فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ

فتاویٰ قاسمیہ

منتخب فتاویٰ

حضرت مولانا مفتی شبیر احمد القاسمی
خادم الافتاء و الحدیث جامعہ قاسمیہ
مدرسہ شاہی مرادآباد، الہند

(جلد ۱۹)

المجلد الثامن عشر

بقية الوقف باب المدارس، كتاب البيوع، البيع الصحيح الفاسد، المرابحه، الصرف، السلم، الاستصناع، الوفاء، الشفعة، المزارعة

۸۴۰۹ ——— ۸۸۵۶

ناشر
مکتبہ اشرفیہ، دیوبند، الہند
01336-223082

فتاویٰ قاسمیہ

صاحب فتاویٰ

حضرت مولانا مفتی شبیر احمد القاسمی

پہلا ایڈیشن محرم الحرام ۱۴۳۷ھ

ناشر

مکتبہ اشرفیہ، دیوبند، ضلع سہارنپور، الهند

01336-223082

ASHRAFI BOOK DEPOT

DEOBAND, SAHARANPUR, INDIA

Phone: 01336-223082

Mob. : 09358001571،08810383186

مکمل اجمالی فهرست ایک نظر میں

❖❖ ❍❖❍

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

٢٤/ بقية كتاب الوقف

□	٩/ باب المدارس	٣٢

مسئلہ نمبر — صفحہ نمبر

الفصل الأول: في المدارس

الفصل الثاني : في التولية ۶۹

❏	**الفصل الثالث: في المدرسين**	۸۶

☐	**الفصل الخامس : في التصرف**	١٣٨

۲۵/ کتاب البیوع

□	۱/ باب البیع الصحیح	۲۴۸

۵/ باب حط الثمن وزیادته نقدا و نسیئة	۵۰۱

□	۸/ باب الصرف	۵۷۵

❐	۹ / باب السلم	۵۸۷

❐	۱۰/ باب الاستصناع	٦٠٩

□	۱۲/ باب الشفعة	۷۰۷

❐	۱۳ / باب المزارعة	۷۱۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۲۴/ بقية كتاب الوقف

۹/ باب المدارس

الفصل الأول: في المدارس

کیا مدرسوں میں دین پڑھایا جاتا ہے سکھایا نہیں جاتا؟

سوال [۸۴۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:
(۱) ایک شخص نے یہ کہا ہے کہ مدارس میں دین پڑھایا جاتا ہے، دین سکھایا نہیں جاتا اور دوسرے شخص نے بھی یہی کہا ہے کہ میں دیانت داری سے کہتا ہوں کہ مدرسوں میں دین نہیں سکھایا جاتا پڑھایا جاتا ہے، مدرسوں میں دین پڑھایا جاتا ہے۔ کیا ان صاحب کی یہ بات صحیح ہے؟
(۲) حدیث شریف: ''**خیر کم من تعلم القرآن وعلمه**'' کا مصداق کیا مدارس نہیں ہیں؟ اگر مدرسہ والے یہ کہیں کہ اس حدیث کے مصداق ہم ہیں، تو یہ بات درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: عقیل الرحمٰن نہٹور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) شخص مذکور کا یہ جملہ کہ مدارس میں دین پڑھایا جاتا ہے سکھایا نہیں جاتا ناواقفیت پر مبنی ہے؛ کیوں کہ مدارسِ اسلامیہ میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا بھی انتظام ہوتا ہے۔
(۲) اس حدیث شریف کا صحیح مصداق مدارسِ اسلامیہ ہی ہیں، جن میں قرآن کریم کی تعلیم

اورتربیت دی جاتی ہے۔

ثم الخطاب عام لا يختص بالصحابة، ولو خص بهم فغيرهم بالطريق الأولىٰ، ولكن لا بد من تقييد التعلم والتعليم بالإخلاص. (بذل المجهود، كتاب الصلاة، باب في ثواب قراءة القرآن، دارالبشائر الإسلامية ٦/ ١٦٠، تحت رقم الحديث: ١٤٥٢)

والحاصل أنه إذا كان خيرا لكلام كلام الله، فكذلك خير الناس بعد النبيين من يتعلم القرآن ويعلمه، لكن لا بد من تقييد التعلم والتعليم بالإخلاص. (مرقاة، كتاب فضائل القرآن، الفصل الأول، مكتبه إمداديه ملتان ٤/ ٣٣٣، حاشية ابن ماجة/ ١٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/۵/۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۴۴/۱۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹/۵/۱۴۳۵ھ

دینی مذہبی ادارہ کورجسٹریشن کرانے کا حکم

سوال [۸۴۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (الف) ایک مسئلہ ہے کہ جس کے مفصل احکام اصول فقہ کے مطابق علماء کرام نے بیان فرمائے اور تمام فقہی کتابوں میں اس کے اصول سے مستقل ابواب قائم فرمائے، ہندوستان میں موجودہ اوقاف بورڈوں کے قوانین وضوابط اسی پر مشتمل ہیں جو کہ خالص مسلمانوں کے لئے ہے۔

(ب) مگر رفاہ عام کے لئے قائم کردہ اداروں کے لئے سیکولر نظریات کی رعایت کرتے ہوئے ایک مشترکہ قانون سوسائٹی ایکٹ ۱۸۹۰ بھی ہے، جو کہ کسی مذہب کے لئے مخصوص نہیں ہے؛ بلکہ اس کے قواعد وضوابط مشترک ہیں اور ان کے منتظمین بلا تخصیص مذہب وملت

مشترک ٹرسٹیان (سوسائٹی) کہلاتے ہیں، ٹرسٹ میں کوئی مخصوص مقصد ضروری نہیں ......
ٹرسٹ مستحق استفادہ ہوسکتا ہے۔

(ج) ٹرسٹ ہمیشہ ملکی قانون کے مطابق ہوتا ہے (جو بدلتے رہتے ہیں) ٹرسٹ میں جائیداد کی ملکیت ٹرسٹیان ودیعت کرتی ہے اور مودع قانونی طور پر اس کا مالک ہوتا ہے۔

(د) اور نا قابل تنسیخ ہونا ضروری نہیں، ٹرسٹ کی جائیداد ٹرسٹی فروخت کرسکتا ہے، غرض ٹرسٹ فقہ انگریزی کا تصور ہے، جب کہ وقف فقہ اسلامی کا ایک خاص مذہبی تصور ہے۔

(ہ) مذکورہ بالا ایکٹ ۱۸۶۰ کی دفعات کے مطالبہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے حکومت اور افسران (غیر مسلم) کے انتظامی معاملات میں مداخلت کا قانونی جواز فراہم ہوتا ہے، ایکٹ مذکور کی دفعہ ۲۳ر کے تحت رجسٹرار کو سوسائٹی کے حسابات کی جانچ کرنے دیگر معاملات کی جانچ کرنے اور اپنی تحقیقات کے نتیجہ میں سوسائٹی کو بذریعہ عدالت تحصیل کرنے کا اختیار ہوتا ہے، دفعہ ۱۲ر کے تحت تحلیل شدہ سوسائٹی کی جائیداد حکومت کو دے دی جاتی ہے۔ ۹۲۰ر ضابطہ دیوانی کے تحت بلا تخصیص مذہب وملت ایک عام ہندوستانی۔

(ی) شہری حساب فہمی وغیرہ کی دادرسی کا حقدار ہوجاتا ہے، میری یقینی معلومات کے مطابق ایک اسی قسم کے درگاہ کے ہندو معتقدین نے بارہ بنکی عدالت میں دعویٰ دائر کیا، ان جزئیات کی روشنی میں دریافت طلب امر یہ ہے:

(۱) کسی دینی مذہبی ادارہ کا رجسٹریشن سوسائٹی ایکٹ ۱۸۶۰ کرانا فرض، واجب، سنت میں سے کونسا درجہ رکھتا ہے؟

(۲) جب کہ اس قسم کے رجسٹریشن کے نتیجہ میں اختلاف پیدا ہوکر فتنہ کی شکل اختیار کرلے، جس سے قوم وملت کے وقار کا خطرہ ہو، مسلمان دو گروہ میں منقسم ہوکر ایک دوسرے کی بے عزتی اور قتل وخون پر آمادہ ہوجائیں، تو ایسے کام کے اصرار کرنے پر کیا حکم ہے؟

(۳) ایسا کام کرنے والوں کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ بینوا توجروا۔

(۴) اگر یہ صحیح و درست ہے تو منع کرنے یا اس سے اختلاف کرنے والے لوگوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد اشفاق عالم، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: احقر نے جن بڑے اداروں کا رجسٹریشن ہو چکا ہے ان کے رجسٹریشن فائلوں کا بغور مطالعہ کیا ہے، ان میں جو شرائط و قیودات مندرج ہیں، ان میں سے کوئی شرط فقہ اسلامی کے خلاف نہیں ہے؛ بلکہ ساری شرائط و قیودات فقہ اسلامی کے موافق اور ادارے کے حق میں مفید و معاون ہیں؛ اس لئے ان میں کوئی تشویش کی بات نہیں۔

(الف) موجودہ دور میں مذہبی اداروں کا رجسٹریشن کرانا فقہ واصول فقہ کے خلاف نہیں۔

(ب) بلا تخصیص مذہب مشترک ہو تو سکتے ہیں، مذہب کی تخصیص کرنا لازم وضروری نہیں ہے؛ لیکن مذہب کی تخصیص بھی کر سکتے ہیں، جیسا کہ بعض بڑے اداروں کے رجسٹریشن فائلوں کے معائنہ کرنے پر صاف طور پر معلوم ہوا ہے کہ ان میں مذہبیت کی شرط بھی موجود ہے۔

(ج) جس کو آپ قانونی طور پر مالکیت سمجھ رہے ہیں وہ درست نہیں ہے؛ بلکہ وہ تصرفات کا ایک اختیار و اقتدار ہے، جس کا مقصد صرف دوسروں کو غلط تصرفات سے روکنا ہے، جس کو شریعت کی اصطلاح میں منتظمانہ تصرف کہا جاتا ہے، نہ کہ مالکانہ؛ اس لئے کہ مالکانہ تصرف میں ساری آمدنی کو آپس میں تقسیم کر کے ذاتی استعمال میں صرف کیا جا سکتا ہے اور منتظمانہ تصرف میں ذاتی اخراجات میں خرچ نہیں کیا جا سکتا؛ بلکہ قانونی طور پر جو تنخواہ متعین ہوتی ہے وہی وصول کی جا سکتی ہے، اس سے زائد ایک پیسہ بھی نہیں لیا جا سکتا، نیز رجسٹریشن شدہ اداروں میں تو مجلس شوریٰ (سوسائٹی منتظمہ) کو تنخواہ بھی نہیں ملتی ہے؛ بلکہ صرف میٹنگ میں شرکت کے وقت آمد و رفت کے اخراجات ملتے ہیں۔

(د) اگرچہ سوسائٹی ٹرسٹ کو فقہ انگریزی کا تصور تسلیم کر لیا جائے، مگر فقہ اسلامی کے خلاف

بھی نہیں ہے۔

(ہ) ۱۸۶۰ء سے ایک سو انتالیس سال کے عرصہ میں کسی رجسٹریشن شدہ مذہبی اداروں کو نہ حکومت نے اپنے قبضہ میں لیا ہے اور نہ ہی کوئی غیر مسلم کسی رجسٹر شدہ ادارے کا منتظم ومقتدر ہوا ہے، یہ محض ذہنی تصورات وتشویشات ہیں، جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

(ی) آپ نے جو بارہ بنکی کی عدالت کی نظیر پیش کی ہے اس کا فیصلہ اور نتیجہ اور پورے واقعہ کی تفصیل کی صحیح رپورٹ کے بعد غور کیا جا سکتا ہے، پھر بھی رجسٹریشن شدہ کوئی ادارہ ۱۲۹/سال کے عرصہ میں نہ حکومت کے قبضہ میں گیا اور نہ ہی غیر مسلم اس میں دخیل ہوئے۔

(۱) اس کا مدار ادارے کے ذمہ دار حضرات پر ہے، حالات کے اعتبار سے کبھی ذمہ داران پر واجب بھی ہوجاتا ہے۔ اور کبھی نہیں بھی ہوتا ہے۔

صاحب البيت أدرى بما فيه. (نخبة الفكر/٥)

(۲) اگر کسی صحیح کام پر اقدام کی وجہ سے دوسرے لوگ مسئلہ کی نزاکت پر غور کیے بغیر فتنہ وفساد پر اتر آئیں تو غلطی فتنہ کرنے والوں کی ہے، ان پر لازم ہے کہ خود کو فتنہ سے باز رکھ کر دوسروں کو فتنہ میں نہ مبتلا کریں۔

(۳) شرعی اعتبار سے رجسٹریشن کرانے والے حق پر ہیں؛ اس لئے ان پر شرعاً کوئی الزام نہیں۔

(۴) اختلاف کرنے والوں کو یا تو ۱۲۹/سال کے عرصہ میں واقع ہونے والے واضح نظائر پیش کرنے چاہئے یا اختلاف سے باز آجانا چاہئے؛ کیوں کہ رجسٹریشن کرانے میں کوئی شرعاً قباحت نہیں ہے، جو رجسٹریشن کے ہر پہلوں پر غور کرنے کے بعد پتہ چل سکتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/۱۳۸۵)

مجلسِ عاملہ ومجلسِ شوریٰ

سوال [۸۴۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کسی مدرسہ یا مسجد کی کوئی مجلسِ شوریٰ ہو اور وہ کمیٹی یا مجلسِ شوریٰ کوئی فیصلہ شریعت کے خلاف دے دے، تو شریعت کی بات مانی جائے گی یا کمیٹی کی؟ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ یہ کمیٹی اس مسجد یا مدرسہ کی بستی ہی میں سے ہونا ضروری ہے یا باہر کی کمیٹی بھی بنائی جا سکتی ہے؟ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ اس کمیٹی نے جو مجلسِ عاملہ تیار کی ہے اس مجلسِ عاملہ کو ہر پانچ سال میں تبدیل کرنا ضروری ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں مسئلہ کو واضح فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں عین نوازش ہوگی۔ والسلام

المستفتی: محمد معروف ساکن ویر پورتھان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مجلسِ شوریٰ یا کمیٹی شریعت کے خلاف فیصلہ کیسے دے سکتی ہے؟ اگر کوئی ایسا فیصلہ دیا ہے تو اس فیصلہ کو متعین کر کے واضح کریں کہ واقعی شریعت کے خلاف ہے اس کے بعد اس سلسلہ میں حکم شرعی لکھا جا سکتا ہے، مستفتی خود اپنے طور پر شریعت کے خلاف سمجھ رہا ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ پوچھا گیا ہے کہ مجلسِ شوریٰ یا کمیٹی کا بستی میں سے ہونا ضروری ہے یا باہر کی بھی بنائی جا سکتی ہے؟ تو اس سلسلے میں شریعت میں کوئی تعیین نہیں ہے، چاہے بستی کے لوگوں کو بنائیں یا سب باہر کے لوگ ہوں، یا کچھ باہر کے اور کچھ مقامی ہوں، ہر طرح جائز ہے، جیسا کہ خود ہمارے مدرسہ شاہی میں مقامی بھی ہیں اور باہر کے بھی ہیں۔ تیسرا مسئلہ یہ پوچھا گیا ہے کہ اس کمیٹی نے جو مجلس عاملہ تیار کی ہے اس مجلس عاملہ کو ہر پانچ سال میں تبدیل کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ اس مدرسہ یا مسجد کی کمیٹی کے اوپر موقوف ہے، چاہے ہر پانچ سال میں تبدیل کریں یا نہ کریں؛ اس لئے کہ مدارسِ اسلامیہ کے قوانین وضوابط آپس کی تراضی اور

مشورہ کے مطابق ہوتے ہیں، جس میں قرآن وحدیث کے نصوص کے خلاف کوئی عمل نہ ہوجو ذیل کی حدیث شریف سے واضح ہوتا ہے:

عن عمرو بن عوف المزني أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دار السلام، رقم: ١٣٥٢، المستدرك للحاكم، كتاب الأحكام، مكتبه نزار مصطفى الباز جديد ٧/ ٢٠٢٣، قديم ٤/ ١٠١، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ١١٣، رقم: ٧٠٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍شوال ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۲۵۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/۱۰/۱۴۳۴ھ

مجلسِ شوریٰ کے اختیارات

سوال [۸۴۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کا تقرر تقریباً ۱۷؍سال قبل ایک ادارہ میں بحیثیت مدرس درجہ ناظرہ ہوا، ضابطہ کے تحت زید امور مفوضہ کی ادائیگی کرتا رہا، ناظم مدرسہ یا نائب مہتمم مدرسہ اپنے اختیار کے تحت مدرسہ کے دوسرے کام بھی زید سے لیتا تھا، جس کی وجہ سے آخری پانچ سال بحیثیت مدرس زید کی کارکردگی بہتر نہیں رہی اور زید کو خارجی کام نائب مہتمم مدرسہ زیادہ دیتا رہا، جس پر نائب مہتمم مدرسہ نے اپنے حکم نامہ مورخہ ۲۸/۵/۱۴۳۰ھ میں زید کو مدرس سے محرر تعلیمات میں عارضی طور پر منتقل کردیا، زید اس عہدے پر ۲۲؍ذیقعدہ ۱۴۳۱ھ تک بحسن وخوبی کام کرتا رہا، ۲۵؍شوال المکرّم ۱۴۳۱ھ کو نائب مہتمم مدرسہ نے زید کو ایک حکم نامہ فراہمی چندہ سے متعلق جاری کیا، زید نے حسب الحکم ۵؍ذیقعدہ ۱۴۳۱ھ کو مدرسہ ہذا کی ۲؍عدد رسید بک (جلد

نمبر: ۳۶۷، ۳۶۸) دفتر مالیات سے مع تصدیق نامہ چندہ حاصل کی، جن پر نائب مہتمم مدرسہ کے دستخط مع مہر وتاریخ کے ثبت ہیں۔ ۷/ ذیقعدہ ۱۴۳۱ھ سے سفر فراہمی چندہ شروع کیا، تصدیق نامہ زید کو ۵/ ذیقعدہ ۱۴۳۱ھ سے ۳۰/ ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ تک جاری کیا گیا۔ اسی دوران مدرسہ مذکور جس میں زید ملازم ہے کی مجلسِ شوریٰ کا اجلاس، جو کہ نامور علماء وصلحاء علاوہ ایک فرد کے پر مشتمل ہے۔ ۱۹/ ذیقعدہ ۱۴۳۱ھ کو منعقد ہوا، شوریٰ کے اجلاس میں شوریٰ کے کسی رکن نے زید سے متعلق نائب مہتمم سے معلوم کیا کہ زید کہاں ہے؟ جس پر نائب مہتمم مدرسہ نے مجلسِ شوریٰ کو جواب دیا مجھے معلوم نہیں، پھر زید سے متعلق شوریٰ میں بحث ہوئی، ایک رکن نے زید پر خوب اعتراض کئے، نائب مہتمم مدرسہ خاموش بیٹھے سنتے رہے، یاد رہے یہ شوریٰ اس مذکورہ تاریخ میں مدرسہ مظاہر علوم کے امین عام حضرت اقدس الحاج سیدی محمد شاہد صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ ''خلیفہ قلم حضرت شیخ الحدیث'' کی صدارت میں چل رہی تھی، آخر کار مدرسہ مظاہر علوم کے ذمہ دار اعلیٰ اور اس شوریٰ کے ایک مؤقر رکن نے شوریٰ کے سبھی حضرات کو خاموش کر کے نائب مہتمم مدرسہ سے صاف طور پر معلوم کیا، کیا زید کا آپ کو علم ہے کہ زید کہاں ہے؟ کیا زید کو آپ نے کسی اپنے یا مدرسہ کے ضروری کام سے تو نہیں بھیج رکھا ہے؟ یکے بعد دیگرے مکرر استفسار پر نائب مہتمم مدرسہ نے شوریٰ کو جواب دیا کہ دو چار روز پہلے ان کا فون آیا تھا کہ وہ مدھیہ پردیش میں چندہ کر رہا ہے، جب کہ زید اپنے سفر سے متعلق روزانہ نائب مہتمم مدرسہ، نائب مہتمم مالیات مدرسہ کو آگاہ کرتا رہا اور ان کے شاگردوں سے موبائل فون پر گفتگو کراتا رہا، اس پر شوریٰ کے اسی موقر رکن نے نائب مہتمم مدرسہ سے معلوم کیا کہ چندہ بھی آپ کی بغیر اجازت کے کر رہا ہے؟ اس کو کاپیاں کس نے دیں؟ کاغذات کہاں سے لئے وغیرہ؟ اس پر نائب مہتمم مدرسہ خاموشی اختیار کر گئے، آخر کار شوریٰ نے ۵/ ذیقعدہ ۱۴۳۱ھ سے غیر حاضر مان کر غیر حاضری کے الزام میں زید کی علیحدگی کا فرمان جاری کر دیا۔ ۲۲/ ذیقعدہ کو زید سفر سے واپس آیا اور سفر کا حساب وغیرہ مدرسہ کے تحویلدار کے حوالہ کیا۔ اور رجسٹری حاضری میں باضابطہ دستخط کے حساب سے فراغت کے بعد نائب مہتمم

مدرسہ نے تعلیمات کے محرر اعلیٰ کے ذریعہ زبانی پیغام پہنچایا کہ زید سے کہو وہ اپنا حساب کرکے چپ چاپ (خاموشی) سے مدرسہ سے چلے جائیں۔ زید کو یہ سن کر بہت رنج ہوا جو کہ ہر انسان کو ایسے وقت میں ہوا کرتا ہے۔ زید نے تحویلدار سے معلوم کیا، مہتمم مدرسہ سے معلوم کیا، مہتمم مدرسہ نے جواب دیا کہ نائب مہتمم مدرسہ نے جو رپورٹ مجلسِ شوریٰ میں رکھی، اس پر فیصلہ ہوگیا، میری یا مجلسِ شوریٰ کی کوئی غلطی نہیں، اس کے بعد زید نے نائب مہتمم سے معلوم کیا، نائب مہتمم مدرسہ حیلہ بازی کرنے لگے اور کہنے لگے کہ مجھے مجلسِ شوریٰ میں بولنے نہیں دیا گیا، زید نے سب کچھ ناظم مدرسہ نائب مہتمم مالیات کو بتلایا، زید کی گفتگو سن کر نائب مہتمم مہتمم مدرسہ سے ملے اور ان سے ایک مفتی صاحب کی موجودگی میں جو اسی مدرسہ میں ملازم ہیں بولے کہ وہ تو چندہ میں میں نے ہی بھیجا تھا، میرے یاد نہیں رہا، مہتمم مدرسہ نے اپنے نائب کی بات سن کر کہا کہ اب تو شوریٰ کا فیصلہ ہوگیا ہے، آپ کو شوریٰ میں ہی کہنا پڑے گا میں اکیلا اس کام کو نہیں کرسکتا، پھر ۲۳ر ذیقعدہ کو علی الصبح مہتمم مدرسہ، نائب مہتمم مدرسہ، نائب مہتمم مالیات اور شوریٰ کے ایک رکن کی دفتر مدرسہ میں ایک میٹنگ ہوئی، دوران میٹنگ زید پھر سے ان سب کے درمیان پہنچ گیا اور معلوم کیا کہ مجھے کس جرم کی سزا مل رہی ہے، یہ سب خاموش رہے، زید نے پھر معلوم کیا کہ جس وجہ سے اور جس تجویز پر مجلس شوریٰ نے علیحدگی کا فرمان جاری کیا ہے اس تجویز کو لکھ کر مجھے دے دو، تو مہتمم مدرسہ یوں گویا ہوئے کہ ہم نے بغیر تحریر کے رکھا تھا اور کوئی تحریر دئے بغیر الگ کررہے ہیں اور بس اب چلے جاؤ۔ اور مذکورہ چاروں حضرات مجھے نظر غیر سے دیکھنے لگے جیسے مجھے مار ہی ڈالیں گے اور ان چاروں حضرات نے تحویلدار مدرسہ کو حکم دیا کہ ان کی پانچ یوم کی تنخواہ دے کر ان کا حساب صاف کرو، حسب الحکم تحویلدار مدرسہ نے پانچ یوم کی تنخواہ مجھے دی اور رجسٹر قبض الوصول پر بغیر ٹکٹ لگائے میرے دستخط لئے، اس طریقہ سے میرے ۱۸ر یوم کی اجرت ذمہ داران مدرسہ نے رکھ لی اور تعلقی فرمان سے بڑی بے عزتی سے زید کو مدرسہ سے باہر کا راستہ دکھایا۔ اس سے پیشتر بھی انھیں نائب مہتمم مدرسہ نے تقریباً ۱۶ر آدمیوں کی مجلسِ شوریٰ میں غلط بیانی اور غلط

رپورٹ دے کراور شوریٰ کو دھوکے میں رکھ کر مدرسین وملازمین کی عزت سے کھلواڑ کیا ہے، تو اس صورت میں:

(۱) کیا مجلسِ شوریٰ فریقین کی بغیر سنے اور نائب مہتمم کی رپورٹ پر مدرسین وملازمین کو الگ کرنے کا اختیار رکھتی ہے؟ کیا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین، بزرگانِ دین کی کسی مجلس سے اس قسم کا کوئی ثبوت ملتا ہے؟ اور کیا کسی عالم، حافظ، قاری کی عزت سے کھلواڑ کرنا بروئے شرع جائز ہے؟

(۲) کیا ایسا شخص جو خود ہی تحریری یا زبانی کہہ کر اپنے مدرس یا ملازم کو کہیں بھیجے اور شوریٰ کے وہ علماء وصلحاء مجلسِ شوریٰ کے اجلاس میں کسی مدرس یا ملازم کے متعلق معلوم کریں تو نائب مہتمم کذب گوئی، دھوکہ دھڑی سے کام لے، کیا ایسے شخص کو ایسے مؤقر ادارے کا نائب مہتمم مدرسہ بنائے رکھنا شرعی روشنی میں جائز ہے؟

(۳) مجلسِ شوریٰ آئندہ اجلاس میں اپنے اس فیصلہ پر دوبارہ غور کرنے کی مجاز ہے یا نہیں؟ اور زید کی بحالی کا حکم صادر کرنے میں مجلسِ شوریٰ کو شرعی کوئی قباحت نہیں؟

(۴) زید ۷؍سال قدیم مدرس وملازم ہے اور مدرسہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا سمجھتا ہے اور زید نے کبھی نائب مہتمم مدرسہ کی حکم عدولی بھی نہیں کی ہے، تو ایسی صورت میں نائب مہتمم کا یہ سارا برتاؤ زید سے کرنا اخلاقاً شرعاً جائز ہے؟ نیز ذمہ دارانِ مدرسہ کو ۶؍ذیقعدہ ۱۴۳۱ھ سے ۲۳؍ذیقعدہ ۱۴۳۱ھ تک کی اجرت رکھنا مدرسہ یا ذمہ دارانِ مدرسہ کو جائز ہے؟ شریعت مطہرہ کی روشنی میں مع دلیل وحوالہ کے جواب سے مطلع فرمائیں، نوازش ہوگی۔

المستفتی: ابو حافظ محمد طلحہ بن محمد نسیم راوت، مقام سلیم پور گدا، ڈاکخانہ ساڈھولی قدیم، ضلع سہارنپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدارسِ اسلامیہ کے اصول وضوابط حسب ذیل حدیث شریف پر مبنی ہیں:

عن عوف المزني أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون

على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، المعجم الكبير للطبراني، دارإحياء التراث العربي ١٧/ ٢٢، رقم: ٣٠)

اس حدیث شریف کی روشنی میں مدرسہ کے اصول وضوابط کی پابندی، امانت ودیانت کے ساتھ ہرایک کے اوپر لازم ہے، اگر نائب مہتمم نے بددیانتی سے کام لیا ہے، تو اس کا گناہ ان ہی کے سر ہوگا، باقی سائل کے معاملہ کی جزئیات سے متعلق اسی مدرسہ کے ذمہ دار و دیانتدار علماء ہی کو غور کرنا چاہئے اور سب سے بڑی کمیٹی جس کو بالا دستی حاصل ہے، وہ مجلسِ شوریٰ ہے اور مجلسِ شوریٰ تک صحیح رپورٹ پیش کرنے کی ذمہ داری مدرسہ کے ان ذمہ دار حضرات پر ہے جو شوریٰ میں رپورٹ پیش کرنے والے ہوتے ہیں، اگر ان کی طرف سے کوئی کمزوری ہے، جس کی وجہ سے مدرسہ یا کسی ملازم پر زد آسکتی ہے، تو اس کا گناہ ان ہی کے سر ہوگا۔ اور دیانتداری امانت داری اور کسی کی ہتک عزت سے متعلق ''المعجم الکبیر'' کی یہی حدیث شریف سب کے لئے سبق آموز ہے:

عن عبدالله بن مسعود –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: لا إيمان لمن لا أمانة له، ولا دين لمن لا عهد له، والذي نفس محمد بيده لا يستقيم دين عبد حتى يستقيم لسانه، ولا يستقيم لسانه حتى يستقيم قلبه، ولا يدخل الجنة من لا يأمن جاره بوائقه. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ١٠/ ٢٢٧، رقم: ١٠٥٥٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍رجب ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۴۶۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۷/۱۴۳۲ھ

مدارسِ اسلامیہ میں طلبہ کی دیکھ بھال کے لئے کیمرہ لگانے کا حکم

سوال [۸۴۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: آج کل ایک کیمرہ رائج ہے، جس کو عام اجتماع گاہوں، مثلاً بڑے بڑے ہوٹلوں، ہسپتالوں، اسٹیشنوں، ہوائی اڈوں اور شہر کے چوراہوں وغیرہ پر نصب کیا جاتا ہے اور اس کا کنکشن چھوٹی بڑی اسکرین سے ہوتا ہے، جس کو کسی دفتر یا کاؤنٹر میں رکھا جاتا ہے، جہاں اس چھوٹی یا بڑی اسکرین پر کیمرہ کی زد میں آنے والے تمام افراد کی تصاویر نظر آتی ہیں اور اس کے ذریعہ متعلقہ اشخاص کی نقل وحرکت پر مکمل نظر رکھی جاتی ہے اور ایک متعینہ مدت تک اس نقل وحرکت کو ریکارڈ بھی کیا جاسکتا ہے، جسے بوقت ضرورت آن کرکے دیکھا جاسکتا ہے اور یہ چیز بظاہر چوری، خیانت، ایذا رسانی اور ممکنہ خطرات سے حفاظت کا عمدہ سامان ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ اس کیمرہ کو کسی اسلامی درسگاہ ''مدرسہ یا جامعہ'' کی گذرگاہوں، گیلریوں، برآمدوں اور دارالاقامہ کے صحن وغیرہ میں نصب کرکے طلبہ کرام پر نظر رکھ کر متعلقہ فوائد حاصل کرنے اور ان کی لایعنی مصروفیات اور غیر قانونی حرکات پر کنٹرول کرنے کے ارادہ سے استعمال میں لانا شرعی نقطۂ نظر سے کیا حکم رکھتا ہے۔ اور اس کے استعمال کی کہاں تک گنجائش ہے؟ امید ہے کہ تسلی بخش تفصیلی جواب عنایت فرماکر ممنون فرمائیں۔

المستفتی: محمد مشتاق ستپونی، خادم دارالعلوم سعادت دارین ستپونی بھروچ، گجرات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس کیمرہ کا سوال نامہ میں ذکر ہے، مالی نقصان سے بچنے کے لئے دفع مضرت کے طور پر اس کی گنجائش ہے؛ لیکن مدارسِ اسلامیہ اور دینی درسگاہوں میں یہ کیمرہ لگانا کسی طرح مناسب نہیں ہے، اکابر ومشائخ کے طریقہ کے خلاف ہے۔ اور طلبہ کی اخلاقیات پر نظر رکھنے کے لئے اس قدر تجسس کے ہم مکلّف نہیں ہیں۔ اور مدارسِ اسلامیہ اور دینی درسگاہوں میں مالی نقصان اور حقوق العباد کے تلف ہونے کا ایسا خطرہ نہیں ہے، جس کے لئے ایسے تجسس کے کیمرے کے لگانے کی ضرورت ہو؛ لہٰذا مدارسِ اسلامیہ کو ایسے کیمروں سے پاک رکھا جائے۔

وَلا تَجَسَّسُوا. الآية [حجرات: ۱۲]

الثابت بالضرورة يتقدر بقدرها. (قواعد الفقه أشرفي، ص: ٧٤، قاعده: ١٠٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ذیقعدہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۰۸۶۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶/۱۱/۱۴۳۳ھ

ایک مدرسہ سے متعلق چند سوالات وجوابات

سوال [۸۴۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں ''مدرسہ جامعہ اسلامیہ جلالیہ'' میں درجہ اول دینیات میں غیر مقامی طلبہ داخلہ لیتے ہیں، ان سے مزید کھانے کے لئے پانچ ہزار پانچ سو روپئے لئے جاتے ہیں اور ان بچوں کے سرپرست صاحبان کو یہ بتلایا جاتا ہے کہ آپ کا بچہ اگر مدرسہ سے چلا جائے تو پانچ ہزار پانچ سو روپئے آپ کو واپس نہیں کئے جائیں گے؛ اس لئے کہ اس سے مدرسہ میں طلبہ کی کمی ہوگی؛ کیوں کہ درجات کے اعتبار سے طلبہ کی تعداد متعین ہے، سرپرست صاحبان بھی اس وقت مان لیتے ہیں؛ لیکن بعد میں جب بچہ چلا جاتا ہے تو خوراکی کے نام پر جو رقم جمع کی تھی اسے مانگتے ہیں، مذکورہ صورت میں گارجین کو خوراکی کی رقم واپس کرنا ضروری ہے، جب کہ گارجین نے وعدہ کیا تھا کہ بچہ اگر چلا جائے تو رقم واپس نہیں لیں گے۔ دوسری صورت ہمارے یہاں یہ بھی ہے کہ ایک خصوصی مطبخ قیمتاً چلتا ہے، جس میں اہل ثروت حضرات کے بچے سالانہ نو ہزار روپئے جمع کرتے ہیں اور اپنا کھانا کھاتے ہیں، اس صورت میں بھی کبھی بچے چلے جاتے ہیں، ان بچوں کے سرپرست صاحبان بھی بوقت داخلہ وعدہ کرتے ہیں، بچے چلے جانے کی صورت میں روپئے واپس نہیں لیں گے؛ لیکن بعد میں کچھ لوگ مطالبہ کرتے ہیں، ایسی صورت میں یہ رقم شرعاً واپس کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

(ب) خوراکی کے نام پر جو رقم الگ سے لی جاتی ہے وہی رقم اگر داخلہ فیس کے ساتھ جوڑ کر

داخلہ فیس میں اضافہ کردیا جائے اور داخلہ فیس بجائے ۸۰۰؍ کے ۹۸۰؍ یا ۶۳۰۰؍ کردیا جائے اور اس صورت میں اگر بچہ چلا جائے تو رقم واپس نہیں کی جائے گی، تو کیا یہ شرعاً جائز ہے؟

(۲) ایک استاذ ایک مدرسہ میں پڑھاتے پڑھاتے بوڑھے کمزور اور بیمار ومعذور ہوگئے، اب پڑھانے سے معذور ہیں، ادھر پوری زندگی مدرسہ میں رہنے کی وجہ سے دوسرا کوئی ذریعہ معاش کا بھی گھر میں انتظام نہیں ہے، اب کیا اس حالت میں مدرسہ کی طرف سے ان کے لئے پنشن جاری کرنا یا ان کے لئے پنشن لینا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو کس فنڈ سے ان کو رقم دی جائے گی؟

المستفتی: ارکان حل وعقد جامعہ جلالیہ ہوجائی آسام، ہند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حسب تحریر سوال جو رقم مدرسہ میں مقیم طلبہ کے سرپرستوں سے سال بھر کی خوراکی کے نام پر وصول کی جاتی ہے وہ رقم شرعاً طعام کے عوض میں ہے؛ لہٰذا درمیان سال میں اگر طالب علم چلا جاتا ہے، تو حساب لگا کر باقی ماندہ رقم سرپرستوں کو واپس کرنا ضروری ہے؛ کیوں کہ اب اس رقم کا کوئی مصرف نہیں رہا اور داخلہ کے وقت مدرسہ کے ذمہ داران اور طلبہ کے سرپرستوں کے درمیان یہ جو طے ہوا تھا کہ بیچ سال میں طالب علم کے چلے جانے کی صورت میں وہ رقم کی واپسی کے مطالبہ کے مجاز نہ ہوں گے، اس کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں ہے؛ البتہ خوراکی کی رقم اگر داخلہ فیس میں منضم کرکے اصل داخلہ فیس میں اضافہ کردیا جائے تو اب ذمہ داران مدرسہ طالب علم کے درمیانی سال میں واپس چلے جانے کی صورت میں بقیہ رقم کی واپسی کے مکلّف نہ ہوں گے۔ اور نہ ہی سرپرست حضرات کو مطالبہ کا اختیار ہوگا؛ اس لئے کہ وہ پوری رقم داخلہ فیس ہی کے لئے متعین ہے اور منجانب مدرسہ اس کا داخلہ ہوچکا ہے۔

عن أبي حميد الساعدي أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل لمسلم أن يأخذ مال أخيه بغير حق. (مجمع الزوائد، باب الغصب وحرمة مال المسلم، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٤١، رقم: ٦٨٥٩، مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٤٢٥، رقم: ٢٣٠٠٣)

عن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني عن أبيه، عن جده، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢)

لو باع كاغذة بألف يجوز، ولا يكره. (فتح القدير، كتاب الكفالة، زكريا ديوبند ٧/ ١٩٨، دارالفكر ٧/ ٢١٢، كوئٹه ٦/ ٣٢٤، دارالحكام ٢/ ٣٠٤، الدر مع الرد، مطلب بيع العينة، كراچی ٥/ ٣٢٦، زكريا ٧/ ٦١٣)

(۲) جب مدرسہ میں قانون وضابطہ یہ بن جائے کہ کمزور اور معذور مدرسین وملازمین کے لئے پنشن جاری کیا جائے گا، تو ایسی صورت میں اس ضابطہ کے مطابق مذکورہ مدرس کو منجانب مدرسہ پنشن دینا جائز اور درست ہے۔ اور بہتر یہ ہے کہ اخبارات اور کثیر الاشاعت رسائل میں اس ضابطہ کا اعلان کر دیا جائے، تاکہ لوگوں کو اس کا علم ہو جائے۔

وأما شرائط الصحة، فمنها: رضا المتعاقدين. (هندية، كتاب الإجارة، الباب الأول، زكريا جديد ٤/ ٤٤٠، قديم ٤/ ٤١١)

عن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني عن أبيه، عن جده، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ١٧/ ٢٢، رقم: ٣٠، سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٢٣، رقم: ٢٨٦٩)

والوكيل إنما يستفيد التصرف من الموكل، وقد أمره بالدفع إلى فلان فلا يملك الدفع إلى غيره. (شامي، كتاب الزكاة، زكريا ٣/ ١٨٩، كراچی ٢/ ٢٦٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ذیقعدہ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۲۱۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۱۱/۱۴۳۱ھ

مدارسِ اسلامیہ کے اصول کا ماخذ

سوال [۸۴۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک ادارہ میں تمام اساتذہ کو مدعو کرکے روبرو تنخواہ دی گئی، ایک مدرس کو نہ صرف فراموش کیا گیا بلکہ پیمنٹ رجسٹر اس کے مکان پر پہنچایا گیا، ایک بالغ لڑکے کے ذریعہ، جب کہ مدرس ادارہ میں حاضر تھا، شرارتاً اس طرح کیا گیا، دس ذی الحجہ کو ناظم مدرسہ اور مدرس میں توتو میں میں ہوگئی، پھر مدرس نے ٹرسٹ کے مطالبہ پر معافی نامہ پیش کردیا، پھر بھی ناظم صاحب نے سبکدوش کرنے کا پلان بنالیا، ٹرسٹ کے سامنے کہتے ہیں: میں نے اکراماً تنخواہ ان کے گھر بھجوائی تھی، ناظم صاحب کا کہنا ہے کہ ادارہ پندرہ سو روپئے مکان کرایہ ایک ماہ کا آپ کو دے رہا ہے، پانچ سو روپئے میں اپنی جیب سے دے رہا ہوں، آپ مدرسہ کا مکان خالی کردیں؟ تحقیقی فتویٰ مطلوب ہے۔

المستفتی: سید ذاکر علی اشاعتی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مدارسِ اسلامیہ کے قوانین وضوابط حسب ذیل حدیث شریف سے ثابت ہوتے ہیں کہ آپس میں جو معاملہ طے ہوجائے اسی پر پابند ہونا مدارس کے ذمہ دار اور ملازمین پر لازم ہے۔

عن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.

(سنن الترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، المستدرك للحاكم، كتاب الأحكام، مكتبه نزار مصطفى الباز جديد ٧/ ٢٥٢٣، قديم ٤/ ١٠١، دارالكتب العلمية ٤/ ١١٣، رقم: ٧٠٥٩)

اب رہی سوال نامہ میں جانبین کی ایک دوسرے کی شکایت کی باتیں، تو اس سلسلہ میں وہیں قریب کے بااثر علماء ومفتیان کرام سے رابطہ قائم کریں، اصل صورت حال کیا ہے اس کو پیش نظر رکھ کر وہاں کے علماء بہتر بات کہہ سکتے ہیں اور ہم اتنی دور رہ کر وہاں کی نزاکت کو نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۰۹۸۶)

مدرسہ کے قوانین کا ماخذ

سوال [۸۴۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اجتماع مرکز ماہانہ میں بلانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ متعلقہ شاخ کے جملہ رجسٹر جات جن میں اس شاخ کے متعلق پوری کارروائی درج ہوتی ہے، ان کا معائنہ مرکز میں ہوا کرتا ہے اور اس مقصد کے لئے مرکز میں بلایا جاتا ہے، تو اب اگر مرکز آنے کی صورت میں مدرسہ سے واپسی میں گھر جاتا ہے، تو ایک طرف کا کرایہ ملے گا۔ اور اگر گھر نہ جا کر مدرسہ واپس ہو جاتا ہے، تو دونوں طرف کا کرایہ ملے گا، کوئی مدرس اگر تاخیر کر کے آتا ہے، تو بھی کرایہ مل جاتا ہے۔ اور اگر اجتماع کی کارروائی ختم ہونے کے بعد حاضر ہوتا ہے، تو کرایہ نہیں ملتا ہے، مثلاً اگر شنبہ کی صبح کو اجتماع ہوتا ہے، تو جمعہ کو حاضری ضروری ہو جاتی ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے جمعہ کی شام تک حاضر نہ ہو سکے تو سنیچر کی صبح تک وہ حاضر ہو جاتا ہے، تو پھر بھی رعایۃً کرایہ مل جاتا ہے؛ لیکن اگر اجتماع ختم ہونے کے بعد یا سنیچر کی دوپہر کے بعد آتا ہے تو کوئی بھی کرایہ نہیں ملے گا۔ اب ایسے حالات میں ایک مدرس شاخ سے بجائے مرکز آنے کے اپنے گھر چلا گیا، براہ راست مرکز نہیں آیا گھر سے اجتماع ختم ہونے کے بعد مرکز آ گیا اور درس میں بھی جملہ کارروائی رجسٹر لے کر نہیں آیا جس کی بنا پر اس مدرس کو اپنی کارروائی رجسٹر کے لئے دوبارہ

مدرسہ جانا پڑا، تو ان دونوں سفروں میں سے کس سفر کا کرایہ اس کو مدرسہ سے ملے گا یا کچھ بھی نہیں ملے گا، مدرس صاحب کو معطل کردیا گیا جس کا حکم نامہ مرکز حاضر ہونے کے بعد دیا گیا، نیز ابھی بحالی بھی نہیں ہوئی ہے، یعنی مدرسہ واپسی کا حکم نہیں ملا ہے۔ بینوا توجروا

المستفتی: فیض الحسن ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدارسِ اسلامیہ کے قوانین اور ضوابط ترمذی شریف اور دارقطنی کی اس حدیث شریف سے مستنبط ہوتے ہیں:

عن عبداللّٰه بن عمرو بن عوف المزني أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.

(سنن الترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول اللّٰه ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٢٣، رقم: ٢٨٦٩)

کہ مسلمان آپس میں جائز معاملہ میں جو شرائط طے کرلیں ان کی پابندی ہر ایک پر لازم ہوجاتی ہے، جیسا کہ مذکورہ حدیث سے واضح ہے؛ لہٰذا جب مذکورہ مدرسہ اور اس کے مرکز کے درمیان یہ قانون اور ضابطہ مقرر ہوچکا ہے کہ اجتماع کے موقع پر ذیل کے پانچ شرائط کی پابندی لازم ہے جو سوال نامہ سے سمجھ میں آرہے ہیں:

(۱) کارروائی رجسٹر مکمل لے کر کے مرکز میں پہنچنا۔

(۲) طے شدہ وقت کے اندر اندر پہنچنا۔

(۳) اگر مدرسہ سے طے شدہ وقت کے اندر مرکز میں پہنچ کر پھر کارروائی کے بعد مدرسہ لوٹ کر آیا ہے، تو مدرسہ دونوں طرف کا کرایہ دے گا۔

(۴) اگر ایاباً یا ذہاباً ایک دفعہ گھر ہوتے ہوئے آتا ہے یا جاتا ہے، تو مدرسہ ایک طرف کا کرایہ دے گا۔

(۵) آتے اور جاتے دونوں دفعہ گھر ہوکر جاتا ہے یا آتا ہے، تو مدرسہ کوئی کرایہ نہیں دے گا۔ یہ آپس کے قوانین اور شرائط ہیں، جن کی پابندی لازم ہے، سوال نامہ میں ذکر کردہ واقعہ کے مطابق مذکورہ مدرس نے طے شدہ شرائط میں سے جن کی پابندی سے کرایہ مل سکتا ہے کسی بھی شرط کی پابندی نہیں کی ہے؛ اس لئے مذکورہ مدرس کو مدرسہ کی جانب سے کوئی کرایہ نہیں ملے گا، پہلے سفر میں اس لئے نہیں ملے گا کہ ضابطہ نمبر ۲ رکی پابندی نہیں کی ہے۔ اور دوسرے سفر میں اس لئے نہیں ملے گا کہ ضابطہ نمبر ا رکی پابندی نہیں کی۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰ ؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۹۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۵/۳۰ھ

مدارس کے اصول وضوابط کی شرعی حیثیت

سوال [۸۴۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ایک ادارہ میں قانون بنایا گیا کہ اساتذہ گھنٹہ میں دس منٹ سے زائد تاخیر سے آئیں گے، تو ان کا پورا گھنٹہ غیر حاضری شمار ہوکر پورے گھنٹہ کی تنخواہ وضع کی جائے گی، اگرچہ اڑتالیس منٹ استاذ نے پڑھایا ہو۔

(۲) ایسے ہی جو ملازم پندرہ منٹ سے زائد تاخیر سے آئیں گے ان کے پورے چار گھنٹے غیر حاضر شمار ہوکر پورے چار گھنٹے کی تنخواہ وضع کی جائے گی، اگرچہ ملازم نے تین گھنٹے چالیس منٹ دفتر وغیرہ میں کام کیا ہو اور ڈیوٹی انجام دی ہو، مذکورہ بالا قانون کی شرعی حیثیت سے مطلع فرما کر ممنون فرمائیں، کیا مذکورہ قانون میں حق تلفی نہیں ہے؟

(۳) ایک ادارہ میں تقسیم کار اور مختلف امور کے الگ الگ شعبے ہیں، جس شعبہ میں جس ملازم کا تقرر جس خدمت پر طے ہوا اس کی خدمت مفوضہ کے علاوہ دوسرا کوئی کام انجام نہ دینے پر غیر حاضری شمار کر کے تنخواہ وضع کرنا شرعاً کیسا ہے؟ بینوا توجروا

المستفتی: حکیم محمد مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدارسِ اسلامیہ کے قوانین وضوابط کا سارا مدار ایک حدیث شریف پر ہے، جس کو ہم پہلے نقل کردیتے ہیں، اس کے بعد تینوں سوالات کے جوابات اسی حدیث شریف کی روشنی میں پیش کئے جائیں گے۔حدیث شریف یہ ہے:

عن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.

(سنن الترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، المعجم الكبير للطبراني دار إحياء التراث العربي ١٧/ ٢٢، رقم: ٣٠)

مسلمانوں کی آپسی تراضی سے ہر وہ صلح اور قانون جائز ہے جس سے قرآن وحدیث کے حرام کو حلال کرنا لازم نہ آتا ہو، اسی طرح ہر وہ شرط بھی ضابطہ اور قانون میں جائز ہے جس سے قرآن وحدیث کے قطعی حرام کو حلال، یا حلال کو حرام کرنا لازم نہ آتا ہو، اب سوالات کے جوابات ملاحظہ فرمایئے:

(۱) جب مدرسہ نے یہ قانون بنادیا ہے کہ دس منٹ کی تاخیر سے پورا گھنٹہ غیر حاضری میں شمار ہوا کرے گا تو مدرس کو یہ اختیار بھی حاصل ہوگیا کہ وہ گھنٹہ نہ پڑھائے اور دس منٹ کی تاخیر کے بعد رجسٹر پر دستخط کردے۔اور اگر رجسٹر پر دستخط کردیا گیا ہے اور پھر پورا گھنٹہ مدرس نے نہیں پڑھایا ہے او مدرسہ میں حاضر رہ کر کوئی کام نہیں کیا ہے، تو اس گھنٹے کی تنخواہ وضع کرلینا مدرسہ والوں کے لئے جائز ہے؛ لیکن مدرسہ والوں کے لئے یہ جائز نہیں ہوگا کہ پورا گھنٹہ غیر حاضر قرار دیں اور پھر اس گھنٹہ میں کام بھی لیں جیسا کہ اوپر کی حدیث شریف سے یہ بات واضح ہوئی۔

(۲) جب پندرہ منٹ کی تاخیر ہوگئی ہے اور پندرہ منٹ سے زائد تاخیر ہوجائے تو پورے چار

گھنٹے کی غیر حاضری لگ جاتی ہے، تو مدرسہ والوں کے لئے غیر حاضری لگانا جائز ہے؛ لیکن شرط یہ ہے کہ اب مدرس کو بھی اختیار حاصل ہو جائے کہ یہ پورے چار گھنٹے مدرسہ میں کوئی کام نہ کرے، گویا ایک وقت کی مکمل غیر حاضری ہوگئی؛ لیکن اگر مدرسہ والے پندرہ منٹ سے زائد تاخیر کے بعد چار گھنٹہ کی تنخواہ وضع کرلیں اور کام بھی لیں یہ جائز نہیں ہے، صرف اتنا جائز ہے کہ اپنا قانون ایسا بنالیں کہ پندرہ منٹ سے زائد تاخیر کی صورت میں مدرس کو اختیار ہو جائے گا کہ مدرسہ میں رہے یا غیر حاضر رہے، ان گھنٹوں کی تنخواہ نہیں ملے گی، جیسا کہ اوپر کی حدیث شریف کے مضمون سے واضح ہوتا ہے۔

(۳) مدرسہ کے مدرسین اور ملازمین کے کارمفوضہ متعین ہونے کے ساتھ ساتھ قانون اور ضابطہ میں اگر یہ بات بھی ملحوظ رکھی گئی ہے کہ صبح کے چار گھنٹے یا شام کے دو گھنٹے کے درمیان اس کارمفوضہ کے علاوہ، ضرورت مدرسہ کی وجہ سے ذمہ دار مدرسہ دوسرا کام بھی لے سکتا ہے، مثلاً چار گھنٹے میں سے دو گھنٹے پڑھانے کے بعد ایک گھنٹہ دفتری کام کرنا ہے، پھر چوتھا گھنٹہ پڑھانا ہے یا ایک دو گھنٹے مدرسہ کی ضرورت سے متعلق میٹنگ میں بیٹھنا ہے، یا مدرسہ کی ضرورت سے متعلق آس پاس کے لوگوں سے ملاقاتیں کرنی ہیں، تو اس طرح کا قانون مذکورہ حدیث شریف کی رو سے جائز اور درست ہے، ہاں البتہ مدرسہ میں اگر دو ٹائم کی پابندی ہے، مثلاً صبح کو چار گھنٹے اور شام کو دو گھنٹے، ان کے علاوہ خارج میں کام کرنا مدرس کی ذمہ داری نہیں، تو اگر خارج میں کام کرنے پر پابند کیا جائے تو اس کے لئے الگ سے الاؤنس مقرر کرنا من جانب مدرسہ لازم ہے اور بغیر الاؤنس مدرس پر دباؤ ڈالنا ذمہ دار کے لئے اس قانون کی رو سے درست نہیں ہے، ہاں البتہ اگر کوئی ملازم یا مدرس بخوشی کام کرتا ہے تو وہ اس کی طرف سے ایثار اور تبرع ہے۔ اور اگر درجہ حفظ کے لئے مدرسہ نے شروع سے یہ قانون بنایا ہے کہ ان کو تین ٹائم کام کرنا پڑے گا، صبح سے دوپہر تک، شام کے ٹائم عصر تک، اس کے بعد مغرب اور عشاء کے درمیان کا وقت، تو ایسے مدرسین کو تینوں ٹائم کام کرنے کی تنخواہ ملتی ہے، اگر ان کے لئے الگ سے ضابطہ نہیں بنا ہے، تو پھر مغرب کے بعد طلبہ کی نگرانی کے لئے بٹھانے پر

منجانب مدرسہ ان کو الگ سے الاؤنس دینا لازم ہے۔ اور الاؤنس مدرسہ اپنی صواب دید پر متعین کرسکتا ہے، یہ ساری باتیں اوپر کی حدیث شریف سے ثابت ہوتی ہیں، اسی طرح اگر کسی ملازم کو پڑھانے کے لئے اور چندہ فراہم کرنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے، تو یہ بھی مدرسہ کے ضابطہ کے مطابق جائز اور درست ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۶/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۹ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۶۳۰/۳۸)	۱۴۲۹/۶/۱۶ھ

ضوابط برائے اساتذہ، تعزیرات وتعطیلات برائے طلبہ

سوال [۸۴۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) نماز باجماعت کی پابندی طلبہ سے زیادہ ضروری ہوگی۔

(۲) طلبہ کی نگرانی اور امر بالمعروف نہی عن المنکر کی ذمہ داری ہوگی۔

(۳) درجہ میں بیٹھنے کی ہیئت ایسی رکھنی ضروری ہوگی جس سے چستی اور رعب ظاہر ہو۔

(۴) درجہ میں بلا عذر کمر لگا کر بیٹھنے کی اجازت نہ ہوگی۔

(۵) تعلیمی اوقات میں دوسرے مدرس کے پاس جانے یا درجہ میں بیٹھے ہوئے کسی کے ساتھ باتوں میں لگنے کی اجازت نہ ہوگی۔

(۶) تعلیمی اوقات میں کتب بینی، خط نویسی کی بھی اجازت نہ ہوگی۔

(۷) طلبہ میں بجائے زجر وتنبیہ انسیت کا پیدا کرنا ضروری ہوگا۔

(۸) نیز طلبہ کے اندر کپڑے، جسم، درسگاہ وغیرہ کی صفائی کا جذبہ پیدا کرنے کے طریقے اختیار کرنا ضروری ہوگا۔

(۹) کسی کی واقعی غیر واقعی کسی کمزوری کا تذکرہ یا حکایت وشکایت کسی مدرس وغیر مدرس کے سامنے کرنے کی اجازت نہ ہوگی؛ البتہ صدر مدرسہ کو پیش کر دینا مناسب ہوگا۔

(۱۰) حسب صواب دید صدر و مہتمم کسی وقت درجہ بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔
(۱۱) طلبہ سے خدمت لینے میں ان کی رضا و مناسبت کا لحاظ ضروری ہوگا۔
(۱۲) اوقات مدرسہ میں آنے والے مہمان کے لئے مدرسہ کی جانب سے ۱۰/منٹ مہمان نوازی کی اجازت ہوگی۔
(۱۳) ایک سال میں تعطیلات مقررہ کے علاوہ بیس یوم کی رخصت ہوگی، اس سے زیادہ غیر حاضری کی تنخواہ وضع کی جائے گی۔
(۱۴) مغرب وعشاء کے بعد طلبہ کی نگرانی ضروری ہوگی۔
(۱۵) درجہ میں ہر جدید کام کرنے کے لئے پہلے ذمہ دار سے مشورہ کرنا ضروری ہوگا۔
(۱۶) پندرہ روز سے پہلے گھر جانے کی اجازت نہ ہوگی۔
(۱۷) جمعرات میں دو پہر سے سنیچر کی دوپہر تک یا زائد سے زائد شام تک کی رخصت ہوگی۔
(۱۸) اوقات تعلیم میں جتنا وقت اپنے کام میں خرچ کیا جائے گا اس کی تنخواہ وضع کی جائے گی۔
(۱۹) وقتی ضرورت پر چھٹی مل جائے گی، مگر اس کا حساب ۲۰/یوم کی رخصت میں لگے گا۔
(۲۰) مسلسل دس پندرہ یوم کی تعطیل مدرسہ کی جانب سے نہیں مل سکے گی، شادی کے موقع پر صرف ۴/۵/یوم کی رخصت ملے گی۔
(۲۱) اگر کوئی استاذ درمیانی سال میں مدرسہ سے علیحدہ ہوگا تو اس کی اطلاع پندرہ روز پہلے دینا ضروری ہوگا، اگر بلا اطلاع الگ ہوگیا تو پندرہ یوم کی تنخواہ وضع کرلی جائے گی، اسی طرح اگر مدرسہ نے کسی استاذ کو بلا اطلاع علیحدہ کردیا تو اس کو پندرہ یوم کی تنخواہ مزید دی جائے گی۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: معلمین کے حق میں جو قوانین وضوابط مقرر کئے گئے ہیں، احقر حرفاً حرفاً ہر ایک سے متفق ہے، ماشاء اللہ اگر ان پر عمل ہو سکے تو مدرسہ طلبہ، استاذ، قوم سب کے حق میں فلاح ہی فلاح ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۴۳۲/۲۵)

تعزیرات برائے طلبہ مدرسہ عربیہ امداد الاسلام ہرسولی ضلع مظفرنگر یوپی

سوال [۸۴۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) جماعت کی ایک رکعت چھوٹ جانے پرسب کے سامنے ہاتھ پر پانچ قمچی لگائی جائیں گی۔

(۲) ظہر کی پہلی سنت پہلے نہ پڑھنے پر مسجد کی شمالی دیوار سے جنوبی تک چار چکر مرغ بن کر لگانے ضروری ہوں گے۔

(۳) باہمی منازعت کی صورت میں دست درازی کرنے والے پر ایک کے عوض پچیس قمچی ماری جائیں گی۔

(۴) ایک گالی زبان سے نکالنے پر نفل کی چار رکعت ادا کرنی ہوگی۔

(۵) دس روپئے یا دس روپئے سے زائد کسی بھی سامان کی چوری کرنے کے ثبوت پر مدرسہ سے اخراج کردیا جائے گا۔

(۶) اگر دس روپئے سے کم چوری کی گئی تو (الف) فی روپیہ پانچ قمچی ہوں گی (ب) ضمان ہرصورت میں چور کے ذمہ ہوگا، جوکہ اسی وقت ادا کرنا ضروری ہوگا (ج) یہ سزا صاحب حق کے معاف کردینے سے بھی ساقط نہ ہوگی۔

(۷) تعطیلات مقررہ میں ایک کی بھی تاخیر معاف نہ ہوگی، دوروز کی تاخیر تک فی یوم دس قمچی ہوں گی اور تین روز کی غیر حاضری پر اخراج ہوجائے گا۔

(۸) وقتی تعطیل میں مقدار موجود سے زائد ایک دن پر دس قمچی ہوں گی۔

(۹) بیماری کی تعطیل میں اگر مسلسل بلا اطلاع دس روز تاخیر ہوگی تو اخراج ہوجائیگا۔

(۱۰) تندرستی کی حالت میں رخصت لی اور گھر جا کر بیمار ہو جائے تو ڈاکٹر کی تصدیق قابل قبول ہوگی۔

(۱۱) ہفتہ کے درمیان رخصت نہیں ملے گی، الا یہ کہ شدید بیماری یا گھر کسی پریشانی کی صحیح خبر

ملے۔

(۱۲) ایک مرتبہ اخراج کے بعد حسب صوابدید اراکین مدرسہ دوسرے سال داخلہ ممکن ہوگا، اسی سال داخلہ کی صورت نہ ہوگی۔فقط

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: طلبہ کی تعزیرات کے سلسلہ میں جوضوابط مقرر کئے ہیں سب سے احقر متفق ہے، البتہ جن میں قینچی کی سزا مقرر ہوئی ہے، ان کے ساتھ نوافل بھی مقرر ہو جائیں تو تربیت کے لئے زیادہ مناسب تھا، نیز نمبر ایک میں پانچ قینچی کے بجائے اگر دس مقرر کی جائے تو زیادہ اصلاح کی بات تھی، نیز مہذب ادارہ میں مہذب سزا مناسب ہے؛ اس لئے اگر مرغ بن کر چکر لگانے کے بجائے حسب مناسب نوافل مقرر کردی جائیں تو زیادہ تربیت واصلاح کی امید ہے۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۴۳۳/۲۵)

ضوابط برائے مدرسہ عربیہ امدادالاسلام ہرسولی ضلع مظفرنگر

سوال [۸۴۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) تمام طلبہ کونماز پنج گانہ باجماعت باہتمام تکبیر اولیٰ ادا کرنا ضروری ہوگا۔

(۲) لباس نیچے سے اوپر تک مطابق شرع سنت رکھنا ضروری ہوگا۔

(۳) غیبت واختلاط سے سخت پرہیز نہایت ضروری ہوگا۔

(۴) بدفعلی کے ثبوت یا ظہور پر یقیناً اخراج کردیا جائے گا۔

(۵) سرقہ (چوری) کے ثبوت ملنے پر بھی اخراج کردیا جائے گا۔

(۶) مدرسہ کے جملہ اساتذہ کا خصوصاً اور عامۃ المسلمین کا عموماً ادب واحترام ضروری ہوگا۔

(۷) وقتی طور پر جو اعلان کیا جائے اس کا احترام ضروری ہوگا۔

(۸) مدرسہ کے تعلیمی اوقات میں خصوصاً اور خارجی اوقات میں عموماً بستی کے اندر جانے سے پرہیز ضروری ہوگا۔

(۹) کسی بھی طالب علم کو مدرسہ سے متعلق کسی بھی واقعہ میں دخیل ہونے کا حق نہ ہوگا۔

(۱۰) تعطیلات مقررہ کے علاوہ پندرہ دن غیر حاضر ہونے سے مدرسہ آئندہ تعلیمی خدمت سے معذور رہے گا۔

(۱۱) ہر طالب علم کو ہر ماہ اپنے سر کے بال مشین سے صاف کرانا ضروری ہوگا۔

(۱۲) بالغ طلبہ کو نابالغ بچوں کے ساتھ تفریح کے لئے جانا ایک حجرہ میں رہنا قطعاً جائز نہ رکھا جائے گا۔

(۱۳) مدرسہ پر کسی بھی طالب علم کا کوئی حق مطالبہ نہ ہوگا۔

(۱۴) مدرسہ کے اصول کے مطابق بنے ہوئے کپڑے کم ازکم دو جوڑی ہونا ضروری ہوگا۔

(۱۵) طلبہ کو کسی قسم کی جمعیت بنانے کا کوئی حق نہ ہوگا۔

(۱۶) ٹوپی پنج کلی یا دو پلی کے علاوہ دوسری نہیں چلے گی۔

(۱۷) اپنا لوٹا المونیم کا ہونا ضروری ہے۔

(۱۸) ایک ماہ سے پہلے چھٹی لینے کی اجازت نہ ہوگی ،اس وقت بھی جمعرات کو دوپہر سے سینچر کی دوپہر تک اجازت ہوگی۔

(۱۹) کسی وقتی حادثہ پر بھی چھٹی مل سکتی ہے، مگر مدرسہ کو واقعی ثبوت ملنا ضروری ہے۔

(۲۰) چھٹی کے وقت سے دوروز زائد ہوتے ہی نام خارج کردیا جائے گا۔

(۲۱) روشنی کا انتظام اپنے پاس سے کرنا ضروری ہوگا، اس کے لئے دوروپۓ ماہانہ جمع کرنے ضروری ہوں گے۔

(۲۲) داخلہ فیس دس روپۓ ہیں جو بلا طلب کئے پیش کردینی چاہئے۔

(۲۳) قاعدہ، پارہ اور کلام پاک ناظرہ پڑھنے والوں کا مدرسہ میں امدادی داخلہ نہیں ہوگا۔

(۲۴) کوئی طالب علم اگر نصاب کے مطابق نہیں پڑھے گا یا پڑھنے میں سستی کرے گا تو اس کا نام خارج کر دیا جائے گا۔

(۲۵) غیر امدادی داخلہ ہونے والے طلبہ کے کھانے کا انتظام مدرسہ کی جانب سے کیا جا سکتا ہے، خوراکی پچاس روپئے ماہانہ ہوگی، جس میں چار ماہ کا خرچ داخل ہونے سے پہلے جمع کرنا ضروری ہوگا۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: امور شرعیہ دو قسموں میں منقسم ہیں: (۱) وہ امور جن کا تعلق بابِ احکام سے ہے، جن کے لئے شارع کی طرف سے بنیادی نصوص ہوتے ہیں (۲) وہ امور جن کا تعلق بابِ تربیت سے ہوتا ہے اور بابِ تربیت کا مدار نصوص پر نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ حالات اور مربی اور مربی کے مزاج وصلاحیت پر مدار ہوتا ہے؛ اس لئے بابِ تربیت میں بہت سی ایسی چیزیں بھی جائز ہوتی ہیں جو بابِ احکام کے لحاظ سے ناجائز ہیں؛ اس لئے مذکورہ تمام ضوابط بابِ تربیت میں جائز ہیں؛ لیکن جن ضابطوں میں روپیہ پیسہ کی بات آتی ہے ان میں نادار طالبان علم کی تخصیص حتی الامکان ضروری ہے، مثلاً داخلہ فیس لوٹا جوڑے وغیرہ نیز غیر امدادی طلبہ پر چار ماہ کا خرچ پیشگی جمع کرنا لازم قرار دینا باقی تمام اصول ماشاء اللہ مناسب ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷ر شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۴۳۴/۲۵)

سوال [۸۴۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے مدرسہ کے ضوابط برائے اساتذہ وطلبہ اور تعزیرات وتعطیلات جو مقرر کی گئی ہیں ان میں کوئی نمبر خلاف شرع تو نہیں؟ اگر ہے تو اس کی اصلاح وترمیم کی درخواست ہے۔

امید ہے کہ مزاج آپ کے بخیر ہوں گے۔فقط

نوٹ: تمام نقلوں کی واپسی کی ضرورت نہیں صرف آپ کا جواب ہمارے لئے کافی ہے۔

المستفتی: مہربان علی بڑوتوی خادم تعلیمات مدرسہ عربیہ امداد الاسلام ہرسولی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) معلمین کے حق میں جوضوابط مقرر کئے گئے ہیں ان میں سے کوئی بھی شریعت کے خلاف نہیں ہے، ان میں مدرسہ، طلبہ، معلمین، عوام سب کے حق میں فلاح ہی فلاح ہے۔

(۲) طلبہ کی تعزیرات کے لئے جوقوانین مقرر کئے گئے ہیں باب تربیت میں ان کی گنجائش ہے؛ البتہ مہذب ادارہ میں مہذب سزامناسب ہے؛ اس لئے نمبر۲ رمیں مرغ بن کر چکر لگانے کے بجائے اگر حسب مناسب نوافل مقرر کردی جائیں تو زیادہ اصلاح وبہتری کی بات ہوگی۔

(۳) طلبہ کے لئے جوقوانین مقرر کئے گئے ہیں، باب تربیت میں ان سب کی گنجائش ہے، البتہ جن ضابطوں میں مالی بھار طلبہ پر رکھا گیا ہے، ان میں نادار غریب طلبہ کے حق میں تخفیف ہونی چاہئے، لوٹا، جوڑا، داخلہ فیس وغیرہ میں ان کے ساتھ تخفیف ہونی چاہئے، نیز غیر امدادی طلبہ سے چار ماہ کا خرچ پیشگی لینے کی مصلحت احقر کو سمجھ میں نہیں آئی، ویسے آپس کی رضامندی سے جو معاملہ طے کرلیا جائے تو شرعاً وہ معاملہ درست ہے، خلاف شرع نہیں ہے۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵ رشوال المکرّم ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۴۳۱/۲۵)

مدرسے کے من جملہ بچوں کی ضروریات مدّ زکوۃ سے پوری کرنے کا حکم

سوال [۸۴۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مدارسِ اسلامیہ میں جو طلبہ دور دراز سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں، ان

میں ہر طرح کے طلبہ ہوتے ہیں (مالدار، غرباء یتیم) اب ان کے لئے مدرسہ والے جو چندہ لاتے ہیں، اس چندہ میں زکوۃ، صدقات اور امداد وغیرہ سبھی مدات ہوتی ہیں، اب چندہ کی رقم مجموعی طور سے مذکورہ طلبہ پر صرف ہوسکتی ہے، جب کہ مذکورہ طلبہ میں دوسرے صوبوں کے بھی طلبہ ہیں، تفصیل سے جواب تحریر فرما کر کرم فرمائیں۔ والسلام

المستفتی: بندہ خدا ملی تال (نینی تال)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زکوۃ، صدقات اور امداد وغیرہم کی رقوم غرباء، یتیم ومساکین طلبہ کو دینا اور ان کی ضروریات طعام ووظائف وغیرہ میں خرچ کرنا درست ہے، نیز ان طلبہ پر بھی خرچ کرنا درست ہے کہ جن کی ملکیت میں بقدر نصاب مال نہیں ہے، اگرچہ ان کے گھر پر مال موجود ہے؛ البتہ وہ غنی طلبہ کہ جن کی ملکیت میں نصاب سے زائد مال اور رقم ہے، راجح قول کے مطابق ان کو زکوۃ کی رقم دینا یا مد زکوۃ سے خرچ کرنا جائز نہیں ہے؛ لیکن مدارس میں پڑھنے والے طلبہ میں ایک دو فیصد بھی ایسے طلبہ نہیں ہوتے ہیں کہ جن کے پاس نصاب کے بقدر ماں باپ سے ہٹ کر الگ سے پیسے ہوں۔ (مستفاد: فتاویٰ دارالعلوم ۶/ ۲۵۵، امداد الفتاوی ۲/ ۱۸، احسن الفتاوی ۴/ ۲۵۲، ایضاح النوادر/ ۴۸)

والأوجه تقييده بالفقير، ويكون طلب العلم مرخصا لجواز سؤاله من الزكوة وغيرها، وإن كان قادرا على الكسب إذ بدونه لا يحل له السؤال. (فتاوى شامي، كتاب الزكوة، باب المصرف، زكريا ٣/ ٢٨٦، كراچی ٢/ ٣٤٠، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٨/ ٣٣٦)

لا يجوز دفع الزكوة إلى من يملك نصابا، أي مال كان. (هندية، الباب السابع في المصارف، زكريا قديم ١/ ١٨٩، جديد ١/ ٢٥١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۱۸/ محرم الحرام ۱۴۲۳ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۷۴۳۳/۳۶)

مدرسہ میں آمدہ غلہ میں اشیاء کی رسید دینے کا حکم

سوال [۸۴۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک دینی مدرسہ ہے، جس میں بیرونی طلبا مقیم ہیں، طلبا کا طعام مدرسہ کے مطبخ میں بنتا ہے، اکثر طلبا کا کھانا امدادی ہے، بعض کا غیر امدادی ہے، مدرسہ میں دو قسم کی رسید بک ہیں: ایک عام چندہ کرنے کی، دوسری رسید اشیاء کی ہے، جو غلہ وغیرہ مدرسہ میں آتا ہے اس کو اشیاء کی رسید دی جاتی ہے، اور اس کو مطبخ میں استعمال کیا جاتا ہے، گویا کہ اشیاء کی رسید کا مطلب یہ ہے کہ یہ مطبخ کی رسید ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ جو غیر امدادی طلبا طعام کی فیس جمع کرتے ہیں، ان کو اشیاء کی رسید دی جائے یا عام چندہ کی رسید دے کر اس رقم کو مین بیلنس میں جمع کیا جائے؟

المستفتی: مرغوب الرحمٰن، دھام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں دو قسم کی رسیدوں کا ذکر ہے، ایک عام چندہ کی ہے۔ اور ایک اشیاء کی ہے اور اشیاء کے بارے میں یہ شبہ ظاہر کیا گیا ہے کہ جو بھی اشیاء ہوں وہ مطبخ میں آئیں گی، یہ بات عمومی طور پر ہے؛ لیکن کبھی کبھی ایسی اشیاء بھی ہوتی ہیں جو مطبخ سے متعلق نہیں ہیں، مثلاً تعمیر کے موقع پر سریا، چوکہ، سیمنٹ وغیرہ چندہ میں آجائے تو اس میں بھی اشیاء ہی کی رسید کاٹ کر دی جاتی ہے؛ اس لئے غیر امدادی طلبہ کی فیس جمع کرنے میں کوئی بھی رسید کاٹ کر دینے میں کوئی حرج نہیں، بس اتنی بات ضروری ہے کہ مطبخ میں خوراکی کی قیمت متعین ہو اور اس قیمت کی رسید کاٹ کر دے دی جائے۔ اور رسید کاٹنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اتنے دنوں کی خوراکی کا پیسہ مدرسہ میں آگیا ہے۔ اور مدارس میں اس طرح کا تعامل اور عرف ہے؛ اس لئے اس میں کسی کو اشکال نہیں ہونا چاہئے۔

المعروف كالمشروط. (الأشباه والنظائر، جديد ص: ٢٧٨)

المعروف بالعرف كالمشروط شرطا. (قواعد الفقه، أشرفي، ص: ١٢٥، رقم: ٣٣٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٢/ربیع الثانی ١٤٣٦ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٤١/ ١١٨٩)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٤٣٦/٤/١١ھ

مدارس میں فیس لے کر تعلیم دینے کا حکم

سوال [٨٤٢٤]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مدارسِ اسلامیہ کے اندر درجہ حفظ یا درجہ عربی کے بچوں سے فیس لینا درست ہے، اس سے قرآن کا بیچنا تو لازم نہیں آئے گا؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اپنے بچوں کو مدرسے میں اس لئے داخل نہیں کراتے کہ فیس نہیں لگتی اور اسکولوں میں ہر مہینہ فیس لگتی ہے؛ حالانکہ قرآن کا مرتبہ اس سے بہت بڑھا ہوا ہے، پھر بھی مدرسہ والے فیس نہیں لیتے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ حافظ لوگ صدقہ کا مال کھاتے ہیں، جس سے ہمارے بچوں پر اس کا اثر پڑے گا۔

المستفتی: نسیم احمد غازی پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مدارسِ اسلامیہ میں طلبہ کو قرآن کریم اور دیگر دینی کتابوں کی تعلیم دے کر ان سے فیس وصول کرنا شرعاً جائز ہے۔ اور آج کل چوں کہ مدارس میں عموماً غریب اور نادار طلبہ ہوتے ہیں جو صدقات وخیرات وغیرہ کے مستحق ہوتے ہیں اور وہ تعلیم کی فیس ادا کرنے کے متحمل نہیں ہوتے ہیں؛ اس لئے مدارس میں ان سے تعلیمی فیس وصول نہیں کی جاتی ہے؛ لیکن اگر کسی مدرسہ میں تعلیمی فیس وصول کی جائے تو شرعاً اس کی اجازت ہے، اس کو قرآن کریم کا معاوضہ کہنا اور قرآن کی آیتوں کی فیس کہنا قطعاً درست نہیں؛ بلکہ تعلیم

دینے والے بچوں کے حبس وقت کی فیس اور تنخواہ ہے، جو فیسوں کے نام سے وصول کیا جاتا ہے، ورنہ قرآن کی آیتوں کی فیس کون ادا کرسکتا ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۴۲۲)

قال في الهداية: وبعض مشايخنا استحسنوا الاستئجار على تعليم القرآن اليوم؛ لظهور التواني في الأمور الدينية، ففي الامتناع تضييع حفظ القرآن وعليه الفتوى. (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، مطلب تحرير مهم في عدم جواز الاستئجار على التلاوة والتهليل، زكريا ٩/ ٧٦، كراچی ٦/ ٥٥، هداية أشرفی ٣/ ٣٠٣، البناية، أشرفيه ديوبند ١٠/ ٢٨٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰/۳/۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۲۲۰/۳۸)

طلبہ کا بلا اجازت مدرسہ کی چیزوں کو استعمال کرنے کا حکم

سوال [۸۴۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی طالب علم مدرسہ کے ذمہ داران کی اجازت کے بغیر کھانے کی کوئی چیز اٹھا کر کھالے تو اس کا مدلل حکم تحریر کیجئے۔

المستفتی: محمد ابو الکلام، مظفر نگر، متعلم مدرسہ شاہی مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرسہ کی جس چیز کا ذکر کیا جارہا ہے، اگر وہ چیز مدزکوۃ کی ہے، تو اس کے مستحقین میں مذکورہ طالب علم بھی ہے، اس نے جو چیز ذمہ داروں کی اجازت کے بغیر کھائی ہے، دیانۃً تو وہ چیز اس کے لئے حلال ہوئی؛ لیکن مدرسہ کے ذمہ داران اور مدرسہ کے نظام کے خلاف اس نے یہ عمل کیا ہے اور اس طرح کے اعمال کی بنا پر مدرسہ کا نظم ونسق باقی نہیں رہ سکتا؛ اس لئے کسی طالب علم کے لئے مدرسہ کے قانون اور نظام کی مخالفت کی بنا پر ذمہ داران کی اجازت کے بغیر از خود مدرسہ کی کسی چیز کے کھانے کی اجازت نہیں۔

وظاهره أن من له حظ في بيت المال بكونه فقيرا، أو عالما، أو نحو ذلک، ووجد ما مرجعه إلى بيت المال من أي بيت من البيوت الأربعة الآتية في آخر الجزية له أخذه ديانة بطريق الظفر في زماننا، ولا يتقيد أخذه بأن يكون مرجع المأخوذ إلى البيت الذي يستحق منه. (شامي، كتاب الجهاد، باب المغنم وقسمته، مطلب: فيمن له حق في بيت المال، وظفر بشيء من بيت المال زكريا ٦/ ٢٦٥، كراچی ٤/ ١٥٩، البحرالرائق، كوئٹه ٥/ ١١٨، زكريا ٥/ ٢٠٠، هندية زكريا قديم ١/ ١٩١، جديد ١/ ٢٥٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍صفر المظفر ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۴۹۵)

تعلیمی اوقات کے دوران طلبہ کو قرآن خوانی کے لئے بھیجنا

سوال [۸۴۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدرسہ کے تعلیمی وقت میں طلبہ کو قرآن خوانی کی دعوت میں بھیجنا کیسا ہے، جب کہ تعلیمی وقت میں قرآن خوانی کے لئے بھیجنے کی صورت میں تعلیم کا نقصان یقینی ہوتا ہے، اس سلسلے میں مدرسہ والوں کی کیا ذمہ داری ہے؟

المستفتی: راشد علی (کاتب) پیپلسانہ، ضلع مرادآباد (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ارباب مدرسہ کی اہم ذمہ داری یہی ہے کہ طلبہ کو ہر ایسی چیز اور امور سے محفوظ رکھیں جو ان کی تعلیم میں نقصان دہ ہوں، چاہے وہ امور فی نفسہٖ اچھے کیوں نہ ہوں، کیونکہ ان کے لئے تعلیم سے اہم کوئی چیز نہیں ہے، نیز موجودہ دور میں جن لوازمات کے ساتھ قرآن خوانی ہوتی ہے، اس کو بعض فقہاء نے ناجائز اور مکروہ قرار دیا ہے۔

من قال من المشايخ: قراءة القرآن بالجماعة جهرا ويسمى

بالفارسية سی پاره خوانده مکروه الخ. (نفع المفتي والسائل، ص: ۱۲٤، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ۷/ ۵۱۳، رقم: ۹٤۵۲، الفتاوی التاتارخانية زکريا ۱۸/ ۵۸، رقم: ۲۸۰۲۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۳۱۷۸)

مدارس کے طلباء سے قرآن خوانی کرانا

سوال [۸۴۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدارس کے بچوں سے کلام پاک پڑھوانا کیا حکم رکھتا ہے؟

المستفتی: عبد المعید قاسمی آزادنگر، ہلدوانی نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: فی نفسہٖ قرآن کریم کی تلاوت باعث خیر وبرکت ہے؛ لیکن اس زمانہ میں جو مدارس کے طلبہ کو تعلیمی وقت وغیرہ میں لے جاکر پڑھوایا جاتا ہے، اس میں بہت سی خرابیاں ہیں، مثلاً طلبہ کی تعلیم کا حرج وہاں جاکر کھانے پینے کا التزام وغیرہ، اس لئے مروجہ طریقہ سے گھروں میں لے جاکر پڑھوانا ممنوع اور بدعت سئیہ ہے۔

ومن قال من المشايخ: إن ختم القرآن بالجماعة جهرا ويسمی بالفارسية سي پاره خوانده مکروه. (المحيط البرهاني، كتاب الكراهية والاستحسان، الفصل الرابع، المجلس العلمي ۷/ ۵۱۳، رقم: ۹٤۵۲، الفتاوی التاتارخانية زكريا ۱۸/ ۵۸، رقم: ۲۸۰۲۳، نفع المفتي والسائل، ص: ۱۲٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۳۰۷۹)

لڑکیوں کا مدرسہ قائم کرنا

سوال [٨٤٢٨]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: خواتین کی بڑھتی ہوئی جہالت کو مٹانے کے لئے ایک شخص پورے پردہ وغیرہ کی رعایت کے ساتھ لڑکیوں کا مدرسہ کھولنا چاہتا ہے، جس میں اساتذہ کی اکثریت عورتوں کی ہوگی، مگر کچھ مرد بھی ہوں گے، جو پردہ کے اندر سے تعلیم دیں گے، تو اس کا یہ اقدام کیسا ہے؟

المستفتی: محمد محسن علی متعلم تکمیل ادب مدرسہ امدادیہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زنانہ مدارس کا کھولنا اور جاری کرنا اور لڑکیوں کے لئے وہاں تعلیم کے لئے جانا اور عورتوں کو ان کی صنف کے مناسب علوم وفنون سکھانا یہ تمام امور نہ یہ کہ صرف جائز ہیں؛ بلکہ مستحسن ہیں؛ لیکن لڑکیوں کے اسکول صرف لڑکیوں کے لئے مخصوص ہونے چاہئے تاکہ فتنہ کا احتمال باقی نہ رہے، جس کے لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ نیک کردار پاک دامن عورتوں کو تعلیم وتربیت کے لئے مقرر کیا جائے، اگر معلمات نہ مل سکیں، تو مجبوراً نیک اور صالح قابل اعتماد مردوں کو متعین کیا جائے۔ اور ان کی کڑی نگرانی رکھی جائے اور کسی بھی طرح بے پردگی بالکل نہ ہونے پائے، تو اس کی بھی گنجائش ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ٢/ ٣٥-٣٦، جدید مطول ٢/ ٣٨٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
٢٩ر جمادی الاولیٰ ١٤١٥ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ٣١/ ٤٠٣٩)	١٤١٥/٥/٢٩ھ

مدارسِ اسلامیہ میں غیر مسلم بچوں کو تعلیم دینے کا حکم

سوال [٨٤٢٩]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کیا اسلامی مدارس میں غیر مسلم ہندو بچوں کو ان کے والدین کی خواہش پر عربی تعلیم دینا درست ہے، جب کہ وہ مسلم بچوں کے مقابلہ میں صاف ستھرے ہو کر آئیں؟

المستفتی: سید اشرف علی شیر کوٹ بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اسلامی مدارس میں غیر مسلم ہندو بچوں کو ان کی خواہش کے مطابق داخل کر کے عربی تعلیم دینا درست ہے، جب کہ ان غیر مسلم بچوں کی نیت صاف ہو، علم حاصل کر کے مذہب اسلام پر اعتراض کرنے کی نیت نہ ہو۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۲/ ۱۴، جدید مطول ۲/ ۵۲۸)

وفي الخانية: من بحث القراءة الحربي أو الذمي إذا طلب تعلم القرآن، والفقه، والأحكام يعلم رجاء أن يهتدي؛ لكن يمنع من مس المصحف إلا إذا اغتسل فلا يمنع. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، دارالكتاب ديوبند، ص: ۱۴۳)

ويمنع النصراني من مسه، وجوزه محمد إذا اغتسل، ولا بأس بتعليمه القرآن والفقه عسى يهتدى. (شامي، كتاب الطهارة، مطلب يطلق الدعاء على ما يشمل الثناء، زكريا ۱/ ۳۲۱، كراچی ۱/ ۱۷۷، وهكذا في حلبي كبير سهيل اكيڈمي لاهور، ص: ۴۹۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۹ رشعبان ۱۴۱۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۵۶۷)	۱۴۱۶/۸/۲۹ھ

طلباء کو انعام میں ملنے والے روپیوں کا مالک کون؟

سوال [۸۴۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کسی بچہ نے مقابلہ قراءت ونعت خوانی میں اول نمبر حاصل کیا، اس بچہ سے خوش ہو کر

مقابلہ کرانے والی کمیٹی نے بطور انعام ایک قرآن شریف اور -/500 روپئے نقد اور ایک دیوار گھڑی اور ایک سند بھی دی اور وہ بچہ اس وقت ہاپوڑ میں زیر تعلیم تھا اور وہیں سے مقابلہ کے لئے گیا تھا، جب سب انعام مل گیا تو مدرسہ والوں نے قرآن تو بچہ کو دے دیا؛ لیکن بقیہ مذکورہ سامان بچہ کو نہیں دیا اور مدرسہ والے یہ کہہ رہے ہیں کہ مدرسہ کی طرف سے بھیجا گیا تھا؛ لہٰذا سامان مدرسہ ہی لے گا، شریعت کی روشنی سے مدلل جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد نذیر احمد مؤذن مدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دینی مدارس کی جانب سے جن بچوں کو قراءت وغیرہ کے مقابلہ ومظاہرہ کے لئے بھیجا جاتا ہے، اس سے یہ مقصود نہیں ہوتا ہے کہ بچے مدرسہ کے لئے آمدنی حاصل کر کے لائیں گے؛ بلکہ صرف بچہ کی ہمت افزائی اور مدرسہ کی شہرت مقصود ہوتی ہے اور انعام دینے والے بھی محض بچہ کی حوصلہ افزائی کی غرض سے خاص طور پر بچے کو دیتے ہیں، اگر یہ معلوم ہوجائے کہ بچے سے لے لیا جائے گا، تو بچے کو بھی نہیں دیں گے؛ اس لئے عرف میں جو کچھ بھی انعام بچے کو ملتا ہے وہ سب بچے کا حق ہے، جبراً یا دباؤ ڈال کر بچے سے لے لینا جائز نہیں ہے۔

عن أبي حميد الساعدي –رضي الله عنه– أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا يحل لامرئ أن يأخذ مال أخيه بغير حقه، وذلك لما حرم الله مال المسلم على المسلم. (مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٤٢٥، رقم: ٢٤٠٠٣)

عن أبي حرة الرقاشي عن عمه، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه. (شعب الإيمان للبيهقي، باب في قبض اليد عن الأموال المحرمة، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٣٨٧، رقم: ٥٤٩٢)

الثابت بالعرف كالثابت بالنص. (شرح عقود رسم المفتي، قديم، ص: ٩٤، قواعد الفقه أشرفي، ص: ٧٤، رقم: ١٠١)

لا يجوز لأحد أن يأخذ مال أحد بلا سبب شرعي. (قواعد الفقه أشرفي،

ص: ۱۱۰، رقم: ۲٦۹، شرح المجلة رستم اتحاد ۱/ ٦۲، رقم المادة ۹۷، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۱/ ۱۱۲، ۲۸/ ۲٦٤، ۳۷/ ۳٥٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم رمضان ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲٦/ ۱۹۳۸)

کیا پرانے مکتب میں تعلیمی سلسلہ کو جاری رکھنا ضروری ہے؟

سوال [۸۴۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں کی مسجد کو بنے ہوئے ۳۵/ سال ہوگئے ہیں اور مکتب کو جو اسی مسجد کی ملکیت کی زمین میں ہے۔ ۲۷/ سال ہوگئے، اب اس مکتب کی چھت کمزور ہوگئی ہے، تو مکتب چلانے والے ذمہ دار اور مہتمم مسجد کے متولی کی اجازت سے اس چھت کی مرمت یا تعمیر کر سکتے ہیں، تاکہ آئندہ بھی بچے وہاں تعلیم حاصل کر سکیں، یا اس مکتب کی زمین کو بھی مسجد میں شامل کرلیا جائے شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: عبدالکریم راجہ غالب پور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: جب ۲۷/ سال سے مکتب قائم ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ متولی وواقف کی اجازت سے ہے؛ لہٰذا اس کو آئندہ کے لئے بھی باقی رکھ کر تعلیمی سلسلہ کو جاری رکھنا بلاتردد جائز ہوگا۔ اور کمزور چھت کی مرمت بھی متولی وغیرہ کی اجازت سے کردینا جائز ہوگا۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۵/ ۲۳۷، ڈابھیل ۱۵/ ۵۹۷)

وسائر التصرفات لمن يتولى. (درمختار على الشامي، الوقف، مطلب لا يستبدل العامر إلا في أربع، زكريا ٦/ ٥٨٩، كراچی ٤/ ٣٨٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٤/ ١٣٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ٦۹۹۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱/۵ھ

الفصل الثاني: في التولية

طلبا کی تعلیمی کوتاہی پر مسئول کون ہے؟

سوال [۸۴۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: طلبہ قومی وملی امانت ہیں، ان کی تعلیم وتربیت میں دانستہ کوتاہی ہورہی ہے، عنداللہ مسئول کون ہوں گے؟ ان حالات کی روشنی میں مدرسہ کی ملازمت کا کیا حکم ہے؟ مفصل ومدلل جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: نبی حسن، خادم دارالعلوم اررریہ بیرگاچھی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر طلبہ کی تعلیم وتربیت میں دانستہ کوتاہی ہورہی ہے تو اساتذہ عنداللہ مسئول ہوں گے۔ اور اگر اس کوتاہی میں ناظم مدرسہ یا مہتمم مدرسہ کا دخل ہے تو اللہ کے نزدیک وہی مسئول ہوگا؛ کیوں کہ مہتمم کے سامنے اساتذہ کا اختیار نہیں چلتا؛ البتہ مدرسے کی ملازمت آپ کے لئے ہر حال میں جائز ہے، انتظامی کوتاہی کے آپ ذمہ دار نہیں ہیں، اس کے ذمہ دار منتظمین حضرات ہیں، اللہ کے یہاں انہیں سے پوچھا جائے گا۔

عن ابن عمر –رضي الله عنه– عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ألا! كلكم راع، وكلكم مسئول عن رعيته، فالأمير الذي على الناس راع، وهو مسئول عن رعيته. (مسلم شريف، باب فضيلة الإمام العادل، النسخة الهندية ۲/ ۱۲۲، بيت الأفكار، رقم: ۸۲۹، صحيح البخاري، كتاب الجمعة، النسخة الهندية ۱/ ۱۲۲، رقم: ۸۸۳، ف: ۸۹۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ صفر ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۷۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۲/۱۸ھ

موقوفہ جائیداد کو ذاتی ملکیت سمجھنے کا حکم

سوال [۸۴۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) اگر کوئی مہتمم مدرسہ یا متولی زبان سے تو ملکیت نہ کہتا ہو، مگر دل میں وقف دینی مدرسہ کو اپنی ذاتی ملکیت ہی سمجھتا ہو، تو اس کا کیا حکم ہے؟

(۲) اس کے برعکس زبان سے کچھ نہ کہتا ہو، مگر عملاً وقف کی جائیداد مدرسہ کی جائیداد کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتا ہو، تو اس کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: عبدالحق چندرہاں عمری الہ آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۲) دینی مدرسہ کی زمین اور جائیداد کو اپنی ملکیت قرار دینا یا اپنی ملکیت سمجھنا درست نہیں ہے؛ بلکہ مہتمم یا متولی کو اپنے آپ کو مدرسہ یا مسجد کا خادم سمجھنا چاہئے۔

لم يبق على ملك الواقف، ولا انتقل إلى ملك غيره بل صار على حكم ملك الله تعالىٰ الذي لا ملك فيه لأحد سواه. (شامي، الوقف، مطلب لو وقف على الأغنياء وحدهم لم يجز، زكريا ٦/ ٥٢١، كراچی ٤/ ٣٣٩، الفقه الإسلامي وأدلته، دارالفكر ١٠/ ٧٦٠١، هدى انٹر نيشنل ديوبند ٨/ ١٥٣، مجمع الأنهر دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٥٧١، مصري قديم ١/ ٧٤٠، هندية، زكريا قديم ٢/ ٣٥٠، جديد ٢/ ٣٤٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۸/۳/۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۲۱۶/۳۸)

مہتمم صاحب کا مدرسہ کی زمین اپنے نام رجسٹری کروانے کا حکم

سوال [۸۴۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: دینی مدرسہ کی زمین وجائیداد کو اپنے ذاتی نام سے رجسٹری یا رجسٹریشن کرانا کیسا ہے؟ جس طرح لوگ اپنی زمین وجائیداد اور باغ وغیرہ اپنے نام بیع نامہ یا رجسٹری کراتے ہیں، اسی طرح زمین ومکان اپنے نام کرانا کیسا ہے؟ کیا مہتمم یا متولی اپنے نام کرا سکتا ہے یا نہیں؟ اگر دانستہ یا غیر دانستہ طور پر اپنے نام رجسٹری یا بیع نامہ کرالیا ہو تو پھر اب کیا کرنا چاہئے، اسے یوں ہی رہنے دیا جائے یا رد کرائیں؟

المستفتی: عبدالحق چندوہاں عمری الہ آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرسہ کی زمین وجائیداد کو مہتمم یا ناظم مدرسہ کے لئے مدرسہ کے نام رجسٹری کرانا لازم اور ضروری ہے، اگر رجسٹری اپنے نام سے کرالی ہے تو اس کو مدرسہ یا مسجد کے نام سے دوبارہ رجسٹری کرالینا چاہئے۔

وینزع وجوبا لو الواقف فغیرہ بالأولیٰ غیر مامون (درمختار) وفي الشامیة: قال في الإسعاف: ولا یولی إلا أمین قادر بنفسه أو بنائبه؛ لأن الولایة مقیدة بشرط النظر، ولیس من النظر تولیة الخائن؛ لأنه یخل بالمقصود. (شامي، الوقف، مطلب في شروط المتولي زکریا ٦/ ٥٧٨، کراچی ٤/ ٣٨٠، الموسوعة الفقیة الکویتیة ٤٤/ ٢٠٧، البحرالرائق، زکریا ٥/ ٣٧٨، کوئٹه ٥/ ٢٢٦، هندیة زکریا قدیم ٢/ ٤٠٨، جدید ٢/ ٣٨٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۲۱۶/۳۸)

مدرسہ کے لئے خریدی گئی زمین کا شخصی بیع نامہ کرانا

سوال [۸۴۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک عمارت مدرسہ کے لئے خریدی گئی، یہ مدرسہ امداد العلوم محلّہ قریشیان کے نام سے

موسوم ہے، جوعرصہ پچاس سال سے دینی خدمت انجام دیتا چلا آرہا ہے، جس میں حفاظ فارغ ہوتے چلے آرہے ہیں، آج بھی اس مدرسہ میں معلمین حضرات حافظ وقاری دینی خدمت کوانجام دے رہے ہیں، وہ نئی عمارت جو مدرسہ کے پیسہ سے خریدی گئی، اس میں بھی عرصہ آٹھ سال سے دینی تعلیم بدستور چلی آرہی ہے، جگہ کی قلت کی وجہ سے یہ عمارت مدرسہ نے اپنی جیب خاص سے خریدی، اس میں بھی آٹھ سال سے بدستور دینی خدمت انجام دی جارہی ہے، اب یہ عمارت کسی نے وقف نہیں کی؛ بلکہ یہ عمارت مدرسہ نے صدقہ خیرات زکوۃ وچرم قربانی اور تمام ہی مدات سے بطور امداد خریدی، اب زید نے اس عمارت کوآٹھویں یا دسویں تک کرانے کے لئے بیع نامہ اپنے نام کرالیا ہے، جب کہ یہ عمارت مدرسہ کے پیسہ سے خریدی گئی تھی، اب اس مدرسہ کو بجائے مدرسہ کے جونیر ہائی اسکول کے نام سے موسوم کرلیا ہے، اب جب کہ جونیر ہائی اسکول کے نام سے بیع نامہ کرالیا ہے، تو پھر جب کبھی سرکاری پیسہ آنا شروع ہوگا تو پھر مدرسہ سے اس کا کچھ تعلق نہ رہے گا اور مدرسہ جو کہ دین کی بقا کا ذریعہ ہے بالکل ختم ہوجائے گا، تو کیا زید مدرسہ کے حق میں اچھا کررہا ہے یا برا؟ کیا زید کا شمار دین کے باغیوں میں ہوگا یا فرماں برداروں میں؟ اور زید نے یہ بیع نامہ بغیر قوم وملت کے مشورے کے خود اپنے نام کرالیا ہے، قوم وملت اس بیع نامہ کے خلاف ہے، ان تمام امر کا جواب دے کر ماجور ہوں۔

المستفتی: امیر حسین ٹھیکیدار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ عمارت جو مدرسہ کے لئے مدرسہ کے نام سے خریدی گئی تھی، اس کو زید کا اپنے نام سے بیع نامہ کرالینا سخت ترین خیانت اور غصب ہے، وہاں کے اہل حل وعقد اور بااثر لوگوں پر لازم ہے کہ ایسے خائن ذمہ دار کو فوری طور پر ذمہ داری سے سبکدوش کردیں، اس کا نام بیع نامہ سے خارج کردیں اور مدرسہ کی عمارت کی حفاظت کریں، مدرسہ کی کسی بھی عمارت کو کسی شخص کے نام کرنا جائز نہیں ہے۔

إن عزل القاضي للخائن واجب عليه. الخ (مجمع الأنهر، كتاب الوقف، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٦٠٢، قديم ١/ ٧٦٢، شامي، زكريا ٦/ ٥٧٨، كراچی ٤/ ٣٨٠، البحر الرائق، زكريا ٥/ ٤١١، كوئٹه ٥/ ٢٤٥، بزازية، زكريا جديد ٣/ ١٣٤، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٥٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۶۴۲۲/۳۴)

احکام شریعت کا لحاظ نہ رکھنے والے مہتمم کا حکم

سوال [۸۴۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں دینی مدرسہ میں جو مہتمم ہے وہ داڑھی نہیں رکھتا ہے، انگریزی لباس پہنتا ہے، اپنے گھر کی عورتوں کو بے پردہ رکھتا ہے، گھر میں ٹی وی رکھتا ہے، ہر وقت فلم وغیرہ دیکھتا ہے اور پہلے کسی دوسرے کالج میں پرنسپل رہا ہے اور وہاں پر غبن کیا ہے اور وہاں سے دو سال قبل ان ہی حرکتوں کی وجہ سے رٹائر کر دیا گیا ہے اور مستقل علماء دین کے ساتھ توہین آمیز گفتگو کرتا ہے، جب تک دوسرے مہتمم رہے ان کو ہر طرح پریشان کرتا رہا اور مجلسِ شوریٰ میں بہت سے دیندار پابند شریعت متبع سنت لوگ ہیں، تو کیا ایسے آدمی کو مہتمم بنانا درست ہے؟ اور مدرسہ کے حق میں دعا فرمایئے۔

المستفتی: محمد خالد معرفت اسعد الرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مدرسہ کا مہتمم اگر داڑھی کٹاتا ہو، اپنے گھر کی عورتوں کو بے پردہ رکھتا ہو، گھر میں ٹی وی رکھ کر فلمیں وغیرہ دیکھتا ہو اور بلا وجہ مدرسین اور اساتذہ کو پریشان کرتا ہو اور گالیاں دیتا ہو، تو ایسا مہتمم فاسق ہے، اس کو معزول کر دینا چاہئے اور جب

کہ شوریٰ میں اس کے علاوہ دوسرے حضرات پابند شریعت اور متبعین سنت موجود ہیں، تو ان ہی میں سے کسی کو مہتمم بنایا جائے، تاکہ مدرسہ کا نظام اور مقصد قیام تعلیم وتعلم کا سلسلہ باقی رہے۔

وينزع وجوبا لو الواقف. فغيره بالأولى غير مامون أو عاجزا، أو ظهر به فسق، كشرب خمر ونحوه. (درمختار) **وفي الشامية: قوله: ''غير مامون'' قال في الإسعاف: ولا يولي إلا أمين قادر بنفسه، أو بنائبه؛ لأن الولاية مقيدة بشرط النظر الخ.** (درمختار مع الشامي، الوقف، مطلب في شروط المتولي زكريا ٦/ ٥٧٨، كراچی ٤/ ٣٨٠، البحرالرائق زكريا ٥/ ٤١١، كوئٹه ٥/ ٢٤٥، بزازية، زكريا جديد ٣/ ١٣٤، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٥٣، مجمع الأنهر دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٦٠٢، مصري قديم ١/ ٧٦٢، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٤/ ٢٠٧)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ رجب ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۶۲۸۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹/۷/۱۴۲۰ھ

مہتمم سے متعلق سوال وجواب

سوال [۸۴۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے گاؤں میں ایک مدرسہ ہے جو بریلوی حضرات کے قبضہ میں چل رہا ہے، اور مسلک اہل سنت (مسلک علماء دیوبند) کا کوئی مدرسہ نہ تھا، چند نوجوانوں نے جدوجہد کرکے رضا خانیوں سے مدرسہ چھین لیا اور مسلک دیوبند کے قبضہ میں آگیا، مدرسہ کی ایک کمیٹی بھی بنائی گئی، جس میں ہمارے گاؤں کے ایک صاحب ہیں جو مدرسہ فرقانیہ گونڈہ میں مدرس ہیں، ان کو مہتمم کے نام سے منتخب کیا گیا، مدرسہ چلنے لگا اور تعلیم بھی بہترین طریقہ سے

ہونے لگی، آمدنی کے وسائل بھی پیدا ہوگئے، مدرسہ صحیح ڈھنگ سے چلنے لگا، اس کے بعد مہتمم صاحب نے من مانی کرنا شروع کی، یہاں تک کہ کئی سال ہوگئے میٹنگ تک نہیں کی، کمیٹی کے لوگ کرتے رہے؛ لیکن کوئی توجہ نہ کی، آہستہ آہستہ تعلیم بالکل کمزور ہوگئی اور مہتمم صاحب کے اندر اقربا پروری بھی آگئی اور اپنے بہنوئی کو مدرس رکھ لیا جو پڑھانے لکھانے میں نہایت ہی نکمے تھے، ان کے آنے سے مدرسہ کی حالت اور زیادہ خراب ہوگئی، علاقہ سے بہت شکایتیں آنے لگیں، مدرسہ کے نائب مہتمم اور دیگر حضرات مہتمم صاحب کے پاس گونڈہ گئے کہ میٹنگ کرو؛ لیکن مہتمم صاحب نے بات سنی ان سنی کردی اور مدرسہ کا نظام بہت ہی زیادہ خراب ہوگیا، مہتمم صاحب کے بہنوئی صاحب نے مدرسین میں گروپ بندی کرنا شروع کردی، جس کی وجہ سے تعلیم اور زیادہ خراب ہوگئی، یہاں تک کہ مہتمم صاحب نے چوری چوری ایک کمیٹی بنائی، جس میں اپنے ایک بھائی کو صدر دوسرے کو سکریٹری اور خود مہتمم اور بقیہ بھائیوں اور بھتیجوں اور بہنوئی کو ممبر بنا کر کمیٹی فیض آباد سے رجسٹریشن کرالی، جب کچھ دنوں کے بعد علاقہ والوں کو پتہ چلا کہ حضرت مہتمم صاحب ایسی ٹیڑھی چال چلے ہیں، تو لوگ فیض آباد گئے تو رجسٹرار نے بتایا کہ مدرسہ رجسٹریشن ہو چکا ہے، اب مقدمہ دائر کرو تب شاید کچھ نکلے، ان لوگوں نے چونکہ کافی رشوت دے کر رجسٹریشن کرایا تھا، علاقہ والوں نے سرکاری مقدمہ دائر کرنا مناسب نہ سمجھا اور کچھ لوگ اکٹھا ہوئے کہ مہتمم صاحب سے کہا جائے کہ انہوں نے ایسا کام کیوں کیا ہے؟ لیکن وہ سامنے نہیں آئے اور مہتمم صاحب رات میں مدرسہ جا کر مدرسہ کا تالا توڑ کر مدرسہ کی روداد اور رسیدات، رجسٹر، بالٹی، ٹاٹ، پٹی وغیرہ سب اٹھا لے گئے اور مدرسہ کی رقم جو انہیں کے پاس سب جمع تھی سب لے لی اور دینے سے انکار کردیا۔ اور رجسٹریشن کے حساب سے پرانے مدرسہ کے نام سے دوسری جگہ چھپر رکھ کر اپنے گھر کے اپنے بہنوئی کے بچوں کو لے کر مدرسہ قائم کردیا اور پرانے مدرسہ والوں نے مقدمہ کرنا نامناسب سمجھ کر خدا کے بھروسہ پر مدرسہ کا نام تبدیل کر کے مدرسہ چلانا شروع کیا، اب یہ حضرات ایسی ہٹ دھرمی پر تلے ہیں کہ باہر جا کر پرانے معاونین کو روکتے ہیں کہ وہاں چندہ مت دو اور

تعاون نہ کرو، جس کی کئی شہادتیں موجود ہیں۔ اور اب بھی اسی کوشش میں لگے ہیں کہ کسی طریقہ سے یہ پرانا مدرسہ بند ہو جائے، پرانے مدرسہ کی عمارت پختہ عمارت ہے، رقبہ ستر ستر فٹ ہے؛ لہٰذا مہتمم صاحب کی کارستانیوں کو قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان فرمائیں؛ کیوں کہ اس کا علاقہ والوں پر بہت برا اثر پڑا ہے، رضا خانی حضرات خوب مذاق اڑاتے ہیں اور جو لوگ رضا خانیت سے توبہ کر کے اس طرف آئے تھے وہ لوگ بہت برا اثر لے رہے ہیں، اس میں پورے مسلک کی بدنامی ہو رہی ہے۔

المستفتی: محمد خان سراوستی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مہتمم صاحب کے لئے مدرسہ کی رقم، رسیدات، روداد اور رجسٹر وغیرہ دیگر سامان روکنا اور لے جانا اور سابقہ مدرسہ کے نام پر دوسرے مدرسہ کا نام رکھنا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے؛ بلکہ تمام چیزوں کی واپسی لازم ہے؛ کیوں کہ ایک مدرسہ کی رقم یا دیگر اشیاء دوسرے مدرسہ میں صرف کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۶/ ۴۰۷، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۰/ ۲۱۱، جدید ڈابھیل ۱۵/ ۴۷۲-۴۷۳)

ومن اختلاف الجهة ما إذا كان الوقف منزلين أحدهما للسكنى والآخر للاستغلال، فلا يصرف أحدهما للآخر، وهي واقعة الفتوى. (شامي، الوقف، مطلب في نقل القاضي المسجد ونحوه، زكريا ٦/ ٥٥١، كراچی ٤/ ٣٦١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۸۰۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۵؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ

مدارس اسلامیہ کے قوانین کی پابندی مہتمم وملازم سب پر لازم ہے

سوال [۸۴۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: (۱) مغربی یوپی کے بیشتر مدارس ومساجد میں مدرسین وملازمین اورمؤذنین وائمہ حضرات کومشاہرہ اتنا کم دیا جاتا ہے کہ اس میں ان کی زندگی کی اہم ضروریات بھی پوری نہیں ہو پاتیں، سخت دوڑ دھوپ اور جدوجہد کے بعد بھی یہ حضرات ضروریات زندگی کی فراہمی اور اہل وعیال کے حقوق ادا کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ حقوق العباد ادا نہ کر پانے کی وجہ سے بعض اوقات معاشرہ میں سب کی بےتوقیری اور اندرون خانہ حقارت آمیز رویہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے، دیگر مراعات کا تو کیا ذکر، ان حضرات کو اکثر اضافی کاموں کا بھی کچھ عوض نہیں ملتا۔ از روئے شریعت ذمہ دارانِ مدارس ومساجد کا یہ عمل کیسا ہے؟ اور مدارس ومساجد کے ایسے ذمہ دار لوگ شریعت کی نظر میں کیا کہلانے کے مستحق ہیں؟

(۲) بعض مدارس میں حال یہ ہے کہ جب مدرسین وملازمین تنخواہ کا مطالبہ کرتے ہیں، تو ان کو رسید دے دی جاتی ہے کہ وہ چندہ کر کے اپنی تنخواہ خود وصول کرلیں، منتظمینِ مدرسہ کا یہ عمل کیسا ہے؟

(۳) اس تکلیف دہ صورتِ حال کا مناسب اور معقول حل کیا ہونا چاہئے؟

(۴) ضروریاتِ زندگی کی فراہمی، حقوق العباد کی ادائے گی اور گوناگوں حالات کے مقابلے کے لئے مدرسین وملازمین اور مؤذنین وائمہ حضرات کا مشاہرہ کتنا ہونا چاہئے؟

(۵) ہمارے حضرات علماء کرام جو یقیناً مذکورہ حضرات کی زبوں حالی سے واقف ہیں، وہ ان کے حق میں کوئی آواز کیوں نہیں اٹھاتے؟

(٦) مساجد میں ائمہ سے مسلسل کام لیا جاتا ہے اور ائمہ کو ضرورتاً ایک دو روز کے لئے کہیں جانا پڑتا ہے تو مسجدوں کے ذمہ داران ائمہ حضرات ہی کو اس کا پابند بناتے ہیں کہ وہ کسی نماز پڑھانے والے کا انتظام کریں، بعض اوقات کسی کا انتظام نہیں ہو پاتا تو اماموں کا جانا موقوف ونا ممکن ہو جاتا ہے۔

(۷) بعض مدارس میں مدرسین وملازمین کو کوئی چھٹی منجانب مدرسہ قطعاً نہیں دی جاتی، اگر کوئی بیمار ہو جائے یا ضرورت سے کہیں جانا پڑ جائے تو اس کی تنخواہ وضع کر لی جاتی ہے۔ کیا شرعاً یہ درست ہے؟

(۸) بعض مقامات پر مقتدی قربانی کی کھال بطور ہدیہ ائمہ کرام کو دے دیتے ہیں؛ لیکن اہل مدارس اس سے منع کرتے ہیں، کیا مدرسہ والوں کا یہ عمل ازروئے شریعت جائز ہے؟

(۹) بعض مدارس والے یہ زیادتی کرتے ہیں کہ ابتداً ملازم ومدرس کو معمولی تنخواہ پر عارضی کہہ کر رکھ لیتے ہیں اور دو دو، ڈھائی ڈھائی سال گذر جاتے ہیں اور اسی طرح ان سے کام لیتے رہتے ہیں، نہ ان کی تنخواہ بڑھاتے ہیں، نہ ان کا استقلال منظور کرتے ہیں، منتظمینِ مدرسہ کے لئے ایسا کرنا کیسا ہے؟

(۱۰) بہت کم مساجد میں ائمہ کرام کے لئے رہائشی مکان کا نظم ہے، زیادہ تر مساجد کے ذمہ دار اور عوام اماموں کی ضرورت سے لاپرواہ اور غافل ہیں، وہ اس بات کا قطعاً خیال نہیں کرتے کہ امام اور مؤذن کے لئے مسجد کے قریب کسی مناسب رہائشی مکان کا نظم کردیں، اگرچہ اس میں امام اور مقتدی دونوں کو سہولت ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ یہ انتظام نہیں کرسکتے؛ اس لئے کہ مساجد کی تزئین وبے جا آرائش پر نیز سردی گرمی سے حفاظت کے نام پر اور مسجدوں کے بلند میناروں اور گنبدوں پر پانی کی طرح پیسہ بہایا جاتا ہے، تو ایسی حالت میں اگر امام اہل محلّہ سے رہائشی مکان کی درخواست کرے تو امام کا یہ مطالبہ جائز ہے یا نہیں؟ اور اہل محلّہ کو اس کا نظم کرنا چاہئے یا نہیں؟ فقط

المستفتی: تنظیم برائے فلاح وبہبود ائمہ مساجد سہارنپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مساجد اور مدارسِ اسلامیہ کے قوانین اور آپس میں تقرر وعزل اور ملازمت سب چیزوں کا مدار اس حدیث پاک پر ہے۔

حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

عن كثير بن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده، أن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين، إلا صلحا حرم حلالا أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا أو أحل

حراما. (ترمذي شريف، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٢٣، رقم: ٢٨٦٩)

اس حدیث شریف کے پیشِ نظر مساجد ومدارس کے جو بھی قانون بنائے جاتے ہیں اور آپس کی تراضی سے ان قانون وضوابط کے مطابق تقرر ہو جائے، تو جانبین اسی کے پابند ہیں؛ لہٰذا جس مدرسہ میں جو بھی قانون بنایا جائے ذمہ داران اور ملازمین اسی کے پابند ہیں اور اسی قانون کی رو سے تنخواہ وظیفہ اور الاؤنس لینے اور دینے کا حکم ہوگا۔ اور یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ ہر مدرسہ اور مسجد کا قانون ایک نہیں ہوتا؛ بلکہ الگ الگ ہوتا ہے اور اس حدیث شریف کی رو سے الگ الگ قانون بنانے کا حق ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۰۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/ ۳/ ۱۴۳۴ھ

کیا ذمہ دارانِ مدرسہ اصول کے پابند ہیں؟

سوال [۸۴۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید مدرسہ اسلامیہ میں تین سال سے مسلسل مستقل طور پر تدریسی خدمات انجام دے رہا ہے، مدرسہ کے اصول کے مطابق پابندی سے کام کر رہا ہے، مدرسہ کا اصول یہ ہے کہ اگر کسی مدرس کو ہٹانا ہے تو اس کو ایک ماہ قبل مطلع کر دیا جاتا ہے کہ تم کو اگلے ماہ سے الگ کر دیا جائے گا۔ اور اگر علی الفور کسی مدرس کو ہٹانا ہوتا ہے تو اسے ایک ماہ پیشگی مشاہرہ دے کر الگ کر دیا جاتا ہے، تو سوال یہ ہے کہ مندرجہ بالا اصول کو چھوڑ کر کسی مدرس کو ہٹا دیا جائے، تو ہٹانے والا شخص عند اللہ وعند الناس وعند الرسول کیسا ہے؟ دلائل کے ساتھ لکھیں۔

المستفتی: محمد انیس چھپی ٹولہ پہانی، ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدارسِ اسلامیہ کے اصول وضوابط کا مدار آقائے نامدار علیہ السلام کا ارشاد ہے:

عن كثير بن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين، إلا صلحا حرم حلالا أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا أو أحل حراما. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ١٧/ ٢٢، رقم: ٣٠، ترمذي شريف، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢) پر ہے۔

جب قانونی شرط یہی ہے کہ جب مدرس کو فوری طور پر ہٹایا جائے تو اس کو پیشگی ایک مہینہ کی تنخواہ دی جائے، اب اگر کسی مدرس کو فوری طور پر ہٹا دیا گیا ہے اور اس کو ایک مہینہ کی پیشگی تنخواہ نہیں دی گئی ہے، تو مدرسہ پر اس مدرس کی ایک مہینہ کی تنخواہ باقی ہے، وہ بہر حال اس مدرس کا حق ہے، مدرسہ پر لازم ہے کہ اس کا شرعی حق اس کے حوالہ کردے اور مدرسہ جس کے زیر انتظام چل رہا ہے اس کی طرف سے اگر ادائے گی میں کوتاہی ہے تو عنداللہ وہ شخص پکڑا جائے گا، پھر بھی مدرسہ کے اوپر اس مدرس کا حق بدستور باقی رہے گا، چاہے بیس سال کے بعد کیوں نہ ہو، اس کا حق اسے ملنا چاہئے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۶۳۲/۳۶ ۷)	۱۴۲۳/۵/۵ھ

مدرسہ اور قبرستان کے نام چندہ لے کر اپنی ضروریات میں خرچ کرنے کا حکم

سوال [۸۴۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عرض حال یہ ہے کہ بحیثیت ایک عام آدمی ایک شرعی مشورہ مانگتا ہوں، آپ مہربانی

کرکے ناچیز کو مفید مشورے سے نوازیں، تاکہ اس کے ذریعہ ہمارے سماج میں مسلم نما درندے جو پھیلے ہیں، ان کا اصلی چہرہ سماج کو دکھا سکوں، میرے گاؤں گرام ماہرس ٹولہ، پوسٹ بھگوتی پور، وایہ رام پٹی، ضلع مدھوبنی، صوبہ بہار میں ایک کمیٹی بنی اور گاؤں والوں نے گاؤں کے خاص خاص آدمیوں کو خاص خاص عہدہ دیا اور تمام عہدہ داروں نے مسجد میں قرآن شریف ہاتھ میں لے کر قسم کھائی کہ ہر ممکن کوشش کریں گے غریبوں اور لاچاروں کے ساتھ انصاف ہوگا اور ایمانداری کے ساتھ مسجد و مدرسہ کو چلائیں گے، خاص عہدہ پر جن کو فائز کیا گیا وہ یہ ہیں: محمد عابد حسین صدر، محمد اسلام سردار نائب صدر اور سکریٹری حافظ محمد بھولی حسن سابق متعلم مدرسہ شاہی، نائب سکریٹری محمد اسرائیل۔ یہ لوگ بالا طبقہ کے لوگ ہوئے اور خزانچی محمد صابر اور محاسب منشی محمد شعیب، یہ کمزور طبقہ کے لوگ ہوئے، باقی ممبر لوگ دونوں طبقہ سے چن کر رکھے گئے، جب سے کمیٹی بنی بیرونی چندہ آنے لگا اور گاؤں سے بھی ماہانہ چندہ وصول ہونے لگا اور صرف ایک مدرس رکھ سکے اور پیسہ جو بھی باہر سے آتا وہ بحکم سکریٹری خزانچی کے پاس جمع نہ ہوکر صدر کے پاس جمع ہونے لگا، قبرستان کی رقم اور مدرسہ کی رقم صدر کے پاس جمع ہونے لگی، گاؤں پنچایت میں جو جرمانہ ہوتا ہے وہ بھی صدر کے پاس رہتا ہے، پہلے مسجد کے متولی دوسرے آدمی تھے، ان کو الزام لگا کر ہٹا دیا، اس کے بعد اپنی خواہش کے مطابق صدر سکریٹری نائب صدر کو مسجد کا متولی چنا گیا اور مسجد کی رقم نائب صدر محمد اسلام کے پاس رہنے لگی، جب کچھ لوگوں نے ان سے ان کے رویہ سے تنگ آکر حساب مانگا تو کافروں کے اکسانے پر آپس میں لڑ پڑے اپنے حصے کی خاطر جو فضول لڑائی تھی جس حصہ پر لڑے تھے وہاں پر اس کا کچھ نہیں ہے، بعد میں مقدمہ ہوگیا، اپنی ذاتی لڑائی میں جو روپیہ مسجد کا نائب صدر کے پاس تھا اور مدرسہ کا جو روپیہ صدر کے پاس تھا، مقدمہ میں دونوں نے خرچ کردیا، جب تک پیسہ باقی رہا لڑتے رہے اور جب ختم ہوگیا، تو لوگوں کو جمع کرکے صلح کرنی چاہی؛ لیکن پنچ نے فیصلہ کیا کہ جب تک مسجد اور مدرسہ کا پیسہ جو ان لوگوں کے پاس ہے واپس نہ کردیں فیصلہ نہیں ہوگا، انہوں نے پنچ سے وعدہ کیا کہ اگلی بیٹھک میں جمع کردیں گے؛ لیکن

اس سے پہلے ایک خط معافی نامہ کا لکھا اور گاؤں والوں سے سائن کرانا شروع کیا، سب سے پہلا سائن نائب سکریٹری جنرل سکریٹری اور نائب صدر کا تھا کہ روپیہ معاف کردیا جائے، باقی پچاس سائن ڈپلیکیٹ کراکے جمع کردیا، جب کہ گاؤں کی آبادی تین سو ہے، ان پنچوں نے آدمیوں کو بلانے کے لئے کہا جنہوں نے سائن کئے تھے، تو کسی کو بلا کر نہیں لائے، صدر نے صدارت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد ظلم کی انتہا کردی اور جو وعدہ کیا تھا اس کے برعکس کیا، حضور والا سے گزارش ہے کہ ایسے لوگوں کے بارے میں ہماری شرعی عدالت کیا فیصلہ سناتی ہے؟ اوران کا ساتھ دینے والوں کے بارے میں علماء کیا فرماتے ہیں؟ مفید مشوروں سے نوازیں، مدرسہ حمایت الاسلام پوسٹ بھگوتی پور، ضلع مدھوبنی اگر اس مدرسے کی رسید لے کر کوئی پہنچے تو فوراً اسے گرفتار کرادیں؛ کیوں کہ اس سے وہ زمین خریدتے ہیں اور عیش کرتے ہیں، اس پیسہ سے مدرسہ کا کوئی بھلا نہیں ہوتا۔

المستفتی: آپ کا کفش بردار شرکت علی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چندہ کا پیسہ اس کام میں صرف کرنا واجب ہے جس کام کے لئے لوگوں نے دیا ہے۔

شرط الواقف كنص الشارع، فيجب اتباعه. (شامي، الوقف، مطلب ما خالف شرط الواقف، فهو مخالف للنص، زكريا ٦/ ٧٣٥، كراچی ٤/ ٤٩٥)

شرط الواقف كنص الشارع في وجوب العمل به، وفي المفهوم والدلالة. (قواعد الفقه أشرفي، ص: ٨٥، رقم: ١٥٢)

ظاہر ہے کہ لوگوں نے اس روپیہ کو ناجائز مقامات اور آپسی لڑائی میں صرف کرنے کے لئے نہیں دیا؛ بلکہ مدرسے پر خرچ کرنے کے لئے دیا ہے، ارکان مدرسہ چندہ دینے والوں کے وکیل ہیں اور وکیل اگر موکل کی منشاء کے خلاف خرچ کرے تو خود وکیل ضامن ہوتا ہے؛ لہٰذا جن لوگوں نے ناجائز مقدمات اور آپسی لڑائی پر مدرسہ وقبرستان کا روپیہ صرف کردیا ہے، ان

پر ضروری ہے کہ اپنی جیب سے وہ روپیہ مدرسہ وقبرستان کو واپس کریں، وہ کسی کے معاف کرنے سے معاف نہیں ہوگا؛ اس لئے کہ یہ مدرسہ وقبرستان کی امانت ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۷/ ۹۹، جدید زکریا مطول ۱۰/ ۴۸۰)

الوكيل إذا خالف، إن خلافا إلى خير في الجنس كبع بألف درهم، فباعه بألف ومائة نفذ، ولو بمائة دينار لا ولو خيرا. (الدرمع الرد، كتاب الوكالة، باب الوكالة بالبيع والشراء، زكريا ٨/ ٢٥٦، كراچى ٥/ ٥٢١، الحكام شرح عزرا الأحكام ٢/ ٢٨٩)

ایسے لوگوں کو مدرسہ وقبرستان وغیرہ اوقاف کے ارکان بننے کا شرعاً کوئی حق نہیں ہے، ایسی حالت میں مسلمانوں کو چاہئے کہ دیندار وامانت دار لوگوں کو ارکان بنائیں۔

ولا يولي إلا أمين قادر بنفسه. (الدرمع الرد، الوقف، مطلب في شروط المتولي زكريا ٦/ ٥٧٨، كراچى ٤/ ٣٨٠، هندية، زكريا قديم ٢/ ٤٠٨، جديد ٢/ ٣٨٠، البحر الرائق، زكريا ٥/ ٣٧٨، كوئٹه ٥/ ٢٣٦، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٤/ ٢٠٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲؍رجب ۱۴۱۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۱۰۹)	۲؍۷؍۱۴۱۵ھ

بچہ کے قاعدہ پورا ہونے پر مہتمم صاحب کا دعوت کا مطالبہ کرنا

سوال [۸۴۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک بچہ ایک مدرسہ میں ایک استاذ کے پاس پڑھتا ہے، اس استاذ کا نظریہ یہ ہے کہ بچوں سے کسی طرح کی کوئی چیز نہ لی جائے، نہ دعوت کھائی جائے؛ کیوں کہ وہ کہتے ہیں کہ جب ہم مدرسہ سے تنخواہ لیتے ہیں تو بچوں سے استاذوں کو کچھ لینے کا حق نہیں، خصوصاً جب کہ بچہ کو دعوت کرنے پر یا کچھ ہدیہ دینے پر مجبور کیا جائے؛ لیکن اس مدرسہ کا ناظم ایک بچہ کے قاعدہ پورا ہونے پر اس کا ذہن بناتا ہے کہ تم ہماری دعوت کرو اور جب اس بچہ کے والد صاحب آتے ہیں

تو ان سے یہ ناظم دعوت کا مطالبہ کرتا ہے، بچہ کا والد دعوت منظور کرلیتا ہے، تو پھر ناظم کہتا ہے کہ ہمارے پاس تمہارے گھر جانے کی فرصت نہیں ہے؛ لہٰذا آپ یہاں پر ہی مرغی یا بطخ پہنچادیں، چنانچہ باضابطہ ناظم مدرسہ اس بچہ کو بطخ لانے کے لئے چھٹی دیتا ہے اور وہ بطخ ناظم مذکور اپنے گھر پکوا کر کھالیتا ہے، جب کھانا تیار ہوجاتا ہے تو مدرسہ کے ایک استاذ اور بچہ کے استاذ سے بھی کھانے کے لئے کہتا ہے؛ لیکن چونکہ یہ دونوں استاذ اس طرح زبردستی دعوت کھانے کے خلاف ہیں، اس لئے ناظم مدرسہ کی یہ لوگ دعوت قبول نہیں کرتے۔ سوال یہ ہے کہ ناظم مدرسہ کا اس طرح طلباء سے دعوت کھانا جائز ہے یا نہیں؟ ایسی دعوت کا کیا درجہ ہے؟

المستفتی: محمد صابر عمری کلاں، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کسی شخص سے دعوت کا مطالبہ کرنا اور اس کو مجبور کرنا جائز نہیں۔ حدیث میں آتا ہے:

عن أبي حرة الرقاشي، عن عمه، أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه. (مسند أبي يعلى الموصلي، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٩١، رقم: ١٥٦٧، سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٢٢، رقم: ٢٨٦٣، مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٧٢، رقم: ٢٠٩٧١، مشكوة ١/ ٢٥٥) کہ کسی کا مال بغیر اس کی دل کی خوشی کے لینا جائز نہیں۔ اور اگر صرف بچوں سے ہی یہ مطالبہ کیا جائے اور ان کے مال سے دعوت کھائی جائے تب بھی جائز نہیں۔

وأما ما يرجع إلى الواهب، فهو أن يكون الواهب من أهل الهبة، وكونه من أهلها أن يكون حرا، عاقلا، بالغا، مالكا للموهوب (إلى قوله) حتى لو كان صغيرا، أو مجنونا، أو لا يكون المالك للموهوب لا يصح. (هندية، كتاب الهندية، الباب الأول، زكريا جديد ٤/ ٣٩٥، قديم ٤/ ٣٧٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ ربیع الاول ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۰۹۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/ ۳/ ۱۴۲۰ھ

مہتمم کے مدرسہ کی رقم اپنے کاروبار میں لگانے یا دوسرے کوقرض دینے کا حکم

سوال [۸۴۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید جو اپنے مدرسہ کا مہتمم ہے، اگر مدرسہ کی رقم سے قرض لے کر اپنے کاروبار میں لگالے، تو اس کا کیا حکم ہے، اس سے جو منفعت ہوگی اس کا کیا حکم ہے؟ اور اگر دوسرے کو بطور قرض دینا چاہے، تو اس کا بھی حکم مدلل باحوالہ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: مولانا خورشید انور صاحب، مولانا عبدالناصر صاحب

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مدرسہ کا مہتمم مدرسہ کی رقم کا مالک نہیں ہے؛ بلکہ امین ہے؛ اس لئے اس میں مالکانہ تصرف کرکے اس میں سے کسی کو قرض دینا یا بطور قرض لے کر ذاتی کاروبار میں لگانا ہرگز جائز نہیں ہے، یہ امانت میں زبردست خیانت ہے، اگر ایسا کرے گا تو خیانت کے گناہ کے ساتھ ساتھ وہ رقم ضمانت بن جائے گی اور مدرسہ کا مہتمم اب امین نہیں رہے گا؛ بلکہ ضامن بن جائے گا اور ضامن جب ضمان ادا کرے گا تو حاصل شدہ منفعت کا تصدق اس پر لازم نہ ہوگا؛ البتہ خیانت کا خطرناک گناہ کا وبال اس پر عائد ہوکر رہے گا۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ۵۲۶/۲، ڈابھیل ۵۰۴/۱۵)

وليس للمودع حق التصرف والاسترباح في الوديعة. (المبسوط للسرخسي، كتاب الوديعة، دارالكتب العلمية بيروت ۱۱/ ۱۲۲)

ولا يجوز للقيم شراء شيء من مال المسجد لنفسه ولا البيع له، وإن كان فيه منفعة ظاهرة للمسجد -إلى- ليس للمتولي إيداع مال الوقف والمسجد إلا ممن في عياله، ولا إقراضه، فلو أقرضه ضمن. (البحرالرائق، كوئٹه ۵/ ۲۳۹، زكريا ۵/ ۴۰۱)

فإن خلطها المودع بماله حتى صار لا تتميز ضمنها؛ لأنه استهلاك، ثم لا سبيل للمودع عليها عند أبي حنيفة -رحمه الله-. (الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ۲/ ۲۷، دارالكتاب ديوبند ۲/ ۳۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱ر محرم الحرام ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹۶۳/۲۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱/۱/۱۴۱۳ھ

الفصل الثالث: في المدرسين

ذمہ دارانِ مدرسہ و مدرسین کے تعلق سے چند سوالات کے جوابات

سوال [۸۴۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدرسہ کی ایک باضابطہ با اختیار تقریباً بیس ارکان پر مشتمل کمیٹی ہے۔

(۱) کیا مدرسہ کے اساتذۂ کرام کو خود اپنی تنخواہ بڑھانے کا جواز ہے؟ اگر بغیر مہتمم مدرسہ اور بغیر کمیٹی کے مشورہ کے تنخواہ بڑھا لی ہے اور وہ انہوں نے خود مدرسہ کے فنڈ سے ادا کر لی ہے، تو یہ بڑھائی ہوئی تنخواہ لوٹانا ضروری ہے یا نہیں؟

(۲) بغیر کمیٹی کے پاس گئے رمضان میں فراہمی چندہ کے عوض ڈبل تنخواہ خود اپنی مرضی سے ادا کر لی ہے یہ جائز ہے یا ناجائز؟

(۳) مہتمم مدرسہ اور ایک رکن شوریٰ نے ایک تجویز منظور کی، کیا ان دو کی منظور کردہ تجویز قابل عمل ہے یا نہیں، جب کہ ارکان شوریٰ کی تعداد تقریباً بیس ہے؟

(۴) کیا مہتمم مدرسہ کو بغیر کمیٹی کے مشورہ کے تنخواہ ملازمین بڑھانے کا جواز ہے یا نہیں؟

المستفتی: ارکان شوریٰ مدرسہ جامعہ علمیہ مسجد کہنہ ٹانڈہ بادلی، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) کمیٹی کے سرگرم اور با اختیار رہونے کی حالت میں اگرچہ اساتذہ کو خود اپنی تنخواہ بڑھانے کی اجازت نہیں ہے؛ لیکن اگر کمیٹی کے ارکان کسی استاذ یا مہتمم کو مکمل اختیار دے دیں اور وہ اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے تنخواہ بڑھائیں اور ان کے اس عمل پر کمیٹی کے ارکان نکیر نہ کریں؛ بلکہ خاموش رہیں یا توثیق کریں، تو یہ اضافہ کرنا شرعاً جائز ہوگا۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ۱۲/ ۲۰۷، جدید ڈابھیل ۱۴/ ۱۲۸)

وسائر التصرفات لمن يتولى. (درمختار على الشامي، الوقف، مطلب لا يستبدل العامر إلا في أربع، زكريا ٦/ ٥٨٩، كراچی ٤ / ٣٨٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٤ / ١٣٣)

والنائب مثل الأصيل. (درمختار على شامي، الوقف، مطلب فيما إذا شرط المعلوم مباشر الإمامة الخ- زكريا ٦/ ٦٣٢، كراچی ٤/ ٤٢٠، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٢، ٤٨)

(۲) رمضان کی ڈبل تنخواہ کے سلسلہ میں بھی وہی تفصیل ہے جو نمبر ایک میں لکھی گئی کہ اگر بااختیار مدرس نے یہ فیصلہ کیا اور بعد میں اس کی توثیق صراحتاً یا دلالۃً ہوگئی ہے، تو یہ مقرر کرنا درست ہے۔

وسائر التصرفات لمن يتولى. (درمختار على الشامي، الوقف، مطلب لا يستبدل العامر إلا في أربع، زكريا ٦/ ٥٨٩، كراچی ٤/ ٣٨٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٤/ ١٣٣)

والنائب مثل الأصيل. (درمختار على شامي، الوقف، مطلب فيما إذا شرط المعلوم مباشر الإمامة الخ- زكريا ٦/ ٢٣٢، كراچی ٤/ ٤٢٠، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٢، ٤٨)

(۳) اگر مذکورہ تجویز بعد میں دیگر اراکینِ شوریٰ منظور کریں تو وہ قابل عمل ہے۔

وسائر التصرفات لمن يتولى. (درمختار على الشامي، الوقف، مطلب لا يستبدل العامر إلا في أربع، زكريا ٦/ ٥٨٩، كراچی ٤/ ٣٨٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٤/ ١٣٣)

والنائب مثل الأصيل. (درمختار على شامي، الوقف، مطلب فيما إذا شرط المعلوم مباشر الإمامة الخ- زكريا ٦/ ٢٣٢، كراچی ٤/ ٤٢٠، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٢، ٤٨)

(۴) مہتمم کو اگر کمیٹی نے اختیار دے رکھا ہے، تو مہتمم کو اضافۂ تنخواہ کا فیصلہ کرنے کی شرعاً اجازت ہے۔

وسائر التصرفات لمن يتولى. (درمختار على الشامي، الوقف، مطلب لا يستبدل العامر إلا في أربع، زكريا ٦/ ٥٨٩، كراچی ٤/ ٣٨٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٤/ ١٣٣)

والنائب مثل الأصيل. (درمختار على شامي، الوقف، مطلب فيما إذا شرط المعلوم مباشر الإمامة الخ- زكريا ٦/ ٢٣٢، كراچی ٤/ ٤٢٠، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٢، ٤٨)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/۲/۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۷۰۶۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۰/۲/۱۴۲۲ھ

مدرسہ کے مفاد کے پیش نظر کسی ملازم کو برطرف کرنا

سوال [۸۴۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) اکبر حسین بن عبدالکریم کو قومی مدرسہ کا عہدہ خزانچی دیا، اس سے جب حساب مانگا تو اس نے اولاً تو منع کیا کہ میں حساب نہیں دوں گا، مگر جب قوم اس کے سر ہوگئی، تو اس نے مجبوراً حساب دیا اور حساب ۱۹۸۱ء سے ۱۹۹۱ء تک دیا اور ایک ہی سیاہی اور ایک ہی قلم سے آمد اور خرچ کا دیا اور خرچ مع واؤچر کے نہیں دیا۔

(۲) اکبر حسین بن عبدالکریم نے اپنے والد مرحوم کو عرصہ دراز کے بعد مدرسہ کا متولی بنایا ۱۹۸۴ء میں جب کہ باپ مر چکا ہے ۱۹۳۷ء میں۔

(۳) اکبر حسین مدرسہ کو اپنی ملکیت بنانا چاہتا ہے اور لوگوں کے ساتھ بداخلاقی سے پیش آتا ہے۔ اور پولیس کو روپیہ بھر دیتا ہے اور ناجائز لوگوں کو ستاتا ہے اور عرصہ ۲۱؍سال میں مدرسہ میں تعلیم بھی نہیں دی ہے۔

(۴) اکبر حسین بن عبدالکریم نے مدرسہ میں ایک طرف مسجد بنانے کے لئے چندہ اکٹھا کر کے تعمیر مسجد کا کام شروع کر دیا، اس نے اپنے ذاتی مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پیسے کو دوکان میں صرف کر دیا اور مسجد مکمل نہیں بنائی، لوگوں نے کہا تو مارنے مرنے کے لئے تیار ہو گیا؛ لہٰذا ان تمام صورتوں میں شرعاً اس اکبر حسین پر کیا حکم لاگو ہوتا ہے۔ اور کیا مدرسہ کا کوئی عہدہ دیا جا سکتا ہے۔

المستفتی: سائل امجد علی کاشی پور، نینی تال (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر اکبر حسین کو مدرسہ میں رکھنا مدرسہ کے ذمہ دار حضرات مدرسہ کے مفاد کے خلاف سمجھتے ہیں، تو ان کو علیحدہ کرنے کا اختیار رہے۔ اور اگر مدرسہ کے مفاد کے خلاف نہیں ہے تو الگ کرنے سے اکبر حسین مظلوم ہوگا اور ذمہ دار حضرات ظلم کے مرتکب ہوں گے۔

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: لا ضرر ولا ضرار. (سنن ابن ماجة، الأحكام، باب من بنى في حقه ما يضر بجاره، النسخة الهندية ۱/ ۱۶۹، دارالسلام، رقم: ۲۳۴۱، موطا إمام مالك، باب القضاء في المرفق، أشرفي ص: ۳۱۱، رقم: ۲۷۵۸)

لا عبرة بالتوهم. (قواعد الفقه أشرفي، ص: ۱۰۷، رقم: ۲۵۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۱۴/ ۲۰۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱ر صفر ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۳۰۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱/۲/۱۴۱۳ھ

مدرسہ کے صدر مدرس کے خلاف عوام کے انتشار کا حکم

سوال [۸۴۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مولوی صاحب مدرسہ میں صدر مدرس کی حیثیت سے ہیں اور اس شخص کی وجہ سے مسلمانوں میں آپس میں انتشار وخلفشار ہے اور اس شخص سے یہاں کے عوام ومسلمان بدظن ہیں اور اس کی وجہ سے زبردست کشیدگی ہے، تو ایسے شخص کا مدرسہ میں رہنا ٹھیک ہے یا نہیں؟ اور یہاں کے مسلمان ان سے کہتے ہیں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ تو بھی وہ جانے کے لئے تیار نہیں ہے، اگر یہ شخص یہاں سے نہ گیا تو مسلمانوں میں آپس میں خون ہوسکتا ہے، صحیح ومدلل جواب تحریر فرمائیں۔ فقط

المستفتی: ناظم تیاگی، محلّہ ستی رڑکی، سہارنپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ ذمہ داری اربابِ انتظام واہل شوریٰ کی ہے، کسی دوسرے شخص کے لئے اظہار رائے اس کے منصب سے خارج ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۷/۱۶۱، جدید مطول ۱۰/۴۷۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳ر صفر ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۵۱۱)

اوقات مدرسہ میں مہتمم کی اجازت سے حوائج ضروریہ کے لئے جانا

سوال [۸۴۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں شعبۂ حفظ کا مدرس ہوں مدرسہ کے بالکل سامنے مدرسہ کے مکان میں میرے بچے رہتے ہیں، میں مہتمم صاحب کی اجازت سے روزانہ گھر جا کر استنجاء ووضو نماز چاشت مدرسہ کے تعلیمی وقت میں ادا کرتا ہوں، کیا میرے لئے یہ جائز ہے اور مہتمم صاحب کا اس طرح اجازت دینا جائز ہے؟ جواب سے نوازیں۔ والسلام

المستفتی: مجیب الرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حسب تحریر سوال آپ کا اوقات مدرسہ میں مدرسہ کے قریب اپنے گھر جا کر حوائج ضروریہ سے فارغ ہونا اور وضو کر کے چاشت کی نماز پڑھنا شرعاً جائز ہے؛ کیوں کہ مہتمم صاحب کی اجازت کی بنا پر آپ کے مدرسہ کا عرف اس کی اجازت کا ہوگیا ہے اور ایسے مسائل کا مدار عرف پر ہوا کرتا ہے۔

الثابت بالعرف كالثابت بالنص. (قواعد الفقه، أشرفي، ص: ٧٤، رقم: ١٠١، مجموعة رسائل ابن عابدين ثاقب بكڈپو ١/ ٤٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲ر صفر ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۸۹۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۲/۱۴ھ

مدرس کو دو وقت پڑھانے پر مجبور کرنا

سوال [۸۴۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں حافظ فرید احمد مدرسہ عربیہ احیاء العلوم محلّہ ترک پٹی خیرآباد میں شعبۂ حفظ کا مدرس

ہوں، میرا کمیٹی سے طے تھا کہ میں صرف صبح کے وقت درسگاہ میں بیٹھوں گا، باقی وقت دوسرے حافظ نوشاد صاحب پڑھائیں گے، اب اس وقت ہمارے مدرسہ کی کمیٹی میں کچھ خلفشار ہے اور کمیٹی میں دو گروہ ہو گئے ہیں، اپنی بات منوانے کی غرض سے ہمارے منیجر حاجی محمد آفاق صاحب چاہتے ہیں کہ میں اب تینوں وقت مدرسہ میں تدریسی کام دیکھوں، جس کے بارے میں میں نے منع کر دیا ہے، ہمارے صدر صاحب سکریٹری وخزانچی وغیرہ حضرات کا کہنا ہے، جب تک خلفشار دور نہیں ہو جاتا کوئی مدرس نہ تو نکالا جائے گا اور نہ ہی کسی سے کوئی زبردستی کی جائے گی۔ الحمد للہ مدرسین میں کوئی خلفشار نہیں ہے، جب میں نے منیجر صاحب کو تینوں وقت پڑھانے سے منع کیا، تو گذشتہ ۶ ؍ستمبر کو انہوں نے حفظ کی درسگاہ میں آکر کافی گالی گلوچ اور بدکلامی کی، درسگاہ میں ہم تین حافظ موجود تھے، حافظ معین الدین، حافظ نوشاد اور حفظ کے طلبہ کی موجودگی میں جب کہ قرآن کریم پڑھایا جارہا تھا، مجھ سے کہا کہ تمہیں میرے ساتھ تینوں اوقات میں مدرسہ آکر قوم لوط والا عمل کرنا ہوگا۔ اور اگر میری ماں زندہ ہوتی تو تمہیں ان کے اوپر تینوں وقت چڑھواتا وغیرہ، اس سے زیادہ کہنے سے قاصر ہوں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسے شخص کا کسی دینی ادارہ کا ذمہ دار بنے رہنا چاہئے جو قرآن وحافظ قرآن کی توہین کرے اور اس کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہئے؟ اس کا اسلام سے کوئی رشتہ ہے یا نہیں؟ براہ کرم اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جواب مرحمت فرما کر ملت اسلام کے کچھ افراد پر احسان فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرس کا منصب تدریس پر فائز ہونے سے پہلے یہ شرط لگانا کہ میں صرف ایک وقت پڑھاؤں گا جائز اور درست ہے۔ اور اس کے برخلاف مدرس کو اس سے زیادہ وقت پڑھانے پر مجبور کرنا درست نہیں ہے؛ البتہ اگر مدرس اپنی خوشی سے دوسرے وقت میں پڑھانے پر تیار ہو جائے تو اسے اس کا مکمل اختیار ہے؛ لیکن زائد وقت نہ پڑھانے پر اس کو گالم گلوچ کرنا یا اس کے حق میں نامناسب الفاظ استعمال کرنا یہ قطعاً غلط ہے، ایسے شخص کو

چاہئے کہ مدرس صاحب سے معافی مانگے اور اپنے اس غلط عمل پر توبہ واستغفار کرے؛ لیکن اگر مذکورہ شخص اپنی غلطی پر مصر ہو تو ایسا شخص فاسق ہوگا اور فاسق آدمی دینی ادارہ کا ذمہ دار بننے کا اہل نہیں، اس کے بجائے کسی متبع شریعت دیندار آدمی کو ذمہ دار بنانا چاہئے۔

قال عبداللہ: قال النبي ﷺ: سباب المسلم فسوق، وقتاله كفر. (بخاري شريف، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم لا ترجعوا بعدي كفارا، النسخة الهندية ٢/ ١٠٤٨، رقم: ٦٧٩٧، ف: ٧٠٧٦)

وينزع وجوبا لو غير مأمون أو عاجزا أو ظهر به فسق، كشرب خمر ونحوه. (درمختار مع الشامي، الوقف، مطلب في شروط المتولي، زكريا ٦/ ٥٧٨، كراچی ٤/ ٣٨٠، البحرالرائق، زكريا ٥/ ٤١١، كوئٹه ٥/ ٢٤٥، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٦٠٢، قديم ١/ ٧٦٢، بزازية زكريا جديد ٣/ ١٣٤، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٥٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍محرم الحرام ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۸۰۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۱/۳ھ

مدرس سے مدرسہ کی رقم گھر سے چوری ہوگئی

سوال [۸۴۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص مدرسہ میں مدرس ہے جس نے رمضان المبارک میں مدرسہ کے لئے مالیات کی وصولیابی کی، وصول کی ہوئی رقم اس کے پاس بطور امانت اس کے گھر میں رکھی ہوئی تھی، امانت کی حفاظت میں کوئی کمی نہیں کی اور نہ ہی اپنی ذاتی رقم میں اس امانت کو ملایا، وہ شخص کسی کام سے باہر چلا گیا اور اس کے بال بچے گھر پر ہی تھے، اس کی غیر موجودگی میں اس کے بڑے لڑکے جس کی عمر سترہ سال ہے نے نہ جانے کیسے سیف الماری کا تالا کھولا اور بیگ کی

چھین توڑ کر امانت کی رقم جو اس کے پاس ساٹھ ہزار روپئے تھی اس میں سے چھیالیس ہزار پانچ سو لے کر فرار ہو گیا، یعنی چوری کی، اس شخص نے اپنے بیٹے کو بہت تلاشا ڈھونڈا؛ لیکن وہ نہ ملا تیسرے روز اس کے بیٹے کا فون اس کے بیٹے کے دوست کے پاس آیا تو اس کے دوست کے والد نے اس شخص کے بیٹے کو بہت سمجھایا اور والدین کے کچھ نہ کہنے کی اپنے اوپر ذمہ داری لی، تو اس کے بیٹے نے چوتھے روز دوست کے گھر شام کو آنے کا وعدہ کیا اور اس شخص کا بیٹا چوتھے روز دوست کے گھر پر آ گیا، جہاں اس کے بیٹے کے تایا کو بلا کر بات چیت ہوئی اور اس شخص کا بیٹا اپنے تایا کے ہمراہ گھر پر آ گیا، اس شخص کا بیٹا جو رقم چھیالیس ہزار پانچ سو روپئے لے گیا تھا، اس میں سے جو رقم اس کے بیٹے کے پاس سے وصول ہوئی وہ اڑتیس ہزار پانچ سو تھی، یعنی پوری رقم میں سے آٹھ ہزار روپیہ کم۔ مذکورہ صورت میں دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس شخص پر تاوان واجب ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد شاہد قاسمی سرائے خام، بریلی (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرسہ کی رقم وصول ہونے کے بعد وصول کنندہ کے لئے اپنے گھر پر رکھنے کا حق نہیں ہوتا، جب اس نے اپنے گھر پر رکھا ہے، تو اس کی ضمانت میں داخل ہو گیا، چاہے باہر کے چور آ کر چوری کر لیں یا گھر کے افراد میں سے کوئی یہ حرکت کر لے ہر حال میں پوری پوری رقم مدرسہ کو ادا کرنا اس کے اوپر لازم ہے، نیز اگر منجانب مدرسہ مدرسہ کی کمیٹی اور ذمہ دار نے مل کر کے مدرسہ کی رقم اس شخص کے پاس امانت میں رکھی ہے، پھر اس شخص کے بیٹے یا گھر کے افراد میں سے کوئی بھی فرد اس میں سے چوری کر لے، تو بھی اس کی مکمل ادائیگی اس شخص کے اوپر لازم ہے؛ اس لئے کہ گھر کے افراد میں سے کسی کا اس میں سے لے کر خرچ کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے خود یہ کام کیا ہو؛ اس لئے بہر صورت مدرسہ کی مکمل رقم مدرسہ کو واپس کرنا اس شخص پر لازم ہے، جیب خاص سے دے یا قرض لے کر دے یا کسی بھی طریقہ سے اسی کے ذمہ لازم ہے۔

عن الحسن، قال: إذا خالف المستودع غير ما أمر به ضمن، وإن كان فيه فضل فهو له بضمانه. (مصنف عبدالرزاق، البيوع، باب الوديعة، المجلس العلمي ٨/ ١٨٣، رقم: ١٤٨٠٦)

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده، عن النبي ﷺ قال: ليس على المستعير غير المغل ضمان، ولا على المستودع غير المغل ضمان.

(سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٣٦، رقم: ٢٩٣٩)

وللمودع أن يحفظها بنفسه وبعياله ...... ويشترط أن يكون من في عياله أمينا؛ لأنه لو دفع إلى زوجته، وهي غير أمينة، وهو عالم بذلك أو تركها في بيته الذي فيه ودائع الناس، وذهب فضاعت ضمن. الخ

(البحرالرائق، كتاب الوديعة، کوئٹه ٧/ ٢٧٤، زكريا ٧/ ٤٦٥، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٦٩، قديم ٢/ ٣٣٩، الدر مع الرد، زكريا ٨/ ٤٥٦، کراچی ٥/ ٦٦٤)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍شوال ۱۴۳۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۸۰۳/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/۱۰/۱۴۳۰ھ

مدرسین کا چرم قربانی وصول کرنے پر معاوضہ لینے کا حکم

سوال [۸۴۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک دینی مدرسہ میں عیدالاضحیٰ کے موقع پر مدرسین کو تعطیل نہیں دی جاتی ہے، بمشکل کسی سخت ضرورت کی وجہ سے مہتمم صاحب کسی مدرس کو گھر جانے کی اجازت دیتے ہیں بقرعید کے دنوں میں مدرسین سے چرم کی وصولی کا کام لیا جاتا ہے اور بقرعید کے ایام کے کام کی الگ سے کوئی تنخواہ متعین نہیں کی جاتی ہے، تدریسی خدمات پر مدرسین کی جو تنخواہ متعین ہے، اسی

حساب سے بقرعید کے دنوں کی تنخواہ ملتی ہے، مزید برآں مثلاً ہر چرم کی وصولی پر بطور انعام کے دس روپئے ملتے ہیں، تو کیا ایسے تنخواہ دار مدرس کے لئے ہر چرم کی وصولی پر دس روپئے انعام لینا شرعاً جائز ہے، یا یہ صورت غیر تنخواہ دار محض کمیشن پر چندہ کرنے یا چرم وصول کرنے والے کے حکم میں داخل ہے۔

المستفتی: محمد طاہر عفی عنہ دارالعلوم رحمانیہ ٹانڈہ بادلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی کے موقع پر چرم قربانی کی وصولی مدرسین کے ذمہ لازم نہیں ہوتی ہے۔ اور یہ ایام چھٹی کے ہوتے ہیں اور جب چھٹی کے ایام میں مدرسین اپنی چھٹیوں سے فائدہ اٹھانے کے بجائے چرم قربانی کی وصولی پر محنت کریں تو ان کو فی چرم دس روپیہ پندرہ روپیہ محنتانہ کے طور پر لینا جائز اور درست ہے؛ اس لئے کہ اس محنت کا تعلق تنخواہ سے نہیں ہے۔

وشرطها كون الأجرة والمنفعة معلومتين. (درمختار، كتاب الإجارة، زكريا ۹/ ۷، كراچی ٦/ ٥)

ولا يصح حتى تكون المنافع معلومة، والأجرة معلومة. (هداية، أشرفي ۳/ ۲۹۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ ذی الحجہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۴۴)

مدارس کے ملازم اجیر بالعمل ہیں یا اجیر فی الوقت

سوال [۸۴۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ہمارے مدارس عربیہ میں مدرسین ملازمین ومنتظمین اجیر فی الوقت ہیں یا اجیر بالعمل، یا اجیر بالعمل فی الوقت؟

(٢) اگر صرف اجیر فی الوقت ہیں تو منتظمین کو نصاب وامور مفوضہ کی تکمیل کا مطالبہ ومؤاخذہ کرنا کیسا ہے؟

(٣) اگر اجیر بالعمل ہیں تو کیا منتظمین کی جانب سے اوقاتِ متعینہ کے علاوہ اوقات میں وہ اپنے امورِ مفوضہ کو پورا کر سکتا ہے؟ اور اوقاتِ متعینہ میں غیر حاضر رہنے یا نہ کر سکنے پر مؤاخذہ تو نہیں ہوگا؟ بینوا توجروا

المستفتی: مدیر ماہنامہ ندائے شاہی مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (١) مدارسِ اسلامیہ کا عرف اس زمانہ میں یہ ہے کہ ملازمین ومدرسین ومنظمین وقت مقررہ میں امورِ مفوضہ کی تکمیل کیا کریں اور یہی ضابطہ مقرر اور معروف ہے اور شریعت اسلامیہ میں اس طرح اجارہ اور ملازمت کا معاملہ کرنا جائز اور مشروع ہے؛ اس لئے مدارسِ اسلامیہ کے ملازمین اجیر بالعمل فی الوقت ہیں؛ لہٰذا عمل نہ کرنے اور وقت مقررہ میں حاضر نہ ہونے پر مقررہ ضابطہ کے مطابق مؤاخذہ جائز ہے، نیز عرف وشرط وضابطہ کی وجہ سے بوقت تقرری بغیر صراحت قانونی تعطیلات کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ٣/ ٣٤٨، ٣/ ٣٤٩، ٣/ ٣٥٦، فتاوی محمودیہ ٦/ ٣١١، ڈابھیل ١٦/ ٥٧٢)

لأن المعروف كالمشروط. (الأشباه والنظائر قديم، ص: ١٥٢، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ١٢/ ٥٤، ١٣/ ٧٩، ١٤/ ٣٦، البناية أشرفيه ٥/ ٤٨١، ٨/ ٢٤٥، ١١/ ٤٨٣، قواعد الفقه أشرفي، ص: ١٢٥، رقم: ٣٣٤)

الثابت بالعرف كالثابت بالنص. الخ (عقود رسم المفتي، قديم ص: ٩٥، قواعد الفقه أشرفي، ص: ٧٤، رقم: ١٠١)

(٢) صرف اجیر فی الوقت نہیں ہے؛ اس لئے شرائط وضوابط کے مطابق مطالبہ ومؤاخذہ کا حق ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ٣/ ٣٤٩، ٣/ ٣٥٦)

اور اگر کسی مدرسہ میں کوئی ضابطہ بنا ہوا نہیں ہے، تو علاقہ کے مشہور اداروں کے عرف وشرائط کے مطابق عمل کرنا ہوگا۔

وإن شرط المعلم على المولى أن يعطيه في كل شهر كذا، ويقوم على غلامه في تعليم كذا، فهو جائز، وإذا لم يشترط كل واحد منهما شيئا فلما فرغ وتعلم قال المعلم لي الأجرة على رب العبد كذا، وقال سيد العبد: لي الأجرة على المعلم ينظر في ذلک إلى عرف تلک البلدة، فإن كان سيد العبد هو الذي يعطي، فالأجرة عليه، وإن كان المعلم هو الذي يعطي، فالأجرة على المعلم. الخ (البحرالرائق، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة كوئٹه ٨/ ١٩، زكريا ٨/ ٣٤)

(۳) صرف اجیر بالعمل نہیں ہے؛اس لئے اوقاتِ مقررہ پر غیر حاضری کی وجہ سے مؤاخذہ کا حق ہوگا۔(مستفاد: امدادالفتاوی ۳/ ۳۴۹،۳/ ۳۵۶)

اوراگر کسی ملازم کومخصوص شرط پر رکھاہےتو وہ اسی شرط کا پابند ہوگا۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ:شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/۵/۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/۲۲۱۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/۱۰/۱۴۱۱ھ

شخص واحد کے ذمہ درس وتدریس اورامامت وغیرہ سپرد کرنا

سوال [۸۴۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: درس وتدریس وعظ ونصیحت، امامت، اذان یہ سب الگ الگ شعبہ ہیں، کیا ایک شخص کوان امور کا پابند کیا جاسکتا ہے، جب کہ گذراوقات اور بال بچوں کے اخراجات بھی ہوں؟

(۲) کیا امام اپنے ذاتی کام یااور مجبوری سے چھٹی کرسکتا ہے؟

(۳) امام کے کل اخراجات کس کے ذمہ ہیں، جب کہ امام پردیسی ہو فی سبیل اللہ امامت کرتا ہواورامام کی مالی حالت بھی کمزور ہو، ایسی صورت میں اہل محلّہ کیا کریں؟ ان کی کیا ذمہ داری ہے؟ امام شادی شدہ ہے، نوجوان ہے، تو کیا بیوی بچوں کے ساتھ رکھنے کا نظم وبندوبست مقتدیوں کے اوپر ہے؟

المستفتی: محمد ہارون، راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) مذکورہ امور سب الگ الگ شعبہ کی حیثیت رکھتے ہیں؛ لیکن اگر ایک شخص ان سب ذمہ داریوں کو تنہا ادا کرسکتا ہے، تو اس کے لئے اس کی گنجائش ہے اور امام کے ساتھ ساتھ اگر ان کاموں کی ذمہ داری کی شرط بھی لگائی گئی ہے۔ اور امام صاحب نے منظور کرلیا ہے، تو اس پر ان تمام امور کو انجام دینا لازم ہوگا۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۳/ ۴۶)

عن عمرو بن عوف المزني، عن رسول الله ﷺ قال: المسلمون على شروطهم إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ۷/ ۲۲، رقم: ۳۰)

(۲) امام اپنی ذاتی ضروریات کے لئے چھٹی لے سکتا ہے، مگر ان امور کی شرط لگا لینی چاہئے یا علاقہ میں ان کا عرف ہو۔

المعروف كالمشروط، فصار كأنه صرح به. (الأشباه والنظائر قديم/ ۱۵۶)

نیز ایام رخصت کی تنخواہ بھی امام کو ملنی چاہئے۔

فحيث كانت البطالة معروفة في يوم الثلاثاء والجمعة، وفي رمضان والعيدين يحل الأخذ. (شامي، الوقف، مطلب في استحقاق القاضي والمدرس الوظيفة في يوم البطالة، زكريا ٦/ ٥٦٨، كراچی ٤/ ٣٧٢، سكب الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٥٨٩)

(۳) امام کے کل اخراجات خود امام کے ذمہ ہیں، ہاں البتہ امام کی تنخواہ کے ذمہ دار مسجد کے ذمہ دار حضرات ہوتے ہیں، وہ لوگ مسجد کے فنڈ میں سے ادا کریں گے۔

رزق القاضي من بيت المال. (درمختار، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ٩/ ٥٥٨، كراچی ٦/ ٣٨٩، المبسوط دارالكتب العلمية بيروت ١٦/ ١٠٢، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٣/ ٣١٨)

امام جب ضرورت مند ہےتو وہ فی سبیل اللہ امامت کیوں کرے؟ وہ اپنی تنخواہ متعین کرلیا کرے،تاکہ کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیراحمدقاسمی عفااللہ عنہ
۸رصفرالمظفر ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر:۳۳/۵۶۲۴)

الجواب صحیح:
احقرمحمدسلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۱۹/۲/۸ھ

کیا گاؤں کے مدرس پرمسجد کی امامت بلا اجرت واجب ہے؟

سوال [۸۴۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بستی میں مدرسہ اسلامیہ ہے،جس میں غلہ کی سیر من کی آمدنی کے ساتھ ساتھ بستی کے چرم قربانی،فطرہ،زکوۃ وغیرہ بھی صرف ہوتا ہے،مدرسہ میں چار مدرس ہیں،انہیں کی تنخواہوں یا تعمیر میں جملہ رقم خرچ ہوتی ہے،مدرسہ میں بیرونی بچے بھی دس پندرہ رہتے ہیں،جو بستی میں گھروں میں کھانا کھاتے ہیں،مدرسہ کے مدرسین کی ذمہ داری مسجدوں میں نماز پڑھانا بھی ہے جبکہ نماز کی اجرت مدرسہ سے ملنے والی تنخواہ میں ہی مشروط ہے،علیحدہ مسجد سے کوئی وظیفہ نہیں ہے،معلوم کرنا یہ ہے کہ یہ شکل کہاں تک صحیح ہے؟

المستفتی:ظہیراحمدقاسمی،مدرسہ بدرالعلوم گنگوارحسن پور،مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب گاؤں میں امامت کی شرط پرمدرس کا تقرر ہوتا ہے،تومدرس اس شرط کا پابند ہوگا۔اوراگرتقررکےوقت امامت طےنہیں ہےتوامامت لازم نہیں ہے۔

ومن استأجر عبدا ليخدمه له أن يسافر به إلا أن يشترط ذلك. الخ

(هداية، كتاب الإجارات، باب إجارة العبد أشرفي ٣/ ٣١٢، هندية، زكريا قديم ٤/ ٤٣٥، جديد ٤/ ٤٦٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیراحمدقاسمی عفااللہ عنہ
۱۴۱۵/۳/۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر:۳۱/۴۹۴۳)

مدرس کونابالغ طلباء کی امامت کاپابند بنانا

سوال [۸۴۵۳]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک مدرسہ میں مستقل مدرس ہے، اس مدرسہ میں بیرونی طلبہ بھی کافی تعداد میں ہیں، کوئی طالب علم پندرہ سال کی عمر کا نہیں پایا جاتا اور نہ ہی کسی دوسری صورت سے سن بلوغ کا اظہار ہوتا ہے، یعنی سب نابالغ ہیں، مدرسہ کے مہتمم نے زید کے اوپر یہ پابندی عائد کی ہے کہ تم مدرسہ میں ان طالب علموں کو نماز پڑھایا کرو، یعنی زید امام بنے اور سب نابالغ طالب علم اس کے مقتدی بن کر فرض نماز باجماعت مدرسہ ہی میں ادا کریں، اس صورت میں زید کی فرض نماز صحیح ہوگی اور جماعت کا ثواب ملے گا یا نہیں؟ مہتمم صاحب کی طرف سے زید پر ان نابالغ بچوں کی امامت کے لئے جبر کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: صورت مسئولہ میں زید کی فرض نماز ادا ہو جائے گی اور جماعت کا ثواب بھی ملے گا، مگر مسجد میں نماز پڑھنے کے ثواب سے محروم ہو جائے گا، نیز مہتمم صاحب کا اس بات پر پابند کرنا درست نہیں ہے کہ مدرس مسجد چھوڑ کر یہیں نماز پڑھائے، اگر مدرس خود مسجد میں جا کر نماز پڑھنا چاہتا ہے تو اس پر رکاوٹ ڈالنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳/ ۲۹۹)

والجماعة سنة مؤكدة للرجال، وأقلها اثنان واحد مع الإمام ولو مميزا. (وتحته في الشامية) أي ولو كان الواحد المقتدى صبيا مميزا، ويؤخذ منه أنه يحصل ثواب الجماعة باقتداء المتنفل بالمفترض؛ لأن الصبي متنفل. (ردالمحتار، كتاب الصلاة، باب الإمامة، مطلب في تكرار الجماعة في المسجد زكريا ۲/ ۲۸۷، ۲۸۹، كراچی ۱/ ۵۵۲، ۵۵۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲ / ربیع الاول ۱۴۲۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۵۱۲)	۱۴۲۱/۳/۲ھ

کیا مدرس کا بیماری میں چھٹی لے کر اپنے نجی کام سے جانا دھوکہ نہیں؟

سوال [۸۴۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدرس اپنے نجی کام سے باہر جاتے ہیں، چھٹی کا ان کو استحقاق نہیں ہے تو وہ میڈیکل سرٹیفکیٹ دے کر چلے جاتے ہیں، میڈیکل سرٹیفکیٹ میں ڈاکٹر صاحب نے آرام کا مشورہ دیا ہے، یہ مدرس ہزاروں میل دور سفر پر چلے جاتے ہیں، اس طرح ان ایام کی تنخواہ ان کے لئے حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ یہ مدرس حافظ، مولوی، عالم اور فاضل بھی ہیں، ان کا یہ کردار ایک مشہور زمانہ دارالعلوم کے لئے جہاں سے یہ فارغ التحصیل ہیں، بدنما داغ ہے یا نہیں؟ شریعت مطہرہ میں ایسے علماء کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: صابر رضا خان منیجر مدرسہ جامع العلوم، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر واقعی جعلی سرٹیفکٹ ہے تو دھوکہ دہی ہے جو جائز نہیں ہے۔ اور اگر جعلی سرٹیفکٹ نہیں ہے؛ بلکہ سرٹیفکٹ اپنی جگہ درست ہے اور بیماری کی حالت میں آدمی اپنے ذاتی کسی کام سے جا آسکتا ہے، جیسا کہ دنیا بھر میں بہت سے بیمار لوگ بھی اپنے ضروری اسفار کرتے ہیں اور ہلکے پھلکے کام بھی کرتے ہیں، تو ایسی صورت میں دھوکہ دہی نہیں ہے، رخصت علالت لینا بھی درست ہے اور جب مدرسہ میں رخصت علالت منجانب مدرسہ دینے کا قانون ہے تو ان ایام کی تنخواہ لینا بھی درست ہے۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– أن رسول الله ﷺ قال: …… من غشنا فليس منا. (مسلم شريف، باب قول النبي ﷺ من غشنا فليس منا، النسخة الهندية ١/ ٧٠، بيت الأفكار، رقم: ١٠١)

عن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني عن أبيه عن جده أن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين، إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل

حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا أو أحل حراما.
(سنن الترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ۱۷/ ۲۲، رقم: ۳۰، سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۲۳، رقم: ۲۸٦۹، المستدرك، كتاب الأحكام، مكتبه نزار مصطفى الباز- ۷/ ۲۰۲۳، قديم ٤/ ۱۰۱، رقم: ۷۰۵۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۵۲۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۵/۱۴ھ

مکتب میں استاذ کا جمعراتی لینا

سوال [۸۴۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعض جگہوں پر یہ رواج ہے کہ مکتب میں پڑھانے والا استاذ جمعراتی پیسے لیتا ہے، کیا یہ پیسے لینا جائز ہے؟ نیز نکاح پڑھانے کے بعد قاضی کو جو روپیہ ملتے ہیں اس کا بھی لینا جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب تقرر کے وقت یہ معلوم ہے کہ جمعرات میں کچھ ملتا ہے اس کی وجہ سے اس کم تنخواہ پر بھی استاذ تیار ہوجاتا ہے؛ اس لئے جمعراتی پیسہ اس کے لئے اس کا حق بھی ہے؛ اس کے لئے لینا جائز ہے، یہ اصل تنخواہ پر انعام اور تحفہ ہے، اس سے ملازمت کی ترغیب ہوتی ہے، ملازمت کی اصل تنخواہ نہیں ہے اور چونکہ نکاح پڑھانا مدرس کی ذمہ داری میں شامل نہیں ہے؛ اس لئے نکاح خوانی کی اجرت الگ سے لینے کی گنجائش ہے۔

وكل نكاح باشره القاضي وقد وجبت مباشرته عليه كنكاح الصغار، والصغائر، فلا يحل له أخذ الأجرة عليه، وما لم تجب مباشرته عليه حل له أخذ الأجرة عليه كذا في المحيط. الخ (عالمگيرى، كتاب أدب القاضي، الباب الخامس عشر في أقوال القاضي، وما ينبغي، زكريا قديم ۳/ ۳٤٥، جديد ۳/ ۳۰٦، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ۱۲/ ۲۳۲، ۲۳۳، رقم: ۱٤۲۹۹، الفتاوى التاتارخانية زكريا ۱۱/ ۱۱۹، رقم: ۱٥٦۳٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹ رصفر ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۹۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۲/۳۰ھ

مدرس کے جمعراتی وصول کرنے کا حکم

سوال [۸۴۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مکاتب کے اندر مدرسین حضرات جو جمعراتی پیسے وصول کرتے ہیں درست ہے یا نہیں؟ نیز بچوں سے کرناٹک کے علاقہ میں مسجد کی کمیٹی کی طرف سے نکاح خوانی کی فیس متعین ہوتی ہے، اس کی وضاحت یوں ہے کہ جب کسی مسجد کے امام کو کسی شادی میں نکاح خوانی کے لئے بلایا جاتا ہے، تو اس مسجد کی کمیٹی کی طرف سے لڑکا اور لڑکی کے والدین کو تین تین سو مجموعہ پانچ سو روپیہ کمیٹی کو ادا کرنے پڑتے ہیں، کیا یہ روپئے کمیٹی کے لئے لینا درست ہے؟ اور کمیٹی کے ان ہی روپیوں میں سے امام کو روپئے لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر امام خود شادی والوں سے نکاح خوانی کی فیس مانگ لے تو کیا یہ روپیہ اس کے لئے درست ہوگا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مکاتب کے اندر مدرسین حضرات جو بچوں سے جمعراتی وصول کرتے ہیں، وہ ان کے لئے لینا درست ہے؛ کیوں کہ مدرس کو تقرر کے وقت ہی معلوم

رہتا ہے کہ جمعرات کے روز بچوں کے ذریعہ اس کو کچھ ملے گا، اس کی وجہ سے وہ کم تنخواہ پر بھی راضی ہوجاتا ہے؛ اس لئے جمعراتی پیسہ اس کے لئے لینا جائز ہے۔ (مستفاد: عزیز الفتاوی/ ۷۵۸)

اور چونکہ نکاح پڑھانا مدرس کی ذمہ داری نہیں ہے؛ اس لئے نکاح خوانی کی اجرت اس کے لئے لینا جائز اور درست ہے، البتہ کمیٹی کی طرف سے نکاح خوانی کی فیس متعین کرنا درست نہیں ہے؛ بلکہ جو جتنا دے دے اتنا لے لینا چاہئے اور جس شخص (امام) نے نکاح پڑھایا ہے اس کے لئے نکاح خوانی کی اجرت لینا جائز ہے، اور کمیٹی کے لئے لینا درست نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۲/ ۳۷۰)

وكل نكاح باشره القاضي، وقد وجبت مباشرته عليه كنكاح الصغار والصغائر، فلا يحل له أخذ الأجرة عليه، وما لم تجب مباشرته عليه حل له أخذ الأجرة عليه. (هندية، كتاب أدب القاضي، الباب الخامس عشر في أموال القاضي، زكريا قديم ۳/ ۳٤٥، جديد ۳/ ۳۰٦، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ۱۲/ ۲۳۲، ۲۳۳، رقم: ۱٤۲۹۹، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ۱۱/ ۱۱۹، رقم: ۱٥٦۳٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍صفر ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۹۳۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۲/۱۹ھ

طلبہ کی طرف سے معلم کو ملنے والے ہدیہ کا حکم

سوال [۸۴۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک ادارہ میں ۱۶؍معلم کام کرتے ہیں، اس میں ابتدائی تعلیم سے لے کر حفظ وتجوید تا شرح جامی کی تعلیم ہے، دس سال قبل اس ادارہ میں یہ قانون نافذ ہوا کہ جس معلم کو بھی طلبہ کی

طرف سے ہدیہ انعام واکرام ملے گا اس کو فنڈ میں جمع کیا جائے گا اور اخیر سال میں سب معلموں میں تقسیم کیا جائے گا، ان میں چند معلم ایسے ہیں جن کو ہدیہ یا انعام وغیرہ ملتا ہے، باقی ایسے ہیں جن کو بالکل انعام نہیں ملتا اور وہ چند معلموں کا انعام سب معلموں میں تقسیم ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ معلم جن کو انعام ملتا ہے وہ دل میں کڑھتے ہیں ور ناخوش ہیں اور وہ چاہتے ہیں ہمیں علیحدہ کر دیا جائے، ہم اس فنڈ میں شریک نہیں ہیں، اب ان معلموں میں بھی کسی کو کم اور کسی کو زیادہ انعام اور ہدیہ ملتا ہے جو کہ سب میں شریک ہوتا ہے، یہاں تک کہ جو کوئی اشیاء جیسے کپڑے ملتے ہیں تو ان کو بھی فروخت کیا جاتا ہے جس کو وہ کپڑے ملتے ہیں وہ دل سے ناخوش ہے۔ اور اگر اس فنڈ سے کسی کو علیحدہ کر دیا جائے تو ہر معلم علیحدہ ہوگا جو انتشار کا باعث ہے، تو آپ تحریر فرمائیں شرعاً اس فنڈ میں جمع کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس کے لئے کوئی صریح جزئیہ نظر سے نہیں گذرا؛ البتہ اگر طے شدہ قانون طلبہ اور معلمین سب کو معلوم ہے۔

تو "**المسلمون عند شروطهم**". (بخاري تحت ترجمة الباب أجر السمسرة، النسخة الهندية ۱/ ۳۰۳) کے تحت جواز معلوم ہوتا ہے، مگر طلبہ سے ہدیہ لینا نامناسب عمل ہے، اس سے بہت سے مضر اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۶۲۱)

مدرسے میں بے پردہ معلّمہ کے تقرر کرنا کا حکم

سوال [۸۴۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا مدارسِ اسلامیہ میں جہاں پر معلم حضرات تعلیم دیتے ہیں وہاں پر نوجوان

معلّمہ صاحبہ کا تقرر کرنا درست ہے، جب کہ معلّمہ صاحبہ آتے جاتے اور پڑھاتے وقت بھی بے پردہ رہتی ہوں، یعنی کہ سر پر ڈوپٹہ تک بھی نہ رکھتی ہوں، اگر معلّمہ صاحبہ کا تقرر کیا جائے تو کن شرائط کے ساتھ؟

المستفتی: محمد مسلم امروہوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسے مدارسِ اسلامیہ جن میں صرف لڑکیاں ہی تعلیم حاصل کرتی ہیں، وہاں بہتر یہ ہے کہ معلّمہ کا ہی تقرر کیا جائے، جب کہ وہ پابند شرع ہو۔اور اگر مدرسہ ایسا ہے جس میں لڑکے تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اکثر پڑھانے والے مرد ہیں، تو وہاں معلّمہ کے تقرر کرنے میں بہت سارے مفاسد ہیں، مثلاً بے پردگی نامحرم مردوں کے ساتھ اختلاط، بعض موقعوں پر تنہائی اور خلوت کا بھی موقع آسکتا ہے، آپس میں بے تکلفانہ بات چیت اور نامحرم مردوں کے ساتھ آمد ورفت وغیرہ کے بھی امکانات ہیں؛ اس لئے عورتوں کے لئے شرعاً ایسی ملازمت کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۱۰/ ۳۰۸، جدید۱۰/۱۰۳-۹۰، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۷/ ۲۳۵، ڈابھیل۳/ ۳۸۹،فتاوی نظامیہ اندوریہ ۱/۴۳۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰/ ۶/ ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۸۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۳۰/ ۶/ ۱۴۱۹ھ

اساتذہ کے لئے طلباء کو ملنے والے کنسیشن استعمال کرنے کا حکم

سوال [۸۴۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدارسِ دینیہ کے طلبہ کے لئے جو سرکار کی طرف سے کنسیشن فارم دیا جاتا ہے، کیا اس پر مدرسہ کے اساتذہ کرام سفر کرسکتے ہیں؟

المستفتی: منظور احمد اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سرکار نے صرف طلبہ کے لئے کنسیشن فارم دیا ہے، اساتذہ یاملازمین کے لئے نہیں؛ اس لئے اساتذہ کرام وملازمین کے لئے اس پر سفر کرنا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۴۴۵، ۴/۱۴۲، ۴/ ۱۴۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۵۳۱)

مدرسے کے کمروں میں مدرس کا فیملی کے ساتھ رہنا

سوال [۸۴۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید ایک مدرسہ کا مدرس بھی ہے اور مسجد کا امام بھی اور اس کا نگراں بھی زید ہے، تو کیا زید کے لئے مدرسہ کے کمروں میں فیملی لے کر رہنا جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگ اشکال کرتے ہیں کہ مدرسے کے کمرے میں فیملی لے کر کیسے رہیں گے؟ واضح ہو کہ مدرسہ میں چار پانچ کمرے ہیں، مدرسے میں بیرونی طلبا بھی نہیں ہیں، گاؤں والے بچے پڑھ کر چلے جاتے ہیں، مدرسہ خالی رہتا ہے، تو کیا زید کے لئے مدرسے کے کمرے میں فیملی لے کر رہنا جائز اور گنجائش ہے یا نہیں؟ براہ کرم تفصیلی جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد منظور عالم خوشحال پوری، مدرسہ کاشف العلوم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مدرس کی ملازمت کے لئے مدرسہ کی طرف سے کمرہ یا مکان کا بھی معاملہ طے ہوا ہے یا کمیٹی وذمہ داران مدرسہ کی جانب سے بچوں واہلیہ کے رکھنے کی اجازت ہے، تو ایسی صورت میں مدرس کا اپنے بچوں واہلیہ کو مدرسہ کے کمرہ میں رکھنا شرعاً درست ہے، ہاں پردہ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، لوگوں کا اس سلسلہ میں اعتراض جہالت اور غلطی پر مبنی ہے۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ۱۴/ ۱۶۸، جدید ڈابھیل ۱۵/ ۵۲۰)

عن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده أن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين، إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.

(ترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دار السلام، رقم: ۱۳۵۲، مشكوة شريف: ۲۵۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۰۳۹/۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/۱/۱۴۲۲ھ

مدرسین کے وسعت ونجی گھر ہونے کے باوجود مدرسہ کا گھر خالی نہ کرنے کا حکم

سوال [۸۴۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک دینی مدرسہ جو کافی عرصہ سے دینی تعلیم کی خدمت میں مصروف ہے، اس ادارے کے ذمہ داران نے اس ادارے میں مامور مدرسین وملازمین کی پریشانی اور کم وسعتی کو سامنے رکھتے ہوئے ادارے کی مملوکہ اراضی میں مدرسین وملازمین کے لئے مکانات مہیا کر دیئے تھے، جس سے مدرسین وملازمین کو سکون اور یکسوئی کے ساتھ خدمت کا موقع فراہم ہوا، مدرسہ کی جانب سے سہولیات فراہمی کے ساتھ معمولی کرایہ بھی طے کر دیا گیا، جس کی ادائیگی ہوتی رہی، مزید کوئی دوسرا معاملہ یا عہد وپیمان نہ ہوا، آج تک ان مکانات میں رہنے والے مدرسین وملازمین ان مکانات کو ادارے کی ہی ملک سمجھتے ہیں؛ لیکن موجودہ صورت یہ ہے کہ ان میں سے بعض کو اللہ نے کافی وسعت سے نواز دیا ہے، وہ لوگ اسی بستی میں جہاں ادارہ قائم ہے یا تو اپنے نجی مکانات کے مالک ہیں یا مکان بنانے کی مکمل وسعت رکھتے ہیں، جب کہ ادارے کو مکانات کی ضرورت ہے، ایسے حالات میں چند امور دریافت طلب ہیں:

(۱) ادارے کا مدرسین وملازمین کو رہائش کے لئے مکان دینا یہ معاملہ شرعی اعتبار سے کس دائرے میں آئے گا؟

(۲) کیا وسعت وفراخی آنے یا اپنے نجی مکان کا مالک ہونے کے بعد ایسے لوگوں کا ادارے کے مکان میں قیام پذیر رہنا جب کہ ادارے کو ضرورت بھی ہے، شرعی اعتبار سے درست ہے؟

(۳) کیا ادارہ مکان کے انخلاء کے لئے کوئی دباؤ یا اصرار کا طریقہ اپنا سکتا ہے؟

(۴) کبھی کبھی ان مکانات پر قبضہ کی صورت بن جانے سے ان کی حفاظت کا مسئلہ بھی اٹھتا ہے، اس سلسلہ میں کیا پیش رفت کی جاسکتی ہے؟ مفید مشورہ مطلوب ہے، شرعی نقطہ نظر سے جواب عنایت فرما کر ممنون ہوں۔

المستفتی: عبدالمقتدر، محلّہ خانقاہ دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) کوئی بھی ادارہ اپنے ماتحت ملازمین کے لئے رہائشی مکان مہیا کرتا ہے، اس میں دو باتیں پیش نظر رہتی ہیں: اولاً اس میں ادارہ کا فائدہ پیش نظر رہتا ہے، ملازمین کی فیملی کی رہائش کا انتظام نہ ہونے کی صورت میں ان کو ادارے کا کام چھوڑ کر بار بار اپنی فیملی اور بچوں کے حقوق کی ادائے گی اور ان کی خبر گیری کے لئے جانا پڑتا ہے، اس میں ادارہ کا نقصان ہوتا ہے، اس سے بچنے کے لئے ادارہ رہائشی مکانات کا انتظام کرتا ہے۔ دوسری یہ کہ ادارے کے پیش نظر یہ بات بھی ہوتی ہے کہ اس سے ملازم کو سہولیات فراہم ہوتی ہیں، جس سے اپنے بال بچوں کے متعلق بے فکر ہوکر کام کرنے میں جماؤ پیدا ہوجائے اور ملازم دلجمعی کے ساتھ ادارے کے کام میں لگ جائے۔ اور جب ملازم کی یہ ضرورت اپنے ذاتی مکان کے ذریعہ پوری ہوجائے تو ملازم کے اوپر لازم ہے کہ ادارے کا مکان رضا کارانہ طور پر خالی کردے اور ذاتی مکان میں رہائش اختیار کرلے، تاکہ ادارے کے دوسرے ضرورت مند ملازمین خالی کردہ مکانات سے ادارے کے واسطے سے اپنی ضرورت پوری کرسکیں۔ اور سوال میں یہ بھی پوچھا گیا ہے کہ یہ معاملہ شرعی اعتبار سے کس دائرہ میں آئے گا؟ واضح ہو کہ یہ معاملہ کرایہ دار کے دائرہ میں تو آتا ہے، مگر مطلقاً نہیں؛ بلکہ ضرورت پوری ہونے کی حد تک آتا ہے۔

قال في الأشباه: فيفرق بين اشتراط تقديم العمارة كل سنة والسكوت عنه، فإنه مع السكوت تقدم العمارة عند الحاجة إليها، ولا يدخر لها عند عدم الحاجة إليها، ومع الاشتراط تقدم عند الحاجة ويدخر لها عند عدمها. (شامي، كتاب الوقف، مطلب في قطع الجهات لأجل العمارة، زكريا ٦/ ٥٦٦، كراچی ٤/ ٣٧١)

(۲) جب ملازم کو اللہ تعالیٰ وسعت اور فراخی عطا فرما دے اور اپنا نجی مکان بنالے تو ملازم پر ضروری ہے کہ ادارے کا مکان خالی کر کے اپنے نجی مکان میں منتقل ہو جائے اور ذاتی رہائشی انتظام کے باوجود ادارے کا مکان خالی نہ کرنا جب کہ ادارے کو اپنے دوسرے ضرورت مند ملازمین کے لئے مکان کی ضرورت ہے، تو یہ قابض ملازمین کی طرف سے ناجائز قبضہ ہے، اس کو خالی کرانے میں ادارے کو اپنی طاقت کے استعمال کرنے کا حق ہے اور قابض ملازمین کے سخت گنہگار اور عند اللہ سخت پکڑ میں آنے کا خطرہ ہے۔

إذا مضت مدة الإجارة قلع البناء والغرس، وسلم الأرض إلى المؤجر فارغة؛ لأنه يجب عليه تسليمها إلى صاحبها غير مشغولة ببنائه وغرسه، وذلک بقلعهما في الحال؛ لأنهما ليس لهما حالة منتظرة ينتهيان إليها.

(تبيين الحقائق زكريا ٦/ ٩٦، مكتبه إمداديه ملتان ٥/ ١١٤)

وتصح إجارة أرض للبناء والغرس ...... مضت المدة قلعهما وسلمها فارغة لعدم نهايتهما إلا أن يغرم له الموجر قيمته، أي البناء والغرس مقلوعا. (درمختار مع رد المحتار زكريا ٩/ ٤١، كراچی ٦/ ٨٣، هندية، زكريا قديم ٤/ ٤٢٩، جديد ٤/ ٤٦٢)

عن سعيد بن زيد بن عمرو بن نفيل أن رسول الله ﷺ قال: من اقتطع شبرا من الأرض ظلما طوقه الله إياه يوم القيامة من سبع أرضين.

(مسلم شريف، كتاب المساقاة، باب تحريم الظلم وغصب الأرض، النسخة الهندية ٢/ ٣٢، بيت الأفكار رقم: ١٦١٠، بخاري شريف ١/ ٤٥٣، رقم: ٣٠٩١، ف: ٣١٩٥)

(۳) مدارسِ اسلامیہ کے قوانین وضوابط اس حدیث شریف کی روشنی میں بنائے جاتے ہیں۔حدیث شریف ملاحظہ فرمایئے:

عن كثير بن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده أن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين، إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (جامع الترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، طبراني ١٧/ ٢٢، رقم: ٣٠، سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٢٣، رقم: ٢٨٦٩)

اس حدیث پاک کے پیش نظر ضرورت مند ملازمین کو جو رہائشی مکانات منجانب ادارہ دئے جاتے ہیں وہ وقتی ضرورت پوری کرنے کے لئے دئے جاتے ہیں، جب ان کی ضرورت ذاتی رہائشی مکانات یا کسی اور طریقہ سے پوری ہو جائے تو ان پر لازم اور ضروری ہے کہ ادارے کے مکانات کو رضا کارانہ طور پر خالی کر کے ادارے کے حوالہ کردیں اور از خود خالی نہ کرنے کی صورت میں ادارے کو دباؤ ڈالنے اور خالی کرانے پر اصرار کا حق ہے، پھر بھی خالی نہ کریں تو ادارے کو جہاں تک ہو سکے اپنی طاقت استعمال کرنے کا حق ہے، اگر کوئی ملازم ایسا مضبوط ہے کہ اس پر دباؤ ڈالنے کی صورت میں ادارے کو طرح طرح کے خطرات کا اندیشہ ہے، تو ایسی صورت میں وہ ملازم شرعاً غاصب اور ظالم شمار ہوگا اور عنداللہ سخت پکڑ میں آنے کا خطرہ ہے۔

عن كثير بن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده أن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين، إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (جامع الترمذي، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢)

إذا مضت مدة الإجارة قلع البناء والغرس، وسلم الأرض إلى المؤجر

فارغة؛ لأنه يجب عليه تسليمها إلى صاحبها غير مشغولة ببنائه وغرسه، وذلك بقلعهما في الحال؛ لأنهما ليس لهما حالة منتظرة ينتهيان إليها. (تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٥/ ١١٤، زكريا ٦/ ٩٦)

وتصح إجارة أرض للبناء والغرس ...... مضت المدة قلعهما وسلمها فارغة لعدم نهايتهما (وتحته في الشامية:) أي البناء والغرس إذ ليس لهما مدة معلومة. (الدرالمختار مع الشامي، كراچی ٦/ ٨٣، زكريا ٩/ ٤١)

(۴) جب ادارہ کو ملازمین کی طرف سے ان مکانات پر قبضہ کر لینے کا خطرہ ہوتو مکانات ملازمین کو ہندوستانی قانون کے مطابق ۱۱؍مہینے کے اگریمنٹ کے ساتھ دینے چاہئیں اور ہر گیارہ مہینے پر نئے اگریمنٹ پر دستخط کرائے جائیں، جب یہ سلسلہ رہے گا تو آگے چل کر ملازمین کی نیت میں فتور نہیں آئے گا اور ادارہ جب چاہے خالی کراسکتا ہے، اسی وجہ سے بہت سے فقہاء نے اوقاف کی جائیداد کو صرف ایک سال کے لئے کرایہ پر دینے کا مشورہ دیا ہے۔ اور بعض نے تین سال کی بھی اجازت دی ہے۔ اور مقصد یہی ہے کہ ادارہ کے حق میں جائیداد خطرہ میں نہ پڑ جائے۔

ومنها: بيان المدة في الدور والمنازل والحوانيت. (هندية، زكريا قديم ٤/ ٤١١، جديد ٤/ ٤٤٠)

وشرطها كون الأجرة والمنفعة معلومتين؛ لأن جهالتهما تفضي إلى المنازعة، ويعلم النفع ببيان المدة كالسكنى والزراعة. (الدرالمختار مع الشامي، زكريا ٩/ ٧-٨، كراچی ٦/ ٦٥)

وكان القاضي الإمام أبو علي النسفي رحمه الله يفتي بأن المتولي لا ينبغي أن يؤاجر أكثر من ثلاث سنين. (هندية، زكريا ٢/ ٤١٩، تاتارخانية ٨/ ٦٩، رقم: المسألة: ١١٢٣٣، تبيين الحقائق، زكريا ٧٩، ١٨٠، إمداديه ملتان ٥/ ١٠٦)

فإن كان الواقف شرط أن لا يؤاجر أكثر من سنة، فليس للقيم أن

يخالف شرطه ويؤاجرها أكثر من سنة. (تاتارخانية، زكريا ٨/ ٦٨، رقم: ١١٢٣٢)

روي عن الفقيه أبي جعفر رحمه الله أنه كان يقول في الوقف لا يؤاجر أكثر من سنة. (تاتارخانية ٨/ ٦٨، رقم: ١١٢٣٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍محرم الحرام ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/۱۱۸۲۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۱/۱۴۳۶ھ

غیر صاحب نصاب مدرس کے لئے مدرسہ کا کھانا کھانا

سوال [۸۴۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی مدرس صاحب نصاب نہ ہو، تو مدرسہ میں طلباء کے لئے پکا ہوا کھانا بغیر قیمت یا فیس ادا کئے ہوئے کھا سکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: زاہد الاسلام، مدرسہ رحمانیہ محمد نگر سہاگ پور، شہڈولی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرس خواہ صاحب نصاب ہو یا غیر صاحب نصاب، اگر بوقت ملازمت کھانا مدرسہ سے طے ہوا ہے جو کہ جزو تنخواہ ہے یا فیس ادا کر کے کھانا لیتا ہے بہرصورت مدرس کو مطبخ سے کھانا لینا درست ہے؛ لیکن اگر مدرس کی خورا کی منجانب مدرسہ جمع نہ ہوئی ہو یا فیس ادا کئے بغیر کھانا لے اور مطبخ میں زکوۃ کی رقم بلا تملیک صرف کی جاتی ہو تو ایسی صورت میں مدرس کو کھانا لینا درست نہ ہوگا۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۵/ ۲۸۵، جدید ڈابھیل ۱۵/۴۸۰، ۵۵۱)

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ. الآية [التوبة: ٦٠]

مصرف الزكوة والعشر هو فقير. (شامي، كتاب الزكوة، باب المصرف، کراچی ٢/ ٣٣٩، زکریا ٣/ ٢٨٣)

(۲) معطی کی طرف سے زکوۃ کی رقم دوقسموں پر ہوتی ہے: (۱) مدِ زکوۃ کے نام سے علی الاطلاق زکوۃ کی رقم دی جاتی ہے، اس میں یہ تخصیص نہیں ہے کہ یہ پیسہ مستحقین پر کس طریقہ سے خرچ کیا جائے، ایسی صورت میں معطی کی طرف سے مدرسہ کے ذمہ دار یا سفراء کے ہاتھ میں پیسہ آتے ہی معطی کی زکوۃ ادا ہوجاتی ہے؛ اس لئے کہ سفراء اور مدرسہ کے ذمہ دار طلباء کے وکیل ہیں اور زکوۃ کے ایسے پیسے کو طباخ کی اجرت، آٹا پیسائی کی اجرت اور لکڑی کی خریداری وغیرہ میں صرف کرنا درست نہیں، ہاں البتہ ایسی چیز کی خریداری اس پیسے سے جائز ہے جس کی بقاء طلباء کے ہاتھوں میں کھانا پہنچنے تک رہتی ہے، جیسا کہ گوشت، دال، مسالا، آٹا وغیرہ۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۱/ ۱۱۵، جدید ڈابھیل ۹/۶۰۳)

هي تمليك خرج الإباحة جزء مال خرج المنفعة فلو أسكن فقيرا داره سنة ناويا لا يجزيه المال كما صرح به أهل الأصول ما يتمول ويدخر للحاجة، وهو خاص بالأعيان، فخرج به تمليك المنافع. (درمختار مع الشامي، كتاب الزكوة، كراچی ۲/ ۲۵۶، ۲۵۷، زكريا ۳/ ۱۷۱-۱۷۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰/۵/۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۷۲۵۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۶/۱۴۲۲ھ

مدرسین کے لئے ایصال ثواب کا کھانا کھانا

سوال [۸۴۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدرسہ میں مطبخ کا کھانا تیار ہوتا ہے، اس میں مدرسین وملازمین اور طلباء کا کھانا ایک ساتھ تیار کیا جاتا ہے، کبھی کبھی صدقہ کا مال یا ایصال ثواب کا کھانا بریانی وغیرہ آجاتی ہے، اب مدرسین جو مدرسہ کے مطبخ سے کھانا کھاتے ہیں، وہ بھی اس میں کھا سکتے ہیں یا نہیں؟ کیوں کہ جب کھانا آگیا تو مطبخ میں کھانا بنتا نہیں ہے، نیز مدرسہ کے ناظم صاحب کا کہنا ہے

کہ اگر علیحدہ کھانا بنے گا تو مدرسہ کا نقصان ہوتا ہے اور اس کھانے کا جو بستی سے آتا ہے، ہم کیا کریں گے اور وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ یہ صدقہ نافلہ ہے؛ کیوں کہ نیت ثواب کی ہوتی ہے اور طباخ بھی جلد کھانا بنانے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

المستفتی: رحمت اللہ قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایصال ثواب کا کھانا صدقہ ہے۔اور صدقہ فقہاء کا حق ہے، اغنیاء کو صدقہ دینے سے صدقہ کا ثواب نہیں ملتا؛ لہٰذا اگر اساتذہ سرمایہ دار ہیں، تو ان کے لئے ایصال ثواب کا کھانا درست نہیں ہے؛ البتہ اگر صدقہ نافلہ کریں تو اس کا کھانا اساتذہ کے لئے درست ہوگا، خواہ صاحب نصاب ہوں یا نہ ہوں۔سوال نامہ میں جس پریشانی کا ذکر ہے کہ الگ سے کھانا تیار کرنے میں مدرسے کا نقصان ہوگا، نیز طباخ بھی تیار نہیں ہوتے، تو اس صورت میں جواز کی صورت یہ ہے کہ مستحق طلبہ کھانا لے آئیں وہ اپنا کھانا اساتذہ کو اپنی خوشی سے کھلادیں، تو اس کی گنجائش ہے، جیسا کہ حدیث بریرہ سے واضح ہوتا ہے۔(مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۴/ ۱۰۸، جدید زکریا مطول ۵/ ۵۷۱)

عن عائشة –رضي الله عنها– أنها أرادت أن تشتري بريرة للعتق …… وأوتي النبي صلى الله عليه وسلم بلحم، فقلت: هذا ما تصدق به على بريرة، فقال: هو لها صدقة ولنا هدية. (صحيح البخاري، باب الصدقة على موالي أزواج النبي صلى الله عليه وسلم، النسخة الهندية ١/ ٢٠٢، رقم: ١٤٧١، ف: ١٤٩٣)

وأما بقية الصدقات المفروضة والواجبة (وقوله) فلا يجوز صرفها للغني (إلى قوله) خرج النفل عنها؛ لأن الصدقة على الغني هبة. (البحرالرائق، كتاب الزكوة، باب المصرف، دارالفكر بيروت ٢/ ٢٤٥، زكريا ٢/ ٤٢٧، كوئٹه ٢/ ٢٤٥)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ صفر ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۷۱۹)

مدرسے کے ملازم کے علاج کی ذمہ داری کس پر ہے؟

سوال [۸۴۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کسی مدرسہ کا ملازم ہے جو درس وتدریس کا کام انجام دیتا ہے اور وہ باقاعدہ مدرسہ سے اپنی متعین تنخواہ لیتا ہے، اتفاقاً وہ کسی سے ملاقات کرنے کے لئے کہیں چلا گیا، مدرسہ کے کام سے نہیں گیا، واپسی میں وہ شدید بیمار پڑ گیا یا اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا، تو کیا اس کے علاج ومعالجہ کی پوری ذمہ داری مدرسہ کے اوپر ہوگی یا کس کے اوپر ہوگی؟ جب کہ زید کے وارث مثلاً اس کا بھائی یا اس کا لڑکا اس کے پاس موجود ہے اور اس کے علاج کی کیا شکل ہوگی؟

المستفتی: ڈاکٹر عبدالکافی مہتمم جامعہ اخلاق العلوم چکر کی ملک، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: مدرسہ کی رقم سے علاج کرنے کا حق نہیں ہے، ہاں البتہ علی الحساب لے کر بعد میں تنخواہ میں مجرا کرتے رہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اور تنخواہ اور منجانب مدرسہ مقرر کردہ دیگر وظائف کے علاوہ لینے کا حق نہیں ہے۔

لا يجوز لأحد أن يتصرف في ملك الغير بغير إذنه. الخ (قواعد الفقه، أشرفي ديوبند، ص: ١١٠)

لا يجوز التصرف في مال غيره بغير إذنه، ولا ولايته عليه. (الأشباه، كتاب الغصب، كراچی ٢/ ٩٨) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۴۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۴/۲۸ھ

الفصل الرابع:

مدارس میں سرکاری اور غیر مسلم کا مال صرف کرنے کا حکم

مدرسہ کو ایڈ کرانا

سوال [۸۴۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) بعد آداب وتسلیمات کے خدمت اقدس میں عرض یہ ہے کہ مدرسہ جامعہ عربیہ اصلاح العلوم عرصہ سے دینی خدمات انجام دے رہا ہے، جس میں چار مدرس اور دو ٹیچر ایک عالم دو قاری اور ایک حافظ دینی خدمات انجام دے رہے ہیں، تعلیمی نصاب حافظہ، ناظرہ درجات پرائمری اول تا درجہ پنجم ہے۔

(۲) ہمارے گاؤں میں دوسرا مدرسہ ہدایت العلوم ملحق حضرت ناظم صاحب مدظلہ مجلس دعوۃ الحق ہردوئی بھی چل رہا ہے، وہ مدرسہ امسال رکنائز ہو گیا ہے، نیز امداد برائے وظائف طلبہ بھی ملتی ہے، اس وجہ سے اکثر طلباء مدرسہ ہدایت العلوم میں داخل ہو رہے ہیں اور ہمارے مدرسہ اصلاح العلوم میں ابتدائی بچوں کی آمد پر کافی اثر پڑا، وظیفہ کی وجہ سے اکثر لوگ اپنے طلباء کو مدرسہ ہدایت العلوم میں داخل کررہے ہیں، موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اہم اراکین مدرسہ اصلاح العلوم کو گورنمنٹ سے رکنائز کرانا چاہتے ہیں، شرعاً کیسا ہے؟

(۳) نیز گورنمنٹ سے امداد برائے وظائف طلبہ ملتی ہے، اس کا لینا شرعاً کیسا ہے؟

المستفتی: اراکین مدرسہ اصلاح العلوم بڑا انو اردہ غوث گنج، ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دینی مدارس اللہ تعالیٰ پر توکل اور عامۃ المسلمین کے تعاون سے چلتے ہیں، جن مدارس نے حکومت سے ایڈ اور وظائف لینا شروع کیا ہے وہ کبھی بھی آزاد مدارس سے آگے بڑھ کر ترقی نہیں کر پائے؛ اس لئے دینی مدارس کا حکومت سے ملحق

ہوکر وظائف حاصل کرنا روحانی ترقیات پر روک لگانا ہے؛ اس لئے حکومت سے ملحق کرنا مناسب نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَعَسَى اَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ. [البقرة: ٢١٦] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۲۴۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴/۴/۱۴۱۸ھ

کیا ایڈ کے مدارس میں سرکاری قوانین کی پابندی لازم ہے

سوال [۸۴۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک سرکاری مدرسہ کا مدرس ہے اور اس کی تنخواہ تقریباً ۲۰؍ ہزار روپیہ مہینہ ہے اور اب جبراً زید سے اور اس کے تمام ساتھیوں سے ہر مہینہ تنخواہ کا دس فیصد منیجر مدرسہ لیتا ہے، جو سالانہ تقریباً ۲۴؍ ہزار روپیہ ہوتا ہے، جو ہم لوگ ظلم وجبر کی وجہ سے دیتے ہیں اور اس کے باوجود تعلیم کے بارے میں بھی کڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ اور اگر کوئی مدرس ۵؍ منٹ بھی دیر سے پہنچتا ہے، تو اسے غیر حاضر کر دیا جاتا ہے، ایسی صورت میں اگر کوئی شخص سفر حج کے لئے جائے تو مدرسہ اس کی تنخواہ نکال کر آدھی تنخواہ دے دیتا ہے اور آدھی مدرسہ کے نام پر لے لیتا ہے، یا پوری تنخواہ دے دیتا ہے یا اگر کوئی جماعت میں جانا چاہتا ہے تو مدرسہ والے اس کو بھیج دیتے ہیں اور اس کی تنخواہ اس کو دی جاتی ہے، کبھی پوری کبھی آدھی، تو کیا ان تمام حالتوں میں جبراً دی گئی رقم کو ہم ان کاموں کے لئے جوڑ سکتے ہیں یا ہمارا تنخواہ لے کر حج و جماعت کے لئے جانا درست ہوگا؟ جب کہ تنخواہ کٹوا دینے میں بڑی دقتیں قانونی اعتبار سے پیش آتی ہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں مفصل وضاحت فرمائیں۔

المستفتی: محمد عرفان پنتے پور، ضلع سیتاپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: سرکاری مدرسہ میں منجانب حکومت طے کئے گئے ضوابط کی پابندی منیجر اوراساتذہ سب پر لازم ہے؛ لہٰذا منیجر کا جبراً اساتذہ کی تنخواہ سے ۱۰ر فیصد حصہ کاٹ لینا شرعی نقطہ نظر سے جائز نہیں ہے، اسی طرح اساتذہ بھی شرعاً اتنے ہی دن کی تنخواہ لینے کے مجاز ہیں جتنے دن انہوں نے مدرسہ میں حاضر ہوکر باقاعدہ پڑھایا ہو، غیر حاضری کے ایام کی تنخواہ لینا جائز نہیں ہے، اسی طرح غیر حاضر رہنے کی صورت میں منیجر کے ذریعہ لی گئی رقم کو اس کا عوض مان کر اس دن کی حاضری لگانا بھی شرعاً جائز نہیں ہے۔

وقال النبي صلى الله عليه وسلم: المسلمون عند شروطهم. (صحيح البخاري، تحت ترجمة الباب، باب أجر السمسرة، النسخة الهندية ١/ ٣٠٣)

وأما شرائط الصحة، فمنها: رضا المتعاقدين. (هندية، كتاب الإجارة، الباب الأول، زكريا جديد ٤/ ٤٤٠، قديم ٤/ ٤١١)

والأجرة إنما تكون في مقابلة العمل. (شامي، كتاب النكاح، باب المهر، مطلب أنفق على معتدة الغير، زكريا ٤/ ٣٠٧، كراچی ٣/ ١٥٦)

ليس لأحد أن يأخذ مال غيره بلا سبب شرعي. (شرح المجلة رستم، مكتبه اتحاد ١/ ٦٢، رقم المادة: ٩٧، قواعد الفقه، ص: ١١٠، رقم: ٢٦٩، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢١/ ١١٢)

عن أبي حميد الساعدي أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل لمسلم أن يأخذ مال أخيه بغير حق. (مجمع الزوائد، باب الغصب وحرمة مال المسلم، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٧١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹ر ربیع الاول ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۳۳۹)

سرکار کی طرف سے آئے ہوئے رسد کو مدرسہ یا مسجد میں لگانے کا حکم

سوال [٨٤٦٧]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سرکار کی طرف سے اسکول میں جو چاول اور گیہوں آتا ہے بچوں کے لئے اگر گاؤں کے سبھی لوگ مل کر اسی چاول کو مدرسہ یا مسجد میں لگانا چاہیں تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: شمس الحق، جھارکھنڈ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جن طلبہ کے لئے رسد آتا ہے، ان ہی کو دینا لازم ہے، مدرسہ یا مسجد والوں کو دینا جائز نہیں۔

إنهم صرحوا بأن مراعاة غرض الواقفين واجبة. (شامي، الوقف، مطلب مراعاة غرض الواقفين واجبة، زكريا ٦/ ٦٦٥، كراچی ٤/ ٤٤٥)

ومن اختلاف الجهة، ما إذا كان الوقف منزلين أحدهما للسكنى والآخر للاستغلال، فلا يصرف أحدهما للآخر، وهي واقعة الفتوى. (شامي، الوقف، مطلب في نقل أنقاض المسجد ونحوه، زكريا ٦/ ٥٥١، كراچی ٤/ ٣٦١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٦ / رجب المرجب ١٤٢٢ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٥/ ٧٣٠٤)

اسکولوں میں آمدہ سرکاری امداد کی بچی ہوئی رقم کا مصرف

سوال [٨٤٦٨]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل حکومت اسکولوں وغیرہ میں اس کی ضروریات کے لئے اسی طرح طلبہ

کی ضروریات کے لئے کافی بڑی مقدار میں رقم دیتی ہے، پھر اس رقم کے ذریعہ اسکولوں اور طلبہ دونوں کی ضروریات بحسن خوبی ادا ہونے کے بعد کافی رقم بچ جاتی ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ اس بچی ہوئی رقم کو واپس کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر نہیں، تو اس رقم کا مالک کون ہوگا؟ نیز واپسی کی صورت میں وہ رقم حکومت تک نہیں پہنچ پاتی ہے؛ بلکہ اس رقم کو پانے والے اس کا غلط استعمال کرتے ہیں، تو اب ایسی صورت میں رقم کا کیا کرنا چاہئے؟

المستفتی: عبدالعظیم، جگر کالونی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اسکول اور اسکولی طلبہ کی ضروریات پوری ہونے کے بعد بچی ہوئی فاضل رقم سرکار کو واپس کرنا ضروری ہے، اگر سرکار کو واپس کرنے میں سرکار کے خزانہ تک وہ رقم نہیں پہنچتی ہے، تو ایسی صورت میں اسکولی طلبہ پر اس فاضل رقم کو بطور وظیفہ اور کھانے وغیرہ کی شکل میں خرچ کر دینا ضروری ہے۔ اور اسکول کے ذمہ داروں کے لئے اپنی ذاتی استعمال میں لانا جائز نہ ہوگا؛ اس لئے کہ یہ ایک امانت ہے اور امانت کو اس جگہ پہنچانا لازم ہے جہاں کے لئے یہ امانت دی گئی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوْا الْاَمَانَاتِ اِلٰی اَھْلِھَا. [النساء: ۵۸]

لیس أداء الأمانة منحصرا في مال الودیعة ونحو ذلک بل کل حق لأحد علی أحد أمانة یجب أدائه لأهله کما یدل علیه سبب نزول هذه الآیة.

(تفسیر مظهري، زکریا قدیم ۲/ ۱۴۸، جدید ۲/ ۳۶۴، تحت تفسیر رقم الآیة: ۵۸، من سورة النساء)

ولو فضل من الخشب ونحوه شيء فهو علی وجهین: إن کان یقدر علی أربابها یشاورهم القیم في ذلک، وإن کان لا یقدر علی أربابها فللقیم أن یفعل به ما یری، وفي جامع الجوامع: وما فضل من الخشب ونحوه جاز صرفه في قنطرة أخری بجنبها بمشورة أربابها: أوقاف علی قنطرة فیبس الوادي وصار الماء إلی شعبة أخری من الأرض من تلک المحلة، واحتیج

إلى عمارة القنطرة للوادي الجديد، فهل يجوز صرف القنطرة الأولى إلى الثانية؟ إن كانت القنطرة الثانية للعامة، وليس هناك قنطرة أخرى للعامة أقرب إلى القنطرة الأولىٰ جاز. (الفتاوى التاتارخانية، زكريا ۸/ ۱۹۶، رقم: ۱۱۶۲۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ربیع الاول ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/۱۱۹۶۰)

اسکول کی تعمیر یا طلبہ کی خوراک سے بچی ہوئی رقم کو ہیڈ ماسٹر کا استعمال کرنا

سوال [۸۴۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) حکومت ہند کی طرف سے اسکول کے طلبہ کو متعینہ خوراک ملتی ہے کہ ہیڈ ماسٹر فی طالب علم اتنا کھانا یا اس کی رقم طالب علم کے حوالہ کرے گا۔ اور ان کا یہ بھی قانون ہے کہ کھانا صرف اس طالب علم کو دیں جو اسکول میں حاضر ہو ورنہ نہیں اور ظاہر ہے کہ جتنے طلبہ کا نام رجسٹر میں ہے سب نہیں آتے ہیں، جس کی وجہ سے ہر ماہ کافی مقدار میں خوراک بچ جاتی ہے، تو اب اس خوراک اور اس کی رقم کو کیا کریں؟ حکومت ہم سے اس کا مطالبہ بھی نہیں کرتی ہے، تو کیا ہیڈ ماسٹر اس میں تصرف کرسکتا ہے؟ اور اگر ان میں سے کچھ رقم دوسرے اساتذہ کو دیں تو کیا اس کے لئے یہ حلال ہے؟

(۲) اسی طرح حکومت اسکول کی عمارت بنانے کے لئے روپئے دیتی ہے، عمارت بنانے کے بعد کچھ رقم بچ جاتی ہے، تو کیا اس رقم میں بھی ہیڈ ماسٹر تصرف کرسکتا ہے؟ اور اگر دوسرے کو دے تو کیا یہ اس کے لئے حلال ہے؟ اگر اس طرح کے روپئے حرام ہیں، تو کیا سود کی ادائے گی میں یہ رقم دے سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد فیاض عالم، ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱)صورت مسئولہ میں طلبہ کی خوراکی کے بعد جو روپیہ بچ جاتا ہے، ہیڈ ماسٹر کے لئے اس کو اپنے استعمال میں لانا اور اپنے اوپر خرچ کرنا شرعاً جائز نہیں ہے؛ بلکہ ان بچے ہوئے پیسوں کو سرکار کو واپس کرنا یا پھر طلبہ ہی پر دوبارہ خرچ کرنا واجب ہے؛ اس لئے کہ ہیڈ ماسٹر سرکار کی طرف سے ان روپیوں کو خرچ کرنے کا وکیل ہے؛ لہٰذا حسب ہدایت خرچ کرنے کے بعد جو بچ جائے گا وہ اس کے قبضہ میں سرکاری امانت ہوگا، جس میں تصرف کرنے کی اسے اجازت نہیں؛ ہاں البتہ طلبہ کی خوراکی سے بچا ہوا پیسہ طلبہ ہی پر خرچ کرنے کی گنجائش ہے۔

قال في الشامية: وهنا الوكيل إنما يستفيد التصرف من الموكل، وقد أمره بالدفع إلى فلان، فلا يملك الدفع إلى غيره. (شامي، كتاب الزكوة، زكريا ٣/ ١٨٩، كراچی ٢/ ٢٦٩)

والمال الذي قبضه الوكيل بقبض العين بحسب وكالته هو في حكم الوديعة بيد الوكيل. (شرح المجلة سليم رستم، اتحاد ٢/ ٧٨٤، رقم المادة: ١٤٦٣، مستفاد: فتاوى محموديه جديد ١٥/ ٥٧٥، امداد الفتاوى ٤/ ١٣٩)

(۲) منجانب سرکار اسکول کی عمارت کی تعمیر کے لئے جو پیسہ آتا ہے، تعمیر کی تکمیل کے بعد اس میں سے بچا ہوا پیسہ حکومت کو واپس کردینا واجب ہے، ہیڈ ماسٹر یا کسی اور کے لئے اس میں تصرف کرنا یا اسے خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ جدید ۱۵/ ۵۷۵، امداد الفتاوی ۴/ ۱۴۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۹/۲/۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۴۴۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۲۹/۲/۶ھ

امام باڑہ کے اوپر مدرسہ بنانے کا حکم

سوال [۸۴۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: شہراجل پور میں مسلمانوں کاامام باڑہ ہے، جو پورے سال دوسروں کے پاس کرایہ پر رہتا ہے؛ لیکن محرم الحرام کی یکم تاریخ سے ۱۰/ تاریخ تک کرایہ داروں سے خالی کرالیا جاتا ہے،علم اورسواری رکھنے کے لئے ،باقاعدہ اس کی رجسٹرڈ کمیٹی ہے، یہ کمیٹی چاہتی ہے کہ دھیرے دھیرے یہ ساری خرافات ختم ہوں تو کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ اس عمارت کےاوپرایک مدرسہ تعمیر کیا جائے اوراس میں بچوں کی دینی تعلیم کے لئے مدرس رکھے جائیں،تا کہ یہ خرافات بند ہوسکیں،آیا اس امام باڑہ کی جوسال بھرکرایہ کی آمدنی ہےاس میں سے مدرس کی تنخواہ دینا جائز ہے یانہیں؟

المستفتی: نسیم احمدقاسمی،مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تعزیہ نکالناامر معصیت ہےاوراس کے لئےامام باڑہ بنانا اوراسی کے نام سے وقف کرنا شرعی طور پرناجائزاور باطل ہے؛ لہٰذا مذکورہ عمارتیں اور دوکانیں صرف کمیٹی والوں کےتحت جائیداد ہیں؛ لہٰذا کمیٹی والوں کے مشورہ سےان عمارتوں اوردوکانوں کو مدرسہ کےتحت لانااوراس کےاوپر باقاعدہ دینی مدرسہ بنانا جائز اوردرست ہوگا، ایک چیز جو ناجائز کام میں چل رہی تھی وہ ایک دینی کام میں شامل ہوجائے گی۔اور جو لوگ مدرسہ بنانے میں شامل ہوں گے وہ سب بہت بڑےاجروثواب کے مستحق ہوں گے۔ اوردوکانوں کی آمدنی سے مدرسین کوتنخواہ دینابھی جائز ہوگا۔

من شرائط الوقف: أن يكون قربة في ذاته، وعند التصرف، فلا يصح وقف المسلم على البيعة، والكنيسة، أو على فقراء أهل الحرب. الخ
(هندية، كتاب الوقف، الباب الأول، زكريا قديم ٢/ ٣٥٣، جديد ٢/ ٣٤٧، النهر الفائق، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٣١٣)

ولا يصح وقف مسلم، أو ذمي على بيعة أما في المسلم فلعدم كونه قربة في ذاته، وأما في الذمي فلعدم كونه قربة عندنا وعنده. (الدر مع الرد،

الوقف، مطلب في وقف المرتد والكافر، زكريا ٦/ ٥٢٦، كراچی ٤/ ٣٤٢، الفقه الإسلامي وأدلته، دارالفكر ١٠/ ٧٦٤٠، هدى انٹر نيشنل ديو بند ٨/ ١٨٧-١٨٨)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۵۰۷۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۶/ ۴/ ۱۴۱۷ھ

غیر کی زمین میں اس کی اجازت کے بغیر مدرسہ بنانے کا حکم

سوال [۸۴۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اب سے دس بارہ سال پہلے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد میں نے ایک زمین میں مدرسہ قائم کیا، جب کہ دوسرے مدارس کے ذریعہ تعلیم کا معقول انتظام تھا، اور اب بھی ہے، یہ زمین بہت سارے لوگوں کی ہے، ان میں سے چند حضرات نے مدرسہ بنانے کی اجازت دے دی تھی؛ لیکن باقی حق دار اب تک اجازت نہ دے کر میری اس کارکردگی سے ناراض ہیں؛ لیکن کچھ رعب دار لوگ میرے ساتھ ہیں، اس وجہ سے وہ بیچارے مجھ سے اپنے حق کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے اور مدرسہ کی تعمیر وتعلیم جاری ہے، اس صورت میں میرے لئے اس زمین میں تعمیر وتعلیم کا کیا حکم ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں واضح فرمائیں، جس سے ہماری آخرت برباد نہ ہو، میں اس ادارے اور پراپرٹی کا خود ہی مالک ہوں۔

المستفتی: ابن خان ککرالہ، بدایوں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب مدرسہ قائم ہو چکا اور اس زمین پر مدرسہ کے نام سے تعمیر ہو چکی، اب اس کو مدرسہ ہی باقی رکھنا لازم ہے، اطراف میں دوسرے مدارس کیوں نہ ہوں اور دوسروں کی زمین جو مدرسہ کی عمارت میں آچکی ہے، منجانب مدرسہ اس کی قیمت ادا

کردی جائے، اب مدرسہ بن جانے کے بعد یہ مسلمانوں کا قومی ادارہ بن چکا ہے، شرعاً آپ اس کے مالک نہیں ہیں، آپ کا مالکانہ تصرف کرنا جائز نہیں ہے، اگر آپ سے انتظام نہیں چل سکتا ہے، تو کسی تجربہ کار عالم دین کو منصب نظامت پر بٹھا دیجئے، اگر یہ بھی نہ ہوسکے تو اطراف میں جو مدارس چل رہے ہیں، اس مدرسہ کو ان میں سے کسی اچھے مدرسہ کی شاخ بنا دیجئے اور اسی مدرسہ کے منتظمین کے اختیار میں دے دیجئے۔ اور آپ اس میں دخل اندازی نہ کریں، تاکہ مدرسہ صحیح طریقے سے چل سکے۔

فإذا تم ولزم لا يملك ولا يعار ولا يرهن. قال في الشامية: لا يملك: أي لا يكون مملوكا لصاحبه، ولا يملك: أي لا يقبل التمليك لغيره بالبيع ونحوه لاستحالة تمليك الخارج عن ملكه ولا يعار. (ردالمحتار شامي، الوقف، مطب مهم فرق أبو يوسف بين قوله موقوفة، زكريا ٦/ ٥٣٩، كراچى ٤/ ٣٥١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳ر محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۴۰۹)

مالک کی اجازت کے بغیر اس کی زمین پر مدرسہ بنانا

سوال [۸۴۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کیا کسی کی زمین پر زمین کے مالک کی اجازت کے بغیر مدرسہ قائم کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو بلا اجازت کسی کی زمین پر مدرسہ قائم کرکے اس کو چلانے والے کے بارے میں حکم شرعی کیا ہے؟

(۲) ہم دو بھائی مسمیٰ راجا، وراہو، ابنا حاجی محمد عاقل (عقلو) کی تقریباً ۵۲ر بیگہ رقبہ کی زمین ہے، جس زمین کی ملکیت کا ثبوت شرعی وسماجی ہمارے پاس موجود ہے، ہماری اس ۵۲ر بیگہ والی رقبہ کی زمین میں سے تقریباً ۱۲ر بیگہ زمین پر ایک مدرسہ کے ناظم نے زبردستی قبضہ کرلیا

ہے، جس زمین پر مدرسہ کی ایک عمارت بھی بنوالی ہے اور مابقیہ زمین کو کھیتی کے طور پر استعمال کررہا ہے، کئی بار پٹواریوں کو بلوا کر ہم نے ناپ کروائی؛ لیکن مدرسہ کا ناظم اور اس کے کچھ دبنگ ساتھیوں نے پٹواریوں کو گالی گلوج دے کر بھگا دیا، آخر کار ۲۳/۳/۲۰۱۱ء کو صحیح طور پر زمین کی پیائش کی گئی، تو پیائش کرنے والے پٹواری نے ہماری زمین کی حد بندی کی اور حد بندی میں مدرسہ کی پوری بلڈنگ سوائے برآمدہ کے ہماری زمین ثابت ہوئی اور اس سے پہلے بھی کئی بار اس بات کی وضاحت کی گئی اور گاؤں کے لوگوں نے بھی کئی بار مدرسہ کے ناظم سے کہا کہ آپ اس غریب کی زمین سے مدرسہ کا قبضہ ہٹالو؛ اس لئے کہ اس غریب کا ذریعۂ معاش کھیتی باڑی ہی ہے اور مدرسہ کے پاس مدرسہ کی نجی زمین بھی ہے، اس کے باوجود بھی ناظم اور اس کے حواری ہماری زمین سے اپنا قبضہ نہیں ہٹا رہے ہیں، ۱۹۹۴ء سے آج تک ہماری زمین پر زبردستی مدرسہ چلا رہے ہیں اور باقی بچی زمین پر کھیتی بھی کرر ہے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح زبردستی کسی کی زمین پر قبضہ کرکے مدرسہ قائم کرنا اور اس کا چلانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو زبردستی کسی کی زمین پر قبضہ کرکے مدرسہ قائم کرنے اور اس کے چلانے والے اور اس کی معاونت کرنے والے کے بارے میں حکم شرعی کیا ہے؟

المستفتی: محمد راہو وراجا بنا حاجی محمد عاقل، عرف عقلو، ریتانی باڑمیر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کسی کی زمین پر مالک زمین کی اجازت کے بغیر قبضہ کرنا جائز نہیں۔ اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ شخص غاصب ہے، جس کے بارے میں حدیث شریف میں بڑی سخت وعید آئی ہے؛ لہٰذا اگر حقیقت میں زمین راجہ اور راہو ہی کے نام ہے تو ناظم مدرسہ کو اس پر قبضہ کرکے مدرسہ چلانے کا حق نہیں ہے اور مالکان زمین کو مدرسہ منہدم کرکے اس زمین کو اپنے تصرف میں لینے کا حق ہے؛ لہٰذا ناظم مدرسہ وہ زمین مالک زمین کو واپس کردے اور جو زمین شرع کے مطابق مدرسہ کی ہے اسی پر مدرسہ چلائے، ورنہ قیامت کے روز سخت باز پرس ہوگی۔

عن سالم، عن أبيه، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: من أخذ شيئا من الأرض بغير حقه، خسف به يوم القيامة إلى سبع أرضين. (صحيح البخاري، كتاب بدء الخلق، باب ماجاء في سبع أرضين، النسخة الهندية ١/ ٤٥٣، رقم: ٣٠٩٢، ف: ٣١٩٦، صحيح مسلم، باب تحريم الظلم وغصب الأرض وغيرها، النسخة الهندية ٢/ ٣٢، بيت الأفكار، رقم: ١٦١٠)

لا يجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي. (هندية، كتاب الحدود، فصل في التعزير، زكريا قديم ٢/ ١٦٧، جديد ٢/ ١٨١، قواعد الفقه أشرفي، ص: ١١٠، رقم: ٢٦٩، الدرمع الرد، زكريا ٦/ ١٠٦، كراچی ٤/ ٦١، البحر الرائق، زكريا ٥/ ٦٨، كوئٹه ٥/ ٤١)

ومن غصب أرضا، فغرس فيها أو بنى قيل له: اقلع البناء والغرس، وردها لقوله عليه السلام: ليس لعرق ظالم حق ...... فإن كانت الأرض تنقص بقلع ذلک فللمالک أن يضمن له قيمة البناء. (هداية، كتاب الغصب، أشرفي ٣/ ٣٧٩)

لا يجوز لأحد أن يتصرف في ملک غيره بلا إذنه، أو وكالة منه أو ولاية عليه، وإن فعل كان ضامنا. (شرح المجلة رستم باز، مكتبة اتحاد ١/ ٦١، رقم المادة: ٩٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴ ؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۳۹۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۵/۴ھ

مغصوبہ زمین پر مدرسہ بنانا

سوال [۸۴۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مسلمان کی زمین پر غیر مسلم نے قبضہ کر کے مسلمانوں کے ہی ہاتھ فروخت

کردی، خریدنے والے مسلمان یہ جانتے ہیں کہ یہ زمین اس غیر مسلم کی نہیں اور نہ ہی اس اکیلے مسلمان کی ہے جو حیات ہے؛ بلکہ اس زمین پر دو مرحوم اشخاص کا حق ہے، جن کی وراثت ان دونوں کی بیواؤں کو پہنچتی ہے، خریدنے والے اشخاص اتنی قدرت بھی رکھتے ہیں کہ اگر چاہیں تو غیر مسلم سے ان دونوں بیواؤں کا حق دلواسکیں، مگر یہ اشخاص غیر مسلم کو پوری رقم دے کر اس جگہ دینی مدرسہ بنارہے ہیں، کیا ایسی غاصبانہ جگہ میں تدریس کا سلسلہ جائز ہوگا؟ کیا بچے ایسی جگہ تعلیم حاصل کرسکتے ہیں، چنانچہ قرآن وحدیث کی روشنی میں مع دلیل مندرجہ سوالات کے جوابات دینے کی زحمت گوارہ کریں، ایسی جگہ جو غاصبانہ ہو اور بچوں کے والدین کو معلوم ہو کہ یہ جگہ غاصبانہ ہے، تعلیم حاصل کرانا درست ہوگا یا نہیں؟ یہ جانتے ہوئے کہ یہ جگہ غیر مسلم کی نہیں بلکہ کسی دیگر فرد کی ہے اور اس میں دو بیواؤں کا حصہ ہے اور بیواؤں پر ظلم ہورہا ہے، یہ اشخاص شریعت حقہ کی نظر میں گناہ کے مرتکب ہونے کی صورت میں کس سزا کے لائق ہیں؟ کیا ایسے مدرسہ میں بیٹھ کر علماء تعلیم دے سکتے ہیں؟ مزید اس بات کی بھی تشریح فرمادیں کہ جو لوگ حقدار کا حق دلوانے پر قادر ہوں اور نہ دلوائیں، ان کے لئے حدیث میں کیا وعید ہے؟ اور اگر دلوادیں تو کیا ثواب ہے ان لوگوں کے لئے؟

المستفتی: محمد عرفان گڑھی، سلیم پور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جن لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ مذکورہ زمین اس غیر مسلم بائع کی نہیں ہے؛ بلکہ غصب کردہ ہے، ان کے لئے وہ زمین خریدنا جائز نہیں ہے، اس میں مسجد یا مدرسہ بنانا اور اس میں تعلیم جاری رکھنا اس وقت تک ممنوع ہوگا جب تک اصل مالک کو راضی نہ کرلیا جائے اور مشتری کے لئے ضروری ہے کہ وہ زمین اس کے حق داروں کو لوٹا دے اور اپنا حق بائع سے وصول کرے۔ حدیث شریف میں مظلوم کی مدد کرنے اور ظالم کو ظلم سے روکنے کی تاکید آئی ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۳/ ۱۱۱، جدید زکریا مطول ۱۰/ ۳۳۶، فتاوی محمودیہ ۶/ ۲۸۰، ۶/ ۲۱۷)

وقال هشام: أنا أكره الصلاة فيه حتى يطيب أربابه، وأكره شراء المتاع من أرض غصب، أو حوانيت غصب. (البحرالرائق، كتاب الغصب، كوئٹه ۸/ ۱۱۵، زكريا ۸/ ۲۰۹، هندية، زكريا ۵/ ۱٤۲، جديد ۵/ ۱٦٦)

الحرام ينتقل، فلو دخل بأمان وأخذ مال حربي بلا رضاه وأخرجه إلينا ملكه وصح بيعه لكن لا يطيب له ولا للمشتري منه. (الدرالمختار، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد قبيل مطلب البيع الفاسد لا يطيب له، ويطيب للمشتري منه، زكريا ۷/ ۳۰۰، كراچی ۵/ ۹۸)

وفي الشامية: ولا للمشتري منه فيكون بشرائه منه مسيئا؛ لأنه ملكه بكسب خبيث، وفي شرائه تقرير للخبث، ويؤمر بما كان يؤمر به البائع من رده -إلى قوله- إن لم يرده يكره للمسلمين شراؤه منه؛ لأنه ملك خبيث بمنزلة المشتري فاسدا إذا أراد بيع المشتري بعد القبض يكره شراءه منه. (شامي، مطلب البيع الفاسد لا يطيب له ويطيب للمشتري منه، زكريا ۷/ ۳۰۰، ۳۰۱، كراچی ۵/ ۹۸)

عن سمرة بن جندب قال: قال رسول الله ﷺ: من وجد عين ماله عند رجل فهو أحق به، ويتبع البيع من باعه. (سنن أبي داؤد، باب في الرجل يجد عين ماله عند رجل، النسخة الهندية ۲/ ٤۹۸، دارالسلام رقم: ۳۵۳۱، سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۲٤، رقم: ۲۸۷٤)

فهو أحق به أي من غصب مال أحد أو سرق، ثم باعه من آخر، فصاحب المال إن وجده في يد المشتري أخذه، ويرجع المشتري على البائع. (حاشية مشكوة شريف ۱/ ۲۵۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ربیع الاول ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۲۰۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۳/۱۴۱۸ھ

پریس کرنے پر پریس بیچ کر رقم مدرسہ میں لگانا

سوال [۸۴۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدرسہ کے لڑکوں کے پاس بجلی کی پریس پکڑی گئی تو ذمہ دارانِ مدرسہ اس پریس کو بیچ کر اس کی رقم مدرسہ میں لگا سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد عزیز مدرسہ اشرف العلوم لکھیم پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالِ مذکور میں طالب علم سے جو بجلی کی پریس پکڑی گئی اس کو فروخت کر کے اس کی رقم مدرسہ میں لگانا جائز نہیں ہے۔ اور جس کی پریس ہے اس کو واپس کرنا لازم ہے؛ البتہ مدرسہ کے طلبہ کو مدرسہ کی بجلی بلا اجازت استعمال کرنا ناجائز ہے؛ لہٰذا اس نے مدرسہ کی قانون شکنی کی ہے، تو زیادہ سے زیادہ جو اس نے مدرسہ کی بجلی خرچ کی ہے اس کا معاوضہ لیا جا سکتا ہے۔

عن أبي حميد الساعدي، أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل لامرئ أن يأخذ مال أخيه بغير حقه، وذلک لما حرم الله مال المسلم على المسلم.

(مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٤٢٥، رقم: ٢٤٠٠٣)

قال: وعلى الغاصب رد العين المغصوبة، معناه مادام قائما لقوله عليه السلام: على اليد ما أخذت حتى ترد، وقال عليه السلام: لا يحل لأحد أن يأخذ متاع أخيه لاعبا ولا جادا، فإن أخذه فليرد عليه. (هداية، كتاب الغصب، أشرفي ٣/ ٣٧٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ ر صفر المظفر ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۰۵۱)

لیٹ فیس وصول کرنے کی شرعی حیثیت

سوال [۸۴۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: طالبات کے مدرسہ میں تعطیلات کے ختم ہوجانے کے بعد تاخیر سے حاضر ہونے پر مدرسہ والوں کا ان بچیوں سے لیٹ فیس لینا جائز ہے، اگر جائز ہے تو کتنی مقدار تک لے سکتے ہیں؟ اوراس کا مصرف کیا ہے؟ کیا کسی سے کم اورکسی سے زیادہ لینے کی گنجائش ہے؟

المستفتی: محمد یاسر، گجرات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: لیٹ فیس کے نام سے جولیا جاتا ہے یہ تاخیر سے آنے کا جرمانہ ہے اورشرعاً اس طرح مالی جرمانہ لینا جائز نہیں ہے، ہاں البتہ اگر یہ انتظام کیا جائے کہ وقتی طور پر مالی جرمانہ ان سے وصول کرلیا جائے، تاکہ وہ آنے میں لیٹ نہ کریں اورسال کے آخر میں جس سے جتنا مالی جرمانہ لیا گیا ہے وہ ان کو واپس کردیا جائے تو گنجائش ہے، ورنہ جائز نہیں ہے۔

عند أبي یوسفؒ یجوز التعزیر للسطان بأخذ المال، وعندهما وباقي الأئمة الثلاثة لا یجوز، کذا فی فتح القدیر، ومعني التعزیر بأخذ المال علی القول به: إمساک شيء من ماله عنده مدة لینزجر، ثم یعیده الحاکم إلیه لا أن یأخذه الحاکم لنفسه، أو لبیت المال کما یتوهم الظلمة. (عالمگیري، کتاب الحدود، فصل في التعزیر، زکریا قدیم ۲/ ۱۶۷، جدید ۲/ ۱۸۱، البحر الرائق، زکریا ۵/ ۶۸، کوئٹہ ۵/ ۴۱، الدرمع الرد، زکریا ۶/ ۱۰۶، کراچی ۴/ ۶۰-۶۱، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۳۷/ ۳۵۴) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍محرم الحرام ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۹۱۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۱/۵ھ

مدرسہ کے لئے غیر مسلموں کا چندہ لینا

سوال [۸۴۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مدرسہ کے لئے غیر مسلموں کا یعنی ہندوؤں کا چندہ لے سکتے ہیں یا نہیں؟ جواب سے نوازیں مہربانی ہوگی۔

المستفتی: محمد آفاق میاں سرائے

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر یہ احتمال نہ ہو کہ کل کو اہل اسلام پر احسان رکھیں گے اور نہ یہ احتمال ہو کہ اہل اسلام ان کے ممنون ہوکر ان کے مذہبی شعائر میں شرکت یا ان کی خاطر سے اپنے شعائر میں مداہنت کرنے لگیں گے، تو اس شرط سے قبول کر لینا جائز ہے۔

(مستفاد: امداد الفتاوی ۲/۶۶۴)

وأما الإسلام فليس من شرطه، فصح وقف الذمي بشرط كونه قربة عندنا وعندهم. (البحرالرائق، كتاب الوقف، كوئٹه ٥/ ٨٩، زكريا ٥/ ٣١٦، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٧/ ٢٢٢، هندية زكريا قديم ٢/ ٣٥٢، جديد ٢/ ٣٤٧، الدر مع الرد، زكريا ٦/ ٥٢٤، كراچی ٤/ ٣٤١)

وللمسلمين أن يقبلوا من الكافر إذا لم يكن في ذلك ضرر ديني، أو سياسي. (تفسير مراغى ٤/ ٧٤، بحواله محموديه ميرٹھ ٢٥/ ٤٨٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ شعبان المعظم ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۳۰۳)

ہندو کی رقم کارِ خیر میں لگانا

سوال [۸۴۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کوئی جگہ ایسی ہے جہاں علم دین اٹھتا جا رہا ہے اور لوگوں کو اس کی کچھ پرواہ نہیں، کوئی بھی امداد نہیں کرتا تو علم دین کو جاری کرنے کے لئے اور برقرار رکھنے کے لئے زکوۃ صدقات لے سکتے ہیں یا نہیں؟ اور پھر اس میں ہندو دس ہزار روپئے دینا چاہتے ہیں، تو کیا ہندو کی رقم چل سکتی ہے یا نہیں؟ کوئی صورت نکال کر تفصیلی جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد آفاق غفرلہ قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: صدقات، زکات کی رقوم کا پہلے کسی فقیر کو مالک بنا دیا جائے، پھر فقیر مدرسہ وغیرہ کو دے دے، تو اس طرح حیلہ تملیک کے ساتھ جائز ہوگا۔

كما في الدر المختار: ويشترط أن يكون الصرف تمليكا لا إباحة.

(الدر مع الرد، كتاب الزكوة، باب المصرف، زكريا ٣/ ٢٩١، كراچی ٢/ ٣٤٤، مصري ٢/ ٨٥)

اور ہندو کی رقم میں اگر یہ احتمال نہ ہو کہ کل کو اہل اسلام پر احسان رکھیں گے اور نہ یہ احتمال ہو کہ اہل اسلام ان کے ممنون ہو کر ان کے مذہبی شعائر میں شرکت یا ان کی خاطر سے اپنے شعائر میں مداہنت کرنے لگیں گے تو اس شرط کے ساتھ قبول کر لینا جائز ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۲/۲۶۴)

شرط وقف الذمي أن يكون قربة عندنا وعندهم، كالوقف على الفقراء، أو على مسجد القدس. (شامي، الوقف، مطلب قد يثبت الوقف بالضرورة، زكريا ٦/ ٥٢٤، كراچی ٤/ ٣٤١، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٧/ ٣٢٢، هندية زكريا قديم ٢/ ٣٥٢، جديد ٢/ ٣٤٧)

وأما الإسلام فليس من شرطه، فصح وقف الذمي بشرط كونه قربة عندنا وعندهم. (البحرالرائق، كتاب الوقف، زكريا ٥/ ٣١٦، كوئٹه ٥/ ١٨٩)

وللمسلمين أن يقبلوا من الكافر إذا لم يكن في ذلك ضرر ديني، أو سياسي.

(تفسير المراغی ٤/ ٧٤، بحواله محمو ديه ميرٹھ ٢٥/ ٤٨٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ر شعبان المعظم ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۰۳/۲۳)

مدرسہ کی تعمیر میں سودی رقم یا کافر کا پیسہ لگانا

سوال [۸۴۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدرسہ خان العلوم دڑھیال کی رقومات بینک میں جمع کر کے حسب ضرورت نکال کر خرچ کی جاتی ہے، جمع شدہ رقومات پر سیونگ چالو کھاتہ میں حسب ضابطہ بینک سے سود ملتا ہے، اسی طرح اور فاضل رقم چھ مہینہ کی میعاد مدت کھاتے میں ڈال کر مذکورہ سود اور زیادہ ملتا ہے، اس وصول شدہ سود کو مدرسہ کی ضروریات پر صرف کر سکتے ہیں یا نہیں؟

فی الحال مدرسہ کی چہار دیواری باؤنڈری نہیں ہے، جس کی وجہ سے انتظامی اور حفاظتی پریشانیاں ہیں، خرچ زیادہ ہونے کی وجہ سے اصل رقم سے یہ کام ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی ہے، وجہ ظاہر ہے کہ عموماً مدارس مسلسل مقروض ہورہے ہیں، اصل ضروریات کی تکمیل بھی نہیں ہو پاتی، اسی طرح بستی کا پانی جو مدرسہ سے متصلا گذرتا ہے نالہ خام ہونے کی وجہ سے مدرسہ میں داخل ہوتا رہتا ہے، اس نالے یا چہار دیواری پر بینک سے حاصل شدہ سود کی رقم خرچ کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

(۲) مدرسہ ہٰذا کا رجسٹریشن ۲۵ ر سال قبل ہوا تھا، اس کے بعد تجدید نہ ہوسکی، اب اس کی تجدید پر بیس ہزار روپئے کام میں آنا چاہتے ہیں، اس طرح کہ دس ہزار روپیہ متعلقہ آفیسر لیتا ہے، آٹھ ہزار روپیہ تاخیر اور تجدید کی سرکاری فیس ہے، دو ہزار روپیہ کاغذات کی تیاری کے ہیں، کیا یہ رقم بینک کے سود کی رقم میں سے دی جا سکتی ہے؟

(۳) ایک غیر مسلم اپنے کسی اعتقاد یا کسی اور وجہ سے بنا کسی دباؤ کے مدرسہ کو کچھ رقم دینا چاہتا ہے، کیا اس رقم کو مطبخ یا تعمیر یا دیگر ضروریات مدرسہ پر خرچ کر سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد عثمان مفتاحی مدرسہ اسلامیہ خازن العلوم، دڑھیال، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) سودی اور حرام پیسے کا شرعی حکم یہ ہے کہ کسی بھی

عنوان سے اصل مالک کو واپس کردیا جائے، جیسا کہ سیل ٹیکس، انکم ٹیکس کے ذریعہ سرکاری پیسہ سرکاری بینک میں واپس ہو جائے، اگر یہ شکل نہ ہو سکے تو نہایت مجبور اور محتاج فقیر کو بغیر نیت ثواب دے دیا جائے؛ لہٰذا مدرسہ کی جانب سے بینک میں جمع شدہ رقم پر جو سود حاصل ہوگا اس کو مدرسہ کی کسی ضرورت میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے؛ البتہ غریب طلبہ کو جوتا، چپل لے کر دے دیا جائے تو اس کی گنجائش ہے۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فإما إن ملكه بعقد فاسد، أو حصل له بغير عقد ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مكتبه سهارنپور، قديم ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلاميه ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، هندية، زكريا قديم ۵/ ۳٤۹، جديد ۵/ ٤۰٤، البحرالرائق، زكريا ۹/ ۳٦۹، كوئٹه ۸/ ۲۰۱)

(۲) جو آٹھ ہزار روپیہ سرکاری فنڈ میں جمع ہوگا وہ سرکاری بینک کے سود کے پیسے سے دینا جائز ہے اور بقیہ چیزوں کے لئے سرکاری بینک کے سود کے پیسے سے دینا جائز نہیں ہے۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فإما إن ملكه بعقد فاسد، أو حصل له بغير عقد ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مكتبه سهارنپور، قديم ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلاميه ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳٤/ ۲٤٦، الدر مع الرد، زكريا ۹/ ۵۵۳، كراچی ٦/ ۳۸۵، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ۲۷، زكريا ۷/ ٦۰)

(۳) اگر کوئی غیر مسلم اپنی خوشی سے مدرسہ کے لئے چندہ دینا چاہتا ہے اور کسی مضرت کا اندیشہ نہیں ہے، تو اس کو مدرسہ کی ضروریات میں چاہے تنخواہوں میں یا تعمیر میں یا مطبخ یا کسی بھی ضرورت میں خرچ کرنا جائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ٦/ ۲۴۹، ڈابھیل ۱۵/ ٦۲۱)

اختلف الفقهاء في وقف الذمي على المسجد، فذهب الجمهور إلى

صحته لعموم أدلة الوقف. (الموسوعة الفقهية ۳۷/ ۳۲۲، عالمگری، زکریا قدیم ۲/ ۳۵۳، جدید ۲/ ۳۴۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍شوال ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۱۴۹/۳۷)

طوائف کی زمین پر مدرسہ تعمیر کرنا

سوال [۹۸۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: طوائف نے ایک زمین ثواب جان کردی ہے، کیا اس زمین پر مدرسہ کی بنیاد قائم کرنا درست ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: طوائف کی دی ہوئی زمین پر مدرسہ قائم کرنا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ مدرسہ ایک خالص دینی ادارہ ہے اور اس میں حرام کمائی لگانا جائز نہیں ہے۔

رجل اكتسب مالا من حرام، ثم اشترى، فهذا على خمسة أوجه: أما إن دفع تلك الدراهم إلى البائع أولا، ثم اشترى منه بها أو اشترى قبل الدفع بها، ودفعها الخ. قال الكرخي في الوجه الأول والثاني: لا يطيب، وفي الثلاثة الأخيرة يطيب -إلى قوله- والفتوى الآن على قول الكرخي.

(شامی، کتاب البیوع، باب المتفرقات، مطلب إذا اكتسب حراما، ثم اشترى على خمسة أوجه، زکریا ۷/ ۴۹۰، کراچی ۵/ ۲۳۵، هندية زکریا قدیم ۳/ ۲۱۵، جدید ۳/ ۲۰۱)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍۵؍۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴۸۴/۲۹)

الفصل الخامس : في التصرف

کیا کسی مدرسے کا دو نام رکھنے سے وہ دو مدرسے ہو جائیں گے؟

سوالات ذیل کے جوابات درکار ہیں، جواب دینے کی زحمت فرمائیں۔

سوال [۸۴۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سیتاپور میں مدرسہ ملت نام کا ایک ادارہ ہے، جو تحفیظ القرآن اور عالمیت اور دینیات، اردو نیز ناظرہ قرآن پاک کے لئے قائم کیا گیا تھا، پہلے اس کی ذاتی عمارت نہیں تھی، ۱۲/نومبر ۱۹۷۶ء کو میں نے ایک بوسیدہ عمارت مدرسہ ملت کے نام رجسٹری کرائی تھی، جس کو سنی سینٹرل آف یوپی بورڈ سے رجسٹرڈ کرالیا تھا، جس میں میرا نام بحیثیت ناظم درج ہے، چونکہ سیتاپور رسوماتِ بد کا مرکز تھا، دینی تعلیم کے لئے خاص کر مسلک دیوبند کے لئے اس کی فضاء مدرسہ کے حق میں نہیں تھی، بوجہ اضطرار (سرکار کے ہتھکنڈے) سے بچنے کی غرض سے ایک دوسرا ادارہ مدرسہ عربیہ ملیہ کے نام سے سرکار سے منظور کرالیا اس سے تنخواہوں کے لئے آسانی ہوگئی، امدادی تنخواہیں نام بنام مدرسین کے لئے آتی ہیں، اس کے علاوہ مدرسہ ملت کے بھی مدرسین ہیں، ان مدرسین کی تنخواہیں اور طلباء کا کھانا ہر ایک کے فرش، فروش، تعمیر بلڈنگ اور دیگر مصارف مسلمانوں سے ملنے والی رقومات سے پورے کئے جاتے ہیں، نیز حسب گنجائش وظائف طلباء مدرسہ ملیہ کے پاس پیسہ اور بلڈنگ نہیں ہے، وہ مدرسہ ملت کے طلبہ کی تعلیم میں لگے ہوئے ہیں اور مدرسہ ملت کی آمدنی نہایت قلیل ہے، جس کی وجہ سے بحسن وخوبی کام نہیں چل پا رہا ہے، اور بلڈنگ بھی کمزور ہے، اس کی مرمت کے لئے بھی رقم درکار ہے؛ اس لئے نیچی سطح کے ملازمین کے علاوہ کو بلا کر میں نے گزارش کی کہ جس طرح دوسرے مسلمانوں سے امداد ملتی ہے آپ لوگ بھی اسی طرح بلڈنگ کی مرمت کے لئے امداد کر دیں اور آپ لوگ باقاعدہ مشورہ کر کے بتا دیجئے؛ لیکن مثبت یا منفی جواب نہ ملنے پر میں نے بذریعہ تحریر مطالبہ کیا کہ آپ

لوگ بھی اپنی اپنی تنخواہوں میں سے پانچ پانچ دنوں کی تنخواہیں دے دیں، جب کہ آپ لوگ مدرسہ ملت سے کافی فائدہ اٹھاتے ہیں، اس کا بھی جواب نہیں ملا، میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے اجتماعی کاموں کے لئے یا اہل حاجت مسلمانوں کی ضرورتوں کے لئے گنجائش والے مسلمانوں پر زکوۃ کے علاوہ بھی دینا ضروری ہے۔ حدیث پاک میں فرمایا ہے: ''**إن في مال المرء لحق سوی الزکوۃ**'' دینی اداروں کے لئے ایسے حضرات سے مطالبہ کرنا جو صاحب گنجائش ہیں اور مدرسہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں، یعنی بجلی، پانی، فرش فروش وغیرہ، یہ مطالبہ اگر درست ہے، تو مطالبہ کیا جائے ورنہ تو میں اپنی بات واپس لے لوں۔ مدرسہ ملیہ عربیہ کے بعض مدرسین مدرسہ ملت کے لئے چندہ میں ہاتھ بٹاتے ہیں، ان علماء، حفاظ، مدرسین کو یہ بھی معلوم ہے کہ فقہ کا جزئیہ ہے کہ ''اگر زکوۃ سے مسلمانوں کی حوائج نہ پوری ہوں تو حسب ضرورت مسلمانوں سے رقم لی جاسکتی ہے''۔ والسلام

المستفتی: سائل ولی محمد ناظم مدرسہ ملت

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں صاف الفاظ میں اس کا ذکر ہے کہ دو مدرسے الگ الگ ہیں، ایک مدرسہ ملت ہے اور دوسرا مدرسہ ملیہ ہے۔ اور سوال نامہ میں اس انداز سے اس کو واضح کیا گیا ہے کہ مدرسہ ملت الگ ادارہ ہے اور مدرسہ ملیہ مستقل دوسرا ادارہ ہے۔ اور مدرسہ ملیہ کے نام حکومت سے ایڈ آتا ہے۔ اور مدرسہ ملت کے نام ایڈ نہیں آتا ہے، مگر اس میں سوال یہ ہے کہ دونوں ادارے الگ الگ ہوں اور ان کی عمارتیں مدرسین وملازمین اور طلبہ الگ الگ ہوں چاہے ناظم اور ذمہ دار ایک ہی کیوں نہ ہوں، مگر مختلف انداز سے معلوم کرنے کے بعد یہ پتہ چلا کہ دو ادارے مستقل الگ الگ نہیں ہیں، جن کے لئے دو عمارتیں الگ الگ ہوں اور ان کے ملازمین ومدرسین بھی الگ الگ ہوں، ایسا نہیں ہے؛ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مدرسہ ملت کے نام سے اصل ادارہ ہے اور سارے ملازمین اسی میں کام کرتے ہیں، اور اسی عمارت پر وہی مدرسین وملازمین درس دیتے ہیں اور ایسا بھی نہیں ہے کہ مدرسہ ملت کے نام سے ایک وقت میں تعلیم ہوتی ہو اور مدرسہ ملیہ میں دوسرے وقت میں تعلیم

ہوتی ہوں؛ بلکہ شئ واحد ہے، الگ الگ دوشئ نہیں ہے؛ بلکہ مدرسہ ملت ہی کے لئے ذرا سا املا بدل کر حکومت سے ایڈ حاصل کرنے کے لئے فرضی نام مدرسہ ملیہ کا غذات میں اندراج ہے، جس کے نام سے ایڈ آتا ہے، تو اس طرح محض نام بدلنے کی وجہ سے شرعی طور پر الگ الگ دو ادارے نہیں ہو جائیں گے؛ بلکہ یہ ایک ہی ادارہ کے دو نام ہیں، جیسا کہ دارالعلوم دیوبند کے دو نام ہیں: (۱) مدرسہ اسلامیہ اور الجامعۃ الاسلامیہ۔ اور اب مدرسہ اسلامیہ کا نام مستعمل نہیں ہے، صرف دارالعلوم دیوبند ہی مستعمل ہے، اسی طرح مدرسہ شاہی کے دو نام ہیں: (۱) مرکز العلوم الاسلامیہ (۲) جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی، آج بھی دونوں نام موجود ہیں، اسی طرح مدرسہ ملت کے دو نام ہیں: (۱) مدرسہ ملت (۲) مدرسہ ملیہ۔ ہاں البتہ اتنا ہے کہ ایڈ والے مدرسہ میں دو قسم کے ملازمین و مدرسین ہوتے ہیں: (۱) وہ مدرسین و ملازمین جن کے نام سے ایڈ آتا ہے (۲) وہ مدرسین وملازمین جن کے نام سے ایڈ منظور نہیں ہے، جن کی تنخواہیں عوامی چندہ سے پوری ہوتی ہیں، تو اتنے فرق کی وجہ سے نہ دو ادارے الگ الگ شمار ہوں گے اور نہ ہی ایڈ والے مدرسین وملازمین ایک مستقل ادارہ کے شمار ہوں گے اور غیر ایڈ مدرسین وملازمین دوسرے ادارہ کے شمار ہوں گے؛ بلکہ سب ایک ہی ادارہ کے مدرسین وملازمین شمار ہوں گے، جیسا کہ ہندوستان کے ایڈ والے تمام مدارس کی یہی صورت حال ہے، ورنہ ہر ایڈ والے مدرسہ میں دو مدرسے شمار کئے جاسکتے ہیں اور ایسا ہے نہیں، اور اگر بالفرض جیسا کہ سوال نامہ میں دو الگ الگ مدرسہ ہونے پر زور دیا گیا ہے، اگر واقعہ ایسا ہی ہے اور مدرسہ ملیہ کے تمام مدرسین وملازمین مدرسہ ملت میں کام کرتے ہیں اور مدرسہ ملیہ کے نام سے حکومت سے ایڈ لیتے ہیں، تو یہ دھوکہ اور فریب ہے جو شرعاً جائز نہیں ہے اور نہ ہی سرکار کی طرف سے اس کی اجازت ہے۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– أن رسول الله ﷺ مر على صبرة من طعام –إلى– ثم قال: من غش فليس منا. (سنن الترمذي، البيوع، باب ماجاء في كراهية الغش في البيوع، النسخة الهندية ١/ ٢٤٥، دارالسلام، رقم: ١٣١٥)

عن ابن عمر –رضی اللہ عنہ– قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: إذا جمع اللہ الأولین والآخرین یوم القیامۃ یرفع لکل غادر لواء، فقیل ھذہ غدرۃ فلان بن فلان. (مسلم شریف، باب تحریم الغدر، النسخۃ الھندیۃ ۲/ ۸۳، بیت الأفکار، رقم: ۱۷۳۵، صحیح البخاري، باب إثم الغدر للبر والفاجر، النسخۃ الھندیۃ ۱/ ۴۵۲، رقم: ۳۰۸۴، ف: ۳۱۸۸)

سوال نامہ میں دوسری بات یہ پوچھی گئی ہے کہ مدرسہ کے وہ ملازمین جن کو سرکار سے ایڈ ملتا ہے، ان کی تنخواہوں کا ایک حصہ مدرسہ میں تعاون کے نام سے لینا جائز ہے یا نہیں؟ چاہے وہ بطیب خاطر دینے کے لئے راضی نہ ہو، ذمہ دار مدرسہ تحریری طور پر دباؤ ڈال کر ان کی تنخواہوں کا ایک حصہ تعمیر مدرسہ کے نام سے لے سکتا ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں شرعی حکم یہ ہے کہ کسی کے مال اور ملکیت کو زور وزبردستی یا دباؤ ڈال کر حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔ اور سوال نامہ میں جو حدیث شریف پیش کی گئی ہے، وہ نفلی صدقہ خیرات کے بارے میں ہے، جس کے حصول کے لئے دباؤ ڈالنا اور نہ دینے کی صورت میں تحریری طور پر مطالبہ کر کے زور ڈالنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ اور اس حدیث شریف میں صرف ترغیب مراد ہے جو دینا چاہے وہ دے اور جو نہ دینا چاہے اس پر زور ڈالنا جائز نہیں ہے۔

عن أبي ھرۃ الرقاشي، عن عمہ. أن رسول اللہ ﷺ قال: لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفس منہ. (شعب الإیمان للبیھقي، باب في قبض الید عن الأموال المحرمۃ، دارالکتب العلمیۃ بیروت ۴/ ۳۸۷، رقم: ۵۴۹۲، مسند أحمد بن حنبل ۵/ ۷۲، رقم: ۲۰۹۷۱، مسند أبي یعلی الموصلي، دارالکتب العلمیۃ بیروت ۲/ ۹۱، رقم: ۱۵۶۷)

لا یجوز لأحد من المسلمین أخذ مال أحد بغیر سبب شرعي.
(ھندیۃ، کتاب الحدود، فصل في التعزیر، زکریا قدیم ۲/ ۱۶۷، جدید ۲/ ۱۸۱، قواعد الفقہ أشرفي دیوبند، ص: ۱۱۰، رقم: ۲۶۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵ر صفر المظفر ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۶۸۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۵/ ۲/ ۱۴۲۶ھ

مسجد مدرسہ بنانے سے متعلق چند سوالات کے جوابات

سوال [۸۴۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: شہرامراوتی مہاراشٹر میں ایک علاقہ جو پانچ مسلم کالونیوں پر مشتمل ہے، پیراڈائز کے نام سے موسوم ہے۔۱۹۹۲ء میں جگہ خرید کرایک مدرسہ عربیہ کے نام سے عارضی عمارت کی شکل میں بنیادرکھی گئی تب سے پنجوقتہ اذان ونماز کا عمل جاری ہے، ساتھ ہی دو وقت مقامی طلبہ وطالبات کے لئے دینی تعلیم کا انتظام ہے، فی الوقت رہائشی مکانات ۲۵۰/ سے کچھ زائد ہوگئے ہیں، مکانات کے تعمیری سلسلہ کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہے کہ مستقبل قریب میں مکانات کی کل تعداد۴۰۰/ تک ہوجائے گی، ان کالونیوں میں اکثر سرکاری ملازمین وآفیسراور چند تاجر اور کاروباری حضرات رہتے ہیں، بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر مسجد ومدرسہ سے منسلک SF 3500 کا پلاٹ خریدا گیا، اس طرح مسجد ومدرسہ کا کل رقبہ تقریباً: SF 11000فٹ ہے، جس کے مشرقی سمت میں بڑی شاہراہ ہےاور ’’حی علی الصلاۃ‘‘ اور ’’حی علی الفلاح‘‘ کی طرف بھی راستے ہیں، صرف مسجد کے سمت قبلہ مکانات ہیں، مسجد ومدرسہ کالونیوں کے درمیان واقع ہے، مسجد ومدرسہ کی انتظامیہ مع مصلیان مسجد کی دلی خواہش ہے کہ اس وسیع آراضی میں ازسرنو مسجد ومدرسہ کی پختہ تعمیر اس انداز سے کی جائے کہ مسجد ومدرسہ کا انتظام چلانے کے لئے مستقل آمدنی کی شکل بھی نکل آئے جوسردست احباب خیر کے ہر ماہ چندہ عطیات وغیرہ سے انجام پاتا ہے، اس لئے اکثر احباب کی رائے ہے کہ نئی تعمیر زیرزمین کے ساتھ ہواور بیسمینٹ کا بڑا حصہ شادی خانہ اور دینی پروگرام کے استعمال کے لئے ہو، جس کے دونوں جانب کمروں کی تعمیر اس طرح ہو کہ طہارت خانہ بیت الخلاء وضو وغسل خانہ کا انتظام ہو، مصلیان مسجد کے لئے زیرزمین کے اوپری سطح پر بھی دونوں جانب طہارت خانہ، بیت الخلاء، وضو وغسل خانے علیحدہ تعمیر ہوں۔اور کمروں کی بھی تعمیر ہو، جس میں سے مدرسہ کے کمروں کے علاوہ کمروں کو اسکول وکالج کے طلبہ کو کرائے پر دیا جائے، زیرزمین اوراوپری

سطح کے آمد وخروج کے گیٹ وراستے علیحدہ ہوں، تاکہ بدنظمی نہ ہو، انجینئر اور آرکیٹیکٹ کے پلان کے مطابق سرکاری وکارپوریشن کے قانونی ضابطے کے تحت راستوں سے لگ کر غیر تعمیر جگہ چھوڑنے پر اور کمروں کی تعمیری جگہ چھوڑ کر بھی مسجد کے لئے 4500 SF جگہ نماز کی ادائے گی کے لئے آسانی سے استعمال میں آسکتی ہے۔ درخواست ہے کہ اس مسئلہ کو مفصل ومدلل تحریر فرما کر ممنون فرمائیں۔

المستفتی: شریف الدین امام مسجد الصحابہ، نورنگر امراؤتی، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرسہ کے نام سے شروع کی بنیاد رکھی گئی ہے، اس کے بعد سلسلہ بڑھتا چلا گیا، معاون وچندہ دہندگان نے دینی مدرسہ ہی کے نام سے چندہ اور عطیات دئے اور دیتے رہے؛ اس لئے اصل عمارت دینی مدرسہ ہی کے لئے ہونا لازم ہے۔ اور زیر زمین جو پروگرام رکھا گیا ہے وہ بھی مدرسہ کے ہی مفاد کے لئے ہونا لازم ہے۔ اور مدرسہ کی عمارت میں اسکول وکالج کے طلبہ کا رہنا چاہے کرایہ پر ہی کیوں نہ ہو اس سے فتنہ کا دروازہ کھلتا ہے؛ اس لئے اسکول کالج کے طلبہ کو کرایہ پر دینے کے لئے مدرسہ کی عمارت تیار کرنا خود مدرسہ کو خطرہ میں ڈالنا ہے؛ اس وجہ سے یہ پروگرام دینی مصلحت کے خلاف ہے؛ لہٰذا دینی ہی مدرسہ کے طلبہ کے قیام کے لئے کمروں کی تعمیر ہونی چاہئے، ہاں البتہ مدرسہ کی آمدنی کے لئے شادی خانہ کی جو بات کہی گئی ہے وہ بھی ایک فتنہ ہے؛ اس لئے کہ شادی خانہ میں بھی مردوں کے ساتھ عورتوں کی آمد ورفت بھی کثرت سے رہتی ہے جو آگے چل کر طلبہ ومدرسین کے لئے فتنہ کا سبب بن سکتا ہے؛ البتہ جب تک طلبہ کے قیام کا نظم نہ ہو اس وقت تک شادی کے واسطے یومیہ کرایہ پر دیا جاسکتا ہے، مثلاً دن بھر تعلیم ہو اور شام کو کرایہ پر دے دیا جائے، پھر صبح وہیں تعلیم ہو، اس طرح سے شادی کا کام بھی ہوتا رہے گا، جس سے مدرسہ کا فائدہ بھی ہوگا اور دینی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہے گا، تو جائز ہوسکتا ہے۔ اور سائڈ میں جو غسل خانہ کی بات کہی گئی ہے، اسی طرح بیت الخلاء کی بات وہ درست ہے اور جو اوپر کے حصہ پر مسجد بنے گی اتنے حصہ پر مسجد بنانا

ضروری ہے، جتنے کے نیچے بیت الخلاء وغسل خانہ نہ آرہا ہو۔

لو تبين أن المستأجر يخاف منه على رقبة الوقف يفسخه القاضي، ويخرجه من يده. (شامي، كتاب الإجارة، باب فسخ الإجارة، مطلب فسق المستاجر ليس عذرا في الفسخ، زكريا ۹/ ۱۱۱، كراچی ٦/ ٨١، مطلب في الأرض المحتكرة ومعني الاستحكار، زكريا ۹/ ٤٤، كراچی ٦/ ٣٣، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/ ٢٠٠)

وما يأتي متنا لا يفيد الجواز؛ لأن بيت الخلاء ليس من مصالحه. (تقريرات رافعي ملحق بالشامي زكريا ٢/ ٨٥، كراچی ١/ ٨٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۸۸۵۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱/ ۶/ ۱۴۲۶ھ

کیا مدرسہ کی موقوفہ چیزوں میں غرض واقف لازم ہے؟

سوال [۸۴۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ محمد تقی صاحب مرحوم نے ایک قطعہ مکان واضح ڈھکیہ پیر ضلع مرادآباد میں ۸۱ء میں ایک دینی مدرسہ کے لئے یہ کہہ کر کہ اس میں قرآن پاک کی تعلیم مسلمان بچوں کو دی جاتی رہے، تاکہ اس کا اجر وثواب مجھے ملتا رہے اور آخرت میں میرے کام آئے، وہ قطعہ مکان حافظ عبدالحمید کی تحویل میں دے کر اس میں دینی مدرسہ قائم کرا دیا، اس وقت سے اب تک برابر اس میں مدرسہ فرقانیہ لطیف العلوم کے نام سے جاری ہے، محمد تقی صاحب مرحوم کا فروری ۸۷ء میں انتقال ہوگیا۔ موصوف اس سلسلہ میں کوئی تحریر نہیں لکھ سکے، اب موصوف کے شرعی ورثاء ان کی اہلیہ قدسیہ بیگم اور ان کے لڑکے محمد اقبال تقی نے ایک تحریر اسی سلسلہ میں لکھ کر دی کہ ہمارے مورث محمد تقی مرحوم نے یہ مکان مدرسہ کو دے دیا تھا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ مرحوم کی طرف سے وقف علی الخیر سمجھا جائے گا یا نہیں؟ تفصیلی کاغذات ہم رشتہ ہیں، مطالعہ فرما کر جواب باصواب سے نوازیں۔

المستفتی: حکیم محمد مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: رجسٹری کاغذات اورسوال نامہ کی عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ محمد تقی صاحب مرحوم نے مذکورہ مکان خاص طور پر مدرسہ مذکورہ کی ملکیت میں دے دیا ہے؛ اس لئے شرعاً مذکورہ مکان مدرسہ کی ملکیت میں داخل ہو چکا ہے، اس میں مدرسہ مذکورہ کے مفاد کے خلاف کسی کو تصرف کا حق حاصل نہیں ہوسکتا ہے، نیز اس کی حفاظت کے لئے رجسٹریشن کرالینا بہتر ہوگا۔

ولو قال: وهبت داري للمسجد، أو أعطيتها له صح، ويكون تمليكا، فيشترط التسليم. (هندية، الوقف، الباب الحادي عشر في المسجد وما يتعلق به، زكريا قديم ۲/ ٤٦٠، جديد ۲/ ٤١٢) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۷۶۶۸)

مدارس میں قائم کردہ انجمن کی تقسیم کا حکم

سوال [۸۴۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عرض یہ ہے کہ ضلع بستی سرکاری طور پر دوحصوں میں تقسیم ہوگیا ہے، تو دارالعلوم دیوبند میں ضلع بستی کے طلبہ کی قائم کردہ انجمن تہذیب الکلام کی تقسیم کا مسئلہ پیدا ہوگیا، ابھی ہم لوگ اس سلسلہ میں غور وخوض کر ہی رہے تھے کہ چند طلبۂ عزیز نے ایک استفتاء اوراس کا جواب پیش کرکے درخواست کی کہ اس کے مطابق معاملہ کا فیصلہ کیا جائے، یہ صورت نہایت مناسب ہے کہ فقہ اسلامی کے مطابق معاملہ کا تصفیہ کیا جائے؛ لیکن استفتاء اوراس کے جواب میں چند تنقیح طلب جواب ہیں اوراسی لئے یہ تحریر پیش خدمت ہے۔ استفتاء میں یہ بات ذکر میں نہیں آسکی کہ تمام انجمنوں کے دستور اساسی میں یہ وضاحت ہوتی ہے کہ اس انجمن سے فلاں

ضلع یا فلاں صوبہ یا فلاں مدرسہ کے طلبہ استفادہ کرسکیں گے، چنانچہ طلبہ بدلتے رہتے ہیں اور انجمن اپنی جگہ قائم رہتی ہے، اسی طرح کی انجمنوں کو اصطلاحی وقف تو نہیں کہا جا سکتا؛ کیوں کہ ان پر وقف کی تعریف صادق نہیں آتی؛ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ انجمن یا اس کی املاک سے افراد انجمن کا تعلق ذاتی ملکیت کی طرح کا نہیں ہوتا؛ بلکہ ان کا باہمی تعلق اس طرح ہوتا ہے جیسے وقف کی املاک سے موقوف علیہ کا ہوتا ہے؛ اس لئے اس انجمن کا قریب ترین مقیس علیہ وہ اوقاف ہیں جن کا موقوف علیہ کسی خطہ کے فقراء وغیرہ کو قرار دیا گیا ہو، چونکہ استفتاء میں یہ وضاحت نہیں تھی؛ اس لئے جواب فتویٰ میں ذاتی املاک والے جزئیات کو مقیس علیہ قرار دے کر حکم بیان فرمایا گیا ہے۔

(۲) مندرجہ بالا وضاحت کے بعد اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان ذاتی ومشترک املاک میں تو عندالطلب تقسیم ضروری ہوتی ہے؛ لیکن وقف یا وقف جیسی عوامی املاک میں بھی تقسیم ضروری ہے، مثلاً کسی شخص نے کوئی جائیداد وقف کی اور اس میں تصریح کی کہ یہ فلاں ضلع کے طلبہ یا فقراء یا یتیموں کے لئے ہے، پھر وہ ضلع دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تو کیا اس وقف کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ضروری ہوگا؟

(۳) یا مثلاً واقف نے تصریح کی کہ یہ جائیداد فلاں مدرسہ کے لئے ہے، پھر وہ مدرسہ دو حصوں میں اس طرح تقسیم ہو گیا کہ ایک حصہ تو سابقہ نام سے قائم رہا اور دوسرا حصہ نئے نام سے موسوم ہوا، تو کیا اس وقف کو تقسیم کرنا ضروری ہوگا؟

(ب) اگر تقسیم کرنا ضروری نہیں ہے؛ بلکہ صرف جائز ہے یا جائز بھی نہیں ہے، تو کیا یہ صورت اختیار کرنا جائز ہوگا کہ وہ انجمن صرف انہیں طلبہ کے لئے خاص کردی جائے جو ضلع کی تقسیم کے بعد بھی سابقہ نام سے منسوب ہیں اور نو تشکیل شدہ ضلع کے طلبہ کی زیادہ سے زیادہ مدد کرکے ان کے لئے دوسری انجمن قائم کرادی جائے؟

المستفتی: حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب بستوی، مدرس دارالعلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدارس میں طلبہ کی انجمنوں کی حیثیت شرعاً وقف کی ہے،

اگرچہ اموال منقولہ میں امام ابو یوسف ومحمد رحمہما اللہ کے درمیان اختلاف ہے؛ لیکن تمام متأخرین نے حضرت امام محمد رحمہ اللہ کے قول پر فتویٰ دیا ہے اور یہی مفتی بہ ہے، اسی پر امت کا عمل ہے؛ لہٰذا اسے وقف نہ کہنا درست نہیں ہے، نیز کتابیں ورقوم وغیرہ سب وقف ہیں، اس کے لئے چند عبارتیں معتبر کتب فقہ سے پیش کی جاتی ہیں:

(۱) صح أيضا وقف كل منقول قصدا فيه تعامل للناس كفأس وقدوم بل ودراهم ودنانير، وفي الشامية: ولما جرى التعامل في زماننا في البلاد الرومية وغيرها في وقف الدراهم والدنانير دخلت تحت قول محمد المفتى به في وقف كل منقول فيه تعامل الخ. (الدرالمختار مع الشامي، الوقف، مطلب في وقف المنقول قصدا، زكريا ٦/ ٥٥٥، كراچی ٤/ ٣٦٣، بزازية، زكريا جديد ٣/ ١٣٧، وعلى هامش الهندية قديم ٦/ ٢٥٩، البحرالرائق، كوئٹه ٥/ ٢٠٣، زكريا ٥/ ٣٣٨، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٥٨٠، مصري قديم ١/ ٧٤٦)

(٢) وجوز الفقيه أبو الليث وقف الكتب وعليه الفتوى. (البحرالرائق، كتاب الوقف، كوئٹه ٥/ ٢٠٢، زكريا ٥/ ٣٣٨، قاضيخان زكريا جديد ٣/ ٢١٨، وعلى هامش الهندية ٣/ ٣١١، هندية زكريا قديم ٢/ ٣٦١، جديد ٢/ ٣٥٢، البناية قديم ٢/ ٩٩٥، أشرفيه ٧/ ٤٤٠)

(٣) ومحمد يقول القياس قد يترك بالتعامل كما في الاستصناع وقد وجد التعامل في هذه الأشياء، وعن نصير بن يحيى أنه وقف كتبه إلحاقا بالمصحف، وهذا صحيح؛ لأن كل واحد يمسك للدين تعليما وتعلما وقراءة، وأكثر فقهاء الأمصار على قول محمد. الخ (هداية، كتاب الوقف، أشرفي ٢/ ٦٤٠، البناية، قديم ٢/ ٩٩٥، أشرفيه جديد ٧/ ٤٤٠، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٣/ ٣٢٧، زكريا ٤/ ٢٦٥، بزازية، زكريا جديد ٣/ ١٣٧، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٥٩، البحرالرائق، كوئٹه ٥/ ٢٠٢، زكريا ٥/ ٣٣٨)

(٤) وإن على طلبة العلم وجعل مقرها في خزانته التي في مكان

كذا، ففي جواز النقل تردد. (وفي الشامية:) ظاهره صحة الوقف عليهم؛ لأن الغالب فيهم الفقر -إلى قوله- وقد يقال: إن هذا مما يستوى في الانتفاع به الغني والفقير. الخ (الدرالمختار مع الشامي، الوقف، مطلب في حكم الوقف على طلبة العلم، زكريا ٦/ ٥٥٨- ٥٥٩، كراچی ٤/ ٣٦٦، منحة الخالق على البحر الرائق، كوئٹه ٥/ ٢٠٢، زكريا ٥/ ٣٣٨)

(٥) **الوقف على ثلاثة أوجه: إما للفقراء أو للأغنياء، ثم الفقراء أو يستوى فيه الفريقان، كرباط وخان ومقابر وسقايات، وقناطر ونحو ذلک، كمساجد وطواحين وطست لاحتياج الكل لذلک، وفي الشامية: وكذا مصاحف مساجد وكتب مدارس. الخ** (الدرالمختار مع الشامي، الوقف، مطلب في وقف الراهن والمريض والمديون، زكريا ٦/ ٦٠٣، كراچی ٤/ ٣٩٩)

جب مذکورہ عبارات سے انجمن کی کتب ورقوم کا موقوفہ ہونا ثابت ہوگیا ہے، تو ضلع بستی کی قدیم حدود دائرہ کے اندر رہنے والے تمام طلبہ مذکورہ وقف میں شامل ہوں گے، اوران سب کے لئے انتفاع کا حق مذکورہ انجمن کے ساتھ برابر طریقہ سے منسلک ہوگا، چاہے شہر بستی کے رہنے والے ہوں یا خلیل آباد کے یا سدھارتھ نگر کے یا مذکورہ ضلع کے کسی گاؤں یا دیہات کے رہنے والے ہوں، سب برابر کے حق دار ہوں گے، اوراب سرکاری طور پر تقسیم کی صورت میں بھی قدیم حدود کے تمام طلبہ کو انتفاع کا حق یکساں طور پر باقی رہے گا؛ لہٰذا ضلع کی حدود تقسیم ہونے کی وجہ سے ان کا ثابت شدہ حق باطل نہیں ہوگا، اگرچہ نام دوسرا رکھ دیا گیا، نفس نام کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ اغراض ومقاصد کا اثر ہوا کرتا ہے؛ لہٰذا ضلع کی حدود دو حصوں میں تقسیم ہوجانے پر دوسرے حصہ کا نیا نام رکھ دینے کی وجہ سے اس حصہ کے طلبہ اپنے حق سے محروم نہیں ہوں گے، اس لئے ضلع تقسیم ہوجانے کی وجہ سے اگر موقوفہ انجمن کا تقسیم ہونا مجبوراً لازم آجائے تو برابر طریقہ سے تقسیم کردینا ضروری ہوگا اور حدود ضلع کے کسی ایک حصہ کے طلبہ کو دوسرے حصہ پر محض نام کے بدل جانے کی وجہ سے کوئی فضیلت وترجیح حاصل

نہیں ہوگی، جیسا کہ بزازیہ، شامی و بحر و عالمگیری کی عبارات ذیل سے وضاحت ہوتی ہے:

(۱) **إذا وقف كتبا وعين موضعها، فإن وقفها على أهل ذلك الموضع لم يجز نقلها منه لا لهم ولا لغيرهم، وظاهره أنه لا يحل لغير هم الانتفاع بها، وإن وقفها على طلبة العلم، فلكل طالب الانتفاع بها فى محلها. الخ** (شامي، الوقف، مطلب في نقل كتب الوقف من محلها، زكريا ٦/ ٥٥٩، كراچی ٤/ ٣٦٦)

(۲) **إذا وقف على طلبة علم بلدة كذا يجوز؛ لأن الفقر غالب فيهم، فكان الاسم منبئا عن الحاجة، والحاصل أنه متى ذكر مصرفا فيه نص على الفقراء والحاجة، فالوقف صحيح يحصون أم لا.** (البحرالرائق، كوئٹه ٥/ ١٩٩، زكريا ٥/ ٣٣٢)

(۳) **وقف على فقراء أقربائهم المقيمين في خوارزم، فانتقلوا إلى بلد آخر، إن كان مما يحصون لا تنقطع وظيفتهم، وإن لا يحصون تنقطع، ثم إن بقي هناك منهم أحد يصرف الكل إليه، وإن لم يكن صرف الكل إلى الفقراء، فلو رجعوا إلى خوارزم ثانيا يعود حقهم، وقال في الفتاوى: لا ينقطع حقهم مطلقا. الخ** (فتاوى بزازية، الوقف، الفصل السادس في الوقف على الفقراء، زكريا جديد ٣/ ١٤٩، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٧٨)

(٤) **ولو قال لقرابتي، وجيراني، وموالي، والمساكين يضرب كل واحد من القرابة، وكل واحد من الجيران، وكل واحد من الموالي بسهم، والمساكين بأسرهم بسهم، كذا فى خزانة المفتين، ولو قال لقرابتي، وللمساكين، ضرب كل واحد من القرابة بسهم والمساكين بسهم. الخ** (فتاوى عالمگيرى، الباب الخامس، في ولاية الوقف، فصل في كيفية قسمة الغلة، زكريا قديم ٢/ ٤٢٨، ٤٢٩، جديد ٢/ ٣٩٢)

(۲) جی ہاں دو حصوں میں تقسیم کرنا واجب ہوگا، جیسا کہ عالمگیری کی عبارت نمبر۴ر سے

واضح ہوتا ہے، نیز وقف علی الاولاد کا بھی یہی حکم ہے، جس کی تفصیل اپنی جگہ موجود ہے۔

(۳) اگر بغیر نفسانیت کے اضطراری طور پر مدرسہ کی تقسیم دوحصوں میں ہوجائے اور نام بھی دو ہوجائیں، تو موقوفہ املاک بھی دوحصوں میں تقسیم ہوجائیں گی، جیسا کہ عالمگیری کی عبارت سے واضح ہوتا ہے، لیکن اشخاص کا تقسیم ہوجانا املاک کی تقسیم کو مستلزم نہیں ہوتا ہے، جیسا کہ دارالعلوم وجامع مسجد دیوبند کا واقعہ ہے، نوتشکیل شدہ ضلع کے طلبہ کی زیادہ سے زیادہ مدد کر کے دوسری انجمن قائم کر دینے سے ان طلبہ کا حق قدیم انجمن سے ساقط نہیں ہوگا؛ کیوں کہ غرض واقف کے تحت سب طلبہ داخل ہیں، جس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے۔اور موقوفہ انجمن کے ساتھ طلبہ کے جو حقوق منسلک ہیں وہ حقوق مجردہ میں سے ہیں، اس کا عوض دینا شرعاً درست نہیں ہے۔

إن مراعاة غرض الواقفين واجبة. الخ (شامي، الوقف، مطلب مراعاة غرض الواقفين واجبة، زكريا ٦/ ٦٦٥، كراچی ٤/ ٤٤٥)

الحقوق المجردة لا يجوز الاعتياض عنها، ومثالها: كحق الشفعة، فلو صالح عنه بمال بطلت ورجع به، ولو صالح المخيرة بمال لتختاره بطل ولا شيء لها، ولو صالح إحدى زوجتيه بمال تترك نوبتها لم يلزم ولا شيء لها. الخ (قواعد الفقه، أشرفي، ص: ٧٧-٧٨، رقم: ١١٨)

الحق متى ثبت لا يبطل بالتأخير ولا بالكتمان. (قواعد الفقه، أشرفي، ص: ٧٧، رقم: ١١٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ رجمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۲۷۸)

چندہ کے پیسے سے بنی ہوئی عمارت میں اراکین مدرسہ کا کتبہ لگانا

سوال [۸۴۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک زمین جس میں اس وقت مدرسہ قائم ہے، یہ اپنی گھونگھر وسوسائٹی کی ملکیت تھی، پھر

کام ٹھپ ہوجانے کی وجہ سے اس زمین کے خریدار بتیس آدمی ہوگئے، اوراب بتیس کی ملکیت ہے، جس میں مدرسہ سراج العلوم گڑھی مان خان جلیسر قائم ہے اور مدرسہ کا پچھلا حصہ گھونگھر وسوسائٹی کا ہی بنا ہوا ہے اوراب جوآگے کا حصہ برآمدہ تیار کیا گیا ہے، اس میں محلّہ کا چندہ اور شہر کا چندہ اور دیگر مختلف شہروں کے چندے سے تیار کیا گیا، اس حصہ میں مدرسہ کے اراکین کے نام کا پتھر لگنا کیسا ہے؟ جب کہ اب تک مدرسہ کے صدر گیٹ پر گھونگھر و کمیٹی کے نام کا پتھر بھی موجود ہے، مدرسہ کی زمین کی ملکیت گھونگھر وسوسائٹی کی ہے، ایسی حالت میں ان اراکین کمیٹی کے نام کا پتھر لگنا کیا ضروری تھا؟ وہ نام حسب ذیل ہیں:

عہدیداران	صدر مدرسہ عبدالرشید صاحب عرف گوپ
نائب	عبدالستار صاحب چھوٹے
سکریٹری	محمد حسن صاحب
خازن	جمال الدین صاحب
نائب	عبدالرشید صاحب
//	عبدالجبار صاحب

ممبران کمیٹی: محمد خلیل، محمد ہارون، باب الدین، عبدالحسیب، محمد مشتاق، عبدالعزیز، محمد حنیف، عبدالغفار۔ اس کا جواب مدلل ومفصل دینے کی زحمت گوارہ کریں، عین کرم ہوگا۔

المستفتی: صابر حسین عباسی، محلّہ گھڑی مان خان، جلیسر ٹاؤن، ضلع ایٹہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب اراکین وممبران مدرسہ کی ذاتی رقم سے مدرسہ کا مذکورہ حصہ نہیں بنایا گیا ہے؛ بلکہ عوامی چندے سے بنایا گیا ہے، تو اس حصہ کے پتھروں میں اراکین مدرسہ کے نام درج کردینا اور اراکین مدرسہ کی طرف منسوب کردینا ناجائز اور حرام ہے، سب اراکین مدرسہ سخت گنہگار رہوں گے۔ حدیث شریف میں ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم بتلایا گیا ہے:

عن أبي ذر -رضي الله عنه- أنه سمع رسول الله ﷺ يقول: ......

ومن ادعى ما ليس له، فليس منا، وليتبوأ مقعده من النار. (صحيح مسلم، الإيمان، باب بيان حال إيمان من رغب عن أبيه وهو يعلم، النسخة الهندية ١/ ٥٧، بيت الأفكار، رقم: ٦١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ جمادی الثانیہ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۲۸۸)

جلسہ کی بچی ہوئی رقم کا مصرف

سوال [۸۴۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: علاقائی جمعیۃ علماء کے تحت کرائے گئے جلسہ کے مصارف سے بچی ہوئی جلسہ کی مدکیا مدرسہ میں اس کا منتظم اپنی صوابدید پر خرچ کرسکتا ہے یا نہیں؟ جب کہ جلسہ میں اگر رقم کم پڑتی تو مدرسہ کی مد سے پوری کی جاتی، ویسے بھی جمعیۃ کی لائبریری کے لئے کتب وغیرہ کی فراہمی مدرسہ سے کی جاتی ہے، چونکہ دونوں کا انتظام تقریباً مشترک ہے۔

المستفتی: حمید الرحمٰن، ساکن رسول پور، پوسٹ امیر نگر، ضلع کھیری لکھیم پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ بچی ہوئی رقم چندہ دہندگان کی اجازت سے مدرسہ میں خرچ کرسکتے ہیں، جمعیۃ کی لائبریری کے کتب کی فراہمی مدرسہ کی مد سے درست نہیں ہے، الا یہ کہ چندہ دہندگان کو یہ معلوم ہو کہ دونوں کا انتظام اسی چندہ سے ہوگا تب جائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۲/ ۲۷۹، جدید ڈابھیل ۱۵/ ۱۶۷، فتاوی رحیمیہ قدیم ۸/ ۲۶۶، جدید زکریا ۹/ ۸۸، امداد الفتاوی ۲/ ۵۹۳، امداد المفتین/ ۷۷۹)

أن الفتوى على أن المسجد لا يعود ميراثا، ولا يجوز نقله ونقل ماله إلى مسجد آخر. (شامي، مطلب فيما لو خرب المسجد أو غيره، زكريا ٦/ ٥٤٩، كراچی ٤/ ٣٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ رجب ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۳۱۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/ ۷/ ۱۴۲۲ھ

طلبہ سے لی گئی قیمت طعام کو مدرسہ کی تعمیر میں لگانا

سوال [۸۴۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدرسہ میں کچھ امراء کے بچے تعلیم حاصل کررہے ہیں، وہ اپنے طعام پر مدرسہ کی طرف سے مقرر رقمیں جمع کرتے ہیں، کیا ان رقوم کو مدرسہ کی تعمیر پر خرچ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: بشیر احمد قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جی ہاں ان کی طرف سے جمع شدہ رقم مدرسہ کی تعمیر اور تنخواہ وغیرہ میں صرف کرسکتے ہیں؛ کیوں کہ وہ زکوۃ نہیں ہوئی۔

فيجوز لو بأمره، أي يجوز عن الزكاة على أنه تمليك منه، والدائن يقبضه لحكم النيابة عنه، ثم يصير قابضا لنفسه. (شامي، كتاب الزكاة، باب المصرف، زكريا ۳/ ۲۹۲، كراچی ۲/ ۳۴۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/۱۲/۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۲۵۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۳/۱۲/۱۴۱۵ھ

مدرسہ کی رقم سے امام ومؤذن کو وظیفہ دینے کا حکم

سوال [۸۴۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا مدرسہ کی رقم سے مسجد کی امامت ومؤذنی کا وظیفہ دے سکتے ہیں؟

المستفتی: نسیم احمد چلہ امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مسجد مدرسہ کے تابع ہے اور مدرسہ کے مختلف شعبۂ

اخراجات میں سے ایک شعبہ مسجد بھی ہے، تو مدرسہ کی رقم سے امام ومؤذن کا وظیفہ جائز ہے۔ اور اگر تابع نہیں ہے تو جائز نہیں ہے۔

التابع تابع. (الأشباه، قديم: ۱۸۳) **تابع اپنے لوازمات کے ساتھ تابع ہوتا ہے۔**

اتحد الواقف والجهة، وقل مرسوم بعض الموقوف عليه بسبب خراب وقف أحدهما جاز للحاكم أن يصرف من فاضل الوقف الآخر عليه؛ لأنهما حينئذ كشيء واحد. (تنوير الأبصار مع الدر المختار، كتاب الوقف، مطلب في انقاض المسجد ونحوه، كراچی ٤/ ٣٦٠، زكريا ٦/ ٥٥١، وكذا في البحرالرائق، كوئٹه ٥/ ٢١٦، زكريا ٥/ ٣٦٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۱۴/۲/۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۳۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۲/۲۸ھ

انجمن کی رقم سے سرپرست انجمن کو ہدیہ دینا

سوال [۸۴۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کسی مدرسہ میں مختلف انجمنیں قائم ہیں اور ان کے اراکین اور سرپرست بھی ہیں اور سال کے آخر میں جہاں ہم طلبہ کی بذریعہ انعام حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، وہیں سرپرست انجمن کی کافی محنت ہم طلبہ پر ہوتی ہے، تو کیا اراکین انجمن کی جانب سے سرپرست صاحب کو انجمن کی رقم سے بطور ہدیہ کے کچھ انعام مثلاً کتاب وغیرہ دینا چاہیں تو کیا دینا جائز ہے؟

المستفتی: محمد مظفر گڈاوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: انجمن کے بارے میں جتنے بھی امور عمل میں لائے جائیں وہ سارے کے سارے مدرسہ کے کسی بڑے مربی قسم کے استاذ کی ماتحتی میں ان ہی کے مشورہ سے عمل میں لائے جائیں۔ اور سوال نامہ میں جن جن چیزوں سے متعلق سوال کیا

گیا ہے وہ سارے کام اس طرح کے اہم اساتذہ کی نگرانی اوران کے مشورہ اوران کے حکم کے مطابق عمل میں لانا چاہئے، اگر ہدیہ اورانعام کی بات آتی ہے،تو وہ بھی ان کے مشورہ کے بغیر عمل میں نہ لائی جائے۔

يَـا اَيُّهَـا الَّـذِيْـنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوْا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْا الرَّسُوْلَ وَاُوْلِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ.

[سورة النساء، آيت: ٥٩]

وقـال ابـن كيسان: هم أولو العقل والرائ الذين يدبرون أمر الناس.

(قرطبي، دارالكتب العلمية بيروت ٥/ ١٦٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

كتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰/ رجب ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۷۶۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۸/۵ھ

اسکول کے درجہ پنجم کے امتحان کا خرچ مدرسہ سے لینا

سوال [۸۴۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: درجہ پنجم کے امتحان کا خرچ جونیر میں داخلہ لینے کے لئے مدرسہ سے لینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: ربیع الاسلام

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرسہ عربیہ میں دینی امداد یا مال زکوۃ تملیک شدہ ہو تو اس مال سے جائز نہیں؛ کیوں کہ جونیر یونیورسٹی وغیرہ میں دینی چندہ دینا بھی جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۴/۲/۲۷)

ويشتـرط أن يـكـون الصرف تمليكا، لا إباحة. (شامي، كتاب الزكوة، باب المصرف، زكريا ٣/ ٢٩١، كراچی ٢/ ٣٤٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

كتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۳۸۵)

مدرسہ کی رقم سے متعلقین کو ہدیہ دینے کا حکم

سوال [۸۴۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدرسہ کی رقم سے دوست احباب کو ہدیہ دے سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: نبی حسن خادم دارالعلوم، ارریہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرسہ کی رقم اپنی ذاتی ملکیت نہیں ہے، ہدیہ تحفہ اپنی ذاتی ملکیت سے دیا جاتا ہے، ہاں البتہ جن حضرات کو مدرسہ کے مفاد کی غرض سے مدرسہ میں جلسہ جلوس یا امتحانات میں بلایا جاتا ہے، ان کو واپسی میں منجانب مدرسہ کچھ تحفہ ونذرانہ پیش کردیا جائے، تو اس کی گنجائش ہے؛ اس لئے کہ یہ ہدیہ تحفہ مدرسہ کا خرچ ہے، مگر دوستانہ طور پر دوست احباب کو دینا جائز نہیں، مدرسہ کی مالیات محتاط طریقہ سے خرچ کرنے میں ذمہ دارانِ مدرسہ ایک قسم کے امین کے درجہ میں ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ ۶/ ۷۸)

وليس للمودع حق التصرف والاسترباح في الوديعة. (المبسوط، كتاب الوديعة، دارالكتب العلمية بيروت ۱۱/ ۱۲۲)

الثامنة في وقف المسجد أيجوز أن يبنى من غلته منارة؟ قال في الخانية: معزيا إلى أبي بكر البلخي إن كان ذلک من مصلحة المسجد بأن كان أسمع لهم فلا بأس به. (البحرالرائق، كتاب الوقف، کوئٹہ ۵/ ۲۱۵، زكريا ۵/ ۳۶۰)

ويبدأ من غلته بعمارته، ثم ما هو أقرب لعمارته ...... كذلک إلى آخر المصالح. (الدر مع الرد، الوقف، مطلب يبدأ من غلة الوقف بعمارته، زكريا ۶/ ۵۵۹-۵۶۱، كراچی ۴/ ۳۶۶-۳۶۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ صفر ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۷۲۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۲/۱۸ھ

مدرسے کے فنڈ سے مہمان نوازی کرنا

سوال [۸۴۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا مدرسہ کے فنڈ سے مہتمم ضیافت کرسکتا ہے، چاہے ضیف سید ہو، تاجر ہو، عامی ہو، غیر عامی ہو، غریب ہو؟

المستفتی: عبداللہ عاصی، جامعہ اسلامیہ دارالعلوم قاضی باغ کاشی پور، اودھم سنگھ نگر، یوپی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مدرسہ کو نفع کی توقع ہو اور چندہ دہندگان کی طرف سے صراحتاً یا دلالۃً اجازت اور رضامندی ہو، تو مہمانوں کی ضیافت مدرسہ کی جانب سے کرنا درست ہے، یا مدرسہ میں باضابطہ ضیافت کا الگ سے فنڈ ہو، تو اس فنڈ سے کرنا درست ہے، ورنہ ذمہ دار اپنی جیب سے خرچ کرے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ ۶/ ۸۷، جدید زکریا ۹/ ۹۶)

شرط الواقف كنص الشارع في وجوب العمل به، وفي المفهوم والدلالة. (قواعد الفقه، أشرفي، ص: ۸۵، رقم: ۱۵۲)

الثامنة في وقف المسجد أيجوز أن يبنى من غلته منارة؟ قال في الخانية: معزيا إلى أبي بكر البلخي إن كان ذلك من مصلحة المسجد بأن كان أسمع لهم فلا بأس به. (البحرالرائق، كتاب الوقف، كوئٹه ۵/ ۲۱۵، زكريا ۵/ ۳۶۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۱/۳/۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۵۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۳/۲ھ

مدرسہ کی رقم سے چائے، بسکٹ اور مہمانوں کی ضیافت

سوال [۸۴۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: (۱)مدرسہ کی رقوم سے، چائے، بسکٹ، پان وغیرہ کھانا اور کھلانا درست ہے یانہیں؟
(۲) کسی مہمان کی مہمان داری مدرسہ کی رقوم سے جائز ہوگی یانہیں؟
المستفتی: بندہ محمدعبداللطیف عفی عنہ،خادم مدرسہ مرکز العلوم،ڈاکخانہ بھیگاپور،ضلع کریم گنج،آسام

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) غالب یہ ہے کہ چندہ دہندگان کی طرف سے اس کی اجازت نہیں ہوتی ہے؛اس لئے اپنے پاس سے خرچ کرنا لازم ہے۔
(۲) مخصوص مہمان جس کی ذات سے مدرسہ کومعتد بہ نفع کی توقع ہوتو درست ہے، ورنہ مہتمم واہل شوریٰ اپنے پاس سے خرچ کریں۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ ۶/۷۸، جدیدزکریا ۹/۹۶)

صرحوا بأن مراعاة غرض الواقفين واجبة. (شامي، الوقف، مطلب مراعاة غرض الواقفين واجبة، زكريا ٦/ ٦٦٥، كراچی ٤/ ٤٤٥)

شرط الواقف كنص الشارع في وجوب العمل به، وفي المهوم والدلالة. (قواعد الفقه، أشرفي، ص: ٨٥، رقم: ١٥٢)

الثامنة في وقف المسجد أيجوز أن يبنى من غلته منارة؟ قال في الخانية: معزيا إلى أبي بكر البلخي إن كان ذلك من مصلحة المسجد بأن كان أسمع لهم فلا بأس به. (البحرالرائق، كتاب الوقف، كوئٹه ٥/ ٢١٥، زكريا ٥/ ٣٦٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیراحمدقاسمی عفااللہ عنہ
۱۰ر شوال ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر:۲۳/ ۲۶۹)

مدرسہ کی رقم سے تقریب میں گیٹ وغیرہ کی سجاوٹ

سوال [۸۴۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کسی تقریب میں مدرسہ کی رقوم سے گیٹ وغیرہ کی سجاوٹ درست ہے یانہیں؟
المستفتی: بندہ عبداللطیف عفی عنہ،خادم مدرسہ مرکز العلوم،ڈاکخانہ بھیگاپور،ضلع کریم گنج،آسام

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرسہ کی رقوم سے استحکام جائز ہے، تزئین ناجائز ہے، ہاں اگر مدرسہ کو معتد بہ اور بین نفع کا یقین ہے تو گنجائش ہے، محض احتمال نفع کی صورت میں اپنے پاس سے گیٹ وغیرہ کا خرچ ادا کریں۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۲/۵۳۲)

الوكيل إنما يستفيد التصرف من الموكل، وقد أمره بالدفع إلى فلان فلا يملك الدفع إليه غيره. (شامي، كتاب الزكوة، زكريا ۳/ ۱۸۹، كراچی ۲/ ۲۶۹)

الثامنة في وقف المسجد أيجوز أن يبنى من غلته منارة؟ قال في الخانية: معزيا إلى أبي بكر البلخي إن كان ذلك من مصلحة المسجد بأن كان أسمع لهم فلا بأس به. (البحرالرائق، كتاب الوقف، كوئٹه ۵/ ۲۱۵، زكريا ۵/ ۳۶۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰ ارشوال ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۲۶۹)

مدرسے کی زمین میں اساتذہ وطلبہ کے لئے مسجد بنانا

سوال [۸۴۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مدرسہ ہے، جس میں کوئی زمین مستقل مسجد کے لئے نہیں ہے، تو محض مدرسہ کی زمین میں طلبہ واساتذہ کے لئے مسجد بنائی جاسکتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: ساجد انور، سیتامڑی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مسجد کے لئے مستقل طور پر مدرسہ کے پاس الگ سے کوئی زمین نہیں؛ بلکہ مدرسہ کی ضروریات کے لئے مدرسہ ہی کی زمین ہے اور طلبہ واساتذہ کو نماز کے لئے مسجد کی سخت ضرورت ہے، تو ایسی صورت میں مدرسہ کے اندر مدرسہ کی زمین میں

مسجد بنانا مدرسہ کی شرعی ضرورت ہے؛ اس لئے مدرسہ کی ملکیت کی زمین میں طلبہ واساتذہ کے واسطے شرعی مسجد بنانا بلاتردد جائزاور درست ہے۔

وإن جعل شيء من الطريق مسجدا صح كعكسه يعني إذا بني قوم مسجدا، واحتاجوا إلى مكان ليتسع، فأدخلوا شيئا من الطريق ليتسع المسجد وكان ذلك لا يضر بأصحاب الطريق جاز ذلك، وكذا إذا ضاق المسجد على الناس وبجنبه أرض لرجل تؤخذ أرضه بالقيمة كرها لما روي عن الصحابة رضي الله عنهم لما ضاق المسجد الحرام أخذوا أرضين بكره من أصحابها بالقيمة، وزادوا في المسجد الحرام. (البحرالرائق، كتاب الوقف، فصل في أحكام المسجد، كوئٹه ٥/ ٢٥٥، زكريا ٥/ ٤٢٨، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٣/ ٣٣١-٣٣٢، زكريا ٤/ ٢٧٣-٢٧٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/۴/۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۸۰۱۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲/۴/۱۴۲۴ھ

مدارس کی جمع شدہ رقم اپنی ضروریات میں صرف کرنا

سوال [۸۴۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مساجد ومدارس میں خصوصاً مدارس میں زکوۃ کی مد میں رقومات جمع کی جاتی ہیں، تو کیا زکوۃ میں دی گئی رقم کاروبار میں لگانے کے مجاز مدارس کے متولیان یا ذمہ داران ہوسکتے ہیں، یہ ادارہ اگر R.B.I میں رجسٹرڈ ہے، تو کس بنا پر یہ کہتے ہیں کہ غیر سودی ہے۔ اور اگر رجسٹرڈ نہیں ہے تو عوام کے روپیوں کی کیا گارنٹی ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مساجد ومدارس کی جو رقومات ان کے ذمہ داران کے

پاس جمع ہیں وہ ان کے پاس امانت ہیں؛ لہٰذا اس کو کاروبار میں لگانا جائز نہیں۔ (مستفاد: عزیز الفتاوی ۱/۳۶۱، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۵/ ۲۸۸، ڈابھیل ۱۵/ ۵۰۵)

وليس للمودع حق التصرف والاسترباح في الوديعة. (المبسوط للسرخسي، كتاب الوديعة، دارالكتب العلمية بيروت ۱۱/ ۱۲۲)

ومقتضى ما قاله أبوسعود أنه يقبل قوله في حق براءة نفسه لا في حق صاحب الوظيفة؛ لأنه أمين فيما في يده، فيلزم الضمان في الوقف؛ لأنه عامل له، وفيه ضرر بالوقف. (شامي، الوقف، مطلب إذا كان الناظر مفسدا لا يقبل قوله بيمينه، كراچی ٤/ ٤٤٩، زكريا ٦/ ٦٧٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۱۴۸)	۱۴۲۰/۵/۹ھ

خزانچی کا مدرسہ کی رقم اپنے استعمال میں لانا

سوال [۸۴۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے پاس مدرسہ کا فنڈ کمیٹی کی طرف سے رہتا ہے اور وہ مدرسہ کا خزانچی ہے، کیا خزانچی کے پاس زکوۃ وغیرہ کا پیسہ بغیر تملیک جمع کر سکتے ہیں؟ اور خزانچی مدرسہ کا پیسہ اپنے استعمال میں لاسکتا ہے یا نہیں؟ اگر تملیک شدہ رقم جمع ہے اور خزانچی امانت کے بطور نہیں رکھتا؛ بلکہ بطور قرض مدرسہ رکھتا ہے، تو وہ پیسہ اپنے استعمال میں یا کسی کو ادھار دے سکتا ہے یا نہیں؟ فقط والسلام

المستفتی: رحمت اللہ قاسمی، مدرسہ دارالعلوم جمعیت القریش ندائے السلام

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید جب مدرسہ کا خزانچی ہے، تو اس کے پاس مد زکوۃ کا

بھی پیسہ جمع ہوگا اور مدامداد کا بھی جمع ہوگا اور اس پر لازم ہے کہ مدزکوۃ اورصدقات واجبہ کا حساب الگ رکھے اورامداد وخیرات کا حساب الگ رکھے،اس کے پاس بغیر تملیک کے زکوۃ کا پیسہ بھی جمع ہوسکتا ہےاورامداد کا پیسہ بھی۔ اور یہ دونوں قسم کے پیسے بطورضمانت جمع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے کوئی پیسہ ادھرادھر ہوگیا تو اس کا ذمہ دارزید ہی ہوگا اور وہ اپنی جیب سے پورا کرے گا، جب کہ پہلے ہی سے ذمہ داران مدرسہ کی طرف سے اس طرح ضمانت کی بات طے ہوگئی ہوتو زیداس کا پابندرہے گا، نیز اس ضمانت کے باوجود جمع شدہ رقم نہ وہ اپنی ذات پرخرچ کرسکتا ہےنہ ہی دوسروں کوکمیٹی اورذمہ داران مدرسہ کی اجازت کےبغیر دےسکتا ہے؛ بلکہ وہ امین ہونے کے ساتھ ساتھ ضامن بھی ہے،استعمال کی اجازت نہ ہونے کےاعتبار سے امانت ہےاورضائع ہونے کی صورت میں تاوان دینے کےاعتبار سے ضمانت اورامانت مع الضمانت کا اکثر مدارس کےتحویل داراورخزانچی کےساتھ معاملہ ہوتا ہے اوراس طرح کے معاملات میں امانت میں ضمانت کی شرط لگانا ضرورت اورحالات کی وجہ سے جائز اور درست ہے۔اورآج کل کےزمانے میں اس طرح کامعاملہ حالات کی وجہ سے ضرورت کےدرجہ میں ہوگیا ہے،اس کےبغیرامانت محفوظ نہیں رہتی۔

والأصل فيه أن الشرط إذا كان مقيدا والعمل به ممكنا وجب مراعاته والمخالفة فيه توجب الضمان. (عناية مع فتح القدير، كتاب الوديعة، زكريا ٨/ ٥١٩، كوئٹه ٧/ ٤٦٠، دارالفكر ٨/ ٤٩٤-٤٩٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیراحمدقاسمی عفااللہ عنہ
۸رصفر۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر:۳۷/۱۹؍۸)

مدرسہ کا روپیہ ذاتی معاملہ میں خرچ کرنا

سوال [۸۴۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: ایک دینی ادارے سے متعلق بستی میں دو پارٹی ہیں، ایک مدرسہ سے مخالف، دوسری معاون، مع عملہ مدرسین مخالف پارٹی طرح طرح کی الزام تراشیاں معاون پارٹی پر کرتی رہتی ہے، اسی دوران مخالف پارٹی کے ایک شخص سے مدرسہ کے ایک مدرس سے گھریلو معاملہ میں جھگڑا ہوجاتا ہے اور یہ جھگڑا ان کے مدرسہ میں مدرس بننے سے پہلے چلا آرہا ہے؛ لہٰذا یہ مدرس صاحب اب اس جھگڑے کے مقدمہ میں مدرسہ کا روپیہ صرف کرتے ہیں، آیا مدرسہ کا روپیہ اپنے ذاتی معاملہ میں لگانا جائز ہے یا نہیں؟ جواب سے نوازیں گے۔

المستفتی: الطاف الرحمٰن، مدرسہ اختر العلوم بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: مدرس یا متعلقین مدرسہ کا اپنے ذاتی معاملہ وجھگڑے میں مدرسہ کا روپیہ خرچ کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔

إذ لا يجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي.

(شامي، كتاب الحدود، باب التعزير، زكريا ٦/ ١٠٦، كراچی ٤/ ٦١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍رمضان ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۱۹۷۰)

مدرسہ کے فون سے تبلیغی خبر کرنا

سوال [۸۴۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدرسہ کے فون سے تبلیغی خبر کرنا اور اپنے ذاتی کام میں استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: مدرسہ کے فون سے ذاتی خبر لینا دینا جائز نہیں اور تبلیغی خبر

امور دینیہ میں سے ہے، اگر مدرسہ تبلیغ سے بھی منسلک ہے، تو ایسے مدرسہ کے فون سے تبلیغی خبر کرنا جائز ہے؛ اس لئے کہ تبلیغی انتظام بھی ایسے مدرسہ میں مدرسہ ہی سے منسلک ہوتا ہے؛ اس لئے کہ یہ کام بھی مدرسہ کا ایک جزو ہے، جیسا کہ مدارس میں مختلف شعبے ہوتے ہیں، شعبہ نشر واشاعت شعبہ دعوت وتبلیغ، شعبہ تنظیم وترقی وغیرہ، اسی طرح تبلیغی دعوت کا سلسلہ بھی مدرسہ کا ایک شعبہ بن سکتا ہے۔

ويبدأ من غلته بعمارته، ثم ما هو أقرب لعمارته ...... كذلك إلى آخر المصالح. (الدر مع الرد، الوقف، مطلب يبدأ من غلة الوقف بعمارته، زكريا ٦/ ٥٥٩-٥٦١، كراچی ٤/ ٣٦٦-٣٦٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٤/ ١٨٨)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/۱/۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۵۹۴٦)

مدرسے کی رقم بطور رشوت دینا

سوال [۸۴۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم ایک مدرسہ کے بنیادی اراکین میں سے ہیں، ایک مرتبہ اس مدرسہ کا ایک طالب علم غائب ہوگیا، اس کے گھر والوں نے تلاش کرنے میں ناظم مدرسہ سے تعاون مانگا؛ لیکن ناظم نے کسی قسم کی معاونت سے انکار کر دیا، گھر والوں نے ناظم کے خلاف اغوا کی رپورٹ درج کرا دی، اخبار کے مطابق اس میں مدرسہ کا کوئی تذکرہ نہ تھا؛ بلکہ یہ شخص متعین پر کیس تھا، اس مقدمہ کے سلسلہ میں ناظم نے قریبی تھانہ میں تقریباً پچاس ہزار روپئے بطور رشوت کے خرچ کیئے، مجلسِ شوریٰ نے اس رقم کو مدرسہ کی مد میں تسلیم کر لیا، اس فیصلہ سے آج تک مجھے تردد ہے کہ مدرسہ کی رقم کو بطور رشوت کے دینا جائز ہے یا نہیں؟ لیکن کثرت رائے کے مطابق

فیصلہ ہوگیا۔ واضح رہے کہ اس رپورٹ میں مدرسہ کا نام نہ تھا اور نہ ہی یہ تھا کہ یہ شخص مدرسہ کا ناظم ہے، آپ شریعت کی روشنی میں جواز یا عدم جواز کا فیصلہ فرما کر اطمینان قلب کا سامان فراہم کریں۔

المستفتی: منیر احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرسہ کا ذمہ دار طالب علم کی تعلیم اور تربیت کی ذمہ داری لیتا ہے، اس کی جسمانی اور ذاتی نفع نقصان کی ذمہ داری نہیں لیتا ہے اور ایسے حالات میں اگر بچہ غائب ہوگیا ہے، تو مدرسہ کے ذمہ دار کے اوپر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے، صرف اتنی ذمہ داری ہوتی ہے کہ ماں باپ کو اطلاع کردے کہ تمہارا بچہ فلاں وقت سے غائب ہے۔ اور غائب شدہ بچہ کے ذمہ دار مدرسہ والے نہیں ہوتے ہیں؛ بلکہ اس کے ماں باپ اور اس کے سرپرست ہوتے ہیں، اس اعتبار سے مدرسہ کے ذمہ دار کا غائب شدہ بچہ کے سلسلہ میں دوڑ دھوپ نہ کرنے کی وجہ سے اس کے خلاف مقدمہ دائر کرنا شرعاً اور قانوناً درست نہیں ہے، اس کے باوجود ذمہ دار کے اوپر اغوا کا الزام لگا کر مقدمہ جو دائر کیا گیا ہے، اس میں اگرچہ مدرسہ کا نام کہیں سے کہیں تک نہیں ہے؛ لیکن ذمہ دار مدرسہ کو جو کچھ بھی دفاع کرنا پڑا وہ مدرسہ کا ذمہ دار ہونے کی وجہ سے کرنا پڑا ہے؛ اس لئے مدرسہ کے ارکانِ شوریٰ نے اگر اس کو محسوس کر کے ذمہ دار کی ذات پر یہ ذمہ داری ڈالنے کے بجائے مدرسہ پر ڈالی ہے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ اور اس کے لئے بہتر صورت یہ تھی کہ صاحب خیر حضرات سے اس کام کے لئے خصوصی تعاون کی گزارش کی جاتی اور یہ پیسے مخصوص حضرات اپنی طرف سے ادا کردیتے اور مدرسہ کے اوپر یہ بار نہ پڑتا۔

عن كثير بن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني، عن جده، عن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين، إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم إلا شرطا حرم حلالا أو أحل حراما.

(ترمذي شريف، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، المستدرك، كتاب الأحكام، مكتبه نزار مصطفى الباز، جديد ٧/ ٢٥٢٣، قديم ٤/ ١٠١، رقم: ٧٠٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ر صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۲/۲۶ھ

مدرسہ کی رقم سرکاری اسکیم شروع کرانے کے لئے بطور رشوت دینا

سوال [۸۵۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مسئلہ دریافت طلب ہے جواب سے مطلع فرما کر احسان فرمائیں۔ یوپی گورنمنٹ سے ایک اسکیم شروع ہوئی ہے، گورنمنٹ سے منظور شدہ ہے، مدارس کے پرائمری سیکشن کے طلبہ کو فی کس ۱۴۴ر روپیہ بطور وظیفہ سالانہ دینے کی اس سلسلہ میں لاعلمی کی وجہ سے بھی اہل مدارس سے رشوت لی گئی، اس میں تعداد زائد وظیفہ لانے کے لئے ذمہ داروں نے خود لکھ دی، تاکہ زائد رقم ان کو مل جائے، بہرکیف اب احساس ہو رہا ہے کہ غلط کام ہو گیا، توبہ واستغفار کر رہے ہیں، آئندہ کے لئے احتیاط سے کام لیا جائے گا، اس کی تلافی کا جو طریقہ ہو اس سے مطلع فرما کر احسان فرمایا جائے، گورنمنٹ سے آئی ہوئی رقم کا لوٹانا اور بھی دشوار ہے آج کل کے ماحول میں اور اکگنا ئزڈ کاغذ بھی گم ہو گیا ہے، دوسرا ملنے کے بھی رشوت مانگ رہے ہیں، کیا کیا جائے؟

المستفتی: حامد علی، مدرسہ ارشاد العلوم ٹانڈہ، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حدیث شریف میں جھوٹ اور دھوکہ دہی کی سخت مذمت آئی ہے۔

قال النبي صلى الله عليه وسلم: الخديعة في النار. (صحيح البخاري، تعليقات، باب النجش، ومن قال: لا يجوز ذلك البيع، النسخة الهندية ١/ ١٨٧)

اس کی تلافی کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ جو رقم رشوت میں دی ہے وہ اگر مدرسے کی رقم ہے تو رشوت دینے والے ذمہ داران اپنی جیب سے بطور تاوان اتنی رقم مدرسہ کے خزانہ میں جمع کردیں۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ١٤/١٦١، جدید ڈابھیل ١٥/ ٥٢٥)

والأصل فيه: أن الشرط إذا كان مقيدا والعمل به ممكنا وجب مراعاته، والمخالفة فيه توجب الضمان. (عناية، كتاب الوديعة، زكريا ٨/ ٥١٩، كوئٹه ٧/ ٤٦٠، دارالفكر ٨/ ٤٩٤-٤٩٥)

اور سرکار کی طرف سے جو زائد رقم آتی ہے، اس کو سرکاری خزانہ میں واپس کردیں، لیکن اگر سرکاری خزانہ میں واپس کرنے کی صورت نہ بن سکے تو اس رقم کو فی کس ١٤٤/ روپیہ کے حساب سے آئندہ سال کے جلسہ میں تقسیم کردیں؛ کیوں کہ طلبہ ہی کے نام سے آیا ہوا پیسہ ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ، قدیم ١٤/ ١٤١، جدید ڈابھیل ١٥/٤/ ٥٧)

اس کے بعد پھر اپنی غلطی پر نادم ہوکر اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کرتے رہیں۔

وأما حكمها فوجوب الحفظ على المودع، وصيرورة المال أمانة في يده، ووجوب أدائه عند طلب مالكه. (هندية، كتاب الوديعة، الباب الأول، زكريا قديم ٤/ ٣٣٨، زكريا جديد ٣/ ٣٤٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٤/ شوال ١٤١٨ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٣/ ٥٤٤٢)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٤/ شوال ١٤١٨ھ

الفصل السادس:

اشیائے مدرسہ کی منتقلی کے احکام

مدرسہ کی منتقلی سے متعلق چند سوالات کے جوابات

سوال [۱۰۸۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک بستی میں ایک مکتب کے لئے بستی والوں کی رضا مندی سے چک بندی کے ایام میں ایک بیگہ سے کچھ اوپر زمین چھوڑی گئی۔ ۱۹۷۰ء میں مکتب کی بنیاد رکھی گئی، دو تین مدرس کام کرنے لگے، رفتہ رفتہ مکتب میں ترقی ہوتی رہی، ابتداء میں اہل بستی کے مشورہ سے مقامی ایک صاحب مہتمم بنائے گئے تھے، چند سال بعد ہی مدرس اول مولانا صاحب پر اعتماد ہونے کے باعث سب نے متفقہ طور پر مولانا صاحب کو مہتمم بنا دیا اور پورے اختیارات مہتمم صاحب کو دے دیئے، تدریجی طور پر مکتب ترقی کرتا رہا، اعتماد میں مزید اضافہ ہوا، تو کمیٹی بھی تحلیل کردی گئی، مکتب کی ترقی برابر جاری رہی، یہاں تک کہ مکتب مدرسہ بن گیا، شعبہ تحفیظ القرآن الکریم میں فضل الٰہی سے خاص خدمت ہونے لگی، عربی سال ششم تک تعلیم ہوگئی، فللّٰہ الحمد...... پورا عملہ قناعت پسند اور مخلص ہے، مدرسہ میں توسیع کی ضرورت محسوس کی گئی، تو برابر کی زمین خریدی گئی، اب مزید زمین برابر میں چاروں طرف نہیں ہے، طلبہ کا رجوع متقاضی ہے کہ مدرسہ بڑا ہو، ایک عالم صاحب نے لوگوں سے زمینی چندہ کی اپیل کی تو خوشی خوشی زمینداروں نے ایک ایک، دو دو بیگہ کاشت کی زمین چندہ میں دینے کا وعدہ کرلیا، اس طرح کافی زمین موعود ہوگئی، تاکہ بڑا مدرسہ بستی سے الگ تقریباً ڈیڑھ کلو میٹر کے فاصلہ پر بڑے روڈ کے قریب بنایا جائے اور قدیم مدرسہ کی عمارت کو مکتب مطبخ دفتر اور گودام کی حیثیت سے استعمال کیا جائے۔ چندہ دہندگان کو مطلع کردیا جائے کہ مدرسہ میں نام کی تبدیلی کے

ساتھ توسیع کی گئی ہے، اگر آپ قدیم نام سے بھی چندہ دیں گے تب بھی وہ جدید مدرسہ میں استعمال کیا جائے گا، اگر آپ کو یہ پسند نہیں تو چندہ نہ بھیجیں، آپ مختار ہیں، نیز پہلے عالم مہتمم صاحب چونکہ ضعیف ہوگئے، بیمار رہنے لگے، کئی بار فالج ہو چکا؛ اس لئے چاہتے ہیں دوسرے عالم شاب صالح کو مہتمم ناظم بنا دیں، تا کہ روز بروز ترقی ہوتی رہے، قدیم مہتمم صاحب بھی ان جوان صالح پر راضی ہیں، وہ جوان ہوس اقتدار نہیں رکھتے، بمشکل آمادہ ہوتے ہیں، یہ تفصیل جو عرض کی گئی ہے، شریعت مطہرہ اس بارے میں کیا کہتی ہے؟ فضل الٰہی سے اختلاف اور جھگڑے کا ہمارے یہاں دور تک بھی نام ونشان نہیں، طویل مدت میں کبھی بھی مدرسہ انتشار کا شکار نہیں ہوا۔ بحمد اللہ تعالیٰ۔

(۱) کیا مدرسہ کے نام اور مہتمم کی تبدیلی سے الگ الگ وقف کا حکم نہیں ہوگا؟

(۲) کیا قدیم مدرسہ کی عمارت، جدید مدرسہ کے مطبخ، دفاتر، کتب خانہ، مہمان خانہ وغیرہ میں استعمال کرنا اور قدیم مدرسہ کو جدید مدرسہ کے تابع بنانا درست ہوگا؟

(۳) جب اتنے فاصلہ پر جنگل میں مدرسہ بنے گا تو یقیناً چند سال میں وہاں مستقل بستی آباد ہو جائے گی، تو کیا وہ دوسری بستی کا مدرسہ نہیں کہلائے گا؟

المستفتی: محمد یونس

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) جتنی زمین مدرسہ کے لئے وقف ہے، اس کا حکم مدرسہ کے نام یا مہتمم کی تبدیلی سے الگ نہیں ہوگا؛ بلکہ ساری زمین ایک ہی مدرسہ کے ماتحت رہے گی۔

أراد المتولي إقامة غيره مقامه في حياته وصحته، إن كان له التفويض عاما صح. (درمختار مع رد المحتار، الوقف، مطلب للناظر أن يوكل غيره، زكريا ٦/ ٦٣٨، كراچی ٤/ ٤٢٥، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٦٠٣، مصري قديم ١/ ٧٥٥)

(۲) قدیم مدرسہ کی عمارت کو ضرورت کے پیش نظر جدید مدرسہ کے دفاتر اور مطبخ وغیرہ کے

لئے استعمال کیا جا سکتا ہے، مگر بہتر یہ ہے کہ وہاں کوئی مکتب جاری رکھا جائے جو جدید مدرسہ کی ماتحتی میں چلتا ہو، نیز بستی والوں کی رضامندی اور ارباب حل وعقد کے مشورہ سے قدیم مدرسہ کو جدید مدرسہ کے تابع بنانا درست ہے۔

لأنہ قال الشامي: مراعاۃ غرض الواقفین واجبۃ. الخ (شامي، الوقف، مطلب مراعاۃ غرض الواقفین واجبۃ، زکریا ٦/ ٦٦٥، کراچی ٤/ ٤٤٥)

(۳) مدارس دینیہ بستیوں کے تابع نہیں ہوتے؛ کیوں کہ مدارسِ اسلامیہ ساری امت کی امانت ہیں اور ساری امت ان کی ذمہ دار ہے؛ البتہ قرب وجوار والے حضرات مدرسہ کے ساتھ خیرخواہی اور تعاون کے زیادہ ذمہ دار ہیں؛ لہٰذا آئندہ کسی بستی کے وہاں آباد ہونے سے مقصود میں کوئی خلل نہیں ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ ربیع الاول ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۰۸۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/ ۳/ ۱۴۲۰ھ

مدرسہ کی آمدنی اسکول میں لگانا

سوال [۸۵۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج بتاریخ ۲۵؍ مارچ ۱۹۹۳ء کو ایک جنرل میٹنگ دونوں مدرسوں کے بارے میں پورے گاؤں کی پردھان جی کی بیٹھک پر دن کے ۱۲؍ بجے ہونی شروع ہوئی، جس میں دونوں اسکولوں کے عہدیدار موجود تھے، جناب صدر صاحب مہتمم مدرسہ نے اپنی بات رکھی کہ ایسا راستہ اختیار کیا جائے کہ دونوں اسکول چلتے رہیں، سبھی گاؤں والوں کی رائے کے مطابق یہ طے پایا کہ مدرسہ تعلیم القرآن کو جو بازار اور گاؤں سے امدادی آمدنی ہوگی، اس کا ایک ۲/ ۱ جونیر ہائی اسکول کلیان پور کو دینی ہوگی، بقیہ آمدنی (۱) زکوۃ (۲) فطرہ (۳) چرم قربانی (۴) بیرونی چندہ، یہ چاروں آمدنی تعلیم القرآن میں لگائی جائیں گی، پرستاؤ کا سمرتھن سبھی گاؤں والوں نے کیا، یادداشت کے لئے چند کلمے لکھ

دئے ہیں: (۱) دونوں اسکول چندے سے چل رہے ہیں، سرکار سے ایڈ کسی اسکول کو نہیں ملتی؟ (۲) زید کہتا ہے کہ ایسا پرستاؤ کرنا ناجائز ہے۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرسہ تعلیم القرآن کی جو بھی آمدنی ہوگی، چاہے بازار یا گاؤں سے ہو یا باہر سے جونیر ہائی اسکول میں لگانا شرعاً جائز نہیں ہے، تمام آمدنی مدرسہ تعلیم القرآن ہی میں لگانا لازم ہوگا؛ اس لئے کہ لوگوں نے مدرسہ کے لئے دی ہے نہ کہ ہائی اسکول کے لئے۔

قال النبي صلى الله عليه وسلم: المسلمون عند شروطهم. (صحيح البخاري، كتاب الإجارة، باب أجر السمسرة، رقم الباب: ١٤، سنن الترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢)

المسلمون عند شروطهم. (قواعد الفقه، أشرفي ديوبند ١٢١)

زید کا کہنا صحیح اور شریعت کے مطابق ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱ر جمادی الاولیٰ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۲۸۱)

مسجد و مدرسہ کی مشترکہ رقم سے جنریٹر خریدنا

سوال [۸۵۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسجد اور مدرسہ کے ذمہ دار دونوں نصف نصف روپئے ملا کر جنریٹر خریدنا چاہتے ہیں اور جنریٹر کا استعمال مدرسہ والوں کے حق میں زیادہ رہے گا اور مسجد کے استعمال میں کم، تو اس سلسلہ میں کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد رضوان مقبرہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسجد اور مدرسہ کی مشترکہ رقم سے جنریٹر خریدنا درست ہے؛ البتہ جب جنریٹر کا استعمال مدرسہ کے حق میں زیادہ ہے بالمقابل مسجد کے، تو تیل کی قیمت اور خرید میں اسی تناسب سے پیسہ ادا کرنا لازم ہوگا۔

أما إذا اختلف الواقف أو اتحد الواقف، واختلفت الجهة بأن بنى مدرسة ومسجدا وعين لكل وقفا، وفضل من غلة أحدهما لا يبدل شرط الواقف، وكذا إذا اختلف الواقف لا الجهة يتبع شرط الواقف.

(البحرالرائق، كتاب الوقف، كوئٹه ٥/ ٢١٦، زكريا ٥/ ٣٦٢، تنوير الأبصار مع الدر المختار، كتاب الوقف، مطلب في انقاض المسجد ونحوه، كراچی ٤/ ٣٦٠، زكريا ٦/ ٥٥١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۷ر ذیقعدہ ۱۴۳۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۲۸۲/۴۰)	۷/۱۱/۱۴۳۴ھ

مسجد و مدرسہ کی رقم کو ایک دوسرے پر صرف کرنا

سوال [۸۵۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کچھ لوگوں نے ایک زمین خریدی، اس میں مسجد و مدرسہ دونوں تعمیر کرنے کے ارادے سے اور دونوں کو ایک دوسرے کے تابع رکھنے کا ارادہ ہے، مسجد پہلے تعمیر ہو چکی ہے اور اب مدرسہ تعمیر ہو رہا ہے، تو کیا مسجد کا پیسہ مدرسہ میں اور مدرسہ کا پیسہ مسجد میں لگایا جا سکتا ہے؟ اور مسجد کے پیسوں کو مدرسین پر خرچ کیا جا سکتا ہے؟ نیز مدرسین میں بعض ناظرہ وغیرہ پڑھانے کے لئے ہیں اور بعض ہندی ماسٹر ہیں، تو کیا ماسٹروں پر بھی خرچ کیا جا سکتا ہے؟ جب کہ ہندی تعلیم دینی نہیں ہے۔ (احسن الفتاوی ۶/ ۴۴۶) سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دونوں ایک دوسرے کے تابع ہوں تو خرچ کیا جا سکتا ہے، مدلل تحریر فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر مدرسہ مسجد کے تابع ہے، یا مسجد مدرسہ کے تابع ہے اور لوگوں کو اس کا علم بھی ہے اور چندہ دینے والے مدرسہ میں نہ دینے کی صراحت بھی نہیں کرتے اور مسجد ومدرسہ دونوں کی رسید بھی ایک ہی ہے، تو اس رسید سے حاصل شدہ آمدنی مسجد ومدرسہ دونوں میں بلاامتیاز خرچ کرسکتے ہیں، اور ناظرہ قرآن پڑھانے والوں کی تنخواہ میں بھی دے سکتے ہیں اور اگر ضمنی طور پر ہندی پرائمری تک کی تعلیم دی جاتی ہے اور ایک دو ہی ماسٹر ہیں تو ان کی تنخواہ میں بھی وہ رقم خرچ کرسکتے ہیں۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۶/ ۴۴۶، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۴/ ۱۴۸، جدید ڈابھیل ۱۵/ ۷۳)

اتحد الواقف والجهة وقل مرسوم بعض الموقوف عليه بسبب خراب وقف أحدهما، جاز للحاكم أن يصرف من فاضل الوقف الآخر عليه؛ لأنهما حينئذ كشيء واحد. (تنوير الأبصار مع الدر المختار، كتاب الوقف، مطلب في انقاض المسجد ونحوه، كراچی ٤/ ٣٦٠، زكريا ٦/ ٥٥١، وكذا في البحر الرائق، زكريا ٥/ ٣٦٢، كوئٹه ٥/ ٢١٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۱۷/۶/۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۸۸۷)

مسجد ومدرسہ کا پانی ولائٹ خارج مسجد ومدرسہ کو دینا

سوال [۸۵۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کسی مہتمم مدرسہ یا مسجد کو مسجد یا مدرسہ سے خارج مکان میں بجلی، پانی مدرسہ یا مسجد کی لائن میٹر سے دینے کا حق ہے یا نہیں؟ جب کہ خارج مکان میں خرچ ہونے والی بجلی یا پانی کا بل مسجد یا مدرسہ ہی ادا کرتا ہے، ایسا کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

المستفتی: فرحت حسین، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مہتمم اور متولی واقف اور چندہ دہندگان کی طرف سے بحیثیت وکیل کے امین ہیں اور امین کے لئے امانت میں اس طرح مالکانہ تصرف خیانت ہے جو کہ حرام ہے؛ لہٰذا اس صورت میں یہ دونوں پانی وبجلی کے بل کے ضامن ہوں گے۔

(مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۷/ ۹۹، جدید زکریا مطول ۱۰/ ۴۸۰، امداد الفتاوی ۲/ ۶۷۲)

عن أبي هريرة –رضی الله عنه– عن النبي ﷺ قال: آية المنافق ثلاث: إذا حدث كذب، وإذا وعد أخلف، وإذا أؤتمن خان. (صحيح البخاري، كتاب الإيمان، باب علامة المنافق ١/ ١٠، رقم: ٣٣)

ولو اشترى القيم بغلة المسجد ثوبا، ودفع إلى المساكين لا يجوز، وعليه ضمان. (هندية، كتاب الوقف، الباب الحادي عشر، الفصل الثاني زكريا قديم ٢/ ٤٦٢، جديد ٢/ ٤١٣، وكذا في فتاوى قاضي خان، جديد زكريا ٣/ ٢٠٨، وعلى هامش الهندية، زكريا ٣/ ٢٩٧)

الوكيل يقبض العين –إلى قوله– لأنه أمين محض. (هداية، كتاب الوكالة، باب الوكالة بالخصومة والقبض، أشرفي ديوبند ٣/ ١٩٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ رمضان ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۲۴۵)

ایک مدرسہ کا غلہ دوسرے مدرسہ میں دینے کا حکم

سوال [٨٥٠٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مدرسہ کے سفیر اور استاذ ایک گاؤں میں غلہ کی وصولیابی کے لئے گئے اور غلہ اکٹھا کر کے ایک جگہ رکھ دیا اور صاحب مکان سے یہ کہہ کر چلے گئے کہ ہم اٹھا کر لے

جائیں گے، کئی مہینہ غلہ رکھا رہا، جب خراب ہونے لگا تو صاحب مکان نے مشورہ سے وہ غلہ ایک مدرسہ میں دے دیا، یہ سوچ کر کہ ضائع ہونے سے تو یہی اچھا ہے کہ مدرسہ میں دے دیا جائے، مدرسہ، مدرسہ سب ایک ہیں، چند مہینے کے بعد اس مدرسہ والے آئے اور معلوم ہو جانے پر کہ وہ غلہ فلاں مدرسہ میں دیا جاچکا ہے، صاحب مکان پر برس پڑے کہ یہ تم نے نا جائز کیا، جس مدرسہ کی نیت سے غلہ دیا تھا وہیں جانا چاہئے تھا، اس کے علاوہ میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

المستفتی: ساکنان بستی بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صاحب مکان پر یہ لازم تھا کہ جس مدرسہ کے لئے غلہ جمع کیا گیا ہے، اس مدرسہ والوں کو اطلاع کر دیتا؛ اس لئے کہ یہ غلہ اس کے پاس بطور امانت تھا، اور اگر اطلاع کرنے کی کوئی شکل نہیں تھی اور اس کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، جس کی وجہ سے مجبوراً غلہ دہندگان کے مشورہ سے دوسرے مدرسہ کو غلہ دے دیا ہے تو صحیح ہوا ہے، صاحب مکان پر کوئی تاوان لازم نہیں ہے۔

عن عمرو بن شعيب عن أبيه، عن جده، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ليس على المستعير غير المغل ضمان، ولا على المستودع غير المغل ضمان. (سنن الدارقطني، البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٣٦، رقم: ٢٩٣٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۲۶۸)

ایک مدرسہ کی رقم دوسرے مدرسہ میں لگانا

سوال [۸۵۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: ایک مدرسہ کی کچھ رقم ہے، تو کیا دوسرے مدرسہ میں ضرورت کے مطابق اس کو لگا سکتے ہیں یا نہیں؟ جس مدرسہ کی رقم ہے وہ جاری ہے اور پیسہ بچت میں ہے۔

المستفتی: رحمت اللہ قاسمی سنبھل، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر دوسرے مدرسہ کا انتظام اور مہتمم سب کچھ الگ الگ ہیں، تو بلاعوض خرچ کرنا درست نہیں؛ بلکہ بطور قرض لے کر خرچ کر سکتے ہیں اور بعد میں قرض ادا کرنا لازم ہوگا، ورنہ آپس میں اختلاف اور فتنہ کا خطرہ ہوجاتا ہے؛ البتہ اگر اول مدرسہ میں اس رقم کی بالکل ضرورت نہیں ہے نہ فی الحال ضرورت ہے اور نہ ہی بعد میں ضرورت ہوسکتی ہے، تب دوسرے مدرسہ میں لگانے کی اجازت ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ۱۲/ ۳۸۳، ڈابھیل ۱۵/ ۷۳)

اتحد الواقف والجهة، وقل مرسوم بعض الموقوف عليه بسبب خراب وقف أحدهما، جاز للحاكم أن يصرف من فاضل الوقف الآخر عليه؛ لأنهما حينئذ كشيىء واحد. (الدر مع الرد، الوقف، مطلب في نقل انقاض المسجد ونحوه، زكريا ٦/ ٥٥١، كراچی ٤/ ٣٦٠، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٥٩٦، مصري قديم ١/ ٧٤٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۲ ررربیع الثانی ۱۴۱۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۴۲۷)	۱۴۱۶/۴/۲۲ھ

مدرسہ بنانے کے نام پر وصول شدہ رقم کو دوسرے مدرسہ میں دینا

سوال [۸۵۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص محمد نعیم نے اپنی ذاتی رہائش کے لئے قطعہ زمین کا بیع نامہ کرایا، پھر اس بیع نامہ کے ذریعہ لوگوں سے یہ کہہ کر رقم وصول کی کہ یہ زمین میں نے مدرسہ کے لئے خریدی ہے؛ لہٰذا

لوگوں نے امدادی وزکاتی تعاون پیش کیا، اس شخص نے مزید دو آدمیوں کو یہ کہہ کر اپنے ساتھ شامل کرلیا کہ زمین برائے مدرسہ خرید لی گئی ہے، تم بھی مدرسہ جاری کرنے میں معاون ہوجاؤ، ایک نے شخص مذکور کو معتمد سمجھتے ہوئے اپنے تعلقات میں سے چند ہزار سے تعاون دیا، دوسرے شخص نے کہا کہ جب تک مدرسہ کی عمارت تیار نہ ہو تم اپنے مکان میں مدرسہ قائم کرالو، چنانچہ ایک نام تجویز کر کے اس کے مکان میں مدرسہ جاری کردیا گیا، دو یا چند ماہ کے بعد معلوم ہوا کہ نہ مدرسہ کی کوئی زمین ہے اور نہ آئندہ زمین ملنے کا امکان ہے، یہ سب سوانگ اس لئے رچایا گیا ہے کہ کسی طرح مکان کی تعمیر ہوجائے؛ لہٰذا جس شخص کے مکان میں مدرسہ جاری کیا گیا تھا، اس نے مکان خالی کرالیا، مدرسہ بند ہوگیا، جس شخص نے چند ہزار روپئے جو وصول کر کے دئے تھے وہ بھی اس فریب کاری سے عاجز آکر علیحدہ ہوگیا، اور اس نے بقیہ دونوں شخصوں سے کہہ دیا کہ اب جو رقم زکوۃ کی رہ گئی ہے وہ فلاں مدرسہ کو دے دی جائے، اور جو امدادی رقم ہے اس کو فلاں مسجد کے حوالہ کردی جائے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس رقم کو مدرسہ اور مسجد میں صرف کیا جاسکتا ہے، جب کہ اس رقم کو وصول کرنے کی کوئی صحیح بنیاد نہیں ہے؟ والسلام بینوا توجروا۔

المستفتی: محمد ذاکر سرائے کھجور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زکوۃ کی رقم کو ایسے مدارس میں زکوۃ کے نام سے دینا درست ہے جن میں زکوۃ کی رقم صحیح مصرف میں صحیح طریقے سے صرف کی جاتی ہے۔

وللوكيل أن يدفع لولده الفقير وزوجته لا لنفسه إلا إذا قال ربها ضعها حيث شئت. الخ (الدرالمختار، کتاب الزکوۃ، زکریا ۳/ ۱۸۸-۱۸۹، کراچی ۲/ ۲۶۹، البحرالرائق، کوئٹہ ۲/ ۲۱۱، زکریا ۲/ ۳۶۹)

اور امدادی رقم جن لوگوں سے لے کر جمع کی گئی ہے ان کی اجازت سے مسجد میں خرچ کرسکتے ہیں، ورنہ انہیں لوگوں کو واپس کردینا واجب ہے؛ کیوں کہ وہ رقم دینے والوں کی ملکیت سے خارج نہیں ہوئی ہے۔ (مستفاد: امدادالفتاوی ۲/ ۵۹۵)

عن أبي حرة الرقاشي -رضي الله عنه- عن عمه أن رسول الله ﷺ قال: لايحل مال امرئ مسلم، إلا بطيب نفس منه. (مسند أبي يعلى الموصلي، دارالكتب العلمية بيروت ۲/ ۹۱، رقم: ۱۵٦۷، مسند أحمد بن حنبل ۵/ ۷۲، رقم: ۱۱۷٤۰)

لا يحل مال امرئ إلا بطيب نفس منه، أي بأمر أو رضا عنه. الخ

(مرقاة، إمدادیه ملتان ٦/ ۱۱۸)

لو أن قوما بنوا مسجدا وفضل من خشبتهم شيء -إلى قوله- يكون الفاضل لهم يصنعون به ماشاؤوا. الخ (البحرالرائق، كتاب الوقف، فصل في أحكام المسجد، کوئٹه ۵/ ۲۵۱، زکریا ۵/ ۴۲۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۱۵/صفر ۱۴۰۹ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۱۱۷)

ایک مدرسہ کی وقف شدہ اراضی کو دو مدرسوں پر تقسیم کرنا

سوال [۸۵۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہندہ نے بدرستگیٔ ہوش وحواس اپنی ایک اراضی کے لئے مرنے سے پہلے وصیت کی کہ میری یہ فلاں اراضی مدرسہ کو وقف ہے، چنانچہ مرحومہ کے انتقال کے بعد ورثاء نے وہ اراضی مدرسہ رحمانیہ کو وقف کردی اور ۱۹۷۰ء سے آج تک جس کو ۱۹/ برس کا عرصہ ہوگیا، مدرسہ رحمانیہ کا اس اراضی پر قبضہ ہے، اب مرحومہ کے وہی ورثاء چاہتے ہیں کہ اس اراضی کو دو مدرسوں پر تقسیم کردیں، ان دونوں مدرسوں میں سے ایک مدرسہ کا اس وقت جب مرحومہ کا انتقال ہوا تھا وجود بھی نہیں تھا، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ وقف شدہ اراضی جو مدرسہ رحمانیہ کی ملک بن چکی ہے اور ۱۹/ برس سے آج تک مدرسہ کی کاشت میں ہے، کیا مرحومہ کے ورثاء کو یہ حق ہے کہ مرحومہ کی اس وقف شدہ آراضی کو دوسرے مدرسہ کو تقسیم کرکے دے دیں؟

المستفتی: عبد السلام ناظم مدرسہ رحمانیہ، ٹانڈہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر بوقت وصیت دوسرے مدرسہ کی طرف منتقل کرنے کی شرط نہیں لگائی ہے اور ورثاء نے موصی کی وصیت کے مطابق مدرسہ رحمانیہ کو وقف کر کے متولی کے قبضہ میں دے دیا ہے، تو بالاتفاق وقف کامل ومکمل ہو کر مدرسہ رحمانیہ کی ملکیت میں مذکورہ آراضی داخل ہو چکی ہے، آئندہ ورثاء اور متولی وغیرہ کو جب تک مدرسہ رحمانیہ چلتا رہے گا کسی دوسرے مدرسہ وغیرہ کی طرف منتقل کرنے کا حق نہیں ہوگا، ورنہ غرض واقف کی مخالفت کی وجہ سے منتقل کرنے والے گنہگار رہوں گے۔

أنهم صرحوا بأن مراعاة غرض الواقفين واجبة. (شامي، الوقف، مطلب مراعاة غرض الواقفين واجبة، زكريا ٦/ ٦٦٥، كراچی ٤/ ٤٤٥، كوئٹه ٣/ ٤٦٤)

ملک العين الموقوفة يزول عن ملک المالک بقضاء القاضي بلزوم الوقف من غير أن ينتقل إلى ملک أحد. الخ (البحرالرائق، كوئٹه ٥/ ١٩١، زكريا ٥/ ٣٢٠)

فإذا تم ولزم لا يملک ولا يملک ولا يعار. الخ وفي الشامي: والوقف لا يمكن تمليكه. الخ (الدرالمختار، زكريا ٦/ ٥٣٩، كراچی ٤/ ٣٥١، كوئٹه ٣/ ٤٠٢)

الملک يزول، أي ملک الواقف فيصير الوقف لازما للاتفاق على التلازم بين اللزوم والخروج عن ملكه. الخ (شامي، الوقف، مطلب شرائط الوقف معتبرة إذا لم تخالف الشرع، زكريا ٦/ ٥٢٧، كراچی ٤/ ٣٤٣، كوئٹه ٣/ ٣٩٥)

البتہ اگر موصی نے بوقت وصیت کوئی شرط لگائی ہے، تو اس کا حکم دوسرا ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ جمادی الثانیہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۷۶۷)

مدرسہ کی رقم سے مدرسہ کی زمین میں مسجد تعمیر کرنا

سوال [۸۵۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے مدرسہ میں مسجد نہیں تھی اور نماز کی پریشانی تھی، اس وجہ سے ہم نے مدرسہ کا ایک کمرہ توڑ کر مسجد کی تعمیر کرالی۔ اور ہم نے پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً مدرسہ کا پیسہ استعمال کرلیا اب مسجد تعمیر ہوچکی ہے، اور نماز شروع ہوگئی، تو اس میں شرعاً کوئی قباحت تو نہیں ہے؟

المستفتی: عبدالصمد کاشی پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرسہ کی زمین پر مدرسہ کی رقم سے مسجد کی تعمیر شرعاً درست نہیں ہے؛ کیوں کہ زمین اور چندہ مدرسہ کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ اور وقف تام ہونے کے بعد اس میں اس طرح کا تصرف جائز نہیں؛ لہٰذا زمین کی قیمت اور تعمیر پر خرچ ہوئی رقم مسجد کے چندہ سے مدرسہ میں لوٹانا ضروری ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۲/ ۴/ ۳۷۷، جدید ڈابھیل ۱۵/ ۴۸۵)

یہ اس صورت میں ہے جب کہ مسجد کا نظام اور ذمہ داری مدرسہ والوں کے ہاتھ میں نہ ہو اور مسجد بھی خاص طور پر مدرسہ کی نہ ہو؛ بلکہ محلّہ والوں کی نماز کے لئے مسجد بنائی گئی ہو؛ لیکن اگر یہ مسجد مدرسہ میں بنی ہے اور مسجد ومدرسہ کے متولی ایک ہی ہیں اور آئندہ بھی دونوں کے اخراجات کی ذمہ داری ایک ہی پر ہو تو وہ مدرسہ ہی کی مسجد ہے، تو ایسی مسجد مدرسہ کی رقم سے مدرسہ کی زمین مین بنانا شرعاً جائز ہے؛ اس لئے کہ یہ مسجد بھی مدرسہ کی ضروریات کے دائرہ میں داخل ہے۔

وفي الدرالمختار: فإذا تم ولزم لا يملك، ولا يعار، ولا يرهن.

(الدرالمختار على الشامي، كتاب الوقف، زكريا ٦/ ٥٣٩، كراچی ٤/ ٣٥١، كوئٹه ٣/ ٤٠٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ر محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۸۴۶۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۱/۲۵ھ

الفصل السابع: في الإجارة

مدرسے کی زمین میں ضروریاتِ مدرسہ کے لئے دوکان تعمیر کرنا

سوال [۱۱۸۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ضلع بجنور، قصبہ شیر کوٹ بستی میں قریب ۸۰-۹۰ سال پرانا مدرسہ قائم ہے، جس کی مستقل لمبی چوڑی عمارت ہے، اس عمارت میں نیچے کے حصے میں بھی کمرے ہیں اور اوپر بھی کمرے بنے ہیں، پورب کی طرف کی عمارت میں نیچے دوکانیں تعمیر ہیں، جن کا کرایہ مدرسہ ہی وصول کرتا ہے، پچھّم کی طرف بھی عمارت کے نیچے حصے میں دوکانیں تعمیر ہوئی ہیں، اوپر کے حصے میں لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی ہیں، دکھن کی جانب نیچے کے حصے میں کمروں کے ۶-۷ دروازے صحن کی طرف کھلے ہوئے ہیں، مدرسہ کے صحن کی باؤنڈری بنی ہوئی ہے اور فرش صحن بھی، یہ مدرسہ بستی کے عالموں بزرگوں اور معزز لوگوں نے مل کر قائم کیا تھا، بستی کے معزز لوگ برابر اس کا انتظام کرتے چلے آرہے ہیں، مدرسہ کے قریب پہلے ایک چھوٹی مسجد قائم تھی جس کو بزرگوں نے دائیں بائیں بڑھا کر بستی کی جامع مسجد قائم کردی تھی، اب بھی یہ جامع مسجد ہی ہے، اس کی حد بندی بھی قائم کردی تھی، اس کے دروازے اور دیواریں پرانی قائم ہیں، اب جب کہ مدرسہ کی ایک لمبی چوڑی اوپر نیچے مستقل عمارت ہے اور دوکانیں بھی تعمیر ہیں، مدرسہ کی ضرورت کی وجہ سے مدرسہ کے ذمہ دار صحن میں دوکانیں تعمیر کرا کر اس کا کرایہ مدرسہ کے خرچ میں لگانا چاہتے ہیں، کچھ لوگ تنازعہ قائم کر کے اور مسجد کی ملکیت بتا کر تعمیر میں رکاوٹ ڈالنا چاہتے ہیں، اسی صحن سے جو دروازہ اوپر کی منزل پر جارہا ہے اس پر مدرسہ کا کمرہ بنا ہوا ہے، جس پر دار التحفیظ اور تجوید لکھا ہوا ہے، ایسی صورت میں کیا تعمیر میں رکاوٹ ڈالنا درست ہوگا؟ مدرسہ میں ضرورت کے مطابق برابر تعمیر کا سلسلہ چلا آرہا ہے، کسی کو آج تک تعمیر کے بارے میں کوئی اعتراض نہیں ہوا ہے۔

نوٹ: مدرسہ کے اسی صحن میں بزرگوں نے مسجد کی ضرورت کی وجہ سے پانی گرم کرنے کے

لئے سردیوں میں صرف کھوئی کے لئے ایک کولہولگوا دیا تھا، جب کہ یہ پورا صحن برابر بچوں کی تعلیم کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔

المستفتی: احقر شمیم الحسن، سکریٹری مدرسہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد شیر کوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہمارے ہندوستان میں مکان اور دوکان وغیرہ جب کرایہ پر دئے جاتے ہیں تو کرایہ دار کو عملاً مالکانہ حیثیت حاصل ہو جاتی ہے، جب وقف شدہ زمین میں دوکان بنا کر کرایہ پر دے دی جائے گی تو وقف کے تقاضہ کے مطابق اس کی حیثیت مکمل طور پر باقی نہیں رہتی؛ بلکہ عملاً کرایہ داری کی ملکیت میں منتقل ہو جاتی ہے؛ اس لئے وقف شدہ میں دوکان یا مکان بنا کر کرایہ پر دینا درست نہیں، ہاں اس مسجد یا مدرسہ کی توسیع کر دی جائے یا طلبہ کے لئے قیام گاہ بنا دیا جائے تو وقف کا تقاضہ مکمل طور سے باقی رہتا ہے؛ اس لئے جائز ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ وقف کی حیثیت اور ہے اور وقف کی ملکیت کی حیثیت بالکل دوسری ہے، وقف کا مطلب یہ ہے کہ اس کو بیچنا اور اس کا تبادلہ کرنا جائز نہیں ہے۔ اور وقف کی ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ وقف کی آمدنی کے لئے اس کو بیچنا اور منافع کی غرض سے اس کو تبدیل کرنا اور آمدنی کے لئے اس کو کرایہ پر دینا جائز ہے۔ اور مذکورہ زمین کے بارے میں یہ وقف کی ملکیت ہے یا خود وقف شدہ ہے، کوئی صراحت نہیں ہے؛ اس لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پوری زمین جس پر مسجد اور مدرسہ دونوں بنے ہوئے ہیں اور اس سے ملحقہ خالی زمین پوری کی پوری وقف ہے، نہ کہ وقف کی ملکیت ہے۔ اور وقف کی ملکیت ہونے کے لئے ثبوت ہونا چاہئے، نہ مسجد کے پاس اس سلسلہ میں کاغذی ثبوت ہے اور نہ ہی مدرسہ کے پاس؛ اس لئے یہ زمین وقف شدہ تسلیم کی جائے گی نہ کہ وقف کی ملکیت جس میں دوکانیں بنا کر کرایہ پر دینا درست نہ ہوگا۔ اور درسگاہ، کمرہ بنانا درست ہوگا؛ لہٰذا وقف شدہ زمین میں جو دوکانیں پہلے سے بن گئی ہیں، ان کو بھی مسجد اور مدرسہ میں شامل کر لینا چاہئے۔

قيـم المسجد إذا أراد أن يبنى حوانيت في حد المسجد، أو في فنائه لا يجوز. (الفتاوى التاتارخانية، كوئٹه ٥/ ٨٦٠، زكريا ٨/ ١٧٩٨، رقم: ١١٥٦٣، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ٩/ ١٣٧، رقم: ١١٣٨٢، هندية، زكريا قديم ٢/ ٤٦٢، جديد ٢/ ٤١٣، البحرالرائق، كوئٹه ٥/ ٢٤٩، زكريا ٥/ ٤١٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ رجمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۰۸۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۶/۱۳ھ

مدرسہ کی رقم مسجد یا مسجد کی رقم مدرسہ کو بطور قرض دینا

سوال [۸۵۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدرسہ کے روپیہ کو قرض کے طور پر لے کر مسجد میں اور مسجد کے روپئے کو قرضہ لے کر مدرسہ میں لگا سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: محمد افتخار بہرائچی، متعلم مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر قرض وصول ہونے کا مکمل اعتماد ہو اور اس کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو کمیٹی اور ذمہ داروں کے مشورہ سے مسجد کی رقم مدرسہ کو اور مدرسہ کی رقم مسجد کو بطور قرض دینے کی گنجائش ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ۱/ ۴۹۱، ڈابھیل ۱۵/ ۴۷)

للمتولي إقراض مال المسجد بأمر القاضي. (شامي، كتاب القضاء، مطلب للقاضي اقراض مال اليتيم ونحوه، زكريا ٨/ ١١١، كراچی ٥/ ٤١٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ رجمادی الثانیہ ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۳۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۶/۱۰ھ

مدرسہ کے تہہ خانہ میں آمدنی کی خاطر ''کار پارکنگ'' بنانا

سوال [۸۵۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسجد سے متصل دینی مدرسہ (دارالاقامہ) کے لئے ایک صاحب خیر نے زمین خرید کر وقف کردی، جس پر فی الوقت تعمیری کام چل رہا ہے۔ مذکورہ مسجد کافی بڑی وسیع ہے، جمعہ اور ہفتہ واری تبلیغی اجتماع میں مجمع کثیر ہوتا ہے، مسجد کی انتظامی کمیٹی یہ چاہتی ہے کہ مدرسہ کی وقف شدہ زمین کا گراؤنڈ فلور (نچلا حصہ مسجد کے لئے چھوڑ دیا جائے، تاکہ اجتماعات اور جمعہ کے دن آئے ہوئے مصلیوں کو پارکنگ کی سہولت ہو۔اور سڑک اور راستہ پر پارکنگ کی وجہ سے عوام کو تکلیف بھی نہ ہو۔کیا مدرسہ کی انتظامی کمیٹی کو شرعاً اس بات کا حق ہوگا کہ وہ مدرسہ کی زمین کا نچلا حصہ پارکنگ کے لئے چھوڑ دے اور ہر ماہ اس پر کچھ اجرت لے لے، تاکہ مدرسہ کا کچھ فائدہ بھی ہوجائے اور مصلیوں اور عوام کو سہولت ہوجائے۔

ایسے ہی مدرسہ کا وضو خانہ، مسجد کے مصلیوں کے لئے استعمال کرنے کی اجازت ہوگی یا نہیں؟ شرعی اعتبار سے مدرسہ کی زمین مسجد کے کن کن کاموں میں استعمال ہوسکتی ہے؟ اور اس کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟ بینوا توجروا

المستفتی: محمد حنیف خان امام وخطیب جامع مسجد محمدی شاہ پور نگر وناظم مدرسہ الانصار شاہ پور نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب مذکورہ زمین مدرسہ ہی کے لئے وقف کی گئی ہے، تو وہ زمین مدرسہ کے مفاد میں ہی مستعمل ہونی ضروری ہے؛ لہٰذا اگر نیچے پارکنگ بنادیں اور ملکیت مدرسہ کی رہے اور اس سے مدرسہ کو کرایہ کے ذریعہ سے آمدنی ہو اور اوپر کی منزلوں میں مدرسہ کی توسیع ہوتی رہے، تو ایسا کرنا شرعاً جائز اور درست ہے؛ لیکن اس میں مدرسہ کی انتظامیہ کی رضامندی بھی لازم ہے۔

وإذا أراد أن يبني فيها بيوتا ليستغلها بالإجازة –إلى– إن كانت

أرض الوقف متصلة ببيوت المصر يرغب في استئجار بيوتها، وتكون غلة ذلک فوق غلة الأرض، والنخيل كان له ذلک. (الفتاوى التاتارخانية، الفصل السابع في تصرف القيم، کوئٹہ ٥/ ٧٤٦، زكريا ٨/ ٦٣، رقم: ١١٢١٥، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ٩/ ٢٤، رقم: ١١٠١٩، البحرالرائق، کوئٹہ ٥/ ٢١٦، زكريا ٥/ ٣٦١، مجمع الضمانات ١/ ٣٣١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ ذی قعدہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۸۵۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/ ۱۱/ ۱۴۳۳ھ

مدرسہ میں ووٹ ڈالنے کی مشین لگانا

سوال [۸۵۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارا مدرسہ اسلامیہ عربیہ مونڈھا ائمہ جو ایک طویل عرصہ سے خالص دینی تعلیم دیتا رہا ہے، اس میں نہ آج تک دینی تعلیم کے علاوہ کوئی تعلیم ہوئی ہے اور نہ سرکار سے آج تک اس کے لئے کوئی مدد لی گئی ہے، نیز یہ ہمارے گاؤں کے قبرستان کے احاطہ میں واقع ہے، اس صورت حال میں سیاسی انتخابات اس کے حدود میں کرانا جائز ہے یا نہیں؟ ہمیشہ کی روایت یہی رہی ہے کہ ووٹ سرکاری اسکول کی آراضی میں ڈالے جاتے تھے، یہ پہلی مرتبہ ہے کہ کچھ لوگ مدرسہ کے حدود میں ووٹ ڈلوانا چاہتے ہیں۔

المستفتی: مولانا مرغوب احمد، مہتمم مدرسہ اسلامیہ عربیہ مونڈھا ائمہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر مدرسہ کا کوئی مفاد اس معاملہ میں وابستہ نہیں ہے، تو اہل مدرسہ سیاسی ذمہ داروں سے اپنا عذر پیش کردیں کہ مدرسہ صرف دینی تعلیم گاہ ہے؛ اس لئے سیاسی انتخاب مدرسہ میں نہ کیا جائے، کسی دوسری جگہ اس کا انتظام کیا جائے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۲/ ۲۱۳، جدید میرٹھ ۲۳/ ۱۳۲)

شرط الواقف كنص الشارع في وجوب العمل به، وفي المفهوم والدلالة. (قواعد الفقه، أشرفي ص: ٨٥، رقم: ١٥٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ ربیع الثانی ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۳۹۷۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/۴/۱۴۱۵ھ

احاطۂ مدرسہ میں قربانی کرنے سے روکنا

سوال [۸۵۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک مدرسہ کا ذمہ دار ہے، بکر زید کے مدرسہ کا تعاون کرتا ہے اور اس مدرسہ میں سالہا سال سے ایک سلسلہ چلتا آرہا ہے، وہ یہ کہ ہر سال قربانی کے موقع پر لوگوں کو احاطہ مدرسہ میں قربانی کرنے کی اجازت دے کر منتظمین مدرسہ اہل قربانی سے مدرسہ کے مستحق طلبہ کے لئے چرم قربانی وصول کرتے ہیں، چنانچہ اس مرتبہ بکر اس مدرسہ کے احاطہ میں اپنے بیسیوں جانور قربانی کرنا چاہتا ہے؛ لیکن وہ چرم قربانی مدرسہ کو دینا نہیں چاہتا، اس پر زید نے بکر کو احاطہ مدرسہ میں قربانی کرنے سے منع کر دیا، اب پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں زید کا بکر کو احاطہ مدرسہ استعمال کرنے کی اجازت نہ دینا شرعاً درست تھا یا نہیں؟

المستفتی: بندہ محمد فاروق ندوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کا احاطہ مدرسہ میں بکر یا دیگر لوگوں کو قربانی کرنے سے منع کر دینا صحیح اور درست ہے؛ اس لئے کہ قربانی کی اجازت دینے میں مدرسہ کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور پہلے جو اجازت دیتے تھے وہ اس وجہ سے تھا کہ مدرسہ کو کھال کا فائدہ ہوتا تھا، اور اب کھال کا فائدہ نہیں ہے؛ اس لئے اب اجازت نہ دینا صحیح ہے؛ کیوں کہ مدرسہ ذمہ دار کی ملکیت نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ ذمہ دار مدرسہ کا منتظم ہوتا ہے۔ اور منتظم کے لئے ہر معاملہ میں مدرسہ کا فائدہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

ویؤجر بأجر المثل، فلا یجوز بالأقل. (الدرالمختار مع رد المحتار، مطلب لا یصح ایجار الوقف بأقل من أجرة المثل، زکریا ٦/ ٦٠٨، کراچی ٤/ ٤٠٦، هندیة، زکریا قدیم ٢/ ٤١٩، جدید ٢/ ٣٨٧، مجمع الأنهر، دارالکتب العلمیة بیروت ٣/ ٥١٤، مصري قدیم ٢/ ٣٦٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۷ر ربیع الاول ۱۴۳۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۱۱)	۱۷/ ۳/ ۱۴۳۴ھ

مدرسہ کی عمارت اسکول کے لئے کرایہ پر دینا

سوال [۸۵۱٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جامعہ عربیہ شمس العلوم کی عمارت جونیر ہائی اسکول کے لئے کرایہ پر دی جاسکتی ہے یانہیں؟ جب کہ چندہ دینے والوں نے دینی تعلیم کے لئے چندہ دیا تھا، کچھ درسگاہیں مستقل طور پر صرف ایک ایک آدمی نے قرآن حکیم کی تعلیم کے لئے تعمیر کرائیں، جن پر ان کے نام کی تختیاں بھی لگی ہوئی ہیں، جونیر ہائی اسکول متعلقہ مدرسہ شمس العلوم کو مدرسہ سے الگ کرنے کا فیصلہ مجلس شوریٰ مدرسہ ہذا نے کرلیا ہے، فی الوقت علیحدہ مستقل عمارت کا نظم دشوار ہے؛ لہٰذا ایسی صورت میں جونیر ہائی اسکول کو مدرسہ کی عمارت میں کرایہ پر لے کر چلایا جاسکتا ہے یانہیں؟ جب کہ بالغ لڑکے اور لڑکیاں مخلوط تعلیم حاصل کرتی ہیں؟

المستفتی: محمد یوسف قاسمی، خادم جامعہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب کہ چندہ دہندہ نے دینی تعلیم ہی کی شرط وغرض سے چندہ دیا ہے، یا درسگاہ بنادی ہے، تو ذمہ داران جامعہ عربیہ شمس العلوم پر واجب ہے کہ مذکورہ چندہ و درسگاہوں کو دینی تعلیم ہی میں استعمال کریں، اور غرض واقف کے خلاف جونیر ہائی

اسکول یا یونیورسٹی وغیرہ کی دنیاوی تعلیم کی اعانت اور کرایہ پر دینا ہرگز ہرگز جائز نہیں ہوگا، مدارس میں شریک ہونے والے سب گناہ کبیرہ اور خیانت کے مرتکب ہوں گے۔ اور جونیر کو کرایہ پر دینے میں عمارتوں کے جامعہ کے ہاتھ سے نکلنے اور دیگر ناجائز فائدہ اٹھانے کا بھی سخت خطرہ ہے۔

القضاء بخلاف شرط الواقف، كالقضاء بخلاف النص لقول العلماء: شرط الواقف كنص الشارع. الخ (الأشباه والنظائر، قديم ص: ١٠٧، شامي، الوقف، مطلب في قولهم شرط الواقف كنص الشارع، زكريا ٦/ ٦٤٩، كراچی ٤/ ٤٣٣)

صرحوا بأن مراعاة غرض الواقفين واجبة. الخ (شامي، الوقف، مطلب مراعاة غرض الواقفين واجبة، كراچی ٤/ ٤٤٥، زكريا ٦/ ٦٦٥)

نیز بالغ لڑکے ولڑکیوں کی مخلوط تعلیم دنیاوی کے لئے کرایہ پر دینے میں اعانت علی المعصیہ ہونے کی وجہ سے خود چندہ دہندہ اور درسگاہ وعمارت بنوانے والے کو بھی اس کی اجازت نہیں ہے۔

لقوله تعالىٰ: وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة: ٢] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍ ذیقعدہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۸۲/۲۴)

مدرسہ میں بارات رکانا

سوال [۸۵۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک دینی مدرسہ ہے، جہاں قرآن کی تعلیم ہوتی ہے، حفظ وناظرہ کے بچے پڑھتے ہیں؛ لیکن کچھ مواقع ایسے آتے ہیں کہ بیاہ شادیوں میں مدرسہ کے اندر بارات کو ٹھہرایا جاتا ہے،

اس میں بارات کے لوگ غیر شرعی کام کرتے ہیں، جیسے جوتے سمیت اندر چلنا پھرنا، بیڑی سگریٹ پینا، جیتی گھٹکے کھانا، بے ہودہ باتیں کرنا، اندر بیٹھ کر تاش کھیلنا، ایک دوسرے کا فوٹو کھینچنا، کیا ایسی صورت میں بارات کو مدرسہ کے اندر ٹھہرانا درست ہوگا یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب تحریر فرمائیں، عین کرم ہوگا۔

المستفتی: امام مسجد عمران بیگ، مدرسہ ہٰذا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حدود مدرسہ کے اندر وہ تمام منکرات جو سوال نامہ میں درج ہیں، مثلاً تاش کھیلنا، فوٹوں کھینچنا وغیرہ منکرات قابل نکیر ہیں، ایسی چیزوں سے مدرسہ کو پاک رکھنا ضروری ہے؛ لہٰذا جس بارات میں اس قسم کے خرافات ومنکرات ہوں، انہیں مدرسہ میں ٹھہرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اوراگر اس قسم کے خرافات نہ ہوں اور مدرسہ کے مصالح اس سے متعلق ہوں، نیز تعلیمی نقصان بھی نہ ہو تو اجازت ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۲۱۳/۱۲، جدید ڈابھیل ۵۲۲/۱۵)

عن جابر –رضي الله عنه– قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الصورة في البيت، ونهى أن يصنع ذلك. (ترمذی شریف، باب ماجاء في الصورة، النسخة الهندية ١/ ٣٠٥، دارالسلام، رقم: ١٧٤٩)

وعن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من صور صورة عذبه الله حتى ينفخ فيها، يعني الروح، وليس بنافخ فيها. (ترمذي شريف، باب ماجاء في المصورين، النسخة الهندية ١/ ٣٠٥، دارالسلام، رقم: ١٧٥١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۳۵۹/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۵/۱ھ

مدارس عربیہ کی بالائی منزل پر جونیر کی تعلیم دینا

سوال [۸۵۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: دینی عربی مدرسہ جس کا قیام دینی تعلیم کے لئے ہوا تھا، جس میں ابتداء ہی سے درجہ پنجم تک پرائمری تعلیم بھی تھی، عرصہ دراز کے بعد اس میں جونیر کی تعلیم کے لئے کچھ پیسہ نرائن دت تیواری جی کے ذریعہ سرکاری طور پر لے کر چند کمرے مدرسہ کی تیسری منزل پر بنا دئے گئے ہیں اور جونیر کی تعلیم شروع کردی گئی ہے، ان حالات میں زکوۃ، صدقات وغیرہ کی رقم حیلۂ تملیک کے بعد مذکورہ تعلیمات پر خرچ کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد یوسف قاسمی جامعہ عربیہ شمس العلوم، کاشی پور، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مذکورہ حالات میں جونیر کی تعلیم کے لئے زکوۃ وصدقات کی رقم کا حیلۂ تملیک کرنا شرعاً جائز نہیں ہوگا، اس میں شریک ہونے والے سب خائن اور گنہگار ہوں گے؛ کیوں کہ حیلۂ تملیک صرف خالص دینی امور میں شدت ضرورت کی بنا پر جائز قرار دیا گیا ہے اور جونیر دینی امور میں شامل نہیں ہے۔ اور پرائمری دینی مدارس کے تابع ہے اور جونیر مستقل ہے۔

فذهب علمائنا رحمهم الله أن كل حيلة يحتال بها الرجل لإبطال حق الغير، أو لإدخال شبهة فيه، أو لتمويه باطل، فهو مكروهة، وفي العيون، وفي جامع الفتاوى: لا يسعه ذلك. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الحيل، الفصل الأول، زكريا ١٠/ ٣١١، رقم: ١٤٨٤٥، هندية، زكريا قديم ٦/ ٣٩٠، جديد ٦/ ٣٩٣)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۰۳۶)

گرام سماج کی زمین پر مدرسہ کی رقم سے دوکان بنانا

سوال [۸۵۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ایک آراضی جو قبرستان سے ملحق ہے؛ لیکن قبرستان میں شامل نہیں ہے، جس کے مقدم میں روڈ ہے؛ لہٰذا دیگر شخص اس پر قابض بھی نہیں ہوسکتا ہے، جس سے کوڑی وغیرہ کا کام لیا جارہا تھا، آج تک نہ تو اس میں کوئی قبر بنائی گئی ہے اور نہ ہی اس میں کسی کو دفن کیا گیا ہے، بطور تحقیق معلوم ہوا کہ آراضی گرام سماج کی ہے، جس میں مدرسہ کی رقم سے مفاد مدرسہ کو مدنظر رکھتے ہوئے دوکانوں کی بنیاد اندازی کردی گئی ہے، تو یہ شریعت کی روشنی میں جائز ہے یا نہیں؟

(۲) اور اس بنیاد پر مدرسہ کی رقم سے دوکانوں کی تعمیر کرکے مدرسہ کی ملکیت میں شامل کرنا کیسا ہے؟ جائز ہے یا نہیں؟

(۳) اور اسی جگہ پر بطور چندہ دوکانوں کا تعمیر کرنا اور ان دوکانوں کی آمدنی کو مدرسہ اور قبرستان میں خرچ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: شمشاد عالم، فیض العلوم موضع لانیا کھیڑ، پوسٹ بڈھن پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قبرستان سے ملحق زمین جو قبرستان میں شامل نہیں ہے اور تحقیقات سے معلوم بھی ہوگیا ہے کہ یہ گرام سماج کی زمین ہے، تو ایسی زمین میں مدرسہ کی رقم سے دوکانوں کی جو بنیاد رکھی گئی ہے، ان کا جواز گرام سماج کی اجازت پر موقوف ہے؛ کیوں کہ گرام سماج اس کا مالک ہے؛ لہٰذا گرام سماج اگر اجازت دے دے تو جائز ہوگا، ورنہ نہیں۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۸/۴۶۱)

نیز مدرسہ کی رقم سے دوکانوں کی تعمیر کرنا اس وقت جائز ہوگا، جب کہ چندہ دہندگان کو کوئی اعتراض نہ ہو۔ اور گرام سماج کی اجازت بھی ہو۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۰/ ۲۳۶، جدید ڈابھیل ۱۵/ ۵۹۵)

پھر مدرسے کی آمدنی کے پیش نظر بطور چندہ دوکانوں کی تعمیر کرانا بھی گرام سماج کی اجازت پر موقوف ہوگا، اگر گرام سماج اجازت دے دے تو اس کی آمدنی مدرسہ اور قبرستان میں خرچ کرنا جائز ہوگا۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۸/ ۴۶۱)

عن أبي حرة الرقاشي، عن عمه، أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل مال رجل مسلم لأخيه، إلا ما أعطاه بطيب نفسه. (السنن الكبرى للبيهقي، باب أهل البغي إذا فاؤا ...... دارالفكر ١٢/ ٣٥٢، رقم: ١٧٢٢٤)

الوكيل إنما يستفيد التصرف من الموكل، وقد أمره بالدفع إلى فلان، فلا يملك الدفع إلى غيره. (شامي، كتاب الزكوة، زكريا ٣/ ١٨٩، كراچی ٢/ ٢٦٩، شرح المجلة رستم، مكتبه اتحاد ٢/ ٤٧٧، رقم المادة: ١٤٥٧)

صرحوا بأن مراعاة غرض الواقفين واجبة. (شامي، الوقف، مطلب مراعاة غرض الواقفين واجبة۔ زكريا ٦/ ٦٦٥، كراچی ٤/ ٤٤٥)

شرط الواقف كنص الشارع في وجوب العمل به، وفي المفهوم والدلالة. (قواعد الفقه أشرفي، ص: ٨٥، رقم: ١٥٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳ر محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۴۱۵)

مسجد کے لئے مدرسہ سے قرض لینا

سوال [۸۵۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک مسجد کا امام ہے اور مسجد کے اندر کام کرانے کی وجہ سے رقم مدرسہ سے بطور قرض لے کر وہ کام کرا دیا، یا مدرسہ نے مسجد سے بطور قرض لے کر اینٹ یا روپیہ یا فرش یا دیوار وغیرہ میں صرف کر دیا، تو اس صورت میں قرض لینا مسجد یا مدرسہ کو جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عمران الحق، خادم معارف القرآن، گڑھی بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر قرض وصول ہونے کا اعتماد ہو ضائع ہونے کا احتمال نہ ہو تو منتظمہ کمیٹی کے مشورہ سے مسجد کے لئے مدرسہ سے قرض لینا اور مدرسہ کے لئے مسجد سے قرض لینا درست ہے، تنہا امام کو حق نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱/ ۴۹۱، ڈابھیل ۱۵/ ۵۰۴)

للمتولي إقراض مال المسجد بأمر القاضي. (شامي، كتاب القضاء، مطلب للقاضي إقراض مال اليتيم و نحوه، زكريا ۸/ ۱۱۱، كراچی ۵/ ۴۱۷) **فقط واللّٰہ** سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ ذیقعدہ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۸۴۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/ ۱۱/ ۱۴۲۳ھ

مدارس کی رقم تجارت کے لئے دینا

سوال [۸۵۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک کمپنی شہر کی مساجد ومدارس کو دعوت دیتی ہے، کہ آپ ہماری کمپنی میں حصہ داری کریں، اگر آپ (مساجد ومدارس کے ذمہ دار) ہماری کمپنی میں ایک لاکھ روپیہ سرمایہ لگاتے ہیں، تو کمپنی دو ماہ کے بعد ہر ماہ ۷ سے ۸/ ہزار روپئے منافع کی شکل میں دے گی، جس کا معاہدہ سات سال کا ہوگا، سات سال تک کمپنی ۸/ ہزار، ۷/ ہزار روپئے مہینہ کے حساب سے تقریباً ۸۴/ ہزار سے ۹۶/ ہزار روپئے تک کا منافع ایک سال میں ادا کرے گی، اس طرح سات سال میں ۵/ لاکھ ۸۸/ ہزار سے ۶/ لاکھ ۲۷/ ہزار روپئے تک کمپنی مساجد ومدارس کو ادا کرے گی اور مدارس ومساجد کا ابتداء میں جمع کیا ہوا اصل سرمایہ اپنی جگہ قائم رہے گا، اور اگر ان سات سال میں کمپنی کو نقصان ہوتا ہے، تو وہ نقصان صرف کمپنی برداشت کرے گی، اس نقصان میں سے مساجد ومدارس کو کوئی نقصان برداشت نہیں کرنا پڑے گا، تو کیا اس طرح

مساجد ومدارس کا کسی تجارتی کاروبار میں سرمایہ لگا کر منافع کمانا درست ہے؟ شریعت کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: مولوی محمد الطاف کرن احمد نگر، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مساجد ومدارس کی رقم متولی اور مہتمم کے پاس امانت ہوتی ہے اور امانت میں امین کی منشا کے خلاف تصرف کرنا جائز نہیں؛ لہٰذا مساجد ومدارس کی رقم تجارت کے لئے دے کر اس سے منافع حاصل کرنا جائز نہیں۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ۱۵/ ۲۸۹، ڈابھیل ۱۵/۵۰۲)

ولا يجوز للقيم شراء شيء من مال المسجد لنفسه، ولا البيع له، وإن كان فيه منفعة ظاهرة للمسجد -إلى- ليس للمتولي إيداع مال الوقف والمسجد إلا ممن في عياله، ولا إقراضه، فلو أقرضه ضمن. (البحرالرائق، كتاب الوقف، كوئٹه ٥/ ٢٣٩، زكريا ٥/ ٤٠١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۲/۶۱۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۵/۲۶ھ

الفصل الثامن: في المشاهرة (تنخواہ)

کیا مہتمم مدرسین کے مقابلہ میں دوگنی تنخواہ لے سکتے ہیں؟

سوال [۸۵۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا دورحاضر میں مہتمم مدرسہ مدرس اعلیٰ سے دوگنی تنخواہ لے سکتا ہے، جب کہ وہ دن رات مدرسہ کے لئے جدوجہد کرے؟

المستفتی: عبداللہ عاصی، جامعہ اسلامیہ دارالعلوم قاضی باغ کاشی پور، ادھم سنگ نگر (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرسہ کا مہتمم مطلقاً مدرس اعلیٰ سے دوگنی تنخواہ نہیں لے سکتا؛ بلکہ اپنے کام اور خدمت کے بقدر جتنا مجلس شوریٰ نے مقرر کردیا ہے اتنا ہی لے گا۔

عن عبداللہ بن عمرو بن عوف المزني، عن أبیه، عن جده أن رسول اللہ ﷺ قال: الصلح جائز بین المسلمین إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون علی شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.
(سنن الترمذي، أبواب الأحکام، باب ما ذکر عن رسول اللہ ﷺ في الصلح بین الناس، النسخة الهندیة ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲، المعجم الکبیر للطبراني، دار إحیاء التراث العربي بیروت ۱۷/ ۲۲، رقم: ۳۰، سنن الدارقطني، کتاب البیوع، دارالکتب العلمیة بیروت ۳/ ۲۳، رقم: ۲۸۶۹، المستدرك للحاکم، کتاب الأحکام، مکتبه نزار مصطفی الباز، بیروت ۷/ ۲۵۲۳، رقم: ۷۰۵۹، قدیم ۴/ ۱۰۱)

إن للمتولي أجر مثل عمله، وفي الشامیة: لیس للمتولي أخذ زیادة علی ما قرره له الواقف. (درمختار مع الشامي، کتاب الوقف، مطلب فیما یسمی خدمة وتصدیقا في زماننا، کراچی ۴/ ۴۵۱، زکریا ۶/ ۶۷۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۱/۳/۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۵۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۳/۲ھ

موجودہ دور میں تنخواہ میں زیادتی کا مطالبہ کرنا

سوال [۸۵۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مساجد کے ائمہ کرام اور مدارس کے معلمین کرام ان بے چاروں کو امامت وتعلیم کے بعد اتنا وقت نہیں ملتا کہ وہ کچھ اور کر کے اپنے اخراجات کی تکمیل کرسکیں؛ کیوں کہ انہیں اپنے کام کی تنخواہیں بہت کم ملتی ہیں؛ لہٰذا وہ اپنے گذارے اور اہل خانہ کے اخراجات کے لئے کیا شکل اختیار کریں، اگر یہ لوگ تنخواہ میں اضافہ کی مانگ کریں تو لوگ ان کو بدنام کرتے ہیں کہ یہ اپنے منہ سے تنخواہ مانگتے ہیں، آج کل اس طرف سے بڑی غفلت برتی جارہی ہے، ہزار آٹھ سو روپیہ ماہانہ مشکل سے ملتا ہے، اس میں بھی ہفتہ دو ہفتہ کی تاخیر ہو جاتی ہے: لہٰذا شریعت کی رو سے آج کے اس مہنگائی کے زمانہ میں ان کی تنخواہ کیا ہونی چاہئے؟ شریعت کا اس بارے میں کیا حکم ہے؟ اس کے مدنظر عوام الناس ان حضرات کو رمضان المبارک میں نذرانہ وہدیہ دیتے ہیں، تاکہ اس قلیل اور کم تنخواہ کی بھرپائی ہوسکے، تاکہ یہ بے چارے بھی اپنے اور اپنے اہل وعیال کے اخراجات کو پورا کرسکیں اور اطمینان اور سکون کی زندگی گذار سکیں؛ لیکن نیم ملا نے نئے نئے فتوی لے کر اس کی بھی مخالفت کی؟

المستفتی: منجانب اتحاد المسلمین گھر کون، ایم پی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: موجودہ زمانہ کی گرانی اور مہنگائی سب کے سامنے ہے، ہزار بارہ سو روپیہ، دو ہزار روپیہ ضروریات زندگی کے کسی ایک پہلو کو پورا کرنے کے لئے کافی نہیں، جس کے گھر میں دو چار بچے ہوں تو ہزار بارہ سو روپیہ کا دودھ تو یہی بچے پی لیتے ہیں؛ اس لئے مہنگائی اور گرانی کے اعتبار سے مدارس کے تمام مدرسین، ملازمین اور ائمہ مساجد کی تنخواہیں بڑھنی لازمی ہے، نیز جو اساتذہ باصلاحیت، محنتی اور تجربہ کار ہیں، ان کی تنخواہیں دوسروں کے مقابلہ میں نمایاں طور پر زائد ہونی چاہئیں، مدارس اسلامیہ کے ذمہ داروں کو اس

معاملہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سنت کو اپنانا چاہئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی طرح کا قانون بنایا تھا، ملاحظہ فرمائیے:

فلما توفي أبو بكر –رضي الله عنه– واستخلف عمر، فتحت عليه الفتوح، وجاء هم مال أكثر من ذلک، فقال: كان لأبي بكر –رضي الله عنه– في هذا المال رأي، ولي رأى آخر، رأي أبو بكر أن يقسم بالسوية، ورأيت أن أفضل المهاجرين والأنصار، ولا أجعل من قاتل رسول الله صلى الله عليه وسلم كمن قاتل معه، ففضل المهاجرين والأنصار، فجعل لمن شهد بدرا منهم خمسة آلاف، ومن كان له إسلام مع إسلامهم، إلا أنه لم يشهد بدرا أربعة آلاف أربعة آلاف، وللناس على قدر إسلامهم ومنازلهم.

(شرح معاني الآثار، كتاب وجوه الفيء، بيروت ٣/ ٢٢٨، رقم: ٥٣١٤)

فلما كان عمر بن الخطاب –رضي الله عنه– وجاء الفتوح فضل، وقال: لا أجعل من قاتل مع غير رسول الله ﷺ كمن قاتل، ففرض لأهل السوابق والقدم من المهاجرين والأنصار ممن شهد بدرا أو لم يشهد بدرا أربعة آلاف درهم، وفرض لمن كان إسلامه كإسلام أهل بدر دون ذلک أنزلهم على قدر منازلهم من السوابق انتهى. وفي القنية: من باب ما يحل للمدرس والمتعلم كان أبوبكر –رضي الله عنه– يسوى بين الناس في العطاء من بيت المال، وكان عمر –رضي الله عنه– يعطيهم على قدر الحاجة، والفقه، والفضل، والأخذ بما فعله عمر –رضى الله عنه– في زماننا أحسن. (الأشباه والنظائر، قديم ١٨٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۶۵۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۵/۲۲ھ

شرط فاسد لگا کر تنخواہ بڑھانا

سوال [۸۵۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گذشتہ ایام ہمارے مدرسہ کی مجلسِ شوریٰ کا اجلاس ہوا، اساتذۂ مدرسہ نے مجلسِ شوریٰ سے یہ درخواست کی کہ مسلسل بڑھتی ہوئی گرانی کے پیش نظر تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے، اس درخواست پر شوریٰ نے یہ قرارداد منظور کی کہ اساتذہ کی تنخواہوں میں مبلغ ۳۰۰/ روپئے کا اضافہ اس شرط پر کیا جاتا ہے کہ اساتذہ اپنی تنخواہوں کی دو تہائی رقم مدرسہ میں چندہ کر کے جمع کریں، مثلاً اگر کسی استاذ کی سالانہ تیس ہزار ہوتی ہے تو بیس ہزار روپئے جمع کرنا ضروری ہے، اس سے کم چندہ کرنے پر وہ اضافہ کی رقم کا مستحق نہیں ہوگا، جب کہ کسی مدرس کا تقرر چندہ کی شرط پر نہیں ہے؛ بلکہ صرف تعلیم وتدریس کے لئے ہے، نیز دستور مدرسہ میں چندہ کی ذمہ داری اربابِ انتظام کی ہے، تاکہ اساتذہ کی ذمہ داری صرف درس وتدریس رہے۔ آنجناب فرمائیں کہ یہ قرارداد از روئے شرع جائز ہے؟ اور کیا اساتذۂ مدرسہ مجلس شوریٰ سے یہ شرط ختم کرنے کی درخواست کرسکتے ہیں؟

المستفتی: اساتذہ مدرسہ رحمانیہ ٹانڈہ بادلی، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مدارسِ اسلامیہ کے قوانین وضوابط کا سارا مدار ذیل کی حدیث پاک پر ہے:

الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، وهكذا في المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي بيروت ١٧/ ٢٢، رقم: ٣٠، سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب

العلمية بيروت ٣/ ٢٣، رقم: ٢٨٦٩، المستدرك للحاكم، كتاب الأحكام، مكتبه نزار مصطفى الباز، بيروت ٧/ ٢٥٢٣، رقم: ٧٠٥٩، قديم ٤/ ١٠١)

اسی حدیث پاک سے دینی اداروں کے قوانین مستنبط ہوتے ہیں۔سوال نامہ میں اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ کو امر متردد فیہ کے ساتھ معلق اور مشروط کیا گیا ہے، یہ شرط فاسد ہے، مذکورہ حدیث شریف کی روشنی میں مدارس اسلامیہ کے قوانین مستنبط ہوتے ہیں؛ لیکن اس حدیث میں شرط فاسد اور ناجائز شرط لگانے کی ممانعت بھی موجود ہے؛ اس لئے مجلسِ شوریٰ نے تنخواہوں میں اضافہ کے لئے اساتذہ پر جو شرط رکھی ہے وہ ناجائز اور ممنوع شرط ہے، اسے ختم کرنا ضروری ہے۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٥/ ربیع الاول ١۴٢٥ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٧/ ٨٢٩٦)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٦/ ٣/ ١۴٢٥ھ

سائنس سے انٹر پاس اور ہندی کے مدرس کو گورنمنٹ سے تنخواہ دلانا

سوال [٨٥٢٥]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گورنمنٹ نے ان دینی مدارس کے لئے جو گورنمنٹ سے منظور شدہ ہیں، ہر ایسے مدرسہ کے لئے ایک مدرس کی تنخواہ تین ہزار روپیہ ماہوار دینے کا اعلان کیا ہے، جو سائنس سے انٹر پاس ہو اور ہندی کا مدرس ہو، مذکورہ مدرس کو گورنمنٹ کی جانب سے تنخواہ دلانے میں کیا مضائقہ ہے؟ اگر مضائقہ ہے تو تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

المستفتی: مہتمم مدرسہ ضیاء الاسلام ٹانڈہ رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اکابر دار العلوم اور مظاہر علوم اور اکابر شاہی کی ہدایت ہے کہ حکومت کی طرف سے کوئی تعاون نہ لیا جائے، اگر سرکاری تنخواہ کے ساتھ مدرس رکھا جائے گا تو بعد میں ممکن ہے کہ سرکار کی طرف سے مداخلت کا سلسلہ شروع ہو جائے، یہی مضائقہ

ہے، نیز ایک مضائقہ اور بھی ہے کہ سرکار کی طرف سے ایک مدرس کا اعلان ہے اور منجانب مدرسہ چار پانچ امیدوار کی شکل میں کھڑے ہیں، ان میں آپس میں اختلافات وتنازعات کا سلسلہ شروع ہوجائے، بعض جگہ ایک جگہ کے امیدوار دو شخص ہوگئے اور دونوں کی برادری اور خاندانی دوفریق بن گئے اور ممبران شوریٰ میں بھی دوفریق ہوگئے، جس کے نتیجہ میں ماحول میں ایک طوفان سابرپا ہوگیا، جانبین میں سخت گرما گرمی ہوگئی، کئی مہینہ تک یہ سلسلہ جاری رہا، یہ دوسرا مضائقہ ہے؛ اس لئے منجانب سرکار تنخواہ دار ملازم مدرسہ میں نہ رکھا جائے۔ (مستفاد: امدادالمفتیین / ۱۰۱۹)

قال اللّٰہ تعالی: وَعَسَى اَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ وَعَسَى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَكُمْ. [سورة البقرة، آیت: ٢١٦] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ / جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۳۸۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۵/۲۵ھ

مدرسہ کے ناظم کا مدرس کی تنخواہ نہ دینا

سوال [٨٥٢٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک مدرسہ کا ملازم ہے، مدرسہ کے ناظم کے پاس بجنور کے اجتماع میں جانے کے لئے چھٹی کی درخواست لے کر گیا، سات مہینے گذرنے کے بعد پہلی چھٹی کی درخواست ہے، جس پر ناظم مدرسہ نے سخت برہمی کا اظہار کیا، ناظم مدرسہ کی سخت کلامی سن کر زید نے اسی وقت استعفیٰ بھیج دیا، اب مدرسہ کے ذمہ زید کی آٹھ دن کی تنخواہ باقی ہے؟ ناظم مدرسہ نے تنخواہ دینے سے انکار کردیا ہے، از روئے شریعت بتایئے، زید کی تنخواہ مدرسے کے ذمہ واجب ہے یانہیں؟ تنخواہ نہ دینے کی صورت میں ناظم مدرسہ سے قیامت کے دن باز پرس ہوگی یانہیں؟ اور یہ حقوق العباد میں داخل ہے یانہیں؟

المستفتی: رئیس احمد، دڑھیال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس مدرسہ سے متعلق سوال لکھا گیا ہے، اس مدرسہ کا قانون اور ضابطہ کیا ہے؟ معلوم ہو جاتا تو بہتر تھا، اگر اس مدرسہ میں ملازم کے رکھنے اور علیحدہ ہونے سے متعلق کوئی قانون اور ضابطہ پہلے سے بنا ہوا نہیں تھا، تو مذکورہ ملازم سوال نامہ میں لکھی ہوئی آٹھ دنوں کی تنخواہ کا مستحق ہے، جن میں اس نے مدرسہ کی خدمت انجام دی ہے اور تنخواہ نہ دینے کی صورت میں ناظم مدرسہ سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے دربار میں باز پرس ہوگی۔ اور اگر اس مدرسہ میں اس بارے میں کوئی قانون اور ضابطہ بنا ہوا ہے، تو اسی ضابطہ کے مطابق حکم شرعی ثابت ہوگا۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ألا ! لا تظلموا، ألا ! لا تظلموا، ألا ! لا تظلموا إنه لا يحل مال امرئ إلا بطيب نفس منه. (مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٧٢، رقم: ٢٠٩٧١، دارقطني، البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٢٢، رقم: ٢٨٦٣)

المسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (ترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي بيروت ١٧/ ٢٢، رقم: ٣٠، دارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٢٣، رقم: ٢٨٦٩، المستدرك للحاكم، كتاب الأحكام، مكتبه نزار مصطفى الباز، بيروت ٧/ ٢٥٢٣، رقم: ٧٠٥٩، قديم ٤/ ١٠١)

الأجير الخاص يستحق الأجرة إذا كان في مدة الإجارة حاضرا للعمل. (شرح المجلة، كتاب الإجارة، اتحاد بك ڈپو ديوبند ٦/ ٢٣٩، رقم: ٤٢٥)

الأجرة إنما تكون في مقابلة العمل. (شامي، كتاب النكاح، باب المهر، كراچی ٣/ ١٥٦، زكريا ٤/ ٣٠٧)

لا يجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي.

(شامي، كتاب الحدود، مطلب في التعزير بأخذ المال، كراچی ٤/ ٦١، زكريا ٦/ ١٠٦، البحرالرائق، كوئٹه ٥/ ٤١، زكيا ٥/ ٦٨، هندية، زكريا قديم ٢/ ١٦٧، جديد ٢/ ١٨١)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۳۹۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۵/۴ھ

مقررہ تنخواہ سے کم دینے کا حکم

سوال [۸۵۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مدرس کے تقرر کے وقت مہتمم مدرسہ سے ماہانہ تنخواہ سولہ سو طے ہوتی ہے، پھر رجسٹر میں درج کرنے کی باری آتی ہے تو تنخواہ پندرہ سو روپیہ لکھی جاتی ہے، جب اعتراض کیا گیا تو جواب ملا کہ آپ کو تنخواہ سے مطلب ہے؟ چنانچہ یہ تنخواہ سال کے اختتام پر تیرہ سو رمضان کی ڈبل کے اعتبار سے وصول ہو جاتی ہے، پھر دوسرا سال گذر جانے کے بعد جب اس تنخواہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے، تو مہتمم مدرسہ سے یہ جواب ملتا ہے کہ ہم چھوٹے ہیں، ہم نہیں دے سکتے جو رجسٹر میں موجود ہے وہی دے سکتے ہیں، اس کے علاوہ نہیں دے سکتے، تو کیا اس صورت میں مدرس دو سال کی تنخواہ کا یا ایک سال کی تنخواہ کا مستحق ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ارشاد قاسمی

الجواب وباللہ التوفیق: جب آپس میں یہ شرط طے ہوگئی کہ سولہ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ رہے گی، تو وہ مدرس سولہ سو روپیہ ماہوار کا مستحق ہے۔ اور جو مقدار اس میں رہ گئی ہے وہ مدرس کا حق ہے، اس کی ادائے گی ذمہ دارانِ مدرسہ پر لازم ہے؛ اس لئے کہ آپس کی طے شدہ شرائط کی پابندی حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق جانبین پر لازم ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۷/ ۲۸۴، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۴/ ۱۶۴، جدید ڈابھیل ۱۵/ ۵۶۱)

المسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.

(ترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲، وهكذا في البخاري، كتاب الإجارة، تحت ترجمة الباب، باب أجر السمسرة ۱/ ۳۰۳، رقم الباب: ۱۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ ذی الحجہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۹۶۹)

چندہ نہ کرنے کی صورت میں مدرس کو سابقہ تنخواہ نہ دینا

سوال [۸۵۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدرسین حضرات دینی مدرسوں میں تعلیم دے رہے ہیں اور دیتے چلے آئے ہیں اور تعلیم دیتے رہیں گے؛ لہٰذا مدرس کو کمیٹی والے حضرات جب معلم کی حیثیت سے مدرسہ میں رکھتے ہیں تو مدرس سے کچھ شرائط رکھتے ہیں کہ ہماری یہ شرائط ہیں، مثلاً ٹائم کی پابندی کرنا یا چندہ کرنا یا کرانا، کہنا ضروری یہ ہے کہ کمیٹی والے حضرات نے مدرس کو رکھا جو شرائط اوپر کی عبارت میں درج ہیں وہ شرائط طے پائیں، ان شرائط میں مدرس صرف ایک شرط ادا کرسکا، چندہ کے بارے میں مدرس سے شروع میں پوچھا تھا کہ آپ کتنا چندہ کرسکیں گے؟ مدرس نے کہا تھا کہ میں صرف پینتالیس سو روپیہ کا چندہ کرسکتا ہوں، بہرحال مدرس نے صرف تعلیم ہی سہی وقت پر بچوں کو دیتے رہے، چندہ کسی مجبوری میں اگر نہ کرسکا یہاں تک کہ رمضان شریف میں ہر سال قرآن شریف نماز تراویح میں پڑھتا تھا، قرآن شریف بھی نہ پڑھا، کمیٹی نے مدرس کو رکھتے وقت یہ کہا تھا کہ اس وقت ہمارے پاس پیسہ نہیں ہے، رمضان میں چندہ ہوگا آپ کی تنخواہ مل جائے گی، کچھ آپ کریں گے اور کچھ ہم کریں، یا مدرس نے یہ بھی کہہ دیا کہ میں دس ہزار پندرہ ہزار کا چندہ دوں گا، وہ مجبوری میں ایسا گھرا کہ وہ چندہ بالکل نہ کرسکا، تو آیا اس

صورت میں مدرس کوتنخواہ کمیٹی دے یا نہ دے؟ کمیٹی کوتنخواہ روکنی جائز ہے یا ناجائز؟ مدرس کا دارومدار تنخواہ پر ہی ہے، چھ ماہ کی تنخواہ کمیٹی پر ہے، جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد عمران سرسواں دوراہہ کاشی پورروڈ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بوقت تقرریہ کہنا کہ اس وقت مدرسہ میں پیسہ نہیں ہے رمضان میں چندہ بھی کرنا پڑے گا، جیسا کہ سوال نامہ سے واضح ہے، ۴۵۰۰؍ کی ہمت ظاہر کی ہے یہ بھی سوال سے واضح ہے اوراس طرح کے شرائط اکثر مدارس کے اندر مدرسین کے تقرر کے وقت لگائے جاتے ہیں؛ لیکن اس طرح کے شرائط باوجودیکہ مدارس اسلامیہ میں متعارف ہیں؛ لیکن مدارس اسلامیہ کے اندر یہ بھی متعارف ہے کہ اگرکوئی شخص خاص مجبوری یا پریشانی کی وجہ سے چندہ نہ کرسکے تو اس کی اصل تنخواہ نہیں کاٹی جاتی، ہاں البتہ مدرسہ میں پیسہ نہ ہونے کی صورت میں تنخواہوں کی ادائے گی میں تاخیر ہوجاتی ہے؛ اس لئے سوال نامہ میں درج کردہ صورت میں مدرس چندہ نہ کرنے کی وجہ سے تنخواہ سے محروم نہ ہوگا، وہ پوری تنخواہ کا مستحق ہے؛ البتہ مدرسہ میں پیسہ نہ ہونے کی صورت میں کچھ تاخیر ہوسکتی ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۷/ ۲۸۴، امدادالفتاویٰ ۳/ ۳۶۱)

عن عبداللّٰہ بن عمرو بن عوف المزني، عن أبیه، عن جدہ أن رسول اللّٰہ ﷺ قال: الصلح جائز بین المسلمین إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون علی شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.

(سنن الترمذي، أبواب الأحکام، باب ما ذکر عن رسول اللّٰہ ﷺ في الصلح بین الناس، النسخة الهندیة ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲، المعجم الکبیر للطبراني، دار إحیاء التراث العربي بیروت ۱۷/ ۲۲، رقم: ۳۰، سنن الدارقطني، کتاب البیوع، دارالکتب العلمیة بیروت ۳/ ۲۳، رقم: ۲۸۶۹، المستدرك للحاکم، کتاب الأحکام، مکتبه نزار مصطفی الباز، بیروت ۷/ ۲۵۲۳، رقم: ۷۰۵۹، قدیم ۴/ ۱۰۱) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ ربیع الاول ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۱۱۶)

مقررہ وقت میں کام کرنے پر تنخواہ کا استحقاق اور کوتاہی پر برطرف کرنا

سوال [۸۵۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک دینی تعلیمی ادارہ جس کے بعض مدرسین کی تنخواہ حکومت دے رہی ہے۔ اور بعض مدرسین کی تنخواہ مجلس منتظمہ بذریعہ عوامی امداد ادا کرتی ہے۔ سرکار کے ذریعہ تنخواہ پانے والے مدرسین میں ایک حافظ بھی ہے، جو قرآن پاک کو بھلا چکا ہے، ادارہ کے ناظم نے بارہا کوشش کی کہ وہ قرآن پاک کو پھر سے یاد کرلے؛ لیکن حافظ مذکور مسلسل آٹھ سالوں سے قرآن پاک کو پھر سے یاد کرلینے کی مہلت لیتا رہا، پھر بھی وہ اپنی یادداشت کو بحال نہ کرسکا، نتیجتاً مروجہ حفظ بے جان ہوکر رہ گیا ہے اور حافظ کی پیداوار لمبی مدت سے بند ہے، جب کہ ہندوستان جیسے آفت زدہ ملک میں حافظ کی پیداوار بہت ضروری ہے اور ہمارا قصبہ اور علاقہ دیندار حافظ سے محروم ہی ہے۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ حکومت حافظ کے عہدہ کے لئے رقم دیتی ہے اور شخص مذکور حافظ رہا نہیں اور اپنے عہدہ کو چھوڑنے کے لئے قطعی تیار نہیں ہے، مدرسین کی تقرری اور برخواستگی کا کلی اختیار ادارہ کے ناظم انتظامیہ کو حاصل ہے، مذکورہ عہدہ کو خالی کراکر باصلاحیت حافظ کی بحالی کی غرض سے جب شخص مذکور کی برخواستگی کی کارروائی شروع کی جاتی ہے، تو لوگوں سے اپنی روزی روٹی کے لئے ہنگامہ کرواتا ہے اور ہتھیار اٹھانے کی دھمکی دیتا ہے، اس طرح دینی تعلیم کا ایک اہم شعبہ اس ادارہ میں زندہ نہیں ہو پا رہا ہے، تو کیا مذکورہ صورت میں حکومت کے ذریعہ حافظ کے عہدہ کے لئے ادارہ کو دی گئی رقم شخص مذکور کو دینا لینا شرعاً درست ہے؟

المستفتی: عبدالغفار سیتامڑی، بمعرفت سجاد حسین دارالعلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب وہ مفوضہ وقت میں کام کرے گا تو طے شدہ تنخواہ کا مستحق ہوجائے گا؛ لیکن ذمہ داری میں ناکامی کی صورت میں ذمہ داران مدرسہ کو برطرف

کرنے کا حق ہوسکتا ہے، مگر جب تک کام کرتا رہے گا تنخواہ مذکورہ کا مستحق رہے گا۔

عن عمرو بن يحيى المازني، عن أبيه أن رسول الله ﷺ قال: لا ضرر ولا ضرار. (موطا إمام مالك، كتاب القضاء، القضاء في المرفق، أشرفي ديوبند ٣١١)

لا يضر الرجل أخاه ابتداء ولا جزاء. الخ (الأشباه، قديم، ص: ١٣٩)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ رمضان ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۳۶۸۱)

مدارس ومساجد کے ملازمین کا سرکاری تنخواہ لینا

سوال [۸۵۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بہت سے اسکولوں، مدارس ومساجد کو تنخواہ سرکار دیتی ہے، اس کا لینا کیسا ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سرکار تو سود لیتی ہے، اور وہی سود تنخواہ میں ملا کر دیتی ہوگی، تو گویا سود لیا گیا پھر جب وہ اسکول ومدارس ومساجد والے اپنی واجبی ماہانہ تنخواہ لینے کے لئے متعلقہ سرکاری دفتر میں جاتے ہیں تو وہ ان سے رشوت لیتے ہیں، بغیر اس کے دیتے ہی نہیں، تو یہ رشوت دینا اور پھر اس میں سود کی رقم لینا جائز ہے یا نہیں؟ کوئی گنجائش ہے یا نہیں؟

المستفتی: قمر الدین، مدرسہ قاسمیہ عربیہ جامع مسجد نگینہ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سرکاری تنخواہ مساجد ومدارس کے لئے لینا اس وقت جائز ہے جب کہ سرکاران لوگوں پر اپنا تسلط وغلبہ نہ جمائے۔ اور اگر تنخواہ لینے کے لئے سرکاری دفتروں میں رشوت وغیرہ دینی پڑتی ہے تو ایسی صورت میں ارتکاب حرمت کی وجہ سے لینا جائز نہ ہوگا۔ اور آج کل مدارس ومساجد کا سرکار سے ملحق کرنا ہرگز مناسب نہیں ہے۔ (مستفاد: نظام الفتاوی ۲/ ۳۷۵)

عن عبدالله بن عمرو قال: لعن رسول الله ﷺ الراشي والمرتشي. (سنن أبي داؤد، كتاب القضاء، باب في كراهية الرشوة، النسخة الهندية ۲/ ۵۰۴، دارالسلام، رقم: ۳۵۸۰، مسند أحمد بن حنبل ۲/ ۱۶۴، رقم: ۶۵۳۲)

قال الفقيه أبو الليث: اختلف الناس في أخذ الجائزة من السلطان، قال بعضهم: يجوز ما لم يعلم أنه يعطيه من حرام، قال محمد رحمه الله تعالىٰ: وبه نأخذ ما لم نعرف شيئا حراما بعينه، وهو قول أبي حنيفة رحمه الله تعالىٰ وأصحابه. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الثاني عشر في الهدايا والضيافات، زكريا قديم ۵/ ۳۴۲، جديد ۵/ ۳۹۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۴۷۵)

پرائیویٹ فنڈ کا حکم

سوال [۸۵۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک مدرسہ میں ملازم ہے اور تنخواہ سرکار سے ملتی ہے۔ اور قانوناً دس فیصد پرائیویٹ فنڈ کٹتا ہے اور فنڈ میں جمع ہوتا ہے، پھر سرکار اس دس فیصد پر مزید اضافہ کر کے دیتی ہے؛ لیکن زید اپنے اختیار سے مزید بیس یا پچیس فیصد پرائیویٹ فنڈ کٹواتا ہے اور سرکار اس پر بھی مزید اضافہ کے ساتھ رقم واپس دیتی ہے، تو سوال یہ ہے کہ دس فیصد جو قانوناً کٹتا ہے اس کا کیا حکم ہے؟ اور اپنے اختیار سے جو زیادہ کٹواتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ اور اس پر ملنے والی زائد رقم کا کیا حکم ہے؟ سود کے حکم میں داخل ہے یا نہیں؟ اور زید کا اپنے اختیار سے G.P.S زائد کٹوانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد طارق، مئو

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مدرسہ کے ملازم کی تنخواہ سے جو دس فیصد پرائیویٹ فنڈ کے نام سے سرکار کاٹ کر اپنے پاس جمع کرتی ہے اور اس پر مزید اضافہ کر کے ریٹائرڈ ہوتے وقت دیتی ہے، یہ اضافہ شرعاً سود نہیں ہے؛ اس لئے اس کا لینا جائز ہے۔ اور اپنے اختیار سے جو کٹواتے ہیں، اس کی دو شکلیں ہیں:

(۱) تنخواہ کے پیسے اپنے اختیار سے قبضہ میں آنے کے بعد از خود داخل کرے، اس پر ملنے والا اضافہ سود ہے، وہ جائز نہیں ہے۔

(۲) دوسری شکل یہ ہے کہ تنخواہ میں سے وہ حصہ اس کے ہاتھ نہیں آیا تو ملنے والا اضافہ جائز ہے؛ اس لئے کہ اس کے قبضہ میں آنے سے پہلے پہلے وہ مالک ہی نہیں ہوا ہے؛ اس لئے اصل اور اضافی دونوں قسم کی رقم پرائیویٹ فنڈ کے ہی حکم میں ہے، اس وجہ سے جائز ہے۔

(مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۱۵۲، پرائیویٹ فنڈ پر زکوۃ اور سود کا مسئلہ بحوالہ فتاوی عثمانی ۳/ ۳۰۷، ایضاح المسائل ص: ۱۰۷، کتاب المسائل ۲/ ۲۲۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۵)

بلا اجازت مدرسے سے جانے والے کی تنخواہ کا حکم

سوال [۸۵۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک مدرسہ میں استاذ تھا، اس نے ایک سال کے لئے رخصت بالوضع طلب کی؛ لیکن مدرسہ نے اس کی رخصت منظور نہیں کی؛ لیکن زید بلا منظوری ہی اپنی ضرورت سے چلا گیا؛ البتہ اسی دوران زید نے اسی مدرسہ کے لئے تقریباً ۷۰۰۰۰/ ہزار روپئے کا چندہ کیا، جس میں سے بقول زید آٹھ ہزار ایک سو اٹھاسی روپئے وصول نہ ہوئے اور پینتیس ہزار

روپئے یہ کہہ کر واپس لے لئے کہ مجھے ان کی ضرورت ہے، جب حساب ہوگا اس وقت دیکھا جائے گا، بعد ازاں مزید ۱۴۰۰۰/ ہزار روپئے قرض لئے ، پھر جب اہل مدرسہ نے پینتیس ہزار روپئے کی واپسی کا مطالبہ کیا تو زید نے جواب دیا کہ ۲۴۰۰۰/ ہزار روپئے کا میرا انعام بنتا ہے۔اور گیارہ ہزار سفر خرچ کے ہیں جو چندہ کی وصولیابی میں ہوا ہے،اس طرح پینتیس ہزار روپئے کا مطالبہ میری جانب نہیں ہے؛ لیکن زید سفر خرچ زبانی بیان کرتا ہے،تحریری طور پر نہیں دیتا، جب کہ مدرسہ کا تعامل سفر خرچ میں تحریری معتبر ہے،تا کہ رجسٹروں میں اندراج ہو سکے،

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

(۱) زید کا بلا اجازت مدرسہ سے جانا اور چندہ کی رقم میں انعام کا نفاذ ومطالبہ کیا زید کے لئے شرعی طور پر درست ہے؟ پھر کیا مہتمم کے لئے اس انعامی رقم کا دینا اور زبانی سفر خرچ منظور کرنا شرعاً درست ہے؟ لہٰذا زید پینتیس ہزار روپئے کے مطالبہ کی نفی جس شکل میں کرتا ہے، کیا وہ قابل تسلیم ہے؟

(۲) آٹھ ہزار ایک سو اٹھاسی کی رقم کس پر واجب الاداء ہے،زید پر یا چندہ دہندگان پر جیسا کہ زید کہتا ہے کہ یہ رقم مجھے ابھی وصول نہیں ہوئی ہے؛ لیکن زید اہل مدرسہ کو ان حضرات کا پتہ دینے پر آمادہ نہیں ہے؟

المستفتی: ڈاکٹر عبدالرؤف محلّہ دائم پورہ، ٹانڈہ، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب زید مدرسہ سے اجازت لئے بغیر ایک سال سے غائب ہوگیا، تو اس درمیان زید مدرسہ سے تنخواہ کا مستحق نہیں اور اس دوران جو اس نے ۷۰۰۰۰/ ہزار کا چندہ کیا ہے، وہ پوری رقم مدرسہ میں جمع کر دینا لازم ہے،اس کے بعد جتنے دن اس نے مدرسہ کا کام کیا ہے، اتنے دنوں تک کے لئے مدرسہ اس کو اجرت مثل دے گا اور اجرت مثل سے زائد کچھ بھی نہیں ملے گا، ہاں البتہ سارا پیسہ مدرسہ میں داخل ہونے کے بعد مدرسہ کی شوریٰ یا اس کے قائم مقام کمیٹی مدرسہ کی مصلحت ومفاد کو پیش نظر رکھ کر اس کی تنخواہ

کے ساتھ کچھ انعام بھی دے تو اس کی گنجائش ہے۔لیکن شوریٰ و کمیٹی کی منظوری واجازت کے بغیر جائز نہیں ہے، نیز جب کہ زید اجازت ومنظوری کے بغیر سفر میں چلا گیا ہے، تو وہ سفر خرچ کا مستحق نہیں ہے، ہاں البتہ شوریٰ یا کمیٹی اپنے مشورہ سے کوئی مناسب خرچ مدرسہ کی مصلحت کی بنا پر متعین کرے، تو اس کی گنجائش ہوسکتی ہے؛ اس لئے کہ مدرسہ کے ضوابط وقوانین کا مدار عرف اور ان شرائط پر ہے جو شوریٰ و کمیٹی نے متعین کی ہیں۔

عن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده أن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، هكذا في البخاري، كتاب الإجارة، تحت ترجمة الباب، أجر السمسرة، النسخة الهندية ١/ ٣٠٣، رقم: الباب: ١٤)

(۲) اور زید کا آٹھ ہزار ایک سو اٹھاسی کے بارے میں یہ کہنا کہ اتنی رقم وصول نہیں ہوئی یہ زید کی تنخواہ اور کارکردگی میں سے کاٹ کر اس وقت تک روک لیا جائے گا، جب تک کہ وہ پیسہ لاکر داخل دفتر نہ کردے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۵/ ذیقعدہ ۱۴۲۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۹۵۸)	۱۵/ ۱۱/ ۱۴۲۱ھ

مدرس کی تقرری کے بعد بلاعوض نگرانی پر مجبور کرنے کا حکم

سوال [۸۵۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک مدرسہ میں مدرس ہے اور درجہ حفظ میں بچوں کو پڑھاتا ہے، جب کہ زید مغرب کے بعد اور عشاء کے بعد اور فجر سے پہلے فجر کے بعد نگرانی کبھی کبھی نہیں کرتا ہے اور

کبھی کرتا ہے۔اور بکراس مدرسہ کا صدر مدرس ہے اور بار بار کہتا ہے کہ درجہ حفظ کے بچوں کے استاذ کو ان تینوں وقت کی پابندی ضروری ہے، جب کہ تقرر کے وقت ان تینوں وقت کی کوئی بات نہیں ہوئی ہے، اس پر زید کہتا ہے کہ میرا احسان ہے کہ یہ وقت مدرسہ میں دے رہا ہوں، ورنہ میری اس وقت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، بکر کا کہنا ہے کہ ان تینوں وقت کی پابندی ضروری ہے، زید کا کہنا ہے کہ میری یہ ذمہ داری نہیں ہے، اس مسئلہ میں مدرسہ کا کیا اصول ہے وضاحت فرمائیں؟ کیا زید کو ان تینوں اوقات کی پابندی ضروری ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عبداللہ ٹھاکردوارہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب تقرر کے وقت تینوں اوقات کی نگرانی کرنے کا کوئی تذکرہ اور صراحت نہیں ہے، تو ان اوقات کی نگرانی پر مجبور کرنا ناانصافی ہے اور ہمارے مدرسہ شاہی میں اصول یہ ہے کہ حفظ کے اساتذہ مغرب سے عشاء تک اور فجر کے بعد نگرانی کرتے ہیں؛ لیکن اس کا الگ سے انہیں معقول معاوضہ دیا جاتا ہے؛ اس لئے اگر آپ کے مدرسہ میں کوئی ایسا اصول نہیں ہے اور تینوں اوقات کی نگرانی بھی کرانا چاہتے ہیں، تو پھر آپ کو انہیں الگ سے الاؤنس دینا چاہئے اور مدارسِ اسلامیہ کے قوانین وضوابط کا دارومدار درج ذیل حدیث پر ہے:

عن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده أن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.

(سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي بيروت ١٧/ ٢٢، رقم: ٣٠، سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب

العلمية بيروت ٣/ ٢٣، رقم: ٢٨٦٩، المستدرك للحاكم، كتاب الأحكام، مكتبه نزار مصطفى الباز، بيروت ٧/ ٢٥٢٣، رقم: ٧٠٥٩، قديم ٤/ ١٠١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰ ؍صفر ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۹۱۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۲/۱۱ھ

حج کو جانے والے مدرس کے لئے رخصت بالوضع کا حکم

سوال [۸۵۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص مدرسہ کا ملازم ہے اور فریضۂ حج کے لئے سفر میں جارہا ہے، اس صورت میں رخصت اس کو مدرسہ دے گا یا بالوضع رخصت استاذ لے گا، تفصیل کے ساتھ شریعت کی روشنی میں جواب مرحمت فرما دیا جائے۔

المستفتی: عبدالرحمٰن، ٹانڈہ رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایک دفعہ حج کو جانے کے لئے منجانب مدرسہ رخصت دینا متعارف ہے؛ اس لئے رخصت منجانب مدرسہ سمجھی جائے گی اور جن مدارس میں رخصت کی صراحت نہ ہو ان کو بھی عرف کی وجہ سے انہیں مدارس پر قیاس کیا جائے گا، جن میں منجانب مدرسہ حج فرض کی رخصت دی جاتی ہے؛ لہٰذا حج فرض کی رخصت کو رخصت بالوضع قرار نہ دیا جائے۔ اور مدارسِ اسلامیہ کے قوانین وضوابط اس حدیث سے مستنبط ہیں۔

عن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده أن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.

(سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢)

ومنها: البطالة في المدارس كأيام الأعياد ويوم عاشوراء، وشهر رمضان في درس الفقه لم أرها صريحة في كلامهم، والمسئلة على وجهين، فإن كانت مشروطة لم يسقط من المعلوم شيء، وإلا فينبغي أن يلحق ببطالة القاضي إمام يترك الإمامة لزيارة أقربائه في الرساتيق أسبوعا، أونحوه، أو لمصيبة، أو لاستراحة لا بأس به، ومثله عفو في العادة والشرع.

(الأشباه والنظائر، قديم ۱/ ۱۵۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/۱۱/۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۳۹۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸/۱۱/۱۴۲۲ھ

گورنمنٹ سے روپیہ لے کر مدرسین کو تنخواہ دینا

سوال [۸۵۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: حکومت تعلیمی امداد کے نام پر جو روپئے مدرسہ کو دیتی ہے اور جسے عرف عام میں ایڈ کہا جاتا ہے، اس کا لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور کیا اس کے عدمِ جواز کی دلیل صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ چونکہ یوپی کے مدارس ایڈ نہیں لیتے، مثلاً مدرسہ شاہی مرادآباد، مظاہر علوم سہارنپور، دارالعلوم دیوبند وغیرہ ایڈ نہیں لیتے؛ اس لئے ہمیں بھی لینا جائز نہیں ہے، جب کہ صحیح صورت حال یہ ہے کہ ایڈ لینے سے قبل ہمارے علاقہ کے مدارس میں اتنی قلیل اور معمولی تنخواہ ہوتی تھی جو کسی طرح بھی کافی اور تسلی بخش نہیں کہی جاسکتی، اس کے برعکس مذکورہ بالا مغربی مدارس میں اس وقت بھی تنخواہیں انتہائی مناسب اور اطمینان بخش ہوتی تھیں، جس کے سبب ایک مدرس ہر طرف سے فارغ البال ہوکر یکسوئی کے ساتھ کام کرتا، ادھر کچھ سالوں سے یہ مشرقی مدارس سرکار سے ایڈ لینے لگے ہیں، جس کے طفیل مدرسین کے اندر فرائض منصبی کو بحسن خوبی انجام دینے کے لئے ایک گونہ سکون میسر ہوگیا ہے اور بڑی حد تک دینی تعلیم کی

طرف سے پرانی بے توجہی دور ہوگئی ہے، لوگ شوق سے اپنے بچوں کو پڑھانے بھی لگے ہیں، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایڈ لینا، اسی طرح مدرسہ کے لئے مصرف میں خرچ کرنا اوراس سے مدرسین کو تنخواہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: ظہیرالحق نعمانی، کوپا گنج اعظم گڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگرحکومت مدرسہ میں کسی بھی وقت دخل نہ دینے کا وعدہ کرے اورارباب مدرسہ کوبھی اس بارے میں اطمینان ہو، تو گورنمنٹ سے ایڈ لینا اوراس کو تنخواہوں اور دوسری ضروریات میں صرف کرنا درست اور جائز ہے، ورنہ احتراز لازم ہے۔ (مستفاد: امدادالفتاوی ۴/ ۷۷، کفایت المفتی قدیم ۷/ ۱۰۱، جدیدزکریا مطول ۱۰/ ۴۷۹، فتاوی مظاہر علوم ۱/ ۱۷۴، نظام الفتاوی ۲/ ۳۷۴)

قال الفقیه أبو اللیث: اختلف الناس في أخذ الجائزة من السلطان، قال بعضهم: یجوز ما لم یعلم أنه یعطیه من حرام، قال محمد رحمه الله تعالیٰ: وبه نأخذ ما لم نعرف شیئا حراما بعینه، وهو قول أبي حنیفة رحمه الله تعالیٰ وأصحابه. (هندیة، کتاب الکراهیة، الباب الثاني عشر في الهدایا و الضیافات، زکریا قدیم ٥/ ٣٤٢، جدید ٥/ ٣٩٦) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/۵/۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۱۲۱۴)

بمد تعمیر رقم کو تنخواہ میں استعمال کرنا

سوال [۸۵۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مدرسہ میں صدر مدرس اور معاون صاحب نے ناظم مدرسہ کی اجازت کے

بغیر بمد تعمیر رقم کو تنخواہ میں استعمال کرلیا، ناظم صاحب کے استفسار پر ان لوگوں نے غلطی کا اقرار کیا، معافی کے طالب ہیں، ایسی صورت میں حکم شرعی کیا ہے؟ بینوا توجروا

المستفتی: فیض الحسن، ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر تعمیر کی رقم کو مد تنخواہ میں خرچ کردیا ہے، تو ایسی صورت میں مذکورہ صدر مدرس اور معاون کو تصرف میں خائن شمار کیا جائے گا؛ لیکن چونکہ مد تعمیر اور تنخواہ دونوں از قبیل امداد ہیں اور مذکورہ صدر مدرس اور معاون نے اپنی ذات میں خرچ نہیں کیا ہے؛ بلکہ ایک مصرف کی چیز کو دوسرے مصرف میں خرچ کرنے میں بدنظمی اور بددیانتی کا ثبوت دیا ہے؛ اس لئے اپنی جیب سے تاوان ادا کرنا لازم نہ ہوگا، ہاں البتہ ناظم صاحب اور اعلیٰ ذمہ داروں کو انہیں صدارت اور معاونت سے سبکدوش کرنے کا حق ہے؛ لیکن جب وہ معافی کے طلب گار ہیں تو ''التائب من الذنب کمن لا ذنب له''. **الحديث** (ابن ماجة، أبواب الزهد، باب ذكر التوبة، النسخة الهندية/ ٣١٣، دارالسلام، رقم: ٤٢٥٠) کی رو سے انہیں در گذر کردینا چاہئے، نیز یہ بھی لازم ہے کہ مد تنخواہ میں سے اتنی رقم جتنی تنخواہ میں خرچ کی گئی ہے مد تعمیر میں منتقل کردی جائے، تاکہ دینے والے کی غرض کے مطابق مقصد میں خرچ ہوسکے۔ ''البحر الرائق'' کی ذیل کی عبارت سے یہ مسئلہ مستفاد ہوتا ہے:

ولو جمع مالا لينفقه في بناء المسجد، فأنفق بعضه في حاجته، ثم رد بدله في نفقة المسجد لا يسعه أن يفعل ذلک، فإذا فعله وكان يعرف صاحبه ضمن له بدله، أو استاذنه في صرف عوضه في المسجد، وإن كان لا يعرفه، رفع الأمر إلى القاضي ليأمره بإنفاق بدله فيه، وإن لم يمكنه الرفع إليه قالوا: نرجوا له في الاستحسان الجواز إذا أنفق مثله في المسجد يخرج عن العهدة فيما بينه وبين الله تعالىٰ. (البحر الرائق، كتاب الوقف، فصل في أحكام المساجد، زكريا ٥/ ٤٢٠، كوئٹه ٥/ ٢٥١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰ رجمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۹۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۵/۳۰ھ

غیر حاضری کی تنخواہ کا حکم

سوال [۸۵۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عمر ایک مسجد میں امامت اور اسی مسجد میں مکتب میں مدرس ہے، تقریباً دو سال سے ذمہ دار مکتب ان کی تدریسی ذمہ داری سے مطمئن نہیں ہیں، گذشتہ شعبان میں سالانہ امتحان کے نتیجہ کے بعد مکتب کے مدرس کو علیحدہ کر دیا گیا، عمر (امام صاحب) اس کے بعد چالیس روز کے لئے جماعت میں چلے گئے اور عید کے بعد امام صاحب عمر نے اپنے دوبارہ مکتب میں مدرس ہونے کے لئے کچھ لوگوں کو ہموار کیا، لوگوں نے جب محسوس کیا کہ اگر ان کو مدرس نہ بنایا گیا تو ہم لوگوں میں اختلاف ہوجائے گا؛ لہٰذا امام صاحب عمر کو پھر نئی شرائط کے ساتھ مدرس کے طور پر تقرر کرلیا گیا؛ لیکن عمر امام صاحب تقریباً ڈیڑھ ماہ جو بقول ذمہ دار مکتب مکتب سے علیحدگی کے تئیں ان ایام کی تنخواہ کا مطالبہ کررہے ہیں، جب کہ مہتمم صاحب ان سے یہ کہہ رہے ہیں کہ میں تو ان کو شعبان میں علیحدہ کر چکا ہوں؛ لہٰذا دوبارہ تقرر کی مدت تک کی تنخواہ مکتب ادا نہیں کرے گا، اس تنخواہ کے سلسلہ میں کیا مسئلہ ہے؟ کیا ان کو دی جائے یا نہیں؟

المستفتی: امداد حسین ڈپٹی گنج، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدارس، مکاتب، مساجد کی ملازمت کے شرائط آپس کی تراضی سے جو طے ہوجائیں وہی معتبر ہیں۔ اور ان کا ضابطہ اور اصول اس حدیث پاک سے ثابت ہے:

عن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده أن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.

(سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢)

معلوم ہوا کہ یہ بات حدیث سے ثابت ہے۔ واضح رہے کہ مدرسہ سے مذکورہ امام کو علیحدہ کردیا گیا ہے، اس کے بعد وہ جماعت میں چلا گیا ہے، اور پھر نئی تقرری کے بعد جماعت میں جانے کے درمیان کی غیر حاضری کی مدت کی تنخواہ کا مطالبہ کرنا یہ ان کی طرف سے ناجائز مطالبہ ہے، ذمہ داران اس مدت کی تنخواہ دینے کے مکلّف نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ رشوال ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۷۹۸)

مدرس کے ایام مرض کی تنخواہ ومجلسِ شوریٰ کی شرعی حیثیت

سوال [۸۵۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گزارش خدمت عالیہ میں یہ ہے کہ ہمارے یہاں ایک دینی قومی مدرسہ ہے، ہم چاہتے ہیں کہ اس کا ایک دستور بن جائے جو خلاف شرع نہ ہو؛ اس لئے چند سوالات درج ذیل ہیں، ان کے کافی شافی شرعی احکام بتا کر عند اللہ ماجور ہوں۔ سوالات یہ ہیں:

(۱) مدرسہ کے کسی عامل کو اس کی بیماری کی وجہ سے غیر حاضری کے ایام کی تنخواہ کا شرعاً استحقاق ہوگا یا نہیں؟

(۲) متفقہ طور پر یا اکثریت سے کسی کو ایسے حالات کی تنخواہ دی جائے تو یہ شرعاً درست ہوگا یا نہیں؟

(۳) کہیں کہیں ایک مہینہ یا ڈیڑھ مہینہ کی تنخواہ دینے کا دستور بنایا تو یہ جائز ہوگا یا نہیں؟

(۴) مجلس شوریٰ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

(۵) مالیات میں ان کو کہاں تک تصرف کا حق حاصل ہے؟

(۶) مجلس شوریٰ عند اللہ ماجور یا ماخوذ یا جوابدہ ہوگی یا نہیں؟

نوٹ:- حتی الامکان جلد جواب مل جائے تو عین نوازش ہوگی۔ گستاخی معاف فرمائیں۔

المستفتی: بندہ عبد اللطیف، خادم مدرسہ مرکز العلوم، ضلع کریم گنج، آسام

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) مہتمم چندہ دہندگان کی طرف سے وکیل ہوتا ہے اور وکیل کو جس تصرف کی اجازت دی جائے اس میں تصرف کرسکتا ہے، اس کے علاوہ میں نہیں، اگر چندہ دہندگان کی طرف سے صراحتاً یا دلالۃً اختیار ثابت ہوجاتا ہے اور تقرر کے وقت ملازم کے ساتھ یہ شرط ٹھہرائی گئی ہے، تو ایام بیماری کی تنخواہ مہتمم کو دینا اور ملازم کو لینا دونوں جائز رہے گا، ورنہ نہیں۔ (مستفاد: امدادالفتاوی ۳/۳۴)

(۲) سوال نمبر ۱ ر کے جواب کی شرائط کے ساتھ گنجائش ہے ورنہ نہیں۔

(۳) چندہ دہندگان کی رضا سے ایسا قانون بنالینا درست ہے۔

الوكيل إنما يستفيد التصرف من الموكل وقد أمره بالدفع إلى فلان فلا يملك الدفع إلى غيره. (شامي، كتاب الزكوة، مطلب في زكوة ثمن المبيع وفاء كراچی ۲/ ۲٦۹، زكريا ۳/ ۱۸۹)

شرط الواقف كنص الشارع في وجوب العمل به، وفي المفهوم والدلالة. (قواعد الفقه، أشرفي ديوبند/ ۸٥، رقم: ۱٥۲)

أنهم صرحوا بأن مراعاة غرض الواقفين واجبة. (كتاب الوقف، مطلب مراعاة غرض الواقفين واجبة، كراچی ٤/ ٤٤٥، زكريا ٦/ ٦٦٥)

(۴) مجلسِ شوریٰ کو اقتدار اعلیٰ کی حیثیت حاصل ہے، تفسیر ''البحر المحیط'' میں ''شاورہم فی الامر'' الآیۃ کے تحت لکھا ہے کہ شوریٰ شریعت اور دین کے قواعد اور بنیادی اصولوں میں سے ہے، جو امیر یا ذمہ دار اہل علم اور اہل دین سے مشورہ نہ لے اس کو معزول کرنا واجب ہے، یہ بالاتفاق مسئلہ ہے۔

(۵) مالیات میں جواب نمبر: ۱ ر کی شرائط کے مطابق اختیار حاصل ہوگا۔

(٦) جواب نمبر ۱ ر کی شرائط کی موافقت میں کوئی مواخذہ نہیں، مخالفت میں عنداللہ مواخذہ ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰ ر شوال ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۲٦۹)

علالت کے زمانہ کی تنخواہ

سوال [۸۵۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں مدرسہ میں فراہمی مالیہ کے سلسلہ میں اصول وضابطہ مدرسین کے لئے یہ ہے کہ اگر رمضان میں کوئی مدرس اطراف مدرسہ میں وصولی کا کام کرتا ہے، تو اپنی تنخواہ کا بارہ گنا کرنے پر ڈبل تنخواہ کا مستحق ہوتا ہے، مزید پر پانچ فیصد کا انعام اور غیر معروف جگہ پر ڈبل تنخواہ پانے کے لئے اپنی تنخواہ کا دس گنا کرنا لازمی ہے، مزید پر پانچ فیصد کا انعام، مدرسہ ہذا میں دو بھائی ملازم ہیں، دونوں بھائیوں نے اپنی محنت سے مدرسہ کا ایک میدان بنایا، اتفاق سے ایک سال رمضان میں ایک بھائی کی طبیعت شدید خراب ہوئی، سفر کرنا ممکن نہ رہا، تو مہتمم صاحب کے حکم سے دوسرے بھائی نے اپنے اور بھائی کے علاقہ میں مکمل کام کیا، مہتمم مدرسہ ہذا نے یہ حکم فرمایا کہ بیمار بھائی کے علاقہ میں آپ رسید انہیں کے نام سے بنائیں اور بقلم لکھ کر اپنا نام لکھ دیں، تا کہ تنخواہ وانعام ان بیمار بھائی کے نام پر چڑھے اور ان کو احساس نہ ہو؛ کیوں کہ علاقہ انہیں کا بنایا ہوا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، بوقت حساب ایک پرانے مدرسہ کے ملازم محرر صاحب کا کہنا ہے کہ ایسا نہیں ہوگا؛ بلکہ جس نے کام کیا ہے صرف اس کو تنخواہ وانعام ملے گا، بیمار کو کچھ نہ ملے گا؛ کیوں کہ دونوں کو ملنے کی صورت میں ایک ہزار روپئے مدرسہ سے زائد جاتے ہیں۔ اور ایک کو ملنے کی صورت میں کم جاتے ہیں۔ بتلایئے محرر صاحب کا مہتمم صاحب کے سامنے یہ اشکال صحیح ہے، جب کہ یہ سب کچھ مہتمم صاحب کی صواب دید سے ہوا؟ اور شوریٰ کی طرف سے مہتمم صاحب بااختیار ہیں، شرعاً قانوناً معاملۃً رہنمائی فرما کر ممنون فرمائیں۔

المستفتی: صدر مدرس محمد سلیمان مصباح الظفر، ڈھکہ حسن پور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اکثر مدارسِ اسلامیہ کا یہ دستور ہے کہ بیمار ملازم کو اس کی

تنخواہ دی جاتی ہے؛ لہٰذا جو بھائی بیمار ہوگئے، ان کو مدرسہ کی جانب سے صرف تنخواہ ملے گی، مزید رقم یا انعام کچھ بھی نہیں ملے گا اور دوسرے بھائی جو پورا کام کئے ہیں ان کو تنخواہ مزید رقم اور انعام سب ملیں گے، اور بیمار بھائی کے علاقہ سے جتنی رقم لائے ہیں سب میں پانچ فیصد کے حساب سے اس کا رکن بھائی کو ملے گا اور محرر صاحب کا یہ اشکال کہ بیمار بھائی کو تنخواہ پر مزید رقم اور انعام دینے پر مدرسہ کا پیسہ زائد جائے گا جس کا وہ مستحق نہیں بجا ہے، انعام اور مزید رقم صرف اسی شخص کو ملے گی جو رقم لایا ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۵/ ۲۶۵، جدید ڈابھیل ۱۵/ ۲۶۵)

إن العقد وقع على عملها فلا تستحق الأجر بعمل غيرها كمن استاجر أجيرا ليعمل بنفسه، فأمر غيره فعمل لم يستحق الأجرة. (بدائع الصنائع، كتاب الإجارة، باب استحقاق الأجرة، زكريا ديوبند ٤/ ٧١)

قال: الأجرة لا تجب بالعقد، وتستحق بإحدى معاني ثلاثة: إما بشرط التعجيل، أو بالتعجيل من غير شرط، أو باستيفاء المعهود عليه. (هداية، أشرفي ديوبند ٣/ ٢٩٤)

أمور المسلمين محمولة على الصلاح والسداد ما أمكن. (بدائع الصنائع، كتاب الصلح، فصل في الشرائط التي ترجع إلى المصالح، زكريا ٥/ ٥٢)

عن كثير بن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني عن أبيه، عن جده أن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۲۸۲)

بیماری کے ایام میں گھر پر رہتے ہوئے تنخواہ لینے کا حکم

سوال [۸۵۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک ادارہ میں کام کرتا ہے اور مدت مدیدہ تک خدمات انجام دیتے رہے، مگر اب پیر میں چوٹ لگ جانے اور ہڈی ٹوٹ جانے کی وجہ سے کام سے معذور ہو گئے، جس کی وجہ سے ایک ماہ کی رخصت باتنخواہ حسب دستورادارہ ناظم ادارہ کی منظوری پر دی گئی، اس کے بعد دستور ادارہ کے مطابق مجلس شوریٰ نے دو ماہ کی رخصت باتنخواہ کی منظوری کا مشورہ دیا اوران کو دونوں مہینوں کی تنخواہ دی گئی، دستورادارہ میں شوریٰ کو اختیار ہے کہ کسی ملازم ادارہ کو بوجہ بیماری یا کسی معذوری کی بنا پر رخصت باتنخواہ کی منظوری کا مشورہ دے دے، مگر اس میں اس بات کی صراحت نہیں ہے کہ کتنی مدت تک ایسی منظوری دی جاسکتی ہے؛ لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ از روئے شرع ایسے شخص کو جو ادارہ کے کار مفوضہ سے معذور ہو گیا ہو، کب تک رخصت با تنخواہ دی جاسکتی ہے؟ اور جو اس شخص کو تنخواہ دی گئی، اس کا دینا درست تھا یا نہیں؟

المستفتی: محمد عبدالرحمٰن، مجلس دعوۃ الحق ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کے مدرسہ کا جو قانون ودستور ہے اس کے مطابق عمل ہوگا؛ لہٰذا جتنے ایام کی رخصت بیماری باتنخواہ دئے جانے کا قانون ہے یا مجلسِ شوریٰ جتنے ایام کی رخصت منظور کرے ان کی تنخواہ لینا شرعاً جائز اور درست ہے؛ اس لئے مجلسِ شوریٰ کے مشورہ سے پچھلی جو تنخواہ دی جا چکی ہے وہ شرعاً جائز اور درست ہے۔ اور آئندہ کے لئے مجلس شوریٰ جو درحقیقت مدارسِ اسلامیہ کے حق میں مجلسِ قانون ساز ہے، اس کے مشورہ کے مطابق عمل کرنا جائز ہوگا۔ اور مدارسِ اسلامیہ کے حق میں قوانین وضوابط، بخاری وترمذی کی اس حدیث شریف سے مستنبط ہوتے ہیں:

عن عبداللّٰه بن عمرو بن عوف المزني عن أبيه، عن جده أن رسول

الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲، صحيح البخاري، كتاب الإجارة، تحت باب أجر السمسرة ۱/ ۳۰۳، رقم الباب: ۱٤)

بخلاف ما إذا لم يقدر لكل يوم مبلغا، فإنه يحل له الأخذ، وإن لم يدرس فيهما للعرف. (شامي، كتاب الوقف، مطلب في استحقاق القاضي والمدرس الوظيفة في يوم البطالة، كراچی ٤/ ۳۷۲، زكريا ديوبند ٦/ ٥٦٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶؍محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۰۰۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱/۶ھ

اطلاعی نوٹس ۱۵؍ یوم قبل نہ دینے کی صورت میں تنخواہ کاٹ لینے کا حکم

سوال [۸۵۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج کل مدارسِ عربیہ میں جو مدرسین دینی وملی خدمات انجام دیتے ہیں، اراکین مدرسہ کسی مدرس کو مدرسہ سے سبکدوش کرتے ہیں، تو اس مدرس کو بذریعہ نوٹس علیحدگی کم از کم ۱۵/ یوم یا ایک مہینہ قبل اطلاعی نوٹس دیتے ہیں، یا وہ خود علیحدہ ہوتا ہے، تو نوٹس برطرفی کا خود دیتا ہے، تاکہ اراکین انتظام کرلیں، اس کے برخلاف کرنے پر مدرسہ والے مدرس کی ۱۵؍ یوم یا ایک ماہ کی تنخواہ کاٹ لیتے ہیں (دیتے نہیں ہیں) یا مدرس کو ۱۵؍ یوم کی تنخواہ دیتے ہیں، اس صورت میں مدرس کو ۱۵؍ یوم یا ایک ماہ کی تنخواہ لینا یا کمیٹی مدرسہ کا مدرس کی تنخواہ کاٹ لینا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اسی طرح اگر بغیر اطلاعی نوٹس دئے ہوئے علیحدہ ہوتا ہے یا علیحدہ کیا جاتا ہے، تو اس پر قانوناً چارہ جوئی کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: حافظ محمد شاکر، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جب آج کل مدارس میں نوٹس علیحدگی کے سلسلہ میں ایک ماہ یا پندرہ دن پہلے اطلاع دینا مشروط اور معروف ہے تو قاعدہ ’’المعروف کالمشروط‘‘ کے ہونے کی وجہ سے ذمہ دارانِ مدرسہ کے لئے طےشدہ شرط کے مطابق تنخواہ کا دے دینا اور کاٹ لینا دونوں جائز ہے۔ (امداد الفتاوی ۳/ ۳۴۹، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۲/ ۲۲۳، جدید ڈابھیل ۱۵/ ۵۳۲)

طے شدہ شرط کے خلاف قانونی چارہ جوئی جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ مدارس کے قوانین کا اعتبار عرف اور شرائط پر ہے؛ لہٰذا اسی کے مطابق عمل درآمد کرنا لازم ہوگا۔

الثابت بالعرف كالثابت بالنص. (رسم المفتي قديم ۳۸، قواعد الفقه، اشرفي ديوبند، ص: ۷٤، رسائل ابن عابدين، ثاقب بك ڈبو ديوبند ۱/ ٤٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ شعبان ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۱۶۴)

نصفِ شعبان میں معزولی کی وجہ سے رمضان کی تنخواہ کے استحقاق کا مسئلہ

سوال [۸۵۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مدرس نے پورے تین سال ایک مدرسہ میں کام کیا، ہر رمضان المبارک کی تنخواہ کام پر ڈبل وصول کی، پھر تیسرے سال جب سالانہ امتحان ہوجاتا ہے، تو پندرہ شعبان کو معزولی کی اطلاع یہ کہہ کر دی جاتی ہے کہ آپ کے اندر خامی ہے، پھر پورے شعبان کی تنخواہ دی جاتی ہے، جب کہ مہتمم مدرسہ سے درمیان سال میں مدرس خود کہہ دیتا ہے کہ تحقیق کر لیجئے، پھر معزول ہوجانے کے بعد دوسرے مدرسہ میں کام شروع کردیتا ہے، تو کیا مدرس شرع کے اعتبار سے رمضان کی سنگل تنخواہ کا مستحق ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ارشاد قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پندرہ شعبان کومعزولی کی صورت میں رمضان کی تنخواہ بھی دینا اگر اس مدرسہ کے قانون میں ہے تو رمضان کی تنخواہ کا استحقاق ہے۔ اور اگر مدرسہ کے قانون میں نہیں ہے، تو رمضان کی تنخواہ کا استحقاق نہیں؛ اس لئے کہ مدارس اسلامیہ کے قوانین وضوابط کا مدارس آپس کی شرائط کے مطابق ہے جو حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے:

عن عبداللّٰہ بن عمرو بن عوف المزني أن رسول اللّٰہ ﷺ قال: –إلی قولہ– والمسلمون علی شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.

(سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول اللّٰہ ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، صحيح البخاري، كتاب الإجارة، تحت باب أجر السمسرة ١/ ٣٠٣، رقم الباب: ١٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ ذی الحجہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۹۷۰)

پندرہ شعبان کو معزول مدرس رمضان کی تنخواہ کا مستحق کب؟

سوال [۸۵۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مدرس نے پورے تعلیمی سال از شوال تا شعبان پڑھایا، پھر سال کے اختتام پر جب سالانہ امتحان ہو جاتا ہے تو دس شوال تک کے دستخط تعطیل کئے جاتے ہیں، پھر پندرہ شعبان کو معزولی کی اطلاع دے کر پورے شعبان کی تنخواہ دی جاتی ہے، نیز اس سے قبل کام پر رمضان کی ڈبل تنخواہ اور نہ کرنے پر سنگل تنخواہ دی جاتی تھی، تو کیا اصول شرع کے اعتبار سے مدرس کو رمضان کی سنگل تنخواہ کے مطالبہ کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ارشاد قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شعبان سے دس شوال تک دستخط کرالینے کا قانون یا مصلحت کیا ہے، ہم کو سمجھ میں نہیں آیا؛ البتہ پندرہ شعبان کو معزولی کی اطلاع دے کر پورے شعبان کی تنخواہ دے دینا اگر وہاں کے قانون وضابطہ کے مطابق ہے، تو یہ جائز ہے۔ اور رمضان کی تنخواہ کے بارے میں اگر وہاں کا قانون یہ ہے کہ شعبان کے معزول شدہ ملازم کو رمضان کی بھی تنخواہ ملے گی تب تو اس قانون کے مطابق رمضان کی تنخواہ کا استحقاق ہے۔ اور اگر وہاں کا قانون ایسا نہیں ہے، یا قانون میں اس طرح کی صراحت نہیں ہے، تو ایسی صورت میں اس مدرس کو رمضان کی تنخواہ نہیں ملے گی؛ اس لئے کہ رمضان میں اس مدرس نے اپنا تقرر دوسرے مدرسہ میں کرالیا ہے، جیسا کہ استفتاء نمبر۲ر سے واضح ہے، ایسی صورت میں وہ حقیقتاً وحکماً دونوں اعتبار سے اس مدرسہ کا مدرس ہی نہیں رہا؛ اس لئے رمضان کی تنخواہ کا استحقاق بھی نہیں ہے۔

عن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني أن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲، صحيح البخاري، كتاب الإجارة، تحت باب أجر السمسرة ۱/ ۳۰۳، رقم الباب: ۱٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ر ذی الحجہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۶۹۷۱)

اضافی رقم کے حقدار ملازم ہیں نہ کہ مستعفی؟

سوال [۸۵۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: بارہ مدرسین جامعہ ہٰذا نے ایک درخواست تنخواہ کے اضافہ کے بارے میں انتظامیہ کو دی، ایک ماہ کے بعد پھر ایک درخواست دی کہ ہماری گرانی کو مدنظر رکھتے ہوئے اضافہ اگر سو روپیہ نہ کیا گیا تو ہم لوگ چھ صفر المظفر سے خدمت تعلیم سے قاصر رہیں گے، نائب مہتمم حاجی جمیل احمد صاحب نے کہا کہ تم لوگ تعلیم شروع کردو پرسوں تمہارا اضافہ جو کچھ کمیٹی کرے گی سامنے آجائے گا، مدرسین نے انکار کردیا اور کہا کہ جب نتیجہ سامنے آئے گا تب ہی کام کریں گے، حاجی صاحب نے یہ بھی کہا کہ اگر کام نہیں کروگے تو مشاہرہ کاٹوں گا، یہاں مدرسہ میں ہر سال اضافہ ہوتا ہے، اور اضافہ جب بھی ہو شوال سے شمار ہوکر اگلا پچھلا سب ملتا ہے، اضافہ پچاس روپیہ ہوا اور ان مشروط درخواست دہندگان کو چھ صفر المظفر سے الگ کردیا گیا، مدرسین کا کہنا ہے کہ ہم کو نتیجہ نو صفر کو سنایا گیا، ۹ر صفر تک تنخواہ مع اضافہ دے دی جائے، جو حکم شرع ہو مطلع کیا جائے، تاکہ اسی حساب سے مشاہرہ دے دیا جائے۔ فقط والسلام

المستفتی: محمد شفیع غفرلہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مدرسین کا مشروطاً استعفیٰ ۶ر صفر کا ہے اور فیصلہ نامہ ۹ر صفر کو سنایا گیا ہے، تو اگر نو صفر تک مدرسین نے خدمت کی ہے تو شرعاً ان کو ۹ر صفر تک کی تنخواہ ملے گی۔ اور اگر خدمت نہیں کی ہے تو ان ایام کی تنخواہ کے حق دار نہیں ہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/ ۳۴۸)

نیز مستعفی ہونے والے حضرات اضافہ کے مستحق نہیں ہیں؛ کیوں کہ جو اضافہ کیا جاتا ہے وہ آئندہ کام کرنے والوں کے لئے ہوتا ہے، اگرچہ پچھلا بھی ملتا ہو، نیز اضافہ جو کیا گیا وہ ان کی درخواست کے خلاف کیا گیا ہے؛ اس لئے یہ اضافہ شرعاً ان کے حق میں نہیں ہوگا۔

عن عبداللّٰہ بن عمرو بن عوف المزني عن أبیہ عن جدہ أن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: الصلح جائز بین المسلمین إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون علی شروطھم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.

(سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲)

الأجرة إنما تكون بمقابلة العمل. (شامي، كتاب النكاح، باب المهر، كراچی ۳/ ۱۵٦، زكريا ٤/ ۳۰۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲٦؍صفر المظفر ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲٦/ ۲۱۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲٦؍صفر المظفر ۱۴۱۱ھ

مستعفی کی ایک ماہ کی تنخواہ ضبط کرنے کا حکم

سوال [۸۵۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک مدرسہ میں پڑھا رہا تھا، اس نے ایک سال کے بعد استعفیٰ دے دیا، جب استعفیٰ دیا تو ذمہ دارانِ مدرسہ نے یہ کہہ کر ایک ماہ کی تنخواہ ضبط کر لی کہ ہمارے ضابطے اور قانون میں یہ لکھا ہوا ہے کہ استعفیٰ دینے سے ایک ماہ قبل اطلاع ضروری ہے، ورنہ ایک ماہ تنخواہ نہیں دی جائے گی۔ اور اب استعفیٰ دیتے وقت قانونچہ کھول کر دکھایا بھی واقعی لکھا بھی ہے؛ لیکن زید کا کہنا ہے کہ حضور والا بندہ اس ضابطہ کا پابند اس وقت ہوسکتا جب آپ نے بوقت تقرری یہ سارے ضابطے سامنے رکھ دیتے، جس ضابطہ کا علم نہیں اس کا مکلّف نہیں، اگر اس کا علم ہوتا تو بجائے ذیقعدہ کے استعفیٰ دینے کے شوال ہی میں دیتا؛ کیوں کہ دوسری جگہ جانے کی بات رمضان ہی سے چل رہی تھی، آنجناب سے درخواست ہے کہ زید اس تنخواہ کا حقدار ہے یا نہیں؟ فتویٰ مطلوب ہے، ورنہ اسلاف واکابر کا تقویٰ سامنے ہے، جو بغیر تنخواہ کے بھی دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

المستفتی: محمد ارشد بیگ قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مدارسِ اسلامیہ کے قوانین وضوابط اس حدیث

شریف کی رو سے صحیح اور درست ہیں: **عن كثير بن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني عن أبيه عن جده أن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.** (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢)

اور دارالعلوم دیوبند، مدرسہ شاہی مرادآباد اور ان کے ذیلی مدارس جوان مدارس کے اصول پر چل رہے ہیں، ان سب میں یہ ضابطہ اور دستور موجود ہے کہ اگر کوئی مدرس یا ملازم مستعفی ہو کر جانا چاہتا ہے، تو ایک مہینہ پہلے اطلاع دے دے اور پوری تنخواہ اس کو مل جائے گی۔ اور اگر اچانک استعفیٰ دے کر جاتا ہے، تو ایک مہینہ کی تنخواہ روک لی جائے گی، اسی طرح اگر مدرسہ اچانک برطرف کر دیتا ہے تو منجانب مدرسہ ایک مہینہ کی مزید تنخواہ مل جائے گی، تاکہ حدیث پاک "لاضرر ولاضرار" کی رو سے کسی کو نقصان نہ پہنچے، اور کسی بھی مدرسہ میں تقرری منظور کر لینے کا مطلب یہی ہے کہ اس کے سارے قوانین وضوابط کے ماتحت رہ کر ملازمت قبول کی گئی ہے؛ لہٰذا جب رمضان سے دوسری جگہ کی بات چیت چل رہی ہے اور اس کی کوئی اطلاع نہیں کی اور ذیقعدہ میں جا کر اچانک مستعفی ہوتا ہے، تو مدرسہ کو ضابطہ کے مطابق ایک مہینہ کی تنخواہ روک لینے کا حق ہے۔

عن عمرو بن يحيى المازني، عن أبيه، أن رسول الله ﷺ قال: لا ضرر ولا ضرار. (موطا إمام مالك، كتاب القضاء، القضاء في المرفق، أشرفي ديوبند/ ٣١١، سنن ابن ماجة، الأحكام، باب من بنى في حقه ما يضر بجاره، النسخة الهندية/ ١٦٩، دارالسلام، رقم: ٢٣٤١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۵۱/۳۸)

جمعہ کے دن کی تعطیل کو رخصت میں شمار کرنا

سوال [۸۵۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک دینی مدرسہ میں مدرس ہے، مدارس میں جمعہ کی تعطیل رہتی ہے، زید نے جمعرات کی رخصت اتفاقیہ طلب کی، مدرسہ کے مہتمم صاحب نے جمعرات وجمعہ دو دن کی رخصت لگائی، جب کہ زید مدرسہ میں جمعہ کی شام کو واپس آ گیا اور ہفتہ کے دن صبح کو تدریسی فرائض انجام دیئے، مدرسہ میں زید کی جمعہ کے دن کسی قسم کی کوئی ذمہ داری بھی نہیں ہے، یا ہفتہ کو رخصت کی درخواست دلوائی اور جمعہ کے دن صبح سے مدرسہ سے سفر پر چلا گیا اور ہفتہ کی شام کو واپس آ گیا، ان دونوں صورتوں میں جمعہ رخصت اتفاقیہ میں شامل کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: حسین سعدی، چلہ امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدارسِ اسلامیہ میں ہر جمعہ کو مدرسہ کی تعلیم وتدریس بند رہتی ہے؛ اس لئے جمعہ کے دن کی تعطیل مدارسِ اسلامیہ میں متعارف اور معروف ہے، اسی وجہ سے دارالعلوم دیوبند مظاہر علوم سہارنپور، مدرسہ شاہی مرادآباد اور ندوۃ العلماء لکھنو ان ام المدارس میں جمعہ کا دن تعطیل ہی میں شمار ہوتا ہے، اس دن مدرس پر کوئی پابندی نہیں رہتی ہے؛ اس لئے ان مدارس میں ضابطہ یہ ہے کہ اگر جمعرات کو ایک دن کی چھٹی لے کر جائیں تو حفظ وناظرہ کے مدرس کو جمعہ کی شام کو حاضر ہونا پڑتا ہے؛ اس لئے کہ جمعہ کی شام کو بچوں کی تعلیم ہوتی ہے اور درجہ عربی وفارسی کے مدرسین کو سنیچر کی صبح کو حاضر ہونا ضروری ہوتا ہے، ان کا کام سنیچر کی صبح سے شروع ہوتا ہے۔ اور اگر سنیچر کی رخصت لے رکھی ہے تو جمعہ کے دن کا کوئی محاسبہ نہیں ہوتا، ہر مدرس سنیچر کی چھٹی لے کر جمعہ کو جا سکتا ہے، اس میں ایک ہی دن کی رخصت شمار ہوتی ہے، اگر اس کے باوجود ذمہ دار کی طرف سے جمعہ کی رخصت بنائی جائے تو یہ بیجا سختی اور تعدی وظلم ہے۔ اور اگر جمعرات اور سنیچر کی رخصت لے رکھی ہے تو جمعہ بھی اس رخصت کے درمیان شامل ہوتا

ہے اور تین دن کی رخصت شمار ہوجائے گی۔ سوال نامہ میں یہ تیسری شکل نہیں ہے؛ لہٰذا جس مدرسہ سے متعلق سوال کیا جارہا ہے اگر یہ مدرسہ جواب میں ذکر کردہ ام المدارس کے تابع ہے اور ان ہی مدارس کے اصول پر چل رہا ہے، تو سوال نامہ میں ذکر کردہ دونوں صورتوں میں جمعہ کے دن کو شامل کرنا تعدی وظلم کے دائرہ میں شامل ہے۔ اور اگر مذکورہ مدرسہ ام المدارس کے اصولوں پر نہیں ہے اور اس مدرسہ کے الگ اصول وضوابط ہیں، تو ان کو تحریر کریں اس کے بعد ان کے اعتبار سے جواب لکھا جائے گا۔

عن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين –إلى قوله– والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢)

أما لو شرط شرطا تبع، كحضور الدرس أياما معلومة في كل جمعة، فلا يستحق المعلوم إلا من باشر خصوصا إذا قال من غاب عن الدرس قطع معلومه، فيجب اتباعه. (شامي، كتاب الوقف، مطلب في الغيبة التي يستحق بها العزل عن الوظيفة وما لا يستحق، كراچی ٤/ ٤١٩، زكريا ٦/ ٦٣١)

المعروف بالعرف كالمشروط شرطا. (قواعد الفقه، أشرفی ديوبند، ص: ١٢٥)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم شعبان ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۰۷۴)

غیر حاضری کے ایام کو حاضری کے ایام کا بدل قرار دے کر تنخواہ اصول کرنا

سوال [۸۵۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: زید ایک سرکاری مدرسہ میں ملازم ہے، سرکاری تنخواہ پاتا ہے، سرکار کی طرف سے جن ایام میں چھٹی رہتی ہے، مدرسہ میں ان ایام میں پڑھائی ہوتی ہے، زید مدرسہ میں حاضر ہوکر درس دیتا ہے، اب زید کسی وجہ سے پڑھائی اور حاضری کے ایام میں غیر حاضر ہوجاتا ہے، تو کیا اس کے لئے جائز ہے کہ اس غیر حاضری کو ان ایام کا (جن میں سرکاری چھٹی تھی مگر اس نے مدرسہ میں حاضر ہوکر درس دیا تھا) بدل قرار دے کر اس غیر حاضری کے ایام میں رجسٹر حاضری میں دستخط کرے اور ان دنوں کی تنخواہ لے؟

المستفتی: محمد عبداللہ ساکن ڈھکیا، ضلع امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر سوال کا مطلب یہ ہے کہ سرکاری چھٹی اتوار کو ہوتی ہے اور مدرسہ میں جمعہ کو چھٹی ہوتی ہے۔ اور سرکاری قانون کے اعتبار سے جمعہ کو حاضر رہنا اور مدرسہ کے ضابطے کے اعتبار سے اتوار کو حاضر رہنا چاہئے، چونکہ دینی مدرسہ کی تعلیم اتوار میں بند نہیں رہتی ہے؛ بلکہ جمعہ کو بند رہتی ہے، تو اس سلسلے میں اگر اربابِ مدرسہ نے اس بات پر اتفاق کرکے ضابطہ بنالیا ہے کہ اتوار کو تعلیم ہوا کرے گی اور جمعہ کو تعلیم نہیں ہوا کرے گی اور سرکار سے تنخواہ لینے کے لئے اتوار کے بدلے جمعہ کو دستخط ہوجایا کریں گے، ہفتہ میں کل چھ دن حاضری ہوجایا کرے گی، اور سرکار سے فی الجملہ ایک دن کی چھٹی اور چھ دن کی حاضری کی تنخواہ لی جائے گی، اس طرح اتفاق کرلینے سے مدرس کی تنخواہ جائز اور درست ہوجائے گی، جیسا کہ ایڈ کے مدارس میں ہوتا ہے، اس لئے کہ مدارسِ اسلامیہ کے قوانین وضوابط اس حدیث کے پیش نظر ہیں۔

الصلح جائز بین المسلمین -إلی قوله- والمسلمون علی شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحکام، باب ما ذکر عن رسول الله ﷺ في الصلح بین الناس، النسخة الهندیة ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۹/۲/۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۳/۹۴۷۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۲/۱۲ھ

غیر عالم کا حکومت سے عالم کی تنخواہ لینا

سوال [۸۵۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک دینی تعلیمی ادارہ جس کے بعض مدرسین کی تنخواہ حکومت دے رہی ہے۔ اور بعض مدرسین کی تنخواہ مجلس منتظمہ ادا کرتی ہے، سرکار کے ذریعہ تنخواہ پانے والے مدرسین میں ایک مولوی کے عہدہ پر کام کرنے والے ہیں، جو فاضل کی سندر کھتے ہیں، ان کی سند جعلی ہے، ان کے پاس علمی صلاحیت بھی نہیں ہے، مدرسہ کے ناظم نے عوامی رائے کے خلاف دوستی نبھانے کے لئے شخص مذکور کو مدرسہ میں بحال کیا، نتیجہ یہ ہے کہ مدرسہ میں درس وتدریس کے کام میں بہتری نہیں ہو پار رہی ہے، اب غور طلب بات یہ ہے کہ حکومت مولوی کے عہدہ کے لئے رقم دے رہی ہے اور شخص مذکور مولوی ہے نہیں، تو کیا مذکورہ صورت میں حکومت کے ذریعہ مولوی کے عہدہ کے لئے ادارہ کو دی گئی رقم شخص مذکور کو لینا شرعاً جائز ہے؟

المستفتی: سجاد حسین، دارالعلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اسلام میں دھوکہ بازی جائز نہیں ہے، مگر مولوی صاحب کو طے شدہ تنخواہ ایام کارکردگی کی ملنی چاہئے؛ البتہ دھوکہ دہی سے بچنے کے لئے ذمہ دار پر تنخواہ کی شرط کے افراد فراہم کرنا لازم ہے۔

عن عمرو بن يحيى المازني، عن أبيه، أن رسول الله ﷺ قال: لا ضرر ولا ضرار. (موطا إمام مالك، كتاب القضاء، القضاء في المرفق، أشرفي ديوبند/ ٣١١، سنن ابن ماجة، الأحكام، باب من بنى في حقه ما يضر بجاره، النسخة الهندية/ ١٦٩، دارالسلام، رقم: ٢٣٤١، الأشباه قديم: ١٣٩، جديد ١/ ٢٥٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍رمضان ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶۸۲/۳۱)

غیر حاضری کے دن کی دستخط کر کے تنخواہ وصول کرنا

سوال [۹۴۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ زید اسکول سے غیر حاضر رہتا ہے اور دوسرے دن آ کر گذشتہ کل کے دستخط کر دیتا ہے جو اس کے حاضر رہنے کی دلیل ہوتی ہے، اس کے ناجائز ہونے پر کوئی شک نہیں، کیا اس طرح کرنے سے اس کی تنخواہ میں حلت وحرمت یا اشتباہ کے اعتبار سے کچھ فرق پڑے گا۔ اور اگر وہ غیر حاضری ہی رہنے دیتا ہے، تو کیا پھر بھی اس کی تنخواہ متاثر ہوگی؛ اس لئے کہ تنخواہ پورے ایک مہینہ کی ملتی ہے۔

المستفتی: محمد فیاض عالم، مرکز المعارف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ سینٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کبھی کبھی اسکول سے غیر حاضر رہتا ہے اور دوسرے دن جا کر گذشتہ کل کے بھی دستخط کر دیتا ہے، تو اس کے لئے غیر حاضری کے ایام پر دستخط کے ذریعہ حاضری لگانا اور پھر ان ایام کی تنخواہ لینا جائز نہیں ہے، نیز دستخط کئے بغیر بھی ان ایام کی تنخواہ لینا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ من جانب سرکار غیر حاضری کے ایام کی تنخواہ کا مستحق نہیں قرار دیا جاتا ہے۔

قال في الشامية: بخلاف غيرهما من أيام الأسبوع حيث لا يحل له أخذ الأجر عن يوم لم يدرس فيه مطلقا، سواء قدر له أجر كل يوم أو لا. (شامي، كتاب الوقف، مطلب في استحقاق القاضي والمدرس الوظيفة فی يوم البطالة، کراچی ٤/ ٣٧٢، زكريا ٦/ ٥٦٨)

وقال عليه السلام: من غش فليس مني. (مسلم شريف، كتاب الإيمان، باب قول النبي صى الله عليه وسلم من غشنا فليس منا، النخسة الهندية ١/ ٧٠، بيت الأفكار، رقم: ١٠٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ صفر ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۴۴۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۲/۵ھ

مدرس وامام کے لئے ایام تعطیل کی تنخواہ لینے کا حکم

سوال [۸۵۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص کسی دینی عربی مدرسہ میں مدرس ہو اور وہ کسی دوسری ریاست کا رہنے والا ہو، اگر وہ اپنے خاص کام کے لئے مدرسہ سے ایک ماہ کی چھٹی لے کر اپنے وطن جائے، اب وطن سے واپس آنے پر اس ماہ کی تنخواہ یہ مدرس لے سکتا ہے یا نہیں؟ یا اس ماہ کی چھٹی کی تنخواہ مدرسہ یا مدرسہ کے کارکنان حضرات اپنے پاس سے اس مدرس کو دے سکتے ہیں یا نہیں؟ شرعی حکم کیا ہے؟ یہی صاحب کسی مسجد میں امامت کرتے ہوں اور وہاں سے ایک ماہ کی چھٹی لے کر چلے جائیں، اوران کی غیر موجودگی میں اتنے وقت امامت کی ذمہ داری مؤذن صاحب نے نبھائی ہو تو ان حالات میں چھٹی میں گذرے ہوئے ماہ کی تنخواہ امام صاحب کو دی جائے یا مؤذن صاحب کو ملنی چاہئے، شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: محمد اعظم لال مسجد سرائے ترین سنبھل، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مساجد اور مدارس کے قوانین وضوابط کا مدار اس حدیث پاک پر ہے:

عن عبداللہ بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين ، إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲)

اس حدیث میں اس کی وضاحت ہے کہ مسلمان اپنے معاملات میں ان شرائط وضوابط کے پابند ہیں جو معاملہ کرتے وقت آپس میں طے ہوتے ہیں اور جو مدارس ومساجد کے پہلے سے

بنے ہوئے قوانین وضوابط ہیں، امام ومدرس کو رکھتے وقت وہ خود بخود ان قوانین کے پابند ہوجاتے ہیں؛ لہٰذا اگر مذکورہ مدرسہ میں مدرس کو ایک مہینہ کی چھٹی ملتی ہے، تو پورے مہینے کی تنخواہ کا مستحق ہے۔ اور اگر پندرہ دن کی چھٹی ملتی ہے تو پورے مہینے میں سے پندرہ دن کی تنخواہ اس کو ملے گی باقی پندرہ دن کی تنخواہ وضع ہوجائے گی، اسی طریقہ سے جس مسجد میں امامت کرتے ہیں، اس کا تعامل اور اس مسجد کی طرف سے کیا مراعات ہیں، اس پر عمل کیا جائے گا، اگر کبھی مہینہ بھر امام کے غائب رہنے کی صورت میں تنخواہ وضع نہیں ہوئی ہے، تو امام کو مسجد سے جو ماہانہ ملتا تھا وہ ملنا چاہیئے۔ اور امام کی عدم موجودگی میں موذن کا نماز پڑھا دینا اس کا عام رواج ہے، اس سے امام کی تنخواہ مؤذن کو نہیں ملتی ہے، اس طرح تبرعاً نماز پڑھانے کا تعامل مساجد کے اندر چل رہا ہے؛ اسی لئے امام کی تنخواہ مؤذن کو نہیں ملے گی۔

إمام يترك الإمامة لزيارة أقربائه في الرساتيق أسبوعا، أو نحوه، أو لمصيبة، أو لاستراحة لابأس به، ومثله عفو في العادة، والشرع وهذا مبني على القول بأن خروجه أقل من خمسة عشر يوما بلا عذر شرعي لا يسقط معلومه. (شامي، كتاب الوقف، مطلب فيما إذا قبض المعلوم وغاب قبل تمام السنة، شامي، كراچی ٤/ ٤١٨، زكريا ٦/ ٦٣٠)

إن النائب لا يستحق شيئا من الوقف؛ لأن الاستحقاق بالتقدير ولم يوجد ويستحق الأصيل الكل إن عمل أكثر السنة، وسكت عما يعينه الأصيل للنائب كل شهر في مقابلة عمله، والظاهر أنه يستحق لأنها إجارة. (شامي، مطلب مهم في الاستنابة في الوظائف، كراچی ٤/ ٤٢٠، زكريا ٦/ ٦٣١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۰۲۶/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۵/۶ھ

سرکار سے مدرسین کا غیر حاضری کے ایام کی تنخواہ لینا

سوال [۸۵۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بہار کے کچھ مدارس سرکار سے ملحق ہیں، ملحقہ مدارس کے اساتذہ مدرسہ میں تعلیم نہیں دیتے اور مدرسہ بھی اکثر نہیں جاتے ہفتہ میں مہینہ میں دو چار دن مدرسہ میں جاکر رجسٹر حاضری بنا لیتے ہیں اور فارم بھروا کر گاؤں گھر کے لڑکے لڑکیوں کا بورڈ سے امتحان دلواتے رہتے ہیں، عوام جب تعلیم پر زور دیتی ہے تو اساتذہ کہتے ہیں کہ ہم آپ لوگوں سے تنخواہ نہیں لیتے ہیں، ہمیں سرکار تنخواہ دیتی ہے، آپ کو کیا مطلب، بایں طور بورڈ کے مدرسہ میں تعلیم بالکل نہیں؛ بلکہ طلبہ بالکل نہیں ہیں، نہ گاؤں کے نہ باہر کے، کمرے سب خالی پڑے ہیں، جب کہ سرکار تعلیم دینے کے لئے تنخواہ دیتی ہے، بایں صورت بغیر کام کئے ہوئے صرف جھوٹی حاضری بھر کر تنخواہ لینا اور کھانا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد راشق الہدیٰ، ساکن لادھ کیسیا، سمستی پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سرکار کی جانب سے مدرسین کو تنخواہ پڑھانے کے عوض ملتی ہے؛ لہٰذا مدرسین جتنے دن حاضر ہوکر باقاعدہ بچوں کو پڑھائیں وہ صرف انہیں دنوں کی تنخواہ کے مستحق ہیں، غیر حاضری کے ایام کی حاضری لگا کر ان دنوں کی تنخواہ وصول کرنا جائز نہیں ہے۔

الأجرة لا تملك بنفس العقد، ولا يجب إيفاءها إلا بعد استيفاء المنفعة. (تاتارخانية ۱۵/ ۱٤، برقم: ۲۱۹۵۰)

الأجرة إنما تكون بمقابلة العمل. (شامي، كتاب النكاح، باب المهر كراچی ۳/ ۱۵٦، زكريا ٤/ ۳۰۷)

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يحل لمسلم أن يأخذ مال أخيه بغير حق. (مجمع الزوائد، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ۱۷۱)

عن أبي هريرة -رضي الله عنه- أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من غشنا فليس منا. الحديث (صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: من غشنا فليس منا، النسخة الهندية ١/ ٧٠، بيت الأفكار، رقم: ١٠١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۲۴۳)

ایامِ رخصت کی تنخواہ کا مسئلہ

سوال [۸۵۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے ایک مدرس سفر حج پر تشریف لے گئے ہیں، تقریباً دو ماہ مدرسہ سے رخصت پر رہیں گے، جب کہ تمام مدرسین وملازمین کی ایک ماہ کی رخصت اتفاقیہ و بیماری بھی منظور ہے، علاوہ ازیں موصوف کے سفر پر جانے کی وجہ سے ایک زائد مدرس کا بھی بندوبست کرنا پڑا ہے، اس سلسلے میں مسئلہ کیا ہے؟ ایام حج کی تنخواہ مدرسہ کو دینی ہوگی یا نہیں؟ یا جو بھی شریعت اسلامیہ کا حکم ہو تحریر فرمادیں۔

المستفتی: محمد طاہر القاسمی، مدرسہ احیاء العلوم صدیقیہ پٹلوکر سہارنپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حج چونکہ اسلام کے اساسی اور بنیادی فرائض میں سے ہے؛ اس لئے اہم اور بڑے اداروں میں اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے منجانب مدرسہ حج فرض کی ادائے گی کے نام سے ایک مرتبہ رخصت دی جاتی ہے، جیسا کہ دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ شاہی وغیرہ کا دستور ہے۔ اور مدارس اسلامیہ کے قوانین وضوابط کا مدار اس حدیث شریف پر ہے کہ:

عن عمرو بن عوف المزني عن أبيه عن جده، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين، إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢)

اب آپ اپنے مدرسہ کے قوانین وضوابط دیکھیں کہ اس میں کیا حکم ہے؟ اگر سفر حج کے متعلق کوئی صراحت نہیں تو آئندہ کے لئے قانون بنانا چاہئے۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر:۳۶/ ۷۸۶۲)

تعطیل کلاں میں تنخواہ کا استحقاق کب؟

سوال [۸۵۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے کسی مدرسہ میں تدریس کے لئے ملازمت طے کی، فرائض وتنخواہ اور جملہ امور سب مقرر ہوگئے، مدرس ابتدائے سال سے اپنے وقت پر کام میں لگ گیا، بعد چند ایام کچھ باتیں پیش آئیں، جن کے متعلق مہتمم اور مدرس میں کچھ گفت وشنید ہوئی، دوران گفتگو مدرس نے کہا کہ فلاں طریق کار میں معاہدے سے انحراف ہورہا ہے، آپ اس پر عمل درآمد کریں اور کرائیں، مہتمم نے کہا کہ ابھی ہم آپ کو ایک سال تک آزمائیں گے، یعنی آپ کے مطالبات کا معاہدے کے مطابق حق بجانب ہونا ہم کو مسلم ہے، مگر ان کی تکمیل ایک سال بعد ہوگی، جب کہ قالاً یا حالاً آزمائش پر طے شدہ امور کو معلق کرنے کا کوئی اشارہ تک پہلے نہیں ہوا تھا، کیا اس طرح ایام عمل کے دوران بے گمان شرط لگانا اور طے شدہ امور کو غیر مذکور وغیر معہود شرائط پر معلق کرنا درست ہے، جب کہ مدرس خود مقامی باشندہ ہے اور چھوٹے بڑے ہر

ایک کو معلوم ہو، نیز اب مدرس اپنے تئیں یہ سوچ رہا ہے کہ جو وعدے ہوئے تھے نہ ہی پورے کئے گئے نہ آئندہ ان کی بظاہر کوئی توقع ہے، ان حالات میں وہ موجودہ تعلیمی سال (۵/ شوال تا ۲۵/ شعبان) کی مدت پوری کر کے تحریراً یا مشافہۃً مہتمم سے اپنی برطرفی کا اظہار کر دینا چاہتا ہے، واضح رہے کہ تعطیلات میں چندہ کی وصولی اس کے ذمہ لازم نہیں کی گئی تھی، یہ امر تاہنوز سب کو مسلم ہے، اس کو صرف شعبہ عربی وفارسی کی تاسیس اور اس کی مکمل نگرانی وذمہ داری کے لئے لایا گیا تھا، کیا وہ حسب دستور مدرسہ آئندہ امتحان سالانہ سے فراغت کے بعد دوبارہ کام پر لگنے سے ایک ماہ قبل اطلاع کر دے تو وہ رمضان کی تنخواہ کا شرعاً مستحق ہوگا یا نہیں؟ یعنی ایام تعطیل ایام تعلیم کے ساتھ ملحق اور ان کے تابع ہیں یا نہیں؟ اس تعلق سے کوئی بات اس سے قبل نفیاً یا اثباتاً ہوئی بھی نہیں ہے، بوضاحت مدلل جواب عنایت فرمائیں، کتب فقہیہ کے حوالوں سے جواب دیں۔

المستفتی: محمد عنایت اللہ چھتی بازار مہولی، کبیر نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) اگر صراحتاً سارے شرائط مقرر نہیں ہوئے؛ لیکن مدرسہ کے قواعد معروف ومدون ہیں، تو وہ بھی مثل مشروط کے ہیں، اب اگر ایک سال کی آزمائش قوانین مدرسہ میں سے ہے تو اس کی پابندی لازم ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۹/ ۳۰۴)

(۲) تعطیلات رمضان ایام تعلیم کے اس وقت تابع ہوں گی، جب کہ آئندہ سال بھی آپ اسی مدرسہ میں تدریسی خدمت انجام دیں؛ لیکن جب آپ کا ارادہ اس سال مدرسہ چھوڑ دینے کا ہے، تو اس صورت میں آپ رمضان کی تنخواہ کے مستحق نہ ہوں گے، یہی مدارس کے اندر معروف ومشروط ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۲/ ۲۲۶، جدید ڈابھیل ۱۵/ ۵۲۵، رحیمیہ قدیم ۹/ ۳۰۵، جدید زکریا ۹/ ۳۰۲)

لأن المعروف کالمشروط. (الأشباہ والنظائر، قدیم: ۱۵۲، جدید زکریا ۱/ ۲۷۸، المبسوط للسرخسي، دارالکتب العلمیة بیروت ۱۲/ ۵٤، البنایة أشرفیه دیوبند ٥/ ٤٨١، قواعد الفقه أشرفي ١٢٥، رقم: ٣٣٤)

فحيث كانت البطالة معروفة في يوم الثلثاء والجمعة، وفي رمضان والعيدين يحل الأخذ. (شامي، الوقف، مطلب في استحقاق القاضي والمدرس الوظيفة في يوم البطالة كراچی ٤/ ٣٧٢، زكريا ٦/ ٥٦٨، سكب الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٥٨٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ۶/ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۲۸۶)

مدرسہ کے ملازم کا ایامِ تعطیل کی تنخواہ لینا

سوال [۸۵۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک دینی مدرسہ میں غیر مستقل ملازم ہے، ۶/ ذی الحجہ تک کام کرتا ہے، ۷/ ذی الحجہ سے تعطیل عید الاضحیٰ ہو جاتی ہے، ۱۷/ ذی الحجہ کو مدرسہ کھلنے کے دن ۱۰/ بجے دفتر میں حاضر ہو کر رجسٹر حاضری مدرسین پر دستخط کر کے فوراً ہی چلا جاتا ہے، جب کہ مدرسہ کا وقت صبح ۸/ تا ۱۱/ بجے ہے۔ اور تعطیل کے بعد وقت پر حاضر ہونا لازم ہے، پھر ۱۸/ تا ۲۰/ ذی الحجہ کی رخصت بوضع تنخواہ حاصل کرتا ہے (مدرسہ میں غیر مستقل ملازم کو رخصت بوضع تنخواہ ہی کا حق ہے) ۲۱/ ذی الحجہ کو جمعہ پڑتا ہے اور پھر ۲۲/ ذی الحجہ کو استعفیٰ نامہ ارسال کر دیتا ہے۔ مطلوب یہ ہے کہ ۷/ ذی الحجہ تا ۲۱/ ذی الحجہ تنخواہ ذمہ داران مدرسہ پر واجب الاداء ہے یا نہیں؟ واضح رہے کہ مدرسہ میں ایام تعطیل کلاں کی تنخواہ غیر مستقل ملازم کو نہیں دی جاتی ہے، باقی ایام تعطیل کی تنخواہ دے دی جاتی ہے، بشرطیکہ مدرسہ کھلنے والے دن وقت پر حاضر ہوا ہو۔

المستفتی: نظام الحق، مہتمم ادارہ محمودیہ محمدی کھیری، لکھیم پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدارسِ اسلامیہ کے قوانین اور ضوابط کا مدار ذیل کی حدیث پاک پر ہے:

الصلح جائز بين المسلمين ، إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲)

اسی حدیث پاک سے دینی اداروں کے قوانین مستنبط ہوتے ہیں، آپ کے مدرسہ میں تحریری طور پر رخصت سے متعلق جو قانون دستور مدرسہ میں درج ہے، اسی کے مطابق عمل کرنا چاہئے، اگر ملازم ایام تعطیل کی تنخواہ کا مستحق ہوتا ہے، تو دینا چاہئے اور نہیں ہوتا ہے تو نہیں دینا چاہئے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰ر محرم الحرام ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۲۰۲/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۱/۱۴۲۵ھ

تعطیل کلاں میں تنخواہ کا استحقاق

سوال [۸۵۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے گھر میں کوئی اولاد نہ تھی، ہم نے دوسری شادی کی اور منت مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اولاد سے نواز دیا تو چلہ لگاؤں گا، الحمد للہ لڑکی بعدہ لڑکا، دونوں سے اللہ تعالیٰ نے نواز دیا، میں ایک مکتب میں مدرس ہوں، میں نے مہتمم صاحب سے اپنی منت کا تذکرہ کیا اور کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی منت پوری کرلوں، مہتمم صاحب نے اجازت مرحمت فرمادی اور میں نے چلہ پورا کرلیا، اب چلہ کے زمانہ کا مشاہرہ وجہ نزع بن گیا، مہتمم صاحب فرمارہے ہیں کہ چونکہ اولاد کے لئے آپ نے منت مانی ہے، بوضع مشاہرہ چلہ پورا کرنا چاہئے، اگر آپ نے مشاہرہ لے لیا تو وقت مدرسہ کا ہوجائے گا، آپ کی منت پوری نہ ہوگی، ہم چاہتے ہیں کہ مشاہرہ مجھے ملے؛ کیوں کہ چلہ میں جانے والوں کو مدرسہ مشاہرہ دیتا ہے؛

اس لئے آپ حضرات سے درخواست ہے کہ فیصلہ تحریر فرمادیں، کیا مجھے مشاہرہ لینا جائز ہے؟ اگر جائز ہوتو مطالبہ کروں ورنہ خاموش ہو جاؤں؟

المستفتی: محمد ملیح مدرس مدرسہ اسلامیہ دارالعلوم فرقانیہ، مہراج گنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں آپ کے مدرسہ ومکتب کا جو قانون وقاعدہ مروج ومشہور ہو اسی کے مطابق عمل ہوگا، بعض مدارس میں سالانہ کچھ ایام کی رخصت اتفاقیہ کا قانون ہوتا ہے، ان ایام کے بقدر رخصت لینے پر تنخواہ نہیں کاٹی جاتی، اگر آپ کے مدرسہ ومکتب میں یہ قانون ہے، تو ان ایام کے بقدر تنخواہ کا استحقاق ہے، اس سے زائد کا نہیں، نیز اس کے بعد تمام سال ضرورت پڑنے پر جو رخصت لی جائے گی اس رخصت کے ایام کی تنخواہ کا بھی استحقاق نہیں رہے گا۔ اور سوال نامہ میں جو مدرسہ کی جانب سے چلہ کی بات کہی گئی ہے تو چلہ میں جانے پر مشاہرہ اسی وقت ملے گا، جب کہ مدرسہ از خود اپنی خوشی سے بھیجے، اس میں نذر کا چلہ داخل نہیں ہوسکتا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۴۹، فتاوی رحیمیہ قدیم ۹/ ۳۰۳، فتاوی محمودیہ قدیم ۶/ ۳۱۱، جدید ڈابھیل ۱۵/ ۵۳۵، احسن الفتاوی ۷/ ۲۸۳)

بخلاف ما إذا لم يقدر لكل يوم مبلغا، فإنه يحل له الأخذ، وإن لم يدرس فيهما للعرف، بخلاف غيرهما من أيام الأسبوع حيث لا يحل له أخذ الأجر عن يوم لم يدرس فيه مطلقا، سواء قدر له أجر كل يوم أو لا. الخ

(شامي، كتاب الوقف، مطلب استحقاق القاضي والمدرس الوظيفة في يوم البطالة، كراچی ٤/ ٣٧٢، زكريا ٦/ ٥٦٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۴/۲۹ھ

مدارسِ اسلامیہ میں ایامِ تعطیل کی تنخواہوں کا حکم

سوال [۸۵۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں ماضی قریب میں ایک ملکی ہنگامہ کی زد میں آکر دیگر ضروریات زندگی کے تعطلات کے ساتھ ساتھ مدارسِ اسلامیہ بھی بند ہوگئے، چنانچہ ہمارا مدرسہ ۲۵/ ذیقعدہ کو بالکل بند کردیا گیا، پھر ۳/ صفر کو کھولا گیا، اب بحمداللہ بدستور تعلیم جاری ہے، ایام تعطیل کی تنخواہوں سے متعلق اختلاف واقع ہوا، مدرسین طالب ہیں اور ذمہ داران عدم عمل کی وجہ سے مانع ہیں، دستور اساسی میں اس بارے میں کوئی تصریح نہیں اور نہ ہی عقد اجارہ کے وقت کوئی بات طے شدہ ہے اور نہ ہی اطراف وجوانب کے مدارس میں کوئی قانون منضبط ہے؛ لہٰذا برائے کرم حسب شرع فیصلہ فرمادیں، نیز تنخواہ نہ ملنے کی صورت میں ذی الحجہ کے اندر جو ایام دستوری چھٹی کے ہیں، ان کی تنخواہ الگ ملے گی یا نہیں؟

المستفتی: سبحان اللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں چونکہ ملازمین ومدرسین کی جانب سے کوئی تعدی نہیں ہے، نیز عقد اجارہ کے وقت بھی کوئی بات طے نہیں ہوئی اور نہ ہی آپ کے مدرسہ کے دستور اساسی میں اس قسم کی کوئی بات موجود ہے، تو عرف کے مطابق وہ لوگ تنخواہ کے مستحق ہوں گے، اگرچہ آپ کے اطراف کے مدارس میں اس کے بارے میں کوئی قانون منضبط نہیں ہے؛ لیکن ہمارے یہاں مرادآباد میں ۱۹۸۰ء کے فساد کے موقع پر بڑے بڑے مدارس مثلاً مدرسہ شاہی، امدادیہ، جامع الہدیٰ وغیرہ تقریباً دو تین ماہ بند رہے؛ لیکن ملازمین ومدرسین کی تنخواہیں وضع نہیں کی گئیں؛ بلکہ برابر تنخواہیں دی گئیں، نیز ''امداد الفتاوی'' (۳/ ۳۴۹) سے یہی مستفاد ہوتا ہے۔ اور تقریباً تمام مدارس میں ایسا ہی دستور ہے۔

الثابت بالعرف كالثابت بالنص. (شرح عقود رسم المفتي، قديم ص: ۹۵،

قواعد الفقه، أشرفي ديوبند/ ٧٤، رسائل ابن عابدين، ثاقب بك ڈپو ديوبند/ ٤٤)

وقول الفقهاء: المعروف بالعرف كالمشروط شرطا. (قواعد الفقه، أشرفي ديوبند/ ١٢٥، إمداد الفتاوى ٣/ ٣٤٩)

نیز ذی الحجہ کے اندر جو ایام دستوری چھٹی کے ہیں، ان کی تنخواہ دینے کا چونکہ عام مدارس کا دستور ہے، جو بمنزلہ شرط کے ہے؛ لہٰذا اس کی تنخواہ کے ملازمین ومدرسین مستحق ہوں گے، اگر اہل چندہ کی رضا قالاً یا حالاً معلوم ہوجائے تو چندہ سے دیا جاسکتا ہے، ورنہ موجر اپنے پاس سے دے گا۔ اور عدم اشتراط کی صورت میں ان ایام کی تنخواہ کا استحقاق نہیں ہوگا۔ (مستفاد: امدادالفتاوی ۳/۳۴۸)

فحيث كانت البطالة معروفة في يوم الثلاثاء والجمعة، وفي رمضان والعيدين يحل الأخذ. (شامي، الوقف، مطلب في استحقاق القاضي والمدرس الوظيفة في يوم البطالة، كراچی ٤/ ٣٧٢، زكريا ٦/ ٥٦٨، سكب الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٥٨٩)

لأن المعروف كالمشروط. (الأشباه قديم/ ١٥٢، جديد زكريا ١/ ٢٧٨، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ١٢/ ٥٤، البناية، أشرفيه ديوبند ٥/ ٤٨١، قواعد الفقه، اشرفي ديوبند/ ١٢٥، رقم: ٣٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۴۰۹۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹/۶/۱۴۱۵ھ

مدرسے کی چھٹیوں میں پڑھانے کی اجرت اور تعطیل کلاں کی تنخواہ کا حکم

سوال [۸۵۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) مدارسِ اسلامیہ میں انتظامیہ کمیٹی کی جانب سے کچھ چھٹی منظور ہوتی ہیں، جنہیں اتفاقیہ واحتیاجیہ کہا جاتا ہے، اگر کوئی مدرس وغیرہ منظور شدہ چھٹیوں سے زائد حاصل کر

لیتا ہے تو جزو زائد کی تنخواہ کاٹ لی جاتی ہے؛ لیکن اگر مدرس وغیرہ پوری چھٹیاں حاصل نہیں کر پاتا؛ بلکہ کچھ باقی رہ جاتی ہیں، تو بقایا کا مدرس کو کچھ نہیں دیا جاتا، آیا یہ طریقہ اسلامی تعلیمات وشرعی احکامات کے مطابق ہے کہ زائد ہونے پر رقم وضع کر لی جائے اور باقی باندہ کا کچھ نہ دیا جائے؟ کیا ناظم مدرسہ اپنے اس رویہ کے باعث حق العبد میں ماخوذ ہوگا یا نہیں؟

(۲) تعطیل کلاں کی تنخواہ کا حق دار مدرس کب ہوتا ہے؟ زید کا کہنا ہے کہ اگر مدرس سالانہ امتحان تک مدرسہ کی خدمت پر مامور رہتا ہے، تو وہ تعطیل کلاں کی تنخواہ کا حق دار ہوگا، ورنہ نہیں؛ لیکن خالد کا کہنا ہے کہ اگر مدرس تعلیمی سال کے نصف تک مدرسہ کی خدمت کرتا رہا تب بھی وہ آنے والی تعطیل کلاں کی تنخواہ کا واجبی حق دار ہے، صحیح قول کس کا ہے؟ واضح فرمائیے گا، اگر ارکان مدرسہ اس میں کوتاہی کریں تو کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد صابر خان، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدارسِ اسلامیہ کے تمام قواعد وضوابط اس حدیث شریف سے مستنبط ہیں:

عن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين، إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲)

اب اس حدیث شریف کی روشنی میں مذکورہ سوالات کے جوابات اس طرح ہوں گے کہ منظور شدہ چھٹیوں میں سے باقی رہنے پر کچھ نہ دینا اور زائد چھٹیوں پر تنخواہ وضع کر لینا آپ کے یہاں کے اداروں کے اصول وضوابط پر مبنی ہے، اگر وہاں کے اداروں میں منظور شدہ چھٹیوں میں باقی رہنے پر کچھ نہیں دیا جاتا اور زائد چھٹیوں پر تنخواہ وضع کر لی جاتی ہے، تو اسی پر عمل

ہوگا۔اور چھٹی باقی رہنے پر مدرس کو کسی طرح کا استحقاق نہ ہوگا۔اور اگر باقی چھٹیوں پر ان ایام کی تنخواہ دینے کا قانون ہے،تو ایسی صورت میں مدرس ان ایام کی تنخواہ کا شرعاً مستحق ہوگا۔ پہلی صورت میں نہ دینے پر ناظم مدرسہ حق العبد میں ماخوذ بھی نہ ہوگا۔اور دوسری صورت میں نہ دینے سے ذمہ دار اور ناظم حق العبد میں ماخوذ ہوگا۔

(۲) اگر تعطیل کلاں سے قبل مدرس کو مدرسہ سے علیحدہ نہیں کیا گیا،تو ایسی صورت میں مدرس تعطیل کلاں کی تنخواہ کا مستحق ہے؛ کیوں کہ مدارس اسلامیہ میں مدرسین کا تقرر مکمل سال کے لئے ہوتا ہے۔اور اگر مدرس کو تعطیل کلاں سے قبل مدرسہ سے علیحدہ کردیا گیا یا تقرر کے وقت اس بات کی وضاحت کردی گئی تھی کہ آپ کا اور ہمارا معاملہ صرف شعبان تک ہے،تو ایسی صورت میں مدرس تعطیل کلاں کی تنخواہ کا مستحق نہیں ہوگا؛ کیوں کہ آپس کی شرائط کی پابندی مسلمانوں پر لازم ہے۔

لأن أمور المسلمين محمول على الصلاح والسداد. (بدائع الصنائع، كتاب الصلح، فصل في الشرائط التي ترجع إلى المصالح، زكريا ديوبند ٥/ ٥٢) **فقط واللہ** سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۵/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر:۳۵/ ۷۲۸۰)	۱۵/ ۶/ ۱۴۲۲ھ

رمضان کی تنخواہ کا حکم

سوال [۸۵۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ادارہ والے یا مدرسہ والے مدرسین وملازمین حضرات کو رمضان المبارک کی تعطیلات کی جو تنخواہ دیتے ہیں اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ جو حضرات مستعفی ہونا چاہتے ہیں وہ اس کے مستحق ہوں گے یا نہیں؟ اور ان کی تین شکلیں ہیں: (۱) ایک تو وہ حضرات ہیں جو شعبان میں مستعفی ہوتے ہیں (۲) وہ حضرات جو پندرہ رمضان یا ۲۵/ رمضان کو مستعفی ہونے کی اطلاع دیتے

ہیں(۳) وہ حضرات ہیں جو شوال میں ایک ہفتہ یا دو ہفتہ پڑھا کر رمضان کی تنخواہ لے کر اپنا استعفیٰ منظور کروائے بغیر چلے جاتے ہیں، یا تنخواہ لے کر تو نہیں جاتے مگر بغیر انتظامیہ کی منظوری کے دوسری جگہ جا کر خدمت میں لگ جاتے ہیں اور پھر رمضان کی تنخواہ کا مطالبہ فرماتے ہیں، حالانکہ مدرسہ کا قانون ہے کہ جن حضرات کو مستعفی ہونا ہے وہ ایک مہینہ قبل اطلاع دیں، تو اس صورت میں کون حضرات رمضان المبارک کی تنخواہ کے مستحق ہو سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد عابد غلام محمد کیسر پوری، خادم مدرسہ مفتاح العلوم موڑ اسا، گجرات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدارسِ اسلامیہ کے قوانین وضوابط منقول اور منصوص نہیں ہیں، ہاں البتہ ترمذی شریف کی اس حدیث کی رو سے مدارس کے قوانین وضوابط صحیح اور درست ہیں، حدیث شریف یہ ہے:

عن عبداللّٰه بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده، أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين ، إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول اللّٰه ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢)

اس حدیث شریف کی روشنی میں سارے قوانین جائز اور درست ہیں۔ سوال نامہ میں لکھی ہوئی تینوں شکلیں مدرسہ کے ذمہ دار سے معلوم کریں، ان کے یہاں جو دستور اور ضابطہ بنا ہوا ہے اس کے مطابق یہ تینوں شکلیں ضابطہ اور دستور کے کس کالم میں اترتی ہیں، دیکھ لیں، پھر ان ہی کالم کے مطابق ان شکلوں پر عمل کرنا چاہئے۔ فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۶ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۱۰۰۰۲)	۱۴۳۱/۴/۲۶ھ

بسم الله الرحمن الرحیم

۲۵/ کتاب البیوع

۱/ باب البیع الصحیح

مالِ متقوم وغیر متقوم، بیع باطل اور فاسد کی تعریف

سوال [۸۵۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مال کی تعریف، نیز مالِ متقوم وغیر متقوم کی واضح تعریف کیا ہے؟ نیز بیع باطل وفاسد کی جامع مانع تعریف اور فرق دونوں کے درمیان کیا ہے؟ ان سب کو جامع مانع اور واضح الفاظ میں پیش فرمادیں۔

المستفتی: حبیب الرحمٰن گوری نو ادا، فرخ آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مال: اس کو کہتے ہیں جس کی طرف طبیعت کا میلان ہو اور بوقت ضرورت جمع کر کے رکھا جا سکتا ہو۔

المراد بالمال: ما یمیل إلیه الطبع، ویمکن إدخاره لوقت الحاجة.

(شامي، البیوع، مطلب في تعریف المال والملك والمتقوم، کراچی ٤/ ٥٠١، زکریا ٧/ ١٠، وهکذا في البحرالرائق، زکریا ٥/ ٤٣٠، کوئٹه ٥/ ٢٥٦، معجم لغة الفقهاء، کراچی ٣٩٦، الموسوعة الفقهية الكويتية ١٥/ ٢٧، ٣١/ ٦٠، ٣١/ ٢٧٩، ٣٦/ ٣١، الفقه الإسلامي وأدلته، هدی انٹرنیشنل دیوبند ٤/ ١١٢/ دارالفکر ٥/ ٣٣٠٥)

اور مالِ متقوم: اس کو کہتے ہیں جس سے مسلمان کو نفع اٹھانا ممکن ہو اور مسلمان کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہو۔

المتقوم: ما یمکن إدخاره مع الإباحة، فإن المتقوم هو المال المباح

الانتفاع به شرعا. (شامي، البيوع، مطلب في تعريف المال والملك والمتقوم، زكريا ٧/ ١٠، ٢٣٥، كراچی ٤/ ٥٠١، ٥/ ٥٠، معجم لغة الفقهاء، كراچی ٣٩٧، الموسوعة الفقهية الكويتية ١٥/ ٢٧، ٣٦/ ٣٤، الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹرنيشنل ديوبند ٤/ ١٢٥، دارالفكر ٥/ ٣٣٢١)

اور مالِ غیر متقوم: اس کو کہتے ہیں کہ مسلمان کے لئے جس سے فائدہ اٹھانا بالکل جائز نہیں ہوتا ہے اور اس کی بیع قطعاً باطل ہو جاتی ہے۔

وبطل بيع مال غير متقوم، أي غير مباح الانتفاع به، كخمر وخنزير. (درمختار، البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب في تعريف المال زكريا ٧/ ٢٣٥، كراچی ٥/ ٥٠، زكريا ٧/ ٢٤١، ٢٤٢، كراچی ٥/ ٥٥، معجم لغة الفقهاء، كراچی ٣٩٧، الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹرنيشنل ديوبند ٤/ ١٢٥، دارالفكر ٥/ ٣٣٢١)

نیز بیع باطل وہ ہے کہ جس کے صلب عقد میں فساد آیا ہو۔ اور بیع فاسد وہ ہے کہ صلب عقد میں تو فساد نہ آیا ہو؛ بلکہ خارج عقد اور صفات میں فساد آیا ہو، جیسا کہ جب مبیع میتہ یا خنزیر ہو تو رکن بیع یعنی عین مبیع میں فساد آیا ہے؛ اس لئے باطل ہے۔ اور دریا سے مچھلی پکڑنے سے قبل فروخت کرنا اور ہوا میں اڑتے پرندہ کو پکڑنے سے قبل فروخت کرنا اس میں عین مبیع میں فساد تو نہیں ہے، مگر خارج مبیع میں فساد ہے اور وہ مبیع کا غیر مقدور التسلیم ہونا ہے، اس لئے فاسد ہے۔

ظاهره أن الفاسد بيع السمک، وأنه يملک بالقبض، وفيه أن بيع ما ليس في ملكه باطل كما تقدم؛ لأنه بيع المعدوم، والمعدوم ليس بمال فينبغي أن يكون بيعه باطلا، وأن يكون الفاسد هو بيع العرض؛ لأنه مبيع من وجه، وإن دخلت عليه الباء. (شامي، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب في البيع الفاسد، زكريا ٧/ ٢٤٨، كراچی ٥/ ٦٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸ر محرم الحرام ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۱۳۶)

نیلامی کا حکم

سوال [۸۵۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نیلامی میں بولی خرید وفروخت کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: سید عادل حسن سید کالونی، جے پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: نیلام سے خرید وفروخت کرنا شرعاً جائز ہے۔(مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۸/۳۷، جدید زکریا مطول ۱۱/۹۰، امداد الفتاوی ۳/۱۲۱)

عن أنس بن مالک، أن رسول الله ﷺ باع حلسا وقدحا، وقال: من يشترى هذا الحلس والقدح، فقال رجل: أخذتهما بدرهم، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: من يزيد على درهم؟ من يزيد على درهم؟ فأعطاه رجل بدرهمين، فباعهما منه. (سنن الترمذي، البيوع، باب ماجاء في من يزيد، النسخة الهندية ۱/ ۲۳۱، دارالسلام، رقم: ۱۲۱۸، سنن أبي داؤد، كتاب الزكوة، النسخة الهندية ۱/ ۲۳۲، دارالسلام، رقم: ۱٦٤۱، سنن النسائي، البيوع، النسخة الهندية ۱/ ۱۸۹، دارالسلام، رقم: ٤٥۱٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲ رصفر ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۰۹۹)

امریکہ سے ٹیلی ویژن پر خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۵۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج کے جدید ترقی یافتہ دور میں ایک شخص امریکہ سے ٹیلی فون پر کہتا ہے، ہندوستانی

تاجر سے کہ آج سونے کا یہاں بھاؤ یہ ہے، بولوتم کو لینا ہے؟ ہندوستانی تاجر بولتا ہے کہ آپ کے بتلائے ہوئے بھاؤ پر میرا دوکیلو ہوگیا ہے، پھر کچھ ٹائم بعد یا ایک دوروز بعد وہ امریکی کہتا ہے کہ آج سونے کا بھاؤ یہ ہے تم کو لینا ہے، ہندوستانی تاجر کہتا ہے کہ میرے خریدے ہوئے سونے آپ کے بتائے ہوئے بھاؤ پر فروخت کردیں، یہ خرید وفروخت کیسی ہے یہ سونے کا ہی معاملہ نہیں ہے؛ بلکہ قریب قریب منقولی چیزیں اسی طرح سے بیچی اور خریدی جاتی ہیں، ابتلاء عام ہے اور اس میں کوئی جھگڑا نہیں ہے اور نہ سنا گیا ہے، ویسے یہ شکل وکیل کی سی ہوجاتی ہے؛ البتہ وکیل بول کر متعین نہیں کیا جاتا ہے؛ بلکہ ٹیلی فون پر اسی طرح گفتگو ہوتی ہے، جیسے لکھا گیا ہے۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) **ما إذا وكل رجلا غائبا، وأخبره رجل بالوكالة يصير وكيلا، سواء كان المخبر عدلا أو فاسقا، أخبره من تلقاء نفسه أو على سبيل الرسالة صدقه الوكيل في ذلک أو كذبه.** (فتاوی عالمگیری، کتاب الوکالة، الباب الأول زکریا قدیم ۳/ ٥٦١، جدید ۳/ ٤٧٧)

(۲) **والأصل فيه أن الجهالة اليسيرة تتحمل فى الوكالة كجهالة الوصف استحسانا؛ لأن مبنى التوكيل على التوسعة؛ لأنه استعانة.** (هداية، الوكالة، باب الوكالة بالبيع والشراء، أشرفي ۳/ ١٨١)

(۳) **الملک يثبت للموكل خلافه عن الوكيل ابتداء وهو الصحيح.** (عالمگیری قدیم ۳/ ٥٦٧، جدید ۳/ ٤٨٣)

(٤) **وإذا دفع الوكيل بالشراء الثمن من ماله وقبض المبيع فله أن يرجع به على الموكل؛ لأنه انعقدت –إلى قوله– فإن هلک المبيع في يده قبل حبسه هلک من مال الموكل ولم يسقط الثمن؛ لأن يده كيد الموكل.** (هداية، باب الوكالة بالبيع والشراء، أشرفي ۳/ ١٨٢–١٨٣)

مذکورہ عبارات سے حسب ذیل امور ثابت ہوتے ہیں: عبارت نمبر ۱ر سے غائب شخص کو وکیل بنانا اور ٹیلی فون کی خبر کا معتبر ہونا مسئلہ وکالت میں ثابت ہوتا ہے۔
عبارت نمبر ۲ر سے مسئلہ وکالت میں بمقابلہ بیع کے زیادہ جہالت برداشت کی جاتی ہے۔
عبارت نمبر ۳، ۴ر سے وکیل کا اپنی طرف سے ثمن ادا کر کے مبیع پر قبضہ کر لینا اور موکل کے لئے ملکیت ثابت ہونا واضح ہوتا ہے، نیز نمبر ۱ر سے وکیل بالشراء، وکیل بالبیع دونوں کا بحالت غیبوبت جائز ہونا ثابت ہوتا ہے؛ اس لئے مذکورہ دلائل کی روشنی میں بشرط عدم منازعت مذکورہ معاملہ جائز ہے، تاہم اس مسئلہ میں دوسرے مفتیان کرام کی طرف بھی رجوع کر لیجئے۔
فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵ر شعبان المعظم ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۱۹۰۱)

مسلمانوں کا غیر مسلموں سے خرید وفروخت کرنا

سوال [۸۵۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید جو عالم اور مدبر ہے، مسلمانوں کو تلقین کرتا ہے کہ مسلم قوم کا بھلا اسی میں ہے کہ مسلمان جو چیز خریدیں مسلمان دوکانداروں سے ہی خریدیں، یہ بہت ضروری ہے، بکر جو سیاسی آدمی ہے، وہ کہتا ہے کہ ''اگر ایسا کیا گیا تو یہ بڑی غلطی ہوگی اور اس سے فرقہ واریت بڑھے گی، ہمارے بزرگوں نے اس طرح کی جو غلطیاں کی تھیں، ان کا نتیجہ ابھی تک مسلمان بھگت رہے ہیں، اس قسم کی مزید غلطیاں مسلمانوں کو لے ڈوبیں گی''۔ آپ سے گزارش ہے کہ اس بارے میں شریعت مطہرہ کی روشنی میں فیصلہ فرمائیں۔ علماء کو مسلمانوں کے ہر مسئلے میں رہنمائی فرمانا چاہئے، کیا ہمارے اکابر علماء نے اس بارے میں کوئی رائے دی ہے؟ اگر ہو تو حوالہ دے کر عنداللہ راہ صواب دکھائیں۔ بینوا توجروا

المستفتی: محمد ذکی ساکن محلّہ سیف خان سرائے سنبھل، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسلمانوں پر شرعاً یہ لازم نہیں ہے کہ وہ صرف مسلمان دوکانداروں ہی سے خریدا کریں؛ بلکہ اپنی ضرورت کی چیزیں بلا کراہت غیر مسلم دوکانداروں سے بھی خرید سکتے ہیں جولوگ منع کرتے ہیں وہ بلا تحقیق منع کرتے ہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۹۶/۳)

وكذا إسلام البائع ليس بشرط لانعقاد البيع ولا لنفاذه، ولا لصحته بالإجماع، فيجوز بيع الكافر وشراؤه -إلى قوله- ولنا عمومات البيع من غير فصل بين بيع العبد المسلم من المسلم، وبين بيعه من الكافر فهو على العموم. الخ (بدائع الصنائع، البيوع، فصل في شرائط ركن البيع، كراچی ٥/ ١٣٥، زكريا ٤/ ٣٢١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ رصفر ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱٦٦٨)

مشتری کا مبیع کو استعمال کرنے کے بعد فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۵٦٣]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کی اسٹیل کی ایک دوکان ہے، جس میں وہ برتن وغیرہ بیچتے ہیں؛ لیکن کبھی کبھی ضرورت کے وقت عارضی طور پر ان برتنوں کو استعمال بھی کر لیتے ہیں، تو سوال یہ ہے کہ بیچتے وقت کیا زید پر یہ صراحت ضروری ہے کہ میں نے تھوڑا بہت استعمال کیا ہے؟ براہ کرام جواب سے نوازیں۔

المستفتی: عبد المجید کیرالا، متعلم جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کا اپنی دوکان کے برتن استعمال کرنا اور اس کے بعد

خریدار کو صحیح صورت حال بتائے بغیر اس کو نیا برتن بتا کر فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ مستعمل اشیاء کی قیمت بازار میں نئی اور غیر مستعمل چیزوں کے مقابلہ میں کم ہوتی ہے، نیز اس طرح فروخت کرنا ایک قسم کی دھوکہ دہی بھی ہے؛ لہٰذا صحیح صورت حال بتا کر ہی مستعمل برتنوں کو فروخت کرنا چاہئے۔

عن عقبة بن عامر قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: المسلم أخو المسلم، ولا يحل لمسلم باع من أخيه بيعا فيه عيب، إلا بينه له. (ابن ماجة، البيوع، باب من باع عيبا فليبينه، النسخة الهندية ١٦٢، دارالسلام، رقم: ٢٢٤٦، المستدرك للحاكم، كتاب البيوع، مكتبه نزار مصطفى الباز، جديد ٣/ ٨١٦، قديم ٢/ ٨/ رقم: ٢١٥٢)

لايحل كتمان العيب في مبيع أو ثمن؛ لأن الغش حرام. (شامي، البيوع، باب خيار العيب، مطلب في جملة ما يسقط به الخيار، زكريا ٧/ ٢٣٠، كراچی ٥/ ٤٧)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– أن رسول الله صلى الله عليه وسلم مر برجل يبيع طعاما، فسأله كيف تبيع؟ فأخبره، فأوحى إليه أن أدخل يدک فيه، فأدخل يده فيه، فإذا هو مبلول، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ليس منا من غش. (أبو داؤد شريف، البيوع، باب النهي عن الغش، النسخة الهندية ٢/ ٤٨٧، دارالسلام، رقم: ٣٤٥٢، وهكذا في صحيح مسلم، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم من غشنا فليس منا، النسخة الهندية ١/ ٧٠، بيت الأفكار، رقم: ١٠٢)

كل ما أوجب نقصان الثمن في عادة التجار، فهو عيب. (هداية، البيوع، باب خيار العيب، أشرفي ٣/ ٤٠، مختصر القدوري، ص: ٧٦، الموسوعة الفقهية الكويتية ١٥/ ٥٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/۲/۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۹۱۳/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶/۲/۱۴۳۱ھ

کیا حرام مال میں تعدی پائی جاتی ہے؟

سوال [۸۵۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: حضرات فقہاء کی تصریحات کے مطابق اگر کسی کی آمدنی حرام ہو تو اس سے مسلمانوں کو خرید وفروخت کا معاملہ کرنا ممنوع ہے، اس کے بالمقابل حضرت امام کرخیؒ کی تصریح کے مطابق حرام مال کی کسی جہت سے تعیین کے بغیر اگر کوئی چیز خریدی جائے تو اس چیز میں حرمت سرایت نہیں کرے گی اور اس کا استعمال جائز ہوگا۔ **كما في الشامية، وأيضا في فتاوى علماء نا العامة.**

سوال یہ ہے کہ امام کرخیؒ کی تصریح کے مطابق خرید کردہ شئ میں حرمت سرایت نہیں کرے گی، کیا مشتری جو حرام مال ادا کر رہا ہے اس سے بھی حرمت کی خباثت ختم ہو جائے گی، اگر نہیں تو بائع حاصل شدہ نفع مع اصل فروخت کردہ چیز کی قیمت کے ساتھ کیا کرے؟ دانستہ اور غیر دانستہ دونوں شکلوں کا حکم کیا یکساں ہوگا؟ نیز ہمارے شہر بمبئ میں اس سے بچنا بہت دشوار ہے، خصوصاً شوروم، بڑی دوکانیں، ہوٹلیں وغیرہ ان ہی حضرات سے آباد رہتے ہیں، خلاصی کی شکل کیا ہے؟

المستفتی: بندہ عبدالرشید عفی عنہ نعمانی، دارالافتاء والارشاد اندھری ایسٹ بمبئ، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب ایک مسلمان کے پاس حلال اور حرام دونوں مخلوط پیسے موجود ہیں اور وہ شخص خریداری کے وقت حرام یا حلال پیسے کی تعیین کئے بغیر پیسہ ادا کرتا ہے، تو وہ پیسہ بائع کے لئے اپنے مال کے عوض میں لینا بلا تردد جائز اور حلال ہے۔ اور بائع کے حق میں وہ پیسہ حلال ہے، اگر مشتری نے حرام پیسہ دیا ہے، تو گنہگار مشتری ہوگا بائع نہیں ہوگا، اب رہی یہ بات کہ حرام پیسہ کے عوض میں مشتری نے جو پاک مال خریدا ہے، اس میں بھی حرمت سرایت کر جائے گی یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب اس نے کسی قسم کی

صراحت کئے بغیر مطلقاً مال خریدا ہے اور پیسہ کی ادائے گی میں حرام مال دیا ہے، تو اس کی وجہ سے مشتری گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا؛ لیکن مشتری کے پاس جو مال آیا ہے، وہ اس کے لئے حلال ہے اور امام کرخیؒ ہی کے قول پر فتویٰ ہے۔ اور دوسری طرف بائع کے پاس اپنے حلال مال کے عوض میں جو بھی پیسہ حرام مال کی صراحت کے بغیر مطلقاً پہنچا ہے، وہ پیسہ بائع کے حق میں حلال ہوگا، اس لئے کہ اگر بائع کو مشتری کا حال معلوم نہیں ہے تو بلاتردد اس کے حق میں حلال ہے۔ اور اگر بائع کو مشتری کا حال معلوم ہے کہ اس کے پاس حلال وحرام دونوں طرح کا پیسہ ہے، تو مشتری نے جب حرام کی صراحت نہیں کی ہے؛ بلکہ بلا صراحت کے مطلقاً پیسہ پیش کردیا ہے، تو ایسی صورت میں شریعت نے بائع کو اس کا مکلّف بنایا ہے کہ مشتری مسلمان ہے، اس نے اپنا حلال مال ہی دیا ہوگا؛ لہٰذا بائع کے حق میں وہ پیسہ حلال ہوگا، ہاں البتہ اگر مشتری پیسہ کی ادائے گی کے وقت اس کی صراحت کردیتا ہے کہ میں آپ کو حرام اور خبیث پیسہ دے رہا ہوں تو بائع کے لئے اپنے حلال مال کے بدلہ میں اس کا پیسہ لینا جائز نہیں ہے، ایسی صورت میں اس پیسہ کی حرمت بائع کے حق میں بھی سرایت کرجائے گی، ورنہ بائع کے حق میں سرایت نہیں کرے گی۔

رجل اكتسب مالا من حرام، ثم اشترى فهذا على خمسة أوجه: إما إن دفع تلك الدراهم إلى البائع أولا، ثم اشترى منه بها، أو اشترى قبل الدفع بها ودفعها، أو اشترى قبل الدفع بها ودفع غيرها، أو اشترى مطلقاً ودفع تلك الدراهم، أو اشترى بدراهم أخر ودفع تلك الدراهم -إلى قوله- وقال الكرخيؒ: في الوجه الأول والثاني لا يطيب، وفي الثلاث الأخيرة يطيب، وقال أبوبكرؒ: لا يطيب في الكل، لكن الفتوىٰ الآن على قول الكرخيؒ دفعا للحرج عن الناس. (شامي، كتاب البيوع، باب المتفرقات، مطلب إذا اكتسب حراما، ثم اشترى على خمسة أوجه، زكريا ۷/ ۴۹۰، كراچی ۵/ ۲۳۵، وهكذا في الهندية، زكريا قديم ۳/ ۲۱۵، جديد ۳/ ۲۰۱)

أهدی إلی رجل شيئا أو أضافه إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن يعلم بأنه حرام، فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لا يقبل الهدية، ولا يأكل الطعام إلا أن يخبره بأنه حلال ورثته أو استقرضته من رجل. (هندية، كتاب الكراهية والاستحسان، الباب الثاني عشر في الهدايا و الضيافات، زكريا قديم ٥/ ٣٤٢، جديد ٥/ ٣٩٦، وهكذا في البناية أشرفيه ديوبند ١٢/ ٢٠٩، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ٨/ ٧٣، رقم: ٩٦١٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۷ / ربیع الاول ۱۴۲۸ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۲۳۷/۳۸)	۱۴۲۸/۳/۲۷ھ

زمین فروخت کرنے کے بعد رجسٹری نہ کرانا

سوال [۸۵۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم نے تقریباً دوسال پہلے ایک جگہ جس کے مالک نجمی خاتون اور رئیس احمد تھے، خریدی، قیمت چھ لاکھ روپئے طے ہوئی، وہ ہم نے ساری کی ساری ادا کردی، آپسی مشورہ سے یہ بات طے پائی کہ رجسٹری بعد میں کرالیں گے، ثبوت کے طور پر ایک ایگریمنٹ لکھا گیا۔ ۱۲/۱ کتوبر ۲۰۱۰ء کو اس میں لکھا گیا کہ اب اس جگہ کے مالک محمد عاصم ہیں، ہم نے نجمی خاتون ورئیس احمد یہ جگہ چھ لاکھ روپئے میں انہیں بیچ دی ہے، اور ساری رقم وصول کرلی ہے، اب انہیں محمد عاصم کو اختیار ہے کہ یہ اپنے نام سے رجسٹری کرائیں یا کسی اور کے نام سے رجسٹری کرائیں، میں رجسٹری ان کو کردوں گا، یہ معاہدہ باقاعدہ ۱۰۰/ روپئے کے اسٹامپ پر طے پایا۔ اب ہم نے اس جگہ کو بیچنے کی آواز لگائی ہے اور تقدیر سے ایک گراہک سے سات لاکھ ساٹھ ہزار میں سودا طے ہوگیا، اب جب ہم نے اس سودے کی اطلاع حاجی رئیس احمد کو دی کہ ہم نے اس جگہ کا سودا کرلیا ہے، آپ اس کی رجسٹری کرادیجئے، تو حاجی رئیس احمد نے برجستہ یہ کہا کہ مجھے ایک لاکھ روپئے دو میں جب رجسٹری کروں گا، پھر ہم نے ان سے بات کی کہ آپ رجسٹری کرادیں تو

انہوں نے یہ کہا کہ میں کسی کے نام کی رجسٹری نہیں کراؤں گا، میں تمہیں بیچ ہی نہیں رہا اور میں تمہیں فائدے کے ساتھ پیسے واپس کردوں گا، اس مکان پر قبضہ محمد عاصم کا ہے اور مکان کی چابیاں بھی محمد عاصم کے پاس ہیں۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ شریعت کی رو سے اس جگہ کا مالک کون ہے؟ اگر وہ حاجی رئیس اس جگہ کو دوبارہ خریدنا چاہتے ہیں تو مجھے وہ فائدہ دیں جو میرا گراہک سے طے ہوگیا ہے، اس بارے میں شریعت کیا کہتی ہے؟

المستفتی: محمد عاصم، محلّہ تکیہ بدھا شاہ، کسرول، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں جب محمد عاصم نے نجمی خاتون اور رئیس احمد سے زمین خریدی اور محمد عاصم نے طے شدہ قیمت چھ لاکھ روپئے ادا کرکے اس پر قبضہ بھی کرلیا ہے، تو ایسی صورت میں مذکورہ زمین محمد عاصم کی ملکیت میں جائز طریقہ سے منتقل ہوگئی ہے؛ لہٰذا نجمی خاتون اور رئیس احمد کا کوئی واسطہ اس زمین کے ساتھ نہیں رہا ہے؛ اس لئے پکی رجسٹری کے وقت دستخط کے لئے بلانے پر وعدہ کے مطابق جاکر دستخط کردینا شرعی طور پر ان پر لازم ہے، الگ سے پیسہ مانگنا جائز نہیں ہے۔ اور اس طرح کا پیسہ لینا حرام کا پیسہ ہوگا۔

ولنا أن ركن البيع صدر من أهله مضافا إلى محله، فوجب القول بانعقاده. (هداية، كتاب البيوع، أشرفي ٣/ ٢١)

وإن ذكر البيع من غير شرط، ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة جاز البيع، ويلزمه الوفاء بالوعد؛ لأن المواعدة قد تكون لازمة، فتجعل لازمة لحاجة الناس. (فتاوى قاضيخان، البيع، باب البيع الفاسد، فصل في الشروط المفسدة، زكريا جديد ٢/ ٩٩، وعلى هامش الهندية ٢/ ١٦٥، مجمع الضمانات ١/ ٤٤٣، شامي، مطلب في البيع بشرط فاسد، زكريا ٧/ ٢٨١، كراچى ٥/ ١٨٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٦/ ١٦٤، ٩/ ٢٤٧، ٤٤/ ٩٦)

إذا قبض البائع الثمن وهو مما يملك به، فإنه يكون إذنا بالقبض دلالة. (شامي، زكريا ۷/ ۲۸۷)

باع شيئا وخلى بينه وبين المشترى صار المشترى قابضا حتى لو هلك يهلك من ماله. (الفتاوى السراجية، ص: ۴۳۸)

وإذا قبض المشترى المبيع برضا بائعه صريحا أو دلالة ولم ينهه البائع، ملكه أي يملك عينه وهو الصحيح المختار، وإذا ملكه تثبت كل أحكام الملك، فيكون المشتري خصما لمن يدعيه، ولو باعه كان الثمن له.

(شامي، مطلب في الشرط الفاسد إذا ذكر بعد القعد أو قبله، زكريا ۷/ ۲۸۷، کراچی ۵/ ۸۸)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ربیع الاول ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۶۴۸)

خریدار کا بائع کی اولاد کو رجسٹری پر دستخط کرنے کے عوض کچھ دینے کا حکم

سوال [۸۵۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے والد صاحب کا ایک مکان تھا جو اب بھی ہے، انہوں نے اپنی زندگی میں آدھا مکان اپنے ایک ملنے والے کے ہاتھ بیچ دیا تھا، منہ زبانی طور پر جس کی کوئی لکھت پڑھت نہیں ہوئی تھی، اس مکان کو بیچے ہوئے لگ بھگ چوبیس سال ہوگئے، میرے والد کا انتقال بھی بائیس سال پہلے ہوگیا، میں اپنے گھر کی سب سے چھوٹی بیٹی ہوں؛ لہٰذا اب وہ رجسٹری کروارہے ہیں اس مکان کی، میرے دستخط ہونے ہیں، میرا ان سے کوئی مطالبہ نہیں ہے، اگر وہ اپنی خوشی سے مجھے کچھ پیسے دینا چاہیں تو وہ میرے لئے جائز ہیں یا نہیں؟ ویسے میں بہت غریب ہوں اور پندرہ سال سے مستقل بیمار بھی ہوں، شریعت کے دائرے میں بتائیں ان سے پیسے لینا جائز ہے؟

المستفتیة: ثریا سخاوت کھاری کنواں، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: آپ کے لئے ایمان داری اور دیانت داری کی بات یہ ہے کہ بلا کسی لالچ اور طمع کے رجسٹری پر دستخط کردیں نیت صحیح کی وجہ سے عند اللہ آپ کو اس کا اجر ملے گا اور اس دستخط کی وجہ سے آپ کی بیماری اور غربت کی وجہ سے اگر وہ اپنی جانب سے بخوشی بطور مدد کے کچھ دے دیں تو ان کی طرف سے ایک تبرع ہوگا۔

عن أبي سعيد الخدري –رضي الله عنه– عن النبي ﷺ قال: أيما مسلم كسا مسلما ثوبا على عرى، كساه الله من خضر الجنة، وأيما مسلم أطعم مسلما على جوع، أطعمه الله من ثمار الجنة، وأيما مسلم سقى مسلما على ظمأ، سقاه الله عز وجل من الرحيق المختوم. (أبو داؤد، باب في فضل سقى الماء، النسخة الهندية ١/ ٢٣٦، دارالسلام، رقم: ٦٨٢)

لا يجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي. (البحرالرائق، كتاب الحدود، فصل في التعزير، زكريا ٥/ ٦٨، كوئٹه ٥/ ٤١، شرح المجلة، رستم مكتبه اتحاد ١/ ٦٢، رقم المادة: ٩٧، قواعد الفقه، اشرفي، ص: ١١١، رقم: ٢٦٩، هندية، زكريا قديم ٢/ ١٦٧، جديد ٢/ ١٨١، شامي، زكريا ٦/ ١٠٦، كراچی ٤/ ٦١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ شعبان ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۳)

خریدار کا ادائے قیمت پر کمیشن کا مطالبہ

سوال [۸۵۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مال خریدنے کے سودے میں کسی خریدار نے یہ طے کیا کہ مال کی رقم ادا کرنے پر ہم ایک یا

دو فیصد کمیشن یا مدت لیں گے، تو اس طرح کا لین دین شرعی اعتبار سے کیسا ہوگا؟

المستفتی: محمود ابن جمال الدین جی تیلی، محلّہ تیلیان کاڈرا، راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خریدار کا قیمت ادا کرتے وقت کمیشن یا مدت لینے کا کیا مطلب ہے؟ بہرصورت جو آپس میں خریداری کا معاملہ کرتے وقت طے ہوا تھا، اسی طے شدہ معاملہ کے مطابق لین دین لازم ہے، اس کی خلاف ورزی جائز نہیں۔

عن عمرو بن عوف المزني عن أبيه عن جده، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ...... والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢)

وإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع، ولا خيار لواحد منهما. (هداية، كتاب البيوع، اشرفي ٣/ ٢٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
١٠ر ربیع الثانی ١٤٣٢ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٩/ ١٠٠٥٥)	١٠/٤/١٤٣٢ھ

بیع میں کس جگہ کا اعتبار ہے؟

سوال [٨٥٦٨]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (١) دو شخصوں نے رامپور میں بیٹھ کر بریلی کی ایک زمین کے متعلق بیع وشراء کی اور فی گز کے اعتبار سے ثمن مقرر کیا؛ لیکن رامپور اور بریلی میں زمین کی پیائش کا گز مختلف ہے، یعنی رامپور کا گز ٣٣ر انچ اور بریلی کا ٣٦ر انچ کا ہے۔ دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ فروخت شدہ زمین کس گز سے ناپ کردی جائے گی، بریلی کے گز سے یا رامپور کے گز سے؟

(۲) اگر بائع نے مشتری کو رامپوری گز سے زمین کی پیمائش کی اور مشتری نے رامپور و بریلی کے گز کے فرق کو نہ جانتے ہوئے رامپوری گز کے لحاظ سے ثمن ادا کیا، تو اب بائع کو زمین پوری کرنی واجب ہے، جب کہ فروخت شدہ زمین سے متصل بائع کی زمین موجود ہے، یا گز کے تفاوت سے جو زائد رقم پہنچی ہے اس کی واپسی ضروری ہے؟

(۳) اگر بائع نے مسئلہ جاننے کے بعد نہ زمین پوری کی اور نہ ہی زائد رقم واپس کی، تو اس کے لئے شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: محمد فاروق رامپوری، مدرس مدرسہ عربیہ حیات العلوم پیرزادہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۲-۳) حضرات فقہاء نے ایسی شکل میں مکان عقد کا اعتبار کیا ہے۔ اور جب دونوں نے رامپور میں رہ کر عقد کیا ہے، تو رامپوری گز کا اعتبار کیا جائے گا، بشرطیکہ بوقت عقد رامپوری اور بریلی کے گز کا کوئی ذکر نہ کیا گیا ہو؛ لہٰذا مذکورہ صورت میں بائع کا رامپوری گز کے لحاظ سے زمین دینا اور مشتری کا اسی حساب سے ثمن ادا کرنا صحیح اور درست ہے۔

باع عينا من رجل بأصفهان بكذا من الدنانير، فلم ينقد الثمن حتى وجد المشتري ببخارى يجب عليه الثمن بعيار أصفهان، فيعتبر مكان العقد. الخ (شامي، البيوع، مطلب يعتبر الثمن في مكان العقد، زكريا ۷/ ۵۹، كراچی ٤/ ٥٣٦، الموسوعة الفقهية الكويتية ١٥/ ٤١) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۳۱۴۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۴/۱۴۱۳ھ

مشترکہ طور پر سامان خریدنے کی صورت میں کس پر کتنی قیمت واجب ہے؟

سوال [۸۵۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: میں نے ایک سامان نو روپیہ میں خریدا ہے، اس سامان میں تین آدمی ساجھی ہیں، ایک آدھے کا ساجھی ہے اور ایک تہائی کا اور ایک نوے حصہ کا، جس شخص سے سامان خریدا ہے، اس کو پیسہ دینا ہے، اب جو آدھے کا ساجھی ہے اس نے اپنے ساجھے کی پوری قیمت یعنی ساڑھے چار روپیہ دے دئے ہیں اور تہائی کے ساجھی نے بھی اپنے ساجھے کی پوری قیمت تین روپیہ دے دی ہے اور نویں حصہ کے ساجھی نے بھی اپنے نویں حصہ کا ایک روپیہ دے دیا ہے، پیسوں کا جوڑ ساڑھے آٹھ روپیہ ہوتا ہے، پچاس پیسہ کی کمی ہوتی ہے، کوئی ساجھی اپنے حصہ کی قیمت سے زیادہ پیسے دینے پر تیار نہیں ہے، احقر کو اس کے جواب سے نوازیں۔

المستفتی: حافظ ضیاء الاسلام، مدرس مدرسہ بدر العلوم گنگوار حسن پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب ساڑھے چار روپیہ آدھے کے ساجھی نے آدھا لے لیا اور ایک تہائی کے ساجھی نے اپنا ایک تہائی تین روپیہ میں لے لیا ہے اور نویں حصہ کے ساجھی نے ایک روپیہ میں اپنا نوا حصہ لے لیا ہے، تو کل پیسوں کا جوڑ ساڑھے آٹھ روپیہ ہوتا ہے اور پچاس پیسہ کا ذمہ داران تینوں میں سے کوئی نہ ہوگا اور سامان میں سے بھی تینوں کے حصہ میں ساڑھے آٹھ ہی جا سکتے ہیں باقی نصف حصہ سامان کا بھی باقی ہے؛ لہٰذا پچاس پیسہ اس پر واجب ہوگا جو نویں حصہ میں سے بچا ہوا نصف حصہ لینا چاہتا ہے۔ اور اگر یہ نصف کوئی نہیں لیتا ہے تو بائع کا ہے، نیز یہ خریداری میں داخل نہیں ہوا ہے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍صفر ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/۳۳۱۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۲/۱۵ھ

خریدار کا زمین خالی کرانے کے لئے چھپ کر فصل کاٹ لینا

سوال [۸۵۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: ایک شخص نے دوسرے شخص سے ایک کھیت خریدا اور کھیت کی کل قیمت ادا کردیا؛ لیکن کھیت ایک تیسرے آدمی کے قبضہ میں تھا، جس کی اس میں فصل لگی ہوئی تھی، خریدار نے کھیت خالی کرانا چاہا؛ لیکن قابض شخص خالی نہیں کررہا تھا، تو خریدار نے چندآدمیوں کے درمیان کہا کہ اس کھیت سے جو شخص جتنی فصل چاہے کاٹ لے جائے، پھر رات کو چھپ کر فصل خریدار نے کاٹ لی، تو فصل کٹوانا شرعاً کیسا ہے؟ کیا وہ خریدار اپنا کھیت خالی کرانے کے لئے ایسا کر سکتا ہے یا وہ شرعاً چوری کرنے والا ہوگا؟ اور فصل کاٹتے وقت بہت سے لوگ اس کے حمایتی تھے، اس میں ایک مولانا صاحب بھی تھے، تو کیا وہ لوگ بھی شرعاً گنہگار رہوں گے؟ اور مولانا صاحب کی امامت کیسی ہے؟

المستفتی: مولانا حامد علی نئی بازار، تمبور سیتاپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب خریدار نے وہ زمین بائع سے خرید لی تو خریدار اس زمین کا مالک ہوگیا؛ اس لئے فصل لگانے والے آدمی کو کھیت خریدار کے حوالہ کردینا چاہئے تھا اور خریدار سے اس کی رقم وصول کرلینا چاہئے تھا، یا فصل لگانے والا کھیتی کاٹ کر زمین واپس کردیتا، نیز خریدار کو اپنی زمین پر قبضہ کرنے کے لئے فصل لگانے والے پر دباؤ ڈالنا درست ہے؛ لیکن رات میں چھپ کر فصل کاٹنا درست نہیں ہے۔ اور جن لوگوں نے رات میں چھپ کر فصل کاٹنے کی حمایت کی ہے وہ گنہگار ہوئے، ان سب کو توبہ کرنا چاہئے اور مولانا کی امامت درست ہے۔

وكذا إذا كان فيها زرع؛ لأن ملك المشتري مشغول بملك البائع، فكان عليه تفريغه وتسليمه. (هداية، كتاب البيوع، أشرفي ٣/ ٢٦، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٤/ ١١، زكريا ٤/ ٢٩٣، البحر الرائق، زكريا ٥/ ٥٠١، كوئٹه ٥/ ٣٠٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍ شوال ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۱۶۴)

فرضی بل کے ذریعہ سرکاری گرفت سے بچنا

سوال [١٧٨٥١]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید امریکہ سے سامان منگاتا ہے اور سامان کی قیمت تحریر کے ذریعہ سے وہاں بھیجتا ہے، نقد رقم وہاں نہیں جاسکتی ہے اور اس چیز کا تحریری بل کے ذریعہ سے ہندوستان میں بیچنا ضروری ہے، اس کے بغیر وہ رقم امریکہ نہیں بھیج سکتا ہے، تو زید امریکہ سے سامان آجانے کے بعد ہی عمرو کو بغیر تحریری بل کے مثلاً دوسو روپیہ میں فروخت کیا اور دوسو روپیہ لے لئے؛ لیکن امریکہ رقم بھیجنے کے لئے بل ضروری ہے، تو زید نے خالد سے یوں کہا کہ تم مجھے فرضی دوسو روپیہ کا بل بنادو کہ میں نے تم کو دوسو روپیہ میں فلاں سامان فروخت کیا ہے، خالد نے فرضی دو سو روپیہ کا بل بنادیا، لیکن خالد دوسو روپیہ کا بل بنا کر زید سے ۲۵/روپیہ لیتا ہے کہ میں بل کی وجہ سے انکم ٹیکس اور سیل ٹیکس ادا کروں گا، تو زید کا فرضی بل بنانے کی وجہ سے ۲۵/روپیہ خالد کو دینا جائز ہے یا نہیں؟ مع الدلائل تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد سعید پالنپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس مسئلہ میں اولا یہ بات قابل تنقیح ہے کہ زید نے عمرو کو مال بیچتے وقت ہی اس سے بل کیوں نہیں بنوایا؟ اس میں کیا مصلحت ہے؟ اگر زید کو بل کی ضرورت تھی تو وہ عمرو ہی سے مال بیچتے وقت بل بنواتا؛ البتہ اگر اس طرح کا معاملہ ہوچکا ہے اور عمرو سے بل بنوانے میں دشواری ہے تو اپنے حق کی حفاظت اور نقصان سے بچنے کے لئے جعلی بل بنوانا بضرورت گنجائش ہوگی اور بل بنوانے والے نے اگر انکم ٹیکس کے عنوان سے زید سے رقم طلب کی تو زید کے لئے اس رقم کو دینا بھی درست ہوگا۔

لا بأس بالرشوة إذا خاف على دينه، تحته في الشامية عبارة المجتبى لمن يخاف، وفيه أيضا، دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه

ومالہ ولاستخراج حق له، ليس برشوة، يعني في الدافع. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ۹/ ٦٠٧، كراچی ٦/ ٤٢٣-٤٢٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ر شوال ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۰۱۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵ر شوال ۱۴۱۰ھ

حکومت کے قانون کے خلاف نیپال میں جا کر غلہ بیچنا

سوال [۸۵۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہندوستان میں بہت سے حضرات ایسے ہیں جو ہندوستان میں رہ کر اپنا غلہ ہندوستان کے بجائے نیپال میں بیچتے ہیں؛ اس لئے کہ نیپال میں غلے کی قیمت زیادہ لگتی ہے اور مہنگا فروخت ہوتا ہے؛ لیکن انڈیا حکومت اس پر پابندی لگاتی ہے اور پولیس وغیرہ کے ذریعہ سے روکتی ہے، اس کے باوجود لوگ ان سے چھپ کر اپنے غلہ کی سپلائی نیپال ہی میں کرتے ہیں اور بعض حضرات پولیس والوں کو کچھ رقم دے دیتے ہیں، جس سے وہ خوش ہوکر اس کام کی اجازت دے دیتے ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ان حضرات کا نیپال میں اپنا مال سپلائی کر کے نفع حاصل کرنا از روئے شرع درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: نیاز احمد متعلم مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب ہندوستان میں نیپال کے مقابلہ میں غلہ کی افراط ہے اور غلہ کے مالک کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ جہاں سے نفع زیادہ حاصل ہو اپنا غلہ وہیں لے جا کر فروخت کرے؛ اس لئے نیپال لے جا کر جنہوں نے زیادہ نفع حاصل کیا ہے وہ ان کے لئے بلاتردد حلال اور جائز ہے؛ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ حکومت کے قوانین اور گرفت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا بھی لازم ہے، اس کا خیال ضروری ہے۔

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ. [البقرة: ١٩٥]

ولا يمنع الشخص من تصرفه في ملكه إلا إذا كان الضرر بجاره ضررا بينا، فيمنع من ذلك. (الدرالمختار مع الشامي، كتاب القضاء، باب كتاب القاضي إلى القاضي، مطلب اقتسموا دارا، وأراد كل منهم فتح باب لهم ذلك، زكريا ٨/ ١٥٢، كراچی ٥/ ٤٤٧)

القياس في جنس هذه المسائل أن من تصرف في خالص ملكه لا يمنع ولو أضر بغيره لكن ترك القياس في محل يضر بغيره ضررا بينا. (شامي، البيوع، باب المتفرقات، مطلب ربغ فی داره وتأذی الجيران، زكريا ٧/ ٤٩٢، كراچی ٥/ ٢٣٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ربیع الاول ١٤٢٥ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٧/ ٨٢٧٨)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
٣/٤/١٤٢٥ھ

وکیل کا فعل موکل کے فعل کے حکم میں ہوتا ہے

سوال [٨٥٧٣]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید جو شہر لکھنؤ کا رہنے والا ہے، وہ دبئی کی شہزادیوں کا نوکر تھا، پھر زید کو اس پر مامور کیا گیا کہ وہ دبئی سے کپڑے لے کر بمبئی سے سلوا کر دے جو اس کی مزدوری ہوگی، اس کو دی جائے گی، چنانچہ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ وہ دبئی سے کپڑا لے کر بمبئی آیا اور سلوا کر پیش کیا، تو ان شہزادیوں نے کہا: مہنگا سلوا کر لائے ہو اور تمہاری غلطی نہیں ہے، تم بمبئی کے تاجروں کے فریب میں آ گئے ہو، الغرض اس طرح اس کو روپئے نہ ملے اور سارا مال ان شہزادیوں نے منگوالیا، تو اب تفصیل طلب مسئلہ یہ ہے کہ یہ روپئے کس کے ذمہ عائد ہوں گے؟ اور قرضدار کی موت کون مرے گا، زید یا شہزادیاں اور قصوروار کون ہوں گے؟ دلیل کی روشنی میں جواب سے نوازیں۔

المستفتی: حبیب احمد دبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر سائل اپنے بیان میں سچا ہے تو زید شہزادیوں کی طرف سے محض وکیل ہے اور وکیل کا فعل موکل کے فعل کے حکم میں ہوتا ہے۔ اور مذکورہ صورت میں چونکہ زید شہزادیوں سے رقم وصول کرنے سے قاصر ہے؛ اس لئے قرض دار کی موت مرنے والی شہزادیاں ہی ہوں گی، جب کہ غبن فاحش نہ ہو۔

کما استفید من الهداية: الوكيل بالشراء يجوز عقده بمثل القيمة وزيادة يتغابن الناس في مثلها. (هداية، كتاب الوكالة، باب الوكالة بالبيع والشراء، أشرفي ديوبند ۳/ ۱۸۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍محرم ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/۲۹۸۳)

فروختگی کا وکیل بنانا

سوال [۸۵۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید اپنی ایک زمین بیٹی کے نام چھوڑ کر مرگیا، بیٹی نے بیچنے کی بھاگ دوڑ سے بچنے کے لئے زبانی طور پر بلا کسی شرط کے بھائی پر بھروسہ کر کے بھائی کو بیچنے کا اختیار دیا، تین سال قبل بھائی اس طور پر راضی ہوا کہ میں اس کو اپنے طور پر بیچ دوں گا اور تم کو پچاس ہزار روپیہ مل جائے گا، اس پر وہ راضی ہوگئی، اب بیٹی کو پیسہ کی ضرورت ہے اور بھائی نہ زمین بیچتا ہے اور نہ ہی پچاس ہزار روپیہ دیتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ پچاس ہزار روپیہ زمین فروخت ہونے کے بعد ہی ملے گا، چاہے جس وقت فروخت ہو اور جس قیمت میں فروخت ہو، اب اس زمین کی قیمت پچاس ہزار سے کہیں زیادہ ہوگئی ہے، اب بھائی اس وجہ سے مؤخر کررہا

ہے کہ قیمت اور بڑھ جائے اس میں اس کے بھائی کا نفع ہے، تو ایسی صورت میں دونوں بھائی بہنوں کے لئے کیا حکم ہے؟ جواب سے نوازیں۔

المستفتی: عبدالرؤف گونڈوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: ایسا معاملہ کرنا درست ہے کہ فروختگی کی ذمہ داری سونپی جائے اور وہ یہ کہے کہ تم کو اتنا پیسہ دوں گا اور جتنے میں چاہوں فروخت کروں گا، گویا ایسا ہو گیا کہ پچاس ہزار روپئے میں وہ زمین بھائی نے خریدی ہے، اس کو بیچ کر جو زائد نفع حاصل ہوگا وہ بھائی کے لئے جائز ہوگا؛ لیکن گاہک ملنے کے بعد زیادہ تاخیر کی اجازت نہیں ہے، اگر بھائی زیادہ تاخیر کرتا جارہا ہے اور بہن کو پیسوں کی پریشانی ہے تو بہن کو حق ہے کہ زمین واپس لے لے، پھر از خود یا کسی غیر کے ذریعہ فروخت کروا کے اپنی ضرورت پوری کر لے، نیز مذکورہ معاملہ میں پچاس ہزار روپیہ دینے کی مدت صاف طور پر متعین نہیں ہے؛ اس لئے مدت کی جہالت اتنی برداشت کی جاسکتی ہے جتنے میں فریقین میں اختلاف نہ ہو، اور اتنی جہالت جس کی وجہ سے فریقین میں اختلاف پیدا ہو جائے عقد بیع میں جائز نہیں۔ اور یہاں زیادہ تاخیر کی جہالت اختلاف کا سبب بن گئی ہے؛ لہٰذا بھائی پر لازم ہے کہ بہن کی رضامندی سے فوری فروخت کر دے۔ اور اگر فوری فروخت کرنا نہیں جانتا تو بہن کی زمین اس کے حوالہ کر دے، ورنہ گنہگار ہوگا۔

ولو باع إلى هذه الآجال، ثم تراضيا بإسقاط الأجل قبل أن يأخذ الناس في الحصاد –إلى قوله– ولنا: أن الفساد للمنازعة وقد ارتفع قبل تقرره، وهذه الجهالة في شرط زائد لا في صلب العقد، فيمكن إسقاطه.

(هداية، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد ٣/ ٦١)

وقد يكون الفساد لمخافة تنازع، ولا يكون فيه شيء آخر يوجب الإثم، فذلك إن لم يقع فيه التنازع جاز عندي ديانة. (فيض الباري، كتاب

البیوع، باب من آجر أمر الأمصار علی ما یتعارفون، مکتبة الرشید، کوئٹه ۳/ ۲۵۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍رجب ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۸۸۹۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۷/۵ھ

بائع مبیع کی قیمت وکیل سے کم لے تو کیا حکم ہے؟

سوال [۸۵۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اسکوٹر پارٹس کی ایک کمپنی ہے، اس سے اگر کوئی عام شخص اسکوٹر خریدے تو اس کو پورے سو روپے میں دے گا، اور اگر اس کا خاص آدمی خریدے تو اس کو سو روپے کی رسید دے گا اور دس پرسینٹ چھوٹ ہوگی، اب اگر یہ خاص آدمی کسی عامی کا وکیل ہے اور اسکوٹر خرید کر موکل کے لئے لایا اور سو روپے کی رسید موکل کو دکھا کر پورے پیسہ لے لئے؛ لیکن موکل کو اس بات کی خبر نہیں ہوتی ہے کہ اس کو دس پرسینٹ کی چھوٹ ہے اور مجھ سے زیادہ لے رہا ہے۔ اور نہ اس کو (وکیل کو) ہاتھوں ہاتھ ملتا ہے؛ بلکہ ایک مدت متعینہ کے بعد کمپنی اس کو دس پرسینٹ کا حساب کر کے دے گی، تو بیع کی یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: مولوی عبد الواحد، معلم مدرسہ فیض التبلیغ جے، پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں درج شدہ صورت میں نفسِ عقدِ شراء اور عقدِ وکالت دونوں درست اور صحیح ہیں؛ لیکن وکیل سے رقم کی جو مقدار کی کمی کی گئی ہے وہ موکل کے حق میں ہوگی؛ لہٰذا وکیل کے لئے موکل سے سو روپے کی رسید دکھا کر سو روپے اصول کرنا جائز نہیں ہوگا، وکیل پر واجب ہے کہ دس روپے موکل کو واپس کر دے اور ۹۰؍روپے وصول کرے، ورنہ دس روپے وکیل کے لئے حرام ہوں گے۔

وإن حط البائع عن الوكيل بعض الثمن فإنه يحطه عن الموكل -إلى قوله- ولو وهب البائع بعض الثمن عن الوكيل يظهر ذلك في حق الموكل حتى لم يكن للوكيل أن يرجع على الموكل بذلك القدر. (هندية، كتاب الوكالة، قبيل الباب الثالث في الوكالة بالبيع، زكريا قديم ۳/ ۵۸۸، جديد ۳/ ۴۹۹، البحرالرائق، كوئٹه ۷/ ۱۵۵، زكريا ۷/ ۲۶۳، هكذا في الشامي، زكريا ۸/ ۲۵۰، كراچی ۵/ ۵۱۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ / جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۲۵۴)

مستحق نکل آنے والی زمین کا حکم

سوال [۸۵۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے ایک زمین عمرو کو فروخت کی ۱۹۹۸ء میں۔ اور عمرو نے خرید کر رجسٹری کروائے بغیر اس زمین پر ایک مکان تعمیر کرلیا ۲۰۱۰ء میں جب حکومت سے سروے کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ زمین زید کی نہیں؛ بلکہ اس کا آدھا حصہ حکومت کا ہے، جس پر راستہ آرہا ہے۔ اور آدھا حصہ ایک عیسائی کی زمین ہے اور زید کی زمین اس کے پڑوس میں ہے اور اس وقت عمرو کہہ رہا ہے کہ زید نے مجھے دھوکہ دیا ہے؛ اس لئے وہ مجھے زمین اور اس پر تعمیر شدہ مکان کی قیمت ادا کرے اور زید کہہ رہا ہے کہ مجھ سے غلط فہمی ہوگئی تھی، البتہ میں زمین کی قیمت واپس کروں گا، مکان کی نہیں، تو اب معلوم یہ کرنا ہے کہ زید عمرو کو زمین کی کون سی قیمت واپس کرے گا ۱۹۹۸ء کی یا ۲۰۱۰ء کی؟ اور زمین پر تعمیر شدہ مکان کی قیمت کا کون ذمہ دار ہے؟ نیز عمرو کا رجسٹری نہ کروانا اور تحقیق نہ کروانا بھی غلطی میں شمار ہوگا یا نہیں؟ جواب سے نوازیں۔

المستفتی: سید اللہ الغالب، مدرسہ عربیہ تعلیم القرآن اپہلی اندورا، چکمگلور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں زید پر زمین کی ۱۹۹۸ء کی قیمت عمرو کو لوٹانا واجب ہے، نیز مذکورہ زمین پر تعمیر کردہ مکان کی موجودہ قیمت بھی اسی کے ذمہ عمرو کو دینا لازم ہے۔ اور عمرو رجسٹری اور تحقیق نہ کرنے کے باوجود دونوں قیمتوں کا مستحق رہے گا۔ اور اس کی ایک متبادل شکل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ زید عیسائی کو راضی کرکے اس زمین کی جو بھی قیمت بنتی ہو وہ قیمت عیسائی کو ادا کردے یا زید کی جو زمین ہے عیسائی کو وہی زمین تبادلہ میں دے دے، اور اس سلسلہ میں ایک سرکاری کاغذ بھی ایسا بنالیا جائے جس کی وجہ سے بعد میں کوئی نزاعی شکل نہ بن سکے۔

شری دارا وبنی فیها، فاستحقت رجع بالثمن وقيمة البناء مبنيا على البائع إذا سلم النقض إليه يوم تسليمه، وتحته في الشامية: متعلق بقيمة، فلو سكن فيه وانهدم بعضه أو زادت قيمته يرجع عليه بقيمة البناء يوم التسليم. (شامي، كتاب البيوع، باب الاستحقاق، زكريا ۷/ ٤٤٩، كراچی ٥/ ٢٠٥)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۴؍ رجب ۱۴۳۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۱۴۷)	۲۴/ ۷/ ۱۴۳۱ھ

پریس والوں کا پوری قیمت وصول کرکے کچھ اشتہار کم دینا

سوال [۸۵۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید کتابت اور چھپائی کا کام کرتا ہے اور جتنے اشتہار یا کتابچے وغیرہ قیمت مقررہ پر چھاپنے طے ہوتے ہیں ان سے دو چار یا آٹھ دس کم دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اتنے عدد تو عام طور پر پریس میں خراب ہو ہی جاتے ہیں اور قیمت طے شدہ ہی لیتا ہے، تو کیا یہ فعل

اس کا درست ہے؟ اور اگر بعد میں جتنے اشتہار کم چھپتے ہیں ان کی قیمت واپس کردے، تو کیا یہ معاملہ درست ہوجائے گا؟

المستفتی: (مفتی) اسرار احمد نجیب آباد، بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جی ہاں چھپائی میں کچھ کاغذ ضرور خراب ہوجاتے ہیں؛ اس لئے جتنی تعداد خراب ہوجائے اتنی کم دے کر پوری قیمت لینا پریس والوں کے لئے جائز ہے؛ اس لئے کہ خراب ہوجانا مشاہدہ میں ہے اور جتنے اشتہار کم چھپے ہیں ان کی قیمت واپس لینا اس شرط پر جائز ہے کہ جب اتنے خراب نہ ہوئے ہوں۔

عن ابن عباس – رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: لا ضرر ولا ضرار. (سنن ابن ماجة، الأحكام، باب من بنى في حقه ما يضر بجاره، النسخة الهندية ۱/ ۱۶۹، دارالسلام، رقم: ۲۳٤۱، المعجم الكبير للطبراني ۲/ ۸۶، رقم: ۱۳۸۷، الأشباه، قديم: ۱۱۸، جديد زكريا ۱/ ۲۵۰، قواعد الفقه ۱۰۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ ذیقعدہ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۳۵۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶/۱۱/۱۴۲۰ھ

سپلائر کا کارخانہ دار سے سامان خرید کردوکاندار کو کم قیمت میں فروخت کرنا

سوال [۸۵۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک کارخانہ دار نے اپنے یہاں کا مال تیار کیا ہوا ایک سپلائر کے ہاتھ بیچ دیا، اس سپلائر نے خریدنے کے بعد وہ مال مارکیٹ میں جاکر ایک دوکاندار کے ہاتھ بیچ دیا، جتنے میں کارخانہ دار سے خریدا تھا اس سے پچاس روپئے کم میں بیچ دیا، اب کارخانہ دار کو اطلاع ملی کہ میرے یہاں کا مال مارکیٹ میں فلاں دوکاندار کو پچاس روپئے کم میں بیچا، وہ مال تقریباً ۲۰/ یا ۲۵/ ہزار عدد تھا، جس کے پچاس روپئے سے ۱۰/ یا ۱۲/ لاکھ روپئے بیٹھتے ہیں، اب کارخانہ دار دوکاندار کو

اپنے گھر بلاتا ہے اور آدمیوں کو بھی جمع کرتا ہے اور سب کے سامنے یہ کہتا ہے کہ اس دوکاندار نے ہمارا مال پچاس روپئے کم میں سپلایر سے خریدا ہے، اب یہ رقم ہمیں چاہئے، اس میں کافی لوگ جمع تھے، اب یہ فرمائیں علماء دین یہ کہ ۱۰/یا ۱۲/لاکھ روپئے کی رقم ان آدمیوں کا کارخانہ دار کو دلانا جائز ہے یا نہیں؟ اور ان کا اس رقم کو لینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: حاجی فرزند صاحب سرائے ترین سنبھل

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دوکاندار نے سپلایر سے خریدا ہے، دوکاندار کا معاملہ سپلایر سے ہے کارخانہ دار سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، جیسا کہ سوال نامہ سے واضح ہو رہا ہے۔ اور سوال نامہ سے یہ بھی واضح ہے کہ کارخانہ دار نے دوکاندار سے کوئی معاملہ نہیں کیا ہوا ہے؛ بلکہ سارا معاملہ دوکاندار اور سپلایر کے درمیان میں ہے؛ اس لئے سپلایر نے جتنے میں دوکاندار کو دیا ہے، دوکاندار کو اتنے میں خریدنے کا حق ہے، اب اگر سپلایر نے کارخانہ دار سے ادھار خرید کر دوکاندار کے ہاتھ کم قیمت میں نقد بیچا ہے تو اس نقصان کا ذمہ دار سپلایر ہے، دوکاندار نہیں؛ اس لئے دوکاندار سے کسی قسم کے مطالبہ کا حق نہیں۔ اور سارا مطالبہ سپلایر سے ہوگا۔

الثمن المسمى هو الثمن الذي يسميه ويعينه العاقدان وقت البيع بالتراخي، سواء كان مطابقا بقيمته الحقيقية أو ناقصا عنها، أو زائدا عليها. (شرح المجلة، رستم مكتبه اتحاد ۱/ ۷۳، رقم المادة: ۱۵۳، مجلة الأحكام العدلية ۱/ ۳۳، رقم المادة: ۱۵۳)

يجوز للمشتري أن يزيد في الثمن، ويجوز للبائع أن يحط من الثمن، وأن يزيد في المبيع ويلتحق بأصل العقد، ويتعلق الاستحقاق بجميع ذلك. الخ (تبيين الحقائق، كتاب البيوع، باب التولية، زكريا ٤/ ٤٤٢، إمداديه ملتان ٤/ ٨٣، مختصر القدوري، باب المرابحة والتولية، ص: ٨١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/رجب ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۲۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/۷/۱۴۳۴ھ

مبیع کو انعام کے ساتھ فروخت کرنا

سوال [۹۷۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عبدالحلیم تجارت کرتا ہے، جس میں کچھ ایسی صورتیں درپیش ہیں جو مشکل کا باعث ہیں، مثلاً میٹھی سپاری کا ایک پورا پیکٹ جس کی قیمت ۲۲/ روپئے ہے، جس کے اندر ۶۰/ پاؤج ہوتے ہیں، میٹھی سپاری کے ہر پاؤج کی فروخت پچاس پیسے ہے، اس حساب سے پورے پیکٹ کے منافع ۸/ روپئے ہیں، اس پیکٹ کی قیمت جتنی پہلے تھی اتنی ہی اب ہے؛ لیکن قبل ازیں پاؤج میں انعامات نہیں ہوتے تھے، مگر اب سپاری میں بغیر کسی کمی کے انعام کے طور پر کچھ چیزیں رکھ دی ہیں، مثلاً پنسل، قلم اور گھڑی، سائیکل وغیرہ اور کمپنی کی طرف سے یہ اعلان ہے کہ کمپنی صرف مال کے پیسے لے رہی ہے اور انعام فری میں دئے جارہے ہیں، کیا ایسی حالت میں ان جیسی اشیاء کی خرید وفروخت شریعت کی رو سے جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالحلیم مجاشاہ قلندر لہرپور، سیتاپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب کمپنی کی طرف سے یہ اعلان ہے کہ وہ صرف سپاری کی پیکٹ کے پیسے لے رہی ہے اور انعامات اپنی جیب خاص سے دے رہی ہے، تو ایسی صورت میں یہ بیع جائز ہوگی؛ لیکن ایسے معاملہ میں کسی حد تک قمار کا شبہ رہتا ہے؛ اس لئے یہ معاملہ کم سے کم کراہت تنزیہی کے درجے میں ہوگا؛ البتہ اگر خریدنے والے کی نیت صرف انعام حاصل کرنا ہو اور سپاری کی خریداری ضمنی طور پر ہو تو پھر یہ شکل جائز نہ ہوگی۔ (مستفاد: جواہر الفقہ، قدیم ۲/ ۳۴۵، جدید زکریا ۴/ ۵۶۶، جدید فقہی مسائل ۴/ ۲۷۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ رجب ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۴۵۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/ ۷/ ۱۴۲۵ھ

اسکیم کے تحت پنکھے کی خرید وفروخت

سوال [۸۵۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک سوال پیش خدمت ہے، جس کے لئے فتویٰ عنایت کریں کہ کام کرنے کے لئے کہاں تک گنجائش ہے، اگر اس کام میں مسئلہ کے مطابق رخصت ہوتو تحریر فرمائیں کام یہ ہے کہ ہم بجلی سے چلنے والے پنکھے جن کی قیمت مبلغ چار سو پانچ روپیہ فی عدد ہوتی ہے، ایک اسکیم کے تحت پانچ روپیہ روزانہ جمع کر کے ۸۰/ دن میں کل چار سو پانچ روپیہ فیس ممبری وصول کرتے ہیں، اپنی اس اسکیم کے مطابق ہفتہ یا پندرہ دن میں ایک عدد پنکھا بطور انعام بذریعہ قرعہ اندازی کسی بھی ایک ممبر کو دے دیتے ہیں، یہ سلسلہ اسکیم مکمل ہونے تک چلتا رہتا ہے، اسکیم کی مدت مکمل ہونے پر تمام ممبران کو پنکھے دے دیئے جاتے ہیں، دوران اسکیم بھی اگر ممبر کو ضرورت ہوتو نصف رقم جمع ہو جانے کے بعد بھی پنکھا دے دیا جاتا ہے (یہ بات تعلقات اور بھروسہ پر مبنی ہے، جو قیمت اسکیم میں رکھی گئی ہے، وہی قیمت نقد پنکھے کی بھی ہے، حق کسی کا نہیں مارا جاتا، قسط جمع کرنے کے بعد روزانہ خاص محنت بھی کی جاتی ہے۔

المستفتی: منورعلی، شیرکوٹ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: متعدد وجوہ سے یہ اسکیم ناجائز اور حرام ہے (۱) یہ عقود شرعیہ میں سے کسی میں بھی پوری طرح داخل نہیں، نہ بیع میں نہ سلم میں، نہ ہبہ میں، نہ شرکت میں۔ (۲) جو رقم قسطوں میں جمع ہوتی ہے وہ تمام ممبران کی مساوی ملکیت ہے، قرعہ اندازی میں تمام ممبران کی ملکیت کا بلا معاوضہ ایک شخص کو مالک بنایا جاتا ہے۔ (۳) دیگر ممبران راضی بھی نہیں ہوتے اور ہوں تو مجبوراً؛ کیوں کہ ہر ایک کی تمنا ولالچ رقم جمع کرنے میں یہی ہے کہ قرعہ میں میرا نام نکل آئے اور یہ امر متردد فیہ ہے جو شرعاً قمار میں داخل ہے۔ (۴) شرکت میں اس لئے داخل نہیں کہ اس میں نفع ونقصان میں سب کا برابر شریک ہونا شرط ہے جو یہاں

نہیں ہے؛ لہٰذا یہ معاملہ ہرگز ناجائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ، قدیم ۶/ ۱۴۲، جدید زکریا ۹/ ۲۶۶، کفایت المفتی قدیم ۸/۱۲۲، جدید زکریا مطول ۱۱/ ۱۰۷-۱۰۸، امداد الفتاوی زکریا ۴/ ۱۶۲، فتاوی محمودیہ، قدیم ۴/ ۲۵۴، جدید ڈابھیل ۱۶/ ۳۳۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍محرم الحرام ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۴۲۶)

عقد کے وقت ثمن میں جہالت نہ ہو تو عقد صحیح ہے؟

سوال [۸۵۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کا کسی غیر مسلم سے کاروبار چلتا ہے، اس طرح کہ مثلاً زید نے کسی غیر مسلم کو کوئی چیز فروخت کی، دوسو روپئے قیمت طے ہوئی؛ لیکن وہ غیر مسلم یوں کہتا ہے کہ ان غیر مسلموں کے یہاں مدت دراز سے یہی قانون بنا ہوا ہے، اگر نقد روپیہ لوگے تو ۲۵؍ پرسینٹ رقم کم ملے گی۔ اور اگر ایک ماہ بعد لوگے تو بیس پرسینٹ کم رقم ملے گی۔ اور دو ماہ بعد لوگے تو دس پرسینٹ کم ملے گی اور تین ماہ بعد لوگے تو پانچ پرسینٹ کم ملے گی، تو زید نے یہ طے کرلیا کہ ایک ماہ بعد ۲۰؍ پرسینٹ کم پر دے دیں، یہ معاملہ طے ہو گیا؛ لیکن وہ غیر مسلم ایک ماہ پورا ہونے پر رقم نہیں دیتا ہے، مطالبہ پر یوں کہتا ہے کہ دو ماہ پورے ہونے پر ۱۰؍ پرسینٹ کم پر لے لینا، تو اس طرح مدت کے بڑھ جانے پر زید کے لئے دس پرسینٹ بڑھا کر لینا جائز ہے یا نہیں؟ حالانکہ اس نے ۲۰؍ پرسینٹ کم پر معاملہ طے کیا تھا اور اس طرح کا معاملہ بھی درست ہے یا نہیں؟ مع الدلائل بحوالہ کتب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد سعید، پالن پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت ہذا میں اگر عقد کے وقت ثمن میں کوئی

جہالت نہ تھی اور یہ بات طے کر لی گئی تھی کہ ایک مہینہ بعد بائع کو اتنی رقم دی جائے گی، تو یہ معاملہ درست اور منعقد ہو گیا، البتہ اگر مشتری وقت پر ثمن نہ ادا کرے تو مزید مہلت دینے کی وجہ سے طے شدہ ثمن سے زیادہ لینا درست نہ ہوگا؛ بلکہ اتنی ہی رقم لی جائے گی جتنی ابتداء عقد میں طے ہوئی تھی، یہ بات یاد رہے کہ فیصدی کے ذریعہ اس طرح رقم طے کرنا کہ اصل ثمن مجہول رہے جائز نہیں ہے؛ اس لئے اس طرح کا معاملہ کرتے وقت اس نکتہ کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

قال في النهر: ولو كان البدل مثليا، فباعه به وبعشرة، أي عشر ذلك المثلي، فإن كان المشترى يعلم جملة ذلك صح وإلا، فإن علم في المجلس خير وإلا فسد. (شامي، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، زكريا ۷/ ۳۵۲-۳۵۳، كراچی ۵/ ۱۳۵، النهر الفائق، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۴۵۶، تبيين الحقائق، مكتبه إمداديه ملتان ۴/ ۷۴، زكريا ۴/ ۴۲۴)

كل قرض جر نفعا فهو ربا حرام. (قواعد الفقه، أشرفي، ص: ۱۰۲، رقم: ۲۳۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ شوال ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۰۱۱)

پیکنگ شدہ ڈبوں کی وزن کئے بغیر خرید وفروخت کرنا

سوال [۸۵۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل مارکیٹوں میں جو بیوعات ہوتی ہیں، ان کی مختلف صورتیں ہیں: ایک صورت تو یہ ہے کہ مشتری ایک کیلو یا دو کیلو کی پیکٹ خریدتا ہے۔
دوسری صورت یہ ہے کہ مشتری خرید وفروخت مجازفتہ کرتا ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ دوکاندار مشتری کے کسی وکیل کے سامنے اشیاء تولتا ہے، ان تمام صورتوں میں اگر دوکاندار مشتری کے سامنے اشیاء نہ بھی تولے تو بھی اس کے جواز میں کسی کو کوئی کلام نہیں۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ مشتری دوکاندار کو ایک چٹ دے دیتا ہے جس کے مطابق دوکاندار اشیاء تول کر مشتری کے گھر بھجوا دیتا ہے، جس میں مشتری کی جانب سے کوئی وکیل بھی نہیں ہوتا اور مشتری وزن کا اعادہ نہیں کرتا ہے۔

پانچویں صورت یہ ہی ہے کہ مشتری جب دوکان جاتا ہے تو دوکاندار نے پہلے سے اشیاء تول کر رکھی ہوتی ہیں اور سابقہ وزن کی بنیاد پر مشتری اشیاء لے لیتا ہے اور وزن کا اعادہ نہ دوکان میں کرتا ہے نہ گھر جا کر کرتا ہے، حالانکہ ''بہشتی زیور'' میں اس طرح کے اشیاء کے استعمال کرنے کو ناجائز لکھا ہے۔ اور تمام متون سے بھی یہی بات سمجھ میں آتی ہے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ آخری دوصورتیں اگر واقعی ناجائز ہیں تو کیا ان کے جواز کی کوئی صورت ہوسکتی ہے یا نہیں؟ کیوں کہ آج کل اس طرح کی بیوعات میں تو عوام وخواص مبتلا ہیں۔ از راہ کرم جواب باصواب سے مطلع فرما کر ثواب دارین حاصل کریں۔ جزاک اللہ

المستفتی: محمد بن احمد حسین پٹنی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مشتری کے سامنے کیل کرنا اور تولنا یا مشتری کا گھر لا کر کے کیل کرنا اور تولنا اس صورت میں لازم ہوتا ہے کہ جب خریدار کو بائع اور دوکاندار پر اعتماد نہ ہو اور آج کل کے زمانہ میں کیل کی ہوئی چیزیں اور تلی ہوئی چیزیں جو پیکنگ شدہ خرید وفروخت ہوتی ہیں، ان پر اعتماد ہوتا ہے؛ اس لئے مشتری کے سامنے تولنا یا کیل کرنا یا مشتری کا گھر لا کر کے تولنا یا کیل کرنا لازم نہیں ہے۔ اور ''بہشتی زیور'' میں جو لکھا ہوا ہے، اسی طرح تمام متون میں جو لکھا ہوا ہے، ان سب کا مدار اسی پر ہے کہ جب مشتری کو بائع پر اعتماد نہ ہو یا مفضی الی المنازعت ہو اور یہاں نہ کوئی عدم اعتماد ہے اور نہ مفضی الی المنازعت ہے۔ اور

سوال نامہ میں جتنی شکلیں رائج شدہ لکھی گئی ہیں وہ سب جائز ہیں۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳/ ۴۹۹-۴۹۷، انوار رحمت، ص:۲۸۱، جامع الفتاوی ۳/ ۱۵۸)

فالذي يتبين أن المشتري إن اعتمد على كيل البائع جاز له أكله بدون إعادة الكيل، سواء كان بحضرته أو بغيبته. (فيض الباري ۳/ ۲۲۰)

وقيد بقوله: ”غير الدراهم والدنانير“ ...... كبيع التعاطي، فإنه لا يحتاج في الموزونات إلى وزن المشتري ثانيا؛ لأنه صار بيعا بالقبض بعد الوزن، قنيه وعليه الفتوى، خلاصة، عبارة البحر: وهذا كله في غير بيع التعاطي أما هو فقال في القنية: ولا يحتاج الخ، وظاهر قوله، وهذا كله أنه لا يتقيد بالموزونات بل التعاطي في المكيلات والمعدودات كذلك.

(شامي، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، مطلب في تصرف البائع في المبيع قبل القبض، زكريا ۷/ ۳۷۳، كراچی ۵/ ۱۵۰، قديم ص: ۱۵٤)

فصل في تعارض العرف مع الشرع، فإذا تعارضا قدم عرف الاستعمال. (الأشباه والنظائر، زكريا ص: ۲۷٤، قديم: ۱۵٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ ذیقعدہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۸۵۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/۱۱/۱۴۳۳ھ

بنجر زمین کو آباد کرنا

سوال [۸۵۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک زمین جو کہ نہر کے کنارے ہے، جو بنجر پڑی ہوئی تھی، زید نے اس کو اپنے نام پٹواری سے کرالیا، کچھ قیمت دے کر، واضح رہے کہ وہ زمین کسی کی ملکیت میں نہیں تھی، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ آیا شرعی اعتبار سے اس پر زید کی ملکیت درست ہے؟

المستفتی: عبدالرحمٰن سول لائن، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بنجر زمین جس پر کسی کی ملکیت نہ ہواسے جب کوئی شخص آباد کرلے اور آباد کرنے کے بعد حکومت کی اجازت سے اپنے نام کاغذات بنالے، تو وہ زمین اس کی ملکیت ہوجاتی ہے۔ اور بورڈ کی طرف سے جو علاقہ کا پٹواری ہوتا ہے، اس پٹواری کے ذریعہ سے اگر نام کرالیا جائے تو وہ صحیح اور درست ہوجاتا ہے؛ لہٰذا سوال نامہ میں زید نے جو زمین آباد کرکے پٹواری کے ذریعہ اپنے نام کروالیا ہے وہ شرعی طور پر درست ہے، زید اس کا مالک ہے۔

عن عائشة –رضي الله عنها– عن النبي ﷺ قال: من أعمر أرضا ليست لأحد فهو أحق، قال عروة: قضى به عمر في خلافته. (صحيح البخاري، كتاب الحرث والمزارعة، باب من أحيى أرضا مواتا، النسخة الهندية ١/ ٣١٤، رقم: ٢٢٧٧، ف: ٢٣٣٥)

فالملک في الموات يثبت بالإحياء بإذن الإمام عند أبي حنيفة، وعندهما يثبت بنفس الإحياء وإذن الإمام ليس بشرط. (بدائع الصنائع، كتاب الأراضی، زكريا ٥/ ٢٨٤، إمداديه ملتان ٦/ ١٩٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ محرم الحرام ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۶۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/۱/۱۴۲۶ھ

سرکاری افتادہ زمین کی خرید وفروخت کی شرعی حیثیت

سوال [۸۵۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ممبئی کی آراضی سے متعلق ویسے تو بہت سے مسائل ہیں، فی الحال شخصی ملکیت والی آراضی سے متعلق حکم شرعی مطلوب ہے۔ چنانچہ ممبئی کے بعض علاقوں میں متعین شخص یا چند افراد (کمپنی) کی بڑی بڑی آراضی ہیں، سرکاری ریکارڈ میں ان کے مالک ہونے کے تمام

ثبوت وشواہد موجود ہیں، قانوناً ان کے خلاف کسی کا دعویٰ بھی نہیں ہے؛ لیکن ان آراضی کا حال یہ ہے کہ فی الحال ان پر سیکڑوں بلکہ بعض جگہ ہزاروں مکانات تعمیر ہو چکے ہیں، جن میں ہر قوم و مذہب کی ہزاروں فیملیاں رہائش پذیر ہیں، اور بہت سی جگہ مسجد، مدرسہ اور مکاتب بھی قائم ہیں۔ موجودہ صورت حال کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں؛ البتہ ان میں ایک بڑا اور ظاہری سبب یہ ہے کہ پرکھوں، باپ داداؤں کی زمینیں تھیں اور اکثر وبیشتر بے قیمت تھیں؛ لہٰذا ان کی طرف توجہ نہیں تھی؛ بلکہ بہت سے لوگوں کو تو حکومت کی طرف سے بتایا گیا تو انہیں پتہ چلا کہ یہ ساری زمین ان کے آباء واجداد کی تھیں اور اب وہ ان کے مالک ہیں، چنانچہ خالی زمینیں دیکھ کر آہستہ آہستہ لوگ قبضہ کرنے لگے اور بستیاں بس گئیں۔ اور بعض جگہ ایسا ہوا کہ بغرض حفاظت دربان اور واچ مین رکھے گئے تھے، انہوں نے مالکوں کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے معمولی معمولی رقم لے کر لوگوں کو جھونپڑے بنانے کی اجازت دے دی۔ اور اس طرح یہ دربان لکھپتی کروڑ پتی بن گئے اور خالی زمینیں بستیوں میں تبدیل ہو گئیں، چونکہ اس قسم کی جھوپڑ پٹیاں، سیاستدانوں کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہیں، کیوں کہ عموماً یہی لوگ ووٹ دینے جاتے ہیں، سیاسی جلسوں میں شریک ہوتے ہیں، ورنہ امیر طبقہ بلکہ اب تو متوسط طبقہ بھی عموماً ان جھمیلوں میں نہیں پڑتا، اس لئے ایسی بستیوں میں بنیادی ضروریاتِ زندگی لائٹ، پانی وغیرہ فراہم کردی جاتی ہیں۔ اور کبھی کبھار راستہ کی اصلاح ومرمت ہوتی رہتی ہے۔ ان میں اکثروں کے راشن کارڈ نہیں بن پاتے؛ البتہ کچھ لوگ غلط سلط معلومات کی بنیاد پر راشن کارڈ بنا لیتے ہیں، جو عموماً اصلی نہیں ہوتے؛ بلکہ نقلی ہوتے ہیں، ان کے پاس مکانات کے فوٹو پاس نہیں ہوتے، ان کے ایڈریس پر بہت سے اہم سرکاری دستاویزات بھی نہیں بن پاتے ہیں۔ الغرض حکومت کی نگاہ میں بھی یہ لوگ حقیقی مالکان کی حیثیت نہیں رکھتے؛ لیکن ان کو ہٹانا بہت مشکل ہوتا ہے؛ کیوں کہ ساری سیاسی جماعتیں اور ہیومن رائٹس کی تنظیمیں، غریبوں کے حقوق کی جنگ لڑنے کھڑی ہو جاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات مالکان، سیاستدانوں اور افسروں سے سازباز کر کے کسی بہانے بستی میں آگ لگوا دیتے ہیں، تاکہ ان کی زمینیں خالی ہو جائیں، اب تک اس طرح کے کئی واقعات رونما ہو چکے ہیں۔

الغرض ان حالات سے نمٹنے کے لئے حکومت مہاراشٹر نے ایک اسکیم پاس کی ہے، جس کو S.R.A اسکیم کہتے ہیں۔ حکومت کا مقصد اس اسکیم سے قابضین اور مالکان دونوں کو فائدہ پہنچانا ہے، چنانچہ قابضین کو مکان مل جائے گا اور مالکان کی اراضی خالی ہوکر ان کے قبضہ میں آجائے گی؛ البتہ اس اسکیم سے متعلق کچھ ضوابط اور چند شرائط ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) S.R.A اسکیم میں اسی شخص کو فلیٹ مل سکتا ہے جس کے پاس ۱۹۹۵ء سے پہلے کا کوئی بھی سرکاری ثبوت اس مکان سے متعلق موجود ہو، مثلاً لائٹ بل ہو یا فوٹو پاس ہو وغیرہ۔ ۱۹۹۵ء کے بعد سے رہائش پذیروں کو اس اسکیم سے فلیٹ نہیں مل سکتا۔

(۲) اگر رہائشی مکان ہے تو خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو یا کتنا ہی چھوٹا ہو، اس کے بدلہ میں 269 اسکوائرفٹ ہی کا مکان ملے گا۔ واضح رہے کہ پہلے 225 اسکوائرفٹ کا قانون تھا، جو اب بدل کر بڑھ گیا ہے۔

(۳) اگر دوکان ہے تو اگر 100 اسکوائرفٹ کی ہے تو بدلہ میں بلڈنگ کے اندر 100 اسکوائرفٹ کی دوکان ملے گی۔ اور اگر 100 اسکوائرفٹ سے بڑی ہے، خواہ کتنی ہی بڑی ہو تو اسے 225 اسکوائرفٹ کی دوکان ملے گی۔

واضح رہے کہ مالکان آراضی کو اپنی آراضی باقاعدہ S.R.A اسکیم میں پاس کروانی ہوتی ہے جس کے لئے وقت اور مال دونوں بڑی مقدار میں خرچ ہوتا ہے، بغیر پاس کرائے یہ کام نہیں ہوسکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ مالکان آراضی کو لاکھوں روپئے خرچ کرکے S.R.A اسکیم میں اپنی زمین پاس کروانی ہوتی ہے، پھر جتنے بھی قابضین ہیں سب کو ضابطہ کے مطابق مکانات اور دوکانیں مفت دینی ہوتی ہیں، ان سب کے لئے بلڈنگیں تعمیر کرنے کے بعد جو زمین خالی بچ جائے وہ مالکان کو ملتی ہے؛ البتہ اس کے عوض میں حکومت کی طرف سے مالکانِ آراضی کو F.S.I بڑھ کر ملتی ہے، مثلاً اگر مکمل خالی زمین پر ایک لاکھ اسکوائرفٹ کا کام قانوناً ہوسکتا تھا؛ لیکن S.R.A اسکیم کی وجہ سے زمین کا کچھ حصہ کم ہوگیا، تو اس کے بدلہ حکومت ایک لاکھ اسکوائرفٹ کے بجائے دو لاکھ

اسکوائرفٹ بنانے کی اجازت دیتی ہے،اس طرح کافی حد تک تلافی ہوجاتی ہے؛لیکن بہرحال اس طرح بھی مالکین پر کافی بوجھ آتا ہےاور مجبوراً اور بادلِ نخواستہ مکانات بنا کر دینے پڑتے ہیں۔ اور بعض تو ہمت ہی نہیں کر پاتے؛ کیوں کہ ان جھونپڑے والوں کو دینے کے لئے اتنی مقدار میں بلڈنگیں بنانی پڑیں گی کی ان کی تعمیر پر کروڑوں روپئے کی لاگت آئے گی،جس کی وہ ہمت نہیں کرپاتے اور بالآخر زمین یونہی پڑی رہتی ہے۔

الغرض مسطورہ بالاتفصیلات کی روشنی میں درج ذیل سوالات کے جوابات مطلوب ہیں:

(۱) کیا شخصی ملکیت کی زمین پر قبضہ کرکے مکان ودوکان بنانا جائز ہے؟ اس طرح سے تعمیر شدہ مساجد ومدارس اور مکاتب قرآنیہ کا کیا حکم ہے؟

(۲) کیا شخصی ملکیت کی زمین پر قابض اول سے خریدنے کی اجازت ہے، اسی طرح دوسرے تیسرے نمبر پر خریدنے کا کیا حکم ہے؟ نیز ان جیسے مکانات اور دوکانوں سے حاصل ہونے والے منافع کا کیا حکم ہے؟

(۳) اگر قابض یا خریدار، امام مسجد ہو، خواہ وہ اس میں رہائش پذیر ہو، یا کرائے پردے کرکے کرایہ حاصل کررہا ہو، اور باوجود علم کے اس سے باز نہ آتا ہو، تو اس کی امامت کا کیا حکم ہے؟

(۴) S.R.A ڈیولپمینٹ اسکیم کے تحت ملنے والے مکانات لینا جائز ہے یا ناجائز؟

نوٹ:- واضح رہے کہ ایسی زمینوں پر بسے ہوئے اکثر لوگوں کے پاس رہنے کے لئے یہی مکان ہوتا ہے؛ اس لئے ان لوگوں کی بازآبادکاری کے لئے حکومت کی S.R.A اسکیم ہے، اگرچہ بہت سے لوگوں نے بڑی جگہیں بھی قبضہ میں کررکھی ہیں اور اس پر تعمیرات کرکے اچھی خاصی آمدنی حاصل کررہے ہیں۔ فقط والسلام

المستفتی: عبدالرشید عفی عنہ نعمانی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہندوستان کی جائیداد، ان کی نوعیت اور ان کی حیثیت سے متعلق کافی غور وخوض کرنے کے بعد یہ بات سامنے آئی ہے کہ ہندوستان کی جائیداد جن

پر مالکان کے علاوہ دوسروں کا قبضہ ہے، وہ کل تین قسموں پر ہیں: (۱) صحرائی جائیداد: ۱۹۴۷ء سے پہلے انگریزی حکومت نے یہ قانون بنایا تھا کہ جس جائیداد پر کسی کسان نے ۱۲ر سال تک تسلسل کے ساتھ کھیتی کی ہو کسان اس زمین کا مالک ہو جائے گا، مگر یہ قانون لازمی اور جبری نہیں تھا؛ بلکہ اختیاری تھا، اس بارے میں اس زمانہ کے علماء نے یہ فتوی صادر کیا تھا کہ چونکہ زمین پر حکومت کے استیلاء اور تغلب کے ذریعہ سے قبضہ نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ کسان کو مالک بننے کا ایک اختیاری قانون ہے۔ اور کسان اگر مالک کو واپس کردے اور مالک اپنی ملکیت میں رکھے تو کسان و مالک پر قانونی طور پر کوئی دار و گیر نہیں ہے؛ اس لئے سرکاری قانون کے باوجود شرعاً کسان ان زمینوں کے مالک نہیں ہوں گے، ان کو دوسروں کے ہاتھ فروخت کرنے کا حق نہیں ہے، جیسا کہ ''امداد الفتاوی'' وغیرہ میں اس کی صراحت موجود ہے، پھر ۱۹۴۷ء سے دوسرا دور آیا جس میں انگریزی حکومت کے خاتمہ کے بعد کانگریس کا راج آیا ہیں۔ اور کانگریس راج آنے کے بعد صرف تین سال نہیں گزر پائے تھے کہ ۱۹۵۰ء میں کانگریس نے خاتمہ زمینداری کا اعلان کیا، جس میں حکومت ہند نے زمینداروں کی زمینوں پر استیلاء اور تغلب حاصل کرلیا اور ساری زمینیں زمینداروں سے لے کر کسانوں کو دے دیں، کسی کو معمولی کوڑیوں کا معاوضہ بھی دیا اور کسی کو نہیں دیا، گویا کہ حکومت نے جبریہ طور پر زمینداروں کی زمینوں پر استیلاء حاصل کر کے کسانوں کو مالک بنادیا، اس بارے میں علماء کا فتویٰ یہ جاری ہوا کہ سرکار کے استیلاء اور تغلب کے ذریعہ سے کسانوں کو جو جائیدادیں ملی ہیں، اس سے کسان ان زمینوں کے مالک بن چکے ہیں۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۷/ ۱۷۸-۱۸۰، میرٹھ ۲۵/ ۳۵۱-۳۵۴)

اس وضاحت کے بعد اصل سوال کا جواب حسب ذیل تفصیل سے واضح ہوگا وہ زمینیں جن کے بارے میں مالکوں کی طرف سے کوئی روک تھام نہیں ہے، یا ایسی افتادہ زمین جن کے مالکوں کا اتا پتا نہیں ہے، یا سرکاری افتادہ زمین ہے، یا کسی شہر اور آبادی کے متصل بہتے دریا

نے کاٹ کر کے ایک طرف کی زمین کو دوسری طرف پہنچا دیا ہے، تو ایسی زمینوں پر غریب لوگوں کا قبضہ ہوتا چلا جاتا ہے اور چھوٹے چھوٹے مکانات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور غریبوں کے اس طرح کے قبضہ پر نہ مالکوں کی طرف سے کوئی روک ٹوک ہوتی ہے، نہ سرکار کی طرف سے کوئی پابندی ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ ایسی جگہ آباد ہو کر شہر کی طرح گلی کوچوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے، نیز ایسا بھی ہوتا ہے کہ چالاک قسم کے لوگ اس طرح کی زمینوں پر پہلے اپنا قبضہ جما لیتے ہیں، اس کے بعد جو غریب لوگ بسنے والے ہوتے ہیں، ان کے ہاتھوں میں معمولی پیسوں میں فروخت کر دیتے ہیں اور فروختگی کا کوئی ذیلی کاغذ بھی بنا لیتے ہیں، پھر اس میں سرکاری طور پر میونسپلٹی کی سڑکیں بن جاتی ہیں اور بجلی پانی کا انتظام بھی سرکار کی طرف سے ہو جاتا ہے، پھر اس کے بعد وہاں کے بسنے والوں کے لئے ذیلی کاغذات تیار ہو جاتے ہیں، اور مسلم آبادی ہو تو اس میں مسجدیں بھی بن جاتی ہیں اور مسجد کا رجسٹریشن بھی ہو جاتا ہے، جیسا کہ ہمارے مرادآباد میں جامع مسجد سے متصل دریا کے کنارے پر لاکھوں کی آبادی اسی طرح بسی ہوئی ہے اور اس میں متعدد مسجدیں بھی بن گئی ہیں اور اسی طرح بمبئی میں دسیوں مقامات پر اس طرح کی آبادیاں بسی ہوئی ہیں، اور بھی دیگر شہروں میں اس طرح کی نوعیت کی آبادیاں بکثرت ہیں اور ایسی آبادیوں کو اکھاڑ کر ختم کرنا نہ مالکوں کے بس کی بات ہے اور نہ ہی حکومت ان کے بارے میں خاص توجہ دیتی ہے، اب اس طرح کی آبادیوں پر سرکار کا تغلب دو طرح کا ہوتا ہے:

(۱) اگر سرکاری افتادہ زمین ہے جن پر ان غریبوں نے قبضہ کر رکھا ہے اور سرکار کو وہاں اپنا کوئی ترقیاتی پروگرام چلانا ہے، تو ان پر تغلب حاصل کر کے وہاں کے بسنے والوں کو بے گھر کر کے اپنے قبضہ میں لے کر سرکار اپنا کام کرتی ہے۔

(۲) بعض سرکاری افتادہ زمین جن پر غریبوں کا قبضہ ہے یا ان زمینوں کا کوئی مالک ہے جن کی طرف سے اب تک کوئی روک تھام نہیں ہوئی اور سرکار نے روڈ بنا دیا ہے، بجلی پانی کا انتظام کر دیا ہے، اور وہاں کے بسنے والوں کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا ہے اور وہاں کی مردم

شماری کر کے سرکاری طور پر وہاں کے لوگوں سے الیکشن کے زمانے میں ووٹ بھی لیا جاتا ہے، تو گویا کہ اگر سرکاری زمین ہے، تو سرکار نے ان غریبوں کو عملاً ان زمینوں کا مالک بنا دیا ہے۔ اور اگر ان زمینوں کا کوئی مالک رہا ہو تو سرکار نے اس عمل کے ذریعہ سے مالکوں کی زمین پر تغلب حاصل کرلیا ہے۔ اور تغلب حاصل کر کے وہاں کے بسنے والوں کو ان زمینوں کا مالک بنا دیا ہے، تو ایسی صورت میں خاتمہ زمینداری کے بعد کسانوں کو جس درجہ کی زمینوں کی ملکیت حاصل ہوگئی ہے، اسی درجہ کی ان جگہوں پر بسنے والوں کو بھی اپنے اپنے قبضہ کی زمینوں پر ملکیت حاصل ہوچکی ہے اور ان آبادیوں میں جو مسجدیں بن چکی ہیں، ان مسجدوں کو شرعی حیثیت حاصل ہوجائے گی۔ احقر نے یہ تحریر اپنی سمجھ کے اعتبار سے لکھی ہے، اس لئے دوسرے علماء سے بھی اس سلسلے میں رابطہ قائم کرنا مناسب ہوگا۔ اور احقر نے جن جزئیات کے پیش نظر مذکورہ حکم لکھا ہے ان میں سے چند جزئیات حسب ذیل ہیں:

إن الاستيلاء عبارة عن الإقتدار على محل مطلقا على وجه يتمكن من الانتفاع في الحال، ومن الإدخار في المآل والاقتدار بهذه الصفة لا تكون إلا بعد الإحراز، ثم بعد إحرازهم ارتفعت العصمة، فورد الاستيلاء حينئذ على مال مباح لا على مال محظور –إلى قوله– فإن قلت: لا نسلم أن المال مباح بأصل الخلقة، قلت: هو مباح لقوله تعالى:﴿خَلَقَ لَكُمْ مَا فِيْ الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾ (البناية، باب استيلاء الكفار، اشرفيه ٧/ ١٨٨، نعميه ٩/ ٢٤٤)

قال أبو حنيفة، ومالك رحمهما الله: الكفار إذا استولت على أموال المسلمين ملكوها. (تفسير مظهري، زكريا ٩/ ٢٤٠)

ولو استولى أهل الحرب على أموالنا وأحرزوها بدارهم ملكوها عندنا. (هندية، الباب الخامس في استيلاء الكفار، زكريا جديد٢/ ٢٤١، قديم ٢/ ٢٢٥)

أما المال غير المعصوم، فإنه يجوز الاستيلاء عليه، وإن كان مملوكا. (الموسوعة الفقهية الكويتية ٤/ ١٥٨)

وإن غلبوا علی أموالنا وأحرزوها بدارهم ملکوها. (شامي، زکریا ٦/ ٢٦٧، کراچی ٤/ ١٦٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۰۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷؍۳؍۱۴۳۴ھ

کیا جلسہ کے موقع پر بالعوض کھانا کھانا بیع ہے؟

سوال [۸۵۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مہتمم صاحب مدرسہ کے سالانہ جلسہ کے موقع پر لوگوں کی دعوت کر کے ان کے لئے کھانا تیار کرتے ہیں، دعوت نامہ کا ماحصل یہ ہے کہ: جناب............فلاں تاریخ کو فلاں مدرسہ کا سالانہ جلسہ کیا جارہا ہے، آپ اس جلسے میں تشریف لاکر مدرسہ کو زیادہ سے زیادہ امداد دے کر جلسہ کو کامیاب بنانے میں مدد فرمائیں، اتنے بجے شروع ہوکر اتنے بجے ختم ہوگا، جلسہ کے دن جلسہ گاہ کو چاروں طرف سے گھیر کر گیٹ میں کاؤنٹر بنا کر آنے والوں سے پیسہ لیا جاتا ہے، جب اختتام جلسہ کا وقت قریب ہوجاتا ہے، تو ایک منادی ندا کرتا ہے کہ جن لوگوں نے کاؤنٹر سے رسید حاصل نہیں کی ہے، اب حاصل کرلیں، کھانے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ (یعنی رسید حاصل کئے بغیر نہیں کھاسکتا) اب سوال یہ ہے کہ اس صورت واقعہ کو اصطلاح فقہاء میں کیا کہا جائے گا؟ ''للہ'' تو نہیں کیوں کہ کھانے کے عوض روپئے حاصل کررہے ہیں، اور روپئے کے عوض کھانا کھارہے ہیں، تو معلوم ہوا کہ یہ بیع ہے، مہتمم صاحب نے تمول مال کے لئے تجارت کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا ہے، مگر اس میں قابل غور ایک بات ہے کہ بیع کے صحیح ہونے کے لئے مبیع اور ثمن کا مقدار معلوم ہونا شرط ہے، وہ یہاں مفقود ہے؛ اس لئے معاملہ صحیح نہیں ہوا، نیز حاصل شدہ روپیہ حلال نہیں ہوا، آپ مفتیان کرام کی خدمت میں عرض کیا جاتا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق تحقیق سے فتویٰ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: ابوالکلام، محمد عبدالرشید

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں جس دعوت نامہ کا ماحصل پیش کیا گیا ہے، اس میں امداد کا لفظ مذکور ہے، جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ذمہ دار کی طرف سے کھانے کا انتظام ان ہی لوگوں کے لئے ہے جو مدرسہ کو امداد پیش کریں گے۔ اور جو لوگ امداد پیش نہیں کریں گے ان کے لئے کھانے کا نظم منجانب مدرسہ نہیں کیا گیا ہے، اب اگر تعاون کی مقدار مساوی نہ ہو؛ بلکہ ہر ایک اپنے صوابدید پر جو دینا چاہے دیدے تو اسے بیع وشراء سے تعبیر نہیں کیا جائے گا اور اگر سب کے تعاون کی مقدار مساوی ہو تو پھر اس کو بیع وشراء سے تعبیر کیا جائے گا۔ رہی بات جہالت مبیع کی تو عرف ورواج کی بنا پر یہ جائز ہے، کتب فقہ میں اس کی نظیر موجود ہے۔

ویخرج على هذا كثير من السائل في عصرنا، فقد جرت العادة في بعض الفنادق الكبيرة، أنهم يضعون أنواعا من الأطعمة في قدور كبيرة، ويخيرون المشتري في أكل ماشاء بقدر ماشاء، ويأخذون ثمنا واحدا معينا من كل أحد، فالقياس أن لا يجوز البيع لجهالة الأطعمة المبيعة وقدرها؛ ولكنه يجوز ؛ لأن الجهالة يسيرة غير مفضية إلى النزاع، وقد جرى بها العرف والتعامل. (تكملة فتح الملهم، كتاب البيوع، البيع بالتعاطي، أشرفيه ديوبند ١/ ٣٢٠، وهكذا نووي على مسلم ٢/ ٢) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸ر محرم الحرام ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۶۵۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۱/۱۹ھ

مکمل قیمت کی وصولیابی سے قبل بیوہ کا اپنی زمین میں نماز سے روکنا

سوال [۸۵۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم نے ایک مسجد کی جگہ ایک بیوہ سے خریدی اور یہ طے کیا کہ ایک مہینے کے بعد پورے

پیسے دے دیں گے اور کچھ پیسے پہلے دے دیئے اور اس وقت اس کی اجازت سے وہاں نماز پڑھنے لگے؛ لیکن ہم لوگ بجائے ایک مہینے کے دو مہینے تک وہاں نماز پڑھتے رہے اور دو مہینے کی مہلت اور لے لی گئی۔ اور وہاں نماز پڑھتے رہے اور چھوٹی چھوٹی دیواریں بنادی گئیں، اب وہ عورت پھر پیسے لینے آئی؛ لیکن ابھی تک اس کے پیسے نہیں دیئے۔ اور اب پانچ سال گذر چکے ہیں اور پیسے نہیں دیئے ہیں اور وہ عورت برابر یہی کہتی ہے کہ یہاں نماز مت پڑھو۔ اور گالیاں وغیرہ بکتی ہے، ایسی حالت میں اس جگہ نماز پڑھی جائے یا نہ پڑھی جائے، اور نماز ہوگی یا نہیں؟ جواب بالتفصیل اور باصواب سے نوازیں۔

المستفتی: عبداللہ مقام کربلا، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں درج شدہ صورت میں مذکورہ جگہ پر نماز پڑھنا اس وقت تک غیر مقبول اور مکروہ تحریمی ہوگی جب تک بیوہ عورت کو زمین کی پوری قیمت ادا نہ کردیں۔

قال تاج الشریعة: أما لو أنفق في ذلک مالا خبیثا، ومالا سببه الخبیث والطیب فیکره؛ لأن اللّٰه تعالی لا یقبل إلا الطیب، فیکره تلویث بیته بمالا یقبل. الخ (شامي، کتاب الصلاة، باب ما یفسد الصلاة، مطلب کلمة لا بأس دلیل علی أن المستحب غیره الخ۔ کوئٹه ۱/ ٤٨٧، کراچی ۱/ ٦٥٨، زکریا ۲/ ٤٣١)

ومدرسة السلیمانیة في دمشق ...... والوقف یثبت بالشهرة، فتلک المدرسة خولف في بناء ها شرط وقف الأرض الذي هو کنص الشارع، فالصلاة فیها مکروهة تحریما فی قول وغیر صحیحة له في قول آخر. الخ (شامي، کتاب الصلاة، مطلب في الصلاة في الأرض المغصوبة، کوئٹه ۱/ ٢٨، کراچی ۱/ ٣٨٦، زکریا ۲/ ٤٥)

الضرر یزال، ومنها لو غصب أرضا فبنی فیها أو غرس، فإن کانت قیمة الأرض أکثر قلعها وردت وإلا ضمن له قیمتها. (الأشباه والنظائر، قدیم ١٤٤)

نیز مذکورہ بیوہ کو ہر وقت حق ہے کہ قیمت وصول کرنے کی غرض سے وہاں نماز پڑھنے سے روک دے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍رجب ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۸۱۰)

مشتری اول کا پوری رقم دینے سے قبل مشتری ثانی کو فروخت کرنا

سوال [۸۵۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے بکر سے زمین خریدنے کے متعلق بات چیت کی اور زید نے بکر کو بیعانہ دیا، زمین کی قیمت ۲۰؍لاکھ میں سے ۵؍لاکھ دے دیا، چار مہینے کے وقت کے ساتھ اس مدت کے دوران ایک تیسرے شخص نے اس زمین کو خریدنا چاہا، تو کیا زید تیسرے شخص کو وہ زمین نفع کے ساتھ فروخت کرسکتا ہے؛ حالانکہ زید نے بکر کو پوری قیمت ادا نہیں کی اور اس مدت کے دوران بکر زید سے اپنی زمین واپس لے سکتا ہے؟

المستفتی: محمد فاروق، راجونگر، منڈولی، دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید نے جب بکر سے ایجاب وقبول کے ساتھ خرید لیا ہے اور بیعانہ کے طور پر کچھ رقم بھی دے دی ہے، تو ایسی صورت میں زید مشتری اول کے لئے پوری رقم پیمنٹ کرنے سے پہلے مذکورہ زمین کو نفع کے ساتھ بیچنا اور فروخت کرنا درست ہے اور اس مدت کے دوران بکر کو زید سے اپنی زمین واپس لینے کا حق نہیں ہے۔

أن يكون الثمن حالا، فإن كان مؤجلا فلا يثبت حق الحبس؛ لأنه سقط بالتأخير. (الفقه الإسلامي وأدلته، الهدى ديوبند ٤/ ١٧٨، تاتارخانية، زكريا ٨/ ٢٤٢، رقم: ١١٧٧٨)

وإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع، ولا خيار لواحد منهما إلا

من عيب أو عدم رؤية. (تاتارخانية، زكريا ديو بند ۸/ ۲۲۲، رقم: ۱۱۷۱٤، هداية، كتاب البيوع، اشرفي ديو بند ۳/ ۲۰/ الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ۱/ ۲۲٦، دارالكتاب ديوبند ۱/ ۲۲۰، ملتقى الأبحر، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۱۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶ /ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۵۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۶/۴/۱۴۳۴ھ

جائیداد پر قبضہ کرنے سے پہلے مشتری کا بائع کو وکیل بالبیع بنانا

سوال [۸۵۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے خالد سے کہا کہ مجھے زمین کی ضرورت ہے اور میں آپ کے توسط سے زمین خریدنا چاہتا ہوں، خالد نے ایک تیسرے شخص بنام بکر سے ایک اراضی سولہ سو روپیہ بیگہ کے حساب سے خریدی اور خریدتے وقت بکر سے کہہ دیا کہ یہ زمین میری ہوگئی، اب اگر اس کو کوئی تیسرا شخص تم سے خریدے تو تم اس کو فروخت کر دینا اور جو نفع ہوگا وہ میرا ہوگا، اب خالد نے وہ زمین زید کو خریدنے کے لئے توجہ دلائی اور زید نے اس کو بکر سے ۱۹/سو روپیہ بیگہ کے عوض خریدا، اب یہ ۳/سو روپیہ بیگہ کا نفع جو ہے، وہ خالد لینا چاہتا ہے، جب کہ خالد بکر سے خریدتے وقت نہ تو کوئی بیعانہ دیا اور نہ ہی زمین کا کوئی پیسہ بطور ثمن ادا کیا، تو کیا خالد کو اس طرح درمیان میں نفع لینا حلال ہے اور خالد کا یہ فعل کیسا ہے؟

المستفتی: محمد حنیف فتح پور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خالد کا بکر سے زمین خرید کر پھر بکر کو زید کے ہاتھ فروخت کرنے کا وکیل بنانا اور بکر کا ۱۶/سو کی زمین کو آپس کی تراضی سے ۱۹/سو روپے میں زید کے ہاتھ فروخت کر دینا اور تین سو روپے کا نفع خالد کا اپنی ملکیت کر لینا جائز اور درست ہے اور اس موقع پر اگر خالد نے کوئی جھوٹ بولا ہے تو اس کا گناہ الگ سے ہوگا۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۲۶)

ویجوز بیع العقار قبل القبض عند أبي حنیفة و أبي یوسف –رحمهما الله.
(هدایة، کتاب البیوع، باب المرابحة والتولیة، أشرفي دیوبند ۳/ ۷٤، تاتارخانیة، زکریا ۸/ ۲٦٦، رقم: ۱۱۸٦۲)

وأما بیع الأعیان غیر المنقولة قبل قبضها کبیع الأرض والضیاع، والنخیل، والدور، ونحو ذلک من الأشیاء الثابتة التي لا یخشی هلاکها، فإنه یصح. (کتاب الفقه علی المذاهب الأربعة، کتاب البیع، مبحث التصرف في المبیع قبل قبضه، دارالفکر بیروت ۲/ ۲۳٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۰/ ۴۰۴۸)

قبضہ سے پہلے زمین کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۵۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید زمین کی خرید وفروخت کا معاملہ کرتا ہے، جس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زمین کے مالک کے پاس جاکر معاملہ طے کرتا ہے کہ مثلاً ایک بیگہ زمین ایک لاکھ روپیہ میں طے کرتا ہے اور یہ قیمت اس کو ادا نہیں کرتا؛ بلکہ وہ اس دوران دوسرا گاہک تلاش کر کے ڈیڑھ لاکھ روپے میں اس کو بیچ دیتا ہے اور زمین کے مالک سے رجسٹری اسی کے نام کرا دیتا ہے، اب اس کے بعد زید مشتری سے ڈیڑھ لاکھ روپئے لے کر ایک لاکھ بائع کو دے دیتا ہے اور پچاس ہزار خود رکھ لیتا ہے، تو اب کیا زید کے لئے یہ پچاس ہزار روپئے کا منافع لینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد حاکم چاند پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کا قبضہ سے پہلے زمین کو فروخت کر دینا جائز اور

درست ہے؛ اس لئے کہ زمین مکان وغیرہ اشیائے غیر منقولہ ہیں اور ایسی اشیاء اور جائیداد کی خرید وفروخت مکمل ہونے کے لئے ایجاب وقبول کے ساتھ سودا اور معاملہ طے کر لینا کافی ہے، باقاعدہ وہاں جاکر اپنا سامان ڈال دینا، یا چہار دیواری وغیرہ بنا دینا لازم نہیں؛ لہٰذا معاملہ طے ہوجانے کے بعد خریدار کے لئے دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا اور اس پر نفع حاصل کرنا جائز اور درست ہے۔ (مستفاد: انوار رحمت/۲۶۳-۲۶۴)

ویجوز بیع العقار قبل القبض. (هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، اشرفي ديوبند ۳/ ۷۴، تاتارخانية زكريا ۸/ ۲۶۶، رقم: ۱۱۸۶۲)

أما بيع الأعيان غير المنقولة قبل قبضها كبيع الأرض، والضياع والنخيل، والدور، ونحو ذلك من الأشياء الثابتة التي لا يخشى هلاكها، فإنه يصح. (الفقه على المذاهب الأربعة، كتاب البيع، مبحث التصرف في المبيع قبل قبضه، دارالفكر بيروت ۲/ ۲۳۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۲/۶/۱۴۲۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۸۸۶۸)	۲۳/۶/۱۴۲۶ھ

متعینہ بکنگ شدہ زمین کو منافع کے ساتھ فروخت کرنا

سوال [۸۵۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں ایک اچھی کمپنی میں اونچے عہدہ پر فائز تھا، تنخواہ بھی اچھی خاصی تھی، کچھ رقم جمع ہونے پر میں نے اپنا ایک ذاتی مکان رہنے کا سوچ کر بکنگ کروایا، فی الوقت ماں باپ کے ساتھ رہتا ہوں، بکنگ میں آدھی رقم بھردی ہے، کام شروع ہونے پر قسطوں میں رقم بھرنی تھی، اچانک پچھلے مہینے ایک ایسے (موذی مرض) میں مبتلا ہوگیا کہ مجھے مجبوراً ملازمت چھوڑنی پڑی، اب آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں اور اس موذی مرض کا خرچ تقریباً چار لاکھ رقم ہاتھ میں نہ ہونے پر قرض لینا پڑا (بغیر سودی)۔

مجبوراً وہ مکان جس کا کام شروع نہیں ہوا، اگر اسے بیچتا ہوں تو بھری ہوئی رقم سے زیادہ پیسے آرہے ہیں، تو کیا شرعی اعتبار سے مجھے منافع لینے کا حق ہے، ابھی فی الوقت میں کافی پریشان ہوں، گھر اور بیماری کے خرچ سے۔

اگر بالفرض اچھی حالت میں بھی لوگ ایسا کاروبار کرتے ہیں جس کے بکنگ کے وقت کم دام ہوتے ہیں۔ اور اگر کام شروع ہوتا ہے تو دام بڑھ جاتا ہے، اس طرح اگر کاروبار کریں تو شرعی اعتبار سے اس کی گنجائش ہے؟ دونوں سوالوں کی نوعیت الگ ہے، برائے کرم مفصل جواب دیں۔ عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: معرفت مولانا محمد اشفاق صاحب چیتا کیمپ، ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس زمین کو آپ نے اپنے نام سے بکنگ کرالیا ہے اور اس جگہ کی باقاعدہ تعیین بھی ہوگئی ہے، اور آپ نے قسطوں میں رقم بھی بھرنی شروع کردی ہے، تو اس جگہ پر آپ کو مالکانہ حقوق حاصل ہوگئے ہیں؛ اس لئے اس زمین پر تعمیر کا کام شروع ہو یا نہ ہو بہرصورت آپ کے لئے اس زمین کو منافع کے ساتھ فروخت کرنے کی شرعاً اجازت ہے۔

ویجوز بیع العقار قبل القبض عند أبي حنیفة وأبي یوسف –إلی قوله– ولهما أن رکن البیع صدر من أهله في محله ولا غرر فیه؛ لأن الهلاک في العقار نادر بخلاف المنقول، والغرر المنهي عنه غرر انفساخ العقد، والحدیث معلول به عملا بدلائل الجواز. (هدایة، کتاب البیوع، باب المرابحة والتولیة، اشرفي دیوبند ۳/ ۷٤)

إذا اشتری دارا أو عقارا فوهبها قبل القبض من غیر البائع یجوز عند الکل، ولو باع یجوز في قول أبي حنیفة وأبي یوسف. (تاتارخانیة، زکریا ۸/ ۲٦٦، رقم: ۱۱۸٦۲)

وأما بیع الأعیان غیر المنقولة قبل قبضها کبیع الأرض والضیاع،

والنخيل، والدور، ونحو ذلک من الأشياء الثابتة التي لا يخشى هلاكها، فإنه يصح. (الفقه على المذاهب الأربعة، كتاب البيع، مبحث التصرف في المبيع قبل قبضه، دارالفكر بيروت ۲/ ۲۳٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۳۴۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۶/۲۵ھ

قبضہ سے قبل زمین کو فروخت کرنا

سوال [۸۵۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں ایک اچھی کمپنی میں اونچے عہدہ پر فائز تھا، تنخواہ بھی اچھی خاصی تھی، کچھ رقم جمع ہونے پر میں نے اپنا ایک مکان رہنے کا سوچ کر بکنگ کروایا، فی الوقت ماں باپ کے ساتھ رہتا ہوں، بکنگ میں آدھی رقم بھردی ہے، کام شروع ہونے پر قسطوں میں رقم بھرنی تھی، اچانک پچھلے مہینے ایک ایسے موذی مرض میں مبتلا ہوگیا کہ مجھے مجبوراً ملازمت بھی چھوڑنی پڑی، اب آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں اوراس موذی مرض کا خرچ تقریباً چارلاکھ رقم ہاتھ میں نہ ہونے پر قرض لینا پڑا (بغیر سودی)

مجبوراً وہ مکان جس کا کام شروع نہیں ہوا، اگر اسے بیچتا ہوں تو بھری ہوئی رقم سے زیادہ پیسے آرہے ہیں، تو کیا شرعی اعتبار سے مجھے منافع لینے کا حق ہے، ابھی فی الوقت میں کافی پریشان ہوں، گھر اور بیماری کے خرچ سے۔

اگر بالفرض اچھی حالت میں بھی لوگ ایسا کاروبار کرتے ہیں جس کے بکنگ کے وقت کم دام ہوتے ہیں۔ اور اگر کام شروع ہوتا ہے تو دام بڑھ جاتا ہے، اس طرح اگر کاروبار کریں تو شرعی اعتبار سے اس کی گنجائش ہے؟ دونوں سوالوں کی نوعیت الگ ہے، برائے کرم مفصل جواب دیں۔ عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: یعقوب کولسہ والا، میمن کالونی ممبئ، جوگیشوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بیع کے صحیح ہونے کے لئے مبیع کا موجوداور مقدورالتسلیم ہونا شرط ہے۔

وبیع مالیس في ملکه لبطلان بیع المعدوم، وماله خطر العدم (قوله لبطلان بیع ...... إذ من شرط المعقود علیه أن یکون موجودا مالا متقوما مملوکا في نفسه...... یکون مقدور التسلیم. (درمختار مع الشامي، زکریا ۷/ ۲٤٦، کراچی ٥/ ٥٨)

لہٰذا یہ دونوں صورتیں بیع کی نہیں ہیں، وعدۂ بیع ہے اور وعدۂ بیع سے بیع مکمل نہیں ہوتی۔اور جو رقم پیشگی جمع کی ہے اس کی حیثیت بیعانہ کی رقم کی ہے،جس کا حکم یہ ہے کہ صرف اتنی رقم کا لینا جائز ہوگا جتنی جمع کی، زائد رقم لینا درست نہیں، دونوں صورتوں میں حکم یہی ہے۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

حررہ: العبد شعیب احمد بستوی غفرلہ
مظاہر علوم سہارنپور ۲۵/ ۵/ ۱۴۲۸ھ

الجواب صحیح: مقصود
۲۵/ ۵/ ۱۴۲۸ھ

محترم المقام جناب حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

استفتاء کا جواب حضرت والا نے عنایت فرمایا تھا؛ لیکن مستفتی نے مظاہر علوم سہارنپور سے فتوی منگایا جو بالکل حضرت کے جواب سے مختلف ہے، حضرت والا سے مکرر رجوع کرتے ہیں، ساتھ ہی مظاہر علوم کا فتویٰ ارسال خدمت ہے، اس فتوے کی حیثیت کسی خاص صورت سے ہے؟ امید کہ حضرت والا زحمت فرما کر خلجان کو دور فرما کر مشکور فرمائیں، تضاد کو رفع فرمائیں۔

سوال [۸۵۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں ایک اچھی کمپنی میں اونچے عہدہ پر فائز تھا، تنخواہ بھی اچھی خاصی تھی، کچھ رقم جمع ہونے پر میں نے اپنا ایک مکان رہنے کا سوچ کر بکنگ کروایا، فی الوقت ماں باپ کے ساتھ رہتا ہوں، بکنگ میں آدھی رقم بھر دی ہے، کام شروع ہونے پر قسطوں میں رقم بھرنی تھی، اچانک پچھلے مہینے ایک ایسے موذی مرض میں مبتلا ہوگیا کہ مجھے مجبوراً ملازمت چھوڑنی پڑی،

اب آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں اور اس موذی مرض کا خرچ تقریباً چار لاکھ رقم ہاتھ میں نہ ہونے پر قرض لینا پڑا بغیر سودی۔

مجبوراً وہ مکان جس کا کام شروع نہیں ہوا، اگر اسے بیچتا ہوں تو بھری ہوئی رقم سے زیادہ پیسے آرہے ہیں، تو کیا شرعی اعتبار سے مجھے منافع لینے کا حق ہے، ابھی فی الوقت میں کافی پریشان ہوں، گھر خرچ اور بیماری کے خرچ سے۔

اگر بالفرض اچھی حالت میں بھی لوگ ایسا کاروبار کرتے ہیں جس کے بکنگ کے وقت کم دام ہوتے ہیں۔ اور اگر دام شروع ہوتا ہے تو دام بڑھ جاتا ہے، اس طرح اگر کاروبار کریں تو شرعی اعتبار سے اس کی گنجائش ہے؟ دونوں سوالوں کی نوعیت الگ ہے برائے کرم مفصل جواب دیں۔ عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: یعقوب کولسہ والا، میمن کالونی ممبئی، جوگیشوری

محترمی مزاج گرامی　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آنجناب کا سوال اور مظاہر کا لکھا ہوا فتوی اور مدرسہ شاہی کا لکھا ہوا جواب سب پر نظر ثانی کی گئی، اور ہم نے اس سلسلے میں مرادآباد اور دہلی میں ذکر کردہ معاملات کی شکلیں اختیار کرنے والوں سے متعلق بڑے بڑے پلاٹنگ کرنے والوں سے رابطہ قائم کر کے اس کی مختلف صورتیں اور شکلیں معلوم کی ہیں، ہمارے جواب کے ذیل میں جس شکل اور نوعیت کے متعلق حکم شرعی لکھا گیا ہے وہ الحمد للہ صحیح ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍شعبان ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۴۰۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴/۸/۱۴۲۸ھ

ادھار خریدی ہوئی زمین میں مالک کی اجازت سے کھیتی کرنے کا حکم

سوال [۸۵۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: عامر کے پاس ایک زمین ہے، اب اس زمین کو عامر سے خالد نے تین لاکھ کے عوض میں خرید لیا؛ لیکن خالد نے عامر کو تین لاکھ کے بجائے ڈھائی لاکھ روپیہ پیمنٹ میں دے دیا اور پچاس ہزار روپئے روک لئے اور عامر نے اس ایک بیگہ زمین میں سے آدھا بیگہ نام کرادی خالد کے اور آدھا بیگہ رہنے دی؛ حالانکہ اس نصف بیگہ کے کچھ پیسے جا چکے ہیں، کچھ باقی ہیں، اب عامر نے خالد کو پوری زمین استعمال کے لئے دے دی ہے، تو کیا خالد کے لئے اس پوری زمین پر عامر کی اجازت سے کھیتی کرنا جائز ہے، جب کہ خالد نے ابھی کچھ پیسے نہیں دیئے ہیں؟

المستفتی: محمد عمر نیوممبئ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب تین لاکھ روپئے میں پوری زمین خرید لی ہے اور آدھے کی رجسٹری کردی اور باقی آدھے بیگہ کی رجسٹری کو پچاس ہزار کی ادائے گی کی وجہ سے موقوف رکھا گیا ہے؛ لیکن اس کا بھی قبضہ دے کر استعمال کی اجازت دے دی گئی ہے، تو خریدار کے لئے پوری زمین کو استعمال کرنا اس سے فائدہ اٹھانا بلا شبہ جائز اور درست ہے۔

فإن كان مؤجلا فلا يثبت حق الحبس؛ لأنه سقط بالتأجيل. (الفقه الإسلامي وأدلته، القسم الثالث العقود حق حبس المبيع أو احتباسه، هدى انٹر نیشنل دیوبند ٤/ ١٧٨)

وإن كان الثمن مؤجلا لم يكن له حق الحبس. (تاتارخانية، زكريا ديو بند ٨/ ٢٤٢، رقم: ١١٧٧٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۱۸)

خرید وفروخت کی ایک شکل کا حکم

سوال [۸۵۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: زید کو ایک لاکھ روپیہ کی ضرورت ہے، عمرو اس کو قرض اس طرح دیتا ہے کہ ایک لاکھ روپیہ نقد کے بجائے ایک لاکھ روپیہ کی کوئی چیز دے گا اور وہ چیز ڈیڑھ لاکھ میں زید کو فروخت کرے گا اور زید ایک سال میں ڈیڑھ لاکھ روپیہ عمرو کو لوٹائے گا، تو کیا یہ سود ہے؟ کیا اس طرح کا حیلہ درست ہے؟

المستفتی: محمد زبیر، احمد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں جو طریقہ بیان کیا گیا ہے، وہ ہیر پھیر کا ہے۔ اور چیز کی فروختگی کی ظاہری شکل جو بیان کی گئی ہے وہ شکل تجارت کی ہے کہ زید کو عمرو نے قرض نہیں دیا؛ بلکہ شریعت کے مطابق عمرو نے زید کے ہاتھ سامان فروخت کیا ہے اور عمرو کو اختیار ہے کہ ایک لاکھ روپیہ کی قیمت کی چیز ڈیڑھ لاکھ میں فروخت کرے۔ اور سوال نامہ میں جو یہ کہا گیا ہے کہ زید ڈیڑھ لاکھ روپیہ لوٹا دے گا؛ اس لئے نہیں کہ زید نے ڈیڑھ لاکھ روپئے لئے؛ بلکہ ڈیڑھ لاکھ روپئے سامان کے عوض میں اس کی قیمت لوٹائے گا، اور اس طرح ادھار میں زیادہ قیمت کے ساتھ سامان کا فروخت کرنا جائز ہے۔

أن يأتي الرجل المحتاج إلى آخر ويستقرضه عشرة دراهم، ولا يرغب المقرض في الإقراض طمعا في فضل لاينا له بالقرض، فيقول: لا أقرضك، ولكن أبيعك هذا الثوب إن شئت باثنى عشر درهما، وقيمته في السوق عشرة ليبيعه في السوق بعشرة، فيرضى به المستقرض، فيبيعه كذلك، فيحصل لرب الثوب درهمان، وللمشتري قرض عشرة...... قال في الفتح: ولا كراهة فيه إلا خلاف الأولى. (شامي، كتاب البيوع، باب الصرف، مطلب في بيع العينه، كراچی ۵/ ۲۷۳، زكريا ۷/ ۵٤۱، هندية، كتاب البيوع، الباب العشرون في البياعات المكروهة، زكريا قديم ۳/ ۲۰۸، جديد ۳/ ۱۹٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/۱۱/۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۱۴۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/۱۱/۱۴۲۷ھ

خریدار پردین مہرادا کرنا لازم نہیں اور فروختگی کے بعد ورثاء کو حق اعتراض نہیں

سوال [۸۵۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسماۃ مقصود النساء نے اپنے بیٹے کی شادی کے وقت زرمہر معجّل مبلغ دوسوروپیہ زبانی اقرار دی، محمد جان نے زرمہر مبلغ دوسوروپیہ بذریعہ دستاویز اقرار نامہ ۲۶/جولائی ۱۹۱۲ء کو دو ثلث کوٹھہ محمد جان نے ۱۹۶۱ء میں انواری بیگم، کشوری بیگم کو فروخت کر دیا تھا، جو مہر شوہر پر واجب الاداء ہیں۔ دریافت طلب مسئلہ ہے:

(۱) اگر ورثاء رفیع النساء یہ مہر طلب کریں تو؟ (۲) آیا خریدار پردین مہرادا کرنا واجب ہے؟ (۳) نیز محمد جان نے جس وقت یہ دوثلث کوٹھہ فروخت کیا تو ان کی اولاد جوان تھی، کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ فریدالدین پر مہرادا کرنا واجب ہے کہ نہیں؟

المستفتی: یوسف خان، محلّہ چاہ غوری، امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب خریدار نے مبیع کا ثمن ادا کر دیا ہے، تو خریدار سے احمد جان اور اس کے ورثاء وغیرہ کا کوئی تعلق نہیں رہا، نیز دین مہر خریدار پر لازم نہیں ہے؛ بلکہ شوہر کا چھوڑا ہوا مال ہو تو اس میں سے ادا کیا جائے گا، اگر مال نہیں ہے، تو کسی اور پر واجب نہیں ہوگا؟ نیز جب بوقت فروختگی جوان اولاد تھی، انہوں نے اس وقت دعویٰ نہیں کیا ہے، اب اتنی طویل مدت گذرنے اور مشتری کے تصرف کے بعد دعویٰ کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں۔

لو باع عقارا وابنه أو امرأته حاضرة تعلم به وتصرف المشتري فيه زمانا، ثم ادعى الابن أنه ملكه؛ ولم يكن ملك أبيه وقت البيع اتفق مشايخنا على أنه لا تسمع مثل هذه الدعوة. الخ (البحرالرائق، كتاب الخنثى، مسائل شتى، كوئٹه ٨/ ٤٨٣، زكريا ٩/ ٣٥٤، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٢٢، زكريا

دیوبند ۷/ ٤٥٦، مجمع الأنهر، دارالکتب العلمیة بیروت ٤/ ٤٨٣، قدیم ٢/ ٧٣٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ ذی قعدہ ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۳۵۸)

مکان کی فروختگی کی قیمت وصول ہونے کے بعد مالک کا کوئی حق باقی نہیں رہتا

سوال [۸۵۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمد جان ولد احمد بخش، محلّہ چاہ غوری امروہہ نے ایک کوٹھہ منجملہ ایک مکان جس میں ۱۹/ کڑی اور آگے کھپریل پڑی تھی، تقریباً ایک دس گز مربع یہ مکان محمد جان نے مسما تان کشوری بیگم، انوری بیگم کو بتاریخ ۱۱/ ۱۰/ ۱٦، جلد نمبر ۱/ جلد نمبر ۹۲۲، صفحہ نمبر: ۳۹۷/ ۳۹۱/ پر اندراج ہے، مبلغ چار سو روپیہ میں فروخت کر دیا، بوقت فروختگی محمد جان کی اولاد محمد نبی، محمد شیبہ، نسیم، فاطمہ جوان تھے، خریداری کے بعد دونوں مسما تان نے علیحدہ علیحدہ کوٹھے کی شکل میں دو کوٹھری بنوالیں، اب ہوتا یہ ہے کہ اس میں سے ایک کوٹھی نصف حویلی مسماۃ انوری بیگم نے ۸۲/ ۵/ ۱۸/ سکندری خاتون زوجہ یوسف خان کو مبلغ: ۴۵۰۰/ روپئے میں قطعی بیعانہ فروخت کر دیا، اس کے بعد نصف حصہ مسماۃ کشوری بیگم نے تاریخ ۸/ ۹/ ۱۲ کو مبلغ: ۲۰۰۰/ روپئے میں سکندری خاتون کو قطعی بیعانہ فروخت کر دیا، محمد جان یہ مکان ۱۹٦۱ء میں فروخت کرنے کے بعد تقریباً ۱۹۷۸ء میں مر گئے تھے۔ دریافت طلب مسئلہ ہے: (۱) محمد جان جو مکان ٦۱/ ۱۰/ ۱۷ کو فروخت کیا اور بعد میں انوری بیگم کشوری بیگم نے سکندری خاتون کو فروخت کیا، اس مکان میں سے محمد جان کی لڑکی نسیم فاطمہ سکندری خاتون سے تہائی طلب کرتی رہی ہے، آیا شرعاً سکندری خاتون کو اس میں سے تہائی دینا چاہئے یا نہیں؟

المستفتی: محمد یوسف خان محلّہ چاہ غوری، امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ واقعہ کے سلسلے میں رمضان المبارک میں بہت

واضح سوال نامہ آیا تھا، نیز بہت سے مفتیان کرام کے دیئے ہوئے جوابات بھی منسلک تھے، جو ہمارے رجسٹر میں درج ہیں، یہاں سے ۲۳ر رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ میں سوال نامہ، اور اقرار نامہ کے مطابق مدلل ومبرہن جواب دیا جاچکا ہے، جس کا ۲۳/ ۲۵۴ ہے، پھر ۱۲ر محرم الحرام ۱۴۰۸ھ میں سائل کی طلب پر اقرار نامہ کی موافقت وانطباق کی تائید میں تصدیق نامہ بھی لکھا جاچکا ہے، جس کا ۲۳/ ۴۴۴ ہے، وہ سب کاغذات سامنے رکھے جائیں تو مزید فتویٰ کی ضرورت نہیں، تاہم موجود سوال نامہ زیادہ واضح بھی نہیں ہے، شرعی حکم یہی ہے کہ جب محمد جان نے مذکورہ مکان فروخت کردیا اور اس کا ثمن بھی وصول کرلیا تو بعد میں خود محمد جان اور اس کے ورثاء میں سے نسیم، فاطمہ وغیرہ کسی کو کسی طرح بھی اس مکان سے حصہ داری کا دعویٰ کرنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔

فإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع. (الجوهرة النيرة، كتاب البيوع، ملتان ١/ ٢٢٦، دارالكتاب ديوبند ١/ ٢٢٠، هداية، أشرفي ديوبند ٣/ ٢٠، تاتارخانية زكريا ٨/ ٢٢٢، رقم: ١١٧١٤)

وفي البناية: مع شرط النفاذ وهو الملك أو الولاية لزم البيع، ولا خيار لواحد. الخ (بناية شرح هداية، قديم ٣/ ١١، جديد أشرفيه ديوبند ٨/ ١١)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ر محرم الحرام ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۴۶۸)

والد کے مکان فروخت کرنے کے بعد اولاد کا دعویٰ معتبر نہیں

سوال [۸۵۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مقصود النساء زوجہ احمد بخش ساکن امروہہ محلہ چاہ غوری دوسوستر گز میں ایک مکان چھوڑ کر مر گئی، اولاد میں مقصود النساء نے ایک لڑکا محمد جان اور ایک لڑکی صابرہ خاتون

چھوڑیں، اب ہوتا یہ ہے کہ محمد جان نے اپنے بڑے لڑکے کی شادی میں اپنی بہو انوری بیگم بنت فضل کریم خان کے نام ۶ - ۴۱؍گز زمین اور حویلی کا نصف حصہ مبلغ پانچ سو روپیہ میں بیعانہ کردیا، اس کے بعد تیس گز زمین سرپرست نابالغ محمد شبیہ کا بن کر محمد جان نے اسرار الحق کو .... 1.9.47 کے بذریعہ بیعانہ سے مسماۃ انوری بیگم زوجہ محمد نبی نے اور محمد جان نے اپنی زمین ساڑھے گیارہ گز ملا کر یہ بھی اسرار الحق کو...... 10.1.50 میں بیعانہ کردیا، اس کے بعد انوری بیگم زوجہ محمد نبی نے نصف حصہ حویلی 10.9.47 کے مالکانہ حقوق سے یہ بھی اسرار الحق کو 18.12.50 میں بیعانہ کردیا، اب یہ جائیداد فروخت کرنے کے بعد ایک سو دس ۱۱۰ گز جگہ تقریباً رہ گئی جس کو محمد جان نے کشوری بیگم انوری بیگم بنت فرحت اللہ کے ہاتھ بذریعہ بیعانہ مبلغ چار سو روپیہ میں جس کا بہی ا؍جلد: ۹۲۲ صفحہ نمبر ۳۹۱/۳۹۲ اندراج رجسٹری ہے فروخت کردیا، اس میں سے ۵۵؍گز جگہ انوری بیگم زوجہ محمد شیبہ سے 18.5.82 کو بذریعہ بیعانہ مبلغ چار ہزار پانچ سو روپیہ میں سکندری خاتون نے خرید لی، ۵۵؍گز جگہ مسماۃ کشوری بیگم زوجہ محمد نبی سے 12.9.86 کو بذریعہ بیعانہ مبلغ ۱۲۰۰۰؍روپیہ میں سکندری خاتون نے خرید لی، نیز اس میں ایک ایک کوٹھہ دونوں مسماتان کا بنا ہوا ہے، صابرہ خاتون نے اپنی اولاد میں شیدا علی رضا علی مرتضیٰ علی انوری بیگم، کشوری بیگم ولد فرحت اللہ چھوڑیں، محمد جان تقریباً 1978 میں مر گئے تھے، اور صابرہ خاتون تقریباً 1980 میں مرگئیں تھیں۔

دریافت طلب مسئلہ یہ ہے: (۱) صابرہ خاتون کی اولاد سکندری خاتون سے صابرہ خاتون کی تہائی کا حق مانگ رہی ہے، سکندری خاتون نے جو مسماتان انوری بیگم و کشوری بیگم سے محمد جان کا فروخت کیا ہوا مکان جو 1961 کے بیعانہ کے ذریعہ سے سکندری خاتون نے خرید کیا ہے، کیا اس میں سے شرعی طور صابرہ خاتون کے ورثاء کو تہائی ملے گی یا نہیں؟

(۲) اسرار الحق صاحب نے جو مکان بذریعہ بیعانہ محمد جان سے .10-18.1250 47-150-711 میں خرید کیا ہے اور یہ مکان پورا ایک تھا، تو اس میں سے اسرار الحق کو بھی تہائی دینی پڑے گی یا صرف سکندری خاتون کو ہی یہ تہائی دینی پڑے گی شرعی طور پر؟

المستفتی: یوسف چاہ غوری، امروہہ

سوال [۸۵۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بوقت انتقال مسماۃ مقصود النساء نے تقریباً دوسوسترہ گز زمین بنا ہوا ایک منزل مکان واقع محلّہ چاہ غوری امروہہ میں چھوڑا۔ اور مرتے وقت دو اولا دلڑکا محمد جان اور لڑکی صابرہ خاتون چھوڑیں، محمد جان نے یہ مکان قسطوں میں فروخت کردیا، صابرہ خاتون بوقت فروختگی اپنی تہائی کی دعویدار نہیں ہوئیں اور کبھی زندگی میں بھی اظہار نہیں کیا، اب یہ مکان جب کہ محمد جان نے کسی کو فروخت کیا اور جن لوگوں نے یہ مکان محمد جان سے خریدا تھا، انہوں نے کسی دوسرے اشخاص کو فروخت کردیا، اب صابرہ خاتون کی اولا دصابرہ خاتون کے مرنے کے بعد صابرہ خاتون کی تہائی طلب کررہی ہے، اولا دصابرہ خاتون کے نام شیدا علی، رضا علی، مرتضی علی، افسری بیگم، انوری بیگم، کشوری بیگم۔ دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ محمد جان تقریباً ۱۹۷۵ء اور صابرہ خاتون ۱۹۸۰ء میں مرگئے۔ (۱) آیا ان کو تہائی دی جائے گی یا نہیں؟ یہ تہائی کیا خریدار پر واجب الاداء ہے؟ (۲) محمد جان نے یہ مکان کسی کو فروخت کیا اور ان خریداروں نے دوسرے اشخاص کو فروخت کردیا۔

المستفتی: یوسف خان چاہ غوری، امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مختلف وجوہ کی بنا پر صابرہ خاتون کی اولاد ورثاء کا دعوی قضاءً مسموع نہیں ہوگا۔ (۱) محمد جان نے زندگی بھر مالکانہ تصرف کرتے ہوئے مختلف قسطوں میں فروخت کرڈالا اور صابرہ خاتون نے باوجود بلا جبر وخوف کے دعویٰ نہیں کیا، یہاں تک کہ محمد جان کا انتقال ہوگیا، تو بعد کا دعویٰ شرعاً مسموع نہیں ہوگا۔

رجل تصرف في أرض زمانا، ورجل أخر يرى تصرفه فيها، ثم مات المتصرف ولم يدع الرجل حال حياته، لا تسمع دعواه بعد وفاته. الخ

(شامي، كوئٹه ٥/ ٥٢٤، كراچی ٦/ ٧٤٢، زكريا ١٠/ ٤٦٧-٤٦٨)

(۲) صابرہ خاتون مدعیہ نے جب اپنی زندگی میں مطالبہ نہیں کیا، تو ان کی وفات کے بعد ورثاء کا دعویٰ شرعاً مسموع نہیں ہوگا۔

وفی الحامدية عن الولوالجية: رجل تصرف زمانا في أرض، ورجل آخر يرى الأرض والتصرف ولم يدع ومات على ذلك لم تسمع بعد ذلك دعوى ولده، فترك على يد المتصرف. الخ (شامي، كتاب الخنثى مسائل شتى، مطبوعه كوئٹه ٥/ ٥٢٤، كراچی ٦/ ٧٤٢، زكريا ١٠/ ٤٦٨)

(۳) جب بوقت فروختگی اعزه وا قارب سکوت اختیار کریں اور کسی قسم کا اقدام نہ کریں، تو بعد کا دعویٰ مسموع نہیں ہوگا۔

باع عقارا أو حيوانا أو ثوبا وابنه وامرأته أو غيرهما من أقاربه حاضر يعلم به، ثم ادعى الابن مثلا أنه ملكه لا تسمع دعواه. (الدرالمختار، كوئٹه ٥/ ٥٢٤، كراچی ٦/ ٧٤٢، زكريا ١٠/ ٤٦٧-٤٦٨، البحرالرائق، كوئٹه ٨/ ٤٨٣، زكريا ٩/ ٣٥٤، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٢٢، زكريا ديوبند ٧/ ٤٥٦، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٤٨٣، قديم ٢/ ٧٣٩)

(۴) اگر اجنبی بھی بوقت بیع وتسلیم مبیع خاموش رہے اور مشتری خرید کر اپنا تصرف شروع کردے، تو بعد کا دعوی قابل قبول نہیں ہوتا اور اسی پر فتویٰ بھی ہے۔

الأجنبي سكوته ولو جارا لا يكون رضا إلا إذا سكت الجار وقت البيع والتسليم، وتصرف المشتري فيه زرعا وبناء، فحينئذ لا تسمع دعواه على ما عليه الفتوى قطعا للأطماع الفاسدة. الخ (الدرالمختار، كوئٹه ٥/ ٥٢٥، كراچی ٦/ ٧٤٣، زكريا ١٠/ ٤٦٩-٤٧٠)

(۵) سوال نامہ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ صابرہ خاتون نے بوقت بیع جبر وتشدد نہ ہونے کے باوجود کسی طرح کی پیشکش نہیں کی، جس کو ہبہ سکوتی بالقرائن کی دلیل قرار دیا جا سکتا ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۴۶۹)

(۶) بیعانہ واقرار نامہ میں صاف وضاحت موجود ہے کہ ہر قسم کے موانع سے پاک وصاف ہے، جس کی تفصیل بیعانہ میں موجود ہے؛ لہٰذا ان تمام وجوہات کی بنا پر صابرہ خاتون کے ورثاء کا دعویٰ مخدوش اور غیر مسموع ہوگا۔ بالفرض اگر واقع میں صابرہ خاتون کا

حق تھا اور وہ مظلوم رہی ہے، جس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، تو آخرت میں ملے گا، دنیا میں ورثاء کو دعویٰ کا حق نہیں ہوگا۔

قالوا: إن الحق لا يسقط بالتقادم كما في قضاء الأشباه، فلا تسمع الدعوى في هذه المسائل مع بقاء الحق للآخرة. الخ (شامي، مطبوعه كوئٹه ٥/ ٥٢٤، كراچی ٦/ ٧٤٣، زكريا ١٠/ ٤٦٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ صفر ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۵۳۵)

والدہ کا حالت صحت میں اپنی جائیداد بیچنا

سوال [۸۵۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہماری والدہ کا ایک مکان ہے، وہ فروخت ہو رہا ہے، ہمارے والد صاحب بھی حیات ہیں اور ایک ہم سے چھوٹا بھائی ہے اور چار بہنیں حیات ہیں، والدہ اس مکان کی قیمت میں سے ہمیں کچھ بھی دینا نہیں چاہتیں، تو کیا میں حق دار ہوں یا نہیں؟ شرعاً اولاد کو اس طرح محروم کر دینا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد ساجد شمسی، گوکل داس انٹر کالج طویلہ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر آپ کی والدہ بحالت صحت وہوش وحواس صحیح ہونے کی حالت میں فروخت کر رہی ہیں اور اس کی رقم کو اپنی مرضی سے کہیں بھی خرچ کر دیتی ہیں تو شرعاً آپ کی والدہ کو اختیار ہے۔

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء. (بيضاوي، رشيديه دهلي ١/ ٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ شعبان ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۴۲۲)

بائع کا زمین پر قبضہ دینے کے بعد اس کے ورثاء کا بیچنے سے انکار کرنا

سوال [۸۶۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے ایک پلاٹ خریدا، جس کا بیعانہ کرالیا اور پھر دوسرا پلاٹ اسی سے متصل اسی مالک سے خریدا اور اصل مالک بکر نے اس پر قبضہ بھی کرا دیا، یعنی اس کی حد بندی کرادی اس خرید وفروخت کا تحریری شکل میں کوئی ثبوت نہیں، ہاں بکر کے کچھ قریبی رشتہ دار جو اس ملکیت میں بھی شامل تھے، ان کو معلوم تھا کہ بکر نے یہ پلاٹ بھی زید کو دے دیا ہے، ابھی زید نے مکمل روپیہ ادا نہیں کیا تھا کہ بکر کا انتقال ہو گیا، انتقال کے بعد جب زید روپیہ لے کر بکر کی بیوی کے پاس پہنچا (کیوں کہ اولاد نہیں ہے) تو بکر کی بیوی نے کہہ دیا کہ ہم پلاٹ نہیں دیں گے، اب سوال یہ ہے کہ کیا اگر کچھ روپیہ بکر کی زندگی میں دے دیا گیا تھا، تو پلاٹ پر کس کا حق ہے؟ اور اگر اس پلاٹ کا روپیہ بالکل نہیں پہنچا تو کیا حکم ہے؟ یا اگر زید کے پاس گواہ ہیں، تو کیا مسئلہ ہوگا، اگر گواہ نہیں ہیں تو کیا مسئلہ ہوگا، بکر نے جو حد بندی کرائی تھی وہ آج بھی باقی ہے اور اسی شکل میں موجود ہے، جواب تحریر فرمادیں۔

المستفتی: محمد شاکر لکھیم پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں جب زید اور بکر میں ایجاب وقبول ہو گیا اور مالک بکر نے زید کو زمین پر قبضہ بھی دلا دیا، تو اب زید زمین کا مالک بن گیا، خواہ اس نے پوری رقم بکر کو ادا کی ہو یا نہ کی ہو اور زمین بکر کی ملکیت سے نکل گئی؛ لہٰذا بکر کی وفات کے بعد اس کی بیوی کا یہ کہنا کہ ہم پلاٹ نہیں دیں گے بدمعاملگی وبدعہدی ہوگی؛ لہٰذا بقیہ پیسہ وصول کر کے رجسٹری کرا دینی چاہئے، ورنہ بدمعاملگی ووعدہ خلافی کا گناہ ہوگا۔

إذا حصل الإیجاب والقبول لزم البیع. (هدایة، کتاب البیوع، أشرفي دیوبند ۳/ ۲۰/ الجوهرة النیرة، إمدادیه ملتان ۱/ ۲۲۶، دارالکتاب دیوبند ۱/ ۲۲۰،

تاتارخانية زكريا ٨/ ٢٢٢، رقم: ١١٧١٤، ملتقى الأبحر دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١٠)

وفي الهندية: إذا استوفى الثمن وسلم المبيع أو سلم بغير قبض الثمن الخ ليس له أن يسترده ليحبسه بالثمن. (هندية، الباب الرابع في حبس المبيع بالثمن الخ، زكريا قديم ٣/ ١٥، جديد ٣/ ١٨)

ولا يشترط القبض بالبراجم؛ لأن معنى القبض هو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفا وعادة وحقيقة. (بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٣٤٢)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۵۷۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۴/۲۳ھ

کیا پھٹی بوریوں سے گرنے والا کھاد دوکان دار استعمال کرسکتا ہے؟

سوال [۸۶۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کھاد کی دوکان میں بہت سی بوریوں کے پھٹ جانے سے کھاد گرتا ہے اور بوریوں کے سلنے سے بھی کھاد گرتا ہے، جب دوکان بہاری جاتی ہے، تو دس بیس کیلو ہر قسم کا کھاد ملا کر جمع ہوجاتا ہے، تو اس کھاد کا استعمال صاحب دوکان کے لئے جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ابوبکر، فیض آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر خریدار کو وزن کرکے دیا جاتا ہے تو جمع شدہ کھاد شرعاً دوکاندار کی ملکیت ہے جو عبارت ذیل سے مستفاد ہے:

إذا اجتمع للدهانين ما يقطر من الأوعية في إنائه، فإن كان يسيل من خارج الأوعية يطيب له؛ لأنه ليس للمشتري؛ لأن ما انفصل عنها لا يدخل

البيع، وإن سال من الداخل، أو من الداخل والخارج جميعا، أو لا يعلم ينظر. الخ (البحر الرائق، كتاب اللقطة، كوئٹه ٥/ ١٥٣، زكريا ديوبند ٥/ ٢٥٧، هندية، زكريا قديم ٢/ ٢٩٣، جديد ٢/ ٣٠٢، فتاوى قاضي خان، جديد زكريا ٣/ ٢٨٢، وعلى هامش الهندية، زكريا ٣/ ٣٩٣، تاتارخانية، زكريا ٧/ ٤٢٠، رقم: ١٠٧٩٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳ / جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۷۱۸)

دوکان دار کا کم قیمت لینا

سوال [۸۶۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص بازار میں کچھ خریداری کرنے کے واسطے گیا اور اس نے مثلاً ایک سو روپیہ کا سودا خریدا، تو دوکاندار نے اسے ایک روپیہ واپس کر دیا، یعنی ننانوے روپئے کاٹے، ایک روپئے کی چھوٹ کر دی، تو اس چھوٹ کو کیا کہیں گے، یہ ایک روپیہ چھوٹ کا جائز بھی ہے یا نہیں؟ اسی طرح اگر کوئی ایک ہزار روپیہ کا سودا خریدے تو اسے دوکاندار دس روپیہ چھوٹ کر دیتا ہے، چاہے وہ ادھار خریدے چاہے نقد، بہت سے لوگ اسے سود اور بیاج کہتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ برائے مہربانی اس کا جواب مکمل ومدلل ومفصل نوازیں، عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: محمد آصف ہلدوانی، پان بھنڈار لین ۷/ آزادنگر، ضلع نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں درج شدہ طریقے سے بیچنے والے کا ثمن میں کمی کر دینا شرعاً جائز اور درست ہے، وہ سود نہیں ہے۔

ويجوز للبائع أن يزيد للمشتري في المبيع، ويجوز أن يحط عن الثمن. الخ (هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، اشرفي ديوبند ٣/ ٧٥)

والحط منه، أي صح حط البائع بعض الثمن ولو بعد هلاک المبیع. **الخ** (مجمع الأنهر، باب المرابحة والتولیة، فصل في بیان البیع قبل قبض المبیع، قدیم ۳/ ۸۱، جدید دارالکتب العلمیة بیروت ۳/ ۱۱۵، درمختار کراچی ٥/ ١٥٤، زکریا ۷/ ۳۷۹)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ رجب المرجب ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۸۲۰)

قصاب کا چرم قربانی بازاری بھاؤ سے کم قیمت پر خریدنا

سوال [۸٦٠۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بقرعید کے موقع پر چرم قربانی میں ایسا ہوتا ہے کہ، جولوگ قربانی کرنے والے ہوتے ہیں، ان سے قریشی حضرات جو مزدوری پر گوشت نکالنے والے ہوتے ہیں، اپنی مزدوری کم طے کرتے ہیں، اس لالچ میں کہ اس قربانی کے جانور کا چمڑا تھوڑے روپئے میں مالک لوگوں سے خرید لیں گے باوجود کہ ان قریشیوں کو پتہ ہوتا ہے کہ اس چمڑے کی قیمت زیادہ ہے؛ لیکن قربانی کرنے والوں سے تھوڑے پیسے میں خرید لیتے ہیں، جس سے غریب محتاج اور مدارس دینیہ کا بہت بڑا نقصان ہوتا ہے، آیا چمڑا اس طرح خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد احمد ٹھاکر دوارہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب مالک کم پیسہ میں فروخت کررہا ہے، تو قصاب کو کم پیسہ میں لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

البیع ینعقد بالإیجاب والقبول إذا کانا بلفظی الماضي. (وقوله:) رضیت بکذا، وأعطیتک بکذا. الخ (هدایة، کتاب البیوع، أشرفي دیوبند ۳/ ۱۸،

الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ١/ ٢٢٥، دارالكتاب ديوبند ١/ ٢١٩، تاتارخانية، زكريا ٨/ ٢١٢-٢١٣، رقم: ١١٦٧٢-١١٦٧٣، ملتقى الأبحر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ رذی الحجہ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۷۷۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۱۲/۲۵ھ

زائد قیمت کے چاول کے ساتھ کم قیمت والے چاول بیچنا

سوال [۸۶۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے عمر کو دس کوئنٹل چاول بیچے، جس میں ایک کوئنٹل کی قیمت ۹۰۰ روپئے ہیں، اور عمر نے ان دس کوئنٹل چاولوں کے اندر پانچ کوئنٹل چاول ملائے جن کی قیمت پانچ سو روپئے کوئنٹل ہے اور زید کو چاول فروخت کرتے وقت یہ بھی معلوم ہے کہ عمر ان چاولوں کو ملا کر بیچے گا، تو کیا زید کے لئے یہ چاول بیچنا صحیح ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں مفصل ومدلل جواب تحریر فرمائیں۔ فقط

المستفتی: ظہیر الاسلام، متعلم مدرسہ رحمانیہ ٹانڈہ بادلی، ضلع رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کا عمر کے ہاتھ یہ جانتے ہوئے فروخت کرنا کہ وہ اس چاول میں ردی قسم کا چاول ملا کر اعلیٰ قسم کا ظاہر کر کے فروخت کرے گا، تو یہ زید کے لئے شرعاً جائز ہے، زید پر کوئی الزام نہیں؛ بلکہ گنہگار عمر ہی ہوگا؛ کیوں کہ فاعل مختار عمر ہے نہ کہ زید۔

ولا معصية فيه وإنما المعصية بفعل المستاجر وهو مختار، فينقطع نسبته عنه. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، زكريا ٩/ ٥٦٢، كراچی ٦/ ٣٩٢)

إذا اجتمع المباشر والمتسبب أضيف الحكم إلى المباشر. الخ
(الأشباه والنظائر، قديم، ص: ۲۳۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍رجب المرجب ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/۱۳۳۶)

کرایہ دار کے مکان خالی نہ کرنے پر اسی کے ہاتھ کم قیمت پر بیچنا

سوال [۸۶۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید، بکر کا مکان کرایہ پر لیتا ہے اور یہ شرط طے پاتی ہے، کہ جب آپ کو ضرورت ہوگی تو خالی کردوں گا، چند سال بعد جب بکر زید سے مکان خالی کرنے کو کہتا ہے تو بکر دو تین سال بعد خالی کرنے کو کہتا ہے اور عذر یہ کرتا ہے کہ میں نے زمین لے لی ہے، اس کو بنالوں گا پھر آپ کا مکان خالی کردوں گا؛ لیکن اس میعاد کے بعد بھی وہ خالی نہیں کرتا اور مکان مالک کا انتقال ہوجاتا ہے، اس کے بعد اس کے وارث پھر مکان خالی کرنے کو کہتے ہیں اور زید خالی کرنے کو راضی نہیں ہوتا۔ اور مجبوراً اس کے وارث اس مکان کو بیچنے کا ارادہ کرتے ہیں؛ لیکن کوئی گاہک اس کو اس حال کے ساتھ کہ اس میں کرایہ دار کا قبضہ ہے، راضی نہیں ہوتا اس وجہ سے مجبوراً مکان زید ہی کے ہاتھ فروخت کرنا پڑتا ہے اور قیمت بھی قبضہ کے دباؤ میں اصل قیمت سے کافی کم طے ہوتی ہے، اس حال میں یہ خرید وفروخت کیسا ہے؟ شریعت کی روشنی میں مطلع فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: مختار حسین مقبرہ روڈ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس طرح دباؤ میں آکر اگر کرایہ دار کے ہاتھ کم قیمت میں فروخت کرتا ہے تو شرعاً خرید وفروخت صحیح ہوجائے گی؛ لیکن کرایہ دار سخت ترین گنہگار بھی ہوگا؛ اس لئے کہ اس نے غیر کی ملکیت کو اس کی مرضی کے خلاف بکوایا ہے۔

عن عمر بن يحيى المازني عن أبيه، أن رسول الله ﷺ قال: لا ضرر

ولا ضرار. (مؤطا إمام مالك، كتاب القضاء، القضاء في الرفق، أشرفی دیوبند/ ۳۱۱)

لا ضرر ولا ضرار. الخ (قواعد الفقه، أشرفي ديوبند ١٠٦، شرح المجلة، اتحاد بك ڈپو ديوبند ١/ ٢٩، المادة: ١٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ر صفر ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۵۵۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰/ ۲/ ۱۴۱۲ھ

کتے کے جھوٹے آٹے کی بیع کا حکم

سوال [۸٦۰٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کتے نے آٹے کو جھوٹا کردیا، اب اس آٹے کو بیچ کر اس روپیہ سے دوسرا آٹا یا اور کوئی چیز خرید کر کھانا جائز ہے یا نہیں؟ نیز کتے کا جھوٹا فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: تجمل حسین مدھوبنی، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جہاں پر کتے نے منہ لگایا وہاں سے الگ کرکے باقی آٹا کھانے کے کام میں لگانا جائز اور درست ہے۔ اور جس حصہ پر منہ لگایا ہے، اس کو فروخت کرکے اس کے پیسہ سے دوسرا آٹا خرید کر کھانا بھی جائز ہے، مگر احتیاط کی بات یہ ہے کہ خریدار سے بتلادے کہ خود کھانے کے علاوہ دوسرے کام میں لائے۔

المخلوط من العذرة بالتراب بمنزلة زيت خالطته النجاسة حيث يجوز بيعه والانتفاع به كالاستصباح ونحوه. الخ (بناية، كتاب الكراهية، فصل في البيع، قديم ٤/ ٢٥٦، جديد أشرفيه ديوبند ١٢/ ٢٠١، شامي، زكريا ٩/ ٥٥٢، كراچی ٦/ ٣٥٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٠/ ١٠٢، المحيط البرهاني، المجلس العلمي بيروت ٨/ ١٠٢، رقم: ٩٦٨٧، تاتارخانية، زكريا ١٨/ ٢٣٥، رقم: ٢٨٦١٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ر محرم ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۸۳۳)

اولاد نے والد کے ساتھ رہ کر جو کمائی کی وہ کس کی ملک ہے؟

سوال [٨٦٠٧]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں ایک مکان کا مالک تھا، اس مکان کو میرے دولڑکوں نے میری مرضی سے فروخت کردیا اور اس پیسہ سے دوسرا مکان دونوں لڑکوں نے اپنے نام سے خرید لیا، اب اس مکان میں میرا اور میری بیوی ولڑکی کا حصہ نکلتا ہے؟ از روئے شرع تحریر فرمائیں، نیز باپ بیٹے سب ایک ساتھ رہتے تھے اور سب باپ کے زیر تحت تھے۔

المستفتی: حمید اللہ سنبھل، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: جب دونوں لڑکے آپ کے زیر تحت رہ کر کام کرتے ہیں، تو آپ کی اور دونوں کی ساری کمائی شرعاً آپ کی ملکیت میں ہوگی، اگرچہ لڑکوں نے خریدتے وقت اپنا نام کرالیا ہو شرعاً اس میں آپ کے بعد آپ کے تمام ورثاء کا حق شامل ہوگا۔ اور زندگی میں آپ خود مالک ہیں۔

والأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيء، فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله؛ لكونه معينا له. الخ (شامي، كتاب الشركة، فصل في الشركة الفاسدة، مطلب اجتهاد في دار واحدة واكتسبا الخ، كراچی ٤/ ٣٢٥، زكريا ٦/ ٥٠٢، هندية، الباب الرابع في شركة وجوه وشركة الأعمال، زكريا قديم ٢/ ٣٢٩، جديد ٢/ ٣٣٢)

إذا عمل رجل في صنعة هو وابنه الذي في عياله فجميع الكسب لذلک الرجل، وولده يعد معينا له، وكذا إذا أعانه ولده الذى في عياله عند غرسه شجرة، فتلك الشجرة للأب لا يشاركه ولده فيها. (شرح المجلة، اتحاد بكڈپو ديوبند ٢/ ٤٧١، رقم: ١٣٩٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢٦/ ربیع الاول ١٤١٢ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٢٧/ ٢٦٠٦)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
٢٦/ ٣/ ١٤١٢ھ

دودھ کی بالائی مشین کے ذریعہ نکال کرفروخت کرنا

سوال [٨٦٠٨]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں دودھ میں سے بالائی نکالنے کا کاروبار ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ دودھ والے ہمارے پاس اپنا دودھ لے کر آتے ہیں اور ہم اس دودھ سے مشین کے ذریعہ بالائی نکال لیتے ہیں۔ اوراس کی قیمت دودھ والوں کوادا کردیتے ہیں، اس کے بعد وہ لوگ اپنا دودھ واپس لے جاتے ہیں اور وہ لوگ اس دودھ کو کسی بھی طرح استعمال کریں اس سے ہمیں کوئی مطلب نہیں، تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا اس طرح بالائی نکال کر اس کو فروخت کرنا یااور کوئی مکھن وغیرہ بنا کر فروخت کرنا جائز ہے یانہیں؟

المستفتی: زاہدعلی ولد محمد جابرعلی ہوٹل والے بڑی مسجد کے پاس محلّہ کھتاڑی رامنگر، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: دودھ کی بالائی مال متقوم اور مال مرغوب فیہ ہے، اس کو مشین کے ذریعہ الگ کر کے خریدنا اور فروخت کرنا شرعاً جائز اور درست ہے، اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

ما من شأنه أن ترغب إليه النفس، وهو المال. البيع لغة مبادلة شيء مرغوب فيه بمثله. الخ (شامی، کتاب البیوع، مطلب في تعريف المال والملك، کراچی ٤/ ٥٠٢، زکریا دیوبند ٧/ ١١-١٢)

ہاں البتہ دودھ والوں پر لازم ہے کہ بالائی نکالے ہوئے دودھ کو فروخت کرتے وقت خریدار کے سامنے صاف طور پر ظاہر کردیں کہ اس دودھ میں سے بالائی نکال لی گئی ہے۔ اور اگر دودھ والے بوقت فروختگی اس کا اظہار نہ کریں تو عنداللہ سخت گنہگار اور دھوکہ باز ثابت ہوں گے۔ اور خریدار کو واپس کرنے اور رجوع بالنقصان کا حق حاصل ہوگا۔

عن أبي هريرة -رضي الله عنه- قال: نهى رسول الله ﷺ عن بيع الغرر. الحديث (مسلم شريف، كتاب البيوع، باب بطلان بيع الحصاة والبيع الذي فيه غرر، النسخة الهندية ٢/ ٢، بيت الأفكار، رقم: ١٥١٣)

عن عقبة بن عامر –رضي الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: المسلم أخو المسلم، ولا يحل لمسلم باع من أخيه بيعا فيه عيب إلا بينه له. (سنن ابن ماجة، أبواب التجارات، باب من باع عيبا فليبينه، النسخة الهندية/ ١٦٢، دارالسلام، رقم: ٢٢٤٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍شعبان ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۳۲۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۱/۸/۲ھ

فوٹو فریم بنا کر فروخت کرنا

سوال [۸۶۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فریم بنانا جائز ہے یا نہیں؟ چونکہ اگر میں یہ کام کرنا چاہوں تو ہر طرح کے اچھے برے یعنی فوٹو وغیرہ بھی لوگ فریم کرائیں گے، اس کے بارے میں تشفی کرنی ہے۔ فقط

المستفتی: محمد تحسین سہس پوری، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر آپ کا ارادہ فوٹو کی خصوصیت کا نہیں ہے یا صرف جائز چند چیزوں کے لئے ہے، تو ”**الأمور بمقاصدها**“ کے تحت یہ کام جائز ہے، بعد میں جو لوگ جائز کام میں استعمال کریں ان کے لئے جائز اور جو ناجائز کام میں استعمال کریں ان کے لئے ناجائز، آپ پر کوئی گناہ نہیں۔

القاعدة الثانية: الأمور بمقاصدها...... وذكر قاضيخان في فتواه: أن بيع العصير ممن يتخذ خمرا إن قصد به التجارة فلا يحرم، وإن قصد به لأجل التخمير حرم، وكذا غرس الكرم على هذا. الخ (الأشباه والنظائر قديم، ص: ٥٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍صفر ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۴۹۳)

غیر مسلم کو قرآن شریف فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۶۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قرآن پاک کو کبھی کبھی ہندو فروخت کرتا ہے اور وہ پاک ہے یا ناپاک ہے، کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے؛ لہٰذا اس کے بارے میں شرعی مسئلہ کیا ہے؟ حدیث وقرآن کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔ اور مسلم پرسنل لاء کی طرح اس پر بھی عمل ہو جائے تو بہت اچھا ہوگا۔

المستفتی: محمد طاہر انصاری، گرام وپوسٹ بڑامدن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر غیر مسلم تاجر قرآن کریم کی عظمت اپنے دل میں رکھتا ہو اور قرآن کریم کو غسل یا وضو کر کے پکڑتا ہو، ورنہ غلاف سے پکڑتا ہو تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اس کو امام محمدؒ نے جائز قرار دیا ہے۔

قال الله تعالى: لَا يَمَسُّهُ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ. [الواقعة: ٧٩]

ويمنع النصراني (في الشامية، في بعض النسخ: الكافر) من مسه وجوزه محمد إذا اغتسل. الخ (درمختار مع الشامي، كتاب الطهارة، قبيل باب المياه، كوئٹه ١/ ١١٩، كراچی ١/ ١٧٨، زكريا ديوبند ١/ ٣٢١)

لا يمس المصحف (الكافر) ما لم يغتسل، وهذا قول محمد. (حلبي كبير، أشرفيه ديوبند/ ٤٩٧)

لیکن قرآن کریم کو بے حرمتی سے محفوظ رکھنا ہم پر ضروری ہے؛ اس لئے جب بھی بے حرمتی کا خطرہ ہوگا تو کافر کو اس سے روکا جائے گا اور مسلم پرسنل لاء کو بھی اس وقت آواز اٹھانی ہوگی۔

عن عبدالله بن عمر –رضي الله عنه– عن رسول الله ﷺ أنه كان ينهى أن يسافر بالقرآن إلى أرض العدو مخافة أن يناله العدو. الحديث. وتحته في الشرح: فيه النهي عن المسافرة بالمصحف إلى أرض الكفار

للعلة المذكورة في الحديث، وهي خوف أن ينالوه فينتهكوا حرمته.

(صحيح مسلم مع الشرح، كتاب الأمارة، باب النهي أن يسافر بالمصحف إلى أرض الكفار، النسخة الهندية ٢/ ١٣١، بيت الأفكار، رقم: ١٨٦٩)

والحاصل: مما سبق أن وقوع المصحف بأيدى الكفار إنما يمنع منه إذا خيف منهم إهانته، أما إذا لم يكن مثل هذا الخوف فلابأس بذلك.

(تكملة فتح الملهم، مسألة تعليم الكافر القرآن، أشرفيه ديوبند ٣/ ٣٨٦)

وتكره المسافرة بالقرآن الكريم إلى دارالحرب صونا عن وقوعه في أيدي الكفرة واستخفافه. (البحرالرائق، باب الحيض، كوئٹه ١/ ٢٠٢، زكريا ١/ ٣٥١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/۲۲۷)

آیاتِ قرآنیہ والے کیلنڈر غیر مسلم کو فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۶۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گزارش خدمت عالیہ میں یہ ہے کہ کیلنڈر کے اندر جو کلام پاک کی آیت لکھ کر اسکو ہندو اور مسلمان دونوں فروخت کرتے ہیں، اس کو اس طرح فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر ناجائز ہے تو اس پر بھی کیوں نہیں مسلم پرسنل لاء کی طرح پابندی لگائی جاتی، حضور والا سے گزارش ہے کہ جلد از جلد جواب سے نوازیں گے۔

المستفتی: محمد طاہر انصاری پوسٹ بڑامدن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر غیر مسلم کے دل میں قرآن کریم کی عظمت ہو اور اس کی طرف سے اس بات کا اطمینان ہو کہ وہ اس کی بے ادبی اور بے حرمتی نہیں کرے گا، اور وہ

غسل یا وضو کر کے پکڑتا ہے، تو اس کے لئے اس کی گنجائش ہے۔ اور غیر مسلم کا غسل و وضو شرعاً معتبر ہے، جب کہ ارکان غسل و وضو ادا کر کے غسل یا وضو کرے۔

كما في البحر: لعدم اشتراط النية في الوضوء، لايبطل وضوءه. الخ

(البحرالرائق، كتاب الطهارة، باب التيمم، كوئٹه ۱/ ۱۵۱، زكريا ۱/ ۲٦٤)

اور کیلنڈر وغیرہ میں آیات کا حصہ زیادہ ہو تو بھی مسلم و غیر مسلم سب کے چھونے کے لئے طہارت ضروری ہے۔

كما في الشامي: الأظهر والأحوط القول الثالث، أي كراهته في التفسير دون غيره لظهور الفرق، فإن القرآن في التفسير أكثر منه في غيره، وذكره فيه مقصود استقلالا لا تبعا فشبهه بالمصحف أقرب من شبهه بقية الكتب. الخ (شامي، كتاب الطهارة، قبيل باب المياه، نعمانيه ۱/ ۱۱۹، كراچی ۱/ ۱۷۷، زكريا ديوبند ۱/ ۳۲۰) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱ر رمضان ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۲۲۷)

سرکار کی طرف سے بینڈ شدہ کتاب کی فروختگی کا حکم

سوال [۸٦۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں کتابوں کا کاروبار کرتا ہوں، جس میں کچھ کتابیں ایسی ہیں جن کو ہمارے ملک میں بیچنے کی اجازت نہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا میں ان کتابوں کو بلیک کر سکتا ہوں؟

المستفتی: محمد عمران ارشد میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: بلیک کرنے سے آمدنی حرام نہیں ہوتی؛ لیکن جان و مال کے تحفظ کے خاطر ایسے کاروبار کا نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

قال الله تعالىٰ: وَلَا تُلْقُوا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ. [البقرة: ۱۹۵]

طاعة الإمام فيما ليس بمعصية فرض. (درمختار، كتاب الجهاد، باب البغاة، مطلب في وجوب طاعة الإمام، زكريا ٦/ ٤١٦، كراچى ٤/ ٢٦٤)

أن الرجل يمنع من التصرف في ملكه إذا كان تصرفه يضر بجاره ضررا فاحشا؛ لأن درء المفاسد عن جاره أولى من جلب المنافع لنفسه. (شرح المجلة، اتحاد بكڈپو ديو بند ١/ ٣٢، رقم المادة: ٣٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۰۱۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۴/۱۴ھ

مسلم شخص کا غیر مذہبی فوٹو کی کتابیں فروخت کرنا

سوال [۸۶۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: دریافت طلب امر یہ ہے کہ مسلمان دوکاندار اپنی دوکان پر غیر مذہبی کتابیں جن میں فوٹو بھی ہوں فروخت کرسکتا ہے یا نہیں۔ بینوا توجروا

المستفتی: قاری حسیب الرحمٰن سیوہارہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر فوٹو کی بیع مقصود نہ ہو تو غیر مذہبی کتابوں کی فروختگی میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی، قدیم ۹/ ۲۳۵، جدید زکریا مطول ۱۱/۱۱۲)

إنما تحصل المعصية بفعل فاعل مختار -إلى قوله- وإنما المعصية بفعل المستاجر وهو مختار، فينقطع نسبته عنه فصار كبيع الجارية ممن لايستبرئها أو يأتيها من دبر، وبيع الغلام من لوطي. الخ (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، زكريا ٩/ ٥٦٢، كراچى ٦/ ٣٩٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍ربیع الاول ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۷۱۹)

لہوولعب کی چیزیں بنانے اور بیچنے کا حکم

سوال [۸۶۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) وہ تمام اشیاء جو مسلمان بچے لہوولعب کے طور پر استعمال کرتے ہیں، ان کا بنانا اور خریدنا کیسا ہے؟ مثلاً پتنگ، ڈمروو غیرہ حرام ہے یا مکروہ یا حلال؟

(۲) وہ تمام اشیاء جو غیر مسلموں کے بچے بطور لہوولعب استعمال کرتے ہیں، ان کا بنانا کیسا ہے؟ مثلاً گھنٹی ہے جو غیر مسلم کے بچے استعمال کرتے ہیں، ان کا بنانا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: جمیل احمد قاسمی، بستوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: مذکورہ اشیاء کا بنانا اور ان کی تجارت اور خرید وفروخت حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے؛ اس لئے کہ معصیت کا تعلق فاعل مختار کے فعل کے ساتھ ہوا کرتا ہے، اور حضرت امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک تعاون علی المصعیۃ کی وجہ سے ناجائز ہے۔

قال الله تعالى: وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة: ٢]

وجاز تعمير كنيسة وحمل خمر ذمي بنفسه، أو دابته بأجر، وتحته في الشامية: إنما تحصل المعصية بفعل فاعل مختار. الخ (الدرالمختار مع الشامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، زكريا ٩/ ٥٦٢، كراچی ٦/ ٣٩١)

من حمل لذمي خمرا بأجر طاب له عنده، وعندهما يكره للإعانة.

(الدرالمنتقى، كتاب الكراهية، قديم ٢/ ٥٢٩، جديد دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٨٦-١٨٧)

لہٰذا احتیاط اس میں ہے کہ ان چیزوں سے اپنے آپ کی حفاظت کریں۔

(۲) تعاون علی المصعیۃ کی وجہ سے درست نہیں ہے۔ کما مر۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵ رمحرم الحرام ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۰۹۳)

مانجھے کی آمدنی کا حکم

سوال [۸۶۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید مانجھے کا کام کرتا ہے، آیا مانجھے کی کمائی جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر اس کمائی کے پیسہ سے زید ولیمہ کرے یا نذر ونیاز کرے تو اس کے یہاں کھانا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس کا نذر ونیاز کرنا قبول بارگاہ ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: لیاقت حسین فلاح عام سوسائٹی بلاری، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مانجھے فی نفسہ ممنوع نہیں؛ البتہ مانجھے کے ڈورے سے جو امر ممنوع کا ارتکاب کرے گا وہی گنہگار رہوگا؛ اس لئے مانجھے کی آمدنی حرام نہ ہوگی۔

إنما تحصل المعصية بفعل فاعل مختار. الخ (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، زكريا ۹/ ۵۶۲، کراچی ۶/ ۳۹۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍محرم الحرام ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۵۱۴۰/۳۳)

پوجا پاٹ اور نذر ونیاز میں استعمال ہونے والی اشیاء کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۶۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ۱۹۰۵ء میں ہمارے پرنانا نے ایک دوکان، قرآن دینی کتابیں عطر وغیرہ کی کھولی، پھر اس دوکان کو ہمارے نانا جو سند یافتہ وکیل ہیں، انہوں نے سنبھالا وکالت کا عہدہ؛ اس لئے قبول نہیں کیا کہ اس میں جھوٹ بولنا پڑے گا، دوکان میں آہستہ آہستہ شرک وبدعات کی چیزیں یعنی مندروں میں مورتیوں کے پوجا پاٹ کے لئے استعمال ہونے والی اشیاء (ہلدی،

گنگوتم، سندور، گلاب وغیرہ) اسی طرح درگاہوں اور تعویذات، منتروں کے لئے استعمال کی جانے والی چیزوں (ڈوریاں، تختیاں وغیرہ) کی بھی خرید وفروخت شروع ہوئی، اس وقت دوکان نانا کے بیٹوں (ماموں) کے ہاتھ میں ہے، تجارت بڑھ گئی ہے، تقریباً ۱۵/آدمی کام کرتے ہیں، اصل تجارت اس وقت دوکان میں شرک وبدعات کے لئے استعمال ہونے والی چیزیں ہی ہیں، قرآن، دینی کتابیں، عطر وغیرہ کی تجارت بھی ہے، مگر برائے نام بہت کم، معلوم یہ کرنا ہے کہ ایسی دوکان چلانا جس سے شرک و بدعات کوتقویت پہنچتی ہو (جب کہ یہی ایک دوکان ہی ذریعہ معاش نہیں؛ بلکہ دوسری اچھی تجارت کپڑے کی بھی ہے؛ اس سے اچھی آمدنی ہورہی ہے، ایسی دوکان کا چلانا کیسا ہے؟ کیا دوکان کے کاروبار کو بندر کردیں، دوسری تجارت کریں جو بھی شریعت کا حکم ہو تحریر فرمادیں۔

المستفتی: محمد طارق، رحمت پالہ ویلور، تمل ناڈو

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں جن چیزوں کی فروختگی کا ذکر کیا گیا ہے وہ چیزیں دوسرے کاموں میں بھی آسکتی ہیں؛ لہٰذا ان چیزوں کا فروخت کرنا فی نفسہ جائز اور درست ہے۔ اور دوکانوں سے خرید کر جو لوگ غلط جگہ استعمال کریں گے وہ خود گنہگار ہوں گے۔ اور جو لوگ غلط جگہ استعمال نہ کرکے صحیح اور جائز جگہ استعمال کریں گے، ان پر کوئی گناہ نہ ہوگا؛ اس لئے بیچنے والے تاجروں پر کوئی وبال نہیں اور سارا وبال غلط استعمال کرنے والوں کے سر پر ہوگا۔ اور مذکورہ دوکانوں کی آمدنی جائز اور درست ہوگی، ہاں اگر دوکاندار خود غلط جگہ استعمال کرنے میں شریک ہوتا ہے اور دوسروں کو ترغیب دیتا ہے، تو دوکاندار بھی گنہگار ہوگا، مگر پیسہ بہرحال حلال ہوگا۔

لایکره بیع الزنانیر من النصراني والقلنسوة من المجوسي؛ لأن ذلک إذلال لهما. (شامي، کتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغیره، زکریا ۹/ ۵۶۲، کراچی ٦/ ۳۹۲، هندیة، زکریا قدیم ٥/ ۳٤٦٤، جدید ٥/ ٤٠١، مجمع الأنهر،

مصري قديم ٢/ ٥٣٠، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٨٨، تبيين الحقائق، مكتبه إمداديه ملتان ٦/ ٢٩، زكريا ٧/ ٦٤-٦٥)

وجاز بيع عصير عنب ممن يعلم أنه يتخذه خمرا؛ لأن المعصية لا تقوم بعينه بل بعد تغيره. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ٩/ ٥٦٠-٥٦١، كراچی ٦/ ٣٩١، تبيين الحقائق، زكريا ٧/ ٦٣، إمداديه ملتان ٦/ ٢٩، الأشباه والنظائر، قديم، ص: ٥٣)

وجاز إجارة بيت بسواد الكوفة ...... لا بغيرها على الأصح ...... ليتخذ بيت نار، أو كنيسة، أو بيعة، أو يباع فيه الخمر، وتحته في الشامية: هذا عنده أيضا؛ لأن الإجارة على منفعة البيت، ولهذا يجب الأجر بمجرد التسليم، ولا معصية فيه، وإنما المعصية بفعل المستاجر، وهو مختار، فينقطع نسبته عنه. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ٩/ ٥٦٢، كراچی ٦/ ٣٩٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲ رشعبان ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۶۹۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۸/۲ھ

پوجا میں استعمال ہونے والے پیتل کے چراغ بنانا

سوال [۸۶۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں شہر میں پیتل کے ظروف کا کاروبار ہوتا ہے، چراغ بھی پیتل کے بنائے جاتے ہیں، یہ چراغ عموماً ہندو صاحبان اپنی پوجا کے کام میں لاتے ہیں، کبھی کبھی ان سے چراغاں یا آرائش کا کام بھی لیا جاتا ہے، یہ تحریر فرمائیے کہ پیتل کے چراغ بنا کر فروخت کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ چراغوں کے کام سے کمائی ہوئی دولت حلال ہوگی یا حرام؟

المستفتی: حکیم محمد مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر پوجا کے علاوہ دوسرے جائز کام میں بھی **مستعمل** ہوتا ہے اور محض اپنی تجارت کی غرض سے فروخت کیا جاتا ہے، تو ''**الأمور بمقاصدها**'' کے تحت تجارت اور آمدنی دونوں حلال ہوں گی۔ اور اگر پوجا کرنے والوں ہی کے لئے بنایا جاتا ہے اور فروخت کیا جاتا ہے، تو اعانت علی المعصیت کی بنا پر ناجائز ہوگا۔

وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة: ۲]

الأمور بمقاصدها، وتحته في الأشباه: أن بيع العصير ممن يتخذه خمرا إن قصد به التجارة، فلا يحرم وإن قصد به لأجل التخمير حرم. الخ

(الأشباه والنظائر، قديم ۵۳، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/ ۳۶۱، كراچی ۶/ ۳۹۱، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ۶/ ۲۹، زكريا ۷/ ٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۱۸۷)

گھنٹی، ترشول، اوم، چراغ وغیرہ آرڈر پر بنانا

سوال [۸۶۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک کارخانہ دار ہے اور پیتل کے سامان کا کارخانہ ہے، اس وقت کارخانہ میں جو آرڈر ہے، اس میں غیر مسلموں کے پوجا پاٹ کے عدد کا آرڈر ہے، جیسے گھنٹی، ترشول، اوم، چراغ وغیرہ، اس میں کسی میں بھی کسی جاندار کی تصویر نہیں ہے، تو اس طرح کے یہ سامان بنانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: انور خورشید نئی بستی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گھنٹی مندروں کے علاوہ دوسری جگہ بھی استعمال ہوتی

ہے؛ اس لئے ان کی عبادت کے ساتھ خاص نہیں ہے، اسی طرح ترشول، ان کی عبادت کی چیز نہیں ہے؛ بلکہ ان کے اپنے پاس رکھنے کا شعار ہے اور چراغ بھی ان کے ساتھ خاص نہیں ہے، کہیں بھی استعمال ہوسکتا ہے؛ اس لئے ان چیزوں کا بنانا اور ان کی تجارت جائز اور درست ہے۔ اور اوم ان کی مذہبی شعار ہے اور ان کے یہاں اوم ایسا ہے جیسا کہ ہمارے یہاں بسم اللہ، اس کو نہ بنانا بہتر ہے، اگر اس کو بنا کر قیمت لیتے ہیں تو قیمت بالکل حرام نہیں ہے؛ بلکہ مکروہ ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۷/ ۳۰۹)

وجاز تعمير كنيسة، قال في الشامية: قال في الخانية: ولو آجر نفسه ليعمل في الكنيسة ويعمرها لابأس به؛ لأنه لا معصية في عين العمل.

(شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ۹/ ۵۶۲، كراچى ۶/ ۳۹۲، فتاوى قاضي خان، زكريا جديد ۲/ ۲۰۵، وعلى هامش الهندية ۲/ ۳۲۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۸/ ۱۵۸، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ۸/ ۷۰، رقم: ۹۶۰۷، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ۱۸/ ۱۶۷، رقم: ۲۸۳۷۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍رجب ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۰۵۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲؍۷؍۱۴۲۷ھ

مانع حمل دواؤں کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۶۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کوئی ایسی گولی یا کیپسول جو اسقاط حمل کے لئے استعمال کی جاتی ہو اس کا فروخت کرنا شرعاً جائز ہے کہ نہیں؟ مفصل جواب سے آگاہ کریں۔

المستفتی: نعیم الدین محلّہ مذکھڑی دانوں کوٹھی والی مسجد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: اگر یہ گولی بنانے والے اور تجارت کرنے والے کا مقصد صرف یہی ہے کہ بوقت شدت ضرورت کام آسکے، مثلاً حمل کی وجہ سے عدت یا شیر خوار بچہ کی ہلاکت کا خطرہ ہے اور حمل میں جان پڑنے سے قبل استعمال کی جاتی ہے، تو ''الأمور بمقاصدها'' (قواعد الفقه، أشرفي، ص: ٦٢، رقم: ٥١) کے تحت بنانا اور استعمال کرنا اور تجارت کرنا سب جائز ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/۱۱۷)

لیکن اگر بدکار زناکار عورتوں کے کام کے لئے ہے یا اکثر خریدار رنڈیاں ہوتی ہیں، تو تعاون علی المعصیت کی وجہ سے بنانا تجارت کرنا اور خریدنا سب حرام ہے۔

قوله تعالى: وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة: ٢]

لیکن پیسہ حلال رہے گا؛ کیوں کہ پیسہ مال کا بدلہ ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍محرم الحرام ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/۶ ۴۵)

زمین کی بقیہ قیمت کی ادائیگی موجودہ وقت کے اعتبار سے ہوگی یا خرید کے؟

سوال [۸۶۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمد آصف نے ایک زمین بیچی جو کہ سوا چار بیگہ تھی، عبدالرب صاحب نے خریدی، مگر قیمت صرف چار بیگہ کی ادا کی ہے اور باقی کے بارے میں کہا تھا کہ دے دیں گے، مگر ۲۲؍سال کا عرصہ ہوگیا، کئی بار مطالبہ کے بعد اب وہ قیمت دینے پر راضی ہوگئے ہیں؛ اس لئے دریافت یہ کرنا ہے کہ بقیہ قیمت ۲۲؍سال پہلے کے اعتبار سے لی جائے گی یا یہ کہ موجودہ بھاؤ کے اعتبار سے؟۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ عبدالرب نے ۲۲؍سال تک جو زمین جوتی ہے اور اس سے غلہ حاصل کیا ہے، یہ کس کا تھا؟ اب ۲۲؍سال کے غلہ کی قیمت اصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد آصف جگر کالونی مسجد، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں جوصورت بیان کی گئی ہے، اس میں عبدالرب کے لئے ۲۲؍سال پہلے کی قیمت کے حساب سے اس زمین کا روپیہ دینا ہوگا، جس کا ابھی تک روپیہ ادانہیں کیا ہے، موجودہ زمانہ میں زمین کی جو قیمت ہے اس کے اعتبار سے نہیں دیا جائے گا اور جو کچھ عبدالرب نے زمین سے غلہ حاصل کیا ہے وہ سب عبدالرب کا ہی مانا جائے گا؛ البتہ عبدالرب پر ۲۲؍سال تک زمین کے اس حصہ کا جس کی قیمت ادانہیں کی ہے کرایہ ادا کرنا لازم ہوگا۔ اور یہ کرایہ وہاں کے عرف اور معیار کے اعتبار سے ہوگا، اس کی وجہ یہ ہے کہ مالک زمین کی طرف سے بدستور مطالبہ جاری رہا اوراس نے زمین کی قیمت ادانہیں کی؛ بلکہ قیمت ادا کئے بغیر اس کی جتائی کرتا رہا۔

وحاصل ما مر أنه على قول أبي يوسف المفتى به لا فرق بين الكساد والانقطاع، والرخص، والغلاء في أنه تجب قيمتها يوم وقع البيع. (شامي، كتاب البيوع، مطلب مهم في أحكام النقود إذا كسدت أو انقطت، زكريا ٧/ ٥٥-٥٦، كراچی ٤/ ٥٣٤)

ومن بنى أو غرس في أرض غيره بغير إذنه، أمر بالقلع والرد ...... ولو زرعها يعتبر العرف، فإن اقتسموا الغلة أنصافا أو أرباعا اعتبر، وإلا فالخارج للزارع، وعليه أجر مثل الأرض. (درمختار على الشامي، كتاب الغصب، زكريا ٩/ ٢٨٣-٢٨٤، كراچی ٦/ ١٩٤-١٩٥، تنقيح الفتاوى الحامدية ٢/ ١٥٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍صفر ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۶۲۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۲/۱۶ھ

پھل آنے سے قبل بور آنے کے بعد باغوں کی خرید وفروخت

سوال [۸۶۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: ہمارے یہاں امرود اور آم کے باغ ہیں، ان کو پھل آنے سے پہلے بیچ دیا جاتا ہے اور ہم اس انتظار میں رہتے ہیں کہ پھل آئے تو خریدیں، جب تک سب باغ پک جاتے ہیں اور کچھ باغات ایسے ہیں کہ ان کے ساتھ دوسری کھیتی بھی کر سکتے ہیں، ان دونوں باغوں میں سے کونسا باغ کس وقت اور کس حالت میں خریدنا اور بیچنا جائز ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں مسئلہ کو مدلل فرمائیں۔

المستفتی: منجانب اہل ککرالہ، بدایوں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پھل آنے سے قبل بور آنے کے بعد درختوں کو اوراق سمیت خرید لیا جائے تو جائز ہے، اس سے قبل جائز نہیں؛ لہٰذا بور آنے سے قبل نہ خریدا کریں اور درختوں کو مع زمین کے کرایہ پر لینے کو بعض فقہاء نے منع فرمایا ہے۔

والحيلة في جوازه باتفاق المشايخ: أن يبيع الكمثرى أول ما تخرج مع أوراق الشجر، فيجوز فيها تبعا للأوراق. الخ (شامي، كتاب البيوع، مطلب في بيع الثمر والزرع والشجر مقصودا، زكريا ۷/ ۸۵، كراچی ٤/ ٥٥٥، مجمع الأنهر، مصري قديم ۲/ ۱۷، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۲٦، البحر الرائق، زكريا ٥/ ٥٠٢، كوئٹه ٥/ ٣٠١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰/ ۱۲/ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۵۰٦٦)

باغات کی فروختگی میں جواز کی متبادل شکل

سوال [۸٦۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یوپی میں باغات کو دو سال کے لئے فروخت کیا جاتا ہے، اور یہ پیسوں کے عوض

ہوتا ہے، تو باغات میں پھل آنے سے پہلے پہلے ان کی فروختگی جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہیں تو اس کی متبادل شکل کیا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: باغات کے پھلوں کو پھل آنے سے قبل فروخت کرنا جائز نہیں ہے، یہ معاملہ شرعی طور پر فاسد ہوتا ہے، اور اس کے جواز کی متبادل شکل یہ ہے کہ صرف پھلوں کا معاملہ نہ کیا جائے؛ بلکہ زمین سمیت پورے باغ کا معاملہ کیا جائے، مثلاً ایک سال دو سال کے لئے زمین سمیت باغ کرائے پر دے دیا جائے اور کرایہ دار کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ باغ کی زمین میں کچھ بو کر فائدہ اٹھائے اور مالک کا اس میں کوئی حق نہ ہوگا۔ (مستفاد: انوار رحمت ۱۷۹-۱۸۰)

عن جابر بن عبدالله –رضي الله عنه– قال: نهى رسول الله ﷺ عن المحاقلة، والمزابنة، والمعاومة. الحديث (صحيح مسلم، البيوع، باب النهي عن المحاقلة والمزابنة، النسخة الهندية ۲/ ۱۱، بيت الأفكار، رقم: ۱۵۳٦)

أما النهي عن المعاومة: وهو بيع السنين، فمعناه أن يبيع ثمرة الشجرة عامين، أو ثلاثة، أو أكثر، فيسمى بيع المعاومة، وبيع السنين، وهو باطل بالإجماع؛ ولأنه بيع غرر؛ لأنه بيع معدوم ومجهول، وغير مقدور على تسليمه. (نووي ۲/ ۱۰)

إن استأجر أرضا على أن يكر بها أو يزرعها أو يسقيها وزرعها صح؛ لأنه شرط يقتضيه العقد، وهو ملائم له فلا يفسد العقد. (البحرالرائق، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، كوئٹه ۸/ ۲٤، زكريا ۸/ ٤۳، وهكذا في الدر مع الرد، زكريا ۹/ ۸۲، كراچی ٦/ ٦۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۵۹)

زمین مع باغ ٹھیکہ پر دینا

سوال [۸۶۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کی ملکیت میں کاشت کا کھیت ہے، جس میں آم کا باغ ہے، باغ میں آم بھی آتے ہیں، زید اس کھیت کو واسطے کاشتکاری معہ آم کے باغ کے کسی کو ۲-۳/ سال کے لئے ٹھیکے پر دینا چاہتا ہے۔ اور ۲-۳/ سال کی رقم بھی پہلے ہی لینا چاہتا ہے، برائے کرم بتائیں بیع درست ہونے کی صورت کیا ہوگی؟ جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: عبدالحمید راعینی، ساہنپور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زمین ٹھیکہ پر لے لینا درست ہے، اس کے بعد جو پھل آئیں گے، وہ بھی درست ہوں گے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ۴/۴۷۱، ڈابھیل ۱۶/ ۵۸۱)

إذا استأجر أرضا على أن يكر بها، ويزرعها، أو يسقيها ويزرعها صح؛ لأنه شرط يقتضيه العقد، وهو ملائم له فلا يفسد العقد. (البحرالرائق، کتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، زکریا ۸/ ۴۳، کوئٹہ ۸/ ۲۴، الدر مع الرد، زکریا ۹/ ۸۲، کراچی ٦/ ٦٠) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/۷/۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۲۴۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/۷/۱۴۲۰ھ

باغ مع زمین ایک سال یا کئی سال کے لئے فروخت کرنا

سوال [۸۶۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک باغ ہے چھ بیگہ کا، وہ باغ جوان ہے، بہار آئی ہے؛ لیکن ہم باغوں کا کام نہیں

کرتے؛ اس لئے باغوں میں بیماری بہت زیادہ ہوتی ہے، تھوڑی سے لاپرواہی سے تمام باغ خراب ہوجاتا ہے، ایسی صورت میں ان لوگوں کو جو باغوں کا کام کرتے ہیں، ان کو دوسال کے لئے بہار مع زمین بیچ سکتے ہیں یانہیں؟ زمین کسی قدر کاشت کے قابل ہے؟

المستفتی: مرادالدین چودھریان، سہسپور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: مذکورہ صورت میں دوسال کے لئے باغ کی بہار مع زمین کے بیچ سکتے ہیں، جب کہ خریدنے والے کواس باغ کی زمین میں مکمل طریقہ سے تصرف کرنے کا اختیار دے دیا جائے، نیز لوگوں کے تعامل اور ابتلائے عام کی وجہ سے مع زمین کے ایک سال یاچندسال کے لئے فروخت کرنے کی گنجائش ہوگی۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۴۷)

ومن استأجر أرضا على أن يكر بها، ويزرعها، ويسقيها، فهو جائز. (هداية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، أشرفي ٣/ ٣٠٦، البحرالرائق، زكريا ٨/ ٤٣، كوئٹه ٨/ ٢٤، شامي، زكريا ٩/ ٨٢، كراچی ٦/ ٦٠)

وفي القنية: استأجر أرضا سنة على أن يزرع فيها ماشاء، فله أن يزرع فيها زرعين ربيعيا أو خريفيا. (البحرالرائق، كتاب الإجارة، باب مايجوز من الإجارة، ومـا يـكون خلافا فيها، كوئٹه ٨/ ١٠، زكريا ٨/ ١٨، هندية، زكريا قديم ٤/ ٤٧١، جديد ٤/ ٥١١) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ربیع الاول ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۲۲۴)

کیروسین کی خرید وفروخت

سوال [۸۶۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرا کاروبار مٹی کا تیل (کیروسین) کا ہے، میں ایک ماہ میں ایک لاکھ سے دولاکھ تک کا

کیروسین فروخت کرتا ہوں، مجھے لیٹر میں تین سے چار روپئے نفع ملتا ہے، یہ کیروسین فروخت کرنا سرکاری قانون کی رو سے سرکاری گناہ بنتا ہے، میں سرکاری افسروں کو ہر ہفتہ میں ڈیڑھ دو لاکھ روپئے کے قریب بطور رشوت دیتا ہوں، اس کاروبار میں جو نفع کماتا ہوں، اس میں سے غرباء اور ضرورت مندوں کو بھی دیتا ہوں اور اپنے خرچ میں بھی لاتا ہوں، میں یہ کیروسین سرکاری راشن کی دو کانوں سے بلیک (کالا بازاری) میں سے لاتا ہوں، کیا میرے لئے ایسا کاروبار کرنا جو قانوناً گناہ ہے، شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: نثار احمد گودھرا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس کام میں جو بھی منافع ملتا ہے وہ منافع بہر حال حلال ہے؛ لیکن سرکاری قانون کی خلاف ورزی کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا جائز نہیں، اسی طرح اس کام کو چالو رکھنے کے لئے رشوت دینے کا سلسلہ جاری کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ. [البقرة: ١٩٥]

عن أبي هريرة – رضي الله عنه– لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي في الحكم. (ترمذي، باب ماجاء في الراشي والمرتشي في الحكم، النسخة الهندية ١/ ٢٤٨، دارالسلام، رقم: ١٣٣٦، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ١٥/ ٢٣٥، رقم: ٨٦٧٣)

المالک هو المتصرف في ملكه كيف شاء. (بيضاوي، مكتبه رشيد/٧)

كل يتصرف في ملكه ماشاء. (شرح المجلة، رستم مكتبه اتحاد ١/ ٦٥٤، رقم: ١١٩٢) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍صفر ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۲۷۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۳۲/۲/۱۲ھ

راشن دوکان سے غلہ خریدنا

سوال [۸۶۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کنٹرول کی دوکانوں پر غلہ چینی وغیرہ کا جو راشن تقسیم ہوتا ہے، دوکاندار ایسا کرتے ہیں کہ یہ کہہ کر کہ راشن ختم ہو گیا ہے، اس کو علیحدہ فروخت کرتے ہیں، بعض کو کنٹرول ریٹ پر اور بعض کو زائد قیمت پر اس کا خریدنا کیسا ہے؟ اس خرید وفروخت میں مسلم وغیر مسلم دونوں برابر ہیں، یا غیر مسلم سے خرید سکتے ہیں؟ اور مسلمان دوکاندار سے اس راشن کا خریدنا جائز نہیں؟

المستفتی: نورالعابدین، راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کنٹرول سے کوٹہ لینے والا ڈیلر جب اپنے پیسے دے کر خرید لیتا ہے، تو شرعاً ان اشیاء کا خود مالک ہوجاتا ہے؛ اس لئے عوام کو تقسیم کرنے کے بعد اگر کچھ بچ جاتا ہے یا کسی کے نہ لینے کی وجہ سے رہ جاتا ہے، تو ڈیلر کے لئے اس زائد کو قیمت یا کنٹرول ریٹ میں فروخت کرنا اور دوسروں کے لئے اس کا خریدنا بلا کراہت جائز ہے؛ البتہ قانونی جرم ہو تو احتیاط لازم ہے۔ اور اگر حق دار عوام کو نہ دے کر بلیک میں فروخت کرتا ہے، تو دھوکہ بازی اور خیانت اور قانونی جرم کی وجہ سے ڈیلر گنہگار رہو گا اور خریدنے والا تعاون علی المعصیت کی وجہ سے گنہگار رہو گا؛ البتہ عقد بیع بہر حال منعقد ہوجائے گا۔

قوله تعالى: وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة: ٢]

قال الله تعالىٰ: وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ. [البقرة: ١٩٥]

فإن سعّر، فباع الخباز بأكثر مما سعر، جاز بيعه. (هندية، كتاب البيوع، الباب العشرون، فصل في الاحتكار، زكريا قديم ٣/ ٢١٤، جديد ٣/ ٢٠٠) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۴/ ۶/ ۱۴۱۳ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۲۲۶)

دوسروں کے کنکشن سے گیس لے کرزیادہ قیمت میں فروخت کرنا

سوال [۸۶۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زیدرسوئی گیس کا کاروبار کرتا ہے، کاروبار کی شکل یہ ہے کہ اس کا اپنا ذاتی کنکشن صرف ایک ہے؛ لیکن اس نے اس کے علاوہ کچھ کنکشن ایسے جمع کررکھے ہیں جن کے ذریعہ گیس ایجنسی سے گیس لاتا ہےاورذخیرہ جمع کر کےان سلنڈروں کوایجنسی کی قیمت سے بہت زیادہ بڑھا کرفروخت کرتا ہے۔ اور جب گیس نہیں ملتا ہے تو ضرورت منداس سے اس کی ہی قیمتوں میں خریدتے ہیں،تو کیازید کے لئے ایسی خریدوفروخت کرنا جائز ہے یانہیں؟

المستفتی: شمس الحق مدرسہ عربیہ لطیفیہ لالباغ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کے لئے دوسروں کے کنکشن جمع کر کے گیس ایجنسی سے گیس لے کراس کومہنگے دام میں فروخت کرنافی نفسہ جائز ہےاوراس کی کمائی حلال ہے؛ لیکن چونکہ اس طرح فروخت کرنا حکومت کے قانون کے خلاف ہے،اس سے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالنا لازم آتا ہے،اورشریعت ایسے کام کی اجازت نہیں دیتی ہے،جس سے عزت وآبروخطرہ میں پڑنے کا اندیشہ ہو۔

قال الله تعالىٰ: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ. [البقرة: ١٩٥]

عن حذيفة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: لا ينبغي للمؤمن أن يذل نفسه، قالوا: وكيف يذل نفسه؟ قال: يتعرض من البلاء لما لايطيق. (سنن الترمذي، أبواب الفتن، النسخة الهندية ٢/ ٥١، دارالسلام، رقم: ٢٣٥٤)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفااللہ عنہ
۹ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۵۵۱/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۲۹/۴/۹ھ

گیس کی کالا بازاری کی شرعی حیثیت

سوال [۸۶۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گیس کی کالا بازاری زوروں پر ہے، دو ایڈریس پر گیس باٹلے خریدے جاتے ہیں، جب کہ ضرورت صرف ایک گیس باٹلے کی ہوتی ہے اور دوسرا باٹلہ خریدی کی رقم سے زیادہ قیمت پر فروخت کر دیا جاتا ہے۔ اور حکومت کے نزدیک یہ بلیک مارکیٹ جرم عظیم ہے، اکثر مسلمانوں کے دیندار گھرانے اس میں ملوث ہیں، کہتے ہیں کہ ہمیں کتنی ضرورت ہے، اس کی فکر مت کرو، ہم نئے اور پرانے ایڈریس پر جتنے بھی باٹلے خرید رہے ہیں وہی فروخت بھی کر رہے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ بغیر روپیوں کے حاصل کرتے ہیں؛ لہٰذا یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ دوکاندار خرید وفروخت کے بعد نفع کماتا ہے، حضرت مفتی صاحب سے پوچھنا ہے کہ زائد از ضرورت گیس کے باٹلے خریدنے میں ملک کے غریب لوگوں کی حق تلفی نہیں ہے؟ کیا ایسا کرنا درست ہے؟

المستفتی: محمد رضوان قاسمی، سورت

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شخص واحد کا دو ایڈریس پر گیس باٹلہ (سلنڈر) سرکار سے حاصل کرنا جب کہ ضرورت صرف ایک سے پوری ہو جاتی ہے اور دوسرے کو نفع کے ساتھ فروخت کر دینا حکومت کے قانون کی خلاف ورزی ہے، جس سے اجتناب ضروری ہے؛ لیکن اس کی بیع صحیح ہو جاتی ہے۔ اور اس سے حاصل ہونے والا نفع حلال ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ. [البقرة: ۱۹۵]

إن المسلم يجب عليه أن يطيع أميره في أمور مباحة. (تكملة فتح الملهم، أشرفيه ۳/ ۳۲۴)

طاعة الإمام فيما ليس بمعصية واجبة. (شامي، الصلاة، باب العيدين،

مطلب تجب طاعة الإمام فيما ليس بمعصية، زكريا ٣ / ٥٣، كراچی ٢/ ١٧٢)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۴۹۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۴/۱۴۳۵ھ

132 نمبر کا پلاٹ بیچ کر 131 نمبر کا پلاٹ دینا

سوال [۸۶۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک پلاٹ جس کا نمبر 132 ہے، بتدریج (۱) اسحاق (۲) مقصود (۳) سلیمان (۴) عاصم اور (۵) وسیم تک خرید وفروخت ہوتا ہوا پہنچا، وسیم نے یہ پلاٹ عاصم سے -/4,50,000 روپئے میں خریدا، جو دلالوں کے ذریعہ پلاٹ کی جگہ پر خریدا -/2,20,000 روپئے نقد ادا کردئے گئے (یہ پلاٹ 132 تقریبا دو لاکھ سے بڑھتا ہوا اب -/4,50,000 روپئے تک پہنچا، اب ۲، ۳، ۴/ پارٹیوں نے یہ پلاٹ 132 نمبر کے نام سے ہی فروخت کیا اور قریب -/2,50,000 روپئے نفع چڑھ گیا۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ وہ پلاٹ 132 جو خرید وفروخت ہو چکا تھا، 131 نمبر کا نکلا، اسحاق کہہ رہا ہے کہ 132 تو میرا پلاٹ ہے، اب مقصود بعد کی پارٹیاں سلیمان، عاصم سے یہ کہہ رہا ہے کہ تم کو 131 پلاٹ لینا ہو تو لو ورنہ آپ پرانے ریٹ کے روپئے واپس لے جاؤ، جس سے اس کو تو اور بھی فائدہ ہو جائے گا، مگر سلیمان اور عاصم یہ پلاٹ 132 نمبر دکھا کر فروخت کر کے منافع اچھا حاصل کر کے وسیم کو بیچ چکے ہیں اور وسیم نے 132 خریدا ہے، پر اس کے گلے میں 131 ڈالا جا رہا ہے، جو کم قیمت کا ہے اور وسیم کو لینا بھی نہیں ہے، حال یہ ہے کہ اسحاق اب وہ پلاٹ 132 فروخت بھی کرنا چاہتا ہے، ان تمام صورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے شریعت میں اس مسئلہ کا کیا حکم ہے؟ ان تمام پارٹیوں کے لئے، ان تمام کے بیچ کی خرید وفروخت کیسی

ہے؟ ان تمام سودوں کا کیا حکم ہے؟ وسیم کے علاوہ سب کے سب 132 کے نام سے فروخت کر کے نفع لے گئے، وہ کیسا ہے؟ ۲، ۳، ۴/ والی پارٹیاں مل کر 132 خرید کر وسیم کو دلادیں تو کیسا ہے؟ وسیم اگر دلالوں سے تقاضہ کرتا ہے کہ میں نے 132 خریدا ہے، تو آپ مجھے 132 دو اور دلال وسیم کو کہہ سن کر 132 دلادیتے ہیں، تو وہ کیسا ہے؟

المستفتی: وقار احمد درگاہی، گودھرا، گجرات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: جب پلاٹ ۱۳۲ کے بارے میں معاہدہ طے ہوا ہے، تو بیچنے والے پر پلاٹ نمبر ۱۳۲/ ہی دینا لازم ہے۔ اور پلاٹ نمبر ۱۳۲/ کی جگہ پر پلاٹ نمبر ۱۳۱/ کا پیش کرنا معاہدہ شکنی ہے، جو ناجائز ہے؛ اس لئے کہہ سن کر جس پلاٹ کے بارے میں طے ہوا تھا اور بعد کے خریداروں نے اسی کو بیچا ہے، بائع کے اوپر اس بات پر دباؤ ڈالا جائے کہ اسی کی رجسٹری کرادے۔

وأما شرائط الصحة -إلى قوله- ومنها: أن يكون المبيع معلوما والثمن معلوما علما يمنع من المنازعة -إلى قوله- وأما أحكام، فالأصل له الملك في البدلين لكل منهما في بدل ...... والتابع وجوب تسليم المبيع والثمن. (البحر الرائق، كتاب البيوع، زكريا ٥/ ٤٣٦، كوئٹه ٥/ ٢٦٠-٦١، هندية، زكريا قديم ٣/ ٣، جديد ٣/ ٦)

وأما الثالث وهو شرائط الصحة -إلى قوله- ومعلومية المبيع ومعلومية الثمن بما يرفع المنازعة. (شامي، زكريا ٧/ ١٥، كراچی ٤/ ٥٠٥، الموسوعة الفقهية الكويتية ١٣/ ٤٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ صفر المظفر ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۹۶۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۲/۱۱ھ

گلوکوز کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۶۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں ایک ''شئ گلوکوز'' نام کی جو کہ سیال بھی ہے اور پاؤڈر ٹائپ میں بھی ہے، کئی دوکانوں میں فروخت ہوتی ہے، جس کا استعمال ہمارے یہاں عموماً نقلی دودھ بنانے میں ہوتا ہے اور بمشکل تمام 20% بچوں کے کھائے جانے والے چاکلیٹ یا دوسری چیزوں میں استعمال ہوتا ہے، دودھ والے حضرات یہ دونوں قسم کی گلوکوز یعنی سیال اور پاؤڈر اور ڈالڈا گھی اور کاسٹک سوڈا ہمارے یہاں سے خرید کر نقلی دودھ بناتے ہیں اور ڈیری والوں کو دھوکہ سے بیچتے ہیں، اس میں دورائے نہیں کہ وہ دودھیا حضرات دوسروں کو دھوکہ دیتے ہیں؛ لیکن ہمارا مذکورہ چیزوں کو بیچنا کوئی دھوکہ نہیں، ڈالڈا گھی تو ہر جگہ ملتا ہے، کاسٹک سوڈا بھی ہر دوکان پر ملتا ہے، اسی طرح گلوکوز بیچنے والے بھی کئی دوکاندار ہوتے ہیں۔ مسئلہ دریافت طلب یہ ہے کہ ہمارے لئے تو اس کا بیچنا کوئی گناہ نہیں، مگر مسئلہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے دودھیا حضرات نقلی دودھ بنا کر دوسروں کو دھوکہ دیتے ہیں، کیا ہم بھی اس دھوکہ میں شریک ہیں؟

المستفتی: مولوی ظہیر احمد، مدرسہ انوار العلوم جویا، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کے لئے مذکورہ چیزوں کا بیچنا شرعاً جائز ہے اور آپ دھوکہ دینے والوں میں شمار نہیں ہوں گے، جیسا کہ ''درمختار'' کی اس عبارت سے مستفاد ہوتا ہے:

وجاز بيع عصير عنب ممن يعلم أنه يتخذه خمرا؛ لأن المعصية لا تقوم بعينه، بل بعد تغيره. (الدرمع الرد، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ۹/ ۵٦۰ - ۵٦۱، كراچی ٦/ ۳۹۱، تبيين الحقائق، زكريا ۷/ ٦٤، إمداديه ملتان ٦/ ۲۹، الأشباه والنظائر، قديم، ص: ۵۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۹۰۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۰/ ٦/ ۱۴۱۷ھ

چوری کا اڈا بنانے والے کو زمین فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۶۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا ایسے شخص کو اپنی زمین یا پلاٹ فروخت کرنا درست ہے جس سے یہ اندیشہ ہو کہ وہ اس جگہ کو چوری کا اڈا بنا کر استعمال کرے گا؟

المستفتی: جمیل احمد، ایم پی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: اپنی زمین یا پلاٹ کسی کے بھی ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے؛ البتہ محلّہ والوں کی خیرخواہی اور تقویٰ کی بات یہ ہے کہ چوروں کے ہاتھ بیچنے کے بجائے اچھے آدمیوں کے ہاتھ فروخت کیا جائے۔

عن تميم الداري –رضي الله عنه– أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: الدين النصحية، قلنا: لمن؟ قال: لله، ولكتابه، ولرسوله، ولأئمة المسلمين، وعامتهم. (مسلم شريف، باب بيان أن الدين النصيحة، النسخة الهندية ١/ ٥٤، بيت الأفكار، رقم: ٥٥)

وكذا إسلام البائع ليس بشرط لانعقاد البيع، ولا لنفاذه، ولا لصحته بالإجماع، فيجوز بيع الكافر وشراءه. (بدائع، البيوع، فصل في شرائط ركن البيع، كراچی ٥/ ١٣٥، زكريا ٤/ ٣٢١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

كتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱/۷/۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۸۸۸۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۴/۷/۱۴۲۶ھ

ویزا کی خرید وفروخت

سوال [۸۶۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کوئی شخص حکومت سے اجازت لے کر دوکان کرتا ہے، جس میں اس شخص کو چار ویزے ملتے ہیں، مذکورہ شخص دو ویزہ مبلغ چھ چھ ہزار درہم میں فروخت کر دیتا ہے، خریدار یہاں آکر اپنا کام یا دوسری جگہ نوکری کرتا ہے، تو کیا یہ پیسہ اس کے لئے جائز ہوگا؟ واضح رہے کہ یہاں اس طرح اکثر لوگ ویزا بیچتے ہیں، اگر ان سے پوچھئے تو کہتے ہیں: دوکان کا خرچ کفیل کا خرچ تو نکالنا پڑتا ہے، یہ ویزا تین سال کا ہوتا ہے، تین سال کے بعد اگر وہ شخص تجدید کرے تو کچھ پیسہ لے کر تجدید کر دیتے ہیں، اس مدت میں اس سے کوئی خرچ نہیں لیا جاتا۔

المستفتی: حبیب اللہ تاج شاہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حکومت کی جانب سے دوکان کرنے والوں کو جو ویزا ملتا ہے، وہ ان کا حق ہے، وہ اس کو چاہیں تو بیچ سکتے ہیں۔ اور اس کی آمدنی کا استعمال کرنا بھی جائز ہوگا، بشرطیکہ اس کام کو کرنے میں عزت پر کوئی آنچ نہ آتی ہو؛ کیوں کہ یہ ایک خلاف قانون کام ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۴۳، امداد الفتاوی ۴/۵۸۰)

فإنهم قالوا: يجوز أخذ العوض على وجه الإسقاط للحق، ولا ريب أن الفارغ يستحق المنزول به استحقاقا خاصا. (شامي، كتاب البيوع، مطلب فی العرف الخاص والعام، زكريا ۷/ ۳٦، كراچی ٤/ ٥٢٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ ربیع الاول ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۶۹۳)

اخبار کی خریداری کی قیمت کو فیس قرار دینے کا حکم

سوال [۸۶۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں اخباروں، ماہنامہ رسالوں میں کچھ دینی سوالات اور معمہ آتے

ہیں اوران کوبغیرادائیگی فیس صرف صحیح جواب اوردرست کرنے پرادارہ انعام دیتا ہے، بندہ نے ان کے متعلق ''فتاویٰ محمودیہ، جواہرالفقہ، امدادالفتاویٰ'' وغیرہ کتب میں دیکھا، جس سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ وہ معمہ جات جس میں حل کرنے والے کوفیس ادا کرنی پڑے، پھر درست حل پرانعام ملے یہ سود وقمار ہے؛ لیکن اگرحل کرنے والے کو کچھ فیس ادا نہ کرنی پڑے اور صحیح ودرست پرانعام کا مستحق ہوجائے تو یکطرفہ صورت قمار کی نہیں ہے؛ لیکن اگران اخباری اور ماہنامہ کے معموں کے متعلق غورکیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ظاہری طور پران معموں کے حل کرنے کی فیس نہیں لی جاتی؛ لیکن ان اخبار اور ماہنامہ رسالوں کو بیچ کرحل کرنے والا ان کوخریدکر دوسرے طریقہ سے فیس ادا کرتا ہے؛ اس لئے کہ ان معموں کے حل کے شرائط میں سے ایک شرط یہ ہوتی ہے کہ اصل کتاب کی ٹوکن ہی پرجوابات اورخالی جگہ پرکی جائے، اس کی زیروکس کرکے اگرحل بھیجا جائے تو وہ قابل اعتناء نہ ہوگا، تو اس شرط کی وجہ سے ہرمعمہ بھیجنے والے کووہ رسالہ یا اخبار خریدنا پڑتا ہے، اس طرح ان اخباری اور ماہنامہ رسالوں کے معموں میں بھی دوسرے طریقہ سے فیس لی یا ادا کی جاتی ہے، ناچیز کے اس خلجان کو دفع فرمائیں۔

المستفتی: محمد قاسم جھلرہ بجنور یوپی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: رسالہ یا اخبارخریدنے کی جو قیمت ہے اس کوفیس قرار دینا احقر کی سمجھ میں نہیں آتا؛ کیوں کہ رسالہ یا اخبار کی جو قیمت دی جاتی ہے وہ توخوداس اخبار اور رسالہ کی مناسب قیمت ہے؛ البتہ اگر مناسب قیمت سے زیادتی ہوتی ہے تو فیس شمار ہوسکتی ہے؛ اس لئے احقر کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/۱۱/۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۴۲۱۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/۱۱/۱۴۱۵ھ

ہوٹل والوں کا زیادہ قیمت میں کھانا فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۶۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: بنگال کے بعض مقامات پر بس والے ہوٹلوں پر بس روکتے ہیں اور مسافران ہوٹلوں پر کھانا کھاتے ہیں، مشروبات پیتے ہیں اور عام ریٹ سے ہوٹل والے زیادہ رقم لیتے ہیں، جب کہ ڈرائیور بس کا عملہ یا ان کا مہمان بھی کھانے میں شریک ہوتا ہے اور ان سے رقم نہیں لی جاتی، تو اس میں دو باتیں دریافت طلب ہیں: (۱) آیا یہ کھانا ڈرائیور اور دیگر عملہ کے لئے حلال ہے یا حرام؟ (۲) کیا ہوٹل والے کے لئے زیادہ رقم لینا جائز ہے؟

المستفتی: عبدالعزیز قاسمی، تھانہ برہان الدین، ضلع بھول بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں یہ کھانا ڈرائیور اور بس کے دیگر عملہ کے لئے حلال ہے؛ کیوں کہ یہ کھانا احسان کے بدلے میں کھلایا جا تا ہے۔

فإذا أحسن الناس، فأحسن معهم. (صحيح البخاري، الأذان، باب إمامة المفتون والمبتدع تعليقاء النسخة الهندية ١/ ٩٦، مصنف عبدالرزاق، المجلس العلمي ١/ ٥٢٠، رقم: ١٩٩١)

عن أبي هريرة -رضي الله عنه- يخبرهم بذلک عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إذا كفى أحدكم خادمه طعامه حره ودخانه، فليأخذ بيده، فليقعده معه، فإن أبى فليأخذ لقمة، فليطعمه إياها. (ترمذي، باب ما جاء في الأكل مع المملوك والعيال، النسخة الهندية ٢/ ٦-٧، رقم: ١٨٥٣، مسند أحمد بن حنبل ٢/ ٢٩٩، رقم: ٧٩٦٨، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ١٥/ ٣٢١، رقم: ٨٦٦٤)

(۲) ہوٹل والے اپنی چیز کے مالک ہیں؛ اس لئے ان کو حق بنتا ہے کہ وہ زیادہ رقم پر اپنی اشیاء کو فروخت کریں اور یہ ان کے لئے جائز ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ ۱۳/ ۲۴۹)

والمالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء من الملک. (بيضاوي، مكتبه رشيد/ ٧)

كل يتصرف في ملكه ماشاء. (شرح المجلة رستم، مكتبه اتحاد ديوبند ١/ ٦٥٤، رقم المادة: ١١٩٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۷۴۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۶/۹ھ

قانوناً پابندی شدہ جنگلات سے لکڑیاں کاٹ کرلانا

سوال [۸۶۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے علاقہ میں جنگلات کی دوقسمیں ہیں: ایک تو وہ ہیں جن پر سرکاری آدمی متعین ہیں، دوسرے وہ ہیں جن پر سرکاری آدمی متعین نہیں ہیں، لوگ دونوں جنگلات سے لکڑیاں کاٹ کرلا کرفروخت کرتے ہیں، تو ان دونوں جنگلات سے لکڑیاں کاٹ کرخریدنے اور فروخت کرنے میں کیا حکم ہوگا؟

المستفتی: مفتی عتیق الرحمٰن، مدرسہ اسلامیہ، ناگپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جنگل کی چیزیں ملکیت عامہ مباحہ ہوتی ہیں، ان سے لکڑیاں کاٹ کرفروخت کرنا اور خریدنا سب درست ہے۔

والحطب في ملک رجل ليس لأحد أن يحتطبه بغير إذنه، وإن كان غير ملک فلا بأس به، ولا يضر نسبته إلى قرية أو جماعة ما لم يعلم أن ذلک ملک لهم. (شامي، كتاب إحياء الموات، فصل الشرب، زكريا ١٠/ ١٦، كراچی ٦/ ٤٤٠)

البتہ جن جنگلات پر قانوناً پابندی لگی ہوئی ہو اور سرکاری لوگ متعین ہوں، تو چونکہ کسی حکومت کے تحت رہنے میں اس کے قانون کی پابندی بھی لازم ہوتی ہے اور اس کے خلاف کرنے میں قانونی چوری ہوتی ہے، جس سے عزت ومال دونوں کا خطرہ ہوتا ہے؛ اس لئے قانوناً پابندی شدہ جنگلات سے لکڑیاں کاٹ کرلانا کراہت سے خالی نہیں ہوگا۔ (مستفاد: فتاوی احیاء العلوم، ص: ۲۵۰، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۳/ ۳۵۴، جدید ڈابھیل ۱۶/ ۱۴۸)

قال الله تعالىٰ: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ. [البقرة: ١٩٥]

عن حذيفة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله صلى الله عليه

وسلم: لا ينبغي للمومن أن يذل نفسه، قالوا: وكيف يذل نفسه؟ قال: يتعرض من البلاء لما لايطيق. (سنن الترمذي، أبواب الفتن، النسخة الهندية ۲/ ۵۰، ۵۱، دارالسلام، رقم: ۲۳۵۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۰۶۴)

سرکاری جنگلات کی لکڑیوں کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۶۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے اطراف واکناف میں لکڑی ساگون کے جنگلات ہیں اور وہ دو طرح کے ہیں، ایک تو وہ ہیں جن پر سرکاری آدمی متعین ہیں یا سرکار نے تاروں وغیرہ کے ذریعہ احاطہ کر رکھا ہے۔ اور دوسرے وہ ہیں جن پر نہ سرکاری آدمی متعین ہے اور نہ ہی کسی قسم کا احاطہ، تو اگر کوئی آدمی خفیہ طور پر اس کی لکڑیاں کاٹ کر لائے اور فروخت کرے، تو اس کا فروخت کرنا اور لینا شرعاً کیسا ہے؟ یاد رہے کہ دوسری قسم کا جنگل اگرچہ اس کا سرکار نے احاطہ نہیں کیا ہے اور نہ ہی آدمی متعین ہے؛ لیکن جنگل سے ملحق شہر کی پولیس کو اس کی اطلاع ہوجائے تو پولیس اس پر سرزنش کرتی ہے۔

المستفتی: مفتی عتیق الرحمٰن صاحب

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگرچہ ایسے جنگلات سے لکڑیاں لاکر فروخت کر کے جو پیسہ حاصل ہوگا وہ حلال ہے، مگر اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالنا بھی شرعاً ممنوع ہے؛ اس لئے: ﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ [البقرة: ۱۹۵] کے تحت داخل ہوکر ممنوع وناجائز ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ ۱۱/ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۲۱۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/ ۱۱/ ۱۴۱۵ھ

دریائی جانوروں کی بیع اوران کے کھانے کا حکم

سوال [۸۶۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعض علاقوں میں گھونگھا، سیپی، کیکڑا، کچھوے اور کچھوا کے انڈے کی تجارت ہوتی ہے، تو ان دریائی جانوروں کی بیع کرنا اور کھانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: مولانا شہیرالدین مغربی بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دریائی جانوروں میں سے سوائے مچھلی کے کسی جاندار کا کھانا درست نہیں۔ اور سوال میں ذکر کردہ جانور مچھلی میں داخل نہیں ہیں۔

ولا یوکل من حیوان الماء إلا السمک. الخ (هداية، كتاب الذبائح، فصل فيما يحل أكله وما لا يحل، أشرفی ٤/ ٤٤٢، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ١١/ ٢٤٨، مختصر القدوري، ص: ٢٢٦)

البتہ ان جانوروں سے انتفاع کیا جاتا ہے، مثلاً کیکڑے کو جلا کر شہد میں ملا کر پرانی کھانسی کے لئے استعمال کرنا بہت مفید ہے۔ اور سیپی سے چونا بنایا جاتا ہے؛ لہٰذا ان کی بیع درست ہے، اور اس کا پیسہ بھی حلال ہے۔

والصحيح أنه يجوز بيع كل شيء ينتفع به. (هندية، كتاب البيوع، الباب التاسع، الفصل الرابع زكريا قديم ٣/ ١١٤، جديد ٣/ ١١٥)

أن جواز البيع يدور مع حل الانتفاع. (الفتاوى التاتارخانية ٨/ ٣٤٠، رقم: ١٢١٢٥، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ٩/ ٣٣٢، رقم: ١١٩٩٣) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۲۱/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۰۷۵)

مردار کی ہڈی، دانت، سینگ، پٹھے کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۶۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مردار کی ہڈی اور مردار کا بال اور مردا کی سینگ اور پٹھے وغیرہ پاک ہیں یا ناپاک؟ ان اشیاء کا استعمال جائز ہے یانہیں؟ اسی طرح ان کی تجارت بھی جائز ہے یانہیں؟

المستفتی: نیاز احمد فاروقی، حلال ٹرسٹ جمعیۃ العمار ہند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مردار کے وہ تمام اجزاء پاک اور قابل انتفاع ہیں، جن میں خون نہ ہو؛ لہٰذا مردار جانور کی سینگ، ہڈی، دانت، کھر، بال، پٹھے وغیرہ یہ سب کے سب قابل انتفاع ہیں، ان سب چیزوں کی تجارت اور ان کا پیسہ جائز اور حلال ہے۔ اور ان کو جانوروں کے غذا کی شکل دے کر جانوروں کو کھلانا بھی بلا شبہ جائز ہے۔

لا بيع جلود الميتة قبل الدباغ، ويجوز بعده وينتفع به، ويباع عظمها وينتفع به، وكذا عصبها، وقرنها، وصوفها، وشعرها، ووبرها، وكذا عظم الفيل خلافا لمحمد، وتحته في مجمع الأنهر: المختار قولهما. (ملتقى الأبحر مع مجمع الأنهر، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، جديد ٣/ ٨٥)

اور بدائع کی عبارت اور زیادہ واضح ہے، ملاحظہ فرمایئے:

أما الأجزاء التي لا دم فيها، فإن كانت صلبة كالقرن، والعظم، والسن، والحافر، والخف، والظلف، والشعر، والصوف، والعصب، والأنفحة الصلبة، فليست بنجسة عند أصحابنا. (بدائع الصنائع، كتاب الطهارة، فصل فی حكم الميتة، زكريا ١/ ١٩٩، كراچی ١/ ٦٣، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٠/ ٧٤)

اور ''تاتارخانیہ'' کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

أما شعر الميتة، وعظمها، وصوفها، وقرنها فلا بأس بالانتفاع بها،

وبيع ذلک كله جائز، وقوله: أما العصب ففيه روايتان في رواية جاز الانتفاع به وبيعه. (تاتارخانية، كتاب البيوع، الفصل السابع في بيع المحرمات، زكريا ٨/ ٣٤٢، رقم: ١٢١٣٣، محيط البرهاني، كتاب البيوع، الفصل السادس في ما يجوز بيعه وما لايجوز، جديد بيروت ٩/ ٣٣٤، رقم: ١١٩٩٨، كوئٹه ٧/ ٣٠٧، هندية، كتاب البيوع، الباب التاسع فيما يجوز بيعه وما لايجوز، الفصل الخامس، مطلب في بيع المحرمات، زكريا وكوئٹه ٣/ ١١٥، جديد زكريا ٣/ ١١٦)

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ: قال: قل لا أجد فيما أوحي إلي محرما على طاعم يطعمه ألا كل شيء من الميتة حلال إلا ما أكل منها، فأما الجلد، والقرن، والشعر، والصوف، والسن، والعظم، فكل هذا حلال؛ لأنه لا يذكي. (سنن داراقطني ١/ ٤٣، رقم: ١١٧)

اورشامی کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

شعر الميتة، وعظمها، وعصبها على المشهور وحافرها، وقرنها الخالية عن الدسومة، وفي الشامية: قيد للجميع كما فى القهستاني. (شامي، كتاب الطهارة، باب المياه، مطلب في أحكام الدباغة، زكريا ١/ ٣٥٩، كراچی ١/ ٢٠٦)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/۱۱/۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۸۱۲/۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۱۱/۱۴۳۵ھ

مردار جانور کے کچے چمڑے اور ہڈی کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۶۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مردار جانور کا چمڑا کچا ہو تو اس کی ہڈی کا خریدنا بیچنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: رحمت اللہ قاسمی سنبھل، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مردار کی کھال تازہ اور کچی حالت میں فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ اور سوکھ جانے کے بعد وہ پاک ہوجاتی ہے؛ اس لئے خشک ہونے کے بعد اس کا فروخت کرنا جائز اور درست ہے۔ اور مردار کی ہڈی جس پر چکناہٹ اور تری ہوتو اس کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔ اور اگر ہڈی پر تری اور چکناہٹ نہیں ہے، تو اس کی خرید وفروخت جائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم ۱۴/۳۷۰)

عن ابن عباس –رضي الله عنه– في قوله عز وجل: ﴿قُلْ لَا اَجِدُ فِيْ مَا اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ﴾ قال: الطاعم: الأكل فأما السن، والقرن، والعظم، والصوف، والشعر، والوبر، والعصب، فلا بأس به؛ لأنه يغسل، وقال شبابة إنما حرم من الميتة مايوكل منها، وهو اللحم، فإما الجلد والسن، والعظم، والشعر، والصوف فهو حلال. (سنن داراقطني، دارالكتب العليمة بيروت ۱/ ۴۲، رقم: ۱۱۲)

لا يتنجس من الميتة عشرة أشياء: الشعر، والصوف، والوبر، والريش، والحافر، والقرن، والظفر، والظلف، والعظم، والعصب إذا لم يكن عليه دسومة، ولا لحم ولا دود. وفي الذخيرة: وأما العصب ففيه روايتان: في رواية: جاز الانتفاع به، وبيعه؛ لأنه طاهر. وفي الظهيرية: قال أبوحنيفة رحمه الله: لا بأس بالانتفاع بحافر الميتة، وظلفها، وعظمها. وفي الملتقط: عظام الفيل بعد ما جف طاهرة يجوز بيعها. (تاتارخانية ۱/ ۴۴۶، رقم: ۱۱۵۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ / شعبان ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۹۹۵)

حلال جانوروں کے کون کون سے اعضاء کی تجارت جائز ہے؟

سوال [۸۶۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بھینس، بیل، بکری کے جسم کی کون کون سی چیز کی تجارت کر سکتے ہیں؟ جیسے کہ ان تینوں جانوروں کے پیٹ میں پتا ہوتا ہے، اس کے پانی کی تجارت دیگر ملکوں میں ہوتی ہے، پتے کا پانی اس کو ابال کر خشک کیا جاتا ہے، اس میں کیا گنجائش ہے؟ واضح فرمائیے۔

المستفتی: محمد ظریف قریشی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر حلال جانور کو جائز طریقہ سے ذبح کیا گیا ہو تو اس کے سارے اعضاء پاک ہیں اور اس کی تجارت جائز ہے؛ البتہ اس کا دم سائل حرام ہے اور اس کی تجارت بھی جائز نہیں ہے۔ اور اس کے پتے، مثانہ، بچہ دانی، ذکر اور غدود اور خصیتین وغیرہ کھانا مکروہ ہے؛ لیکن تجارت ان کی بھی جائز ہے؛ اس لئے کہ ان چیزوں کو بطور دوا اور علاج کے استعمال کرنے کی گنجائش ہے۔

والحاصل أن جواز البيع يدور مع حل الانتفاع. (شامي، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب في بيع دودة القرمز، زكريا ۷/ ۲۶۰، كراچی ۵/ ۶۹، الموسوعة الفقهية الكويتية ۹/ ۱۵۵، ۱۷/ ۲۸۱، مجمع الأنهر، مصري قديم ۲/ ۱۰۸، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۱۵۱) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ رشعبان ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۷۸۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۸/۷ھ

مرغ وغیرہ جانوروں کو زندہ فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۶۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: آج کل جورواج چل پڑا ہے کہ مرغ کوزندہ ہی حالت میں بیچتے خریدتے ہیں، اس طرح کی خریداری ازروئے شرع مباح ہے یا حرام؟ اگر ناجائز وحرام ہے،تو کیوں؟ کیا اس سلسلے میں قرآن وسنت یا کتب فقہ میں کوئی صراحت موجود ہے؟ کیا اس طرح بیچنا خریدنا اور کھانا سب حرام ہے؟ کیا اس سلسلے میں کوئی واضح شرعی ضابطہ موجود ہے کہ کون سی چیز کس طرح اورکس پیمانے سے بیچی جائے؟ برائے کرم صاف مفصل واضح مدلل جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: اظہارالحق،مبارک پور، اعظم گڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرغ کوزندہ حالت میں روپیہ پیسے کے عوض میں فروخت کرنا بلاکراہت جائز اور درست ہے، چاہے گن کر فروخت کیا جائے یا تول کر ہرطرح جائز ہے،اس میں ناجائز ہونے کی کوئی علت نہیں، اسی طرح گائے،بھینس،بکری،مچھلی وغیرہ تمام حلال جانوروں کوزندہ حالت میں پیسوں کے عوض میں تول کراور شمار کرکے ہر طرح سے فروخت کرنا جائز اور درست ہے۔

وقال محمد: إن كان بغير جنسه كلحم البقر، بالشاة الحية جاز كيفما كان. الخ (شامي، كتاب البيوع، باب الربا، زكريا ٧/ ٤١٥، كراچی ٥/ ١٨٠، حاشية چلپى مكتبه إمداديه ملتان ٤/ ٩١، زكريا ٤/ ٤٦٠)

قال أبو حنيفة وأبو يوسف يجوز بيع اللحم بالحيوان؛ لأن الحيوان وهو بيع موزون بغير موزون. الخ (أوجز المسالك، قديم ٥/ ١٠٥، جديد دارالقلم)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ رصفر ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۶۹۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/ ۲/ ۱۴۱۷ھ

زندہ جانور تول کر بیچنا

سوال [۸۶۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: جانور کو زندہ تول کر خرید سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: محمد اقبال شمسی طویلہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زندہ جانور کو روپے پیسے کے عوض تول کر بیچنا جائز اور درست ہے؛ کیوں کہ اس زمانے میں وزن اور تول سے زندہ جانوروں کی خرید فروخت ہونے لگی ہے، اس بنا پر معمولی جہالت نزاع کا سبب نہیں ہوتی؛ لہٰذا بیع درست ہے۔

(مستفاد: احسن الفتاوی دہلی ۶/ ۴۹۷، ایضاح المسائل/ ۱۵۸)

كما استفاد من هذه العبارة، كما لو باعه بالأثمان وإن باعه بحيوان بغير مأكول اللحم جاز في ظاهر قول أصحابنا، وهو قول عامة الفقهاء، وفي المحلى: قال أبو حنيفة وأبو يوسف: يجوز بيع اللحم بالحيوان؛ لأن الحيوان ليس من مال الربو، وهو بيع موزون بغير موزون. (أوجز المسالك ٥/ ١٠٥، فتح القدير، دارالفكر، مصرى قديم ٧/ ٢٧، كوئٹه ٦/ ١٦٧، زكريا ٧/ ٢٥، شامي، زكريا ٧/ ٤١٥، كراچى ٥/ ١٨٠، حاشية چلپى، إمداديه ملتان ٤/ ٩١، زكريا ٤/ ٤٦٠)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍جمادی الثانیہ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۱۸۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۶/۵ھ

مذبوحہ جانوروں کے اعضائے تناسل اور خون کی بیع کا حکم

سوال [۸۶۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مذبوحہ جانوروں کے اعضاء تناسل اور ان کے خون کی بیع جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے، تب تو صحیح، ورنہ بجائے ضائع کرنے کے دینی خدمات یا عوام کے مصارف ضروریہ میں کیا خرچ کرنا درست ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حلال جانوروں کے اجزاء میں سے جن اجزاء کا کھانا ممنوع ہے، وہ دوقسموں پر ہیں: (۱) وہ اجزاء جن کا استعمال حرام ہے، جیسا کہ دم مسفوح اس کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے، نہ اس کا کھانا جائز ہے اور نہ ہی اس کی خرید وفروخت جائز ہے، اس کو بیچ کر جو پیسہ آتا ہے وہ بھی حرام ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ. [المائدة: ۳]

(۲) دوسری قسم وہ اجزاء جن کے استعمال کی ممانعت دلیل ظنی سے ثابت ہے، یعنی خبر واحد سے جیسے ذکر، خصیتین، قبل، غدود، مثانہ اور پتہ۔

وأما بيان ما يحرم أكله من أجزاء الحيوان المأكول، فالذي يحرم أكله منه سبعة الدم المسفوح، والذكر، والأنثيان، والقبل، والغدة، والمثانة، والمرارة، والمروي عن أبي حنيفة أنه قال: الدم حرام، وأكره الستة أطلق اسم الحرام على الدم المسفوح، وسمى ماسواه مكروها. (بدائع الصنائع، كتاب الذبائح، والصيود ما يستحب في الزكوة، زكريا ٤/ ١٩٠، كراچی ٥/ ٦١)

ان چیزوں کا کھانا تو مکروہ ہے؛ لیکن ان چیزوں کی خرید وفروخت اس لئے جائز ہے کہ یہ چیزیں کھانے کے علاوہ بطور علاج استعمال ہوسکتی ہیں؛ اس لئے ان کی بیع بھی جائز اور پیسہ بھی حلال ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۵۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/۵/۱۴۲۱ھ

سمندری کیکڑے کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۶۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: حنفیوں کے لئے سمندر کا کیکڑا فروخت کرنا کیسا ہے، جائز ہے یا نہیں؟ جو لوگ اس کو فروخت کرتے ہیں، وہ اس پیسہ کے مالک ہوتے ہیں یا نہیں؟ نیز ان کے گھر کا کھانا کھانا اور ان سے تعلق رکھنا درست ہے یا نہیں؟ مدلل جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: رضاء الکریم قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حنفیہ کے نزدیک کیکڑے کو کھانے کے لئے بیچنا اور خریدنا جائز نہیں ہے؛ لیکن اگر اس کا استعمال دوائیوں میں ہوتا ہے جیسا کہ معتبر اطباء سے معلوم ہوا ہے کہ کیکڑے کی کھال کا استعمال پھیپھڑے کی دوائیوں میں ہوتا ہے، تو ایسی صورت میں اس کو بیچنا اور خریدنا جائز ہے۔ اور مالک بیچنے کی وجہ سے اس پیسہ کا مالک ہوجائے گا، اور اس کی دعوت وغیرہ قبول کرنا بھی جائز ہے۔

الحاصل أن جواز البيع يدور مع حل الانتفاع. وفي الشامية: يجوز بيع الحيات إذا كان ينتفع بها للأدوية وما جاز الانتفاع بجلده أو عظمه، أي من حيوانات البحر أو غيرها. (شامي، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب في بيع دودة القرمز، زكريا ٧/ ٢٦٠، كراچی ٥/ ٦٩، الموسوعة الفقهية الكويتية ٩/ ١٥٥، ١٧/ ٢٨١، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١٥١، مصري قديم ٢/ ١٠٨)

ولو دعي إلى دعوة، فالواجب أن يجيبه إلى ذلك، وإنما يجب عليه أن يجيبه إذا لم يكن هناك معصية ولا بدعة. (عالمگيري، كتاب الكراهية، الباب الثاني عشر في الهدايا والضيافات، زكريا قديم ٥/ ٣٤٣، جديد ٥/ ٣٩٧)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۷۰۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۶/۱۶ھ

کتے کی بیع کی شرعی حیثیت

سوال [۸۶۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک حنفی عالم جو اپنے آپ کو دار العلوم دیو بند کی طرف منسوب کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ حنفی مسلک قرآن وحدیث سے بہت دور ہے، یہی وجہ ہے کہ پورے خلیج میں ڈھونڈ نے سے ایک حنفی بھی نہیں ملے گا۔ ''ہدایہ'' میں لکھا ہے کہ کتا فروخت کرنا جائز ہے، ایسے بہت سے واقعات ہیں۔

المستفتی: شفیع احمد الاعظمی، بحرین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس حنفی عالم کا سوال نامہ میں ذکر کیا گیا ہے اور جو اپنے آپ کو دار العلوم دیو بند کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اوپر سے اس جہالت کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ حنفی مسلک قرآن وحدیث سے بہت دور ہے، اور اس پر یہ تنزیہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ''ہدایہ'' میں لکھا ہے کہ کتا فروخت کرنا جائز ہے، تو اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ صرف کرتا پائجامہ والے عالم ہیں؛ اس لئے یہ شخص نہ حنفی مسلک سے واقفیت رکھتا ہے اور نہ ہی حدیث رسول سے واسطہ ہے؟ کیا صحیح حدیث شریف میں اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ کلب معلم کو فروخت کرنا جائز اور درست ہے۔ حدیث شریف ملاحظہ فرمائیں۔

حدثنا أبوبكر النيسابوري، نا إسحاق بن الجراح، نا الهيثم بن جميل، ح وحدثنا عثمان بن أحمد الدقاق، نا محمد بن أحمد بن الوليد بن برد، نا الهيثم بن جميل، نا حماد بن سلمة، عن أبي الزبير، عن جابر قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن ثمن الكلب والسنور، إلا كلب صيد. (سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ٦١، رقم: ۳۰٤۹)

حدثنا محمد بن القاسم بن زكريا، نا أبو كريب، محمد بن العلاء، نا سويد بن عمرو، عن حماد بن سلمة، عن أبي الزبير، عن جابر قال: نهى

رسول الله صلى الله عليه وسلم عن ثمن السنور والكلب، إلا كلب صيد.
(سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٦١، رقم: ٣٠٥٠)

عن جابر بن عبدالله أن رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عن ثمن الكلب والسنور، إلا كلب صيد. (نسائي شريف، البيوع، باب بيع الكلب، النسخة الهندية ٢/ ٢٣٠، دارالسلام، رقم: ٤٦٦٨)

قال الحافظ في الباري: أخرجه النسائي بإسناد رجاله ثقات. (فتح الباري، البيوع، باب ثمن الكلب، أشرفيه ٤/ ٥٣٦، دارالفكر ٤/ ٤٢٧)

نیز بعض متعدد روایات میں کھیتی کے کتے کی فروختگی کا جواز بھی ثابت ہے؛ لیکن ان روایات کی صحت میں محدثین نے کلام کیا ہے، اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے کتے کا پیسہ حلال قرار دیا ہے اوراس پر کسی جاہل کو اشکال ہے تو اس کا اشکال اسی کو مبارک ہو، نیز یاد رکھئے کہ حنفی مسلک کے مسائل کے لئے احادیث شریفہ ڈھونڈی جائیں تو انشاء اللہ ہر ایک مسئلہ کے موافق حدیث رسول مل جائے گی، چاہے دلالۃ ہو یا اشارۃ یا اقتضاء ہو۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ رصفر ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۲۰-۵۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۲/۲۴ھ

انسانی وحیوانی فضلات کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۶۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: موجودہ زمانہ میں انسانی اور حیوانی فضلہ کا استعمال بطور کھاد ہوتا ہے۔ اوراس سے گیس بھی پیدا کی جاتی ہے؛ لہٰذا ایسی صورت میں انسانی وحیوانی فضلات کی خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں؟ دونوں کا حکم الگ الگ ہے یا ایک ہے؟ جواب تحریر فرمادیں۔

المستفتی: کلیم احمد حسن پور، امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: خالص انسانی فضلات کی خرید وفروخت کرنا مکروہ ہے، اوراگر وہ راکھ یامٹی وغیرہ کے ساتھ مخلوط ہواور وہ غالب ہوتو بلا کراہت جائز ہے۔اورحیوانی فضلات کی خرید وفروخت بہرحال بلاکراہت جائز ہے۔

كره بيع العذرة رجيع الآدمي خالصة لا يكره بل يصح بيع السرقين، أي الزبل، ثم قال: وصح بيعها مخلوطة بتراب أو رماد غلب عليها في الصحيح. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، فصل في البيع، زكريا ۹/ ۵۵۲، كراچی ٦/ ۳۸۵، البناية، أشرفيه ۱۲/ ۲۰۱، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٠/ ۱۰۲، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ۸/ ۱۰۲، رقم: ۹٦۸۷، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ۱۸/ ۲۳۵، رقم: ۲۸٦۱۵، هندية، زكريا قديم ۳/ ۱۱٦، جديد ۳/ ۱۱۷، أحسن الفتاوى ٦/ ۳۲۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۰۴۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۵/۱۴۲۴ھ

بریلوی مسلک کے لوگوں کو زمین فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸٦۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم نے گاؤں میں ایک دو بیگہ آراضی خریدی، اس زمین کو بریلوی مسلک کے لوگ ہم سے خرید کر ایک مدرسہ تعمیر کرنا چاہتے ہیں، جب کہ اس جگہ کے برابر میں ایک دیوبندی مسلک کا مدرسہ بھی ہے، تو ایسی صورت میں ہم اپنی زمین کو ان حضرات کے ہاتھوں فروخت کرسکتے ہیں؟ جوبھی حکم شرعی ہو واضح فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

المستفتی: فہیم انور قریشی، محلّہ اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خرید وفروخت ایک اختیاری عمل ہے جو چاہے، بیچ سکتا ہے اور جو چاہے خرید سکتا ہے؛ لیکن جب آپ کو پہلے سے یہ بات نظر آرہی ہے کہ بریلوی مسلک کے لوگ یہاں ادارہ قائم کریں گے جس کی وجہ سے خوش عقیدہ دیوبندی مسلک کے ادارہ کے ساتھ ٹکراؤ اور مسلسل فتنہ کا ایک دروازہ کھل جائے گا جو دونوں طرف کے لوگوں کے لئے بے چینی اور بے قراری کا سبب ہوگا؛ اس لئے وہ زمین کسی دیوبندی مسلک کے آدمی کے ہاتھ فروخت کرنا زیادہ بہتر ہے۔

وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ. [البقرة: ۲۱۷]

قال رسول الله ﷺ: إن الشيطان قد أيس أن يعبده المصلون في جزيرة العرب، ولكن في التحريش بينهم. (مسلم، كتاب صفة المنافقين، باب تحريش الشيطان ۲/ ۳۷٦، بيت الأفكار، رقم: ۲۸۱۲)

لكل واحد منهم أن يتصرف في حصته كيف ماشاء. (شرح المجلة رستم باز، اتحاد دیوبند ۱/ ٦٤۳، رقم: ۱۱٦۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۳۰۰۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/ ۶/ ۱۴۳۶ھ

۲ / باب الخیار

بیع کے تام ہونے کے بعد کسی ایک فریق کے بیع کو ختم کرنے کا حکم

سوال [۸٦٤۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مرحوم عبدالمنان خان کھرگون ایم پی نے اپنی زندگی میں شیخ حمید اسلام پور مہاراشٹر کو اپنی کھیتی کی زمین (قابل زراعت وپیداوار) ۸/ ایکڑ ۴ / ڈسمل جو ۱۹۹۸ء میں مبلغ تین لاکھ ۳۲/ ہزار روپئے میں فروخت کی۔ مذکورہ رقم کی ادائے گی کی شکل فریقین میں اتفاق رائے سے اس طرح طے کی گئی پچاس ہزار روپئے ۱۵/ جون ۱۹۹۸ء کو، پھر ایک لاکھ روپئے یکم اگست ۱۹۹۸ء کو اور ایک لاکھ ۲۵/ ہزار روپئے یکم جنوری ۱۹۹۹ء کو یہ کل -/2,75,000 ہوئے باقی بچے -/57,000 روپئے، یہ رجسٹری ہوجانے کے بعد ادا کئے جائیں گے۔

غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ -/2,75,000 روپئے یکم جنوری ۱۹۹۹ء تک ادا کرنے چاہئے تھے، مگر فروری ۲۰۰۰ء تک شیخ حمید نے صرف -/2,15,000 روپئے ہی ادا کئے ہیں اور باقی -/60,000 ساٹھ ہزار ابھی تک ادا نہیں کئے ہیں، تو ایسی صورت میں جب کہ ساٹھ ہزار کو ۱۲/ ۱۳/ سال کا طویل عرصہ گذر گیا ہے، تو کیا عبدالمنان مرحوم کے لڑکے شیخ حمید سے ساٹھ ہزار کا معاوضہ لے سکتے ہیں؛ کیوں کہ شیخ حمید نے وعدے کے مطابق ۱۹۹۹ء تک -/2,75,000 روپئے ادا نہیں کئے ہیں، زمین کی پوری قیمت ادا کئے بغیر ۱۲-۱۳/ سال سے اس زمین کی پیداوار حاصل کر رہا ہے؛ لہٰذا عبدالمنان کے لڑکوں کو یا تو اس کا معاوضہ ملنا چاہئے یا پھر سودا کینسل کرنے کا اختیار رہنا چاہئے، شرعاً کیا حکم ہے؟

المستفتی: قیصر محمود خان کھرگون

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عبدالمنان کا شیخ حمید کو اپنی زمین بغیر کسی شرط کے ثمن

مؤجل کے ساتھ بیچ دینا اور شیخ حمید کا بائع کی اجازت سے اس پر قبضہ کر لینے سے وہ زمین اس کی ملکیت میں داخل ہوگئی ،اب شیخ عبدالمنان کے لڑکوں کو مبیع کے کچھ ثمن کی ادائے گی نہ ہونے پر اس بیع کو تنہا اپنی طرف سے فسخ کرنے کا اختیار نہ ہوگا؛ بلکہ وہ صرف مابقیہ قیمت کے حقدار ہوں گے جس کی ادائے گی کے لئے شیخ حمید پر دباؤ ڈالا جائے گا۔اور اگر دباؤ کے باوجود ساٹھ ہزار روپئے ادانہیں کرتا ہے تو پھر عبدالمنان کے لڑکوں کو عقد کے فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہوجائے گا۔

إذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع. (تاتارخانية ٨/ ٢٢٢، رقم: ١١٧١٤، هداية، كتاب البيوع، أشرفي ديوبند ٣/ ٢٠، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ١/ ٢٢٦، دارالكتاب ديوبند ١/ ٢٢٠، ملتقى الأبحر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١٠)

وللبائع حق حبس المبيع لاستيفاء الثمن إن كان الثمن حالا، وإن كان الثمن مؤجلا لم يكن له حق الحبس، وإذا استوفى الثمن وسلم المبيع أو سلم بغير قبض الثمن وبعضه مؤجل، أو قبض المشتري بإجازة البائع لفظا أو قبضه وهو يراه، ولا ينهاه ليس له أن يسترده ليحبسه بالثمن.

(تاتارخانية ٨/ ٢٤٢، رقم: ١١٧٧٨، الفقه الإسلامى وأدلته، هدى انٹرنيشنل ديوبند ٤/ ١٧٨)

لأن أحد المتعاقدين لا ينفرد بالفسخ كمالا ينفرد بالعقد. (هداية، كتاب القضاء، باب التحكيم، مسائل شتى، اشرفيه ديوبند ٣/ ١٤٧)

لأنه لما تعذر استيفاء الثمن من المشتري، فات رضا البائع، فيستبد بفسخه. الخ (هداية، أشرفى ديوبند ٣/ ١٤٧، البحرالرائق، كوئٹه ٧/ ٣٦، زكريا ٧/ ٦١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍رجب ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۱۹۸/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۷/۱۶ھ

عقد صحیح کے بعد واپسی پر مجبور کرنا

سوال [۸۶۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید اپنی زمین فروخت کررہا تھا، عمرو دو آدمیوں کو لے کر زید کے پاس آیا اور زید سے زمین کا سودا کرنا شروع کیا، زید نے اس کی قیمت پانچ ہزار روپیہ فی بیگہ خام کم ازکم بتائی، عمرو کے ساتھ اس کا لڑکا بھی تھا جو عاقل وبالغ ہے، عمرو نے اس کی قیمت ساڑھے تین ہزار روپیہ فی بیگہ خام لگائی، کچھ دن خاموشی رہی، اس کے بعد سے عمرو کے لڑکے نے پونے چار ہزار روپیہ فی بیگہ خام لگائی، اس کے بعد زید نے ہنس کر کہا کہ بیٹا تمہارے بس کی نہیں، پھر تقریباً پندرہ منٹ خاموشی رہی، عمرو کے ساتھ جو دو آدمی آئے تھے، ان میں سے ایک نے کہا کہ دونوں فریق کیوں خاموش ہوگئے؟ اس کے بعد زید نے ان دونوں آدمیوں کو اختیارات دے دئے، جن کو عمرو لے کر آیا تھا کہ تم کو کل اختیار رہے، چاہے جتنے میں طے کردو، پھر خاموشی رہی، کچھ دیر بعد عمرو نے بھی ان دونوں ہی آدمیوں کو اختیار دے دیا، اس کے بعد پیسے کا لین دین شروع ہوگیا اور اگلے ہی روز سے زید نے زمین عمرو کے قبضہ میں دے دی، کچھ دنوں بعد جب عمرو پاکستان جانے لگا تو زید سے یہ کہہ کر گیا کہ میرے لڑکے سے پیسے لینے کی کوشش کرنا، یہ پیسہ دینا نہیں چاہتا ہے، زید نے جب لڑکے سے پیسوں کو کہا تو آج کل کرتا رہا اور اس طرح دو مہینے عمرو کا لڑکا زید کو دھوکہ دیتا رہا، عمرو کے پاکستان سے آنے پر زید نے یہ واقعہ من وعن عمرو سے دوہرایا، جس پر عمرو نے خاموشی اختیار کی اور کوئی جواب نہیں دیا، اس کے بعد عمرو نے لوگوں سے یہ کہنا شروع کیا کہ زید مجھ کو زمین دینا نہیں چاہتا اور اس بات کو خوب شہرت دی، اس کے بعد لوگوں نے زید سے معلوم کیا، زید نے لوگوں سے کہا کہ یہ غلط ہے، جو لوگ ثالث ہیں وہ مجھے جو حکم دیں گے میں اس کا پابند رہوں گا، عمرو نے ان ثالثوں سے ایک مرتبہ بھی یہ نہیں کہا کہ فیصلہ دو اور زمین لکھوا دو، بلکہ زید کی تحقیر وتذلیل میں مستقل لگ گیا، کچھ دنوں کے بعد ان ثالثوں میں سے ایک آدمی کو

لے کر عمرو زید کے پاس آیا اور کہا کہ مجھے کسی قیمت پر زمین نہیں لینی ہے، میرا جورو پیہ ہے وہ واپس کر دو، ان حالات میں اس زمین کی پیداوار عمرو نے کھائی، اس کے لئے شرعی حکم کیا ہے؟ اور اس پیدوار کا شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: عبد اللطیف قاسمی، قبصہ اکبرآباد، ضلع بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ حالات میں اگر فسادِ عقد کی کوئی علت نہیں ہے اور نہ ہی زمین میں کوئی عیب سابق موجود ہے، عمرو کے لئے زید کو مجبور کر کے زمین واپس کرنا شرعاً جائز نہیں ہے؛ بلکہ عمرو پر واجب ہے کہ وعدہ کے مطابق زمین کی رقم ادا کرے۔

وإذا حصل الإیجاب والقبول لزم البیع، ولا خیار لواحد منهما إلا من عیب، أو عدم رؤیة. الخ (هدایة، کتاب البیوع، أشرفي دیوبند ۳/ ۲۰، الجوهرة النیرة، إمدادیه ملتان ۱/ ۲۲۶، دارالکتاب دیوبند ۱/ ۲۲۰، تاتارخانیة، زکریا ۸/ ۲۲۲، رقم: ۱۱۷۱۴، ملتقی الأبحر مع مجمع الأنهر، دارالکتب العلمیة بیروت ۳/ ۱۰-۱۱)

اور عمرو جب اس زمین کی پیداوار استعمال کر چکا ہے تو اب زمین کا واپس کرنا ہرگز درست نہیں ہے۔

باع کرما وسلمه، فأکل ………… (الدرالمختار، قبیل باب المرابحة والتولیة، کراچی ۵/ ۱۳۲، زکریا ۷/ ۳۴۸) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۲۹/ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۵۲۲)

بیعانہ کی ادائے گی نہ کرنے پر کیا بیع کو ختم کیا جا سکتا ہے؟

سوال [۸۶۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فدوی نے اپنی زمین کا سودہ ایک ہندو سے مبلغ دو لاکھ دس ہزار روپئے میں کیا تھا،

مورخہ: ۱/۷/۲۰۰۹ء کو اور اس نے فدوی کو ایڈوانس ایک لاکھ سڑسٹھ ہزار پانچ سو روپے دیئے، باقی رقم اس نے بیعانہ پر دینے کو کہا تھا، تاہم اس نے بیعانہ نہیں کروایا، بیع نامہ کی مدت ٦/ماہ رکھی تھی، نہ اس نے رقم ادا کی اور اب اس معاملہ کو تقریباً تین سال تین ماہ گذر چکے ہیں، اب زمین کی قیمت سات لاکھ روپے ہے، اس نے جو رقم ایڈوانس دی تھی، فدوی نے اس کو زمین جوتنے کی اجازت دے دی تھی، براہ کرم جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: لیاقت حسین اعجاز نگر بریلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب بیع نامہ کی مدت چھ مہینے تھی اور چھ مہینے کی مدت گذر جانے کے بعد بھی اس نے بیع نامہ نہیں کیا ہے اور اسی پر تین سال سے زیادہ عرصہ گذر گیا ہے، تو ایسی صورت میں آپ کو بیع فسخ کر کے اس کا پیسہ اس کو دے کر اپنی زمین واپس لینے کا حق ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۵/۵۰٦)

فإذا عزم البائع على ترك الخصومة، تم الفسخ ...... ولأنه لما تعذر استيفاء الثمن من المشتري، فات رضا البائع، فيستبد بفسخه.

(هداية، كتاب القضاء، باب التحكيم، مسائل شتى، اشرفيه ديوبند ۳/ ۱٤٦، البحر الرائق، زكريا ۷/ ٦١، كوئٹه ۷/ ۳٦)

فيستبد بفسخه لفوات شرط البيع، وهو التراضي. (فتح القدير، زكريا ۷/ ۳۰۹، كوئٹه ٦/ ٤١٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۰۸۷۹)

مدت متعینہ پر ثمن کی ادائے گی نہ ہونے پر بائع کو خیار فسخ حاصل ہے

سوال [۸٦۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: زید نے اپنی زمین خالد کوفروخت کی اور زید نے کہا کہ یہ زمین اس لئے فروخت کررہا ہوں کہ مجھے دوسری جگہ زمین خریدنی ہے، اگر آپ ایک مہینے کے اندر پوری رقم ادا کرسکتے ہیں، تو یہ زمین لیجئے، اگر آپ ایک مہینہ کے اندر رقم ادا نہیں کرسکیں گے تو میں دوسری جگہ زمین نہیں خرید سکوں گا، تو خالد نے کہا کہ میں ایک مہینہ کے اندر پوری رقم ادا کردوں گا اور آدھی رقم زید کو دی اور وہ پڑھانے کے لئے باہر چلے گئے، بار باران کو اطلاع بھی دی گئی؛ لیکن اس نے رقم ایک مہینہ کے اندر نہیں دی۔ اور زید نے یہ شرط لگا دی تھی؛ لیکن اس نے رقم ایک مہینے کے اندر نہیں دی۔ اور زید نے یہ شرط لگا دی تھی کہ اگر وہ زمین خرید نہیں سکا تو یہ زمین میں آپ کو نہیں دوں گا؛ اس لئے کہ یہ زمین فروخت کرنے کا مقصد دوسری زمین خریدنی ہے۔ اور خالد نے یہ رقم دس مہینے کے بعد ادا کی اور وہ زمین بھی زید کے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ اور خالد نے جو بقیہ رقم ادا کی تھی وہ زید کے بھائی کو دی تھی، زید کو نہیں دی تھی، تو کیا اس صورت میں خالد کو رقم لوٹائی جائے گی یا زمین لکھی جائے گی، جیسا کہ زید نے یہ شرط لگائی تھی کہ ایک مہینہ کے اندر پوری رقم ادا کرسکتے ہیں، تو آپ لیجئے ورنہ آپ کو میں زمین نہیں دوں گا۔

المستفتی: حافظ محمد اشفاق، بھاگلپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں درج کردہ صورت میں بیع مکمل منعقد نہیں ہوئی۔ اور بیع تام نہ ہونے کی وجہ سے زید کو اختیار رہے کہ رقم واپس کرکے اپنی زمین اپنے پاس رکھ لے۔

عن سلیمان بن البرصاء قال: بایعت ابن عمر بیعا، فقال لي: إن جاء تنا نفقتنا إلی ثلاث لیال، فالبیع بیعنا، وإن لم تأتنا نفقتنا إلی ذلک فلا بیع بیننا وبینک، ولک سلعتک. (المحلی بالآثار، کتاب البیوع، دارالکتب العلمیة بیروت ۷/ ۲٦۵، إعلاء السنن، دارالکتب العلمیة بیروت ۱٤/ ۵۷، رقم: ٤٦۲۱)

فإن اشتری شخص شیئا علی أنه أي المشتري إن لم ینقد ثمنه إلی

ثلاثة أيام فلا بيع صح إستحسانا، خلافا لزفر فلو لم ينقد في الثلاث فسد (وفي الشامية) هذا لو بقي المبيع على حاله. (الدر مع الشامي، كتاب البيوع، باب خيار الشرط، مطلب خيار النقد، كراچی ٤/ ٥٧١، زكريا ٧/ ١١٧، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٣٦، هداية، أشرفي ديوبند ٣/ ٣٠، تاتارخانية، زكريا ٩/ ٥٣، رقم: ١٢٦٩١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍شعبان ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۰۹۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۸/۱۴۲۷ھ

مال میں نقص نکلنے پر کارخانہ دار پر ہرجانہ عائد کرنا

سوال [۸٦۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے یہاں کی ایک ایکسپورٹ کرنے والی فرم کو ایک سیمپل بنا کر دیا، اس کا آرڈر میرے پاس منظور ہو کر آ گیا اور میرے اور ایکسپورٹ پارٹی کے درمیان ریٹ طے ہوگئے اور میں نے آرڈر کا نصف حصہ بنا کر دے دیا، میں نے اپنی بقایا رقم مبلغ تین لاکھ ۷۵؍ ہزار روپیہ کا مطالبہ کیا، تو یہاں کی ایکسپورٹ پارٹی یہ کہہ رہی ہے کہ آپ نے مال خراب دیا تھا؛ اس لئے میری غیر ملکی پارٹی بطور ہرجانہ کاٹ رہی ہے جو کہ میں آپ کے روپیہ میں سے مجری کروں گا، کیا یہ اقدام جائز ہے یا نا جائز ہے؟ جب کہ انہوں نے مال لیتے وقت ایک ایک عدد کی چیکنگ کی تھی اور جو مال میں نقص تھا اس کی پھر میں نے مرمت کرا کر مال کو دوبارہ ٹھیک کر کے واپس کیا، اب وہ میرا ایک لاکھ پچھتر ہزار روپیہ بطور ہرجانہ کاٹ رہے ہیں، یہ جائز ہے کہ نہیں؟

المستفتی: محمد عرفان محلّہ طویلہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر آپ نے ایک ایک مال چیک کرا کے دیا ہے اور

ایکسپورٹر نے چیک کرکے لیا ہے اور پورے اطمینان کے بعد مال دوسرے ملک میں امپورٹ کے پاس پہنچنے کے بعد مال میں خرابی نکلی ہے تو اس کے ذمہ دار شرعی طور پر آپ نہیں ہیں؛ بلکہ اس کا ذمہ دار ایکسپورٹر ہی ہوگا؛ لہٰذا ایسی صورت میں ایکسپورٹر آپ سے ہرجانہ (کلیم) لینے کا حقدار نہیں ہے۔

وعلمت أن بيع المشتري للمعيب حبس للمبيع سواء علم بالعيب أو لم يعلم، فلا يمكنه الرد بعد ذلک. الخ (فتح القدير، كتاب البيوع، باب خيار العيب، زكريا ٦/ ٣٦٢، كوئٹه ٦/ ٣٨)

ولا يرجع بائعه على بائعه؛ لأنه صار بالبيع حابسا للمبيع. الخ (كفاية مع الفتح كوئٹه ٦/ ٣٨، زكريا ٦/ ٣٦٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ذیقعدہ ١٤١٨ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٣/٥٤٩٢)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١/١١/١٤١٨ھ

وقت پر قیمت ادا نہ کرنے کی وجہ سے معاملہ فسخ کرنا

سوال [٨٦٥٣]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک صاحب سے میں نے ٨/ لاکھ پچاس ہزار روپئے میں مکان خریدا، جن میں سے ٢/ لاکھ ١٠/ ہزار روپئے باقی رکھے، جس کی مدت متعین ہوگئی، مجھے ایک تاجر سے ٤٠/ لاکھ روپئے لینے تھے کہ اچانک اس کی بیوی کو کینسر ہوگیا اور وہ روپئے مجھے نہ دے سکا اور میں مالک مکان کو وقت مقررہ پر پیسے نہ دے سکا، جس کی بنا پر مالک مکان بہت ناراض ہوا اور زبردستی مجھ سے ایک عہد نامہ لکھوایا کہ اگر آئندہ چھ مہینے میں مجھے میری باقی رقم ٢/ لاکھ ١٠/ ہزار لوٹا دی تب تو ٹھیک ہے ورنہ تمہاری دی ہوئی رقم ٦/ لاکھ ٤٠/ ہزار میں سے ایک روپیہ بھی تم کو نہیں دوں گا۔ اور مکان بھی واپس لے لوں گا اور میری اجازت کے بغیر کسی کو مکان بیچ بھی

نہیں سکتے، اب یہ چھ مہینے کی مدت بھی پوری ہونے والی ہے اور میرے پاس انتظام نہیں ہو پایا، میں نے سوچا کہ مکان بیچ دوں اور اس سے پیچھا چھڑا لوں، جب مالک مکان کو پتہ چلا تو کہتا ہے کہ منافعہ میں سے آدھا منافع اگر مجھے دو تب بیچ سکتے ہو ورنہ عہد نامہ کے مطابق تجھ پر کیس کر دوں گا، تو مالک مکان کی یہ شرطیں کہاں تک درست ہیں، میں اگر مکان بیچوں تو کیا واقعی وہ آدھے منافع کا حق دار ہے؟ فی الحال مکان پر میرا قبضہ ہے، میں مکان میں رہتا ہوں، مکان کا ٹیکس میرے نام سے آتا ہے، لائٹ کا بل بھی میرے نام سے آتا ہے۔

المستفتی: محمد سلمان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں جب کہ بیع کا معاملہ مکمل ہو چکا ہے اور مشتری نے مبیع زمین پر قبضہ اور دخل لے لیا ہے، تو اب اگر وقت پر قیمت ادا نہ کرنے کی وجہ سے فریقین کی رضامندی سے اس معاملہ کو فسخ کیا جائے تو حکم یہ ہوگا کہ مشتری خالی مکان بائع کے حوالہ کرے اور بائع وصول کردہ پوری رقم کو مشتری کو واپس کرے، معاملہ فسخ ہونے کی صورت میں اس ادا کردہ رقم کو ضبط کرنے کی شرط قطعاً حرام ہے اور خلاف شریعت جبریہ معاہدہ کا کوئی اعتبار نہیں، نیز جب تک معاملہ فسخ نہ ہو مشتری اس جگہ کو اپنی مرضی سے کسی بھی شخص کے ہاتھ فروخت کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور اس میں جو بھی منافع ہوں وہ خود ہی اس کا مالک ہوگا، بائع اس منافع میں سے کسی بھی حصہ کا حق دار نہیں۔ الغرض خلاصہ یہ ہے کہ بائع مقررہ قیمت سے ایک روپیہ بھی زائد لینے کا مطالبہ کسی صورت میں نہیں کرسکتا؛ البتہ رقم مقررہ وقت پر ادا نہ ہونے کی شکل میں وہ معاملہ فسخ کرنے کی بات کرسکتا ہے؛ لیکن اس صورت میں بھی اسے آمدہ رقم میں سے کوئی حصہ ضبط کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

الإقالة جائزة في البيع بمثل الثمن الأول، فإن شرط أكثر منه أو أقل، فالشرط باطل ويرد مثل الثمن الأول. (هداية، كتاب البيوع، باب الإقالة، أشرفي ديوبند ٣/ ٦٩)

فلو شرط فيها أي الإقالة أكثر من الثمن الأول، أو خلاف الجنس بطل الشرط، ولزم الثمن الأول عند الإمام؛ لأن الإقالة فسخ وهو لا يكون إلا على الثمن الأول، فيصير ذلک الشرط فاسدا ولغوا دون الإقالة لما مرّ إن الإقالة لا تفسد بالشرط الفاسد. (مجمع الأنهر، دارالکتب العلمية بيروت ۳/ ۱۰۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ /۷/ ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۷۱۴)

بیع تام اور لازم ہونے کے بعد معاملہ منسوخ کرنے کا حکم

سوال [۸٦۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک جائیداد (نشست گاہ) واقع محلّہ کٹکوئی چاند پور، ضلع بجنور جس کا رقبہ تقریباً تیس گز ہے جو کہ ترکہ پدری جناب حکیم سید ابن حسن صاحب مرحوم سے چاروں بھائیوں کو وراثت میں پہنچی، والدین کے انتقال کے بعد چاروں بھائیوں کی باہمی رضا مندی سے یہ طے پایا کہ جائیداد قلیل ہونے کی وجہ سے اس کو تقسیم کر کے ہر حصہ قابل تعمیر نہ رہے گا؛ لہٰذا اس کی قیمت اسی ہزار روپئے قائم کر کے طے پایا کہ اس کو کسی ایک بھائی کو دے دیا جائے، خرید نے والا بھائی ان تینوں بھائیوں کو ان کے حصہ کی قیمت ادا کردے اور جائیداد مذکورہ کو اپنے نام کرالے؛ لہٰذا سب سے بڑے بھائی سے چھوٹے احمد اشرف نے اس کو لینا اور تینوں بھائیوں نے اس کو دینا قبول کیا، بڑے بھائی غلام غوث نے احمد اشرف سے دس ہزار نقد لے لیا، دس ہزار باقی رہا، اس کے چار سال بعد بڑے بھائی کا انتقال ہوگیا، باقی چھوٹے دونوں بھائیوں نے بھی اپنے حصہ کی رقم بیس بیس ہزار روپئے اپنے خریدار بھائی سے وصول کرلی؛ البتہ بڑے بھائی مرحوم کے دس ہزار روپئے اب بھی باقی ہیں، کیا بڑے بھائی مرحوم کی اہلیہ یا ان کی کسی اولاد کو اس فیصلہ کے منسوخ کرنے کا شرعاً حق حاصل ہے، جو فیصلہ بڑے بھائی مرحوم کر گئے ہیں، اس تحریر کے مطابق شریعت کا کیا فیصلہ ہے؟

المستفتی: احمد اشرف جیلانی محلّہ کٹکوئی چاند پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب چاروں بھائیوں نے مل کر آپسی رضامندی کے ساتھ مذکورہ معاملہ طے کرلیا تھا، تو اب اسی پر قائم رہنا لازم ہے، بڑے بھائی کے انتقال کے بعد ان کی اہلیہ یا دیگر وارث کو مذکورہ معاملہ منسوخ کرنے کا شرعاً حق نہیں ہے؛ بلکہ یہ معاملہ لازم اور تام ہو چکا ہے؛ اس لئے اسی پر قائم رہنا ضروری ہے، ہاں البتہ جو دس ہزار روپیہ باقی ہے وہ بلا تاخیر ادا کر دینا چاہئے۔

وإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع، ولا خيار لواحد منهما إلا من عيب، أو عدم رؤية. (هداية، كتاب البيوع، أشرفي ديوبند ٣/ ٢٠، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ١/ ٢٢٦، دارالكتاب ديوبند ١/ ٢٢٠، ملتقى الأبحر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١٠، تاتارخانية، زكريا ٨/ ٢٢٢، رقم: ١١٧١٤)

وإن كان كل واحد منهما يستضر لصغره لم يقسمها إلا بتراضيهما ...... وتجوز بتراضيهما؛ لأن الحق لهما، وهما أعرف بشأنهما. (هداية مع فتح القدير، كتاب القسمة، فصل فيما يقسم وما لايقسم، زكريا ٩/ ٤٤٥، كوئٹه ٨/ ٣٥٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ رصفر ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۶۸۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۲/۸ھ

وعدہ کی خلاف ورزی پر سابقہ معاملہ ختم کردینے کا حکم

سوال [۸۶۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم لوگ ایک خاندان کے افراد ہیں، آج سے تقریباً ۱۵ رسال قبل ہمارے درمیان جائیداد کا بٹوارہ ہوا، اس سے پہلے ہم سب لوگ مشترک مکان میں رہتے تھے، کسی کے پاس کم اور کسی کے پاس اس کے حصہ رسد سے زیادہ تھا، ایک قطعہ مکان جو فریق ثانی کے قبضہ میں تھا، جس کی قیمت اس وقت اڑتالیس ہزار روپیہ مانی گئی تھی، اس میں سے -/26,750 روپئے فریق ثانی

کا حصہ تھا اور باقی -/21,250 روپئے کا ہمارا (فریق اول) کا حصہ تھا؛ لہٰذا طے ہوا کہ فریق ثانی دو چار روز میں فریق اول کے حصہ کی قیمت -/21,250 روپئے نقد ادا کردے، تو فریق اول اپنے حق سے دست بردار ہوجائے گا، باہمی طور پر یہ بات طے ہوگئی؛ لیکن فریق ثانی نے مقررہ رقم کی ادائے گی کافی عرصہ تک باوجود تقاضہ کے نہیں کی ۷-۸/ سال بعد فریق ثانی نے صرف دس ہزار -/10,000 روپیہ دینا چاہا جو فریق اول نے لینے سے انکار کردیا اور معاملہ معلق رہا، اب فریق اول کہتا ہے کہ چونکہ فریق ثانی نے طے شدہ معاملہ کے خلاف کیا ہے؛ لہٰذا وہ معاملہ ختم ہوگیا، اب فریق ثانی مکان مذکورہ مشترکہ کے میرے حصہ کی رقم موجودہ بازار بھاؤ سے ادا کرے اور اس عرصہ کے استعمال کا کرایہ ادا کرے، یا پھر اپنے حصہ کی قیمت فریق اول سے لے کر مکان اس کے سپرد کرے، جس کے لئے فریق ثانی تیار نہیں ہے۔

المستفتی: ذکرالرحمٰن، محلّہ گلشہید، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر سائل کا سوال واقع کے مطابق ہے، اور فریق ثانی نے طے شدہ وعدہ کے مطابق فریق اول کا حق ادا نہیں کیا ہے، تو فریق اول کو سابقہ معاملہ شرعاً ختم کردینے کا حق ہے، نیز فریق اول کا یہ مطالبہ بھی صحیح ہے کہ فریق ثانی اپنے حصہ کی قیمت فریق اول سے وصول کر کے اپنے حصہ سے دست بردار ہوجائے۔

عن عمرو بن يحيى المزني، عن أبيه أن رسول الله ﷺ قال: لا ضرر ولا ضرار. (موطا إمام مالك، كتاب القضاء، القضاء فى المرفق، أشرفي ديوبند/ ۳۱۱)

قوله عليه السلام: لا ضرر ولا ضرار. الحديث، لا يضر الرجل أخاه ابتداءًا ولا جزاء. الخ (الأشباه، قديم/ ۱۳۹، قواعد الفقه، أشرفى ديو بند/ ۱۰۶، شرح المجلة رستم باز اتحاد ديو بند ۱/ ۲۹، رقم المادة: ۱۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۵۸)

۳/ باب العربون

بیعِ عربون

سوال [۸۶۵۶]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بیع عربون (بیعانہ) کے جواز کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عمل سے کتب احادیث میں کوئی روایت موجود ہوتو بحوالہ نقل فرما کر ممنون ومشکور فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بیع عربون کے جواز کے متعلق روایات کتب حدیث میں موجود ہیں۔ حضرت نافع بن عبدالحارث اور حضرت عمرؓ کا واقعہ ذیل میں ملاحظہ فرمایئے:

حدثنا ابن عيينة عن عمرو عن عبدالرحمن بن فروخ أن نافع بن عبدالحارث اشترى دار السجن من صفوان بن أمية بأربعة آلاف درهم، فإن رضي عمر فالبيع له، وإن عمر لم يرض، فأربع مئة لصفوان. (مصنف لابن أبي شيبة، مؤسسة علوم القرآن بيروت ۱۱/ ۶۷۲، رقم: ۲۳۶۶۲)

واشترى نافع بن عبدالحارث دارا للسجن بمكة من صفوان بن أمية على أن عمر رضي بالبيع، فالبيع بيعه، وإن لم يرض عمر فلصفوان أربع مائة دينار، وسجن ابن الزبير بمكة. (بخاري شريف، كتاب الخصومات، باب الربط والحبس في الحرم ۱/ ۳۲۷، رقم الباب: ۸)

عن زيد بن أسلم أن النبي ﷺ أحل العربان في البيع. (مصنف لابن أبي شيبة، مؤسسة علوم القرآن بيروت ۱۱/ ۶۷۱، رقم: ۲۳۶۵۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ ذیقعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۱۸)

بیعانہ دے کر خرید وفروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۶۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: خالد کاروبار اس طرح کرتا ہے کہ مثلاً زمین ایک لاکھ روپئے کی خرید کر بیعانہ دے کر لی اور طے کر دیا کہ ایک لاکھ روپئے ایک ماہ یا دو ماہ میں ادا کر دوں گا۔ اور پھر اسی زمین کو ۱۵/ دن میں ڈیڑھ لاکھ کی بیچ کر وہ ایک لاکھ روپئے ادا کر دئے، کیا اس طرح کاروبار کرنا صحیح ہے؟ عاقل کا کہنا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ بیع قبل القبض ہے جو صحیح نہیں، صحیح جواب سے نوازیں۔

المستفتی: مجیب الرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حسب تحریر سوال خالد نامی شخص کا بیعانہ دے کر زمین اس شرط کے ساتھ خریدنا کہ میں ایک دو ماہ میں قیمت ادا کر دوں گا اور اس کے بعد اس زمین کو کچھ زائد نفع کے ساتھ غیر کو بیچ کر اس روپیہ سے زمین کی قیمت ادا کرنا اور اس طرح کاروبار کرنا شرعاً درست ہے اور عاقل کا اس خرید وفروخت کو بیع قبل القبض قرار دینا صحیح نہیں؛ اس لئے کہ زمین کی خرید وفروخت میں حکماً قبضہ موجود ہے۔

قال أبو حنيفة وأبو يوسف: يمنع بيع قبل القبض في سائر المنقولات، ويجوز في العقار الذي لا يخشى هلاكه. (تكمله فتح الملهم، كتاب البيوع، باب بطلان بيع المبيع قبل القبض، أشرفيه ديوبند ۱/ ۳۵۱)

للمشتري أن يبيع المبيع من آخر قبل قبضه إن كان عقارا. (شرح المجلة رستم باز ۱/ ۱۲۸، رقم المادة: ۲۵۳، مكتبه اتحاد ديوبند)

ويجوز بيع العقار قبل القبض عند أبي حنيفة وأبي يوسف. (هداية، باب المرابحة والتولية، أشرفى ديوبند ۳/ ۷۴، تاتارخانية زكريا ۸/ ۲۶۶، رقم: ۱۱۸۶۲،

الفقه على المذاهب الأربعة، مبحث التصرف في المبيع قبل قبضه، دارالفكر بيروت ۲/ ۲۳٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۱/۲/۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۸۹۳/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۲/۱۴ھ

کیا دھوکہ سے اپنے نام بیع نامہ کرانے سے ملکیت ثابت ہوجائے گی

سوال [۸۶۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے شوہر نے ایک پلاٹ ذاتی آمدنی سے خریدا تھا اور پوری قیمت سوسائٹی کو ادا کردی تھی؛ لیکن بیع نامہ نہیں ہوا تھا، میرے شوہر کے شہید ہونے کے بعد خسر نے میرے بڑے لڑکے فہیم الدین سے بہانہ سے اس کی رسید حاصل کر کے بیع نامہ کرالیا، جب کہ وعدہ فہیم کے نام کرانے کا کیا تھا، تو اس پلاٹ کے مالک میرے خسر ہیں یا میں؟ اور میرا شرعاً اس میں کتنا حق ہے؟ جب کہ خسر نے شوہر کے انتقال کے بعد لوگوں کو گواہ بنا کر پلاٹ پر نسیم کی ملک ہونے کا اقرار کیا تھا، جواب سے مطلع فرمائیں۔

المستفتية: نرگس جہاں، ہمشیرہ حاجی محمد انصار، ڈھوتی کھار، آگرہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: جب نسیم مرحوم نے اپنی ذاتی آمدنی سے پلاٹ خریدا ہے تو وہ پلاٹ ان کی ملک ہے، ان کے والد نے دھوکہ دے کر پلاٹ کے کاغذات میں اپنے نام جو بیع نامہ کرالیا ہے، اس سے شرعاً وہ اس پلاٹ کے مالک نہ ہوں گے؛ بلکہ یہ نسیم مرحوم ہی کی ملک ہے؛ لہٰذا ان کے انتقال کے بعد وہ پلاٹ شرعی وارثین میں بطور ترکہ تقسیم ہوگا۔ (مستفاد: امداد المفتیین ۲/ ۸۹۰)

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يأخذن أحدكم متاع أخيه

لاعبا ولا جادا. الحديث (سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب من يأخذ الشيء من مزاح، النسخة الهندية ٢/ ٦٨٣، دارالسلام، رقم: ٥٠٠٣)

عن عبدالله بن السائب بن يزيد عن أبيه عن جده قال: قال رسول الله ﷺ: لا يأخذ أحدكم عصا أخيه لاعبا أو جادا، فمن أخذ عصا أخيه فليردها إليه. (سنن الترمذي، أبواب الفتن، باب ماجاء لا يحل مسلم أن يردع مسلما، النسخة الهندية ٢/ ٣٩، دارالسلام، رقم: ٢١٦٠، شامي، كتاب الغصب، مطلب في رد المغصوب وفيما لو أبى المالك قبوله، كراچی ٦/ ١٨٢، زكريا ٩/ ٢٦٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۵/۵ھ

کیا ’’امدادالفتاویٰ‘‘ میں بیعانہ ضبط کرنے کا مسئلہ ہے؟

سوال [۸۶۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا حضرت تھانویؒ نے ’’امدادالفتاویٰ‘‘ میں بیعانہ ضبط کرنے سے متعلق کوئی فتویٰ تحریر کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو اس کو وضاحت سے تحریر فرمائیے۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حضرت تھانویؒ نے ’’امدادالفتاویٰ‘‘ جدید ۳/۱۴۲ پر اپنے ایک فتویٰ میں بیعانہ کی رقم کو ضبط کرنے کی اجازت دی ہے۔ سوال کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے دانت بنانے والے سے دانت بنوائے اور بطور بیعانہ کے اس کو رقم پیشگی دے دی اور وہ شخص دانت بنا چکا؛ البتہ اس میں کچھ نقص رہ گیا، اس دوران اس شخص کا انتقال ہوگیا، تو اب یہ شخص یہ رقم بیعانہ واپس کرے گا یا نہیں؟ چنانچہ اس کے جواب میں حضرت فرماتے ہیں: میرے نزدیک جب وہ بنے ہوئے دانت لے چکا اور وہ موافق فرمائش کے تھے اور ایسی

خفیف کمی جو عرف کے موافق ہو، موافقت فرمائش کے خلاف نہیں ہے، تو وہ بیع کامل ہوگئی اور بنانے والا دانت کا مالک ہوگیا، اس لئے بنانے والا بقیہ دام کا مستحق ہے۔ اور بقیہ کا وہ مطالبہ کرے گا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/۱۴۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۵/۳/۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۴۶۲/۴۰)

زرِ بیعانہ کی واپسی کا حکم

سوال [۸۶۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: خرید وفروخت کے وقت جب کہ قیمت متعین ہوجاتی ہے اور خریدار کے پاس فی الحال مکمل قیمت موجود نہیں ہے، تو خریدار اسی مجلس میں آئندہ مکمل قیمت دینے کا وعدہ کرتا ہے اور بات کو معتبر اور پختہ بنانے کے لئے زر بیعانہ کے نام پر کچھ روپے دیتا ہے، اب اگر خود مشتری کی جانب سے یہ معاملہ فسخ کیا گیا تو سامان کا مالک زر بیعانہ والی رقم واپس نہیں کرتا اور اپنے لئے حلال سمجھتا ہے، کیا یہ جائز ہے؟

المستفتی: محمد اشتیاق نواز قاسمی، بھاگلپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: معاملہ چاہے مشتری کی طرف سے فسخ ہوجائے یا بائع کی طرف سے ہر حال میں بیعانہ کی رقم مشتری کو واپس دے دینا بائع پر لازم ہے۔ اور بائع کے لئے وہ رقم حلال نہیں ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/ ۷۷)

عن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جده أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن بيع العربان، قال أبو عبدالله: العربان: أن يشتري الرجل دابة بمائة دينار، فيعطيه دينارين عربونا، فيقول: إن لم أشتر الدابة فالديناران لك.

الحديث (ابن ماجة شريف، أبواب التجارات، باب بيع العربان، النسخة الهندية ١/ ١٥٨، دارالسلام، رقم: ٢١٩٣، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في العربان، النسخة الهندية ٢/ ٤٩٤، دارالسلام، رقم: ٣٥٠٢)

ويرد العربان إذا ترک العقد على كل حال بالاتفاق. (بذل المجهود يحيى سهارنپور ٤/ ٢٨٧، دارالبشائر الإسلاميه بيروت ١١/ ٢٢١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ شعبان ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۱۵۲)

بیعانہ کی واپسی لازم ہے

سوال [۸۶۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے ایک مکان خریدنے کے لئے عمر سے سودا کیا اور کچھ رقم بطور بیعانہ دے کر ایک مدت مثلاً تین ماہ یا چھ ماہ رجسٹری کرنے کے لئے طے کرلی، مدت پوری ہونے سے پہلے زید نے عمر سے کہا کہ میں مکان نہیں لے سکوں گا؛ لہٰذا کچھ دن بعد زید نے عمر سے اپنی بیعانہ کی رقم واپس مانگی تو عمر نے کہا کہ وہ رقم مسجد کو دے دی۔

(الف) کیا عمر کو زید کی رقم مسجد کو دینا درست ہے یا نہیں؟

(ب) کیا رقم زید کو واپس ملنی چاہئے یا نہیں؟

(ج) بیعانہ کی رقم واپس نہ کرنے پر عمر معاوضہ دار رہے گا یا نہیں؟

المستفتی: محمد شفیق جگر کالونی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب زید نے مکان لینے سے انکار کردیا ہے، تو عمر پر لازم ہے کہ بیعانہ کی رقم زید کو واپس کردے اور مسجد کو جو رقم عمر نے دی ہے اس کا ذمہ دار عمر خود ہے، اور وہ پیسہ عمر کا اپنی جیب سے دینا شمار ہوگا۔ اور زید سے لی ہوئی رقم واپس کرنا لازم ہے۔

عن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جده أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن بيع العربان، قال أبو عبدالله: العربان: أن يشتري الرجل دابة بمائة دينار، فيعطيه دينارين عربونا، فيقول: إن لم أشتر الدابة فالديناران لک.

الحديث (ابن ماجة شريف، أبواب التجارات، باب بيع العربان، النسخة الهندية ١/ ١٥٨، دارالسلام، رقم: ٢١٩٣، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في العربان، النسخة الهندية ٢/ ٤٩٤، دارالسلام، رقم: ٣٥٠٢)

ويرد العربان إذا ترک العقد على كل حال بالاتفاق. (بذل المجهود يحيى سهارنپور ٤/ ٢٨٧، دارالبشائر الإسلاميه بيروت ١١/ ٢٢١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹ر جمادی الثانیہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۱۴۳)

بیعانہ کی رقم ضبط کرنے کا حکم

سوال [۸۶۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے اپنی ایک چیز مثلاً زمین فروخت کی اس رقم سے کوئی دوسرا کام کرنا تھا، عمرو نے وہ زمین خریدنے کی بات کی، قیمت طے ہوگئی اور یہ وعدہ ہوگیا کہ دس دن بعد ۱/۴ قیمت ادا کروں گا اور ایک ماہ بعد کل قیمت ادا کرکے بیعانہ لکھا لے گا، یہ بات طے ہونے کے بعد عمرو نے مبلغ دو ہزار روپئے زید کو بیعانہ کے طور پر دے دیئے جو کہ ایک طرح کی ضمانت ہوتی ہے بات کی پختگی کے لئے، بات طے ہونے کے بعد زید نے دوسرے خریداروں کو منع کردیا کہ ہماری زمین فروخت ہوگئی؛ لیکن عمرو نے وعدہ خلافی کی اور حسب وعدہ نہ تو دس دن میں ۱/۴ قیمت ادا کی نہ ایک ماہ بعد کل قیمت ادا کی، نہ بیعانہ کرایا، عمرو کے اس عمل سے زید کا نقصان یہ ہوا کہ وہ جو کام اس رقم سے کرنا چاہتا تھا وہ نہیں کرسکا اور اشیاء کی قیمت بڑھنے اور گرانی ہوجانے کی وجہ سے زید کو ہی وہ کام زیادہ مہنگا اور زیادہ قیمت میں ملا، وعدہ کی مدت نکلنے کے بعد اور مزید انتظار کے بعد زید

نے اپنی وہ زمین دوسرے شخص کوفروخت کردی، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اپنے نقصان کے بدلے میں زید عمرو کے دو ہزار روپئے جوبطور بیعانہ آئے تھے ضبط کرسکتا ہے یانہیں؟ یا اس بیعانہ کی رقم کوواپس کرنا ضروری ہے؟ جواب عالی سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی: محمد عمیر کاس گنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: وقت معینہ پررقم ادا نہ کرنے کی بناء پرفروخت کرنے والے کے لئے عقد ختم کرنے کا حق ہے، مگر عقد ختم کرنے کے بعد دئے ہوئے بیعانہ کوضبط کر لینا جائز نہیں ہے، اس کوواپس کردینا لازم ہے۔

أن النبي صلی اللّٰہ علیه وسلم نهی عن بیع العربان، قال أبو عبداللّٰہ: العربان: أن یشتري الرجل دابة بمائة دینار، فیعطیه دینارین عربونا، فیقول: إن لم أشتر الدابة فالدیناران لک. الحدیث (ابن ماجة شریف، أبواب التجارات، باب بیع العربان، النسخة الهندیة ۱/ ۱۵۸، دارالسلام، رقم: ۲۱۹۳، سنن أبي داؤد، کتاب البیوع، باب في العربان، النسخة الهندیة ۲/ ٤۹٤، دارالسلام، رقم: ۳۵۰۲)

ویرد العربان إذا ترک العقد علی کل حال بالاتفاق. (بذل المجهود مکتبه یحیی سهارنپور ٤/ ۲۸۷، دارالبشائر الإسلامیه بیروت ۱۱/ ۲۲۱) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ محرم ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۶۰۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/ ۱/ ۱۴۱۹ھ

بیعانہ کی واپسی پرزائد رقم لینا

سوال [۸۶۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے بکر سے ایک آراضی بذریعہ عمر مبلغ ایک لاکھ دس ہزار روپیہ میں خرید لی اور مبلغ پانچ ہزار روپیہ کا بیعانہ بذریعہ عمر دلاکر آراضی کا سودا بالکل پکا طے پا گیا، نیز جس دن

بیعانہ دیا گیا اسی دن کے لئے بیعانہ ہونا بھی طے پا گیا، رجسٹری شدہ مگر کچھ دیر کے بعد بکر عمر کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ مذکورہ آراضی میں نے کسی دوسرے شخص کو مبلغ ایک لاکھ بیس ہزار روپئے میں فروخت کردی ہے، تم اپنا بیعانہ واپس لے لو، عمر نے منع کیا، بات بڑھتی دیکھ کر کچھ لوگ اکٹھا ہو گئے اور صورت حال معلوم کرنے کے بعد لوگوں نے کہا کہ اس طرح سودا ختم کئے جانے پر بیعانہ کا دوگنا روپئے واپس کیا جاتا ہے، اس پر بکر نے عمر کو مبلغ دس ہزار روپئے واپس کردئے، یعنی پانچ ہزار روپئے زائد واپس کئے اور یہ زائد روپئے اس وقت عمر کے پاس ہی بطور امانت کے ہیں، عمر یہ چاہتا ہے کہ یہ روپئے بکر کو ہی دئے جائیں، جب کہ زید کا کہنا ہے کہ یہ روپئے مجھے ملنے چاہئیں، تو ایسی صورت میں عمر کو یہ روپئے کس کو دینے چاہئیں؟ کیوں کہ علماء حضرات سے سنا ہے کہ اس طرح کا لین دین سود کہلاتا ہے، جو کہ ناجائز ہے، اگر عمر یہ روپئے زید کو دیتا ہے، تو کیا عمر بھی گنہگار ہوگا؟ اور آخرت میں ایسے شخص کے بارے میں کیا وعید آئی ہے؟ برائے کرم تفصیل سے روشنی ڈال کر جواب مرحمت فرمائیں، تاکہ حق والے کو حق مل جائے۔

المستفتی: عبدالحمید راعینی، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بیعانہ کی واپسی پر جو زائد رقم بائع بکر سے وصول کی گئی ہے، وہ بکر کو واپس کردی جائے، اس کا لینا جائز نہیں۔

لا یجوز لأحد من المسلمین أخذ مال أحد بغیر سبب شرعي.

(شامي، کتاب الحدود، مطلب في التعزیر بأخذ المال، کراچی ۴/ ۶۱، زکریا ۶/ ۱۰۶، هندیة زکریا قدیم ۲/ ۱۶۷، جدید ۲/ ۱۸۱، البحرالرائق، کوئٹه ۵/ ۴۱، زکریا ۵/ ۶۸، قواعد الفقه، أشرفی دیوبند/ ۱۱۰، رقم: ۲۶۹، الموسوعة الفقهیة ۲۱/ ۱۱۲)

البتہ بکر نے معاملہ طے ہوجانے کے بعد جو دھوکہ دیا ایسا کرنا جائز نہیں، بکر اس سے گنہگار ہوا؛ لہٰذا بکر پر توبہ واستغفار ضروری ہے۔

اِنَّمَا التَّوۡبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِيۡبٍ فَاُولٰٓـئِكَ يَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ. الآية [النساء: ۱۷] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍۷؍۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۲۴۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹؍۷؍۱۴۲۰ھ

بیعانہ کے بعد معاملہ ختم کرنے کا حکم

سوال [۸۶۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے اپنے مکان کا ایک آدمی سے سودا کیا تھا، میں نے چھ ماہ کا ٹائم دیا تھا، اس چھ ماہ میں تقاضہ کرنے پر میری بقایا رقم اس نے نہیں دی، جس کو تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوگیا، ڈیڑھ سال کے عرصہ سے برابر تقاضہ کر رہا ہوں، میں اب اپنا معاملہ بقایا رقم نہ دینے کی صورت میں ختم کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے دئے ہیں وہ رقم واپس کر کے اپنی جائیداد واپس لینا چاہتا ہوں، کیا یہ میرے لئے جائز ہے؟

المستفتی: صباحت علی ولد صفایت علی، محلّہ تمباکو والان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر خریدار وقت مقررہ پر بقیہ رقم ادا کرے تو فروخت کرنے والے کو مطالبہ کے باوجود رقم ادا کرنے پر عقد فسخ کرنے کا حق ہوگا۔ اور سوال نامہ سے واضح ہوتا ہے کہ بجائے چھ ماہ کے ڈیڑھ سال مہلت دی گئی ہے؛ اس لئے آپ کو معاملہ فسخ کر کے حاصل شدہ رقم واپس کر کے اپنی جائیداد واپس لینے کا حق ہے۔

إذ الحاجة مست إلى الانفساخ عند عدم النقد تحرزا عن المماطلة في الفسخ. الخ (هداية، كتاب البيوع، باب خيار الشرط، أشرفي ديوبند ۳/ ۳۰)

فإذا عزم البائع على ترك الخصومة، تم الفسخ ...... ولأنه لما تعذر

استيفاء الثمن من المشتري فات رضا البائع، فيستبد بفسخه. (هداية، القضاء، باب التحكيم، مسائل شتى، أشرفي ديوبند ٣/ ١٤٦-١٤٧، البحرالرائق، كوئٹه ٧/ ٣٦، زكريا ٧/ ٦١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/شعبان ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۱۹۲۹)

جائیداد کا بیعانہ دوسرے کو دے کر سوتیلے بیٹے کو فروخت کرنا

سوال [۸۶۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: روشن اختر نے اپنی دولڑکیوں کے جائیداد کے حصہ کا معاہدۂ بیع کچھ رقم پیشگی لے کر بیعانہ کے طور پر میرے نام کردیا تھا، معاہدۂ بیع کے وقت لڑکیوں کی عمر ۱۲/سال اور ۱۴/سال کی تھی، آٹھ سال بعد لگ بھگ روشن اختر نے اسی حصہ کا بیعانہ اپنے سوتیلے بیٹے انتخاب کے نام کرادیا، معاہدۂ بیع کے وقت روشن اختر کے پاس اپنی لڑکیوں کے پالن پوسن تعلیم وغیرہ کے لئے کوئی اثاثہ نہیں تھا، تو میرے نام معاہدۂ بیع کرنے کے بعد سوتیلے بیٹے کو بیعانہ کردینا کیسا ہے؟ کیا اس پر لازم ہے کہ بعد والے بیعانہ کو ختم کرکے پہلے والے خریدار کے نام بیعانہ کرائے، شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: اقبال انور تمبا کو والان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: روشن اختر نے اپنی لڑکیوں کی جائیداد کا آپ کے نام جو بیعانہ کیا ہے، یہ ایک طرح کا وعدۂ بیع ہے، نہ کہ بیع، روشن اختر کو وعدۂ بیع پورا کرنا چاہئے تھا، وعدہ پورا نہ کرنے کی وجہ سے وہ گنہگار ہوگی اور روشن اختر کا اپنے سوتیلے بیٹے انتخاب عالم کے نام بیعانہ کرکے فروخت کرنا درست ہوگا۔ اور روشن اختر پر اس بیع کو ختم کرنا لازم اور ضروری

نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ بیع مکمل ہوگئی ہے، جو فریقین کی رضا مندی کے بغیر ختم نہیں کی جاسکتی، اور پہلے معاہدہ کی وجہ سے وہ صرف گنہگار ہوگی۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: آية المنافق ثلاث: إذا حدث كذب، وإذا وعد أخلف، وإذا اؤتمن خان. (ترمذي شريف، أبواب الإيمان، باب ماجاء في علامة المنافق، النسخة الهندية ۲/ ۹۱، دارالسلام، رقم: ۲٦۳۱، صحيح البخاري، كتاب الإيمان، باب علامة المنافق ۱/ ۱۰، رقم: ۳۳)

وإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع، ولا خيار لواحد منهما. (هداية، كتاب البيوع، أشرفي ديوبند ۳/ ۲۰، تاتارخانية، زكريا ۸/ ۲۲۲، رقم: ۱۱۷۱٤، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ۱/ ۲۲٦، دارالكتاب ديوبند ۱/ ۲۲۰، ملتقى الأبحر، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۱۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ رجب ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۱۲۲/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸/۷/۱۴۲۴ھ

بائع کا بیعانہ کی رقم جمع کرنا اور مشتری کا ڈبل رقم لینا

سوال [۸٦٦٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کو کسی آدمی نے زمین خریدنے کی غرض سے دو لاکھ روپئے ایڈوانس بیعانہ کے طور پر دیا۔ اور روپئے دیتے وقت یہ عہد ہوا جو کاغذ پر لکھا گیا کہ اگر میں فلاں تاریخ تک آپ سے زمین نہیں لیتا ہوں، تو میرے یہ دو لاکھ روپئے آپ نہیں دیں گے، اور نہ ہی میں اس کا حق دار ہوں گا، اور اگر آپ مجھے فلاں تاریخ تک زمین نہیں لکھتے ہیں تو میں آپ سے دو لاکھ روپئے کا چار لاکھ روپئے لوں گا۔ اور وہ تاریخ نکل گئی جس تاریخ کا معاہدہ ہوا تھا، دوسری بات یہ ہے کہ مشتری نے بائع کو کورٹ تک دوڑایا، کورٹ سے اس کے پاس نوٹس آیا تو وہ کورٹ میں حاضر ہوا؛ لیکن جب بات چلی تو وکیل نے بھی کہا کہ جب کاغذ بن گیا ہے، تو اس کا مشتری

حقدار نہیں ہے، اس کے بعد پھر بھی وہ زمین لینے کے لئے پہلی والی رقم دو لاکھ کے ساتھ تیار ہے اس صورت میں بائع کیا کرے؟ اب اس زمین کو دوسرا بھی لینے کے لئے تیار ہے جو کہ اس سے زیادہ رقم دے رہا ہے، اب بائع اس صورت میں کیا کرے کہ پہلے مشتری کو جو دو لاکھ ایڈوانس دیا تھا اس کو دے یہ دو لاکھ روپئے کو جوڑ کر یا اس کے علاوہ پھر دوبارہ اس سے پوری رقم لی جاوے، یا زمین کسی اور کے معرفت بیچ دے؟

المستفتی: محمد سعود شہزادہ باغ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جائیداد کی خریداری کے لئے معاہدہ نامہ اور اقرار نامہ لکھتے وقت مشتری کی جانب سے جو پیشگی روپئے دئے جاتے ہیں اس کا دینا جائز ہے، کیونکہ یہ رجسٹری کے وقت محسوب ہو جاتا ہے؛ لیکن اگر کسی وجہ سے مشتری وقت مقررہ پر خرید نہ سکے، تو بیعانہ کی رقم بائع ضبط کرلے اور بائع اس کو حلال سمجھ کر استعمال کرنے لگے، اسی طرح وقت مقررہ پر رجسٹری کرانے سے بائع گریز کرنے لگے یا بیچنے سے انکار کر دے تو جتنی رقم بائع کے یہاں جمع ہوئی ہے اس کی دوگنی رقم مشتری کو دینی پڑ جائے تو جانبین کی یہ دونوں شرطیں شرعی طور پر ناجائز ہیں؛ بلکہ مشتری نے جتنی رقم جمع کی ہے ہر حال میں خریداری نہ ہونے یا بائع کے نہ بیچنے کی صورت میں اتنی ہی رقم مشتری کو واپس کر دینا واجب ہوتا ہے، نہ فروخت کرنے والے کے لئے اس رقم کا ضبط کرنا جائز ہے اور نہ ہی مشتری کے لئے اور نہ بیچنے کی صورت میں ڈبل رقم وصول کرنا جائز ہوگا۔ (مستفاد: ایضاح النوادر/ ۷۷)

أن النبي صلی اللّٰہ علیه وسلم نهی عن بیع العربان، قال أبو عبداللّٰہ: العربان: أن یشتري الرجل دابة بمائة دینار، فیعطیه دینارین عربونا، فیقول: إن لم أشتر الدابة فالدیناران لک. الحدیث (ابن ماجة شریف، أبواب التجارات، باب بیع العربان، النسخة الهندیة ۱/ ۱۵۸، دارالسلام، رقم: ۲۱۹۳، سنن أبي داؤد، کتاب البیوع، باب في العربان، النسخة الهندیة ۲/ ۴۹۴، دارالسلام، رقم: ۳۵۰۲)

ویرد العربان إذا ترک العقد علی کل حال بالاتفاق. (بذل المجهود یحیی سهارنپور ٤/ ٢٨٧، دارالبشائر الإسلامیه بیروت ١١/ ٢٢١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۶۴۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۶/۲۴ھ

معاملہ ختم ہونے کی صورت میں بیعانہ کی رقم کا حکم

سوال [۸۶۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زاہد نے ایک زمین فروخت کی، مثلاً پچاس ہزار روپئے میں معاملہ کرتے وقت مشتری نے دس ہزار روپئے دئے اور کہا کہ مابقیہ رقم رجسٹری کے وقت ادا کردوں گا یا بعد میں، جب آپ کہیں، مگر چندہ ماہ بعد مشتری نے زمین خریدنے سے انکار کردیا کہ زمین نہیں لوں گا، دس ہزار روپئے جو معاملہ کرتے وقت دئے تھے، وہ واپس کردو، زاہد نے کہا زمین نہیں لوگے تو روپئے واپس نہیں ہوں گے؛ اس لئے کہ ہم دونوں کے عرف میں معاملہ کے وقت کی ادا شدہ رقم معاملہ کے فسخ کی صورت میں واپس نہیں ہوتی؛ اس لئے اب روپئے نہیں ملیں گے، صورت مذکورہ کا شرعاً کیا حکم ہے؟ عرف عام کا رواج جو مشتری اور بائع کے علاقہ میں ہے، جس کا اوپر بھی تذکرہ کردیا ہے، اس کی شرع میں کچھ حیثیت ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عرف عام کی وجہ سے تخصیص نص تو جائز ہے، مگر ترک نص جائز نہیں ہے۔ اور بیعانہ واپس نہ کرنے کی صورت میں ترک نص لازم آرہا ہے؛ اس لئے ایسا عرف جائز نہیں ہے۔ اور بیعانہ دس ہزار روپئے واپس کرنا لازم ہوگا۔ نص حدیث میں واپسی کی صراحت ہے:

أن النبي ﷺ نهی عن بیع العربان، قال أبو عبداللّٰه: العربان: أن

يشتري الرجل دابة بمائة دينار، فيعطيه دينارين عربونا، فيقول: إن لم أشتر الدابة فالديناران لك. الحديث (ابن ماجة شريف، أبواب التجارات، باب بيع العربان، النسخة الهندية ۱/ ۱۵۸، دارالسلام، رقم: ۲۱۹۳، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في العربان، النسخة الهندية ۲/ ۴۹۴، دارالسلام، رقم: ۳۵۰۲، حجة الله البالغة ۲/ ۱۰۸)

ويرد العربان إذا ترك العقد على كل حال بالاتفاق. (بذل المجهود يحيى سهارنپور ۴/ ۲۸۷، دارالبشائر الإسلاميه بيروت ۱۱/ ۲۲۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ ربیع الاول ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۶۵۸)

بیعانہ کی ڈبل رقم واپس کرنا

سوال [۸۶۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص اپنا مکان یا زمین فروخت کرنا چاہتا ہے، اوراس نے اس کے متعلق دوسرے شخص سے بات چیت کی اور بیعانہ بھی لے لیا، پھراس کے بعد اس کو بیچنے کا ارادہ ترک کردیا، تو کیا وہ شخص بیعانہ ڈبل واپس کرسکتا ہے، جب کہ اس میں ربو کی بو محسوس ہوتی ہے؟

المستفتی: محمد فاروق، راجونگر، منڈولی، دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب ایجاب وقبول ہوگیا اور ساتھ میں بیعانہ کے طور پر پیشگی کچھ رقم بھی دے دی گئی ہے، تو بیچنے والے کے لئے بعد میں سابقہ معاہدہ کے مطابق زمین مشتری کے حوالے کرنے سے مکر جانا ناجائز اور سخت وعدہ خلافی ہے، حدیث میں ایسی وعدہ خلافی اور دھوکہ دھڑی کی سخت وعید آئی ہے، تاہم اگر معاملہ فسخ کرے، تو بیعانہ جتنا دیا گیا ہے، اتنا ہی واپس ہوگا اس کا دوگنا دینا اور لینا سود اور ناجائز ہے۔

آية المنافق ثلاث: إذا حدث كذب، وإذا وعد أخلف، وإذا أؤتمن

خان. (ترمذي شريف، أبواب الإيمان، باب ماجاء في علامة المنافق، النسخة الهندية ۲/ ۹۱، دارالسلام، رقم: ۲٦۳۱)

عن أبي هريرة -رضي الله عنه- أن رسول الله ﷺ قال: -إلى قوله- من غشنا فليس منا. (مسلم شريف، كتاب الإيمان، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: من غشنا فليس منا، النسخة الهندية ۱/ ۷۰، بيت الأفكار، رقم: ۱۰۱)

عن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جده أنه قال: نهى رسول الله ﷺ عن بيع العربان، قال مالک: وذلک فيما نرى -والله أعلم- أن يشتري الرجل العبد، أو يتكارى الدابة، ثم يقول: أعطيک دينارا على أني إن تركت السلعة، أو الكراء فما أعطيتک لک. (سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في العربان، النسخة الهندية ۲/ ٤۹٤، دارالسلام، رقم: ۳۵۰۲)

قلت: ويرد العربان إذا ترک العقد على كل حال بالإتفاق. (بذل المجهود، قديم دارالبشائر الإسلاميه ۱۱/ ۲۲۱)

لأن الربوا عرفه الحنفية بأنه فضل خال عن عوض بمعيار شرعي مشروط لأحد المتعاقدين فى المعاوضة. (الموسوعة الفقهية ۲۲/ ۵۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹۵۱/۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۴/۱۶ھ

خریداری میں دی گئی رقم کی واپسی میں دوگنی رقم لینا

سوال [۸٦٦۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: خالد نے حامد سے ایک زمین خریدی، جس کی دوتہائی رقم ادا کردی گئی، جب کہ ایک تہائی

رقم کا زمین کی رجسٹری کے موقع پر ادا کرنا طے ہوا؛ لیکن حامد نے دھوکہ سے ایسی زمین فروخت کی جس کے وہ خود مالک نہ تھے، دس ماہ تک رجسٹریشن کے لئے ٹال مٹول کرتے رہے، تحقیق پر پتہ چلا کہ وہ خود اس زمین کے مالک نہیں ہیں؛ لہٰذا حامد سے ہر روز مطالبہ کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ میں دوسری زمین دیتا ہوں، دو چار زمینیں اور دکھلائیں؛ لیکن وہ بھی متنازع فیہ تھیں، خالد نے لینے سے انکار کیا، اس طرح دو تین ماہ اور گذر گئے، اس وقت تک اس زمین کی قیمت جس کو خالد نے خریدا تھا، کئی گنا بڑھ چکی تھی، اب خالد نے حامد سے کہا کہ جو زمین آپ نے ہمیں بیچی ہے وہ خود آپ خرید لیں اور آج کی بازار کی قیمت سے کچھ کم ادا کردیں، مختلف مجالس میں طویل بحث کے بعد یہ طے پایا کہ خالد اصل رقم بیس لاکھ روپئے جو ادا کر چکا تھا پر مزید بیس لاکھ روپئے ملا کر دے دیں گے۔ (یعنی جملہ چالیس لاکھ روپئے) یہ فیصلہ ہو گیا، اس فیصلے کے بعد رقم وصول کرنے میں بڑی دشواری پیش آئی، بہر حال تین سال کے عرصہ میں مختلف قسطوں میں انیس لاکھ پچاس ہزار روپئے خالد نے وصول کئے، اصل رقم میں ابھی پچاس ہزار روپے وصول ہونا باقی ہے؛ لیکن حامد نے اپنی زمین خالد سے چالیس لاکھ روپے میں خریداری کی (یعنی بیس لاکھ زائد رقم اصل بیس لاکھ پر دینے کا وعدہ کیا) وہ رقم اب دینے سے یہ کہہ کر انکار کر رہے ہیں کہ یہ رقم تمہارے لئے جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ تمہاری رقم صرف بیس لاکھ روپے ہے، اس پر جو بھی رقم زائد خالد لے گا وہ سود ہوگا، اس لئے میں خالد ان مذکورہ تفصیلات کی روشنی میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ از روئے شرع یہ زائد رقم میرے لئے جائز ہے یا ناجائز ہے؟

المستفتی: امداد اللہ راجہ پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زمین کی خریداری میں دی گئی رقم کے ساتھ جو شرط لگائی گئی کہ رقم کی واپسی کے ساتھ دوگنے واپس ہوں گے، یہ ناجائز شرط ہے؛ لہٰذا اصل رقم جو بیس لاکھ ہے، اس کے اوپر جو کچھ بھی زائد واپس ہوگا وہ سود ہے، لینے والے کے حق میں وہ پیسہ

حرام ہے؛ لہٰذا خالد کو صرف بیس لاکھ واپس ملے گا اور بیس لاکھ پر زائد حاصل کرنا سود اور حرام ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ا/ ٧٨)

أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن بيع العربان، قال أبو عبدالله: العربان: أن يشتري الرجل دابة بمائة دينار، فيعطيه دينارين عربونا، فيقول: إن لم أشتر الدابة فالديناران لک. الحديث (ابن ماجة شريف، أبواب التجارات، باب بيع العربان، النسخة الهندية ١/ ١٥٨، دارالسلام، رقم: ٢١٩٣، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في العربان، النسخة الهندية ٢/ ٤٩٤، دارالسلام، رقم: ٣٥٠٢)

قلت: ويرد العربان على كل حال بالإتفاق. (بذل المجهود، قديم دارالبشائر الإسلاميه ١١/ ٢٢١)

لأن الربوا عرفه الحنفية بأنه فضل خال عن عوض بمعيار شرعي مشروط لأحد المتعاقدين فى المعاوضة. (الموسوعة الفقهية ٢٢/ ٥٠) **فقط** واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢ رشعبان ١٤٢٩ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٩٦٩٠/٨)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
٢/٨/١٤٢٩ھ

۴/ باب البیع الفاسد، والباطل، والمکروه

شرطِ فاسد کے ساتھ خرید وفروخت کی شرعی حیثیت

سوال [۸۶۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک چیز کی قیمت بازاری بھاؤ کے اعتبار سے ۲۹۰/روپئے ہے، اس وقت زید نے وہ چیز ۳۰۰/روپیہ کے اعتبار سے خریدی اس شرط پر کہ آئندہ فروخت کرنے پر اس میں جو نفع ہوگا وہ میرا اور جو نقصان ہوگا وہ بائع کا۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ اس طرح کی بیع وشراء جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: ذبیح الرحمٰن چاند پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں ذکر کردہ شرط شرعاً شرطِ فاسد ہے؛ اس لئے ایسا معاملہ شرعاً جواز کے دائرہ میں داخل نہیں ہوتا؛ لہٰذا مسلمانوں کا اس طرح معاملہ کرنا جائز نہیں ہے۔

كل شرط لا يقتضيه العقد، وفيه منفعة لأحد العاقدين أو للمعقود عليه وهو من أهل الاستحقاق يفسده. الخ (هداية، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، أشرفي ۳/ ۵۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/رمضان ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۴۳۶)

شروط فاسدہ کے ساتھ بیع کا معاملہ

سوال [۸۶۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے بکر سے ایک قطعہ زمین اس شرط ووعدہ کر کے خریدی کہ میں اس زمین میں اینٹ

کا بھٹہ لگاؤں گا، اس میں تمہاری آدھی شرکت رہے گی۔ اور اس زمین میں دیگر ترقیاتی کام کروں گا جس سے تمہاری بھی ترقی وفائدہ ہوگا، نیز اگر اس زمین کو نفع سے بیچوں گا تو اصل قیمت خرید سے جتنی زیادہ کی بکے گی اس اضافہ اور نفع میں ہماری تمہاری نصف نصف شرکت رہے گی، ان شرائط اور وعدے اور امیدیں دلاکر زید نے بکر سے زمین نصف قیمت میں طے کرلی، یعنی اس وقت مثلاً چار ہزار روپیہ فی کس قیمت کی زمین دو ہزار روپیہ فی کس میں خرید لی، بکر نے اس امید وشرط پر کہ اگر میری زمین کچھ عرصہ بعد زیادہ قیمت میں بکے گی تو آدھا نفع ملے گا، یا تجارت وکاروبار ہوگا، تو اس نفع میں شرکت رہے گی، اس وقت آدھی قیمت میں اس زمین کا زید کے نام بیع نامہ کردیا؛ لیکن زید نے وعدوں کے مطابق اس زمین میں نہ بھٹہ لگایا اور نہ ہی کوئی ترقیاتی کام حسب وعدہ کیا اور نہ اس زمین کو بیچ کر نفع کی نصف رقم دینے کو تیار ہے؛ بلکہ قانونی پختگی وبیع نامہ کرانے کے بعد خود کو مستقل مالک کہتا ہے، نہ تجارت میں بکر کو شریک کرنا چاہتا ہے اور نہ قیمت کے اضافہ ونفع میں حسب وعدہ نصف منافع دینے کو تیار ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ جس شرط کے ساتھ بکر نے زید کو نصف قیمت پر زمین دی تھی، اس شرط ووعدہ کو پورا نہ کرنے کی شکل میں بکر اس زمین کی پوری قیمت زید سے وصول کرنے کا شرعاً حق دار ہے یا نہیں؟ اور کیا کسی طرح آدھی رقم وصول کرسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالرحمٰن خان قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: صورت مسئولہ میں زید کا بکر سے شرط کے ساتھ زمین کی بیع کا جو معاملہ ہوا وہ تمام شرائط باطل ہیں اور وہ شروط فاسدہ میں سے ہیں، ایسی شرائط کے ساتھ بیع جائز نہیں ہوتی؛ کیوں کہ خرید وفروخت میں ایسی شرط لگانا جو متعاقدین میں سے کسی ایک کے لئے نفع مند ہو شرط فاسد کہلاتی ہے؛ لہٰذا اس میں بائع کو یہ حق ہے کہ وہ بیع کو فسخ کرکے مذکورہ زمین کو مشتری سے واپس لے لے اور مشتری کے لئے بھی لازم ہے کہ بلا کسی چوں چرا کے اس زمین کو واپس کردے۔

عن سعيد بن زيد -رضي الله عنه- أن رسول الله ﷺ قال: من اقتطع

شبرا من الأرض ظلما طوقه الله إياه يوم القيامة من سبع أرضين. (مسلم شريف، باب تحريم الظلم وغصب الأرض وغيرها، النسخة الهندية ٢/ ٣٢، بيت الأفكار، رقم: ١٦١٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ ؍رجب ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۸۵۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳ ؍۷؍ ۱۴۲۱ھ

بیع میں شرطِ فاسد لگانے کا حکم

سوال [۸٦٧٢]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے خالد سے ایک زمین دس لاکھ روپئے میں خریدی، دو لاکھ روپئے زید نے خالد کو دے دیئے، باقی آٹھ لاکھ روپئے کے بارے میں خالد نے زید کو یہ سہولت دی کہ آپ یہ آٹھ لاکھ روپئے ۲۰۱۵ء تک یعنی پانچ سال کے اندر اندر ادا کردینا، چاہے تھوڑا تھوڑا کر کے چاہے یکبارگی دونوں بخوشی اس بیع اور معاملہ پر رضامند ہوگئے، پھر خالد جو بائع ہے، یوں کہتا ہے کہ اگر آپ نے یعنی زید نے اگر پانچ سال کے اندر اندر یہ آٹھ لاکھ کی رقم ادا نہیں کی اور زید پھر منع کرنے لگے کہ میں زمین نہیں لیتا مجھ سے آٹھ لاکھ کی رقم ادا نہیں ہو پارہی ہے، تو خالد کہتا ہے کہ میں پانچ سال کے بعد زمین کی جو قیمت ہوگی وہ قیمت لگاؤں گا؛ کیوں کہ پانچ سال تک میری زمین آپ کو بیچنے کی وجہ سے بیکار پڑی رہی اور اس قیمت کو میں آپ کی دی ہوئی دو لاکھ کی رقم سے وضع کرلوں گا، خالد کی اس بات پر زید رضامند ہوگیا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا خرید وفروخت کی یہ شکل درست ہے، خالد کا یہ شرط لگانا اور زید کا اس پر رضامند ہوجانا درست ہے؟ شرعاً جو فیصلہ ہو تحریر فرمائیں۔

المستفتی: جلال الدین کملائی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سوال میں خرید وفروخت سے متعلق جو معاملہ لکھا گیا ہے وہ جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ اس معاملہ کو اس بات پر معلق کیا گیا ہے کہ پانچ سال میں اگر

زید بقیہ آٹھ لاکھ روپیہ ادا نہ کر سکے تو زمین کی طے شدہ قیمت (دس لاکھ روپیہ) باقی نہیں رہے گی؛ بلکہ پانچ سال کے بعد مذکورہ زمین کی جو قیمت ہوگی وہی قیمت ادا کرنی ہوگی اور وہ قیمت مجہول ہے؛ لہٰذا یہ معاملہ بیع فاسد اور واجب الاسترداد ہے اور جو دو لاکھ روپیہ ادا کیا گیا ہے اس کو پورا کا پورا واپس کرنا لازم ہوگا۔ اور پانچ سال کے بعد اگر طرفین آپسی رضامندی سے نئے سرے سے دوسرا معاملہ کرتے ہیں، تو اس کی اجازت ہے۔

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده أن النبي ﷺ نهى عن بيع وشرط. الخ (مجمع الزوائد، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٨٥، نصب الرأية ٤/ ٤٣، المعجم الأوسط، دارالفكر ٣/ ٢١١، رقم: ٤٣٦١)

والأثمان المطلقة لا تصح إلا أن تكون معروفة القدر والصفة ...... هذه الجهالة تفضي إلى المنازعة، وكل جهالة هذه صفتها تمنع الجواز هذا هو الأصل. (هداية، كتاب البيوع، اشرفي ٣/ ٢٠-٢١)

عن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: -إلى- والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ١٧/ ٢٢، رقم: ٣٠)

عن أبي حميد الساعدي، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا يحل لامرئ أن يأخذ مال أخيه بغير حقه، وذلك لما حرم الله مال المسلم على المسلم. (مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٤٢٥، رقم: ٢٤٠٠٣، مجمع الزوائد، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٧١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ ذی قعدہ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۲۲۰/۳۹)

بیع واجارہ بیک وقت شئ واحد میں کرنے کا حکم

سوال [۸۶۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سمرن نامی ایک کمپنی ہے جو فارم والے کو مرغی کا بچہ دیتی ہے، بچہ کا بھاؤ بیس روپیہ پچاس پیسہ طے کرتی ہے، چاہے بازار میں اس سے کم بھاؤ ہو یا زیادہ ہو اور ساتھ میں اس بچہ کے متعلق دوائی کا خرچ اور دانہ وغیرہ تمام خرچ کمپنی کے ذمہ ہوتا ہے۔ اور فارم والے کا فارم پانی لائٹ اور محنت ہوتی ہے، کمپنی کی طرف سے فارم والے کو اس کی محنت کی اجرت دے دی جاتی ہے، مگر اس کے لئے چند شرائط ہوتی ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) مرغی کے ایک کلو وزن کے ساتھ دانہ ایک کیلو ۸۵/ گرام استعمال ہونا چاہئے اور لوگوں کا تجربہ یہ ہے کہ اتنی مقدار دانے میں مرغی کا وزن ایک کیلو ہو جاتا ہے، دانہ کی مقدار طے کر دینے کی وجہ یہ ہے کہ اگر چھوٹ دے دی جائے تو بعض فارم والے دانہ کی چوری کر کے بازار میں بیچ دیتے ہیں۔

(۲) اگر مرغی کا ایک کلو وزن ۴۸/ روپیہ ۲۵/ پیسے تک ہوا تو فارم والے کو ہر کیلو پر ۳/ روپیہ ۸۰/ پیسہ اجرت ملے گی۔ اور اگر اس سے کم خرچ میں تیار ہوا تو ہر ایک روپیہ کم خرچ ہونے پر مزید ۳۰/ پیسہ اجرت ملے گی۔ اور اگر ۴۸/ روپیہ ۲۵/ پیسہ سے زیادہ خرچ لگ گیا تو ہر ایک روپیہ زائد ہونے پر ۳۰/ پیسہ کم ہو جائے گا۔

(۳) پھر اگر کمپنی کو مارکیٹ میں ایک کیلو کا بھاؤ ۵۵/ روپیہ سے زائد ملا تو ہر ایک کلو پر کمپنی مزید ۱۰/ پیسہ انعام دے گی۔

(۴) مال اٹھاتے وقت جس قدر مرغیاں ہوں گی، فقط ان ہی کی اجرت ملے گی، اگر کسی وجہ سے کچھ مرغیاں مرگئی تو مری ہوئی مرغیوں کی اجرت نہیں ملے گی، چاہے مال اٹھانے کے ایک گھنٹہ قبل ہی مری ہوں۔

سوال یہ ہے کہ مذکورہ بالا طریقہ پر کمپنی کے ساتھ معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر جائز نہیں ہے تو جواز کی کیا شکل ہے؟

المستفتی: مولانا مجاہد ڈینڈ رولوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ پر بار بار غور کیا گیا اور بعض مرغی فارم چلانے والوں سے براہ راست تبادلہ خیال کیا گیا، تو معلوم ہوا کہ اس طرح کا معاملہ مرغی فارم چلانے والے کو بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ اور بیس روپیہ پچاس پیسے ہر بچہ کی قیمت شمار کی گئی اور ایک مہینہ یا پینتیس دن تک ان کی دیکھ ریکھ پرورش کرنے کے لئے تین روپیہ تیس پیسہ فی بچہ اجرت طے کی گئی، تو سب سے تضادیوں پیش آیا کہ شروع میں بیع کی بات سمجھ میں آرہی ہے اور آخر میں اجارہ کی بات سمجھ میں آتی ہے۔ اور بیع واجارہ بیک وقت شئ واحد میں جائز نہیں ہے۔ اور اس میں کچھ شرائط مجہول اور متردد فیہ لگائی گئی ہیں:

(۱) اگر مرغی کا ایک کیلو وزن ۴۸/ روپیہ ۲۰/ پیسہ تک ہوا تو فارم والے کو ہر کیلو پر ۳/ روپیہ ۸۰/ پیسے اجرت ملے گی۔ اور اگر اس سے کم خرچ میں تیار ہوا تو کم خرچ ہونے پر ۳۰/ پیسہ مزید اجرت ملے گی۔ اور اگر ۴۸/ روپیہ ۲۵/ پیسہ سے زائد خرچ لگ گیا تو ہر روپیہ زائد ہونے پر ۳۰/ پیسہ کم ہو جائیں گے۔ اور پھر کمپنی کو مارکیٹ میں ایک کیلو کا بھاؤ ۵۵/ روپیہ سے زائد ملا تو کمپنی فی کیلو پر دس پیسہ انعام دے گی، یہ سب امر متردد فیہ ہیں، جن کی وجہ سے یہ معاملہ شرعاً جائز نہیں ہے۔

عن عبداللّٰہ بن مسعود –رضی اللّٰہ عنہ– قال: نہی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن صفقتین في صفقة. (مسند أحمد بن حنبل ۱/ ۳۹۸، رقم: ۳۷۸۲، مسند البزار، مکتبة العلوم والحکم ۵/ ۳۸٤، رقم: ۲۰۱۷)

ومنها: أن یکون المبیع معلوما، والثمن معلوما علما یمنع من المنازعة، فالمجهول جهالة مفضیة إلیها غیر صحیح. (البحر الرائق،

كتـاب البيـوع، كـوئٹه ٥/ ٢٦٠، زكريا ٥/ ٤٣٦، هندية، زكريا قديم ٣/ ٣، جديد ٣/ ٦، شـامـي، زكـريـا ٧/ ١٥، كـراچـی ٤/ ٥٠٥، الـمـوسـوعة الفقهية الكويتية ١٣/ ٤٣)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۶۸۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۵/۷ھ

معدوم کی بیع کا حکم

سوال [۸۶۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج کل ایک کمپنی ایم سی ایکس کے نام سے زور شور سے چل رہی ہے، اس کا پورا نام ''میلٹی کموڈیٹی ایکسچینج'' ہے اس کا ہیڈ کواٹر بمبئی میں ہے اور اس کی آفسیں پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور ان تمام برانچ آفسوں میں کمپنی کے افراد متعین ہیں اور ہر آفس میں کمپیوٹر بھی لگا ہوا ہے، اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ ملکی اور بین الاقوامی مارکیٹوں میں اشیاء کا بھاؤ کیا ہے وہ اپنے کمپیوٹر میں انٹرنیٹ کے ذریعہ سے درج کروالیتا ہے، مثلاً سونا، چاندی، تابنا، پیتل، گیہوں، چاول، پیپل منٹ کا تیل وغیرہ مختلف اشیاء کا ملکی اور بین الاقوامی بھاؤ معلوم کر کے کمپیوٹر اسکرین پر درج کردیا جاتا ہے۔ اور کمپنی کے پاس ان اشیاء میں سے کوئی چیز نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی یہ کمپنی کسی چیز کی مالک ہوتی ہے، بس اس کا کام صرف اتنا ہے کہ دنیا بھر کی چیزوں کا بھاؤ اپنی اسکرین پر درج کردے۔ اور دوسرا کام یہ ہوتا ہے کہ اپنے ورکروں کے ذریعہ سے اور اپنی برانچ آفسوں کے ذریعہ سے عام لوگوں کو اس کمپنی میں شرکت کی دعوت دیتی ہے۔ اور اس کی شرکت کی شکل یہ ہے کہ کم سے کم پندرہ ہزار روپئے پہلی بار آفس میں جمع کریں اور یہ طے کر کے جمع کریں کہ کمپیوٹر اسکرین میں مختلف اشیاء کا جو بھاؤ آرہا ہے پندرہ ہزار روپئے میں ان میں سے کوئی چیز زبانی خریدلیں کہ جو پندرہ ہزار روپئے ہم نے

آپ کو دیا ہے، اس کی ہم مثلاً چاندی خرید لیتے ہیں، مثلاً اس وقت ڈیڑھ کلو چاندی پندرہ ہزار روپئے میں مل سکتی ہے اور اسکرین میں چاندی کا بھاؤ آیا ہے کہ دس ہزار روپئے کلو ہے، تو ہم وہیں بیٹھے بیٹھے آفس میں جس آدمی کو پندرہ ہزار روپے دیتے ہیں اس سے ہم یہ کہہ دیں کہ ہم نے آپ سے ڈیڑھ کلو چاندی خریدلی اور وہ اسکرین اسی طرح گھومتی رہے گی، حالاں کہ اس کے پاس چاندی نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ملکیت میں ہے، اور مثلاً شام کو چاندی گیارہ ہزار روپئے بن گئی ہے تو ہمارے ڈیڑھ کلو کی قیمت ساڑھے سولہ ہزار بن گئی ہے، ہم اسی وقت آفس کے ذمہ دار سے یہ کہہ کر کے ساڑھے سولہ ہزار روپئے لے سکتے ہیں کہ ہم نے آپ کے ہاتھ چاندی بیچ دی ہے، ہمیں ساڑھے سولہ ہزار روپئے دے دو، اسی طرح اگر چاندی کا بھاؤ گھٹ گیا ہے، تو وہ ہمیں اتنا گھٹا کر دے گا جتنا بھاؤ گھٹ گیا ہے، یہی اس اسکیم اور کمپنی کا خلاصہ ہے، حالاں کہ کمپنی کے پاس نہ تو چاندی موجود ہے اور نہ ہی کمپنی اس کی مالک ہے، بس صرف بین الاقوامی یا ملکی قیمت اس کی اسکرین پر آتی رہتی ہے، تو کیا شریعت میں اس طرح کی تجارت اور لین دین جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد قربان، خادم مدرسہ فیض العلوم، تھانہ ٹبّن رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب یہ کمپنی کسی چیز کی مالک نہیں ہے اور نہ ہی کوئی چیز اس کے پاس موجود ہے اور نہ کمپنی کا ارادہ خریدکران اشیاء کو اپنی ملکیت میں لانے کا ہے اور نہ ہی کمپنی حقیقی مالک اور خریدار کے درمیان مذکورہ اشیاء کے فروخت کروانے اور خریدوانے کا حقیقی معنی میں واسطہ ہے؛ بلکہ یہ ایسا ہے جیسے ہاتھی کے دانت ہیں دکھانے کے اور ہیں کھانے کے لئے دوسرے ہیں، اس لئے ایسا معاملہ شریعت میں شروع سے آخر تک جائز نہیں ہے۔

عن حكيم بن حزام –رضي الله عنه– قال: نهاني رسول الله ﷺ أن أبيع ماليس عندي. (سنن الترمذي، البيوع، باب ماجاء في كراهية بيع ما ليس عندك، النسخة الهندية ۱/ ۲۳۳، دارالسلام، رقم: ۱۲۳۳)

وبيع ما ليس في ملكه لبطلان بيع المعدوم وماله خطر العدم (درمختار) وفي الشامية: قوله: لبطلان بيع المعدوم: إذ من شرط المعقود عليه أن يكون موجودا مالا متقوما مملوكا في نفسه، وأن يكون ملك البائع فيما يبيعه لنفسه، وأن يكون مقدور التسليم. (شامي، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب الآدمي مكرم شرعا ولو كافرا، زكريا ٧/ ٢٤٦، كراچی ٥/ ٥٨-٥٩، البحرالرائق، زكريا ٥/ ٤٣٥، كوئٹه ٥/ ٢٦٠، بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٣٣٩، كراچی ٥/ ٤٦، الموسوعة الفقهية الكويتية ٩/ ١٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹ر محرم الحرام ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۱۵۲/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۱/۱۴۲۸ھ

”بیع منابذہ“

سوال [۸۶۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک کام یہاں ہوتا ہے کہ کئی آدمی مل کر ایک جگہ روپیہ جمع کراتے ہیں، پھر وہ انعام کے طور پر قرعہ اندازی کرتے ہیں اور اس میں کسی کے نام کولر، کسی کے نام ریڈیو، کسی کے ٹیلی ویزن، کسی کے اسکوٹر، کسی کے کپڑا دھونے کی مشین نکلتی ہے، کئی چھوٹے بڑے انعام اوروں کے بھی نکلتے ہیں، ایسی صورت میں یہ سب کام جائز ہے یا ناجائز؟

المستفتی: حاجی ماسٹر علی محمد جھن جھنوں، راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ معاملہ اور اسکیم بیع منابذہ اور بیع القاء الحجر ہونے کی وجہ سے ناجائز اور باطل ہے، جس کو شریعت نے قطعی طور پر حرام قرار دیا ہے۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– أن رسول الله صلى الله عليه وسلم

نهى عن الملامسة والمنابذة. (صحيح مسلم، البيوع، باب إبطال بيع الملامسة والمنابذة، النسخة الهندية ۲/ ۱، بيت الأفكار، رقم: ۱۵۱۱)

ولا يجوز البيع بإلقاء الحجر، والملامسة، والمنابذة. (هداية، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، أشرفي ۳/ ۳٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ رجب المرجب ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳٦/ ۷۳۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/ ۷/ ۱۴۲۲ھ

کمیٹی کا خریدار سے متعینہ رقم سے زیادہ کا مطالبہ کرنا

سوال [۸٦۷٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے شہر کھر گون میں عامۃ المسلمین کی ایک منتخب کمیٹی (جماعت اصلاح المسلمین) ہے، جو قومی وملی خدمات انجام دیتی ہے، مذکورہ جماعت شہر میں مکاتب بھی چلاتی ہے، قوم وملت کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے اصلاحات کرنا اور وقت اور موقع کی نزاکت کے اعتبار سے قوم وملت کی صحیح رہنمائی کرنا وغیرہ اس جماعت کے اہم مقاصد ہیں۔

جماعت کو اپنے دینی، قومی وملی پروگرام منعقد کرنے کے لئے ایک جماعت خانہ (بڑے ہال) کی اشد ضرورت تھی، اس اہم ضرورت کی تکمیل کے لئے جماعت نے باتفاق رائے یہ طے کیا کہ جماعت کے پاس جو کھیت ہے اس میں پلاٹ کاٹ دئے جائیں اور آسان قسطوں پر عام غریب مسلمانوں کو فروخت کر دیئے جائیں اور اس سے حاصل ہونے والی رقم سے جماعت خانہ تعمیر کیا جائے، تاکہ بے گھر غریب مسلمانوں کو گھر مل جائیں اور جماعت خانہ کی تعمیر بھی انجام پذیر ہو سکے گی۔

آج سے تقریباً ۱۸؍ سال قبل جماعت نے اپنے کھیت میں ۲۳۷؍ پلاٹ کاٹے تھے مختلف قسم کے مختلف سائز کے پلاٹ کاٹے اور مسلمانوں کو فروخت کر دئے، مثلاً 18,000/-

-/6,000 -/8,000 -/10,000 آسان قسطوں پر فروخت کئے شروع میں قسطیں جمع کرواتے رہیں، مگر جماعت کی باڈی ہر تین سال میں بدلنے چینج ہونے کی وجہ سے قسطوں کا جمع کرنے اور کروانے کا سلسلہ ختم ہوگیا، نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ہی لوگوں کی قسطیں پوری جمع ہوسکیں اور اکثر قسطیں باقی رہ گئیں، کسی کی کم تو کسی کی زیادہ۔

پلاٹ کے خریداروں نے کئی مرتبہ جماعت کے صدر، سکریٹری سے درخواست کی کہ ہماری قسطیں جمع کرلی جائیں اور پلاٹ کی رجسٹری کروادی جائے؛ لیکن کسی بھی صدر نے اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا، تا دم تحریر صرف ۱۴-۱۵/ پلاٹوں کی رجسٹری ہی ہوسکی ہے۔

ماضی کی طرح موجودہ باڈی سے بھی پلاٹ کے خریداروں نے درخواست کی کہ قسطیں جمع کرکے رجسٹری کروادی جائے اور ہمارے پلاٹوں پر ہمیں قبضہ دیا جائے، الحمد للہ موجودہ باڈی نے ہماری درخواست کو قبول کرتے ہوئے ایک میٹنگ بلائی، مگر استغفر اللہ جماعت نے ایک بے جا اور بے تکا فیصلہ لے کر پلاٹ کے خریداروں کو بہت ہی مایوس کیا ہے۔

زیادہ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے عرض ہے کہ جماعت نے یہ فیصلہ لیا ہے کہ چونکہ پلاٹوں اور زمین کی قیمت آسمان چھو رہی ہے؛ اس لئے فی الحال زمین کے جو بھاؤ اور ریٹ چل رہے ہیں اس اعتبار سے پلاٹ کی قیمت ادا کی جائے، جماعت کے اس فیصلہ کے مطابق مثلاً -/6,000 کے پلاٹ کی قیمت ایک لاکھ روپے -/8,000 والے کی قیمت ڈیڑھ لاکھ روپے -/10,000 اور -/18,000 والے کی ۲/ ڈھائی تین لاکھ روپے اب ادا کرنی ہوگی۔ عرض یہ ہے کہ پلاٹ کی قیمت کئی گنا اضافے کے ساتھ ادا کرنی ہوگی، جب ہی پلاٹ پر قبضہ ہوسکے گا، اور تعجب تو یہ ہے کہ جماعت اس اضافی رقم کو امداد اور تعاون کا لبادہ پہنا کر قوم کو لبھا رہی ہے اور قوم کو اپنی بات منوا کر اپنے فیصلہ کو برقرار رکھنے میں مصروف ہے۔ اور کہتی ہے کہ یہ اضافی رقم امداد ہے، جس سے قوم کے کام انجام دیئے جائیں گے۔

جماعت کے اس فیصلے سے عوام میں کافی بے چینی اور انتشار کی صورت حال پیدا ہوگئی ہے، دن بدن ٹکراؤ کے حالات بن رہے ہیں۔ غور طلب امر یہ ہے کہ:

(۱) ۱۸؍سال قبل جماعت نے جو پلاٹ فروخت کئے تھے، اس کی قیمت آج کئی گنا ہوگئی ہے، تو کیا جماعت کو شرعاً حق ہے کہ وہ موجودہ قیمت پر خریداروں سے رقم وصول کریں؟
(۲) جماعت اس اضافی رقم کو امداد کا نام دے رہی ہے، تو شرعی نقطہ نظر سے یہ امداد ہوگی اور امداد لینے کا یہ طریقہ کس زاویے سے درست ہے؟ جتنی جلدی ممکن ہو تسلی و تشفی بخش جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں عنایت فرما کر ممنون ومشکور فرمائیں، نوازش ہوگی۔

المستفتی: عبدالرشید انصاری کھرگون

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مسئولہ صورت میں اٹھارہ سال پہلے جو پلاٹ جس قیمت پر فروخت ہوئے تھے، کمیٹی کے لئے اس متعینہ رقم سے زیادہ وصول کرنا جائز نہیں ہے، ہاں البتہ اگر پوری رقم ادا کرنے کے لئے ایک مدت متعین ہوچکی تھی اوراس وقت پر ادائیگی نہیں کی گئی تو ایسی صورت میں کمیٹی کے لئے گذشتہ عقد کو ختم کر کے از سر نو کسی بھی رقم پر فروخت کرنا درست ہوگا۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۶/ ۵۰۶)

ولأنه لما تعذر استيفاء الثمن من المشتري فات رضا البائع، فيستبد بفسخه. (هداية آخرين، كتاب القضاء، باب التحكيم، أشرفي ٣/ ١٤٧، البحرالرائق، كوئٹه ٧/ ٣٦، زكريا ٧/ ٦١)

إذا تبايعا على أن يؤدى المشتري الثمن في وقت كذا وإن لم يؤده فلا بيع بينهما صح البيع –إلى قوله– إذا لم يؤد المشتري الثمن في المدة المتعينة كان البيع الذي فيه خيار النقد فاسدا، ولكل من العاقدين فسخه، إذا بقي المبيع على حاله. (شرح المجلة رستم، مكتبه اتحاد ١/ ١٦٦، رقم المادة: ٣١٣-٣١٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۱۰۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/۵/۱۴۳۴ھ

دوسرے کی زمین فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۶۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے ایک مکان تقریباً پندرہ وبیس سال پہلے اپنے ماموں سے خریدا تھا، جس میں ایک زینہ آمد ورفت کا ہے جو کہ میرے استعمال میں ہے، مگر اب آ کر مجھ پر واضح ہوا ہے کہ وہ زینہ پڑوسی کے آبچک میں بنا ہوا ہے، ان کے اور پڑوسی کے بیچ میں مقدمہ بازی بھی ہوئی تھی، جس کے تصفیہ میں یہ لکھا ہے کہ ان کو زینہ کا حق تصرف حاصل تھا، نہ کہ ملکیت آج وہ وہ جگہ میرے استعمال میں ہے، کیا ان کو وہ جگہ بیچنے کا حق تھا؟

(۲) اب جب کہ وہ مکان میری ملکیت ہے اور مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس جگہ کا صرف حق تصرف تھا، حق ملکیت نہیں تو وہ جگہ میرے لئے جائز ہے اگر نہیں تو کیا کرنا چاہئے؟

المستفتی: کرامت علی ۲۴/ پرگنہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جب وہ زمین پڑوسی کی ہے اور اس کا آپ کے ماموں کو استعمال کے لئے دینا آپ پر ایک احسان ہے، آپ کے ماموں کو فروخت کرنے کا حق نہیں ہے؛ اگر فروخت کر دیا ہے تو پڑوسی کو اپنا حق واپس لے لینے کا حق ہے۔

عن أبي حميد الساعدي، أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل لامرئ أن يأخذ مال أخيه بغير حقه، وذلك لما حرم الله مال المسلم على المسلم.

(مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٤٢٥، رقم: ٢٤٠٠٣)

عن أبي حرة الرقاشي، عن عمه، أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل مال رجل مسلم لأخيه، إلا ما أعطاه بطيب نفسه. (السنن الكبرى للبيهقي، باب أهل البغي إذا فاؤا، دار الفكر ١٢/ ٣٥٢، رقم: ١٧٢٢٤)

لا يجوز لأحد أن يتصرف في ملك الغير بغير إذنه. الخ. لا يجوز لأحد أن يأخذ مال أحد بلا سبب شرعي. الخ (قواعد الفقه، أشرفي، ص: ١١٠،

رقم: ۲۶۹-۲۷۰، شرح المجلة رستم، مکتبه اتحاد ۱/ ۶۱-۶۲، رقم المادة: ۹۶-۹۷)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ رجب ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۱۳/۳۵۱۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۳/۷/۱۴۱۴ھ

دوسرے کی دوکان اپنی بنا کر فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۶۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے والد احمد نبی خان ولد عبد الغنی خان نے ایک قطعہ دوکان اپنے انتقال کے بعد چھوڑی۔ اور زید کے والد مرحوم کے زید سمیت دولڑکے، دولڑکیاں، چار بچے تھے، جو اس دوکان کے شرعاً مالک ہوگئے تھے، اس کے بعد زید کے چچا نیاز احمد خان ولد عبد الغنی خاں نے زید سمیت چاروں بہن بھائی سے یہ کہہ کر کہ تم کو دوکان سے زیادہ آمدنی ہوجاوے گی، میں دوکان کو دوبارہ تعمیر کرا کر دے دوں اور جب تک میرا لگا ہوا تعمیر میں روپیہ وصول ہوگا دوکانوں کا کرایہ اس وقت تک میں وصول کرتا رہوں گا، جب تک میرا لگا ہوا پیسہ کل وصول ہوگا اس کے بعد کرایہ داروں سے کرایہ آپ لوگوں کو دلوا دوں گا، ہم چاروں نے ان کو اپنا چچا سمجھتے ہوئے اجازت دے دی، تعمیری کام شروع ہوگیا، اسی دوران ہم کو معلوم ہوا کہ چچا نے خود کو مالک بتا کر نقشہ بنوایا ہے، تب ہم نے ان سے معلوم کیا تب انہوں نے یہ کہا کہ میں تمہارا چچا ہوں، تم اگر چاہو تو میں تم کو اقرار نامہ کرا دوں؛ لہٰذا انہوں نے چاروں کے مالک رہنے کا اقرار نامہ لکھا دیا جو کہ زید کے پاس موجود ہے؛ لیکن چچا نے ان دوکانوں کو اپنی بیٹی رخسانہ کو بیچ دیا، جب کہ وہ مالک ہی نہیں تھے، اب چچا کا انتقال ہوگیا ہے، ایسی صورت میں کون مالک ہوا؟

المستفتی: راحت جان جامع مسجد روڈ مغل پورہ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر ایسا واقعہ ہے جیسا کہ سوال نامہ میں درج ہے، تو اس دوکان کا مالک نیاز احمد نہیں ہے اور نہ ہی اس کو فروخت کرنے کا حق ہے؛ بلکہ احمد نبی خان کی مذکورہ اولاد ہی مالک ہوں گی اور انہیں کو قبضہ دے دینا لازم ہوگا۔ اوران کے چچا نیاز احمد خان کا فروخت کرنا صحیح نہیں ہے؛ البتہ چچا نے جتنا خرچ کیا وہ لے سکتا ہے۔

عن أبي حرة الرقاشي، عن عمه، أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه. (شعب الإيمان للبيهقي، باب في قبض اليد عن الأموال المحرمة، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٣٨٧، رقم: ٥٤٩٢)

لا يجوز لأحد أن يأخذ مال أحد بلا سبب شرعي. الخ (قواعد الفقه، أشرفي، ص: ١١٠، رقم: ٢٦٩، شرح المجلة رستم، مكتبه اتحاد ١/ ٦٢، رقم المادة: ٩٧، هندية، زكريا قديم ٢/ ١٦٧، جديد ٢/ ١٨١، مجلة الأحكام العدلية ١/ ٢٧، رقم: ٩٧)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍شوال ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۴۷۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۱۰/۲۸ھ

دوسرے کی چیز بلا اجازت فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۶۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک پتھر کی کان کا مالک ہے، عمرو خریدار نے ۲۰؍روپیہ کے حساب سے کٹ سائز کے پیسے ادا کردئے اور زید نے قبول کرتے ہوئے کہا کہ کان سے پتھر نکلتے ہی اس کو کٹ سائز کے اعتبار سے کٹوا کر اور اس کی ٹائلیں بنا کر آپ کے حوالہ کردوں گا، اب جب پتھر کان سے باہر آتا ہے، تو زید بجائے اس کی ٹائلیں بنانے کے دوسرے شخص بکر کے ہاتھوں دوگنی

قیمت میں بیچتا ہے(قطع نظر اس سے کہ بکر کو اس پتھر کے بکے ہوئے ہونے کا علم تھا یا نہیں) اور زید عمرو مشتری اول کو کہتا ہے کہ ۲۵/ روپیہ کے اعتبار سے تمہارا حصہ رکھ کر پروفٹ سمیت تمہیں دے دوں گا اور باقی منافع میں رکھوں گا، تو کیا زید کا مشتری اول عمرو کی اجازت سے پتھر کو بیچنا اور اسکوائر فٹ ۵/ روپیہ کا منافع عمرو کو دے کر باقی خود رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر بحکم شرع زید کے لئے منافع رکھنا جائز نہیں ہو تو عمرو نے جو پروفٹ ۵/ روپیہ کا منافع لیا ہے وہ اس کے لئے حلال رہے گا یا نہیں؟

المستفتی: محمد رمضان، مکرانوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: طے شدہ عقد کے مطابق وہ پتھر عمرو ہی کی ملکیت ہے؛ لہٰذا عمرو کی ملکیت کی چیزوں کو زید نے اس کی اجازت کے بغیر جو فروخت کیا ہے، اس کی تلافی کی دو شکلیں ہیں: پہلی شکل یہی ہے کہ جتنے میں فروخت کیا ہے وہ سارا پیسہ عمرو کے حوالہ کردے، ہاں البتہ اس میں زید عمرو سے اتنا مطالبہ کرسکتا ہے کہ فروخت کرنے کے محنتانہ کے طور پر کچھ اجرت زید کو مل جائے یہ بھی عمرو کی طرف سے تبرع ہوگی، لازم نہیں ہوگی۔ دوسری شکل یہ ہے کہ عمرو کے جو پتھر زید نے فروخت کردیئے ہیں بعینہٖ اسی صفت اور اسی معیار کے اتنے پتھر زید عمرو کے حوالہ کردے، چاہے اسی کان میں سے یا دوسری جگہ سے خرید کر۔

عن أبي حرة الرقاشي، عن عمه، أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه. (مسند أبي يعلى الموصلي، دارالكتب العلمية بيروت ۲/ ۹۱، رقم: ۱۵٦۷، مسند أحمد بن حنبل ۵/ ۷۲، رقم: ۲۰۹۷۱، سنن الدار قطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۲۲، ۲۸٦۲-۲۸٦۳)

ليس لأحد أن يأخذ مال غيره بلا سبب شرعي. (شرح المجلة رستم، مكتبه اتحاد ديوبند ۱/ ٦۲، رقم المادة: ۹۷)

وإن أخذه ولو على ظن أنه ملكه وجب عليه رده علينا، إن كان قائما

وإلا فيضمن قيمته إن كان قيما، ومثله إن كان مثليا . (شرح المجلة رستم، مكتبه اتحاد ديوبند ١ / ٦٢، رقم المادة: ٩٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۶۶۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/۴/۱۴۳۳ھ

لون کے رکشہ فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۶۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) میں ایک رکشہ ایجنٹ ہوں، نیا رکشہ لون کروا کر بیچ سکتا ہوں یا نہیں؟ خریدنے والا ایمان والا ہو یا غیر ایمان والا؟

(۲) اگر خریدنے والا غیر ایمان والا ہے اور جس کے نام پر لون کر رہے ہیں وہ بھی غیر ایمان والا ہو تو اس کو لون کروا کر دینا جائز ہے یا نہیں؟

(۳) نیا رکشہ اگر کیش میں ایک لاکھ دس ہزار میں پڑتا ہے، اس میں انکم ٹیکس کی پروبلم ہونے کی وجہ سے لوگ لون کی ہی مانگ کرتے ہیں، تو ایسی صورت میں لون کروا سکتے ہیں یا نہیں؟ (۴) جس رکشہ پر لون پہلے سے موجود ہو تو وہ رکشہ خرید کر بیچ سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: محمد عمران یونس پٹھان نمبر ۱۰۱ ر بھوانی پیٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: (۱) لون پر رکشہ لینے میں تین شکلیں نکلتی ہیں: ایک شکل تو ناجائز اور دو شکلیں جائز ہیں:

(۱) ناجائز شکل: خریدنے والا اگر کمپنی سے از خود ایک لاکھ روپیہ میں رکشہ خریدے اور اس کی قیمت بینک ادا کرے؛ لیکن بینک خریدار سے ایک لاکھ پانچ ہزار روپیہ وصول کرے، تو یہ خریدار کا بینک کو پانچ ہزار روپیہ مزید دینا ناجائز اور حرام ہے۔ اور یہ سود میں داخل ہے۔

عن فضالة بن عبيد صاحب النبي ﷺ أنه قال: كل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربا. (السنن الكبرى للبيهقي، البيوع، باب كل قرض جر منعفة فهو ربا، دارالفكر ۸/ ۲۷٦، رقم: ۱۱۰۹۲)

عن إبراهيم قال: كل قرض جر منفعة فهو ربا. (المصنف لابن أبي شيبة، البيوع، من كره كل قرض جر منفعة، موسسة علوم القرآن جديد ۱۰/ ٦٤۸، رقم: ۲۱۰۷۸)

كل قرض جر نفعا فهو حرام. (شامي، البيوع، باب المرابحة والتولية، مطلب كل قرض جر نفعا حرام، زكريا ۷/ ۳۹۵، كراچی ۵/ ۱٦٦)

(۲) بیع مرابحہ کی شکل: جو جواز کے دائرہ میں آتی ہے، یہ ہے کہ بینک خریدار کے ساتھ اپنے کسی آدمی کو بھیج دے اور بینک کا آدمی بینک کے لئے ہی ایک لاکھ روپیہ میں کمپنی سے سودا کرے، تو وہ گاڑی بینک کی ہوجائے گی، پھر بینک خریدار کو ایک لاکھ پانچ ہزار روپے میں فروخت کردے، تو یہ شکل شرعاً جائز ہے۔

عن أبي بحر عن شيخ لهم، قال: رأيت على علي رضى الله عنه إزارا غليظا، قال: اشتريت بخمسة دراهم، فمن أربحني فيه درهما بعته إياه.

(السنن الكبرى للبيهقي، البيوع، باب المرابحة، دارالفكر ۸/ ۲۲۹، رقم: ۱۰۹٤٤)

المرابحة بيع بمثل الثمن الأول، وزيادة ربح (إلى قوله) جائز.

(عالمگيري، زكريا قديم ۳/ ۱٦۰، جديد ۳/ ۱۵٦، معجم لغة الفقهاء، كراچی، ص: ٤۲۰، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ۱۵/ ۱۸۳، رقم: ۱۲۷۲۹)

(۳) وکالت کی شکل: یہ بھی جواز کے دائرہ میں آتی ہے کہ بینک خریدار کو اپنا وکیل بنادے، پھر وہی شخص رکشہ کو کمپنی سے خرید کر بینک کے حوالہ کردے، پھر بینک اس رکشہ کو ایک لاکھ پانچ ہزار روپیہ میں فروخت کردے، تو یہ صورت بھی شرعاً جائز ہے۔ اوراخیر کی ان دوصورتوں کے مطابق اگر بینک سے رکشہ کا لون کرایا جائے تو درست ہے، ورنہ نہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/ ۱۳۵، انواررحمت، ص: ۲۱۲، ایضاح النوادر ۱/ ۱۰۷)

(۲) اگرخریدنے والا غیر مسلم ہواور جس کے نام لون کرایا جائے وہ بھی غیر مسلم ہو، تو ایسی صورت میں ان کے حق میں یہ معاملہ درست ہے۔ اور آپ کے لئے لون کرانا جب کہ خرید نے والا اور بینک کے تمام ذمہ دار غیر مسلم ہیں، تو جائز اور درست ہے۔

فهذا عمر قد أجاز لأهل الذمة ببيع الخمر والخنازير، وأجاز للمسلمين أخذ أثمانها. (إعلاء السنن، البيوع، باب حرمة بيع الخمر والخنزير والأصنام، دارالكتب العلمية بيروت ١٤/ ١٣٥، كراچی ١٤/ ١١٢، أنوار رحمت/ ١٩٤)

(۳) انکم ٹیکس کی مجبوری ہے، تو ایسی صورت میں مرابحہ اور وکالت کی شکلیں اختیار کریں جو جواب نمبر ۱ رکی شکل نمبر ۲ راور نمبر ۳ رمیں موجود ہے۔

(۴) اگرلون کرتے وقت لون کی صراحت کردی گئی ہوتو کوئی دھوکہ دہی نہیں ہے، مگرایک سودی معاملہ میں شامل ہونے کی بناپر گنہگار ہوگا۔

عن جابر -رضي الله عنه- قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربو ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، باب لعن أكل الربا وموكله، النسخة الهندية ٢ / ٢٧، بيت الأفكار، رقم: ١٥٩٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۶ ر رجب ۱۴۲۷ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۰۴۸)	۶/۷/۱۴۲۷ھ

سامان نہ ملنے پر ۴۵ رسو کی جگہ چھ ہزار لینے کا حکم

سوال [۸۶۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید پتھر کی کان کا مالک ہے، عمرو نے زید کی کان میں جمے ہوئے پتھر کا ناپ چوک کرتے ہوئے کہا کہ میں یہ پتھر -/4,500 میں خریدتا ہوں اور پیسے دے دئے، زید نے قبول کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں نے یہ پتھر وقت مقررہ پر آپ کے حوالہ نہ کیا تو آپ کو

-/6,000 روپیہ دے دوں گا، دھیان رہے کہ ایک پتھر جو کان میں جما ہوا ہوتا ہے، اس کو باہر آنے میں تقریباً دو تین مہینہ لگ ہی جاتے ہیں اور باہر آنے کے بعد وہی پتھر جو جمے ہوئے ہونے کی حالت میں -/4,500 کا تھا، چھ ہزار یا سات ہزار میں بکتا ہے، ان ہی باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے، زید نے خود ہی کہا تھا کہ اگر میں نے وقت مقررہ پر آپ کے حوالہ نہ کیا تو میں آپ کو ۶۰۰۰/ ہزار روپئے دے دوں گا، تو کیا عمرو کا ۴۵۰۰/ روپئے دے کر ۶۰۰۰/ روپئے لینا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ جب کہ عمر نے ۴۵۰۰/ روپئے کے اوپر کا جو منافع ہے، ڈیڑھ یا دو ہزار اس کو حاصل کرنے کے لئے ہی زید کو تین مہینہ پہلے ۴۵۰۰/ روپئے دیئے تھے۔

المستفتی: محمد رمضان مکرانوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) سوال میں ذکر کردہ صورت میں عمرو کے دیئے ہوئے ۴۵۰۰/ روپئے کے بدلے ۶۰۰۰/ روپئے لینے میں ۱۵۰۰/ روپئے سود ہو جائیں گے، اور نقصان سے بچنے کی شکل یہ ہے کہ طے شدہ پتھر ہی وصول کرلیں۔ (احسن الفتاوی ۶/ ۴۸۱، آپ کے مسائل اور ان کا حل ۶/ ۱۶۴)

فإن تعذر عليه الأداء زادوا في الحق والأجل، فهذا هو الربى الذي كانوا في الجاهلية يتعاملون به. (تفسير كبير ۷/ ۹۱)

كان الرجل إذا حل ماله على صاحبه يقول المطلوب للطالب: زدني في الأجل، وأزيدك على مالك، فإذا فعل ذلك قيل لهم هذا ربا، قالوا: سواء علينا إن زدنا في أول البيع أو عند محل المال فهما، سواء فأكذ بهم الله تعالىٰ، فقال: ﴿واحل الله البيع وحرم الربوا﴾ (الدرالمنثور، تحت رقم الآية: ۲۷۵ من سورة البقرة، دارالكتب العلمية بيروت ۱/ ٦٤٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۶۶۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۴/۲۵ھ

۵۰۰/روپئے کا بل ۴۰۰/روپئے میں فروخت کرنا

سوال [۸۶۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے اپنا غلہ ان شرطوں پر فروخت کیا فی کوئنٹل -/2,200 روپئے نقد -/1,700 روپئے -/500 روپئے دوقسطوں میں ملیں گے۔ -/500 روپئے ملنے میں دیر ہوگئی، زید کو ضرورت پڑی پیسوں کی تو زید نے -/500 روپئے کا بل بیچ دیا، حارث نے زید کے غلہ کا بل -/400 روپئے میں خریدا، حارث کا کم قیمت میں بل خریدنا یعنی -/500 روپئے کا بل -/400 روپئے میں خریدنا شریعت کی نظر میں کیسا ہے؟

المستفتی: سیداشرف علی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کا غلہ فروخت کرنے کے بعد پانچ سو روپئے ملنے میں تاخیر ہونے کی بنا پر پانچ سو روپئے کا بل چار سو روپئے میں فروخت کرنا، میعادی چیک کی بیع اور بیع الجا مکیہ کے مرادف ہوکر ناجائز وحرام ہوگا۔ اور بیع الجامکیہ کی صورت یہ ہے کہ حکومت کا ملازم یا صاحب وظیفہ جس کو منجانب حکومت مقررہ میعاد پر تنخواہ یا وظیفہ ملتا ہے، وہ کبھی وقت مقررہ سے پہلے ضرورت کی وجہ سے کم پیسے میں اپنی تنخواہ یا وظیفہ فروخت کر دیتا ہے اور خریدار وقت مقررہ پر صاحب وظیفہ کے نام سے پورا وظیفہ وصول کرلیتا ہے، تو حضرات فقہاء نے اس طرح کی خرید وفروخت کو ناجائز اور حرام کہا ہے؛ اس لئے زید کے لئے قبل از وقت کم قیمت میں اپنا بل فروخت کرنا ربا اور سود کی وجہ سے جائز نہ ہوگا۔ (مستفاد: ایضاح النوادر۱/ ۳۶)

إن بيع الصک و البراء ة و الجامكية إنما لا يجوز. (إعلاء السنن، كراچی ۱۴/ ۲۴۴، كتاب البيوع، بيع الصك والبراءة والجامكية والنوط، دارالكتب العلمية بيروت ۱۴/ ۲۸۷)

وأفتی المصنف ببطلان بیع الجامکیة. (درمختار مع الشامي، البیوع، مطلب في بیع الجامکیة، زکریا ۷/ ۳۳، کراچی ٤/ ٥١٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ رجب ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۸۸۸۳)

پیمنٹ کی دوسونوے کی پرچی ۲۸۰/ میں فروخت کرنا

سوال [۸۶۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سرکار نے بینکوں کے لئے ایک کپڑا تیار کرنے کے لئے دیا ہے، جس کو جنتا جوڑا کہتے ہیں، اس کو سرکار اپنے طور پر سینٹر قائم کر کے خریدتی ہے، اس کا سرکاری بھاؤ -/34/5 روپے ہے؛ لیکن اس کا پیمنٹ ۲۲-۳۰/ دن یا اس سے کم وزیادہ وقت میں آتا ہے۔ زید نے ۲۰/ جوڑے میٹر پر جمع کئے، جس کی قیمت ۵۹۵/ روپئے ہیں، سینٹر کے سوت کے چار میٹر ملے، جس کی قیمت ۴۰۰/ روپئے ہوئی، زید کو وہاں سے پرچی ملی، جس میں ۲۹۵/ روپئے ملنے باقی ہیں، زید اپنی اس پرچی کو خالد کو ۲۸۰/ میں اس لئے فروخت کردیتا ہے کہ پیمنٹ کئی ہفتہ بعد آئے گا، خالد اس لئے خرید لیتا ہے کہ اس کو دس روپئے کا نفع ہو جائے گا، کیا اس طرح کی خرید وفروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: عثمان غنی داؤد کاندی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس طرح معاملہ شرعاً جائز نہیں ہے، ہاں البتہ گناہ سے بچنے کے لئے حیلہ کیا جاسکتا ہے کہ زید خالد سے ۲۸۰/ روپئے بنام قرض لے لے اور خالد سے کہہ دے کہ فلاں تاریخ کو اس پرچی کے ذریعہ فلاں سینٹر سے ۲۹۰/ روپئے وصول کر کے لے آنا، تو اس میں سے ۲۸۰/ روپئے قرض کا ہوگا اور دس روپئے اس کام کی مزدوری میں تم کو ملے گا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۱۶۹)

ڈیڑھ روپئے فی اشتہار معاملہ طے کرنے کے بعد ایک روپئے میں چھپوانا

سوال [۸۶۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے بکر سے یہ کہا کہ تم جلسہ کے اشتہار چھپوا دو تو بکر بولا کہ ایک اشتہار ڈیڑھ روپئے کا پڑے گا، اس نے کہا ٹھیک ہے چھپوا دو، بکر نے چھپوا دئے، اشتہار ایک روپئے کا پڑا، تو بکر کا اب اس سے ایک اشتہار کا ڈیڑھ روپئے وصول کرنا کیسا ہے؟ نیز اگر بکر کچھ روپئے بطور بیعانہ کے جمع کروالے تو یہ نفع جائز رہے گا یا نہیں؟ جب کہ بکر ان روپیوں کو بطور امانت الگ رکھ لے اور اپنی رقم صرف کرے، یا اگر اس کی بھی رقم ملا دے تو یہ معاملہ ونفع جائز رہے گا یا نہیں؟

المستفتی: محمد اویس کاسگنج، ایٹہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کے بکر سے کہنے پر کہ تم جلسے کا اشتہار چھپوا دو بکر نے کہا کہ ڈیڑھ روپئے میں ایک اشتہار پڑے گا، گویا کہ زید اور بکر کے درمیان یہ معاملہ طے ہوگیا کہ فی اشتہار ڈیڑھ روپئے کے اعتبار سے زید بکر کو دے گا، چاہے زید نے فی اشتہار کچھ بھی خرچ کیا ہو نفع ونقصان کا ذمہ دار زید ہے۔ اور ڈیڑھ روپئے میں دینے کا ذمہ دار بکر ہے؛ لہٰذا اشتہار تیار کر کے زید کو حوالہ کرنے سے پہلے وہ سب اشتہار ضائع ہو جائے یا چوری ہو جائے تو سارا بھگتان بکر کے ذمہ لازم ہے؛ اس لئے اس درمیان میں جو کچھ بھی نفع ہوگا وہ سب بکر کا حق ہے، اور پھر زید کے حوالے کر دینے کے بعد پوری ذمہ داری زید کے اوپر آئے گی، نیز بیع نامہ کے طور پر جمع شدہ رقم خواہ الگ رکھے یا اس رقم کو اشتہار کی چھپائی میں صرف کرے، بہر صورت منافع یعنی فی اشتہار ڈیڑھ روپئے لینا درست ہے۔ (ایضاح النوادر ۲۳/۱)

وبدونه فيما فيه تعامل كخف وقمقمة، وطست صح بيعا لا عدة. (تنوير الأبصار، وتحته في الشامية) ثم ينعقد عند الفراغ بيعا بالتعاطي.

(شامي، كتاب البيوع، باب السلم، مطلب في الاستصناع، زكريا ٧/ ٤٧٥، كراچی

۵/ ۲۲٤، الفقه الإسلامي وأدلته، دارالفكر ٥/ ٣٦٤٣، هدی انٹر نیشنل دیوبند ٤/ ٣٩٢)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍صفر ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۷۲۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۲/۲۹ھ

دیوالی پر مسلمان کا آتش بازی کی اشیاء فروخت کرنا

سوال [۸۶۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: دیوالی کے موقع پر کیا ایک مسلمان آتش بازی کے سامان کو بطور تجارت فروخت کرسکتا ہے؟

المستفتی: فردوس برگونہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: دیوالی کے موقع پر جو آتش بازی وغیرہ کا سامان فروخت کیا جاتا ہے، اس کی تجارت کو فقہاء کرام نے مکروہ ممنوع لکھا ہے، اس سے بچنا ضروری ہے۔
(مستفاد: فتاویٰ محمودیہ میرٹھ ۲۴/ ۱۶۶)

عن أبي أمامة قال: قال النبي ﷺ إن الله عز وجل بعثني هدى ورحمة للعالمين، وأمرني بمحق المعازف، والمزامير، والأوثان، والصلب، وأمر الجاهلية -إلى- لا يحل بيعهن ولا شراؤهن، ولا التجارة فيهن، وثمنهن حرام. (مسند أبي داؤد الطيالسي، دارالكتب العلمية بيروت ١/ ٦٣٥-٦٣٦، رقم: ١٢٣٠، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ٨/ ١٩٦، رقم: ٧٨٠٣، مسند أحمد بن حبنل ٥/ ٢٥٧، ٢٦٨، رقم: ٢٢٥٧١-٢٢٦٦٣)

ونظيره كراهة بيع المعازف؛ لأن المعصية تقام بها عينها. (شامي، كتاب الجهاد، باب البغاة، مطلب في كراهة بيع ما تقوم المعصية بعينه، زكريا ٦/ ٤٢٠، كراچی ٤/ ٢٦٨)

بيع المزامير يكره. (البحرالرائق، كوئٹه ٥/ ١٤٣، زكريا ٥/ ٢٤٠)

ما قامت المعصية بعينه يكره بيعه تحريما وإلا فتنزيها. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ٩/ ٥٦١، كراچی ٦/ ٣٩١، مطلب في كراهية بيع ما تقوم المعصية بعينه، زكريا ٦/ ٤٢٠، كراچی ٤/ ٢٦٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ٩/ ٢١٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍محرم الحرام ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۵۸۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲؍۱؍۱۴۳۳ھ

گرین وے پشو پالن میں حصہ لینا

سوال [۸۶۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ہماری ایک کمپنی (گرین وے پشو پالن) ہے، اس میں اگر کوئی شخص مثلاً ۴۶۰۰؍ روپئے دیتا ہے، تو اس کو دو طرح سے نفع ملتا ہے، فارم ہاؤس سے اور دوسرے اپنے منافع سے، وہ اس طرح کہ ہم جانتے ہیں کہ بکری ہر چھ ماہ میں بیاہتی ہے، سال میں چار بچے دیتی ہے، ہم اس میں سے پچھتر فیصد رکھ لیتے ہیں اور ۲۵؍ فیصد دیتے ہیں، اس طرح تین بکرے ہم رکھ لیتے ہیں اور ایک بکرا یا چھیالیس سو روپئے اس شخص کو دیتے ہیں، جب تک اس کی بکری یا بکری کے بچوں میں سے کوئی بکری رہے گی اس کو ہر سال ایک بکرا ملتا رہے گا۔

(۲) کمپنی دوسرا نفع اپنی آمدنی سے دیتی ہے، جب کمپنی کی آمدنی دوگنی ہوتی ہے، تو وہ آپ کے مقرر حصہ کو دوگنا کر دیتی ہے، مثلاً کمپنی کے پاس سو لوگ ہوں گے، یعنی سو بکریاں فارم ہاؤس چلی جائیں گی تو وہ حساب کرے گی، تو وہ سو لوگوں کو کچھ نہیں دے گی، جب کمپنی دوسری بار دو سو لوگوں پر حساب کرے گی، تو پہلے والے سو لوگوں کو چالیس چالیس روپئے فی آدمی دے گی، اسی طرح ہر دفعہ دوگنی تعداد ہونے پر نفع دوگنا کرتی رہے گی۔

المستفتی: سید یاور علی نگینہ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سوال میں کمپنی کے کاروبار کی جوصورت بیان کی گئی ہے کہ آدمی ۴۶۰۰/روپئے جمع کرے اوراس قیمت کی بکری لے کر کمپنی پالتی ہے، جب وہ سال میں بچہ دے تو اس میں کا ایک چوتھائی پیسہ دینے والے کا اور بقیہ تین چوتھائی کمپنی لیتی ہے، یہ شرکت ناجائز ہے؛ بلکہ اس صورت میں کمپنی کو صرف اجرت ملے گی اور روپئے دینے والے کو بکری اوراس کے بچے ملیں گے؛ اس لئے کہ اس میں تردد کی وجہ سے قمار کا شبہ ہے، اسی طرح دوسری صورت جس میں کمپنی اپنے متعین ممبروں کے دوگنے ہونے پر منافع دیتی ہے، اس میں بھی قمار کا شبہ ہے؛ کیوں کہ جتنے ممبر ایک سال میں بنے اتنے دوبارہ بننا ضروری نہیں ہے؛ اس لئے کمپنی کا یہ نفع بھی جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۶/۶۰۳)

والربح في الشركة الفاسدة بقدر المال ولا عبرة بشرط الفضل، فلو كل المال لأحدهما، فللآخر أجر مثله كما لو دفع دابّته لرجل ليؤجرها، والآجر بينهما، فالشركة فاسدة، والربح للمالك وللآخر أجر مثله.

(درمختار مع الشامي، كتاب الشركة، مطلب يرجح القياس، زكريا ٦/ ٥٠٣، كراچی ٤/ ٣٢٦)

وعلى هذا إذا دفع البقرة إلى إنسان بالعلف ليكون الحادث بينهما نصفين فما حدث، فهو لصاحب البقرة، ولذلک الرجل مثل العلف الذي علفها وأجر مثله فيما قام عليها. الخ (عالمگيري، الباب الخامس في الشركة الفاسدة، زكريا قديم ٢/ ٣٣٥، جديد ٢/ ٣٣٦، حاشية چلپی مكتبه إمداديه ملتان ٤/ ٤٩، زكريا ٤/ ٣٧٣، الدر مع الرد، زكريا ٦/ ٥٠٤، كراچی ٤/ ٣٢٧)

وحقيقة القمار تمليک المال على المخاطرة، وهو أصل في بطلان عقود التمليكات الواقعة على الأخطار. (أحكام القرآن للجصاص، سهيل اكيڈمي لاهور ٢/ ٤٦٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/رجب المرجب ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۶۷۴)

سودی رقم سے، جھوٹ بول کر یا کم تول کر تجارت کرنا

سوال [۸۶۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بینکوں سے سود پر روپئے لے کر کاروبار کرنا، ملاوٹ کر کے، جھوٹ بول کر، کم تول کر، ٹیکس چوری کر کے کاروبار کرنے والوں کی بھی روزی حرام ہے، پھر خنزیر کے بال کے برش بنانے والوں کی روزی کیوں حرام ہے؟ کیا دونوں ایک زمرے میں آتے ہیں؟ یعنی دونوں کی روزی ایک ہی جنس کی ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: احسان علی صدیقی، اصغر منزل شیر کوٹ بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سود کی رقم جھوٹ بول کر غیر سے حاصل کردہ مال حرام ہے۔

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد، كالبيوع الفاسدة، والاستئجار على المعاصي والطاعات، أو بغير عقد، كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور قديم ١/ ٣٧، دارالبشائر الإسلاميه بيروت ١/ ٣٥٩، رقم: ٥٩، الدر مع الرد، زكريا ٩/ ٥٥٣، كراچى ٦/ ٣٨٥، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٧، زكريا ٧/ ٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/ ٣٦٩، كوئٹه ٨/ ٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/ ٤٩، جديد ٥/ ٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/ ٢٤٦)

انکم ٹیکس اور مکان ٹیکس وغیرہ شرعاً جبری ٹیکس ہیں، اگر جھوٹ بول کر یا کسی اور ترکیب سے ٹیکس کی چوری سے جو رقم محفوظ ہو جائے وہ حلال ہوگی۔

الكذب مباح لإحياء حقه، ودفع الظلم عن نفسه. (الدرالمختار، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ٩/ ٦١٢، كراچى ٦/ ٤٢٧)

اور خنزیر کے بالوں کا پیسہ حرام ہے۔

كالبيوع الفاسدة، والاستئجار على المعاصي والطاعات، أو بغير عقد، كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور قديم ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلاميه بيروت ۱/ ۳٦۹، رقم: ٥۹)

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۰۲۹)

لاٹری کے پتے، تاش، لوڈو، کنچے، آتش بازی بیچنے کا حکم

سوال [۸٦۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آیا لاٹری کے پتے بیچنا، کنچے گولی بیچنا، تاش، لوڈو، آتش بازی بیچنا، ان چیزوں کو بیچنا یا استعمال کرنا قرآن وحدیث کی روشنی میں جائز ہے یا ناجائز؟

المستفتی: محمد منظور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ چیزوں کی فروختگی ناجائز ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِىْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ. [لقمان: ٦]

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة: ۲]

البتہ پیسہ حلال رہے گا، نیز اس کا استعمال کرنا اور ان سے کھیل بھی ناجائز اور حرام ہے۔

أن الملاهي كلها حرام. (درمختار، كتاب الحظر والإباحة، كوئٹه ٥/ ۲٤٥، كراچى ٦/ ۳٤۸، زكريا ۹/ ٥۰۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ صفر ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۵۱۳)

غیر شرعی لباس کوسلنا اور فروخت کرنا کیسا ہے؟

سوال [۸۶۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مومن کے لئے غیر ملکی یا مغربی لباس جیسے کوٹ، پتلون، جیکٹ، جنس کولہوں سے اونچی اور آدھی آستین والی مردانی شرٹ عورتوں کے لئے بلاوز، چولی، میکسی، فراک، غرارے، شرارے، آدھی آستین کے یا مونڈھے اور بغل صاف طور پر محسوس ہوتے ہوں اور گلے کھلے ہوئے ہونے کے باعث پستان بھی نظر آتے ہوں، ان کی کاٹ چھانٹ، سلائی، خرید وفروخت کیسی ہے؟ اور پہننا کیسا ہے؟

مندرجہ بالا قراش تراش کے نابالغ بچوں کے لباسوں کی کٹائی، سلائی، یا سلے ہوئے لاکر ریڈی میڈ ملبوسات کی خرید وفروخت شرعاً کیا حکم رکھتی ہے؟

المستفتی: حبیب الرحمٰن انصاری متصل علی مسجد، شیر کوٹ، ضلع بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: وہ لباس جو اغیار کا شعار ہے، اس کا استعمال مسلمانوں کے لئے تشبہ کی وجہ سے ناجائز اور ممنوع ہے۔

عن ابن عمر –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: من تشبه بقوم فهو منهم. (سنن أبي داؤد، اللباس، باب في لبس الشهرة، النسخة الهندية ٢/ ٥٦٩، دارالسلام، رقم: ٤٠٣١)

اگر مذکورہ لباس مغربی یہود ونصاریٰ کا شعار ہے تو اس کا استعمال ناجائز ہے، اسی طرح جو لباس بدن اور ستر کی حفاظت نہ کر سکے اس کا استعمال بھی ناجائز ہے، نیز عورتوں کے لباس میں غرارہ، شرارہ وغیرہ جہاں تک احقر کے علم میں ہے یہود ونصاریٰ کا لباس نہیں ہے؛ بلکہ ہندوستان میں غیر مسلم ومسلم عورتیں سب استعمال کرتی ہیں، ہاں البتہ شرفاء کا لباس نہیں سمجھا جاتا ہے؛ اس لئے اس میں بظاہر کوئی قباحت نہیں ہے؛ البتہ بلاوز عام طور پر ساڑی کے ساتھ

ہی استعمال ہوتا ہے وہ ستر کی حفاظت نہیں کرتا ہے؛ اس لئے اس کا استعمال ناجائز ہے۔ اور اگر چولی کے اوپر باقاعدہ قمیص پہنی ہے تو جائز ہے۔ اور اگر فراک مغربی لباس ہے بالغ لڑکیوں کے لئے استعمال جائز نہیں ہے، اسی طرح آدھی آستین کا لباس اور ایسا لباس کہ جس سے پستان وغیرہ نمایاں نظر آجائے ناجائز ہے۔ وہ ''**نساء كاسيات عاريات**'' کی وعید کے اندر داخل ہوں گے۔ حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: صنفان من أهل النار ...... ونساء كاسيات عاريات، مميلات مائلات رؤوسهن كأسنمة البخت المائلة، لايدخلن الجنة، ولا يجدن ريحها، وإن ريحها ليوجد من مسيرة كذا وكذا. (صحيح مسلم، كتاب اللباس والزينة، باب النساء الكاسيات، النسخة الهندية ٢/ ٢٠٥، بيت الأفكار، رقم: ٢١٢٨)

اور ایسے فساق کا لباس بنانے والا درزی فعل مکروہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

أو خياطا أمره أن يتخذ له ثوبا على زي الفساق يكره له أن يفعل؛ لأنه سبب التشبه بالمجوس والفسقة. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ٩/ ٥٦٢، كراچی ٦/ ٣٩٢، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٨٨، مصري قديم ٢/ ٥٣٠، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٩، زكريا ٧/ ٦٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ر محرم ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۹۸۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۱/۱۴۱۳ھ

ہیروئن کی بیع وشراء

سوال [٨٦٩٠]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: ہیروئن (HEROIN) کی بیع وشراء، اس کا استعمال اوراس کی آمدنی کے شرعی احکام کیا ہے؟ ہیروئن کے باقی تمام احکام بالتفصیل مدلل ارشادفرمائیں۔

المستفتی: جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم، بردوان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ہیروئن کی بیع وشراء ناجائز اورحرام ہے اوراسے حرام قرار دینے ہی میں احتیاط ہے؛ چونکہ اس کی تھوڑی سی مقدار بھی نشہ آور ہوتی ہے؛ اس لئے اس کا استعمال بھی حرام ہوگا، اس سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی ناجائز اورحرام ہوگی۔

عن جابر بن عبدالله –رضي الله عنه– أن رسول الله ﷺ قال: ما أسكر كثيره فقليله حرام. (سنن الترمذي، باب ماجاء أسكر كثيره فقليله حرام، النسخة الهندية ۲/ ۸، دارالسلام، رقم: ۱۸٦۵، سنن النسائي، تحريم كل شراب أسكر كثيره، النسخة الهندية ۲/ ۲۷۷، دارالسلام، رقم: ۵٦۰۷، سنن أبي داؤد، باب ماجاء في السكر، النسخة الهندية ۲/ ۵۱۸، دارالسلام، رقم: ۳٦۸۱، مسند أحمد بن حنبل ۲/ ۹۱، رقم: ۵٦٤۸)

قلت القليل المسكر والقليل الغير المسكر بينهما فرق، كما قال الشيخ المحدث الفقيه رشيد أحمد الكنكوهي في تقريره الكوكب الدري تحت حديث ما أسكر كثيره فقليله حرام: وإنما يحتاج إلى أمثال هذه التاويلات لما ثبت من بعض الصحابة شرب أمثالها، فعلم بفعلهم أن النهي ليس مطلقا، ويمكن أن يقال في الرواية وهو ما أسكر كثيره: أن الكثير والقليل كلاهما مسكران، إلا أن الكثير أكثر إسكارا من القليل، فالقليل حينئذ قسمان: قليل مسكر، وقليل غير مسكر، والموضوع في الحديث هو القليل الأول دون الثاني، فكان المعنى أن القليل المسكر حرام، وإن قل إسكاره فبقي القليل الغير المسكر غير حله، وهذا التاويل جاز في قوله عليه الصلاة والسلام: كل مسكر حرام. (الكوكب الدري ۲/ ۱۲)

أن محل البيع هو المال، وإنه اسم لما يباح الانتفاع به حقيقة وشرعا، ولم يوجد فلا يكون مالا، فلا يجوز بيعها كبيع الخمر. (بدائع الصنائع، كتاب الأشربة، أحكام الخمر، زكريا ٤/ ٢٨٢، كراچی ٥/ ١١٥)

عن يحيى النخعي قال: سأل قوم ابن عباس عن بيع الخمر وشرائها والتجارة فيها، فقال: أمسلمون أنتم؟ قالوا: نعم، قال: فإنه لا يصلح بيعها ولا شرائها، ولا التجارة فيها. (صحيح مسلم، باب إباحة النبيذ الذي لم يشتد ولم يصر مسكرا، النسخة الهندية ٢/ ١٦٨، بيت الأفكار، رقم: ٢٠٠٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ ؍ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۰۳۲/۴۰)

نشہ آور چیزوں کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۶۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بھانگ، افیم اور ہیروئین وغیرہ نیز نشہ آور اشیاء کی تجارت اور خرید وفروخت اور کاروبار وغیرہ پر حکومتیں سخت رویہ اختیار کرتے ہوئے دو سال کی سزا دیتی ہیں، شریعت وسنت ہماری اس بارے میں کیا رہنمائی کرتی ہے؟ شرعاً یہ سزا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: سید معین نواز، رانچی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شراب کی تجارت حرام ہے، اس کے علاوہ دیگر نشہ آور چیزوں کی تجارت مکروہ ہے۔ اور حکومتی قانون کی خلاف ورزی کرکے اپنی جان خطرے میں ڈالنا قطعاً جائز نہیں ہے۔

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ. [البقرة: ١٩٥]

عن يحيى النخعي قال: سأل قوم ابن عباس عن بيع الخمر وشرائها

والتجارة فيها، فقال: أمسلمون أنتم؟ قالوا: نعم، قال: فإنه لا يصلح بيعها ولا شرائها، ولا التجارة فيها. (صحيح مسلم، باب إباحة النبيذ الذي لم يشتد ولم يصر مسكرا، النسخة الهندية ٢/ ١٦٨، بيت الأفكار، رقم: ٢٠٠٤)

عن زيد بن أسلم، عن عبدالرحمن بن وعلة السبئيّ، من أهل مصر، أنه سأل عبدالله بن عباس عما يعصر من العنب، فقال ابن عباس: إن رجلا أهدى لرسول الله صلى الله عليه وسلم راوية خمر، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: هل علمت أن الله قد حرمها؟ قال: لا فسار إنسانا، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: بم ساررته؟ فقال: أمرته ببيعها، فقال: إن الذي حرم شربها حرم بيعها. (صحيح مسلم، باب تحريم بيع الخمر، النسخة الهندية ٢/ ٢٢، بيت الأفكار، رقم: ١٥٧٩)

وصح بيع غير الخمر ...... ثم إن البيع، وإن صح لكنه يكره. (شامي، كتاب الأشربة، زكريا ١٠/ ٣٥، كراچی ٦/ ٤٥٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/۸/۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۷۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴/۸/۱۴۳۲ھ

شراب سے بنے ہوئے سرکہ کا استعمال وتجارت

سوال [۸۶۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ گیہوں اور پھلوں سے اخذ کرکے جو سرکہ تیار کیا جاتا ہے، اسے مارکیٹ میں ”وائن ویلیگر“ یا شراب کے سرکہ کے نام سے فروخت کیا جاتا ہے، اس کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: نیاز احمد فاروقی، حلال ٹرسٹ جمعیۃ علماء ہند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گیہوں، دھان، پھل اور سبزی وغیرہ سے اخذ کرنے

سے جو سرکہ تیار کیا جاتا ہے، چاہے اس کو شراب کے سرکہ کے نام سے فروخت کیا جاتا ہو بلا شبہ جائز اور حلال ہے؛ اس لئے کہ کوئی بھی سرکہ ایسا نہیں ہے کہ اس کی اصل ماہیت پر شراب کا مرحلہ نہ گزرا ہو، یعنی پہلے شراب بنتی ہے، پھر اس شراب سے سرکہ بنتا ہے۔ حدیث وفقہ سے اس کا حلال ہونا ثابت ہے۔

عن عائشة – رضي الله عنها – أن النبي ﷺ قال: نعم الإدام الخل. (مسلم شريف، باب فضيلة الخل والتأدم به، النسخة الهندية ۲/ ۱۸۲، بيت الأفكار، رقم: ۲۰۵۱، مسند الدارمي، دارالمغني ۲/ ۱۳۰۲، رقم: ۲۰۹۳)

إن النجاسة لما استحالت وتبدلت أوصافها ومعانيها خرجت عن كونها نجاسة؛ لأنها اسم لذات موصوفة، فتنعدم بانعدام الوصف، وصارت كالخمر إذا تخللت. (بدائع، كتاب الطهارة، الدباغة، زكريا ۱/ ۲۴۳، كراچی ۱/ ۸۵)

وكذا الخمر تصير خلا، فعلم أن استحالة العين تستتبع زوال الوصف. (غنية المستملي شرح منية المصلي، أشرفيه ۱۸۹)

ولا يرد طهارة الخمر بانقلابها خلا ...... لأن عين الشيء حقيقته، وحقيقة الخمر ...... ذهبت وخلفتها أخرى، وإنما يرد ذلك لو قلنا ببقاء حقيقة الخمر ...... مع الحكم بطهارتها. (شامي، كتاب الطهارة، باب الأنجاس، مطلب في العفو عن طين الشارع، زكريا ۱/ ۵۳۶، كراچی ۱/ ۳۲۸)

لأن العصير لا يتخلل إلا بعد التخمر غالبا، فلو لم نقل بالطهارة لربما تعذر الخمر وهو حلال إجماعا. (نهاية المحتاج ۲/ ۲۳۰، بحواله جديد فقهي تحقيقات ۱۰/ ۱۳۹)

إذا تخللت الخمر بنفسها بغير قصد التخليل يحل ذلك الخل بلا خلاف بين الفقهاء؛ لقوله عليه الصلاة والسلام: نعم الإدام الخل. (الموسوعة الفقهية الكويتية ۵/ ۲۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۷/ ذیقعدہ ۱۴۳۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۶۹۹)	۱۴۳۵/۱۱/۸ھ

اعضائے انسانی کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۶۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ہر انسان کے سینہ کے اندر دو کیڈنی رہتی ہے (گوشت کے دو ٹکڑے) ان دونوں کا فانکشن ایسا ہے کہ کسی وجہ سے اگر ایک بیکار ہو جاتی ہے تو ایک کیڈنی سے انسان زندہ رہ سکتا ہے؛ البتہ کمزور ہو جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کسی انسان کی اگر دونوں کیڈنی بیکار ہو جائے تو اس آدمی کو بچانے کے لئے میں اپنی ایک کیڈنی اس کو ہدیہ کر سکتی ہوں؟

(۲) ایسی حالت میں اگر اس آدمی کو روپئے کے بدلے کیڈنی فروخت کر دوں تو اس کا کیا حکم ہے؟ میں نے ان سے روپئے کی بات نہیں کی؛ بلکہ شکریہ کے طور پر اس نے روپئے مجھے دے دیا ہے، تو کیا میں اس روپئے کو استعمال کر سکتی ہوں؟

المستفتية: آمنہ خاتون، ساکن سونا گاچھی، بردوان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: انسان کا کوئی عضو انسان کی ملک نہیں ہے؛ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امانت وودیعت ہے؛ لہٰذا مالکانہ طور پر نہ کسی کو ہدیہ میں دے سکتے ہیں اور نہ بالقیمت بیچ سکتے ہیں اور نہ ہی وہ قیمت اس کے لئے حلال ہے، خواہ شکریہ کے طور پر وہ رقم ملی ہو؛ بلکہ اس رقم کا واپس کرنا ضروری ہے۔ (مستفاد: جواہر الفقہ ۲/ ۴۹، جدید زکریا ۷/ ۱۷۰، فتاوی رحیمیہ قدیم ۶/ ۲۸۶، جدید زکریا ۱۰/ ۱۷۰)

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ اٰدَمَ. [سورة الإسراء، آيت: ۷۰]

الانتفاع بأجزاء الآدمي لم يجز، قيل: للنجاسة، وقيل: للكرامة هو الصحيح. (هندية، الباب الثامن عشر في التداوي والمعالجات، زكريا قديم ۵/ ۳۵٤، جديد ۵/ ٤۰۹، هداية أشرفی ۱/ ٤۱، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۸/ ۳٤۵)

فكما لا يجوز التداوي بشيء من الآدمي الحي إكراما له. (شرح السير الكبير بحواله جواهر الفقه ۲/ ۵۱، جديد زكريا ۷/ ۶۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ رجب ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۱۲۳)

گوبر اور اس سے نکلے ہوئے دانے کی تجارت

سوال [۸۶۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جانوروں کے بڑے بڑے مذبح ہیں، وہاں بڑی مقدار میں گوبر ہوتا ہے، آج کل گوبر بھی فروخت ہوتا ہے، نیز گوبر کو مشینوں کے ذریعہ چھان کر اس میں سے دانہ وغیرہ نکالا جاتا ہے، جسے جانور کے لئے بنائی جانے والی اغذیہ میں استعمال کیا جاتا ہے، کیا گوبر کی تجارت کرنا خواہ وہ کھاد کے لئے ہو یا جانور کی غذا کے لئے، یا کسی اور مصرف کے لئے شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: نیاز احمد فاروقی، حلال ٹرسٹ جمعیۃ علماء ہند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: گوبر کی خرید وفروخت راجح اور مفتی بہ قول کے مطابق جائز اور درست ہے۔ اور اس کا پیسہ بھی بلا شبہ جائز اور حلال ہے، جیسا کہ ذیل کے جزئیہ سے واضح ہوتا ہے:

قال الإتقاني: ولنا أن السرقين مال فجاز بيعه كسائر الأموال، وإنما قلنا: أنه مال؛ لأن المال ما ينتفع به، ويتمول، أي يدخر لوقت الحاجة، وقد تمول المسلمون السرقين وانتفعوا به من غير نكير من أحد من السلف. (حاشية چلپي على التبين، كتاب الكراهية، فصل في البيع، زكريا ۷/ ۵۷، إمداديه ملتان ۶/ ۲۶)

''البحرالرائق'' کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

کره بيع العذرة لا السرقين؛ لأن المسلمين يتمولون السرقين، وانتفعوا به في سائر البلاد والأمصار من غير نكير، فإنهم يلقونه في الأراضي لاستكثار الربيع. (البحرالرائق، كتاب الكراهية، فصل في البيع، زكريا ٨/ ٣٦٥، كوئٹه ٨/ ١٩٩، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٦، زكريا ٧/ ٥٧، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ٨/ ١٠٢، رقم: ٩٦٨٦)

''مجمع الانہر'' کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

جاز بيع السرقين مطلقا في الصحيح عندنا لكونه مالا منتفعا به لتقوية الأرض في الإنبات. (مجمع الأنهر، كتاب الكراهية، فصل في البيع، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٢١١، مصري ٢/ ٥٤٦)

''شامی'' کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

أجازوا بيع السرقين للانتفاع به -إلى- لأنه مال يضمن به، وهو المفتى به. (شامي، كتاب الطهارة، باب الأنجاس، مطلب في حكم الصيغ والاستخضاب بالصبغ والحناء النجسين، زكريا ١/ ٥٣٨، كراچی ١/ ٣٣٠)

''ہندیہ'' کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

يجوز بيع السرقين والبعر والانتفاع به، كما في الزاهدي. (هندية، الباب التاسع، الفصل الخامس، زكريا قديم ٣/ ١١٦، جديد ٣/ ١١٧)

(۲) نیز گوبر کو مشینوں سے صاف کرکے دانہ وغیرہ نکال کر جانوروں کی غذا کے طور پر استعمال کرنا بھی بلا شبہ جائز ہے، جب کہ اس میں کسی قسم کی بدبو وغیرہ باقی نہ رہے، یہ ایسا ہے جیسا کہ گیہوں وغیرہ نجاست میں گر جائیں تو انہیں دھوکر صاف کرکے استعمال کرنے کی گنجائش ہوتی ہے، اس کو ''بنایہ شرح ہدایہ'' میں ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

الحنطة المتنجسة قبل أن تنتفخ تغسل ثلاثا وتوكل إذا لم يبق لها رائحة ولا طعم. (بناية شرح هداية، أشرفيه ١/ ٧٤١)

(۲) اور ”فتاوی تاتارخانیہ“ اور ”المحیط البرہانی“ میں مزید وضاحت کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

إذا أصابت الحنطة الخمر إلا أنها لم تنتفخ من الخمر فغسلت ثلاثا ولا يوجد لها طعم ولا رائحة ذكر في بعض المواضع عن أبي يوسف أنه لابأس بأكلها. (فتاوى تاتارخانية ١/ ٤٥٦، رقم المسألة: ١١٩٩، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ١/ ٣٨٣، رقم: ٧٨٩)

الحنطة تغير بالماء النجس ...... على قياس أبي يوسف فيطهر بالغسل ثلاثا، والتجفيف في كل مرة. (خلاصة الفتاوى أشرفيه ديوبند ١/ ٤١)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ ذیقعدہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۶۹۶)

مردار جانور کی ہڈی، کھال اور چربی فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۶۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مردار جانوروں کی ہڈی اور کھال وچربی کی خرید وفروخت کیسی ہے؟

المستفتی: عبدالمعید قاسمی، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مردہ جانور کی کھال کو دباغت سے پہلے بیچنا جائز نہیں ہے، دباغت کے بعد بیچنا جائز ہے اور ہڈی میں چونکہ دباغت نہیں دی جاتی؛ اس لئے مردہ جانوروں کی ہڈی کو بغیر دباغت کے بیچنا جائز ہے۔

وإن لم يكن مدبوغا ولا مذبوحا لا ينعقد بيعه؛ لأنه إذا لم يدبغ ولم

يذبح بقيت رطوبات الميتة فيه، فكان حكمه حكم الميتة -إلى- ولهذا يطهر الجلد بالدباغ حتى يجوز بيعه لزوال الرطوبة عنه، ولا رطوبة في هذه الأشياء فلا تكون حراما. (بدائع الصنائع، كتاب البيوع، حكم عظم الخنزير والآدمي، زكريا ٤/ ٣٣٣، كراچی ٥/ ١٤٢)

وأما عظم الميتة فيجوز بيعها. (بدائع زكريا ٤/ ٣٣٣، كراچی ٥/ ١٤٢)

لیکن مردہ جانوروں کی چربی کا استعمال اور اس سے بنے ہوئے گھی کا استعمال اور خرید وفروخت جائز نہیں ہے، ہاں البتہ اس کی ماہیت تبدیل کر کے صابون وغیرہ بنالیا جائے تو اس کا استعمال درست ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسالک/ ۱۴۲، ایضاح المسائل/ ۱۴۷، کفایت المفتی ۲/ ۲۷۹، جدید مطول ۳/ ۴۴۰)

عن ابن عباس -رضي الله عنه- قال: رأيت رسول الله ﷺ جالسا عند الركن، قال: فرفع بصره إلى السماء فضحك، فقال: لعن الله اليهود ثلاثا، إن الله حرم عليهم الشحوم فباعوها وأكلوا أثمانها، وإن الله إذا حرم على قوم أكل شيء حرم عليهم ثمنه. (سنن أبي داؤد، البيوع، باب في ثمن الخمر والميتة، النسخة الهندية ٢/ ٤٩٣، دارالسلام، رقم: ٣٤٨٨)

وعبارة المجتبى جعل الدهن النجس في صابون يفتى بطهارته؛ لأنه تغير والتغير يطهر عند محمد، ويفتي به للبلوى. (شامي، كتاب الطهارة، باب الأنجاس، زكريا ١/ ٥١٩، كراچی ١/ ٣١٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۸/ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۶۵۵۰/۳۵)	۱۴۲۱/۳/۱۸ھ

میتہ بکریوں کی بیع اور اس کی آمدنی کا حکم

سوال [٨٦٩٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: ہماری چالیس بکریاں گاڑی میں آرہی تھیں، ۳۵ر بکریاں گاڑی میں دب کر مر گئیں، ان ۳۵ر بکریوں کو ہم نے غیر قوم میں فروخت کردیا، اس سے ۴۵۰۰ر سو روپئے بنے، بیو پاری کا سارا روپیہ ادا کردیا، یہ رقم ہمارے پاس الگ رکھی ہوئی ہے، ہماری مسجد کے برابر میں دو کمریں ہیں جو ٹوٹی پھوٹی حالت میں ہیں، جن میں بچے وغیرہ پڑھتے ہیں، یہ پیسہ ان کمروں کی تعمیر میں کام آسکتا ہے یا نہیں؟ مسجد کے چاروں طرف دیوار میں کام آسکتا ہے کہ نہیں، یہ پیسہ ہمارے کس مد میں کام آسکتا ہے؟ آپ سے گزارش ہے کہ آپ ہمیں اس بات کا خلاصہ بتادیں، تاکہ ہم اپنے پاس سے یہ رقم جلد سے جلد ادا کردیں، جس کام میں بھی ہو جیسے کام آسکتی ہے آپ ہمیں فوراً جواب لکھ کر بھیج دیں، ہم اپنا پتہ لفافہ اس خط کے ساتھ بھیج رہے ہیں، امید کہ آپ جلد سے جلد ہمیں اس بات کا جواب دیں گے۔

المستفتی: رحمت اللہ خان نصیب اللہ خان مرچنٹ گراؤنڈ مقام و پوسٹ گڑور، ضلع الموڑ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسجد ومدرسہ میں پاک وحلال مال لگانا لازم ہے، مذکورہ بکریوں کی رقم حرام ہے، ان کا پیسہ مسجد ومدرسہ میں اور اس کی ضروریات میں لگانا جائز نہیں ہوگا۔

جابر بن عبداللہ –رضي اللہ عنه– يقول: قال رسول اللہ صلی اللہ عليه وسلم عام الفتح وهو بمكة: إن اللہ ورسوله حرم بيع الخمر والميتة، والخنزير، والأصنام، فقيل له عند ذلک: أرأيت شحوم الميتة، فإنه يدهن بها السفن، ويدهن بها الجلود، ويستصبح بها الناس؟ قال: لا، هن حرام، ثم قال رسول اللہ صلی اللہ عليه وسلم: قاتل اللہ اليهود، إن اللہ حرم عليهم الشحوم، فأجملوه، ثم باعوه، فأكلوا ثمنه. (سنن ابن ماجة، البيوع، باب ما لا يحل بيعه، النسخة الهندية، ص: ۱۵۷، دارالسلام، رقم: ۲۱۶۷)

البيع بالميتة والدم باطل. (هداية ۳/ ۲۳)

أما لو أنفق في ذلک مالا خبيثا ومالا سببه الخبيث والطيب فيكره؛

لأن الله تعالیٰ لا یقبل إلا الطیب. (شامي، کراچی ١/ ٦٥٨، مطلب کلمة لا بأس دلیل علی أن المستحب غیره؛ لأن البأس الشدة، شامي زکریا ٢/ ٤٣١)

مذکورہ رقم کو بلانیت ثواب فقراء کو دینا لازم ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ر شعبان ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۱۹۲۰)

مردار جانوروں کے گوشت کی خرید وفروخت

سوال [۸۶۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مردہ حلال وحرام جانوروں کا گوشت پہلے گدھ کھاجایا کرتے تھے، اب ادھر گدھ ناپید ہے، گوشت سڑ گل کر فضا کو مسموم کردیتا ہے؛ اس لئے زید اس گوشت کو فروخت کردیتا ہے، غیر مسلم خریدار بذریعہ مشین پیس کر اس گوشت کو مچھلیوں کی خوراک بنادیتا ہے، جس سے مچھلیوں کی نشوونما غیر معمولی طور پر بڑھ جاتی ہے، ایسا کاروبار زید کے لئے درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالحمید قاسمی، ناظم مدرسہ اسلامیہ کانکی نارہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کے لئے مردار جانوروں کے گوشت کی فروختگی کا کاروبار ناجائز اور حرام ہے اور اس کا پیسہ بھی حرام ہے، خواہ غیر مسلم ہی سے فروخت کرے، اگر فضا مسموم ہونے کی وجہ سے غیر مسلم کو گوشت دینے کی ضرورت ہے، تو مفت میں دے دیا جائے، اس کی قیمت نہ لی جائے؛ لہٰذا مردار کے گوشت کا کاروبار کرنا قطعاً جائز نہیں ہے۔ اور اس کا پیسہ بھی حلال نہیں ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ. [المائدة: ٣]

عن ابن عباس -رضي الله عنه- قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لعن الله الهيود، حرمت عليهم الشحوم، فباعوها وأكلوها أثمانها،

وإن الله عز وجل إذا حرم على قوم أكل شيء حرم عليهم ثمنه. (مسند أحمد بن حنبل ۱/ ۲۹٤، رقم: ۲٦۷۸، ۱/ ۲٤۷، رقم: ۲۲۲۱)

وبطل بيع ما ليس بمال، كالدم والميتة. (شرح تنوير مع الشامي، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب في تعريف المال، زكريا ۷/ ۲۳۵، كراچى ۵/ ۵۰)

وكذا بيع الميتة والدم، والحر باطل؛ لأنها ليست أموالا، فلا تكون محلا للبيع. (هداية، أشرفي، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، اشرفي ۳/ ٤۹) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۳۸۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/۵/۱۴۲۵ھ

جھٹکے کے بکرے کی آنت کی تجارت کا حکم

سوال [۸٦۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جھٹکے سے ذبح کئے ہوئے جانور کی آنت کی تجارت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ جیسے: جھٹکے کے بکرے کی کھال پر نمک لگا کر تجارت کرتے ہیں، اسی طرح سے بکری کی آنت پر نمک لگا کر رکھ دیں، اس کا پانی خشک ہونے پر اس کو دھو کر اس کی صفائی کر کے تجارت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ کبھی کسی زمانہ میں شاہی مسجد میں ہم نے پوچھا تھا تو گنجائش بتلائی تھی، قریب ۳۵/ یا ۴۰/ سال کا عرصہ گذر گیا؛ لہٰذا کوئی گنجائش ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ظریف قریشی، اصالت پورہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جھٹکے کے جانور مردار کے حکم میں ہیں اور مردار کے سارے اعضاء ناپاک ہوتے ہیں۔ اوران کی تجارت جائز نہیں ہوتی ہے؛ البتہ جو اعضاء دباغت کے ذریعہ سے پاک کر کے خارجی استعمال کے لائق ہوتے ہیں، ان کی دباغت کے

بعد خارجی استعمال کے لئے تجارت جائز ہے، مثلاً کھال دباغت کے بعد پاک تو ہو جاتی ہے؛ لیکن کھانے کے لائق نہیں ہوتی؛ بلکہ خارجی استعمال کے لائق ہوتی ہے، اس کی تجارت جائز ہے، اسی طرح اوجھڑی دباغت کے بعد برتن اور مشکیزہ کے طور پر استعمال کے لائق ہوسکتی ہے، اس کو بھی اگر دباغت کے ذریعہ بالکل سکھا کر برتن یا مشکیزہ بنالیا جائے اور مشکیزہ کے طور پر استعمال کے لائق ہو تو اس کی بھی تجارت جائز ہے؛ لیکن سوال نامہ میں مردار کی آنتوں کی دباغت کی بات نہیں ہے؛ بلکہ آنتوں کو دوسری جگہ کھانے کے استعمال میں لانے کے لئے سپلائی کیا جاتا ہے اور سڑنے سے حفاظت کے لئے نمک وغیرہ کا استعمال کیا جاتا ہے، اور یہ دباغت کے دائرہ میں داخل نہیں ہے؛ اس لئے یہ ناپاک ہی رہیں گی؛ لہٰذا اس طرح مردار کی آنتوں کی تجارت جائز نہیں ہے۔

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: رأيت رسول الله ﷺ جالسا عند الركن، قال: فرفع بصره إلى السماء فضحك، فقال: لعن الله اليهود ثلاثا، إن الله حرم عليهم الشحوم فباعوها وأكلوا أثمانها، وإن الله إذا حرم على قوم أكل شيء حرم عليهم ثمنه. (سنن أبي داؤد، البيوع، باب في ثمن الخمر والميتة، النسخة الهندية ٢/ ٤٩٣، دارالسلام، رقم: ٣٤٨٨)

وكذا لو أصلح المثانة ودبغها وجعل فيها اللبن أو السمن جاز، وكذا الكرش، وكل ما يمنع عن الفساد، ويخرج عن حد الأكل، فهو دباغ كان ذلك بالتراب أو الشمس ونحوهم. (قاضيخان، كتاب الطهارة، فصل في النجاسة التي نصيب الثوب، زكريا جديد ١/ ١٨، وعلى هامش الهندية ١/ ٢٥)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍شعبان ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۷۷۲/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۸/۶ھ

خون کی مصنوعات کی تجارت

سوال [۸۶۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جانوروں کے خون کی مصنوعات اوران کی تجارت جائز ہے یانہیں؟

المستفتی: نیاز احمد فاروقی حلال ٹرسٹ جمعیۃ علماء ہند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جانوروں کے خون کی تجارت جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ نص قطعی سے دمِ مسفوح کی حرمت ثابت ہے۔ آیت کریمہ ملاحظہ فرمائیے:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ. [المائدة: ۳]

قُلْ لَا اَجِدُ فِيْ مَا اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ اِلَّا اَنْ يَكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَسْفُوْحًا. [سورة الأنعام، آیت: ۱٤٥]

البتہ خون کی مصنوعات جن میں تبدیل ماہیت ہوکر دم سائل کا رنگ وبومزہ اور سیلانیت ختم ہوکر اس کی شکل بدل کر شئ جامد اور شئ آخر بن جائے، تو انقلابِ ماہیت کی وجہ سے پاک ہوجاتی ہیں، پھر اس کی تجارت وغیرہ بھی جائز ہوجاتی ہے، اس کے لئے بدائع کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

إن النجاسة لما استحالت وتبدلت أوصافها ومعانيها خرجت عن كونها نجاسة؛ لأنها اسم لذات موصوفة، فتنعدم بانعدام الوصف. (بدائع، كتاب الطهارة، الدباغة، كراچی ۱/۸۵، زكريا ۱/ ۲٤۳، الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹر نيشنل ديوبند ۱/ ۱۰۰)

''فتح القدیر'' اور ''غنیۃ المستملی'' میں اس طرح کی عبارت ہے، ملاحظہ فرمائیے:

إن استحالة العين تستتبع زوال الوصف المرتب عليها. (فتح القدير

زكريـا ١/ ٢٠٢، دارالـفـكـر ١/ ٢٠١، الـمـوسـوعة الفقهية ٣/ ٢١٣، ٢٩/ ١٠٨، غنية المستملي أشرفيه، ص: ١٨٩)

اس سلسلے میں شامی کی عبارت اس طرح ہے:

لا يرد طهارة ...... الـدم بـصيرورته مسكا؛ لأن عين الشيء حقيقته، وحـقيقة الخمر والدم ذهبت وخلفتها أخرى، وإنما يرد ذلک لو قلنا ببقاء حـقيقة الخمر والدم مع الحكم بطهارتها. (شـامي، كتاب الطهارة، باب الأنجاس، مطلب في العفو عن طين الشارع، زكريا ١/ ٥٣٦، كراچی ١/ ٣٢٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ ذیقعدہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۶۹۵)

خون کی بیع کا حکم

سوال [۸۷۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شہر بمبئی میں ہم قریش برادری کے درمیان ایک مسئلہ درپیش ہے، ہم لوگ آپ سے اس کی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس سے پہلے کہ ہم لوگ اپنا مسئلہ رکھیں پہلے آپ اطمینان سے ہماری مشکلات کو ایک نظر دیکھ لیجئے جو مندرجہ ذیل ہیں: ہم لوگ بمبئی کارپوریشن کے ماتحت کام کرتے ہیں، گونڈی دیونار میں ایک مذبح کارپوریشن نے بنوایا ہے، ہماری برادری کے لوگ ہندوستان کے کونے کونے سے جانور لاتے ہیں، ان کو لانے کے لئے ہم لوگوں کو جو دقتیں ہوتی ہیں وہ ہم ہی لوگ جانتے ہیں، اسٹیٹ اسٹیٹ میں لاری کے کرایہ کے علاوہ چنگی جو حکومت کا حق ہے، وہ دیتے ہیں، ہمارے پاس لائسنس ہے، اس کے لئے رشوت دینی پڑتی ہے، اگر نہ دیں تو پریشانی ہوتی ہے، جانور مر جانے کا ڈر لگتا رہتا ہے: اس لئے رشوت دینی پڑتی ہے، وہاں سے نکلے تو راستہ میں آر ٹی او پکڑتے ہیں، ان کو بھی رشوت

دینی پڑتی ہے۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ آپ کے پاس لاری پرمٹ ہے، تو آپ کیوں دیتے ہیں؛ اس لئے دینا پڑتا ہے کہ گاڑی پرمٹ صرف نو جانوروں کا ہوتا ہے، اگر نو جانور لائیں گے تو لاری کا کرایہ ان جانوروں پر زیادہ ہوجاتا ہے؛ اس لئے اس میں جانور زیادہ لاتے ہیں، اگر جانور زیادہ نہ لائیں تو جانور کی قیمت بڑھ جائے گی، تو جانور نہیں بکے گا، جتنے وہاں بچتے بچاتے نکلے تو گارے ہتھیار مل جاتے ہیں، وہ تو لاری ہی روک لیتے ہیں، جانور پکڑ لیتے ہیں، لاری کھالی کرواکر جانور نکال دیتے ہیں، ہم لوگ پولیس کی مدد مانگتے ہیں، پولیس آتی ہے مدد کرتی ہے، مگر ان لوگوں کا کچھ نہیں کرتی ہے، کہتی ہے کہ وہ بھی ٹھیک کرتے ہیں جیسے جیسے کرکے جانور پکڑتے ہیں اس میں بھی کبھی جانور گم ہوجاتے ہیں، وہ ہمارا نقصان ہوجاتا ہے، پولیس آتی ضرور ہے، مگر رشوت لے کر آتی ہے نہ دیں تو وہ کیوں آتی، اگر نہ دیں تو معلوم پڑا کہ جانور سب غائب ہوگئے، تو وہ دینا بھی ضروری ہوجاتا ہے۔ (مرتا کیا نہ کرتا) چلئے وہاں سے نکلے تو بمبئی کے چنگی خانہ پر آئے وہاں پر بھی یہی ہوتا ہے، چنگی بھریئے، کاغذ لیجئے، پھر سب سے پہلے کاغذ والا چپراسی رشوت لیتا ہے، وہاں سے نکلے تو خاکی ڈریس بلو ڈریس پٹری والے میونسپلٹی والے اسٹاف آرٹی او والے واٹریس والے سب چنگی خانہ کے ناکہ ہی پر ملتے ہیں، اس لئے ان لوگوں کو بھی دینا ہی پڑتا ہے، کیوں کہ جانور کئی گھنٹوں سے لاری میں بند رہتے ہیں، وہ لوگ جب حیران کرتے ہیں تو ہم لوگوں کو ڈر لگتا ہے کہیں اندر ہی اندر ایک دو جانور مر نہ جائیں؛ اس لئے ہم پر ضروری ہوجاتا ہے کہ ان لوگوں کو کچھ کھلائیں، کہنے کو تو لائسنس ہے، دیونار میں جانور کاٹتے ہیں، مگر حکومت ہم لوگوں کی کوئی سپورٹ بھی نہیں کرتی ہے، پھر ہم لوگ گورنمنٹ سے پرمیشن یافتہ آدمی ہوتے ہیں۔ خیر جیسے تیسے کرکے ہماری گاڑی دیونار کے گیٹ پر آتی ہے، معلوم پڑتا ہے کہ ستیہ گرہ والے مورچہ لگا کر بیٹھے ہیں، گاڑی اندر ہونے نہیں دیتے ہیں، پھر یہاں پر بمبئی پولیس کی ضرورت ہوتی ہے، ان لوگوں کو بلوایا جاتا ہے، وہ آتے ہیں، ان کو پکڑتے ہیں، پولیس چوکی لے جاتے ہیں، جب ہماری گاڑی اندر ہوتی ہے، یہاں پر بھی وہی بات پولیس والوں کو ہم قریش برادری کی طرف

سے ہفتہ بندھا ہوا ہے، وہ ہر ہفتہ ہم لوگ جمع کر کے چوکی میں بھجوا دیتے ہیں، اگر نہ دیں تو مصیبت ہوتی ہے۔ جیسے وہاں سے نکلے دیونار کے اندر داخل ہوگئے، یہاں بھی مصیبت ہے، سب سے پہلے گیٹ پر جانوروں کی پاؤتی بنوائی جاتی ہے، ان کا ٹیکس ادا کیا جاتا ہے، اس کے علاوہ رشوت بھی دی جاتی ہے، جانور اگر تندرست وخوبصورت ہوا تو وہ لوگ پاس ہی نہیں کرتے؛ اس لئے ان کو بھی دینا ضروری ہے اور دیا جاتا ہے۔ خیر وہ اندر آ گیا، بازار لگا ہوا ہوتا ہے، اب آپ اندازہ لگائیے کہ جانور پر کتنا وزن ہوجاتا ہے، جانور کی خرید وفروخت چالو ہوجاتی ہے، اگر جانور کم آئیں تو جانور مہنگے بکتے ہیں، زیادہ آ گئے تو سستے بکتے ہیں، اس میں بیوپاریوں کا نفع نقصان ہوتا ہے، اسی طرح کاٹنے والوں کو بھی ہوتا ہے، یہ سب رہی ہماری مصیبت جس کا ہم نے مختصر حال بیان کردیا ہے، آپ آگے سمجھ سکتے ہیں، اب ہم آتے ہیں اپنے اصل مقصد کی طرف:

ہم قریش برادری بہت دنوں سے کارپوریشن لڑ رہے تھے، خون کے بارے میں جس میں ہم لوگ جیت گئے ہیں، دیونار میں جو جانور ذبح کئے جاتے ہیں، ان کا خون کارپوریشن لیتی ہے اور اس کو فروخت کردیتی ہے، جس کی سالانہ انکم ۱۵۰۰۰۰۰/لاکھ کے قریب ہے، ہم سب سمجھتے ہیں کہ یہ خون ہمارے لئے حرام ہے، اس کا پیسہ بھی حرام ہے، مگر اتنی بڑی رقم ہم حکومت کو چھوڑنا نہیں چاہتے ہیں، جب کہ حکومت ہم لوگوں کو اتنا پریشان کرتی ہے اور مصیبت میں اتنا روپئے اس کو دے دیا جائے، جب کہ ہم لوگ یہ کیس جیت گئے ہیں، اب ان روپیوں کو کس کام میں لایا جائے، یہی آپ سے معلوم کرنا چاہتے ہیں، برائے کرم تشفی بخش جواب سے نوازکر عنداللہ ماجور ہوں۔ والسلام

المستفتی: حاجی محمد میاں قدرت اللہ قریشی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خون کا فروخت کرنا مسلمانوں کے لئے حرام اور بیع شرعاً باطل ہے۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ. [المائدة: ۳]

بطل بيع ما ليس بمال، كالدم المسفوح، والميتة. (تنوير مع الدر، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب في تعريف المال، زكريا ۷/ ۲۳۵، کراچی ۵/ ۵۰)

اور فروخت کر کے جو رقم ہاتھ میں آتی ہے اس کا استعمال حرام ہے، اس کو بلانیت ثواب صدقہ کر دینا واجب ہے۔ اور جبری رشوت میں دینا ہے تو حیلہ تملیک کے بعد دی جا سکتی ہے۔

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد، كالبيوع الفاسدة، والاستئجار على المعاصي والطاعات، أو بغير عقد، كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه، ولكن إن أخذه من غير عقد –إلى قوله– يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (وقوله) وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فإما إن ملكه بعقد فاسد، أو حصل له بغير عقد ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، وليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور قديم ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلاميه بيروت ۱/ ۳۶۹، رقم: ۵۹، وهكذا في الهندية، زكريا قديم ۵/ ۳۴۹، جديد ۵/ ۴۰۴، شامي، زكريا ۹/ ۵۵۳، کراچی ۶/ ۳۸۵، البحر الرائق، زكريا ۹/ ۳۶۹، کوئٹه ۸/ ۲۰۱، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ۶/ ۲۷، زكريا ۷/ ۶۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ر شوال ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۰۱۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳ر شوال ۱۴۱۰ھ

خون سے بنے مچھلیوں کے دانہ کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۷۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: دور حاضر میں خون سے گولی بنائی جاتی ہیں، چاہے وہ خون بیل کا ہو یا بھینس کا یا بکری کا اور وہ خون سے بنی ہوئی گولی مچھلیوں کو کھلائی جاتی ہیں، تو اس خون سے بنی گولی کی تجارت جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو کیوں؟

المستفتی: محمد عزیز الرحمٰن مغربی بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گائے، بیل، بھینس اور بکری کے خون سے بنی ہوئی گولیاں جن مچھلیوں کو کھلائی جاتی ہیں وہ مچھلیاں بلا کراہت جائز اور حلال ہیں۔ دمِ مسفوح کی تجارت ناجائز اور حرام ہے؛ لیکن اگر بطور کھاد اس کو استعمال کرنے کے لئے تجارت کی جائے تو اس کی گنجائش ہے، جیسا کہ سرقین اور انسان کے براز کی تجارت کھاد کے طور پر جائز ہے۔

سئل علي بن أحمد ويوسف بن محمد عن السمكة إذا أخذت وأرسلت في الماء النجس، فكبرت فيه؟ فقال: لا بأس بأكلها للحال.

(التاتارخانية ١٨/ ٤٩٢، رقم: ٢٩٧١٠)

ولا يحل حيوان مائي إلا السمک الذي مات بآفة ولو متولدا في ماء نجس. (وتحته في الشامية) فلا بأس بأكلها للحال لحله بالنص وكونه يتغذى بالنجاسة لا يمنع حله. (الدرالمختار مع الشامي، كتاب الذبائح، زكريا ٩/ ٤٤٤، كراچی ٦/ ٣٠٦)

كره بيع العذرة لا السرقين، وقال الشافعي رحمه الله: لا يجوز بيع السرقين أيضا؛ لأنه نجس العين، فلا يكون مالا فلا يجوز بيعه كالعذرة وجلدالميتة قبل الدبغ، ولنا أن المسلمين تمولوا السرقين، وانتفعوا به في سائر البلدان والأعصار من غير نكير، فإنهم يلقونه في الأراضى لاستكثار الريع، بخلاف العذرة؛ لأن العادة لم تجر بالانتفاع بها، وإنما ينتفع بها

مخلوطة برماد وتراب غالب عليها بالإلقاء في الأرض، فحينئذ يجوز بيعها، والصحيح عن أبي حنيفة أن الانتفاع بالعذرة الخالصة جائز. (تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٦، زكريا ٧/ ٥٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ربیع الاول ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۹۸۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۴/۴ھ

بیع سرطان کا حکم

سوال [۸۷۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بیع سرطان ازروئے شرع متین جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: خدا بخش گوبند پور، ۲۴؍ پرگنہ مغربی بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: اگرچہ فقہ کی بعض جزئیات سے بیع سرطان کا عدم جواز معلوم ہوتا ہے؛ لیکن وہاں پر کلیہ بھی موجود ہے کہ جو چیز دوا کے لئے منتفع ہو اس کی خرید وفروخت جائز ہے۔ اور کیکڑے کی پشت دواؤں میں استعمال ہوتی ہے؛ لہٰذا اس کی بیع جائز ہوگی؛ البتہ کھانا جائز نہیں ہے۔

ويجوز بيع جميع الحيوانات سوى الخنزير، وهو المختار. (هندية، البيوع، الباب التاسع، الفصل الرابع في بيع الحيوانات، زكريا قديم ٣/ ١١٤، جديد ٣/ ١١٥)

يجوز بيع الحيات إذا كان ينتفع بها للأدوية، وما جاز الانتفاع بجلده أو عظمه، أي من حيوانات البحر أو غيرها. (شامي، مطلب في بيع دودة القرمز، زكريا ٧/ ٢٦٠، كراچی ٥/ ٦٨)

فالحاصل أن جواز البيع يدور مع حل الانتفاع. (شامي، زكريا ٧/ ٢٦٠،

کراچی ۵/ ٦٨، الفتاوی التاتارخانية، زکریا ۸/ ۳٤۰، رقم: ۱۲۱۲٥، المحيط البرهاني، المجلس العلمی ۹/ ۳۳۲، رقم: ۱۱۹۹۳، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۱٥۱، مصري قديم ۲/ ۱۰۸، الموسوعة الفقهية الكويتية ۹/ ۱٥٥، ۱۷/ ۲۸۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱/۲/۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۶۰۱۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۲/۱۴۲۰ھ

خنزیر کے بالوں کے ساتھ دوسرے جانور کے بالوں سے برش بنانا

سوال [۸۷۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خنزیر (سور) کے بالوں کا برش بنانا اس صورت میں کہ اس میں گائے، بھینس، گھوڑا وغیرہ کے بالوں کی آمیزش بھی ہو یا کثیر مقدار خنزیر کے بال کے علاوہ دوسرے بالوں کی ہو، تو از روئے شرع حرام ہے یا حلال؟

المستفتی: احسان علی صدیقی، اصغر منزل، شیر کوٹ بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: خنزیر کے بال نجس العین ہیں، شدت ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے دوسرے جانوروں کے بالوں کی آمیزش کے ساتھ بھی خنزیر کے بالوں سے برش وغیرہ بنانا حرام ہے۔ اور تیار کردہ برش وغیرہ شرعاً ناپاک ہوگا۔

وأما الخنزير فشعره، وعظمه، وجميع أجزائه نجسة. (البحرالرائق، كتاب الطهارة، زكريا ۱/ ۱۹۱، كوئٹه ۱/ ۱۰۷، هداية، أشرفى ۳/ ۳۹، مجمع الأنهر مصري قديم ۱/ ۳۲، دارالكتب العلمية بيروت ۱/ ٥۱)

وشعر الميتة غير الخنزير على المذهب (تحته فى الشامية) أي على قول أبي يوسف الذي هو ظاهر الرواية أن شعره نجس، وصححه في

البدائع، ورجحه في الاختيار. (الدر مع الرد، كتاب الطهارة، باب المياه، مطلب في أحكام الدباغة، زكريا ١/ ٣٥٩، ٣٦٠، كراچی ١/ ٢٠٦، بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٣٣٣، كراچی ٥/ ١٤٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۰۲۹)

فحش کتابیں اور خنزیر کی چربی سے بنے چپس فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۷۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کچھ لوگ اپنی دوکانوں میں برہنہ تصویروں والی کتابیں، خنزیر کے خوشبو والے آلو کے چپس اور دوسری چیزیں جو مسلمان کے لئے حلال نہیں ہے فروخت کرتے ہیں۔

المستفتی: محمد ساجد قاسمی، بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: برہنہ تصویروں کو رکھنا اور فروخت کرنا سخت معصیت ہے، اس کا ترک کرنا لازم ہے، خنزیر کا کوئی بھی جز وفروخت کرنا جائز نہیں، اس کا پیسہ بھی حلال نہیں ہے، مسلمانوں کو اس قسم کی حرکات سے باز رہنا لازم ہے۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– أن رسول الله ﷺ قال: إن الله حرم الخمر وثمنها، وحرم الميتة وثمنها، وحرم الخنزير وثمنه. (سنن أبي داؤد، باب في ثمن الخمر والميتة، النسخة الهندية ٢/ ٤٩٣، دارالسلام، رقم: ٣٤٨٥، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ١١/ ١٥٢، رقم: ١١٣٣٥، سنن الدار قطني، كتاب البيوع، دارالكتب العليمة بيروت ٣/ ٧، رقم: ٢٧٩٢، المعجم الأوسط، دارالفكر ١/ ٤٦، رقم: ١١٦)

وأما بيع الخمر والخنزير ان قوبل بالدين كالدراهم والدنانير، فالبيع باطل.
(هداية، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، أشرفی دیوبند ۳/ ٤٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍محرم ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۱۰۶)

ادھیا پر بکری دینا

سوال [۸۷۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے بکر کو ایک بکری خرید کر دی، تا کہ بڑھے (یعنی زیادہ ہو) اور اگر بچہ دے گی تو اس میں دونوں کا آدھا حصہ ہوگا، زید کے لئے ایسا کرنا شریعت کے اعتبار سے کیسا ہے؟ جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: علی مرتضی قاسمی، دارالشفاء اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سوال نامہ میں جو شکل بتائی گئی ہے، اس کو عوام میں ادھیا پر دینے کا معاملہ کہا جاتا ہے۔ زید کا اس طرح معاملہ کرنا شرعاً جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ اجارۂ فاسدہ ہے۔ اور اگر زید نے اس طرح کا معاملہ کرلیا ہے اور بچہ بھی پیدا ہوگیا ہے، تو وہ جانور اور بچہ بھی زید کی ملکیت میں شمار ہوں گے۔ اور زید پر بکر کو چارہ کی قیمت اور جو بکری پالنے کی عام طور پر اجرت ہوتی ہے اس کا دینا واجب ہوگا؛ البتہ حضرات فقہاء نے جواز کی ایک شکل بتلائی ہے کہ مالک جانور کی مناسب قیمت لگا کر نصف حصہ پرورش کرنے والے کے ہاتھ فروخت کردے، پھر اس کی قیمت معاف کردے، تو ایسی صورت میں جانور دونوں کے درمیان مشترک ہوجائے گا؛ اس لئے اس کی نسل وآمدنی بھی دونوں کے درمیان نصف نصف ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر/ ۱۱۵)

وعلى هذا إذا دفع البقرة إلى إنسان بالعلف ليكون الحادث بينهما نصفين، فما حدث فهو لصاحب البقرة، ولذلک الرجل مثل العلف الذي علفها وأجر مثله فيما قام عليها، والحيلة في ذلک أن يبيع نصف البقرة من ذلک الرجل بثمن معلوم حتى تصير البقرة وأجناسها مشتركة بينهما فيكون الحادث منهما على الشركة. (هندية، كتاب الشركة، الباب الخامس في الشركة الفاسدة، زكريا قديم ٢/ ٣٣٥، جديد ٢/ ٣٣٦، حاشية چلپی، مكتبه إمداديه ملتان ٤/ ٤٩، زكريا ٤/ ٣٧٣)

وعلى هذا دفع البقرة بالعلف ليكون الحادث بينهما نصفين، فما حدث فهو لصاحب البقرة وللآخر مثل علفه وأجر مثله. (شامي، كتاب الشركة، مطلب يرجح القياس، زكريا ٦/ ٥٠٤، كراچی ٤/ ٣٢٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم صفر ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۶۱۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۲/۱۴۳۳ھ

چار من غلہ پر زمین کاشتکاری کے لئے دینا

سوال [۸۷۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص اپنی زمین اس شرط پر دیتا ہے کہ مثلاً چار من غلہ دے دو اور یہ زمین میں کاشتکاری فلاں مہینے تک کرتا ہے، اس میں جتنا بھی غلہ پیدا ہو جائے وہ تمہارا ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد شمیم اختر ارریاوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سوال میں جو شکل مذکور ہے وہ قطعاً ناجائز ہے۔ اور جواز کی شکل یہ ہے کہ پیداوار کی تقسیم حصہ کے اعتبار سے طے کریں، اس طرح کہ دونوں کو نصف

نصف ملے گا، ایک کوایک تہائی اور دوسرے کو دوتہائی ملے گا۔(مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۹/۳۱۲، جدید زکریا ۹/۳۱۰)

وأن يكون الخارج شائعا بينهما تحقيقا لمعنى الشركة، فإن شرطا لأحدهما قفزانا مسماة فهي باطلة؛ لأن به تنقطع الشركة؛ لأن الأرض عساها لا تخرج إلا هذه القدر، وصار كاشتراط دراهم معدودة لأحدهما في المضاربة. (هداية، كتاب المزارعة، أشرفي ديوبند ٤/ ٤٢٦)

ہاں ایک شکل یہ ہے کہ غلہ کے بجائے روپئے کے عوض معاملہ کیاجائے تو اس کی گنجائش ہے۔

قال: سألت رافع بن خديج عن كراء الأرض بالذهب والورق، فقال: لابأس به. (مسلم شريف، كتاب البيوع، باب كراء الأرض، النسخة الهندية ٢/ ١٣، بيت الأفكار، رقم: ١٥٤٧، صحيح البخاري، كتاب الحرث والمزارعة، باب كراء الأرض بالذهب والفضة، رقم: ٢٢٨٨، ف: ٢٣٤٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍رجب ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۲۷۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴؍۷؍۱۴۲۰ھ

زمین کی فروختگی کی ایک شکل

سوال [۸۷۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے اپنی زمین حامد کے ہاتھ فروخت کردی، خرید نے والے حامد کے دریافت کرنے پر کہ زمین جومیں نے آپ سے خریدی ہے، وہ کس طرف ہے، آپ اس کی تعیین کردیں، میں نے حامد کونقشہ دے کر کہا کہ کہیں ہوگی، تم پٹواری کے ذریعہ اسے تلاش کرلو، چنانچہ حامد نے پٹواری کے ذریعہ زمین تلاش کی، مگر اس کی تعیین نہیں ہوسکی، گو مجھے

یقین تھا کہ زمین اسی موضع میں ہے، ابھی زمین کی تعیین نہیں ہوسکی تھی کہ اسی درمیان میں میرے ہی مشورہ سے حامد نے مذکورہ زمین خالد کے ہاتھ فروخت کردی، واضح رہے کہ حامد نے مذکورہ زمین اپنی ایک متعین زمین کے ساتھ فروخت کی ہے، جب خالد نے زمین کی تعیین چاہی تو حامد نے اپنی متعین زمین کی تو تعیین کردی، مگر مذکورہ زمین کے بارے میں وہی جواب دیا جو میں نے حامد کو دیا تھا، یعنی یہیں کہیں ہوگی تم نقشہ لواور پٹواری کے ذریعہ اس کی تعیین کرالو۔عرض یہ ہے کہ حامد نے جو مجہول زمین مجھ سے خریدی وہ بیع تام ہوئی کہ نہیں اور جو بیع حامد نے خالد کو کی اس کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد زبیر عباسی جنرل اسٹور، چوک گونڈہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں عقد اول اور عقد ثانی دونوں ناتمام ہیں؛ اس لئے کہ دونوں میں مشتری کے حق میں مبیع مجہول ہے اور اس طرح جہالت کہ جس کی وجہ سے مبیع کو مشتری کے ضمان میں منتقل کرنا اور مشتری کے لئے اس میں تصرف کرنا ممکن نہ ہو جائز نہیں ہے، اس سے بیع منعقد نہیں ہوتی۔

وإن لم یذکر الحدود ولم یعرفه المشتري …… وجهل المشتري یمنع (بزازیة، کتاب البیوع، الفصل الثالث فی ما یجوز بیعه وما لایجوز جدید زکریا ۱/ ۲۳۵، وعلی هامش الهندیة زکریا ٤/ ۳۷۲)

إذ لم یعلم أن العشرة من أي جانب من الدار، فیکون مجهولا جهالة تفضي إلی المنازعة. (عنایة شرح هدایة، دارالفکر بیروت ٦/ ۲۷۵، کوئٹه ٥/ ٤۷۹، زکریا ٦/ ۲٥٥) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷رمحرم الحرام ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۱۲۱)

زمین کی فروختگی کی ایک ناجائز شکل

سوال [۸۷۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے اپنی زمین حامد کے ہاتھ فروخت کردی، خریدنے والے حامد کے دریافت کرنے پر یہ زمین جو میں نے آپ سے خریدی ہے وہ کس طرف ہے؟ آپ اس کی تعیین کردیں، میں نے حامد کو نقشہ دے کر کہا کہ یہیں کہیں ہوگی، تم پٹواری کے ذریعہ اسے تلاش کرلو، چنانچہ حامد نے پٹواری کے ذریعہ زمین تلاش کی، مگر اس کی تعیین نہیں ہوسکی، گو مجھے یقین تھا کہ زمین اسی موضع میں ہے، ابھی زمین کی تعیین نہیں ہوسکی تھی کہ اسی درمیان میں میرے ہی مشورہ سے حامد نے مذکورہ زمین خالد کے ہاتھ فروخت کردی، واضح رہے کہ حامد نے مذکورہ زمین اپنی ایک متعین زمین کے ساتھ فروخت کی ہے، جب خالد نے زمین کی تعیین چاہی تو حامد نے اپنی متعین زمین کی تو تعیین کردی، مگر مذکورہ زمین کے بارے میں وہی جواب دیا جو میں نے حامد کو دیا تھا، یعنی یہیں کہیں ہوگی، تم نقشہ لو اور پٹواری کے ذریعہ اس کی تعیین کرالو۔ عرض یہ ہے کہ حامد نے جو مجہول زمین مجھ سے خریدی وہ بیع تام ہوئی کہ نہیں اور جو بیع حامد نے خالد کو کی اس کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: مولانا محمد یحییٰ صاحب، استاذ شعبہ عربی مدرسہ فرقانیہ، گونڈہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ صورت میں چونکہ نفس بیع متعین نہیں ہے، کہ وہ کہاں واقع ہے، تاکہ مشتری اس کو اپنے ضمان میں لے کر تصرف کرسکے، اسی طرح اس نے جو فروخت کیا ہے، اس میں بھی ایسی جہالت ہے کہ بائع کے لئے مشتری کے ضمان میں دینا اور مشتری کے لئے اس میں تصرف کرنا ممکن نہیں ہے؛ اس لئے آپ کا حامد کے ہاتھ فروخت کرنا اور حامد کا خالد کے ہاتھ فروخت کرنا دونوں معاملہ ناجائز اور فاسد ہے۔ اور واجب الاسترداد ہے؛ البتہ حامد نے جو اپنی متعین زمین فروخت کی ہے، اس کی قیمت الگ سے لگائی جائے تو درست ہوسکتا ہے۔

اشترى أرضا وذكر حدودها لا ذرعها طولا وعرضا جاز، وإذا عرف المشتري الحدود لا الجيران يصح، وإن لم يذكر الحدود ولم يعرفه المشتري يمنع. (بزازية، كتاب البيوع، الفصل الثالث فيما يجوز بيعه وما لا يجوز، جديد زكريا ١/ ٢٣٥، وعلى هامش الهندية، زكريا ٤/ ٣٧٢، شامي، مطلب ما يبطل الإيجاب سبعة، كراچی ٤/ ٥٢٩، زكريا ٦/ ٤٩)

إذ لم يعلم أن العشرة من أي جانب من الدار، فيكون مجهولا جهالة تفضي إلى المنازعة. (عناية مع الفتح، دارالفكر بيروت ٦/ ٢٧٥، كوئٹه ٥/ ٤٧٩، زكريا ٦/ ٢٥٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۵۰۶۴)

قسطوار زمین کی خرید وفروخت کرنے والی کمپنی کا ممبر بننا

سوال [۸۷۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک کمپنی ہے جو زمینوں کی خرید وفروخت کرتی ہے اور وہ لوگوں کو اپنا ممبر بنا کر ایک متعین رقم قسط وار وصول کرتی ہے، پورا ہوجانے کے بعد اس کو وہ زمین موعود دی جاتی ہے، اگر وہ نہ لینا چاہے تو اس کی قیمت لگا کر رقم دی جاتی ہے، ظن غالب نفع کا ہوتا ہے۔

دوسری اسکیم یہ ہوتی ہے کہ جو ممبران کمپنی کے لئے ایجنٹ کا کام کرتے ہیں، ان کو کمیشن دیتی ہے اور ایجنٹ نے جن لوگوں کو ایجنٹ بنایا ہے، ان کی ممبر سازی پر بھی اول کو کمیشن دیتی ہے، جو سب متعین ہوتا ہے، اسی طرح سلسلہ وار سلسلہ الی غیر النہایہ چلتا رہتا ہے، جسے ''نیٹ ورک'' سسٹم کہا جاتا ہے۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں ذکر کردہ صورت کے مطابق مذکورہ کمپنی کا

لوگوں کو اپنا ممبر بنا کر متعینہ زمین قسطوں پر فروخت کرنا اور تمام اقساط کی ادائے گی کے بعد زمین موعود خریدار کے حوالہ کرنا اس حد تک معاملہ ازروئے شرع جائز ہے۔

البيع مع تأجيل الثمن وتقسيطه صحيح. (شرح المجلة رستم باز، اتحاد ديوبند ١/ ١٢٥، رقم المادة: ٢٤٥)

ولو لم يكن الأجل مشروطا في العقد ولكنه منجم معتاد قيل: لا بد من بيانه؛ لأن المعروف كالمشروط. (هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، قديم ٣/ ٥٨، جديد أشرفي ديوبند ٣/ ٧٤)

وللبائع حبس المبيع إلى قبض الثمن ولو بقي منه درهم. (شامي، مطلب في حبس المبيع لقبض الثمن الخ، كراچى ٤/ ٥٦١، زكريا ٧/ ٩٣)

لیکن معاملہ کی دوسری صورت کہ قسطوں کی ادائے گی کے بعد اگر خریدار کسی وجہ سے زمین نہ لینا چاہے تو اسے زمین کی قیمت لگا کر رقم دی جاتی ہے، وضاحت طلب ہے چنانچہ اگر معاملہ اور ایجاب وقبول کے وقت کاغذی کارروائی کرتے ہوئے اس بات کی صراحت کی جاتی ہے کہ اگر قسطوں کی ادائے گی کے بعد تم زمین نہ لینا چاہو تو تمہیں اس کی موجودہ قیمت واپس مل جائے گی اور اس شرط کے ساتھ معاملہ طے ہوتا ہے، تو اس طرح معاملہ کرنا شرعاً جائز نہیں ہے؛ لیکن اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ ایجاب وقبول کے وقت اس کی صراحت نہ ہو؛ بلکہ مطلق معاملہ کیا جائے، پھر بعد میں خریدار کسی وجہ سے زمین نہ لینا چاہے تو اس کی ضرورت ومجبوری کا خیال کرتے ہوئے قسطوار جتنی رقم ادا کی جاچکی ہے اتنی رقم خریدار کو واپس کردیں اور زمین اپنی ملکیت میں رکھیں، تو یہ معاملہ اقالہ میں داخل ہوکر درست ہوجائے گا۔ اور اگر ادا شدہ قسطوں کا لحاظ نہ کرتے ہوئے موجودہ قیمت کا اعتبار کرکے وہ زمین خریدار سے خرید لی جائے تو یہ بھی جائز ہے؛ اس لئے کہ یہ از سرنو خرید وفروخت کا معاملہ ہے۔

أخرج الطبراني حديثا طويلا طرفه هذا: حدثني عمر بن شعيب عن أبيه عن جده، أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن بيع وشرط. (معجم

الأوسط، دارالفكر بيروت ۳/ ۲۱۱، رقم: ٤٣٦١، مجمع الزوائد، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٨٥، نصب الراية، كراچی ٤/ ١٧)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أقال مسلما، أقاله الله عثرته يوم القيامة. (ابن ماجة، أبواب التجارات، باب الإقالة، النسخة الهندية/ ١٥٩، دارالسلام، رقم: ٢١٩٩، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب فضل الإقالة، النسخة الهندية ٢/ ٤٩٠، دارالسلام، رقم: ٣٤٦٠)

الإقالة جائزة في البيع بمثل الثمن، فإن شرط أكثر منه أو أقل، فالشرط باطل ويرد مثل الثمن الأول. (هداية أشرفی ۳/ ٦٩)

زاد في الموسوعة الفقهية: سواء كانت الإقالة قبل القبض أو بعده، وسواء كان المبيع منقولا أو غير منقول. (الموسوعة الفقهية ٥/ ٣٢٧)

كل شرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين أو للمعقود عليه وهو من أهل الاستحقاق يفسده. (هداية، كراچی ٥/ ١١٦، أشرفي ديوبند ٣/ ٥٩)

وإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع، ولا خيار لواحد منهما. (هداية، كراچی ٥/ ٦، أشرفي ديوبند ٣/ ٢٠، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ١/ ٢٢٦، دارالكتاب ديوبند ١/ ٢٢٠، تاتارخانية، زكريا ٨/ ٢٢٢، رقم: ١١٧١٤)

(۲) ممبر سازی کی اجرت میں تفصیل یہ ہے کہ جو ایجنٹ براہ راست لوگوں کو کمپنی کا ممبر بناتے ہیں، اس کے عوض میں جو متعین اجرت انہیں ملتی ہے، یہ کمپنی سے جوڑنے کے عمل کی اجرت ہے، جو جائز ہے؛ لیکن ایجنٹ نے جن لوگوں کو ممبر بنایا ہے ان کے ذریعہ ممبر سازی پر اول ایجنٹ کو کمیشن دینا جائز نہیں؛ اس لئے کہ ان لوگوں نے جو محنت کی ہے اس میں پہلے ایجنٹ کی محنت شامل نہیں ہے؛ اس لئے شریعت اس صورت میں اول کو بلا محنت اجرت لینے کی اجازت نہیں دیتی؛ بلکہ یہ محنت کنندگان کا حق ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يحل لمسلم أن يأخذ مال

أخيه بغير حق. (مجمع الزوائد، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٧١، مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٤٢٥، رقم: ٢٤٠٠٣)

سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به.
(شامي، كتاب الإجارة، مطلب في أجرة الدلال، زكريا٩/ ٨٧، كراچی ٦/ ٦٣)

لا يجوز لأحد أن يأخذ مال أحد بلا سبب شرعي. (شامي، كتاب الحدود، مطلب في التعزير بأخذ المال، زكريا ٦/ ١٠٦، كراچی ٤/ ٦١، البحرالرائق، كوئٹه ٥/ ٤١، زكريا ٥/ ٦٨، هندية زكريا قديم ٢/ ١٦٧، جديد زكريا ٢/ ١٨١، قواعد الفقه ص: ١١٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰ ؍صفر ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۹۱۲/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۳/۲ھ

زمین کو فروخت کرنے کی ایک ناجائز شکل

سوال [۸۷۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک کمپنی جس کا نام ’’پیس گرین فوریسٹ لمٹیڈ‘‘ (P.G.F) ہے، اپنے گراہک سے زمین فروخت کرنے کا معاہدہ کرتی ہے، اور اس کے بعد گراہک سے قسطوار پانچ سال چھ سال سات سال یا نو سال تک یا جتنا وقت بھی معاہدہ میں طے ہوتا ہے، اس وقت تک روپئے وصول کرتی ہے، مثال کے طور پر کمپنی اپنے کسی گراہک سے معاہدہ کرتی ہے کہ پچاس گز زمین خریدنے کے لئے گراہک چھ سال تک ماہوار قسط کے ذریعہ ہر مہینہ کمپنی کے پاس دوسو روپئے جمع کرے گا، چھ سال مکمل ہونے پر کل جمع رقم ۱۴۴۰۰؍ روپئے ہوگی، معاہدہ کرتے وقت کمپنی نے ایک بات واضح کردی تھی کہ گراہک چھ سال تک ۱۴۴۰۰؍ روپئے جمع کرنے کے بعد اگر زمین لینے کا خواہش مند نہیں ہے، تو کمپنی واپس اس زمین کو ۲۰۴۰۰؍ روپئے میں خریدنے کے لئے تیار رہے گی؛ لہٰذا محترم اس مسئلہ میں فرمائیں کہ اس صورت میں گراہک کو جو ۶۰۰۰؍

روپئے کا فائدہ ہورہا ہے، وہ جائز اور حلال ہے یا ناجائز اور حرام ہے؟ کمپنی نے اپنا کاروبار چلانے کے لئے الگ الگ عہدوں پر آدمی فائز کر رکھے ہیں جو گراہکوں سے رقم وصول کرنے کے بعد کمپنی کے خزانہ میں جمع کرتے ہیں اوران کی وصول کی گئی رقم میں سے کمپنی ان کے عہدوں کے حساب سے ان کو کمیشن دیتی ہے، کمپنی میں کام کرنے کے بعد آمدنی کا واحد ذریعہ یہی ہے؛ لہٰذا حضرت اس مسئلہ میں بھی فرمائیں کہ ایسی کمپنی میں کام کرنا اوراس سے حاصل شدہ آمدنی کواستعمال کرنا حلال ہے یا حرام؟

یہ واضح رہے کہ کمپنی کے لاکھوں گراہک ہیں، جن سے رقم وصول کرکے کمپنی بڑے پیمانے پر اپنا کاروبار چلاتی ہے، کمپنی زمین پر پیڑ لگاتی ہے، اورلکڑی کا کاروبار کرتی ہے، کاشتکاری کرتی ہے، کھیتی کے لئے بیج تیار کرتی ہے، کھاد بناتی ہے اور کئی مختلف کاروبار کرتی ہے اور جو آمدنی ہوتی ہے اس میں سے ہی اپنے گراہکوں کو اور کام کرنے والوں کو فائدہ پہنچاتی ہے، ان تمام صورتوں میں ایسی کمپنی سے وابستہ ہوکر نفع حاصل کرنا کیسا ہے؟ اور یہ بات کمپنی نے معاہدہ کے وقت واضح کردی تھی کہ زمین پر قبضہ اسی وقت دیا جائے گا جب کہ کمپنی کو طے شدہ رقم پوری ادا کردی جائے گی۔

المستفتی: محمد آصف کندرکی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کمپنی کا قانون چہ ہندی اور انگلش دونوں میں شائع شدہ ہے اور قانونچہ سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ اس میں کئی خرابیاں ہیں:

(۱) اگر سال میں ایک دو قسط کسی وجہ سے ادا نہ کرسکے تو ۱۵ ر فیصد سود کے ساتھ اس کو پورا کرنا لازم ہوگا، تو اس سے معلوم ہوا کہ اس میں سودی شرط موجود ہے۔ اور اگر اس درمیان میں قسطیں پوری ہونے سے پہلے پہلے کسی ممبر کا انتقال ہوجائے تو اس کے پسماندگان کو ۱۵۰ ر فیصد کے حساب سے معاوضہ دیا جائے گا، تو یہ شکل جیون بیمہ کی ہوئی، اس میں سود کے ساتھ ’’شبہۃ القمار‘‘ بھی ہے، اس طرح کی باطل اور فاسد شرائط کی بنا پر قسطوں پر زمین خریدنا جائز نہیں ہے۔ اور سوال نامہ میں ان باطل اور فاسد شرائط کا ذکر موجود نہیں ہے؛ اس لئے سوال

ناقص اور غیر واضح ہے۔ اور سوال میں ان باطل شرائط کا ذکر بھی آنا چاہئے تھا؛ لہٰذا ان شرائط کی بنا پر مذکورہ کمپنی سے قسطوں پر زمین خریدنا جائز نہیں ہے۔

قال الله تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [البقرة: ٢٧٥]

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. [المائدة: ٩٠]

عن جابر –رضي الله عنه– قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربو ومؤكله وكاتبه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، كتاب المساقاة المزارعة، باب الربا، النسخة الهندية ٢/ ٢٧، بيت الأفكار، رقم: ١٥٨٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ رجب ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۷۷۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/ ۷/ ۱۴۲۳ھ

پتنگ بنانا اور فروخت کرنا کیسا ہے؟

سوال [۱۱۷۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: پتنگ کی فروختگی اور اس کا بنانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: مولانا حفظ الرحمٰن مدیر ندائے شاہی ونائب مہتمم مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پتنگ بنانا اور فروخت کرنا تعاون علی المعصیت کی وجہ سے ناجائز ہے۔

لقوله تعالى: وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة: ٣] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۱۸۳)

جانوروں کی تصاویر بنانا اوران کا کاروبار کرنا

سوال [۸۷۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص کا پیتل کے جانوروں کا کاروبار ہے، وہ پیتل کے کتے، بلی، اونٹ، ہاتھی، سور، پرندے وغیرہ بنا تا ہے۔

المستفتی: عبد القدیر، شاہی مسجد مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جاندار کی تصویروں اور مورتیوں کی تجارت اعانت علی المعصیت کی بنا پرنا جائز ہے۔

لقوله تعالى: وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة: ٢]

جاندار کی تصویر اور مورتی بنانا حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔

تصوير صورة الحيوان أشد التحريم، وهو من الكبائر. (عمدة القاري، دارإحياء التراث العربي بيروت ٢٢/ ٧٠، زكريا ديوبند ١٥/ ١٢٤)

وفي الحديث: قال عبدالله: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: إن أشد الناس عذابا عند الله المصورون. (صحيح البخاري، كتاب اللباس، باب عذاب المصورين يوم القيامة ٢/ ٨٨٠، رقم: ٥٧١٧، ف: ٥٩٥٠، صحيح مسلم، كتاب اللباس والزينة، باب تحريم صورة الحيوان، النسخة الهندية ٢/ ٢٠١، بيت الأفكار، رقم: ٢١٠٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۱۵۹)

پیتل کے ہاتھی گھوڑے وغیرہ بنانا

سوال [۸۷۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شہر مرادآباد میں جیسا کہ آپ کو معلوم ہے پیتل کی صنعت اور اس میں جیسا بیرون ملک سے آرڈر ملتا ہے، اس کو بنایا جاتا ہے، مثلاً ایک آرڈر آیا ہے جس میں ہاتھی، گھوڑے، بلی، کتے وغیرہ کو اس نے مانگا ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان ہاتھی وغیرہ (جاندار) کو بنانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ باحوالہ جواب باشرع عنایت فرمائیں۔

المستفتی: عبیدالرحمٰن پیرزادہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ناجائز اور حرام ہے، عنداللہ سخت ترین عذاب الٰہی کا مستحق ہوگا، مسلمانوں کو ایسا آڈر واپس اور مسترد کرنا واجب ہے۔

عن عبدالله بن مسعود –رضي الله عنه– قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إن أشد الناس عذابا عند الله المصورون.

(صحيح البخاري، كتاب اللباس، باب عذاب المصورين يوم القيامة ٢/ ٨٨٠، رقم: ٥٧١٧، ف: ٥٩٥٠، صحيح مسلم، كتاب اللباس والزينة، باب تحريم صورة الحيوان، النسخة الهندية ٢/ ٢٠١، بيت الأفكار، رقم: ٢١٠٩، مشكوة شريف ٢/ ٣٨٥)

عن ابن عباس –رضى الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: كل مصور في النار يجعل بكل صورة صورها نفسا، فتعذبه في جهنم. (مسلم شريف، النسخة الهندية ٢/ ٢٠٢، بيت الأفكار، رقم: ٢١١٠، مشكوة شريف ٢/ ٣٨٥)

ان احادیث کے تحت محدثین نے حیوانات کی تصویر کشی کو سخت حرام اور گناہ کبیرہ لکھا ہے۔

وهذه الأحاديث صريحة في تحريم تصوير الحيوان، وأنه غليظة التحريم. (نووي ٢/ ٢٠١، هكذا عمدة القاري، دار إحياء التراث العربي بيروت ٢٢/ ٢٠،

زکریا دیوبند ۱۵/ ۱۲٤، مرقاة، باب التصاویر، إمدادیه ملتان ۸/ ۳۳۰، أشعة اللمعات ۳/ ۵۹۳)

قال أصحابنا وغيرهم: تصوير صورة الحيوان حرام أشد التحريم، وهو من الكبائر. (عمدة القاري، دار إحياء التراث العربي بيروت ۲۲/ ۷۰، زکریا دیوبند ۱۵/ ۱۲٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۳۱۷)

پیتل وغیرہ کی مورتی بنانا کیسا ہے؟

سوال [۸۷۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کا ایک پیتل کا کارخانہ ہے، جس میں جانور وغیرہ کی مورتی بنائی جاتی ہیں، تو اس طرح بنانا جائز ہے یا نہیں؟ مفصل جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: احسان الرحمٰن محلّہ لال مسجد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جانوروں کی صورت اور تصویر بنانے والے کو سخت ترین عذاب دیا جائے گا؛ لہٰذا جانور بنوانے والے اور بنانے والے سب حرام وگناہ کبیرہ اور سخت عذاب الٰہی کے مستحق ہوں گے۔

عن عبدالله بن مسعود –رضي الله عنه– قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إن أشد الناس عذابا عند الله المصورون.

(صحيح مسلم، كتاب اللباس والزينة، باب تحريم صورة الحيوان، النسخة الهندية ۲/ ۲۰۱، بيت الأفكار، رقم: ۲۱۰۹، صحيح البخاري، كتاب اللباس، باب عذاب المصورين يوم القيامة ۲/ ۸۸۰، رقم: ۵۷۱۷، ف: ۵۹۵۰)

عن ابن عباس –رضى الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول:

كل مصور في النار يجعل بكل صورة صورها نفسا، فتعذبه في جهنم. (مسلم شريف، النسخة الهندية ۲/ ۲۰۲، بيت الأفكار، رقم: ۲۱۱۰، مشكوة شريف ۲/ ۳۸۵)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷ر محرم ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۶۹/۲۴)

تانبا پیتل سے جانوروں کا مجسمہ بنانا

سوال [۸۷۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید پیتل کے برتنوں کا کاروبار کرتا ہے اور اپنا مال بیرون ملک سپلائی کرتا ہے، اس کے گاہک یہودی اور نصرانی ہیں، اس کے گاہک ہاتھی، شیر، ہرن اور دوسرے جانور پیتل کے منگوانا چاہتے ہیں۔

(۲) زید کا کوئی اپنا مال بنانے کا کارخانہ ابھی نہیں ہے، زید دوسرے کارخانہ داروں سے کورا مال لے کر صرف اپنی نگرانی میں پالش چاندی اور پیکنگ کر کے مال روانہ کرتا ہے؛ لیکن اگر یہ جانور سپلائی نہیں کرتا تو اس کا گاہک جانور کسی دوسرے سے ضرور خریدے گا اور اس کے ساتھ ہی زید کا دوسرا مال بھی؛ کیوں کہ دوسرے سپلائر اس گاہک کو توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس طرح زید کے گاہک کا چھوٹ جانے کا اندیشہ ہے۔

(۳) چونکہ زید کا اپنا کوئی کارخانہ نہیں ہے؛ لیکن دوسرے تاجر جانور اور تصویریں بناتے ہیں، کیا ان سے خرید کر مجبوراً خود ہی سپلائی کر سکتا ہے اور اس سے جو نفع حاصل ہوگا اس کا کیا حکم ہے؟

(۴) کیا زید جانوروں کے آرڈر حاصل کرنے کے بعد کسی دوسرے کو آرڈر ٹرانسفر دے دے، دلوا دے، زید کا تعلق صرف آرڈر دلوانے سے ہوگا، ایسی صورت میں جزوی رقم جو بطور

نفع کے حاصل ہو، تو اس کا لینا اور اپنی ضروریات میں شرعاً استعمال کرنا کیسا ہوگا؟
(۵) جزوی رقم یا منافع کا کوئی دوسرا استعمال شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ براہ کرم جواب حدیث سے اور سنت کی روشنی میں مطلع فرمائیں۔

المستفتی: اکرام باری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تانبا، پیتل وغیرہ دھات سے ہاتھی، شیر، ہرن دوسرے جانوروں کا مجسمہ بنانا اور بنوانے سے عنداللہ سخت ترین عذاب کا مستحق ہونا ہے۔

عن عبدالله بن مسعود –رضي الله عنه– قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إن أشد الناس عذابا عند الله المصورون.

(صحيح مسلم، كتاب اللباس والزينة، باب تحريم صورة الحيوان، النسخة الهندية ۲/ ۲۰۱، بيت الأفكار، رقم: ۲۱۰۹، صحيح البخاري، كتاب اللباس، باب عذاب المصورين يوم القيامة ۲/ ۸۸۰، رقم: ۵۷۱۷، ف: ۵۹۵۰، مشكوة ۲/ ۳۸۵)

اللہ تعالیٰ آخرت میں ایسے لوگوں کو اس طرح عذاب دیتے رہیں گے اور کہتے رہیں گے کہ اس میں جان ڈال دو اور وہ جان نہ ڈال سکیں گے۔

من صور صورة عذب وكلف أن ينفخ فيها، وليس بنافخ. (صحيح البخاري، باب بلا ترجمة ۲/ ۸۸۱، رقم: ۵۷۲۹، ف: ۵۹۶۳، مشكوة ۲/ ۳۸۶)

اور پالش کرنے والا بھی مستحق عذاب ہوگا، اب اپنا گاہک چھوٹ جانے اور آخرت کے عذاب میں خود ہی تناسب دیکھا جا سکتا ہے۔

(۳) عمل تجارت حرام نہیں ہے، مگر تعاون علی المعصیت ہونے کی وجہ سے کراہت کے درجے میں ہوگا۔ اور تجارت کے منافع حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بلا کراہت حلال ہیں؛ اس لئے کہ اصل شئ فی نفسہٖ مال ہے اور حضرت امام یوسف ومحمدؒ کے نزدیک مکروہ ہیں؛ اس لئے کہ معصیت کے تعاون کے ساتھ نفع حاصل کیا گیا ہے۔

ومثله في الشامي: لو آجره دابة لينقل عليها الخمر أو آجره نفسه

لیرعی له الخنازیر یطیب الأجر عنده وعندهما یکره. (شامي، کتاب الحظر والإباحة، فصل في البیع، زکریا ۹/ ٥٦٢، کراچی ٦/ ۳۹۲، تبیین الحقائق، إمدادیه ملتان ٦/ ۲۹، زکریا دیوبند ۷/ ٦٤، مجمع الأنهر، دارالکتب العلمیة بیروت ٤/ ۱۸۸، قدیم ۲/ ٥۳۰)

(۴-۵) آرڈر دلوانے والا دلال کے حکم میں ہوگا۔ اور دلال کی اجرت جس طرح دیگر معاملات میں حلال ہے، اسی طرح یہاں بھی حلال ہوگی؛ اس لئے کہ اصل معاملہ کا تعلق دلال سے نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ ایکسپورٹر اور ایمپورٹر کے ساتھ ہوتا ہے۔

سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به. (شامي، کتاب الإجارة، مطلب في أجرة الدلال، زکریا ۹/ ۸۷، کراچی ٦/ ٦۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۵۰۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۶/۲۲ھ

چوری کے سامان کی خرید وفروخت کا شرعی حکم

سوال [۸۷۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص پرانی گاڑیوں کی مرمت کا کام کرتا ہے، کہ پرانی ایکسیڈنٹل گاڑیاں خریدتا ہے، تو اس گاڑی کو ٹھیک کرنے میں کبھی کھڑکی کی ضرورت پڑتی ہے اور کبھی چھت کی ضرورت پڑتی ہے، تو اگر گاڑی کے ان پارٹس کو ایجنسی سے خریدیں تو یہ چیزیں پرانی گاڑی کے پیسوں کے بمقابلہ ٦۰؍ فیصد مہنگی ہوتی ہیں؛ اس لئے ان چیزوں کو کباڑی کی دوکان سے خرید لیتے ہیں، جہاں سے پرانے سامان بہت سستے مل جاتے ہیں اور اس طرح گاڑی کی مرمت کرنے میں بچت اچھی ہوتی ہے؛ البتہ کباڑی کی دوکان جہاں سے ہم پارٹس خریدتے ہیں تو وہاں جو گاڑیاں کاٹی جاتی ہیں وہ عموماً چوری کی ہوتی ہیں اور کچھ گاڑیاں خرید کر بھی کاٹی جاتی ہیں؛ لہٰذا

ہم جو بھی سامان کباڑی کی دوکان سے خریدیں گے اس میں غالب گمان چوری کا ہے اور مغلوب اور احتمال اس بات کا بھی ہے کہ وہ خریدی ہوئی گاڑی کا پارٹ ہے، تو کیا اس احتمال کی وجہ سے مطلقاً پارٹس خریدنا جائز ہوسکتا ہے؟ اور لوگ جواز کی دلیل میں یہ بات پیش کرتے ہیں کہ جس طرح شراب کی بوتلوں کو خریدنا اور پھر اس کو بیچنا جائز ہے، جب کہ اس میں ظن غالب یہی ہے کہ اس میں دوبارہ شراب بھری جاتی ہے؛ لیکن احتمال اس بات کا بھی ہے کہ اس میں تیل وغیرہ بھرا جائے۔ حضرت والا سے گزارش ہے کہ دلائل کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں، اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی شایان شان اجر عظیم عطا فرمائے اور آپ کی عمر میں برکت دے۔ آمین

المستفتی: مولانا محمد طارق صاحب نعمانی، قصبہ جویا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جن دوکانوں کے بارے میں یقین سے معلوم ہے کہ چوری کا مال ہے یا ظن غالب یہی ہے کہ چوری کا مال یہاں بکتا ہے، تو وہاں سے مذکورہ سامان خریدنا خریدار کے لئے جائز نہیں ہے، اگر سستے کے لالچ میں وہاں سے خریدے گا تو چوری کے گناہ میں خریدار بھی شامل ہوجائے گا۔ اور جن دوکانوں کے بارے میں یقین ہے یا ظن غالب ہے کہ یہاں چوری کا سامان نہیں بکتا ہے، وہاں سے خریدنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور شراب کی بوتلوں پر اس مسئلے کو قیاس کرنا درست نہیں ہے؛ اس لئے کہ شراب کی بوتلیں چوری کی نہیں ہوتی ہیں اور یہاں مسئلہ چوری کا ہے۔

قال عليه السلام: من اشترى سرقة وهو يعلم أنها سرقة، فقد شرك في عارها، وإثمها. (شعب الإيمان، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٣٨٩، رقم: ٥٥٠٠، المصنف لابن أبي شيبة، جديد موسسة العلوم القرآن بيروت ١١/ ٣٣٨، رقم: ٢٢٤٩٥، فيض القدير ١١/ ٥٦٥٤، رقم: ٨٤٤٣، بحواله محموديه ڈابهيل ١٦/ ٨٦)

والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم، وإلا فإن علم

عين الحرام لا يحل له. (شامي، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب فيمن ورث مالا حراما، كراچی ۵/ ۹۹، زكريا ۷/ ۳۰۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۱۷)

چوری کا مال خریدنا کیسا ہے؟

سوال [۸۷۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ناجائز طریقہ سے حاصل شدہ مال کا خریدنا واستعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً چوری کا مال یا ایسا کوئی مال جس کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ یہ غلط طریقہ سے آیا ہے، جیسے آج کل آم وغیرہ کے باغات عموماً خلاف شرع انداز پر بیچے جاتے ہیں، لوگ دس دس بیس بیس سال آگے تک کے لئے فصل خرید لیتے ہیں اور پھر وہ مارکیٹ میں آکر فروخت ہوتے ہیں، تو اس طرح کے اموال کی خرید وفروخت میں شرعاً کیا قباحت ہے؟

المستفتی: محمد الیاس، کٹک اریسہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چوری کا مال خریدنا ہرگز جائز نہیں ہے، اگر خرید چکا ہے تو واپس کردینا لازم ہے۔ اور اگر اصل مالک معلوم ہوجائے تو اس کے حوالہ کردینا چاہئے، اگر وہ فروخت کرنے پر تیار ہوجائے تو اس سے معاملہ کرسکتے ہیں۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۱/ ۲۸۰، جدید ڈابھیل ۱۶/ ۸۶)

قال عليه السلام: من اشترى سرقة وهو يعلم أنها سرقة، فقد شرك في عارها، وإثمها. (شعب الإيمان، دارالكتب العلمية بيروت ۴/ ۳۸۹، رقم: ۵۵۰۰، المصنف لابن أبي شيبة، جديد موسسة العلوم القرآن بيروت ۱۱/ ۳۳۸، رقم: ۲۲۴۹۵)

والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم، وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له. (شامي، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب فيمن ورث مالا حراما، کراچی ۵/ ۹۹، زکریا ۷/ ۳۰۱)

اور بیع فاسد سے حاصل شدہ مال پر جب مشتری بائع کی اجازت سے قبضہ کرلیتا ہے تو شرعاً مشتری مالک ہوجاتا ہے، بس رفع فساد کے لئے واپسی لازم ہوتی ہے؛ اس لئے دوسرے لوگوں کو اس سے خریدنا جائز ہوجاتا ہے اور پھر اس کے بعد واپسی بھی شرعاً لازم نہیں ہوا کرتی ہے۔

وإذا قبض المشتري المبيع في البيع الفاسد بأمر البائع، وفي العقد عوضان كل واحد منهما مال ملك المبيع ولزمته قيمته -إلى قوله- ولكل واحد من المتعاقدين فسخه رفعا للفساد. (وقوله) فإن باعه المشتري نفذ بيعه؛ لأنه ملكه، فملك التصرف فيه وسقط حق الاسترداد لتعلق حق العبد بالثاني، ونقض الأول لحق الشرع. (هداية، باب البيع الفاسد، فصل في أحكامه، اشرفي ديوبند ۳/ ٦٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱ر صفر ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/۳۰۱۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۳/۲/۱۱ھ

مال مسروق کی بیع وشراء کا حکم

سوال [۸۷۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بہت سے حضرات اون کا کام کرتے ہیں (یہ اون نہیں بلکہ ریشمی اون ہے) اون کی چادریں بنا کر فروخت کرتے ہیں، یہی ان کا کاروبار ہے؛ لیکن معلوم ہوا کہ وہ اون جو آتی ہے وہ نمبر دو کا مال ہے؛ کیوں کہ نمبر ایک کی اگر اون لاکر اس کا کچھ بھی مال تیار کر کے فروخت کریں تو اس میں فائدہ نہیں ہے، نمبر دو کی ہی اون کا مال بناتے ہیں، تو فائدہ ہے، نمبر دو کی تفصیل یہ ہے کہ لدھیانہ میں یہ مال بنتا ہے اور وہیں اس کی رنگائی ہوتی ہے، رنگائی کے

بڑے بڑے کارخانہ ہیں، کوئنٹلوں مال رنگا جاتا ہے، رنگنے والے اس مال میں سے جو کسی کا رنگنے کے واسطے مال آیا ہے؛ کیوں کہ وہ سوکھا مال ہوتا ہے، جب رنگائی کر کے وہ مال واپس کرتے ہیں تو اس میں سے کچھ مال اپنے پاس رکھ لیتے ہیں، یہ تو چوری کرتے ہیں، اس طرح سے کوئنٹلوں مال جمع کر کے اس کو فروخت کر دیتے ہیں، ان کا یہ رویہ ہے کہ یہ بڑے بڑے کارخانہ والے سب ہی غیر مسلم ہیں۔ اور اگر کوئی مسلمان بھی رنگنے کے واسطے مال دے تو اس میں سے بھی رکھنا ضروری ہے، یعنی یہ ان کا پیشہ ہے، رنگوانے والوں کو بھی خوب معلوم ہے کہ یہ ایسا کرتے ہیں، اب اس مال کو مسلمان یا غیر مسلم خرید کر دوسروں کو بیچتے ہیں، ہمارے یہاں ایسا کاروبار بہت چل رہا ہے، یہ کاروبار کرنا کیسا ہے؟ کچھ اگر گنجائش ہو تو جواب سے مطلع کریں، اس اون کا تیار کیا ہوا مال لے کر فروخت کرنا یا لے کر جمع کر کے رکھنا کیسا ہے؟ اور اس کو بکری کے اوقات میں ہی بیچنا جیسے کہ گرمیوں میں ستا مل جاتا ہے، سردیوں میں کچھ مہنگا ہو جاتا ہے، اکثر لینے والے ایسا کرتے ہیں، شرعاً یہ کیسا ہے؟

المستفتی: حافظ اشرف علی سہسپور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر آپ براہ راست فیکٹری سے مال خرید رہے ہیں اور مال کے متعلق قطعی علم نہیں ہے کہ یہ چوری کا ہے تو ایسے مال کی خرید وفروخت جائز ہے، نیز ایسے مال کو خرید کر کے جمع کرنا، پھر اسے اس کے موسم میں فروخت کرنا جب کہ آپ کے جمع کرنے سے دوسروں کو کوئی تنگی پیش نہ آتی ہو، تو درست ہے، یہ شکل احتکار میں شامل نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۱۹)

وإن اشترى في ذلك المصر، وحبسه ولا يضر بأهل المصر لا بأس به.

(هندية، كتاب البيوع، الباب العشرون في البياعات المكروهة، فصل في الاحتكار، زكريا قديم ۳/ ۲۱۳، جديد ۳/ ۲۰۰، درمختار مع الشامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ٦/ ۳۹۸، زكريا ۹/ ۵۷۱، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ۲۱۳، هداية مع فتح القدير، كوئٹه ۸/ ٤۹۱، زكريا ۱۰/ ٦۹)

البتہ اگر آپ کو تحقیق سے معلوم ہو جائے کہ یہ مال چوری کا ہے تو ایسے مال کی خرید وفروخت شرعاً ناجائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۶/ ۲۸۳، جدید زکریا ۱۰/ ۲۲۱، محمودیہ قدیم ۱۱/ ۲۸۰، جدید ڈابھیل ۱۶/ ۸۶)

قال عليه السلام: من اشترى سرقة وهو يعلم أنها سرقة، فقد شرك في عارها، وإثمها. (شعب الإيمان، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٣٨٩، رقم: ٥٥٠٠، المصنف لابن أبي شيبة، جديد موسسة العلوم القرآن بيروت ١١/ ٣٣٨، رقم: ٢٢٤٩٥)

قال: هي لي ظلمني فلان وغصبها مني، فأخذتها منه لا ينبغي للسامع أن يشترى منه؛ لأن الغصب أمر مستنكر. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الأول، الفصل الثاني في العمل بخير الواحد في المعاملات، زكريا قديم ٥/ ٣١١، جديد ٥/ ٣٥٩، البحرالرائق، فصل في البيع، كوئٹه ٨/ ٢٠٠، زكريا ٨/ ٣٦٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۱/۶/۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۷۶۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۶/۱۴ھ

چوری کی لکڑی کی خرید وفروخت اور عددوں کو تیار کرنے پر مزدوری لینا

سوال [۸۷۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (الف) ہمارے شہر میں لکڑی میں صنعت کاری کا کام ہوتا ہے، مختلف قسم کی لکڑیاں آتی ہیں، ان کو چیر کران کا عدد تیار ہوتا ہے، پھر اس کو فیشن وغیرہ کرکے تھیلی اور ڈبہ میں پیک کرکے باہر بھیجا جاتا ہے، ان ہی لکڑیوں میں ایک لکڑی نمبر دو کی آتی ہے، جو کہ گورنمنٹ کی ہوتی ہے۔ اور چوری سے کاٹ کرلائی جاتی ہے، اور چوری ہی سے بکتی ہے، چوری ہی سے چیری جاتی ہے، پکڑے جانے پر جرمانہ بھی ہوتا ہے اور بے عزتی بھی ہوتی ہے اور یہ لکڑی مناسب قیمت پر ملتی ہے، تو کیا اس لکڑی کو خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگ ایسا کرتے

ہیں کہ اس کے کٹے ہوئے عدد ڈبہ یا تھیلی میں پیک تیار مال خرید لیتے ہیں، جب کہ خریدنے والے کو یقینی یہ بات معلوم ہے کہ یہ مال اسی چوری کی لکڑی کا ہے؛ لیکن ایسا خریدنے میں پکڑے جانے کا اور رسوائی کا خطرہ کم ہوتا ہے، تو ایسا مال خریدنا معلوم ہوتے ہوئے جائز ہے یا ناجائز ہے؟

(ب): نیز اسی لکڑی کے عددوں کو تیار کرنے پر مزدوری لینا کیسا ہے؟

المستفتی: حافظ فرید احمد نگینہ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: الف: جس لکڑی کے بارے میں یہ یقین ہو کہ وہ چوری کی ہے جیسا کہ سوال میں ہے، تو ایسی لکڑی کو خریدنا اور بیچنا دونوں ناجائز ہے۔

إن علم أن العين التي يغلب على الظن أنهم أخذوها من الغير بالظلم قائمة وباعوه في الأسواق، فإنه لا ينبغي شراء ه منهم، وإن تداولته الأيدي.

(طحطاوي على الدر، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كوئٹه ٤/ ١٩٢)

ب: چوری کی لکڑی کے عددوں کو تیار کرنے پر مزدوری لینا جائز ہے؛ کیوں کہ یہ اپنے کام کی اجرت ہے، چوری میں شرکت نہیں ہے۔

ولو آجر نفسه ليعمل في الكنيسة ويعمرها لا بأس به؛ لأنه لا معصية في عين العمل. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ٦/ ٣٩٢، زكريا ٩/ ٥٦٢)

ولأبي حنيفة وأبي يوسف وكسر الحطب ...... بإيقاع الفعل على المحل بالتجافي، ولكن الكل فيه سواء في صفة الحل شرعاً، فلهذا جاز الاستئجار عليه. (مبسوط سرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ١٦/ ٤٠)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/۱/۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۴۰۶)

باغات کی خرید وفروخت

سوال [۸۷۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آم کے باغ کی فصل کو پھول یا پھل آنے سے قبل ہی ایک سال، دو سال یا اور زیادہ عرصہ کے لئے فروخت کیا جائے، پچھلے طویل عرصے سے ہم اپنے باغ کی فصل اسی طرح فروخت کرتے آئے ہیں کہ ماہ ستمبر، اکتوبر میں دوسال کی فصل فروخت کردی جاتی تھی، جب کہ پھول اور پھل فروری کے مہینے میں نکلتے ہیں، اگر چہ یہ علم تھا کہ اس طرح کی فروخت شرعی طور پر جائز نہیں ہے؛ لیکن چونکہ دستور اور رواج اس طرح کا ہے؛ اس لئے بدرجہ مجبوری اسے فروخت کیا جاسکتا ہے؛ لیکن کسی کتاب کے مطالعہ کے دوران یہ علم ہوا کہ اس طرح کی بیع ناجائز ہے اور اس کی آمدنی حرام ہے، چنانچہ ہم نے ارادہ کیا کہ اس بار ہم اس طرح فروخت نہیں کریں گے۔ جو صاحب ہر سال ہمارے باغ کی فصل لیا کرتے تھے وہ پچاس ہزار روپئے نقد لے کر آئے بطور بیعانہ اور کہا کہ پہلے سال کی فصل سے پہلے ایک لاکھ اور دوسرے سال کی فصل سے پہلے ایک لاکھ یعنی کل ملا کر ڈھائی لاکھ روپئے دوسال کی فصل کے لئے ادا کریں گے؛ لیکن ہم نے انہیں سختی سے منع کردیا کہ اب ہم اس طرح فصل نہیں فروخت کریں گے۔ چنانچہ ہم نے باغ کی دیکھ بھال خود شروع کردی اور جتائی، صفائی، تلائی، کھاد وآب پاشی اور کٹر ون اور بیماریوں کی روک تھام کے لئے دواؤں کا چھڑکاؤ وغیرہ کروایا، جس پر تقریباً -/81,000 (اکیاسی ہزار روپے) خرچ کئے۔ اور فروری اور مارچ میں پھول اور پھل بننے کے بعد اسے فروخت کرنے کا ارادہ کیا، بہت لوگوں سے رابطہ کیا؛ لیکن سب نے ایک ہی جواب دیا کہ دوسال کے لئے دیں گے جیسا کہ دستور ہے، تو لے سکتے ہیں ورنہ نہیں، مجبوراً اپریل کے آخر میں صرف -/20,000 (بیس ہزار روپے) میں اس سال کی فصل فروخت ہوئی، اس طرح پہلے سال کی فصل میں ایک لاکھ تیس ہزار کم ملے اور مبلغ اکیاسی ہزار روپے اپنے پاس سے خرچ کئے، جب کہ بصورت دیگر یہ خرچ خریدار کے ذمہ ہوتا ہے۔

اب موجودہ فصل کے اختتام پر پھر وہی حالات درپیش ہوں گے، اگلے دو سال کی فصل کی فروخت کے لئے، ایسی صورت حال میں ہمیں کیا کرنا چاہئے کہ ہم شرعی احکامات کی خلاف ورزی کے مرتکب نہ ہوں اور ہمیں مالی طور پر خسارہ بھی نہ برداشت کرنا پڑے۔

نیز یہ کہ ماضی میں جو سالہا سال تک ہم سے غلطی سرزد ہوتی رہی اور اس آمدنی کو ہم اپنے استعمال میں لاتے رہے، تو اس کے کفارہ کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ از راہ کرم مفصل اور مدلل جواب تحریر فرماکر ممنون ومشکور فرمائیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔ فقط

المستفتی: بذل الرحمٰن فاروقی، قصبہ ڈھکہ تحصیل حسن پور، جے پی نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ شروع سے آخر تک پڑھا گیا ہے، باغ کی خرید وفروخت کا جو دستور چلا آرہا ہے، وہ شرعی طور پر جائز نہیں ہے، اس کے لئے متبادل شکل یہی ہے کہ باغ کی فروختگی کے ساتھ مع زمین کے دو سال کے لئے معاملہ طے کیا جائے کہ جس میں خریدار کو اس باغ کے دائرہ میں کسی بھی چیز کے کاشت کرنے کی اجازت ہو اور باغ کے بیچ بیچ میں جو خالی جگہ ہو اس میں جو چیز بھی پیدا ہوسکتی ہے خریداران جگہوں میں کوئی بھی چیز بو کر پیداوار حاصل کرسکے، اس طرح زمین سمیت دو سال کے لئے فروخت کردیا جائے اور کھیتی کے ساتھ باغ کی دیکھ ریکھ کرکے اس کے پھلوں سے بھی فائدہ اٹھائے، ایسی شکل اختیار کرنا جائز ہے؛ لہٰذا آئندہ سے آپ اس طرح معاملہ کرسکتے ہیں اور پچھلے سالوں میں جو معاملہ کیا گیا ہے اس سے اللہ سے توبہ کرلیں، اللہ پاک بندوں کی توبہ قبول کرتے ہیں۔

(مستفاد: ایضاح النوادر، ص: ۴۷، انوار رحمت، ص: ۱۸۰)

عن جابر بن عبدالله – رضي الله عنه – قال: نهى النبي ﷺ عن بيع الثمار حتى يبدو صلاحها. (صحيح البخاري، الزكوة، باب من باع ثماره أو نخله ١/ ٢٠١، رقم: ١٤٦٥، ف: ١٤٨٧، صحيح مسلم، البيوع، باب النهي عن بيع الثمار قبل بدو صلاحها، النسخة الهندية ٢/ ٧، بيت الأفكار، رقم: ١٥٣٤، سنن أبي داؤد، البيوع،

باب بيع الثمار قبل أن يبدو صلاحها، النسخة الهندية ٢/ ٤٧٨، دارالسلام، رقم: ٣٣٦٧)

ومن استاجر أرضا على أن يكربها ويزرعها ويسقيها فهو جائز.
(هداية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، اشرفی دیو بند ٣/ ٣٠٦، البحرالرائق، کوئٹه ٨/ ٢٤، زکریا ٨/ ٤٣، درمختار مع الشامي، کراچی ٦/ ٦٠، زکریا ٩/ ٨٢)

وإن استأجر دارا سنة بعشرة دراهم جاز، وإن لم يبين قسط كل شهر من الأجرة. (هداية، أشرفي ديوبند ٣/ ٣٠٢)

قال الله تعالىٰ: ﴿إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾.
[النساء: ١٧] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍شعبان ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۷۸)

بدو صلاح سے قبل پھلوں کی خرید وفروخت

سوال [۸۷۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے ایک عزیز نے باغ کی بہار اس کے مول (پھول) پر ہی فروخت کردی، بغیر دریافت کئے، جب کہ شرعی حیثیت سے خرید وفروخت ناجائز ہے، میں اپنے حصہ کی رقم کو کس مد میں خرچ کروں؟

(۱) اس کو اپنے خرچ میں کروں یا نہیں؟ اگر کی جائے تو کس طرح؟

(۲) مکان کی مرمت میں ہوسکتی ہے یا نہیں؟

(۳) اس کے علاوہ جس مد میں خرچ ہوسکتی ہو تحریر فرمائیں، تاکہ اس وقت کی پکڑ سے محفوظ رہوں، اس کے لئے جو شرعی حیثیت ہو تحریر فرمائیں۔ فقط

المستفتی: محمد حنیف لاجپت نگر، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں درج شدہ صورت میں جانبین پر واجب ہے کہ عقد کو فسخ کر کے مشتری ثمن واپس کر لے اور مالک باغ واپس کرے، نہ مالک کو ثمن میں تصرف جائز ہے اور نہ مشتری کو باغ میں تصرف جائز؛ اس لئے مذکورہ رقم باغ کا مالک واپس کر کے مشتری کو لوٹانے کے علاوہ کوئی اور شکل نہیں، جب باغ میں پھل ظاہر ہو جائے تو دوبارہ عقد شرعی کر سکتے ہیں۔

عن جابر بن عبدالله –رضي الله عنه– قال: نهى النبي ﷺ عن بيع الثمار حتى يبدو صلاحها. (صحيح البخاري، الزكوة، باب من باع ثماره أو نخله ١/ ٢٠١، رقم: ١٤٦٥، ف: ١٤٨٧، صحيح مسلم، البيوع، باب النهي عن بيع الثمار قبل بدو صلاحها، النسخة الهندية ٢/ ٧، بيت الأفكار، رقم: ١٥٣٤، سنن أبي داؤد، البيوع، باب بيع الثمار قبل أن يبدو صلاحها، النسخة الهندية ٢/ ٤٧٨، دارالسلام، رقم: ٣٣٦٧)

منها: أن يكون موجودا فلا ينعقد بيع المعدوم (وقوله) وكذا بيع الثمر والزرع قبل ظهوره؛ لأنهما معدوم، وإن كان بعد الطلوع جاز. (بدائع الصنائع، كتاب البيوع، فصل وأما الذي يرجع على المعقود عليه، كراچی ٥/ ١٣٨، زكريا ٤/ ٣٢٦)

وقوله: روى عن النبي عليه الصلاة والسلام، أنه نهى عن بيع الثمار قبل بدو صلاحها. الخ (بدائع الصنائع، كراچی ٥/ ١٣٨، زكريا ٤/ ٣٢٦)

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة –إلى قوله– ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه (وقوله) يجب عليه أن يرده على مالكه. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مطبع سهارنپور ١/ ٣٧، دارالبشائر الإسلاميه بيروت ١/ ٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍رجب ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۸۱۸)

بہارانبہ کی فصل کی خرید وفروخت

سوال [۸۷۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: باغ بہارانبہ کی فصل قبل فصل آنے سے بیچنا جائز ہے یا نہیں؟ کیا اس آمدنی سے حج بیت اللہ کا سفر کرنا درست ہوگا؟

المستفتی: راشد نگم قاضی سرائے

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فصل آنے سے پہلے باغات کے پھل بیچنا ناجائز ہے؛ البتہ آم وغیرہ چونکہ اس کے پھل ایک مرتبہ میں نہیں پکتے؛ لہٰذا ان کو بعض پھل آنے کے بعد فروخت کرنا جائز ہے اور ناجائز اور حرام طریقہ سے حاصل کردہ مال سے حج واجب نہیں ہوتا ہے؛ لیکن حج کرلے تو ادا ہوجاتا ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/۱۰۲، احسن الفتاوی ۶/۴۸۶)

عن جابر بن عبدالله –رضي الله عنه– قال: نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن بيع الثمار حتى يبدو صلاحها. (صحيح البخاري، الزكوة، باب من باع ثماره أو نخله ۱/ ۲۰۱، رقم: ۱٤٦٥، ف: ۱٤۸۷، صحيح مسلم، البيوع، باب النهي عن بيع الثمار قبل بدو صلاحها، النسخة الهندية ۲/ ۷، بيت الأفكار، رقم: ۱۵۳٤، سنن أبي داؤد، البيوع، باب بيع الثمار قبل أن يبدو صلاحها، النسخة الهندية ۲/ ٤۷۸، دارالسلام، رقم: ۳۳٦۷)

بيع الثمار قبل الظهور لا يصح إتفاقا، فإن باعها بعد أن تصير منتفعا بها يصح. (الهندية، كتاب البيوع، الباب التاسع في ما يجوز بيعه وما لا يجوز، زكريا قديم ۳/ ۱۰٦، جديد ۳/ ۱۰۷، الدر المختار، كتاب البيوع، مطلب في بيع الثمر والزرع والشجر مقصودا، كراچی ٤/ ۵۵۵، زكريا، ۷/ ۸۵)

ولو برز بعضها دون بعض لا يصح في ظاهر المذهب، وأفتى الحلواني بالجواز، وتحته في الشامية: فحيث تحققت الضرورة هنا أيضا

أمكن الحاقة بالمسلم للضرورة. (شامي، کراچی ٤/ ٥٥٥-٥٥٦، زکریا ٧/ ٨٥-٨٦)

لا يجب بالمال الحرام لكن لو حج به جاز. (مجمع الأنهر، كتاب الحج، قديم ١/ ٢٦١، جديد دارالكتب العلمية بيروت ١/ ٣٨٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۳۵۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۶/۲۷ھ

باغ خریدنے کی جائز اور ناجائز شکلیں

سوال [۸۷۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے پھل آنے سے پہلے ہی باغ خریدا۔ شکل نمبر ۱؍ پھول ابھی نہیں آیا ہے۔ شکل نمبر ۲؍ پھول آچکا ہے، یا پھل تو آچکا ہے؛ لیکن نہایت چھوٹے چھوٹے ہیں، جو کسی کام میں نہیں آسکتے، لوگ ایسا کرتے ہیں؛ اس لئے عرض ہے کہ مذکورہ دونوں شکلیں شریعت کی رو سے جائز ہے یا ناجائز۔ اور جواز کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟

المستفتی: افسر علی خان بلند شہری، معرفت ظفر دارک بدایوں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) باغ کی ایسی فصل کو خریدنا جس میں ابھی درخت پر پھول بھی نہیں آیا ہے، یا صرف پھول آچکا ہے درست نہیں ہے؛ اس لئے کہ یہ شئ معدوم کی بیع کے دائرہ میں داخل ہو کر ناجائز اور باطل ہے۔ (فتاوی رشیدیہ قدیم ۴۹۸، جدید زکریا ۴۷۶)

عن جابر بن عبدالله -رضي الله عنه- قال: نهى النبي ﷺ عن بيع الثمار حتى يبدو صلاحها. (صحيح البخاري، الزكوة، باب من باع ثماره أو نخله ١/ ٢٠١، رقم: ١٤٦٥، ف: ١٤٨٧، صحيح مسلم، البيوع، باب النهي عن بيع الثمار قبل بدو صلاحها، النسخة الهندية ٢/ ٧، بيت الأفكار، رقم: ١٥٣٤)

فلم ينعقد بيع المعدوم وماله خطر العدم كالحمل واللبن في الضرع والثمر قبل ظهوره. (شامي، كتاب البيوع، مطلب شرائط البيع أنواع أربعة، كراچی ٤/ ٥٠٥، زكريا ٧/ ١٥)

أما قبل الظهور فلا يصح إتفاقا. (شامي، مطلب في بيع الثمر والزرع والشجر مقصودا، زكريا ٧/ ٨٥، كراچی ٤/ ٥٥٥، هندية قديم ٣/ ١٠٦، جديد ٣/ ١٠٧)

(۲) دوسری شکل یہ ہے کہ معاملہ طے ہوچکنے کے بعد دوبارہ خریدار مالک سے یہ اجازت لے لے کہ پکنے تک کے لئے ہمارے پھل آپ کے درخت پر رہیں گے اور مالک زبانی اجازت دے دے، تب پکنے تک کے لئے جائز ہے۔

ولو اشتراها مطلقا وتركها بإذن البائع طاب له الفضل. (هداية، اشرفي ديو بند ٣/ ٢٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۴؍ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۴۸۳/۳۷)	۱۴۲۵/۷/۲۴ھ

پھل آنے سے قبل باغات کی خرید وفروخت

سوال [۸۷۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں قصبہ ککرالہ ضلع بدایوں میں امرودوں کی فصل بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور ایک سال میں امرودوں کی دو فصلیں آتی ہیں اور دونوں فصلیں پھل آنے سے پہلے ہی بک جاتی ہیں۔ دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ یہ خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں؟ کچھ پرہیزگار لوگ پھل آنے کے انتظار میں رہتے ہیں؛ لیکن تب تک سب باغ فروخت ہوجاتے ہیں، اس حال میں ہم لوگ کیا کریں؟ جب کہ ہمارے یہاں یہی کاروبار ہے، تو پھل آنے سے پہلے بیچنا کیسا ہے؟ خریدنے والا گنہگار رہے یا نہیں؟

المستفتی: ابن علی خان جامعہ مراکیٹ، بدایوں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پرہیزگار لوگ جو عمل کرتے ہیں وہ صحیح ہے، شریعت اسلامی میں باغات میں پھل آنے سے قبل ان کی فصل فروخت کرنا ناجائز اور بیع فاسد ہے؛ اس لئے کہ یہ شئ معدوم کی بیع ہے، جو کہ شرعاً جائز نہیں ہے۔ اور پھل آنے سے قبل فروختگی کے جواز کی یہ شکل ہوسکتی ہے کہ چھ ماہ یا سال بھر کے لئے باغات مع زمین کے کرایہ پر دے دئے جائیں اور اس درمیان میں لینے والے کو یہ اختیار بھی دیا جائے کہ زمین میں کوئی چیز بوکر اس کی پیداوار سے فائدہ اٹھائے اور ساتھ ساتھ باغ میں جو پھل آئے گا وہ بھی کرایہ دار کی ملکیت میں ہوجائے گا۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۷۴)

عن جابر بن عبدالله –رضي الله عنه– قال: نهى النبي ﷺ عن بيع الثمار حتى يبدو صلاحها. (صحيح البخاري، الزكوة، باب من باع ثماره أو نخله ١/ ٢٠١، رقم: ١٤٦٥، ف: ١٤٨٧، صحيح مسلم، البيوع، باب النهي عن بيع الثمار قبل بدو صلاحها، النسخة الهندية ٢/ ٧، بيت الأفكار، رقم: ١٥٣٤)

ومن استأجر أرضا على أن يكربها ويزرعها ويسقيها فهو جائز. (هداية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، اشرفی ديوبند ٣/ ٣٠٦، البحرالرائق، كوئٹه ٨/ ٢٤، زكريا ٨/ ٤٣، درمختار مع الشامي، كراچی ٦/ ٦٠، زكريا ٩/ ٨٢)

نیز پھل آنے کے بعد فروخت کرنے میں بھی معاملہ طے ہوجانے کے بعد مالک اپنی زبان سے یہ کہہ دیا کرے کہ میں آپ کو پھلوں کے پکنے تک کے لئے درختوں پر چھوڑ دینے کی اجازت دیتا ہوں۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۷۵)

ولو اشتراها مطلقا وتركها بإذن البائع طاب له الفضل. (هداية، اشرفي ديوبند ٣/ ٢٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۵۸۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۹/۸ھ

پھل آنے سے قبل باغ کی بیع وشراء کی جائز اور ناجائز صورت

سوال [۸۷۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ہم اپنی زمین جس میں باغ ہے؛ لیکن کچھ نہ کچھ اس میں پیدا ہوسکتا ہے، اجرت پر دینا چاہتے ہیں، مثلاً بیس بیگہ زمین مع باغ ایک سال کے لئے پندرہ ہزار روپے میں اور کچھ جنس آم دو کوئنٹل فصل میں طے کرتے ہیں، الحمد للہ باغ میں پھل خوب آتا ہے، کیا اس طرح معاملہ کرنا جائز ہے؟

(۲) یا دوسری شکل پھل آنے سے قبل معاملہ طے کرلیا، مثلاً پندرہ ہزار میں اور کچھ آم دو کوئنٹل، جب کہ یہ بیع درست نہیں ہے۔ اور جب پھل بن کر تیار ہوگیا اس وقت اس سے کہا کہ وہ بیع درست نہیں تھی؛ اس لئے اب ہم دو ہزار روپئے کم کرکے تیرہ ہزار میں معاملہ کرتے ہیں، جس کی حقیقت صرف ایک حیلہ کی ہے، کیا یہ شکل جواز کے لئے صحیح ہے؟

المستفتی: غیاث الدین، مرادآبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) جس زمین میں باغ لگا ہوا ہے، اس کو ایک سال کے لئے مع باغ پندرہ ہزار روپئے کرایہ پر دینا جس میں مشتری کو اس درمیان باغ کے پھلوں کے ساتھ ساتھ زمین میں پیداوار وغیرہ کے ذریعہ فائدہ حاصل کرنے کا مکمل اختیار ہو شرعاً درست ہے؛ اس لئے کہ اس صورت میں اصل عقد اور معاملہ زمین کی کرایہ داری کا ہے اور باغ اس کے تابع ہے۔ اور پندرہ ہزار روپئے کے ساتھ بائع کی طرف سے دو کوئنٹل آم کی بات جزو ثمن و قیمت کے درجہ میں ہوکر اس وقت جائز ہے، جب کہ اس باغ کے آم ہونے کی شرط نہ لگائی جائے؛ بلکہ مشتری کو اختیار رہے کہ وہ کہیں سے بھی دے اور آم کی نوع وقسم بھی متعین کرلی جائے (مثلاً چوسہ، دسہری وغیرہ) ہونا، تاکہ جھگڑے وغیرہ کی نوبت نہ آئے، تو ایسی صورت میں دو کوئنٹل آم کی بات درست ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/ ۵۷، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۱/ ۲۸۶، جدید ڈابھیل ۱۶/ ۷۰۱)

ومن استأجر أرضا على أن يكربها ويزرعها ويسقيها فهو جائز. (هداية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، اشرفى ديو بند ٣/ ٣٠٦، البحرالرائق، كوئٹه ٨/ ٢٤، زكريا ٨/ ٤٣، درمختار مع الشامي، كراچى ٦/ ٦٠، زكريا ٩/ ٨٢)

ولا يجوز أن يبيع ثمرة، ويستثنى منها أرطالا معلومة. (هداية، أشرفي ديو بند ٣/ ٢٧)

وكل شرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين ...... يفسده. (هداية، أشرفى ديوبند ٣/ ٥٩)

(۲) پھل آنے سے قبل فصل کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ یہ شئ معدوم کی بیع ہے، جو شرعاً درست نہیں ہے، نیز سوال میں ذکر کردہ حیلہ اس وقت درست ہے جب کہ پہلے سابقہ عقد فاسد کو مکمل ختم کر دیا جائے اور اس کو ختم کرنا لازم ہے، اس کے بعد از سر نو فصل کا معاملہ کریں، اب جس مقدار پر جانبین رضا مند ہو جائیں اس پر فروخت کرنا جائز ہے؛ لیکن اگر صرف بائع کی طرف سے تیرہ ہزار کی بات ہو اور مشتری کو منظور نہ ہو یا مشتری کی طرف سے ہو اور بائع کو منظور نہ ہو، تو یہ بیع تراضی کے نہ ہونے کی وجہ سے درست نہ ہوگی۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/ ۷۵)

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ. [النساء: ٢٩]

فلم ينعقد بيع المعدوم وماله خطر العدم كالحمل ...... والثمر قبل ظهوره. (شامي، البيوع، مطلب شرائط البيع، أنواع أربعة، كراچى ٤/ ٥٠٥، زكريا ٧/ ١٥)

إن التراضي من الجانبين لا يدل عليه الإيجاب وحده بل هو مع القبول. (شامي، مطلب القبول قد يكون بالفعل، وليس من صور التعاطي، كراچى ٤/ ٥٠٧، زكريا ٧/ ١٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍ ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۱۷۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۴/۱۸ھ

پھل آنے سے پہلے ان کی بیع کا حکم

سوال [۸۷۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج کل عام آموں کی یا ان پھلوں کی جن کی بیع پھل کے آنے سے پہلے ہی ہوجاتی ہے، تو ایسے پھلوں کی بیع جائز ہے یا نہیں؟ اور ان پھلوں کو خریدیں یا نہیں؟ دوسری بات یہ ہے کہ اگر مالک بیع مجہول کرے اور بیع مجہول کرتے وقت کچھ ڈالی اپنے لئے متعین کرلے کہ ہم کو اتنے من آم دینے ہیں، اب مالک بطور ہدیہ لائے یا خود استعمال کرے، تو جائز ہے یا نہیں؟ نیز ایک صاحب یہ کہتے ہیں کہ اب تقریباً ننانوے فیصد بیع مجہول ہے؛ لہٰذا بازار کے آم بھی استعمال کرنا جائز نہیں۔ ''للأ کثر حکم الکل''۔

اور ایک بات یہ ہے کہ جو پھل بازار میں آئے اور متعین طور پر معلوم ہے کہ ان کی بیع ناجائز ہے، مثلاً کسی رشتہ دار کا ہے، یا ہم آم وغیرہ خریدنے کے لئے ایسے باغ میں جائیں جن کے بارے میں متعین طور پر معلوم ہو کہ اس کی بیع ناجائز ہوتی تو ایسے آموں کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: حافظ محمد فرحت تجوید القرآن، بلندشہر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کئی کئی سال پہلے فصل فروخت کردینا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ یہ شئ معدوم کی بیع ہے، جو کہ ناجائز ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/ ۷۵)

عن جابر بن عبداللّٰه –رضي اللّٰه عنه– قال: نهى النبي صلى اللّٰه عليه وسلم عن بيع الثمار حتى يبدو صلاحها. (صحيح البخاري، الزكوة، باب من باع ثماره أو نخله ۱/ ۲۰۱، رقم: ۱٤٦٥، ف: ۱٤۸۷)

فلم ينعقد بيع المعدوم وماله خطر العدم كالحمل، واللبن في الضرع، والثمر قبل ظهوره. (شامي، كتاب البيوع، مطلب شرائط البيع، أنواع أربعة، زكريا ۷/ ۱۵، كراچی ٤/ ۵۰۵)

ہاں البتہ اگر باغ مع زمین کئی سال کے لئے کرایہ پر لے لیتا ہے وراس میں کھیتی کرتا ہے، تو باغ زمین کے تابع ہوکر عقد کے اندر داخل ہو جائے گا، پھر اس میں دیکھ ریکھ اور پھلوں کی پرورش کر کے پھل حاصل کرتا ہے، تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے؛ اس لئے کہ اصل عقد زمین کی کرایہ داری کا ہے، باغ اس کے تابع ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/ ۷۵)

ومن استاجر أرضا على أن يكربها ويزرعها ويسقيها فهو جائز.

(هداية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، اشرفي ديوبند ٣/ ٣٠٦، البحرالرائق، كوئٹه ٨/ ٢٤، زكريا ٨/ ٤٣، درمختار مع الشامي، كراچی ٦/ ٦٠، زكريا ٩/ ٨٢)

اوراگر بائع کچھ آموں کی مقدار کو اس طرح متعین کرتا ہے کہ فصل کی جتنی قیمت ہے اس کے علاوہ اتنے من آم بھی دینا پڑے گا، خواہ وہ آم کی کوئی بھی قسم ہو، تو ایسی صورت میں آم جزو ثمن میں داخل ہو کر جائز ہو جائے گا۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۱/ ۲۸۶، جدید ڈابھیل ۱۶/ ۱۰۱)

اوراگر اسی باغ کا آم ہونا متعین کرے تو یہ جائز نہیں ہے۔

وكل شرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين ...... فسد.

(هداية، أشرفي ديوبند ٣/ ٥٩)

ولا يجوز أن يبيع ثمرة، ويستثنى منها أرطالا معلومة. (هداية، أشرفي ديوبند ٣/ ٥٩)

باغات کی جوخرید وفروخت ہوتی ہے وہ عام طور پر پھل آنے سے پہلے ایک دوسال کے لئے ہوتی ہے اوراس طرح کا عقد شرعاً عقد فاسد ہے، جو کہ واجب الاسترداد ہے؛ لیکن پھر باغبان سے جو تھوک بھاؤ کے خریدار ہوتے ہیں ان کا عقد شرعاً صحیح اور درست ہے، اس کے بعد بازاروں، منڈیوں میں جو پھل آتے ہیں تو وہ جائز عقد کے بعد آتے ہیں، پھر اس کے بعد بازاروں منڈیوں میں جو خرید وفروخت کرتے ہیں وہ تمام صحیح اور درست ہے؛ اس لئے بازاروں سے پھلوں کو خرید کر کھانا بلاتردد جائز اور درست ہے۔

فإن باعه المشتري نفذ بيعه؛ لأنه ملكه فملك التصرف فيه، وسقط

حق الاسترداد، ولتعلق حق العبد بالثاني، ونقض الأول لحق الشرع، وحق العبد مقدم لحاجته؛ ولأن الأول مشروع بأصله دون وصفه، والثاني مشروع بأصله ووصفه (وتحته في البناية) وإذا باعه المشتري ليس للبائع إبطاله، وعلى المشتري القيمة أو المثل إن كان مثليا، ويطيب ذلك الملك للثاني؛ لأنه ملكه بعقد صحيح. (بناية، باب البيع الفاسد، فصل في أحكامه، قديم ۳/ ۱۱۳، جديد أشرفيه ۸/ ۲۰۳، فتح القدير، دارالفكر بيروت ٦/ ٤٦٦، كوئٹه ٦/ ۹۸، زكريا ديوبند ٦/ ٤۲۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۷۰۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۵/۲۸ھ

پھل آنے سے پہلے فروخت کئے گئے باغوں کے پھلوں کا حکم

سوال [۸۷۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: باغات جواب عام طور پر پھل آنے سے پہلے گویا پتوں پر خریدے گئے ہوں، ان کی اس فروخت کے باعث ان کے آم کا کھانا جائز ہے یا ناجائز حرام ہے، یا کراہت، کراہت ہے، تو تحریمی یا تنزیہی؟

المستفتی: مولوی محمد ظریف قاسمی، امام جامع مسجد میوادہ نوادہ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر بور اور پھل آنے سے قبل باغ فروخت کیا جائے جیسا کہ ہمارے ہندوستان کے اکثر علاقوں میں رائج ہے، تو اس طرح باغ کے پھلوں کو فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ جانبین میں سے ہر ایک کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ اصل عقد اس پھل پر ہو رہا ہے کہ جس کے پیدا ہونے کی امید ہے۔ اور ایسی مبیع کا وجود

لازم اور شرط ہے؛ اس لئے ناجائز اور بیع فاسد ہوجاتی ہے، ہاں البتہ اس کی متبادل شکل یہ ہوسکتی ہے کہ زمین مع پیڑوں کے ایک سال یا دو سال کے لئے کرایہ پر دے دے، پھر اس درمیان باغ کی زمین میں سبزی وغیرہ کوئی بھی چیز بو دے اور پیڑوں کی خدمت بھی کرتا رہے، تو ایسی صورت میں کھیتی اور باغ کے پھل سب خریدار کے لئے جائز ہوجائیں گے۔ (مستفاد: انوار رحمت/۱۸۰)

عن جابر بن عبدالله –رضي الله عنه– قال: نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن بيع الثمار حتى يبدو صلاحها. (صحيح البخاري، الزكوة، باب من باع ثماره أو نخله ۱/ ۲۰۱، رقم: ۱٤٦٥، ف: ۱٤۸۷)

ومن استاجر أرضا على أن يكربها ويزرعها ويسقيها فهو جائز. (هداية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، اشرفی دیوبند ۳/ ۳۰٦، البحرالرائق، کوئٹه ۸/ ۲٤، زكريا ۸/ ٤۳، درمختار مع الشامي، کراچی ٦/ ٦۰، زكريا ۹/ ۸۲)

وفي القنية: استأجر أرضا سنة على أن يزرع فيها ماشاء فله أن يزرع فيها زرعين ربيعيا و خريفيا. (البحرالرائق، باب مايجوز من الإجارة وما يكون خلافا فيها، کوئٹه ۸/ ۱۰، زكريا ۸/ ۱۸، هندية زكريا قديم ٤/ ٤۷۱، جديد ٤/ ٥۱۱)

نیز اگر متبادل شکل اختیار نہیں کی ہے اور عقد فاسد کا معاملہ ہوجانے کے بعد باغ والوں سے جب دوسرے لوگ خرید کر بازار میں لاکر فروخت کریں گے، تو عام لوگوں کے لئے ان سے خرید کر کھانا جائز اور حلال ہے، یعنی پہلا عقد فاسد ہوا۔ اور یہ بعد میں جو سلسلہ وار ایک دوسرے سے خریداری ہوئی ہے وہ جائز ہے۔

فإن باعه المشتري بالشراء الفاسد نفذ بيعه؛ لأنه ملكه فملك التصرف فيه، وسقط حق الاسترداد لتعلق حق العبد بالثاني، ونقض الأول لحق الشرع، وحق العبد مقدم لحاجته؛ (هداية، أشرفي ديوبند ۳/ ٦٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۴؍رجب ۱۴۲۷ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۰۶۵)	۱۴؍۷؍۱۴۲۷ھ

پھلوں کی فروختگی میں پہلا عقد فاسد ہونے کے بعد دیگر عقود کا صحیح ہو جانا

سوال [۸۷۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر پھلوں کی فروختگی کا معاملہ ہو چکا ہے اور یہ عقد فاسد ہوا ہے، اب اس عقد کے بعد خریدار نے پھلوں کو توڑ کر قبضہ کرلیا اور مالک بن گیا اس کے بعد باغ والے نے آڑھت والوں کے ہاتھ آموں کو فروخت کر دیا، تو سوال یہ ہے کہ آڑھت والوں کے ہاتھ جو معاملہ ہوا ہے، یہ فاسد ہے یا یہ عقد صحیح ہو چکا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مشتری نے جب عقد فاسد میں پھلوں کو توڑ کر قبضہ کرلیا تو وہ ان کا مالک بن گیا؛ لہٰذا اب اگر یہ کسی دوسرے کو یہ پھل بیچے گا تو یہ عقد صحیح ہوگا اور اس کے بعد جتنے عقد ہوں گے تیسرا، چوتھا عقد سب صحیح ہوں گے۔

فإن باعه، أي باع المشتري ما اشتراه شراء فاسدا بيعا صحيحا نفذ بيعه؛ لأنه ملكه فملك التصرف فيه، وسقط حق البائع الأول في الاسترداد. (فتح القدير، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، فصل في أحكامه، اشرفي ٦/ ٤٢٧، دارالفكر بيروت ٦/ ٤٦٦، كوئٹه ٦/ ٩٨)

فإن باعه المشتري نفذ بيعه؛ لأنه ملكه، فملك التصرف فيه.

(هداية، أشرفي ديوبند ٣/ ٦٥، بناية نعميه أشرفيه ديو بند ٨/ ٢٠٣)

يكره للمشتري أن يتصرف فيما اشترى شراء فاسدا بتمليك وانتفاع، فإن تصرف فيه كالبيع أو ما أشبه ذلك نفذ تصرفه ولم ينفسخ.

(تاتارخانية، زكريا ٨/ ٤٥٤، رقم: ١٢٤٧٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۸/۴/۱۴۳۵ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۴۷۶)

”بیع عرایا“ کی تفسیر میں ائمہ حدیث اور فقہاء کا اختلاف

سوال [۸۷۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ”عرایہ“ کے کیا معنی ہیں؟ اور ”عرایا“ کی تفسیر میں ائمہ محدثین کا اور فقہاء کا کا کیا اختلاف ہے اور اس پر فریقین کے دلائل اس کے جواب کیا ہیں؟

المستفتی: مولانا الطاف الرحمٰن صاحب مدرس مدرسہ امداد الغرباء رام نگر، ضلع پورنیہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضرات محدثین عام طور پر ”عرایا“ کی تین تفسیریں مذاہب کے اعتبار سے پیش کرتے ہیں:

(۱) حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کچھ لوگ فقیر نادار تھے، جن کے پاس تو کھجوریں خریدنے کے لئے پیسہ نہیں تھا، مگر کھانے کو جی چاہتا تھا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی شکایت کی گئی تو بیت المال سے ان کو خشک کھجور ملتی تھی، اس کے بدلے میں اندازہ کر کے تازہ کھجور خریدنے کے لئے اجازت دے دی جو ابھی درخت پر ہے؛ لیکن یہ معاملہ پانچ وسق (ساڑھے دس کنٹل) سے زائد میں نہ ہو؛ لہٰذا امام شافعی علیہ الرحمہ کے نزدیک عرایا بیع کی قسم میں سے ہے۔

(۲) حضرت امام مالکؒ کے نزدیک یہ ہے کہ کسی کے باغ میں دوسرے شخص کے صرف ایک یا دو درخت ہوں اور اہل مدینہ کی عادت تھی کہ موسم میں بیوی بچوں کو باغ میں لے کر جا کر فروکش ہو جاتے تھے اب جس کے ایک دو درخت ہیں اس کی آمد ورفت صاحب باغ کی عورتوں کی ایذا وتکلیف کا باعث بن جاتی تھی؛ اس لئے صاحب باغ یہ کہہ دیتا کہ تمہارے درخت پر جو تازہ کھجور ہے اس کے عوض میں مجھ سے خشک خرما لے جاؤ اور یہاں مت آیا کرو؛ لہٰذا امام مالک کے نزدیک بھی عرایا بیع کی قسم سے ہے۔

(۳) امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک ”عریہ“ بمعنی عطیہ کے ہے، موسم میں جن کے

پاس باغ وپیسہ نہ ہوتے ان کو اہل باغ ایک دو درخت بطور عطیہ دے دیا کرتے، اور جب موہوب لہ کے آنے جانے پر واہب کو ایذا ہوتی تو واہب وعدہ سے بچنے کے لئے درخت کی تازہ کھجور کے بدلہ میں خشک کھجور فروخت کردیتے؛ لہٰذا امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک بیع نہیں بلکہ ہبہ اور عطیہ ہے۔ دلائل اور تفصیل ''بذل المجہود'' میں ملاحظہ ہوں: (بذل المجهود، كتاب البيوع، باب في العرايا، مطبع سهارنپور ٤/ ٢٤٩، دارالبشائر الإسلاميه بيروت ١١/ ٦١، فيض الباري، كوئٹه ٣/ ٢٤٤، هداية، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد أشرفي ديوبند ٣/ ٥٣، عويصات ٢/ ١٢٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۶۳۸)

ایسے باغات کی خریداری کا حکم جن کی زمین میں کاشت نہیں ہوتی

سوال [۸۷۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں عام طور سے آم کے باغوں کی خرید وفروخت دو سال یا تین سال کے لئے پیشگی ہوتی ہے اور باغ کا مالک اس شخص کو جس نے باغ خریدا ہے، باغ کی زمین میں کاشت کرنے کی بھی اجازت دیتا ہے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ باغ کے خریدنے والے اصل میں باغ خریدتے ہیں؛ اس لئے کہ بہت سے باغ ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں کاشت نہیں ہوتی، آیا ایسی صورت میں ان باغوں کی خرید وفروخت کرنا درست ہے یا نہیں مطلع فرمائیں کرم ہوگا۔ فقط والسلام

المستفتی: احقر سلیم الدین غفرلہ، خادم جامع مسجد سہسپور، ضلع بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر دو سال یا تین چار سال کے لئے باغ خریدا ہے اور

باغ کی زمین اس لائق ہے کہ با ضابطہ اس میں کھیتی کی جاسکتی ہے، تو مالک باغ سے مستقل زمین کو کرایہ پر لینے کی گفتگو کی جائے اور ساتھ میں یہ بھی طے کرلیا جائے کہ پیڑ کی پیداوار کرایہ دار کی ہوگی تو ایسی صورت میں دو تین سال کے لئے زمین اور پیڑ کو کرایہ پر لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ اور اگر باغ کی زمین کھیتی کے قابل نہیں ہے، تو پھر زمین میں کھیتی کی شرط لگانا بے فائدہ ہے۔

ومن استاجر أرضا على أن يكربها ويزرعها ويسقيها فهو جائز.

(هداية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، اشرفی دیوبند ۳/ ۳۰۶، البحرالرائق، کوئٹه ۸/ ۲٤، زکریا ۸/ ٤۳، درمختار مع الشامي، کراچی ٦/ ٦۰، زکریا ۹/ ۸۲)

وإن استاجر دارا سنة بعشرة دراهم جاز، وإن لم يبين قسط كل شهر من الأجرة. (هداية، أشرفي ديوبند ۳/ ۳۰۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۳۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۴/۲۷ھ

کئی سال کے لئے باغات کو ٹھیکہ پر لینا

سوال [۸۷۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے علاقہ میں اکثر باغات کئی کئی سال کے ٹھیکہ پر لوگ خرید لیتے ہیں، جتنے سالوں کے لئے باغ خریدا تھا وہ مدت پوری ہوجانے پر باغ کے مالک کو باغ واپس مل جاتا ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ اس طرح کئی کئی سال کے ٹھیکہ پر باغات کی خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہیں ہے، تو اس طرح کے باغات کے پھل کھانا ناجائز ہے یا نہیں؟ صحیح صورت حال خرید وفروخت کی کیا ہے؟

المستفتی: عبدالرشید قاسمی سیڈھا، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: باغات کی خریداری کا مقصد پیدا ہونے والے پھلوں کی خریداری ہے اور یہ شئ معدوم کی خریداری ہوتی ہے؛ اس لئے حضرات فقہاء نے اس کو بیع فاسد میں شمار کیا ہے؛ البتہ باغبان کے ہاتھوں سے آڑھت والوں کا خریدنا اور پھر آڑھت والوں سے بازار والوں کا خریدنا یہ سب بلا تردد جائز اور درست ہے، اس میں کراہت بھی نہیں ہے۔

فإن باعه المشتري نفذ بيعه؛ لأنه ملكه فملك التصرف فيه، وسقط حق الاسترداد لتعلق حق العبد بالثاني، ونقض الأول لحق الشرع، وحق العبد مقدم لحاجته؛ (هداية، أشرفي ديوبند ٣/ ٦٤)

اورکئی سال کے لئے باغات کی خریداری کے جواز کے لئے متبادل شکل یہ ہے کہ مع زمین کے لے لے اور اس درمیان میں باغبان اس زمین میں کوئی بھی چیز بو کر کے فائدہ اٹھا لے تو ایسی صورت میں تبعاً اس درمیان پیڑوں میں جو کچھ پھل پیدا ہوسکتا ہے وہ باغبان کے لئے حلال ہوجائے گا، اس طریقہ سے کئی سالوں کی خریداری کا مسئلہ جواز کے دائرے میں آسکتا ہے۔ (مستفاد: انوار رحمت، ص: ۱۸۰)

ومن استأجر أرضا على أن يكربها ويزرعها ويسقيها فهو جائز.

(هداية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، اشرفی ديوبند ٣/ ٣٠٦، البحرالرائق، كوئٹه ٨/ ٢٤، زكريا ٨/ ٤٣، درمختار مع الشامي، كراچی ٦/ ٦٠، زكريا ٩/ ٨٢) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/۱۰/۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۱۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹/۱۰/۱۴۲۷ھ

باغ کی فصل فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۷۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: میں اپنے باغ آم وامرود، ناشپاتی، لیمو، بیل وغیرہ ان فصلوں کو دوسال کے لئے فروخت کر دیتا ہوں۔ اور ہمارے علاقہ میں خریدار اسی طرح لیتے ہیں، امسال واسطہ نہیں پڑا، لیتے میں ان میں سے ہر قسم کی ڈالی بھی طے کر لیتا ہوں۔

المستفتی: محمد عقیل خان غازی آبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس طرح سے باغوں کی بیع جائز نہیں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ زمین کو ٹھیکہ پر لے لیا جائے، اس کے بعد جو پھل ہوں گے وہ بھی جائز ہوں گے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۴/۱۷۴، جدید ڈابھیل ۱۶/۱۰۱)

عن جابر بن عبدالله –رضي الله عنه– قال: نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن بيع الثمار حتى يبدو صلاحها. (صحيح البخاري، الزكوة، باب من باع ثماره أو نخله ١/ ٢٠١، رقم: ١٤٦٥، ف: ١٤٨٧)

بيع الثمار قبل الظهور لا يصح إتفاقا، فإن باعها بعد أن تصير منتفعا بها يصح. (الهندية، كتاب البيوع، الباب التاسع في ما يجوز بيعه وما لا يجوز، الفصل الثاني زكريا قديم ٣/ ١٠٦، جديد ٣/ ١٠٧، الدر المختار، كتاب البيوع، مطلب في بيع الثمر والزرع والشجر مقصودا، كراچی ٤/ ٥٥٥، زكريا، ٧/ ٨٥) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۴۲۰/۲/۱۹ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۶۰۳۶)	۱۴۲۰/۲/۱۹ھ

پانچ کوئنٹل آم کے عوض باغ فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۷۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مالکان باغ بہار باغ لینے والے سے یہ طے کر لیتے ہیں کہ پوری فصل میں پانچ کوئنٹل

آم ہمارے یہاں پہنچانے ہیں، بہار باغ خریدار یومیہ آم پہنچا کر پوری فصل میں پانچ کوئنٹل آم طے شدہ پورا کرتا ہے، مالکان باغ کا اس طرح سے آم طے کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: اقبال احمد، شیر کوٹ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مالکان باغ کا خریداروں سے اس طرح آم طے کر کے لینا جائز نہیں ہے؛ البتہ اگر کسی خاص اور معین درخت کو بوقت خرید وفروخت الگ کرلیا جائے تو اس کے جواز میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (مستفاد: امدادی الفتاوی ۳/ ۹۸)

ولا يجوز أن يبيع ثمرة ويستثنى منها أرطالا معلومة، خلافا لمالك بخلاف ما إذا باع واستثنى نخلا معينا؛ لأن الباقي معلوم بالمشاهدة. (هداية، كتاب البيوع، اشرفی ديوبند ۳/ ۲۷، عناية مع الفتح، دارالفكر بيروت ٦/ ۲۹۱، كوئٹه ٥/ ٤٩٢، زكريا ٦/ ۲٦۹، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ۱/ ۲۳۱، دارالكتاب ديوبند ۱/ ۲۲٥، تاتارخانية، زكريا ۸/ ۳۹۳، رقم: ۱۲۲۷۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۷۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۵/۶ھ

بیس کوئنٹل آم پر باغ فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۷۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: باغ مالک فصل لینے والے سے یہ طے کر لیتے ہیں کہ بہار سے فصل میں بیس کوئنٹل آم مثلاً ہمارے گھر پہنچائے، اب فصل لینے والا روزانہ تھوڑے تھوڑے آم دے کر طے شدہ آم پورے کرتا ہے، تو کیا مالک فصل سے آم متعین کر کے فصل لینے والے سے آم گھر منگا سکتا ہے؟ یہ شکل جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: حاجی ضمیر احمد شیر کوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مالکان باغ کا خریداروں سے اس طرح آم طے کر کے لینا جائز نہیں ہے؛ البتہ اگر کسی خاص اور معین درخت کو بوقت بیع الگ کرلیا جائے تو اس کے جواز میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (مستفاد: إمداد الفتاوی ۳/ ۹۵)

ولا يجوز أن يبيع ثمرة ويستثني منها أرطالا معلومة، خلافا لمالك بخلاف ما إذا باع واستثنى نخلا معينا؛ لأن الباقي معلوم بالمشاهدة. (هداية، كتاب البيوع، اشرفی دیوبند ۳/ ۲۷، فتح القدير، دارالفكر بيروت ٦/ ۲۹۱، كوئٹه ٥/ ٤٩٢، زكريا ٦/ ٢٦٩، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ١/ ٢٣١، دارالكتاب ديوبند ١/ ٢٢٥، تاتارخانية، زكريا ٨/ ٣٩٣، رقم: ١٢٢٧٨) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍رجب ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۸۴۷)

’’احتکار‘‘ کا مطلب

سوال [۸۷۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ’’احتکار‘‘: حاجت شدید ہونے پر لفظ حالت شدید کن حالات میں استعمال کیا گیا ہے؟ (۱) اپنی حاجت (۲) قحط سالی (۳) سرکاری غلہ پر پابندی (۴) یا غرباء کی روزمرہ کی حاجات شدیدہ ہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ’’احتکار‘‘ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص غلہ کو اپنے گودام میں اسٹاک کر کے رکھے اور غلہ بازار میں بالکل نایاب ہو اور وہ شخص پھر بھی اپنا غلہ گودام نہیں کھولتا ہے، تو اس کو احتکار کہتے ہیں۔ اور اگر وہی غلہ بازار میں سستا یا مہنگا دستیاب ہے، تو اس

شخص کا اپنے گودام میں مہنگا ہونے تک رکھنا احتکار نہیں ہے، جس کی شریعت میں ممانعت آئی ہے اور اس میں دارالحرب، دارالاسلام اور جمہوریت کا کوئی فرق نہیں ہے۔

الاحتكار هو افتعال من حكر أي حبس، والمراد حبس الأقوات متربصا للغلاء. (حاشية: ٦ على الهداية، كتاب الكراهية، فصل في البيع، اشرفی دیوبند ٤/ ٤٧٠، حاشیه نووی علی المسلم، کتاب المساقاة والمزارعة، باب تحریم الاحتكار فی الأقوات ٢/ ٣١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۳؍ذی قعدہ ۱۴۲۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۶۰۴)	۱۳/۱۱/۱۴۲۵ھ

احتکار کی ممانعت کا مصداق

سوال [۸۷۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عوام الناس میں معروف ومشہور ہے کہ چالیس دن سے زائد غلہ کا اسٹاک کرنا منع ہے، کیا یہ درست ہے؟ اس کا ثبوت شریعت مطہرہ سے مل سکتا ہے؟ اس کا حکم خاص مواقع پر ہے یا خاص ملک کے لئے ہے؟

المستفتی: شرف الدین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: عوام الناس میں جو مطلقاً ممانعت کی شہرت ہوگئی ہے وہ درست نہیں ہے؛ بلکہ اس کی صورت یہ ہے کہ جب غلہ مارکیٹ میں دستیاب ہو، جب چاہے مارکیٹ سے خرید کر ضرورت پوری کی جاسکتی ہے، تو ایسے حالات میں اگر کوئی شخص مہنگا ہونے پر بیچنے کے لئے ذخیرہ اندوزی کرتا ہے، تو بلا کراہت جائز ہے، یہ احتکار کے دائرہ میں داخل نہیں۔ اور اگر کسی نے ذخیرہ اندزی کر کے رکھ لیا ہے اور مارکیٹ منڈیوں میں غلہ ختم ہوگیا

ہے اور ختم ہونے کے باوجود یہ شخص اپنا اسٹاک جاری نہیں کرتا ہے، تو یہ شرعاً احتکار کی ممانعت میں داخل ہے، جو شریعت میں جائز نہیں ہے۔

وإن اشترى في ذلك المصر وحبسه ولا يضر بأهل المصر لا بأس به، كذا في التاتارخانية. (عالمگيري، كتاب البيوع، الباب العشرون في البياعات المكروهة، فصل في الاحتكار، زكريا قديم ٣/ ٢١٣، جديد ٣/ ٢٠٠، درمختار مع الشامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ٦/ ٣٩٨، زكريا ٩/ ٥٧١، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٢١٣، تاتارخانية زكريا ٩/ ٤١٤، رقم: ١٣٧٥٤)

وقال أبو يوسف: كل ما أضر بالعامة حبسه فهو احتكار. (هداية، أشرفی ديوبند ٤/ ٤٧٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۲۲۸)

بغرضِ تجارت ذخیرہ اندوزی کرنا

سوال [۸۷۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ذخیرہ اندوزی بغرضِ تجارت اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ ہماری معلومات کے مطابق اس غرض سے ذخیرہ کیا جائے کہ قلت کے وقت اشیاء زیادہ منافع سے فروخت کی جائیں، اس کا شرعی حکم واضح کیجئے۔

المستفتی: مولوی محمد الطاف احمد نگر، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر بستی میں یہ اشیاء بکثرت موجود ہیں اور اس شخص کے خریدنے سے کوئی تنگی پیش نہیں آئی اور موسم ختم ہو جانے پر ان کو گراں فروخت کرتا ہے، تو یہ جائز ہے، اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

وإن اشترى في ذلک المصر وحبسه ولا يضر بأهل المصر لا بأس به، كذا في التاتارخانية ناقلا عن التجنيس. (عالمگيري، كتاب البيوع، الباب العشرون في البياعات المكروهة، فصل في الاحتكار، زكريا قديم ۳/ ۲۱۳، جديد ۳/ ۲۰۰، درمختار مع الشامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ٦/ ۳۹۸، زكريا ۹/ ۵۷۱، مجمع الأنهر، كتاب الكراهية، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ۲۱۳، تاتارخانية زكريا ۹/ ٤١٤، رقم: ١٣٧٥٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۶/۵/۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۲/۶۱۷۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۵/۲۶ھ

غلہ کی ذخیرہ اندوزی کرکے فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۷۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ہمیشہ موسم ارزاں میں غلے وغیرہ خرید کر اسٹاک کر لیتا ہے، پھر کچھ مہینوں کے بعد یعنی موسم گراں میں نفع کی زیادتی کے ساتھ فروخت کر دیتا ہے، ایسا کرنا مسئلہ کی رو سے کیسا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب سے نوازیں۔

المستفتی: محمد اقبال صدیقی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر زید غلہ سستا خرید کر ذخیرہ اندوزی کرتا ہے اور اہل شہر کو اس کی وجہ سے کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی ہے، تو پھر زید کا یہ عمل جائز ہے، ورنہ جائز نہیں۔

عن عمر بن الخطاب –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: الجالب مرزوق، والمحتكر ملعون. (سنن ابن ماجة، التجارات، باب الحكرة والجلب، النسخة الهندية ١/ ١٥٦، دارالسلام، رقم: ٢١٥٣)

ویکره الاحتکار في أقوات الآدميين والبهائم إذا كان ذلک في بلد يضر الاحتكار بأهله، وكذلک التلقي، فأما إذا كان لا يضر فلا بأس به.

(هداية، كتاب الكراهية، فصل في البيع، أشرفی ديوبند ٤/ ٤٧٠، البحرالرائق، زكريا ديوبند ٨/ ٣٧٠، كوئٹه ٨/ ٢٠١، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٢١٣، شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ٦/ ٣٩٨، زكريا ٩/ ٥٧١، تاتارخانية، زكريا ٩/ ٤١٤، رقم: ١٣٧٥٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۳۰۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۵/۲۲ھ

اناج اسٹاک کر کے رکھنے کا حکم

سوال [۸۷۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک آدمی نے ۱۰۰؍ روپئے من چاول یا کوئی چیز اس ارادہ سے خرید کر رکھی ہے کہ کچھ دنوں کے بعد ۱۵۰؍ روپئے من فروخت کرے گا، کیا ایسا کرنا درست ہے؟ کیا اس صورت میں غریب محتاج کو ستانا متصور ہوگا یا نہیں؟ مہربانی فرما کر جواب عنایت فرمادیں۔

المستفتی: محمد جسیم الدین محلّہ بر ولان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر پورے علاقہ میں وہ چیز بالکل نایاب ہوجائے تو ناجائز ہے، حکام کو زبردستی فروخت کروانا جائز ہے، اگر عام لوگوں کو نقصان نہیں پہنچتا ہے تو جائز ہے، اگر جمع کر کے رکھنے والا مال فروخت کرنے کے باوجود بھاؤ میں کوئی خاص زیادتی نہیں کرتا ہے، تو غریب محتاج کو ستانا نہیں سمجھا جائے گا۔

عن عمر بن الخطاب –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ:

الجالب مرزوق، والمحتكر ملعون. (سنن ابن ماجة، التجارات، باب الحكرة والجلب، النسخة الهندية ١/ ١٥٦، دارالسلام، رقم: ٢١٥٣)

وكره احتكار قوت البشر، كتين وعنب، ولوز، والبهائم كتبن وقت في بلد يضر بأهله. (الدرالمختار، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچى ٦/ ٣٩٨، زكريا ٩/ ٥٧١)

وإذا رفع إلى القاضي هذا الأمر يأمر المحتكر ببيع ما فضل عن قوته وقوة أهله على اعتبار السعة في ذلک، وينهاه عن الاحتكار، فإن رفع إليه مرة أخرى حبسه وعزره على ما يرى زجرا له، ودفعا للضرر عن الناس. (هداية، كتاب الكراهية، فصل في البيع، أشرفى ديوبند ٤/ ٤٧١، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٢١٣، تاتارخانية، زكريا ٩/ ٤١٥، رقم: ١٣٧٥٦)

وإن اشترى في ذلک المصر وحبسه، ولا يضر بأهل المصر لا بأس به. (هندية، كتاب البيوع، الباب العشرون فصل في الاحتكار، زكريا قديم ٣/ ٢١٣، جديد ٣/ ٢٠٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ شعبان ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۸۳۷)

زیادتی ثمن کے لئے پہلے خریدار سے معاملہ ختم کرنے کا حکم

سوال [۸۷۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید نے اپنی زمین فروخت کرنے کا معاملہ ایک غیرمسلم خریدار سے طے کیا تھا؛ لیکن محض قانونی رکاوٹوں کی وجہ سے بیع کی تکمیل نہیں ہوسکی؛ چونکہ زید پر قرض کا بہت بار ہوگیا تھا، اس کی فوری ادائیگی کے لئے زمین بیچنا چاہتا تھا، بیع کی تکمیل میں کافی وقت لگ گیا اور قرض کا بار زید پر اور بڑھ گیا، اب صورت حال یہ ہے کہ پہلے زمین کی جو قیمت طے

ہوئی تھی اس رقم میں اب کل قرض کی ادائے گی بھی نہیں ہوسکتی، ادھر قرض خواہوں کی طرف سے بھی سخت تقاضہ ہے، اب ایک دوسرا خریدار ہے جو پہلے طے شدہ قیمت سے زیادہ رقم دے رہا ہے، جس میں پورے قرض کی ادائے گی ہوجائے گی؛ لہٰذا اگر پہلے خریدار سے معاملہ ختم کرکے دوسرے خریدار کو زمین دے دی جائے تو شرعاً اس کی گنجائش ہوسکتی ہے، پہلے خریدار کا تو کوئی نقصان نہیں ہوگا، اگر زید ایسا نہیں کرتا تو کئی قرض خواہوں کا قرض ادا کرنے کی کوئی شکل نہیں ہے۔ اور ان تقاضوں سے ذلت وپریشانی کا بھی سخت خطرہ ہے، نیز کھانے پینے کے گذارے کے لئے بھی زید کے پاس کوئی اور ذریعہ نہیں ہے، بالکل اضطراری کیفیت وحالت میں پہلے معاملہ کو ختم کرکے دوسرے خریدار سے معاملہ کرنا چاہتا ہے، اس کے متعلق شرعی حکم سے مطلع فرمائیں۔

(۲) اگر کوئی شخص ایسا معاملہ کرچکا ہے، تو اب اس کی تلافی کی کیا شکل ہوسکتی ہے؟

المستفتی: عبدالرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) اگر زید کا معاملہ اس غیر مسلم کے ساتھ طے ہوچکا ہے اور اس کا معاہدہ بھی ہوچکا ہے، پھر زیادہ قیمت میں دوسرے کے ہاتھ بیچنے کے لئے اس غیر مسلم سے بدعہدی کرنا شرعاً جائز نہیں ہے اور بدعہدی کی وجہ سے زید گناہ گار ہوگا، ہاں البتہ زیادہ قیمت دینے کے لئے وہ غیر مسلم ازخود راضی ہوجاتا ہے، تو بدعہدی کا گناہ نہیں ہوگا۔

عن ابن عمر –رضي الله عنه– قال: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: لكل غادر لواء ينصب بغدرته. (بخاري، كتاب الجزية والموادعة ١/ ٤٥٢، رقم: ٣٠٨٤، ف: ٣١٨٨)

والصلح بعد الشراء (درمختار) وفي الشامي: وقيده في القنية بأن يكون الثاني أكثر ثمنا من الأول أو أقل أو بجنس آخر، وإلا فلا يصح. (شامي، كتاب الصلح ٨/ ٤١٧، زكريا ديوبند كراچی ٥/ ٦٣٦)

(۲) اگر کسی شخص نے ایسا معاملہ کرلیا ہے تو اس کی تلافی کی یہی شکل ہے کہ جس کے ساتھ

اس طرح کی بدعہدی کر لی ہے، اس کو کسی بھی طریقے سے راضی کر کے اس سے معافی تلافی کر لے۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: من كانت له مظلمة لأخيه من عرضه أو شيء، فليتحلله منه اليوم قبل أن لا يكون دينار ولا درهم، إن كان له عمل صالح أخذ منه بقدر مظلمته، وإن لم يكن له حسنات أخذ من سيئات صاحبه، فحمل عليه. (بخاري، كتاب المظالم، باب من كانت له مظلمة عند الرجل ١/ ٣٣١، رقم: ٢٣٨٥، ف: ٢٤٤٩، مشكوة ٢/ ٤٣٥)

إن كانت المعصية لحق آدمي فلها ركن رابع، وهو التحلل من صاحب ذلك الحق. (شرح النووي على مسلم، كتاب التوبة ٢/ ٣٥٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ رجب ۱۴۳۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۷۷۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/ ۷/ ۱۴۳۰ھ

سرکاری باغ سے لکڑی چوری کر کے مکتب میں فروخت کرنا

سوال [۸۷۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) لوگ سرکاری باغ سے لکڑی چوری کر کے بیچ رہے ہیں اور ایسی لکڑی کو خرید کر کے لوگ پنجگانہ اور اسلامی مکتب میں استعمال کرتے ہیں، تو اس میں نماز اور تعلیم جائز ہوگی یا نہیں؟

(۲) چوری کا مال جان بوجھ کر اور نہ جان بوجھ کر خریدنا کیسا ہے؟

المستفتی: نور الزماں آسامی مدرس جامعہ اسلامیہ محمودیہ بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۲) سرکاری باغات جن کی منجانب حکومت حفاظت ہوتی ہے، ان کے درختوں کی لکڑی چوری کر کے بیچنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ اور چوروں سے جان بوجھ کر کے ایسی لکڑیاں خرید کر مدارس اور مکاتب میں ٹپائی وغیرہ کی شکل میں استعمال کرنا بھی جائز

نہیں ہے، ہاں البتہ اگر خریدنے والوں کو چوری کا علم نہیں ہے، تو ایسی حالت میں لکڑیوں کو خرید کر مدارس اور مکاتب کے استعمال میں کوئی گناہ نہیں ہے؛ بلکہ گناہ چور کے اوپر ہوگا۔

قال عليه السلام: من اشترى سرقة وهو يعلم أنها سرقة، فقد شرك في عارها، وإثمها. (شعب الإيمان، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٣٨٩، رقم: ٥٥٠٠، المصنف لابن أبي شيبة، جديد موسسة العلوم القرآن بيروت ١١/ ٣٣٨، رقم: ٢٢٤٩٥)

بخلاف الأشجار؛ لأن الكلأ مالا ساق له، والأشجار لها ساق فلا تدخل فيه حتى جاز بيعها إذا نبتت في أرضه. (عالمگيري، كتاب البيوع، الباب التاسع فيما يجوز بيعه وما لايجوز، الفصل الثاني في بيع الثمار، زكريا قديم ٣/ ١١٠، جديد ٣/ ١١١)

ويدخل في الكلأ جميع أنواع ما ترعاه المواشي رطبا كان أو يابسا، بخلاف الأشجار؛ لأن الكلأ مالا ساق له، والشجر لها ساق فلا تدخل فيه حتى يجوز بيعها إذا نبتت في أرضه لكونها ملكه. (البحر الرائق، باب البيع الفاسد، زكريا ٦/ ١٢٧، كراچی ٦/ ٧٨، شامي، كراچی ٥/ ٦٦، زكريا ٧/ ٢٥٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
یکم رجب ۱۴۲۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۷۲۶۶)	۱۴۲۲/۷/۱ھ

جانتے ہوئے چوری کا سامان خریدنا مکروہ

سوال [۸۷۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص یہ جانتے ہوئے کہ یہ سامان چوری کا ہے، پھر اس کو خریدتا ہے تو کیا یہ چوری کا سامان جاننے کے باوجود خریدنا جائز ہے، جب کہ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں، صحیح مسئلہ کیا ہے؟ واضح فرمادیں، عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: محمد اسحاق بیر پور تھان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس چیز کے متعلق یہ معلوم ہے کہ یہ چوری کی ہے تو اس کے خریدار کو حدیث شریف میں چوری میں شریک ہونے والا بتایا گیا ہے۔ اور جو لوگ یہ کہہ رہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے وہ غلط ہے۔ حدیث شریف ملاحظہ فرمایئے:

عن أبي هريرة –رضی اللہ عنہ– عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم قال: من اشترى سرقة وهو يعلم أنها سرقة، فقد شرك في عارها، وإثمها. (شعب الإيمان، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٣٨٩، رقم: ٥٥٠٠، المصنف لابن أبي شيبة، جديد موسسة العلوم القرآن بيروت ١١/ ٣٣٨، رقم: ٢٢٤٩٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ شوال ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۸۶ ۱۱۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹/۱۰/۱۴۲۵ھ

پتنگ اور پٹاخوں کی تجارت کا حکم

سوال [۸۷۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) مسلمان کے لئے حلال پتنگ، پٹاخے کی تجارت جائز ہے یا نہیں؟ اور ان روپیوں کا استعمال مسلمان کے لئے حلال ہے یا نہیں؟

(۲) اگر مسلمان تاجر سے پتنگ یا پٹاخے کوئی غیر مسلم خریدے تو کیا حکم ہے؟ مع حوالہ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد قاسم گجراتی، شریک دار الافتاء مدرسہ ہٰذا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۲) پتنگ اور پٹاخے کی تجارت تعاون علی المعصیت کی وجہ سے مکروہ ہیں۔ اور اس سے حاصل شدہ روپئے حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک حلال اور پاک ہیں۔ اور امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک مکروہ ہے؛ کیوں کہ فساد دونوں میں

مشترک ہے اور اس زمانہ میں فتویٰ اور عمل حضرات صاحبین کے قول پر ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۴/۲۴۳)

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ [المائدة: ۲]

ومستفاد من الدر المنتقى: ومن حمل لذمي خمرا بأجر طاب له عند الإمام، وعندهما يكره للإعانة. (الدر المنتقى، كتاب الكراهية، فصل في الكسب، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ١٨٨، قديم ٢/ ٥٣٠، شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ٦/ ٣٩٢، زكريا ٩/ ٥٦٢، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٩، زكريا ديو بند ٧/ ٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸ محرم الحرام ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/۲۰۸۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۱/۱/۸ھ

تصویر والے کپڑوں کی تجارت

سوال [۸۷۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ٹی شرٹ اور ریڈی میڈ کپڑوں وغیرہ کی تجارت کرتا ہے، جس میں مختلف قسم کی تصویریں بنی ہوئی ہیں، ان کپڑوں کی تجارت کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: حشمت الحق متعلم مدرسہ امدادیہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فی نفسہٖ تصویر بنانا تو قطعاً حرام ہے، اور کپڑوں میں عام طور پر جو تصویریں بنی ہوئی ہیں، ان کی وجہ سے ان کپڑوں میں نماز پڑھنا تو ممنوع ہے، مگر ان کپڑوں کا پیسہ حرام نہیں ہے؛ اس لئے کہ اس کی فروختگی سے مقصود مالیت ہوتی ہے، تصویر نہیں؛ اس لئے ایسے کپڑوں کی بیع جائز ہے، مگر چونکہ اس میں تعاون علی المعصیت بھی ہے؛ اس لئے اس کی بیع مکروہ ہوگی۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۸۲، ایضاح المسائل/ ۱۵۶)

وكذا أيضا تستفاد من عبارة آتية وجاز بيع عصير عنب ممن يعلم أنه يتخذه خمرا؛ لأن المعصية لا تقوم بعينه، بل بعد تغيره، وقيل: يكره لإعانته على المعصية. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، زكريا ٩/ ٥٦٠-٥٦١، كراچی ٦/ ٣٩١، البحرالرائق، كتاب الكراهية، فصل في البيع، زكريا ٨/ ٣٧١، كوئٹه ٨/ ٢٠٢، هداية، أشرفي ديوبند ٤/ ٤٧٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍جمادی الاولی ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۳۸۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۵/۱۴۱۸ھ

مصور زیورات کی خرید فروخت کی شرعی حیثیت

سوال [۸۷۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایسے زیورات کی تجارت جس میں بتوں اور مورتیوں کی تصویر ہو، جائز ہے یا نہیں؟ اور اس کی آمدنی حلال ہے یا حرام؟ مدلل ومفصل جواب دیں۔

المستفتی: حبیب الرحمٰن، کلکتہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسے زیورات کی تجارت کرنا جس میں بتوں اور مورتیوں کی تصویر ہو، مسلمان کے لئے سخت مکروہ ہے؛ لیکن اس سے حاصل ہونے والی آمدنی حرام نہیں کہلائے گی؛ البتہ تعاون علی المعصیت کی وجہ سے کراہت کے دائرہ میں آئے گی۔

(مستفاد: ایضاح النوادر، ص: ۸۳)

ما قامت المعصية بعينه يكره بيعه تحريما، وإلا فتنزيها. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ٦/ ٣٩١، زكريا ٩/ ٥٦١)

إن ما قامت المعصية بعينه يكره بيعه، وما لا فلا. (البحرالرائق، كتاب السير، باب البغاة، زكريا ٥/ ٢٤٠، كوئٹه ٥/ ١٤٣)

ولو كانت من خشب أو صفر جاز اتفاقا فيما يظهر لإمكان الانتفاع بها. (شامي، كتاب البيوع، باب المتفرقات، كراچی ٥/ ٢٢٦، زكريا ٧/ ٤٧٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ١٢/ ١٢٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۶۶۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۴/۱۸ھ

خنزیر کے برش میں لگنے والے دیگر آلات کا آرڈر لینا

سوال [۸۷۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: خنزیر کے برش بنانے والوں کا وہ سامان جو برش سے متعلق ہے، جیسا کہ لکڑی کا دستہ، ٹین کے فول، رنگ یا اس کے ڈلیہ تیار کر کے دینا ان کے آرڈر کو لے کر اجرت لینا کیسا ہے؟

المستفتی: احسان علی صدیقی اصغر منزل شیر کوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: اگر آلات وسامان بنانے والوں کا واحد مقصد خنزیر کے بالوں کے کام کے لئے ہے، تو اعانت علی المعصیت کی وجہ سے مکروہ ہے۔

ولا تكره إجارة بيت بالسواد ليتخذ بيت نار أو كنيسة، أو بيعة أو يباع فيه الخمر عنده، وعندهما يكره؛ لأنه إعانة على المعصية –إلى قوله– ويكره في المثل إجماعا. (ملتقى الأبحر، كتاب الكراهية، فصل في البيع قديم ٢/ ٥٢٩، جديد، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٨٦، الدرالمختار كراچی ٦/ ٣٩٢، باب البيع)

اگر بنانے والوں کا واحد مقصد یہ نہیں ہے؛ بلکہ دوسرے کاموں میں بھی یہ آلات مستعمل ہوتے ہیں، تو بلا کراہت جائز ہے۔

كما استفاده من الشامي: ولو آجر نفسه ليعمل في الكنيسة ويعمرها لا بأس به؛ لأنه لا معصية في عين العمل، وحمل خمر ذمي (وقوله) وله أن

الإجارة على الحمل وهو ليس بمعصية، ولا سبب لها، وإنما تحصل المعصية بفعل فاعل مختار، وليس الشرب من ضرورات الحمل؛ لأن حملها قد يكون للإراقة أو التخييل. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، زكريا ۹/ ۵۶۲، كراچی ۶/ ۳۹۱-۳۹۲، مجمع الأنهر، قديم ۲/ ۵۳۰، جديد دارالكتب العلمية بيروت ۴/ ۸۷، فتاوى قاضي خان زكريا جديد ۲/ ۲۰۵، وعلى هامش الهندية زكريا ۲/ ۳۲۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۸/ ۱۵۸، المحيط البرهاني، المجلس العلمي بيروت ۸/ ۷۰، رقم: ۹۶۰۷، تاتارخانية، زكريا ۱۸/ ۱۶۷، رقم: ۲۸۳۷۹)

ولو وقع في ماء قليل نجسه -إلى قوله- وفي زماننا استغنوا عنه أي فلا يجوز استعماله لزوال الضرورة الباعثة للحكم بالطهارة. (شامي، كتاب الطهارة، مطلب في أحكام الدباغة، كراچی ۱/ ۲۰۶، زكريا ۱/ ۳۶۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۰۲۹)

نجش فی البیع کا حکم

سوال [۸۷۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک گاؤں کے چند افراد کا یہ پیشہ ہے کہ دیہاتوں یا شہروں میں جانوروں کی بیع وشراء کے لئے بازار لگتے ہیں، یہ پیشہ ور لوگ ان بازاروں میں جا کر بیل وغیرہ خریدتے ہیں یا اپنے گھروں سے لے جاتے ہیں، اور اپنے ہی ساتھیوں میں سے ایک شخص کو جانوروں کو فروخت کے لئے متعین کر دیتے ہیں اور باقی ساتھی اسی جگہ گھومتے پھرتے رہتے ہیں، اور جب کوئی شخص ان بیلوں کو یا جانوروں کو خریدنے آتا ہے، تو باقی ساتھیوں میں سے اس جانور کی قیمت ایک شخص نے زیادہ کر کے لگائی، مثلاً اگر اس کی قیمت سو ہے تو پانچ سو لگائے اور وہ لوگ جو اس جانور کو خریدنے کے لئے کھڑے تھے وہ دھوکہ کھا کر اس بیل کی قیمت پانچ سو یا کچھ کم کر کے دینے

کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔اور وہ بیل والے کے ساتھ قیمت اور بڑھا کر یعنی ساڑھے پانچ سو میں خریدنے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں،تو وہ شخص جس کے یہ لوگ ساتھی ہیں، کہتے ہیں کہ میں تمہیں بیل نہیں دے سکتا؛ کیوں کہ تم قصائی ہو، اس کو ذبح کر دو گے، میں اسے اپنے کسان بھائیوں کو دوں گا،تو یہ کھڑے ہوئے کسان یہ دھوکہ کھا کر جب قصائی ساڑھے پانچ سو دے رہا ہے،تو کچھ کم کرا کے یا اتنے ہی میں اسے کیوں نہ لیں، پھر یہ کسان لوگ ساڑھے پانچ سو یا چار سو میں خرید لیتے ہیں،اب جو نفع ملتا ہےاس کو یہ سب ساتھی مل کر تقسیم کر لیتے ہیں اور اسی سے گزر بسر کرتے ہیں۔کیا یہ پیشہ اختیار کرنا درست ہے؟مفصل تحریر فرمائیں عین کرم ہوگا۔

المستفتی:کلیم اللہ سیتا پوری،متعلم جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس طرح کی فروختگی شرعاً مکروہ تحریمی ہے؛ کیوں کہ یہ سخت دھوکہ دہی ہے؛ لیکن پیشہ حلال ہوگا، دھوکہ دہی کی بنا پر گنہگار رہوں گے۔(مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۴/۱۷۰، جدید ڈابھیل ۱۷/۶۲۰)

نهى رسول الله ﷺ عن النجش. (بخاري، كتاب البيوع باب النجش ١/ ٢٨٧، رقم: ٢٠٩٥، ف: ٢١٤٢)

لاتفعلوا ذلک وسبب ذلک إيقاع رجل فيه بأزيد من الثمن وهو خداع، والخداع قبيح جاور هذا البيع فكان مكروها. (عناية مع فتح القدير، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، فصل فيما يكره، دارالفكر بيروت ٦/ ٤٧٦، زكريا ٦/ ٤٣٦، كوئٹه ٦/ ١٠٦، درمختار كراچی ٥/ ١٠١، زكريا ٧/ ٣٠٥، البحرالرائق، كوئٹه ٦/ ٩٩، زكريا ٦/ ١٦٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر:۲۵/۱۴۷۰)

❁❁❁

۵/ باب حط الثمن وزيادته نقدا ونسيئة

ادھار خرید وفروخت

سوال [۸۷۴۸]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گاؤں کے کچھ آدمیوں نے مل کر ایک کمیٹی قائم کی اور کمیٹی والے ایک کوئنٹل چاول دیتے ہیں اور تین مہینہ کے بعد دو ہزار روپئے لیتے ہیں، کیا یہ معاملہ جائز ہے؟ بینوا توجروا

المستفتی: سعید الرحمٰن بھنگنا ماری انچلک دینی تعلیمی بورڈ آسام

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: شریعت میں ادھار خرید وفروخت جائز اور درست ہے؛ لہٰذا ایک کوئنٹل چاول کی ادھار خرید وفروخت اس طرح طے ہو جائے کہ تین مہینے کے بعد دو ہزار روپئے قیمت ادا کریں گے جائز اور درست ہے۔

عن عائشة –رضي الله عنها– أن النبي ﷺ اشترى طعاما من رجل يهودي إلى أجل ورهنه درعا من حديد. (صحيح البخاري، البيوع، باب شراء النبي صلى الله عليه وسلم بالنسيئة، النسخة الهندية ١/ ٢٧٧، رقم: ٢٠٢١، ف: ٢٠٦٨)

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: قدم رسول الله ﷺ المدينة وهم يسلفون بالثمر السنتين والثلاث، فقال رسول ﷺ: من أسلف في شيء ففي كيل معلوم، ووزن معلوم إلى أجل معلوم. (صحيح البخاري، كتاب السلم، باب السلم في وزن معلوم، النسخة الهندية ١/ ٢٩٩، رقم: ٢١٨٨، ف: ٢٢٤٠)

ويجوز البيع بثمن حال ومؤجل إذا كان الأجل معلوما. (هداية، كتاب البيوع، أشرفی ٣/ ٢١، مختصر القدوري / ٧١، البناية، أشرفيه ٨/ ١٦، اللباب ٢/ ٦)

وصح بثمن حال وهو الأصل، ومؤجل إلى معلوم لئلا يفضي إلى النزاع.

(شامي، مطلب فی الفرق بين الأثمان والمبيعات، زكريا ٧/ ٥٢، كراچی ٤/ ٥٣١، مجمع

الأنهر، دار الكتب العلمية ۳/ ۱۳، مصري قديم ۲/ ۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۰۸۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/ ۶/ ۱۴۳۱ھ

ادھار خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۷۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے علاقہ شہر بنگلور میں اسٹارٹ منٹ کی لوگ تجارت کرتے ہیں، اس کی شکل یہ ہے کہ عید کے موقع پر کپڑے اور دیگر ضروریات روزانہ کی پیش آمدہ اشیاء چاول وغیرہ گھروں کے پاس گاڑی میں لے کر آتے ہیں، پھر وہ لوگ مارکیٹ سے کچھ زائد رقم پر مبیع کو قرض کے طور پر دے دیتے ہیں، آخر میں جتنا سامان خریدا ہے اس کو ایک کارڈ میں قیمت لکھ کر دے کر ہر ہفتہ یا روزانہ کچھ کچھ رقم لیتے ہیں، مثلاً ۵۰۰/ کا سامان یا تو ہر ہفتہ ۵۰/ روپے روزانہ ۱۰/ روپئے دینا ہوتا ہے، اگر کوئی قسط میں نہ دے تو مزید مہلت دیتے ہیں، یعنی جتنی مبیع خریدتے وقت قیمت لکھی اتنا ہی لیتے ہیں، زائد کچھ نہیں لیتے، تو کیا یہ شرعاً جائز ہے؛ کیوں کہ اکثر عورتیں اپنے خاوندوں کے پیسے کو اپنے پاس رکھ کر اس طرح قرض لیا کرتی ہیں، تاکہ ہاتھ میں روپئے رہیں، حضرت والا اس کا شرعی حکم بیان کر کے باعث ممنون ہوں مہربانی ہوگی۔

المستفتی: مفتی حسن قادری رائے چوٹی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال میں ذکر کردہ صورت قسطوں پر خرید فروخت ہے، جو شرعاً جائز اور درست ہے۔

البيع مع تأجيل الثمن وتقسيطه صحيح -إلى- يلزم أن تكون المدة معلومة في البيع بالتأجيل والتقسيط إذا عقد البيع على تأجيل الثمن إلى

كذا يوما أو شهرا. (شرح المجلة، رستم مكتبه اتحاد ١/ ١٢٤-١٢٥، رقم المادة: ٢٤٥-٢٤٦)

ويصح البيع بثمن حال، وهو الأصل، وبثمن مؤجل ولا يثبت الأجل إلا بالشرط ما لم يكن ربويا بأجل معلوم. (الدر المنتقى، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١٣/ قديم ٢/ ٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ / جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۵۴۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۵/۲۹ھ

فائنس کا حکم

سوال [۸۷۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک گاڑی فائنس کرانا چاہتا ہے، جس میں زید کو اس وقت گاڑی کی قیمت میں سے ۳۵ / فیصد رقم جمع کرنی ہوگی اور باقی ۶۵ / فیصد رقم ۶ / فیصد بیاج کی در سے چار سال میں قسط وار ادا کرنی ہوگی۔ اور زید اس گاڑی کو کرایہ پر چلائے گا اور جو رقم آمد ہوگی وہ اور اس میں کچھ اور رقم اپنے پاس سے ڈال کر قسط جمع کرے گا۔ اور اگر ایسا نہیں کرتا ہے تو گورنمنٹ کو اتنی رقم کے ٹیکس کے کاغذات اور معلومات چاہئے کہ اتنی رقم کہاں سے آئی اور اس کا ٹیکس جمع کیا یا نہیں؟ تو اس طرح گاڑی فائنس کرانا درست ہے یا نہیں؟ جو اس سے آمد ہوگی وہ جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: انور خورشید نئی بستی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اس میں جواز اور عدم جواز کا مدار تحریری معاہدہ پر ہے۔ اور تحریری معاہدہ اس طرح لکھا جائے، مثلاً گاڑی کی قیمت ۲ / لاکھ لکھی گئی ہے اور قسطوار ادائے گی میں ڈھائی لاکھ کر دیا گیا اور پچاس ہزار بیاج لکھا گیا، تو اس طرح جائز نہیں، اس کو پچاس ہزار سود دینا لازم ہے، جو باعث لعنت ہے۔ اور اگر تحریری معاہدہ اس طرح لکھا جائے

کہ گاڑی کی کل ادائے گی ڈھائی لاکھ روپئے ہے، جس کی قسط باندھ دی گئی ہے، جس کی ادائے گی دوسال میں ہوگی، تو یہ جائز اور درست ہے، چاہے گاڑی کی قیمت ۲ ؍لاکھ ہی کیوں نہ ہو، ایسی صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ گاڑی ڈھائی لاکھ میں ملی۔ (مستفاد: انوار رحمت/ ۲۱۲، ایضاح النوادر ا/ ۱۰۹)

البيع مع تأجيل الثمن وتقسيطه صحيح -إلى- يلزم أن تكون المدة معلومة في البيع بالتأجيل والتقسيط إذا عقد البيع على تأجيل الثمن إلى كذا يوما أو شهرا. (شرح المجلة، رستم مكتبه اتحاد ١/ ١٢٤-١٢٥، رقم المادة: ٢٤٥-٢٤٦)

البيع لأجل أو بالتقسيط أجاز الشافعية والحنفية والمالكية والحنابلة والجمهور بيع الشيء في الحال لأجل أو بالتقسيط بأكثر من ثمنه النقدي إذا كان العقد مستقلا بهذا النحو، ولم يكن فيه جهالة بصفقة أو بيعة من صفقتين أو بيعتين ...... جاز البيع، وإن ذكر في المساومة سعران سعر للنقد وسعر للتقسيط، ثم تم البيع في نهاية المساومة تقسيطا. (الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹرنيشنل ديوبند ٤/ ٢٤٢، دارالفكر ٥/ ٣٤٦١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۲؍رجب ۱۴۲۷ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۰۵۷)	۱۲؍۷؍۱۴۲۷ھ

ادھار پر مونجی کی فصل کسانوں سے خریدنے کا حکم

سوال [۸۷۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اس وقت مونجی کی فصل کٹنے کے بعد اناج گھر میں آ گیا، تجار حضرات نے اس شرط پر معاملہ شروع کردیا کہ اس وقت اناج کی قیمت ۴۰۰ ؍روپئے ہے، پانچ ماہ کے بعد ہم تم کو ۶۰۰ ؍روپئے اضافہ کے ساتھ دیں گے، خواہ اس وقت بھاؤ جو بھی ہو، پھر پانچ

ماہ بعد وہ اس زائد رقم کے ساتھ خرید کرلے جاتا ہے؛ لہٰذا اس شرط پر خرید وفروخت کرنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد فاروق شریف نگر، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں یہ عقد بیع نہیں ہے؛ بلکہ ایک معاہدہ ہے، اوراس طرح معاہدہ کرنا اور پانچ ماہ بعد اضافہ کے ساتھ خریدنا درست ہے؛ کیوں کہ پانچ ماہ بعد جولین دین ہوگا وہی اصل عقد ہوگا۔

ویجوز للمشتري أن یزید للبائع في الثمن. (هدایة، کتاب البیوع، باب المرابحة والتولیة، فصل أشرفي ۳/ ۷۵، مختصر القدوري ۸۱، البنایة، أشرفیه ۸/ ۲۵٤، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۹/ ۲۹)

زیادة البائع في المبیع والمشتري في الثمن، وحط البائع من الثمن بعد العقد یلتحقان بأصل العقد، فکان العقد وقع علی ما حصل بعد الزیادة والحط. (شرح المجلة رستم، مکتبه اتحاد ۱/ ۱۳۳، رقم المادة: ۲۵۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍شعبان ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۹۷۳/۳۲)

قسطوں پر سواری یا سامان کی خریداری

سوال [۸۷۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قسطوں پر سواری یا سامان لینے کا شرعی حکم کیا ہے، جب کہ ایسا کرنے میں بظاہر سود کی شکل نظر آتی ہے؟

المستفتی: زوار احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: قسطوں پر سواری اور سامان کی بیع اس شرط پر جائز ہے کہ اس میں سود کا معاملہ نہ ہو اور کتنی قسطوں میں اور کتنی مدت میں رقم ادا کرے گا اس کو بھی متعین کرلیا جائے اور جتنی مقدار تمام قسطوں کی بیع کی ہے، خریداری کے وقت میں اسی کی مقدار کی رقم متعین کرلی جائے، مثلاً اگر دو سال میں کل ادائے گی دو لاکھ روپئے کی ہوتی ہے، تو شروع ہی سے گاڑی اور سامان کی قیمت دو لاکھ لگائی جائے اور وقت پر قیمت ادا کرنے کی کوشش کی جائے بس یہی صورت بیع بالتقسیط کی صحیح ہے، باقی تمام شکلیں ناجائز ہیں۔

البيع مع تأجيل الثمن وتقسيطه صحيح. (شرح المجلة، رستم مكتبه اتحاد ۱/ ۱۲٤ رقم المادة: ۲٤٥)

البيع لأجل أو بالتقسيط أجاز الشافعية والحنفية والمالكية والحنابلة والجمهور بيع الشيء في الحال لأجل أو بالتقسيط بأكثر من ثمنه النقدي إذا كان العقد مستقلا بهذا النحو، ولم يكن فيه جهالة بصفقة أو بيعة من صفقتين أو بيعتين ...... جاز البيع، وإن ذكر في المساومة سعران سعر للنقد وسعر للتقسيط، ثم تم البيع في نهاية المساومة تقسيطا. (الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹرنیشنل دیوبند ٤/ ٢٤٢، دار الفكر ٥/ ٣٤٦١) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍رجب ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۸۹۰۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۷/۱۴۲۶ھ

گڑ کی بھیلی بازار کی قیمت سے کم یا زیادہ قیمت پر بنانا

سوال [۸۷۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ہمارے یہاں عموماً گڑ کا کاروبار ہوتا ہے، اکتوبر سے مارچ تک گڑ کے کارخانے چلتے ہیں اور اپریل میں کارخانے بند ہو جاتے ہیں، مارچ میں عموماً گڑ کا بھاؤ کم ہوتا

ہےاور جولائی میں گڑ اکثر مہنگا ہوجاتا ہے، زید نے دو ہزار بھیلی سترہ روپئے کے بھاؤ سے ڈالی ہیں، اب بکران بھیلیوں کا خریدار ہے، بکر کا کہنا ہے کہ میں جون کی پہلی کو بیس روپئے کے بھاؤ سے پیسہ ادا کر دوں گا، بکر کا یہ بھی کہنا ہے کہ جولائی تک اگر زید روک سکتا ہے تو جولائی میں جو بھی بھاؤ ہوگا اس سے دو روپئے فی بھیلی کے حساب سے زائد پیسہ دوں گا۔

(۲) گڑ کا کارخانہ چلنے سے پہلے یعنی ستمبر میں کارخانہ والے کچھ رقم بیو پاریوں سے لے لیتے ہیں کہ ہم اس بھاؤ کی بھیلی تمہیں مارچ میں بنادیں گے، مثلاً بھیلی کا بھاؤ بیس روپئے ہوتا ہے اور فریقین آپس میں مشورہ کر کے پندرہ روپئے کے بھاؤ سے سودا کر لیتے ہیں، تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کارخانہ والے یہ کہہ کر بھی سودا کرتے ہیں کہ مارچ میں جو بھی بھاؤ ہوگا اس سے دو روپئے کم میں ہم بھیلی بنادیں گے۔

المستفتی: محمد جاوید قاسمی، مدرسہ مفتاح العلوم ڈڑھیال، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: کسی چیز کو نقد بیچنے پر کم قیمت لینا اور ادھار بیچنے پر زیادہ قیمت لینا اس وقت جائز ہے، جب کہ مجلس عقد میں قیمت کی مقدار اور ادائے قیمت کی میعاد متعین کر لی جائے، مذکورہ صورت میں چونکہ یہ دونوں شرطیں موجود ہیں؛ اس لئے بیع درست ہوجائے گی۔

ألا يرى! أنه يزاد في الثمن لأجل الأجل. (هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، اشرفي ۳/ ۷٤، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ۱۰/ ۱۸۷، رقم: ۱۲۷۳۸، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۱۱۲، مصري قديم ۲/ ۷۸، شرح المجلة رستم مكتبه اتحاد ۱/ ۱۱٤-۱۱۵، رقم المادة: ۲٤۵-۲٤٦)

اور جولائی میں جو بھاؤ ہوگا اس پر دو روپئے زائد فی بھیلی دینے کے حساب سے معاملہ کرنا جہالت ثمن کی وجہ سے جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ ایسی صورت میں جولائی میں کیا بھاؤ ہوگا،

یقین کے ساتھ کسی کو معلوم نہیں ہے؛ اس لئے یہ شکل جائز نہیں ہے۔

رجل باع على أنه بالنقد بكذا، وبالنسيئة بكذا، وإلى شهر بكذا، وإلى شهرين بكذا لم يجز. (عالمگيري، الباب العاشر: الشروط التي تفسد البيع والتي لا تفسده، زكريا قديم ٣/ ١٣٦، جديد ٣/ ١٣٧)

ستمبر میں کارخانے والے بیوپاریوں سے یہ کہہ کر پیسہ لیں کہ مارچ میں عام طور سے بیس روپئے کا بھاؤ ہوتا ہے، پیشگی پیسہ دینے پر ۱۵/ روپئے فی بھیلی ستمبر میں پیشگی روپئے دے کر معاملہ طے کرلیا جائے اور مارچ ادا کئے گئے روپئے کے بدلے میں فی بھیلی ۱۵/ روپئے کے حساب سے وصول کرنا بیع سلم کے دائرے میں داخل ہوکر جائز ہے، جب کہ ستمبر میں مجلس عقد میں پیسہ کی ادائے گی ہوچکی ہے؛ لیکن ایسا کرنا جائز نہیں ہے کہ پیشگی پیسہ لے کر یہ کہہ دے کہ مارچ میں جو بھی بھاؤ ہوگا اس سے دو روپئے کم میں بھیلی بنادیں گے؛ اس لئے کہ ثمن کی جہالت کی وجہ سے مسلم فیہ میں بھی جہالت آجاتی ہے، اس لئے یہ شکل جائز نہیں ہے۔

وتحقيقه أن جهالة قدر رأس المال تستلزم جهالة المسلم فيه؛ لأن المسلم إليه ينفق رأس المال شيئا فشيئا، وربما يجد بعض ذلك زيوفا ولا يستبدله في مجلس الرد، فيبطل العقد بقدر ما رده، فإذا لم يكن مقدار رأس المال معلوما لا يعلم في كم انتقض السلم أو في كم بقي، وجهالة المسلم فيه مفسدة بالإتفاق، فكذا ما يستلزمها. (عناية على فتح القدير، كتاب البيوع، باب السلم، زكريا ٧/ ٨٨، دارالفكر ٧/ ٩١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ صفر ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۲۵۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۲/۱۶ھ

سوسائٹی سے کھاد خریدنے کا حکم

سوال [۸۷۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم لوگ سرکاری سوسائٹی سے جو کھاد لیتے ہیں وہ نقد نہیں ملتا ہے، ادھار دیتے ہیں۔ اور سرکار اس ادھار پر تھوڑا سا بیاز لیتی ہے اور سوسائٹی میں اچھا کھاد اور چھوٹ بھی ملتی ہے۔ اور اگر وہی کھاد بازار سے لیتے ہیں تو وہ خراب ہوتا ہے اور بازار والے کھاد میں ملاوٹ بھی ہوتی ہے اور مہنگا بھی ملتا ہے، اس صورت میں ہم لوگ کیا سوسائٹی سے کھاد لے سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: حمیداللہ عیسیٰ پور، فرخ آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ صورت بیع نسیئہ (ادھار خریداری) کی ہے، جس میں ادھار کی وجہ سے قیمت میں اضافہ ہوتا ہے، جب کہ مدت متعین ہو اور سائل کو اس کا بیاج سمجھنا درست نہیں ہے۔

وأما الأئمة الأربعة وجمهور الفقهاء والمحدثين فقد أجازوا البيع، والبيع المؤجل بأكثر من سعر النقد. (بحوث قضايا فقهية معاصرة ٥/ ٧، بحواله انوار رحمت ٢٣٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۰۱۶/۴۰)

قیمت بڑھا کر ادھار فروخت کرنا

سوال [۸۷۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے ۵۰۰؍روپئے کوئنٹل کے حساب سے ۱۰۰؍من چاول کا اسٹاک کیا، اب وہ

زید مذکور عمرو کے ہاتھ سے پانچ ماہ کی ادھاری پر آٹھ سو روپئے کے عوض میں فروخت کرتا ہے، حال یہ ہے کہ لینے والا کبھی وقت معینہ پر روپئے دیتا ہے اور کبھی وقت غیر معینہ کے بعد، تو کیا ایسا کاروبار زید کے لئے درست ہے یا نہیں؟ جب کہ زید ایک عالم اور مفتی ہے؟

المستفتی: شاکر حسین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب مدت متعین ہے، تو مذکورہ معاملۂ بیع جائز اور درست ہے، اگرچہ وقت مقررہ پر روپئے ادا نہ ہوتا ہو، بس صرف عقد کے وقت میں مدت متعین کر لینا شرط ہے۔

ویجوز البیع بثمن حال ومؤجل إن کان الأجل معلوما. (هداية، کتاب البیوع، أشرفی ۳/ ۲۱، مختصر القدوري، ص: ۷۱، شامي، زکریا ۷/ ۵۲، کراچی ٤/ ۵۳۱، مجمع الأنهر، دارالکتب العلمیة بیروت ۳/ ۱۳/ مصري قدیم ۲/ ۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ شوال ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۶۷۳)

ادھار کی صورت میں مبیع کی قیمت بڑھانا

سوال [۸۷۵٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم نے ایک تاجر کو ایک لاکھ روپئے کا آرڈر دیا، ایک لاکھ روپئے کی مال کی تیاری میں سات فیصد خرچ آتا ہے۔ اور ہم اس کو دس فیصد خرچ دے رہے ہیں، اس شرط پر کہ ہم اس کو ایک ماہ کے بعد پیمنٹ کریں گے، کیا یہ شرط بیع وشراء میں جائز ہے، یا بیع فاسد ہے؟

المستفتی: سمیع اللہ محلّہ بھٹی اسٹریٹ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ طریقہ سے بیع وشراء درست ہے، نیز ادھار کی صورت میں خرچ میں اضافہ کر کے دینا بھی جائز ہے۔

ألا یری! أنه یزاد في الثمن لأجل الأجل. (هدایة، کتاب البیوع، باب المرابحة والتولیة، أشرفي ۳/ ۷٤، المحیط البرهاني، المجلس العلمي ۱۰/ ۱۸۷، رقم: ۱۲۷۳۸، مجمع الأنهر، دارالکتب العلمیة بیروت ۳/ ۱۱۲، مصري قدیم ۲/ ۷۸)

وإن شرط الأجل في الثمن، والثمن دین، فإن کان الأجل معلوما جاز البیع. (عالمگیري، الباب العاشر في الشروط التي تفسد البیع والتي لا تفسده، زکریا قدیم ۳/ ۱٤۲، جدید ۳/ ۱٤۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ ذیقعدہ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۷۲۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/ ۱۱/ ۱۴۱۴ھ

کیش لے کر کم قیمت پر سامان بعد میں دینا

سوال [۸۷۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے ایک اسکیم چلائی ہے، جس میں اس نے چند چیزیں رکھی ہیں اور بازاری قیمت سے بہت کم قیمت پر لوگوں کو دے رہا ہے، مثال کے طور پر بجلی کا پنکھا بازار میں سات سو روپئے کا ہے وہ ۲۴۰/ روپئے کا اپنی اسکیم میں دے رہا ہے، الگ سے دس پرسینٹ کمیشن لیتا ہے، تو کیا ایسی چیز کا خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

نوٹ: روپئے جمع کرنے کے ۲۰/ دن بعد وہ آئیٹم دیتا ہے، اور روپئے جمع کرتے وقت دس فیصد کمیشن لیتا ہے، آپ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: حکیم مولوی محمد شاہد صاحب لائن نمبر: ۱۳، آزاد نگر، ہلدوانی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فیصدی اور پرسینٹ کی قید کے ساتھ ناجائز ہے؛ لیکن اگر یوں کرلیا جائے کہ پورے پنکھے کی قیمت ۲۴۰ر کے بجائے ۲۶۴ر قرار دی جائے، یا یوں کرلیا جائے کہ بوقت عقد مشتری بطور انعام خوشی سے فیصدی کی قید لگائے بغیر ۲۴ر روپئے مزید دے دیا کرے تو گنجائش ہے۔ اور یہ دس فیصد یا دس پرسینٹ نہیں سمجھا جائے گا؛ بلکہ مبیع کی اصل قیمت سمجھی جائے گی۔

ويجوز للمشتري أن يزيد للبائع في الثمن –إلى قوله– فالزيادة والحط يلتحقان بأصل العقد عندنا. (هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، أشرفي ٣/ ٧٥، مختصر القدوري، ص: ٨١، الموسوعة الفقهية الكويتية ٩/ ٢٩، شرح المجلة رستم، مكتبه اتحاد ١/ ١٣٣، رقم المادة: ٢٥٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹ر ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۰۲۱)

قیمت بڑھا کر قسطوار ادھار بیچنا

سوال [۸۷۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قسطوں پر زیادہ رقم دے کر کوئی چیز خرید سکتے ہیں، جب کہ نقد پر کم قیمت لگ رہی ہو؟

المستفتی: محمد زوار مال پوری، جے پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قسطوں پر خریداری کے وقت اگر تمام قسطیں متعین ہوجائیں اور ہر ایک قسط کی مقدار بھی معلوم ہوجائے اور ادائے گی کی مدت بھی متعین ہوجائے، تو اس طرح قسطوں پر خریداری شرعاً جائز ہے، چاہے نقد کے مقابلہ میں قسطوں کی

شکل میں رقم کی مقدار کتنی ہی بڑھ جائے اس کی وجہ سے شرعی طور پر خریداری میں کوئی خرابی لازم نہیں آتی ۔(مستفاد: امداد الفتاوی ۳/۲۰)

البيع مع تاجيل الثمن و تقسيطه صحيح ...... يلزم أن تكون المدة معلومة في البيع بالتأجيل و التقسيط. (شرح المجلة رستم، مكتبه اتحاد ١/ ١٢٤-١٢٥، رقم المادة: ٢٤٥-٢٤٦، مجلة الأحكام العدلية، كراچی ١/ ٥٠، رقم المادة: ٢٤٥-٢٤٦)

ولو لم يكن الأجل مشروطا في العقد، لكنه منجم معتاد كعادة بعض البلاد يشترون بنقد ويسلمون الثمن بعد شهر، إما جملة أو منجما قيل: لا بد من بيانه؛ لأن المعروف كالمشروط. (عناية مع الفتح، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، كوئٹه ٦/ ١٣٤، دارالفكر ٦/ ٥٠٩، زكريا ٦/ ٤٦٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/۵/۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۶۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/۵/۱۴۲۳ھ

ادھار ونقد کی صورت میں قیمت میں تفاوت کا حکم

سوال [۸۷۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: رائی کے کھیت والے نے تیل والے کو رائی دی، جس پر میل مالک کہتا ہے: اگر دو مہینہ کے بعد پیسہ لوگے تو ۵۰۰/ روپئے کوئنٹل اور اگر ۶/ مہینہ کے بعد لوگے تو ۶۰۰/ روپئے کوئنٹل اور ایک سال بعد لوگے تو ایک ہزار روپئے کوئنٹل کے حساب سے پیسے ملیں گے، تو کیا یہ سود ہے؟

المستفتی: محمد زبیر احمد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: رائی کے کھیت والے نے جس وقت میل مالک کو رائی دی

اسی وقت دو مہینے چھ مہینے یا ایک سال ان میں سے کوئی ایک مدت حتمی طور پر متعین کرلی ہے، تو جائز ہے، اگر ادائے گی میں کچھ تاخیر بھی ہوجائے تو اس متعینہ رقم پر اضافہ نہیں ہوسکتا۔

وأما البطلان فيما إذا قال: بعتكه بألف حالا، وبألفين إلى سنة، فلجهالة الثمن. (فتح القدير، كتاب البيوع، دارالفكر ٦/ ٢٦٢، زكريا ٦/ ٢٤٣، كوئٹه ٥/ ٤٦٩، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢/ ٣٨)

وصح بثمن حال وهو الأصل، ومؤجل إلى أجل معلوم. (شامي، كتاب البيوع، مطلب في الفرق بين الأثمان والمبيعات، زكريا ٧/ ٥٢، كراچی ٤/ ٥٣١، هداية، أشرفي ٣/ ٢١، مختصر القدوري، ص: ٧١، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١٣، مصري قديم ٢/ ٨)

رجل باع على أنه بالنقد بكذا و بالنسيئة بكذا، وإلى شهر بكذا، وإلى شهرين بكذا لم يجز. (عالمگيري، الباب العاشر في الشروط التي تفسد البيع، والتي لا تفسده، زكريا قديم ٣/ ١٣٦، جديد ٣/ ١٣٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ ذیقعدہ ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۱۴۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/ ۱۱/ ۱۴۲۷ھ

نقد وادھار کی وجہ سے قیمت میں کمی زیادتی کرنا

سوال [۸۷۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے پاس دو شخص کچھ خریدنے کے لئے آئے، ایک نقد دوسرا ادھار، تو ہم نقد والے کو جو بھاؤ ہے اسی میں دیتے ہیں اور ادھار خریدنے والے کو بھاؤ بڑھا کر دیتے ہیں۔

المستفتی: شمس الدین علی پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: نقد اور ادھار کی وجہ سے قیمت میں کمی زیادتی شرعاً وعرفاً درست ہے، مثلاً کوئی تاجر ایک چیز نقد ایک روپئے میں اور ادھار دو روپئے میں دیتا ہے، تو

اس میں کوئی حرج نہیں ہے؛ لیکن شرط یہ ہے کہ خرید وفروخت کرتے وقت قیمت کی مقدار اور ادائے قیمت کی مدت متعین کر لی جائے، مثلاً تاجر یہ کہے کہ میں یہ چیز ایک ماہ کے لئے دو روپئے میں ادھار دے رہا ہوں۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/ ۲۰، محمودیہ قدیم ۱۳/ ۳۳۲، جدید اشرفیہ ۱۶/ ۱۵۲، کفایت المفتی قدیم ۸/ ۴۰، جدید زکریا ۸/ ۵۲، جدید زکریا مطول ۱۱/ ۱۳۵، رحیمیہ قدیم ۹/ ۲۵۲، جدید زکریا ۹/ ۱۹۸)

ألا يرى! أنه يزاد في الثمن لأجل الأجل. (هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، اشرفي ٣/ ٧٤، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ١٠/ ١٨٧، رقم: ١٢٧٣٨، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١١٢، مصري قديم ٢/ ٧٨، هندية زكريا قديم ٣/ ١٤٢، جديد ٣/ ١٤٢)

لیکن اس میں یہ صورت کہ اگر ایک ماہ میں قیمت ادا کرو تو دو روپئے اور تین ماہ میں ادا کرو تو تین روپئے، اس طرح جہالت کے ساتھ یہ معاملہ کرنا شرعاً جائز نہیں ہوگا؛ بلکہ عقد کے وقت میں جو قیمت طے ہوگئی ہر حال میں اتنی ہی قیمت ملے گی، خواہ زیادہ سے زیادہ تاخیر ہی کیوں نہ ہو۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/ ۲۰، رحیمیہ ۹/ ۲۵۲)

رجل باع على أنه بالنقد بكذا، وبالنسيئة بكذا، وإلى شهر بكذا، وإلى شهرين بكذا، لم يجز كذا فى الخلاصة. (هندية، الباب العاشر في الشروط التي تفسد البيع، والتي لا تفسده، زكريا ٣/ ١٣٦، جديد ٣/ ١٣٧، وهكذا في فتح القدير، زكريا ٦/ ٢٤٣، دارالفكر ٦/ ٢٦٢، كوئٹه ٥/ ٤٦٩، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢/ ٣٨)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۶۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۵/۲۰ھ

نقد وادھار معاملہ میں قیمت میں کمی بیشی کرنا

سوال [۸۷۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کی پرچون کی دوکان ہے، اگر کوئی شخص اس سے نقد سامان خریدتا ہے، تو اسے کم پیسوں پر دیتا ہے اور جو قیمت فوراً ادا نہیں کرتا ہے اسے قیمت بڑھا کر دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ میں جس دوکان سے سامان لاتا ہوں، اگر اس کو بروقت روپئے سامان کے نہیں ادا کرتا ہوں تو وہ مجھ سے ان روپیوں پر سود لیتا ہے، تو اس کو میں اسی سے ادا کروں گا، اپنی جیب سے میں سود ادا نہیں کروں گا، تو سوال یہ ہے کہ ادھار دینے والے کو سامان کی قیمت بڑھا کر دینا اور اپنے سے اوپر بڑی دوکان کو سود دینا شرعاً کیسا ہے؟ مدلل ومفصل جواب مطلوب ہے۔

المستفتی: محمد اخلاق، خوشحال گنجی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں نقد وادھار میں قیمت کی کمی وزیادتی تو جائز ہے، مثلاً کوئی تاجر ایک چیز نقد لینے والے کو ایک روپئے میں دیتا ہے اور وہی چیز ادھار لینے والے کو دو روپئے میں دے، تو اس میں مضائقہ نہیں، مگر اس کے جواز کے لئے شرط یہ ہے کہ مجلس عقد میں قیمت کی مقدار اور ادائے قیمت کی میعاد مقرر کرلی جائے، بڑی دوکان والوں کے لئے چھوٹی دوکان والوں سے سود لینا جائز نہیں۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۸/ ۴۰، جدید زکریا ۸/ ۵۲، جدید زکریا مطول ۱۱/ ۱۳۵، فتاوی رحیمیہ قدیم ۹/ ۲۵۲، جدید زکریا ۹/ ۱۹۸، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۳/ ۳۳۲، جدید ۱۶/ ۱۵۲)

ألا يرى! أنه يزاد في الثمن لأجل الأجل. (هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، اشرفي ٣/ ٧٤، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ١٠/ ١٨٧، رقم: ١٢٧٣٨، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١١٢، مصري قديم ٢/ ٧٨، هندية زكريا قديم ٣/ ١٤٢، جديد ٣/ ١٤٢)

رجل باع على أنه بالنقد بكذا، وبالنسيئة بكذا، وإلى شهر بكذا،

وإلى بشهرين بكذا، لم يجز. (هندية، الباب العاشر في الشروط التي تفسد البيع، والتي لا تفسده، زكريا ٣/ ١٣٦، جديد ٣/ ١٣٧، وهكذا في فتح القدير، زكريا ٦/ ٢٤٣، دارالفكر ٦/ ٢٦٢، كوئٹه ٥/ ٤٦٩، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢/ ٣٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴ رجمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۴۴ ۶۶)

نقد ۸۰/ روپئے اور ایک ماہ کی ادھاری پر ۸۵/ روپئے میں فروخت کرنا

سوال [۸۷۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عمرو کاروباری آدمی ہے، اپنے یہاں مال تیار کر کے فروخت کرتا ہے، جس میں اس کا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی خریدار نقد خریدے تو ۸۰/ روپئے کلو اور ایک ماہ کے ادھار پر ۸۵/ روپئے کلو اور دو ماہ کے ادھار پر ۹۰/ روپئے کلو فروخت کرتا ہے، جو کہ بظاہر استحصال ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ اور کیا مذکورہ صورت ربوا میں داخل نہیں؟

المستفتی: مولانا شمیم احمد، مولانا والی مسجد تمبا کو والان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: مذکورہ صورت میں نقد اور ادھار کے اندر قیمت کی کمی وزیادتی تو جائز ہے، مگر اس کے جواز کے لئے شرط یہ ہے کہ مجلس عقد میں قیمت کی مقدار اور ادائے قیمت کی میعاد متعین کر لی جائے۔ اور اگر احتمالی صورت بیان کر کے عقد کرے تو جائز نہیں۔

رجل باع على أنه بالنقد بكذا، وبالنسيئة بكذا، وإلى شهر بكذا، وإلى بشهرين بكذا، لم يجز، كذا في الخلاصة. (هندية، الباب العاشر في الشروط التي تفسد البيع، والتي لا تفسده، زكريا ٣/ ١٣٦، جديد ٣/ ١٣٧، وهكذا في فتح القدير، زكريا ٦/ ٢٤٣، دارالفكر ٦/ ٢٦٢، كوئٹه ٥/ ٤٦٩، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢/ ٣٨)

اور مذکورہ صورتیں ربوا میں داخل نہیں بشرطیکہ ان صورتوں میں میعاد ختم ہونے کے بعد مزید اضافہ نہ کیا جاتا ہو۔

ألا يرى! أنه يزاد في الثمن لأجل الأجل. (هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، اشرفي ۳/ ۷٤، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ۱۰/ ۱۸۷، رقم: ۱۲۷۳۸، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۱۱۲، مصري قديم ۲/ ۷۸، هندية زكريا قديم ۳/ ۱٤۲، جديد ۳/ ۱٤۲)

ويزاد في الثمن لأجله إذا ذكر الأجل بمقابلة زيادة الثمن قصدا، فاعتبر مالا في المرابحة. (شامي، قبيل مطلب في الكلام على الرد بالغبن الفاحش، زكريا ۷/ ۳٦۲، كراچی ۵/ ۱٤۲، البحرالرائق، كوئٹه ٦/ ۱۱۵، زكريا ٦/ ۱۹۱)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍ ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۱۲۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶/۴/۱۴۲۰ھ

نقد اور ادھار کی صورت میں قیمتوں کے فرق کا حکم

سوال [۸۷۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کہ گیہوں ۸۰۰؍ روپئے کوئنٹل ملتا ہے، زید بکر کو ایک کوئنٹل گیہوں اس شرط پر دیتا ہے کہ اگر تم ایک ماہ بعد دو گے تو اسی ریٹ کی قیمت تم کو دینا ہوگی، جب کہ ایک ماہ بعد ۷۰۰؍ روپئے کوئنٹل گیہوں ملتا ہے، تو کیا زید کا اس طرح بیع کرنا اور اس بھاؤ پر دینا درست ہے یا نہیں؟ (۲) زید بکر کو ایک کوئنٹل گیہوں ادھار اس شرط پر دیتا ہے کہ ۱۲۰۰؍ روپئے لوں گا، جب کہ ابھی ۱۰۰۰؍ روپئے کوئنٹل گیہوں ملتا ہے، کیا زید کا ادھار دینے کی وجہ سے زیادہ قیمت لینا درست ہے یا نہیں؟ ربوا تو نہیں؟

المستفتی: محمد منصور عالم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مذکورہ دونوں صورتوں میں اس طرح کی خرید وفروخت کرنا جائز ہے، بشرطیکہ بوقت خرید فروخت متعاقدین بیع کے مؤجل ہونے یا نہ ہونے کی تعیین کرکے ایک ثمن پر متفق ہوجائیں۔ اوراگر متعاقدین تأجیل بیع وعدم تأجیل بیع اور تعیین ثمن یا عدم تعیین ثمن کا فیصلہ کرنے سے قبل جدا ہوجائیں، تو اس صورت میں بیع جائز نہ ہوگی، نیز متعاقدین کے مابین جو قیمت طے ہوجائے وہی معتبر ہے، خواہ مارکیٹ میں کوئی اور قیمت ہو؛ لہٰذا بائع مبیع کو مارکیٹ ریٹ پر دے یا مارکیٹ ریٹ پر نہ دیتے ہوئے اپنے متعین کردہ ریٹ پر دے، بہرصورت بیع جائز ہے۔

لأن للأجل شبها بالمبيع، ألا يرى! أنه يزاد في الثمن لأجل الأجل.

(هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، اشرفي ٣/ ٧٤، البحرالرائق، كوئٹه٦/ ١١٥، زكريا ٦/ ١٩١، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ١٠/ ١٨٧، رقم: ١٢٧٣٨، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١١٢، مصري قديم ٢/ ٧٨، هندية زكريا قديم ٣/ ١٤٢، جديد ٣/ ١٤٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍محرم الحرام ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۹۷۶)

نقد اور ادھار کی قیمت میں فرق کرنا

سوال [۸۷۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کی پرچون کی دوکان ہے، نقد سودا پانچ روپئے میں ایک کلو دیتا ہے اور ادھار آٹھ یا سات روپئے میں ایک کلو دیتا ہے، تو زید کا نقد اور ادھار میں قیمت کا یہ فرق کرنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبد اللہ مقبرہ دوئم کیت والی مسجد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ادھار کی وجہ سے قیمت زیادہ لینا اور نقد کی صورت میں قیمت کم لینا جائز اور درست ہے۔(مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۳/۳۳۳، جدید اشرفیہ ۱۶/۱۵۲)

ألا یری! أنه یزاد في الثمن لأجل الأجل. (هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، اشرفي ٣/ ٧٤، شامی، زكريا ٧/ ٣٦٢، كراچی ٥/ ١٤٢، البحر الرائق، كوئٹه٦/ ١١٥، زكريا ٦/ ١٩١، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ١٠/ ١٨٧، رقم: ١٢٧٣٨، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١١٢، مصري قديم ٢/ ٧٨)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/۵/۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۴۰۲۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴/۵/۱۴۱۵ھ

ادھار معاملہ میں کمی وبیشی کا حکم

سوال [۸۷۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: لوگ ایسے معاملہ کرتے ہیں کہ تم مجھ سے اس وقت چاول لے جاؤ، اس وقت پندرہ روپئے کے حساب سے لوں گا اگر چہ اس وقت بیس روپئے کیوں نہ ہو۔

المستفتی: محمد اطہر بن عبد الجلیل، ارریہ بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بعض لوگوں کا اس طرح معاملہ کرنا کہ اس وقت چاول لے جاؤ اور اس وقت مثلاً اگہن کے مہینہ میں پندرہ روپئے کے حساب سے چاول لوں گا تو یہ ادھار کی شکل ہے۔ اور ادھار میں کمی زیادتی جائز نہیں ہے۔ اور یہاں ادائے گی کے وقت میں کمی زیادتی لازم آرہی ہے؛ اس لئے جائز نہیں ہے۔ اور اس کے جواز کی صرف یہی شکل

ہے کہ اس وقت تم ایک کوئنٹل چاول لے جاؤ اور اگہن کے مہینہ میں تمہیں ایک ہی کوئنٹل چاول دینے پڑیں گے، چاہے اس وقت چاول کی قیمت کچھ بھی ہو، اس سے کوئی سروکار نہیں۔

وأما بيع المكيل المطعوم بجنسه متفاضلا، وبيع الموزون المطعوم بجنسه متفاضلا -إلى- فلا يجوز بالإجماع. (بدائع الصنائع، كتاب البيوع، مسائل الربا، زكريا ٤/ ٤٠٣، كراچی ٥/ ١٨٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۶۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۴/۲۷ھ

نقد میں کم اور ادھار میں زائد روپئے لینا

سوال [۸۷٦٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک آدمی سلی کا کاروبار اس طرح کرتا ہے کہ نقد ۹۰/ روپئے کلو اور ادھار ۹۲/ روپئے کلو دیتا ہے؛ لیکن اگر ادھار مال کے پیسے ایک ماہ بعد بھی دئے جائیں تب بھی ۹۲/ روپئے کلو کے ہی پیسے لیتا ہے۔ اور دوسرا آدمی اس طرح کاروبار کرتا ہے کہ نقد مال ۹۰/ روپئے کلو اور ادھار ۹۲/ روپئے کلو؛ لیکن ادھار کے ساتھ ساتھ وقت مقرر کرتا ہے، کہ اگر ایک ہفتہ کے اندر پیسے دے دو تب تو یہی قیمت ہے؛ لیکن اگر ایک ہفتہ سے ایک دن بھی آگے بڑھ گیا تو ۹۳/ روپئے کے حساب سے پیسہ لیتا ہے، تو حضرت والا سے درخواست ہے کہ دونوں آدمیوں میں سے کس کا کاروبار جائز ہے اور کس کا حرام؟

المستفتی: مجیب الرحمٰن حیاتی محلّہ پیرزادہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سلی کی خریداری میں اس طرح کا معاملہ کرنا کہ نقد ۹۰/

روپئے فی کلو اور ادھار ۹۲ ؍روپئے فی کلو ہے؛ لیکن ادھار مال کے پیسے مدت معینہ سے ایک مہینہ تاخیر سے بھی دئے جائیں تب بھی ۹۲ ؍روپئے فی کلو ہی رہے گا، تو اس طرح کا معاملہ شرعی طور پر جائز اور درست ہے، ادائے گی میں تاخیر کی وجہ سے مزید کوئی پیسہ زائد لینا شرعاً جائز نہیں ہے۔

ويـزاد فـي الثـمـن لأجـله إذا ذكر الأجل بمقابلة زيادة الثمن قصدا. (البحر الرائق، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، كوئٹه ٦/ ١١٥، زكريا ٦/ ١٩١، شامي، زكريا ٧/ ٣٦٢، كراچی ٥/ ١٤٢)

ألا يـرى! أنـه يـزاد في الثمن لأجله. (هـداية، كتـاب البيوع، باب المرابحة والتـولية، اشـرفـي ٣/ ٧٤، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ١٠/ ١٨٧، رقم: ١٢٧٣٨، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١١٢، مصري قديم ٢/ ٧٨، هندية زكريا قديم ٢/ ١٤٢، جديد ٢/ ١٤٢)

اور دوسری شکل کہ نقد خریداری میں ۹۰ ؍روپئے فی کلو اور ایک ہفتہ یا ایک مہینہ کی ادھار خریداری میں ۹۲ ؍روپئے فی کلو؛ لیکن اس میں ادائے گی میں ایک دن بھی تاخیر ہو جائے تو ۹۳ ؍روپئے فی کلو تو یہ معاملہ قطعاً جائز نہیں ہے، تاخیر کے عوض میں پیسہ بڑھانا زمانہ جاہلیت کے سود کے مرادف ہے۔

وإن تـعـذر عليه الأداء زادوا في الحق والأجل، فهذا هو الربى الذي كانوا في الجاهلية يتعاملون به. (تفسير كبير ٧/ ٩١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۴۳۰)

❁❁❁

٦/ باب المرابحة

شرعاً نفع لینے کی حد کیا ہے؟

سوال [۸۷٦۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: خرید وفروخت پر کتنا نفع لینا بائع کے لئے درست ہے؟ ہمارے چوڑی کا کاروبار ہوتا ہے، بسا اوقات ٹرک میں مال آنے کی وجہ سے چوڑی کے بہت سے بنڈل ٹوٹ جاتے ہیں، جس سے ہمارا بہت سارا نقصان ہوجاتا ہے، ہم اس نقصان کی تلافی کے لئے چوڑیوں کی قیمت میں اضافہ کرکے فروخت کرتے ہیں، جس سے نقصان کی تلافی ہوجائے، حتی کہ بسا اوقات چوڑیوں کی اصلی قیمت سے زیادہ نفع لیتے ہیں، مثلاً سو روپئے کا ایک بنڈل آیا، ہم نے اس کو تین سو روپئے میں یا ڈھائی سو روپئے میں بیچا، تو کیا ایسا کرنا شرعاً درست ہے اور اتنا نفع لینے کی گنجائش ہے؟ اگر نہیں تو پھر کتنا نفع لے سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد عزیز فتح پور، چوڑی بازار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چیزوں کی خرید وفروخت میں نفع لینے کی مقدار شرعاً متعین نہیں ہے، دوگنی قیمت میں بھی بیچنا جائز ہے اور لینے والوں کو لینے اور نہ لینے میں اختیار ہے؛ البتہ بیچنے والے کو جھوٹ سے احتراز لازم ہے کہ خریدنے والے کے سامنے یہ نہ کہا کرے کہ ہم نے اتنے میں خریدا ہے؛ بلکہ اگر مشتری کے سامنے کہنے کی ضرورت پڑ جائے تو خریدار کے سامنے خرچ اور نقصان سب ملا کر کریوں کہا کرے کہ ہم کو اتنے کی پڑ گئی ہے اور یہ نہ کہے کہ اتنے میں خریدی ہے۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– أن رسول الله ﷺ قال: من حمل علينا السلاح، فليس منا، ومن غشنا فليس منا. (صحيح مسلم، الإيمان، باب من غشنا فليس منا، النسخة الهندية ١/ ٧٠، بيت الأفكار، رقم: ١٠١)

عن ابن عمر -رضي الله عنه- أن النبي ﷺ قال: إذا كذب العبد تباعد عنه الملک میلا من نتن ما جاء به. (سنن الترمذي، باب ماجاء في الصدق والکذب، النسخة الهندیة ۲/ ۱۸، دارالسلام، رقم: ۱۹۷۲)

عن أنس بن مالک -رضي الله عنه- عن النبي ﷺ قال: أکبر الکبائر: الإشراک بالله، وقتل النفس، وعقوق الوالدین، وقول الزور، أو قال: وشهادة الزور. (صحیح البخاري، التفسیر، باب قول الله تعالیٰ: ﴿ومن احیاها﴾ النسخة الهندیة ۲/ ۱۰۱۵، رقم: ۶۶۰۶، ف: ۶۸۷۱، صحیح مسلم، باب بیان الکبائر وأکبرها، النسخة الهندیة ۱/ ۶۴، بیت الأفکار، رقم: ۸۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۸۹۷)

دوگنے نفع پر فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۷۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے ایک چیز کو پچیس روپئے میں خریدا ہے اور اس کو دوگنی قیمت میں بیچتا ہے، تو کیا دوگنی قیمت میں بیچنا جائز ہے؟

المستفتی: جلال الدین پاکبڑہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نفع لینے کی کوئی حد متعین نہیں ہے، جتنا لینا چاہے لے سکتا ہے، بشرطیکہ گاہک کو دھوکہ نہ دے۔ (فتاویٰ رشیدیہ ۵۵۷، جدید مبوب ۵۴۰)

الثمن المسمی: هو الثمن الذي یسمیه ویعینه العاقدان وقت البیع بالتراضي سواء کان مطابقا لقیمته الحقیقیة أو ناقصا عنها أو زائدا علیها.
(شرح المجلة رستم، مکتبه اتحاد دیوبند ۱/ ۷۳، رقم المادة: ۱۵۳)

المرابحة بيع بمثل الثمن الأول وزياة ربح ...... والكل جائز . (هندية، الباب الرابع عشر في المرابحة والتولية والوضيعة، زكريا جديد ۳/ ۱٥٦، قديم ۳/ ۱٦٠، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ۲۲/ ۷۸، الفقه الإسلامي وأدلته، دارالفكر ٥/ ۳٦٠٠، هدى انٹر نیشنل دیوبند ٤/ ۳٥۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/۴/۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر:۲۹/۳۴۴۳)

الجواب صحیح:
احقرمحمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/۴/۱۴۱۴ھ

سلنڈر بلیک کرنا

سوال [۸۷۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گیس کمپنیوں نے کچھ عرصہ سے قانون بنایا ہے کہ بیس دن سے پہلے گیس نہیں ملے گا، نیز کھانے پینے کے ہوٹل اور دوکانوں کے لئے ایک نیا سلنڈر بنایا ہے، جس میں گیس بیس کلو ہوتی ہے اور قیمت گھر والے سلنڈر سے دوگنی ہوتی ہے، اب مثلاً زید کا سلنڈر چالیس دن چلتا ہے تو زید کمپنی کے ضابطہ کے مطابق دوسلنڈر لے کر ایک خود رکھ لیتا ہے، دوسرا ہوٹل والے کوسلنڈر کی متعینہ قیمت سے کچھ زائد رقم لے کر بیچ دیتا ہے، تو اس طرح زید کا گیس اور مٹی کا تیل کچھ قیمت زیادہ لے کر فروخت کرنا جس کو اصطلاح میں ''بلیک'' کرنا کہتے ہیں جائز ہے یانہیں؟ نیز ہوٹل والوں کا اس طرح گیس لینا صحیح ہے یانہیں؟ ہوٹل والے مجبور ہیں؛ کیوں کہ ہوٹلوں کا گیس جیسا کہ ذکر کیا گیا مہنگا اور کم ہے۔ واضح ہو کہ اس طرح سلنڈر بلیک کرنا گیس کمپنی کی نظر میں جرم ہے؟

المستفتی: محمدزبیر مظاہری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید سلنڈر اور تیل خرید نے کے بعد اس کا مالک بن چکا

ہے اور مالک کو اپنی چیز فروخت کرنے کا حق ہے، جس قیمت پر چاہے فروخت کرے؛ لیکن اس کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ یہ خلاف قانون ہے، تو پھر ہتک عزت کا خطرہ ہے اور ہتک عزت سے بچنا بھی ضروری ہے؛ اس لئے اس کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے؛ لیکن اگر ہتک عزت سے بچ کر اس کام میں نفع حاصل کرلیا ہے، تو وہ نفع جائز اور حلال ہے۔

قال الله تعالیٰ: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ. [البقرة: ١٩٥]

عن عروة هو البارقي أن النبي ﷺ أعطاه دينارا يشترى له به شاة، فاشترى له به شاتين، فباع إحداهما بدينار، فجاء بدينار وشاة، فدعا له بالبركة في بيعه، فكان لو اشترى التراب لربح فيه. (بخاري شريف، كتاب المناقب، النسخة الهندية ١/ ٥١٤، رقم: ٣٥١٣، ف: ٣٦٤٢)

عن ابن عمر –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: لا ينبغي لمؤمن أن يذل نفسه قيل: يا رسول الله! وكيف يذل نفسه؟ قال: أن يتعرض من البلاء لما لا يطيق. (المعجم الكبير للبطراني، دار إحياء التراث العربي ١٢/ ٣١٢، رقم: ١٣٥٠٧، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ٧/ ٢١٨، رقم: ٢٧٩٠، سنن الترمذي، أبواب الفتن، النسخة الهندية ٢/ ٥١، دارالسلام رقم: ٢٢٥٤، سنن ابن ماجة، باب قول الله تعالى: ﴿ياأيها الذين آمنوا عليكم انفسكم﴾ النسخة الهندية ١/ ٢٩٠، دارالسلام، رقم: ٤٠١٦)

ولو باع شيئا مرابحة إن كان الثمن مثليا كالمكيل والموزون جاز البيع إذا كان الربح معلوما سواء كان الربح من جنس الثمن الأول أم لم يكن. (عالمگيري، كتاب البيوع، الباب الرابع عشر في المرابحة والتولية والوضيعة، زكريا قديم ٣/ ١٦٠، جديد ٣/ ١٥٦-١٥٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ ؍رجب ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۳۶۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷؍۷؍۱۴۲۸ھ

لون پر رکشہ لینے کی جائز شکل

سوال [۸۷۷۰]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں آٹو رکشہ چلتے ہیں، اب پچھلے ڈیڑھ سال سے گورنمنٹ نے قانون بنا دیا ہے کہ اب صرف ایس این جی (گیس سے چلنے والے رکشے) ہی چلیں گے، یہ رکشہ بہت مہنگا ہونے کے سبب آدمی اسے خرید نہیں سکتا، رکشہ ایک لاکھ پندرہ ہزار کا ہے، اب مثلاً زید کے پاس پندرہ ہزار روپے ہیں وہ بینک میں گیا تو بینک نے اس سے کہا کہ تم اپنے پسند کا رکشہ خرید لو ہم تم کو ایک لاکھ کا لون بشکل چیک دیتے ہیں؛ لہٰذا بینک نے ایک لاکھ کا چیک دے دیا اور زید رکشہ لے آیا، اب زید کو ایک لاکھ روپے چار سال میں ادا کرنے ہیں اور مزید پچیس ہزار بھی ادا کرنے ہیں، تو کیا زید کا مذکورہ عمل جائز ہے یا نہیں؟ واضح ہو کہ اگر زید چاہے کہ چار سال کے بجائے دو سال میں رقم ادا کرے تو بینک اس کو قبول نہیں کرتے۔

المستفتی: محمد زبیر مظاہری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: آٹو رکشہ خریدنے کے لئے بینک سے مذکورہ طریقہ سے لون لینا پھر اس لون کے پیسہ سے کمپنی سے آٹو رکشہ خرید لیا جائے تو جب تک بینک کا قرضہ مع سود کے ادا نہ کر دیا جائے اس وقت تک سود کی وعید میں شامل رہے گا، مگر سود کھانے کی وعید نہ ہوگی؛ بلکہ سود دینے کی وعید ہوگی۔

عن جابر –رضي الله عنه– قال: لعن رسول الله ﷺ آكل الربو ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (صحيح مسلم، باب لعن أكل الربو وموكله، النسخة الهندية ٢/ ٢٧، بيت الأفكار، رقم: ١٥٩٨، سنن أبي داؤد، باب في آكل الربا وموكله، النسخة الهندية ٢/ ٤٧٣، دارالسلام، رقم: ٣٣٣٣)

اوراس وعیداور لعنت سے بچنے کے لئے متبادل شکل یہ ہے کہ بینک جو ایک لاکھ روپے کا چیک

کاٹ کر دیتا ہے وہ آٹو رکشہ کی کمپنی کو بینک کا آدمی دے دے اور یہ شخص بینک کے توسط سے کمپنی سے آٹو رکشہ نکلوالے، تو ایسی صورت میں یہ ہوگا کہ بینک نے ایک لاکھ میں آٹو رکشہ کمپنی سے خرید کر ایک لاکھ پچیس ہزار روپئے میں اس شخص کے ہاتھ ادھار فروخت کیا جو چار سال میں ادا ہوگا۔ یہ بیع مرابحہ کی ایک جائز شکل ہے، جس کا اختیار کرنا شرعاً جائز ہے۔

المرابحة بمثل الثمن الأول وزيادة ربح -إلى قوله- جائز.

(عالمگيري، كتاب البيوع، الباب الرابع عشر في المرابحة والتولية والوضيعة، زكريا جديد ٣/ ١٥٦، قديم ٣/ ١٦٠، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ١٠/ ١٨٣، رقم: ١٢٧٢٩، بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٤٦١، كراچی ٥/ ٢٢٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ رجب ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۳۵۹/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۷/۳ھ

کمیشن پر کتاب لاکر پوری قیمت میں فروخت کرنا

سوال [۸۷۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: پرائمری اسکول میں کورس کی کتابیں کمیشن پر لاکر اسکول میں بچوں سے پوری قیمت لینا کیسا ہے؟ شریعت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد نصیر الدین نور پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کورس کی کتابیں کمیشن پر لاکر بچوں کو پوری قیمت پر فروخت کرنا جائز ہے؛ اس لئے کہ جو شخص کمیشن پر کتابیں لاتا ہے، وہ اس کا اپنا معاملہ ہے اور پوری قیمت پر نفع کے ساتھ فروخت کرنا اس کا تجارتی نفع ہے جو شرعاً جائز ہے۔

بيع المرابحة: وهو مبادلة المبيع بمثل الثمن الأول وزيادة ربح

معين. (الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹر نیشنل دیوبند ٤/ ٣٥٧، دارالفكر ٥/ ٣٦٠٠، بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٤٦١، كراچی ٥/ ٢٢٠)

المرابحة نقل ما ملكه بالعقد الأول بالثمن الأول مع زيادة ربح.

(هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، أشرفي ٣/ ٧٠، مختصر القدوري، ص: ٨٠)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ صفر المظفر ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۴۹۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۲/۱۶ھ

ایک روپئے کی چیز سو روپئے میں فروخت کرنا

سوال [۸۷۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسئلہ یہ ہے کہ مارکیٹ میں دوکاندار لاکھوں روپئے کا مال خریدتے ہیں اور بیچتے ہیں، کیا دوکاندار روپئے کا مال سو روپئے میں بیچے یا سو روپئے کا مال روپئے میں خریدے تو علماء کرام یہ فرمائیں کہ یہ سو کا مال روپئے میں خریدنا یا روپئے کا مال سو میں بیچنا یہ دوکاندار کے لئے جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: حاجی فرزند صاحب محلّہ سرائے ترین، سنبھل

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بائع اور مشتری میں سے ہر ایک کو اختیار رہتا ہے کہ آپسی رضا مندی سے روپئے کی چیز سو روپئے میں بیچے یا خریدے، اسی طرح سو روپئے کا مال روپئے میں بیچے یا خریدے؛ لہٰذا بیچنے والے بیوپاری اور دوکان دار کے درمیان جو بھی طے ہوجائے اس پر بیچنا اور دوکان دار کے لئے خریدنا بلاتردد جائز ہے۔

الثمن المسمى: هو الثمن الذي يسميه ويعينه العاقدان وقت البيع

بالتراضي، سواء كان مطابقا لقيمته الحقيقية، أو ناقصا عنها، أو زائدا عليها. (شرح المجلة رستم، مكتبه اتحاد ديوبند ۱/ ۷۳، رقم المادة: ۱۵۳)

يجوز للمشتري أن يزيد في الثمن، ويجوز للبائع أن يحط من الثمن، وأن يزيد في المبيع ويلتحق بأصل العقد، ويتعلق الاستحقاق بجميع ذلك. (تبيين الحقائق، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، زكريا ٤/ ٤٤٢، إمداديه ملتان ٤/ ٨٣، هداية، أشرفي ٣/ ٧٥، مختصر القدوري، ص: ٨١، الموسوعة الفقهية الكويتية ٩/ ٢٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۳؍ رجب ۱۴۳۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۰۲)	۲۳/ ۷/ ۱۴۳۴ھ

بیس ہزار کا مال ۲۴؍ ہزار میں فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۷۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں محمد سراج بن محمد حنیف بالا پور ضلع آکولہ برتنوں کا بیوپاری ہوں، اور میری مالی حیثیت اچھی ہے، مجھ سے بہت سارے لوگ ہفتہ واری مال ادھاری سے لیتے ہیں، تو میں ان سے واضح طور پر بتا دیتا ہوں کہ مثلاً میں دوکان سے -/20,000 (بیس ہزار روپئے) میں خریدوں گا اور تمہیں -/24,000 (چوبیس ہزار روپئے) میں دوں گا، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ میں اس خریدار کو اپنے ساتھ مارکیٹ لے جاتا ہوں، پھر وہ خریدار اپنے پسند کا سامان پسند کر لیتا ہے اور پھر میں اپنے نام سے بل بنواتا ہوں۔ اور وہ سامان اس کے حوالہ (خریدار کے) کرتا ہوں، پھر -/1,000 (ایک ہزار روپئے) ہفتہ اس سے وصول کرتا ہوں، آیا یہ صورت لین دین کی جائز ہے یا نہیں؟ یہ سود میں تو داخل نہیں ہے؟

المستفتی: محمد سراج بالا پور آکولہ، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: یہ بیع مرابحہ ہے، شرعاً اس طرح کی خرید وفروخت جائز ودرست ہے۔

عن أبي بحر عن شيخ لهم، قال: رأيت على علي –رضى الله عنه– إزارا غليظا، قال: اشتريت بخمسة دراهم فمن أربحني فيه درهما، بعته إياه. (السنن الكبرى للبيهقي، البيوع، باب المرابحة، دارالفكر ٨/ ٢٢٩، رقم: ١٠٩٤٤، دارالحديث القاهرة ٥/ ٦٩٧، رقم: ١٠٧٩٤)

المرابحة بيع بمثل الثمن الأول والزيادة. (الفتاوى التاتارخانية، الفصل السادس عشر في بيع المرابحة، زكريا ٩/ ٢٢١، رقم: ١٣١٨٣، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ١٠/ ١٨٣، رقم: ١٢٧٢٩، هندية، زكريا قديم ٣/ ١٦٠، جديد ٣/ ١٥٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ رمضان المبارک ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۴۹)

۷/ باب التلجئة

"بیع تلجئه" کا مقصد

سوال [۸۷۷۴]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے اپنے والد کی موجودگی میں کپڑے کا کام شروع کیا جس میں کسی طرح کی کوئی مدد میرے والد نے یا بھائیوں نے نہیں کی، بفضلہ تعالیٰ کاروبار میں ترقی ہوتی چلی گئی؛ حتی کہ میں نے ایک مکان اپنی ذاتی کمائی سے والد کی حیات میں خریدا، اس وقت کاروبار میں تیزی سے اتار چڑھاؤ ہوتا تھا، میں نے سوچا کہ خدانخواستہ کبھی مندی آگئی اور مکان بیچنے کی نوبت آگئی تو میرے ساتھ ساتھ میرے بھائی بھی بے گھر ہوجائیں گے۔اور اگر میرے ساتھ ساتھ بھائیوں کا نام بھی ہوگا تو میں مکان بیچنے سے رک جاؤں گا، یہ سوچ کر میں نے مکان میں بھائیوں کا نام بھی داخل کروایا، اس وقت والدصاحب نے کہا بھی کہ جب سب تیرا ہی ہے تو کسی کا نام داخل مت کرو؛ لیکن میں نے مذکورہ بات کو مدنظر رکھتے ہوئے بھائیوں کا نام بھی داخل کروالیا، اب میرا چھوٹا بھائی کہتا ہے کہ جب کاغذات میں میرا نام ہے،تو مکان میں میرا حصہ ہے،اور میں اپنا حصہ لےکر رہوں گا، حالانکہ میں نے مذکورہ وجہ سے بھائیوں کا نام ڈلوایا تھا، کسی بھائی کو مکان ہدیہ نہیں دیا اور نہ ہی نام ڈلواتے وقت ہدیہ کی نیت تھی، نیت صرف یہ تھی اگر مکان صرف میرے نام پر ہوگا تو تنگی کے وقت میں بیچ دوں گا،تو میرے ساتھ ساتھ میرے بھائی بھی بے گھر ہوجائیں گے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا واقعی مذکورہ وجہ کی بناپر بھی بھائی کا نام داخل کرنے پر وہ مکان کا حقدار ہے؟ جب کہ بڑے بھائی کہتے ہیں کہ تو نے اپنی محنت سے کما کر سب لیا تھا؛ لہٰذا سب تیرا ہی ہے،تو جب کہے گا ہم مکان خالی کردیں گے،اگر بھائیوں کا حق مکان میں ہے،تو کس کو کتنا ملے گا،ہم تین بھائی ہیں؟

المستفتی: عبدالرشید، احمد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سائل نے سوال نامہ میں بھائیوں کے نام ڈالنے کی جو صورت ذکر فرمائی ہے وہ ''بیع التلجئہ'' کی حدود میں داخل نہیں ہوئی؛ کیوں کہ بیع التلجئہ حکومت یا کسی دشمن یا کسی طاقتور کی طرف سے خطرہ کی بنا پر ہوا کرتی ہے؛ اس لئے یہی سمجھا جائے گا کہ بھائیوں کو بھی مکان میں شریک کرنا مقصد ہے؛ لہٰذا اس میں رجسٹری کے مطابق ان کا بھی حق ہوگا۔

والتلجئة إنما تكون عن إضطرار. (شامي، كتاب البيوع، باب الصرف، مطلب في مبيع التلجئة، زكريا ديوبند ۷/ ۵٤۲، كراچى ۵/ ۲۷۳)

بيع التلجئة: البيع الصوري أن يضطر لإظهار عقد وإبطان غيره مع إرادة ذلك الباطن كأن يظهر بيع داره لابنه لئلا يستولي عليها السلطان.

(معجم لغة الفقهاء، كراچى، ص: ۱۱۳، قواعد الفقه، أشرفي ۲۱۳، معجم المصطلحات والألفاظ الفقهية، دارالفضيلة ۱/ ٤۰۵، الموسوعة الفقهية الكويتية ۹/ ٦۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ شوال ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۷۱۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۱۰/۱۴۲۹ھ

بیع تلجئہ

سوال [۸۷۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: نذیر احمد ایک سنی مسلمان ہے، اس کی بیوی سے اس کے دولڑکے اور چار لڑکیاں ہیں، نذیر احمد نے اپنی کمائی سے اور اپنے پیسے سے ہلدوانی لائن نمبر: ۱؍ محلّہ پنجو پورہ میں زمین کا ایک قطعہ (پلاٹ) خریدا، جس میں ٹین کی چھت کی صرف ایک کوٹھری بنی ہوئی ہے اور اس کوٹھری کے آس پاس صحن کے طور پر کچھ خالی زمین تھی، نذیر احمد نے یہ سب جگہ اپنے ہی پیسے

سے خریدی تھی، اس کے خریدنے میں نذیر احمد کی بیوی مشتری بیگم کا کوئی پیسہ نہیں تھا، مگر نذیر احمد کو چونکہ اپنی بیوی سے بہت محبت تھی؛ اس لئے پیار میں دلداری کی خاطر اس زمین کا بیع نامہ میں نے اپنی بیوی کے نام لکھوادیا تھا، مگر اس کو مالک نہیں بنایا تھا، اس کے بعد نذیر احمد نے اس زمین میں نئے طریقہ سے دومنزلہ مکان تعمیر کیا، اس مکان کی تعمیر میں بھی کل روپیہ صرف نذیر احمد ہی کا خرچ ہوا اور اس کی بیوی مشتری بیگم کا تعمیر میں بھی کوئی پیسہ نہیں لگا، اس مکان کی تعمیر کے بعد مشتری بیگم اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ اس مکان میں رہتی رہی اور پھر کئی سال کے بعد مشتری بیگم کا یکم مئی ۱۹۷۷ء کو انتقال ہوگیا، انتقال سے دو مہینے پہلے یکم مارچ ۱۹۷۷ء کو مشتری بیگم نے اس مذکورہ مکان کے بارے میں ایک وصیت نامہ لکھوادیا، جس میں اس نے کھل کر یہ اقرار کیا ہے اور صاف صاف یہ بات لکھوائی ہے کہ پختہ دومنزلہ مکان جس کا نگر پالیکا نمبر ۳۸۰۵/ ہے، اور جو لائن نمبر: امحلّہ پنچو پورہ ہلدوانی میں ہے، ضلع نینی تال میں واقع ہے، اس مکان کی تعمیر میں اور اس مکان کی جگہ خریدنے میں میرا کوئی پیسہ خرچ نہیں ہوا ہے؛ بلکہ اس کے خریدنے اور تعمیر کرانے میں سارا پیسہ میرے شوہر نذیر احمد نے اپنی کمائی کا لگایا ہے، پیار اور محبت کی وجہ سے صرف بیع نامہ میرے نام لکھوادیا تھا، اس مکان کے اصلی مالک میرے شوہر نذیر احمد ہی ہیں، میں مالک نہیں ہوں۔

مشتری بیگم کے انتقال کے بعد نذیر احمد نے اس دومنزلہ مکان پر ایک سہ منزلہ اپنے پیسے سے اور بھی بنالیا ہے، نذیر احمد کے دولڑکے: انیس احمد اور رئیس احمد جو مشتری بیگم ہی سے ہیں، یہ دونوں اپنے باپ نذیر احمد سے بدسلوکی اور بدزبانی کرتے ہیں، اس کے ساتھ والد جیسا اچھا سلوک نہیں کرتے، روزانہ شراب پی کر آتے ہیں اور گالی گلوچ کرتے ہیں اور اس مذکورہ مکان کو اپنی ماں کا بتا کر اسمیں اپنا حصہ مانگتے ہیں، جب کہ اصل اور حقیقت یہ ہے کہ اس مکان کی مالک ان کی ماں نہیں تھی، تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

(۱) اس صورت میں اس مکان کا اصل مالک صرف نذیر احمد ہی ہے یا اس کی بیوی مشتری بیگم؟

(۲) لڑکوں کا یہ مطالبہ کرنا کہ یہ ہماری ماں کا مکان ہے، ماں کی طرف سے اس میں ہمارا حق

ہے، یہ مطالبہ کرنا شرعاً غلط اور بے بنیاد اور باپ پر ظلم ہے یا نہیں؟

المستفتی: نذیر احمد ولد اللہ بخش، لائن نمبر ا رمحلّہ آزادنگر، ہلدوانی نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس طرح نام کردینے کو شریعت کی اصطلاح میں بیع التلجئۃ کہا جاتا ہے۔اوراس میں جس کے نام کیا جاتا ہے وہ شرعاً مالک نہیں ہوتا؛ اس لئے مذکورہ صورت میں مسمی نذیر احمد کی بیوی مذکورہ زمین وکوٹھری وغیرہ کسی چیز کی شرعاً مالک نہیں ہوتی ہے،اورنہ ہی بعد کے تعمیر کردہ مکان کے کسی حصہ کی مالک ہوتی؛ لہٰذا پوری زمین ومکان سب مسمی نذیر احمد ہی کی ملکیت میں ہیں،اس میں مسماۃ مشتری بیگم کے لڑکے اور دوسرے ورثاء کومطالبہ کا کوئی حق شرعاً حاصل نہیں ہوسکتا۔

وبيع التلجئة ويأتي متنا في الإقرار، وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف عدو، وهو ليس ببيع في الحقيقة، بل كالهزل -إلى قوله- ولو تبايعا في العلانية إن اعترفا ببنائه على التلجئة، فالبيع باطل لاتفاقهما أنهما هزلا به. (الدالمختار، كتاب البيوع، باب المصرف، مطلب في بيع التلجئة زكريا ٧/ ٥٤٢، كراچی ٥/ ٢٧٣، بدائع الصنائع كراچی ٥/ ١٧٦، زكريا ٤/ ٣٨٩، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ٢٤/ ١٢٢، هندية زكريا قديم ٣/ ٢٠٩، جديد ٣/ ١٩٦، قواعد الفقه أشرفي، ص: ٢١٣، الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹرنيشنل ديوبند ٤/ ١٢٧-١٢٨، دارالفكر ٥/ ٣٣٢٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍رجب المرجب ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۳۲۴/۲۵)

کسی کے نام سے خریدنے کا حکم

سوال [۸۷۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: مسماۃ بشیرن مرحومہ زوجہ جناب عبدالسلام مرحوم صاحب ساکن مرادآباد محلّہ اصالت پورہ اسماعیل روڈ ایک قطعہ مکان کچا غرب رویہ واقع اسماعیل روڈ اصالت پورہ مرادآباد کی تنہا مالک وقابض بذریعہ بیع نامہ بالعوض دین مہر چلی آرہی تھی، انہوں نے اپنے انتقال پر سات پسران دو دختران چھوڑے، مسماۃ بشیرن مرحومہ کاروباری سلسلہ کی وجہ سے مع اہل وعیال کے شہر جالنہ مہاراشٹر میں ہی مقیم رہی۔ ۱۹۷۰ء سے قبل مسماۃ بشیرن مرحومہ مرادآباد اپنے بھائی اللہ بخش مرحوم ودیگر رشتہ داروں کے یہاں آئیں، انہوں نے اپنے بھائی اللہ بخش مرحوم کو مکان مذکورہ کی تعمیر کرانے کے لئے روپئے دے کر تعمیر شروع کروادی، تعمیر کے بعد بھائی اللہ بخش مرحوم نے بہن بشیرن مرحومہ کو بتایا کہ تمہارے مکان کی مکمل تعمیر کرانے میں میرے پاس سے بھی -/5,000 روپئے لگ گئے ہیں، جس پر مسماۃ بشیرن مرحومہ نے کہا کہ یہ -/5,000 روپئے میں جالنہ پہنچ کر بھجوا دوں گی، اس پر بھائی اللہ بخش مرحوم نے کہا کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے، پتہ نہیں زندگی رہی یا نہ رہی آپ یادداشت بطور میرے -/5,000 روپئے کی ایک تحریر لکھ دو؛ لہٰذا اللہ بخش مرحوم بھائی نے اپنی بہن مسماۃ بشیرن مرحومہ کو لے جاکر کچھ کاغذوں پر دستخط وانگوٹھے لگانے کے بعد بہن سے کہا: آپ جاکر -/5,000 روپئے بھیج دوگی تب یہ کاغذ واپس کردوں گا یا پھاڑ دوں گا، مسماۃ بشیرن مرحومہ مکان مذکورہ میں کرایہ دار رکھوانے کے بعد جالنہ چلی گئیں۔

کچھ ہی عرصہ بعد مسماۃ بشیرن مرحومہ بہن نے اپنے لڑکے ولڑکی کی شادی کرنے کے لئے مرادآباد آکر بھائی اللہ بخش مرحوم سے اپنے مکان کے کرایہ دار سے مکان خالی کرنے کے لئے کہا کہ مجھے بچوں کی شادی اپنے مکان مذکورہ سے کرنی ہے، بھائی اللہ بخش مرحوم مکان خالی کرانے کی بات سن سن کر ٹال مٹول کرتے رہے، مزید رشتہ داروں کے ذریعہ کہنے پر اللہ بخش مرحوم بھائی نے کہا کہ میں نے بشیرن مرحومہ سے -/5,000 روپئے قرض کے بعوض تحریر کے بجائے بیع نامہ بحق اپنی زوجہ مسماۃ فاطمہ مرحومہ رجسٹری کرلیا تھا، جس سے میری بیوی مکان کی مالک ہوگئی، یہ سن کر مسماۃ بشیرن مرحومہ کے پسر محمد طاہر نے کچہری جاکر

کاغذات وغیرہ کا معائنہ کرا کرنقل حاصل کر کے قانونی کارروائی کی تیاری شروع کی ،مزید مسماۃ بشیرن مرحومہ کی طرف سے بیع نامہ منسوخی کا دعویٰ دائر کردیا،اس طرح سے کئی مقدمات شروع ہوگئے ،جن کا کل خرچ وپیروی تنہا محمد طاہر نے اپنے نجی سرمایہ سے کی جومقدمات کئی سال تک چلتے رہے، کئی سالوں کے بعد محلّہ کے چند معزز اشخاص نے مقدمات کے اخراجات وفریقین کی پیسے کی بربادی پرغور کرتے ہوئے دونوں فریقین کی رضامندی سے یہ فیصلہ کیا؛ چونکہ اللہ بخش مرحوم اپنی بہن مسماۃ بشیرن مرحومہ کا مکان کا بیع نامہ اپنی زوجہ مسماۃ فاطمہ مرحومہ کے نام کرا چکے ہیں اور مسماۃ فاطمہ مرحومہ زوجہ اللہ بخش مرحوم مذکورہ مکان کے برابر کے رقبہ کا مین روڈ کا حصہ حال ہی میں مبلغ: -/30,000 روپئے میں فروخت کر چکی ہیں؛ اس لئے پچھلے حصہ کے عوض میں محمد طاہر پسر بشیرن مرحومہ -/27,000 روپئے مسماۃ فاطمہ مرحومہ کو ادا کریں گے اور بیع نامہ اقراری مسماۃ فاطمہ مرحومہ منسوخ ہوکر مقدمہ میں فیصلہ کی درخواست دی جائے گی، مسماۃ بشیرن مرحومہ نے اپنے موجودہ پسران سے -/27,000 روپئے ادا کرنے کے لئے کہا،اس پر موجودہ پسران نے جواب دیا کہ ہمارے پاس روپئے کا انتظام بالکل نہیں ہے،اس کے بعد مسماۃ بشیرن مرحومہ نے اپنے پسر محمد طاہر سے کہا کہ کسی بیٹے نے مقدمہ میں کبھی کوئی روپئے خرچ نہیں کیا اور نہ ہی اپنا وقت کچہری میں لگایا،اب تک کافی روپئے مقدموں میں تیرا خرچ ہوگیا اور مقدمات میں وقت بھی تو نے ہی لگایا؛ لہٰذا -/27,000 روپئے بھی تو ہی ادا کردے،محمد طاہر نے والدہ مسماۃ بشیرن مرحومہ کے حکم بموجب کچھ روپئے کاروبار میں سے نکال کر اور کچھ زیور نکال کر کل -/27,000 روپئے کا انتظام کر کے مومانی مسماۃ فاطمہ مرحومہ وماموں اللہ بخش مرحوم کو -/27,000 روپئے بھی ادا کردیئے ،اس کے بعد والدہ مسماۃ بشیرن مرحومہ نے اپنے پسر محمد طاہر سے کہا کہ مکان تو نے ہی خریدا ہے،تو اس کا مالک ہے ، میں یہ نہیں چاہتی کہ تو مکان اپنے پیسے سے خریدے اور مالک سب بنیں، اکیلا منہ میرا گور میں جائے گا، قیامت کے دن اللہ کو میں کیا جواب دوں گی؟ تو مکان کی لکھت بھی اپنے نام کرالے؛ لہٰذا محمد طاہر نے بیع نامہ کے خرچ سے بچنے

کے لئے مقدمہ میں ہی فیصلہ کی درخواست لگا کر مقدمہ ختم کرا دیا، مکان مذکورہ میں محمد طاہر مع اہل وعیال اپنی سکونت کر رہا ہے۔

مجھلے گاؤں مہاراشٹر میں مسماۃ بشیرن مرحومہ نے اپنے پسر ابوالکلام کے بچہ کی شادی کے موقع پر اپنے پسران ابوالکلام محمد شمشاد، محمد نوشاد، محمد طاہر کی موجودگی میں مکان مذکورہ کا ذکر کرتے ہوئے محمد طاہر کے تنہا مالک ہونے کی تصدیق کی، مسماۃ بشیرن مرحومہ نے اپنی موت سے چار پانچ دن قبل بھی اپنے پوتے التمش پسر محمد طاہر سے بھی کہا کہ مکان مذکورہ تیرے والد کا ہے۔

محمد نسیم پسر بشیرن مرحومہ اورنگ آباد کی شادی مرادآباد میں ہونے کے موقع پر محمد طاہر نے یہ سوچ کر کہ مکان پر کڑیا پڑی ہیں، اس کو دوبارہ تعمیر کرا دوں؛ کیوں کہ شادی کے موقع پر مہمان بھی دیگر شہروں سے آئیں گے؛ لہٰذا مکان مذکورہ کی دوبارہ تعمیرات و بھائی محمد نسیم کی شادی کی تیاری بھی ساتھ ساتھ شروع ہوگئی، محمد نسیم نے اورنگ آباد سے من جملہ ۶۰ر ہزار روپئے بھیجے، جب کہ شادی میں -/65,000 روپئے کا خرچ محمد طاہر نے کیا، مزید مکان کی کل تعمیرات محمد طاہر نے اپنے سرمایہ سے کی۔

برائے کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں مندرجہ بالا حالات کے مدنظر حسب ذیل سوال کے جواب سے آگاہ فرمائیں:

(۱) کیا پسر محمد طاہر مکان مذکورہ کا تنہا مالک بذریعہ والدہ مسماۃ بشیرن مرحومہ ہے؟

(۲) کیا مسماۃ بشیرن مرحومہ کے کسی دیگر وارثوں کو کوئی شرعی حق مکان مذکورہ میں کسی قسم کا یا اس کو فروخت کرنے یا آپس میں ایک دوسرے کو دینے کا پہنچتا ہے؟

المستفتی: محمد طاہر قریشی، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ کی تفصیل بغور پڑھی گئی، اس کا حاصل یہ نکلا کہ پورا مکان حاصل کرنے میں مکمل رقم محمد طاہر نے اپنے ذاتی پیسے سے ادا کی ہے اور اسی نے اپنے ذاتی پیسے سے پورا مکان واپس خرید لیا ہے؛ اس لئے اس کے نام رجسٹری بیعنامہ کا

انتظام کیا گیا؛ لیکن اس نے رجسٹری خرچ بچانے کے لئے مقدمہ کے ذریعہ اپنے نام ڈگری کرالی ہے، جو بیع نامہ رجسٹری کے قائم مقام ہوجاتا ہے، اور اس نے جو کچھ کیا ہے مکان کی مالک بشیرن کے حکم سے کیا ہے، تو ایسی صورت میں محمد طاہر ہی تنہا اس کا مالک ہوگا، کسی دیگر وارثین کا اس سے حق متعلق نہ ہوگا۔

الآثار المرتبة على البيع أولا: انتقال الملك يملك المشترى المبيع، ويملك البائع الثمن ويكون ملك المشتري للبيع بمجرد عقد البيع الصحيح، ولا يتوقف على التقابض. (الموسوعة الفقهية ۹/ ۳٦)

ففي قبض العقار تكفي التخلية –إلى قوله– لكن لو أذن البائع للمشتري بقبض الدار والمتاع صح التسليم. (الموسوعة الفقهية ۹/ ٤١)

وحكمه (البيع) فثبوت الملك في المبيع للمشتري، وفي الثمن للبائع إذا كان البيع باتا. (عالمگيري، كتاب البيوع، الباب الأول، زكريا قديم ۳/ ۳، جديد ۳/ ٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۸۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۵/۴ھ

نام کردینے سے ملکیت کا حکم

سوال [۸۷۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک باپ کی چھ اولادیں ہیں، تین لڑکے، تین لڑکیاں اور ماں باپ، بیت اللہ شریف اس سال حج کے لئے جارہے ہیں، والد کا بہت بڑا شوروم ہے، والد نے سب سے بڑے لڑکے کو کاروبار دیا اور لڑکے نے کاروبار کو برباد کیا اور ماں باپ کا نافرمان ہوگیا اور پارٹیوں کا کافی قرض ہوگیا ہے، باپ نے بہت بڑے لڑکے کو سمجھایا، رشتہ داروں نے سمجھایا

وہ برابری نافرمانی کررہا ہے اوراس کی شادی میں جوخرچ ہواسسرال والوں کا وہ باپ پر دباؤ ڈالتا ہے اورنوٹس بھجواتا ہے اور خودشراب پیتا ہے اور کافی بینک کا روپیہ قرض ہے اور باپ کی جتنی بھی جائیداد ہے اس جائیداد میں بڑےلڑکے کا نام اور ایک چھوٹے لڑکے کا نام پڑا ہوا ہے اور بڑےلڑکے نے دھوکہ دے کر ماں باپ کے کاغذوں پر دستخط کرا کے بینک سے قرض لیا، اب اس صورت میں بڑےلڑکے نے کروڑوں روپئے برباد کئے، اب بینک کا قرض بڑا لڑکا دینے کا حق دار ہوگا یا باپ ہوگا؟ اور جتنی بھی جائیداد ہے وہ سب باپ نے کما کر بنائی اور صرف بڑےلڑکے کا نام اور چھوٹے لڑکے کا نام ڈلوا دیا، اپنی جائیداد میں اور وہ قرض ادا کرنے سے انکار کررہا ہے، تو اس صورت میں جواس کا نام باپ کی جائیداد میں پڑا ہوا ہے تو کیا وہ جائیداد شرعی طور پر بڑےلڑکے کی ہوگی یا باپ کی ہوگی؟ اور قرض بینک کا لڑکا ادا کرے اپنے حصہ سے یا باپ؟ اور ابھی دولڑکوں کی شادی باقی ہے، پوری باپ کی جائیداد میں نام دو لڑکوں کا پڑ جانے سے رجسٹری میں تو کیا اس صورت میں شرعی طور پر دونوں لڑکے مالک ہوں گے؟ یا پوری جائیداد باپ کی ہوگی؟ اور بڑا لڑکا شوروم پر قبضہ کئے ہوئے ہے اور ایک مکان پر قبضہ کئے ہوئے ہے، جب کہ شوروم میں دو بھائیوں کا نام ہے اور مکان میں باپ کا نام اور ماں کا نام ہے، اور ماں بہت بیمار رہتی ہے، حال تک نہیں پوچھتا ہے، کافی ماں باپ کو دکھ ہے، تو ایسی صورت میں باپ چاہتا ہے کہ میری دنیا وآخرت میں کوئی پکڑ نہ ہو تو شریعت کی روشنی میں مسئلہ کی واضح طور پر وضاحت کردی جائے شکرگزار رہوں گا۔

المستفتی: محمد اسلام ولد علی احمد مرحوم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب تک باپ باحیات ہے، پوری جائیداد کا مالک تن تنہا باپ ہی ہے، محض نام کردینے کی وجہ سے بڑا لڑکا اور چھوٹا لڑکا اس کی جائیداد کے مالک نہیں ہوتے ، باپ پر لازم ہے کہ سبھی اولاد کے ساتھ برابری کا معاملہ کرے، ورنہ عنداللہ سخت گنہگار ہوگا اور بڑےلڑکے نے جو شوروم اور گھر پر قبضہ جمارکھا ہے، وہ شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔ احادیث مبارکہ میں اس پر سخت وعید آئی ہے۔ اور بڑےلڑکے نے دھوکہ دے

کر باپ کے دستخط سے بینک سے جو قرض اٹھایا ہے اس کی ادائے گی بھی اسی پر واجب ہے نہ کہ باپ پر، آخر باپ اتنا غافل کیوں ہے کہ اس کے دستخط کی وجہ سے کروڑوں روپئے کی بربادی ہو رہی ہے؟

وبيع التلجئة هي ما ألجئى إليه الإنسان بغير اختياره، وذلك أن يخاف الرجل السلطان، فيقول لآخر: أني أظهر أني بعت داري منك، وليس ببيع في الحقيقة، وإنما هو تلجئة. (شامي، كتاب البيوع، باب الصرف، مطلب في بيع التلجئة، زكريا ٧/ ٥٤٢، كراچی ٥/ ٢٧٣، معجم لغة الفقهاء، كراچی، ص: ١١٣، قواعد الفقه أشرفي ٢١٣، معجم المصطلحات والألفاظ الفقهية، دارالفضيلة ١/ ٤٠٥، الموسوعة الفقهية الكويتية ٩/ ٦٢، الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹرنيشنل ديوبند ٤/ ١٢٧-١٢٨، دارالفكر ٥/ ٣٣٢٥، بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٣٨٩، كراچی ٥/ ١٧٦، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ٢٤/ ١٢٢، هندية زكريا قديم ٣/ ٢٠٩، جديد ٣/ ١٩٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰ رشوال ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۲۷۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۳۰/۱۰/۱۴۳۴ھ

محض نام کرنے سے ملکیت کا حکم

سوال [۸۷۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میری والدہ کلثوم بیگم کو میری دادی موتی بیگم نے بوقت میری والدہ کے نکاح کے اپنے مکان کو ۳ر سہام پر تقسیم کیا، جو کہ کل مکان ۲۰۰ رمیٹر کا ہے، ۳ر سہام میں سے ایک سہام میری والدہ کے مہروں میں لکھ دیا، کلثوم بیگم کے چار لڑکے عبدالودود خان، عبدالمعبود، عبدالرؤف، عبدالشہود خان۔ اور ایک لڑکی مشہودی بیگم ہوئی میرے بھائی عبدالرؤف کی شادی کے موقع پر وہ ایک سہام میری والدہ نے عبدالرؤف کی بیوی کے دین مہر میں لکھا اور

زبانی انھوں نے بتلایا کہ اس کی ملکیت سب بچوں کی ہے جو حصہ عبدالرؤف خان کا اس میں نکلتا ہے وہی ان کی بیوی کے دین مہر میں منتقل ہوگا اور باقی اور بچے حصہ رسد کے مالک ہوں گے؛ کیوں کہ اس وقت کوئی تقسیم نامہ نہیں ہوا تھا، اب میری والدہ کا انتقال ہوگیا، عبدالرؤف خان اس حصہ کو اپنا پورا بتلاتے ہیں؛ کیوں کہ میری والدہ نے دین مہروں میں کیا ہے؟ شریعت کی رو سے اور بہن بھائی اس سہام میں سے حق دار ہوتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: عبدالودود فیض گنج مشرق مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: اگر آپ کی والدہ نے صراحت کے ساتھ یہ بات کہہ دی ہے کہ نام تو پورے سہام کو کیا جارہا ہے، مگر اس میں سے عبدالرؤف خان کی بیوی دین مہر میں صرف عبدالرؤف کے حصہ کے بقدر کی مالک ہوسکتی ہے، گویا دین مہر میں صرف عبدالرؤف خان کے حصہ کے بقدر شامل ہوسکتا ہے، بقیہ دیگر اولاد کو اپنے اپنے حصہ کے بقدر ملے گا۔ اور یہ بات آپ کی والدہ نے شرعی گواہوں کے سامنے کہی ہے۔ اور گواہوں سے والدہ کی یہ بات ثابت ہوئی ہے تو محض نام کر دینے سے رؤف خان کی بیوی پورے کی مالک نہ ہوگی؛ بلکہ اس میں سب وارثین کا حق ہوگا اور یہ عقد تلجئہ کے مرادف ہوگا۔

وبيع التلجئة وهو أن يظهر عقدا وهما لا يريدانه يلجأ إليه، وتحته في الشامية: وليس ببيع في الحقيقة، وإنما هو تلجئة ويشهد على ذلك.

(درمختار مع الشامي، كتاب البيوع، باب الصرف، مطلب في بيع التلجئة، زكريا ٧/ ٥٤٢، كراچی ٥/ ٢٧٣، هندية زكريا قديم ٣/ ٢٠٩، جديد ٣/ ١٩٦، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ٢٤/ ١٢٢، بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٣٨٩، كراچی ٥/ ١٧٦قواعد الفقه أشرفي ٢١٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/۲/۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۲۳۱۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۲/۱۴۱۴ھ

جائیداد نام کرنے سے ملکیت کا حکم

سوال [۸۷۷۹]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کا انتقال ہوگیا ورثاء میں پانچ لڑکے اور دولڑکیاں ہیں، میت نے متفرق جائیدادیں چھوڑیں، ایک جائیداد کی رجسٹری میں سب کا نام ہے، حتی کہ لڑکیوں کا بھی بھائیوں کے برابر حصہ ہے، دوسری جائیداد میں بعض لڑکوں کا نام ہے، لڑکیوں کا نہیں، اسی طرح تیسری اور چوتھی جائیداد میں بھی بعض کا نام ہے، بعض کا نہیں، رجسٹری میں لڑکیوں کا نام نہ لکھنے کی بابت جب میت سے پوچھا گیا تھا تو انہوں نے کہا تھا کہ لڑکیوں کے پاس سسرالی جائیداد کافی ہے؛ اس لئے انہیں ضرورت نہیں۔ واضح رہے کہ یہ تقسیم محض کاغذی تھی، میت کی وفات سے قبل اولاد کا نہ تو اس پر کسی طرح کا قبضہ تھا اور نہ ہی ان کو کسی تصرف کا اختیار تھا، خرید وفروخت اور دیگر تمام امور میں میت خود مختار تھا، اب سوال یہ ہے کہ یہ ہبہ تام ہوا یا نہیں؟ اور مورث کی وفات کے بعد جائیداد کی تقسیم رجسٹری میں لکھائے گئے ناموں کے اعتبار سے ہوگی یا شرعی حصوں کے مطابق؟

المستفتی: محمد نصیرالدین، متعلم دارالعلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جائیداد کے اولاد کے نام کردینے کے بارے میں اولاد دو شکلیں ہیں: (۱) جائیداد خریدی جارہی ہے اور خریدتے وقت اولادوں میں سے بعض یا کل کے نام سے خریدی جائے اور اس وجہ سے اولاد کے نام سے خریدی جارہی ہے تاکہ قانونی پیچیدگیوں سے حفاظت ہو اور مقصد یہ نہیں ہے کہ اولاد کی ملکیت میں دے دی جائے، اس کو بیع تلجئہ کہا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں نام کردینے کے باوجود اولاد مالک نہیں ہوتی؛ بلکہ مالک خریدنے والے ماں باپ ہی ہوتے ہیں، جیسا کہ درمختار، شامی، مجمع الانہر وغیرہ کی عبارات اس سلسلہ میں واضح ہیں۔ اور اگر خریدتے وقت قانونی پیچیدگیوں سے حفاظت

مقصد نہیں ہے؛ بلکہ انہیں اولادوں کی ملکیت میں دینے کے واسطے انہیں کے نام سے خریدی جارہی ہے، تو یہ بیع تلجیہ کے دائرہ میں داخل نہیں ہے؛ بلکہ اس مقصد سے خرید کر نام کردینے کی صورت میں اولادان جائیدادوں کی مالک ہوجاتی ہے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ جائیداد پہلے ہی سے باپ یاماں کی ملکیت میں ہوتی ہے اور ماں باپ یہی چاہتے ہیں کہ اپنی زندگی ہی میں اولاد کے نام منتقل کرکے ان کو مالک بنادیں، اگر اس مقصد کے لئے اولاد کے نام رجسٹری کردی گئی ہے، تو ایسی صورت میں اولاد کے نام رجسٹری کرکے قانونی قبضہ سے دستبردار ہوجانے سے اولاد مالک ہوجاتی ہے اور اولاد کے حق میں قانونی قبضہ حاصل ہوجاتا ہے اور ملک تام حاصل ہونے کے لئے قانونی قبضہ کافی ہے۔اور جائیداد اور عقار ہونے کی وجہ سے قبضہ حقیقی لازم نہیں، قبضہ حکمی کافی ہے۔اور قانونی قبضہ قبضہ حکمی ہے اور قانونی قبضہ کے بعد شخص آخر رکاوٹ نہیں بن سکتا، یہی فقہاء کا بنیادی نقطہ ہے۔

ثم لا خلاف بين أصحابنا في أن أصل القبض يحصل بالتخلية في سائر الأموال. (بدائع الصنائع، كتاب البيوع، تفسير التسليم والقبض، زكريا ٤/ ٤٩٨، كراچی ٥/ ٢٤٤)

اتفق الفقهاء على أن قبض العقار يكون بالتخلية والتمكين من اليد والتصرف، فإن لم يتمكن منه بأن منعه شخص آخر من وضع يده عليه، فلا يعتبر التخلية قبضا، كما اشترط الحنفية أن يكون العقار قريبا، فإن كان بعيدا فلا تعتبر التخلية قبضا، وهو رأى الصاحبين؟ وظاهر الرواية والمعتمد في المذهب خلافا لأبي حنيفة. (الموسوعة الفقهية ٣٢/ ٢٥٩)

ولو باع ضيعة في الصحراء وسلمها إليه، فإن كانت قريبة عنه بحيث يتصور فيه القبض الحقيقي في الحال يكون قبضا وإلا فلا، والناس عنه غافلون، وهو الصحيح، وظاهر الرواية. (الحموي على الأشباه كراچی ١/ ٣٢٧)

اس کے بعد اولاد کا باپ کی سرپرستی میں رہنا اور باپ کے حکم کے ماتحت میں چلنا اور باپ کا

اپنے اختیارات چلاتے رہنا اور اولاد کا اس پر اعتراض نہ کرنا محض از قبیل تعظیم ہے، از قبیل تملیک نہیں ہے۔ اور اسی کا عرف اور تعامل جاری ہے، نیز اگر باپ اولاد کے اختیار کے بغیر رجسٹری شدہ جائیداد کو اپنے نام کرانا چاہے تو قانوناً نہیں کرا سکتا، پورا اختیار اولاد کو حاصل ہو جاتا ہے۔ سوال نامہ میں جن جائیدادوں کے اولادوں کے نام رجسٹری کر دینے کا ذکر ہے، وہ از قبیل بیع تلجئہ نہیں ہے؛ بلکہ از قبیل تملیک رجسٹری ہے، اس کی دلیل خود سوال نامہ میں موجود ہے کہ جب میت سے لڑکیوں کے نام نہ لکھنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا تھا کہ لڑکیوں کے پاس سسرالی جائیداد کافی ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مذکورہ رجسٹری از قبیل تلجئہ نہیں ہے؛ بلکہ از قبیل تملیک ہے، ہاں البتہ یہ بات دوسری ہے کہ باپ نے اولاد کے ساتھ یکسانیت کا معاملہ نہیں کیا، بعض کو دیا اور بعض کو نہیں دیا، اسکی وجہ سے باپ گنہگار ہوگا؛ لیکن باپ کی طرف سے تملیک صحیح ہوگئی؛ لہٰذا مرحوم کی وفات کے بعد جو جائیداد جس کے نام سے رجسٹری کی گئی ہے، وہی اس کا مالک ہوگا، اس کے بعد مابقیہ جائیداد اور ترکہ تمام شرعی ورثاء کے درمیان حصص شرعی کے اعتبار سے تقسیم ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۱۹۲/۳۸)

اولاد کے نام جائیداد خریدنے کا حکم

سوال [۸۷۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک صاحب جن کے ایک بیوی سے چار لڑکے ہیں، جن کی عمر گذشتہ وقت میں سات برس سے لے کر بارہ برس کی تھی، ان کے والد نے ایک پلاٹ قریب دس بیگہ کا دہلی روڈ پر ان چاروں کے نام سے خریدا، اس پلاٹ کو خرید کئے ہوئے تقریباً ۲۵ سال ہوگئے، ان کے والد نے اپنے دوسرے لڑکوں کے نام سے بھی جائیداد کی خرید وفروخت کی اور اب بھی

کرتے رہتے ہیں، اس پلاٹ کوقریب پانچ سال قبل ایم ڈی اے نے قبضہ میں لے لیا، ایم ڈی اے سے ان کے والد نے مقدمہ بازی اپنے خرچ سے کی، جس میں تقریباً تین لاکھ روپئے خرچ ہوئے، اس پلاٹ کی دیکھ بھال والد کے ذمہ تھی اور اس کی کاشت وغیرہ کی جو کچھ بھی آمدنی آتی تھی وہ والد کے پاس ہی آتی تھی۔ اور یہ پلاٹ بھی والد ہی کے قبضہ ودخل میں تھا، ان چاروں لڑکوں کی پرورش تعلیم وتربیت والد ہی نے کی ہے، ان لوگوں کی شادی بیاہ بھی والد نے اپنے خرچ سے کی ہیں، اب چاروں بیوی بچے والے ہیں، کچھ عرصہ قبل ان کے والد نے ان چاروں کو دولاکھ روپئے فی کس یہ کہہ کر دئے کہ تم لوگ میری مرضی و کہنے پر عمل نہیں کرتے ہو اور ہر بات میں اپنی من مانی کرتے ہو؛ لہٰذا ان روپئے سے جو بھی کاروبار تم لوگ اپنی مرضی سے کرنا چاہتے ہو کرلو۔

ایم ڈی اے سے مقدمہ بازی تقریباً چار سال رہی اور بالآخر ایم ڈی اے پر بہتر لاکھ روپئے کی ڈگری ہوئی ایم ڈی نے اس ڈگری کے خلاف ہائی کورٹ الہ آباد میں اپیل کردی جو کہ چل رہی ہے، اس کی پیروی وخرچ وغیرہ ان لوگوں کے والد ہی کررہے ہیں، ان چاروں کو اس کا پتہ نہ پہلے معلوم تھا اور نہ اب ہے، اب والد نے حتی الامکان کوشش کر کے ساڑھے سترہ لاکھ روپئے ایم ڈی سے جمع کرادیا اور واؤچر بنوا کر بڑے لڑکے کو دلوا دیا، روپئے ملتے ہی ان چاروں لڑکوں نے آپس میں ساز باز کی کہ کسی طرح سے یہ روپئے والد کو نہ دے کر خود ہڑپ کرلئے جائیں ؛ لہٰذا ان چاروں نے اپنے بیوی بچوں کو بھی شامل کر کے یہ پلان بنایا کہ آپس میں جھگڑے کا ناٹک کیا جائے، بہرحال جب ان کے والد آفس سے فارغ ہوکر اپنے کمرے میں آئے تو یہ چاروں معہ اپنی بیوی بچوں کے پلان کے مطابق کمرے میں آئے اور آتے ہی جھگڑا شروع کردیا، جب ان کے والد نے ان کو خاموش کر کے یہ معلوم کیا کہ کیا معاملہ ہے؟ تم لوگ آپس میں جھگڑا کس بات پر کررہے ہو؟ تو تین لڑکوں نے کہا کہ یہ ہمارا بڑا بھائی ہم کو ہمارے روپئے نہیں دیتا، ہم اس کو مار ڈالیں گے، والد نے اس پر سوچا کہ روپئے ان کے قبضہ میں ہیں اور یہ لوگ بدنیت ہوگئے ہیں، پھر بھی والد نے ان تینوں سے کہا کہ تم کو اور تمہارے

بڑے بھائی کو روپئے سے کیا مطلب؟ یہ روپئے تو میرے ہیں تمہارے پاس امانت میری ہے اور مجھے یہ روپئے تم کو دینا چاہئے، والد نے یہ بھی کہا کہ میرے دیگر دوسرے لڑکے ہیں ان کے نام سے بھی خرید وفروخت میں کرتا ہوں، جب بھی کسی پلاٹ وغیرہ کی رقم آتی ہے تو وہ لڑکے یہی کہتے ہیں کہ یہ زمین آپ نے ہی خریدی ہے، اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ رقم بھی میرے ہی پاس رہتی ہے، لڑکے نہیں لیتے۔

(۲) آپ سے درخواست ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں فتویٰ صادر فرمائیں کہ یہ روپئے جو ان چاروں لڑکوں نے بدنیتی سے ہڑپ کئے ہیں، اگر یہ واپس نہیں کرتے ہیں، تو قیامت کے دن یہ لوگ عذاب کے حق دار ہوں گے یا نہیں؟ جب کہ اس پلاٹ کی خریداری میں ان کا ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔

المستفتی: اختر جہاں گلشہید مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: خط کشیدہ عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ والد نے مذکورہ جائیداد سوال نامہ میں ذکر کردہ لڑکوں کے نام سے تو خریدی ہے، مگر ان کو باقاعدہ قبضہ دے کر مالک نہیں بنایا، جیسا کہ والد کا اس کی دیکھ بھال اور مقدمہ کے سلسلہ میں بھاگ دوڑ اور اس کے اخراجات وغیرہ خود اپنی طرف سے کرنے سے صاف واضح ہو رہا ہے، اور اس طرح پر کسی کے نام سے خریدنے کو شریعت میں بیع التلجئہ کہا جاتا ہے۔ اور اس طریقہ پر خریداری میں جن کے نام سے خریدا جاتا ہے وہ شرعی طور پر مالک نہیں ہوتے؛ بلکہ مالک وہی ہوتا ہے جو از خود خریدتا ہے؛ اس لئے مذکورہ جائیداد شرعی طور پر والد ہی کی ملکیت میں داخل ہے، جن لڑکوں کے نام سے خریدی ہے وہ اس جائیداد اور اس کی قیمت کے مالک نہیں ہیں؛ لہٰذا ایم ڈی اے کی طرف سے جو رقم ملی ہے اور جو کچھ آئندہ ملنے والی ہے وہ سب کی سب والد ہی کی ملکیت ہے، ان میں مذکورہ لڑکوں کا شرعی طور پر کوئی حق نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۶)

وبيع التلجئة ويأتي متنا في الإقرار، وهو أن يظهر عقدا وهما

لايريدانه يلجأ إليه لخوف عدو، وهو ليس ببيع في الحقيقة، بل كالهزل .
(الدرالمختار مع الرد، كتاب البيوع، باب المصرف، مطلب في بيع التلئجة زكريا ۷/ ۵٤٢، كراچی ۵/ ۲۷۳، هندية زكريا قديم ۳/ ۲۰۹، جديد ۳/ ۱۹۶، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ٢٤/ ۱۲۲، بدائع الصنائع زكريا ٤/ ۳۸۹، كراچی ۵/ ۱۷٦، الفقه الإسلامي و أدلته، هدى انٹرنيشنل ديو بند ٤/ ۱۲۷-۱۲۸، دارالفكر ۵/ ۳۳۲۵، الموسوعة الفقهية الكويتية ۹/ ٦٢، قواعد الفقه أشرفي، ص: ۲۱۳، معجم لغة الفقهاء، کراچی، ص: ۱۱۳، معجم المصطلحات والألفاظ الفقهية، دارالفضيلة ۱/ ٤٠٥)

اوراگر مذکورہ لڑکے حیلہ بازی کرکے یاوالدکوایذا اورتکلیف پہنچا کران رقوم میں سےکوئی بھی رقم ہڑپ کرلیں گے، تو وہ سب لڑکے عند اللہ سخت گنہگار رہوں گےاور قیامت کے دن سخت ترین عذاب کے مستحق ہوں گے۔اور بہت ممکن ہے کہ دنیا میں بھی تنگدستی کی سزا بھگتنی پڑے۔حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا مندی والد کی رضامندی میں ہے۔اوراللہ تعالیٰ کی ناراضگی والدکی ناراضگی پر ہے۔

قال رسول الله ﷺ: رضى الرب في رضى الوالد، وسخط الرب في سخط والد. الحديث. (ترمذي شريف ۲/ ۱۲)

ایک ضروری نوٹ:- اسی مسئلہ کے بارے میں ہمارے دارالافتاء سے۹؍رمضان المبارک ۱۴۱۵ھ کومہتاب عالم،خورشید عالم،آفتاب عالم،منظورعالم کے نام سے جو جواب حاصل کیا گیا ہے وہ اس قید سے مقید ہے کہ اگر باپ نے لڑکوں کو قبضہ دے کر مالک بنا دیا ہے،تب لڑکے مالک ہیں،اب اس سوال سے معلوم ہوا کہ واقعہ اس کے برعکس اور برخلاف ہے؛ اس لئے آج کا لکھا ہوا جواب ہی قابل عمل ہے۔نیز ۱۹؍رمضان کا لکھا ہوا جواب اوراس کی وضاحت بھی ساتھ میں منسلک ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیراحمدقاسمی عفااللہ عنہ
۱۴۱۵/۱۰/۱٦ھ
(الف فتویٰ نمبر:۳۱/٦/۴۱۷)

لڑکوں کے نام سے جائیداد خریدی تو وہ کس کی ملک ہوگی؟

سوال [۸۷۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عرصہ سے زید ایک کرایہ کے مکان میں رہتا تھا، مکان مالک نے اس سے مکان خالی کرنے کو کہا، تو یہ بات طے ہوئی کہ یا تو آپ ۵۰۰۰۰/روپئے دے دیں یا لے لیں، طے یہ ہوا کہ مکان مالک مذکورہ رقم دے کر کرایہ دار کو مکان فروخت کرنے پر راضی ہوگیا، کرایہ دار کے پاس ادا کرنے کے لئے پیسہ نہیں تھے؛ اس لئے اس مقبوضہ مکان میں سے کچھ زمین فروخت کر کے چالیس ہزار روپئے دے دیئے اور دس ہزار روپئے زید کے دولڑکوں نے ادا کئے اور مکان زید کے دولڑکوں کے نام رجسٹری ہوگیا۔ دریافت طلب یہ امر ہے کہ باقی بھائی بہنوں اور زید کی بقیہ اولاد کو اس مکان میں سے حصہ ملے گا یا نہیں؟۔

المستفتی: صادق حسین منصوری، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مذکورہ جائیداد خریدتے وقت جن لڑکوں نے دس ہزار روپئے ادا کئے ہیں وہ زید ہی کے ساتھ اس کی فیملی میں رہ چکے ہیں، تو صرف نام کردینے سے ملکیت ان لڑکوں کی ثابت نہ ہوگی؛ بلکہ پوری ملکیت شرعاً زید کو حاصل ہوگی اور زید کے مرنے کے بعد زید کے تمام ورثاء اس میں شرعی حصوں کے حق دار رہوں گے۔

الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيء، فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله؛ لكونه معينا له. (شامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ولا يعلم التفاوت فهو بينهما بالسوية، زكريا ٦/ ٥٠٢، كراچی ٤/ ٣٢٥، تنقيح الفتاوى الحامدية ٢/ ١٨)

نیز کسی مصلحت سے اولاد میں سے کسی کے نام کردینے سے جس کے نام کیا جائے وہ مالک

نہیں ہوتا ہے، نیز اگر روپئے دینے والے لڑکے باپ سے الگ تھے تب بھی ان لڑکوں کے لئے ملکیت ثابت نہ ہوگی؛ بلکہ دس ہزار قرض باپ پر اور باپ کی موت کے بعد ورثاء پر ثابت ہوسکتا ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی زکریا ۳/۳۸۰)

وبيع التلجئة ويأتي متنا في الإقرار، وهو أن يظهر عقدا وهما لا يريدانه يلجأ إليه لخوف عدو، وهو ليس ببيع في الحقيقة، بل كالهزل .

(الدرالمختار مع الرد، كتاب البيوع، باب الصرف، مطلب في بيع التلجئة زكريا ٧/ ٥٤٢، كراچی ٥/ ٢٧٣، هندية زكريا قديم ٣/ ٣٠٩، جديد ٣/ ١٩٦، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ٢٤/ ١٢٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹ر ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/۳۱۵۰)

خوف کے سبب عارضی طور پر کسی کے نام جائیداد

سوال [۸۷۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک جائیداد رہائش پذیر اب ۲۹ر سال قبل کسی مصلحت کی بنا پر (یعنی والد صاحب بہت زیادہ مقروض ہوگئے تھے، جائیداد پر حملہ ہونے کا خطرہ تھا؛ اس لئے چچا کے نام ۲-۳ سال کے لئے کردی تھی، میرے والد حاجی مشیت اللہ مرحوم نے اپنے حقیقی بھائی شمس الدین مرحوم کے نام بیچ کر کے رجسٹری کردی تھی اور زبانی طے تھا کہ ۲-۳ سال کے بعد واپس کرنی ہوگی، دونوں فریق اقراری تھے، ۲-۳ سال گذر جانے پر قول وقرار کے مطابق میرے والد صاحب نے اپنی مملوکہ جائیداد واپس لینے کی مانگ کی، چچا نے واپس کرنے سے صاف انکار کردیا۔ ۱۹۶۵ء میں میرے والد مرحوم حاجی مشیت اللہ صاحب کا انتقال ہوگیا، ہم پانچ بھائی چار بہنیں ہیں، سب کے سب شادی شدہ اور حیات ہیں، والد صاحب کے زمانہ سے

اسی آراضی میں مقیم ہیں اور قابض ہیں، نام اس طرح ہیں: انوری بیگم، عبدالوحید، عبدالباری، عبدالسلام، شرافت جہاں بیگم، ریاست علی، عابدہ شاہین، زاہدہ شاہین، خورشید عالم۔

نوٹ:- عبدالوحید الگ مکان میں کرایہ پر رہتے ہیں، ایک بھائی ریاست علی لاہور منتقل ہوگئے ہیں، تین بھائی عبدالباری، عبدالسلام، خورشید عالم اسی مکان میں مقیم ہیں۔ کل آراضی ۴۱۸ر مربع گز ہے، نصف حصہ پر تین منزلہ عمارت ہے اور نصف حصہ میں کھپریل ۷۱ء میں ہم بھائیوں کے بہت زیادہ اصرار پر میرے چچا شمس الدین نے اپنی اولاد کے لئے ۱۳۷ر مربع گز روک کر بقیہ حصہ ۲۸۱ر مربع گز کی ہم تین بھائیوں کے نام وصیت نامہ اور رجسٹری کردی ہے، ۸۰ء میں چچا محترم شمس الدین صاحب کا بھی انتقال ہوگیا ہے۔

الف: اس عمارت میں شرعاً بہن بھائیوں کا حق نکلتا ہے یا نہیں؟ اگر حق نکلتا ہے تو کتنا؟

ب: قانونی طور پر وصیت نامہ کے مطابق ہم تین بھائی عبدالباری، عبدالسلام، خورشید عالم مالک بنتے ہیں، تو ہم بھائیوں میں کس طرح تقسیم ہوگی؟

المستفتی: منجانب خورشید عالم، حاجی مشیت اللہ مرحوم، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر آپ کے والد مرحوم نے دشمن سے حفاظت ہی کی غرض سے چھوٹے بھائی شمس الدین کے نام کردی تھی، تو شمس الدین اس کا مالک نہیں ہوا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۷-۳۸)

بيع التلجئة: البيع الصوري، أن يضطر لإظهار عقد وإبطان غيره مع إرادة ذلک الباطن، کأن يظهر بيع داره لابنه لئلا يستولی عليها السلطان.

(معجم لغة الفقهاء، کراچی، ص: ۱۱۳)

بيع التلجئة: هو العقد الذی يباشره إنسان عن ضرورة ويصير کالمدفوع إليه، صورته: أن يقول الرجل لغيره: أبيع داري منک بکذا في الظاهر ولا يکون بيعا في الحقيقة، ويشهد علی ذلک وهو

نوع من الهزل. (قواعد الفقه، أشرفي ص: ۲۱۳، معجم المصطلحات والألفاظ الفقهية، دارالفضيلة بيروت ۱/ ۴۰۵)

لہٰذا وہ حاجی مشیت اللہ کی ملکیت ہے،ان کے مرنے کے بعدان کی اولاد اس کی حق دار ہوگی، صرف تین بھائیوں کے متعلق وصیت نامہ اس لئے صحیح نہیں ہے کہ شمس الدین خود مالک نہیں ہے؛ بلکہ مشیت اللہ مرحوم کی سب اولاد باپ کی پوری ملکیت میں برابر کی شریک ہوں گی۔
فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۳۹۰)

غلطی سے دوسرے کے نام رجسٹری ہونے سے ملکیت کا حکم

سوال [۸۷۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک باغ کی زمین تقریباً آٹھ آدمیوں کے درمیان مشترک تھی، جن کے نام یہ ہیں: (۱) شہاب الدین (۲) الحسن (۳) ابن حسن (۴) شفیق (۵) منتا (۶) اسرار دو کا نام مجھے فی الوقت یاد نہیں ہے؛ لیکن غلطی سے مذکورہ زمین رجسٹری دوسرے آٹھ آدمیوں کے نام ہوگئی، جن کے نام یہ ہیں: (۱) ہادیہ (۲) حسن (۳) شہادت (۴) صابر (۵) نایاب (۶) اسد۔ ان میں سے بھی دو نام یاد نہیں ہیں، پھر دونوں فریق کے درمیان لگ بھگ ۲۵/ سال سے مقدمہ چل رہا ہے، آخر میں وہ لوگ مقدمہ جیت گئے، جن کے نام غلطی سے رجسٹری ہوگئی تھی، اور جو لوگ اصل مالک تھے وہ ہار گئے، اس کے بعد اصل مالکوں میں سے دو شخص: (۱) الحسن (۲) شفیق اور دو نئے آدمی: (۱) منا (۲) ثمر جھیل نے مل کر مذکورہ زمین ان شرکاء سے خریدی جن کے نام غلطی سے رجسٹری ہوگئی تھی؛ البتہ ان میں سے شہادت نے اپنے حصہ کی زمین فروخت نہ کی؛ بلکہ اپنے حصہ پر قابض رہے، مذکورہ مسئلہ کا قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

نوٹ:- مذکورہ زمین جب مؤخرالذکر چار شخصوں: (۱)الحسن (۲)شفیق (۳)منا (۴)ثمر جمیل نے خریدی،تو بقیہ اصل مالک کواس معاملہ میں آگاہ کئے بغیر خریدی۔

المستفتی: محمد آصف،ممتاز،آفتاب ہائی وے علی گڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اول الذکر آٹھ افراد کی زمین اگر غلطی سے مؤخرالذکر آٹھ افراد کے نام رجسٹری ہوگئی ہے،تو مؤخرالذکر آٹھ افراد شرعاً مذکورہ زمین کے ہرگز مالک نہیں بن سکتے ہیں، وہ زمین شرعاً اول الذکر آٹھ افراد کی ہے،ان کی ملکیت سے وہ زمین نہیں نکلی ،اگر مقدمہ مؤخرالذکر آٹھ افراد نے جیت لیا تو ان پر واجب ہے کہ جن کی زمین ہے ان کو واپس کردیں۔

عن أبي حميد الساعدي، أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل لامرئ أن يأخذ مال أخيه بغير حقه، وذلک لما حرم الله مال المسلم على المسلم.

(مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٤٢٥، رقم: ٢٤٠٠٣)

لا يجوز لأحد أن يأخذ مال أحد بلا سبب شرعي. (قواعد الفقه، أشرفي، ص: ١١٠، رقم: ٢٦٩، هندية زكريا قديم ٢/ ١٦٧، جديد ٢/ ١٨١، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢١/ ١١٢، ٢٨/ ٢٦٤، ٣٧/ ٣٥٤)

اورمؤخرالذکر افراد کے مقدمہ جیتنے کی بناپر مذکورہ زمین فروخت کرنا ہرگز درست نہیں ہے۔ اور نئے جن دوافراد نے زمین خریدی ہے،ان پر پورا کا پورا واپس کردینا واجب ہے۔اور اصل مالکوں میں سے جن دوافرادنے خریدی ہے،ان پر اپنے حصہ کے بقدر قبضہ کر کے بقیہ واپس کردینا واجب ہے۔ نیز اپنے حصہ کی رقم واپس لینا بھی ان کا حق ہے،اسی طرح نئے دونوں افراد کے لئے زمین واپس کرتے ہوئے اپنی رقم واپس لینے کا حق ہے۔نیز شہادت پر بھی قبضہ شدہ زمین اصل مالکان کو واپس کردینا لازم ہے۔

لا يجوز لأحد أن يتصرف في ملک الغير بغير إذنه. (قواعد الفقه،

أشرفي، ص: ۱۱۰، رقم: ۲۷۰، شرح المجلة رستم، اتحاد ۱/ ۶۲، رقم المادة: ۹۷)
نیز مؤخرالذکر پر مذکورہ زمین کی رقم استعمال کرنا شرعاً حرام ہے۔

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد، كالبيوع الفاسدة -إلى- أو بغير عقد، كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليهم -إلى- ولكن إن أخذه من غير عقد ولم يملكه يجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، هندية زكريا قديم ۵/ ۳۴۹، جديد ۵/ ۴۰۴، تبيين الحقائق، مكتبة إمداديه ملتان ۶/ ۲۷، زكريا ۷/ ۶۰)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍شوال المکرم ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۴۴۳/۲۵)

مصلحتاً بڑے لڑکے کے نام بیع نامہ کرانے سے ملکیت کا حکم

سوال [۸۷۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے مکان خریدا اور اپنے بڑے لڑکے کے نام کردیا اور اس کا بیع نامہ قانوناً کردیا، مگر زبانی بڑے لڑکے کو وصیت کردی کہ میرے مرنے کے بعد اپنے سب بھائی بہن کو حصہ دے دینا، اگر بڑا لڑکا باپ کے مرنے کے بعد اس زبانی وصیت سے منحرف ہوکر انکار کردے اور کہے کہ میرے باپ نے قانوناً مکان مجھے دیا ہے میں کسی کو نہیں دوں گا ایسی صورت میں شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟ اور بیٹی کا باپ کی جائیداد میں کتنا حصہ ہے؟

المستفتی: امینہ بیگم، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قانوناً مصلحتاً بڑے لڑکے کے نام بیع نامہ کردینے کی وجہ سے بڑا لڑکا اس کا شرعاً مالک نہیں ہوا ہے؛ بلکہ اس میں حسب وصیت سب ورثاء حق دار ہوں گے۔(مستفاد: امداد الفتاوی زکریا ۳/ ۳۷)

وبيع التلجئة ويأتي متنا في الإقرار، وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف عدو، وهو ليس ببيع في الحقيقة، بل كالهزل .

(الدرالمختار مع الرد، كتاب البيوع، باب المصرف، مطلب في بيع التلئجة زكريا ٧/ ٥٤٢، كراچی ٥/ ٢٧٣، قواعد الفقه أشرفي، ص: ٢١٣، الموسوعة الفقهية الكويتية ٩/ ٦٢، هندية، زكريا قديم ٣/ ٢٠٩، جديد ٣/ ١٩٦)

نیز بیٹی کو بیٹے کے مقابلہ میں آدھا ملے گا۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ. [النساء: ۱۱] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ محرم ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۰۸۷)

انکم ٹیکس سے بچنے کی غرض سے کاروبار بیوی بچوں کے نام کرنے کا حکم

سوال [۸۷۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مستفتی کاروبار کا بانی بھی ہے اور اس نے جملہ بنیادی سرمایہ بھی لگایا ہے۔ اور ۱۹۴۷ء سے تا ایں یوم تقریباً پینتالیس سال تک مسلسل کاروبار میں مصروف کار بھی ہے اور شروع سے اخیر تک جملہ معاملات میں اس کی مرضی واختیار کو دخل بھی رہا ہے، سوائے مختصر اوقات کے جب کہ وہ اور اس کی زوجہ شدید طور سے علیل ہو گئے تھے، اس نے اپنا سارا وقت

کاروبار میں صرف کیا ہے اوراخراجات میں بھی اس نے اپنی ذات پر کوئی نمایاں رقم صرف نہیں کی ہے اور فرزندان میں سے کسی ایک فرد نے مسلسل محنت کے علاوہ ایک پیسہ سرمایہ کی شکل میں نہیں لگایا ہے، ایسی صورت میں مذکورہ بالا حالات کی بنا پر کاروبار متعلقہ کا مستفتی مالک ہے یا نہیں؟ جب کہ مستفتی نے اپنے پورے کاروبار کو اپنے چار فرزندان اور بیوی کے نام انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے کر دیا تھا۔

(۲) اگر دفعہ ایک کا جواب اثبات میں ہو تو فرزندان میں سے کوئی جو رقومات مذکورہ کاروبار سے بلا اجازت مستفتی نکال کر اپنے بچوں کے تصرف میں لے آیا ہے، اس کا یہ فعل جائز ہے یا ناجائز؟ اور وہ اس کی واپسی کا ذمہ دار ہے یا نہیں؟

(۳) اگر فرزندان میں سے کوئی فرزند کوئی شئ مثلاً گاڑی وغیرہ بلا اجازت مستفتی کاروبار مذکور کی منفعت سے حاصل کر کے اپنے استعمال میں لا رہا ہے اور اس کے استعمال میں کاروبار کی جو رقم صرف ہو رہی ہے، اس کا یہ فعل شرع کی روشنی میں کیا حیثیت رکھتا ہے؟

(۴) فرزندان میں سے جس کے یا جن کے قبضہ میں یا تحویل میں کاروبار سے متعلق جو رقومات یا دیگر اشیاء کسی بھی شکل میں اور کسی بھی جگہ موجود ہیں، تو وہ شرعاً مستفتی کی امانت ہیں اور فرزند یا فرزندان متعلقہ اس کو بحیثیت امین مستفتی کے حق میں منتقل کرنے کے یا اس کو واپس کرنے کے ذمہ دار ہیں یا نہیں؟

(۵) علماء کی رائے میں جب فرزندان کے جملہ اخراجات و دیگر ضروریات بشمول شادیاں وغیرہ پر تصرف کی کفالت شروع سے اخیر تک کاروبار مذکور سے ہوتی رہی ہے، تو فرزندان میں سے کوئی حق المحنت کا بھی حق دار نہیں ہے، کیا علماء کی یہ رائے صحیح اور درست ہے؟

(۶) فرزندان اول و دوئم نے جو علیحدہ کاروبار اپنے یا اپنے بیٹوں کے نام سے بلا اجازت مستفتی کرایا ہے اور اس کے پس پشت مستفتی کے کاروبار مذکور کا سرمایہ ہے، وہ دونوں کاروبار اور اس سے جو منفعت حاصل ہوئی ہے وہ مستفتی کے کاروبار کا جزو متصور ہوگا یا نہیں؟ اور وہ جزو مستفتی کے حق میں منتقل یا اس کو ادا کرنے کے فرزندان متعلقہ یا اس کے بیٹے ذمہ دار ہیں یا نہیں؟

(۷) جیسا کہ دفعہ نمبر: ۵ میں عرض کیا گیا ہے، علماء کی رائے میں فرزندان حق المحنت کے بھی مستحق نہیں ہیں، تاہم اگر کسی زاویہ نظر سے مستفتی کے فرزندان بطور حق المحنت منفعت کے کسی جزو کے حق دار ہیں بھی تو فرزندان مذکور میں سے وہ صرف اس کاروبار کے منفعت کے کسی جزو کے حق دار ہیں، جس میں انہوں نے کام کیا ہے یا جملہ فرزندان مجموعی طور سے جملہ کاروبار کے نفع ونقصان کے حق دار یا ذمہ دار ہیں، ہر کاروبار کے نفع ونقصان کا حساب وکتاب علیحدہ علیحدہ مرتب ہوتا رہا ہے۔

(۸) زکوۃ کے سلسلہ میں فرزندان کی جانب سے مستفتی کی ہدایت پر عدم تعمیل کی صورت میں مستفتی شرعی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جائے گا یا نہیں؟

المستفتی: عین الحسن نمبر: ۳۰ ؍ رانی لچھمی بائی مارگ الگن روڈ کانٹن منیٹ، کانپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) اگر انکم ٹیکس سے حفاظت کی غرض سے مستفتی نے فرزندوں اور بیوی کے نام کاروبار کر دیا ہے اور پھر کاروبار کے جملہ معاملات میں سائل کی مرضی واختیار کا بھی دخل رہا ہے، تو ایسی شکل کو شریعت میں بیع تلجئہ کہا جاتا ہے۔ اور بیع تلجئہ میں جن لوگوں کے نام کیا جاتا ہے وہ لوگ شئ مبیع کے مالک نہیں ہوا کرتے ہیں؛ بلکہ شئ بحالہ اصل مالک کی ملکیت میں رہ جاتی ہے؛ اس لئے سوال نامہ کی درج شدہ شکل میں جمیع کاروبار کا مستفتی خود مالک ہے۔ اور فرزندان اور بیوی کی ملکیت میں کاروبار کا کوئی جزو داخل نہ ہوگا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۱)

وبيع التلجئة : وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف عدو، وهو ليس ببيع في الحقيقة، بل كالهزل . (الدرالمختار مع الرد، كتاب البيوع، باب المصرف، مطلب في بيع التلجئة زكريا ۷/ ۵٤۲، كراچی ۵/ ۲۷۳، هندية، زكريا قديم ۳/ ۳۰۹، جديد ۳/ ۱۹٦ ، بدائع الصنائع زكريا ٤/ ۳۸۹، كراچی ۵/ ۱۷٦)

بيع التلجئة: البيع الصوري أن يضطر لإظهار عقد وإبطان غيره مع

إرادة ذلک الباطن کأن یظهر بیع داره لابنه لئلا یستولي علیها السلطان.
(معجم لغة الفقهاء، کراچی، ص: ۱۱۳، قواعد الفقه، أشرفي ۲۱۳، معجم المصطلحات والألفاظ الفقهیة، دارالفضیلة ۱/ ۴۰۵)

اور اگر بالفرض کاروبار میں باپ کی محنت بہت کم شامل رہی ہے، یا بالکل نہیں رہی، مگر باپ کے زیر تحت کاروبار چل رہا ہے، تب بھی سارے کاروبار اور منافع کا تنہا باپ ہی مالک ہوگا۔

الأب وابنه یکتسبان في صنعة واحدة ولم یکن لهما شيء، فالکسب کله للأب إن کان الابن في عیاله؛ لکونه معینا له. (شامي، کتاب الشرکة، مطلب اجتمعا في دار واحدة واکتسبا ولا یعلم التفاوت فهو بینهما بالسویة، زکریا ۶/ ۵۰۲، کراچی ۴/ ۳۲۵، تنقیح الفتاوی الحامدیة ۲/ ۱۸)

(۲) جب ایک ساتھ ایک فیملی میں مستفتی کے زیر تحت فرزندان رہے ہیں اور فرزندان اپنا وقت باپ کے کاروبار میں لگا رہے ہیں، تو اس درمیان میں سب کے اخراجات کا ذمہ دار مستفتی (باپ) ہی رہا ہے؛ لہٰذا اس دوران باپ نے ان کے بال بچوں کے کماحقہ اخراجات ادا نہیں کئے ہیں، تو بلا اجازت اپنے معیار زندگی کی ضرورت کے بقدر لے کر بال بچوں میں خرچ کرنا جائز تھا۔ حدیث میں اس کی اجازت آئی ہے:

عن عائشة – رضي الله عنه – قالت: دخلت هند بنت عتبة امرأة أبي سفیان – رضي الله عنه – علی رسول الله ﷺ، فقالت: یا رسول الله! إن أبا سفیان رجل شحیح، لا یعطیني من النفقة ما یکفیني، ویکفي بنيّ إلا ما أخذت من ماله بغیر علمه، فهل علي في ذلک من جناح، فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: خذي من ماله بالمعروف ما یکفیک، ویکفي بنیک. (مسلم شریف، باب قضیة هند، النسخة الهندیة ۲/ ۷۵، بیت الأفکار، رقم: ۱۷۱۴)

(۳) مذکورہ کاروبار سے بلا اجازت جو گاڑی خریدی ہے شرعاً وہ گاڑی خریدنے والے کی ملکیت میں داخل نہ ہوگی؛ بلکہ مستفتی (باپ) ہی اس کا مالک ہوگا، جیسا کہ جواب نمبر:۱ کی عبارت نمبر:۲ر سے واضح ہوتا ہے۔

وبيع التلجئة : وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف عدو، وهو ليس ببيع في الحقيقة، بل كالهزل . (الدرالمختار مع الرد، كتاب البيوع، باب المصرف، مطلب في بيع التلئجة زكريا ۷/ ۵٤۲، كراچی ۵/ ۲۷۳، هندية، زكريا قديم ۳/ ۳۰۹، جديد ۳/ ۱۹٦ ، بدائع الصنائع زكريا ٤/ ۳۸۹، كراچی ۵/ ۱۷٦)

بيع التلجئة: البيع الصوري أن يضطر لإظهار عقد وإبطان غيره مع إرادة ذلک الباطن كأن يظهر بيع داره لابنه لئلا يستولي عليها السلطان.

(معجم لغة الفقهاء، كراچی ،ص: ۱۱۳، قواعد الفقه، أشرفي ۲۱۳، معجم المصطلحات والألفاظ الفقهية، دارالفضيلة ۱/ ٤۰۵)

(۴) جی ہاں یہ سب رقوم مستفتی کوواپس کردینا لازم ہے۔

(۵) جی ہاں علماء کی مذکورہ رائے درست اور صحیح ہے۔

(٦) فرزنداول ودوئم نے جوکاروبار اپنے اور اپنے فرزندوں کے نام سے الگ قائم کئے ہیں اوراس کا رأس المال اورسرمایہ پہلا کاروبار ہے،جس کا مالک مستفتی ہے،تو اس میں دو صورتیں سامنے آتی ہیں:

(۱)فرزندان دوئم نے یہ کاروبار باپ کی فیملی اور زیرتحت رہ کرقائم کیاہے،توایسی صورت میں ان کے قائم کردہ کاروبار بھی مستفتی ہی کی ملکیت میں ہوگا اوراس میں باپ کی وفات کے بعد تمام ورثاء حق دار ہوں گے۔

(۲) مذکورہ فرزندان نے باپ سے الگ ہوکرقائم کیا ہے،تو ایسی صورت میں قائم کردہ کاروبار کے مالک وہی فرزندان ہوں گے؛ البتہ اس میں مذکورہ فرزندوں نے باپ کے کاروبار سے جورأس المال اورسرمایہ لے کرلگایا ہے،اس کا تاوان ادا کرنا لازم ہوسکتا ہے، اس سے زیادہ نہیں۔

(۸) اگرسنین ماضیہ کی زکوۃ حساب لگا کرنہیں دی گئی ہے اوراس سے سبکدوش ہوناچاہتا ہے، توتخمینہ لگا کرکچھ زائد دے دیں۔(مستفاد: فتاوی دارالعلوم ٦/ ۱۴۸)

جب کاروبار میں مستفتی کا اختیار رہا ہے تو مستفتی پر لازم ہے کہ تمام مال میں سے تخمینہ لگا کر سنین ماضیہ کی لازم شدہ زکوۃ ادا کردے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ رجمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۳۱۹۸)

بیوی کے نام زمین کرانے سے ملکیت کا حکم

سوال [۸۷۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے اپنے لئے زمین خریدی اور اپنی ہی ملکیت کی وضاحت کرتے ہوئے اپنی بیوی کے نام رجسٹری کرائی اور بعد رجسٹری کے بیوی اپنی ملکیت کو ثابت کرتی ہے، جب کہ شوہر انکار کرتا ہے، تو حکم شرع کیا ہے؟ آیا رجسٹری کو اصل ملک مانیں گے یا شوہر کی ملکیت مانیں گے کہ شوہر نے اپنے لئے ہی خریدا ہے؟ ایسی وضاحت مطلوب ہے جس سے یقین محکم حاصل ہو جائے۔

المستفتی: محمد عمران، کٹیہاری، بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس صورت میں جب کہ شوہر نے اپنے ہی پیسے سے اپنے لئے زمین خریدی ہے اور کسی مصلحت سے بیوی کے نام کرادی تو محض نام کرانے سے وہ زمین بیوی کی ملکیت نہیں ہوتی ہے؛ بلکہ خریدی ہوئی چیز زمین شوہر ہی کی ملکیت ہوگی اور اس کو شریعت کی اصطلاح میں ''بیع التلجئۃ'' کہا جاتا ہے؛ اس لئے کہ کسی کے نام محض رجسٹری کرا دینے سے وہ زمین اس کی نہیں ہو جاتی، جب تک کہ حقیقتاً اس کو مالک بنانے کی نیت سے اس کے قبضہ میں نہ دے دی جائے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۶-۳۷، فتاوی محمودیہ قدیم ۶/ ۲۸۰، جدید اشرفیہ ۱۶/ ۳۹)

وبيع التلجئة : وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف عدو، وهو ليس ببيع في الحقيقة، بل كالهزل . (الدرالمختار مع الرد، كتاب البيوع، باب الصرف، مطلب في بيع التلجئة زكريا ٧/ ٥٤٢، كراچی ٥/ ٢٧٣، هندية، زكريا قديم ٣/ ٣٠٩، جديد ٣/ ١٩٦ ، بدائع الصنائع زكريا ٤/ ٣٨٩، كراچی ٥/ ١٧٦، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ٢٤/ ١٢٢)

بيع التلجئة: هو العقد الذى يباشره إنسان عن ضرورة ويصير كالمدفوع إليه، صورته: أن يقول الرجل لغيره: أبيع داري منك بكذا في الظاهر ولا يكون بيعا في الحقيقة، ويشهد على ذلك وهو نوع من الهزل. (قواعد الفقه، أشرفي ص: ٢١٣، معجم المصطلحات والألفاظ الفقهية، دارالفضيلة بيروت ١/ ٤٠٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ ؍جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۱۳۰)

بیوی بچوں کے نام بیع نامہ کرانے سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی

سوال [۸۷۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: حافظ عبدالحمید صاحب نے ایک بیع نامہ اپنے دو لڑکوں :عبدالباری (اس وقت عمر ۱۲ ؍سال)وعبدالہادی (اس وقت عمر۲ ؍سال) کے نام کرایا تھا، جس کا پیسہ انہوں نے ہی دیا تھا، بعد میں ان کے مزید لڑکے پیدا ہوئے ،شرعی طور پر وہ جائیداد جن کے نام ہے، ان کی مانی جاوے گی یا حافظ عبدالحمید (پدر جنہوں نے روپیہ خرچ کیا تھا) کی مانی جاوے گی؟ نیز حافظ عبدالحمید صاحب نے اپنے زمانہ حیات میں بھی کبھی یہ نہیں کہا کہ یہ جائیداد میں نے عبدالباری یا عبدالہادی ہی کے لئے خریدی ہے اور نہ یہ کہا کہ یہ جائیداد میں انہیں کو دیتا

ہوں، یعنی ہبہ بھی نہیں کیا، نیز خریداری کے وقت جائیداد خام تھی، بعد میں کچھ جائیداد حافظ عبدالحمید ہی نے اپنے پیسے سے تعمیر کرائی اور کچھ جائیداد عبدالہادی و دیگر لڑکوں نے تعمیر کرائی اوراس میں تمام لڑکے سکونت پذیر رہے، عبدالباری صاحب نے دیگر مکان خرید کر تعمیر کرلیا اوروہ اسی میں سکونت رکھتے ہیں، اس خریدی ہوئی جائیداد سے سکونت ترک کردی، عبدالباری صاحب کا انتقال ہوگیا، ان کے بچے اس جائیداد میں سکونت پذیر ہیں، عبدالباری صاحب کا یہ کہنا ہے کہ یہ جائیداد ہمارے باپ نے اپنے پیسے سے خریدی تھی، ہم اس وقت نابالغ تھے، ہمارا کوئی پیسہ بھی والدصاحب کے پاس جمع نہیں تھا؛ اس لئے یہ جائیداد تمام بھائیوں کی ہے، عبدالہادی مرحوم نے یا ان کے بچوں نے عبدالباری جیسے الفاظ کبھی نہ کہے، وہ اس معاملہ میں خاموش رہے، مکرر یہ ہے کہ حافظ عبدالحمید صاحب بھی اپنی حیات میں یہی کہتے رہے کہ یہ جائیداد میرے سب بچوں کی ہے۔

المستفتی: محمد یعقوب ومحمد فاروق، پسران حافظ عبدالحمید صاحب مرحوم، باغ بہادر گنج، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شریعت اسلامی میں بیوی یا بچے کے نام بیعانہ کرانے کی وجہ سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی ہے؛ بلکہ ملکیت اصل مالک کی باقی رہتی ہے؛ اس لئے مذکورہ صورت میں عبدالحمید نے جس زمین کا بیع نامہ اپنے لڑکے عبدالباری وعبدالہادی کے نام کرایا ہے، وہ عبدالحمید کی ملکیت سے خارج نہیں ہوئی ہے؛ اس لئے اس میں شرعاً عبدالحمید کے تمام ورثاء کا حق وابستہ ہوگا۔ اور کسی کو محروم کرنا جائز نہ ہوگا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۷،۳/ ۳۹)

وبيع التلجئة : وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف عدو، وهو ليس ببيع في الحقيقة، بل كالهزل . (الدرالمختار مع الرد، كتاب البيوع، باب المصرف، مطلب في بيع التلجئة زكريا ۷/ ۵٤۲، كراچی ۵/ ۲۷۳، هندية، زكريا قديم ۳/ ۲۰۹، جديد ۳/ ۱۹٦، كتاب البيوع، الباب العشرون في البياعات المكروهة والأرباح الفاسدة، بدائع الصنائع زكريا ٤/ ۳۸۹، كراچی ۵/ ۱۷٦، المبسوط

للسرخسي، دار الكتب العلمية بيروت ٢٤/ ١٢٢، الفقه الإسلامي و أدلته، هدى انٹرنيشنل ديو بند ٤/ ١٢٧-١٢٨، دارالفكر ٥/ ٣٣٢٥، الموسوعة الفقهية الكويتية ٩/ ٦٢)

بيع التلجئة: البيع الصوري أن يضطر لإظهار عقد وإبطان غيره مع إرادة ذلك الباطن كأن يظهر بيع داره لابنه لئلا يستولي عليها السلطان.

(معجم لغة الفقهاء، كراچی، ص: ١١٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ربیع الاول ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/۲۵۸۶)

بیوی کے نام سے زمین خریدنا

سوال [۸۷۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے ۱۹۹۰ء میں کبیر نگر رامپور روڈ ریلوے کراسنگ کے نیچے مرادآباد میں دو مکان M.D.A. سے خریدے، ایک اپنے نام ایک اپنی بیوی کے نام، جس کی کل رقم میں نے اپنی جیب سے ادا کی، بیوی کے نام مکان خریدنے کا مقصد بیوی کو مالک بنانا نہیں تھا؛ بلکہ میں سرکاری آدمی تھا، اس لئے ان کے نام مجبوراً لینا پڑا، میں نے دونوں مکان ایک خاتون کو بیوی اوراپنے دستخط کرا کر کچہری میں مختارنامہ کردیا، مکانوں کی رقم ابھی پوری ملی بھی نہیں، بیوی نے میرے ایک دوست جو مکانوں کے بکوانے میں شامل تھے، ان کو ایک پرچہ لکھا تھا کہ یہ مکان میں نے اپنی جیب سے خریدا ہے، جب ان سے کہا گیا کہ رسیدیں اور دستخط دکھاؤ، تو ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہے، براہ کرم یہ بتائیں کیا بیوی کو دی جانے والی رقم جائز ہوگی؟

المستفتی: سید اقتدار علی جگر کالونی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر کسی مصلحت کی بنا پر آپ نے اپنی بیوی کے نام سے

مکان خریدا اور یہ مقصد نہیں تھا کہ بیوی کو حقیقی مالک بنانا ہے؛ بلکہ سرکاری اور قانونی پریشانیوں سے بچنے کے لئے یا بیوی کو خوش کرنے کے لئے اس کے نام سے جائیداد خرید لی، تو اس سے شرعی طور پر بیوی جائیداد کی مالک نہیں ہوگی، اس طرح نام کر کے خریداری کو شریعت کی اصطلاح میں ''بیع تلجئہ'' کہا جاتا ہے۔ اور ایسی بیع میں جس کے نام سے خریدا جاتا ہے وہ مالک نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ جو خریدتا ہے وہی اصل مالک ہوا کرتا ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۹)

والإقرار بالبيع تلجئة هي أن يلجئك أن تأتي أمرا باطنه على خلاف ظاهره (وتحته في الشامية) كما لا يجوز بيع التلجئة لا يجوز الإقرار بالتلجئة بأن يقول لآخر: إني أقر لك في العلانية بمال وتواضعا على فساد الإقرار لا يصح إقراره حتى لا يملكه المقر له. (الدر مع الرد، كتاب الإقرار، باب الاستثناء وما في معناه، زكريا ۸/ ۳۷۷-۳۷۸، كراچی ۵/ ٦۰۸)

بيع التلجئة: البيع الصوري أن يضطر لإظهار عقد وإبطان غيره مع إرادة ذلك الباطن كأن يظهر بيع داره لابنه لئلا يستولي عليها السلطان. (معجم لغة الفقهاء، كراچی، ص: ۱۱۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹ر رجب ۱۴۲٦ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۸۸۹۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/ ۷/ ۱۴۲٦ھ

بیوی کی دل جوئی کے لئے مکان اس کے نام سے خریدنے کا حکم

سوال [۸۷۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمود نے ایک مکان اپنی بیوی اختری بیگم کے نام سے خریدا اور اسی کے نام رجسٹری کرائی، محمود کے اس وقت تین لڑکے اور سات لڑکیاں ہیں، دو لڑکیاں شادی شدہ ہیں، ایک بڑے لڑکے نے اپنی شادی خود کر لی ہے۔ اور ایک چھوٹے بھائی کو قتل بھی کر چکا ہے، دیگر بھائی بہنوں کے ساتھ بھی ظلم وزیادتی کرتا رہتا ہے، پھر اپنی والدہ کو بہلا کر آدھے مکان

(جومیں نے بیوی کے نام سے خریدا تھا) کا اپنے نام بیع نامہ کروالیا، میں نے بیوی سے جب معلومات ہونے پر پوچھا کہ ایسا کیوں کیا؟ تو اس نے کہا مجھے دھمکی دی تھی تو:

(۱) دریافت یہ کرنا ہے کہ بیوی نے جو آدھا مکان بڑے لڑکے کے نام بیع نامہ کردیا ہے، وہ بڑے لڑکے کا ہوگیا یا نہیں؟

(۲) کیا اس طرح صرف ایک لڑکے کے نام آدھا مکان کردینے سے بیوی گنہگار ہوگی یانہیں؟ یا سب کو برابر دینا چاہئے؟

(۳) بڑے لڑکے کا ماں باپ کے ساتھ اور بھائی بہنوں کے ساتھ ظلم وزیادتی کرنا شرعاً کیسا ہے؟ اس کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمود حسین پیرزادہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کسی مصلحت کی بنا پر مثلاً بیوی کی دلجوئی یا کسی قانون سے حفاظت کے لئے شوہر کا اپنے پیسے سے بیوی کے نام سے جائیداد خریدنے سے شرعی طور پر بیوی جائیداد کی مالک نہیں ہوتی؛ بلکہ مالک شوہر ہی ہوا کرتا ہے۔ اور اس طرح کی خرید وفروخت کو بیع تلجئہ کہا جاتا ہے؛ لہٰذا مذکورہ صورت میں محمود کی بیوی اختری بیگم اس مکان کی مالک ہی نہیں ہوئی؛ بلکہ مالک محمود ہی ہے؛ لہٰذا بعد میں اختری بیگم کے دستخط کے ذریعہ سے محمود کی اجازت کے بغیر بڑے لڑکے کے نام اس کا بیع نامہ کردینا شرعی طور پر درست نہیں ہوا؛ اس لئے محمود کو حق ہے کہ اس بیع نامہ اور رجسٹری کو ختم کرا کر مکان اپنی ملکیت میں واپس لے لے، پھر محمود کی مرضی ہے چاہے اپنے پاس رکھے اور چاہے کسی اور کے تصرف میں رکھے، اس میں سوال نامہ کے تینوں اجزاء کا جواب واضح ہوگیا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۷، فتاوی محمودیہ قدیم ٦/ ۲۸۰، جدید اشرفیہ ۱٦/۳۹)

وبیع التلجئة: وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف

عدو، وهو ليس ببيع في الحقيقة، بل كالهزل. (الدرالمختار مع الرد، كتاب البيوع، باب المصرف، مطلب في بيع التلئجة زكريا ٧/ ٥٤٢، كراچی ٥/ ٢٧٣، هندية، زكريا قديم ٣/ ٣٠٩، جديد ٣/ ١٩٦، بدائع الصنائع زكريا ٤/ ٣٨٩، كراچی ٥/ ١٧٦، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ٢٤/ ١٢٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۴۴۵)

انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے بیوی کے نام جائیداد کرنے کا حکم

سوال [۸۷۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کو اپنے والد کے ترکہ میں سے ۸۸؍ گز کا مکان ملا جس میں سے اس نے چوتھائی حصہ اپنی بیوی کے نام لکھ دیا، کچھ عرصہ بعد زید نے ۱۷۵؍ گز کا ایک مکان خریدا، مکان خریدنے کے بعد زید کے یہاں انکم ٹیکس کا چھاپا لگا، زید کے وکیل نے مشورہ دیا کہ تم یہ سب مکان اپنی بیوی کے نام کر دو، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، کچھ عرصہ بعد زید کی بیوی کا انتقال ہو گیا، مرحومہ نے ۶؍ لڑکیاں اور ۴؍ لڑکے چھوڑے۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ مذکورہ جائیداد میں زید کا اور بچوں کا شرع کی رو سے کیا حق ہے؟

المستفتی: عبدالستار بھٹی اسٹریٹ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: کسی مصلحت یا قانون سے حفاظت کے لئے شوہر اپنی بیوی کے نام جائیداد کردے، تو بیوی مالک نہیں ہوتی؛ اس لئے جب زید نے انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے اپنا ایک سو پچھتر گز کا مکان وقتی طور سے بیوی کے نام کر دیا، تو بیوی اس کی مالک نہیں ہوئی؛ بلکہ مالک بدستور زید ہی ہے؛ لہٰذا بیوی کے مرجانے کے بعد اس کے ورثاء میں

مذکورہ ایک سو پچھتر گز کے مکان کی تقسیم نہیں ہوگی؛ کیوں کہ اس جائیداد کا مالک زید ہے۔اور یہ صورت بیع التلجئہ کے تحت ہے؛لیکن زید نے جو دوسرے اٹھاسی گز مکان میں سے چوتھائی حصہ اپنی بیوی کو دے کر مالک بنا دیا تو بیوی اس کی مالک ہوگئی؛ لہٰذا بیوی کے مرنے کے بعد اب چوتھائی حصہ میں جس کی وہ مالک تھی جائیداد تقسیم ہوگی۔(مستفاد: امدادالفتاوی ۳/ ۳۷، فتاوی محمودیہ۶/ ۲۸۰،جدید اشرفیہ۱۶/ ۳۹)

وبيع التلجئة : وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف عدو، وهو ليس ببيع في الحقيقة، بل كالهزل. (الدرالمختار مع الرد، كتاب البيوع، مطلب بيع التلجئة، زكريا ٧/ ٥٤٢، كراچی ٥/ ٢٧٣، وهكذا في الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹر نیشنل ديوبند ٤/ ١٢٧-١٢٨، دارالفكر ٥/ ٣٣٢٥، الموسوعة الفقهية الكويتية ٩/ ٢٩٦، هندية، زكريا قديم ٣/ ٣٠٩، جديد ٣/ ١٩٦، معجم لغة الفقهاء، كراچی ص: ١١٣، قواعد الفقه أشرفی، ص: ٢١٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم صفر ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۴۸۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۲/۱ھ

بیوی کے نام مکان خریدنے سے کیا وہ مالک ہوجائے گی؟

سوال [۸۷۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے اپنا مکان ۱۹۵۰ء میں اپنی بیوی کے نام سے خریدا تھا، میرے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی ہے، سبھی حیات ہیں۔ مکان خریدنے کے وقت دس سال بعد میرے بڑے لڑکے نے مکان کو مبلغ: -/1,000 میں گروی رکھ دیا، جس کو تین سال بعد میرے تیسرے لڑکے نے چھڑا لیا، مکان چھڑانے کے بعد اب کچھ سالوں سے وہ یہ کہتا ہے کہ میں نے اس مکان کا آدھا حصہ اپنی ماں سے اپنے نام کرا رکھا ہے، اور وہ مکان کے آدھے حصہ پر قابض بھی ہے،

باقی آدھا حصہ تم چاروں بھائیوں کا ہے اور میرا بھی ہے، میرے سبھی لڑکوں اور بیٹی کی شادی ہوچکی ہے، جس وقت میرے بڑے لڑکے نے مکان گروی کاروبار کے لئے رکھا تھا، اس وقت میرے چھوٹے دونوں بیٹے بہت چھوٹے تھے جو کہ اب شادی شدہ ہیں اور وہ اس مکان کے بقیہ آدھے حصے میں رہتے ہیں جو کہ انہوں نے اپنے پیسے سے بنوایا ہے، میرے ان دونوں چھوٹے بیٹوں کو میرے بڑے لڑکے بہت پریشان کرتے ہیں، میری آپ سے گزارش ہے کہ اس مکان کو شرعاً کس طرح تقسیم کیا جائے؟

کل آراضی پچاسی گز ہے اور لڑکوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں: (۱) اشتیاق حسین (۲) اشفاق حسین (۳) مختار حسین (۴) ممتاز حسین (۵) انتظار حسین، ایک لڑکی زاہدہ خاتون۔

المستفتی: مشتاق حسین، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر آپ نے اپنے ذاتی پیسہ سے بیوی کے نام سے خریدا ہے، تو شرعاً اس طرح بیوی کے نام سے خریدنے سے بیوی مالک نہیں ہوئی؛ اس لئے شرعاً مذکورہ مکان کے آپ ازخود مالک ہیں، آپ کے مرنے پر آپ کے تمام ورثاء اس مکان میں بطور وارث شریک ہوں گے۔ (مستفاد: امدادالفتاوی ۳/ ۳۷-۳۹)

اور اس طرح خریداری کو بیع التلجئہ کہا جاتا ہے اور اس میں ملکیت اسی کی ثابت ہوتی ہے جو خریدتا ہے اور اپنا پیسہ ادا کرتا ہے۔

وبيع التلجئة : وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف عدو، وهو ليس ببيع في الحقيقة، بل كالهزل. (الدرالمختار مع الرد، كتاب البيوع، باب الصرف، مطلب بيع التلئجة، زكريا ۷/ ٥٤٢، كراچی ٥/ ۲۷۳، وهكذا في الهندية، زكريا قديم ۳/ ۲۰۹، جديد ۳/ ۱۹٦، بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ۳۸۹، كراچی ٥/ ۱۷٦، معجم المصطلحات والألفاظ الفقهية، دارالفضيلة ۱/ ٤٠٥، قواعد الفقه، أشرفي، ص: ۳۱۳، معجم لغة الفقهاء، كراچی ص: ۱۱۳)

نیز اگر جس وقت مذکورہ مکان کو رہن میں رکھا گیا تھا اور پھر چھڑ وایا گیا تھا، اس وقت رہن میں رکھنے والے اور چھڑانے والے دونوں لڑکے آپ کے زیر تحت رہے ہیں، تو شرعاً دونوں کو آپ کی طرف سے بطور وکیل ومعین کے کام کرنے والے سمجھے جائیں گے اور سارا تصرف شرعاً آپ کی ملکیت میں ہوا ہے۔

الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيء، فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله؛ لكونه معينا له. (شامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ولا يعلم التفاوت فهو بينهما بالسوية، زكريا ٦/ ٥٠٢، كراچی ٤/ ٣٢٥، تنقيح الفتاوى الحامدية ٢/ ١٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/۲۶۴۴)

بیوی کے نام سے جائیداد خریدنے کا حکم

سوال [۸۷۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گلزار احمد نے ۱۹۴۸ء میں مسماۃ رئیسہ خاتون سے شادی کی اور اپنے روپیوں سے آراضی مسماۃ رئیسہ خاتون کے نام سے خریدی، بعدہ گلزار احمد نے دوسری شادی مسماۃ صابرہ خاتون سے کی، جنہوں نے اپنے خرچ سے افتادہ آراضی میں مکان بنوایا، جس کے بعد رئیسہ خاتون کا انتقال ہوگیا، جنہوں نے بعد اپنی وفات چار لڑکے: رئیس احمد، ظہیر احمد عرف بھولا، انیس احمد، حسین احمد اور ایک لڑکی مسماۃ شاکرہ خاتون اور شوہر گلزار احمد چھوڑے، جو بقید حیات ہیں، نیز آراضی افتادہ پر مکان بنوانے والی مسماۃ صابرہ خاتون بھی بقید حیات ہیں، جس کی بھی دو لڑکیاں ہیں، گلبہار اور ناظمہ خاتون اور چار لڑکے: ذوالفقار احمد، گلشاد احمد، دلشاد احمد اور رخسار احمد شوہر موصوف گلزار احمد سے ہیں، ایسی صورت میں مناسب فتویٰ بروئے

شریعت دے کر ممنون فرمائیں کہ تعمیر شدہ مکان میں کیسے کتنا کتنا حق پہنچتا ہے؟ عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: گلزار محمد گوئیاں باغ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: محض بیوی کے نام جائیداد وآراضی خرید نے سے بیوی شرعاً مالک نہیں ہوتی؛ اس لئے مذکورہ آراضی کا مالک گلزار احمد ہی ہوگا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۷، ۳/ ۳۹)

وبيع التلجئة: وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف عدو، وهو ليس ببيع في الحقيقة، بل كالهزل. (الدرالمختار مع الرد، كتاب البيوع، باب الصرف، مطلب بيع التلجئة، زكريا ۷/ ۵٤۲، كراچی ۵/ ۲۷۳، کوئٹه ٤/ ۲۷۳، هندية، زكريا قديم ۳/ ۲۰۹، جديد ۳/ ۱۹٦)

لہٰذا فی الحال اس کی تقسیم کی بھی ضرورت نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ صفر ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۵۱۸)

قانونی مصلحت کی بنا پر بہن کے نام رجسٹری کرانے سے ملکیت کا حکم

سوال [۸۷۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے جو کہ اپنے بہنوئی کا پارٹنر بھی ہے، اس نے ذاتی طور پر اپنے لئے ایک جگہ خریدی اور اس جگہ کو اپنی بیوی اور بہن کے نام سے اس لئے کرالیا کہ اس میں سرکاری اور قانونی طور پر کوئی مصلحت تھی اور یہ بھی کہا کہ اس زمین میں نفع کا دس فیصد اپنی بہن کو دوں گا، اس مذکورہ بیان وسچائی پر گواہ بھی موجود ہیں، اس کے باوجود کچھ دنوں کے بعد اس شخص کے بھانجے اس زمین میں اپنی ماں کی پارٹنری کا مطالبہ کرتے ہیں، کیا ان لوگوں کے

لئے اس طرح کا دعویٰ کرنا درست ہے؟

المستفتی: محمد ارشد اشتیاق، متعلم مدرسۃ الجنۃ، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ذاتی طور پر اپنے پیسہ سے خریدتے وقت قانونی پیچیدگی سے بچنے کے لئے بیوی یا بہن کے نام رجسٹری کرنے کی وجہ سے خریدار کی ملکیت سے الگ نہیں ہوتا ہے اور ایسی خریداری کو بیع تلجئہ کہا جاتا ہے، جس میں شرعی طور پر وہ لوگ مالک نہیں ہوتے ہیں، جن کا نام رجسٹری میں درج کردیا جاتا ہے۔ اور شرعی طور پر مالک وہی ہوتا ہے جس نے اپنے پیسہ سے خریدا ہو؛ لیکن سوال نامہ میں ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ ''اس کے منافع سے دس فیصد دیں گے''۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ زمین کے دس فیصد میں مالک بنانا مقصود ہے؛ اس لئے بہن یا بہن کے بچوں کا دس فیصدی کا مطالبہ کرنا اس تحریر کی روشنی میں درست ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/۳۱)

وبيع التلجئة هي ما ألجئى إليه الإنسان بغير اختياره، وذلک أن يخاف الرجل السلطان، فيقول لآخر: أني أظهر أني بعت داري منک، وليس ببيع في الحقيقة، وإنما هي تلجئة. (شامي، كتاب البيوع، باب الصرف، مطلب في بيع التلجئة، زكريا ۷/ ۵٤۲، كراچی ۵/ ۲۷٤)

عن أبي يوسفؒ في رجلين قالا: ما اشترينا من شيء فهو بيننا نصفان، فهو جائز. (تاتارخانية، زكريا ۷/ ٤۷۰، برقم: ۱۰۹۰۹)

شركة الملک لا تبطل أي لا يبطل الاشتراک فيها بل يبقى المال مشتركا بين الحي وورثة الميت. (شامي، كتاب الشركة، مطلب يرجح القياس، زكريا ٦/ ۵۰٤، كراچی ٤/ ۳۲۷)

ووجوب أدائه عند طلب مالكه، وشرعية الإيداع إن الله يأمركم أن تؤدوا الأمانات إلى أهلها. (مجمع الأنهر، كتاب الوديعة، دارالكتب العلمية بيروت

۳/ ٤٦٧، مصـري قـديـم ۲/ ۳۳۸، هـنـدية، زكـريـا قديم ٤/ ۳۳۸، جديد ٤/ ۳٤۹)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ر شوال ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۴۹۲/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۱۰/۲۶ھ

بڑے بھائی کے نام بیع نامہ ہونے کے باوجود دوسرا بھائی حق دار

سوال [۸۷۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے بڑے بھائی محمد مہربان اور میں محمد فرقان نے مل کر ایک پلاٹ ۷۰ر گز لگ بھگ تھا، گنگا سرن بھٹنا گر ایڈوکیٹ سے خرید کیا تھا، معاہدہ کے وقت اس کی کل قیمت ۱۱۰۰۰ر روپئے طے ہوئی۔ مالک کو -/5000 روپئے دے کر معاہدہ کر لیا تھا، جس میں -/3000 روپئے بڑے بھائی نے اور -/2000 روپئے میں نے دیئے تھے، ہم دونوں بھائیوں میں آپس میں بہت میل تھا اور مجھے اپنے بڑے بھائی پر پورا بھروسہ تھا؛ اس لئے معاہدہ میں صرف بڑے بھائی کا نام ہی لکھوا دیا گیا؛ کیوں کہ بڑے بھائی کو رہنے کی پریشانی تھی اور ان کی مالی حالت بہت کمزور تھی؛ اس لئے عارضی طور پر چاردیواری کرا کر میں نے اوپر ٹین شیڈ ڈلوا دیا تھا، جس میں -/3000 روپئے خرچ ہوا تھا، جو میں نے اپنے پاس سے دیئے، اس کے علاوہ -/1600 روپئے ان کو ضرورت پڑنے پر دیئے تھے؛ لہٰذا جس وقت اس کا مختار نامہ ہوا بھائی نے مجھ سے روپیوں کے لئے کہا، تو میں نے ان سے کہا کہ میرے آپ کے پاس -/6600 روپئے پہنچ چکے، آپ اس میں سے میرے حصے کے روپئے جمع کر دیں؛ کیوں کہ -/11000 کل قیمت کے آدھے -/5500 روپئے ہوتے ہیں، اس طرح میرے حصہ کی آدھی سے زیادہ قیمت ان کے پاس پہنچ چکی تھی۔

بہر کیف آپسی بھروسہ کی وجہ سے مختار نامہ میں بڑے بھائی کا نام لکھوا دیا تھا؛ کیوں کہ بڑے

بھائی برابر اس میں رہتے رہے ہیں، میں کرایہ کے مکان پر رہتا تھا، اس درمیان میں مکان مالک نے مجھ سے مکان خالی کرنے کے لئے کہا، تو مجھے اس کی فکر ہوئی، میں نے بڑے بھائی سے مشورہ کیا، تو انہوں نے کہا یہ زمین آدھی تمہاری ہے، اس پر اپنا مکان بناؤ اور رہو؛ کیوں کرایہ دیتے ہو، میری بڑی بہن اور چچا وغیرہ سے بھی میرے بڑے بھائی نے کہا کہ محمد فرقان سے کہو کہ کیوں پریشان ہوتا ہے، اب اس کی زمین موجود ہے، تو اس میں مکان بنوا کر رہے، پھر میں نے اپنے زیور وغیرہ فروخت کر کے اور کچھ قرض لیکر اس جگہ پر -/75,000 روپئے خرچ کئے، پہلے بڑے بھائی کے لئے نیچے کا لینٹر ڈلوایا اس کے بعد اپنے رہنے کے لئے اوپر کمرہ بنوایا، اس کے بعد وہاں رہنے لگا، بڑے بھائی کے بھروسہ کی وجہ سے میں نے کسی قسم کی کوئی بھی تحریر نہ تو گنگا سرن سے لی اور نہ ہی بڑے بھائی سے اب تک حاصل کی، اب جب کہ بڑے بھائی کے بار بار اصرار کرنے پر میں نے اپنا کافی روپیہ اس جگہ پر لگا دیا، بڑے بھائی مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ اس میں تمہارا کچھ نہیں، یہ ساری زمین میرے نام ہے، میں اس معاملہ کو عدالت میں لے جانا نہیں چاہتا، کوئی شرعی تصفیہ اس میں چاہتا ہوں، اس زمین کے بارے میں میرے چچا جناب عثمان صاحب اور میرے سب سے بڑے بھائی محمد عمران کو بھی معلوم ہے، اور میرے بڑے بہنوئی علی حسین مرحوم نے ساری کارروائی اس زمین کی خریداری وغیرہ کی کرائی تھی، میری بڑی بہنیں بھی یہ بات جانتی ہیں۔ آپ مجھے شرعی مشورہ دیں، مجھے کیا کرنا ہے؟

المستفتی: محمد فرقان، لالباغ نئی آبادی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب دونوں بھائیوں نے مشترکہ طور پر خریدا ہے اور پیسے بھی دونوں بھائیوں کے خرچ ہوئے ہیں اور سوال نامہ کے اعتبار سے ایک بھائی کے اوپر پانچ ہزار پانچ سو روپئے آئے ہیں، جب چھوٹے بھائی نے پانچ ہزار پانچ سو کے بجائے چھ ہزار چھ سو دے دیئے تو گیارہ سو روپئے زیادہ پہنچے اور ایسے حالات میں بڑے

بھائی پر بھروسہ واعتماد کی بنا پر بیع نامہ میں صرف بڑے بھائی کے نام ڈال دینے کی وجہ سے تنہا وہ مالک نہیں ہوگا؛ بلکہ مالک دونوں بھائی برابر کے ہیں۔ اور نیز بڑے بھائی کا یہ کہنا کہ اس میں آدھی زمین تمہاری ہے، اس پر تم اپنا مکان بناؤ یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ بڑا بھائی بھی آدھا حصہ چھوٹے بھائی کا تسلیم کرتا تھا اور پھر چھوٹے بھائی کا اس کے اوپر پچھتر ہزار روپئے خرچ کر کے تعمیر کروانا اور اس تعمیر کے لئے بڑے بھائی کی طرف سے ترغیب دینا یہ مشترکہ ہونے کا ثبوت ہے؛ لہٰذا اب بڑے بھائی کا محض اس وجہ سے انکار کر دینا کہ بیع نامہ میں صرف میرا ہی نام پڑا ہے، جائز نہیں ہے؛ بلکہ دونوں کا حق برابر کا ہے۔ اور پھر تعمیر میں جو خرچ ہوا ہے، اس کے ذمہ دار بھی دونوں برابر کے ہوں گے، محض بیع نامہ میں نام ڈلوانے سے پورا مکان بڑے بھائی کی ملکیت میں نہیں ہوسکتا۔ (مستفاد: امداد المفتیین /۸۹۰، احسن الفتاوی ۶/ ۴۰۰، امداد الفتاوی ۳/ ۳۸)

وبيع التلجئة: وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف عدو، وهو ليس ببيع في الحقيقة، بل كالهزل. (درمختار، كتاب البيوع، باب الصرف، مطلب بيع التلئجة، زكريا ۷/ ۵٤۲، كراچی ۵/ ۲۷۳، هندية، زكريا قديم ۳/ ۲۰۹، جديد ۳/ ۱۹٦، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ۲٤/ ۱۲۲، بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ۳۸۹، كراچی ۵/ ۱۷٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۷۳۰/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۷/۲ھ

۸/ باب الصرف

سونے کی ادھار بیع کا حکم

سوال [۸۷۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے پاس پندرہ ہزار -/15,000 روپئے کی رقم تھی، جس سے وہ اپنی ایک عزیزہ کی شادی کے لئے سونا خرید کر رکھنا چاہتا تھا؛ کیوں کہ سونے کی قیمتیں بہت تیزی سے بڑھ رہی تھیں، اس وقت بکر کو کاروبار کے سلسلہ میں رقم کی ضرورت تھی، بکر نے زید سے کہا کہ تم مجھے پندرہ ہزار روپئے ابھی دیدو اور سونے کی قیمت جو بھی ہو ایک سال بعد میں تمہیں دو تولہ سونا دے دوں گا، زید اور بکر کا اس طرح کا معاملہ کرنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: حکیم محمد مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سونے کی بیع کرنسی کے عوض میں ادھار جائز ہے؛ اس لئے پندرہ ہزار روپئے کے بدلے سونے کی ادھار بیع درست ہوگئی؛ لہٰذا وعدہ کے مطابق مقررہ وقت پر پندرہ ہزار روپئے کے عوض میں دو تولہ سونا دینا جائز ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: المسلمون على شروطهم.

(ترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي، بيروت ۱۷/ ۲۲، رقم: ۳۰، سنن الدارقطني البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۲۳، رقم: ۲۸۶۹، المستدرك للحاكم، مكتبه نزار مصطفى الباز بيروت ۷/ ۲۵۲۳، رقم: ۷۰۵۹، قديم ٤/ ۱۰۱)

سئل الحانوتي عن بيع الذهب بالفلوس نسيئة، فأجاب بأنه يجوز إذا

قبض أحد البدلين. (شامي، كتاب البيوع، باب الربا، مطلب في استقراض الدراهم عددا، كراچی ٥/ ١٨٠، زكريا ٧/ ٤١٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰/ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۳۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶/ ۴/ ۱۴۳۲ھ

سونے اور چاندی کے زیورات کی ادھار خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۷۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کیا چاندی اور سونے کی یا پھر چاندی اور سونے کے زیورات کی ادھار خرید وفروخت قطعی ناجائز ہے؟ (۲) کیا چاندی اور سونے کے زیورات کی ادھار خرید وفروخت ایک معینہ مدت کے لئے جائز ہے؟

المستفتی: ماسٹر افتخار احمد علوی، چوہان بانگر، دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ملک میں رائج نوٹوں اور سکوں کے ذریعہ سونے چاندی اور ان کے زیورات کی ادھار خرید وفروخت شرعاً جائز ہے؛ لیکن اگر سونے کے بدلے سونے یا چاندی کے بدلے چاندی کو خریدا جائے یا بیچا جائے تو اس وقت ادھار خرید وفروخت ناجائز ہوگی۔

سئل الحانوتي عن بيع الذهب بالفلوس نسيئة، فأجاب بأنه يجوز إذا قبض أحد البدلين. (شامي، كتاب البيوع، باب الربا، مطلب في استقراض الدراهم عددا، زكريا ٧/ ٤١٤، كراچی ٥/ ١٨٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۲۵۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/ ۴/ ۱۴۲۸ھ

سونے چاندی کی ادھار بیع وشراء کی شرعی حیثیت

سوال [۸۷۹۷]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سونے چاندی کی ادھار بیع وشراء جائز ہے یانہیں؟

المستفتی: محمد افتخار سیندھولی، شاہجہاں پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: سونے چاندی کی ادھار بیع وشراء جائز ہے۔

وإن اشترى خاتم فضة أو خاتم ذهب فيه فص، أو ليس فيه فص بكذا فلسا وليست الفلوس عنده، فهو جائز تقابضا قبل التفرق، أولم يتقابضا؛ لأن هذا بيع وليس بصرف. (عالمگيري، كتاب الصرف، الباب الثاني، الفصل الثالث في بيع الفلوس، زكريا قديم ٣/ ٢٢٤، جديد ٣/ ٢٠٩، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ١٤/ ٢٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۴۲۵)

قسطوں پر سونے چاندی کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۷۹۸]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سونا چاندی قسطوں پر خریدنا جائز ہے یانہیں؟ مثلاً زید نے عمر کے پاس سے رقم لے کر سونا خریدا اور پھر عمر کو اتنی رقم قسطوں پر ادا کرے، تو ایسا کرنا جائز ہے یانہیں؟

المستفتی: محمد زبیر مظاہری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: سونا چاندی خریدنا چونکہ بیع صرف میں داخل ہے اور بیع

صرف میں مبیع اور ثمن پر عاقدین کا مجلس میں قبضہ کرنا ضروری ہے۔ اور قسطوں پر خرید نے سے ثمن ادھار ہوتا ہے۔ اور مشتری بعد میں تھوڑا تھوڑا ثمن ادا کرتا ہے؛ اس لئے سونا چاندی قسطوں پر خریدنا جائز نہیں۔

ويشترط عدم التأجيل، والخيار، والتقابض بالبراجم لا بالتخلية قبل الافتراق، وفي الشامي: أي افتراق المتعاقدين بأبدانهما، والتقييد بالعاقدين يعم المالكين والنائبين، وتقييد الفرقة بالأبدان يفيد عموم اعتبار المجلس، وهو شرط بقائه صحيحا على الصحيح. (شامي، كتاب البيوع، باب الصرف، كراچى ٥/ ٢٥٧-٢٥٨، زكريا ٧/ ٥٢١، سكب الأنهر في شرح ملتقى الأبحر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١٦١، تاتارخانية، زكريا ١٠/ ٤-٥، رقم: ١٣٨٧٨)

ہاں البتہ کسی سے رقم بطور قرض لے لی جائے اور اس سے نقد سونا خرید لیا جائے اور قرض کی رقم قسطوں پر ادا کی جائے جس پر کوئی سود نہ ہو تو جائز ہے اور درست ہے۔

﴿وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ﴾ الآية. المراد به الإمهال والتأخير. (روح المعاني، سورة البقرة، تحت رقم الآية: ٢٨٠، زكريا ديوبند ٣/ ٨٧)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍رجب ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۳۶۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸؍۷؍۱۴۲۸ھ

سونے کو سونے کے عوض چاندی کو چاندی کے عوض کمی بیشی کے ساتھ فروخت کرنا

سوال [۸۷۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میری ایک چاندی سونے کی دوکان ہے، اس میں بہت سے گراہک ایسے آتے ہیں جو پرانے زیورات لے کر آتے ہیں، بعض دفعہ وہ پرانے زیورات ٹوٹے پھوٹے ہوتے ہیں اور بعض دفعہ ٹوٹے نہیں ہوتے؛ لیکن پرانے ہوتے ہیں، جن کو گلا کر ہم نئے

زیورات بنواتے ہیں، آپ کو معلوم ہوگا سونے چاندی کے جوز یورات بنتے ہیں وہ خالص سونا چاندی سے نہیں بن سکتے، ہر جوڑ پرٹانکا دوسری کئی دھاتوں کو ملا کر ایک دھات بنتی ہے، جس کے ذریعہ لگتا ہے، مثلاً دس گرام کا کوئی زیور ہے، تو ایک گرام اس میں ٹانکا والی دھات ہوتی ہے، اسی وجہ سے جب ہم خریدتے ہیں تو اس چاندی یا سونے کے علاوہ والی دھات کو گھٹا کر اصل چاندی کی قیمت دیتے ہیں، یا کوئی زیور دیتے ہیں، اسی طرح جب مال فروخت کرتے ہیں، تو اس میں بھی ٹانکا والی دھات چاندی سونے کے علاوہ موجود ہوتی ہے؛ لیکن جتنے وزن کا پورا زیور ہوتا ہے، اتنی ہی چاندی یا سونے کی قیمت لیتے ہیں، ٹانکا والی دھات کو گھٹا کر قیمت نہیں لیتے ،اسی کو کردا سے تعبیر کیا جاتا ہے، واضح رہے کہ ہر چاندی اور سونا میں کتنی دھات ٹانکے والی ہوتی ہے، اس کو ہم ایک پتھر (کسوٹی) کے ذریعہ پتہ لگا لیتے ہیں، اسی حساب سے کردا کاٹتے ہیں، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ اس طرح کردا کاٹ کر پرانی چاندی سونے کے بدلہ میں نئے زیورات دینا یا رقم دینا درست ہے یا نہیں؟ یا شریعت نے کوئی دوسری شکل بتائی ہو تو وہ تحریر فرمادیں۔

المستفتی: محمد اعلم، سیتاپور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: کردا کاٹ کر چاندی کو چاندی کے بدلہ میں یا سونے کو سونے کے بدلہ میں لین دین کرنا کمی زیادتی کے ساتھ جائز نہیں ہے؛ البتہ اگر کردا کاٹ کر لینے میں عوض میں روپئے دیا جائے اور دینے میں روپئے لیا جائے تو جائز ہوسکتا ہے۔

فإن باع فضة بفضة، وذهبا بذهب لا يجوز إلا مثلا بمثل، وإن اختلفت في الجودة والصياغة (وقوله) وإن باع الذهب بالفضة جاز التفاضل لعدم المجانسة. (هداية، كتاب الصرف، أشرفي ۳/ ۱۰٤) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ ذیقعدہ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۲۰۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/ ۱۱/ ۱۴۱۵ھ

۲۰/ ہزار کے زیورات ۲۴/ ہزار میں فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۸۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بہت سارے لوگ مجھ سے ادھاری میں سونا (زیورات) مانگتے ہیں، میں ان سے بھی واضح طور پر کہہ دیتا ہوں کہ دوکان سے میں مثلاً: -/20,000 روپئے کا سونا خریدوں گا اور تمہیں -/24,000 (چوبیس ہزار روپئے) میں دوں گا، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ میں سونا خریدکران کے حوالہ کردیتا ہوں، اور ہر ہفتہ -/1,000 (ایک ہزار روپئے) وصول کرتا ہوں، یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد سراج بالاپورآ کولہ، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: روپئے، پیسے، فلوس کی طرح ثمن عرفی ہیں، ثمن حقیقی نہیں۔ اور سونا چاندی کو فلوس کے عوض میں ادھار فروخت کرنا اور ادھار خریدنا جائز اور درست ہے؛ اس لئے روپئے پیسے اور کرنسی کے عوض میں بھی ادھار خرید وفروخت شرعاً جائز ہے؛ لہٰذا سوال نامہ میں جو شکل لکھی ہے وہ شرعاً جائز اور درست ہے، جو فقہاء کی عبارات سے واضح ہوتا ہے:

وإذا اشترى الرجل فلوسا بدراهم، ونقد الثمن ولم تكن الفلوس عند البائع، فالبيع جائز؛ لأن الفلوس الرائجة ثمن كالنقود، وقد بينا أن حكم العقد في الثمن وجوبها ووجودها معا، ولا يشترط قيامها في ملك بائعها لصحة العقد كما لا يشترط ذلك في الدراهم والدنانير -إلى- وبيع الفلوس بالدراهم ليس بصرف. (المبسوط للسرخسي بيروت ١٤/ ٢٤، هندية، كتاب الصرف، الباب الثاني، الفصل الثالث في بيع الفلوس، زكريا قديم ٣/ ٢٢٤، جديد ٣/ ٢٠٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ رمضان المبارک ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۴۹)

ریال کا تبادلہ اس سے کم مالیت کے سکوں سے کرنے کا حکم

سوال [۸۸۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) سعودی وغیرہ میں گاڑی وغیرہ کی پارکنگ کے لئے ریال سکے کی شکل میں درکار ہوتے ہیں؛ لیکن بہت مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ریال نوٹ کی شکل میں ہوتا ہے، سکہ حاصل کرنے کے لئے نوٹ دے کر سکہ کم لینا پڑتا ہے، تو کیا اس طریقہ سے تبادلہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟ سود کی تعریف تو اس پر صادق نہیں آرہی ہے۔

(۲) جیسے اپنے یہاں ہندوستان میں لوگوں کو ریزگاری روپیوں کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً ہوٹل والوں کو پھیری کرنے والے کو ۱۰۰/ کا نوٹ دے کر ۹۵/ روپئے ریزگاری نکال لیتے ہیں، ایسا کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

المستفتی: محمد راشد فتح پوری، متعلم جامعہ عربیہ معراج العلوم چیتا کیمپ، ممبئ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۲) ریال ہوں یا ہندوستانی نوٹ ان کا تبادلہ اگر اسی ملک کے سکوں سے کیا جائے تو ریال کی مالیت کے بقدر سکے سے تبادلہ لازم ہے، اسی طرح ہندوستانی سو روپئے کے نوٹ کا سو روپئے کے سکے سے تبادلہ لازم ہے۔ اور ۹۰/ روپئے کے سکوں سے تبادلہ ناجائز ہے، اسی طرح ریال کا تبادلہ اس سے کم مالیت کے سکوں سے جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فقہی مقالات زمزم بک ڈپو ۳۱، ومسائل سود/ ۱۷۵)

علة القدر مع الجنس فإن وجدا حرم الفضل والنساء، وإن عدما حلا، وإن وجد أحدهما حل الفضل، وحرم النساء. (درمختار مع الشامي، باب الربا، كراچی ٥/ ١٧٢، زكريا ٧/ ٤٠٣-٤٠٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۱۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۳/۱۷ھ

دوملکوں کی کرنسیوں کے کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کا حکم

سوال [۸۸۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سعودی ریال کے پانچ سو روپئے کے نوٹ کی قیمت فی الحال -/57000 روپئے ہے، ایک شخص نے دوسرے شخص سے پانچ سو کا نوٹ -/6,000 میں اس لئے لیا ہے کہ وہ رقم تین چار ماہ کے بعد ادا کرے گا، یعنی اصل قیمت اول الذکر سے زیادہ قیمت صرف رقم تاخیر سے ادا کرنے کی وجہ سے رکھی ہے، قیمت ادا کرنے کا وقت مقرر ہو چکا ہے، اس معاملہ میں نرخ ایک ہی رہا یہ نہیں کہا کہ ادھار لوگے تو زیادہ قیمت کا ہے اور نقد میں اس قیمت کا بلکہ صرف ایک بھاؤ ہی طے کرلیا گیا ہے کہ چار ماہ کے بعد رقم ادا کردی جائے گی اور قیمت -/6,000 ادا کی جائے گی، تو یہ معاملہ جائز ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: عبدالولی ولد حاجی عبدالکریم شیرکوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دو مختلف ملکوں کی کرنسیاں ثمن حقیقی نہیں؛ بلکہ ہر ایک ملک کی کرنسی مستقل طور پر ثمن عرفی ہے؛ لہٰذا قدر وجنس کے مختلف ہونے کی وجہ سے کمی زیادتی اور ادھار دونوں طرح کا تبادلہ جائز ہے؛ البتہ فی الحال ایک جانب سے قبضہ کرنا لازم ہے، جو عام طور پر ہوتا ہے؛ اس لئے سعودی ریال کا ہندوستانی رقم کے ساتھ ہر طرح کی کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ جائز ہے، بس شرط یہ ہے کہ ایک جانب سے قبضہ ہو جائے، خواہ پانچ سو ریال کو پانچ ہزار سات سو میں لیا جائے جو سرکاری بھاؤ یا مارکیٹ کا بھاؤ ہے، یا پانچ سو ریال کو چھ ہزار میں لیا جائے، دونوں طرح جائز ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱۲۳، احسن الفتاوی ۷/ ۱۰۰)

إن الأوراق النقدية ثمن عرفي ليست ثمنا حقيقيا، والربا يجري في الثمن الخلقي الذاتي إذ في الأوراق النقدية من مختلف الدولة ينفي القدر والجنس، أما الجنس فظاهر لاختلاف الدولة، وأما القدر لأنها ليست من جنس الأثمان الخلقية بل عرفية، فيجوز التفاضل والنسيئة إلا أن القبض على أحد البدلين ضروري لئلا يقع في بيع الكالي بالكالي. (التبيان في زكوة الأثمان، بحواله مجله فقه اكيڈمي ٤/ ٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ ۷/ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۲۷۲)

دوسو روپئے کے نوٹوں کے ہار کو تین سو روپئے میں بیچنا

سوال [۸۸۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میری دوکان جنرل اسٹور کی ہے، میں نوٹوں کا ہار بیچتا ہوں اور نوٹوں کی گڈی خرید کر لاتا ہوں، دوسو روپئے والی گڈی دوسو ۲۷/ روپئے کی لاتا ہوں اور ہار اپنے ہاتھ سے بناتا ہوں، تین سو روپئے کا بیچتا ہوں، قرآن وحدیث کی روشنی میں بتائیں کہ یہ صحیح ہے یا غلط؟

المستفتی: نیاز محمد مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: دوسو روپئے کی گڈی دوسو ستر میں خریدنا جائز نہیں ہے، یہ شرعی طور پر سودی کاروبار میں داخل ہوگا اور دوسو کے نوٹوں کے ہار کو تین سو روپئے میں فروخت کرنا جائز ہے؛ اس لئے کہ دوسو روپئے تو ہار کے دوسو کے عوض میں ہوگا اور باقی سو روپئے ہار کی بیل وغیرہ کے عوض میں ہوگا۔

عن ابن عباس –رضي الله عنه– حديث طويل وطرفه: فقال:

ردوه لا حاجة لي فيه، التمر بالتمر، والحنطة بالحنطة، والشعير بالشعير، والذهب بالذهب، والفضة بالفضة، يدا بيد عينا بعين، مثلا بمثل، فمن زاد فهو ربا. الحديث. (المستدرك للحاكم، البيوع، جديد دارالبشائر الإسلاميه، بيروت ۳/ ۸٦۲، قديم ۲/ ٤۳، رقم: ۲۲۸۲)

ولا يجوز بيع الزيتون بالزيت، والسمسم بالشيرج حتى يكون الزيت والشيرج أكثر مما في الزيتون، والسمسم فيكون الدهن بمثله، والزيادة بالثجير. (هداية، كتاب البيوع، باب الربا، اشرفي ديوبند ۳/ ۸۵، ملتقى الأبحر، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۱۲٦-۱۲۷، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ۱/ ۲٦۱، دارالكتاب ديو بند ۱/ ۲٥٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۹۱۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/ ۳/ ۱۴۱۵ھ

بوسیدہ نوٹ کم قیمت میں فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۸۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جب نوٹ بوسیدہ ہوجاتا ہے یا پھٹ جاتا ہے، تو سو کا پھٹا ہوا نوٹ ستر یا اسی روپئے میں چلتا ہے، بتلایئے یہ جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: قمرالدین قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر ملکی کرنسی پھٹ جانے کی وجہ سے مارکیٹ میں اس کی حیثیت عرفیہ گھٹ جائے اور اس روپئے سے کوئی دوسری چیز خریدی نہ جاسکتی ہو کوئی تاجر لینے کے لئے تیار نہ ہو، تو اگر بآسانی بینک میں دے کر نئی اور صحیح کرنسی حاصل کی جاسکتی ہو تو کم

قیمت میں فروخت کرنا جائز نہ ہوگا؛ لیکن اگر آسانی کے ساتھ بینک سے صحیح کرنسی حاصل نہیں کی جاسکتی ہے؛ بلکہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے تو گویا کہ علاقہ میں اس کی حیثیت عرفیہ گھٹ گئی ہے اور چونکہ یہ ثمن عرفی ہے، اس کی ثمنیت کا مدار عرف پر ہے، تو جس قدر اس کی حیثیت گھٹ جائے گی اسی قدر کم پیسے میں اس کو فروخت کرنا جائز ہوگا، مگر اس میں شرط یہ ہے کہ معاملہ اور لین دین دست بدست ہو؛ اس لئے کہ اس کی حیثیت عرفیہ گھٹ جانے کی وجہ سے اگرچہ مختلف القدر ہوگیا ہے؛ لیکن فی الجملہ کسی حد تک یعنی سرکاری سطح پر ثمنیت باقی ہونے کی وجہ سے اتحاد جنسیت باقی ہے۔ (ایضاح النوادر ۱/۱۲۲)

فلا يجوز مبادلة الأوراق النقدية بجنسها متفاضلة، ويجوز إذا كانت متماثلة، والمماثلة ههنا أيضا تكون بالقيمة لا بالعدد، كما في الفلوس، فيجوز أن يباع ورق نقدي قيمته عشر روبيات، بعشرة أوراق قيمة كل واحد روبية واحدة، ولا يجوز أن يباع الأول بأحد عشر ورقا من الثانية.

(تكمله فتح الملهم، كتاب البيوع، باب الصرف، وبيع الذهب بالورق نقدا، أشرفيه ديوبند ۱/ ۵۹۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ر ذیقعدہ ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۱۹۶)

۹۵ر روپئے ریزگاری کا سو روپئے سے تبادلہ کرنا

سوال [۸۸۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عام طور سے ہوٹل یا دوکان والوں کو ریزگاری اور کھلے ہوئے روپیوں اور سکوں کی ضرورت ہوتی ہے؛ اس لئے وہ نوٹ کا ریزگاری سے تبادلہ کرتے ہیں؛ لیکن کمی زیادتی کے ساتھ مثلاً سو کا نوٹ دیا، تو ریزگاری والا صرف ۹۰ر روپئے یا ۹۵ر روپئے

بمشکل ریزگاری دے گا، کیا اس طریقہ سے زرمبادلہ کمی بیشی کے ساتھ درست ہے؟ علت ربوا کا تحقق ہے یا نہیں؟

المستفتی: ابواسامہ قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوروپئے کا نوٹ دے کر ۹۰ یا ۹۵/روپئے کی ریزگاری دینے میں صراحتاً سود کا تحقق ہوتا ہے؛ اس لئے کمی بیشی کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کرنا حرام وناجائز ہے۔ (مستفاد: عزیز الفتاوی، ص: ۶۴۴)

ومن أعطى صيرفيا درهما، وقال: أعطني بنصفه فلوسا وبنصفه نصفا إلا حبة جاز البيع في الفلوس، وبطل فيما بقي عندهما، وعلى قياس قول أبي حنيفة –رحمه الله– بطل في الكل. (هداية، كتاب الصرف، أشرفي ٣/ ١١٠، البناية، أشرفيه ٨/ ٤١٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۸۱۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۱۹/۶/۱۱ھ

۹/ باب السلم

بیع سلم کی تعریف اور شرائط

سوال [۸۸۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ''بیع سلم'' کیا ہے؟ اس کی شرطیں تحریر فرمادیں، نیز یہ شرط کہ مسلم فیہ موجود ہو اس سے کیا مراد ہے؟ کہاں موجود ہونا ضروری ہے، مجلس عقد میں یا بائع کے پاس گھر میں یا بازار میں؟

المستفتی: محمد انوار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اصطلاح فقہ میں بیع سلم اس کو کہا جاتا ہے کہ پہلے روپے دے کر غلہ کا نرخ معین کر کے ٹھہرالیا جائے۔

وشرعا بيع آجل، وهو المسلم فيه بعاجل وهو رأس المال. (شامي، كتاب البيوع، باب السلم، كراچی ٥/ ٢٠٩، زكريا ٧/ ٤٥٤)

بیع سلم کے صحیح ہونے کے لئے مندرجہ ذیل شرائط کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

(۱) غلہ کی جنس بیان کردی جائے کہ گیہوں ہے یا جو۔

(۲) نوع بیان کردی جائے کہ غلہ کس قسم کی زمین کا ہوگا۔

(۳) صفت بیان کردی جائے کہ عمدہ ہوگا یا گھٹیا۔

(۴) مقدار بیان کردی جائے کہ کتنا غلہ لینا ہے۔

(۵) مدت معین کرلی جائے۔

(۶) جس قدر غلہ لینا ہو اس کی پوری قیمت کا روپیہ جو ان کے باہمی طے شدہ نرخ سے متعین ہوتا ہے، پہلے ہی یعنی بوقت عقد دے دیا جائے۔

(۷) غلہ کس جگہ پر حوالہ کیا جائے گا اس کو بھی معین کرلیا جائے۔ اور جس قسم کے غلہ کی بات

چیت ہوتی ہے، اس کو ’’مسلم فیہ‘‘ کہتے ہیں، اس کا مارکیٹ میں یا علاقہ میں پوری مدت کے زمانہ میں کہیں نہ کہیں دستیاب ہونا ضروری ہے۔

ولا يصح السلم عند أبي حنيفة إلا بسبع شرائط: جنس معلوم، كقولنا: حنطة، أو شعير، ونوع معلوم، كقولنا سقية أو نجسية، وصفة معلومة، كقولنا: جيد أو ردي، ومقدار معلوم، كقولنا: كذا كيلا بمكيال معروف، أو كذا وزنا وأجل معلوم، ومعرفة مقدار رأس المال إذا كان يتعلق العقد على مقداره كالمكيل والموزون والمعدود، وتسمية المكان الذي يوفيه فيه إذا كان له حمل ومؤنة. (هداية، باب السلم، أشرفی دیوبند ۳/ ۹۵، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ۱/ ۲٦٦، دارالكتاب ديوبند ۱/ ۲٥۹، درمختار كراچی ٥/ ۲۱٤، تا ۲۱٦، زكريا ديوبند /۷/ ٤٦۱ تا ٤٦٤)

ولا يجوز السلم حتى يكون المسلم فيه موجودا من حين العقد إلى حين المحل. (هداية، أشرفی ديوبند ۳/ ۹۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۵/۶/۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۴۲۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۶/۲۵ھ

پیشگی رقم لے کر مبیع بعد میں دینا

سوال [۸۸۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مسلمان کا دوسرے کو فصل سے پیشگی رقم دینا اس شرط کے ساتھ کہ بھاؤ بازار کا فصل آنے پر کچھ بھی ہو، مگر اس وقت جو بھاؤ مقرر ہورہا ہے اسی بھاؤ میں جنس کو دینا ہوگا، کیا اس طرح سے خریداری کرنا شرعاً صحیح ہے؟ اور جانبین کے بارے میں کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد یعقوب علی موضع چوہا نگلہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر عقد مجلس میں رقم پر قبضہ ہو چکا ہے اور فصل میں غلہ دینے کے لئے بات طے ہو گئی ہے کہ وہ کس قسم کا غلہ ہوگا اس کی صفت ومقدار وغیرہ بیان کردی ہے اور فی الحال آپس میں بھاؤ بھی مقرر کرلیا ہے، تو یہ شرعاً بیع سلم ہے، جو کہ جائز ہے، اس میں کسی قسم کی قباحت نہیں ہے۔

ولا يصح السلم عند أبي حنيفة إلا بسبع شرائط: جنس معلوم، كقولنا: حنطة، أو شعير، ونوع معلوم، كقولنا سقية أو نجسية، وصفة معلومة، كقولنا: جيد أو ردي، ومقدار معلوم، كقولنا: كذا كيلا بمكيال معروف، أو كذا وزنا وأجل معلوم، ومعرفة مقدار رأس المال إذا كان يتعلق العقد على مقدار كالمكيل والموزون والمعدود، وتسمية المكان الذي يوفيه فيه إذا كان له حمل ومؤنة. (هداية، باب السلم، أشرفى ديوبند ٣/ ٩٥، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ١/ ٢٦٦، دارالكتاب ديوبند ١/ ٢٥٩، درمختار كراچى ٥/ ٢١٤، تا ٢١٦، زكريا ديوبند / ٧/ ٤٦١ تا ٤٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ ؍ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۱۷۵)

پیشگی رقم لے کر مبیع کو فروخت کرنے کی چار شکلوں کا حکم

سوال [۸۸۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عوام الناس میں یہ طریقہ رائج ہے کہ کسان تجار سے پیشگی رقم لے کر اپنی کھیتی باڑی کے کام میں صرف کرتے ہیں اور تجار سے ایک نرخ مقرر کر لیتے ہیں کہ بازار میں جو بھاؤ ہو مگر ہم تم کو ۵۰۰؍ روپئے کوئٹل گندم دیں گے، یا بازاری نرخ سے سو روپئے کم میں گندم دیں گے،

گندم کی نوع وجنس مقام سب کچھ مقرر ہو جاتا ہے، اس طرح پیشگی رقم دے کر کم نرخ میں کیل گندم دینا یا بھٹے والے طے کر لیتے ہیں کہ رقم پیشگی دے دو، جب بھٹہ کی نکاسی ہوگی تو پیشگی رقم دینے والے کو ۲۰۰؍ فی ہزار کم اینٹ دی جائے گی، یا بھینس والے دودھ کے خریدار سے پیشگی رقم لے لیں کہ جب بھینس بیائے گی تو تم کو دودھ عام قیمت سے دو روپئے کم فی کیلو دیا جائے گا، یہ شکلیں جواز کی ہیں یا نہیں؟

المستفتی: حاجی ضمیر احمد شیر کوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: (۱) سوال میں چار شکلیں ذکر کی گئی ہیں: (۱) کسان سے پانچ سو روپئے فی کوئنٹل پر بات متعین ہوگئی ہے، یہ شکل بیع سلم کے دائرہ میں داخل ہو کر جائز ہوگئی۔

(۲) فصل کے زمانہ میں فصل کا جو بھی بھاؤ ہوگا اس سے سو روپئے کم میں دیا جائے گا، یہ شکل غلہ کی قیمت صحیح طور پر متعین نہ ہونے کی وجہ سے جائز نہ ہوگی۔

(۳) بھٹہ کی نکاسی کے وقت میں ایک ہزار اینٹ دوسو روپئے فی ہزار کم کی شرط بھی جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ نکاسی کے وقت میں ایک ہزار اینٹ کی قیمت کتنی ہوگی یہ اس معاملہ کے وقت متعین نہیں ہے، ہاں البتہ اگر یوں معاملہ کیا جاتا کہ بھٹہ کی نکاسی کے وقت میں بارہ سو اینٹ کی قیمت کا جو اندازہ ہوسکتا ہے اس اندازہ سے کم کر کے ایک ہزار اینٹ کی قیمت اسی وقت متعین کر لی جائے تب جائز ہوسکتا ہے۔

(۴) یہ شکل بھی دودھ کی قیمت صحیح طور پر متعین نہ ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ دودھ لینے کے زمانہ میں عام قیمت کیا ہوگی وہ آج معلوم نہیں ہے۔

وجملة الشروط جمعوها في قولهم إعلام رأس المال، وتعجيله، وإعلام المسلم فيه، وتأجيله، وبيان مكان الإيفاء والقدرة على تحصيله، فإن أسلم مائتي درهم في كرّ حنطة مائة منها دين على المسلم إليه ومائة

نقد، فالسلم في حصة الدين باطل لفوات القبض، ويجوز في حصة النقد لاستجماع شرائطه. الخ (هداية، كتاب البيوع، باب السلم، أشرفي ديوبند ۳/ ۹۷، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۱٤٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍رجب ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۸۴۷)

مال کے لئے آرڈر دے کر نہ لینے کا حکم

سوال [۸۸۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ضروری گزارش یہ ہے کہ ایک شخص ثمین یورپ کے کسی ملک میں رہتا ہے، دوسرا شخص ہندوستانی ہے ثمین نے ہم سے پانچ لاکھ روپئے کا سامان تیار کرنے کے لئے کہا اور ایک لاکھ روپئے نقد دیئے، ہم نے آرڈر لے لیا اور ایک لاکھ روپئے بھی لے لئے، ہم نے ہندوستان میں مال تیار کروالیا، اب ہم نے مال کی تیاری کے بعد ثمین سے کہا کہ اپنا مال منگوا لیجئے مال تیار ہے، مال کی تیاری کے بعد ثمین کہتا ہے کہ کسی مجبوری میں مال نہیں لوں گا، میرا ایک لاکھ روپئے واپس بھیج دیجئے، ادھر ہم ایک لاکھ سے زائد رقم لگا کر تقریباً پانچ لاکھ کا مال تیار کروا چکے ہیں، ایسے میں دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ہم ثمین کو وہ ایک لاکھ روپئے کی رقم واپس کرنے کے مکلّف ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر ہم تو اس سے زائد رقم مال کی تیاری میں خرچ کر چکے ہیں، اس نقصان کی تلافی کا کون ذمہ دار ہوگا؟ اور کیا صورت ہوگی؟ اور اگر واپسی کے مکلّف نہیں ہیں تب پھر مال مصنوع کا کون مالک ہوگا؟ اگر ہم ہی مالک ہے تو کیا اس کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کا اختیار ہے؟ تشفی بخش جواب مطلوب ہے۔

المستفتی: مظاہر حسین، مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب پانچ لاکھ کا مال تیار کرنے کے لئے پیشگی ایک لاکھ

روپئے دے کر آرڈر فائنل کر دیا ہے اور اسی کے مطابق ہندوستان میں مال تیار کروا لیا ہے، اس کے بعد یورپ والا شخص مال لینے سے معذرت خواہی کر رہا ہے، تو ایسی صورت میں تیار شدہ مال نہ بھیجنے سے تیار کرنے والے کا بڑا نقصان ہوسکتا ہے؛ اس لئے اس کو یہ حق ہے کہ یورپ والے شخص کو مال لینے پر مجبور کرے۔ اور اگر وہ لینے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہے، تو وصول شدہ ایک لاکھ روپئے میں سے نقصان کے بقدر تلافی نقصان کے لئے لے سکتا ہے۔ اور بقیہ روپئے واپس کر دینا ضروری ہوگا۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ زکریا ۳/۱۴۱)

لا خيار لهما أما الصانع فلما ذكرنا أولا، وأما المستصنع فلأن الصانع أتلف ماله بقطع الصرم وغيره ليصل إلى بدله، فلو ثبت له الخيار تضرر الصانع؛ لأن غيره لا يشتريه بمثله، ألا ترى! أن الواعظ إذا استصنع منبرا ولم يأخذه فالعامي لا يشتريه أصلا. (عناية مع الفتح، باب السلم قبيل مسائل نشوره، كوئٹه ٦/ ٢٤٤، زكريا ديوبند ٧/ ١٠٩)

إذا أتى الصانع بالمستصنع على الصفة المشروطة روي عن أبي يوسف إنه لازم في حقهما حتى لا خيار لأحدهما لا للصانع ولا للمستصنع أيضا، إن في إثبات الخيار للمستصنع إضرارا بالصانع؛ لأنه قد أفسد متاعه، وأتى بالمستصنع على الصفة المشروطة، فلو ثبت له الخيار لتضرر به الصانع فيلزم دفعا للضرر عنه. (بدائع الصنائع، باب حكم الاستصناع، زكريا ديوبند ٤/ ٤٤٤)

عن أبي يوسف أنه لا خيار لواحد منهما، أما الصانع فلما ذكرنا، وأما المستصنع فلأن في إثبات الخيار له إضرارا بالصانع فربما لا يرغب فيه غيره. (تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٤/ ١٢٤، زكريا ديوبند ٤/ ٥٢٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ ذیقعدہ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۳۹۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۱۱/۱۴۲۲ھ

تاریخ اور کھیت متعین کئے بغیر فصل سے پہلے گیہوں خریدنا

سوال [۸۸۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عبدالرحیم نے فصل سے پہلے سو روپئے کوئنٹل گیہوں کے لئے روپئے پہلے ہی ادا کردئے، تاریخ کوئی مقرر نہیں کی کہ کب تک گیہوں لینا ہے اور کس کھیت کا گیہوں لینا ہے، صرف گیہوں طے کئے، اس طرح پہلے روپئے دے کر اور بھاؤ بازار سے کم شرح پر گیہوں طے کرنا عبدالرحیم کے لئے جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: یہ بیع سلم کی صورت ہے اور بیع سلم کے جواز کے لئے چند شرطیں لازم ہیں جن کے بغیر صحیح نہیں ہوسکتی:

(۱) جس چیز کی بیع کی جارہی ہے اس کی جنس معلوم ہونا (۲) اس کی قسم معلوم ہونا (۳) اس کی صفت معلوم ہونا (۴) اس کی مقدار معلوم ہونا (۵) ادائے گی کی مدت معلوم ہونا (۶) نرخ معلوم ہونا (۷) ادائے گی کی جگہ معلوم ہونا۔ صورت مذکورہ میں شرط نمبر: ۲، ۳، ۵، ۷/ مفقود ہیں؛ اس لئے ناجائز ہے۔

وشرطه بيان الجنس، والنوع، والصفة، والقدر، والأجل، وأقله شهر، وقدر رأس المال في المكيل والموزون والمعدود، ومكان الإيفاء فيما له حمل من الأشياء. (كنز الدقائق مع البحر، كتاب البيوع، باب السلم، كوئٹه ٦/ ١٦٠، زكريا ٦/ ٢٦٥، درمختار كراچى ٥/ ٢١٤-٢١٦، زكريا ديوبند ٧/ ٤٦١-٤٦٤، الفقه على المذاهب الأربعة، دارالفكر بيروت ٢/ ٣٠٤، بدائع الصنائع، كراچى ٥/ ٢٠٧، زكريا ديوبند ٤/ ٤٤٠، هداية أشرفي ديوبند ٣/ ٩٥)

لہٰذا دوبارہ شرائط مذکورہ کے مطابق عقد کرنا لازم ہوگا یا فسخ کردیں۔ فقط واللہ سبحانہ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۵۸۶)

فصل کاٹنے سے پہلے کاشتکار کو روپئے دینے کا حکم

سوال [۸۸۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فصل کاٹنے سے پہلے ایک امام کا کاشتکاروں کو اس شرط پر روپئے دینا اور یہ کہنا کہ بازاری ریٹ جو بھی نکلے اس سے ہمیں کوئی مقصد نہیں ہے، بازاری ریٹ سے پچاس روپئے کم میں مال لوں گا، اگر اس طرح کوئی امام تجارت کرے تو اس امام کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

المستفتی: ابودرداء، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: یہ بیع سلم ہے، جس کے شرائط میں یہ ہے کہ معاملہ طے کرتے وقت بھاؤ متعین کرلیا جائے اور مذکورہ صورت میں بھاؤ متعین نہیں ہوا ہے، جس کی وجہ سے قیمت مجہول ہوگئی ہے؛ لہٰذا قیمت مجہول ہونے کی وجہ سے یہ معاملہ ناجائز ہے، ممکن ہے امام صاحب نے ایسا معاملہ عدم علم کی وجہ سے کیا ہو ان کو بتا دیا جائے کہ معاملہ کے وقت بھاؤ متعین کرلینا اور آپس کی رضامندی سے جو بھی ریٹ متعین ہو جائے اس کے مطابق عمل کرنا جائز ہے، چاہے بازاری بھاؤ سے بہت ہی کم کیوں نہ ہو۔ اور امام صاحب اگر سابقہ معاملہ سے باز آجائیں اور آئندہ ایسا معاملہ نہ کریں، تو ان کے پیچھے نماز بلا کراہت جائز اور درست ہوگی۔ (فتاوی محمودیہ ۶/ ۲۸۱، جدید ڈابھیل ۱۶/ ۲۰۴، ایضاح النوادر ۱/ ۲۲)

ولا يصح السلم عند أبي حنيفة إلا بسبع شرائط (إلى قوله) ومعرفة رأس المال. (هداية، كتاب البيوع، باب السلم أشرفي ديوبند ۳/ ۹۵، كنز الدقائق مع البحر كوئٹه ٦/ ١٦٠، زكريا ٦/ ٢٦٥، درمختار كراچى ٥/ ٢١٤-٢١٦، زكريا ٧/ ٤٦١-٤٦٤، الفقه على مذاهب الأربعة، دارالفكر بيروت ٢/ ٣٠٤، بدائع الصنائع، كراچى ٥/ ٢٠٧، زكريا ٤/ ٤٤٠)

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۸۰۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲/ ۵/ ۱۴۱۷ھ

فصل کی کٹائی سے پہلے سو روپے کوئنٹل گیہوں خریدنا

سوال [۸۸۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عبداللہ صاحب فصل سے پہلے لوگوں کو سو روپے کوئنٹل گیہوں یا دھان پر پیسے دیتے ہیں، یعنی ایک مہینے پہلے پیسے دیتے ہیں اور فصل میں اناج وصول کرتے ہیں، یہ پیسے دینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالمجید ہدایت پور، ضلع بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: یہ شرعاً بیع سلم ہے، جو شرعاً جائز ہے۔

فالسلم عقد يثبت به الملك في الثمن عاجلا، وفي المثمن آجلا.

(عالمگیري، کتاب البیوع، الباب الثامن عشر في السلم، زکریا قدیم ۳/ ۱۷۸، جدید ۳/ ۱۷۱)

وقوله: وأما بيان حكم السلم فهو ثبوت الملك لرب السلم في المسلم فيه مؤجلا بمقابلة ثبوت الملك في رأس المال المعين، أو الموصوف معجلا للمسلم إليه. (فتاوی عالمگیري، زکریا قدیم ۳/ ۱۸۱، جدید ۳/ ۱۷۳، درمختار کراچی ۵/ ۲۰۹، زکریا ۷/ ۴۵۵)

اس میں یہ لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ ایک کوئنٹل گیہوں کس قسم کا ہے؟ کب ادا کرے گا؟ بوقت معاملہ عادل کے سامنے تحریر بھی کر لینا چاہئے، تاکہ بعد میں کوئی اختلاف نہ پیدا ہو۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ رصفر ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۵۴۲/۲۳)

بیع سلم میں مسلم فیہ کی مقدار کا متعین نہ ہونے کا حکم

سوال [۸۸۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: خریدار نے کسان سے پیشگی رقم اس شرط پر لی یا دی کہ فصل کے موقع پر جو بھی بازار کا بھاؤ ہوگا، اس سے کچھ کم پر لوں گا، تو کیا یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: نصیر احمد قاسمی بھاگلپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس میں مسلم فیہ کی مقدار متعین نہ ہونے کی وجہ سے بیع جائز نہ ہوگی۔

وشروطه: أي شروط صحته التي تذكر في العقد سبعة: بيان جنس، ونوع، وصفة، وقدر -إلى- وبيان قدر رأس المال. (تنوير الأبصار مع الدر المختار، كتاب البيوع، باب السلم، كراچی ٥/ ٢١٤-٢١٥، زكريا ٧/ ٤٦١، ٤٦٢، هداية أشرفي ديوبند ٣/ ٩٥، هندية، زكريا قديم ٣/ ١٧٩، جديد ٣/ ١٧٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ ر صفر المظفر ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۴۴/۲۴)

بیع سلم کی ایک صورت

سوال [۸۸۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فصل آنے سے پہلے ایک شخص ۱۵۰ ر روپئے فی کوئنٹل کے حساب سے کسی مجبور انسان کو اس شرط پر دیتا ہے کہ جب فصل آئے تو مجھ کو غلہ دے دینا، جب کہ فصل میں سرکاری ریٹ

۲۲۰/دوسوبیس روپئے فی کوئنٹل پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے، تو کیا اس طرح پیشگی روپئے دے کر معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ فقط

المستفتی: نسیم احمد، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ شرعاً بیع سلم میں داخل ہے اور بیع سلم کا مطلب یہی ہے کہ پیسہ والا مالدار شخص پیسوں سے مجبور شخص کو اس شرط پر پیسہ دے دے کہ فصل پر طے شدہ معاہدہ کے مطابق غلہ حاصل کرے، چاہے طے شدہ معاہدہ میں غلہ کی قیمت فصل کے بھاؤ کے بنسبت بہت کم کیوں نہ ہو اور اس طرح معاہدہ اور معاملہ کرنا قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: قدم رسول الله ﷺ المدينة وهم يسلفون بالثمر السنتين والثلاث، فقال رسول الله ﷺ: من أسلف في شيء ففي كيل معلوم، ووزن معلوم إلى أجل معلوم. (صحيح البخاري، كتاب السلم ۱/ ۲۹۹، رقم: ۲۱۸۸، ف: ۲۲۴۰، صحيح مسلم، كتاب المساقاة، باب السلم، النسخة الهندية ۲/ ۳۱، بيت الأفكار، رقم: ۱۶۰۴)

السلم عقد مشروع بالكتاب وهو آية المداينة ...... قوله عليه السلام: من أسلم منكم فليسلم في كيل معلوم، ووزن معلوم إلى أجل معلوم. (هداية، كتاب البيوع، باب السلم، اشرفی ديوبند ۳/ ۹۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ربیع الاول ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/۲۱۷۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۱/۳/۲۷ھ

بیع سلم کی ایک جائز صورت

سوال [۸۸۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: ہماری طرف عام طور سے لوگ پیشگی رقم اس شرط پر لیتے ہیں، مثلاً دھان کا موسم ہے تو پیشگی رقم لے لی اور یہ طے کرلیا کہ اس وقت آپ کو ساٹھ ستر روپئے من دھان دوں گا۔

المستفتی: نصیر احمد قاسمی، بھاگلپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر معاملہ اس طرح پر کیا جاتا ہے کہ مثلاً ساٹھ روپئے اس وقت وصول کرلئے جائیں اور ایک یا دو ماہ کے بعد فصل کے موقع پر ایک من دھان دیا جائے گا تو یہ شرعاً بیع سلم ہے اور جائز ہے۔

ولا يصح السلم عند أبي حنيفة إلا بسبع شرائط: جنس معلوم، كقولنا: حنطة، أو شعير، ونوع معلوم، كقولنا سقية أو نجسة، وصفة معلومة، كقولنا: جيد أو ردي، ومقدار معلوم، كقولنا: كذا كيلا بمكيال معروف. الخ (هداية، كتاب البيوع، باب السلم، أشرفی ديوبند ٣/ ٩٥، كنز الدقائق مع البحر، كوئٹه ٦/ ١٦٠، زكريا ٦/ ٢٦٥، درمختار كراچی ٥/ ٢١٤، زكريا ديوبند / ٧/ ٤٦١، بدائع الصنائع، كراچی ٥/ ٢٠٧، زكريا ديوبند ٤/ ٤٤٠)

وفي الهندية: الرابع: أن يكون معلوم القدر بالكيل أو الوزن. (فتاوى عالمگيري زكريا قديم ٣/ ١٧٩، جديد ٣/ ١٧٢) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۲۹ ؍صفر ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۱۱۴۴)

بیع سلم کا مشہور معاملہ

سوال [۸۸۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک کاشتکار ہے، اسے کچھ روپیوں کی ضرورت ہے، اس نے ایک تاجر سے معاملہ کیا کہ وہ اسے پانچ ہزار روپئے دے دے غلہ کی فصل آنے پر وہ اسے پانچ کوئنٹل غلہ دے دے گا،

چاہے اس وقت غلہ کا بھاؤ کچھ بھی ہو، تو کیا اس طرح کا معاملہ کرنا شرعاً درست ہے؟

المستفتی: رکن الدین پاکبڑہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سوال نامہ میں ذکرکردہ معاملہ بیع سلم کا معاملہ ہے۔ اور اس طرح رقم دے کر وقت مقررہ پر متعین مقدار غلہ لینا شرعاً جائز اور درست ہے، غلہ کی وصولیابی کے دن اس کی موجودہ قیمت کا کوئی اعتبار نہیں۔

أخرج البخاري عن ابن عباس –رضي الله عنه– حديثا طويلا طرفه هذا: من سلف في تمر فليسلف في كيل معلوم، ووزن معلوم. (الحديث) وأخرج أيضا تعليقا عن ابن عمر –رضي الله عنه– قال: لا بأس بالطعام الموصوف بسعر معلوم إلى أجل معلوم. (بخاري، كتاب السلم، باب السلم في كيل معلوم ١/ ٢٩٨، رقم: ٢١٨٧، ف: ٢٢٣٩، باب السلم إلى أجل معلوم ١/ ٣٠٠، رقم الباب: ٧، صحيح مسلم، كتاب المساقاة، باب السلم، النسخة الهندية ٢/ ٣١، بيت الأفكار، رقم: ١٦٠٤)

بيع السلم: هو شرعاً بيع أجل، وهو المسلم فيه بعاجل وهو رأس المال. (شامي، كتاب البيوع، باب السلم، كراچى ٥/ ٢٠٩، زكريا ٧/ ٤٥٤، هندية، زكريا قديم ١٧٨، جديد ٣/ ١٧١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۴ رربیع الثانی ۱۴۳۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۹۹۰/۳۸)	۱۴۳۱/۴/۶ھ

قیمت کی ادائے گی کے چھ ماہ بعد مال وصول کرنا

سوال [۸۸۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید لوہے کا کاروبار کرتا ہے، خالد نے لوہے کا سریا خریدنے کے لئے تین ہزار روپے

کوئنٹل کے حساب سے پیسے جمع کئے اور سریا کون سی کمپنی کا ہوگا، کتنے سوت کا ہوگا سب باتیں طے ہوگئیں اور چھ مہینے کے بعد لینا طے ہوگیا۔ اور ایک بات یہ طے ہوئی کہ اگر چھ مہینے کے بعد سریے کی قیمت چار ہزار روپئے کوئنٹل بھی ہوگئی تب بھی تین ہزار روپئے کوئنٹل ہی کے حساب سے لین دین ہوگا، اس کے ساتھ زید جو بائع ہے، اس نے خالد سے کہا: اگر چھ مہینے کے بعد سریے کی قیمت تین ہزار سے کم ہوگئی، تو میں آپ سے کم ہی کے پیسے لوں گا، اس پر معاملہ طے ہوگیا، معلوم یہ کرنا ہے، کیا یہ معاملہ بیع وشراء کا درست ہے؟

المستفتی: سعید احمد امام مسجد کاشی واڑی پونہ، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں مذکورہ معاملہ خرید وفروخت کی ایک قسم بیع سلم کا معاملہ ہے اور بیع سلم میں رأس المال یعنی قیمت کا متعین اور حتمی ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اور ذکر کردہ صورت میں فریقین کے درمیان قیمت کی حتمی تعیین نہیں ہوئی؛ بلکہ یہ طے قرار پایا ہے کہ چھ مہینے بعد مال کی سپردگی کے وقت اگر اس کی قیمت مقرر کردہ قیمت سے کم ہوگئی ہو تو خریدار خالد کو اسی کے حساب سے قیمت ادا کرنی ہوگی۔ اور اسی شرط کے ساتھ معاملہ ہوا، بریں بنا یہ معاملہ قیمت کی عدم تعیین اور جہالت کے سبب ناجائز قرار دیا جائے گا؛ البتہ اگر اس طرح کی شرط نہ لگائی ہو بلکہ صرف یہ طے ہوا ہو کہ تین ہزار روپئے فی کوئنٹل ادا کر دیا جائے اور مال کی سپردگی کے وقت اس کی جو کچھ بھی قیمت ہو اس کا اعتبار نہ کیا جائے، تو یہ معاملہ جائز اور درست ہوگا۔

يشترط بيان قدر رأس المال. (كنز الدقائق، كتاب البيوع، باب السلم، درمختار كراچی ٥/ ٢١٥، زكريا ٧/ ٤٦٢، هداية، أشرفي ديوبند ٣/ ٩٥)

شرطه: بيان قدر رأس المال إذا كان العقد يتعلق على مقداره. (تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٤/ ١١٦، زكريا ٤/ ٥١٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۲۲۰)

دھان پر پیسہ دینا

سوال [۸۸۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: دھان پر پیسہ دینا اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ستمبر، اکتوبر کے مہینے میں ہمارے یہاں مزدور لوگ مزدوری نہ ملنے کی وجہ سے مالداروں سے قرض لینے جاتے ہیں، تو وہ کہتے ہیں کہ قرض اس شرط پر دوں گا کہ ابھی پچاس روپئے لے جاؤ دو ماہ بعد جب دھان کی فصل کٹے گی تو ایک من دھان لوں گا، حالانکہ جس وقت روپئے دے رہا ہے اس وقت ایک من دھان کی قیمت ۳۰۰/ روپئے ہے۔ اور جس وقت دھان لے گا اس وقت بھی کم از کم ایک من دھان ۱۵۰/ روپئے کا ہوگا، یعنی قرض کے اس پچاس روپئے کا دھان کی قیمت سے کچھ بھی برابری نہیں ہے؛ لیکن بیچارے غریب لوگ مجبوراً لیتے ہیں، تو کیا یہ معاملہ شرعاً جائز ہے؟ ہمارے علاقہ میں یہ سودی معاملہ مشہور ہے۔

المستفتی: محمد عبداللہ رشیدی جامعہ اشاعت سنیہ رام گنج، مغربی بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ بیع سلم کی شکل ہے کہ مزدور نے مالدار سے پچاس روپئے اس شرط پر لئے کہ دھان کی فصل آنے پر وہ ایک من دھان اس مالدار کو دے گا، تو یہ شرعاً جائز اور درست ہے۔ اور علاقہ والوں کا اس کو سودی معاملہ کہنا شرعی مسئلہ سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

وشرطه: قبض رأس المال قبل أن يتفرقا؛ لأن السلم ينبئ عن أخذ عاجل بآجل، وذلك بالقبض قبل الافتراق. (البحر الرائق، كتاب البيوع، باب السلم، كوئٹه ٦/ ١٦٢، زكريا ٦/ ٢٧١، هداية، أشرفي ديوبند ٣/ ٩٦، درمختار، كراچی ٥/ ٢١٦، زكريا ٧/ ٤٦٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۶۵۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۵/۹ھ

بیع سلم میں روپئے کے عوض دھان لینے کی شرط کا حکم

سوال [۸۸۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) گیہوں کے سلسلہ میں ہم لوگ یہ کاروبار کرتے ہیں کہ ہم نے کسی سے کہا کہ ہمیں پچاس ہزار روپئے دے دو، ہم تمہیں اس کے عوض میں گیہوں دے دیں گے، مثلاً ۵۰۰/ روپئے کے حساب سے ۱۰۰/کوئنٹل گیہوں دیں گے، پھر بعض دفعہ گیہوں کے ریٹ کم زیادہ ہوتے ہیں، تو روپئے لینے والا دیتے وقت گیہوں کی جو قیمت (ریٹ) ہوتے ہیں اسی حساب سے دیتا ہے، تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

(۲) اس مسئلہ میں ایک بات یہ بھی دریافت طلب ہے کہ اگر گیہوں دے تو ۱۰۰/کوئنٹل جو طے ہیں، اتنے ہی دینے پڑیں گے، یا ادائے گی کے وقت جو ریٹ ہوں گے اس کے حساب سے پچاس ہزار روپئے کے گیہوں کم یا زیادہ دے سکتے ہیں؟

(۳) اور اگر روپئے لینے والا گیہوں ادا نہ کرکے صرف ادائے گی کے وقت ریٹ لگا کر ۱۰۰/ کوئنٹل کی رقم ادا کرے جو پچاس ہزار سے کم بھی ہوسکتی ہے، زیادہ بھی ہوسکتی ہے، تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: شرف الدین ہیبت پور، جویا، جے پی نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر روپیوں کا معاملہ کرتے وقت مجلس عقد میں گیہوں وغیرہ کی مقدار نیز ان کا وصف ادائے گی کا مقام بیان کردیا جائے تو یہ معاملہ شرعاً بیع سلم کے دائرہ میں داخل ہوکر جائز ہوتا ہے۔ اور اگر معاملہ کے وقت مذکورہ شرائط واضح نہ ہوں، تو پھر معاملہ درست نہ ہوگا؛ لہٰذا سوال نامہ میں جو شقیں لکھی گئیں ہیں ان میں سے جس شق میں یہ بات مذکور ہے کہ آپ ہم کو پچاس ہزار روپئے دے دو ہم آپ کو سو کوئنٹل گیہوں دیں گے، یہ معاملہ بیع سلم کے دائرہ میں داخل ہوکر جائز ہوگا، ادائے گی کے وقت گیہوں کا بھاؤ کم وزیادہ

کچھ بھی ہو اس کا اعتبار نہیں ہے، سو کوئنٹل ہی ادا کرنے ہوں گے، باقی جو شقیں سوال نامہ میں درج ہیں ان میں سے کوئی بھی شق شرعاً جائز نہیں ہے۔

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: قدم رسول الله ﷺ المدينة وهم يسلفون بالثمر السنتين والثلث، فقال رسول الله ﷺ: من أسلف في شيء ففي كيل معلوم، ووزن معلوم إلى أجل معلوم. (صحيح البخاري، كتاب السلم ۱/ ۲۹۹، رقم: ۲۱۸۸، ف: ۲۲٤۰، صحيح مسلم، كتاب المساقاة، باب السلم، النسخة الهندية ۲/ ۳۱، بيت الأفكار، رقم: ۱٦۰٤، سنن الترمذي، أبواب البيوع، باب ماجاء في السلف في الطعام والتمر، النسخة الهندية ۱/ ۲٤٥، دارالسلام، رقم: ۱۳۱۱)

هو جائز في الميكلات والموزونات لقوله عليه السلام: من أسلم منكم فليسلم في كيل معلوم، ووزن معلوم إلى أجل معلوم. (هداية، كتاب البيوع، باب السلم، أشرفي ديوبند ۳/ ۹۲، درمختار، كراچی ٥/ ۲۰۹، زكريا ۷/ ٤٥٥، البحرالرائق، كوئٹہ ٦/ ۱٥٥، زكريا ٦/ ۲٥۹، مجمع الأنهر، قديم ۲/ ۹۷، جديد دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۱۳۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ / جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۷۹۹)

قرض کی رقم کے عوض میں دھان لینا

سوال [۸۸۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید عمر سے ۳۰۰/ روپئے قرض لینا چاہتا ہے، عمر یہ شرط رکھتا ہے کہ آپ ان ۳۰۰/ کے بدلہ ایک کوئنٹل دھان دے دینا جب کہ قرض کے وقت دونوں فریق کو معلوم ہے کہ دھان کا سرکاری بھاؤ پانچ سو روپئے ہے۔ اور جب دھان ادا کرنے ہوں گے، اس وقت بھی پانچ سو

روپئے کوئنٹل کا بھاؤ ہے، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ اس طرح قرض کے بدلہ ایک کوئنٹل دھان متعین کرنا، جب کہ وہ قرض پر لی ہوئی رقم سے زائد قیمت کے ہیں، تو یہ شریعت کی روشنی میں جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال میں مذکور معاملہ بیع سلم کے دائرہ میں داخل ہوکر اس وقت جائز ہوسکتا ہے جب کہ معاملہ کرتے وقت دھان کا وصف مثلاً باسمتی، ہنسراج، سرجو باون، سرجو ۴۹/ نیز ادائے گی کا مقام وغیرہ بیان کردیا جائے، اگر یہ شرائط عقد کے وقت واضح نہ ہوں، تو پھر یہ معاملہ جائز نہ ہوگا۔

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: قدم رسول الله ﷺ والناس يسلفون، فقال لهم رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أسلف فلا يسلف إلا في كيل معلوم، ووزن معلوم. (صحيح مسلم، كتاب المساقاة، باب السلم، النسخة الهندية ٢/ ٣١، بيت الأفكار، رقم: ١٦٠٤، صحيح البخاري، كتاب السلم ١/ ٢٩٨، رقم: ٢١٨٧، ف: ٢٢٤٠، سنن الترمذي، أبواب البيوع، باب ماجاء في السلف في الطعام والتمر، النسخة الهندية ١/ ٢٤٥، دارالسلام، رقم: ١٣١١)

هو جائز في الميكلات والموزونات لقوله عليه السلام: من أسلم منكم فليسلم في كيل معلوم، ووزن معلوم إلى أجل معلوم. (هداية، كتاب البيوع، باب السلم، أشرفي ديوبند ٣/ ٩٢، درمختار، كراچی ٥/ ٢٠٩، زكريا ٧/ ٤٥٥، البحرالرائق، كوئٹه ٦/ ١٥٥، زكريا ٦/ ٢٥٩، مجمع الأنهر، قديم ٢/ ٩٧، جديد دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١٣٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۷۷۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۶/۱۹ھ

بیع سلم میں روپئے کے عوض دھان لینے کی شرط

سوال [۸۸۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے عمر سے پانچ ہزار روپئے کی رقم طلب کی اور اس کے عوض فصل کا دھان پانچ سو روپئے فی کوئنٹل کے حساب سے دس کوئنٹل دھان دینے پر اپنی رضامندی ظاہر کی، اور اس پر دونوں میں اتفاق ہو گیا، جب کہ ابھی دھان بویا جارہا ہے اور فصل آنے میں تین یا چار ماہ باقی ہیں، اس طرح یہ بیع قرآن وحدیث کی روشنی میں جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد الیاس نگلیا عاقل، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ شرعی طور پر بیع سلم ہے جو جائز اور درست ہے۔

وجملة الشروط جمعوها في قولهم: إعلام رأس المال، وتعجيله، وإعلام المسلم فيه، وتأجيله، وبيان مكان الإيفاء، والقدرة على تحصيله.

(هداية، كتاب البيوع، باب السلم، أشرفي ديوبند ۳/ ۹۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۲۰ ؍ربیع الاول ۱۴۱۹ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۶۸۶)

ادھار معاملہ میں قیمت میں زیادتی اور بیع سلم سے متعلق ایک سوال

سوال [۸۸۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) گیہوں کی قیمت پانچ روپئے ہے، بکر نے زید سے چھ مہینے کے ادھار پر گیہوں خریدے، زید نے بکر کو اس شرط پر گیہوں دیئے کہ آپ کو آٹھ سو روپئے کے دام دینے ہوں گے، یہ معاملہ شریعت کی رو سے جائز ہے یا نہیں؟

(۲) بکر نے زید سے آٹھ سو روپئے کے حساب سے ادھار گیہوں خریدے، زید نے اس شرط پر گیہوں دیئے کہ آپ کو تین سو روپئے کے حساب سے مونجی دینی ہوگی، بکر نے اس شرط کو منظور کرلیا؛ حالاں کہ فصل آنے پر مونجی کا بھاؤ پانچ روپئے کو ہے، تو اس طرح بیع کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: شمس الدین علی پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) مسئولہ صورت میں خرید وفروخت کا اس طرح ادھار معاملہ کرنا جائز ہے؛ اس لئے کہ ادھار کی وجہ سے قیمت میں زیادتی کرنا شرعاً وعرفاً درست ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۸/۴۰، جدید زکریا مطول ۱۱/۱۳۴-۱۳۶، امداد الفتاوی ۳/۲۰، محمودیہ قدیم ۱۳/۳۱۳، جدید ڈابھیل ۱۶/۱۵۱، رحیمیہ قدیم ۹/۲۵۲-۲۵۴، جدید زکریا ۹/۱۹۶)

ألا یری! أنه یزاد في الثمن لأجل الأجل. (هدایة، کتاب البیوع، باب المرابحة والتولیة، اشرفی دیوبند ۳/ ۷٤، البحرالرائق، کوئٹه ٦/ ١١٤، زکریا ٦/ ١٩٠، شامي، زکریا ۷/ ۳٦١، کراچی ٥/ ١٤٢)

(۲) فی نفسہ خرید وفروخت کا سوال میں ذکر کردہ معاملہ فاسد ہے؛ البتہ اگر خرید وفروخت کا معاملہ کرتے وقت تمام گیہوں کی مقدار اور اس کا پیسہ متعین ہوجائے، پھر اس پوری مقدار میں سے تین سو روپئے کے حساب سے فصل میں فی کوئنٹل مونجی وصول کرنے کی بات اسی مجلس میں طے ہوجائے، تو ایسی صورت میں اس کو بدل سلم قرار دے کر بیع سلم کے دائرہ میں داخل کرکے جائز کہا جاسکتا ہے۔

عن ابن عباس -رضي الله عنه- قال: قدم رسول الله ﷺ والناس یسلفون، فقال لهم رسول الله صلی الله علیه وسلم: من أسلف فلا یسلف إلا في کیل معلوم، ووزن معلوم. (صحیح مسلم، کتاب المساقاة والمزارعة، باب السلم، النسخة الهندیة ۲/ ۳۱، بیت الأفکار، رقم: ١٦٠٤)

هو جائز في المیکلات والموزونات لقوله علیه السلام: من أسلم

منكم فليسلم في كيل معلوم، ووزن معلوم إلى أجل معلوم. (هداية، كتاب البيوع، باب السلم، أشرفي ديوبند ٣/ ٩٢، درمختار، كراچی ٥/ ٢٠٩، زكريا ٧/ ٤٥٥، البحر الرائق، كوئٹه ٦/ ١٥٥، زكريا ٦/ ٢٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۶۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۵/۲۰ھ

باغات کی فصل فروخت کرنے کی ایک شکل

سوال [۸۸۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید نے اپنے آم کے باغ کی فصل کو اس شرط پر فروخت کیا کہ قیمت کے علاوہ خریدار زید کو دو کوئنٹل آم ۵/ روپئے فی کلو کے حساب سے دے گا۔

(۲) یا دوسری صورت میں کل قیمت کے علاوہ دو کوئنٹل آم خریدار مالک باغ زید کو دے گا، ان دونوں صورتوں میں کون سی صورت جائز ہے؟ برائے کرم تحریری جواب سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی: محمد اکبر امام علی مسجد شیرکوٹ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: باغات کی فصل فروخت کرنے کی بہت سی شکلیں ہیں، ان میں سے بعض شکلیں جائز ہیں۔ اور بعض شکلیں ناجائز ہیں۔ سوال نامہ میں جس شکل کا ذکر ہے، اگر یہ جواز کی شکل ہے، تو اس میں فصل کی فروختگی کے ساتھ دو کوئنٹل آم پانچ روپئے فی کلو کے حساب سے لینے کی جو بات کہی گئی ہے، اگر یہ معاملہ اس طرح ہوا ہے کہ فصل کی قیمت الگ سے متعین ہو چکی ہے، پھر الگ سے بائع اور مشتری کے درمیان یہ معاملہ طے ہوا ہے کہ مشتری چونکہ باغ والا بن چکا ہے، پانچ روپئے فی کلو کے حساب سے دو کوئنٹل آم مالک باغ کے ہاتھ فروخت کرنے کی بات طے ہوگئی اور آم کی قسم بھی بیان کردی گئی ہے، دیسی ہے،

دسہری ہے، یا چوسہ ہے وغیرہ اور مالک نے دو کوئنٹل آم کی قیمت معاملہ کے وقت نقد ادا کردی ہے اور آم کے بارے میں یہ شرط نہیں لگائی ہے کہ اسی باغ میں سے دینا ہوگا؛ بلکہ کہیں سے بھی دے سکتا ہے، تو ایسی صورت میں دو کوئنٹل آم کا معاملہ بیع سلم کے دائرہ میں داخل ہوکر جائز ہوجائے گا اور جو شرائط اوپر ذکر کی گئی ہیں، اگر یہ شرائط معاملہ میں موجود نہیں ہیں، تو یہ شکل جائز نہ ہوگی۔

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: قدم رسول الله ﷺ والناس يسلفون، فقال لهم رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أسلف فلا يسلف إلا في كيل معلوم، ووزن معلوم. (صحيح مسلم، كتاب المساقاة والمزارعة، باب السلم، النسخة الهندية ٢/ ٣١، بيت الأفكار، رقم: ١٦٠٤)

هو جائز في الميكلات والموزونات لقوله عليه السلام: من أسلم منكم فليسلم في كيل معلوم، ووزن معلوم إلى أجل معلوم. (هداية، كتاب البيوع، باب السلم، أشرفي ديوبند ٣/ ٩٢، البحرالرائق، كوئٹه ٦/ ١٥٥، زكريا ٦/ ٢٥٩)

(۲) یہ صورت اس طرح جائز ہے کہ فصل کی قیمت جو متعین کی گئی ہے۔ اور ساتھ میں مالک کو دو کوئنٹل آم دینے کی شرط لگائی ہے، تو دو کوئنٹل آم جزو ثمن بن جائے گا؛ لہٰذا دو کوئنٹل آم اور وہ قیمت جو فریقین کے درمیان طے ہوتی ہے دونوں مل کر فصل کی قیمت بن گئی ہے؛ اس لئے یہ صورت شرعاً معتبر و جائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۱/ ۲۸۶، جدید ڈابھیل ۱۶/ ۱۰۱)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ربیع الاول ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۵۲۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹؍۳؍۱۴۲۱ھ

١٠/ باب الاستصناع

بیع استصناع

سوال [٨٨٢٤]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) شہر مالیگاؤں میں کپڑوں کے بنکروں اور بیوپاریوں نیز سوت کے بیوپاریوں کے درمیان ایک طریقۂ تجارت رائج ہے، جسے ’’فارورڈ ڈیلیوری‘‘ یعنی مستقبل میں مال فراہم کرنے کا طریقہ، اس طرز تجارت میں ہوتا یہ ہے کہ آج مثلاً ۲۵/ جون کو بنکر اور کپڑے کا بیوپاری دونوں آپس میں مستقبل کی کسی تاریخ پر سودا طے کرتے ہیں، اس طور پر کہ بنکر، بیوپاری کو (مثلاً) کپڑے کی ایک سو گانٹھ فلاں تاریخ تک تیار کرکے دے گا، کپڑے کی کوالیٹی، قیمت اور مقدار وغیرہ سب اسی وقت متعین کرلیا جاتا ہے، مدت بسا اوقات متعین کی جاتی ہے اور بعض مرتبہ طے نہیں کی جاتی، اس صورت میں بیوپاری بنکر کو خام مال نہیں دیتا اور نہ ہی پیشگی (ایڈوانس یا ڈپازٹ کے طور پر) کچھ رقم دیتا ہے؛ بلکہ بنکر کو خود ہی خام مال حاصل کرکے آرڈر کے مطابق تیار مال دینا ہوتا ہے، یہ خام مال بنکر کے پاس کبھی موجود ہوتا ہے اور کبھی موجود نہیں ہوتا، خام مال موجود نہ ہونے کی صورت میں بنکر کو یہ مال بازار سے ’’فارورڈ ڈیلیوری‘‘ ہی کی صورت میں سوت کے بیوپاری سے خریدنا پڑتا ہے اور بیوپاری کے آرڈر کے مطابق بنکر حسب سہولت مال تیار کرکے کئی قسطوں میں دیتا ہے، بیوپاری جب مال وصول کرتا ہے، تو اس کو جانچتا ہے، اگر کپڑے کی کوالیٹی وغیرہ طے شدہ شرائط کے مطابق ہوتی ہیں تو جتنی مقدار میں مال اس کو پہنچتا ہے، اتنے مال کا پیسہ وہ طے شدہ قیمت کے مطابق چیک یا نقد کی صورت میں ادا کردیتا ہے، بیوپاری جس وقت مال وصول کرتا ہے، تو وہ اس موقع پر طے شدہ قیمت کے مطابق ہی اس مال کا پیسہ دیتا ہے، چاہے اس زمانہ میں اس مال کی بازاری قیمت طے شدہ قیمت کی بہ نسبت بہت گھٹ گئی ہو یا بہت بڑھ گئی ہو۔ اس کے برعکس اگر وہ مال آرڈر اور طے

شدہ شرائط کے مطابق نہ ہواوراس میں عیب وغیرہ ہو،تو وہ اس مال کو رد کردیتا ہے، چنانچہ بنکر کو ازسر نو مال تیار کرکے دینا پڑتا ہے،اور جس مال کو بیوپاری نے رد کردیا ہے، اسے بنکر کو مجبوراً کم داموں میں نقصان کے ساتھ بازار میں فروخت کرنا پڑتا ہے۔

(۲) کبھی بازار کا بھاؤ اچھا ہوتو بنکر آرڈر سے زیادہ مال تیار کرتا ہے اور دوسرے بیوپاریوں کو اپنی قیمت میں وہ مال دے کر زیادہ نفع حاصل کرلیتا ہے، اس صورت میں یہ بنکر جس بیوپاری سے مستقبل کی تاریخوں میں سودا کر چکا ہوتا ہے، اس کو یا تو معاہدہ کے مطابق مال دے نہیں پاتا یا اگر دیتا ہے،تو مقررہ مقدار سے کم دیتا ہے۔

(۳) اور کبھی ایسا موقع بھی آتا ہے کہ بیوپاری اپنے آرڈر کے مطابق مال لینے سے انکار کردیتا ہے،یعنی بنکر اس بیوپاری کو جتنی مدت میں مال کی جو مقدار دینے کا پابند ہوتا اس قدر مال تیار ہونے اور مدت پوری ہونے سے پہلے ہی بیوپاری اس معاہدہ کو منسوخ کردیتا ہے، اس صورت میں اگر اس تیار مال کی قیمت بازار میں اچھی ہو یا وہی قیمت ہو جو دونوں کے درمیان طے ہوئی تھی،تو ٹھیک۔اور اگر اس قیمت سے کم میں اسے فروخت کرنا پڑے تو بعض بنکر اس کمی کی تلافی کا مطالبہ (ڈیفرینس کے نام سے) بیوپاری سے کرتا ہے اور بیوپاری کو اس کا ضمان اس تلافی اور ڈیفرینس کے نام پر دینا پڑتا ہے،بعض بنکر اس ڈیفرینس کو چھوڑ بھی دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا تینوں صورتوں میں وضاحت طلب امر یہ ہے کہ:

(۱) یہ کاروبار بیع کی کس قسم سے تعلق رکھتا ہے؟

(۲) اس کاروبار کو ’’استصناع‘‘ کا عنوان دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

(۳) استصناع کے صحیح ہونے کی شرطیں کیا ہیں؟ اور اس کاروبار میں استصناع کی تمام شرطیں پائی جاتی ہیں یا نہیں؟

(۴) استصناع میں جن باتوں کا ہونا ضروری ہے، ان میں سے اگر کوئی ایک شرط نہ پائی جائے تو اس وقت کیا حکم ہوگا؟

(۵) ’’فارورڈ ڈیلیوری‘‘ کے مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق کپڑے اور سوت کی خرید وفروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

(٦) معاہدہ کی مدت میں ایک جگہ بیوپاری سے ملے ہوئے مال کے آرڈر سے زیادہ مقدار میں مال تیار کرنا اوراسے کسی اور بیوپاری کے ہاتھوں زیادہ منافع کے ساتھ فروخت کرنا، تاکہ نفع زیادہ حاصل ہواور جس بیوپاری سے معاہدہ ہے، اس کو معاہدہ کی مدت میں مال نہ دینا یا طے شدہ مقدار سے کم مال دینے کا شرعاً کیا حکم ہے؟ اس طریقہ سے حاصل ہونے والا نفع حلال ہوگا یا حرام؟

(٧) بیوپاری اگر اپنے آرڈر کا پورا مال لینے سے انکار کردے اور مدت پوری ہونے سے پہلے معاہدہ کو توڑ دے، تو پھر وہ مال کم قیمت میں فروخت ہونے کی صورت میں بیوپاری سے اس فرق کی رقم بطور ڈیفرینس لی جاسکتی ہے یا نہیں؟ فقط والسلام— **بینوا بالکتاب والسنة توجروا إن شاء الله تعالیٰ—**

المستفتی: الحاج محمد ایوب، مالیگاؤں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سوال نامہ میں ذکر کردہ طریقۂ تجارت میں بیع استصناع کی شکل معلوم ہوتی ہے۔ اور بیع استصناع کے صحیح ہونے کے لئے مبیع کی جنس ونوعیت اور مقدار وصف کا اس طرح معلوم ہونا شرط ہے کہ مبیع مکمل طور پر متعین ہوجائے؛ لہٰذا سوال میں ذکر کردہ طریقۂ تجارت کے مطابق معاملہ کرنا شرعاً صحیح اور درست ہے۔

إنما جاز الاستصناع فيما للناس فيه تعامل إذا بين وصفا على وجه يحصل التعريف. (هندية، كتاب البيوع، الباب التاسع عشر، مطلب الاستصناع، زكريا قديم ٣/ ٢٠٧، جديد ٣/ ١٩٥)

أما صورة الاستصناع فهي أن يقول إنسان لصانع من خفاف أو صفار أو غيرهما: إعمل لي خفا، أو آنية من أديم، أو نحاس من عندك بثمن كذا، ويبين نوع ما يعمل، وقدره، وصفته، فيقول الصانع: نعم. (بدائع الصنائع، كتاب الاستصناع، كراچی ٥/ ٢، زكريا ديوبند ٤/ ٩٣)

أما شرائط جوازه: فمنها: بيان جنس المصنوع، ونوعه، وقدره، وصفته؛ لأنه لا يصير معلوما بدونه. (بدائع الصنائع، زكريا ديوبند ٤/ ٩٤)

صانع کا مال تیار کر کے مستصنع یعنی بیوپاری کے علاوہ دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا شرعاً درست ہے؛ اس لئے کہ وہ اسی کا مال ہے، وہ اپنا مال کسی کے بھی ہاتھ فروخت کرسکتا ہے؛ لیکن اس نئے آرڈر دینے والے کے ساتھ وعدہ خلافی اور دھوکہ کا معاملہ کیا ہے؛ اس لئے وہ سخت گنہ گار ہوگا۔

عن عبدالله قال: قال رسول الله ﷺ: لا دين لمن لا عهد له، والذي نفس محمد بيده لا يستقيم دين عبد حتى يستقيم لسانه، ولا يستقيم لسانه حتى يستقيم قلبه. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي بيروت ١٠/ ٢٢٧، رقم: ١٠٥٥٣)

فيجبر الصانع على عمله، ولا يرجع الآمر عنه. (الدرالمختار، مطلب في الاستصناع زكريا ٧/ ٤٧٥، كراچی ٥/ ٢٢٤)

وأما بعد الفراغ من العمل قبل أن يراه المستصنع، فكذلک حتى كان للصانع أن يبيعه ممن شاء. (بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٩٤، هندية، زكريا قديم ٣/ ٢٠٨، جديد ٣/ ١٩٥، هداية أشرفي ديوبند ٣/ ١٠١)

(۳) بیوپاری کے لئے مدت پوری ہونے سے پہلے معاملہ کوختم کرنے کا حق ہے اور اس وقت نقصان کی صورت میں کاریگر کے لئے بیوپاری پر کوئی ضمان لازم نہ ہوگا؛ لیکن اس میں کاریگر کونقصان ہورہا ہے اور بیوپاری کی طرف سے وعدہ خلافی اور دھوکہ بھی ہے؛ اس لئے بیوپاری سخت گنہگار ہوگا۔

عن عبدالله قال: قال رسول الله ﷺ: لا دين لمن لا عهد له، والذي نفس محمد بيده لا يستقيم دين عبد حتى يستقيم لسانه، ولا يستقيم لسانه حتى يستقيم قلبه. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي بيروت ١٠/ ٢٢٧، رقم: ١٠٥٥٣)

فيجبر الصانع على عمله، ولا يرجع الآمر عنه. (الدرالمختار، مطلب في الاستصناع زكريا ۷/ ٤٧٥، كراچی ٥/ ٢٢٤)

مذکورہ بالاتحریر میں سوال کے اندر ذکر کردہ تمام شقوں کے جوابات آگئے ہیں؛ اس لئے ہر شق کو الگ الگ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍محرم الحرام ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۸۶۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶؍۱؍۱۴۳۱ھ

عقدِ استصناع کا مدار عرف وتعاملِ ناس پر ہے یا نصوص پر؟

سوال [۸۸۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عقدِ استصناع کا مدار نصوص پر ہے یا عرف وتعامل ناس پر؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: عقدِ استصناع کا مدار عرف اور تعاملِ ناس پر ہے، نصوص پر نہیں ہے؛ بلکہ نصوص سے اصول حاصل کیا گیا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انگوٹھی بنوانے کی حدیث سے اصول مل گیا ہے۔

عن نافع أن عبدالله -رضي الله عنه- حدثه أن النبي صلى الله عليه وسلم اصطنع خاتما من ذهب، وجعل فصه في بطن كفه إذا لبسه، فاصطنع خواتيم من ذهب فرقي المنبر، فحمد الله وأثنى عليه، فقال: إني كنت اصطنعته، وإني لا ألبسه فنبذه، فنبذ الناس، وقال جويرية: ولا أحسبه إلا قال في يده اليمنى. (بخاری شريف ٢/ ٨٧٣، رقم: ٥٦٤٧)

عن أنس بن مالك -رضى الله عنه- قال: اصطنع رسول الله صلى الله عليه وسلم خاتما، فقال: إنا قد اصطنعنا خاتما، ونقشنا فيه نقشا فلا

ينقش أحد عليه. (مسند أحمد ٣/ ١٠١، رقم: ١٢٠١٢، السنن الكبرى للنسائي، دارالكتب العلمية بيروت ٥/ ٤٥٦، رقم: ٩٥٤٥)

ولكنا جوزناه إستحسانا للتعامل الراجع إلى الإجماع العمليّ من لدن رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى اليوم بلا نكير، والتعامل بهذه الصفة أصل مندرج في قوله صلى الله عليه وسلم: لا تجتمع أمتي على ضلالة. (فتح القدير، كتاب البيوع، باب السلم، كوئٹه ٦/ ٢٤٢، زكريا ٧/ ١٠٧)

جاز لأن الناس تعاملوه في سائر الأعصار من غير نكير، فكان إجماعا منهم على الجواز. (بدائع الصنائع زكريا ٤/ ٤٤٤)

أما الاستصناع فبالتعامل ومخصوص مما فيه تعامل. (البحرالرائق، كوئٹه ٦/ ١٧١، مكتبه دارالكتاب ٦/ ٢٨٥)

أما الاستصناع: فللإجماع الثابت بالتعامل من لدن النبي إلى يومنا هذا، وهو من أقوى الحجج. (تبيين الحقائق، زكريا ٤/ ٥٢٦، إمداديه ملتان ٤/ ١٢٣)

وجه الاستحسان الإجماع الثابت بالتعامل، فإن الناس في سائر الأعصار تعارفوا الاستصناع فيما فيه تعامل من غير نكير، والقياس يترك بمثله كدخول الحمام. (عناية مع فتح القدير، مكتبه أشرفيه ٧/ ١٠٨، كوئٹه ٦/ ٢٤٢، الموسوعة الفقهية ٣/ ٣٢٩)

عن أنس بن مالك –رضي الله عنه– قال: اصطنع رسول الله صلى الله عليه وسلم خاتما فقال: إنا قد اصطعنا خاتما ونقشنا فيه نقشا فلا ينقش أحد عليه. (السنن الكبرى للنسائي، دارالكتب العلمية بيروت ٥/ ٤٤٦، رقم: ٩٥٥٤، مسند أحمد ٣/ ١٠١، رقم: ١٢٠١٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/۱۲/۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۳۴۴)

عقدِ استصناع اجارہ ہے یا بیع؟

سوال [٨٨٢٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بیع استصناع بوقت عقد بیع ہے، یا معاہدہ بیع یا اجارہ، قولِ راجح کیا ہے؟ تحریر فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: صحیح اور راجح قول کے مطابق معاملہ استصناع کی حیثیت بیع کی ہے، استصناع معاہدہ بیع یا اجارہ نہیں ہے۔

ثم هو بيع عند عامة مشايخنا، وقال بعضهم: هو عدة وليس بسديد؛ لأن محمد ذكر القياس والاستحسان في جوازه، وذكر القياس والاستحسان لا يليق بالعدات، وكذا ثبت خيار الرؤية للمستصنع وأنه خصائص البيوع. (بدائع الصنائع، كتاب البيوع، حكم الاستصناع، زكريا ديوبند ٤/ ٤٤٤)

واختلفوا فى جوازه هل هو بيع أو عدة؟ والصحيح أنه بيع لا عدة، وهو مذهب عامة مشايخنا، وكان الحاكم الشهيد يقول: هو مواعدة ينعقد العقد بالتعاطي، وجه العامة: أنه سماه في الكتاب بيعا، وأثبت فيه خيار الرؤية. (عناية مع فتح القدير، أشرفيه ديوبند ٧/ ١٠٨، كوئٹه ٦/ ٢)

صح الاستصناع بيعا لاعدة على الصحيح. (شامي، زكريا ٧/ ٤٧٥، كراچی ٥/ ٢٢٤)

اختلف المشايخ فيه، فقال بعضهم: هو مواعدة وليس ببيع، وقال بعضهم: هو بيع لكن للمشتري فيه خيار، وهو الصحيح. (الموسوعة الفقهية بيروت ٣/ ٣٢٦)

والصحيح الراجح في المذهب الحنفي: أن الاستصناع بيع للعين المصنوعة لا لعمل الصانع فهو ليس وعدا ببيع ولا إجارة على العمل. (الفقه

الإسلامي وأدلته، هدی انٹرنیشنل دیوبند ٤/ ٣٩٢، تاتارخانية زكريا ٩/ ٤٠٠، رقم: ١٣٧١٧، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٤/ ١٢٣، زكريا ديوبند ٤/ ٥٢٧، مجمع الأنهر، فقيه الأمت ٣/ ١٥٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/۱۲/۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۲۵)

کئی واسطوں سے معاملہ استصناع

سوال [۸۸۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ معاملۂ استصناع میں مستصنع (مشتری) نے براہ راست صانع (بائع) کوآرڈر نہیں دیا؛ بلکہ درمیان میں کئی واسطے ہیں، مثلاً مرادآباد میں یہ معاملہ بہت زیادہ ہوتا ہے کہ ایکسپورٹر نے بایر سے آرڈر لیا، پھر داخلی لوگوں کو مال بنانے کا آرڈر دیا اور جس کارخانہ دار کوآرڈر دیا اس نے اپنے بعد کے لوگوں کوآرڈر دیا، درحقیقت صانع کم ازکم دوسرے یا تیسرے نمبر پر ہوتا ہے اوراس صانع سے اس کے خریدار نے لیا، اس سے ایکسپورٹر نے اوراس نے لے کر باہر کے بایرکودیا، تو یہ کئی واسطوں سے عقد استصناع جائز ہے یانہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: معاملۂ استصناع میں مستصنع اور صانع کے درمیان اگر کئی واسطے ہوں تب بھی استصناع صحیح اور درست ہوجاتا ہے؛ کیوں کہ صحت استصناع کا مدار عرف وعادت پر ہے۔ اور بالواسطہ استصناع کا عرف عام ہے؛ لہٰذا مرادآباد میں جو عقد استصناع کی شکل رائج ہے، وہ بلاشبہ جائز اور درست ہے۔

الثابت بالعرف كالثابت بالنص. (رسم الفتي ١٧٦)

استعمال الناس حجة يجب العمل بها. (شرح المجلة رستم باز مكتبة اتحاد ديو بند ١/ ٣٥، المادة: ٣٧)

العادة تجعل حكما إذا لم يوجد التصريح بخلافه. (الفوائد البهية ١٩٣)

العادة محكمة. (شرح المجلة، اتحاد ١/ ٣٤، المادة: ٣٦)

يجوز فيما فيه تعامل لافيما لا تعامل فيه. (عناية مع فتح القدير، أشرفيه ٧/ ١٠٨، كوئٹه ٦/ ٢٤٣)

للاستصناع شروط هي: أن يكون مما جرى فيه التعامل بين الناس. (الموسوعة الفقهية ٣/ ٣٢٨، بيروت) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ ۱۲/ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۲۶)

باہر کے بایر سے آرڈر لینے والے ایکسپورٹر کو صانع کہا جائے یا مستصنع ؟

سوال [۸۸۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے باہر کے بایر سے آرڈر لیا جس میں اس نے یہ وعدہ کیا کہ ۳/ ماہ کے اندر اندر مال بنوا کر پیش کردوں گا، پھر زید نے کارخانہ دار بکر کو آرڈر دیا کہ اس نمونہ کا بنا کر کے دینا ہے اور بکر نے اپنی لیور کے ذریعہ اس کا مال بنا کر دیا، تو ایسی صورت میں بایر بہر حال مستصنع ہے اور بکر جس نے مال بنا کر دیا ہے وہ صانع ہے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ زید کیا ہے، کیا زید کو صانع کہا جائے گا یا مستصنع کہا جائے گا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید جس نے بایر سے آرڈر لیا اور کارخانہ دار بکر کو آرڈر دیا، اس کو من وجہ (مشتری) مستصنع اور من وجہ (بائع) صانع دونوں کہا جائے گا؛ اس لئے کہ یہ بایر کے لئے صانع ہے اور کارخانہ دار بکر کے لئے مستصنع ہے، جیسے کہ بیع سلم میں کوئی شخص کسی دوسرے

سے کوئی چیز خرید وفروخت کرے تو اس کو بائع اور مشتری دونوں کہا جاتا ہے۔

وهو في اصطلاح الفقهاء: طلب العمل من الصانع في شيء مخصوص، وينعقد الاستصناع بالإيجاب والقبول من المستصنع والصانع ويقال للمشتري مستصنع، وللبائع صانع، وللشيء مصنوع. (الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹرنیشنل دیوبند ٤/ ٣٩١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۴/۱۲/۲۷ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۳۶)

غیر منقول اشیاء میں استصناع کا معاملہ

سوال [۸۸۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ استصناع کا معاملہ منقول اشیاء میں ثابت ہے، اب سوال یہ ہے کہ غیر منقول اشیاء عقار میں بھی معاملہ استصناع جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً مکانات بنانے کے لئے آرڈر دیا جائے اور بلڈر شرائط کے مطابق مکان بنا کر دے دے تو یہ معاملہ استصناع کے دائرے میں ہو کر جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: چونکہ استصناع کا مدار تعامل ناس اور عرف وعادت پر ہے اور اس جدید دور میں غیر منقول اشیاء میں بھی استصناع کا عرف عام ہے؛ لہٰذا غیر منقول اشیاء میں بھی معاملہ استصناع بلا شبہ جائز ہے اور آڈر پر مکان اور فلیٹ وغیرہ بنوانا یہ سب معاملہ استصناع کے دائرے میں ہو کر جائز ہوگا۔ (مستفاد: چند اہم عصری مسائل/ ۲۸۳)

ثم انتشر الاستصناع إنتشارا واسعا في العصر الحديث، ولم يقتصر الأمر على الصناعات المختلفة ما دام يمكن ضبطها بالمقاييس

والمواصفات المتنوعة، وإنما يشمل أيضا إقامة المباني وتوفير المساكن المرغوبة. (الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹرنیشنل دیوبند ۴/ ۴۰۲)

كل شيء تعومل استصناع يصح فيه الاستصناع على الإطلاق. (شرح المجلة رستم باز، مطبع اتحاد دیوبند ۱/ ۲۲۰، مادة: ۲۸۹)

يجب أن يعلم بأن الاستصناع جائز في كل ماجرى التعامل فيه.
(تاتارخانية، زكريا ۹/ ۴۰۰، رقم: ۱۳۷۱۶)

للاستصناع شروط هي: أن يكون مما جرى فيه التعامل بين الناس.
(الموسوعة الفقهية بيروت ۳/ ۳۲۸، بدائع، زكريا ۴/ ۴۴۴، عناية مع فتح القدير أشرفيه ۷/ ۱۰۸، کوئٹه ۶/ ۲۴۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱/۱/۱۴۳۵ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۱۱۳۵۳/۴۰)

گاڑی وغیرہ بڑی چیزوں میں استصناع کا معاملہ

سوال [۸۸۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جوتا، چپل، برتن وغیرہ جیسی چھوٹی اشیاء کے بارے میں معاملۂ استصناع نصوص سے ثابت ہے، سوال یہ ہے کہ آج کے زمانے میں بڑی چیزوں مثلاً ٹرک، گاڑی وغیرہ میں بھی استصناعت ہوتی ہے، تو کیا ایسی بڑی چیزوں میں بھی معاملۂ استصناع جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: معاملۂ استصناع کا مدار تعامل ناس اور عرف وعادت پر ہے، بریں بناء جن چیزوں میں بھی استصناع کا عرف ہوگا، اس میں معاملۂ استصناع جائز ہوگا، خواہ وہ چیزیں چھوٹی ہوں یا بڑی؛ لہٰذا آج کے زمانے میں جو گاڑی وغیرہ میں استصناعت جاری ہے بلاشبہ جائز اور درست ہے۔

منها: أن يكون ما للناس فيه تعامل كالقلنسوة، والخف، والآنية ونحوها، فلا يجوز فيما لا تعامل لهم فيه. (بدائع الصنائع، كتاب البيوع، حكم الاستصناع، زكريا ديوبند ٤/ ٤٤٤)

كل شيء تعومل استصناع يصح فيه الاستصناع على الإطلاق. (شرح المجلة رستم باز، مطبع اتحاد ديوبند ١/ ٢٢٠، مادة: ٢٨٩)

ولأنه يجوز فيما فيه تعامل لا فيما لا تعامل فيه. (عناية مع فتح القدير، أشرفيه ديوبند ٧/ ١٠٨، كوئٹه ٦/ ٢٤٣)

للاستصناع شروط هي: أن يكون مما يجرى فيه التعامل بين الناس. (الموسوعة الفقهية بيروت ٣/ ٣٢٨، بدائع، زكريا ٤/ ٤٤٤، عناية مع فتح القدير أشرفيه ٧/ ١٠٨، كوئٹه ٦/ ٢٤٣)

يجب أن يعلم بأن الاستصناع جائز في كل ماجرى التعامل فيه. (تاتارخانية، زكريا ٩/ ٤٠٠، رقم: ١٣٧١٦)

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/۱۲/۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۰۶۷)

عقدِ استصناع کی شکل میں مکان، فلیٹ وغیرہ کا معاملہ

سوال [۸۸۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسئلہ یہ ہے کہ فلیٹ وغیرہ کا باضابطہ نقشہ، نمونہ، سائز سب کچھ ہوتا ہے، پھر اس کا آرڈر دیا جاتا ہے، پھر تیاری کے بعد لین دین بھی وعدہ کے مطابق ہوجاتا ہے، تو یہ معاملہ استصناع میں داخل ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب فلیٹ وغیرہ کا نقشہ،نمونہ،سائز سب کچھ دکھا کر کے آرڈر دیا گیا، پھر وعدہ کے مطابق لین دین بھی ہوگیا تو یہ معاملہ استصناع کے دائرہ میں داخل ہوکر جائز ہے۔

ومن أبرز الأمثلة والتطبيقات لعقد الاستصناع بيع الدور، والمنازل، والبيوت السكنية على الخريطة ضمن أوصاف محددة. (الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹر نيشنل ديوبند ٤/ ٤٠٢)

ولا يصح السلم فيما لا يمكن ضبطه بالوصف كالدور، والعقارات، والجواهر، واللآلي، والجلود، والخشب لتفاوت آحادها تفاوتا فاحشا في المالية، أما الاستصناع فيصح في الأمرين إذا تعامل الناس به. (الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹر نيشنل ديوبند ٤/ ٤٠١)

ولا يجوز فيما لا تعامل فيه للناس كالثياب لعدم المجوّز، وفيما فيه تعامل إنما يجوز إذا أمكن إعلامه بالوصف ليمكن التسليم. (هداية، مكتبة الأمين، كتاب البيوع، باب السلم ٣/ ١٠١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۴/۱۲/۲۷ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۴۴/۱۱۳۴۴)

(صانع) کاریگر کو اجیر کب قرار دیا جائے؟

سوال [۸۸۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: صانع کو اجیر کب قرار دیا جائے گا، جب کہ معاملے کی دو شکلیں ہوسکتی ہیں: (۱) سارا مال اور عمل صانع کی طرف سے ہوں (۲) سارا مال مستصنع کی طرف سے ہو اور صانع نمونہ کے

مطابق مال تیار کر کے دے دے، تو سوال یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں یہ معاملہ اجرت کا ہوگا یا بیع کا؟ اگر اجرت کا ہے تو اجیر خاص کا ہے یا اجیر مشترک کا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب مال مستصنع کا ہو اور عمل صانع کا ہو، تو یہ عقدِ اجارہ ہوگا، عقدِ استصناع نہیں ہوگا اور اس صورت میں عمل کرنے والا اجیر قرار دیا جائے گا اور وہ اجیر مشترک ہوگا۔ (مستفاد: اسلام اور جدید معاشی مسائل ۵/ ۱۵۵-۱۵۶)

فإذا كانت العين من المستصنع لا من الصانع، فإن العقد يكون إجارة لا استصناعا. (الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹرنيشنل ديوبند ٤/ ٣٩١)

والاستصناع أن يكون العين والعمل من الصانع، فأما إذا كان العين من المستصنع لا من الصانع يكون إجارة ولا يكون استصناعا. (تاتارخانية، زكريا ١٥/ ٣٤٧، رقم: ٢٣٣٢٣)

شرطه: أن تكون العين والعمل من الصانع، فإن كانت العين من المستصنع كان العقد إجارة. (شرح المجلة، إتحاد ١/ ٦٩، مادة: ١٢٤)

حتى لو كان العين من المستصنع كان إجارة لا استصناعا. (مجمع الأنهر، فقيه الأمت ٣/ ١٤٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۴۸)

ایک ماہ سے زیادہ مدت ہو تو کیا معاملہ استصناع سلم میں تبدیل ہو جاتا ہے؟

سوال [۸۸۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ معاملہ استصناع اگر ایک ماہ اس سے زیادہ کی مدت کے لئے ہو تو وہ معاملہ استصناع باقی رہے گا یا سلم ہو جائے گا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چونکہ معاملۂ استصناع کا مدار عرف اور تعامل ناس پر ہے اور عرف میں ایک ماہ اور اس سے زائد کے لئے بھی استصناع کا معاملہ کرنا رائج ہے؛ لہٰذا ایک ماہ یا زیادہ کی تحدید کی بنا پر یہ معاملہ سلم نہ ہوگا؛ بلکہ استصناع ہی باقی رہے گا۔

وخالف في ذلک أبو یوسف ومحمد إذ أن العرف عندهما جری بضرب الأجل في الاستصناع، والاستصناع إنما جاز للتعامل، ومن مراعاة التعامل بین الناس، رأي الصاحبین: أن الاستصناع قد تعورف فیه علی ضرب الأجل فلا یتحول إلی السلم بوجود الأجل. (الموسوعة الفقهیة ۳/ ۳۲۹)

وقال الصاحبان: لیس هذا بشرط، والعقد استصناع علی کل حال حدد فیه أجل أو لم یحدد؛ لأن العادة جاریة بتحدید الأجل في الاستصناع، فیکون شرطا صحیحا لذلک، وهذا القول هو المتفق مع ظروف الحیاة العملیة، وحاجات الناس. (الفقه الإسلامي وأدلته، هدی انٹر نیشنل دیوبند ٤/ ٣٩٦)

وقالا: الأول: أي ما فیه تعامل استصناع؛ لأن اللفظ حقیقة للاستصناع فیحافظ علی قضیته، ویحمل الأجل علی التعجیل بخلاف مالا تعامل فیه؛ لأنه استصناع فاسد، فیحمل علی السلم الصحیح. (شامي، مطلب الاستصناع کراچی ٥/ ٢٢٤، زکریا ٧/ ٤٧٤)

وقال أبو یوسف ومحمد: إنه لا یصیر سلما بل یبقی استصناعا، وهذا في استصناع للناس فیه تعامل. (محیط البرهاني، کوئٹه ٨/ ٢٥٧، المجلس العلمي بیروت ١٠/ ٣٦٦، رقم: ١٣٠٤٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۵/۲/۵ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۴۲۳)

عقدِ استصناع اجارہ کب ہوگا؟

سوال [۸۸۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آپ نے شروع میں جمہور کا قول نقل کیا ہے کہ استصناع کا معاملہ نہ اجارہ ہے نہ معاہدہ؛ بلکہ نفس بیع ہے، تو اس صورت میں اجیر خاص یا اجیر مشترک کی مثال پیش کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جمہور کا قول عقدِ استصناع کے بیع ہونے کا اس صورت میں ہے، جب سارا سامان اور عمل صانع کا ہو، اس صورت میں اجیر خاص یا اجیر مشترک کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی؛ لیکن اگر سامان مستصنع کا ہو اور عمل صانع کا ہو، تو اجیر مشترک کی مثال پیش کرنا درست ہے۔

الاستصناع: أن يكون العين والعمل من الصانع. (تاتارخانية، زكريا ١٥/ ٣٤٧، رقم: ٢٣٣٢٣)

إن الاستصناع بيع للعين المصنوعة لا لعمل الصانع، فهو ليس وعدا ببيع، ولا إجارة على العمل. (الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹر نيشنل ديوبند ٤/ ٣٩٢)

الصحيح أنه يجوز بيعا لا عدة. (هداية مع فتح القدير، كتاب البيوع، باب السلم، كوئٹه ٦/ ٢٤٢، زكريا ديوبند ٧/ ١٠٨)

شرطه: أن تكون العين والعمل من الصانع، فإن كانت العين من المستصنع كان العقد إجارة. (شرح المجلة رستم باز، مطبع إتحاد ديوبند ١/ ٦٩، مادة: ١٢٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۲۹/ ۱۲/ ۱۴۳۴ھ

(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۴۹)

مدت متعینہ میں مال تیار نہ کرنے سے آرڈر کینسل کرنے کا حق

سوال [۸۸۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مستصنع نے نمونہ بتلا کر کے آرڈر دیا اور صانع نے اس کی شرائط کے مطابق آرڈر لے لیا اور اس کی مدت متعین ہوگئی، اس کے بعد اگر مدت کے اندر اندر مال تیار کر کے صانع مستصنع کے حوالہ نہیں کر پایا، تو ایسی صورت میں مستصنع کو مدت کے ختم ہونے پر آرڈر کینسل کرنے کا حق ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: صورت مسئولہ میں صانع شرائط کے مطابق مقررہ مدت میں مال تیار کر کے مستصنع کے حوالہ نہ کر سکے، تو ایسی صورت میں مستصنع (مشتری) کو آرڈر کینسل کرنے کا حق ہے۔

إذا انعقد الاستصناع فليس لأحد العاقدين الرجوع، وإذا لم يكن المصنوع على الأوصاف المطلوبة المبينة كان المستصنع مخيرا. (مجلة الأحكام، ص: ٧٦، بحواله كتاب الفتاوى ٥/ ٢٣٩)

وإذا حددت مدة لتقديم المصنوع، فانقضت دون أن يفرغ الصانع منه ويسلمه، فالظاهر أن يتخير المستصنع بين الانتظار والفسخ كما هو المقرر في عقد السلم. (الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹر نیشنل دیو بند ٤/ ٣٩٦)

ولا يجبر المستصنع على إعطاء الدراهم وإن شرط تعجيله؛ لأن الإجارة في الأجرة شراء ما لم يره كان له أن يفسخ العقد ولا يعطى البدل.

(المحيط البرهاني، كوئٹه ٨/ ٢٥٦-٢٥٧، المجلس العلمي بيروت ١٠/ ٣٦٦، رقم: ١٣٠٤٦)

إذا تعذر تسليم المسلم فيه عند المحل، إما لغيبة المسلم إليه أو عجزه عن التسليم حتى عدم المسلم فيه، أو لم تحمل الثمار تلك السنة،

فـالسلم بالخيار بين أن يصبر إلى أن يوجد فيطالب به، وبين أن يفسخ العقد ويرجع بالثمن إن كان موجودا أو بمثله إن كان مثليا وإلا قيمته. (المغني لابن قدامة بيروت ٤/ ١٩٦، رقم: ٣٢٢٩، بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٤٤٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/۱۲/۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۴۵)

استصناع میں مال صانع کا ہو تو وہ بائع ہو جائے گا

سوال [۸۸۳٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: استصناعت کے معاملے میں صانع اجیر مشترک قرار دیا جائے گا یا اجیر خاص؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: معاملہ استصناع میں جب مال اور عمل دونوں صانع کے ہوں، تو اس صورت میں صانع کو بائع قرار دیا جائے گا، اجیر مشترک یا اجیر خاص قرار نہیں دیا جائے گا؛ کیوں کہ اجیر کا صرف عمل ہوتا ہے عین نہیں ہوتا۔

يقال للمشتري: مستصنع، وللبائع صانع، وللشيء مصنوع. (الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹرنيشنل ديوبند ٤/ ٣٩١)

صح الاستصناع بيعا لا عدة. (شامي، باب السلم، مطلب في الاستصناع، زكريا ٧/ ٤٧٥، كراچى ٥/ ٢٢٤، هداية أشرفي ديوبند ٣/ ١٠٠)

الاستصناع أن يكون العين والعمل من الصانع. (تاتارخانية، زكريا ١٥/ ٣٤٧، رقم: ٢٣٣٢٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/۱۲/۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۵۰)

مال کے لئے انکار پر پیشگی رقم کا ضبط کرنا

سوال [۸۸۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: استصناعت کے معاملہ میں اگر خریدار نے پیشگی کچھ رقم بطور بیعانہ کے دیدی اور شرائط کے مطابق صانع نے مال تیار کردیا، مگر اب مستصنع لینے سے انکار کرتا ہے، تو کیا اس صورت میں اس پیشگی رقم کو ضبط کرسکتا ہے یا نہیں؟ جب کہ شرائط میں یہ طے تھا کہ مال نہ لینے کی صورت میں پیشگی رقم ضبط ہوجائے گی۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: استصناعت کے معاملہ میں خریدار نے پیشگی رقم دی تھی اور یہ شرط لگائی تھی کہ مال نہ لینے کی صورت میں صانع کو یہ رقم ضبط کرنے کا حق ہوگا، اب جب مال تیار ہونے کے بعد خریدار مال لینے سے انکار کرتا ہے تو چونکہ اس میں صانع کا کافی پیسہ لگ چکا ہے اور مال نہ بکنے میں اس کا ضرر اور نقصان ہے؛ اس لئے نقصان کے بقدر اس پیشگی رقم میں سے ضبط کرسکتا ہے۔ (مستفاد: اسلام اور جدید معاشی مسائل ۴/۱۶۱)

إذا أتى الصانع بالمستصنع على الصفة المشروطة. روي عن أبي يوسف رحمه الله إنه لازم في حقهما حتى لا خيار لأحدهما لا للصانع ولا للمستصنع أيضا أن في إثبات الخيار للمستصنع إضرار بالصانع؛ لأنه قد أفسد متاعه، وفرى جلده وأتى بالمستصنع على الصفة المشروطة، فلو ثبت له الخيار لتضرر به الصانع، فيلزم دفعا للضرر عنه. (بدائع الصنائع، باب حكم الاستصناع، زكريا ٤/ ٤٤٤)

عن أبي يوسف أنه لا خيار لواحد منهما، أما الصانع فلما ذكرنا، وأما المستصنع فلأن في إثبات الخيار له إضرار بالصانع فربما لا يرغب فيه غيره. (تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٤/ ١٢٤، زكريا ديوبند ٤/ ٥٢٨)

والعربون في البيع هو أن يشتري السلعة فيدفع إلى البائع درهما أو

غيره على أنه إن أخذ السلعة احتسب به من الثمن، وإن لم يأخذ فذلك للبائع يقال: عربون وأربون وعربان وأربان قال أحمد: لا بأس به، وفعله عمر رضي الله عنه وعن ابن عمر أنه أجازه، قال ابن سيرين: لا بأس به.

(المغني بيروت ٤/ ١٦٠، رقم: ٣١٢٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/۱۲/۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۵۱)

داخلی لوگوں نے مال کی تیاری میں تاخیر کر دی، جس سے باہر کے خریدار نے آرڈر کینسل کر دیا، تو نقصان کی تلافی کون کرے؟

سوال [۸۸۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر مشتری ایسے وقت میں آرڈر کینسل کر دے جس وقت بائع نے مال کی تیاری میں لاکھوں روپئے خرچ کر دیا ہے، تو ایسی صورت میں اس کے نقصان کا بھگتان کون کرے گا؟ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وعدہ کے مطابق مال بھیجنا لازم ہوتا ہے اور وقت کے اندر تیار نہ ہونے کی وجہ سے ایکسپورٹر مارکیٹ سے اسی نمونہ کا تیار شدہ مال زیادہ قیمت کا خرید کر کے روانہ کر دیتا ہے، تاکہ اس کی طرف سے وعدہ خلافی نہ ہو اور جو مال تیار ہوا ہے، اس کے لئے کوئی دوسرا گراہک نہیں ملتا، تو ایسی صورت میں بائع کا نقصان ہو جاتا ہے، تو اس نقصان کی تلافی تاخیر کرنے والوں سے کرائی جا سکتی ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب مال کی تیاری میں تاخیر کی وجہ سے بائع نے اسی نمونہ کا مال مارکیٹ سے خرید کر مشتری کے پاس روانہ کر دیا اور اس آرڈر دئے گئے مال کا کوئی دوسرا گراہک نہیں ملا جس کی وجہ سے بائع کا لاکھوں کا نقصان ہو گیا، تو ایسی صورت میں اس نقصان

کی تلافی بائع ان داخلی لوگوں سے وصول کرسکتا ہے جنہوں نے مال بنانے میں تاخیر کی ہے، یا داخلی لوگوں کو تیارشدہ مال واپس کردے اور نقصان داخلی لوگ خود برداشت کریں۔

إما إذا كانت المنفعة المعقود عليها هي إنجاز عمل من الأعمال كالبناء والخياطة ونحوهما، فإن الضمان يختلف بحسب صفة العامل وهو الأجير في اصطلاحهم؛ لأنه إما أن يكون أجيرا خاصا أو مشتركا أي عاما. (الموسوعة الفقهية بيروت ٢٨/ ٢٥٥)

تعدى الأجير هو أن يعمل عملا أو يتصرف تصرفا مخالفين لأمر الموجر صراحة كان أو دلالة لزمه الضمان. (شرح المجلة رستم باز، إتحاد ديوبند ١/ ٣٢٦، مادة: ٦٠٨)

الأجير المشترك يضمن الضرر والخسار الذي تولد عن فعله وصنعه إن كان بتعديه وتقصيره أو لم يكن. (شرح المجلة رستم باز، إتحاد ديوبند ١/ ٣٣٠، مادة: ٦١١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۴/۱۲/۲۸ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۱۱۳۴۶/۴۰)

لوکل اور بین الاقوامی مارکیٹ میں عقدِ استصناع کے مسائل

نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ أَمَّا بَعْد!

آج کے زمانہ میں عقدِ استصناع کا معاملہ عالمی سطح پر وسیع تر ہو چکا ہے، مقامی اور لوکل مارکیٹوں سے تجاوز کر کے ممالک بعیدہ تک عقدِ استصناع کا تجارتی معاملہ پھیل چکا ہے، اس لئے موضوع کی اہمیت اور اس میں پیدا ہونے والے نئے مسائل کی وجہ سے اس نوع کی تجارت کے بعض جزئی مسائل وضاحت طلب ہیں، اسی کے تناظر میں یہ مضمون پیش خدمت ہے۔

عقدِ استصناع کا معاملہ خود صاحبِ شریعت پیغمبر انسانیت ﷺ نے کیا ہے، جو اس حدیث شریف میں صراحت کے ساتھ ثابت ہے۔ حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: اصْطَنَعَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَاتَمًا، فَقَالَ: إِنَّا قَدِ اصْطَنَعْنَا خَاتَمًا وَنَقَشْنَا فِيْهِ نَقْشًا فَلا يَنْقُشُ أَحَدٌ عَلَيْهِ. (مسند أحمد، ٣/ ١٠١، رقم: ١٢٠١٢، السنن الكبرى للنسائي ٥/ ٤٥٦، رقم: ٩٥٤٥)

حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے معاملہ استصناع کے طور پر انگوٹھی بنوائی ہے، پھر آپ نے فرمایا کہ بے شک ہم نے ایک انگوٹھی بنانے کا آرڈر دیا ہے اور اس میں ایک خاص نقش بنوایا ہے؛ لہٰذا کوئی شخص اس جیسا نقش نہ بنوائے۔

معاملۂ استصناع کے جواز کا مدار تعامل ناس پر

استصناع کا معاملہ ایسی شئ کا عقد ہے جو شئ معدوم ہوتی ہے، عقد کے وقت اس شئ کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہوتا ہے۔ اور شرعی ضابطہ اور اصول کے مطابق ایسی شئ کی خرید وفروخت جائز اور مشروع نہیں ہوتی ہے، جس شئ کا خارج میں کوئی وجود نہ ہو؛ اس لئے اصول اور ضابطہ

کے مطابق استصناع کا معاملہ جائز نہیں ہونا چاہئے، مگر شریعت نے تعاملِ ناس اور لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے عقد استصناع کو اصول وضوابط سے مستثنیٰ کر کے جائز قرار دیا ہے؛ اس لئے استصناع کا معاملہ ہر ایسے امور اور ایسی اشیاء میں جائز ہوگا جن اشیاء کو آرڈر دیکر بنوانے کا لوگوں کے درمیان تعارف اور تعامل ہو چکا ہو اور ایسی اشیاء میں جائز نہیں ہوگا جن اشیاء کو آرڈر دے کر تیار کروانے کا لوگوں کے درمیان تعامل نہ ہو، اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے بیان فرمایا ہے۔ اس کو عنایہ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

يَجُوزُ اسْتِحْسَانًا وَالْقِيَاسُ يَقْتَضِي عَدَمَ جَوَازِهِ لِأَنَّهُ بَيْعُ الْمَعْدُومِ وَقَدْ نَهَى النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم عَنْ بَيْعِ مَا لَيْسَ عِنْدَ الإِنْسَانِ (إلى قوله) وَجْهُ الاسْتِحْسَانِ الإِجْمَاعُ الثَّابِتُ بِالتَّعَامُلِ، فَإِنَّ النَّاسَ فِيْ سَائِرِ الأَعْصَارِ تَعَارَفُوا الاِسْتِصْنَاعَ فِيْ مَا فِيهِ تَعَامُلٌ مِنْ غَيْرِ نَكِيرٍ، وَالْقِيَاسُ يُتْرَكُ بِمِثْلِهِ (وقوله) وَلِأَنَّهُ يَجُوزُ فِيمَا فِيهِ تَعَامُلٌ لَا فِيمَا لَا تَعَامُلَ فِيهِ. (عناية مع فتح القدير زكريا ديوبند ۷/ ۱۰۸، كوئٹه ۶/ ۲۴۲، دالفكر ۷/ ۱۱۶)

استصناع کا معاملہ استحساناً جائز ہے اور قیاس اس کے عدم جواز کا متقضی ہے؛ اس لئے کہ یہ معاملہ شئ معدوم کی بیع کا ہے اور یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی چیز کے بیچنے سے منع فرمایا ہے جو انسان کے پاس نہ ہو۔ اور استحساناً جواز کی دلیل ایسا اجماع ہے جو تعاملِ ناس سے ثابت ہے؛ اس لئے کہ بے شک لوگ ہر زمانہ میں ایسی چیزوں میں بلانکیر استصناع کا معاملہ کرنے کو متعارف جانتے ہیں، جن چیزوں میں معاملہ کرنے کا تعامل ہو چکا ہو اور اس جیسے تعامل کی وجہ سے قیاس کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور مصنف کا قول: بے شک معاملۂ استصناع ان چیزوں میں جائز ہے جن میں معاملہ کرنے کا تعامل ہے اور ان چیزوں میں جائز نہیں ہے جن میں تعامل نہیں ہے۔

اسی کو امام زیلعیؒ نے ''تبیین الحقائق'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

وَأَمَّا الاِسْتِصْنَاعُ فَلِإِجْمَاعِ الثَّابِتِ بِالتَّعَامُلِ مِنْ لَدُنْ النَّبِيِّ ﷺ إِلٰى يَوْمِنَا هٰذَا، وَهُوَ مِنْ أَقْوَى الْحُجَجِ. (تبيين الحقائق ملتان ٤/ ١٢٣، زكريا ٤/ ٥٣٦، هكذا في البدائع زكريا ديوبند ٤/ ٩٣، كراچی ٥/ ٣، مبسوط سرخسي ١٢/ ١٣٨)

اور بہر حال استصناع کا معاملہ اس اجماع کی وجہ سے مشروع ہے، جو حضور ﷺ کے زمانہ سے لے کر ہمارے اس زمانہ تک تعاملِ ناس کے ذریعہ سے ثابت ہے اور یہ قوی ترین حجت شرعیہ میں سے ہے۔

عقدِ استصناع اور عقدِ سلم کا فرق

عقدِ استصناع اور عقدِ سلم میں کیا فرق ہے؟ اس سلسلے میں کتب فقہ میں کافی تفصیلات موجود ہیں اور دونوں عقد اس بات میں مشترک ہیں کہ دونوں میں شئ معدوم کی بیع ہوتی ہے اور تعاملِ ناس اور ضرورت کی وجہ سے ان دونوں عقدوں میں شئ معدوم کی خرید وفروخت کی اجازت دی گئی ہے۔ اور دونوں عقدوں میں سے ہر ایک میں ثمن کا متعین ہونا اور مبیع کی جنس کا متعین ہونا اور اس کی قسم کا متعین ہونا اور اس کی مقدار اور صفت کا متعین ہونا لازم ہے، ورنہ عقد فاسد ہو جائے گا۔ چند امور میں دونوں عقد کے درمیان فرق ہے:

(۱) عقدِ سلم میں رأس المال یعنی ثمن اور قیمت کا مکمل طور پر نقد ادا کرنا لازم ہو جاتا ہے اور مجلسِ عقد میں ثمن پر قبضہ کرنا بھی لازم ہو جاتا ہے، اس کے برخلاف عقد استصناع میں ثمن اور قیمت کا پیشگی ادا کرنا لازم نہیں ہے؛ جانبین کی تراضی سے جیسا طے ہو جائے ویسا ہی عمل کرنا جائز ہے، چاہے ساری قیمت پیشگی ادا کردے یا کچھ پیشگی ادا کردے، باقی بعد میں ادا کردے، یا کچھ بھی ادا نہ کرے؛ بلکہ مبیع کی وصولی کے وقت میں ادا کرے، تو یہ ہر طرح سے جائز ہے۔ (شرح المجلۃ رستم باز ۱/ ۲۲۱، رقم المادۃ: ۳۹۱، الفقہ الإسلامی وأدلتہ ۴/ ۳۹۹)

(۲) عقدِ سَلَم میں خیارِ شرط کا ثبوت نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ عقد کے وقت سے لازم ہو جاتا

ہے، اس میں کسی کو خیار نہیں ہوتا ہے۔ اور عقدِ استصناع غیر لازم ہوتا ہے، اس میں عقد کے بعد عمل سے پہلے خیار ثابت ہوتا ہے۔

(۳) عقدِ سَلَم میں جنس مسلم فیہ جس کو مبیع کہا جاتا ہے، اسی قسم کی اشیاء کا بازار کے اندر ہر زمانہ میں موجود ہونا لازم ہے اور عقدِ استصناع میں شئ مصنوع کی قسم کی اشیاء کا بازار میں ہر وقت موجود ہونا لازم نہیں ہے۔

(۴) عقدِ سَلَم میں مسلم فیہ کا ازقبیل ذوات الامثال ہونا لازم ہے اور اس کے برخلاف عقدِ استصناع میں ذوات الامثال ہونا لازم نہیں ہے؛ بلکہ مبیع ذوات القیم بھی ہوسکتی ہے، جب کہ ایسی شئ میں معاملہ کرنے کا لوگوں کے درمیان تعامل ہو۔

(۵) عقدِ سَلَم ایسی چیزوں میں جائز ہے جن کا لوگوں کے درمیان میں تعامل ہے اور ایسی چیزوں میں بھی جائز ہے جن کا لوگوں میں تعامل نہیں ہے، اس کے برخلاف عقدِ استصناع صرف ایسی چیزوں میں جائز ہے جن میں معاملہ کرنے کا لوگوں کے درمیان میں تعامل ہے اور ایسی چیزوں میں جائز نہیں ہے جن کا لوگوں میں تعامل نہیں ہے۔ یہ پوری تفصیل ”الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/۳۹۹ سے ۴۰۱“ تک کے اندر موجود ہے۔

عقدِ استصناع بیع ہے یا وعدۂ بیع؟

معاملۂ استصناع کے بارے میں غور طلب بات یہ ہے کہ جب آرڈر دینے والا مال کا نمونہ اور سائز دکھا کر مال بنانے کیلئے آرڈر دیتا ہے اور صانع اور کاریگر طے شدہ معاہدہ کے مطابق آرڈر قبول کرلیتا ہے تو یہ معاملہ عقدِ بیع ہے یا وعدۂ بیع ہے؟ تو اس سلسلے میں مسلکِ حنفی کے فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، چناں چہ اس بارے میں دو فریق ہیں:

فریقِ اول: حضرت امام حاکم شہید مروزیؒ، امام محمد بن سلمہؒ، امام صفارؒ۔ صاحبِ منثور امام ابوالقاسم ناصر الدین سمرقندیؒ وغیرہ نے اس طرح کے معاملہ کا نفسِ بیع ہونے سے انکار کیا ہے۔ اور انہوں نے یہ ثابت فرمایا ہے کہ یہ بیع نہیں ہے؛ بلکہ آئندہ چل کر عقدِ بیع کرنے

کا معاہدہ اور وعدہ ہے؛ لہٰذا استصناع کا معاملہ طے ہو جانے کے بعد جانبین میں سے ہر ایک کو معاملہ ختم کرنے کا حق ہوگا۔ اور عقد بیع اس وقت منعقد ہوگا کہ جب صانع (کاریگر) طے شدہ شرائط کے مطابق مال تیار کر کے خریدار کو پیش کر دے، اس کو حضرات فقہاء نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

ثُمَّ اخْتَلَفَ الْمَشَايِخُ أَنَّهُ مُوَاعَدَةٌ أَوْمُعَاقَدَةٌ؟ فَالْحَاكِمُ الشَّهِيْدُ وَالصَّفَّارُ وَمُحَمَّدُ بْنُ سَلَمَةَ وَصَاحِبُ الْمَنْثُوْرِ مُوَاعَدَةٌ، وَإِنَّمَا يَنْعَقِدُ عِنْدَ الْفَرَاغِ بَيْعًا بِالتَّعَاطِي، وَلِهٰذَا كَانَ لِلصَّانِعِ أَنْ لا يَعْمَلَ وَلا يُجْبَرُ عَلَيْهِ بِخِلَافِ السَّلَمِ، وَلِلْمُسْتَصْنِعِ أَنْ لايَقْبَلَ مَا يَأْتِي بِهٖ وَيَرْجِعُ عَنْهُ وَلا تَلْزَمُ الْمُعَامَلَةُ.

(فتح القدير زكريا ۷/ ۱۰۸، كوئٹه ۶/ ۲۴۲، دارالفكر ۷/ ۱۱۶، البحر الرائق، زكريا ۶/ ۲۸۴، كوئٹه ۶/ ۱۷۱، الفاظ کے فرق کے ساتھ مجمع الأنهر بيروت ۳/ ۱۴۹، مبسوط سرخسي ۱۲/ ۱۳۹، تبيين الحقائق ملتان ۴/ ۱۲۳، زكريا ۴/ ۵۲۷)

پھر مشائخ کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ استصناع کا معاملہ وعدۂ بیع ہے یا عقدِ بیع ہے؟ تو حاکم شہیدؒ، امام صفارؒ، محمد بن سلمہؒ اور صاحبِ منثورؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ وعدۂ بیع ہے اور یقیناً عقد بیع منعقد ہوگی مال کی تیاری کے بعد لین دین کے وقت۔ اور اسی وجہ سے کاریگر کو اس بات کا اختیار رہے کہ وہ مال نہ بنائے اور نہ ہی اس پر جبر کیا جا سکتا ہے، برخلاف معاملۂ سلم کے اور مستصنع (آرڈر دینے والے) کے لئے اس بات کی گنجائش ہے کہ جو مال بنا کر لائے اسے قبول نہ کرے اور اس معاملہ سے رجوع کر لے اور معاملہ ان دونوں کے درمیان میں لازم نہیں ہوتا ہے۔

فریق ثانی: جمہور فقہاء کے نزدیک معاملۂ استصناع وعدۂ بیع نہیں ہے؛ بلکہ نفسِ عقدِ بیع ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ امام محمدؒ نے استصناع کے اندر قیاس اور استحسان دونوں کو ذکر فرمایا ہے اور قیاس واستحسان وعدہ میں جاری نہیں ہوتے ہیں، نیز اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ معاملۂ استصناع ایسی چیزوں میں جائز ہے جن میں معاملہ کرنے کا لوگوں کے درمیان میں تعامل ہے اور جن چیزوں میں تعامل نہیں ہے اس میں استصناع جائز نہیں ہے، اس کو صاحبِ

عنایہ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

وَالصَّحِيحُ أَنَّهُ بَيْعٌ لاعِدَةٌ وَهُوَ مَذْهَبُ عَامَّةِ مَشَايِخِنَا. (عنايه مع فتح القدير زكريا ديوبند ٧/ ١٠٨، كوئٹه ٦/ ٢٤٢، دارالفكر ٧/ ١١٦)

اور صحیح یہی ہے کہ معاملۂ استصناع عقدِ بیع ہے نہ کہ وعدۂ بیع، یہی ہمارے عامۃ المشائخ کا مذہب ہے۔

اور اس کو تبیین الحقائق میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

ثُمَّ فِي الصَّحِيحِ أَنَّ الاسْتِصْنَاعَ يَجُوزُ بَيْعًا (إلى قوله) وَجْهُ قَوْلِ الْجُمْهُورِ أَنَّ مُحَمَّدًا سَمَّاهُ شِرَاءً، وَذَكَرَ فِيهِ الْقِيَاسَ وَالاسْتِحْسَانَ، وَفَصَلَ بَيْنَ مَافِيهِ تَعَامُلٌ وَمَا لَاتَعَامُلَ فِيهِ. (تبيين الحقائق ملتان ٤/ ١٢٣، زكريا ٤/ ٥٢٧)

پھر صحیح یہی ہے کہ معاملۂ استصناع عقدِ بیع بن کر کے جائز ہے اور جمہور کے قول کی دلیل یہ ہے کہ امام محمدؒ نے معاملۂ استصناع کا نام خرید وفروخت رکھا ہے اور اس میں قیاس اور استحسان دونوں کو ذکر کیا ہے اور جن چیزوں میں تعامل ناس ہے ان کے درمیان اور جن چیزوں میں تعامل ناس نہیں ہے ان کے درمیان میں فرق بیان فرمایا ہے۔

پہلے خریدار کا دوسرے خریدار کو دوسرے خریدار کا تیسرے خریدار کو فروخت کرنے کا معاملہ

عقدِ استصناع کے جواز کا سارا مدار عرف وعادت اور تعاملِ ناس پر ہے اور عقدِ استصناع میں شئ معدوم ہی کی خرید وفروخت ہوتی ہے اور مبیع کا فی الحال وجود ہی نہیں ہوتا ہے، جب کہ عقدِ سلم میں بوقت عقد اگر چہ مبیع معدوم ہوتی ہے؛ لیکن تسلسل کے ساتھ بازاروں اور مارکیٹوں میں مدت پوری ہونے تک مبیع کا دستیاب ہونا لازم ہے اور اس کے برخلاف عقدِ استصناع میں شئ مصنوع (مبیع) کا تسلسل کے ساتھ مارکیٹ میں پایا جانا بھی لازم نہیں ہے، بس عقدِ استصناع کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ سائز، نمونہ اور ڈیزائن کے ساتھ آرڈر دیکر لوگوں کے درمیان معاملہ کرنے کا تعامل جاری ہوجائے اور بوقت عقد مبیع کا وجود میں ہونا لازم نہیں ہے؛

اس لئے مالیاتی ادارہ کے لئے ایسا کرنا جائز ہے کہ وہ اپنے لئے نمونہ اور سائز اور ڈیزائن وغیرہ کی شرائط کے ساتھ مال بنوانے کا آرڈر لے لے اور اسی ڈیزائن اور نمونہ کی شرائط کے ساتھ وہ مالیاتی ادارہ اپنے ماتحت کاریگروں کو مال بنوانے کا آرڈر دے دے اور اس میں اپنے منافع کی شرح کی رعایت رکھے اور اسی طرح جس بائع اور خریدار نے مالیاتی ادارہ کو آرڈر دیا ہے وہ اپنے منافع کی رعایت کرتے ہوئے سائز، نمونہ اور ڈیزائن دکھا کر اپنے خریدار کے ساتھ استصناع کا معاملہ کرے، اسی طرح دوسرے خریدار بھی اپنے نفع کی رعایت کرتے ہوئے تیسرے خریدار سے نمونہ اور ڈیزائنوں کی شرائط کے ساتھ معاملۂ استصناع کرتے جائیں۔ اور سارے ڈیزائن اور نمونہ اور طے شدہ شرائط کاغذوں میں درج ہوں تو اس طرح کا معاملہ بلاشبہ جائز اور درست ہے کیوں کہ اس طرح معاملہ کرنے کا تعامل لوگوں کے درمیان جاری ہو چکا ہے؛ اس لئے کہ معاملۂ استصناع میں دو چیزیں بنیادی ہوتی ہیں:

(۱) معاملہ کرنے کا عرف اور تعامل لوگوں کے درمیان میں جاری ہو۔

(۲) جس شئ پر معاملہ کیا جاتا ہے وہ شئ وجود میں نہیں ہوتی ہے؛ بلکہ معدوم ہوتی ہے اور یہاں پر یہ دونوں بنیادی چیزیں موجود ہیں؛ اس لئے اس طرح کا معاملہ شرعاً جائز اور درست ہے۔

یہ حکم حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے بیان فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

يَجُوزُ اسْتِحْسَانًا وَالْقِيَاسُ يَقْتَضِي عَدَمَ جَوَازِهِ لِأَنَّهُ بَيْعُ الْمَعْدُومِ (قوله) وَجْهُ الاسْتِحْسَانِ الإِجْمَاعُ الثَّابِتُ بِالتَّعَامُلِ، فَإِنَّ النَّاسَ فِي سَائِرِ الأَعْصَارِ تَعَارَفُوا الاسْتِصْنَاعَ فِي مَا فِيهِ تَعَامُلٌ مِنْ غَيْرِ نَكِيرٍ، وَالْقِيَاسُ يُتْرَكُ بِمِثْلِهِ. (عنایه مع فتح القدیر علی الهدایة زکریا دیوبند ۷/ ۱۰۸، کوئٹه پاکستان ۶/ ۲۴۲، دارالفکر ۷/ ۱۱۶)

اور عقد استصناع استحساناً جائز ہے اور قیاس اس کے عدم جواز کا تقاضہ کرتا ہے؛ اس لئے کہ یہ شئ معدوم کی بیع ہے اور استحساناً جواز کی وجہ وہ اجماع ہے جو تعاملِ ناس سے ثابت ہے؛ اس لئے کہ بے شک لوگوں میں ہر زمانہ میں ان چیزوں میں عقدِ استصناع بلا کسی نکیر کے متعارف رہا ہے، جن میں عقدِ استصناع کا تعامل ہو اور اس جیسے تعاملِ ناس کی وجہ سے قیاس کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔

’’الفقہ الاسلامی میں یہ بات وضاحت سے ذکر کی گئی ہے کہ عقد استصناع میں مبیع کا مارکیٹوں میں موجود ہونا بھی لازم نہیں ہے۔

وَيُشْتَرَطُ فِي عَقْدِ السَّلَمِ عِنْدَ الْحَنَفِيَّةِ كَوْنُ جِنْسِ الْمُسْلَمِ فِيْهِ (الْمَبِيْع) مَوْجُوْدًا فِي الْأَسْوَاقِ بِنَوْعِهٖ وَصِفَتِهٖ مِنْ وَقْتِ الْعَقْدِ إِلٰى وَقْتِ حُلُوْلِ أَجَلِ التَّسْلِيْمِ (قوله) وَلَا يُشْتَرَطُ ذٰلِكَ فِي عَقْدِ الاسْتِصْنَاعِ. (الفقه الإسلامي ٤/ ٤٠١)

اور حنفیہ کے نزدیک عقدِ سلم میں مسلم فیہ (مبیع) کا اپنی جنس اور صفت کے ساتھ عقد کے وقت سے سونپنے کے زمانہ تک بازاروں اور مارکیٹوں میں موجود ہونا شرط ہے اور عقدِ استصناع میں یہ شرط نہیں ہے۔

چھوٹی منقول اشیاء کی طرح بڑی چیزوں میں استصناع کا معاملہ

جس طرح جوتا، چپل، اوانی، برتن اور گھریلو اشیاء کو استصناع کے طور پر آرڈر دے کر بنوانا جائز ہے، اسی طرح استصناع کا معاملہ بڑی بڑی منقول چیزوں میں بھی جائز اور درست ہے، مثلاً بحری جہاز، ہوائی جہاز، چھوٹی بڑی گاڑیاں اور ٹرین کے ڈبے وغیرہ جب ایسی چیزوں میں سائز، نمونہ اور ڈیزائن کے ساتھ آرڈر دے کر بنوانے کا تعامل ہو تو عقد استصناع کا معاملہ ایسی بڑی بڑی چیزوں میں بھی جائز اور درست ہو جائے گا۔

اس کو الفقہ الاسلامی میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:

ثُمَّ انْتَشَرَ الْاسْتِصْنَاعُ اِنْتِشَارًا وَاسِعًا فِي الْعَصْرِ الْحَدِيْثِ، فَلَمْ يُعَدّ مَقْصُوْرًا عَلٰى صِنَاعَةِ الْأَحْذِيَةِ وَالْجُلُوْدِ وَالنَّجَارَةِ وَالْمَعَادِنِ وَالْأَثَاثِ الْمَنْزِلِيِّ مِنْ مَفْرُوْشَاتٍ وَغَيْرِهَا مِنَ الْخَزَائِنِ

پھر استصناع کا معاملہ دورِ حاضر میں وسیع تر ہو کر پھیلتا چلا گیا؛ لہٰذا جوتے، چپل، چمڑے کی اشیاء، بڑھئی کی اشیاء، دھات کی اشیاء اور لوگوں کے صندوق، صوفے، کرسیاں، لاکر بچھونے اور گھریلو سامان وغیرہ کے دائرہ

وَالْمَقَاعِدِ وَالْمَسَانِدِ وَالصَّنَادِيْقِ، وَإِنَّمَا شَمُلَ صِنَاعَاتٍ مُتَطَوِّرَةٍ وَمُهِمَّةٍ جِدًا فِي الْحَيَاةِ الْمُعَاصَرَةِ كَالطَّائِرَاتِ وَالسُّفُنِ وَالسَّيَّارَاتِ وَالْقِطَارَاتِ وَغَيْرِهَا، مِمَّا أَدَّى إِلٰى تَنْشِيطِ الْحَرَكَةِ الصِّنَاعِيَّةِ.

(الفقه الإسلامي ٤ / ٤٠٢)

میں محدود کر کے شمار نہیں کیا جائے گا؛ بلکہ یقینی طور معاملۂ استصناع دور حاضر میں بہت زیادہ اور ترقی یافتہ مصنوعات کو بھی شامل ہے، جیسا کہ ہوائی جہاز، بحری جہاز، گاڑیاں، ٹرین کے ڈبے وغیرہ، جو صنعتی سرگرمیوں کی ترقی کو شامل ہیں۔

غیر منقول عقار میں استصناع کا معاملہ

جس طرح چھوٹی بڑی منقول اشیاء میں نمونہ کے ساتھ آرڈر دے کر استصناع کا معاملہ جائز اور درست ہوتا ہے، اسی طرح جب غیر منقول عقار کو نمونہ اور سائز کے ساتھ آرڈر دے کر بنوانے کا لوگوں کے درمیان عرف اور تعامل جاری ہو جائے تو ایسی صورت میں غیر منقول عقار میں بھی استصناع کا معاملہ جائز اور درست ہو جائے گا؛ نمونہ اور نقشہ تیار کر کے عمارت، مکانات، فلیٹ وغیرہ کا بنوانا بھی معاملۂ استصناع کے دائرہ میں داخل ہو کر جائز اور درست ہو جائے گا اور آج کے زمانہ میں بڑے شہروں میں نقشہ اور نمونہ کے مطابق فلیٹ بنوایا جاتا ہے، کتنے کمرے، کس سائز کے کمرے، کتنے بیت الخلاء ہوں گے، کتنے غسل خانہ ہوں گے اور ان کا سائز کیا ہوگا اور کچن کتنا بڑا ہوگا؟ ان سب چیزوں کی تفصیل کے ساتھ جب فلیٹ بنانے کا آرڈر دیا جائے اور اسی کے مطابق جب فلیٹ تیار ہو جائے تو یہ معاملہ استصناع کے دائرہ میں داخل ہو کر جائز اور درست ہو جائے گا، اسی طرح چھوٹے شہروں میں پلاٹنگ کا سلسلہ جاری ہے، پھر ان پلاٹوں میں نقشہ اور نمونہ کے مطابق عمارت بنانے کا، مکان بنانے کا آرڈر دیا جاتا ہے، تو یہ بھی معاملۂ استصناع کے دائرہ میں داخل ہو کر جائز ہو جائے گا۔ اس کو ''الفقہ الاسلامی'' میں اس طرح کے الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:

وَإِنَّمَا يَشْمُلُ أَيْضًا إِقَامَةَ الْمَبَانِي وَتَوْفِيرَ الْمَسَاكِنِ الْمَرْغُوبَةِ، وَقَدْ سَاعَدَ كُلُّ ذٰلِكَ فِي التَّغَلُّبِ عَلٰى اَزْمَةِ الْمَسَاكِنِ، وَمِنْ أَبْرَزِ الْأَمْثِلَةِ وَالتَّطْبِيْقَاتِ لِعَقْدِ الاسْتِصْنَاعِ بَيْعُ الدُّوْرِ وَالْمَنَازِلِ وَالْبُيُوْتِ السَّكِيْنَةِ عَلَى الْخَرِيْطَةِ ضِمْنَ أَوْصَافٍ مُحَدَّدَةٍ. (الفقه الإسلامي ٤/ ٤٠٢)

اور بے شک عقدِ استصناع مکانات کی تعمیر کرنے اور پسندیدہ رہائش کے حاصل کرنے کو بھی شامل ہے اور یقیناً یہ سب کے سب رہائشی بحران پر غلبہ حاصل کرنے میں معاون ہیں اور عقدِ استصناع کو عملی تشکیل دینے اور اس کی مثالوں کو عام کرنے میں نقشوں کے مطابق متعین اوصاف کے ضمن میں رہائشی کمروں اور گھروں اور مکانوں کی خرید وفروخت بھی شامل ہے۔

عقدِ استصناع میں بیعانہ ضبط کرنے کا حکم

معاملۂ استصناع چونکہ وسیع ترین دائرہ میں پھیلا ہوا ہے، مقامی اور ملکی دائرہ میں وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ ممالکِ بعیدہ کے ساتھ بھی بین الاقوامی مارکیٹ میں استصناع کا معاملہ عام ہو چکا ہے اور ایسے حالات میں جب خریدار صانع کو آرڈر دیتا ہے، تو بسا اوقات ایسی بھی نوبت آجاتی ہے کہ نمونہ، سائز اور ڈیزائن دکھا کر آرڈر کا معاملہ مکمل ہو جاتا ہے اور بائع آرڈر اور طے شدہ شرائط کے مطابق مال تیار کر لیتا ہے، اس کے بعد خریدار بسا اوقات لینے سے مکر جاتا ہے، جس سے صانع اور بائع کو خطیر رقم کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے، تو اس نقصان اور خطرہ سے بچنے کے لئے صانع (آرڈر لینے والا) مستصنع (آرڈر دینے والا) سے بطور بیعانہ کے پیشگی متعین رقم کا مطالبہ کرتا ہے اور اس میں یہ شرط لگاتا ہے کہ اگر مستصنع (آرڈر دینے والا) بعد میں لینے سے انکار کر دے تو بائع (آرڈر لینے والا) بیعانہ کی پیشگی رقم ضبط کر لے گا، اس کو شرعی اصطلاح اور لغت میں ''عربون'' کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (بذل المجہود بیروت ۱۱/ ۲۲۱، مکتبہ مظاہر العلوم قدیم ۴/ ۲۸۷)

اب یہاں زیرِ بحث مسئلہ یہ ہے کہ استصناع کے معاملہ میں پیشگی رقم جو بطور بیعانہ لی جاتی ہے، طے شدہ شرائط کے مطابق مال تیار ہو جانے کے بعد خریدار کے لینے سے انکار کرنے پر صانع (آرڈر لینے والے) کے لئے وہ رقم شرائط کے مطابق ضبط کر کے اپنے استعمال میں لانا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس بارے میں حنفیہ اور جمہور کے نزدیک شرعی حکم یہ ہے کہ بیعانہ کی رقم ضبط کرنا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ شریعت میں مالی جرمانہ لینا جائز نہیں ہے؛ لیکن حضرت امام احمد بن حنبلؒ، امام سعید بن المسیبؒ، امام محمد بن سیرینؒ وغیرہ کے نزدیک بیعانہ ضبط کرنا شرائط کے مطابق جائز اور درست ہے اور مال تیار کرنے والے کے لئے اس رقم کا استعمال بھی جائز ہے اور اس سلسلے میں امام احمد بن حنبلؒ، حضرت عمرؓ کا فیصلہ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا فتویٰ دلیل میں پیش کرتے ہیں، اب حنفی مسلک کے علماء کو عصرِ حاضر کی بین الاقوامی تجارت پر نظر رکھتے ہوئے غور کرنا ہے کہ عقدِ استصناع کا سارا مدار عرف اور تعاملِ ناس پر ہے اور مقامی، ملکی، بین الاقوامی مارکیٹ میں خطرہ اور نقصان سے بچنے کے لئے پیشگی رقم لینے اور خریدار کی طرف سے انکار کی صورت میں پیشگی دی ہوئی رقم ضبط کرنے کا تعامل اور تعارف ہو چکا ہے، تو اس تعامل ناس کے پیش نظر امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ کے قول پر عمل کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟ تو اس بارے میں دورِ حاضر کے مفکر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ کی رائے بھی یہی ہے کہ تعاملِ ناس اور ضرورت کی بناء پر ’’عربون‘‘ (بیعانہ) کی رقم امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ کے قول پر عمل کرتے ہوئے ضبط کرنے کی گنجائش ہے اور جہاں ضرورت نہ ہو وہاں جمہور کے قول پر عمل کیا جائے گا؛ اسی لئے احقر کی رائے بھی یہی ہے کہ تعاملِ ناس کی وجہ سے عقدِ استصناع میں عربون (بیعانہ) کی رقم خریدار کے مبیع کو رد کرنے کی صورت میں ضبط کرنے کی گنجائش ہوگی۔ حنفی مسلک کے علماء سے گزارش ہے کہ مسئلہ کے اسی نقطہ پر غور فرمائیں، اگر سارے علماء ایک بات پر متفق ہو جاتے ہیں تو بہتر ہوگا؛ لہٰذا ایسی صورت میں آرڈر دے کر فلیٹ اور مکان بنوانے میں یا چھوٹی چیزیں بھاری تعداد میں بنوانے کی صورت میں عربون (بیعانہ) کا مسئلہ انتہائی قابل غور ہے۔ (مستفاد اسلام اور جدید معاشی مسائل ۴/ ۱۶۱، ۱۶۲)

اس کے جواز سے متعلق حسبِ ذیل دلائل ملاحظہ فرمائیے: مغنی ابن قدامہ میں اس کو ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:

وَالْعَرَبُوْنُ فِي الْبَيْعِ هُوَ أَنْ يَشْتَرِىَ السِّلْعَةَ فَيَدْفَعُ إِلَى الْبَائِعِ دِرْهَمًا أَوْ غَيْرَهُ عَلٰى أَنَّهُ إِنْ أَخَذَ السِّلْعَةَ أُحْتُسِبَ بِهٖ مِنَ الثَّمَنِ، وَإِنْ لَمْ يَأْخُذْهَا فَذٰلِكَ لِلْبَائِعِ ...... قَالَ أَحْمَدُؒ: لَا بَأْسَ بِهٖ وَفَعَلَهُ عُمَرُؓ، وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ أَنَّهُ أَجَازَهُ، وَقَالَ ابْنُ سِيْرِيْنَؒ: لَا بَأْسَ بِهٖ، وَقَالَ سَعِيْدُ بْنُ الْمُسَيِّبِؒ وَابْنُ سِيْرِيْنَؒ: لَا بَأْسَ إِذَا كَرِهَ السِّلْعَةَ أَنْ يَرُدَّهَا وَيَرُدَّ مَعَهَا شَيْئًا. (المغني ٤/١٦٠)

عقدِ بیع میں عربون (بیعانہ) وہ اس طرح سے ہے کہ مشتری سامان کی خریداری کا معاملہ کرکے بائع کو درہم (روپیہ) وغیرہ اس شرط پر دے دے کہ اگر سامان لے گا تو یہ روپیہ ثمن میں شمار ہو جائے گا اور اگر سامان (مبیع) نہیں لیتا ہے تو یہ بیعانہ کی رقم بائع کے لئے ہو جائے گی۔ امام احمدؒ نے فرمایا کہ اس طرح کا معاملہ کرنے میں کوئی حرج نہیں اور اس کو حضرت عمرؓ نے بھی کیا ہے اور ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے اس کی اجازت دی ہے۔ اور امام محمد بن سیرینؒ نے فرمایا کہ اس طرح کا معاملہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اور امام سعید بن المسیبؒ اور ابن سیرینؒ نے کہا کہ جب مشتری سامان لینے سے انکار کرکے رد کردے تو اس کے ساتھ کوئی چیز بھی رد کرنے کے ساتھ واپس دے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

اس بارے میں حسبِ ذیل روایات ان کی طرف سے پیش کی جاتی ہیں:

عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَؓ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَحَلَّ الْعُرْبَانَ فِي الْبَيْعِ. (المصنف لابن أبي شيبة ١١/ ٦٧١، رقم: ٢٣٦٥٦، ٢٣٦٦١)

زید بن اسلم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع میں عربان (بیعانہ) کو حلال رکھا ہے۔

عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ فَرُّوْخٍ أَنَّ نَافِعَ بْنَ عَبْدِالْحَارِثِ اشْتَرَى دَارَ السِّجْنِ مِنْ صِفْوَانَ بْنِ أُمَيَّةَ بِأَرْبَعَةِ آلَافِ دِرْهَمٍ، فَإِنْ رَضِيَ عُمَرُؓ فَالْبَيْعُ لَهُ، وَإِنْ عُمَرُؓ لَمْ يَرْضَ، فَأَرْبَعُ مِائَةٍ لِصَفْوَانَؓ.

(المصنف لابن أبي شيبة ١١/ ٦٧٢، رقم: ٢٣٦٦٦)

عبدالرحمٰن بن فروخ کہتے ہیں کہ نافع بن عبدالحارث نے صفوان بن امیہ سے اس شرط پر قید خانہ کا گھر چار ہزار درہم میں خریدا کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس عقد پر راضی ہوجائیں، تو مبیع ان کے لئے ہے اور اگر حضرت عمرؓ راضی نہ ہوں تو صفوان بن امیہ کے لئے چارسو درہم ہوں گے۔

اور بخاری کے ترجمۃ الباب میں اس روایت کو ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

وَاشْتَرَى نَافِعُ بْنُ عَبْدِالْحَارِثِ دَارًا لِلسِّجْنِ بِمَكَّةَ مِنْ صَفْوَانَ بْنِ أُمَيَّةَ عَلٰى إِنْ عُمَرُؓ رَضِيَ بِالْبَيْعِ فَالْبَيْعُ بَيْعُهُ، وَإِنْ لَمْ يَرْضَ عُمَرُؓ فَلِصَفْوَانَؓ أَرْبَعُ مِائَةِ دِيْنَارٍ.

(بخاري شريف ١/ ٣٢٧)

نافع بن عبدالحارث نے قید خانہ کے لئے مکہ مکرمہ میں ایک گھر صفوان بن امیہ سے اس شرط پر خریدا کہ اگر حضرت عمرؓ بیع پر راضی ہوجائیں تو عقد بیع اسی طرح قائم رہے گا اور اگر حضرت عمرؓ راضی نہ ہوں تو صفوان بن امیہ کے لئے چارسو دینار ہیں۔

ضروری وضاحت

اس مسئلہ میں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ہم نے جو بیعانہ کی رقم ضبط کرنے کی گنجائش کی طرف رجحان ظاہر کیا ہے وہ صرف عقدِ استصناع کے دائرہ میں محدود ہے اور ملکی اور بین الاقوامی مارکیٹ میں آرڈر دے کر مال بنوانے اور مال ایکسپورٹ کرنے اور امپورٹ کرنے کا معاملہ عقدِ استصناع کے ساتھ متعلق ہوتا ہے، اور اس میں آرڈر کینسل کرنے کی صورت میں آرڈر لینے والے کا بھاری نقصان ہوجاتا ہے اور اس نقصان کی تلافی بیعانہ کی رقم کے ذریعہ سے جہاں تک ممکن ہو کرنے کی گنجائش ہے، مثلاً بائع نے دیگر ممالک کے خریدار سے

بیس لاکھ روپئے کا مال طے شدہ شرائط کے مطابق ایکسپورٹ کرنے کا معاملہ طے کرلیا ہے اور بیعانہ کے طور پر کچھ رقم پیشگی وصول کرلی ہے اور اس نے بیس لاکھ روپیہ کا مال تیار کرلیا ہے اس کے بعد باہر کے بایر (خریدار) نے آرڈر کینسل کردیا، تو ایسی صورت میں بائع نے مال کی تیاری میں جو بھاری رقم خرچ کی ہے، اس کا بھاری نقصان بائع کے سر پڑتا ہے، تو ایسے بڑے نقصان سے بچنے کیلئے عربون (بیعانہ) کی پیشگی رقم ضبط کرنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے، اسی طرح اندرون ملک میں بھی کثرت کے ساتھ ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں اور بائع کو نقصان بھگتنا پڑ جاتا ہے، اس طرح کے نقصانات کے پیشِ نظر حضرت امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ کے قول پر عمل کی گنجائش قرار دی جارہی ہے اور یہ بات بھی یاد رکھیں کہ اندرونِ ملک میں زمین کی خریداری اور پلاٹ کی خریداری، تیار شدہ مکان کی خریداری میں جو بیعانہ پیش کیا جاتا ہے، مشتری بعد میں لینے سے مکر جائے اور لینے سے انکار کردے تو بیعانہ کی رقم مکمل طور پر واپس کردینا بائع کے اوپر لازم اور ضروری ہے؛ اس لئے کہ یہ عقود عقدِ استصناع کے دائرہ میں داخل نہیں ہیں، نیز ایسے معاملات میں مشتری کے انکار کرنے کی صورت میں بائع کا عمومی طور پر کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اور پھر بھی اگر کسی کو نقصان ہوجاتا ہے اور پھر اس طرح کے نقصان کا سلسلہ عام ہونے کا خطرہ ہے، تو اس سے بچنے کے لئے حضرت مفتی شفیع صاحب عثمانیؒ نے امداد المفتیین میں ایک حیلہ نقل فرمایا ہے اور وہ حیلہ یہ ہے کہ ظاہری حالات کے اعتبار سے بائع بیعانہ کی رقم ضبط کرلے؛ لیکن خفیہ طور پر کسی بھی حیلہ سے مشتری کے پاس وہ رقم پہنچادے، مثلاً کسی دوسرے کے واسطے سے بطورِ ہدیہ یا ہبہ واپس کردے، یا ایک مدت کے گذر جانے کے بعد بطور تحفہ وغیرہ کے عنوان سے واپس کردے، ملاحظہ فرمایئے (امداد المفتیین کراچی ۲/۸۴۳)

معاملۂ استصناع اجارہ کب بن سکتا ہے؟

استصناع کا معاملہ مال اور سامان کے اعتبار سے دو طرح سے وجود میں آتا ہے:

(۱) مال بنانے کا سامان، اوزار اور عمل یہ سب کے سب کاریگر کے ذمہ ہوں گے، ایسی صورت میں یہ معاملۂ استصناع حاکم شہیدؒ وغیرہ کے قول کے مطابق وعدۂ بیع ہے اور عامۃ المشائخ اور جمہور کے نزدیک عقد بیع ہے، جس کو استصناع کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس کو معاملۂ اجارہ میں کسی نے بھی داخل نہیں کیا (جیسا کہ اس کی تفصیل عقدِ استصناع بیع ہے یا وعدۂ بیع ہے کے عنوان کے ذیل میں مفصل طور پر آچکی ہے)

(۲) مال تیار کرنے کا سامان اور مٹیریل خریدار کی طرف سے ہو اور کاریگر کا کام صرف یہی ہے کہ طے شدہ شرائط کے مطابق مال بنا کر تیار کردے اور اس میں اس کو اپنی طرف سے کوئی سامان نہیں لگانا ہے، تو ایسی صورت میں استصناع کی یہ شکل عقد بیع یا معاہدۂ بیع نہیں رہے گی؛ بلکہ استصناع کی شکل میں اجارہ بن جائے گی۔ اور صانع (کاریگر) اجیر مشترک بن جائے گا اور آرڈر دینے والا مستصنع مستاجر بن جائے گا۔ اس سلسلے میں حضرات فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمایئے، اس کو فتاویٰ تاتارخانیہ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:

وَالْاِسْتِصْنَاعُ أَنْ يَكُوْنَ الْعَيْنُ وَالْعَمَلُ مِنَ الصَّانِعِ، فَأَمَّا إِذَا كَانَ الْعَيْنُ مِنَ الْمُسْتَصْنِعِ لَا مِنَ الصَّانِعِ يَكُوْنُ إِجَارَةً وَلَا يَكُوْنُ اسْتِصْنَاعًا. (تاتارخانية، زكريا ١٥/ ٣٤٧، رقم: ٢٣٣٢٣)

استصناع کی شکل یہ ہے کہ عین (مال کا سامان) اور عمل دونوں کاریگر کی طرف سے ہو، پس بہرحال جب سامان مستصنع (آرڈر دینے والے) کی طرف سے ہو، کاریگر کی طرف سے نہ ہو، تو یہ معاملہ اجارہ بن جائے گا اور بیع استصناع باقی نہیں رہے گا۔

اور ''شرح المجلہ'' میں اس کو ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:

وَشَرْطُهُ أَنْ يَكُوْنَ الْعَيْنُ وَالْعَمَلُ مِنَ الصَّانِعِ، فَإِنْ كَانَتِ الْعَيْنُ مِنَ الْمُسْتَصْنِعِ كَانَ الْعَقْدُ إِجَارَةً. (شرح المجلة ١/ ٦٩)

اور استصناع کی شرط یہی ہے کہ سامان اور عمل دونوں کاریگر کی طرف سے ہو؛ لہٰذا اگر سامان مستصنع (آرڈر دینے والے) کی طرف سے ہو تو عقد اجارہ بن جائے گا۔

بین الاقوامی تجار جن کی فیکٹریاں بڑی اور وسیع ہوتی ہیں، ان کے یہاں یہی شکل زیادہ پیش آتی ہے، وہ لوگ باہر سے خام مال ایمپورٹ کرکے لاتے ہیں اور کارخانہ دار اور کاریگروں کو اپنی ہی فیکٹری میں ٹھیکہ پر رکھتے ہیں اور اسی فیکٹری میں ہی کاریگروں کو ایکسپوٹر نمونہ اور سائز دکھا کر مال بنانے کا آرڈر دیتے ہیں اور کچا مال بھی اپنی طرف سے ان کو دیتے ہیں، پھر ٹھیکہ دار اپنے کاریگروں کے ذریعہ سے اسی خام مال کو گلا کر طے شدہ شرائط کے مطابق مال کا آرڈر تیار کرکے ایکسپوٹر کو پیش کرتے ہیں، پھر ایکسپوٹر اس مال کی پیکنگ وغیرہ کرکے اپنے خریداروں کو ایکسپورٹ کرتے ہیں، تو ایسی صورت میں ان بڑے تاجروں کے یہاں اپنے کاریگروں سے مال بنوانے کا معاملہ اجارہ ہی کا ہوگا، بیع یا معاہدہ بیع کا نہیں ہوگا، ہاں البتہ ایکسپوٹر اور اس کے خریدار کے درمیان میں بیع استصناع کا معاملہ جاری رہے گا۔

طے شدہ شرائط اور نمونہ کی خلاف ورزی پر نقصان کا بھگتان کس پر؟

طے شدہ شرائط اور نمونہ کی خلاف ورزی کی دو شکلیں ہوسکتی ہیں:

(۱) استصناع کی شکل خریدار نے بائع کو نمونہ اور سائز پیش کردیا اور مال بنانے کے لئے سارے شرائط جانبین میں طے ہوگئے، اس کے بعد کاریگر نے اپنے مٹیریل کے ذریعہ سے مال بنا کر تیار کردیا ہے، مگر جو مال تیار کردیا ہے وہ نمونہ اور شرائط کے خلاف ہے، ایسی صورت میں مشتری کو اختیار رہے کہ مال قبول کرے یا واپس کردے اور واپسی کی صورت میں جو بھی نقصان ہوگا، اس کا پورا بھگتان کاریگر کو اٹھانا پڑے گا، آرڈر دینے والا خریدار نقصان کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔ اس کو شرح مجلہ رستم باز میں مادہ ۳۹۲ رمیں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

وَإِذَا لَمْ يَكُنِ الْمَصْنُوْعُ عَلَى الْأَوْصَافِ الْمَطْلُوْبَةِ الْمُبَيَّنَةِ كَانَ الْمُسْتَصْنِعُ مُخَيَّرًا لِفَوَاتِ الْوَصْفِ الْمَرْغُوْبِ فِيْهِ. (شرح المجلة ١/ ٢٢١، رقم: ٣٩٢، الفقه الإسلامي ٤/ ٣٩٨)

اور جب بنا ہوا مال طے شدہ اور واضح اوصاف کے مطابق نہ ہو تو آرڈر دینے والے خریدار کو ایسے پسندیدہ اوصاف کے نہ ہونے کی وجہ سے اختیار حاصل ہوگا، جس کی شرط اس میں لگائی گئی تھی۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ مطلوبہ شرائط اور نمونہ کے مطابق مال نہ بنانے کی وجہ سے مستصنع (آرڈر دینے والے خریدار) کو صرف اتنا اختیار ہوگا کہ وہ مال لینے سے انکار کردے اور اس مال کے بنانے میں کاریگر کی محنت وغیرہ کے نقصان کا بھگتان خود کاریگر برداشت کرے گا اور خریدار کو اس مال سے متوقع منافع میں جو نقصان ہوا ہے اس نقصان کی تلافی کاریگر سے نہیں کرسکتا۔

(۲) اجارہ کی شکل ایکسپوٹر نے کاریگر اور ٹھیکیدار کو نمونہ کے مطابق مال بنانے کے لئے مٹیریل اور خام مال اپنی طرف سے پیش کردیا ہے، تو دو صورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱) ٹھیکیدار اور کاریگر نے مال تیار کرنے میں نمونہ اور شرائط کی خلاف ورزی کی ہے، تو ایسی صورت میں ٹھیکیدار اور کاریگر خام مال اور مٹیریل کا ضامن ہوگا کہ مٹیریل جیسا آیا تھا ویسا ہی اسی کے ہم مثل واپس کردے گا اور آرڈر دینے والے ایکسپوٹر کا جو مال خراب ہوا ہے وہ ٹھیکیدار اور کاریگر کو مل جائے گا اور محنتانہ کا جو نقصان ہوا ہے اس کا بھگتان ٹھیکیدار اور کاریگر کو برداشت کرنا پڑے گا اور اس نقصان میں آرڈر دینے والا ایکسپوٹر شریک نہیں ہوگا۔

اس کو صاحبِ بدائع نے اس طرح کے الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

فَإِنْ سَلَّمَ إِلٰى حَدَّادٍ حَدِيْدًا لِيَعْمَلَ لَهُ إِنَاءً مَعْلُوْمًا بِأَجْرٍ مَعْلُوْمٍ، أَوْ جِلْدًا إِلٰى خِفَافٍ لِيَعْمَلَ لَهُ خُفًّا مَعْلُوْمًا بِأَجْرٍ مَعْلُوْمٍ، فَذٰلِكَ جَائِزٌ، وَلَا خِيَارَ فِيْهِ؛ لِأَنَّ هٰذَا لَيْسَ بِاسْتِصْنَاعٍ بَلْ هُوَ اسْتِئْجَارٌ فَكَانَ جَائِزًا، فَإِنْ عَمِلَ كَمَا أَمَرَ اسْتَحَقَّ الْأَجْرَ، وَإِنْ فَسَدَ

پس اگر لوہا وغیرہ دھات کے کاریگر کو لوہے کی دھات سونپ دی ہے، تاکہ اس کے لئے متعین اجرت کے عوض میں متعین برتن بنا کردے، یا جوتا موزہ کے کاریگر کو چمڑا سونپ دیا ہے، تاکہ اس کے لئے متعین اجرت کے بدلہ میں متعین شرائط کے مطابق جوتا موزہ بنا کر تیار کردے، تو ایسا معاملہ جائز ہے اور اس میں کسی قسم کا خیار نہیں ہے؛ اس لیے کہ یہ عقد استصناع نہیں ہے؛ بلکہ وہ اجارہ بن کر کے جائز ہوگیا ہے؛ لہٰذا اگر حکم کے مطابق مال بنادیا ہے، تو طے شدہ اجرت کا مستحق ہو جائے گا اور اگر مال کو بگاڑ دیا ہے، تو آرڈر دینے والے

فَلَهُ أَنْ يُضَمِّنَهُ حَدِيْدًا مِثْلَهُ؛ لِأَنَّهُ لَمَّا أَفْسَدَهُ، فَكَأَنَّهُ أَخَذَ حَدِيْدًا لَهُ وَاتَّخَذَ مِنْهُ آنِيَةً مِنْ غَيْرِ إِذْنِهِ، وَالإِنَاءُ لِلصَّانِعِ؛ لِأَنَّ الْمَضْمُونَاتِ تُمْلَكُ بِالضَّمَانِ. (بدائع زکریا دیوبند ۴/ ۹۶، کراچی ۵/ ٤)

کے لئے اسی کے ہم مثل لوہے کی دھات کا تاوان وصول کرنا جائز ہے، اس لئے کہ جب کاریگر نے اسے بگاڑ دیا ہے، تو گویا کہ کاریگر نے اس کے لوہے کی دھات لے کر اس دھات سے اس کی اجازت کے بغیر برتن بنا دیا ہے اور برتن کاریگر کو مل جائے گا؛ اس لئے کہ بنے ہوئے برتن کا ضمان اور تاوان کے بدلہ میں کاریگر مالک ہو جاتے ہیں۔

(۲) دوسری صورت اجارہ کی شکل میں یہ ہوسکتی ہے کہ ایکسپوٹر اور مالیاتی ادارہ نے مال بنانے کے لئے سارا مٹیریل اپنی طرف سے کاریگر کو دیا ہے اور کاریگر نے مال بنانے میں نمونہ، سائز اور ڈیزائن کی خلاف ورزی کی ہے کہ مال کا ڈیزائن خراب کر دیا، یا مال کو چھوٹا بڑا کر دیا، تو ایسی صورت میں مالیاتی ادارہ کے ذمہ دار ایکسپوٹر وغیرہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ بنا ہوا مال اسی حالت میں کاریگر کو دے دے اور اپنے دیئے ہوئے مٹیریل کے ہم مثل مٹیریل اس سے وصول کر لے، یا تیار شدہ وہی مال قبول کر لے، اگر مال کی قیمت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، تو اس کو پوری اجرت ادا کر دے؛ لیکن اگر مال خراب بنانے کی وجہ سے مال کی قیمت گھٹ گئی ہے، تو جتنی گھٹی ہے اتنے نقصان کی تلافی کاریگر کی اجرت میں سے وصول کر لے۔

یہ حکم مبسوط سرخسی کی اس عبارت سے واضح ہوتا ہے:

وَلَوْ أَسْلَمَ غَزْلًا إِلَى حَائِكٍ لِيَنْسَجَ لَهُ سَبْعًا فِي أَرْبَعٍ، فَحَاكَهُ أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ أَوْ أَصْغَرَ فَهُوَ بِالْخِيَارِ إِنْ شَاءَ ضَمَّنَهُ مِثْلَ غَزْلِهِ وَسَلَّمَ لَهُ الثَّوْبَ، وَإِنْ

اور اگر کپڑا بننے والے کو سوت اور دھاگا پیش کر دیا ہے، تاکہ اس کے لئے چار بائی سات طول وعرض میں کپڑا بنا کر دے، تو کپڑا بننے والے نے اس سے بڑا بنا دیا، یا اس سے چھوٹا تو آرڈر دینے والے کو اختیار ہے کہ اگر چاہے اپنے دیئے ہوئے سوت اور دھاگے کے ہم

شَاءَ أَخَذَ ثَوْبَهُ وَأَعْطَاهُ الْأَجْرَ إِلَّا فِي النُّقْصَانِ؛ فَإِنَّهُ يُعْطِيهِ الأَجْرَ بِحِسَابِ ذٰلِكَ وَلاَ يُجَاوَزُ بِهِ مَا سَمَّى. (مبسوط سرخسي ١٥/ ٨٦)

مثل تاوان میں وصول کرلے اور بنا ہوا کپڑا بننے والے کو دے دے اور اگر چاہے تو اسی کپڑے کو لے کر اس کی اجرت ادا کردے، الا یہ کہ قیمت کا نقصان ہوجائے تو بے شک وہ اس نقصان کو مجری کرکے اجرت دے گا۔ اور اس میں متعین قیمت سے تجاوز نہیں کرے گا۔

معاملۂ استصناع کو منسوخ کرنے کی شکلیں

نمونہ، سائز اور طے شدہ شرائط کے مطابق فریقین کے درمیان استصناع کا معاملہ طے ہوجانے کے بعد پھر اس معاملہ کو جانبین میں سے کسی ایک کی طرف سے فسخ کرکے ختم کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ تو اس کی تین شکلیں پیش آسکتی ہیں:

شکل (۱): طے شدہ شرائط کے مطابق معاملۂ استصناع جانبین کے درمیان طے ہوجانے کے بعد ابھی مال بنانے کی تیاری شروع نہیں ہوئی ہے، تو اس حالت میں جانبین میں سے کسی کو بھی معاملہ منسوخ کرنے کا اختیار ہے، ایسی صورت میں کسی کا کوئی نقصان نہیں ہوتا ہے، اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

وَأَمَّا صِفَةُ الاسْتِصْنَاعِ فَهِيَ: أَنَّهُ عَقْدٌ غَيْرُ لَازِمٍ قَبْلَ الْعَمَلِ فِي الْجَانِبَيْنِ جَمِيعًا بِلَا خِلَافٍ حَتّٰى كَانَ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا خِيَارُ الامْتِنَاعِ قَبْلَ الْعَمَلِ. (بدائع الصنائع زكريا ٤/ ٩٥، كراچی ٥/ ٣)

جانبین کے درمیان عمل سے پہلے بالاتفاق عقد غیر لازم ہے، یہاں تک کہ مال کی تیاری سے پہلے دونوں میں سے ہر ایک کے لئے معاملہ کو ختم کرنے کا اختیار ہے۔

شکل (۲): مال بنانے کی تیاری شروع ہوگئی ہے، مگر ابھی مال نمونہ کے مطابق مکمل تیار نہیں ہو پایا ہے، تو ایسی صورت میں خریدار کو معاملہ ختم کرنے کا اختیار ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں

جمہور کی رائے یہی ہے کہ چوں کہ آرڈر دینے والے خریدار کے نمونہ کے مطابق ابھی مال تیار نہیں ہوا ہے؛ اس لئے آرڈر کینسل کر دینے کا خریدار کو اختیار رہے گا۔ اس کو صاحب بدائع نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

إِذَا قَطَعَ الْجِلْدَ وَلَمْ يَعْمَلْ فَقَالَ الْمُسْتَصْنِعُ: لَا أُرِيْدُ لِأَنَّا لَا نَدْرِيْ أَنَّ الْعَمَلَ يَقَعُ عَلَى الصِّفَةِ الْمَشْرُوْطَةِ أَوْ لَا فَلَمْ يَكُنِ الامْتِنَاعُ مِنْهُ إِضْرَارًا بِصَاحِبِهِ، فَثَبَتَ الْخِيَارُ. (بدائع الصنائع زكريا ٤/ ٩٦، كراچى ٥/ ٤)

جب چمڑے کو جوتا یا موزہ بنانے کے لئے کاٹ لیا ہے اور ابھی بنایا نہیں ہے، تو آرڈر دینے والے خریدار نے کہا: میں لینے کا ارادہ نہیں رکھتا؛ اس لئے کہ ہم نہیں جانتے ہیں کہ تمہارا کام ہمارے طے شدہ شرائط کے مطابق ہو پائے گا یا نہیں؟ لہٰذا اس حالت میں لینے سے منع کر دینا اپنے فریق کو نقصان پہنچانے کے مرادف نہیں ہوگا؛ اس لئے اس کو فسخ کا اختیار حاصل ہوگا۔

شکل (۳): طے شدہ شرائط اور نمونہ کے مطابق مال تیار ہو چکا ہے اب مکمل تیار ہو جانے کے بعد یہ معاملہ ختم کرنے کا اختیار ہو سکتا ہے یا نہیں؟ تو ایسی صورت میں اگر مال مکمل تیار کر کے کاریگر نے آرڈر دینے والے مشتری کے پاس پیش کر دیا ہے اس کے بعد کاریگر معاملہ ختم کر کے مال واپس لے جانا چاہے، تو کسی کے نزدیک بھی واپس لے جانا جائز نہیں ہے، مگر اختلاف اس بارے میں ہے کہ آرڈر دینے والے خریدار کو ایسی حالت میں واپس کر دینے کا اختیار ہے یا نہیں؟ تو جمہور احناف کے نزدیک ایسی صورت میں بھی آرڈر دینے والے خریدار کو خیار رؤیت حاصل رہے گا، چنانچہ خریدار مال دیکھنے کے بعد یہ کہہ کر واپس کر سکتا ہے کہ اگر چہ طے شدہ شرائط اور نمونہ کے مطابق مال بن گیا ہے؛ لیکن مال مجھے پسند نہیں ہے میں نہیں لوں گا، یہ قول ظاہر الروایہ کے مطابق ہے؛ لیکن حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مال تیار ہونے سے پہلے پہلے عقد غیر لازم رہتا ہے اور مال مکمل تیار ہو جانے کے بعد یہ عقد خود بخود لازم ہو جاتا ہے اور آرڈر دینے والے مشتری کو خیار رویت حاصل نہیں ہوگا؛

اس لئے کہ ایسی حالت میں مشتری کو اگر خیار رؤیت کے نام سے اختیار دیا جائے اور وہ مال لینے سے انکار کردے تو بائع (کاریگر) کو بڑا نقصان ہوسکتا ہے اور شریعت چھوٹے نقصان کے مقابلے میں بڑے نقصان سے بچنے کو اہمیت دیتی ہے؛ اس لئے خریدار پر لازم ہوجائے گا کہ مال کو واپس نہ کرے اور بلا کسی اڑچن لگائے اس کو قبول کرلے، اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے۔ بدائع کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

فَأَمَّا إِذَا أَحْضَرَ الصَّانِعُ الْعَيْنَ عَلَى الصِّفَةِ الْمَشْرُوْطَةِ فَقَدْ سَقَطَ خِيَارُ الصَّانِعِ وَلِلْمُسْتَصْنِعِ الْخِيَارُ؛ لِأَنَّ الصَّانِعَ بَائِعٌ مَا لَمْ يَرَهُ فَلا خِيَارَ لَهُ، وَأَمَّا الْمُسْتَصْنِعُ فَمُشْتَرِي مَا لَمْ يَرَهُ، فَكَانَ لَهُ الْخِيَارُ (إلى قوله) هٰذَا جَوَابُ ظَاهِرِ الرِّوَايَةِ عَنْ أَبِي حَنِيْفَةَؒ وَأَبِي يُوْسُفَؒ وَمُحَمَّدٍؒ، وَرُوِيَ عَنْ أَبِي حَنِيْفَةَؒ أَنَّ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا الْخِيَارُ، وَرُوِىَ عَنْ أَبِي يُوْسُفَ: أَنَّهُ لا خِيَارَ لَهُمَا، وَجْهُ رِوَايَةِ أَبِي يُوْسُفَ أَنَّ الصَّانِعَ قَدْ أَفْسَدَ مَتَاعَهُ وَقَطَعَ جِلْدَهُ وَجَاءَ بِالْعَمَلِ عَلَى الصِّفَةِ

اور بہر حال جب کاریگر سامان کو طے شدہ شرائط کے مطابق بنا کر پیش کردے تو کاریگر کا اختیار ختم ہوجائے گا اور آرڈر دینے والے خریدار کو اختیار باقی رہے گا؛ اس لئے کہ کاریگر ایسی چیز کا بیچنے والا ہے جس کو اس نے نہیں دیکھا ہے (پھر بنا کر تیار کرنے کے بعد) اس کے لئے خیار ثابت نہیں ہوگا اور بہر حال آرڈر دینے والا خریدار ایسی چیز کا خریدنے والا ہے جس کو اس نے دیکھا نہیں ہے؛ اس لئے اس کو خیار رؤیت حاصل ہوگا، یہ ظاہر الروایہ کا جواب ہے جو امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ سے مروی ہے۔ اور امام ابوحنیفہؒ سے ایک روایت یہ ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک کو اختیار حاصل ہوگا اور امام ابو یوسفؒ سے ایک روایت یہ ہے کہ دونوں میں سے کسی کو بھی فسخ کا اختیار حاصل نہیں ہوگا۔ اور امام ابو یوسفؒ کی روایت کی وجہ یہ ہے کہ کاریگر نے اپنا

الْمَشْرُوطَةِ فَلَوْ كَانَ لِلْمُسْتَصَنِعِ الامْتِنَاعُ مِنْ أَخْذِهِ لَكَانَ فِيهِ إِضْرَارٌ بِالصَّانِعِ. (بدائع الصنائع زكريا ديوبند ٤/ ٩٥، ٩٦، كراچى ٥/ ٣، ٤)

سامان مال بنانے کے لئے توڑ دیا اور چمڑا کاٹ دیا اور اس کے بعد طے شدہ شرائط کے مطابق مال بنا کر تیار کرلیا ہے، پھر اگر آرڈر دینے والا خریدار اس کو لینے سے انکار کردیگا تو کاریگر کو بڑا نقصان پہنچ جائے گا۔

اور اسی کو عنایہ میں اس طرح کے الفاظ سے نقل کیا گیا ہے:

وَعَنْ أَبِي يُوسُفَ أَنَّهُ لا خِيَارَ لَهُمَا، أَمَّا الصَّانِعُ فَلِمَا ذَكَرْنَا أَوَّلًا، وَأَمَّا الْمُسْتَصْنِعُ فَلأَنَّ الصَّانِعَ أَتْلَفَ مَالَهُ بِقَطْعِ الصَّرْمِ وَغَيْرِهِ لِيَصِلَ إِلَى بَدَلِهِ، فَلَوْ ثَبَتَ لَهُ الْخِيَارُ تَضَرَّرَ الصَّانِعُ؛ لِأَنَّ غَيْرَهُ لا يَشْتَرِيهِ بِمِثْلِهِ، أَلا تَرَى! أَنَّ الْوَاعِظَ إِذَا اسْتَصْنَعَ مِنْبَرًا وَلَمْ يَأْخُذْهُ فَالْعَامِيُّ لا يَشْتَرِيهِ أَصْلاً. (عناية مع فتح القدير زكريا ديوبند ٧/ ١٠٩، كوئٹه پاكستان ٦/ ٢٤٢، دارالفكر ٧/ ١١٦)

اور امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ دونوں میں سے کسی کو فسخ کا اختیار نہیں ہے، بہر حال صانع کو اس لئے نہیں ہے کہ جو ہم نے شروع میں ذکر کیا ہے اور بہر حال آرڈر دینے والے خریدار کو اس لئے اختیار حاصل نہیں ہے کہ کاریگر نے اپنا مال چمڑا وغیرہ کاٹنے کے ذریعہ سے خراب کردیا ہے، تاکہ اس کا بدل (قیمت) حاصل کرلے؛ لہٰذا اگر خریدار کے لئے اختیار ثابت ہوجائے تو کاریگر کو نقصان پہنچ جائے گا؛ اس لئے کہ اس خریدار کے علاوہ دوسرا آدمی اس جیسی چیز خریدتا نہیں ہے، کیا نہیں دیکھتے ہو کہ بے شک خطیب نے جب منبر بنوا کر اس کو نہیں لیا تو عام آدمی اسے بالکل نہیں خریدے گا۔

امام ابو یوسفؒ کے قول کی ترجیح

امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق عقدِ استصناع بیع لازم ہے اور جب نمونہ اور شرائط کے مطابق مال تیار ہوجائے اس کے بعد اگر آرڈر دینے والے خریدار کو مال قبول نہ کرنے کا اختیار دیا جائے، تو کاریگر کا زبردست نقصان ہوسکتا ہے اور بلا کسی شرعی وجہ کے کاریگر کو اتنے بڑے نقصان کا مکلّف شریعت نہیں بناتی؛ اسی لئے حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول کو راجح قرار

دیا جائے اور آرڈر دینے والے خریدار پر لازم کردیا جائے کہ اس کو قبول کرنے کا پابند ہوجائے۔ اور خیار رؤیت استعمال کرنے کا حق اس کو حاصل نہیں ہوگا، اسی کو مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے بھی ''اسلام اور جدید معاشی مسائل ۵/ ۱۵۵'' میں واضح فرما کر ترجیح دی ہے؛ اسی لئے امام ابو یوسفؒ کی رائے کو ترجیح دینے میں علماء متفق ہوجائیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ نیز فتاویٰ تاتارخانیہ میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ امام ابو یوسفؒ شروع میں امام ابوحنیفہؒ کی طرح اس بات کے قائل تھے کہ عقدِ استصناع عقد غیر لازم ہے؛ لہٰذا معاملہ ہوجانے کے بعد فریقین میں سے ہر ایک کو اختیار رہے گا، چاہے عقد کو باقی رکھے یا ختم کردے، اس کے بعد امام ابو یوسفؒ نے اپنے اس قول سے رجوع کر کے فرمایا کہ صانع پر جبر نہیں کیا جاسکتا اور مستصنع کو قبول کرنے پر مجبور کیا جائے گا، پھر اس کے بعد امام ابو یوسفؒ نے اپنے اس قول سے بھی رجوع کر کے فرمایا کہ استصناع کا معاملہ منعقد ہوجانے کے بعد عقد لازم ہوجائے گا اور جانبین میں سے کسی کو بھی مسترد کرنے کا حق نہیں ہوگا؛ بلکہ کاریگر کو عمل پر مجبور کیا جائے گا اور آرڈر دینے والے خریدار کو مبیع کے قبول کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔ اور آج کے زمانہ میں حضرت امام ابو یوسفؒ کے اس قول سے کوئی مفر نہیں ہے، ورنہ جانبین کو نقصان اٹھاتے رہنا پڑے گا۔ حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول ہی کو مفتی بہ قرار دینا زیادہ مناسب ہوگا۔ عبارت ملاحظہ فرمائیے:

وَرَوَى أَبُو يُوسُفَ عَنْ أَبِي حَنِيفَةَؒ: الصَّانِعُ لَا يُجْبَرُ عَلَى الْعَمَلِ بَلْ يَتَخَيَّرُ إِنْ شَاءَ فَعَلَ وَإِنْ شَاءَ لَمْ يَفْعَلْ، وَإِذَا أَتَى الصَّانِعُ بِالْمَصْنُوعِ لَا يُجْبَرُ الْمُسْتَصْنِعُ عَلَى الْقَبُولِ بَلْ هُوَ بِالْخِيَارِ إِنْ شَاءَ قَبِلَ وَإِنْ شَاءَ لَمْ يَقْبَلْ	حضرت امام ابو یوسفؒ امام ابوحنیفہؒ سے روایت کرتے ہیں کہ کاریگر کو عمل پر مجبور نہیں کیا جائے گا؛ بلکہ اس کو اختیار رہے گا، چاہے کرے اور چاہے نہ کرے اور جب کاریگر شرائط کے مطابق مال بنا کر کے لے آئے تو آرڈر دینے والے خریدار کو قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا؛ بلکہ اس کو اختیار ہے چاہے قبول کرلے اور چاہے قبول نہ کرے۔ اور امام ابو یوسفؒ نے شروع

وَقَالَ أَبُويُوسُفَ أَوَّلًا: يُجْبَرُ الْمُسْتَصْنِعُ دُونَ الصَّانِعِ، وَهُوَ رِوَايَةٌ عَنْ أَصْحَابِنَا، ثُمَّ رَجَعَ عَنْ هٰذَا وَقَالَ: لاَ خِيَارَ لِوَاحِدٍ مِّنْهُمَا، بَلْ يُجْبَرُ الصَّانِعُ عَلَى الْعَمَلِ، وَيُجْبَرُ الْمُسْتَصْنِعُ عَلَى الْقَبُولِ.

(الفتاوی التاتارخانیة زکریا ۹/ ۱۰۴، رقم: ۱۳۷۱۹)

میں یہ فرمایا تھا کہ آرڈر دینے والے خریدار کو قبول کرنے پر مجبور کیا جائے گا، صانع کو عمل پر مجبور نہیں کیا جائے گا، یہ ہمارے اصحاب کی ایک روایت ہے، پھر امام ابویوسفؒ نے اس قول سے رجوع کر کے فرمایا کہ دونوں میں سے کسی ایک کو بھی اختیار نہیں ہے؛ بلکہ صانع (کاریگر) کو عمل پر مجبور کیا جائے گا اور آرڈر دینے والے (مستصنع) کو قبول کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔

اور یہ حکم ملتقی الابحر کی ذیل کی عبارت سے بھی واضح ہوتا ہے:

وَهُوَ بَيْعٌ لَا عِدَةٌ، فَيُجْبَرُ الصَّانِعُ عَلٰى عَمَلِهِ وَلَا يَرْجِعُ الْمُسْتَصْنِعُ عَنْهُ. (ملتقي الابحر مع مجمع الأنهر بيروت ۳/ ۱۴۹)

اور وہ عقد بیع ہے وعدۂ بیع نہیں ہے؛ لہٰذا کاریگر کو عمل پر مجبور کیا جائے اور آرڈر دینے والے مستصنع کو اس عقد سے رجوع کا حق نہیں ہوگا۔

عقدِ استصناع میں مدت کی تعیین کا مسئلہ

عقدِ سَلَم میں مسلم فیہ (مبیع) کے سونپنے کے زمانہ اور مدت کی تعیین لازم ہے، مگر عقدِ استصناع میں زمانہ اور مدت کی تعیین کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر مدت متعین کردی جائے، تو عقدِ استصناع عقدِ سلم میں تبدیل ہوجائے گا؛ لیکن حضرات صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ ایسی کوئی شرط مشروط نہیں ہے؛ اس لئے کہ عقدِ استصناع کا سارا مدار تعامل ناس اور عرف پر ہے اور جب تعاملِ ناس اور عرف میں عقدِ استصناع کے اندر مدت متعین کرنے کا سلسلہ جاری ہوجائے تو اس کا اعتبار کرنا ضروری ہوجائے گا؛ لہٰذا اگر عقدِ استصناع میں مبیع کو سونپنے کی مدت متعین کردی جائے تو وہ سلم میں تبدیل نہیں ہوگا؛ بلکہ بدستور معاملہ عقدِ استصناع کے طور پر باقی رہے گا؛ اس لئے عقدِ استصناع دونوں طرح جائز ہوگا کہ اگر مدت متعین کردی جاتی ہے تب بھی عقدِ استصناع ہی رہے گا اور مدت متعین نہ کرے تب بھی

استصناع ہی کے دائرہ میں رہے گا۔ اور دورِ حاضر میں استصناع کے معاملہ میں عام طور پر مدت متعین کرنے کا دستور ہے، تاکہ جانبین کے لوگ اس کی پابندی کی کوشش کریں اور زیادہ تاخیر کی وجہ سے آرڈر دینے والے کو نقصان نہ پہنچے اور اس زمانہ کے تعامل کے لحاظ سے صاحبینؒ کے قول کو ترجیح حاصل ہوگی۔

اس کو صاحب بدائع نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

وَمِنْهَا أَنْ لايَكُوْنَ فِيْهَا أَجَلٌ، فَإِنْ ضَرَبَ لِلْاسْتِصْنَاعِ أَجَلاً صَارَ سَلَمًا (قوله) وَهٰذَا قَوْلُ أَبِي حَنِيْفَةَ، وَقَالَ أَبُوْيُوْسُفَ وَمُحَمَّدٌ: هٰذَا لَيْسَ بِشَرْطٍ وَهُوَ اسْتِصْنَاعٌ عَلٰى كُلِّ حَالٍ، ضَرَبَ فِيْهِ أَجَلاً أَوْ لَمْ يَضْرِبْ. (بدائع الصنائع زكريا ٤/ ٩٤، كراچی ٥/ ٣، اسی طرح کی عبارت البحر الرائق زکریا دیوبند ٦/ ٢٨٥، کوئٹہ ٦/ ١٧١، مبسوط سرخسی ١٢/ ٣٩، تبيين الحقائق ملتان ٤/ ١٢٤، زکریا ۴/ ۵۲۸ میں موجود ہے)

اور ان شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ استصناع کے اندر مدت متعین نہ ہو؛ لہٰذا اگر استصناع میں مدت متعین کردے گا، تو وہ سلم میں تبدیل ہوجائے گا اور یہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ شرط مشروط نہیں ہے اور یہ عقد ہر حال میں استصناع ہی رہے گا، اس میں مدت متعین کردی ہو یا نہ کی ہو۔

اور اس حکم کو ''الفقہ الإسلامی'' میں مزید واضح الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

وَقَالَ الصَّاحِبَانِ: لَيْسَ هٰذَا بِشَرْطٍ، وَالْعَقْدُ اسْتِصْنَاعٌ عَلٰى كُلِّ حَالٍ حُدِّدَ فِيْهِ أَجَلٌ أَوْ لَمْ يُحَدَّدْ؛ لِأَنَّ الْعَادَةَ جَارِيَةٌ بِتَحْدِيْدِ الْأَجَلِ فِي الاسْتِصْنَاعِ، فَيَكُوْنُ شَرْطًا صَحِيْحًا لِذٰلِكَ. (الفقه الإسلامي ٤/ ٣٩٦)

اور صاحبینؒ نے فرمایا کہ ایسی کوئی شرط مشروط نہیں ہے اور عقد ہر حال میں استصناع کے طور پر باقی رہے گا، اس میں مدت متعین کردی ہو یا نہ کی ہو؛ اس لئے کہ عادت وعرف عقد استصناع میں مدت متعین کرنے کے بارے میں جاری ہوچکی ہے؛ لہٰذا شرعی طور پر یہ جائز اور صحیح ہوجائے گا۔

عقدِ استصناع میں طے شدہ مدت سے تاخیر کے نقصان کا عوض

عقدِ استصناع میں مال تیار کر کے پیش کرنے کی مدت کا تعین لازم اور ضروری نہیں ہے؛ بلکہ اس میں جانبین کو اختیار ہے کہ مدت متعین کریں، یا نہ کریں؛ لہٰذا اگر جانبین کی تراضی سے مدت متعین ہو جاتی ہے اور مال تیار کنندہ اس کی فراہمی میں طے شدہ وقت سے تاخیر کر دے، تو آرڈر دینے والے خریدار کو اختیار ہے کہ قیمت ادا کر کے اسے قبول کر لے، یا اس کو قبول کرنے سے انکار کر دے، تو اس بات کو یقینی بنانے کے لئے آپس کی تراضی سے معاملہ کے وقت یہ طے کر لیں کہ بائع مال تیار کر کے فراہم کر دینے میں اگر متعین وقت سے تاخیر کرے گا تو اس پر جرمانہ عائد ہوگا، جیسا کہ بین الاقوامی مارکیٹ میں اس طرح کی تاخیر کی صورت میں کِلم کاٹنے کا تعامل اور دستور جاری ہے، تو سوال یہ ہے کہ شریعت میں بھی اس طرح کسی تعزیری جرمانے کی گنجائش ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلے میں مبسوط سرخسی میں مسئلہ اجارہ کی بحث کے تحت میں تاخیر کے نتیجہ میں کلمِ کاٹنے کی شرط کو جائز قرار دیا ہے، چنانچہ حضرات فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے کپڑوں کو سلائی کے لئے کسی خیاط کو یہ کہہ کر کے کپڑا پیش کرتا ہے کہ اگر خیاط ایک دن میں یہ کپڑا تیار کر دے، تو اس کی اجرت سو روپیہ ہوگی اور اگر دو دن میں تیار کرتا ہے، تو اجرت سو روپیہ کے بجائے پچاس روپیہ ہو جائے گی، تو اس طرح کی تاخیر کی کِلم کاٹنا مسئلۂ اجارہ کے ذیل میں فقہاء نے جائز لکھا ہے، تو اس طرح سے عقد استصناع میں بھی مال کی قیمت کو فراہمی کے وقت کے ساتھ منسلک کیا جا سکتا ہے؛ لہٰذا اگر فریقین اس بات پر متفق ہو جائیں کہ فراہمی میں تاخیر کی صورت میں فی یوم یا فی ہفتہ قیمت میں سے متعین مقدار کم ہوتی جائے گی، تو ایسا کرنا شرعاً جائز ہوگا۔ اور اس زمانہ کے مفکر حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہ نے بھی اس کو جائز لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو ''اسلام اور جدید معاشی مسائل ۵/ ۱۵۶''۔ اب فقہاء کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

لَوْ دَفَعَ إِلَيْهِ ثَوْبًا لِيَقْطَعَهُ قَمِيصًا، وَاشْتَرَطَ عَلَيْهِ إِنْ خَاطَهُ الْيَوْمَ فَلَهُ دِرْهَمٌ، وَإِنْ لَمْ يَفْرُغْ مِنْهُ الْيَوْمَ فَلَهُ نِصْفُ دِرْهَمٍ، عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ إِنْ خَاطَهُ الْيَوْمَ فَلَهُ دِرْهَمٌ، وَإِنْ لَمْ يَفْرُغْ مِنْهُ الْيَوْمَ فَلَهُ أَجْرُ مِثْلِهِ، لَا يَنْقُصُ عَنْ نِصْفِ دِرْهَمٍ وَلَا يُجَاوِزُ بِهِ دِرْهَمًا. وَقَالَ أَبُويُوسُفَ وَمُحَمَّدٌ رَحِمَهُمَا اللّٰهُ تَعَالٰى: وَهُوَ عَلَى مَااشْتَرَطَ إِذَا فَرَغَ مِنْهُ الْيَوْمَ فَلَهُ دِرْهَمٌ، وَإِنْ فَرَغَ مِنْهُ بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهُ نِصْفُ دِرْهَمٍ (إلى قوله) ثُمَّ رَجَعَ أَبُوحَنِيفَةَ فَقَالَ: الشَّرْطَانِ جَائِزَانِ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي يُوسُفَ وَمُحَمَّدٍ. (مبسوط سرخسي ١٥/ ٩٩، ١٠٠)

اور اگر درزی کو کوئی کپڑا یہ کہہ کر دیا ہے کہ اسے کاٹ کر قمیص بنا دے اور اس پر یہ شرط لگائی ہے کہ اگر اس کو آج سی کر تیار کر دے گا، تو اس کے لئے ایک درہم ہے اور اگر آج اس سے فارغ نہیں ہو پاتا ہے تو اس کے لئے نصف درہم ہوگا، تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر اس نے اس کو آج ہی سی کر کے تیار کر دیا ہے، تو اس کو ایک درہم ملے گا اور اگر آج اس سے فارغ نہیں ہو پایا ہے، تو اس کے لئے اس کے ہم مثل اجرت ہوگی، جو نصف درہم سے کم نہ ہوگی۔ اور ایک درہم سے تجاوز بھی نہیں کرے گی۔ اور امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے فرمایا کہ وہ معاملہ لگائی ہوئی شرط کے مطابق رہے گا کہ جب اس سے آج فارغ ہو جائے گا، تو اس کے لئے ایک درہم ہے۔ اور اگر اس کے بعد سی کر فارغ ہوتا ہے تو اس کو نصف درہم ملے گا، پھر امام ابوحنیفہؒ نے اپنے قول سے رجوع کر کے فرمایا کہ دونوں شرطیں جائز ہیں اور وہی امام ابو یوسفؒ اور امام محمد رحمہما اللہ کا قول ہے۔

مقالہ کا خلاصہ اور جوابات کا حاصل

(۱) عقدِ استصناع شئ معدوم پر منعقد ہوتا ہے اور یہ عقد شرعی اصول اور قیاس کے تناظر میں

شئ کے معدوم ہونے کی وجہ سے ناجائز ہونا چاہئے ؛ لیکن شریعت نے اس عقد کو اصول اور قیاس سے مستثنیٰ کر کے ایک ضابطہ کے دائرہ میں رکھا ہے۔ اور وہ ضابطہ یہی ہے کہ جن چیزوں کے بارے میں لوگوں کے درمیان شئ معدوم پر عقدِ استصناع کا معاملہ کرنے کا عرف اور تعامل جاری ہو چکا ہو، ان تمام چیزوں میں عقدِ استصناع جائز اور درست ہے۔

(۲) عقدِ استصناع اور عقدِ سلم دونوں میں شئ مبیع معدوم ہوتی ہے، مگر فرق یہ ہے کہ عقدِ سلم میں مسلم فیہ (مبیع) کی جنس کی اشیاء کا حلول مدت تک بازاروں میں ہر وقت دستیاب ہونا لازم ہے، مگر عقدِ استصناع میں شئ (مبیع) کا بازاروں میں موجود ہونا لازم نہیں ہے۔ اور عقدِ سلم میں مجلس عقد میں رأس المال (ثمن اور قیمت) کا ادا کرنا لازم ہے۔ اور عقدِ استصناع میں لازم نہیں ہے، اسی طرح عقدِ سلم میں خیار شرط کا ثبوت نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ بر وقت عقد لازم ہو جاتا ہے اور عقدِ استصناع میں لازم نہیں ہوتا۔ اور اسی طرح عقدِ سلم میں مسلم فیہ (مبیع) کا مثلی اور ذوات الامثال میں سے ہونا لازم ہے اور عقدِ استصناع میں شئ (مبیع) کا ذوات الامثال میں سے ہونا لازم نہیں، نیز عقدِ سلم ایسی چیزوں میں جائز ہے جن کا لوگوں کے درمیان تعامل ہے۔ اور ایسی چیزوں میں بھی جائز ہے جن کا تعامل نہیں ہے، اس کے برخلاف عقدِ استصناع صرف ایسی چیزوں میں جائز ہے جن میں عقدِ استصناع کا معاملہ کرنا لوگوں کے درمیان میں تعامل ہے اور جن میں تعامل نہیں ہے ان میں جائز نہیں ہے۔

(۳) معاملۂ استصناع عقدِ بیع ہے یا وعدۂ بیع؟ تو اس سلسلے میں امام حاکم شہید مروزیؒ، امام محمد بن سلمہؒ، امام صفارؒ، امام ابوالقاسمؒ، ناصر الدین سمرقندیؒ صاحبِ منثور وغیرہ کے نزدیک معاملہ استصناع عقدِ بیع نہیں ہے؛ بلکہ وعدۂ بیع ہے۔ اور حضرات جمہور کے نزدیک معاملۂ استصناع وعدۂ بیع نہیں ہے؛ بلکہ نفس بیع ہے، دونوں فریق کے دلائل مقالہ میں مفصل موجود ہیں۔

(۴) پہلے خریدار کا دوسرے خریدار کو اور اسی طرح دوسرے خریدار کا تیسرے خریدار کو نمونہ

اور ڈیزائن دکھا کر معاملۂ استصناع کے طور پر فروخت کرنا جائز اور درست ہے، تو ایسی صورت میں مالیاتی ادارہ عام طور پر درمیان کا خریدار ہوتا ہے، وہ اپنے کاریگروں سے مال بنوا کر خریدتا ہے، اور پھر اپنے بائرُوں کے ہاتھ نمونہ اور آرڈر کے مطابق فروخت کرتا ہے، اسی طرح بائر جس نے مالیاتی ادارہ سے معاملہ کیا ہے، تیار ہونے سے پہلے دوسروں کو وہی نمونہ دکھا کر کے استصناع کا معاملہ کرسکتا ہے؛ اس لئے کہ عقدِ استصناع کے جواز کا سارا مدار تعاملِ ناس پر ہے اور اسی طرح کا معاملہ کرنے کا ملکی اور بین الاقوامی مارکیٹوں میں تعامل ہو چکا ہے؛ اس لئے اس کے جواز میں کسی قسم کا تردد نہیں ہے۔

(۵) جس طرح چھوٹی چھوٹی منقول چیزوں میں معاملۂ استصناع جائز اور درست ہے، جیسا کہ جوتے، چپل، دھات کے برتنوں وغیرہ میں، اسی طرح بڑی بڑی منقول چیزوں میں بھی معاملۂ استصناع جائز اور درست ہے، مثلاً بحری جہاز، ہوائی جہاز، چھوٹی بڑی گاڑیاں اور ٹرین کے ڈبے وغیرہ، جب ایسی چیزوں میں سائز اور نمونہ وڈیزائن کے ساتھ آرڈر دے کر بنوانے کا تعامل ہو تو عقدِ استصناع کا معاملہ ایسی بڑی بڑی چیزوں میں بھی جائز اور درست ہے۔

(۶) جس طرح چھوٹی بڑی منقول اشیاء میں سائز اور نمونہ کے ساتھ آرڈر دے کر استصناع کا معاملہ جائز اور درست ہے، اسی طرح غیر منقول عقار میں بھی جائز اور درست ہے۔ تفصیل مقالہ میں موجود ہے۔

(۷) عقدِ استصناع میں بیعانہ کب ضبط کرسکتے ہیں؟ جب ڈیزائن اور سائز اور طے شدہ شرائط کے مطابق مال تیار ہو جائے اس کے بعد بلا کسی خامی کے مستصنع (آرڈر دینے والا خریدار) لینے سے مکر جائے، تو پیشگی دی ہوئی بیعانہ کی رقم ضبط کرنے کی گنجائش ہے۔

(۸) معاملۂ استصناع اجارہ کب بن سکتا ہے؟ اگر مالیاتی ادارہ عقد استصناع کا معاملہ کرتے وقت سارے مٹیریل کاریگر کو دے دے اور کاریگر اسی مٹیریل سے شرائط کے مطابق مال بنا کر پیش کردے تو یہ معاملہ عقدُ استصناع سے بدل کر عقدِ اجارہ بن جائے گا۔

(۹) طے شدہ شرائط اور نمونہ کی خلاف ورزی پر نقصان کا بھگتان کس پر ہوگا؟ ایسی صورت میں نقصان کا بھگتان کاریگر کو برداشت کرنا پڑے گا، استصناع کی شکل میں اس نے اپنے مٹیریل سے جو مال بنایا ہے اور نمونہ اور ڈیزائن کے خلاف بنایا ہے، تو اس طرح مال کے خراب ہوجانے کا نقصان اسے خود برداشت کرنا پڑے گا۔ اور اگر مٹیریل مالیاتی ادارہ نے اپنی طرف سے پیش کردیا ہے، تو ایسی صورت میں مالیاتی ادارہ کو اختیار رہے کہ اپنے مٹیریل کے مثل کاریگر سے وصول کرلے اور بنا ہوا مال کاریگر کے پاس چھوڑ دے اور چاہے بنا ہوا مال اسی حالت میں قبول کرلے، اگر اس مال کی قیمت میں کوئی کمی نہیں آتی ہے، تو پوری اجرت ادا کردے۔ اور اگر مال کی قیمت میں کمی آتی ہے، تو اس مال کے وصول کے ساتھ ساتھ کمی کے بقدر نقصان کی تلافی اسی کی اجرت میں سے کاٹ لے۔

(۱۰) معاملۂ استصناع کو منسوخ کرنے کی شکلیں: اگر طے شدہ شرائط کے مطابق معاملۂ استصناع جانبین کے درمیان طے ہوجائے اور ابھی مال کی تیاری شروع نہیں ہوئی ہے، تو ابھی جانبین میں سے ہر ایک کو معاملہ منسوخ کرنے کا اختیار رہے۔ اور اگر طے شدہ شرائط کے مطابق معاملہ طے ہوچکا ہے، اور کاریگر نے اپنے مٹیریل کے ذریعہ سے مال کی تیاری شروع کردی ہے، مگر ابھی مال مکمل تیار نہیں ہوا ہے، تو ایسی صورت میں جمہور کے نزدیک آرڈر منسوخ کرنے کا اختیار ہے؛ لیکن حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مال تیار ہوجانے کے بعد آرڈر کینسل کرنے کا حق نہیں ہے۔ اور اس سلسلے میں امام ابو یوسفؒ کا آخری قول یہی ہے کہ طے شدہ شرائط کے ساتھ عقد استصناع منعقد ہوجانے کے بعد یہ عقد لازم ہوجاتا ہے، جانبین میں سے کسی کو بھی معاملہ منسوخ کرنے کا حق نہیں ہے۔ اور عقد ہوجانے کے بعد کاریگر مال بنانے کا پابند ہوجائے گا اور مستصنع (آرڈر دینے والا) مال مصنوع (مبیع) کو قبول کرنے کا پابند ہوجائے گا۔ اور آج کے زمانہ میں امام ابو یوسفؒ کا قول ہی زیادہ راجح ہے۔

(۱۱) عقدِ استصناع میں مدت کی تعیین کا حکم کیا ہے؟ تو اس بارے میں راجح قول یہی ہے کہ

عقدِ استصناع میں مدت متعین نہ کرے، تب بھی جائز ہے۔ اور مدت متعین کردے تب بھی جائز ہے اور مدت متعین کرنے کی وجہ سے عقد استصناع سلم میں تبدیل نہیں ہوگا۔

(١٢) عقدِ استصناع میں طے شدہ مدت سے تاخیر کے نقصان کا عوض وصول کرنا جائز ہے یانہیں؟ عقدِ استصناع میں اگر جانبین کے درمیان اس طرح شرائط طے ہوجائیں کہ طے شدہ مدت کے اندر کاریگر مال تیار کرکے فراہم نہ کرے اور مالیاتی ادارہ نے جس خریدار سے آرڈر دے رکھا ہے وہ خریدار تاخیر کی وجہ سے طے شدہ قیمت میں کلم کاٹ کر کمی کرتا ہے، تو اس کمی کی تلافی کاریگر سے کی جائے گی، اگر بوقت عقد اس طرح کے شرائط طے ہوجائیں اور پھر کاریگر نے مال کی فراہمی میں تاخیر کردی ہے، تو یومیہ یا ہفتہ کے حساب سے کمی کے نقصان کی تلافی اس کے مال یا اس کی اجرت میں سے کرنے کی گنجائش ہے۔

واللہ الموفق والمعین.

شبیر احمد قاسمی

خادم: دارالافتاء جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد (الہند)

٢/محرم الحرام ١٤٣٥ھ

١١ / باب بيع الوفاء

بیع الوفاء

سوال [۸۸۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے پاس مکان بھی ہے اور دوکان بھی، مگر پیسہ کی سخت ضرورت ہے، کوئی شخص اس کو قرض بھی دینے کو تیار نہیں، زید اپنی دوکان فروخت کرنا بھی نہیں چاہتا۔ اور اگر قرض کے لئے دوکان کو رہن رکھ کر قرض لیتا ہے تو قرض دینے والا شرعاً دوکان مرہون سے فائدہ بالکل نہیں اٹھا سکتا ہے، تو ایسی تباہ کن حالت میں مالک دوکان (کتاب ایضاح النوادر ص: ٦٨-٦٩) پر جو لکھا ہے: دو گواہوں کے روبرو بیع الوفاء، بیع الامانت، بیع الرہن کے تحت یہ معاملہ طے ہوا ہے کہ مجھے مبلغ تیس ہزار روپئے آپ دے دیں بطور قرض میں اس کے عوض اپنی دونوں دوکانیں آپ کے سپرد کرتا ہوں، جب میں قرض ادا کر دوں گا تو اپنی دوکانیں واپس لے لوں گا، تو کیا شرعاً اس طریقے سے قرض دینے والا زید کی دوکانوں سے کرایہ وغیرہ سے فائدہ حاصل کرسکتا ہے یا نہیں؟ مکمل ومدلل جواب سے نوازیں مہربانی ہوگی، اس کے باوجود بھی کچھ اعتراض سامنے آرہے ہیں، اس لئے فتویٰ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

المستفتی: شمشاد احمد رام نگر، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر زید کو قرض حسنہ کے طور پر کوئی قرض دینے والا نہیں ہے اور وہ بہت سخت ضرورت مند ہے، تو ایسی صورت میں مشائخ سمرقند اور مشائخ بلخ اور مشائخ بخاری کے فتوی پر عمل کرنے کی گنجائش ہے۔ اور عقد کے وقت میں اس معاملہ کا نام قرض نہ رکھا جائے؛ بلکہ خریداری اور فروختگی کے الفاظ استعمال کریں، مالک دوکان اس طرح کہے کہ میں ۳۰/ہزار روپئے کے عوض یہ مکان یا دوکان بیع امانت اور بیع رہن کے طور پر آپ کو

دیتا ہوں اور جب میں آپ کی پوری رقم ادا کردوں گا تو آپ مکان مجھے واپس کردیں گے۔ اوراس درمیان آپ مکان یا دوکان سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ اور اس سلسلہ میں ایک ایگریمنٹ بھی تحریر کر کے رکھ لیں، تا کہ جانبین اس تحریر کے پابند رہیں۔

ومن مشايخ سمرقند من جعله بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه، منهم الإمام نجم الدين النسفي، فقال: اتفق مشايخنا في هذا الزمان، فجعلوه بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه، وهو الانتفاع به دون البعض، وهو البيع لحاجة الناس إليه ولتعاملهم فيه -إلى قوله- وقال صاحب النهاية: وعليه الفتوى.

(تبيين الحقائق، كتاب الإكراه، مكتبه إمداديه ملتان ٥/ ١٨٣-١٨٤، زكريا ديوبند ٦/ ٢٣٧)

ومن هذا القبيل بيع الأمانة، المسمى ببيع الوفاء جوزه مشايخ بلخ وبخارى توسعة. (الأشباه والنظائر، القاعدة الرابعة: المشقة تجلب التيسير، قديم ص: ١٣٠، جديد زكريا ١/ ٢٦٥-٢٣٦)

ومنها: الإفتاء بصحة بيع الوفاء حين كثر الدين على أهل بخارى، وهكذا بمصر وقد سموه بيع الأمانة، والشافعية يسمونه الرهن المعاد.

(الأشباه والنظائر القاعدة الخامسة: الضرر يزال، قديم، ص: ١٤٩، وهكذا ١٦١، جديد زكريا ١/ ٢٦٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍رجب المرجب ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۴۹۰)

بیع الوفاء کا حکم

سوال [۸۸۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج کل ممبئی اور بنگلور جیسے بڑے شہروں میں ہیوی ڈپازٹ یا مینٹینس پر مکان لئے جاتے ہیں، جس میں مالک مکان کوڈپازٹ کے طور پر ایک بڑی رقم دی جاتی ہے اور بجائے

کرائے کے صرف مینٹیننس کی رقم ادا کرنی ہوتی ہے اور متعین مدت کے بعد ڈپازٹ کی رقم بغیر کمی بیشی کے واپس مل جاتی ہے، اس طرح مکان لینا ازروئے شریعت کیسا ہے؟

بعض علماء کے نزدیک مندرجہ بالا صورت جائز نہیں ہے۔ اور بعض کے نزدیک ڈپازٹ کی رقم کے ساتھ کرایہ بھی طے کرنا چاہئے، جن حضرات نے اس صورت کو ناجائز قرار دیا ہے ان کی دلیل مندرجہ ذیل ہے:

''کسی کو قرض دے کر بطور ضمانت اس کی کوئی منقولہ یا غیر منقولہ چیز قرض دہندہ اپنی تحویل میں لے لے، تاکہ اگر قرض لینے والا ادائے گی نہ کر سکے تو قرض دینے والا اسے فروخت کر کے اپنی رقم وصول کر سکے، اسے شرعاً رہن کہتے ہیں؛ لیکن اس دوران قرض دینے والا اس چیز سے کسی قسم کا نفع حاصل نہیں کر سکتا، اگر نفع حاصل کرے گا تو سود ہوگا۔ اور اس صورت مسئولہ میں مکانوں کو ہیوی ڈپازٹ پر دینے کی نوعیت بھی وہی ہے؛ لہٰذا یہ شخص مکان اپنی تحویل میں تو لے سکتا ہے، تاکہ ادائے گی کی ضمانت رہے؛ لیکن نفع حاصل کرنا جائز نہ ہوگا۔

اس فتویٰ پر چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:

(۱) مالک مکان اگر اپنا مکان رہن رکھنا چاہے تو کیا کوئی اس شرط پر بڑی رقم دے گا کہ وہ اس مکان کو استعمال نہ کرے؟

(۲) کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی ہیوی ڈپازٹ ادا کرے اور مکان استعمال نہ کرے، جب کہ اقرارنامہ میں ''اگریمنٹ'' استعمال کی اجازت درج کرائی جاتی ہے؟

(۳) کیا مالک مکان کی رضامندی اور اجازت سے مکان استعمال کرنا بھی سود میں داخل ہے؟

(۴) اگر بالفرض کوئی استعمال نہ کرنے والا ہو تو مکان کا مینٹیننس کون ادا کرے؟

(۵) کیا ڈپازٹ کی رقم متعین مدت میں واپس نہ ملے تو مکان فروخت کیا جا سکتا ہے؟

(۶) جو شخص کرایہ ادا کرنے کی استعداد نہیں رکھتا وہ کیا کرے؟

(۷) اگر ہیوی ڈپازٹ کے ساتھ کرائے کی رقم طے بھی کرنا چاہیں تو کس بنیاد پر کریں؟ اور

اس کا تناسب کیا ہو، جب کہ زیادہ ڈپازٹ تو کرایہ کم اور کم ڈپازٹ تو کرایہ زیادہ کا اصول چلن میں ہو؟ مثلاً زید نے چار لاکھ روپئے ڈپازٹ کے طور پر دیئے ہوں اور وہ ہر ماہ ۵۱۰/ روپئے بلاناغہ مینٹینس کے طور پر بھی ادا کررہا ہوں، اب زید کتنا کرایہ دے؟ وغیرہ

المستفتی: اسلم ملا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جومعاملہ سوال نامہ میں درج ہے وہ بنیادی طور پر شرعاً جائز نہیں ہے۔ اور جن حضرات نے اس کو ناجائز کہا ہے اور ناجائز ہونے پر دلیلیں پیش کی ہیں، وہ اپنی جگہ درست ہیں؛ لیکن بعض فقہاء نے اس طرح کے معاملہ کو ''بیع الوفاء'' کے دائرہ میں داخل کرکے گنجائش قرار دی ہے۔ اور بیع الوفاء کو بیع الامانت اور بیع رہن بھی کہا جاتا ہے، انتہائی مجبوری کی حالت میں بیع الوفاء اور بیع الامانت کے جواز کی گنجائش قرار دی گئی۔ اور بیع الوفاء میں یہی شرط ہے کہ جتنے پیسے میں جائیداد خریدار کے ہاتھ میں دی جاتی ہے اتنے ہی پیسے میں اصل مالک کو واپس کیا جائے اور اس درمیان میں جس نے جائیداد لی ہے وہ جائیداد سے نفع حاصل کرسکتا ہے۔ اور جب مالک لیے ہوئے پیسہ واپس دے گا تو لینے والے پر لازم ہے کہ ان ہی پیسوں پر جائیداد واپس کرے اور اس معاملہ میں اگر پکی رجسٹری ہوجائے، تو واپسی کی شرائط کے ساتھ پکی رجسٹری ہونی چاہئے، ورنہ معمولی اسٹامپ پر کچی رجسٹری ہونی چاہئے، تاکہ مالک کو واپس لینے کے وقت میں کوئی دشواری پیش نہ آجائے۔

ومن مشايخ سمرقند من جعله بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه، منهم الإمام نجم الدين النسفي، فقال: اتفق مشايخنا في هذا الزمان، فجعلوه بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه، وهو الانتفاع به دون البعض، وهو البيع لحاجة الناس إليه ولتعاملهم فيه –إلى قوله– وقال صاحب النهاية: وعليه الفتوى.

(تبيين الحقائق، كتاب الإكراه، مكتبه إمداديه ملتان ٥/ ١٨٣–١٨٤، زكريا ديوبند ٦/ ٢٣٧)

ومن هذا القبيل بيع الأمانة، المسمى ببيع الوفاء جوزه مشايخ بلخ

وبخاری توسعة. (الأشباه والنظائر، القاعدة الرابعة: المشقة تجلب التيسر، قديم ص: ١٣٠، جديد زكريا ١/ ٢٣٥-٢٣٦)

ومنها: الإفتاء بصحة بيع الوفاء حين كثر الدين على أهل بخارى، وهكذا بمصر وقد سموه بيع الأمانة، والشافعية يسمونه الرهن المعاد. (الأشباه والنظائر، القاعدة الخامسة: الضرر يزال، قديم، ص: ١٤٩، وهكذا ١٦١، جديد زكريا ١/ ٢٦٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۴۴۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲/ ۶/ ۱۴۳۲ھ

’’بیع الوفاء‘‘ کا جواز

سوال [۸۸۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مجھے دو لاکھ روپئے کی فوری ضرورت ہے اور قرض ملنا دشوار ہے، تو کیا میں اپنی دو بیگہ زمین ایک صاحب ثروت کو یہ کہہ کر دے سکتا ہوں کہ تم یہ زمین اپنے استعمال میں رکھ لو، جب میرے پاس پیسوں کا انتظام ہوگا میں پیسہ ادا کرکے اپنی زمین واپس لے لوں گا، اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نظر نہیں آرہا ہے، حکم شرعی سے مطلع فرمادیں عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: مفتی سمیر عثمان آباد مہاراشٹر، استاذ مدرسہ فلاح دارین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اس طرح کا معاملہ کرنا جائز نہیں ہے، ہاں البتہ سخت ضرورت کی وجہ سے سود سے بچنے کے لئے ’’بیع الوفاء‘‘ کی صورت اختیار کرنے کی گنجائش ہے۔ اور اس کی شکل یہ ہے کہ: صاحب ثروت سے یوں کہے کہ: یہ زمین اتنے پیسوں کے عوض میں تمہارے ہاتھ اس وقت تک کے لئے بیچ دیتا ہوں جب تک میرے پاس پیسوں کا

انتظام ہوجائے اور جب میرے پاس پیسوں کا انتظام ہوجائے گا، تو اتنے ہی پیسوں پر میرے ہاتھ واپس فروخت کرنا ہوگا، اس طرح ''بیع الوفاء'' کی شکل اختیار کرلی جائے، تو مجبوری میں اس کی گنجائش ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۱۰۷، فتاوی خلیلیہ ۱/ ۳۹۵، انوار رحمت ص: ۲۱۹، ایضاح النوادر ۱/ ۷۳)

لا يحل له أن ينتفع بشيء منه بوجه من الوجوه، وإن أذن له الراهن؛ لأنه أذن له في الربا، لأنه يستوفى دينه كاملا، فتبقى له المنفعة فضلا، فيكون ربا، وهذا أمر عظيم. (شامي، كراچی ٦/ ٤٨٢، زكريا ١٠/ ٨٣)

ومن هذا القبيل بيع الأمانة، المسمى ببيع الوفاء جوزه مشايخ بلخ وبخارى توسعة. (الأشباه والنظائر، القاعدة الرابعة: المشقة تجلب التيسير، قديم ص: ١٣٠، جديد زكريا ١/ ٢٣٥-٢٣٦)

ومن مشايخ سمرقند من جعله بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه، منهم الإمام نجم الدين النسفي، فقال: إتفق مشايخنا في هذا الزمان، فجعلوه بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه، وهو الانتفاع به دون البعض، وهو البيع لحاجة الناس إليه ولتعاملهم فيه -إلى قوله- وقال صاحب النهاية: وعليه الفتوى.

(تبيين الحقائق، كتاب الإكراه، مكتبه إمداديه ملتان ٥/ ١٨٣-١٨٤، زكريا ديوبند ٦/ ٢٣٧)

ومنها: الإفتاء بصحة بيع الوفاء حين كثر الدين على أهل بخارى، وهكذا بمصر وقد سموه بيع الأمانة. (الأشباه والنظائر، القاعدة الخامسة: الضرر يزال، قديم، ص: ١٤٩، وهكذا، ص: ١٦١، جديد زكريا ١/ ٢٦٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ / جمادی الثانیہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۵۷۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۶/۲۳ھ

کیا ہندوستان میں عقودِ فاسدہ جائز ہیں؟

سوال [۸۸۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسئلہ درپیش ہے۔ امید ہے کہ قرآن وحدیث اور فقہ کی روشنی میں حوالہ اور عبارت کے ساتھ جواب مرحمت فرمائیں گے۔

سوال: زید نے ایک زراعت کی زمین پچاس لاکھ روپئے کی غیر مسلم سے خریدی، پیسے دے دئے، رجسٹری بھی کرالی، اس شرط پر کہ جب غیر مسلم کے پاس پچاس لاکھ روپئے آویں گے تو غیر مسلم زید کو پیسے دے دیگا اور اپنی زمین واپس لے لے گا۔ اور جب تک پیسے نہیں دے گا وہاں تک ماہانہ زمین کا ۵۰۰۰۰/ ہزار روپئے کرایہ دے گا، زمین غیر مسلم کے قبضہ میں ہی ہے، رجسٹری اگر چہ زید کے نام کرادی، تو کیا اس طرح معاملہ کرنا درست ہے؟ تو کیا زید اس طرح غیر مسلم سے ماہانہ کرایہ لے سکتا ہے؟ کسی نے زید سے منع کیا، تو اس کا کہنا ہے کہ ہندوستان دارالحرب ہے، برائے کرم مدلل جواب عطا فرمائیے۔

سوال: زید نے غیر مسلم سے پچاس لاکھ روپئے میں اس شرط پر زمین خریدی کہ جب میرے پاس پیسے آویں گے تو یہ زمین پچاس لاکھ میں ہی تجھے مجھ کو لوٹانی پڑے گی، تو کیا اس شرط کے ساتھ خریدنا جائز ہے؟

سوال: غیر مسلم نے زید سے اس زمین کو ماہانہ پچاس ہزار روپئے کرایہ پر لے لی، حالانکہ اس علاقہ میں اتنی زمین کا کرایہ پچاس ہزار سالانہ چلتا ہے، تو کیا اس طرح کرایہ پر دینا جائز ہے؟

مسئلہ مذکورہ میں غیر مسلم نے زید کو زمین کا قبضہ دیا ہی نہیں ہے، صرف پیسے لے کر شرطیہ رجسٹری کرالی ہے، قبضہ غیر مسلم کا ہی ہے اور ماہانہ پچاس ہزار روپئے کرایہ دیتا ہے۔

المستفتی: محمد یونس

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہندوستان کو دارالحرب کہہ کر عقودِ فاسدہ کو جائز کہنا

درست نہیں ہے؛ کیوں کہ دارالحرب میں بھی عقودِ فاسدہ جائز نہیں ہیں اور ہندوستان جمہوری ملک ہے، اس کو دارالحرب کہنا درست نہیں ہے۔ اب رہا مسئلہ زیر بحث یہ مسئلہ ''بیع الوفاء'' کے دائرہ میں شامل ہے۔ اور بیع الوفاء کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، فقہاء میں سے بعض جیسے امام ظہیر الدین صدر الشہید حسام الدین اور صدر السعید تاج الاسلام وغیرہ نے اس کو عقد فاسد قرار دیا ہے۔ اور اس کے برخلاف دوسرے فقہاء نے سودی قرض سے بچنے کے لئے حاجت ناس اور تعامل ناس کی وجہ سے اس کو جائز قرار دیا ہے، جیسا کہ مشائخ بلخ اور مشائخ بخاری اور مشائخ سمرقند وغیرہ نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ اور اسی کو مفتی بہ قرار دیا گیا ہے؛ لہٰذا مذکورہ معاملہ کی شرعاً گنجائش ہے، بس اتنی بات ہے کہ مشتری کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کی اجازت نہیں ہوتی؛ لیکن مذکورہ جائیداد سے خود فائدہ اٹھا سکتا ہے، یا دوسرے کو کرایہ پر دے سکتا ہے۔ اور جس سے خریدا ہے اس کے ہاتھ بھی کرایہ پر دیا جا سکتا ہے؛ اس لئے کہ خریدار نے پچاس لاکھ روپئے کی بھاری رقم دے کر خریدا ہے، پھر اس کو پچاس ہزار روپئے ماہانہ کے حساب سے کرایہ پر دینے کی بھی گنجائش ہے، جب اس علاقے میں اس طرح کی جائیداد پچاس ہزار روپئے میں کرایہ پر دینا لوگوں کے درمیان متعارف ہے، اس میں کسی قسم کا غبن فاحش بھی نہیں ہے، جیسا کہ سوال نامہ میں خود اس کا ذکر موجود ہے۔ (مستفاد: انوار رحمت، ۲۱۷، فتاوی عثمانی ۳/ ۱۰۸)

ومن مشايخ بخارى من جعل بيع الوفاء كبيع المكره، منهم: الإمام ظهير الدين، والصدر الشهيد حسام الدين، والصدر السعيد تاج الإسلام، وصورته: أن يقول البائع للمشتري: بعت منک هذا العين بدين لک علي، على أني متى قضيت الدين فهو لي -إلى قوله- ومن مشايخ سمرقند من جعله بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه، منهم الإمام نجم الدين النسفي، فقال:

إتفق مشايخنا في هذا الزمان، فجعلوه بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه، وهو الانتفاع به دون البعض، وهو البيع لحاجة الناس إليه ولتعاملهم فيه -إلى قوله- وقال صاحب النهاية: وعليه الفتوى. (تبيين الحقائق، كتاب الإكراه، مكتبه إمداديه ملتان ٥/ ١٨٣-١٨٤، زكريا ديوبند ٦/ ٢٣٦-٢٣٧)

ومن هذا القبيل بيع الأمانة، المسمى ببيع الوفاء جوزه مشايخ بلخ وبخارى توسعة. (الأشباه والنظائر، قديم ص: ١٣٠)

ومنها: الإفتاء بصحة بيع الوفاء حين كثر الدين على أهل بخارى، وهكذا بمصر وقد سموه: بيع الأمانة، والشافعية يسمونه: الرهن المعاد.

(الأشباه والنظائر، قديم، ص: ١٤٩، وهكذا، ص: ١٦١) *فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم*

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ ذیقعدہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۷۱۲/۱۱)

قرض کی واپسی تک زمین کو فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۸۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک آدمی کے پاس بہت سی زمین جائیداد ہے؛ لیکن نقد روپیہ پیسہ نہیں؛ حالانکہ پیسہ کی اس کو ضرورت ہے، تو وہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ۱۰؍ ہزار روپئے فی بیگہ اپنی زمین اس شخص کو دے دیتا ہے، جس سے پیسہ لینا ہوتا ہے، اس وقت تک کے لئے کہ جب تک یہ صاحب معاملہ کو روپئے واپس نہیں کرے گا، تو اس وقت تک وہ اس زمین سے فائدہ اٹھاتا رہے گا، تو اس طرح کا معاملہ سود کے دائرے میں آتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: عظمت علی آسام

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: روپئے کے عوض میں زمین کو رہن میں دینا، پھر مرتہن اس زمین سے روپئے واپس دینے تک فائدہ اٹھاتا رہے، تو یہ قرض کے اوپر سود لینا لازم ہوا جو قطعاً ناجائز اور حرام ہے، یہ دراصل معاملہ رہن ہے اور مرتہن کے لئے مال رہن سے فائدہ اٹھانا قرض کے عوض میں سود کے دائرہ میں داخل ہونے کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہے، ہاں البتہ متأخرین فقہاء نے سود سے بچنے کے لئے انتہائی مجبوری میں ایک متبادل شکل جواز کی بتلائی ہے، اس کی شکل یہ ہے کہ: زمین کی تقریباً پوری قیمت لے کر کے پیسے والے کو زمین فروخت کردے اور اس میں شرط یہ لگائے کہ جب اتنے پیسے پر زمین والا خود خریدنا چاہے تو پیسے والے پر لازم ہے کہ اتنے ہی پیسے پر زمین واپس کردے۔ اور اس درمیان میں پیسے والا آدمی اس زمین سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس کو شریعت میں ''بیع الوفاء'' اور ''بیع الامانت'' بھی کہا جاتا ہے، اس شکل کو اختیار کئے بغیر پیسے والے کے لئے زمین سے فائدہ اٹھانا ہرگز ثابت نہیں۔

لأن المرتهن لا يجوز له الانتفاع بالرهن أصلا. (بدائع الصنائع، كتاب الرهن، فصل وأما حكم للرهن، زكريا ٥/ ٢١٠، قديم ٦/ ١٤٥)

ومن مشايخ سمرقند من جعله بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه، منهم الإمام نجم الدين النسفي، فقال: إتفق مشايخنا في هذا الزمان، فجعلوه بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه، وهو الانتفاع به دون البعض، وهو البيع لحاجة الناس إليه ولتعاملهم فيه -إلى قوله- وقال صاحب النهاية: وعليه الفتوى.

(تبيين الحقائق، كتاب الإكراه، مكتبه إمداديه ملتان ٥/ ١٨٣-١٨٤، زكريا ديوبند ٦/ ٢٣٧)

ومنها: الإفتاء بصحة بيع الوفاء حين كثر الدين على أهل بخارى، وهكذا بمصر وقد سموه: بيع الأمانة، والشافعية يسمونه: الرهن المعاد.

(الأشباه والنظائر، القاعدة الخامسة: الضرر يزوال، قديم، ص: ١٤٩، جديد زكريا ١/ ٢٦٧)

ومن هذا القبيل بيع الأمانة، المسمى ببيع الوفاء جوزه مشايخ بلخ وبخاری توسعة. (الأشباه والنظائر، القاعدة الرابعة: المشقة تجلب التيسير، قديم ص: ۱۳۰، جدید زکریا، ۱/ ۲۳۵-۲۳۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۳۰۱۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۶/۳۰ھ

رہن یا کرایہ پر رکھی ہوئی زمین سے فائدہ اٹھانے کی مختلف شکلیں

سوال [۸۸۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ایک ضرورت مند شخص جسے غیر سودی قرض نہیں ملتا اور وہ سودی قرض لینا بھی نہیں چاہتا، تو شریعت میں اس کے لئے کیا متبادل شکل موجود ہے؟ کیا وہ اپنا سامان مثلاً زمین ومکان وغیرہ یہ کہہ کر کسی پیسے والے شخص سے معاملہ کرسکتا ہے کہ تم اتنے روپئے مجھے دے دو اور میری زمین سے اس وقت سے مکمل فائدہ اٹھاؤ جب تک کہ میں تمہارے پیسے واپس نہ کردوں، پھر جب میں تمہارے روپئے واپس کردوں گا تو تم میری زمین بھی واپس کردوگے، ہمارے شہر میں اس طرح کے معاملات بہت رائج ہیں، تقریباً ۵۰/ فیصد لوگ اس میں مبتلا ہیں، کیا یہ معاملہ از روئے شرع جواز کے دائرہ میں آتا ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو کن حالات میں، کن شرائط کے ساتھ؟ اور اگر شریعت میں اس کی گنجائش نہیں ہے تو اس کے اسباب ووجوہات کیا ہیں؟

(۲) دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ صورت بالا میں زمین والے ایک مدت متعینہ مثلاً ایک سال میں جمع شدہ رقوم میں سے صاحب حق کی رضامندی سے متعین تعداد مثلاً سو روپئے کاٹ لیتے ہیں اور عاقدین اس صورت کو ربا سے پاک سمجھتے ہیں، کیا اس طرح سے یہ معاملہ جائز ہوجائے گا یا نہیں؟

(۳) تیسرا مسئلہ جس میں ہمارے علاقہ کے تقریباً ۷۵ر فیصد لوگ مبتلا ہیں، وہ یہ ہے کہ صاحب زمین کسی کا شتکار کو اپنی زمین اس شرط پر دے کہ تم مجھے فی بیگہ مثلاً ۵ر من گندم دینا اور تمہیں اب اختیار ہے کہ جو چاہو اس میں زراعت کرو؛ لیکن وقت متعین پر ہمیں اتنا گندم ملنا چاہئے خواہ پیداوار ہو یا نہ ہو، کم ہو یا زیادہ، صاحب زمین کو اس سے کوئی مطلب نہیں، مگر اپنی رضامندی سے یہ معاملہ کرتے ہیں، تو کیا شرعاً یہ جائز ہوگا یا ناجائز؟ اگر جائز ہے تو کن شرائط کے ساتھ اور اگر ناجائز ہے تو اس کے اسباب و وجوہات کیا ہیں؟ برائے مہربانی مذکورہ سوالات کے جوابات مرحمت فرما کر عند اللہ ماجور رہوں۔

المستفتی: مرشد عالم ارریہ (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں صاحب قرض کے قرض لینے کی تین شکلیں بیان کی گئی ہے:

(۱) صاحب زمین پیسے والے سے اس شرط پر پیسے لے کہ جب تک وہ پیسے واپس نہیں کرے گا اس وقت تک وہ زمین سے فائدہ اٹھاتا رہے گا، یہ شکل شرعی طور پر ناجائز ہے؛ اس لئے کہ یہ رہن کی شکل ہے اور رہن میں مرتہن کے لئے مال رہن سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں، یہ ''کل قرض جر نفعا'' کے تحت آکر ناجائز اور حرام ہے، اگر صاحب زمین کو غیر سودی قرض کسی طرح نہیں ملتا ہے تو اس کے لئے انتہائی مجبوری میں فقہاء متأخرین نے ایک متبادل شکل ''بیع الوفاء'' کی پیش کی ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ صاحب زمین پیسے والے کے ہاتھ اس شرط کے ساتھ زمین فروخت کرے کہ جب اتنا پیسہ صاحب زمین پیسے والے کو واپس کر دے گا جتنا کہ اس نے لیا ہے، تو پیسے والا صاحب زمین کے ہاتھ وہ زمین اتنے پیسہ میں فروخت کر دے گا اور اس کے لئے بہتر شکل یہ ہے کہ اس معاملہ کے لئے کچا کاغذ بنالے، سرکاری رجسٹری نہ کرے، اس کو بیع الوفاء اور بیع الامانہ بھی کہا جاتا ہے، جیسا کہ حسب ذیل جزئیات سے واضح ہوتا ہے:

كـل قـرض جـر نـفـعـا حـرام، فكره للمرتهن سكنى المرهونة بإذن الراهن. (الدر مع الرد، زكريا ٧/ ٣٩٥)

لا يـحـل لـه أن ينتفع بشيء منه بوجه من الوجوه وإن أذن له الراهن؛ لأنـه أذن له في الربا؛ لأنه يستوى دينه كاملا فتبقى له المنفعة فضلا، فيكون ربا. (شامي، زكريا ١٠/ ٨٣)

وليس للمرتهن الانتفاع بالرهن باستخدام ولا للسكنى. (مجمع الأنهر ٤/ ٢٧٣، البحرالرائق ٦/ ٤٣٨)

ومن مشايخ سمرقند من جعله بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه، ومنهم الإمام نجم الدين النسفي، فقال: اتفق مشايخنا في هذا الزمان، فجعلوه بيعا جـائـزا مفيدا بعض أحكام، وهذا الانتفاع به دون البعض، وهو البيع لحاجة الـناس إليه ولتعاملهم فيه -إلى قوله- وقال صاحب النهاية: وعليه الفتوى. (زيلعي ٥/ ١٨٣)

ومـن هـذا الـقبيـل بيع الأمانة المسمى ببيع الوفاء جوزه مشايخ بلخ توسعة. (الأشباه: ص: ١٣٠)

ومـنهـا الإفتـاء بـصـحة بيع الوفاء حين كثر الدين على أهل بخارى، وهـكـذا بـمـصـر وقد سموه بيع الأمانة، والشافعية يسمونه الرهن المعاد.

(الأشباه والنظائر، ص: ١٤٩، ايضاح النوادر ٧١- ٧٢، أنوار رحمت ٢١٨)

(۲) اور دوسری شکل سوال نامہ میں یہ پیش کی گئی ہے کہ صاحب زمین پیسے والے کے ہاتھ اپنی زمین اس شرط پر دے دے کہ لئے گئے پیسوں میں سے سالانہ یا ماہانہ اتنی مقدار کرایہ میں کاٹ دئے جائیں گے، تو یہ شکل جائز ہے؛ لیکن کرایہ میں جو پیسہ کٹے گا اس میں غبن فاحش کی شکل نہیں ہونی چاہئے، اگر غبن فاحش ہے تو کم سے کم معاملہ مکروہ ہوگا۔

كـل مـا صـلـح ثمنا أي بدلا في البيع صلح أجرة؛ لأنها ثمن المنفعة.

(الدرالمختار مع الشامي، زكريا ۹/ ۵، کراچی ٦/ ٤، هندية ٤/ ٤١٢، جديد زكريا ٤/ ٤٤٢، شرح المجلة ١/ ٢٦٠، رقم المادة: ٤٦٣)

(۳) تیسری شکل یہ بیان کی گئی ہے کہ زمین کو بٹائی پر نہیں دیا جارہا ہے؛ بلکہ زمین کو کرایہ پر دیا جارہا ہے اور کرایہ داری کے ثمن میں پیسے بھی جائز ہیں اور غلہ اور دیگر ساز وسامان بھی دینا جائز ہے؛ لہٰذا متعین وقت پر متعین مقدار کے عوض میں زمین کو کرایہ پر دینا جائز ہے اور کرایہ پر لینے والے کو اختیار ہے، چاہے اس زمین پر کھیتی کرے یا ایسے ہی خالی چھوڑ کر جانور چرائے تو اس طرح زمین کو کرایہ پر دینا شرعاً جائز ہے، مگر یاد رکھیں کہ اس زمین کی پیداوار میں سے مخصوص مقدار کو کرایہ کے عوض میں قرار دینا جائز نہیں۔

وما صلح أن يكون ثمنا في البيع كالنقود والمكليل والموزون صلح أن يكون أجرة في الإجارة. (هندية ٤/ ٤١٢، جديد زكريا ٤/ ٤٤٢، الدر المختار مع الشامي، زكريا ٩/ ٥، کراچی ٦/ ٤، شرح المجلة ١/ ٢٦٠)

ولو دفع غزلا لآخر لينسجه له بنصفه أو استأجر بغلا ليحمل طامه ببعضه أو ثورا ليطحن بره ببعض دقيقة فسدت في الكل؛ لأنه استأجره بجزء من عمله. (الدرالمختار کراچی ٦/ ٥٦، شامي زكريا ٩/ ٧٨، بزازية على الهندية ٥/ ٣٥، جديد زكريا ٢/ ٢١، البحرالرائق ٨/ ٤١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/رجب ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۲۱۶۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲/۷/۱۴۳۶ھ

بیع الوفاء کی شرعی حیثیت

نحمده ونصلي على رسوله الكريم، أما بعد:

اس مضمون کواس طریقہ سے پیش کرتے ہیں، اولاً بیع الوفاء کی وجہ تسمیہ اوراس کے اسماء، اس کے بعد بیع الوفاء کی حقیقت اور جواز کا خلاصہ اور مختصر نوٹ جومعتدل حکم تک ہے، پھر اس کے بعد بیع الوفاء کے بارے میں مفصل بحث سات اقوال کے ساتھ پیش کی گئی ہے، پھرآخر میں مبیع کے بارے میں چنداحکام پر مضمون ختم کیا گیا ہے۔

بیع الوفاء کے اسماء

اس عقد کوحسبِ ذیل ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے:

(١) بیع الوفاء (٢) بیع الامانت (٣) بیع الاطاعت (۴) بیع المعاملہ (۵) البیع الجائز (٦) بیع الرہن۔

(١) **بیع الوفاء**: اس کو بیع الوفاء اس لئے کہا جاتا ہے کہ بائع اور مشتری کے درمیان اس عقد میں وفاداری کا معاہدہ ہوتا ہے کہ جس وقت بائع ثمن کو لاکر واپس کردے گا تو مشتری معاہدہ کے موافق ایفائے وعدہ کے طور پر مبیع کو واپس کردے گا، اوراس عقد کے ناموں میں سے مشہورترین نام یہی ہے۔

(٢) **بیع الأمانة**: اس کا نام مصر وغیرہ میں بیع الامانۃ کے نام سے مشہور ہے، اوراس کو بیع الامانۃ اس لئے کہا جاتا ہے کہ مبیع مشتری کے پاس بطور امانت رہتی ہے۔

(٣) **بیع الاطاعة**: ملک شام وغیرہ میں یہ بیع بیع الاطاعت کے نام سے موسوم اور مشہور ہے؛ اس لئے کہ اس عقد کے اندر اطاعت اور وفاداری پائی جاتی ہے کہ مشتری مبیع کے حق میں بائع کی اطاعت کرتا ہے اور بائع ثمن کے حق میں مشتری کی اطاعت کرتا ہے۔

(۴) **بیع المعاملہ**: بعض فقہاء نے اس کا نام بیع المعاملہ رکھا ہے، اوراس کی وجہ یہ

بیان کرتے ہیں کہ اس بیع کے اندر مشتری درپردہ اپنے قرض سے فائدہ اٹھاتا ہے؛ اس لئے کہ مشتری درحقیقت دائن اور قرض دینے والا ہے، اور اس قرض کے مقابلہ میں وہ مبیع سے فائدہ اٹھاتا ہے، اس لئے بعض فقہاء نے اس کا نام بیع المعاملہ رکھا ہے۔

(۵) **البیع الجائز**: بعض فقہاء نے اس کا نام ''البیع الجائز'' رکھا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بیع کو ربا اور سود سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے صحیح اور جائز قرار دیا گیا ہے، اور مشتری کے لئے مبیع کا نفع کھانے اور استعمال کرنے کی گنجائش دی ہے۔

(۶) **بیع الرھن**: اس کی وجہ یہ ہے کہ مبیع مشتری کے پاس ایسی محفوظ رہتی ہے کہ جس طرح مرتہن مالِ رہن کو فروخت نہیں کرسکتا اور اس کی ملکیت کو منتقل نہیں کرسکتا، اسی طرح بیع الوفاء میں مشتری مبیع کو بیچ نہیں سکتا اور اس کی ملکیت کو منتقل نہیں کرسکتا۔ علماء شوافع نے اس کا نام ''بیع رہن'' اور ''الرہن المعاد'' رکھا ہے۔

یہ چھ نام ہمارے سامنے ہیں، حضراتِ فقہاء نے ان مختلف وجوہات کی بناء پر اپنے اپنے طور پر اس عقد کو مختلف ناموں سے موسوم کیا ہے اور ان ناموں کی وجہِ تسمیہ وہی ہے جو ہم نے آپ کے سامنے پیش کی ہے۔

عربی عبارات ملاحظہ فرمایئے:

وَبَيْعُ الْوَفَاءِ صُوْرَتُهُ أَنْ يَّبِيْعَهُ الْعَيْنَ بِأَلْفٍ عَلىٰ الدَّيْنِ وَهٰذَا يَشْتَرِيْهِ أَنَّهُ إِذَا رَدَّ عَلَيْهِ الثَّمَنَ رَدَّ عَلَيْهِ الْعَيْنَ وَسَمَّاهُ الشَّافِعِيَّةُ الرَّهْنَ الْمُعَادَ وَيُسَمّٰى بِمِصْرَ بَيْعَ الْأَمَانَةِ وَبِالشَّامِ بَيْعَ

اور بیع الوفاء اس کی صورت یہ ہے کہ مشتری کے ہاتھ عینِ مبیع کو بیچے مثلاً ایک ہزار کے عوض میں اس شرط کے ساتھ کہ جب ثمن واپس کردے گا تو عینِ مبیع بھی واپس کردے گا، اور شافعیہ نے اس کا نام ''الرہن المعاذ'' رکھا ہے، اہل مصر نے اس کا نام ''بیع الامانۃ'' رکھا ہے، اور اہل شام نے اس کا نام ''بیع الاطاعۃ'' رکھا

الإِطَاعَةِ (وَتَحْتَهُ فِيْ الشَّامِيَةِ) وَوَجْهُ تَسْمِيَتِهِ بَيْعُ الْوَفَاءِ أَنَّ فِيْهِ عَهْداً بِالْوَفَاءِ مِنَ الْمُشْتَرِيْ بِأَنْ يَّرُدَّ الْمَبِيْعَ عَلَى الْبَائِعِ حِيْنَ رَدَّ الثَّمَنَ، وَبَعْضُ الْفُقَهَاءِ يُسَمِّيْهِ الْبَيْعَ الْجَائِزَ وَلَعَلَّهُ مَبْنِيٌّ عَلىٰ أَنَّهُ بَيْعٌ صَحِيْحٌ لِحَاجَةِ التَّخَلُّصِ مِنَ الرِّبَا حَتّٰى يَسُوْغَ لِلْمُشْتَرِيْ أَكْلُ رِيْعِهٖ وَبَعْضُهُمْ يُسَمِّيْهِ بَيْعَ الْمُعَامَلَةِ وَوَجْهُهُ أَنَّ الْمُعَامَلَةَ رِبْحُ الدَّائِنِ لِيَنْتَفِعَ بِهٖ بِمُقَابَلَةِ دَيْنِهٖ (وَقَوْلُهُ) بَيْعُ الْأَمَانَةِ وَجْهُهُ أَنَّهُ أَمَانَةٌ عِنْدَ الْمُشْتَرِيْ (وَقَوْلُهُ) وَفِيْ بَعْضِهَا بَيْعُ الطَّاعَةِ وَهُوَ الْمَشْهُوْرُ الْآنَ فِيْ بِلَادِنَا. (الدر المختار مع الشامی زکریا ۷/۵٤٥، کراچی ۵/۲۷٦)

ہے،اس کے نیچے شامی میں ہے کہ اس کا ’’بیع الوفاء‘‘ نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس عقد میں مشتری سے وفاداری کا عہد کیا جاتا ہے، بایں طور کہ مشتری مبیع کو واپس کردے گا جس وقت بائع ثمن واپس کردے گا، اور بعض فقہاء نے اس کا نام ’’البیع الجائز‘‘ اور ’’البیع الصحیح‘‘ رکھا ہے، اور شاید اس کا مدار اس بات پر ہے کہ یہ عقد بیع ربا سے خلاصی حاصل کرنے کے لئے صحیح اور جائز ہے، یہاں تک کہ مشتری کے لئے اس کا نفع کھانے کی گنجائش ہے اور بعض فقہاء نے اس کا نام ’’بیع المعاملۃ‘‘ رکھا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں دین سے نفع اٹھانے کا معاملہ پایا گیا اور یہ اس طور پر ہے کہ قرض دینے والے نے مبیع کو خریدا ہے؛ تاکہ اپنے دین کے مقابلہ میں اس مبیع سے نفع اٹھائے، اور ’’بیع الامانۃ‘‘ اس کا نام اس لئے ہے کہ مبیع مشتری کے پاس بطورِ امانت رہتی ہے اور بعض نسخوں میں ’’بیع الطاعۃ‘‘ ہے۔ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے بلاد میں اس وقت یہی مشہور ہے۔

اورالاشباہ والنظائر میں ہے کہ:

وَمِنْ هٰذَا الْقَبِيْلِ بَيْعُ الْأَمَانَةِ الْمُسَمّٰى بِبَيْعِ الْوَفَاءِ جَوَّزَهُ مَشَائِخُ بَلْخٍ وَبُخَارىٰ تَوْسِعَةً. (الاشباہ والنظائر قدیم ۱۳۰)

اور اسی قبیل سے ہے، بیع الامانۃ جو بیع الوفاء کے نام سے موسوم ہے، مشائخ بلخ اور مشائخ بخاریٰ نے لوگوں سے تنگی کو دور کر کے وسعت دیتے ہوئے اس کو جائز قرار دیا ہے۔

بیع الوفاء کی حقیقت

کوئی شخص صاحبِ ضرورت ہے اس کو روپیہ کی ضرورت ہے، اور کہیں سے ادھار بھی نہیں ملتا، اور اس کے پاس مکان یا دوکان یا زمین وغیرہ موجود ہے، اور اس کو رہن میں رکھ کر روپیہ حاصل کرنا چاہتا ہے، مگر رہن میں رکھنے کی صورت میں مرتہن اس سے فائدہ حاصل نہیں کرسکتا، اس لئے کوئی شخص رہن رکھ کر بھی قرض دینے پر تیار نہیں، اور صاحبِ جائدا داس ضرورت کی وجہ سے اپنی ہمیشہ کی جائیداد کو بالکلیہ فروخت کرنا بھی نہیں چاہتا، تو اس طرح حاجت مند کی ضرورت پوری کرنے کے لئے فقہاء نے عقد کی ایک نئی شکل نکالی ہے، اور وہ یہ ہے کہ مکان یا دوکان یا زمین وغیرہ صاحبِ ضرورت شخص اس طرح فروخت کرے کہ فروخت شدہ جائیداد مشتری کے پاس من کل الوجوہ امانت تو نہیں مگر مثل امانت کے ہوگی، کہ مشتری اس سے فائدہ تو اٹھا سکتا ہے مگر اس کو فروخت نہیں کرسکتا۔ اور فائدہ اٹھانے کا سلسلہ اس وقت تک باقی رہے گا جب تک بائع لی ہوئی رقم واپس نہ کردے، اور جب بائع رقم واپس کردے گا تو مشتری پر لازم ہوگا کہ اتنی ہی رقم لے کر جائیداد واپس کردے جتنی میں بائع نے مشتری کو دی تھی۔

علامہ ابن نجیم مصریؒ البحر الرائق اور علامہ فخر الدین زیلعیؒ تبیین الحقائق میں اس عقد کی نوعیت کو ان الفاظ میں نقل فرماتے ہیں:

وَصُوْرَتُهُ أَنْ يَّقُوْلَ الْبَائِعُ لِلْمُشْتَرِيْ بِعْتُ مِنْکَ هٰذَا الْعَيْنَ بِدَيْنٍ لَکَ عَلَيَّ عَلٰى أَنِّيْ مَتٰى قَضَيْتُ الدَّيْنَ فَهُوَ لِيْ أَوْ يَقُوْلَ الْبَائِعُ بِعْتُ هٰذَا بِكَذَا عَلٰى أَنِّيْ مَتٰى دَفَعْتُ الثَّمَنَ تَدْفَعُ الْعَيْنَ إِلَيَّ الخ.

(البحر الرائق کوئٹه ٦/ ١١، تبيين الحقائق إمداديه ملتان ٥/ ١٨٣، زكريا ٦/ ٢٣٧، البناية أشرفيه ١١/ ٤٥، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٤١، مصري قديم ٢/ ٤٣٠، ایضاح النوادر ٦٩/١)

اور اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ بائع مشتری سے یوں کہہ دے کہ میں تیرے ہاتھ یہ شئ اس قرض کے عوض فروخت کرتا ہوں جو تیرا میرے اوپر لازم ہے، اس شرط پر کہ جب میں قرض ادا کردوں گا تو وہ شئ میری ہوجائے گی، یا یوں کہہ دے کہ یہ شئ اتنے میں اس شرط کے ساتھ تیرے ہاتھ فروخت کرتا ہوں کہ جب میں ثمن واپس دے دوں گا تو وہ شئ مجھ کو واپس کردے گا۔

بیع الوفاء کا جواز

اس عقد کے جواز اور عدمِ جواز میں فقہاءِ متأخرین میں دو فریق ہوگئے:

فریقِ اول:

حضرت امام ظہیر الدین اور صدر الشہید اور تاج الاسلام وغیرہؒ نے شرطِ فاسد کی وجہ سے اس عقد کو فاسد قرار دیا ہے، اور امام ابوشجاعؒ، امام علی سغدیؒ اور قاضی ابوالحسن ماتریدیؒ وغیرہ نے اس عقد کو رہن کی طرح اور رہن کے حکم میں قرار دیا ہے، اور مرتہن کے لئے رہن سے انتفاع جائز نہیں ہے، اور بیع الوفاء میں مشتری مبیع سے فائدہ اٹھاتا ہے، اس لئے یہ عقد ان کے نزدیک جائز ہے۔

علامہ زیلعیؒ اس کو ان الفاظ سے نقل فرماتے ہیں:

مِنْهُمُ الإِمَامُ ظَهِيرُ الدِّينِ وَالصَّدْرُ الشَّهِيدُ حُسَامُ الدِّينِ وَالصَّدْرُ السَّعِيدُتَاجُ الإِسْلامِ -إلى- فَجَعَلُوْهُ فَاسِداً بِاعْتِبَارِ شَرْطِ الْفَسْخِ (إِلٰى قَوْلِهٖ) وَمِنْهُمْ مَنْ جَعَلَهُ رَهْناً مِنْهُمُ السَّيِّدُ الإِمَامُ أَبُو شُجَاعٍ وَالْإِمَامُ عَلِي السُّغْدِيُ وَالإِمَامُ الْقَاضِيُ أَبُوْ الْحَسَنِ الْمَاتُرِيْدِىُ قَالُوْا: لَمَّا شُرِطَ عَلَيْهُ أَخْذُهُ عِنْدَ قَضَاءِ الدَّيْنِ أَتىٰ بِمَعْنَى الرَّهْنِ (إِلٰى قَوْلِهٖ) فَإِذَا كَانَ رَهْناً لا يَمْلِكُهُ وَلَا يَنْتَفِعُ بِهٖ. (تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٥/ ١٨٣، زكريا ٦/ ٢٣٧)

فقہاء میں سے امام ظہیر الدین، صدر الشہید امام حسام الدینؒ اور صدر السعید تاج الاسلامؒ نے اس کو فسخ کی شرط کی وجہ سے عقد فاسد قرار دیا ہے۔ (زیلعیؒ فرماتے ہیں) اور فقہاء میں سے جن لوگوں نے اس کو رہن قرار دیا ہے ان میں سید امام ابوشجاعؒ اور امام علی سغدیؒ اور امام ابوالحسن ماتریدیؒ وغیرہ شامل ہیں، ان لوگوں نے کہا کہ جب قضاء دین کے وقت واپسی کی شرط لگائی ہے تو یہ عقد رہن کا معنی ادا کرتا ہے۔ پس جب رہن ثابت ہوگا تو مرتہن اس کا مالک نہ ہوگا، اور نہ ہی اس سے انتفاع جائز ہوگا۔

فریقِ ثانی:

مشائخ سمرقند اور مشائخ بلخ اور مشائخ بخاریٰ نے مفلسین اور حاجت مندوں کی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مذکورہ بیع الوفاء کو جائز قرار دیا ہے، اور امام نجم الدین نسفیؒ نے نقل کیا ہے کہ ان کے زمانہ کے تمام مشائخ نے متفق ہوکر اس معاملہ کو جائز قرار دیتے ہوئے بہت سے احکامِ بیع کے لئے مفید ثابت کیا ہے۔

اورصاحبِ نہایہ نے اس کے جواز کے قول کومفتی بہ قرار دیا ہے، اور علامہ زین الدین ابن نجیم مصریؒ نے دیون کی کثرت کے زمانہ میں بیع الوفاء کی صحت وجواز پرفتویٰ کا حکم فرمایا ہے۔

وَمِنْ مَشَايِخِ سَمَرْقَنْدَ مَنْ جَعَلَهُ بَيْعًا جَائِزاً مُفِيْداً بَعْضَ أَحْكَامِهِ وَمِنْهُمُ الإِمَامُ نَجْمُ الدِّيْن النَّسَفِيُّ فَقَالَ اِتَّفَقَ مَشَايِخُنَا فِيْ هٰذَا الزَّمَانِ فَجَعَلُوْهُ بَيْعاً جَائِزاً مُفِيْداً بَعْضَ أَحْكَامِهِ وَهُوَ الْإِنْتِفَاعُ بِهِ دُوْنَ الْبَعْضِ وَهُوَ الْبَيْعُ لِحَاجَةِ النَّاسِ إِلَيْهِ وَلِتَعَامُلِهِمْ فِيْهِ وَالْقَوَاعِدُ قَدْ تُتْرَكُ بِالتَّعَامُلِ، وَقَالَ صَاحِبُ النِّهَايَةِ وَعَلَيْهِ الْفَتْوىٰ.

(تبيين الحقائق إمداديه ملتان ۱۸۳/۵، زكريا ۲۳۷/۶، ايضاح النوادر ۷۱/۱)

اور مشائخ سمرقند میں سے وہ مشائخ بھی ہیں جو اس بیع کو جائز قرار دیتے ہیں، جو بعض احکامِ بیع کے لئے مفید ہے، اور ان میں سے امام نجم الدین نسفیؒ نے کہا کہ اس زمانہ کے مشائخ اس عقد کے جواز پر متفق ہیں، یہ عقد بعض احکام کو مفید ہے، مثلاً مبیع سے انتفاع حاصل کرنا اور بعض کو مفید نہیں (مثلاً فروختگی کے عدمِ جواز) اور یہ عقد لوگوں کی ضرورت اور تعامل کی وجہ سے جائز ہے اور صاحبِ نہایہ نے کہا ہے کہ اس کے جواز ہی پر فتویٰ ہے۔

اور علامہ ابن نجیم مصریؒ الاشباہ میں اس کے جواز کو ان الفاظ میں بھی نقل فرماتے ہیں:

وَمِنْ هٰذَا الْقَبِيْلِ بَيْعُ الْأَمَانَةِ الْمُسَمّٰى بِبَيْعِ الْوَفَاءِ جَوَّزَهُ مَشَايِخُ بَلْخٍ وَبُخَارىٰ تَوْسِعَةً الخ. (الاشباه والنظائر قديم ۱۳۰)

اور اسی قبیل میں سے بیع الامانت ہے، جس کو بیع الوفاء کہا جاتا ہے، اس کو مشائخ بلخ ومشائخ بخاریٰ نے لوگوں کے لئے وسعت دیتے ہوئے جائز قرار دیا ہے۔

وَمِنْهَا الإِفْتَاءُ بِصِحَّةِ بَيْعِ الْوَفَاءِ حِيْنَ كَثُرَ الدَّيْنُ عَلٰى أَهْلِ بُخَارٰى وَهٰكَذَا بِمِصْرَ وَسَمُّوْهُ بَيْعَ الْأَمَانَةِ وَالشَّافِعِيَّةُ يُسَمُّوْنَهُ الرَّهْنَ الْمُعَادَ. (الأشباه والنظائر قديم ۱۴۹، انوار رحمت ۲۱۵-۲۱۹)

اور ان میں سے بیع الوفاء کی صحت پر فتویٰ ہے، جب اہلِ بخاریٰ پر دیون کا سلسلہ زیادہ ہوگیا تھا، اور اسی طرح مصر میں بھی جواز کا فتویٰ ہے اور اس کو بیع الامانۃ کہا جاتا ہے اور شافعیہ نے اس کا نام ’’رہنِ معاد رکھا ہے۔

مناسب ومعتدل حکم

اب معلوم ہوا کہ بیع الوفاء کے جواز وعدمِ جواز میں فقہاء متأخرین اور اساطینِ امت کے مابین اختلاف واقع ہو چکا ہے، اور دونوں طرف ایسے ایسے فقہاء ہیں جن کے قول ورائے کو دلیل شرعی مانا جاتا ہے، اور لوگوں کی ضرورت اور تعاملِ ناس جواز کے قائلین کے موافق ہے۔ اور تعاملِ ناس اور عرف کو شرعی طور پر ’’اَلثَّابِتُ بِالْعُرْفِ کَالثَّابِتِ بِالنَّصِّ‘‘ (عقود رسم المفتی ۹۴) کے قاعدہ سے حجتِ شرعیہ کا درجہ بھی حاصل ہے۔ اور حضرت تھانوی قدس سرہ نے امداد الفتاویٰ میں فریقِ اول کے دلائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اصولاً عدمِ جواز کو ثابت کیا ہے، اور بوقتِ ضرورت فریقِ ثانی کے قول پر عمل کی اجازت دی ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/۱۰۷)

اور حضرت مولانا حافظ مفتی عبد اللطیف صاحب محدث سہارن پوریؒ نے فتاویٰ خلیلیہ میں بیع الوفاء کو جائز قرار دیتے ہوئے یہ شکل پیش فرمائی ہے کہ دستاویز لکھتے وقت بیع کو مطلق عن الشرط رکھا جائے، اور مبیع مع الشرط کی عبارت اور قید نہ لگائی جائے؛ تاکہ فقہاء متأخرین کے دونوں فریقوں کے قول پر عمل ثابت ہو جائے۔ (مستفاد: فتاویٰ خلیلیہ ۱/۳۹۵، ایضاح النوادر ۱/۴۳۷)

نیز حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مایہ ناز شاگرد حضرت فخر الاسلام مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا فتوی بھی یہی ہے کہ جب بغیر نفع لئے کوئی شخص رہن لینے پر رضا مند نہیں ہوتا ہے، تو ایسی صورت میں ربا سے بچنے کے لئے بیع الوفاء کا معاملہ جائز اور درست ہے، اگر مدت کی قید لگائی ہے تو ایسی صورت میں مدت پوری ہوجانے کے بعد بائع یعنی راہن کا حق اسی وقت ختم نہیں ہوگا؛ بلکہ اس کے بعد بھی اس کو لینے کا حق باقی رہے گا؛ البتہ اس مدت کے بعد مشتری کو مرتہن کی طرح یہ اختیار رہے گا کہ بائع کے نہ لینے کی صورت میں جائیداد کو فروخت کرکے اپنی رقم وصول کرلے۔ ملاحظہ ہو عکس احمد (سوانح حیات فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحب مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند، ص:۴۵۲، مکتبہ حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند)

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ کے قابل اعتماد عالم اور فقیہ تھے، نظام حیدر آباد نے آپ کو وہاں کے مسند افتاء کی صدارت بھی عطا کی تھی، اس زمانہ میں جو فتاوی لکھے گئے ہیں ان میں سے حضرت والا کے اہم ترین چھپن فتاوی جو انتہائی مدلل ہیں عکس احمد میں ص:۳۷۶ سے ۴۶۳ تک میں نقل کئے گئے ہیں، ان میں مذکورہ فتوی تقریباً دو صفحہ پر مدلل طور پر موجود ہے۔

اس لئے ضرورت اور حاجتِ ناس کی وجہ سے مشائخِ سمرقند اور مشائخِ بلخ اور مشائخِ بخاری اور امام نجم الدین نسفیؒ اور صاحبِ نہایہ وغیرہم کے فتویٰ کے مطابق اس زمانہ میں بیع الوفاء کے جواز پر فتویٰ دینا اولیٰ اور انسب ہوگا۔

بیع الوفاء کے بارے میں مفصل بحث اور فقہاء کی آراء

بیع الوفاء کو فقہی نقطۂ نظر سے کس اصول اور ضابطہ کے دائرہ میں داخل کیا جائے؟ آیا اسے بیعِ صحیح کے دائرہ میں داخل کیا جائے یا بیعِ فاسد کے دائرہ میں یا رہن کے اصول وضابطہ کے دائرہ میں شمار کیا جائے یا بیع مکرہ کے ضابطہ میں داخل کیا جائے، یا اسے بیع اور رہن سے مرکب ایک الگ عقد قرار دیا جائے یا بیع صحیح اور بیع فاسد اور رہن تینوں سے مرکب ہوکر ایک مستقل عقد

قرار دیا جائے؟ تو اس سلسلہ میں فقہاءِ متأخرین کے مختلف نظریات اور مختلف اقوال پر غور کرنے کے بعد حضراتِ فقہاء کے سات فریق اور سات اقوال وآراء ہمارے سامنے ہیں، جن کو ترتیب وار یہاں پر درج کردیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

فریقِ اول بیع صحیح کے قائلین

مشائخ بلخ اور مشائخ بخاریٰ نے بیع الوفاء کے جواز پر فتویٰ جاری فرمایا ہے اور مشائخ سمرقند میں سے امام نجم الدین نسفیؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ بیع الوفاء کو لوگوں کی ضرورت اور اس میں تعامل کی وجہ سے بیع صحیح کے اصول وضابطہ کے دائرہ میں داخل کر کے صحیح قرار دیا جائے گا، اس لئے کہ زمانہ کے تمام مشائخ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ ایسی بیع ہے جو جائز ہے اور بہت سے احکامِ بیع کو محیط اور مفید ہے، اور لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے اس عقد کو جائز اور صحیح قرار دیا گیا ہے، اور امام زیلعیؒ نے اسی کو مفتی بہ قرار دیا ہے۔ اور علامہ ابن نجیمؒ نے الاشباہ میں بیع الوفاء کے بیع صحیح ہونے اور اس کی صحت پر فتویٰ نقل فرمایا ہے؛ لہٰذا بیع الوفاء شرعی طور پر جائز اور درست ہے۔ حضراتِ فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمائیے:

وَمِنْ مَشَايِخِ سَمَرْقَنْدَ مَنْ جَعَلَهُ بَيْعاً جَائِزاً مُفِيْداً بَعْضَ أَحْكَامِهِ مِنْهُمُ الإِمَامُ نَجْمُ الدِّيْنِ النَّسَفِيُّ فَقَالَ اِتَّفَقَ مَشَايِخُنَا فِيْ هٰذَا الزَّمَانِ فَجَعَلُوْهُ بَيْعاً جَائِزاً مُفِيْداً بَعْضَ أَحْكَامِهِ وَهُوَ الْاِنْتِفَاعُ بِهِ دُوْنَ الْبَعْضِ

اور مشائخ سمرقند میں سے کچھ وہ حضرات ہیں جنہوں نے اس کو بیع صحیح اور بیع جائز کے دائرہ میں داخل کیا ہے، جو بیع کے بعض احکام کو مفید ہے، انہیں مشائخ میں سے امام نجم الدین نسفیؒ ہیں، پس وہ فرماتے ہیں کہ اس زمانہ کے مشائخ نے متفق ہو کر اس بیع کو جائز قرار دیا ہے جو عقد بیع کے بعض احکام کو مفید ہے، اور وہ اس بیع کے بعض منافع سے فائدہ اٹھانا ہے، بعض سے نہیں (جیسا کہ مشتری اس کو بیچ

وَهُوَ الْبَيْعُ لِحَاجَةِ النَّاسِ إِلَيْهِ وَلِتَعَامُلِهِمْ فِيْهِ وَالْقَوَاعِدُ قَدْ تُتْرَكُ بِالتَّعَامُلِ وَجُوِّزَ الْاِسْتِصْنَاعُ لِذٰلِكَ وَقَالَ صَاحِبُ النِّهَايَةِ وَعَلَيْهِ الْفَتْوىٰ. (تبيين الحقائق إمداد ملتان ۵/۱۸۳، ۱۸۴، زکریا ۶/۲۳۷)

نہیں سکتا) اور لوگوں کو اس بیع کی ضرورت ہونے کی وجہ سے اور لوگوں کے اس میں تعامل ہونے کی وجہ سے اس بیع کو جائز قرار دیا گیا ہے، اور کبھی تعاملِ ناس کی وجہ سے قواعد وضوابط کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے بیعِ استصناع کو جائز قرار دیا گیا ہے اور صاحبِ نہایہ نے کہا کہ اس کے بیعِ صحیح ہونے پر ہی فتویٰ ہے۔

اور علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بیع صحیح ہونے کو زیلعی کے حوالہ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، نیز علامہ ابن نجیم مصری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح کے الفاظ نقل فرمائے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

أَنَّهُ بَيْعٌ صَحِيْحٌ يُفِيْدُ لِبَعْضِ أَحْكَامِهِ مِنْ حِلِّ الْاِنْتِفَاعِ بِهٖ إِلَّا أَنَّهُ لَا يَمْلِكُ بَيْعَهُ، قَالَ الزَّيْلَعِيُّ فِي الْإِكْرَاهِ وَعَلَيْهِ الْفَتْوىٰ. (شامی زکریا ۷/۵٤٦، کراچی ۵/۲۷۷، وهٰكذا فی البحر الرائق کوئٹه ٦/۷، زکریا ٦/۱۲)

بے شک یہ بیع صحیح ہے جو بیع کے بعض احکام کو مفید ہے، اس کے ذریعہ نفع کے حلال ہونے کی وجہ سے مگر یہ کہ مشتری اس کو بیچنے کا مالک نہیں ہوگا، زیلعی نے کتاب الاکراہ میں فرمایا ہے کہ اسی پر فتویٰ ہے۔

الاشباہ والنظائر میں اس طرح کے الفاظ سے نقل کیا گیا ہے:

وَمِنْ هٰذَا الْقَبِيْلِ بَيْعُ الْأَمَانَةِ الْمُسَمّٰى بَيْعُ الْوَفَاءِ جَوَّزَهُ

اور اسی قبیل سے بیع الأمانۃ ہے جو بیع الوفاء کے نام سے موسوم ہے، مشائخ بلخ اور مشائخ

مَشَایِخُ بَلْخٍ وَبُخَارِیٰ تَوْسِعَةً. (الاشباه والنظائر قديم ١٣٠)

بخاریٰ نے لوگوں سے تنگی دور کر کے وسعت دیتے ہوئے اس کو جائز قرار دیا ہے۔

اورالاشباہ والنظائر میں دوسری جگہ صاف الفاظ کے ساتھ مذکور ہے کہ بیع الوفاء کے بیع صحیح ہونے پر ہی فتویٰ ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

وَمِنْهَا الإِفْتَاءُ بِصِحَّةِ بَيْعِ الْوَفَاءِ حِيْنَ كَثُرَ الدَّيْنُ عَلٰى أَهْلِ بُخَارِیٰ وَهٰكَذَا بِمِصْرَ وَقَدْ سَمُّوْهُ بَيْعَ الْأَمَانَةِ وَالشَّافِعِيَّةُ يُسَمُّوْنَهُ الرَّهْنَ الْمُعَادَ. (الاشباه والنظائر قديم ١٤٩)

اسی قبیل میں سے بیع الوفاء کی صحت پر فتویٰ جاری کرنا ہے جس وقت اہل بخاریٰ پر دیون کی کثرت ہوگئی تھی اور ایسا ہی مصر میں ہوا ہے اور یقیناً اس کا نام مشائخ مصر نے بیع الأمانۃ رکھا ہے اور شوافع نے اس کا نام ’’الرہن المعاد‘‘ رکھا ہے۔

فریقِ ثانی بیع فاسد کے قائلین

امام ظہیرالدین ابوبکر محمد بن احمد البخاری اور امام شہاب الدین احمد الچلپی وغیرہ فرماتے ہیں کہ بیع الوفاء میں مقتضائے عقد کے خلاف شرطِ فاسد پائی جاتی ہے اس لئے بیع الوفاء کو بیع فاسد کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل کیا جائے گا اور بائع کے ثمن اور دین کی واپسی کے موقع پر مبیع کی واپسی کو بیع فاسد کے اصول وضوابط کے مطابق واجب الاسترداد قرار دیا جائے گا؛ لہٰذا اس کا حکم تمام بیوعِ فاسدہ کے حکم کی طرح ہوگا، اس لئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عقد بیع کے ساتھ شرط لگانے سے منع فرمایا ہے، اس کو حضراتِ فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

وَاخْتَارَهُ الإِمَامُ ظَهِيرُ الدِّيْنِ أَنَّهُ بَيْعٌ فَاسِدٌ فَلَوْ تَبَايَعَا ثُمَّ قَالَ أَحَدُهُمَا چون سیم آریم بیع بمن بازده فَقَالَ نَعَمْ لَا يَفْسُدُ الْبَيْعُ، أَمَّا لَوْ شَرَطَاهُ فِي الْبَيْعِ يَفْسُدُ. (بزازية زكريا جديد ١/ ٢٥١، وعلى هامش الهندية ٤/ ٤٠٧)

اسی کو امام ظہیر الدین نے اختیار فرمایا ہے بایں طور پر کہ یہ بیع فاسد ہے؛ لہٰذا اگر طرفین نے عقد کرلیا ہے پھر ان میں سے ایک نے کہا جب میں ثمن لاکر کے واپس کردوں گا تو میری مبیع مجھے واپس کردینا، دوسرے نے کہا جی ہاں! تو بیع فاسد نہیں ہوگی، بہرحال اگر دونوں نے عقد بیع میں اس کی شرط لگادی ہے تو بیع فاسد ہوجائے گی۔

وَالْأَصَحُّ عِنْدِيْ أَنَّهُ بَيْعٌ فَاسِدٌ يُوْجِبُ الْمِلْكَ بَعْدَ الْقَبْضِ وَحُكْمُهُ حُكْمُ سَائِرِ الْبِيَاعَاتِ الْفَاسِدَةِ لِأَنَّهُ بَيْعٌ بِشَرْطٍ لَا يَقْتَضِيْهِ الْعَقْدُ وَقَدْ نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعٍ وَشَرْطٍ الخ. (حاشيه شلبى على تبيين الحقائق إمداديه ملتان ٥/ ١٨٤، زكريا ٦/ ٢٣٨)

اور زیادہ صحیح میرے نزدیک یہی ہے کہ بیع الوفاء بیع فاسد ہے جو قبضہ کے بعد ملکیت کو لازم کرتی ہے اور اس کا حکم تمام بیوعِ فاسدہ کی طرح ہے؛ اس لئے کہ یہ بیع ایسی شرط کے ساتھ مشروط ہے جس کا عقد تقاضہ نہیں کرتا، حالاں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع اور شرط سے منع فرمایا ہے۔

فریقِ ثالث بیع صحیح یا بیعِ فاسد کے قائلین

امام فخر الدین حسن بن منصور الاوزجندی وغیرہ نے فرمایا کہ بیع الوفاء رہن کے دائرہ میں داخل نہیں ہوسکتی؛ بلکہ صحیح بات یہی ہے کہ وہ عقدِ بیع ہی کے دائرہ میں داخل ہوگی؛ لہٰذا اگر صلبِ

عقد میں اس بات کی شرط لگائی ہے کہ ثمن کی واپسی پر مبیع بھی واپس ہو جائے گی تو صلبِ عقد میں مقتضائے عقد کے خلاف شرط لگانے کی وجہ سے بیع فاسد کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل ہوگی، اس لئے حضراتِ صاحبین فرماتے ہیں کہ بیع الوفاء بیع فاسد کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل ہے، اور اگر صلبِ عقد میں شرط نہیں لگائی ہے؛ بلکہ اولاً بغیر شرط کے عقد بیع وجود میں آجائے پھر اس کے بعد آپس کی تراضی سے اس بات کی شرط لگادی جائے کہ ثمن کی واپسی پر مبیع کی واپسی لازم ہو جائے گی تو ایسی صورت میں چوں کہ صلبِ عقد میں شرطِ فاسد نہیں پائی گئی ہے، اس لئے یہ عقد بیعِ صحیح کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل ہوگا، اور وعدہ کے مطابق ثمن کی واپسی پر مبیع کا استرداد لازم ہو جائے گا، جیسا کہ فقہاء کی حسبِ ذیل عبارات سے واضح ہوتا ہے:

وَالصَّحِيْحُ أَنَّ الْعَقْدَ الَّذِيْ جَرىٰ بَيْنَهُمَا إِنْ كَانَ بِلَفْظِ الْبَيْعِ لَا يَكُوْنُ رَهْناً ثُمَّ يُنْظَرُ إِنْ ذَكَرَا شَرْطَ الْفَسْخِ فِي الْبَيْعِ فَسَدَ الْبَيْعُ وَإِنْ لَمْ يَذْكُرَا ذٰلِكَ فِي الْبَيْعِ وَتَلَفَّظَا بِلَفْظِ الْبَيْعِ بِشَرْطِ الْوَفَاءِ أَوْ تَلَفَّظَا بِالْبَيْعِ الْجَائِزِ وَعِنْدَهُمَا هٰذَا الْبَيْعُ عِبَارَةٌ عَنْ عقد غَيْرِ لَازِمٍ فَكَذٰلِكَ وَلَفْظُهُ صَاحِبِ الْبَحْرِ فَالْبَيْعُ فَاسِدٌ وَإِنْ ذَكَرَا الْبَيْعَ بِلَا شَرْطٍ ثُمَّ شَرَطَاهُ عَلٰى	اور صحیح یہی ہے کہ بے شک وہ ایسا عقد ہے جو متعاقدین کے درمیان میں جاری ہوا ہے، اگر لفظ بیع کے ساتھ عقد ہوا ہے تو وہ رہن نہیں ہوسکتا، پھر دیکھا جائے کہ اگر صلب عقد میں فسخ کی شرط کا ذکر کیا ہے تو بیع فاسد ہو جائے گی، اور اگر صلب عقد میں اس شرط کا ذکر نہیں کیا ہے اور دونوں نے لفظ بیع کا تلفظ وفا کی شرط کے ساتھ کیا ہے یا دونوں نے بیع جائز کے ساتھ تلفظ کیا ہے اور ایسی بیع کا نام حضراتِ صاحبینؒ کے نزدیک بیع غیر لازم ہے، تو بھی ایسا ہی حکم ہوگا اور صاحب بحر کے الفاظ یہ ہیں کہ ایسی صورت میں بیع فاسد

وَجْهِ الْمُوَاعِدَةِ جَازَ الْبَيْعُ وَلَزِمَ الْوَفَاءُ وَقَدْ يَلْزَمُ الْوَعْدُ لِحَاجَةِ النَّاسِ فِرَاراً مِنَ الرِّبَا. (قاضي خان زكريا جديد ٢/ ٩٩، وعلى هامش الهندية ٢/ ١٦٥، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٥/ ١٨٤، زكريا ٦/ ٢٣٧، بزازية، زكريا جديد ١/ ٢٥١، وعلى هامش الهندية ٤/ ٤٠٦، البحرالرائق، كوئٹه ٦/ ٨، زكريا ٦/ ١٢)

ہوجائے گی اوراگر بغیر شرط کے دونوں نے عقد میں لفظ بیع کا ذکر کیا ہے، پھراس کے بعد معاہدہ کے طور پر وفا کی شرط لگائی ہے تو بیع جائز اور صحیح ہوجائے گی اور وفا بھی لازم ہوجائے گی، اور کبھی سود سے راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے وعدہ کا پورا کرنا لازم ہوجاتا ہے۔

فریقِ رابع رہن کے حکم کے قائلین

امام سید ابوشجاع اور امام ابوالحسن علی السغدی اور امام قاضی ابوالحسن الماتریدی اور ائمہ خوارزم اور خاتم المجتہدین مولانا سیف الدین عصبہ وغیرہ بیع الوفاء کو رہن کے اصول وضابطہ کے دائرہ میں داخل کرتے ہیں، اوراس کو رہن ہی تسلیم کرتے ہیں، بس فرق اتنا ہے کہ ائمہ خوارزم بعض شرائط کے ساتھ رہن تسلیم کرتے ہیں اور امام سیف الدین عصبہ علی الاطلاق اس کو رہن تسلیم کرتے ہیں، اسی طرح فتاویٰ قاضی خان میں ہے کہ امام ابوشجاع اور قاضی ابوالحسن علی سغدی بھی بیع الوفاء کو علی الاطلاق رہن کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل کرکے اس کے اوپر رہن کے حکم کی طرح حکم لگاتے ہیں، چناں چہ ان کے نزدیک مشتری مبیع کا مالک نہیں ہوگا اور مبیع سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا مشتری کے لئے جائز نہیں ہوگا؛ البتہ رہن کی طرح مالک کی اجازت سے فائدہ اٹھانا جائز ہوسکتا ہے، اور رہن کی طرح مبیع کے ہلاک ہونے کی وجہ سے

دین بھی ساقط ہوجائے گا؛ لیکن ائمہ خوارزم اس کو تین باتوں میں سے ایک بات کے ساتھ مشروط کرتے ہیں:

(۱) بوقتِ عقد بیع مطلق رکھی جائے اور بوقتِ واپسی جب بائع ثمن لے کر حاضر ہوجائے گا تو مشتری بیع کو فسخ کرنے کے لئے کسی کو وکیل بنادے۔

(۲) بیعِ مطلق کے بعد اس بات پر معاہدہ ہوجائے کہ جب بائع ثمن لے کر آئے گا تو خود بخود بیع فسخ ہوجائے گی۔

(۳) عقد کے بعد مشتری اصل مال پر نفع کی شرط لگادے تو ان تینوں صورتوں میں ائمہ خوارزم بیع الوفاء کو رہن کے درجہ میں قرار دیتے ہیں۔

اور یہ حضرات بیع الوفاء کو رہن کے حکم میں قرار دینے میں حسبِ ذیل نظائر پیش کرتے ہیں:

(۱) اس بیع میں مشتری کو مبیع کی فروختگی کا حق نہیں۔

(۲) مبیع کو دوسرے کے ہاتھ رہن میں رکھنے کا حق نہیں۔

(۳) مبیع اگر باغ ہے تو اس کے درختوں کو کاٹنے کا حق نہیں۔

(۴) مبیع اگر عمارت ہے تو منہدم کرنے کا حق نہیں۔

(۵) مشتری کے ہاتھ میں اگر مبیع ہلاک ہوجائے تو ثمن اور دین ساقط ہوجاتا ہے؛ لہٰذا بائع سے ثمن کی واپسی کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔

(۶) اگر مبیع میں نقصان اور کمی آجائے تو رہن کی طرح ثمن اور دین طرفین کے درمیان نقصان کے تناسب سے تقسیم ہوجاتا ہے۔ (مستفاد: بزازیہ زکریا جدید ۱/ ۲۵۲، وعلی ہامش الہندیہ ۴/ ۴۰۹)

(۷) جس طرح معاملہ رہن میں مرتہن کے مالِ رہن کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کردینے پر راہن کو یہ حق حاصل ہوجاتا ہے کہ بیع باطل کرکے مالِ رہن کو اپنے قبضہ میں لے لے، اسی

طرح بیع الوفاء میں بھی مشتری جب مبیع کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کردے گا تو مالک کو یہ حق حاصل ہوجاتا ہے کہ بیعِ ثانی کو باطل کرکے مشتری ثانی سے مالِ مبیع اپنے قبضہ میں لے لے، ہاں البتہ یہ بات الگ ہے کہ مرتہن کو اپنے قرض کے وصول ہونے تک لوٹ کر مالِ رہن کو اپنے قبضہ میں لینے کا حق ہے، اسی طرح بیع الوفاء میں بھی مالک کے قبضہ میں پہنچ جانے کے بعد مشتری اول کو اپنے ثمن کے وصول ہونے تک مالک سے مالِ مبیع اپنے قبضہ میں لینے کا حق ہے۔ (بزازیہ زکریا جدید ۱/ ۲۵۱، وعلی ہامش الہندیۃ ۴/ ۴۰۶، شامی زکریا ۷/ ۵۴۸، کراچی ۵/ ۲۷۸)

ان تمام نظائر کی وجہ سے ان حضرات نے اس کو رہن کے اصول وضابطہ کے دائرہ میں داخل کردیا ہے، اوران لوگوں کی رائے کے مطابق مشتری بائع کی اجازت کے بغیر مالِ مبیع سے کوئی فائدہ اٹھا نہیں سکتا۔ جوحسبِ ذیل عبارت سے واضح ہوتا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

قَالَ أَكْثَرُ الْمَشَايِخِ مِنْهُمُ السَّيِّدُ الإِمَامُ أَبُوْ شُجَاعٍ وَالْقَاضِيُ الإِمَامُ أَبُو الْحَسَنِ عَلِي السُّغْدِيُ، حُكْمُهُ حُكْمُ الرَّهْنِ لا يَمْلِكُهُ الْمُشْتَرِيُ وَيَضْمَنُهُ الْمُشْتَرِيُ بِالأَكْلِ مِنْ ثَمَرِهِ وَلَا يُبَاحُ لَهُ الْاِنْتِفَاعُ وَلَا الْأَكْلُ إِلَّا بِإِبَاحَةِ الْمَالِكِ وَيَسْقُطُ الدَّيْنُ بِهَلَاكِهِ إِذَا كَانَ بِهِ وَفَاءً بِالدَّيْنِ وَلَا يَضْمَنُ الزِّيَادَةَ إِذَا هَلَكَ لَا بِصُنْعِهِ

اکثر مشائخ نے کہا جن میں سید امام ابوشجاع اور قاضی امام ابوالحسن علی السغدی وغیرہ ہیں کہ اس بیع کا حکم رہن کے حکم کی طرح ہے، اس میں مشتری مبیع کا مالک نہیں ہوگا اور اس کے پھل کھانے کی وجہ سے مشتری اس کا ضامن ہوجائے گا، اور مشتری کے لئے مبیع سے انتفاع مباح نہیں ہے، اور نہ ہی اس میں سے کچھ کھانا جائز ہے، مگر مالک کی اجازت سے جائز ہے اور مبیع کی ہلاکت کی وجہ سے دین ساقط ہوجائے گا، جب مبیع دین کے

وَلِلْبَائِعِ أَنْ يَّسْتَرِدَّ إِذَا قَضَى الدَّيْنَ. (فتاویٰ قاضي خان جديد زكريا ۲/ ۹۹، وعلى هامش الهندية ۱٦٥/۲، تبيين الحقائق إمداديه ملتان ٥/ ۱۸۳، زكريا ٦/ ۲۳۷)

برابر ہو، اور زیادہ کا تاوان لازم نہیں ہوگا، جب مشتری کی تعدی اور لاپرواہی کے بغیر ہلاک ہوجائے اور بائع کو مبیع واپس لینے کا حق ہوگا جب دین ادا کردے۔

اور الجامع الوجیز میں حافظ الدین بزازیؒ نے ائمہ خوارزم کی رائے کو ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

وَاخْتَارَهُ أَئِمَّةُ خَوَارِزْمَ أَنَّهُ إِذَا أَطْلَقَ الْبَيْعَ لٰكِنْ وَكَّلَ الْمُشْتَرِيْ وَكِيْلاً بِفَسْخِ الْبَيْعِ إِذَا أَحْضَرَ الْبَائِعُ الثَّمَنَ أَوْ عَهِدَ عَلٰى أَنَّهُ إِذَا أَوْفَاهُ فَسَخَ الْبَيْعُ وَالثَّمَنُ لَا يُعَادِلُ الْمَبِيْعَ وَفِيْهِ غَبَنٌ فَاحِشٌ أَوْ وَضَعَ الْمُشْتَرِيْ عَلٰى أَصْلِ الْمَالِ رِبْحاً بِأَنْ وَضَعَ عَلٰى مِائَةٍ عِشْرِيْنَ دِيْنَاراً فَرَهَنَ (إِلٰى قَوْلِهٖ) وَاخْتَارَ خَاتَمُ الْمُجْتَهِدِيْنَ مَوْلَانَا سَيْفُ الدِّيْنِ الْعَصَبَةُ أَنَّهُ رَهْنٌ. (بزازية، زكريا جديد ۱/ ۲٥۱، على هامش الهندية ٤/۷۰٤)

جس کو ائمہ خوارزم نے اختیار فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ جب بیع کو مطلق رکھا جائے؛ لیکن جب بائع ثمن لے کر کے حاضر ہوجائے تو مشتری بیع کو فسخ کرنے کے لئے کسی کو وکیل بنادے یا بیع مطلق کے بعد اس بات پر معاہدہ ہوجائے کہ جب بائع ثمن لاکر پیش کردے گا تو عقد بیع خود بخود فسخ ہوجائے گا اور ثمن مبیع کے برابر نہ ہو اور اس میں غبن فاحش ہو یا مشتری عقد کے بعد اصل مال پر نفع کی شرط لگادے مثلاً ہر سو دینار پر بیس دینار نفع کا رہے گا، تو ان تمام صورتوں میں یہ عقد رہن کے حکم میں ہوگا، اور خاتم المجتہدین مولانا سیف الدین عصبہ نے اسی کو اختیار فرمایا ہے کہ وہ رہن ہی ہوگا۔

فریقِ خامس بیع المکرّہ کے حکم کے قائلین

مشائخ بخاریٰ میں سے امام صدر الشہید حسام الدین اور امام صدر السعید تاج الدین امام علاء الدین بدر اور صاحبِ ہدایہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ بیع الوفاء بیع مکرہ کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل ہوگی اور اس کو بیع فاسد قرار دینا صحیح نہیں ہے جیسا کہ امام ظہیر الدین بخاریؒ نے اس کو بیع فاسد بھی تسلیم کیا اور بیع مکرہ کے درجہ میں بھی قرار دیا جو کہ درست نہیں ہے؛ بلکہ بیع مکرہ کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل کرنا زیادہ صحیح ہے، امام زیلعیؒ نے تبیین الحقائق میں امام ظہیر الدین بخاریؒ کو بیع مکرہ کے قائلین کی فہرست میں شمار فرمایا ہے، حالاں کہ وہ بیع فاسد کے قائلین کی فہرست میں شامل ہیں، اسی وجہ سے بزازیہ میں اس بات کو صاف واضح کردیا گیا ہے کہ بیع الوفاء بیع مکرہ کے اصول وضابطہ کے دائرہ میں داخل ہے، اس لئے بیع الوفاء بیع مکرہ کی طرح ہوگی۔

اور بیع فاسد کے اصول وضوابط میں داخل نہیں ہے؛ لہٰذا بیع الوفاء کا حکم بیع فاسد کی طرح نہیں ہوگا؛ بلکہ بیع مکرہ کی طرح ہوگا اور امام ظہیر الدین بخاری نے دونوں کو مخلوط کردیا ہے، اور امام علاء الدین بدرؒ فرماتے ہیں کہ جنہوں نے دونوں کو مخلوط کردیا ہے وہ درست نہیں ہے؛ اس لئے کہ دونوں کے شرائط وضوابط الگ الگ ہیں؛ لہٰذا بیع الوفاء واجب الاسترداد ہونے میں بیع مکرہ کی طرح ہوگی، بیع فاسد کی طرح نہیں۔ فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمایئے:

وَمِنْ مَشَايِخِ بُخَارِىٰ مَنْ جَعَلَ بَيْعَ الْوَفَاءِ كَبَيْعِ الْمُكْرَهِ مِنْهُمُ الإِمَامُ ظَهِيْرُ الدِّيْنِ وَالصَّدْرُ الشَّهِيْدُ حُسَامُ الدِّيْنِ وَالصَّدْرُ السَّعِيْدُ تَاجُ الاسْلَامِ وَصُوْرَتُهُ	مشائخ بخاریٰ میں سے جنہوں نے بیع الوفاء کو بیع مکرہ کی طرح قرار دیا ہے ان میں سے امام ظہیر الدینؒ اور صدر الشہید حسام الدینؒ اور امام صدر السعید تاج الاسلامؒ (وغیرہ) ہیں، اور اس کی صورت یہ ہے کہ بائع مشتری سے

أَنْ يَّقُوْلَ الْبَائِعُ لِلْمُشْتَرِيْ بِعْتُ مِنْكَ هٰذَا الْعَيْنَ بِدَيْنٍ لَكَ عَلَيَّ عَلٰى أَنِّيْ مَتٰى قَضَيْتُ الدَّيْنَ فَهُوَ لِيْ فَجَعَلُوْهُ فَاسِداً بِاعْتِبَارِ شَرْطِ الْفَسْخِ عِنْدَ الْقُدْرَةِ عَلٰى إِيْفَاءِ الدَّيْنِ يُفِيْدُ الْمِلْكَ وَعِنْدَ اتِّصَالِ الْقَبْضِ بِهٖ وَيُنْقَضُ بَيْعُ الْمُشْتَرِيْ كَبَيْعِ الْمُكْرَهِ لِأَنَّ الْفَسَادَ بِاعْتِبَارِ عَدَمِ الرِّضَا فَكَانَ حُكْمُهُ حُكْمُ بَيْعِ الْمُكْرَهِ فِيْ جَمِيْعِ مَا ذَكَرْنَا. (تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ۱۸۳/۵، زكريا ٦/ ۲۳۷)

کہے کہ یہ چیز میں نے تمہارے ہاتھ تمہارے دین کے بدلہ میں بیچ دی ہے اس شرط پر کہ جب میں تمہارا قرض ادا کردوں گا تو وہ چیز میری ہوجائے گی، تو ان حضرات نے اس عقد کو دین کی ادائیگی پر قدرت کے وقت فسخ عقد کی شرط کا اعتبار کرتے ہوئے عقد فاسد قرار دیا ہے، جو اتصالِ قبضہ کے وقت ملکیت کا فائدہ دیتا ہے اور دوسرے کے ہاتھ مشتری کی بیع ٹوٹ جایا کرے گی جیسا کہ مکرہ کی بیع ٹوٹ جاتی ہے؛ اس لئے کہ عدمِ رضا کی وجہ سے اس میں فساد آیا ہے؛ لہٰذا بیع الوفاء کا حکم بیع مکرہ کے حکم میں ہوگا، ان تمام امور میں جو ہم نے ذکر کئے ہیں۔

اور اس حکم کو امام حافظ الدین بزازی نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

أَجَابَ عَلَاءُ الدِّيْنِ بَدْرٌ أَنَّهٗ لَا يَصِحُّ وَعَلٰى هٰذَا اخْتِيَارُ صَاحِبُ الْهِدَايَةِ وَأَوْلَادِهٖ وَمَشَائِخُ زَمَانِنَا وَعَلَيْهِ الْفَتْوٰى أَعْنِيْ لَا يَمْلِكُ الْمُشْتَرِيْ الْبَيْعَ مِنَ الْغَيْرِ كَمَا فِيْ بَيْعِ

امام علاء الدین بدر نے اس طرح سے جواب دیا ہے کہ یہ بیع صحیح نہیں ہے اور اسی کو صاحب ہدایہ اور ان کی اولاد اور ہمارے زمانہ کے مشائخ نے اختیار کیا ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے یعنی مشتری دوسرے کے ہاتھ بیچنے کا مالک نہیں ہے۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ بیع مکرہ میں

اَلْمُكْرَهِ لَا الْبَيْعِ الْفَاسِدِ بَعْدَ الْقَبْضِ.
(بزازيه، زكريا جديد ١/ ٢٥١، وعلى هامش الهندية ٤/ ٤٠٨)

ہوتا ہے اور ایسا نہیں ہے جیسا کہ بیع فاسد میں قبضہ کے بعد ہوتا ہے۔

فریقِ سادس بیع اور رہن سے مرکب کے قائلین

امام فخر الدین زاہد وغیرہ نے اس عقد کو من وجہٍ بیع صحیح اور من وجہٍ رہن تسلیم کیا ہے، یعنی صلب عقد میں جب شرط کا ذکر نہ ہو تو مشتری کے حق میں بیع صحیح ہے اور مبیع کی آمدنی کا مشتری مالک ہوا کرے گا اور بائع کے حق میں یہ عقد رہن ہوگا اس لئے مشتری مبیع کے قبضہ اور اس کی ملکیت کو منتقل نہیں کرسکتا، نہ دوسرے کو بطورِ ہدیہ دے سکتا ہے اور نہ ہی دوسرے کو فروخت کرسکتا ہے، اور نہ ہی دوسرے کے ہاتھ میں رہن کے طور پر رکھ سکتا ہے اور جب بائع ثمن واپس کردے گا تو مشتری کو مبیع کی واپسی پر مجبور کیا جائے گا؛ لہٰذا بیع الوفاء من وجہٍ بیع صحیح کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل ہوکر جائز ہوجائے گی اور من وجہٍ رہن کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل ہوکر جائز ہوجائے گی، اور اس عقد کو زرافہ کی طرح دو چیزوں سے مرکب مانا جائے گا جیسا کہ زرافہ گردن کے اعتبار سے اونٹ کی طرح ہے اور پیروں کے اعتبار سے گائے اور بیل کی طرح ہے، اسی طرح اس عقد کا حال ہے کہ مشتری مبیع کی آمدنی کا مالک ہوجاتا ہے اور مشتری مبیع سے ہر طرح کا نفع اٹھا سکتا ہے، تو اس اعتبار سے بیع صحیح ہے اور دوسرے کے ہاتھ میں قبضہ کو منتقل نہیں کرسکتا اور دوسرے کو مالک نہیں بنا سکتا، اور ثمن کی واپسی پر مبیع کی واپسی لازم ہوجاتی ہے تو اس اعتبار سے یہ عقد رہن کی طرح ہے۔ فقہاء کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

اَلْقَوْلُ السَّادِسُ مَا اخْتَارَهُ الْبَعْضُ وَاخْتَارَهُ الإِمَامُ الزَّاهِدُ أَنَّ الشَّرْطَ إِذَا لَمْ يُذْكَرْ فِي

قولِ سادس وہ ہے جس کو بعض فقہاء نے اختیار فرمایا ہے اسی کو فخر الدین زاہد نے پسند فرمایا ہے بایں طور پر کہ جب عقد بیع کے اندر

الْبَيْعِ نَجْعَلَهٗ صَحِيْحاً فِيْ حَقِّ الْمُشْتَرِيْ حَتّٰى مَلَكَ الْأَنْزَالَ وَرَهْناً فِيْ حَقِّ الْبَائِعِ فَلَمْ يَمْلِكِ الْمُشْتَرِيْ تَحْوِيْلَ يَدِهٖ وَمَلَكَهٗ إِلٰى غَيْرِهٖ وَأُجْبِرَ عَلَى الرَّدِّ إِذَا أَحْضَرَ الدَّيْنَ لِأَنَّهٗ كَالزِّرَافَةِ مُرَكَّبٌ مِنَ الْبَيْعِ وَالرَّهْنِ. (فتاوی بزازیه، زکریا جدید ١/ ٢٥١، وعلی هامش الهندية ٤/ ٤٠٨)

شرط کا ذکر نہ کیا ہو تو اس کو مشتری کے حق میں بیع صحیح قرار دیں گے؛ تاکہ مشتری مبیع کی آمدنی کا مالک ہو جائے اور بائع کے حق میں رہن قرار دیں گے؛ تاکہ مشتری مبیع پر قبضہ کر کے مبیع کی ملکیت کو دوسرے کی طرف منتقل کرنے کا مالک نہ ہو جائے اور مشتری کو مبیع کی واپسی پر مجبور کیا جائے گا جب بائع دین ثمن لا کر پیش کردے؛ اس لئے کہ یہ عقد زرافہ کی طرح بیع اور رہن سے مرکب ہے۔

فریقِ سابع بیعِ صحیح اور بیعِ فاسد اور رہن تینوں سے مرکب کے قائلین

امام حافظ الدین بزازی وغیرہ فرماتے ہیں کہ بیع الوفاء کے اندر تین صفتیں موجود ہیں:

(۱) یہ بیع بیع تلجئہ کے مشابہ ہے، بیع تلجئہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بیع صحیح ہے اور صاحبین کے نزدیک صحیح نہیں ہے؛ لہٰذا امام ابوحنیفہؒ کے قول پر عمل کرتے ہوئے اس کے اوپر بیع صحیح کا حکم لگا دیا جائے گا؛ لہٰذا مشتری اس عقد کی مبیع سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اور حضراتِ صاحبینؒ کے قول پر عمل کرتے ہوئے اس کے بعض احکام کے اعتبار سے اس کے اوپر بیع فاسد کا حکم لگا دیا جائے گا کہ جس طریقہ سے مقتضائے عقد کے خلاف شرط کی وجہ سے بیع فاسد ہو جاتی ہے اسی طرح اس عقد کے اندر بھی واپسی کی شرط بیع فاسد کے اصول کے مطابق شرط فاسد ہے، اور ان لوگوں کے قول پر عمل کرتے ہوئے جنہوں نے بیع الوفاء کو رہن کی طرح قرار دیا ہے اس کے اوپر رہن کا حکم لگا دیا جائے گا کہ جس طریقہ سے مرتہن کو مالِ رہن دوسرے کے قبضہ میں دینے اور

دوسرے کو مالک بنانے کا حق نہیں ہوتا ہے، اسی طرح اس عقد کے اندر مشتری کو دوسرے کی ملکیت میں دینے کا حق نہیں ہے، اس لئے اس کے اوپر معاملہ رہن کا حکم لگا دیا جائے گا؛ لہٰذا بیع الوفاء تین قسم کے عقود سے مرکب ہے، بیع صحیح اور بیع فاسد اور رہن ان تینوں سے مرکب ہے، جیسا کہ ایک جانور جس کا نام زرافہ ہے تین قسم کے جانوروں کی صفتوں کے ساتھ وہ جانور متصف ہے کہ گردن کو دیکھا جائے تو اس کے اندر اونٹ کی صفت ہے اور پیروں کو دیکھا جائے تو اس کے اندر گائے اور بیل کی صفت ہے اور رنگ کو دیکھا جائے تو اس کے اندر چیتے کی صفت ہے تو جس طرح ایک جانور تین قسم کے جانوروں کی صفات کے ساتھ متصف ہوکر وجود میں آیا ہے اور اس طرح کا جانور وجود میں آنا صحیح اور درست ہے، اسی طرح بیع الوفاء بھی تین قسم کے عقود کی صفتوں کے ساتھ متصف ہوکر وجود میں آئی ہے۔ اور وجود میں آنا درست ہے اور اسی وجہ سے اس کو عقد صحیح اور عقد جائز ہی قرار دیا جائے گا اور جب اس عقد کے اندر یہ تینوں صفتیں موجود ہیں تو ان تینوں میں سے کس کو ترجیح دی جائے؟ تو بزازیہ میں ہے کہ بیع صحیح کے پہلو کو ترجیح دینا زیادہ بہتر اور اولیٰ ہے؛ اس لئے کہ اس کو بیع صحیح قرار دینے میں امام ابوحنیفہؒ کے قول کو ترجیح دینا ثابت ہوتا ہے، اور صاحب مذہب کے قول کو ترجیح دینا زیادہ اولیٰ اور بہتر ہوا کرتا ہے۔ عربی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

قُلْتُ هٰذَا الْعَقْدُ مُرَكَّبٌ مِنَ الْعُقُوْدِ الثَّلَاثَةِ كَالزِّرَافَةِ فِيْهَا صِفَةُ الْبَعِيْرِ وَالْبَقَرِ وَالنَّمِرِ جَوَّزَ لِحَاجَةِ النَّاسِ إِلَيْهِ بِشَرْطِ سَلَامَةِ الْبَدَلَيْنِ لِصَاحِبِهِمَا (إلٰى قَوْلِهٖ) لِأَنَّهٗ يُشْبِهُ بَيْعَ التَّلْجِئَةِ

میں کہتا ہوں یہ عقد عقودِ ثلاثہ سے مرکب ہے جیسا کہ زرافہ اس میں اونٹ، بیل اور چیتے کی صفت ہوتی ہے، اس کی طرف لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے اس عقد کو جائز قرار دیا گیا ہے، متعاقدین کے لئے بدل کی سلامتی کی شرط کے ساتھ اور مصنف کا قول اس لئے کہ یہ عقد بیع تلجئہ کے مشابہ ہے، اور بے شک بیع

وَإِنَّهُ صَحِيْحٌ عِنْدَهُ لَا عِنْدَهُمَا فَأُعْطِيَ لَهُ حُكْمُ الصَّحِيْحِ عَمَلاً بِقَوْلِهِ وَحُكْمُ الْفَاسِدِ فِيْ بَعْضِ الْأَحْكَامِ عَمَلاً بِقَوْلِهِمَا وَحُكْمُ الرَّهْنِ فِيْ بَعْضِ الْأَحْكَامِ عَمَلاً بِقَوْلِ النَّاسِ كَمَا ذَكَرْنَاهُ فِيْمَا تَقَدَّمَ وَإِذَا وَقَعَ التَّرَدُّدُ فِيْ إِلْحَاقِهِ بِالْفَاسِدِ أَوِ الصَّحِيْحِ فَإِلْحَاقُهُ بِالصَّحِيْحِ أَوْلىٰ تَقْلِيْلاً لِلْفَسَادِ وَتَرْجِيْحاً لِقَوْلِ الإِمَامِ فَيُعْتَبَرُ الْمَذْكُوْرُ ثَمَناً لَا الْمَأْخُوْذُ. (فتاویٰ بزازية، زکریا جدید ۱/ ۲۵۲، وعلی هامش الهندية ٤/ ٤١٠، البحر الرائق کوئٹه ٦/ ١٢)

ترجمہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک صحیح ہے، صاحبین کے نزدیک صحیح نہیں؛ لہٰذا امام صاحب کے قول پر عمل کرتے ہوئے اس کو بیع صحیح کا حکم دیا جائے گا اور صاحبین کے قول پر عمل کرتے ہوئے بعض احکام میں بیع فاسد کا حکم دیا جائے گا اور دوسرے لوگوں کے قول پر عمل کرتے ہوئے بعض احکام میں رہن کا حکم دیا جائے گا جیسا کہ ماقبل میں دوسرے کا قول ہم نے ذکر کر دیا ہے اور جب اس کو بیع فاسد یا بیع صحیح کے ساتھ لاحق کرنے میں تردد واقع ہوگیا تو اس کو بیع صحیح کے ساتھ لاحق کرنا زیادہ بہتر ہوگا فساد کی کمی کو ثابت کرنے کے لئے اور امام ابوحنیفہؒ کے قول کو ترجیح دینے کے لئے؛ لہٰذا ذکر کی گئی چیز کو ثمن قرار دیا جائے گا نہ کہ ماخوذ اور مقبوض کو۔

مبیع کو کرایہ پر دینے کا حکم

بیع الوفاء میں مشتری مبیع کو کرایہ پر دے کر اس کی آمدنی حاصل کرسکتا ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں یہ بات خوب ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ بیع الوفاء کے بارے میں فقہاء

کے درمیان کافی اختلاف واقع ہو چکا ہے، جس کو ہم نے اس مقالہ کے اندر واضح کردیا ہے کہ بعض فقہاء نے بیع الوفاء کو رہن کے درجہ میں قرار دیا ہے اور بعض فقہاء نے بیع فاسد کے درجہ میں قرار دیا ہے اور بعض فقہاء نے بیع مکرہ کے درجہ میں قرار دیا ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ ان تمام صورتوں میں مشتری کی ملکیت نہیں ہوسکتی، اسی کی جانب علاء الدین حصکفیؒ اور علامہ شامیؒ کا رجحان ہے۔

اور اس کے برخلاف بعض فقہاء نے بیع الوفاء کو بیع صحیح کے درجہ میں قرار دیا ہے اور بعض فقہاء نے بیع صحیح اور رہن سے مرکب عقد قرار دیا ہے، اور ساتھ میں یہ فرمایا ہے کہ مشتری کے حق میں بیع صحیح ہے اسی لئے مشتری مبیع کی آمدنی اور پیداوار کا مالک ہوجائے گا اور بائع کے حق میں رہن ہے اس لئے مشتری مبیع کو بیچنے اور دوسرے کے ہاتھ رہن رکھنے کا مجاز نہ ہوگا، اور بعض فقہاء نے بیع صحیح اور رہن اور بیع فاسد تینوں سے مرکب زَرافہ کی طرح الگ سے ایک عقد تسلیم کیا ہے، اور بعض فقہاء نے تعاملِ ناس اور لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے اس کو بیع صحیح کے درجہ میں قرار دیا ہے، ان تمام فقہاء کے قول کے مطابق بیع الوفاء صحیح اور جائز عقد ہے؛ لہٰذا ان سب حضرات کے نزدیک مشتری کے لئے مبیع سے فائدہ اٹھانے اور مبیع کے ذریعہ سے آمدنی حاصل کرنے کا حق ہے اور آمدنی کا ایک ذریعہ اجارہ اور کرایہ پر دینا بھی ہے، اس لئے ان تمام فقہاء کے نزدیک مشتری کے لئے مبیع کو بائع کے ہاتھ یا کسی دوسرے کے ہاتھ کرایہ پر دینا جائز ہے؛ لہٰذا اگر کھیتی کی زمین ہے تو مشتری اس زمین کو خود بائع کے ہاتھ میں یا کسی دوسرے کے ہاتھ میں کرایہ یا بٹائی پر دے کر نفع حاصل کرسکتا ہے، اور اگر عمارت ہے اس کو بھی کرایہ پر دے کر آمدنی حاصل کرسکتا ہے، اور متأخرین کا فتویٰ اسی پر جاری ہو چکا ہے کہ آمدنی مشتری کی ملکیت ہوگی؛ لہٰذا راجح یہی ہوگا کہ مبیع کو کرایہ پر دے کر اجرت حاصل کرنا مشتری کے لئے اس وقت تک جائز ہوگا جب تک بائع

ثمن دے کر مبیع کو واپس نہ لے گا، اس کو حضراتِ فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے۔عبارت ملاحظہ فرمایئے:

وَإِنْ آجرَ الْمَبِيْعَ وَفَاءً مِنَ الْبَائِعِ مِمَّنْ جَعَلَهُ فَاسِداً قَالَ لَا تَصِحُّ الإِجَارَةُ (إِلٰى قَوْلِهِ) وَمَنْ جَعَلَهُ رَهْناً كَذٰلِكَ لَمْ يَلْزَمِ الْبَائِعَ الأَجْرُ، وَمَنْ أَجَازَهُ جَوَّزَ الإِجَارَةَ مِنَ الْبَائِعِ وَغَيْرِهِ وَأَوْجَبَ الأَجْرَ. (فتاویٰ بزازیہ، زکریا جدید ۱/۲۵۳، علی الهندية ۴/۴۱۳، شامی زکریا ۷/۵۴۸، کراچی ۵/۲۷۸)

اور اگر مبیع کو بیع الوفاء میں بائع کے ہاتھ اجرت پر دیا ہے تو جن لوگوں نے اس کو بیع فاسد قرار دیا ہے تو انہوں نے کہا کہ اجارہ صحیح نہیں ہوگا اور جنہوں نے رہن قرار دیا ہے ان کے نزدیک ایسے ہی اجارہ صحیح نہ ہوگا اور بائع پر اجرت لازم نہ ہوگی اور جن لوگوں نے بیع الوفاء کو بیع صحیح قرار دیا ہے ان لوگوں نے مبیع کو بائع کے ہاتھ اور اس کے علاوہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں کرایہ پر دینے کو بھی جائز قرار دیا ہے، اور اجرت بھی لازم ہو جائے گی۔

(وَقَوْلُهُ) وَذُكِرَ فِيْ الإِيْضَاحِ أَنَّ كُلَّ مَا يَصِحُّ بَيْعُهُ قَبْلَ قَبْضِهِ تَجُوْزُ إِجَارَتُهُ وَمَا لَا فَلَا وَبَيْعُ الْعَقَارِ قَبْلَ الْقَبْضِ جَائِزٌ فَكَذٰلِكَ إِجَارَتُهُ. (فتاویٰ بزازیہ، زکریا جدید ۱/۲۵۳، وعلی هامش الهندية ۴/۴۱۳)

اور ایضاح میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ ہر وہ شئ جس کو قبضہ سے پہلے بیچنا جائز ہے اس کو اجارہ پر دینا بھی جائز ہے اور جس کو قبل القبض بیچنا صحیح نہیں اس کو اجارہ پر دینا بھی صحیح نہیں ہے اور عقار کی بیع قبضہ سے پہلے جائز ہے؛ لہٰذا اس کو کرایہ پر دینا بھی جائز ہو جائے گی۔

بیع الوفاء میں مبیع کی آمدنی کا حق دار کون؟

جب لوگوں کی ضرورت اور تعاملِ ناس کی وجہ سے بیع الوفاء کو جائز قرار دیا گیا ہے تو مشتری کے لئے مبیع کی واپسی تک اس سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے اور مبیع سے جو آمدنی پیدا ہوگی وہ آمدنی بھی مشتری کی ملکیت میں ہوگی؛ لہٰذا اگر مبیع کے ذریعہ سے کچھ آمدنی حاصل ہو جائے یا مبیع عقار ہے اور کھیتی کی زمین ہے اس میں سے پیداوار حاصل ہو جائے تو وہ ساری کی ساری مشتری کی ملکیت میں ہوگی؛ لہٰذا اگر آمدنی اور پیداوار ضائع ہو جائے یا مشتری نے ضائع کر دیا ہے تو اس کا تاوان بائع کے لئے مشتری پر لازم نہیں ہوگا، یہی فقہاء کا آخری قول ہے اور صاحبِ ہدایہ اور ان کی اولاد اور اس زمانہ کے مشائخ کا فتویٰ اسی پر جاری ہو چکا ہے۔
عبارت ملاحظہ فرمایئے:

اَلَّذِیْ اسْتَقَرَّ عَلَیْهِ فَتْوىٰ صَاحِبِ الْهِدَایَةِ وَأَوْلَادِهٖ وَمَشَایِخِ الْعَهْدِ أَنَّ الْمِلْکَ یَثْبُتُ لِلْمُشْتَرِیْ فِیْ زَوَائِدِهٖ وَلَا یَضْمَنُهٗ بِالْإِتْلَافِ. (فتاویٰ بزازیه، زکریا جدید ۱/ ۲۵۲، وعلی هامش الهندیة ٤/ ٤١٠)

جس کے اوپر صاحب ہدایہ اور ان کی اولاد اور اس زمانہ کے مشائخ کا فتویٰ مسلسل جاری ہو چکا ہے وہ یہی ہے کہ بیع الوفاء میں مبیع کی پیداوار اور آمدنی میں مشتری کی ملکیت ثابت ہو جائے گی اور آمدنی کو ضائع اور ہلاک کر دینے سے مشتری بائع کے لئے ضامن نہیں ہوگا۔

بیع الوفاء میں مبیع کے نقصان کی تلافی

اگر بیع الوفاء میں مشتری کے یہاں مبیع ہلاک ہو جائے تو ثمن کی ادائیگی ساقط ہو جاتی ہے؛ لیکن اگر مبیع ہلاک تو نہیں ہوئی ہے؛ لیکن اس میں نقصان آ جائے تو اس نقصان کی تلافی کی کیا

شکل ہے؟ تو اس سلسلہ میں شرعی حکم یہ ہے کہ مبیع میں جتنا نقصان ہوا، دینِ ثمن میں سے اتنا مجریٰ ہوکر ساقط ہوجائے گا، مثال کے طور پر ایک ہزار روپیہ لے کر کے مبیع مشتری کے قبضہ میں دی گئی ہے اور مبیع کی قیمت پندرہ سو روپیہ ہے اور مبیع میں پانچ سو روپیہ قیمت کا نقصان ہوجائے تو ثمن میں سے پانچ سو روپیہ کی ادائیگی ساقط ہوجائے گی، اس کو حضراتِ فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے، ملاحظہ ہو:

وَالَّذِیْ اسْتَقَرَّ عَلَیْهِ فَتْوٰی الْأَئِمَّةِ وَالْأَسَاتِذَةِ فِیْ مَسْئَلَةِ نُقْصَانِ الْمَبِیْعِ وَفَاءً سُقُوْطُ حِصَّةِ النُّقْصَانِ مِنْ مَالِ الْوَفَاءِ وَهُوَ الثَّمَنُ وَيُقَسَّمُ مَالُ الْوَفَاءِ عَلٰی قِیْمَةِ الْبَاقِیْ وَالْهَالِکِ فَیَسْقُطُ قِسْطُ الْهَالِکِ وَیَبْقٰی حِصَّةُ الْبَاقِیْ بَیَانُهٗ اشْتَرٰی دَاراً بِالْوَفَاءِ قِیْمَتُهَا تُسَاوِیْ أَلْفاً بِمِائَةٍ فَخَرِبَتْ الدَّارُ حَتّٰی صَارَتِ الْقِیْمَةُ خَمْسَ مِائَةٍ تَسْقُطُ مِنَ الثَّمَنِ خَمْسُوْنَ.

(فتاویٰ بزازیه، زکریا جدید ۱/ ۲۵۳، وعلی هامش الهندیة ٤/ ۲/ ٤١)

بیع الوفاء میں مبیع کے نقصان کے مسئلہ میں اساتذہ اور ائمہ کا فتویٰ اس بات پر جاری ہوچکا ہے کہ مالِ وفاء یعنی ثمن میں سے نقصان کا حصہ ساقط ہوجائے گا اور ثمن وفاء مبیع کی باقی قیمت پر اور مبیع کے ہلاک شدہ پر تقسیم ہوجائے گا؛ لہٰذا ہلاک شدہ کا حصہ بائع کے اوپر سے ادا کرنا ساقط ہوجائے گا اور باقی کا حصہ باقی رہے گا، اس کی وضاحت یوں ہے کہ بیع الوفاء کے طور پر ایک مکان خریدا ہو جس کی قیمت ایک ہزار روپیہ کے برابر ہے اس کو سو روپیہ میں خریدا ہے پھر مکان منہدم ہوجائے یہاں تک کہ اس کی قیمت پانچ سو روپیہ رہ جائے تو ثمن میں سے پچاس روپیہ ساقط ہوجائیں گے۔

بیع الوفاء میں ثمن کی زکوٰۃ کون ادا کرے؟

یہاں یہ مسئلہ بھی اہمیت کا حامل ہے کہ مشتری کے قبضہ میں مبیع ہوتی ہے اور بائع کے قبضہ میں ثمن ہوتا ہے اور مبیع چوں کہ مالِ نمو نہیں ہوتی ہے، اس لئے مبیع کی زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی؛ لیکن ثمن مالِ نمو ہوتا ہے، اسی لئے اس کے اوپر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور یہ مال فی الحال بائع کے قبضہ اور ملکیت میں ہے، اس اعتبار سے اس کی زکوٰۃ ادا کرنا بائع کے اوپر لازم ہوگا اور مشتری کے اوپر اس لئے اس کی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہے کہ اس نے ثمن کے بدل پر قبضہ کررکھا ہے جس کی وجہ سے ثمن در پردہ اس کی ملکیت ہے اس لئے مشتری پر بھی اس کی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہوجائے گا، اور چوں کہ عقود وفسوخ میں یعنی عقد کے منعقد ہونے میں اور عقد کے فسخ ہوجانے میں نقود متعین نہیں ہوتے ہیں، اس لئے یہ نہیں کہا جائے گا کہ ایک مالِ متعین کی زکوٰۃ دو آدمیوں پر لازم آرہی ہے؛ بلکہ لاعلی التعیین اتنے مال کی زکوٰۃ بائع کے اوپر بھی لازم ہے اور مشتری کے اوپر بھی لازم ہے جو فقہاء کی اس طرح کی عبارات سے واضح ہوتا ہے۔

وَزَكوٰةُ مَالِ الْوَفَاءِ عَلَى الْبَائِعِ لِأَنَّهُ مِلْكُهُ بِالْقَبْضِ وَعَلَى الْمُشْتَرِىْ أَيْضاً لِأَنَّهُ يُعَدُّ مَالاً لَهُ مَوْضُوعاً عِنْدَ الْبَائِعِ لَيْسَ فِيْهِ زَكوٰةُ مَالٍ عَلٰى رَجُلَيْنِ لِأَنَّ النُّقُوْدَ لَا تَتَعَيَّنُ فِى الْعُقُوْدِ وَالْفُسُوْخِ وَعَلَيْهِ صَاحِبُ الْهِدَايَةِ وَالإِمَامُ الْبَزْدَوِىُّ.

(فتاویٰ بزازیه، زکریا جدید ۱/ ۲۵۳، وعلی هامش الهندية ٤/ ٤١٢)

بیع الوفاء کے مال ثمن کی زکوٰۃ بائع کے اوپر اس وجہ سے لازم ہوگی کہ قبضہ کی وجہ سے بائع اس کا مالک ہو چکا ہے اور مشتری کے اوپر بھی اس لئے واجب ہے کہ وہ مشتری ہی کا مال شمار ہوتا ہے جو بائع کے یہاں رکھا ہوا ہے اور اس میں ایک متعین مال کی زکوٰۃ کا ادا کرنا دو آدمیوں پر اس لئے لازم نہیں آتا ہے کہ عقود وفسوخ میں نقود یعنی ثمن متعین نہیں ہوا کرتا ہے، یہی صاحب ہدایہ اور امام بزدوی کی رائے ہے۔

بائع اور مشتری کا اختلاف

اگر بائع اور مشتری کے درمیان اس طرح اختلاف ہو جائے کہ دونوں میں سے ایک اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ بیع قطعی ہو چکی ہے واپسی اور استرداد کا کوئی مسئلہ نہیں اور دوسرا اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ بیع قطعی نہیں ہوئی؛ بلکہ بیع الوفاء کے طور پر عقد ہوا ہے؛ لہٰذا ثمن کی واپسی پر مبیع کا استرداد لازم ہے اور دونوں نے اپنے اپنے دعویٰ پر بینہ اور گواہ پیش کر دیئے ہیں تو ایسی صورت میں کس کو ترجیح دی جائے؟ تو اس سلسلہ میں صاحبِ درِمختار فرماتے ہیں کہ استحساناً بیع الوفاء کے دعویٰ کرنے والے کے قول کو ترجیح دی جائے؛ لیکن اس کے نیچے شامی نے ملتقط کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے کہ اولاً متأخرین نے بیع قطعی کے دعویٰ کرنے والے کے بینہ کو ترجیح دینے پر فتویٰ دیا ہے پھر اس کے بعد بیع الوفاء کے دعویٰ کرنے والے کے بینہ کے اولیٰ ہونے پر فتویٰ دیا ہے، اور اس کے اوپر استحسان کا نشان لگایا ہے، اس کے بعد یہ وضاحت نقل فرمائی ہے کہ اگر مشتری نے بیع قطعی کا دعویٰ کیا ہے کہ بیع مکمل ہو چکی ہے اب استرداد کا کوئی مسئلہ نہیں ہے اور بائع دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے بیع الوفاء کے طور پر بیچا ہے تو ایسی صورت میں اگر دونوں نے بینہ پیش کیا ہے تو بائع کے گواہ کو ترجیح دی جائے گی اور اگر بینہ پیش نہیں کیا گیا؛ بلکہ دونوں کا محض دعویٰ ہے تو ایسی صورت میں بیع قطعی کے دعویٰ کرنے والے کے قول کو ترجیح دی جائے گی، ہاں البتہ اگر مبیع کے مقابلہ میں ثمن کی کمی پر واضح دلیل اور قرینہ موجود ہو تو ایسی صورت میں بیع الوفاء کے دعویٰ کرنے والے کے قول کو ترجیح ہو گی؛ تاکہ بائع غبن فاحش کے نقصان کا شکار نہ ہو تو حاصل یہ نکلا کہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں اگر بیع الوفاء کا قرینہ موجود ہو مثلاً مبیع کے مقابلہ میں ثمن کی مقدار کم ہے تو ایسی صورت میں بائع کے قول کا اعتبار کر کے بیع الوفاء کا حکم صادر کر دیا جائے گا اور دونوں کو اس کا پابند بنایا جائے گا اور اگر کوئی قرینہ موجود نہیں ہے اور ثمن اور مبیع کے درمیان تناسب میں تفاوت نہیں ہے اور نہ ہی غبنِ فاحش لازم آ سکتا ہے تو ایسی صورت میں مشتری کے قول کا

اعتبار کر کے بیع قطعی کا حکم جاری کر دیا جائے گا۔ فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمائیے:

إِنَّ الْقَوْلَ لِمُدَّعِي الْوَفَاءِ اِسْتِحْسَاناً، وَلَوْ قَالَ الْبَائِعُ بِعْتُکَ بَيْعاً بَاتًّا فَالْقَوْلُ لَهُ إِلَّا أَنْ يَّدُلَّ عَلَى الْوَفَاءِ بِنُقْصَانِ الثَّمَنِ كَثِيراً (وَتَحْتَهُ فِي الشَّامِيَةِ) قَوْلُهُ: هُنَّ اسْتِحْسَاناً يَقْتَضِي تَرْجِيحَ مُدَّعِي الْوَفَاءِ فَيَنْبَغِي تَقْيِيدُهُ بِقِيَامِ الْقَرِيْنَةِ (اِلٰى قَوْلِهٖ) وَإِنْ ادَّعٰى أَحَدُهُمَا بَيْعاً بَاتًّا وَالآخَرُ بَيْعَ الْوَفَاءِ وَأَقَامَ الْبَيِّنَةَ كَانُوْا يُفْتُوْنَ أَنَّ الْبَاتَّ أَوْلٰى ثُمَّ أَفْتَوْا أَنَّ بَيْعَ الْوَفَاءِ أَوْلٰى وَهٰذَا اِسْتِحْسَانٌ (إِلٰى قَوْلِهٖ) وَلَوْ قَالَ الْمُشْتَرِيْ اشْتَرَيْتُهُ بَاتًّا وَقَالَ الْبَائِعُ بِعْتُهُ بَيْعَ الْوَفَاءِ (إِلٰى قَوْلِهٖ) أَنَّ الْاِسْتِحْسَانَ فِي الْاِخْتِلَافِ فِي الْبَيِّنَةِ تَرْجِيحُ بَيِّنَةِ الْوَفَاءِ وَفِي الاخْتِلَافِ فِي الْقَوْلِ تَرْجِيحُ

بے شک استحسانا بیع الوفاء کے مدعی کا قول معتبر ہوگا اور اگر بائع نے کہا کہ میں نے تمہارے ہاتھ بیع قطعی کے طور پر بیچا ہے تو اس کا قول معتبر ہوگا؛ لیکن اگر بیع الوفاء پر ثمن کے کثیر نقصان کی وجہ سے دلالت کرنے والی کوئی دلیل ہو تو بیع الوفاء کا اعتبار ہوگا اس کے نیچے شامی میں ہے کہ یہاں استحسانا کا لفظ بیع الوفاء کے مدعی کے دعویٰ کی ترجیح کا تقاضا کرتا ہے؛ لہٰذا اس کو قیامِ قرینہ کے ساتھ مقید کرنا زیادہ مناسب ہے اور اگر دونوں میں سے ایک نے بیع قطعی کا دعویٰ کیا اور دوسرے نے بیع الوفاء کا اور دونوں نے بینہ قائم کر دیا تو فقہاء متأخرین اس بات پر فتویٰ دیتے تھے کہ بیع قطعی کی ترجیح کو اولیٰ قرار دیا جائے پھر اس کے بعد بیع الوفاء کی ترجیح کے اولیٰ ہونے پر فتویٰ دینے لگے اور بیع الوفاء کو ترجیح دینا مستحسن ہے اور اگر مشتری نے کہا کہ میں نے بیع الوفاء کے طور پر بیچا ہے تو ایسی صورت میں بینہ کے ساتھ میں اختلاف کی صورت میں مستحسن یہی ہے کہ بیع الوفاء کے بینہ کو ترجیح

قَوْلِ مُدَّعِي الْبَتَاتِ (إِلٰى قَوْلِهٖ) وَهُوَ كَوْنُ الْقَوْلِ لِمُدَّعِي الْبَتَاتِ بِمَا إِذَا لَمْ تُقِمِ الْقَرِينَةُ عَلٰى خِلَافِهٖ. (الدر المختار مع الشامي زكريا ۷/ ۵۵۰، شامي كراچي ۵/ ۲۷۹)

دی جائے اور بغیر بینہ کے قول میں اختلاف کی صورت میں بیع قطعی کے مدعی کے قول کو ترجیح دی جائے اور بیع قطعی کے مدعی کے قول کی ترجیح اس بات کے ساتھ مشروط ہے کہ جب اس کے خلاف پر کوئی قرینہ قائم نہ ہو۔

اورالاشباہ والنظائر کے حاشیہ حموی میں صاف الفاظ کے ساتھ بائع کے قول کوترجیح دی گئی ہے کہ جب مشتری اور بائع کے درمیان اس طرح کا اختلاف ہوجائے کہ مشتری بیع قطعی کا دعویٰ کرے اور بائع بیع الوفاء کا دعویٰ کرے تو ایسی صورت میں بائع کے قول کا اعتبار کر کے اس معاملہ کو بیع الوفاء قرار دیا جائے گا؛ اس لئے کہ بیع قطعی ہونے کی صورت میں مشتری کا فائدہ ہے اور بائع کا نقصان ہے اور بیع الوفاء ہونے کی صورت میں کسی کا نقصان نہیں؛ کیوں کہ مشتری کو اپنا ثمن واپس مل جاتا ہے اور بائع کو اپنی مبیع واپس مل جاتی ہے۔

وَفِي الْفُصُوْلِ الْعِمَادِيَةِ إِذَا اخْتَلَفَ الْمُتَبَائِعَانِ فَقَالَ الْمُشْتَرِيْ اشْتَرَيْتُهٗ شِرَاءً بَاتًّا وَقَالَ الْبَائِعُ بَيْعَ الْوَفَاءِ فَإِنَّ الْقَوْلَ قَوْلُ الْبَائِعِ لِأَنَّ الْمُشْتَرِيَ يَدَّعِيْ زَوَالَ عَيْنِهٖ بِالْبَتَاتِ وَمُدَّعِي الْوَفَاءِ يُنْكِرُ الزَّوَالَ فَيَكُوْنُ الْقَوْلُ قَوْلَهٗ. (حاشيه الحموی علی الأشباه قديم ۱۳۰)

فصولِ عمادیہ میں ہے کہ جب متبائعین میں اختلاف ہوجائے تو مشتری کہتا ہے کہ میں نے عقدلازم اور عقد قطعی کے طور پرخریدا ہے اور بائع کہتا ہے کہ بیع الوفاء کے طور پر میں نے بیچا (اورتم نے خریدا ہے) تو بائع کے قول کو ترجیح حاصل ہوگی؛ اس لئے کہ مشتری معاملہ قطعی کے ذریعہ سے عین مبیع کے زوال کا دعویٰ کرتا ہے اور بیع الوفاء کا مدعی زوال کا انکار کرتا ہے؛ لہٰذا اسی کے قول کا اعتبار ہوگا۔

شبیراحمد قاسمی
خادم الحدیث جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد (یو-پی)

۱۲/ باب الشفعة

اپنے پڑوس کو بتائے بغیر زمین فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۸۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ترکہ پدری سے حاصل شدہ ایک قطعہ زمین چار حصوں میں کر کے دو حقیقی بھائیوں میں تقسیم ہوگئی، بعدہ محمد دین صاحب نے ایک قطعہ اپنی زمین کے بیچنے کا خیال اب سے تین سال پہلے ظاہر کردیا تھا، اس کے متعلق محمد دین نے اپنے حقیقی بھائی امام الدین سے کسی تیسرے شخص کی معرفت سودے بازی بھی کی، مگر محمد دین نے امام الدین کو بغیر بتائے دوسرے شخص کے ہاتھ معاملہ بیع کردیا، جب کہ محمد دین کی زمین دونوں جانب سے امام الدین کی زمین کے درمیان واقع ہے، جس کی صورت یہ ہے:

(۱)امام الدین	(۲)محمد الدین	(۳)امام الدین	(۴)محمد دین

اور خریدار بھی قریبی رشتہ دار ہیں، تو کیا امام الدین کو حق شفعہ حاصل ہے؟ اور بائع اور مشتری پر بھی کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟

المستفتی: امام الدین، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں حق مبیع اور پڑوس کی بنیاد پر امام الدین کو مذکورہ جائیداد میں شفعہ کا حق حاصل ہے، بائع اور مشتری کو چاہئے کہ وہ اس کے شرعی حق کو ادا کریں۔

سمع أبا رافع، سمع النبي صلى الله عليه وسلم يقول: الجار أحق بسقبه. (سنن أبي داؤد، باب في الشفعة، النسخة الهندية، مكتبة البدر ۲/ ۴۹۶، دارالسلام، رقم: ۳۵۱۶، صحيح البخاري، باب عرض الشفعة على صاحبها قبل البيع،

النسخة الهندية ١/ ٣٠٠، رقم: ٢٢٠٣، ف: ٢٢٥٨، سنن الترمذي، باب ماجاء في الشفعة للغائب، النسخة الهندية ١/ ٢٥٣، دارالسلام، رقم: ١٣٦٩)

ثم له في حق المبيع الخ. ثم لجار ملاصق بابه في سكة أخرى. (التنوير مع الدرالمختار، كتاب الشفعة، زكريا ٩/ ٣٢٠-٣٢٢، كراچی ٦/ ٢٢٠-٢٢١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ رصفر ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۳۸۸۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۲/۲۴ھ

مکان میں شریک شفعہ کا مستحق ہے یا قبرستان؟

سوال [۸۸۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرا مکان دادالٰہی ہے، جس پر میں قابض ودخیل ہوں، جو قبرستان سے ملحق ہے، اس میں چند حصہ دار مختصر جزو کے مالک ہیں، کیا کوئی حصہ دار اپنا جزو قبرستان کے نام مجھے نہ دے کر بیع نامہ کر سکتا ہے اور میرے مکان کو جبراً توڑ کر قبرستان میں شامل کرنا اور قبور کا کھودنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: نعیم اللہ مغل پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کے ساتھ جو لوگ مکان میں شریک ہیں، وہ اگر اپنا حصہ فروخت کرنا چاہیں اور آپ خریدنا چاہیں، تو آپ ہی شرعی طور پر خریدنے کے حق دار ہوں گے۔ اور اگر آپ کو نہ دے کر قبرستان کو فروخت کر دیا ہے، تو آپ کو اس کی خریداری ختم کر کے خریدنے کا حکم ہے۔

عن شريح قال: الخليط أحق من الشفيع، والشفيع أحق من سواه.

(مصنف عبدالرزاق، باب الشفعة بالجوار والخليط أحق، المجلس العلمي ٨/ ٧٨، رقم: ١٤٣٨٦)

عن هشام بن المغيرة قال: سمعت الشعبي يقول: قال رسول الله ﷺ: الشفيع أولى من الجار، والجار أولى من الجنب. (مصنف عبدالرزاق، باب الشفعة بالجوار والخليط أحق، المجلس العلمي ٨/ ٧٩، رقم: ١٤٣٩٠)

ليس للشريك في الطريق والشرب، والجار شفعة مع الخليط في الرقبة. (هداية، كتاب الشفعة، أشرفی ٤/ ٣٩٠)

وإذا بنى المشتري أو غرس، ثم قضى للشفيع بالشفعة فهو بالخيار إن شاء أخذها بالثمن وقيمة البناء والغرس، وإن شاء كلف المشتري قلعه.

(هداية، كتاب الشفعة، باب طلب الشفعة والخصومة فيها، أشرفي ٤/ ٤٠٠)

اور قبور کھودنے کی بات واضح کیجئے، اس کے بعد جواب دیا جائے گا۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍محرم الحرام ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸۱۱/۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۱/۱۱ھ

شریک فی حق المبیع کو شفعہ میں حق تقدم حاصل ہے

سوال [۸۸۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ثناء الرحمٰن اپنا مکان فروخت کررہے ہیں، جن کے دو بھائی بھی ہیں اور دیگر رشتہ دار بھی جو مکان سے کچھ دوری پر رہتے ہیں، ثناء الرحمٰن کے مکان سے متصل پچھّم جانب محمد یوسف کا مکان ہے اور پورب جانب سیٹھ مشتاق احمد صاحب کا مکان ہے اور اتر جانب محمد اطہر کا مکان ہے (محمد اطہر اور ثناء الرحمٰن کا مکان پہلے ایک ہی تھا، پھر تقسیم ہوا اور دیوار ہی صرف حد فاصل کے طور پر ہے) محمد اطہر کے مکان کے کل پانی کی نکاسی ثناء الرحمٰن کے مکان کے اندر ہی سے ہے جو کہ تقسیم سے پہلے ہی سے پشتینی راستہ ہے، اب ثناء الرحمٰن صاحب اپنا مکان فروخت کررہے ہیں، تو حق شفعہ دور رہنے والے بھائیوں کو ہے یا بالواسطہ متصل رہنے والے محمد اطہر کو ہے؟

المستفتی: محمد اطہر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب ثناء الرحمٰن کے مکان کے اندر ہی سے محمد اطہر کے مکان کے کل پانی کی نکاسی ہوتی ہے، تو محمد اطہر ثناء الرحمٰن کے مکان میں شریک فی حق المبیع ہے؛ اس لئے دائیں بائیں کے پڑوس، تو محمد یوسف اور سیٹھ مشتاق کے مقابلہ میں محمد اطہر ہی کو ثناء الرحمٰن کے مکان میں حق شفعہ کا تقدم حاصل ہے؛ اس لئے اگر محمد اطہر، ثناء الرحمٰن کے مکان کو خریدنے کے لئے تیار ہے، تو محمد یوسف اور سیٹھ مشتاق احمد کو حق شفعہ حاصل نہیں ہوگا۔

عن الشعبي قال: الخليط أحق من الشفيع، والشفيع أحق من الجار، والجار أحق ممن سواه. (المصنف لابن أبي شيبة، البيوع والأقضية من كان يقضى بالشفعة للجار، موسسة علوم القرآن، جديد ۱۱/ ۵۳۸، رقم: ۲۳۷۲)

عن هشام بن المغيرة قال: سمعت الشعبي يقول: قال رسول الله ﷺ: الشفيع أولى من الجار، والجار أولى من الجنب. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب البيوع والأقضية من كان يقضى بالشفعة للجار، موسسة علوم القرآن، جديد ۱۱/ ۵۳۷، رقم: ۲۳۷۲)

فدل ذلک علی أن الشفعة كما تستحق بالشركة في نفس المبيع تستحق بالشركة في الطريق، ولما استحقت بالشركة في الطريق، فبالشركة في حق آخر كالمسبل وغيره، كذلک لاشتراک العلة. (إعلاء السنن بيروت ۱۷/ ۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ محرم الحرام ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۴۳۲/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۱/۲۸ھ

دس ماہ کے بعد حق شفعہ کا دعویٰ کرنا

سوال [۸۸۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک قطعہ مکان کے چار بھائی وزیر بیگ، شبیر بیگ، صدیق بیگ، شاہد بیگ مالک تھے

اور برابر حصوں کے مالک تھے، اس میں سے ایک حصہ وزیر بیگ کا ان کے بھتیجے راشد بیگ ابن شاہد بیگ نے خرید لیا، پھر ۱۰ر مہینہ کے بعد صدیق بیگ نے راشد بیگ پر حق شفعہ کا دعویٰ کر دیا تھا، اب صدیق بیگ کا انتقال ہو گیا، ان کے ورثاء مقدمہ چلا رہے ہیں، تو آپ سے دریافت یہ کرنا ہے کہ شرعاً وزیر بیگ کے اس مکان پر صدیق بیگ کا دعویٰ حق شفعہ کرنا اور پھر ان کے بیٹوں کا اسی پر مقدمہ چلانا جائز ہے یا نہیں؟ یا راشد بیگ نے جب خرید لیا اور دس ماہ تک کوئی حق شفعہ کا دعویٰ نہیں ہوا، تو اس کی خریداری صحیح ہو گی؟ شرعی حکم جو بھی ہو تحریر فرمائیں۔

المستفتی: راشد بیگ سنبھلی گیٹ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب راشد بیگ کے خرید لینے کے دس ماہ بعد تک صدیق بیگ نے خاموشی اختیار کی، تو اب اتنے ایام گذرنے کے بعد حق شفعہ ثابت نہ ہوگا؛ کیونکہ جس مجلس میں خریداری کا علم ہو جائے اسی مجلس میں حق شفعہ کا دعویٰ کر کے اپنے دعویٰ پر گواہ نہیں بناتا ہے تو بعد میں شرعی طور پر کوئی حق باقی نہیں رہتا ہے۔

وقال الشعبي: من بيعت شفعته وهو شاهد لا يغيرها فلا شفعة له.

(صحيح البخاري، باب عرض الشفعة على صاحبها قبل البيع، النسخة الهندية ١/ ٣٠٠)

إذا ترك الشفيع الإشهاد حين علم بالبيع وهو يقدر على ذلك بطلت شفعته. (هداية، كتاب الشفعة، باب ما تبطل به الشفعة، اشرفي ٤/ ٤٠٦، الدر مع الرد، كراچی ٦/ ٢٤٠، زكريا ٩/ ٣٤٠-٣٥٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۱/۱۱/۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۹۲۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۱۱/۳ھ

ایک سال بعد حق شفعہ کا دعویٰ کرنا

سوال [۸۸۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: مرزا نذیر بیگ نے بوقت انتقال ۲۰۶ر گز زمین کا ایک مکان چھوڑا اور ورثاء میں چار لڑکے: وزیر بیگ، شبیر بیگ، صدیق بیگ، شاہد بیگ کو چھوڑا، بعد میں وزیر بیگ کا انتقال ہوا، اس کا ایک لڑکا افتخار بیگ تھا، افتخار بیگ کا بھی انتقال ہوگیا، اس کے بعد افتخار بیگ کے ورثاء سے اس کا حصہ شاہد بیگ کے لڑکے راشد بیگ نے خرید لیا۔خریدے ہوئے ایک سال گذر جانے کے بعد صدیق بیگ نے حق شفعہ کا دعویٰ دائر کردیا ہے، تو کیا شریعت میں خرید کو ایک سال گذر جانے کے بعد صدیق بیگ کا حق شفعہ کا دعویٰ صحیح ہے یا نہیں؟ شریعت کا جو بھی حکم ہو تحریر فرمائیں عنایت ہوگی۔فقط

المستفتی: شاہد بیگ، متصل سرائے پختہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایک سال گذر جانے کے بعد تک باوجود فروختگی کے علم کے حق شفعہ کا مطالبہ نہیں کیا ہے، یا قیمت زیادہ سمجھ کر زیادہ قیمت سے نہیں لیا ہے اور سال گذرنے کے بعد اب حق شفعہ کا دعویٰ کررہا ہے، تو شرعاً یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔اور سال گذر جانے کے بعد صدیق بیگ کو حق شفعہ کے دعویٰ کا حق باقی نہیں رہا ہے؛ لہٰذا خرید شدہ حصہ کا مالک شرعاً شاہد بیگ کا لڑکا راشد بیگ ہو چکا ہے، اب اس میں کسی کا کوئی حق باقی نہیں رہا ہے۔

وقال الشعبي: من بيعت شفعته وهو شاهد لا يغيرها فلا شفعة له.

(صحيح البخاري، باب عرض الشفعة على صاحبها قبل البيع، النسخة الهندية ١/ ٣٠٠)

إذا علم الشفيع بالبيع اشهد في مجلسه ذلک على المطالبة اعلم أن الطلب على ثلاثة أوجه: طلب المواثبة: وهو أن يطلبها كما علم حتى لو بلغ الشفيع البيع ولم يطلب شفعته بطلت الشفعة. (هداية، كتاب الشفعة، باب طلب الشفعة، والخصومة، اشرفي ٤/ ٣٩٢، شامي، كراچی ٦/ ٢٢٤، زكريا ٩/ ٣٢٩-٣٣٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷ر رمضان ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/۱۴۰۰)

۱۳ / باب المزارعة

پندرہ کیلو تیل پر کھیتی کاشت کے لئے دینا

سوال [۸۸۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے اپنی سات بیگہ زمین میتھی کی کھیتی کرنے کے لئے بکر کو یہ کہہ کردی کہ جب تیل نکلے تو اس میں سے مجھ کو تم پندرہ کلو تیل دینا اور کھیتی میں آنے والا خرچ سب تم کروگے اور پندرہ کلو تیل سے اوپر جو بھی ہوگا وہ سب تمہارا ہوگا، پھر بکر نے اس زمین میں آٹھ ہزار کی لاگت لگائی اور کھیتی کو محنت سے پالا، کھیتی کٹنے کے چند دن پہلے شدید بارش ہوگئی، جس سے تقریباً آدھی کھیتی پانی بھر کر سوکھ گئی اور خراب ہوگئی، پھر بکر باقی ماندہ کھیتی کو کاٹ کر اپنے ٹریکٹر ٹرالی سے لا رہا تھا کہ کھیت میں ٹریکٹر پھنس گیا، بمشکل تمام خالی ٹریکٹر ٹرالی نکلی اور کٹی بھری کھیتی اتارنی پڑی، پھر چند دن بعد ذرا موسم ٹھیک ہونے پر بکر اس کو بھرنے گیا تو ٹریکٹر پھر دلدل میں پھنس گیا اور بھری کھیتی اتار کر بمشکل تمام ایک دوسرے ٹریکٹر کی مدد سے ٹریکٹر ٹرالی نکلی، اس میں بکر اور اس کا بھائی زور لگاتے لگاتے بیہوش ہوگئے اور بیمار بھی پڑ گئے، بکر نے زید سے آکر کہہ دیا کہ اس کو لانے سے ہم تو عاجز آگئے آپ نکال سکو تو لاکر تیل نکال لو، آخر وہ کٹی پڑی کھیتی نہ نکل سکی اور خراب ہوگئی، اب صورت حال یہ ہے کہ زید بکر کو مجبور کررہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میرا پندرہ کلو تیل دو اور بے ایمان بتارہا ہے، اب پوچھنا یہ ہے کہ زید اور بکر کے درمیان اس طرح کھیتی کرنے کا معاہدہ ٹھیک ہوا تھا یا نہیں؟ اور بکر کے ذمہ وہ پندرہ کلو تیل دینا لازم ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد طاہر القادری افضل پور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید اور بکر کے درمیان زمین کی پیداوار کے سلسلہ میں جو

معاملہ ہوا ہے، وہ از روئے شرع صحیح نہیں؛ اس لئے کہ عقد مزارعہ کے صحیح ہونے کے لئے کل پیداوار کا نصف یا ربع یا ایک تہائی یا دوتہائی کے حساب سے طے کرنا لازم ہوتا ہے، اس کے بغیر معاملہ فاسد ہوجاتا ہے، متعین طریقہ سے طے کرنا کہ پیداوار سے حاصل شدہ پندرہ کلو تیل مالک زمین لے گا اور بقیہ کھیتی کرنے والا صحیح نہیں۔ اور بٹائی کے معاملہ میں پیداوار کھیتی کرنے والے کے پاس امانت کے درجہ میں ہوتی ہے؛ لہٰذا مذکورہ صورت میں پیداوار کے ضائع ہونے میں بکر کے کسی عمل کا دخل نہیں تھا؛ اس لئے وہ پیداوار کا ضامن نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی زید کو پندرہ کلو تیل دینا اس پر لازم ہوگا۔

عن حنظلة بن قيس الأنصاري، سمع رافع بن خديج قال: كنا أكثر أهل المدينة مزدرعا، كنا نكري الأرض بالناحية منها مسمى لسيد الأرض، قال: فمما يصاب ذلک وتسلم الأرض، ومما تصاب الأرض ويسلم ذلک، فنهينا، وأما الذهب والورق فلم يكن يومئذ. (صحيح البخاري، كتاب الحرث والمزارعة، النسخة الهندية ١/ ٣١٢، رقم: ٢٢٦٩، ف: ٢٣٢٧، صحيح مسلم، باب كراء الأرض بالذهب والورق، النسخة الهندية ٢/ ١٢، بيت الأفكار رقم: ١٥٤٨)

منها: أن يكون ذلک البعض من الخارج معلوم القدر من النصف أو الثلث أو الربع أو نحوه، ومنها: أن يكون جزءا شائعا من الجملة، حتى لو شرط لأحدهما قفزان معلومة لا يصح العقد. (هندية، كتاب المزارعة، الباب الأول، زكريا جديد ٥/ ٢٧٢، قديم ٥/ ٢٣٥)

وفي الدر: الغلة في المزارعة مطلقا ...... أمانة في يد المزارع ...... فلا ضمان عليه لو هلكت الغلة في يده بلا صنعه. (درمختار مع الشامي، كتاب المزارعة، زكريا ٩/ ٤٠٨، كراچی ٦/ ٢٨٢، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٤٧، مصري قديم ٢/ ٥٠٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم شعبان ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۶۸۸)

مزارعت میں مخصوص مقدار کی شرط لگانے کا حکم

سوال [۸۸۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارا ایک مکتب ہے، جس کی کئی بیگہ زمین ہے، کمیٹی والے ایک شخص کو ایک بیگہ زمین اس شرط پر دیتے ہیں کہ ہم دھان کے موسم میں دس من دھان لیں گے اور دھان اسی زمین کی پیداوار سے لیں گے۔ اور گیہوں کے موسم میں پانچ من گیہوں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک بیگہ زمین میں کل دھان دس من نہیں ہو پاتا، تو کیا کمیٹی والے اس شخص سے تب بھی دس من دھان وصول کریں گے؟ اور کیا یہ صورت شرعاً جائز ہے، جب کہ یہ مخابرہ کی ایک شکل معلوم ہوتی ہے جو کہ شرعاً حرام ہے۔

المستفتی: محمد عبداللہ رشیدی، جامعہ اشاعت السنہ رام گنج، مغربی بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زمین کو اس شرط پر دینا کہ دھان کے موسم میں دس من دھان اور گیہوں کے موسم میں پانچ من گیہوں اسی زمین کی پیداوار سے لئے جائیں گے، تو یہ معاملہ فاسد ہے، شرعاً جائز نہیں ہے؛ البتہ اس کے جواز کی یہ شکل ہوسکتی ہے کہ اس زمین کی پیداوار سے نصف یا ثلث یا ربع لیا جائے گا اور اس کو مخابرہ کی شکل کہنا درست نہیں ہے۔

عن حنظلة بن قيس الأنصاري، سمع رافع بن خديج قال: كنا أكثر أهل المدينة مزدرعا، كنا نكري الأرض بالناحية منها مسمى لسيد الأرض، قال: فمما يصاب ذلك وتسلم الأرض، ومما تصاب الأرض ويسلم ذلك، فنهينا، وأما الذهب والورق فلم يكن يومئذ. (صحيح البخاري، كتاب الحرث والمزارعة، النسخة الهندية ۱/ ۳۱۲، رقم: ۲۲۶۹، ف: ۲۳۲۷، صحيح مسلم، باب كراء الأرض بالذهب والورق، النسخة الهندية ۲/ ۱۲، بيت الأفكار رقم: ۱۵۴۸)

لا تصح المزارعة إلا على مدة معلومة، وأن يكون الخارج شائعا

بینھما ، فإن شرطا لأحدھما قفزانا مسماۃ، فھي باطلة؛ لأن الأرض عساھا لا تخرج إلا ھذا المقدار . (ھدایة، کتاب المزارعة، أشرفي ٤/ ٤٢٦، مختصر القدوري، ص: ١٥٥، ھندیة، زکریا قدیم ٥/ ٢٣٥، جدید ٥/ ٢٧٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/۵/۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۶۵۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۵/۱۴۲۳ھ

ایک کا کھیت اور دوسرے کی محنت و بیج ہونے کی صورت کا حکم

سوال [۸۸۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بٹائی پر دینا یعنی ایک آدمی کا کھیت دوسرے آدمی کی محنت مزدوری بیج وغیرہ دونوں کے درمیان شامل ہو، تو کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد اطہر بن عبد الجلیل ارریہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بٹائی کی یہ مخصوص صورت کہ ایک آدمی کا کھیت ہو اور دوسرے آدمی کی محنت ومزدوری اور بیج وغیرہ میں دونوں شامل ہوں، شرعاً جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/۵۲۲)

دفع رجل أرضه إلى آخر على أن یزرعھا بنفسه وبقرہ والبذر بینھما نصفان، والخارج بینھما کذلک فعملا على ھذا، فالمزارعة فاسدة. (شامي، کتاب المزارعة، زکریا ٩/ ٤٠٦، کراچی ٦/ ٢٨١، مجمع الأنھر، دارالکتب العلمیة بیروت ٤/ ١٤٤، مصري قدیم ٢/ ٥٠١، المبسوط للسرخسي، دارالکتب العلمیة بیروت ٢٣/ ٣٠)

اور اگر بیج کل کے کل کسی ایک کی طرف سے ہوں تو بٹائی کی یہ مذکورہ شکل شرعی طور پر جائز اور درست ہے۔

إن كان الأرض لواحد والعمل والبقر والبذر لواحد جازت. (هداية، كتاب المزارعة، اشرفى ٤/ ٤٢٦، مختصر القدوري، ص: ١٥٥، الدر مع الرد، زكريا ٩/ ٤٠١، كراچى ٦/ ٢٧٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/۴/۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۶۱۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/۴/۱۴۲۳ھ

مزارعت میں خاص مقدار میں غلہ متعین کرنا

سوال [۸۸۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے بکر سے ایک قطعہ زمین کرایہ پر لیا اور ایک تیسرے شخص کے ساتھ مزارعت کا معاملہ کیا، بایں طور کے تم خود کھیتی کرو میں تم کو دانہ کھاد وغیرہ کچھ بھی نہیں دوں گا، تم صرف ہر فصل پر مجھ کو اتنی تعداد غلہ دے دینا، چاہے پیداوار کتنی بھی زیادہ ہو یا کم ہو تجھ کو اس سے کوئی سروکار نہیں، کیا اس طرح کا معاملہ شریعت مطہرہ میں جائز ہے؟

المستفتی: سعید احمد قاسمی ٹانڈہ بادلی، ضلع رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: یہ معاملہ شرعاً باطل ہے؛ کیوں کہ مزارعت میں کسی ایک فریق کے لئے غلہ کی خاص مقدار متعین کرنا جائز نہیں ہے۔

عن حنظلة بن قيس الأنصاري، سمع رافع بن خديج قال: كنا أكثر أهل المدينة مزدرعا، كنا نكري الأرض بالناحية منها مسمى لسيد الأرض، قال: فمما يصاب ذلک وتسلم الأرض، ومما تصاب الأرض ويسلم ذلک، فنهينا، وأما الذهب والورق فلم يكن يومئذ. (صحيح البخاري، كتاب الحرث والمزارعة، النسخة الهندية ١/ ٣١٢، رقم: ٢٢٦٩، ف: ٢٣٢٧، صحيح مسلم، باب كراء الأرض بالذهب والورق، النسخة الهندية ٢/ ١٢، بيت الأفكار رقم: ١٥٤٨)

لا تصح المزارعة إلا على مدة معلومة، وأن يكون الخارج شائعا بينهما، فإن شرطا لأحدهما قفزانا مسماة، فهي باطلة؛ لأن الأرض عساها لا تخرج إلا هذا المقدار. (هداية، كتاب المزارعة، أشرفي ٤/ ٤٢٦، مختصر القدوري، ص: ١٥٥، هندية، زكريا قديم ٥/ ٢٣٥، جديد ٥/ ٢٧٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۰۹/۶/۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۲۷۱/۲۴)

پیسوں کے عوض میں زمین کو کرایہ پر دینا

سوال [۸۸۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کوئی شخص اپنی زمین اناج کے بدلے کرائے پر نہیں دیتا؛ بلکہ پیسوں کے بدلے کرائے پر دیتا ہے، مثلاً پانچ بیگہ زمین دھائی ہزار (۲۵۰۰) کے بدلے کرائے پر دیتا ہے، یہ جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زمین کو پیسوں کے بدلے کرائے پر دینا مثلاً پانچ بیگہ زمین ڈھائی ہزار روپئے کے بدلے کرائے پر دے تو جائز اور درست ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۶/ ۵۵۹، میرٹھ ۲۵/ ۱۱۳)

ما صلح بدلا في البيع يصلح بدلا في الإجارة؛ لأن البدل في الإجارة ثمن المنفعة، وهي تابعة للعين، وما صلح بدلا عن الأصل صلح بدلا عن التبع. (شرح المجلة رستم باز، إتحاد ١/ ٢٦٠، رقم المادة: ٤٦٣)

وما صلح ثمنا في البيع صلح أجرة في الإجارة؛ لأن الأجرة بثمن المنفعة. (مجمع الأنهر، كتاب الإجارة، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٥١٣، مصري

قديم ٢/ ٣٦٩، هندية زكريا قديم ٤/ ٤١٢، جديد ٤/ ٤٤٢، الدر مع الرد، كراچی ٦/ ٤، زكريا ٩/ ٥، البحر الرائق، زكريا ٨/ ٥٠٦، كوئٹه ٧/ ٢٩٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ جمادی الاخریٰ ۱۴۳۵ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۱۱۳۴۱/۴۰)

متعین غلہ کے عوض میں زمین کرایہ پر دینا

سوال [۸۸۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کسان اپنی کھیتی کی زمین کرائے پر دیتا ہے، مگر بٹائی کی شکل میں نہیں دیتا، کرائے کی شکل میں دیتا ہے اور کہتا ہے: ہمیں فصل میں فی بیگہ ایک کوئنٹل اناج چاہئے، چاہے تو کھیتی کریا نہ کر کہیں سے بھی اناج لا ہمیں اناج چاہئے، یہ جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زمین کو اس شرط پر کرائے پر دینا کہ ہمیں فی بیگہ ایک کوئنٹل اناج چاہئے، خواہ وہ اناج کوئی سا بھی کہیں سے بھی آیا ہو، اسی زمین سے دینے کی شرط نہ ہو، تو اس طرح کرائے پر زمین دینا جائز اور درست ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۳۵۹/۱۶، محمودیہ میرٹھ ۱۱۳/۲۵)

يجوز استئجار الأرض للزراعة إن بين ما يزرع فيها، أو قال على أن يزرع فيها ما يشاء وللبناء والغرس، أو يقول له: ازرع فيها ما شئت كي لا يفضي إلى المنازعة. (البحر الرائق، كتاب الإجارة، باب ما يجوز من الإجارة وما يكون خلافا فيها، زكريا ٨/ ١٧، كوئٹه ٨/ ١٠، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٣/ ٥٢٢، مصري قديم ٢/ ٣٨٩)

رجل استأجر أرضا بطعام ولم يسم أين يقبض الطعام، قال: هو جائز. (تاتارخانية، زكريا ١٥/ ٩، رقم: ٢١٩٢٥)

والحيلة في ذلک لمن أراد الجواز أن يشترط صاحب الحنطة قفيزا من الدقيق الجيد ولم يقل من هذه الحنطة، أو يشترط ربع هذه الحنطة من الدقيق الجيد؛ لأن الدقيق إذا لم يكن مضافا إلى حنطة بعينها يجب في الذمة والأجر كما يجوز أن يكون مشارا إليه يجوز أن يكون دينا في الذمة.

(هندية، كتاب الإجارة، الباب الخامس عشر، الفصل الثالث في قفيز الطحان، زكريا قديم ٤/ ٤٤٤، جديد ٤/ ٤٨٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ جمادی الاخریٰ ۱۴۳۵ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۵۶۳)

غیر کی ملکیت میں لگایا گیا پودا کس کا ہوگا؟

سوال [۸۸۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے اپنی زمین سمجھ کر اس میں پودا لگایا اور پوری سینچائی سالہا سال کرتا رہا؛ لیکن زمین پیمائش کرنے پر زمین اور پودا سب بکر کے حصہ میں نکل رہا ہے، حالانکہ قبضہ اور پودے کی سینچائی زید نے کی ہے، از روئے شرع پودا کس کو دیا جائے؟

المستفتی: محمد نعیم الدین جھگڑوا، دربھنگہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: درخت اور پودے کا اصل مالک وہی ہوتا ہے جس نے درخت لگایا ہو اور اس کی دیکھ بھال کی ہو؛ البتہ پیمائش کے بعد زمین جس کے حصہ میں نکلے گی وہی زمین کا مالک ہوگا اور زمین کے مالک کو زمین کی مناسب اجرت دلوائی جائے گی۔

(کفایت المفتی ۷/ ۳۴۷، جدید زکریا مطول ۱۱/ ۵۷۶، امداد الفتاوی ۳/ ۵۲۰)

حدثنا أبو جعفر الخطمي، قال: بعثني عمي أنا وغلاما له إلى سعيد

بن المسيب، قال: قلنا له شيء: بلغنا عنک في المزارعة؟ قال: كان ابن عمر لا يرى بها بأسا، حتى بلغه عن رافع بن خديج، حديث، فأتاه فأخبره رافع أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أتى بني حارثة، فرأى زرعا في أرض ظهير، فقال: ما أحسن زرع ظهير، قالوا: ليس لظهير، قال: أليس أرض ظهير؟ قالوا: بلى، ولكنه زرع فلان، قال: فخذوا زرعكم وردوا عليه النفقة، قال: رافع: فأخذنا زرعنا ورددنا إليه النفقة. (سنن أبي داؤد، البيوع، باب في التشديد ذلك، النسخة الهندية ۲/ ٤٨٣، دارالسلام، رقم: ٣٣٩٩)

وإذا فسدت عنده، فإن سقى الأرض وكربها ولم يخرج شيء فله أجر مثله لو البذر من رب الأرض، ولو منه فعليه أجر مثل الأرض، والخارج في الوجهين لرب الأرض. (شامي، كتاب المزارعة، زكريا ۹/ ۳۹۸، كراچی ٦/ ۲۷٥، هداية، أشرفی ٤/ ٤٢٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ رجمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۴۵۰۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰/۶/۱۴۱۶ھ

بحمد اللہ تم

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ

فتاویٰ قاسمیہ

منتخب فتاویٰ

حضرت مولانا مفتی شبیر احمد القاسمی
خادم الافتاء و الحدیث جامعہ قاسمیہ
مدرسہ شاہی مرادآباد، الہند

(جلد ۲۰)

المجلد العشرون

الشرکۃ، المضاربۃ، الربٰوا
بتمام انوعها

۸۸۵۶ ——— ۸۸۵۷

ناشر
مکتبہ اشرفیہ، دیوبند، الہند
01336-223082

فتاویٰ قاسمیہ

صاحب فتاویٰ

حضرت مولانا مفتی شبیر احمد القاسمی

پہلا ایڈیشن محرم الحرام ۱۴۳۷ھ

ناشر

مکتبہ اشرفیہ، دیوبند، ضلع سہارنپور، الہند

01336-223082

ASHRAFI BOOK DEPOT

DEOBAND, SAHARANPUR, INDIA

Phone: 01336-223082

Mob. : 09358001571،08810383186

مکمل اجمالی فهرست ایک نظر میں

❖❖ ❍❖❍

فہرست مضامین

٢٦/ کتاب الشرکة والمضاربة

	١/ باب شرائط الشركة	

۲/ باب شرکة العنان

۳/ باب شركة الوجوه

۴/ باب الشرکۃ الفاسدۃ

۵/ باب المضاربة

٢٧/ کتاب الربوا

١/ باب ما یتعلق بنفس الربوا

۲ / باب البنوک

۳/ مسلم فنڈ

۴/ باب کاروبار میں سودی شکلیں

۵/ باب پرائیویڈنٹ فنڈ

۶/ بیمہ کے احکام

۷/ باب القمار

۸/ باب الرشوۃ

۹/ باب سودی رقم کا مصرف

۱۰/ باب سرکاری ٹیکس

۲۶/ کتاب الشرکۃ والمضاربۃ

(۱) باب شرائط الشرکۃ

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا ☆ عَلٰی حَبِيبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

تجارت میں فیصد طے کر کے شرکت کرنے کا حکم

سوال [۸۸۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بکر کی ایک تجارت ہے، مستقل چل رہی ہے، زید کچھ رقم داخل کر کے بکر کے ساتھ شریک ہونا چاہتا ہے، فریقین کے مابین ہر ماہ کی بکری میں سے فیصد طے ہوجاتا ہے۔ مزید یہ کہ زید وہ روپیہ کچھ عرصہ کے بعد واپس لے گا، تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور نفع ونقصان میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: نازش متین، پنجابیان، املی جھولے والی، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کا بکر کی تجارت میں فیصد کے لحاظ سے نفع ونقصان طے کر کے شرکت کرنا جائز ہے؛ اس کے لئے حسب ذیل شرائط ہیں۔

(۱) یہ کہ مثال کے طور پر جس کا کاروبار پہلے سے چل رہا ہے اور اس کا کل سرمایہ چار لاکھ ہے اور بعد والے کا ایک لاکھ ہے، تو یہ کل سرمایہ پانچ لاکھ ہوگیا، تو نفع میں ۲۰/ فیصد ایک لاکھ والے کو ملے گا اور ۸۰/ فیصد چار لاکھ والے کو ملے گا۔

(۲) اگر نفع نہیں ہوتا ہے، تو کسی کو بھی کچھ نہ ملے گا۔

(۳) اگر بجائے نفع کے رأس المال میں نقصان آجاتا ہے، تو ایک لاکھ والا رأس المال میں سے ۲۰؍ فیصد نقصان کا ذمہ دار ہوگا اور چار لاکھ والے کو ۸۰؍ فیصد نقصان کا بھگتان برداشت کرنا پڑے گا۔

(۴) اور زید کو ہر وقت علیحدہ ہو جانے کا اختیار رہے گا، ان چار شرطوں کے ساتھ یہ شرکت جائز ہوسکتی ہے اور آج کل کے زمانے میں ایک شکل یہ چل رہی ہے کہ کوئی بھی پیسے والا آدمی کاروبار کرنے والے کو اپنا پیسہ اس شرط پر دیتا ہے، کہ ماہانہ اتنی فیصد یا ماہانہ اتنا روپیہ ہمیں نفع کے طور پر دینا ہوگا۔ اب کاروبار کرنے والے کو نفع میں کچھ ملتا ہو یا نہ ملتا ہو؛ لیکن پیسے والے کو اپنی شرط کے مطابق بہرحال ملنا ہے اور اگر نقصان ہو جائے تو پیسے دینے والا اس نقصان میں شریک نہ ہوگا وہ صرف نفع میں ہی شریک ہوتا ہے؛ اس لئے یہ ناجائز و حرام ہے۔

إن شرطا الربح بينهما بقدر رأس مالهما جاز – والوضيعة بينهما على قدر رأس مالهما أبداً. (شامي، كتاب الشركة، مطلب في شركة العنان، زكريا ٦/٤٨٤، كراچي ٤/٢ ٣١، بدائع الصنائع، زكريا ٥/٨٣، كراچي ٦/٦٢، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٦/٦١، هندية، زكريا قديم ٢/٣٢٠، زكريا ٢/٣٢٦)

وأحدهما يملك فسخها، وإن كان المال عروضاً. (شامي، مطلب في شركة العنان، زكريا ٦/٥٠٥، كراچي ٤/٣٢٧، البحر الرائق، زكريا ٥/٣٠٩، كوئٹه ٥/١٨٥)

ولا تصح إلا بالمال الذي تصح به الشركة. (هداية، كتاب المضاربة، اشرفيه ٣/٢٥٧، مختصر القدوري ١١٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴؍ ۶۲۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲؍۷؍۱۴۲۰ھ

شرکت میں نفع ونقصان کا تناسب

سوال [۸۸۵۸]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری خالہ نے اب سے چند سال قبل تقریباً ایک لاکھ پچاس ہزار کی رقم بطور کاروبار میری فرم (کمپنی) میں لگائی تھی جوکہ نفع اور نقصان کی شرائط پر دی تھی، چند سال قبل میری فرم جوکہ ملک سے باہر مال سپلائی کرتی تھی، اس میں نقصان ہوگیا، اس طرح کہ ۱۲/لاکھ روپیہ کی رقم باہر کے کاروباری نے روک لی اور رقم دینے سے منع کردیا اور میرا کاروبار بند ہوگیا۔ اور تنگ دستی بھی ہے اور رقم وصول کرنے کے لئے قانونی کارروائی بھی جاری ہے، جوکہ آج بھی چل رہی ہے، میں نے اپنی خالہ محترمہ سے رقم لینے کے بعد سے اب تک لگ بھگ وقتاً فوقتاً ۳۵ سے ۴۰ ہزار تک دے بھی دیا ہے۔

اب میری خالہ محترمہ کل رقم کا مطالبہ کررہی ہیں؛ جبکہ ابھی تک باہر سے کوئی رقم نہیں آئی ہے، تو اب شرعی طور پر میرے اور میری خالہ محترمہ پر کیا شرعی قانون لاگو ہوگا؟ تو کیا ان کو اس طرح رقم مانگنا صحیح ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں تاکہ میں گناہ سے بچ سکوں۔ عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: ظہیر احمد ولد شاندار حسین مرحوم، مفتی ٹولہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر سائل اپنے بیان میں سچا ہے، تو جب نفع اور نقصان دونوں میں اپنی لاگت کے تناسب کے حساب سے شرکت کے ساتھ معاملہ کیا گیا ہے، تو دونوں جس طرح نفع میں شریک ہوں گے، اسی طرح نقصان میں بھی شریک ہوں گے؛ لہٰذا جو پیسہ بائر نے روک لیا ہے، اس کے اندر تناسب کے اعتبار سے دونوں کا پیسہ رکا ہوا سمجھا جائے گا اور جو پیسہ وہاں سے آتا رہے گا، تناسب کے حساب سے دونوں اس پیسہ میں حقدار ہوں گے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۴/۱۸۲)

عن جابر بن زيدؓ، قال: الربح على ما اصطلحوا عليه، والوضيعة على المال هذا في الشريكين، فإن هذا بمأة، وهذا بمأتين. (مصنف عبد الرزاق، البيوع، باب نفقة المضارب، ووضيعته، المجلس العلمي ٨/٢٤٨، رقم: ١٥٠٨٩)

إذا شرطا الربح على قدر المالين متساوياً، أومتفاضلاً ، فلا شك أنه يجوز ويكون الربح بينهما على الشرط......والوضيعة على قدر المالين متساوياً، ومتفاضلاً؛ لأن الوضيعة اسم لجزء هالك من المال فيتقدر بقدر المال. (بدائع الصنائع، كتاب الشركة، زكريا ٥/٨٣، كراچي ٦/٦٢، هندية، زكريا قديم ٢/٣٢٠، جديد ٢/٣٢٦)

ويجوز مع ذلك أن يتساويا في الربح، أويختلفا فيوزع الربح بينهما حسب الشرط الذي اتفقا عليه، أما الخسارة فتكون بنسبة رأس المال، فحسب عملاً بقاعدة الربح على ما شرطا والوضيعة على قدر المالين. (الفقه الإسلامي وأدلته ٤/٢٥٩٢-٢٦٠٩-٦١٠)

وإن شرطا أن يكون الربح والوضيعة بينهما نصفين، فشرط الوضيعة بصفة فاسدة؛ ولكن بهذا لا تبطل الشركة؛ لأن الشركة لا تبطل بالشروط الفاسدة، وإن وضعا فالوضيعة على قدر رأس مالهما. (تاتارخانية، زكريا ٧/ ٤٩١، رقم: ١٠٩٦٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۱؍رجب المرجب ۱۴۳۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۶۱۲/۴۱)	۱۴۳۵/۷/۲۱ھ

پانچ فیصد کے نفع پر شرکت کرنے کا حکم

سوال [۸۸۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک جگہ حاجی اشرف نے دو غیر آدمیوں کے ساتھ لی، یعنی پارٹنرشپ میں لی،

میں نے یعنی حاجی اسلام نے کہا کہ اس زمین میں میرا بھی شیئر ڈال دو، حاجی اشرف نے کہا کہ آپ کا اس میں کوئی پیسہ لگا ہوا نہیں ہے، پھر بھی میں آپ کو پانچ پرسنٹ پر پارٹنر بناتا ہوں، میں ان کے ساتھ لگا رہا اور ہم دونوں آتے جاتے رہے، جہاں پر بھی ضرورت پڑی وہ زمین ساری فروخت ہوگئی، حاجی اشرف نے کہا کہ تمہاری کوئی رقم لگی ہوئی تو تھی نہیں، میں نے کہا کہ بغیر پیسہ کے بھی پارٹنر ہوتے ہیں اور میں آپ کے ساتھ بھاگ دوڑ بھی کرتا رہا اور آپ نے یہ خود ہی کہا تھا اور طے کیا تھا کہ آپ کو پانچ پرسنٹ کا پارٹنر بناتا ہوں۔ اب وہ میرا حصہ دینے کو راضی نہیں ہیں تو شریعت کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: حاجی محمد اسلام، پیرزادہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب پانچ فیصد کے ساتھ معاملہ طے ہوا اور اسی شرط پر حاجی اسلام نے بھاگ دوڑ اور محنت میں پورا پورا حصہ لیا ہے، تو نفع میں سے پانچ فیصد وعدہ کے مطابق دینا لازم ہے۔

قال اللّٰه تعالى: يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ . [المائدہ: ۱]

وإن فسدت فأجير فله أجر مثله ربح، أو لم يربح ولا يزاد على ماشرط له عند أبي يوسف ملتقي الأبحر، وهو المختار، الدر المنتقي. (مجمع الأنهر، كتاب المضاربة، دارالكتب العلمية بيروت ۳/۴۴۴، مصري قديم ۲/۳۲۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰؍۱۱۲۸۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷؍۱۱؍۱۴۳۴ھ

منافع کا فیصدی لازم ہے

سوال [۸۸۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: کہ ایک صاحب کاٹنے والے جانوروں کا کاروبار کرتے ہیں، مالی حیثیت سے کمزور ہیں، میں جن صاحب سے روپیہ لیتا ہوں وہ صاحب فی جانور پر اصل کے علاوہ سورو پیہ منافع لیتے ہیں، وقت کی کوئی قید نہیں ہے، جب جانور ذبح ہوکر فروخت ہوگا، تب حساب دینا ہوگا، کیا اس طرح روپیہ لینا دینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: حافظ شوکت علی راوتپور، قصبہ کانٹ، شاہجہاں پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں درج کردہ صورت جس میں رقم دینے والے کو فی جانور سورو پیہ دینے کی بات طے ہوتی ہے جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ اپنے پیسے پر سود اور بیاج ہے جو کہ قطعی حرام ہے، ہاں البتہ یہ صورت جائز ہوسکتی ہے کہ فی جانور جو کچھ نفع ہوسکتا ہو اس کی تقسیم کی بات طے ہوجائے، مثلاً نصف نصف کہ اگر دوسورو پیہ نفع ہوتا ہے، تو سو سورو پیہ یا ایک ثلث اور دوثلث کہ ڈیڑھ سو نفع ہوتا ہے، تو ایک کو سورو پیہ اور دوسرے کو پچاس روپیہ اس طرح جائز ہوسکتا ہے۔

وکون الربح بینهما شائعاً فلو عین قدراً فسدت وکون نصیب کل منهما معلوما عند العقد. (در مختار مع الشامي، کتاب المضاربة، زکریا ٨/٤٣٣، کراچي ٥/٦٤٨)

ومن شرطها أن یکون الربح بینهما مشاعاً لا یستحق أحدهما منه دراهم مسماة. (مختصرالقدوري، کتاب المضاربة ١٨٨، هداية، اشرفي ٣/٢٥٨)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۹؍رجب المرجب ۱۴۲۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۵۳۹/۳۷)	۱۴۲۵/۸/۵ھ

منافع کی تقسیم طے شدہ فیصد کے مطابق کرنے کا حکم

سوال [۸۸۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص نے ایک جگہ خریدی، اس جگہ میں حاجی اسلام اور حاجی اشرف کا بھی شیئر تھا، حاجی اشرف کی -/535000 پانچ لاکھ پینتیس ہزار کی رقم لگی ہوئی تھی، اور حاجی اسلام کی -/400000 چار لاکھ روپیہ کی رقم لگی ہوئی تھی، مگر یہ طے ہوا تھا کہ حاجی اشرف اور حاجی اسلام دونوں نفع اور نقصان کے برابر کے ذمہ دار ہیں، اگر حاجی اشرف کی رقم زیادہ تھی، تو حاجی اسلام کی محنت زیادہ تھی۔

عرض یہ ہے کہ ہم دونوں آدھے آدھے کے پارٹنر بن گئے، جب یہ کام ختم ہوگیا، تو کچھ رقم دوسرے کام میں لگادی، پھر کچھ رقم تیسرے کام میں لگادی اور پھر ساری رقم چھوتھے کام میں لگادی۔ زمین کی خریداری میں اب حاجی اشرف کا کہنا ہے کہ منافع پرسنٹیز کے حساب سے بٹے گا، حاجی اسلام کا کہنا ہے کہ اگر تمہاری رقم زیادہ تھی، تو میری محنت زیادہ تھی اور آپ میرے اوپر حکم بھی زیادہ چلاتے تھے، کیا کہتے ہیں علماءدین یہ منافع پرسنٹیز کے حساب سے بٹے گا یا آدھا آدھا بٹے گا؟ جب یہ طے تھا کہ نفع نقصان میں دونوں آدھے آدھے کے ذمہ دار ہیں، اس شخص سے حاجی اشرف نے ایک دوکان کا سودا، پندرہ لاکھ روپیہ کا کیا اور اپنے پاس سے دو لاکھ روپیہ ایڈوانس دے دیئے، میری بغیر اجازت کے اور باقی جو تیرہ لاکھ روپیہ کی رقم تھی پارٹنرشپ کی، وہ پارٹنرشپ کی رقم میں سے کاٹنے کے لئے کہہ دیا، جو حاجی اشرف اور حاجی اسلام کی زمین کے منافع کے تھے، حاجی اسلام حاجی اشرف سے کہتے ہیں کہ اس میں میرا بھی آدھا حصہ ہے، دوکان کی خریداری میں؛ چونکہ میری بھی رقم لگی ہوئی ہے اور آپ کی جو زائد رقم لگی ہوئی ہے، مجھ سے یعنی حاجی اسلام سے لیں۔ اس بات پر تیار ہیں حاجی اشرف اور کہتے ہیں کہ حاجی اسلام سے کیا واسطہ میں اکیلا اپنے نام رجسٹری کراؤں گا،

جب کہ حاجی اسلام کی بھی دوکان میں رقم لگی ہوئی ہے۔ اب اس دوکان کی قیمت کافی بڑھ چکی ہے۔ کیا کہتے ہیں علماء دین مفتیان کرام کیا اس دوکان میں حاجی اسلام کا شیئر ہے یانہیں؟ یا کوئی اور راستہ ہے؟ جواب عنایت فرمادیں عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: حاجی محمد اسلام، شیخ علاؤالدین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شروع میں جب دونوں شریکوں میں آپسی رضامندی سے نصف نصف منافع متعین ہو چکا تھا اور اسی معاہدہ پر خرید وفروخت جاری رہی؛ لہٰذا جب سامانوں کی خرید وفروخت مکمل ہو چکی اب حاجی اسلام کا یہ کہنا کہ منافع پرسینٹیز کے اعتبار سے تقسیم ہوں گے درست نہیں ہے؛ بلکہ دونوں کے درمیان جو پہلے طے ہو چکا تھا، اسی کے تناسب سے منافع کی تقسیم ہوگی اور شرکت کی رقم سے جو دوکان خریدی گئی ہے، اس میں دونوں شریک برابر کے حصہ دار ہیں؛ اس لئے دونوں شریک میں سے کسی ایک شریک کا جائیدا دکو تن تنہا اپنے نام رجسٹری کرانا درست نہیں ہے۔

عن جابر بن زیدؓ، قال: الربح علی ما اصطلحوا علیه، والوضیعة علی المال هذا في الشریکین، فإن هذا بمأة، وهذا بمأتین. (مصنف عبد الرزاق، البیوع، باب نفقة المضارب، ووضیعته، المجلس العلمي ۸/۲۴۸، رقم: ۱۵۰۸۹)

إن شرکة العنان لا یشترط فیها المساواة لا في المال، ولافي التصرف، فیجوز أن یکون مال أحد الشریکین أکثر من الآخر -إلی- فیوزع الربح بینهما حسب الشرط الذي اتفقا علیه. (الفقه الإسلامي وأدلته الهدیٰ انٹرنیشنل دیوبند ۴/۵۹۲)

أما شرکة العنان فهي أن یشترک اثنان فأکثر بمالین علی أن یعملا معاً في تنمیتها، والربح بینهما علی ما اشترطا. (الفقه علی المذاهب الأربعة، دار الفکر ۳/۷۵)

شركة عنان: تصح مع تساوي المال واختلاف الربح، ومع اختلاف المال وتساوي الربح، ومع اختلاف مال كل من الشريكين. (معجم لغة الفقهاء، كراچي ٢٦١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۲۸۷/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۱۱/۴ھ

بغیر پیسے دیئے کاروبار میں شرکت کا حکم

سوال [۸۸۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص نے تین آدمیوں کی موجودگی میں وعدہ کیا کہ بے پیسہ کے ساجھی حکیم الدین کو ہرگز اپنے ساجھے سے الگ نہیں کروں گا، اس کے بعد کام ہوتا رہا، پھر کام فیل ہونے لگا، تو اس نے حکم دیا کہ ایسے مال لینے والے اور دینے والے فراہم کرو، جس سے کام میں فائدہ ہو، میں نے کافی محنت کر کے ایسے لوگ فراہم کئے، جن کو ۱۵/ ۲۰/ لاکھ روپیہ کا مال سپلائی کیا گیا، کیا میں اپنا فائدہ وصول کرنے کا حق رکھتا ہوں؟ مہربانی فرما کر جواب لکھ دیں۔ ۳۰/ فیصد طے ہوا تھا منافع میں سے۔

المستفتی: حکیم الدین، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب دونوں میں پہلے سے یہ بات طے ہو چکی تھی کہ جو کچھ بھی اس کاروبار میں نفع ہوگا، اس میں سے ۳۰/ فیصد مال ادھر سے ادھر دینے اور لیجانے والے کے لئے متعین ہوگا اور ۷۰/ فیصد کارخانہ دار کو ملا کرے گا، تو شرط کے مطابق شرعاً ۷۰/ فیصد کارخانہ دار کا ہوگا اور ۳۰/ فیصد مذکورہ کام کرنے والے کا حق ہوگا۔

عن أبي حصين، وعن هاشم بن أبي كليب، وعن إبراهيم، وإسماعيل

الأسدي عن الشعبي، وعاصم الأحول عن جابر بن زيد قالوا: الربح على ما اصطلحوا عليه، والوضيعة على المال، هذا في الشريكين، فإن هذا بمأة، وهذا بمأتين. (مصنف عبد الرزاق، البيوع، باب نفقة المضارب، ووضيعته، المجلس العلمي۸/۲٤۸، رقم:۱٥۰۸۹)

وقال النبي صلى الله عليه وسلم: المسلمون عند شروطهم. (صحيح البخاري، كتاب الإجارة، باب أجر السمسرة تعليقا، النسخة الهندية ۱/۳۰۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱ رشوال المکرّم ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۳۲۵)

نقصان کی صورت میں شریکوں کو کس حساب سے پیسے لوٹائے جائیں؟

سوال [۸۸۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ

۱	تنظیم برکت نے روپے دیئے	۹۱۸۰۰	91800
۲	سلیم برکت نے روپے دیئے	۷۵۶۰۰	75600
۳	نسیم برکت نے روپے دیئے	۶۶۴۰۰	66400
۴	ظہیر حنیف نے روپے دیئے	۴۵۴۵۰	45450
۵	ظہیر ماموں نے روپے دیئے	۴۱۰۵۰	41050
۶	پپو برکت نے روپے دیئے	۳۳۲۰۰	33200
	کل رقم دی گئی	۳۵۳۵۰۰	353500

۳۵۳۵۰۰ کا مال ان سب حضرات نے مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق حنیف ولد لئیق کو دیا ہے، مگر حنیف ولد لئیق کے کاروبار میں نقصان ہونے کی وجہ سے اس نے یہ سارا پیسہ

نہیں دیا، بعد میں فیصلہ ہوا کہ دو لاکھ اسی ہزار روپئے حنیف ولد لئیق مذکورہ بالا حضرات کو دے سکتے ہیں اور جانبین میں مشترکہ صلح ہوگئی اور جب رقم نقصان کے ساتھ لوٹ رہی ہے، تو مذکورہ بالا شرکاء میں سے ان کی رقم کے تناسب کے اعتبار سے کس کو کتنا نقصان پہونچے گا اور کس کو کتنا کتنا ملے گا؟ مزید اس میں ایک تفصیل یہ بھی ہے کہ حنیف نے فوری ڈھائی لاکھ روپیہ ادا کر دیا ہے اور تیس ہزار روپیہ چھ مہینہ کے بعد دے گا، تو مفتی صاحب ہم کو یہ بتائیے کہ ڈھائی لاکھ میں سے کسکو کتنا کتنا ملے گا؟ اور چھ مہینہ کے بعد تیس ہزار روپیہ جو ملے گا وہ ہمارے درمیان کس طرح تقسیم ہوگا،

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق:

707	توافق	500
353500	500	250000

میت

تنظیم برکت	سلیم برکت	نسیم برکت	ظہیر حنیف	ظہیر ماموں	پپو برکت
918000	75600	45450	41050	41050	33200

ڈھائی لاکھ روپیہ میں سے تنظیم برکت کو سلیم برکت کو

نسیم برکت کو ظہیر حنیف، ظہیر ماموں کو

پپو برکت کو دے کر کے پھر صرف تین روپیہ بچے گا، جس کو ہم نے بٹوں اور ریزگاری میں لکھ دیا ہے، سب مل کر تین روپیہ کی مونگ پھلی یا چنا منگا کر کھالیں۔

707	توافق	60
353500	500	30000

میـــت

تنظیم برکت	سلیم برکت	نسیم برکت	ظہیر حنیف	ظہیر ماموں	پپو برکت
918000	75600	66400	45450	41050	33200

چھ مہینہ کے بعد ملنے والی رقم تیس ہزار روپیہ میں سے تنظیم برکت کو

سلیم برکت کو نسیم برکت کو ظہیر حنیف کو

ظہیر ماموں کو پپو برکت کو دے کر کے پھر صرف تین روپیہ بچے گا، جس کو ہم نے بٹوں اور ریز گاری میں لکھ دیا ہے، سب مل کر کے تین روپیہ کی مونگ پھلی یا چنا منگا کر کھالیں۔

101	توافق	80
353500	3500	280000

میـــت

تنظیم برکت	سلیم برکت	نسیم برکت	ظہیر حنیف	ظہیر ماموں	پپو برکت
918000	75600	66400	45450	41050	33200

دو لاکھ اسی ہزار روپیوں میں سے تنظیم برکت کو ، سلیم برکت کو

نسیم برکت کو ظہیر حنیف کو ظہیر ماموں کو

پپو برکت کو دے کر کے پھر صرف دو روپیہ بچے گا،

جس کو ہم نے بٹوں اور ریز گاری میں لکھ دیا ہے، سب مل کر کے دو روپئے کی مونگ پھلی یا چنا منگا کر کھالیں۔

نقصان کی تفصیل حسب ذیل ہے

میت 353500					
تنظیم برکت	سلیم برکت	نسیم برکت	ظہیر حنیف	ظہیر ماموں	پپو برکت

دو لاکھ اسی ہزار اوپر کی تفصیل کے مطابق دو مرتبہ میں ملیں گے، اور دو لاکھ اسی ہزار ملنے کے بعد ہر ایک کو کتنا کتنا نقصان ہوا ہے، تو نقصان کی تفصیل مذکورہ چوتھے کالم میں لکھدی گئی ہے، دیکھ لیجئے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۱ر ربیع الاول ۱۴۲۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۵۵۶/۳۶)	۱۴۲۳/۳/۱۱ھ

ساجھے داری ختم کرتے وقت کونسی قیمت کا اعتبار ہوگا؟

سوال [۸۸۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید اور عمر نے ایک دیوار ساجھے داری میں تعمیر کرائی، چند سالوں کے

بعد اس دیوار پر دونوں میں اختلاف ہوا، زید یہ چاہتا ہے کہ دیوار کی اینٹوں کی نصف قیمت عمر کو دے کر دیوار اپنے حصہ میں لگالے۔

امر مطلوب یہ ہے کہ پیسے اور نصف قیمت تعمیر والے دن کے بھاؤ سے دیئے جائیں یا موجودہ نرخ کے حساب سے؟ اور تعمیر کے وقت معمار وغیرہ کی جو مزدوری میں پیسے لگے تھے، ان کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: عبدالقادر، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب دیوار ساجھے داری میں تعمیر کی گئی، تو لازمی طور پر وہ دیوار جس زمین پر کھڑی ہے، وہ زمین بھی ساجھے میں ہوگی۔ سوال نامہ میں اس کو ظاہر کیوں نہیں کیا گیا، زید اگر یہ چاہتا ہے تو نصف دیوار اور نصف زمین کی موجودہ قیمت جو بھی طے ہوجائے یعنی جس دن ساجھے داری ختم کی جائے گی، اسی دن کی قیمت ادا کر کے پوری دیوار اور زمین آپس کی رضامندی سے زید اپنی ملکیت میں منتقل کرسکتا ہے۔

إذا اشتریٰ أحد الشریکین جمیع الدار المشترکة من شریکه، قلت: علم من هذا ما یقع کثیراً، وهو أن أحد الشریکین في دار ونحوها یشتري من شریکه جمیع الدار بثمن معلوم، فإنه یصح علی الأصح بحصة شریکه من الثمن، وهي حادثة الفتویٰ. (شامي، کتاب البیوع، باب المبیع الفاسد، مطلب فیما إذا اشتریٰ أحد الشریکین جمیع الدار المشترکة من شریکه، زکریا ۷/ ۲۴۳، کراچي ۵/ ۵۷) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ صفر المظفر ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/ ۵۶۲۹)

شریک سے متعین نفع سے زیادہ رقم وصول کرنے کا حکم

سوال[۸۸٦۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ احقر مقبول احمد ایک تاجر ہے، کچھ سال پہلے میرا ایک مسلمان بھائی کے ساتھ یہ معاہدہ ہوا تھا کہ دونوں مل کر تجارت کریں گے، نفع ونقصان میں دونوں برابر شریک رہیں گے، اللہ نے تجارت میں خوب برکت دی، نفع میں دونوں کے حصے میں خطیر رقم آئی، میرے شریک نے میرا حصہ روک لیا، ڈیڑھ سال تک کچھ بھی نہیں دیا، اس کے بعد ہر ماہ قسطوار دے رہے ہیں، میرا سوال یہ ہے کہ کیا میں نے ان سے اپنے متعین نفع سے زیادہ کا مطالبہ کرسکتا ہوں؛ کیونکہ وقت پر میرا حق ادا نہ کرنے کی وجہ سے مجھ کو کافی نقصان ہوا۔

(۱) اپنا حق لینے کے لئے کئی بار سفر کیا، ہر سفر پر ایک خطیر رقم خرچ ہوئی۔

(۲) بار بار فون پر مطالبہ کیا، جس پر بھی کافی رقم خرچ ہوئی۔

(۳) اپنے کچھ ایسے کام نکل آئے کہ مجبوراً سودی قرض لینا پڑا۔

(۴) ڈیڑھ سال قبل کرنسی کی (Value) قدر وقیمت زیادہ تھی اب کم ہے، اگر وقت مقررہ پر یہ رقم مل جاتی، تو اللہ کے فضل وکرم سے دوگنا کمالیتا۔

(۵) اب بھی یک مشت نہیں قسطوار دے رہے ہیں۔

(٦) ذہنی کوفت اور پریشانی ان سب پر مستزاد ہے۔

برائے کرم مجھے یہ بتلائیے کہ شریعت محمدیہ ﷺ کے قانون کے مطابق اپنے حصہ سے زیادہ کا مطالبہ کرسکتا ہوں؟ اگر کرسکتا ہوں، تو اس کی حد کیا ہے؟ اگر نہیں تو اس کے مطالبہ میں جو خرچ ہوا ہے، اس کے متعلق شریعت مطہرہ کیا کہتی ہے؟

المستفتی: احقر مقبول احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: آپ کے شریک پر وقت مقررہ ہی میں آپ کا حق دینا ضروری تھا؛ لیکن جب وہ وقت مقررہ میں نہ دے کر ابھی قسطوار آپ کو دے رہا ہے، تو تاخیر کرنے کی وجہ سے گنہگار ہوگا، مگر آپ کو اپنے وقت پر نہ ملنے کی وجہ سے متعین نفع سے

زیادہ کا مطالبہ کرنا درست نہیں؛ البتہ اس مطالبہ میں جو خرچ ہوا ہے، وہ اس وقت لے سکتے ہیں؛ جبکہ وہ دینے پر راضی ہو۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۷/۲۱۸، امداد الفتاوی ۴/۱۴۱)

عن أبي حرة الرقاشي، عن عمه، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا يحل مال امريء مسلم إلا بطيب نفس منه. (مسند أحمد أبي يعلى الموصلي، دارالكتب العلمية بيروت ۲/ ۹۱، رقم:۱۵۶۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍صفر المظفر ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۰۱۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۲/۲ھ

مشترکہ کمائی کا مالک کون؟

سوال [۸۸۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عبدالغفار وعبدالقیوم ونواسہ عبدالماجد تینوں نے مل کر پیسہ کمایا، عبدالغفار کا انتقال ہو گیا، پندرہ سال کے بعد جو دولت تھی، وہ عبدالقیوم اور عبدالماجد نے تقسیم کر لی، عبدالغفار کے دو لڑکے الگ تھے، اس مال میں دونوں لڑکے عبدالغفور اور محمد ایوب کا حصہ ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالغفور، ساکن نجو پورہ، ٹانڈہ بادلی، رام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر سب شرکاء نے ساتھ کمایا ہے اور بوقت شرکت آپس میں حصہ داری کی کوئی شرط لگائی تھی، تو اس شرط کے اعتبار سے ہر شریک کو حصہ ملے گا اور اگر کوئی شرط نہیں تھی اور ساتھ مل کر کمایا ہے، تو تینوں شریکوں کے درمیان حاصل شدہ کمائی برابر تقسیم ہوگی؛ اس لئے عبدالغفار اور اس کے ورثاء عبدالغفور اور محمد ایوب کو محروم کر دینا ہرگز جائز نہیں؛ بلکہ اس میں سے عبدالغفار کے انتقال کے بعد اس کے شرعی ورثاء کو اس کا حق ملے گا۔

کما یستفاد من الشامیة: یؤخذ من هذا ما أفتى به في الخيرية في

زوج امرأة وابنها اجتمعا في دار واحدة، وأخذ كل منهما يكتسب على حدة ويجمعان كسبهما ولا يعلم التفاوت، ولا التساوي، ولا التمييز، فأجاب بأنه بينهما سوية. وكذا لو اجتمع إخوة يعلمون في تركة أبيهم ونما المال، فهو بينهم سوية ولو اختلفوا في العمل والرأي. (شامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ولا يعلم التفاوت، فهو بينهما بالسوية، زكريا ٦/ ٥٠٢، كراچي ٤/ ٣٢٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷ر جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶ / ۲۲۱۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۱/۵/۱۹ھ

ذاتی اور مشترک رقم سے خریدی گئی زمین کا مالک کون؟

سوال [۸۸۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرا نام صابر حسین ہے، ۱۹۲۷ء میں میری پیدائش ہوئی، اس اعتبار سے میری عمر ۶۲ ر سال کی ہے، میرا ایک چھوٹا بھائی جو مجھ سے دس سال چھوٹا ہے، میں گیارہ سال کا تھا کہ میرے والد کا انتقال ہوگیا، دادا، دادی نے میری پرورش کی ماموں نے ہمارے رہنے کے لئے ایک مکان کی زمین خریدی تھی، جس پر ہم نے ایک کچا مکان بنالیا، کچھ دن بعد میں نے یہاں اور نیپال میں کپڑے کا کام شروع کردیا، خدا نے وسعت دی، تو میں نے رہنے کے لئے زمین خریدی، اس وقت میرا چھوٹا بھائی پڑھ رہا تھا؛ جبکہ اس کی عمر ۲۸ ر سال کی تھی، پڑھنے کے زمانہ ہی میں اس کی شادی بھی کردی اور میں کماتا رہا، ابھی تک وہ کسی کام میں شریک نہیں تھا، میں زمین موقع بموقع خریدتا رہا، جس کے کل کاغذات میرے اور میری بیوی کے نام ہیں۔

اب میرے بھائی کے دو بچے ہوگئے، تب انہوں نے نیپال میں میرے ساتھ کپڑے کے کام میں ہاتھ بٹانا شروع کردیا، اس تفصیل کے بعد مسئلہ یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ زمین وجائداد

جو میں نے بذات خود خریدی ہے، جس کے کل کاغذات میرے اور میری بیوی کے نام ہیں، اس زمین میں میرے چھوٹے بھائی کا شرعاً کیا حصہ نکلتا ہے؟ تحریر فرما کر ممنون فرمائیں۔

المستفتی: صابر حسین صدیقی، محلّہ چوک بازار، کانٹھ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: چھوٹے بھائی کے کمائی میں لگنے سے پہلے پہلے جو جائداد آپ نے اپنی خاص کمائی سے خریدی ہے، اس میں آپ کے بھائی کا شرعاً حصہ نہیں ہوگا اور جس وقت سے بھائی نے بھی کمانا شروع کیا ہے، اس کے بعد شرکت میں رہتے ہوئے، جو جائداد خریدی گئی ہے، اس میں چھوٹے بھائی کا بھی برابر حصہ ہے۔

نیز ماموں نے جو مکان دیا ہے، اس میں دونوں برابر کے حقدار ہوں گے۔

إن كان في يده مال الشركة، فهو على الشركة، فإن لم يكن فاشترىٰ بدراهم و دنانير فالشراء له خاصة دون شريكه. (فتاوى بزازيه على هامش الهندية، كتاب الشركة الثاني فيما للشريك وما لاله قديم زكريا، جديد زكريا۳/۱۱۸)

فإن قالوا هم أو امرأته بعد موته إن هذا استفدناه بعد موته، فالقول لهم. (شامي، كتاب الشركة، فصل في الشركة الفاسدة، كراچي ٤/٣٢٥، زكريا٦/٥٠٢)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ربیع الاول ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/۱۷۸۱)

مشترکہ روپئے سے بحالت شرکت خریدے ہوئے مکان کا حکم

سوال[۸۸۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ رمضان کے دولڑکے تھے، حافظ بشیر و حافظ نذیر، دونوں بھائیوں کے کاروبار ایک میں تھے، حافظ بشیر جو کہ بڑے بھائی ہیں، انہوں نے اسی حالت میں ایک قطعہ

مکان خریدا؛ جبکہ دونوں کا رہنا سہنا ایک میں تھا، خریداری مکان کا کاغذ منسلک استفتاء ہے۔

مسئلہ دریافت یہ ہے کہ حافظ بشیر کا خریدا ہوا مکان خود ان کی ذاتی ملکیت ہوئی یا دونوں بھائیوں کا اس میں اشتراک ہوگا؟ مسئلہ واضح فرمائیں۔

المستفتی: عبید اللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر حافظ بشیر نے مذکورہ مکان دونوں بھائیوں کی شرکت کے زمانہ میں خریدا ہے، حافظ بشیر کے پاس حافظ نذیر کی شرکت کے علاوہ کوئی الگ کاروبار بھی نہیں تھا اور دونوں بھائیوں کی کمائی کا پیسہ بھی ملا جلا رہتا تھا، تو شرعاً مذکورہ مکان میں حافظ بشیر اور حافظ نذیر دونوں شریک ہوں گے۔

لو اجتمع إخوة يعملون في تركة أبيهم، ونما المال، فهو بينهم بالسوية، ولو اختلفوا في العمل والرأي. (شامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحدة، واكتسبا ولا يعلم التفاوت، فهو بينهما بالسوية، زكريا ٦/٥٠٢، كراچي ٤/٣٢٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶؍۲۰۵۳)

گاڑی کی خرابی کا خرچہ مشترکہ رقم سے لینے کا حکم

سوال [۸۸۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حاجی محمد اسلام، نجمی بھائی واشرف صاحب، ان تینوں حضرات کا مشترکہ کاروبار ہے، جس کے لئے ایک گاڑی بھی ہے اور اس گاڑی کے لئے یہ طے شدہ معاملہ ہے کہ اگر یہ گاڑی مشترکہ کاروبار میں کچھ خراب ہو جائے، تو مشترکہ رقم سے ہی گاڑی کی مرمت کی جائیگی اور اگر کوئی ایک ساتھی گاڑی اپنے ذاتی کام میں استعمال کر رہا ہے، اور اسی وقت

اس میں کچھ خرابی آ گئی، تو اس کا نقصان اس ساتھی کو برداشت کرنا پڑے گا، ایک دن گاڑی حاجی محمد اسلام صاحب کے ذاتی کام میں تھی، ان کا کام شام ۵/ بجے ختم ہوگیا، اس کے بعد گاڑی تینوں مشترکہ ساتھیوں کے مشترکہ کام میں استعمال ہونا شروع ہوئی کہ اچانک اس میں رات دس بجے خرابی آ گئی اور اسی خرابی کو دور کرنے میں ۶۴۰۰/ چھ ہزار چار سو روپئے کا خرچہ آیا۔ اب مذکورہ صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس خرچہ کو تینوں ساتھی برداشت کریں گے یا تنہا حاجی محمد اسلام صاحب برداشت کریں گے؟ شریعت کی روشنی میں شرعی فیصلہ فرمادیں تاکہ اسی پر عمل کیا جائے۔

المستفتی: محمد وسیم بن حاجی احمد جان خان، کٹار شہید، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر واقعہ ایسا ہی ہے جیسا کہ سوال نامہ میں درج ہے، تو گاڑی کی خرابی کا خرچ مشترکہ رقم میں سے لازم ہوگا۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۶/ ۳۹۷)

عن عمرو بن العوف المزني، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: المسلمون على شروطهم. (المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التراث العربي ۱۷/ ۲۲، رقم: ۳۰، صحيح البخاري، كتاب الإجارة، باب أجر السمسرة تعليقا، النسخة الهندية ۱/ ۳۰۳، سنن أبي داؤد، القضاء، باب في الصلح، النسخة الهندية ۲/ ۵۰۶، دار السلام، رقم: ۳۵۹٤، سنن الترمذي، الأحكام، باب ماذكر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دار السلام رقم: ۱۳۵۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ ربیع الاول ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۳۱۸)

شرکت کے معاملہ میں نفع کا مجہول ہونا

سوال[۸۸۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے تیس ہزار روپئے عبداللہ کو کاروبار میں لگانے کے لئے دیا، اورزید نے یہ بات بھی کہہ دیا کہ جوبھی نفع میں سے آپ دیں گے، میں رکھ لوں گا بخوشی، تو کیا یہ نفع زید کے لئے لینا اور عبداللہ کوکاروبار میں تیس ہزار روپئے لگانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: نوراحمد، گلشہید، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: یہ معاملہ شرعی طور پر جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ یہ کہنا کہ نفع میں سے آپ جوبھی دیں گے میں قبول کرلوں گا، اس میں نفع کی مقدار کی تعیین نہیں ہے؛ بلکہ اس طرح معاملہ کرنا ضروری ہے کہ نفع میں سے نصف تہائی یا چوتھائی میں لوں گا، اس کے بغیر درست نہیں ہوسکتا۔

قال القدوري في كتابه: كل شرط يوجب جهالة الربح، أو قطع الشركة في الربح يوجب فساد المضاربة......ولو دفع إليه مضاربة على أن يعطي المضارب رب المال ماشاء من الربح، فهذه مضاربة فاسدة، كذا في المبسوط. (عالمگيري، كتاب المضاربة، الباب الأول، والثاني، زكريا جديد٤/ ٢٩٦، ٢٩٧، قديم ٤/ ٢٨٨، المبسوط للسرخي، دارالكتب العلمية بيروت ٢٢/ ٢٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۱۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/ ۶/ ۱۴۳۴ھ

نفع زیادہ ہوتو آٹھ ہزار اور کم ہوتو سات ہزار پر شرکت کا حکم

سوال [۸۸۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: کہ میں نے اپنے ایک عزیز کو جو موٹر سائیکل کی خرید وفروخت کی تجارت کرتے ہیں دو لاکھ روپئے بطور شراکت کے دیدیا اور دیگر لوگوں نے بھی اسی طرح کم وبیش اپنی اپنی رقمیں ان کے پاس جمع کر دیں، جس کا منافع وہ ہمیں اس طرح دیتے ہیں کہ نفع زیادہ ہوا تو نو یا آٹھ ہزار روپئے اگر نفع کم ہوا تو ساتھ ہزار روپئے یا چھ ہزار ماہانہ کے حساب سے دیتے ہیں، فیصد کے حساب سے نہیں، تو کیا اس طرح فیصد متعین کئے بغیر کاروبار میں شرکت کرنا اور نفع لینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ظہیر اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: موٹر سائیکل کی خرید وفروخت کی تجارت کرنے والے شخص کے پاس بطور شرکت اس طرح پیسے جمع کرنا کہ اگر زیادہ نفع ہوا، تو ماہانہ نو یا آٹھ ہزار اور کم ہوا تو چھ یا سات ہزار روپئے دیں گے، تو یہ دونوں صورتیں ناجائز اور صریح سود ہے۔

يشترط أن يعلم كيف يقسم الربح بين الشركاء فإذا بقي مبهمًا ومجهولاً كانت الشركة فاسدةً؛ لأن الربح هو المعقود عليه في الشركة وجهالة المعقود عليه تفسد العقد. (شرح المجلہ، رستم، مکتبہ اتحاد دیوبند۲/۳/ ۷۱، رقم:۱۳۳۶)

وأن يكون الربح معلوم القدر، فإن كان مجهولاً تفسد الشركة، وأن يكون الربح جزءً شائعاً في الجملة لا معيناً، فإن عين عشرة، أومأةً، أو نحو ذلک كانت الشركة فاسدة. (هندية، كتاب الشركة، الباب الاول، الفصل الأول، زكرياجديد ۲/۱/ ۳۱۱، قديم۲/ ۳۰۲، بدائع الصنائع، كراچي۶/ ۵۹، زكريا۵/ ۷۷)

كل شرط يوجب جهالة في الربح، أ ويقطع الشركة فيه يفسدها. (شامي، كتاب المضاربة، زكريا ۸/ ۴۳۳-۴۳۴، كراچي ۵/ ۶۴۸، هندية، زكريا قديم ۴/ ۲۸۸، جديد ۴/ ۲۹۶، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية

بیروت ۳/ ٤٤٥، مصري قديم ۲/ ۳۲۳، تبيين الحقائق، زكريا ٤/ ۳٤٨، امداديه ملتان ٥/ ٥٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۴۷۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۳/۱۷ھ

مشترکہ کاروبار میں کسی شریک کے لئے الگ سے اجرت متعین کرنے کا حکم

سوال [۸۸۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید اور زبیر دوست ہیں، دونوں ایک ساتھ مل کر کاروبار کرنا چاہتے ہیں؛ چنانچہ ہر ایک نے پچاس پچاس ہزار روپیہ جمع کئے اور چونکہ زید مشغول آدمی ہے؛ اس لئے اس کو کاروبار چلانے کی فرصت نہیں ہے اور زبیر کو فرصت ہے۔ اب ان دونوں کے مشترکہ طور پر کاروبار کرنے کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) نفع ونقصان دونوں کو برابر ملے گا اور چونکہ زبیر کاروبار چلا رہے ہیں؛ اس لئے اس کے لئے اجرت متعین کی گئی۔

(۲) کاروبار چلانے کی وجہ سے زبیر نفع کا دو ثلث لے گا اور زید کو ایک ثلث دے گا اور اس دوسری صورت میں کیا نقصان کو بھی تین ثلث کیا جائے گا یا برابر آپس میں جو طے ہو؟

اب آپ فرمائیے کہ کیا مشترکہ طور پر کاروبار کی یہ دونوں صورتیں جائز ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو جواز کی متبادل شکل کیا ہے؟

المستفتی: محمد شاکر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید اور زبیر کے مشترکہ کاروبار کی دونوں صورتیں جائز ہیں؛ البتہ پہلی صورت میں کاروبار چلانے کی وجہ سے زید کے لئے اجرت متعین

کرنا جائز نہیں اور دوسری صورت میں کاروبار چلانے کی وجہ سے زبیر کے لئے نفع کا دوثلث اور زید کے لئے ایک ثلث متعین کرنا جائز ہے اور چونکہ رأس المال دونوں کا برابر ہے؛ اس لئے جب نقصان ہوگا، تو رأس المال میں کمی آئے گی ؛ اس لئے نقصان میں دونوں برابر کے شریک ہوجائیں گے، اگرچہ نفع میں برابری نہ ہوں، کسی کا ایک ثلث کسی کا دوثلث نفع میں تفاوت ہونے کی وجہ سے نقصان میں تفاوت نہ ہوگا۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۶/۳۹۵)

إذا شرطا الربح على قدر المالين متساوياً، أو متفاضلاً، فلا شك أنه يجوز ويكون الربح بينهما على الشرط سواء شرطا العمل عليهما، أو على أحدهما، والوضيعة على قدر المالين متساوياً، ومتفاضلاً؛ لأن الوضيعة اسم لجزء هالك من المال فيتقدر بقدر المال. (بدائع الصنائع، كتاب الشركة، زكريا ٥/ ٨٣، كراچي ٦/ ٦٢، هندية، زكريا قديم ٢/ ٣٢٠، جديد ٢/ ٣٢٦، شامي، زكريا ٦/ ٤٨٤، كراچي ٤/ ٣١٢، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٦/ ٦١)

ولا أجر لأحدهما على صاحبه عندنا...... إلا أنه استحق الربح بعمله فلا يستحق الأجر. (بدائع الصنائع، زكريا ٥/ ١٠٤، كراچي ٦/ ٧٧)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ رجب المرجب ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۷۶۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/ ۷/ ۱۴۲۳ھ

شریک کے لئے نفع کے علاوہ عمل کی اجرت کا حکم

سوال [۸۸۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہم چار بھائی ہیں اب تک شرکت میں تھے؛ لیکن اب ہمارا بٹوارہ ہوچکا ہے،

ہماری ایک دوکان ممبئی میں ہے، اس دوکان کی آمدنی چاروں بھائیوں میں مشترک ہے، تین بھائی گھر رہتے ہیں، ایک بھائی دوکان پر رہتا ہے، جو بھائی دوکان پر رہتا ہے، وہ نفع میں تو برابر شریک رہے گا ہی مگر اس کو تنخواہ بھی دیتے ہیں، ہمارے یہاں ایک عالم اس تنخواہ دینے کو جائز نہیں کہتے؛ جبکہ تینوں بھائی وطن میں کام بھی کرتے ہیں اور دوکان کے نفع میں بھی برابر کے شریک ہیں، اس سلسلے میں ہماری رہنمائی فرمائیں، کیا کسی شریک کے لئے مشترک عمل کی اجرت لینے کا جواز نہیں ہے؟

المستفتی: عبدالرشید قاسمی، سیڑھا، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: مذکورہ صورت میں عالم صاحب نے مسئلہ صحیح بتایا ہے کہ دوکان کے منافع میں بھی سب لوگ برابر شریک ہوں اور دوکان میں بیٹھنے والے کے لئے نفع میں شریک ہونے کے ساتھ اجرت مقرر کرنا جائز نہیں ہے؛ بلکہ اس کی شکل یہ ہوسکتی ہے کہ جو بھائی دوکان میں بیٹھ کر دوکان چلا رہا ہے، اس کے لئے نفع کی مقدار میں زیادتی کی جائے، عدم جواز کی وجہ یہ ہے کہ تنخواہ دینا ازقبیل اجارہ ہے اور شریکوں کا نفع میں شریک ہونا ازقبیل شرکت ہے اور شرکت اور اجارہ کو ایک عقد اور ایک کام میں جمع کرنا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ، جدید زکریا ۷/۱۸۳)

وعلى هذا يخرج ما إذا استاجر رجلاً على العمل في شيئ هو فيه شريكه نحو ما إذا كان بين اثنين طعام فاستاجر أحدهما صاحبه على أن يحمل نصيبه إلى مكان معلوم والطعام غير مقسوم، فحمل الطعام كله –إلى قوله– لا تجوز هذه الإجارة عند أصحابنا وإذا حمل لاأجرله. (بدائع الصنائع، كتاب الإجارة، باب الإستئجار على الطاعات، زكريا ٤/٤٣، كراچي ٤/١٩٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍صفر المظفر ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر:الف ۳۸/ ۹۴۸۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۲/۲۳ھ

ایک شریک کا دوسرے کو اجارہ پر رکھنا

سوال [۸۸۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ دو آدمی کسی کاروبار میں شریک ہوں اور دونوں کے سرمایہ کا تناسب بھی برابر ہو اور دونوں میں سے ایک کام بھی جانتا ہو، تو کیا کام کرنے والے شریک کے لئے اپنے نفع کے علاوہ کام کی الگ اجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟

خلاصہ یہ ہے کہ ایک شریک اپنے دوسرے شریک کو اجارہ پر لے سکتا ہے یا نہیں؟ احسن الفتاوی ۷/ ۳۲۸ میں کتاب الاجارۃ میں یہ مسئلہ حضرت مفتی صاحب نے لکھا ہے کہ شریک کو اجارہ پر لینا جائز ہے، باقی حضرات مفتیان کرام نے اس کو منع لکھا ہے، ان دونوں باتوں میں سے کون سی بات عوام کے سامنے لانی چاہئے؟

المستفتی: عبداللہ، گودھرا، گجرات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس مسئلہ میں دو معاملے الگ الگ ہیں ایک معاملہ یہ ہے کہ دونوں کا برابر پیسے دے کر کے کاروبار میں برابر کا شریک ہوجانا یہ معاملہ شرکت کا ہے دوسرا معاملہ دونوں میں سے ایک کو اجرت دے کر کے اجیر بنانا، تو شریعت میں ایک معاملہ کو دوسرے معاملہ میں داخل کر کے ایک ساتھ معاملہ کرنے کو ناجائز قرار دیا گیا ہے، جن حضرات نے اس معاملہ کو ناجائز کہا ہے، وہ اسی وجہ سے ہے کہ اس کے اندر صفقہ در صفقہ لازم آتا ہے، جیسا کہ امداد الفتاوی ۳/ ۵۱۷ میں ہے اور اگر اس طریقہ سے کیا جائے کہ اولاً دونوں کاروبار میں برابر پیسے دے کر کے شریک ہوجائیں اور دونوں نفع ونقصان میں برابر

کے شریک ہوجائیں، اس کے بعد دوسرا معاملہ الگ سے کیا جاوے کہ جو کام جانتا ہے، وہ الگ سے اجرت لے کر کام کرتا رہے گا، ایسی صورت میں دو معاملے الگ الگ ہوجائیں گے، کام کرنے کی وجہ سے اس کو اجرت ملا کرے گی اور اجرت کا تعلق نفع ونقصان سے نہیں ہے اور اس طرح کے معاملہ کو حضرت تھانویؒ نے امداد الفتاوی میں اسی وجہ سے جائز قرار دیا ہے، مگر صاحب احسن الفتاوی نے احسن الفتاوی ۳۲۸/۷ میں تعامل ناس کی وجہ سے دونوں صورتوں کو جائز قرار دیا ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۵۱۸/۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ر محرم الحرام ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۹۵۲/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۲/۱ھ

مسلم کا کافر ومشرک کے ساتھ مشترکہ تجارت کرنے کا حکم

سوال [۸۸۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کسی کافر ومشرک سے تجارت کرنا یا اس کی شرکت میں تجارت کرنا جائز ہے؟ جبکہ وہ سود کا لین دین کرتا ہے اور بیع وشراء کے اصول شرعیہ کو ملحوظ رکھتا ہے۔ بینوا وتوجروا۔

المستفتی: خورشید انور القاسمی، فیض آبادی (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کافر ومشرک اگر معاملۂ مضاربت میں رب المال ہے اور مسلمان مضارب تو بلاشبہ جائز ہے۔

ونحن أمرنا بأن نتركهم ومايعتقدون دل عليه قول عمرؓ ولُّوهم بيعهما وخذوا العشر من أثمانهما. (هداية، كتاب البيوع، مسائل منثورة، اشرفي ديوبند ۱۰۲/۳، البنايه، اشرفيه ۳۸۳/۸، الموسوعة الفقهية الكويتية ۱۰۲/۴۰)

اور اگر مسلمان رب المال ہے یا عقد شرکت ہے، تو جائز نہیں ہے۔

ولا بين المسلم والكافر وتحته في الفتح؛ لأن الذمي لايهتدي إلى

الجائز من العقود ولا يحترز من الرباء فيكون سبباً لوقوع المسلم في أكل الحرام. (فتح القدير، كتاب الشركة، زكريا٦/ ١٥٠، كوئٹه٥/ ٣٨٣، دارالفكر٦/ ١٥٩، الموسوعة الفقهية الكويتية٢/ ٣١٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ربیع الاول ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۹۴/۲۴)

مال حرام کے ساتھ شرکت کرنا

سوال [۸۸۷٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک کاروبار میں ہم دوشریک ہیں، شریک اول عبد الستار۔ شریک دوم عبد الخالق دونوں نے شرکت میں ایک گاڑی جیپ خریدی، عبد الستار اس گاڑی پر سود لینا چاہتا ہے، عبد الخالق سودی قرض لینے سے سختی سے منع کرتا ہے؛ لیکن پھر بھی وہ لے لیتے ہیں اور اسی سودی قرض سے کاروبار ہوتا ہے؛ لیکن میں عبد الخالق اس کا نفع نہیں لیتا ہوں، پھر وہ گاڑی فروخت کی گئی، تو اس میں نقصان ہوا، انہوں نے سودی روپیہ گاڑی میں بھی لگایا تھا، تو آپ بتائیں کہ میں قرض لینے سے منع کرتا رہا اور اس سے جو کاروبار ہوا، اس کا نفع بھی نہیں لیا۔

المستفتی: عبد الخالق ولد عبد الغفار، سرائے ترین سنبھل، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مال حرام کے ساتھ شرکت درست نہیں ہے اور جب عبد الخالق نے حرام مال کے ساتھ شرکت سے انکار کیا ہے اور پھر اس تجارت میں شریک ہوکر اس کا نفع نہیں لیا ہے؛ بلکہ سارا نفع عبد الستار نے لے لیا ہے، تو نقصان میں بھی عبد الخالق شریک نہ ہوگا۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/ ۵۱۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ ذی قعدہ ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/ ۲۸۷۲)

چند آدمیوں کا حلال وحرام مال سے تجارت میں شرکت کرنا

سوال [۸۸۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید، بکر، شریف، نعیم، ان چار اشخاص نے مشترکہ تجارت شروع کی کام کرنے کے لئے ملازمین رکھے اور چاروں شرکاء نے منافع مساوی تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا، زید کے پاس حلال کی کمائی کا روپیہ تھا، جو اس نے اسی تجارت میں لگایا؛ لیکن بقیہ جن شرکاء کی کمائی مشکوک یا ناجائز تھی روپیہ سب شرکاء نے تجارت میں لگایا، تحریر فرمایئے کہ زید کے لئے اس تجارت کا نفع جائز ہے یا حرام؟

المستفتی: محمد احمد خاں، فیض گنج، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر دوسرے شرکاء کی کمائی اکثر حلال یا صرف مشکوک ہے، تو معاملہ شرکت سے حاصل شدہ نفع زید کے لئے حلال ہے اور اگر دوسرے شرکاء کی تمام کمائی ناجائز وحرام ہے، تو زید کے لئے ان کے ساتھ معاملہ کرنا جائز نہیں ہے؛ البتہ اگر شرکت کا معاملہ کرلیا ہے اور نفع بھی حاصل کیا جارہا ہے، تو حاصل شدہ زید کے لئے حلال ہوگا۔ اور دوسرے شرکاء پر واجب ہے کہ حرام راس المال کی مقدار رقم، حرام مال کی نیت سے نکال کر صدقہ کردیں، ورنہ زید کے لئے مناسب یہی ہے کہ ان کے ساتھ معاملہ کو ختم کردے۔

ويخرج قدر الحرام بالميزان فيدفعه إلى صاحبه وقدر الحلال له وإن لم يعرفه وتعذرت معرفته تصدق به عنه. (فتاوى ابن تيميه ۳۰۸/۳)

وإذا كان في ماله حلال وحرام واختلط لم يحرم الحلال؛ بل له

أن يأخذ قدر الحلال كما لو كان المال لشريكين فاختلط مال أحدهما بمال آخر، فإنه يقسم بين الشريكين، وكذلك من اختلط من مال الحلال والحرام أخرج قدر الحرام والباقي حلال له. (فتاوى ابن تيميه ۲۹/۲۷۳)

إذا كان أكثر مال الرجل حرام، هل تحرم معاملته أو تكره على وجهين: وإن كان الغالب على ماله الحرام لم تحرم معاملته؛ ولكن قد قيل إنه من المشتبه الذي يستحب تركه. (فتاوى ابن تيمية۲۹/۲۷۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴؍۱۱۸۷)

کسی ایک شریک کا دوران شرکت انتقال ہوجائے تو کیا حکم ہے؟

سوال [۸۸۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ دوآدمی ایک دوکان کی ملکیت اور کاروبار میں تقریباً چالیس سال سے شریک ہیں، کچھ عرصہ کے بعد ایک شریک کا انتقال ہوگیا، اب اس کے وارثین حیات ہیں اور شریک کے انتقال کے بعد اس کے وارثین سے تجدید شرکت ابھی تک نہیں کی گئی ہے۔

اب زندہ شریک یہ چاہتا ہے کہ شرکت ختم کر کے دوسرے شریک کے وارثین کو دوکان کی ملکیت وکاروبار کا حصہ دیدیا جائے؛ لیکن دوسرے شریک کے وارثین کسی بات پر تیار نہیں ہیں، نہ آج تک کا حساب لینے کے لئے تیار ہیں اور نہ اپنا حصہ بیچنے کے لئے تیار ہیں اور نہ زندہ شریک کا حصہ خریدنے کے لئے تیار ہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ شریک کے وارثین کو زندہ شریک پر کامل ومکمل اعتماد ہے، وہ ہمارا ایک بھی پیسہ نہیں کھائے گا؛ لہٰذا شریعت مطہرہ میں مذکورہ شرکت بالکلیہ ختم کرنے کے لئے کیا صورت ہے؟ کیا قاضی یا شرعی پنچایت مذکورہ دوکان کی بازاری قیمت کر کے شریک کے وارثین کو ان کا مکمل حصہ دے

کرشرکت ختم کرسکتی ہے؟

المستفتی: مولانا نظام الدین، ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں شریک کے انتقال سے شرکت باطل ہوچکی؛ لہٰذا اب مرحوم کے ورثاء اس کے قائم مقام ہیں، اگر ان کی جانب سے مورث کے انتقال کے بعد تجدید شرکت نہیں ہوئی، تو آگے شرکت کا معاملہ شرعاً باقی نہیں رہا؛ اس لئے مرحوم کے وارثین اور دوسرے شریک پر ہر وقت شرعی حکم یہ جاری ہے کہ حساب وکتاب کر کے معاملہ ختم کرلیں۔ آئندہ اگر دوبارہ شرکت کا ارادہ ہو، تو اپنا اپنا حصہ دینے کا مطالبہ کرنا شرعاً درست ہے اور آپ کو یہ کام کرنے کا حق ہے اور مرحوم کے وارثین کو شرعاً مان لینا چاہئے۔

ولو مات أحد الشريكين انفسخت الشركة علم الشريك بموته أولم يعلم. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الشركة، الفصل الثالث، كوئٹه ٥/٦٣٨، زكريا ٧/٤٧٦، رقم:١٠٩٢٣، بدائع الصنائع، كراچي ٦/٧٨، زكريا ٥/١٠٥، الفقه الإسلامي وأدلته، هدیٰ انٹر نیشنل٤/٦٢١، دارالفكر ٥/٣٩١٦، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ٨/٣٦٥، رقم: ١٠٤٦٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۴۴۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۱/۱۹ھ

شرکت ختم کرنے کے بعد مطالبہ کئے گئے کا حکم

سوال [۸۸۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں ثاقب رضا ولد جناب علی رضا مرحوم ساکن کوچہ لالہ میاں رام پور

نے ایک زمین ۶ ۳ ؍لاکھ روپیہ کا سودا کیا، جس میں مبلغ پانچ لاکھ روپئے بیع نامہ دیدیا گیا، ثاقب رضا نے اپنے ساتھ دو پارٹنر فرحان اور عمر کو شامل کیا، زمین پلاٹنگ کرنے کی غرض سے خریدی گئی تھی، جس شخص سے زمین خریدی گئی اسے باقی رقم ۳۱؍لاکھ روپئے دینے کا ایک سال کا وعدہ کرلیا گیا ہے، جس میں ثاقب رضا نے اپنے بھائی حاجی بابو کو گواہ بنالیا اور تحریر لکھ لی گئی، تقریباً دو ماہ کے بعد ثاقب رضا اور دونوں ساتھیوں نے زمین کا نقشہ بنوا کر پلاٹ بک کرنا شروع کئے، ایک دن ثاقب رضا نے دوراندیشی کے طور پر کہ زمین کے مالک کو ۳۱؍ لاکھ روپئے دینا ہے، اگر ہمارے پاس رقم اکٹھا نہیں ہوئی۔ یہ سوچ کر اپنے بڑے بھائی حاجی بابو کو 10% کا شریک یہ کہہ کر بنالیا کہ اگر ہمیں رجسٹری کے وقت کچھ رقم کی ضرورت پڑی تو آپ ہی ہمیں اپنے پاس سے دیں گے، اس وقت وہ رضا مند ہوگئے، تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد ثاقب رضا کے پاس رقم اکٹھا نہیں ہو پائی؛ اس لئے وہ حاجی بابو کے پاس پہونچے جو 10% کے پارٹنر تھے اور انہوں نے ان سے رقم کا مطالبہ کیا، جسے دینے سے حاجی بابو نے انکار کردیا اور کہا کہ میرے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے، ثاقب رضا نے کہا میں نے بوقت ضرورت رقم لینے ہی کے لئے پارٹنر بنایا تھا؛ لہٰذا آج سے ہماری پارٹنر شپ (شراکت) ختم ہوگئی، اس پر دونوں بھائیوں میں تھوڑا سا غصہ بھی ہوا تھا، تقریباً آٹھ دس دن تک کوئی بات چیت بھی نہیں ہوئی تھی، وقت گذرتا گیا اور حالات دونوں بھائیوں میں پہلے سے بہتر ہوتے ہوگئے، ایک نجی معاملے کی وجہ سے دونوں بھائی اتنے قریب آگئے کہ ایک دوسرے پر جان نچھاور کرنے لگے، جو پلاٹنگ ثاقب رضا اور دونوں ساتھیوں نے کی تھی، اس کی میعاد اگست ۲۰۰۳ء کو ختم ہوگئی، اچانک ایک دن حاجی بابو ثاقب رضا کے پاس آئے اور انہوں نے اپنے 10% کا حساب مانگا، تو ثاقب رضا نے جواب دیا کہ حساب بن رہا ہے لمبا حساب ہے، دو تین دن کا وقت لگ سکتا ہے، دو دن کے بعد حاجی بابو کے سامنے حساب پیش کیا گیا، تب حاجی بابو نے 10% حساب سے اپنا حصہ مانگا، تو رضا نے کہا کہ لوگوں کی طرف پلاٹ کے

پیسے باقی ہیں، میں کچھ دنوں میں انتظام کردوں گا، یہ سن کر حاجی بابو بگڑ گئے اور اپنے بھائی ثاقب رضا کو برا بھلا کہنے لگے اور شر پسند عناصر کے ذریعہ قبضہ کرنے کی بات کہی، تو گھر آکر غصہ میں بیٹھے ثاقب رضا کو یاد آیا کہ میں نے تقریباً ڈھائی سال پہلے ہی حاجی بابو کا 10% کا حصہ ختم کردیا تھا، اب میں کس چیز کا حساب دے رہا ہوں یہ میری بہت بڑی بھول تھی پھر ثاقب رضا نے اپنے چھوٹے بھائی سالم رضا کو بھیجا اور یہ کہلوایا کہ میں نے آپ کو غلطی سے حساب دیدیا تھا، میری اور آپ کی پارٹنر شپ ڈھائی سال پہلے ہی ختم ہوگئی تھی، جو مجھے بالکل یاد نہیں تھی اس پر حاجی بابو نے صاف انکار کردیا کہ ثاقب رضا سے پارٹنر شپ ختم کرنے کے متعلق کوئی بات نہیں ہوئی تھی، ثاقب رضا جھوٹ بول رہا ہے ثاقب رضا نے ان سے حلف اٹھانے کی اور اٹھوانے کی بات کی تو حاجی بابو نے یہ کہا کہ ثاقب رضا نے ختم کرنے کو کہا ہوگا پر میں نے ہاں نہیں کہا تھا، حاجی بابو حلف اٹھانے اور اٹھوانے کو تیار نہیں ہوئے۔ آنجناب سے گذارش ہے کہ اس متعلق حاجی بابو سے ثاقب رضا کی پارٹنر شپ (شراکت داری) باقی رہی یا نہیں؟ ان کا دس فیصد کا حصہ بنتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: ثاقب رضا، ساکن کوچہ لالہ میاں، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس روز حاجی بابو نے رقم ادا کرنے سے انکار کر دیا اور ثاقب رضا نے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ آج سے ہماری پارٹنر شپ شراکت ختم ہوگئی، اسی روز سے شرعی طور پر حاجی بابو کی شراکت ختم ہوچکی۔

لأنه لما تعذر استيفاء الثمن من المشتري فات رضا البائع فيفسد بفسخه لفوات شرط البيع وهو التراضي. (فتح القدير، كتاب أدب القاضي، مسائل شتى من كتاب القضاء، زكريا ٣٠٩/٧، كوئٹه ٤١٨/٦، دارالفكر ٣٣٠/٧)

مستفتی نے دوسوالات ایک ہی وقت سے متعلق روانہ کئے دونوں کے جوابات لکھے

گئے اوپر نیچے دونوں درج ہیں کہ جب حاجی بابو نے متعینہ موقع پر رقم ادا کرنے سے انکار کردیا، تو حاجی بابو کو پارٹنری سے خارج کرنے کا ثاقب رضا کو پورا پورا حق ہے؛ لہٰذا جب موقع پر حاجی بابو نے رقم ادا کرنے سے انکار کردیا اور اس کے بعد ثاقب رضا نے صاف لفظوں میں یہ کہہ دیا کہ آج سے ہم آپ کو پارٹنری سے خارج کردیتے ہیں تو آپ کی شراکت کا دعویٰ کرنا حاجی بابو کے لئے درست نہیں ہے اور نہ ہی ثاقب رضا پر یہ لازم ہے کہ حاجی بابو کو اپنا شریک باقی رکھے۔

وإذا فسخ أحد الشريكين الشركة، ومال الشركة أمتعة صح الفسخ-إلى- قال الصدر الشهيد: والفتوى على الأول وهذا إذا فسخ بحضرة صاحبه. (الفتاوى التاتارخانية، زكريا ٧/٤٧٦، رقم: ١٠٩٢٣، كوئٹه ٥/٦٣٧)

فإذا فسخه أحدهما عند وجود شرط الفسخ ينفسخ. (بدائع الصنائع، زكريا ٥/١٠٥، كراچي٦/٧٨)

ولأنه لما تعذر استيفاء الثمن من المشتري فات رضا البائع فيفسد بفسخه لفوات شرط البيع وهو التراضي. (فتح القدير،دارالفكر ٧/٣٣٠، زكريا ٧/٣٠٩، كوئٹه ٦/٤١٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍صفر المظفر ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷؍۸۲۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۲/۱۹ھ

شرکت میں رقم کی چوری کا ضمان کس پر؟

سوال [۸۸۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید اور عمر دونوں مل کر آدھے منافع پر کاروبار کرتے ہیں، آدھی رقم زید کی اور

آدھی رقم عمر کی، منافع میں دونوں شریک ہوتے ہیں، زید نے عمر کو آدھی رقم دے کر کاروبار کرنے کے لئے بھیجا، عمر پیسے لے کر سودا خرید نے جارہا تھا، اتفاق ایسا ہوا کہ منافع کا سودا نہ مل سکا اور واپسی میں عمر کی جیب کٹ گئی؛ جبکہ یہ پیسے دونوں کے تھے۔

اب دریافت یہ کرنا ہے کہ یہ نقصان صرف عمر کا ہوگا یا اس نقصان میں دونوں شریک ہوں گے؛ جبکہ اگر سودا ملتا تو منافع میں دونوں شریک ہوتے؟

المستفتی: عبدالناصر، امام مدینہ مسجد، خان پور بلند شہر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سوال نامہ میں ذکر کردہ صورت میں عمر کے ہاتھ میں وہ مال امانت تھا، اس لئے ضائع ہونے کی وجہ سے اس پر کسی قسم کا ضمان لازم نہیں ہوگا اور اس نقصان کو دونوں شریک مل کر برداشت کریں گے۔

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جدهؓ، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ليس على المستعير غير المغل ضمان ولا على المستودع غير المغل ضمان. (سنن الدار قطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/٣٦، رقم: ٢٩٣٩)

وهي أمانة فلا تضمن بالهلاك. (شامي، كتاب الإيداع، زكريا ٨/٤٥٥، كراچي ٥/٦٦٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٨/ ٢٤٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱/ ذی قعدہ ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۱۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۴/ ۱۱/ ۱۴۲۷ھ

شریک کا مال مشترک کو خریدنا

سوال [۸۸۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید اپنی دوکان پر اپنے پیسہ سے کاروبار کرتا ہے، اور اس میں پچاس قسم کے

سامان کی خرید وفروخت کرتا ہے، زید کی برادری کی ایک تنظیم ہے، تنظیم کے ذمہ دار شخص نے زید سے کہا ایک دوسامان میں تنظیم کا روپیہ لگالو جو منافع ہوگا وہ آدھا آدھا ہوگا اسی طرح نقصان میں، زید نے منظور کرلیا اور معاہدہ ہوگیا اور زید نے معاہدہ کے مطابق عمل شروع کردیا، کچھ عرصہ میں منافع ہوتے ہوتے روپیہ کافی مقدار میں بڑھ گیا۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید نے تنظیم کے ذمہ دار کی نالج میں لاکر معاہدہ کے سامان کے علاوہ کچھ سامان خریدا اور گودام میں اسٹاک کردیا، زید جس طرح ضرورت کے مطابق اپنا سامان فروخت کرنے کے لئے بازار میں سے خرید کر لاتا ہے، اور فروخت کرتا ہے، اسی طرح تنظیم کا وہ مال جو اسٹاک میں ہے، کچھ نفع کے ساتھ اپنی ضرورت کے مطابق خرید سکتا ہے یا نہیں؟

(۲) خرید دستاویز پر کیا اور معاہدہ کے سامان کے علاوہ کچھ سامان موقع کا ملا، جس کو تنظیم کی رقم سے یہ سمجھ کر خرید لیا کہ تنظیم کا بڑھا ہوا فاضل پیسہ رکھا ہے اور یہ نیت کی کہ گھر جاکر معقول منافع دے کر ضرورت کے مطابق ہم خرید لیں گے، جس سے تنظیم کا فائدہ بھی ہوگا، تو ایسا کرنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: حافظ محمد خالد اویسی، اعظم نگر، بریلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: منافع دے کر اس طرح مالی شرکت کو خرید لینا جائز ہے؛ لیکن اگر نیت خراب ہونے کا مسئلہ ہے، تو ایسا نہ کیا جائے۔

وبقي شيئ آخر يقع كثيراً، وهو مالو اشترى أحدهما من شريكه لنفسه هل يصح أم لا لكونه اشترىٰ ما يملك بعضه، والذي يظهر لي أنه يصح؛ لأنه في الحقيقة اشترىٰ نصيب شريكه بالحصة من الثمن المسمىٰ، وان أوقع الشراء في الصورة على الكل. (شامي، كتاب الشركة، مطلب ادعي الشراء لنفسه، زكريا٦/٤٨٧، كراچي ٤/٣١٤)

جب تنظیم ہی کے پیسہ سے خریدا ہے، تو وہ سامان تنظیم کی شرکت کا ہوگیا ہے۔

فإن نقد الثمن من مال الشركة، فهو للشركة. (شامي، كتاب الشركة، مطلب ادعىٰ الشراء لنفسه، زكريا ٦/٤٨٧، كراچي ٤/٣١٤)

ہاں البتہ بعد میں اس کو نفع دے کر خرید لینا آپ کے لئے جائز ہے، جیسا کہ سوال نمبر ا/ کے جواب سے واضح ہوتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/محرم الحرام ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/۷/۵۱۲۷)

شریکین کے مال کی مقدار معلوم نہ ہو تو حصہ کا تناسب کیسے ہوگا؟

سوال [۸۸۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کی شادی آج سے ۱۳/سال قبل ہوئی، زید دبئی میں رہتا تھا؛ جبکہ اس کی اہلیہ سرکاری اسکول میں ٹیچر تھی، میاں بیوی دونوں نے مل کر ایک زمین خریدی اور اس نیت سے اپنی بیوی کے نام رجسٹری کرادی کہ میاں کو بینک سے قرض لینے میں سہولت رہے؛ چنانچہ بینک سے قرض لے کر مکان کی تعمیر ہوگئی اور میاں بیوی مل کر قرض کی ادائے گی کرتے رہے، یہاں تک کہ مئی ۲۰۰۹ء میں بیوی کا انتقال ہوگیا اور قرض کی کافی مقدار تقریباً ۵/لاکھ کی ادائے گی باقی ہے، جس کو شوہر ہی ادا کر رہا ہے۔

واضح رہے کہ یہ بھی متعین نہیں ہے کہ مکان میں میاں بیوی میں سے کس کا کتنا پیسہ لگا ہے؟ آپ سے سوال یہ ہے کہ مذکورہ بالا مکان میں از روئے شرع زید کتنے کا حقدار ہے؟ جبکہ زید کی اہلیہ کے انتقال کے وقت ان کے والد شوہر ایک لڑکی اور دو لڑکے موجود تھے۔

المستفتی: نیاز علی، سندیلہ، ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: سوال نامہ میں یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ بیوی کے نام سے مذکورہ زمین کیوں خریدی گئی، اس طرح مخصوص مصلحت کی بناء پر کسی ایک کے نام سے خریدنے سے شرعی طور پر اس کی ملکیت نہیں ہوتی ہے، جس کے نام سے خریدی گئی ہے اور ایسے عقد کو بیع تلجۂ کہا جاتا ہے۔

بيع التلجئة هي ما ألجئ إليه الإنسان بغير اختياره، وذلک أن يخاف الرجل السلطان، فيقول آخر أني بعت داري منک، وليس ببيع في الحقيقة، وإنما هو تلجئة. (شامي، كتاب البيوع، باب الصرف، مطلب في بيع التلجئة، زكريا ٧/٥٤٢، كراچي ٥/٢٧٣، هندية، زكريا قديم٣/٣٠٩، جديد ٣/١٩٦، معجم لغة الفقهاء، كراچي ١١٣، قواعد الفقه أشرفي ٢١٣، معجم المصطلحات والألفاظ الفقهيه، دارالفضيلة١/٤٠٥)

دونوں نے مشترک پیسے سے وہ زمین خریدی ہے اور اس پر تعمیر بھی دونوں کے مشترکہ پیسے سے کی گئی ہے اور کس کا کتنا پیسہ لگا ہے، اس کا کوئی حساب نہیں ہے، تو ایسی صورت میں دونوں کو برابر کا شریک سمجھا جائے گا اور دونوں نصف نصف کے مالک ہوں گے۔

وما حصلاه معا فلهما نصفين إن لم يعلم ما لكل، وقال الشامي تحته يعني ثم خلطاه وباعه، فيقسم الثمن على كيل أووزن ما لكل منهما، وإن لم يكن وزنيًا و لا كيلياً، قسم على قيمة ماكان لكل منهما، وإن لم يعرف مقدار ماكان لكل منهما، صدق كل واحد منهما إلى النصف (إلى قوله) لايصدق على الزيادة على النصف إلا ببينة؛ لأنه يدعى خلاف الظاهر.

(شامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحدة، واكتسبا ولايعلم التفاوت، فهو بينهما بالسوية، زكريا٦/٥٠٢، كراچي ٤/٣٢٥)

زوج امرأة وابنها اجتمعا في دار واحدة، وأخذ كل منهما يكتسب على حدة ويجمعان كسبهما و لا يعلم التفاوت ولا التساوي، ولا التمييز،

فأجاب بأنه بينهما سوية. (شامي، زكريا ٦/٢ ٥٠، كراچي ٤/٥ ٣٢)

بر تقدیر صحت سوال وعدم موانع ارث اور بعد ادائے حقوق ما تقدم علی الارث پورے مکان میں سے شوہر کا آدھا حصہ چھوڑ کر بقیہ آدھا جس کی مالک بیوی ہے وہ بیوی کے شرعی ورثاء کے درمیان درج ذیل نقشہ کے اعتبار سے تقسیم ہوگا۔

شوہر	باپ	لڑکا	لڑکا	لڑکی
۱۵/۳	۱۰/۲	۱۴	۱۴	۷

مرحومہ کا کل ترکہ ۶۰/ برابر سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا اتنا ملے گا، جو اس کے نیچے درج ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ محرم الحرام ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۸۶۱/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/۱/۱۴۳۱ھ

شرکت مفاوضہ میں تساوی کی شرط کی وضاحت

سوال [۸۸۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ قدوری ۱۱۳/ میں ہے کہ شرکت مفاوضہ میں مال کی برابری شرط ہے، یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے؛ کیونکہ مال کی برابری سے مراد اگر جمیع مال ہے، تو یہ محال ہے؛ کیونکہ ممکن ہے کہ وہ کچھ مال چھپادے۔

نیز قدوری کی اگلی عبارت **إلا طعام أهله وكسوتهم** کا مطلب صحیح نہ ہوگا؛ کیونکہ طعام وکسوہ خرید نے سے کمی زیادتی ہوجائے گی۔ نیز جب وہ مال ہے، تو پھر صرف اپنے اہل کے لئے طعام کسوہ خریدنا کیسے صحیح ہوگا؟

اور اگر یہ مراد ہے کہ جتنا مال شرکت کے لئے نکالا ہے، وہ برابر ہونا چاہئے، تو پھر

قدوری کی اگلی عبارت **فإن ورث أحدهما (إلی قوله) بطلت المفاوضة** کا مطلب صحیح نہ ہوگا؛ کیونکہ مال شرکت اس سے جداگانہ ہے۔ نیز **إلاطعام أهله وكسوتهم** کا مطلب اس صورت میں بھی صحیح نہ ہوگا؛ کیونکہ وہ مال دونوں کا ہے؛ لہٰذا صرف اپنے اہل کے لئے خریدنا صحیح نہ ہوگا، نیز اس صورت میں **إلاطعام أهله** کا یہ مطلب ہوجائے گا کہ طعام وکسوہ کے علاوہ جو بھی خریدے گا، اس میں شرکت ہوجائے گی، یہ بھی بعید ہے، امید ہے کہ شبہات دور کئے جائیں گے۔

المستفتی: نجیب الرحمٰن، خادم مدرسہ افضل العلوم، تاج گنج، آگرہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شرکت مفاوضہ میں ابتداءً وبقاءً مال، نفع، عمل اور دین میں برابری ضروری ہے، اگر کسی وقت بھی کسی چیز میں کمی وبیشی ہوجائے گی، تو فوراً ہی شرکت مفاوضہ باطل ہوکر شرکت عنان بن جائے گی؛ لہٰذا کوئی شخص اپنے جمیع مال کو نہیں نکالتا؛ بلکہ کچھ چھپا دیتا ہے، تو ابتداء ہی سے شرکت مفاوضہ کا انعقاد نہ ہوگا، اگرچہ نام کے اعتبار سے مفاوضہ ہو اور صاحب قدوری کا یہ جزئیہ **إلاطعام أهله** ماقبل کی عبارت **ومايشتريه كل واحد منهما يكون على الشركة** سے مستثنیٰ ہے اور یہ حکم ضرورت کی وجہ سے استحساناً دیا گیا ہے اور اس میں سے ایک دوسرے کے اخراجات لینے کی وجہ سے شرکت مفاوضہ باطل نہیں ہوتی؛ البتہ اتنی مقدار ان کے نفع سے وضع کی جائے گی اور احد الشریکین کے وارث ہونے سے شرکت مفاوضہ باطل ہوکر شرکت عنان بن جائیگی۔

وما اشتراه أحدهما من طعام لأهله، أو كسوة، أومالا بدله منه، فذلک جائز وهو له خاصة دون صاحبه (إلى قوله) وإن وقع المشترى للذي اشتراه خاصة؛ لأن هذا مما يجوز فيه الاشتراک، وكل واحد منهما كفيل عن الآخر ببدل مايجوز فيه الاشتراک إلا

أنهم، قالوا: إن الشريک يرجع علی شريکه بنصف ثمن ذلک؛ لأنه قضیٰ دينا عليه من ماله لا علی وجه التبرع؛ لأنه التزم ذلک فيرجع عليه. (بدائع الصنائع، کتاب الشرکة، فصل وأما حکم الشرکة، کراچي ٦/ ٧٤، زکريا حکم شرکة المفاوضة ٥/ ١٠٠، شامي، کتاب الشرکة، مطلب فيما يقع کثيراً في الفلاحين فما صورته شرکة مفاوضة، کراچي ٤/ ٣٠٧، زکريا ٦/ ٤٧٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۷۳۹/۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۵/۹ھ

مشروط شرکت کا حکم

سوال [۸۸۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید اور بکر کے درمیان شرکت کا معاملہ ہوا؛ جبکہ زید پہلے ہی سے ایک صاحب کے ساتھ کاروبار میں شریک رہا ہے، ڈھائی لاکھ روپیہ زید کے اور دوسرے کے ایک لاکھ زید نے بکر کو مزید ایک لاکھ روپیہ کے ساتھ شریک کرنا چاہا، اور بکر کو درج ذیل شرائط پر شریک کیا۔

(۱) شرکت ایک سال کے لئے ہے درمیان سال اگر بکر شرکت سے علیحدہ ہونا چاہے، تو اس کو نفع کے تناسب کا حساب لگا کر اپنا رأس المال اور نفع لے کر الگ ہونے کا اختیار ہوگا۔

(۲) فرم میں مذکورہ تین شریک ہوں گے۔

(۳) چوتھے کسی اور فرد کو شریک نہیں کیا جائے گا، اثنائے تجارت ادھار مال بھی فروخت کیا گیا اور زید کو ہر طرف سے رقم وصول نہیں ہوئی اور بکر کو چونکہ کسی بھی وقت شرط اول کے اعتبار سے علیحدگی کا اختیار ہے؛ اس لئے وقت علیحدگی بکر کو یکمشت رقم مع نفع ملنی چاہئے یا ادھار رقم کی وصولیابی تک انتظار کرنا ہوگا۔

زید نے ایک چوتھے آدمی کو۲۵ ؍ ہزار روپیہ پر شریک کرلیا، کیا یہ شرط ثالث کی خلاف ورزی تصور کی جائے گی؛ جبکہ زید کا کہنا ہے کہ ہم نے چوتھے کو فروغ تجارت کے لئے شریک کیا ہے، امید ہے کہ دلائل شرعیہ کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں گے۔

المستفتی: محمد مجتبیٰ، خادم ادارہ محمودیہ، قصبہ محمدی لکھیم پور کھیری (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ شرائط کے مطابق بکر کو اپنا نفع ورأس المال لے کر اپنی شرکت فسخ کرنے کا شرعی طور پر اختیار رہوگا۔

وأما صفة عقد الشركة ، فهي أنها عقد جائز غير لازم حتى ينفرد كل واحد منهما بالفسخ إلا أن من شرط جواز الفسخ أن يكون بحضرة صاحبه. (بدائع الصنائع، كتاب الشركة، فصل في صفة عقد الشركة، زكريا ٥/ ١٠٥، كراچي ٦/ ٧٧)

البتہ اگر زید نے بھی تجارت کا سلسلہ ختم کردیا ہے، تو بکر کو اپنی رقم کے تناسب سے ادھار رقم وصول ہونے تک انتظار کرنا ہوگا اور اگر تجارت کا سلسلہ باقی ہے اور زید کے پاس یکمشت ادا کرنے کے لئے نقد رقم تیار نہیں ہے، تو زید کے پاس رقم آنے تک کے لئے مہلت دینا بکر پر ضروری و لازم ہے اور اگر زید ٹال مٹول کررہا ہے، تو زید کو رعایت نہیں دی جائے گی، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے:

قال الله تعالىٰ: وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ. [البقرة: ٢٨٠]

عن أبي هريرةؓ، يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: مطل الغني ظلم. (صحيح البخاري، باب مطل الغني ظلم، النسخة الهندية، ١/ ٣٢٣، رقم: ٢٣٣٨، ف: ٢٤٠٠)

سوال نامہ کا آخری ٹکڑا واضح نہیں ہے کہ ۲۵ ؍ ہزار روپیہ پر چوتھے آدمی کو شریک کرنے کا فلسفہ کیا ہے، اس کی اصل حقیقت واضح الفاظ سے تحریر فرمائیں جب غور کیا

جا سکتا ہے۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ربیع الاول ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر:الف ۲۸/۳۰۸۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/۳/۱۴۱۳ھ

مشترکہ کاروبار میں ہر شریک اپنے حصہ کے بقدر تصرف کا مختار ہے

سوال [۸۸۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہماری پارٹنر شپ ہے،ٹرک یونین کے اندر جس میں ۳۳؍ پرسنٹ کے ہم مالک ہیں اور ۶۷؍ پرسنٹ کے وہ مالک ہیں،اس صورت میں فنڈ سے وہ لوگ سب لوگوں کو چندہ دیتے ہیں،کیا ہم بھی اس میں سے اپنی مسجد کی ضروریات کے لئے پیسہ لے سکتے ہیں یا نہیں؟ جواب با حوالہ تحریر فرمادیں۔

المستفتی: سلیمان،منڈی دھنورہ،مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب شرکت ۳۳؍فیصد اور ۶۷؍فیصد منافع کے حساب سے ہوتی ہے،تو ہر ایک پارٹنر کا ذاتی صرفہ اسی حساب سے منافع میں سے مجریٰ کرلیا جائے گا اور زکوۃ صدقہ اور چندہ وغیرہ بھی دینے والے کے ذاتی صرفہ میں ہی شمار ہوگا،جو شخص جتنا چندہ دیگا،اتنا اس کے منافع میں سے محسوب کر کے کم کرلیا جائے گا؛ لہٰذا اگر آپ کا پارٹنر آپ کے بغیر اجازت اپنی مرضی سے چندہ دیتا ہے،تو وہ اس کے منافع میں سے محسوب ہوگا اور اسی طرح اگر آپ بھی اپنے طور پر چندہ دیں گے،تو وہ بھی آپ کے منافع میں سے محسوب ہوگا۔

وليس لأهل الشريكين أن يؤدي زكوة مال الآخر إلا بإذنه؛ لأنه ليس من جنس التجارة. (هداية،كتاب الشركة، فصل ما ينبغي للشريكين، اشرفی ۶۳۵/۲، مختصر القدوري ۱۱۷، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۶/ ۶۸، هندية، زكريا

قدیم ۲/ ۳۳٦، جدید ۲/ ۳۳٦)

وإذا حال الحول على مال الشريكين المفاوضين، فأدىٰ كل واحد منهما زكاة جميع المال، فإن أدىٰ كل واحد منهما بغير أمر صاحبه ضمن لصاحبه؛ لأن واحدًا منهما بسبب الشركة صار نائباً عن صاحبه في التجارات دون إقامة العبادات. (المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ۲/ ۲۰۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍محرم الحرام ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲؍۴٦۰۱)

مال مشترک میں سے کسی ایک شریک کا اپنے حصہ کو فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۸۸٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ وارثین میں سے کسی ایک شخص نے مکمل جائیدا میں سے ۴۴؍گز اپنا حصہ مان کر رجسٹری کردی، تو کیا یہ درست ہوگا یا نہیں؟ مہربانی فرما کر اس کا جواب عنایت فرمائیں تا کہ یہ جھگڑا ختم ہو۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تقسیم میراث کے وقت جب اس شخص کا حصۂ وراثت ۲۰؍۲-۴۴ گز بنتا ہے، تو اس کے لئے اپنا حصہ ۲۰؍۲-۴۴ گز فروخت کر کے رجسٹری کردینا درست ہے۔

ويجوز بيع أحدهما نصيبه من شريكه في جميع الصور ومن غير شريكه بغير إذنه. (البحر الرائق، كتاب الشركة، زكريا٥/ ۲۸۰، كوئٹه ٥/ ٦٧، هداية، اشرفي ديوبند ۲/ ٦۲٤، البنايه اشرفيه ۷/ ۳۷۳، هندية، زكريا قديم ۲/ ۳۰۱، جديد ۲/ ۳۱۱، الدر مع الرد، كراچي ٤/ ۳۰۰، زكريا٦/ ٤٦٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍صفر المظفر ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴؍۱۱۰۸)

شرکت میں طے شدہ شرائط کی شرعی حیثیت

سوال [۸۸۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید اور بکر دونوں حضرات گائے کو ذبح کر کے اس کا گوشت فروخت کرتے ہیں، جس میں بکر کا چالیس فیصدی حصہ ہے اور زید کا ساٹھ فیصدی اور اس بات پر دونوں رضامند بھی ہیں؛ لیکن زید کا یہ کہنا ہے کہ ذبیحہ کی جو چربی ہے، وہ میں لوں گا اور زید چربی اس بناء پر لیتا ہے کہ اس کے گھر والے بھی اس میں لگے رہتے ہیں، بکر اس بات پر راضی بھی ہے کوئی اعتراض نہیں معلوم یہ کرنا ہے کہ یہ شرکت اس طرح کی درست ہے یا نہیں؟

اسی مسئلہ میں یہ بھی ہوتا ہے کہ پولیس پکڑ لیتی ہے، اب تھانہ میں ضمانت پر جو پیسہ خرچ ہوگا اس میں یہ دونوں حضرات شریک ہوں گے یا جو پکڑا گیا؟ مثلاً زید کے گھر کے تین افراد پکڑے گئے، اب تین میں ایک کو جیل بھیج دیا، دو لوگوں کو رشوت لے کر چھوڑ دیا، اب زید کا یہ کہنا ہے کہ جو چالیس فیصدی میں شریک تھا، اس میں بھی شریک ہوا اور جو ضمانت میں روپیہ خرچ ہوا ہے، بکر بھی چالیس فیصد دے گا۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ زید کا بکر سے چالیس فیصد لینا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد رضوان قاسمی، راوت پور کانٹ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جن افراد سے زید کام لیتا ہے، ان کو نامزد کر کے کام کرنے کے لئے زید اور بکر دونوں نے متفق ہو کر کمپنی میں ملازم کی حیثیت سے رکھ لیا تھا، تو ایسی صورت میں ضمانت میں بکر چالیس فیصدی اور زید ساٹھ فیصدی کی حیثیت سے شریک ہوں گے، اور اگر جن لوگوں کو پکڑا گیا ہے، ان کو کمپنی میں رکھنے میں زید نے بکر سے اتفاق

نہیں کیا ہے؛ بلکہ اپنے طور پر رکھا ہے، تو ایسی صورت میں بکر ضمانت میں شامل نہیں ہوگا؛ اس لئے کہ حدیث میں آیا ہے **المسلمون علی شروطهم** کہ مسلمان آپس کی شرائط کے پابند ہوں گے اور آپس کی شرائط کے مطابق مذکورہ بالا شرکت کا معاملہ بھی اپنی جگہ درست ہے۔

عن كثير بن عبد الله بن عمرو بن عوف المزني عن أبيه عن جده أن رسول الله صلى الله عليه قال: الصلح جائز بين المسلمين إلاصلحا حرم حلالاً، أو أحل حراما والمسلمون علي شروطهم إلا شرطا حرم حلالا، أوأحل حراما. (ترمذي، كتاب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/٢٥١، دارالسلام رقم: ١٣٥٢، المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التراث العربي ١٧/٢٢، رقم: ٣٠، سنن الدار قطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/٢٣، رقم: ٢٨٦٩، المستدرك للحاكم، الأحكام، مكتبه نزار مصطفىٰ الباز ٧/٢٣٠٢، قديد ٤/١٠١، رقم: ٧٠٥٩، صحيح البخاري، كتاب الإجارة، باب أجر السمسرة تعليقا، النسخة الهندية، ١/٣٠٣، سنن أبي داؤد، كتاب القضاء، باب في الصلح، النسخة الهندية ٢/٥٠٦، دارالسلام رقم: ٣٥٩٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍شوال المکرّم ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷۸/۸۵۶۷)

دوسرے کی زمین میں مکان بنانا اور کرایہ وصول کرنا

سوال [۸۸۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خالد نے اپنے روپیہ سے عبداللہ کی زمین پر عمارت بنائی بعدہ خالد وعبداللہ میں یہ طے ہوا کہ جب تک عبداللہ تعمیر میں صرف کیا ہوا روپیہ واپس نہ کر دے، تب تک خالد

اس عمارت کا کرایہ لیتا رہے گا اور جس وقت عبداللہ روپیہ ادا کردے گا، اس کے بعد خالد بھی کرایہ لینا بند کردے گا، تو سوال یہ ہے کہ عبداللہ وخالد کا یہ عمل از روئے شریعت کیا حکم رکھتا ہے؟

المستفتی: محمد غفران، گونڈوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ معاملہ اس وقت جائز ہوسکتا ہے؛ جبکہ خالد جو کرایہ وصول کررہا ہے، وہ تعمیر میں خرچ کئے ہوئے پیسوں میں سے مجریٰ ہوتا جائے اور اس درمیان میں جو کچھ پیسہ عمارت کی قیمت میں سے بطور کرایہ وصولیابی میں باقی ہے، وہ پیسہ عبد اللہ خالد کو ادا کردے اور خالد دستبردار ہوجائے تو جائز ہے؟ یا ایسا طے کرلیا جائے کہ جو کرایہ کا پیسہ آرہا ہے، اس کا کچھ حصہ عبداللہ کو دیتا رہے، بقیہ حصہ خالد اپنے پاس رکھے؛ لیکن اس طرح طے کرلینا ضروری ہے کہ معاملہ نصف نصف کا ہے یا ایک کیلئے ایک تہائی اور دوسرے کے لئے دو تہائی یا ایک کے لئے ایک چوتھائی دوسرے کے لئے تین چوتھائی کرایہ ہوگا، تو ایسی صورت میں ایسا کرنا درست ہے؛ اس لئے کہ یہ دونوں کی مذکورہ عمارت میں مشترکہ شرکت ہے جو شرعاً جائز ہے اور سوال نامہ میں ایسا نہیں ہے؛ بلکہ اس عمارت کا منافع صرف خالد حاصل کررہا ہے، اور عبداللہ اس سے محروم ہے۔

طاحونة مشتركة بين اثنين أنفق أحدهما في عمارتها لم يكن متطوعًا بخلاف ما إذا أنفق على عبد مشترك أو أدى خراج كرم مشترك حيث يكون متطوعًا كذا في السراجية، دار بين اثنين، غاب أحدهما، وآجرها الآخر وأخذ الأجرة، فللغالب أن يشاركه في الأجر، كذا في القنية. (فتاى عالمگيري، كتاب الشركة، الباب السادس في المتفرقات، زكريا جديد ٢/ ٣٤٠، ٣٤١، قديم ٢/ ٣٤٢، مجمع الأنهر مصري قديم ١/ ٧٣٠، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٥٦٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍صفر المظفر ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۸۷۷/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۲/۴ھ

مشترکہ راستہ میں تعمیر کرنے کا حکم

سوال [۸۸۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سردار حسین محمدی بیگم، صاحبزادی کے وارثان کا ایک مشترکہ راستہ ہے، جس کی چوڑائی تقریباً تین فٹ ہے، اس راستہ میں سردار حسین کے وارثان نے بیت الخلاء نل وغیرہ بائیس سال پہلے ہی بنالیا تھا، اب اس راستہ کے اوپر لینٹر ڈال کر تعمیر کرنا چاہتے ہیں، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ اس مشترکہ راستہ پر بلا رضامندی دیگر شرکاء تعمیر کرنا لینٹر ڈالنا یا راستہ میں غسل خانہ، بیت الخلاء بنانا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ شرعی حکم تحریر فرمادیں۔

المستفتی: محمد حنیف، نئی بستی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مشترکہ راستہ میں سب ہی شرکاء کا حق متعلق ہے، بائیس سال قبل جو بیت الخلاء اور غسل خانہ بنایا گیا ہے، اس پر اب تک اعتراض نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ دیگر شرکاء کی طرف سے اس کی اجازت تھی، ہاں البتہ اب جو اوپر لینٹر ڈال کر تعمیر کرنا چاہتے ہیں، اور اس پر دیگر شرکاء کو اشکال ہے، تو شرعاً اور قانوناً سردار حسین کے ورثاء کے لئے دیگر شرکاء کی اجازت کے بغیر اس پر لینٹر ڈالنا جائز نہیں۔

عن ابن عباسؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا ضرر ولا ضرار. (سنن ابن ماجه، كتاب الأحكام، باب من بني في حقه ما يضر بجاره۔ (النسخة الهندية ۱۶۹/۱۷، دارالسلام رقم: ۲۳۴۱، مؤطا إمام مالك، كتاب القضاء، القضاء في المرفق، النسخة الهندية ۳۱۱)

وفي الطريق الخاص لا يسعه بلا إذن الشركاء، وإن لم يضر لأنه

مملوک لهم؛ ولهذا وجبت الشفعة لهم على كل حال، فلا يجوز التصرف أضربهم، أو لم يضر إلا بإذنهم بخلاف العام فإنه ليس لأحد فيه ملك. (مجمع الأنهر، كتاب الديات، باب ما يحدث في الطريق، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٣٦٠، ٣٦١، مصري قديم ٢/ ٦٥١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍صفر المظفر ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶؍ ۷۹۱۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۲/۷ھ

مشترک راستہ میں دروازہ لگانے کا حکم

سوال [۸۸۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ دو بھائیوں کے درمیان مشترکہ راستہ ہے، اس میں اپنے شریک کی اجازت کے بغیر آگے کو دروازہ لگانا کیسا ہے؟

المستفتی: عبدالقدیر، محلّہ چھبو کا نالہ، نورانی، مسجد مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مشترک راستہ میں اپنی متعین حد کے آگے دروازہ لگا کر قابض ہو جانا جائز نہیں ہے، جو بھائی ایسی حرکت کر رہا ہے۔ شرعی طور پر اسے ظالم شمار کیا جائے گا۔

لايجوز لأحد أن يتصرف في ملك الغير بغير إذنه. (قواعد الفقه، اشرفي ١١٠، رقم: ٢٦٩، شرح المجلة رستم مكتبه اتحاد، ١/ ٦١، رقم المادة ٩٦)

عن ابن عباسؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا ضرر ولا ضرار. (سنن ابن ماجه، كتاب الأحكام، باب من بني في حقه ما يضر بجاره، النسخة الهندية ١٦٩/١٧، دارالسلام رقم: ١٢٣٤١، المعجم الكبير للطبراني، دارإحياء التراث العربي ٢/ ٨٦، رقم: ١٣٨٧)

عن أبي حرة الرقاشي، عن عمه، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا يحل مال رجل مسلم لأخيه، إلا ما أعطاه بطيب نفسه. (السنن الكبري للبيهقي، باب أهل البغي إذا فائا......دار الفكر ١٢/ ٣٥٢، رقم: ١٧٢٢٤)

لايجوز لأحد أن يتصرف في ملك الغير بغير إذنه. (قواعد الفقه، اشرفي ١١٠، رقم: ٢٦٩، شرح المجلة رستم مكتبه اتحاد، ١/ ٦١، رقم المادة: ٩٦)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ شعبان المعظم ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۸۰۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۸/۱۶ھ

ایک مکان میں کم وبیش حصہ داروں کا مشترکہ مکان فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۸۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عبدالغفار کے ۳/ لڑکے تھے، عبدالقیوم، محمد ایوب، عبدالغفور، عبدالغفار کے پاس دو مکان تھے، جن کی قیمت ۴۵/ ہزار روپیہ تھی ہر بھائی کے حصہ میں ۱۵/ ہزار روپیہ آتا تھا، محمد ایوب نے اپنا حصہ بیچ دیا، مشترک خریداری میں ۹/ ہزار روپیہ عبدالغفور نے دیا، ۶/ ہزار روپیہ عبدالقیوم نے دیا، اس صورت میں عبدالقیوم آدھی جائداد پر قابض ہوسکتا ہے یا نہیں؟ ۱۵۰۰/ عبدالقیوم سے لینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالغفور، نجو پورہ، ٹانڈہ بادلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسی صورت میں عبدالقیوم کے لئے آدھی جائداد پر قابض ہونا شرعاً جائز نہیں ہے؛ بلکہ آدھی میں سے ڈیڑھ ہزار روپیہ کی جائداد عبدالغفور کو دیدینا لازم ہوگا، عبدالغفور کی رضامندی سے عبدالغفور سے وہ مقدار خرید کر کے قابض

ہوجائے، تو جائز ہوسکتا ہے اس کے بغیر عبدالقیوم سخت ترین وعید کا مستحق ہوگا۔

وَلَا تَأْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَا اِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوْا فَرِيْقًا مِنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. [البقره:۱۸۸]

عن أبي حميد الساعدي رضؓ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا يحل لامرئ، أن يأخذ مال أخيه بغير حقه، وذلك لما حرم الله مال المسلم على المسلم. (مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٢٥، رقم:٢٤٠٠٣)

عن أبي حرة الرقاشي، عن عمه، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا يحل مال لامريء مسلم إلا بطيب نفس منه. (شعب الإيمان للبيهقي، باب في قبض اليد عن الأموال المحرمة، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٣٨٧، رقم: ٥٤٩٢، مسند أحمد أبي يعلى الموصلي، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٩١، رقم:١٥٦٧، مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٧٢، رقم: ٢٠٩٧١، سنن الدار قطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٢٢، رقم: ٢٨٦٢، ٢٨٦٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ ؍ ربیع الثانی ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۱۸۹/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/۴/۱۴۱۱ھ

شرکت بالاموال کی ایک صورت

سوال [۸۸۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کوئی شخص کسی تاجر یا کسی دوکاندار کو اپنی کچھ رقم اس شرط پر دیدے کہ اس سے جو آمدنی فائدہ ہوگا، اس کا نصف یا اس سے کم یا زیادہ رقم دینے والے کو دیتا رہے گا، رقم دینے والے کو اس کے سودے کا علم نہیں کہ کون سی چیز کتنے فائدہ یا نقصان سے بکتی ہے؟ صرف مہینہ میں جو کچھ دوکاندار رقم دیتا ہے، اس کو فائدہ سمجھ کر لے

لیتا ہے، تو یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد یامین، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئلہ مذکورہ میں جو صورت بیان کی ہے، وہ شرکت بالاموال کی صورت ہے، اس قسم کی شرکت منافع سے نصف وربع وثلث کی تعیین کے ساتھ جائز ہے۔

عن الثوري في رجل رفع إليه ما لا مضاربة بالثلث، أو بالربع، أوماتراضيا، قال: هو ماله يشترط فيه ماشاء. (مصنف عبد الرزاق، البيوع، باب اشتراط المقارض، المجلس العلمي ۸/۲۵۷، رقم: ۱۵۱۳۲)

والمضاربة عقد يقع على الشركة بمال من أحد الجانبين (إلى قوله) ومن شرطها أن يكون الربح بينهما مشاعاً لا يستحق أحدهما دراهم مسماة من الربح. (هداية، كتاب المضاربة، اشرفي ۳/۲۵۷، ۲۵۸، بدائع الصنائع، زكريا۵/۱۱۹، كراچي ۶/۸۶، مختصر القدروي ۱۱۸) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍رجب المرجب ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۸۶۰/۳۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۷/۱۴۱۹ھ

(۲) باب شرکۃ العنان

جدید تعمیر عمارت کے دو طریقوں کا حکم

سوال [۸۸۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ یہاں سے قریبی شہروں مثلاً بنگلور اور مدراس وغیرہ میں عمارتوں کی تعمیر کے کئی نئے طریقے چل پڑے ہیں، ان میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ کسی کے پاس خالی جگہ ہو، وہ اس پر بلڈنگ تعمیر کرنے کی سہولت نہ رکھتا ہو، تو اس کے پاس کوئی بلڈر آ کر کہتا ہے کہ ''تم مجھے اپنی جگہ دیدو میں اس پر ایک بلڈنگ تعمیر کروں گا، مثلاً آٹھ منزلہ عمارت کھڑی کروں گا، پھر چار منزل تمہارے حوالہ کردوں گا، تم اس کے مالک ومختار ہو گے، چاہو تو انہیں فروخت کردو یا کرایہ پر دو یا دوسروں کے حوالہ کردو اور میں چار منزلوں کا مالک ومختار ہوں گا'' رہی زمین تو وہ مالک اور بلڈر دونوں کے درمیان ایک معین مدت مثلاً ننانوے یا سو سال تک کے لئے مشترک کرلی جاتی ہے، اس پر اگریمنٹ بھی کردیا جاتا ہے۔

تعمیر عمارت کا ایک دوسرا طریقہ یہ بھی ہے کہ بلڈر آ کر جگہ کے مالک سے کہتا ہے کہ تم مجھے اپنی جگہ اور ایک یا دو لاکھ روپئے ایڈوانس دیدو، میں عمارت تعمیر کر کے تمہارے حوالہ کردوں گا، تم بعد میں مجھے اتنے لاکھ روپئے اتنی مدت تک ماہانہ ایک لاکھ یا پچاس ہزار روپئے کی قسطوں سے ادا کردو۔

اب سوال یہ ہے کہ اس طرح قسطوار ادائے گی سے وہ بلڈر اس تعمیر کردہ بلڈنگ کی مالیت سے بہت زیادہ وصول کرلیتا ہے، مثلاً دس لاکھ روپئے وہ خرچ کرتا ہے، تو چودہ پندرہ لاکھ روپیہ وصول کرلیتا ہے، کیا یہ صورت جائز ہے؟

المستفتی: رشید احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) اس میں دومعاملہ الگ الگ ہیں۔

(۱) زمین کے بارے میں ۹۹؍سال کا اجارہ ہے، اگر جانبین ۹۹؍سال کے پٹے پر راضی ہیں اور اس کا سرکاری ایگریمنٹ بھی ہوجائے، تو آپس کی تراضی سے اس لمبی مدت معینہ تک اجارہ کی گنجائش ہے، اور جانبین میں سے کسی ایک کی موت کے بعد یا دونوں کی موت کے بعد ان کے ورثاء ایگریمنٹ اور معاہدہ پر راضی ہوجائیں، تو یہ مدت طویلہ کے لئے اجارہ داری جائز اور درست ہے جیسا کہ ہندیہ کی اس عبارت سے واضح ہوتا ہے۔

رجل آجر أرض وقف مدة طويلة مائة سنة من رجل، وأقر أنهما باشرا لواحد من المسلمين، وأن حاكما حكم بصحة ذلك، فالإجارة صحيحة إذا حكم حاكم بصحتها مع طول المدة، ولا تنفسخ بموت أحدهما بعد إقرارهما، بأن العقد وقع لواحد غير معين، ويكون المال حلالا له، هكذا ذكر وهو الصحيح، وهذا ممالا خلاف فيه. (هندية، كتاب الأجارة، الباب الثلاثون في الإجارة الطويلة المرسومة ببخاري، زكريا جديد ٤/ ٥٦١، قديم ٤/ ٥١٥)

دوسرا معاملہ اس میں شرکت کا ہے کہ آٹھ منزلہ عمارت بنا کر چار منزل صاحبِ زمین کو زمین کے عوض دیدی گئی اور چار منزل بلڈر نے بنا کر دینے کے عوض میں اپنے لئے لے لیا، یہ شرکت عنان کے دائرہ میں داخل ہوکر جائز اور درست ہے۔

عنان تصح مع التساوي في المال دون الربح وعكسه. وفي البحر تحته: وهو التفاضل في المال و التساوي في الربح، قوله: (وببعض المال) يعني يصح أن يعقدها كل واحدمنهما ببعض ماله دون البعض؛ لأن المساواة في المال ليس بشرط إذ اللفظ لا يقتضيه (قوله: وبخلاف الجنس) بأن يكون من أحدهما دنانير و من الآخر دارهم لعدم اشتراط الخلط عندنا فجازت في متحد الجنس و مختلفه. (البحر الرائق، كتاب الشركة، زكريا ٥/ ٢٩١تا ٢٩٣،

کـوئـٹـه ٥/٧٤ ١تـا١٧٦، وهـكـذا في بدائع الصنائع، زكريا٥/٨٣، كراچي ٦/٦٢، هندية، زكريا قديم ٢/٣٢٠، جديد ٢/٣٢٦، شامي، زكريا٦/٤٨٤، كراچي٤/٣١٢)

سوال میں عمارت تعمیر کرنے کا جو معاملہ بیان کیا گیا ہے، وہ بلاشبہ جائز ہے، یہ ٹھیکیداری کی ایک شکل ہے کہ یہاں بلڈر ٹھیکیدار بن چکا ہے، مالک زمین کو مکان بنا کر تیار کر کے پیش کردے گا، جس میں مثلاً بلڈر کے دس لاکھ روپئے خرچ ہوئے، مگر بلڈر مالک زمین کو مکان بنا کر پیش کرنے کے بعد اب جو پیشگی مختصر پیسہ لیا جا چکا ہے، اس کو بھی لے کر ۵ر سال یا ۱۰ر سال میں قسط وار ۱۵ر لاکھ روپئے وصول کرے گا اور شروع ہی میں معاملہ صاف کرلیا گیا ہے ۱۵ر لاکھ روپیہ میں تعمیر کر کے پیش کردیا جائے گا اور دو لاکھ روپئے پیشگی لے لیا جائے گا باقی تیرہ لاکھ روپئے ۵ر سال میں قسطوار ادا کرتے رہیں گے، اس طرح بلڈر کا نفع بھی اپنی جگہ ہوتا ہے اور مالک زمین کو قسطوار پیسہ دے کر عمارت حاصل کرنے میں بھی آسانی ہوتی ہے، ایسا کرنا جائز اور درست ہے، یہ ادھار معاملہ کے مرادف ہے۔

البيع مع تأجيل الثمن، وتقسيطه صحيح، ويلزم أن تكون المدة معلومة في البيع بالتاجيل والتقسيط. (شرح المجله، رستم، مكتبه اتحاد ١/١٢٤-١٢٥، رقم المادة ٢٤٥-٢٤٦، الفقه الإسلامي وأدلته، هدیٰ انٹر نیشنل ديوبند ٤/٢٤٢، دارالفكر ٥/٣٤٦١)

لأن للأجل شبهاً بالمبيع ألا ترى أنه يزاد في الثمن لأجل الأجل. (هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، اشرفي ٣/٧٤، شامي، زكريا ٧/٣٦٢، كراچي ٥/١٤٢، البحرالرائق، كوئٹه ٦/١١٥، زكريا ٦/١٩١، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ١٠/١٨٧، رقم:١٢٧٣٨، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت٣/١١٢، مصري قديم ٢/٧٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ر جمادی الثانیہ ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸ر ۹۶۴۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۶/۲۵ھ

شرکت عنان میں نقصان کو سرمایہ سے کم یا زیادہ فیصدی متعین کرنے کا حکم

سوال [۸۸۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید اور عمر ایک کاربارو میں شرکت کرتے ہیں، باین طور کہ زید ایک لاکھ روپیہ لگائے گا اور عمر پچاس ہزار، مگر زید کام نہیں کرے گا، کام صرف عمر کرے گا، نفع نقصان برابر برابر تقسیم ہوگا، تو نفع نقصان میں برابر کیا جائے گا یا ایک لاکھ والے کو نفع نقصان میں ڈبل اور پچاس ہزار والے کو نصف، کام عمر کرے گا جس کی رقم نصف ہے، زید نہیں کریگا، جس کی رقم ڈبل ہے، یہ معاملہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: حاجی اقبال احمد، سکریٹری علی مسجد شیر کوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سوال نامہ میں شرکت کی جو شکل بیان کی گئی ہے، وہ شرکت فی العنان کے دائرہ میں آتی ہے؛ لیکن اس کی صحت کے لئے شرط یہ ہے کہ جس شریک نے جتنا مال لگایا ہوگا نقصان کی شکل میں اس کو اسی کے تناسب سے نقصان برداشت کرنا پڑے گا؛ لہٰذا یہ شرط لگانا کہ نفع ونقصان میں دونوں برابر کے شریک ہوں گے، یہ شرط باطل ہے اور نقصان میں دونوں اپنی حصہ داری کے اعتبار سے شریک ہوں گے۔

اشتركا فجاء أحدهما بألف والآخر بألفين على أن الربح والوضيعة نصفان فالعقد جائز، والشرط في حق الوضيعة باطل، فإن عملا وربحا، فالربح على ما شرطا، وإن خسرا فالخسران على قدر رأس في مالهما.

(عالمگيري، كتاب الشركة، الباب الثالث في شركة العنان، الفصل الثاني، زكريا جديد ٣٢٦/٢، قديم ٣٢٠/٢، بدائع الصنائع، زكريا ٥ ٨٣، كراچي ٦٢/٦، شامي، زكريا ٤٨٤/٦، كراچي ٣١٢/٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٦١/٢٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۲۷۳/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۴/۲۱ھ

چندلوگوں کامل کر مشترکہ کاروبار کرنے کا حکم

سوال [۸۸۹۵]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زیداور بکر وغیرہ مشترکہ سرمایہ سے کاروبار کے لئے کمپنی قائم کرتے ہیں، جس میں بکر وغیرہ زید سے کہتے ہیں کہ سرمایہ ہم لوگ لگائیں گےاور کام پوری ذمہ داری کے ساتھ آپ کریں اور ہم لوگ بھی ساتھ لگے رہیں گے،اور منافع میں آپ کومثلاً پچیس فیصد دیں گے،جس وقت کمپنی کا آغاز ہوا تھا،اس وقت اس طرح کی کوئی بات سامنے نہیں آئی کہ سرمایہ سودی لون لے کرلگایا جائے گا،اورانٹریسٹ وضع کرنے کے بعد جو پرافٹ ہوگا،اس میں سے آپ یعنی زیدکو پچیس پرسینٹ منافع کا شیئر دیا جائے گا،کام شروع کئے ہوئے کئی سال ہوگئے،اس دوران کبھی بھی اس کا تذکرہ نہیں آیا،تحریری صورت میں جوشرائط رکھی گئی تھیں، ان میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ جونفع ہوگا،اس میں سے استعمال شدہ مشینوں کے عوض دس فیصد وضع کرنے کے بعد آپس میں منافع تقسیم ہوگا،زیدان مذکورہ بالاشرائط کی پابندی کرتے ہوئے کام کرتا رہا۔اب جبکہ حساب کر کے منافع کی تقسیم کی نوبت آئی تو بکر وغیرہ کا کہنا یہ ہے کہ سودی قرض کا انٹریسٹ نکالنے کے بعد جورقم بچے گی،اس میں سے مجوزہ پچیس فیصد جوآپ کے لئے طے ہوا تھا، وہ آپ کو دیا جائے گا اور یہ بات اگرچہ تحریر میں نہیں تھی،مگر ہمارے دل میں شروع ہی سے تھی۔واضح رہے کہ بکر وغیرہ نے کاروبار میں جورقم لگائی تھی، اس میں شیئر ہولڈروں کی بھی شرکت ہے،ان کے اپنے شیئرز (حصوں) کے اعتبار سے اب بکر وغیرہ مذکورہ بینک کے اعتبار سے انٹریسٹ لے رہا ہے؛ حالانکہ زید سوداور سودی کاروبار سے اجتناب ہی نہیں نفرت بھی کرتا ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا بکر وغیرہ کو زید سے (اسے لاعلم رکھتے ہوئے) اس کے منافع کی کل رقم میں سے انٹریسٹ کی رقم کاٹنے کا شرعاً حق حاصل ہے؟شریعت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

نوٹ: یہ مضاربت کی وہ شکل نہیں جس میں مال ایک کا ہوتا ہے اور محنت دوسرے کی؛ بلکہ اس مسئلہ میں محنت دونوں فریقوں کی برابر ہے، اگر چہ مال صرف ایک فریق کا ہے، مذکورہ بالا صورت مسئلہ کے بارے میں پہلے جو فتوی دیا جا چکا ہے، تو کیا نوٹ والی عبارت کے بڑھانے کے باوجود فتوی وہی رہے گا یا بدل جائے گا، جس کی فوٹو کاپی لفافے میں موجود ہے۔

المستفتی: مولانا وکیل احمد، کانپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفیق: سوال نامہ میں دو معاملہ کا ذکر ہے، ایک معاملہ رب المال کا بینک سے سود پر قرض لینا، دوسرا معاملہ رب المال کا زید کو نفع میں شریک کر کے مضارب بنانا، دونوں کا حکم اور دونوں کی ذمہ داری بھی بالکل الگ الگ ہوگی کہ بینک کے قرض کی ادائے گی اور اس پر سود کی ادائیگی کا ذمہ دار صرف رب المال ہوگا، زید کا اس سے کوئی تعلق نہ ہوگا اور معاملہ مضاربت میں اگر نفع ہوا تو اس میں دونوں طے شدہ شرائط کے مطابق شریک ہوں گے اور اگر نقصان ہوا تو نفع کے نقصان میں دونوں شریک ہوں گے اور رأس المال کے نقصان میں صرف رب المال ہی کا نقصان ہوگا، مضارب یعنی زید پر نہ ہوگا؛ لہٰذا مذکورہ صورت میں تجارتی نفع میں سے دونوں کو طے شدہ شرائط کے مطابق اپنا اپنا حصہ ملے گا اور بینک کے سود ادا کرنے کی ذمہ داری صرف رب المال پر ہونی چاہئے، وہ اپنے نفع میں ادا کرلے یا کسی اور طریقے سے اسی کے ذمہ رہے گا۔ نیز سوال نامہ میں اس کی صراحت بھی ہے کہ معاملہ طے ہوتے وقت بینک کے قرض اور لون کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا ہے؛ اس لئے شرعاً زید کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

عن عمرو بن عوف المزني: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: المسلمون على شروطهم إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراماً.

(المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ١٧/ ٢٢، رقم: ٣٠، سنن الترمذي

كتاب الأحكام، باب ذكر عن رسول الله صلى الله عليه و سلم في الصلح بين الناس، النسخة الهندية، ۲۵۱/۱۷، دارالسلام رقم: ۱۳۵۲، صحيح البخاري، النسخة الهندية ۳۰۳/۱، سنن أبي داؤد، كتاب القضاء، باب في الصلح، النسخة الهندية ۵۰۶/۲، دارالسلام رقم: ۳۵۹٤)

نیز اگر یہ مضاربت نہیں ہے، تو شرکت عنان تو لازمی ہے، اور شرکت عنان کا بھی شرعاً یہی حکم ہے، جو اوپر لکھا گیا ہے، نیز نوٹ والی عبارت کو بڑھانے کے باوجود حکم ایک ہی رہے گا۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍شوال المکرّم ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف؍)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۱۰/۱۴۲۰ھ

فتویٰ ۳۴؍ ۶۳۲۷ سے متعلق دوسرا فتویٰ

سوال [۸۸۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عبدالکریم اپنے دو بھائیوں کے ساتھ اپنی کمپنی میں براس کے اسکرپٹ کا کام کرتا تھا، اس کمپنی نے پبلک سے لیا گیا روپیہ لگایا ہے، عبد الکریم اور اس کے بھائی سودی قرض لے کر کام کرتے ہیں یہ بات سب کو معلوم ہے۔

عبدالکریم کے چھوٹے بھائی عبد الرحیم نے ۱۹۹۵ء میں یہ مشورہ دیا کہ براس کی کٹنگ کے ساتھ براس کے برتن بھی بنائیں جائیں، اس کام کے لئے اس نے اپنے دوست عبد الجبار کے بارے میں بتایا کہ اسے اس کام کا تجربہ ہے، اس کام میں ہم عبدالجبار کو شامل کرلیں، اس کام میں جو عبدالجبار کی پارٹنرشپ ہوگی یہ کاغذ پر نہ ہوکر زبانی ہوگی اور اس کا حصہ کیش کی شکل میں دے دیا جائے گا۔ پارٹنرشب کی مندرجہ ذیل شرائط طے ہوئیں۔

(۱) عبدالجبار کوئی پیسہ نہیں لگائیں گے۔

(۲) عبدالجبار کا کمپنی کے asseis میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

(۳) ۲۵ رفیصد کی جگہ پر Depention 10% ہر سال نفع میں کٹے گا۔

(۴) خالص نفع (Net Profit)اور خالص نقصان (Net Loss) میں عبدالجبار کا ۳۰ رفیصد اور عبدالکریم اوران کے بھائیوں کا ۷۰ رفیصد ہوگا۔ یہ کام ۱۹۹۵ء میں شروع ہوا، عبدالکریم نے پہلے ۲۵ رلاکھ پھر پچاس لاکھ اور پھر ایک کروڑ روپیہ اپنا لگایا، اس کے بعد جیسے جیسے ضرورت پڑی عبدالکریم بینک سے سودی قرض لے کر کام میں پیسہ لگاتا رہا، اس وقت کام میں بارہ کروڑ روپیہ لگے ہوئے ہیں۔ عبدالکریم اور عبدالجبار کے درمیان بہت ذمہ داری ہے اور پردوں میں رہ کر بہت مختصر بات چیت ہوئی ہے، دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے بہت عزت ہے۔

اس دوران کام کی ہر سال اکاؤنٹنگ (Accounting) کے طریقۂ کار کے حساب سے Baanse Sheeet نیز Profit-Loss بنتا رہا۔ یاد رہے کہ ابھی ساری دنیا میں Balanse Sheet بنانے کا جو طریقۂ کار لاگو ہے، اس کے حساب سے سارے خرچ کاٹ کر Net Profit یا Net Loss نکالا جاتا ہے، یہ خرچے مزدوری کی تنخواہ، مال کی قیمت، بجلی کا بل، حکومت کو دیئے گئے ٹیکس وغیرہ اور بینک کا سود وغیرہ وغیرہ ہیں۔

عبدالجبار Balanse Sheet اور Profit-Loss برابر دیکھتا رہا، عبدالجبار اپنی خواہش کے حساب سے عبدالرحیم سے روپیہ لیتا رہا؛ چونکہ عبدالکریم اور اس کے بھائی اور عبدالجبار میں زبردست Under Standing ہے؛ اس لئے اس بات کی ضرورت نہیں سمجھی کہ کہیں عبدالجبار کو کم یا زیادہ ادائیگی تو نہیں ہورہی ہے؟ عبدالکریم نے ہمیشہ یہ سوچا کہ اگر زیادہ Payment ہوجائے گا، تو آنے والے سالوں میں عبدالجبار کے نفع میں وضع ہوجائے گا، اگر کم Payment ہوجائے گا، تو آنے والے سالوں میں جب عبدالجبار کو ضرورت ہوگی تو اسے دے دیا جائے گا۔

۱۹۹۶ءیا۱۹۹۷ءمیں عبدالجبار نے کہا کہ حساب کرلیں کہ کہیں اس کی زکوۃ تو کم نہیں نکل رہی ہے؟ جب عبدالکریم نے عبدالجبار کو بتایا کہ ۳۰ ؍فیصد کے حساب سے اس کا اتنا بنتا ہے، اتنا وہ کاٹ رہے ہیں اور سود کی تو کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

عبدالکریم نے عبدالجبار کو سمجھایا کہ یہ بات عبدالجبار کو اچھی طرح معلوم ہے کہ عبدالکریم بینک سے سودی قرض لے کر کام کرتا ہے اور اس کام میں بینک کا سودی قرض لگا ہے اور یہ بھی بتایا کہ سود ایک خرچ اور ایسے Net Profit میں گھٹایا جاتا ہے، جس طرح سے دیگر خرچ گھٹائے جاتے ہیں، جیسے کہ کام کرنے والوں کی تنخواہ، اور ہیڈ (Over Head) بجلی کا بل مال خام کی قیمت اور حکومت کے دیئے گئے ٹیکس وغیرہ۔

عبدالجبار نے کہا کہ وہ اس بات کو نہیں مانتا، اس کا کہنا ہے کہ سود کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی اور وہ ہمیشہ یہ سمجھتا رہا کہ روپیہ عبدالکریم اور اس کے بھائی لگا رہے ہیں اور روپیہ کہاں سے آرہا ہے یہ اسے معلوم نہیں۔

عبدالکریم نے اسے سمجھایا کہ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ عبدالکریم اور اس کے بھائی بینک سے سودی قرض لے کر کام کرتے ہیں اور یہ بات عبدالجبار کو بھی معلوم ہے۔ بار بار یہ بات عبدالجبار کے سامنے ہوئی کہ بینک کا سودی قرض بڑھتا جارہا ہے اور ہم سب کو اسے اتارنے کی کوشش کرنی چاہئے اور یہ بات بھی عبدالجبار کو معلوم ہے کہ آج کی تاریخ میں جو بارہ کروڑ روپیہ اس کام میں لگا ہے، یہ روپیہ لگانے کا عبدالکریم اور اس کے بھائیوں کی ذاتی حیثیت نہیں ہے، یہ روپیہ بینک سے لے کر ہی لگایا گیا ہے۔ عبدالجبار یہ ساری باتیں ماننے سے انکار کرتا ہے، آپ بتائے کہ عبدالکریم صحیح ہے یا عبدالجبار؟

نوٹ: یہ مضاربت کی وہ شکل نہیں ہے، جس میں مال ایک کا ہوتا ہے اور محنت دوسرے کی؛ بلکہ اس مسئلہ میں محنت دونوں فریقوں کی برابر ہے، اگرچہ مال صرف ایک فریق کا ہے۔

المستفتی: محمد خالد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ معاملہ اگر کلی طور پر مضاربت کا نہیں ہے، تو شرکت عنان کا معاملہ ضرور ہے، اور قاعدہ یہ ہے کہ جب معاملہ مضاربت میں رب المال بھی محنت میں شریک ہوجاتا ہے، تو معاملہ خودبخود شرکت عنان میں داخل ہوجاتا ہے، رب المال کے محنت میں شریک ہوجانے کی وجہ سے معاملہ کا نام تو شرکت عنان میں بدل جاتا ہے، مگر حکم بعینہ مضاربت کا باقی رہتا ہے اور شرکت عنان کو شرکت بالاعمال بھی کہا جاتا ہے، اور جس کا مال ہوتا ہے، وہ خود اپنے مال کا اس اعتبار سے ذمہ دار ہوتا ہے کہ اس نے کہیں سے قرض میں لایا ہو یا سودی قرض لایا ہو، یا اپنی جائداد فروخت کرکے لایا ہو، یا اپنی دوکان یا گھر فروخت کر کے لایا ہو، وہ اپنے شریک یا مضارب پر اس مال کی ذمہ داری عائد نہیں کرسکتا ہے، وہ ازخود اس کا ذمہ دار ہوگا اور شریک اور مضارب کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔

نیز اس معاملہ کو معاملۂ مضاربت پر باقی رکھنا بھی شرعاً درست ہے، ایسی صورت میں یہ مضاربت بشرط الاستعانت رب المال کہلائے گی۔ بہر حال اس معاملہ کو چاہے کسی بھی زاویہ سے دیکھا جائے، سودی قرض کی ادائے گی کا ذمہ دار رب المال ہی ہوگا۔ زید کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

وأما شركة العنان فلا يراعي لها شرائط المفاوضة (إلى قوله) والأصل أن الربح إنما يستحق عندنا، امابالمال وإما بالعمل، وإما بالضمان، أما ثبوت الإستحقاق بالمال فظاهر؛ لأن الربح نماء رأس المال يكون لمالكه؛ ولهٰذا استحق رب المال الربح في المضاربة، وأما بالعمل فلأن المضارب يستحق الربح بالعمل. فكذا الشريك (إلى قوله) و سواء عملا جميعاً، أو عمل أحدهما دون الآخر، فالربح بينهما يكون على الشرط؛ لأن استحقاق الربح في الشركة بالأعمال بشرط العمل لا بوجود

العمل بدليل أن المضارب إذا استعان برب المال استحق الربح، وإن لم يوجد منه شرط العمل لوجود شرط العمل عليه. (بدائع الصنائع، كتاب الشركة، زكريا ٥/٨٢، كراچي ٦/٦٢-٦٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/شوال المکرّم ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/۶۳۲۷)

شرکت عنان میں کسی ایک شریک کے الگ سے تجارت کرنے کا حکم

سوال [۸۸۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص (زید) نے اسکریپ (پرانا لوہا، المونیم، پیتل وغیرہ) کا کام شروع کرنے کا ارادہ کیا اور اپنے ایک دوست بکر سے تذکرہ کیا کہ چلو آدھی رقم تم دو اور آدھی میں دیتا ہوں، شرکت میں کام کریں گے، بکر نے زید کو صراحت سے کہا کہ میں کام تو کرلوں گا؛ لیکن آپ یہ جان لیں کہ اس طرح کاروبار کرنے میں یہ ضروری ہے کہ دونوں فریق نفع ونقصان میں حسب حصہ شریک ہونگے، زید نے کہا کہ مجھ کو معلوم ہے۔

اب کام زید کی نگرانی میں شروع ہوا اور زید کی جگہ پر زید کے عاملین نے کام کرنا شروع کیا، طے یہ پایا کہ اس جگہ اور عاملین کی تنخواہ اور مکمل خرچ کاروبار سے نکالنے کے بعد نفع ونقصان ہر مہینہ کے آخر میں تقسیم ہوجایا کریگا، بکر نے زید پر مکمل بھروسہ واعتماد کرکے زید کو رقم دیدی، کام شروع ہوگیا۔ اب کچھ عرصہ بعد ایک نئی صورت یہ پیش آئی کہ زید نے اپنا ایک اورنجی کام شروع کردیا اور کچھ بڑی گاڑیاں خریدیں، جسے دیکھ کر بعض لوگوں نے بکر سے کہا کہ یہ کام زید نے تمہارے پیسوں سے شروع کیا ہے، مقصد لوگوں کا یہ تھا کہ بکر اپنی رقم زید سے واپس لے لے؛ لیکن بکر نے ایسا نہیں کیا، پھر کچھ دنوں کے بعد جب بکر نے اپنی رقم

واپس نہیں لی تو کہا گیا کہ یہ کاروبار سود ہے، یہ سن کر بکر زید کے پاس گیا اور اس کو لوگوں کی باتوں سے آگاہ کیا، اس نے کہا کہ ایسی بات نہیں ہے، میں نے اپنا کاروبار اپنے پیسہ سے شروع کیا ہے، اگر آپ کو شک ہے تو آپ آج ہی اپنی رقم =/50000 ریال واپس لے لیں، بکر نے کہا کہ مجھ کو آپ (زید) پر اعتماد ہے، اور مزید بکر نے یہ بھی کہا کہ آپ کو میں اختیار دیتا ہوں کہ میرا پیسہ نفع ونقصان دونوں میں شرکت کی شرط پر کسی بھی کام میں لگائیں، آپ کو اختیار ہے، بس شرط یہ ہے کہ ہم دونوں نفع ونقصان دونوں چیزوں میں برابر شریک ہوں گے ورنہ یہ سود ہوگا، یہ گفتگو کئی لوگوں کے بیچ میں ہوئی، زید نے بکر کو اطمینان دلایا کہ میں خود بھی ایسا کام کرنا نہیں پسند کرتا، جو سود کے زمرے میں آئے اور بکر کو مطمئن کر دیا اور بکر نے زید کے ساتھ زید کو کامل اختیار اپنی رقم کا دے کر کاروبار جاری رکھا۔

اب کرم فرماؤں کا کہنا ہے کہ یہ کاروبار مذکورہ شکل میں سودی ہے اور بکر کو نفع کی شکل میں جو روپیہ ملتا ہے، وہ سود ہے یاد رہے کہ زید بکر کو کسی ماہ ایک ہزار، کسی ماہ ۹رسو، کسی ماہ سات سو، کسی ماہ آٹھ سو ریال نفع دیتا ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ اس سے بھی کم دیا؛ لیکن نفع ونقصان ابھی تک اس نے نہیں دکھایا۔

آپ وضاحت فرمائیں کہ کیا یہ سود ہے؟

(۲) نیز یہ بھی واضح فرمادیں کہ فریقین میں سے اگر ایک کا صرف پیسہ ہو اور دوسرے کا پیسہ اور محنت دونوں چیزیں ہوں، تو کاروبار کی جائز شکل کیا ہے؟

المستفتی: محمد عادل رشید

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ کو بار بار پڑھ کر غور کیا گیا، یہ کاروبار شرکت عنان کے دائرے میں داخل ہے اور فریقین کے درمیان یہ جو طے ہوا ہے کہ جو کچھ نفع ونقصان ہوگا، اس میں دونوں فریق برابر کے شریک ہوں گے یہ جائز ودرست ہے؛ لہٰذا جو

کچھ بھی نفع ہوگا، وہ نفع دونوں کے درمیان برابر تقسیم ہوگا اور زید اپنے الگ پیسے سے گاڑیاں خرید کر جو چلا رہا ہے، وہ اس کی الگ تجارت ہے، شرکت عنان میں شریکین میں سے کسی کے لئے الگ سے تجارت کرنا بھی جائز ہے اور زید جو رأس المال اور نفع کا حساب لگائے بغیر بکر کو کبھی ایک ہزار، کبھی پانچ سو، کبھی سات سو ریال دیتا رہتا ہے، یہ طریقہ شرعی طور پر غلط ہے؛ بلکہ حساب فہمی کے ساتھ جو کچھ نفع ہوا ہے، اس کا آدھا حصہ بکر کو دیا کرے، ہاں البتہ اب تک جو دیا گیا ہے اس کے صحیح ہونے کے لئے ایسا کرنا لازم ہے کہ رأس المال کے اوپر اب تک جتنا نفع ہوا ہے، اس کا حساب جوڑ کر اب تک جو بکر کو دیا گیا ہے اور جو زید نے خود لیا ہے، اس کو نفع کے حصے میں جوڑ کر اس کو مجریٰ کر لیا جائے اور لئے ہوئے پیسے کو علی الحساب شمار کیا جائے، تو اس طریقہ سے معاملہ درست ہو جائے گا اور آئندہ جب بھی جانبین اس کاروبار سے پیسہ لیں، تو اس کا حساب اہتمام سے رکھ لیا کریں اور زید کا یہ کہنا بھی درست نہیں تھا کہ اگر آپ کو اطمینان نہیں ہے، تو اپنا پیسہ پچاس ہزار ریال واپس لے لیجئے؛ بلکہ واپسی کے وقت رأس المال اور نفع دونوں کا حساب کرنا لازم اور ضروری ہے اور دونوں کا حساب کر کے جانبین کے پچاس، پچاس ہزار کل ایک لاکھ کے اوپر جو کچھ نفع ہوا ہے، اس نفع کا نصف حصہ بھی پچاس ہزار ریال کی واپسی کے ساتھ پیش کرنا لازمی ہوگا؛ لہٰذا یہ کاروبار اس طریقہ سے شرکت عنان کے دائرے میں داخل ہو کر جائز اور درست ہے۔

لو كان المال منهما في شركة العنان والعمل على أحدهما، إن شرطا الربح على قدر رؤوس أموالهما جاز، و يكون ربحه له ووضيعته عليه.

(هندية، كتاب الشركة، الباب الثالث في شركة العنان، الفصل الثاني، زكريا جديد ٢/ ٣٢٦، قديم ٢/ ٣٢٠)

أن تكون حصة كل شريک من الربح محددة بجزء شائع منه معلوم النسبة إلي جملته. (الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٦/ ٤٥)

(۲) اگر فریقین میں سے ایک کا صرف پیسہ ہو اور دوسرے کا پیسہ اور محنت دونوں ہوں، تو یہ شرکت عنان بن جاتا ہے اور یہ شرعاً جائز ہے اور اس کی شکل یہ ہوگی کہ نفع جو بھی طے ہو، اس پر عمل ہوگا چاہے نصفا نصفی ہو، چاہے ثلثان اور ثلث ہو۔

لو كان المال منهما في شركة العنان والعمل علي أحدهما، إن شرطا الربح على قدر رؤوس أموالهما جاز، ويكون ربحه له ووضيعته عليه. (هندية، كتاب الشركة، الباب الثالث في شركة العنان، الفصل الثاني، زكريا جديد ٢/٣٢٦، قديم ٢/٣٢٠)

إذا شرطا الربح على قدر المالين متساويا، أو متفاضلاً، فلا شك أنه يجوز ويكون الربح بينهما علي الشرط، سواء شرطا العمل عليهما، أو على أحدهما، والوضيعة على قدر المالين متساوياً، ومتفاضلاً. (بدائع الصنائع، كتاب الشركة، زكريا ٥/٨٣، كراچي ٦/٦٢، وهكذا في الشامي، زكريا ٦/٤٨٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٦/٦١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

كتبه: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ رصفر المظفر ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۴۸۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۲/۲۷ھ

تجارتی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۸۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ تجارتی کمپنیوں کے شیئرز (حصص) خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ یہ کمپنیاں سرکاری بھی ہوتی ہیں اور غیر سرکاری بھی یہ نفع ونقصان کی بنیاد پر کام کرتی ہیں، اگر کمپنی کو نفع ہوتا ہے، تو وہ خریدار کو نفع دیتی ہے، اگر نقصان ہوتا ہے، تو وہ خریدار کی رقم میں سے نقصان کی رقم کاٹ لیتی ہے۔

المستفتی: محمد احمد خاں، فیض گنج مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگرکوئی براہ راست کمپنی سے شیئرز کا فارم خرید کرشرکت کر لیتا ہے، اورحصوں کے تناسب سے نفع ونقصان اور رأس المال سب میں شریک رہتا ہے،تو شرعاً یہ معاملہ شرکت عنان کے دائرہ میں داخل ہوکر جائز اورحلال ہوگا۔ (مستفاد: ایضاح النوادر۱۰۲)

لو كان المال منهما في شركة العنان والعمل على أحدهما، إن شرطا الربح على قدر رؤوس أموالهما جاز، و يكون ربحه له ووضيعته عليه.

(هندية، كتاب الشركة، الباب الثالث في شركة العنان، الفصل الثاني، زكريا جديد ٢/٣٢٦، قديم ٢/٣٢٠، شامي، مطلب في شركة العنان، زكريا ٦/٤٨٤، كراچي ٤/٣١٢، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٦/ ٦١، بدائع الصنائع، زكريا ٥/٨٣، كراچي ٦/٦٢)

لیکن اس وقت شیئرز کی جتنی کمپنیاں ہندوستان میں ہیں،ان میں شرعی تجارت کے بارے میں تردد ہے؛اس لئے تحقیق کر لینا بہتر ہے۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶رمحرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴ر۶۴۳۴)

باپ اور بیٹے کے مشترکہ کاروبار کا تحقیقی جائزہ

سوال نامہ میں دس سوالات کے ذریعہ سے مشترکہ کاروبار سے متعلق وضاحت طلب کی گئی ہے؛ اس لئے ہر ایک سوال کا جواب الگ الگ سرخیوں کے ذریعہ سے دیا گیا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

بڑے بیٹے کا باپ کے کاروبار کو آگے بڑھانے کی وجہ سے اپنی ملکیت کا دعویٰ کرنا

سوال [ا]: باپ اپنے سرمایہ سے کوئی کاروبار شروع کرتا ہے، پھر مثلاً: بڑا بیٹا اس کے کام میں شریک ہوجاتا ہے، بیٹے کا اپنا کوئی سرمایہ نہیں لگتا، اس کا کھانا پینا، رہنا سہنا باپ ہی کے ساتھ ہوتا ہے، بڑے بیٹے اور گھر کے دیگر افراد کے سارے اخراجات اسی کاروبار سے پورے کئے جاتے ہیں، بعد میں س بڑا بیٹا پورا کاروبار سنبھالتا ہے، باپ کمزوری اور بیماری کی وجہ سے عملی طور پر کاروبار میں وقت نہیں دے پاتا، اسی حالت میں باپ کا انتقال ہوجاتا ہے، اس کے انتقال کے بعد بڑا بیٹا کہتا ہے کہ باپ کی زندگی میں چوں کہ میں نے ہی پورا کاروبار سنبھالا ہے؛ اس لئے اس کاروبار اور اس سے حاصل شدہ آمدنی کا میں ہی تنہا مالک ہوں، دیگر بھائیوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے، ایسی صورت حال میں شریعت کیا کہتی ہے؟ کیا بڑا بیٹا ہی کاروبار کا مالک ہوگا یا بڑے بیٹے کے کاروبار میں اپنا سرمایہ لگانے اور باپ کے عیال میں رہنے کی وجہ سے اس کو باپ کا معاون قرار دیا جائے گا اور باپ کے انتقال کے بعد سارا کاروبار اور اس سے حاصل شدہ آمدنی ورثاء کے مابین حسب حصص شرعیہ تقسیم کی جائے گی۔ واضح رہے کہ اس سلسلے میں علامہ شامیؒ کی یہ عبارت بہت اہمیت کی حامل ہے:

الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة، ولم يكن لهما شيء فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله؛ لكونه معينا له.

لیکن اس عبارت میں اس بات کی تنقیح کی ضرورت ہے کہ بیٹے کا باپ کے عیال میں رہنے کا کیا مطلب ہے؟ کیا عیال کا مفہوم ہر علاقہ کے طرز معیشت کو سامنے رکھ کر متعین کیا جائے گا یا اس کا کوئی ایک ہی خاص مفہوم ہے، جس کی روشنی میں سارے علاقوں والے کے لئے ایک ہی حکم ہوگا؟

المستفتی: ادارۃ المباحث الفقہیۃ جمعیۃ علماء ہند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: باپ کے چلتے ہوئے کاروبار میں بیٹے کا شریک ہوکر محنت کرنے کی وجہ سے اور اس کی محنت سے کاروبار میں اضافہ ہوجانے کی وجہ سے اس کاروبار میں بیٹا الگ سے کسی چیز کا مالک نہیں ہوگا؛ بلکہ سب چیزوں کا مالک باپ ہی ہوگا اور بیٹا باپ کا صرف معاون ثابت ہوگا اور کاروبار کی حصہ داری میں باپ کا شریک نہیں ہوگا؛ اس لئے کہ باپ کی زندگی میں اس کے کاروبار میں سے کوئی چیز بیٹے کو الگ سے نہیں ملتی ہے، اسی طرح باپ کی موت کے بعد بھی الگ سے کوئی خصوصی حصہ نہیں ملے گا؛ بلکہ باپ کے تمام وارثین اس کاروبار میں اپنے اپنے شرعی حصے کے حق دار بنیں گے۔ اور اس کا یہ دعویٰ کرنا کہ میری محنت سے کاروبار بڑھا ہے؛ اس لئے میں ہی حق دار ہوں شرعاً قابل اعتبار نہیں ہے۔

اس کو "شرح المجلہ" میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

إذا عمل رجل في صنعة هو وابنه الذي في عياله فجميع الكسب لذلك الرجل، وولده يعد معينا له، فيه قيدان احترازيان كما تشعر عبارة المتن، الأول: أن يكون الابن في عيال الأب، الثاني: أن يعملا معا في صنعة واحدة إذ لو كان لكل منهما صنعة يعمل فيها وحده فربحه له. (شرح المجلة لسليم رستم باز ۲/ ۷٤۱، رقم المادة: ۱۳۹۸)

اوراس کو ’’ہندیہ‘‘ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

أب وابن يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما مال فالكسب كله للأب إذا كان الابن في عيال الأب لكونه معينا له. (الهندية زكريا، قديم ۲/ ۳۲۹، جديد مطول زكريا ۲/ ۳۳۲)

اورعلامہ شامیؒ نے مزید وضاحت کے ساتھ لکھا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيء فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله؛ لكونه معينا له. (شامي زكريا ٦/ ٥٠٢، كراچی ٤/ ٣٢٥)

سوال نامہ میں باپ کے عیال میں ہونے کا مطلب اور حقیقت بھی معلوم کی گئی ہے؛ اس لئے اس کو بھی واضح کیا جاتا ہے، ملاحظہ فرمایئے۔

عیال اور فیملی کی حقیقت

باپ بیٹے کے مشترکہ کاروبار سے متعلق بہت سارے گوشے اور شکلیں سامنے آتی ہیں، بعض شکلیں وہ ہوتی ہیں جن میں باپ کے عیال اور فیملی میں رہ کر کے بیٹا باپ کے ساتھ کام کرتا ہے اور بعض شکلیں وہ ہوتی ہیں جن میں باپ کے عیال میں اور فیملی میں رہ کر بیٹا اپنا کاروبار الگ سے کرتا ہے؛ اس لئے اس موضوع سے متعلق سوالات کے جوابات پیش کرنے سے پہلے عیال اور فیملی کا مطلب کیا ہے؟ اس کو واضح کردینا ضروری ہے۔

حضرات فقہاء نے ’’فی عیالہ‘‘ کے الفاظ کثرت سے استعمال کئے ہیں، اس سے مراد یہ ہے کہ باپ کے زیرِ نگیں ایک ہی فیملی میں کھانا پینا، رہنا سہنا مشترکہ طور پر ایک ساتھ ہوتا ہے اور سب کے سرپرست اور ذمہ دار گھر کا بڑا آدمی ہوتا ہے، جس کو سب اپنا بڑا اور سرپرست تسلیم کرتے ہیں؛ لہٰذا آدمی کے بیٹے، بیٹیاں، بیوی اور خدام یہ سب کے سب

اسی کے عیال میں شمار ہوتے ہیں، سب کی ضروریات اور تقاضوں کی ذمہ داری اسی کو ادا کرنی پڑتی ہے اور اردو کی اصطلاح اور محاورہ میں ''عیال'' کا بہتر ترجمہ ''فیملی'' کے ہیں۔اس کو''لغۃ الفقہاء'' میں ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

عيال الرجل الذين يسكنون معه وينفق عليهم، كامرأته، وأولاده، وغلامه، وأمه، وأباه الشيخان الفانيان الفقيران. (لغة الفقهاء، ص: ٣٢٥)

اور''**الموسوعة الفقهية**'' میں''**الآل، الأهل، العيال**'' اور''**الأسرة**'' ان سب الفاظ کو ایک ہی معنی میں ہونے کو ثابت کیا گیا ہے، یعنی آدمی کی فیملی کے لئے لفظ'' آل، اہل'' اور''عیال'' سب استعمال ہوتے ہیں۔

موسوعہ کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

المتعارف عليه الآن إطلاق لفظ الأسرة على الرجل ومن يعولهم من زوجه وأصوله وفروعه، وهذا المعنى يعبر عنه الفقاء قديما بألفاظ منها: الآل، والأهل، والعيال. (الموسوعة الفقهية ٤/ ٢٢٣)

بیٹے کا اپنا سرمایہ لگا کر باپ کے ساتھ کاروبار کرنا

سوال [۲]: بسا اوقات باپ اور بیٹوں کے درمیان کاروبار کی یہ نوعیت ہوتی ہے کہ بیٹا محنت کرنے کے ساتھ ساتھ بلا کسی معاہدے کے کاروبار میں اپنا کچھ سرمایہ بھی لگا دیتا ہے اور باہم نفع کا کوئی فیصد متعین نہیں ہوتا، باپ اپنی زندگی میں بیٹے کو جو بھی دے دیتا ہے، بیٹا اس کو لے لیتا ہے؛ لیکن باپ کے انتقال کے بعد سرمایہ لگانے والا بیٹا کاروبار میں اپنی ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے، دیگر ورثاء اس کی مخالفت کرتے ہیں، ایسی صورت میں کیا بیٹے کو سرمایہ لگانے کی وجہ سے کاروبار کی ملکیت میں شریک سمجھا جائے گا یا یہ اس کی طرف سے تبرع ہوگا؟ اگر بیٹے کو شریک قرار دیا جائے گا تو اس کا تناسب کیا ہوگا؟ فقہی کتابوں میں مذکورہ

شرکت کی تفصیلات کی روشنی میں اس کا حکم واضح فرمائیں، واضح رہے کہ اس صورت میں بیٹا باپ ہی کے عیال میں رہتا ہے۔

المستفتی: ادارۃ المباحث الفقہیۃ جمعیۃ علماء ہند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: باب کے چلتے ہوئے کاروبار میں بیٹا محنت کرنا شروع کردیتا ہے اور اس محنت کے درمیان بیٹا الگ سے اپنا کچھ سرمایہ باپ کے کاروبار میں لگا دیتا ہے، یا کاروبار میں پیسوں کی کمی کی وجہ سے بیٹا کہیں سے قرض لے کر لگا دیتا ہے اور بیٹے کی طرف سے سرمایہ لگانے کی دو حیثیتیں ہمارے سامنے آتی ہیں:

(۱) بیٹے نے اپنی طرف سے سرمایہ لگاتے وقت باپ کے ساتھ کسی قسم کا معاہدہ نہیں کیا ہے؛ بلکہ باپ کے چلتے ہوئے کاروبار میں ترقی کے لئے بلا کسی معاہدہ کے بیٹے نے اپنی طرف سے پیسہ لگا دیا ہے، باپ اس سے اس کا تقاضہ نہیں کیا ہے اور کاروبار کی ساری آمدنی باپ کے قبضہ اور اس کے اختیار میں ہے، تو ایسی صورت میں بیٹے کی طرف سے لگایا ہوا سرمایہ باپ کے حق میں تبرع اور ہبہ ہے اور اس سرمایہ کے لگانے کی وجہ سے اس کاروبار میں اس بیٹے کو الگ سے کوئی پرافٹ نہیں ملے گا؛ لہٰذا باپ کی وفات کے بعد اس بیٹے کا کاروبار میں اپنی ملکیت کا دعویٰ کرنا باطل ہوگا اور دوسرے ورثاء کا اس کی مخالفت کرنا درست رہے گا اور حق میراث کے علاوہ اس بیٹے کو الگ سے کوئی چیز نہیں ملے گی، جیسا کہ ذیل کی جزئیات سے واضح ہوتا ہے۔

علامہ شامیؒ نے اس کو ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

والذي تحصل في هذا المحل أن الشريك إذا لم يضطر إلى العمارة مع شريكه بأن أمكنه القسمة فأنفق بلا إذنه فهو متبرع، وإن اضطر وكان الشريك يجبر على العمل معه فلابد من إذنه أو أمر القاضي فيرجع بما أنفق وإلا فهو متبرع، وإن اضطر وكان شريكه لا

يجبر، فإن أنفق بإذنه أو بأمر القاضي رجع بما أنفق وإلا فبالقيمة. (شامي، زكريا ٦/ ٥١٣-٥١٤، كراچی ٤/ ٣٣٤)

(۲) دوسری حیثیت یہ ہے کہ بیٹے نے اپنی طرف سے جو سرمایہ باپ کے کاروبار میں لگایا ہے اور اس سرمایہ کو لگاتے وقت باپ سے بات چیت کر کے ایک معاہدہ کے تحت معاملہ طے کرلیا ہے کہ پرانا کاروبار کا سرمایہ اور پونجی کل اتنی ہے اور میرا سرمایہ اتنا لگ رہا ہے؛ لہٰذا دونوں قسم کے سرمائے کے تناسب کے حساب سے آمدنی تقسیم ہوجایا کرے گی، مثلاً باپ کا جو سرمایہ چل رہا تھا اس میں بیٹے نے بیس فیصد کا سرمایہ الگ سے لگا دیا ہے، تو باپ کے اسی فیصد ہوگئے اور بیٹے کے بیس فیصد تو آئندہ کاروبار کے منافع پانچ حصوں میں تقسیم ہوکر اس بیٹے کے حق میں ایک حصہ اور باپ کے حق میں چار حصے جائیں گے اور دونوں کے سرمائے بدستور چلتے رہیں گے، اس طرح کا معاہدہ طے ہوجانے کے بعد بیٹا کاروبار میں باپ کا شریک کہلائے گا اور جتنی مقدار میں رأس المال لگایا ہے اتنی مقدار کا مالک بیٹا رہے گا اور بقیہ کا مالک باپ رہے گا اور منافع میں تناسب کے حساب سے دونوں مشترکہ طور پر مالک رہیں گے اور پھر باپ کی موت کے بعد باپ کا حصہ میراث میں شمار ہوگا اور بیٹے کا حصہ اس کی ملکیت ہوگی اور بیٹے کے لئے باپ کی میراث سے الگ اپنے حصے کی ملکیت کا دعویٰ کرنا درست ہوجائے گا اور باپ کے حصوں میں دوسری اولادوں کی طرح یہ بیٹا بھی میراث کا حصہ دار بنے گا۔

اس کو ''الفقہ الاسلامی'' میں اس طرح کے الفاظ سے نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

يجوز في شركة العنان أن يشترط الشريكان العمل عليهما، أو على أحدهما دون الآخر كأن يشترط على أن يبيعا ويشتريا على أن ما رزق الله من التجارة فهو بينهما على شرط كذا، أو أن يبيع ويشترى أحدهما دون الآخر، وأما الربح فيكون في الأصل العام على قدر رأس المال متساويا أو متفاضلا. (الفقه الإسلامي وأدلته ٤/ ٦٠٩)

اس کو صاحب بدائع نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

وأما الأول: وهو الشركة بالأموال، فهو أن يشترك اثنان في رأس المال فيقولان: اشتركنا فيه على أن نشتري ونبيع معا أو شتى أو أطلقا على أن ما رزق الله عز وجل من ربح فهو بيننا على شرط كذا. (بدائع الصنائع، زكريا ٥/ ٧٣)

اور صاحب بدائع نے دوسری جگہ ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

إذا شرطا الربح على قدر المالين متساويا أو متفاضلا فلا شك أنه يجوز، ويكون الربح بينهما على الشرط، سواء شرطا العمل عليهما أوعلى أحدهما، والوضيعة على قدر المالين متساويا ومتفاضلا؛ لأن الوضيعة اسم لجزء هالك من المال، فيتقدر بقدر المال. (بدائع الصنائع، زكريا ٥/ ٨٣)

اس کو صاحب تاتارخانیہ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

ولو اشتركا ولأحدهما ألف درهم وللآخر مائة دينار قيمتها ألف وخمس مائة على أن الربح والوضيعة بقدر رأس المال صح. (الفتاوى التاتارخانية ٧/ ٤٩٢، رقم: ١٠٩٧١)

باپ کی فیملی میں رہ کر باپ کی پونجی اور سرمایہ سے بیٹے کا کاروبار شروع کرنا

سوال [۳]: کبھی کاروبار کی یہ نوعیت سامنے آتی ہے کہ باپ کے عیال میں رہتے ہوئے باپ کی پونجی اور سرمائے سے بیٹے کوئی کام شروع کرتے ہیں، باپ کاروبار کی ملکیت اوراس کے منافع میں اپنے کواور سب بیٹوں کو برابر کا شریک قرار دیتا ہے؛ لیکن باپ عملی طور پر کاروبار میں شریک نہیں ہوتا اور بیٹوں میں بعض زیادہ محنت کرتے ہیں، بعض کم اور بعض بالکل نہیں، ایسی صورت میں اس کاروبار کا مالک کس کو قرار دیا جائے گا، باپ کو یا کاروبار کرنے والے بیٹوں کو یا سب کو؟ نیز باپ کے انتقال کے بعد اس طرح کے کاروبار میں بیٹوں

کی باہم کیا حیثیت ہوگی؟ کیا سارے بیٹے کاروبار کی ملکیت اوراس کے منافع میں برابر شریک ہوں گے یا بعض بیٹوں کے زیادہ محنت کرنے کی وجہ سے ان کا زیادہ حصہ ہوگا؟

المستفتی: ادارۃ المباحث الفقہیۃ جمعیۃ علماء ہند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: باپ کی عیال اور فیملی میں رہتے ہوئے باپ کی پونجی اور سرمایہ سے بیٹا جو کاروبار شروع کرتا ہے اس کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں:

(۱) باپ بیٹے کو کاروبار کے لئے جو پونجی اور سرمایہ دیتا ہے وہ اس کو بطور ہبہ دیتا ہے، تو ایسی صورت میں رأس المال اور منافع کا مالک وہی بیٹا ہوگا، اس سے کسی دوسرے کا حق متعلق نہیں ہوگا۔

(۲) دوسری حیثیت یہ ہوتی ہے کہ باپ نے جو سرمایہ اور پونجی بیٹے کو کاروبار کے لئے دیا ہے وہ بطور ہبہ نہیں دیا ہے؛ بلکہ کاروبار کو بڑھانے اور محنت کرنے کے لئے دیا ہے اور باپ کا ارادہ یہی ہے کہ تنہا وہ بیٹا اس سرمایہ اور منافع کا مالک نہیں ہوگا اور باپ ہی اس کا مالک رہے گا اور باپ کے بعد سب بیٹے برابر کے شریک ہوجائیں گے، تو ایسی صورت میں سارے کاروبار کا مالک شرعی طور پر باپ ہی ہوگا، بیٹا کسی چیز کا مالک نہیں ہوگا اور بیٹے کو باپ کا معین اور مددگار شمار کیا جائے گا اور باپ کے مرنے کے بعد رأس المال اور منافع سب میراث بن کر سارے ورثاء کے درمیان حق شرعی کے اعتبار سے تقسیم ہوں گے۔

اسی طریقے سے اگر باپ کی فیملی میں رہ کر کئی بیٹے الگ الگ محنت کرتے ہوں اور کوئی زیادہ کماتا ہو اور کوئی کم ،تو سارے بیٹوں کی کمائی باپ ہی کی ملکیت شمار ہوگی اور باپ کے انتقال کے بعد سارا سرمایہ باپ کی میراث بن جائے گا اور حصہ شرعی کے اعتبار سے سارے وارثین کے درمیان تقسیم ہوجائے گا۔

اس کو علامہ علاؤ الدین الحصکفیؒ نے ''الدر المختار'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

دفع لابنه مالا ليتصرف فيه، ففعل و كثر ذلك، فمات الأب إن أعطاه هبة فالكل له وإلا فميراث. (الدرالمختار مع الشامي، كتاب الهبة، باب الرجوع في الهبة، زكريا ٨/ ٥٢٠، كراچی ٥/ ٧٠٩)

اور علامہ شامیؒ نے ''کتاب الشرکۃ'' کے ذیل میں اور بھی زیادہ واضح الفاظ سے نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

ولو اجتمع إخوة يعملون في تركة أبيهم ونما المال فهو بينهم سوية ولو اختلفوا في العمل والرأي. (شامي، فصل في الشركة الفاسدة، زكريا ٦/ ٥٠٢، كراچی ٤/ ٣٢٥)

باپ کے سرمایہ میں بیٹوں کی شرکت کی شکلیں

سوال [۴]: باپ اور بیٹوں کے درمیان کاروبار کی یہ شکل بھی سامنے آئی ہے کہ باپ اپنے بیٹوں کو ان کے سرمائے لگائے بغیر مثلاً اپنی کمپنی میں پرسنٹ کے حساب سے شریک بنالیتا ہے اور عموماً اس طرح کے معاملے کے وقت ملکیت اور منافع میں شرکت کی کوئی صراحت نہیں ہوتی، ایسی صورت میں کیا شریعت کی رو سے بیٹوں کو باپ کے ساتھ اصل کمپنی کی ملکیت میں شریک قرار دیا جائے گا یا صرف منافع میں شریک مانا جائے گا؟ پھر ملکیت میں شریک قرار دیا جائے یا محض منافع میں شریک سمجھا جائے؟ دونوں صورتوں میں فقہ کی رو سے اس کی کیا توجیہ کی جائے گی؟ کیا یہ سمجھا جائے گا کہ باپ نے گویا بیٹوں کے درمیان کمپنی کی ملکیت پرسنٹ کے حساب سے تقسیم کرکے ہر ایک کو اس کے حصے کا مالک بنادیا اور اگر معاملہ کے وقت ملکیت یا منافع میں شرکت کی صراحت ہوجائے تو اس وقت کیا حکم ہوگا؟ اس جزو

کے جواب میں اس بات کی ضرور وضاحت فرمائیں کہ غیر منقسم اشیاء کے ہبہ میں قبضہ کا تحقق ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری ہے تو اس میں قبضہ کی صورت میں کیا ہے؟

المستفتی: ادارۃ المباحث الفقہیۃ جمعیۃ علماء ہند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: باپ اور بیٹوں کے درمیان مشترکہ کاروبار کے لئے بنیادی اصول اور ضابطے پر غور کرنے کے لئے سب سے پہلے ان کے درمیان کاروبار کا بنیادی ڈھانچہ کیا ہے؟ اور زمینی سطح پر اس کی حقیقت کیا ہے؟ اسے سامنے لانا لازم اور ضروری ہے، اس کے بعد اس کے اوپر شرعی حکم لگایا جاسکتا ہے؛ اس لئے زمینی سطح پر اس کا جو ڈھانچہ ہے اس پر غور کر کے دیکھنا لازم ہے، اس کی پانچ شکلیں سامنے آتی ہیں اور ہر ایک شکل کا حکم ساتھ ساتھ ملاحظہ فرمائیے:

شکل ۱: باپ کا کاروبار پہلے ہی سے چل رہا ہے اور اس کی متعدد اولادیں ہیں، ان میں سے جو پڑھ لکھ کر کاروبار کے لائق ہوجاتے ہیں ان کو وہ اپنے چلتے ہوئے کاروبار میں پرسنٹ کے حساب سے شریک کر کے پارٹنر بنالیتا ہے اور جو بچے ابھی نابالغ ہیں یا حصول تعلیم میں مصروف ہیں، ان کو کاروبار میں ابھی شریک نہیں کرتا ہے اور باپ جن اولادوں کو شریک کرتا ہے ان کو صرف نفع میں شریک کرتا ہے، چلتے ہوئے سرمایہ میں شریک نہیں کرتا، ایسی صورت میں گویا کہ اگر باپ نے مثلاً بیس فیصدی نفع میں شریک کیا ہے تو اپنے سرمایہ میں سے ۲۰/ فیصد بیٹے کو بطور قرض دے رکھا ہے جو باپ کے پاس واپس آئے گا اور باپ نے بیٹے کو صرف منافع میں شریک کیا ہے، ایسی حالت میں اگر باپ کا انتقال ہوجاتا ہے، تو جس بیٹے کو ۲۰/ بیس فیصد کے منافع میں شریک کیا ہے تو اصل سرمایہ اور رأس المال کو چھوڑ کر اور اسی فیصد منافع کو چھوڑ کر وہ بیٹا صرف ۲۰/ فیصد منافع کا مالک ہوگا، جس میں دوسرے ورثاء کا حق متعلق نہ ہوگا، باقی سارے سرمائے اور ۸۰/ فیصد منافع سب باپ کی میراث ثابت

ہوں گے اور تعلیم حاصل کرنے والی اولادیں اور نابالغ لڑکے اور لڑکیاں یہ سب پوری کمپنی میں حقِ وراثت کے مستحق ہو جائیں گے، جیسا کہ درج ذیل جزئیات سے واضح ہوتا ہے۔

اس بارے میں شامی کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

إذا شرطا العمل عليهما الخ، فلا ينافى ما ذكره الزيلعي في كتاب المضاربة من أنه إذا أراد رب المال أن يجعل المال مضمونا على المضارب أقرضه كله إلا درهما منه وسلمه إليه، وعقد شركة العنان ثم يدفع إليه الدرهم ويعمل فيه المستقرض، فإن ربحا كان بينهما على ما شرطا، وإن هلك هلك عليه. (شامی زکریا ٦/ ٤٨٤، کراچی ٤/ ٣١٢)

شامی میں دوسری عبارت انتہائی مختصر ہے؛ لیکن بہت صاف ہے، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بطور قرض کسی کو روپئے دے کر پھر اسے اپنے کاروبار میں شریک ٹھہرالیا جائے تو بالاجماع جائز ہے، عبارت ملاحظہ فرمائیے:

أقرضه نصفه يحتمل أن يكون الإقراض بعد إفرازه أو قبله، فإن قرض المشاع جائز بالإجماع كما في جامع الفصولين. (شامي، زكريا ٦/ ٥١٠، کراچی ٤/ ٣٣١)

نیز علامہ شامیؒ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

والظاهر أن الشركة المفاوضة لو دفع ألفا نصفها قرض على أن يعمل بالألف بالشركة بينهما والربح بقدر المالين مثلا وأنه لا كراهة في ذلك؛ لأنه ليس قرضا جر نفعا. (شامي زكريا ٦/ ٥١٠، کراچی ٤/ ٣٣١)

شکل ۲: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ باپ کاروبار کے لائق اولادوں کو اپنے چلتے ہوئے کاروبار میں شریک کر لیتا ہے، مثلاً باپ کی تین اولادیں ہیں، ان میں سے بعض کاروبار کے لائق ہو چکے ہیں، بعض تعلیم حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں، کاروبار کے لائق نہیں ہیں، تو ایسی صورت میں باپ ایسا کرتا ہے کہ ساری اولادوں کو فیصد کے حساب سے اپنے کاروبار

میں شریک کرلیتا ہے، مثلاً تین اولا دوں میں ہر ایک کو۲۰ ر فیصد کے حساب سے اپنے کاروبار میں شریک کرلیتا ہے، اور جو اولا دیں ابھی کاروبار کے لائق نہیں ہیں، ان کو بھی ۲۰ ر فیصد کے حساب سے شریک کرلیتا ہے، تاکہ باپ کے مرنے کے بعد بڑی اولا دیں چھوٹی اولادوں کو دبا نہ سکیں اور ان کی طرف سے محنت کی ذمہ داری باپ خود لیتا ہے، مثلاً تین اولادوں میں سے ہر ایک کو۲۰-۲۰ر فیصد میں شریک کرلیتا ہے اور اپنے لئے ۴۰ر فیصد باقی رکھتا ہے اور اولادوں میں سے جو کاروبار کے لائق نہیں ہے اس کے حصہ کی محنت کی ذمہ داری خود لیتا ہے اور ۲۰-۲۰ر فیصد کے حساب سے اپنے سرمایہ میں سے ہر ایک بیٹے کے حق میں رأس المال کو قرض قرار دیتا ہے؛ لہٰذا ۶۰ر فیصد سرمایہ بطور قرض بچوں کے نام سے اور ۴۰ر فیصد سرمایہ اپنی ذات کے لئے متعین کرتا ہے، پھر اس کے بعد مشترکہ کاروبار چلتا ہے اور نفع نقصان میں سبھی تناسب کے حساب سے شریک ہوتے ہیں، تو یہ باپ اور بیٹوں کے درمیان شرکت عقد ہوتی ہے اور شرکت عقد کے اقسام میں باپ بیٹوں کے درمیان مشترکہ کاروبار کی یہ شکل شرکت عنان کے اصول کے دائرہ میں داخل ہوجاتی ہے جو جائز اور درست ہے، یہ مدعیٰ ذیل میں آنے والے جزئیات سے ثابت ہوتا ہے۔

بدائع کی عبارت سے اس معاملہ کا شرکت عنان میں داخل ہونا ثابت ہوتا ہے اور حصہ داری میں کمی زیادتی کا ہونا ثابت ہوتا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

وأما شركة العنان منها فلا يشترط لها أهلية الكفالة ولا المساواة بينهما في ملك المشترى حتى لو اشتركا بوجوههما على أن يكون ما اشتريا أو أحدهما بينهما نصفين أو أثلاثا أو أرباعا، وكيف ما شرطا على التساوي والتفاضل كان جائزا. (بدائع الصنائع، زکریا ۵/ ۸۷)

نابالغ اور چھوٹی اولادوں کو ہبہ کر کے شریک کرنے کا مدعیٰ تکملہ شامی کی اس عبارت سے ثابت ہوتا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

لو عينه فقال: حانوتي الذي أملكه أو داري لابنى الصغير فهو هبة، ويتم بكونها في يد الأب، ولو قال: هذا الشيء لولدي الصغير فلان جاز، ويتم من غير قبول، فقولهم: القبول شرط لثبوت الملك في الموهوب يستثنى منه الهبة للصغير من أبيه. (تكملة، شامي زكريا ١٢/ ٥٧٤، كراچی ٨/ ٤٣٠)

اور''الموسوعة الفقهية'' کی عبارت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، ملاحظہ فرمایئے:

إذا وجب الإقباض واتحدت يد القابض والمقبض وقع القبض بالنية، قال القرافي: ومن الإقباض أن يكون للمديون حق في يد رب الدين، فيأمره بقبضه من يده لنفسه، فهو إقباض بمجرد الإذن ويصير قبضه له بالنية كقبض الأب من نفسه لنفسه مال ولده إذا اشتراه منه. (الموسوعة الفقهية ٣٢/ ٢٦٣)

رأس المال کو اولاد کے حق میں قرض قرار دینے کے مدعیٰ کی تائید مبسوط کی اس عبارت سے ہوتی ہے:

وأما القرض فلأنه تمليك بعوض والشيوع لا يمنع صحته كالبيع بخلاف الهبة، فإن الهبة تبرع محض، والتبرع ينفي وجوب الضمان على المتبرع، وبسبب الشيوع فيما يحتمل القسمة يجب ضمان المقاسمة على المتبرع، فأما القبض بجهة القرض لا ينفي وجوب الضمان. (المبسوط للسرخسي ٢٢/ ١٣٦)

''تاتارخانیہ'' اور ''تبیین'' کی اس عبارت سے بھی قرض والی بات ثابت ہوتی ہے، ملاحظہ فرمایئے:

وإذا أراد أن يجعله عليه مضمونا أقرضه رأس المال كله ويشهد عليه وسلمه إليه، ثم يأخذه منه مضاربة، ثم يدفعه إلى المستقرض يستعين به في العمل، فإذا عمل وربح كان الربح بينهما على الشرط، وأخذ رأس المال على أنه بدل القرض وإن لم يربح أخذ رأس المال بالقرض، وإن هلك

هلک علی المستقرض وهو العامل أو أقرضه کله إلا درهما منه وسلمه إليه، وعقدا شرکة العنان، ثم يدفع إليه الدرهم ويعمل فيه المستقرض، فإن ربح کان بينهما علی ما شرطا وإن هلک هلک عليه. (تبيين الحقائق، زکريا ٥/ ٥١٥، الفتاوی التاتارخانية ١٥/ ٥٣٠، رقم: ٢٣٩٤٠)

شکل۳: کبھی باپ ایسا کرتا ہے کہ اپنی اولادوں کو چلتے ہوئے کاروبار میں پرسنٹ اور فیصد کے حساب سے شریک کر لیتا ہے اور کمپنی کے سرمایہ کا حساب لگا کر مثلاً ہر اولاد کو کمپنی کے ۲۰ رفیصد کا مالک قرار دیتا ہے اور قرض نہیں قرار دیتا ہے؛ بلکہ باپ کی طرف سے عطیہ اور ہبہ قرار دیتا ہے اور ہبہ میں ثبوت ملک کے لئے قبضہ شرط ہوتا ہے اور قبضہ کی دو قسمیں ہیں: قبضہ حقیقی اور قبضہ حکمی اور یہاں قبضہ حقیقی نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ کاغذات کی تکمیل سے قبضہ حکمی ثابت ہو جاتا ہے، تمام کاغذات قانونی اعتبار سے ۲۰ رفیصد کے لحاظ سے بیٹوں کے نام منتقل ہو جاتے ہیں، اسی حساب سے آمدنی بھی بیٹوں کے کھاتے میں جمع ہوتی ہے، پھر نفع ونقصان میں ہر ایک تناسب کے حساب سے شریک ہوتے ہیں، یہ بھی شریعت کے اصول کے مطابق شرکت عنان کے دائرہ میں داخل ہو جاتی ہے جو جائز اور درست ہے، بڑے بڑے شہروں میں ہزاروں کاروبار باپ اور اولاد کی شرکت میں اس طرح چلتے ہیں، جس کا جواز ذیل میں آنے والی جزئیات سے ثابت ہوتا ہے، چنانچہ ''تکملہ شامی'' اور ''تاتارخانیہ'' کی عبارت میں اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ ہبہ میں قبضہ حقیقی اور قبضہ حکمی معتبر ہے اور قبضہ حکمی قبضہ حقیقی کی طرح ہوتا ہے اور قبضہ حکمی کسی بھی معاملہ میں حالات اور تقاضے کی مناسبت سے ثابت ہوتا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

قبض کل شيء بما يناسبه، فقبض مفتاح الدار قبض لها، وقبض ما يحتمل القسمة يکون بها، وقبض مالا يحتملها يکون بقبض کله، قال في التاتارخانية: قد ذکرنا أن الهبة لا تتم إلا بالقبض، والقبض نوعان: حقيقي، وأنه ظاهر، وحکمي، وذلک بالتخلية، وقد أشار في هذه المسألة أي مسألة

التمكن من القبض قبض إلى القبض الحكمي: وهو القبض بطريق التخلية.
(تكملة، شامي زكريا ١٢/ ٥٧٩، كراچی ٨/ ٤٣٤، تاتارخانية ١٤/ ٤٢١، رقم: ٢١٥٦٤)

اور ”الموسوعۃ الفقہیہ“ میں بہت صاف اور واضح الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

القبض الحكمي عند الفقهاء يقام مقام القبض الحقيقي وإن لم يكن متحققا حسا في الواقع، وذلک لضرورات ومسوغات تقتضي اعتباره تقديرا وحكما، وترتيب أحكام القبض الحقيقي عليه، وذلک في حالات ثلاث: الحالة الأولى: عند إقباض المنقولات بالتخلية مع التمكين في مذهب الحنفية ولو لم يقبضها الطرف الآخر حقيقة، حيث أنهم يعدون تناولها باليد قبضا حقيقيا، والقبض بالتخلية قبضا حكميا بمعنى أن الأحكام المترتبة عليه كأحكام القبض الحقيقي. (الموسوعة الفقهية ٣٢، ٢٦٢-٢٦٣)

شکل ۴: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ باپ کے پاس پہلے سے کوئی سرمایہ نہیں ہوتا ہے اور باپ اور اولادیں ایک ساتھ شرکت میں کوئی کام شروع کرتی ہیں اور شروع ہی میں معاہدہ طے ہوجاتا ہے کہ اولاد اتنے پرسنٹ کی مالک رہے گی اور باپ اتنے پرسنٹ کا مالک رہے گا اور اسی معاہدہ کے تحت کاروبار شروع ہوجائے، تو ایسی صورت میں جو معاہدہ طے ہوا ہے اسی معاہدہ کے مطابق باپ اور اولاد کاروبار میں شریک رہیں گے اور ہر ایک معاہدہ کے حساب سے اپنے اپنے حصوں کے مالک رہیں گے اور ایسا مشترکہ کاروبار کبھی شرکت مفاوضہ کے شرائط پائے جانے کی وجہ سے اس کے اصول کے تحت داخل ہوجاتا ہے اور کبھی شرکت مفاوضہ کے اصول وشرائط نہ پائے جانے کی وجہ سے شرکت عنان کے دائرے میں داخل ہوجاتا ہے اور باپ اور اولاد کے درمیان مشترکہ کاروبار کی یہ شکل ایسی ہے جیسا کہ اجنبی لوگوں کے درمیان میں ہوا کرتا ہے، اس میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ اس وقت ہے جب

کہ بیٹے باپ کی فیملی اور اس کے عیال میں نہ ہوں۔ اور اگر باپ کی فیملی میں ہوں تو باپ ہی سب کا مالک ہو جائے گا اور اولاد اس کی معاون ثابت ہوگی، جیسا کہ ذیل کی فقہی جزئیات سے واضح ہوتا ہے، علامہ شامیؒ کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

ثم هذا في غير الابن مع أبيه؛ لما في القنية الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيء فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله؛ لكونه معينا له. (شامي، زكريا ٦/ ٥٠٢، كراچی ٤/ ٣٢٥)

اس کو ''شرح المجلہ'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

إذا عمل رجل في صنعة هو وابنه الذي في عياله فجميع الكسب لذلك الرجل، وولده يعد معينا له، فيه قيدان احترازيان كما تشعر عبارة المتن، الأول: أن يكون الابن في عيال الأب، الثاني: أن يعملا معا في صنعة واحدة إذ لو كان لكل منهما صنعة يعمل فيها وحده فربحه له. (شرح المجلة لسليم رستم باز ٢/ ٧٤١، رقم المادة: ١٣٩٨)

اور اس کو ''ہندیہ'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

قال محمد رحمه الله تعالى: إذا اشتركا بغير مال على أن ما اشتريا اليوم فهو بينهما وخصا صنفا أو عملا أو لم يخصا فهو جائز، وكذلك إذا قالا: هذا الشهر، وكذلك إذا لم يذكرا للشركة وقتًا بأن اشتركا على أن ما اشتريا فهو بينهما. (الهندية قديم ٢/ ٣٠٢، جديد ٢/ ٣١٢)

شکل ۵ : باپ اور اولاد کے درمیان مشترکہ کاروبار اس طرح چلتا ہے کہ اس میں کوئی معاہدہ طے نہیں ہوتا ہے، مل جل کر کاروبار چلاتے ہیں، پھر اس میں کاروبار بڑھتا چلا جاتا ہے، ایسی صورت میں سارا کاروبار باپ کی ملکیت شمار ہوگا اور اولادیں باپ کی معاون ثابت ہوں گی اور اولادوں میں سے کسی کو بھی اس کاروبار میں کلی یا جزئی ملکیت حاصل نہیں ہوگی؛ بلکہ باپ کے مرنے کے بعد سارا سرمایہ باپ کی میراث ثابت ہوگا، مگر اس میں شرط

ہے کہ اولاد باپ کی فیملی اورعیال میں رہتی ہو؛ اس لئے کہ اگر اولاد باپ کے عیال اور فیملی میں نہیں رہتی ہے؛ بلکہ دونوں الگ الگ رہتے ہیں، تو معاملات، تجارت اور کاروبار میں دونوں کی حیثیت اجنبیوں کی طرح ہوجاتی ہے۔

اس کو ”ہندیہ“ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

أب وابن يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما مال فالكسب كله للأب إذا كان الابن في عيال لكونه معينا له. (الهندية زكريا، قديم ۲/ ۳۲۹، جديد مطول زكريا ۲/ ۳۳۲)

علامہ شامیؒ کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيء فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله؛ لكونه معينا له. (شامي زكريا ٦/ ٥٠٢، كراچی ٤/ ٣٢٥)

اس کو ”شرح المجلہ“ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

إذا عمل رجل في صنعة هو وابنه الذي في عياله فجميع الكسب لذلك الرجل، وولده يعد معينا له، فيه قيدان احترازيان كما تشعر عبارة المتن، الأول: أن يكون الابن في عيال الأب، الثاني: أن يعملا معا في صنعة واحدة إذ لو كان لكل منهما صنعة يعمل فيها وحده فربحه له. (شرح المجلة لسليم رستم باز ۲/ ۷٤۱، رقم المادة: ۱۳۹۸)

بیٹے کا اپنے سرمایہ سے کمپنی قائم کرکے باپ کے نام کردینا

سوال [۵]: کبھی مشترکہ کاروبار کی یہ شکل ہوتی ہے کہ بیٹے اپنے سرمائے سے ایک کمپنی قائم کرتے ہیں، اس میں والد کوئی سرمایہ نہیں لگا ہوتا؛ لیکن بیٹے احترام میں کمپنی والد

ہی کے نام سے قائم کرتے ہیں، کاغذات میں کمپنی کا مالک والد ہی قرار دیا جاتا ہے، اس طرح کی قائم کردہ کمپنی میں شرعاً باپ کی کیا حیثیت ہوگی؟ باپ کے انتقال کے بعد اس طرح کے معاملے میں بھائیوں اور بہنوں میں اختلافات کثرت سے پیش آتے ہیں، بہنوں کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ والدمحترم یا تو کاروبار کے اصل مالک تھے یا کاروبار میں شریک تھے؛ لہٰذا کاروبار میں ان کے حصے میں سے ہم کوحق ملے گا، بھائیوں کا یہ کہنا ہوتا ہے کہ کاروبار کے اصل مالک ہم ہی تھے، ہم نے احتراماً کمپنی میں والد صاحب کا نام ڈلوادیا تھا، اس طرح کے نزاع کوشریعت کی روشنی میں کیسے حل کیا جائے گا؟

المستفتی: ادارۃ المباحث الفقہیۃ جمعیۃ علماء ہند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر بیٹے نے اپنے سرمائے کے ذریعہ سے یا کسی سے قرض لے کر کمپنی قائم کرکے کاروبار شروع کردیا ہے اور کمپنی باپ ہی کے نام سے قائم کیا ہے اور کاغذات میں بھی کمپنی کا مالک والد ہی کو قرار دیا ہے، اس کے بعد بیٹے نے اس کاروبار میں محنت کر کے کاروبار کو خوب بڑھا لیا اور جو قرضہ وغیرہ لے رکھا تھا وہ سب اسی کاروبار کے منافع سے ادا کردیا ہے، تو ایسی صورت میں مسئلے کے دو پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں:

(ا) بیٹا باپ کے نام سے کمپنی قائم کرکے اس کمپنی کا سارا سرمایہ اور ساری آمدنی باپ کے پاس جمع کردیتا ہے اور اپنے پاس کچھ نہیں رکھتا، اور باپ اپنے اختیار سے سارے سرمائے اور ساری آمدنی میں تصرف کرتا ہے اور اس بیٹے کو بھی باپ ہی خرچہ کا پیسہ دیتا ہے اور اسی سرمایہ سے دیگر اولادوں کا خرچ بھی باپ ہی پورا کرتا ہے اور اسی سرمایہ کے پیسے سے باپ دیگر اولادوں کی شادی بیاہ بھی کرتا ہے اور اس پر بیٹے کو کوئی اشکال نہیں ہوتا ہے؛

بلکہ بیٹا یہی سمجھتا ہے کہ سب کچھ باپ کا ہے اور میں باپ کا خادم اور معین ہوں، تو ایسی صورت میں پوری کمپنی حقیقی معنی میں باپ ہی کی ملکیت شمار ہوگی اور باپ کے مرنے کے بعد پوری کمپنی اور پورا سرمایہ باپ کی میراث بن جائے گا، جیسا کہ بدائع الصنائع کی اس عبارت سے یہ مسئلہ مستفاد ہوتا ہے:

وجه الاستحسان: أنهما لم يقصدا بيعا باطلا بل بيعا صحيحا، فيجب حمله على الصحة ما أمكن ولا يمكن حمله على الصحة إلا بثمن العلانية، فكأنهما انصرفا عما شرطاه في الباطن، فتعلق الحكم بالظاهر، كما لو اتفقا على أن يبيعاه بيع تلجئة فتواهبا. (بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٣٩٠)

(۲) مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ بیٹے نے کمپنی قائم کر کے باپ کے نام کاغذات جو بنوادئے ہیں وہ صرف باپ کے ساتھ ظاہر داری کے لئے بنوایا ہے، تا کہ اس سے باپ خوش رہے، حقیقت میں باپ کو مالک بنانا مقصود نہیں ہے؛ بلکہ حقیقی مالک وہ بیٹا خود ہی رہے گا، چنانچہ اس کاروبار کا سرمایہ اور آمدنی سارا کا سارا بیٹے ہی کے پاس رہتا ہے اور اس آمدنی سے جائیداد وغیرہ جو خریدتا ہے وہ بھی اپنے ہی نام سے خریدتا ہے اور دوسرے بھائیوں اور بہنوں پر وہ بیٹا جو خرچ کرتا ہے وہ اپنی طرف سے کرتا ہے اور اس میں بیٹا یہ سمجھتا ہے کہ میں اپنے بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ ہمدردی کرتا ہوں اور ماں باپ کا خرچ بھی ادا کرتا ہے، مگر سارا حساب وکتاب وہ خود اپنے ہی پاس رکھتا ہے، تو ایسی صورت میں باپ کو کمپنی کا حقیقی مالک بنانا ثابت نہیں ہوگا؛ بلکہ تلجئہ کی شکل ثابت ہوگی اور عقد تلجئہ میں ظاہر داری کی جاتی ہے، حقیقی معنی میں وہ عقد منعقد نہیں ہوتا ہے؛ لہٰذا باپ کے مرنے کے بعد مذکورہ کمپنی اور اس کی آمدنی میں سے کوئی بھی چیز باپ کی میراث نہیں بنے گی؛ بلکہ کمپنی اور سارے سرمائے کا حقیقی مالک وہی بیٹا شمار ہوگا، دیگر اولادوں کو اس میں حق میراث کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہوگا۔

نیز معاملہ تلجئہ میں یہ بات بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ بعد میں اگر فریقین میں سے

ایک تلجئہ کا انکار کر کے عقد کو حقیقی عقد ہونے کا دعویٰ کرے اور دوسرا اس کا انکار کرے تب بھی عقد حقیقی نہیں بنے گا اور معاملہ تلجئہ ہی رہے گا اور جس کے نام کیا گیا ہے وہ مالک نہیں بنے گا۔

اس سلسلے میں بدائع الصنائع کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

أن التلجئة في الأصل لا تخلوا إما أن تكون في نفس البيع، وإما أن تكون في الثمن، فإن كانت في نفس البيع، فإما أن تكون في إنشاء البيع، وإما أن تكون فى الإقرار به، فإن كانت فى إنشاء البيع بأن تواضعوا في السر لأمر ألجأهم إليه على أن يظهر البيع، ولا بيع بينهما حقيقة، وإنما هو رياء وسمعة نحو أن يخاف رجل السلطان فيقول الرجل: إني أظهر أني بعت منک داري وليس ببيع في الحقيقة، وإنما هو تلجئة فتبايعا، فالبيع باطل في ظاهر الرواية عن أبي حنيفة وهو قول أبي يوسف ومحمد؛ لأنهما تكلما بصيغة البيع لا على قصد الحقيقة، وهو تفسير الهزل، والهزل يمنع جواز البيع؛ لأنه يعدم الرضا بمباشرة السبب فلم يكن هذا بيعا منعقدا فى حق الحكم. (وقوله: **ولو أجاز أحدهما دون الآخر لم يجز، وإن أجازاه جاز** (وقوله) **فلا يصح إلا بتراضيهما ولا يملكه المشترى بالقبض.** (بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٣٨٩)

اس کو ''الموسوعۃ الفقہیۃ'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

أما بيع التلجئة فالاتفاق على عدم إرادة البيع مضمر بينهما، وليس هناک بيع أصلا (إلى قوله) **أن المتعاقدين في بيع التلجئة يتفقان على أن يظهرا العقد، إما خوفا من ظالم ونحوه، وإما لغير ذلک، ويتفقان أيضا على أنهما إذا أظهراه لا يكون بيعا.** (الموسوعة الفقهية ٩/ ٦٣)

اور ''موسوعہ'' میں آگے ایک صفحہ کے بعد تھوڑی سی عبارت مزید وضاحت کے ساتھ نقل کی گئی ہے، ملاحظہ فرمائیے:

بيـع تـكـون التـلـجـئة فـي إنشـائه، وذلک بأن يتواضعا في السر لأمر ألـجأهما إليه على أن يظهرا البيع ولا بيع بينهما حقيقة، وإنما هو رياء وسمعة نـحـو أن يـخاف رجل السلطان فيقول لآخر: إني أظهر أني بعت منک داري وليس ببيع في الحقيقة، وإنما هو تلجئة فتبايعا. (الموسوعة الفقهية ٩/ ٦٤)

موسوعہ میں ایک عبارت اس طرح بھی ہے کہ آپس میں بیع کا اقرار کیا جائے اورحقیقت میں دونوں کے درمیان بیع نہیں ہے،صرف ظاہرداری کے طور پر عقدکولوگوں کے سامنےظاہرکیاجارہاہے،عبارت ملاحظہ فرمایئے:

التـلجئة إذا كانت في الإقرار بالبيع بأن اتفقا على أن يقرا ببيع لم يكن، فأقرا بذلک، ثم اتفقا على أنه لم يكن، فالبيع باطل. (الموسوعة الفقهية ٩/ ٦٦)

باپ کااپنے سرمایہ سے سب بیٹوں کا کاروبارا لگ ا لگ کر کے سرپرستی کرنا

سوال [٦]: یہ شکل بہت معروف ہے کہ بیٹوں کا اگر چہ باپ کے ساتھ رہنا نہیں ہوتا ہے؛ لیکن باپ اپنے ہی سرمایہ سے سب کا الگ الگ کاروبار کروادیتا ہے اوران سب کی کمائی باپ کے پاس آتی ہے کاروبار میں باپ اور بیٹوں کی کوئی حیثیت متعین نہیں ہوتی، باپ بیٹوں کی ضروریات کے تناسب سے ان کورقم دیتارہتاہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آمدنی باپ کے پاس نہیں آتی بیٹے باپ کی رہنمائی میں کاروبار کرتے ہیں، اس طرح کے کاروبار میں باپ اور بیٹوں کی شرعاً کیا حیثیت ہوگی؟

المستفتی: ادارۃ المباحث الفقہیۃ جمعیۃ علماء ہند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر باپ نے اپنے ہی سرمایہ سے سارے بیٹوں کا کاروبارا لگ ا لگ کردیا ہے،تو اس کی دو حیثیتیں ہمارے سامنے آتی ہیں:

(۱) پہلی حیثیت یہ ہے کہ سارے بیٹے اپنے اپنے کاروبار کی آمدنی باپ کو لاکر

پیش کرتے ہیں اور مجموعی حساب وکتاب باپ کے پاس ہی رہتا ہے، تو ایسی صورت میں ساری پونجی اور آمدنی کا مالک باپ ہی ہوگا، اگر چہ یہ سب بیٹے باپ کے ساتھ نہیں رہتے ہیں، پھر بھی سارا سرمایہ باپ کی ملکیت میں شمار ہوگا، اس لئے کہ بعض دفعہ عورتوں کی اَن بن کی وجہ سے باپ پہلے ہی سے بچوں کے چولہے اور کھانا پینا الگ کر دیتا ہے، تاکہ اولاد کے درمیان کوئی جھگڑا اور نزاع پیدا نہ ہو سکے، مگر سرمایہ سب باپ کے ہاتھ میں ہی ہوتا ہے اور مجموعی سرمایہ میں سے ہر ایک بیٹے کو خرچ کے لئے پیسہ دیتا رہتا ہے، تو ایسی صورت میں باپ نے جو الگ الگ سرمایہ دے کر ہر ایک کا کاروبار الگ الگ کر دیا ہے وہ باپ کی طرف سے ہبہ نہیں ہے؛ بلکہ محنت کر کے سرمایہ کو آگے بڑھانے کا مکلّف بنایا گیا ہے؛ لہٰذا باپ کی موت کے بعد سارے بیٹوں کے پاس جو سرمایہ ہے وہ سب باپ کی میراث بن جائے گی اور تمام وارثین میراث میں شریک ہو جائیں گے اور اس میں لڑکوں کے ساتھ لڑکیاں بھی میراث کی حق دار بن جائیں گی۔

(۲) دوسری حیثیت یہ ہے کہ باپ اپنی زندگی میں سارے بیٹوں کو الگ الگ سرمایہ دے کر الگ الگ کاروبار شروع کرا دیتا ہے اور بیٹے باپ کے سرمایہ کے ذریعہ سے محنت کر کے کاروبار کو آگے بڑھاتے ہیں اور آمدنی بیٹے خود اپنے پاس رکھتے ہیں، باپ کو نہیں دیتے ہیں اور نہ ہی باپ کو اس سے کوئی مطلب ہوتا ہے اور نہ ہی باپ کو اس کی ضرورت پڑتی ہے، تو ایسی صورت میں باپ نے بیٹوں کو کاروبار کے لئے جو کچھ بھی دیا ہے وہ سب باپ کی طرف سے ہبہ شمار ہوگا؛ لہٰذا بیٹوں کے پاس باپ کی طرف سے دیا ہوا جو کچھ بھی سرمایہ ہے، پھر اس کے اوپر بیٹوں کی محنت کے ذریعہ سے جو کچھ آمدنی کا اضافہ ہوا ہے وہ سب کچھ انہیں بیٹوں کی ملکیت میں شمار ہوگا، باپ ان میں سے کسی چیز کا مالک نہیں ہوگا؛ لہٰذا باپ کی موت کے بعد ہر بیٹے کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ خود اس کے مالک رہیں گے، باپ کی میراث نہیں بنے گی اور بہنوں کو اس میں حق میراث کا دعویٰ کرنا درست نہیں ہوگا۔

حضرات فقہاء کی عبارات اس سلسلے میں ملاحظہ فرمایئے، چنانچہ تاتارخانیہ اور شامی کی عبارت کچھ مختصر ہے؛ لیکن واضح ہے، ملاحظہ فرمایئے:

لو دفع لابنه مالا فتصرف فيه الابن يكون للأب إلا إذا دلت دلالة على التمليك. (الفتاوى التاتارخانية ١٤/ ٤٦٦، رقم: ٢١٧٣٨، شامي زكريا ٨/ ٥٠٢، كراچی ٥/ ٦٩٧)

''درمختار'' کی عبارت اس سے بھی واضح ہے، ملاحظہ فرمایئے:

دفع لابنه مالا ليتصرف فيه ففعل وكثر ذلك فمات الأب، إن أعطاه هبة فالكل له، وإلا فميراث، وتحته في الشامية: بأن دفع إليه ليعمل للأب.

(الدرالمختار مع الشامي، زكريا ٨/ ٥٢٠، كراچی ٥/ ٧٠٩)

اور ''ہندیہ'' میں اس سے بھی واضح الفاظ میں ہے، ملاحظہ فرمایئے:

رجل دفع إلى ابن في صحته مالا يتصرف فيه، ففعل وكثر ذلك، فمات الأب إن أعطاه هبة فالكل له، وإن دفع إليه لأن يعمل فيه للأب فهو ميراث. (هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٩٢، جديد ٤/ ٤١٧)

مرحوم باپ کے متروکہ سرمایہ سے حاصل شدہ آمدنی کیسے تقسیم ہو؟

سوال [۷]: والد کے انتقال کے بعد کبھی ایسا ہوتا ہے کہ والد کا ترکہ تقسیم نہیں کیا جاتا، مرحوم باپ کے بیٹوں کا رہن سہن ایک ساتھ رہتا ہے، والد کے پرانے کاروبار کو بعض بیٹے سنبھال لیتے ہیں اور اس سے حاصل شدہ آمدنی سے پورے گھر کا خرچ چلتا ہے، ایسی صورت میں انتقال کے بعد کاروبار میں جو اضافہ ہوتا ہے، کیا وہ سب ورثاء کے مابین ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کیا جائے گا یا اضافہ شدہ کاروبار کے صرف وہی بیٹے مالک ہوں گے جنہوں نے والد کے انتقال کے بعد کاروبار سنبھالا ہے؟ اگر اضافہ شدہ کاروبار اور اس سے

حاصل شدہ کاروبار اور اس سے حاصل شدہ جائیداد وغیرہ کا صرف کاروبار کرنے والے بیٹوں کو مالک قرار دیا جائے تو اس پر بہنوں کو اعتراض ہوتا ہے، اور اگر سب کو برابر کا مالک قرار دیا جائے تو کاروبار کرنے والے بیٹوں کی محنت ضائع ہوتی ہے؟

المستفتی: ادارۃ المباحث الفقہیۃ جمعیۃ علماء ہند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: والد کے انتقال کے بعد فوری طور پر اولاد کے درمیان ترکہ تقسیم نہ ہو اور باپ کی زندگی میں باپ کا سرمایہ جس حالت میں چل رہا تھا موت کے بعد بھی اسی طرح بدستور باقی رہے، تو ایسی صورت میں ہر وارث کا حصۂ میراث اس متروکہ مال میں شامل رہتا ہے؛ لہٰذا تمام ورثاء مال متروکہ میں شریک ہوں گے، اب شرکت سے متعلق بطور تمہید دو باتیں یاد رکھنا ضروری ہے:

پہلی بات: شرکت کی دو قسمیں ہیں، شرکت عقد اور شرکت ملک۔

(۱) شرکت عقد میں شرکت کی بہت ساری قسمیں آجاتی ہیں، جس میں شرکت مفاوضہ، شرکت عنان اور شرکت وجوہ وغیرہ سب داخل ہیں۔ اگر باپ بیٹے کے درمیان شرکت کا مسئلہ ہوتا ہے، تو شرکت عقد باپ کی زندگی میں ہوسکتی ہے، مرنے کے بعد نہیں۔

(۲) ملک یعنی ملکیت میں شریک ہوجانا اس کی بھی دو قسمیں ہیں:

(۱) شرکت ملک اختیاری: یعنی شرکاء کے فعل اختیاری سے یہ شرکت ملک عمل میں آتی ہے، مثال کے طور پر چند شرکاء مل کر ایک ساتھ کوئی جائیداد خریدلیں، تو خریدی ہوئی شئ میں سب کی ملکیت مشترکہ طور پر ثابت ہوگی یا کوئی شخص چند افراد کو کوئی چیز غیر منقسم طور پر ایک ساتھ ہبہ کردے تو مال موہوب کی ملکیت میں سب لوگ شریک ہوجائیں گے یا چند افراد کے لئے کسی نے ایک ساتھ وصیت کردی تو موصی کی موت کے بعد وصیت نافذ ہوجائے گی اور وہ سارے لوگ شئ موصی بہ کی ملکیت میں شریک ہوجائیں گے یا کسی نے چند فقیروں کو ایک

ساتھ کوئی چیز صدقہ کی تو وہ سارے فقراء اس شئ کی ملکیت میں شریک ہوجائیں گے، ان تمام صورتوں میں یہ سب حضرات شئ مشترک کی ملکیت میں شرکت ملک کے طور پر شریک ہوجائیں گے اور اس شرکت ملک میں ان لوگوں کی ملکیت اور شرکت ان کے اختیار سے حاصل ہوتی ہے؛ اس لئے اس کو شرکت ملک اختیاری کہا جاتا ہے۔

(۲) شرکت ملک اضطراری اور غیر اختیاری: کہ شئ کی ملکیت حاصل ہونے میں اور اس کی ملکیت میں شریک ہونے میں انسان کا کوئی اختیار اور ارادہ کا دخل نہیں ہوتا؛ بلکہ قدرتی طور پر غیر اختیاری ملکیت ہوتی ہے، اور شرکت بھی غیر اختیاری ہوجاتی ہے، مثال کے طور پر کسی شخص کا انتقال ہوجائے تو اس کے متروکہ سرمایہ اور جائیداد میں اولادیں شرکت ملک کے طور پر شریک ہوجائیں گی، تو معلوم ہوا کہ باپ کے مرنے کے بعد تقسیم ترکہ سے پہلے اولاد کے درمیان میراث کی شرکت، شرکت ملک ہی کے دائرے میں داخل ہوتی ہے؛ لہٰذا اس مسئلہ پر غور کرنے میں شرکت عقد کے مسائل کو سامنے رکھنا بے موقع بے محل ہوگا؛ بلکہ شرکت ملک کے ذیل میں جو مسائل آتے ہیں انہیں کو سامنے رکھنا لازم ہوگا، اس کو صاحب بدائع نے اس طرح کے الفاظ میں نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

الشركة في الأصل نوعان: شركة الأملاک، وشركة العقود، وشركة الأملاک نوعان: نوع يثبت بفعل الشريكين، ونوع يثبت بغير فعلهما، أما الذي يثبت بفعلهما فنحو أن يشتريا شيئا أو يوهب لهما أو يتصدق عليهما فيقبلان فيصير المشترى والموهوب والموصى به والمتصدق به مشتركا بينهما شركة ملک، وأما الذي يثبت بغير فعلهما فالميراث بأن ورثا شيئا فيكون الموروث مشتركا بينهما شركة ملک.

(بدائع الصنائع، زکریا ۵/ ۷۳)

اس کو تاتارخانیہ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

وفي الذخيرة: الشركة نوعان: شركة ملك، وشركة عقد، وشركة الملك نوعان: شركة جبر، وشركة اختيار، وشركة الجبر: أن يختلط المالان لرجلين بغير اختيار المالكين خلطا لا يمكن التمييز بينهما حقيقة بأن كان الجنس واحدا أو يمكن التمييز ولكن بكلفة وضرب مشقة نحو أن يختلط الحنطة بالشعير أو يرثا مالا، وشركة الاختيار: أن يوهب لهما مال أو يملكان مالا باستيلاء أو يخلطان مالهما، وفي الخانية: ويملكان مالا بالشراء أو بالهبة أو بالصدقة. (الفتاوى التاتارخانية ٧/ ٤٥٧-٤٥٨، رقم: ١٠٨٧٥)

دوسری بات: شرکت ملک میں ہر شریک دوسرے کے حصہ میں اجنبیت کا حکم رکھتا ہے، ایک دوسرے کے حصہ میں نہ تو وکیل ہوسکتا ہے اور نہ ہی کسی کو کسی کے حق میں تصرف کا حق ہوتا ہے، چاہے شرکت ملک از قبیل اختیاری ہو یا از قبیل اضطراری اور غیر اختیاری ہو، دونوں صورتوں میں ہر شریک دوسرے کے حصہ میں اجنبی کی حیثیت رکھتا ہے؛ لہٰذا شرکت ملک غیر اختیاری میں مورث کے متروکہ سرمایہ اور جائیداد میں ہر ایک وارث دوسرے وارث کے حصہ میں اجنبی ہوگا، اس کے حصہ میں اس کی اجازت کے بغیر کسی طرح کا تصرف کرنا کسی بھی وارث کے لئے جائز نہ ہوگا۔ اور آج کے زمانہ میں بہنوں کے حصوں کو بھائی اپنا ہی سمجھتے ہیں اور بہنوں کو ان کا حصہ ہی نہیں دیتے ہیں، حالانکہ بہنوں کے حصے میں بھائیوں کو کسی قسم کے تصرف کا حق نہیں ہے، اسی طرح نابالغ کے حصے میں بالغ بھائیوں کو منافع بڑھانے کے کا حق ہوسکتا ہے؛ البتہ استہلا کی تصرف کا حق نہ ہوگا، فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمائیے:

صاحب بدائع نے اس کو ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

فأما شركة الأملاك فحكمها في النوعين جميعا واحد وهو أن كل واحد من الشريكين كأنه أجنبي في نصيب صاحبه، لا يجوز له التصرف فيه

بغير إذنه؛ لأن المطلق للتصرف الملك أو الولاية ولا لكل منهما في نصيب صاحبه ولاية بالوكالة أو القرابة، ولم يوجد شيء من ذلك، وسواء كانت الشركة في العين أو الدين لما قلنا. (بدائع الصنائع، زكريا ٥/ ٨٧، هكذا في شرح المجلة لرستم باز ١/ ٦٠٣، رقم المادة: ١٠٧٥)

اس کو ''الموسوعۃ الفقہیۃ'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

الأصل أن كل واحد من الشريكين أو الشركاء في شركة الملك أجنبي بالنسبة لنصيب الآخر؛ لأن هذه الشركة لا تتضمن وكالة ما ثم لا ملك لشريك ما في نصيب شريكه، ولا ولاية له عليه من أي طريق آخر، والمسوغ للتصرف إنما هو الملك أو الولاية، وهذا أما لا يمكن تطرق الخلاف إليه. (الموسوعة الفقهية ٢٦/ ٢٢)

اس کو ''فتاوی تاتارخانیہ'' میں اس طرح کے الفاظ میں نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

ففي النوع الأول: لو باع أحدهما نصيبه من أجنبي بغير إذن الشريك لا يجوز، وفي النوع الثاني: إذا باع أحدهما نصيبه من أجنبي بغير إذن الشريك جاز، وإن باع أحدهما نصيبه من صاحبه يجوز في الوجهين، ولا يجوز لأحدهما التصرف في نصيب شريكه إلا بإذن الشريك. (الفتاوى التاتارخانية، زكريا ٧/ ٤٥٨، رقم: ١٠٨٧٦)

اس تمہیدی گفتگو کے بعد اصل سوال کا جواب یہ ہے کہ باپ کی وفات کے بعد فوری طور پر وارثین کے درمیان میراث تقسیم کر لینے کا شرعی حکم ہے اور ہر وارث کو اپنا حصۂ میراث وصول کرنے کا حق ہے؛ لیکن بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ وارثین فوری طور پر میراث تقسیم کر کے الگ ہو جانا نہیں چاہتے؛ بلکہ باپ کے زمانہ میں جس طرح کاروبار چلتا آیا ہے اور جس طرح آپس میں رہن سہن مشترکہ طور پر رہتا ہوا آیا ہے، اسی طرح بدستور رکھنے پر راضی ہو جاتے ہیں، تو ایسی صورت میں سارے ورثاء کی طرف سے کاروبار کو بدستور جاری رکھنے

کے لئے عرفاً اور دلالۃً اجازت ہوجاتی ہے اور شریعت میں اجازت عرفی اور حکمی بھی اجازت حقیقی اور صریح کے درجہ میں ہوجاتی ہے؛ اس لئے والد کے پرانے کاروبار کو جو بیٹے سنبھال لیتے ہیں اور اس کو جاری رکھتے ہوئے اسی کاروبار سے گھر کا سارا خرچہ چلتا ہے اور پھر اس میں کچھ اضافہ بھی ہوجاتا ہے، تو اس اضافہ شدہ میں بھی سارے وارثین کا حق بدستور متعلق ہوتا جائے گا؛ لہٰذا اضافہ شدہ میں شادی شدہ بہنوں کا حق بھی متعلق ہوگا، اس لئے کہ ان کی طرف سے بھی اجازت حکمی اور عرفی پائی گئی ہے، اسی طرح نابالغ کا حق بھی اس اضافہ شدہ میں متعلق ہوجائے گا، اس طرح باپ کی موت کے بعد وارثین کی مشترکہ فیملی میں کاروبار کا سلسلہ شریف خاندانوں میں کثرت کے ساتھ چلتا رہتا ہے اور بعد میں جب تقسیم میراث کا مسئلہ سامنے آئے گا تو اسی طرح سارا سرمایہ میراث میں تقسیم ہوجائے گا، جس طرح باپ کی موت کے بعد تقسیم ہونا تھا اور اس میں یہ بات بھی یاد رکھنی ضروری ہے کہ وارثین میں سے کوئی بھی اپنا حق میراث لے کر درمیان سے الگ ہوجاتا ہے، تو اس کو اپنا حق لے کر الگ ہوجانے کا اختیار ہوگا؛ اس لئے کہ یہ شرکت، شرکت ملک ہے اور شرکت ملک میں ہر ایک شریک کو جب چاہے اپنا حق لے کر الگ ہوجانے کا اختیار ہوتا ہے۔ اور اس میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ اگر بعض ورثاء دیگر ورثاء کی اجازت کے بغیر سرمایہ لے کر الگ کاروبار کرتے ہیں، تو وہ غصب کے حکم میں ہوتا ہے، جس کا تفصیلی حکم سوال نمبر ۸ کے ذیل میں آرہا ہے اور سوال نامہ میں یہ بات جو اٹھائی گئی ہے کہ اگر سب کو برابر کا مالک قرار دیا جائے تو کاروبار کرنے والے بیٹوں کی محنت ضائع ہوتی ہے، یہ بات درست نہیں ہے؛ اس لئے کہ کاروبار کرنے والے بیٹوں کو ہر وقت یہ اختیار رہے کہ اپنا شرعی حصہ لے کر الگ ہوجائیں اور پھر اپنا الگ کاروبار کریں، اب اس مسئلہ سے متعلق جزئیات ملاحظہ فرمائیے:

وكذا لو اجتمع إخوة يعملون في تركة أبيهم ونما المال فهو بينهم سوية ولو اختلفوا في العمل والرأي. (شامي، زكريا ٦/ ٥٠٢، كراچی ٤/ ٣٢٥)

اورعلامہ شامیؒ نے دوسری جگہ اس مسئلے کو بہت وضاحت اور تفصیل کے ساتھ تحریرفرمایا ہے،ان کی عبارت ملاحظہ فرمایئے :

یقع کثیرا فی الفلاحین ونحوهم أن أحدهم یموت فتقوم أولاده علی ترکته بلا قسمة، ویعملون فیها من حرث وزراعة وبیع وشراء واستدانة ونحو ذلک، وتارة یکون کبیرهم هو الذي یتولی مهماتهم ویعملون عنده بأمره، وکل ذلک علی وجه الإطلاق والتفویض، لکن بلا تصریح بلفظ المفاوضة، ولا بیان جمیع مقتضیاتها مع کون الشرکة أغلبها أو کلها عروض لا تصح فیها شرکة العقد ولا شک أن هذه لیست شرکة مفاوضة خلافا لما أفتی به فی زماننا من لا خبرة له بل هي شرکة ملک کما حررته فی تنقیح الحامدیة، ثم رأیت التصریح به بعینه في فتاوی الحانوتي: فإذا کان سعیهم واحدا ولم یتمیز ما حصله کل واحد منهم بعمله یکون ما جمعوه مشترکا بینهم بالسویة، وإن اختلفوا في العمل والرأي کثرة وصوابا کما أفتی به في الخیریة. (شامي، زکریا ٦/ ٤٧٧-٤٧٨، کراچی ٤/ ٣٠٧)

اس میں یہ بات بھی یادرکھنی ضروری ہے کہ تقسیم میراث سے پہلے چلتا ہوا سرمایہ اور اس کی آمدنی سے کسی فرد نے اپنے نام سے کوئی جائیداد وغیرہ خریدی ہوتو تقسیم میراث کے وقت اس کی خریدی ہوئی جائیداد کی قیمت اس کے حصۂ میراث سے مجریٰ کر لینا ضروری ہوگا، جیسا کہ فقہاء کی اس طرح کی عبارتوں سے واضح ہوتا ہے،عبارت ملاحظہ فرمایئے:

وما اشتراه أحدهم لنفسه یکون له ویضمن حصة شرکائه من ثمنه إذا دفعه من المال المشترک، وکل ما استدانه أحدهم یطالب به وحده.

(شامي، زکریا ٦/ ٤٧٨، کراچی ٤/ ٣٠٧)

کسی وارث کا والد کے متروکہ سرمایہ کو لے کر اپنا کوئی کاروبار کرنا

سوال [٨]: کبھی ترکہ کی تقسیم سے پہلے بعض بیٹے والد کی متروکہ رقم لے کر اپنا کوئی

کاروبارشروع کردیتے ہیں، اس رقم سے ہونے والے کاروبار کی شرعاً کیا حیثیت ہوگی؟ کیا رقم کی حیثیت کی تعیین میں ورثاء کی رضامندی وعدم رضامندی کا کوئی فرق ہوگا؟

المستفتی: ادارۃ المباحث الفقہیۃ جمعیۃ علماء ہند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرحوم باپ کے ترکہ میں سے بعض بیٹے نے کچھ سرمایہ اور رقم لے کر اپنا ذاتی کاروبار شروع کردیا ہے اور یہ رقم تقسیم ترکہ سے پہلے لی گئی ہے، ایسی صورت میں مسئلے کے حکم شرعی کو سمجھنے کے لئے دو شکلیں ہمارے سامنے آتی ہیں:

شکل ۱: جس نے تقسیم میراث سے پہلے رقم یا سرمایہ لیا ہے، اس نے دیگر ورثاء سے کسی قسم کی اجازت اور رضامندی حاصل نہیں کی ہے، اس کے بغیر اس نے یہ سلسلہ شروع کردیا ہے، اس کے بعد اس نے اس سرمایہ کے ذریعہ سے اپنا کاروبار الگ سے شروع کردیا ہے، تو ایسی صورت میں اس کاروبار میں اگر کوئی نقصان اور خسارہ ہوتا ہے، تو وہ خود اس کا ذمہ دار بنے گا اور دیگر ورثاء کے حصوں کا ضامن بنے گا، اسی طرح اس کے کاروبار میں اگر کوئی نفع ہوا ہے تو وہ منافع بھی اسی کی ملکیت میں داخل ہوگا اور اس منافع میں دیگر ورثاء کا کوئی حق نہ ہوگا، نیز اگر اس نے سرمایہ لے کر اپنے نام سے کوئی جائیداد خرید لی ہے، تو وہ جائیداد بھی اس کی ملکیت ہوگی اور اس کے نفع نقصان کا تعلق اسی کی ذات کے ساتھ ہوگا، دیگر ورثاء کا اس سے کوئی تعلق نہ ہوگا، ہاں البتہ اگر اس نے اپنے حصۂ میراث کی مقدار سے زیادہ لیا ہے، تو نقصان کی صورت میں اس زیادتی کا ضامن وہی بنے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ماں باپ کی میراث میں اولاد کی شرکت شرکت ملک ہی کے دائرے میں داخل ہوتی ہے اور شرکت عقد کا اس شرکت میں کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے اور شرکت ملک میں ہر ایک شریک اپنے حصہ کا مستقل مالک ہوتا ہے، دوسرے شریک کے لئے کسی بھی شریک کے حصہ میں تصرف کا حق نہیں ہوتا ہے؛ لہٰذا بغیر اجازت کے دوسروں کے حصہ میں تصرف بحکم غصب ہوتا ہے اور غصب کی

صورت میں مال مغصوب میں نفع نقصان کا تعلق غاصب کے ساتھ ہوتا ہے، مغصوب منہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے، اسی لئے مذکورہ مسئلہ میں کاروبار کے نفع ونقصان کا تعلق اسی وارث کے ساتھ ہوگا جس نے دوسروں کی اجازت کے بغیر مال میراث میں تصرف کیا ہے، جیسا کہ حسب ذیل فقہی جزئیات سے واضح ہوتا ہے:

اس کو ''ہندیہ'' میں مختصر الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

لو تصرف أحد الورثة في التركة المشتركة وربح، فالربح للمتصرف وحده. (هندية قديم ٢/ ٣٤٦، جديد ٢/ ٣٤٣)

اس کو علامہ شامیؒ نے بھی مختصر الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

وما اشتراه أحدهم لنفسه يكون له ويضمن حصة شركاءه من ثمنه إذا دفعه من المال المشترك، وكل ما استدانة أحدهم يطالب به وحده.

(شامي، زكريا ٦/ ٤٧٨، كراچی ٤/ ٣٠٧)

اس کو ''شرح المجلۃ'' میں بہت واضح الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

إذا أخذ أحد الورثة مبلغا من نقود التركة قبل القسمة بدون إذن الآخرين، وعمل فيه وخسر كانت الخسارة عليه، كأنه إذا ربح لا يسوغ لبقية الورثة أن يقاسموه الربح، وكذا لو باشر العمل والسعي وصي القاصر فليس للأم وللورثة الكبار طلب حصتهم من الربح، حامدية: والأصل في هذا أن الغاصب والمستودع إذا تصرف فى المغصوب والوديعة فالربح له لا للمالك. (شرح المجلة لرستم باز ١/ ٦١٠، رقم المادة: ١٠٩٠)

اس کو ''ہندیہ'' میں اس طرح واضح فرمایا ہے کہ شرکت ملک میں ایک شریک دوسرے شریک کے حق میں اجنبی ہوتا ہے، اس کی اجازت کے بغیر کسی وارث کو تصرف کا حق نہیں ہوتا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

وركنها اجتماع النصيبين، وحكمها وقوع الزيادة على الشركة بقدر الملك، ولا يجوز لأحدهما أن يتصرف في نصيب الآخر إلا بأمره، وكل واحد منهما كالأجنبي في نصيب صاحبه.

(هندية، قديم ٢/ ٣٠١، جديد ٢/ ٣١١)

اور''الموسوعۃ'' میں مزیدوضاحت کے ساتھ لکھاہے کہ بغیراجازت کے ایک شریک کا دوسرے شریک کے حصے میں تصرف کرنا غصب کے حکم ہوتا ہے اور مال مغصوب میں نفع نقصان کا ذمہ دار غاصب ہی ہوا کرتا ہے، ملاحظہ فرمایئے :

ذهب الفقهاء إلى أنه في حضور الشريك لا ينتفع شريكه الآخر بالمال المشترك إلا بإذنه؛ لأنه بدون الإذن يكون غصبا، ويدخل في الإذن الإذن العرفي. (الموسوعة الفقهية ٢٦/ ٢٥)

اور''شرح مجلّہ'' میں دوسری جگہ بہت واضح الفاظ سے دونوں حکم نقل فرمایا ہے کہ نفع نقصان تصرف کرنے والے وارث سے متعلق ہوجائیں گے اوردوسرے ورثاء کی اجازت کے بغیرتصرف کرناغصب کے حکم میں ہوتا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

أما لو بذرها بغير إذن بقية الورثة فالغلة للزارع فقط، ولو كان البذر مشتركا كما صرح به في الحامدية ورد المحتار، ومفاده أنه يضمن لبقية الورثة مثل نصيبهم في الحبوب، وحصتهم من نقصان الأرض كما يستفاد من الفقرة الآتية، ولكن لو بذر أحدهم حبوب نفسه، فالحاصلات له خاصة لكنه يضمن لبقية الورثة حصتهم مما نقصت الأرض بزراعته. (شرح المجلة لرستم باز ١/ ٦٠٩، رقم المادة: ١٠٨٩)

شکل۲ : جس وارث نے تقسیم ترکہ سے پہلے غیرمنقسم مال میراث میں سے رقم یا سرمایہ لےکرکاروبارشروع کردیاہےاوراس نے دیگرورثاءکی اجازت کے بغیراپنے طورپر یہ کام نہیں کیا؛ بلکہ دیگرورثاء سے باضابطہ اجازت لےکرکاروبارشروع کیاہے، توایسی صورت

میں نفع ونقصان دونوں کا تعلق صرف اسی متصرف کی ذات کے ساتھ خاص نہیں رہے گا؛ بلکہ دیگر ورثاء بھی اس کے نفع ونقصان میں شامل ہوجائیں گے؛ لہٰذا جتنا نقصان ہوگا دیگر ورثاء بھی تناسب کے حساب سے اس نقصان کے بھگتان میں شامل ہوں گے، اسی طرح جو کچھ نفع ہوگا اس نفع میں بھی دیگر ورثاء تناسب کے حساب سے شامل اور شریک رہیں گے اور اس میں یہ بات بھی یاد رکھیں کہ دیگر ورثاء اس کے ساتھ شرکت عنان کے طور پر شریک ہوجائیں گے اور دوسرے ورثاء جب چاہیں گے ان کو معاملہ فسخ کرنے کا اختیار رہے گا، اور فسخ کرکے اپنا جو کچھ بھی حصہ ہے اس کو واپس لینے کا حق رہے گا؛ لہٰذا ہر وارث کا اختیار اس میں مکمل طور پر باقی رہے گا؛ لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ جب رضامندی کے ساتھ کاروبار شروع ہوا ہے، تو کاروبار کے حساب وکتاب کو مکمل کرنے کا موقع دینا بھی ضروری ہے۔

اس کو ''شرح مجلّہ'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

إذا بذر بعض الورثة الحبوب المشتركة بإذن الكبار أو وصي الصغار في الأراضي الموروثة تصير جملة الحاصلات مشتركة بينهم.

(شرح المجلة لرستم باز ۱/ ۶۰۹، رقم المادة: ۱۰۸۹)

''مغنی المحتاج'' کی عبارت اس مسئلے سے متعلق بہت واضح ہے، اس میں معاملہ کی نوعیت کو بھی واضح کردیا گیا ہے اور ہر وارث کے اختیار کو بھی بیان کردیا گیا ہے کہ ہر ایک وارث جب چاہے معاملہ فسخ کرکے اپنا حق واپس لے سکتا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

فإن ملكا مشتركا بإرث وشراء وغيرهما، وأذن كل للآخر في التجارة فيه تمت الشركة والحيلة في الشركة في العروض أن يبيع كل واحد بعض عرضه ببعض عرض الآخر ويأذن له في التصرف، ولا يشترط تساوى قدر المالين، والأصح أنه لا يشترط العلم بقدرهما عند العقد، ويتسلط كل منهما على التصرف بلا ضرر، فلا يبيع نسيئة ولا بغير نقد

البلد ولا بغبن فاحش، ولا يسافر به، ولا ببعضه بغير إذن، ولكل فسخه متى شاء. (مغنی المحتاج، بیروت ۳/ ۲۲۶-۲۲۷-۲۲۸)

ابتداء معاملہ کی نوعیت واضح نہ ہونا اور بعد میں شرکت عنان ہونا

سوال [۹]: جس کاروبار میں ابتداءً معاملے کی نوعیت متعین نہیں ہوتی اس میں نوعیت کی تعیین کن بنیادوں پر کی جائے گی؟ کیا اس سلسلے میں قرائن اور عرف کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے؟

المستفتی: ادارۃ المباحث الفقہیۃ جمعیۃ علماء ہند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس کاروبار میں ابتداءً معاملے کی نوعیت متعین نہیں ہوتی ہے اور بعد میں اس کی نوعیت کس اصول کی بنیاد پر متعین کی جائے گی؟ تو اس کی دو شکلیں ہمارے سامنے ہیں:

شکل ا : باپ کا چلتا ہوا کاروبار ہے اور بیٹے بڑے ہوکر جب کاروبار کے لائق ہوجاتے ہیں، تو بغیر کوئی معاملہ طے کئے ہوئے باپ کے کاروبار میں محنت کرنے لگتے ہیں، اسی طرح دیگر بیٹے بھی کاروبار میں لگتے جاتے ہیں اور محنت کرنے لگتے ہیں، تو ایسی صورت میں سارا کاروبار اور ساری پونجی باپ ہی کی ملکیت میں شمار ہوتی ہے، اس لئے کہ اولاد باپ کی فیملی اور عیال میں ہوتی ہے اور جب بعد میں باپ کو یہ احساس ہوتا ہے کہ چلتے ہوئے مشترکہ کاروبار میں فیصد کے اعتبار سے حصہ متعین ہونا چاہئے اور باپ اپنے بیٹوں کو پرسنٹ اور فیصد کے حساب سے کاروبار میں ریک کرتا جاتا ہے، تو ایسی صورت میں شرعاً شرکت کے اصولوں میں سے کس اصول کے دائرے میں ان کی یہ شرکت داخل ہوگی؟ تو اس سلسلے میں غور وخوض کرکے دیکھا گیا کہ یہ شرکت شرکت عنان میں شامل ہوگی اور اس

کے لئے شرط یہ ہے کہ باپ نے صراحت کے ساتھ بچوں کو اپنے کاروبار میں پاٹنر بنایا ہو اور اگر کوئی صراحت نہیں کی ہے تو صرف قرائن اور عرف کی وجہ سے اس طرح کے کاروبار میں بیٹے باپ کے پاٹنر نہیں بنتے ہیں؛ بلکہ سارا کاروبار باپ ہی کی ملکیت شمار ہوتا ہے؛ لہٰذا معاملۂ شرکت میں اس کاروبار کو شامل کرنے کے لئے صراحت کے ساتھ پاٹنری کا معاملہ طے کرنا لازم ہے، داخلی، خارجی اور قانونی کاغذات میں پاٹنری کی صراحت لازم ہے اور اس میں نفع ونقصان، رأس المال اور منافع کی مقدار کی تعیین، ہر چیز کی صراحت لازم ہے، اس کے بعد باپ کے ساتھ شرکت عنان کے طور پر کاروبار کی نوعیت متعین ہوسکتی ہے، جیسا کہ ذیل کی جزئیات سے واضح ہوتا ہے:

وتقوم دلالة الفعل مقام دلالة اللفظ، فلو أن شخصا ما أخرج جميع ما يملك من نقد وقال لآخر: اخرج مثل هذا واشتروما رزق الله من ربح فهو بيننا على التساوي أو لك فيه الثلثان ولي الثلث فلم يتكلم الآخر، ولكنه أخذ واعطى وفعل كما أشار صاحبه، فهذه شركة عنان صحيحة.
(الموسوعة الفقهية ٢٦/ ٤٢)

''والوالجیہ'' کی عبارت سے اس مدعی کی کافی واضح تائید ہوتی ہے، ملاحظہ فرمایئے:

وكذلك لو أشركه أحدهما في نصيبه ولم يبين في كم الشركة، ثم أشركه الآخر كان له النصف، ولهما النصف. (الفتاوى الولوالجية ٣/ ٣١)

شکل ۲: باپ اور بیٹے دونوں کی فیملی الگ الگ ہے، بیٹا باپ کی عیال میں نہیں رہتا ہے؛ بلکہ اس کا رہن سہن اور اس کی فیملی الگ ہے، اس حالت میں باپ بیٹے مل کر کوئی کاروبار شروع کردیں اور معاملہ کی نوعیت متعین نہ ہوئی ہو، پھر بعد میں لین دین کے درمیان احساس پیدا ہوا اور معاملہ کی نوعیت متعین کرنا اور نفع ونقصان کی تعیین اور اس کی مقدار کو متعین کرنا ضروری سمجھا جائے، تو ایسی صورت میں جب منافع کی مقدار متعین کریں گے تو شرکت

عنان کے دائرے میں داخل ہوکر متعین کیا جائے گا اور شرائط وضوابط جو بھی طے کئے جائیں گے اسی اصول کے دائرہ میں طے کئے جائیں گے، تو شرعا اس کے جواز کی گنجائش ہے، جیسا کہ حسب ذیل جزئیہ سے واضح ہوتا ہے:

أما شركة العنان فهي أن يشترك اثنان في نوع من التجارات بر أوطعام، أو يشتركان في عموم التجارات ولا يذكران الكفالة خاصة (وقوله) فتجوز هذه الشركة بين الرجال والنساء والبالغ والصبي المأذون والحر والعبد المأذون في التجارة والمسلم والكافر (وقوله) وأما شرط جوازها فكون رأس المال عينا حاضرا أو غائبا عن مجلس العقد لكن مشارا إليه، والمساوات في رأس المال ليست بشرط، ويجوز التفاضل في الربح مع تساويهما في رأس المال. (هندية قديم ۲/ ۳۱۹، جديد ۲/ ۳۲۵-۳۲۶)

باپ اور بیٹوں کے مابین مشترکہ کاروبار کے بنیادی اصول

سوال [۱۰]: باپ اور بیٹوں کے مابین مشترکہ کاروبار کے حوالے سے ایک ایسا واضح لائحۂ عمل تجویز فرمائیں جو شریعت کے اصول وضابطے کے مطابق ہو، نیز اس زمانے کے حالات میں اس کا نفاذ آسان ہو، تاکہ ان اصول اور ہدایات کی روشنی میں لوگوں کے لئے اپنے معاملات طے کرنا آسان ہو۔

المستفتی: ادارۃ المباحث الفقہیۃ جمعیۃ علماء ہند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: باپ اور بیٹوں کے مابین مشترکہ کاروبار سے متعلق بنیادی ضابطے اور اصول یہی سامنے آتے ہیں کہ باپ کی زندگی میں باپ اور بیٹے کے درمیان مشترکہ کاروبار سے متعلق ماقبل میں تفصیلی بحثیں سامنے آچکی ہیں، اصولی طور پر چار باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں:

(۱) بیٹا باپ کی عیال میں رہتے ہوئے باپ کے ساتھ کاروبار میں محنت کرتا ہے اور کوئی معاہدہ طے نہیں ہوتا ہے، تو ایسی صورت میں ساری کمائی اور سارا سرمایہ باپ کی ملکیت میں شمار ہوگا اور بیٹے کو باپ کا معاون قرار دیا جائے گا، جیسا کہ حسب ذیل جزئیات سے واضح ہوتا ہے:

الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيء فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله؛ لكونه معينا له. (شامي زكريا ٦/ ٥٠٢، كراچی ٤/ ٣٢٥، هندية قديم ٢/ ٣٢٩، جديد ٢/ ٣٣٢)

(۲) بیٹا باپ کی فیملی اور عیال میں نہیں رہتا ہے؛ بلکہ اس کا رہن سہن سب کچھ الگ ہے، پھر باپ کے ساتھ باپ کے کاروبار میں شریک ہوکر محنت کرتا ہے اور کوئی معاہدہ طے نہیں ہوتا ہے، تو ایسی صورت میں سارا کاروبار اور سارا سرمایہ باپ کی ملکیت میں شامل ہوگا اور بیٹے نے اگر اپنی محنت کے معاوضہ کا دعوی نہیں کیا ہے، تو اسے الگ سے کچھ نہیں ملے گا؛ بلکہ اس کی طرف سے محنت کا تبرع سمجھا جائے گا اور بیٹے کو باپ کا معاون قرار دے کر سارا سرمایہ باپ کی ملکیت قرار دینے کے لئے دو قیدیں اور شرطیں ملحوظ رکھنا ضروری ہے:

(۱) بیٹا باپ کی عیال اور باپ کی فیملی میں ہو اور باپ سے الگ نہ رہتا ہو۔

(۲) دونوں ایک ہی کاروبار میں شریک ہوں، دونوں کا کاروبار الگ الگ نہ ہو؛ لہٰذا اگر بیٹا باپ سے بالکل الگ رہتا ہو، پھر باپ کے ساتھ کاروبار میں محنت کرتا ہو، تو بیٹا من وجہ ایک اجنبی کے درجہ میں ہے اور من وجہ اجنبی بھی نہیں ہے، اس لئے اگر معاملہ طے نہیں ہوا ہے اور بیٹے نے کسی چیز کا مطالبہ بھی نہیں کیا ہے، تو من وجہ اجنبی نہ ہونے کی وجہ سے بیٹے کی طرف سے محنت کا تبرع سمجھا جائے گا۔ اور اگر بیٹے نے اپنی محنت کا مطالبہ کیا ہے، تو من وجہ اجنبی کے درجہ میں ہونے کی وجہ سے اس کو اجرت مثل ملے گی۔ ''شرح المجلہ'' میں مذکورہ دونوں شرطیں بہت واضح الفاظ میں نقل کی گئی ہیں، ملاحظہ فرمائیے:

إذا عمل رجل في صنعة هو وابنه الذي في عياله فجميع الكسب لذلك الرجل، وولده يعد معينا له، فيه قيدان احترازيان كما تشعر عبارة المتن، الأول: أن يكون الابن في عيال الأب، الثاني: أن يعملا معا في صنعة واحدة إذ لو كان لكل منهما صنعة يعمل فيها وحده فربحه له. (شرح المجلة لسليم رستم باز ۲/ ۷٤۱، رقم المادة: ۱۳۹۸)

اوراجرت مثل کی دلیل تنویرالابصار کی عبارت سے واضح ہوتی ہے، ملاحظہ فرمائیے:

وما حصله أحدهما بإعانة صاحبه فله ولصاحبه أجر مثله بالغا ما بلغ عند محمد، وعند أبي يوسف لا يجاوز به نصف ثمن ذلک، والربح في الشركة الفاسدة بقدر المال ولا عبرة بشرط الفضل. (تنوير الأبصار مع الشامي ٦/ ٥٠٢-٥٠٣، کراچی ٤/ ٣٢٥-٣٢٦)

(۳) بیٹا باپ کی فیملی میں رہتے ہوئے باپ کے ساتھ محنت کرتا ہے اور الگ سے کچھ سرمایہ اپنی طرف سے لگا دیتا ہے، تو اگر اس نے سرمایہ شرکت کے معاہدہ کے ساتھ لگایا ہے، تو اس کو اس کے معاہدہ کے مطابق کاروبار اور سرمایہ کے تناسب سے الگ سے منافع ملے گا؛ اس لئے کہ اس نے جب اپنی طرف سے الگ سے سرمایہ لگا دیا ہے اور باپ سے باضابطہ طور پر معاہدہ بھی کرلیا ہے، تو من وجہ اجنبی کے حکم میں ہوگیا ہے؛ لہٰذا طے شدہ معاملے کے مطابق شریک مان کر کے اس کو طے شدہ منافع ملتا رہے گا۔ اور اگر کاروبار کا کوئی معاہدہ نہیں ہے اور یوں ہی لگا دیا ہے، تو ایسی صورت میں بیٹے کی طرف سے سرمایہ کا سہارا لگانا تبرع سمجھا جائے گا، اس کو اتنا ہی مال ملے گا جتنا اس نے لگایا ہے، منافع میں اس کا الگ سے کوئی حصہ نہیں ہوگا؛ اس لئے کہ بیٹے نے باپ کی عیال اور فیملی میں رہ کر ہی سرمایہ لگا کر محنت کی ہے اور کسی قسم کا معاہدہ نہیں ہے۔

حصہ داری سے متعلق شامی کا حسب ذیل جزئیہ ملاحظہ فرمائیے:

اعلم أنهما إذا شرطا العمل عليهما إن تساويا مالا وتفاوتا ربحا جاز عند علمائنا الثلاثة خلافا لزفر، والربح بينهما على ما شرطا، وإن عمل أحدهما فقط وإن شرطاه على أحدهما فإن شرطا الربح بينهما بقدر رأس مالهما جاز. (شامي، زكريا ٦/ ٤٨٤، كراچی ٤/ ٣١٢)

اور باپ کا معاون قرار دینے کا جزئیہ ذیل میں ملاحظہ فرمایئے:

الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيء فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله؛ لكونه معينا له، ألا ترى لو غرس شجرة تكون للأب. (شامي زكريا ٦/ ٥٠٢، كراچی ٤/ ٣٢٥)

(۴) بیٹا باپ کی فیملی سے الگ رہتا ہے اور باضابطہ طور پر باپ کے ساتھ معاملہ طے کرکے شریک ہوتا ہے، تو طے شدہ معاملہ کے مطابق بیٹا کاروبار اور منافع میں شریک ہوگا اور اسی کے تناسب سے اس کو حصہ ملتا رہے گا؛ اس لئے کہ ایسی صورت میں بیٹا معاملہ اور لین دین میں ایک اجنبی کے درجہ میں ہو چکا ہے، صرف باپ کا معاون ثابت نہیں ہوگا؛ کیوں کہ باپ کا معاون قرار دینے کے لئے باپ کی عیال اور فیملی میں ہونا شرط ہے اور وہ شرط یہاں نہیں ہے:

أما الأول: وهو الشركة بالأموال، فهو أن يشترك اثنان في رأس مال فيقولان: اشتركنا فيه على أن نشتري ونبيع معا أو شتى أو أطلقا على أن ما رزق الله عز وجل من ربح فهو بيننا على شرط كذا، أو يقول أحدهما ذلك ويقول الآخر نعم. (بدائع الصنائع، زكريا ٥/ ٧٣، هندية قديم ٢/ ٣٠٢، جديد ٢/ ٣١١)

یہ بات بھی یاد رکھنی ضروری ہے کہ باپ کی زندگی میں باپ بیٹے کی شرکت شرکت عقد ہی میں شامل ہوتی ہے اور اس میں عام طور پر شرکت عنان ہی کے اصول وضوابط جاری ہوتے ہیں اور شرکت مفاوضہ کے شرائط کی پابندی مشکل ہو جاتی ہے اور باپ کے انتقال کے بعد میراث میں اولاد کی شرکت شرکت ملک کے اصول کے دائرہ میں داخل ہوتی ہے۔

الشركة في الأصل نوعان: شركة الأملاك، وشركة العقود، وشركة

الأملاک نوعان: نوع يثبت بفعل الشريكين، ونوع يثبت بغير فعلهما، أما الذي يثبت بفعلهما فنحو أن يشتريا شيئا أو يوهب لهما أو يوصى لهما أو يتصدق عليهما فيقبلان فيصير المشترى والموهوب والموصى به والمتصدق به مشتركا بينهما شركة ملک. (بدائع الصنائع، زكريا ٥/ ٧٣)

❁❁❁

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا ☆ عَلٰى حَبِيْبِکَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

اَللّٰهُ أَكْبَر كَبِيْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا وَسُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَأَصِيْلاً. الحديث

(المعجم الكبير ٢/ ١٣٥، برقم: ١٥٧٠)

(مفتی) شبیر احمد قاسمی

خادم الحدیث والافتاء جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد (یو-پی)

بروز بدھ ۲۶/صفر ۱۴۳۷ھ

(٣) باب شرکۃ الوجوہ

باپ کی فیملی میں رہ کر مشترکہ کمائی کی تقسیم

سوال [٨٨٩٩]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید، عمر، بکر، حارث چاروں حقیقی بھائی ہیں اور باپ کی موجودگی میں گھر باہر کے جملہ کاروبار مشترکہ ہوتے ہیں، ابھی تک کسی طرح کا کوئی متعین بٹوارہ نہیں تھا، اول الذکر تینوں بھائیوں نے باہر رہ کر ملازمت وغیرہ سے جو جائیداد بنائی ہے اچانک کہتے ہیں کہ ہم آخر الذکر کو کوئی بھی حصہ نہ دیں گے، اس طرح آخر الذکر باوجود یکہ مشترکہ کاروبار میں تھا اور اس نے گھر کے جملہ مع زراعت کے تمام امور انجام دیتا رہا، اس جائیداد سے محروم ہوجاتا ہے، کیا شریعت محمدی میں حصہ ہے یا نہیں اور اگر وہ لوگ حصہ نہیں دیتے ہیں، تو کیا باپ اپنی جائیداد میں سے حارث کو بطور معاوضہ اس جائیداد کے جس سے محروم ہورہا ہے کچھ زائد دے سکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عبداللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: باپ کی فیملی میں رہ کر چاروں لڑکوں نے کم وبیش جو کچھ بھی کمایا ہے، وہ سب باپ کی ملکیت ہے، بیٹوں میں سے کسی کی ملکیت نہیں ہے؛ لہٰذا لڑکوں میں سے کسی کا یہ کہنا کہ فلاں جائیداد میری ہے، اس میں کسی کا حصہ نہیں ہے یا فلاں فلاں جائیداد فلاں کی ہے اور فلاں کی نہیں ہے، یہ جائز نہیں ہے؛ بلکہ ساری ملکیت باپ کی ہے، یہ حق باپ کو پہونچ سکتا ہے کہ اس میں سے کچھ چیز لے کر کے کسی کے لئے خاص کردے، مگر لڑکوں میں سے کسی کو یہ حق نہیں ہے، اگر باپ کی زندگی میں جائیداد تقسیم

ہو جائے، تو چاروں لڑکوں کو برابر برابر دینا ضروری ہے۔

عن عامر قال: سمعت النعمان بن بشير وهو على المنبر يقول أعطاني أبي عطية، فقالت: عمرة بنت رواحة: لا أرضي حتى تشهد رسول الله صلى الله عليه وسلم: فأتي رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال: إني أعطيت ابني من عمرة بنت رواحة عطية، فأمرتني أن أشهدك يارسول الله! قال: أعطيت سائر ولدك مثل هذا؟ قال: لا، قال: فاتقوا الله واعدلوا بين أولادكم، قال: فرجع فرد عطيته. (صحيح البخاري، باب الإشهاد في الهبة، النسخة الهندية ۱/۳۵۲، رقم:۲۵۱۵-۲۵۸۷)

الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيء، فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله لكونه معينا له. (شامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحدة......زكريا ۶/۵۰۲، كراچي ۴/۳۲۵، هندية، زكريا قديم ۳/۳۲۹، جديد ۲/۳۳۲)

وفي الخانية: لابأس بتفضيل بعض الأولاد في المحبة؛ لأنهما عمل القلب، وكذا في العطايا. (در مختار مع الشامي، كتاب الهبة، زكريا ۸/۵۰۱، كراچي قاضيخان، زكريا جديد ۳/۱۹۳، وعلى هامش الهندية ۳/۲۷۹، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ۳/۴۹۷، مصري قديم ۲/۳۵۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶؍رجب المرجب ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/۷۷۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶/۷/۱۴۲۳ھ

والد صاحب کے زیر سایہ اولاد کاروبار کرے، تو مالک کون؟

سوال [۸۹۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) عمر نے بچپن سے شادی تک جو کچھ کمایا ماں باپ کو دیا، شادی کے بعد عمر

نے جویا سے آ کر دین نگر پور دوکان کرلی، دوکان میں لگانے کے لئے عمر نے والد صاحب سے صرف ۳/ ہزار روپیہ لیا باقی چار ہزار قرض لے کر عمر نے دوکان کرلی، دوکان پر والد صاحب اور عمر رہتے ہیں والد صاحب کبھی عمر کے پاس دس بیس دن رکتے کبھی گھر چلے جاتے، دوسال پہلے والد صاحب عمر کے چھوٹے بھائی کو بھی لے آئے؛ جبکہ دوکان پر اتنا کام نہیں تھا، ایک ڈیڑھ سال عمر کا چھوٹا بھائی بھی آتا جاتا رہا، عمر والد صاحب کو اور چھوٹے بھائی کو پورا خرچ دیتا رہا، یہاں تک کہ گھر کا پورا خرچ دیتے ہوئے عمر نے گھر کے خرچ سے الگ چھوٹے بھائی کی شادی میں ۲۰/ ہزار روپیہ اٹھایا، اور ۱۰/ ہزار والد صاحب کو نقد دیا، مکان کی تعمیر کے لئے؛ جبکہ عمر نے صرف ۳/ ہزار لیا تھا، پھر عمر نے ایک مکان خریدا جو کہ عمر نے اپنے نام کردیا، کچھ کہاسنی ہونے کے بعد والد صاحب کا کہنا ہے کہ مکان اپنے چھوٹے چاروں بھائیوں کے نام کرادو، ورنہ تو اپنے بھائیوں کا حق ماررہا ہے، کیا واقعی عمر کے بھائیوں کا حق ہے؟ دوکان اور مکان میں؛ جبکہ عمر نے مکان ۴۰/ ہزار روپیہ قرض لے کرلیا ہے جو کہ عمر کو ہی دینا ہے؟

(۲) عمر کے تین بچے ہیں والد صاحب کا کہنا ہے کہ تو نے بی بی کے کہنے میں آ کر مکان اپنے نام کرالیا ہے؛ لہٰذا اس کو چھوڑ دے؛ جبکہ عمر کی نگاہوں میں ہندہ کی کوئی غلطی نہیں، عمر ہندہ کو چھوڑنا یوں نہیں چاہتا ہے کہ ہندہ کے والد اس لائق نہیں کہ ہندہ کا ایک روز کا خرچ بھی اٹھاسکیں، بہت ہی غریب ہیں، والد صاحب کا کہنا ہے کہ اگر تو اس کو نہیں چھوڑے گا، تو میں ناراض ہوں؛ جبکہ ہندہ تین بچوں کی ماں ہے اور چار ماہ کے حمل سے ہے عمر کیا کرے؟ مہربانی فرما کر بتائیے۔

المستفتی: انیس احمد، دین نگر پور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب عمر کا باپ بھی دوکان میں بیٹھا کرتا تھا، اور بھائی بھی بیٹھا کرتا تھا اور سوال نامہ کے سیاق وسباق سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عمر باپ

کی فیملی سے الگ بھی نہیں ہے؛ تو جو کچھ بھی آمدنی حاصل ہو رہی ہے، وہ سب باپ کی ملکیت میں داخل ہوگی اور باپ کے بعد سب اولاد اس میں برابر کی شریک ہوں گی؛ اس لئے عمر کا اپنے نام کرالینا درست نہیں ہوگا۔

الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيئ، فالكسب كله للأب، إن كان الابن في عياله لكونه معينا له. (شامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ......زكريا ٦/ ٥٠٢، كراچي ٤/ ٣٢٥، هندية، زكريا قديم ٣/ ٣٢٩، جديد ٢/ ٣٣٢)

نیز اگر بیوی کی طرف سے کوئی نشوز اور تعدی نہیں ہے اور باپ کے حکم سے بیوی کو طلاق دینے سے معصیت میں مبتلا ہونے اور بچوں کی پرورش میں دشواری اور ان کے بے سہارا ہونے کا خطرہ ہے، تو بیوی کو طلاق نہ دینے سے عمر گنہگار نہ ہوگا اور طلاق کے علاوہ دیگر مطالبات پورے کر کے باپ کو راضی کرنے کی کوشش کرنا عمر پر لازم ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲ رشعبان المعظم ۱۴۱۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۳۲۰)	۱۴۱۱/۸/۲ھ

باپ بیٹے یکجا محنت سے کمائیں تو مالک کون؟

سوال [۸۹۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کے پانچ لڑکے ہیں، جن میں سے بڑا لڑکا شادی ہونے کے بعد الگ ہوگیا، الگ ہونے کے وقت زید کے پاس صرف ایک مکان تھا، زید کے گھر ڈاکہ پڑا چوری ہوئی؛ اس لئے گھر میں کچھ نہیں رہا، اس کے بعد فصل کٹی، جو گیارہ سو روپیہ کی ہوئی، اسی میں سے کٹائی کے اور دوسرے خرچ ہوئے، جس کے بعد بہت کم پیسے بچے جو نہ ہونے کے درجہ میں ہیں، بڑے لڑکے نے الگ ہو کر زمین خرید کر مکان بنایا، باپ نے بھی باقی لڑکوں کے ساتھ مل کر ایک مکان کی جگہ لی، بڑے بھائی نے اس جگہ میں کچھ پیسہ نہ دیا۔

اب بڑا بھائی اس جگہ میں اپنا حق مانگتا ہے، جو اس کے الگ ہونے کے بعد زید نے خریدا تھا، بڑے لڑکے کا اس جگہ میں جو کہ اس کے الگ ہونے کے بعد میں لی گئی تھی حصہ نکلتا ہے یا نہیں؟ جبکہ بڑا بھائی اپنے الگ کے خریدے ہوئے مکان میں سے چھوٹے بھائیوں کو کچھ نہیں دے رہا ہے۔

المستفتی: مختار احمد، میاں سرائے، سنبھل مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چھوٹے بھائیوں نے باپ کے ساتھ مل کر جو جائیداد باپ کی فیملی میں رہ کر باپ کے نام پر خریدی ہے اور باپ کی ملکیت میں رہنے کی حالت میں باپ کا انتقال ہوا ہے، تو اس جائیداد میں بڑے بھائیوں کا بھی حصہ ہے، مگر باپ کی زندگی میں کوئی حصہ نہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۴/ ۳۴۵)

أب وابن يكتسبان في صنعة واحدة، ولم يكن لهما مال، فالكسب كله للأب، إذا كان الابن في عيال الأب؛ لكونه معينا له. (هندية، كتاب الشركة، الباب الرابع في شركة الوجوه، زكريا جديد ٢/ ٣٣٢، قديم ٢/ ٣٢٠، شامي، زكريا ٦/ ٥٠٢، كراچي ٤/ ٣٢٥)

أما بيان الوقت الذي يجري فيه الإرث...... قال مشايخ بلخ الإرث يثبت بعد موت المورث. (البحر الرائق، كتاب الفرائض، زكريا ٩/ ٣٦٤، كوئٹه ٨/ ٤٨٨) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۱/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۱۳۵)

کیا والد صاحب کے ساتھ شرکت کی بناء پر لڑکا تمام جائیداد کا مالک ہوگا؟

سوال [۸۹۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ **الحمد للہ** ہمارے والدین حیات ہیں، ہم چار بھائی اور ایک بہن ہے، ہمارے والد صاحب کا قصبہ ہنگو لی میں کھیت تھا، جسے بڑے دو بھائیوں نے زبردستی بیچ کر شہر اورنگ آباد میں ایک 30*20 کا مکان خریدا تھا، ۱۹۹۸ء میں اس وقت اس کی قیمت تین لاکھ ۲۵/ ہزار روپئے تھی بقول ان دونوں بھائیوں کے، اس کے علاوہ قصبہ ہنگو لی میں والد صاحب اور ہم تین بھائی سوائے دونمبر کے بھائی کے ہم لوگ سالانہ ٹھیکے پر ایک مارواڑی کی کھیتی کیا کرتے تھے، جس میں ترکاری وغیرہ اگائی جاتی تھی، خصوصاً پھول گوبھی زیادہ تر، سب لوگ اجتماعی طور پر اپنی اپنی ذمہ داریوں کے حساب سے کام کرتے تھے۔

الحمد للہ سب کچھ اچھا چل رہا تھا، ہمارے والد صاحب کھیت میں کام کے اوقات کے علاوہ گوبھی کا پتہ (جسے بکریاں کھاتی ہیں) اور گھاس نکال کر بیچتے تھے، والد صاحب نے یہ پیسے حج کی نیت سے جمع کر رکھے تھے، جس کی وجہ سے والد صاحب اور بڑے بھائی میں اکثر بحث ہوا کرتی تھی، والد صاحب نے بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے بڑے بھائی صاحب کے ہاتھ میں پورا کاروبار دے دیا تھا؛ اس لئے کہ والد صاحب پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے، پھر والد صاحب نے قصبہ ہنگو لی میں جس گھر میں ہم رہ رہے تھے، ناکافی ہونے کی وجہ سے دوسرا گھر خریدا ان گھاس کے پیسوں سے ۱۹۹۶-۱۹۹۵ء میں گھر خریدنے کے بعد والد صاحب نے ہی کھیت کے پڑوس میں اینٹوں کی بھٹی والوں سے چارے کے عوض گھر تعمیر کے لئے ہزاروں اینٹیں خریدیں، پھر الحمد للہ اجتماعی طور پر گھر کی تعمیر مکمل ہوئی، ۱۹۹۷ء میں سب لوگ نئے گھر میں رہنے لگے۔ واضح ہو کہ دوسرے نمبر کے بھائی صاحب نے ہنگو لی میں گھر کے تعمیر کے لئے ایک روپیہ بھی نہیں دیا بقول بڑے بھائی کے، اب والد صاحب نے تقسیم کا ذکر بڑے بھائیوں سے کیا، تو دونوں بھائی حساب بتانے لگے، نمبر ایک بھائی کا کہنا ہے کہ قصبہ ہنگو لی کا گھر میری کمائی سے بنا ہے اور آخری دو چھوٹے بھائیوں نے کچھ بھی کما کر نہیں دیا اور میں نے والدین کی بیماری میں ایک لاکھ سے زیادہ خرچ کیا اور دونوں چھوٹے بھائیوں کی شادیاں بھی کی ہیں؛ اس لئے قصبہ ہنگو لی کا گھر پورا میرا ہے، کسی کا کوئی حصہ نہیں۔

مفتی صاحب ہم دو چھوٹے بھائی ضرور کمانے کے قابل نہ تھے؛ لیکن والد صاحب اور ہم سب مل کر کھیت میں کام کیا کرتے تھے اور پورا حساب بڑے بھائی کے پاس ہوتا تھا، اس لئے وہ پورا حق اپنا ہی سمجھ رہے ہیں، اس کے بعد دوسرے نمبر کے بھائی صاحب کا کہنا ہے کہ اورنگ آباد کے گھر میں میں نے ۸۰؍ ہزار روپئے دیئے تھے، اور ان کا کہنا ہے کہ میں نے والدین کو دو لاکھ پچاس ہزار روپئے لگا کر حج کروایا ہے؛ اس لئے دوسرے نمبر کے بھائی اورنگ آباد کے گھر پر قبضہ کر کے بیٹھ گئے۔ واضح ہو کہ دوسرے نمبر کے بھائی نے ملت ندوہ سے فراغت کے بعد علوم عصریہ بھی پاس کیا ہے۔ اور ۱۹۹۰ء سے سرکاری نوکری پر مامور ہیں، یہ مولوی صاحب مہمانوں کی دعوت کا خرچ بھی والد صاحب کو بتاتے ہیں اور والد صاحب سے بحث کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اپنی قابلیت پر تعلیم حاصل کی آپ کا اس میں کچھ بھی تعاون نہیں ہے، اس وجہ سے والد صاحب ان سے سخت ناراض ہیں، مولوی صاحب کی کارگذاری اس لئے بیان کردیا ہے کہ یہ بندہ علوم دینیہ سے اچھی طرح واقف ہے؛ اس لئے والد صاحب کو ان سے صحیح انصاف کی امید تھی؛ لیکن تدبیر الٹی ہوگئی؛ اس لئے کٹھن مسئلہ کا حل آپ جیسے اہل علم حضرات سے دریافت کیا جارہا ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کا جواب تحریر فرمائیں۔ یہ تحریر میرے والدین کے حکم سے لکھی گئی ہے۔

المستفتی: حافظ محمد عبدالواحد، روشن گیٹ، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کے بھائیوں نے آپ کے والد صاحب کے کھیت کو بیچ کر اورنگ آباد میں جو مکان خریدا ہے اور آپ کے والد صاحب نے جو دوسرا گھر گھاس کے پیسوں سے خریدا ہے اور اسی طرح مشترکہ کاروبار میں جو کچھ نفع ہوا ہے، گرچہ اس کا حساب وکتاب آپ کے بڑے بھائی کے پاس تھا؛ لیکن ان سب کے مالک آپ کے والد صاحب ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ والد صاحب کی فیملی میں رہ کر کے انہی کی سرپرستی میں ساری جائیداد خریدی گئی ہے؛ اس لئے سب کے مالک والد ہی ہوں گے اور کسی بھی بیٹے کا یہ کہنا کہ فلاں فلاں وجہ سے فلاں جائیداد کا میں مکمل مالک ہوں درست نہیں ہے اور والد صاحب کے انتقال کے بعد چھوٹے بڑے سب بھائی اور بہنیں ساری جائیداد میں شرعی حصہ کے حقدار ہوجائیں گے۔

الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيئ، فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله لكونه معينا له، ألاترىٰ لو غرس شجرة تكون للأب وبعد أسطر. وفي الخانية: زوج بنيه الخمسة في داره وكلهم في عياله، واختلفوا في المتاع فهو للأب، وللبنين الثياب التي عليهم لا غير. (شامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ولا يعلم التفاوت...... زكريا ٦/٥٠٢، كراچي ٤/٣٢٥، هندية، زكريا ٢/٣٣٢، جديد ٢/٣٣٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۰۴۸)

والد کی فیملی میں رہ کر کمایا ہوا مال کس کی ملکیت ہے؟

سوال [۸۹۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کسی شخص کے پانچ بیٹے ہوں اور وہ شخص اپنے دو بڑے بیٹوں کو جو زیر تعلیم نہ ہوں اپنا کاروبار سونپ دے اور بیٹے اس کاروبار کو بہتر کرلیں، جس سے تمام اخراجات شادی بیاہ وغیرہ کے پورے ہونے لگے ہوں؛ لیکن اس شخص کی بیوی اپنے شوہر سے بات بات پر یہ کہہ کر لڑنے لگے کہ میرا خرچ تمہارے ذمہ تھا، تم میرا خرچ نہیں اٹھا رہے ہو، میں اپنی

اولاد کی کمائی کھارہی ہوں اوراولاد سے ہروقت شوہر کی برائی کرنے لگے، یہ کہہ کرلڑنے لگے کہ مزدوری بھی کرتے تو ۶۰ / ۷۰ روپیہ تازہ آمدنی گھر میں آتی اس طرح فقرے کستی رہتی ہو، اس کی ہروقت کی لڑائی نے گھر کوجہنم بنادیا ہو، اگرکہیں جاتی ہوتووہاں سےفون پر کہتی ہوکہ تمہاراباپ جیسا کہےاس کا الٹا کرنا، جس نےحق زوجیت کی ادائیگی سے بھی انکار کردیا ہو، شوہر کی طرف سے کھانے پینے کاقطعی دھیان نہ دیتی ہو، شوہرخود لےکرکھانا کھاتا ہو، اس کے برعکس نماز کی پابندی تلاوت قرآن بھی کرتی رہتی ہو، ایسی عورت کا اسلام میں کیا مقام ہے؟ شریعت کا کیا حکم ہے؟

(۱) اولاد کس کی مانی جائے گی؟

(۲) اولاد کی کمائی کس کی مانی جائے گی؟

(۳) کیاماں کااثر بیٹی میں آتا ہے؟

المستفتی: محمد شمیم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب باپ نے کاروبار بیٹوں کوسونپ دیا اور بیٹے باپ کی فیملی میں رہ کرکاروبار بڑھارہے ہیں، توایسی صورت میں بیٹوں کی تمام کمائی باپ کی ملکیت ہےاورعورت کا یہ کہنا غلط ہے کہ شوہر کی نہیں اولاد کی کمائی کھارہی ہے؛ بلکہ اولاد جوکچھ کمارہی ہے، وہ سب باپ ہی کی ملکیت ہوتی ہے، تو یہ کہا جائے گا کہ عورت شوہر کی ہی کمائی کھارہی ہے۔

الأب و ابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيئ، فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله لكونه معينا له. (شامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ولا يعلم التفاوت……زكريا ٦/٥٠٢، كراچي ٤/٣٢٥، هندية، زكريا قديم ٢/٣٢٩، جديد ٢/٣٣٢)

اوراولاد ماں باپ دونوں کی ہوتی ہے، مگر حسب ونسب کے اعتبار سے باپ کی مانی جاتی ہے، اگر ماں کی تربیت میں رہتی ہے، تو بیٹی میں ماں کا اثر ہوتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ذی قعدہ ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۶۰۳/۳۷)

کیا بیٹے کی رقم سے خریدی گئی جائیداد والد صاحب کی ہی ملک ہوگی؟

سوال [۸۹۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے پردادا مرحوم نے کوئی جائیداد اپنے تین بیٹوں اور دو بیٹیوں میں سے کسی ایک بیٹے کے پیسہ سے خریدی ہو اور رجسٹری بھی باپ کے نام ہو، تو کیا ان کے انتقال کے بعد اس جائیداد میں باقی بیٹے بیٹیاں یا ان کی اولادیں بھی حقدار ہوں گی یا نہیں؟ یا صرف وہی بیٹا اور اس کی اولادیں حقدار ہوں گی جس کی رقم سے وہ جائیداد خریدی گئی ہے؟

نوٹ: واضح ہو کہ جس بیٹے کے پیسے سے باپ نے زمین خریدی ہے، وہ بیٹا باپ ہی کے ساتھ رہتا تھا کاروبار اور کھانا پینا ایک ساتھ تھا۔

المستفتی: جنید الحق ولد خورشید الحق، قاضی ٹولہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس بیٹے کی رقم سے باپ نے وہ جائیداد خریدی ہے؛ چونکہ اس کا کاروبار کھانا پینا باپ ہی کے ساتھ تھا؛ اس لئے وہ جائیداد باپ ہی کی ملک ہوگی اور اس کے شرعی ورثاء یعنی تینوں بیٹوں اور دونوں بیٹیوں کے درمیان وہ جائیداد حق شرعی کے مطابق تقسیم ہوگی۔ تنہا اس کا یا اس کی اولاد کا حق نہیں ہے؛ بلکہ پردادا کی تمام اولاد کا حق اس سے متعلق ہے۔

الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيئ، فالكسب كله للأب، إن كان الابن في عياله؛ لكونه معينا له.

(شامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ولا يعلم التفاوت زكريا ٦/٢ ٥٠، كراچي ٤/٣٢٥، هندية، زكريا قديم ٢/٣٢٩، جديد ٢/٣٣٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶؍رجب المرجب ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۴۴۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۷/۶ھ

باپ کی فیملی میں رہتے ہوئے حاصل شدہ جائیداد میں دیگر ورثاء کا حق

سوال [۸۹۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عمرو کے دولڑکے پانچ لڑکیاں اور ایک بھائی ہے، کچھ سالوں پہلے کی بات ہے کہ جب عمرو اور اس کا بھائی ایک دوکان اور زمین وگھر میں شریک تھے، پھر ایک لڑکا زید اپنے باپ و چچا کے ساتھ دوکان وکھیت کے کاموں میں اس شرط کے ساتھ لگ گیا کہ آئندہ جونئی جائیداد خریدی جائے گی، اس میں اس کا تیسرا حصہ ہوگا، لڑکیاں بھی دوکان کے کاموں میں تعاون کرتی تھیں اور دوسرا بھائی بھی کچھ سالوں کے بعد دوکان وکھیت کے کام میں لگ گیا، زید اس کی بیوی بچہ عمرو اور لڑکیاں دوسرا لڑکا بھائی بھاوج تمام ایک ساتھ رہتے تھے، عمرو نے مرنے سے پہلے تمام لڑکیوں اور لڑکوں سے کہا کہ تم بھائی بہن آپس کی رضامندی سے جائیداد تقسیم کرلو، تقسیم کے وقت زید اپنی شرط کے مطابق نئی خریدی گئی جائیداد سے تیسرا حصہ لینے پر مصر ہے، تو سوال یہ ہے کہ زید کی یہ شرط لگانا صحیح ہوگا؛ جبکہ پورا خاندان ایک ساتھ رہتا تھا اور کیا اس کا اصرار کرنا جائز اور صحیح ہے۔

المستفتی: انس نواپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: باپ کی زندگی میں اگر بیٹا باپ کی فیملی میں شامل تھا، یعنی اس کا کھانا پینا باپ کے ساتھ رہتا تھا، تو بیٹے کی کمائی باپ کی ملک قرار دی جائے گی اور چچا کے ساتھ جس شرط پر کاروبار شروع کیا تھا، وہ چچا کے ساتھ حساب وکتاب میں تیسرا شریک ہوگا اور ۳/۱ حصہ بیٹے کو ملکر باپ کی ملکیت میں شامل ہوجائے گا اور باپ کے انتقال کے بعد تمام ورثاء بقدر حصص برابر کے شریک ہوں گے۔

وقدمنا أن هذا ليس شركة مفاوضة ما لم يصرحا بلفظها، أوبمقتضياتها مع استيفاء شروطها، ثم هذا في غير الابن مع أبيه لما في القنية الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيئ، فالكسب كله للأب، إن كان الابن في عياله؛ لكونه معينا له. وفي الخانية: زوج بنيه الخمسة في داره وكلهم في عياله، واختلفوا في المتاع فهو للأب، و للبنين الثياب التي عليهم لا غير. (شامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ولا يعلم التفاوت فهو بينهما بالسوية، زكريا ٦/٢ ٥٠، كراچي ٤/ ٣٢٥، هندية، جديد زكريا ٢/ ٣٣٢، قديم ٢/ ٣٣٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰ر محرم الحرام ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۶۲۴/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۱/۱۰ھ

والد صاحب کے ساتھ مل کر حاصل کردہ آمدنی میں سبھی ورثاء کا حق ہے

سوال [۸۹۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) میرے والد صاحب کی دوکان مٹھائی کی ہے، میں ان کی زندگی سے ان کے ساتھ کام کیا کرتا تھا، انہوں نے مجھے کام سکھایا اور عرصہ تک ان کے ساتھ رہا،

کافی عرصہ کے بعد انہوں نے اپنی رضا مندی سے مجھے دوکان اور بہار دانہ دید یا اور میں اس کو استعمال کرتا رہا۔

اب میرے برادران مجھ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ بہار دانہ کی تقسیم کی جائے، اس کا جواب تحریر فرمائیں۔

(۲) میرے برادران چاہتے ہیں کہ دوکان کی پگڑی لےکر سارے بھائیوں میں تقسیم کی جائے؟

(۳) جو رقم میں نے دوکان کی مرمت وغیرہ میں صرف کی ہے وہ رقم مالک جائیداد سے لی جائے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عرفان، محلّہ بھٹی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: (۱) آپ اپنے والد کی زندگی میں ان کے ساتھ مل کر جو دوکان کررہے تھے، وہ درحقیقت والد ہی کی ملک شمار کی جائے گی؛ لہٰذا ان کے انتقال کے بعد تمام برادران دوکان اور بہاردانہ وغیرہ میں برابر کے حقدار ہوں گے اور باپ کی طرف سے شرعی ضابطہ کے مطابق آپ کو ہبہ کر کے قبضہ دیدینا اور باپ کا قبضہ سے دست بردار ہوجانا ثابت نہیں ہے؛ اس لئے تنہا آپ مالک نہیں ہوں گے۔

الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيئ، فالكسب كله للأب، إن كان الابن في عياله؛ لكونه معينا له. (شامي، زكريا٦/٥٠٢، كراچي ٤/٣٢٥)

(۲) دوکان کے ذریعہ پگڑی یا کوئی بھی چیز مل جائے اس کے حقدار آپ تنہا نہیں ہیں، ہر چیز میں سبھی ورثاء کا حق متعلق ہوتا ہے۔

استحباب التسوية بين الأولاد في الهبة فلا يفضل بعضهم على بعض. (شرح الطيبي بيروت٦/ ١٨٠)

(۳) آپ نے اگر مالک دوکان کی اجازت سے معاملہ طے کرکے مرمت کی ہے کہ اس میں جو خرچ ہوگا وہ کرایہ میں مجریٰ ہوگا یا مالک دوکان سے لیا جائے گا، تو مالک جائیداد سے اس خرچ کا مطالبہ کرنے کا حق ہے اور اگر مالک کی اجازت اور معاملہ طے کئے بغیر آپ نے خرچ کیا ہے، تو مالک جائیداد سے اس خرچ کے مطالبہ کا حق نہیں ہے، ہاں البتہ یہ خرچ تمام ورثاء کے حصہ میں منقسم کردینا درست ہے۔

فإن كفل بأمره رجع بما أدىٰ عليه؛ لأنه قضىٰ دينه بأمره، وإن كفل بغير أمره لم يرجع بمايؤديه؛ لأنه متبرع بأدائه. (هداية، كتاب الكفالة، اشرفي بكڈپو ديوبند ۳/۱۱۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ ذی قعدہ ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۵۹۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/۱۱/ ۱۴۲۵ھ

ایک ہی فیملی میں رہ کر خریدی گئی جائیداد کا حکم

سوال [۸۹۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہم لوگ ۴/ بھائی اور دو بہنیں تھے، ایک بہن کا کافی عرصہ قبل انتقال ہو چکا ہے، ہم لوگوں کے آبائی مکان سے ملحق ایک قطعۂ آراضی ایک صاحبہ کا تھا، وہ اس کو فروخت کر رہی تھیں، تو ہمارے ماموں نے وہ حصہ خرید کر ہم لوگوں کو دیدیا تھا، اور یہ بھی کہدیا تھا کہ یہ سب بھائی بہنوں کا ہے؟ بعد میں ماموں والدہ اور کئی رشتہ داروں کے سامنے یہ بات طے ہوئی تھی کہ ماموں کا یہ قرض بڑے بھائی ادا کریں گے (جو کہ انہوں نے ادا کردیا) اور بقیہ بھائی گھر کا پورا خرچ اٹھائیں گے جو کہ آج ۲۵/سال گذر جانے پر بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

اب اس سلسلہ میں یہ امر قابل وضاحت ہے کہ اس قطعۂ آراضی کے مالک صرف بڑے بھائی ہوں گے یا سب لوگ ہوں گے؟

المستفتی: وثیق انور، بریلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ صورت میں سب بھائی بہن ایک ساتھ ایک ہی فیملی میں مشترک ہیں، کسی کی کمائی زیادہ ہے، اور کسی کی کمائی کم ہے، کسی کی کمائی سے باہر کا خرچہ برداشت کیا جاتا ہے اور کسی کی کمائی سے گھر کا خرچہ پورا کیا جاتا ہے، اور بڑے بھائی کی کمائی سے قرض ادا کیا گیا اور دوسرے بھائیوں کی کمائی سے گھر کا خرچہ پورا کیا گیا، تو ایسی صورت میں جتنی بھی جائیداد اور آمدنیاں ہیں، سب مشترک ہی شمار ہوں گی؛ اس لئے مشترک جائیداد کی طرح تقسیم کرنا ضروری ہے اور مشترک جائیداد کی طرح اس زمین میں سب شریک ہوں گے، صرف بڑا بھائی مالک نہیں ہوگا۔

یؤخذ من هذا ما أافتی به في الخیریة: في زوج امرأة وابنها اجتمعا في دار واحدة وأخذ کل منهما یکتسب علی حدة ویجمعان کسبهما ولایعلم التفاوت ولا التساوي ولا التمییز، فأجاب بأنه بینهما سویة، وکذا لو اجتمع إخوة یعملون في ترکة أبیهم ونما المال، فهو بینهم سویة، ولو اختلفوا في العمل والرأي، وقدمنا أن هذا لیس شرکة مفاوضة مالم یصرحا بلفظها، أوبمقتضیاتها مع استیفاء شروطها. (شامي، کتاب الشروط، مطلب اجتمعا في دار واحدة واکتسبا ولایعلم التفاوت، فهو بینهما بالسویة، زکریا ٦/٥٠٢، کراچي ٤/٣٢٥، هکذا في الهندیة، زکریا قدیم ٢/٣٢٩، جدید ٢/٣٣٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/۹۹۹۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۳/۶ھ

باپ کی فیملی میں رہ کر کمائی گئی جائیداد کا حکم

سوال [۸۹۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ زید اپنی بیوی اور ایک بیٹے (شادی شدہ) اور پانچ بیٹیوں (دوشادی شدہ تین غیرشادی شدہ) کی موجودگی میں ساڑو کے ایک اچھے کاروبار کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا کچھ ایام گذرنے کے بعد زید کی بیوی کا انتقال ہوگیا، جس کے باعث زید بیمار اور ذہنی اعتبار سے انتہائی منتشر اور پریشان تھا، اس ذہنی انتشار و بیماری کی وجہ سے زید کے دوکان جانے میں اور کاروباری عمل کے اندر کچھ سستی آگئی، جس کے نتیجے میں زید کا بیٹا بکر پورے کاروبار مع دوکان وسانچہ وغیرہ پر مکمل طور پر زبردستی قابض ہوگیا اور ایک لمبی پونجی جو زید نے بنائی تھی اس پوری پونجی پر بھی پورے طور پر زبردستی قابض ہوگیا اور تقریباً ۷/۸ سال تک زید کاروبار و دوکان کا حساب کتاب مانگتا رہا، مگر بکر نے کوئی حساب کتاب نہیں دیا اور نہ ہی کوئی خرچ دیا، حتی کہ اپنے والد زید کو کاروبار و دوکان سے ہر طریقہ سے کنارہ کش کر دیا اور پورے کاروبار و دوکان پر تنہا زبردستی قابض ہوگیا اور سارے تعلقات بھی اپنے والد زید سے منقطع کر لئے۔

یہ بھی واضح ہو کہ زید نے ایک قطعہ زمین ۳۴ر کڑی خریدی تھی اور اس کی صرف رجسٹری بیٹے بکر کے نام کی تھی، وراثۃ اس زمین کا مالک نہیں بنایا تھا، اب بکر اس زمین پر بھی پوری طرح قابض ہے، اس میں جو پھل وغیرہ لگتے ہیں، وہ سب بکر ہی استعمال کر رہا ہے، کچھ ایام گذرنے کے بعد زید نے اپنی بہنوں اور ساتھیوں کے مشورے سے شادی کرلی، شادی کے بعد سے بیٹے بکر سے کشیدگی اور بڑھ گئی اور اس نے اپنے والد کے ساتھ اپنی پھوپھیوں سے بھی تعلقات ختم کر لئے، جنہوں نے زید کی شادی کرانے میں تعاون کیا تھا۔

اور اب اس وقت کی صورت حال یہ ہے کہ زید نے اپنا ایک چھوٹا سا کاروبار کرلیا ہے اور ایک مختصر سی پونجی بھی بنالی ہے، اور زید کی یہ خواہش ہے کہ میری جو مختصر سی پونجی ہے، میرے نہ رہنے کے بعد میری موجودہ بیوی اور تین لڑکیاں (جن میں ایک کسی اسکول کی معلّمہ ہے، اس سے ان کا خرچ چلتا ہے) اس کی مالک بن جائیں، بکر اس میں سے کچھ بھی نہ لے سکے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید کا یہ عمل (کہ میرے نہ رہنے کے بعد میری

پونجی سے بیٹے بکر کو کچھ نہ ملے) ازروئے شرع کیسا ہے؟ جبکہ زید کا پچھلا پورا کاروبار مع دوکان اور پوری پونجی بکر زبردستی لے چکا ہے، اس میں سے نہ زید کو کچھ دیا اور نہ ہی اپنی بہنوں کو، کیا شرعی اعتبار سے اس کاروبار میں زید اور اس کی بیٹیوں کا کوئی حق نہیں ہے؟ یہ بھی واضح فرمائیں کہ ۳۴رکڑی زمین جو زید نے اپنے سے خریدی تھی، صرف رجسٹری بکر کے نام تھی، اس زمین میں زید کی بیوی اور بیٹیوں کا حصہ نہیں؟ جبکہ زید نے بیٹے بکر کو اس کا مالک نہیں بنایا ہے۔ نیز زید جس مکان میں مقیم ہے، وہ تقریباً ۷۰رکڑی ہے، زید اس میں اپنا حصہ ۱۰رکڑی رکھنا چاہتا ہے، اس کی کیا صورت اختیار کرنی چاہئے؟ برائے مہربانی ان تمام مسائل کو ازروئے شرع واضح فرمائیں۔

المستفتی: شیر احمد ابن انور حسین، مؤناتھ بھنجن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بکر بیٹا اپنے باپ زید کی دوکان، زمین اور جن پونجیوں پر قبضہ کر کے اپنا کاروبار چلا رہا ہے، شریعت میں یہ ساری پونجی، دوکان، کاروبار وغیرہ سب کا مالک باپ ہی ہے؛ لہٰذا باپ کے مرنے کے بعد ان سب چیزوں میں بیٹا بکر اور زید کی بیوی اور اس کی تمام بیٹیاں شرعی طور پر میراث کے حقدار ہوں گے۔

الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيئ، فالكسب كله للأب، إن كان الابن في عياله؛ لكونه معينا له. (شامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ولا يعلم التفاوت، فهو بينهما بالسوية، كراچي ٣٢٥/٤، زكريا ٥٠٢/٦، هندية، زكريا قديم ٣٢٩/٢، جديد ٣٣٢/٢)

لو اجتمع إخوة يعملون في تركة أبيهم، ونما المال فهو بينهم سوية، وإن اختلفوا في العمل والرأي، وقدمنا أن هذا ليس شركة مفاوضة مالم يصرحا بلفظها، أو بمقتضياتها مع استيفاء شروطها، ثم هذا في غير الابن مع أبيه. (شامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحد...... زكريا ٥٠٢/٦)

اور زید نے ۳۴ رکڑی زمین اپنے پیسے سے خریدتے وقت رجسٹری میں بکر کا نام جوڑ الا ہے، اس نام کے ڈالنے سے بکراس کا مالک نہیں ہوگا اور شریعت میں ایسے عقد کو بیع تلجیۂ کہاجاتا ہے؛ لہٰذا یہ بھی باپ زید ہی کی ملکیت میں شمار ہوگی اور زید کے مرنے کے بعد اس کے تمام وارثین میں میراث کے طور پر تقسیم ہوجائے گی۔

التلجئة هي العقد الذي ينشئه لضرورة أمر فيصير كالمدفوع إليه، وإنه على ثلاثة أضرب أحدها: أن تكون في نفس البيع وهو أن يقول لرجل: إني أظهر أني بعت داري منك وليس ببيع في الحقيقة ويشهد على ذلك، ثم يبيع في الظاهر فالبيع باطل. (هندية، كتاب البيوع، الباب العشرون في البياعات المكروهة والأرباح الفاسدة، زكريا قديم ٣/٢٠٩، جديد ٣/١٩٦، شامي، زكريا ٧/٥٤٢، كراچي ٥/٢٧٣، بدائع الصنائع، زكريا ٤/٣٨٩، كراچي ٥/١٧٦، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العملية بيروت ٢٤/١٢٢)

اور باپ کا یہ کہنا کہ ۷۰ رکڑی مکان میں سے ۱۰ رکڑی لینا چاہتا ہے، اس کو اس کی ضرورت نہیں ہے، شریعت میں پورا مکان اسی کا شمار ہوگا، جب تک باپ زندہ ہے، اس وقت تک اس کے وارثین میں سے کسی کو کسی چیز میں مالکانہ تصرف کا حق نہیں ہے۔

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده، أن رجلاً أتى النبي صلى الله عليه وسلم فقال: يارسول الله! إن لي مالاً وولداً، وإن والدي يحتاج مالي، قال: أنت ومالك لوالدك. (أبوداؤد شريف، باب في الرجل ياكل من مال ولده، النسخة الهندية ٢/٤٩٨، دارالسلام رقم: ٣٥٣٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ رصفر المظفر ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۸۹۵/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۲/۲۱ھ

فیملی کا رہن سہن الگ ہو، تو آپسی شرکت کا حکم

سوال[۸۹۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) زید بسلسلہ تجارت اپنا شریک کار اپنی بالغ اولادوں میں سے کسی ایک کو ۱/۲ یا ۱/۴ کا بنا سکتا ہے یا نہیں؟

(۲) اگر بنا دیا ہے تو کیا اولاد مذکور بنائے ہوئے حصہ کا مالک ہوسکتی ہے؟

(۳) مذکورہ متعینہ حصہ کا کل یا بعض اگر والد یا اولاد لے لے، تو حقوق العباد میں گرفتار ہوں گے یا نہیں؟

المستفتی: محبوب عالم، بیکن گنج کانپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱/۲/۳) اگر بالغ اولاد کی فیملی اور رہن سہن کھانا پینا سب باپ سے الگ ہے، تو شرکت کا مذکورہ معاملہ درست ہے اور اولاد متعینہ حصہ کی مالک بھی ہوسکتی ہے اور اس معاملہ کو صحیح رکھنا بھی لازم ہوگا اور حسب معاملہ حصہ بھی تقسیم کرنا ہوگا اور اگر واقعہ ایسا نہیں ہے؛ بلکہ اولاد کی فیملی باپ کے ساتھ ہی ہے، تو یہ شرکت کا معاملہ شرعاً لغو ہے اور رأس المال اور منافع سب کا مالک باپ ہی ہوگا اور بیٹے کو باپ کا معین و مددگار شمار کیا جائے گا اور بیٹا صرف روزینہ خوراک کا حقدار ہوسکتا ہے، کسی چیز کا مالک نہیں بن سکتا اور پورے سرمایہ میں باپ اپنے اختیار سے جس طرح چاہے تصرف کرسکتا ہے بیٹے کو اعتراض کا حق نہ ہوگا۔

الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيئ، فالكسب كله للأب، إن كان الابن في عياله؛ لكونه معينًا له.

(شامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ولا يعلم التفاوت ،

فهو بينهما بالسوية، زكريا ٦/ ٥٠٢، كراچي ٤/ ٣٢٥، هندية، زكريا قديم ٢/ ٣٢٩، جديد ٢/ ٣٣٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵ رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۳۸۹/۲۵)

باپ کی موت کے بعد اولاد کا مشترکہ کاروبار

سوال [۸۹۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) اسلام میں مشترکہ خاندان کی کیا حیثیت ہے، جس کو انگریزی میں جوائنٹ فیملی کہتے ہیں اس کی ممانعت کرتا ہے یعنی مشترک قیام وطعام وتجارت شرعاً منع ہے؟

(۲) بعض کا یہ کہنا ہے کہ شریعت نے آزاد رکھا ہے، مشترک خاندان کا پابند نہیں بنایا ہے؟

(۳) ایک تیسرا نظریہ یہ ہے کہ فقہاء نے کچھ حدود وقیود کے ساتھ اجازت دی ہے، عرض یہ ہے کہ تفصیل سے بیان کیا جائے کہ شریعت کا اصل حکم کیا ہے؟ مثلاً ایک باپ کی چار اولادیں ایک ساتھ رہنا چاہتی ہیں، مال، آراضی، تجارت میں سب کے سب اشتراک کے خواہشمند ہیں، تو اس کی اجازت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کی صورت کیا ہوگی؟ اگر ایک لڑکا نابالغ ہے، تو پھر اس کی کیا صورت ہوگی؟

المستفتی: احمد نصر، غفرلہ، مدرسہ عربیہ امدادیہ بنارس کینٹ (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذہب اسلام نہ تو جوائنٹ فیملی کی مخالفت کرتا ہے اور نہ ہی مشترک خاندان کا پابند بناتا ہے؛ بلکہ مذہب اسلام افراط وتفریط سے قطع نظر ہمیشہ اتحاد واتفاق، میل ومحبت اور اخوت وبھائی چارگی کی تعلیم دیتا ہے؛ لہٰذا اگر ایک باپ کی چند اولاد ایسی رضامندی سے ایک ساتھ رہنا چاہیں اور قیام وطعام اور مال، آراضی، تجارت میں

سب کے سب بخوشی اشتراک کے خواہشمند ہوں، تو یہ جائز اور درست ہے؛ البتہ تمام اموال اور نفع ونقصان میں سب برابر شریک ہوں گے، اگران میں سے کوئی اولاد نابالغ ہو، تو بالغ اولاد پر ضروری ہے کہ سب مل کر اس کی شادی بیاہ وغیرہ کا انتظام کریں؛ کیونکہ باپ اور دادا کی عدم موجودگی میں بالغ اولاد ولی نکاح ہوتی ہے۔ (مستفاد: امداد المفتیین ۸۲۱، ۵۳۸، فتاوی محمودیہ ۳۲۴/۱۰، جدید ڈابھیل ۳۰۹/۲۰، فتاوی دار العلوم ۳۶/۸، عزیز الفتاوی ۴۲۹)

وكذلك لو اجتمع إخوة يعملون في تركة أبيهم ونما المال، فهو بينهم سوية، ولو اختلفوا في العمل والرأي. (شامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ولا يعلم التفاوت......، زكريا ٥٠٢/٦، كراچي ٣٢٥/٤، مصري ٣٨١/٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۴۲۹/۳۶)

والد صاحب کی موت کے بعد مشترکہ کاروبار کی آمدنی کی تقسیم کا تناسب

سوال [۸۹۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ والد صاحب نے ایک دوکان بوقت انتقال چھوڑی، جس پر کرایہ دار قابض تھا، میں نے کافی رقم دے کر مقدمہ کر کے حاصل کی اور کسی بھائی نے کوئی پیسہ نہیں دیا، میں نے پھر ایک مکان خریدا، اس میں بھی کسی بھائی نے کوئی روپیہ پیسہ نہیں دیا، گھر کا کل خرچ بھی میں ہی کرتا رہا؛ جبکہ سب بھائی بہن ایک ہی گھر میں ایک ساتھ کھاتے پیتے تھے۔

اب وراثت کی تقسیم کا مسئلہ ہے، تو کس میں وراثت جاری ہوگی، کس میں نہیں؟ میں نے مکان کی رجسٹری میں بھائیوں کا نام بھی ڈالوا دیا تھا۔

المستفتی: غلام نبی، مغلپورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: والد ہی کے زمانے سے چونکہ آپ اور آپ کے بہن بھائی ایک ہی فیملی میں رہتے تھے، اور بعد میں بھی ایک فیملی میں رہے اور ایک فیملی میں رہنے والے بھائی بہن ایک دوسرے کی آمدنی وکمائی میں برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں؛ اس لئے آپ کے بھائی بہن دوکان اور مکان میں حسب حصص شرعیہ حقدار ہیں اور آپ ان بھائیوں کی تمام آمدنی اور کمائی میں برابر کے حصہ دار ہیں؛ ہاں البتہ اگر آپ اپنی فیملی کو بھائی بہنوں سے الگ کر لیتے ان کا چولہا الگ اور آپ کا الگ ہوتا، ان کا خرچہ الگ آپ کا الگ ہوتا، پھر اس علیحدگی کی صورت میں آپ اپنی کمائی سے کوئی جائیداد اور سرمایہ اکٹھا کرتے، تو اس میں آپ کے بھائی بہن کا حصہ نہ ہوتا؛ لیکن آپ کا واقعہ ایسا نہیں ہے؛ اس لئے جو کچھ بھی جائیداد وسرمایہ آپ کی نمائندگی سے ایک فیملی میں رہ کر اکٹھا ہوا ہے، اس میں آپ کے سب بھائی بہن شریک ہوں گے۔ (مستفاد: احیاء العلوم ۱/۳۳۵)

لو اجتمع إخوة يعملون في تركة أبيهم ونماء المال، فهو بينهم سوية، ولو اختلفوا في العمل والرأي. (شامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ولا يعلم التفاوت، فهو بينهما بالسوية، زكريا ٦/٥٠٢، كراچي ٤/٣٢٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/شعبان المعظم ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳٦/۷۳۵۵)

والد کی دوکان میں شرکت اور منافع کی تقسیم کا حکم

سوال [۸۹۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حاجی افضل کے پاس دو دوکانیں اور تین لڑکے ۱. عبد المجید ۲. یوسف ۳. صدیق ہیں۔

حاجی افضل نے اپنی زندگی ہی میں ایک دوکان عبدالمجید اور دوسری دوکان یوسف اور صدیق کے نام کردی تھی نیز نقدی رقم یوسف کو دے دی تھی، اب اسی دوکان میں یوسف اور صدیق مشترکہ طور پر کام کرتے رہے، پھر ۱۹۹۲ء میں صدیق اپنی رضا مندی سے دست بردار ہوگئے، اس کے باوجود یوسف اپنی دوکان پر صدیق کو بیٹھاتے رہے اور ساتھ میں صدیق کا لڑکا عارف بھی اس دوکان میں آتا رہا۔

۱۹۹۹ء میں یوسف کا انتقال ہوگیا، اب یوسف کی جگہ ان کے انتقال کے بعد یا پہلے سے ان کے لڑکے فاروق کا نام درج ہے؛ لیکن فاروق نے اس دوکان سے قبضہ چھوڑ دیا اور فاروق کے بھائی مستقیم کی آمد ورفت جاری رہی، اب اسی دوکان کے منافع سے صدیق نے ۱۰/لاکھ قرضہ ادا کیا اور دو دوکانیں مزید خرید لی ہیں اور یوسف کے گھر اس دوکان سے سوائے غلہ کے کچھ نہیں آتا۔ اب سوال یہ ہے کہ مذکورہ بالاصورت میں ازروئے شرع اس دوکان میں یوسف کی اولاد کا بھی کچھ حصہ ہے یانہیں؟ نیز صدیق نے مزید دو دوکانیں خرید لی ہیں اور ۱۰/ لاکھ قرضہ ادا کیا ہے، اس میں بھی اولاد یوسف کا حصہ ہے یانہیں؟ اگر ہے تو کتنا ہے؟

المستفتی: محمد عظمت علی آسامی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: یوسف اور صدیق کو باپ نے دوکان کا برابر کا حصہ دار بنایا؛ اس لئے اس دوکان کی مالیت اور قیمت میں دونوں برابر کے شریک ہوں گے؛ لہٰذا اگر دوکان تقسیم کی جائے تو دونوں کو آدھا آدھا حصہ ملے گا یا آدھے آدھے حصہ کی قیمت ملے گی اور جب تک دونوں مشترکہ طور پر دوکان چلاتے رہیں گے، تو جو نفع ہوگا وہ کاروبار کرنے والے کو ملے گا؛ البتہ دوسرے کو آدھی دوکان کا کرایہ وصول کرنے کا حق ہوگا اور اگر ایسی شکل ہے کہ جس وقت ایک نے دست برداری دیدی تھی، اس وقت دوکان میں جو سامان تھا، اس میں دونوں کا برابر حصہ رہا ہے اور پھر بعد میں ایک نے کاروبار بڑھایا اور دوسرا کاروبار میں دخیل نہیں رہا ہے اور معاملہ بھی آپس میں طے اور صاف نہیں کیا ہے، تو دوکان میں

جو سرمایہ دوسرے کا تھا، اس کے سہارے کام کرنے پر منافع میں سے اس کو کتنا ملے گا؟ تو ایسی صورت میں یہ معاملہ شرعی طور پر فاسد معاملہ ہے جو شرعاً ناجائز ہے، اس کے لئے واحد حل یہ ہے کہ دونوں فریق کے لوگ آپس میں بیٹھ کر مصالحت اور صلح کرلیں کہ کس کو کتنا کتنا ملے گا؛ اس لئے کہ دوکان کا بھاری نفع جس سے قرضہ ادا کیا گیا ہے، اور جس سے دوکانیں خریدی گئی ہیں، یہ صرف ایک شخص کی محنت سے ہوا ہے، دوسرے شخص کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔

لو تصرف أحد الورثة في التركة المشتركة وربح فالربح للمتصرف وحده. (عالمگيري، كتاب الشركة، باب المتفرقات، زكريا قديم ٢/٣٤٦، جديد ٢/٣٤٣)

وما حصله أحدهما أي بدون عمل من الآخر فله وما حصلاه معا فلهما نصفين و ما حصله أحدهما بإعانة صاحبه فله ولصاحبه أجر مثله. (در مختار مع الشامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحدة واكتسبا و لايعلم التفاوت ، فهو بينهما بالسوية، زكريا ٦/٥٠٢، كراچي ٤/٣٢٥)

الصلح جائز بين المسلمين. زاد أحمد: إلا صلحا أحل حراماً، أو حرم حلالاً. (أبوداؤد شريف، كتاب القضاء، باب في الصلح، النسخة الهندية، ٢/٥٠٦، دارالسلام، رقم: ٣٥٩٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۵؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷؍ ۸۸۰۳)	۱۴۲۶/۵/۵ھ

فیملی کے نام خریدی گئی زمین میں تعمیر کے خرچہ کا تناسب

سوال [۸۹۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عظمت اللہ، حشمت اللہ اور حکمت اللہ یہ تینوں حقیقی بھائی ہیں، تینوں ایک ساتھ رہتے تھے، اور تینوں کا ایک ہی فیملی میں کھانا پینا ایک ساتھ تھا، اور ان میں سے حشمت

اللہ معذور رہا اور عظمت اللہ بھی معذور ہے، یہ دونوں شادی شدہ تھے اور اپنے اپنے معذوری کے زمانہ میں عظمت اللہ اور حشمت اللہ چھلائی کا کام کرتے تھے، اور حکمت اللہ دن میں ڈھلائی کا کام کرتا تھا اور رات میں ہوٹل میں بھی بیٹھتا تھا، حکمت اللہ کی آمدنی سب سے زیادہ تھی اور عظمت اللہ اور حشمت اللہ کی آمدنی اقل قلیل تھی؛ لیکن تینوں ساتھ ہی رہتے تھے، اس دوران حکمت اللہ کی آمدنی کا پیسہ زیادہ آیا اور اس پیسہ سے حکمت اللہ نے ایک زمین خریدی؛ چونکہ تینوں بھائی ساتھ رہتے تھے؛ اس لئے اس زمین میں تینوں بھائیوں کا نام ڈالدیا، اس کے بعد عظمت اللہ کا انتقال ہوگیا، پھر اس کے بعد حشمت اللہ کا بھی انتقال ہوگیا اور حکمت اللہ اب بھی زندہ ہے، حکمت اللہ اب یہ کہتا ہے کہ دونوں بھائیوں کا نام ان کے دل کو خوش کرنے کے لئے ڈلوایا تھا، شرعی حکم اس کے بارے میں کیا ہے؟ اس مکان میں صرف حکمت اللہ کا حق ہے یا تینوں بھائیوں کا؟

نیز تینوں بھائیوں کی شرکت کے زمانہ میں اس زمین پر ایک کمرہ اور ایک برآمدہ بنایا، پھر جب عظمت اللہ کا انتقال ہوا، تو حکمت اللہ نے ایک اور کمرہ بنایا، پھر اس کے بعد پوری عمارت کے اوپر دوسری منزل بھی بنائی، اب ان حالات کے اندر اس زمین میں سے دوسرے بھائیوں کا حق ہے یا نہیں؟

المستفتی: حکمت اللہ، جامع مسجد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مشترک رہائش کے زمانہ میں جب کہ سب لوگ ایک فیملی میں تھے، اس وقت جو زمین سب کے نام سے خریدی گئی ہے، اور اس پر تعمیر ہوئی ہے، اس میں شرعاً سب بھائی برابر کے شریک ہوں گے، چاہے اس میں کسی کی کمائی کا پیسہ زیادہ ہو یا کم ہو۔ (مستفاد: فتاوی احیاء العلوم ۱/۳۳۵، احسن الفتاوی ۴/۳۲۵، امداد المفتیین ۲/۸۲۱)

لو اجتمع أخوة يعملون في تركة أبيهم ونما المال، فهو بينهم سوية،

ولو اختلفوا في العمل والرأي. (شامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ولايعلم التفاوت، فهو بينهما بالسوية، زكريا ٦/٢ ٥٠، كراچي ٤/٣٢٥)

اور عظمت اللہ کے انتقال کے بعد حکمت اللہ نے جو کمرہ اور دوسری منزل اپنے الگ پیسہ سے تعمیر کی ہے، اس کے خرچہ کو تینوں فریقوں پر برابر ڈالا جائے گا، اور اس کمرہ اور منزل میں تینوں فریق برابر کے شریک ہوں گے، دوسرے شرکاء سے ان کے حصہ کا پیسہ وصول کرلیا جائے۔

ومن بنیٰ أو غرس في أرض غيره بغير إذنه. (در مختار) قال الشامي: تحته فلو بإذنه فالبناء لرب الدار ويرجع عليه ا بما أنفق. (شامي، كتاب الغصب، زكريا ٩/٢٨٣، كراچي ٦/١٩٤)

إذا كانت الأرض تنقص بالقطع كان لصاحب الأرض ان يضمن للغاصب قيمة البناء والغرس ويكونان له. (البحر الرائق، كتاب الغصب، زكريا ٨/٢١٣، كوئٹه ٨/١١٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ رربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/۶۶۲۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۴/۲۹ھ

بھائیوں کی مشترکہ آمدنی کی شرعی تقسیم

سوال [۸۹۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ چھ بھائیوں نے آپس میں کاروبار شروع کیا، اور چھ کے چھ نے کمایا اور ہر ایک کے پاس ایک ایک دوکان ہوگئی اور ساری کمائی مشترکہ طور پر ایک جگہ جمع ہوتی رہی اور اس کمائی کے پیسہ سے دیگر زمین جائیداد بھی خریدی گئی، یہ سلسلہ چلتا رہا اور کاروبار بڑھتا رہا، ایک عرصہ کے بعد بھائیوں میں اختلاف شروع ہوگیا، یہاں تک کہ علیحدگی کی نوبت آگئی، جب الگ ہونے کی نوبت آئی تو طے ہوا کہ ہر ایک اپنی اپنی دوکانوں کا حساب پیش کردے؛

چنانچہ چھ میں سے تین بھائیوں نے اپنی اپنی دو کانوں کا حساب پیش کردیا اور تین بھائیوں نے حساب پیش نہیں کیا، تو جن تین بھائیوں نے حساب پیش کیا ہے، انہوں نے ساری زمین جائیداد کو آپس میں تقسیم کرلیا، اور جنہوں نے حساب پیش نہیں کیا ہے، ان کو دیگر زمین جائیداد اور زیورات رقوم وغیرہ میں حصہ دار نہیں بنایا۔

اب مفتی صاحب سے سوال ہے کہ یہ شریعت کے مطابق ہوا یا نہیں ہوا؟ اگر نہیں ہوا تو شریعت کے مطابق ہونے کیلئے کوئی صورت واضح فرمائیں۔

المستفتی: مولانا عبدالمنان، استاذ مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب چھ بھائیوں کی مشترکہ محنت اور مشترکہ کمائی ہے اور سب کے کمائی کی رقم مشترکہ اور مخلوط طور پر ایک جگہ جمع ہوتی رہی اور اسی رقم سے دیگر جائیداد وغیرہ خریدی گئی ہے، تو ایسی صورت میں شرعی طور پر چھ کے چھ بھائی سارے کاروبار اور آمدنی اور ایک ایک پیسے میں برابر کے شریک اور برابر کے حقدار ہوں گے؛ لہٰذا جب اختلاف کی وجہ سے علیحدگی کی نوبت آگئی ہے، تو ہر ایک کی ذمہ داری ہے کہ اپنی اپنی دوکان و دیگر سرمایہ سے متعلق ایماندارانہ طور پر حساب پیش کریں، اس کے بعد سب چیزیں برابر چھ حصوں میں تقسیم کرکے ہر ایک کو الگ الگ حصہ دیدیا جائے اور سوال نامہ میں ذکر کردہ واقعہ میں ایسا نہیں ہوا؛ بلکہ تین بھائیوں نے حساب پیش کردیا اور تین نے پیش نہیں کیا؛ لہٰذا جن تین بھائیوں نے اپنی دوکانوں کا حساب پیش نہیں کیا ان پر حساب پیش کرنا لازم ہے اور جن تین بھائیوں نے حساب پیش کردیا، ان کا حساب پیش کرنے تک کا معاملہ درست ہے، مگر ساری جائیداد اور زیورات و رقوم وغیرہ انہیں تین بھائیوں نے آپس میں جو تقسیم کرلیا اور حساب پیش نہ کرنے والوں کے حصوں کو دبالیا ہے یہ غلط ہوا؛ لہٰذا جن تین بھائیوں نے اب تک حساب پیش نہیں کیا، جب وہ اپنی دوکانوں کا حساب پیش

کردیں گے، تو ان کا جو حصہ جائیداد اور رقوم وزیورات وغیرہ میں ہے ان کو دینا لازم اور واجب ہوجائے گا ورنہ حساب پیش کرنے والے مال کے غصب کرنے کے حکم میں شامل ہوجائیں گے اور جنہوں نے حساب پیش نہیں کیا ہے، ان پر حساب پیش کرنا بھی واجب ہے ورنہ وہ بھی گنہگار رہوں گے۔ (مستفاد: محمودیہ ڈابھیل ۱۴/ ۱۸۴)

إن كل واحد من الشريكين كأنه أجنبي في نصيب صاحبه لا يجوز له التصرف فيه بغير إذانه. (بدائع الصنائع، كتاب الشركة، كراچي ٦/٦٥، شرح المجلة رستم باز اتحاد ١/ ٦٠١، مادة:١٠٧٥، مجمع الأنهر ٢/ ٥٤٣، الفقه الإسلامي و أدلته، دارالفكر ٥/ ٣٨٧٨، هدى انٹر نيشنل ديو بند ٤/ ٥٨٩)

يلزم رد المغصوب عينا؛ لأن الغاصب بالأخذ فوت على المالك اليد وهي مقصودة؛ لأن المالك يتوصل بها إلى تحصيل ثمرات الملك من الانتفاع، فيجب نسخ فعله دفعاً للضرر عنه. (شرح المجلة رستم باز ١/ ٤٨٨، مادة: ٨٩٠)

فإن كان من القيميات يلزم الغاصب قيمته في زمان الغصب ومكانه، وإن كان من المثليات يلزم إعطاء مثله. (شرح المجلة رستم با ز ١/ ٤٩٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷ر شعبان المعظم ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/ ۱۱۶۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۸/۷ھ

بھائیوں کی مشترکہ کمائی سے خریدی گئی زمین کا حکم

سوال [۸۹۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عبداللہ، عبدالکریم، عبدالمجید، پیارے چاروں بھائی ایک ساتھ رہتے تھے

اورتمام معاملات کمائی وغیرہ ایک ساتھ ملی جلی تھی، عبداللہ سربراہ تھا،اس نے ۱۹۱۹ء میں ۵ ۷رگز زمین عمارتی بذریعہ بیع نامہ اقراری مسماۃ عزیزاً بحق خودخریدی اوراس کے بعد عبداللہ ہی نے ایک اور قطعہ آراضی رقبہ ۵ ۷ارگز زمین ۱۹۱۰ء میں بذریعہ بیع نامہ اور مسماۃ ننھی بحق خودخریدی، اس کے بعد ۱۹۱۷ء میں ایک اور قطعہ آراضی رقبہ ۷۰۰رگز بنام عبداللہ وعبدالکریم وعبدالمجید و پیارے ہر چہار برادران خریدی گئی۔اب یہ مذکورہ جائداداں کے درمیان کس طرح تقسیم ہوسکتی ہے؟ اوراس جائداد کا کون کون حقدار ہے،کل جائداد ملاکر ۹۵۰ گز زمین ہے۔

المستفتی: چھوٹو ولد عبدالمجید، چھوٹی منڈی اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب چاروں بھائی ایک ساتھ کمائی،آمدنی وغیرہ سب میں شریک ہیں،تو اس دوران جو بھی کوئی چیز خریدے گا، وہ سب کے درمیان شرعاً مشترک ہوا کرے گی؛ لہٰذا صورت مذکورہ میں تین قسطوں میں خریدی ہوئی ۹۵۰ گز آراضی چاروں بھائیوں کے درمیان برابر تقسیم ہوگی۔

كـمـا استـفاده من الشامي: يؤخذ من هذا ما أفتى به في الخيرية: في زوج امرأة وابنها اجتمعا في دار واحدة، وأخذ كل منهما تكسب على حدة ويجمعان كسبهما، ولايعلم التفاوت ولا التمييز، فأجاب بأنه بينهما سوية.

(شامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحدة واكتسبا و لايعلم التفاوت، فهو بينهما بالسوية، زكريا۶/۵۰۲، كراچي ۴/۳۲۵، كوئٹه ۳/۳۸۳)

لہٰذا درج ذیل طریقے سے تقسیم ہوگی۔

مسئلہ ۴ر ۹۵۰رگز زمین

میت

عبداللہ	کریم اللہ	عبدالحمید	پیارے
۱	۱	۱	۱
۲۳۷	۲۳۷	۲۳۷	۲۳۷

۹۵۰ر گز آراضی چار سہام میں تقسیم ہوکر ہر بھائی کو۴/۲-۲۳۷ گز کے حساب سے ملے گا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ر ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/۶۲۴۵)

مشترکہ زندگی میں ایک بھائی کے پیسے سے خریدی گئی زمین میں شرکت کا تناسب

سوال [۸۹۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ دو بھائی ہیں دونوں ایک میں رہتے ہیں، ایک بھائی نے اپنے ذاتی پیسوں سے زمین خریدی اور دوسرے بھائی کا نام بھی اس میں ڈلوادیا، اور جس بھائی کا نام اس میں ڈلوایا ہے، اس بھائی نے اس زمین کی خریداری میں کچھ بھی پیسہ نہیں دیا ہے، تو کیا اس بھائی کا حق جس نے پیسہ نہیں دیا، اس زمین میں ثابت ہوجائے گا؟ کیا اگر خریدتے وقت بھائی نے دینے کی نیت کی ہو، تو کیا نیت کی وجہ سے حق ثابت ہوگا یا نام ڈالوانے کی وجہ سے ثابت ہوگا؟ یا ایک میں خریدنے کی وجہ سے حق ثابت ہوگا؟ تینوں صورتوں کو تفصیل سے لکھدیں یا کسی اور وجہ سے ان کا حق ثابت ہوگا؟

المستفتی: شہاب الدین، ماہل اعظم گڑھ (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب دونوں بھائی ایک ساتھ رہتے ہیں اور مشترکہ زندگی میں ایک بھائی کے پیسہ سے دونوں بھائی کے نام زمین خریدی گئی ہے، تو ایسی صورت میں دونوں بھائی اس زمین میں برابر کے شریک ہیں؛ اس لئے بعد میں تنازع اور اختلاف کی وجہ سے یہ مسئلہ کھڑا کرنا درست نہیں ہے کہ ایک کا پیسہ لگا تھا، دوسرے کا پیسہ نہیں لگا ہے؛ بلکہ اس کے لئے اتنا کافی ہے کہ جس کا پیسہ لگا ہے، اس نے اپنی خوشی اور اپنی

مرضی سے دوسرے کا نام ڈلواکر اس کو شریک کیا ہے؛ اس لئے خریداری کے وقت جس طرح دونوں کی شرکت تھی اختلاف اور تنازع کے وقت بھی دونوں کی شرکت اسی طرح باقی رہے گی۔

شـركة مـلك وهي أن يملك متعدد اثنان فأكثر عيناً...... كما لو اشترىٰ شيئاً، ثم اشترك فيه آخر. (در مختار، كتاب الشركة، زكريا ٦/٤٦٦، كراچي ٤/٢٩٩)

سئل والدي......قال لأجنبي: أشركتك في نصيبي مما اشتريت، هل يثبت له فيها شركة؟ فقال: لاتثبت فينهما شركة عقد، ويصير شريكاً شركة ملك له. (تاتارخانية، زكريا ٧/٤٧٣، رقم: ١٠٩١٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٨ر شعبان المعظم ١٤٣٣ھ
(فتویٰ نمبر: الف ٣٩/١٠٧٩٠)

مدد کی غرض سے کاروبار میں شریک کئے گئے بھائیوں کے حصہ کا تناسب

سوال [٨٩١٧]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے بڑے ہونے کے بعد ٹرانسپورٹ کمپنی میں ملازمت شروع کی، پھر اس کے بعد اس نے خود ٹرانسپورٹ کی ایک کمپنی قائم کی، اس میں والدصاحب کی طرف سے کسی قسم کا تعاون نہیں تھا، اپنی کمائی کے پیسہ ادھار یا قرض لے کر کام شروع کیا اور کسی بھی بھائی کا کسی قسم کا مالی تعاون اس میں نہیں رہا، پھر اس نے اپنے دو بھائیوں کو کام میں لگالیا اور دونوں بھائیوں میں سے کسی کا کوئی پیسہ اس میں نہیں لگا، گاؤں کے رہنے والے ہیں، گاؤں میں معمولی کھیتی باڑی سے گذارہ ہوتا ہے، اور اس نے اپنے بھائیوں کو ساتھ لگاکر خوشحالی کے انداز سے اسی کاروبار سے سب پر خرچ کیا، بھائیوں اور بہنوں کی شادیاں بھی اس کاروبار سے ہوئیں اور بھائیوں کو ساتھ لگاتے وقت کسی قسم کی شراکت وغیرہ کا معاہدہ نہیں ہوا، اور ضرورت کے مطابق خرچہ کا پیسہ سب بھائیوں اور بہنوں کو دیا جاتا رہا۔

اب سوال یہ ہے کہ جب بھائیوں میں سے کوئی الگ ہونا چاہے، تو اس کو زید کے کاروبار میں سے حصہ کا مطالبہ کرنے کا حق ہے یا نہیں؟ جبکہ ان کا کوئی پیسہ کاروبار میں نہیں لگا ہوا ہے۔

(۲) اگر کاروبار میں حصہ داری نہیں ہے، تو ان کو بطور اجرت کچھ دینے کا کیا طریقہ ہوگا؟ جبکہ اجرت کے اعتبار سے جو پیسہ ماہانہ یا سالانہ ہونا چاہئے، اس سے زیادہ مقدار کا پیسہ ان کو دیا جاتا رہا ہے، جو بھی شریعت کا حکم ہو واضح طور پر تحریر فرمائیے۔

المستفتی: محمد عیاض مرول بمبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید نے جو کمپنی اپنی کمائی ہوئی رقم سے قائم کی ہے، اور اس میں اس کے بھائیوں میں سے کسی کا کوئی پیسہ نہیں لگا ہے، تو اس کمپنی کا مالک تنہا زید ہی ہے اور اپنے جن بھائیوں کو اس نے اپنے ساتھ لگالیا تھا، ان کے لئے زید کا کاروبار سے الگ ہونے کی صورت میں حصہ کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے؛ البتہ وہ اجرت مثل کے حقدار ہوں گے اور اب تک جو بھائیوں کو پیسہ دیا گیا ہے، اس کا حساب لگالیں، اگر اجرت مثل یا اس سے زائد دیا گیا ہے، تو الگ ہوتے وقت بھائیوں کو نہ تجارت میں کوئی حصہ ملے گا اور نہ پیسہ ملے گا اور اگر اب تک دی گئی رقم اجرت مثل سے کم ہے، تو جتنا کم ہے الگ ہونے والا بھائی اتنے کا مستحق ہوسکتا ہے، اس سے زائد مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے، اس سے دونوں سوالوں کا جواب واضح ہو چکا ہے۔

فلو كل المال لأحدهما، فللآخر أجر مثله كمالو دفع دابته لرجل ليؤجرها، والأجر بينهما فالشركة فاسدة، والربح للمالك وللآخر أجر مثله وكذلك السفينة والبيت ولو لبيع عليها البر فالربح لرب البر وللآخر أجر مثل الدابة (وتحته في الشامية) حاصله أن الشركة الفاسدة إما بدون مال أو به من الجانبين، أو من أحدهما......والثالثة لرب المال وللآخر أجر

مثله. (شامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحدة واكتسبا و لايعلم التفاوت، فهو بينهما بالسوية، زكريا ٦/٣ ٠ ٥، كراچي ٤/٥ ٢ ٣-٦ ٣ ٣)

ومثل ذلک السفينة وأدواتها، والخمس لصاحب السفينة، والباقي بينهم بالسوية، فالشركة فاسدة و الحاصل لصاحب السفينة وعليه لهم أجر مثلهم. (شرح المجلة، رستم مكتبه اتحاد ٢/ ٧١٩، تحت رقم المادة:٤ ٤ ٣ ١)

فلو كل المال لأحدهما كدابة، أو كسفينة، أوبيت، أودابة دفعها لرجل ليؤجرها (على) والأجر بينهما فالشركة فاسدة، والربح للمالك وللآخر أجر مثله. (الدر المنتقیٰ مع مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٢/٤ ٦ ٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ر محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۳۷۲/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۱/۹ھ

چھوٹے بھائی کا بڑے بھائی کی کل جائیداد میں شرکت کا دعویٰ کرنا

سوال [۸۹۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حاجی غلام نبی صاحب سورت (گجرات) میں بھینسوں کا کاروبار کرتے تھے، ان کا ایک بیٹا (ایوب) دسویں کے امتحان کے بعد ان کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹانے لگا، جس وقت ایوب کاروبار میں لگا، اس وقت والد صاحب مقروض تھے، ایوب کاروبار میں لگنے کے بعد کاروبار کی ساری ذمہ داری نبھانے لگا، ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۸ء تک خوب محنت اور لگن کے ساتھ ایوب نے والد صاحب کا ساتھ دیا، پھر بھی والد صاحب قرضہ کے بار سے سبکدوش نہیں ہو پائے، تو ایوب نے کہا کہ کاروبار کا حساب وکتاب میرے حوالے کر دیجئے؛ لیکن والد صاحب نے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ اگر تجھے کاروبار کرنا ہے، تو اپنا الگ کاروبار کر؛ چنانچہ

ایوب اپنے والد کے کاروبار سے الگ ہوگیا،۱۹۸۶ءمیں ایوب کا نکاح ہوا تھا؛تقریباً دوسال تک وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ والدصاحب کے مکان ہی میں سکونت پذیر رہے؛لیکن ۱۹۸۸ء میں جب ایوب اوران کے والد صاحب کے درمیان کاروبار کے سلسلہ میں ان بن ہوئی،تو اسی وقت وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ مکان سے بھی علیحدہ ہوگئے،اس وقت والدصاحب نے سونے کی ایک انگوٹھی (تقریباً ایک تولہ) ایوب کو دی تھی،اس کے علاوہ اورکوئی مدد نہیں کی تھی،بعدازاں ایوب نے لوگوں سے ادھار روپیہ لے کراپنا کاروبار شروع کیا(سورت میں) اسی کاروبار کی بدولت انہوں نے والد صاحب کا قرضہ بھی ادا کیا، بعدہ انہوں نے والد صاحب کوان کے کاروبار سے بھی فارغ کردیا۔

تقریباً تین سال بعداپنے چھوٹے بھائی (عبدالقیوم) کے اصرار پراسے بھی سورت اپنے پاس بلالیا،اوراسے دودھ دوہ کرخریدارتک پہنچانے کی ذمہ داری سپردکی اوراس کی تمام ترضروریات کی کفالت ایوب ہی کرتارہا،اسی طرح دوسرے رشتہ داروں کوبھی ایوب کام کے لئے رکھتا رہا اوران کو ماہانہ تنخواہ بھی دیتارہا،اسی طرح چندسال گزرچکےاوروالدصاحب کا انتقال ہوگیا،اس کے چندسال بعدچھوٹے بھائی عبدالقیوم نے دعویٰ کیاکہ بھائی ایوب نے جتنی پراپرٹی اور جائیدادخریدی ہے،اس میں میں برابر کا شریک ہوں؛ حالانکہ بھائی ایوب بعض زمین و مکان عبدالقیوم کے سورت آنے سے پہلےخرید چکاتھا، اس پورے عرصہ میں ایوب نے عبدالقیوم سے شرکت کا کوئی تذکرہ نہیں کیا؛ بلکہ محض امداد کی غرض سے رکھا تھا اورایوب نے اس کی شادی بھی کروائی، حج بھی کرایااورعبدالقیوم کی بیوی کے بیمار ہونے پر تقریباًدس لاکھ روپئےخرچ کئے(دل میں اس کوپوری طرح سیٹ کرنے کاعزم تھا)

ایوب نے کل پراپرٹی و جائیداد والد صاحب سے الگ ہونے کے بعد ہی خریدی ہے۔جوحسب ذیل ہے۔

(۱) چھاپر بھاٹھا (سورت کے قریب ایک قریہ) میں مکان،بھینسوں کا تبیلہ،

مزدوروں کے رہنے کے کمرے اوراس کے علاوہ تعمیری کام ۔(سروے نمبر۱۳۵۹،بلاک نمبر۱۳۱۶)

(۲) چھاپر بھاٹھا میں کھلی زمین۔

(۳) سورت میں لال دروازہ اپارٹمینٹ۔

(۴) کچھولی میں مکان، تبیلہ، مزدوری کے رہائشی کمرے، متعلقات تبیلہ۔ (سروے نمبر۳۵۲،بلاک نمبر۴۵۹)

(۵) سانگلی میں واقع ایک زمین۔

(۶) سورت ناگوری واڑ میں فلیٹ میں شرکت۔

(۷) ایک ٹیمپو۶۰۸۔

(۸) ٹاٹا ایس ٹیمپو۔

(۹)دودھ کے کین۔

(۱۰)ایس ایکس فور گاڑی۔

(۱۱) سوسائٹی کی جگہ۔

دوسوسات عدد بھینسیں۔

دونوں بھائی میں اختلاف ہونے پر بڑے بھائی نے مصالحین کے کہنے پر اپنی جائیداد تقسیم کی۔(صلہ رحمی کی بنیاد پر)

اور اسٹامپ پیپر پر دستخط بھی لئے گئے تاکہ آئندہ جھگڑے کی نوبت نہ آئے، کچھ عرصہ گزر چکا ابھی قبضہ بھی نہ تھا کہ دوبارہ تو تو میں میں ہونے لگی،اس پر عبدالقیوم کہنے لگا کہ مجھے صلہ رحمی کے طریقہ پر نہیں لینا ہے؛ بلکہ مجھے شرعی طور پر میرا حق ملنا چاہئے؛ چنانچہ اگلا صلح نامہ رد کردیا گیا،اور ردشدہ تحریر پر بھی سب دستخط لے لئے گئے،اور یوں لکھا گیا کہ شرعی طور پر جس کوحق ملے گا،اس پر وہ راضی رہے گا،والدین کے انتقال کے بعدان کے ترکے میں چنداشیاء تھیں۔

(۱)چھ لاکھ کی قیمت کی زمین۔

(۲) کھم بھات ضلع آنند میں ایک مکان اور والدہ کے ایک لاکھ پچیس ہزار کے زیورات، وارث داروں میں دولڑکے (ایوب اور عبدالقیوم) اور دولڑکیاں (حفصہ اور میمونہ) تھیں۔

اب آپ حضرت سے دریافت طلب چند امور یہ ہیں:

(۱) صلح نامہ طے کرنے سے عبدالقیوم کا حق ثابت ہوجائے گا؟

(۲) صلح نامہ رد کرنے سے رد ہوگا یا نہیں؟

(۳) صلح نامہ کو بنیاد بنا کر ایوب کی طرف سے عبدالقیوم کی شرکت کا اقرار مانا جائے گا؟

(۴) [المادہ: ۱٦٥٦] **الابتدار إلى تقسيم التركة إقرار بأن المقسوم مشتركاً وعليه فالادعاء بعد التقسيم بقول المقسوم لي تناقض.** (شرح المجلة لعلي حيدر ٤/ ٢٤٧)

اس عبارت میں ترکہ کو بطور مثال سمجھ کر مطلق مال کو اس پر قیاس کرنا صحیح ہوگا؟

(٥) **أقول الحاصل من جملة مامر أن المدعى لو صدر عنه ما يدل على أن المدعى ملك المدعى عليه تبطل رد دعواه لنفسه ولغيره للتناقض لو صدر عنه ما يدل على عدم ملكه ولايدل على عدم ملك المدعى عليه تبطل دعواه لنفسه لا لغيره؛ لأنه إقرار بعدم ملكه لا بملك المدعى عليه.**

(جامع الفصولين)

اس عبارت کے پیش نظر کیا تناقض ثابت ہوگا؟

(۷) ان دونوں عبارتوں سے فیصلہ عبدالقیوم کے حق میں کرنا صحیح ہوگا؟

نوٹ: ایوب نے جو الگ کاروبار کیا اس میں جتنا نقصان ہوا، سب کا تاوان ایوب ہی کے ذمہ تھا، سب نقصان کی بھرپائی ایوب نے کی، اول صلح نامہ کے وقت تقریباً بیس لاکھ قرضہ تھا وہ بھی ایوب ہی کے ذمہ تھا۔

المستفتی: فیاض آنند، ضلع: آنند (گجرات)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ کو بار بار پڑھ کے غور کیا گیا، اس قسم کے واقعات اور معاملات سے متعلق کثرت سے سوالات آرہے ہیں، کاروبار کے شروع کرتے وقت یا اپنے ذاتی کاروبار میں دوسرے بھائیوں کو شریک کرتے وقت کوئی معاملہ طے نہیں کیا جاتا ہے کہ شریک ہونے والا بھائی بطور مزدور شریک ہو رہا ہے یا بطور شرکت کاروبار میں شریک ہورہا ہے یا طفیلی بن کر کے شریک ہو رہا ہے، پہلے سے کاروبار چلانے والے بھائی کے رحم وکرم کی امید پر اس طرح کی کوئی صراحت نہیں کی جاتی ہے...... بالآخر نتیجہ یہی ہوتا ہے جو سوالنامہ میں تقسیم سے متعلق درج ہے، شرعی طور پر اس طرح بلا صراحت کسی کو کاروبار میں شریک کرنا معاملہ فاسدہ میں شامل ہوتا ہے، جس کا نتیجہ بالآخر لڑائی جھگڑا بن کر رہ جاتا ہے اور اس میں سب سے بڑی کمی پہلے سے کاروبار چلانے والے کی طرف سے ہوتی ہے کہ جب کاروبار میں اپنے بھائی کو شریک کرنے لگے، اسی وقت یہ صراحت کر دینی لازم ہے کہ بعد میں شریک ہونے والے کا حق کیا ہوگا۔

اب سوال نامہ سے متعلق اس کے علاوہ ہمارے سمجھ میں اور کچھ نہیں آرہا ہے کہ معتبر آدمیوں کو بیچ میں ڈال کر جانبین سے صلح کے ذریعہ سے معاملہ کو حل کیا جائے، دوسرا بھائی عبد القیوم ایوب کی جانب سے صلہ رحمی اور رحم وکرم کے طور پر لینے کو تیار نہیں ہو رہا ہے؛ اس لئے دونوں بھائیوں کے ذہنوں میں شرکت کے وقت کیا تھا، ان ہی دونوں کو معلوم ہے؛ لہٰذا ایماندارانہ طور پر ایک دوسرے کی عزت کا لحاظ رکھتے ہوئے صلح کے ذریعہ سے معاملہ کو حل کرلیں، تو بہتر ہوگا اور عبد القیوم کا یہ کہنا کہ میں اپنا حق لوں گا وہ حق کیا ہے، وہ متعین نہیں ہے؛ اس لئے عبد القیوم کو صلح ہی پر راضی کر لینا چاہئے۔

عن عبد الله بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه عن جده،أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحاً حرم

حلالاً، أو أحل حراماً، والمسلمون على شروطهم إلا شرطاً حرم حلالاً، أوأحل حراماً. (سنن الترمذي، الأحكام، باب ماذكر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/۲۵۱، دارالسلام رقم:۱۳۵۲، سنن أبي داؤد، كتاب القضاء، باب في الصلح، النسخة الهندية ۲/۵۰۶، دارالسلام رقم:۳۵۹٤، صحيح البخاري، كتاب الإجارة، باب أجر السمسرة، النسخة الهندية ۱/۳۰۳)

قوله تعالىٰ: والصلح خير، ولأن الصلح شرع للحاجة إلى قطع الخصومة، والمنازعة، والحاجة إلى قطعها في التحقيق عند الإنكار. (بدائع الصنائع، كتاب الصلح، زكريا٥/٤٧، كراچي ٦/٤٠، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۷/۳۳٦)

وهذه الجهالة مفضية إلى المنازعة فيمتنع التسليم والتسلم وكل جهالة هذه صفتها تمنع الجواز هذا هو الأصل. (هداية، كتاب البيوع، اشرفي ۳/۲۰)

وكل ما هو واجب بالعقد يمتنع حصوله...... بالجهالة المفضية إلى النزاع، فالتسليم يمتنع بها. (العناية، مع الفتح دارالفكر ٦/۲٦۱، كوئٹه ٥/٤٦۸، البنايه، اشرفيه ديوبند۸/۱٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶؍ جمادی الثانیہ ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹؍۱۰۴۲۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۶/۷ھ

ترکہ کے منافع کی تقسیم کے تناسب کا طریقۂ کار

سوال [۸۹۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہم چار بھائی دو بہنیں ہیں، والد کا انتقال بہت پہلے ہوگیا، ہم چاروں بھائی کا کاروبار ایک ساتھ ہورہا تھا، اس سال ساری جائیداد تقسیم ہوگئی، میں سب سے چھوٹا ہوں اوراپنی دونوں بہنوں کو ان کا حصہ دینا چاہتا ہوں، کیا والد کے وقت کی جائیداد بٹے گی یا اس

وقت جو ہمیں ملا ہے، اس میں حصہ لگےگا اور کتنا کتنا حصہ دونوں بہنوں کا ہوگا ؟

المستفتی: محمد عظمت علی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مرحوم کا ترکہ ان کے وارثین کے درمیان موجودہ ترقی شدہ مال کے اعتبار سے تقسیم ہوگا؛ کیونکہ متروکۂ مرحوم میں تقسیم سے قبل تجارت اور کاروبار جاری رکھا تو متروکۂ مرحوم بھی مشترک رہا ہے؛ اس لئے موجودہ جائیداد کے اعتبار سے بھائیوں اور بہنوں کو حصہ ملے گا۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۸/۳۱۴، جدید زکریا مطول ۱۳/۵۷۵)

و لو اجتمع إخوة يعملون في تركة أبيهم ونما المال، فهو بينهم سوية، ولو اختلفوا في العمل والرأي. (شامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ولايعلم التفاوت، فهو بينهما بالسوية، زكريا ۶/۵۰۲، كراچي ۴/۳۲۵)

اور بوقت تقسیم کا اعتبار کرتے ہوئے حسب ذیل نقشہ کے مطابق ترکہ تقسیم ہوگا۔

والدمرحوم: میت

لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی
۲	۲	۲	۲	۱	۱

مرحوم کا کل ترکہ دس سہام میں تقسیم ہوکر چاروں بھائیوں کو ۲-۲ اور دونوں بہنوں کو ایک ایک حصہ ملے گا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/ ذی قعدہ ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۶۰۲/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۱۱/۱۴۲۵ھ

ایک بھائی کی جائیداد میں دوسرے بھائی شریک ہیں یا نہیں؟

سوال [۸۹۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ زید کی نو اولادیں ہیں، تین لڑکیاں اور چھ لڑکے عمر اور بکر نے زید کی حیات میں پرانی عمارت توڑ کر دوبارہ بنوائی ہے اور باقی چار لڑکے اس وقت نابالغ تھے اور عمر اور بکر ہی نے دو بہنوں کی شادی بھی کی ہے، اس کے بعد عمر اپنے ہی پیسے سے ایک زمین الگ خرید کر اس پر عمارت بنا کر رہ رہا ہے اور زید کی پرانی عمارت میں اتنی گنجائش نہیں ہے، جو گھر کے لوگ اس میں رہ سکیں، عمر کے علاوہ گھر کے سب لوگ زید کی پرانی عمارت میں رہ رہے ہیں۔ اب عمر معلوم یہ کرنا چاہتا ہے کہ باپ یعنی زید کی پرانی عمارت میں عمر کا حق ہے یا نہیں؟ جواب تحریر فرمادیجئے۔

المستفتی: افتخار احمد، مقبرہ اولی، درگاہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: عمر نے نئی زمین خرید کر الگ سے جو عمارت بنائی ہے، اگر سب کے ساتھ شریک رہتے ہوئے کما کر بنائی ہے، تو جس طرح پرانی عمارت میں سب کا حق ہے، اسی طرح مذکورہ جدید عمارت میں بھی سب کا حق ہوگا اور اگر عمر سب سے الگ ہو کر اپنی فیملی کو بالکل الگ رکھا ہے اور الگ رہنے کے زمانہ میں زمین خرید کر عمارت بنائی ہے، تو جدید عمارت میں عمر کے ساتھ اور کوئی شریک نہ ہوگا اور عمر کی پرانی عمارت سے باپ کے ترکہ کا حصہ ملے گا۔

ولو اجتمع إخوة يعملون في تركة أبيهم ونما المال، فهو بينهم سوية، ولو اختلفوا في العمل والرأي. (شامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ولايعلم التفاوت، فهو بينهما بالسوية، زكريا ٦/٥٠٢، كراچي ٤/٣٢٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ رجب المرجب ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/۲۷۸۱)

مشترکہ زمین میں ورثاء اور شریک کے حصہ کی تفصیل

سوال [۸۹۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری ساس اور ماں نے مل کر ساڑی میں بیل لگانے کی ایک مشین لگائی تھی، لائسنس ساس کے نام تھا، ان کے انتقال کے بعد میرے شوہر نسیم کے نام کر دیا گیا، جس پر بالغ لوگوں نے اپنی طرف سے اور میرے خسر نے نابالغ بچوں کی طرف سے یہ کہہ کر دستخط کر دیئے کہ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے، اس طرح لائسنس شوہر مرحوم کے نام ہوگیا؛ لیکن میری والدہ کو کچھ بھی پیسہ نہیں دیا گیا، تھوڑے عرصہ کے بعد شوہر نے مشین فروخت کر کے بنیان پر لیبل لگانے کی مشین لگائی، اس کے نفع سے تین اور مشین لگائیں، پھر اسی نفع سے تانبے کی چین بنانے کی مشین لگائی، ان تمام مشینوں کی بجلی کا کنکشن میرے شوہر کے نام تھا، ان سے مجھے ماہواری پچاس ہزار روپیہ آمدنی ملتی تھی، شوہر کی شہادت کے بعد خسر نے مجھ سے جھگڑا کر لیا، اس وقت میرے بچے نابالغ تھے، جس کا فائدہ اٹھا کر انہوں نے مشینوں کو اپنے قبضہ میں لیکر کمرہ میں تالا لگا دیا، اب تک پچاس ہزار روپیہ کا نقصان ہو رہا ہے، یہ مشینیں کس کی ہیں؟ اور اس نقصان کا ذمہ دار کون ہے؟ تفصیل سے آگاہ فرمائیں۔

المستفتیۃ: نرگس جہاں، آگرہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کی ساس اور ماں نے مل کر جو مشین لگائی تھیں، اس میں دونوں برابر کی شریک ہوں گی آدھا آدھا دونوں کا حق ہوگا، پھر ساس کے انتقال کے بعد بالغ ورثاء کا آدھی مشین میں جتنا حق ہے، ان کی رضا سے آپ کے شوہر اتنے کے مالک ہوں گے اور نابالغ ورثاء کی جانب سے رضامندی کا دستخط کرنے سے ان کے حصے کے مالک نسیم نہ ہوں گے؛ کیونکہ باپ کو نابالغ بچوں کا حق کسی کو ہبہ کرنے اور دینے کا اختیار نہیں ہے۔

ليس للأب تحرير قنه بمال وغيره، ولا أن يهب ماله، ولو بعوض ولا إقراضه في الأصح. (شامي، كتاب الوكالة، باب الوكالة بالبيع والشراء، زكريا ٢٦٧/٨، كراچي ٥٢٩/٥، جامع الفصولين ١٣)

اوراس کاروبار کو مرحوم نسیم کے ذریعہ جو ترقی ہوئی، ان کے انتقال کے بعد موجودہ کل مشینوں کی قیمت کے اعتبار سے اولاً دو حصے کئے جائیں گے، آدھے کی مالک آپ کی ماں ہوں گی، اور دوسرے آدھے میں جتنا نابالغ ورثاء کا حق ہوتا ہے، اتنا نکال کر بقیہ نسیم مرحوم کے شرعی ورثاء کے مابین تقسیم ہوگا۔

وإذا صحت فما اشتراه أحدهما يقع مشتركا. (در مختار، كتاب الشركة، زكريا٦/٤٧٨، كراچي ٣٠٧/٤، تنقيح الفتاوى الحامدية ٩٤/١)

اور نفع ہونے سے جو خسر صاحب نے مشینوں کو روک رکھا ہے، اس کی وجہ سے وہ گنہگار رہوں گے اس نقصان کا ان پر کوئی تاوان نہ ہوگا، ان مشینوں میں جن لوگوں کا حق ہے ان کو ان کا حق ملنا چاہئے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴ ر جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵ / ۶۶۱۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۵/۵ھ

(۴) باب الشركة الفاسدة

کمپنیوں میں ممبری کی شرعی حیثیت

سوال[۸۹۲۲]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اس دور میں بہت سی سرکاری ونیم سرکاری کمپنیاں اوران کے ایجنٹ لوگوں کو کمپنیوں کاممبر بناتی ہیں، ایجنٹوں کا کہنا ہے کہ ہم سرمایہ جمع کرنے کے بعداس سے زمین خرید کرشجر کاری کرتے ہیں اورمرغی فارم وغیرہ کھولتے ہیں، دوتین چار چھ سال بعداس کوفروخت کرکے اس کا نفع مع اصل کے دوگنا واپس کرتے ہیں، اس ممبر کا نقصان سے کوئی واسطہ نہیں، یہ شکل درست ہے یاسود بیاج میں داخل ہے، ایسی ممبری وایجنٹی کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد الیاس بن عبدالرحیم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سرکاری ونیم سرکاری کمپنیاں اوران کے ایجنٹ اگرکمپنی کے نفع ونقصان دونوں میں حسب تناسب شرکت کے ساتھ ممبرسازی کریں اورممبر کے ذہن میں بھی یہ بات ہو کہ کمپنی کے نفع ونقصان دونوں میں شرکت ہے، تواس صورت میں کمپنی کاممبر بن کراس میں شرکت تجارت کے درجے میں ہوکر جائز ہوگی، اوراگرصرف نفع ہی میں شرکت ہونقصان میں نہیں، تو یہ صورت جائز نہیں اورآپ کا یہ کہنا کہ ممبر کا نقصان سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، درست نہیں ہے، اتفاقی طور پر نقصان ہوسکتا ہے، مثلاً ساری مرغیوں میں بیماری پھیل جائے اور چند دن میں سب مرجائیں یا کوئی شکل ایسی ہوسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نقصانات سے حفاظت فرمائے؛ اس لئے نفع کے ساتھ نقصان کی بھی قید لگائی جائے، ورنہ

صرف نفع کی شرکت کی صورت میں اس کا نفع سود ہوگا، تجارت نہیں؛ لہٰذا ایسی کمپنیوں کی ممبر شپ اور ملازمت درست نہیں۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ار۱۰۳)

عن جابر بن زيدؓ، قالوا: الربح على ما اصطلحوا عليه، والوضيعة على المال، هذا في الشريكين، فإن هذا بمأة، وهذا بمأتين. (مصنف عبد الرزاق، البيوع، باب نفقة المضارب، ووضيعته، المجلس العلمي ٢٤٨/٨، رقم: ١٥٠٨٩)

إذا شرطا الربح على قدر المالين متساوياً، أومتفاضلاً ، فلا شك أنه يجوز ويكون الربح بينهما على الشرط، سواء شرطا العمل عليهما، أوعلى أحدهما، والوضيعة على قدر المالين متساوياً، ومتفاضلاً؛ لأن الوضيعة إسم لجزء هالك من المال فيتقدر بقدر المال. (بدائع الصنائع، كتاب الشركة، زكريا ٥/٨٣، كراچي ٦/٦٢، شامي، زكريا ٦/٤٧٥، كراچي ٤/٣١٢، هندية، زكريا قديم ٢/٣٢٠، جديد ٢/٣٢٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶ رمحرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴ر۶۴۳۱)

کمپنیوں کی ممبر سازی کا حکم

سوال [۸۹۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک کمپنی روزمرہ کی استعمال میں آنیوالی چیزیں لوگوں میں سپلائی کرتی ہے، جس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس کمپنی کا ممبر بننا چاہے، تو پندرہ سو روپئے جمع کر کے کمپنی اس کے بدلے شروع میں کچھ کپڑے بیگ وغیرہ دیتی ہے اور اپنا ممبر بنا لیتی ہے۔ اب ممبر بننے کے بعد اگر کوئی شخص مثلاً ڈھائی ہزار روپئے کا روزمرہ کی استعمال میں آنیوالی چیزیں ہر ماہ خریدتا ہے، تو اس کو بازار کی عام قیمت میں سے بیس فیصد چھوٹ دی جاتی ہے؛ اسی طرح جتنے

روپیہ کا سامان خریدے گا، اتنی زیادہ چھوٹ دی جاتی ہے یعنی اتنا ہی سستا سامان اس کو ملے گا؛ لیکن جس وقت سامان کی خریداری ہوتی ہے، اس وقت ہی بازار کی عام قیمت پوری ادا کرنی ہوتی ہے، اور بیس فیصد چھوٹ والی رقم کمپنی مہینے کے اخیر میں واپس کرتی ہے، یعنی چیزوں کی پوری رقم ابھی ادا کردو، پھر مہینے کے اخیر میں حساب لگا کر جتنے روپئے کا سامان بنتا ہے، اتنی فیصد چھوٹ والی رقم واپس کردی جاتی ہے۔

اب یہ ممبر کسی دوسرے شخص کو ممبر بنائیں اور وہ ممبر بن کر سامان خریدے تو اس کا کچھ نفع ممبر بنانیوالے کو بھی ملتا ہے مثلاً دوسرے شخص نے پانچ ہزار کا سامان خریدا تو کمپنی ممبر بنانے والے کو دس فیصد نفع دیتی ہے، اسی طرح دوسرے نے تیسرے کو ممبر بنایا، تو اس کا کچھ نفع پہلے ممبر کو بھی ملتا ہے، اور دوسرے کو بھی ملتا ہے، اسی طرح تیسرے نے چوتھے کو ممبر بنایا، تو اوپر والوں کو کمپنی کچھ نہ کچھ نفع دیتی ہے، مگر ایک آدمی صرف دو ممبر بنا سکتا ہے، زیادہ نہیں۔

نیز یہ نفع اس وقت ملے گا جب خود ممبر بنے اور بنانے کے بعد ہر ماہ کچھ نہ کچھ سامان خریدے یعنی دوسرے ممبروں سے نفع حاصل کرنے کے لئے خود ممبر کو سامان خریدنا ضروری ہے، پھر نفع کی مقدار کے مختلف درجات بھی طے ہیں، یعنی جتنا روپیوں کا سامان خریدا جائے گا، کمپنی اتنا زیادہ نفع دے گی، مثلاً پانچ ہزار کی خرید پر دس فیصد نفع دیتی ہے اور تیس لاکھ پچاس ہزار کی خرید پر تیس فیصد منافع دیتی ہے، کمپنی والوں کا کہنا ہے کہ ہم سامان؛ اس لئے سستا دیتے ہیں کہ سامان کی تشہیر کے لئے جتنے اسباب مثلاً اخبار، ٹیلی ویژن وغیرہ ہوتے ہیں، ان کو ختم کر کے بلا واسطہ ممبران کمپنی سے خریدتے ہیں؛ اسی لئے ممبران کو چیزیں سستی پڑتی ہیں اور نفع اس لئے دیتے ہیں کہ آپ ممبر سازی کرتے ہیں، تو ممبر سازی کی وجہ سے اپنے نفع میں سے کچھ نفع آپ کو دیا جاتا ہے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طرح ممبر بننا بنانا نیز کمپنی جو نفع دیتی ہے اس کو لینا کیسا ہے؟ برائے کرم مفصل مدلل جواب سے نوازیں گے، تو بہت مہربانی ہوگی۔

المستفتی: حاجی محمد شاکر، اکولہ (مہاراشٹر)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس قسم کی کمپنیاں ہندوستان میں مختلف نوعیت کے ساتھ چل رہی ہیں اور اس میں عدم جواز کی ایک علت تقریباً اکثر کمپنیوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے، وہ علت یہ ہے کہ پہلے جو شخص کمپنی سے سامان خرید کر ممبر بنا ہے، پھر اس کو کمپنی کے ضابطہ کے مطابق سستا سامان خریدار کو ملتا ہے اور اس سامان کی فروختگی کے بعد کمپنی اپنے ضابطہ کے مطابق پیسے کی کمی والا حصہ ممبر کو واپس کر دیتی ہے، یہ بات پہلے سے طے ہے، تو یہاں تک معاملہ کسی حد تک جائز کہا جاسکتا ہے، پھر اس کے بعد یہ ممبر دوسروں کو جب ممبر بنائے گا، اس ممبر سازی کے عوض میں اس پہلے ممبر کو کمپنی اپنے ضابطہ کے مطابق کمیشن کے نام سے اجرت دیتی ہے، یہ بھی جائز ہے، مگر اس کے بعد نیچے کے ممبران جو ممبر سازی کریں گے، اس ممبر سازی کے عوض میں پہلے ممبر کو بھی کچھ دیا جاتا ہے، یہ جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ نیچے کی ممبر سازی میں پہلے ممبر کا براہ راست کوئی عمل شامل نہیں ہے، اسی طرح نیچے تک کسی بھی طبقہ کے ممبر کی ممبر سازی کی اجرت کا کچھ حصہ پہلے ممبر کو ملنا جائز نہیں؛ اس لئے مذکورہ کمپنی کا طریقہ کار اور اس کے معاملات شرعاً درست نہیں ہیں۔

ولم یر ابن سیرین وعطاء، وإبراهیم، والحسن بأجرة السمسار بأسًا. (صحیح البخاري، کتاب الاجارة، باب أجر السمسرة، النسخة الهندیة ۱/۳۰۳، مصنف لابن أبي شیبة مؤسسة علوم القرآن جدید ۱۱/۳۳۹، رقم: ۲۲۵۰۰)

سئل محمد بن سلمة رضؓ، عن أجرة السمسار، فقال: أرجوا أنه لا بأس به، وإن کان في الأصل فاسداً لکثرة التعامل. (شامي، کتاب الإجارة، باب ضمان الأجیر، مطلب في أجرة الدلال، زکریا ۹/۸۷، کراچي ۶/۶۳، الفتاوی التاتارخانیة، زکریا ۱۵/۱۳۷، رقم: ۲۲۴۶۲، الفتاوی الولوالجیه، دارالأیمان سهارن پور ۳/۳۴۴، الأشباه والنظائر، کراچي ۲/۶۰، المبسوط دارالکتب العلمیة بیروت ۱۵/۱۵۵)

لایجوز لأحد من المسلمین أخذ مال أحد بغیر سبب شرعي. (شامي،

كتاب الحدود، باب التعزير، زكريا ٦/١٠٦، كراچي ٦١/٦، قواعد الفقه اشرفي ١١٠، رقم:٢٦٩، هندية، زكريا قديم ١٦٧/٢، جديد ٢/١٨١، شرح المجلة رستم اتحاد ديوبند ٦٢/١، رقم المادة: ٩٧، البحرالرائق، زكريا ٥/٦٨، كوئٹه ٥/٤١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۲۳۰)

شیئرز میں بیمہ کی شکل

سوال [۸۹۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بھارتی جیون بیمہ نگم کے بارے میں کیا حکم ہے؟ یہ نگم کمپنی ایک لاکھ یا کم و بیش روپیہ بیس سال کی مدت یا کم وبیش کے لئے مبلغ چھ ہزار روپیہ یا کم وبیش سالانہ رقوم جمع کراتی ہے، رقم جمع کرنے والے نے جس چیز کا بیمہ کرایا ہے، اس کی گارنٹی دیتی ہے، جان ومال وغیرہ کی یعنی ممبر کا یہ پیسہ مارا نہیں جائے گا، اگر وہ بیس سال سے قبل اپنا پیسہ لینا چاہتا ہے، تو ممبر کو ۳/۴ جمع رقم سے مل بھی سکتا ہے اور وہ اس صورت میں بھی ممبری کا حقدار بنا رہے گا، یہ کمپنی اس پیسہ کو بینک میں جمع نہ کر کے تجارت میں لگاتی ہے، اس میں نفع ونقصان دونوں کا احتمال ہے، یہ کمپنی اپنے ممبر کو سود کی شکل میں رقم یا پیسہ نہ دیکر منافع کی صورت میں دیتی ہے، نقصان کمپنی خود برداشت کرتی ہے، جس سے بہت سے بے روزگاروں کو کام ملتا ہے۔ نیز روٹی روزی چلتی ہے، بہر حال یہ سودی کاروبار نہیں۔

المستفتی: خادم قوم حافظ و ماسٹر شکیل احمد سلیم پور گڑھی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سوال نامہ میں بیمہ کی پوری شکل واضح نہیں کی گئی؛ لیکن پھر بھی آخری جز کا جواب یہ ہے کہ جمع شدہ رقم سے تجارت کرنے میں صرف نفع

میں شرکت کرنا اور نقصان میں شرکت نہ کرنا شرعی طور پر جائز نہیں، ایسا معاملہ شرعاً فاسد ہے؛ اس لئے کہ شرکت کے جائز ہونے کے لئے تجارت کے نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہونا شرط ہے؛ اس لئے یہ معاملہ جائز نہیں ہے۔

لكل واحد منهما ربح ماله والوضيعة بينهما على قدر رأس المال أبداً. (فتاوى شامي، كتاب الشركة، مطلب في شركة العنان، زكريا ٦/٤٨٤، كراچي ٤/٣١٢، حاشية الطحطاوي على الدر، كوئٹه ٢/٥١٧، بدائع الصنائع، زكريا ٥/٨٣، كراچي ٦/٦٢، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٦/٦١، هندية، زكريا قديم ٢/٣٢٠، جديد ٢/٣٢٦، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ٧/٤٩١، رقم: ١٠٩٦٩، الفقه الإسلامي وأدلته، هدىٰ انٹرنيشنل ديوبند ٤/٥٩٢)

والربح على ما شرطا وقيد بالربح؛ لأن الوضيعة على قدر المال، وإن شرطا غير ذلك. (الدر المختار مع الشامي، زكريا ٦/٤٨٦، كراچي ٤/٣١٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۴۴۸)

شیئرز کی بیع وشراء کا شرعی حکم

سوال [۸۹۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہندوستان میں رائج شیئرز کمپنیوں میں شرکت کرنا یا شیئرز خریدنے والوں سے شیئرز خریدنا (چاہے کمپنی مسلمان کی ہو یا غیر مسلمان کی) از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟ اور اس طریقہ سے حاصل شدہ آمدنی حلال ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: محمد محسن، متعلم دار الافتاء، جامعہ اسلامیہ مدنیۃ العلوم، معماری، بردوان (بنگال)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: ہندوستان میں رائج شدہ شیئرز جومختلف کمپنیوں کے نام سے جاری کردہ ہیں، تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ صرف نام کے شیئرز ہیں، حقیقت میں سٹہ کی شکل ان میں پائی جاتی ہے؛ اس لئے ہندوستان کے شیئرز کے کاروبار کو مطلقاً جائز نہیں کہا جاسکتا، ہاں البتہ اگر واضح ہوجائے کہ کمپنی حصہ داروں کے پیسے براہ راست اپنے کاروبار میں لگاتی ہے، مثلاً پلاٹنگ میں یا فیکٹری بنانے میں یا فیکٹریوں میں مال تیار کرنے میں براہ راست لگاتی ہے، پھر اس کے سالانہ منافع صحیح طور پر نکال کر حصہ داروں میں وہ نفع بلا کسی سودے بازی کے ہر حصہ دار کو پہونچایا جاتا ہے، تو اس طرح کے شیئرز جائز ہے، مگر تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ اس طرح کے شیئرز کا کاروبار نہیں پایا جاتا، یا یہ کالعدم جیسا ہے۔

أما الميسر ......وقال قوم من أهل العلم، القمار كله من الميسر ......وحقيقة تمليك المال على المخاطرة. (أحكام القرآن للجصاص، سورة المائدة، باب تحريم الخمر زكريا ٢/ ٥٨٢، سهيل اكيڈمي لاهور٢/ ٤٦٥، هكذا في أحكام القرآن للتهانوي ١/ ٥٨١، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٩/ ٤٠٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۷؍ربیع الاول ۱۴۲۹ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸؍۹۵۰۴)	۱۴۲۹/۳/۸ھ

شیئرز کا شرعی حکم

سوال [۸۹۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کسی کمپنی کا شیئرز لینا جائز ہے یا ناجائز ہے؟ جس میں نفع اور نقصان دونوں ہوں۔

المستفتی: دانش علی، محلّہ بھٹی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آج کل کے زمانے میں شیئرز کے نام سے جتنی بھی شکلیں چل رہی ہیں، تقریباً سبھی کے بارے میں تحقیقات کی گئیں ہیں، ان میں سے کوئی بھی شکل شرعاً جواز کے دائرے میں نہیں آتی اور انٹرنیٹ کے ذریعہ سے جو شکلیں چل رہی ہیں، وہ صاف طور پر جوا اور قمار پر مبنی ہیں؛ اس لئے اس زمانے میں شیئرز کی جتنی بھی شکلیں رائج ہیں وہ جائز نہیں؛ اس لئے کہ تقریباً سبھی قمار یا سود کے دائرہ میں داخل ہو جاتی ہیں۔

وقال قوم من أهل العلم: القمار كله من الميسر –إلى قوله– وحقيقة تمليك المال على المخاطرة. (أحكام القرآن للجصاص، سورة المائده، باب تحريم الخمر، زكريا ۲/۵۸۲، سهيل اكيڈمي لاهور ۲/۴۶۵)

وقال الجصاص لا خلاف بين أهل العلم في تحريم القمار وأن المخاطرة من القمار. قال ابن عباس: المخاطرة قمار. (أحكام القرآن التهانوي ۱/۲۸۱، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۹/۴۰۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۶ رجمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/۱۰۰۴۷)	۱۴۳۱/۵/۶ھ

شیئرز کی کون سی شکل جائز اور کون سی نا جائز؟

سوال [۸۹۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ **الف:** ایک گروپ عوام کے سرمائے کو شیئرز اور دیگر بڑی کمپنیوں میں لگاتا ہے، اور ان کمپنیوں کے کاروبار میں حصہ لیتا ہے، جو قیمتی اشیاء تیار کر کے مارکیٹ میں فروخت کرتی ہیں۔

اب وہ کمپنیاں کس طرز پر تجارت کرتی ہیں، بینک سے سودی کاروبار ہوتا ہے،

فروخت کا طریقہ کار کیا ہے؟ ہمیں معلوم نہیں، تو کیا اس طریقہ سے کسی انجانے کاروبار میں سرمایہ لگا کر گھر بیٹھے منافع کمانا درست ہے؟

ب: ایک گروپ منافع کی شرح ۸۰/۲۰ کے تناسب سے شرکاء کے درمیان تقسیم کرتا ہے، یعنی سرمایہ کار کو ۲۰/ فیصد منافع حاصل ہوتا ہے؛ جبکہ تمام محنت اور جو بھی کاروبار ہوتا ہے، وہ گروپ اور اس کے ذمہ داران کرتے ہیں اور منافع صرف ۲۰/ فیصد لیتے ہیں اور سرمایہ کار جو پیسہ لگاتا ہے، اسے ۸۰/ فیصد منافع ہوتا ہے، تو کیا یہ درست ہے؟

ج: اسی طرح اگر کمپنی کا نقصان ہوتا ہے، تو سرمایہ کار کو نقصان برداشت نہیں کرپڑے گا، وہ نقصان صرف کمپنی ہی برداشت کرے گی، تو کیا یہ درست ہے؟

المستفتی: محمد اسلم، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسی کمپنی سے شیئرز لینا جس کا طریقۂ تجارت معلوم نہ ہو اور نہ یہ معلوم ہو کہ وہ سودی کاروبار بھی کرتی ہے؛ لیکن غالب گمان یہی ہے کہ وہ کمپنی سودی کاروبار بھی کرتی ہے، تو ایسی شکل میں اس کمپنی کے ساتھ شرکت مکروہ تحریمی ہوگی اور اگر کمپنی میں سودی کاروبار نہیں ہے یا کمپنی کا سودی کاروبار کرنا یقین سے نہ معلوم ہوسکا، تو ایسی کمپنی سے شیئرز خریدنا اور منافع حاصل کرنا بلا کراہت جائز ہوگا۔

(مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۴۹۷، ایضاح النوادر ۱/ ۱۰۶)

مگر تشویش کی بات یہ ہے کہ ہندوستان میں فی زمانہ ایسی کوئی کمپنی جو شیئرز کا کام کرتی ہو، جو بالکل معاملہ شرکت کے انداز پر کام کرتی ہو تحقیق سے نہ معلوم ہوسکی، اگر کوئی ایسی کمپنی معاملہ مضاربت یا شرکت کے تمام شرائط کو ملحوظ رکھ کر کام کرتی ہو اور سودی کاروبار بھی نہ کرتی ہو، تو ایسی کمپنی میں شرکت کرنا بلاتردد جائز ہے، مگر ہماری معلومات میں نہیں ہے۔

ب: شرکت اور مضاربت کے شرائط کے ساتھ یہ منافع درست ہیں اور نقصان ہو، تو نقصان میں سب برابر شریک ہوں گے۔

ج: اگر سرمایہ کارکوکوئی نقصان نہ ہوتا ہو؛ بلکہ اس کا نفع متعین ہے، چاہے کمپنی کا نقصان ہو یا نفع تو یہ معاملہ بینک کے سود کے مشابہ ہوکر ناجائز اورحرام ہوگا۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/ ۱۰۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۱۵۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۵/۱۴ھ

شیئرز کی خرید وفروخت کی شرعی حیثیت

سوال [۸۹۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسلمانوں کوشیئرز خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز تو پھر ہمیں کن کمپنیز کے شیئرز خریدنے چاہئے؛ جبکہ ہم یہ بھی جانتے ہیں، سبھی بڑی بڑی کمپنیز اپنے کاروبار کے لئے بینک سے ہی سرمایہ لیتی ہیں، جن کے ساتھ سود کا بھی عنصر ہوتا ہے۔

المستفتی: مفتی عتیق الرحمٰن، مدرسہ اسلامیہ، دارالعلوم کامٹی، ناگپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شیئرز کی جتنی بھی قسمیں ہیں، ان سب کے بارے میں غور کرکے دیکھا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی قسم جواز کے دائرہ میں نہیں آتی اور ہر ایک قسم یا تو سودی معاملہ میں داخل ہوکر ناجائز ہوجاتی ہے یا جوا اور سٹہ کے دائرہ میں داخل ہوتی ہے اور یہ دونوں قسمیں ناجائز ہیں۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا . [البقرہ:۲۷۵]

عن عبداللّٰہ بن عمروؓ، أن نبي اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم نهی عن الخمر والمیسر والکوبة. (أبوداؤد شریف، باب النهي عن المسکر، النسخة الهندیة، ۲/ ۵۱۹، دارالسلام رقم: ۳۶۸۵)

وعن ابن سيرين: كل شيئ فيه خطر فهو من الميسر. (روح المعاني، زكريا٣/ ١٧٢)

ومعنىٰ النهي ما في كل من الجهالة و تعليق التمليک بالخطر . (فتح القدير، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، كوئٹه ٦/ ٥٥، زكريا ٦/ ٣٨٣، دارالفكر٦/ ٤١٧، الموسوعة الفقهية الكويتية، ١٦/ ١٧٠، شامي، كراچي ٥/ ٦٥، زكريا ٧/ ٩٥٥)

والقمار حرام. (مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٢١٦، مصري قديم ٢/ ٥٤٩، المبسوط دارالكتب العلمية بيروت ١١/ ١٨، ١٥/ ٧)

ولا خلاف بين أهل العلم في تحريم القمار . (أحكام القرآن للجصاص، سورة، باب تحريم الميسر، زكريا ١/ ٣٩٨، سهيل اكيڈمي لاهور ١/ ٣٢٩)

عن عمر بن الخطابؓ، قال: إن آخر ما نزلت آية الربا، وإن رسول الله صلى الله عليه وسلم قبض ولم يفسرها لنا، فدعوا الربا والريبة. (سنن ابن ماجه، باب التغليظ في الربا، النسخة الهندية ٤ ١٦، دارالسلام رقم:٦ ٢٢٧، مسند أحمد بن حنبل ١/ ٣٦، رقم:٦ ٢٤، ١/ ٤٩، رقم: ٣٥٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ر شوال المکرم ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۴۹۸/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۱۰/۲۸ھ

شیئرز کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۹۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بندہ شیئرز مارکیٹ کا کام کرنا چاہتا ہے، اس کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) کسی کمپنی کا شیئرز ۱۰۰ر روپیہ کا ہو، اس کو ہم ۱۰۰ روپئے دیکر خریدلیں اور دو چار دنوں کے بعد کمپنی فائدے یا خسارے میں جائے، اگر خسارے میں جاتی ہے، تو شیئرز ۸۰ر روپیہ کا رہ جاتا ہے، اگر فائدہ میں جاتی ہے، تو شیئرز ۱۲۰ر کا ہوجاتا ہے، اس شیئرز کو ہم

فروخت کر دیتے ہیں، فروخت کرنے کی شکل میں فائدہ اور نقصان دونوں کا امکان ہے، کیا یہ صورت جائز ہے یا ناجائز؟

(۲) اگر ۱۰۰ روپیہ والے شیئرز کو ہم دس فیصد جمع کر کے خرید لیں، خرید نے کے ساتھ ساتھ شیئرز کو ایک مہینہ کے اندر فروخت کرنا ضروری ہے، اگر کمپنی خسارے میں ہو، تو فروخت کر دیتی ہے اور فائدے کی صورت میں صاحب معاملہ کی اجازت پر فروخت کرے گی، فروخت کرنے کی صورت میں فائدہ اور نقصان دونوں کا امکان ہے، کیا یہ صورت جائز ہے یا ناجائز؟

المستفتی: محمد عارف، حسن، فٹ پیر سینمارو ڈ، بلاسپور، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں درج کردہ کمپنی کے شیئرز کا جوطریقۂ کار ذکر کیا گیا ہے، وہ شرعاً شیئرز کے دائرہ میں داخل نہیں؛ اس لئے کہ شیئرز کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی کمپنی کے کاروبار میں حصہ دار بن جانا، جس کمپنی میں حقیقی معنیٰ میں مشروع طریقہ سے کاروبار ہوتا ہو اور حصہ دار اور پارٹنر بننے کا مطلب یہ ہے کہ کمپنی کی پونجی اورآپ کے دیئے ہوئے روپئے کے درمیان میں تناسب دیکھا جائے پھر اس تناسب کے اعتبار سے آپ کے پیسہ سے کمپنی حقیقی معنیٰ میں کاروبار کرے، پھر اس کارور بار سے نفع ہو، تو آپ کو نفع ملے اور کاروبار میں گھاٹا ہو، تو اس گھاٹے کا نقصان آپ کو بھی برداشت کرنا پڑ جائے اور سوال نامہ میں درج کردہ انٹرنیٹ پر شیئرز کے کاروبار کا موجودہ طریقہ اس میں شامل نہیں ہے؛ اس لئے کہ انٹرنیٹ پر صرف اشیاء کا بھاؤ دیکھا جاتا ہے، کبھی بین الاقوامی سطح پر بھاؤ دیکھا جاتا ہے اور کبھی ملکی سطح پر بھاؤ دیکھا جاتا ہے؛ حالانکہ کمپنی اور کمپنی کے آرگنائزر ان اشیاء کے نہ مالک ہوتے ہیں اور نہ ہی ان اشیاء کو براہ راست ہاتھ میں لے کر فروخت کر سکتے ہیں؛ بلکہ ایک ایسی چیز کے بھاؤ تاؤ پر شیئرز کی خریداری ہوتی ہے، جس کے وہ خود مالک

نہیں ہوتے ہیں؛ لہٰذا یہ ایک فرضی معاملہ ہے؛ اس لئے بھاؤ کے اتار چڑھاؤ پر نفع نقصان کا معاملہ محض سٹہ کے مرادف ہے؛ اس لئے شیئرز کی خرید وفروخت کا یہ طریقہ شرعاً ناجائز ہے۔

نیز سوال نمبر۲ رمیں یہ واضح کیا گیا ہے کہ خریدے ہوئے شیئرز کو ایک مہینے کے اندر اندر فروخت کردینا ضروری ہے، تو یہ بھی اس بات پر دلیل ہے کہ شیئرز کے خریدار کا پیسہ کمپنی میں باقاعدہ طور پر استعمال ہوکر کے نفع نقصان کا واسطہ نہیں بن پاتا؛ اس لئے کہ بڑی کمپنی کا کاروبار ہونے کے بعد پھر اس کا حساب کتاب سال کے آخر میں ہی ہو پاتا ہے، اور یہ بات سب کو معلوم ہے؛ اس لئے اس طرح کے شیئرز کے کاروبار کو ہم جائز نہیں سمجھتے ۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲ر جمادی الثانیہ ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸ /۹۳۲۲)

شیئرز کی خرید وفروخت

سوال [۸۹۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ موجودہ زمانہ میں کاروبار کا ایک رائج ومصروف طریقہ شیئرز کی خرید وفروخت ہے، تو شیئرز کی خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں؟

حضرت تھانویؒ نے امداد الفتاوی ۳/ ۴۹۰، ۴۹۱ر پر القصص السنی فی حکم حصص کمپنی کے تحت شیئرز کی خرید وفروخت کے جواز کا فتوی دیا ہے، تو کیا اس زمانہ میں بھی حضرت تھانویؒ کا فتوی قابل عمل ہے یا نہیں؟ اور شیئرز کے ذریعہ تجارت ونفع اندوزی درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: احمد صالح،

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضرت تھانویؒ نے القصص السنی میں جو شکلیں

جواز کی لکھی ہیں، وہ آج بھی جائز ہیں اور جو شکلیں کراہت یا عدم جواز کی لکھی ہیں، وہ آج بھی اسی حکم میں ہیں، آپ کو اس کے متعلق کچھ روشنی ایضاح النوادر ٢/ ١٠٢ تا ١٠٦ کے مطالعہ سے بھی حاصل ہوسکتی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢٥/ رمضان المبارک ١٤١٤ھ
(فتویٰ نمبر: الف ٣١/ ٣٦٢٧)

شیئرز کی خرید وفروخت کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

سوال [٨٩٣١]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہندوستان میں کچھ سرکاری و نیم سرکاری وغیر سرکاری کمپنیاں قائم ہوتی رہیں اور ہورہی ہیں، جو اعلان کرتی ہیں کہ دس دس روپیہ یا سوسو روپیہ یا ہزار ہزار روپیہ کے ہمارے حصے خرید کر کمپنی میں حصہ دار بن جاؤ، کمپنی چالو ہونے پر سالانہ نفع یا نقصان تقسیم ہوتا رہے گا۔ اب بازار میں ان حصوں کی خرید وفروخت چلتی رہتی ہے، کبھی وہ حصہ دس روپیہ والا پچاس روپیہ میں فروخت ہوتا ہے، کبھی وہ حصہ دس روپیہ کا ہی رہتا ہے، کیا ان حصوں کی خریداری اور فروخت جائز ہے؟

المستفتی: انتظار حسین، کاتب باغ بہادر گنج، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کمپنی کے حصص وشیئرز کی خریداری شرعاً معاملۂ مضاربت میں داخل ہوتی ہے؛ اس لئے شرعاً مضاربت اسی کو کہتے ہیں کہ جس میں ایک جانب سے رقم ہو اور دوسری جانب سے کام ہو، اور نفع ونقصان میں دونوں شریک ہوں اور کمپنی کے شیئرز میں یہ شرائط موجود ہوتی ہیں؛ اس لئے شیئرز کی خریداری جائز ودرست ہے۔

المضاربة عقد يقع على الشركة من أحد الجانبين، ومراده الشركة في الربح. (هداية، كتاب المضاربة، اشرفي ۲۵۷/۳)

فإن فضل شيئ كان بينهما؛ لأنه ربح وإن نقص فلا ضمان على المضارب. (هداية، كتاب المضاربة، فصل في العزل والقسمة، اشرفي ۲۶۷/۳)

اور دس روپیہ کا حصہ پچاس روپیہ میں اس وقت فروخت ہوتا ہے، جب دس روپیہ کے حصہ میں نفع ہوکر وہ پچاس روپیہ کا حصہ ہوجایا کرتا ہے، اور دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنا سرمایہ وصول کر کے دوسرے کو اپنی جگہ شریک ٹھہرایا جائے اور اس طرح معاملہ جائز ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۹ رشوال المکرم ۱۴۱۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/ ۲۸۶۷)	۱۴۱۲/۱۰/۲۹ھ

شیئرز بازار کی خرید وفروخت ومنافع کا حکم

سوال [۸۹۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرا بھائی شیئرز بازار میں خرید وفروخت کا کاروبار کرتا ہے اور اس کی آمدنی گھر پر استعمال ہوتی ہے، تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ شیئرز بازار میں خرید وفروخت کرنا شرعاً کیسا ہے، اور ان کی آمدنی کا استعمال کرنا شرعاً کیسا ہے؟

المستفتی: بلال احمد، عثمان آبادی، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر کوئی کمپنی ایسی ہے، جو شیئرز خریدنے والوں کا پیسہ حقیقی طور پر کمپنی کے کاروبار میں لگاتی ہے، پھر اخیر میں نفع ونقصان کے تناسب سے شیئرز کے حصہ لینے والوں کو ان کا حق دیتی ہے، تو یہ شرعی طور پر شرکت عنان کے دائرہ میں

داخل ہوکر جائز اور درست ہے؛ لیکن ہمارے ہندوستان میں ایسی کمپنیوں کا پتہ نہیں چلتا یا جو شیئرز کے حصہ لینے والوں کا پیسہ براہ راست کاروبار میں لگا کر اس کا تناسب قائم کرتی ہوں؛ بلکہ شیئرز بازار اور شیئرز ہولڈری کے علاوہ اور کچھ نہیں اور شیئرز ہولڈری کا کام ایک طرح سے لاٹری اور جوے کی طرح ہوگیا ہے؛ اس لئے شیئرز بازار کی خرید وفروخت کراہت سے خالی نہیں اور اس کی آمدنی بھی مکروہ ہوگی۔

وقال حسان بن أبي سنان مارأيت شيئاً أهون من الورع دَعْ مايريبك إلى مالا يريبك. (بخاري شريف، باب تفسير المشبهات، النسخة الهندية ۱/۲۷۵)

عن أبي الحوراء السعدي، قال: قلت للحسن بن عليؓ: ما حفظت من رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ قال: حفظت منه دع ما يريبك إلى مالا يريبك. (سنن النسائي، البحث على ترك الشبهات، النسخة الهندية ۲/۲۸۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴ / جمادی الثانیہ ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸ / ۹۰۲۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۷/۶/۴ھ

یونٹ ٹرسٹ گورنمنٹ آف انڈیا کا شیئرز خریدنا

سوال [۸۹۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ یونٹ ٹرسٹ گورنمنٹ آف انڈیا کمپنی گورنمنٹ کا شعبہ ہے، جو اپنا شیئرز بیچتی ہے، اور ۱۴/ روپئے پر یونٹ اس طرح سے ہر ماہ ۱۰/ پیسے ۲۰/ پیسے منافع کمپنی دیتی ہے، اگر منافع کم ہوا، تو بجائے وہ پرسنٹ کے کم بھی دیتی ہے، آج سے چند سال قبل ۲۴/ پرسنٹ منافع دیتی تھی، اب ۲۰/ پرسنٹ دے رہی ہے، تو اس سے پتہ چلا کہ ریٹ گھٹتا بڑھتا بھی ہے، سود بول کر نہیں دیتی ہے، منافع سمجھ کر دیتی ہے؛ لہٰذا تحقیق و مدلل مفصل جواب

عنایت فرمائیں، بہت سے مسلمان اس میں ملوث ہیں اور میں بھی ہوں۔

المستفتی: محمد طیب قاسمی، عیسیٰ پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: یونٹ ٹرسٹ کے بارے میں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اس میں رقم جمع کرنے والے کا کوئی نقصان نہیں ہوتا؛ بلکہ اس کا نفع متعین ہے، کمپنی کو نفع ہو یا نقصان رقم جمع کرنے والے کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور کمپنی کا منافع میں کمی بیشی کرنا درحقیقت سود ہے، خواہ وہ کسی بھی نام سے دے؛ لہٰذا اس میں شرکت کرنا ناجائز وحرام ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱۰۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴؍ ۶۱۱۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۴/۱۸ھ

ایف آئی سی کمپنی کا ایجنٹ بننا اور تجارت میں شامل ہونا

سوال [۸۹۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک کمپنی جس کا نام ایف آئی سی ہے، یہ ہندوستانی کمپنی ہے، جس کے مرادآباد سمیت ملک کے متعدد شہروں میں دفاتر ہیں، کمپنی کے بقول ڈائریکٹ سیلنگ کمپنی ہے، یعنی براہ راست فروخت کرنے والی کمپنی مختلف قسم کے سامان فروخت کرتی ہے، جیسے کولر، گیس چولہا، موٹر سائیکل وغیرہ، کمپنی اپنے ایجنٹوں کو دوسرے لوگوں کو کمپنی کا ایجنٹ بنانے کی شرط پر کمیشن دیتی ہے، اور مختلف خطابات وانعامات سے نوازتی ہے، کمپنی کا کہنا ہے کہ ہمارا جو پیسہ ایڈوٹائز یعنی اشتہارات، ٹی وی، ریڈیو، اخبارات ورسائل میں خرچ ہوتا ہے، اسی طرح تھوک بیچنے والا اور ریٹیل والا جو فائدہ بیچنے میں حاصل کرلیتا ہے، ہم ان تمام راستوں کو چھوڑ کر نہ اشتہارات پر خرچ کریں گے، نہ تھوک بیچنے والوں پر، نہ ہم کو پھٹکر بیچنے

والوں کی ضرورت ہے، ہم استعمال کرنے والوں کو اپنا ایجنٹ بنائیں گے اور ہم اس کے ہاتھ اسی قیمت پر سامان فروخت کریں گے، جس قیمت پر کوئی عام رٹیلر بیچتا ہے، کمپنی کی جانب سے فروخت ہونے والی اشیاء کی فہرست اور ریٹ متعین ہیں، اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جو آدمی کمپنی کا ایجنٹ بننا چاہتا ہے، اس کے لئے لازم ہے کہ مطلوبہ سامان کی قیمت جو کم سے کم پچیس سو روپیہ ہے، اور زیادہ سے زیادہ انتالیس ہزار روپیہ ہے، سروس چارج کے ساتھ جمع کردے، کل ملا کر کمپنی کا ایجنٹ بننے کے لئے کم سے کم چونتیس سو روپئے کا جمع کرنا لازم ہے۔

اب وہ آدمی کمپنی کا ایجنٹ بن گیا، پھر اگر مطلوبہ سامان کی قیمت ارسال کردہ رقم کے برابر ہے، تو کمپنی وہ سامان بھیج دے گی؛ لیکن اگر ارسال کردہ رقم سامان کی قیمت سے کم ہے، تو کمپنی ابھی وہ مطلوبہ سامان نہیں بھیجے گی؛ بلکہ وہ ایجنٹ اب دوسرے لوگوں کو کمپنی کا ایجنٹ یا ممبر بنائے، ہر ایجنٹ بنانے پر کمپنی کی طرف سے اس کو متعین کمیشن ملے گا، جب ایجنٹوں کے بنانے سے کمیشن کی رقم مطلوبہ سامان کی قیمت کے برابر ہو جائے گی، تو کمپنی اب سامان بھیج دے گی، ہر ایجنٹ کو تین ایجنٹ بنانے لازمی ہیں A.B.C. اور ہر ایجنٹ کو کمپنی کا ایجنٹ یا ممبر بننے کے لئے مذکورہ بالا کم سے کم چونتیس سو روپیہ کا جمع کرنا ضروری ہے، پہلا ممبر بنانے پر پانچ سو روپیہ کا کمیشن، دوسرا ممبر بنانے پر بھی پانچ سو روپیہ کا اور تیسرا ممبر یعنی C بنانے پر ایک ہزار روپیہ کا کمیشن کمپنی کی جانب سے ملے گا۔

اسی طرح آگے بھی ہر ممبر کو تین ممبر بنانے ہیں، یہ سلسلہ لامتناہی ہے، اس کے نیچے جتنے لوگ بھی کمپنی کے ممبر بنیں گے، ان کا کمیشن سب سے پہلے والے ایجنٹ کو بھی کمپنی دیتی ہے، کسی ایجنٹ پر دس فیصد، کسی ایجنٹ پر بیس فیصد جو متعین ہیں؛ جبکہ نیچے والے لوگوں کے کمپنی کا ایجنٹ بننے میں ایجنٹ والوں کا کوئی عمل ومحنت نہیں ہے، کمپنی کو یہ معلوم رہتا ہے کہ کس ایجنٹ نے کس کو ممبر بنایا؛ اس لئے کہ یہ کاروبار انٹرنیٹ سے بھی جڑا ہوا ہے، کمپنی کہتی ہے کہ کھپت کرنے والوں (عوام) کی جو رقم اشتہارات وغیرہ پر خرچ ہو جایا کرتی تھی، وہ رقم ہم اس

سسٹم کے ذریعہ مختلف طریقوں سے انہی لوگوں کو واپس کردیں گے، پھر ایجنٹ اول کے نیچے اس کے نیٹ ورک میں بہت سے لوگ کمپنی سے جڑ جائیں گے، تو اب پہلا ایجنٹ پریمیم کے عہدہ پر مانا جائے گا، اب اس کو کوئی عمل ومحنت کی ضرورت نہیں ہے، گھر بیٹھے اس کو پندرہ ہزار روپیہ کا ڈرافٹ تاحیات کمپنی کی جانب سے آتا رہتا ہے، اس کے انتقال کے بعد اس کے بچوں کو ڈرافٹ آتا رہے گا، یہ ایسی تجارت ہے، جس میں فائدہ ہی فائدہ ہے نقصان نہیں۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ مذکورہ ایف آئی سی کمپنی کا ایجنٹ بننا اوراس تجارت میں شامل ہونا جائز ہے یا نہیں؟ نیز اس ایجنٹ اول کا عمل اور محنت ختم ہونے کے بعد بھی اس کو ملنے والا پیسہ جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: قمرالدین، محلّہ گھٹاڑی رامنگر، نینی تال (اترانچل)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال کے ہر گوشہ پر غور کیا گیا، اس طرح کے سوالات ہمارے دارالافتاء میں اس سے پہلے بھی متعدد بار آچکے ہیں، اور جوابات بھی لکھے گئے ہیں اوراس قسم کی کمپنی میں ممبر بننے اور ممبر سازی کرنے میں مختلف پہلو نظر آئے، کافی غور وخوض کے بعد اس میں سے صرف دو چیزیں حد جواز کے دائرہ میں سمجھ میں آئی ہیں، باقی دائرۂ جواز سے خارج ہیں اور جو چیزیں حد جواز میں سمجھ میں آئی ہیں، ان میں سے نمبر ایک یہ ہے کہ پہلا ممبر جو سامان کی خریداری کرتا ہے، اور سامان کا مکمل پیسہ کمپنی کو مل جاتا ہے، جس پر کمپنی اس کے ہاتھ سامان فروخت کردیتی ہے۔ نمبر دو وہ شخص براہ راست ممبر ساز بن کر جن لوگوں کو ممبر بنائے گا، اس ممبر سازی کی فیس اس کے لئے لینا جائز ہے، اور کمپنی کے لئے دینا بھی جائز ہے؛ اس لئے کہ یہ شکل براہ راست آرگنائزر اور دلال کی سی ہے، اور دلال کی اجرت جائز اور مباح ہے۔

وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل (إلى قوله) سئل محمد بن سلمةؒ،

عن أجرة السمسار، فقال: أرجوا أنه لا بأس به، وإن كان في الأصل فاسداً لكثرة التعامل، وكثير من هذا غير جائز فجوزوه لحاجة الناس إليه. (شامي، كتاب الإجارة، باب ضمان الأجير، مطلب في أجرة الدلال، زكريا ۹/۸۷، كراچي ۶/۶۳، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ۱۵/۱۳۷، رقم: ۲۲۴۶۲، الفتاوى الولوالجيه، دارالأيمان سهارن پور۳/۳۴۴، الأشباه والنظائر، كراچي ۲/۶۰، المبسوط للرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ۱۵/۱۵۵، صحيح البخاري ۱/۳۰۳)

ان دو پہلوؤں کے علاوہ باقی جتنے پہلو ہیں جو سلسلہ وار جاری ہیں، وہ سب ناجائز ہیں، ایک پہلو یہ ہے کہ پہلا ممبر اگر مکمل پیسہ نہیں بھیجتا، تو سامان اس کو نہیں ملتا ہے، اور بعد میں ممبر سازی کے ذریعہ سے اس کی فیس سامان کی قیمت کے برابر ہو جائے، تب اس کو سامان ملے گا ورنہ نہیں، تو ایسی صورت میں سامان کی خریداری متردد فیہ ہے کہ اگر ناقص پیسہ بھیجنے کے بعد یہ شخص بیمار پڑ جاتا ہے، یا اس کو موت آجاتی ہے، یا ممبر سازی کے لئے آمادہ نہیں ہے، تو خریداری معلق رہے گی؛ لہٰذا امر متردد فیہ کے ساتھ بیع معلق رہی، جس کی گنجائش نہیں ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ پہلا ممبر براہ راست نیچے کے ممبروں میں سے جن لوگوں کو ممبر نہیں بناتا ہے، پھر اس کو ان ممبروں کی طرف سے کمپنی جو فیس دے گی، وہ حد جواز کے دائرہ میں داخل نہیں ہو سکتی چاہے کمپنی اس نیت سے وہ فیس دیتی ہو کہ پرچار وایڈوٹائز میں جو خرچ ہوتا ہے، وہی ہم دے رہے ہیں، تب بھی جائز نہیں اس لئے کہ شریعت کے نقطۂ نظر سے اس میں اس کا کوئی عمل دخل متعلق نہیں ہے اور عمل دخل متعلق نہ رہنے کے باوجود گھر بیٹھے ۱۵؍ ہزار روپیہ اسے جو تاحیات ملتا رہے گا اور انتقال کے بعد اس کی اولاد کو ملتا رہے گا، یہ شرعاً کسی طرح جواز کے دائرہ میں داخل نہیں ہے؛ اس لئے اس قسم کی کمپنی میں شرکت کرنا اور اس کا پرچار اور ایڈوٹائز کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

لايجوز لأحد أن يأخذ مال أحد بلا سبب شرعي. (قواعد الفقه اشرفي

۱۱۰، رقم:۲۶۹، شرح المجلة رستم اتحاد دیوبند ۱/۶۲، رقم المادة: ۹۷، هندية، زکریا قدیم ۲/۱٦۷، جدید ۲/۱۸۱، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۱/۱۱۲، ۲۸/۲٦٤، ۳۷/۳٥٤، شامي، زکریا٦/۱۰٦، کراچي ٦/٦۱، البحرالرائق، زکریا ٥/٦۸، کوئٹہ ٥/٤۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/محرم الحرام۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر:الف۳٦/۸۸۳۷)

شرکت کی ایک ناجائز شکل

سوال [۸۹۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید ایک غیر مسلم شخص کے ساتھ شرکت میں بکریوں کی تجارت کرنا چاہتا ہے، وہ غیر مسلم شخص اس طرح شرکت کرنا چاہتا ہے کہ زید بکریاں خریدے اپنے مال سے اور ان بکریوں کی پرورش، حفاظت، کھلانا پلانا اس غیر مسلم شخص کے ذمہ رہے گا، کھلانے پلانے اور کسی خرچہ کی ذمہ داری زید کی نہیں ہوگی، ان بکریوں سے جو آمدنی ہوگی، مثلاً دودھ بیچ کر یا بچے فروخت کر کے اس آمدنی سے وہ غیر مسلم شخص زید کا کل روپیہ جو بکریوں کی خریداری میں صرف ہوا ہے، واپس کردے گا اور کل روپیہ واپس کردینے کے بعد ان بکریوں میں آدھے کا شریک ہوجائے گا، اور آدھے آدھے کی شرکت چلتی رہے گی، زید یہ چاہتا ہے کہ کل بکریاں زید کی ملکیت رہیں اور ان سے جو آمدنی ہو، دودھ فروخت ہوکر اور بچے فروخت ہوکر، اس آمدنی میں سے نصف حصہ زید کا رہے گا، نصف حصہ اس غیر مسلم کا رہے گا۔ (کل بکریاں جو خریدی گئیں، وہ زید کی ملکیت رہیں)

دریافت طلب امر یہ ہے کہ مندرجہ بالا دونوں صورتوں میں شرکت جائز اور صحیح ہوگی؟ یا کون سی شکل شرکت کی جائز ہے؟

المستفتی: محمد عمیر، کاسگنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیر مسلم کی پیش کردہ شکل اس لئے جائز نہیں ہے کہ جب تمام رأس المال کی قیمت ادا کر دیگا، تو اس رأس المال پر اس غیر مسلم کی ملکیت ہوجائے گی اور اس وقت تک جو آمدنی ہوئی ہے، اس کی مقدار معلوم نہیں ہے، جو زید کی ملکیت ہے؛ اس لئے شرکت کا یہ طریقہ جائز نہیں ہے اور زید کی پیش کردہ شکل؛ اس لئے جائز نہیں ہے کہ ادھیا کی شکل ہے جو کہ شرعاً جائز نہیں ہے۔

دفع بقرة إلى رجل على أن يعلفها ومايكون من اللبن، والسمن بينهما أنصافاً، فالأجرة فاسدة وعلى صاحب البقرة للرجل أجر قيامها، وقيمة علفه إن علفها من علف هو ملكه. (هندية، كتاب الأجارة، الباب الخامس عشرة الثالث، زكريا جديد ٤/ ٤٨١، قديم ٤/ ٤٤٥، مجمع الضمانات ١/ ٣٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ر محرم الحرام ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/ ۵۶۰۵)

شریکین میں سے نقصان صرف ایک شریک پر ہو، تو کیا حکم ہے؟

سوال [۸۹۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہماری بمبئی میں ایک دوکان ہے، جس میں ۱۸ر گھنٹے کام ہوتا ہے، اس دوکان میں پچاس ہزار کا سامان بھر کر اپنے ایک عزیز کے حوالہ کر دی اور طے یہ کیا کہ ۱۲ر گھنٹے ہمارا عزیز چلائے گا اور چھ گھنٹے میں خود مالک چلاؤں گا، اور ہر مہینہ جو نفع ہوگا، ایک حصہ عزیز کا رہے گا اور تین حصے میرے رہیں گے، اگر دوکان میں نقصان آتا ہے، تو وہ سب میرا ہی ہوگا، عزیز کا اس نقصان سے کوئی تعلق نہیں ہوگا، کیا ہماری دوکان کی یہ شکل درست ہے؟

المستفتی: نسیم احمد، وارد حال پونہ (مہاراشٹر)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: معاملہ کی یہ شکل نہ شرکت میں داخل ہے، نہ مضاربت میں، شرکت میں اس لئے شامل نہیں کہ دونوں کا سرمایہ نہیں لگا ہے، اور مضاربت میں اس لئے نہیں ہے کہ مضاربت میں رب المال کا کوئی عمل نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ سارا عمل مضارب کا ہی ہوتا ہے، اور یہاں رب المال کی محنت بھی موجود ہے؛ لہٰذا مذکورہ شکل درست نہیں۔

الشركة هي عبارة عن عقد بين المتشاركين في الأصل والربح. (الدر مع الرد، كتاب الشركة، زكريا٦/٤٦٦، كراچي٤/٢٩٩، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٢/٥٤٢، مصري قديم ١/٧١٤، الجوهرة النيرة، امداديه ملتان ١/٣٤٤، دارالكتاب ديوبند ١/٣٣٣)

أن اشتراط عمل رب المال في المضاربة مفسد. (شامي، كتاب المضاربة، باب المضارب يضارب، زكريا ٨/٤٤٢، كراچي ٥/٦٥٢، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/٤٥٦، مصري قديم ٢/٣٣٠، مكتبه امدايه ملتان ٥/٥٦، زكريا ٥/٥٢٢، حاشيه چلبي)

البتہ مذکورہ معاملہ کے جائز ہونے کے لئے دو متبادل شکلیں ہیں۔

اول یہ کہ مالک دوکان سرمایہ کی خرید وفروخت اور دوکان چلانے میں کوئی ذمہ داری نہ لے؛ بلکہ دوکان چلانے اور خرید وفروخت کی ساری ذمہ داری اس کا عزیز لے لے، تو درج کردہ بقیہ شرائط کے مطابق یہ معاملہ جائز ہوجائے گا، یعنی سارا سرمایہ ایک شخص کی جانب سے ہو، اور دوسرے شخص کی جانب سے محنت اور کام ہو۔

المضاربة هي شركة في الربح بمال من جانب وعمل من جانب. (البحر الرائق، كتاب المضاربة، كوئٹه٧/٢٦٣، زكريا٧/٤٤٨، مختصر القدوري١١٨، هداية، اشرفي ٣/٢٥٧، معجم لغة الفقهاء، كراچي ٤٣٤، قواعد الفقه، اشرفي ٤٩٢)

دوسری شکل یہ ہے کہ سوال نامہ میں ذکر کردہ تمام شرائط کو باقی رکھا جائے، سوائے اس کے کہ عزیز کو نفع میں تناسب کے اعتبار سے حصہ دار نہ رکھیں؛ بلکہ اس کے لئے معتد بہ ماہانہ یا ہفتہ واری تنخواہ مقرر کردی جائے، تو اس تنخواہ کی حیثیت عزیز کی محنت کے محنتانہ اور اجرت کی ہوگی اور یہ شکل معاملۂ اجارہ میں داخل ہوکر جائز ہوجائے گی۔

وشرطها كون الأجرة، والمنفعة معلومتين. (شامي، كتاب الإجارة، زكريا ۹/۷، كراچي ٦/٥، هداية، اشرفي ۳/۲۹۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۹۴۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۳/۱۲ھ

ہر ماہ دو ہزار دینے پر شرکت کرنا

سوال [۸۹۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے ایک بھائی نے بیس ہزار روپئے لگا کر ایک دوکان میں شرکت کر لی، اور دوکاندار سے یہ طے کرلیا کہ مجھے ہر مہینہ دو ہزار روپئے دیئے جائیں؛ چنانچہ دوکاندار ہر مہینہ میرے بھائی کو دو ہزار روپئے دیتا ہے، اور جب کبھی شرکت ختم کرنی ہوگی، تو بیس ہزار روپئے واپس مل جائیں گے، میرے بھائی کا دوکاندار سے یہ معاملہ درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: وسیم احمد، واردحال پونہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سوال نامہ میں ذکر کردہ صورت کے مطابق آپ کے بھائی کا کسی کی دوکان میں ۲۰/ ہزار روپیہ کے ذریعہ شرکت کر کے اپنے لئے ماہانہ دو ہزار روپئے نفع کی شرط لگانا شرعاً درست نہیں ہے؛ بلکہ ان پر لازم ہے کہ یا تو یہ معاملہ ختم کرلیں یا اپنے لئے نفع کا کوئی متناسب حصہ مقرر کریں؛ اس لئے کہ ایسا بھی ممکن ہے کہ دوکان میں کچھ نفع نہ ہو یا صرف دو ہزار روپئے کا ہی نفع ہو، تب بھی دو ہزار روپئے دوکاندار کا آپ کے بھائی

کو دینا ضروری ہوگا، شریعت میں یہ معاملہ جائز نہیں ہے۔

وتفسد باشتراط دراهم مسماة من الربح، لأحدهما لقطع الشركة.
(شامي، كتاب الشركة، مطلب اشتركا على أن ما اشتريا من تجارة فهو بيننا، زكريا ٦/٤٨٩، كراچي ٤/٣١٦)

لو كان المال منهما في شركة العنان–إلى قوله– إن شرطا الربح على قدر رؤس أموالهما جاز. (الهندية، الباب الثالث في شركة العنان، زكريا جديد ٢/٣٢٦، قديم ٢/٣٢٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۹۴۴/۳۸)

ایک شریک کا دوسرے پر احسان جتانا

سوال [۸۹۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ دو پارٹنر ہیں، ایک کا پیسہ ہے اور ایک ورکنگ پارٹنر ہے، اور فائدہ بھی ہو رہا ہے، اور پیسہ والے پارٹنر کا حصہ قریب دس لاکھ ہوگیا ہے، وہ ہر وقت یہ کہتا رہتا ہے نقصان ہے، میں اگر ایف ڈی آر کراتا، انشورنس کراتا، شیئرز بازار میں لگاتا تو بہتر تھا ورکنگ پارٹنر پر احسان جتانے کے لئے یہ کہتا ہے، تو اس کا یہ کہنا ہر وقت جائز ہے یا ناجائز؟

المستفتی: انتظار حسین، قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر جائز کاروبار میں دو آدمی پارٹنر بنے ہیں، اور اس میں کاروبار کی جائز شرائط بھی موجود ہیں، تو جو کچھ بھی نفع ہوگا، وہ حلال اور پاک ہے، اور حلال منافع کے مقابلہ میں لائف انشورنس اور شیئرز کے ذریعہ سے ملنے والے سود کو محض زائد ہونے کی وجہ سے بہتر قرار دینا نادانی اور جہالت ہے؛ اس لئے کہ سود میں ملنے والا پیسہ حرام اور ناپاک ہے اور اوپر سے اللہ اور رسول کی لعنت اس کے اوپر ہوتی ہے۔

وأما ركن العقد–إلى–وما يؤدي معاني هذه الألفاظ بأن يقول: رب المال خذ هذا المال مضاربة على أن ما رزق الله، أو أطعم الله منه من ربح، فهو بيننا علي كذا من نصف، أو ربع، أو ثلث، أو غير ذلک من الأجزاء المعلومة. (بدائع الصنائع، كتاب المضاربة، زكريا ٥/١٠٩، كراچي ٦/٧٩)

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم، آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، باب لعن أكل أمر باوموكله، النسخة الهندية ٢/٢٧، بيت الأفكار، رقم:١٥٩٨)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸؍۹۵۴۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۵؍۴؍۱۴۲۹ھ

(۵) باب المضاربة

مضاربت جائز اور سود حرام ہے

سوال [۸۹۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کچھ مدت کے لئے غیر مما لک جانا چاہتا ہے، اور واپسی کا امکان بھی ہے اور نہیں بھی ہے، اس وجہ سے اپنے بال بچوں کے لئے زید اپنے بھائی بکر کو مثلاً ایک لاکھ روپیہ دینا چاہتا ہے، جس سے بکر ان روپیوں کو اپنے بزنس میں شامل کرے اور زید کے بال بچوں بیوی کو چار ہزار یا پانچ ہزار روپیہ ماہانہ دیدے، تو کیا زید کے لئے ایسا کرنا جائز ہوگا؟ یا ان کے بھائی بکر کے لئے ایسا کرنا جائز ہوگا؟ یا پھر دوسری صورت یہ ہے کہ بکر کو اس ماہ میں جتنا نفع ہوگا، زید کے لئے روپئے کے بقدر پرسینٹیز نکال کر زید کی عیال کو دے، اس میں ماہانہ روپئے متعین نہیں ہو پائیں گے۔

المستفتی: محمد شاکر عالم، تخت والی مسجد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: صورت مسئولہ میں دو شکلیں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے پہلی شکل صریح سودی معاملہ ہے؛ اس لئے ناجائز ہے۔

دوسری شکل مضاربت کی ہے جو بلاشبہ جائز ہے۔

كشرط دراهم معينة من الربح لأحدهما، فإنه يقطع الشركة في الربح لاحتمال أن لا يربح غيره. (مجمع الأنهر، كتاب الشركة، قديم ١/٦١٧، جديد دارالكتب العلمية بيروت ٢/٥٤٤، الدر المختار، كراچي ٤/٣٠٥، زكريا٧/٤٧٥)

وكون الربح بينهما شائعاً فلو عين قدراً فسدت. (الدر مع الشامي، كتاب المضاربة، كراچي ٥/٦٤٨، زكريا٨/٤٣٣)

وأن يكون الربح جزأ شائعا في الجملة لا معيناً، فإن عيناعشرة، أومائة أو نحو ذلك كانت الشركة فاسدة. (هندية، كتاب الشركة، الباب الاول، زكريا قديم ۲/ ۳۰۲، جديد ۲/ ۳۱۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶ / رجب المرجب ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۳۲۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/ ۷/ ۱۴۲۲ھ

کسی ایک شریک کے انتقال ہونے کے صورت میں مضاربت کا حکم

سوال [۸۹۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے کاروبار میں کچھ رقم اپنے بھائی سے لے کر لگائی اور طے پایا کہ اس میں جو نفع ہوگا، اس میں سے تیس پیسہ تمہارا اور ستر پیسہ میرا ہوگا؛ کیونکہ محنت ساری زید کی تھی، زید وہ منافع برابر اپنے بھائی کو دیتا رہا۔

۳۰/ مارچ کو زید نے اپنے بیٹے اور بیوی سے کہا کہ میرے پاس میرے بھائی کا پیسہ ہے، اور یہ میں نے آج تک یعنی ۳۰/ مارچ تک کا حساب بنا دیا ہے، تم میرے انتقال کے بعد یہ رقم میرے بھائی کو دیدینا اور میرا فلاں فلاں جگہ اتنا پیسہ ہے، یہ سب وصول کر کے تم میرا قرضہ ادا کر دینا اور حکم ربی ۳۰/ مارچ کی رات ہی کو ان کا انتقال ہوگیا۔

اب زید کے بیٹے نے باپ کی وصیت کے مطابق وہ سارا پیسہ وصول کر کے والد کے بھائی کا پورا پورا قرض ادا کر دیا، روپیہ اکٹھا کرنے میں چار مہینہ لگ گئے، اب زید کے بھائی کا کہنا ہے کہ مجھے چار مہینہ کے بھی منافع دو، تو کیا زید کے بھائی کو ان چار مہینوں کا منافع لینا جائز ہے؟ جبکہ زید کے دو بیٹے ہیں، بڑے بیٹے کی عمر اکیس سال ہے اور دوسرا چودہ سال کا ہے۔

المستفتی: حبیب الرحمٰن چاندپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید اوراس کے بھائی کے درمیان جومعاملہ ہے، شریعت میں وہ معاملہ مضاربت کہلاتا ہے،اور معاملۂ مضاربت رب المال اور مضارب میں سے کسی کے بھی انتقال سے باطل ہوجاتا ہے؛ لہٰذا جب زید کی وفات ہوگئی ،تو اس کی وفات پر معاملۂ مضاربت ختم ہوگیا۔اب صرف اتنی بات رہ گئی کہ جس کا جوحق تھا،حساب وکتاب صاف کرکے اسے دے دیا جائے؛ لہٰذا حساب وکتاب صاف کرنے میں اور وصولی قرضہ وغیرہ میں جو چار مہینہ کی تاخیر ہوئی ہے،اس تاخیر کا کوئی پرافٹ زید کے بھائی کونہیں ملے گا۔

إذامات رب المال، أو المضارب بطلت المضاربة؛ لأنه توكيل على ما تقدم وموت الموكل يبطل الوكالة، وكذا موت الوكيل و لا تورث الوكالة.

(هداية، كتاب المضاربة، اشرفى ديوبند ٣/٢٦٥)

وتبطل المضاربة بموت أحدهما أي بموت المالك، أو المضارب لكونها وكالة وهي تبطل به و لا يورث. (مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/٤٥٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/۷۶۹۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۶/۱۴ھ

مضاربت میں نفع ونقصان کے تناسب کا طریقۂ کار

سوال [۸۹۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید اور بکر نے شرکت میں ایک کاروبار کیا ،زید نے کاروبار میں رقم لگائی ؛لیکن بکر نے رقم نہیں لگائی۔

(۲) دونوں نے مال تجارت بھیجا وہ مال راستے میں خراب ہوگیا ، جسے دوکاندار نے کم قیمت میں لینا منظور کیا ،اس بات پر زید کا دوکاندار سے جھگڑا ہوگیا۔

(۳) بکر نے دوکاندار کو حلال تجارت بیچ کر رقم زید کو دی؛ لیکن زید نے مذکورہ رقم نہیں لی اور وہ رقم بکر کے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔

(۴) وہ رقم لے کر بکر تنہا آرہا تھا کہ وہ رقم راستے میں لوٹ لی گئی۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ مذکورہ رقم کے متعلق حکم شرعی کیا ہے؟ آیا بکر کے ذمہ اس رقم کی ادائے گی زید کو واجب ہے یا نہیں؟ جبکہ بکر پہلے سے مقروض چل رہا ہے، وہ کس طرح ادائے گی کرے؟

المستفتی: محمد فاضل، پینٹھ، اتوار، سرائے ترین، سنبھل، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: زید اور بکر کا آپس میں یہ معاملہ مضاربت ہے، جس میں نفع ونقصان جانبین میں سے ہر ایک کی طرف منسوب ہوتا ہے؛ لہٰذا مال کی خرابی کی بناء پر نفع میں جو کمی ہوئی ہے، اس میں زید اور بکر دونوں برابر کے شریک ہوں گے اور زید کا کمی کی وجہ سے رقم لینے سے انکار کرنا درست نہیں ہے، اور اس سے عقد مضاربت پر کوئی اثر نہیں پڑا، اس کے بعد جب بکر کے پاس سے وہ ساری رقم لٹ گئی، ہلاک ہوگئی، تو بکر زید کے حصہ کا ضامن نہ ہوگا۔

نیز جو رأس المال ہلاک ہوا ہے، وہ بھی رب المال یعنی زید ہی کے پاس سے گیا، بکر پر اس کا ضمان بھی لازم نہیں ہے۔

وان هلک أحد المقتسمين قبل أن يقبض رب المال نصيبه هلک من مالهما جميعاً. (هندية، كتاب المضاربة، الباب الثالث في الرجل يدفع المال الخ زكريا قديم ٤/ ٢٩٠، جديد ٤/ ٢٩٨)

وإن قسم الربح وبقيت المضاربة، ثم هلک المال أوبعضه ترادّا الربح ليأخذ المالک رأس ماله، وما فضل فهو بينهما، وإن نقص لم

یضمن. (البحر الرائق، کوئٹہ۷/ ۲٦٨، زکریا ٧/ ٤٥٦، در مختار، قبیل فصل في المتفرقات، کراچي ٥/ ٦٥٦، زکریا ٨/ ٤٤٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍محرم الحرام ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴؍ ۵۹۴۱)

مضاربت میں نفع ونقصان دونوں میں شرکت اور تعین کا حکم

سوال [۸۹۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے ایک انجمن کھولی ہے، جس میں کافی مسلمان اپنے پیسے جمع کرتے ہیں، جس کی قسط ہر ماہ چار سو روپئے ہے، یہ ساڑھے پانچ سال کی مدت ہے، جس میں ہماری رقم چھبیس ہزار چار سو روپئے جمع ہوئی، مدت پوری ہونے کے بعد زید ہمیں اکتالیس ہزار پانچ سو روپئے دیگا، اس انجمن میں نقصان طے نہیں ہے؛ کیونکہ یہ انجمن تقریباً ۲۰؍سال سے چل رہی ہے، آج تک نقصان نہیں ہوا۔ اس میں مالی منافع ہی طے ہے، زید کا کہنا ہے کہ ہم اس رقم سے زمین خریدتے ہیں اور اس میں پیڑ لگاتے ہیں اور اس کی پرورش کے بعد اس کو کٹوا کر بیچتے ہیں، اس میں جو منافع ہوتا ہے، اس کو ہم بھی لیتے ہیں اور اسی میں سے رقم جمع کرنے والوں کو بھی منافع دیتے ہیں۔ تو یہ منافع ہم لوگوں کو لینا جائز ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں مفصل جواب سے نوازیں۔ عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: محمد یونس، مدرسہ فلاح دارین کاٹھ، دروازہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: شجر کاری کی مذکورہ صورت میں چوں کہ نفع ونقصان دونوں میں شرکت کی شکل نہیں ہے، صرف نفع میں شرکت کی شکل ہے۔ نیز نفع میں ثلث ربع وغیرہ کی تعیین بھی نہیں ہے کہ نفع میں سے کتنے فی صد کس کو ملے گا؟ اس کی کوئی

صراحت نہیں اور شرکت کی تجارت میں یہ دونوں شرطیں لازم ہوتی ہیں جوکہ یہاں مفقود ہیں؛ اس لئے انجمن کا معاملہ شرعی طور پر جائز نہیں۔

ومن شروطها كون نصيب المضارب من الربح حتى لو شرط له من رأس المال، أو منه ومن الربح فسدت. وفي الجلاليه: كل شرط يوجب جهالة في الربح، أو يقطع الشركة فيه يفسدها (قوله في الربح) كما إذا شرط له نصف الربح، أو ثلثه. (در مختار مع الشامي، كتاب المضاربة، كراچي ٥/٦٤٨، زكريا ٨/٤٣٣، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/٤٤٦، البحر الرائق، زكريا ٧/٤٤٩، كوئٹه ٧/٢٦٤، هداية، اشرفي ديوبند ٣/٢٥٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍صفر المظفر ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/۶۴۸۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۲/۱۲ھ

مضاربت میں فیصد کی تعیین لازم ہے رقم کی نہیں

سوال [۸۹۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید بھدوہی سے قالین کمپنی سے آڈر اٹھاتا ہے، جس کی بنائی فی گز دو ہزار روپیہ ملتی ہے، بھدوئی سے لاکر اپنے مقام پر کاریگروں سے پندرہ سو روپئے گز بنوائی دیتا ہے، بنوائی میں کاری گروں کو پیش گی روپیہ دینا پڑتا ہے، زید کے پاس روپئے نہ ہونے کی وجہ سے وہ دوسرے لوگوں سے روپئے لے لیتا ہے اور دوسو روپئے فی گز منافع دینے کو کہتا ہے، وقت کی کوئی قید نہیں ہے، قالین دو ماہ میں بھی اتر سکتی ہے اور چھ ماہ میں بھی اتر سکتی ہے، جب بھی قالین اترے گی، تب ہی حساب ہوگا، یہ روپیہ لینا دینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: حافظ شوکت علی،

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: زید کے لئے یہ جائز ہے کہ دو ہزار روپیہ کے حساب سے بنوائی طے کر کے کاریگروں سے پندرہ سو روپیہ میں بنوائی کرالے، اور یہ بھی جائز ہے کہ کاری گروں کو پیش گی روپیہ دیدیا کرے؛ لیکن دوسروں سے پیسے لے کر کاریگروں کو ادا کرنی کا مسئلہ قابل غور ہے، جن لوگوں سے روپیہ لیا جاتا ہے، اگر ان سے ایسا معاملہ طے ہوتا ہے کہ پندرہ سو روپیہ میں بنوائی ہوتی ہے اور دو ہزار روپیہ میں قالین کمپنی کو دی جاتی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر قالین میں فی گز، پانچ سو روپیہ نفع ہوتا ہے، اور اس پانچ سو روپیہ کے منافع میں سے دو سور روپیہ ان لوگوں کو دینے کی بات ہوتی ہے، جن سے روپیہ لیا گیا، اور اگر کسی وقت منافع پانچ سو روپیہ سے کم ہوجائے ،تو اس کے تناسب کے حساب سے ان لوگوں کے منافع میں بھی کمی آجاتی ہے، جن سے روپیہ لیا گیا ہے اور اگر منافع پانچ سو سے زیادہ ہوجاتا ہے، تو جن سے پیسے لئے گئے ہیں، ان کے منافع میں اسی تناسب سے روپیہ زائد ہوجاتا ہے، یعنی منافع کے دو حصہ قرض دینے والے کے اور تین حصہ آڈر دینے والے کے، تو ایسی صورت میں یہ معاملہ مضاربت میں داخل ہوکر جائز ہوگا اور اگر معاملہ ایسا نہ ہو؛ بلکہ منافع کی مقدار پانچ سو روپیہ سے کم یا زیادہ ہوجائے، دو سو روپیہ فی گز ہر حال میں ان لوگوں کو دینا لازم ہے، جن سے پیسہ لیا گیا، تو ایسی صورت میں یہ سودی معاملہ میں داخل ہوکر ناجائز اور قابل ترک ہوجائے گا۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۲۲)

في شركة البزازية: حيث قال وإن لأحدهما ألف، وللآخر ألفان، واشتركا واشترطا العمل على صاحب الألف، والربح أنصافاً جاز، وكذا لو شرطا الربح، والوضيعة على قدر المال، والعمل من أحدهما بعينه جاز، والربح إنما يستحق بالمال، أو بالعمل، أو بالضمان.

(شامي، كتاب المضاربة، كراچي ٥/٦٤٦، زكريا ٨/٤٣٠، هداية، اشرفي ديوبند ٢/٦٣٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍شعبان المعظم ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/۸۵۳۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۸/۵ھ

مضارب کی محض نفع میں شرکت کا حکم

سوال [۸۹۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خالد اور راشد نے پانچ پانچ لاکھ روپئے یعنی کل دس لاکھ روپئے زید کو دیئے اور دونوں نے زید سے کہا کہ آپ اس رقم سے جہاں کہیں سمجھ میں آوے، وہاں ہوٹل بناؤ یا تیار ہوٹل خرید لو، اور ہوٹل چلانے یا خریدنے کے بعد آپ اس کو چلاؤ، آپ کو اس کے بدلہ میں ہوٹل میں سے چالیس فیصد حصہ دیا جائے گا۔ اب زید نے چھ مہینہ تک بہت دوڑ دھوپ کی اور ہوٹل بنالیا یا خرید لیا، اور اس ہوٹل کو چلانا شروع کیا، اور دس سال تک برابر چلایا اور شرط کے مطابق نفع بھی برابر تقسیم ہوتا رہا، دس سال کے بعد کچھ نا اتفاقی کی وجہ سے سب نے مل کر ہوٹل کو فروخت کر دیا اور فروخت کے بعد اس کی قیمت پندرہ لاکھ روپیہ آئی؛ جبکہ ہوٹل دس لاکھ روپیہ میں تیار ہوا تھا، اور پانچ لاکھ روپیہ منافع آیا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا اس پانچ لاکھ کے منافع میں زید چالیس فیصد حصہ کا حقدار ہوگا یا نہیں؟ جبکہ خالد اور راشد نے بذات خود ہوٹل بنا کر نہیں دیا؛ بلکہ انہوں نے تو صرف زید کو رقم حوالہ کی اور اس کو اپنی صواب دید کے مطابق ہوٹل خریدنے یا بنانے کا اختیار دیدیا تھا، اور اسی وقت حصہ کی تعیین بھی ہو چکی تھی کہ اب آپ کو ان سب کے بدلہ میں نفع میں سے چالیس فیصد حصہ دیا جائے گا۔ اب زید کہتا ہے کہ شرط کے مطابق ہوٹل کی بلڈنگ میں بھی میرا حصہ ہونا چاہئے؛ جبکہ خالد اور راشد اس سے انکار کر رہے ہیں، تو از روئے

حدیث وفقہ مسئلہ کو مدلل ومفصل واضح فرمائیں۔

المستفتی: محمد اسماعیل، ماہی، خادم التدریس والإفتاء دارالعلوم چھاپی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خالد اور راشد کا زید کو پانچ پانچ لاکھ روپئے ہوٹل بنانے یا خریدنے کے لئے دینا اور زید کے لئے نفع میں سے چالیس فیصد مقرر کرنا مال مضاربت کی وجہ سے درست ہے؛ لہٰذا جتنا نفع ہوگا، اس میں سے چالیس فیصد کا زید حقدار ہوگا؛ چونکہ بلڈنگ زید کے پاس سے نہیں خریدی گئی ہے؛ بلکہ نفع میں سے صرف چالیس فیصد کا زید کو حقدار قرار دیا گیا ہے؛ اس لئے زید نفع میں سے چالیس فیصد کا حقدار ہوگا۔ بلڈنگ میں سے حقدار نہیں ہوگا؛ کیونکہ بلڈنگ میں جو پیسہ لگا ہے، وہ خالد اور راشد کا ہے، وہی رأس المال ہے، جو مالکوں کے پاس شرعی طور پر واپس ہونا چاہئے،زید کا یہ کہنا کہ شرط کے مطابق بلڈنگ، میں میرا حصہ ہونا چاہئے سوال نامہ میں ایسی کوئی شرط کا تذکرہ نہیں ہے۔

خذه على أن لك نصف الربح، أوثلثه جاز وله المشروط والباقي لرب المال؛ لأنه نماء ملكه والمضارب يستحق بالشرط. (بزازيه، كتاب المضاربة، الفصل الثاني، فيما يملك المضارب وما لا يملك، جديد زكريا ٣/٣٩، وعلى هامش الهندية، زكريا ٦/٧٨)

وإن كانا يقتسمان الربح والمضاربة بحالها، ثم هلك المال بعضه، أو كله تراد الربح حتى يستو في رب المال رأس المال. (هداية، كتاب المضاربة، باب المضارب يضارب، اشرفي ديوبند ٣/٢٦٦، البحرالرائق، كوئٹه ٧/٢٦٨، زكريا ٧/٤٥٦، در مختار، قبيل فصل في المتفرقات، كراچي ٥/٦٥٦، زكريا ٨/٤٤٥، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/٤٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: رجسٹر خاص)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴؍۵؍۱۴۲۶ھ

دوسرے کی رقم سے مکان بنا کر فروخت کرنے اور منافع میں شرکت کا تناسب

سوال [۸۹۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے پاس زمین ہے، مکان بنوانے کے لئے روپئے نہیں ہیں، اگر میں کسی ساتھی سے روپئے لے کر مکان بنواؤں اور اس کو روپئے کے عوض ایک مکان دیدوں تو کیا یہ جائز ہے؟

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر میں اپنے ساتھی سے روپئے مکان بنانے کے لئے لوں اور مکان بیچ کر منافع دونوں برابر لے لیں اور ساتھی کی اصل رقم بھی واپس کردوں، کیا یہ شکل شریعت میں مذکور مضاربت میں داخل ہوسکتی ہے؟ جو بھی حکم شرعی ہو، تحریر فرمائیں یا اس کی کوئی متبادل جائز شکل تحریر فرمانے کی زحمت فرمائیں۔

المستفتی: اکرام الحق،

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: روپیہ کے بدلہ میں مکان کا دینا ہر حال میں جائز ہے، گویا کہ اس کے عوض میں مکان بیچ دیا گیا ہے، اور اگر مکان کی قیمت زیادہ ہو، تو وہ بھی لیا جاسکتا ہے اور آپ نے اپنے ساتھی سے مکان بنانے کے لئے پیسے قرض لئے ہیں، اور قرض کے پیسوں سے مضاربت کا معاملہ کرنا جائز ہے اور آپ نے ان پیسوں کے ذریعہ جو مکان بنایا ہے، وہ سب آپ کا ہے، اور اس سے آپ کو جو نفع حاصل ہوا ہے، وہ بھی صرف آپ کا ہے، آپ کے ساتھی کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے اور قرض ادا کرنا آپ کے ذمہ ضروری ہوگا؛ ہاں البتہ اگر اس پیسہ سے معاملۂ مضاربت کے لئے الگ سے معاہدہ ہوجائے، تو معاہدہ کے بعد گنجائش ہے اور موجودہ صورت میں چوں کہ معاہدہ نہیں ہے؛ اس لئے گنجائش نہیں ہے۔

فالحاصل أن الصلح على أجود أنقص قدراً من حقه لايجوز، وإن على المثل، أوأقل قدراً وجودةً جاز. (البزازيه، كتاب الصلح، الفصل الثاني في الدين، جديد زكريا۳/ ۱۹، وعلى هامش الهندية، زكريا ٦/ ٣٢)

ومنهما أن يكون رأس المال عيناً لاديناً، فالمضاربة بالديون لا تجوز. (عالمگيري، كتاب المضاربة، الباب الأول في تفسيرها وركنها الخ زكريا قديم ٤/ ٢٨٦، جديد ٤/ ٢٩٤، تاتارخانية، زكريا ١٥/ ٣٩٣، رقم: ٢٢٥٠٤)

وأما المضاربة بدين، فإن كان على المضارب فلا يصح، وما اشتراه له والدين في ذمته. (البحرالرائق، زكريا ٧/ ٤٤٨، كوئٹه ٧/ ٢٦٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۵ / جمادی الثانیہ ۱۴۲۸ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸ / ۹۳۴۷)	۱۴۲۸/۶/۲۵ھ

پانچ فیصدی نفع پر زمین تلاش کر کے فروخت کرنا

سوال [۸۹۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کاظم زمین کا معاملہ کرتا ہے؛ لیکن زمین کی تلاش وجستجو خود نہیں کرتا؛ بلکہ ناظم سے کراتا ہے اور ناظم اس سے یہ کہتا ہے کہ زمین خریدنے کے بعد اس کی فروخت پر جو منافع ہوگا، اس میں سے پانچ فیصدی میں لونگا، تو اب ناظم کے لئے یہ پانچ فیصدی منافع لینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد حاکم، چاندپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ناظم کا کاظم سے یہ کہنا کہ زمین خریدنے کے بعد اس کی فروخت پر جو منافع ہوگا، اس میں سے پانچ فیصد میں لوں گا، یہ ایک طرح کی کاروباری

شرکت کا معاملہ ہے، جس میں پیسہ کاظم کی طرف سے ہے اور محنت ناظم کی طرف سے ہے، اور منافع کا پانچ فیصد ناظم کے لئے متعین ہے، یہ شرعی طور پر جائز اور درست ہے۔

المضاربة عقد يقع على الشركة بمال من أحد الجانبين، ومراده الشركة في الربح، وهو يستحق بالمال من أحد الجانبين، والعمل من الجانب الآخر. (هداية، كتاب المضاربة، اشرفي ديوبند ۲۵۷/۳، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ۴۴۳/۳، تاتارخانية، زكريا ۳۹۰/۱۵، رقم: ۲۳۴۹۲، البحر الرائق، زكريا ۴۴۸/۷، كوئٹه ۲۶۳/۷)

فإن شرطا أن المشترى بينهما نصفان، والربح كذلك يجوز (إلى قوله) لأن الربح لا يستحق إلا بالمال، أوالعمل، أو بالضمان، فرب المال يستحقه بالمال، والمضارب يستحقه بالعمل. (هداية، كتاب الشركة، اشرفي ديوبند ۶۳۴/۲، شامي، كتاب المضاربة، كراچي ۶۴۶/۵، زكريا ۴۳۰/۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ / جمادی الثانیہ ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۸۶۸/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۶/۲۳ھ

دس فیصد کے منافع پر سرمایہ لگانا

سوال [۸۹۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں نے اپنے ایک مسلمان بھائی کو اس کے مطالبہ پر اس کے کاروبار میں دس فیصد منافع پر کچھ سرمایہ فراہم کیا ہے، دینی اور شرعی رو سے مذکورہ منافع جائز ہوگا یا نا جائز؟ اس پر آپ بحیثیت مفتی فیصلہ کن روشنی ڈالئے۔

المستفتی: عبداللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر منافع کا فیصد متعین کیا جائے، تو جائز ہے، یہ شرعاً مضاربت ہے اور اگر رأس المال کے فیصد کے لحاظ سے منافع حاصل کرنے کی بات ہو، تو جائز نہیں ہے۔

من شرطها أن يكون الربح بينهما مشاعاً لا يستحق أحدهما دراهم مسماة من الربح. (هداية، كتاب المضاربة، اشرفي ديوبند ٣/٢٥٨، هندية، كتاب الشركة، الباب الأول، زكريا قديم ٢/٣٠٢، جديد ٢/٣١١، در مختار مع الشامي، كراچي ٥/٦٤٨، زكريا ٨/٤٣٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/صفر المظفر ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۶۰۶/۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۲/۵ھ

دو ہزار نفع کی شرط لگانا، عقد مضاربت میں داخل نہیں

سوال [۸۹۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید پانچ لاکھ کی لاگت کا کاروبار کرتا ہے، عمر نے بطور مضاربت اس کو دو لاکھ روپئے دیئے اور کہا کہ مجھے ہر ماہ دو ہزار روپئے دیتے رہنا، چند سال کاروبار چلتا رہا، اس کے بعد کاروبار میں کچھ نقصان ہوا، اور رفتہ رفتہ پورا کاروبار ختم ہوگیا، اور جو مال دوسروں کو ادھار دیا تھا، اس کی بھی رقم ملنے کی امید نہیں ہے، ادھر عمر اپنے دو لاکھ کا مطالبہ کر رہا ہے؛ جبکہ زید دو دو ہزار کر کے عمر کو تقریباً دو لاکھ سے زیادہ ادا کر چکا ہے، اب ایسی صورت میں معلوم یہ کرنا ہے کہ یہ معاملۂ مضاربت کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ دونوں صورتوں میں زید کے ذمہ عمر کے دو لاکھ روپئے اسے دینا واجب ہے یا نہیں؟ جبکہ زید کا سارا اثاثہ ختم ہو چکا ہے اور اگر زید عمر

کے دولاکھ ادا نہ کرے، تو عنداللہ گرفت ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: شاہد ابصار، سیتاپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں عمر کی طرف سے زید کو دو لاکھ روپیہ دے کر ہر ماہ دو ہزار روپیہ کی شرط لگانا بہرحال شرط فاسد ہے، جو مضاربت کی شکل ہی نہیں ہے؛ بلکہ ایک سودی معاملہ ہے، اور ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ فیصد کے اعتبار سے حصہ نفع متعین ہوتا؛ لہٰذا جب اصل معاملہ ہی فاسد ہوا، تو اس پر ہونے والا لین دین بھی ناجائز ہوگا۔

وشرطها كون الربح بينهما شائعاً، فلو عين قدراً فسدت. (درمختار، كتاب المضاربة، كراچي ٥/٦٤٨، زكريا٨/٤٣٣)

ومن شرطها أن يكون الربح بينهما شائعاً لا يستحق أحدهما دراهم مسماة من الربح؛ لأن الشرط ذلک يقطع الشركة بينهما. (هداية مه الفتح، زكريا٨/٤٧٠، كوئٹه ٧/٤١٧، حاشية چلبي على تبين الحقائق، امداديه، ملتان ٥/٥٤، زكريا ديوبند ٥/٥١٨، الفقه على المذاهب الأربعة مكمل٥ ٢٦)

إذا تلف بعض مال المضاربة يحسب في أول الأمر من الربح، ولا يسرى إلى رأس المال، وإذا تجاوز مقدار الربح، وسرى إلى رأس المال، فلا يضمنه المضارب سواء كانت المضاربة صحيحة، أو فاسدة...... الضرر والخسار يعود في كل حال على رب المال، وإذا شرط أن يكون مشتركاً بينه، وبين المضارب، فلايعتبر ذلک الشرط .... استحقاق رب المال لما له، فإذ فسدت المضاربة، فالربح كله له، والمضارب بمنزلة أجيره له أجر المثل؛ لكن لا يتجاوز القدر المشروط حين العقد ولا يستحق أجر المثل إن لم يكن ربح؛ لأنه في المضاربة الصحيحة لا تستحق شيئاً إذا لم يربح، فينبغي أن يكون كذلک في المضاربة الفاسدة. (شرح المجلة، اتحاد

دیو بند ۲/۷۵٦-۷۵۷، رقم المادة: ٦ ٢ ٤ ١ ٧ ٢ ٤ ١، فتاوی حقانية ٦/ ٣٤٧-٣٤٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۵۰٦/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴/۴/۱۴۳۵ھ

رب المال کا معاملہ ختم ہونے سے قبل رأس المال لینے کا حکم

سوال [۸۹۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کو اپنی ذاتی رقم سے ایک کمپنی لگانی ہے؛ جبکہ اس کمپنی میں دوا سازی کا فارمولہ عمر کا ہے، اور زید اور عمر میں یہ طے ہوگیا ہے، کہ زید کا نفع ٦۰؍ فیصد ہوگا اور عمر کا نفع ۴۰؍ فیصد ہوگا؛ لیکن زید اس نفع سے پہلے اپنی وہ رقم نکالنا چاہتا ہے، جو کہ کمپنی کو لگانے میں اس نے لگائی ہے، کیا زید کو اس کی اجازت ہے کہ وہ پہلے نفع سے اپنی لگائی رقم لے اور بعد میں نفع کی تقسیم طے شدہ طور پر ہو۔

المستفتی: حکیم سلیم اختر، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ مضاربت کی ایک شکل ہے، اور مضاربت میں جب تک معاملہ کا سلسلہ باقی رہے گا، اس وقت تک رأس المال کا کاروبار میں لگائے رکھنا لازم ہوتا ہے اور جب رأس المال نکال لیا جائے گا، تو مضاربت کا معاملہ ہی ختم ہوجاتا ہے؛ اس لئے رأس المال نکال کر وصول کرلینا، پھر اس کے بعد نفع تقسیم کرنے کی بات درست نہیں ہے، ہاں البتہ یہ اس وقت درست ہوسکتا ہے، جب معاملہ ختم کرنا طے ہوجائے۔

ومن شروطها كون نصيب المضارب من الربح حتى لو شرط له من

رأس المال،أو منه ومن الربح فسدت. (شامي، كتاب المضاربة، كراچي ٥/٦٤٨،
زكريا ٨/٤٣٣، البحرالرائق، زكريا ٧/٤٤٩، كوئٹه ٧/٢٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۰۸۰/۴۰)

مضاربت ختم کرنے کے بعد مضارب سے نفع طلب کرنے کا حکم

سوال [۸۹۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ احقر انعام الحق نے زید سے کاروبار کے لئے دو لاکھ روپئے لئے کہ میں ان دو لاکھ سے کاروبار کروں گا، اور نفع آدھا آدھا ہوگا؛ چنانچہ انعام الحق نے رقم لے کر سامان خریدلیا؛ البتہ سامان لانے میں دیر ہوگئی، سامان خریدنے کے بعد زید نے کہا کہ ہم مال نہیں لیں گے، آپ کسی اور سے کاروبار کرلیں، میرا پیسہ واپس کردیں، میں نے واپس کرنے کا وعدہ کرلیا، اس میں وعدہ خلافی ہوگئی، مگر واپس کردیا، پھر کاروبار میں نفع ہوا۔ اب زید اس میں نفع بھی مانگ رہا ہے، کیا زید کا نفع مانگنا درست ہے؟

المستفتی: انعام الحق، قنوج (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں مذکورہ معاملہ عقد مضاربت کی ایک شکل ہے؛ لیکن جب انعام الحق نے مقرر کردہ وقت کے بعد سامان خریدا اور رب المال زید نے اپنا لگایا ہوا روپیہ واپس لے کر معاملہ ختم کردیا، تو ان کے درمیان شرکت مضاربت ختم ہوگئی اور پیسہ ادا کرنے کے بعد خریدا ہوا تمام مال انعام الحق کی ملک ہوگیا؛ لہٰذا بعد میں اس مال سے کاروبار کرنے میں جو نفع ہوا، وہ خالص انعام الحق کی ملکیت ہے، زید کا اس میں کوئی حق نہیں؛ اس لئے کہ زید اور انعام الحق کے درمیان کا معاملہ پہلے ختم

ہو چکا تھا اوراس مشترک معاملہ کے ختم ہونے کے بعد انعام الحق نے یہ نفع حاصل کیا ہے۔

المضاربة عقد شركة بمال من أحد الشريكين وعمل من الآخر. (تبيين الحقائق، كتاب المضاربة، امدادية ملتان ٥/٥٢، زكريا ٥/٥١٤، هداية اشرفي ديوبند ٣/٢٥٧، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/٤٤٣، تاتارخانية، زكريا ١٥/٣٩٠، رقم:٢٣٤٩٢)

ان التسليم إلى المضارب شرط صحة المضاربة. (تبيين الحقائق، امدادية ملتان ٥/٥٦، زكريا ديوبند ٥/٥٢٢)

وينعزل بعزله. (شامي، باب المضارب يضارب، كراچي ٥/٦٥٥، زكريا ٨/٤٤٣)

فما استقاموا لكم على العهدة ما استقيموا لهم على الوفاء. (تفسير مظهري، سورة التوبة، تحت رقم الآية٧، زكريا قديم ديوبند ٤/١٤٠، زكرياجديد ٤/١٢٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍رجب المرجب ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹؍۱۰۱۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱؍۷؍۱۴۳۱ھ

مضاربت کی ایک صورت

سوال [۸۹۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے خالد کو ایک دوکان دی، جس میں پچاس ہزار روپئے کا سامان تھا، دوکان زید کی، کام خالد کا، اور ہر مہینہ دوکان سے جو نفع ہوگا، وہ زید اور خالد کے درمیان آدھا آدھا تقسیم ہوگا اور یہ معاہدہ ایک سال تک کے لئے ہے، ایک سال پورا ہونے پر اگر دوکان کا سامان پچاس ہزار سے کم ہوگا، تو وہ زید اور خالد کے نفع سے پورا کیا جائے گا، اور اگر ہر مہینہ دوکان سے نفع نہ ہوا؛ بلکہ نقصان ہوا، تو یہ نقصان زید جو مالک ہے، اسی کا سمجھا جائے گا، خالد

اس نقصان کا ذمہ دار نہیں ہوگا، اس معاہدہ پر یہ دو کان تقسیم ہوئی، معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا مالک اور کام کرنے والا دونوں صرف نفع میں شریک ہوں گے یا نقصان میں بھی؟ اگر نقصان میں شریک نہ ہونے کی شرط لگائی تو کیا یہ عقد صحیح ہوگا یا فاسد ہوگا؟

المستفتی: تسلیم احمد، وارد حال پونہ (مہاراشٹر)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں ذکر کردہ شکل معاملۂ مضاربت میں شامل ہے اور معاملۂ مضاربت میں رأس المال کے اندر نقصان کا ذمہ دار رب المال ہوتا ہے، اور جو بھی کم زیادہ نفع ہوتا ہے، اس میں طے شدہ شرائط کے مطابق دونوں صاحب معاملہ شریک ہوتے ہیں، اس اعتبار سے سوال نامہ میں مذکور معاملہ میں زید رب المال ہے اور خالد مضارب ہے، اور گھاٹے کی جو بات کہی گئی ہے اس سے مراد اگر رأس المال میں گھاٹا ہے تو وہ زید رب المال کے سر جائے گا اور نفع میں دونوں طے شدہ شرائط کے مطابق شریک ہوں گے اور اسی طرح یہ شرط بھی صحیح ہے کہ سال پورا ہونے پر دونوں کے منافع سے رأس المال کو پورا کیا جائے گا، جس کی صورت یہ ہے کہ درمیانِ سال میں جس کے حصہ میں جتنا نفع آتا ہے، اس کو سامنے رکھ کر دونوں کے مجموع تناسب سے پہلے رأس المال کو پورا کیا جائے گا، اس کے بعد جو بچے اس کو طے شدہ شرائط کے مطابق یہ دونوں حضرات آپس میں تقسیم کرلیں۔

المضاربة هي شركة في الربح بمال من جانب، وعمل من جانب.

(البحر الرائق، كتاب المضاربة، كوئٹه ۲٦٣/۷، زكريا ٤٤٨/۷، هداية، اشرفي ديوبند ۲٥۷/۳، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤٤٣/۳، تاتارخانية، زكريا ۳۹۰/۱٥، رقم: ۲۳٤۹۲)

مافات جزء من المال بالهلاک یلزم صاحب المال دون غيره.

(تبيين الحقائق، امدادية ملتان ٥٦/٥، زكريا ديوبند ٥۲۱/٥)

ما هلک من مال المضاربة، فهو من الربح دون رأس المال.

(هندية، الباب الرابع عشر في هلاك المضاربة، زكريا قديم ۳۱۸/٤، جديد ۳۲۷/٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۹۴۴/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۳/۱۲ھ

دوسرے سے رقم لے کر کوچنگ سینٹر قائم کر کے نفع برابر تقسیم کرنا

سوال [۸۹۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کے پاس رقم ہے، بکر کا زید سے کہنا ہے کہ یہ رقم مجھے دیدو کوچنگ سینٹر قائم کرلوں اور کوچنگ کا ایک اسکول چلاؤں، جو منافع ہوگا، اس میں سے آدھا زید کا آدھا بکر کا۔

سوال یہ ہے کہ زید کا بکر سے اس طرح کا معاملہ کرنا شرعاً درست ہے؟ اور کیا یہ مضاربت کی شکل ہے یا اور کوئی شکل ہے؟

المستفتی: ماسٹر صدیق، گونڈہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں معاملہ کی جو شکل بیان کی گئی ہے کہ زید کا مال ہوگا اور بکر کی محنت ہوگی اور منافع دونوں کے درمیان برابر برابر تقسیم ہوا کریں گے، تو شرعاً یہ مضاربت کی شکل ہے اور یہ معاملہ شرعاً جائز ہے۔

وكون الربح بينهما شائعاً، فلو عين قدراً فسدت، وكون نصيب كل منهما معلوما للعقد. (در مختار مع الشامي، كتاب المضاربة، كراچي ٦٤٨/٥، زكريا ٤٣٣/٨، هداية، اشرفي ديوبند ۲٥٨/٣، مجمع الأنهر قديم

۷۱٦/۱، جديد دارالكتب العلمية بيروت ۵٤٤/۲، هندية، زكريا قديم ۳۰۲/۲، جديد ۳۱۱/۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ رجمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۲۸۱/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۵/۶ھ

ایک کا پیسہ اور دوسرے کی محنت ہو، تو کیا حکم ہے؟

سوال [۸۹۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے بکر سے ایک ہزار روپئے لئے اور طے یہ ہوا کہ میں تجارت کروں گا، نفع دونوں کے درمیان آدھا آدھا ہوگا اور شرکت جب ختم ہوگی، تو میں ایک ہزار روپیہ تمہیں واپس دیدوں گا، کیا یہ معاملہ درست ہے؟

المستفتی: اسرار احمد، نجیب آباد، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ شرعاً مضارت یا شرکت عنان ہے، جو بلا شبہ جائز ہے۔

المضاربة عقد يقع على الشركة بمال من أحد الجانبين (وقوله) ومن شرطها أن يكون الربح بينهما مشاعاً الخ. (هداية، كتاب المضاربة، اشرفي ديوبند ۲۵۸/۳، درمختار، كراچي ٦٤۸/۵، زكريا ٤۳۳/۸، هندية، كتاب الشركة، الباب الأول، زكريا قديم ۳۰۲/۲، جديد ۳۱۱/۲، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤٤٦/۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰ رجمادی الاولیٰ ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۷۴۳/۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۵/۱۴ھ

دو ثلث اور ایک ثلث کے منافع پر شرکت کرنے کا حکم

سوال [۸۹۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے عمر کو تجارت کے لئے پچاس ہزار رقم دی؛ لیکن شرط یہ لگادی کہ اس میں جو فائدہ ہوگا، اس کا تین حصہ کیا جائے گا، جس میں دو حصہ ہمارا یعنی زید کا اور ایک حصہ تمہارا یعنی عمر کا، تو کیا اس طرح سے روپئے لے کر تجارت کرنا یا روپئے دینا جائز ہے یا ناجائز؟ اگر ناجائز ہے، تو کیوں ہے اور گنہگار کون ہوگا؛ لہٰذا قرآن وحدیث کی روشنی میں مفصل جواب تحریر فرمائیں عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: محمد وثیق الرحمٰن پورنوی، متعلم مدرسہ ہٰذا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ شکل شرعاً مضاربت کی ہے، اور یہ معاملہ شرعاً صحیح اور درست ہے، اور ہر ایک طے شدہ شرائط کے مطابق اپنے اپنے حصے میں نفع وصول کرنے کا حقدار ہے۔

أن يكون المشروط لكل واحد منهما من المضارب، ورب المال من الربح جزأ شائعاً نصفاً، أو ثلثاً، أو ربعاً. (بدائع الصنائع، كتاب المضاربة، فصل وأما شرائط الركن، كراچي ٦/٨٥، زكريا ديوبند ٥/١١٩، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/٤٤٦، درمختار، كراچي ٥/٦٤٨، زكريا ٨/٤٣٣، هندية، كتاب الشركة، الباب الأول، زكريا قديم ٢/٣٠٢، جديد ٢/٣١١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ / جمادی الثانیہ ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۷/ ۲۷۱۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۲/۶/۲۱ھ

عقد مضاربت کی دو شکلیں

سوال [۸۹۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے ایک لاکھ روپیہ کپڑے کے کاروبار کے لئے دیئے ہیں، اس شرط پر -/600 روپیہ ہفتہ بطور منافعہ لیتا رہے گا، تو کیا یہ صحیح ہے، اگر غلط ہے، تو زید اس پیسے کا یعنی -/600 روپیہ ہفتہ جو منافع آتا ہے، کیا کرے گا زید گنہگار ہوگا یا نہیں؟

زید نے ایک لاکھ روپیہ کا کپڑا دیا ہے، اس شرط پر کہ شام تک جو بکری ہوگی یعنی صبح سے شام تک جو ۱۰؍ پرسنٹ کے حساب سے نفع گھاٹا ہوگا، وہ بانٹ لیا جائے گا، مد پوری ہی رہے، کیا یہ صحیح ہے؟ اگر غلط ہے تو صحیح کس شکل میں ہوگا؟

المستفتی: محمد حنیف قادری، لال مسجد، سرائے ترین، سنبھل

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: یہ معاملہ شرعاً عقد مضاربت میں داخل نہیں ہے، نہ ہی عقد شرکت میں؛ لہٰذا اس طرح کی شرط جائز نہیں ہے، ہاں البتہ اگر اس طرح شرط لگائی جاتی کہ نفع میں سے ثلث یا نصف کوئی ملا کریگا، تب جائز ہوتا؛ لہٰذا یہ معاملہ شرعاً جائز نہیں ہے اور اس طرح کا روپیہ لینا شرعاً سود میں داخل ہے اور دیئے ہوئے روپئے قرض کے حکم میں ہیں اور قرض کے بدلے نفع حاصل کرنا سود ہے؛ لہٰذا یہ کل قرض جر نفعاً کے تحت داخل ہو کر حرام ہوگا۔

وقوله لا يصح إلا بالمال الذي يصح به الشركة، وهو أن يكون رأس المال، ودراهم، أودنانير. عند أبي حنيفةؒ، وأبي يوسفؒ أوفلوساً رائجة عند محمدؒ حتى أن المضاربة بما سوىٰ هذه الأشياء لا يجوز إجماعاً. (عنايه، فتح القدير، كتاب المضاربة اشرفي ديوبند ۳/۲۵۸، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ۳/۴۴۵)

دوسری شکل میں زید نے جوایک لاکھ کا کپڑا دے کر دس پرسینٹ نفع کے اعتبار سے معاملہ کیا ہے، یہ شرعاً جائز ہے۔

ولو دفع إليه عرضًا وقال بعه، واعمل مضاربة في ثمنه جاز؛ لأنه يقبل الإضافة من حيث أنه توكيل وإجارة فلا مانع من الصحة. (هداية اخيرين، كتاب المضاربة، اشرفي ديوبند ۲۵۸/۳، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ۴۴۵/۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ / صفر المظفر ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۰۴۸/۳۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۲/۲۸ھ

مضاربت سے متعلق چند مسائل

سوال [۸۹۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں چند سرمایہ داروں نے بسلسلہ کاروبار شرعی مضاربت کی بنیاد پر مندرجہ ذیل شرائط تحریر کے طور پر اپنے تمام سرمایہ کاروں سے طے کر رکھی ہیں۔ وہ شرائط یہ ہیں:

(۱) اگر کسی معاملہ میں نہ اتفاقی ہوگئی، تو فیصلہ شریعت کے مطابق ہوگا۔

(۲) دونوں فریقین میں سے اگر کوئی کام ختم کرنا چاہے گا، تو ایک ماہ پیشتر اطلاع دینی ہوگی اور اس اطلاعی ماہ کا نفع نہ مل سکے گا۔

(۳) رقم بالا پر جو نفع ہوگا اس نفع کا چالیس فیصدی ہر ماہ کے حساب پر دیا جائے گا۔

براہ کرم مہربانی فرما کر قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں کہ آیا یہ شرعی طور سے جائز ہے؟ اور اس میں رقم لگانا جائز ہے؟ کیونکہ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ سرمایہ دار اس رقم کو کس قسم کے کاروبار میں لگاتے ہیں، اور نہ ہی یہ کتنی مقدار کے منافع پر چالیس فیصد دے رہے ہیں۔ اس طریقے کے مطابق جو یہ منافع دے رہے ہیں کیا جائز ہے؟ جزاکم اللہ خیراً۔

المستفتی: عبدالرشید، باندہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اطلاعی ماہ کا نفع نہ مل سکے گا یہ شرط فاسد ہے اور خلاف شریعت ہے؛ اس لئے اس شرط کا اعتبار نہ ہوگا، پس اطلاعی ماہ کا نفع دینا بھی ضروری ہے۔

قال في الهداية: وكل شرط يوجب جهالة في الربح يفسده لاختلال مقصوده وغير ذلك من الشروط الفاسدة لا يفسدها. (فيصح العقد) ويبطل الشرائط. (هداية، كتاب المضاربة، اشرفي ديوبند ٣/٢٥٨، در مختار وكراچي ٥/٦٤٨، زكريا ٨/٤٣٤)

چالیس فیصد نفع کا ہر ماہ دیا جائے گا، یہ شرط صحیح ہے جب اسمیں مال کی مقدار کا کوئی ذکر نہیں، تو کل مال کے کل منافع کا چالیس فیصد رب المال کا ہر ماہ کے حساب پر واجب الاداء ہے۔

قال في الهداية: ومن شرطها أن يكون الربح بينهما مشاعاً. (هداية، اشرفي ديوبند ٣/٢٥٨، هندية، كتاب الشركة، الباب الاول، زكريا قديم ٢/٣٠٢، جديد ٢/٤١١، در مختار مع الشامي، كراچي ٥/٦٤٨، زكريا ٨/٤٣٣)

یہ معلوم نہیں کہ کس قسم کے کاروبار میں اس رقم کو لگاتے ہیں، سو جب رب المال نے کوئی قید نہیں لگائی، تو یہ مضاربت ہے اور ہر کاروبار اس سے کیا جانا صحیح ہوگا؛ البتہ ضروری ہوگا کہ حرام اور سودی کاروبار میں رقم نہ لگائی جائے۔ وہذا ظاہر۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/ ۱۰۰۵)

۲۷/ کتاب الربوا

(۱) باب ما یتعلق بنفس الربوا

سود کی لعنت

سوال [۸۹۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سود کو قرآن میں اللہ نے حرام کہا ہے اور ایک حدیث فضائل اعمال میں ہے کہ سود کے ایک درہم کو لینا ۳۵/ بارزنا کرنے کے برابر ہے، تو کیا سود لینا جائز ہے؟ سوال کا جواب دین حنیف کی روشنی میں عنایت فرمائیں؟

المستفتی: مظہر محمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سود لینا کسی طرح بھی جائز نہیں ہے، اللہ رب العزت نے اسے حرام قرار دیا ہے؛ لہٰذا سود دلانے کا مطالبہ حرام اور ناجائز ہے اور حدیث شریف میں ربا کے ایک درہم کو لینا ۳۶/ بارزنا کے برابر کہا ہے، نہ کہ ۳۵/ بار۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا . [البقرہ:۲۷۵]

عن جابرؓ، قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم آکل الربوا، ومؤکله، وکاتبه، وشاهدیه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، باب لعن أكل الربا ومؤكله، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۸، سنن أبي داؤد، باب في آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية ۲/۴۷۳، دارالسلام رقم:۳۳۳۳)

عن عبد اللّٰہ بن حنظلة غسیل الملائکة قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: درهم ربوا یأکله الرجل، وهو یعلم أشد من ستة وثلاثین زنیة.

(مسند أحمد بن حنبل٥/٢٢٥، رقم: ٢٢٣٠٣، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ٨/٣٠٩، رقم:٣٣٨١، سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت٣/١٣، رقم: ٢٨١٩-٢٨٢١، مشكاة ٢٤٦/١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶ / ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۹۴/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۴/۱۶ھ

کیا سود لینا اور دینا دونوں برابر ہیں؟

سوال [۸۹۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سود کا لینا اور دینا برابر ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالعزیز، نئی آبادی، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حدیث میں آیا ہے کہ سود لینے والا اور دینے والا دونوں لعنت کی وعید میں برابر کے شریک ہیں۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، باب لعن آكل الربا ومؤكله، النسخة الهندية، ٢/٢٧، بيت الأفكار رقم:١٥٩٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰ / جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲۱۹/۲۹)

سود ناجائز کیوں؟

سوال [۸۹۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج بازار میں ہر چیز کی قیمت دس گنا بڑھادی جائے اور آج جس شخص

کی جتنی آمدنی ہے، اسے بھی دس گنا بڑھادی جائے، تو کیا لوگوں کو چیزوں کی خریداری کرنے میں کچھ دشواری ہوگی؟ یا بازار کی ہر چیز کی قیمت دس گنا کم کردی جائے اورلوگوں کی آمدنی بھی دس گنا کم کردی جائے، تولوگوں کی قوت خرید میں کوئی فرق پڑے گا، یا وہ پہلے ہی جیسا قوت خریداری محسوس کریں گے؟

مان لیا ۱۹۷۵ء میں کسی شخص کی تنخواہ پانچ سو روپیہ تھی، اس وقت چاول کی قیمت ایک روپیہ کیلو اور گیہوں کی قیمت اسی پیسے کیلو تھی، پھر ۲۰۰۵ء میں چاول ۱۰/ روپیہ کیلو اورگیہوں آٹھ روپیہ کیلو ہو گئے، اوراسی طرح تیس سال کے عرصہ میں ہر چیز کی قیمت دس گنا بڑھ گئی اوراس شخص کی آمدنی بھی پانچ سو روپیہ سے بڑھ کر پانچ ہزار ہوگئی، تو کیا وہ شخص ۱۹۷۵ء کے مقابلہ میں ۲۰۰۵ء میں زیادہ امیر ہوگیا یا زیادہ غریب ہوگیا؟ میری رائے میں وہ شخص امیر ہوا نہ غریب؛ کیونکہ ۱۹۷۵ء کے پانچ سو روپئے کے نوٹ کی قوت خریداری ۲۰۰۵ء کے پانچ ہزار نوٹ کے قوت خریداری کے برابر ہے، اسی طرح کسی شخص نے ۱۹۷۵ء میں ہزار روپئے بینک میں جمع کئے تھےاور وہ شخص ۲۰۰۵ء میں بینک سے دس ہزار روپیہ پاتا ہے، تو گویا وہ ۱۹۷۵ء کا ہزار روپیہ ہی پاتا ہے،تو کیا وہ بینک سے سود لینے کا گہنگار ہوگا یانہیں؟ اسی طرح کسی عورت کا دین مہر ۱۹۷۵ء میں ایک ہزار روپیہ طے ہوا تھا، تو ۲۰۰۵ء میں اگراس کا شوہر ایک ہزار ہی ادا کرے تو کیا اس عورت کی حق تلفی نہیں ہوگی؟

المستفتی: محمد جاوید قاسمی، چاندپور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سود جس کو اللہ نے حرام کیا ہے، وہ ہر حال میں حرام رہے گا، اگر چہ قوت خریداری کم ہو یا زائد۔ انسانوں اور ہمارے فائدوں کو ہمہ شما سے زیادہ اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے، اس کے سامنے ازل سے ابدتک پیش آنے والے تمام واقعات وحالات ہیں، وہ حکیم ہے، اس کے حکمت بھرے حکم میں اپنی حماقت بھری رائے داخل کرنا اپنے کو دنیوی اوراخروی خسارے میں ڈالنا ہے۔

عن جابر بن عبد اللہ ؓ، قال: لعن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم آکل الربوا، ومؤکله، وکاتبه، وشاهدیه، وقال: هم سواء. (مسلم شریف، باب لعن آکل الربا، ومؤکله، النسخة الهندیة، ۲/ ۲۷، بیت الأفکار رقم: ۱۵۹۸، سنن أبي داؤد، باب في آکل الربا، ومؤکله، النسخة الهندیة ۲/ ۴۷۳، دارالسلام رقم: ۳۳۳۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۷۹۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/ ۴/ ۱۴۲۶ھ

سودا اور معاہدہ میں فرق

سوال [۸۹۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہم کو سودا اور معاہدے کے بارے میں جان کاری درکار ہے، جو اس طرح ہے کہ مالک جائیداد اور کرایہ دار کے درمیان ایک معاہدہ ہوا، اس کی تحریر اس طرح ہے کہ کرایہ دار اس وقت 75% فی صدی کرایہ بڑھائے گا، اور ہر پانچ سال بعد موجود کرایہ میں دس فی صدی کی بڑھوتری کرتا رہے گا، تو کرایہ دار کو کسی طرح پریشان نہیں کیا جائے گا اور نہ بے دخلی کی کارروائی کی جائے گی، ہم اور ہمارے وارثان وقائم مقام اس تحریر کے پابند رہیں گے، تحریر کر دیا گیا تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آوے۔

اب کرایہ بڑھانے کے لئے مالک جائیداد نے کہا تو کرایہ دار نے ان کو مذکورہ بالا یہ تحریر دکھائی، مگر مالک جائیداد نے اس تحریر کو نظر انداز کرتے ہوئے کرایہ دار کے خلاف بے دخلی کا دعویٰ کر دیا اور عدالت سے مانگ کی کہ کرایہ دار سے کرایہ پر معقول سود بھی دلایا جائے۔

کیا معاہدہ جس کے بارے میں قرآن مجید میں ہے۔ **والموفون بعهدهم إذا عٰهدوا.** اور پورا کرو جب عہد کرو، کیا توڑنا جائز ہے عہد کا؟

المستفتی: مظہر محمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگرآخری مدت متعین نہیں کی گئی ہے،تو پانچ سال پورے ہونے کے بعد مالک مکان کومکان خالی کرانے کا حق ہوجائے گااور پانچ سال پرکرایہ بڑھانے کا جو معاہدہ ہوا ہے، وہ گویا کہ اس کے مرادف ہے کہ ہر پانچ سال پر نیا معاہدہ ہواکرے گا؛ لہٰذا پانچ سال پورے ہونے کے بعد مالک مکان کو نیا معاہدہ طے کرنے اورمکان سے بےدخلی کا دعویٰ کرنے کا حق ہے۔

قال العلامة الحصكفيؒ: آجر داره كل شهر، بكذا فلكل الفسخ عند تمام الشهر. (شامي، كتاب الإجارة، قبيل باب الإجارة الفاسدة، زكريا ٩/٦١، كراچي ٦/٤٥)

وإن كان استأجرها كل شهر فلكل واحد منهما أن ينقض الإجارة عند رأس الشهر. (المبسوط، دارالكتب العلمية بيروت ١٥/١٣١)

ثم إذا تم الشهر كان لكل واحدمنهما نقض الإجارة لانتهاء العقد الصحيح بشرط أن يكون الآخر حاضراً. (تبيين الحقائق، زكريا ٦/١١٢، امداديه ملتان ٥/١٢٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۴۹۴/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۲۵/۴/۱۶ھ

سودی رقم سے خریدی گئی جائیداد کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال [۸۹۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید سے بیس بیگھہ زمین بٹائی پراس شرط کے ساتھ لی گئی کہ آدھا پانی آدھا کھاد اور آدھا بیج زید بھی ادا کرے گا، اس میں باہم رضامندی سے یہ بات طے پائی، مگر

زید بہت بڑا سودخور تھا، انتہائی شہرت کا سودخور ہے، وہ زمین بھی اسی پیسے سے خریدی گئی، گوکہ وہ دوسری تجارت بھی کرتا ہے، مگر پیسہ سب وہی تھا، ایسی صورت میں زمین میں آدھا پانی آدھا بیج اور آدھا کھاد لینا اور فصل کو آدھا آدھا بانٹ لینا، جس نے زمین بٹائی پر لی شرع میں اس کے لئے جائز ہے یا ناجائز ہے؟

المستفتی: محلّہ دیپا سراء سنبھل، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ صورت شرعاً مزارعت کی جائز شکل ہے؛ کیونکہ اس میں عمل اور آلۂ زراعت عامل کی طرف سے ہے۔

وإن كانت الأرض، والبذر لواحد، والبقر والعمل لواحد جازت المزارعة. (هداية، كتاب المزارعة اشرفي ٤/٤٢٦، مختصر القدوري ١٥٥، الدر مع الرد، زكريا ٩/٤٠١، كراچي ٦/٢٧٨)

زید سے بٹائی پر لینے والے کے لئے حاصل شدہ حق حلال اور جائز ہوگا؛ البتہ زید پر زمین کی قیمت کے بقدر رقم صدقہ کرنا لازم ہے، اور جب تک اتنی مقدار صدقہ نہ کرے، اس وقت تک جو منافع زید کو حاصل ہوں گے، ان کا صدقہ کرنا زید پر لازم ہوگا، بٹائی پر لینے والے پر کوئی چیز لازم نہ ہوگی۔

كما استفاده من الهداية: وأصله أن الغاصب والمودع إذا تصرف في المغصوب، أو الوديعة وربح لا يطيب له الربح عندهما. (هداية، كتاب الغصب، اشرفي ٣/٣٧٥، بدائع الصنائع، كراچي ٦/٨٧، زكريا ٥/١٢٠-١٢١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰؍ رجب المرجب ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۲۹۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۳۰/ ۷/ ۱۴۱۱ھ

کیا دارالحرب میں سودی کاروبار جائز ہے؟

سوال [۸۹۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ یہ جو مشہور ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دارالحرب میں وہاں کے لوگوں سے سود کا لینا دینا جائز ہے، اس کے بارے میں ہم مفتیان کرام سے وضاحت چاہتے ہیں کہ اس کی اصل حقیقت کیا ہے؟

المستفتی: فہیم احمد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس مسئلہ کی اصل حقیقت یہ ہے کہ دارالحرب میں حربیوں سے وہی مسلمان سود لے سکتے ہیں، جو مسلمان خود اس دارالحرب کے رہنے والے نہ ہوں؛ لہٰذا ہندوستان یا پاکستان کے وہ مسلمان جو یورپ وامریکہ ملازمت کے لئے یا عارضی طور پر تجارت کے لئے یا کسی اور مقصد کے لئے ویزا لے کر جاتے ہیں، ان کے لئے وہاں کے سرکاری بینک اور وہاں کے غیر مسلموں سے سود حاصل کرنا اور اس کو اپنے استعمال میں لانا جائز اور درست ہے؛ لیکن خود ان ملکوں کے رہنے والے مسلمانوں کے لئے جائز نہیں۔

ولا بين حربي، ومسلم مستأمن، ولو بعقد فاسد، أو قمار ثمة.

(شامي، كتاب البيوع، باب الربا، زكريا ۷/۴۲۲، كراچي ۵/۱۸۶، ايضاح النوادر ۱/۹۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ جمادی الثانیہ ۱۴۳۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۷۶۲/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۰/۶/۲۹ھ

دارالحرب میں حربیوں سے سود لینے کی ایک شرط

سوال [۸۹۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: کہ (زمانہ حربی ہے) ایک مسلمان کا حربی سے دس روپیہ کے گیارہ روپیہ لینا سود ہے؟ کیا یہ جائز ہے؟

المستفتی: حافظ ایوب علی گڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دارالحرب میں حربیوں سے سود کے جواز کے لئے بہت سے شرائط ہیں، ان میں سے ایک شرط یہ بھی ہیکہ سود لینے والا مسلمان دارالحرب کا رہنے والا نہ ہو؛ بلکہ دارالاسلام سے آیا ہو، یہ شرط ملتی ہی نہیں اس لئے ناجائز ہے۔ تفصیل امدادالفتاوی زکریا ۳/ ۱۵۶ میں معائنہ فرمائیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/ ۵۹۱)

کیا ہندوستان میں سود کے جواز کی کوئی شکل ہے؟

سوال [۸۹۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آپ نے مذکورہ کتاب کے ضمیمہ میں ۱۶۰/ پر انڈین مسلمانوں کے لئے چین وامریکہ سے سود کا جواز نقل کیا ہے، اور امداد الفتاوی ۳/ ۱۵۷ کا حوالہ دیا ہے جو کہ زیر بحث مسئلہ ہے، ’’رافع الضنک عن منافع البنک‘‘ نام سے حضرت تھانوی قدس سرہ کا مستقل مضمون ہے۔

حالانکہ حضرت تھانوی قدس سرہ نے اس مضمون میں مطلقاً حرمت سود کی رائے کو اختیار کیا ہے جو کہ امام ابو یوسفؒ اور ائمہ ثلاثہ کا قول ہے، اور طرفینؒ کی مستدل حدیث شریف ’’لا ربیٰ بین المسلم والحربي في دار الحرب‘‘ کا جواب دیا ہے کہ یہ حدیث نہ قطعی الثبوت ہے اور نہ قطعی الدلالۃ ہے اور حدیث حرمت سود میں دارالحرب کا استثناء کلام اللہ میں زیادتی اور تخصیص کا مترادف ہے جو کہ قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ حدیث سے ہی ممکن ہے۔

قیاس کا سہارا تو منصوصات بالا جماع محل قیاس واجتہاد نہیں ہے، اور طرفینؒ کے مسلک کی روشنی میں حضرت تھانوی قدس سرہ نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ خود حضرت کی تصریح کے مطابق ''علی سبیل التنزل'' ہے؛ لہٰذا اس کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ حضرت تھانویؒ کی رائے طرفینؒ کے مطابق جواز کی ہے، احقر کی ناقص رائے میں درست نہیں ہے، اس مسئلہ پر احقر کو تین وجوہ سے اشکال ہے۔

(۱) طرفینؒ کے قول کا مفتی بہ ہونا جبکہ قوت دلیل امام ابو یوسفؒ کے قول میں ہے اور علامہ شامیؒ نے عقود رسم المفتی ۶۹ میں فرمایا ہے۔ ع

وقيل من دليله أقوىٰ رجح ☆ وذالمفت ذي اجتهاد الأصح

اور حضرت تھانویؒ قدس سرہ یقیناً مفتی مجتہد تھے؛ لہٰذا ان کا قوت دلیل کی بنیاد پر امام اعظمؒ کے قول کے برخلاف، امام ابو یوسفؒ کے قول کو راجح اور مفتی بہ قرار دینا بالکل برحق ہے؛ چنانچہ دار العلوم کے دار الافتاء سے بھی یہی فتوی دیا جاتا ہے۔

(۲) جواز کی رائے کا امداد الفتاوی کے حوالہ سے حضرت تھانوی قدس سرہ کی طرف انتساب؛ حالانکہ امداد الفتاوی میں حضرت تھانویؒ نے عدم جواز کی رائے کو اختیار کیا ہے۔ کما مر آنفاً.

اور یہی حضرت کی آخری اور قطعی رائے ہے؛ چنانچہ امداد الفتاوی ۳/۱۵۵ کے حاشیہ میں مرقوم ہے، ''تنبیہ از حکیم الامت دام ظلہم العالی: یہ رسالہ بینک وغیرہ سے سود لینے کے مسئلہ میں میری آخری تحقیق ہے، اگر کوئی تحریر میری اس کے خلاف دیکھی جائے، تو وہ سب اس سے منسوخ (یعنی مرجوع عنہ) ہے ''اشرف علی''

(۳) آپ نے ایضاح النوادر ۹۸/ میں یہ مسئلہ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ''تمام اکابرین کا فتوی بھی اسی پر ہے'' - حالانکہ حضرت گنگوہی قدس سرہ نے فتاوی رشیدیہ ۵۰۲/ میں اور مفتی محمود صاحب قدس سرہ نے فتاوی محمودیہ ۱۳/۳۷۳ میں اور مفتی رشید احمد صاحب

مدظلہ نے احسن الفتاوی ۷/۲۰ میں، امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق بلا استثناء دارالحرب مطلقاً سود کی حرمت کا فتوی دیا ہے اور حضرت تھانویؒ کی رائے بھی امداد الفتاوی ۳/۱۵۸/ حوالہ سے سامنے آگئی۔ اور مولانا مفتی تقی عثمانی مدظلہ کی رائے بھی یہی معلوم ہوتی ہے؛ چنانچہ فقہی مقالات ۱/۲۹۷/ میں غیر مسلم ممالک کے عالمی بینکوں سے حاصل ہونے والے سود کے متعلق ایک استفتاء کے جواب میں رقمطراز ہیں ''ہم بھی ان سفارشات کے ساتھ موافقت کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ ان بینکوں کا سود بھی حقیقت میں عین ربا ہی ہے اور جمہور فقہاء کا صحیح اور مختار قول یہی ہے کہ سود حرام ہے؛ اگر چہ وہ کسی حربی سے لیا جائے الخ''

احقر کے تتبع اور استقراء کے مطابق صرف مفتی کفایت اللہ صاحب قدس سرہ نے کفایت المفتی ۸/۵۴/ میں جواز کا فتوی دیا ہے؛ لیکن اس کا ضعف بالکل واضح ہے؛ کیونکہ انہوں نے ہندوستان میں سود کے جواز کا فتوی دیا ہے، جس کے طرفینؒ بھی قائل نہیں ہیں؛ کیوں کہ ان کے نزدیک دارالحرب میں سود کے جائز ہونے کے لئے جہاں مختلف شرائط ہیں وہیں آخذ کا مستأمن ہونا بھی شرط ہے، جیسا کہ رد المحتار ۴/۱۸۸/ وغیرہ میں صراحت ہے اور ان شرائط کو حضرت تھانویؒ نے امداد الفتاوی ۳/۱۵۷/ میں تفصیل سے نقل کیا ہے۔

آپ حضرات کی شفقتوں اور مسائل فقہیہ میں غایت درجہ احتیاط کے پیش نظر یہ چند سطور جناب والا کی خدمت میں ارسال کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ اور جواب کا از حد مشتاق اور منتظر ہوں، اگر کوئی خلاف ادب اور نامناسب بات بلا اختیار سبقت قلمی کے باعث تحریر میں آگئی ہو، تو معذرت خواہ ہوں۔ ع

والعذر عند کرام الناس مقبول

المستفتی: محمد ارتضاء الحسن رضی، کاندھلوی عفی عنہ، متعلم تدریب فی الإفتاء دارالعلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایضاح النوادر ۱/۹۸ میں ہندوستانی، پاکستانی مسلمان کے لئے چین، امریکہ، جرمنی اور اٹلی وغیرہ ممالک میں عارضی طور پر جا کر وہاں

کے غیر مسلم عوام اور سرکاری بینک سے سود حاصل کرنے کے جواز کا فتوی ہے- اس میں آخر میں یہ جملہ لکھا گیا تھا کہ تمام اکابر کا فتوی بھی اسی پر ہے، جس کا حوالہ ایضاح المسائل کے ضمیمہ میں بھی دیا گیا ہے، اس پر آنجناب کو اشکال ہے- اولاً یہ گزارش ہے کہ اس دنیا میں کوئی انسان خطاء ونسیان سے خالی نہیں ہے، یہ نااہل بھی ایک کمزورترین انسان ہے؛ اس لئے اپنی تحریرات میں سے کسی قابل رجوع مسئلہ پر کوئی صاحب علم توجہ دلاتا ہے، تو ہر وقت رجوع کے لئے تیار رہتا ہے۔ آنجناب کی تحریر پڑھتے وقت ذہن میں یہ خیال آیا کہ ممکن ہے کہ مسئلہ غلط لکھا گیا ہو، رجوع کر لیا جائے گا، مگر اصل کتاب اور اکابر کی آراء کی طرف مراجعت کے بعد اطمینان ہوا کہ مسئلہ اپنی جگہ بالکل درست اور صحیح ہے۔ قابل رجوع نہیں ہے شاید آنجناب کو اس مسئلہ پر دو طرح سے اشکال ہے۔

(۱) تمام اکابر کے فتوی پر۔

(۲) امداد الفتاوی کے حوالے پر؛ لہٰذا اسی انداز سے جواب بھی لکھ دیتا ہوں، اجلۂ اکابر کی آراء اس مسئلے کے بارے میں آنجناب کی خدمت میں پیش کی جارہی ہیں۔

الامام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی رائے: حضرت نانوتویؒ کی رائے یہی ہے کہ دارالحرب میں وہاں کے مسلمانوں کے لئے حربیوں سے سود لینا جائز نہیں ہے، مگر دوسرے ممالک سے عہد و پیمان کی رعایت کے ساتھ جو مسلمان دارالحرب میں آکر ان کی تراضی سے ان سے سود حاصل کرتا ہے، تو طرفینؒ کی رائے کے مطابق جائز ہے، اس موضوع پر حضرت نانوتویؒ نے حضرت مولانا احمد حسن صاحب محدث امروہوی کے نام ۳۵؍ صفحات پر مشتمل ایک مبسوط مکتوب تحریر فرمایا ہے اور یہ مکتوب پورا فارسی میں ہے۔

اینکہ در دارالحرب مال کفار مباح است چنانچہ فرمودہ اند ان مالہ ثمہ مباح اگر مراد ازیں سخن ایں است کہ بعد عہد و پیمان و امان واستیمان نیز مباح است، تعرض با موال اوشان چرا حرام است۔ (از مکتوب ہشتم ۲۶)

اور اس مکتوب کا حاصل حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی نور اللہ مرقدہ نے مکتوبات شیخ الاسلام ۱/۱۶ میں عربی میں لکھا ہے۔

لاشک أن الهند دار حرب بيد أن حضرة مولانا النانوتوي قدس الله سره العزيز، كان يرىٰ أن من كان من سكان الديار الإسلامية يباح له أن يدخل الهند ويأخذ من الحربيين الأموال بالربوا، والقمار، وإمكان ذلك فيه التراضي بغير نقض عهدٍ واما القاطنون بالهند فليس لهم ذلك ويرى أن النص الفقهي معناه كذٰلك الخ مكتوبات.

حضرت قطب عالم مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی رائے: حضرت گنگوہی کا فتوی جوفتاوی رشیدیہ میں ہے، اس میں عدم جواز لکھا ہے، جو حفظ عوام کی مصلحت پر مبنی ہے، ورنہ حضرت گنگوہیؒ کی اصل رائے جواز کی ہے؛ چنانچہ حضرت شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ جو حضرت گنگوہیؒ کے حالات اور آراء سے بہت خوبی کے ساتھ واقف تھے، وہ نقل فرماتے ہیں کہ حضرت گنگوہی کی رائے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بھی یہاں کے انگریزوں اور ہندوؤں سے سود لینے کے جواز کی ہے، مگر حفظ عوام کے لئے اس کو شائع نہیں فرمایا:

وأما حضرة مولانا الكنكوهيؒ قدس سره العزيز فكان يرى أن المسلمين القاطنين بالهند أيضا لهم أن ياخذوه من الانكليز والهندوس بيد أنه كان لا يفشى بهذا الفتوى لمصلحة حفظ العوام الخ. (مكتوبات ۱۷/۱)

جب ہندوستانی مسلمانوں کے لئے دار الحرب تسلیم کرنے کی صورت میں یہاں کے کفار سے سود لینا جائز ہے، تو دوسرے ممالک سے عارضی طور پر دارالحرب میں جانے والوں کے لئے بطریق اولی حضرت کے نزدیک جائز ہوگا؛ لہٰذا حضرتؒ کی رائے بھی اس موضوع میں جواز کی ہے۔

حضرت ابوالحسنات علامہ عبد الحی لکھنویؒ کی رائے: حضرت مولانا عبد الحی لکھنویؒ کی رائے واضح طور پر جواز کی ہے، ان کی فارسی عبارت ملاحظہ ہو:

دردارالحرب ازحربیاں ربوا گرفتن جائزاست خواہ وکیل باشد یامؤکل زیراکہ نائب مثل منیب است (دوسرا فتوی) اگرمسلم معاملۂ ربوا ازحربی در دارالاسلام کردہ وکیل خودرا برائے قبض آں بدارالحرب فرستادہ جائزنخواہدشد چہ معاملۂ ربوادر دارالاسلام ممنوع است، واگردردارالحرب کردہ است البتہ جائزخواہدشد۔(مجموعۃ الفتاوی ۱/۳۱)

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی رائے: حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ جو دارالاسلام اور دارالحرب کے حالات پرزیادہ واقف تھے، جنہوں نے اپنی زندگی کا لمبا حصہ بڑی بڑی حکومتوں سے مقابلے میں گزاردیا، ان کی رائے بھی صاف طور پر جواز کی ہے، ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

ہندوستان کا مسلمان امریکہ، انگلینڈ میں سود پر روپیہ قرض دے سکتا ہے۔(مستفاد: مکتوبات شیخ الاسلام ۴/۷۶۳، فتاوی شیخ الاسلام ۱۴۵)

حضرت اقدس مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ کا فتوی: حضرت اقدس مفتی صاحبؒ کے فتاوی محمودیہ قدیم ۱۳/۳۷۳، جدید ڈابھیل ۱۶/۳۵۲ رکا جو عدم جواز کا حوالہ سوال نام کے اشکال میں دیا گیا ہے، وہ ہمارے اس موضوع سے متعلق نہیں ہے؛ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کو دارالحرب تسلیم کرنے کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں کے لئے حکومت ہند یا ہندوؤں سے سود لینا حرام ہے اور زیر بحث مسئلہ سے متعلق حضرت مفتی صاحب کا مستقل الگ سے فتوی ہے، جو فتاوی محمودیہ قدیم ۴/۲۳۸، جدید ڈابھیل ۱۶/۲۷۹-۶/۲۹۴، جدید ڈابھیل ۱۶/۳۵۳ - ۶/۲۹۸، جدید ڈابھیل ۱۶/۳۵۹ میں موجود ہے۔حضرت مفتی صاحب کی عبارت ملاحظہ ہو:

دوسری تشریح: یہ ہے کہ دارالاسلام سے دارالحرب میں امن لے کر جو مسلم داخل ہو عقود فاسدہ ربویہ کے ذریعہ جو مال حاصل کر کے لے آئے، وہ اسی کی ملک ہے۔

تیسری تشریح: یہ ہیکہ مسلم مستأمن جو مال عقود فاسدہ ربویہ کے ذریعہ دارالحرب

میں حربی سے حاصل کرتا ہے، اس پر ربوا کا اطلاق نہیں ہوتا؛ بلکہ جس طرح سے مال مباح حطب وحشیش وغیرہ پر استیلاء سے ملک حاصل ہوجاتی ہے، اسی طرح یہاں بھی ہے، فرق یہ ہے کہ یہاں قابض کی رضامندی ضروری ہے، وہ بصورت عقد حاصل ہے، تو موجب ملک عقد نہیں؛ بلکہ موجب ملک استیلاء ہے اور عقد صرف تحصیل رضائے قابض کے لئے ہے۔

(مستفاد: فتاوی محمودہ ۲۳۹/۴، جدید ڈابھیل ۲۷۹/۱۶)

نیز اسی کے قریب قریب ۲۹۴/۶، جدید ڈابھیل ۳۵۳/۱۶، ۲۹۸/۶، جدید ڈابھیل ۳۵۹/۱۶ میں حضرت مفتی صاحبؒ کا فتوی ہے؛ لہٰذا حضرت مفتی صاحبؒ کی رائے زیر بحث مسئلہ میں وہ نہیں ہے، جو آنجناب نے نقل فرمائی ہے۔

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ کی رائے: حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ کی رائے بھی اسی طرح جواز سے متعلق ہے کہ موجب ملک عقد نہ ہو؛ بلکہ موجب ملک برضائے حربی استیلاء ہو، تو جائز اور درست ہے۔ ملاحظہ:

ان المسلم المستأمن منع من تملكه من غير رضاه لما فيه من الغدر، والخيانة، فإذا بذله باختياره ورضاه فقد زال هذا المعنى، فكان الأخذ استيلاء على مال مباح غير مملوك، وأنه مشروع مفيد بالملك كالاستيلاء على الحطب، والحشيش وبه تبين أن العقد ههنا ليس بتملك؛ بل تحصيل شرط التملك و هو الرضا. (اعلاء السنن، كتاب البيوع، الجواب عن ايراد بعض الأحباب على الطحاوي، كراچي ٣٣٩/١٤، دار الكتب العلمية بيروت ٣٩٢/١٤)

آیت ربا کی قطعیت: آنجناب نے آیت ربا قطعی الثبوت وقطعی الدلالۃ ہونے کی وجہ سے حدیث کے ذریعہ سے زیادتی کو ناجائز لکھا ہے، وہ صحیح نہیں ہے، اس کا جواب یوں ہے کہ آیت ربا قطعی الثبوت ہے، مگر اس کے معنی مرادی کے مجمل ہونے کی وجہ سے دلالت ظنی ہے؛ لہٰذا نصوص ظنیہ کے ذریعہ سے اس میں شرائط وقیودات کا لگانا جائز

اور درست ہوگا؛ چنانچہ آپ ﷺ نے حدیث عبادہ بن الصامتؓ کے ذریعہ سے آیت ربوا میں اشیاء ستہ کی قید لگائی اور اس کی علت حنفیہ نے قدر وجنس کو قرار دیا اور شافعیہ نے جنسیت اور ثمنیت کی قید لگائی۔ اور مالکیہ نے ادخار کی قید لگائی ہے وغیرہ وغیرہ اور اصول کی کتابوں میں آیت ربوا کو بالاتفاق مجمل قرار دیا ہے۔

أو لم يكن البيان شافياً كالربوا في قوله تعالىٰ: وحرم الربوا، فإنه مجمل بينه النبى عليه السلام، بقوله الحنطة بالحنطة، والشعير بالشعير، الحديث (نور الأنوار ۹۲، ترمذي ۱/ ۲۳۵)

بالفاظ مختلفہ مفصل موجود ہے، تو کیا حدیث عبادہ بن الصامتؓ ظنی نہیں ہے؟ اس سے قیود وشرائط لگا کر آیت ربوا میں زیادتی کی گئی ہے، جو بالاجماع جائز ہے اور حدیث مکحول۔

أن رسول الله صلى عليه وسلم قال: لا ربوا بين أهل الحرب، وبين الإسلام يا لا ربوا بين المسلمين و بين أهل دار الحرب في دار الحرب.

(اعلاء السنن، كتاب البيوع، باب الربوا في دارالحرب بين المسلم والحربي، كراچي ۱۴/ ۳۳۳، دارالكتب العلمية بيروت ۱۴/ ۳۸۶)

جو کہ ظنی ہے اس کے ذریعہ سے حضرات طرفین نے آیت ربوا کے مدلول میں دارالحرب میں حربیوں سے سود کے استثناء کی قید لگائی ہے، اس کو بھی ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔

دلیل ظنی سے کتاب اللہ پر زیادتی: آنجناب نے جو تحریر فرمایا ہے کہ حرمت سود میں دارالحرب کا استثناء، کلام اللہ میں زیادتی اور تخصیص کے مرادف ہے۔ نیز یہ فرمایا کہ منصوصات بالاجماع محل قیاس اور اجتہاد نہیں؛ حالانکہ حدیث اشیاء ستہ بھی تو ظنی ہے اور اس کے ذریعہ سے آیت ربوا میں قیودات وشرائط کے ذریعہ سے زیادتی کی گئی۔ اور اس زیادتی کا امت میں کسی نے انکار نہیں کیا۔ نیز اس میں ائمہ مجتہدین نے اپنے قیاس اور اجتہاد کے ذریعہ سے مزید اضافہ فرمایا ہے کہ حضرات حنفیہ نے جنسیت کے ساتھ ساتھ قدریت کو علت

ربوا قرار دیا اور حضرات شافعیہ نے جنسیت کے ساتھ ساتھ اثمان کے اندر ثمنیت کی قید لگائی اور حضرات مالکیہ نے اشیاء ماکولہ میں ادخار کی قید لگائی۔ (مستفاد: نووی ۲/۲۴)

حضرات ائمہ مجتہدین کا حکم ربوا میں اپنے اجتہادات کے ذریعہ سے اس طرح کی قیود وشرائط کا لگانا کسی کے نزدیک بھی ناجائز نہیں ہے، تو حضرات طرفین نے حدیث **مکحول لا ربا بین الحربي والمسلم** کے ذریعہ سے حکم ربوا میں جو دار الحرب اور حربیوں کا استثناء کیا ہے، تو اس سے حضرات طرفین پر کسی طرح کا اشکال وارد نہیں ہوسکتا؛ لہٰذا زیادتی اور تخصیص پر اشکال درست نہیں۔

حضرت تھانویؒ مفتی مجتہد: حضرت تھانویؒ ضرور مفتی مجتہد ہیں، ان کو اپنے وفورِ علم اور قوت دلائل کے ذریعہ سے حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول کو راجح اور مفتی بہ قرار دینے کا حق ہے؛ لیکن حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ، حضرت علامہ عبد الحی لکھنویؒ، حضرت شیخ الاسلامؒ مدنی اور حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ قدس اللہ اسرارہم بھی اپنی جگہ مفتی مجتہد تھے، ان حضرات کی آراء آپ کے سامنے پیش کی جاچکی ہیں، ان کو بھی حضرات طرفین کے قول سے اتفاق کرنے کا حق ہے۔

آخری گذارش: آنجناب نے کفایت المفتی کے جواز کو لکھ کر اس پر تردید کی جو کوشش فرمائی ہے، احقر کے پیش نظر وہ فتویٰ نہیں تھا؛ اس لئے کہ وہ صاف اور واضح نہیں ہے، پھر حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کی رائے کسی حد تک احقر کے مضمون کی موافقت میں ہے؛ بلکہ احقر کے پیش نظر حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ، حضرت مولانا عبد الحی لکھنویؒ، حضرت شیخ الاسلام مدنیؒ، حضرت مفتی محمود حسن صاحبؒ گنگوہی قدس اللہ اسرارہم وغیرہ کی آراء رہی ہیں، اتفاق سے اپنی کوتاہی اور غفلت کی بنا پر یہ کمی رہ گئی ہے کہ ان اکابر کا نام زد حوالہ نہیں دیا گیا۔ اور حضرت تھانویؒ نے امداد الفتاوی میں بعض سوال کے جواب میں زیر بحث مسئلہ کو جائز لکھا ہے اور ساتھ ہی یہ قید بھی لگائی ہے کہ موجب ملک عقد کو قرار دینا جائز نہیں ہے؛ بلکہ موجب

ملک استیلاء ہے؛ چنانچہ حضرت لکھتے ہیں۔ بہر حال نفس مسئلہ میں جو کچھ میرے سمجھ میں آیا ہے وہ یہ ہے۔

لایباح العقد لکونہ رباً منھي عنه نصاً قطعیاً، ویباح المال المأخوذ؛ لأن مال الحربي مباح برضاہ بلا عذر به، ولم أر أحداً من أصحاب الفتاوی حکم بحل العقد مقصوداً. (امداد الفتاوی ۳/ ۱۵۳)

نیز اس کے ذیل میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب۔ محدث دہلوی کی تحریر بھی نقل کی گئی ہے، پھر اس کیبعد صفحہ ۳/ ۱۵۵ میں بھی کچھ اسی طرح کی بات معلوم ہوتی ہے، پھر صفحہ ۳/ ۱۶۲، میں عربی عبارت کے ساتھ جو جواب لکھا گیا ہے،اس سے بھی کچھ بات مترشح ہوتی ہے، مگر پھر بھی یہ تمام جوابات رافع الضنک سے پہلے لکھے گئے ہیں اور رافع الضنک حضرت تھانویؒ کی آخری تحقیق ہے، احقر کو اپنی کوتاہی اور غفلت کی وجہ سے رافع الضنک کے بارے میں حضرت تھانویؒ نے جو اپنی آخری تحقیق ہونے کی طرف اشارہ فرمایا ہے، اس کا خیال نہیں رہا۔ بس صرف ذہن میں یہ رہا کہ درمختار کی عبارت کو اہمیت سے پیش نظر رکھ کر حضرت تھانویؒ نے بحث فرمائی ہے اور مسلم مستأمن کی قید لگانے پر زور دیا ہے۔ مقدمات قائم کرنے کے بعد نمبر وار جو امور گنائے ہیں، وہی امور پیش نظر رہے ہیں خاص طور پر صفحہ ۳/ ۱۵۸ کا نمبر ۴ زیادہ پیش نظر رہا ہے؛ اس لئے ذیل میں امداد الفتاوی کا حوالہ دیا گیا تھا اور یہ خیال نہیں رہا کہ حضرت تھانویؒ خود طرفین کے قول سے مطمئن نہیں ہیں۔

نیز احقر نے اپنے پورے مضمون میں ہندوستان میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے یہاں کی حکومت اور غیر مسلم عوام سے سود لینے کے عدم جواز پر ہی زور دیا ہے اور حضرت تھانویؒ نے بھی اسی کو زیادہ پیش نظر رکھا ہے، اس بنیاد پر امداد الفتاوی کا حوالہ دیا گیا تھا۔ اب ان شاء اللہ بجائے امداد الفتاوی کے حوالے کے حضرت نانوتویؒ، حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی، حضرت شیخ الاسلام مدنیؒ، حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہی وغیرہ ہی کا حوالہ لکھ دیا جائے گا؛ اس لئے کہ

مسئلہ اپنی جگہ صحیح اور درست ہے اور آپ کا بھی بہت بڑا شکر گزار ہوں کہ آپ نے امداد الفتاوی کے حوالہ پر توجہ دلائی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴؍ ۶۲۲۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸؍ ۶؍ ۱۴۲۰ھ

ہندوستان کے دارالحرب ہونے اور اس میں سود لینے کا حکم

سوال [۸۹۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بغیر نفع (نو انٹرسٹ) کی شرط پر زندگی بیمہ کیا گیا، پھر کل اقساط کے وصول کے بعد اصل روپیہ سے زائد چیک بھیج دیا زائد کا استعمال جائز ہوگا یا نہیں؟

حضرت مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کفایت المفتی جلد ہشتم ۷۹، جدید زکریا مطول ۱۱؍۲۵۴ میں فرماتے ہیں: ہندوستان کے دارالحرب ہونے میں؛ چونکہ اختلاف ہے؛ اس لئے جو لوگ اسے دارالحرب نہیں کہتے وہ بیمہ کو حرام کہتے ہیں، مگر بیمہ کرانے کی ابتداءً وبقاء ہندوستان کے دارالحرب ہونے کی تقدیر پر گنجائش ہے؛ کیونکہ دارالحرب میں غیر مسلموں سے عذر کے بغیر باقی تمام طرق سے ان کی رضامندی کے ساتھ مال وصول کرنا جائز ہے، اسی صفحہ کے بعد ارشاد فرماتے ہیں ''دارالحرب ہونے کی بناپر اگر کوئی کرے تو گنجائش ہے، اگرچہ احتیاط ترک میں ہے'' صفحہ ۸۰ میں فرماتے ہیں: اس بناء پر جو لوگ بیمہ کرائیں، ان کے عمل کو ہم کو حرام کہنے سے احتراز کرنا چاہئے میں نے بیمہ کی ترغیب یا تحسین نہیں کی ہے۔

(۲) فی الحال ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں؟

(۳) دارالحرب ہونے کی بنا پر تمام عقود ربویہ کا جواز حضرت مفتی اعظمؒ کی عبارت سے مفہوم ہوتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد خدا بخش

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: بغیر نفع کی شرط پر بھی زندگی بیمہ المعروف کالمشروط قاعدہ کی وجہ سے ناجائز ہے؛ اس لئے حاصل شدہ زائد رقم بلا نیت ثواب نادار فقیروں کو دیدی جائے اور مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا فتوی کہ بیمہ کرانے کی گنجائش ابتداء و بقاءً ہندوستان کے دارالحرب ہونے کی تقدیر پر ہے ممکن ہے کہ حضرت مفتی صاحب کے ذہن میں دارالحرب والے مسئلہ میں ''مسلم مستأمن'' کی قید نہ رہی ہو کہ ایسے مسلمان کے لئے دارالحرب کے حربیوں سے سودی رقم حاصل کرنا جائز ہے، جو خود اس دارالحرب کے رہنے والے نہ ہوں؛ بلکہ کسی دوسرے ملک سے عارضی طور پر ویزا لے کر آئے ہوئے ہوں، جیسا کہ مذکورہ فقہی عبارت سے یہ بات واضح ہے، اسی وجہ سے حضرت مفتی صاحبؒ کے علاوہ باقی بڑے بڑے اکابر مشائخ مفتیان کرام اور اہل فتاوی نے فقہی عبارت میں ''مسلم مستأمن'' کی قید کی وجہ سے یہ شرط لگائی ہے کہ خود اس ملک کے رہنے والے کے لئے اس دارالحرب سے سود لینا جائز نہیں ہے؛ لہٰذا بیمہ کے سود کو دارالحرب کی قید لگا کر جائز قرار دینا، اس ملک کے رہنے والے کے لئے درست نہیں ہے۔ (مستفاد: رحیمیہ قدیم ۲/۲۰۰، جدید زکریا ۹/۲۴۱، امداد الفتاوی ۳/۱۵۷)

ولا بين حربي ومسلم مستأمن، ولو بعقد فاسد أو قمار ثمة. (شامي، كتاب البيوع، باب الربا، زكريا ٧/٤٢٢، كراچي ٥/١٨٦)

(۲) آپ ہندوستان کے دارالحرب یا دارالجمہوریہ وغیرہ کے فرق کے ذریعہ سے کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ اوپر کے جواب سے بات واضح ہوگئی ہے کہ اگر ہندوستان کو بالفرض دارالحرب بھی تسلیم کرلیا جائے، تو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے یہاں کے بینک یا غیر مسلم سے کسی بھی طریقہ سے سود حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔

بالفرض اگر دارالحرب قرار دیا جائے، تو کیا فائدہ ہوگا؟ بلکہ ایک زبردست نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا، وہ نقصان یہ ہے کہ دارالحرب اس کو کہا جاتا ہے، جس حکومت میں

مسلمانوں کا کسی قسم کا عمل دخل نہ ہو، نہ مسلمانوں کو اسمبلی یا پارلمینٹ کی جانب سے کھڑے ہوکر ووٹ حاصل کرنے کا حق ہوگا، اور نہ ہی مسلمانوں کو ووٹ دے کر کسی کو جتانے کا حق ہوگا، تو دار الحرب قرار دینے سے جو مسلمانوں کو اس ملک کے اندر رہ کر حق رائے دہی حاصل ہے وہ بھی ختم ہوجائے گا اور ارباب وطن یہی چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کا حق رائے دہی بھی ختم ہوجائے کچھ بھی باقی نہ رہے، جو حضرات محض سود حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کو دار الحرب قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں، وہ آگے پیچھے کچھ نہیں سوچتے ہیں کہ بعد میں کیا نتیجہ برآمد ہوگا اور دار الحرب قرار دینے کے باوجود سود کسی طرح بھی حلال نہیں ہوتا اور آپ کو اگر اس موضوع پر تفصیل دیکھنی ہے تو ہماری کتاب ایضاح النوادر ا/ ۸۷ تا ۹۸ دیکھ سکتے ہیں۔ کتاب دیوبند کے کتب خانوں میں ملتی ہے۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ۱۳/ ۳۷۳، جدید ڈابھیل ۱۶/ ۳۵۳، ایضاح النوادر ا/ ۸۷)

(۳) مفتی اعظم کے فتوی میں جو کمی ہے، وہ سوال نمبر ایک کے جواب میں واضح کردی گئی ہے؛ اس سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا؛ بلکہ ایک زبردست نقصان سامنے آتا ہے، جو سوال نمبر ۲/ کے جواب میں واضح کردیا گیا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۴۲۸)

کیا ہندوستان میں بینک سے سود لینا جائز ہے؟

سوال [۸۹۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ دیوبند کے مدرسہ کا حوالہ دیا ہے کہ مولوی لوگ ہندوستان میں (مسحبومیہ سمتی) بینک ہے، اس سے روپیہ لیتے ہیں، تجارت کرنے کی بناء پر اس کا سود بھی دینا پڑتا ہے، مولوی لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں سود دینا بھی جائز ہے اور دو تین مولوی

یہاں ہیں، جنہوں نے بینک سے روپیہ لیا ہے، اور ان میں سے ایک امام بھی ہیں، ان کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

المستفتی: عبد الماجد، مدرسہ سخاوت العلوم نارتھ،۲۴/ پرگنہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ہندوستان کو اگر دار الحرب بھی مان لیا جائے، تب بھی ہندوستان کے سودی بینکوں کا سود ہندوستانی مسلمانوں کے لئے جائز یا حلال نہیں ہے؛ کیونکہ دار الحرب کے سود کو جو جائز کہا جاتا ہے، وہ اس ملک کے مسلمانوں کے لئے نہیں؛ بلکہ دوسرے ملک سے عارضی طور پر ویزے سے آئے ہوئے مسلمانوں کے لئے جائز ہے۔

ولا بين حربي ومسلم مستأمن، ولو بعقد فاسد أو قمار ثمه.

(در مختار، كتاب البيوع، باب الربا، كراچي ۵/ ۱۸٦، زكريا ۷/ ٤٢٢)

تفصیل کے لئے ایضاح النوادر ۹۳ تا ۹۸ کا مطالعہ کیجئے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ شوال ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/ ۵۴۵۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/ ۱۰/ ۱۴۱۸ھ

ہندوستانی کافروں سے سود لینے کا حکم

سوال [۸۹٦۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کہتا ہے کہ کافروں کی تین قسمیں ہیں:

(۱) کافر مستأمن۔ (۲) کافر ذمی۔ (۳) کافر حربی۔

(۱) کافر مستأمن اور کافر ذمی سے سود لینا حرام ہے اور کافر حربی سے سود لینا جائز، تو ہمارا سوال یہ ہے کہ ہمارے ہندوستان کے کافر کس قسم کے کافر ہیں؟ کیا ہمارے ہندوستان میں اس وقت کافروں سے سود لینا جائز ہے یا نہیں؟ مہربانی فرما کر دلائل ارشاد فرمائیں۔

(۲) ہمارے ہندوستان کو کون سا دار کہتے ہیں؟ ہندوستان میں عوام سے سود کا کاروبار جائز ہے یا نہیں؟ کیا دارالحرب میں مسلمانوں سے سود کا کاروبار جائز ہے یا نہیں؟

(۳) زید کہتا ہے کہ بینک میں روپیہ رکھنے کے بعد جو انٹرسٹ ملتا ہے، وہ سود کے اندر داخل ہی نہیں؛ کیونکہ سود ہونے کے لئے جو شرائط ہیں، ان میں سے کوئی شرط نہیں پائی جاتی ہے۔

دوسری بات سود ہونے کے لئے سود دینے والے اور سود لینے والے دونوں کو معلوم ہونا ضروری ہے اور اس صورت میں دینے والے مجہول؛ کیونکہ بینک کا مالک معلوم نہیں؛ لہٰذا یہ سود ہی نہیں۔ کیا زید کا یہ قول صحیح ہے یا نہیں؟ کیا بینک کا انٹرسٹ ہمارے ہندوستان میں لینا اور اپنے کام میں استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ کیا اس صورت میں علماء دیوبند کے اندر اختلاف ہے؟ اگر اختلاف ہے تو ہم سب عوام کون سی راہ اختیار کریں؟

(۴) دارالعلوم دیوبند کے مفتی مولانا سہول صاحب ۱۹۸۹ء کے ستمبر کے رسالہ میں ریاض الجنۃ ۱۰؍ میں لکھتے ہیں کہ صرف بینک ہی نہیں؛ بلکہ تمام کافروں سے بھی سود لینا جائز ہے۔ مفتی مولانا محمود الحسن صاحب گنگوہی اسی رسالہ کے ۲۰؍ میں لکھتے ہیں کہ بینک سے سود لینا جائز ہے؛ لیکن اختلاف ہونے کی وجہ سے نہ لینا ہی بہتر ہے۔ اگر ناجائز ہے تو اس قول کا کیا مطلب ہے؟

المستفتی: محمد شرف الحق، بیربھوم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) کافر ذمی اور کافر مستأمن سے سود لینا، تو بالاتفاق حرام اور ناجائز ہے، اور حربی سے مسلمان کا سود لینا حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک جائز ہے؛ لیکن یہ بھی ہر مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے؛ بلکہ اس مسلمان کے لئے جائز ہے، جو دارالحرب کا رہنے والا نہ ہو؛ بلکہ دارالاسلام سے وقتی طور پر پاسپورٹ لے کر مستأمن بن کر آیا ہو؛ اس لئے دارالحرب کے رہنے والے

مسلمان کے لئے اس ملک کے حربی کافر سے سود لینا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے اور جہاں امام صاحب نے مسلمان کے لئے حربی سے سود کی اجازت دی ہے، وہیں مسلمان کیساتھ مسلم مستأمن کی بھی قید لگائی ہے۔

ولا ربا بین حربي ومسلم مستأمن. (در مختار، کتاب البیوع، باب الربا، زکریا ۷/۴۲۲، کراچي ۵/۱۸۶)

فلا یحل أخذ ماله بعقد فاسد بخلاف المسلم المستأمن في دار الحرب، فإن له أخذ مالهم برضاهم، ولو بربا، أو قمار الخ. (شامي، کتاب الجهاد، باب المستأمن، مطلب مایؤخذ من النصاری زوار بیت المقدس لا یجوز، کراچي ٤/١٦٩، زکریا ٦/ ٢٨٠، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ٣٧/١٨١)

(۲) ہندوستان ایسا ملک ہے، جس میں مسلم پرسنل لاء اور ہندو پرسنل لاء میں آزادی ہے۔ ہر مذہب کے لوگوں کو اپنے اپنے مذہبی معاملات میں آزادی ہے اور ایوان بالا اور مجلس قانون ساز کے افراد مسلم وغیر مسلم سب مشترک ہیں؛ اس لئے ہندوستان کو نہ بالکل دارالحرب کہا جاسکتا ہے اور نہ ہی بالکلیہ دارالاسلام؛ بلکہ سیکولر اور دارالجمہور یہ کہا جائے گا اور ایسے ملکوں کے باشندوں کا آپس میں سودی کاروبار کرنا بھی ناجائز وحرام ہے۔

وظاهره أنه لو أجریت أحکام المسلمین، وأحکام أهل الشرک لاتکون دار حرب الخ. (شامي، کتاب الجهاد، باب المستأمن، مطلب فیما تصیر به دار الإسلام دار حرب و بالعکس، زکریا ٦/٢٨٨، کراچي ٤/١٧٥، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ١٠/٢٩٤)

(۳) شخص کی دو قسمیں ہیں: (۱) شخص حقیقی۔ (۲) شخص حکمی۔ حکومت شخص حکمی ہے؛ لہٰذا مجہول نہیں بلکہ متعین ہے؛ اس لئے زید کا استدلال درست نہیں ہے۔

(۴) حضرت مولانا سہول صاحبؒ کا فتویٰ غالباً آزادی سے پہلے کا ہے اور اس وقت کے حالات کیا تھے، احقر کو معلوم نہیں اور حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی دامت برکاتہم

الحمد للہ باحیات ہیں، ان کی تحریر سے متعلق آپ ان ہی سے رجوع فرمائیں اور اصل حکم میں نے اوپر درج کردیا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ذی قعدہ ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۷؍۲۴۴۶)

مسلمانوں کا ہندوستان میں سودی کاروبار کرنا

سوال [۸۹۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے سودی کاروبار کرنا درست ہے؟

المستفتی: ڈاکٹر روشن علی، محمد سالم علی، محمد ابوالکلام آزاد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ہندوستان میں سودی کاروبار کرنا ہرگز جائز نہیں ہے اور اگر ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا جائے، تب بھی ہندوستانی مسلمانوں کے لئے سود لینا ودینا دونوں جائز نہیں ہے؛ البتہ کسی دارالاسلام سے پاسپورٹ لے کر جو مسلمان عارضی طور پر ہندوستان آجائیں؛ ان کے لئے غیر مسلموں سے سود لینا تو جائز ہے؛ لیکن دینا جائز نہیں اور جہاں کتب فقہ میں دارالحرب میں حربیوں سے سود لینے کو جائز لکھا گیا ہے، وہاں مسلم مستأمن کی قید بھی موجود ہے۔

ولا بین حربي ومسلم مستأمن. (در مختار، کتاب البیوع، باب الربا، کراچي ٥/١٨٦، زکریا ٧/٤٢٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸؍۲۹۲۷)

یوروپ میں قیام پذیر مسلمانوں کے لئے غیر مسلم سے سود لینا

سوال[۸۹۶۹]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جولوگ علی الدوام کے لئے یوروپ میں قیام پذیر ہوں، تو کیاان کے لئے وہاں کے بینک یا غیر مسلم سے سود لینا جائز ہے؛ چونکہ بکثرت ایسے لوگ ہیں جو ہندوستان سے تمام جائیداد فروخت کر کے مع اہل وعیال یوروپ میں رہتے ہیں اور کبھی بھی انڈیا مراجعت نہیں ہوتی ہے، خصوصاً صوبہ گجرات کے ایسے لوگ کافی وہاں پر ہیں، تو اس صورت میں کیا حکم ہے؟ سود وغیرہ کے متعلق جواز یا عدم جواز؟ جواب ارشاد فرمائیں۔

نوٹ: بکثرت حضرات یوروپ میں ۵؍سال کے بعد وہاں کے حقدار ہوتے ہیں، وہاں کو وطن اصلیہ کا حکم دیتے ہیں اور اخبارات وغیرہ کی اطلاع کے مطابق وہاں کی گورنمنٹ وہاں کے مسلمانوں کے لئے کچھ نہ کچھ تحفظ دین کا حق بھی دیتی ہے اور روز بروز اضافہ ہوتا جارہاہے، جو حضرت والا پر مخفی نہیں ہے۔

المستفتی: محمد زاہد، ارریاوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جن لوگوں نے دارالحرب یعنی برطانیہ، امریکہ، جرمنی وغیرہ میں ہمیشہ کے لئے قیام اختیار کرلیا ہے، وہ وہاں کے باشندے ہوگئے ہیں، ان مسلمانوں کے لئے وہاں کے بینک یا غیر مسلم عوام سے سود حاصل کرنا جائز نہیں ہے؛ کیونکہ وہ لوگ اب وہاں کے مستأمن نہیں رہے؛ بلکہ اصلی باشندے ہوگئے ہیں اور جواز کے لئے مسلم مستأمن اور عارضی قیام شرط ہے۔

ولا ربا بين حربي ومسلم مستأمن، ولو بعقد فاسد أو قمار الخ.

(در مختار، كتاب البيوع، باب الربا، زكريا ۷/۴۲۲، كراچي ۵/۱۸۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍صفر المظفر ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/ ۵۶۴۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۲/۲۰ھ

ہندوستان میں رہتے ہوئے دارالحرب کے بینک سے سود لینا

سوال [۸۹۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص ہندوستان میں رہتا ہے؛ لیکن ہندوستان میں ہوتے ہوئے وہ امریکہ، لندن، اٹلی وغیرہ جو دارالحرب ہیں، ان بینکوں سے سود حاصل کرسکتا ہے یا نہیں؟ اس طور پر کہ بینک انہیں ممالک میں واقع ہیں۔

المستفتی: عبدالرحمٰن، مرادآبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ہندوستانی مسلمانوں کے لئے امریکہ، لندن، اٹلی، چین وغیرہ ممالک جو دارالحرب ہیں، ان کے ان بینکوں سے سود حاصل کرنا جائز ہے، جو بینک خود ان ہی ممالک میں موجود ہوں؛ لیکن خود ان ممالک کے باشندوں کو وہاں کے بینکوں سے سود حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۷۹)

ولابين حربي ومسلم مستأمن، ولو بعقد فاسد أو قمار ثمه. (شامي، كتاب البيوع، باب الربا، زكريا ٧/٤٢٢، كراچي ٥/١٨٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸ ربیع الاول ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/۸۷۴۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۴/۸ھ

بینک کے سود کا حکم

سوال [۸۹۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ الحمد للہ میں بھی عالم ہوں، مگر فرق یہ ہے کہ نہایت ہی ناکارہ ہوں۔ سوال یہ ہے کہ ایک عالم صاحب یہ کہتے ہیں کہ بینک میں روپیہ جمع کرنا، قرض دینا نہیں ہوا؛ بلکہ بینک

جواس رقم سے تجارت کرتا ہے، اس میں جواس کو منافع ہوتا ہے،اس منافع کی سب سے قلیل رقم منافع ونقصان کا حساب لگا کرسود کے نام سے مقرر کردی ہے؛ بلکہ ایک طرح سے مشترکہ بیع ہے؛ اس لئے بینک میں روپیہ جمع کر کے اس کا سود لینا جائز ہے؛ کیونکہ یہ ربوا نہیں ہے، مشترکہ بیع ہے اوراس طرح بینک کا رواج نیا کے تمام ممالک میں ہے اوراس سے کوئی ملک بچا ہوا نہیں ہے،تو اس سے پرہیز بھی ناممکن ہے اور یہ بینک کے ساتھ شرکت کی بیع ہے۔

المستفتی: مولانا محمد فیض الدین، لیگوارہ گڈھ، پوسٹ: بہارشریف، نالندہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدعی کا دعوی غلط اور بلا دلیل ہے؛ بلکہ یہی سود کی وہ قسم ہے، جوزمانۂ جاہلیت میں زیادہ رائج تھی، وہ لوگ مال اس شرط پر دیا کرتے تھے کہ ہر مہینہ میں نفع کا ایک حصہ لیا کریں اور رأس المال جوں کا توں باقی رہے،جتنی مدت زیادہ ہوتی جاتی تھی،اس مدت ومہلت کے بدلے میں نفع میں زیادتی ہوتی تھی، جو بینک کے سود کا بالکل ہم معنی ہے،جیسا کہ تفسیر کبیر کے اندر امام فخر الدین رازیؒ نے اس کی صراحت فرمائی ہے۔

إعلم أن الربا قسمان: النسيئة وربا الفضل، وأما ربا النسيئة، فهو الأمر الذي كان مشهوراً متعارفاً في الجاهلية، وذٰلک أنهم كانوا يدفعون المال على أن يأخذ واعلى شهر قدراً معيناً، ويكون رأس المال باقياً. (تفسير كبير للإمام الفخر الرازيؒ تحت تفسير رقم الآية:۲۷۵، من سورة البقره ۷/ ۹۱)

جنہوں نے مشترک تجارت کا دعوی کیا ہے، وہ کسی طرح صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ بینک میں رقم جمع کر کے نفع حاصل کرنے میں شرکت مفاوضہ، شرکت عنان، شرکت صنائع ،شرکت وجوہ میں سے کسی کی تعریف صادق نہیں آتی ہے جن کی تفصیل اپنی جگہ موجود ہے؛ لہٰذا بینک سے حاصل شدہ نفع شرعاً حرام ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ر رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳ ر ۲۵۹)

پیریس کا حکم

سوال [۸۹۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص نے ایک کام کو اختیار کیا، جس کا نام پیریس ہے، اس کو اس طرح پر انجام دیتے ہیں کہ دوسرے شخص کو کہتے ہیں کہ اگر آپ ایک سو روپیہ ایک ماہ میں جمع کریں گے، تو میں سرکار کے ذریعہ دس ماہ کے بعد آپ کو ایک ہزار روپیہ دوں گا اور یہ دینا ضروری ہے اور وہ شخص جو کہ دوسرے کو حکم دیتا ہے، وہ خود بھی روپئے جمع کرتے ہیں اور سال میں ۱۰۰/ روپئے کے بدلے میں ۱۰۰۰/ روپیہ اٹھاتے ہیں، تو ایسا معاملہ ازروئے شرع کیسا ہے؟

المستفتی: محمد جاوید قاسمی، چاند پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ معاملہ سودی ہے، اور سود کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا . [البقرۃ: ۲۷۵]

نیز حدیث شریف میں سودی معاملہ کرنے والے اور ان کی معاونت کرنے والوں پر وعید آتی ہے۔

لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم آکل الربا، ومؤکلہ، وکاتبہ، وشاھدیہ، وقال: ھم سواء. (مسلم شریف، باب لعن آکل الربا، ومؤکلہ، النسخۃ الھندیۃ، ۲/۲۷، بیت الأفکار رقم: ۱۵۹۸)

حرم بیع کیلي ووزني بجنسہ متفاضلاً. (در مختار مع الشامي، کتاب البیوع، باب الربا، زکریا ۷/۴۰۶، کراچي ۵/۱۷۴) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴۹۱/۲۹)

اسپیک ایشیاء آن لائن کی شرعی حیثیت

سوال [۸۹۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک کمپنی اسپیک ایشیاء آن لائن کے نام سے چالو ہوتی ہے، اس کمپنی میں آپ ایک مرتبہ میں گیارہ ہزار روپیہ داخل کردیں گے اور یہ پیسہ داخل کرتے وقت اپنا نام پتہ عمر اور اپنی معیار زندگی سے متعلق پوری کیفیت لکھ کر ایک فارم بھریں گے، اس کے بعد ہر مہینہ میں آٹھ فارم آئیں گے اور ان فارموں میں اسی طرح اپنی معیار زندگی سے متعلق تمام حالات لکھ کر بھرنا ہوتا ہے اور کبھی زائد سوال آتے ہیں، تو ان سوالات کے ساتھ مہینے کے آٹھ فارم بھرنے ہوتے ہیں اور ہر فارم کے بدلے میں پانچ سو روپئے ملتے ہیں تو اس طریقہ سے چار ہزار روپیہ ملتے ہیں اور یہ سلسلہ پورے سال تک چلتا رہے گا، تو گیارہ ہزار روپئے بھرنے کے نتیجے میں سال پورا ہونے تک ۵۲/ ہزار روپئے مل جاتے ہیں، تو فارم بھرنیوالے کے لئے اپنے گیارہ ہزار روپئے پر ۴۱/ ہزار روپئے سالانہ جو زائد ملتے ہیں وہ جائز ہیں یا نہیں؟

نیز یہ شخص اپنے نیچے دو ممبر بناتا ہے، تو ایک ممبر پر ایک ہزار روپئے ملتے ہیں، اسی طرح دو بناتا ہے، تو دو ہزار اور مزید کمپنی کی طرف سے ۵۰۰/۵۰۰/ سو روپئے فی نفر کے اعتبار سے اور ملتے ہیں، پھر اس کے بعد ہر مہینہ میں فی ممبر ایک ہزار روپئے کے اعتبار سے پہلے والے کو ملتے ہیں، پھر اس کے بعد ہر مہینہ ۶۰۰/ سو روپئے کمیشن کے ملتے رہتے ہیں؛ لہٰذا حضور والا سے درخواست ہے کہ اس کا قرآن وحدیث کی روشنی میں شرعی حکم واضح فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔ عنداللہ ماجور ہوں گے۔

المستفتی: اشہد الٰہی، تمبا کو محلّہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: گیارہ ہزار روپیہ کمپنی میں جمع کرنے کے بعد

سال پورا ہونے تک ماہانہ ۴؍ ہزار روپئے کے حساب سے ۴۸؍ ہزار روپیہ اس گیارہ ہزار روپیہ کے عوض میں ملتا ہے اور فارم کی خانہ پوری کر کے یہ ۴۸؍ ہزار روپیہ قسطوں میں ملتا ہے، تو اپنی جمع شدہ رقم پر ۳۷ ہزار روپیہ اصل رقم پر زائد ملتا ہے، یہ زائد رقم شرعی طور پر سود کے دائرے میں داخل ہوگی اور مہینہ میں ۵۰۰/ ۵۰۰ سو روپیہ کر کے ۸؍ قسطوں میں ۴؍ ہزار روپیہ ملتے ہیں اور ہر ۵۰۰؍ روپیہ پر فارم بھر ہونا ہوتا ہے، یہ قسطوں کی ادائے گی کے فارم کی خانہ پوری ہے، غلط فارم بھرنے پر جو روپیہ ملنے میں خطرات ہیں وہ اس وجہ سے کہ دوسرا آدمی بھی فارم بھر کر روپیہ لے سکتا ہے اور اسی وجہ سے کبھی کچھ زائد سوالات بھی کمپنی کی طرف سے ہوتے ہیں؛ لہٰذا گیارہ ہزار روپیہ اصل رأس المال ہے، جو جائز اور حلال ہے اور ۳۷؍ ہزار روپیہ سود ہوں گے، اس طرح یہ زمانۂ جاہلیت کے سود کے دائرے میں داخل ہو جائیں گے، جس کی ممانعت قرآن سے ثابت ہے، اس کے بعد سوال میں اس کا بھی ذکر ہے، کہ جس نے گیارہ ہزار روپیہ جمع کئے ہیں، آگے مزید ۱۱/ ۱۱ ہزار روپیہ کے دو دو ممبر جوڑنے پر اس کو ہر ممبر پر ایک ہزار روپیہ اور مزید ۵۰۰ -۵۰۰ سو روپیہ اس طرح ملتا رہے گا اور کمیشن کے طور پر بھی ہر مہینہ ٦۰۰؍ روپیہ ملتا رہے گا، تو یہ بعد کے ممبران کو جوڑنے پر جو مل رہا ہے، اس کو محنت کے عوض قرار دیا جا سکتا ہے؛ لیکن سودی معاملات میں محنت کرنے والوں پر بھی لعنت ہے؛ کیونکہ گیارہ ہزار روپیہ کے ساتھ ہر ممبر کو کمپنی سے جوڑنے میں سودی لین دین میں تعاون اور مدد ہے؛ اس لئے اس محنت پر بھی لعنت کا خطرہ ہے، اور اس کے بعد اس کے بنائے ہوئے ممبران آگے چل کر جو ممبر بنائیں گے، اس کے عوض بھی اس کو کچھ ملے گا، جس میں اس کی کوئی محنت نہیں ہے، وہ پیسہ بھی اس کے لئے جائز نہیں ہے۔

وفي الشريعة: الربا هو الفضل الخالي عن العوض المشروط في البيع لما بينا أن البيع الحلال مقابلة، مال متقوم بمال متقوم فالفضل الخالي عن العوض إذا دخل في البيع كان ضد ما يقتضيه البيع، فكان حراماً شرعاً.

(مبسوط سرخسي، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ۱۲/ ۱۰۹)

وأما ربا النسيئة فهو الأمر الذي كان مشهوراً متعارفاً في الجاهلية، وذلك أنهم كانوا يدفعون المال على أن يأخذ وا على شهر قدراً معيناً، ويكون رأس المال باقياً. (تفسير كبير للإمام الفخر الرازيؒ تحت تفسير الآية:٢٧٥، من سورة البقره٧/ ٩١)

الربا يقتضي أخذ مال الإنسان من غير عوض؛ لأن من يبيع الدرهم بالدرهمين نقداً، أو نسيئة تحصل له زيادة درهم من غير عوض ومال المسلم متعلق حاجته وله حرمة عظيمة......وأخذ الدرهم الزائد متيقن. (تفسير رازي ٩٣/٧، الموسوعة الفقهية٢٢/ ٥٤)

والربا الذي كانت العرب تعرفه و تفعله، إنما كان قرض الدراهم، والدنانير إلى أجل بزيادة على مقدار ما استقرض على ما يتراضون به، ولم يكونوا يعرفون البيع بالنقد، وإذا كان متفاضلاً من جنس واحد، إذا كان المتعارف المشهور بينهم، ولذلک قال الله تعالىٰ: ”وما اٰتيتم من ربا ليربو في أموال الناس فلا يربو عند الله“ فأخبر أن تلک الزيادة المشروطة، إنما كانت رباً في المال العين؛ لأن لا عوض لها من جهة المقرض......فأبطل الله عزوجل الربا الذي كانوا يتعاملون به. (أحكام القرآن للجصاص، من سورة البقره، باب الربا، زكريا ديوبند ١/ ٥٦٣، سهيل اكيڈمي لاهور ١/ ٤٦٥)

خطب رسول الله صلى الله عليه وسلم في حجةالوداع فقال: ألا! أن كل ربا كان في الجاهلية موضوع عنكم كله؛ لكم رؤوس أموالكم لا تظلمون و لاتظلمون. (أبوداؤد شريف، كتاب البيوع، باب في وضع الربا، النسخة الهندية ٢/ ٤٧٣، دارالسلام رقم: ٣٣٣٤)

عن عبد الله بن مسعودؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه. (مسلم شريف،

كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربوا، النسخة الهندية، ٢/٢٧، بيت الأفكار رقم:١٥٩٨، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية ٢/٤٧٣، دارالسلام رقم:٣٣٣٣، سنن الترمذي، كتاب البيوع، باب ماجاء في آكل الربوا، النسخة الهندية ١/٢٢٩، دارالسلام رقم: ١٢٠٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹؍۱۰۴۰۰)

یونٹ ٹرسٹ کا حکم

سوال [۸۹۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حکومت ہند کی جانب سے منظور شدہ ایک عوامی ادارہ ہے، جس کا نام یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا ہے۔

یہ ادارہ عوام کے فائدہ کے لئے وجود میں آیا ہے، یہ ادارہ عوام سے ان کا سرمایہ لے کر اس کو مختلف قسم کے کاروبار میں لگاتا ہے، پھر اس سرمایہ سے جو آمدنی ہوتی ہے، اس میں ہر سال مالک سرمایہ کے سرمایہ میں کچھ فیصدی نفع طے کرکے اس کو سالانہ نفع تقسیم کرتا ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ ادارہ کے منتظمین سرمایہ داروں کا سرمایہ جن کاروبار میں لگاتے ہیں، ان میں سے اکثر سودی طریقہ پر لگاتے ہیں، اور اس کاروبار سے حاصل ہونے والا نفع شرعاً سود ہی ہوتا ہے، جیسا کہ کچھ سرمایہ کمپنیوں کے بریفرنس شیئرز اور مختلف شیئرز میں لگاتے ہیں اور کچھ سرمایہ کاری بینکوں کی فکس ڈپازٹس اور بونڈس میں لگاتے ہیں اور کچھ سرمایہ سرکاری سودی سرٹیفکٹ اور وکالت مشیروں میں لگاتے ہیں، بیمہ کا کاروبار بھی ہوتا ہے، اگر کوئی شخص غریبوں اور محتاجوں کی مدد کے لئے آمدنی کی غرض سے لوگوں سے چندہ کرکے سرمایہ جمع کرے اور اس چندہ کی رقم کو آمدنی حاصل کرنے کے لئے ادارہ یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا میں

لگائے اور یونٹ ٹرسٹ سے جو نفع حاصل ہو، اس کو محتاجوں میں تقسیم کرے، تو سوال یہ ہے کہ اس غرض سے چندہ کرنا اور پھر اس کو مذکورہ یونٹ ٹرسٹ میں لگا کر اس سے نفع حاصل کرنا، پھر نفع کی رقم سے غریبوں کی مدد کرنا جائز ہے یا نہیں؟

امید ہے کہ مذکورہ تفصیل کو سامنے رکھ کر جواب باصواب سے مطلع فرمائیں گے۔

المستفتی: (حضرت مولانا) اسمٰعیل منوبری، مہتمم دارالعلوم بھروچ، کنتھاریہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یونٹ ٹرسٹ کے بارے میں مختلف تجربہ کار حضرات سے معلومات فراہم کیں، جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ یہ معاملہ عام بینکوں جیسا ہے، معاملۂ مضاربت کی شرائطوں کے مخالف ہے اور عام سرکاری بینکوں کے سود کا حکم زمانۂ جاہلیت کے سود کے مرادف ہے، جس کی ممانعت قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ موجود ہے، امام رازی نے تفسیر کے اندر زمانۂ جاہلیت کے سودی کاروبار کی وضاحت یوں فرمائی ہے۔

إعلم ان الربا قسمان: النسيئة وربا الفضل، وأما ربا النسيئة، فهو الأمر الذي كان مشهوراً متعارفاً في الجاهلية، وذٰلک أنهم كانوا يدفعون المال على أن يأخذوا على شهر قدراً معيناً، ويكون رأس المال باقياً، ثم إذا حل الدين طالبوا المديون برأس المال، فإن تعذر عليه الأداء زادوا في الحق والأجل، فهذا هو الربا الذي كانوا في الجاهلية. (تفسير كبير للإمام الفخر الرازيؒ تحت تفسير رقم الآية: ۲۷۵، من سورة البقره۷/ ۹۱)

اور حدیث جابر میں سود دینے والے اور لینے والے اور اس پر شاہد بننے والے اور اس کے کاتب پر حضور ﷺ نے لعنت فرمائی ہے؛ اس لئے سوال نامہ کے اغراض کے لئے یعنی یونٹ میں روپیہ جمع کرنا اور اسکے لئے چندہ کرنا بھی جائز نہ ہوگا۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، كتاب المساقاة،

باب الربا، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بیت الأفکار رقم:۱۵۹۸، سنن أبي داؤد، کتاب البیوع، باب في آکل الربا، ومؤکله، النسخة الهندية ۲/۴۷۳، دارالسلام رقم:۳۳۳۳، سنن الترمذي، کتاب البیوع، باب ماجاء في آکل الربوا، النسخة الهندية ۱/۲۲۹، دارالسلام رقم: ۱۲۰۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍شعبان المعظم ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/۱۹۲۳)

یونٹ ٹرسٹ کا حکم

سوال [۸۹۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک استفتاء یونٹ ٹرسٹ کے متعلق اس سے پہلے ارسال کیا تھا؛ لیکن جواب سے محروم ہوکر دوبارہ ارسال خدمت ہے۔

امید ہے کہ اس مرتبہ محروم نہیں ہونا پڑے گا، یونٹ ٹرسٹ میں روپیہ جمع کرنا اور اس سے ملنے والی آمدنی کو اپنے ذاتی اخراجات میں صرف کرنا از روئے شرع کیسا ہے؟ اطمینان بخش جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: مشتاق احمد، مرادآباد

منجانب: دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: یونٹ ٹرسٹ میں روپیہ جمع کرنا اور اس سے ملنے والی آمدنی ذاتی اخراجات میں خرچ کرنا شرعاً جائز ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: کفیل الرحمٰن، نائب مفتی دارالعلوم دیوبند
۲۷؍صفر المظفر ۱۴۰۶ھ

الجواب صحیح: العبد نظام الدین غفرلہ
مفتی دارالعلوم دیوبند

منجانب: دارالافتاء مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تحقیق یہی ہے کہ یونٹ ٹرسٹ کا حکم عام بینکوں جیسا ہے؛ اس لئے جائز نہیں ہے اور مذکورہ جواب سے ہم کو اتفاق نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ شعبان المعظم ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵؍ ۱۵۱۳)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پہلی تحقیق کے مطابق اس کا حکم مضاربت کا سا تھا؛ اس لئے حکم جواز کا دیا گیا تھا، مگر بعد کی تحقیق سے اس کا حکم عام بینکوں جیسا معلوم ہوا، پس اس فتوی سے اب رجوع کیا جاتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کفیل الرحمٰن غفرلہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند
۱۸؍ شعبان المعظم ۱۴۰۹ھ

رجوع صحیح ہے: پہلی تحقیق سے یونٹ ٹرسٹ کی حقیقت مضاربت معلوم ہوتی تھی، وہ فتوی احقر کا ہی تھا، پھر جب بعد میں مسلم فنڈ دیوبند کے منیجر حسیب صاحب وغیرہ سے تحقیق کی تو اس کا حال بھی بالکل عام بینکوں جیسا معلوم ہوا؛ اس لئے احقر اپنے سابق فتوی سے رجوع کر چکا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: العبد نظام الدین مفتی دارالعلوم دیوبند
۱۸؍ شعبان المعظم ۱۴۰۹ھ

ہنڈی

سوال [۸۹۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہنڈی کا کاروبار کرنا شرعی نقطۂ نظر سے کیسا ہے؟ اس کی دو شکلیں رائج ہیں۔

پہلی شکل: یہ ہے کہ پیسے بھیجنے والے سے کچھ رقم بطور معاوضہ لے کر جمع کردہ رقم مرسل الیہ کو پہونچادیتے ہیں، مثلاً سو روپیہ میں پانچ روپئے الگ سے لے کر سو روپئے مطلوب تک پہونچادیتے ہیں۔

دوسری شکل: یہ ہے کہ رقم ارسال کرنے والے سے الگ سے کچھ معاوضہ نہیں لیتے؛ بلکہ جمع کی گئی رقم سے فیصدی کے اعتبار سے اپنی اجرت کاٹ لیتے ہیں اور بقیہ رقم ارسال کردیتے ہیں۔

واضح رہے کہ اس طرح کے کام کرنے والوں کے ہر شہر میں ممبر رہتے ہیں اور وہ رقم وصول کرنے والوں کے اطلاع دینے پر متعینہ رقم مرسل الیہ تک پہونچاتے ہیں، بعینہ وہی رقم نہیں پہونچائی جاتی اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تعلقات کی بنا پر کچھ معاوضہ نہیں لیا جاتا؛ بلکہ پوری پوری رقم پہونچادی جاتی ہے۔ جاننا چاہئے کہ یہ کام حکومتی طور پر ممنوع ہے، لوگ خفیہ طور پر یہ کام کرتے ہیں۔

(۲) آج کل بینکوں کا یہ ضابطہ ہے کہ سو روپئے سے دس ہزار تک رقم جمع کرنے پر پچیس روپئے کاٹ لئے جاتے ہیں۔ کیا یہ شکل بھی ہنڈی میں داخل ہے، اگر ہاں تو اس طرح کے بینکوں میں پیسے جمع کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: ابوعطاء، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) سوال نامہ میں مذکورہ ہنڈی کی دونوں معاوضہ والی شکلیں معاملۂ قرض اور وکالت سے مرکب ہیں اور وکیل اپنے کسی بھی عمل پر موکل سے اجرت لے سکتا ہے؛ اس لئے دونوں شکلیں فی نفسہ درست ہیں؛ البتہ یہ معاملہ چونکہ سرکاری قانون کیخلاف ہے؛ اس لئے سرکاری قانون کی گرفت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے احتیاط کا پہلو اختیار کرنا چاہئے۔ قرآن کریم میں اللہ کا فرمان ہے کہ: اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں سے ہلاکت اور خطرہ میں نہ ڈالو۔

قلت إنها حوالة وأنت تعلم أن الحوالة قد تكون بمعنى الوكالة، وقد تكون أن يحتال للدائن، قد يحتال بغير الدائن ولا رواية أن الوكيل، والمحتال عليه حرام عليه الأجرة، والأخذ من الموكل، والمحيل إن عمل فيه عملاً، فلا بأس به إن شاء الله. (حاشية شرح وقايه ۱۱۹/۳)

بحوالہ بینک سے جاری ہونے والے مختلف کارڈ کے شرعی احکام ۱۷۲۔

قال الله تعالیٰ: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ . [البقرة الآية: ۱۹۵]

(۲) بینک نے اپنی وکالت کے لئے اجرت الخدمت سو سے دس ہزار تک کے درمیان ۲۵/ روپئے متعین کردی ہے، اسی ضابطہ کے مطابق یہ معاملہ جائز اور درست ہے اوراس معاملہ میں سرکاری قانون کی خلاف ورزی بھی نہیں ہے؛ بلکہ قانون کا احترام ملحوظ رکھا جاتا ہے؛ لہٰذا اس طرح بینکوں کے ذریعہ سے پیسوں کا منتقل کرنا بلا شبہ جائز اور درست ہے، ہنڈی اور بینک کے درمیان اتنا فرق ہے کہ ہنڈی غیر قانونی ہوتی ہےاور بینک قانونی ہوتا ہے۔

والوكالة قد تكون تبرعاً من الوكيل، وقد تكون بأجر؛ لأنه تصرف لغيره لا يلزمه، فجاز أخذ العوض عليه. (فقه السنة، دارالكتاب العربي بيروت ۲۱٤/۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۰٦۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/۵/۱۴۳۱ھ

ربوا کی ایک صورت کا حکم

سوال [۸۹۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے (راقم الحروف) کے والد قاضی اتقان حسین صاحب نے اپنی زندگی میں اپنا رہائشی مکان بمعہ ملحقہ زمین تقریباً ۵۵۰ گز ۱۹۵۸ء میں بالعوض دو ہزار روپئے

اس شرط کے ساتھ بیع کیا کہ اندر میعاد چار سال وہ خود یا ان کے وارثان دو ہزار روپئے کی ادائے گی کر کے مکان واپس لینے کے حقدار رہوں گے۔

قاضی اتقان حسین صاحب کا ۱۹۵۹ء میں انتقال ہو گیا اور اخیر تاریخوں تک ان کے وارثین کی استطاعت نہیں تھی کہ وہ دوہزار روپئے کی ادائے گی کریں اور مکان چھڑا لیں؛ چنانچہ میں نے اور دیگر وارثین نے اپنے ہمسایہ احمد جان و پیارے جان صاحب سے ایک تحریری معاہدہ کیا کہ وہ دونوں بھائی ہمیں ساڑھے چار ہزار روپیہ دیدیں تا کہ ہم اپنا مکان روپئے ادائے گی کر کے برضا مکان واپس لے لیں اور جس شخص کو مکان بیع کیا ہے، وہ برضا مکان واپس کرنے پر آمادہ نہ ہو، تو ضروری عدالتی کارروائی کر کے مکان حاصل کریں اور مذکورہ مکان کا بنا ہوا، وہ حصہ جو میاں احمد جان و پیارے جان کے مکان سے ملحق ہے، اس کا بیع نامہ میاں احمد جان و پیارے جان کے حق میں کر دیا جائے گا، جس شخص کے پاس مکان تھا یعنی جس کے قبضہ میں تھا، اس نے مکان واپس کرنے سے پہلو تہی کی؛ چنانچہ اپریل ۱۹۶۲ء میں اندر میعاد مکان کی واپسی کا مقدمہ کر دیا گیا اور خلاف توقع وہ مقدمہ طویل عرصہ تک لڑنا پڑا کثیر رقم بھی خرچ ہوئی اور وقت بھی؛ لیکن مقدمہ کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا، تو ۳۵ رسال کے بعد میں نے عدالت سے ذاتی طور پر درخواست کی کہ عدالت اپنے اثرات کام میں لا کر فریق مخالف کو کوئی فیصلہ کرنے پر آمادہ کرے؛ چونکہ میری عمر ساٹھ سال سے زیادہ ہو چکی تھی اور روز کچہری میں پہونچنا میرے لئے اب بہت مشکل ہو گیا تھا، منصف صاحب نے فریق مخالف کو اس پر آمادہ کیا کہ کل آراضی میں سے سو گز زمین اور ایک لاکھ روپئے کی ادائے گی، وہ ہمیں کریں اور ہم مقدمہ واپس لے لیں؛ چنانچہ ۱۹۹۸ء میں اس طرح کا معاہدہ عدالت میں داخل کر دیا گیا اور ایک لاکھ روپئے کی ادائے گی ہمیں کر دی گئی، فریق مخالف جن کے قبضہ میں مکان تھا، انہوں نے یقین دلایا کہ چند روز میں وہ ہمارے حصۂ زمین پر حد بندی کروا دیں گے؛ لیکن بالآخران لوگوں نے پہلو تہی کی اور مجبور ہو کر، پھر وکیل کی معرفت سو گز

قطعۂ زمین پر قضبہ لینے کے لئے عدالت میں جانا پڑا؛ لیکن تقریباً چار سال کی دوڑ دھوپ کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور اپنے وکیل کے کہنے پر مقدمہ واپس لے لیا اور اس بات کو بھی دو ڈھائی سال گذر گئے؛ لیکن اس عرصہ میں میرے دیگر بھائی بہنوں نے نہ ہی میاں احمد جان و پیارے جان کے ورثاء نے مجھ سے زمین کے معاملہ میں کوئی استفسار کیا، نہ ہی اپنا کوئی تعاون دیا؛ چونکہ تنہا میں نے تقریباً ۲۸ ؍سال مقدمہ کی پیروی بھی کی تھی اور رقم بھی صرف کی تھی؛ اس لئے مجھے اس کا افسوس تھا کہ کوئی حاصل نہیں ہوا، تاہم میں کسی ایسے صاحب حیثیت شخص کی تلاش میں رہا، جو اپنے اثرات کو کام میں لاکر معاہدہ کے بموجب ہماری سو گز زمین ہمیں دلوادے؛ چنانچہ ایک صاحب بچولیا بنے اور یہ طے پایا کہ ایک لاکھ اڑتیس ہزار روپئے کے عوض ہم سو گز زمین انہیں لوگوں کے نام رجسٹری کردیں، جن کے قضیہ میں وہ زمین ہے، یہ زمین واقعتاً تقریباً چار لاکھ روپئے قیمت کی تھی؛ لیکن اب یہ احتمال تھا کہ کچھ بھی ہاتھ نہ آئے؛ اس لئے اس آخر کو قبول کرلیا اور ستمبر ۲۰۰۳ء میں ایک لاکھ اڑتیس ہزار روپئے کے عوض سارے وارثین نے زمین کی رجسٹری غاصب لوگوں کے حق میں کردی۔

اب میں چاہتا ہوں کہ مبلغ -/4500 کی رقم میاں احمد جان و پیارے جان کے وارثان کو کردوں تاکہ عند اللہ مؤاخذہ دار نہ ہوں؛ لیکن احمد جان و پیارے جان کے وارثان اس رقم کو لینے سے یہ کہتے ہوئے پہلو تہی کررہے ہیں کہ ہمارے والد نے زیورات فروخت کرکے -/4500 روپیہ کی رقم مہیا کی تھی اور اب سونے کی قیمت بہت زیادہ ہے؛ لہٰذا ہم -/4500 کیوں لے لیں؟ اور اس حقیر رقم کا ہم کیا کریں گے؟ علماء دین فرمائیں کہ مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں از راہ فقہ اسلامی تنازعہ کو ختم کرنے کے لئے کیا کرنا مناسب ہوگا؟

المستفتی: قاضی عبد الماجد، فیض گنج، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں جو معاملہ لکھا ہوا ہے، یہ

معاملہ ابتداء ہی سے شریعت کے نزدیک فاسد ہے کہ -/4500 روپیہ اس شرط پر قرض لینا کہ سلسلہ مقدمہ کے بعد پوری جائیداد قبضہ میں آجائے گی، تب سوگز زمین جو متعین کی گئی تھی، وہ دی جائے گی، خود یہ بات متردد فیہ ہے کہ زمین قرضہ لینے والے کو واپس مل پائے گی یا نہیں جیسا کہ مدتوں کے بعد یہی بات ثابت ہوئی ہے کہ بالآخر زمین واپس نہیں آئی اور پوری جائیدا کے عوض میں پوری کوشش کے باوجود مالک زمین کو 238000 روپئے مل پائے ہیں۔ اب -/4500 روپیہ جس سے قرض لیا ہے شرعی طور پر اس کو کیا مل سکتا ہے، تو دو احتمال ہمارے سامنے ہیں۔

(۱) ۲۳۸۰۰۰ روپیہ کے عوض اس زمین میں سے ۱۰۰ گز زمین کے عوض میں کتنا روپیہ آتا ہے، اس کا حساب لگا کر اتنا ہی روپیہ دیدیا جائے، تو ظاہر بات ہے کہ ۱۰۰ رگز زمین کے عوض میں کل ۴۰/۵۰ ہزار روپیہ آئے گا، تو ۴۵۰۰ روپیہ کے عوض میں ۴۰/۵۰ ہزار روپیہ دینے کی صورت میں ۴۵۰۰ روپیہ اصل تسلیم کرنے کے بعد باقی روپیہ سود اور بیاج شمار ہوگا؛ اس لئے سود کی حقیقت یہ ہے کہ دیا گیا روپیہ یا اس کا مثل جب واپس آئے تو زائد پیسہ ساتھ میں لے کر لوٹ جائے، اسی کو سود کہتے ہیں اور یہاں پر یہ شکل واضح طور پر سود کے دائرہ میں داخل ہے؛ اس لئے ۴۵۰۰ روپئے سے زائد قرض دینے والے کو روپیہ کی شکل میں لینا جائز نہیں ہے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ جس طرح لیتے وقت ۴۵۰۰ر روپئے لیا ہے، واپسی میں بھی ۴۵۰۰ روپیہ ہی واپس ہو جائے، چاہے قرض دینے والے نے آج سے ۳۰/ ۳۵ سال پہلے زیورات بیچ کر ہی دیا ہو، تب بھی ۴۵۰۰ روپیہ ہی واپس مل سکتا ہے، اس سے زائد جو کچھ بھی ملے گا وہ سود کے دائرہ میں داخل ہوگا، ہاں البتہ قرض لینے والے ۴۵۰۰ روپیہ قرض ادا کرنے کے بعد اپنی طرف سے بطور تحفہ الگ سے ہٹ کر کچھ دیدے، تو وہ دینے والے کو اختیار ہے۔

لا خلاف بين الفقهاء في أن اشتراط الزيادة في بدل القرض

للمقرض مفسد لعقد القرض سواء أكانت الزيادة في القدر، بأن يرد المقترض أكثر مما أخذ من جنسه أو بأن يزيده، وان هذه الزيادة تعد من قبيل الربا. (الموسوعة الفقهية ۳۳/ ۱۳۰)

وإن استقرض دانق فلوس، أو نصف درهم، فلوس ثم رخصت، أوغلت لم يكن عليه إلامثل عدد الذي أخذه. (شامي، كتاب البيوع، باب المرابحة، فصل في القر، كراچي ۵/ ۱۶۲، زكريا ۷/ ۳۹۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍صفر المظفر ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۲۵۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۲/۱۶ھ

کیا ڈاکخانہ میں جمع شدہ رقم کے علاوہ بڑھی ہوئی رقم سود ہے؟

سوال [۸۹۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے اپنی رقم پانچ سال کے لئے ڈاکخانہ میں جمع کی ہے، گورنمنٹ کے اصول کے مطابق پانچ سال میں دوگنی رقم ملے گی، اصل رقم کے علاوہ بڑھی ہوئی رقم سود ہے؟ یا اس کی رقم کا نفع ہے یہ لینا جائز ہے؟

المستفتی: ناطق نعمانی، رام پور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ مذکورہ بڑھی ہوئی رقم شرعی طور پر ربا اور سود ہے اور شریعت میں اپنی دی ہوئی رقم پر زائد ملنے کو سود کہا جاتا ہے، اور یہ عقد مضاربت بھی شرائط نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:

قا اللّٰہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا . الآية [البقرہ: ۲۷۵]

اور زائد رقم کو بلانیت ثواب صدقہ کردینا واجب ہے۔

وإذا كان عند رجل مال خبيث......ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء الخ. (بذل، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مصرى ١٤٨/١ ،يحيٰ سهارنپور ٣٧/١، دارالبشائر الاسلاميه بروت ٣٥٩/١، تحت رقم الحديث ٥٩)

وصرح الحنفية بأنه إذا مات الرجل وكسبه خبيث كأن من بيع الباذق، أو الظلم، أو أخذ الرشوة فالأوليٰ لورثته أن يردوا المال إلى أربابه، فإن لم يعرفوا أربابه تصدقوا به؛ لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه. (الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٤٦/٣٤، شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٣٨٥/٦، زكريا ٥٥٣/٩، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ٢٧/٦، زكريا ٦٠/٧، البحر الرائق، كوئٹه ٢٠١/٨، زكريا ٣٦٩/٩، هندية، زكريا قديم ٥٤٩/٥، جديد ٤٠٤/٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲۲۹/۲۹)

کیا ورثاء پر میت کے سودی قرض کو ادا کرنا لازم ہے؟

سوال [۸۹۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کوئی شخص بینک یا بلاک سے لون پر روپیہ لے کر انتقال کر گیا، یہ جو روپئے لئے تھے، گھر میں کسی کو معلوم تھا اور کسی کو معلوم نہ تھا، یہ روپئے سرکار کو ادا کرنا یا ادا نہ کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: قمر الدین، مقام وپوسٹ: بریاہی بازار، سہرسہ (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک اور بلاک سے لون وسود پر روپیہ

لینا حرام اور موجب وعید ہے، اور جب سے لیا اور مر گیا تو ورثاء پر سرکاری قرضہ ادا کرنا میت کے مال میں سے واجب ہے۔

ثم تقضى ديونه من جميع ماله الخ. (سراجي٤، وهكذا في الدر المختار، كتاب الفرائض، كوئٹه ٥/٥٣٦، كراچي ٦/٧٦٠، زكريا ١٠/٤٩٥، مجمع الأنهر شرح ملتقي الأبحر قديم ٢/٧٤٦، جديد دارالكتب العلمية بيروت ٤/٤٩٥)

اور اگر بلاسود قرض ادا کرنا ممکن نہ ہو، سرکار کی طرف سے جبر وزیادتی ہو، تو دفع ظلم کے لئے حالت اضطراری میں مع سود کے قرض ادا کر دیا جائے، تو خدائی وعید سے بچنے کی امید ہے۔ (مستفاد: فتاوی رشیدیہ قدیم ۵۲۴، جدید زکریا ۵۰۲، فتاوی رحیمیہ قدیم ۶/۱۴۱، جدید زکریا ۹/۲۳۵)

في الدر المختار لا بأس بالرشوة إذا خاف على دينه. وفي الشامية: وفيه أيضا دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له ليس برشوة يعني في حق الدافع. (الدر المختار مع الشامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع مطبوعه كوئٹه ٥/٣٠٠، كراچي ٦/٤٢٣، زكريا ديوبند ٩/٦٠٧)

ومنها إذا دفع الرشوة خوفا على نفسه، أو ماله فهو حرام على الآخذ غير حرام على الدافع. (البحر الرائق، كتاب القضاء، زكريا ديوبند ٦/٤٤١، كوئٹه ٦/٢٦٢)

إذا دفع الرشوة لدفع الجور عن نفسه، أو أحد من أهل بيته لم يأثم. (هندية، كتاب الهبة، الباب الحادي عشر في المتفرقات، زكريا قديم ٤/٤٠٣، جديد ٤/٤٣١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/ ۶۷۸)

غیرسودی رفاہی ادارے اورسوسائٹیوں کاحکم اورطریقۂ کار کے سلسلہ میں

ادارہ مباحث فقہیہ کی جانب سے چندسوالات اوران کے جوابات

سوال[۸۹۸۰]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نزول قرآن سے پہلے ربا ایک معروف ومتعارف چیزتھی، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں سود اورسودی کاروبار کی سخت مذمت فرمائی ہے اورسود کھانے والے قیامت کے روز حیران ومدہوشی کی حالت میں خبطی بناکر اٹھائے جائیں گے۔

قال اللہ تعالیٰ: الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبَا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ . الآية [البقرہ: ۲۷۵]

ایک جگہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیع کوحلال اورسودکوحرام فرمایا ہے:

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا . الآية [البقرہ: ۲۷۵]

دوسری جگہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سوداورسودی کاروبار کوملیامیٹ کردیتا ہے، اورصدقات وخیرات کوفروغ دیتا ہے۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ. الآية (البقرہ:۲۷۶)

تیسری جگہ سودی کاروبارکوچھوڑنے اوراس سے بازرہنےکوایمان کی شرط قراردیا ہے اورسودی لین دین میں جمے رہنے اوراس سے بازنہ آنے والوں کوخدااوررسول سے جنگ کا چیلنج بتایا ہے اورفرمایا کہ اے ایمان والو! اگرتم حقیقی معنی میں مؤمن ہو، توسودی کاروبارترک کرواورجوربواباقی رہ گیا ہے، اس کوچھوڑدو، اگرتم کو یہ منظورنہیں ہے، تواللہ ورسول سے جنگ کااعلان کردو، اورخدائی طاقت کے مقابلہ کے لئے تیار ہوجاؤ۔

قال اللہ تعالیٰ: يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا اِنْ

كُنتُمْ مُؤْمِنِيْن. [البقره: ٢٧٨]

فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ . الآية [البقره:٢٧٩]

اور حضور ﷺ نے سود کھانے والے، کھلانے والے سودی حساب و کتاب کرنے والے اور سودی معاہدہ لکھنے والے سب پر لعنت فرمائی ہے۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه. الحديث (سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية ٢/٤٧٣، دارالسلام رقم:٣٣٣٣، صحيح مسلم، كتاب المساقاة، باب الربوا، النسخة الهندية، ٢/٢٧، بيت الأفكار رقم:١٥٩٨، سنن الترمذي، كتاب البيوع، باب ماجاء في آكل الربوا، النسخة الهندية ١/٢٢٩، دارالسلام رقم: ١٢٠٦، مشكوة شريف ١/٢٤٤، رقم:٢٦٧٦)

اور ایک جگہ حضور ﷺ نے مزید شدت کے ساتھ یہ فرمایا کہ ایک درہم کے بقدر سود کھانا چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ بدتر ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: درهم ربوا يأكله الرجل، وهو يعلم أشد من ستة و ثلثين زنية. الحديث (سنن الدار قطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/١٣، رقم: ٢٨١٩، مشكوة ١/٢٤٦، رقم:٢٦٩٤)

اور اسی حدیث شریف کے ذیل میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ: ربوا کو چھتیس مرتبہ زنا سے زیادہ برا؛ اس لئے کہا گیا کہ سودی کاروبار اللہ و رسول سے اعلان محاربہ اور مقابلہ آرائی ہے اور اللہ تعالیٰ اور رسول سے مقابلہ آرائی چھتیس مرتبہ زنا سے زیادہ بری اور باعث بربادی ہے۔

قوله أشد من ستة وثلثين زنية، وقيل توجيهه أن آكل الربوا يحارب الله ورسوله كما وقع في التنزيل، والمحاربة مع الله أشد من الزنا هذا. (حاشية مشكوة ١/٢٦، اشعة اللمعات٣/٢٣)

سوالات اور جوابات سودی معاملہ میں ابتلاء عام رفاہی اداروں کا قیام اور اس کی ضرورت

(۱) ذکر کردہ طریقۂ کار کے مطابق غیر سودی رفاہی اداروں اور سوسائٹیوں کا چلانا اور رائج کرنا شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو پھر کیا طریقۂ کار ہو؟

(۲) اس طرح کے ادارے قائم کرنے اور چلانے والے مسلمانوں کو صرف سودی لین دین کی لعنت سے بچانے کی نیت رکھیں یا جائز طریقہ سے حاصل شدہ آمدنی سے رفاہی امور کے فروغ دینے اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کی بھی؟ یا دونوں کی؟

المستفتی: معز الدین احمد غفرلہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱/۲) ربا کا لفظ سودی معاملہ کے لئے زمانۂ جاہلیت سے معروف ومشہور طریقے سے مستعمل ہوتا چلا آیا ہے، اور موجودہ دور میں ربا نظام تجارت کا رکن اعظم اور عمود کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ نصوص قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے جب اس کی حرمت سامنے آتی ہے، تو عام طبائع ان کی حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے کے وقت اس کی حرمت سے ہچکچاتی ہیں اور حیلہ جوئی کی طرف مائل ہوتی ہیں؛ چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے، جس میں کوئی شخص سود کھائے بغیر محفوظ نہیں رہ سکتا یہاں تک کہ اگر کوئی شخص بے انتہا احتیاط کرتا رہے اور سود سے دور بھاگتا رہے، تو پھر بھی سود کا کچھ نہ کچھ حصہ اور اس کا اثر اس کو پہونچے گا اور کوئی بچ نہیں سکے گا۔

عن أبي هريرة رضي الله عنه، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ليأتين على الناس زمان لا يبقي أحد إلا آكل الربوا، فإن لم يأكله أصابه من بخار، قال ابن عيسىٰ: أصابه من غباره. (سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في اجتناب الشبهات، النسخة الهندية ۲/۴۷۳، دارالسلام رقم: ۳۳۳۱، مشكوة ۱/۲۴۵)

جب دور حاضر میں سودی لین دین انسانی دنیا کی تجارت اور معاملات کا جزء لا ینفک بن چکا ہے، تو اس سے فرار اختیار کرنے اور عام مسلمانوں کو اس کے وبال سے بچانے کے لئے ایسی سوسائٹیاں اور قومی اداروں کا قیام اور ان کو فروغ دینا، جن کے ذریعہ سے عامۃ المسلمین کو سودی معاملات سے محفوظ رکھا جا سکے۔

رہبران ملت کے لئے صرف جائز ہی نہیں ؛ بلکہ ضروری ہے اور ان اداروں کے قیام کا مقصد صرف اور صرف مسلمانوں کو سود کے عام وبال سے محفوظ رکھنا اور ان کو صحیح طریقہ پر لگا دینا ہے اور ان اداروں کے قائم کرنے والے اور ذمہ داران اقتصادیات کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینے اور بہتر سے بہتر بنانے کی نیت ہرگز نہ کریں۔ نیز اگر سوسائٹی اور فنڈ کسی وقت اس قابل ہو جائے کہ اس کو قرض کے فارم و معاہدے نامے کی قیمت کی ضرورت نہ رہے، تو فارم وغیرہ بلا قیمت دید یا کریں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ رر جب المرجب ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶ / ۲۳۰۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/ ۷/ ۱۴۱۱ھ

پاس بک کی فروختگی کا جواز

سوال [۸۹۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ رقم امانت جمع کرنے والوں سے اجرائے کھاتہ کے لئے پاس بک (جس پر امانت کے جمع وواپسی کا اندراج ہوگا) کی قیمت لینا جائز ہے یا نہیں اور مصارف ادارہ میں صرف کرنا درست ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: معز الدین احمد غفرلہ، ادارۃ المباحث الفقہیہ جمعیۃ علماء ہند دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: پاس بک شرعاً مال اور شئ مرغوب فیہ میں داخل ہے۔

ما من شانه أن ترغب إليه النفس وهو المال الخ. (شامي، كتاب البيوع، مطلب في تعريف المال والملك والتقوم، كراچي ٤/ ٥٠٢، زكريا ٧/ ١١)

اور ہر قسم کے مال اورشئ مرغوب فیہ کی خرید وفروخت بلا کراہت جائز ودرست ہے۔

أما ركن البيع، فهو مبادلة شئ مرغوب بشيئ مرغوب. (بدائع الصنائع، کراچي ٥/ ١٣٣، زكريا ٤/ ٣١٨، هكذا في الشامي، كراچي ٤/ ٥٠٢، زكريا ٧/ ١١)

اس لئے امانت کی رقم جمع کرنے والوں کے ہاتھ پاس بک فروخت کرنا اور اس سے ملنے والی رقوم رفاہی ادارے کی کسی بھی ضرورت میں خرچ کرنا بلا تردد جائز اور درست ہوگا؛ اس لئے مزید دلائل انشاء اللہ فارم کی فروختگی کے مسئلہ کے تحت پیش کئے جائیں گے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ رجب المرجب ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۳۰۱)

رفاہی اداروں کے لئے عطایا اور صدقات میں حیلۂ تملیک کا حکم

سوال [۸۹۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ادارہ کے مصارف اور اخراجات کی کفالت کے لئے عطایا اور دیگر صدقات کی رقومات حاصل کی جاسکتی ہیں یا نہیں؟ بصورت اثبات

الف: کس مد کی رقم اس مقصد پر صرف کی جاسکتی ہے، صدقات غیر واجبہ یا صدقات واجبہ بھی؟ اگر صدقات غیر واجبہ تک محدود کیا جائے، تو اتنی رقم کا مہیا ہوسکنا مشکل ہے، جو اخراجات کو پورا کر سکے اور اگر صدقات واجبہ کو بھی اس مقصد پر صرف کیا جائے، تو کیا ایسا مقصد ہے، جس میں حیلۂ تملیک کی اجازت ہوگی یا بلا حیلۂ تملیک صرف کیا جائے گا۔

ب: عطایا وصدقات قابل اعتماد اور مستقل ذریعہ آمدنی بھی نہیں قرار دیئے

جاسکتے ، جن پر اس نظام کے بقاء وتحفظ کی ضمانت دی جا سکے چہ جائے کہ نظام کو وسیع اور ہمہ گیر بنایا جا سکے؛ جبکہ مقصد زیادہ سے زیادہ لوگوں کو سودی لعنت سے بچانا اور ان کی معاشیات کو سدھارنا ہے۔

ج: اس صورت میں چندہ دہندگان ادارہ کے انتظام وانصرام میں دخیل ہوکر اس بقاء وتحفظ کو خطرہ میں ڈال سکتے ہیں۔

د: فراہمی چندہ کے سلسلہ میں جو عملی دشواریاں پیش آتی ہیں، جو ارباب بصیرت سے مخفی نہیں، ان کے ہوتے ہوئے ان اداروں کے بقا کی کیا صورت ہوگی؟

المستفتی: معزالدین احمد غفرلہ، ادارۃ المباحث الفقہیہ دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: رفاہی اداروں کے چلانے کے لئے صدقات غیر واجبہ کا حاصل کرنا اور اس ذریعہ سے ان اداروں کو فروغ دینا اور وقت ضرورت اس میں سے غریبوں ناداروں پر صرف کرنا شرعاً جائز اور درست ہوگا۔

لأن النفل يجوز للغني كما للهاشمي (إلى قوله) لأن الصدقة على الغني هبة. (البحرالرائق، كتاب الزكاة، باب المصرف، كوئٹه ۲/۲۴۵، زكريا ۲/۴۲۷، هندية، زكريا قديم ۱/۱۸۹، جديد ۱/۲۵۱، بدائع الصنائع، زكريا ۲/۱۵۷)

اور صدقات واجبہ کے اصل مستحق ومصرف فقراء ہیں اور فقراء اور ناداروں کو نہ دے کر سوسائٹی اور قومی فنڈ اور دیگر رفاہی اداروں میں صرف کرنا ہرگز جائز نہیں ہے؛ حتی کہ تعمیر مساجد، ومدارس، پل، سڑک، نہر، حج اور جہاد وغیرہ جیسے اہم امور میں صرف کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

ويشترط أن يكون الصرف تمليكاً لا إباحة و لايصرف إلى بناء نحو مسجد. وفي الشامية: كبناء القناطر، والسقايات، وإصلاح الطرقات، وكري الأنهار، والحج، والجهاد وكل مالا تمليك فيه. (الدر المختار مع

الشامي، كتاب الزكاة، باب المصرف، كراچي ٢/٣٤٤، زكريا٣/٢٩١، مجمع الأنهر قديم ١/٢٢٢، جديد دارالكتب العلمية بيروت ١/٣٣٨، الجوهرة النيرة، امداديه ملتان ١/١٥٧، دارالكتاب ديوبند ١/١٥٥)

لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رفاہی اداروں کا قیام اور ان کے اخراجات اگر قومی امداد اور صدقات غیر واجبہ وغیرہ سے پورے نہ ہوں، تو کیا یہ ایسے اہم شرعی امور ہیں کہ جن کے حصول کے لئے صدقہ واجبہ میں حیلۂ تملیک جائز ومشروع ہو سکے؟ تو حیلۂ تملیک کے لئے حضرات فقہاء نے یہ مسئلہ بیان فرمایا ہے کہ حرام سے فرار اختیار کرنے اور معصیت میں مبتلا ہونے سے حفاظت کے لئے حیلہ اختیار کرنا جائز اور مندوب ومستحسن ہے، بشرطیکہ اس میں کسی انسان کی حق تلفی نہ ہوتی ہو اور ساتھ ساتھ یہ مسئلہ بھی بیان فرمایا ہے کہ احکام الٰہیہ سے فرار اختیار کرنا اور در پردہ کسی کو اپنے حق سے محروم کرنے کے لئے حیلہ جوئی کرنا ہرگز جائز نہیں اور اس کے لئے یہ ضابطہ مقرر فرمایا ہے کہ ہر وہ حیلہ جس کے ذریعہ سے حرام اور معصیت میں مبتلا ہونے سے حفاظت ہو یا حرام سے بچ کر حلال تک رسائی ہو سکے وہ جائز ومندوب ہے۔

وكل حيلة يحتال بها الرجل ليتخلص بها عن الحرام، أو ليتوصل بها إلى حلال، فهي حسنة. (هنديه، كتاب الحيل، الفصل الأول في بيان جواز الحيل، زكريا قديم ٦/٣٩٠، جديد ٦/٣٩٣، تاتارخانية، زكريا ١٠/٣١١، رقم:١٤٨٤٦)

والاحتيال للهروب عن الحرام، والتباعد عن الوقوع في الآثام لا بأس به؛ بل هو مندوب إليه. (عمدة القارى، كتا ب الحيل، باب في ترك الحيل، دار احياء التراث العربي بيروت ٢٤/١٠٨، زكريا ١٦/٢٣٩)

اور ہر وہ حیلہ جس کے ذریعہ سے احکام الٰہیہ سے فرار اختیار کرنا یا کسی کے حق کو باطل کرنا یا اس کے ذریعہ مشتبہات میں مبتلاء ہونا لازم آتا ہے، وہ ناجائز اور امر مکروہ ہے۔

إن كل حيلة يحتال بها الرجل لإبطال حق الغير، او لإدخال شبهة فيه،

أو لتمويه باطل فهي مكروهة. (هندية، زكريا قديم ٦/ ٣٩٠، جديد ٦/ ٣٩٣، تاتارخانية، زكريا ١٠/ ٣١١، رقم: ١٤٨٤٥)

وليس من أخلاق المؤمنين الفرار من أحكام الله بالحيل الموصلة إلى إبطال الحق. (عمدة القاري، دار احياء التراث العربي بيروت ٢٤/ ١٠٩، زكريا ديوبند ١٦/ ٢٣٩)

لیکن خاکسار کے خیال میں رفاہی اداروں کے اخراجات ایسی اہم اور اشد دینی ضروریات میں داخل نہیں ہے کہ جن کی وجہ سے فقراء اور غریبوں کو حق زکوۃ سے محروم کیا جا سکے؛ بلکہ ان اداروں کی اہمیت زیادہ سے زیادہ تعمیر مساجد وقناطر وسقایات وجہاد کے درجہ میں ہوسکتی ہے اور ان میں حضرات فقہاء نے حیلۂ تملیک کی اجازت نہیں دی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ رجب المرجب ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۳۰۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/ ۷/ ۱۴۱۱ھ

اجرۃ الخدمت کا عدم جواز اور ضرورت کے درجات

سوال [۸۹۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ادارہ کے انتظامی مصارف اور اخراجات کے لئے قرض لینے والوں سے اجرۃ الخدمت وصول کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہے تو............

الف: کیا یہ اجرۃ الخدمت کل قرض جر نفعاً فہو ربوا میں داخل نہ ہوگا؟

ب: کیا اسے واقعی شرعی عقد اجارہ میں داخل کر کے اجرۃ الخدمت قرار دیا جا سکتا ہے؟

ج: اگر یہ عقد اجارہ ہے تو کیا مستقرض سے اس اجرۃ الخدمت کی ادائے گی پر جبر کیا جا سکتا ہے؟

د: اس اجرۃ الخدمت کا تعین کس تناسب سے ہوگا؟ مقدار قرض کا اعتبار ہوگا یا ہر مقروض سے برابر؟

ہ: مدت قرض کی توسیع وتجدید کے وقت کیا دوبارہ مستقرض سے اجرۃ الخدمت لیا جائے گا؟

و: اس اجرۃ الخدمت کو کیا ایسے ملازمین ادارہ پر صرف کیا جا سکتا ہے، جو معاملہ قرض کے ساتھ دیگر امور ادارہ بھی انجام دیتے ہیں اور یا ادارہ میں تنخواہوں کے علاوہ دیگر اخراجات میں بھی اسے لگایا جا سکتا ہے؟

المستفتی: معز الدین احمد غفرلہ، ادارۃ المباحث الفقهیه جمعیة علمائے ہند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: قرض گیرندگاں سے اجرۃ الخدمۃ کے نام سے کسی بھی طرح کی کوئی رقم وصول کرنا حدیث نبوی **عن علي قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم كل قرض جر منفعة فهو ربا.** (كنز العمال الدين، والسلم، دارالكتب العلمية بيروت ٦/٩٩، رقم: ١٥٥١٢، السنن الكبرى للبيهقي، كتاب البيوع، باب كل قرض جر منفعة فهو ربا، دار الفكر بيروت ٨/٢٧٦، رقم: ١١٠٩٢، نصب الراية، لاهور پاکستان ٥/١٦٧) کے تحت داخل ہونے کی وجہ سے شرعاً اس کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ ایک اہم ترین ضرورت ہے، اس کے لئے مستقرض کو واقعی اور ضروری اخراجات وصول کرنے کی گنجائش ہونی چاہئے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ضرورت کی کون سی قسم میں داخل ہے اور ضرورت کی کل پانچ قسمیں اور پانچ درجات ہیں۔

(۱) ضرورت بمعنی اضطرار، جس کی وجہ سے حرام چیزوں (میتۃ اور شراب وغیرہ) کا استعمال جائز ہو جاتا ہے۔

(۲) ضرورت بمعنی حاجت، جس کی وجہ سے حرام اشیاء کا استعمال جائز نہیں ہوتا؛

البتہ عبادات میں تخفیف آجاتی ہے، جیسا کہ حالت عذر وسفر وغیرہ میں روزہ افطار اور ترک جماعت وغیرہ۔

(۳) ضرورت بمعنی منفعت، جیسا کہ قوت حاصل کرنے کے لئے عمدہ غذا وغیرہ تناول کرنا۔

(۴) ضرورت بمعنی فضول، جیسا کہ خواہش نفس کی وجہ سے حرام اور مشتبہ چیزوں کا کھانا۔

وفي فتح المدير: ههنا خمسة مراتب ضرورة، وحاجة، ومنفعة، وزينة، وفضول فالضرورة بلوغه حداً، إن لم يتناول الممنوع هلك أوقارب، وهذا يبيح تناول الحرام، والحاجة كالجائع لو لم يجد ماياكله لم يهلك غير أنه يكون في جهة ومشقة، وهذا لايبيح الحرام ويبيح الفطر في الصوم، والمنفعة كالذي يشتهي خبز البر ولحم الغنم، والطعام الدسم، والزينة كالمشتهي بحلوى، والسكران والفضول التوسع بأكل الحرام والشبهة. (حموي على الأشباه قديم ١٤٠)

اور اجرة الخدمت وصول کرنا اس کا مذکورہ ضرورتوں میں سے قسم اول میں داخل نہ ہونا بالکل واضح ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ قسم ثانی ضرورۃ بمعنی حاجت میں داخل ہوسکتا ہے اور اس کی وجہ سے اجرۃ الخدمت جیسے امر ممنوع کی اجازت کیسے ہوسکتی ہے؟

نیز اگر ضرورت کی قسم اول میں داخل مان لیا جائے اور اس قسم کی ضرورت کی وجہ سے گنجائش قرار دی جائے، تب بھی اس کے نقصانات سے حفاظت کے لئے کوئی راستہ نظر نہیں آتا؛ اس لئے کہ عوام الناس ضرورت کے درجات میں کوئی فرق نہیں کریں گے اور معمولی معمولی بہانوں سے اپنی غرض پوری کرنے کی فکر میں ہوں گے؛ اس لئے اجرۃ الخدمت کے جواز کی کوئی راہ نہیں نکلتی۔ نیز اس طرح کا معاملہ شرعاً اجارۂ فاسدہ میں داخل ہے۔

ولو استقرض دراهم وسلم حماره إلى المقرض ليستعمله إلى شهرين حتى يوفيه دينه، أو داره ليسكنها، فهو بمنزلة الإجارة الفاسدة.

(شامي، كتاب الرهن، كراچي ٦/٤٨٢، زكريا ١٠/٨٧، هندية، زكرياقديم ٥/٤٣٤، جديد ٥/٤٩١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍رجب المرجب ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۳۰۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/ ۷/ ۱۴۱۱ھ

سرمایہ کو تجارت میں لگانے کا حکم

سوال [۸۹۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سرمایہ کو تجارت میں لگا کر اس کے منافع سے ادارہ کے اخراجات اور ضروریات پورا کرنا درست ہے یا نہیں؟ اس صورت کے اختیار کرنے میں درج ذیل امور قابل توجہ ہیں۔

الف: تجارت کس سرمایہ سے ہوگی رقوم امانت سے یا ادارہ کی آمدنی سے؟

ب: رقوم امانت سے تجارت ہو، تو نفع کی صورت میں وہ نفع صرف ادارہ کا حق ہوگا یا مستودعین بھی حقدار ہوں گے؟ اگر مستودعین بھی حقدار ہوں گے، تو کس تناسب سے؟

ج: خسارہ کی امکانی صورت میں اسے کون برداشت کرے گا ادارہ یا مستودعین؟ اگر ادارہ تو کہاں سے؟ اگر مستودعین تو کیوں؟

د: اگر ادارہ کی آمدنی سے تجارت کی جائے، تو یہ آمدنی کہاں سے اور کیسے حاصل ہوگی؟

ہ: یہ تجارت کاری ادارہ کی جانب سے ہوگی یا کسی فرد کی جانب سے اور وہ فرد کون ہوگا؟ واضح رہے کہ ادارہ بحیثیت ادارہ ملکی قانون کے اعتبار سے تجارت نہیں کرسکتا۔

المستفتی: معز الدین احمد غفرلہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ادراہ کی آمدنی سے تجارت کرنا اور اس کے منافع

کو ادارے کے اخراجات میں صرف کرنا بلا تردد جائز ہے اور جو رقم رفاہی اداروں میں جمع ہوتی ہے، اس کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔

(۱) اگر بلا تعدی ہلاک ہوجائے اور ادارہ اس کا تاوان ادا نہیں کرتا ہے، تو ایسی صورت میں جمع شدہ رقم اور سرمایہ امانت کے حکم میں ہوگا اور شرعاً امانت کی رقوم کو مالک کی اجازت کے بغیر تجارت میں لگانا جائز نہیں ہے، اس کے باوجود اگر تجارت میں لگا کر مخلوط کردی جائے، تو وہ امانت کی ضمانت بن جائے گی اور اس کی آمدنی اور خسارہ سب کا تعلق ادارے کے ساتھ ہوگا۔ نیز امانت میں تعدی کی وجہ سے ادارے کا ذمہ دار گنہگار ہوگا اور اگر مالک کی اجازت سے تجارت میں لگائی جائے، تو شرعاً مالک بھی ادارے کے ساتھ شرکت املاک کے طور پر شریک ہوجائے گا اور نفع ونقصان میں مالک وادارہ دونوں برابر کے شریک ہوں گے۔

وكذا لو خلطها المودع بماله بغير إذن المالك بحيث لا تتميز ضمنها، وإن بإذنه اشتركا شركة أملاك. (تنوير الأبصار مع الدر المختار، كتاب الايداع، كراچي ٥/٦٦٨، زكريا ٨/٤٦٢)

(۲) ادارہ پوری طرح ذمہ داری لیتا ہے اور بلا تعدی ہلاکت کی صورت میں بھی ادارہ اس کا تاوان ادا کرتا ہے، تو ایسی صورت میں جمع شدہ رقم بحیثیت امانت نہیں ہوئی؛ بلکہ بحیثیت ضمانت اور قرض ہوتی ہے، اور ضمانت وقرض کی رقوم کو تجارت وغیرہ میں صرف کرنا اور اس سے آمدنی حاصل کرنا ادارہ کے لئے بلا کراہت جائز اور درست ہے؛ لیکن اس صورت میں خسارہ کا ذمہ دار بھی ادارہ ہی ہوگا اور مالک خسارہ کا ذمہ دار ہرگز نہیں ہوگا۔

ولو استقرض فلوسا فكسدت فعليه مثلها (إلى قوله) أن الواجب في القرض رد مثل المقبوض. (بدائع الصنائع، كتاب القرض، كراچي ٧/٣٩٥، زكريا

٦/ ٥١٨، شامي، کراچي ٥/ ١٦٢، زكريا ٧/ ٣٩٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍رجب المرجب ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶؍۲۳۰۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹؍۷؍۱۴۱۰ھ

(۷-۸) فارم اور معاہدہ نامہ کی فروختگی کے جواز پر پانچ دلیلیں

سوال [۸۹۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ادارہ کے مصارف اور واقعی اخراجات کی کفالت کے لئے قرض لینے والوں سے قرض لینے کے وقت معاہدہ نامہ اور فارم حصول قرض کی قیمت لینا شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہے تو

الف: کل قرض جر نفعاً فہو ربوا سے کیوں کر خارج ہوگا؟ کیا اس میں انتفاع بالقرض نہیں؟

ب: اس صورت میں ربوا نہ پایا جائے گا یا اس مقصد کے لئے شبہ ربوا قرار دیا جائے گا؟

ج: اگر یہ حیلہ ہے تو عقود مالیہ میں مفید حل واقعی ہو سکے گا یا نہیں؟

د: فارموں کی قیمت مقدار قرض کے تناسب سے ہوگی یا ہر مقروض سے یکساں؟

ہ: اگر مقدار قرض کے تناسب سے فارموں کی قیمت رکھی جائے، تو ان فارموں کا ہر حال میں یکساں ہونا ضروری ہے یا مختلف نوعیتوں، حیثیتوں اور رنگوں کا؟

و: اگر ہر مقروض سے برابر لیا جائے، تو معمولی قرض لینے والوں اور زیادہ لینے والوں میں عدل کیوں کر ہوگا؟

۸- قرض کی مدت متعینہ ختم ہونے کے بعد توسیع مدت اور تجدید قرض کے لئے از سر نو دوسرے معاہدہ نامہ کی قیمت مستقرض سے وصول کرنا درست ہے یا نہیں؟ اگر درست ہے تو صرف پہلا معاہدہ نامہ باطل کر کے یا پہلا معاملہ قرض بالکل ختم کرنے کے بعد؟ اگر پہلا معاملہ قرض یا بالکل ختم کرنے کے بعد، تو اس کی کیا صورت ہوگی؟ جبکہ وہ قرض کی ادائے گی سے بالکل عاجز ہے اور کہیں اور سے قرض بھی دستیاب نہیں؟

اوراگرتجدیدقرض کے وقت ازسرنومعاہدہ نامہ کی قیمت لینادرست نہیں،تو زرقرض جلدوصول کرنے کی کیاصورت اختیارکی جائے؟جبکہ زیورات مکفولہ کوفروخت کرکے زرقرض کووصول کرنا،ان اداروں کے لئے قانونی سرپرستی نہ ہونے کےسبب تقریباً ناممکن ہے۔

نیزاس طرزعمل سےادارہ کا اعتمادبھی مجروح ہوتاہے، اوراس صورت میں لوگوں کو معاشی مشکلات سےنکالنے کے بجائے مزیداس میں ڈالنا بھی ہے،اس کے علاوہ منتظمین ادارہ اورمستقرض کے مابین زیورات مکفولہ کی قیمتوں وغیرہ میں نزاع اوراختلاف پیداہوکر معاملہ عدالت تک پہونچ جاتا ہے، جہاں ان اداروں کوکوئی مددنہیں مل پاتی۔اس صورت حال میں زرقرض کی واپسی کی کیاصورت ہو؟ جبکہ مستقرض نوٹس پرنوٹس کے باوجودآتا بھی نہیں۔کیایہ صورت اختیارکی جاسکتی ہے کہ مستقرض سےقرض لینے کے وقت معاہدہ نامہ میں یہ شرط منظورکرائی جائے کہ اگروہ متعینہ مدت کے بعدقرض نہیں لوٹاتاہے،اورنوٹس کے باوجود آتانہیں،تواس کی جانب سےمعاہدہ نامہ پرکرکے رکھ دیاجایاکرےگااورآخرمیں جب زر قرض واپس کرےگا،توان کی قیمت کوبھی اداکرنا ہوگا۔اسی صورت میں شئ مرہون لوٹائی جائےگی،جس طرح معاہدہ نامہ میں یہ شرط منظورکرائی جاتی ہے کہ وقت متعینہ پرزرقرض نہ لوٹانےکی صورت میں زیورات مکفولہ کوفروخت کرکے زرقرض وصول کرلیاجائے۔

المستفتی: معزالدین احمدغفرلہ،ادارۃالمباحث الفقہیہ جمعیۃ علماءہند دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۸/۷)ضروری اخراجات کےپیش نظرقرض گیرندگاں کے ہاتھ حصول قرض اور معاہدہ نامہ کوفروخت کرنا اوران لوگوں سے طےشدہ قیمت وصول کرکےاس کوادارے کے واقعی اورضروری اخراجات میں صرف کرنا شرعاً جائز اوردرست ہوگااوریہ **کل قرض جر منفعة فهو ربا** کےتحت داخل ہوکرناجائزاورحرام نہ ہوگا اوراس دعویٰ پرہم پانچ دلیلیں پیش کرتے ہیں۔

دلیل نمبر۱ : اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے اندر آیت مداینت میں معاملہ قرض کے معاہدہ نامہ لکھوانے اور اس کے اخراجات کا ذمہ دار مستقرض کو قرار دیا ہے اوراجرت کتابت کی مقدار متعین نہیں فرمائی ہے؛ بلکہ آیت کریمہ کے سیاق وسباق نے عاقدین کی آپسی تراضی پر سونپا ہے۔

وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَق. الآية [البقره:۲۸۲]

اور کاتب کو اجرت دینے میں اتنی کوتاہی بھی نہیں کرنی چاہئے، جس سے اس کی ضرورت پوری نہ ہونے کی وجہ سے وہ تنگی میں پڑجائے؛ چنانچہ فرمایا:

وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ . [الآية البقره: ۲۸۲]

مذکورہ نص قرآنی سے واضح ہوتا ہے کہ فارم اور معاہدہ نامہ کی قیمت وصول کرنا ادارہ کے لئے جائز اور درست ہے۔

دلیل نمبر ۲ :اگراس کوبیع عینہ قرار دیا جائے،تواس میں حضرت امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے درمیان اختلاف ہے،حضرت امام یوسفؒ کے نزدیک بلا کراہت جائز ہے، وہ فرماتے ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں بیع عینہ کا رواج تھا اور اس کو کوئی مذموم نہیں سمجھتا تھا، یہاں تک کہ اگر کسی معمولی سے کاغذ کو ایک ہزار میں فروخت کیا جائے،تو وہ بھی جائز ہے اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک یہ بیع مکروہ تحریمی ہے اور آپ فرماتے ہیں کہ میرے قلب میں اس بیع کا مذموم ہونا مثل جبل جم چکا ہے،اس کو اہل ربا نے گھڑ کر رواج دیا ہے۔

وقال أبو يوسف لا يكره هذا البيع؛ لأنه فعله كثير من الصحابة وحمدوا على ذلك ولم يعدوه من الربا حتى لو باع كاغذة بألف يجوز ولايكره. وقال محمدؒ هذا البيع في قلبي كأمثال الجبال ذميم اخترعه أكلة الربا الخ. (فتح القدير، كتاب الكفالة، دارالفكر بيروت ۲۱۲/۷، كوئٹه ۳۲٤/٦، زكريا ۱۹۸/۷، شامي، مطلب في بيع العينه، كراچي ۳۲٥/٥-۳۲٦، زكريا ٦۱۳/۷، درالحكام شرح غررالأحكام ۳۰٤/۲)

جب مسئلہ مذکورہ کے بارے میں اساطین امت کے درمیان جواز وعدم جواز میں اختلاف ہے،تو حضرت امام محمدؒ کے قول کو پیش نظر رکھتے ہوئے عدم جواز کواختیار کرنا احوط ہوگا؛ لیکن حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول پر عمل کرتے ہوئے، اگر جواز کے پہلو کو اختیار کیا جائے، تو امت مسلمۃ میں سے ایک جم غفیر کو سودی معاملہ میں مبتلا ہونے سے روکا جاسکتا ہے؛ اس لئے ادارہ کے اپنے پیر پر کھڑے ہونے تک حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول پر عمل کرنا جائز اور مستحسن ہوگا۔

دلیل نمبر ۳ : شریعت اسلامی میں ایسا قرض ناجائز ہے، جو اپنے ضمن میں منفعت کو کھینچ کر لاتا ہو اور ایسی بیع ناجائز مذموم نہیں ہے، جس میں منفعت شامل ہو؛ بلکہ بیع وتجارت کا اصل مقصد منفعت ہی ہوتی ہے اور مذکورہ معاملہ میں حاصل شدہ منفعت **کل قرض جر منفعة** کے تحت داخل نہیں ہے؛ بلکہ **کل بیع جر منفعة** کے تحت داخل ہے اور اسی کو مشائخ بلخ میں سے حضرت امام محمد بن سلمۃؒ نے اختیار فرمایا ہے:

وابن سلمة يقول هذا ليس بقرض جر منفعة؛ بل هذا بيع جر منفعة وهي القرض الخ. (شامي، فصل في القرض مطلب كل قرض جر نفعاً فهو حرام، كراچي ١٦٧/٥، زكريا٧/ ٣٩٧)

ربا اور سودی معاملات کے سد باب کے لئے حضرت امام محمد بن سلمۃؒ کے قول پر عمل کرنے میں کوئی قباحت نہ ہونی چاہئے ؛ بلکہ مستحسن ہونا چاہئے۔

دلیل نمبر ٤: جن لوگوں کے نزدیک ناجائز اور مکروہ ہے، ان کے یہاں بھی عدم جواز کے لئے مجلس واحد اور صفقۂ واحدہ ہونا شرط ہے اور اگر صفقہ واحدہ نہ ہو؛ بلکہ الگ الگ دو معاملہ ہوں، تو ان کے یہاں بھی ناجائز اور مکروہ نہیں ہے۔

لہٰذا اگر رفاہی اداروں میں شئ مرہون جمع کر کے قرض دینے والا الگ سے مستقل آدمی ہو اور فارم فروخت کر کے اس کی قیمت وصول کرنے والا مستقل دوسرا آدمی ہو،

تو قرض گیرندگاں سے فارم اور معاہدہ نامے وغیرہ کی قیمت وصول کر کے ادارے کے اخراجات میں صرف کرنا بلاشبہ وبلا کراہت جائز ہوگا۔

وفیها شراء الشيئ الیسیر بثمن غال لحاجة القرض یجوز ویکره وتحته في الشامیة: یکره لو کانا في مجلس واحد، وإلا فلا بأس به؛ لأن المجلس الواحد یجمع الکلمات المتفرقة فکأنهما وجدا معاً، فکانت المنفعة مشروطة في القرض. (شامي، باب المرابحة، مطلب کل قرض جر نفعاً فهو حرام، کراچي ٥/١٦٧، زکریا ٧/٣٩٦-٣٩٧)

دلیل نمبر ۵: اگر فارم وغیرہ کی فروختگی کو **کل قرض جر منفعة فهو ربا** کی ممانعت سے بچنے کے لئے حیلہ قرار دیا جائے، تو پھر بھی سودی معاملات سے سد باب اور مسلمانوں کو سود کی لعنت سے بچانے کے لئے یہ حیلہ جائز ہونا چاہئے؛ اس لئے کہ حضرات فقہاء کرام نے حرام اور معصیت سے حفاظت اور حلال تک رسائی کے لئے حیلہ کو جائز اور مستحسن قرار دیا ہے اور یہاں پر بھی اس حیلے کو جائز قرار دے کر اس پر عمل کرنے کی صورت میں بہت سے مسلمان عین سود کی لعنت سے محفوظ ہو جائیں گے؛ اس لئے یہ حیلہ وقت ضرورت تک جائز ہونا چاہئے۔

وکل حیلة یحتال بها الرجل لیتخلص بها عن حرام، أو لیتوصل بها إلی حلال فهي حسنة. (هندیة، کتاب الحیل، الفصل الأول في بیان جواز الحیل، زکریا قدیم ٦/٣٩٠، جدید ٦/٣٩٣، تاتارخانیة، زکریا ١٠/٣١١، رقم: ١٤٨٤٦، عمدة القاري، کتاب الحیل، باب في ترك الحیل، دار إحیاء التراث العربي بیروت ٢٤/١٠٨، زکریا ١٦/٢٣٩)

اب اخیر میں مشورہ یہ ہے کہ چونکہ مسئلہ اختلافی ہے اور کسی قدر ضرورت کی بناء پر فارم وغیرہ کی قیمت وصول کرنے کی اجازت دی گئی ہے؛ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ ادارے کو اتنی وسعت عطا کردے کہ فارم وغیرہ کی قیمت لئے بغیر ادارے کے اخراجات بآسانی پورے ہونے لگیں،

تو فارم وغیرہ بلا قیمت دیدینا چاہئے۔ اور مدت پوری ہونے کے بعد دوبارہ توسیع مدت کے لئے فارم فروخت کر کے اس کی رقم حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ رجب المرجب ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۳۰۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/ ۷/ ۱۴۱۱ھ

اشیاءمرہونہ کی اجرۃ الحفظ کا عدم جواز

سوال [۸۹۸٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مستقرض سے اشیاءمرہونہ کی حفاظت کا کرایہ لینا درست ہے یا نہیں؟ اگر درست نہیں تو اشیاء مرہونہ کی حفاظت کے مصارف کون برداشت کرے گا؟ مستقرض یا ادارہ؟ اگر ادارہ تو کہاں سے؟ خاص کر جب ان کی حفاظت کے لئے بینکوں کے لاکرس کرایہ پر لینے کی ضرورت پڑے۔

المستفتی: معزالدین احمد غفرلہ، ادارۃ المباحث الفقہیہ جمعیۃ علماء ہند دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اشیاءمرہونہ کی حفاظت مرتہن (ادارے) پر لازم ہے اور حفاظت کا کرایہ وصول کرنا کل قرض جر منفعۃ فہو ربا کے تحت داخل ہوکر ناجائز اور حرام ہوگا۔ نیز اگر حفاظت کے لئے مکان، صندوق، لاکرس وغیرہ کرایہ پر لینا پڑے اور اسی طرح اگر حفاظت کے لئے ملازم رکھنا پڑے، تو سب کی اجرت اور کرایہ وغیرہ کی ذمہ داری مرتہن (ادارے) پر لازم ہوگی، راہن اور مستقرض پر کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔

(مستفاد: فتاوی احیاء العلوم ۱/ ۵۱۲، امداد الفتاوی ۳/ ۴۵۴، کفایت المفتی قدیم ۷/ ۱۴۷، جدید زکریا مطول ۱۱/ ۵۸۵، فتاوی محمودیہ قدیم ۹/ ۳۷۰، جدید ڈابھیل ۲۰/ ۱۳۰، فتاوی مظاہر علوم ۱/ ۱۸۷)

وأجرة البيت الذي يحفظ فيه الرهن علی المرتهن، وكذلك أجرة

الحافظ والراعي، وكل ماكان لحفظه أو لرده إلى يد المرتهن أو لرده جزء منه، فهو على المرتهن مثل أجرة الحافظ (إلى قوله) وكذلك أجرة البيت الذي يحفظ الرهن فيه، وهذا في ظاهر الرواية. (هداية، كتاب الرهن، اشرفي ديوبند ٤/٥٠٧، الأمين كتابستان ٤/٥٢٣، البحر الرائق، كوئٹه ٨/٣٣٩، زكريا ٨/٤٤١)

اور حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اشیاء مرہونہ کی حفاظت کا مکان، صندوق، لاکرس وغیرہ سب کی ذمہ داری راہن پر لازم ہوتی ہے؛ لہٰذا ان چیزوں کا کرایہ وصول کرنا مرتہن ادارے کے لئے جائز ہوگا اور رفاہی ادارے کی ضرورت کے لئے حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول پر عمل کرنا جائز ہونا چاہئے۔

وعن أبي يوسفؒ أن كراء المأوىٰ على الراهن بمنزلة النفقة.

(هداية اشرفي ديوبند ٤/٥٢٣، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/٢٦٧)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍رجب المرجب ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/۲۳۰۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۷/۱۴۱۱ھ

اشیاء مرہونہ میں مضمون بالقرض سے زائد کی حفاظت کا کرایہ

سوال [۸۹۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اشیاء مرہونہ ومکفولہ میں مضمون بالقرض سے زائد مقدار کی حفاظت پر کرایہ لینا نیز اس کے حسابات رکھنے رجسٹری وغیرہ میں درج کرنے دیگر امانتوں میں اختلاط سے بچانے پر ادارہ کا جو خرچ آتا ہے، اس کا راہن اور مستقرض سے لینا صحیح ہے یا نہیں؟ اور اس کو ادارہ کے مصارف میں لگایا جاسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: معز الدین احمد غفرلہ، ادارۃ المباحث الفقهیه جمعیة علماء ہند دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اشیاءمرہونہ میں مضمون بالقرض سے جوزائد ہوتا ہے، وہ بمنزلۂ امانت کے ہوتا ہے؛ لیکن باب حفاظت میں مضمون بالقرض کے تابع ہوکراس کی حفاظت کے مکان، صندوق وغیرہ کا کرایہ بھی مرتہن ادارے پرلازم ہوگا اور بدائع وغیرہ کی جوعبارت وصول کرایہ کے جواز میں پیش کی جاتی ہے، وہ قابل اعتماد نہیں ہے؛ اس لئے کہ وہ جمہور کے خلاف ہے؛ لہٰذا مقدار زائد کی حفاظت کا کرایہ وصول کرنا بھی جائز نہ ہوگا۔

وأجرة البيت الذي ذكرناه، فإن كلها تجب على المرتهن، وإن كان في قيمته الرهن فضل لأن وجوب ذلک لسبب الحبس وحق الحبس في الكل ثابت له. (هداية، كتاب الرهن، اشرفي ديوبند٤/٥٠٧، البحرالرائق، كوئٹه ٣٣٩/٨، زكريا ٤٤١/٨، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٢٧٦/٤، بنايه شرح الهداية، قديم ٣٩٣/٤، جديد اشرفيه ديو بند١٢/ ٤٩١) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۹؍رجب المرجب ۱۴۱۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۳۰۷)	۱۹/۷/۱۴۱۱ھ

مستقل امانت کی حفاظت کے کرایہ کا جواز

سوال [۸۹۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اشیاء مرہونہ کے علاوہ اگرلوگ اپنے زیورات یا قیمتی اشیاء ان اداروں میں بغرض حفاظت رکھیں، تو کیا ان کی حفاظت پر مدت کے اعتبار سے کرایہ لینا صحیح ہوگا؟ کرایہ لینے کی صورت میں اگروہ چیز بلا تعدی ضائع ہوجائے، تو ادارہ پرضمان و تاوان واجب ہوگا یانہیں؟

المستفتی: معزالدین احمد غفرلہ، ادارۃ المباحث الفقہیہ جمعیۃ علماء ہند دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مستقل امانت کی حفاظت کا کرایہ وصول کرنا شرعاً جائز ہے۔

المودع إذا شرط الأجرة للمودع على حفظ الوديعة صح ولزم عليه.

(هندية قديم ٤/٣٤٢، جديد ٤/٣٥٤)

لیکن اگر بلا تعدی ہلاک ہوجائے، تو امین پر تاوان واجب ہوگا اور بعض فقہاء کا قول اس پر ہے کہ امین پر تاوان واجب نہیں ہوگا؛ اس لئے کہ اس صورت میں امین اجیر مشترک بن چکا ہے اور اجیر مشترک پر بلا تعدی ہلاکت کا تاوان واجب نہیں ہوتا ہے اور یہی مفتی بہ قول بھی ہے؛ اس لئے بلا تعدی ہلاکت کا تاوان ادارے پر لازم نہ ہوگا۔

فلا تضمن بالهلاك إلا إذا كانت الوديعة بأجر. وفي الشامية وأما من جرى العرف بأنه يأخذ في مقابلة حفظه أجرة يضمن لأنه وديع بأجرة؛ لكن الفتوى على عدمه. (در مختار مع الشامي، كتاب الإيداع، كراچي ٥/٦٦٤، زكريا ٨/٤٥٥-٤٥٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۹/رجب المرجب ۱۴۱۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/۲۳۰۸)	۱۹/۷/۱۴۱۱ھ

بیع الجامکیہ اور میعادی چیک کی خریداری کا عدم جواز

سوال [۸۹۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ان اداروں کے لئے مروجہ بینکوں کے میعادی چیک کو ضرورت مندوں سے کم قیمت پر خریدنے کی کیا کوئی صورت نکل سکتی ہے؟ جو جائز اور شرعاً درست ہو، یعنی وہ چیک جن کی ادائے گی بینک ایک مدت کے بعد ہی کرے گا، مثلاً وہ ایک ہزار کا ہے اور چھ ماہ بعد

ملے گا، کیا ایسے چیک کو کسی ضرورت مند سے نوسو پچاس میں لینا اور وقت مقررہ پر بینک سے پورے ایک ہزار وصول کرنا جائز ہوسکتا ہے؟

جائز صورت سے حاصل شدہ رقم اگر مصارف ادارہ سے بڑھ جائے، تو اسے کیا کیا جائے؟ ادارہ کی ترقی میں لگایا جائے یا رفاہی امور پر صرف کیا جائے یا غرباء پر صرف کرنا ضروری ہے؟

ضرورتمند حضرات سے معیادی چیک اس طریقہ سے خریدنا کہ کسی کو رقم وصول کرنے کا چیک دو ماہ کی میعاد کے ساتھ قید شدہ حاصل ہوجائے؛ لیکن اس کو فوری رقم کی ضرورت ہے، تو وہ مجبور ہوکر ہزار روپیہ کا چیک نوسو روپئے میں فروخت کرتا ہے اور رفاہی ادارہ یا کوئی اور شخص اس کو نوسو روپئے نقدی دے کر خریدتا ہے، اور میعاد معینہ پر چیک داخل کرکے ہزار روپیہ وصول کرتا ہے، تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: معزالدین احمد غفرلہ، ادارۃ المباحث الفقہیہ جمعیۃ علماء ہند دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس طرح ضرورت مندوں سے میعادی چیک کا خریدنا بظاہر بیع الجامکیہ کے مرادف ہے، اور بیع الجامکیہ کی صورت یہ ہے کہ حکومت کے ملازم یا صاحب وظیفہ جس کو حکومت کی طرف سے میعاد مقررہ پر تنخواہ یا وظیفہ ملتا ہے، اس کو مقررہ وقت سے پہلے کوئی دوسرا آدمی کم پیسے میں خریدے اور خریدار وقت مقررہ پر اس کو حاصل کرلے، تو حضرات فقہاء کرام نے اس طرح کی خرید وفروخت کو ناجائز کہا ہے؛ اس لئے رفاہی ادارے کے لئے مذکورہ طریقہ پر چیک کی خریداری اور اس کے منافع حاصل کرنا جائز نہیں ہوگا۔ (مستفاد: غایۃ الاوطار ۳/۱۰)

وأفتی المصنف ببطلان بیع الجامکیه الخ. وتحته في الشامیة: وعبارة المصنف في فتاواه سئل عن بیع الجامکیة، وهو أن یکون لرجل جامکیة فی بیت المال ویحتاج إلی دراهم معجلة قبل أن تخرج

الجامكية، فيقول له رجل بعتني جامكيتك التي قدرها، كذا بكذا أنقص من حقه في الجامكية، فيقول له بعتك فهل البيع المذكور صحيح أم لا لكونه بيع الدين بنقد أجاب إذا باع الدين من غير من هو عليه كما ذكر لا يصح. (در مختار مع الشامي، كتاب البيوع، مطلب في بيع الجامكية، كراچي ٤/ ٥١٧، زكريا ٧/ ٣٣)

جائز صورت سے حاصل شدہ رقم ادارے کے مصارف میں صرف کرنا جائز اور درست ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍رجب المرجب ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶؍ ۲۳۱۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹؍۷؍۱۴۱۱ھ

فکسڈ ڈپازٹ میں رکھنا اور اس سے ملنے والی رقم کا حکم

سوال [۸۹۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ یہ ادارے جمع شدہ رقم امانت بغرض حفاظت مروجہ بینکوں کے کرنٹ اکاؤنٹ سیونگ اکاؤنٹ، اور فکسڈ ڈپازٹ میں رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں رکھ سکتے تو ان امانتوں کی حفاظت کی کیا صورت ہو؟ جبکہ اس کے علاوہ کوئی قابل اعتماد ذریعہ حفاظت بھی نہیں۔

نیز ملکی قانون کی رو سے زیادہ رقم خود اپنے پاس بھی نہیں رکھ سکتے اور اگر بغرض حفاظت بینکوں میں رکھنا درست ہے، تو اس پر مل سکنے والی سودی رقم کو کیا کیا جائے؟ بینوا توجروا انشاء اللہ اجرا عظیما.

المستفتی: معز الدین احمد غفرلہ، ادارۃ المباحث الفقہیہ جمعیۃ علماء ہند دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: رفاہی اداروں کی رقم بغرض حفاظت سرکاری

بینک میں رکھنا بہرحال جائز ہے؛ لیکن فکسڈ ڈپازٹ کھاتے میں رکھنا اور جمع شدہ رقم سے زائد رقم حاصل کر کے ادارے میں خرچ کرنا قطعی حرام اور ناجائز ہے؛ اس لئے کہ فکسڈ ڈپازٹ کھاتے میں رکھنا بھی بنص حدیث جابرؓ مستحق لعنت ہوگا؛ کیونکہ اس کھاتے میں رکھنے کا مقصد ہی سود حاصل کرنا ہوتا ہے، ورنہ بینک میں اور بھی بہت سے کھاتے ہیں، جن میں رکھنے سے بہت کم سود ملتا ہے، یا بالکل نہیں ملتا؛ اس لئے ایسے کھاتے میں جمع کرنا بھی جائز نہ ہوگا، تاہم فکسڈ ڈپازٹ کھاتہ یا کسی اور انواع کے کھاتے میں رکھنے کے نتیجہ میں جو زائد رقم ملتی ہے، اس کو ادارے کی ضرورت یا اس کی تجارتی اسکیم وغیرہ میں لگانا ہرگز جائز نہ ہوگا، اس لئے کہ یہ زیادتی بالکل زمانۂ جاہلیت کے ربا سے ملتی جلتی ہے، تفسیر کبیر میں امام رازیؒ فرماتے ہیں:

أما ربا النسيئة، فهوالأمر الذي كان مشهوراً متعارفاً في الجاهلية، وذٰلک أنهم كانوا يدفعون المال على أن يأخذ على شهر قدراً معيناً، ويكون رأس المال باقياً، ثم إذا حل الدين طالبوا المديون برأس المال، فإن تعذر عليه الأداء زادوا في الحق والأجل، فهذا هو الربا الذي كانوا في الجاهلية يتعاملون به. (تفسير كبير للإمام فخر الرازيؒ تحت تفسير رقم الآية: ۲۷۵، من سورة البقره ۷/۹۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍رجب المرجب ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/۲۳۱۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۷/۱۴۱۱ھ

(۲) باب البنوک

بینک سے گرین کارڈ بنوانا کیسا ہے؟

سوال [۸۹۹۱]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید اپنی زمین کے کاغذات کولگا کر بینک سے کچھ روپئے بطور قرض لیتا ہے اوران روپیوں پر بینک بہت کم روپیہ سود وصول کرتی ہے، جس کوعرف عام میں گرین کارڈ کہتے ہیں؛ لہٰذا بینک سے گرین کارڈ بنوانا کیسا ہے؟ اورکن صورتوں میں سودلیا جاسکتا ہے؟

المستفتی: مشیراحمد، مدرسہ تجوید القرآن، سسیا کلاں، لکھیم پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سودکالینادینادونوں ناجائزاورحرام ہیں، چاہے سودکم ہو یازیادہ، ہرحال میں حرام ہے؛ اس لئے جائیداد کے کاغذات بینک میں رکھ کرسودی قرض لیناجائزنہیں ہے، چاہے شرح سود بہت ہی کم کیوں نہ ہو۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم آکل الربوا، ومؤکلہ، وکاتبہ، وشاھدیہ، وقال: ھم سواء. (مسلم شریف، باب لعن آکل الربا، ومؤکلہ، النسخۃ الھندیۃ، ۲/۲۷، بیت الأفکار رقم:۱۵۹۸، سنن الترمذي، باب ماجاء في آکل الربا، النسخۃ الھندیۃ ۱/۲۲۹، دارالسلام رقم: ۱۲۰۶)

کل أمر یتذرع بہ إلی محظور، فھو محظور في ھامشہ، فھو محظور أي ممنوع ومحرم و یدخل في ذلک القرض یجر المنفعۃ. (مرقاۃ المفاتیح، کتاب الزکاۃ، قبیل الفصل الثانی، مکتبہ امدادیۃ ملتان ۴/۱۲۸)

من القاعدۃ المقررۃ أن للوسائل حکم المقاصد فوسیلۃ الطاعۃ، طاعۃ

ووسيلة المعصية ، معصية ماحرم فعله حرم طلبه. (الأشباه والنظائر قديم ۳۹۲، قواعدة الفقه، اشرفي ۱۱۵، رقم: ۲۹۱-۲۹۲، شرح المجلة رستم اتحاد ديوبند ۱/۳۳-۳٤، رقم: ۳٤-۳۵ مجلة الأحكام العدليه، كراچي ۱/۲۰، رقم المادة ۳٤-۳۵، مرقاة المفاتيح، كتاب الزكاة، الفصل الثاني، مكتبه امداديه ملتان ٤/۱۲۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷رمحرم الحرام ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۰۹۲۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/۱/۱۴۳۴ھ

کریڈٹ کارڈ کی شرعی حیثیت

سوال [۸۹۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے پاس کریڈٹ (Credit) ڈیوٹ (Debit) کارڈ کی مشین ہیں اور میں اپنا کاروباران کارڈوں سے کرتا ہوں، میں اپنے گاہک سے ان کارڈ کے ذریعہ پیسے وصول کرتا ہوں، تو میں گاہک یعنی سامان خریدار سے ڈیڑھ پرسنٹ رقم زیادہ لیتا ہوں اور یہ زائد رقم بینک کے اصول کے اعتبار سے بینک میں جمع کرتا ہوں بینک والے اس کا نام سروس چارج دیتے ہیں۔

(۲) کاروبار زیادہ ہوجانے کی صورت میں اپنے یعنی سامان خریدار سے دو پرسنٹ لیا جاتا اور بینک کو بینک کے اصول کے اعتبار سے پرسنٹ دیا جاتا ہے، اور ایک پرسنٹ سامان بیچنے والا یعنی دوکاندار رکھ لیتا ہے، تو کیا میرے لئے رقم کی وصولیابی اس طرح جائز ہے کہ نہیں اور اس میں سود کی کوئی شکل تو نہیں؟

یہ کریڈٹ رڈیوٹ کارڈ کی مشین فری میں دیجاتی ہے اور مستقل پچاس ہزار روپیہ اس کارڈ مشین میں جمع رکھنا پڑتا ہے، کم کی شکل میں بینک کے اصول کے اعتبار سے چارج دینا پڑتا ہے، تو اس چارج اور مشین کا کیا حکم ہے؟ جواب سے نواز کر ممنون فرمائیں۔

نوٹ: بعض مرتبہ مال کی قیمت ڈیڑھ پرسنٹ بڑھا کر گاہک سے وصول کرتا ہوں اور اپنے پاس سے ڈیڑھ پرسینٹ بینک کے اصول کے اعتبار سے بینک میں جمع کرتا ہوں۔

المستفتی: محمد ندیم ولد گلزار، ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: آج کل کے زمانہ میں جن لوگوں کا پیسہ بینک میں ہوتا ہے، بینک ان پر اعتماد کر کے کریڈٹ کارڈ جاری کر دیتا ہے اور اس کارڈ کے ذریعہ سے اپنی ضروریات کا سامان اپنی مرضی کے مطابق خرید سکتا ہے، جتنے پیسے کے سامان خریدے گا، اتنے پیسے بینک اس کے کھاتہ میں سے کٹوتی کر لیتا ہے اور دوسری طرف بینک قابل اعتماد دوکاندار کے پاس کریڈٹ کارڈ کے ذریعہ سے خریداری کے لئے اور فروختگی کے لئے کریڈٹ ڈیوٹ کی مشین رکھ دیتا ہے، اور اس مشین کے استعمال کے ذریعہ سے کچھ متعین فیس مقرر کی جاتی ہے، دوکاندار وہ فیس خریدار کے حساب میں لگا لیتا ہے اور اس فیس میں سے کچھ حصہ بینک کے کھاتہ میں چلا جاتا ہے اور کچھ دوکاندار کے کھاتہ میں چلا جاتا ہے، اس طریقہ سے دوکاندار کے لئے اس مشین کے ذریعہ سامان کی فروختگی درست ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلے میں غور وخوض کر کے دیکھا گیا کہ اس کی عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں ہے، یہ دوکاندار کے حق میں ایک نقد فروختگی ہے، بس اتنا فرق ہے کہ فروختگی کے ساتھ ساتھ اس کا پیسہ بینک میں محفوظ ہو جاتا ہے اور خریدار کے لئے بھی نقد خریداری ہے؛ کیونکہ خریدتے ہی اس کے کھاتہ میں سے اتنا ہی پیسہ فیس وغیرہ کی کٹوتی کے ساتھ دوکاندار کے کھاتہ میں منتقل ہو جاتا ہے۔ حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالیؒ نے اسلام اور جدید معاشی مسائل ۱۵۱/۴ پر کافی تفصیل کے ساتھ جانبین سے جواز کی بات ثابت فرمائی، اسی طرح ان کی کتاب انعام الباری شرح بخاری ۴۸۶/۶ پر اس کے جواز کی بات تفصیل سے ثابت فرمائی ہے اور ہندیہ کے حسب ذیل جزئیہ سے بھی جواز کی بات مستفاد ہوتی ہے۔

في الكبرى: أهل بلدة ثقلت عليهم مؤنات العمل، فاستاجروا رجلاً بأجرة معلومة ليذهب ويرفع أمرهم إلى السلطان الأعظم، ليخفف عنهم بعض الحيف، وأخذ الأجرة من عامتهم غنيهم، وفقيرهم ذكرههنا أنه إن كان بحال لو ذهب إلى بلد السلطان تهيأ له إصلاح الأمر يوما، أو يؤمين جازت الإجارة. (هندية، كتاب الإجارة، الباب الثاني والثلاثون في المتفرقات، زكريا جديد ٤/٥٧٣-٥٧٤، قديم ٤/٥٢٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ رشوال المکرّم ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۶۷۲/۴۱)

شیئرز اور بونڈر کا حکم

سوال [۸۹۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شیئرز کمپنیوں کے خریدنا، بونڈر خریدنا کیا یہ کام درست ہیں؟ ان کی صحیح جانکاری سے مطلع فرمائیں، ہمارے یہاں کئی عالم ہیں؛ لیکن ان چیزوں کی جان کاری نہیں ہے، لوگ مسائل معلوم کرتے ہیں؛ اس لئے ہم لوگ دارالافتاء ہی سے رجوع کرتے ہیں۔

المستفتی: عبدالرشید قاسمی، سیڈھا، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کمپنی سے شیئرز خرید کر کمپنی کے کاروبار میں شریک ہونا ہے، تو شرعا جائز ہے اور شیئرز مارکیٹوں میں جو شیئرز ہولڈری کا کاروبار ہوتا ہے، صبح وشام اتار چڑھاؤ کا سلسلہ ہوتا ہے، یہ ایک قسم کی لاٹری کی شکل ہے، اس سے گریز کرنا چاہئے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۷/۲۶)

وصورتها أن يشترك إثنان في نوع خاص من التجارات،

أويشتركان في عموم التجارات و لايذكران الكفالة، والمفاوضة فيها فتضمنت معنى الوكالة. (عالمگيري، كتاب الشركة، الباب الثالث في شركة العنان، زكريا جديد ۲/ ۳۲۵-۳۲٦، قديم ۲/ ۳۱۹)

اور بونڈز اور لاٹری کی خریداری اور اس میں شرکت جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۷/ ۲٦)

إنما الخمر و الميسر والأنصاب والازلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه. [سورة المائده: ۷] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ شعبان المعظم ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۱۳۴/۳۸)

بونڈ کی اضافی رقم کی شرعی حیثیت

سوال [۸۹۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بندہ سرکاری ملازم ہے، بندہ کے ماہانہ تنخواہ سے انکم ٹیکس چودہ ہزار روپیہ ادا کرنے کا سرکاری حکم نافذ ہوا، اس سے بچنے کی لئے بندہ اپنے جی پی ایف سے کچھ رقم وضع کرنے کے بعد کچھ رعایت ہوئی، بقیہ کچھ رعایت کے لئے بندہ کو تیس ہزار روپیہ کی رعایت ملی۔ اب مذکور BOND کا تین سال کے بعد میعاد پوری ہونے پر بندہ کو -/30000 کے ساتھ مزید -/9000 ملا، یہ مزید نو ہزار کی رقم کا استعمال بندہ کے حق میں از روئے شرع کیسا ہے؟

المستفتی: محمد سعود، کورائی، جاجموؤ، اڑیسہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: تیس ہزار روپیہ کا بونڈ خریدنے کے بعد اس کی

میعاد پوری ہونے کے بعد مزید جو نو ہزار کی رقم ملے گی وہ سود ہے، اس کا استعمال کرنا قطعاً جائز نہیں ہے، اس پیسے کو آپ سرکاری انکم ٹیکس وغیرہ میں دے سکتے ہیں اور اگر ٹیکس وغیرہ نہ ہو، تو بلا نیت ثواب فقراء وغیرہ میں تقسیم کر دینا ضروری ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [سورة البقرہ: ۲۷۵]

ان أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور قديم ۱/۳۷، دار البشائر الإسلامية ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث ۵۹، البحرالرائق، زكريا ۹/۳۶۹، كوئٹه ۸/۲۰۱، تبيين الحقائق، امداديه ملتان ۶/۲۷، زكريا ۷/۶۰، زكريا قديم ۵/۵۴۹، جديد ۵/۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/۲۴۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵ / ذی قعدہ ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۱۴۳/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۷/۱۱/۵ھ

بینک کی ایک اسکیم کا حکم

سوال [۸۹۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ رام نگر ضلع نینی تال کے اندر نگر پالیکا کی جانب سے غرباء کے واسطے ایک اسکیم ہے، وہ یہ کہ جو غرباء مالی حالت کمزور ہونے کی بنا پر کاروبار سے دور ہیں، ان کو نگر پالیکا بذریعہ بینک قرض دلوارہی ہے تاکہ وہ اپنے کاروبار کریں اور اس کے اندر کچھ رعایت بھی ہے، جس کی شکل یہ ہے کہ نگر پالیکا مقامی لوگوں کے مصدقہ فارم بھروانے کے بعد پندرہ فیصد رقم فارم کیساتھ بینک کو روانہ کر دیتی ہے اور اس پندرہ فیصد کو معاف کر دیتی ہے۔

اب بینک سے جو رقم ملے گی وہ سات سال کے اندر ماہوار قسط کے اعتبار سے قرض

لینے والے کوادا کرنی ہوگی اوراس درمیان میں بینک کی رقم کا سود بن کر اتنا ہو جائے گا جتنا کہ نگر پالیکا نے پندرہ فیصد بینک کے حوالہ کر کے لینے والے کے لئے معاف کردیئے ہیں، تواس صورت میں قرض لینے والا بینک کواتنی ہی رقم ادا کرے گا جتنی کہ اس کو حاصل ہوئی ہے؟ تو کیا اس شکل میں قرض جائز ہے یانہیں؟

المستفتی: قاری محبوب عالم، مدرسہ مدینۃ العلوم، نینی تال (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مسئلہ مذکورہ میں جواسکیم بیان کی ہے، یہ اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ سات سال کے اندر اندر بینک کی جمیع رقم کو جمع کردے اوراگر سات سال میں تمام رقم کو جمع نہیں کیا اوراس پر سود بڑھنے لگے، تو پھر یہ عمل جائز نہ ہوگا۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، باب لعن آكل الربا، مؤكله، النسخة الهندية، ٢/ ٢٧، بيت الأفكار رقم:١٥٩٨، سنن ابن ماجه، التجارات التغليظ في الربا، النسخة الهندية ٢/ ١٦٥، دارالسلام رقم: ٢٢٧٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ر جمادی الاولیٰ ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/ ۵۷۷۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۵/۲۹ھ

بینکوں سے ملنے والی اضافی رقم کی شرعی حیثیت

سوال [۸۹۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہندوستان بینکوں سے جو مزید رقم ملتی ہے، وہ سود ہے یانہیں؟ اس کا استعمال کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: غلام یٰسین، موضع ،مورا، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر ہندوستان کو دارالحرب بھی تسلیم کرلیا جائے اور غیر مسلموں کو حربی تسلیم کرلیا جائے، تب بھی ہندوستان میں رہنے والے مسلمان کے لئے غیر مسلموں یا حکومت سے سود لینا جائز نہیں ہے اور حضرات طرفین اور امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک جہاں حربیوں سے سود لینا جائز ہے، وہاں یہ قید بھی موجود ہے کہ سود لینے والا مسلمان دارالحرب کا باشندہ نہ ہو؛ بلکہ کسی دارالاسلام وغیرہ سے پاسپورٹ لے کر، مستأمن بن کر آیا ہوا ہو۔

ولا بین حربي ومسلم مستأمن. (الدر المختار، کتاب البیوع، باب الربا، کراچي ۱۸٦/٥، زکریا ۴۲۲/۷، امداد الفتاوی۱٥٦/۳)

لہٰذا بینکوں سے حاصل شدہ زائد رقم کا استعمال ناجائز اور حرام ہوگا۔ حکم شرعی یہی ہے کہ اس کو بغیر نیت ثواب کسی غریب نادار کو دیدیا جائے۔

وأما إذا کان عند الرجل مال خبیث، فأما إن ملکه بعقد فاسد، أوحصل له بغیر عقد ولا یمکنه أن یرده إلی مالکه، ویرید أن یدفع مظلمة عن نفسه فلیس له حیلة إلا أن یدفعه إلی الفقراء. (بذل المجهود، کتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور قدیم ۳۷/۱، دارالبشائر الإسلامیة ۳٥۹/۱، تحت رقم الحدیث: ٥۹، هندیة، زکریا قدیم ٥۴۹/٥، جدید ۴۰۴/٥، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۳٤٦/۲٤، شامي، زکریا ٥٥۳/۹، کراچي ۳۸٥/٦، تبیین الحقائق، مکتبه امدادیه ملتان۲۷/٦، زکریا۷/٦۰، البحرالرائق، زکریا ۳٦۹/۹، کوئٹه ۲۰۱/۸) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍رمضان المبارک۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر:الف ۲۳۹۱/۲۷)

بینک میں مسجد کا اکاؤنٹ کھولنے اور ملنے والے سود کی شرعی حیثیت

سوال[۷۹۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کیا مسجد کا بینک میں سیونگ اکاؤنٹ کھولنا اور بینک جو بنا مانگے سود دیتا ہے، وہ لینا جائز ہے یا ایسا ہی ہے، جیسا طے کر کے لینا جس کا حرام ہونا ہر مسلمان کو معلوم ہے؟

المستفتی: مظہر محمد بنیا نگر، دہرادون

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسجد کی رقم کی حفاظت کے لئے بینک میں سیونگ اکاؤنٹ کھولنا جائز اور درست ہے اور اس سے حاصل ہونے والے سود کو مسجد کی کسی بھی مد میں خرچ کرنا جائز نہیں ہوگا، ہاں البتہ سود کی رقم کو مسجد کے لئے خریدی جانے والی زمین جائیداد کی رجسٹری اسٹامپ فیس میں دینا جائز ہے، ورنہ غریب مسکینوں میں بلانیت ثواب تقسیم کردیا جائے؛ لیکن سود حاصل کرنے کی غرض سے مسجد کی رقم بینک میں جمع کرنا جائز نہیں ہے۔

الأمور بمقاصدها. (الأشباه زكريا ۱۰۲، قواعد الفقه اشرفي ۶۲، رقم: ۵۱)

والواجب في الكسب الخبيث تفريغ الذمة، ولتخلص منه برده إلى أربابه إن علموا وإلا إلى الفقراء. (الموسوعة الفقهية ۳۴/۲۴۵، ومثله في بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، معارف السنن اشرفي ۱/۳۴)

عن فضالة بن عبيد صاحب النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: كل قرض جر منفعة، فهو وجه من وجوه الربا. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، كتاب البيوع، باب كل قرض جر منفعة فهو ربا، دارالفكر ۸/۲۷۶، رقم: ۱۱۰۹۲)

عن عليؓ، قال: كل قرض جر منفعة، فهو ربا. (كنز العمال الدين والسلم،

دارالكتب العلمية بيروت ٦/٩٩، رقم: ١٥٥١٢، جامع الأحاديث الكبير للسيوطي ٦/٤٣٨، رقم: ١٥٨٢١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/۱۱۴۹۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۴/۱۷ھ

بینک سے ملنے والی اضافی رقم کا حکم

سوال [۸۹۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سود لینا دینا دونوں حرام ہے، میں نے سرکاری بینک میں کچھ پیسے جمع کر رکھے ہیں، بینک اصل رقم سے ہمراہ اضافی رقم بھی دیتا ہے کیا یہ سود ہے؟

المستفتی: غلام حسین، مدرس رام نگر تحصیل رام نگر، اودھم پور جے لینڈہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہاں یہ بھی سود ہے؛ لیکن بینک سے نکال کر اگر انکم ٹیکس وغیرہ ہے، تو اس میں دیدینا ورنہ فقراء میں بلانیت ثواب تقسیم کردیجئے۔

إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور قديم ١/٣٧، دار البشائر الإسلامية ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الهندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٣٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴ محرم الحرام ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/۴۳۲)

بینک سے ملنے والی اضافی رقم نکال لیں یا بینک میں ہی چھوڑ دیں

سوال [۸۹۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہندوستان میں بینک وغیرہ سے سود لینا جائز ہوگا یا نہیں؟ مع حوالہ جواب دے کر شکریہ کا موقع دیں۔

المستفتی: محمد علی قاسمی، مدرسہ حیات العلوم، گیادوہا، مدناپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہندوستان کے بینک سے سود کی رقم نکال لینی چاہئے؛ البتہ نکال کر اپنے صرفہ میں لانا جائز نہیں؛ بلکہ فقراء کو بلانیت ثواب دیدینا واجب ہے، ہندوستان کے بینک سے جو سود ملتا ہے، وہ ایسا ہے جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں تھا۔ قرآن کریم میں جس کی مذمت آئی ہے۔

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق (إلى قوله) أو بغير عقد كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه (وقوله) ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، شامي، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ۶/۲۷، زكريا ۷/۶۰، البحر الرائق، زكريا ۹/۳۶۹، كوئٹه ۸/۲۰۱)

اعلم أن الربا قسمان: النسيئة وربا الفضل، وأما ربا النسيئة، فهو الأمر الذي كان مشهوراً متعارفاً في الجاهلية، وذٰلک أنهم كانوا يدفعون المال على أن يأخذ واكل شهر قدراً معيناً، ويكون رأس المال باقياً، ثم إذا حل الدين طالبوا المديون برأس المال، فإن تعذر عليه الأداء

زادوا في الحق والأجل، فهذا هو الربا الذي كانوا في الجاهلية يتعاملون به. (تفسير كبير للإمام الفخر الرازيؒ، تحت تفسير رقم الآية: ۲۷۵، من سورة البقره۷/ ۹۱، روح البيان ۲/ ۹۳، غرائب القرآن لنيساپوری ۲/ ۶۰، فقه السنة للسيد سابق ۳/ ۱۳۵ - ۱۳۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/ ۷۱۲)

بینک کے سود کا حکم

سوال [۹۰۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہندوستان میں جو بینکوں میں رقم جمع کی جاتی ہے، اصل رقم کے علاوہ جو منافع ملتا ہے، وہ شرعاً جائز ہے کہ نہیں؟ ہمارے ہندوستان میں بہت سارے بینک ہیں، مثلاً اسٹیٹ بینک، پنجاب نیشنل بینک آف انڈیا وغیرہ اور اس کے علاوہ بیمہ کمپنیاں ہیں، مثلاً بی اے سی ایل انڈیا لمیٹیڈ ہے اور بھارتی جیون بیمہ نگم ہے، ان سارے بینکوں اور کمپنیوں کے مالک کافر لوگ ہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب سے نوازیں۔

المستفتی: محمد اختیار حسین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال میں لکھی گئی جتنی شکلیں ہیں، ان سب کے لئے حکم شرعی یہ ہے کہ اگر ہندوستان کو دار الحرب تسلیم نہ کیا جائے؛ بلکہ مسلم اور غیر مسلم کی مشترکہ جمہوری حکومت تسلیم کی جائے، جیسا کہ اکثر علماء کی یہی رائے ہے، تو یہاں کے سود کے جائز ہونے کا سوال ہی نہیں ہوتا، اور اگر ہندوستان کو دار الحرب تسلیم کرلیا جائے جیسا کہ بعض لوگ یہی کہتے ہیں، تو ایسی صورت میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے حق رائے

دہی اور لوک سبھا اور راجیہ سبھا کی ممبری اور منسٹری اور صدر جمہوریہ وغیرہ بننے کے سارے حقوق ہاتھ سے نکل جائیں گے؛ تاہم اگر ہندوستان کو دارالحرب کہنے والوں کے مطابق دارالحرب تسلیم کر بھی لیا جائے، تب بھی امام ابوحنیفہؒ کے راجح قول کے مطابق ہندوستان کے رہنے والے مسلمانوں کے لئے یہاں کی غیر مسلم کمپنی یا سرکاری بینک سے حاصل شدہ سود جائز اور حلال نہیں ہے، ہاں البتہ دوسرے ممالک سے ویزا لے کر عارضی طور پر ہندوستان میں آنے والے مسلمانوں کے لئے یہاں کے غیر مسلم کمپنی اور سرکاری بینک سے سود حاصل کرنا یا غیر مسلم افراد سے سود حاصل کرنا اور استعمال کرنا جائز ہے، یہی حضرت امام ابوحنیفہؒ کے قول کا مطلب ہے، یہ بات اس صورت میں ہے؛ جبکہ ہندوستان کو دارالحرب تسلیم کرلیا جائے؛ لیکن ہندوستان کا کوئی مسلمان اس کے لئے تیار نہیں ہوسکتا ہے کہ اپنا وطنی حق غیروں کے ہاتھ میں دیدیا جائے۔

بہرحال ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے سرکاری بینک یا غیر مسلم پرائیویٹ کمپنی سے سود حاصل کر کے استعمال کرنا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے، چاہے ہندوستان کو دارالحرب تسلیم کیا جائے، یا نہ کیا جائے۔ (مستفاد: فتاوی رشیدیہ ۵۰۴، جدید مبوب ۵۸۳، امداد الفتاوی ۱۵۸/۳، محمودیہ جدید ۳۵۲/۱۶، قدیم ۳۷۳/۱۳، جدید ڈابھیل ۲۷۲/۱۶ تا ۲۸۱، ایضاح النوادر ۹۷، انوار رحمت ۱۷۷)

ولا بين حربي، ومسلم مستأمن، ولو بعقد فاسد، أو قمار ثمة؛ لأن ماله ثمة مباح فيحل برضاه مطلقاً بلا عذر (در مختار) وإذا دخل المسلم دار الحرب بأمان فلا بأس بأن يأخذ منهم أموالهم بطيب أنفسهم بأي وجه كان. (شامي، كتاب البيوع، باب الربا، زكريا ٤٢٢/٧، كراچي ١٨٦/٥)

لاتصير دار الإسلام دار الحرب إلا بأمور ثلثة (منهم) بأن لا يبقي فيها مسلم، أو ذمي أمنا بأمان الأول على نفسه (در مختار) ظاهره أنه

لو أجريت أحكام المسلمين، وأحكام أهل الشرك لا تكون دار حرب .

(شامي، كتاب الجهاد، باب المستأمن، مطلب فيما تصيربه دارالإ سلام دار الحرب وبالعكس، زكريا ٦/٢٨٨، كراچي ٤/١٧٥، الموسوعة الفقهية الكويتية ١٠/٢٩٤، وهكذا في البزازيه، زكريا جديد ٣/١٧٢، وعلى هامش الهندية قديم٦/٣١٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۵؍ جمادی الثانیہ ۱۴۳۰ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸؍۹۷۶۱)	۱۵؍۶؍۱۴۳۰ھ

سودی بینک میں سودی لین دین کے حساب کی ملازمت کا حکم

سوال [۱۰۰۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید سودی بینک میں نوکری کرتا ہے، جہاں اسے سودی لین دین، حساب وکتاب کرنا پڑتا ہے۔

المستفتی: محمد زبیر، متعلم دار العلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک میں سودی حساب وکتاب لکھنے کی نوکری کرنا ناجائز اور حرام ہے، آنحضرت ﷺ نے سود لینے دینے والے اور اس کو لکھنے والے پر لعنت فرمائی ہے؛ البتہ اس نوکری پر جو تنخواہ ملتی ہے، وہ اپنے عمل اور محنت کی اجرت ہے، اس کا لینا اور استعمال کرنا جائز ہے، اور آپ کے ماتحت لوگوں کے لئے ان کی کمائی سے اپنے اخراجات پورے کرنے میں بھی از روئے شرع کوئی حرج نہیں ہے، اسی طرح ان کی دعوت قبول کرنا، ہدیہ کا لین دین اور مشترکہ قربانی وغیرہ یہ سب امور جائز ہیں؛ لیکن چونکہ ان کا ذریعۂ آمدنی حرام ہے؛ اس لئے ایسے لوگوں کے ساتھ مذکورہ معاملات میں احتیاط ہی بہتر ہے۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم آکل الربوا، ومؤکلہ، وکاتبہ، وشاہدیہ، وقال: ہم سواء. (مسلم شریف، باب لعن آکل الربا، ومؤکلہ، النسخۃ الہندیۃ، ۲/۲۷، بیت الأفکار رقم:۱۵۹۸،سنن النسائي، الزنیۃ، الموتشما، النسخۃ الہندیۃ ۲/۲۳۸، دارالسلام رقم: ۵۱۰۸)

الأجرۃ إنما تکون في مقابلۃ العمل. (شامي، کتاب النکاح، باب المہر، زکریا ۴/۳۰۷، کراچي ۳/۱۵۶)

یجیب دعوۃ الفاسق والورع أن لا یجیبہ. (ہندیۃ، کتاب الکراہیۃ والإستحسان، الباب الثاني عشر في الہدایا، والضیافات، زکریا قدیم ۵/۳۴۳، جدید ۵/۳۹۷)

والبقر والبعیر یجزی عن سبعۃ إذا کانوا یریدون بہ وجہ اللّٰہ تعالیٰ. (ہندیۃ، کتاب الأضحیۃ، الباب الثامن فیما یتعلق بالشرکۃ في الضحایا، جدید ۵/۳۵۱، قدیم ۵/۳۰۴)

عن أبي الحوراء السعدي، قال: قلت لحسن بن علي: ما حفظت من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم؟ قال: حفظت من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم دع مایریبک إلی ما لا یریبک الحدیث. (سنن الترمذي، باب بلا ترجمۃ، النسخۃ الہندیۃ ۲/۷۸، دارالسلام رقم: ۲۵۱۸) *فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم*

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍رجب المرجب ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/۱۰۴۶۴)

بینک کی ملازمت کی شرعی حیثیت

سوال [۹۰۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بینک کی ملازمت کسی قسم کی بھی یعنی چپراسی اور چوکیدار سے لے کر منیجر تک یا اس سے بھی اونچی پوسٹ کی کوئی ملازمت ہو جائز ہے یا ناجائز ہے؟

(۲) بینک کا منیجر یا کسی اور عہدے کا آدمی مثلاً چپراسی یا خزانچی وغیرہ اگر دعوت کرے یا ہدیہ تحفہ دے، تو اس کی دعوت کا قبول کرنا اور اس کے ہدیہ کا قبول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

(۳) ایک شخص کے پاس روزی روٹی کا کوئی انتظام نہیں ہے، مستحق زکاۃ ہے، اس کو بینک کی ملازمت مل رہی ہے وہ بینک کی ملازمت کرسکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ وہ دوسری ملازمت کی تلاش رکھے اور دوسری ملازمت ملنے پر بینک کی ملازمت ترک کردے؟

المستفتی: محمد نسیم کاسگنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) بینک کے اندر چپراسی، چوکی داری وغیرہ کی ملازمت جائز ہے۔ اور وہ ملازمت ناجائز ہے، جس میں سودی حساب وکتاب لکھنا پڑتا ہو۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم آکل الربوا، ومؤکله، وکاتبه، وشاهدیه، وقال: هم سواء. (مسلم شریف، باب لعن آکل الربا، ومؤکله، النسخة الهندیة، ۲/۲۷، بیت الأفکار رقم:۱۵۹۸، سنن الترمذي، باب ماجاء في آکل الربا، النسخة الهندیة ۱/۲۲۹، دارالسلام رقم: ۱۲۰۶، سنن النسائي، الزنیة الموتشمات، النسخة الهندیة ۲/۲۳۸، دارالسلام رقم:۵۱۰۸)

(۲) بینک کا سودی حساب وکتاب باعث لعنت ہے اور اس عمل کی وجہ سے لعنت کا مستحق ہوجائے گا؛ لیکن ملازمین کو جو تنخواہ ملتی ہے، وہ بہرحال ان کے لئے حرام نہیں ہے؛ کیونکہ ان کی تنخواہ میں سود کا پیسہ نہیں آتا؛ بلکہ ان کی تنخواہ ایسی ہے، جیسے دیگر سرکاری ملازمین کی تنخواہ ہوتی ہے؛ اس لئے اس کے یہاں دعوت وغیرہ قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

أهدیٰ إلی رجل شیئًا، أو أضافه إن کان غالب ماله من الحلال فلابأس إلا أن یعلم أنه حرام، فإن کان الغالب هو الحرام ینبغي أن لا یقبل الهدیة، و لا یأکل الطعام إلا أن یخبره بانه حلال ورثته، أو استقرضته من رجل، کذا في الینا بیع. (فتاوی عالمگیري، کتاب الکراهیة والإستحسان، الباب الثاني عشر

في الهدايا والضيافات، زكريا قديم ٥/٣٤٢، جديد ٥/٣٩٦، الفتاوى التاتار خانية، زكريا ١٨/١٧٥، رقم: ٢٨٤٠٥، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ٨/٧٣، رقم:٩٦١٧، البنايه اشرفية١٢/٢٠٩، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/١٨٦-١٨٧، مصري قديم ٢/٥٢٩، عيدن المسائل للسمر قندي، مطبع اسد بغداد ١/٤٧٨)

(۳) روزی روٹی کے لئے بینک کی ملازمت میں چپراسی اورکلرک وغیرہ کا عہدہ قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، مگر وہ عہدہ قبول کرنا جائز نہیں ہے، جس میں سودی حساب وکتاب لکھنا پڑتا ہو۔ حدیث میں اس پرلعنت آئی ہے۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، با ب لعن آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ٢/٢٧، بيت الأفكار رقم:١٥٩٨، سنن أبي داؤد، باب في آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية ٢/ ٤٧٣، دارالسلام رقم: ٣٣٣٣، سنن ابن ماجه، التجارات، التغليظ في الربا،النسخة الهندية ٢/١٦٥، دار السلام رقم: ٢٢٧٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۰۹۰۲)

سودی نظام والے محکمہ کی ملازمت کرنے کا حکم

سوال [۹۰۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ڈاکخانہ میں سرکاری نظام کے تحت سرمایہ کاری ہوتی ہے، جو ماہانہ قسط کی شکل میں ۱/۲/۳/۴/۵/ سال کے لئے ہوتی ہے، جس پر ۳/ یا ۴/ فیصد سود ملتا ہے، یہ سود جمع کنندہ اوراس کے سرکاری ملازم ہیڈ کو بھی ۲/ فیصد ملتا ہے؛ اس لئے جمع کنندہ کا ملازم وسود کا لینا اورایسے سودی نظام والے محکمہ میں ملازمت کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد عثمان ابن مرزا جی عبدالرحیم، کوکر پور سرائے کھجور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ڈاکخانہ میں سرکاری نظام کے تحت سرمایہ کاری میں جمع شدہ رقم پر جمع کنندہ کواسی طرح سرکاری ملازم کو جو۲/۳/۴/۵/ فیصد سود ملتا ہے، اس کا لینا اور ایسے سودی نظام والے محکمہ میں ملازمت کرنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ ۵/۱۴۷، ایضاح النوادر ۵/۱۴۹)

عن ابن مسعودؓ، قال: لعن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وشاهديه، وكاتبه. (سنن الترمذي، باب ماجاء في آكل الربا، النسخة الهندية ۱/ ۲۲۹، دارالسلام رقم: ۱۲۰۶)

عن عليؓ، قال: لعن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، قال آكل الربوا، ومؤكله، وشاهديه، وكاتبه. (مصنف عبد الرزاق، المجلس العلمي ۶/ ۲۶۹، رقم: ۱۰۷۹۱، مسند أحمد بن حنبل ۱/ ۸۳، رقم: ۶۳۵، ۶۶۰، ۶۷۱، ۸۴۴، ۱۲۸۹، ۱۳۶۴، ۳۷۲۵، ۳۷۳۷، ۴۳۲۷) فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۱۶/ محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۴۳۰)

سودی فنڈ یا بینک کی ملازمت کا شرعی حکم

سوال [۹۰۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اقتصادی اصلاحی اسکیم کے طور پر ایک ادارہ مسلم فنڈ نجیب آباد کے نام سے نجیب آباد ضلع بجنور میں قائم ہے، اس کے ایک شعبہ کا نام النجیب ملی موصل بنی فسٹ لمیٹیڈ ہے، اس کی ایک شاخ مرادآباد میں مصوری مارکیٹ پرنس روڈ میں بھی قائم ہے، یہ ادارہ اپنے بعض کھاتوں پر منافع دیتا ہے اور مقروض سے خرچہ لیتا ہے، جو ہر فیصد پر مقررہ تعداد میں ہوتا ہے، معلوم یہ کرنا ہے کہ مذکورہ بالا ادارہ سے وہ منافع لینا کھانا اور مقروض سے مقررہ فیصد خرچ

جو کہ اس وقت تیرہ روپیہ فی سیکڑہ ہے لینا جائز ہے یا نہیں؟ نیز اس ادارہ میں ملازمت کرنا جس کی تنخواہ مذکورہ بالا مد سے حاصل ہوتی ہے جائز ہے یا نہیں؟

(۲) سنڈی کیسٹ بینک جو کہ حکومت ہند کا قومیایا ہوا بینک ہے، اس سے ملنے والے منافع کا کیا حکم ہے؟ کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟ اگر کھانا جائز نہ ہو اور کوئی کھاتہ دار اپنے کھاتہ اور کتاب پر مندرج سود کی رقم کسی کو بلا ثواب کی نیت سے دینا چاہے، تو وہ رقم مقررہ ہی کھاتہ اور پاس بک سے نکال کر دینی ہوگی یا اتنی رقم اپنی جیب سے (کھاتہ سے الگ سے) اس سود کی رقم کی ادائے گی کی نیت سے نکال دے، تو بھی جائز ہوگا یا نہیں؟ جبکہ بینک والے سب رقم یکجا رکھتے ہیں اصل اور سود کی رقم الگ الگ نہیں رکھتے۔

المستفتی: مطلوب احمد، بچھرایوں، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تیرہ روپیہ فی سیکڑا سودی معاملہ ناجائز اور حرام ہے، اور ایسے فنڈ یا بینک کی ملازمت بھی جائز نہیں ہے۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم آکل الربوا، ومؤکلہ، وکاتبہ، وشاہدیہ، وقال: ہم سواء. (مسلم شریف، باب لعن آکل الربا، ومؤکلہ، النسخۃ الہندیۃ، ۲/ ۲۷، بیت الأفکار رقم:۱۵۹۸) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ ربیع الاول ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۴۱۸/۳۲)

سودی کمپنی میں ملازمت کرنے والے کی تنخواہ حلال ہے یا حرام؟

سوال [۹۰۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرا نام محمد جنید خاں ہے، میں ضلع بارہ بنکی میں رہتا ہوں، میں سہارا انڈیا

کے پیرابینکنگ ڈیویژن میں کام کرتا ہوں، سہارا انڈیا کمپنی کی شروعات ۱۹۷۸ء میں ہوئی تھی، جس میں لوگوں سے پیسے جمع کرانا اور میعاد پوری ہونے پر سود سمیت واپس کرنا تھا، کمپنی نے اس بزنس میں کافی ترقی کی اور بعد میں کمپنی نے دیگر بزنس بھی شروع کیں، جیسے لائف انشورنش، ہاؤسنگ پروجیکٹ، ہوٹل، ہسپتال وغیرہ میں اسی ڈویژن میں کام کرتا ہوں، جس میں پیسے کا لین دین ہوتا ہے، یعنی اس کی شکل بینک کی سی ہے، گذشتہ ۱۳؍ سالوں سے ملازمت کرر ہا ہوں، میرا کام کمپیوٹر پر کام کرنا ہے، جس کے عوض میں مجھے تنخواہ ملتی ہے، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میری ملازمت جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہیں ہے تو مجھے کیا کرنا چاہئے؟

(۱) میری ملازمت جائز ہے یا نہیں؟

(۲) اگر نہیں تو گذشتہ ۱۳؍ سالوں میں میں نے جو مال کمایا ہے، اس کا کیا استعمال ہے؟

(۳) جو رقم ہے اس سے کوئی روزگار کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

(۴) میں اپنی ملازمت فوراً چھوڑ دوں یا نہیں؟

(۵) کیا پیر بینکنگ کے علاوہ کسی دوسرے ڈویژن میں ملازمت جائز ہے؟ مہربانی کرکے تفصیل سے مسائل کے بارے میں جانکاری دیں؟

المستفتی: محمد جنید خاں، صدیق نگر، بارہ بنکی (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہاں پر دو باتیں الگ الگ طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔

(۱) جس طرح سود لینا اور دینا حرام ہے، اسی طرح سودی حساب وکتاب لکھنا بھی حرام اور باعث لعنت ہے؛ لہٰذا اگر آپ کا کام کمپیوٹر میں سودی حساب وکتاب لکھنا ہے، تو لعنت کے دائرہ میں آپ بھی داخل ہو جائیں گے اور جب تک حساب وکتاب لکھتے رہیں گے، تب تک مستحق لعنت رہیں گے۔

(۲) حساب وکتاب لکھنے کی محنت کا پیسہ یہ پیسہ آپ کے لئے حرام نہیں ہے؛ اس لئے

کہ یہ آپ کی محنت اور مزدوری کا پیسہ ہے؛ لہٰذا اب تک جو کمایا ہے اس کا استعمال آپ کے لئے جائز ہے اور چونکہ مستحق لعنت عمل ہوتا رہتا ہے؛ اس لئے ایسی ملازمت سے جہاں تک ہوسکے بچنے کی کوشش کر کے ہوٹل یا ہسپتال میں اپنا ٹرانسفر کرالیں یا کوئی دوسرا جائز روزگار تلاش کرلیں، اس میں پانچوں سوالات کے جوابات آچکے ہیں۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، باب لعن آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۸)

عن محمدؒ: رجل إستاجر رجلاً ليصور له صوراً، أو تماثيل الرجال في بيت، أو فسطاطٍ فإني أكره ذلك، وأجعل له الأجرة. (هندية، الباب السادس عشر في مسائل الشيوع في الإجارة، زكرياقديم ٤/٤٥٠، جديد ٤/٤٨٦، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٥/١٣٠، رقم: ٢٢٤٣١)

وإن إستاجره لينحت له طنبوراً، أو بربطاً، ففعل طاب له الأجر إلايأثم به. (هندية، زكريا قديم ٤/٤٨٦، جديد زكريا ٤/٤٥٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۰۱۹/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۴/۱۴ھ

بینک سے حاصل شدہ زائد رقم کا حکم

سوال [۹۰۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے دس ہزار روپیہ بینک میں جمع کیا اور کچھ مدت کے بعد اس کو بیس ہزار روپیہ ملا۔ اب یہاں پر کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ سود ہے؛ اس لئے برائے کرم جواب تحریر فرمادیں۔ یہ جو دس ہزار روپیہ ملا یہ سود ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد رضوان الحق، نعیمی عمری کلاں، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک سے زید کی اصل رقم کے علاوہ جو زائد دس ہزار روپئے ملے ہیں وہ سراسر سود کے ہیں؛ اس لئے کہ جمع شدہ رقم منافع کے ساتھ واپس آنے کا نام ہی سود ہے اور یہی زمانہ جاہلیت کا سود ہے، جس کی حرمت قرآن میں نازل ہوئی ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [البقرہ: ۲۷۵]

أما ربا النسيئة، فهو الأمر الذي كان مشهوراً متعارفاً في الجاهلية، وذٰلک أنهم كانوا يدفعون المال على أن يأخذوا على شهر قدراً معيناً، ويكون رأس المال باقياً، ثم إذا حل الدين طالبوا المديون برأس المال، فإن تعذر عليه الأداء زادوا في الحق والأجل، فهذا هو الربا الذي كانوا في الجاهلية يتعاملون به. (تفسير كبير للإمام الفخر الرازيؒ تحت تفسير رقم الآية:۲۷۵، من سورة البقره۷/۹۱، روح البيان ۲/۹۳، غرائب القرآن للنيساپورى ۲/۶۰، فقه السنة للسيد سابق ۳/۱۳۵- ۱۳۶) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵؍ ۶۷۹۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵؍ ۶؍ ۱۴۲۱ھ

بینک میں جمع شدہ رقم کے سود کا حکم

سوال [۹۰۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ یہ جو ہندوستان میں بینک میں روپیہ جمع کر کے اس روپیہ پر بیاج ملتا ہے، وہ لینا مسلمانوں کو جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر جائز ہے تو کس طریقے سے لیا جائے اور اس کو کہاں استعمال کیا جائے؟

المستفتی: محمد یعقوب، نگلہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اولاً توجہاں تک ہوسکے بلاضرورت بینک وغیرہ میں رقم جمع ہی نہ کی جائے اوراگر جمع کردی ہے، تواس پر ملنے والی فاضل رقم وہاں سے وصول کرلی جائے، چھوڑنا درست نہیں، اس کے بعد اگر حکومت کی طرف سے کوئی ناجائز اورجری ٹیکس آپ کے اوپر لگا ہوا ہے، تواس میں رقم کو استعمال کرلیں اوراگر کسی قسم کا ٹیکس نہیں ہے، تو پھر اس رقم کو بلانیت ثواب غرباء پرصدقہ کردیناواجب ہے۔

ويجب ردّه لو قائما ورد مثله، أو قيمته لو مستهلكا. (شامي، كتاب البيوع، باب الربا، زكريا ٣٩٩/٧، كراچي ١٦٩/٥، عزيز الفتاوى ٦٤٧/١، فتاوى محموديه ٢٠٣/٤، ڈابهيل ٣٨١/١٦، امداد المفتيين ٨٥٠/٢)

يردوا المال إلي أربابه، فإن لم يعرفوا أربابه، تصدقوا به. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الخامس عشر في الكسب، زكريا قديم ٣٤٩/٥، جديد ٤٠٤/٥)

يردوا المال إلي أربابه، فإن لم يعرفوا أربابه، تصدقوا به؛ لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه. (الموسوعة الفقهية الكوتية ٢٤٦/٣٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍رجب المرجب ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۲۳۵/۳۴)

سود حاصل کرنے کے لئے بینک میں رقم جمع کرنا

سوال [۹۰۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اس خط کے ساتھ دوسوال۔

(۱) سود کے متعلق۔

(۲) یٰسین شریف کے ختم کے متعلق ارسال خدمت ہیں امید کہ مفصل جواب مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

آج کل مدارس اسلامیہ، اوقاف دینیہ کی بڑی بڑی رقوم بینکوں میں کرنٹ کھاتہ میں جمع کی جاتی ہیں اور کرنٹ کھاتہ میں جمع شدہ رقم پر بینک سے سود نہیں ملتا، مگر اپنی ان رقوم سے بینک والے سودی کاروبار کے ذریعہ پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان رقوم کو بطور قرض دیکر لوگوں سے بہت زیادہ سود وصول کرتے ہیں تو بجائے اس کے کہ ہماری ان بڑی بڑی رقوم سے صرف بینک والے فائدہ اٹھائیں گے، اگر ہماری یہ رقم بینک سیونگ کھاتہ میں جمع کی جائے اور بینک سے جو سود ملے، اس سے غریب محتاج مسلمانوں کے لئے خرچ کیا جائے تو ہمارے ان مذہبی اداروں کی رقوم سے غریب مسلمانوں کو بھی بہت فائدہ ہوگا، تو کیا اس طرح بینک میں سیونگ کھاتہ میں پیسے جمع کرنا جائز ہے یا نہیں؟

چونکہ عام طور پر سیونگ میں پیسے جمع کرنا ناجائز سمجھا جارہا ہے، اور فتاوی کی کتابوں میں یہ مسئلہ بھی نظر سے گذرا ہے کہ بینک سے ملنے والا سود بینک میں نہ چھوڑنا چاہئے؛ بلکہ اس کو وصول کرلینا چاہئے۔ امید کہ تفصیلی جواب سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی: محمد اسماعیل احمد عبد اللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سودی رقم حاصل کرنے کی نیت سے بینک میں رقم جمع کرنا ناجائز اور حرام ہے اور بنص حدیث مستحق لعنت ہے؛ اگرچہ سودی رقم سے غریبوں کی مدد کرنا مقصود ہو؛ بلکہ سودی رقم غریبوں کو دیتے وقت اگر ثواب کا ارادہ کیا جائے، تو ایمان کے چلے جانے کا خطرہ ہے؛ کیونکہ حرام چیز سے ثواب کی امید حرام کو حلال سمجھنے کے مرادف ہے، جو بہت خطرناک ہے؛ اس لئے غریبوں کی مدد کی نیت سے سودی رقم حاصل کرنے کے لئے بینک میں رقم جمع کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔

رجل دفع إلى فقير من المال الحرام شيئًا يرجوبه الثواب يكفر .
(شامي، كتاب الزكاة، باب زكاة الغنم، مطلب في التصدق من المال الحرام، زكريا۳/ ۲۱۹، كراچي ۲/ ۲۹۲)

اس لئے بینک میں اس نیت سے رقم جمع کرنا جائز ہوتا ہے کہ وہاں محفوظ رہے گی، نہ کہ سود حاصل کرنے کے لئے اب اگر بلا اختیار بینک سے سود حاصل ہو جائے ،تو اس حرمت سے بچنے کے لئے علاج یہ ہے کہ بلانیت ثواب فقراء کو دیدیا جائے۔

ويريد أن يدفع مظلمة من نفسه فليس له حيله إلا أن يدفعه إلي الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلاميه ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث ۵۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ صفر المظفر ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۱۲۷)

ایف ڈی

سوال [۹۰۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بینک میں ایف ڈی آر پر بیاج جوڑ کر میعادی رقم دی جاتی ہے، اس کو لینا کیسا ہے؟

المستفتی: تفسیر احمد رشیدی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فکسڈ ڈپوزٹ (F.D.R) میں جو رقم جمع کی جاتی ہے، وہ اپنا مملوکہ سرمایہ ہوتی ہے، جو اپنے اختیار سے جمع کی جاتی ہے؛ لہٰذا اس پر جو اضافی رقم ملتی ہے وہ سود ہے اور اس کا استعمال جائز نہیں؛ البتہ اس رقم کو بینک سے نکال کر انکم ٹیکس اور بیع نامہ کی رجسٹری میں دینے کی گنجائش ہے، ورنہ نادار فقراء کو بلانیت ثواب دینا لازم ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [البقرہ: ۲۷۵]

عن فضالة بن عبيد صاحب النبي صلى الله عليه وسلم، أنه قال: كل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربا. (السنن الكبرى، كتاب البيوع، باب كل قرض جر منفعة، دارالفكر ۸/۲۷٦، رقم: ۱۱۰۹۲)

إذا كان عند رجل مال خبيث ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه......ويريد أن يدفع مظلمة عن نفسه فليس له حيلة الا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور قديم ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹)

ينبغي لمتصدق الحرام أن يزعم بتصدق المال تخليص رقبة و لا يرجوا الثواب منه. (العرف الشذي على هامش الترمذي ۱/۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/۱۰۲۳۹)

بینک میں ایف ڈی کرانا

سوال [۹۰۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کچھ روپیہ بینک میں جمع کردیا، اب وہ روپیہ پانچ سال کے بعد دوگنا ہوجاتا ہے، اسی طریقہ سے اس روپیہ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، اس شکل کو ایف ڈی کہا جاتا ہے، یہ شکل جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد افتخار سندھول، شاہجہاں پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک میں اس طرح روپیہ جمع کرنا کہ متعینہ مدت

کے بعد دوگنا یا کچھ بھی اضافہ کے ساتھ ملے، یہ صریح سود کی وجہ سے ناجائز ہے؛ اس لئے بینک میں ایف ڈی کرانا بھی جائز نہیں۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۷۵)

عن جابرؓ، قال: لعن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم آکل الربوا، ومؤکله، وکاتبه، وشاهدیه، وقال: هم سواء. (صحیح مسلم، باب لعن آکل الربا، ومؤکله، النسخة الهندیة، ۲/۲۷، بیت الأفکار رقم:۱۵۹۸، سنن الترمذي، باب ماجاء في آکل الربا، النسخة الهندیة ۱/۲۲۹) دار السلام رقم: ۱۲۰۶)

أما ربا النسیئة، فهوالأمر الذي کان مشهوراً متعارفاً في الجاهلیة، وذٰلک أنهم کانوا یدفعون المال علی أن یأخذوا علی شهر قدراً معیناً، ویکون رأس المال باقیاً، ثم إذا حل الدین طالبوا المدیون برأس المال، فإن تعذر علیه الأداء زادوا في الحق والأجل، فهذا هو الربا الذي کانوا في الجاهلیة یتعاملون به. (تفسیر کبیر للإمام الفخر الرازيؒ تحت تفسیر رقم الآیة:۲۷۵، من سورة البقره ۷/۹۱، روح البیان ۲/۹۳، غرائب القرآن للنسیاپوری ۲/۶۰، فقه السنة للسید سابق ۳/۱۳۵- ۱۳۶) **فقط واللّٰه سبحانه وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/۷۴۲۵)

فکس ڈپازٹ کرانے کا حکم

سوال [۱۱۰۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں ایک بیوہ عورت ہوں، میرے چھ چھوٹے بچے ہیں، میرے پاس تھوڑا سا روپیہ ہے، قرض لینے والے پریشان کرتے ہیں، اگر کسی کو بطور قرض کے دیدیا جائے، تو وہ واپس نہیں کرتے اور اگر بغرض تجارت بھی کسی کو روپیہ دیدیا جائے، تب بھی ہمیں کچھ نہیں ملتا۔

دریافت طلب یہ ہے کہ اپنے روپیہ کو فکس ڈپازت میں جمع کرسکتی ہوں، جس سے آئندہ چل کر میں اپنے بچوں کی شادیاں آرام سے کرسکوں؟

المستفتی: مولانا وسیم احمد، استاذ جامع الہدیٰ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فکس ڈپازٹ میں اس نیت سے رکھنا جائز نہیں ہے کہ اس کی سودی رقم سے بچوں کی ضروریات پوری کرنا ہے؛ اس کے لئے جائز اور بہتر مشورہ یہ ہے کہ شہر سے باہر معمولی قیمت کی زمین خرید کر ڈال دیں ڈپوزٹ سے زیادہ پیسہ ہوتا جائے گا اور حلال طریقہ سے وہ پیسہ حاصل ہوگا، فکس ڈپازٹ کا زائد روپیہ حلال نہیں ہے، یہ زمانہ جاہلیت کے سود کی طرح ہے جو کہ حرام ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۷۶)

أما ربا النسيئة، فهو الأمر الذي كان مشهوراً متعارفاً في الجاهلية، وذٰلک أنهم كانوا يدفعون المال على أن يأخذوا على شهر قدراً معيناً، ويكون رأس المال باقياً، ثم إذا حل الدين طالبوا المديون برأس المال، فإن تعذر عليه الأداء زادوا في الحق والأجل، فهذا هو الربا الذي كانوا في الجاهلية يتعاملون به. (تفسير كبير للإمام الفخر الرازيؒ تحت تفسير رقم الآية:۲۷۵، من سورة البقره۷/ ۹۱، روح البيان ۲/ ۹۳، غرائب القرآن للنسياپورى ۲/ ۶۰، فقه السنة للسيد سابق ۳/ ۱۳۵- ۱۳۶) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/ ۵۰۸۸)

ایف ڈی کرانے اور اس پر ملنے والے روپے کا حکم

سوال [۹۰۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرا چھوٹا کاروبار ہے، میرے یہاں یکے بعد دیگرے پانچ لڑکیاں پیدا

ہوئیں، میں نے ہرلڑکی کے نام پچیس ہزار روپیہ کی ایف ڈی کرادی تاکہ ان کی شادیوں کے وقت کوئی پریشانی نہ ہو۔اب تین لڑکیاں شادی کے لائق ہوگئیں اور ایف ڈی کا وقت بھی پورا ہورہا ہے۔اب یہ رقم تین لاکھ کچھ ہزار روپیہ بنتی ہے، میں نے اپنے محلّہ کی مسجد کے امام صاحب سے معلوم کیا تو انہوں نے کہا کہ یہ تمہارے لئے جائز ہے۔

بریلوی مکتب فکر کی لکھی ہوئی ایک کتاب انہوں نے مجھے دکھائی، جس میں لکھا تھا کہ ہندوستان میں بینک سے سود لینا جائز ہے، اس میں احناف کی معتبر کتابوں کا حوالہ تھا، مجھے اس میں تردد ہوا میں نے پھر دیوبند کے فارغ التحصیل ایک عالم سے رجوع کیا، انہوں نے کہا کہ آپ اس کولکھ کر بھیج دیں جو جواب آئے اس پر عمل کریں۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ میں اس پیسہ کولے کر اپنی بچیوں کی شادی میں صرف کرسکتا ہوں یا نہیں؟ اور اس سارے پیسوں کی مجھ پر زکوۃ فرض ہوگی یا نہیں؟ اور اس میں جو رقم بچے اسکو میں کاروبار میں لگا سکتا ہوں یا نہیں؟ جواب باحوالہ عنایت فرمائیں۔

المستفتی: نبی احمد نواب خیل سرائے ترین سنبھل، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ایف ڈی کرانا شرعاً درست نہیں، اس پر مدت متعینہ میں جو کچھ رقم کا اضافہ ہوا ہے، وہ سب سود ہے، جس کا استعمال مسلمانوں کے لئے قطعاً جائز نہیں۔قرآن وحدیث میں سود کھانے، نیز اس کے لین دین کا معاملہ کرنے والوں پر سخت ترین وعید آئی ہے؛ لہٰذا آپ مذکورہ حاصل شدہ رقم کو نہ بچیوں کی شادی میں استعمال کرسکتے ہیں اور نہ اپنے کاروبار میں؛ بلکہ اس رقم کا بلانیت ثواب فقراء کودیدینا ضروری اور لازم ہے۔

نیز محلّہ کی مسجد کے امام صاحب نے ہندوستان میں بینک سے سود کے جواز کی جو بات کہی ہے وہ درست نہیں، احناف کی کسی بھی کتاب میں اس طرح کی صراحت نہیں۔

قال اللہ تعالیٰ: يَمۡحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَيُرۡبِي الصَّدَقَاتِ. (البقرة: ۲۷۶)

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، باب ماجاء في آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم: ۱۵۹۸، مشكوة شريف ۲٤٤)

فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور قديم ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹)

لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه.

(الموسوعة الفقهية الكويتية ۳٤/۲٤٦)

آپ کے ذمہ اصل رقم جو تقریباً ایک لاکھ پچیس ہزار ہوتی ہے، کی زکاۃ بھی لازم ہے، اس کے علاوہ بقیہ مال حرام ہے، جس کے آپ مالک نہیں اس پر زکوۃ بھی لازم نہیں ۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/ ذیقعدہ ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۶۹۶۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۱۱/۱۹ھ

کسی تنظیم کا فلاح و بہبود کے لئے رقم جمع کر کے سود حاصل کرنے کا حکم

سوال [۹۰۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک تنظیم مسلم ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے نام سے قائم ہوئی ہے، جس کے اغراض ومقاصد میں قوم کی خدمت کے تحت اصلاحی اور تعلیمی کاموں کو فروغ دینا ہے، تنظیم کا فنڈ سردست ممبر سازی وقوم کے مخلصین لوگوں سے تعاون وامداد عطیات وجمع امانت قابل واپسی سے حاصل ہوگا، اس رقم کے تحفظ اور ملک کی قانونی پابندیوں کے لحاظ سے یہ رقم کسی سرکاری نیشنلائزڈ بینک میں تنظیم کے نام سے بینک کھاتہ کھول کر جمع کرائی جائے گی، جس پر

بینک سے سود بیاج بھی ملے گا، بینک سے جو سود ملے گا، اس سود کو تنظیم کن کاموں میں استعمال کر سکتی ہے۔ تنظیم کے اغراض و مقاصد میں یہ کام شامل ہیں۔

(۱) غریب ومساکین کی امداد کرنا۔

(۲) ضرورت مندوں و بیروزگاروں کو بنا سود قرض فراہم کرنا۔

(۳) غریب نادار بچوں کی تعلیم کا بندوبست کرنا۔

(۴) غریب نادار ضرورت مندوں کی تیمار داری اور ان کے علاج کے لئے مدد کرنا اور سہولیات مہیا کرانا۔

مندرجہ بالا مقاصد کو پورا کرنے کے لئے دیگر اخراجات بھی سامنے ہیں، جیسے دفتر کے لئے کرائے پر یا تنظیم کے نام جگہ خرید کر آفس قائم کرنا، فرنیچر، اسٹیشنری اور دفتر کے دیگر اخراجات و دفتری ملازمین کی تنخواہ وغیرہ۔ کیا تنظیم بینک میں تنظیم کا کھاتہ کھول سکتی ہے اور بینک کے کھاتہ پر ملے سود کو کن مقاصد میں خرچ کر سکتی ہے؟

برائے مہربانی اسلامی دائرہ میں رہتے ہوئے اور وقت اور ملک کے حالات کو دیکھتے ہوئے رہنمائی فرمائیں۔

المستفتی: عہدیداران، مسلم ڈیولپمنٹ، آرگنائزیشن، نجیب آباد، بجنور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سوال سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ تنظیم کا مقصد قوم کی فلاح و بہبود کے نام پر بڑی مقدار میں روپیہ حاصل کر کے بینک میں فکس ڈپازٹ کرا دینا ہے تاکہ اس کے آمدہ سود سے غریبوں وغیرہ کے تعاون کا انتظام کیا جائے، اگر واقعہ ایسا ہی ہے، تو نہ تو اس مقصد سے تنظیم بنانا جائز ہے اور نہ اس ارادے سے روپئے اکٹھے کرنے کی اجازت ہے اور ایسے روپئے سے جو سود آئے اس سے غریبوں کا تعاون بھی جائز نہیں ہے؛ اس لئے ایسی سود خور تنظیموں کو بند کر دینا لازم ہے؛ چونکہ

غریبوں کا تعاون محض مستحب ہے اور سود لینا قطعاً حرام ہے؛ لہٰذا کسی مستحب کام کے لئے حرام کا ارتکاب ہرگز جائز نہیں۔

نیز اگر عام مسلمانوں کو یہ پتہ چل جائے کہ یہ تنظیم سود لے کر اس کو عوام پر خرچ کرتی ہے، تو کوئی بھی مسلمان کبھی بھی اس کا تعاون کرنا پسند نہیں کرے گا۔

درء المفاسد أولى من جلب المصالح، فإذا تعارضت مفسدة ومصلحة قدم دفع المفسدة غالباً؛ لأن اعتناء الشرع بالمنهيات أشد من اعتناءه بالمأمورات. (الأشباه والنظائر، زكريا ٢٦٤، قواعد الفقه اشرفي ٨١، رقم:١٣٣)

درء المفاسد أولى من جلب المنافع،أي إذا تعارض مفسدة ومصلحة قدم رفع المفسدة ؛ لأن اعتناء الشرع بالمنهيات أشد من اعتناءه بالمأمورات. (شرح المجلة رستم اتحاد ٣٢/١، رقم المادة: ٣٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ جمادی الثانیہ ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۵۶۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۶/۵ھ

یتیم بچوں کے مستقبل کی خاطر ایف ڈی کرانے کا حکم

سوال [۹۰۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید ایک مسجد میں امام تھا، اس کی کچھ رقم بینک میں تھی، پھر ایک حادثہ میں زید کا انتقال ہوگیا اور پسماندگان میں ایک بیوی دو چھوٹی چھوٹی بچیاں اور ایک بچہ ماں کے پیٹ میں چھوڑا، کچھ احباب کے مشورہ سے بینک میں جمع شدہ رقم کو بچوں کے مستقبل کی خاطر ایف ڈی میں ڈال دیا گیا، اور بچوں کے تاؤ کو اس کا ولی بنا دیا گیا۔

یاد رہے کہ زید کے انتقال کے بعد بچوں کا خاطر خواہ کوئی ذریعۂ معاش نہیں ہے،

توسوال یہ ہے کہ اس ایف ڈی کی رقم کو بچوں کے نکاح وغیرہ میں اور دیگر اخراجات میں صرف کرنا شرعاً کیسا ہے؟ نیز ممنوع ہونے کی صورت میں اگر استعمال کی کوئی صورت بنتی ہے، تو مطلع فرمائیں۔

المستفتی: حافظ شیر علی، مدرس مدرسہ اعزاز العلوم ویٹ، غازی آباد (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ایف ڈی میں جو اصل رقم بچوں کے نام جمع کی گئی ہے، وہ رقم اگر بچوں کو تقسیم کرنے کے بعد ہر بچہ کو اتنی مقدار ملتی ہے، جس مقدار پر زکوۃ واجب ہوجاتی ہے، تو پھر ایف ڈی کی زائد رقم کو بچوں کے نکاح وغیرہ دیگر اخراجات میں صرف کرنا جائز نہ ہوگا؛ کیونکہ ایف ڈی میں اصل رقم سے جو زائد رقم ملتی ہے، وہ صریح سود ہونے کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہے اور اس کا بلا نیت ثواب فقیروں کو دیدینا ضروری ہے اور اگر وہ رقم تقسیم کرنے کے بعد ہر بچہ کو اتنی مقدار ملتی ہے، جس پر زکوۃ واجب نہیں ہوتی اور ان بچوں کے پاس کوئی سرمایہ بھی نہیں ہے، تو وہ بچے خود فقیر ہیں؛ لہٰذا وہ زائد رقم ان بچوں کے لئے استعمال میں لانے کی گنجائش ہے۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، با ب لعن آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ٢/ ٢٧، بيت الأفكار رقم:١٥٩٨، سنن أبي داؤد، باب في آكل الربا ومؤكله، النسخة الهندية٢/ ٤٧٣، دارالسلام رقم: ٣٣٣٣، مشكوة شريف، ٢٤٤)

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فإما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمة عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء؛ لكن لايريد بذلك الأجر والثواب؛ ولكن يريد دفع المعصية عن نفسه. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور قديم ١/ ٣٧، دارالبشائر الإسلامية ١/ ٣٥٩، تحت رقم

الحديث: ٥٩، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، شامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، تبيين الحقائق، مكتبه امداديه ملتان٦/٢٧، زكريا٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه ٨/٢٠١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۶۳۰/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۵/۸ھ

فقراء کو سودی رقم دینے کی غرض سے بینک میں روپئے جمع کرنے کا حکم

سوال [۹۰۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں مسلم فنڈ کا منیجر ہوں، بینک میں دو طرح کے کھاتے ہوتے ہیں: سیونگ، کرنٹ۔ سیونگ میں سود ملتا ہے اور کرنٹ میں سود نہیں ملتا ہے۔ میں سیونگ میں روپیہ جمع کرتا ہوں اور حاصل شدہ سود فقراء کو تقسیم کر دیتا ہوں، جس سے فقراء کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے، تو میرا سیونگ کھاتہ میں پیسہ جمع کر کے فقراء کی خوشنودی حاصل کرنا کیسا ہے؟ شرعی حکم تحریر فرمائیں۔

المستفتی: عبدالکریم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حفاظت کی غرض سے اگرچہ سیونگ وکرنٹ دونوں طرح کے کھاتوں میں رقومات جمع کرنے کی گنجائش ہے؛ لیکن محض فقراء کی خوشنودی کی نیت سے قصداً سود حاصل کرنے کے لئے سیونگ کھاتہ میں روپیہ جمع کرنا درست نہیں، اگر فقراء کے ساتھ خیر خواہی کا ارادہ اور خواہش ہو، تو اپنی حلال اور پاکیزہ کمائی کے ذریعہ فقراء کی مدد کریں، فقراء کو بہانا بنا کر سود حاصل کرنے کی غرض سے مذکورہ صورت کو اختیار کرنا درست نہیں۔ باقی یہ مسئلہ اپنی جگہ ہے کہ اگر کسی کے پاس سود کی رقم ہو، تو بلانیت ثواب فقراء اور محتاجوں کو دیدینا چاہئے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ ۹/۲۸۱، جدید زکریا ۹/۲۷۸)

وهو الحرام مطلقاً فإن علموا أربابه ردوه عليهم وإلا تصدقوه.

(شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره فصل في البيع، كراچي ٣٨٥/٦، زكريا ٥٥٤/٩، هندية، زكريا قديم ٣٤٩/٥، جديد ٤٠٤/٥، تبيين الحقائق، امداديه ملتان ٢٧/٦، زكريا ٦٠/٧، البحرالرائق، زكريا ٣٦٩/٩، كوئٹه ٢٠١/٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵؍۱۷۱۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۶؍۴؍۱۴۲۲ھ

بے سہارا شخص کو گذارے کے لئے بینک میں روپئے جمع کر کے سود حاصل کرنے کا حکم

سوال [۹۰۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص ہے، ان کے کئی لڑکے ہیں اور باپ صحت کی حالت میں ہے، لڑکے ان کی کوئی بھی خبر گیری نہیں لیتے یعنی کوئی بھی لڑکے نہ ان کو کھانا دیتے ہیں اور نہ ان کو پہننے کو کپڑا وغیرہ، دیتے ہیں، ہاں ان کے پاس کچھ زمین ہے، جس کی قیمت تقریباً ۲۰؍ہزار روپئے کی ہے، اگر اس زمین کو بیچ کر بینک میں جمع کر دیں اور اس کی جو رقم سود یا منافع کی شکل میں ملے، تو ان کے لئے استعمال کرنا درست ہوگا یا نہیں؟

دوسری بات یہ ہیکہ اگر اس پیسہ کو کسی کام میں شرکت کے طور پر دے بھی دیا جائے، تو آج کل کے دور میں اصل رقم کا ملنا تو درکنار، تو منافع کی کیا امید رکھی جائے اور دوسرے یہ کہ ان کے لڑکے کو معلوم ہونے پر لڑ مر کر ان سے روپئے چھین لیں گے، تو آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں بتلائیں کہ وہ شخص کون سی صورت اختیار کرے کہ ان کا گذر بسر بآسانی ہو جائے اور شرعاً ان کے لئے کوئی ممنوع بھی نہ ہو۔

المستفتی: محمد نذیر الدین، مونگیری، انجیر والی مسجد بھٹی اسٹریٹ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ان کے لئے ایسی صورت میں یہ شکل اختیار کرنا ضروری ہے کہ مذکورہ زمین فروخت کر کے اس کی قیمت سے اپنا گذارا کریں، سود حاصل کر کے اس سے گذارہ ہرگز جائز نہیں ہے، اگر مناسب شرکت کا معاملہ ہوجائے، تو ٹھیک ورنہ رأس المال ہی سے گذارا کریں۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فإما إن ملكه بعقد فاسد، أو حصل له بغير عقد ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمة عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور قديم ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، شامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/ ۲۹۲۵)

سودی رقم حاصل کرنے کی غرض سے بینک میں رقم جمع کرنے کا حکم

سوال [۹۰۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: احقر ایک سن رسیدہ آدمی ہے، میری زیر ملکیت ایک مکان ہے، جو میری رہائش کے کام آتا ہے اور تقریباً پندرہ بیگھہ قطعہ آراضی ہے، جو فی الحال مقدمہ بازی کی زد میں ہے، میرے تین بیٹے ہیں، جو مالی حیثیت سے اچھے ہیں؛ لیکن ان میں سے کوئی بھی میری اور میری اہلیہ کی کفالت کے لئے راضی نہیں ہے کاروبار اور مزدوری کے لئے بھی قوی جواب دے چکے ہیں؛ لہٰذا ان سب باتوں کے پیش نظر بندہ کے ذہن میں یہ

صورت آرہی ہے کہ بندے کے پاس جونقدی روپئے ہیں، ان کوکسی بینک میں جمع کردیا جائے اوراس کی اضافی رقم کو(جوآمدنی کے حوالے سے بینک والے دیتے ہیں) اپنی اوراہلیہ کی ذاتی ضروریات میں کام میں لایا جائے، آیا اس اضافی رقم کومیرے لئے اس شکل میں استعمال میں لانا جائز ہوگا یانہیں؟

المستفتی: صغیراحمد، جھبوکا نالہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک میں پیسہ جمع کرکے اس کے اوپر جوزائد رقم بطورنفع کے بینک کی طرف سے دی جاتی ہے، وہ سود ہے، اس کواپنے استعمال میں لانا درست نہیں اوراس ارادہ سے بینک میں پیسہ جمع کرنا بھی جائز نہیں۔

قال اللّٰہ تعالی: يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَأْكُلُوْا الرِّبَا اَضْعَافًا مُضَاعَفَةً . [آل عمران: ۱۳۰]

عن جابرؓ، قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم آکل الربوا، ومؤکلہ، وکاتبہ، وشاهدیه، وقال: هم سواء. (مسلم شریف، باب لعن آکل الربا، ومؤکلہ، النسخة الهندیة، ۲/ ۲۷، بیت الأفکار رقم: ۱۵۹۸، سنن النسائي، الزنیة الموتشمات، النسخة الهندیة ۲/ ۲۳۸، دارالسلام رقم: ۵۱۰۸) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۲۹/ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۶۸۱/۳۸)

بیوہ عورت کا میراث کی رقم بینک میں رکھ کرسود حاصل کرنا

سوال [۹۰۱۸]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک بیوہ عورت ہمارے اپنے وراثت میں ملے ہوئے پیسے بینک میں رکھ کر

اس کا بیاج کھاتی ہے؛ کیونکہ وہ تنہا اپنی بیٹی کے ساتھ رہتی ہے، کمانے والا کوئی نہیں ہے، تو اس کے لئے بیاج کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: فاروق دستگیر، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک سے حاصل شدہ سودی رقم حرام ہے؛ اس لئے مذکورہ بیوہ عورت کے لئے بہتر یہی ہے کہ وراثت سے ملی ہوئی رقم کے ذریعہ سے چھوٹی موٹی ایسی تجارت کرے، جس میں نقصان کا خطرہ کم ہو، پھر تجارت کے حلال نفع سے اپنا گذارا کرے اور ساتھ میں اس بات کا بھی خیال رکھے کہ دھوکہ اور فریب دینے والے لوگوں کے ہاتھوں میں رقم نہ پہنوچنے پائے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَأْكُلُوْا الرِّبَا اَضْعَافًا مُضَاعَفَةً . [آل عمران: ۱۳۰]

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. الآية [البقرہ: ۲۷۵]

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، باب لعن آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۸)

عن قتادة في هذه الآية " يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَأْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ، قال: التجارة رزق من رزق الله، حلال من حلال الله لمن طلبها بصدقها وبرها. (السنن الكبرى للبيهقي، باب إباحة التجارة، دارالفكر ۸/۸۶، رقم: ۱۰۵۳۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ رجب المرجب ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/ ۱۱۶۰۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸/۷/۱۴۳۵ھ

شادی کے لئے بینک میں سودی کھاتہ کھولنا

سوال [۹۰۱۹]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل جو بینک میں لڑکی کے نام سے اس کی شادی تک کے لئے رقم جمع کرتے ہیں، اور اس طرح بینک میں پندرہ سال کے لئے دو ہزار یا بائیس سو روپئے سالانہ جمع کرتے ہیں، صرف شادی کی نیت سے تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ پندرہ سال کے بعد وہ پورے ساٹھ ہزار یا زیادہ روپئے دیتے ہیں، تو اس طرح پالیسی بینک کی صحیح ہے یا نہیں؟ کیا مسلمان ایسا کر سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد ذاکر حسین، سکریٹری، مسجد جامع شاہی مزرعہ، نیر پی ٹی ایل ایس، پنجاب

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: شادی کے لئے بینک کے سودی کھاتے میں رقم جمع کرانا حرام ہے اور اس میں سے جو زائد پیسہ آتا ہے، وہ صریح سود ہے، اس کا استعمال قطعاً جائز نہیں ہے، فقیروں کو بلانیت ثواب صدقہ کر دینا لازم ہے، یا انکم ٹیکس کے نام سے جو روپیہ دیا جاتا ہے، اس میں استعمال کرے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ۲۰۳/۴، ڈابھیل ۳۸۱/۱۶)

لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه. (كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره فصل في البيع، زكريا ۵۵۳/۹، كراچي ۳۸۵/۶، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۴۶/۳۴)

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، باب لعن آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ۲۷/۲، بيت الأفكار رقم: ۱۵۹۸، سنن ابن ماجه، التجارات، التغليظ في الربا، النسخة الهندية

۲۷/ ۱٦٥، دارالسلام رقم: ۲۲۷۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۳۸۳/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۵/۱۶ھ

بیٹی کے نام سے بینک میں جمع شدہ رقم کے سود کو شادی میں خرچ کرنا

سوال[۹۰۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کچھ لوگ اپنی مالی کمزوری کی وجہ سے کچھ پیسہ بیٹی کے نام سے بینک میں جمع کردیتے ہیں اور وقت مقررہ پر دس روپیہ کے عوض میں بیس روپئے ملتے ہیں، وہ بیٹی کی شادی میں جہیز ونقد دیتے ہیں اور اگر جہیز نقد نہ دیں، تو بیٹی کی شادی میں بہت مشکل مسئلہ پیش آتا ہے۔

المستفتی: محمد صلاح الدین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک میں دس روپئے جمع کرنے پر وقت مقررہ پر جو مزید دس روپئے دیتے ہیں وہ صریح سود ہے، ان پیسوں کو شادی کے موقع پر جہیز میں خرچ کرنا یا نقد دینا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ۱۴۳)

الربا في الشرع عبارة عن فضل مال لا يقابله عوض في معاوضة مال بمال. (هندية، كتاب البيوع، الباب التاسع فما يجوز بيعه و ما لا يجوز الفصل السادس في تفسيرالربا و أحكامه، زكريا جديد۳/۱۱۸، قديم۳/۱۱۷، هداية اشرفي ۳/۷۸)

فأما إن ملكه بعقد فاسد، أو حصل له بغير عقد ولا يمكنه أن يرده على مالكه، ويريد أن يدفع مظلمة عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور قديم ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، هندية، زكريا قديم ۵/۳٤۹،

جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، شامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق، مكتبه امداديه ملتان ٦/٢٧، زكريا٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه ٨/٢٠١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ربیع الاول ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/۹۵۱۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۳/۱۷ھ

زکوۃ کی رقم کی ایف ڈی کرانا

سوال [۹۰۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ چند اشخاص نے مل کر بمد زکوۃ مجھے ایک رقم معقول دی، اس واسطے کہ میں ایک مکان برائے رہائش خریدوں؛ لیکن مکان کی خریداری میں وہ رقم ناکافی ہے، ایسی صورت میں کرایہ کا مکان ہی ہوسکتا ہے؛ لیکن سائل کی اس قدر آمدنی بھی نہیں ہے کہ کرایہ ادا کرسکے، کچھ حضرات نے یہ تجویز رکھی ہے کہ رقم کو بینک میں فکس ڈپازٹ کی شکل میں جمع کردیا جائے، اور اس کے سود سے کرایہ کی ادائے گی ہوجایا کرے۔

(۲) تو کیا زکوۃ دہندہ کی زکوۃ ادا ہوجائے گی؟

(۳) سائل کا اس قسم کا عمل مطابق شرع ہوگا؟

المستفتی: چمن بیگم، تمبا کو اسٹریٹ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: لوگوں سے بمد زکوۃ رقم وصول کرکے اس کو سود حاصل کرنے کے لئے ڈپازٹ کرانا سخت حرام اور مستحق لعنت ہے۔ نیز سودی رقم سے اپنے رہائشی مکان کا کرایہ ادا کرنا بھی ناجائز اور حرام ہے۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم آکل الربوا،

ومؤکله، وکاتبه، وشاهدیه، وقال: هم سواء. (مسلم شریف، باب لعن آکل الربا، ومؤکله، النسخة الهندیة، ۲/ ۲۷، بیت الأفکار رقم:۱۵۹۸)

(۲) زکوۃ دہندگان کو اگر یہ حرکت معلوم نہیں ہے، تو ان کی زکوۃ ادا ہوجائے گی اور پوری ذمہ داری ڈپازٹ کرانے والے پر ہوگی۔ نیز اگر ایک شخص نے پانچ چھ ہزار روپیہ دیدیا ہے، تو اب آپ مذکوۃ کا مصرف نہیں رہے۔ آپ کے لئے زکوۃ لینے کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔

نیز زکوۃ دہندگان کے لئے بھی اب آپ کو زکوۃ دینا جائز نہیں ہے، جان بوجھ کر پھر آپ کو زکوۃ دینے والے کی زکوۃ ادا نہ ہوگی۔ مزید اس پر ڈپازٹ کرانا سخت حرام ہے۔

(۳) سائل کا یہ عمل شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔ (ایضاح النوادر ۱/۱۷۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ ربیع الثانی ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۷۰۹/۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۳/۵ھ

مدرسہ کی رقم کو فکس ڈپازٹ میں رکھنا

سوال [۹۰۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مدرسہ کی کچھ رقم جو زکوۃ وغیرہ کی ہے، اس کو مدرسہ ہی کے فکس ڈپازٹ یعنی پانچ سال کے لئے بینک میں جو دوگنی رقم ہوجاتی ہے، اس میں جمع کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر ایسا ہوسکتا ہے، تو زائد جو رقم ملی اس کا استعمال مدرسہ کے کن کن کاموں میں ہوسکتا ہے؟

المستفتی: بشیر احمد قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مدرسہ کی زکوۃ کی رقم فکس ڈپازٹ میں رکھنا ہرگز جائز نہیں ہے، اور ڈپازٹ میں رکھنا سودی کاروبار ہے۔ نیز اس میں زکوۃ دہندگان کے ساتھ خیانت بھی ہے۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، باب لعن آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/۳۹۱۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۳/۱۳ھ

جمع شدہ رقم پر ساڑھے تین فیصد زائد ملنے والی رقم کا حکم

سوال[۹۰۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید ایک اسکول کا گورمنٹ مدرس ہے اور چونکہ گورمنٹ مدرس کے لئے یہ شرط ہوتی ہے کہ وہ آرڈی کے نام پر ڈاکخانہ میں پیسہ جمع کرے اور وہ جمع کیا جاتا ہے کہ اس کے بغیر تنخواہ نہیں نکلتی ہے اور ہر مہینہ کی قسط جمع کرانے میں اگر دیر ہوجائے، تو ۱۰/فیصد جرمانہ بھی پڑتا ہے، اور تین سال کے بعد وہ روپیہ واپس لے لیا جاتا ہے اور دوسری آرڈی شروع ہوجاتی ہے، تو ایسی صورت میں جمع کئے گئے روپیوں پر ساڑھے تین فیصد اضافی رقم ملتی ہے، تو کیا مجبوری کے طور پر جمع کی گئی رقم میں اضافی رقم جائز ہے؟ یا وہ اضافی رقم کسی مدرسہ یا مسجد میں صرف کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو اس کا صحیح مصرف کیا ہے؟ یا وہ اپنے استعمال میں لائی جاسکتی ہے اور رقم جمع کرنے میں جو دیر ہوئی ہے اور ۱۰/فیصدی جرمانہ دیا ہے، تو کیا وہ جرمانہ کی رقم اپنے استعمال میں لا سکتے ہیں؟

المستفتی: سالار پور، سیتا پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں اصل جمع کردہ رقم پر جو اضافی رقم ملتی ہے، وہ شرعاً سود کے دائرہ میں داخل ہے؛ لہٰذا اسے بینک سے نکال کر انکم ٹیکس،

سیل ٹیکس اور رجسٹری کی اسٹامپ فیس وغیرہ میں داخل کردیا جائے تو جائز ہے؛ اس لئے کہ مال حرام میں حکم شرعی یہی ہے کہ کسی بھی عنوان سے اصل مالک کو پہنچا دیا جائے ورنہ بلانیت ثواب مستحق زکوۃ فقراء پر تقسیم کرنا لازم ہوگا۔ اور وقت پر قسط جمع نہ کرنے کی صورت میں جرمانے کے عنوان سے دی ہوئی رقم کے بدلہ میں جو اضافی رقم ملتی ہے، اسے بینک سے نکال کر اپنے استعمال میں لانا جائز ہے؛ اس لئے کہ وہ اپنا ہی پیسہ ہے۔

لومات الرجل وكسبه من بيع الباذق، أو الظلم، أو أخذ الرشوة يتورع الورثة، ولا يأخذون منه شيئاً، وهو أولىٰ بهم ويردونها على أربابها إن عرفوهم، وإلا تصدقوابها؛ لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره فصل في البيع، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵، بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۳۲۵)

این آئی اے میں جمع شدہ رقم پر اضافی رقم کا حکم

سوال [۹۰۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ یوپی حکومت سے ملحق مدارس اسلامیہ کے اساتذہ کو حکومت کی جانب سے چھ مہینہ کے لئے این آئی اے کرانا ضروری ہوتا ہے اور این آئی اے کا مطلب یہ ہے کہ ہر مہینہ جو تنخواہ ملتی ہے، مدرس اس کو اپنے قبضہ میں لیتا ہے، پھر اس کے بعد مثلاً ایک ہزار روپیہ این آئی اے کے نام سے جمع کرتا ہے جو کہ ضروری ہے اور چھ مہینہ کے بعد اس کو جمع

شدہ رقم سے زائد رقم ملتی ہے، تو کیا یہ زائد رقم کا لینا درست ہے؟ سود تو نہیں ہے؟ جبکہ ایک جگہ سے جواز، دوسری جگہ سے عدم جواز کا فتویٰ آیا ہے، جو بھی ہو محقق بیان فرمائیں۔

المستفتی: مولوی محمد منور، ادری، مئو

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مدارس کی تنخواہ پر قبضہ کرنے سے پہلے حکومت تنخواہ ہی میں سے کاٹ لیتی ہے، تو اضافہ شدہ رقم جائز اور درست ہے؛ اس لئے کہ یہ سود کی تعریف کے دائرہ میں نہیں؛ کیونکہ شریعت میں سود کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ملکیت کا پیسہ دینے کے بعد پھر وہ پیسہ مع اضافہ کے واپس آجائے، اور جب مدرس نے اس پیسہ پر قبضہ نہیں کیا، تو اس پر ملک تام حاصل نہیں ہوئی؛ اس لئے اس پر جو اضافہ مل رہا ہے، وہ ایسا ہے جیسا کہ مدارس اسلامیہ میں پرائیویڈنٹ فنڈ جس طرح اس سے ملنے والا اضافہ جائز ہے، اسی طریقہ سے یہ بھی جائز ہے اور اگر یہ شکل نہیں ہے؛ بلکہ مدرس پہلے پوری تنخواہ پر قبضہ کر لیتا ہے، پھر قبضہ شدہ رقم میں سے متعین مقدار این آئی اے کے نام سے جمع کرتا ہے، تو اس پر جو اضافہ ملے گا وہ مدرس کے لئے حلال نہیں ہوگا؛ اس لئے کہ قبضہ کے بعد ملک تام حاصل ہو چکی، پھر اپنی ملکیت کا پیسہ جمع کر رہا ہے، تو اس پر یہ اضافہ مل رہا ہے؛ اس لئے سود کے دائرہ میں داخل ہے، ممکن ہے کہ جن علماء نے جائز لکھا ہے، وہ پہلی صورت کو مد نظر رکھا ہو اور جن علماء نے ناجائز لکھا ہو، وہ دوسری صورت کے پیش نظر ہو۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱۴۸- ۱۴۹- ۱۵۰، فتاوی رحیمیہ ۵/ ۱۴۷، جدید زکریا ۲/۱۵۲، احسن الفتاوی ۴/ ۲۶۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ر صفر المظفر ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۵۲۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۲/۲۴ھ

کاروبار میں لمٹ کرانے پر سود دینا

سوال [۹۰۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ مدعی کو کاروبار کے لئے بینک سے لمٹ کرانا ہے، جس پر مدعی کو سود دینا ہوگا، کیا کاروبار میں لمٹ کرانا اور اس پر سود دینا جائز ہے؟

المستفتی: عاصف بھائی، بُھٹی محلّہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس طرح سود لینا حرام ہے، اسی طرح سود دینا بھی حرام ہے، بس اتنا فرق ہے کہ سود لینے میں حرام کام دو ہیں۔ پہلا سود لینا، دوسرا سود کھانا۔ اور اس رقم کو اپنے استعمال میں لانا اور سود دینے میں صرف سود دینا کا گناہ ہوگا، کھانے کا نہیں۔ اپنے پاس حرام مال نہیں آیا۔ بہرحال دینا بھی فعل حرام ہے۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، باب لعن آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ۲/ ۲۷، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍صفر المظفر ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳؍ ۵۱۶۵)

پوسٹ میں کھاتہ کھلانے پر ملنے والی زائد رقم کا حکم

سوال [۹۰۲٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہم مدرسین کو R.D. پوسٹ میں رقم جمع کرنے کا کھاتہ خوشی سے اور کبھی سرکار کے حکم کے تحت کھولنا پڑتا ہے؛ لہٰذا جو زائد رقم یعنی ۵۰؍روپئے ماہوار کی کتاب کے تین ہزار جمع ہوتے ہیں اور چار ہزار ملتے ہیں، اس زائد رقم ایک ہزار کا خرچ کس مد میں کریں؟

المستفتی: رفیق ماسٹر، نزد درگاہ مسجد قاضی پورہ، چمن گاؤں سوامی، امراوتی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو رقم زائد ملے گی وہ واجب التصدق ہے، وہ آپ حضرات کے لئے حلال نہیں ہے۔

صرح الفقهاء: بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة والإستئجار على المعاصي والطاعات، أو بغير عقد كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه؛ ولكن إن أخذه من غير عقد ولم يملك يجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ رصفر المظفر ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/ ۱۱۳۵)

(۳) مسلم فنڈ

مسلم فنڈ کی ملازمت کی شرعی حیثیت

سوال [۹۰۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسلم فنڈ میں ملازمت کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: عبدالرشید قاسمی، سیڈھا، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسلم فنڈ میں جبکہ اس میں سودی حساب وکتاب نہ ہوتا ہو اور اسلامی اصول وضوابط کی پابندی ہوتی ہو، تو اس میں ملازمت جائز ہے؛ البتہ سودی حساب وکتاب لکھنے کی ملازمت جائز نہیں ہے۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلی الله علیه وسلم آکل الربوا، ومؤکله، وکاتبه، وشاهدیه، وقال: هم سواء. (مسلم شریف، باب لعن آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ۲/ ۲۷، بيت الأفكار رقم: ۱۵۹۸، سنن الترمذي، باب ما جاء في آكل الربا، النسخة الهندية ۱/ ۲۲۹، دارالسلام رقم: ۱۲۰۶، سنن ابن ماجه، التجارات، التغليظ في الربا، النسخة الهندية ۲/ ۱۶۵، دارالسلام رقم: ۲۲۷۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۴۶۳)

مسلم فنڈ کے خرچہ اخراجات کے لئے ایف ڈی کرانا

سوال [۹۰۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسلم فنڈ کے نام سے کمیٹی بنا کر لوگوں سے یہ کہہ کر روپیہ جمع کرانا اور کچھ رقم سرکاری بینکوں میں ایف ڈی آر کرا کر اس رقم سے کاغذوں کا خرچہ و ملازمین کی تنخواہ دینا اور امانت گروی رکھ کر اور اس پر کاغذوں کے خرچہ کے نام سے کچھ فیصدی لینا یہ سب جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد بنیانگر، دہرادون

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسلم فنڈ کی رقم کی بینک میں ایف ڈی کرا کر اس سے سود کی رقم حاصل کر کے کاغذوں کے خرچ اور ملازمین کی تنخواہ میں دینا ناجائز اور حرام ہے؛ البتہ کاغذوں اور ملازمین کی تنخواہ کے لئے فارم اور پاس بک کو امانت کی رقم رکھنے والے کے ہاتھ فروخت کیا جائے، تو جائز اور درست ہے، اسی طرح سامانوں کی حفاظت کے لئے جو لا کر رکھے جاتے ہیں، اس کا کرایہ مستقل امانت رکھنے والوں سے وصول کیا جا سکتا ہے اور یوں اس رقم سے تنخواہ وغیرہ کی ضرورت پوری کرنا بھی جائز ہوگا۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱۶۱ تا ۱۷۶)

وقال أبو يوسف لا يكره هذا البيع؛ لأنه فعله كثير من الصحابة وحمدوا على ذالک ولم يعدوه من الربوا حتى لو باع كاغذة بألف يجوز ولا يكره. (فتح القدير، كتاب الكفالة، زكريا ۱۹۸/۷، دارالفكر ۲۱۲/۷، كوئٹه ۳۲٤/٦، شامي، مطلب في بيع العينه، زكريا ۶۱۳/۷، كراچي ۳۲۵/۵-۳۲٦، در الحكام شرح در الأحكام ۳۰٤/۲)

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ. [البقرہ: ۲۸۲]

المودع إذا شرط الأجرة للمودع على حفظ الوديعة صح ولزم عليه.

(هندية، كتاب الوديعة، الباب الثالث في شروط يجب إعتبارها في الوديعة، زكريا قديم ٤/٣٤٢، جديد ٤/٣٥٤، بدائع الصنائع، كتاب الرهن، بيان ما ينعزل به العدل)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۹۹/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۴/۱۴۳۵ھ

سودی کاروبار کرنے والے مسلم فنڈ میں ملازمت

سوال [۹۰۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں مسلم فنڈ نجیب آباد والوں کی برانچ بڑھا پور میں ملازمت کرتا ہوں، جس میں سودی کاروبار ہوتا ہے، سودی لین دین کی شکل مندرجہ ذیل ہے۔

سود لینے کی صورت یہ ہے کہ سونے چاندی کے زیورات پر روپیہ دے کر اس پر خرچ بطور دس پرسینٹ کے حساب سے لیا جاتا ہے، مکان گاڑی زمین پر بھی لون لیا جاتا ہے، اس کے اندر سود بائیس پرسینٹ لیا جاتا ہے، سود دینے کی صورت یہ ہے کہ فنڈ میں تین طرح کے سودی کھاتے ہیں، فکس اس پر بارہ پرسینٹ دیا جاتا ہے، ایف ڈی اس پر دس پرسینٹ دیا جاتا ہے اور بینک میں بھی فنڈ کھاتہ ہے، جس میں فکس اور ایف ڈی دونوں کھاتے ہیں، فکس اور چالو دونوں کھاتوں سے سود حاصل ہوتا ہے، یعنی چالو کھاتہ پر چار پرسینٹ سود لیا جاتا ہے۔

نیز دفتر کے کرمچاریوں کو جو تنخواہ دی جاتی ہے، وہ سب اسی رقم میں سے دی جاتی ہے، تو کیا میں اس حالت میں اس بینک کے اندر نوکری کرسکتا ہوں؟ اس طرح سود کا لین دین کرنا کیسا ہے درست ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں مذکور مسلم فنڈ میں سودی معاملہ کی وجہ سے ملازمت کرنا جائز نہیں ہے اور اس میں روپیہ کا لین دین بھی درست نہیں۔ حدیث شریف میں ہے۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (صحيح مسلم، باب لعن آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍محرم الحرام ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/۵۹۸۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۱/۲۱ھ

مسلم فنڈ کا فارم کے نام پر قرضدار سے رقم وصول کرنا

سوال [۹۰۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں مسلم فنڈ نام کا ایک ادارہ ہے، جو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے قائم کیا گیا ہے، فنڈ کی بابت درج ذیل امور میں قرآن حکیم اور احادیث رسول کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔

(۱) فنڈ سے امانت رکھنے کے بعد جو قرض لیا جاتا ہے، اس پر فنڈ کے ذریعہ ایک ہزار روپیہ پر ہر چھ ماہ کے لئے چھیاسٹھ روپیہ مطالبہ فارم کے نام پر وصول کیا جاتا ہے، اس طرح دو ہزار کے لئے چھیاسٹھ روپیہ کا دوگنا یعنی فی ہزار روپیہ پر چھیاسٹھ روپیہ لیا جاتا ہے، قرضدار اگر چھ ماہ میں روپیہ ادا نہ کر پائے، تو اس فارم پر ایک سو بتیس روپیہ فی ہزار روپیہ وصول کیا جاتا ہے، اس روپیہ سے ہی فنڈ کے کارکنان کی تنخواہ ودیگر اخراجات پورے کئے جاتے ہیں۔

براہ کرم اس مسئلہ میں فرمائیں کیا اس طرح فنڈ کو روپیہ لینا جائز ہے؟ اور پھر اس طرح

کی شرط کے ساتھ فنڈ سے قرض لینا جائز ہے؟ اس طرح سے لئے گئے روپیہ سے کیا کسی تعلیمی ادارہ یعنی دینی تعلیم کا کام چلایا جا سکتا ہے یا نہیں؟

(۲) اگر یہ درست نہیں ہے، تو ایسا انتظام کرنے والے لوگوں کا شرعی حکم کیا ہے؟

(۳) ایسے شخص کا کسی بھی اسلامی ادارہ کا ذمہ دار اور اس کی امانت کے بارے میں کیا حکم ہے؟

نوٹ: آج کل قومی سطح کے بینکوں کے ذریعہ جو قرض عوام کو دیا جاتا ہے، اس کا سود بھی تقریباً چھیاسٹھ روپیہ فی ہزار چھ ماہی بیٹھتا ہے، یہ بات بھی فتوی لکھتے وقت براہ کرم ذہن میں رکھیں۔

المستفتی: محمد یوسف ٹانڈہ بادلی، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسلم فنڈ میں بطور امانت کوئی چیز رکھ کر قرض لیتے ہوئے، مذکورہ طریقہ پر چھیاسٹھ روپیہ فی ہزار چھ ماہی مطالبہ یا معاہدہ فارم کے نام پر وصول کرنا فنڈ کے لئے جائز ہے؛ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے اندر آیت مداینت میں معاملہ قرض کے معاہدہ نامہ لکھوانے اور اس کے اخراجات کا ذمہ دار مستقرض کو قرار دیا ہے اور اجرت کتابت کی مقدار متعین نہیں فرمائی ہے۔

وقال اللّٰہ تعالیٰ: وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ. [البقرہ: ۲۸۲)

البتہ قرض کی مدت ختم ہونے پر معاملہ کا اختتام کر دیا جائے اور قرض خواہ سے کہہ دیا جائے کہ اپنے زیورات (یا جو بھی چیز بطور امانت فنڈ میں جمع ہے) واپس لے لیا جائے اور قرض ادا کر دیا جائے اور اگر اس کے پاس ادا کرنے کے لئے کوئی چیز نہ ہو، تو وہ کہیں سے قرض لے کر دیدے، پھر دوبارہ معاملہ شروع کیا جائے؛ لیکن پہلا معاملہ ختم کئے بغیر فارم وہی رہے اور اسی فارم پر تجدید کر کے فارم قرض کی قیمت از سر نو لی جائے، یہ درست نہیں ہے۔

اب رہی یہ بات کہ آج کل بین الاقوامی سطح پر بینکوں کا جوسودی نظام ہے، تو وہ در حقیقت بینک سے قرض شدہ نفس رقم کے مقابلہ میں ہوا کرتا ہے، یہ بالکل حرام اور ناجائز ہے؛ اس لئے کہ حدیث شریف میں ایسے قرض کے معاملہ کو سود قرار دیا گیا ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۶۵، فتاوی محمودیہ ۶/۲۲۶، ڈابھیل ۱۶/۳۳۳)

عن فضالة بن عبيد صاحب النبي صلى الله عليه وسلم، أنه قال: كل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربا. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، كتاب البيوع، باب كل قرض جر منفعة فهو ربا، دارالفكر ۸/۲۷٦، رقم: ۹۲-۱۱)

عن عليؓ قال: كل قرض جر منفعة فهو ربا. (كنز العمال، كتاب الدين والسلم، دارالكتب العلمية بيروت ٦/۹۹، رقم: ١٥٥١٢، جامع الأحاديث الكبير للسيوطي ٦/٤٣٨، رقم: ١٥٨٢١)

يستحق القاضي الأجر على كتب الوثائق، والمحاضر، والسجلات قدر ما يجوز لغيره كالمفتي. قال ابن عابدين: قال في الجامع الفصولين: للقاضي أن يأخذ ما يجوز لغيره (إلى قوله) كثقاب اللآلي مثلاً لا يأخذ الأجر على قدر مشقته، فإنه لا يقوم بمؤنته. (الدر المختار مع الشامي، كتاب الإجارة، باب فسخ الإجارة، مطلب في أجرة القاضي والمفتي، زكريا ٩/١٢٧، كراچي ٦/٩٣)

(۲/۳) یہ طریقہ جواب نمبر ۱/ کے مطابق ہو، تو درست ہے؛ لہٰذا ایسے کام کرنے والے حضرات ذی رائے متدین تجربہ کار مستقل مزاج اور قادر علی النظم ہوں، تو ان کو کسی اسلامی ادارہ کا ذمہ دار بنایا جا سکتا ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۷/۱۶۱، جدید ڈابھیل ۹/۵۴۷)

قال العلائي فلو مأمونا لم تصح تولية غيره. (الدر المختار، كتاب الوقف، مطلب في عزل الناظر، زكريا ٦/٥٨٠، كراچي ٤/٣٨٢)

قال ابن عابدين: قال في الاسعاف: ولا يولي إلا أمين قادر بنفسه.

(الدر المختار مع الشامي، كتاب الوقف، مطلب في شروط المتولي، زكريا ٦/٥٧٨، كراچي ٤/٣٨٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ ذی قعدہ ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳۳۳/۱۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۱۱/۴ھ

سودی رقم سے ملازم کی تنخواہ

سوال [۹۰۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسلم فنڈ جس میں عوام وخواص رقم اور زیورات جمع کرتے ہیں، جس کی صورت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی نقد رقم مسلم فنڈ میں جمع کرتا ہے، تو مسلم فنڈ اس کو کوئی بیاج یا سود کی رقم نہیں دیتا؛ بلکہ عین رقم واپس کرتا ہے، اور اس کے برخلاف اگر کوئی شخص مسلم فنڈ سے قرض لیتا ہے، اور اس کے عوض زیورات گروی رکھتا ہے، تو فنڈ والے یوں کہہ کر کہ زیورات کی حفاظت ہمارے ذمہ ہے، کچھ فیصد اجرت لیتے ہیں اور پھر اسی رقم سے ملازمین کی تنخواہ کا بندوبست کرتے ہیں، معلوم یہ کرنا ہے کہ ایسی شکل میں جبکہ بیاج اور سود کی رقم سے ملازمین کی تنخواہ کا انتظام ہو، تو ملازمت کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد طیب تجویدی، میوانو ادہ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مسلم فنڈ کے لئے زیورات وغیرہ رہن اور گروی رکھنا اور اس کی حفاظت کی اجرت لینا، حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جائز ہے اور دیگر ائمہ کے نزدیک جائز نہیں؛ لہٰذا غریبوں کو قرض دینے کے لئے مسلم فنڈ چلانے کے واسطے امام ابو یوسفؒ کے قول پر عمل کی گنجائش ہے۔

نیز فارم کی فروختگی اور اس کی خانہ پوری کی اجرت کے نام سے لینا بھی جائز ہے؛

لیکن فیصد کے اعتبار سے لینا درست نہیں ہے، ہاں البتہ فارموں میں الگ الگ نمبر قائم کئے جائیں کہ فارم نمبر ا اتنا، اتنی قیمت کا ہے اور فارم نمبر فلاں، فلاں قیمت کا ہے، اس طرح کی گنجائش ہے اور بیاج کے نام سے لینا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ا/۱۶۵تا ۱۷۲)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ / صفر ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸ / ۹۴۴۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۲/۸ھ

مسلم فنڈ میں قرض کی مدت پوری ہونے کے بعد دوبارہ فیس وصول کرنا

سوال [۹۰۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے مسلم فنڈ بچھرایوں (النجیب) سے یہ سوچ کر قرض لیا (جیسا کہ سنا تھا) کہ یہاں بغیر سود کے قرض دیا جاتا ہے، اپنی بیوی کا زیور رکھ کر قرض لیا؛ لیکن جب زیور لینے گیا، تو انہوں نے 3% کا سود لیا، تو کیا کسی مسلم ادارے کو ایسا کرنا جائز ہے؟ کیا کسی مسلمان کو ایسے ادارے سے قرض لینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: ڈاکٹر سخاوت حسین صدیقی، جے پی نگر (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مسلم فنڈ کے لئے پہلی مرتبہ خانہ پوری کے وقت فیس لینا جائز ہے، اس کے بعد دوبارہ زیورات کی واپسی کے وقت یا واپسی میں تاخیر ہونے کی وجہ سے کسی قسم کا پیسہ لینا جائز نہیں، اگر لیں گے تو وہ سود ہے؛ لہٰذا مسلم فنڈ النجیب میں بھی فارم کی خانہ پوری کے وقت کے علاوہ دیگر مواقع میں زیورات کی واپسی کے وقت یا سالہا سال کی تاخیر کی وجہ سے دوبارہ فارم کی خانہ پوری کے واسطے فیس لینا ناجائز اور حرام ہے؛ اس لئے کہ مدت پوری ہونے کے بعد دوبارہ فیس کے نام سے پیسہ وصول کرنا قرض کی

ادائے گی میں تاخیر کی بناء پر سود میں اضافہ کرنے کے مرادف ہے، جو زمانۂ جاہلیت کے سودی معاملہ کے حکم میں ہے، جس کی شریعت نے ہرگز اجازت نہیں دی ہے۔

أما ربا النسيئة، فهو الأمر الذي كان مشهوراً متعارفاً في الجاهلية، وذٰلک أنهم كانوا يدفعون المال على أن يأخذوا على شهر قدراً معيناً، ويكون رأس المال باقياً، ثم إذا حل الدين طالبوا المديون برأس المال، فإن تعذر عليه الأداء زادوا في الحق والأجل، فهذا هو الربا الذي كانوا في الجاهلية يتعاملون به. (تفسير كبير للإمام الفخر الرازيؒ تحت تفسير رقم الآية: ۲۷۵، من سورة البقرة ۷/ ۹۱، روح البيان ۲/ ۹۳، غرائب القرآن للنيساپورى ۲/ ۶۰، فقه السنة للسيد سابق ۳/ ۱۳۵ - ۱۳۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ رربیع الثانی ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۱۰۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۴/۷ھ

❀ ❀ ❀

(۴) باب کاروبار میں سود کی شکلیں

سودی کاروباری ملعون ہیں

سوال [۹۰۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سود کی حرمت قرآن سے ثابت ہونے کے باوجود دین کے اہم ترین مرکزوں میں سودی لوگوں کے تعاون کو بلاخوف وخطر لیا جانے لگا، تو کیا سود کی حرمت کا خوف انسانوں کے اندر باقی رہے گا؟ یا ختم ہوجائیگا؟ اس لئے آپ سے ہماری گزارش ہے کہ ان مسائل پر شریعت حقہ کی روشنی میں نہایت تفصیل کے ساتھ جواب عنایت فرمائیں نوازش ہوگی۔

المستفتی: محمد قمر ٹانڈہ بادلی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خوف انسانوں میں باقی رہے گا یا نہیں؟ ان لوگوں سے دریافت فرمائیں، جو سودی کاروبار کرتے ہیں کہ ان کو خوف کا تجربہ ہورہا ہوگا، رہا اس کا حکم وانجام سو آنحضور ﷺ نے سود لینے والے، دینے والے، اس کے کاغذات لکھنے والے اوراس کا گواہ بننے والے، سب پر لعنت فرمائی ہے۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم آکل الربوا، ومؤکله، وکاتبه، وشاهدیه، وقال: وهم سواء. (صحیح مسلم، باب لعن آکل الربا، ومؤکله، النسخة الهندیة، ۲/ ۲۷، بیت الأفکار رقم:۱۵۹۸، سنن أبي داؤد، باب في آکل الربا ومؤکله، النسخة الهندیة ۲/ ۴۷۳، دارالسلام رقم: ۳۳۳۳) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۱۳/ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/ ۶۲۳)

سودی لین دین عقد تجارت ہے یا مضاربت؟

سوال [۹۰۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے ۵۰۰۰/روپئے بینک میں جمع کئے، بینک کی طرف سے زید کو ۷/سال یا ۴/سال کے بعد ۱۰۰۰۰/روپئے ملیں گے،تو یہ ۵۰۰۰/روپئے جو زید کو زائد ملے، اس کے لئے جائز ہیں یا نہیں؟ دلیل میں وہ یہ پیش کرتا ہے کہ حکومت میرے روپئے سے تجارت کرتی ہے، اس کو جو منافع ہوتا ہے،اس میں سے دیتی ہے۔

المستفتی: بشیر احمد، بھوجپوری، سکرہٹہ خورد (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک میں رقم جمع کرنے کا جو طریقہ رائج ہے، اس میں شرعی عقد تجارت یا مضاربت کی کوئی صورت صادق نہیں آتی؛ اس لئے جو زائد رقم حاصل ہوتی ہے،وہ مال خبیث اور حرام ہے،اس کو صدقہ کردینا واجب ہے۔

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق، فأما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة والإستئجار على المعاصي و الطاعات، أو بغير عقد كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه (إلى قوله) يجب عليه أن يصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۳۷/۱، دارالبشائر الإسلامية، ۳۵۹/۱، تحت رقم الحديث: ۵۹، هندية، زكريا قديم ۳۴۹/۵، جديده/۴۰۴، شامي، زكريا ۵۵۳/۹، كراچي ۳۸۵/۶، الموسوعة الفقهية الكوتية ۲۴۶/۳۴، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ۲۷/۶، زكريا ۶۰/۷، البحر الرائق، زكريا ۳۶۹/۹، كوئٹه ۲۰۱/۸) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳۶۵/۲۷)

مسلمانوں کا ہندؤں کے ساتھ سودی کاروبار کرنا

سوال[۹۰۳۵]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ غیر مسلموں ہندؤں وغیرہ سے سود کا لینا اور دینا کیسا ہے؟ جواب میں پیدا ہونے والے امور کالحاظ رکھنا بہت ضروری ہے۔

المستفتی: سعیداحمد کاشی پور، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیر مسلموں ہندؤں وغیرہ سے بھی سود لینا اور دینا دونوں ناجائز اور حرام ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ۲۴۰/۴، جدید ڈابھیل ۳۷۷/۱۶، امدادالفتاوی ۱۵۷/۳)

قال اللّٰہ تعالیٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ. [سورة البقرہ: ۲۷۸]

ولا بين حربي، ومسلم مستأمن، ولو بعقد فاسد، أو قمار.

(الدر مع الرد، كتاب البيوع، باب الربا، زكريا ۷/ ۴۲۲-۴۲۳، كراچي ۵/۱۸۶)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/صفر المظفر ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۰۹/۲۳)

کاروبار میں لگی ہوئی سٹہ کی رقم کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال[۹۰۳۶]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سٹہ کا روپیہ کاروبار میں لگا ہوا ہے، اس کے پاک ہونے کی کوئی

صورت ہے یا نہیں؟ اس کے استعمال کا کیا طریقہ ہے؟

المستفتی: طفیل احمد، نوبت خاں، امروہہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جتنی رقوم کاروبار میں لگائی گئیں ہیں، ان کی بقدر رقوم اصل مالک کو واپس دینے سے انشاء اللہ پاک ہو جائے گا، اگر مالک تک رسائی کسی بھی طرح ممکن نہ ہو تو اتنی مقدار فقراء کو دید یجئے۔

یرد المال إلی أربابه، فإن لم یعرفوا أربابه تصدقوا به. (هندیة، کتاب الکراهیة والإستحسان، الباب الخامس عشر في الکسب، زکریا جدید ۵/۴۰۴، قدیم ۵/۳۴۹)

لو مات رجل وکسبه من بیع الباذق، أو الظلم، أو أخذ الرشوة یتورع الورثة ولا یأخذوا منه شیئاً، وهو أولی لهم، ویردونها علی أربابها إن عرفوهم، وإلا تصدقوا بها؛ لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبه. (تبیین الحقائق، کتاب الکراهیة، فصل في البیع، زکریا ۷/۶۰، امدادیة ملتان ۶/۲۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ ذی قعدہ ۱۴۰۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/ ۳۵۹)

سٹے میں جیتی ہوئی رقم کاروبار میں لگانا

سوال [۹۰۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سٹہ میں جیتی ہوئی رقم کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اس رقم کو اپنے کاروبار میں لگا سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: طفیل احمد، نوبت خاں، امروہہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اپنے کاروبار میں لگانا حرام ہے؛ بلکہ اس کے مالک کو واپس کرنا واجب ہے اور اگر مالک تک رسائی ممکن نہ ہو، تو فقراء کو بلا نیت ثواب دیدینا واجب ہے۔

صرح الفقهاء بان من اكتسب مالا بغير حق (إلى قوله) يجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، الموسوعة الفقهية الكوتية ۳۴/۲۴۶، شامي، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵، البحرالرائق، زكريا ۹/۳۶۹، كوئٹه ۸/۲۰۱) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ ذی قعدہ ۱۴۰۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵۹/۲۳)

نفع میں رقم کی مقدار کو متعین کرنا

سوال [۹۰۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے خالد کو ایک لاکھ روپیہ دیا، خالد نے اس سے کپڑا خریدا اور زید وخالد میں یہ طے ہوا کہ یہ ایک لاکھ اپنی جگہ باقی رہے گا، اور جو نفع ہوگا، اس میں سے ۴۰۰/ روپیہ ہفتہ زید کو دے گا، بقیہ نفع اپنے پاس رکھے گا، تو شرعاً یہ شکل جائز ہے؟

(۲) اگر زید اس نفع کے پیسہ کو لے لے، تو اب اسے واپس کرنا ضروری ہوگا یا نہیں؟ کیا حکم ہے؟

المستفتی: حافظ محمد حنیف، لال مسجد، سرائے ترین، سنبھل، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) یہ معاملہ شرعاً عقد مضاربت میں داخل نہیں ہے اور نہ ہی عقد شرکت میں؛ لہٰذا اس طرح کی شرط جائز نہیں ہے؛ ہاں البتہ اگر اس طرح شرط لگائی جاتی کہ نفع میں سے ثلث یا نصف کوئی ملا کرے گا، تب جائز ہوتا؛ لہٰذا یہ معاملہ شرعاً جائز نہیں ہے اور اس طرح کا روپیہ لینا شرعاً سود میں داخل ہے اور دیئے ہوئے روپئے قرض کے حکم میں ہیں اور قرض کے بدلے نفع حاصل کرنا سود ہے اور سود کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [سورة البقره: ۲۷۵]

إلا بالمال الذي تصح به الشركة، وهو أن يكون رأس المال دراهم، أو دنانير، عندهما رحمهما الله، أو فلوساً رائجة، عند محمدؒ و بما سواه لا يجوز وبه قالت الأئمة الثلاثة ونص في الذخيرة أنه إجماع. (البناية، كتاب المضاربة، اشرفيه ۱۰/ ٤٦)

(۲) جب زید نفع کے پیسے لے لے، تو اس صورت میں اس رقم کو اصل مالک کی طرف لوٹانا لازم ہے، اور مالک نہ ہونے کی صورت میں اس کے وارثین کو دیدیا جائے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۷/ ۲۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ ربیع الاول ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۰۵۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۳/۴ھ

ایک لاکھ قیمت طے ہونے کے بعد ایک لاکھ بیس ہزار لینا

سوال [۹۰۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہم نے کمپنی سے ایک لاکھ روپیہ کی زمین خریدی، کمپنی نے رقم پا کر زمین کا بیع

نامہ ہمارے پاس بھیج دیا، اب کمپنی پانچ سال کے لئے زمین اپنے پاس رکھتی ہے، تاکہ اس میں کچھ کام کرکے اس سے فائدہ اٹھائے، اب اگر ہم اس آمد میں سے ایک فیصد حصہ اپنے نام سے لیں تاکہ پانچ سال کے بعد ہمیں وہ رقم مل جائے، یعنی ایک لاکھ کے ایک لاکھ بیس ہزار، تو کیا یہ زیادہ رقم لینا ہمارے لئے جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ کمپنی پانچ سال کے بعد بائع سے یہ کہہ دیتی ہے کہ یہ زمین لے لو یا ایک لاکھ کے عوض ایک لاکھ بیس ہزار روپیہ لے لو، تو کیا یہ زیادتی کی رقم لے سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: شریف احمد، نصیر پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زمین کا لینا تو جائز ہے، مگر ایک لاکھ کے عوض ایک لاکھ بیس ہزار لینا جائز نہیں ہے، بیس ہزار سود کے دائرہ میں داخل ہے؛ اس لئے یہ طریقہ جائز نہیں ہے۔

الربا: هو الفضل المستحق لأحد المتعاقدين في المعاوضة الخالي عن عوض شرط فيه. (هداية، كتاب البيوع، باب الربا، اشرفي ۷۸/۳)

الربا في الشرع عبارة عن فضل مالٍ لا يقابله عوض في معاوضة مالٍ بمالٍ. (هندية، الفصل السادس في تفسير الربا وآحكامه، زكريا جديد ۱۱۸/۳، زكريا قديم ۱۱۷/۳)

الربا: هو الفضل الخالي عن العوض المشروط في البيع. (المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ۱۰۹/۱۲) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۵۵۹/۳۳)

تاخیر کی وجہ سے قیمت زیادہ وصول کرنا

سوال [۹۰۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ۷۵؍روپیہ کیلو نقد کوئی چیز ہے، ادھار پر وہ چیز ۸۰؍روپیہ میں دی جارہی ہے، دو ماہ کے لئے، اگر دو ماہ کے اندر روپئے نہ دیئے تو شرط یہ ہے کہ جتنے دن لگیں گے، اسی حساب سے روپئے بڑھتے جائیں گے۔

(۲) ایک صورت یہ ہے کہ ۷۰؍روپیہ کیلو نقد والی چیز ایک ماہ پر ادھار ۷۵؍روپیہ میں دیتے ہیں؛ لیکن یہ معلوم ہے کہ ایک ماہ کے اندر روپیہ ادا نہیں کرے گا، تو دو ماہ پورے ہونے پر ۸۰؍روپیہ دینا ہوگا اور اگر ایک ماہ میں ادا کردیا تو ۷۵؍روپیہ رہے گا۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس طرح کا معاملہ شرعاً سودی معاملہ ہے؛ اس لئے جائز نہیں اور زمانہ جاہلیت کے سودی کاروبار میں سے ایک اس طرح بھی تھا، جس کا سوال نامہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

وذٰلک أنهم كانوا يدفعون المال على أن يأخذوا على شهر قدراً معيناً، ويكون رأس المال باقياً، ثم إذا حل الدين طالبوا المديون برأس المال، فإن تعذر عليه الأداء زادوا في الحق والأجل، فهذا هو الربا الذي كانوا في الجاهلية يتعاملون به. (تفسير كبير للإمام الفخر الرازيؒ تحت تفسير رقم الآية: ۲۷۵، من سورة البقرة ۷/۹۱، روح البيان ۲/۹۳، غرائب القرآن للنيسابوري ۲/۶۰) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۱۲؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱؍۴۰۰۳)

شیئرز بازار میں پیسہ لگانا

سوال[۹۰۴۱]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شیئرز بازار میں پیسہ لگانا جائز ہے یا ناجائز؟ اس میں ریٹ گھٹتا بڑھتا ہے، اور وہ پیسہ لے کر بینک سے سود لیتے ہیں، سب ایک جگہ کرتے ہیں اور ہم نے یہ بھی سنا ہے، جو کاروبار اپنے سامنے نہیں ہوتا جائز نہیں اور نہ ہم کوئی محنت کر رہے ہیں، نہ وقت دے رہے ہیں، سب کچھ وہ ہمارے پیسے سے کر رہے ہیں۔

المستفتی: انتظار حسین قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آج کل کے زمانہ میں جو شیئرز بازار چل رہا ہے، وہ سٹہ کی شکل ہے اور کسی نہ کسی درجہ میں بات وہیں پہونچ جاتی ہے جہاں پر سٹہ کی حرمت پائی جاتی ہے؛ اس لئے شیئرز بازار میں پیسہ لگانا جائز نہیں ہے۔

وسمي القمار قماراً؛ لأن كل واحد من المقامرين ممن يجوز أن يذهب ماله إلى صاحبه ويجوز، أن يستفيد مال صاحبه، وهو حرام بالنص.

(شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، فصل في البيع، زكريا ٩/٥٧٧، كراچي ٦/٤٠٣، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ٨/١٤، رقم: ٩٤٨٦، تبيين الحقائق، امدادية، ملتان ٦/٢٢٧، زكريا ٧/٤٦٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۵۴۴/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۴/۵ھ

سودی کاروبار والے بینک اور کمپنی کا شیئرز خریدنا

سوال[۹۰۴۲]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ (۱) ایک کمپنی دوسری چھوٹی بڑی کمپنیوں کو سودی قرض دیتی ہے، کیا ہم اس طرح کی کسی کمپنی کے شیئرز کی خرید وفروخت کر سکتے ہیں؟ صرف شیئرز کی تجارت۔

(۲) کیا کسی بھی طرح کی چھوٹی بڑی حکومتی وغیر حکومتی بینک کے شیئرز کی خرید وفروخت جائز ہے؟

(۳) ٹی وی، وی سی آر، اور شراب بنانے والی کمپنی کے شیئرز کی تجارت جائز ہے؟

(۴) ایک کمپنی جو غریبوں کو گھر بنا لینے کے لئے سودی قرض دیتی ہے، ایسی کمپنیوں کی شیئرز کی تجارت جائز ہے؟

یادرر ہے کہ جدید دنیا کی دور میں شیئرز کی تجارت کا معاشیات واقتصادیات پر گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔ حالات کا جائزہ لیتے ہوئے معاملہ اور موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے مسلم معاشرہ اور سوسائٹی کو کسی حد تک اجازت دی جاسکتی ہے؟ یا امیر وغریب کی کچھ تفریق ممکن ہے؟

(۵) نفلی نماز میں ایک آدمی قرأت کرتا ہے، اس طرح قریب والا اس کی فسر فسر، سی سی، سوسو، کی آواز بھی سنتا ہے، بسا اوقات سورت کا تعین بھی کرسکتا ہے، کیا ایسی نفل دن یارات کی جائز ہے یا نہیں؟ آہستہ پڑھنے پر مصلی کو قرأت نہ کرنے کا اور قرأت کرنے پر جہر کا ہونا معلوم ہوتا ہے، کیا اس طرح کی نماز میں کوئی خرابی آتی ہے یا صحیح و درست ہے؟ نمبر وار جواب لکھتے جائیں۔ بینوا توجروا۔

المستفتی: محمد موسیٰ قاسمی، دارالعلوم احمد نگر خانقاہ عالمگیر، احمد نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) جس کمپنی میں سودی کاروبار اور سودی قرض کی لین دین ہوتی ہے، اور آپ کو ازخود اچھی طرح اس کا علم بھی ہے تو آپ کے لئے شیئرز خریدنا اور اس میں شریک ہونا شرعاً جائز نہیں ہے؛ کیونکہ ایسی صورت میں اکل ربوا یا موکل ربوا میں شامل ہونا لازم آتا ہے، خاص کر جب کمپنی مسلمانوں کی ہو۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم: آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۸، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في آكل الربا ومؤكله، النسخة الهندية۲/ ٤٧٣، دارالسلام رقم: ۳۳۳۳، سنن الترمذي، باب ماجاء في آكل الربا، النسخة الهندية ۱/۲۲۹، دارالسلام رقم: ۱۲۰٦)

(۲) سرکاری یا غیر سرکاری بینک جس میں سودی کاروبار ہوتا ہے، اس میں شرکت اوراس کا شیئرز خریدنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ مذکورہ حدیث سےاس کی ممانعت ثابت ہے۔

(۳) شراب کی کمپنی میں بھی شرکت جائز نہیں ہے؛ کیونکہ اس کا روپیہ بالکل مال حرام ہے، جوملکیت کے دائرہ میں داخل نہیں ہوسکتا۔

عن أبي هريرةؓ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إن الله حرم الخمر وثمنها. (سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في ثمن الخمر والميتة، النسخة الهندية ۲/٤۹۳، دارالسلام رقم: ۳٤۸۵)

عن عبد الله بن عباسؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ثمن الخمر حرام. الحديث (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ۱۲/۱۰۲، رقم: ۱۲٦۰۱)

والسابع حرمة الانتفاع بها؛ لأن الانتفاع بالنجس حرام؛ ولأنه واجب الاجتناب وفي الانتفاع به اقتراب. (هداية، كتاب الأشربة، اشرفي ٤/٤۹٤، الموسوعة الفقهية الكوتية ٤۰/۱۰۸)

قال الله تعالىٰ: يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْن. [المائده: ۹۰]

وی سی آر اور ٹی وی کی کمپنی میں شرکت کرنا مکروہ ہے۔

(۴) ایسی کمپنی جس کا کاروبار قرض دے کر سود لینے کا ہے، تو ایسی کمپنی کا شیئر زخریدنا اوراس میں شرکت ہرگز جائز نہیں ہے۔

قال الله تعالى: يَمۡحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَيُرۡبِي الصَّدَقَاتِ. [البقرہ:۲۷۶]

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، باب لعن آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۸، سنن ابن ماجه، التجارات التغليظ في الربا، النسخة الهندية ۲/۱۶۵، دارالسلام رقم: ۲۲۷۷)

(۵) اس طرح فسر فسر کرنا جس سے دوسرے نمازیوں کو خلل ہوسکتا ہے، کراہت سے خالی نہیں ہے؛ لیکن کبھی کبھی ایسی آواز پیدا ہوجانا کہ بغل والا سن لے اور بغل والے کو خلل بھی نہ ہو، تو مکروہ بھی نہیں ہے؛ البتہ بہتر یہی ہے کہ بغل والے کو بالکل سنائی نہ دے۔

عن أبي قتادةؓ، قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم: يقرأ في الركعتين الأخيرتين من الظهر، والعصر بفاتحة الكتاب، وسورة سورة ويسمعنا الآية.

(صحيح البخاري، باب القرأة في العصر، النسخة الهندية ۱/۱۰۵، رقم:۷۵۳، ف:۷۶۲)

الإسرار وهو اسماع النفس في الصحيح. (مراقي الفلاح)

عن النبي صلى الله عليه وسلم كان يقرأ في الركعتين الأخيرتين بفاتحة الكتاب و يسمعنا الآية، أحيانا ولأن اليسير من الجهر، والإخفاء لايمكن الاحتراز عنه لا سيما عند مبادي التنفسات. (طحطاوي على المراقي قديم ۱۳۸، دارالكتاب ديوبند ۱/۲۵۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲/ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/۴۲۶۷)	۲/۱۲/۱۴۱۵ھ

شیئرز کی خرید وفروخت اور شیئرز کمپنی میں حصہ داری

سوال [۹۰۴۳]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شیئرز مارکیٹ جس کا کاروبار ہر وقت اعلی پیمانے پر چل رہا ہے، اس میں جو کمپنیاں اپنی اشیاء پارٹیں، پرزے، مشینری بنا کر مارکیٹ میں فروخت کررہی ہیں، یعنی جو جائز چیزیں تیار کر کے بازار میں فروخت کررہی ہیں، ان کے شیئرز کی خرید وفروخت یا ان میں حصہ داری شرعی اعتبار سے درست ہے یا نہیں تشفی بخش جواب دیں۔

(۲) اگر کوئی مسلم کمپنی اپنے پاس خود کے پروجیکٹ کارخانے میں اور ان میں عوام کا سرمایہ لگا کر مشارکت کے طور پر نفع ونقصان کی بنیاد پر کاروبار کرتی ہو، تو اس سے ملا ہوا منافع جائز ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: عبدالمجید قاسمی، الفہد گروپ دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) اگر جائز کاروبار ہے تو اس کی اشیاء کا خریدنا اور اس میں حصہ دار بن جانا شرعی طور پر جائز ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۰۲)

تجوز هذه الشركة بين كل من كان من أهل التجارة......فتجوز هذه الشركة بين الرجال والنساء، والبالغ، والصبي، والمأذون في التجارة والمسلم والكافر. (هندية، كتاب الشركة، الباب الثالث في شركة العنان، زكرياجديد ٣٢٦/٢، قديم ٣١٩/٢)

(۲) جو شکل آپ نے سوال نامہ میں ذکر فرمائی ہے، اگر واقعی یہی شکل ہے اور اس میں کوئی ناجائز کاروبار نہیں ہوتا ہے، تو شرعی طور پر جائز اور درست ہے؛ کیونکہ یہ شرعاً شرکت عنان کے دائرہ میں داخل ہے۔

أما شركة العنان فهي أن يشترك اثنان في نوع من التجارات برٍ،

أو طعامٍ، أو يشترك كان في عموم التجارات. (هندية، كتاب الشركة، الباب الثالث في شركة العنان، زكريا جديد ٢/٣٢٥، قديم ٢/٣١٩)

مگر اس طرح جائز طریقہ سے شیئرز کا معاملہ ہندوستان میں ہمارے علم میں بہت ہی کم ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍محرم الحرام ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳؍۵۱۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸؍۱؍۱۴۱۸ھ

سودی ادارہ کے شیئرز خریدنا

سوال [۹۰۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں ایک مقامی بینک ہے جو کہ ایک سودی ادارہ ہے اور گاہک سے سودی لین دین کرتا ہے، حال میں ادارہ ہذا کی انتظامیہ نے اپنے ادارے کے حصص فروخت کرنے کا اعلان کیا؛ چونکہ راقم نے بھی کچھ حصص براہ راست بینک انتظامیہ سے خرید لئے میں نے بینک ہذا کے یہ حصص اس لئے نہیں خریدے کہ میں بینک کے کاروبار میں شریک رہوں تاکہ تناسب کے حساب سے نفع ونقصان مین حصہ دار بن جاؤں؛ بلکہ میرے ذہن میں صرف یہ بات تھی اور ہے کہ آئندہ کچھ عرصہ میں یہاں حصص کے بھاؤ بڑھ جائیں گے تاکہ میں زیادہ قیمت پر یہ حصص فروخت کو ڈالوں۔ آپ سے عرض ہے کہ کیا شرعی طور پر ایسے ادارے کے حصص خرید کر زیادہ قیمت پر فروخت کرنا جائز ہے کہ نہیں؟ ادراہ ہذا کی شاخیں ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں بھی ہیں۔

المستفتی: نثار احمد، ہندواره، کشمیر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ایسا سودی ادارہ جس کے سودی کاروبار سے آپ

مطلع ہو چکے ہیں، اس کے شیئرز کا خریدنا آپ کے لئے جائز نہیں ہے، اگر خرید لیا ہے، تو اول فرصت میں اس سے الگ ہو جانے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۴۹۱)

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، النسخة الهندية، ۲/ ۲۷، بيت الأفكار رقم: ۱۵۹۸، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في آكل الربا ومؤكله، النسخة الهندية ۲/ ۴۷۳، دارالسلام رقم: ۳۳۳۳، سنن الترمذي، باب ما جاء في آكل الربا، النسخة الهندية ۱/ ۲۲۹، دارالسلام رقم: ۱۲۰٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ صفر المظفر ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/ ۵٦۴۷)

سودی لین دین والی کمپنی یا بینک سے شیئرز خریدنا

سوال [۹۰۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں نے یہاں بینک کے حصص یعنی (شیئرز) خریدے ہیں؛ چونکہ بینک ایک سودی ادارہ ہے، اور گاہک سے سود کا لین دین ہوتا ہے، اس معاملہ میں بینک کی طرف سے ہمیں سالانہ ایک (Bonus) چیک ملتا ہے، یہ چیک ہمیں بینک سے اس حصے میں نفع یا نقصان کی بنیاد پر دیا جاتا ہے، اس بات کو مدنظر رکھ کر میں نے یہ فیصلہ لیا کہ آپ صاحبان سے اس معاملہ میں شرعی رائے پوچھ لیں کیا یہ نفع یعنی (Bonus) ہمارے لئے حلال ہے؟

نوٹ: یہ حصص (شیئرز) ہم نے براہ راست بینک انتظامیہ سے خریدے ہیں۔

(۲) چونکہ اس سال بینک حکام نے یہ فیصلہ لیا ہے کہ جس کے حصص یہاں ہیں وہ دو گنے کر دیئے جائیں گے، مثلاً ایک ہزار کے دو ہزار وغیرہ، تو کیا دوگنی رقم ہمارے لئے حلال ہے۔

(۳) کتاب ایضاح النوادر کی روشنی میں صفحہ۲۰۲ر حصہ اول کے مطابق ہمیں لکھیں؛ چونکہ اگر اس معاملہ میں آپ کی رائے منفی ہو، تو میں یہ حصص بیچنے کے لئے تیار ہوں، مگر یہاں پھر ایک شرعی مسئلہ آتا ہے کہ ہم نے یہ حصص 25% کے حساب سے خریدے تھے؛ چونکہ آج بینک حکام نے اس کی قیمت 38% فی حصص کردی ہے، اس معاملہ میں آپ حضرات بتائیں کہ میں حصص سابقہ قیمت 25 % کے حساب سے بیچ ڈالوں یا کہ موجودہ ریٹ 38% کے حساب سے مہربانی کر کے ان تینوں مسئلوں کا تفصیلی طور پر شریعت کی روشنی میں فیصلہ دیں تاکہ خداوند قدوس کی عدالت میں کسی قسم کی پشیمانی اٹھانی نہ پڑے۔

المستفتی: آزاد سلیم صوفی، ہنڈواڑہ، کشمیر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سودی لین دین کرنے والی کمپنی یا بینک کا شیئرز جائز نہیں ہے؛ جبکہ اس کا کوئی واضح جائز کاروبار نہ ہو؛ لہٰذا سودی ادارہ سے جو حصص آپ نے خریدے ہیں، ان کو آپ -/25 کے حساب سے فروخت کردیں اور -/38 کے حساب سے فروخت کریں گے، تو اصل سے زائد فقراء کو صدقہ کردیں۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: آکل الربوا، ومؤکلہ، وکاتبہ، وشاہدیہ، وقال: وہم سواء. (مسلم شریف، باب لعن آکل الربا، ومؤکلہ، النسخۃ الہندیۃ، ۲/۲۷، بیت الأفکار رقم:۱۵۹۸، سنن ابن ماجہ، التجارات، التغلیظ في الربا، النسخۃ الہندیۃ ۲/۱۶۵، دار السلام رقم:۲۲۷۷) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۴ر رجب المرجب ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/۵۳۶۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۷/۴ھ

سودی بانڈ کی خرید وفروخت

سوال[۹۰۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک بانڈ ایسا ہے، جوان ڈاکخانوں سے ڈھائی ہزار -/2500 روپے میں خریدا جاتا ہے، اور پانچ سال کی مدت کے بعد ڈاکخانہ اسے پانچ ہزار -/5000 روپے میں خریدتا ہے، اس طرح جو ڈھائی ہزار -/2500 روپۓ منافع ہوتا ہے، وہ کسی صاحب حیثیت کے لئے جائز ہے؟ (یہ منافع بھی بینک انٹرسٹ کی طرح ہے)

المستفتی: محمد حنیف محلّہ طویلہ اسٹریٹ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جی ہاں یہ بھی بینک کے سود کی طرح ہے، اس کا استعمال بھی ناجائز ہے اور اس کا حکم بھی زمانہ جاہلیت کے سود کی طرح ہے۔

وأما ربا النسيئة، فهو الأمر الذي كان مشهوراً متعارفاً في الجاهلية، وذٰلک أنهم كانوا يدفعون المال على أن يأخذوا على شهر قدراً معيناً، ويكون رأس المال باقياً، ثم إذا حل الدين طالبوا المديون برأس المال، فإن تعذر عليه الأداء زادوا في الحق والأجل، فهذا هو الربا الذي كانوا في الجاهلية يتعاملون به. (تفسير كبير للإمام الفخر الرازيؒ، تحت تفسير رقم الآية: ۲۷۵، من سورة البقره۷/۹۱، روح البيان ۲/۹۳، غرائب القرآن للنيسا پوري ۲/۶۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍شعبان المعظم ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/۲۳۴۵)

اندراوکاش پتر کی بیع وشراء اور زائد رقم کا حکم

سوال [۹۰۴۷]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سرکار نے ترقی کے لئے اندراوکاش پتر کے نام سے یہ اسکیم نکالی ہے کہ جو صاحب اپنا روپیہ ڈاکخانے میں جمع کریں، توان کو پانچ سال کے عرصے سے پہلے وہ روپیہ کسی قیمت پر نہیں مل سکتا، پانچ سال کے عرصہ کے بعد دوگنا روپیہ اس دی ہوئی رسید کے ذریعہ مل جائے گا۔ اوراس رسید کی ذمہ داری سرکار نے نہیں لی ہے، اگر وہ رسید چوری ہوجائے یا جل جائے یا دیمک لگ جائے یا گم ہوجائے یا اور کسی طریقہ سے ضائع ہوجائے، تو اس کی ذمہ داری سرکار نے کچھ نہیں لی ہے، تو کیا اس طرح پیسہ دے کر لینا صحیح ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں مسئلہ بالا کا جواب دیں عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: افسر علی، محلّہ پیر غیب، مرادآباد (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جوزائد رقم ملتی ہے وہ حلال نہیں ہے، اس کو وہاں سے نکال کرنا دار وفقراء کو بلانیت ثواب دیدینا لازم ہے۔ نیز مذکورہ غرض سے ڈاکخانہ میں رقم جمع کرنا مسلمانوں کے لئے جائز نہیں ہے۔

صرح الفقهاء بان من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة والإستئجار على المعاصي والطاعات، أو بغير عقد كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه (إلى قوله)ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، هكذا في الهندية، زكرياقديم ۵/۵۴۹، جديد ۵/۴۰۴، شامي، زكريا ۹/۵۵۳،

كراچي ٦/ ٣٨٥، الموسوعة الفقهية الكوتية٣٤/ ٢٤٦، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/ ٢٧، زكريا ٧/ ٦٠، البحرالرائق، كوئٹه٨/ ٢٠١، زكريا ٩/ ٣٦٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/ ذی قعدہ ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۰۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۰/۱۱/ ۱۴۱۰ھ

نقد اور ادھار خریداری ایک ساتھ ہوتو؟

سوال [۹۰۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بیچنے والا اپنے سامان کے بارے میں کہتا ہے کہ نقد لوگے تو ۵/ ہزار روپیہ اور ادھار لوگے تو ۶/ ہزار روپیہ یہ ایک ہی عقد میں تفرق صفقہ ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ اگر یہ درست نہیں ہے، تو درست ہونے کی متبادل شکل کیا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بائع نے اپنے سامان کے متعلق مشتری کو نقد وادھار دونوں کی الگ الگ قسمیں بیان کردیں، مثلاً نقد میں ۵/ ہزار، ادھار میں ۶/ ہزار، تو یہ عقد واحد میں تفرق صفقہ ہے، تو جس صورت پر بھی عاقدین مجلس عقد میں راضی ہوجائیں، تو وہ بیع جائز اور درست ہوگی؛ کیونکہ عاقدین کے اتفاق کی وجہ سے ثمن کی جہالت ختم ہوگئی جو کہ مفسد بیع ہے؛ اس لئے ایسا معاملہ کرنا درست ہے۔ (مستفاد: انوار رحمت ۲۳۱، قسطوں پر خرید وفروخت سے متعلق شرعی احکام ۱۱۱، امداد الفتاوی ۳/ ۲۰، فتاوی عثمانی ۳/ ۱۱۵)

قد فسر بعض أهل العلم قالوا بيعتين في بيعة أن يقول أبيعك هذا الثوب بنقد بعشرة و بنسيئة بعشرين و لايفارقه على أحد البيعتين، فإذا فارقه على أحدهما، فلا بأس إذا كانت العقدة على واحدٍ منهما. (ترمذي شريف، باب ما جاء في النهي عن بيتعين١/ ٢٣٣)

ثم الإنسان في العادة يشتري الشيئ بالنسيئة بأكثر مما يشتري بالنقد. (مبسوط سرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ۱۳/۹۳)

وإذا عقد العقد على أنه إلى أجل كذا بكذا، أو بالنقد بكذا، أوقال إلى اشهر بكذا، أو إلى شهرين بكذا، فهو فاسد؛ لأنه لم يعاطه على ثمن معلوم–وهذا إذا افترقا على هذا فإن كان يتراضيان بينهما و لم يتفرقا حتى قاطعه على ثمن معلوم وأتما العقد عليه فهو جائز؛ لأنهما ماافترقا إلا بعد تمام شرط صحة العقد. (مبسوط سرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ۱۳/۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰؍ ۱۱۴۹۰)

قسط وار اصل قیمت سے زائد قیمت میں گاڑی خریدنا

سوال [۹۰۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ قسط وار گاڑی خریدنا کیسا ہے؟ یعنی گاڑی کی قیمت ہے، ایک لاکھ تیس ہزار روپئے اور خریدتے وقت صرف پچاس ہزار روپئے دیتے ہیں اور باقی ۷۰؍ ہزار کو اور ۲۰؍ ہزار زیادہ کر کے کل ڈیڑھ لاکھ روپیہ کمپنی کو ۲۰؍ مہینہ میں دے کر معاملہ ختم کرتے ہیں۔ کیا یہ ۲۰؍ ہزار روپئے سود میں داخل ہوگا یا نہیں؟

براہ کرم تمام سوالوں کا جواب جلد از جلد دلائل کیساتھ تحریر فرما کر روانہ فرمائیں عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: جنرل سیکٹری بھنگنا ماری انچلیک دینی تعلیمی بورڈ (آسام)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: قسط وار گاڑی کی خریداری کی جو شکل سوال نامہ

میں ذکر کی گئی ہے، وہ شرعاً جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ گاڑی کی اصل قیمت ایک لاکھ تیس ہزار روپئے ہے، پھر قسط وار ڈیڑھ لاکھ کی وصولیابی میں زائد رقم سود میں داخل ہوگی؛ اس کے جواز کی متبادل شکل یہ ہے کہ معاملہ طے کرتے وقت گاڑی کی قیمت ڈیڑھ لاکھ روپئے متعین کر لی جائے اور پچاس ہزار روپئے یک مشت نقدادا کردیئے جائیں اور بقیہ ایک لاکھ روپئے قسط وارادا کرتے رہیں، تو ایسی صورت میں یہ معاملہ شرعاً جائز اور درست ہوجائے گا۔

قال الله تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا . [سورة البقرہ: ٢٧٥]

سلعة يكون ثمنها مائة دينار نقداً، وبمائة و خمسين إلى أجل أن هذا جائز . (كتاب الحجة على أهل المدينة ٢/ ٦٩٤)

البيع مع تأجيل الثمن و تقسيطه صحيح . (شرح مجله، رستم مكتبه اتحاد ١/ ١٢٤، رقم المادة: ٣٤٥٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۰۸۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۶/۱ھ

قسط وار (فائنینس) پر گاڑی کی خریداری کی متبادل شکل

سوال [۹۰۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ قسط وار خریداری کا کیا حکم ہے؟ اگر نقد خریدی جائے تو چیز سستی ملتی ہے، اور قسط وار خریدی جائے، تو مہنگی ملتی ہے، مثلاً گاڑی خریدی جائے، تو وہ نقد دس لاکھ کی ہے، اور پانچ سالہ قسط پر خریدی جائے، تو ۱۲ر لاکھ کی ہے، تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: عمیر قاسمی، ہاپوڑی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قسط وار خریداری زائد قیمت کے ساتھ اس شرط

کے ساتھ جائز ہے کہ جب دونوں عقد کے وقت ایک قیمت پر رضا مند ہو جائیں یعنی ادھار اور قسط وار زائد رقم کی تعیین ہو جائے کہ قسط وار اتنی قیمت میں یہ چیز دی جائے گی، تو یہ شکل جائز اور درست ہے۔ (فتاوی عثمانی ۳/ ۱۱۵)

البيع مع تأجيل الثمن و تقسيطه صحيح. (شرح المجلة ١/ ١٢٤، رقم المادة: ٢٤٥)

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيعتين في بيعة، وقد فسر بعض أهل العلم قالوا: بيعتين في بيعةٍ أن يقول أبيعك هذا الثوب بنقدٍ بعشرةٍ، وبنسيئةٍ بعشرين لا يفارقه على أحد البيعين، فإذا فارقه على أحدهما، فلابأس إذا كانت العقدة على واحد منهما. (ترمذي شريف ١/ ٢٣٣)

وإذا عقد العقد على أنه إلى أجل كذا بكذا، أو بالنقد بكذا، أوقال إلى أشهر بكذا، أو إلى شهرين بكذا، فهو فاسد؛ لأنه لم يعاطه على ثمن معلوم– وهذا إذا افترقا على هذا فإن كان يتراضيان بينهما و لم يتفرقا حتى قاطعه على ثمن معلوم وإنما العقد عليه فهو جائز؛ لأنهما ماافترقا إلا بعد تمام شرط صحة العقد. (مبسوط سرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ١٣/ ٨)

رجل باع على أنه بالنقد بكذا وبالنسيئة بكذا، وإلى شهر بكذا، وإلى شهرين بكذا لم يجز كذا في الخلاصة. (هندية، كتاب البيوع، الباب العاشر في الشروط التي تفسد البيع والتي لاتفسدة، زكريا قديم ٣/ ١٣٦، جديد ٣/ ١٣٧)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۴۹۸)

قسطوں پر گاڑی خریدنا

سوال[۱۰۵۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جو نقد گاڑی نہیں لے سکتے، قسط پر لیتے ہیں، جس میں سود بھی شامل رہتا ہے، کسی اور مد کا سود جو قسط میں واجب الادا رہے بھرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: شفیع احمد، الاعظمی الرقاع

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس طرح خریداری میں حرمت سے بچنے کے لئے بہترین شکل یہی ہے کہ اگر نقد خریدنے میں مثلاً اسی ہزار کی ملتی ہے، اور قسطوار ادا کرنے میں ۸۵/ ہزار دینا پڑتا ہیں، تو سودی معاملہ سے حفاظت اس طرح ہوسکتی ہے، کہ قسطیں پانچ سال میں پوری ہوسکتی ہیں، تو بوقت خریداری یوں معاملہ طے کیا جائے کہ ادھار خرید میں ۸۵/ ہزار روپیہ شی کی قیمت ہے اور نقد میں ۸۰/ ہزار ہے؛ اس لئے کہ نقد کے مقابلہ میں ادھار میں قیمت زیادہ کرنے میں شرعی طور پر کوئی قباحت نہیں ہے، تو اس طرح معاملہ جائز اور درست ہوجائے گا۔

ألایری أنہ یزاد في الثمن لأجل الأجل. (هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، اشرفي ۳/ ۷٤، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ۱۰/ ۱۸۷، رقم: ۱۲۷۳۸، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۱۱۲، مصري قديم ۲/ ۷۸، شرح المجلة رستم مكتبه اتحاد ۱/ ۱۱٤-۱۱۵، رقم المادة: ۲٤۵-۲٤٦)

نیز اگر لون وسودی شرط پر معاملہ کیا جائے تو شرعی طور پر معاملہ فاسد ہوجاتا ہے، اس کا فسخ لازم ہوجاتا ہے، پھر بھی اگر ناجائز معاملہ کرلیا ہے، اور سودی جو شئ خریدی گئی ہے، وہ حکومت سے خریدی ہے اور سودی رقم حکومت کے بینک میں جمع ہوجاتی ہے، تو بینک سے حاصل شدہ سود کو اس سود میں دیدینا جائز ہے؛ اس لئے کہ مال حرام میں اصل حکم یہی ہے کہ کسی بھی عنوان سے اصل مالک کو واپس کردیا جائے۔

ویجب علیه أن یرده علی مالکه إن وجد المالک. ((بذل المجهود، کتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامیة، ۱/۳۵۹، تحت رقم الحدیث: ۵۹، هندیة، زکریاقدیم ۵/۵۴۹، جدید ۵/۴۰۴، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۳۴/۲۴۶، شامي، زکریا ۹/۵۵۳، کراچي ۶/۳۸۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/رجب المرجب ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹/۳۲۵۳)

۱۵/سو روپیہ یا ۳/ہزار میں گاڑی ملنے والی اسکیم کا حکم

سوال [۹۰۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک اسکیم کے تحت اشیاء کی فروختگی کی جاتی ہے، اس کی شکل یہ ہے کہ مذکورہ اسکیم کے تحت چار سو ممبر بنائے جاتے ہیں اور یہ اسکیم تیس ماہ میں پوری ہوتی ہے، مثلاً ایک موٹر سائیکل کی قیمت پینتالیس ہزار روپیہ رکھی گئی ہے، تو ہر ممبر ہر مہینہ پندرہ سو روپیہ جمع کرے گا، اس طرح ۳۰/ماہ میں پینتالیس ہزار روپیہ جمع ہو جائیں گے اور کمپنی ہر ممبر کو ایک گاڑی دیدے گی، مگر اس میں ممبروں کا فائدہ یہ ہے کہ ہر ماہ تمام ممبروں کے نام قرعہ ڈالا جائے گا۔

اب پہلے مہینے میں جس ممبر کا نام نکل آئے گا، اس کو گاڑی مل جائے گی اور اب وہ ممبر باقی ماہ کی قسطیں جمع نہیں کرے گا، گویا اس کو صرف پندرہ سو روپیہ میں گاڑی مل گئی۔ اگلے ماہ پھر بقیہ ممبروں کے نام قرعہ ڈالا جائے گا، پھر جس کا نام نکل آئے گا، اس کو گاڑی مل جائے گی اور اس طرح اس ممبر کو صرف تین ہزار روپیہ میں گاڑی مل گئی، بقیہ قسطیں جمع نہیں کرے گا، اس طرح پورے تیس مہینے تک قرعہ کے ذریعہ ایک ایک گاڑی نکلتی رہے گی اور جس مہینے میں جس نمبر کی گاڑی نکل آئے گی بقیہ ماہ کی قسطیں اب وہ جمع نہیں کرے گا،

اس طرح تیس ممبر کو گاڑی مل جائے گی اور باقی ممبران کو بھی تیس ماہ کے بعد ہر ایک کو گاڑی مل جائے گی، مگر پہلے تیس ممبروں کو کچھ چھوٹ سے گاڑی ملے گی اور بقیہ ممبران کو پورے پینتالیس ہزار روپیہ میں گاڑی پڑے گی، ہاں بقیہ ممبران کا فائدہ یہ ہے کہ وہ قسط وار گاڑی بھی حاصل کر لیتے ہیں اور کسی طرح کا کوئی سود بیاج بینکوں کی طرح اس میں دینا نہیں پڑتا اور سود کی لعنت سے حفاظت ہو جاتی ہے۔

نیز اس اسکیم میں یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ تیس مہینے کے بعد ہی گاڑی ملے گی، اگر کوئی ممبر یہ چاہے کہ اس کو پہلے مہینے میں یا جب بھی گاڑی چاہتا ہے، تو اس کو گاڑی مل جائے گی، مگر آدھی قیمت ابھی ادا کرنی پڑے گی، ہاں بقیہ آدھی قیمت قسطوار جمع کرتا رہے گا؛ البتہ اگر قرعہ میں نام نکل آتا ہے، تو جس مہینے میں نام نکلا ہے، اتنے مہینے کی قسط جمع کر کے کمپنی باقی روپئے واپس کر دے گی، کمپنی کا مقصد اس طرح کے کاروبار سے اپنے کاروبار کے ساتھ یہ بھی ہے کہ لوگوں کو فائنانس پر گاڑی نکالنے پر جو سود دینا پڑتا ہے، اس سے بچایا جائے اور جبکہ اس طرح گاڑی بھی فائنس کے مقابلہ میں سستی پڑ جاتی ہے، اور سود بھی دینا نہیں پڑتا، ہاں کمپنی کو اس میں یہ فائدہ ہے کہ وہ ہر گاڑی پر پانچ ہزار روپیہ زیادہ قیمت لگاتی ہے۔ تو کیا اس طرح کاروبار درست ہے یا نہیں؟

نیز اس میں جو قرعہ والی شکل ہے، اس کو بھی وضاحت سے تحریر فرمادیں کہ شریعت کا کیا حکم ہے؟ اگر کسی ایسی بات کی وجہ سے جس کی اصلاح ہو سکتی ہے، عدم جواز نکلتا ہو، تو اس کی اصلاح فرمادیں۔

المستفتی: قطب الدین، گلبرگہ، کرناٹک

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ از اول تا آخر بغور پڑھا گیا ہے، سوال نامہ میں جس اسکیم کا ذکر ہے اس میں جوا اور سٹہ کی شکل ہے؛ اس لئے کہ جن لوگوں کو

صرف پندرہ سو روپیہ میں یا تین ہزار روپئے میں یا پینتالیس ہزار روپیہ میں چالیس ہزار کی گاڑیاں مل رہی ہیں، وہ مکمل سٹہ کی شکل ہے اور اسی کے لالچ میں لوگ اس اسکیم میں شریک ہوتے ہیں، جن لوگوں کا نام نکلتا ہے، وہ کم پیسے میں گاڑی ملنے کی وجہ سے خوش ہوجاتے ہیں اور جن لوگوں کا نام نہیں نکلتا ہے، وہ خوش نہیں ہوتے ہیں، اگر چہ آخر میں پورے پیسے دینے کے بعد ان کو بھی گاڑی مل جاتی ہے، مگر وہ لوگ ہر قسط کے موقع پر اپنے آپ کو نامراد سمجھتے ہیں اور اس اسکیم میں نام نکالنے کا جو طریقہ بتایا گیا ہے، وہ جائز قرعہ اندازی کے دائرہ میں داخل نہیں ہے؛ اس لئے کہ حقوق مالیہ میں قرعہ اندازی اس وقت جائز ہوتی ہے کہ جب تمام امیدواران کا حصہ برابر ہو اور سب کو فوری طور پر اپنا اپنا حصہ مل رہا ہو، مگر اس کی جہت کی تعیین کے لئے قرعہ اندازی کی جاتی ہے، مثلاً جائیداد کی تقسیم میں جانب شمال اور جانب جنوب یا جانبین کے بیچ کا حصہ ہو اور قرعہ اندازی کے ذریعہ سے ہر ایک کا حصہ متعین کیا جائے کہ جانب شمال یا جانب جنوب میں یا بیچ میں ملے گا، تو ایسا کرنا جائز ہے، مگر حقوق مالیہ میں ایسا جائز نہیں ہے کہ ایک کو ملے اور دوسروں کو نہ ملے یا ایک کو کم قیمت میں ملے اور دوسروں کو زیادہ قیمت میں ملے، یہ تعلیق الملک علی الخطر ہے اور تعلیق الملک علی المخاطرہ کا نام شریعت میں جوا اور سٹہ ہے، جو قطعاً جائز نہیں ہے؛ اس لئے سوال نامہ میں ذکر کردہ اسکیم سٹہ کے دائرہ میں داخل ہونے کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہے۔

وأما الميسر فقدروى عن عليؓ أنه قال: الشطرنج من الميسر وقال عثمان وجماعة من الصحابة، والتابعين النرد. وقال قوم من أهل العلم القمار كله من الميسر وأصله من تيسير الجزور بالاجتماع على القمار فيه، وهو السهام التي يحيلونها فمن خرج سهمه استحق منه ما توجبه علامة السهم فربما اخفق بعضهم حتى لا يخطي بشيئ وينجح البعض فيخطى بالسهم الوافر، وحقيقته تمليك المال على المخاطرة وهو أصل

في بطلان عقود التمليكات الواقعة على الأخطار كالهبات، والصدقات، وعقود البياعات ونحوها، إذا علقت على الأخطار بأن يقول قد بعتك إذاقدم زيد ووهبته لک إذا خرج عمر؛ لأن معنى اليسار الجزور، أن يقول من خرج سهمه استحق من الجزور، كذا فكان استحقاقه لذلک السهم منه معلقاً على الخطر. (أحكام القرآن للجصاص، سورة المائدة، باب تحريم الخمر، زكريا ٢/ ٥٨٢، سهيل اكيڈمي لاهور ٢/ ٤٦٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۵۰۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۳/۴ھ

فی سلی ہر مہینہ دو روپیہ زائد کی شرط سود ہے

سوال [۹۰۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید تانبا پیتل کی سلی کا کام کرتا ہے اور سلی کا بھاؤ دوسو روپیہ ہے؛ لیکن خالد جو کہ خریدار ہے کہتا ہے: کہ میں ادھار خریدوں گا اور ادھار میں سلی کی قیمت دوسو بیس روپیہ طے ہوئی اور یہ طے ہوا کہ دو ماہ میں یہ پیسے ادا کرنے ہوں گے، اگر دو ماہ میں ادا نہ کئے تو فی سلی دو روپیہ پر ہفتہ بڑھ جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ دو ماہ میں عدم ادائے گی کی صورت میں یہ جو ہفتہ واری فی سلی دو روپیہ بڑھنا طے ہوا ہے، تو یہ زید کے لئے حلال ہے یا نہیں؟ یہ سلی کی قیمت ہوگی یا سود ہوگا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دو ماہ میں سلی کی قیمت ادا نہ کرنے کی صورت میں زید نے اپنے لئے ہفتہ واری ہر سلی پر جو دو روپے لینا طے کیا ہے، تو یہ پیسہ اس کے لئے

حلال نہیں ہے؛ اس لئے کہ یہ سلی کی قیمت نہیں؛ بلکہ سود ہے۔ (مستفاد: انوار رحمت ۲۳۳، جدید فقہی مسائل ۲۶۰/۴، ایضاح النوادر ۳۰)

وأمَّا ربا النسيئة، فهو الأمر الذي كان مشهوراً متعارفاً في الجاهلية، وذٰلک أنهم كانوا يدفعون المال على أن يأخذوا كل شهرٍ قدراً معيناً، ويكون رأس المال باقياً، ثم إذا حل الدينُ طالبوا المديون برأس المال، فإن تعذر عليه الأداء زادوا في الحق والأجل، فهذا هو الربا، الذي كانوا في الجاهلية يتعاملون به. (تفسير كبير للإمام الفخر الرازيؒ، تحت تفسير رقم الآية:۲۷۵، من سورة البقرة۷/ ۹۱، روح البيان ۲/ ۹۳، غرائب القرآن للنيساپوري ۲/ ۶۰)

وذلک اعتياض عن الأجل وهو حرام روي أن رجلاً سأل ابن عمرؓ فنهاه عن ذلک، ثم سأله. فقال: إن هذا يريد أن أطعمه الربا، وهذا لأن حرمة ربا النساء ليست إلا لشبهة مبادلة المال بالأجل. (العناية على فتح القدير، كتاب الصلح، باب الصلح عن الدين، زكريا۸/ ۴۴۷، دارالفكر۸/ ۴۲۶، كوئٹه ۷/ ۳۹۶)

وكان ربوا الجاهلية في الديون أن يكون للرجال على الرجل الدين، فإذا حل قال له: أتقضي أم ترىٰ؟ فإن قضاه أخذه وإلا زاده في الحق وزاده في الأجل. (المدوّنة الكبرىٰ ۵/ ۱۸، بحوالة جديد فقهي مسائل ۴/ ۲۶۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۴۰۳)

زندہ بکرے کو تول کر فروخت کرنا

سوال [۹۰۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ زید ایک بکرا زندہ فروخت کرنے کے لئے لایا، مشتری نے اس کی قیمت لگائی؛ لیکن بائع کو وہ قیمت پسند نہیں آئی، مشتری نے کہا کہ اس کو زندتول کر فروخت کردے، بائع نے کہا کہ لے لے؛ چنانچہ مشتری نے اس زندہ بکرے کو تول کر لے لیا، تو کیا یہ صورت صحیح ہے کہ نہیں؟ اگر صحیح ہے تو براہ کرم جواب مع الدلائل تحریر فرمائیں نوازش ہوگی۔

نوٹ: یہ بکرہ قربانی کے لئے لیا گیا ہے۔

المستفتی: محمد عمر غفرلہ قاسمی، مدرسہ اسلامیہ عربیہ پرائمری نجیب آباد، بجنور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر بکرے کو نوٹ کے عوض میں وزن کر کے خریدا ہے، تو شرعاً جائز ہے، اس میں ربوایا سود لازم آنے کے لئے کوئی علت موجود نہیں؛ لہٰذا اس کی قربانی میں کوئی خرابی لازم نہیں آئے گی۔

كما جاز بيع لحم بحيوان ولو من جنسه؛ لأنه بيع الموزون بما ليس بموزون. فيجوز كيف ما كان بشرط التعيين. (الدر مع الرد، كتاب البيوع، زكريا ٧/٤١٤، كراچي ٥/١٧٩، حاشية چلپي، امدادية ملتان ٤/١٩١، زكريا ٤/٤٦٠، فتح القدير، دارالفكر ٧/٢٧، كوئٹه ٦/١٦٧، زكريا ٧/٢٥) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵؍ ۱۵۳۷)

فنڈ میں زیور رکھ کر ماہانہ تین روپیہ بغیر عوض کے دینا

سوال [۹۰۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر محلّہ کے چند مسلمان مل کر ماہانہ، یا ہفتہ واری ایک فنڈ بنالیں اور کسی ضرورت مند کا زیور رکھ کر فی ماہ تین روپیہ طے کر کے اس فنڈ سے اس کی ضرورت پوری

کریں، تو یہ سود ہوگا یا نہیں؟ اگر سود ہوگا تو دفتر میں کام کرنے والے کی تنخواہ کہاں سے دی جائے اور اگر سود نہیں، تو قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل ومفصل بیان فرمائیں۔

المستفتی: علیم الدین، محمد علی، سرجن نگری، مدرس مدرسہ باب العلوم، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ماہانہ تین روپیہ جمع کرنے کی شرط کے ساتھ ناجائز اورحرام ہے، یہ مسلم فنڈ کی شکل بھی نہیں ہے، اس کے بغیر اگر فنڈ نہیں چل سکتا ہے، تو اس طرح فنڈ قائم کرنا شرعاً جائز نہیں ہوگا اور ماہانہ تین روپیہ وصول کرنا زمانۂ جاہلیت کے سود کے مشابہ ہے۔

وأمَّا ربا النسيئة، فهو الأمر الذي كان مشهوراً متعارفاً في الجاهلية، وذٰلک أنهم كانوا يدفعون المال على أن يأخذوا كل شهرٍ قدراً معيناً، فيكون رأس المال باقياً، ثم إذا حل الدينُ طالبوا المديون برأس المال، فإن تعذر عليه الأداء زادوا في الحق والأجل، فهذا هو الربا، الذي كانوا في الجاهلية يتعاملون به. (تفسير كبير للإمام الفخر الرازيؒ، تحت تفسير رقم الآية:۲۷۵، من سورة البقرة ۹۱/۷، روح البيان ۹۳/۲، غرائب القرآن للنيسابوري ۶۰/۲) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۵۶۳/۲۵)

آڑھت والوں کا ایک معاملہ (فائنانس) کا شرعی حکم

سوال [۹۰۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک لفظ فائنانس ہے، انگلش کا ہمارے گاؤں میں بہت ہی شور وزور سے اس کا رواج چل رہا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ کسی شہر سے آڑھت والے گاؤں میں آتے ہیں

اوروہ گاؤں والوں کودس بیس ہزار روپیہ دیتے ہیں، کیلے کی کھیتی کرنے کے لئے اس شرط پر دیتے ہیں کہ فصل کٹنے کے بعد ہمارے یہاں پہونچنی چاہئے؛ لہٰذا گاؤں والے فصل یعنی کیلے کوپہونچاتے ہیں، پھرآڑھت والے اپنی آڑھت پرفصل کوبیچ کرکمیشن جتنا ہوتا ہے، یعنی مقررشدہ رقم لے لیتا ہے اور بقیہ روپئے فصل والے کوسپرد کردیتے ہیں اورایڈوانس جوروپئے فصل والے کوسپرد کردیتے ہیں اس کودوتین دفعہ میں یا ایک ہی دفعہ میں کاٹ لیتا ہے، جیسے جیسے فصل پہونچتی رہتی ہے، وہ اپنی رقم وصول کرتا رہتا ہے۔

نیزآڑھت والے کے ایڈوانس روپئے دینے کے بعد فصل والے کسی اورکوفصل نہیں دے سکتے ہیں، دوسرے کودینے کی صورت میں آڑھت میں پیداور پہونچانے پرمقید کرلیا؛ لہٰذا یہ اور بات ہے کہ وہ پوشیدہ طور پر دوسری جگہ فصل سیل کردیتا ہے، تو ایسی صورت میں شریعت کیا یہ اجازت دیتی ہے اورایسے طریقے سے لین دین کرنے والے کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: عبدالستار، متعلم دورۂ حدیث مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جورقم آڑھت والے دیتے ہیں وہ چونکہ کھیتی ہی کرنے کے لئے دیتے ہیں اوراس وقت باقاعدہ خرید وفروخت نہیں ہوتی ہے؛ اس لئے دی ہوئی رقم شرعاً قرض کے دائرہ میں داخل ہے، اور جب کھیتی تیار ہوجاتی ہے، تو آڑھت والے بازار کے مناسب بھاؤ پر مالکان سے پیداوار خرید لیتے ہیں اوراپنی سابقہ دی ہوئی رقموں سے قیمت کومجرا کرلیتے ہیں، تو اس طرح کا معاملہ شرعاً جائز اور درست ہے بشرطیکہ مالکان کو یہ بھی اختیار ہوکہ خود پیداوار کا مناسب بھاؤ مقرر کریں۔

ولو أعطاه الدارهم وجعل يأخذ منه كل يوم خمسة أمناء ولم يقل في الابتداء اشتريت منک يجوز وهذا حلال، وإن كان نية وقت الدفع الشراء؛ لأنه بمجرد النية لا ينعقد البيع وإنما ينعقد البيع الآن بالتعاطي، والآن المبيع معلوم فينعقد البيع صحيحاً. (شامي، كتاب البيوع، مطلب البيع

بالتعاطي، زكريا ٧/٣١، كراچي ٤/٥١٦، البحرالرائق، كوئٹه ٥/٢٧٤، زكريا٥/٤٥٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ٩/٤٤)

اور اگر آڑھت والوں کو اپنی دی ہوئی رقم کی مقدار کی وصولی میں کوئی تردد نہ ہو تو مالکان کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے سے روکنے کا حق حاصل نہ ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱ر ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹/ ۳۴۰۶)

کمپنی میں دس ہزار جمع کر کے بیس ہزار لینا

سوال [۹۰۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے ملک میں بہت سی کمپنیاں ہیں جو کہ عوام الناس سے روپیہ جمع کراتی ہیں اور کام کرتی ہیں، بہت سی کمپنیاں بھاگ بھی گئی ہیں اور اب ایک کمپنی پلس کے نام سے چل رہی ہے، وہ عوام سے دس ہزار روپئے لے کر سات سال میں اس کے بیس ہزار روپئے دیتی ہے، اور اس کے کام کرنے والوں کو بھی اسمیں حصہ ملتا ہے۔

دوسرا طریقہ اس کے کام کرنے والے یہ بتاتے ہیں کہ ہر چھ ماہ میں ایک قسط پچیس سو روپیہ یا چھتیس سو روپئے کی جمع کراتی ہے، پھر وہ آٹھ یا دس سال میں اس کے دو گنے یا کم و بیش دلانے کو کہتے ہیں، اس میں نفع ہی ہے، اس صورت حال میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ بیاج ہوا اور کچھ لوگ منع کرتے ہیں کہ بیاج نہیں ہوا ہے؟

المستفتی: علیم الدین، قصبہ سرجن نگر، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں دس ہزار روپیہ دے کر سات سال بعد بیس ہزار لینا سود کے دائرہ میں داخل ہو کر اپنے دیئے ہوئے دس ہزار پر مزید دس ہزار کا جو اضافہ آرہا ہے، وہ حرام ہے۔ دوسری صورت بھی سود کے دائرہ میں داخل ہے۔

قال اللہ تبارک وتعالیٰ في کتابه العزیز: یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَأْکُلُوْا الرِّبَا اَضْعَافًا مُضَاعَفَةً. [سورة العمران: ١٣٠]

الربوا هو الفضل المستحق لأحد المتعاقدین في المعاوضة الخالي عن عوض شرط فیه. (هداية، کتاب البيوع، باب الربوا، اشرفي ٣/٧٨، هندية، زکریا قدیم ٣/١١٧، جدید ٣/١١٨، المبسوط للسرخسي، دارالکتب العلمیة بیروت ١٢/١٠٩)

عن جابرؓ، قال: لعن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم آکل الربوا، ومؤکله، وکاتبه، وشاهدیه، وقال: وهم سواء. (مسلم شریف، باب لعن آکل الربا، ومؤکله، النسخة الهندیة، ٢/٢٧، بیت الأفکار رقم:١٥٩٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۸۱۵/۳۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۵/۲۰ھ

پرائیویٹ کمپنی کا کم روپے لے کر کچھ مدت بعد زیادہ روپے دینا

سوال [۹۰۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہندوستان میں کچھ پرائیویٹ کمپنیاں بینک کی شکل میں کچھ اسکیمیں چلاتی ہیں اور لوگوں سے کم رقم لے کر زیادہ رقم دیتی ہیں، مثلاً زید نے ہر مہینہ دوسو روپیہ چھ سال تک جمع کیے، تو زید کی جمع شدہ رقم چھ سال میں چودہ ہزار چار سو روپئے ہوئی؛ لیکن کمپنی نے زید کو اٹھائیس ہزار آٹھ سو روپئے دیئے، یعنی جمع شدہ رقم کا دوگنا اور اگر دوگنا نہیں، تو بہر حال جمع شدہ رقم سے زائد کمپنی نے زید کو ادا کئے اور اس کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ زید نے ماہانہ دوسو روپیہ کر کے چھ سال تک جمع کئے اور ابھی تین سال تک ہی جمع کئے تھے کہ زید کا انتقال ہوگیا۔ اب بھی کمپنی زید کے وارث کو اٹھائیس ہزار آٹھ سو روپیہ ادا کرے گی، تو کیا شرعاً یہ تمام صورتیں جائز ہیں؟

المستفتی: محمد انوار الحق قاسمی، جھارکھنڈ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سوالنامہ میں ذکر کردہ دونوں صورتوں میں جو زائد رقم ملتی ہے، وہ بیاج اور سود ہے؛ لہٰذا وہ زید کے لئے حرام ہے۔

عن علي قال: كل قرض جر منفعة، فهو ربا. (كنز العمال الدين والسلم، دارالكتب العلمية بيروت ٩٩/٦، رقم: ١٥٥١٢، جامع الأحاديث الكبير للسيوطي ٤٣٨/٦، رقم: ١٥٨٢١)

وأما ربا النسيئة: فهو الأمر الذي كان مشهوراً متعارفاً في الجاهلية، وذلک أنهم كانوا يدفعون المال على أن يأخذوا على شهر قدراً معيناً، ويكون رأس المال باقياً، ثم إذا حل الدين طالبوا المديون برأس المال. (تفسير كبير للإمام الفخر الرازيؒ، تحت تفسير رقم الآية: ٢٧٥، من سورة البقره ٩١/٧، روح البيان ٩٣/٢، غرائب القرآن للنيسابوري ٦٠/٢)

وربا النسيئة هو فضل الحلول على الأجل في المطعومات والثمنية في الأثمان. (بدائع الصنائع، زكريا ٤٠٧/٤، كراچي ١٨٧/٥، تحفة الفقهاء، دارالكتب العلمية بيروت ٢٥/٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ربیع الاول ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۹۶۳/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۳/۷ھ

کمپنی فینوسینل ہیلتھ کیر سروس میں شرکت

سوال [۹۰۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک کمپنی فینوسینل ہیلتھ کیر سروس کے نام سے چلتی ہے، جس میں منسلک ہونے کے لیئے جسٹریشن فیس -/300 روپئے ہے، ہر ماہ ہزار روپئے بیس مہینے تک جمع کرنے ہوں گے، جب بیس ہزار روپیہ جمع ہوجائیں تو ۹/سال بعد چالیس ہزار روپئے کمپنی دے گی۔

مزید ایک لاکھ کا انشورنش بھی ملے گا، ایک سال میں کمپنی بیس ایسے ٹوکن دے گی، جس سے متعینہ ہسپتال میں ڈاکٹرس کے یہاں علاج کروانے پر ڈاکٹری فیس معاف ہوجائے گی، ڈاکٹرس کمپنی سے فیس وصول کرلیتے ہیں، سال میں ایک مرتبہ پندرہ ہزارروپیہ میڈیکل خرچ کمپنی خود دے گی، منسلک بغیر ڈپازٹ کے کسی بڑے ہسپتال میں شریک ہوسکتا ہے، پندرہ سو روپئے زائد جمع کرنے پر قلب کے مریض کا علاج مفت ہوگا، اگر ہم ممبرس تیار کریں تو سات فیصد نفع ہم کو حاصل ہوگا۔ کیا اس کمپنی کا ممبر بننا اور اس کے لئے ممبرس تیار کرنا اور اس سے مذکورہ فوائد حاصل کرنا ازروئے شرع درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد انعام الحق

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں جو ذکر کیا گیا ہے کہ کمپنی کا ممبر بننے کے بعد اس میں بیس ہزار روپئے جمع کردیں گے، تو نو سال میں چالیس ہزار روپئے اور ایک لاکھ کا انشورنش اور دیگر منافع جو حاصل ہوں گے، یہ سب شرعاً سود ہے؛ لہٰذا اس کمپنی کا خود ممبر بننا اور دوسروں کو اس کا ممبر بنانا اور اس سے مذکورہ فوائد حاص کرنا جائز نہیں ہے۔

قال اللّٰه تعالىٰ: الرِّبَا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [سورة البقرہ: ٢٧٥]

والحاصل أن الربا حرام. (شامي، كتاب الحقوق، قبيل باب الحقوق في البيع، زكريا ٧/ ٤٢٤، كراچي ٥/ ١٨٧)

عن جابرؓ، قال: لعن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: وهم سواء. (مسلم شريف، باب لعن آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ٢/ ٢٧، بيت الأفكار رقم:١٥٩٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۲۶۶/۳۸)

کمپنیوں کی ممبر سازی کی شرعی حیثیت

سوال [۹۰۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک تنظیمی کمپنی ہے، جس کا کام براہ راست کمپنی سے مال حاصل کر کے گاہکوں کے لئے فراہم کرنا ہے، فراہم کرنے کی شکل یہ ہے کہ جو شخص اس تنظیمی کمپنی سے چھتیس ہزار روپئے کا سامان خریدے گا، تو یہ کمپنی اس مذکورہ گاہک کو اپنا پریوار بنالیتی ہے اور پریوار بنا کر اس کے ذمہ کچھ کام سپرد کر کے بہت سی سہولیات سے مالا مال کرتی ہے، مثلاً اس کی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ کمپنی کا پرچار کر کے گاہکوں کو فراہم کرے، تو گاہک کے دو کام ہوئے، ایک مال شروع میں حاصل کر کے کمپنی کا ممبر بن جانا ہے۔ دوسرا کام پرچار کرنا ہے، مثلاً اگر زید نے تنظیمی کمپنی کا ممبر بن کر عمرو کو ممبر بنایا، تو زید کو صرف عمرو کے ممبر بننے سے ۵۰۰/ روپیہ ملے گا اور ایک ممبر بنانے سے تنظیمی کمپنی زید کو ترقی دیتی ہے، یعنی ایک ہزار ملنے لگتے ہیں، ایک حد تک زید کو نفع ملتا رہتا ہے۔

نیز اگر زید کے بنائے ہوئے ممبر بھی دوسرے ممبر فراہم کریں تو بھی زید کو کچھ رقم ملتی ہے، مثلاً زید نے عمرو کو ممبر بنایا، تو زید کو ۵۰۰/ روپئے حاصل ہوئے، اور اگر عمرو نے خالد کو ممبر بنا دیا تو عمرو کو ۵۰۰/ روپئے ملیں گے؛ لیکن ساتھ ساتھ زید کو بھی کچھ رقم ملے گی۔

واضح رہے کہ یہ کمپنی جو اپنے گاہکوں کو ممبر بنانے اور پرچار کرنے پر روپیہ دیتی ہے، وہ روپئے ہوتے ہیں، جس کے اندر بظاہر سود و ربوا کی کوئی شکل نہیں ہوتی ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ عام طور سے اصل کمپنی سے مال صوبہ کا راجیہ وکریتا حاصل کرتا ہے، مثلاً کمپنی نے ایک چیز ۵۰/ روپیہ میں تیار کی تو یہ کمپنی راجیہ وکریتا کو دس روپئے نفع لے کر کل ساٹھ روپیہ میں دیتی ہے، اور ہر سیلر دس روپیہ نفع لے کر ۸۰/ روپیہ میں دوکاندار کو دیتا ہے، اور دوکاندار دس روپیہ فی شئ کے لیتے ہیں، تو اب عام گاہکوں کے ہاتھ میں مال پہونچتے پہونچتے سو روپئے ہوجاتے ہیں؛ لیکن یہ جو تنظیمی کمپنی ہے، وہ اصل کمپنی سے ۵۰/ روپیہ میں

تیار ہوئی چیز کو ساٹھ روپیہ میں لے کر اپنے خاص گاہک یعنی پر یوار کو ۷۰/ روپیہ میں دیتی ہے، اب یہ جو واسطے بنے ہیں ان کے اور راجیہ و کریتا کے اور ہم سیلر وغیرہ کے پیسے بچا کر قسطوں میں یہ تنظیمی کمپنی ان ہی ممبروں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ نیز یہ جو روپیہ ممبروں کے پاس پہونچتا ہے، حکومت انکم ٹیکس بھی حاصل کرلیتی ہے، یعنی حکومت سے بھی کوئی چیز رہتی نہیں ہے، نیز یہ تنظیمی کمپنی اپنے کسی ممبر یعنی پر یوار کے مرنے پر ایک لاکھ روپئے دیتی ہے اور یہ بھی وہ پیسے ہوتے ہیں جو قسطوں میں تھے، ممبروں میں ماہانہ تقسیم ہوتے ہیں، اس سے ایک ایک روپیہ بچا کر مرنے والے کو دے دیا جاتا ہے، نیز ان باتوں سے ممبر کو شروع ہی میں آگاہ کر دیا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ ایک ایک روپیہ جو کاٹے جاتے ہیں وہ بھی ان کی اجازت سے۔ بہر حال رشوت ربوا، کی کوئی شکل بظاہر نظر نہیں آرہی ہے؛ لہٰذا شرعی حکم مسئلہ مذکورہ میں کیا ہے؟ جواب سے تشفی بخشیں۔

المستفتی: محمد یوسف، شریف نگری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس تنظیمی کمپنی کا سوال نامہ میں ذکر کیا گیا ہے، اس طرح کی کمپنیوں کے متعلق اس سے پہلے بھی کئی سوالات آچکے ہیں اور اس کمپنی کے طریقۂ کار کو پورا سمجھنے کے بعد جوابات بھی لکھے جاچکے ہیں، اس کمپنی میں شرکت اور کمپنی سے منافع وصول کرنے کے بارے دو حیثیتیں الگ الگ ہیں۔

(۱) پہلی حیثیت تو یہ ہے کہ کمپنی سے سامان خریدنا اور پھر کمپنی کا پر یوار اور ایجنٹ بننا اور پھر اس کے منافع میں سے کمپنی کو کچھ دینا اور لینا شریک کار کے لئے صرف دو بطن تک جائز ہے۔

پہلا بطن خود شریک ہونے والا، دوسرا بطن شریک ہونے کے بعد دوسروں کو ممبر بنانے کے نتیجے میں اس کو منافع میں سے ممبر سازی کی اجرت کے طور پر متعین رقم ملنا یہاں تک جائز ہے، اس کے بعد دوسری حیثیت یہ ہے کہ اس شریک اور ممبر نے جن لوگوں کو ممبر

بنایا ہے، اگران لوگوں نے تیسرے ممبر کے لوگوں کوممبر بنایا ہے، اوراس ممبر سازی کے نتیجے میں کمپنی براہ راست ممبر بنانے والوں کو جومنافع دیتی ہے،یعنی دوسرے درجہ کے ممبروں کو منافع یا کچھ دینادرست نہیں ہے۔ اور نہ پہلے درجہ کے ممبروں کے لئے لینادرست ہے؛اس لئے کہ دوسرے درجہ کے ممبروں نے جومحنت کی ہے،اس محنت میں پہلے درجہ کے ممبروں کی محنت شامل نہیں ہے؛ اس لئے شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی اورسوال نامہ میں یہ بات واضح کر کے پیش کی گئی ہے کہ پہلے درجہ کے ممبروں کو دوسرے درجہ کے ممبروں کی ممبر سازی کے نتیجے میں جو کچھ ملتا ہے، وہ سود اور ربوا نہیں ہے،تو یہ بات صحیح ہے کہ وہ حقیقی سود اورربوانہیں ہے،مگردوسرے درجہ کے ممبروں نے جوممبر سازی کی ہے،تو جو کچھ ملنا ہے وہ ان ہی کا حق ہے، پہلے درجہ کے ممبروں کا اس میں کوئی حق نہیں ہے؛اس لئے اس میں ان کا کوئی حق متعلق نہیں ہےاوران کو جوملتا ہےوہ عقود فاسدہ کےنتیجہ میں ملتاہے جوجائزنہیں ہے۔

لایجوز لأحد أن یأخذ مال أحد بلا سبب شرعي. (قواعد الفقه، اشرفي ۱۱۰، رقم: شرح المجلة، رستم اتحاد ۱/۶۲، رقم المادة: ۹۷، هندية، زكريا قديم ۲/۱۶۷، جديد ۲/۱۸۱، شامي، زكريا ۶/۱۰۶، كراچي ۴/۶۱، البحرالرائق، زكريا ۵/۶۸، كوئٹه ۵/۴۱، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۱/۱۱۲، ۲۸/۲۶۴، ۳۷/۳۵۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۰؍شعبان المعظم ۱۴۲۷ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر:الف ۳۸/۹۱۱۰)	۱۱/۸/۱۴۲۷ھ

کمپنی سے دوکان کی خرید وفروخت کی ایک ناجائز شکل

سوال[۹۰۶۱]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک کمپنی جو کہ زمین کی خرید وفروخت کا کاروبار کرتی ہے،اس کاروبار کو کرنے کے لئے پیسہ عوام سے جمع کراتی ہے اور مجھ سے کمپنی نے سات سال کے دس ہزار

روپئے جمع کرائے ہیں اور میرے نام سے دوسو اسکوائر گز زمین رجسٹری کردی ہے، سات سال کے لئے کمپنی نے معاہدہ کرایا ہے، تو اس زمین کا استعمال سات سال تک کمپنی اپنے طریقہ سے کرے گی، سات سال پورے ہونے پر میں چاہوں، تو زمین لے سکتا ہوں، کسی دوسرے شخص یا کسی اور کمپنی کو فروخت کرسکتا ہوں۔ میں چاہوں تو اس کمپنی کو ہی جس نے پیسہ جمع کرایا ہے، چوبیس ہزار چھ سو روپیہ میں فروخت کرسکتا ہوں، میں نے چوبیس ہزار چھ سو روپئے میں اس کمپنی کو ہی زمین فروخت کردی ہے، مجھے سات سال میں چودہ ہزار روپیہ کا منافع ہوا، یہ منافع میرے لئے جائز ہے یا نہیں؟ شرعی جواب سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی: سلیم احمد، میر پور، موہن چک، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر دس ہزار روپیہ جمع کرکے آپ زمین کے خریدار بن گئے ہیں، تو یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ زمین کی مقدار کتنی ہے؟ کس شہر میں ہے؟ کس جگہ ہے؟ اگر آپ کو تمام چیزوں کی نشاندہی حاصل ہوگئی ہے اور سات سال کے بعد آپ کو وہ زمین مل گئی ہے، تو آپ اس کے مالک ہیں، چاہے اسی کمپنی کے ہاتھ فروخت کریں یا دوسرے کے ہاتھ جیسا کہ سوال نامہ میں مذکور ہے۔ اور اگر زمین کی نشاندہی مکمل طریقے سے نہیں ہوئی ہے، کس شہر میں کس علاقہ میں کس جگہ میں یہ تفصیلات آپ کو معلوم نہیں؛ بلکہ یہ سب باتیں فرضی ہیں، اس کے بعد آپ اسی کمپنی سے فروختگی کے لئے فرضی کاغذات بنا کر اسی کمپنی کو ۲۴ر ہزار ۶ رسو میں فروخت کرتے ہیں، تو محض یہ فرضی معاملہ ہے، اس کا کوئی اعتبار نہ ہوگا؛ لہٰذا دس ہزار سے جو زائد رقم اس کمپنی سے ملے گی، وہ سود اور حرام ہے، اور یہ بات محض فرضی ہے کہ کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرسکتے ہیں، یہ عمل کے دائرے میں نہیں ہے، ہاں البتہ اگر عملاً متعدد واقعات پیش آچکے ہیں کہ کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کئے جاچکے ہیں اور زمین بھی متعین ہے، تو جائز ہوسکتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جو چیز فروخت کی جاتی ہے، فروخت کرنے والے کا قبضہ اس چیز پر لازم ہے اور غیر متعین شئ پر قبضہ ممکن نہیں اور نہ ہی

مقدور التسلیم ہوتی ہے اور بیع کے جائز ہونے کے لئے خود فروخت کرنے والے کا قبضہ اور مشتری کو قبضہ دینے کے لئے حوالہ پر قدرت دینا لازم ہے اور فرضی امور میں یہ معاملے نہیں پائے جاتے ہیں۔

فإن كانت كبيرة لا يجوز؛ لأنه غير مقدور التسليم. (عنايه، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، زكريا ٦/ ٣٧٦، كوئٹه ٦/ ٤٩١، دارالفكر ٦/ ٤٠٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ / جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۸۱۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۵/۲۴ھ

ممبر شپ بنانے میں انعام کا حکم

سوال [۹۰۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک تجارتی کمپنی کا نام .R.M.P ہے، یہ کمپنی مختلف سامان فروخت کرتی ہے، مثلاً موٹر سائیکل، گھڑی، لباس، فرنیچر وغیرہ یہ کمپنی ممبر بناتی ہے، اور ہر ممبر کو ہر سامان کی فروختگی پر 500 روپئے انعام دیتی ہے۔

تفصیل یہ ہے کہ مثلاً زید نے اس کمپنی سے ایک گھڑی 7000 سات ہزار روپئے کے عوض خریدی تو محض خریدنا ہی ممبری ہے، ممبری فیس علیحدگی نہیں ہے۔ اب اگر زید اس کمپنی سے کچھ آمدنی وانعام حاصل کرنا چاہے، تو دو آدمیوں کو (راشد وشاکر) کو کمپنی کا کوئی سامان خریدنے پر آمادہ کرے اگر دو آدمیوں کی تشکیل کر کے کمپنی کا دو سامان فروخت کر سکا، تو ہر سامان کے عوض زید کو -/500 روپئے انعام ملے گا؛ لہٰذا دو سامانوں کے عوض -/1000 ایک ہزار روپیہ انعام ملے گا، پھر راشد اور شاکر اگر دو دو آمیوں کو ممبر بنا کر کوئی سامان فروخت کر سکے، تو زید کا انعام -/2000 دو ہزار ہوگا اور راشد وشاکر کا ایک ہزار انعام ہوگا۔ اسی طرح انعام کا سلسلہ آٹھ واسطہ تک چلتا رہے گا، آٹھ واسطے کے بعد زید کا انعام بند ہو جائے گا۔

واضح رہے کہ اس کمپنی سے مال خریدنے کے لئے ممبر سازی شرط نہیں؛ بلکہ اختیاری ہے، انعام حاصل کرنا ہو، تو ممبر بنائے، انعام حاصل کرنا نہ ہو، تو ممبر نہ بنائے۔

اب سوال یہ ہے کہ زید وغیرہ ممبران کو جو ہر سامان کی فروختگی پر پانچ سو روپئے انعام ملتا ہے، یہ انعام لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد شہید اللہ ہاوڑوی، مدرسہ شرف العلوم کیتھن، بر دوان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سوالنامہ میں کمپنی کا طریقۂ کار غور سے پڑھ کر سمجھ لیا گیا ہے، اس طریقہ کار میں زید کے لئے صرف راشد اور شاکر کو سامان خریدوا کر ممبر بنانے کے عوض میں پانچ پانچ سو روپئے (کل ایک ہزار روپئے) جو ملے ہیں وہی جائز ہیں، اس کے بعد راشد اور شاکر جن لوگوں کو ممبر بنا کر انعام حاصل کریں گے، وہ راشد و شاکر کے لئے تو جائز ہے؛ لیکن اس کے نتیجے میں کمپنی کی طرف سے زید کو جو دو ہزار ملیں گے، وہ زید کے لئے جائز نہیں؛ اس لئے کہ اس میں زید کی محنت کا کوئی دخل نہیں، اسی طرح نیچے تک کسی بھی ممبر شپ کے نتیجہ میں زید کے لئے انعام درست نہیں ہے اور پہلی ممبر شپ میں جو اس کو ملا ہے، اس کو انعام نہیں کہا جا سکتا؛ بلکہ ممبر بنوانے کی اجرت ہے، جو پہلے ہی سے طے ہے، کمپنی کا یہ طریقہ کار اگر چہ بالکل ایم وے کی شکل نہیں ہے، مگر اس سے ملتی جلتی ایک اسکیم ہے۔

(مستفاد: انوار رحمت ۲۵۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۳ / صفر المظفر ۱۴۲۹ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۴۶۶/۳۸)	۱۴۲۹/۲/۲۳ھ

بینک سے سود لینے کے مشابہ صورت کا حکم

سوال [۹۰۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ دو شخص آپس میں یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ محنت ایک شخص کی اور پیسہ دوسرے شخص کا، معاملات میں جہاں تک ہماری معلومات ہے، اس طرح تجارت کرنے میں دونوں فریق کو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کون سا دھندہ یا تجارت کی جارہی ہے؟ اور کتنا منافع ہورہا ہے، اس میں منافع کی تقسیم فیصد کے حساب سے ہوتی ہے کہ ایک رقم کی تخصیص کی جاتی ہے، اگر تجارت میں پیسہ لگانے والے شخص کو ایک معقول رقم فکس کردی جائے، تو وہ سود ہوگا کہ نہیں؟ اس بارے میں شرعی معلومات دیجئے۔

المستفتی: محمد اسلم کرن، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر تجارت کے منافع میں سرمایہ کار کیلئے ایک رقم کی تخصیص کردی جائے، تو یہ جائز نہ ہوگا؛ کیونکہ ممکن ہے بالکل ہی نفع نہ ہو اور کمپنی کو نفع کے بجائے نقصان اٹھانا پڑے؛ لہٰذا یہ بھی بینک کے سود کے مشابہ ہوکر ناجائز ہوگا؛ کیونکہ شرکت کے لئے یہ ضروری ہے کہ نفع ونقصان دونوں میں ساجھے داری ہو۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۰۶)

اعلم أنهما إذا شرطا العمل عليهما، وإن تساويا مالا ونفاوتا ربحاً جاز عند علمائنا الثلاثة خلافا لزفر، والربح بينهما على ماشرطا وإن عمل أحدهما. (شامي، كتاب الشركة، مطلب في توقيت الشركة رواتيان، زكريا ٦/٤٨٤، كراچي ٤/٣١٢، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٦/٦١)

وقال الشامي: تحت قوله: والهلاك على مالكه الخ بخلاف مالو هلك بعد الخلط؛ لأنه يهلك على الشركة لعدم التميز عن الإتقان.

(شامي، كتاب الشركة، مطلب فيما يبطل الشركة، زكريا ٦/٤٨٨، كراچي ٤/٣١٥)

وفي الدر المختار: وماهلك من مال المضاربة يصرف إلى الربح؛ لأنه تبع وإن قسم الربح وبقيت المضاربة، ثم هلك المال، أو بعضه تراد الربح؛ ليأخذ المالك رأس المال وما فضل بينهما. (الدر المختار مع الشامي، كتاب المضاربة،

قبیل فصل في المتفرقات، زکریا۸/ ٤٤٥، کراچي ٥/ ٦٥٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴؍ ۶۱۵۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۵/۱۴ھ

پگڑی میں سودی رقم دینا

سوال [۹۰۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کے ایک مکان میں غیر مسلم کرایہ دار آباد ہے، اب اپنا ذاتی مکان لے کر اس میں رہائش اختیار کر لی ہے، اور اس مکان میں بھینس رکھ کر دودھ کا کاروبار کرلیا، مالک مکان کو اپنے بچوں کے لئے مکان کی سخت ضرورت ہے، مالک نے غیر مسلم کرایہ دار سے مکان خالی کرنے کی بات چیت کی، کرایہ دار اس قدر کثیر رقم پگڑی کی مانگ رہا ہے، جو اصل میں سے دینا مشکل ہے، ہمارا بینک میں سود جمع ہے، بینک کا سود اور پگڑی دونوں حرام ہیں، حرام کا روپیہ غیر مسلم کرایہ دار کو حرام پگڑی میں دیا جاسکتا ہے، اگر مطلوبہ رقم کم رہ جائے تو نیت کر کے سود کی رقم میں اور دی جاسکتی ہے؟

المستفتی: محمد شفیع، تاجر عطر وتیل ۲۱۵۲؍ ترکمان دروازہ، دہلی ۱۱۰۰۰۲

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر آپ نے کرایہ دار کو قبضہ دیتے وقت اس طرح یکمشت رقم نہیں لی ہے، تو شرعی طور پر اب کرایہ دار سے خالی کرانے کے لئے پگڑی کے نام پر اس طرح بھاری رقم دینا آپ پر شرعی طور پر لازم نہیں ہے۔ یہ جبری رشوت کے دائرہ میں داخل ہوگا اور رشوت میں بینک سے حاصل شدہ سودی رقم دینا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ مال حرام میں اصل حکم یہی ہے کہ کسی بھی عنوان سے، اصل مالک کو پہونچا دیا جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو بلانیت ثواب فقراء کو دیدینا واجب ہو جاتا ہے، ہاں البتہ اگر اسی کرایہ دار

سے آپ کا سودی معاملہ ہوتا ہے اور کرایہ دار پر آپ کے لئے سودی رقم لازم ہوئی، تو اس سودی رقم کو پگڑی کے نام سے اسی کرائے دار کو دینا جائز ہوسکتا تھا؛ لہٰذا بینک سے حاصل شدہ سودی رقم کرائے دار کو مکان خالی کرانے کی غرض سے پگڑی میں دینا جائز نہ ہوگا۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمة عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور قديم ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰/ رجب المرجب ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۳۲۵۱)

سودی لین دین کرنے والے بھائی کے ساتھ رہن سہن

سوال [۹۰۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ممبئی میں میں نے مدرسہ شاہی سے شائع ہونے والے رسالہ ندائے شاہی کو لیا تھا، بہت پسند آیا، اللہ تعالیٰ ترقی عطا کرے۔ آپ سے ایک مسئلہ دریافت کرنا ہے؛ اس لئے میں آپ کے پاس خط لکھ رہا ہوں امید ہے آپ مجھ ناکارہ کے خط کا جواب ضرور دیں گے۔ ضروری عرض یہ ہے کہ ہم دو بھائی ہیں، والد والدہ ہم لوگوں کے ساتھ ہیں، بھائی کی شادی ہوگئی ہے، میری شادی ابھی نہیں ہوئی ہے۔

1982 میں بھائی نے یہاں بیڑی کا کاروبار شروع کیا اور 1988 میں بھائی نے پرانا ٹرک لیا، ٹرک میرے نام سے ہے، ٹرک میں ایسا ہوتا ہے، مثال کے طور پر کسی نے ڈیڑھ لاکھ کا پرانا ٹرک لیا، گاڑی لینے والے کے پاس اگر ڈیڑھ لاکھ روپیہ ہے، تب تو کیش دے کر لے گا، اگر اس کے پاس پچھتر ہزار یا ایک لاکھ روپیہ ہے، اس کے بعد جتنا پیسہ اس کے پاس کم پڑ رہا ہے،

اتنا پیسہ وہ کسی فائینسر سے بیاج پر پیسہ لے گا، اسی طرح سے ڈیڑھ لاکھ پورا کرے گا تب گاڑی اس کے نام سے ہوگی؛ جبکہ ہم لوگوں کو معلوم ہے کہ بیاج پر پیسہ لینا دینا دونوں حرام ہیں؛ حالانکہ بھائی سے میں نے کہا کہ یہ جائز نہیں ہے، تو پھر بھائی خفا ہوگئے، میں نے بھائی سے کہہ دیا کہ بھائی گاڑی لے لیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، یہ مجھے معلوم نہیں ہے کہ جس سے بھائی نے گاڑی لی، اس کو کتنا پیسہ کیش دیا؟ کتنا باقی رکھا؟ اس بات کا مجھے علم نہیں ہے۔ خیر بھائی جان مجھے فائینینسر کے یہاں لئے گئے، جو بیاج پر پیسہ دیتے ہیں، وہاں مجھے ڈھیر سارے دستخط کرنے پڑے، تب فائینینسر لوگ پیسہ دیتے ہیں، پچاس ساٹھ ہزار جو بھی بھائی نے لیا، اس بات کا مجھے اچھی طرح سے دھیان نہیں ہے، پچاس ہزار لیا کہ ساٹھ ہزار۔ خیر جتنا بھی لیا ہو، اس کے بعد گاڑی میرے نام سے ہوگئی، فائینسر لوگ بیاج کے ساتھ ہفتہ باندھ دیتے ہیں کہ اتنے دن میں آپ کو اتنا پیسہ بھرنا پڑے گا، میں کوشش کرتا ہوں کہ رزق طیب ہو، حلال رزق کھائیں، ماں باپ ساتھ ہیں، کس طرح سے حلال رزق حاصل کریں، بھائی کے ساتھ رہ کر مجھے کس طرح سے زندگی گذارنی ہے؟ شریعت میں میرے لئے کیا حکم ہے؟ آپ جلد سے جلد اس کا جواب دیں۔ مجھے کس طرح سے خرچ کرنا چاہئے اور ضروریات میں شریعت میں جو حکم ہو، آپ میرے پاس خط لکھیں تاکہ میں اپنے قدموں کو جمائے رکھوں۔ اللہ کے فضل سے بیڑی کا کاروبار بھی ہے۔ جواب جلد دیجئے گا آپ کی مہربانی ہوگی۔

المستفتی: حارث احمد، احمدآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سودی معاملہ میں سود لینے والے، دینے والے، اس کے معاہدے لکھنے والے، اس معاملہ میں گواہ بننے والے، سب پر اللہ کے پیارے پیغمبر ﷺ نے لعنت کی ہے۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: آکل الربوا، ومؤکلہ، وکاتبہ، وشاہدیہ، وقال: ہم سواء. (مسلم شریف، باب لعن آکل الربا،

ومؤكله، النسخة الهندية، ۲/ ۲۷، بیت الأفکار رقم:۱۵۹۸)

اورٹرک خریدنے کے لئے سود پر پیسہ لینے والے بھی لعنت میں شامل ہوں گے؛ لیکن سوال نامہ سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کو اصل معاملہ ہی کا علم نہیں ہے؛ چہ جائیکہ خود معاملہ کریں؛ اس لئے مذکورہ معاملہ میں مستحق لعنت آپ کے بھائی صاحب ہی ہوں گے۔ اور جب تک سودی پیسہ دیتے رہیں گے لعنت ہوتی رہے گی۔ اب رہا خریدے ہوئے ٹرک کا مسئلہ اور آئندہ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی تو وہ سب شرعاً آپ کے بھائی صاحب کی ملکیت میں ہوگی نہ کہ آپ کی ملکیت میں۔(مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۶)

وبيع التلجئة: في ما ألجئ إليه الإنسان بغير اختياره وذلک أن يخاف الرجل السلطان، فيقول لآخر أني أظهر أني بعت داري منک وليس ببيع في الحقيقة وإنما هو تلجئة. (شامي، کتاب البيوع، باب الصرف، مطلب في بيع التلجئة، زكريا ۷/ ۵٤۲، کراچي ۵/ ۲۷۳، هندية، زكريا قديم ۳/ ۲۰۹، جديد ۳/ ۱۹٦، المبسوط، دارالکتب العلمية بيروت ۲٤/ ۱۲۲)

نیز وہ آمدنی بھی حلال ہوگی؛ کیونکہ آپ کے بھائی صاحب نے سود لیا تھا اور نہ ہی سودی آمدنی سے ٹرک خریدا؛ بلکہ اپنی کمائی سے سود دیا ہے، جو کہ لینے والے کے حق میں حرام ہے؛ لہٰذا دینے والے کے لئے دینا حرام ہے اور لینے والے کے لئے لینا بھی حرام ہے اور حاصل شدہ سود بھی حرام ہے۔ اب اگر آپ کو اپنے بھائی صاحب کے ساتھ رہنا ہے، تو اس سودی وناجائز معاملات میں شرکت نہ فرمائیں، ورنہ لعنت میں آپ بھی شریک ہوں گے؛ البتہ جائز معاملات میں شرکت کرنا درست رہے گا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ رجب المرجب ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۳۳۸/۲۵)

(۵) باب پرائیویڈنٹ فنڈ

ملازم کے لئے مالک کے واسطے سے آئی ہوئی سودی وغیر سودی رقم کا حکم

سوال [۹۰۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک ادارہ کا ذمہ دار یا فرم وکارخانہ کا مالک اپنے ملازموں کی تنخواہوں سے پرائیویڈنٹ فنڈ کے نام سے ہر ماہ ایک مخصوص مقدار میں رقم کاٹتا ہے، اور اتنی ہی رقم اپنی جانب سے شامل کرتا ہے، پھر ملازموں کی تنخواہ سے ہر ماہ جمع شدہ رقم کو بینک میں جمع کر دیتا ہے، اس کے نکالنے اور داخل کرنے کا اختیار ذمہ دار یا مالک کو رہتا ہے، اس کے دستخط سے نکلتی ہے اور اسی کے دستخط سے جمع ہوتی ہے، کوئی ملازم ادارہ یا فرم سے الگ ہو جاتا ہے، تو وہ ذمہ دار یا مالک جمع شدہ فنڈ اور فنڈ پر اضافہ سود ملازم کو حساب سے دیتا ہے اور ہر ملازم جانتا ہے کہ اس میں اصل رقم جو تنخواہ سے کٹی تھی وہ کتنی ہے، ادارہ یا فرم نے جو لگائی ہے وہ کتنی ہے؟

سوال طلب امر یہ ہے کہ بینک نے جو سودی رقم ہم کو مالک کے واسطہ سے دی ہے، کیا ہمارے لئے اس کا لینا جائز ہے یا نہیں؟ نیز یہ بھی بتائیں کہ بینک کی دی ہوئی سودی رقم اگر ہمارا جائز حق ہے، تو کیا ادارہ یا فرم کے مالک کو اس رقم کو روک لینا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: (مولانا) عبدالناصر (صاحب) مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ملازم کے لئے اصل رقم اور منجانب بینک جو اضافہ ہوا ہے، وہ دونوں حلال ہیں اور تیسری رقم جو سود میں ملی ہے، وہ حلال نہیں ہے، اس کو انکم ٹیکس، سیل ٹیکس وغیرہ کے عنوان سے سرکار کو واپس کر دے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو فقراء کو بلا نیت ثواب دیدے۔

ویجب علیه أن یرده علی مالکه إن وجد المالک وإلا ففي جمیع الصور یجب علیه أن یتصدق مثل تلک الأموال علی الفقراء. (بذل المجهود، کتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامیة، ۱/۳۵۹، تحت رقم الحدیث: ۵۹، هندیة، زکریاقدیم ۵/۳۴۹، جدید ۵/۴۰۴، شامي، زکریا ۹/۵۵۳، کراچي ۶/۳۸۵، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۳٤/۲٤٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴؍ ۶۳۵۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۳؍ ۱۱؍ ۱۴۲۰ھ

ملازم کی بونس اور فنڈ کا حکم

سوال [۹۰۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بکر نے ۲۰؍ سال تک سرکاری ملازمت کی دوران ملازمت ہر ماہ میں اس کے ۱۰۰؍ روپئے کٹ جاتے تھے، جب وہ رٹائر ہوا، تو حکومت کٹے ہوئے روپئے میں سے فی ماہ ۲۰۰؍ روپئے کے حساب سے دینے لگی، کچھ سالوں میں اس کے روپیہ کی مقدار پوری ہوگئی، پھر بھی حکومت اس کو دیتی رہی، یہاں تک کہ یہ روپئے کٹے ہوئے روپئے سے دوگنے ہوگئے، تو زائد جو رقم مل رہی ہے، اس کا لینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: بشیر احمد، بھوجپوری، سکرہٹہ خورد، بھوجپور (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: یہ زائد رقم شرعی طور پر سود میں داخل نہیں، اس کو لے کر اپنے مصرف میں لانا شرعاً جائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ۴؍ ۲۱۹، جدید ڈابھیل ۱۶؍ ۳۹۳، ایضاح النوادر ۱؍ ۱۴۹، امداد الفتاوی ۳؍ ۱۴۸، نظام الفتاوی ۱؍ ۲۱۳)

وتستحق بإحدی معاني ثلاثة: إما بشرط التعجیل، أو بالتعجیل من غیر شرط، أو باستیفاء المعقود علیه. (هدایة، کتاب الإجارة، باب الأجر متی

يستحق، اشرفي ٣/٢٩٤، هندية، زكريا قديم ٤/٤١٣، جديد ٤/٤٤٣، البحر الرائق، زكريا ٧/٥١١، كوئٹه ٧/٣٠٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳۶۴/۲۷)

این ایس سی و بونس کا حکم

سوال [۹۰۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید ایک اسکول میں مدرس ہے، اور تنخواہ گورنمنٹ سے ملتی ہے، تنخواہ سال میں چار قسطوں میں ملتی ہے، ہر ایک قسط تین مہینہ کی ہوتی ہے، آخری قسط جو مارچ میں ملتی ہے، وہ پہلی تین قسطوں سے زیادہ ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہیکہ درمیان سال میں جو مہنگائی گورنمنٹ بڑھاتی ہے، وہ ساری مہنگائی اور بونس کی رقم بھی اسی قسط میں جڑی ہوئی ہوتی ہے، اس وجہ سے آخری قسط کی رقم زیادہ ہوجاتی ہے، زید کا فنڈ نہیں کٹتا اس کے لئے گورنمنٹ کچھ رقم این ایس سی (N.S.C) بناتی ہے، این ایس سی کی رقم گورنمنٹ چھ سال سے پہلے نہیں دیتی ہے، چھ سال کے گذرنے کے بعد وہ رقم دوگنا دیتی ہے ۲۰۰ روپیہ کی (N.S.C) بنی تو چھ سال کے بعد ۲۰۰ر کے بجائے چھ سو روپیہ دیتی ہے۔

تنخواہ کی تفصیل	تنخواہ	مہنگائی	انیر رقم سہایتا	بونس	مجموعہ	N.S.C.	واجب الاداء
	200/-	50/-	50/-	150/-	450/-	200/-	250/-

مان لیجئے کہ زید کی کل تنخواہ -/450 روپیہ ہوئی گورنمنٹ نے پوری رقم اسکول کو بھیج دی اور یہ ہدایت کردی کہ 200 روپیہ کی .N.S.C بنا ہے، تو اسکول والے 200 روپئے کاٹ کر باقی رقم زید کو دیتے ہیں اور بعد میں 200 روپے کی .N.S.C بنوا کر دیتے ہیں، تنخواہ کے وقت زید قبض الوصول پر یہ لکھتا ہے کہ مجھے 250 روپیہ وصول ہوئے اور بعد میں جب N.S.C ملتی ہے، تو لکھتا ہے کہ 200 کی N.S.C وصول ہوئی۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طرح سے N.S.C بنوا کر دیں، تو آڈٹ (Audit) یعنی حساب چیک ہوتے وقت اعتراض ملتا ہے۔ واضح رہے کہ اگر اسکول کا منیجر رقم دیدے، مگر پوری رقم تبھی دے گا، جب آپ 200 روپیہ کی N.S.C بنوا کر اس کو دکھا دیں اور اس کے نمبرات لکھوادیں، پہلے لوگ پوری رقم لیتے تھے، اور این ایس سی نہیں بنواتے تھے؛ اس لئے منیجر خود گورنمنٹ کے حکم کے مطابق رقم کاٹ کر این ایس سی بنواتا ہے۔

خلاصہ: معلوم یہ ہوا کہ پوری رقم ملازم کے قبضہ میں آسکتی ہے، مگر این ایس سی بنوانا لازم اور ضروری ہے۔ مذکورہ صورت میں N.S.C کا کیا حکم ہے؟ دوگنی رقم ایک مدت کے بعد لینا درست ہے یا نہیں؟ شریعت کی روشنی میں مدلل جواب ارسال فرمائیں نوازش ہوگی۔

المستفتی: ودود الحیٔ، مدرسہ ضیاء العلوم، قلی بازار، کانپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تنخواہ کے جس حصہ پر ملازم کا قبضہ نہ ہو، وہ ملازم کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتا ہے؛ لہٰذا جب بعد میں بوقت قبضہ اس پر اضافہ ملے گا، وہ سود نہ ہوگا؛ بلکہ حکومت اپنے قانون کے تحت تنخواہ کے جزء پر اضافہ کر کے اپنے ملازم کو دیتی ہے، جو ملازم کے لئے حلال و پاک ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ۴/۲۲۰، جدید ڈابھیل ۱۶/۳۹۴، امداد الفتاوی ۳/۱۴۸، ۳/۱۴۹، کفایت المفتی ۸/۹۳، جدید زکریا مطول ۱۱/۲۷۵، فتاوی احیاء العلوم ۱/۲۷۲)

قوله: بالتعجيل أو بشرطه، أو بالاستيفاء، أو بالتمكن يعني لا يملك الأجرة إلا بواحد من هذه الأربعة، والمراد أنه لا يستحقها المؤجر إلا بذلك.

(البحر الرائق، كتاب الإجارة، زكريا ۷/ ۵۱۱، كوئٹه ۷/ ۳۰۰، هداية، اشرفي ۳/ ۲۹٤، هندية، زكريا قديم ٤/ ٤۱۳، جديد ۳ ٤٤۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳ / جمادی الاولیٰ ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۴۷۹۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۷/۵/۱۳ھ

بینک کے ملازم کے لئے پینشن کا پیسہ حلال ہے یا نہیں؟

سوال [۹۰۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص کو بینک کی ملازمت سے رٹائرڈ ہونے کے بعد پینشن ملتی ہے، تو اس کے لئے یہ پینشن کا پیسہ حلال ہے یا نہیں؟ اور اس کے گھر کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: سعد اللہ بھاگل پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اب رٹائرڈ ہونے کے بعد جو اسکو پینشن کا پیسہ مل رہا ہے، وہ بلا شبہ جائز ہے؛ اس لئے کہ پینشن حکومت کی جانب سے ایک طرح کا تعاون اور عطیہ ہے، جس کے لینے میں کوئی حرج نہیں؛ لہٰذا اس کے گھر کا کھانا بھی حلال ہوگا۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۸/۹۷، جدید زکریا مطول ۱۱/۲۸۰، آپ کے مسائل ۷/۳۶۹، فتاوی عثمانی ۳/۳۹۵)

اختلف الناس في أخذ الجائزة من السلطان. قال بعضهم: يجوز ما لم يعلم أنه يعطيه من حرام قال محمدؒ: وبه نأخذ مالم نعرف شيئًا حراماً بعينه. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الثاني عشر في الهدايا، والضيافات، زكريا قديم ٥/٣٤٢، جديد ٥/٣٩٦)

والصّدقة على الغلنيين هبة. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دارالكتب العلمية بيروت ٣/٤٩٨)

أن عمر بن الخطابؓ كان يعطيه العطاء ولايزكيه. (المصنف لابن أبي شيبة، مؤسسه علوم القرآن ٦/٥٢٨، رقم: ١٠٥٦٩)

عن محمدؒ قال: رأيت الأمراء إذا أعطوا العطاء زكوه. (المصنف لابن أبي شيبة، مؤسسه علوم القرآن ٦/٥٢٨، رقم: ١٠٥٧٠)

وكانت الصدقة لغني استحساناً؛ لأنه قد يقصد بالصدقة على الغني الثواب. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٥٠٩، مصري قديم٢/ ٣٦٧، البناية، اشرفية ١٠/ ٢١٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۴۰۲)

حکومت کا ملازم کے بارہ سو روپئے جی آر پی فنڈ میں جمع کرلینا

سوال [۹۰۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حکومت کے ذریعہ ہر ماہ تقریباً قریب بارہ سو روپئے جی آر پی فنڈ کے نام سے کاٹا جاتا ہے، وہ پیسہ یعنی کل رقم ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد مع سود کے دیا جائے گا، اس رقم کو لینا کیسا ہے؟

المستفتی: تفسیر احمد رشیدی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تنخواہ کا جو حصہ لازمی طور پر سرکاری قانون کے مطابق وضع کیا جاتا ہے، اور ملازمت سے علیحدگی کے وقت مزید اضافہ کے ساتھ وہ رقم واپس ملتی ہے، یہ اضافی رقم سود میں داخل نہیں ہے؛ بلکہ اصل مشاہرہ کا ہی حصہ ہے؛ اس لئے کہ سود اس اضافی رقم کو کہا جاتا ہے، جو اپنے اختیار سے جمع کردہ اپنی مملوکہ رقم کی واپسی کے وقت ملتی ہے اور جی آر پی فنڈ میں ملازم اپنے اختیار سے اپنی رقم جمع نہیں کرتا؛ بلکہ تنخواہ کا ایک حصہ ملازم کی ملکیت میں آنے سے پہلے جی آر پی فنڈ کے عنوان سے روک لیا جاتا ہے؛ اس لئے یہ رقم سود کے حکم میں نہیں ہے، اسی طرح بڑے مدارس میں بھی پرائیویڈنٹ فنڈ کے نام سے کچھ پیسہ روک لیا جاتا ہے اور علیحدگی کے وقت اضافہ کے ساتھ ملتا ہے۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ.[البقرہ: ۱۷۳]

الأجرة تستحق بأحد معان ثلثة: إما بشرط التعجيل، أو بالتعجيل، أوباستيفاء المعقود عليه. (هندية، كتاب الإجارة، الباب الثاني متى تجب الأجرة وما يتعلق به من الملك وغيره، زكريا قديم ٤/٤١٣، جديد ٤/٤٤٣، اللباب ٢/٩٦، هداية، اشرفي ٣/٢٩٤، البحرالرائق، کوئٹه ٧/٣٠٠، زكريا ٧/٥١١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۲۳۹/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۱۲/۲۷ھ

یکمشت ملنے والے فنڈ میں سود نہیں ہوتا

سوال [۱۰۷۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جب ملازمت کے بعد سرکاری یا غیر سرکاری ملازم کو جمع شدہ فنڈ یکمشت دستیاب ہوتا ہے، تو وہ فنڈ مکمل ملازم کی اپنی جمع شدہ رقم پر کسی گونہ اضافہ کے ساتھ ہوتا ہے، اس فاضل رقم کو اپنے اوپر خرچ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اور اس پر زکوۃ واجب ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عثمان، لالباغ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سرکاری یا غیر سرکاری ملازم سے جو فنڈ کاٹا جاتا ہے، وہ ملازمت ختم ہونے کے بعد جب یکمشت مل جاتا ہے، تو اصل اور اضافہ دونوں جائز اور حلال ہیں، اس میں کوئی سود نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ سود نام ہے، اپنی ملکیت کا پیسہ دوسرے کو دیا جائے اور وہ پیسہ مع اضافہ کے واپس آجائے، تو اضافی رقم سود کہلاتی ہے، اور جمع فنڈ کی صورت میں فنڈ کی رقم چونکہ ملازم کے قبضہ میں نہیں آتی ہے؛ اس لئے شرعی طور پر ملازم اس کا مالک نہیں ہوتا ہے، جب آدمی اس رقم کا مالک ہی نہیں ہوا ہے، تو اس کے اوپر اضافہ شدہ اس ملازم کے حق میں سود نہیں ہے؛ اس لئے کہ اس کی ملکیت کی رقم پر سود میں اضافہ نہیں

ہوا ہے، اس وجہ سے پرائیویڈنٹ فنڈ مع اضافہ کے ملازم یا ملازم کے ورثاء کے لئے جائز اور حلال ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۲/ ۱۳۱، احسن الفتاوی ۴/ ۲۶۰، ایضاح المسائل ۱۰۷)

ثم الأجرة تستحق بأحد معان ثلثة: إما بشرط التعجيل، أوبالتعجيل، أو باستيفاء المعقود عليه، فإذا وجد أحد هذه الأشياء الثلاثة فإنه يملكها، وكما يجب الأجر باستيفاء المنافع، يجب بالتمكن من استيفاء المنافع، إذا كانت الإجارة صحيحة. (هندية، كتاب الإجارة، الباب الثاني متى تجب الأجرة وما يتعلق به من الملك وغيره، زكريا قديم ٤/ ٤١٣، جديد ٤/ ٤٤٣، هداية، اشرفي ٣/ ٢٩٤، البحر الرائق، كوئٹه ٧/ ٣٠٠، زكريا ٧/ ٥١١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ رجب المرجب ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۴۴۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸/ ۷/ ۱۴۲۵ھ

حکومت کا اصل معاوضہ پر اضافی رقم دینا سود نہیں

سوال [۹۰۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں نے ۱۹۸۱ء میں تھوڑی سی زمین بھینسیہ گاؤں کے نزدیک خریدی تھی تقریباً چالیس روپیہ فی میٹر کے حساب سے گورنمنٹ نے اسی زمین پر زبردستی قبضہ کرلیا اور یہ اعلان کیا کہ یہ زمین جن لوگوں نے خریدی تھی اپنے بیع نامے لے کر آجائیں اور گورنمنٹ سے اس کا معاوضہ لے لیں، اب گورنمنٹ اسی زمین کا معاوضہ پانچ سو چھپن روپیہ فی میٹر کے حساب سے دے رہی ہے؛ لیکن گورنمنٹ نے اس زمین کے معاوضے کے ساتھ سود بھی شامل کر لیا ہے، معاوضے کی تفصیل اس طرح ہے۔

زمین کا معاوضہ	200	دوسو روپیہ فی میٹر
سود	356	تین سو چھپن روپیہ فی میٹر
کل میزان	556	پانچ سو چھپن روپیہ فی میٹر

رہا زمین کی اصل قیمت کا سوال تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ کو کوئی ضرورت مند 600 سو روپئے فی میٹر بھی خرید سکتا ہے، اور جس کو ضرورت نہیں ہوگی وہ 100 سو روپئے میٹر بھی نہیں خریدے گا، گورنمنٹ اتنی بیوقوف نہیں ہے کہ وہ کم قیمت کی زمین کو پانچ سو چھپن روپیہ فی میٹر خرید لے، گورنمنٹ کو یقیناً اس میں فائدہ ہوگا، یہاں ایک بات اور واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ گورنمنٹ بغیر سود کے کوئی لین دین نہیں کرتی، جب وہ کسی کو روپیہ ادا کرتی ہے، تو سود کے ساتھ ادا کرتی ہے اور جس سے روپیہ وصول کرتی ہے، اس سے بھی سود کے ساتھ اپنا روپیہ وصول کرتی ہے، اب یہ تحریر فرما دیجئے کہ گورنمنٹ سے پانچ سو چھپن روپیہ 556 فی میٹر اس زمین کا معاوضہ لینا جائز ہے یا نہیں یہ روپیہ ہمارے لئے حلال ہوگا یا حرام؟

المستفتی: ایم اے خاں، فیض گنج، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر حکومت کے قبضہ کرتے وقت آپ کے اور حکومت کے درمیان کوئی قیمت طے نہیں ہوئی تھی، اور نہ ہی حکومت نے قیمت طے کرنے کے بعد آپ کو کچھ دیا ہے اور اب 556 روپیہ فی میٹر کے حساب سے حکومت نے اس کے بعض جزء کا نام سود رکھا ہو تو وہ سود نہیں ہے؛ اس لئے کہ یہ شرعاً سود کی تعریف میں داخل نہیں ہے۔ نیز روپیہ اور زمین میں سود لازم آنے کی شرط بھی نہیں پائی جاتی ہے۔

وإذا عدم الوصفان الجنس والمعنى المضموم إليه حل التفاضل والنسأ لعدم العلة المحرمة، والأصل فيه الإباحة. (هداية، كتاب البيوع، باب الربا، اشرفي ۷۹/۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍محرم الحرام ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸؍۲۹۶۵)

پرائیویڈنٹ فنڈ

سوال [٩٠٧٣]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آپ نے لکھا ہے کہ گورنمنٹ سروس کرنے والے کے لئے اگر جیون بیمہ کی رقم گورنمنٹ زبردستی اس کی تنخواہ سے کاٹے تو اس جمع شدہ رقم کا سود جائز ہے، اسی طرح گورنمنٹ ہماری تنخواہ سے کم سے کم سوا آٹھ پرسینٹ پرائیویڈنٹ فنڈ کے نام پر کاٹتی ہے، تو کیا اس سوا آٹھ پرسینٹ پر جو سود ملے گا، وہ جائز ہوگا؟

(۲) کچھ لوگ اس وجہ سے کہ انکم ٹیکس نہ لگ جائے اپنا پرائیویڈنٹ فنڈ زیادہ کٹوانے لگتے ہیں اور کچھ لوگ پرائیویڈنٹ فنڈ؛ اس لئے زیادہ کٹواتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ ان کی رقم جمع ہوجائے تاکہ رٹائرمنٹ ہونے پر وہ کام آئے؟

(۳) یا اس لئے زیاہ سے زیادہ کٹواتے ہیں کہ اگر نوکری کے درمیان اچانک بیماری کی وجہ سے پیسوں کی ضرورت پڑجائے یا کوئی خوشی کرنا پڑجائے، تو ضرورت کے حساب سے پیسہ نکال سکیں اور یہ بات بھی مدنظر رہے کہ اپنے فنڈ میں سے نکالے گئے پیسے پر سود جمع نہیں کرنا پڑتا ہے اور نہ ہی اس نکالی گئی رقم پر ہمیں سود ملے گا، ایسی صورت میں اگر سوا آٹھ پرسینٹ سے زیادہ ہم فنڈ کٹوائیں تو رٹائرمنٹ پر جو یک مشت رقم پر سود لگ کر ہمیں ملے گا، کیا وہ جائز ہوگا؟

المستفتی: محمد عمیر قاسمی، ہاپوڑی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) پرائیویڈنٹ فنڈ میں کاٹی ہوئی رقم پر جو اضافہ ملتا ہے، وہ شرعی طور پر سود نہیں ہے، وہ حلال ہے؛ اس لئے کہ فنڈ میں جو رقم تنخواہ سے کاٹ لی جاتی ہے، اس پر ملازم کا قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے اس میں ملازم کی حقیقی ملکیت

کا ثبوت نہیں ہوتا ہے اور شریعت میں سود اس کو کہا جاتا ہے، جو حقیقی ملکیت کی چیز پر اضافہ ملتا ہے، اس کی وضاحت اس ناکارہ کی کتاب ایضاح المسائل ۱۰۷؍ پر موجود ہے۔ نیز ایضاح النوادر ۲؍۳۱ میں بھی ہے۔

(۲) اس طرح ٹیکس کی بچت کے لئے ازخود فنڈ کٹوانا تو جائز ہے، مگر اس پر جو اضافہ ملے گا وہ سود ہوگا، اس کا بلانیت ثواب صدقہ کردینا لازم ہوگا۔ نیز انکم ٹیکس میں دینا بھی جائز ہے۔
(مستفاد: ایضاح النوادر ۱؍۱۰۰)

(۳) اس طرح جمع کرانا اور وصول کرنا جائز ہے؛ لیکن اگر جمع کرنے کے بعد نکالنے کی ضرورت نہ پڑے اور رٹائر منٹ کے وقت اس پر اضافہ مل جائے، تو وہ بھی سود کے حکم میں ہے، اس کو اپنے تصرف میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے؛ بلکہ بلانیت ثواب فقراء کو دیدے یا انکم ٹیکس وغیرہ میں دیدے۔

فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور قديم ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية ۱/۳۵۹، تحت الرقم الحديث: ۵۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶؍ ذی قعدہ ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱؍ ۳۶۹۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶؍۱؍۱۴۱۴ھ

پرائیویڈنٹ فنڈ کا حکم

سوال [۹۰۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ماہ رواں کے ندائے شاہی میں مفتی صاحب نے انشورنس کے بارے میں مفصل اور مدلل مضمون شریعت کی روشنی میں قلمبند فرما کر عوام کو روشناس فرمایا۔ جزاک اللہ خیر الجزاء.

اس میں ایک شکل سرکاری ملازمین کو درپیش ہے، براہ کرم اس کے بارے میں بھی مفتی صاحب موصوف سے درخواست ہے کہ شرعی حکم سے مطلع فرما کر مشکور وممنون فرمائیں۔

سرکاری ملازمین کی تنخواہ سے ہر ماہ زبردستی سرکار ایک رقم انشورنس کے نام سے وضع کر لیتی ہے، جو رٹائر ہونے کے بعد کل رقم مع سود واپس مل سکے گی، انتقال کی صورت میں (رٹائرمنٹ سے قبل) ملازم کے ورثاء کو ایک مقررہ رقم ادا کی جاتی ہے، تنخواہ سے رقم ملازم کی تنخواہ کے اسکیل کے اعتبار سے وضع کی جاتی ہے، اور اسی کے اعتبار سے انتقال کی صورت میں معاوضہ کی رقم کا تعین ہوتا ہے۔

المستفتی: زاہد عمر، کلیر شریف، ہریدوار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سرکاری ملازم اگر اپنی مرضی سے کسی انشورنس کمپنی میں حصہ لے کر تنخواہ میں سے کٹوا کر انشورنس کمپنی میں داخل نہیں کرتا ہے؛ بلکہ حکومت اپنی مرضی سے تنخواہ سے کاٹ کر انشورنس کمپنی میں داخل کر دیتی ہے، اور بعد میں انشورنس کمپنی حکومت کی طرف سے مع اضافہ کے ملازم یا اس کے ورثاء کو دیدیتی ہے، تو اس میں سود کی شکل لازم نہیں آتی ہے اور یہ فنڈ کاٹنے کے حکم میں ہوگا؛ اس لئے کہ سود اس کو کہا جاتا ہے، کہ انسان اپنی ملکیت میں آئی ہوئی رقم جمع کر دے اور پھر مع اضافہ کے پوری رقم مل جائے اور ملکیت میں داخل ہونے کے لئے قبضہ شرط ہے اور یہاں ملازم کا قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے تنخواہ سے کٹی ہوئی رقم ملازم کی ملکیت میں داخل نہیں ہوئی؛ اس لئے اضافہ شدہ رقم کو انعام ہی میں شمار کیا گیا ہے، اس وجہ سے وہ رقم حلال اور جائز ہے سود نہیں۔

(مستفاد: جواہر الفقہ ۱/۳۸۵، جدید زکریا ۳/۲۷۶، امداد الفتاوی ۲/۴۴، احسن الفتاوی ۴/۲۶۰، فتاوی احیاء العلوم ۱/۲۳۷، ایضاح المسائل ۱۰۷)

وتستحق بإحدى معاني ثلاثة: إما بشرط التعجيل، أو بالتعجيل من غير شرط، أو باستيفاء المعقود عليه. (هداية، كتاب الإجارة، باب الأجر متى

يستحق، اشرفي ٣/ ٢٩٤، هندية، زكريا قديم ٤/ ٤١٣، جديد ٤/ ٤٤٣، البحر الرائق، كوئٹه ٧/ ٣٠٠، زكريا ٧/ ٥١١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵ر شوال المکرم ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸ ر ۲۸۵۲)

پرائیویڈنٹ فنڈ کی شرعی حیثیت

سوال [۹۰۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عام مدارس میں پرائیویڈنٹ فنڈ کے نام سے جو فنڈ جمع ہوتا ہے، وہ شرعاً درست ہے یا نہیں اور اس کا مقصد کیا ہے؟

(۲) پرائیویڈنٹ فنڈ میں جو رقم مدرسہ داخل کرتا ہے، وہ مدرس و ملازم کا حق ہے اور اس کا مالک مدرس و ملازم ہے یا مدرسہ؟

(۳) مدرس کو درمیان ملازمت اگر کسی ضرورت کی بنا پر مثلاً تعمیر مکان دوا علاج یا شادی وغیرہ کی ضرورت پیش آ جائے تو کیا ایسی صورت میں مدرس و ملازم اپنے پرائیویڈنٹ فنڈ سے رقم لے سکتا ہے یا نہیں؟ مدارس کا کیا تعامل ہے؟ بالخصوص آپ کے ادارہ کا نظام کیا ہے؟

المستفتی: اساتذہ جامعہ روضۃ العلوم، ٹانڈہ رام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱/۲) مدارس کے اصول وضوابط منصوص نہیں؛ بلکہ عرف اور شرائط پر مبنی ہیں؛ لہٰذا **المسلمون عند شروطهم**. (صحيح البخاري، كتاب الإجارة، باب أجر السمسرة، النسخة الهندية ١/ ٣٠٣) کے تحت جن جن شرائط کے ساتھ ادارے کے قوانین بنائے گئے ہیں، ان کی پابندی لازم ہوتی ہے اور پرائیویڈنٹ فنڈ کا مسئلہ بھی عرف اور شرائط پر موقوف ہے، ان میں جن جن شرائط

وقیودات کی پابندی لازم کی گئی ہے، ان کی پابندی بھی ضروری ہے؛ لہٰذا قبضہ کرنے سے قبل مدرس فنڈ کا مستحق تو ہوتا ہے، مگر مالک نہیں ہوتا اور مالک نہ ہونے ہی کی وجہ سے جو رقم اس پر منجانب مدرسہ اضافہ کی جاتی ہے وہ حلال ہے اگر قبل القبض مالک ہوتا تو اضافہ شدہ جائز نہ ہوتا اور پرائیویڈنٹ فنڈ کا اصل مقصد کیا ہے، وہ تو ذمہ داران صحیح بتلا سکتے ہیں، شاید اس کا مقصد یہ بھی ہو کہ جب مدرس یا ملازم وفات پائے یا رٹائر ہو جائے، تو اس کے ورثاء کو یا اس کو کمزوری کی حالت میں کچھ رقم نقدا اکٹھا مل جائے گی۔

نیز درمیان ملازمت میں ضابطہ کے مطابق کچھ رقم قرضہ فنڈ کے نام سے بھی لے سکتے ہیں۔

(۳) درمیان ملازمت اگر علاج معالجہ یا کسی اور غرض سے لینا چاہے، تو لینے کا جو ضابطہ ادراہ نے بنا رکھا ہے، اسی کی پابندی کے ساتھ لے سکتا ہے، ہمارے یہاں ضابطہ یہ ہے کہ دوثلث تک لے سکتے ہیں، پھر ایک خاص مقدار میں تنخواہ میں سے کاٹی جاتی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ر محرم الحرام ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۶۲۵/۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲/۱/۱۴۱۷ھ

پرائیویڈنٹ فنڈ میں زائد رقم کی حلت

سوال [۹۰۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سرکاری ملازمین کو ڈاکخانہ اور بینک میں اپنے اکاؤنٹ رکھنے پڑتے ہیں، دوران ملازمت مختلف فنڈوں میں ماہانہ تنخواہ میں سے لازمی طور پر کافی روپیہ کاٹ کر جمع کیے جاتے ہیں، بیمہ کمپنی کی معرفت بھی روپئے جمع کرنے پڑتے ہیں، ان سب میں اصل رقم کے

علاوہ ماہانہ یا سالانہ کچھ فیصدی زائد رقم ملتی ہے، جسے انٹرسٹ اور بونس کہتے ہیں، اس زائد رقم کو اپنے خرچ میں لانا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) ملازمت سے سبکدوش ہونے پر سرکاری ملازمین کو اس سے جمع شدہ مختلف فنڈوں اور گریجوٹی وغیرہ ملاکر کافی رقم یکمشت مل جاتی ہے، جس میں سے اچھی خاصی رقم مثلاً پچیس ہزار روپئے اگر ڈاکخانہ میں مقررہ مدت کے لئے جمع کرادیا جائے، تو اس کے عوض میں رٹائرمنٹ ملازم کو مبلغ ڈھائی سو روپیہ ماہوار اس کی ماہانہ پینشن کے علاوہ مستقل طور پر ملتے رہیں گے، جو ملازم کی ماہانہ پینشن کی رقم ناکافی ہونے کی صورت میں مزید تقویت کے باعث ہوسکتے ہیں اور اصل رقم محفوظ رہتی ہے، اس طرح اپنی اصل رقم کو محفوظ رکھتے ہوئے یہ ماہانہ مزید رقم وصول کرکے اپنے خرچ میں لانا جائز ہے یا نہیں؟ جواب سے جلد از جلد نوازیں عنداللہ وعندالرسول ماجور ہوں۔

المستفتی: شمس الدین انصاری، صفدر منزل، سبزی بازار، جورا، رتلام (ایم پی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو رقم تنخواہ میں سے کٹ کر فنڈوں میں جمع ہوجاتی ہے، اس پر جو زائد رقم ملتی ہے، وہ سود نہیں ہے، وہ سرکار کی طرف سے عطیہ وانعام ہے، یہی حکم بونس کا ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۱۴۷/۵، جدید زکریا ۲۷/۹، نظام الفتاوی ۲۱۳/۱، امداد الفتاوی ۱۴۹/۳)

اور جو رقم ڈاکخانہ یا بینک یا بیمہ کمپنی میں جمع کردی جائے، اس پر زائد رقم سود ہے، اس کا استعمال حرام ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۲۶۰/۴، فتاوی رحیمیہ قدیم ۱۹۰/۳، جدید زکریا ۲۷۲/۹)

اور جو رقم ملازمت سے سبکدوش ہونے پر بنام پنشن ملتی ہے وہ حرام نہیں ہے اور جو رقم از خود فنڈ یا ڈاکخانہ میں مقررہ طور پر جمع کرتا رہا، اس پر جو زائد رقم ملتی ہے وہ سود ہے

اس کا استعمال حرام ہے۔(مستفاد: امداد الفتاوی ۳/۱۴۷، فتاوی رحیمیہ قدیم ۳/۱۹۰، جدید زکریا ۹/۲۸۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ ذی قعدہ ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/۱۴۹۵)

ملازم کا اختیاری پرائیویڈنٹ فنڈ کٹوانا

سوال [۹۰۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک آدمی سرکاری ملازم ہے، سرکاری ملازم کا ماہ بماہ جو .P.F کٹتا ہے، اوراس پر سرکار اپنی طرف سے جو رقم بڑھا کر دیتی ہے، وہ سود نہیں ہے چونکہ سود کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی؛ لیکن ملازم جبری P.F کے علاوہ اختیاری بھی کٹواتا ہے جو اس کے حق میں مفید ہوتا ہے اور اس پر سرکار اپنی طرف سے جو رقم بڑھا کر دیتی ہے وہ بقول حضرات علمائے کرام وارباب افتاء کے سود کے حکم میں ہے، سود کے نام سے جمع ہونے والی رقم بینک میں علیحدہ نہیں ہوتی؛ بلکہ فقط کاغذ پر ہی اس کا حساب وکتاب رہتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ملازم کے اختیاری کٹوتی میں بڑھنے والی رقم جو سود کے حکم میں ہے، وہ اگر فی الفور اپنی جیب سے حساب لگا کر مصرف سود میں دے تو کیا اس کی گنجائش ہے؟ اور وہ جو سرکار نے بڑھائی ہے، وہ اس کے اکاؤنٹ میں جمع ہوجائے، اور اس کو حلال تصور کیا جائے، تو شرعاً کیا حکم ہے؟

المستفتی: نثار احمد، کلا، خادم دار الافتاء دار العلوم گودھرا (گجرات)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: پرائیویڈنٹ فنڈ کے نام سے سرکار جو رقم کاٹتی ہے، اور پھر ملازمت کے اختتام پر دوگنے اضافہ کے ساتھ وہ رقم ملتی ہے، تو ملازم کے لئے اصل

اوراضافہ سب حلال ہے؛اس لئے کہ یہ سود کی تعریف میں داخل نہیں ہے؛لیکن ملازم جورقم اپنے اختیار سے سود حاصل کرنے کی غرض سے اس فنڈ میں جمع کرتا ہے،تواصل رقم پراضافہ شدہ رقم سود کی تعریف شامل ہوجاتی ہے؛اس لئے اصل رقم پر جواضافہ ہوا ہے، وہ ملازم کے لئے سود کے دائرہ میں داخل ہونے کی وجہ سے حرام ہےاور پھراگراس رقم کی وصولی سے یا سود کھاتہ سے اندراج ختم کرنے سے پہلے جیب خاص سے سودی رقم کی نیت سے غریبوں کو دیدے یا انکم ٹیکس میں دیدے،تو ایسا ہے جیسا کہ ذبح شدہ بکرے کا گوشت دوسروں کو دیدیا ہےاوراس کے عوض اپنے لئے مردار کا گوشت لے لیا ہے؛ لہٰذا جیب خاص سے حلال پیسہ سود کی نیت سے پہلے دیدینے سے ملنے والا سود حلال نہیں ہوگا۔(مستفاد:ایضاح المسائل ۱۵۹)

قوله: الحرام ينتقل أي تنتقل حرمته وإن تداولته الأيدي وتبدلت الأملاك. (شامي، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب في تعيين الدراهم في العقد الفاسد، زكريا ٧/ ٣٠٠، كراچي ٥/ ٩٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍ربیع الاول ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر:الف ۳۶؍۷۹۷۰)

دستور مدرسہ کے خلاف پرائیویڈنٹ فنڈ وصول کرنا

سوال [۹۰۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک دینی مدرسہ ہے، اس میں ملازمین و مدرسین صاحبان کو علاوہ تنخواہ (ماہانہ مشاہرہ) کے راحت کے طور پر فنڈ بھی دیا جاتا ہے، جتنا مدرسہ پرائیویڈنٹ فنڈ کے نام سے دیتا ہے، اتنا ہی مدرس وملازم کی تنخواہ سے وضع کر کے کل جمع کرلیا جاتا ہے، مدرسہ کے دستور میں بطورشرط یہ دفعہ ہے کہ جاری ملازمت کے دوران دس سال کے اندراندر فنڈ نکالنے کا حق نہ ہوگا، اگر دس سال سے قبل کوئی صاحب اپنا فنڈ واپس لینا چاہیں تو کیا ان کو تنخواہ سے

وضع شدہ اور مدرسہ سے جمع شدہ کل فنڈ ادا کیا جائے؟

(۲) یا ملازم کی تنخواہ سے وضع شدہ فنڈ واپس کر دینا بھی صحیح ہوگا؟

(۳) اگر کوئی ملازم دستور مدرسہ کی شرط کے خلاف کل فنڈ وصول کرنا چاہتا ہے، تو اس کا یہ فعل کیسا ہے؟ جواب سے نواز کر مہربانی فرمائیں۔

المستفتی: محمد فاروق، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدارس اسلامیہ کے اکثر اصول عرف پر مبنی ہیں، نصوص پر نہیں؛ لہٰذا جو اصول عرف اور رواج کے مطابق ہیں، اس میں عرف کی رعایت کرنا ضروری ہے؛ کیونکہ شریعت نے مسلمانوں کے عرف کا بھی بڑا لحاظ رکھا ہے اور پرائیویڈنٹ فنڈ کا ضابطہ بھی عرف ہی کے مطابق ہے، اور اس میں جن جن شرطوں کو مشروط قرار دیا گیا ہے، ان کی رعایت بھی ملازمین پر لازم ہے؛ لہٰذا دستور مدرسہ کے خلاف فنڈ وصول کرنے کا حق بھی کسی ملازم کو نہ ہوگا۔

الثابت بالعرف كالثابت بالنص. (قواعد الفقه، اشرفي ٧٤، رقم: ١٠١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍محرم الحرام ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۴۵۹۶)

ملازم کے جمع شدہ فنڈ پر جو زائد رقم ملے اس پر اشکال وجواب

سوال [۹۰۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگست ۱۹۹۱ء کے رسالہ ندائے شاہی میں آپ نے فنڈ کے بیاج کو عطیہ گورنمنٹ بتا کر جائز قرار دیا ہے، میرے ناقص خیال میں یہ فتوی فنڈ کی صحیح صورت حال نہ

معلوم ہونے کی وجہ سے دیا گیا ہے،اورصورت حال آپ کی خدمت میں پیش کررہاہوں امید ہے کہ اس پرنظرثانی فرمالیں گے۔

(۱) بعض محکموں میں پینشن نہیں دی جاتی ہے،فنڈ کاٹ کر گورنمنٹ اپنے حساب سے جمع کرتی رہتی ہے اور رٹائر ہونے والے ملازم کو پوری رقم جواس کے فنڈ کی ہے اور جو گورنمنٹ نے اپنی طرف سے جمع کی ہے دیدی جاتی ہے؛لیکن رقم جوگورنمنٹ کے پاس جمع رہتی ہے،اس پر بھی سود دیا جاتا ہے، جیسے روڈ ویز کے ملازموں کی پینشن نہیں ہے،ان کے لئے یہ صورت ہے۔

(۲) اور جن محکموں میں پینشن ہوتی ہے، اور اس میں فنڈ کاٹا جاتا ہے،اس میں گورنمنٹ اپنی طرف سے کچھ جمع نہیں کرتی ہے؛ بلکہ جو جمع ہوتا ہے، اس پر سالانہ سود دیا جاتا ہے۔ ہر ملازم کے پاس سالانہ ایک چھپا ہوا فارم ہوتا ہے،اسے بھر کر بھیج دیا جاتا ہے۔مثلاً ۱۹۸۹ء میں ایک ملازم کا فنڈ سال بھر کا 600روپئے ہوا،تو اس کا فارم بھر کر یوں آئے گا ۱۹۸۹ء میں 600 جمع ہوئے 25/00 سودکل رقم 625۔

۱۹۹۰ء میں جو فارم بھر کر روانہ کیا جاوے گا وہ یوں ہوگا، سابق رقم 625/00 اس سال جمع کی رقم 600/00 سود 50/00 کل رقم 1275۔

۱۹۹۱ء کے فارم 1275/00 اس کے سابق 600/00 اس سال کے سود 75/00 کل رقم 1950/00۔امید کہ آپ اس پر غور فرمالیں، جو میری سمجھ میں آیا تحریر کردیا ہے،آگے آپ مفتی ہیں۔

المستفتی: عبدالجلیل،محلّہ ولی پورہ،بسی کر تپور،بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضرت والا کی یاد دہانی اورسرکاری ضابطوں پر آگاہی کا بہت بہت شکریہ، رسالہ ندائے شاہی میں حضرت والا کی نظر سے فنڈ کے متعلق

جوفتویٰ گذرا ہے، وہ ان تمام سرکاری ضابطوں پر غور کرنے کے بعد لکھا گیا ہے، جو حضرت والا نے تحریر فرمایا ہے، شریعت اسلامی میں سود اور بیاج کے ثبوت کے لئے یہ شرط ہے کہ آدمی اپنی ملکیت کی رقم جمع کردے، پھر اس کے بدلہ میں رأس المال مع اضافہ سود کے واپس مل جائے، تو زائد رقم شرعاً سود میں داخل ہوتی ہے، اور اگر اپنی ملکیت کی کوئی رقم جمع نہیں کی ہے، اور ملکیت کی رقم جمع کئے بغیر اگر زائد رقم ملتی ہے، تو وہ شرعاً سود نہیں ہوا کرتی ہے اور سرکاری ملازمین اور کسی کمپنی کے ملازمین قبضہ کرنے سے قبل اپنی تنخواہوں کے مالک نہیں ہوا کرتے ہیں؛ لہٰذا قبضہ سے قبل تنخواہوں پر یا اس کے کسی جزء پر جو زائد کیا جاتا ہے، وہ شرعاً سود میں داخل نہیں ہوا کرتا ہے؛ اس لئے فنڈ کی زائد رقم پر سود کا وہم وشبہ نہ کرنا چاہئے۔

نیز اسی وجہ سے اکابر علماء واہل فتاوی نے اس کو جائز لکھا ہے۔ (فتاوی محمودیہ ۲۱۹/۴، جدید ڈابھیل ۳۹۳/۱۶، کفایت المفتی ۲۸۹/۴، جدید مطول ۲۷۵/۱۱)

دار العلوم دیوبند اور جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی اور دیگر بڑے بڑے مدارس میں بھی فنڈ کا سلسلہ جاری رکھا گیا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۹؍ صفر المظفر ۱۴۱۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۷/ ۲۵۵۲)	۱۴۱۲/۲/۱۹ھ

پینشن کی اصل رقم لینا جائز اور اضافی لینا حرام ہے

سوال [۹۰۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے ایک بھائی مشترکہ سکنائی مکان کی مرمت تقسیم و متعلقہ عدالتی کارروائیوں کے سلسلہ میں جو خرچہ میری طرف سے ہوتا رہا اکثر وبیشتر مواقع پر مجھ کو یہ تسلی دیدیا کرتے تھے کہ آپ خرچ کردیجئے حساب ہوجائے گا، کبھی انہوں نے حساب کر کے دینے کی تکلیف نہیں کی، میں اپنی حماقت سے ہمیشہ ان کے قول پر اعتماد کر کے زیر بار ہوتا رہا،

اچانک سوتے ہوئے ان کا انتقال ہوگیا، ان کے بینک کھاتہ میں کچھ رقم ان کی پینشن کی نکلی اور کچھ اس رقم پر بینک کی طرف سے سود کی ہے، میرا جو مطالبہ ان کی طرف نکلتا ہے، کھاتے میں کل رقم سے بہت زیادہ ہے، میں نے عدالت سے ان کے کھاتے کی رقم حاصل کرنے کی اجازت حاصل کرلی ہے، کیا میں اپنے واجبات کے پیش نظر ان کے کھاتے کی کل رقم مع سود اپنے استعمال میں لاسکتا ہوں یا صرف خالص پینشن والا سرمایہ ہی اپنے صرف میں لایا جاسکتا ہے بقیہ غرباء ومساکین پر صرف کرنا ہوگا؟

المستفتی: تلخیص احمد قاضی ٹولہ، بیلداران، مرادآباد

التنقیح :(۱) جس بھائی کے بارے میں آپ نے لکھا ہے کہ ان کی طرف سے عدالتی کارروائی کرتے رہے، ان کے ورثاء میں کون کون ہے، ان کی تفصیل کیا ہے؟

(۲) کیا ان کے ورثاء میں سے ہر ایک نے آپ کو اجازت دیدی ہے، یا کس سے اجازت لی ہے؟ تفصیل تحریر کریں۔

(۳) کسی جان کار کو دارالافتاء بھیج دیں۔ تفصیلات کرکے استفتاء مرتب کرلیا جائے گا۔

کلیم اللہ غفرلہ

جواب تنقیح :(۱) وہ لاولد تھے، بیوی کی پہلے ہی وفات ہوچکی تھی، ایک بہن اور میں ایک بھائی ہی وارث ہیں، بہن میرے حق میں دستبرداری عدالت میں داخل کرچکی ہے۔

(۲) کوئی دیگر وارث یا دعویدار نہیں ہے۔

تلخیص احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تنقیح کی وضاحت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مرنے والا لاولد تھا، اور اس کی بیوی کا انتقال اس سے پہلے ہوگیا تھا، اس کے ورثاء میں صرف ایک حقیقی بھائی جو خود مستفتی ہے اور ایک حقیقی بہن ہے، تو ایسی صورت میں مرحوم کے وارث یہی دونوں بھائی بہن ہیں۔ اور سوال نامہ کے مطابق رہائشی مکان میں سائل نے مرحوم کی

اجازت سے خرچ کیا ہے کہ بعد میں جتنا خرچ ہو جائے، اس کا حساب لگا کر مجریٰ کرلیا جائے گا؛ لیکن مجریٰ کرنے سے پہلے مرحوم کا انتقال ہو گیا ہے، تو ایسی صورت میں اس کا جو ترکہ ہوتا ہے، اس ترکہ میں سے مجریٰ کرنے کی گنجائش ہے اور سود والا پیسہ نکال کر غریبوں میں صدقہ کردینا ضروری ہے اور جو مکان دادالٰہی ہے، وہ تین حصوں میں تقسیم ہو کر بھائی کے لئے دو حصے اور بہن کے لئے ایک حصہ ہوگا۔

قد صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة (إلى قوله) ويجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، هندية، زكرياقديم ۵/۵۴۹، جديد ۵/۴۰۴، شامي، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/۲۴۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/۱۱۰۲۸)

گاڑی کے انشورنس اور پرائیویڈنٹ فنڈ کا حکم

سوال [۹۰۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ گاڑی انشورنس کے سلسلے میں چند جزئیات، فقہی دلائل کی روشنی میں حل طلب ہیں۔

(۱) گاڑی کا انشورنس اگر جبری ہو اور ہر مہینہ قسط جمع کرنا ہو، تو اگر گاڑی کے نقصان کی تلافی کے لئے پبلک انشورنس کمپنی یا نیم سرکاری کمپنی جمع کی ہوئی رقم سے زائد رقم دے، تو اس کا استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) کمپنی روپیہ نہیں دیتی ہے؛ بلکہ گاڑی ٹھیک کرادیتی ہے، جس میں جمع کردہ رقم سے زائد خرچ آتا ہے، تو یہ صورت جواز کی ہے یا نہیں؟

(۳) اگر ڈرائیور کے کسی عضو کو نقصان پہونچ جائے، یا مرجائے، تو اب انشورنس کمپنی جمع شدہ رقم سے زیادہ رقم دیتی ہے، تو اب ڈرائیور یا ڈرائیور کے وارثین اس زائد رقم کو لے سکتے ہیں یا نہیں؟ اس کی دوصورت ہوسکتی ہیں۔

(الف) انشورنس کمپنی کے فارم پر ضمانت کی بات درج نہ ہو۔

(ب) کمپنی کے فارم پر ضمانت کی بات درج ہو، اب جو رقم کیس کرنے کے بعد ملتی ہے، اس کو لینا جائز ہے یا نہیں؟

(۴) اگر میعاد پوری ہونے کے بعد مالک گاڑی کو زائد رقم دے، اس کو اپنے استعمال میں لانا جائز ہے یا نہیں؟

(۵) سرکار تنخواہ کی پوری مقدار ملازم کو دیتی ہے اور پھر جبراً پرائیویڈنٹ فنڈ کے لئے جمع کرتی ہے، تو اس فنڈ میں جمع شدہ رقم سے زائد رقم لینا جائز ہے یا نہیں؟

(٦) کوئی جبر نہیں مگر پھر بھی ملازم پرائیویڈنٹ فنڈ میں رقم جمع کرتا ہے، تو اب جو زائد رقم سرکار کی طرف سے ملے، تو اس کا لینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عمیر قاسمی ہاپوڑی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱/۲) گاڑی کے انشورنس میں پبلک انشورنس کمپنی یا نیم سرکاری کمپنی رقم نہیں دیتی ہے؛ بلکہ وہ نقصان کی تلافی کرتی ہے، چاہے وہ جمع کی ہوئی رقم سے زائد ہو یا کم اس کا لینا جائز ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۵۰۹/۳، ایضاح النوادر ۱۴۳/۱)

(۳) یہ لائف انشورنس ہی کی ایک قسم ہے، جو درحقیقت سودی معاملہ ہے؛ اس لئے جائز نہیں ہے۔ (فتاوی رحیمیہ قدیم ۲۰۰/۲، جدید زکریا ۲۷۳/۹، ایضاح النوادر ۱۴۳/۱)

(۴) میعاد پوری ہونے کے بعد اگر گاڑی صحیح وسالم رہتی ہے، تو جمع کی ہوئی رقم واپس نہیں ملتی ہے اور نہ ہی اس رقم پر زائد ملتی ہے، اس بارے میں صحیح معلومات آپ کو فراہم نہیں ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۴۳)

(۵) پرائیویڈنٹ فنڈ میں سے جو تنخواہ جبراً کاٹ کر جمع کیجاتی ہے، ملازم تنخواہ کے اس حصہ کا مالک نہیں ہوتا؛ اس لئے بعد میں اس پر اضافہ کے ساتھ ملازم کو جو ملتا ہے وہ جائز ہے سود نہیں ہے: اس لئے کہ سود اس کو کہا جاتا ہے، جو اپنی ملکیت کی جمع شدہ رقم پر زائد ملتی ہے، وہی سود ہوتا ہے، یہاں اپنی ملکیت کی کوئی رقم جمع نہیں ہوتی ہے؛ اس لئے پرائیویڈنٹ فنڈ کا پیسہ جائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۵/۱۴۷، جدید زکریا ۹/۲۷، ایضاح النوادر ۱/۱۳۸)

(٦) اگر یہ بات صحیح ہے کہ پرائیویڈنٹ فنڈ پر جمع کرنا لازم نہیں قرار دیا ہے؛ بلکہ ملازم اپنی تنخواہ پوری حاصل کرنے پر قادر ہے، پھر بھی بخوشی تنخواہ کا کچھ حصہ پرائیویڈنٹ فنڈ کے نام میں کٹوا دیتا ہے، گویا کہ وہ حصہ اس کی ملکیت ہے، اس پر جو زائد رقم ملے گی وہ سود کہلائے گا۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۵/۱۴۷، جدید زکریا ۹/۲۷۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۷/ شعبان المعظم ۱۴۲۷ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۱۰۳/۳۸)	۱۴۲۷/۸/۱۷ھ

(٦) بیمہ کے احکام

ایل آئی سی ایجنٹ بننا

سوال[۹۰۸۲]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں ایل آئی سی ایجنٹ بننا چاہتا ہوں، کیا یہ میرے لئے جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: ڈاکٹر سعید اکبر بارہ دری، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایل آئی سی کمپنی میں سودی کاروبار ہوتا ہے؛اس لئے اس کمپنی کا ایجنٹ بننا ازروئے شرع درست نہیں۔

عن عليؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وشاهديه، وكاتبه، ومانع الصدقة. (مسند أحمد بن حنبل ۱/۱۲۱، رقم: ۹۸۰، مشكاة ٢٤٦)

ومن هنا ظهر أن التوظف في البنوك الربوية لايجوز، فإن كان عمل الموظف في البنک ما يعين على الربا، كالكتابة، أو الحساب، فذلک حرام لوجهين: الأول: إعانة على المعصية، والثاني: أخذ الأجرة من المال الحرام. (تكملة فتح الملهم، كتاب المساقاة، والمزارعة، باب لعن آكل الربا، ومؤكله، اشرفية ١/٦١٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍رجب المرجب ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۰۴۶/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۷/۷/۵ھ

جیون بیمہ کی کمپنی میں ملازمت کرنا

سوال [۹۰۸۳]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک کمپنی ساڑھے پانچ سال کے لئے روپئے جمع کراتی ہے، گاہک کورقم اپنی سہولت کے اعتبار سے ماہانہ سہ ماہی، ششماہی، سالانہ کی قسطوں میں ادا کرنی ہوتی ہے، کمپنی اس رقم سے تجارت کرتی ہے، مارکیٹ میں لارنگ کے مسالے اورکئی طرح کی چیزیں تیارکرکے ایجنٹوں کے ذریعہ بیچتی ہے۔اورگاہک کے نام پررقم کی مناسبت سے زمین خریدتی ہے، جس کی رجسٹری کچھ مدت گذرجانے پرڈاک کے ذریعہ گاہک کے گھرآجاتی ہے تاکہ گاہک کو اطمینان آجائے کہ میراپیسہ کام میں لگ گیا، کمپنی اس زمین میں ساڑھے پانچ سال کے لئے پیڑپودے لگاتی ہےاوردرمیان میں اس زمیں سے فصل بھی لیتی ہے ساڑھے پانچ سال کی مدت پوری ہوجانے پر چاہے گاہک اپنی زمین لے لے، جہاں کمپنی نے خریدی یا کہ اس زمین کی قیمت اورنفع لے لے، گاہک کو پوراحق حاصل ہے، اگراس مدت میں گاہک کسی حادثہ کا شکارہوجاتا ہے، جس سے اس کا ایک ہاتھ یا دونوں ٹانگیں یادونوں ہاتھ جاتے رہیں، تو ساڑھے پانچ سال میں جمع ہونے والی رقم کا ڈیڑھ گنا کا آدھامل جائے گااوراگرموت واقع ہوگئی، تو ساڑھے پانچ سال میں جمع ہونے والی کل رقم کا ڈیڑھ گنا اورجتنی قسطیں جمع ہوئی ہیں وہ مل جائیں گی اور کھاتہ بندکردیاجائے گا۔ مثلاً ۲۵۰۰۰/ روپیہ کا ڈیڑھ گنا ۳۷۵۰۰/روپیہ ہوا، کمپنی میں شامل ہرایک آدمی کا بیمہ دوماہ پورے ہوجانے کے بعد وجود میں آتا ہے۔ دوماہ سے قبل حادثہ ہونے پرکمپنی کی طرف سے بیمہ کی رقم جوزائد ہوتی ہے نہیں ملے گی۔ ۲۵۰۰۰/ ہزار کی اسکیم پر مدت پوری ہوجانے پرکمپنی کی طرف سے گاہک کو ۴۰۳۰۰/روپیہ کا ڈرافٹ مل جائے گا۔ مدت پوری ہونے پر ملنے والی رقم متعین نہیں گھٹ بڑھ سکتی ہے، مثلاً اگرگاہک قسطوں کے درمیان میں جمع کرنا بندکردے، تو چونکہ گاہک نے

قسطوں کو درمیان میں روک دیا، تو کمپنی اس کا منافع بھی کاٹ دے گی، گاہک کو کمپنی کے قوانین کے مطابق چلنا لازمی ہے، قوانین سے ہٹ کر چلنے پر گاہک کو نقصان بھی ہوسکتا ہے۔ کمپنی ایجنٹوں کے ذریعہ رقم جمع کرواتی ہے، جمع ہونے والی رقم کا ۱۵؍روپیہ اصل رقم سے اسی وقت کاٹ کر کمیشن رسید بھر کر باقی ماندہ رقم ایجنٹ کمپنی میں جمع کرا دیتا ہے، اس کمپنی میں ایجنٹ کو بھی ایک کھاتہ کھولنا ضروری ہے تاکہ کھاتہ نمبر پر اس کو کمیشن مل سکے، یہ سلسلہ یکے بعد دیگرے ۱۲؍لوگوں تک عہدوں کے اعتبار سے چلتا ہے۔ ۱۱؍لوگوں کا کمیشن ایجنٹ سے بہت کم ہوتا ہے جو کہ وہیں کٹ کر ان کے کھاتہ میں جمع ہو جاتا ہے۔ اور مہینہ پورا ہونے پر واؤچر کے روپ میں ان کو دیدیا جاتا ہے۔ کیا ان صورتوں میں کمپنی میں رقم جمع کرنا یا اس کمپنی میں رقم رکھوانا یا اس کمپنی میں کام کرنا درست ہے؟

المستفتی: عظیم الدین قاسمی، پختہ سرائے، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال کے ہر پہلو پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ مذکورہ کمپنی کا کاروبار جیون بیمہ سے متعلق ہے اور اس کی جو شکلیں سوال نامہ میں لکھی گئی ہیں، ان کے ہر پہلو پر بھی اچھی طرح غور کیا گیا ہے کہ یہ شرعی طور پر سود اور ربو کے دائرہ میں داخل ہے، جو قطعاً ناجائز اور حرام ہے۔

قال اللّٰہ تعالی: يَمۡحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَيُرۡبِي الصَّدَقَاتِ. [البقرہ:۲۷۶]

قال اللّٰہ تعالیٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا اتَّقُوۡا اللّٰهَ وَذَرُوۡا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا اِنۡ كُنۡتُمۡ مُؤۡمِنِيۡنَ ○ فَاِنۡ لَمۡ تَفۡعَلُوۡا فَأۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ. [البقرہ: ۲۸۷-۲۷۸]

نیز حضور ﷺ نے سود کھانے اور کھلانے والے، سودی حساب وکتاب کرنے والے، سودی معاہدہ لکھنے والے سب پر لعنت فرمائی ہے۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم آکل الربوا،

ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (صحيح مسلم، باب لعن آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۸، سنن أبي داؤد، باب في آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية۲/۴۷۳، دارالسلام رقم: ۳۳۳۳، سنن الترمذي، باب ماجاء في آكل الربا، النسخة الهندية ۱/۲۲۹، دارالسلام رقم: ۱۲۰۶، مشكاة۱/۲۴۴)

لہٰذا اس کمپنی میں رقم جمع کرنا، کرانا اور اس میں کام کرنا سب **ممنوع** اور ناجائز ہے۔

(مستفاد: ایضاح النوادر۱/۱۳۳، احسن الفتاویٰ ۷/۲۴، جواہر الفقہ ۲/۱۸۱، جدید زکریا ۴/۵۲۴، کفایت المفتی ۸/۷۶، جدید مطول ۱۱/۲۷۰، محمودیہ ۶/۳۰۸، رحیمیہ ۲/۲۰۰، جدید ۹/۲۶۴، امدادالفتاویٰ ۳/۱۶۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/رجب المرجب ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/۶۸۲۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۰/۷/۱۴۲۱ھ

جیون بیمہ اور انشورنس کمپنی میں کام کرنے کا حکم

سوال [۹۰۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک مسلمان کے لئے زندگی کی بیمہ پالیسی خریدنے کے تعلق اور اس پر ملنے والے کمیشن کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ جائز ہے یا نہیں؟

(۲) ایک مسلمان کا بطور انشورنس ایجنٹ کا کام کرنا اور پھر بطور اجرت اس پر ملنے والے کمیشن کو ذریعہ آمدنی بنانا اس طرح کی کمائی جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: ڈاکٹر عشرت جاوید انصاری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جیون بیمہ کرانا قطعی طور پر ناجائز اور حرام ہے، اس کے لئے اسلامی شریعت میں کسی طرح کی کوئی وجہ جواز کی نہیں ہے اور اس کے بدلے میں

ملنے والی زائد رقم جس کو آپ نے کمیشن کہا ہے، وہ سود ہونے کی وجہ سے مال حرام ہے اور یہ زمانہ جاہلیت کے سود کے مشابہ ہے؛ لہٰذا اس کا لینا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۳۳-۱/۱۳۴، امداد الفتاوی ۳/۱۶۱، فتاوی رحیمیہ ۲/۲۰۰، محمودیہ ۶/۳۰۸، کفایت المفتی ۸/۷۶-۸۴، جدید مطول ۱۱/۲۵۶، جواہر الفقہ ۲/۱۸۱، احسن الفتاوی ۷/۲۴، آپ کے مسائل اور ان کا حل ۶/۲۵۶)

قال الله تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا – يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ. [البقرة: ۲۷۵-۲۷۶]

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (صحيح مسلم، باب لعن آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم: ۱۵۹۸، سنن النسائي، الزينة والموتمشات، النسخة الهندية ۲/۲۳۸/۲۷، دارالسلام رقم: ۵۱۰۸، مشكاة شريف ۱/۲۴۴)

(۲) بطور ایجنٹ انشورنس کا کام کرنا اور اس پر کمیشن لینا یہ سودی کاروبار ہے کسی صورت میں جائز نہیں ہے؛ لہٰذا اس کو ذریعہ معاش بنانا ناجائز اور حرام ہے۔ قرآن کریم اور احادیث میں اس کی حرمت بیان کی گئی ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۲۷، آپ کے مسائل اور ان کا حل ۶/۲۵۸)

قال الله تعالیٰ: يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ ط يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ. [البقرة: ۲۷۷-۲۷۸]

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، باب لعن آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم: ۱۵۹۸، سنن ابن ماجه، التجارات، التغليظ في الربا، النسخة الهندية ۲/۱۶۵، داراسلام رقم: ۲۷۷، مشكاة شريف ۱/۲۴۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/۶۷۵۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۶/۱۴۲۱ھ

جیون بیمہ کمپنی کا ایجنٹ بننا

سوال[۹۰۸۵]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہندوستان میں سرکاری اور پرائیویٹ کمپنیاں مثلاً ایل آئی سی، پرلس اورسہارا وغیرہ بچت اسکیمیں چلاتی ہیں اور انشورنس یعنی بیمہ وغیرہ بھی کرتی ہیں، جن کا طریقہ کارمثال کے طور پر یہ ہے کہ کمپنی کے ایجنٹ کے ذریعہ زید کے پچاس ہزارروپیہ (50000) کا کھاتہ ساڑھے پانچ سال کی مدت کے لئے کھولا جاتاہے،زیدقسطوار ہر سال نو ہزارایک سوروپیہ جمع کرتا ہے،ساڑھے پانچ سال مدت پوری ہونے پر یہ اصل رقم ۵۰۰۰۰/روپیہ ہوجاتی ہے۔اب اس اصل رقم کےساتھ تیس ہزار منافع ملاکر کل ۸۰/ ہزار روپیہ کی رقم کمپنی کی طرف سے زید کودی جاتی ہے۔

نیز کمپنی کی طرف سے اس اسکیم پر بیمہ بھی چلتاہے،اگر اتفاقاً مدت اسکیم کے دوران زیدکی حادثاتی موت ہوجاتی ہے،تو۷۵/ ہزار بیمہ کی رقم بھی کمپنی کی طرف سے زیدکودی جاتی ہے، تو کیاہندوستان کے موجودہ ماحول میں؛ جبکہ مسلمانوں کے جان و مال محفوظ نہیں ہیں، اس طرح کی اسکیموں میں شامل ہونا جائز ہے؟ اگر ہےتو کیااصل رقم کےساتھ اضافہ شدہ رقم زید اپنے ذاتی استعمال میں لاسکتا ہے یانہیں؟ اگرنہیں تو پھراسکےمصارف کیاہیں؟

نیز کمپنی کی طرف سے اس ایجنٹ کوجس نے زید کا پچاس ہزار کا کھاتہ کھولا ہے۱۳/ فیصد محنتانہ حاصل کرنا جائز ہے یانہیں؟

المستفتی: حکیم ایم ایچ صابر، جوہر کلینک،رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: روپئے جمع کرنے کی پالیسی مکمل ہونے کے بعد پچاس ہزارروپئے پرتیس ہزار روپئے جومنافع ملے گا وہ شرعی طور پرصریح سود میں داخل ہے؛

اس لئے تیس ہزار روپئے ناجائز اور حرام ہیں۔

نیز چونکہ یہ معاملہ صاف طور پر سودی معاملہ ہے؛ اس لئے اس کا ایجنٹ بننا بھی قطعاً جائز نہیں ہے۔ اور حدیث شریف میں سود کھانے والے، سود دینے والے، اور اس کے بیچ میں پڑ کر اس کو لکھنے والے اور اس معاملہ میں گواہ بننے والے سب پر لعنت آئی ہے۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، باب لعن آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ٢/ ٢٧، بيت الأفكار رقم:١٥٩٨)

لہٰذا اگر کسی نے ایسا معاملہ کرلیا ہے، تو اس اصل رقم پر جو زائد ملی ہے، اس کو واپس کمپنی کو دیدینا چاہئے۔

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة والاستئجار على المعاصي والطاعات، أو بغير عقد كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه، يجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ١/ ٣٧، دارالبشائر الإسلامية بيروت ١/ ٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، البحرالرائق، زكريا ٩/ ٣٦٩، كوئٹه ٨/ ٢٠١، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ٦/ ٢٧، زكريا ٧/ ٦٠، شامي، زكريا ٩/ ٥٥٣، كراچي ٦/ ٣٨٥، هندية، زكريا قديم ٥/ ٣٤٩، جديد٥/ ٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/ ٢٤٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۰؍۷۴۷۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۱/۲۷ھ

تکافل کی شرعی حیثیت

سوال[۹۰۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مشہور کمپنی ''بجاج الائنز'' (BAJAJ ALLIANZ) اپنے زیرِ اہتمام اس میں ملازمت کرنے والے بعض مسلمانوں کی گذارش پر مختلف عربی وغیر عربی ملکوں میں چلنے والے ''تکافل انشورنس'' جو بتصریح مذکورہ افراد، اسلامی اصولوں اور شرعی ضوابط پر مبنی ایک انشورنس پالیسی وکمپنی ہے، جس کی ایک فائل بزبان انگریزی (جوملیشیا میں چلائے جانے والے اس کاروبار پر مشتمل ہے، ہمارے پاس ۱۵۰؍صفحات پر مشتمل موجود ہے) کے طرز پر ہندوستان میں اسلامی اصولوں پر مبنی ایک تکافل انشورنس شروع کرنا چاہتی ہے، اوراس کارروائی کو انہی مسلمان ملازموں کے حوالے کیا ہے؛ لہٰذا یہ لوگ اس کو یہاں کے قانون کے تحت اس طرح ڈھالنا چاہتے ہیں کہ شرعی قوانین کی بھی رعایت ہو، جب یہ مسئلہ ہمارے سامنے لایا گیا، تو ہم لوگوں نے غور کر کے کافی محنت کے بعد ان کی پالیسی کو سمجھا؛ چونکہ انہوں نے کوئی مرتب میاٹر نہیں دیا تھا؛ بلکہ ایک منتشر مواد تھا، پھر ان کی دی گئی تصریحات کو مدنظر رکھ کر ایک سوال نامہ مرتب کیا گیا اور یہی طے پایا کہ ہندوستان بھر کے بڑے بڑے مدارس کے اربابِ افتاء سے اس سلسلہ میں فتاوی طلب کئے جائیں، اس کے بعد ہی انہیں کوئی تفصیلی جواب فراہم کیا جائے؛ چنانچہ مختصر تفصیلات کے ساتھ آپ حضرات مفتیان کرام کی خدمت میں سوال نامہ ارسال کیا جارہا ہے۔ امید ہے کہ جلد غور فرما کر جواب شافی ووافی ومدلل سے نوازیں گے۔ نیز یہ بھی گذارش ہے کہ اگر کوئی شق ایسی ہو، جس کی شرع شریف میں کوئی گنجائش نہ پاتے ہوں، تو براہ کرم اس کے نعم البدل اور اس کے تغیر کی راہ بھی بتادیں۔

نوٹ: اصل سوال نامہ سے قبل اس کمپنی کی کچھ تفصیلات پیش خدمت ہے۔

نمبر ۱ بنیادی مقصد: متوفی کے عیال کو مالی ومادی تحفظ ونفع پہونچانا،

حصہ داروں اور شرکاء اسکیم (پالیسی ہولڈرس) کی باہمی رضا مندی سے۔

نمبر ۲ طریقہ کار: (۱) ہر پالیسی ہولڈر سے سالانہ (یا سہ ماہی جیسی قسط طے ہو) ایک معتد بہ رقم وصول کی جاتی ہے، ایک مدت مقررہ تک، پھر اس کو چند معینہ شرائط کے ساتھ کمپنی تجارت میں لگاتی ہے اور بطریق مضاربت پالیسی ہولڈرس کو نفع نقصان میں شریک کرتی ہے، یعنی کمپنی اور پالیسی ہولڈر کے درمیان ۵۰% (پچاس پچاس فیصد) تقسیم ہوگا۔

(۲) اس سالانہ یا سہ ماہی وصول کی جانے والی رقم (جس کو پریمیم کہتے ہیں) میں سے کوئی ۵۰% فیصد رقم الگ کرلی جاتی ہے، اس کو کمپنی چند اخراجات میں خرچ کر کے بقایا زائد از ۳% / فیصد رقم کو آپریٹیو فنڈ (جس کو امدادی فنڈ بھی کہتے ہیں) میں محفوظ رکھ لی جاتی ہے، عنقریب اس فنڈ کا استعمال سامنے آئے گا۔ بقیہ ۹۵% / فیصد پریمیم تجارت میں لگائی جاتی ہے۔

نمبر ۳ فوائد: (۱) **سم اشورڈ:** پالیسی ہولڈر یا گاہک مختلف میعاد کے لئے پالیسی لیتا ہے، مثلاً دس سالہ، بیس سالہ، تیس سالہ وغیرہ، ان میعادوں کی پریمیم بھی الگ الگ ہوتی ہے، مثلاً سالانہ دس ہزار روپئے، یا پندرہ ہزار روپئے وغیرہ۔ اہم فائدہ یہ ہے کہ ان پالیسی ہولڈرس کے لئے ایک تیقنی رقم کا وعدہ کیا جاتا ہے، جس کو ''سم اشورڈ'' کہتے ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ مثلاً دس سال کے لئے جس نے پالیسی لی وہ اگر سالانہ دس ہزار روپئے بھر رہا ہے، تو اس کی دس سالہ میعاد پوری ہوگی یا نہیں۔ ہوگی تو دو صورتیں ہیں۔ اگر میعاد پوری ہوگئی، تو اس کی جمع کردہ رقم ایک لاکھ ہو جائے گی، اب اس شخص کو ایک لاکھ روپئے مع اس پر حاصل شدہ دس سالہ منافع یا نقصان ہر حال میں واپس کردئے جائیں گے؛ لیکن اگر میعاد پوری ہونے سے قبل ۹ / سال یا اس سے کم میں مرگیا، تو اس کو پورے ایک لاکھ روپئے دیئے جائیں گے اور جمع کردہ رقم سے زائد ایک خطیر رقم متوفی کے عیال داروں کو دی جائے گی اور جن کو دی جائے گی وہ شرعی وارثت کی تقسیم کے لحاظ سے وارثین کو دی جاتی ہے، نہ کہ نامزد وارث کو۔

کمپنی والوں کا کہنا ہے کہ جو زائد رقم کمپنی نے ڈالی ہے وہ ہر گاہک سے وصول کردہ %۵ ر فیصد میں سے دی جاتی ہے اور یہی وہ امداد ہے، جس کا کمپنی نے تمام گاہکوں کے ساتھ ان کی رضامندی سے معاہدہ کیا ہے۔

دوسرا فائدہ: حج بینیفٹ کا ہے، اس کے لئے علیحدہ رقم جمع کی جائے گی اور اس کو مکمل کاروبار میں لگایا جائے گا اور ایسی جگہ اس کو لگانے کی کوشش ہوگی جہاں نفع ہی نفع ہو، نقصان نہ ہو، اگر نقصان ہو بھی تو بالکل کم ہو، پھر معینہ شرائط کے ساتھ اس کو پالیسی ہولڈر کو حج کے لئے دی جائے گی۔

نمبر ٤ شرائط و ضوابط: (۱) پالیسی حاصل کرنے کے لئے داخلہ کی عمر کم از کم صفر (یعنی نومولود بچہ) اور زیادہ سے زیادہ عمر ۶۰ ر سال کی ہو، قبل از ولادت اور ۶۰ ر سال کے بعد پالیسی نہیں دی جائے گی اور پالیسی جاری رہنے کی آخری عمر ۷۰ ر سال ہے۔

(۲) حکومت ہند کے قانون کے تحت گاہک کو ''سم اشورڈ'' کی کم از کم سطح ضرور لینی ہوگی اور کم از کم سطح یہاں کے قانون کے حساب سے پہلی پریمیم کا پانچ گنا ہے، یعنی سالانہ دس ہزار بھر رہا ہے، تو سم اشورڈ کم از کم ۵۰۰۰۰ ر روپئے ہوگا اور زیادہ سے زیادہ سطح مدت پالیسی کے بقدر یعنی اگر پالیسی بیس سال کے لئے لی ہے، تو ۲۰ ر گنا، تیس سال کے لئے لی ہے، تو ۳۰ ر گنا لینے کی اجازت ہوگی اور کمپنی کی طرف سے صرف چالیس سال تک کے لئے پالیسی لینے کی اجازت ہے، اس سے زیادہ کے لئے نہیں دی جائے گی۔ چالیس سال مکمل ہونے پر بہر حال پالیسی ختم کرنا ہوگا۔

نوٹ: سم اشورڈ کو'' ڈیتھ بینیفٹ بھی کہتے ہیں۔

(۳) ڈیتھ بینیفٹ ملنے کے بعد چند شرائط ہیں:

(۱) کم از کم عمر ۸ ر سال کی ہو (پھر بحث ہونے پر پندرہ سال تک بڑھادی گئی) اس سے کم عمر والا لڑکا مرنے پر اس کو ڈیتھ بینیفٹ نہیں ملے گا؛ کیونکہ اس عمر کو رسک فیکٹر سمجھا گیا ہے۔

یعنی اس عمر کا لڑکا والدین کے کام آنے کا متوقع ہے (اور اس کے مرنے سے والدین کا ظاہری سہارا گویا ٹوٹ گیا) اس سے کم عمر والے سے ایسی توقع کم ہے۔ (اس عمر سے علماء کو اتفاق نہ ہو، تو اس عمر کو تبدیل کیا جا سکتا ہے)۔

(۲) سالانہ پریمیم اگر دو سال سے کم میں بند کر دی اور اس کے بعد پریمیم کا سلسلہ جاری نہیں رکھا، پھر دو چار سال کے بعد انتقال ہو گیا، تو ''ڈیتھ بینیفٹ نہیں ملے گا؛ کیونکہ دو سال مکمل پریمیم نہ جاری رکھنے پر پالیسی ختم ہو جاتی ہے۔

(۳) اگر دو سال مسلسل پریمیم بھر کر پھر بند کر دیا، تو پالیسی ختم نہیں ہوتی، جاری رہتی ہے۔ اب چند سال بعد مر گیا، تو ''ڈیتھ بینیفٹ'' ملے گا۔

(۴) ڈیتھ بینیفٹ ملنے کے لئے یہ شرط ہے کہ پالیسی جاری رہے۔

(۵) پالیسی لینے کے ایک دن بعد بھی مر گیا تو بھی ڈیتھ بینیفٹ ملے گا؛ کیونکہ پالیسی جاری رہتی ہے۔

(۶) دو سال مسلسل پالیسی جاری رکھنے کے بعد بند کر دے، تو پالیسی اس وقت تک جاری رہتی ہے، جب تک کہ پالیسی ہولڈر کے کھاتے میں ادنیٰ رقم باقی رہے؛ اس لئے کہ جب تک پالیسی جاری رہتی ہے، اس وقت تک جمع کردہ رقم سے ہر ماہ/ ہر سال'' کوآپریٹو فنڈ'' یعنی امدادی فنڈ کے لئے معینہ رقم نکالی جاتی رہی گی، خواہ پریمیم بھر رہا ہو یا نہ بھر رہا ہو۔ پھر ادنیٰ رقم باقی رہنے تک کسی بھی وقت بقایا پریمیمس (قسطیں) ادا کر کے پالیسی جاری رکھ کر ڈیتھ بینیفٹ حاصل کر سکتا ہے۔

(۷) دو سال مسلسل پریمیم نہ بھرنے کی صورت میں جب پالیسی ختم ہو کر ڈیتھ بینیفٹ سے محرومی ہوتی ہے، تو اس صورت میں اصل جمع کردہ رقم ضبط نہیں ہوتی؛ بلکہ اپنے نقصانات کی تلافی کر کے بقیہ رقم پالیسی ہولڈر کے حوالے کر دے گی، مگر فوراً نہیں بلکہ کچھ تاخیر سے۔

نمبر ۵ تکافل انشورنس کمپنی کے ذرائع کسب: تکافل کمپنی

اپنے گاہکوں سے وصول کردہ رقوم کو شیئرز میں تبدیل کر کے ایسی کمپنیوں اور اداروں میں لگاتی ہے جہاں کے کاروبار سودی نہ ہوں۔ حرام اشیاء کی فروخت نہ ہوتی ہو اور غیر شرعی طریقہ کار کم سے کم ہو، پھر اس سرمایہ کاری سے حاصل شدہ منافع، تکافل کمپنی اور اس کے شرکاء کے درمیان نصف نصف بانٹے جائیں گے اور یہ منافع پالیسی ہولڈر کے حساب میں جمع ہوتے رہیں گے۔ چنانچہ ذیل کے شرائط انہوں نے مقرر کئے ہیں:

(۱) پالیسی ہولڈرس سے اکٹھا کی گئی رقم ایسے کاروبار میں ہی لگائی جائے گی جس کی اسلامی قانون اجازت دے گا۔

(۲) ایسے اداروں میں تجارت کے لئے نہیں دی جائے گی جہاں شراب، جوا، سود، خنزیر کا گوشت وغیرہ حرام اشیاء کی خرید وفروخت ہوتی ہے۔

(۳) جتنی رقم بھی کاروبار میں لگانا ہے، اس کے یونٹس (یعنی شیئرز) خریدے جائیں گے، مثلاً دس روپئے کا ایک یونٹ تو ایک لاکھ روپئے کے دس ہزار یونٹ ہوئے

(۴) یہ یونٹ کھلے بازار میں فروخت نہیں کئے جائیں گے۔

(۵) بیمہ کی ساری رقم یونٹ میں نہیں دی جاتی؛ بلکہ ایک بڑی رقم لگائی جائے گی بقیہ محفوظ رکھی جاتی ہے۔

(۶) بیمہ کمپنی اس یونٹ کی مالک ہوگی، گاہک اس کا مالک نہیں ہوتا کہ جب چاہے اس کو فروخت کر سکے۔

یہ تمام تفصیلات اصل سوال نامہ سے قبل پیش خدمت کر دینا ضروری تھا۔ اب اصل سوال نامہ آپ حضرات کی خدمت میں پیش ہے، جس کو انشورنس پالیسی (L.I.C) اور تکافل اسلامک انشورنس کمپنی کے مابین موازنہ کر کے مرتب کیا گیا ہے تا کہ جواب میں سہولت ہو۔

(۱) الف (L.I.C) بیمہ کمپنی اپنے شریک اور گاہک کو ایک معینہ مدت کے بعد اس کی جمع کردہ رقم اس کو یا اس کے پسماندگان کو واپس کرتی ہے، ساتھ ہی ایک خطیر رقم

بطور سود دیتی ہے، جس کو وہ بونس (منافع) قرار دیتی ہے، علماء نے اس کو سود کہا ہے، چاہے نام بدل جائے۔

(ب) تکافل پالیسی میں جمع کردہ رقم کے ساتھ جو رقم مستزاد دی جاتی ہے، وہ بطریق مضاربت حاصل شدہ منافع تنصیفاً بین الشریک و بین کمپنی دیئے جاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ صورت اور انشورنس پالیسی کے عدم جواز کی مذکورہ صورت دونوں ایک ہیں اگر ہیں تو کیسے اگر نہیں ہیں تو تکافل کا کیا حکم ہے؟

(۲) (الف) بیمہ کمپنی میں یہ صورت ہے کہ بیمہ شدہ شخص یا بیمہ شدہ شئ وقت معینہ موہومہ سے پہلے تلف ہو جائے، تو اتنی رقم ملے گی اور اس کے بعد تلف ہو، تو اتنی رقم ملے گی؛ جبکہ تلف ہونے کا وقت نا معلوم ہو، علمائے کرام نے اس کو یہ کہہ کر قمار کی حدود میں داخل فرمایا ہے کہ حوادث کا حال معلوم نہیں واقع ہوں گے یا نہیں؟ یا کب اور کیسے؟ ایسی مبہم و نا معلوم چیز پر نفع ونقصان کو معلق کرنے کا نام ہی قمار ہے۔

(ب) تکافل انشورنس پالیسی میں بیمہ شدہ شخص وقت موہومہ سے پہلے انتقال کر جائے، تو تیقنی رقم (یعنی سم اشورڈ) دی جائے گی۔ اور اگر متوقع وقت پر یا بعد میں مرے تو جمع کردہ رقم مع اس کے منافع یا نقصان کے دی جائے گی۔ اتنی بات ضرور ہے کہ پہلی صورت (وقت متوقعہ سے پہلے مرے) میں تیقنی رقم یا جمع کردہ رقم مع منافع ونقصان میں سے جونسی زیادہ ہو، وہ دی جائے گی۔ اور دوسری صورت میں صرف جمع کردہ رقم مع منافع یا نقصان دی جائے گی۔

سوال یہ ہے کہ (ا) کیا سم اشورڈ یعنی ایک گیارنٹی رقم کا وعدہ کرنا (جبکہ یہ بطور تعان کے ہو، گاہکوں کی رضامندی سے نہ کہ بطور سود کے) شرعا درست ہے یا نہیں؟ حوالہ جات کے ساتھ جواب عنایت فرمائیں۔

(۲) تکافل کی جو صورت یہاں ذکر کی گئی، کیا یہ بھی قمار کی حدود میں داخل ہو کر حرام

قرار دی جائے گی؟ اگر ہاں تو اصلاح کی کیا صورت ہوگی؟

(۳) (الف) انشورنس کمپنی میں یہ اصول وقانون ہے کہ جو شخص کچھ قسطیں) تین سال سے پہلے) بیمہ پالیسی کی جمع کر کے باقی قسطیں بند کر دے تو اس کی جمع کردہ رقم سوخت ہو جاتی ہے۔ علمائے دین نے اس کو ناجائز فرمایا ہے۔

(ب) تکافل میں دو سال مسلسل پریمیم نہ بھرے، تو پالیسی ختم ہو جائے گی اور اسکے مرنے پر اس کو ڈیتھ بینیفٹ نہیں ملے گا؛ لیکن اس کی جمع کردہ رقم سوخت نہیں ہوگی؛ بلکہ کمپنی اپنے نقصانات کی تلافی کر کے بقیہ رقم پالیسی ہولڈر کو لوٹا دے گی۔

سوال یہ ہے کہ تکافل کے مذکورہ طریقہ کار اور الف میں ذکر کردہ انشورنس کی صورت میں کیا فرق ہے؟ کیا تکافل کی اس صورت پر الف میں مذکورہ شرعی حکم لگایا جائے گا؟ اگر ہاں تو تکافل کی کس شق کو بدل کر اس حکم شرعی سے بچا جا سکتا ہے؟

(۴) (الف) انشورنس کمپنی کی جانب سے دیئے جانے والے سود کو کمپنی امداد باہمی قرار دے کر جائز سمجھتی ہے۔ علمائے امت نے اس کے تبرع واحسان اور امداد باہمی ہونے سے انکار فرماتے ہوئے ذیل کی وجوہات بیان فرمائی ہیں:

(۱) تبرع اور احسان پر کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا، یہاں (L.I.C) میں عدالتی چارہ جوئی کے ذریعہ جبراً وصول کیا جاتا ہے۔

(۲) کمپنی کو براہ راست کسی غریب مصیبت زدہ سے کوئی ہمدردی نہیں ہے کہ وہ اس مد میں کچھ خرچ کرے؛ بلکہ وہ ایک تجارت ہے، جو اس نظریہ پر قائم ہے کہ عادةً حوادث کا اوسط بہت کم رہتا ہے اور کمائی کا اوسط زیادہ۔

(۳) بیمہ کو امداد باہمی کہنا ایک دھوکہ ہے؛ بلکہ بیمہ اور سٹہ سے آنے والی نحوست کو پوری قوم پر ڈالنے کا ایک خوبصورت حیلہ ہے۔

(۴) جو نقصان خالص ایک ذات پر پڑنے والا تھا، اس کو بیمہ کے ذریعہ پوری قوم

کے سرڈالدیااورنقصان سے بچنے کے لئے سٹہ کا بازارگرم کیا، جب ذرانقصان ہوا،تواپنی بلا دوسرے کے سرڈال کرخودکونقصان سے بچاکر بے باق ہوگیا،اس کوبڑی ہوشیاری سے باہمی امداد کاعنوان دیا گیا۔

(ب) تکافل میں جورقم اصل رقم سے زائد حاصل ہوتی ہے وہ بطریق مضاربت حاصل شدہ منافع ہوتے ہیں،جس کواسلامی اصول (یعنی نفع ونقصان میں شرکت) پرمبنی کیا گیا ہے،رہامعاملہ سم اشورڈ (ڈیتھ بینیفٹ) کا جومدت مقررہ سے پہلے مرنے پردیاجاتاہے،تووہ امداد باہمی کےطور پردیاجاتاہے،جس کے لئے ایک خاص فیصد ہرگاہک کے پریمیم سے کاٹا جاتاہےاوراس کوامدادی فنڈ میں رکھاجاتاہے،جس کی تمام گاہکوں سے ابتدامیں ہی رضامندی لے لی جاتی ہے۔اوریہ معمولی فیصد ہوتاہے،جس کے لئے رضامندی میں تامل نہیں ہوتا۔

اب سوال یہ ہے کہ: (۱) انشورنس میں ملنے والےسودکوامداد باہمی نہ مان کرعلماء کرام نے جن وجوہ سے اس کو ناجائز قراردیاہے، کیاوہ وجوہات تکافل کے مذکورہ نظام میں بھی پائی جاتی ہیں؟

(۲) کیاان وجوہات سے اس کوبھی ناجائز کہاجائے گا؟یاجواز کی کوئی ایسی وجہ اس میں پائی جاتی ہے،جس کوترجیح دی جاسکتی ہے؟

(۳) اگر بدستوراس میں بھی وجوہ عدم جواز پائی جاتی ہیں،توان کی نشاندہی فرمائیں اوران کے ازالہ کی صورت اورمتبادل طریقہ کوواضح فرمائیں تاکہ اس نظام تکافل کواسلامی اصولوں پرڈھالنے میں آسانی ہو۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: تکافل کی حقیقت اورسوال نامہ پربار بارغورکر کے دیکھا گیاتکافل وانشورنس پرجوتقابلی سوال کئے گئے ہیں،ان کوبھی تقابلی انداز سے دیکھا گیابین الاقوامی تاجروں کی ایک خصوصی میٹنگ بلاکران کے سامنے پوری تحریربار بارپڑھ کر

سنائی گئی اور پوری طرح حقیقت حال سے روشناس ہونے کی کوشش کی گئی آخر کار نتیجہ یہی نکلا کہ لائف انشورنس کی بہت سی قسمیں ہیں، تکافل اسکیم لائف انشورنس کے اقسام میں سے کسی نہ کسی قسم سے مل جاتی ہے؛ البتہ کہیں کہیں حیثیت اور نوعیت میں معمولی معمولی فرق بھی ہے اوراس معمولی فرق کی وجہ سے تکافل کی شکل سود اور قمار سے بالکلیہ پاک ہوکر جواز کے دائرہ میں کسی طرح داخل نہیں ہوتی ہے، کئی روز تک بار بار سائل کی تحریر پر غور کیا گیا ہے، جیسا کہ سائل نے تکافل اسکیم کو مضاربت میں شامل ہونے پر کافی زور دیا ہے، اس پر بھی بار بار غور کیا گیا ہے، مگر مضاربت کی تمام شرطیں تکافل اسکیم میں پائی نہیں جاتی ہیں؛ اس لئے تکافل اسکیم لائف انشونس کی ایک قسم ہے، جس میں کہیں قمار کی شکل ہوتی ہے اور کہیں سود کی شکل پائی جاتی ہے؛ لہٰذا سوال نامہ میں ذکر کردہ تکافل اسکیم مضاربت یا شرکت کے دائرہ میں داخل نہ ہونے کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہے اوراس کے عدم جواز کے اکثر دلائل وہی ہیں جو لائف انشورنس کے عدم جواز پر ہوتے ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۹/ ذی قعدہ ۱۴۲۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۶۱۶/۳۷)	۱۹/۱۱/۱۴۲۵ھ

جیون بیمہ

سوال [۹۰۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ادھر چند سالوں سے فرقہ پرست عناصر نے پورے ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف جوزہر پھیلا دیا ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں، اسلام دشمن تمام تنظیمیں اس بات پر متحد ہو چکی ہیں کہ ملک میں نہ کوئی مسلمان باقی رہے، اور نہ مسلمانوں کا تذکرہ اس مقصد کے لئے منظّم طور پر مسلمانوں کی عزت وآبرو اور جان و مال کو نقصان پہنچایا جاتا ہے،

مسلمان عام طور پر اپنی جان و مال دوکان اور تجارت کے تحفظ کے لئے پریشان ہیں، ان حالات کے پیش نظر درج ذیل مسائل میں شرعی رہنمائی فرمائیں۔

(۱) ہندوستان کے موجودہ حالات میں کیا جان و مال کا انشورنس درست ہے؟

(۲) بعض ایسے شہر ہیں جو متواتر فساد کے زد میں ہیں، نہیں کہا جاسکتا کہ کب کیا ہو جائے اور بعض شہر میں قدرے سکون کا ماحول ہے۔ کیا ان دونوں طرح کے شہروں کا ایک ہی حکم ہے یا کوئی فرق؟

(۳) کسی نے لائف انشورنس یا مال کا انشورنس اگر فساد زدہ شہروں میں کرالیا اور اتفاق سے اس کی جان و مال فساد کے زد میں آ گیا، اس صورت میں انشورنس کمپنی کی جانب سے جمع کردہ رقم سے زائد رقم دی جاتی ہے، کیا اس کا لینا درست ہے؟ اور کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ حکومت کی جانب سے تحفظ میں سستی اور کوتاہی کا جرمانہ ہے؟

(۴) بعض لوگ لڑکی کی شادی، لڑکوں کی تعلیم وتربیت اور اس جیسے دوسرے بہتر مقاصد کے لئے انشورنس کراتے ہیں تاکہ بعد میں زمانہ کی بڑھتی ہوئی مہنگائی پریشان کن ثابت نہ ہو، کیا یہ درست ہے؟

(۵) سرکاری ملازمت یا بیرون ملک سفر کے وقت اگر انشورنس کرانا ضروری ہو، تو اس کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: تنظیم عالم قاسمی، دارالعلوم حیدرآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سائل نے دو ایسی چیزوں کو مخلوط کر کے پوچھا ہے، جن میں سے ایک کا تعلق دوسرے سے نہیں ہے، جیون بیمہ بالکل الگ چیز ہے اور املاک کا بیمہ اس سے الگ بالکل دوسری چیز ہے۔

لوگ عام طور پر ان دونوں چیزوں کو خلط ملط کر کے سوال کرتے ہیں، جس کا کوئی صحیح

حاصل نہیں نکلتا۔اورسائل نے بھی اس سوال میں ایسا ہی مخلوط کر کے سوال کیا ہے؛ اس لئے لائف انشورنس سے متعلق الگ سے بحث یا سوال کرنا چاہئے، اس کی وجہ یہ ہے کہ لائف انشورنس میں جو رأس المال جمع ہوتا ہے، وہ باقی رہتا ہے، اس کی بقاء میں کوئی خطرہ نہیں اور رأس المال کی مقدار کے اوپر سود کے اضافہ کے ساتھ اس کا ملنا یقینی ہے؛ اس لئے لائف انشورنس کی شکل صریح سود کی ہے، فسادات کو بنیاد بنا کر لائف انشورنس کی قطعاً اجازت نہیں ہوگی اور املاک کا بیمہ اس سے الگ بالکل دوسری شئ ہے، چاہے گاڑی کا بیمہ ہو یا دوکان، فیکٹری اور مکان وکاربار کا بیمہ ہو یہ سب الگ چیز ہے، ان اشیاء اور املاک کے بیمہ کی شکل یہ ہوتی ہے کہ چھ مہینے یا سال بھر یا زیادہ مدت کے لئے بیمہ کرایا جاتا ہے، اور متعینہ فیس ادا کرنی ہوتی ہے اور جو فیس ادا ہوجاتی ہے، وہ کبھی واپس نہیں آتی، جب مدت ختم ہوجائیگی اور درمیان میں کوئی حادثہ وغیرہ پیش نہ آئے، تو جمع شدہ رقم ہاتھ سے نکل جاتی ہے، اس رقم کے عوض میں کچھ نہیں ملتا، نہ رأس المال واپس ملتا ہے، نہ اس پر اضافہ سود ملتا ہے، تو ایسے حالات میں لائف انشورنس اور املاک کا بیمہ دونوں کو مخلوط کر کے ایک ساتھ بحث کرنا یا سوال کرنا یا مسئلہ کا جواب دینا کسی طرح درست نہیں؛ لہٰذا لائف انشورنس کے بارے میں ہم نے اوپر حکم شرعی لکھا ہے کہ فسادات کو بنیاد بنا کر اس کو جائز قرار دینا درست نہیں ہے، فسادات میں مرنے میں جیون بیمہ والوں کو ہندوستانی قانون کے مطابق کچھ نہیں ملتا، ان کو نقصان کا شکار قرار دے دیا جاتا ہے؛ اس لئے لائف انشورنس کو بنیاد بنانا لا حاصل ہے، ہاں البتہ املاک کا بیمہ ایسا بیمہ ہے، جس کو سودی معاملہ نہیں قرار دیا جاسکتا ہے؛ اس لئے کہ یہ سود کی تعریف میں داخل ہی نہیں؛ کیوں کہ سود اس کو کہا جاتا ہے، جس میں جمع شدہ رقم اضافہ کے ساتھ واپس آجائے، یہاں ایسی شکل نہیں ہے؛ بلکہ املاک کی صرف ضمانت کی فیس ادا کی جاتی ہے، اس تلافی کو کمپنی کی طرف سے ایک قسم کا تعاون بھی قرار دیا جاسکتا ہے اور املاک کے بیمہ میں فیس ادا کرنے کے بعد حادثہ کا پیش آنا نہ آنا امر متردد فیہ ہے؛ اس لئے اس کو قمار کے مشابہ قرار دیا

جاسکتا ہے۔ اور قمار کے مشابہ ہونے کے باوجود ضرورت اور حاجت کی وجہ سے املاک کے بیمہ کی گنجائش قرار دی جاسکتی ہے۔

الضرورات تبیح المحظورات. (الأشباه والنظائر قديم ١٤٠، قواعد الفقة اشرفي ٨٩، رقم: ١٧٠، شرح المجلة رستم اتحاد ٢٩/١، رقم المادة: ٢١، ايضاح النوادر ١٤٤/١)

نوٹ: (سوال کے ساتھ بہت سارے علماء اور مفتیان کرام کے دستخط کے ساتھ جیون بیمہ کے جواز پر ایک فہرست بھیجی گئی تھی، جسے حذف کر دیا گیا ہے)

سائل نے بیمہ کے متعلق علماء کے دستخط کی جو فہرست منسلک کی ہے، اس کے پیچھے بہت سارے تضاد اور تناقضات ہیں، جس کی پوری وضاحت ہم نہیں کرنا چاہتے، بس اتنی بات بتا دیتے ہیں کہ ان دستخط کرنے والے بہت سے علماء اور مفتیان نے اس فتوی سے رجوع کرلیا ہے، اور احقر کے نام کے ساتھ اسی میں نوٹ موجود ہے اور احقر کے ساتھ اور علماء شامل تھے، جن کے نام اسی فہرست میں ایک زمانہ تک آتے رہے؛ لیکن اب نہیں آتے اور اس میں جو دستخط ہیں وہ اعظم گڈھ کے سیمنار میں صرف کمرہ کمرہ جا کر کے مذکورہ علماء سے کرائے گئے۔ اور اس سیمنار میں مسئلہ انشورنس کو نہ موضوع بحث بنایا گیا اور نہ ہی سیمینار ہال میں ضمنی طور پر بھی کوئی بحث ہوئی تھی، ہاں البتہ دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد میں اس کو موضوع بحث بنایا گیا تھا، مگر کوئی فیصلہ نہیں ہوسکا؛ بلکہ عدم جواز کی بات غالب رہی؛ اس لئے یہ فہرست کسی حیثیت کی مالک نہیں اور اس فہرست کے ذریعے سے دنیادار لوگوں نے اب تک بہت ناجائز فائدہ اٹھایا؛ حالانکہ اس فہرست کے اکثر بڑے بڑے علماء نے اپنی رائے سے رجوع کا اعلان کر دیا ہے، اس تحریر سے سوال نمبر ۱/۲/۳/ کے جوابات آگئے۔

اور سوال نمبر ۴/ میں لڑکی کی شادی کے لئے جو بیمہ کا ذکر کیا گیا ہے، وہ جیون بیمہ کی شکل ہے، سائل سے سوال ہے کہ سائل نے جواز کی بنیاد فساد کو بنایا ہے، تو لڑکی کی شادی میں

کون سے فساد کو بنیاد بنایا جائے؟ ظاہر ہے کہ یہ لاحاصل بات ہے اور یہ جیون بیمہ کی شکل ہے، جس میں صریح سود لازم آتا ہے جو شرعاً جواز کے دائرہ میں نہیں آتا۔

اور سوال نمبر ۵ر میں سرکاری ملازمت یا بیرون ملک سفر کے وقت انشورنس کی بات لکھی ہے، اگر سرکاری ملازمت میں جیون بیمہ پر مجبور کیا جاتا ہے، تو مجبوری میں بیمہ کرالے اور بعد میں جو اضافی رقم ملے گی، وہ بینک کے سود کی طرح اپنے اوپر خرچ نہ کرے؛ بلکہ سرکاری ٹیکس وغیرہ میں واپس کردے، ورنہ نہتے فقیروں کو بلانیت ثواب دے دے۔

اور بیرون ملک سفر کے وقت انشورنس کا کیا مطلب ہے؟ سائل کو اسے صاف واضح کرنا چاہئے تھا، اگر سائل کا مطلب یہی ہے کہ ہوائی جہاز کے ٹکٹ کے ساتھ ساتھ انشورنس بھی ضمنی طور پر ہوجاتا ہے، جس کی خود سفر کرنے والے کو خبر نہیں ہوتی، سفر کرنے والا یہی سمجھتا ہے کہ ہمارا ٹکٹ اتنے میں ملا ہے؛ اس لئے اس طریقہ سے ہوئی جہاز کا ٹکٹ خریدنا جائز اور درست ہے، اس موضوع پر علماء نے الگ سے بحث وتمحیص کے ساتھ مسائل لکھے ہیں، اس پر ایک وضاحتی نوٹ انوار رحمت ۳۵۴ سے ۳۵۷ تک میں موجود ہے، موقع ہو تو سائل وہاں سے دیکھ لے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ر شعبان المعظم ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸ / ۹۱۲۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۷/۸/۹ھ

لائف انشورنس

سوال [۹۰۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں نے اسکول کے تُھرو (توسط سے) لائف انشورنس کرایا ہے، رلائنس کمپنی کا ۱۶ر سال کا ہے، ۱۶ر سال کے بعد مجھے جو پیسہ ملے گا، وہ میرے لئے جائز ہے یا نہیں؛ لیکن اس کو ختم کرنے میں مجھے کوئی بھی پیسہ واپس نہیں مل رہا ہے ابھی میں نے ایک

قسط جمع کی ہے؛ لہٰذا مجھے جواب سے نوازیں ۱۶/ سال کے بعد اس پیسہ کا جو منافع مجھے ملے گا وہ میرے لئے جائز ہیں یا نہیں؟

المستفتی: جاوید اختر، پیرغیب، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جولائف انشورنس کرایا ہے، اس کی مدت پوری ہونے پر جمع شدہ رقم پر جو زائد پیسہ ملے گا وہ سود ہوگا، اس کو اپنے استعمال میں خرچ کرنا جائز نہیں ہوگا، اس کو یا تو جہاں سے آیا ہے وہیں واپس کردیا جائے یا نادار فقیروں میں بلانیت ثواب تقسیم کردیا جائے۔

عن علي قال: كل قرض جر منفعة، فهو ربا. (كنز العمال الدين والسلم، دارالكتب العلمية بيروت ٦/٩٩، رقم: ١٥٥١٢، جامع الأحاديث الكبير للسيوطي ٦/٤٣٨، رقم: ١٥٨٢١)

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالاً بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد (إلى قوله) **يجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء.** (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه ٨/٢٠١، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، شامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، هندية، زكريا قديم ٥/٩٤٩، جديده٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۰۰۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۳/۱۴۳۴ھ

جیون بیمہ کا حکم

سوال[۹۰۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہندوستان کے پرخطر ماحول اورآئے دن فسادات کی وجہ سے ہر وقت مسلمانوں کی جان و مال کا خطرہ لاحق رہتا ہے، تو کیا اس ماحول کے پیش نظر جان کا بیمہ کرانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: ضیاء العلوم، کرتپور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جان کا بیمہ قطعاً ناجائز اورحرام ہے، خواہ جیون بیمہ فسادات کے اندیشہ سے کیا جائے یا کسی اور دوسری وجہ سے؛ اس لئے کہ یہ سود، قمار، اوررشوت پر مشتمل ہے، جو سراسر ناجائز و حرام ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۳۴، محمودیہ ۳۰۸/۶، جدید ڈابھیل ۳۸۹/۱۶، رحیمیہ ۲۰۰/۲، جدید زکریا ۲۷۳/۹، امداد الفتاوی ۱۶۱/۳، کفایت المفتی ۷۶/۸-۷۷، جدید مطول ۲۳۹/۱۱)

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا . [سورة البقره: ۲۷۵]

عن جابرؓ، قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (صحيح مسلم، باب لعن آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۸، سنن أبي داؤد، باب في آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية۲/ ۴۷۳، دارالسلام رقم: ۳۳۳۳)

عن عبد اللّٰہ بن عمرو قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم الراشي والمرتشي. (سنن أبي داؤد، كتاب القضاء، باب في كراهية الرشوة، النسخة الهندية۲/ ۵۰۴، دارالسلام رقم: ۳۵۹۰، سنن الترمذي، باب ما جاء في الراشي والمرتشي في الحكم، النسخة الهندية ۱/ ۲۴۸، دارالسلام رقم:۱۳۳۷)

اور فسادات میں تو رکشہ اور ٹھیلہ والے مارے جاتے ہیں، انہیں خود اپنے گذارے کے لئے پیسے نہیں ملتے، تو وہ بیمہ کہاں سے کرائیں گے۔ اب رہے بیمہ کرانے کی استطاعت کے لوگ تو وہ لوگ فسادات کے موقع پر کوٹھیوں اور بالا خانوں میں رہتے ہیں، وہ کبھی گاڑیوں سے نیچے بھی نہیں اترتے، فسادات سے ان کا کوئی تعلق نہیں، تو ایسے لوگوں کو فسادات میں جان کی حفاظت کے لئے بیمہ کی اجازت دینا ایسی بات ہے، جیسے کسی سے یہ کہا جائے کہ پیر سے نہ چلے؛ بلکہ سر سے چلا کرے اور فسادات کو بنیاد بنا کر جب سے جیون بیمہ کا مسئلہ اٹھا ہے، تب سے ہمارے علم کے مطابق سرمایہ دار لوگوں نے کئی کئی کروڑ روپئے کا جیون بیمہ کرا رکھا ہے، جو قطعاً ناجائز اور حرام ہے اور ہر وقت اللہ کی طرف سے اس کی لعنت اور عذاب کا خطرہ ہے۔

اب رہی فسادات میں لوگوں کی دوکان، مکان اور اموال کی بربادی کا مسئلہ تو اس کے لئے اموال کی بیمہ کرانے کی اجازت ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۰؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵؍ ۶۶۷۱)	۱۴۲۱/۵/۲۰ھ

جیون بیمہ کرانے کا حکم

سوال [۹۰۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جیون بیمہ کرانا کیسا ہے؟ جواب تحریر فرمادیں۔

المستفتی: محمد دانش، دولت باغ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جیون بیمہ کا معاملہ کسی بھی نیت اور مصلحت سے ہو جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ جیون بیمہ اپنی شکل وصورت کے اعتبار سے قمار، جوا اور سود ہے؛ کیونکہ بیمہ کرانے والا کب انتقال کر جائے گا اور اسے کتنی زائد رقم ملے گی اور اگر کسی مجبوری

سے رقم جمع کرنے کا سلسلہ بند ہوجائے تو پچھلی جمع شدہ ساری رقم سوخت ہو جاتی ہے، یہ سب امور مخاطرہ یعنی اس معاملہ کے قبیل سے ہیں، جو نفع اور ضرر کے درمیان دائر ہو اور شریعت میں اسی کو قمار کہتے ہیں، جس کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے۔(مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۳۳، فتاوی رحیمیہ ۲/۲۰۰، جدید زکریا ۹/۲۷۳)

إن القمار من القمر الذي يزداد تارة وينقص أخرىٰ وسميٰ القمار قمارا؛ لأن كل واحد من المقامرين ممن يجوز أن يذهب ماله إلى صاحبه ويجوز أن يستفيد مال صاحبه وهو حرام بالنص. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، فصل في البيع، زكريا ٥٧٧/٩، كراچي ٤٠٣/٦، المحيط البرهاني،المجلس العلمي٤/١٨، رقم: ٩٤٨٦، تبيين الحقائق، امداديه ملتان ٢٢٧/٦، زكريا ٤٦٦/٧، معارف القرآن ٤٧٦/١)

اب قمار اور سود کی حرمت کے سلسلہ میں نص شرعی ملاحظہ ہو۔

قال الله تعالىٰ: يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطَانُ اَنْ يُوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِيْ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ. [سورۂ مائدة: ٩٠-٩١]

عن ابن مسعودؓ عن أبيه قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وشاهديه، وكاتبه، وقال: هم سواء. (سنن أبي داؤد، باب في آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية ٢/ ٤٧٣، دارالسلام رقم: ٣٣٣٣، صحيح مسلم، باب لعن آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ٢٧/٢، بيت الأفكار رقم:١٥٩٨، مشكاة شريف ١/ ٢٤٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ربیع الاول ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/۷۹۷۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴؍۳؍۱۴۲۴ھ

جیون بیمہ کا شرعی حکم

سوال [۹۰۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ موجودہ حالات میں جبکہ فسادات عام ہیں، کرنیل گنج گونڈہ کا فساد ہمارے سامنے ہے، آدمی کا سب کچھ پھونک دیا گیا، دوکان لوٹ لی گئی اور پھونک دی گئی، اسی طرح گاڑیاں جیپ وغیرہ پھونک دی گئیں جوان کے لئے روز کا سہارا تھیں، فساد کے بعد آدمی اس زمین کواپنے اوپر تنگ پاتا ہے، گذر بسر کے لئے ظاہر طور پر اس کے پاس روزی کا اور بچوں کا پیٹ پالنے کا کوئی ظاہر سہارا نہیں ہے، تو موجودہ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے کاروبار کا، دوکان کا، گاڑیوں کا انشورنس اور بیمہ کرانا جائز ہوگا؟

اسی طرح فساد کے دوران اکثر قتل کی واردات سامنے آئیں ہیں، اسی حالیہ فساد میں بہت سے ایسے گھر دیکھنے میں آئے کہ گھر کے ذمہ دار مرد شہید کردئے گئے۔ اب گھر میں صرف اس کی بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، مزدوری کر کے وہ مرد بچوں کا پیٹ پالتا تھا، اب شہید ہوجانے کے بعد بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے اس بیوہ عورت کے پاس کوئی سبیل نہیں ہے، تو کیا موجودہ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے آدمی اپنی زندگی کا بیمہ کرا سکتا ہے اور اگر نہیں کرا سکتا ہے، تو پھر یہ بیوہ عورت اور اس کے بچوں کا مسئلہ کیسے حل ہوگا؟ اور روزی وغیرہ ساری ضروریات ان کی کیسے پوری ہوں گی؟ جبکہ حالت یہ ہے کہ پریشانی کے وقت کوئی کام آنے والا نہیں ہوتا ہے۔

المستفتی: مفتی نعمت اللہ، عباسی جنرل اسٹور، چوک گونڈہ (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ سائل کا مقصد نفس بیمہ کے جواز اور عدم جواز سے متعلق معلوم کرنا ہے؛ اعذار اور حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بیمہ

جیسا ناجائز معاملہ جائز ہوسکتا ہے یا نہیں؟ تو اس کی تفصیل یہ ہے کہ بیمہ کے عدم جواز کی علت یہی ہے کہ وہ سود اور قمار میں داخل ہے، جس کی تفصیل اپنی جگہ موجود ہے اور ربوا اور قمار کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے۔

قال الله تعالیٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ. [سورۂ مائدة: ۹۰]

قال الله تعالیٰ: وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [سورة البقره: ۲۷۵]

اور حضرات فقہاء امت نے ایسی حرام چیزوں کا استعمال مباح ہونے کے لئے اصول وضابطہ **الضرورة تبيح المحظورات. الأشباه والنظائر قديم ۱۴۰** مقرر فرمایا ہے۔ اور ضرورت کے پانچ درجات ہیں: ۱. ضرورت ۲. حاجت ۳. منفعة ۴. زینت ۵. فضول۔

اور ضرورت سے مراد ایسی ضرورت و پریشانی ہے کہ اگر حرام چیز استعمال نہ کی جائے، تو جان کا خطرہ ہے، تو ایسی حالت میں بقدر ضرورت حرام چیز استعمال کر کے جان بچانے کی اجازت اور حکم ہے اور حاجت سے مراد ایسی ضرورت و پریشانی و مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے، تو ایسی حالت میں حرام چیز کا استعمال اور حرام کام کو اختیار کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

اور سوال نامہ کی درج شدہ صورتیں حاجت کے تحت داخل ہیں اور ضرورت منصوص کے تحت داخل نہیں ہیں؛ اس لئے مذکورہ حالات میں ہماری تحقیقات کے مطابق بیمہ اور انشورنس کا اختیار جائز نہیں ہے، اسی وجہ سے ضرورت کے اندر عند المخمصہ کی قید لگائی۔

وههنا خمسة مراتب: ضرورة، وحاجة، ومنفعة، وزينت، وفضول. فالضرورة بلوغه حداً إن لم يتناول الممنوع هلك، أو قارب، وهذا يبيح تناول الحرام، والحاجة كالجائع لو لم يجدها يأكله لم يهلك غير أنه يكون في جهد، ومشقة، وهذا لا يبيح الحرام. (حموي على الأشباه قديم ۱۴۰)

ومن ثم جاز أكل الميتة عند المخمصة. (الأشباه والنظائر قديم ۱۴۰، قواعد الفقه، اشرفي ۸۹)

نیز ایسے حالات میں رزق کا مالک رازق حقیقی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ رجمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/۲۲۴۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹/۵/۱۴۱۱ھ

کیا جیون بیمہ کرانا جائز ہے؟

سوال [۹۰۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ابھی کچھ دنوں پہلے اسلامی فقہ اکیڈمی کے حوالہ سے مفتیان کرام کا فیصلہ اخبار میں شائع ہوا تھا کہ ہندوستان کے حالات کے پیش نظر بیمہ کرانے کی اجازت مسلمانوں کو دی جاتی ہے، ہم نے تو اخبارات میں نہیں پڑھا؛ البتہ بہت سے حضرات اس سلسلہ میں معلومات کرنے آرہے ہیں اور اسلامی فقہ اکیڈمی کے حوالہ سے مفتیان کرام کی اجازت اخبار کے حوالہ سے دے رہے ہیں، ہم باشندگان سیڑھا اور نہٹور کے علماء نے دارالافتاء جامعہ قاسمیہ کے فیصلہ آنے پر عوام کو خاموش کر دیا ہے؛ اس لئے آں محترم سے درخواست ہے کہ اس سلسلہ میں تفصیل سے واضح فرمادیں کہ اسلامی فقہ اکیڈمی کا کیا فتوی ہے؟ اور ہم لوگ بیمہ جان ومال کاروبار وغیرہ کا کرا سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: باشندگان سیڑھا، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کاروبار، فیکٹری، فرم، گاڑی وغیرہ املاک کا بیمہ کرانے کی گنجائش ہے، اس میں جو فیس جمع ہو جاتی ہے، وہ نہ واپس ملتی ہے اور نہ ہی اس پر سود ملتا ہے؛ ہاں البتہ خدانخواستہ اگر کوئی حادثہ پیش آجائے، تو کمپنی کی طرف سے نقصان کی تلافی کا تعاون کیا جاتا ہے اور جیون بیمہ جس کو لائف انشورنس کہا جاتا ہے، اس میں جمع شدہ رقم بھی واپس ملتی ہے اور اس پر ضابطہ کے مطابق اضافہ سود بھی ملتا ہے؛ اس لئے لائف انشورنس جس کو جیون بیمہ کہا جاتا ہے قطعاً جائز نہیں ہے اور فسادات کو بنیاد بنا کر اس کے جواز پر بات کرنا

مسلمانوں کوسود کی دعوت دینا ہےاور یہ بنیاد بھی لا حاصل ہے؛ اس لئے کہ فسادات میں رکشہ والے، ٹھیلہ والے، مزدور پیشہ غریب لوگ مرتے ہیں، ان کو روز کی کمائی سے اپنی گذر بسر مشکل ہو جاتی ہے، وہ بیمہ کی پالیسی کہاں سے پوری کرسکیں گے اور جولوگ کروڑ پتی ہیں، وہ سڑک پر اترتے ہی نہیں ہیں، اور کروڑ پتی ہی جیون بیمہ کراتے ہیں؛ اس لئے فسادات کو بنیاد بنا کرصریح حرام اور سود کو مسلمانوں میں عام کرنا ہے، جوسخت خطرناک اقدام ہے۔

اب رہی فقہ اکیڈمی کی بات، درحقیقت ۲۷؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۱ھ میں مختلف قیودات کے ساتھ فسادات کو بنیاد بنا کر بیمہ سے متعلق دارالعلوم دیوبند سے ایک فتوی لکھا گیا تھا، لوگوں کے درمیان سے ساری قیودات وشرائط حذف ہوگئیں اور جیون بیمہ کی حلت کی شہرت ہوگئی، مگر جب بعد میں ان کے نقصانات سامنے آئے، تو دارالعلوم دیوبند کے اہم اساتذہ اور مفتیان کرام نے اس سے رجوع کرلیا اور ۳۱؍اکتوبر تا ۲؍نومبر ۱۹۹۲ء کو اعظم گڈھ میں فقہ اکیڈمی کی طرف سے ایک فقہی سیمینار ہوا اور علماء کے کمرہ کمرہ جا کر اس فتوی پر دستخط کرائے گئے، جس میں فسادات کو بنیاد بنا کر جیون بیمہ کو جائز قرار دیا گیا تھا، مگر ہم لوگوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور بعد میں دستخط کرنے والے اہم علماء اور مفتیان کرام نے اس فتوی سے رجوع کرلیا، اور اب پھر دس بارہ سال کے بعد اخبار میں یہ مسئلہ پھر شائع کیا گیا ہے، اس کے بعد سے ہم لوگوں سے بار بار معلوم کرتے رہے، ہم اس کو صاف لفظوں میں ناجائز بتلاتے ہیں اور یہ ناجائز ہی ہے، اگر دارالعلوم دیوبند کا حوالہ کوئی دیتا ہے، تو براہ راست دارالعلوم سے رجوع کر لینا چاہئے۔

نوٹ: بعد میں دارالعلوم دیوبند سے بھی اس فتوی سے رجوع کا اعلان کیا گیا۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸؍۹۶۱۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۵/۱۸ھ

جیون بیمہ کے بارے میں سبیل السلام حیدرآباد کے سیمینار کی تجویز کا شرعی حکم

سوال [۹۰۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ یہ جوفتویٰ میں آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں کیا یہ آپ کی طرف سے تصدیق شدہ ہے؛ چونکہ فتوی کے پیج نمبر۱۰ر پر مولانا شبیر احمد قاسمی، مدرسہ امدادیہ، شاہی مرادآباد کا نام نامی اسم گرامی بھی لکھا ہوا ہے، کیا اس پر عمل کیا جاسکتا ہے؟ کیا بیمہ کرانا جائز ہے؟ کیا بیمہ کرانے کی ایجنسی لی جاسکتی ہے؟

المستفتی: نفیس احمد انصاری، دھام پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں فقہی سیمینار کی جو تجویز پیش کی گئی ہے، اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۹۱ء میں دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد میں لائف انشورنس کے متعلق سیمینار منعقد ہوا، جس میں احقر از اول تا آخر شریک رہا اور پاکستان سے حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہ بھی سیمینار میں شرکت کے لئے تشریف لائے ہوئے تھے، کافی بحث وتمحیص کے بعد لائف انشورنس کے جواز پر علماء نے اتفاق نہیں کیا، جس کی وجہ سے وہاں پر یہ تجویز منظور نہیں ہوسکی، پھر اس کے ایک سال کے بعد اکتوبر۱۹۹۲ء کو اعظم گڈھ میں فقہی سیمینار منعقد ہوا، جس میں انشورنس کے موضوع کو سیمینار ہال میں قطعاً نہیں لایا گیا اور نہ ہی اس موضوع پر کسی قسم کی بحث ہوئی؛ بلکہ سیمینار میں شرکت کرنے والے علماء اور مفتیان کرام الگ الگ کمروں میں مقیم تھے، صرف دوتین آدمیوں نے کمرے کمرے جا کر علماء سے دستخط کروائے، جس میں اثبات ونفی سے متعلق جواز اور عدم جواز سے متعلق غور کرنے کا بھی کسی کو موقع نہیں ملا تھا، اور اکثر لوگوں نے ایک دوسرے کے دیکھا دیکھی دستخط کردیئے۔

جب یہ ایجنڈا ہمارے کمرے میں آیا، تو احقر نے صاف لفظوں میں یہ کہا کہ فسادات کو بنیاد بنا کر لائف انشورنس کو جائز قرار دینا قطعاً جائز نہیں، اگر ہم سے دستخط کراؤ گے تو ہم اختلافی نوٹ لکھیں گے، اور جو ہمارے کمرے میں علماء تھے، انہوں نے بھی دستخط نہیں کیئے، پھر سیمینار کے ذمہ دار حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب مرحوم نے براہ راست ہم سے بات کی کہ آپ اپنا اختلافی نوٹ نیچے لکھئے، تو ہمارا جملہ یہ تھا کہ ''ہم نے اوپر لکھنے کو کب کہا ہے ہم نیچے ہی لکھتے ہیں'' چنانچہ ہم نے صاف لفظوں میں اختلافی نوٹ یہ لکھا کہ ''فسادات کو بنیاد بنا کر لائف انشورنس کو جائز قرار دینا ہم درست نہیں سمجھتے ہیں اور اس کو ہم ناجائز اور حرام سمجھتے ہیں، ہاں البتہ املاک کا بیمہ جائز اور درست ہے'' یہی ہمارا اختلافی نوٹ تھا، مگر تجویز میں جہاں ہمارا نام لکھا گیا ہے کہ مذکورہ حضرات کے نزدیک املاک کا بیمہ جائز ہے؛ حالانکہ املاک کا بیمہ موضوع بحث ہی نہیں تھا؛ بلکہ اہمیت کے ساتھ لائف انشورنس اور جیون بیمہ سے متعلق بحث تھی، اس کی طرف تجویز کے اندر اشارہ بھی نہیں کیا گیا۔

نیز دارالعلوم دیوبند کے جن مفتیان کرام کا نام اس تجویز کے اندر موجود ہے، انہوں نے اپنی اس رائے اور دستخط سے رجوع کرلیا ہے اور فی الحال سیمینار کے جو صدر ہیں (حضرت اقدس مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب دامت برکاتہم) نے بھی لائف انشورنس کے جواز سے متعلق جو لکھا گیا تھا، اس سے رجوع فرمالیا ہے اور ان حضرات کے رجوع کا اعلان رسالہ ''بحث ونظر'' میں شائع بھی ہو چکا تھا، مگر یہ تجویز کا پرچہ اس کے باوجود بھی مسلسل ملک کے اندر گھوم رہا ہے، ایک ایک دو دو سال کے وقفہ کے بعد اسی تجویز کو بنیاد بنا کر اخبارات میں بھی جواز کا اعلان ہوتا رہتا ہے، اس کا علاج ہمارے پاس نہیں ہے، جن حضرات نے اس تجویز میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے، اللہ پاک ان کو معاف فرمائے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ / جمادی الثانیہ ۱۴۳۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸ / ۹۷۶۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۰/۶/۲۹ھ

جیون بیمہ کے جواز کی تجویز کا حکم

سوال [۹۰۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ۳۰ / اکتوبر ۱۹۹۲ء تا ۲ / نومبر ۱۹۹۲ء کو اعظم گڈھ (یوپی) میں منعقدہ فقہی سیمینار میں زکوۃ کا مسئلہ چھایا رہا۔ سیمینار کو جامعۃ الرشاد میں جس کے مہتمم مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب ہیں، منعقد کیا گیا، اس سیمینار میں ملک بھر کے تمام مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے مدارس اور دار العلوم کی نمائندگی کرتے ہوئے تقریباً دو سو جید مسلم علماء وفقہاء کرام نے شرکت کی۔ اس موقع پر اس سیمینار میں شریک علماء وفقہاء میں عراق سے تشریف لائے ڈاکٹر محروس المدرس، جامعۃ الأزہر قاہرہ (مصر) کے پروفیسر ڈاکٹر علی الجمعہ اور کویت سے تشریف لائے مولانا بدر الحسن قاسمی شامل ہیں۔

ہندوستان میں ہو رہے فرقہ وارانہ تشدد کے پیش نظر جان و مال (جائیداد) کے بیمہ (انشورنس) کرانے کے سلسلے میں حیدرآباد میں منعقدہ چوتھے فقہی سیمینار میں اس مسئلہ کے زیر بحث آنے کے بعد اس پر کوئی فیصلہ لئے بغیر مسئلہ کو اگلی نشست میں بحث کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں حیدرآباد میں منعقدہ چوتھے فقہی سیمینار میں تمام ضروری معلومات کو جمع کرنے کے لئے ایک خصوصی کمیٹی کی تشکیل دی گئی تھی، اعظم گڈھ میں منعقدہ پانچویں فقہی سیمینار میں یہ موضوع زیر بحث آیا اور اس مسئلہ پر فیصلہ سنایا گیا۔

فرقہ وارانہ فسادات کے پیش نظر جان و مال (یعنی جائیداد) کا بیمہ (انشورنس)

حیدرآباد میں منعقدہ چوتھے فقہی سیمینار میں موجود حالات میں ہندوستان میں فسادات کے ذریعہ مسلمانوں پر ہو رہے مسلسل جانی و مالی حملوں اور سرکاری افسران کی جانب سے مسلمانوں کی حفاظت کرنے کی بنیادی ذمہ داری سے غفلت برتنے اور کئی مواقع پر فسادات میں سرکاری افسران کی طرف سے ان فرقہ وارانہ تشدد میں براہ راست

شمولیت کے ذریعہ مسلمانوں کے خلاف ہونے والے حملوں کی حوصلہ افزائی کے پیش نظر اور مسلمانوں کو ان فسادات کے نتیجہ میں ہونے والے جانی و مالی نقصانات کا معاوضہ دینے میں سرکاری مشنریوں کی عدم دلچسپی وغیرہ جیسے مسائل زیر بحث آئے۔ اس مسئلہ پر طویل بحث کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ اس تعلق سے ایک خصوصی کمیٹی تشکیل دی جائے، جو اس مسئلہ کی تہہ میں جاکر اس سلسلے میں تمام معلومات کو حاصل کرے اور اپنے جائزہ کو رپورٹ کی شکل میں اگلے فقہی سیمینار میں بحث کے لئے داخل کرے، اس سلسلے میں فقہی سیمینار کی چوتھی رپورٹ کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

1960ء میں مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ کی جانب سے بیمہ (انشورنس) کی حمایت میں فیصلہ لئے جانے اور حال ہی میں دارالعلوم دیوبند سے جاری کئے گئے تازہ فتوی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس مسئلہ پر مزید تحقیقات کے لئے تشکیل کردہ کمیٹی نے اپنی سفارشات انشورنس کے حمایت میں پیش کی تھیں۔

اس کے پیش نظر اعظم گڈھ میں منعقدہ پانچویں فقہی سیمینار میں یہ مسئلہ اس طرح حل کیا گیا:

حالانکہ اسلام میں بیمہ (انشورنس) کی بالکلیہ اجازت نہیں ہے؛ کیونکہ اس میں سٹہ بازی اور قیاسیات اور سود وغیرہ جیسی چیزیں شامل ہیں؛ لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات میں فرقہ وارانہ تشدد کے نتیجہ میں مسلمانوں کے جان و مال اور کاروبار کو لاحق خطرات کے پیش نظر چند ضروری شرائط کے ساتھ فرقہ وارانہ فسادات جان اور مال کی بیمہ کرانے کی اجازت دی گئی ہے۔

اس اہم مسئلہ پر مندرجہ ذیل اہم فقہاء اور مفتیان نے اپنے دستخط ثبت کئے ہیں۔

(۱) مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، پٹنہ (۲) مولانا مفتی حبیب الرحمٰن خیرآبادی، مفتی دیوبند
(۳) مولانا مفتی نعمت اللہ، مفتی دیوبند (۴) مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی، دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سائل نے سوالنامہ میں حیدرآباد اوراعظم گڈھ کے دونوں سیمیناروں کے مختصر خاکہ کا حوالہ دیکر تحریر فرمایا ہے۔ راقم الحروف شبیراحمد قاسمی نے ان دونوں سیمیناروں میں ازاول تا آخرشرکت کی اوردونوں کے لئے مقالے بھی لکھے، حیدرآباد دارالعلوم سبیل السلام میں تین دن تک اسی موضوع پر بحث چلی اورآخر میں تجویز پاس کرنے کے لئے خصوصی میٹنگ کی تشکیل دی گئی، اوراس خصوصی تجویز کمیٹی میں راقم الحروف بھی شروع سے آخرتک شریک رہا۔ بحث چل ہی رہی تھی کہ اسی اثناء میں مولانا خلیل الرحمٰن سجادندوی نے لائف انشورنس سے متعلق انگریزی کا ایک قانونی پرچہ پیش کیا، جس میں اس بات کی صراحت تھی کہ فسادات میں مرنے والے کو لائف انشورنس سے کچھ نہیں ملتا؛ اس لئے کہ فسادات میں مرنے والوں کو دنگا فساد اور نقض امن پیدا کرنے والا شمار کیا جاتا ہے۔ اس بات پر درمیان سے حضرت مولانا مجاہدالاسلام صاحبؒ اسی وقت فوراً مجلس سے اٹھ گئے، اس کے بعد حیدرآباد میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی اورصرف اتنی بات ہوئی کہ اسے اگلے سیمینار کے لئے چھوڑ دیا جائے، اس کے بعد تحقیقی کمیٹی کیا بنی ہے، ہم کواس کی خبرنہیں ہوسکی۔ پھراس کے بعد پانچواں فقہی سیمینار اعظم گڈھ میں جامعۃ الرشاد میں ہوا۔

جس میں دارالعلوم دیوبند کے بھی متعدداساتذہ اورمفتیان کرام موجود تھے، اس سیمینارمیں شروع سے آخرتک مجمع میں انشورنس کے مسئلہ کوموضوع بحث کہیں بھی نہیں بنایا گیا، صرف اتنا ہوا ہے کہ اپنے طورایک تجویز بنالی گئی اوراس تجویز کے بنانے والے کون کون حضرات تھے، یہ بھی واضح نہیں ہوا؛ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام صاحبؒ کی زیر قیادت یہ تجویز تیار ہوئی، وہ ان کے کمرہ میں یا سیمینار میں آنے سے پہلے تیار ہوئی ہوگی، مگرتین دن کی نشستوں میں سے کسی بھی خصوصی یا عمومی نشست میں اسے نہ رکھا گیا، اورنہ ہی اس کے متعلق بحث ہوئی؛ بلکہ سیمینار کے پروگرام

کے ایام میں ایک دن صبح کو دو آدمیوں نے مدعووین کے کمرہ میں جاکر اس تجویز پر دستخط کرائے، جب ہمارے کمرہ میں کرانے کے لئے آئے، تو راقم الحروف نے صاف الفاظ میں کہا: کہ ’’فسادات کو موضوع بنا کر لائف انشورنس کو جائز قرار دینا قطعاً درست نہیں ہے؛ اس لئے کہ فسادات میں رکشے، ٹھیلے والے مرتے ہیں، پیسہ والے لوگ شاذ و نادر زد میں آتے ہیں اور غریب لوگوں کو خود کھانے کے لئے نہیں ہے، وہ بیمہ کی پالیسی میں پیسہ کہاں ہے جمع کریں گے‘‘ اس وقت مفتی محی الدین صاحب بڑودہ یا مفتی عبدالقیوم صاحب گجرات وغیرہ، ہم چار پانچ آدمی ایک کمرہ میں تھے، سب نے یہ کہا کہ ہم اس شرط پر دستخط کریں گے کہ ہم اختلافی نوٹ لکھیں گے، تو اس پر ہم لوگوں سے دستخط نہیں کرائے گئے، اس کے بعد حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ نے راقم الحروف کو اپنے کمرہ میں بلایا اور فرمایا کہ آپ آخر میں نیچے نوٹ لکھیں اور راقم الحروف کے نوٹ کی عبارت یہ تھی: ’’فسادات کو بنیاد بنا کر جیون بیمہ کو جائز قرار نہیں دیا جا سکتا ہے، ہاں البتہ املاک کے بیمہ کی گنجائش ہے‘‘ پھر اس کے بعد یہ تجویز اخبارات میں آئی، مگر ہمارے لکھے ہوئے نوٹ کو مبہم بنا کر کے اس تجویز کو شائع کیا گیا، ہر دیکھنے والے نے اس تجویز کو دیکھا ہوگا، اس میں ہمارا نوٹ ہے ہی نہیں، صرف اتنا لکھا ہے کہ مذکورہ حضرات کے نزدیک املاک کا بیمہ جائز ہے، پھر ہم چار پانچ آدمیوں کے نام مذکور ہیں۔ یہ تھا جیون بیمہ کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں سیمیناروں کا حاصل۔

پھر کچھ دنوں کے بعد دارالعلوم دیوبند کے مفتیان کرام نے رجوع کا اعلان فرمایا، پھر اس کے بعد مفتی ظفیر الدین صاحب جو اس وقت سیمینار کے صدر تھے، ان کی طرف سے رجوع اخبارات اور رسائل میں آیا اور حیدرآباد کے سیمینار سے پہلے جمعیۃ علماء کے سوال کے جواب میں دارالعلوم دیوبند نے جو جواز کا فتویٰ صادر کیا تھا، اس سے بھی دارالعلوم کے

مفتیان کرام اور اساتذہ نے رجوع فرمالیا ہے،ان سب حضرات کے رجوع کر لینے کے بعد مذکورہ تجویز کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ر محرم الحرام ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۸۶۳/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲/۱/۱۴۳۱ھ

L.I.C. اور اس جیسی پالیسیوں کا حکم

سوال [۹۰۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) L.I.C. اور اس جیسی پالیسیوں کا شرعی حکم کیا ہے۔

(۲) اگر کسی نے نافہمی میں ایل آئی سی کر لی ہے،تو اب وہ کیا کرے؟

(۳) ایل آئی سی میں جمع شدہ رقم پر زکوۃ واجب ہے یا نہیں؟ اگر زکوۃ واجب ہے، تو وہ سال میں ایک مرتبہ نکالے گا یا مکمل جمع شدہ رقم وصول ہونے پر نکالے گا؟

(۴) میں ایک سرکاری ملازم ہوں میں ایل آئی سی اس لئے کرنا چاہتا ہوں کہ آج کل کے زمانہ میں بچوں کو اعلی تعلیم (ڈاکٹر، انجینیر نگ) حاصل کرانے کے لئے داخلہ فیس بھی زیادہ رہتی ہے، اور اسی طرح ڈونیشن جو فیس کے علاوہ دی جاتی ہے، وہ اتنی زیادہ رہتی ہے کہ میں اس کو ادا نہیں کر سکتا،تو کیا شریعت میرے لئے ایل آئی سی کو جائز قرار دیتی ہے؟

(۵) میں ایل آئی سی اس لئے کرنا چاہتا ہوں کہ آج کل کے دور میں گھر بنانے کے لئے قرض کی ضرورت پڑتی ہے،اور قرض جب ہم بینک سے لینے کے لئے جائیں گے، تو بینک والے ضمانت کے طور پر L.I.C پالیسی مانگتے ہیں؟

(۶) میں سرکاری ملازم ہوں سرکار ہماری سال بھر کی تنخواہ کا سال کے آخر میں موازنہ کرتی ہے،اگر ہماری تنخواہ سرکاری ٹیکس کے حد کو پار کرتی ہے،تو وہ ہم سے ٹیکس وصول کرتے

ہیں، اگر ہمارے پاس L.I.C پالیسی ہے تو سرکار ہم سے ٹیکس وصول نہیں کرتی ہے، تو کیا اس صورت میں سرکاری ٹیکس سے بچنے کے لئے L.I.C کر سکتے ہیں؟

(۷) آج کل کے دور میں کوئی بھی کام بغیر رشوت کے نہیں ہو رہا ہے، تو کیا ہم رشوت دے سکتے ہیں؟

(۸) اگر رشوت دے سکتے ہیں، تو کیا ہم رشوت میں سود کی رقم استعمال کر سکتے ہیں؟

(۹) ہمارے گاؤں میں بینک کا اکاؤنٹ بغیر .L.I.C کے نہیں مل رہا ہے اور پاسپورٹ کے لئے نیشنل بینک کا اکاؤنٹ ہونا ضروری ہے، تو کیا اس صورت میں L.I.C پالیسی کر سکتے ہیں؟ اگر کر سکتے ہیں، تو کیا ہم کو بینک سے ملنے والے سود کو اس پالیسی میں استعمال کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟

المستفتی: اسلم قاسم شیخ، بیلگام، کرناٹک

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) .L.I.C جیسی پالیسیوں میں صریح سود ہوتا ہے، جس کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے؛ اس لئے ناجائز اور حرام ہے اور جو واپسی میں اضافی رقم ملتی ہے، اس کا استعمال حرام وناجائز ہے۔

(۲) جس شخص نے نافہمی میں .L.I.C کر لی ہے، تو اگر اب وہ بقیہ قسطیں روکتا ہے، تو اس کا مال ضائع ہو جائے گا؛ لہٰذا جس صورت میں بھی اس کی جمع شدہ رقم واپس مل جائے وہ شکل اختیار کرنے کی گنجائش ہے۔

(۳) .L.I.C کی رقم اپنے اختیارات سے رکھی ہے، دوسروں کی ضرورت کے لئے بطور قرض نہیں رکھا ہے؛ اس لئے اس جمع شدہ اصل رقم کی زکوۃ نکالنی لازم ہے۔

(۴) اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلانا شرعاً نہ فرض ہے، نہ واجب؛ بلکہ حسب گنجائش اختیاری عمل ہے اور .L.I.C کے ذریعہ سے سود حاصل کرنا نص قطعی اور قرآن حکیم سے قطعی طور پر

حرام ہے، ایک حسب گنجائش اختیاری چیز کو حاصل کرنے کے لئے حرام کا ارتکاب کرنا قطعاً جائز نہیں، اگر آپ کے پاس اعلیٰ تعلیم دلانے کے لئے پیسوں کی گنجائش نہیں ہے، تو شریعت نے آپ کو اس کا مکلّف نہیں بنایا ہے؛ بلکہ حسب گنجائش جتنی تعلیم دلا سکتے ہیں دلائیں، اس کے بعد بچوں کو اپنی حیثیت کے اعتبار سے روزگار میں لگائیں۔

(۵) گھر کی تعمیر کے لئے بینک سے سودی قرض لینا جائز نہیں۔

(۶) سرکاری ٹیکس سے بچنے کے لئے .L.I.C کرانے کی گنجائش ہے؛ لیکن جب پالیسی پوری ہو جائے اور جمع شدہ رقم پر اضافی رقم حاصل ہو جائے، تو اس اضافی رقم کو اپنے کسی بھی استعمال میں لانا جائز نہیں، ہاں البتہ کسی بھی عنوان سے اس رقم کو سرکاری خزانہ میں واپس کر دینا جائز ہے، مثلاً انکم ٹیکس، سیل ٹیکس، رجسٹری اسٹامپ فیس وغیرہ کے عنوان سے سرکار کو واپس کر دینا جائز ہے۔

(۷/۸) سات اور آٹھ کا جواب دوسرے پرچہ میں ہے، وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

(۹) آپ نے جو لکھا ہے کہ پاسپورٹ کے لئے نیشنل بینک اکاؤنٹ ہونا ضروری ہے، یہ ہندوستانی قانون نہیں ہے؛ بلکہ پاسپورٹ کے لئے راشن کارڈ ہو یا آدھار کارڈ ہو یا پہچان پتر ہو، یہ چیزیں لازم ہوتی ہیں؛ لیکن نیشنل بینک کے اکاؤنٹ کی بات زائد ہے، جن لوگوں کے پاس نیشنل بینک کے اکاؤنٹ نہیں ہیں، ایسے ہزاروں لوگوں نے پاسپورٹ بنوائے ہیں، ہاں البتہ آپ سرکاری ملازم ہیں، اپنی سرکاری ملازمت کے سرٹیفکٹ سے بھی آپ کو پاسپورٹ مل سکتا ہے، اور ایل آئی سی کو کسی بھی دائرہ میں حاصل کرنے کے لئے جتنے بھی اعذار پیش کئے گئے ہیں وہ انتہائی کمزور اعذار ہیں۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۳۲ تا ۱۳۴، اسلام اور جدید معاشی مسائل ۳/۳۰۷)

قال اللّٰہ تعالیٰ: يَـا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ○ فَاِنْ لَمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِه. [البقرة: ٢٨٧]

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [سورۃ البقرہ: ۲۷۵]

عن جابرؓ، قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم آکل الربوا، ومؤکلہ، وکاتبہ، وشاهدیه، وقال: هم سواء. (صحیح مسلم، باب لعن آکل الربا، ومؤکله، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم: ۱۵۹۸)

إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه وإن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/۳۷، دار البشائر الإسلامية، بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹)

لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، فصل في البيع، زكريا ۹/۵۷۷، كراچي ۶/۳۸۵، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/۲۴۶، تبيين الحقائق، امداديه ملتان ۶/۲۷، زكريا ۷/۶۰، البحر الرائق، زكريا ۹/۳۶۹، كوئٹه ۸/۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/۳۴۹، جديد ۵/۴۰۴، معارف القرآن ۱/۴۷۶، جواهر الفقه قديم ۲/۱۷۰، جديد ۴/۴۵۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۳۱۰/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/۱۱/۱۴۳۴ھ

بیمہ کی کون سی صورت جائز ہے؟

سوال [۹۰۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بیمہ پالیسی پر اسلامی نقطۂ نظر سے مسلم شخص کے لئے زندگی بیمہ، مکان، دوکان، بزنس وغیرہ کے معاملات میں کیا شرائط ہیں؟ دیکھا یہ گیا ہے کہ موجودہ سرکاری معاملات کے مدنظر موٹر کار یا اسکوٹر وغیرہ کا بیمہ لازمی کردیا گیا ہے۔ واضح طور پر اسلامی احکامات کی تفصیل سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی: محمد شریف ولد حاجی محمد رفیق، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: زندگی کا بیمہ صریح سود کی وجہ سے اور قمار کی وجہ سے شرعی نقطۂ نظر سے ناجائز اور حرام ہے، اور املاک کا بیمہ مکان، دوکان، بزنس وغیرہ کے معاملات میں ضرورت کی وجہ سے جائز ہے؛ اس لئے کہ املاک کے بیمہ میں سود نہیں ہوتا ہے اور جو فیس جمع ہو جاتی ہے، وہ واپس نہیں ملتی ہے اور شریعت کے اندر سود اس کو کہا جاتا ہے کہ جس میں دیا ہوا پیسہ واپس آنا ضروری ہے اور واپسی کے ساتھ ساتھ اوپر سے زائد پیسہ بھی ہو اور یہ بات یہاں موجود نہیں ہے، ہاں البتہ اس میں کچھ قمار کا شبہ موجود ہے کہ حادثہ پیش آجائے، تو کمپنی اپنی طرف سے پورے نقصان کی تلافی کرتی ہے اسے باہمی تعاون کہا جاسکتا ہے اور املاک کا بیمہ ضرورت کی وجہ سے گنجائش کے دائرہ میں ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/ ۱۲۷ تا ۱۴۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰/ رجب المرجب ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳٦/ ٦۰ ۷۷)

غیر اسلامی ملک میں رہ کر .L.I.C کرانا

سوال [۹۰۹٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک انشورنس کمپنی جس کا نام ’’لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا‘‘ ہے، اسی میں میں ہوں، اس بار رمضان میں میری ملاقات ایک مفتی صاحب سے ہوئی، انہوں نے ہم کو آپ کا حوالہ دیا اور کہا کہ آپ اس معاملہ میں مفتیان کرام کو لکھئے وہ آپ کو پوری جان کاری دیدیں گے، اسی وجہ سے میں آپ کو زحمت دے رہا ہوں، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ بینک میں غیر اسلامی ملک میں رہ کر .L.I.C کروانا یا کرنا یا پھر اس میں ملازمت کرنا شریعت میں کیسا ہے؟

المستفتی: محمد افتخار اعظم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زندگی کا بیمہ کرانا اور اس کا ایجنٹ بننا سود، قمار، اور رشوت کے لازم آنے کی وجہ سے ناجائز ہے اور غیر اسلامی ممالک میں بھی اسی ملک کے باشندہ کے لئے غیر مسلموں یا حکومت سے سود حاصل کرنا حرام اور ناجائز ہے۔ لہٰذا آنجناب نے جو علت لکھی ہے کہ غیر اسلامی ملک میں رہ کر کے جائز ہے یا نہیں؟

یہ علت سود کے حلال ہونے کے لئے درست نہیں ہے، ہاں البتہ کسی دوسرے ملک کا باشندہ جو عارضی طور پر دارالحرب میں آتا ہے، اس کے لئے اس دارالحرب سے سود لینا صرف امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے؛ لہٰذا ہندوستان مسلمان جو برطانیہ یا امریکہ میں عارضی طور پر جاتے ہیں، پھر اپنے وطن مستقل طور پر واپس آجاتے ہیں، ان کے لئے برطانیہ یا امریکہ کا سود جائز ہوسکتا ہے؛ لیکن ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ہندوستان کی حکومت یا کمپنی یا غیر مسلم عوام سے سود لینا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۹۷، ۱۳۴)

عن جابرؓ، قال: لعن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (صحيح مسلم، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، النسخة الهندية، ٢/٢٧، بيت الأفكار رقم: ١٥٩٨، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية ٢/ ٤٧٣، دارالسلام رقم: ٣٣٣٣، سنن الترمذي، البيوع، باب ماجاء في آكل الربا، النسخة الهندية ١/ ٢٢٩، دارالسلام رقم: ١٢٠٦)

عن عبد اللّٰه بن عمرو قال: لعن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم الراشي والمرتشي. (أبو داؤد، كتاب القضاء، باب في كراهية الرشوة، النسخة الهندية ٢/ ٥٠٤، دارالسلام رقم: ٣٥٨٠)

ولا بين حربي ومسلم مستأمن ولو بعقد فاسد، أوقمار، ثمة. (در مختار،

كتاب البيوع، قبيل باب الحقوق، زكريا ٤٢٢/٧، كراچي ١٨٦/٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ ذی قعدہ ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/۷۳۸۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱۱/۶ھ

ٹیکس سے بچنے کے لئے L.I.C کرانا

سوال [۹۰۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سرکاری مدارس کے بعض مدرسین انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے L.I.C. جیون بیمہ کراتے ہیں اور دوسروں کو ترغیب بھی دیتے ہیں۔ کیا L.I.C. کرانا اوراس کی ترغیب دینا جائز ہے؟ کیا L.I.C کے جواز کی کوئی شکل ہے، L.I.C. کرانے والے کا کیا حکم ہے؟ L.I.C. کرانے والے کا حج کرنا کیسا ہے؟ اس کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: شمشاد احمد اعظمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: L.I.C. جیون بیمہ کرانے سے انکم ٹیکس کی واقعی بچت ہوتی ہے اور ظالمانہ ٹیکس سے پیسہ محفوظ ہوجاتا ہے، یہ بات اگر واقعی صحیح ہے، تو ظالمانہ ٹیکس سے بچنے کی غرض سے جیون بیمہ کرانے کی اجازت ہے، مگر جمع شدہ پیسے پر جو زائد پیسہ واپس ملے گا، اس کو اپنے اوپر خرچ کرنا جائز نہیں ہے؛ بلکہ انکم ٹیکس سیل ٹیکس کے عنوان سے سرکار کو واپس کردیں یا نادار فقراء کو بلانیت ثواب دیدیں۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مطبع سهارنپور ٣٧/١، قديم مصري ١٤٨/١، جديد دارالبشائر الإسلامية، بيروت ٣٥٩/١، تحت رقم الحديث: ٥٩)

وصرح الحنفية: بأنه إذا مات الرجل و كسبه خبيث (إلى قوله) فالأولىٰ لورثته أن يردوا المال إلى أربابه، فإن لم يعرفوا أربابه تصدقوا به؛ لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه.

(الموسوعة الفقهية الكويتية٤٣ / ٢٤٦، شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، فصل في البيع، كراچي ٦ /٣٨٥، زكريا ٩/٥٧٧، تبيين الحقائق، امداديه ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحر الرائق، كوئٹه ٨/٢٠١، زكريا ٩ /٣٦٩، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ر محرم الحرام ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸ر ۹۴۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۲/۱ھ

جیون بیمہ کرانے والے کی امامت

سوال [۹۰۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خالد اپنے وصف کے اعتبار سے حافظ وقاری ہے، خالد نے جیون بیمہ کرایا، بیمہ کی شکل یہ ہے کہ آپ بیس سال میں قسط وار ۹؍۱۰؍ ہزار روپئے جمع کریں گے، بیس سال تک آپ زندہ رہے، تو بھی پچاس ہزار روپئے ملیں گے اور ابھی ایک دو قسط جمع کی ہیں، اچانک کسی حادثہ فاجعہ یا بیمار ہوکر اپنی موت سے مرگئے، تو باقی قسطیں جمع نہیں کرنی پڑیں گی اور آپ کے وارثین کو پچاس ہزار روپئے مل جائیں گے، کیا اب یہ بیمہ کی شکل جائز ہے؟ اگر نہیں اور خالد کو معلوم بھی ہے کہ یہ شکل جائز نہیں ہے، تو کہتا ہے بہت مولوی لوگ کراتے ہیں سب جائز ہے۔ تو کیا ایسے شخص کو امام بنایا جاسکتا ہے؟ اوراس کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے؟

المستفتی: عبدالقیوم، معصوم پوری، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جیون بیمہ کی مذکورہ شکل سود ہونے کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہے، اگر کسی نے کرا بھی لیا ہے، تو زائد رقم بلانیت ثواب فقراء کو دینا لازم ہے، اپنے ذاتی صرفہ میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔

نیز خود کے مرنے کے بعد ورثاء کے لئے بھی ذاتی صرفہ میں لگانا جائز نہیں ہے۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم آکل الربوا، ومؤکلہ، وکاتبہ، وشاهدیه، وقال: هم سواء. (صحیح مسلم ، کتاب المساقاۃ والمزارعة، باب الربا، ومؤکله، النسخة الهندية، ۲/ ۲۷، بيت الأفكار رقم: ۱۵۹۸)

يجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالک، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلک الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، کتاب الطهارة ، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/ ۳۷، يحىٰ سهارنپور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹)

مسجد کی کمیٹی کا فریضہ یہی ہے کہ متبع شریعت اور متقی آدمی امام رکھیں۔ اب رہی خالد کے پیچھے نماز پڑھنا اور خالد کو امام بنانا جائز ہے یا نہیں؟ تو براہ راست واقعہ کی تفتیش کے بغیر مخصوص شخص پر حکم لگانا مناسب نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۶/ ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۴۴۱۰)	۱۶/ ۴/ ۱۴۱۶ھ

انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے بیمہ کرانے کی شرعی حیثیت

سوال [۹۰۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں ایک سرکاری ٹیچر ہوں میرے اوپر انکم ٹیکس لگایا جاتا ہے، اسکول والوں

کی طرف سے ہی انکم ٹیکس بچانے کے لئے ہی ہمیں بینک میں پیسہ جمع کرانا پڑتا ہے، یا .L.I.C کرانی پڑتی ہے، اس پر جو ہمیں سود ملے گا، تو وہ ہمارے لئے جائز ہے یا نہیں؟ اور جو تھوڑا بہت انکم ٹیکس سرکار ہمارے اوپر لگاتی ہے، وہ ہر مہینہ ہماری تنخواہ میں سے کاٹ لیتی ہے، اگر ایسا پیسہ نا جائز ہے، تو ایسے پیسہ کو کہاں پر خرچ کریں؟ ایسے پیسہ پر زکوۃ واجب ہے یا نہیں؟

المستفتی: شبلی حبیب، پیرزادہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: انکم ٹیکس ایک ظالمانہ اور جبری ٹیکس ہے، اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے بینک میں پیسہ جمع کرنا جائز ہے، اسی طرح اس جبری ٹیکس سے بچنے کے لئے جیون بیمہ کرانے کی بھی گنجائش ہے؛ لیکن بہر دوصورت حاصل ہونے والی زائد رقم کا اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہے؛ بلکہ اسے بلانیت ثواب فقراء پر تقسیم کرنا لازم ہے، اسی طرح اس زائد رقم کو انکم ٹیکس، سیل ٹیکس اور رجسٹری کے اسٹامپ فیس وغیرہ میں دینا بھی جائز ہے؛ کیونکہ حرام مال کو کسی بھی عنوان سے اس کے مالک تک پہنچانا لازم ہوتا ہے۔

(مستفاد: ایضاح النوادر ۹۹-۱۰۰، ۱۴۰)

إذا كان عند رجل مال خبيث، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مطبع سهارن پور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹)

من اكتسب مالا بغير حق...... ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام......ويجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك. (بذل المجهود، قديم مطبع سهارن پور، مصري ۱/ ۱۴۸، جديد دارالبشائر الإسلامية بيروت ۱/ ۳۵۹)

صرح الحنفية: بأنه إذا مات الرجل و كسبه خبيث، كأن كان من بيع الباذق، أو الظلم، أو أخذ الرشوة، فالأولىٰ لورثته أن يردوا المال

إلى أربابه، فإن لم يعرفوا أربابه تصدقوا به؛ لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه. (الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/ ٢٤٦، شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، فصل في البيع، كراچي ٦/ ٣٨٥، زكريا ٩/ ٥٥٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ رمحرم الحرام ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۲۶۹/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۱/۲۹ھ

ظالمانہ ٹیکس سے بچنے کے لئے P.L.I. کی گنجائش

سوال [۹۱۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہندوستان غیر اسلامی ملک ہے، سرکاری مشینری کی جانب سے مالدار، تجار، ملازمین پر ٹیکس لاگو ہوتا ہے، جس کا شرع اسلامی میں کوئی وجود نہیں ہے، مسلمان مذہبی فریضہ زکوۃ بھی ادا کرتے ہیں، اس طرح ان پر دوگنا بوجھ پڑ جاتا ہے؛ حالانکہ ان کی معاشی حالت پہلے ہی بہتر نہیں تھی؛ لہٰذا اگر کوئی شخص اس ملکی ٹیکس سے بچنے کے لئے کوئی ایسی تدبیر اختیار کرے، جو عموماً ملک کے چالاک لوگ اختیار کرتے ہیں، مثلاً پوسٹ آفس کی ماہانہ قسط پی ایل آئی P.L.I. کا حربہ اختیار کرے، تو کیا نوعیت اور کیا حیثیت ہوگی؟

نیز دس بیس سال یا معینہ مدت کے لئے رقم جمع کردینا جس پر وہ لوگ منافع بھی دیتے ہیں، جس کو عرف عام میں بونس کہا جاتا ہے، اس کا استعمال کیسا ہے؟ آیا خود استعمال کرسکتے ہیں؟

المستفتی: محمد نعمان، پنجاب وقف بورڈ، انبالہ کینٹ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ٹیکس میں اگر خطیر رقم دینی پڑتی ہے، تو اس جبری وظالمانہ ٹیکس سے حفاظت کے لئے پی ایل آئی کی گنجائش ہے تاکہ اس خطیر رقم کی حفاظت

ہو سکے؛ البتہ اس پر جو منافع بشکل سود حاصل ہوں، ان کو اپنے استعمال میں لانا قطعاً جائز نہیں؛ بلکہ بلانیت ثواب فقراء پر اس کا صدقہ کرنا لازم اور ضروری ہے۔

نیز بونس کا اپنے استعمال میں لانا قطعاً جائز نہیں؛ بلکہ بلانیت ثواب فقراء پر اس کا صدقہ کرنا لازم اور ضروری ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۴۱، فتاوی رحیمیہ قدیم ۱۳۶/۶، ۱۴۹/۵، جدید زکریا ۲۶۲/۹)

إن حصله بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مطبوعه لكهنؤ ١٤٨/١، يحيٰ سهارنپور ٣٧/١، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ٣٥٩/١، تحت رقم الحديث: ٥٩)

لو مات الرجل و كسبه من بيع الباذق، أو الظلم، أو أخذ الرشوة، يتورع الورثة، ولا يأخذون منه شيئاً، وهو أولىٰ بهم ويردونها على أربابها، إن عرفوهم، وإلا تصدقوا بها؛ لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٣٨٥/٦، زكريا ٥٥٣/٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ ذی قعدہ ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۹۶۱/۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۱۱/۲۴ھ

جبری ٹیکس سے بچنے کے لئے جیون بیمہ کرانا

سوال [۹۱۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص سرکاری ملازم ہے، اس کو مکان کی سخت ضرورت ہے، اس کی تنخواہ میں سے فی الحال سالانہ ۳۵۰۰۰/ روپیہ حکومت ٹیکس کاٹ لیتی ہے، اور اپنا مکان نہ ہونے کی

وجہ سے حکومت سالانہ تیس ہزارروپیہ مکان کرایہ کے نام پر دیتی ہے؛ جبکہ اچھا مکان کرایہ کا اس سے زیادہ روپیہ کا ملتا ہے۔ نیز انکم ٹیکس سے بچنے کے ڈر سے جیون بیمہ کرالیا ہے، جس میں سالانہ اٹھارہ ہزارروپیہ جاتا ہے، جس سے مجھ کو کوئی فائدہ نہیں ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر یہ ملازم شخص حکومت کی اسکیم کے تحت اپنا ذاتی مکان خریدنے کے لئے بینک سے لون لے لے، تو انکم ٹیکس میں جو روپیہ جاتا ہے، اور حکومت جو کرایہ مکان کا دیتی ہے جو کہ اپنا مکان ہونے کے بعد بھی دیتی رہے گی، وہ روپیہ اور جیون بیمہ میں جو روپیہ جارہا ہے، یہ سب بچ جائیں گے اور اس کے بدلہ میں بینک کی قسط اتنی ہی مقرر کرلے، جتنا کہ اس کو سالانہ مذکورہ مدات میں خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اب چند سالوں میں اس کا اپنا ذاتی مکان ہوجائے گا، تو کیا ایسا کرنا اس ملازم کے واسطے جائز ہے؟

المستفتی: ڈاکٹر علاء الدین، سیفی ڈپٹی گنج، تارہ بلڈنگ کے سامنے، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر واقعی جیون بیمہ کرانے کی وجہ سے ٹیکس کی بچت ہوجاتی ہے، تو جبری ٹیکس سے حفاظت کی غرض سے جیون بیمہ کرانے کی گنجائش ہے، جیسا کہ روپیہ کی حفاظت کے لئے بینک میں پیسہ جمع کرنا جائز ہے؛ لیکن غیراختیاری طور پر اس میں سود بھی جمع ہوجاتا ہے، اس کو نکال کر بلا نیت ثواب فقیروں کو دیدینا لازم ہے، اسی طرح ٹیکس سے حفاظت کے لئے جیون بیمہ کرانے کی اجازت ہے اور اس کے ساتھ جو غیر اختیاری سود ملے گا، اس کو اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہے نادار فقیروں کو بلا نیت ثواب دیدینا لازم ہے، اور یہ بھی جائز ہے کہ اس سود کے پیسے کو کسی بھی عنوان سے حکومت کو اسی طرح بینک کو واپس کردیا جائے، چاہے انکم ٹیکس کے نام سے ہو، چاہے سیل ٹیکس کے نام سے ہو اور چاہے سودی قرض کی واپسی کے وقت اس کے سود کے نام سے ہو کسی بھی عنوان سے واپس کردینا جائز ہے اور سوال نامہ میں یہ کہنا کہ بینک سے مکان خریدنے کے نام سے

سودی قرض اور لون لینے میں انکم ٹیکس معاف ہوجاتا ہے؛ اس کا مطلب یہ ہے کہ جتنا انکم ٹیکس میں پیسہ دیا جاتا ہے، اتنا ہی قرض کے ساتھ سود بھی جاتا ہے، اب بینک نے انکم ٹیکس میں معافی لکھ دی اور قرض کے سود پر معافی کا نشان نہیں لگایا، اور یہ انکم ٹیکس پر معافی کا نشان لگانا صرف سودی قرض لینے کی وجہ سے ہوا ہے، تو اب آپ کی طرف سے قرض پر جو سود چڑھا ہے، اس کو واپس کرنے میں دو مقصد ہو سکتے ہیں۔

ایک مقصد یہ ہے کہ انکم ٹیکس ادا کرنا ہے، جس پر بینک نے معافی کا نشان لگا دیا ہے، اگر انکم ٹیکس ادا کرنے کا مقصد ہے، تو گویا آپ نے اصل قرضہ کے ساتھ ساتھ ٹیکس ادا کیا، سود ادا ہی نہیں کیا؛ اس لئے سود کا گناہ نہیں ہوگا۔ اور بینک کا انکم ٹیکس پر معافی کا نشان لگانا اور سود پر معافی کا نشان نہ لگانا خود اس کا اپنا فعل ہے۔

اور دوسرا مقصد یہ ہوسکتا ہے کہ ٹیکس تو معاف ہوگیا، مگر قرض کے ساتھ سود دینا ہے، اس ارادہ سے اگر قرض کے ساتھ ساتھ سود دیں گے، تو آپ پر سود دینے کا گناہ ہوگا۔ ہم نے سوالنامہ سے جو کچھ سمجھا ہے وہی لکھا ہے، باقی اگر اندرونی معاملہ دوسرا ہو تو اس کے ہم ذمہ دار نہیں۔

الأمور بمقاصدها. (الأشباه قديم ٥٣)

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/١٤٨، مطبع ندرة العلماء لكهنؤ، ١/٣٧، مطبع سهارنپور ١/٣٥٩، مطبع دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩)

لو مات الرجل وكسبه من بيع الباذق، أو الظلم، أو أخذ الرشوة، يتورع الورثة، ولا يأخذون منه شيئاً، وهوأولىٰ بهم ويردونها على أربابها، إن عرفوهم، وإلا تصدقوا بها؛ لأن سبيل الكسب الخبيث

التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه. (تبيين الحقائق، كتاب الكراهية، فصل في البيع، امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/ ٦٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶ر صفر المظفر ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶ ر ۷۹۲۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۲/۱۷ھ

جانی، مالی بیمہ کا حکم

سوال [۹۱۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں جبکہ مسلمانوں کے جان و مال صنعت وتجارت غیر محفوظ ہیں، جان و مال کا بیمہ کرا سکتے ہیں یا نہیں؟ ایک شخص جو جیون بیمہ ایجنٹ ہے، وہ ایک پرچہ اسلامی فقہ اکیڈمی اعظم گڑھ (ہند) پانچواں سیمینار منعقدہ ۳۰ر اکتوبر تا ۲ر نومبر ۱۹۹۲ء کا فیصلہ دکھاتا ہے، جس میں جان و مال کے بیمہ کی اجازت ہے، تو کیا بیمہ ہر دو کا کرا سکتے ہیں؟

المستفتی: محی الدین نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جیون بیمہ اور اموال کا بیمہ دونوں بالکل الگ الگ چیز ہیں، اموال کے بیمہ میں سود بالکل نہیں ملتا؛ اس لئے کہ جمع کی جانے والی رقموں میں سے کوئی رقم مدت پر واپس نہیں ملتی ہے اور نہ ہی اس پر اضافہ ملتا ہے؛ البتہ صرف شبہ قمار ہے کہ اگر خدانخواستہ ہلاک ہوجائے گا، تو پورے نقصان کی تلافی کی جاتی ہے، اور عموم بلوی اور حالات کے تقاضہ کی وجہ سے شبہ قمار کی خرابی برداشت کر کے اموال کے بیمہ کی گنجائش قرار دیجاتی ہے؛ لیکن جان کے بیمہ میں صریح سود موجود ہے۔ نیز شبہ قمار بھی موجود ہے، تو اگر شبہ قمار کو ضرورت کی وجہ سے برداشت کرلیا جائے، تو صریح سودی معاملہ جس کو نص قطعی اور نص

قرآنی میں صاف حرام کہا ہے، اس کو فسادات کے احتمال اور جیون بیمہ سے فسادات کے سد باب کے کمزور احتمال کو جواز کی علت قرار دے کر ہر گز گنجائش کے دائرہ میں نہیں لایا جاسکتا ہے؛ لہٰذا جیون بیمہ کرالینا ہر گز جائز نہیں ہے اور سوال میں ذکر کردہ سیمینار میں احقر خود بھی شریک تھا، اور اس سیمینار میں انشورنس کے مسئلہ کو مجمع کے سامنے نہیں پیش کیا گیا، جس سیمینار کا ہر شریک شاہد ہے، تو یہ مسئلہ سیمینار کا فیصلہ کیسے بن گیا؟ البتہ جن کمروں میں الگ الگ طور پر شرکاء سیمینار کا قیام تھا، ان کمروں میں ایک آدمی نے جاکر الگ الگ دستخط لئے ہیں اور اس خاکسار سے بھی دستخط لئے گئے ہیں، مگر خاکسار نے صاف الفاظ میں نوٹ لکھا ہے کہ جیون بیمہ جائز نہیں اور اموال کا بیمہ جائز ہے۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (صحيح مسلم، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم: ۱۵۹۸، سنن أبي داؤد، باب في آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية ۲/ ۴۷۳، دار السلام رقم: ۳۳۳۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍صفر المظفر ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳۰۶/۲۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۲/۱۲ھ

دوکان کا بیمہ کرانا

سوال [۹۱۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے شہر کی آبادی ایک لاکھ کے قریب ہے، جس میں تیس فیصد آبادی مسلمانوں کی ہے، اس سے قبل ماضی میں دو بار فساد ہوچکا ہے، اس وقت بھی مسلمانوں کی تمام دوکانوں کو لوٹ لیا گیا تھا، اس شکل میں دوکان کا انشورنس جائز ہے

یانہیں؟ دیگر صورت مثلا دوکان میں بجلی کے تار سے آگ لگ سکتی ہے، جس سے اگر دوکان تباہ ہوگئی، تو کیا اس شکل میں انشورنس جائز ہے؟

المستفتی: انیس احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ہندوستان کے موجودحالات میں اگر دوکان اوردیگر املاک کی حفاظت کے لئے ان کے انشورنس کی ضرورت کا احساس ہو، تو ضرورت اورمال کی حفاظت کی غرض سے انشورنس کی گنجائش ہے، فسادات کو بنیاد بنانے کی ضرورت نہیں، بعض انشورنس کمپنی سے معلوم ہوا کہ فسادات میں نقصان ہونے کی صورت میں کمپنی ذمہ دارنہیں ہوتی؛ اس لئے فسادات کو بنیاد بنانا درست نہیں ؛ ہاں البتہ حالات کے اعتبار سے ضرورت کے تحت دوکان، مکان، فرم، فیکٹری اور کاروبار کے انشورنس کی گنجائش ہے، اورضرورت وخطرات صاحب معاملہ خود سمجھیں گے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۴۴)

الضرورات تبيح المحظورات. (الأشباه قديم، قواعد الفقه، اشرفي ديوبند ۸۹، رقم: ۱۷۰، شرح المجلة اتحاد ۱/ ۲۹، ماده: ۲۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ رجب المرجب ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۴۹۵)

چونے کی دوکان کا بیمہ کرانا

سوال [۹۱۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شہر کی مارکیٹ میں ایک چونے کی دوکان ہے، حالات کے پیش نظر کسی حادثہ کا پیش آجانا یا بجلی کے تار وغیرہ سے آگ لگ جانا کوئی امر مستبعد نہیں، تو اس شکل میں یا دیگر صورتوں میں دوکان کا انشورنس کرانے کی اجازت ہے یانہیں؟

المستفتی: انیس احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دوکان اور دیگر املاک کی حفاظت کی غرض سے بیمہ کرانا ہندوستان کے موجودہ حالات میں جائز اور درست ہے۔ نیز فسادات کے موقع پر جب فسادیوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں مکان یا فلاں دوکان کا انشورنس ہے، ان کو یہ سمجھ کر نقصان نہیں پہونچاتے ہیں کہ ان کو نقصان پہونچانے سے کوئی فائدہ نہیں؛ کیونکہ ان کو اس کا بدلہ مل جائے گا؛ اس لئے دوکان اور دیگر چیزوں کا انشورنس کرالینا جائز ہے۔

نیز فسادات کا خطرہ نہ ہو؛ لیکن دیگر کسی بھی طریقہ سے حادثہ کا خطرہ ہو، جیسا کہ بجلی کے تار کا سوال نامہ میں ذکر ہے، تو ان صورتوں میں بھی دوکانوں کا انشورنس کرانا جائز ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۴۴)

الضرر یزال. (الأشباه قديم ۵/۱۳۹)

الضرورات تبيح المحظورات. (الأشباه والنظائر قديم ۱۴۰، قواعد الفقه اشرفي ۸۹، رقم: ۱۷۰، شرح المجلة اتحاد ديوبند ۱/۲۹، رقم المادة: ۲۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ رجب المرجب ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۴۸۹/۳۷)

دوکان، مکان، کارخانہ وغیرہ کا انشورنس کرانا

سوال [۹۱۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل ہندوستان میں عمومی فتنہ وفساد کا دور چلتا رہتا ہے، جس میں مسلمانوں کی جان مال زد میں رہتی ہے، فسادات کے بعد عمومی طور پر دیکھا جاتا ہے کہ بہت سے مسلمان کے خاندان کا اثاثہ؛ بلکہ نسلوں کی کمائی اور جائز روزی حاصل کرنے کا ذریعہ ختم ہو جاتا ہے، کیا ایسے حالات میں دوکان ومکان وکارخانہ یا جو بھی کاروبار ہو، اس کا انشورنس

کرایا جاسکتا ہے یا نہیں؟ دلائل کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: حبیب احمد ولد ڈاکٹر غلام کریم ،خلیل آباد، بستی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بیمہ میں ہلاکت کی صورت میں بیمہ کمپنی جو معاوضہ دیتی ہے، وہ صورۃ ہلاک شدہ مال کا عوض ہے ،مگر حقیقت میں اس رقم کا عوض ہے، جو مالک ماہانہ، یا سالانہ داخل کرتا ہے؛ کیونکہ کمپنی کا اصل مقصود یہی رقم ہے، ورنہ مال ضائع کرنے سے ان کا کیا نفع ہوسکتا ہے، ؛ لہٰذا حقیقت کے اعتبار سے سود ہے جانبین میں مساوات نہ ہونے کی وجہ سے ۔اور قمار اور سود دونوں نص قطعی سے حرام ہیں؛ اس لئے جائز نہ ہوگا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱۶۱/۳)

قال اللّٰہ تعالیٰ: یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّیْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ. [المائدة: ۹۰]

وسمیٰ القمار قمارا؛ لأن کل واحد من المقامرین ممن یجوز أن یذهب ماله إلی صاحبه ویجوز أن یستفید مال صاحبه وهو حرام بالنص. (شامي، کتاب الحظر والإباحة، فصل في البیع، کراچي ۴۰۳/۶، زکریا ۵۷۷/۹، المحیط البرهاني،المجلس العلمي بیرووت ۱۴/۸، رقم: ۹۴۸۶، تبیین الحقائق، امدادیه ملتان ۲۲۷/۶، زکریا ۴۶۶/۷)

عن جابرؓ، قال: لعن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم آکل الربوا، ومؤکله، وکاتبه، وشاهدیه، وقال: هم سواء. (صحیح مسلم، کتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، ومؤکله، النسخة الهندیة، ۲۷/۲، بیت الأفکار رقم:۱۵۹۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ رشوال المکرّم ۱۴۰۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱۱/۲۳)

انشورنس بیمہ وجیون بیمہ کا حکم

سوال[۹۱۰۶]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ انشورنس بیمہ، جیون بیمہ شرع کی رو سے کیسا ہے، ایک کتاب اسلامک فقہ اکیڈمی سے چھپی ہے، جس میں جواز کا فیصلہ ہے۔ آخر خلاصہ کیا ہے؟

المستفتی: محمد جاوید قاسمی چاندپور، بجنور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اسلامک فقہ اکیڈمی کی طرف سے شائع ہونے والا رسالہ ناقابل اعتبار ہے، جس وقت علماء کرام سے دستخط کرایا جارہا تھا، اس وقت احقر نے دستخط کرتے وقت ایک اختلافی نوٹ لکھا تھا، جس میں احقر کے ساتھ اور بھی علماء شامل ہوگئے، اور ہم نے صاف لفظوں میں لکھدیا تھا کہ فساد کو بنیاد بنا کر جیون بیمہ کو جائز اور درست قرار دینے کو ہم جائز نہیں سمجھتے؛ بلکہ وہ ناجائز اور حرام ہے، اس کے باوجود مذکورہ رسالہ میں ہمارے اس اختلافی نوٹ کو توڑ مروڑ کر اس طرح لکھا گیا کہ مذکورہ حضرات کے نزدیک املاک کا بیمہ درست ہے؛ جبکہ وہاں املاک کے بیمہ کی بحث ہی نہیں تھی، بحث تو صرف جیون بیمہ کے متعلق تھی، یہ رسالہ کے مرتب کرنے والوں کی طرف سے ایک علمی خیانت ہے، جس کا احقر نے ذمہ داران اعلی سے بارہا تذکرہ کیا؛ لیکن احقر کو اس کا کوئی جواب نہیں ملا، اور جیون بیمہ کو شرائط کے ساتھ جائز قرار دینے والوں کے روح رواں حضرت مولانا ظفیر الدین صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند نے اپنے سابق فتوی سے رجوع کا اعلان کرلیا ہے، جو رسالہ بحث ونظر اور راشٹریہ سہارا میں متعدد بار شائع ہو چکا ہے؛ لہٰذا مسلمان اس رسالہ سے دھوکہ نہ کھائیں اور جیون بیمہ کو ہرگز جائز نہ سمجھیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍رجب المرجب ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶؍۷۷۷۷)

املاک یا زندگی کا بیمہ کرانا

سوال[۹۱۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جیون بیمہ کرانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

املاک کا بیمہ کرانا جائز ہے یا نہیں؟ دونوں کے بارے میں شرعی حکم تحریر فرمادیں۔ نوازش ہوگی۔

المستفتی: ریلائنس ایمان سرمایہ کاری منصوبہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: لائف انشورنس، جس کو جیون بیمہ کہا جاتا ہے، صریح سود کے پائے جانے کی وجہ سے اس کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے؛ اس لئے مختلف حیلوں اور متردد فیہ اعذار کو بنیاد بنا کر اسے کبھی بھی جواز کے دائرے میں نہیں لایا جاسکتا ہے؛ چنانچہ ماضی میں ایسا ہی ہوا ہے کہ فسادات کو بنیاد بنا کر بعض بزرگوں نے لائف انشورنس کی گنجائش لکھی اور بعد میں رجوع بھی کرلیا ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ ۲/۲۰۰، جدید زکریا ۹/۲۴۱، کفایت المفتی ۸/۷۶-۷۷، جدید زکریا مطول ۱۱/۲۳۹-۲۴۰، فتاوی محمودیہ جدید ڈابھیل ۱۶/۳۸۹-۳۹۲)

قرآن وحدیث کے نصوص ملاحظہ فرمائیے:

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [سورۃ البقرہ: ۲۷۵]

قال اللّٰہ تعالی: يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ. [البقرہ: ۲۷۶]

قال اللّٰہ تعالیٰ: يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ ○ فَاِنْ لَمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ.

[سورۃ البقرہ: ۲۸۷-۲۷۸]

قال اللّٰہ تعالیٰ: يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. [سورۂ مائدۃ: ۹۰]

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه. الحديث (مسلم شريف، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ٢/٢٧، بيت الأفكار رقم: ١٥٩٨، أبو داؤد شريف، البيوع، باب في آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية ٢/ ٤٧٣، دارالسلام رقم: ٣٣٣٣، مشكوة شريف ٢٤٤)

ولاخلاف بين أهل العلم في تحريم القمار. (أحكام القرآن للجصاص، سورة البقرة، باب تحريم الميسر، زكريا ديوبند١/٣٩٨، سهيل اكيڈمی لاهور ١/٣٢٩)

الربوا هو فضل خال عن عوض بمعيار شرعي. (شامي، كراچي ٥/١٦٨، زكريا ٧/٤٠٠)

املاک کے بیمہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تین مہینہ کے لئے یا چھ مہینہ کے لئے یا سال بھر کے لئے بیمہ کرایا جائے، مثلاً گاڑی کا بیمہ تین مہینہ کے لئے یا چھ مہینہ کے لئے یا سال بھر کے لئے کمپنی میں متعینہ فیس متعینہ مدت کے لئے جمع کردی جائے اور مدت کے درمیان اگر کوئی حادثہ پیش نہیں آیا ہے، تو جمع شدہ فیس میں سے کوئی پیسہ واپس نہیں ملتا ہے، اسی طرح دوکان یا فیکٹری کا بیمہ کرالیا گیا، اس میں بھی متعینہ مدت میں کوئی حادثہ پیش نہیں آیا ہے، تو جمع شدہ فیس میں سے کوئی پیسہ واپس نہیں ملتا ہے، اسی طرح سالہا سال گذر جائیں اور پیسہ جمع کرنے کا سلسلہ جاری رہے، تو آخر تک کوئی پیسہ واپس نہیں آئے گا، ہاں البتہ اگر کوئی حادثہ پیش آجائے تو کمپنی کی طرف سے نقصان کی تلافی کی جاتی ہے، اس کو ہم کمپنی کی طرف سے اپنے ایک آدمی کے لئے تعاون کے درجہ میں سمجھتے ہیں، یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی اسکول یا مدرسہ میں ضابطہ ہے کہ سالانہ داخلہ فیس اتنے روپیہ ہے اور ساتھ میں یہ بھی ہے کہ اگر وہ بیمار ہوجائے یا آپریشن ہو، تو اس بیماری کا علاج مدرسہ برداشت کرے گا؛ اس لئے کہ یہ مدرسہ کا ایک فرد بن چکا ہے، اسی طرح املاک کا بیمہ کرنے والا اس کمپنی کا ایک فرد بن چکا ہے اور حوادثات کے موقع پر کمپنی کی طرف سے یہ نقصان کی تلافی خصوصی تعاون

ہے، ہاں البتہ حوادث کا پیش آنا ایک امر متردد فیہ اور تعلیق الشئ علی الخطر ہے؛ اس لئے شبۃ القمار کی وجہ سے اصلاً ناجائز ہے، مگر ضرورت کی وجہ سے جائز کہا گیا ہے یہی اس احقر کی بھی رائے ہے؛ اس لئے ہم اس کی گنجائش سمجھتے ہیں اور اس میں کچھ شکلیں ایسی بھی ہوتی ہیں، جن میں تجارتی مال کے خریدار کے پاس پہونچانے کی ذمہ دار بھی بیمہ کمپنی بنتی ہے، ایسی صورت میں بیمہ کمپنی ان چیزوں کی شرعاً ذمہ دار بن جائے گی، جیسا کہ شامی کے اس طرح کے جزئیات سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔

لأن المال ليس في يد صاحب السوكرة؛ بل في يد صاحب المركب، وإن كان صاحب السوكرة، هو صاحب المركب يكون أجيرا مشتركا قد أخذ أجرة على الحفظ وعلى الحمل، وكل من المودع والأجير المشترك لا يضمن مالا يمكن الاحتراز عنه كالموت والغرق ونحو ذلك، فإن قلت: سيأتي قبيل باب كفالة الرجلين، قال لآخر: اسلك هذا الطريق فإنه آمن فسلك وأخذ ماله لم يضمن، ولو قال: إن كان مخوفاً وأخذ مالك فأنا ضامن ضمن، وعلله الشارح هناك بأنه ضمن الغار صفة السلامة للمغرور نصاًالخ أي بخلاف الأولىٰ فإنه لم ينص على الضمان بقوله: فأنا ضامن. (شامي، كتاب الجهاد، فصل في استئمان الكافر، مطلب فيا يفعله التجار من دفع ما يسمى سوكرة، زكريا ٦/ ٢٨١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍صفر المظفر ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۸۸۶/۳۸)

جان ومال کا بیمہ کرانا کیسا ہے؟

سوال [۹۱۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: کہ آج کل بیمہ کمپنی کے ایجنٹ منسلک کتاب اسلامی فقہ اکیڈمی کا ہندوستان کے موجودہ حالات میں انشورنس کے جواز کے فیصلہ کے ذریعہ سیدھے سادھے مسلمانوں کو شریعت کا حکم بتا کر مطمئن کر دیتے ہیں، جس کی وجہ سے مسلمان اپنی جان و مال کا بیمہ کرالیتے ہیں، اس سلسلہ میں شرعی حکم مطلوب ہے کہ آیا جان و مال کے بیمہ کی شرعاً کچھ گنجائش ہے یا نہیں؟ منسلکہ کتاب کی کیا حقیقت ہے؟ کیا بیمہ کے جواز کے لئے وہ مستند ہے؟ جواب باصواب سے مطلع فرمائیں؟

المستفتی: عبدالقادر عفی عنہ، خادم مدرسہ انصار العلوم، سرائے رجب علی، نہٹور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اسلامی فقہ اکیڈمی کی طرف سے جو کتابچہ شائع ہوا ہے، وہ قابل اعتبار و قابل اعتماد نہیں ہے، جس وقت علماء سے دستخط کرائے جارہے تھے، اس وقت احقر بھی وہاں موجود تھا، چنانچہ ہمارے ساتھ اور بھی علماء شامل ہوئے، ان میں سے تین کا نام اس رسالہ کے اندر اختلافی نوٹ کے ساتھ موجود ہے، اور ہم نے صاف لفظوں میں لکھ دیا تھا کہ فسادات کو بنیاد بنا کر جیون بیمہ کو جائز اور درست قرار دیا ہے، ہم اس کو جائز نہیں سمجھتے ہیں، وہ ناجائز اور حرام ہے، ہمارے اس اختلافی نوٹ کو مذکورہ کتابچہ میں توڑ مروڑ کر اس طرح لکھا کہ مذکورہ حضرات کے نزدیک املاک کا بیمہ درست ہے، خود اس عبارت میں بڑی غلطی یہ ہے کہ مذکورہ حضرات ان کو کہا جاتا ہے، جن کا ذکر ماقبل میں گذر چکا ہو بعد میں جن کا ذکر ہوتا ہے ان کے بارے میں ذیل کا لفظ کہا جاتا ہے، خود اردو عبارت کی بھی یہی غلطی ہے۔

دوسری غلطی یہ ہے کہ املاک کے بیمہ سے متعلق بحث ہی نہیں تھی؛ بلکہ بحث اور گفتگو جیون بیمہ سے متعلق تھی اور جیون بیمہ کے الفاظ کو حذف کر کے املاک کا بیمہ لکھدیا یہ موضوع سے ہٹ کر دوسری بات لکھنا ثابت ہوا، جو اس رسالہ کے مرتب کرنے والوں کی طرف سے

ایک علمی خیانت ہے؛ چنانچہ احقر نے ذمہ دار حضرات سے بارہا اس بات کا تذکرہ کیا ہے، کہ ہمارا اختلاف املاک کے بیمہ سے تھا ہی نہیں۔ آپ نے اس نوٹ کو توڑ مروڑ کر کیوں لکھا؟ ہمیں اس کا جواب نہیں ملا۔

نیز جن شرائط کو بنیاد بنا کر جیون بیمہ کی گنجائش لکھی گئی تھی، ان شرائط کا عوام کے ذہنوں میں دور دور تک خیال بھی نہیں رہا ہے؛ بلکہ عوام یہ سمجھتے ہیں کہ علماء نے جیون بیمہ کو مطلقاً جائز قرار دیا ہے، اوراخبارات میں بھی اسی طرح اعلان ہو چکا تھا۔ نیز شرائط کے ساتھ جائز قرار دینے والوں کے روح رواں حضرت مولانا ظفیر الدین صاحب، مفتی دارالعلوم دیوبند نے اس رائے سے رجوع کا اعلان فرما دیا تھا، اخبار راشٹریہ سہارا میں کئی مرتبہ اس رجوع کا اعلان ہوا، رسالہ بحث ونظر میں بھی ان حضرات کے رجوع کا اعلان ہو چکا تھا؛ اس لئے اس رسالہ کے ذریعہ سے مسلمان دھوکہ نہ کھائیں اور جیون بیمہ کو ہرگز جائز نہ سمجھیں۔ احقر اس رسالہ کے وجود سے متعلق اول سے آخر تک تمام رازوں سے واقف ہے؛ اس لئے صراحت کے ساتھ ہم اس کا اعلان کرتے ہیں کہ مسلمان اس رسالہ پر اعتماد نہ کریں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ رجب المرجب ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۷۶۶)

ہیلتھ انشورنس

سوال [۹۱۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بہت سے پیچیدہ امراض اور (ایمرجنسی حالات) میں لاکھوں روپئے کے اخراجات آتے ہیں، گورنمنٹ ہاسپٹل میں ان سہولتوں کا فقدان ہے، تو پھر ایسے حالات میں ایک مسلمان کے لئے (ہیلتھ انشورنس) یا بینک کے ذریعہ لون لینا جائز ہے یا نہیں؟ زندگی

تو غریب امیر ہر ایک کی قیمتی ہوتی ہے۔

المستفتی: مفتی عتیق الرحمٰن، کامٹی، ناگ پور (مہاراشٹر)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: امراض کے آئندہ پیش آنے کے خطرہ سے سودی قرض لینا جائز نہیں۔ ہاں البتہ خطرناک مرض پیش آچکا ہے، اور اس کا علاج بڑی رقم کے بغیر ہو نہیں سکتا اور مریض کے پاس اس کا انتظام نہیں ہے، اور نہ ہی اس کو بغیر سود کے قرض حسن مل پایا ہے، تو ایسی صورت میں سود پر قرض لے کر اپنا علاج کرنے کی گنجائش ہے؛ لیکن یہ بات بھی خوب سوچ لیں کہ اس قرض کی ادائے گی سے پہلے سود پر سود نہ بڑھنے پائے، جس کا ادا کرنا انتہائی دشوارکن ہوجائے۔

یجوز للمحتاج الاستقرض بالربح. (الأشباہ والنظائر قدیم ۱٤۹، البحر الرائق، کتاب البیوع، باب الربا، زکریا دیوبند ٦/ ۲۱۱، کوئٹہ ٦/ ۱۲٦)

الضرورات تبیح المحظورات. (الأشباہ والنظائر قدیم ۱٤۰، قواعد الفقۃ اشرفي ۸۹، رقم: ۱۷۰، شرح المجلۃ رستم اتحاد دیوبند ۱/ ۲۹، رقم المادۃ: ۲۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ شوال المکرّم ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۴۹۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۱۰/۲۸ھ

صحت کا بیمہ کرانا

سوال [۹۱۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کچھ روپیہ سالانہ دے کر کوئی شخص اپنا اور اپنی بیوی بچوں کی صحت کا (صرف علاج کے خرچ کے لئے) بیمہ یہ سوچ کر کراتا ہے کہ خدانخواستہ کوئی خطرناک بیماری یا آپریشن کی حالت واقع ہونے پر پیسے کی تنگی کی وجہ سے اچھے علاج سے محروم نہ رہ جائے؛ جبکہ سرکاری

ہسپتال کے فری علاج پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا ہے، صحت کے بیمہ کے بارے میں یہ واضح رہے کہ بیمہ کرنے والی کمپنی کچھ روپیہ سالانہ لے کر کسی کی زندگی وصحت کی گارنٹی نہیں دیتی ہے، یہ ان کے فارم پر صاف صاف لکھا ہوتا ہے؛ بلکہ وہ کمپنی صحت کا بیمہ کئے ہوئے شخص کی اپنے طور پر پیسہ سے مدد بھی کرتی ہے تاکہ وہ بوقت ضرورت کمپنی کے بتائے ہوئے اچھے پرائیویٹ ہسپتال میں بنا پیسے کے علاج یا آپریشن کرا سکے اور علاج ومعالجہ پر ہوئے خرچ کا بھگتان کمپنی ہسپتال کو کرتی ہے، چاہے وہ شخص صحت مند ہو یا نہ ہو، اگر اس شخص یا اس کے بیوی بچے کو علاج کی ضرورت پیش نہ آئی، تو کمپنی میں جمع ہوا پیسہ اس شخص کو کبھی بھی واپس نہیں ملتا، وہ کمپنی کا ہوجاتا ہے، اس طرح کے بچے پیسہ سے ضرورت مند صحت بیمہ کئے ہوئے لوگوں کا علاج ہوجاتا ہے، تو کیا یہ صحت کا بیمہ کرایا جاسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: ڈاکٹر وارث احمد، منگل بازار، بجنور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: صحت کا بیمہ اپنی شرائط کے اعتبار سے جوا اور قمار ہے، صرف ایک موہوم نفع کی بنیاد پر ہرگز اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی؛ اس لئے کہ قمار کی کوئی بھی شکل قطعاً جواز کے دائرہ میں داخل نہیں۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۳۰، احسن الفتاوی ۵/۲۵)

وقال الجصاص لاخلاف في أهل العلم في تحريم القمار، إن المخاطرة من القمار، قال ابن عباسؓ المخاطرة قمار. (أحكام القرآن للتهانوي ۱/ ۲۸۱)

وقال قوم من أهل العلم القمار كله من الميسر (إلى قوله) وحقيقة تمليك المال على المخاطرة. (أحكام القرآن للجصاص، سورة المائدة، باب تحريم الميسر، زكريا ديوبند ۲/ ۵۸۲، سهيل اكيڈمی لاهور ۲/ ۴۶۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ر رجب المرجب ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۹۷۷)

طبی اعتبار سے جیون بیمہ کرانا

سوال [۹۱۱۱]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگرکوئی شخص جیون بیمہ کرائے ،تو کیااس بیمہ کی ملی رقم اس کے بچوں کی پرورش کے لئے جائز ہوگی؛ جبکہ بیمہ کراتے وقت اس شخص کی نیت یہ تھی کہ وہ اپنی زندگی میں بیمہ کی میعاد پوری ہونے پر جمع ہوئی اصل رقم سے بڑھ کر جو پیسہ ملے گا وہ اس پیسہ کواپنے ذاتی اور بیوی بچوں پر خرچ نہیں کرے گا؛ بلکہ اس روپیہ کوغریب نادار ضرورت مندوں اورمحتاجوں کی ضرورت میں صرف کرے گا کبھی کبھی یہ باتیں اس طرح کےلوگوں کے دل ودماغ میں بھی آتی ہیں کہ جولوگ علاج ومعالجہ کرانے سے مجبور ہوتے ہیں اور ڈاکٹر لوگ بھی اس طرح کا مشورہ ایسے لوگوں کوضرورت سے زیادہ فکر وخوف کا غلبہ پیدا ہونے کی صورت میں علاج معالجہ کے طور پر دیئے ہیں، دلی سکون ودماغی توازن کو بنائے رکھنے کے لئے صرف طبی اعتبار سے بیمہ کراسکتا ہے یانہیں؟ نیت وہی ہے جواوپر بیان کردی گئی ہے۔

المستفتی: ڈاکٹر وارث احمد، منگل بازار، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حرام کام نیت کودرست کرنے کی وجہ سے حلال نہیں ہوتا ہے؛ لہٰذا کوئی بھی سودی معاملہ درج کردہ اعذار کی بناپر جائزنہیں ہے، یہ ایسا ہے جیسا کہ کوئی عورت اولاد صالحہ کی آرزو اورنیت کرتی ہے اوراس کا شوہر ناکارہ ہے، مردانی قوت نہیں ہے اوراولاد صالحہ کی نیت سے کسی دوسرے مرد سے منھ کالا کرلیتی ہے، یہ عمل قطعی طور پرحرام ہے اورجیون بیمہ کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے،جیسا کہ بدکاری اورشراب وخنزیر کی حرمت بھی نص قطعی سے ثابت ہے۔(مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۳۲، جواہر الفقہ ۲/۱۷۰، جدید زکریا ۴/۴۵۵)

قال الله تعالیٰ: الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبَا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِیْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ. [سورة البقره: ٢٧٥)

وفي الآية: يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَيُرْبِی الصَّدَقَاتِ. [البقره:٢٧٦]

قال الله تعالى: فَاِنْ لَمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِه. [البقره: ٢٨٩]

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (صحيح مسلم ، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ٢٧/٢، بيت الأفكار رقم:١٥٩٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰؍ربیع الأول ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۹۷۹/۳۸)

گاڑی کا انشورنس کروانا

سوال[۹۱۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہندوستانیوں کے لئے گاڑی کا انشورنس بنوانا لازمی ہے، نہ بنوانے کی صورت میں گاڑیاں پکڑی جاتی ہیں، کیا یہ انشورنس بنوایا جاسکتا ہے؟

المستفتی: شمشاد احمد أعظمی، مئو

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گاڑی کا انشورنس کروانا جائز ہے، اسی طرح دوکانوں، فرموں اور فیکٹریوں کا انشورنس بھی جائز ہے، اس میں صرف انشورنس کے نام سے فیس جمع ہوتی رہتی ہے، جمع شدہ رقم واپس نہیں ملتی؛ البتہ بہت شاذونادر کوئی حادثہ پیش آجائے تو جو کچھ کمپنی کی طرف سے ملتا ہے وہ بطور تعاون سمجھا جائے گا۔

(مستفاد: ایضاح النوادر ۱/ ۲۴۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ ر محرم الحرام ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۴۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/ ۲/ ۱۴۲۹ھ

انشورنس کی سودی رقم کا مصرف

سوال [۹۱۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے خالہ زاد بھائی تقریباً بیس سال پہلے ایک لاری سے ایکسیڈنٹ میں انتقال کر گئے، ان کے دوسرے بھائیوں نے انشورنس کمپنی پر مقدمہ دائر کر دیا تھا، لاری کا انشورنس تھا؛ اس لئے انشورنس کمپنی پر مقدمہ دائر کیا۔ اب پندرہ یوم قبل کمپنی سے تقریباً ۱۹۲۰۰ روپیہ ملا ہے؛ کیونکہ یہ روپیہ کمپنی کی طرف سے کافی تاخیر سے ملا ہے؛ اس لئے جج صاحب کا فیصلہ ہے کہ کمپنی اس پر سود بھی دے۔ اب سود گیارہ ہزار وصول ہوا ہے، تو ایسی صورت میں معلوم یہ کرنا ہے کہ یہ روپیہ کسی مدرسہ، مسجد یا کسی اور دینی ادارہ میں دیا جاسکتا ہے یا کسی یتیم بچی کی شادی میں اخراجات نکال کر جو رقم بچتی ہے وہ دیدی جائے، ہم اس روپیہ کو اپنی ذات پر خرچ کرنا نہیں چاہتے؛ اس لئے یہ معلوم کرنا ہے کہ تینوں مصرف میں سے کس مصرف میں خرچ کیا جاسکتا ہے؟

المستفتی: حسین احمد خاں، بڑوالی امروہہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: چونکہ انشورنس کمپنی سے جو روپیہ مع سود کے حاصل ہوا ہے، وہ مال مشکوک ہے؛ اس لئے مسجد یا مدرسہ میں نہ لگایا جائے؛ بلکہ تیسری صورت یعنی یتیم بچی کی شادی میں خرچ کر دیا جائے؛ کیونکہ مسجد و مدرسہ میں مشتبہ مال لگانا ممنوع ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ ۶/ ۹۹، جدید زکریا ۹/ ۱۰۸)

أما لو أنفق في ذلک مالا خبيثاً، ومالا سببه الخبيث، والطيب فيكره؛ لأن الله تعالى لا يقبل إلا الطيب، فيكره تلويث بيته بمالا يقبله.

(شامي، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلوة الخ، قبيل مطلب في افضل المساجد، كراچي ۱/ ۵۸۸، زكريا ۲/ ۴۳۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍صفر المظفر ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲؍۴۶۷۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲؍۲؍۱۴۱۷ھ

ایل، آئی، سی، میں جمع شدہ رقم پر ملے سود کا مصرف

سوال [۹۱۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر ہم نے L.I.C. ۵۰۰۰۰؍ کی کرائی، تو دس سال بعد ہمیں ایک لاکھ ملیں گے، تو یہ پچاس ہزار روپیہ جو زائد ہیں کیا ہمارے لئے جائز ہیں یا نہیں؟ اگر جائز نہیں ہیں، تو ہم اس روپیہ کو لے کر کن کاموں میں صرف کریں؟ اور بینک کے ملے ہوئے سود کو ہم کن کاموں میں صرف کر سکتے ہیں؟

المستفتی: شبلی حبیب، پیرزادہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ایل، آئی، سی اور انشورنس میں اپنی جمع شدہ رقم پر جو زائد رقم ملتی ہے، وہ سود اور حرام ہے، اس کو اپنے اوپر خرچ کرنا جائز نہیں اور ایسے پیسے کے بارے میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ کسی بھی عنوان سے جہاں سے آیا ہے، وہیں واپس کر دیا جائے؛ لہٰذا اگر یہ رقم سرکاری بینک سے آئی ہے، تو انکم ٹیکس اور سیل ٹیکس میں دینا جائز ہے، اور اگر آپ کے اوپر ٹیکس واجب نہیں ہے، تو ان پیسوں کو بغیر نیت ثواب ایسے فقیروں کو دینا واجب ہے، جو وقت کے فاقے سے ہیں۔

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة والاستئجار على المعاصي (إلى قوله) ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه؛ ولكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، قديم مصري ١/٤٨، مطبع سهارنپور ١/٣٧، جديد دارالبشائر الإسلامية بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩)

و إذا مات الرجل و كسبه خبيث، فالأولىٰ لورثته أن يردوا المال إلى أربابه، فإن لم يعرفوا أربابه تصدقوا به. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الخامس عشر في الكسب، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷؍ ۸۱۰۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۶/۲۴ھ

جیون بیمہ کے بدلے ملی رقم کو اپنی ضروریات میں صرف کرنا

سوال [۹۱۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) زید ہر ماہ جیون بیمہ میں روپئے جمع کرتا ہے، بیمہ دو سال کا ہے اور کمپنی ہر پانچ سال میں پانچ ہزار روپئے بونس دیتی ہے اور ۲۰؍ سال پورے ہونے کے بعد یہ رقم پانچ ہزار بونس کمپنی کاٹ لیتی ہے۔ کیا اس رقم سے بیت الخلاء بنوایا جا سکتا ہے اپنی ضروریات کے لئے؟ یا یہ رقم تلک میں دینا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ تلک لینا دینا مسلمانوں میں حرام ہے اور بونس سود ہے، تو حرام تلک میں حرام رقم استعمال کرسکتا ہے یا کسی غریب کو بلا نیت ثواب رقم کو دینا جائز ہے؟

(۲) ۲۰؍ سال پورے ہونے کے بعد چالیس ہزار روپئے کمپنی دیتی ہے، اپنی رقم جبکہ

بیس ہزار ہے، وہ بیس ہزار تو سود ہوگیا۔ یہ رقم کس چیز میں استعمال کرسکتا ہے؟ کسی غریب، یتیم لاوارث کو بلا نیت ثواب دینا جائز ہے؟ کیا یہ رقم اپنی بھانجی کی تلک میں دینا جائز ہے؟ اور بیت الخلاء اپنی ضروریات کے لئے بنواسکتا ہے؟

المستفتی: روح اللہ، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اولاً تو جیون بیمہ کروانا ہی شرعاً درست نہیں ہے اور اس کے بدلے میں ملنے والی زائد رقم سود ہونے کی وجہ سے مال حرام ہے؛ لہٰذا اس رقم سے اپنی ضروریات کے لئے بیت الخلاء بنوانا اور اس کو تلک وغیرہ میں دینا جائز نہیں؛ بلکہ بلا نیت ثواب فقراء پر تقسیم کردینا واجب ہے۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء؛ ولكن لا يريد بذلك الأجر والثواب؛ ولكن يريد دفع المعصية عن نفسه. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مطبع لكهنؤ ١/ ٤٨، مطبع سهارنپور ١/ ١٣٧، جديد دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/ ٣٥٩، تحت رقم الحديث ٥٩)

و إذا مات الرجل و كسبه خبيث، فالأولىٰ لورثته أن يردوا المال إلى أربابه، فإن لم يعرفوا أربابه تصدقوا به. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الخامس عشر في الكسب، زكريا قديم ٥/ ٣٤٩، جديد ٥/ ٤٠٤، محموديه ٤/ ٢٠٣، جديد ڈابهيل ١٦/ ٣٨٣، ايضاح النوادر ١/ ١٣٣، ١/ ٩٩، فتاوى رحيمية ٢/ ٢٠٠، جديد زكريا ٩/ ٢٤١ و ٩/ ٢٦٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍رجب المرجب ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۲۵۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۹/۷/۱۴۲۰ھ

بیمہ اور ایف، ڈی، میں ملنے والی زائد رقم کا حکم

سوال [۹۱۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) میرے شوہر کا انتقال ہوگیا، ان کا بیمہ کیا ہوا ہے، اب آپ بتائیے کہ یہ پیسہ میرے اور میرے بچوں کے لئے جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ میری دو بیٹیاں ہیں، دونوں جوان ہیں، اس میں ایک بیٹی بیمار ہے، اس کے لئے دوائیوں کا خرچ ہے، ایک بیٹا ہے، وہ چھوٹا ہے، اس حالت میں یہ پیسہ میرے لئے جائز ہوگا یا نہیں؟

(۲) ہم نے اگر ایف ڈی کرائی بینک سے تو پانچ سال کے بعد اس کے پیسے لینے جائز ہیں یا نہیں؟

المستفتی: صالحہ اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) بیمہ کرانے میں جو سود ملتا ہے، وہ شریعت میں جائز نہیں ہے؛ بلکہ ناجائز اور حرام ہے، غریب مسکین کو صدقہ کر دینا لازم ہوتا ہے؛ لیکن اگر آپ انتہائی ضرورت مند ہیں اور آپ کا کوئی سہارا نہیں ہے، اور بیٹی کی بیماری کا خرچ زیادہ ہے، تو ایسی صورت میں آپ کو اور آپ کی بیٹی کو غریب مسکین کے درجہ میں قرار دے کر بیمہ کے پیسہ کو بیٹی کے علاج میں خرچ کرنے کی گنجائش ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْن. [سورۂ مائدة: ۹۰]

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَأْكُلُوْا الرِّبَا اَضْعَافًا مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوْا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْن. [آل عمران: ۱۳۰]

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه

فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء . (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، طبع مصري ١/١٤٨، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث:٥٩)

لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه.

(شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥)

(۲) جو ایف ڈی کرائی گئی ہے،جس کا پیسہ پانچ سال کے بعد ملے گا،اس میں جو سود ملے گا، وہ حلال نہیں ہے؛ بلکہ حرام ہےاورحرام مال میں اصل حکم یہ ہے کہ جہاں سے آیا ہے،اس کوکسی بھی عنوان سے وہاں واپس کر دیا جائے؛ لہٰذا اگرآپ پر انکم ٹیکس یا کوئی اورسرکاری ٹیکس لازم ہے،تو اس ٹیکس کے عنوان سے سرکار کےخزانہ میں جمع کر دینا جائز ہے،اسی طرح اگرکسی جائیداد کی خریداری کا اسٹامپ پیپر ہےتو اس میں بھی دینا جائز ہے؛ کیونکہ یہ پیسہ سرکاری خزانہ میں پہونچ جاتا ہے ورنہ سودی پیسہ بلانیت ثواب فقراء میں تقسیم کردینالازم ہوتاہے۔

ما حصل بسبب خبيث فالسبيل رده أي إلى أرباب الأموال.

(قواعد الفقه اشرفي ١١٥، منتخبات نظام الفتاوى ٣/١٩٢، ايضاح النوادر ٩٩-١٠١)

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة......ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه؛ ولكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مطبع سهارنپور ١/٣٧، مصري ١/١٨٤، دارالبشائر الإسلامية بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩)

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مطبع

سهارنپور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴ر ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۳۳۲)

لائف انشورنس اور ایف ڈی کی اضافی رقم رشوت میں دینا

سوال [۹۱۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں نے ایک مکان سات سال قبل خریدا ہے، جس میں پہلے ہی سے ایک کرایہ دار ہے، میں نے اس کرایہ دار سے مکان خالی کرنے کے لئے کہا، تو اس نے ایک نہ سنی مجھے مجبور ہو کر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا، کئی سال گذرنے کے بعد بھی ابھی تک تاریخیں پڑ رہی ہیں، مقدمہ قاعدے میں شروع بھی نہیں ہوا ہے، میں نے اس سلسلہ میں چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ جج صاحب سے بات کرلو جتنا روپیہ وہ مانگیں، ان کو دیدو تمہارا کیس جلد از جلد شروع ہو جائے گا، اور فیصلہ بھی تمہارے حق میں ہوگا یا کرایہ دار سے بات کرلو جو وہ مانگے اس کو دے دو تو بھی آپ کا مکان خالی ہو جائے گا، تو کیا لائف انشورنس یا ایف ڈی میں زائد ملنے والی رقم کو اس مد میں لگا سکتے ہیں؟ کیا یہ عدالت کا اور کرایہ دار کا ظلم نہیں ہے؟

المستفتی: جمیل احمد، پیرزادہ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: لائف انشورنس یا ایف ڈی کے ذریعہ حاصل ہونے والی زائد رقم جو کہ سود ہے، رشوت میں دینا جائز نہیں؛ بلکہ بلانیت ثواب اس کو غرباء پر صدقہ کرنا واجب ہے؛ لہٰذا حصول حق کے لئے اگر رشوت دینے پر مجبوری ہو، تو اپنے اصل مال سے دینے کی گنجائش ہے، مگر لینے والے کے لئے کسی حالت میں بھی لینا جائز نہیں۔

ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه؛ ولكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك.
(بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، قديم مصري ١/٤٨، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩)

لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه.
(الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/ ٢٤٦)

قال في الشامي: دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله، ولاستخراج حق له ليس برشوة يعني في حق الدافع. (كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٦/٤٢٣، زكريا ٩/٦٠٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍محرم الحرام ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴؍۵۹۴۷)

پرائیویٹ بیمہ کمپنی کی سودی رقم حکومت کے ٹیکس میں دینا

سوال [۹۱۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ استفتاء نمبر الف ۴۳۵۱/۲ میں یہ بات رہ گئی تھی کہ ہمارے یہاں (ساؤتھ افریقہ) بینکیں سرکاری نہیں ہیں، نہ حکومت کا کچھ تعلق ہے، ان بینکوں کے بجائے لائف انشورنس کمپنیاں ہونی چاہئیں؟؛ لہٰذا اس صورت میں حکم شرعی مرحمت فرمادیں۔

المستفتی: محمد شعیب وارث، پوسٹ بکس ۳۳۹۳، ساؤتھ افریقہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پرائیویٹ کمپنی میں بیمہ کراکے اس کی سودی رقم حکومت کے ٹیکس میں دینا جائز نہیں ہے؛ بلکہ انہیں کمپنی کو کسی بھی عنوان سے واپس کردینا یا نادار مسکین غریب کو بلانیت ثواب دینا واجب ہے۔

ویجب علیه أن یرده علی مالکه إن وجد المالک، وإلا ففي جمیع الصور یجب علیه أن یتصدق بمثل تلک الأموال علی الفقراء. (بذل المجهود، کتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، قدیم مصري ۱/۴۸، سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامیة بیروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحدیث: ۵۹)

لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبه. (تبیین الحقائق، کتاب الکراهیة، فصل في البیع، امدادیة ملتان ۶/۲۷، زکریادیوبند ۷/۶۰)

البتہ حکومت کے جبری ٹیکس سے بچنے کے لئے جو بھی حیلہ اور پالیسی اختیار کرنا ممکن ہو، مثلاً کذب بیانی وغیرہ اختیار کرکے اپنا مال بچانے کی شرعی طور پر گنجائش ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ۱۳۶)

الکذب مباح لإحیاء حقه، ودفع الظلم عن نفسه. (در مختار، کتاب الحظر والإباحة، فصل في البیع، زکریا ۹/۶۱۲، کراچي ۶/۴۲۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۸؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۴۹۹/۳۲)	۱۴۱۶/۶/۱۸ھ

L.I.C کی رقم جہیز میں دینا

سوال [۹۱۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں ایک گورنمنٹ ملازم ہوں، اگر L.I.C کروالیتا ہوں، تو انکم ٹیکس کی ادائے گی میں مجھے کچھ مراعات حاصل ہوجائیں گی، تو کیا اس مقصد سے L.I.C کرواسکتا ہوں؟ اور پھر L.I.C کی مدت پوری ہوجانے پر زائد رقم کو اپنے مصرف مثلاً لڑکی کی شادی کے جہیز وغیرہ میں استعمال کرسکتا ہوں یا نہیں؟

المستفتی: عبدالودود انصاری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: L.I.C کرانے کی وجہ سے اگر انکم ٹیکس کی ادائے گی میں کافی رقم بچ جاتی ہے، تو L.I.C کرالینے کی گنجائش ہے؛ لیکن بعد میں اصل رقم سے جوزائد رقم ملے گی، اس کو اپنی لڑکی کے جہیز میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے؛ بلکہ فقراء ومساکین پر صدقہ کرنا لازم ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۹۹، فتاوی رحیمیہ قدیم ۱۳۶/۶، جدید زکریا ۲۶۲/۹)

إن حصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، قديم مصري ۱ /۱٤۸، يحيٰ سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹)

لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه. (البحر الرائق، كتاب الكراهية، فصل في البيع، كوئٹه ۸/۲۰۱، زكريا ۹/۳٦۹)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍محرم الحرام ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۸۹۰/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۱/۲۸ھ

بیمہ کی رقم شرعی وارثین استعمال کرسکتے ہیں یا نہیں؟

سوال [۹۱۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے زندگی میں بیمہ کرایا تھا، اس کا انتقال ہوگیا، پھر لائف انشورنس کارپوریشن نے اس کے وارثوں کو ایک لاکھ روپیہ دیا؛ جبکہ زید نے اپنی حیات تک صرف اکیس ہزار روپیہ لائف انشورنس میں جمع کیا تھا، ایسا اس سبب سے لائف انشورنس کمپنی نے کیا کہ اس کا قانون بنایا ہوا ہے کہ درمیان مدت میں جمع کرنے والا

مرگیا، تو جتنی رقم جمع کرنے کو اس نے لکھا یا تھا، وہ رقم اس کے وارثوں کو کمپنی دے گی، تو کیا یہ رقم وارثوں کو اپنے خرچ میں لانا جائز ہے؟

المستفتی: محمد فیاض، بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر وارثین صاحب نصاب ہیں، نادار فقیر نہیں ہیں، تو جمع شدہ سے زائد رقم کو ان کے لئے اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہے؛ بلکہ اس کو بلانیت ثواب فقراء میں تقسیم کردینا واجب ہے۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث (إلى قوله) **فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء.** (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مصري ١/١٤٨، يحيىٰ سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩)

وإذا مات الرجل و كسبه خبيث، فالأولىٰ لو رثته أن يردوا المال إلى أربابه، فإن لم يعرفوا أربابه تصدقوا به. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الخامس عشر في الكسب، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍صفر المظفر ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳۱۰/۲۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۲/۱۵ھ

(۷) باب القمار

ہارنے والی ٹیم کا جیتنے والی ٹیم کو کھلانا پلانا

سوال [۹۱۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں کھلاڑیوں کی ۲ر جماعتوں نے کھیل میں یہ طے کیا کہ جو بھی ہار گیا، وہ جیتنے والے کو۱۰۰ر روپئے دے گا، مقامی ایک عالم دین نے ان کو سمجھایا اور کہا کہ یہ تو جوا ہے، آپ لوگ ایسا کرلیں کہ ہارنے والا بھی اور جیتنے والا بھی سب مل کر کچھ کھا پی لیا کریں اور پیسے ہارنے والا ہی دیا کرے، اس طرح جیتنے والا اور ہارنے والا برابر کھانے میں شریک ہوں گے، معلوم یہ کرنا ہے کہ یہ دوسرا طریقہ جو عالم صاحب نے بتلایا ہے درست ہے؟ یہ جوا تو نہیں؟

المستفتی: عبدالرشید قاسمی، سیڈھا، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جن عالم صاحب نے دوسری شکل بیان کی ہے، اس میں اگر یہ قید نہ ہوتی کہ ہارنے والا ہی پیسے دیا کرے گا، تب جائز ہوتا، چاہے اس پیسے کو دونوں فریق مل کر کھائیں، ایک طرف سے پیسے کی بات آنے کی وجہ سے یہ بھی عدم جواز کے دائرے میں داخل ہوگیا۔

ولو قال: أحدهما لصاحبه إن سبقتني فلک علي كذا، وإن سبقتک فلاشيئ عليک فهو جائز؛ لأن الخطر إذا كان من أحد الجانبين لا يحتمل القمار. (بدائع الصنائع، كتاب السباق، زكريا ٥/٣٠٦، كراچي٦/٢٠٦)

إن شرط لمالٍ في المسابقة من جانب واحد. تحته في الشامية: بأن يقول أحدهما لصاحبه إن سبقتني أعطيتک كذا، وإن سبقتک لا آخذ

منک شیئًا-إلی قوله-ولاکذلک إذا شرط من جانب واحد؛ لأن الزیادة والنقصان لا تمکن فیهما؛ بل في أحدهما تمکن الزیادة، وفي الآخر الانتقاص فقط، فلا تکون مقامرة؛ لأنها مفاعلة منه. (شامي، کتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغیره، فصل في البیع، زکریا ۹/ ۵۷۷-۵۷۸، کراچي ۶/ ۴۰۳، تبیین الحقائق، امدادیة ملتان ۶/ ۲۲۷، زکریا ۷/ ۴۶۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ شعبان المعظم ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۱۳۴)

قرعہ اندازی کے ساتھ حج بیسی کا حکم

سوال [۹۱۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ۲۹؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ء کو آپ کے دار الافتاء سے بتحریر آنجناب حج بیسی سے متعلق ایک استفتاء کا جواب (الف ۸۸۳۸) جاری ہوا، جس کے عدم جواز کی ایک وجہ حضور والا نے یہ رقم فرمائی کہ صورت مسئولہ میں قرعہ اندازی کا یہ طریقہ جوا، اور قمار کے مشابہ ہے، گستاخی معاف دارید، قرعہ اندازی کی صحیح صورت کیا ہے؟ آگاہ فرمائیں۔

نیز معارف القرآن ۳/ ۴۴۷ مؤلفہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ میں بعنوان (قرعہ اندازی کی جائز صورت) دو صورتیں تحریر کی ہیں:

(۱) جب سب کے حقوق مساوی ہوں اور حصے بھی سب کے مساوی تقسیم کر دیئے گئے ہوں، پھر حصوں کی تعیین بذریعہ قرعہ اندازی کر لی جائے، مثلاً ایک مکان چار شریکوں پر تقسیم کرنا۔

(۲) یا کسی چیز کے خواہشمند ایک ہزار ہوں اور سب کے حقوق مساوی ہوں، مگر جو چیز تقسیم کرنی ہے وہ کل سو ہیں، تو اس میں قرعہ اندازی سے فیصلہ کیا جا سکتا ہے، ہمارا

طریقۂ قرعہ اندازی ہماری ناقص فہم کے مطابق مذکورہ دوسری صورت سے منطبق ہے۔

دوسری بات عرض معروض یہ کہ ہم حج بیسی کی یہ صورت صرف زیارت حرمین کے اشتیاق میں اختیار کررہے ہیں اور یہ مقصد وشوق عمرہ کے ذریعہ بھی پورا ہوسکتا ہے؛ لیکن ہم نے زمانہ حج میں اس کو پورا کرنا زیادہ مناسب سمجھا تاکہ حج جیسی اہم عبادت کا ثواب بھی حاصل ہوجائے؛ اس لئے سوال کے الفاظ دوبارہ اس طرح ملاحظہ ہوں۔

ہم نے بیس افراد تشکیل دیئے، فی ممبر سالانہ سات ہزار روپئے دس سال تک جمع کرتے ہیں، جس سے ہر سال ایک لاکھ چالیس ہزار روپئے جمع ہوتے ہیں اور بیس ممبروں میں دو، دو کی جوڑیاں بنائی ہیں، جوڑیوں کے نام قرعہ اندازی کرتے ہیں، جس جوڑی کے نام قرعہ آتا ہے، وہ اس رقم سے زیارت حرمین کو جاتے ہیں اور یہ صورت دس سال تک چلے گی، جس میں تمام ممبروں کا نمبر آجائے گا، اس کے شرائط حسب ذیل ہیں۔

(۱) یکم ربیع الاول کو ہر ممبر پر ایک ہزار روپئے ادا کرنا لازم ہیں اور بقیہ رقم ختم شوال تک ادا کرنا لازم ہے۔

(۲) حج کرنے سے قبل کسی ممبر کے فوت ہونے کی صورت میں اب تک بھری گئی رقم اس کے ورثاء کی رضامندی کے ساتھ ان سے وصول کی جائیگی، ان کے بخوشی نہ دینے کے صورت میں تمام ممبران حج بیسی فوت ہونے والے ممبر کو اپنا حق معاف کرتے ہوئے اس کی بقیہ قسطوں کو اپنے اوپر تقسیم کرلیں گے۔

المستفتی: ممتاز احمد قاسمی، جودھ پور، راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: قرعہ اندازی کے ساتھ حج بیسی کی جو شکل دس سالہ مدت کے درمیان کی پیش کی گئی ہے، اور اس کا جواب ۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۶ھ کو مدرسہ شاہی کے دارالافتاء سے جاری کیا گیا ہے، وہ صحیح اور درست ہے اور پھر سائل نے معارف القرآن

کے حوالے سے قرعہ اندازی کی دو شکلیں لکھ کر اور قرعہ اندازی کے ذریعہ نام نکلنے والوں کو شکل ۲ رمیں شمار کرنے کی کوشش کی اور اسی سے متعلق دوبارہ شاہی کے دارالافتاء سے رجوع کیا ہے، آج کے سوال کے متعلق گزارش یہ ہے کہ آنجناب نے قرعہ اندازی کے ذریعہ نام نکلنے والوں کو حج میں بھیجنے کی یہ شکل لکھی ہے کہ بیس افراد تشکیل دے کر فی ممبر سالانہ سات ہزار روپئے دس سال تک جمع کریں گے، اور ہر سال قرعہ اندازی کے ذریعہ دو ممبر کے نام نکلیں گے اور یہی دو ممبر حج کو جائیں گے، ہر سال یہ سلسلہ جاری رہے گا اور دس سال تک ہر ممبر سات سات ہزار روپئے جمع کرتا رہے گا۔ سائل سے گذارش ہے کہ معارف القرآن کی دوسری شکل دوبارہ دیکھ لیں اور اپنے پیش کردہ قرعہ اندازی کی شکل کو بھی پھر دیکھ لیں، دونوں ایک ہیں یا بالکل الگ الگ ہیں، دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے، معارف القرآن میں قرعہ اندازی کی دوسری شکل جو لکھی گئی ہے، اس میں جن چیزوں کا قرعہ اندازی کے ذریعہ تقسیم کا ذکر ہے، وہ فوری اور فی الحال ہے، ایسا نہیں ہے کہ کسی کو کوئی حصہ آج مل رہا ہو اور کسی کو دو مہینے کے بعد، اور کسی کو سال بھر کے بعد، اور کسی کو دس سال کے بعد مل رہا ہو، جو کچھ بھی ملنا ہے وہ ایک ہی وقت میں ملنا ہے اور آنجناب نے جو قرعہ اندازی کی شکل پیش کی ہے، اس میں دس حصے ہیں، ہر حصے میں دو آدمی شریک ہوں گے اور ہر ایک حصہ ایک ایک سال کے بعد دس سال میں دس حصے حاصل ہوں گے، دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

نیز اس قرعہ اندازی میں سات سات ہزار روپئے فوری طور پر نقد ملتے ہیں اور دوسرے سال چودہ ہزار جمع کر کے ساٹھ ہزار فوری طور پر نقد ملے گا، اسی طرح یہ سلسلہ چلتے چلتے دسویں سال میں جو دو آدمی رہ جائیں گے، ان کا حال یہ ہوگا کہ وہ اپنا ساٹھ ہزار روپئے جمع کرنے کے بعد جائیں گے، تو کسی کی یہ خواہش نہیں ہوتی ہے کہ پورا پیسہ جمع کرنے کے بعد اس کا نمبر آئے؛ بلکہ ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ معمولی حصہ جمع کرنے کے بعد دوسروں کے پیسوں سے فائدہ اٹھائے اور کس کا نام پہلے نکلے گا؟ کچھ پتہ نہیں، کون دوسروں

کے پیسوں سے فائدہ اٹھائیں گے، اور کون نہیں، کوئی خبر نہیں ہے اور معارف القرآن میں جو شکل پیش کی گئی ہے، اس میں جو حصے متعین ہیں اور فوری طور پر ملنے ہیں، چاہے کسی کو بھی مل جائیں؛ اس لئے سائل سے گزارش ہے کہ دوبارہ نظر ثانی فرمالیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍شعبان المعظم ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸؍ ۹۱۰۲۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷؍۸؍۱۴۲۷ھ

لاٹری کی حقیقت

سوال [۹۱۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اروناچل پردیش میں چند کمپنیاں ہیں، جن کا کاروبار یہ ہے کہ ان کے کارندے گھر گھر دوکان، دوکان؛ بلکہ فرد فرد کے پاس جاکر زبردستی انعام کے نام سے ایک رسید پانچ ہزار سے دس ہزار تک کی کاٹ دیتے ہیں اور جب انعام نکلتا ہے تو وہ خود ہی نکلا ہوا انعام آپ کے گھر بھی پہونچا دیتے ہیں اور اگر کوئی انعام نہیں نکلا تو روپے بھی واپس نہیں کرتے ہیں اور بوجہ مجبوری خواہی نخواہی رسید کٹوانی پڑتی ہے، تو کیا ایسی صورت میں کٹوائی ہوئی رسید پر اگر انعام آجائے، تو اس کا لینا جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ کبھی کبھی انعام کی رقم بہت زیادہ ہوتی ہے، جس کی وجہ سے دل حریص ہوجاتا ہے اور اس کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا ہے؛ لہٰذا حضرت مفتی صاحب سے درخواست ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب سے نوازیں۔

المستفتی: محمد اشتیاق، دیوریاوی، حال مقیم اورناچل پردیش

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ لاٹری ہے، جو جوا اور قمار ہی کے دائرہ میں داخل ہے، یہ عمل ناجائز اور حرام ہے، اس سے جو زائد پیسہ آئے گا، وہ قمار کا پیسہ ہے،

جو قطعی طور پر حرام ہے؛ اس لئے مسلمانوں کو اس سے بچنا لازم اور ضروری ہے۔
(مستفاد: ایضاح النوادر ۱۲۳، فتاوی محمودیہ ۲۴/۴۹۱، میرٹھ)

قال اللّٰہ تعالیٰ: یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّیْطَانِ فَاجْتَنِبُوْہُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْن. [سورۂ مائدۃ: ۹۰]

قال ابن عباسؓ، إن المخاطرة قمار، وإن أهل الجاهلية كانوا يخاطرون على المال والزوجة......إلى أن ورد تحريمه. (أحكام القرآن، للجصاص، سورة البقرة، باب تحريم الميسر، زكريا ۱/۳۹۸، سهيد اكيڈمی لاهور ۱/۳۲۹)

القمار من القمر الذي يزداد تارة وينقص أخرىٰ وسميٰ القمار قمارا؛ لأن كل واحد من المقامرين ممن يجوز أن يذهب ماله إلى صاحبه ويجوز أن يستفيد مال صاحبه وهو حرام بالنص. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، فصل في البيع، زكريا ۹/۵۷۷، كراچي ۶/۴۰۳، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ۸/۱۴، رقم: ۹۴۸۶، بتبيين الحقائق، امداديه ملتان ۶/۲۲۷، زكريا ۷/۴۶۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۱۵۱)

لاٹری کی ایک شکل

سوال [۹۱۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ چند مسلم نوجوانوں نے ایک اسکیم بنائی اور اس کی شکل یہ ہے کہ سو روپے ماہوار کے حساب سے ممبر سازی کرتے ہیں اور ان کا نشانہ تقریبا دوسو ممبر بنانا ہے، اس حساب سے ہر ماہ بیس ہزار روپئے ہوں گے، اور ہر ماہ ایک ڈرا کرتے ہیں، جس میں تقریباً اٹھارہ

سوکا سامان بطور لاٹری نکالتے ہیں، جس ممبر کا بھی نام نکلتا ہے، وہ اسکیم سے خارج کردیا جاتا ہے، یہ سلسلہ اسی طرح پچیس ماہ تک چلتا رہے گا، پچیس ماہ پورے ہونے کے بعد باقی ایک سو پچھتر ممبروں کو اٹھارہ سو روپئے کا مال پچیس روپئے میں دیا جائے گا، جس میں تقریباً سات سو روپئے کا فرق ہوگیا، آیا شریعت کی رو سے یہ جائز ہے یا نہیں؟ یہ اسکیم نوجوانان ملت بطور کاروبار چلارہے ہیں۔

المستفتی: محمد حسین اینڈ سنس، ہوسپیٹل پی، او، سوار، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: لاٹری اور اسکیم کا یہ معاملہ شرعی طور پر قمار اور سود میں داخل ہو کرنا جائز اور حرام ہے، قمار میں اس لئے داخل ہے کہ ہر شخص یہ سوچتا ہے کہ میرا نمبر پہلے آئے؛ لیکن آئے گا یا نہیں؟ اس میں تردد ہے اور اسی کا قمار نام ہے۔

تعليق الملك على الخطر. (قواعد الفقه اشرفي ١/٤٣٤، معجم لغة الفقهاء كراچي ٣٦٩)

اور سود میں اس لئے داخل ہے کہ بعض شرکاء کا جتنا جمع کیا جاتا ہے، اس سے زائد ملتا ہے، تو گویا کہ اس نے سود دیا ہے، اس وجہ سے یہ معاملہ جائز نہیں ہے۔

الربوا في الإصطلاح: هو الفضل الخالي عن العوض المشروط في البيع. (المبسوط، دار الكتب العلمية بيروت ١٢/١٠٩، عناية مع الفتح، كوئٹه ٦/١٤٦، دارالفكر ٧/٣، هداية، اشرفي ٣/٧٨، هندية، زكريا قديم ٣/١١٧، جديد ٣/١١٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳ر محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۴۱۶)

لاٹری کی ایک ناجائز اور حرام صورت

سوال [۹۱۲۵]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ لاٹری کی ایک صورت یہ ہے کہ دس آدمی ممبر ہیں، ان میں سے ہر ایک آدمی ۱۰۰۰/ روپئے ہر ماہ جمع کرتا ہے، پھر ان دس میں سے ایک آدمی دس ہزار کو گیارہ ہزار میں خریدتا ہے، پھر ایک ہزار جو زائد خریدا ہے، وہ ایک ہزار ان دسوں میں تقسیم ہوتا ہے، آیا وہ صورت لاٹری کی فروغ تجارت کے لئے جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد جسیم الدین، بروالان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: یہ صورت شرعاً ناجائز اور حرام ہے، نیز دس ہزار کو گیارہ ہزار میں خرید وفروخت کرنا صریح سود ہے، جس کی سخت وعید اور حرمت نص قطعی سے ثابت ہے۔

قال الله تعالىٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [البقرہ: ۲۷۵]

وفي الحديث: عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (صحيح مسلم، باب لعن أكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ۲/ ۲۷، بيت الأفكار رقم: ۱۵۹۸)

وشرعًا: فضل خالٍ عن عوض بمعيار شرعي مشروط لأحد المتعاقدين. (تنوير الأبصار مع الرد، كتاب البيوع، باب الربا، زكريا ۷/ ۳۹۸ تا ۴۰۰، كراچي ۴/ ۱۹۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ شعبان المعظم ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/ ۸۳۷)

مٹکے کی آمدنی کا کیا حکم ہے؟

سوال[۹۱۲۶]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مٹکے کی آمدنی کا کیا حکم ہے؟ صورت اس کی یہ ہوتی ہے کہ اس کے چند نمبرات ہوتے ہیں اور اتنے ہی اس کے ممبر رہتے ہیں اور اس میں سے بعض نمبرات پر اسکیم والے حسب نمبر کچھ انعام رکھتے ہیں، جس کا ہر دن فیصلہ ہوتا ہے اور فیصلہ کے بعد وہ انعام بھی دیگر نمبرات میں بدل جاتا ہے اور اس اسکیم میں ممبران اپنی وسعت اور کمائی کے حساب سے ۵/ روپئے سے لے کر ہزار، ہزار تک کسی نمبر پر لگاتے ہیں، جس میں کبھی ۵/روپئے لگانے والوں کو ۵۰۰۰/ پانچ ہزار مل جاتے ہیں اور کبھی ہزار والوں کو ۵/روپئے ملتے ہیں اور یہ بھی ان گنے چنے اشخاص کو جن کے نمبرات آئے ہیں، ان کے علاوہ بقیہ ممبران کو کسی طرح کچھ نہیں ملتا؛ بلکہ پوری رقم انعام کے بعد اسکیم والوں کی ملک ہوتی ہے، اس سے اکثر لوگ اسکیم میں پوری طرح لٹ جاتے ہیں۔ آخر ماں اور بیوی کو لگا دینے کے سنگین واقعات بھی ہوتے ہیں؛ اس لئے عام لوگ اس اسکیم کو ''جوئے'' سے یاد کرتے ہیں اور عوام کا سنجیدہ طبقہ اس تجارت کو برا اور گناہ کا کام سمجھتا ہے۔ نیز حکومت کے نزدیک یہ اسکیم جرم ہے۔

الغرض مٹکا چلانے والے مذکورہ صورت میں سے ہزاروں روپئے جو آمدنی پا رہے ہیں، اس طرح حاصل شدہ کمائی کو ان کا جائز اور دینی کام مثلاً مدرسہ کے طلبہ کی ضروریات کھانے وغیرہ میں یا مدرسہ اور مسجد کی تعمیر میں خرچ کرنا درست ہے یا نہیں؟ اگر درست نہیں ہے، تو اس کمائی کا صحیح مصرف کیا ہوگا؟

المستفتی: ابرار الحق

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مٹکے اور نمبر لگانے کی جو شکل سوالنامہ میں درج

ہے، وہ قمار اور جوے کی ہے؛ اس لئے یہ حرام اور ناجائز ہے اور جو زائد رقم مل جائے، اس کو واپس کردینا واجب ہوگا۔

من اکتسب مالا بغیر حق، فإما أن یکون کسبه بعقد فاسد کالبیوع الفاسدة والاستئجار علی المعاصي والطاعات، أوبغیر عقد کالسرقة، والغصب، والخیانة، والغلول، ففي جمیع الأحوال المال الحاصل له حرام علیه (إلی قوله) یجب علیه أن یرده علی مالکه إن وجد المالک. (بذل المجهود، کتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور قدیم ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامیة بیروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحدیث: ۵۹، هندیة، زکریا قدیم ۵/۳۴۹، جدید ۵/۴۰۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹/۳۳۴۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۳/۳ھ

کمپنی والوں کا متعدد لوگوں سے روپئے لے کر یک مشت دوسرے کو قرض دینا اور اس سے زائد رقم لینا

سوال [۹۱۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کئی آدمی مل کر ایک دھندا جو بی سی کا کرتے ہیں، عورتیں بھی کرتی ہیں، یعنی بہت سے لوگ ایک کمپنی بناتے ہیں اور ہر ماہ دو ہزار یا چار ہزار روپیہ جمع کراتے رہتے ہیں، پھر سب ایک جگہ بیٹھ کر میٹنگ کرتے ہیں اور اس جمع رقم کو بولی لگا کر کوئی بھی آدمی پچاس ہزار کے ساٹھ ہزار اپنے نام چھڑا لیتا ہے یا ایک لاکھ کے بڑھا کر ایک لاکھ پچیس ہزار میں لے لیتا ہے، ایسی صورت میں یہ دھندا بھی سود میں شامل ہے یا تجارت میں؟

اس کمپنی میں ہندو بھی شامل رہتے ہیں؟ اصل رقم کمپنی میں جمع رہتی ہے اور لینے والا آدمی لی ہوئی رقم واپس زیادہ جمع کرتا ہے۔

المستفتی: حاجی ماسٹر علی محمد راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مذکورہ میں پچاس ہزار کو ساٹھ ہزار میں یا ایک لاکھ روپیہ کو ایک لاکھ پچیس ہزار میں اپنے نام چھڑانا اور لینا یہ معاملہ سود میں داخل ہے؛ کیونکہ یہ صراحتاً نقد کے بدلہ میں نقد ہے جو زیادتی کے ساتھ لیا گیا ہے، جس کا سود ہونا ظاہر ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۷/۲۲-۲۳)

الربا وهو الفضل الخالي عن العوض المشروط في المبيع. (المبسوط، دارالكتب العلمية بيروت ۱۲/۱۰۹)

وهو في الشرع: عبارة عن فضل مالٍ لا يقابله عوض في معاوضة مالٍ بمالٍ. (هندية، كتاب البيوع، الباب التاسع، الفصل السادس، زكريا جديد ۳/۱۸۸، قديم۳/۱۱۷، و هكذا في الهداية، اشر في ۳/۷۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/رجب المرجب ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/۳۳۱/۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/۷/۱۴۲۲ھ

سٹہ لگانا کیسا ہے؟

سوال [۹۱۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سٹہ لگانا کیسا ہے؟ اور اس کے ذریعہ حاصل شدہ رقم جائز ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص بہت غریب ہو اور اس کے پاس کوئی حلال ذریعہ آمدنی نہیں ہے، تو کیا وہ سٹہ کھیل کر اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکتا ہے؟ اسی طرح کوئی مریض ہو، جس کے پاس حلال آمدنی

نہیں ہے، تو کیا وہ سٹہ کھیل کر اپنا علاج کرا سکتا ہے، اسی طرح کوئی مقروض ہو، تو کیا وہ سٹہ کے ذریعہ حاصل شدہ رقم سے اپنا قرضہ ادا کرسکتا ہے؟

المستفتی: رضاء الاسلام، سہارنپور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سٹہ کھیلنا، سٹہ لگانا صریح قمار اور جوا ہے، جس کی حرمت نص قطعی اور آیات قرآنی سے ثابت ہے؛ اس لئے سٹہ کھیلنا کسی بھی طرح جائز نہیں۔

نیز اس میں کیا گارنٹی ہے کہ تم کو مل ہی جائے گا اور جو کچھ ملے گا وہ قطعاً حرام ہے، جب ایسی حالت میں دینے کا نمبر آئے، تو تم کہاں سے لاکر دوگے۔

سوال نامہ میں اس ڈھنگ سے لکھا گیا ہے کہ تم کو مل ہی جائے گا، اگر یہی بات ہوتی کہ مل ہی جائے گا، تو کوئی بھی حرام خور کوئی دوسرا کام نہیں کرتا، سٹہ میں لگا رہتا۔

بہرحال نہ ملے تب بھی یہ فعل حرام ہے، سخت ترین عذاب الٰہی کا سبب ہے، اور اگر مل جاتا ہے، تو عذاب الٰہی کے ساتھ ساتھ ملنے والا پیسہ بھی ایسا ہی حرام ہے جیسا کہ شراب اور خنزیر کا پیسہ حرام ہے؛ اس لئے سٹہ لگانا قطعاً جائز نہیں ہے، اور اس سے ملنے والا پیسہ بھی حلال نہیں ہے، جس کو ملا ہے، اس کو واپس کرنا واجب ہے۔ (مستفاد: عزیز الفتاوی ۶۴۶، جواہر الفقہ ۲/۳۴۴)

قال اللّٰہ تعالیٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ. [سورۂ مائدۃ: ۹۰]

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة والاستئجار على المعاصي والطاعات، أو بغير عقد كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه؛ لكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة ،

باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/ ۳۷، دار البشائر الإسلامية، بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/ ۲۴۶، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ۶/ ۲۷، زكريا ۷/ ۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/ ۳۶۹، کوئٹہ ۸/ ۲۰۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۶۹۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۶/۱۴ھ

سٹہ کی رقم سے بنائے گئے مکان کو سٹہ باز کے لئے ایصال ثواب میں دینا

سوال [۹۱۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص سٹہ کا کام کرتا ہے، اور اس نے اسی کی آمدنی سے مکان خریدے اور اس کے بعد اس شخص کا انتقال ہوگیا۔ اب اس مرحوم کے خریدے ہوئے مکان کے کرایہ سے جو آمدنی ہوتی ہے، اس مکان کے کرایہ کی آمدنی کو کسی کارِ خیر یا مرحوم کے ایصال ثواب کے لئے صدقہ جاریہ کے طور پر استعمال کر سکتے یا نہیں تاکہ مرحوم کی مغفرت کا سامان ہوجائے؟

المستفتی: شنو خاں، مقبرہ اول، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سٹہ کے پیسہ کے بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ جن لوگوں کا پیسہ ہے انہیں کو واپس کردیا جائے۔

يجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹)

اور اگر واپس نہیں کیا ہے، اور اس پیسہ سے مکان خریدلیا ہے، تو غصب کے پیسے سے خریدے ہوئے مکان کے حکم میں ہوگا اور یہ مکان سٹہ باز کی ملکیت میں شمار تو ہوگا؛ لیکن اس

کے اوپر لازم ہے کہ مکان کے پیسوں کے بقدر مالکوں کو واپس کردے اور اگر مالکان تک رسائی ممکن نہ ہوتو اتنا پیسہ بلا نیت ثواب فقیروں کوحوالہ کردینا ضروری ہے اور سٹہ باز کے مرنے کے بعد بھی یہی حکم ہے کہ اس کے وارثین اس مکان کی قیمت کا پیسہ غریبوں کوصدقہ کردیں، اس کے بعد اس مکان کی آمدنی بلا کراہت حلال ہوگی اور ایصال ثواب میں خرچ کرنا بھی جائز ہوگا، اور کار خیر میں دینا بھی جائز ہوگا اور فقیروں غریبوں کو دینے سے پہلے ایصال ثواب کے لئے خرچ کرنا جائز نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی سٹہ باز کو اس کا ثواب پہونچے گا۔

صرح الفقهاء بان من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة والاستئجار على المعاصي والطاعات، أوبغير عقد كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه؛ لكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹)

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فإما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمة عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء، ولو أنفق على نفسه، فقد استحكم ماارتكبه من الفعل الحرام، فيلزم عليه أن يدفعه إلى الفقراء؛ ولكن لا يريد بذلك الأجر والثواب؛ ولكن يريد دفع المعصية عن نفسه. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور قديم ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ ذی قعدہ ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶؍ ۷۸۴۷)

سٹہ کا پیسہ اجرت وغیرہ میں لینا

سوال[۹۱۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید پورے دن سٹہ کا کام کرتا ہے، یہی اس کا ذریعۂ معاش ہے، اس کے علاوہ کوئی اور کام نہیں ہے، اس کے یہاں بچوں کو دینی تعلیم پڑھا کر اجرت لینا کیسا ہے؟ تحفہ لینا، دینا، کھانا، پینا کیسا ہے؟ اجرت لے کر ذاتی کام میں استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟ یا کسی اور کام میں آسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد اشفاق، پیرغیب، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سٹہ اور جوے کا پیسہ قطعی حرام ہے، بعینہ اس پیسے کو اجرت میں لینا منع ہے، ہاں البتہ زید جو سٹہ باز ہے، وہ کسی سے قرضہ لے کر کے اس کے بچوں کو پڑھانے والے کو اجرت دیدے یا تحفہ دیدے یا کھانا کھلائے، پھر اس کے بعد زید اپنے پیسے سے وہ قرضہ ادا کردے، تو بچوں کو پڑھانے والے کے لئے قرضہ کے پیسے سے اجرت لینا اور قرض خواہ کو زید اپنے پیسے سے قرضہ ادا کردے، تو اس کی گنجائش ہے۔ بعینہ سٹہ کا پیسہ اجرت میں لینا جائز نہیں۔

إذا أراد الرجل أن يحج بمال فيه شبهة، فإنه يستدين للحج ويقضي دينه من ما له كذا في فتاوى قاضيخان. (هندية، كتاب المناسك، الباب الأول، زكريا جديد ١/٢٨٣، قديم ١/٢٢٠، قاضيخان، زكريا جديد ١/١٩١، وعلى هامش الهندية ١/٣١٣، الموسوعة الفقهية الكويتية٣/٢٦٥، غنية الناس قديم٨، جديد اشرفية ديوبند٢١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ربیع الاول ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۴۹۱/۳۸)

جوا اور سٹہ کی رقم غریبوں پر صرف کرنا

سوال [۹۱۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جوا یا سٹہ سے جو رقم ہاتھ آئی ہے، اس کو غریبوں پر صرف کر سکتے ہیں یا نہیں؟ مدلل ومفصل جواب مطلوب ہے۔

المستفتی: طفیل احمد ومحمد سلیم الدیم، پورنوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اولاً اصل مالک کو واپس کرنا واجب ہے، یہ ممکن نہ ہو تو فقراء اور غریبوں پر خرچ کر سکتے ہیں۔

یردوا المال إلی أربابہ، فإن لم یعرفوا أربابہ تصدقوا بہ؛ لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبہ. (الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/ ٢٤٦، شامي، زكريا ٩/ ٥٥٣، كراچي ٦/ ٣٨٥، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ٦/ ٢٧، زكريا ٧/ ٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/ ٣٦٩، كوئٹه ٨/ ٢٠١) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۱۹/ ذی قعدہ ۱۴۰۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/ ۳۵۹)

تجارت کی نئی اسکیم اور قمار کی مہذب شکل

سوال [۹۱۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے ایک لکی ڈرا (قرعہ اندازی) کی اسکیم بنا کر دو سو آدمیوں کو اس کا ممبر بنایا اور ممبر سے ممبر شپ کے لئے ۱۰/ ۱۰/ روپئے لئے، قرعہ اندازی اور اس اسکیم کا طریقہ کار یہ ہے کہ ہر ممبر ہر ہفتہ ۲۰-۲۰ روپئے زید کو دیتا ہے اور ہر ہفتہ قرعہ اندازی ہوتی ہے پہلے ہفتہ

کی قرعہ اندازی میں جس ممبر کا نام آگیا اسے صرف ۳۰؍روپے دینے پر تقریباً بارہ تیرہ سو کی ملکیت کا سامان مل گیا اسی طرح دوسرے تیسرے چوتھے اور بعد کے ہفتوں میں جن جن کا نام آیا انہیں ایک ہزار، ۹؍سو، ۸؍سو، ۷؍سو، ۶؍سو کی قیمت کا سامان ملتا ہے اور جس ممبر کا نام قرعہ میں آجاتا ہے اس ممبر کو اس کے بعد ۲۰؍روپئے ہفتہ دینے نہیں پڑتے، یہ اسکیم سولہ ہفتہ کی ہے، آخری ہفتہ کی رقم ان لوگوں کو دینی پڑتی ہے جن کا نام پندرہویں ڈرا میں آیا نہیں، سولہویں ڈرا میں بقیہ ممبر کو ۱۰۰۱-۱۰۰ روپئے کی قیمت کا سامان ملتا ہے، جب کہ انہوں نے ۳۵۰ روپئے ادا کئے ہیں۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طرح کی اسکیم کے تحت رقم لینا اور سامان دینا اور اس طرح کی اسکیم میں شریک ہونا کیسا ہے؟ کیا شریعت مطہرہ میں اس طرح کی اسکیم چلا کر ایسی تجارت کرنے کی شریعت اجازت دیتی ہے اور اگر نہیں ہے، تو اس اسکیم کو قمار میں شمار کیا جائے گا؟

اس طرح کی اسکیم بنا کر اور اس مقصد کے تحت کہ اس سے حاصل شدہ رقم سے غریب طلبہ کو دینی اور دنیاوی تعلیم دی جائیں گی اور غرباء کی مدد کی جائے گی ایک ایسا ادارہ بھی چلاتا ہے جو عربی مدرسہ بھی چلاتا ہے اور اس مدرسہ کے بچوں کو اسی سے مدد بھی دی جاتی ہے تو کیا ان کا یہ عمل اور طریقہ کار صحیح ہے؟ اور کیا عربی مدارس میں اس طرح سے حاصل شدہ رقم کھانا درست ہے؟ بینوا توجروا۔

المستفتی: محمد روشن علی ابن مرحوم شیخ اکبر حسین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: متعدد وجوہ سے یہ اسکیم ناجائز اور حرام ہے۔

(۱) یہ عقود شرعیہ میں سے کسی میں بھی داخل نہیں ہے نہ بیع میں، نہ سلم میں، نہ ہبہ میں، نہ شرکت میں، نہ مضاربت میں۔

(۲) جو رقم قسطوار جمع ہوتی ہے وہ تمام ممبران کی مساوی ملکیت ہے قرعہ اندازی کے ذریعہ تمام ممبران کی ملکیت کا بلا معاوضہ ایک شخص کو مالک بنادیا جاتا ہے دیگر ممبران واقعی راضی نہیں ہوتے اور اگر ہوں تو مجبوراً کیونکہ ہر ایک کی تمنا اور لالچ رقم جمع کرنے میں یہ ہے کہ قرعہ میں میرا ہی نام نکل آوے اور یہ شرعاً قمار میں داخل ہے۔

(۳) شرکت میں اس لئے داخل نہیں ہے کہ اس میں نقصان و منافع میں سب کا برابر شریک ہونا شرط ہے، مضاربت میں اس لئے داخل نہیں کہ اس میں جمع شدہ رقم رب المال کی ملکیت سے نہیں نکلتی نیز مضارب تصرفات میں رب المال کے تابع بھی ہوتا ہے جو یہاں مفقود ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۲۲۸/۸، فتاوی رحیمیہ ۱۴۲/۶، امداد الفتاوی ۱۶۲/۴، فتاوی محمودیہ ۲۰۴/۴)

(۱) اس طرح کی اسکیم میں حصہ لینا اور اس میں شرکت کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔

(۲) شرعاً یہ اسکیم قمار میں داخل ہے اس میں شرکت ہرگز جائز نہیں۔

قوله سبحانه تعالیٰ: اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ . [سورة المآئدہ: ۹۰]

(۳) اس سے حاصل شدہ رقم مدارس اور دینی امور میں لگانا جائز نہیں ہے؛ کیونکہ دینی امور اور مسجد و مدارس میں حلال مال لگانا لازم ہے حرام مال جائز نہیں ہے، نیز اس رقم کو قرعہ میں جیتنے والے کے لئے استعمال کرنا بھی جائز نہیں ہے؛ بلکہ واپس کردینا واجب ہے۔

عن أبي هريرة رضـ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أيها الناس! إن الله طيب، لا يقبل إلا طيبًا. (صحيح مسلم، باب قبول الصدقة من الكسب الطيب الخ النسخة الهندية ۳۲۶/۱، بيت الأفكار ۱۰۱۵، مسند أحمد بن جنبل ۳۲۸/۲، رقم: ۸۳۳۰)

اما لو أنفق في ذلک مالاً خبيثًا ومالا سببه الخبيث والطيب فيكره؛ لأن الله لا يقبل الا الطيب الخ. (شامي، مطلب في أحكام المسجد زكريا ۴۳۱/۲، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء جديد دار البشائر الإسلامية بيروت ۳۵۹/۱، قديم مطبع سهارن پور ۳۷/۱، كراچي ۶۵۸/۱)

لكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۳۷/۱، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۳۵۹/۱، تحت رقم الحديث: ۵۹، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۴۶/۳۴، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ۲۷/۶، زكريا ۶۰/۷، البحرالرائق، زكريا ۳۶۹/۹، كوئٹه ۲۰۱/۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹۰/ذی قعدہ ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۴۷۸/۲۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۰۹/۱۱/۱۰ھ

کمیٹی کی ایک شکل اوراس کا حکم

سوال [۹۱۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ دس آدمیوں نے مل کر ایک کمیٹی بنائی جس کے تحت انہوں نے یہ طے کیا کہ تمام لوگ ہر مہینے ایک ایک ہزار روپئے جمع کرلیا کریں گے، تو اس طرح سے ایک مہینے میں دس ہزار روپئے جمع ہو جائیں گے اور پھر قرعہ اندازی کریں گے، جس کا بھی نام آجائے گا اس کو دس ہزار مل جائیں گے، اس کو جہاں چاہے استعمال کرے پھر یہی دس حضرات اگلے مہینے دس ہزار جمع کریں گے، تو جس کا نام پہلی مرتبہ یا اس سے پہلے نکل چکا ہے، اس کو چھوڑ کر قرعہ اندازی کریں گے؛ البتہ جس کا نام قرعہ اندازی میں پہلی مرتبہ میں نکل چکا تھا، اس کو آخر تک پیسے جمع کرنے ہوں گے، تو اس طرح ہر آدمی کو اس کے دس ہزار جو دس ماہ میں جمع ہوئے تھے مل جائیں گے، تو اب سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح کا معاملہ کرنا جائز ہے؟

المستفتی: محمد واصف، امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اس معاملہ میں سود نہیں ہے، مگر شبہۃ القمار ہے،

وہ یہ ہے کہ ہر ایک چاہتا ہے کہ میرا نام پہلے نکلے اور میں پہلے فائدہ اٹھاؤں یہی شبہۃ القمار ہے؛ لیکن یہ معاملہ اس شرط کے ساتھ درست ہوگا کہ اس میں با قاعدہ ایگریمنٹ اور ضمانت ہو اور بغیر اگریمنٹ اور ضمانت کے یہ معاملہ درست نہیں ہوگا؛ اس لئے کہ جس کا نمبر شروع میں آگیا ہے، وہ پیسہ لیکر فرار ہو جائے، تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟ یا آئندہ قسطوں کی ادائیگی سے مکر جائے، تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا؛ اس لئے ضمانت اور اگریمنٹ لازم ہے؛ لہٰذا بغیر سرکاری ایگریمنٹ کے ایسا معاملہ کرنا درست نہیں ہے۔

وذكر الناطفي: إن القرعة ثلاثة–إلى– والثالثة: لإثبات حق واحد في مقابلة مثله فيفرز بها حق كل واحد منهما وهو جائز.

(هندية، الباب الخامس في الرجوع عن القسمة واستعمال القرعة فيها زكريا قديم ٥/٢١٧، جديد ٥/٢٥٢، الفتاوى التاتارخانية زكريا ١٧/١٧٧، رقم: ٢٦٨٧٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍رجب المرجب ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۰؍۱۱۱۹۲)

بسی کا حکم

سوال [۹۱۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بیس آدمی ممبر بنے اور پانچ پانچ سو روپئے ہر مہینہ جمع کرنے کا پروگرام بنا اور یہ بات طے ہوئی کہ ہر ماہ قرعہ اندازی کر کے ایک ایک فرد اپنی ضرورت کے لئے وہ رقم لیتا رہے گا، کیا اس طرح کرنا شرعاً درست ہے اور دوسری شکل یہ ہے کہ کسی ایک ممبر نے سخت ضرورت کے پائے جانے کی بنا پر کہا کہ جو رقم دس ہزار روپیہ جمع ہے میں اس کو نو ہزار پر لے جا رہا ہوں، سارے ممبران منافع مان کر آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس ایک ہزار رقم کو آپس میں منافع سمجھ کر تقسیم کر لینا اور پھر اپنی ذاتی ضرورت میں خرچ کرنا کیا شرعًا جائز ہے؟ تفصیل سے آگاہ فرمائیں۔

المستفتی: ماسٹر صدیق عمر، عباسی جنرل اسٹور چوک گونڈہ (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پہلی شکل میں اگرچہ سود لازم نہیں آرہا ہے؛ لیکن شبہۃ القمار ہے کہ ہر ایک شخص اسی امید پر اپنا پیسہ جمع کرتا ہے کہ اب کے میرا نام نکلے گا نہیں نکلتا ہے بیس میں سے کسی ایک فرد کا نکلتا ہے، دوسرے لوگ مجبوراً مان لیتے ہیں؛ اس لئے اس شکل کو بھی ہم جائز نہیں سمجھتے۔

نیز اس میں سرکاری طور پر ایگریمنٹ نہ ہونے کی وجہ سے جن ممبروں کو پیسہ مل چکا ہے ان کے آخر تک باقی رہنے کی کوئی گارنٹی نہیں ہے اور جن لوگوں نے اس شکل کو جائز قرار دیا ہے اس سے ہم کو اتفاق نہیں ہے؛ اس لئے کہ قرعہ اندازی کا معاملہ وہاں جائز ہوتا ہے جہاں پر بالفعل سب کو حصہ ملنے والا ہو؛ البتہ حصہ کی تعیین کے بارے میں قرعہ اندازی کی جائے تو شرعاً جائز ہے اور یہاں پر ایسا نہیں ہے؛ بلکہ ہر مرتبہ غیر متعین طور پر صرف ایک شخص کا حصہ موجود ہوتا ہے جو قرعہ اندازی کے ذریعہ سے متعین ہوتا ہے؛ لہٰذا حقوق مالیہ میں جہاں سب کا حصہ بالفعل موجود نہ ہو اور سب کو فی الحال حصہ ملنے والا نہ ہو وہاں قرعہ اندازی درست نہیں ہے، اور سوال نامہ میں جو دوسری شکل ذکر کی گئی ہے کہ اس معاملہ میں شریک لوگوں میں سے کسی ایک شخص کو پیسوں کی زیادہ ضرورت ہو اور وہ اپنی باری آنے سے پہلے روپیہ لینا چاہ رہا ہو تو وہ کم پیسے لینے پر تیار ہو جائے اور باقی رقم بقیہ شرکاء آپس میں تقسیم کر لیں تو یہ شکل صراحۃً سود کی ہے اور قطعًا جائز نہیں ہے، اس میں شرکت کرنا بھی ناجائز ہوگا۔ (مستفاد: کتاب الفتاوی ۳۴۲/۵، معارف القرآن ۲۲۷/۳)

والحاصل أن الربا حرام. (در مختار مع الشامي، کتاب البیوع، باب الربا ۴۲۴/۷، کراچي ۱۸۷/۵)

تجری القرعة في مواضع منها الأول في تمييز المستحق إذا ثبت الاستحقاق ابتداء لمبهم غير معين عند تساوي المستحقين. (الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۳/ ۱۳۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۹۵۱۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۵/۶ھ

قرعہ اندازی کا حکم

سوال [۹۱۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کچھ لوگ مل کر ایک کمیٹی بناتے ہیں اور ہر مہینے مثلاً سوسو روپئے جمع کرتے ہیں، پھر پرچیوں میں نام لکھتے ہیں، جس کا نام نکلتا ہے تو وہ رقم جو اس مرتبہ جمع ہوئی ہے اس کو مل جاتی ہے اور یہ آدمی آئندہ بھی ہر مہینے پیسے جمع کرتا رہتا ہے، اس طرح چند مہینوں میں ہر شخص کو اس کی جمع کی ہوئی پوری رقم بغیر کسی کمی اور زیادتی کے مل جاتی ہے تو یہ طریقہ سود یا جوا تو نہیں ہے؟

المستفتی: قمرالدین نہٹور بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں قرعہ اندازی سے برابر سرابر رقم کا لین دین اصولاً تو جائز معلوم ہوتا ہے؛ لیکن قرعہ اندازی کی وجہ سے تملیک علی الخطر کا شائبہ پیدا ہونے کی بنیاد پر یہ معاملہ کراہت سے خالی نہ ہوگا؛ کیونکہ اس میں ایک طرح سے جوئے کی مشابہت پائی جارہی ہے۔

نیز آئندہ ہر شریک رقم جمع کرے گا اس کی بھی گارنٹی اور ضمانت لینا مشکل ہے اور ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں کہ جس کا نام نکل جاتا ہے وہ رقم لے کر غائب ہوجاتا ہے تو اس سے رقم واپسی کی کوئی صورت نہیں رہتی ہے؛ اس لئے اس کو اگر چہ جوا اور قمار نہیں کہا

جا سکتا؛ لیکن شبہۃ القمار ضرور ہے جو درجۂ کراہت سے نیچے نہیں؛ لہٰذا احتیاط اسی میں ہے کہ اس طرح کی اسکیموں میں شرکت نہ کی جائے۔

عن نعمان بن بشیرؓ، یقول: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: الحلال بين والحرام بين وبينهما مشتبهات لا يعلمها كثير من الناس فمن اتقى المشتبهات استبرأ لدينه وعرضه ومن وقع في الشبهات كراع يرعىٰ حول الحمىٰ يوشک أن يواقعها. (بخاري شريف، باب فضل من استبرأ لدينه النسخة الهندية ١/١٣، رقم: ٥٢)

وحقيقة تمليک المال على المخاطرة: وحواصل في بطلان عقود التمليكات الواقعة على الأخطار الخ. (أحكام القرآن للجصاص، باب تحريم الخمر، سهيل اكيڈمی لاهور ٢/٤٦٥، زكريا ٢/٥٨٢)

لو كان الخطر من الجانبين جميعًا ولم يدخلا فيه محلا لا يجوز؛ لأنه في معنى القمار. (بدائع الصنائع، كتاب السباق، زكريا ٥/٣٠٦، كراچي ٦/٢٠٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ جمادی الثانیہ ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۷۱۵/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۶/۸ھ

(۸) باب الرشوة

ہندوستان میں رشوت لینے دینے کا حکم

سوال [۹۱۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اس بھارت دیش میں رشوت لینا اور دینا جائز ہے یا نہیں؟ مع دلیل کے جواب دیں۔

المستفتی: عبداللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر رشوت دیئے بغیر اپنا حق واجبی حاصل نہیں ہوسکتا، یا رشوت نہ دینے سے مالی یا جانی نقصان کا خطرہ ہے، تو رشوت دے کر ظلم سے بچنے کی گنجائش ہے، ہرجگہ جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ۱۴۲، فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۱۷/۵-۳۳۹/۱۵، جدید ڈابھیل ۴۵۵/۱۶-۴۵۶)

عن وهب بن منبه قال: ليست الرشوة التي يأثم فيها صاحبها، بأن يرشو فيدفع عن ماله ودمه، إنما الرشوة التي تأثم فيها أن ترشو تعطي ماليس لک. (السنن الكبرى للبيهقي، دارالفكر، بيروت ١٤٦/١٥، رقم: ٢١٠٦٩)

لا بأس بالرشوة إذا خاف على دينه (وتحته في الشامية) دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه، وماله، ولاستخراج حق له، ليس برشوة يعني في حق الدافع. (در مختار مع رد المختار، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٤٢٣/٦، زكريا ٦٠٧/٩، البحرالرائق، كتاب القضاء،

کوئٹه ٦/٢٦٢، زکریا٦/٤٤١، هندية، كتاب الهبة، الباب الحادي عشر في المتفرقات، زكريا قديم ٤/٤٠٣، جديد ٤/٤٣١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ ؍ذی قعدہ ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳ ؍۵۵۲۴)

دفع ظلم اور حق کی وصولیابی کے لئے رشوت

سوال [۹۱۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں محمد عارف ساکن مرادآباد بحیثیت استاد علی گڈھ یونیورسٹی میں ہوں، میرے پاس راشن کارڈ نہیں ہے، اس کے بنوانے کے لئے باضابطہ کارروائی کی جائے، تو بننا مشکل ہی نہیں؛ بلکہ ناممکن سا لگتا ہے؛ البتہ ۵۰ ؍روپیہ رشوت دینے پر بن جانے کا غالب امکان ہے، آیا یہ رشوت اس صورت میں دینا مناسب ہے اور اگر ہے تو یہ رشوت سود کے پیسہ سے دی جائے، تو مناسب ہے یا نہیں؟

المستفتی: ڈاکٹر محمد عارف صدیقی، استاذ میکینکل انجیرنگ، علی گڈھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: رشوت کا لینا دینا دونوں حرام ہے، حدیث شریف میں آیا ہے۔

عن أبي سلمة بن عبد الرحمن عن أبيه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الراشي والمرتشي في النار. (مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم، بيروت ٣/٢٤٧، رقم: ١٠٣٧، المعجم الأوسط، دارالفكر بيروت ١/٥٥٠، رقم: ٢٠٢٦)

البتہ دفع ظلم اور اپنا حق وصول کرنے کے لئے بحالت مجبوری رشوت دینے کی گنجائش ہے، اس صورت میں صرف رشوت لینے والا گناہ گار ہوگا۔

ومنها إذا دفع الرشوة خوفا على نفسه، أو ماله، فهو حرام على آخذ

غير حرام على الدافع. (البحرالرائق، كتاب القضاء، كوئٹه ٦/٢٦٢، زكريا ٦/٤٤١، شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٦/٤٢٣، زكريا ٩/٦٠٧، هندية، كتاب الهبة، الباب الحادي عشر في المتفرقات، زكريا قديم٤/٤٠٣، جديد ٤/٤٣١)

لیکن یہ رشوت سود کے پیسے سے دینا جائز نہ ہوگا؛ کیونکہ سود حرام مال ہے اور حرام مال میں اولاً واجب اصل مالک کو واپس کرنا ہے اور اصل مالک تک رسائی ممکن نہ ہو، تو فقراء کو بلانیت ثواب دینا لازم ہوگا۔ بذل المجہود میں صراحت موجود ہے۔

واما إذا كان عند رجل مال خبيث، فإما إن ملكه بعقد فاسد، أو حصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمة عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مصري ١/٤٨، مطبع سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ رشعبان المعظم ۱۴۰۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳ /۲۱۴)

مجبوری میں رشوت دینا

سوال [۹۱۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بعض مدارس اسلامیہ یوپی سرکار سے ملحق ہیں اور حکومت کی طرف سے انہیں تنخواہ ملتی ہے؛ لیکن سرکاری افسران کو رشوت دیئے بغیر تنخواہ کا وصول کرنا ناممکن ہے، تو کیا بدرجۂ مجبوری سرکاری افسران کو سود کا روپیہ دیا جا سکتا ہے؟

المستفتی: مولوی بہاء الدین، مدرسہ دار العلوم ادری، مؤ (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سرکاری افسران کو رشوت دیئے بغیر جب تنخواہ کا

نکالنا مدرسین کے لئے ناممکن ہے، تو بدرجۂ مجبوری اپنی جیب خاص سے حلال پیسہ دینا جائز ہوگا، اس میں دینے والا گنہگار نہ ہوگا اور لینے والا حرام خور اور گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا؛ لیکن رشوت میں سود کا پیسہ دینا جائز نہیں اور سود کا پیسہ رشوت میں دینا؛ اس لئے جائز نہیں کہ سود کا پیسہ صرف دو جگہ دیا جا سکتا ہے۔

(۱) کسی بھی عنوان سے اصل مالک کو واپس کر دیا جائے اور جن آفیسروں کو رشوت دی جاتی ہے، وہ اصل مالک نہیں ہیں۔

(۲) اگر اصل مالک تک رسائی نہ ہو سکے، تو بغیر نیت ثواب فقیروں اور مسکینوں کو دیدینا لازم ہے اور شوت لینے والے افسران فقیر اور مسکین بھی نہیں ہیں۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱۰۰)

دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه، وماله، ولاستخراج حق له، ليس برشوة يعني في حق الدافع. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٦/٤٢٣، زكريا ٩/٦٠٧، البحرالرائق، كتاب القضاء، كوئٹه ٦/٢٦٢، زكريا ٦/٤٤١، هندية، زكريا قديم ٤/٤٠٣، جديد ٤/٤٣١)

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة والاستئجار على المعاصي (إلى قوله) ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه؛ لكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه، ويجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، قديم مصري ١/١٤٧، مطبع سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ صفر المظفر ۱۴۳۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۵۰۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۷/۲/۱۵ھ

مجبوراً رشوت دینے کا حکم

سوال [۹۱۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ضلع جج کے یہاں ضلع جج اپنے خاص آدمی پی اے کے ذریعہ روپیہ لے کر ضمانت منظور کر دیتا ہے، ورنہ فریق ملزم کو ضمانت خارج ہونے کی صورت میں الہ آباد کورٹ سے ضمانت کروانی پڑتی ہے، اس سلسلہ میں زاہد پیشکار کے پاس کوئی فریق آتا ہے، تو جج کے پی اے کے پاس بھیج دیتا ہے۔ اب اگر وہ پی اے زاہد کے فریق بھیجنے پر زاہد کو کچھ روپیہ دیتا ہے، تو کیا یہ روپیہ زاہد کے لئے جائز ہے؟

فوج داری کے معاملات میں دوسرا فریق نہیں ہوتا، دوسرا فریق پولیس ہے، زمین جائیداد کے معاملات میں دوفریق ہوتے ہیں، ایک کا کام کرانے پر دوسرے کی حق تلفی ہوتی ہے۔

المستفتی: محمد انور پیشکار، ضلع جج، محلّہ نواب کا سنگنج، کانشی رام نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: رشوت دیئے بغیر جج کی طرف سے ضمانت وغیرہ کسی بھی معاملہ میں اگر پریشانی ہوسکتی ہے، تو پریشانی کو دور کرنے کے لئے دفع مضرت کے طور پر رشوت دینا جائز ہے، دینے والا گنہگار نہ ہوگا اور لینے والے کے لئے پیسہ بھی حرام ہے، اور لینے والا گناہ گار بھی ہوگا۔ اور رشوت لینے میں جو لوگ بھی شامل ہوں گے، وہ سب گنہگار رہوں گے۔

عن عبد الله بن عمرو رضـ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم: الراشي والمرتشي. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما جاء في الراشي والمرتشي في الحكم، النسخة الهندية ۱/ ۲٤۸، دارالسلام رقم:۱۳۳۷، سنن أبي داؤد، كتاب القضاء، باب في كراهية الرشوة، النسخة الهندية۲/ ٥۰٤، دارالسلام رقم: ۳٥۸۰،

سنن ابن ماجه، كتاب الأحكام، باب التغليظ في الحيف والرشوة، النسخة الهندية ١/١٦٧، دارالسلام رقم:٢٣١٣)

أما إذا أعطىٰ ليتوصل به إلى حق، أو ليدفع به عن نفسه ظلماً، فلابأس به. (مرقاة المفاتيح، كتاب الأمارة والقضاء، باب رزق الولاة و هداياهم، الفصل الثاني، امدادية ملتان ٧/٢٤٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰؍ جمادی الثانیہ ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹؍۱۰۷۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۶/۳۰ھ

ناجائز جگہ پر سودی رقم رشوت دینا

سوال [۹۱۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل دیکھا جا رہا ہے کہ کسی تنازع کے سلسلے میں معاملہ تھانہ، کورٹ میں چلا جاتا ہے، جہاں پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے، تاکہ فیصلہ اپنے حق میں آجائے، ایسے موقعوں پر رشوت دینے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا جو کہ شرعاً ناجائز ہے۔ تھانہ کے اخراجات اور کورٹ میں وکیلوں کو فیس اور جج کو رشوت وغیرہ دینے کے لئے بینک سے ملنے والی سود کی رقم کو بے دریغ و بے جھجک استعمال کیا جا رہا ہے، اور ان کو منع کرنے پر یہ جواب دیا جاتا ہے کہ ناجائز پیسہ ناجائز جگہ استعمال کیا جا رہا ہے، اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔

(۱) کیا سود کی رقم ایسے موقعوں پر استعمال کرنے کی شریعت اجازت دیتی ہے؟

(۲) اگر مسجد یا مدرسہ کا کیس کورٹ میں چل رہا ہو، تو وہاں پر سود کی رقم فیس دینے کے لئے یا رشوت دینے کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے؟

(۳) زید کا اگر کوئی ذاتی کیس کورٹ میں چل رہا ہو، تو کیا وہ سود کی رقم کورٹ کے اخراجات میں لگا سکتا ہے؟

المستفتی: امام الدین، جوئے، سابق صدر ضلع وقف کمیٹی کھرگون (ایم پی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک سے حاصل شدہ رقم سودی کسی بھی عنوان سے سرکاری فنڈ میں واپس کرنا جائز ہے؛ لہٰذا انکم ٹیکس کے عنوان سے سیل ٹیکس کے عنوان سے، رجسٹری اسٹامپ فیس کے عنوان سے دینا جائز ہے؛ اس لئے کہ حرام مال کا حکم یہی ہے کہ کسی بھی عنوان سے اصل مالک کی ملکیت میں واپس چلا جائے۔ اور یہاں ایسا ہی ہے؛ لیکن سرکاری آفیسر کو رشوت میں دینے سے اور وکیل کو وکالت کی فیس دینے سے حکومت کے فنڈ میں جمع نہیں ہوتا ہے؛ اس لئے یہ جائز نہیں ہے، چاہے مسجد اور مدرسہ کے کیس میں دیا جائے، یا کسی فرد کے اپنے ذاتی کیس میں دیا جائے، سب کا حکم یکساں ہے، ہاں البتہ دفع ظلم کے لئے رشوت میں ذاتی رقم دینے کی گنجائش ہے، ایسی صورت میں دینے والا گنہگار نہیں ہوگا، لینے والے کے لئے حرام ہوگا۔

ينبغي لمتصدق الحرام أن يزعم بتصدق المال تخليص رقبته، ولا يرجو الثواب منه. (العرف الشذي، أبواب الطهارة، باب ماجاء لا تقبل صلوة بغير طهور ۳/۱)

فكان الأخذ معصية، والسبيل في المعاصي ردها. (هندية، كتاب الكراهية،الباب الخامس عشر في الكسب، زكريا قديم ۵/۳۴۹، جديد ۵/۴۰۴)

والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم. (شامي، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب فيمن ورث مالا حراما، كراچي ۵/۹۹ زكريا ۷/۳۰۱)

واما إذا كان عند رجل مال خبيث، فإما إن ملكه بعقد فاسد، أو حصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة ......لأنه لو أنفق على نفسه، فقد استحكم ماارتكبه من الفعل الحرام. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مصري ۱/۴۸، جديد دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹)

دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه، وماله،

ولاستخراج حق له، ليس برشوة يعني في حق الدافع. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٦/٤٢٣، زكريا ٩/٦٠٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹ر محرم الحرام ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۵۹۹/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۱/۱۹ھ

مدت قیام بڑھا کر رشوت لینا

سوال [۹۱۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے غیر مسلم سے برائے مسافرین قیام ہوٹل خریدا، ان مسافرین میں سے بعض مسافر ایسے بھی قیام فرماتے ہیں، جو کمپنی کے ہوتے ہیں، ان مسافروں کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے قیام کی مدت کو مالک ہوٹل سے زیادہ کر کے لکھاتے ہیں۔ اور اس کے عوض بطور رشوت کے کچھ پیسے دیدیتے ہیں، جیسا کہ یہ معاملہ غیر مسلم مالک سے کرتے تھے۔ اب یہ زید سے بھی کرنا چاہتے ہیں؛ لہٰذا زید کو اس طرح مدت قیام کو بڑھا کر لکھنا اوران سے زائد پیسہ بطور رشوت کے لینا دینا کیسا ہے؟ اگر یہ صورت ناجائز ہے، تو کوئی صورت جواز کی جوطرفین کے حق میں نکل سکتی ہو تحریر کریں۔

المستفتی: محمد غفران مدرس مدرسہ تعلیم القرآن، شیر کوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کے لئے کسی مسافر کے کہنے پر مدت قیام بڑھا کر لکھنا اور اس پر رشوت لینا ناجائز اور حرام ہے، اس سے احتراز لازم ہے۔

عن عبد الله بن عمرو رضـ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم: الراشي والمرتشي. (ترمذي، أبواب الأحكام، باب ما جاء في الراشي والمرتشي، النسخة الهندية ١/٢٤٨، دار السلام رقم: ١٣٣٧، سنن أبي داؤد، كتاب القضاء،

باب في كراهية الرشوة، النسخة الهندية ٢/٤ ٥٠، دارالسلام رقم: ٣٥٨٠، سنن ابن ماجه، كتاب الأحكام، باب التغليظ في الحيف والرشوة، النسخة الهندية ١/١٦٧، دارالسلام رقم:٢٣١٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍شعبان المعظم ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/۱۸/ ۹۷۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۸/۱۶ھ

کرایہ دار کا بیس ہزار روپیہ لے کر مکان خالی کرنا

سوال [۹۱۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مکان مالک اور کرایہ دار میں مکان خالی کرانے کے سلسلہ میں مقدمہ شروع ہوگیا، اور یہ سلسلہ کئی سال تک چلتا رہا، جس میں دونوں فریقوں کا وقت اور پیسہ برباد ہوتا رہا، بعدہ کرایہ دار نے مبلغ ۲۰۰۰۰/ ہزار روپیہ رشوت کا (بطور پگڑی) لے کر مکان خالی کردیا۔ کیا مکان مالک سے روپیہ لے کر مکان خالی کرنا جائز ہے؟ اور کیا ایسے شخص کے پیچھے نماز درست ہے؟

المستفتی: محمد رئیس، پریم نگر، کانپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بلا کسی عذر شدید کے کرایہ دار بغیر پگڑی (رشوت) مکان خالی نہیں کرتا ہے، اور بوقت کرایہ داری مالک مکان نے کرایہ دار سے یکمشت کوئی رقم بنام قبضہ دہی نہیں لی تھی، تو مذکورہ ۲۰۰۰۰/ ہزار روپیہ کرایہ دار کے حق میں رشوت اور حرام ہے، اس کا واپس کرنا لازم ہے، ورنہ وہ فاسق ہے، اس کی امامت مکروہ تحریمی ہوگی۔

الرشوة لا تملك بالقبض الخ. (الدر المختار، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٦/٤٢٣، زكريا ٩/٦٠٧)

ویکره تقديم الفاسق كراهة تحريم. (صغيرى، مطبع مجتبائي، دهلي ٢٦٤، حلبي كبير، الأولى بالإمامة اشرفيه ديوبند ٥١٣، هداية، اشرفي ديوبند ١٢٢/١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۰۵۹)

مالک مکان کا کرایہ دار کو رقم دینا رشوت میں داخل ہے

سوال [۹۱۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مکان مالک اور کرایہ دار دونوں نے مل کر ایک شخص کے پاس تیس ہزار روپیہ جمع کئے اور یہ طے ہوا کہ اس مدت تک اگر کرایہ دار مکان خالی نہ کرے، تو کل رقم مالک مکان کو دیدی جائے اور اگر کرایہ دار طے شدہ مدت میں خالی کر دے، تو کرایہ دار کل رقم لے جائے۔ کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

المستفتی: محمد رئیس، پریم نگر، کانپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: اگر مذکورہ رقم مالک مکان کی ہے، اور اس نے مجبور ہو کر یہ رقم جمع کر دی ہے، اور مدت مقررہ پر کرایہ دار مکان خالی کر کے جمع شدہ رقم لے لے، تو یہ رشوت ہے، یہ کرایہ دار کے لئے حرام ہے، اور مالک مکان کے حق میں رشوت نہیں ہے، اور نہ ہی وہ گنہگار ہوگا۔

دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه، وماله، ولاستخراج حق له، ليس برشوة يعني في حق الدافع. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٤٢٣/٦، زكريا ٦٠٧/٩، البحرالرائق، كتاب القضاء، كوئٹه ٢٦٢/٦،

زکریا۶/ ۴۴۱، هندية، زکريا قديم ۴/ ۴۰۳، جديد ۴/ ۴۳۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۰۵۹)

ٹھیکہ لینے کے لئے رشوت دینا

سوال [۹۱۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل ٹھیکداری کا حال یہ ہے متعینہ رقم میں سے سرکاری عملے کو ۱۰/ فیصد کے حساب سے دینا پڑتا ہے، اگر نہ دی جائے تو کام کی منظوری ہی نہیں ہو پاتی ہے۔ ایسا کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: مبارک حسین، مدرسہ بدر العلوم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سرکاری کاموں کو ٹھیکے پر لینا اور پھر ٹھیکے دار کے لئے سرکاری کام کرا کر اپنے لئے کچھ بچا لینا جائز اور درست ہے، اور کام کی منظوری میں آفیسر لوگ اگر رشوت لیتے ہیں، تو مجبوری میں رشوت دینے سے ٹھیکیدار گنہگار نہیں ہوگا؛ بلکہ رشوت لینے والے آفیسر لوگ گنہگار ہوں گے۔ اور سرکار سے معاملہ طے کرنے کے بعد ٹھیکیدار کا سرکاری کام مکمل کر کے اپنے لئے بچا لینا ایک قسم کا تجارتی نفع ہے، جو شرعاً جائز اور درست ہے، جیسا کہ سڑک کی تعمیر اور روڈ کی مرمت وغیرہ کے لئے سرکاری کاموں کو ٹھیکے پر لیا جاتا ہے، اور ان کاموں کے حصول میں آفیسروں کو رشوت بھی دینی پڑتی ہے، یہ شرعاً جائز اور درست ہے، ایسے معاملات میں صرف آفیسر لوگ گنہگار ہوں گے، جنہوں نے رشوت لی ہے، ٹھیکیدار گنہگار نہیں ہوں گے۔

دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه، وماله، ولاستخراج حق له ليس برشوة يعني في حق الدافع. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ۶/ ۴۲۳، زكريا ۹/ ۶۰۷)

اور سرکاری کاموں کو ٹھیکے پر لینے اور راشن تقسیم کرنے والے ڈیلر کے معاملہ میں کسی قسم کی مطابقت نہیں ہے؛ اس لئے کہ راشن تقسیم کرنے والا ڈیلر سرکار سے جو راشن حاصل کرتا ہے، وہ لوگوں کے راشن کارڈ کی تعداد اور ان کے نام سے حاصل کرتا ہے؛ اس لئے دونوں یکساں نہیں ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳ ؍ ربیع الاول ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷ ؍ ۸۷۷۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳ ؍ ۳ ؍ ۱۴۲۶ھ

ڈونیشن

سوال [۹۱۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۹۶ء میں ایک تعلیمی سوسائٹی قائم کی، جس کے تحت اردو اور انگریزی میڈیم کے مدارس قائم کرنے کی مختلف اوقات میں کوشش کی گئی، اس کے لئے کئی مرتبہ ہائی کورٹ میں بھی جانا پڑا۔ زید اب تک اپنی زندگی کے قیمتی ۱۷ ؍ سال اس ادارہ کو قائم کرنے میں صرف کر چکا ہے، اس کے علاوہ قریب پندرہ لاکھ سے زائد رقم بھی۔ زید کو اس مقصد میں کامیابی ۲۰۰۶ء میں ملی، جب حکومت مہاراشٹر کی جانب سے اردو میڈیم کا پرائمری اسکول شروع کرنے اور چلانے کی اجازت ملی۔ مہاراشٹر میں حکومت کی تعلیمی پالیسی کچھ یوں ہے کہ ایک تو وہ اسکول شروع کرنے کو اجازت نہیں دیتے ہیں اور سرکاری کارندے اگر پیسے لے کر اجازت دے بھی دیتے ہیں تو ایک پالیسی یہ ہے کہ شروع میں (تقریباً ۱۰ تا ۱۵ سال) حکومت کی طرف سے کسی بھی طرح کی امداد کسی بھی شکل میں اسکول کو نہیں ملتی ہے، یعنی جس سوسائٹی کو اسکول چلانے کی اجازت دی گئی ہے، اب اس کی ذمہ داری ہے کہ جگہ، کلاس روم، فرنیچر، پانی، کھیل کا میدان، معلم اور ہر طرح کی ضرورتیں خود مہیا کرے اور اسکول چلائے۔

اردو میڈیم کے مدرسوں میں خاص کر چھوٹے شہروں میں اردو سے پڑھنے کا رواج اب قریب الختم ہے، ایسے حالات میں فیس دے کر بچوں کو اردو سے پڑھانے والے بہت مشکل سے ملتے ہیں اور اردو میڈیم کے جتنے بھی اسکول مہاراشٹر میں چل رہے ہیں، تقریباً سبھی کا یہ حال ہے کہ وہ اساتذہ سے ڈونیشن لے کر اسکول چلاتے ہیں اور یہ رقم آج کل پانچ سے دس لاکھ فی معلم ہوتی ہے، اس میں سے ادارہ کے ذمہ دار کچھ پیسہ اسکول کی ضروریات کے لئے استعمال کرتے ہیں اور کچھ اپنی ضروریات کے لئے۔

اسکول شروع کرنے کے پیچھے زید کا مقصد کبھی بھی پیسہ کمانا نہیں تھا اور اب بھی نہیں ہے، وہ یہ چاہتا تھا کہ بچوں کی بنیادی تعلیم (کم از کم میٹرک تک) اردو میں ہو، اور ساتھ ہی انہیں علاقائی اور انگریزی زبان پر اتنا عبور ہو کہ وہ آج کے مسابقتی دور میں اپنا وجود ثابت کرسکیں۔

الحمدللہ زید کے اسکول میں شروعات ''سورہ فاتحہ'' سے ہوتی ہے، پھر ''لب پہ آتی ہے دعا'' پڑھائی جاتی ہے، اس کے بعد ''راشٹریہ گیت'' ''اور'' عہد'' وغیرہ پڑھایا جاتا ہے۔

آج زید کی سوسائٹی کے زیر انتظام ایک اردو پرائمری اسکول چلتا ہے، جہاں ہفتم تک تعلیم دی جارہی ہے، جس میں قریب ۶۰۰ رطلبا سرکاری (عصری) تعلیم کے ساتھ ساتھ کچھ دینی تعلیم بھی حاصل کررہے ہیں۔

مدرسہ ہذا میں عصری تعلیم کے علاوہ روزانہ ایک گھنٹہ عربی کی بنیادی تعلیم بھی دی جاتی ہے، یہ خدمت سوسائٹی اپنی ذاتی طور پر مہیا کررہی ہے، اس میں حکومت کی طرف سے دینیات پڑھنے اور نہ پڑھنے پر کوئی پابندی نہیں۔ زید یہ سمجھتا ہے کہ آج جو ۶۰۰ طلبا اس کے اسکول میں اردو سے تعلیم حاصل کررہے ہیں، اگر وہ یہ اسکول نہ شروع کرتا، تو اس میں سے کچھ طلبا سرکاری اردو مدرسہ میں جاتے، کچھ دیگر میڈیم میں، سرکاری مدرسوں میں دینیات کی تعلیم نہیں دی جاتی ہے؛ جبکہ دیگر میڈیم میں اسلامی ماحول ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جب سے زید نے اس سوسائٹی کی بنیاد ڈالی ہے، تب سے آج تک سوسائٹی اور اسکول

کو چلانے میں زید کا حصہ 95% ہے، اور مابقیہ ذمہ داران سوسائیٹی کا 5%۔

حکومت کی جانب سے جو بھی امداد اب تک ملی ہے، اس کو حاصل کرنے کے لئے پھر اس کا استعمال کس طرح سے ہوا ہے، یہ جاننے کے لئے جب بھی سرکاری عہد دار معائنہ کے لئے آتے ہیں، تو انہیں باوجود اسکے کہ ہر کام صاف ستھرا، اطمینان بخش اور واقعتاً کیا گیا ہے، اس کے باوجود انہیں کچھ نہ کچھ رقم بطور رشوت دینی پڑتی ہے۔

اب حکومت اساتذہ کو گرانٹ دینے کی سوچ رہی ہے، اور اس کی کارروائی کے لئے بھی کافی رقم بطور رشوت کھلانی پڑے گی۔

گرانٹ منظور ہوتی ہے، تو وہ سیدھے اساتذہ کو ملے گی، اس میں سوسائٹی کو کچھ بھی نہیں ملنے والا ہے۔ آپ سے مؤدبانہ گذارش ہے کہ حسب ذیل سوالات کے جوابات شریعت کی روشنی میں بتائیں۔

(۱) زید کا صرف کیا ہوا پیسہ کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے؟

(۲) زید کی جو صلاحیتیں اور وقت صرف ہوا ہے، اس کا معاوضہ اسے کیسے مل سکتا ہے؟

(۳) کیا زید ڈونیشن لے کر اسکول میں تقرری کر سکتا ہے، اور اگر لے سکتا ہے تو کس حد تک؟

(۴) اگر ڈونیشن نہیں لیا جاسکتا ہے، تو زید کے پیسہ، وقت اور صلاحیتوں کا بدل اسے کب اور کیسے ملے گا؟

(۵) زید اگر چاہے تو یہ اسکول کسی اور شخص یا ادارہ کو فروخت کر سکتا ہے؟ خریدار بھی یہ دیکھ کر اسکول کی قیمت طے کرے گا کہ اسے کتنے اساتذہ کو نوکری دینے کا موقع مل سکتا ہے، اور فی معلم اسے کتنی رقم مل سکتی ہے؟ پھر اسی حساب سے اسکول کی قیمت کا تعین ہوگا اور بعد میں خریدار اس کا لگایا ہوا سرمایہ وہ شخص لوگوں سے ڈونیشن کی صورت میں وصول کرے گا، یعنی خریدار کے لئے یہ ایک طرح سے تجارت کا معاملہ ہوگا۔

(۱) کیاان حالات میں زید کا اسکول کوفروخت کرنے کا فیصلہ مناسب رہے گا؟
(۲) اگراسکول فروخت کیا جاتا ہے، تواس کی قیمت کاتعین کیسے کیا جائے گا؟

ایک محتاط اندازے کے مطابق زید اب تک مختلف اوقات میں اسکول کے جائز کاموں کے لئے قریب ایک لاکھ روپیہ بطور رشوت دے چکا ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ جانتا ہے کہ رشوت خوری حرام ہے؛ لیکن یہاں ماحول ایسا ہے کہ اگر آپ کی فائل مکمل ہو بھی تو آفیسر بغیر پیسہ لئے دستخط نہیں کرتے، ایسی حالتِ مجبوری میں کیا رشوت دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ امید کہ آپ شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں گے۔

المستفتی: محمد منظور احسن، پربھنی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس سلسلہ میں آپ اساتذہ کو اکٹھا کرکے ایک میٹنگ کریں اوراس میٹنگ میں یہ بات طے کرلیں کہ گرانٹ حاصل ہونے کے سلسلے میں جو بھی رقم خرچ ہوگی وہ رقم اساتذہ کو ان کی تنخواہوں کے تناسب کے حساب سے ادا کرنی ہوگی اوراس پر اساتذہ کے دستخط کروالیں، زید کا گرانٹ حاصل کرنے میں جو پیسہ صرف ہوگا، وہ پیسہ اسی طریقے سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

أن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: الصلح جائز بین المسلمین إلا صلحاً حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون علی شروطهم إلا شرطاً حرم حلالا، أو أحل حراما. (ترمذي شریف، أبواب الأحکام، باب ماذکر عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم في الصلح بین الناس، النسخة الهندیة ۱/ ۲۵۱، دارالسلام رقم: ۱۳۵۲)

(۲) زید کی جو صلاحیت اور وقت خرچ ہوا ہے، اس کا معاوضہ زید کو کیسے ملے گا یا نہیں ملے گا، اس کے بارے میں زید ہی زیادہ جان سکتا ہے۔

(۳) رشوت کو دوسرا خوب صورت نام ڈونیشن دیا گیا ہے، یہ ناجائز اور حرام ہے

اور رشوت لینے والا سخت عذاب الٰہی کا مستحق ہوگا۔

عن عبد الرحمن بن عوفؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الراشي والمرتشي في النار. (مجمع الزوائد، دار الكتب العملية، بيروت ٤/١٩٩)

والإسلام يحرم الرشوة في أي صورة كانت وبأي اسم سميت فسميتها باسم الهدية لا يخرجها عن دائرة الحرام إلى الحلال. (الحلال والحرام في الإسلام ٢٧١، بحواله محموديه ڈابهيل١٨/٤٦٣)

(۴) اس کا جواب نمبر۲؍ میں گزر گیا۔

(۵) اسکول کی خرید وفروخت سے متعلق بیچنے والے اور خریدار خود جانیں اور جو بھی ڈونیشن کے نام سے رشوت لے گا، وہ سخت گنہگار ہوگا اور وہ حرام کا پیسہ ہوگا۔

عن عبد الرحمن بن عوفؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الراشي والمرتشي في النار. (مجمع الزوائد، دارالكتب العملية، بيروت ٤/١٩٩)

(٦) دفع مضرت کے لئے رشوت دینا جائز ہے، دینے والا گنہ گار نہ ہوگا لینے والا گنہگار رہوتا ہے۔

الرابع: ما يدفع لدفع الخوف من المدفوع إليه على نفسه، أو ماله حلال للدافع حرام على الآخذ. (شامي، كتاب القضاء، مطلب في الكلام على الرشوة والهدية، زكريا ٨/٣٥، كراچي ٥/٣٦٢)

دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه، وماله، ولاستخراج حق له، ليس برشوة. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٦/٤٢٣، زكريا ٩/٦٠٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰؍ ۱۱۰۷۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۴/۲۴ھ

کالجوں میں لئے جانے والے ڈونیشن کی شرعی حیثیت

سوال [۹۱۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ڈگری کالجوں میں اسی طرح میڈیکل کالجوں میں داخلہ کے لئے لاکھوں روپئے ڈونیشن کے نام سے لیا جاتا ہے، شریعت کے روسے یہ ڈونیشن کس خانہ میں آتا ہے، ہم اس سلسلے میں تردد میں پڑے ہوئے ہیں؛ اس لئے کہ اس پر رشوت کی تعریف صادق نہیں آتی؛ کیونکہ رشوت اس کو کہا جاتا ہے کہ کوئی بھی ذمہ دار جس کو اپنی ذمہ داری ادا کرنے پر مامور کردیا گیا ہو اور اس ذمہ داری کی تنخواہ اس کو ملتی ہو، پھر وہ اسی ذمہ داری کی ادائے گی میں لوگوں سے الگ سے پیسے لیتا ہو، تو یہ رشوت کے دائرہ میں داخل ہوگا اور ڈگری کالجوں میں یہ بات نہیں ہوتی ہے؛ اس لئے کہ ڈونیشن لینے والے سرکار یا کسی اور کی طرف سے تنخواہ دار ملازم نہیں ہوتے؛ بلکہ وہ خود مالک ہوتے ہیں؛ اس لئے خوب غور وخوض کر کے جواب تحریر فرمادیں۔

اور اگر اس کو مدارس اور اسکولوں کی داخلہ فیس کی طرح قرار دیا جائے تو قوم کو اشکال ہوسکتا ہے کہ اتنی بڑی رقم داخلہ فیس کے نام سے لینا متعارف نہیں ہے، تو اس پر ہمارے سامنے ہائی کورٹ کے وکلاء کی بات سامنے آئی ہے کہ ایک ایک پیشی میں کئی کئی لاکھ روپئے لیتے ہیں، جب وکلاء کو اتنی بڑی رقم لینا جائز ہے، تو ڈگری کالجوں میں کیوں کرنا جائز ہوسکتا ہے؟ مدلل طور پر واضح فرمادیں۔

المستفتی: محمد شعیب اختر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ڈگری کالجوں میں، اسی طرح میڈیکل کالجوں میں ڈونیشن کے نام سے جو بھاری رقم لی جاتی ہے، وہ اگر پرائیویٹ اور ذاتی کالجوں میں ہے،

تو وہ رشوت کے دائرہ میں داخل نہیں؛ بلکہ داخلہ فیس کے درجے میں ہے؛اس لئے کہ ان کالجوں کے ذمہ داران کو مالکانہ حیثیت حاصل ہے، داخلہ لینے والے طلبہ کو بھی اختیار رہوتا ہے کہ اتنی بڑی رقم ڈونیشن فیس جمع کر کے داخلہ لے، یا نہ لے، یہ آپس کی تراضی کا معاملہ ہے اور کوئی بچہ اگر اتنی فیس دے کر داخلہ نہ لے،تو اس پر کسی کی طرف سے زبردستی بھی نہیں؛ البتہ یہ رشوت نہ ہونے کے باوجود اتنی بڑی رقم ایک ایک طالب علم سے لینا انسانی معاشرہ سے ہٹ کر ہے، جو بھی سنتا ہے، اس کی عقل حیران رہ جاتی ہے؛اس لئے یہ کم از کم کراہت کے درجہ میں ہے، اور جس طرح بعض حالات میں حکومت گرانی کے زمانہ میں بازاری اشیاء کی قیمتیں محدود کرسکتی ہے، اسی طرح ڈونیشن کی مقدار کی تحدید کا بھی اختیار اسے ہے اور یہ تحدید اگر نہ ہو، پھر بھی اتنی بڑی مقدار ڈونیشن کی لینا انسانیت اور مروت کے خلاف ہے، اور وکیل جو فیس لیتا ہے، یہ اجارہ کا معاملہ ہے اور آپسی رضامندی سے جو اجرت طے ہو جائے، اس کے لین دین میں شرعاً کوئی حرج نہیں، تاہم انسان اور اخلاقی بنیادوں پر وکلاء کے لئے بھی بہتر یہی ہے کہ نا قابل تحمل فیس مقرر نہ کریں۔

إعطاء إنسان غير موظف عند القاضي، أو الحاكم مالاً؛ ليقوم بتحصيل حقه له، فإنه يحل دفع ذلك وأخذه؛ لأنه وإن كانت معاونة الإنسان للآخر بدون مال واجبة، فأخذ المال مقابل المعاونة لم يكن إلا بمثابة أجرة. (الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۲/ ۲۲۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۵؍صفر المظفر ۱۴۳۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/ ۱۱۸۶۸)	۱۴۳۶/۲/۵ھ

طلبہ کو رعایۃً پاس کرنے کے عوض روپیہ وصول کرنا

سوال [۹۱۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ میں ڈسٹرکٹ پورہ کے اسکول میں ٹیچر ہوں، سالانہ امتحان کے موقعہ پر طلبہ سے انعام کے نام پر کچھ پیسہ ملتا ہے، یا لیا جاتا ہے، کچھ طلبا کو رعایۃً نمبرات دے کر پاس کیا جاتا ہے، اوران سے روپیہ وصول کیا جاتا ہے،تو ہر دوصورت میں پیسہ لینا جائز ہے یانہیں اوراس پیسہ کواپنے ذاتی اخراجات میں لانا کیسا ہے؟

سال ہائے گذشتہ کی کچھ رقم میرے پاس موجود ہے جوکہ میں نے جمع کر رکھی ہے، اس رقم کا مصرف کیا ہے؟

المستفتی: ماسٹر محمد انیس، سیوہارہ، اسلام نگر بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: انعام اس کو کہا جاتا ہے، جو اپنی خوشی سے بلا کسی دباؤ اور مانگ کے کسی کے عمدہ کام پر دیا جاتا ہے،اوراسکولوں میں ماسٹران طلبہ سے جو لیتے ہیں، وہ اس میں داخل نہیں ہے؛ اس لئے کہ ماسٹران طلبہ سے دباؤ یا طلب یا رعایتی نمبرات کی حرص دلا کر لیتے ہیں؛ اس لئے یہ روپیہ جائز نہیں ہے؛ بلکہ انہیں طلبہ کو واپس کر دینا لازم ہے؛ البتہ اگرکوئی اپنے استاذ کو بلا دباؤ اور طلب کے اپنی طرف سے بخوشی کچھ دیتا ہے،تو وہ تحفہ ہے، جو کہ بلا تردد جائز ہے؛ لہٰذا مذکورہ رقم واپس کرنا ضروری ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۲۲/۱۶، جدید ڈابھیل ۴۶۶/۱۸)

عن أبي حميد الساعديؓ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لايحل لامرئ أن يأخذ مال أخيه بغير حقه، وذلك لما حرم الله مال المسلم على المسلم. (مسند أحمد بن حنبل ٥/٤٢٥، رقم: ٢٤٠٠٣)

لايجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي.

(شامي، كتاب الحدود، مطلب في التعزير بأخذ المال، كراچي ٤/٦١، زكريا ٦/١٠٦، البحرالرائق، كوئٹه ٥/٤١، زكريا ٥/٦٨، هندية، زكريا قديم ٢/١٦٧، جديد ٢/١٨١، قواعد الفقه،

اشرفي ديو بند ١١٠، رقم:٢٦٩، الموسوعة الفقهية ٢١/ ١١٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍صفر المظفر ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۴۳۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۲/۲۸ھ

اسکول کی داخلہ اسکیم کی کچھ شکلوں کا حکم

سوال [۹۱۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں اپنے بچہ کا داخلہ کرانے ایک اسکول میں گیا، واضح رہے کہ اسکول مسلم ہے اور پوری انتظامیہ بھی الحمدللہ مسلمان ہے، اسکول میں داخلہ کی تین اسکیمیں ہیں۔

اسکیم نمبر ۱: رجسٹریشن فیس -/250 روپئے، ایڈمیشن فیس -/500 روپئے، سیکورٹی فیس -/500 اور ماہانہ اسکول فیس -/360 روپئے ہے، بچہ کو اسکول سے ہٹانے پر -/500 روپئے سیکورٹی کے واپس مل جائیں گے، اگر ہم اس اسکیم کے تحت اپنے بچے کا داخلہ کراتے ہیں، تو فی الوقت ہمیں -/1610 روپئے جمع کرنے ہوں گے اور ہر ماہ -/360 روپئے دینے ہوں گے۔

اسکیم نمبر ۲: رجسٹریشن فیس -/250 روپئے، ایڈمیشن فیس -/500 روپئے اور سیکورٹی فیس -/500 روپئے، یہ سب مل کر -/1250 روپئے ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ایک سال کی فیس جو کہ -/4320 روپئے بنتی ہے، اس %5 فیصد کے حساب سے، 2161 روپئے کی رعایت ملے گی، اگر ہم یہ -/4104 روپیہ اور -/1250 روپیہ یکمشت جمع کریں جو کہ -/5354 روپیہ ہوتے ہیں، تو ہمیں -/261 روپیہ کی رعایت ملے گی۔ کیا یہ رعایت لینا مناسب ہے۔

اسکیم نمبر ۳: یہ ہے کہ رجسٹریشن فیس -/250 ایڈمیشن فیس -/500 روپئے، سیکوریٹی فیس -/500 روپئے جو کہ -/1250 روپئے بنتے ہیں، یہ تو جمع کرنے ہی ہیں

اور جب بھی بچہ اسکول چھوڑیگا تو سیکورٹی کے -/500 روپیہ واپس مل جائیں گے،فیس کی شکل میں جوایک سال میں -/4320 روپئے جمع کرتے یا دوسری اسکیم کے تحت 5% فیصد رعایت لے کر -/4104 روپئے جمع کرتے ،ان دونوں کو بچانے کے لئے یا ہمیں فائدہ دینے کے لئے اسکول والے کہتے ہیں کہ -/38900 روپئے ایک سال کے لئے ہمارے پاس جمع کردیں،تو اس رقم کو جمع کرنے کی صورت میں آپ کو کوئی ماہانہ فیس ایک سال تک جمع نہیں کرنی پڑے گی۔اور سال پورا ہونے پر -/38900 روپئے بھی واپس مل جائیں گے۔ وضاحت فرمائیں کہ یہ جائز ہے؟

المستفتی: محمد مرسلین تمباکو محلّہ،مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اسکول کے داخلہ اسکیم کی تینوں شکلوں کو بار بار غور کر کے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔مزید سائل سے زبانی بھی وضاحت حاصل کی جاچکی ہے۔

سوال نامہ میں درج شدہ تینوں شکلوں میں سے پہلی اور دوسری شکل شرعی طور پر جائز اور درست ہے؛ لیکن تیسری شکلوں میں سے کسی بھی شکل کو اختیار کر کے اسکول میں بچہ کو داخل کرنا جائز اور درست نہ ہوگا؛ کیونکہ تیسری شکل کل قرض جر منفعۃ کے دائرہ میں داخل ہوکر ناجائز ہے۔

-/38900 روپئے ایڈمیشن کے جو اسکول کو سال بھر کے لئے دیے جاتے ہیں،شرعی طور پر اسکول کے اوپر یہ سال بھر کا قرضہ ہے اور اس قرضہ کے ذریعہ سے بچوں کے ورثاء نے ایسے کئی ہزار روپئے کا فائدہ اٹھایا ہے، جو ورثاء کے اوپر اسکول کے لئے واجب الاداء ہے۔ اور شریعت میں قرضہ دے کر اس طرح کا فائدہ اور نفع اٹھانا جائز نہیں۔

عن فضالة بن عبيد صاحب النبي صلى الله عليه وسلم، أنه قال: كل قرض جر منفعة، فهو وجه من وجوه الربا. (السنن الكبریٰ للبيهقي، كتاب البيوع،

بـاب كـل قرض جر منفعة، فهو ربا، دارالفكر بيروت ٨/٢٧٦، رقم: ١١٠٩٢، كنز العمال، الدين والسلم، دارالكتب العلمية بيروت٦/٩٩، رقم: ١٥٥١٢، نصب الراية ٤/٦٠، شامي، كراچي٥/١٦٦، زكريا٧/٣٩٥، اعلاء السنن، كراچي ١٤/٤٩٨، دارالكتب العلمية بيروت١٤/٥٦٦، قواعد الفقه، اشرفي ديوبند١٠٢، رقم: ٢٣٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ رصفر المظفر ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/۷۹۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۲/۲۶ھ

ملازمت کے حصول کے لئے رشوت دینا

سوال [۹۱۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک مسلمان کسی ملازمت کے لئے تگ ودو کرتا ہے؛ لیکن اس محکمہ میں رشوت (جسے آج کے دور میں سہولت فیس سے تعبیر کرتے ہیں) کے بغیر ملازمت کا حصول مشکل ہی نہیں؛ بلکہ ناممکن ہے، اگر وہ یہ فیس نہیں دیتا، تو کسی بھی چیز میں اسے فیل اور ناکام کردیا جاتا ہے، اور صورت یہ ہے کہ رشوت لینے والا مسلمان اور دینے والا بھی مسلمان ہے۔

نیز دوسری صورت یہ ہے کہ رشوت دینے والا مسلمان اور لینے والا غیر مسلم ہے، دونوں صورتوں میں رشوت دے کر ملازمت حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ ہندوستان کے اکثر محکموں میں رشوت ہی کی بنیاد پر ملازمت کے لئے تقرر کیا جاتا ہے بالفاظ دیگر ہندوستان میں اپنے حق کے حصول کے لئے رشوت دینا جائز ہے یا نہیں؟ شریعت کی روشنی میں جواب سے نوازیں۔

المستفتی: مولانا جلیس احمد، محلّہ نیب ٹانڈہ بادلی، رامپور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: رشوت دے کر ملازمت حاصل کرنے کی دو شکلیں ہیں:

(۱) رشوت دینے سے ایسی ملازمت حاصل ہورہی ہے، جس کا مستحق رشوت دینے والے سے اچھی صلاحیت کا آدمی ہوتا ہے، اور کمزور آدمی رشوت دے کر اعلیٰ ملازمت حاصل کرتا ہے، تو رشوت دے کر ملازمت حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔

نیز اسی طرح اگر ملازمت کی ایک جگہ خالی ہے، متعدد افراد اس کے خواہشمند ہیں، اور جو رشوت دے گا، اس کو مل جائے گی، تو اس کو بھی رشوت دے کر حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: تحذیر الإخوان عن الربوافی ہندوستان ۲۲)

(۲) امتحان وانٹرویو میں کامیابی ہوچکی ہے اور اب ملازمت ضرور ملنی ہے، مگر درمیان میں افسران رشوت کے بغیر کاغذات جاری کرنے کے لئے کسی طرح تیار نہیں، تو ایسی صورت میں اپنا حق حاصل کرنے کے لئے رشوت دینا جائز اور گنجائش ہے، مگر لینے والے کے لئے حرام اور واجب الاسترداد ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسالک ۱۳۶)

دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه، وماله، ولاستخراج حق له، ليس برشوة يعني في حق الدافع. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٦/ ٤٢٣، زكريا ٩/ ٦٠٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ ربیع الاول ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۴۳۹۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۱۶/۳/۲۸ھ

رشوت دے کر سرکاری مدرسہ میں ملازمت حاصل کرنا

سوال [۹۱۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جو مدرسے سرکاری ہورہے ہیں، ان میں علماء کرام مفتیان کرام لاکھ دو لاکھ روپیہ دے کر لگ رہے ہیں، ان کا یہ رقم دینا اور مدرسہ کے ذمہ داران کو لینا جائز ہے یا نہیں اور پھر لگنے کے بعد ان کو بیس ہزار روپیہ بطور تنخواہ جو مل رہے ہیں،

وہ ان کے لئے درست ہیں یا نہیں؟

المستفتی: انور حسین، پیشکار، محلّہ نواب کا سنگنج، کے آر نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: رشوت دے کر ملازمت حاصل کرنے والے لوگ، اگر ایسے پرانے اساتذہ ہوں جو سالوں سے اس ادارہ میں کام کر رہے ہیں اور رشوت نہ دینے کی صورت میں انہیں سرکاری تنخواہ نہیں ملے گی، تو ایسی صورت میں اپنا حق ملازمت حاصل کرنے کے لئے رشوت دینے کی گنجائش ہے اور اگر رشوت دیکر ملازمت حاصل کرنے والے ان اداروں کے پرانے ملازم نہیں ہیں؛ بلکہ اداروں کے پرانے ملازمین جو بڑی رشوت دینے پر قادر نہیں ہیں، ان کو صرف نظر کر کے یہ نئے لوگ رشوت دے کر سرکاری ملازمت حاصل کرتے ہیں، تو اس قسم کی رشوت دینے والے لوگ گناہ گار ہوں گے اور رشوت لینے والے لوگ دونوں صورتوں میں تین قسم کے گناہ عظیم کے مرتکب ہوں گے:

اول: یہ حقدار سے صرف نظر کر کے اس پر ظلم کا گناہ۔

دوم: رشوت لینے کا گناہ۔

سوم: رشوت کا پیسہ اپنے اوپر خرچ کرنے کا گناہ، البتہ بعد میں ملازمین کو سرکار کی طرف سے جو تنخواہ ملے گی، وہ اپنی ملازمت ومحنت کی تنخواہ ہوگی؛ اس لئے یہ تنخواہ اساتذہ کے لئے حلال ہوگی۔

الرشوة على أربعة أقسام: الثالث: أخذ المال ليسوي أمره عند السلطان دفعاً للضرورة، وهو حرام على الآخذ فقط. (شامي، كتاب القضاء، مطلب في الكلام على الرشوة والهدية، كراچي ٥/٣٦٢، زكريا ٨/٣٥)

عن ابن عمرؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: يا ايهاالناس: اتقوا الظلم فإن الظلم ظلمات يوم القيامة. (مسند الإمام أحمد٢/٩٢، رقم: ٥٦٦٢)

ما حرم أخذه حرم إعطاء ه إلا في مسائل......أو ليسوي أمره عند

سلطان. وتحته في الحموي: هذا في جانب الدافع. (الأشباه والنظائر جديد ٤٨٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/۳۳۲ ۱۰)

نوکری کے لئے رشوت دینا

سوال[۹۱۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کیا ٹیچر کے لئے یا نوکری کے لئے رشوت دینا جائز ہے؟ کیونکہ بنا رشوت کے نوکری ملنا مشکل ہے۔

المستفتی: سید شاکر حسین، اجنتا، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: رشوت لینا دینا دونوں شریعت میں ناجائز ہے؛ لیکن فقہاء نے لکھا ہے کہ دفع ظلم کے لئے رشوت دینا جائز ہے، لینے والا گنہگار ہوگا، اسی طرح اپنا حق لینے کے لئے رشوت دینا جائز ہے، یہاں بھی صرف لینے والا گنہگار ہوگا اور ہمارے یہاں ہندوستان میں رشوت دیئے بغیر کسی کو سرکاری ملازمت نہیں ملتی ہے، تو مسلمانوں کے سرکاری ملازمت کا حق ہاتھ سے نکل جائے گا؛ اس لئے مسلمانوں کو رشوت دے کر سرکاری ملازمت حاصل کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اور ایسی صورت میں رشوت لینے والا ہی گنہگار ہوگا۔

ما يدفع لدفع الخوف من المدفوع إليه على نفسه، أو ماله حلال للدافع حرام على الآخذ؛ لأن دفع الضرر عن المسلم واجب. (شامي، كتاب القضاء، مطلب في الكلام على الرشوة والهندية، زكريا ۸/۳۵، كراچي ۵/۳۶۲)

عن أبي سلمة بن عبد الرحمن عن أبيه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الراشي والمرتشي في النار. (مسند البزار، مكتبه العلوم والحكم، باب لـلتغليظ في الحيف والرشوة ۳/۲۴۷، رقم: ۱۰۳۷، المعجم الأوسط، دارالفكر بيروت ۱/۵۵۰، رقم: ۲۰۰۲۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍شعبان المعظم ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/۱۰۴۸۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۸/۱۴ھ

سودی رقم بینک کے کارندوں کو رشوت میں دینا

سوال [۹۱۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر ہم بینک سے لون پر قرض لیں، تو اس میں بینک کے کارندے اور ایجنٹ حضرات کو بھی کچھ رقم دینی پڑتی ہے، تو جو رقم ہم ایجنٹ حضرات کو دیں گے، وہ دینی جائز ہوگی یا نہیں؟ کیا وہ رشوت ہوگی؟ اس میں سود کی رقم دے سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: شرف الدین، ہیبت پور، جویا، امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: لون پر قرض لینا جائز نہیں ہے۔

قال الله تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [سورة البقره: ۲۷۵]

وأما ربا النسيئة: فهو الأمر الذي كان مشهوراً متعارفاً في الجاهلية، وذٰلك أنهم كانوا يدفعون المال على أن يأخذوا على شهر قدراً معيناً، ويكون رأس المال باقيًا. (تفسير كبير للإمام الفخر الرازيؒ، تحت تفسير رقم الآية: ۲۷۵، من سورة البقره ۷/۹۱)

اور بینک کے کارندے اور ایجنٹ لوگوں کو جو رقم دی جاتی ہے، وہ شرعاً رشوت ہے،

اگران کورشوت دیئے بغیر وہ کوئی کام کر کے نہ دیں، تو ضرورت کی بناء پر رشوت دینے کی گنجائش ہے، مگر لینے والے کے لئے وہ حرام ہے۔

دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه، وماله، ولاستخراج حق له، ليس برشوة يعني في حق الدافع. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٦/٤٢٣، زكريا ٩/٦٠٧)

اور یہ رشوت کی رقم جیب خاص سے دینا لازم ہے، بینک کے سود کی رقم رشوت میں دینا جائز نہیں ہے۔(مستفاد: ایضاح المسائل ۱۴۲)

لو أنفق على نفسه، فقد استحكم ماارتكبه من الفعل الحرام. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مصري ١/١٤٨، جديد دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍رجب المرجب ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۸۱۲/۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۷/۳ھ

بیرون ملک مال فروخت کرنے پر رشوت دینا

سوال [۹۱۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کوئی شخص انڈیا سے غلہ خرید کر نیپال میں فروخت کرنا چاہتا ہے؛ جبکہ درمیان میں رشوت دینی پڑتی ہے، بوجہ مجبوری تو کیا انڈیا سے خرید کر نیپال میں فروخت کرنے کی اجازت ہے؟

المستفتی: ارشاد احمد، متعلم دورۂ حدیث مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب کوئی آدمی کسی بیرون ملک میں اپنا مال فروخت کرنا چاہتا ہے، تو انڈین قانون کے مطابق اس کاروبار کا رجسٹریشن کرانا منجانب

سرکار ضروری و لازم ہوتا ہے؛ لہٰذا اگر سائل نے غلہ فروختگی کے لئے منجانب سرکار ہند رجسٹریشن کرایا ہے، اس کے بعد اگر رشوت دینی پڑتی ہے، تو یہ دفع ظلم کے لئے رشوت دینے کے حکم میں ہوگا اور فقہاء کرام نے دفع ظلم کے لئے رشوت دینے کی اجازت دی ہے۔

(مستفاد: ایضاح النوادر ۱۷)

أما إذا أعطیٰ لیتوصل به إلی حق، أو لیدفع به عن نفسه ظلماً، فلابأس به. (مرقاة شرح المشکوة، کتاب الأمارة والقضاء، باب رزق الولاة وهدایاهم، الفصل الثاني، امدادیة ملتان ۷/۲٤۸)

لیکن اگر اس نے سرکار ہند سے اپنی تجارت کے لئے رجسٹریشن نہیں کرایا ہے، تو رشوت لینا ظلم کے دائرہ میں داخل نہیں؛ لہٰذا درمیان میں افسران کو رشوت دینا جواز کے دائرہ میں نہیں آسکتا؛ بلکہ تاجر اس صورت میں حضور ﷺ کی لعنت کا مصداق بن سکتا ہے۔

عن عبد الله بن عمرو رضی قال: لعن رسول الله صلی الله علیه وسلم: الراشي والمرتشي. (سنن أبي داؤد، کتاب القضاء، باب في کراهیة الرشوة، النسخة الهندیة ۲/٥٠٤، دارالسلام رقم: ۳٥٨٠، سنن ابن ماجه، کتاب الأحکام، باب التغلیظ في الحیف والرشوة، النسخة الهندیة ۱/۱٦۷، دارالسلام رقم: ۲۳۱۳، سنن الترمذي، أبواب الأحکام، باب ما جاء في الراشي والمرتشي، النسخة الهندیة ۱/۲٤۸، دارالسلام رقم: ۱۳۳۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ربیع الاول ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/۶۱۶۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۵/۴/۱۴۲۰ھ

کام کو درست کرنے کے لئے حکام کو رشوت دینا

سوال [۹۱۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ موجودہ حکومت میں حکام کو درست کام کرنے کے لئے بھی رشوت دینا کیسا ہے؟ کیونکہ بغیر رشوت کے کام نہیں ہوتا۔

المستفتی: ڈاکٹر محمد الیاس بن مرزا جی عبد الرحیم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حکومت کے کسی بھی حاکم کو کسی بھی طریقہ سے رشوت لینا جائز نہیں؛ البتہ حاکم سے کوئی جائز کام کرانے اور کسی جائز کام کے لئے دستخط کرانے میں رشوت دینے پر مجبور کیا جائے، نیز اس طریقے سے رشوت نہ دینے سے اپنا حق مارا جائے، یا اپنی ذات پر کوئی ظلم ہوسکتا ہے، تو دفع مضرت کے لئے رشوت دینے والے کے لئے جائز اور لینے والے کے لئے حرام ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۷)

وفي الشامية: دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه، وماله، ولاستخراج حق له، ليس برشوة يعني في حق الدافع. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٦/٤٢٣، زكريا ٩/٦٠٧، البحرالرائق، كتاب القضاء، كوئٹه ٦/٢٦٢، زكريا٦/٤٤١، هندية، زكريا قديم ٤/٤٠٣، جديد ٤/٤٣١) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶ر محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/۶۴۳۱)

پردھان کا تحریری اجازت ومہر پر روپیہ لینا

سوال [۹۱۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ درختوں کے کاٹنے پر حکومت کی طرف سے پابندی ہے؛ لیکن گاؤں کے پردھان صاحب تحریری اجازت مہر لگا کردیں تو کاٹ سکتے ہیں، تو اب اگر پردھان صاحب

اس تحریری اجازت اور مہر لگانے پر کچھ روپیہ لیں، تو یہ رشوت میں شمار ہوگا؟

المستفتی: محمد عثمان قاسمی، دونک پوری، ٹانڈہ، رام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: اگر اپنی ملکیت کے درختوں کے کاٹنے پر پیسہ دینا پڑتا ہے، تو وہ رشوت ہے؛ لیکن دینے والا دفع ظلم کے لئے دے رہا ہے؛ اس لئے گنہگار نہ ہوگا اور لینے والے کے لئے وہ پیسہ حرام ہے، واپس کرنا واجب ہے۔

الرابع: ما يدفع لدفع الخوف من المدفوع إليه على نفسه، أو ماله حلال للدافع حرام على الآخذ، لأن دفع الضرر من المسلم واجب. (شامي، كتاب القضاء، مطلب في الكلام على الرشوة والهدية، زكريا ٨/٣٥، كراچي ٥/٣٦٢، كوئٹه ٣٣٨)

ويجب على المرتشي ردها. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كوئٹه ٥/٣٠٠، كراچي ٦/٤٢٣، زكريا ٩/٦٠٧)

اور اگر سرکاری درختوں کے متعلق ہے، اور حکومت کی طرف سے پردھان بلا تنخواہ مامور ہے، اور کام پورا ہونے پر بلا ظلم وزیادتی لیتا ہے، تو اس کی گنجائش ہے اور اگر پہلے ہی مطالبہ کر کے لیتا ہے، تو حرام ہے۔

ثم قال بعد هذا سعى له عند السلطان وأتم أمره لا بأس بقبول هديته بعد وقبله بطلبهسحت وبدونه مختلف فيه، ومشائخنا على أنه لابأس به. (شامي، كوئٹه ٥/٣٠٠، كراچي ٦/٤٢٣، زكريا ٩/٦٠٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰؍ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳؍ ۴۲۱)

رشوت دے کرمشترکہ گرام سماج کی زمین حاصل کرنا

سوال [۹۱۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک آراضی تمام گاؤں والوں کی مشترکہ گرام سماج کی ہے گورنمنٹ نے یہ قانون جاری کیا ہے کہ جونسبندی کا کیس دے، وہ اس حصہ میں شریک ہے، چنانچہ بہت سو کو کچھ نہ کچھ حصہ ملے گا یا ہندو وغیر مسلم کیس دلا کروہ روپئے حاصل کرے یا نہیں؟ لیکن تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ فرضی کیس دیئے جارہے ہیں، یعنی کچھ روپئے دیدیتے ہیں اور فرضی کیس بنا کر روپئے لے کر زمین اس کے نام میں لکھ دیتے ہیں۔ کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ اس زمین میں تمام کا حق ہے، اس حق کو حاصل کرنے کے لئے رشوت پر روپیہ دے کر حصہ حاصل کریں یا نہیں؟ **بینوا توجروا۔**

المستفتی: حبیب احمد، گنگڈسپوری، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نسبندی کرانا اوراس کا کیس دینا ہر مسلمان پر حرام ہے، اس سے پرہیز لازم ہے۔

عن سعد بن أبي وقاص يقول: رد رسول الله صلى الله عليه وسلم على عثمان بن مظعون التبتل، ولو أذن له لاختصينا. (صحيح البخاري، كتاب النكاح، باب مايكره من التبتل والخصاء ۲/۷۵۹، رقم: ٤٨٨٢، ف:٥٠٧٣)

وأما خصاء الآدمي فحرام. (الدر المختار، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٦/٣٨٨، زكريا٩/٥٥٧، مطبوعه مصري٥/٣٤٢)

فرضی کیس بنا کر، رشوت لے کرمشترکہ زمین میں سے اپنا حق حاصل کرنا جائز نہیں ہے؛ البتہ اگر اپنا حق ضائع ہونے کا خطرہ ہو، تو رشوت دے کر دفع ظلم کرتے ہوئے اپنا حق حاصل کرلینا جائز ہے؛ لیکن لینے والے کے لئے رشوت کا پیسہ حلال نہ ہوگا؛ بلکہ واپس کرنا واجب ہے۔

الرشوة لاتملک بالقبض . وفي الشامية: ويجب على المرتشي ردها.
(الدر المختار، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٦/٤٢٣، زكريا ٩/٦٠٧)

ومنها إذا دفع الرشوة خوفا على نفسه، أو ماله، فهو حرام على الآخذ غير حرام على الدافع. (البحر الرائق، كتاب القضاء، كوئٹه ٦/٢٦٢، زكريا ٦/٤٤١، هندية، كتاب الهبة، الباب الحادي عشر في المتفرقات، زكريا قديم٤/٤٠٣، جديد٤/٤٣١، شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٦/٤٢٣، زكريا٩/٦٠٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍رجب المرجب ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴؍۷۹۷)

سرکاری ملازمین کا عوام سے سرکاری کام پر معاوضہ لینا

سوال [۹۱۵٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسلم سرکاری ملازمین جس کام کرنے کی تنخواہ پاتے ہیں، اگر وہ کام کسی آدمی کا کردیا، تو جس آدمی کا کام کیا، اگر سرکاری ملازم کے بغیر مانگے اس نے اپنی خوشی سے کچھ رقم دی کہ یہ آپ کو اپنے کام کے پورا ہونے کی خوشی میں بطور انعام دے رہا ہوں، تو سرکاری ملازم اس رقم کو اپنے خرچ میں لاسکتا ہے یا نہیں؟ یا کسی غریب کا گھر بنوادے یا غریب لڑکی کی شادی کرادے، تو اس قسم کے کام میں استعمال کرسکتا ہے یا نہیں؟ بہت سے مسلمان ملازم یہ مسئلہ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے ذریعہ کتنے غریبوں کا بھلا ہونے کی امید ہے۔

المستفتی: عبدالواحد، مہراج گنج (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو کام کسی کے ذمہ واجب ہو، پھر اس کا معاوضہ

لیا جائے، تو وہ رشوت ہے؛ اس لئے سرکاری ملازمین کا دفتری اوقات میں پبلک کا کام کردینے پر ان کی خوشی سے معاوضہ لینا المعروف کالمشروط قاعدہ کی وجہ سے جائز نہیں ہے؛ لہٰذا اس معاملہ کی حاصل شدہ رقم اصل مالک تک پہونچائی جائے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَلَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. [سورة بقره:۱۸۸]

ثم الرشوة أربعة أقسام: الثاني: ارتشاء القاضي ليحكم، وهو كذلك ولو انقضاء بحق لأنه واجب عليه. (شامي، كتاب القضاء، مطلب في الكلام على الرشوة والهدية، زكريا ۸/۳٤-۳۵، كراچي ۵/۳٦۲، البحرالرائق، كوئته٦/٢٦٢، زكريا ٦/٤٤١) فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ ذی الحجہ ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۴۰۵)

پیشکار کا فریقین سے رقم لینا

سوال [۹۱۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ محمد زاہد ضلع جج کے پیشکار ہیں، عدالت کے چپراسی آواز لگانے اور حاضری کرانے کے ۱۵/ روپئے لیتے ہیں، ان پیسوں کو جج صاحب کی چائے وغیرہ میں خرچ کرنے کے بعد آدھے پیشکار کو دیتے ہیں اور آدھے خود لیتے ہیں پیشکار زاہد اگر آدھے نہ بھی لے، تو بھی چپراسی لینا بند نہیں کریں گے، تو سوال یہ ہے کہ زاہد پیشکار کے لئے یہ روپیہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ سود اور رشوت ہوگا یا نہیں اور لے کر کسی کارِ خیر میں خرچ کرسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد انور پیشکار، ضلع جج، محلّہ نواب کا سنگنج، کانشی رام نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چپراسی چونکہ سرکار کی طرف سے تنخواہ دار ملازم ہوتا ہے، اور آواز لگانے وغیرہ انہی کاموں کا ملازم ہوتا ہے؛ اس لئے اس کے لئے اپنے ان واجبی فرائض کی انجام دہی میں پبلک سے کوئی پیسہ لینا جائز نہیں ہے اور جو بھی پیسہ لے گا وہ رشوت کے دائرہ میں ہوکر حرام ہوگا اور یہ پیسہ نہ چپراسی کے لئے حلال ہے نہ جج کے لئے اور نہ ہی پیشکار کے لئے حلال ہے اور نہ ہی کار خیر میں لگانا جائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۸/۴۶۵)

الرشوة بالكسر: ما يعطيه الشخص الحاكم وغيره؛ ليحكم له أويحمله على ما يريد. (شامي، كتاب القضاء، مطلب في الكلام على الرشوة والهدية، كراچي ۵/۳۶۲، زكريا ۸/۳٤)

عن عبد الله بن عمروؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي. (ترمذي شريف، أبواب الأحكام، باب ما جاء في الراشي والمرتشي، النسخة الهندية ۱/۲٤۸، دارالسلام رقم: ۱۳۳۷، سنن أبي داؤد، كتاب القضاء، باب في كراهية الرشوة، النسخة الهندية ۲/٥٠٤، دارالسلام رقم: ۳٥۸۰)

لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإسبتراء، فصل في البيع، كراچي ٦/۳۸٥، زكريا ۹/٥٥۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۷۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۶/۳۰ھ

دس بیس روپیہ دے کر پولیس سے چھٹکارا پانا

سوال [۹۱۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ ہمارے یہاں گاڑی چلاتے وقت ہیلمیٹ لازم ہے، بغیر ہیلمیٹ پکڑے جانے پر قانونی طور پر ۵۰۰/روپئے جرمانہ مقرر ہے؛ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کہہ سننے کے بعد ۱۰/۲۰/روپئے لینے پر پولیس والا راضی ہو جاتا ہے تو یہ دس بیس روپیہ دیکر جان چھڑانا صحیح ہے یا نہیں؟ کیا یہ رشوت ہے؟

المستفتی: محمد زبیر مظاہری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ قانون کی خلاف ورزی کی صورت میں جان چھڑانے کے لئے جو کچھ پولیس والوں کو دیا جاتا ہے، اس کی وجہ سے دینے والا گنہگار نہیں ہوگا، صرف لینے والا گنہگار ہوگا؛ اس لئے کہ دفع ظلم کے لئے رشوت دینا جائز ہے۔

دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه، وماله، ولاستخراج حق له، ليس برشوة يعني في حق الدافع. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٦/٤٢٣، زكريا ٩/٦٠٧، البحر الرائق، كتاب القضاء، كوئٹه ٦/٢٦٢، زكريا٦/٤٤١، هندية، زكريا قديم ٤/٤٠٣، جديد ٤/٤٣١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/رجب المرجب ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۶۶۱/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲/۷/۱۴۲۹ھ

کچہری یا تحصیل میں پیش ہونے والے لوگوں سے رقم وصول کرنا

سوال [۹۱۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کچہری یا تحصیل میں عمران نامی شخص جو چپراسی تنخواہ دار ہے، یہ آواز لگاتا ہے کہ فلاں آدمی پیش ہو، اس آواز لگانے کے دس یا بیس روپیہ پیش ہونے والے سے وصول کرتا ہے، شام تک جو پیسے جمع ہو جاتے ہیں، اسمیں سے دو پہر میں افسروں کی چائے کا انتظام اور دیگر خرچہ ہوتا ہے، جو خرچہ کرنا چپراسی کو ضروری ہے؛ کیونکہ افسر اس کے عادی ہو چکے ہیں،

جو پیسے بچ جاتے ہیں، وہ اپنی جیب میں چپراسی رکھتا ہے اس کے بدلہ نوکری کے وقت کے علاوہ افسروں کے گھر کے کام بھی کرنے پڑتے ہیں، اس لئے اس کی مجبوری بھی ہے، اگر وہ وصول نہ کرے، تو اسے اپنی جیب سے افسروں کی چائے وغیرہ کا انتظام کرنا پڑے گا، تو سوال یہ ہے کہ عمران کے لئے یہ دس یا بیس روپیہ ہر پیش ہونے والے سے لینا جائز ہے یا نہیں؟ یہ رشوت میں شامل ہے یا نہیں؟

المستفتی: انور حسین، کاسگنج، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں سرکار کی طرف سے اگر اس طے شدہ رقم کو لینے کی اجازت ہے، تو یہ آواز لگانے والے کی تنخواہ اور اجرت میں شامل ہے، اور اگر سرکار کی طرف سے اس پیسہ کو لینے کی اجازت نہیں ہے، تو یہ لی جانے والی رقم رشوت شمار ہوگی۔ اب آپ خود فیصلہ کرلیں کہ یہ پیسہ کس خانہ میں داخل ہے۔

وأما شرائط الصحة فمنها رضا العاقدين. (هندية، كتاب الإجارة، الباب الأولى في الاجارة، زكريا قديم ٤/ ٤١١، جديد ٤/ ٤٤٠)

الرشوة: مايعطي من المال ونحوه لإبطال حق، أو لإحقاق باطل.

(معجم لغة الفقهاء، كراچي ٢٢٣، قواعد الفقه، اشرفي ديوبند٣٠٧، موسوعة ٢٢/ ٢٢٠)

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الراشي والمرتشي في النار.

(تلخيص الجير، رقم: ٢٠٩٣، مسند البزار، مكتبه العلوم والحكم، بيروت ٣/ ٢٤٧، رقم:١٠٣٧، المعجم الأوسط، دارالفكر بيروت ١/ ٥٥٠، رقم:٢٠٠٢٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۳۳۲)

مقدمہ جیتنے والے کا بخوشی بابو وچپراسی کورقم دینا

سوال[۹۱۶۰]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ(۱) میں کچہری میں پیشکار ضلع جج ہوں، لوگوں کے جس دن مقدمہ چھوٹتے ہیں، وہ قتل زنا کاری بدکاری کے معاملوں سے بری ہوجاتے ہیں، توان کے گھر والے سبھی کو کورٹ میں پیسے بانٹتے ہیں، خوشی میں چپراسی بابو اور مجھے بھی دیتے ہیں، کبھی کبھی چپراسی خود مانگ لیتے ہیں، یہ روپے میرے لئے جائز ہیں یانہیں؟

(۲) جب دوفریقوں کے کورٹ میں چل رہے، قتل وخون زنا کاری وغیرہ کے مقدمات میں فیصلہ ہوجاتا ہے یا سمجھوتا ہوجاتا ہے، تو خلاف فریق دوسرے کے موافق بیانات دیتا ہے، تو وہ فیصلہ ہوجانے کی وجہ سے بیانات لکھنے کے بعد سرکاری وکیل کے ساتھ خوشی میں پیشکار کو بھی کچھ روپیہ دیتا ہے، اوراب تو فیصلہ ہونے پر لکھے گئے بیانات کے بعد وہ فریق جس کے حق میں فیصلہ ہوجاتا ہے، وہ ضرور پیشکار کو کچھ کچھ نہ دیتا ہے، یہ عادت بن گئی ہے، کبھی کبھی سرکاری وکیل یاچپراسی بھی کہہ دیتے ہیں کہ بھائی تم لوگوں کا فیصلہ ہوگیا ہے، کچھ تو خرچ کرو۔

المستفتی: انورحسین پیشکار، ضلع کاسگنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) کچہری میں مقدمات جیتنے کے بعد جس کے حق میں فیصلہ ہو چکا ہو، وہ کسی کے دباؤ کے بغیر اپنی خوشی سے بابو چپراسی اور پیشکار وغیرہ کو کچھ پیسہ دے کر آجائے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، وہ پیسہ ان لوگوں کے لئے حلال ہے اوراگرکوئی نہیں لیتا ہے، تو وہ اس کا اپنا تقویٰ ہے؛ اس لئے کہ وہ رشوت نہیں ہے، اور رشوت وہ ہے جو فیصلہ سے پہلے دی جاتی ہے تاکہ اس کے حق میں فیصلہ ہوجائے۔

ولو قضیٰ حاجته بلا شرط ولاطمع فأهدیٰ إلیه بعد ذلک، فهو

حلال لا بأس له، ومانقل عن ابن مسعودؓ عن كراهته فورع. (شامي، كتاب القضاء، مطلب في الكلام على الرشوة والهدية، كراچي ٥/٣٦٢، زكريا ٨/٣٥)

وفي المصباح: الرشوة بالكسر: ما يعطيه الشخص الحاكم وغيره؛ ليحكم له أويحمله على ما يريد. (شامي، كتاب القضاء، مطلب في الكلام على الرشوة والهدية، زكريا ٨/٣٤، كراچي ٥/٣٦٢)

(۲) فیصلہ ہوجانے کے بعد بابو یا چپراسی وغیرہ کوجس کے حق میں فیصلہ ہوا ہے، وہ کچھ پیسہ اپنی خوشی سے دیدے، تو وہ رشوت نہیں ہوتی ہے، اوراس پیسہ کو لینے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ لیکن اگر جن کے حق میں فیصلہ ہوگیا ہو، ان کے اوپر دباؤ ڈالا جائے اورمطالبہ کیا جائے اور وہ دباؤ میں آکر کے کچھ دیدے، تو اس کا لینا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ بطیّب خاطر خوشی سے یہ پیسہ نہیں دیا جارہا ہے؛ بلکہ دباؤ میں دیا جارہا ہے۔

وإن طلب منه أن يسوي أمره ولم يذكر له الرشوة، وأعطاه بعد ما يسوي اختلفوا فيه، قال بعضهم: لا يحل له أن يأخذ، وقال بعضهم: يحل وهو الصحيح. (البحرالرائق، كاب القضاء، زكريا ٦/٤٤١، كوئٹه٦/٢٦٢، تاتارخانية ١١/٧٨، رقم: ١٥٥١١)

ألا لا يحل مال امرئ إلا بطيب نفس منه الحديث رواه البيهقي وغيره. (مشكاة المصابيح ٢٥٥، شعب الإيمان للبيهقي، دارالكتب العلمية بيروت ٤/٣٨٧، رقم: ٥٤٩٢، السنن الكبرىٰ للبيهقي، دارالفكر بيروت ٣/٢٢، رقم: ٢٨٦٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۹۰۳/۴۰)

ڈاکیہ کا مدارس کے طلبہ سے رشوت لینا

سوال [۹۱۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ڈاکیہ مدرسہ کے بچوں سے ایک سو روپیہ میں پانچ روپئے اور پانچ سو روپئے میں پانچ روپیہ لیتا ہے اوراسی طرح چھ سو روپئے میں دس روپئے اور ہزار روپئے میں دس روپئے لیتا ہے؛ جبکہ اس ڈاکیہ کی ملازمت سرکار سے ہی پوری ہوجاتی ہے، تو آپ کیا فرماتے ہیں؟

المستفتی: عمر فاروق، روم نمبر۱۵، صدیق منزل ہتھورا، باندھا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: چونکہ پیسے لگانے کے وقت ہی سرکار ان پیسوں کا پورا ڈاک خرچ وصول کرلیتی ہے۔ اب مزید ان روپیوں پر کچھ روپیہ متعین کر کے وصول کرنا رشوت کے دائرہ میں آکر حرام ہوجاتا ہے؛ البتہ دفع ظلم اور اپنا حق وصول کرنے کے لئے بحالت مجبوری رشوت دینے کی گنجائش ہے اور اس صورت میں فقط رشوت لینے والا ہی گنہگار ہوگا۔

دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه، وماله، ولاستخراج حق له، ليس برشوة يعني في حق الدافع. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، زكريا ۹/۶۰۷، كراچي ۶/۴۲۳)

أما إذا أعطىٰ ليتوصل به إلى حق، أو ليدفع به عن نفسه ظلماً، فلابأس به. (مرقاة شرح مشكوة، كتاب الأمارة والقضاء، باب رزق الولاة وهداياهم، الفصل الثاني، امدادية ملتان ۷/۲۴۸، محموديه قديم ۵/۱۱۷، جديد ڈابھیل ۱۸/۴۵۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/۸۳۶۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۵/۱۴۲۵ھ

سودی رقم سرکاری افسران کورشوت میں دینا

سوال [۹۱٦۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے بڑے بھائی وصی احمد خاں، جن کا انتقال ۱۲/۷/۱۹۹۳ء کو ہوا، جو پی ڈبلو ڈی ویژن میں سرکاری ملازم تھے، جن کا بیمہ انشورنس فنڈ وغیرہ کی کاغذی کارروائی میں ہمیں ۳/سال کا عرصہ لگ گیا، کچہری کے کام میں ۳/سال رقم دفتر میں رکی رہی، جس کا بیاج ۹/ ہزار روپیہ دے رہے ہیں اور ہمارے پاس سے اب تک تقریباً ساڑھے تین ہزار روپئے خرچ ہو چکے ہیں اور اب ۸/ ہزار روپیہ پھر ۱۰/ فیصد کے حساب سے اور مانگ رہے ہیں، جو رشوت کے ہوتے ہیں، تو ایسی صورت میں ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ۹/ ہزار مل رہے ہیں اور ۱۱/ ہزار دینے پڑ رہے ہیں، تو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ کیا ہم اس سود کی رقم کو لے سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: شبیر احمد خاں، بھٹی محلّہ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سود کی رقم سرکاری افسران کو رشوت میں نہیں دی جاسکتی ہے، اس رقم کو لے کر فقراء پر بلا نیت ثواب تقسیم کرنا ضروری ہے۔

لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه.

(شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٦/٣٨٥، زكريا ٩/٥٥٣، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحر الرائق، كوئٹه ٨/٢٠١، زكريا ٩/٣٦٩، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٦/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/۴۸۹۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
٦/٦/۱۴۱۷ھ

مال حرام کو رشوت میں دینا

سوال [۹۱۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ گورنمنٹ سے مدارس کو امداد ملتی ہے، اس کے حصول کے سلسلہ میں بعض مدرسہ والوں نے تعداد طلبا زائد ظاہر کی ہے، اس طرح زائد بتائی گئی تعداد سے جو رقم حاصل ہوئی اس کو رشوت میں دیا گیا۔ اب تنبہ ہو رہا ہے، تو اس کی تلافی کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ کیا وہ رقم حکومت کو واپس کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر واپس کرنا ضروری ہے، تو پھر کس طرح واپس کی جاسکتی ہے؟ یہ رقم طلبا کے لئے آئی ہے کہ ان کو تقسیم کردی جائے؛ چنانچہ تقسیم کردی گئی، جو رقم اس میں سے بطور رشوت دی گئی ہے، اس کو بھی اس مد میں داخل کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ مدرسہ والوں کو بتایا گیا کہ بغیر رشوت دیئے رقم نہیں ملے گی، رشوت کے بعد پہلی بار ہی یہ رقم حاصل ہوئی ہے۔

المستفتی: حامد علی مدرسہ ارشاد العلوم، ٹانڈہ رام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جھوٹ کے ذریعہ سے حکومت سے جو رقم حاصل کی وہ حرام ہے، اس کو واپس کردینا واجب ہے، اس کو رشوت میں دینا بھی جائز نہیں ہے، اور جب تک حکومت کو واپس کردینا ممکن ہو، اس وقت تک طلبہ پر خرچ کرنا بھی جائز نہیں ہے، اس میں مبتلا ہونے والے سب لوگ گنہگار رہوں گے۔

أو بغير عقد كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه؛ ولكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مصري ۱/ ۱٤۸، هندي ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية بيروت ۱/ ۳۵۹)

لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه.

(الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء، فصل في البيع، كراچي ٦/٣٨٥، زكريا ٩/٥٥٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍محرم الحرام ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳؍۵۱۵۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰؍۱؍۱۴۱۸ھ

سودی رقم رشوت میں دینا

سوال [۹۱۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل کسی بھی قسم کا کوئی بھی کام ہو بغیر رشوت کے نہ ہم کو ہمارا واجبی حق حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی ہمارا کوئی کام بغیر رشوت کے ہوتا ہے اور نہ وہ کام آگے بڑھتا ہے باوجودیکہ ان کی واجبی رقم ادا کر کے پھر بھی وہ دفتر والے ہم سے زیادتی کا مطالبہ کرتے ہیں باقاعدہ رشوت مانگ کر لیتے ہیں، بعض دفعہ ہزاروں روپیہ رشوت مانگتے ہیں، جیسے زمین کی خرید وفروخت کے وقت زمین پر اپنا نام لگوانے کے وقت، ڈاکٹری کے کورس میں، داخلہ لینے کے وقت اور بھی بہت سے کاموں میں رشوت کے بغیر اپنا حق حاصل نہیں کر سکتے، تو کیا ایسی صورت میں سودی رقم ہو یا کوئی بھی حرام کمائی کی رقم بطور رشوت دے کر ہم اپنا کام کرا سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: عبدالرحمٰن، ادگاؤی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سوال نامہ میں جو دشواریاں لکھی گئی ہیں، وہ اپنی جگہ صحیح اور درست ہیں، حالات ایسے ہی ہیں جیسے سوال نامہ میں درج ہیں؛ اس لئے ایسے مشکل حالات میں اپنے جائز اور حلال پیسہ رشوت میں دے کر اپنا کام کرا لینے کی اجازت ہے،

اور رشوت دینے کا گناہ نہ ہوگا اور صرف لینے والا ہی گنہگار ہوگا اور فقہاء نے ضرورت میں جیب خاص کا پیسہ رشوت میں دے کر اپنا حق حاصل کرنے کی اجازت دی ہے۔

دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه، وماله، ولاستخراج حق له، ليس برشوة. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٦/٤٢٣، زكريا ٩/٦٠٧، البحرالرائق، كتاب القضاء، كوئٹه ٦/٢٦٢، زكريا٦/٤٤١، هندية، زكريا قديم ٤/٤٠٣، جديد ٤/٤٣١)

رشوت میں سود کی رقم دینا اس لئے جائز نہیں ہے کہ سود اور حرام مال میں شریعت کا اصل حکم یہ ہے کہ کسی بھی عنوان سے اصل مالک کو واپس کر دیا جائے؛ اس لئے انکم ٹیکس اور سیل ٹیکس جو ظلم اور جبری ٹیکس ہیں، اس کے عنوان سے بھی دینا جائز ہے اور رشوت میں دینے میں اصل مالک کو واپس نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ مالک کے علاوہ غیر کے ہاتھ میں پہونچ جاتا ہے؛ اس لئے رشوت میں دینا جائز نہیں ہے۔

ويجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مصري ١/١٤٧، هندي ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية بيروت ١/٣٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۶؍شعبان المعظم ۱۴۲۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۵۵۰)	۱۴۲۵/۸/۱۶ھ

رشوت میں سودی رقم دینا

سوال [۹۱۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل کے دور میں کوئی بھی کام رشوت کے بغیر نہیں ہورہا ہے، تو کیا ہم رشوت دے سکتے ہیں؟

(۲) اگر رشوت دے سکتے ہیں، تو کیا ہم رشوت میں سود کی رقم استعمال کر سکتے ہیں؟

المستفتی: اسم قاسم شیخ، کوٹھگیمتھ نگر، چکاڑی، بیلگام (کے اے)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) جب اپنا حق بغیر رشوت کے حاصل نہیں ہوتا ہے، تو حق کو حاصل کرنے کے لئے اور ظالم سے ظلم کو دور کرنے کے لئے رشوت دینے سے دینے والا گنہگار نہیں ہوگا، لینے والا مستحق لعنت اور گنہگار ہوگا۔

الثالث: أخذ المال ليسوّي أمره عند السلطان دفعاً للضرر، أو جلبا لنفع وهو حرام على الآخذ فقط. الرابع: ما يدفع لدفع الخوف من المدفوع إليه على نفسه، أو ماله حلال للدافع حرام على الآخذ؛ لأن دفع الضرر عن المسلم واجب. (شامي، كتاب القضاء، مطلب في الكلام على الرشوة والهدية، زكريا ۸/۳۵، كراچي ۵/۳٦۲)

دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه، وماله، ولاستخراج حق له، ليس برشوة يعني في حق الدافع. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، زكريا ۹/٦۰۷، كراچي ٦/٤۲۳-٤۲٤، البحرالرائق، كتاب القضاء، كوئٹه ٦/۲٦۲، زكريا٦/٤٤١، هندية، زكريا قديم ٤/٤۰۳، جديد ٤/٤٣١)

(۲) رشوت میں سود کی رقم دینا جائز نہیں؛ اس لئے کہ حرام مال کے بارے میں حکم شرعی یہی ہے کہ جہاں سے آیا ہے کسی بھی عنوان سے وہیں واپس ہوجائے؛ اس لئے سرکاری بینک کی سودی رقم انکم ٹیکس، سیل ٹیکس اور رجسٹری فیس کے عنوان سے دینا جائز ہے؛ اس لئے کہ ان عنوانات سے سرکاری خزانہ میں پیسہ واپس ہوجاتا ہے؛ لیکن سرکاری آفیسر کو رشوت دینے سے وہ سرکاری خزانہ میں نہیں پہونچتی ہے؛ اس لئے رشوت میں دینا جائز نہیں ہے، ہاں البتہ مجبوری میں جیب خاص کے پیسے کو رشوت میں دینے کی گنجائش ہے۔

(مستفاد: ایضاح المسائل ص: ۱۴۲)

ویـردونهـا عـلـی أربـابها إن عرفوهم وإلا تصدقوابها؛ لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٦/٣٨٥، زكريا ٩/٥٥٣، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا٧/٦٠، البحرالرائق، كوئٹه ٨/٢٠١، زكريا٩/٣٦٩، هندية، زكريا قديم٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۳۰۸/۴۰)

سودی رقم رشوت میں دینے کا حکم

سوال [۹۱٦٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک تجارتی شخص اپنا مال فروخت کرنے کے لئے دوسرے شہر لے جاتا ہے، سرکاری کارروائی مکمل ہے؛ لیکن کچھ سرکاری افسران کچھ پولیس والے، مال والے سے کچھ نقدی وصول کرتے ہیں، اگر ان کو نہ دی جائے، تو بلاوجہ کا نقص نکال دیتے ہیں اور اس کا خمیازہ بھگتنا مشکل ہوجاتا ہے۔ آپ مہربانی فرماکر تحریر کریں مذکورہ نقدی سود کی رقم سے دینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عبد اللہ، ٹانڈہ بادلی، رام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ نقدی بطور رشوت اپنے حق کی حفاظت اور دفع ظلم کے لئے اپنی ذاتی رقم سے دینا شرعاً جائز ہے اور دینے والے کے حق میں رشوت نہیں؛ بلکہ لینے والے کے حق میں رشوت ہے۔

دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه، وماله،

ولاستخراج حق له، ليس برشوة يعني في حق الدافع. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٤٢٣/٦، زكريا ٦٠٧/٩)

البتہ یہ نقدی سود کی رقم سے دینا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ حق کی حفاظت اور دفع ظلم بھی اپنی حوائج وضروریات میں داخل ہے، اور سود کی رقم کو اپنی حوائج میں صرف کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔

لما أفتى به بعض أكابرنا أن للمسلم أن يأخذ الربوا، من أصحاب البنک أهل الحرب في دراهم، ثم يتصدق بها إلى الفقراء، ولا يصرفه إلى حوائج نفسه. (إعلاء السنن، كتاب البيوع، باب الربا، دليل فتوى بعض الأكابر بأخذ الربا من البنك، كراچي ٣٥٩/١٤، دارالكتب العلمية بيروت ٤١٣/١٤-٤١٤)

واما إذا كان عند رجل مال خبيث (إلي قوله) ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء.

(بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مصري ١٤٨/١، هندي ٣٧/١، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ٣٥٩/١، تحت رقم الحديث: ٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ ربیع الاول ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/ ۶۱۷۳۰)

سودی رقم رشوت میں دینے کی ممانعت

سوال [۹۱٦۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سرکاری بینک سے ملا ہوا سود رشوت میں دینا جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سودی رقم رشوت میں دینا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ سودی رقم سے کسی بھی طرح کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں اور رشوت میں دینا در پردہ ذاتی

فائدہ اٹھانا ہے، اگر مجبوری میں رشوت دینی پڑے، تو اپنی جیب خاص سے رشوت دیں گے اور اس صورت میں دینے والا گنہگار نہیں ہوگا؛ بلکہ لینے والا گنہگار رہوگا۔ اور سودی رقم جہاں سے آئی ہے، کسی عنوان سے وہاں واپس کردینا لازم ہوتا ہے، ورنہ نادار فقیروں کو بلانیت ثواب دیدینا لازم ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ۱۴۲، کفایۃ المفتی قدیم ۸/٦۷، جدید زکریا مطول ۱۱/۲۰۸، آپ کے مسائل اوران کا حل ۷/۳۴۷)

فأخذ الرشوة ممنوع كإعطائها، ومثل ذلك الربا–غير أنه إذا خاف أن يستولي ظالم على مال اليتيم كان له أداء شئ ليخلصه. (شرح المجله ۱/۳۳–۳٤، اتحاد ديوبند)

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، إن ملكه بعقد فاسد، أو حصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، هندي قديم ۱/۳۷، جديد ۱/۳۵۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/۱۱۲۲۳)

سودی رقم کو رشوت میں دینا

سوال [۹۱٦۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) بینک سے سودی بیاج ملتا ہے، کیا اس پیسے کو مقدمہ بازی میں رشوت کے طور پر خرچ کیا جاسکتا ہے؟

(۲) چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے کوئی چھوٹا سا وظیفہ قرآن مجید کی آیات جسے میں اور میری بیوی، بچے وقتاً فوقتاً پڑھ سکیں تاکہ اس جھوٹے مقدمہ سے جلد از جلد چھٹکارا مل سکے۔

(۳) خاص طور سے تاریخ پیشی والے دن اہتمام سے کوئی وظیفہ پڑھنے کے لئے بتادیں جسے عدالت میں پڑھ لیا جائے اور گھر پر بھی اس کا اہتمام کرلیا جائے۔

(۴) مخالف پارٹی والے مقدمہ ختم کرنے کی صورت میں ایک بڑی رقم کا مطالبہ کررہے ہیں، یعنی ایک لاکھ روپیہ کا مطالبہ کررہے ہیں کیا یہ رقم زکوۃ کی مد میں سے دی جاسکتی ہے، بظاہران کی حالت کمزور نظر آتی ہے، ویسے وہ شرابی کبابی ہیں، محلّہ کے لوگوں کو تنگ کرتے رہتے ہیں۔

دوسرے پڑوسیوں سے بھی مقدمہ بازی کررہے ہیں، میرا ایک اور پڑوسی پریشان حال ہے۔ جواب دے کر شکریہ کا موقع دیں۔

المستفتی: اختر شمسی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) بینک سے حاصل شدہ رقم کو مقدمہ بازی کی رشوت میں دینا جائز نہیں ہے؛ بلکہ سود اور حرام مال میں اول تو اصل مالک کو واپس کرنا لازم اورواجب ہے، اوراصل مالک تک رسائی نہ ہونے کی صورت میں اس مال کو فقراء پر بلانیت ثواب صرف کرنا ضروری ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۰۱)

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق (إلى قوله) ولكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه يجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مصري ١/٤٨ ١، هندي ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩)

(۲/۳) حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے مقدمہ میں آسانی اورکامیابی کے لئے **یا حفیظ یا داؤد یا ودود یاحلیم یاعلیم یا علی یا عظیم یاسبوح یا قدوس یا غفور** ہروقت بلاتعداد پڑھتے رہنے کا ذکر فرمایا ہے۔ انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔ (مستفاد: عملیات وتعویذات ۲۳۴)

(۴) سوال نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالف پارٹی مستحق زکوۃ نہیں ہے؛ لہٰذا زکوۃ کی رقم ان کو مقدمہ ختم کرانے کے لئے دینا قطعاً جائز نہیں ہے؛ بلکہ اصل مستحق تک پہونچانا لازم ہے، بصورت دیگر زکوۃ ادا نہ ہوگی اور ایسے لوگوں کو زکوۃ دینے والا سخت گنہگار ہوگا۔

ویشترط أن یکون الصرف تملیکا لا إباحةً کمامر. (در مختار، کتاب الزکاة، باب الصرف، کراچي ۲/۳٤٤، زکریا ۳/۲۹۱)

ویأثم معطیه إن علم بحاله لإعانة علی المحرم. (در مختار کراچي ۲/۳٥٥، زکریا ۳/۳۰٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍رجب المرجب ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۸۴۲/۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۷/۱۴۲۱ھ

سودی رقم شادی، رشوت اور مقدمات میں خرچ کرنا

سوال [۹۱۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) کوئی شخص اپنے نابالغ بچے کے لئے مثلاً پانچ سال کے لئے بینک میں ہر ماہ کچھ فکس کر دیتا ہے، اس کی شادی وغیرہ میں جو نفع اس رقم سے حاصل ہوگا استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو اس کا مصرف کیا ہوگا؟

(۳) ایک شخص بالکل شرعی طریقہ سے تجارت کرنا چاہتا ہے؛ لیکن رشوت خور اس سے رشوت طلب کرتے ہیں۔ کیا یہ سودی رقم رشوت خوروں یا ناجائز مقدمہ پر صرف کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اور اصلی رقم میں سے جو رشوت دی گئی اس کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد حنیف، لکھیم پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: بینک سے حاصل شدہ سودی رقم کو شادی میں

خرچ کرنا جائز نہیں ہے، سب کا اگرانکم ٹیکس میں دینا ممکن ہو، تواس میں دے سکتے ہیں، اگر اس طرح کوئی جبری ٹیکس نہیں ہے، تو نادار فقیر کو بلانیت ثواب دیدینا واجب ہے۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث (إلى قوله) **ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء.** (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مصري ١٤٨/١، هندي ٣٧/١، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ٣٥٩/١)

(۲) اگر رشوت نہ دی جائے، تو اپنا حق ضائع ہونے کا خطرہ ہے، تو اپنی اصل رقم میں سے رشوت دے کر حق وصول کرنے کی گنجائش ہے، مگر سود کی رقم رشوت میں اور مقدمہ میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ یہ بھی سودی رقم سے در پردہ منفی فائدہ حاصل کرنا ہے اور شرعاً اس کی اجازت نہیں ہے۔

لأنه لو أنفق على نفسه، فقد استحكم ما ارتكبه من الفعل الحرام.

(بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مصري ١٤٨/١، هندي ٣٧/١، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ٣٥٩/١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹/ ۳۳۴۷)

(۹) باب سودی رقم کا مصرف

بینک سے سودی رقم نکال کر کہاں صرف کریں؟

سوال [۹۱۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بینک میں جو ہماری تنخواہ آتی ہے، اس پر بینک ہمیں سود دیتا ہے، اور سود الگ کالم میں لکھا ہوتا ہے، اگر ہم سود کی رقم نکالیں تو وہ ہمارے بیلنس میں سے کم کردیتا ہے، اگر ہم سودی رقم نکالنا چاہیں، تو کس طرح سے نکالیں اور اس کو کہاں پر خرچ کریں؟

المستفتی: شبلی حبیب پیرزادہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک میں سرکاری ملازم کی جو تنخواہ آتی ہے، اگر ملازم کے کھاتے میں جمع ہونے سے پہلے اس میں اضافہ ہوتا ہے، تو وہ سود میں داخل نہیں ہے؛ بلکہ اصل مشاہرہ کا ہی حصہ ہے، اور اگر ملازم کے کھاتے میں جمع ہونے کے بعد اس پر اضافہ ملتا ہے، تو وہ سود ہے، اس کو انکم ٹیکس، سیل ٹیکس وغیرہ میں دینا جائز ہے، ورنہ نادار فقراء کو بلا نیت ثواب دیدینا لازم ہے، اگر آپ سود کا پیسہ بینک سے نکالنا چاہیں تو سود والے کالم سے پیسہ نکال سکتے ہیں، اور بیلنس میں جو بھی لکھا ہوا اصل رقم اور سود کے پیسے کا حساب آپ کو خود رکھنا ہے۔

الأجرة تستحق بأحد معان ثلثة: إما بشرط التعجيل، أو بالتعجيل، أو باستيفاء المعقود عليه. (هندية، كتاب الإجارة، الباب الثاني متى تجب الأجرة، زكريا قديم ٤/٤١٣، جديد ٤/٤٤٣، البحر الرائق، كوئٹه ٧/٣٠٠، زكريا ٧/٥١١، هداية، اشرفي ٣/٢٩٤)

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [البقرہ:۲۷۵]

ينبغي لمصدق الحرام أن يزعم بتصدق المال تخليص رقبته، ولا يرجو الثواب منه. (العرف الشذي علی هامش الترمذي ۱/۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۲۶۹/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۱/۲۹ھ

بینک میں جمع شدہ رقم پر ملنے والے سود کو بینک سے نکال لیں

سوال [۹۱۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بینک میں جمع شدہ رقم پر صاحب رقم کو جو زائد رقم ملتی ہے، اس کا لینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد حافظ عبد القدوس، شاہجہاں پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس کو بینک سے نکال لینا چاہئے؛ البتہ اس کو اپنے مصرف میں لانا ناجائز وحرام ہے؛ بلکہ فقراء کو بلانیت ثواب دیدینا واجب ہے۔

من اكتسب مالا بغير حق (إلى قوله) ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه؛ ولكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور قديم ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، هندية، زكريا قديم ۵/۳۴۹، جديده ۵/۴۰۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ جمادی الثانیہ ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۵۹/۲۴)

بینک سے ملے سود کو بلا نیت ثواب فقرا ئمیں تقسیم کرنا

سوال [۹۱۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آپ نے ایضاح المسائل ۱۵۹/ پر سود کی رقم کے سلسلہ میں جو فرمایا ہے وہ سمجھ میں نہیں آیا، بات یہ ہے کہ بینک سود کی رقم کھاتے میں درج کر دیتا ہے، کھاتہ کی نقل پاس بک میں ہوتی ہے، اور پاس بک کھاتہ دار کے پاس ہوتی ہے، کھاتہ دار پاس بک دیکھ کر سود کی جمع شدہ رقم کا پتہ لگالیتا ہے کہ حسب موقع سود کی نیت سے بلا نیت ثواب وہ رقم تقسیم کر دیتا ہے، کھاتہ دار کا بینک سے لین دین جاری رہتا ہے؛ لیکن وہ بطور خاص سود کی رقم بینک سے نہیں نکالتا۔ ان حالات میں کیا سود کی رقم تقسیم ہو جاتی ہے؟ آپ نے جو تحریر فرمایا ہے کہ پہلے بینک کے کاغذات سے سودی رقم کا اندراج ختم کرنا ضروری ہوگا، اس کی عملاً کیا صورت ہوگی؟

المستفتی: افتخار احمد علوی، کامرس ٹیچر فتحپور، دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: عملاً اس کی صورت یوں ہوگی کہ پاس بک میں سود کا خانہ ہوتا ہے، بینک میں جا کر سود کے خانہ میں جو رقم درج ہے، وہ رقم لے کر اس خانہ میں سے اس رقم کو کٹوادے، پھر اس کے بعد اس رقم کو بلا نیت ثواب فقراء کو یا انکم ٹیکس میں دیدے، ایسا ہرگز نہ کرے کہ بینک سے اندراج ختم کرنے سے پہلے فقراء کو دیدے۔

و إذا مات الرجل و كسبه خبيث، فالأولىٰ لورثته أن يردوا المال إلى أربابه، فإن لم يعرفوا أربابه تصدقوا به. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الخامس عشر في الكسب، جديد ٥/٤٠٤، زكريا قديم ٥/٣٤٩)

فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء؛ ولكن لا يريد بذلك الأجر والثواب؛ ولكن يريد دفع المعصية عن نفسه. (بذل المجهود،

كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دار البشائر الإسلامية بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷ر ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/ ۵۲۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۴/۷ھ

سودی رقم کا مصرف

سوال [۹۱۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کہ حکومت اپنے ملازمین کی تنخواہ سے کچھ حصہ پرائیویڈنٹ فنڈ کے نام سے کاٹتی ہے، پھر ڈبل کر کے اپنے کھاتہ میں جمع کر لیتی ہے اور جتنی رقم کل جمع ہوجاتی ہے، اس پر سود کے نام سے ایک رقم دیتی ہے، اس کا کیا حکم ہے، کیا یہ بینکوں کے سود کی طرح ہے یا اس سے الگ ہے؟

(۲) اگر وہ رقم واقعۃً سود کی ہے، تو کیا اس کو وہیں چھوڑ دیں یا اس کو نکال کر کسی جگہ صرف کر دیں؟

(۳) نیز سود کے مصارف مدلل تحریر فرمائیں۔

(۴) بیس آدمیوں نے مل کر یہ طے کیا کہ بیس ماہ تک ایک ہزار روپیہ جمع کریں گے، اسی طرح ہر ماہ بیس ہزار روپیہ جمع ہوجاتے ہیں، پھر اس مجموعہ کو نیلام کیا جاتا ہے، نیلام اس آدمی کے نام چھوڑ دیا جاتا ہے، جس کو دینے کی صورت میں اس بیس کے مجموعہ میں زیادہ رقم بچے، مثلاً ایک آدمی نے انیس کا دام لگایا اور دوسرے نے اٹھارہ کا تو اٹھارہ والے کو دے دیتے ہیں اور دو ہزار روپیہ جو باقی بچے وہ دیگر حضرات آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں، اس طرح اگلے ماہ میں ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ جو ایک مرتبہ اس مجموعہ کو لیتا ہے، اسے بچی ہوئی رقم سے حصہ نہیں دیا جاتا ہے،

اوراس طرح کرنے سے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اول لینے والے کو متصلاً بیس ہزار روپیہ جمع کرنے ہوں گے اوراس کو کل اٹھارہ ہزار ملیں گے، اورسب سے آخر میں لینے والے کو بیس ہزار جمع کرنے پڑیں گے، مگر تقریباً بائیس تیئیس ہزار مل جائیں گے، اس کا کیا حکم ہے؟ اگر کوئی آدمی اس اسکیم میں پھنس گیا ہو، اس کے پاس جو زائد رقم آئے گی یا اس کے پاس سے جائے گی، اس کا کیا حکم ہے؟ جواب سے نوازیں۔

المستفتی: (مولانا) عبدالناصر (صاحب) استاذ مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: (۱) پرائیویڈنٹ فنڈ میں جو اضافہ ہوتا ہے، وہ بینک کے سود کی طرح سود کے دائرہ میں داخل نہیں ہوتا؛ بلکہ اصل اور اضافہ دونوں جائز اور حلال ہیں؛ اس لئے کہ سود کی تعریف یہ ہے کہ انسان اپنی ملکیت کی چیز دیدے، پھر وہی چیز یا اس کے مثل اضافہ کے ساتھ واپس آجائے اور پرائیویڈنٹ فنڈ پر ملازم کا مالکانہ قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے ملک تام حاصل نہیں ہوتی۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۴۸، ایضاح المسائل ۱۰۷، محمودیہ قدیم ۴/۲۲۰، ڈابھیل ۱۶/۳۹۳، رحیمیہ قدیم ۵/۱۴۷، جدید زکریا ۷/۱۵۲)

الأجرة تستحق بأحد معان ثلثة: إما بشرط التعجيل، أو بالتعجيل، أو باستيفاء المعقود عليه. (هندية، كتاب الإجارة، الباب الثاني، زكريا قديم ٤/٤١٣، جديد ٤/٤٤٣، هداية، اشرفي ٣/٢٩٤، البحر الرائق، كوئٹه ٧/٣٠٠، زكريا ٧/٥١١)

(۲) سود کا اصل حکم یہ ہے کہ کسی بھی عنوان سے مالک کو واپس کردیا جائے؛ لہٰذا سرکاری بینک کے سود کو انکم ٹیکس، سیل ٹیکس، بیع نامہ رجسٹری وغیرہ کے عنوان سے سرکار کو واپس کردینا جائز ہے اور اگر مالک تک رسائی کی شکل نہ ہو، تو نہایت نادار فقراء کو بلانیت ثواب دیدینا جائز ہے؛ بلکہ بعض علماء نے واجب کہا ہے۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد،

أو حصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء (إلى قوله) ولكن لايريد بذلك الأجر والثواب؛ ولكن يريد دفع المعصية عن نفسه. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/۲٤۶، معارف السنن اشرفية ۱/۳۳-۳٤، حاشية ترمذي ۱/۳)

(۳) مذکورہ اسکیم میں پہلا شخص بیس ہزار کی شرط پر اٹھارہ ہزار لے رہا ہے؛ لہٰذا اس نے دو ہزار سود پر قرض لیا ہے اور آخری شخص بیس ہزار پر دو تین ہزار سود لے رہا ہے، اسی طرح درمیان کے افراد کا بھی سود دینا یا لینا کسی نہ کسی طرح لازم آتا ہے؛ اس لئے یہ اسکیم سودی معاملہ میں داخل ہو کرنا جائز اور حرام ہوگی۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (صحيح مسلم، باب لعن آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۸)

اور اس طرح کی اسکیم میں جن لوگوں کو زائد رقم حاصل ہوتی ہے، ان پر لازم ہے کہ جواب نمبر ۲ر کے اصول سے تناسب دیکھ کر انہیں شرکاء کو واپس کر دیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴ر جمادی الثانیہ ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/۶۱۸۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۴/۶/۱۴۲۰ھ

سودی رقم کے مصارف کیا کیا ہیں؟

سوال [۹۱۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ممکنہ مصارف سود بینک منجملہ درج ذیل استفتاء کی مثبت ومکمل شرعی حیثیت

واضح فرما کر عنداللہ ماجور ہوں بینک کے سود کو وصول کر کے مدارس عربیہ کے مفلس ونادار طلباء کے مصارف میں صرف کرنا جائز ہے؟

(۲) جواز میں صرف غریب ونادار طلباء ہی نہیں تمام غریب ونادار لوگ شامل ہیں؟

(۳) سود کے مصارف میں اولین مصرف فقہاء کرام نے یہ بیان کیا ہے کہ مال حرام (سود) جہاں سے آیا ہے، وہیں لوٹا دیا جائے اور اگر لوٹانا دشوار ہو یا مصلحت شرعی کے خلاف ہو، تو پھر اس حرام رقم کے وبال سے بچنے کی نیت سے غرباء ومساکین پر تصدق کر دیا جائے۔ (فتاوی بزازیہ علی ہامش الہندیہ ۶/۳۵۳)

(۴) اگر اپنے اوپر حکومت کی طرف سے سیل ٹیکس، انکم ٹیکس وغیرہ کا کوئی غیر شرعی مطالبہ ہو، تو اس میں وہ سودی رقم ادا کر دی جائے، اس طرح کا مطالبہ اپنے اوپر نہ ہو، تو بلانیت ثواب اس کے وبال سے بچنے کے لئے غریب ومحتاج لوگوں پر صدقہ کر دیا جائے۔ (مستفاد: شامی ۵/۲۴۷)

رفاہی امور میں خرچ کرنا درست نہیں، اس میں تصدق نہیں پایا جاتا، صدقہ کرنے کی نظیر مال لقطہ کو اس کا مالک نہ ملنے کی صورت میں صدقہ کرنے کا حکم ہے۔

(۵) شارع نے جانی خطرات کے وقت مردار جیسی گھناؤنی چیز کو جان بچانے کے لئے جائز ومباح قرار دیا؛ لیکن اس نازک موڑ پہ بھی سودی رقم کا اشارہ تک نہیں۔ (البقرۃ ۱۷۳)

نصوص شرعیہ کی رو سے سودی رقم کے مصارف کا تعین اور اس پر شرعی جواز کا حکم بدون دلیل دعویٰ کے مرادف ہے؛ بلکہ علماء کے فتاوی کو ان کی تجویز اور رائے قرار دے کر اس سے بہتر تجویز ورائے پیش کر کے ان کی مخالفت کو شریعت کی خلاف ورزی سے تعبیر کرنا درست نہ ہوگا، اس لئے پل، پائخانہ، نالی، سڑک وغیرہ پر صرف بلانیت ثواب کی تجویزیں مبنی برمصالح ہیں، ان میں شرعی جواز نہیں کہنا چاہئے اور ممکن حد تک اس طرح کی رقم سے اجتناب، احتراز رکھنا ضروری سمجھنا چاہئے؛ البتہ حالات وظروف کے تحت اگر کسی کو ایسی رقم ہاتھ آجائے، تو خود نہ

کھا کر ان مذکورہ جگہوں میں صرف کردے اوراس پر عنداللہ ثواب کی نیت نہ رکھے۔

(۶) سود مال حرام ہونے کے باوجود جہاں جان ومال کو ہر وقت خطرہ رہتا ہے وہاں علماء کرام نے بصورت مجبوری بغرض حفاظت مال کو سودی بینک میں جمع کرنے کے جواز کا فتوی دیا ہے، اور یہ بھی واضح کردیا ہے کہ جو سود آپ کو ملے اس کو آپ بینک میں نہ چھوڑیں؛ بلکہ اسے لے کر ایسے غیر مسلم غرباء ومساکین پر خرچ کریں، جو صرف کھانے پینے کے لئے ہی استعمال کریں، مسلمانوں کے خلاف کاموں میں ان رقوم کو صرف نہ کریں یا مسلمانوں پر فرقہ وارانہ فسادات کے ذریعہ اجتماعی طور پر تباہ کن کوئی ناگہانی آفت آجائے اور وہ مفلوک الحال ہوجائیں، تو ان کے مقدمات وغیرہ کی پیروی اوران کی گلوخلاصی کے لئے سود کے علاوہ کوئی دوسری رقم موجود نہ ہو، تو سر برآوردہ لوگوں کی صواب دید کے مطابق اجتماعی طور پر خرچ کیا جاسکتا ہے، اسی طرح نادار والدین کی لڑکیوں کی شادی اسی صورت میں ان رقوم سے کرنا جائز ہوگا جب ان کے والدین کے پاس کوئی ایسی صورت نہ ہو جس سے وہ اپنی لڑکیوں کی شادی کرسکیں اور لڑکیاں بالغ بھی ہوں اور دنیاوی شرور وفتن کا خطرہ بھی لاحق ہو اور کسی طرف سے جائز رقوم کی امداد کی امید بھی نہ ہو یعنی نہایت مجبوری میں ان رقوم سے ان کی شادی کی جاسکتی ہے؛ لیکن اس سب کے باوجود رفاہی کام کنویں، پل، سرائے وغیرہ میں سود کی رقم خرچ نہیں کرسکتے اور نہ ہی مسجد کے لئے وضو خانہ، بیت الخلاء اور غسل خانہ وغیرہ بنواسکتے ہیں، ان کے علاوہ جو مصارف استفتاء میں مذکورہ ہیں، ان میں بصورت مجبوری صرف کیا جاسکتا ہے؛ لیکن سب سے بہتر مصارف وہ ہیں، جن کو میں نے جواب میں ذکر کیا، مدارس کے نادار طلباء پر بھی صرف کرنا جائز نہیں۔

الجھن مسائل: مذکورہ استفتاء میں ا تا ۴ کا زور تصدق پر ہے، تو ۵/۶ اس سے منکر۔ ۳/ میں رفاہی امور کی گنجائش نکلتی ہے، تو ۴/۶ میں اس سے انکار۔ ۳/ مال حرام کی اسی مقام پر مشروط واپسی پر بھی قدغن۔ ۴/ اکثر عوام بینکوں کی زد سے باہر۔ ۶/ غیر مسلم غرباء ومساکین،

غریب نادارلڑکیوں کی شادی اورفرقہ وارانہ فسادات میں اخراجات کااس قدرمحتاط اندازکہ عملاً امکانات سے باہر اور وہ بھی انتہائی مجبوری میں آسمانی بلائیں، زلزلہ، وطوفان وغیرہ انفرادی مظلومین،فلاحی امورعلم وحرفت وغیرہ پرسکوت ایک فطری تقاضہ مثبت کلام تعین کی حد تک قابل قبول اور بلادلیل حق بات بھی غیرمعتبر۔

محترم مذکورہ حالات میں مسائل کاحل کیا ہو؟ عدم یکسوئی میں آپ کوزحمت دے رہاہوں،خدارا میرے الفاظ کے بجائے روحِ استفتاء پرتوجہ فرما کرراہ نجات کے ممکنہ ذرائع مصارف بینک سود کی مثبت شرعی وضاحت فرمائیں تاکہ گلوخلاصی کی راہ ہموار ہو،افسوس میری مجبوری ہی میری ہلاکت کا سبب بنی ہوئی ہے۔والسلام

المستفتی: ضیاءالدین،

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: محترم ومکرم مزاج گرامی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعدہ عرض یہ ہے کہ آنجناب کاوالا نامہ جس میں خودآں جناب نے چھ شقیں نکال کر مسئلہ کا جواب لکھاہے، کئی مہینے پہلے یہ والا نامہ موصول ہوچکا تھا،اس کے بعدیاددہانی کے خط کااحقرکوعلم نہیں،اس کے بعدآنجناب کااگست کالکھاہوا کارڈحضرت مہتمم صاحب کے واسطہ سےموصول ہوا،جس میں آنجناب کاغم وغصہ اورمفتی پرللکارنمایاں تھی اورجناب والا کاغم وغصہ اورکچھ کہنا سننااپنی جگہ بالکل درست اورصحیح ہےاورآنجناب کواس سے زیادہ کہنے سننے کا حق ہےاوراس بندۂ تودہ جہول اورظلوم کی طرف سے اتنے لمبےزمانہ تک جواب نہ دینااس سےزیادہ شکوہ کاموجب ہے، جوآنجناب نے اگست کےوالا نامہ میں تحریرفرمایا۔

اب جواب نہ لکھنے کی وجہ خدمت عالیہ میں صاف طورپرپیش کی جاتی ہے کہ آنجناب نے چھ شقیں اپنی تحریر میں نقل فرمائی ہیں، ان کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہے،اورنمبر۵ اورنمبر۶ رمیں جوچیزیں نقل فرمائی ہیں، ان سے ہم اتفاق کریں یانہ کریں لیکن بات واضح ہے،

پھراس کے بعدآ نجناب نے الجھن مسائل کا جوعنوان قائم فرمایا ہے، اوراس کے ذیل میں جو کچھ لکھا ہے، وہ آ نجناب کے مقابلہ میں اس سیاہ کار کے لئے کہیں زیادہ الجھن کا باعث بن گیا ہے۔

آ نجناب کا والا نامہ جون کے شروع میں دستیاب ہوا، اس وقت سے جواب لکھنے کے لئے دسیوں مرتبہ اٹھا کر پڑھا، اور پڑھ کرر کھ دیا، کیا جواب لکھیں اس سلسلہ میں واقعی اورسچائی کی بات یہی ہے کہ احقر کے دماغ میں کوئی مضمون مرتب نہ ہوسکا بار بار کوشش کی گئی اور دماغ پر بار بار زور دیا گیا، مگر ایسا کوئی مضمون مرتب نہ کرسکا جو سائل کو مطمئن کرنے کے لئے مفید ثابت ہو؛ اس لئے آخر کار اس استفتاء کو رکھ دیا گیا، اور سوچ لیا تھا کہ اس کے جواب لکھنے کی صلاحیت خاکسار کے اندر نہیں ہے، آ نجناب کے والا نامہ کے جواب لکھنے میں کسی قسم کی غفلت یا لاپرواہی نہیں برتی گئی؛ بلکہ اپنی صلاحیت کی کمزوری کی وجہ سے دسیوں مرتبہ جواب لکھنے کے ارادے کے بعد پھر چھوڑ کرر کھنا پڑا اور جارحانہ انداز سے جواب لکھنا مناسب نہیں سمجھا گیا، جس سے سائل کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا، اس وجہ سے بالقصد استفتاء کا جواب نہ لکھنے کا ارادہ ہو چکا تھا؛ لیکن آ نجناب کا وہ شکوہ جو اگست کے والا نامہ میں ہے، اس نے مجبور کر دیا کہ کچھ نہ کچھ لکھا جائے؛ اس لئے جو کچھ سمجھ میں آیا ہے، وہ پیش خدمت ہے۔

(۱) سود کا پیسہ مدارس عربیہ کے طلباء پر عمومی طور پر خرچ کرنا درست نہیں؛ اس لئے کہ یہ طلباء علوم دین کے حصول میں مصروف ہیں جو درحقیقت ایک عبادت بھی ہے اور اللہ تعالی طیب کو قبول کرتا ہے، خبیث کو قبول نہیں کرتا جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

عن أبي هريرة رضـ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الله طيب لا يقبل إلا طيباً. (مسلم شريف، باب قبول الصدقة من الكسب الطيب وتربيتها، النسخة الهندية ١/٣٢٦، بيت الأفكار رقم:١٠١٥، ترمذي شريف، باب التفسير من سورة البقرة، النسخة الهندية ٢/١٢٨، دار السلام رقم: ٢٩٨٩)

أما لو أنفق في ذلک مالاً خبيثًا سببه الخبيث والطيب فيكره؛ لأن الله لا يقبل إلا الطيب. (شامي، قبيل مطلب في أفضل المساجد زكريا ۲/ ۴۳۱، كراچي ۱/ ۶۵۸)

ہاں البتہ کوئی خاص طالب علم ایسا مفلس و نادار اور ضرورت مند ہے کہ اس کی ضرورت کہیں سے پوری نہیں ہو پا رہی ہے تو مخصوص طور پر اس طالب علم کو دیا جا سکتا ہے، اس میں بھی بہتر یہ ہے کہ سردیوں کے زمانہ میں بچھانے کے لئے بستر یا گدا یا جوتا، چپل یا برسات کے زمانہ میں چھتری وغیرہ جیسی چیز پر خرچ کرے، کھانے اور پہننے کی چیز میں خرچ نہ کرے تاکہ یہ خبیث چیز اس کی غذا اور لباس میں نہ پہونچے؛ بلکہ خارجی ضروریات میں خرچ ہو جائے۔

(۲) یہ بات درست ہے کہ صرف مخصوص غریب و نادار طلباء اس کا مصرف نہیں ہیں؛ بلکہ طلباء کے علاوہ غریب و نادار فقراء بھی اس میں شامل ہیں؛ لیکن اس میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ سود اور حرام مال کا اصل مصرف فقراء نہیں ہیں؛ بلکہ اصل حکم اس میں یہی ہے کہ یہ مال خبیث جہاں سے آیا ہے، کسی بھی عنوان سے وہیں واپس ہو جائے۔

لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، فصل في البيع، زكريا ۹/ ۵۵۳، كراچي ۶/ ۳۸۵، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ۶/ ۲۷، زكريا ۷/ ۶۰، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/ ۲۴۶، البحر الرائق، زكريا ۹/ ۳۶۹، كوئٹه ۸/ ۲۰۱)

ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالک، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلک الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹)

(۳) تیسرے نمبر پر جورائے ذکر کی گئی ہے، وہ مکمل صحیح ہے، جیسا کہ اوپر کی عبارات فقہیہ سے واضح ہے۔

(۴) نمبر۴؍ میں بھی جورائے ذکر کی گئی ہے، وہ مکمل درست ہے۔

(۵) نمبر۵؍ میں جورائے ذکر کی گئی ہے، اس کی بعض چیزوں سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔

(۱) اولاً یہ کہنا درست نہیں معلوم ہوتا ہے کہ مردار جیسی گھناؤنی چیز کو جان بچانے کے لئے جائز اور مباح قرار دیا گیا ہے اور اس معاملہ میں سود کا اشارہ تک نہیں ہے، آنجناب کے اس جزئیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس اضطراری حالت میں مردار کھانے کی اجازت ہے، اس اضطراری حالت میں سود کا پیسہ جائز نہیں ہونا چاہئے، اگر آنجناب کی یہی مراد ہے، تو اس سے ہم کو اتفاق نہیں ہے؛ اس لئے کہ جس درجہ کے اضطرار کی وجہ سے مردار کھانے کی اجازت ہے، اس درجہ کے اضطرار کی وجہ سے سود اور مال حرام کے میسر ہونے کی صورت میں کھا کر کے جان بچانا اسی درجہ میں جائز ہوگا، جس درجہ میں مردار کھا کر جان بچانے کی اجازت ہے۔

(۲) علماء فتاوی کو ان کی تجویز اور رائے قرار دے کر اس سے بہتر تجویز پیش کرنے کی آنجناب نے اپنے جواب میں خواہش ظاہر فرمائی ہے کہ یہ سیاہ کار یہاں آکر کافی الجھ گیا کہ علماء کے فتوی اور رائے سے بالاتر ہو کر اس سے بہتر تجویز کون سی ہے؟ اس کی تعیین بھی آنجناب کو کرنی چاہئے تھی، اس سیاہ کار نے دلائل شرعیہ کی روشنی میں اس سے کوئی بہتر تجویز ہوسکتی ہے اس پر کافی غور وخوض کیا؛ لیکن سمجھ میں نہیں آئی، اگر آنجناب کے ذہن میں دلائل شرعیہ کی روشنی میں کوئی متعین تجویز ہو تو اس کو پیش کر دیا ہوتا تو ہم لوگوں کے لئے بہتر ہوتا۔

(۳) آنجناب نے پل، بیت الخلاء، نالی، سڑک وغیرہ پر خرچ کرنا مبنی بر مصالح قرار دیا ہے، ان میں شرعی جواز نہیں کہنا چاہئے۔ آنجناب کی اس تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب کی رائے میں سود کا پیسہ پل، بیت الخلاء، نالی، سڑک وغیرہ پر مصالح کی بناء پر خرچ کرنا جائز ہے، ہم لوگ اس کو کسی حال میں جائز نہیں سمجھتے کہ سودی رقم رفاہ عام پل، بیت الخلاء،

اور نالی وغیرہ پر خرچ کیا جائے، جن علماء نے اس کی گنجائش قرار دی ہے، ان کی باتیں ہمارے حلق سے نیچے نہیں اترتی ہیں؛ اس لئے کہ کسی قسم کی دلائل شرعیہ اور فقہی جزئیات دور دور تک بھی ان کا ساتھ نہیں دیتے ہیں۔

(۶) جواب نمبر ۶ رمیں چار باتیں قابل غور ہیں:

(۱) آنجناب کی تحریر میں بینک کی سودی رقم کو غیر مسلم غرباء و مساکین پر خرچ کرنے کی قید ہے، اس قید کا کیا مقصد ہے؟ سمجھ میں نہیں آیا، اگر غیر مسلم کی قید سے آنجناب کا مقصد یہی ہے کہ صرف غیر مسلم فقراء کو کھانے پینے کے لئے دینا چاہئے اور مسلم فقراء کو نہیں، تو ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے اور اگر آنجناب کی مراد اس سے یہی ہے کہ مسلم وغیر مسلم دونوں قسم کے فقراء کو دے سکتے ہیں، مگر غیر مسلم فقراء کو دینا زیادہ بہتر ہے، تو اس سے بھی ہمیں اتفاق نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اکابر اہل فتاوی نے غیر مسلم فقیروں کو دینے کے بجائے مسلم فقراء کو دینا زیادہ بہتر قرار دیا ہے، ہاں البتہ غیر مسلم فقیر کو بھی دینے کی مذکورہ قیودات کے ساتھ گنجائش ہے، مگر ان کو دینا نہ بہتر ہے اور نہ ہی ان کو مسلم فقراء پر ترجیح دی جائے گی۔

(۲) فرقہ وارانہ فسادات کے موقع پر جو لوگ مفلوک الحال ہو جائیں، وہ خود بخود فقراء ومساکین میں شامل ہو جائیں گے، ان کو فقیر اور مساکین سمجھ کر کے دینے کی گنجائش ہے، پھر اس پیسہ سے جو بھی ان کی ضرورتیں ہیں وہ خود پوری کریں گے؛ اس لئے ان کے واسطے نئی شق نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۳) غریب نادار لڑکیوں کی شادی میں سودی رقم کو خرچ کرنا آنجناب نے جائز لکھا ہے، اس شق سے بھی ہم کو اتفاق نہیں؛ اس لئے کہ اسلام میں شادی کا خرچہ ایسا اہم نہیں ہے، جس کے لئے سود جیسے مال حرام کو اختیار کرنے کی اجازت دی جائے، اس لئے شادی کے لئے سود کا پیسہ دینا جائز نہ ہوگا، ہاں البتہ جن کی شادی کی جائے، وہ اگر اس قدر نادار اور غریب ہیں کہ جس سے وہ سودی رقم کا مصرف بن سکیں، تو اس مصرف کے نقطۂ نظر سے سودی رقم ان

نادار غریبوں کو دی جاسکتی ہے، مگر شادی کی غرض سے دینا ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے۔

(۴) رفاہی کاموں میں سودی رقم صرف کرنا جائز نہیں اس کا ہم نے پہلے ہی ذکر کردیا، اس کے بعد آنجناب نے آخری جو الجھن مسائل کا نوٹ قائم کیا ہے، اس کے سمجھنے میں ہمیں کافی دشواری ہوئی اور تاہنوز اس کا مقصد ہمیں سمجھ میں نہ آپایا، اگر ہماری لکھی ہوئی اوپر کی تحریر سے جناب والا کی الجھن ختم ہوتی ہے، تو فبہا اور اللہ کا شکر ہے اور اگر ختم نہیں ہوتی ہے، تو الجھن مسائل کا نوٹ سمجھنے سے ہم قاصر ہیں اور اسی کی بنیاد پر لکھنے کا ارادہ بھی بار بار ملتوی ہوتا رہا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۸؍ رجب المرجب ۱۴۲۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۴۴۲)	۸/ ۷/ ۱۴۲۵ھ

بینک کی سودی رقم کا مصرف

سوال [۹۱۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بینک سے جو سود ملتا ہے، وہ کہاں خرچ کرنا چاہئے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک سے ملنے والا سود حکومت کی ملک ہے؛ اس لئے اولاً تو یہ کوشش کی جائے کہ یہ پیسہ کسی بھی عنوان سے حکومت تک پہنچ جائے، مثلاً غیر شرعی جبری ٹیکسوں: جیسا کہ انکم ٹیکس، سیل ٹیکس، جائیداد کی رجسٹری اسٹامپ فیس وغیرہ میں یہ پیسہ دیا جاسکتا ہے اور اگر یہ نہ ہوسکے تو بلانیت ثواب غرباء اور فقراء کو تقسیم کردینا چاہئے۔ (مستفاد: محمودیہ ڈابھیل ۱۶/ ۳۸۱، فتاوی عثمانی ۳/ ۲۷۵، کتاب الفتاوی ۵/ ۳۰۶، ایضاح النوادر ۹۹)

ففي جميع الأحوال: المال الحاصل له حرام عليه؛ ولكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه، ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك

وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹)

ويردونها على أربابها إن عرفوهم، وإلا تصدقوا بها؛ لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، فصل في البيع، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵، هندية، زكريا قديم ۵/۳۴۹، جديد ۵/۴۰۴، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ۶/۲۷، زكريا۷/۶۰، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/۲۴۶، البحر الرائق، زكريا۹/۳۶۹، کوئٹه ۸/۲۰۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۲۱۹/۴۰)

بینک اور جیون بیمہ کے سود کا مصرف

سوال [۹۱۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) بینک سے ملے ہوئے انٹرسٹ کا استعمال اپنی ذات پر کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو اس کا استعمال کہاں ہوسکتا ہے؟

(۲) بینک میں فکس رقم جو وقت مقرر پر دوگنی ہوجاتی ہے، اس کا استعمال اپنی ذات پر کریں یا نہیں؟

(۳) جیون بیمہ کے فنڈ سے ملی رقم استعمال کریں یا نہیں؟

(۴) جیون بیمہ یا فکس ڈپوزٹ یا بینک انٹرسٹ ہم اب لیں یا نہیں؟

(۵) مندرجہ بالا حالات میں میری رقم کے مصارف کیا ہیں، اس صورت میں حج کے لئے جانا چاہتا ہوں میرا جانا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد اختر خاں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱/۲/۳) بینک سے ملا ہوا انٹرسٹ اور فکس ڈپوزٹ کی رقم صریح سود ہونے کی بنا پر ناجائز اور حرام ہے، اس کا استعمال اپنی ذات پر ہرگز جائز نہیں، حکومت کے واجبی جبری ٹیکس مثلاً انکم ٹیکس، کسٹم ٹیکس اور سیل ٹیکس میں اس کو دیا جاسکتا ہے، یا پھر بلانیت ثواب محتاجوں کو دے دیا جائے۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فإما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء؛ ولكن لايريد بذلك الأجر والثواب؛ ولكن يريد دفع المعصية عن نفسه. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور قديم ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹)

(۴) جیون بیمہ اور فکس ڈپوزٹ کرانا سود، قمار اور رشوت کے لازم آنے کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہے اور اگر ان چیزوں کو پہلے سے کرار کھا ہے، تو اس کی نیز انٹرسٹ کی رقم کو بینک سے نکال لیا جائے ،اور انٹرسٹ کی رقم کو حکومت کے واجبی ٹیکس انکم ٹیکس، کسٹم ٹیکس، سیل ٹیکس، میں دیا جاسکتا ہے یا پھر محتاجوں پر بلانیت ثواب صدقہ کردیا جائے۔(مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۹۹-۵۷۱، محمودیہ ۱۷/۱۳۸، جدید ڈابھیل ۱۶/۳۸۳)

(۵) ایسی رقم سے حج کرنا جس کی زکوۃ ادا نہ کی گئی ہو، اس سے حج تو ہو جائے گا؛ لیکن زکوۃ کی ادائے گی میں تاخیر کا گناہ ہوگا اور زکوۃ ادا کرنا لازم بھی ہوگا؛ اس لئے فوری طور پر اس کی زکوۃ نکال کر الگ کر لینا چاہئے۔(مستفاد: امدادالأحکام ۳/۱۶۱)

ويجتهد في تحصيل نفقة حلال، فإنه لا يقبل بالنفقة الحرام كما ورد في الحديث: مع أنه يسقط الفرض عنه معها ولا تنا في بين سقوطه، وعدم قبوله فلا يثاب لعدم القبول، ولايعاقب عقاب تارك الحج. (شامي، كتاب الحج،

مطلب فيمن حج بمال حرام، كراچي ٢/ ٤٦٥، زكريا ٢/ ٤٦٥، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/ ٥٥٣، كراچي ٦/ ٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/ ٢٧، زكريا ٧/ ٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/ ٣٦٩، كوئٹه ٨/ ٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/ ٣٤٩، جديد ٥/ ٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/ ٢٤٦، حاشية ترمذي ١/ ٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/ ٣٣-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ ذیقعدہ ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۴۰۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱۱/۱۵ھ

سودی رقم کہاں خرچ کریں؟

سوال [۹۱۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) مدرسہ فرقانیہ ایک رجسٹرڈ ادارہ ہے، چیریٹی کمشنر کی ہدایت کے مطابق مدرسہ کی رقوم کو بینک میں جمع کرنا ضروری ہوتا ہے، جو رقمیں بینک میں جمع رہتی ہیں، ان پر بینک سے سود ملتا ہے، بیس، پچیس ہزار روپیہ سود کی رقم بینک میں جمع پڑی ہے، اس کے استعمال نہیں کیا گیا، مدرسہ میں تعمیری سلسلہ چل رہا ہے، مدرسہ کی اصل رقم قریب الختم ہے۔

دریافت طلب یہ ہے کہ بیت الخلاء اور غسل خانہ بننے والا ہے، اس میں سود کی رقم کا استعمال ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اس کے علاوہ سود کی رقم کا کوئی اور مصرف ہے یا نہیں؟

(۲) مدارس دینیہ میں زیادہ تر آمدنی خیرات، زکوۃ اور چرم قربانی وغیرہ سے ہوتی ہے، مہاراشٹر میں پبلک اداروں کا رجسٹریشن لازمی ہے، ان رجسٹرڈ اداروں میں سالانہ جتنی آمدنی ہوتی ہے، چیریٹی کمشنر کل آمدنی پر سالانہ دو فیصدی ٹیکس عائد کرتا ہے، جس کا ادا کرنا لازمی ہوتا ہے۔ دریافت طلب یہ ہے کہ یہ ٹیکس سود کی رقم سے ادا کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالحمید انصاری، مدرسہ فرقانیہ، محمد علی روڈ، مؤمن پورہ، ناگپور-۱۸

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱)مذکورہ سود کی رقم کو مدرسہ کی ضروریات (تنخواہ تعمیر وغیرہ) میں خرچ کرنا جائز نہیں ہوگا؛ البتہ غریب طلبہ کی ضروریات میں خرچ کیا جاسکتا ہے (مثلاً لحاف، بستر، جوتا، کرایہ) یا ان کے ہاتھ میں دیدی جائے، وہ جہاں چاہیں خرچ کریں۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث (إلى قوله) فلا حيلة له إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹)

(۲) حکومت کے ٹیکس میں بینک کی سودی رقم کا دینا بلا کراہت جائز ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مال حرام میں اصل حکم یہ ہے کہ مالک کو کسی بھی عنوان سے واپس کردیا جائے، اور ٹیکس بھی حکومت کے خزانہ میں جمع ہوتا ہے، تو ٹیکس کے عنوان سے حکومت کا پیسہ حکومت کو واپس کرنا ثابت ہوتا ہے۔

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق (إلى قوله) لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/۲۷، زكريا ۷/۶۰، البحر الرائق، زكريا ۹/۳۶۹، كوئٹه ۸/۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/۳۴۹، جديد ۵/۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/۲۴۶، حاشية ترمذي ۱/۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/۳۳-۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍صفر المظفر ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹/۳۳۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۲/۱۵ھ

سودی رقم کہاں کہاں خرچ کرسکتے ہیں؟

سوال [۹۱۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) سودی رقم کے مصارف کیا کیا ہیں؟

(۲) رفاہ عام مثلاً عام راستہ یا عوامی بیت الخلاء کی تعمیر میں حیلۂ تملیک کے ذریعہ سودی رقم کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

(۳) کوئی صاحب استطاعت آدمی سودی رقم سے خریدی ہوئی ''اینٹ'' بطور قرض یا ادھار لے سکتا ہے؟

(۴) اگر کسی مستطیع آدمی نے ''سودی رقم سے خریدی ہوئی اینٹ'' بطور قرض یا ادھار لے کر اپنی ضررت میں استعمال کرلیا ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: خورشید عالم قاسمی، خادم تدریس مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: (۱) سودی رقم کے بارے میں اصل حکم یہ ہے کہ اصل مالک کو کسی بھی عنوان سے واپس کردی جائے اور اصل مالک تک رسائی نہ ہونے کی صورت میں اپنے استعمال میں لانا قطعاً جائز نہیں؛ بلکہ فقراء ومساکین پر بلانیت ثواب تقسیم کردینا لازم ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۹۹تا ۱۰۰)

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أو حصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء؛ لأنه لو أنفق على نفسه فقد استحكم مارتكبه من الفعل الحرام. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/۳۷، دار البشائر الإسلامية، بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث:۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية

ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديو بند ١/٣٣-٣٤)

(۲) سودی رقم میں کسی طرح کا بھی حیلہ صحیح نہیں؛ کیوں کہ یہ حرام مال ہے، جس میں تبدل ملک اور انتقال ملک سے حلت نہیں آسکتی؛ اس لئے کسی بھی طرح کا حیلہ کر کے رفاہ عام میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ ۳/۱۷۱)

(۳/۴) مسلمان کے لئے سودی لین دین اور اس کے استعمال یا سودی رقم سے خریدی ہوئی شئ کا استعمال کسی بھی طرح جائز نہیں نہ عاریۃً، نہ ملکیۃً، نہ قرض کے طور پر؛ کیوں کہ قرآن وحدیث میں سودی لین دین اور اس کے استعمال کی حرمت مطلقاً بیان کی گئی ہے؛ اس لئے مستطیع شخص کو سودی رقم سے خریدی ہوئی اینٹ وغیرہ قرض لے کر استعمال کرنا جائز نہیں ہے، اس سے اجتناب لازم ہے، تاہم اگر کسی سے لاعلمی میں ایسا ہو جائے اور اس نے سودی رقم سے خریدی ہوئی اینٹ وغیرہ قرض لے کر استعمال کر لیں تو ناجائز اور امر ممنوع کا ارتکاب کرنے کی وجہ سے ذمہ میں گناہ لازم آیا، اس سے توبہ واستغفار کر لے اور اس کا معاوضہ دیدے۔ امید ہے کہ انشاء اللہ اس طرح سے گناہ معاف ہو جائے گا۔

قال الله تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا . [البقرة:٢٧٥]

عن جابر رضي الله عنه، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، باب لعن آكل الربا، النسخة الهندية، ٢/٢٧، بيت الأفكار رقم:١٥٩٨)

أن الحرام لا يتعدّى ذمتين...... وهو محمول على ما إذا لم يعلم بذلك. (شامي، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب الحرمة تتعدد، زكريا ٧/٣٠١، كراچي ٥/٩٨)

عن أبي عبيدة الله بن عبد الله، عن أبيه قال: قال رسول الله صلى الله

علیہ وسلم: التائب من الذنب كمن لا ذنب له. (سنن ابن ماجه، باب ذكر التوبة، النسخة الهندية ۲/۳۲۳، دارالسلام رقم: ٤٢٥٠، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ١٠/١٥٠، رقم: ١٠٢٨١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍رجب المرجب ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶؍۷۴۷۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳؍۷؍۱۴۲۲ھ

سودی رقم کو کہاں صرف کریں؟

سوال [۹۱۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بینک میں رقم جمع کرنے کے بعد کبھی بھی اس کو نکالا جاتا ہے، تو اس پر پیسہ زائد ملتا ہے جو کہ سود ہے اور اس سود کا استعمال مسلمان پر حرام ہے، تو کھاتہ دار اس سود کو کیا کرے؟ ہم لوگوں میں مختلف رائے ہے۔

(۱) بعض کہتے ہیں کہ اس سے مسجد اور مدرسہ کے بیت الخلاء بنوائے جائیں۔

(۲) بعض کہتے ہیں کہ یتیم ومسکین کو دے دیا جائے۔

(۳) بعض کہتے ہیں کہ اگر کھاتے دار وغیرہ پر کوئی سرکاری مصیبت آپڑے مثلاً ناحق مقدمہ اور عزت بچانے کا مسئلہ، تو رشوت میں سود کا پیسہ دے کر عزت بچالی جائے یا کسی مسلمان پر کوئی مصیبت آپڑے تو سود کے پیسہ سے اس کا کام نکال دیا جائے اور پھر پیسہ جمع کر دیا جائے، تو کیا یہ جائز ہے؟ یہ تو دنیا والوں کی رائے ہے، آپ حضرات اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟ اور علماء حق کا متفقہ فیصلہ کیا ہے؟

گذارش ہے کہ بالتفصیل جواب تحریر فرمائیں اور اس کو ماہنامہ ندائے شاہی میں بھی مفصل طریقہ سے تحریر فرمادیں۔

المستفتی: محمد آفاق، کرتپور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) کھاتہ دار کے لئے سود کا پیسہ بینک سے نکالنے کی اجازت ہے؛ لیکن اس کو اپنے تصرف میں لانا جائز نہیں ہے؛ بلکہ فقیر کو بغیر نیت ثواب دے دینا واجب ہے۔

يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۳۷/۱، دارالبشائر الإسلامية بيروت ۳۵۹/۱، تحت رقم الحديث: ۵۹)

(۲) ان کا کہنا صحیح اور درست ہے۔

(۳) بینک سے حاصل شدہ سود کی رقم رشوت میں دینا جائز نہیں ہے؛ البتہ سرکاری مصیبت انکم ٹیکس، سیل ٹیکس اور کسٹم ٹیکس وغیرہ میں دے دینا جائز ہے، جو حکومت کے خزانہ میں داخل ہوجاتا ہے؛ اس لئے کہ حرام مال میں اصل حکم یہی ہے کہ اصل مالک کو کسی بھی عنوان سے واپس کردیا جائے، اور مذکورہ ٹیکسوں کی شکل میں حکومت کے خزانہ سے آیا ہوا مال دوبارہ حکومت کے خزانہ میں واپس ہوجاتا ہے۔

إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۳۷/۱، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۳۵۹/۱، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۵۵۳/۹، كراچي ۳۸۵/٦، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۲۷/٦، زكريا ٦٠/٧، البحر الرائق، زكريا ۳٦۹/۹، كوئٹه ۲۰۱/۸، هندية، زكريا قديم ۳٤۹/۵، جديد ٤٠٤/۵، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲٤٦/۳٤، حاشية ترمذي ۳/۱، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۳۳/۱-۳٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲٦ ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱٦۵/۲۸)

سودی رقم کو کہاں کہاں صرف کر سکتے ہیں؟

سوال [۹۱۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے ۵۰۰/ روپیہ کچھ مدت کے لئے بینک میں ڈال دیئے، مدت گذر جانے کے بعد ان کو بینک سے اضعافاً مضاعفہ سات سو روپیہ ملے، تو کیا یہ روپیہ سود میں شمار ہوں گے یا نہیں؟ اس کو مصرف میں لا سکتے ہیں یا نہیں؟

اور اگر مدرسہ کے روپیہ ہوں اور بینک سے زیادہ ملیں تو مدرسہ کے کام میں لانا جائز ہوگا یا نہیں اور مسلم فنڈ میں جو روپیہ جمع کئے جاتے ہیں اس سے جو اصل رقم سے زیادہ روپیہ ملتے ہیں، اس کا لینا کیسا ہے؟ اور سودی روپیہ کا مصرف کیا ہے؟ ان باتوں کے متعلق آپس میں ٹکراؤ ہے، ایک کہتا ہے بینک سے جو اصل رقم سے زیادہ ملتا ہے صحیح ہے۔ دوسرا کہتا ہے نا جائز ہے۔

المستفتی: شمیم اختر، مہوت پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک میں روپیہ جمع کرنے کے بعد جو زائد رقم اصل رقم پر ملتی ہے، وہ سود میں داخل ہو کر نا جائز وحرام ہے۔

الربوا كل زيادة لم يقابلها عوض. (أحكام القرآن تهانوي ١/٤٧٣، وهكذا في المبسوط، دارالكتب العلمية بيروت ١٠٩/١٢، هداية، اشرفي ٧٨/٣، هندية، زكريا قديم ١١٧/٣، جديد ١١٨/٣)

اس کو ذاتی مصرف میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے؛ بلکہ نادار اور غریب لوگوں کو بلا نیت ثواب دے دینا ضروری ہے، اسی طرح بینک سے ملی ہوئی زائد رقم مدرسہ کی عمارت، مدرسین کی تنخواہ وغیرہ میں صرف کرنا جائز نہیں ہے، غریب ونادار طلبہ کو دیدینا ضروری ہے۔

وأما إذا كانت عند رجل مال خبيث...... فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/ ۵۵۳، كراچي ۶/ ۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/ ۲۷، زكريا ۷/ ۶۰، البحر الرائق، زكريا ۹/ ۳۶۹، كوئٹه ۸/ ۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/ ۳۴۹، جديد ۵/ ۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/ ۲۴۶، حاشية ترمذي ۱/ ۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/ ۳۳، ۳۴)

اورآپ نے جومسلم فنڈ سے سود ملنے کی بات لکھی ہے، اس کا علم ہم کو نہیں ہے۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۳۹۹۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۴/ ۵/ ۱۴۱۵ھ

بینک سے ملی سودی رقم کا صحیح مصرف

سوال [۹۲۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید ایک کمپنی چلا رہا ہے، اب اس کمپنی کی تجارت سے جو بھی منافع آرہے ہیں، ان کو بینک میں جمع کرتا رہتا ہے صرف اور صرف تحفظ کی نیت سے نہ کہ شہرت اور نہ نفع وصول کرنے کی وجہ سے بلکہ صرف تحفظ مقصود ہے، مثلاً دس لاکھ روپیہ بینک میں جمع کیا، اس کا سال بھر کا نفع (انٹرسٹ) بینک نے زید کو دو لاکھ روپیہ دیدیا ہے۔ اب یہ جو زائد رقم آرہی ہے، اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ اور اس کا مصرف کیا ہے؟ اگر اس کو استعمال کرسکتا ہے، تو کہاں کہاں پر کرسکتا ہے؟ اور کن کن پر کرسکتا ہے۔

زید کو جو زائد رقم بینک سے ملی ہے (انٹرسٹ) اس حکومت کی طرف سے جو بھی تجارت میں کاروبار میں ٹیکس لاگو ہوتا ہے، انکم ٹیکس، سیل ٹیکس اور اس کے علاوہ جو بھی ٹیکس ہے،

ان کی ادائے گی میں استعمال کرسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد وسیم رامپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو سودی رقم (انٹرسٹ) بینک وغیرہ سے حاصل ہواس کا شرعی حکم یہ ہے کہ اولاً حکومت کی طرف سے عائد کردہ غیر شرعی ٹیکسوں میں اسے دیدیا جائے تاکہ اصل مالک تک وہ ٹیکس وغیرہ کے عنوان سے پہونچ جائے اور اگر ٹیکس وغیرہ کے عنوان سے دینے کی شکل نہیں ہے، تو غرباء اور مسکینوں میں ثواب کی نیت کئے بغیر تقسیم کردیا جائے، اپنے ذاتی کام میں لانا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ۱۴۲، فتاوی رحیمیہ ۱۹۹/۲، جدید زکریا ۲۷۸/۹، فتاوی نظامیہ اوندریہ ۲۱۸/۱)

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أو حصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء؛ لأنه لو أنفق على نفسه فقد استحكم ما ارتكبه من الفعل الحرام. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۳۷/۱، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۳۵۹/۱، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۵۵۳/۹، كراچي ۳۸۵/۶، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۲۷/۶، زكريا ۶۰/۷، البحرالرائق، زكريا ۳۶۹/۹، كوئٹه ۲۰۱/۸، هندية، زكريا قديم ۳۴۹/۵، جديد ۴۰۴/۵، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۴۶/۳۴، حاشية ترمذي ۳/۱، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۳۳/۱-۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ جمادی الاولی ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۱۶۰/۳۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۵/۱۴۲۰ھ

سودی رقم کا مصرف کیا ہے؟

سوال [۹۱۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سودی رقم کا مسجد کی اصل عمارت کے علاوہ اس کی چہاردیواری بیت الخلاء اور غسل خانوں میں خرچ کرنا یا رفاہ عام مسلمانوں کے قبرستان، سڑک اور پل وغیرہ میں لگا دینا کیسا ہے؟

(۲) اگر کسی نے سود کی رقم مدرسہ میں چندہ دی تو یہ رقم مدرسہ کے لئے سود ہی کہلائے گی یا تبدل ملک کی وجہ سے بطور صدقہ ہوگی اور اس رقم کو مدرسہ کی تعمیر میں خرچ کرنے کے بارے میں کیا حکم ہوگا؟

نیز اس رقم کو مدرسہ کے طلباء کی ضروریات مثلاً کھانے پینے اور لباس وکتب میں صرف کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اور مسئلہ کے حکم میں باضابطہ بورڈنگ کے ساتھ چلنے والے مدارس اور صباحی شکل کے دونوں یکساں طور پر شامل رہیں گے یا ان میں کچھ فرق بھی ہوگا؟

المستفتی: ابرارالحق غفرلہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) سودی رقم مسجد یا مدرسہ کی چہاردیواری، بیت الخلاء، غسل خانہ یا مسلمانوں کے قبرستان اور سڑک اور دیگر رفاہ عام میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے، اس کا اصل حکم یہی ہے کہ مالک کو واپس کر دینا ممکن ہو تو کسی بھی عنوان سے واپس کر دی جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو، تو بلا نیت ثواب فقراء میں تقسیم کر دینا واجب ہے۔

إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالک، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلک الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء،

سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/۲۷، زكريا ۷/۶۰، البحر الرائق، زكريا ۹/۳۶۹، كوئٹه ۸/۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/۳۴۹، جديد ۵/۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/۲۴۶، حاشية ترمذي ۱/۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/۳۳-۳۴)

لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه.

(شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، فصل في البيع، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ۶/۲۷، زكريا ۷/۶۰، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/۲۴۶، البحر الرائق، زكريا ۹/۳۶۹، كوئٹه ۸/۲۰۱)

(۲) تبدل ملک کی وجہ سے مال حرام حلال نہیں ہوتا ہے، وہ بحالہ حرام رہتا ہے اور سودی رقم میں خبث اور حرمت فساد ملک کی وجہ سے نہیں ہے؛ بلکہ عدم ملک کی وجہ سے ہے؛ لہٰذا تبدل ملک کی وجہ سے اس کی حرمت میں کوئی فرق نہ آئے گا؛ اس لئے تعمیرات وغیرہ میں خرچ کرنا کسی طرح جواز کے دائرہ میں داخل نہیں ہو سکے گا۔

أما الخبث لعدم الملك عند أبي حنيفةؒ و محمد يشمل النوعين.

(هداية، كتاب البيوع، فصل في أحكام اشرفي ۳/۶۶)

الحرام ينتقل أي تنتقل حرمته وإن تدولته الأيدى وتبدلت الأملاك.

(شامي، مطلب في تعيين الدراهم في العقد الفاسد، زكريا ۷/۳۰۰، كراچي ۵/۹۸)

ہاں البتہ سودی رقم نادار طلبہ کی ضروریات میں خرچ کرنا جائز ہے، مگر بجائے تصرف کر کے اس رقم کے عوض اشیاء دینے کے وہی رقم ہاتھ میں دیدینا زیادہ بہتر ہوگا۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث (إلى قوله) فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹،

وھکذا في الشامي، زکریا ۹/ ۵۵۳، کراچي ۶/ ۳۸۵، تبیین الحقائق امدادیة ملتان ۶/ ۲۷، زکریا ۷/ ۶۰، البحر الرائق، زکریا ۹/ ۳۶۹، کوئٹه۸/ ۲۰۱، هندیة، زکریا قدیم ۵/ ۳۴۹، جدید ۵/ ۴۰۴، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۳۴/ ۲۴۶، حاشیة ترمذي ۱/ ۳، معارف السنن، اشرفیة دیوبند ۱/ ۳۳-۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹/ ۳۳۴۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۳/۳ھ

سودی رقم کا کیا کریں؟

سوال [۹۱۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مجھے کاروبار کے سلسلے میں حکومت کے قانون کے تحت اپنا روپیہ بینک یا حکومت کے کسی اور کھاتہ میں رکھنا ہوتا ہے، جس کو واپسی کے وقت حکومت سود بھی دیتی ہے اور اگر ہم اس سود کو نہ لیں، تو وہ رقم مسلمانوں کے خلاف استعمال ہوتی ہے، یا ہوسکتی ہے، جیسا کہ پہلے کے واقعات شاہد ہیں، کیا ہم اس رقم کو لے کر کسی رفاہ عامہ کے کام میں صرف کر سکتے ہیں؟ مثلاً

(۱) کسی اسکول یا مدرسہ میں خرچ کی جاسکتی ہے؟
(۲) کسی غریب لڑکے یا لڑکی کی شادی کے لئے دی جاسکتی ہے؟
(۳) کسی ضرورت مند کو رہائش کے لئے گھر بنوا کر دیا جاسکتا ہے؟
(۴) کسی غریب کو کپڑے دیئے جاسکتے ہیں؟
(۵) بچوں کی تعلیم دری رکھنے کے لئے فنڈ قائم کیا جاسکتا ہے؟
(۶) مسلمانوں کی فلاح وبہبود کے لئے فنڈ قائم کیا جاسکتا ہے؟

المستفتی: عبدالرحمٰن، پرنس روڈ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱)اسکول یامدرسہ میں خرچ کرنا جائز نہیں ہوگا، ہاں البتہ اسکول یا مدرسہ کےفقیر غریب کودیدینا درست ہوسکتا ہے؛ کیونکہ یہ مال حرام ہے،اس کامصرف صرف فقراء ہیں۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أو حصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/ ۵۵۳، كراچي ۶/ ۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/ ۲۷، زكريا ۷/ ۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/ ۳۶۹، كوئٹه۸/ ۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/ ۳۴۹، جديد ۵/ ۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/ ۲۴۶، حاشية ترمذي ۱/ ۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/ ۳۳-۳۴)

(۲) جی ہاں دی جاسکتی ہے،جیسا کہ مذکورہ دلیل سے واضح ہوتا ہے؛لیکن اس میں ثواب واحسان کی نیت کرنا جائز نہیں ہے؛ بلکہ اپنے اوپر سے حرام مال کے وبال کو دور کرنے کی نیت کریں۔

(۳) جی ہاں یہ جائز ہے؛لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ اثاثہ اور لیبر اورمزدوری کی اجرت کافقیر کو مالک بنا کرفقیر کے ہاتھ سے دلوایا جائے۔

(۴) جی ہاں یہ بھی مذکورہ شرائط کے ساتھ درست ہے۔

(۵) یہ جائز نہیں ہے؛اس لئے کہ اس میں من وجہ سود سے نفع حاصل کرنا پایا جاتا ہے اور یہ ناجائز اورحرام ہے۔

(۶) یہ ہرگز جائز نہیں ہے، اس میں مسلمانوں کی فلاح کی امید کرنا بھی ناجائز اورحرام ہےاوراعلان خداوندی کا مقابلہ کرنا ہے،اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس میں تمہاری

فلاح نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو مٹاتا ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: يَمۡحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَيُرۡبِي الصَّدَقَاتِ. [البقرۃ: ۲۷۶]

قال اللّٰہ تعالیٰ: فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَأۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ. [البقرۃ: ۲۷۹] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۲۷۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/ ۶/ ۱۴۱۱ھ

بینک سے ملے سود کو کہاں خرچ کر سکتے ہیں؟

سوال [۹۱۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بینک سے حاصل شدہ سود کا مصرف کیا ہے؟ سود کی رقم کو رفاہ عام مثلاً بیت الخلاء بنوانا، نالی یا غسل خانہ بنوانا، بجلی کی لائن کا انتظام کر دینا اور اسی طرح دیگر رفاہی امور میں خرچ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جو علماء سودی رقم کو رفاہ عام میں خرچ کی اجازت دیتے ہیں، وہ برحق ہیں یا خاطی؟

المستفتی: حافظ نظام الدین، امام جامع مسجد راجہ کا تاج پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک سے حاصل شدہ سود کی رقم کا مصرف یہ ہے کہ انکم ٹیکس اور سیل ٹیکس وغیرہ کے عنوان سے سرکاری خزانہ اور سرکاری بینک میں واپس کر دی جائے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو بلا نیت ثواب فقراء کو دیدی جائے۔

ویجب علیہ أن یردہ علی مالکہ إن وجد المالک. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/ ۳۷، دار البشائر الإسلامية، بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/ ۵۵۳، كراچي ۶/ ۳۸۵،

تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/ ٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤)

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/ ٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤)

لہٰذا رفاہ عام میں خرچ کے جواز کی کوئی دلیل ہمارے سامنے نہیں ہے؛ اس لئے بیت الخلاء، نالی، غسل خانہ، بجلی کی لائن وغیرہ میں خرچ کرنا جائز نہ ہوگا اور جو حضرات رفاہ عام میں خرچ کرنے کی اجازت دیتے ہیں، وہ دلیل میں اس جزئیہ کو پیش کرتے ہیں، جس میں اس کی صراحت ہے کہ جب حکومت اسلام کا لشکر دارالحرب پہونچ کران کے مال پر بغیر قتال کے قبضہ کرلیں، تو اس کو مسلمانوں کے رفاہ عام میں خرچ کردیں۔

وما أوجف المسلمون عليه من أموال أهل الحرب بغير قتال يصرف في مصالح المسلمين كما يصرف الخراج. (هداية، كتاب السير، باب المستأمن، اشرفي ٢/٥٨٧)

دوسرا جزئیہ یہ بھی پیش کرتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان دارالاسلام سے ویزا لے کر دارالحرب پہونچ جائے اور کسی حربی کا مال غصب کر کے دارالاسلام واپس چلا جائے، تو اس مسلمان کو اس بات پر مجبور نہیں کیا جائے گا کہ وہ مالک کو واپس کردے؛ بلکہ اس کا مالک وہی مسلمان ہوجائے گا۔

وإذا دخل المسلم دارالحرب بأمان فأدانه حربي،أوأدان هو حربيًا، أو غصب أحدهما صاحبه، ثم خرج إلينا واستأمن الحربي لم يقض لواحد منهما على صاحبه بشيئ. (هداية، كتاب السير، باب المستأمن، اشرفي ٢/ ٥٨٤)

اب ان میں سے کوئی بھی جزئیہ ہندوستان میں مسلمانوں کا ہندوستانی بینک کے سودی رقم کورفاہ عام میں خرچ کے جواز پر منطبق نہیں ہوتا؛ لہٰذاان کا دعویٰ دلیل کے موافق نہیں ہے؛اس لئے ہم رفاہ عام میں خرچ کو ناجائز کہنے پر مجبور ہیں۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍محرم الحرام ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر:الف ۳۱؍۳۸۳۱)

بینک سے ملے سود کا حکم

سوال [۹۱۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگرایک شخص نے بینک میں پیسہ رکھا ہے،تو اس کا سود کھانا جائز ہے یانہیں؟ اگر جائز ہےتو قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

المستفتی: عبدالرزاق قریشی،جموں وکشمیر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: بینک کا سود زمانہ جاہلیت کی طرح ہے؛لہٰذا اس کو اپنے استعمال میں لانا کسی بھی مسلمان کے لئے جائز اور حلال نہیں ہےاوراگر حکومت کو کسی طرح واپسی کی کوئی صورت نہ بن سکے،تو بلانیت ثواب فقراء پر تقسیم کردینا واجب ہے۔

(مستفاد:ایضاح المسائل اضافہ شدہ ۱۵۹)

وأما ربا النسيئة: فهوالأمر الذي كان مشهوراً متعارفاً في الجاهلية، وذٰلک أنهم كانوا يدفعون المال على أن يأخذوا كل شهر قدراً معيناً،

ویكون رأس المال باقيًا. (تفسير كبير للإمام الفخر الرازيؒ، تحت تفسير رقم الآية:۲۷۵، من سورة البقره۷/۹۱)

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة والاستئجار على المعاصي والطاعات، أو بغير عقد كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه؛ ولكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه، ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، البحرالرائق، زكريا ۹/۳۶۹، كوئٹه ۸/۲۰۱، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ۶/۲۷، زكريا ۷/۶۰، شامي، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵، هندية، زكريا قديم ۵/۳۴۹، جديد ۵/۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/۲۴۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ شعبان المعظم ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/۴۹۸۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۷/۸/۹ھ

سودی رقم کو کہاں خرچ کر سکتے ہیں؟

سوال [۹۱۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کارخانہ دار شخص ہے، کارخانہ ودیگر کاروبار کی وجہ سے حکومت کو انکم ٹیکس، سیل ٹیکس، ودیگر ٹیکس بھی ادا کرنے پڑتے ہیں، کبھی ٹیکس کی ادائے گی میں تاخیر بھی ہو جاتی ہے، تاخیر کی وجہ سے حکومت کی جانب سے اس پر بطور جرمانہ کچھ رقم اور ڈالی جاتی ہے۔

دریافت طلب بات یہ ہے کہ حکومت کو جو ٹیکس ادا کیا جاتا ہے، اس کی ادائے گی

سودی رقم سے کی جاسکتی ہے یانہیں؟ اسی طرح جورقم بطورجرمانہ ڈالی جاتی ہے، اس کی ادائیگی سودی رقم سے کر سکتے ہیں یانہیں

(۲) بعض مجبوریوں کی بناء پر پیسہ بینک میں جمع کرنا پڑتا ہے، جس پر سود بھی ملتا ہے، بینک سے حاصل شدہ سود کا مصرف کیا ہے؟

(۳) سودی رقم سے یا صدقہ کی رقم سے اگر ہم کسی حاجت مند شخص کو دیتے ہیں، تو وہ ہم سے بہت دبتا ہے اور وہ اس کی وجہ سے ہمارا احسان سمجھتا ہے، سودی رقم کسی غریب کو دی جاسکتی ہے یانہیں؟ اسی طرح صدقہ کی نیت سے سودی رقم کسی غریب کو دوسرے کے ہاتھ سے دلوا سکتے ہیں یانہیں؟

المستفتی: محمد شفیع ٹانڈہ، رام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) بینک میں روپیہ جمع کرنے کے بعد جورقم سود کے نام سے ملتی ہے، اس کا اصل مالک کوواپس کرنا ضروری ہے، کسی بھی طرح سے ہو؛ لہٰذا مذکورہ صورت میں سیل ٹیکس، انکم ٹیکس، اسی طرح ٹیکس کی ادائے گی کی تاخیر کی صورت میں حکومت جو رقم بطور جرمانہ لیتی ہے، اس میں سود کی رقم دی جاسکتی ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱۰۱/۱، فتاوی محمودیہ ۲۰۳/۴، ڈابھیل ۳۸۲/۱۶)

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء؛...... لكن لايريد بذلك الأجر والثواب. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۳۷/۱، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۳۵۹/۱، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۵۵۳/۹، كراچي ۳۸۵/۶، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۲۷/۶، زكريا ۶۰/۷، البحرالرائق، زكريا ۳۶۹/۹، كوئٹه ۲۰۱/۸، هندية، زكريا قديم ۳۴۹/۵،

جدید ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤)

(۲) بینک سے جوسود ملتا ہے، اس کا مصرف یہ ہے کہ اس کو اصل مالک کو واپس کر دیا جائے اور اگر اصل مالک تک واپس کرنا ممکن نہ ہو، تو غریبوں اور مسکینوں میں بغیر ثواب کی نیت کے تقسیم کر دیا جائے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ۴/۲۰۳، ڈابھیل ۱۶/۳۸۲)

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء؛...... لكن لايريد بذلك الأجر والثواب. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه ٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤)

(۳) سودی اور صدقہ کی رقم غریبوں فقیروں کو دی جاسکتی ہے اور دوسرے کے ذریعہ بھی دلائی جاسکتی ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ۴/۲۰۳، ڈابھیل ۱۶/۳۸۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍رجب المرجب ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/۵۸۵۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۷/۱۴۱۹ھ

سودی رقم کا مصرف، جبری مطالبہ میں سودی رقم دینا

سوال [۹۱۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ زید نے کچھ رقم تحفظ کے لئے بینک میں رکھی سال پورا ہونے پر بینک زید کو کچھ رقم انٹرسٹ دے رہا ہے، کیا زید اس رقم (انٹرسٹ) کو ان جگہوں پر استعمال کرسکتا ہے یانہیں؟ مثلاً زید کی کمپنی میں حکومت والے (سیاسی احباب) بار بار آکر زید سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمارا یہ کام ہے اتنی رقم دو، تو کیا اس جگہ ان کے اس ظلم وزبردستی مطالبہ پر وہ انٹرسٹ کی رقم کو دے سکتا ہے یانہیں؟

(۲) زید کے رشتہ دار میں قریب کے بھی دور کے بھی کچھ لوگ اس طرح ہیں کہ وہ کاروباری لائن سے بینک کے مقروض ہیں مثلاً عمر بینک سے دس لاکھ روپئے کا مقروض ہے اور اس پر مزید بینک کا انٹرسٹ دو لاکھ روپئے لاگو ہوگیا، گویا عمر بینک کا کل بارہ لاکھ روپیہ کا مقروض ہوا۔

اب عمر کی ملکیت میں نہ کوئی جائیداد ہے اور نہ کوئی چیز کہ وہ فروخت کرکے اس قرض سے چھٹکارا حاصل کرسکے، تو کیا زید اس حال میں اپنی اس انٹرسٹ کی رقم کو عمر کے بینک کے قرض اور اس پر جو انٹرسٹ لاگو ہوا ہے، اس کی ادائیگی کے لئے استعمال کرسکتا ہے یانہیں؟

(۳) زید کو جو انٹرسٹ کی رقم ملی ہے، کیا اس کو مسجد یامدارس کے بیت الخلاء یا ان کی دیواروں پر کمپونڈ وال یا سڑک یا گلی کی مرمت کے تعمیری کام کے لئے استعمال کرسکتا ہے یانہیں؟

(۴) کیا زید کو جو انٹرسٹ ملا ہے اس رقم کو بلانیت ثواب غریبوں کی شادی بیاہ یا علاج یا ان کی کسی بھی ضروریات زندگی کے لئے دے سکتا ہے اور دینے میں کوئی شرعی حدود ہیں یانہیں؟ مثلاً ہزار دو ہزار پانچ ہزار روپئے وغیرہ تک حد ہے یا بڑھا کر بھی دے سکتا ہے؟ مثلاً ایک لاکھ دو لاکھ روپئے مثال کے طور پر شادی ہے یا دل کا آپریشن ہے، اس کے لئے خرچ ایک دو لاکھ آتا ہے دے سکتا ہے یانہیں؟

(۵) زید کو انٹرسٹ کی رقم بینک سے ملی، زید نے ۵۰/لاکھ رکھا تھا تحفظ کے لئے اس پر بینک نے ۵/لاکھ زید کو دیا۔

سوال یہ ہے کہ یہ ۵؍لاکھ انٹرسٹ کا جو بینک سے ملا ہے، اس رقم سے زید کسی بھی ادارے کومثلاً بیت المال یامدارس یا یتیم خانہ یا کوئی ایسے ادارے کو جوصرف مسلمان غریب طبقہ میں خیرخواہی کا کام کرتے ہیں، ایسےاداروں کے لئے کوئی جائیداد خرید کر دیدی جائے یا بلڈنگ، دوکان، لاری، بس یااس طرح کی کوئی چیز خرید کر دیدی جائے، جس سے ماہانہ کچھ ادارے کونفع مل جائے، بلانیت ثواب کےتو کیااس طرح کرنا درست ہے جائز ہے یانہیں؟

المستفتی: ملک اکبرحسین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) حکومت والےسیاسی لوگ جوظاماً مطالبہ کرتے ہیں اس میں بھی رقم کا استعمال جائزنہیں ہے؛ کیونکہ یہ سودی رقم کا مصرف نہیں؛ بلکہ یہ مطالبہ رشوت کی مانگ ہے؛ لہٰذا ظلم کو دفع کرنے کے لئے ان لوگوں کواپنی ذاتی رقم سے دینے کی گنجائش ہے۔

و فيه أيضاً دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه، وماله، ولاستخراج حق له، ليس برشوة . (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، فصل في البيع، زكريا ٦٠٧/٩، كراچي ٤٢٣/٦، ايضاح المسائل ١٤٢)

(۲) بینک کےمقروض کوبھی سود کی رقم دینا درست ہے؛ لہٰذا زید عمر کے قرض کی ادائے گی کے لئے انٹرسٹ کی رقم عمر کودے سکتا ہے؛ اس لئے کہ یہ رقم سرکاری خزانہ میں لوٹانا درست ہے۔

سوال نامہ میں ذکرکردہ عنوان سے بھی لوٹا دینا جائز ہے، جس سے در پردہ زید کے انٹرسٹ کی رقم کی ادائے گی بھی ہوگئی۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث (إلى قوله) ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه . (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ٣٧/١، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ٣٥٩/١، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٥٥٣/٩،

کراچي ٦/٣٨٥، تبیین الحقائق امدادیة ملتان ٦/٢٧، زکریا ٧/٦٠، البحرالرائق، زکریا ٩/٣٦٩، کوئٹه٨/٢٠١، هندیة، زکریا قدیم ٥/٣٤٩، جدید ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ٣٤/٢٤٦، حاشیة ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفیة دیوبند ١/٣٣-٣٤، ایضاح المسائل ١٤٢)

(۳) انٹرسٹ کی رقم مسجد یا مدارس کے بیت الخلاء یا سڑکوں وغیرہ کی تعمیر اور مرمت میں لگانا جائز نہیں ہے۔

وأما إذا کان عند رجل مال خبیث (إلی قوله) ولا یمکنه أن یرده إلی مالکه، ویرید أن یدفع مظلمته عن نفسه، فلیس له حیلة إلا أن یدفعه إلی الفقراء . (بذل المجهود لکهنؤ، کتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامیة، بیروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحدیث: ٥٩، وهکذا في الشامي، زکریا ٩/٥٥٣، کراچي ٦/٣٨٥، تبیین الحقائق امدادیة ملتان ٦/٢٧، زکریا ٧/٦٠، البحرالرائق، زکریا ٩/٣٦٩، کوئٹه٨/٢٠١، هندیة، زکریا قدیم ٥/٣٤٩، زکریا جدید ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ٣٤/٢٤٦، حاشیة ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفیة دیوبند ١/٣٣-٣٤)

(۴) سود انٹرسٹ کی رقم غریب کی شادی بیاہ علاج ومعالجہ یا دیگر ضروریات کے لئے ثواب کی نیت کے بغیر حسب حال خرچ کرنا جائز ہے؛ لیکن شادی بیاہ میں ایک دو لاکھ خرچ کرنا اسراف اور فضول خرچی ہے؛ لہٰذا شادی امیر کی ہو یا غریب کی ہو اتنی بڑی رقم خرچ کرنا درست نہیں ہے۔

فیلزم علیه أن یدفعه إلی الفقراء؛ ولکن لا یرید بذلک الأجر والثواب؛ ولکن یرید دفع المعصیة عن نفسه. (بذل المجهود لکهنو، کتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامیة، بیروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحدیث: ٥٩، وهکذا في الشامي، زکریا ٩/٥٥٣، کراچي ٦/٣٨٥، تبیین الحقائق

امدادية ملتان ٦/ ٢٧، زكريا ٧/ ٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/ ٣٦٩، كوئٹه٨/ ٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/ ٣٤٩، جديد ٥/ ٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/ ٢٤٦، حاشية ترمذي ١/ ٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/ ٣٣-٣٤)

(۵) سود انٹرسٹ کی رقم کو بیت المال میں جمع کرنا اور نہ اس رقم سے ان رفاہی اداروں کے لئے کوئی زمین جائیداد خرید کر دینا درست نہیں ہے؛ کیونکہ مذکورہ رقم کا مصرف یا تو یہ ہے کہ بینک کو کسی بھی عنوان سے دیدیا جائے یا فقیروں اور مسکینوں میں تقسیم کردیا جائے۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أو حصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود لكهنؤ، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/ ٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/ ٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/ ٥٥٣، كراچي ٦/ ٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/ ٢٧، زكريا ٧/ ٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/ ٣٦٩، كوئٹه٨/ ٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/ ٣٤٩، جديد ٥/ ٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/ ٢٤٦، حاشية ترمذي ١/ ٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/ ٣٣- ٣٤، ايضاح المسائل ١٤٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۸ / جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۱۶۱)	۱۴۲۰/۵/۱۸ھ

سودی رقم مالک تک پہونچانے کی ایک شکل

سوال [۹۱۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک کمپنی ہے، جو مال منگواتی ہے، اور یہ مال انہیں لاریوں کے ذریعہ آتا ہے، ان لاری والوں کو ان کا کرایہ ایک مہینے کے بعد ملتا ہے مثال کے طور پر دو ہزار روپئے ہیں،

مگر یہ رقم انہیں ایک ماہ کے بعد ملے گی اب چونکہ ان لاری والوں کو پیسوں کی فوراً ضرورت ہوتی ہے؛ اس لئے وہ اپنے کرایہ کی پرچی کچھ کم داموں میں مثال کے طور پر ١٩٥٠ میں اس شخص کو دیدیتے ہیں، جو فوراً پیسے دے، تو اس سودے میں جو ٥٠/روپیہ کا فائدہ مل رہا ہے، وہ جائز ہے یا نہیں؟ جس شخص نے فوراً رقم دی ہے، اسے پورے ٢٠٠٠/روپئے ایک مہینہ کے بعد مل جاتے ہیں؛ جبکہ اس نے صرف ١٩٥٠ روپئے ہی دیئے ہیں۔

المستفتی: محمد طیب فرخ آبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مذکورہ میں چونکہ رقم میں کمی بیشی ہورہی ہے؛ لہٰذا سود میں داخل ہوکر حرام ہوا صحیح صورت یہ ہوسکتی ہے کہ ٹرک کا مالک یا ڈرائیور کرایہ کی رقم وصول کرنے کے لئے کسی کو اس طرح وکیل بنائے کہ اسے اجرت کے طور پر ٥٠/روپئے دیدے، پھر اس سے کرایہ کی رقم کے برابر قرض لے کر اس سے کہدے کہ میرا قرض مکمل وصول کر کے مالک تک پہونچائے، اس طرح کا تصرف کرنا جائز ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ٧/٥٧١، ایضاح النوادر ١/٦٧)

وجواز التصرف في الأثمان والديون كلها قبل قبضها. (الدر المختار، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، مطلب في تعريف الكر، زكريا ٧/٣٧٧، كراچي ٥/١٥٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٩/ذی الحجہ ١٤١٨ھ
(فتویٰ نمبر: الف ٣٣/٥٥٣٥)

سودی رقم اپنے استعمال میں لانا

سوال [٩١٨٩]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ (۱) سود کے پیسہ سے اپنے گھر کی نالی، بیت الخلاء، وغیرہ بنوا سکتے ہیں یا نہیں؟

(۲) بیمہ کرانے کے بعد جو زائد پیسہ ملتا ہے، اس کو اپنے خرچہ میں لانا کیسا ہے؟

المستفتی: امیر حسن، مدرسہ حبیبیہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱/۲) بینک یا جیون بیمہ سے جو زائد رقم ملتی ہے، وہ سود ہے، اور سود بنص قرآن حرام ہے، اس کو اپنے استعمال میں لانا ہرگز جائز نہیں ہے، اس پیسہ کے ذریعہ گھر کی نالی اور بیت الخلاء بنانا اپنے استعمال میں لانا ہے؛ اس لئے حرام ہے اور ایسے پیسہ کو فقراء ومساکین پر صدقہ کرنا واجب ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۹۹)

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/۲۷، زكريا ۷/۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/۳۶۹، كوئٹه ۸/۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/۳۴۹، جديد ۵/۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/۲۴۶، حاشية ترمذي ۱/۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/۳۳-۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۸۸۵/۳۲)

سودی رقم سے اسلحہ خریدنا

سوال [۹۱۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ آج کل جو مسلمانوں کے اوپر ظلم وستم ہو رہا ہے، آئے دن اخبارات کے ذریعہ سے خبر ہوتی رہتی ہے کہ فلاں ملک میں اتنے مسلمانوں کو قتل کیا گیا، اور اتنے مسلمانوں کو جیل میں قید کر دیا گیا، اس طرح کی خبریں تو روزانہ اخبارات وغیرہ میں رہتی ہیں، اسی کے مدنظر کچھ اہم اور ضروری مسئلہ یہ پوچھنا ہے کہ کیا آدمی بینک کی سودی رقم سے اپنے دفاع کے لئے بندوق اور اس قسم کے آلات جس سے اپنی جان ومال کی حفاظت کر سکے، اس سودی رقم سے لے سکتا ہے یا نہیں؟

آج کل بہت سے مسلمان جن کو مسئلہ کی جان کاری نہیں رہتی ہے، وہ سودی رقم کو بینک میں چھوڑ دیتے ہیں اور اس روپیہ سے غیر مسلم فائدہ اٹھاتے ہیں اور جو شخص مسئلہ جانتا ہے، تو وہ اس رقم کو لے کر کسی فقیر کو دیتا ہے، بغیر ثواب کی نیت کے، یا پیشاب، پاخانہ میں خرچ کر دیتا ہے، جیسا کہ مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے اپنی کتاب میں کئی جگہ پر اس مسئلہ کا تذکرہ کیا ہے کہ سودی رقم کو بینک میں نہیں چھوڑنا چاہئے؛ بلکہ اس کو لے کر کسی فقیر کو بغیر ثواب کی نیت دیدے یا پیشاب پاخانہ میں خرچ کر دے یا رفاہ عام میں خرچ کر دے، اس مسئلہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب ان سب جگہوں پر سودی رقم کو خرچ کر سکتا ہے، تو کیا ایک ضرورت شدیدہ کی وجہ سے اپنی جان و مال کی حفاظت کے لئے بندوق یا اس طرح کا کوئی سامان نہیں خرید سکتا، جس سے اپنی حفاظت کر سکے، آج کل پوری دنیا میں مسلمانوں کے اوپر ظلم وستم ہو رہا ہے، اور فسادات وغیرہ میں بھی مسلمانوں ہی کو شکار بنایا جاتا ہے، تو کیا ان سب مصلحتوں کے تحت اجازت دی جائے کہ سودی رقم سے بندوق یا اس طرح کے آلات خرید سکتا ہے، جس سے اپنی جان ومال کی حفاظت کر سکے، اس سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا اس وقت مفتیان کرام کا فتوی یہی ہے، جو اوپر حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے دور کا فتوی درج کیا گیا ہے؟ یا حالات کے پیش نظر اس میں کچھ تبدیلیاں ہوگئی ہیں؟

المستفتی: شاہد جمال، فیشن بک ہاؤس، مؤناتھ بھنجن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سودی رقم کے بارے میں سوال نامہ میں جو باتیں پوچھی گئی ہیں، ان کی وضاحت یہ ہے کہ بینک کی سودی رقم کو بینک میں نہیں چھوڑا جائے گا؛ بلکہ وہاں سے نکالنا ضروری ہے، پھر نکالنے کے بعد دیکھا جائے کہ اس شخص کے اوپر انکم ٹیکس، سیل ٹیکس وغیرہ لازم ہے یا نہیں؟ اگر انکم ٹیکس، سیل ٹیکس وغیرہ لازم ہے، تو ان ٹیکسوں کے نام سے حکومت کو یہی سودی رقم دیدینا جائز اور درست ہے؛ اس لئے کہ حرام مال میں اصل حکم شرعی یہ ہے کہ جہاں سے آیا ہے، وہاں کسی بھی عنوان سے واپس کردے، تو جائز ہے اور یہاں آپ نے سیل ٹیکس کے نام سے واپس دیئے ہیں اور دوسری شکل یہ ہے کہ آپ پر کوئی سرکاری ٹیکس لازم نہیں ہے، تو سودی رقم نہایت غریب فقیروں کو بغیر نیت ثواب کے دیدینا لازم ہے اور حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے بیت الخلاء اور رفاہ عام میں خرچ کرنے کی اجازت دی ہے، یہی بات حضرت مدنیؒ نے بھی کہی ہے؛ لیکن وہ فتوی انگریزوں کی حکومت کے زمانے کا ہے، جس زمانہ میں ہندوستان کی دولت انگریز انگلینڈ منتقل کررہے تھے، ہوسکتا ہے ان حضرات کی نگاہ میں یہ خاص مصلحت ہو، مگر دلائل شرعیہ کی نظر میں ہندوستان کے موجودہ حالات میں وہ مسئلہ منطبق نہیں ہوتا ہے اور تیسری بات سوال میں یہ پوچھی گئی ہے کہ سودی رقم سے اسلحہ وغیرہ خرید سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر ہندوستان کو بالفرض دارالحرب بھی تسلیم کرلیا جائے، تو یہاں رہتے ہوئے یہاں رہنے والوں کو غیر قانونی اسلحہ رکھنا درست نہیں ہے؛ اس لئے کہ غیر قانونی اسلحہ کی حفاظت نہ مسلمان کرسکتے ہیں اور نہ ہی اب تک کرپائے ہیں، نتیجۃً وہ تمام اسلحے حکومت کے پاس واپس چلے جاتے ہیں۔ مزید جان و مال کا خطرہ مسلمان اپنے اوپر لادتے ہیں؛ اس لئے شریعت کی طرف سے ہندوستان میں بھی غیر قانونی اسلحے رکھنے کی اجازت نہیں ہے؛ اس لئے کہ حفاظت نہیں ہے۔ اللہ نے قرآن میں ارشاد فرمایا:

وَلَا تُلْقُوا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ. [البقرة:١٩٥]

تم اپنے آپ کو خود اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں مت ڈالو۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، مصري، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/ ٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه٨/ ٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/ ٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍صفر المظفر ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۷۰۹/۳۷)

سودی رقم سے نیشنل سیول سرٹیفکٹ خریدنے کا حکم

سوال [۹۱۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) بینک میں جمع شدہ رقم پر جو فائدہ ملتا ہے، اس کو کس مد میں خرچ کر سکتے ہیں؟

(۲) انکم ٹیکس سے چھٹکارا پانے کے لئے سرکاری ملازم کچھ مخصوص رقم کے نیشنل سیول سرٹیفکٹ خرید لیتے ہیں، جن کی مدت ساڑھے پانچ سال یا چھ سال ہوتی ہے، واپسی پر رقم دوگنی حاصل ہوتی ہے، یہ رقم کس طرح خرچ کی جائے؟

(۳) تجارت پیشہ لوگ جب اپنا انکم ٹیکس رٹرن سرکاری خزانہ میں جمع کرتے ہیں، تو کبھی کبھی تعداد سے زائد رقم جمع ہو جاتی ہے، جس کی واپسی سرکاری دفاتر سے فاضل رقم کے

ساتھ اس پر کچھ فائدہ کے ساتھ ہوتی ہے، اس رقم کو کس طرح خرچ کیا جائے؟

المستفتی: ماسٹر محمد مسعود، محلّہ خلو، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال میں ذکر کردہ پہلی دونوں شکلوں میں جوزائد رقم حاصل ہوئی ہے، وہ سود ہونے کی بنا پر حرام ہے، جسے اصل مالک تک کسی بھی عنوان سے پہونچانا ضروری ہے؛ اس لئے اسے جبری ٹیکس، سیل ٹیکس، میں دینا جائز ہے، اگر انکم ٹیکس جبری ٹیکس میں دینے کی شکل نہیں ہے، تو بلانیت ثواب نادار فقراء ومساکین کو دینا جائز ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۹۹)

لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه.

(شامي، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵)

(۳) انکم ٹیکس کی ادائے گی میں زیادہ مقدار جانے کی وجہ سے اس مقدار کی واپسی میں جوزائد رقم ملتی ہے، وہ بینک کے سود کی طرح ہے، اس کو اسی طرح دوبارہ انکم ٹیکس کی ادائے گی میں حکومت کو واپس کردیا جائے۔

ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/۲۷، زكريا ۷/۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/۳۶۹، كوئٹه ۸/۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/۳۴۹، جديد ۵/۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/۲۴۶، حاشية ترمذي ۱/۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/۳۳-۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/رجب المرجب ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/۸۴۵۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/۷/۱۴۲۵ھ

سودی رقم رجسٹری میں لگانا یا غرباء ومساکین کو دینا

سوال[۹۱۹۲]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ انجمن اصلاح قوم پنجابیان رام پور شہر کی ایک قدیم سماجی تنظیم ہے، جس کے زیرِاہتمام کئی تعلیمی ادارے چل رہے ہیں، جس میں لڑکوں کے لئے ایک ہائی سکنڈری لڑکیوں کا انٹر کالج، ایک کمپیوٹر ٹریننگ سینٹر، ایک دستکاری سینٹر اور ایک مدرسہ برائے ناظرہ وحفظ قرآن شامل ہیں، ان سبھی اداروں کے کل آٹھ بینک اکاؤنٹ ہیں، بینک اپنے ضابطوں کے مطابق ان کھاتوں میں سال میں دوبار انٹرسٹ جمع کردیتا ہے، انجمن کے ذمہ داران ان کھاتوں کی انٹرسٹ کی رقم سال تمام ہونے پر اکاؤنٹ سے نکال کر اصل رقم چھوڑ دیتے ہیں، اور انٹرسٹ کی رقم ایک علیحدہ بینک کھاتہ میں داخل کردیتے ہیں، اس طرح انٹرسٹ کی اچھی خاصی معقول رقم اکٹھا ہوگئی ہے،، اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل امور دریافت طلب ہیں۔

(۱) مدرسہ تعلیم القرآن کی عمارت طلبہ کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے ناکافی ہوگئی تھی؛ لہٰذا انجمن نے کچھ اہل خیر حضرات کے تعاون سے ایک مکان خرید لیا ہے، جس کا قبضہ بھی مل چکا ہے، اور مدرسہ اس عمارت میں چالو کردیا گیا ہے، مکان کی قیمت کچھ اہل خیر حضرات نے انجمن کی طرف سے ادا کردی ہے؛ لیکن اس مکان کی باضابطہ رجسٹری نہیں ہوئی ہے، رجسٹری میں اچھی خاصی رقم کا خرچہ ہے، اور انجمن کے پاس اس وقت مطلوبہ رقم مہیا نہیں ہے۔ کیا انٹرسٹ کی رقم سے رجسٹری کے اخراجات ادا کئے جاسکتے ہیں؟ جس میں وثائق نویس کی اجرت، رجسٹری کی فیس اسٹامپ اور مروجہ رشوت جس کا دینا ناگریز ہے شامل ہیں۔

(۲) کیا انٹرسٹ کی رقم غرباء ومساکین کو دی جاسکتی ہے؟

المستفتی: نعمان جلیس شمسی، سکریٹری انجمن قوم پنجابیان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) بینکوں سے ملنے والی سودی رقم رجسٹری کے اسٹامپ فیس میں خرچ کرنا جائز ہے؛ البتہ اس کے علاوہ دیگر متعلقہ اخراجات مثلاً وثائق نویس ورجسٹری کی اجرت اورمروجہ رشوت وغیرہ میں صرف کرنا درست نہیں ہے۔

إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحر الرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤)

(۲) سودکی رقم بلانیت ثواب فقراء ومساکین پرتقسیم کرنا جائز ہے۔

إذا كان عند رجل مال خبيث –إلى قوله– ولا يمكنه أن يرده ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤)

ينبغي لمتصدق الحرام أن يزعم بتصدق المال تخليص رقبته، ولايرجو الثواب منه. (العرف الشذي على هامش الترمذي ١/٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍شعبان المعظم ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/۱۰۱۶۶)

سود کا بیلنس ٹیکس وغیرہ میں دینا

سوال [٩١٩٣]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (١) سود کے پیسہ سے زمین کی رجسٹری کرانا درست ہے یا نہیں؟

(٢) سود کا پیسہ مکان کے ٹیکس میں دینا کیسا ہے؟ جبکہ سود کی رقم کے بارے میں اصل حکم یہ ہے کہ کسی عنوان سے اصل مالک کو لوٹا دی جائے؟ اسی بنیاد پر سود کا پیسہ انکم ٹیکس، سیل ٹیکس، کسٹم ٹیکس میں دینا درست ہے؟ اور یہ تمام غیر شرعی ٹیکس ہیں اور زمین کی رجسٹری میں دو اسٹامپ پیپر خریدا جاتا ہے، وہ رقم سرکاری خزانہ میں جمع کی جاتی ہے؟

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ سود کے پیسہ سے رجسٹری کرانا اور مکان ٹیکس میں دینا درست ہے یا نہیں؟ نیز یہ بھی بتائیں کہ مکان ٹیکس شرعی ٹیکس ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد منورادروی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (١) سود اور حرام مال میں اصل حکم یہ ہے کہ جہاں سے آیا ہے، کسی بھی عنوان سے وہیں واپسی کر دیا جائے اور ہمارے ہندوستان میں جائیداد کی رجسٹری بیع نامہ کا خرچہ جائیداد کی قیمت کا ایک بڑا حصہ بن جاتا ہے، مثلاً پانچ لاکھ کی جائیداد ہو، تو ایک لاکھ رجسٹری کا خرچہ ہوتا ہے، جو سرکار کے فنڈ میں داخل ہوتا ہے؛ اس لئے یہ ناقابل برداشت خرچہ ہے؛ لہٰذا رجسٹری کا وہ خرچہ جو سرکاری فنڈ میں جمع ہوتا ہے، اس میں دینا جائز ہوگا، اور اس کے علاوہ رجسٹرار، کاتب اور درمیان میں پڑنے والے لوگوں اور آفیسر وغیرہ کو ہدیہ، تحفہ اور رشوت کے طور پر جو دیا جاتا ہے، اس میں دینا جائز نہیں ہوگا؛ اس لئے کہ وہ سرکاری فنڈ میں جمع نہیں ہوتا۔

(٢) حضرات علماء کرام نے انکم ٹیکس، سیل ٹیکس، کسٹم ٹیکس اور مکان ٹیکس کو ظلماً ٹیکس

قرار دیا ہے؛ اس لئے ان ٹیکسوں کے عنوان سے بھی سرکار کو واپس کرنا جائز اور درست ہے۔

إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/۲۷، زكريا ۷/۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/۳۶۹، كوئٹه ۸/۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/۳۴۹، زكريا جديد ۵/۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/۲۴۶، حاشية ترمذي ۱/۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/۳۳-۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰؍رجب المرجب ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۵۲۳/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۸/۵ھ

سودی رقم کو گھر کے غسل خانہ وبیت الخلاء میں استعمال کرنا

سوال [۹۱۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارا پیسہ بینک میں موجود ہے، اس کے اوپر بینک والے جو سود کا پیسہ دیتے ہیں، وہ ایف ڈی نہیں ہے، صرف سیونگ اکاؤنٹ ہے، کیا سود کے پیسے کو ہم گھر کی لیٹرین اور باتھ روم میں صرف کر سکتے ہے یا کسی اور مقصد میں صرف کر سکتے ہیں؟

(۲) ایک بیمہ (.L.I.C) میں نے بھول سے کرا دیا تھا، مطلب جائز اور ناجائز کے علم کے بغیر جو کہ مکمل ہونے جا رہا ہے، اس پر بھی سود کا پیسہ مل رہا ہے، کیا اس سود کے پیسے کو بھی ہم گھر کے بیت الخلاء اور غسل خانہ میں لگا سکتے ہیں یا کس مقصد میں خرچ کریں؟

المستفتی: محمد عارف نواز، محلّہ قاضیان، کرتپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱/۲) بینک سے جو بھی سود ملتا ہے، خواہ وہ ایف

ڈی سے ہو یا سیونگ اکاؤنٹ سے ہو، دونوں کا حکم یکساں ہے، اس سود کا استعمال اپنی کسی ذاتی ضرورت میں کرنا جائز نہیں ہے؛ لہٰذا اس پیسہ سے اپنے گھر کی لیٹرین اور باتھ روم بنانا جائز نہیں ہوگا اور سودی رقم کے واقعی حقدار انتہائی مفلوک الحال، غربت زدہ اور نادار لوگ ہیں، سودی رقم انھیں حصول ثواب کی نیت کے بغیر اس کے وبال کو دور کرنے کی غرض سے دیدی جائے، اسی طرح انکم ٹیکس اور سیل ٹیکس بھی حکومت کی جانب سے جبراً وظلماً عائد کیا ہوا ٹیکس ہے؛ اس لئے بینک سے حاصل شدہ سودی رقم سے ان ٹیکسوں کی ادائےگی کی جا سکتی ہے اور یہی حکم بیمہ کے ذریعہ سے ملے ہوئے سود کے پیسہ کا ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ ۶/ ۱۳۷، جدید ۹/ ۲۶۲، ۶/ ۱۳۶، جدید زکریا ۹/ ۲۵۵، ایضاح النوادر ۱/ ۱۰۰)

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أو حصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/ ۵۵۳، كراچي ۶/ ۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/ ۲۷، زكريا ۷/ ۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/ ۳۶۹، كوئٹه ۸/ ۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/ ۳۴۹، جديد ۵/ ۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/ ۲۴۶، حاشية ترمذي ۱/ ۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/ ۳۳-۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ رجب المرجب ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۵۸۴۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۷/۳ھ

سودی رقم کو بیت الخلاء کی تعمیر میں صرف کرنا

سوال [۹۱۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ بینک کی جمع شدہ رقم پر انٹرسٹ ملے، وہ کس مد میں خرچ کیا جاسکتا ہے؟

نوٹ: لیٹرین (گٹر) بنایا جاسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد طیب مرادآبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک سے حاصل شدہ سودی رقم اپنے ذاتی مصرف میں خرچ کرنا کسی طرح جائز نہیں ہے چاہے بیت الخلاء ہو یا کسی اور کام میں؛ بلکہ اس کو فقراء میں بلانیت ثواب تقسیم کردینا واجب ہے۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه ٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ محرم الحرام ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲۹۰/۲۹)

سودی رقم رفاہ عام میں لگانا

سوال [۹۱۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بینک سے حاصل شدہ سودی رقم سے بیت الخلاء یا رفاہ عام کے لئے کنواں، نل

وغیرہ لگا سکتے ہیں یا نہیں؟ ایک صاحب کہتے ہیں کہ بیت الخلاء میں اس لئے لگانا جائز ہے کہ اس میں اس رقم کی اہانت ہے، کیا ان کا یہ کہنا صحیح ہے؟ جواب سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی: محمد کوثر، معرفت مفتی محمد سلیم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سود کی رقم کو بیت الخلاء اور رفاہ عام پر خرچ کرنے کی بعض علماء نے اجازت دی ہے، اور وہ حضرات جو دلیل پیش کرتے ہیں، اس سے ہم کو اتفاق نہیں ہے؛ اس لئے کہ دعوی اور دلیل میں مناسبت نہیں ہے؛ لہٰذا اس رقم کو انکم ٹیکس وغیرہ کے عنوان سے حکومت کو واپس کردیا جائے یا فقراء کو بلانیت ثواب دیدیا جائے، اس کے علاوہ کوئی دوسرا مصرف صحیح نہیں ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۲/ ۲۴)

ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/ ۵۵۳، كراچي ۶/ ۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/ ۲۷، زكريا ۷/ ۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/ ۳۶۹، كوئٹه ۸/ ۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/ ۳۴۹، جديد ۵/ ۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/ ۲۴۶، حاشية ترمذي ۱/ ۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/ ۳۳-۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ محرم الحرام ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۴۳۰۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/ ۱/ ۱۴۱۶ھ

سودی رقم رفاہ عام میں اسی طرح ٹی وی کی خریداری میں لگانا

سوال [۹۱۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ بینک سے موصول ہوئی سودی رقم کو عام لیٹرین بنوانے یا سڑک درست کرانے یا ٹی وی خریدنے میں استعمال کرسکتے ہیں یا نہیں؟ سڑک گھر کے سامنے کی درست کرانی ہے۔

المستفتی: محمد دین مانپور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک سے حاصل ہوئے سود سے عام لیٹرین یا سڑک وغیرہ بنوانا جائز نہیں؛ بلکہ اس رقم کو بلانیت ثواب فقراء پر خرچ کرنا لازم ہے۔ نیز ٹی وی کی خریداری بھی سود کے پیسہ سے جائز نہیں ہے، مسلمانوں کو اس سے احتراز لازم ہے۔

ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/ ۵۵۳، كراچي ۶/ ۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/ ۲۷، زكريا ۷/ ۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/ ۳۶۹، كوئٹه ۸/ ۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/ ۳۴۹، جديد ۵/ ۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/ ۲۴۶، حاشية ترمذي ۱/ ۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/ ۳۳- ۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ صفر المظفر ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۷۰۷۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۲۲/۲/۲۳ھ

سودی رقم سے رفاہی تعمیری کام کرنا

سوال [۹۱۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک اللہ کا بندہ محض اللہ کی رضا کے لئے لاوارث لاشیں لے کر اس کے غسل وکفن کا مکمل انتظام کرتا ہے، شخص مذکور کوئی جگہ ایسی چاہتا تھا جہاں تجہیز وتکفین کا پورا سامان

موجود ہواور محفوظ بھی ہو، اتفاق سے عیدگاہ سے قریب ایک جگہ اس کام کے لئے مل گئی ہے، اور وہ جگہ اب زیر تعمیر بھی ہے؛ لیکن دشواری یہ پیش آرہی ہے کہ اس عمارت کی تعمیر کے لئے عطیہ یا ایصال ثواب کی رقم کوئی دینے کو تیار نہیں ہے، جس سے وہ تعمیری کام رکا ہوا ہے، تو کیا اس تعمیری کام کے لئے بینک کے سود کو استعمال کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالرحیم، بھنگا، بس اسٹاف، بہرائچ (یو پی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: نیک کام کی تکمیل کے لئے حرام کام اور حرام مال کا استعمال جائز نہیں، جائز طریقہ سے جتنا ہو سکے اتنا کیا جائے اور جواز کے دائرہ سے باہر عمل کا اللہ نے مکلّف نہیں بنایا؛ لہٰذا اگر جائز اور حلال مال مل جائے، تو تکمیل کی جائے، ورنہ کام موقوف کردینا چاہئے اور سود کا پیسہ اس میں نہ لگائے اور سود کا مال واجب الاسترداد یا واجب التصدق ہے۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱؍ذی قعدہ ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۹۴۹/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۱۱/۳۰ھ

سودی پیسہ سے نالی بنانا

سوال [۹۱۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ چار بھائی کے آمنے سامنے کمرے ہیں، یعنی دو بھائیوں کے ایک طرف اور دو بھائیوں کے ایک طرف، بیچ میں گندے پانی کی نالی چلتی ہے، یہ نالی کچی ہے اس میں کیچڑ رہتی ہے اور چلنے پھرنے میں پریشانی رہتی ہے، ایک بھائی کا کچھ روپیہ بینک میں جمع رہتا ہے، ان روپیہ پر جو سود ملتا ہے، اس کو غریبوں میں تقسیم کردیتے ہیں، اگر وہ بینک کے سود کو غریبوں میں تقسیم نہ کر کے اس نالی کے پکی کرانے میں جو چاروں بھائیوں کے مکانوں کے بیچ میں چلتی ہے خرچ کر دیا جائے تو کیسا ہے؟

المستفتی: صفدرعلی خاں، اسسٹینٹ ایم کیو آئی سی سیوارہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک سے جو سودی رقم ملے گی اس کو بلانیت ثواب فقراء کو دینا واجب ہوگا، نالی وغیرہ بنانے میں صرف کرنا جائز نہ ہوگا، بعض حضرات نے نالی، بیت الخلاء اور شارع عام میں خرچ کرنے کو جائز کہا ہے؛ لیکن ان کی دلیل کوئی نہیں ہے، ہمیں اس پر اطمینان نہیں ہے۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أو حصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/ ۵۵۳، كراچي ۶/ ۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/ ۲۷، زكريا ۷/ ۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/ ۳۶۹، كوئٹه ۸/ ۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/ ۳۴۹، جديد ۵/ ۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/ ۲۴۶، حاشية

ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديو بند ١/٣٣-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٦/ر جمادی الثانیہ ٠٩ھ
(فتویٰ نمبر: الف ٢٤/١٢٧٣)

بینک سے حاصل شدہ سودی رقم رفاہ عام وغیرہ میں لگانا

سوال [٩٢٠٠]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بینک سے حاصل شدہ سودی رقم کا مصرف کیا ہے؟ رفاہ عام میں نیز تعمیر بیت الخلاء، مساجد ومدارس میں اس رقم کو صرف کیا جاسکتا ہے؟ اگر بینک سے حاصل شدہ سود مسجد کی رقم کا ہو، تو کیا اس کو مسجد کے بیت الخلاء و پیشاب خانہ میں صرف کرنا جائز ہوگا؟

المستفتی: محمد محسن بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک سے حاصل شدہ سود بغیر نیت ثواب فقیروں غریبوں کو دیدینا لازم ہے، رفاہ عام اور مسجد کے بیت الخلاء وغیرہ کی تعمیرات میں خرچ کرنے کو بعض علماء نے جائز لکھا ہے، مگر ان کی دلیل ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أو حصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء؛ ولكن لايريد بذلك الأجر والثواب؛ ولكن يريد دفع المعصية عن نفسه. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه ٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية

ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۵۰۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۳/۸ھ

سودی رقم سے مسافر خانہ تعمیر کرنا

سوال [۹۲۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بینک سے حاصل ہوئی سودی رقم کسی مسلم مسافر خانہ کی تعمیر میں لگا سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: محمد خالد حسین، بروالان، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک سے حاصل ہوئی سودی رقم کو مسلم مسافر خانہ کی تعمیر میں لگانا جائز نہیں؛ بلکہ اس کو بلا نیت ثواب فقراء کو دیدینا لازم ہے۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث (إلى قوله) فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء؛ ولكن لايريد بذلك الأجر والثواب؛ ولكن يريد دفع المعصية عن نفسه. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحر الرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹہ ٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷ رجب المرجب ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۲۶۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۷/۱۷ھ

سودی رقم سے مسافر خانہ تعمیر کرنے کا حکم

سوال [۹۲۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بینک جو سود دیتی ہے، اس سود والی رقم سے مسافر خانہ تعمیر کر سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: عبدالعظیم، بساتیاں مسجد (راجستھان)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک کی سودی رقم سے مسافر خانہ کی تعمیر جائز نہیں ہے؛ البتہ اگر جبری ٹیکس کے عنوان سے حکومت کے خزانہ میں واپس کرنا ممکن نہ ہو، تو فقراء کو بغیر نیت ثواب دیدینا واجب ہو جاتا ہے اور جو لوگ رفاہ عام میں خرچ کرنے کی اجازت دیتے ہیں، ان کے دلائل سے ہم مطمئن نہیں ہیں۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أو حصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دار البشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحر الرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه ٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍رجب المرجب ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹/۳۳۴۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۷/۱۴۱۳ھ

سودی رقم کو لون میں مجری کرنا

سوال [۹۲۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کا بینک میں روپیہ جمع ہے، اس پر فضلہ (سود) بھی ملے گا۔ اب زید کو بینک سے قرضہ کی ضرورت پیش آئی، اس میں سود دینا پڑے گا، تو اپنی رقم کا فضلہ اپنے قرض کے سود میں جو زید پر واجب ہے، مجریٰ کر دے تو جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد اسلام پریس والے، شیرکوٹ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سود اور حرام مال میں اصل حکم یہ ہے کہ اصل مالک کو کسی بھی عنوان سے واپس کر دیا جائے؛ اس لئے حکومت سے لیا ہوا، سود بنام سود حکومت کو واپس کرنا جائز اور درست ہے؛ لہٰذا سوال نامہ میں درج صورت میں بینک سے حاصل شدہ سود حکومت کو بنام لون واپس کرنا جائز ہوگا۔

ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك. (بذل المجهود مصري، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دار البشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحر الرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه ٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/محرم الحرام ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/۲۹۹۲)

بینک کے قرضہ کو سودی رقم سے ادا کرنا

سوال [۹۲۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حوادثات زمانہ سے تنگ آکر مجبوراً قرضہ کی طرف قدم اٹھانا پڑا، سوچا تھا کہ قرض لے کر کچھ دھندھا کر کے بچوں کی روزی روٹی کا انتظام کرلیں گے، مگر مرضیٔ مولیٰ کچھ اور ہی تھی، وہ رقم سب گھاٹے میں چلی گئی اور بینک کا سود بیاج بڑھنے لگا اور ہمارے پاس ادائے گی کے لئے کسی قسم کا کوئی انتظام نہ ہوسکا، نوبت یہاں تک پہونچی کہ قرض بڑھتے بڑھتے ۹۰۰۰۰/ ہزار کے قریب پہونچ گیا۔

اب معاشی انتظام تو کیا عزت وآبرو کی حفاظت ناممکن نظر آرہی ہے، ایسی صورت میں اب ہم کو کیا کرنا چاہئے؟ ہمارے پاس ادائے گی کا سامان وذریعہ نہیں ہے، اپنے ہم مذہب اسلامی بھائی کی عزت وآبرو بچانے کے لئے اپنی زکوۃ، خیرات اور صدقات نافلہ حتی کہ بینک کی سود کہ جس کا آپ حضرات کے پاس کوئی مصرف نہیں، اس سے مدد کریں تاکہ ہمارا قرضہ ادا ہوجائے جس سے نئی زندگی مل جائے، اس کار خیر کا بدلہ باری تعالیٰ دے گا۔

اب ہم گھر پر نہیں رہ سکتے تحصیل میں کاغذات پہنچ چکے ہیں، تحصیل کی گاڑیاں آتی ہیں، کیا اس صورت میں زکوۃ، صدقات و بینک کا سود لے کر ادائیگی قرض ہوسکتی ہے؟ مفتیان حضرات سے درخواست ہے کہ اس کی رہبری فرمائیں کہ اب ہم کیا کریں؟

المستفتی: نظام الدین، سارپیور، پوسٹ: کائی مؤ، ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کا قرضہ سرکاری بینک کا قرضہ ہے اور سرکاری بینک کے قرضہ پر سود بھی بڑھتا ہے، آپ نے قرضہ کی ادائے گی کی مجبوری میں زکوۃ، صدقات اور بینکی سود میں سے کسی ایک کے ذریعہ سے ادائے گی کی سہولت حاصل

کرنے کی پیشکش کے طور پر سوال فرمایا ہے، تو اس کے لئے بہتر شکل یہی ہے کہ آپ دوسرے سرمایہ داروں سے رابطہ قائم کر کے ان کو جو بینک سے ملنے والا سود ہے، وہ سود کا پیسہ لے کر بینک کا قرضہ ادا کر سکتے ہیں اور اس میں یہ بات بھی آئے گی کہ سرکار کی طرف سے آپ کو تعاون مل گیا اور سرکار ہی کے پیسہ سے آپ نے سرکار کا حق ادا کر دیا۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ شعبان المعظم ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۴۰۵/۳۸)

سرکاری بینک کی سودی رقم اسی کے لازم کردہ سود میں منہا کرانا

سوال [۹۲۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص نے سرکاری یا نیم سرکاری بینک سے قرض لیا، جس پر بینک والوں نے مقروض کے ذمہ انٹرسٹ کی رقم عائد کی اور مقروض کی کچھ رقم بھی بینک میں جمع ہے، جس پر بینک سے اسے انٹرسٹ ملے گا، تو کیا وہ اپنی رقم پر ملنے والے انٹرسٹ کو اپنے قرضہ کی رقم پر عائد ہونے والے انٹرسٹ میں منہا کرا سکتا ہے یا نہیں؟ اس شکل میں کیا کرے؟

المستفتی: عبدالرب، قصبہ بچھرائیوں، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سرکاری بینک سے جوسودی رقم ملتی ہے، اس کو سرکاری بینک کے لازم شدہ سود میں منہا کرانا درست ہے؛ اس لئے کہ سودی رقم میں اصل حکم مالک کو واپس کرنا ہے اور جب مقروض بینک سے حاصل شدہ سود کو قرض پر لازم شدہ سود کے عنوان میں بینک کو دیدیتا ہے، تو گویا کہ اصل مالک کو واپس کردیتا ہے۔

من اكتسب مالا بغير حق (إلى قوله) يجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/۲۷، زكريا ۷/۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/۳۶۹، كوئٹه ۸/۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/۳۴۹، جديد ۵/۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/۲۴۶، حاشية ترمذي ۱/۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/۳۳-۳۴) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۴؍ربیع الاول ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/۱۷۰۶)

بینک میں دیئے ہوئے سودی قرض کو حلال رقم سے مجری کرنا

سوال [۹۲۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے شدید مجبوری میں یکم جنوری ۲۰۰۶ء کو دس ہزار روپئے بینک سے قرض لئے اور دسمبر ۲۰۰۶ء میں مع سود کے گیارہ ہزار روپئے جمع کردیئے، پھر چندروز کے بعد ایک شدید ضرورت پیش آگئی اور زید نے پھر اسی بینک سے دس ہزار روپئے قرض لے لئے

اورایک سال گذرگیا، اوراب زید پر بینک کے گیارہ ہزار روپئے واجب ہوگئے، زید کے ایک عزیز کے پاس سود کی رقم موجود ہے، کیا اس رقم کو زید اپنے دونوں مرتبہ کے سود کے عوض بینک کوادا کرسکتا ہے؟ اس طرح کہ ایک ہزار روپیہ ان کے بدلہ جو پچھلی بار بینک کوادا کر چکا ہے اور ایک ہزار وہ جو اسے دس ہزار کے ساتھ بطور سود اب ادا کرنے ہیں تاکہ سود کی ادائے گی میں دو ہزار روپئے ادا کرنے سے اسے جو خسارہ ہو رہا ہے، اس کی تلافی ہو سکے؟

المستفتی: ارشاد عالم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایک ہزار روپیہ سود میں ادا کرنے کے بعد پھر دوسرے پیسے کے بارے میں یہ نیت کرلینا کہ اس سود کے بدلہ میں اس کو قرار دیا جائے، تو اس طرح نیت کرلینے سے یہ پیسہ سود میں دیا ہوا پیسہ کا بدل نہیں بن سکتا، ہاں بعد میں جو دس ہزار روپیہ کے عوض گیارہ ہزار دینا پڑ رہا ہے، تو صرف وہی ایک ہزار بینک سے ملے ہوئے سود میں سے دیا جاسکتا ہے، اور جو پہلے ایک ہزار روپیہ سود میں جا چکا ہے، اس خسارہ کی کوئی تلافی نہیں۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۰۰)

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق، يجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، البحرالرائق، زكريا ۹/۳۶۹، كوئٹه ۸/۲۰۱، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ۶/۲۷، زكريا ۷/۶۰، شامي، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵، هندية، زكريا قديم ۵/۳۴۹، جديد ۵/۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/۲۴۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۵۸۲/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۴/۲۶ھ

سودی رقم سے بجلی کا بل ادا کرنا

سوال [۹۲۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مقروض آدمی سودی رقم سے محکمۂ بجلی کا قرض ادا کرسکتا ہے؟ جبکہ اس کے پاس اپنے کاروبار کے ایسے اوزار اور ایسی مشینیں موجود ہیں جن کی قیمت سے قرض کی ادائے گی ممکن ہے۔ بینوا توجروا۔

المستفتی: خورشید انور قاسمی، خادم تدریس مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سودی رقم سے محکمۂ بجلی کا قرض اور بجلی کا اصل کرایہ ادا کرنا جائز نہیں ہے؛ البتہ بل جمع کرنے میں تاخیر کی وجہ سے جو جبریہ ٹیکس لازم ہوتا ہے اور تاخیر کے ساتھ اس میں ضافہ ہوتا رہتا ہے، اس میں سودی رقم دینے کی گنجائش ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں بھی سودی رقم بلا کسی معاوضہ کے حصول کے اصل مالک تک پہونچ جاتی ہے۔

ویجب علیه أن یرده علی مالکه، إن وجد المالک. (بذل المجهود مصري، کتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامیة، بیروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحدیث: ۵۹، وهکذا في الشامي، زکریا ۹/۵۵۳، کراچي ۶/۳۸۵، تبیین الحقائق امدادیة ملتان ۶/۲۷، زکریا ۷/۶۰، البحرالرائق، زکریا ۹/۳۶۹، کوئٹه ۸/۲۰۱، هندیة، زکریا قدیم ۵/۳۴۹، جدید ۵/۴۰۴، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۳۴/۲۴۶، حاشیة ترمذي ۱/۳، معارف السنن، اشرفیة دیوبند ۱/۳۳-۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ رجب المرجب ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۳۷۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/۷/۱۴۲۲ھ

سرکاری قرض کوادا کرنے میں سودی رقم دینا

سوال [۹۲۰۸]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اب سے تیس سال پہلے ہم نے حکومت سے بطورِقرض کے پانچ ہزارروپئے لئے تھے، اس وقت پانچ ہزار کا سود چھ ہزار روپیہ بن گیا ہے، حکومت ان روپیوں (گیارہ ہزار) کا مطالبہ کررہی ہے، اورسرکاری بینک میں ہمارے پچیس ہزارروپیہ جمع ہیں، پچیس ہزار روپیہ کا سود مثلاً گیارہ ہزارروپیہ بنتے ہیں، تو کیااس رقم (بینک سے ملی ہوئی سودکی رقم) سے حکومت کا قرض ادا ہوسکتا ہے؟ وضاحت فرمائیں کہ سودکی رقم حکومت کے قرض کی ادائے گی میں استعمال کرنا جائز ہے یانہیں؟

(۲) اگرسودکی رقم کوحکومت کےقرض کی ادائے گی میں استعمال کرنا جائز ہے، تو کیا یہ حکم صرف حکومت کےقرض کے ساتھ ہے یاہراس شخص کےقرض کے ساتھ ہے، جوروپیہ بطورقرض سودپردیتاہو؟

المستفتی: محمدزاہد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: منجانب حکومت جتنی رقم سودمیں مل رہی ہے، اس کوآپ اس سود کے نام سےحکومت کوواپس کرسکتے ہیں، جوآپ پرحکومت کا لازم آرہا ہے، جوحقیقی قرض آپ نے حکومت سے لےرکھاہے، وہ اصل رقم سےادا ہوناچاہئے۔

ویجب علیه أن یرده علی مالکه، إن وجد المالک، وإلا ففي جمیع الصور یجب علیه أن یتصدق بمثل تلک الأموال علی الفقراء. (بذل المجهود، کتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامیة، بیروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحدیث: ۵۹، وهکذا في

الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ رشوال المکرّم ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/ ۵۴۸۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۱۰/۲۸ھ

بینک کے جرمانہ میں سودی رقم دینا

سوال [۹۲۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بینک میں کھاتہ دار کا اگر بیلنس زیرو یا ایک ہزار سے کم رہ جائے، تو بینک زیرو بیلنس کے جرمانہ میں اس کے اکاؤنٹ سے کچھ رقم کاٹ لیتی ہے، تو کیا کھاتہ دار اس جرمانہ کے بدلے میں بینک سے ملنے والی سودی رقم دے سکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد فراست علی، سرائے ترین، عائشہ مسجد سنبھل (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک نے کھاتہ دار کے کھاتے سے جو روپیہ جبراً لیا ہے، بینک سے ملنے والی سودی رقم سے اتنا ہی پیسہ اس کے لئے وصول کر لینا جائز ہے اور یہ سمجھ کر کے وصول کرے کہ جو پیسہ ہمارا جبراً وصول کرلیا ہے، ہم وہی پیسہ بینک سے اسی راستہ سے وصول کر رہے ہیں؛ لہٰذا حاصل یہ نکلے گا کہ نہ آپ نے بینک سے لیا اور نہ ہی بینک نے آپ سے لیا؛ بلکہ برابر سرابر ہوگیا۔

قال في الخانية: رجل له على رجل دراهم، وفظفر بدراهم مديونه كان له أن يأخذ الدراهم إن لم يكن دراهمه أجود ولم يكن مؤجلا. (شرح الحموي

علی الأشباہ، تحت القاعدہ الخامسة ١٤٥، قاضیخاں، زکریا جدید ١٧٧/٣، وعلی هامش الهندیة ٣٧/٢٥٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ ذیقعدہ ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱؍ ۱۱۷۵۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵؍۱۱؍۱۴۳۵ھ

غریب غیر مسلم کو سودی روپیہ دینا

سوال [۹۲۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کیا سودی روپیہ غیر مسلم غریب کو دے سکتے ہیں؟

المستفتی: (قاری) محمد تحسین، مدرس اردو سیکشن، مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سود کا روپیہ بلانیت ثواب غیر مسلم فقیر کو دینا جائز ہے؛ کیونکہ اس کا مصرف جہاں فقراء کو بتلایا گیا ہے، وہاں مسلم کی قید نہیں ہے۔

أما إذا کان عند رجل مال خبیث(إلی قوله)فلیس له حیلة إلا أن یدفعه إلی الفقراء. (بذل المجهود، کتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ٣٧/١، دارالبشائر الإسلامیة، بیروت ٣٥٩/١، تحت رقم الحدیث: ٥٩، وهکذا في الشامي، زکریا ٥٥٣/٩، کراچي ٣٨٥/٦، تبیین الحقائق امدادیة ملتان ٢٧/٦، زکریا ٦٠/٧، البحر الرائق، زکریا ٣٦٩/٩، کوئٹه ٢٠١/٨، هندیة، زکریا قدیم ٣٤٩/٥، جدید ٤٠٤/٥، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ٢٤٦/٣٤، حاشیة ترمذي ٣/١، معارف السنن، اشرفیة دیوبند ٣٣/١-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ ربیع الاول ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۷؍ ۲۶۰۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۷؍۳؍۱۴۱۲ھ

رجسٹری اسٹامپ فیس میں سودی رقم دینا

سوال [۹۲۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہم نے ایک مکان اپنے حلال روپئے سے خریدا، اب ہر گز کے اعتبار سے حکومت کو کچھ متعینہ روپیہ دینا پڑتا ہے، کیا حکومت کو سود کا روپیہ دے سکتے ہیں؟

المستفتی: کلیم اللہ قاسمی، سیتا پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ ظلم اور جبری ٹیکس ہے، اور سود اگر بینک سے حاصل ہوا ہے، تو دیا جاسکتا ہے؛ کیونکہ سودی پیسہ کی اصل مالک حکومت ہے اور مذکورہ طریقے سے حکومت کو دینا اس لئے جائز ہے کہ حرام مال اصل مالک تک پہونچ جاتا ہے، اور یہی حرام مال کا اصل حکم ہے۔

ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/۲۷، زكريا ۷/۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/۳۶۹، كوئٹه ۸/۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/۳۴۹، جديد ۵/۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/۲۴۶، حاشية ترمذي ۱/۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/۳۳-۳۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍محرم الحرام ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۰۸۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۱/۱۴۱۱ھ

حاجی مقروض کے لئے سودی رقم سے قرض ادا کرنا

سوال [۹۲۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص قرض لے کر حج کو گیا، اس کے بعد قرض کی ادائیگی کا نمبر آیا، تو ایک دوسرے شخص نے اس کو سودی رقم دیدی کہ اپنا قرض ادا کر لینا، تو اب اس سودی رقم سے اس شخص کا قرض ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ہلال مرادآبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس طرح قرض لے کر حج کرنے کا شریعت نے مکلّف نہیں بنایا ہے، پھر ایک عبادت کی ادائے گی کے لئے اخذ حرام کا ارتکاب کرنا انتہائی غلط اور خراب بات ہے۔ تاہم شخص مذکور اگر اتنا نادار اور مجبور ہے کہ صدقات واجبہ کا مستحق ہے، تو سودی رقم بطور صدقہ لے کر اپنا قرض ادا کردے؛ تو ممکن ہے کہ گنہگار نہ ہو؛ لیکن اگر مستحق نہیں ہے، تو سودی رقم لے کر قرض ادا کرنا جائز نہیں ہے؛ کیونکہ حرام مال میں قبضہ کے بدلنے سے اس کی حرمت ختم نہیں ہوتی ہے۔

إن الصدقة تمليک بلا عوض. (الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٦/ ٣٣٠)

كلٌ يتصرف في ملكه كيف شاء. (شرح المجلة، رستم مكتبه اتحاد ١/ ٦٥٤، رقم: ١١٩٢)

الواجب في الكسب الخبيث تفريغ الذمة والتخلص منه برده إلى أربابه إن علموا وإلا إلى الفقراء. (الموسوعة الفقهية الكوتية ٣٤/ ٢٤٥)

الحرام ينتقل اي تنتقل حرمته وإن تداولته الأيدي وتبدلت الأملاک. (شامي، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب في تعيين الدراهم في القصد الفاسد، كراچي ٥/ ٩٨، زكريا ٧/ ٣٠٠)

ما حرم أخذه حرم إعطاه. (شرح المجلة رستم مكتبه اتحاد ١/٣٣، رقم: ٣٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۴۵/۴۰)

سودی رقم سے قرض ادا کرنا

سوال [۹۲۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص انتہائی مجبور ہے، دوسروں سے قرض لے کر اپنی ضرورت پوری کرتا ہے، اب اس کے پاس قرض کی ادائے گی کی کوئی سبیل نہیں ہے، ایک شخص کہتا ہے کہ میرے پاس سودی رقم موجود ہے چاہے تو اس کو لے کر اپنا قرض ادا کرے، تو یہ شخص اس کے پاس رکھی ہوئی سودی رقم کو لے کر اپنا قرض ادا کردے، تو ایسا کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

المستفتی: محمد عفان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ایسا مجبور شخص جس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے، اس کو سودی رقم بطور صدقہ دیدی جائے، تو صدقہ کرنے کی وجہ سے یہ مجبور شخص اس کا مالک ہوجائے گا اور اس کا ہر تصرف اس رقم میں جائز اور درست ہوگا، پھر اس رقم سے اپنا قرض ادا کرنا اس کے لئے جائز ہوجائے گا۔

إن الصدقة تمليك بلا عوض لثواب الآخرة. (الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٦/٣٣٠)

كلٌ يتصرف في ملكه كيف شاء. (شرح المجلة، رستم مكتبه اتحاد ١/٦٥٤، رقم: ١١٩٢)

من ملک ملکا خبيثاً ولم يملک الرد إلى المالک فسبيله التصدق على الفقراء. (معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/ ٣٤)

الـواجـب فـي الـكسب الخبيث تفريغ الذمة والتخلص منه برده إلى أربابه إن علموا وإلا إلى الفقراء. (الموسوعة الفقهية الكوتية ٣٤/ ٢٤٥)

الـمـال الـحـاصـل لـه حـرام عليه، إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويـجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالک، وإلا ففي جميع الصور يـجـب عـليه أن يتصدق بمثل تلک الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ١/ ٣٧، دارالبشائر الإسلامية بيروت ١/ ٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، البحرالرائق، زكريا ٩/ ٣٦٩، كوئٹه ٨/ ٢٠١، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ٦/ ٢٧، زكريا ٧/ ٦٠، شامي، زكريا ٩/ ٥٥٣، كراچي ٦/ ٣٨٥، هندية، زكريا قديم ٥/ ٣٤٩، جديده/ ٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/ ٢٤٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰؍۱۱۴۴۶)

سود کی رقم سے مسلمان قرضدار کا قرض ادا کرنا

سوال [۹۲۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر ایک مسلمان بے روزگار ہو اور بہت زیادہ قرض میں مبتلا ہو اور قرض ادا کرنے کے لئے تنگی بے روزگاری میں اس کے پاس بالکل بھی اسباب موجود نہ ہوں اور لوگ اپنا قرض حاصل کرنے کے لئے اس کو بہت زیادہ پریشان کررہے ہوں اور ایک دوسرا مسلمان جس کے پاس سود کا روپیہ ہو اور شریعت میں سود کا پیسہ استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے، تو کیا یہ سود کا پیسہ اس مسلمان سے لے کر قرض دار مسلمان

اس روپئے سے قرض ادا کرسکتا ہے؟

المستفتی: افسرعلی، بارہ دری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سرمایہ دار کے بینک کے سود کا پیسہ انکم ٹیکس، سیل ٹیکس اور جائیدا کی رجسٹری اسٹامپ فیس وغیرہ کے عنوان سے دینا جائز ہے اور اگر یہ چیزیں نہیں ہیں، تو نادار فقراء کو بغیر نیت ثواب دیدیا جائے۔

سوال نامہ میں جس قرضدار کا ذکر ہے، وہ قرض کی ادائے گی میں اپنی جائیداد اور سرمایہ وغیرہ سب ختم کر کے فقیر اور محتاج بن گیا ہے، تو اس کو قرض کی ادائے گی کے لئے سود کا پیسہ دینا جائز ہے؛ اس لئے کہ وہ فقیر اور محتاج بن چکا ہے، اور اگر اس کے پاس گذارہ کے بقدر روپئے موجود ہوں، تو اس کے لئے سود لینا جائز نہ ہوگا۔

فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة والاستئجار على المعاصي والطاعات، أو بغير عقد كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه(إلى قوله) يجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالک، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلک الأموال على الفقراء. وقوله وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/ ۵۵۳، كراچي ۶/ ۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/ ۲۷، زكريا ۷/ ۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/ ۳۶۹، كوئٹه ۸/ ۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/ ۳۴۹، جديد ۵/ ۴۰۴، الموسوعة الفقهية

الکویتیة ۳۴/۲٤٦، حاشیة ترمذي ۳/۱، معارف السنن، اشرفیة دیوبند ۱/۳۳-۳٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍شعبان المعظم ۱۴۳۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/۸۸ ۹۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۰/۸/۱۹ھ

سودی رقم سے متعلق چند سوالات

سوال [۹۲۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) کسی شخص کے پاس سودی رقم ہے، وہ اس رقم کو غریبوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے، کون لوگ اس کے زیادہ مستحق ہیں، مسلم یا غیر مسلم، رشتہ دار یا غیر رشتہ دار، اگر سودی رقم کسی مسلمان کو دینا درست ہے، تو اس حدیث کا کیا جواب ہوگا؟ جو چیز اپنے لئے پسند کرو وہی چیز اپنے بھائیوں کے لئے بھی پسند کرو؟

(۲) کسی شخص کے پاس سودی رقم تھی ضرورت پڑنے پر اس کو خرچ کرلیا بعد میں اس رقم کو جمع کردیا، اس طرح خرچ کرلینا کیسا ہے؟ اور کیا وہ سود کی مقدار رقم جو غیر سودی ہے، اپنے پاس سے غریبوں کو دیدے، تو عند اللہ مؤاخذہ ہوگا یا نہیں؟

(۳) کسی شخص کے پاس سود کی رقم تھی، وہ ایک محفوظ جگہ پر رکھی ہوئی تھی، اس رقم کو غریبوں کو دینے کے بجائے اپنے پاس کی رقم تقسیم کردی، تو کیا وہ سود کی رکھی ہوئی رقم اس کے لئے درست ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: محمد قاسم، لال مسجد، بارہ دری شاہ صفا، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) مسلمان کی سودی رقم کے بارے میں اصل حکم شرعی یہ ہے کہ جہاں سے آئی ہے، وہاں واپس کردی جائے؛ لہٰذا بینک سے حاصل

شدہ سودی رقم کو سیل ٹیکس، انکم ٹیکس کے عنوان سے حکومت کو واپس کر دینا چاہئے اور اگر یہ نہ ہو سکے، تو ثانوی درجہ میں بغیر نیت ثواب نہایت نادار فقراء کو دینے کی اجازت ہے، رشتہ دار، غیر رشتہ دار میں کوئی امتیاز نہیں، ہاں البتہ غیر مسلم فقراء کے مقابلہ میں مسلم فقراء کو دینا اکابر نے بہتر کہا ہے۔

ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، البحر الرائق، زكريا ٣٦٩/٩، كوئٹه ٨/٢٠١، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، شامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، هندية، زكريا قديم ٥/٩٤٩، جديد٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، فتاوى رحيمية ١٥٩/٥ و ٩/٢٧٥، جديد زكريا ١٠/١٨١)

(۲) اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بہت سے لوگوں کی نیتوں پر فیصلہ فرمائیں گے، اس لئے وہاں کا معاملہ تو اللہ ہی کو معلوم ہے؛ لیکن ظاہری طور پر آپ کا معاملہ ایسا ہوا ہے کہ ایک مردہ بکرا ہے، اور ایک ذبح شدہ بکرا ہے، آپ نے اپنا ذبح شدہ بکرا، تو فقراء کو دیدیا ہے، اور اس کے بدلہ میں آپ نے مردہ بکرا کھالیا ہے؛ اس لئے آئندہ ایسا ہرگز نہ کیا جائے اور اللہ سے توبہ کر لی جائے۔

ويجب رده لو قائمًا، ورد مثله أو قيمته لو مستهلكاً. (شامي، كتاب البيوع، باب الربا، زكريا٧/٣٩٩، كراچي ٥/١٦٩، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٢/٦٠)

(۳) اس کی مثال بھی نمبر ۲ کی طرح ہے، آپ نے پاک دے کر ناپاک رکھ لیا؛ لہٰذا اس کا استعمال درست نہیں۔

فيجب رد عين الربا، لو قائماً لارد ضمانه. (درمختار مع الشامي،

کتاب البیوع، باب الربا، زکریا ۳۹۹/۷، کراچي ۱۶۹/۵، الموسوعة الفقهية الكويتية ۶۰/۲۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍شعبان المعظم ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۵۴۳/۳۷)

سودی رقم بیوہ کی شادی میں لگانے کا حکم

سوال [۹۲۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عرض ہے کہ آج کل ہر شخص کو خصوصاً سرکاری ونیم سرکاری ملازمین کو بینک میں کھاتہ رکھنا ضروری ہے، وہاں سے سود کی رقم بھی ملتی ہے، اس سلسلہ میں عرض ہے کہ کیا اس سود کی رقم کو غریب مسلم بیوہ لڑکی کی شادی یا کسی مسلم غریب بچے کی تعلیم کے لئے خرچ کیا جا سکتا ہے؟ اگر نہیں تو یہ رقم کہاں خرچ کی جائے؟

المستفتی: اعزاز الحسن، زیدی، محلّہ واحد نگر، نجیب آباد، ضلع بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: بینک کی سود کی رقم حرام پیسہ ہے، اور اس کا حکم شرعی یہی ہے کہ حرام مال جہاں سے آیا ہے، کسی بھی عنوان سے وہیں واپس ہو جائے، اس سے انکم ٹیکس، سیل ٹیکس اور رجسٹری اسٹامپ فیس وغیرہ کے عنوان سے حکومت کے خزانہ میں واپس کر دینا چاہئے اور اگر یہ ٹیکس وغیرہ واجب نہیں ہے، تو انتہائی نادار فقیر اور مساکین کو بغیر نیت ثواب کے دیدیا جائے، وہ اپنی کسی بھی ضرورت میں خرچ کریں، دینے والا ان کی شادی یا غریب بچے کی تعلیم وغیرہ کی نیت ہرگز نہ کرے؛ بلکہ صرف یہ نیت کرے کہ ناپاک چیز کو اپنے پاس سے نکال کر کے اپنے کو پاک کر رہا ہوں۔

صرح الفقهاء بأن من...... اكتسب مالا بغير حق............ففي جميع

الأحوال المال الحاصل له حرام عليه؛ ولكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء...... وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء؛ ولكن لايريد بذلك الأجر والثواب؛ ولكن يريد دفع المعصية عن نفسه. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/ ۵۵۳، كراچي ۶/ ۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/ ۲۷، زكريا ۷/ ۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/ ۳۶۹، كوئٹه ۸/ ۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/ ۳۴۹، جديد ۵/ ۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/ ۲۴۶، حاشية ترمذي ۱/ ۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/ ۳۳-۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸ر شوال المکرّم ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۲۵۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/ ۱۰/ ۱۴۳۴ھ

سودی رقم غریب لڑکی کی شادی میں صرف کرنا

سوال [۹۲۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بیاج کا روپیہ کسی غریب لڑکی کی شادی میں خرچ کر سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: محمد منظر الاسلام، کرولہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بیاج اور سود کی رقم کسی بھی عنوان سے جہاں

سے آئی ہو، وہیں واپس کرنا واجب ہے، مثلاً سرکاری بینک سے حاصل ہوا ہے، تو انکم ٹیکس، سیل ٹیکس اور بیع نامہ میں رجسٹری اسٹامپ فیس کے عنوان سے واپس کی جاسکتی ہے اور اگر اس طرح کی واپسی کی صورت نہ ہو، تو بلانیت ثواب نہایت غریب نہتے فقیروں کو اس طرح دینا لازم ہوجاتا ہے، جیسا کہ کپڑے پر ناپاکی لگنے کی صورت میں اس کو دھوکر صاف کرنا لازم ہوجاتا ہے اور شادیوں میں زائد خرچ ہوتا ہے۔

نیز اس میں کھانا بھی کھلایا جاتا ہے، جس میں ہر طرح کے لوگ کھانا کھاتے ہیں؛ اس لئے اس میں دینا درست نہیں ہے، ہاں البتہ بالکل غریب اور فقیر ہے، تو اس کو بلانیت ثواب دیا جاسکتا ہے اور مالک بنا دیا جائے شادی کی نیت سے نہ دیا جائے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۳۷، کفایت المفتی ۸/۶۸، جدید زکریا مطول ۱۱/۲۲۴-۲۲۵، ایضاح المسائل ۱۴۲)

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/۲۷، زكريا ۷/۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/۳۶۹، كوئٹه ۸/۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/۳۴۹، جديد ۵/۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/۲۴۶، حاشية ترمذي ۱/۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/۳۳-۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۳۴۱/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۶/۲۴ھ

سود کی رقم کو اپنی لڑکی کی شادی میں صرف کرنا

سوال[۹۲۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں کچھ آمدنی ایک سو روپئے کے حساب سے بینک میں جمع کررہے ہیں، اس لالچ میں کہ تین سال سے جمع کی ہوئی رقم سے زائد تین ہزار روپئے ملیں گے؛ لہٰذا یہ تین ہزار روپیہ اپنے تصرف میں لانا یا اپنی لڑکی کی شادی میں خرچ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: شاہد حسین ولد حاجی عبدالغفور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سود حاصل کرنے کے لئے بینک میں رقم جمع کرنا جائز نہیں ہے، اگر جمع کرکے سود کا پیسہ حاصل ہو جائے، تو وہ لڑکی کی شادی یا دیگر اپنی ضروریات میں خرچ کرنا ناجائز اور حرام ہوگا؛ بلکہ اس کو حاصل کرکے بلانیت ثواب فقراء میں تقسیم کردینا واجب ہوگا۔

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة (إلى قوله) أو بغير عقد كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه (إلى قوله) ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/۲۷، زكريا ۷/۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/۳۶۹، كوئٹه۸/۲۰۱، هندية، زكريا قديم

۳٤۹/٥، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳٤/۲٤٦، حاشية ترمذي ۱/۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/۳۳-۳٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲ رصفر المظفر ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/ ۱۰۹۸)

سودی رقم شادی وغیرہ میں دینا

سوال [۹۲۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سود کی رقم کو غریبوں کی شادی میں یا حکومت کے سرکاری ٹیکس جیسے میونسپل کی گھر پٹی وغیرہ یا اور کون کون سی مد میں اس رقم کو خرچ کر سکتے ہیں؟ اس کی وضاحت فرمائیں۔

المستفتی: بشیر احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک سے حاصل شدہ سودی رقم کو بینک سے نکال لینے کا حکم ہے، اس کے بعد سرکار کو واپس کرنے کے لئے کوئی شکل ہو، تو وہ شکل اختیار کی جائے؛ لہٰذا انکم ٹیکس، سیل ٹیکس کے عنوان سے بھی سرکار کو واپس کرنا درست ہے، آفیسروں کو رشوت میں دینا یا میونسپل کی گھر پٹی وغیرہ میں دینا جائز نہیں ہے، ہاں البتہ اگر ٹیکس وغیرہ کے عنوان سے حکومت کو واپس کرنے کی صورت نہیں ہے یا پھر بھی بچی ہوئی ہے، تو اس کو بغیر نیت ثواب فقراء ہی میں تقسیم کرنا واجب ہے اور شادی بیاہ میں بھی دینا جائز نہیں ہے۔

ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالک، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه، أن يتصدق بمثل تلک الأموال على

الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ربیع الاول ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/۸۴۲۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/۳/۱۴۲۵ھ

سودی رقم جہیز میں دینا

سوال [۹۲۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خالد غریب آدمی ہے، اس کے پاس چند لڑکیاں ہیں، دورِ حاضر میں بغیر مانگ یعنی نقدی رقم دیئے بغیر شادی غیر ممکن ہے، تو ایسی صورت میں لڑکی کے نام سے نقدی رقم بینک میں مقررہ وقت کے لئے فکس کر کے سود والی رقم کو مانگ (جہیز) میں دے سکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد احمد، مدرسہ اسلامیہ بشیریہ، سکرہتہ کلاں، ضلع بھوجپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فکس میں رقم رکھنا حرام ہے، شان وشوکت اور دکھاوے کے لئے لڑکیوں کو جہیز دینا ایک الگ گناہ ہے اور اس کے لئے فکس میں رقم رکھ کر سود جیسی حرام چیز کا ارتکاب مزید گناہ ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [البقرہ: ٢٧٥]

لہٰذا جہیز وغیرہ کی غرض سے فکس میں پیسہ رکھنا جائز نہیں ہے۔ نیز فکس پر جو رقم زائد ملے اس کو جہیز میں دینا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱۷۵، فتاوی رحیمیہ ۲۷۹/۹، جدید ۲۷۰/۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ رجمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۲۰۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۶/۱۶ھ

کیا جہیز میں سودی رقم دینے کی گنجائش ہے؟

سوال [۹۲۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کسی کے پاس سود کا روپیہ ہے اور وہ اپنی بیٹی کی شادی کر رہا ہے، اور لڑکے والے نقد جہیز مانگ رہے ہیں اور بیٹی کے پاس سودی روپیہ کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے، تو کیا وہ یہ کہہ کر کہ میرے پاس سودی روپیہ ہے، اس کو دے رہا ہوں، تو کیا ایسا کرنا صحیح ہے؟

المستفتی: محمد افتخار، بہرائچی، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سود کی رقم بلانیت ثواب فقراء پر صدقہ کردینا چاہئے، اس رقم کو جہیز وغیرہ میں دینا کسی حال میں بھی درست نہیں ہے اور سوال نامہ میں جو یہ کہا گیا ہے، کہ لڑکے والے نقد جہیز مانگ رہے ہیں، تو یہ شرعاً رشوت ہے اور سخت مجبوری کی حالت میں اپنا حلال پیسہ رشوت میں دے کر مجبوری دور کرنے کی گنجائش ہے اور ایسی صورت میں رشوت دینے والا گنہگار نہ ہوگا؛ بلکہ رشوت لینے والا گناہ کبیرہ اور حرام کا مرتکب ہوگا اور وہ رقم بھی لینے والے کے لئے حرام ہوگی۔

دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه، وماله،

ولاستخراج حق له، ليس برشوة يعني في حق الدافع. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، فصل في البيع، زكريا ۹/۶۰۷، كراچي ۶/۴۲۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ ر جمادی الثانیہ ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۳۳۲/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۶/۱۰ھ

سودی رقم سے ولیمہ کرنے اور جہیز کا سامان خریدنے کا حکم

سوال [۹۲۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص جس کے پاس سودی رقم ہے، جس رقم سے وہ دعوت ولیمہ کرتا ہے، اس کا ولیمہ کرنا کیسا ہے؟ اور اس میں شرکت کرنے کا شرعی حکم کیا ہے؟

(۲) اس سودی رقم سے جہیز کا سامان بھی خریدتا ہے، آیا یہ شخص اس خریدے ہوئے مال کا مالک ہوگا یا نہیں؟

(۳) اگر یہ شخص سودی رقم کے ذریعہ زیورات خریدے تو اس خریدے ہوئے زیورات پر زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: احمد جنید، سنسار پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) سودی رقم کو اپنے ذاتی استعمال میں لانا حرام ہے؛ لہٰذا اس رقم سے دعوت ولیمہ کرنا اور اس دعوت میں شرکت کرنا حرام اور ناجائز ہے؛ بلکہ سود لینے والے پر ضروری ہے کہ اس سودی رقم کو اس کے اصل مالک کو واپس کردے اور اگر واپس کرنا ناممکن ہو، تو فقراء کو بلانیت ثواب صدقہ کردے۔

سئل الفقيه أبو جعفر عمن اكتسب ماله من امراء السلطان، وجمع المال من أخذ الغرامات المحرمات وغير ذلک؛ هل يحل

لمن عرف ذلک أن یأکل من طعامه، قال: أحب إليّ أن لا یأکل منه، ویسعه حکمًا أن یأکله إلی ما قال أي إن لم یکن عین الغصب أوالرشوة؛ لأنه لم یملکه فهو نفس الحرام فلا یحل له لا لغیره. (شامي، کتاب الزکاة، باب زکاة الغنم، مطلب في التصدق من المال الحرام، زکریا۳/۲۱۹، کراچي ۲/۲۹۲)

(۲) سودی رقم سود لینے والے کی ملکیت نہیں ہے؛ اس لئے اس سودی رقم سے خریدے گئے سامان جہیز کا وہ شخص مالک نہیں ہوگا، اس سودی رقم کا اصل مالک اگر معلوم ہو، تو اس کو لوٹانا واجب اور ضروری ہے، ورنہ بلانیت ثواب فقراء کو صدقہ کردینا واجب ہے۔

صرح الفقهاء بأن من اکتسب مالا بغیر حق، فإما أن یکون کسبه بعقد فاسد کالبیوع الفاسدة والاستئجار علی المعاصي والطاعات، أو بغیر عقد کالسرقة، والغصب، والخیانة، والغلول، ففي جمیع الأحوال المال الحاصل له حرام علیه. (بذل المجهود، هندي، کتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامیة، بیروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحدیث:۵۹، وهکذا في الشامي، زکریا ۹/۵۵۳، کراچي ۶/۳۸۵، تبیین الحقائق امدادیة ملتان ۶/۲۷، زکریا ۷/۶۰، البحرالرائق، زکریا ۹/۳۶۹، کوئٹه۸/۲۰۱، هندیة، زکریا قدیم ۵/۳۴۹، جدید ۵/۴۰۴، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۳۴/۲۴۶، حاشیة ترمذي ۱/۳، معارف السنن، اشرفیة دیوبند ۱/۳۳-۳۴)

(۳) سودی رقم یا اس سے خریدے ہوئے زیورات اس کے لئے حلال نہیں ہیں، رقم ہو یا زیورات کل کا کل اصل مالک کو واپس کرنا واجب ہے، مالک نہ ملے تو کل کا کل فقراء کو بلانیت ثواب دیدینا واجب ہے، جب کل دینے کا حکم ہے تو زکوۃ کا سوال ہی نہیں۔

وفي القهستاني: ولا زکوة في المغصوب، والمملوک شراء فاسداً، والمراد بالمغصوب مالم یخلطه بغیره لعدم الملک.

(شامي، كتاب الزكاة، مطلب الفرق بين السبب و الشرط والعلة، زكريا ۳/ ۱۷۵، كراچي ۲/ ۳٦۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۰۵۱)

شادی کی رسومات میں سودی رقم صرف کرنا

سوال [۹۲۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل بیاہ شادیوں میں بے حد فضول خرچی اور غیر شرعی رسم عورتیں کرتی ہیں، دولہا کی ایک آنکھ میں سرمہ لگا کر دوسری آنکھ میں سرمہ لگانے کے لئے کچھ نذرانہ مانگتی ہیں۔

(۲) دولہا کے سر پر سہرہ باندھتے وقت کچھ نذرانہ مانگتی ہیں، دولہا کی سالیاں جوتا چھپا کر نذرانہ مانگتی ہیں۔

(۳) ان تمام حالات کو سامنے رکھتے ہوئے بینک میں جو رقم جمع ہے، اس کا نفع ان عورتوں کو دیدیا جائے، تو کیا حرج ہے؟ اس طرح سے صاحب خانہ مالی پریشانی سے بچ جاتا ہے، اور اس کی اصل رقم بچ جاتی ہے۔

المستفتی: محمد شفیع، تاجر عطر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) اول تو سرمہ لگانے والی عورتیں غیر محرم ہوتی ہیں، جن کی اس طرح بے تکلفی ہرگز جائز نہیں ہے۔

دوسری اس دھوکہ اور فریب سے نذرانہ کا مطالبہ بھی شرعاً ناجائز اور ممنوع ہے، ایسی حرکتوں پر روک ڈالنا لازم ہے۔ (مستفاد: بہشتی زیور ۱۶/ ۳٦)

(۲) نہ دولہا کی سالیوں کے لئے دولہا کو سہرا باندھنا جائز ہے اور نہ جوتا چوری کر کے

نذرانہ حاصل کرنا جائز ہے۔ نیز دولہا کی سالیوں کے لئے سہرا باندھ کر نذرانہ حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: بہشتی زیور ۶/۲۵و ۶/۳۶)

(۳) اس میں نہ جیب خاص سے پیسہ دینا ضروری ہے اور نہ ہی بینک کی سودی رقم دینا جائز ہے؛ بلکہ سودی رقم کسی بھی عنوان سے حکومت کو واپس کر دینا چاہئے، مثلاً انکم ٹیکس، سیل ٹیکس وغیرہ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۰۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ربیع الاول ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/۴۳۹۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۳/۲۶ھ

مسجد کی جمع شدہ رقم پر ملے سود کو مسجد کی تعمیر میں لگانا

سوال [۹۲۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسجد کی رقم بینک میں جمع تھی، آج اس رقم کا سود دو لاکھ روپئے ہو چکا ہے، آیا اس رقم کو مسجد کی تعمیر یا بیت الخلاء اور غسل خانہ وغیرہ میں خرچ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو پھر اس رقم کو کس مصرف میں خرچ کریں؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد ناصر الدین قاسمی غفرلہ، بجور بازار، بھاگل پور (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شرعاً مسجد میں ایسا حرام اور خبیث مال خرچ کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، اس کو نکال کر فقراء کو مسجد کی کمیٹی کے مشورہ سے دیدینا چاہئے، بعض حضرات نے بیت الخلاء میں خرچ کرنے کی اجازت دی؛ لیکن ان کی دلیل ہماری سمجھ میں نہیں آئی، ان کی دلیل سے ہم کو اطمینان نہیں ہے۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع

مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء؛ ولكن لايريد بذلك الأجر والثواب؛ ولكن يريد دفع المعصية عن نفسه. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/ ۵۵۳، كراچي ۶/ ۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/ ۲۷، زكريا ۷/ ۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/ ۳۶۹، كوئٹه ۸/ ۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/ ۳۴۹، جديد ۵/ ۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/ ۲۴۶، حاشية ترمذي ۱/ ۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/ ۳۳-۳۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍رجب المرجب ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹؍ ۳۲۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲؍۷؍۱۴۱۳ھ

بینک میں جمع شدہ اوقاف کی رقم پر ملے سود کو مسجد کے تعاون میں لینا

سوال [۹۲۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اوقاف کا پیسہ جب بینک میں جمع رہتا ہے، اوراس پر سود ملتا ہے، اور رقم بڑھتی رہتی ہے، تو ایسی صورت میں اس قسم کے وقف سے مسجد وغیرہ میں تعاون لے سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: محمد بشار، مقرب پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جن اوقاف کی رقم بینک میں جمع رہتی ہے اوراس پر سود ملتا ہے، تو اس کی اصل رقم سے مسجد یا مدرسہ کے لئے تعاون لینا جائز ہے اوراس کے سود سے جائز نہیں ہے۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع

مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء؛ ولكن لايريد بذلك الأجر والثواب؛ ولكن يريد دفع المعصية عن نفسه. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/۲۷، زكريا ۷/۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/۳۶۹، كوئٹه۸/۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/۳۴۹، جديد ۵/۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/۲۴۶، حاشية ترمذي ۱/۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/۳۳-۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ ذی قعدہ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۲۰۳/۳۱)

سودخور کا مسجد کی تعمیر میں روپئے دینا

سوال [۹۲۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید سودخور ہے، اور یہ اپنے سود کی رقم مسجد کی تعمیر میں دینا چاہتا ہے اور اسکے سودخور ہونے کا علم لوگوں کو بھی ہے، تو کیا اس کے سود کی رقم مسجد میں لگ سکتی ہے یا نہیں؟ وضاحت فرمائیں۔ اور اگر سود کی رقم کے علاوہ دیتا ہے، اور یہ کہتا ہے کہ سود کی یہ رقم نہیں ہے، تو آیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: رئیس احمد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسجد میں سود کا پیسہ لگانا جائز نہیں ہے؛ البتہ جب وہ سود کے علاوہ دوسرے مال میں سے دے رہا ہے، تو اس کو مسجد کے لئے لینا اور مسجد میں لگانا جائز اور درست ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۴/۱۲۱)

أما لو أنفق في ذلک مالاً خبيثًا سببه الخبيث و الطيب فيكره؛ لأن الله لا يقبل إلا الطيب، فيكره تلويث بيته بما لا يقبله. (شامي، كتاب الصلاة، باب مايفسد الصلاة، ومايكره فيها، قبيل مطلب أفضل المساجد، زكريا ۲/ ٤٣١، كراچي ١/ ٦٥٨)

آكل الربا و كاسب الحرام أهدي إليه أو أضافه وغالب ماله حرام لا يقبل......ما لم يخبره أن ذلک المال أصله حلال. (هندية، كتاب الكراهية، و الاستحسان، الباب الثاني عشر في الهدايا والضيافات، زكريا جديد ٥/ ٣٩٧، قديم ٥/ ٣٤٣، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٨٦-١٨٧، مصری قديم ٢/ ٥٢٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ شعبان ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۴۱۶۲)

سودی رقم مسجد کے گڑھے کی تعمیر میں لگانا

سوال [۹۲۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک گڑھا جس میں مسجد اور مدرسہ کا پانی جمع ہوتا ہے، اس کی تعمیر میں سود کا روپیہ لگایا جاسکتا ہے؟ اور یہ سود مسجد کی رقم کا نہیں ہے۔

المستفتی: ثناء اللہ خادم مدرسہ سلطانیہ ضیاء العلوم سری نگر، لکھیم پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سود حرام ہے، اس کا روپیہ ایسے گڑھے کی تعمیر میں لگانا ناجائز ہے، جس میں مسجد ومدرسہ کا پانی جمع ہوتا ہے، بعض علماء نے اس کی گنجائش لکھی ہے، مگر ان کے دلائل ہمارے نزدیک کمزور ہیں، کسی عنوان سے سود کا پیسہ مالک کو واپس ہوجانا چاہئے، اگر واپسی کی کوئی شکل نہ ہو، تو بلانیت ثواب فقراء کو صدقہ کردے۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/۲۷، زكريا ۷/۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/۳۶۹، كوئٹه۸/۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/۳۴۹، جديد ۵/۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/۲۴۶، حاشية ترمذي ۱/۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/۳۳-۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۱۵۹/۳۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۵/۱۶ھ

سودی رقم سے مسجد کے بیت الخلاء کی تعمیر

سوال [۹۲۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں مسلم عوامی سوسائٹی قائم ہے، جہاں بغیر سود کے قرض کا لین دین ہوتا ہے، اس سوسائٹی نے سود کی رقم سے مساجد میں بیت الخلاء بنوانے کا پروگرام بنایا ہے اور بعض مساجد میں بیت الخلاء کی تعمیر کے لئے رقم مختص کر کے ذمہ دار کے حوالہ بھی کر دیا ہے، ایک مسجد ایسی ہے کہ جس میں بیت الخلاء کی تعمیر کے لئے فی الحال جگہ مختص نہیں ہے، اس مسجد کا ایک مکان ہے، جس میں امام صاحب رہتے ہیں، جس میں بیت الخلاء بنا ہوا تو ہے؛ لیکن پرانے طرز کا ہے فلیش نہیں ہے، امام صاحب بیوی بچوں والے ہیں، جس کی بنا پر کافی پریشانی ہوتی ہے، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ

(۱) مسلم عوامی سوسائٹی کی سود کی رقم سے مسجد کے مکان میں جس میں امام

صاحب رہتے ہیں، کیا بیت الخلاء تعمیر کر سکتے ہیں اور شرعاً امام صاحب کے لئے اس کا استعمال کیسا رہے گا؟

(٢) مسجد میں جماعتیں بھی آتی ہیں، اگر یہ شکل کردی جائے اور اس طرح بیت الخلاء بنوادیا جائے کہ اس کو جماعت کے احباب بھی استعمال کریں، امام صاحب اور امام صاحب کے گھر والے بھی استعمال کریں، تو کیا ایسی شکل میں سود کی رقم سے مسجد کے مکان میں بیت الخلاء کے تعمیر کی اجازت ہوسکتی ہے؟

المستفتی: نعمت اللہ قاسمی، چوک گونڈہ (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں کچھ متضاد باتیں نظر آتی ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ اس سوسائٹی میں سودی لین دین نہیں ہوتا ہے، پھر یہ سوال کیا جارہا ہے کہ سوسائٹی کی سودی رقم سے بیت الخلاء بنا سکتے ہیں یا نہیں؟ جس سے الجھن پیدا ہوگئی۔

بہرحال مسلم عوام سے سود لے کر سوسائٹی کے لئے اس پیسے کو کسی بھی چیز میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے، انہیں عام مسلمانوں کو جن سے سود لیا گیا ہے، واپس کرنا واجب ہے، مسجد کا بیت الخلاء بنانا قطعاً جائز نہیں ہے؛ ہاں البتہ اگر بینک کا سود ہوتا اور واپسی کی صورت نہ بنتی، تو بلانیت ثواب فقراء کو دینے کی گنجائش ہوتی۔

إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/ ٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/ ٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/ ٥٥٣، كراچي ٦/ ٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/ ٢٧، زكريا ٧/ ٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/ ٣٦٩، كوئٹه ٨/ ٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/ ٣٤٩، جديد ٥/ ٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/ ٢٤٦، حاشية

ترمذي ۱/۳، معارف السنن، اشرفية ديو بند ۱/۳۳-۳٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍رجب المرجب ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۶۸۰۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۳/ ۷/ ۱۴۲۱ھ

سودی رقم سے مسجد کی بیت الخلاء یا قبرستان کی چہار دیواری تعمیر کرانے کا حکم

سوال [۹۲۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کہ مسجد ڈیڑ والی محلّہ اصالت پورہ میں ایک شکستہ اور تنگ تاریک بیت الخلاء ہے، امام اور مؤذن اور دور دراز سے آنے والی جماعتوں کو قضاء حاجت کے لئے بہت دشواری اور پریشانی ہوتی ہے، اکثر بار ایسا ہوا ہے کہ جماعت والے بیت الخلاء کے درست نہ ہونے کے سبب بغیر کام کئے واپس چلے گئے؛ اس لئے موجود بیت الخلاء کو توڑ کر نئی بیت الخلاء اور اس سے متصل پیشاب خانہ تعمیر کرنے کا ارادہ ہے، کیا اس کی تعمیر و مرمت میں بینک سے ملی ہوئی سودی رقم لگانے کی شرعاً کوئی گنجائش ہے یا نہیں؟

(۲) کیا سودی رقم قبرستان کی چہار دیواری کی تعمیر میں لگا سکتے ہیں اور اس رقم سے دینی کتب خرید کر مدارس میں پڑھنے والے غریب طلبا کو دینا درست ہے یا نہیں؟ اور اصلاحی ودینی کتابچہ یا پمفلٹ شائع کرنے میں اس رقم کو صرف کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

المستفتی: حاجی عبدالرحمٰن وحاجی عبدالخالق، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) سودی رقم سے مسجد کی بیت الخلاء اور پیشاب خانہ بنانا جائز نہیں ہے۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فإما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع

مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه ٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤)

(۲) سودی رقم سے قبرستان کی چہار دیواری بنانا اور دینی کتابیں خرید کر دینا اور پمفلٹ اور لٹریچر اور دینی رسائل شائع کرنا بھی جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ یہ مال حرام اور مال خبیث ہے دینی امور میں لگائے جانے کا جواز نہیں ہے؛ بلکہ انکم ٹیکس وغیرہ کے عنوان سے سرکاری بینک میں واپس کرنے کی صورت نہ بن سکے، تو اس کو نادار فقراء کو بلانیت ثواب دیدینا واجب ہوتا ہے۔

فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه ٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۸؍محرم الحرام ۱۴۱۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱؍۳۷۹۶)	۱۴۱۵/۱/۸ھ

سودی رقم سے مدرسہ کے مدرسین وملازمین کی تنخواہ دینا

سوال [۹۲۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے پاس سود کا ملا ہوا اپنا پیسہ ہے، جو مجھے میرے بینک کھاتے کی وجہ سے مجھے بینک نے دیا ہے اور پھر مجھے معلوم ہے کہ یہ پیسہ میرے لئے از روئے شرع حرام مال ہے، مگر یہ پیسہ میں اپنی خوشی سے بغیر ثواب کی نیت کئے کسی مدرسہ کے دیانتدار مہتمم صاحب کو کسی اہم مدرسہ کے لئے دیدوں؟ اور وہ مہتمم مدرسہ کے اساتذہ کی تنخواہ اس پیسہ سے دیدے، تو مدرس کے لئے وہ تنخواہ جائز ہے یا نہیں؟ اس کی شرعی تدبیر اور شرعی حکم تحریر فرمائیں۔

المستفتی: نذرحسین، عرف بابو، جامع مسجد مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سود کا روپیہ مدرسین اور اساتذہ وملازمین کی تنخواہ میں دینا ہرگز جائز نہیں ہے چاہے مہتمم کے توسط سے ہو یا کسی اور طریقہ سے بہرصورت ناجائز ہے، ہاں البتہ آپ انکم ٹیکس، سیل ٹیکس، جو جبری ٹیکس ہیں ان میں دے سکتے ہیں؛ اس لئے کہ حرام مال کا حکم یہ ہے کہ کسی بھی عنوان سے اصل مالک کو واپس کردینا واجب ہے اور اگر یہ نہ ہو سکے، تو صرف فقیر نادار کو دے سکتے ہیں۔ نیز غریب طلبہ کو بھی دے سکتے ہیں۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فإما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۳۷/۱، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۳۵۹/۱، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۵۵۳/۹، كراچي ۳۸۵/۶، تبيين الحقائق

امـدادية مـلتـان ٦/٢٧، زكريا ٧/ ٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه٨/ ٢٠١، هندية، زكـريـا قـديـم ٥/٣٤٩، جـديـد ٥/ ٤٠٤، الـمو سوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديو بند ١/٣٣-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم رجب المرجب ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲۳۳/۲۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۷/۱۴۱۳ھ

سودی رقم کو مسجد و مدرسہ یا اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنا

سوال [۹۲۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ۲۱/ستمبر کو ایک عالم صاحب ہمارے یہاں تشریف لائے تھے، انہوں نے اثنائے تقریر مجمع عام کے سامنے بیان فرمایا کہ بینک میں رکھی ہوئی رقم کا جو سود ملتا ہے، وہ مسجد و مدرسہ میں اپنے اور اپنے اہل وعیال کے خرچہ میں لایا جاسکتا ہے اور یہ بالکل جائز ہے اور یہی حکم فکس کا ہے اور یہی حکم جیون بیمہ کا ہے، زمین رہن رکھنا بھی جائز ہے بشرطیکہ ان تمام معاملات کا تعلق ہندو بینک یا ہندوؤں سے ہوں۔

المستفتی: امام مسجد ملپورہ، فیض الحسن، پوسٹ ٹھاکردوارہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: بینک اور فکس ڈپازٹ اور جیون بیمہ سے ملنے والی سودی رقم حرام اور مال خبیث ہے اور حرام مال کو مسجد و مدرسہ میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے چاہے یہ سارے معاملات مسلمانوں سے ہوں یا ہندو بینک یا ہندوؤں سے ہر حال میں جائز نہیں ہے اور جن لوگوں کے نزدیک دارالحرب میں حربی سے سود لینے کی جو اجازت ہے وہ بھی ایسے مسلمان کے لئے ہے جو پاسپورٹ لے کر دوسرے ممالک سے عارضی طور پر آیا ہوا ہو۔

ولا بين حربي ومسلم مستأمن. (در مختار، كتاب البيوع، باب الربا، زكريا٧/ ٤٢٢، كراچي ٥/ ١٨٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹؍۳۴۰۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۶/۷ھ

سودی رقم مدرسہ کی تعمیر یا مدرسین کی تنخواہوں میں دینا

سوال[۹۲۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر رقم جمع کردی گئی تھی اور ڈبل رقم ملی، تو آیا اس سودی رقم کو مدرسہ کی تعمیر یا بیت الخلاء یا طلباء وغیرہ پر خرچ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہیں ہے، تو کفایت المفتی ۶۳/۷، جواب ۵۴/۸/۶۲، جواب ۶۱۸/۵۲، جواب ۴۸ کا کیا مطلب ہوگا؟ مفصل اور مدلل جواب سے نوازیں۔

المستفتی: محمد ناصر الدین قاسمی، بھاگل پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سودی رقم کو مدرسہ کی تعمیر یا بیت الخلاء یا مدرسین کی تنخواہوں میں صرف کرنا ہرگز جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ یہ حرام اور خبیث مال ہے، اس کا حکم یہی ہے کہ اگر مالک تک کسی بھی عنوان سے رسائی ممکن ہو، تو مالک ہی کو واپس کردینا واجب ہے، اگر یہ ممکن نہ ہو، تو غریب ونادار کو بلانیت ثواب دینا لازم ہے اور مدرسہ کے غریب طلبا کو بھی دیا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

أما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أو حصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/ ٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/ ٣٥٩، تحت رقم

الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/ ٥٥٣، كراچي ٦/ ٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/ ٢٧، زكريا ٧/ ٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/ ٣٦٩، كوئٹه٨/ ٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/ ٣٤٩، جديد ٥/ ٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/ ٢٤٦، حاشية ترمذي ١/ ٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/ ٣٣-٣٤)

کفایت المفتی کے جوابات میں خود تعارض ہے۔ نیز انہوں نے جو مدرسین کی تنخواہ میں صرف کرنے کا جواز تحریر فرمایا ہے، اس کی کوئی شرعی دلیل کتب فقہ میں موجود نہیں ہے؛ اس لئے اس کو حضرت مفتی کفایت اللہؒ کا تفرد ہی کہا جا سکتا ہے، جو دوسروں کے لئے اور ہمارے لئے قابل استدلال نہیں ہو سکتا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍رجب المرجب ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹؍ ۳۲۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲؍۷؍۱۴۱۳ھ

سودی رقم مسجد کی نالی یا مدرسہ میں صرف کرنا

سوال [۹۲۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہماری مسجد کا ۳۲؍ہزار روپیہ بینک میں جمع تھا۔ اب اسمیں تقریباً ساڑھے پانچ ہزار روپیہ سود ملا ہے، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ یہ سود کا روپیہ کہاں خرچ کریں؟ مسجد کی نالی بیت الخلاء یا مدرسہ میں لگ سکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد حسین چوگی پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: بینک سے حاصل شدہ رقم مال حرام ہے اور مال حرام کو مسجد کے کسی بھی ملحقات میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے، مسجد کی نالی مسجد کے ملحقات میں سے ہے، اس میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے؛ البتہ مدرسہ کے نادار طلبہ کو بلا نیت ثواب دے سکتے ہیں یا فقراء کو تقسیم کردیں۔

أما إذا کان عند رجل مال خبیث (إلی قوله) فلیس له حیلة إلا أن یدفعه إلی الفقراء. (بذل المجهود، کتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامیة، بیروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحدیث: ۵۹، وهکذا في الشامي، زکریا ۹/۵۵۳، کراچي ٦/۳۸۵، تبیین الحقائق امدادیة ملتان ٦/۲۷، زکریا ۷/٦۰، البحرالرائق، زکریا ۹/۳٦۹، کوئٹه۸/۲۰۱، هندیة، زکریا قدیم ۵/۳٤۹، جدید ۵/٤۰٤، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۳٤/۲٤٦، حاشیة ترمذي ۱/۳، معارف السنن، اشرفیة دیوبند ۱/۳۳-۳٤)

لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبه. (شامي، کراچي ٦/۳۸۵، زکریا ۹/۵۵۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹؍ ۳۳۷۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵؍ ۳؍ ۱۴۱۴ھ

سودی رقم سے ذاتی یا مدارس اسلامیہ کے بیت الخلاء تعمیر کرنا

سوال [۹۲۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سودی رقم سے مدارس اسلامیہ کے بیت الخلاء بنانا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) نیز سود کی رقم سے اپنے ذاتی بیت الخلاء بنا سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: علی شیر، موضع جاجو پارہ، ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱/۲) سود کی رقم سے نہ مدارس کے بیت الخلاء بنائے جاسکتے ہیں اور نہ ہی اپنے گھر کے بیت الخلاء بنانے کی اجازت ہے؛ بلکہ اس کا مصرف صرف فقراء اور مساکین ہیں؛ لہٰذا ان پر بلانیت ثواب صدقہ کردینا واجب ولازم ہے۔

أما إذا کان عند رجل مال خبیث، فأما إن ملکه بعقد فاسد،

أو حصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه -إلى قوله- فلزم عليه، أن يدفعه إلى الفقراء؛ ولكن لايريد بذلك الأجر والثواب. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/ ٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/ ٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/ ٥٥٣، كراچي ٦/ ٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/ ٢٧، زكريا ٧/ ٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/ ٣٦٩، كوئٹه ٨/ ٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/ ٣٤٩، جديد ٥/ ٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/ ٢٤٦، حاشية ترمذي ١/ ٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/ ٣٣-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ جمادی الاول ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹/ ۳۴۶۶)

سودی رقم مدرسہ کی بیت الخلاء میں لگانا

سوال [۹۲۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سود کی رقم سے مسجد یا مدرسہ کے بیت الخلاء یا پیشاب گھر یا غسل خانہ وغیرہ بنائے جاسکتے ہیں یا نہیں؟ یا کسی غریب کی ہی مدد کی جاوے؟ جواب مرحمت فرما کر مشکور فرمائیں۔

المستفتی: محمد یوسف احمد گڑھ (پنجاب)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سود کی رقم مسجد یا مدرسہ یا گھر کے بیت الخلاء، غسل خانہ میں خرچ کرنے کی گنجائش بعض علماء نے لکھی ہے، مگر ان کے دلائل ہمارے نزدیک مخدوش ہیں؛ لہٰذا نادار فقراء ہی کو بلا نیت ثواب دیدینا لازم ہوگا۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فإما إن ملكه بعقد فاسد، أو حصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته

عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/۲۷، زكريا ۷/۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/۳۶۹، كوئٹه۸/۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/۳۴۹، جديد ۵/۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/۲۴۶، حاشية ترمذي ۱/۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/۳۳-۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍شعبان المعظم ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲؍۴۹۶۴)

سودی رقم غریب کو یا دینی مدارس میں دینا

سوال [۹۲۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کیا بینک کے سود کا روپیہ غریب جو صاحب زکوۃ نہ ہو، بغیر ثواب کی نیت کے اشیاء کی صورت میں دے سکتے ہیں؟

(۲) کسی دینی مدارس کے مہتمم یا ناظم صاحب کو یہ بتا کر اشیاء دی جاسکتی ہیں کہ غریب طلبا پر یا اس مد کے مدرسہ کی کسی ضرورت میں صرف کرلینا، یہ بھی بغیر ثواب کی نیت سے تو کیا یہ جائز ہے؟

المستفتی: محمد عابد خاں، بانس بلی اسٹور، چاہ شیریں، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) سود کا پیسہ فقراء کو دینا ہو، تو بلا نیت ثواب فقراء کو دے سکتے ہیں؛ لیکن فقراء کو پیسہ ہی دے سکتے ہیں، اشیاء خرید کر نہ دے؛ کیونکہ سامان خرید کر دینے میں ایک حرام چیز کے ذریعہ خریدنے کا تصرف آجاتا ہے۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فإما إن ملكه بعقد فاسد،

أو حصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤)

(۲) سود کا پیسہ حرام ہوتا ہے، اس میں روحانیت نہیں ہوتی ہے؛ اس لئے سود کا پیسہ مدرسہ کے ناظم کو طلبہ کے کھانے کے لئے نہیں دینا چاہئے۔ نیز سود کا پیسہ حرام ہوتا ہے، مدرسہ میں حلال رقم خرچ کرنی چاہئے، نہ کہ حرام اس لئے مدرسہ میں سود کا پیسہ استعمال نہیں کرنا چاہئے۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فإما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة ، باب فرض الوضوء، سهارنپور١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱ر شعبان ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۱۴۴/۳۷)

حرام مال مسجد یا مدرسہ میں لگانا

سوال [۹۲۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ زید ایک بہت بڑا کلب چلاتا ہے، اس کلب میں مختلف قسم کے جوے چلتے ہیں، اس سے اس کو اچھی خاصی آمدنی ہوتی ہے، ہم لوگوں نے اس کو بہت سمجھایا اور آخرت کا احساس دلایا کہ تو اس کام کو بند کردے، مگر زید کا کہنا یہ ہے کہ میں اس کام میں اتنا آگے بڑھ چکا ہوں کہ اس کو بند کرنا میرے لئے بہت دشوار ہے اور میری جان کو یقینی خطرہ ہے، یعنی کلب میں آنے والے لوگ اپنے راز کے فاش ہونے کے ڈر سے مجھے ہی ختم کرڈالیں گے۔

زید کا کہنا ہے کہ اگر میری آمدنی میں سے مدرسہ وغیرہ کی تعمیر میں لگایا جاسکتا ہے، تو میں بڑی رقم لگا سکتا ہوں یا پھر وہ غریب جن کے پاس رہنے کو گھر نہیں ہے، میں ان لوگوں کو گھر مکان کے لئے خرچ کرنے کو تیار ہوں یا پھر وہ لوگ جو اپنی غربت کی وجہ سے اپنی لڑکیوں کی شادی نہیں کر پاتے ہیں، میں ان کے لئے بھی دینے کو تیار ہوں۔

اب مسئلہ یہ دریافت کرنا ہے کہ ان تینوں کاموں میں سے کسی پر زید کی رقم کو لگایا جاسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: نسیم احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو مال حرام اور ناجائز طریقہ سے کمایا گیا ہے، اس کو مسجد اور مدرسہ میں لگانا قطعاً ناجائز ہے؛ بلکہ اس مال کو اصل مالک تک واپس کرنا ضروری ہے، اگر اصل مالک نہ مل سکے، تو اس کی جانب سے محتاجوں اور غریبوں میں صدقہ کردینا لازم ہے؛ لہٰذا اس شخص کو مسجد و مدارس میں اپنا ناپاک اور خبیث مال دینا جائز نہیں اور نہ ہی مسجد و مدارس میں اس مال کا لینا درست ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ جدید ۱۸/۴۴۶، ایضاح المسائل ۱۴۳)

أما لو أنفق في ذلک مالاً خبيثًا سببه الخبيث والطيب فيكره؛ لأن الله لا يقبل إلا الطيب، فيكره تلويث بيته بما لا يقبله. (در مختار، كتاب الصلاة، باب مايفسد الصلاة، و مايكره فيها، زكريا ۲/۴۳۱، كراچي ۱/۶۵۸)

إن أخذه من غير عقد ولم يملكه يجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالک، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه، أن يتصدق بمثل تلک الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه ٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲؍شعبان المعظم ۱۴۲۹ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸؍۹۶۹۴)	۱۴۲۹/۸/۲ھ

سودی رقم اسکول، کالج، یا رفاہ عام میں لگانا

سوال [۹۲۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں براس کا کاروبار کرتا ہوں، ۳۵؍سال سے برابر انکم ٹیکس دیتا ہوں، کبھی کبھی انکم ٹیکس والوں کی طرف سے یا اگر بندوق کا لائسنس بنوانا ہے، یا کسی جائیداد کی رجسٹری کرانی ہے، تو ان کی مقرر کردہ رقم کی ایف ڈی وکاس پتر، اندرا وکاس پتر خرید کر ان کو دکھانے پڑتے ہیں، انکم ٹیکس کی شرح اس طرح رکھی گئی ہے کہ پبلک میں دولت کا توازن برابر رہے، زیادہ انکم والوں کی شرح بہت زیادہ ہے یہاں تک کہ آمدنی کا ۷۰؍فیصدی انکم ٹیکس بن جاتا ہے، گورنمنٹ نے زیادہ انکم والوں کو کچھ رعایتیں بھی دی ہیں، اگر زیادہ انکم ولا اپنا اور اپنے خاندان کے ممبروں کا بیمہ کرالیتا ہے، تو بیمہ کی قسطوں کا روپیہ اس کی انکم میں سے کم کردیا جائے گا، جس سے اس کو انکم ٹیکس بہت کم دینا پڑے گا، یہی وجہ ہے کہ زیادہ انکم والے تمام ہی لوگ اپنا اور اپنے خاندان والوں کا بیمہ کراتے ہیں، میرے خاندان میں بھی

سبھی کے بیمے تھے، جس سے میں اب قطعی پرہیز کررہا ہوں، مجھے جب بھی بیمہ یا ایف ڈی کی رقمیں ملیں، ان میں جتنا بھی زائد روپیہ ملتا تھا، میں اس کو ضرورت مندوں کو یا کالج کو دے دیا کرتا ہوں، اس نیت کے ساتھ کہ اس کا ثواب نہیں ملے گا، میں نے اپنے بیوی بچوں پر ایسا روپیہ کبھی خرچ نہیں کیا، ہندوستان میں مسلمانوں کو تعلیمی اور تجارتی میدان میں اپنے اہل وطن بھائیوں کے ساتھ ساتھ چلنا ہوگا، جیسا کہ ہمارے رہبر کہتے ہیں، مسلمانوں کے تعلیمی ادارے بہت کم ہیں مرادآباد میں اہل وطن بھائیوں کے پانچ ڈگری کالج ہیں اور مسلمانوں کا صرف ایک، انٹر کالج تیس ہیں اور مسلمانوں کے صرف چھ، ایسی حالت میں ان مسلم اداروں کو لائف انشورنش سے ملنے والی زیادہ رقم (جتنی جمع کی تھی اس سے زائد) دی جاسکتی ہے یانہیں؟ جہاں غریب بچوں کو مفت تعلیم گورنمنٹ نصاب سے دی جاتی ہے اوران اداروں کی ڈگریاں اور سرٹیفکٹ گورنمنٹ مانتی ہے۔

المستفتی: جمیل احمد، پیرزادہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: لائف انشورنس میں جمع کی ہوئی رقم سے زائد جو رقم بطور سود کے ملتی ہے، اس کو کسی بھی اسکول، کالج یا رفاہ عام کے اداروں میں صرف کرنا جائز نہیں؛ بلکہ اگر سرکاری ٹیکس وغیرہ ہے، اور انشورنس کمپنی کا تعلق سرکار سے ہے، تو اس سودی رقم کو ٹیکس میں دینے کی گنجائش ہے، ورنہ نادار فقیروں کو بلانیت ثواب دے دیناواجب ہے۔

كذا في البذل: وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فإما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء.

(بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/ ۵۵۳، كراچي ۶/ ۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/ ۲۷، زكريا ۷/ ۶۰،

البحر الرائق، زکریا ۹/ ۳۶۹، کوئٹہ۸/ ۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/ ۳۴۹، زكريا جديد ۵/ ۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/ ۲۴۶، حاشية ترمذي ۱/ ۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/ ۳۳-۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱ر محرم الحرام ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۵۹۴۸)

سودی رقم سے مساجد، مدارس، دینی اجتماعات کی اعانت

سوال [۹۲۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں ٹانڈہ بادلی ضلع رامپور میں تقریباً سترہ میل ہیں اور اس میں کھلے طور پر سودی روپیہ سے کاروبار ہوتا ہے، تو اس صورت میں مساجد و مدارس اور تبلیغی اجتماع کی مکمل یا نصف یا چوتھائی کفالت از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ میلوں کے تعاون سے لے کر دوسرا تعاون ان لوگوں کا موجود ہے، جو سودی کاروبار نہیں کرتے، اس صورت میں شریعت کی روشنی میں وجہ ترجیح کس کو حاصل ہے؟

المستفتی: محمد قمر ٹانڈہ، ضلع: رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب کل یا اکثر رقم سود یا حرام کی ہو، تو اس کا مدارس مساجد اور دینی اجتماعات وغیرہ میں صرف کرنا جائز نہیں ہے۔ (مستفا: فتاوی محمودیہ ۵/ ۸۸، جدید ڈابھیل ۱۵/ ۸۸، امداد الفتاوی ۳/ ۱۶۶، فتاوی رحیمیہ ۲/ ۱۹۷-۹/ ۲۸۰)

لہٰذا ان لوگوں کی رقم کو ترجیح ہوگی، جو سودی کاروبار نہیں کرتے؛ البتہ اگر میلوں میں اکثر رقم حلال ہے، تو اس کی رقم بھی جائز ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۱۶۶)

أما لو أنفق في ذلک مالاً خبيثًا وما لاسببه الخبيث والطيب

فيكره؛ لأن الله لا يقبل إلا الطيب، فيكره تلويث بيته بما لا يقبله.
(شامي، كتاب الصلاة، باب مايفسد الصلاة، ومايكره فيها، قبيل مطلب في أفضل المساجد، زكريا ٢/٤٣١، كراچي ١/٦٥٨)

آكل الربا وكاسب الحرام أهدي إليه، أو أضافه، وغالب ماله حرام لايقبل، ولا يأكل ما لم يخبره أن ذلك المال أصله حلال......وإن كان غالب ماله حلالا لابأس بقبول هديته والأكل منها. (هندية، كتاب الكراهية، والإستحسان، الباب الثاني عشر في الهدايا والضيافات، زكريا جديد ٥/٣٩٧، قديم ٥/٣٤٣، البناية، اشرفية ١٢/١٠٩، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ٨/٧٣، رقم: ٩٦١٧، الفتاوى تاتارخانية، زكريا ١٨/١٧٥، رقم: ٢٨٤٠٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٣ ربیع الثانی ١٤٠٨ھ
(فتویٰ نمبر: الف ٢٣/ ٦٢٤)

سودی رقم سے خرید شدہ جنریٹر کی آمدنی مدرسہ یا رفاہ عام میں لگانا

سوال[٩٢٤٠]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسجد کے سود کی رقم سے جنریٹر خرید کر، اس کی (جنریٹر) کی آمدنی مدرسہ یا مکتب میں لگائی جاسکتی ہے یا نہیں؟

(۲) مسجد کی سودی رقم سے خریدا ہوا جنریٹر رفاہ عام کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ (شادی یا اجتماعی کام میں)

المستفتی: مولانا خورشید انور، استاذ مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱/۲) سود اور رشوت کا پیسہ تبدل ملک اور تبدل صفت کے بعد بھی بحالہ حرام اور خبیث رہتا ہے؛ اس لئے اس رقم سے نہ جنریٹر خریدنا جائز ہے

اور نہ ہی جنریٹر خرید کر اس کی آمدنی مسجد یا مدرسہ کے کسی مصرف میں خرچ کرنا جائز ہے اور نہ ہی مسجد کی سودی رقم سے خریدے ہوئے جنریٹر کو رفاہ عام میں استعمال کرنا جائز ہے؛ بلکہ نادار فقراء کو بلانیت ثواب دیدینا واجب ہے۔ (مستفاد: امدادالفتاوی ۳/۱۴۳، ۴/۱۴۴، ۵)

الحرام ينتقل أي تنتقل حرمته وإن تداولته الأيدي وتبدلت الأملاك. (شامي، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب في تعيين الدراهم في القصد الفاسد، كراچي ٥/٩٨، زكريا ٧/٣٠٠)

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فإما إن ملكه بعقد فاسد، أو حصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه ٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ ربیع الثانیہ ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/۴۴۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/۴/۱۴۱۶ھ

سودی رقم سے مدرسہ کا فرش یا مسجد کا غسل خانہ وغیرہ تعمیر کرنا

سوال [۹۲۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بینک کے سود سے مدرسہ کی ٹاٹ پٹی (فرش) یا مسجد مدرسہ کے غسل خانہ، پائیخانے تعمیر کرنا بلا تملیک جائز ہے یا ناجائز؟

المستفتی: حافظ علاء الدین، شیرکوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سودی رقم سے مدرسہ کی ٹاٹ پٹی وغیرہ خریدنا اور غسل خانہ بیت الخلاء وغیرہ بنانا جائز نہیں ہے؛ بلکہ مسجد ومدرسہ کی عمارت میں حلال پیسہ لگانا ضروری ہے۔(مستفاد: فتاوی محمودیہ ۱۴/۴۰۴، جدید ڈابھیل ۱۵/۶۰۸)

أما لو أنفق في ذلک مالاً خبیثًا وما لاسببه الخبیث والطیب فیکره؛ لأن اللّٰه لا یقبل إلا الطیب. (شامي، کتاب الصلاۃ، باب مایفسد الصلاۃ، ومایکره فیها، زکریا ۲/۴۳۱، کراچي ۱/۶۵۸) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۲۴؍جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۴۵۱۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۲۴/۶/۱۴۱۶ھ

سودی رقم سے مدرسے کا بجلی یا فون بل ادا کرنا

سوال [۹۳۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مدرسہ کی رقم زکوۃ، فطرہ والی بینک میں جمع ہے، اس رقم پر بینک سود دیتا ہے، اس سود کی رقم کو ذمہ دار مدرسہ ان طلبہ پر جو غریب ونادار ہیں، بیماری اور دیگر ضرورتوں میں خرچ کرتے ہیں، اس کے باوجود سود کی کچھ رقم رہ جاتی ہے، تو کیا اس رقم کو مدرسہ کی بجلی بل اور ٹیلی فون بل پر خرچ کیا جاسکتا ہے؟

اس سود کی رقم سے مدرسہ کے سامان لانے اور دیگر امور کی ضرورت کے تحت سائیکل خریدی جاسکتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: بشیر احمد قاسمی، سکرہٹہ کلاں، ضلع: بھوج پور (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک سے حاصل شدہ سود کی رقم غریب نادار

طلبہ کو بلانیت ثواب دی جاسکتی ہے؛ لیکن بجلی اور ٹیلی فون کا بل ادا کرنا یا دیگر سامان، سائیکل وغیرہ مدرسہ کے لئے خریدنا اوراس سے فائدہ حاصل کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔

لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه. (شامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥)

فيلزم عليه أن يدفعه إلى الفقراء؛ ولكن لايريد بذلك الأجر والثواب. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحر الرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۲؍ربیع الاول ۱۴۱۷ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲؍۴۷۲۳)	۱۲؍۳؍۱۴۱۷ھ

بینک کے سود سے طلباء کی مدد کرنا

سوال [۹۲۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بینک کے سود سے طلبہ دین کے کھانے پکانے کو لکڑی خریدی جاسکتی ہے؟

المستفتی: سید نورالعابدین، نول گڈھ، جھنجھنوں (راجستھان)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک کے سود کے بارے میں حکم یہ ہے کہ کسی بھی عنوان سے حکومت کے خزانہ میں واپس کردیا جائے؛ لہٰذا انکم ٹیکس اور سیل ٹیکس کے عنوان سے

حکومت کے خزانہ میں واپس کرنا جائز ہے، اگر ایسا کوئی ٹیکس نہیں ہے، تو بغیر نیت ثواب فقراء میں تقسیم کر دینا واجب ہوتا ہے اور سود کے پیسے کو طلبہ کے کھانے میں ہرگز خرچ نہ کیا جائے؛ اس لئے کہ اس سے طلبہ کی دینی روح ختم ہو جائے گی۔

نیز طلبہ میں ایسے طلبہ بہت ہوتے ہیں، جن کے لئے سودی رقم لینا ہرگز جائز نہیں۔ نیز اس لئے سب طلبہ کے مصرف میں خرچ کرنا درست نہیں ہے کہ طلبہ کے مصارف سب کے سب مصارف جبر ہیں، جس سے ثواب کی نیت کی جاتی ہے۔ اور سودی رقم سے ثواب کی نیت کرنا ناجائز وحرام ہے؛ اس لئے ایسی رقم کو طلبہ کے مصرف میں ہرگز نہ خرچ کیا جائے؛ بلکہ نہایت غریب نادار متعین فقیر کو بغیر نیت ثواب دیدیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سود کا مال اپنی جگہ حرام ہی رہتا ہے۔ اور ایسا غریب آدمی جو کئی وقت کا بھوکا ہے، اس کے لئے وقتی ضرورت پوری کرنے کے لئے ایسا حرام مال وقتی طور پر جائز ہوتا ہے، اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ سود کا مال حلال ہو جاتا ہے، کسی بھی غریب کو دے سکتے ہیں؛ بلکہ یہ حرام ہی رہتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٣٠ر محرم الحرام ١٤٢٠ھ
(فتویٰ نمبر: الف ٣٤/ ٦٠٠٦)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٤٢٠/١/٣٠ھ

سودی رقم تملیک کے بعد طلبہ پر خرچ کرنا

سوال [٩٢٤٤]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (١) بعض مدارس میں بینک کی حاصل شدہ سود کی رقم بیت الخلاء میں بعد تملیک استعمال کی جاتی ہے جائز ہے یا نہیں؟

(٢) جس ٹائم مدارس کا فنڈ ختم ہو جائے بعض مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ بینک کی

حاصل شدہ رقم سود کو بعد تملیک طلبہ بیرونی پر خرچ کرنے کی اجازت ہے، کیا وہ مفتی صاحب صحیح فرماتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: عبدالواجد، خادم مدرسہ اسلامیہ فیض العلوم، شیر کوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) بینک سے حاصل شدہ سودی رقم ناپاک اور حرام ہے، مدارس میں تملیک کرنے سے پاکی اور حلت نہیں آتی ہے؛ اس لئے حیلہ تملیک کے بعد بھی اس کو مدارس کی ضروریات میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳۷؍۲۴)

الحرام ينتقل أي تنتقل حرمته وإن تداولته الأيدي وتبدلت الأملاك. (شامي، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب في تعيين الدراهم في القصد الفاسد، كراچي ٩٨/٥، زكريا ٣٠٠/٧)

(۲) اس میں حیلہ تملیک کا کوئی اثر نہیں پڑتا؛ البتہ جو طلبہ بہت غریب نادار ہیں، ان کو دیدینا جائز ہے۔

و يجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه، أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ٣٧/١، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ٣٥٩/١، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٥٥٣/٩، كراچي ٣٨٥/٦، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٢٧/٦، زكريا ٦٠/٧، البحرالرائق، زكريا ٣٦٩/٩، كوئٹه ٢٠١/٨، هندية، زكريا قديم ٣٤٩/٥، جديد ٤٠٤/٥، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٤٦/٣٤، حاشية ترمذي ٣/١، معارف السنن، اشرفية ديوبند ٣٣/١-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲؍ ۴۲۶۹)

سودی رقم نادار طلباء پر صرف کرنا

سوال [۹۲۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مدرسہ کی رقم بینک میں جمع ہے، اس رقم پر بینک نے انٹرسٹ دیا۔ اب وہ رقم کن کن امور پر خرچ ہوسکتی ہے؟

المستفتی: بشیر احمد قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک کی سودی رقم فقیر نادار کو بلانیت ثواب دیدینا چاہئے، اگر طلباء میں کوئی ایسا نادار ہو، تو اس کو بھی دے سکتے ہیں۔

و يجب عليه، أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء.

(بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/ ٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/ ٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/ ٥٥٣، كراچي ٦/ ٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/ ٢٧، زكريا ٧/ ٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/ ٣٦٩، كوئٹه ٨/ ٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/ ٣٤٩، جديد ٥/ ٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/ ٢٤٦، حاشية ترمذي ١/ ٣، معارف السنن، اشرفية ديو بند ١/ ٣٣- ٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۴۲۵۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۳/ ۱۲/ ۱۴۱۵ھ

سودی رقم بعد تملیک بیرونی طلباء پر صرف کرنا

سوال [۹۲۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جس ٹائم مدرسہ کا فنڈ ختم ہوجائے، بعض مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ بینک کی

حاصل شدہ سود کو بعد تملیک طلبہ بیرونی پر خرچ کرنے کی اجازت ہے، کیا وہ مفتی صاحب صحیح فرماتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: عبدالواحد بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اس میں حیلۂ تملیک کا کوئی اثر نہیں پڑتا؛ البتہ طلبہ بہت غریب نادار ہیں، ان کو دیدینا جائز ہے۔

ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه، أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء.

(بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحر الرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱؍۴۲۵۷)

سودی رقم مانگ کر کمرہ بنانا

سوال [۹۲۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک صاحب کے دولڑکے ہیں اور دونوں شادی شدہ ہیں، ایک لڑکے کے تین بچے ہیں۔ دوسرے لڑکے کے ایک بچہ ہے، دونوں والد اور والدہ بھی ان کے ساتھ رہتے ہیں، والد کو کچھ کاروبار بھی نہیں، والد کے لڑکے دونوں مزدوری کرتے ہیں،

ایک مکان ہے بڑا کمرہ ہے اور تھوڑی جگہ ہے کمرہ کے علاوہ اور باپ کے پاس کوئی جائیداد یا اور کوئی آمدنی کا ذریعہ نہیں صرف لڑکوں کی مزدوری پر ہی گھر کا خرچہ پورا ہوتا ہے، اور نہ لڑکوں کی اتنی آمدنی ہے، جو بچ سکے۔ ایک کمرہ ہونے کی وجہ سے دونوں لڑکوں کی بیوی میں تنازع رہتا ہے، کبھی کبھی دونوں کی بول چال میں تیزی بڑھ جاتی ہے، ایسی حالت میں لڑکوں کا باپ کیا کرے؟

وہ کسی رشتہ دار یا کسی مالدار سے جو کہ بینک کا انٹرسٹ یا بینک میں جو روپیہ مالدار کا بڑھتا ہے، وہ روپیہ لے کر کسی مالدار سے یا رشتہ دار سے وہ غریب اپنا کمرہ بنوا سکتا ہے؟ اس کے لئے وہ روپیہ لینا جائز ہے؟

المستفتی: عبداللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دوسروں سے سود کا پیسہ مانگ کر اپنے گھر کا کمرہ بنانا جائز نہیں ہے، سود قطعی حرام چیز ہے، دو بہوؤں کی لڑائی سے بچنے کے لئے کمرہ بنانے کی ضرورت ہے اور کوئی مالدار اس سلسلہ میں تعاون کرنا چاہ رہا ہے، تو وہ اپنی جیب خاص سے تعاون کرے یا آپ اس سے قرضہ لے لیں اور آہستہ آہستہ اس کا قرضہ ادا کردیں، مگر سود کا پیسہ لینا قطعاً جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ ۲۶۸/۹، ۲۷۹/۹)

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [البقرہ:۲۷۵]

عن جابرؓ، قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم آکل الربوا، ومؤکله، وکاتبه، وشاهدیه، وقال: وهم سواء. (صحیح مسلم، باب لعن آکل الربا، ومؤکله، النسخۃ الهندیة، ۲/۲۷، بیت الأفکار رقم:۱۵۹۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۷۰۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۶/۱۶ھ

سود کی رقم ذاتی کاموں میں لانا

سوال [۹۲۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کئی لوگ کسی بھی سرکاری بینک میں پچاس ہزار یا دس ہزار روپیہ پانچ یا چھ سال کے لئے ڈالتے ہیں، اس رقم کو بینک واپس دیتا ہے، تو دوگنا دیتا ہے، تو کیا وہ رقم اپنے گھر کے کام میں لے سکتا ہے یا اپنے بھائی یا رشتہ دار یا اپنی بہن یا بیٹی کو بھات یا بطور مدد کے دے سکتا ہے؟ اگر خود اپنی حالت کمزور ہو یا ہمارے لڑکے نے بینک سے ادھار لیا ہو، جس کا بیاج کسی موٹر یا کارخانہ کے چلانے پر قرض لے لیا ہو، تو ایسی صورت میں چڑھا ہوا بیاج چکانا ہو، تو کیا ایسے لڑکے یا بھائی کا بیاج بیاج کے بدلے چکا سکتے ہیں؟ ایک مولوی صاحب نے کہا تھا کہ فکس ڈپوزٹ کا پیسہ ملتا ہے، تو اپنے کام میں لے سکتے ہیں کمزوری میں مولوی صاحب نے یہ بھی کہا کہ یہاں کوئی مسلم حکومت نہیں ہے، نہ ہی کوئی مسلم بینک ہے، ایسی صورت میں ہماری حکومت میں سودی لین دین ہوتا ہے۔ قرض لیتے ہیں تو بھی بینک ہو یا مہاجن سب ہی ہمارے پاس سود لیتے ہیں، اگر ہماری رقم بینک میں فکس ڈپوزٹ ہے اور ہم کو بیاج ملتا ہے، تو ہم لے کر اپنے کام میں یا کسی کی مدد یا بیاج کے بدلے بیاج میں دیدیں یا بہن، بیٹی کی مدد کریں تو کیسا ہے؟

المستفتی: حاجی ماسٹر علی محمد (راجستھان)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک سے ملی ہوئی زائد رقم سود ہے، جو شرعاً حرام آمدنی ہے، کسی بھی ذاتی کام میں اسکا استعمال کرنا شرعاً ناجائز ہے، بلانیت ثواب؛ بلکہ بہ نیت رفع وبال غریبوں، مسکینوں اور حاجت مندوں کو دے دینا چاہئے۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۸/۲۶-۵۹-۵۶، جدید مطول ۱۱/۲۰۶-۲۰۹-۲۱۰، ایضاح النوادر ۱/۹۹)

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه ٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديو بند ١/٣٣-٣٤)

(٢) فکس ڈپوزٹ میں رکھنے کا مطلب ہی سود حاصل کرنا ہوتا ہے، سیونگ بینک میں روپیہ رکھنے سے حفاظت کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے؛ اس لئے فکس ڈپوزٹ میں جمع کرنا ناجائز ہے، بھائی، بہن یا دیگر رشتہ دار اگر واقعی غریب و مسکین اور حاجت مند ہوں، تو ان کو بھی یہ رقم دی جا سکتی ہے؛ لیکن بیٹی کو دینا جائز نہیں ہے۔

ولا إلى من بينهما ولاد ولو مملوكا لفقير. (الدر المختار، كراچي ٢/٣٤٦، زكريا٣/٢٩٤، ايضاح المسائل ١١٠)

اور رہا مولوی صاحب کا یہ کہنا کہ یہاں کوئی مسلم حکومت نہیں، اور نہ ہی مسلم بینک ہے؛ اس لئے یہاں کی حکومت میں سودی لین دین جائز ہے، درست نہیں۔ اور سود کے بدلے چڑھے ہوئے سود اور بیاج کو ادا کرنا جائز ہے؛ کیونکہ ایسی صورت میں سود کا روپیہ اصل مالک یعنی بینک کو پہونچ جاتا ہے اور یہی واجب بھی ہے سودی رقم کو اس کے اصل مالک تک کسی بھی طرح پہونچا دیا جائے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ ٦/١٣٦، جدید زکریا ٩/٢٦٢)

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة والاستئجار على المعاصي (إلى قوله) ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه؛ ولكن أخذه من غير عقد لم يملكه،

فیجب علیه أن یرده علی مالکه، إن وجد المالک. (بذل المجهود، کتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية بیروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحدیث: ۵۹، البحرالرائق، زکریا ۹/۳۶۹، کوئٹه ۸/۲۰۱، تبیین الحقائق، امدادیة ملتان ۶/۲۷، زکریا ۷/۶۰، شامي، زکریا ۹/۵۵۳، کراچی ۶/۳۸۵، هندیة، زکریا قدیم ۵/۹۴۹، جدید۵/۴۰۴، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۳۴/۲۴۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍رجب المرجب ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶؍۷۳۳۱)

سودی رقم سے مزدوری ادا کرنا اور مزدور کا وصول کرنا

سوال [۹۲۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید مزدوری کرتا ہے اور زید کو یہ معلوم ہے کہ اس کو جو مزدوری ادا کی جائے گی، وہ سود کے مال سے ادا کی جائے گی، تو کیا زید کے لئے سود کے مال سے مزدوری وصول کرنا درست ہے اور یہ واضح رہے کہ زید کے لئے کہیں اور کام نہیں ہے جس سے وہ اپنا پیٹ پال سکے؟

المستفتی: محمد عمران

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ میں یہ کوئی صراحت نہیں ہے کہ مسلمان کے یہاں مزدوری کر رہا ہے یا غیر مسلم کے یہاں؛ اس لئے دونوں کا حکم لکھا جا رہا ہے، اگر غیر مسلم کے یہاں مزدوری کی جا رہی ہے، تو غیر مسلم کی طرف سے مزدوری کا پیسہ ہر حال میں وصول کرنا جائز اور حلال ہے، چاہے اس کے سودی کاروبار کا پیسہ ہو یا خنزیر بیچ کر دیا ہو، یا شراب بیچ کر دے رہا ہو ہر طرح سے جائز ہے؛ اس لئے کہ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے بارے میں مکلّف نہیں بنایا گیا ہے کہ غیر مسلم اسلامی شریعت کے مطابق حلال کما رہا ہے

یا حرام؛ بلکہ ہم کو یہ حکم ہے کہ ان کو ان کے مذہب پر چھوڑ دیا جائے اور ان کے پیسوں کے بارے میں ہم کھود کرید نہیں کریں گے اور جو مسلمان کا حق ہے، وہ بہر حال غیر مسلم سے وصول کرے گا اور وصول شدہ پیسہ مسلمان کے لئے حلال ہے۔

عن سويد بن غفلة أن بلالا قال لعمر بن الخطاب: إن عمالك يأخذون الخمر، والخنازير في الخراج، فقال: لا تأخذوها منهم؛ ولكن ولوهم ببيعها وخذوا أنتم من الثمن، وقال أبو عبيد: ثم يقول المسلون ببيعها، فهذا الذي أنكره بلال، ونهى عنه عمر، ثم رخص لهم أن يأخذوا ذلك من أثمانها، إذا كان أهل الذمة المتولين لبيعها؛ لأن الخمر، والخنزير مال من أموال أهل الذمة ولاتكون مالا للمسلمين، فهذا عمر قد أجاز لأهل الذمة بيع الخمر، والخنازير، وأجاز للمسلمين أخذ أثمانها في الجزية، والخراج، وذلك بمحضر من الصحابة، ولم ينكر عليه منكر. (إعلاء السنن، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، دارالكتب العلمية بيروت ١٤/١٣٤، كراچي ١١٢/١٤)

(وجاز أخذ دين على كافر من ثمن خمر لصحة بيعه) **أي بيع الكافر الخمر؛ لأنها مال متقوم في حقه فملك الثمن فيحل الأخذ منه.** (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، فصل في البيع، زكريا ٥٥٣/٩، كراچي ٣٨٥/٦)

اور اگر مسلمان کے یہاں مزدوری کی جا رہی ہے، تو یہ کیسے معلوم ہے کہ سود کے پیسے سے مزدوری ادا کرے گا، مسلمان کے بارے میں بدگمانی جائز نہیں ہے۔ بہر حال پھر بھی اگر معاملہ مشکوک ہے، تو شرعی حکم یہ ہے کہ اگر اس کے پاس ساری کمائی سود کی ہے اور اسی کے پیسے سے مزدوری دے گا، تو ایسے شخص کے یہاں مزدوری کرنا جائز نہیں ہے اور سود کے پیسے سے مزدوری وصول کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ اور اگر حلال وحرام دونوں طرح کی آمدنی ہے اور حلال غالب ہے، تو یہ سمجھنا چاہئے کہ ہماری حلال مزدوری کی اجرت حلال ہی پیسہ سے

ادا کرے گا اور وہ پیسہ آپ کے لئے حلال ہے اور اگر حرام غالب ہے، تو اس کے یہاں مزدوری نہیں کرنی چاہئے۔

وما نقل عن بعض الحنفية من أن الحرام لايتعدى إلى ذمتين أما من رأي المكاس يأخذ من أحد شيئاً من المكس، ثم يعطيه آخر، ثم يأخذه من ذلک آخر فهو حرام. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، فصل في البيع، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵)

غالب مال المهدي إن حلالا لا بأس بقبول هديته وأكل ماله ما لم يتبين أنه من حرام. (مجمع الأنهر، كتاب الكراهية، فصل في الكسب، دارالكتب العلمية بيروت ۴/۱۸۶، مصري قديم۲/۵۲۹، الموسوعة الفقهية الكويتية۴۵/۲۴۴، هندية، زكريا قديم۵/۳۴۳، جديده۵/۳۹۷، المحيط البرهاني، المجلس العلمي۸/۷۳، رقم: ۹۶۱۷، البناية اشرفية ۱۲/۲۰۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸؍ ۹۹۷۱)

نکالے جانے والے مزدور کے ناجائز مطالبہ میں سودی رقم دینا

سوال [۹۲۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے اپنی کمپنی سے کئی مزدوروں کو نکالا، یا وہ مزدور خود نکلے وہ مزدور مسلمان بھی ہو سکتے ہیں اور کافر بھی۔ اب سوال یہ ہے کہ کوئی مزدور کمپنی میں یہ مطالبہ رکھتا ہے کہ میرے حق میں جو بھی رقم قانونی اعتبار سے ہے، اس سے زائد رقم اتنا دیں گے، میں اسی وقت آپ کی کمپنی سے نکلوں گا، مثلاً اس مزدور کی سروس کے مطابق قانونی اعتبار سے تیس ہزار روپئے دینا ہے، مگر وہ مزید اس پر بیس ہزار کا ظلماً مطالبہ کرتا ہے، یہ چیز زید پر زیادتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس موقعہ پر وہ انٹرسٹ کی رقم (جو منافع بینک سے زید کو ملا ہے) اس کو اس کی مزدوری قانونی اعتبار سے جو ملتی ہے اس پر اور جو جبراً زائد مطالبہ کرر ہا ہے، اس پر دونوں جگہ یا ان دوجگہوں میں سے ایک پر خاص کر جو زائد مطالبہ کرتا ہے اس پر یہ انٹرسٹ میں سے دے سکتا ہے یا نہیں؟ کیا اس کی گنجائش ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

المستفتی: محمد احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس مزدور کو نکالا گیا ہے، اس کے قانونی اور غیر قانونی دونوں طرح کے مطالبات میں سودی رقم دینا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ جو اس کا قانونی حق ہے، وہ کمپنی کے ذمہ لازم ہے اور سود کی رقم اپنے کام میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح مزدور کا غیر قانونی مطالبہ رشوت کی مانگ ہے؛ لہٰذا غیر قانونی مطالبہ میں بھی سود کی رقم دینا جائز نہیں ہے، اس کے مطالبات اپنی ذاتی رقم سے پورے کئے جائیں سودی رقم دینے کی اجازت نہیں ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ص:۱۴۲)

لأنہ لو أنفق علی نفسہ فقد استحکم ماارتکبہ من الفعل الحرام.

(بذل المجھود، کتاب الطھارۃ، باب فرض الوضوء، سھارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامیۃ، بیروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحدیث:۵۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷ر جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۱۶۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۵/۱۴۲۰ھ

اپنی جیب سے فقیر کو پیسہ دینا اور اس کی جگہ سود کی رقم رکھنا

سوال [۹۲۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے پاس اے ٹی ایم کا کھاتہ ہے، جس میں ہر مہینے کچھ نہ کچھ سود کا

پیسہ آتا ہے، مثلاً کسی مہینہ میں سات روپیہ، کسی مہینہ میں دس روپیہ اور یہ پیسے جب تک سو روپیہ نہ ہو جائیں، اے ٹی ایم سے نہیں نکال سکتے اور کس مہینہ میں کتنا سود آیا یاد رکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے، تو میں نے یہ تدبیر اختیار کی کہ جب جتنا سود آئے گا، میں اپنی جیب سے اتنا پیسہ سود کے مصرف یعنی فقیر کو بلانیت ثواب دیدوں گا اور وہ جو سود کا پیسہ آیا ہے، میں اس کو لے لوں گا؛ اس لئے کہ پیسوں میں تعیین نہیں ہوتی، تو کیا میرے لئے اس طرح کرنا صحیح ہے، اگر صحیح نہیں تو سود کے پیسے سے بچنے کی بہترین صورت بتلا کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

المستفتی: عبدالستار شیخ، مغربی بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اے ٹی ایم سے سود کی رقم نکالے بغیر اس کے عوض اپنی جیب سے حلال رقم سود کی نیت سے فقیر کو دیدیں اور پھر اس کے بدلہ میں اے ٹی ایم سے ملنے والے سود کو اپنے پاس رکھ لیں تو یہ درست نہیں اور اس طرح آپ سود سے بری نہیں ہوں گے، اس کی مثال یوں سمجھو کہ اپنا ذبح شدہ حلال بکرا دوسرے کو دے کر اس کے بدلہ میں مردار ناپاک بکرا اپنے لئے لیا جائے؛ اس لئے پہلے اے ٹی ایم سے سود کی رقم نکال لی جائے، اس کے بعد بلانیت ثواب اسے فقراء کو دیدیا جائے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ۱/۱۵۹، فتاوی محمودیہ جدید ۱۶/۴۰۱)

إذ لو اختلط بحيث لا يتميز يملكه ملكاً خبيثاً؛ لكن لا يحل له التصرف فيه مالم يؤد بدله. (شامي، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب فيمن ورث مالا حراماً، زكريا ۷/ ۳۰۲، كراچي ۵/ ۹۹) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱/ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۶۵۹)	۱/ ۷/ ۱۴۲۹ھ

اپنے پاس سے رقم غریبوں کو دے کر بینک کے سود سے منہا کرنے کی شرعی حیثیت

سوال [۹۲۵۲]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص کے بینک اکاؤنٹ میں کچھ انٹرسٹ کی رقم ہے، اس نے اپنی زکوۃ نکالی ہوئی رقم اس اکاؤنٹ میں جمع کردی۔ اب جتنا مجموعہ اس انٹرسٹ کی رقم اور زکوۃ کا بنا اس کے برابر اپنے پاس سے دوسری رقم مصارف صدقات میں خرچ کردی یہ سوچ کر بینک میں پڑی ہوئی انٹرسٹ اور زکوۃ کی رقم میں سے اپنے پاس رکھ لوں گا، اس کو ذرا وضاحت سے لکھیں کہ نقود (روپیہ) میں عین تو متعین ہوتی ہے؟

المستفتی: عطاءاللہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: زکوۃ کی جو رقم بینک میں جمع کردی ہے، اس کے عوض میں دوسری رقم زکوۃ میں دے کردی ہوئی رقم کے عوض میں بینک سے زکوۃ والی رقم کو منہا کرلینا جائز ہے، مگر انٹرسٹ والی رقم میں جائز نہیں ہے۔

الوكيل بدفع الزكاة إذا أمسك دراهم الموكل ودفع من ماله ليرجع ببدلها في دراهم الموكل صح. (شامي، كتاب الزكاة، زكريا ٣/١٨٩، كراچي ٢/٢٦٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ر رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/۳۵۹۷)

اپنی جیب سے فقراء کو رقم دے کر سودی رقم اپنے مصرف میں استعمال کرنا

سوال [۹۲۵۳]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: کہ ایک بینک میں ہمارا سیونگ کھاتہ ہے، اس میں کبھی کبھی سود کی رقم بھی بینک والے درج کر دیتے ہیں، ہم سودی رقم کو غریبوں یا مستحقین پر صرف کرنا چاہتے ہیں، کیا اتنی مقدار رقم کو نکال کر ہی صرف کرنا ضروری ہے؟ یا اپنی جیب سے اتنی مقدار رقم صرف کر دیں اور نیت یہی کریں کہ سود والی رقم کے عوض صرف کر رہے ہیں، تو کیا ہمارے کھاتہ میں غیر سودی رقم باقی رہے گی یا سودی اور غیر سودی دونوں؟ اسی طرح فرض کیجئے ہمارے کھاتہ میں سودی رقم ۴۵؍روپئے ۲۵؍ پیسے ہے، ہم کھاتہ سے دوسو روپیہ نکال لیں اور اس میں سے چھیالیس روپئے سود کے مصرف میں لگا دیں تو کیا سود ہمارے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا؟ جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: عبدالناصر، مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب تک سود کا پیسہ سودی کھاتہ سے نکال کر الگ نہ کیا جائے، وہ سود ہی رہے گا؛ لہٰذا اس کے عوض میں اس کی نیت سے پاک پیسہ غریبوں کو دینے سے یہ نہیں سمجھا جائے گا کہ غریبوں کو سود کا پیسہ مل گیا ہے؛ بلکہ یہ ایسا ہے جیسا کہ ایک ذبح شدہ پاک بکری غریبوں کو دیدی ہے، اور اس کے عوض میں اپنے لئے مردہ بکری رکھ لی ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ۱۵۹)

الحرام ينتقل اي تنتقل حرمته وإن تداولته الأيدي وتبدلت الأملاك. (شامي، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب في تعيين الدراهم في العقد الفاسد، زكريا ۷/ ۳۰۰، كراچي ۵/ ۹۸)

اسی طرح نکالتے وقت سودی رقم کا ارادہ نہیں کیا تھا؛ اس لئے بری الذمہ نہیں ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۹۹۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹/ ۳/ ۱۴۲۴ھ

بینک کے کمیشن میں کاٹی گئی رقم کو سود کی رقم سے پورا کرنا

سوال[۹۲۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرا کھاتہ سیونگ بینک میں ہے، جس میں غیر ممالک سے چیک آتے ہیں، چیک جمع کرتے وقت بینک اپنا کمیشن کاٹ کر باقی رقم ہمارے کھاتہ میں جمع کر دیتا ہے، مثلاً چیک دس ہزار روپیہ کا ہے تو بینک ہمارے کھاتہ میں ۹۹۰۰/روپیہ جمع کرتا ہے، یعنی اصل رقم سے سو روپئے کم، دوسری طرف سیونگ اکاؤنٹ پر ہماری جمع رقم پر بینک سود دیتا ہے، جو ہمارے کھاتہ میں ہی جمع ہوتی رہتی ہے، وہ سود کی رقم ہم اپنے استعمال میں نہیں لاتے ہیں، کیا مذکورہ چیک پر کاٹی گئی رقم کو ہم اپنے سود کی رقم سے پورا کر سکتے ہیں، جو چیک 10000/- روپیہ کا ہم نے جمع کیا ہے، کیا یہ پوری رقم (جسکو ہم نے اپنے سود کی رقم سے پورا کیا ہے) بینک سے نکال کر اپنے صرفہ میں کر سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد اخلاق، امروہہ میڈیکل بازار، بنگلہ امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک میں سیونگ اکاؤنٹ یا کسی بھی کھاتہ سے حاصل شدہ سود حرام اور ناجائز ہے؛ اس لئے سیونگ بینک میں چیک جمع کرتے وقت بینک جو کمیشن چیک سے کاٹتا ہے، اس رقم کو آپ سود کی رقم سے پورا نہیں کر سکتے؛ کیونکہ کاٹی گئی رقم بینک کی اجرت الخدمت ہے، جو آپ پر لازم ہے؛ لہٰذا کل رقم پر بعد میں جتنا بھی سود ملے، وہ سب بینک سے نکال کر فقراء ومحتاجوں پر صدقہ کر دیا جائے؛ کیونکہ کاٹی گئی رقم کے عوض میں سود دینا جائز نہیں ہے؛ البتہ اگر آپ پر انکم ٹیکس یا سیل ٹیکس ہے، تو اس میں دے سکتے ہیں۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أو حصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء؛ ولكن لا يريد بذلك

الأجر والثواب؛ ولكن يريد دفع المعصية عن نفسه. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/ ۵۵۳، كراچي ۶/ ۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/ ۲۷، زكريا ۷/ ۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/ ۳۶۹، كوئٹه۸/ ۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/ ۳۴۹، جديد ۵/ ۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/ ۲۴۶، حاشية ترمذي ۱/ ۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/ ۳۳-۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ رجب المرجب ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۷۶۴)

بینک کی سودی رقم کو سرکاری سود میں دینا؟

سوال [۹۲۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کا بینک میں کھاتہ کھلا ہوا ہے اور اس میں سودی پیسہ بھی بن چکا ہے، اس کو ایک مکان یا گاڑی خریدنی ہے، حکومت کو دکھلانے کے لئے حکومت سے لون لینا ہوتا ہے، ورنہ سرکار گرفت کرے گی کہ یہ پیسہ کہاں سے آیا تو خطرے میں پڑنے کا اندیشہ ہے؛ اس لئے اس نے سرکار سے لون (سودی قرض) لیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ سودی قرض کی ادائے گی میں جو سود دینا ہوگا، تو ہمارے بینک کے کھاتے میں جو سرکاری سودی پیسہ ہے، اس پیسے کو اس قرض کے سود میں ادا کرسکتے ہیں یا نہیں؟ ایسی صورت میں معاملہ برابر سرابر ہوجاتا ہے کہ ہم نے نہ سود لیا نہ دیا؛ بلکہ سرکاری کھاتے سے سرکاری میں منتقل کردیا، تو ایسی صورت میں سود کی سودی رقم سے ادائے گی کرسکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: محمد قاسم بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: زید نے جو سرکار سے سودی قرض لیا ہے، اس

کے سود کی ادائے گی اپنے پاس بینک میں موجود سودی رقم سے کرنا جائز ہے؛ اس لئے کہ حرام پیسہ جہاں سے آرہا ہے، وہاں واپس چلا گیا ہے، نہ سود لیا گیا اور نہ ہی دیا گیا، اس میں کوئی قباحت نہیں۔

صرح الحنفیةؒ: بأنه إذامات الرجل وکسبه خبیث کان من بیع الباذق، أو الظلم، أوأخذ الرشوة، فالأولیٰ لورثته أن یردوا المال إلي أربابه. (الموسوعة الفقهیة ۳٤/۲٤٦)

صرح الفقهاء: بأن من اکتسب مالا بغیر حق، فإما أن یکون کسبه بعقد فاسد کالبیوع الفاسدة والاستیجار علی المعاصي والطاعات، أوبغیر عقد کالسرقة، والغصب، والخیانة، والغلول، ففي جمیع الأحوال المال الحاصل له حرام علیه؛ ولکن إن أخذه من غیر عقد ولم یملکه یجب علیه أن یرده علی مالکه، إن وجد المالک. (بذل المجهود، کتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامیة بیروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحدیث: ۵۹، البحرالرائق، زکریا ۹/۳٦۹، کوئٹه ۸/۲۰۱، تبیین الحقائق، امدادیة ملتان ٦/۲۷، زکریا ۷/٦۰، شامي، زکریا ۹/۵۵۳، کراچي ٦/۳۸۵، هندیة، زکریا قدیم ۵/۹٤۹، جدید۵/٤۰٤، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۳٤/۲٤٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: خاص ۴۰؍۱۱۴۲۴)

بینک سے حاصل شدہ سودی رقم کے لئے الگ اکاؤنٹ کھول کر اس سے سرکاری سود ادا کرنا

سوال [۹۲۵٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں ایک کاروباری شخص ہوں، میرے پاس کئی قسم کی رقم موجود ہے، خالص

پیسہ اور سودی پیسہ میں نے اس کی شکل یہ اختیار کی ہے کہ بینک میں الگ الگ کئی کاؤنٹ کھول رکھے ہیں ایک اکاؤنٹ خالص پاک رقم کا ہے، جس میں بھاری رقم ڈپازٹ ہے، جس پر بینک بھاری سود دیتا ہے، پھر جب سود کی اچھی خاصی رقم جمع ہوگئی، تو میں نے ایک مستقل اکاؤنٹ کھولا اور بڑھتی ہوئی سودی رقم کو الگ اکاؤنٹ میں منتقل کردیا۔

اب مجھے سود پر سود مل رہا ہے، تو سوال یہ ہے کہ اس نیت سے سود کی رقم لگانا کہ مزید سود حاصل ہو، اور اس سے ٹیکس ادا کیا جائے نیا کھاتہ کھولنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد توفیق

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک سے حاصل شدہ سود کی رقم سے نیا اکاؤنٹ؛ اس لئے کھلوایا ہے تاکہ حلال رقم سے حرام رقم الگ ہوجائے، تو اس غرض سے الگ اکاؤنٹ کھلوانا بلا شبہ جائز ہے اور پھر غیر اختیار طوری پر اس پر سود مل رہا ہے، تو اس صورت میں آپ گنہگار نہ ہوں۔

نیز حلال مال کو جبری ٹیکس میں دینے سے بچانے کی نیت سے سودی رقم کے لئے الگ سے اکاؤنٹ کھولنا جائز ہے، پھر اس سودی رقم سے جو سود ملتا ہے، اس سے ٹیکس ادا کرنا جائز ہے، اس میں کوئی گناہ نہیں۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، إن ملكه بعقد فاسد، أو حصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفع إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، بذل المجهو جديد ١/٣٥٩، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه ٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية

٢٤٦/٣٤، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤)

درء المفاسد أولی من جلب المصالح، فإذا تعارضت مفسدة، ومصلحة قدم دفع المفسدة غالباً. (الأشباه والنظائر قديم١٤٧، جديد زكريا ٢٦٤)

العبرة في العقود للمقاصد والمعاني لا للألفاظ والمباني.

(شرح المجلة، رستم اتحاد ١/١٩، رقم المادة:٣)

و إذا مات الرجل وكسبه خبيث، فالأولیٰ لورثته أن يردوا المال إلى أربابه، فإن لم يعرفوا أربابه تصدقوا به. (هندية، كتاب الكراهية، والإستحسان، الباب الخامس عشر في الكسب، جديد ٥/٤٠٤، زكريا قديم ٥/٣٤٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٤ رصفر المظفر ١٤٣٥ھ
(فتویٰ نمبر: خاص ٤٠/١١٤٢٢)

جس ہسپتال میں امیر وغریب کا علاج ہوتا ہو، اس میں سودی رقم بھیجنا

سوال[٩٢٥٧]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ چترکوٹ میں غیر مسلموں کا ایک ہسپتال ہے، جس میں امیر وغریب سب کا علاج ہوتا ہے، مگر غریبوں کا علاج زیادہ تر ہوتا ہے، اور ان کے لئے رعایت بھی ہوتی ہے، ان کو کھانا بھی ملتا ہے، کیا ایسی جگہ بینک سے ملا ہوا سود کا پیسہ وروپیہ بھیجا جاسکتا ہے؟ اور اگر وہاں روپیہ بھیجنا جائز ہو، تو کیا رجسٹری خرچہ بھی سود کے روپیہ سے کیا جاسکتا ہے، اور اگر نا جائز ہے، تو میں تو بھیج چکا ہوں، اس کی تلافی کی کیا صورت ہے؟ تفصیلی جواب سے نوازیں۔

المستفتی: مجیب الرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سود کی رقم کے مستحق صرف فقراء ہیں، اور سود کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے فقراء کو رقم کا مالک بنانا ضروری ہے اور مذکورہ اسپتال

میں چونکہ مالداروں کا علاج بھی ہوتا ہے، اور بظاہر بلا امتیاز سود کی رقم ان کے علاج میں بھی صرف ہوگی، جو سودی رقم کے مصرف نہیں بریں بنا سود کی رقم ایسے اسپتال میں بھیجنا درست نہیں، جو رقم پہلے بھیج چکا ہے، اس کے متعلق توبہ واستغفار کرے، اس کی بھرپائی کے لئے مزید اتنی رقم فقراء میں تقسیم کرنا لازم نہیں؛ ہاں البتہ اگر کسی متعین نادار فقیر کا علاج کرانا ہے اور اس کو اس اسپتال میں علاج کے لئے بھیج دیا جائے، اور سود کی رقم سے اس کا علاج کرایا جائے، تو اس کی گنجائش ہے، اور سب سے بہتر شکل یہ ہے کہ سودی رقم علاج کے لئے نادار فقیروں کے ہاتھوں میں براہ راست دیدی جائے۔

والسبيل في المعاصي ردها، وذلک ههنا برد المأخوذ إن تمكن رده، بأن عرف صاحبه وبالتصدق به إن لم يعرفه. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الخامس عشر في الكسب، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤)

قال شيخنا: ويستفاد من كتب فقهائنا كالهداية وغيرها، أن من ملک بملک خبيث ولم يمكنه الرد إلى المالک، فسبيله التصدق على الفقراء. (معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣)

وأما إذا ظهر أنه لم يكن محلاً بأن ظهر أنه غني-إلى قوله-يجوز. (بدائع الصنائع، زكريا ٢/١٦٣، كراچي ٢/٥٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲ر صفر المظفر ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۸۹۳/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۲/۱۴ھ

کسی وارث کا حصہ سودی رقم سے دینا

سوال [۹۲۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مکان میں ہماری پھوپھی کا حصہ ہے، پھوپھی صاحب اپنا حصہ مانگ رہی ہیں،

حصہ کی رقم دینے کے لئے ہمارے پاس حلال رقم نہیں ہے؛ بلکہ بینک کے بیاج کی رقم ہے، کیا بیاج کی رقم مکان کے حصہ کے بدلہ میں دے سکتے ہیں یا نہیں؟ اور بیاج کی رقم کہاں اور کن کن جگہوں پر خرچ کر سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد منظر الاسلام، کرولہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پھوپھی کا جو شرعی حق مکان میں موجود ہے، وہ پھوپھی کا لازمی حق ہے اور اس کے عوض میں سود کا روپیہ دینا قطعاً جائز نہیں، اگر آپ لوگوں کے پاس روپیہ نہیں ہے، تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ مکان فروخت کر کے اس کی قیمت میں سے پھوپھی کا حصہ نکال کر دیا جائے، اور جو حصہ آپ کا بنتا ہے، وہ آپ لے لیں گے۔ (مستفاد: عزیز الفتاوی ۷۳۷)

وإذا كان أرض وبناء فعن أبي يوسف أنه يقسم كل ذلك على اعتبار القيمة؛ لأنه لا يمكن اعتبار المعادلة إلا بالتقويم. وعن أبي حنيفة أنه يقسم الأرض بالمساحة؛ لأنه هو الأصل في الممسوحات، ثم يرد من وقع البناء في نصيبه، أو من كان نصيبه أجود دراهم على الآخر حتى يساويه، فتدخل الدراهم في القسمة ضرورة. (هداية، كتاب القسمة، فصل في كيفته القمسة، اشرفي ديوبند ٤/ ٤١٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۳۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۶/۲۴ھ

سودی رقم سے اشیاء خرید کر غرباء کو دینا

سوال [۹۲۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ ایک شخص کے پاس سود کی رقم ہے وہ اصل رقم نہ دے کر اس پیسہ سے اشیاء خرید کر غرباء کو دینا چاہتا ہے، تو کیا اس رقم سے ہر طرح کی اشیاء خرید کر دی جا سکتی ہیں؟ یا اصل رقم ہی دے شرعی حکم اس سلسلہ میں کیا ہے؟ تحریر فرما دیں۔

المستفتی: معراج الحق، قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سودی رقم قطعی حرام ہے، اس کا اولاً حکم یہی ہے کہ کسی بھی عنوان سے اصل مالک کو واپس کر دی جائے اور اگر اصل تک رسائی کی شکل نہ ہو، تو بغیر نیت ثواب نادار فقیروں کو دیدی جائے اور ایسی رقم سے نادار فقیروں کو ضرورت کی اشیاء خرید کر دی جائیں مثلاً سردیوں میں لحاف وغیرہ تب بھی جائز ہے؛ اس لئے کہ اصل مقصود سودی رقم کو فقیروں کو دے دینا ہے اور وہ اشیاء سے بھی حاصل ہو جاتا ہے؛ کیوں کہ خریدی ہوئی اشیاء سودی رقم کی مثل کے درجہ میں ہیں۔

ولكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنبور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه ٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ صفر المظفر ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۴۵۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۲/۱۵ھ

مریض کوسودی رقم دینے کا شرعی حکم

سوال [۹۲۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسلمانوں کے اموال کے تحفظ کے لئے ادارے قائم ہیں، مثلاً مسلم فنڈ وغیرہ، ان کی کارکردگی اطمینان بخش نہیں ہے، کروڑوں کا گھاٹا مسلمانوں نے اٹھایا؛ چنانچہ مجبور ہوکر وہ بینک کا سہارا لیتا ہے، بینک کا کام ایسا ہے کہ سودی رقم اصل سرمایہ کے ساتھ ملحق ہوتی رہتی ہے، اگر مسلمان نہ لیں تو ممکن ہے کہ یہ رقم مسلمانوں ہی کے خلاف مستعمل ہو اور اگر مسلمان لیں تو اس کے لئے سود کا استعمال حرام ہے۔

مفتیان کرام نے لکھا ہے کہ بغیر ثواب کی نیت دیدی جائے، تو سوال یہ ہے کہ یہ سودی رقم کیسے غریب کو دی جائے؟ مثلاً ہسپتال میں ایک مریض ہے، وہ دولت مند تھا، ساری دولت دوا دارو میں ختم ہوگئی تاہم تین چار لاکھ روپئے کی مزید ضرورت ہے، جو سود کے ہیں اور دو لاکھ نقد حلال ہیں، لیکن وہ کاروبار میں لگانے ہیں، ورنہ دردر کی بھیک مانگنی پڑے گی۔

نیز اس کی کسمپرسی کی یہ حالت دیکھ کر کوئی قرض دینے کو تیار نہیں، تو کیا ایسا شخص سودی رقم ہسپتال میں علاج کے لئے دے سکتا ہے، ایسی ناگفتہ بہ صورت حال پیش آتی رہتی ہے، تو سودی رقم کا ذخیرہ مسلم وغیر مسلم ہسپتال میں کر سکتے ہیں تا کہ مسلمانوں کی جان بچ سکے، سودی رقم کا صحیح مصرف کون کون ہیں؟

المستفتی: محمد رضوان قاسمی، سورت

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سودی رقم کا اصل مصرف مالک کو واپس کرنا ہے؛ لیکن اگر مالک کو لوٹانا ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں انتہائی نادار فقیر جو کسمپرسی کی حالت میں ہوا سے بلا نیت ثواب دے کر سود کے وبال اور لعنت سے خلاصی حاصل کرنا لازم ہے، اور سوال نامہ میں جس مریض شخص کے متعلق سوال کیا گیا ہے، تو چونکہ ابھی اس کے پاس دو لاکھ روپئے

موجود ہیں، جس بنا پر وہ فقیر نہیں ہے؛ اس لئے اس کے لئے اس رقم کا استعمال درست نہیں ہے؛ البتہ جو مریض اپنی دوائیوں کی رقم ادا کرنے پر بھی قدرت نہیں رکھتے ہوں، تو ان کو سودی رقم فقیر ہونے کی وجہ سے دی جاسکتی ہے، تاکہ وہ اپنے علاج کے خرچہ میں وہ پیسے دے سکیں۔

والواجب في الكسب الخبيث تفريغ الذمة والتخلص منه برده إلى أربابه إن علموا وإلا إلى الفقراء. (الموسوعة الفقهية الكوتية ٣٤/٢٤٥)

المال الحاصل له حرام عليه؛ ولكن إن أخذه من غير عقد ولم يملكه يجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤)

من ملك ملكا خبيثاً ولم يمكنه الرد إلى المالك فسبيله التصدق على الفقراء. (معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۵۰۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۴/۲۱ھ

حد درجہ فقیر کو سودی روپیہ دینا

سوال [۹۲۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص اتنا غریب ہے کہ رہنے کے لئے اپنی زمین وجگہ نہیں، جنگل کے

کنارے ایک چھپر ڈال کر کے رہتے ہیں اور اس کے گھر میں چھ آدمی کھانے کو بہت مشکل سے چھ سات روپیہ روزانہ کماتے ہیں جس سے گھر چلانا مشکل ہے اور اس وقت جو کپڑے پہنر ہے ہیں، وہ بھی خیرات کے کپڑے ہیں اور جو چھ سات روپیہ کماتے ہیں، وہ بھی ہر دن ملے گا یا نہیں؟ اس کی بھی کوئی گارنٹی نہیں، اس شخص کو مرگی کی بیماری ہے اور ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ آپریشن کرنا ہوگا، اس کے پاس روپیہ نہیں، ایک آدمی بینک یا ڈاکخانہ میں روپیہ رکھتا ہے اور روپیہ نکالنے کے وقت کچھ روپیہ زیادہ دیتے ہیں، تو اس روپیہ کو ایسے شخص کے کام میں لگانا جائز ہے یا نہیں؟ مہربانی فرما کر جواب دیجئے۔

المستفتی: اشرف علی، موضع: رام چندر پور، پوسٹ: قسمت نگر، مدناپور (بنگال)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر ان کے پاس نصاب کے بقدر مال نہیں ہے، تو ان کو سود کا پیسہ دینا جائز ہے، اس پیسہ سے وہ اپنا علاج وغیرہ کرسکتا ہے؛ کیونکہ وہ فقیر کے حکم میں ہے۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث (إلى قوله) ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء.

(بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه ٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/ ۶۵۲)

غریب نابالغ یتیم بچوں اور بیوہ کی خاطر بینک میں روپیہ جمع کرکے سود کو ان پر خرچ کرنا

سوال [۹۲۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کا انتقال ہوگیا، مرحوم نے آٹھ چھوٹے چھوٹے نابالغ بچے اور ایک بیوہ چھوڑی ہے، ویسے تو اللہ رب العزت رزاق مطلق ہے، مگر دنیاوی اعتبار سے بظاہر ان بچوں کا ذریعہ معاش یا کوئی آمدنی کا ذریعہ نہیں ہے، رہنے کا مکان بھی کرایہ کا ہے، ایسی صورت میں مرحوم کے چند مخلص ہمدردوں نے یہ طے کیا ہے کہ آپس میں کچھ روپیہ جمع کرکے اس کو بینک میں جمع کردیا جائے، جس سے ان کا گذر بسر بآسانی ہوسکے، کیا ان مخلص ہمدردوں کا یہ طریقہ کار از روئے شرع مناسب یا جائز ہے؟ نیز جو لوگ اس سلسلے میں روپیہ دے رہے ہیں وہ کسی اجر کے مستحق ہیں یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل جواب سے مستفید فرمائیں۔

المستفتی: عزیز الرحمٰن خان، محلّہ قانون گوئیاں، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: سوال نامہ میں درج شدہ غرض سے بینک میں رقم جمع کرنا ہرگز جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا:

قال الله تعالىٰ: يَمۡحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَيُرۡبِي الصَّدَقَاتِ. [البقرہ:۲۷۶]

وقوله تعالىٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الۡبَيۡعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [البقرہ:۲۷۵]

نیز مال حرام وربوا سے صدقہ خیرات مقبول نہیں ہوتے اور نہ ثواب ملتا ہے؛ بلکہ بعض فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ سود اور حرام مال کے صدقہ سے ثواب کی نیت کرنے میں کفر کا خطرہ ہے۔

فالحاصل أن التصدق من مال حرام غير مقبول حتى قال بعض علمائنا من تصدق بمال حرام يرجو الثواب كفر. (هندية، كتاب الكراهية والإستحسان، الباب الثاني عشر في الهدايا والضيافات، زكريا جديد ۳۹۷/۵، قديم

٥/٣٤٣، البنـاية، اشرفية ١٢/١٠٩، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ٨/٧٣، رقم:٩٦١٧، الفتاوى تاتارخانية، زكريا ١٨/١٧٥، رقم:٢٨٤٠٥، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/١٨٦-١٨٧، مصرى قديم ٢/٥٢٩)

لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، فصل في البيع، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا٧/٦٠، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، البحرالرائق، زكريا٩/٣٦٩، كوئٹه ٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤)

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء؛ ولكن لايريد بذلك الأجر والثواب؛ ولكن يريد دفع المعصية عن نفسه. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/ ٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤)

جولوگ مذکورہ طریقے سے سود کا پیسہ دینے کا ارادہ کر رہے ہیں وہ شرعاً مخلص ہمدرد نہیں ہیں، ان کو یہ خیال فوراً دل سے نکال دینا لازم ہے، مخلص ہمدرد وہ ہے، جو اپنے حلال مال سے صدقہ کیا کرتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/۶۵۹)

بینک کا سود ریل کے کرایہ میں دینا

سوال [۹۲۶۳]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بینک سے ہم قرض لیتے ہیں، تو وہ ہم سے بیاج لیتے ہیں اور ہم بینک میں روپیہ جمع کرتے ہیں، تو وہ بینک بھی بیاج دیتی ہے، تو بیاج والے روپیہ سے ریل کا کرایہ دے سکتے ہیں یا نہیں؟ اور بیاج والا روپیہ بینک میں چھوڑ دیں یا کسی غریب کو دینا کیسا ہے؟ مفصل جواب سے نوازیں۔

المستفتی: محمد صلاح الدین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک کا جو سود ہے، وہ زمانہ جاہلیت کا سود ہے، اس کو اپنے مصرف میں لانا ریل وغیرہ کے کرایہ میں دینا ناجائز اور حرام ہے؛ بلکہ بینک سے نکال کر فقراء کو بلانیت ثواب دیدینا واجب ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۸/۵۸-۵۹، جدید مطول زکریا ۱۱/۲۱۱، فتاوی محمودیہ ۴/۲۰۲، جدید ڈابھیل ۱۶/۳۸۱)

أما ربا النسيئة: فهوا الأمر الذي كان مشهوراً متعارفاً في الجاهلية، وذٰلک أنهم كانوا يدفعون المال على أن يأخذوا على شهر قدراً معيناً، ويكون رأس المال باقياً، ثم إذا حل الدين طالبوا المديون برأس المال، فإن تعذر عليه الأداء زادوا في الحق والأجل، فهذا هو الربا الذي كانوا في الجاهلية يتعاملون به. (تفسير كبير للإمام الفخر الرازيؒ، تحت تفسير رقم الآية:۲۷۵، من سورة البقرة۷/۹۱، روح البيان ۲/۹۳، غرائب القرآن للنيسابوري ۲/۶۰)

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث (إلى قوله) ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا

أن یدفعه إلی الفقراء. (بذل المجهود، کتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/ ۳۷، دار البشائر الإسلامية، بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/ ۵۵۳، كراچي ۶/ ۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/ ۲۷، زكريا ۷/ ۶۰، البحر الرائق، زكريا ۹/ ۳۶۹، كوئٹه ۸/ ۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/ ۳۴۹، جديد ۵/ ۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/ ۲۴۶، حاشية ترمذي ۱/ ۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/ ۳۳- ۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ جمادی الثانیہ ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/ ۷۳۴)

سودی رقم غیر مسلم فقیروں کو بھی دے سکتے ہیں یا نہیں؟

سوال [۹۲۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سودی رقم جب مالک کو واپس کرنے کی کوئی شکل نہ ہو، تو ایسی صورت میں بلا نیت ثواب فقیروں میں تقسیم کردی جائے، تو سوال یہ ہے کہ مسلم فقیروں کے علاوہ غیر مسلم فقیروں کو بھی دینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد نسیم بستوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سود کی رقم جب مالک کو واپس کرنا ممکن نہ ہو، تو جس طرح مسلم فقیر کو دینا جائز ہے، اسی طرح غیر مسلم فقیر کو بھی دینا جائز ہے؛ البتہ مسلم فقیر کو دینا زیادہ بہتر ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۸/ ۷۰، قدیم ۸/ ۶۱، امداد الفتاوی ۳/ ۱۴۲)

أبو معاوية عن حجاج عن سالم المكي عن ابن الحنفيةؒ، قال: كره الناس أن يتصدقوا على المشركين، فأنزل الله: ليس عليك هداهم الخ، قال فتصدق الناس عليهم. (المصنف لإبن أبي شيبة، مؤسسه علوم القرآن جديد ۶/ ۵۱۴، رقم: ۱۰۵۰۰)

ابن فضيل عن الزرقاني السراج عن أبي رزين قال: كنت مع شقيق بن سلمة فمر عليه أسارى من المشركين، فأمرني أن أتصدق عليهم، ثم تلا هذه الآية: ويطعمون الطعام على حبه. (مصنف لإبن أبي شيبة، مؤسسه علوم القرآن جديد ٦/ ٥١٤، رقم: ١٠٥٠٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۲۳/۴۰)

سرکاری سود براہ راست فقیر کو صدقہ دینا کیسا ہے؟

سوال [۹۲۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سود میں اصل حکم یہ ہے کہ اس کو مالک کو واپس کردے اور اکابر نے لکھا ہے کہ سرکاری سود کے پیسہ کو بغیر نیت ثواب فقراء پر تقسیم کردینا جائز ہے، تو مفتی صاحب سے سوال ہے کہ جب سرکاری سود کو انکم ٹیکس وغیرہ کے ذریعہ سے واپس کردینے کی گنجائش ہے، تو وہاں نہ دیکر فقیر کو بلانیت ثواب صدقہ کرنے سے بریٔ الذمہ ہوجائے گا یا نہیں؟

المستفتی: سمیع الدین، مرادآبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سود میں اصل حکم یہی ہے کہ کسی بھی عنوان سے اصل مالک کو واپس کردے؛ لہٰذا سرکاری سود کو انکم ٹیکس، سیل ٹیکس، رجسٹری اسٹامپ فیس وغیرہ کے عنوان سے واپس کردینا چاہئے؛ لیکن اگر اس طرح ٹیکس وغیرہ لازم نہیں ہے، تو فقراء کو بلانیت ثواب دیدینا لازم ہوتا ہے، اصل تو یہی لکھا گیا ہے؛ لیکن اگر کسی بھی عنوان سے سرکار کو واپس کرنے کی گنجائش کے باوجود ضرورت مند فقیر کو دیدے، تو اس کی بھی گنجائش ہے؛ اس لئے کہ حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ غریبوں اور فقیروں کی مدد

کرے مگر حکومت کی طرف سے فقیر کو تعاون نہیں ملتا ہے؛ اس لئے حکومت کو واپس نہ کر کے فقیروں کو دینے کی گنجائش ہے۔

فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة والإستيجار على المعاصي والطاعات، أو بغير عقد كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال، المال الحاصل له حرام عليه؛ ولكن إن أخذه من غير عقد ولم يملكه، ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤)

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، زكريا جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤)

أنه حصل بسبب خبيث وهو التصرف في ملك الغير وماهذا حاله فسبيله التصدق. (هداية، كتاب الغصب اشرفي ۳/ ۳۷۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴ رربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/۱۱۴۵۹)

لون والے سود کی ادائے گی بینک کی سودی رقم سے

سوال [۹۲۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کے پاس سرکاری بینک کا سود کا پیسہ رکھا ہوا ہے، اور اس کو ایک کروڑ کی عمارت خریدنے کے لئے ضرورت پیش آئی، اگر زید بینک سے لون لئے بغیر عمارت بناتا ہے، تو سرکار کی طرف سے سوال ہوگا کہ اتنا پیسہ کہاں سے آیا؛ لہٰذا اب سوال یہ ہے کہ کیا زید عمارت بنانے کے لئے بینک سے سودی قرض لے سکتا ہے یا نہیں؟

نیز اگر اس نے سودی قرض لے لیا، تو اس میں جو سود ادا کرنا پڑیگا وہ اپنے پاس رکھے ہوئے سود کے پیسے سے ادا کرسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد معظم علی چتور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: عمارت بنانے کے لئے بینک سے سودی قرض لینا جائز نہیں؛ کیونکہ یہ کل قرض جر نفعاً فهو حرام کے تحت آئے گا، تاہم اگر سرکار کے ظالمانہ ٹیکس سے بچنے کے لئے لون پر قرض لیتا ہے، تو اس کی گنجائش ہے اور لون میں جو سود دینا ہے، اس کی ادائیگی اپنے پاس رکھے ہوئے سرکاری سود کے پیسے سے کرنا جائز ہے۔ (مستفاد: انوار رحمت ۲۱۲)

ففي جميع الأحوال، المال الحاصل له حرام عليه؛ ولكن إن أخذه من غير عقد ولم يملكه، ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد

المالک. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ٦/۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/۲۷، زكريا ۷/٦۰، البحرالرائق، زكريا ۹/۳٦۹، كوئٹه۸/۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/۳٤۹، جديد ۵/٤۰٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳٤/۲٤٦، حاشية ترمذي ۱/۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/۳۳-۳٤)

ويردّونها على أربابها إن عرفوهم، وإلا تصدقوا بها؛ لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرّدّ على صاحبه. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، فصل في البيع، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ٦/۳۸۵، هندية، زكريا قديم ۵/۳٤۹، جديد ۵/٤۰٤، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ٦/۲۷، زكريا۷/٦۰، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳٤/۲٤٦، البحر الرائق، زكريا۹/۳٦۹، كوئٹه ۸/۲۰۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/۱۱۴۶۱)

غریب کو سود کا روپیہ قرض کہہ کر دینا

سوال [۹۲٦۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کی کچھ رقم بینک میں جمع ہے، اس جمع شدہ رقم پر بینک زید کو سود دیتا ہے، بینک کی طرف سے اصل رقم پر جو مزید روپیہ ملا ہے، کیا زید یہ روپیہ کسی غریب کو قرض کا نام دے کر دے سکتا ہے یا نہیں؟ دے کر واپس لینے کا قطعاً خیال نہیں صرف نام قرض کا دیا جائے گا، نام اگر قرض نہ رکھیں، تو وہ باوجود مستحق ہونے کے لے نہیں سکتا، تو کیا اس طرح لینا اور اس طرح کرنا جائز اور درست ہے؟

المستفتی: عبدالرحمٰن، کھتولی مظفرنگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عبادات میں تلفظ کا اعتبار نہیں ہوتا؛ بلکہ نیت کا اعتبار ہوتا ہے۔

لو اختلف اللسان والقلب، فالمعتبر ما في القلب. (الأشباه والنظائر قديم ٨٥)

لا يشترط مع نية القلب التلفظ في جميع العبادات. (الأشباه والنظائر قديم ٨٨)

اور مستحق کو سود کا پیسہ دینا نہ عبادات میں سے ہے اور نہ ہی از قبیل معاملات؛ بلکہ مال خبیث کے وبال کو اپنے اوپر سے دور کرنا اور مال خبیث سے اپنے مال کو پاک کرنا مقصود ہوتا ہے؛ لیکن صورۃً اور ظاہراً عبادات مالیہ کے مشابہ ہے اور عبادات مالیہ میں جب نیت وتلفظ میں تعارض ہوجائے، تو نیت کو ترجیح ہوتی ہے؛ اس لئے مذکورہ طریقہ سے مستحق کو سود کا پیسہ دینا جائز اور درست ہوگا۔

سئل والدي عن رجل دفع إلى آخر مالا بنية الزكوة إلا أن المدفوع إليه كان ذا حرمة، فقال له الدافع، دفعته لک قرضًا، فقال: يجوز عن الزكاة. (الفتاوى التاتارخانية، كوئٹه ٢/٢٦٦، زكريا ٣/١٩٧، رقم: ٤١١٤)

من أعطى مسكيناً دراهم وسماها هبة، أو قرضًا، فقال: يجوز عن الزكوة. (البحر الرائق، كتاب الزكاة، قبيل با صدقة السوائم، زكريا ٢/٣٧٠، كوئٹه ٢/٢١٢، هندية، زكريا قديم ١/١٧٠، جديد ١/٢٣٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ جمادی الثانی ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۲۶۹)

بینک کے سود سے اپنے گھر کا خرچ چلانا کیسا ہے؟

سوال [۹۲۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے علاقہ میں عام طور سے مسلمان اب اپنی اپنی رقم بینک میں جمع کر لیتے ہیں اوراس کے سود سے اپنا خرچ چلاتے ہیں۔

المستفتی: نصیر احمد قاسمی، بھاگلپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک کے سود سے اپنا خرچ چلانا جائز نہیں ہے، وہ حرام ہے، واجب التصدق ہے۔ نیز اس ارادہ سے بینک میں رقم جمع کرنا بھی شرعاً جائز نہیں ہے۔

صرح الفقهاء: بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة (إلى قوله) أو بغير عقد كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال، المال الحاصل له حرام عليه؛ ولكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالک، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه، أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه ٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۱۴ھ

(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۴/۲۴)

فقیر امام کا سودی رقم سے اپنا قرض ادا کرنا

سوال [۹۲۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص گھر کا ذمہ دار ہے، اس کا بچہ بیمار ہوا، اس کے علاج معالجہ میں کافی مقروض ہوگیا یا کوئی سرکاری دین اس پر واجب ہے، جس کا ادا کرنا ضروری ہے، ادا نہیں کرے گا تو اور زیادہ پریشانی کا سبب ہوگا، اس شخص نے اس قرض کو ادا کرنے کے لئے کسی بینک سے سود کو لے کر ادا کر دیا، اس شخص کی اپنی اتنی آمدنی نہیں ہے کہ قرض ادا کر سکے، تو کیا اس کے لئے ازروئے شرع ایسا کرنا یعنی قرض ادا کرنا درست ہے یا نہیں؟

(۲) اسی طرح ان تمام مذکورہ بالا وجوہ کی بناء پر امام مسجد مقروض ہوجائے اور وہ کسی شخص سے ملا ہوا سود لے کر قرض ادا کردے، تو کیا اس کے لئے ایسا کرنا ازروئے شرع درست ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: سراج انور، قصبہ منڈاور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) ایسے افلاس کی صورت میں دوسرے شخص کا بینک کی سودی رقم ایسے شخص کو قرضہ ادا کرنے کے لئے دینا جائز اور درست ہے۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، فليزم عليه أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/ ۵۵۳، كراچي ۶/ ۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/ ۲۷، زكريا ۷/ ۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/ ۳۶۹، كوئٹه ۸/ ۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/ ۳۴۹، جديد ۵/ ۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/ ۲۴۶، حاشية ترمذي ۱/ ۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/ ۳۳-۳۴)

(۲)افلاس کی حالت میں فتوی کی رو سے عام آدمی اور امام میں کوئی فرق نہیں ہے؛ لیکن تقویٰ کی رو سے امام کے لئے مناسب نہیں۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۷/۶۴، جدید مطول ۱۰/۲۵۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۹۹۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۳/ ۱۴۲۴ھ

سودی رقم سے قرض کی ادائے گی کرنا

سوال [۹۲۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید ایک مدرسہ کا ذمہ دار ہے، اور وہ یہ چاہتا ہے کہ ہم کسی غیر مسلم سے قرض لے کر تعمیرات مدرسہ کا کام شروع کروادیں اور پھر سودی رقم سے اس غیر مسلم کا قرض ادا کردیں، کیا تملیکاً کسی غیر مسلم سے قرض لے کر بینک سے آمدہ شدہ سودی رقم اس غیر مسلم کو دی جاسکتی ہے؟ از روئے شرع اس طرح تملیک کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد خبیب غفرلہ، خادم مدرسہ اشرفیہ کاسگنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیر مسلم سے قرض لے کر تعمیرات مدرسہ میں خرچ کرنا تو درست ہے؛ لیکن اس قرض کی ادائے گی کے لئے بینک سے حاصل شدہ سود غیر مسلم کو دینا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ سود کا پیسہ صرف دو جگہ دیا جاسکتا ہے۔

(۱) کسی بھی عنوان سے اصل مالک کو واپس کردیا جائے اور جس غیر مسلم سے قرض لیا ہے، وہ اصل مالک نہیں ہے۔

(۲) اصل مالک تک رسائی حاصل نہ ہوسکنے کی صورت میں بلا نیت ثواب فقیروں اور مسکینوں کو دیدینا لازم اور ضروری ہے۔ اور غیر مسلم قرض خواہ فقیر اور مسکین بھی نہیں ہے؛

لہٰذا سودی رقم غیر مسلم قرض خواہ کو قرض کی ادائیگی میں دینا جائز نہیں ہے۔

صرح الفقهاء: بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة. ففي جميع الأحوال، المال الحاصل له حرام عليه؛ ولكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه، أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/ ۵۵۳، كراچي ۶/ ۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/ ۲۷، زكريا ۷/ ۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/ ۳۶۹، كوئٹه ۸/ ۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/ ۳۴۹، جديد ۵/ ۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/ ۲۴۶، حاشية ترمذي ۱/ ۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/ ۳۳-۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۹؍ شعبان المعظم ۱۴۲۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۸۰۱)	۱۴۲۳/۸/۱۲ھ

فقیر شخص کو سودی رقم دینا

سوال [۱۷۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ صاحب حیثیت شخص بینک اکاؤنٹ پہ بنے ہوئے سود کو اگر اپنے کم مال حیثیت والے رشتہ دار کو دیدے، تو اس کا بوجھ دینے والے پر تو نہیں؟

(۲) اسی طرح اگر غیر غرباء کو یہ سود دیا جائے، تو صاحب حیثیت شخص جو دے رہا ہے، وہ گنہگار تو نہیں؟

مندرجہ بالا دو نقطوں میں کم مالی حیثیت اور غریبی کا تعین کیسے کیا جائے؟

المستفتی: محمد حنیف محلّہ طویلہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس کو دیا جائے، وہ اگر بالکل نادار اور مستحق زکوۃ نہیں ہے، تو اس کو دینا جائز نہیں ہے، دینے والا سخت گنہگار ہوگا، اور اگر لینے والے کو معلوم ہو، تو وہ بھی سخت گنہگار ہوگا اور اگر لینے والا بالکل نادار مستحق زکوۃ ہے، تو کوئی بھی گنہگار نہ ہوگا اور لینے والے کے لئے اس کو اپنے اوپر صرف کرنا جائز ہے۔

نهى عن إضافة المال فيلزم عليه أن يدفعه إلى الفقراء؛ ولكن لايريد بذلك الأجر والثواب؛ ولكن يريد دفع المعصية عن نفسه. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذافي الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديو بند ١/٣٣-٣٤)

ان دونوں کے درمیان تعین یوں کیا جاتا ہے کہ کم مالی حیثیت اور غریبی کی علامت یہ ہے کہ وہ صاحب نصاب نہ ہوا اور اس پر صدقۂ فطر بھی واجب نہ ہو، ورنہ شرعاً مالدار شمار ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵ر شعبان المعظم ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶ر ۲۳۵۰)

پگڑی میں سود کی رقم دینے کا حکم

سوال [۹۲۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص کرائے کے مکان میں رہتا ہے، تو مالک مکان اپنا مکان اس سے

خالی کروانا چاہتا ہے، مگر کرایہ دار خالی کرنے کے لئے مالک مکان سے پچاس ہزار روپیہ کا مطالبہ کرتا ہے، تو مالک مکان اس کو مکان خالی کرنے کے لئے اتنی سودی رقم دے سکتا ہے؟ مدلل جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: محمد اظہر گونڈوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مالک کو کرائے دار سے مکان خالی کرانے کے لئے جیب خاص سے پیسے دینے کی گنجائش ہے، سودی رقم دینے کی گنجائش نہیں ہے؛ اس لئے کہ مالک مکان نادار فقیر نہیں ہے اور نہ ہی اس معاملہ میں سودی رقم مالک کو واپس ہو رہی ہے؛ اس لئے یہ جائز نہیں ہے۔

صرح الفقهاء: بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة والاستئجار على المعاصي والطاعات، أوبغير عقد كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه؛ ولكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه، أن يتصدق بمثل تلك الأموال. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/ ۱۲۰۴۶)

غریب کو بجلی کے کنکشن لگوانے کے لئے سودی رقم دینے کا حکم

سوال [۹۲۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص کو اپنے گھر میں بجلی کا نیا کنکشن لگوانا ہے؛ لیکن اس کے پاس اتنا پیسہ

نہیں ہے کہ جس سے وہ اپنے گھر میں کنکشن لگوا سکے، تو کیا ایسی صورت میں کوئی دوسرا شخص اس شخص کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے سودی رقم دے سکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عفان، مرادآبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بہتر یہی ہے کہ اگر وہ شخص مستحق زکوۃ ہے، تو سودی رقم کے بجائے زکوۃ کی رقم سے تعاون کرنا چاہئے، ہاں البتہ زکوۃ کی رقم موجود نہیں ہے اور سودی رقم رکھی ہوئی ہے اور یہ شخص انتہائی نادار ہے، تو سودی رقم کے پیسے کے ذریعہ سے اس کے گھر میں بجلی کا کنکشن لگوانے کی اجازت ہے۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤)

قال ويستفاد من كتب فقهائنا كالهداية وغيرها: أن من ملك بملك الخبيث ولم يمكنه الردّ إلى المالك، فسبيله التصدق على الفقراء. (معارف السنن، أبو اب الطهارة، باب ماجاء لا تقبل صلاة بغير طهور، مكتبه اشرفيه ١/٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ / جمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۲۰۴۳/۴۱)

۱۰/ سرکاری ٹیکس

سودی قرض لینے اور ٹیکس چوری کرنے کی شرعی حیثیت

سوال [۹۲۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے بینک سے مثلاً ایک ہزار روپیہ ۱۵/ پرسینٹ کی شرط کے ساتھ قرض لئے، تو یہ قرض لینا کیسا ہے؟

(۲) زید کاروبار میں انکم ٹیکس، سیل ٹیکس اور منڈی سمیٹی ٹیکس کی چوری کرتا ہے، تو یہ چوری کرنا کیسا ہے؟

(۳) زید پندرہ پرسینٹ جو قرض لیتا ہے اس کی ادائے گی انکم ٹیکس، سیل ٹیکس اورمنڈی سمیتی ٹیکس کی چوری کر کے بینک کا قرض ادا کرتا ہے، تو سرکار کا قرضہ سرکار کی چوری سے کرنا کیسا ہے؟

(۴) زید نے بینک میں پیسہ جمع کیا اور بینک سے اس کو سود حاصل ہو رہا ہے، ادھر بکر نے بینک سے قرضہ لیا ہے اور بینک کو سود دینا پڑتا ہے، تو دریافت یہ ہے کہ زید کو بینک سے جو پیسہ بطور سود حاصل ہو رہا ہے، اس پیسہ سے بکر کا سود ادا کرنے کی گنجائش ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد اکرم ٹانڈہ، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) بینک سے سودی قرض لینا ناجائز اورحرام ہے۔ حدیث شریف میں سود لینے والے دینے والے ہر ایک پر لعنت آئی ہے۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم آکل الربوا،

ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، با ب لعن آكل الربا، ومؤ كله، النسخة الهندية، ٢/ ٢٧، بيت الأفكار رقم:١٥٩٨)

(۲) انکم ٹیکس ،سیل ٹیکس وغیرہ شرعی طور پر نا قابل برداشت ظالمانہ ٹیکس ہیں؛ اس لئے مالک کوکسی بھی حیلہ سے اپنے پیسہ کو ایسے بھاری ٹیکس سے بچانے کا راستہ اختیار کرنے کی اجازت ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۷/ ۲۱، امداد الفتاوی ۴/ ۱۵۲، ایضاح النوادر ۱/ ۱۰۰)

فإذا ظفر بمال مديونه له الأخذ ديانة؛ بل له الأخذ من خلاف الجنس. (شامي، كتاب السرقة، مطلب في أخذ الدائن من مال مديونه من خلاف جنسه، زكريا ٦/ ١٥٧، كراچي ٤/ ٩٥)

(۳) کسی بھی حیلہ سے اگر آپ نے انکم ٹیکس سے اپنے پیسہ کو بچالیا ہے، تو وہ پیسہ آپ کی ملکیت ہے، بینک کے سود میں دینے کے ارادہ سے روکنے کی ضرورت نہیں؛ البتہ ۱۵/ پرسینٹ سود پر بینک سے قرض لینا یہ ایک الگ امر ہے اور یہ ناجائز اور حرام ہے۔ اس عمل کی وجہ سے سود کی لعنت میں آپ ملوث رہیں گے، چاہے انکم ٹیکس سے روکا ہوا پیسہ ادا کردیں، یا ان کے علاوہ دوسرے پیسہ سے ادا کردیں بات ایک ہی ہے، سود کی لعنت سے اپنے آپ کی حفاظت کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

فإذا ظفر بمال مديونه له الأخذ ديانة. (شامي، كتاب السرقة، مطلب في أخذ الدائن من مال مديونه من خلاف جنسه، زكريا ٦/ ١٥٧، كراچي ٤/ ٩٥)

عن عليؓ، قال: كل قرض جر منفعة فهو ربا. (كنز العمال، الدين والسلم، دارالكتب العلمية بيروت ٦/ ٩٩، رقم: ١٥٥١٢)

(۴) جو حکومت کے بینک سے سود کے نام سے ملتا ہے، وہ کسی بھی عنوان سے حکومت کو واپس کردینا جائز اور درست ہے؛ بلکہ واجب ہے؛ لہٰذا انکم ٹیکس کے عنوان سے یا سیل ٹیکس کے عنوان سے یا بینک کے قرضۂ سودی کے عنوان سے حکومت کو واپس کردینا جائز اور درست ہے نیز زید کو جو سرکاری بینک سے سود کا پیسہ حاصل ہوا ہے، وہ سرکار کو واپس کردینے کی نیت سے

بکر کے قرضۂ سودی میں بینک کو دینا بھی جائز ہے، اور اس کو بکر کے قرضۂ سودی میں دینے کے لئے آسان طریقہ یہ ہے کہ زید بینک کے سود کے پیسہ کا حساب لگا کر اپنے کھاتے سے بکر کے قرضۂ سودی کے کھاتے میں منتقل کر کے حکومت کو بکر کی طرف سے دیدے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ۴/۲۰۳، جدید ڈابھیل ۱۶/۳۸۱، ایضاح النوادر ۴/۱۰۰)

صرح الفقهاء: بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة والاستئجار على المعاصي–إلى قوله–ففي جميع الأحوال: المال الحاصل له حرام عليه؛ ولكن إن أخذه من غير عقد ولم يملكه يجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه ٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶ / جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۶۹۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۶/ ۶/ ۱۴۲۳ھ

سیل ٹیکس وانکم ٹیکس میں خیانت کرنا

سوال [۹۲۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جو حکومت کا سیل ٹیکس وانکم ٹیکس وغیرہ ہوتا ہے، اس میں خیانت جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد زبیر ولد نور اللہ، موہن داس، پالن پور، گجرات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جائزتو ہے،لیکن خطرہ میں پڑنا بھی شرعاًپسند نہیں ہے۔

(مستفاد: امداد الفتاویٰ ۱۴۴/۴، فتاویٰ احیاء العلوم ۲۷۱/۱)

وَلَا تُلْقُوۡا بِاَيۡدِيۡكُمۡ اِلَى التَّهۡلُكَةِ. [البقرہ:۱۹۵] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ رشعبان المعظم ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۳۶۶/۲۵)

انکم ٹیکس کے لئے چھوڑی گئی رقم پر اضافی رقم کا حکم

سوال [۹۲۷۶]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سرکاری ملازمین کی تنخواہ میں سے سرکار کچھ حصہ کاٹ لیتی ہے، اور بعد میں اس میں کچھ اضافہ کر کے دیتی ہے۔ نیز کاٹی گئی رقم میں انکم ٹیکس کی چھوٹ بھی ملتی ہے، تو دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے اپنی طرف سے کچھ رقم اگر کٹوا دی جائے، تو اس پر جو بعد میں اضافہ ہوکر ملے گی، وہ اضافہ شدہ رقم ہمارے لئے جائز ہوگی یا نہیں؟

نیز اپنی طرف سے کٹوائی گئی رقم پر زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: محمد احسان، سہاگ پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو رقم ملازمین ازخود انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے کٹاتے ہیں، اس رقم کے وہ خود مالک ہیں اور سرکار کے کھاتہ میں وہ رقم بطور امانت رہتی ہے؛ لہٰذا اس رقم پر جو اضافہ ہوکر ملے گی، وہ شرعاً سود ہوگی۔ نیز اسی اصل رقم پر زکوۃ بھی لازم ہے اور سود کے حصہ پر زکوۃ نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۸۶/۶-۴۸/۶، رحیمیہ قدیم ۱۰/۲ -۱۴/۲، جدید زکریا ۱۷۶/۷)

والمسئلة مستفاد من هذه العبارة: إلا الذهب، والفضة، والسائمة كمافي الخانية: لو ورث سائمة لزمه زكاتها بعد حول نواه أولا. (در مختار علی الشامي، کتاب الزکاة ۳/۱۹۳، کراچي ۲/۲۷۳، قاضیخان، زکریا جدید ۱/۱۵۲، وعلی هامش الهندیة ۱/۲٤٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ربیع الاول ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/۷۱۰۶)

انکم ٹیکس وغیرہ سے بچنے کے لئے سودی قرض لینا

سوال [۹۲۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بندہ مال برداری کا ایک ٹرک خریدنا چاہتا ہے، اب اگر ڈیلر کو نقد رقم دے کر خریدتا ہے، تو اس کو انکم ٹیکس اور دیگر پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑے گا، اور اگر بینک سے سودی قرض لے کر خریدتا ہے، تو ایسی صورت میں انکم ٹیکس اور دوسری قانونی پیچیدگیوں سے محفوظ رہے گا، تو کیا بندہ بینک سے سودی قرض لے کر گاڑی خریدنے کے ذریعہ سے انکم ٹیکس سے بچنے کا حیلہ اختیار کرسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ارشد، امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اضطراری ضرورت یعنی بال بچوں کے بھوکے مرنے کا خطرہ ہونے کی صورت میں سودی قرض لے کر ان کا پیٹ بھرنے کی گنجائش ہے اور تجارت کو فروغ دینے کے لئے سودی قرض لینا جائز نہیں ہے۔ حدیث شریف میں سود دینے والے لینے والے، اور اس کا حساب لکھنے والے سب پر لعنت کی گئی ہے اور آپ کی ضرورت جو سوال نامہ میں درج ہے، ایسی نہیں ہے کہ جس سے سود کی لعنت سے بچ سکیں۔

عن جابر بن عبد اللّٰه ؓ، قال: لعن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم آکل الربوا، ومؤکله، وکاتبه، وشاهدیه، وقال: هم سواء. (مسلم شریف، باب لعن آکل الربا، ومؤکله، النسخة الهندیة، ۲/۲۷، بیت الأفکار رقم:۵۹۸)

عن فضالة بن عبید صاحب النبي صلی اللّٰه علیه وسلم أنه قال: کل قرض جر منفعة، فهو وجه من وجوه الربا. (السنن الکبریٰ للبیهقي، کتاب البیوع، باب کل قرض جر منفعة، فهو ربا، دارالفکر بیروت ۸/۲۷٦، رقم:۱۱۰۹۲)

یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح. (الأشباه والنظائر قدیم ۱۳۹، البحر الرائق کوئٹه ٦/۱۲٦، زکریا ٦/۲۱۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹؍۱۰۳۴۲)

بینک کے سود میں سے حلال کمائی سے اداشدہ ٹیکس کا بدل وصول کرنا

سوال [۹۲۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کو سرکاری ٹیکس ادا کرنا ہے اور زید کی کچھ رقم بینک میں بھی جمع ہے، جس پر اس کو سود ملتا ہے، اور یہ سود کے پیسے زید ٹیکس میں ادا کردیا کرتا ہے اور یہ اتفاق پہلی مرتبہ ہوا کہ زید پر تین سالوں کا ٹیکس چڑھ گیا ہے، اتفاقاً ایسا ہوا کہ جس دن ٹیکس ادا کرنے کی آخری تاریخ تھی اسی دن بینک بند تھا، اور زید کو ٹیکس مع سود جمع کرنا ہے؛ لہٰذا زید نے اپنی خالص کمائی سے ٹیکس مع سود جمع کردیا اور بعد میں بینک میں سے اپنی سودی رقم نکال کر اپنے استعمال میں لے آیا اور کہتا ہے کہ میں نے ٹیکس ادا کرتے وقت ہی نیت کی تھی کہ بعد میں سودی رقم اپنے استعمال میں لے آؤں گا۔ اب بعض علماء فرماتے ہیں کہ زید کا مذکورہ عمل جائز ہے اور بعض فرماتے ہیں کہ اثمان متعین کرنے سے متعین نہیں

ہوتے؛ اس لئے زید کا مذکورہ عمل درست نہیں ہے۔

المستفتی: محمد زبیر مظاہری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اس مسئلہ کا جواب حضرت مفتی شفیع صاحبؒ نے (امداد المفتیین ۸۵۲) میں اور حضرت مفتی رشید احمد صاحبؒ نے (احسن الفتاوی ۲۱/۷) میں اس طرح لکھا ہے کہ ٹیکس ادا کرتے وقت اس نیت سے ادا کرے کہ حکومت زبردستی ہم سے پیسہ حاصل کر رہی ہے، ہم کسی بھی عنوان سے حکومت سے یہ پیسہ وصول کرلیں گے اور اس بینک میں جمع شدہ رقم پر منجانب حکومت سود کا اضافہ ہو چکا ہے، اور یہ نیت کرتا ہے کہ حکومت کا وہ پیسہ اس کے عوض میں وصول کرلیں گے، تو اس کی گنجائش ہے کہ اپنی جیب سے ٹیکس ادا کرنے کے بعد بینک کے سود میں سے ادا شدہ ٹیکس کا بدل وصول کرلے اور انہوں نے دلیل میں یہ جزئیہ پیش فرمایا ہے۔

فإذا ظفر بمال مديونه له الأخذ ديانة؛ بل له الأخذ من خلاف الجنس. (شامي، كتاب السرقة، مطلب في أخذ الدائن من مال مديونه من خلاف جنسه، زكريا ٦/١٥٧، كراچي ٤/٩٥)

اور فقیہ الامت حضرت مفتی محمود صاحبؒ نے لکھا ہے کہ طبیعت سلیمہ اس کی اجازت نہیں دیتی۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۱۶/۱۳، ڈابھیل ۳۸۳/۱۶)

اس لئے ہم بھی اس کی اجازت نہ دینا احوط سمجھتے ہیں؛ لہٰذا اگر کسی نے ایسا کرلیا ہے، تو اس سے کہا جائے کہ اب جو کچھ ہوگیا وہ جائز ہے اور آئندہ احتیاط کی ہدایت دی جائے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍رجب المرجب ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۳۶۲/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۷/۸ھ

اداشدہ سودی قرض یاانکم ٹیکس میں سودی رقم مجری کرنے کا حکم

سوال [۹۲۷۹]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے شدید مجبوری میں یکم جنوری ۲۰۰۶ء کو دس ہزار روپئے بینک سے قرض لئے اور دسمبر ۲۰۰۶ء میں مع سود کے گیارہ ہزار روپئے جمع کردیئے، پھر چندروز کے بعد ایک شدید ضرورت پیش آ گئی اور زید نے پھر اسی بینک سے دس ہزار روپئے قرض لے لئے اور ایک سال گذر گیا اور اب زید پر بینک کے گیارہ ہزار روپئے واجب ہو گئے، زید کے ایک عزیز کے پاس سود کی رقم موجود ہے، کیا اس رقم کو زید اپنے دونوں مرتبہ کے سود کے عوض بینک کو ادا کرسکتا ہے؟ اس طرح کہ ایک ہزار روپئے ان کے بدلے جو پچھلی بار وہ بینک کو ادا کر چکا ہے اور ایک ہزار وہ جو اسے دس ہزار کے ساتھ بطور سود اب ادا کرنے ہیں تاکہ سود کی ادائے گی میں دو ہزار روپئے ادا کرنے سے اسے جو خسارہ ہو رہا ہے، اس کی تلافی ہو سکے؟

(۲) اس بارے میں بھی وضاحت فرمائیں کہ سود کی رقم کیا انکم ٹیکس میں ادا کی جاسکتی ہے؟ اور اگر زید سے انکم ٹیکس وصول کرلینے کے بعد بینک نے زید کو اس کے اکاؤنٹ پر سود دیا، تو کیا یہ سود کی رقم زید اداشدہ انکم ٹیکس میں مجریٰ کرسکتا ہے؟

المستفتی: عبداللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱/۲) جو رقم سودی قرض میں ادا کی جاچکی ہے، وہ جا چکی اور بعد میں بینک سے وصول شدہ سودی رقم کو اداشدہ کے عوض میں نیت کرنے سے بعد والی رقم پاک اور حلال نہ ہوگی اور نہ ہی ایسا کرنا جائز ہوگا، اسی طرح انکم ٹیکس میں اداشدہ کے عوض میں بینک سے وصول ہونے والی رقم کو مجریٰ کرنا جائز نہ ہوگا؛ ہاں البتہ بینک سے وصول ہونے والی سودی رقم کو آئندہ لازم ہونے والے انکم ٹیکس میں ادا کرنا جائز ہوجائے گا۔

یجب علیه أن یرده علی مالکه، إن وجد المالک، وإلا ففي جمیع الصور یجب علیه، أن یتصدق بمثل تلک الأموال علی الفقراء.
(بذل المجهود، کتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامیة، بیروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحدیث: ۵۹، وهکذا في الشامي، زکریا ۹/۵۵۳، کراچي ۶/۳۸۵، تبیین الحقائق امدادیة ملتان ۶/۲۷، زکریا ۷/۶۰، البحرالرائق، زکریا ۹/۳۶۹، کوئٹه۸/۲۰۱، هندیة، زکریا قدیم ۵/۳۴۹، جدید ۵/۴۰۴، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۳۴/۲۴۶، حاشیة ترمذي ۱/۳، معارف السنن، اشرفیة دیوبند ۱/۳۳-۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍محرم الحرام ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۴۲۹/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۱/۲۵ھ

انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے جیون بیمہ کرانا

سوال [۹۲۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے سرکار کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ جو شخص انکم ٹیکس کے برابر بیمہ کرالے، اس کا انکم ٹیکس معاف کردیا جاتا ہے، اگر انکم ٹیکس کو معاف کرانے کی نیت سے بیمہ کرایا جائے، تو اس حالت میں کیا ہوا بیمہ جائز ہوگا یا نہیں؟

اس حالت میں جب یہ بیمہ پورا ہوگا تو جتنی اصل رقم جمع کی گئی تھی، ٹیکس سے بچنے کے لئے اس رقم سے بڑھ کر جو رقم ملے گی بیمہ کرانے والے کی یہ نیت تھی کہ وہ اپنی اصل رقم لے کر باقی بڑھی رقم کو اپنے ذاتی خرچ میں استعمال نہیں کرے گا؛ بلکہ کسی غریب ضرورت مند کو دیدے گا، تو کیا ایسا کرنا درست ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: ڈاکٹر وارث احمد، بازار منگل، بجنور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں ذکرکردہ سرکاری قانون اگر درست اور واقعہ کے مطابق ہے، تو انکم ٹیکس کی رقم کی بچت کی نیت سے بیمہ کرالینا اس شرط کے ساتھ جائز ہوسکتا ہے کہ جیون بیمہ سے حاصل شدہ زائد رقم بلا نیت ثواب فقراء پر صدقہ کردی جائے اور نیت صرف یہ رکھی جائے کہ ہم ٹیکس سے اپنے پیسہ کو محفوظ رکھنے کے لئے بیمہ کرارہے ہیں؛ اس لئے کہ انکم ٹیکس ایک غیر شرعی اور ظالمانہ ٹیکس ہے، اس طرح کے محصول اور ٹیکس وغیرہ سے بچنے کے لئے شرعاً حیلہ جوئی کی گنجائش ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۹۹)

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/۲۷، زكريا ۷/۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/۳۶۹، كوئٹه۸/۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/۳۴۹، جديد ۵/۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/۲۴۶، حاشية ترمذي ۱/۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/۳۳-۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۹۷۸/۳۸)

انکم ٹیکس میں سودی رقم دینا

سوال [۹۲۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کو انکم ٹیکس بچانے کیلئے این ایس سی لینی پڑتی ہے، جس میں ٹائم پورا ہونے

پر اصل رقم کا دوگنا ملتا ہے، جو بیاج ہوتا ہے، اس بیاج پر ہم کو انکم ٹیکس دینا پڑتا ہے، کیا ہم اسی بیاج کی آمدنی سے انکم ٹیکس دے سکتے ہیں؟

نوٹ: یہ مسئلہ ذاتی نہیں عوامی ہے، اس مسئلہ کا حل قرآن وحدیث کی روشنی میں دینے کی زحمت فرمائیں۔

المستفتی: ایاز احمد ایوبی، آنکھ ہسپتال روڈ ایوبی کوٹھی، سیتاپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سود اور حرام مال میں اصل حکم یہی ہے کہ کسی بھی عنوان سے مالک کو پہونچا دیا جائے، انکم ٹیکس کے نام سے حکومت جو ٹیکس وصول کرتی ہے، یہ ایک قسم کا ظلم وجبر ہے؛ اس لئے سرکاری بینک سے حاصل شدہ سودی رقم انکم ٹیکس کے عنوان سے حکومت کو دیدینا جائز اور درست ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۰۱، فتاوی محمودیہ ۴/۲۰۳، جدید ۱۶/۳۸۱)

من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة والاستئجار على المعاصي، ففي جميع الأحوال: المال الحاصل له حرام عليه؛ ولكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، البحرالرائق، زكريا ۹/۳۶۹، كوئٹه ۸/۲۰۱، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ۶/۲۷، زكريا ۷/۶۰، شامي، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵، هندية، زكريا قديم ۵/۹۴۹، جديد ۵/۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/۲۴۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍رجب المرجب ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/۸۹۱۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۲۴/۷/۱۴۲۶ھ

بینک سے حاصل شدہ سود سے بینک کا ٹیکس ادا کرنا

سوال [۹۲۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے پاس ایک پنجاب نیشنل بینک (P.N.B) کا کھاتہ ہے، جس میں تقریباً سال بھر میں سو، دوسو روپیہ ٹیکس کے آتے ہیں اور سود کے پیسہ بھی تین چار سو آتے ہیں، تو کیا میں سو، دوسو روپۓ ٹیکس کا سود کے پیسہ سے ادا کر کے باقی پیسہ مصرف سود میں دے سکتا ہوں؟ اور کیا میرے لئے اس سود کے پیسہ سے ٹیکس ادا کرنا صحیح ہے؟

المستفتی: شمس الدین، کلکتہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سود اور حرام مال کا اصل حکم یہ ہے کہ کسی بھی عنوان سے اسے مالک تک پہونچا دیا جائے؛ لہٰذا آپ کے لئے بینک سے حاصل شدہ سود سے بینک کا ٹیکس ادا کر دینا جائز ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۰۰)

من اكتسب مالا بغير حق، ففي جميع الأحوال: المال الحاصل له حرام عليه، يجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، البحرالرائق، زكريا ۹/۳۶۹، كوئٹه ۸/۲۰۱، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ۶/۲۷، زكريا ۷/۶۰، شامي، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵، هندية، زكريا قديم ۵/۹۴۹، جديد ۵/۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/۲۴۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱رجب المرجب ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/۹۶۵۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱/۷/۱۴۲۹ھ

سودی رقم سے ٹیکس ادا کرنا

سوال [۹۲۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ **انکم ٹیکس**: جو آمدنی پر لگتا ہے، جس کی شرح آمدنی بڑھنے پر بڑھتی چلی جاتی ہے۔

سیل ٹیکس: جو خریدی جانے والی چیز پر لگایا جاتا ہے۔

ھاؤس ٹیکس: ہر مکان یا دوکان کی کرایہ داری جانچی جائے گی اور کرایہ کا بیس فیصد ٹیکس لگے گا۔

واٹر ٹیکس: ہر مکان اور دوکان پر جتنا ہاؤس ٹیکس ہوگا، اتنا ہی واٹر ٹیکس لگے گا چاہے اس کے وہاں پانی کا کنکشن ہو یا نہ ہو۔

کیا مندرجہ بالا ٹیکس ایک ہی قسم کے ہیں؟ اور کیا ان ٹیکسوں کا بھگتان لائف انشورنس کے زائد ملنے والے روپیہ سے ہوسکتا ہے؟

مندرجہ بالا ٹیکسوں کے علاوہ انسپکٹر حضرات کو خوش کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ دینا پڑتا ہے، تو بیمہ سے زائد ملنے والی رقم میں سے ان لوگوں کو دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: جمیل احمد، پیرزادہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: انکم ٹیکس، ہاؤس ٹیکس، سیل ٹیکس یہ سب غیر شرعی اور جبری ٹیکس ہیں، واٹر ٹیکس پانی کا کنکشن نہیں ہے تو وہ بھی ناجائز اور جبری ٹیکس ہے، ہاں البتہ اگر پانی کا کنکشن ہے، تو ٹیکس لینے کی گنجائش ہے؛ اس لئے کہ وہ درحقیقت پانی کی فیس ہے۔

مذکورہ جبری ٹیکسوں میں ایسی کمپنی کے لائف انشورنس کے سود کا پیسہ دینے کی گنجائش ہے، جس کمپنی کا تعلق سرکار کی ملکیت سے ہے، حرام پیسے سے کسی طرح رشوت دینا جائز نہیں؛

البتہ اگر ضرورت پڑے تو اپنا حلال پیسہ دینے کی گنجائش ہے۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أوحصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء؛ لأنه لو أنفق على نفسه، فقد استحكم ما ارتكبه من الفعل الحرام. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤)

دفع المال للسلطان الجائر؛ لدفع الظلم عن نفسه، وماله، ولاستخراج حق له، ليس برشوة: يعني في حق الدافع. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره كراچي ٦/٤٢٣، زكريا ٩/٦٠٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍محرم الحرام ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴؍۵۹۴۹)

انکم ٹیکس میں بینک سے ملی سودی رقم دینا

سوال [۹۲۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کسی مسلمان پر سرکاری انکم ٹیکس ہو، جو قانوناً دینا ضروری ہے، تو اس کے عوض میں سرکاری بینک میں جمع رقم کے عوض جو بیاج ملتا ہے، تو کیا بیاج کے اس پیسہ کو سرکاری انکم ٹیکس کے طور پر جمع کرا سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: ڈاکٹر وارث احمد، منگل بازار، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سود اور حرام پیسے کا حکم یہ ہے کہ جہاں سے آیا ہے، وہیں واپس کردیا جائے، اور سرکار کی طرف سے انکم ٹیکس اور سیل ٹیکس وغیرہ ناقابل برداشت ظالمانہ ٹیکس ہیں، شریعت کے نزدیک اپنی گاڑھی کمائی کا اتنا زیادہ حصہ دینا عوام پر لازم نہیں ہے؛ اس لئے سرکاری بینک سے ملی ہوئی سودی رقم کو انکم ٹیکس اور سیل ٹیکس کے نام سے سرکار کو واپس کرنا جائز اور درست ہے۔(مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۰۰)

صرح الفقهاء: بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة والاستئجار على المعاصي-إلى قوله-ففي جميع الأحوال: المال الحاصل له حرام عليه؛ ولكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه، ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه ٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/۹۹۷۸)

مسجد کے سود کا پیسہ ٹیکسوں میں دے کر اپنا خالص پیسہ مسجد میں دینا

سوال [۹۲۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ ہماری مسجد کا بینک آف انڈیا میں اکاؤنٹ ہے، جس میں مسجد کی رقم جمع رہتی ہے، اوراکاؤنٹ اس طرح کا ہے کہ ہر ماہ اس رقم پر ملنے والا سود خود بخود بینک آف بروڈا میں جمع ہوجاتا ہے۔ اب یہ سود کی رقم تقریباً بیس ہزار روپئے ہوچکی ہے، ایک صاحب کا انکم ٹیکس کا بل آیا ہے، یہ صاحب چاہتے ہیں کہ مسجد کی رقم کا سود بینک سے لے کر اپنا انکم ٹیکس بھر دیں اوراس کے عوض اپنے خالص روپئے مسجد میں دیدیں، تواس طرح کرنا جائز ہے یانہیں؟ کیااس طرح کرنے سے مسجد کی سودی رقم بغیر سودی رقم میں تبدیل ہوجائے گی؟

المستفتی: محمد علی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوداورحرام مال کااصل حکم یہ ہے کسی بھی عنوان سے اسے مالک تک پہونچادیا جائے؛ لہٰذا اگرآپ مسجد کی سودی رقم سے اپنا انکم ٹیکس ادا کردیں اوراس کے عوض اتنے ہی روپیہ مسجد میں دیدیں تو اس کی گنجائش ہےاور مسجد میں دیتے وقت اسےاپنے مال کابدل نہ سمجھا جائے۔

صرح الفقهاء: بأن من اكتسب مالا بغير حق، يجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/ ۵۵۳، كراچي ٦/ ۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/ ۲۷، زكريا ۷/ ٦۰، البحر الرائق، زكريا ۹/ ۳٦۹، كوئٹه ۸/ ۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/ ۳٤۹، جديد ۵/ ٤۰٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳٤/ ۲٤٦، حاشية ترمذي ۱/ ۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/ ۳۳-۳٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ شعبان المعظم ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۷۱۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۸/۱۶ھ

حکومت کی طرف سے عائد کردہ ظالمانہ ٹیکس میں سودی رقم دینا

سوال [۹۲۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ تجار اپنا مال زیادہ منافع سے بیچنے کے لئے دوسرے شہر میں لے جاتے ہیں؛ جبکہ ایک شہر سے دوسرے شہر میں مال کا منتقل کرنا سرکاری سطح پر ممنوع ہے، راستہ میں بہت سارے افسران اور پولیس مین ملتے ہیں، اگر ان کی جیب میں کچھ روپئے نہ ڈالے جائیں، تو بہت ساری رکاوٹیں کھڑی کردیتے ہیں، حتی کہ گاڑی کا چالان تک کردیتے ہیں، اس پر مقدمہ بازی ہوتی ہے اور حکوت مال کو اپنا کر نیلام کردیتی ہے۔

سوال طلب امر یہ ہے کہ ان افسران اور پولس مینوں کو مال کی حفاظت کے لئے سود کی رقم میں سے کچھ دیدیا جائے، تو شرعاً کوئی گناہ تو نہیں؟

المستفتی: محمد عبداللہ، ساکن ٹانڈہ، رام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب سرکاری سطح پر اس کی ممانعت ہے، اور اس قانون کی پابندی سے مسلمانوں کو کوئی مذہبی نقصان بھی نہیں ہے، تو اس کے خلاف کرنا شرعاً ممنوع ہے۔ (مستفاد: فتاوی احیاء العلوم ۱/۳۵۰، فتاوی رحیمیہ قدیم ۶/۲۷۸، جدید زکریا ۱۰/۱۸۱)

وقوله تعالىٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [البقرة:۲۷۵]

یہاں بھی سودی رقم رشوت میں دینا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ رشوت سے من وجہ اپنا بھی فائدہ ہوتا ہے اور سودی رقم سے کسی طرح بھی فائدہ حاصل کرنا جائز نہیں ہے؛ لہٰذا رشوت میں اپنی ذاتی رقم دینی چاہئے نہ کہ سود کی۔

أفتى به بعض أكابرنا أن للمسلم أن يأخذ من أصحاب البينک أهل الحرب في دارهم، ثم يتصدق به على الفقراء، ولا يصرف إلى حوائج

نفسه. (اعلاء السنن، كتاب البيوع، باب الربا، كراچي ۱/۳۵۹، دارالكتب العلمية بيروت ۱٤/۱۳٤-٤١٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ربیع الاول ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/۱۶۸۴)

سودی رقم سے انکم ٹیکس ادا کرنا

سوال [۹۲۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سود کی رقم کیا انکم ٹیکس میں ادا کی جا سکتی ہے؟ اور اگر زید سے انکم ٹیکس وصول کر لینے کے بعد بینک نے زید کو اس کے اکاؤنٹ پر سود دیا، تو کیا یہ سود کی رقم زید ادا شدہ انکم ٹیکس میں مجری کر سکتا ہے؟

المستفتی: ارشاد عالم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: سرکاری بینک سے حاصل شدہ سودی رقم سے انکم ٹیکس ادا کرنا جائز ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ سود اور مال حرام کا اصل حکم یہ ہے کہ جہاں سے آیا ہے کسی بھی عنوان سے وہاں واپس کر دیا جائے؛ اس لئے انکم ٹیکس کے عنوان سے وہاں واپس کر دینا جائز ہے؛ لیکن پہلے جو صاف پیسہ انکم ٹیکس میں ادا کر دیا گیا ہے، اس کے بدلہ میں سود کے پیسہ میں اپنے لئے نیت کر لینے سے ادا شدہ سود کی طرف سے مجری نہیں ہوگا۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۶/۴۰۱-۱۶/۳۸۳، ایضاح النوادر ۱/۱۰۰)

صرح الفقهاء: بأن من اكتسب مالا بغير حق، يجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا

في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحر الرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۵۸۲/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶/۴/۱۴۲۹ھ

بینک کی سودی رقم سے سیل ٹیکس اور انکم ٹیکس ادا کرنا

سوال [۹۲۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسئلہ کا تعلق صرف سیل ٹیکس اور انکم ٹیکس سے ہے، اس عریضہ کے ساتھ ایک فتوی دیوبند، دوسرا مدرسہ امینیہ دہلی کا ہے، سیل ٹیکس اور انکم ٹیکس ایک غیر شرعی ٹیکس ہے، ہم کو جو بینک سے جمع شدہ رقم پر سود مل جاتا ہے، کیا اس سودی رقم سے ہم اس غیر شرعی ٹیکس کو ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟ جبکہ اس سودی رقم کے ہم مالک ہیں۔ تحقیقات علم کے ساتھ جواب عنایت کریں۔

المستفتی: حافظ محمد لقمان، محمد شفیع، اینڈ آئی ایس پرفیومری ورکس، دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: بینک سے جو سود ملتا ہے، وہ آپ پر حرام ہے اور مال حرام میں اصول یہ ہے کہ اصل مالک کو واپس کر دیا جائے، اور حکومت جو انکم ٹیکس وغیرہ لیتی ہے، وہ شریعت کی نگاہ میں سخت ترین جبر وظلم ہے، تو اس جبری ٹیکس میں سود کی رقم کو اس نیت سے دیدینا جائز ہے کہ سودی رقم جو ہمارے پاس ناجائز طریقہ سے آتی ہے، وہ اصل مالک (حکومت) کو واپس کرتے ہیں اور جلب منفعت کے لئے رشوت میں دینا جائز نہیں ہے۔

صرح الفقهاء: بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة والاستئجار على المعاصي والطاعات، أو بغير عقد كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه؛ ولكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه، أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ رصفر المظفر ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/ ۱۶۸۵)

سیل ٹیکس میں سودی رقم دینا

سوال [۹۲۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید اپنا مال بغیر ٹیکس ادا کئے ہوئے چوری سے لا رہا تھا، سیل ٹیکس والوں نے اس کا مال پکڑلیا، پکڑنے کے بعد ۲۵ ر ہزار روپیہ مال کے اوپر ٹیکس ادائے گی وجرمانہ اوراس کے علاوہ پندرہ ہزار روپیہ گھوس ادا کیا، تو کیا ان دونوں رقموں کو سود کے پیسے سے ادا کرسکتے ہیں یانہیں؟ تشفی بخش جواب دیں۔

المستفتی: ڈاکٹر عتیق احمد خاں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سرکاری بینک سے ملی ہوئی سودی رقم سیل ٹیکس اورانکم ٹیکس میں دینا جائز ہے؛ لہٰذا کسٹم کے روک لگانے پر ٹیکس میں جو رقم دی جائے، اس میں سرکاری بینک کی سودی رقم دینا جائز ہے اور باقی رشوت میں جو دی جائے ،اس میں سودی رقم دینا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۴/ ۲۰۳، جدید ڈابھیل ۱۶/ ۳۸۳، ایضاح النوادر ۱/ ۱۰۰، ایضاح المسائل ۱۴۲)

صرح الفقهاء: بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة والاستئجار على المعاصي –إلى قوله– ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه؛ ولكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك . (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/ ۵۵۳، كراچي ۶/ ۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/ ۲۷، زكريا ۷/ ۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/ ۳۶۹، كوئٹه ۸/ ۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/ ۳۴۹، جديد ۵/ ۴۰۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/ ۲۴۶، حاشية ترمذي ۱/ ۳، معارف السنن، اشرفية ديوبند ۱/ ۳۳-۳۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍ رجب المرجب ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۷۶۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/ ۷/ ۱۴۲۳ھ

عوام سے ملی ہوئی سودی رقم کو انکم ٹیکس وغیرہ میں دینا

سوال [۹۲۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: کہ ہمارے ملک کی حکومت ہر کاروباری آدمی سے انکم ٹیکس (آمدنی ٹیکس) وصول کرتی ہے، جو شرعاً ناجائز ہے، اگر کسی شخص پر حکومت نے پچاس ہزار روپیہ انکم ٹیکس لگایا، اگر وہ شخص بینک میں ایف ڈی بنوا کر یا عوام کو سود پر روپیہ قرض دے کر سود کی رقم سے پچاس ہزار روپیہ حاصل کر لیتا ہے اور اس سود کی رقم سے پچاس ہزار روپیہ انکم ٹیکس ادا کر دیتا ہے، تو اس طرح وہ ناجائز ٹیکس کے نقصان سے بچ جاتا ہے، سود کے ذریعہ اس شخص ن جو پچاس ہزار روپیہ حاصل کئے، تو سود لینے کا گناہ اس شخص پر پڑے گا یا نہیں؟ کیا اس طرح سود پر روپیہ چلانا شرعاً جائز ہے؟

المستفتی: عبداللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سائل نے سوال کے دو جزء کو مخلوط کر کے پیش کیا ہے، حالانکہ دونوں کا حکم الگ الگ ہے۔

(۱) بینک میں ایف ڈی بنوانا اس نیت سے کہ اس سے ملنے والی سودی رقم سے غیر شرعی انکم ٹیکس ادا کیا جائے گا یہ جائز نہیں ہے، ورنہ وہ شخص سود لینے کی وجہ سے مستحق لعنت ہوگا اور سخت گنہگار بھی ہوگا؛ البتہ ایف ڈی کرانے کے بعد جو سودی رقم حاصل ہوگی اس کے ذریعہ انکم ٹیکس ادا کرنا درست ہے، اس سے مال حرام حکومت کے خزانے میں پہونچ جائے گا، جو اس کا اصل حکم ہے کہ حکومت کے خزانے سے لیا ہوا مال اپنی جگہ واپس پہونچ گیا۔

إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/ ۵۵۳، كراچي ٦/ ۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/ ۲۷، زكريا ۷/ ٦۰، البحر الرائق، زكريا ۹/ ۳٦۹، كوئٹه ۸/ ۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/ ۳٤۹، جديد

٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤)

(۲) عوام کو سود پر قرض دے کران سے سود حاصل کرنا گناہ عظیم ہے، اس سے ملا ہوا سود بھی قطعی حرام ہے اور عوام سے ملے ہوئے سود کے پیسے کو انکم ٹیکس اور سیل ٹیکس میں دینا قطعاً جائز نہیں ہے؛ بلکہ ایسے سود کے پیسے کو عوام میں سے جن لوگوں سے حاصل کیا گیا ہے، انہیں کو واپس کردینا لازم اور واجب ہے۔

صرح الفقهاء: بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة والاستئجار على المعاصي -إلى قوله- ففي جميع الأحوال: المال الحاصل له حرام. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/٥٥٣، كراچي ٦/٣٨٥، تبيين الحقائق امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/٣٦٩، كوئٹه ٨/٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٢٤٦، حاشية ترمذي ١/٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/٣٣-٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶؍ ۸۰۱۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴؍۴؍۱۴۲۴ھ

سودی رقم انکم ٹیکس میں دینا

سوال [۹۲۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حکومت اس قدر ٹیکس لگاتی ہے کہ آدمی کی کمائی اور آمدنی پر کہ آدمی کی تہائی آمدنی ان ٹیکسوں میں چلی جاتی ہے، پھر مرنے کے بعد بھی اس کے ترکہ سے کچھ ہڑپ کر

لیتی ہے، جس کو حکومت ڈیٹ ڈیوٹی بولتی ہے، ایسے ظلم کے ہوتے ہوئے اگر کوئی شخص اپنی حلال کمائی اور حقوق ورثاء بچانے کے لئے انشورنس پالیسی نکال کر سود کی رقم سے ٹیکس کی ادائے گی کرے، بیمہ کرانے سے محض اس کی غرض یہ ہو، تو کیا جائز ہوگا کہ نہیں؟

المستفتی: محمد شعیب، ساؤتھ افریقہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: لائف انشورنس (جیون بیمہ) ناجائز اور حرام ہے، اور اس غرض سے بھی جائز نہیں ہے کہ اس کو حاصل کر کے ٹیکس میں دینا ہے؛ البتہ اس غرض سے گنجائش ہے کہ جو رقم لائف انشورنس میں جمع ہوگی اس پر سے حکومت ٹیکس نہیں لیتی ہے، تو اس رقم کو ٹیکس سے محفوظ کرنے کی نیت سے انشورنس میں رکھنا مباح ہوگا، پھر جب اضافی رقم ہاتھ میں آجائے گی تو اس کو ٹیکس میں دینا بھی جائز ہوگا؛ اس لئے کہ جو رقم زائد ملتی ہے، اس کو کسی بھی عنوان سے حکومت کو واپس کرنا جائز ہے؛ لہٰذا ٹیکس کے عنوان سے بھی واپس کرنا جائز ہوگا۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/ ۹۹)

صرح الفقهاء: بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة والاستئجار على المعاصي والطاعات، أو بغير عقد كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال: المال الحاصل له حرام عليه، يجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالك، وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية، بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، وهكذا في الشامي، زكريا ۹/ ۵۵۳، كراچي ۶/ ۳۸۵، تبيين الحقائق امدادية ملتان ۶/ ۲۷، زكريا ۷/ ۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/ ۳۶۹، كوئٹه ۸/ ۲۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/ ۳۴۹، زكريا جديد ۵/ ۴۰۴،

الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/ ٢٤٦، حاشية ترمذي ١/ ٣، معارف السنن، اشرفية ديوبند ١/ ٣٣- ٣٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ر صفر المظفر ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۳۵۱/۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۲/۲۴ھ

سودی رقم سیل ٹیکس میں دینا

سوال [۹۲۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید بمبئی سے کاروباری مال خرید کر لاتا ہے۔ اب جو خریدار یوپی کے علاوہ دیگر صوبوں مثلاً پنجاب وغیرہ کے ہوتے ہیں، وہ تو ہم کو پکی رسید میں سیل ٹیکس بھی دیتے ہیں؛ لیکن جو خریدار یوپی کے ہوتے ہیں وہ سیل ٹیکس نہیں دیتے؛ البتہ کچا پرچہ لے لیتے ہیں اور جو دیگر صوبوں کے ہم کو ٹیکس دیتے ہیں، وہ ہم سے مال کی خریداری میں اتنی کم قیمت مال کی کرا لیتے ہیں کہ جو انہوں نے ہم کو ٹیکس دیا ہے، وہ نہ دینے کے درجہ میں ہوتا ہے، گویا یوپی اور غیر یوپی کے گاہکوں کی طرف سے سیل ٹیکس میں ہم کو ہی دینا پڑتا ہے۔

اس تفصیل کے پیش نظر سوال یہ ہے کہ ہماری جو رقومات بینک میں جمع رہتی ہیں، اس کے سود کے روپیہ کو ہم سیل ٹیکس یا انکم ٹیکس میں گورنمنٹ کو ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟ جبکہ ہم زکوۃ بھی ادا کرتے ہیں؟

(۲) کیا مسلمانوں کو سیل ٹیکس اور کسی قسم کا ٹیکس دینا جائز ہے؟ جبکہ اسلامی قانون میں صرف زکوۃ ہی ہے۔

(۳) سیل ٹیکس یا اور کسی ٹیکس کی ادائیگی، اگر ہماری رقم کے سود سے ادا کی جاسکتی ہے، تو اگر ہم بینک کے سود کی رقم کے مطابق اپنے پاس سے اصل رقم میں سے وہ ٹیکس ادا کر دیں اور بعد میں وہ سود کی رقم اپنے استعمال میں لے آئیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ

ہم نے اس کا متبادل اپنی جیب سے ادا کردیا ہے۔

المستفتی: فضل الرحمٰن، لاجپت نگر، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) سیل ٹیکس میں بینک سے حاصل شدہ سود کا پیسہ ناجائز ہے؛ اس لئے کہ سود کا پیسہ کسی بھی عنوان سے اصل مالک کو واپس کردینا واجب ہوتا ہے، اور سیل ٹیکس شرعاً جبری ٹیکس ہے، جو کہ شرعاً واجب نہیں ہے اور سود کو حکومت کو واپس کرنا ہے، تو سیل ٹیکس کے عنوان سے واپس کرنا جائز ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسالک ۱/۱۰۰، فتاوی محمودیہ قدیم ۴/۲۰۳، جدید ڈابھیل ۱۶/۳۸۳)

یجب علیه أن یرده علی مالکه إن وجد المالک. (بذل المجهود، کتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامیة، بیروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحدیث: ۵۹، وهکذا في الشامي، زکریا ۹/ ۵۵۳، کراچي ۶/ ۳۸۵، تبیین الحقائق امدادیة ملتان ۶/ ۲۷، زکریا ۷/ ۶۰، البحرالرائق، زکریا ۹/ ۳۶۹، کوئٹه ۸/ ۲۰۱، هندیة، زکریا قدیم ۵/ ۳۴۹، جدید ۵/ ۴۰۴، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۳۴/ ۲۴۶، حاشیة ترمذي ۱/ ۳، معارف السنن، اشرفیة دیوبند ۱/ ۳۳-۳۴)

(۲) جب آپ اپنے مال کی زکوۃ ادا کرتے ہیں، تو سیل ٹیکس سے بچنے کا راستہ اختیار کرنا جائز ہوگا۔

(۳) ایسا کرنا جائز نہیں یہ گویا ایسا ہے جیسا کہ ذبح شدہ حلال بکرا تو دیدیا اور مردہ بکرا اپنے لئے رکھ لیا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ صفر المظفر ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۴۳۴۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۲/۱۹ھ

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ

فتاویٰ قاسمیہ

منتخب فتاویٰ

حضرت مولانا مفتی شبیر احمد القاسمی

خادم الافتاء و الحدیث جامعہ قاسمیہ

مدرسہ شاہی مرادآباد، الہند

(جلد ۲۱)

المجلد الحادی و العشرون

الدیون، الودیعة، الامانة

الضمان، الهبة، الجارة

۹۳۵۱ ——— ۹۷۳۵

ناشر

مکتبہ اشرفیہ، دیوبند، الہند

01336-223082

فتاویٰ قاسمیہ

صاحب فتاویٰ

حضرت مولانا مفتی شبیر احمد القاسمی

پہلا ایڈیشن محرم الحرام ۱۴۳۷ھ

ناشر

مکتبہ اشرفیہ، دیوبند، ضلع سہارنپور، الهند

01336-223082

ASHRAFI BOOK DEPOT

DEOBAND, SAHARANPUR, INDIA

Phone: 01336-223082

Mob. : 09358001571،08810383186

مکمل اجمالی فهرست ایک نظر میں

فہرست مضامین

٢٧/ بقية كتاب الربوا

١١/ باب القرض

۲۸/ کتاب الدیون

٢٩/ كتاب الوديعة والأمانة والضمان

۳۰/ کتاب الهبة

□	۱/ باب شرائط الهبة	۱۷۸

۲/ باب ما یجوز من الهبة و مالا یجوز ۲۳۴

۳/ باب هبة المشاع ۲۷۸

۴/ باب الرجوع في الهبة ۳۱۵

۵/ باب: زندگی میں تقسیم جائیداد　　۳۲۵

۷/ باب الهبة للصغير ۴۶۳

۳۱/ کتاب الإجارة

❐	۲/ باب الإجارة الفاسدة	۶۱۲

□ ۵/ باب الاستئجار علی الطاعات ۷۰۶

□ ٦/ باب الاستئجار علی المعصیة ۷۲۲

بقية كتاب الربوا

۱۱/ باب القرض

کتنی ضرورت میں سودی قرض لینے کی گنجائش ہے؟

سوال [۹۲۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کسی مسلم نے غیر مسلم سے سو روپئے لئے اور انہوں نے یہ کہا کہ سو روپئے کا ہم سوا سو روپئے لیں گے، یہ لینا کیسا ہے؟ غیر مسلم نے کہا کہ آپ کی مرضی ہے، لو یا نہ لو ہم تو سوا سو روپیہ لیں گے اور روپئے کی سخت ضرورت بھی ہے۔

المستفتی: قمر الدین، بریاہی بازار، سہرسہ (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: حدیث میں آیا ہے۔

عن جابرؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، با ب لعن آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۸، سنن الترمذي، باب ماجاء في آكل الربا، النسخة الهندية ۱/۲۲۹، دارالسلام رقم: ۱۲۰۶)

الاشباہ والنظائر میں ہے۔

الضرورات تبيح المحظورات ومنثم جاز أكل الميتة عند المخمصة. (الأشباه والنظائر قديم ۱/۱٤۰، قواعد الفقه اشرفي ۸۹، رقم: ۱۷۰، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۲/۱٦۲، ۲۸/۱۸۰، شرح المجله رستم ۱/۲۹، رقم المادة ۲۱)

ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح. (الأشباه والنظائر قديم ١٤٩، الجوهرة الرائق، كتاب البيوع، باب الربا، زكريا ٢١١/١، كوئٹه ١٢٦/٦)

حدیث شریف کا مطلب ہے کہ سود لینے والا دینے والا اس کا لکھنے والا، اس کی شہادت دینے والا سب برابر طریقہ سے مستحق لعنت ہیں آنحضور ﷺ نے ان پر لعنت فرمائی ہے۔

الاشباہ کی عبارت نمبر ۱ رکا مطلب ہے کہ بوقت شدت ضرورت حرام اور ناپاک وممنوع چیز بھی مباح ہوجاتی ہے، حتی کہ مردار سخت حرام اور ناپاک ہے، مگر حالت مخمصہ میں کھانا جائز ہے اور کھانے سے گنہگار نہیں ہوگا۔

الاشباہ کی عبارت نمبر ۲ رکا مطلب ہے کہ بوقت شدت ضرورت اور شدت احتیاج میں سود پر قرض لینا جائز ہے، اب اگر کوئی شخص اس حد تک محتاج ہے کہ خود اور بال بچے بھوکے تڑپ رہے ہیں اور کوئی بلا سود کے قرض بھی نہیں دے رہا ہے، اور ان حالات میں اگر سود پر قرض نہ لیا جائے، تو خود اور بال بچوں کی جان کا خطرہ ہے، تو بقدر ضرورت سود پر قرض لے کر ضرورت پوری کرنے کی گنجائش ہے، انشاء اللہ لعنت کی حدیث میں داخل نہیں ہوگا۔ اور اگر اتنی شدید ضرورت نہیں ہے یا اس سے زائد لیتا ہے، تو مستحق لعنت ہوگا، اس کے لئے ناجائز اور حرام ہوگا۔

اب مبتلا بہ خود اپنی حالت پر غور کر کے فیصلہ کرلے کہ اس کی ضرورت کس حد تک ہے، اس ضرورت کی وجہ سے سودی معاملہ کرنے میں لعنت سے بچ سکتا ہے یا نہیں؟ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱ر جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳ر ۶۷۷)

سخت مجبوری کی حالت میں سودی قرض لینے کا حکم

سوال [۹۲۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید دہلی میں کاروبار کرتا ہے، ایک مکان کاروبار کے لئے اور ایک مکان فیملی کی رہائش کے لئے کرایہ پر لئے ہوئے ہے، جس کا مجموعی کرایہ ماہانہ سترہ ہزار پانچ سو روپے

دینا پڑتا ہے، زید نے اپنا سرمایہ لگا کر کسی طرح ایک پلاٹ خرید لیا ہے۔ اب اس کی تعمیر کا مسئلہ درپیش ہے، اتنی گنجائش نہیں ہے کہ تعمیر کی جا سکے ایک صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک بینک بطور قرض مکان کی تعمیر کے لئے روپیہ دیتا ہے، جس کا انٹرسٹ بہت ہی معمولی ہے، سالانہ ایک لاکھ پر آٹھ سو پچاس روپیہ بینک لے گا۔

اب اگر زید اس بینک سے روپیہ لے کر مکان تعمیر کرے، تو ایک فائدہ تو یہ ہے کہ گورنمنٹ ایک لاکھ پر سالانہ تیس ہزار روپیہ ٹیکس لے لیتی ہے، ماہانہ قسط کرایہ سترہ ہزار پانچ سو روپیہ مالک مکان کو دینا پڑتا ہے، مکان کی تعمیر کے بعد کاروبار اور فیملی کی رہائش تعمیر شدہ مکان میں منتقل ہوجائے گی، تو یہ مذکورہ کرایہ بھی بچ جائے گا، اس کو بچا کر جلد ہی لئے ہوئے قرض کی ادائے گی ہوجائے گی، زید کے پاس اس صورت کے علاوہ کوئی اور صورت فی الحال مکان کی تعمیر کے لئے نہیں ہے۔ بعض علماء نے بتایا؛ لیکن اطمینان قلب نہ ہونے کی وجہ سے استفسار کررہا ہوں۔

المستفتی: اشتیاق احمد انصاری، ایس ایس انٹر پرائزز، ڈبلوزیڈ 254 (دہلی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سخت ترین مجبوری اور اضطراری حالت میں سودی قرض لے کر ضرورت پوری کرنے کی شرعاً گنجائش ہے، اور سخت مجبوری اور اضطراری حالت نہ ہو، تو جائز نہیں؛ بلکہ لعنت کا مستحق ہوجاتا ہے۔ اب آپ خود اپنے بارے میں فیصلہ فرمائیں کہ آپ کی مجبوری کہاں تک ہے۔

نیز آپ اپنے حلال پیسہ سے سود دیں گے، آپ کے یہاں سود کا پیسہ نہیں آئے گا؛ لہٰذا اگر مجبوری میں سودی قرض لے لیا ہے، تو جلد ادا کر کے اللہ سے توبہ کرلینی چاہئے۔

يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح، وتحته في الحموي: وذلك نحو أن يقرض عشرة دنانير مثلاً ويجعل لربها شيئًا معلومًا في كل يوم ربحًا.

(الأشباه والنظائر قديم ١٤٩، وهكذا في البحرالرائق، كتاب البيوع، باب الربا، زكريا ٦/٢١١، كوئٹه ٦/١٢٦)

عن جابرؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، باب لعن آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ٢/٢٧، بيت الأفكار رقم:١٥٩٨، سنن أبي داؤد، باب في آكل الربا ومؤكله، النسخة الهندية٢/ ٤٧٣، دارالسلام رقم: ٣٣٣٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍شوال ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۵۵۸/۳۷)

مجبوری کی حالت میں سودی قرض لینا

سوال [۹۲۹۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بعض ناگزیر حالات میں سرکاری قرض لینا، جس پر سود کے ساتھ لوٹانا ہوتا ہے؛ ایسا قرض لینا کیسا ہے؛ جبکہ کہیں سے کوئی قرض نہ مل رہا ہو۔ نیز یہ بھی جواب ارسال فرمادیں کہ اب تک اگر لے لیا ہو، تو اس کی تلافی کی کیا شکل ہوسکتی ہے؟

المستفتی: زوار احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سود کا لینا اور دینا قطعی حرام اور ناجائز ہے، اگر قوت کی روٹی کا محتاج ہے، قرض بھی کوئی نہیں دے رہا ہے، اور اگر سودی قرض نہ لیا جائے، تو بھوکے مرنے کا خطرہ ہے، تو سود پر قرض لے کر ایسی اضطراری حالت میں ضرورت پوری کرنے کی گنجائش ہے، آپ کی ضرورت کس حد تک ہے آپ خود سوچ لیں۔ اگر ایسی ضرورت نہیں ہے، تو سود پر قرض لینے سے مستحق لعنت ہوں گے؛ لہٰذا آپ اپنی ضرورت کا اندازہ خود

لگائیں کہ آپ سودی قرض لے کر اپنی ضرورت پوری کر لینے سے اس لعنت سے بچ سکتے ہیں کہ نہیں۔ حدیث شریف ملاحظہ فرمائیں۔

عن جابرؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، باب لعن آكل الربا، مؤكله، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۸، سنن ابن ماجه، التجارات التغليظ في الربا، النسخة الهندية ۲/۱۶۵، دارالسلام رقم: ۲۲۷۷)

ويجوز للمحتاج الاستقراض بالربح. (البحر الرائق، كتاب البيوع، باب الربا، زكريا ۶/۲۱۱، كوئٹه ۶/۱۲۶، الأشباه والنظائر قديم ۱۴۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹ ؍رجب المرجب ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸؍۸۹۰۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹؍۷؍۱۴۲۶ھ

لون کا معاملہ کرنا کیسا ہے؟

سوال [۹۲۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ لون کا معاملہ کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد اطہر بن عبد الجلیل، ارریہ (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: لون کا معاملہ کرنا یعنی کوئی شخص بینک سے یا کسی دوسرے آدمی سے بطور قرض کچھ روپئے لیتا ہے اور ایک متعین مدت کے بعد اصل رقم کے ساتھ کچھ زائد رقم بھی دینی پڑتی ہے، اور یہ زائد رقم سود کے طور پر دیجاتی ہے؛ لہٰذا اس طرح کا معاملہ کرنا (كل قرض جر نفعاً فهو حرام) کے تحت داخل ہو کر شرعی طور پر ناجائز اور حرام ہوگا اور یہ معاملہ زمانہ جاہلیت کے سودی معاملہ کے مرادف ہے؛ اس لئے قطعاً جائز نہیں ہے۔

وهو ربا أهل الجاهلية، وهو القرض المشروط فيه الأجل وزيادة مال على المستقرض. (أحكام القرآن للجصاص، سورة البقرة، باب البيع، زكريا ۱/۵۶۹، سهيل اكيڈمي لاهور ۱/۴۶۹)

والربا الذي كانت العرب تعرفه و تفعله، إنما كان قرض الدراهم، والدنانير إلى أجل بزيادة على مقدار ما استقرض على ما يتراضون به، ولم يكونوا يعرفون البيع بالنقد، وإذا كان متفاضلاً من جنس واحد، هذا كان المتعارف المشهور بينهم، ولذلک قال الله تعالیٰ: ''وما آتيتم من ربا ليربو في أموال الناس فلا يربو عند الله'' فأخبر أن تلك الزيادة المشروطة، إنما كانت رباً في المال العين؛ لأنه لا عوض لها من جهة المقرض. (أحكام القرآن للجصاص، من سورة البقره، باب الربا، زكريا ۱/۵۶۳، سهيل اكيڈمي لاهور ۱/۴۶۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۶۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۴/۲۷ھ

ہندوستان کو دار الحرب خیال کر کے بینک سے لون لینا

سوال [۹۲۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بینک سے ملنے والی سودی رقم کو لے سکتے ہیں یا نہیں؟ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ہندوستان چونکہ دار الحرب ہے؛ اس لئے یہاں پر سودی رقم لینا جائز ہے۔

نیز اس کا استعمال جائز ہے یا نہیں اور موجودہ زمانہ میں اس سے بچنا ممکن نہیں ہے؛ اس لئے کہ بینک والے گورنمنٹ کو بینک کا پیسہ لون پر دیتے ہیں، پھر وہ اسی پیسہ کو عام انسانوں کے نفع کی خاطر استعمال کرتی ہے، جیسے سڑک وغیرہ بنانا؛ چنانچہ اسی پیسہ سے بنی

ہوئی چیزوں کواستعمال بھی کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ہم لوگوں کا اس کا استعمال کرنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد دانش دولت باغ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک سے جوسودی رقم ملتی ہے، اس کو بینک میں چھوڑنا جائز نہیں؛ بلکہ اس کو لے لے؛ اس لئے کہ اگر سودی رقم نہ لی جائے، تو چونکہ بینک اس کو ناجائز کاموں میں خرچ کرتی ہے، جو معصیت پر تعاون ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَان. [سورۃ المآئدۃ:۲]

اور اس سودی رقم کو اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں، نادار فقیروں کو بلانیت ثواب دیدیا جائے، اسی طرح حکومت کے غیر شرعی ٹیکس مثلاً انکم ٹیکس، سیل ٹیکس وغیرہ کے عنوان سے دیدینا بھی جائز ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۸/۵۹، جدید زکریا مطول ۱۱/۱۷۷، ۸/۱۷۷، جدید زکریا مطول ۱۱/۲۳۳، ایضاح النوادر ۱/۹۷)

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق، إلى ما قال: لكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك، إلى ما قال: وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فأما إن ملكه بعقد فاسد، أو حصل له بغير عقد، ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، هندية، زكريا قديم ۵/۳۴۹، جديد ۵/۴۰۴، شامي، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ۶/۳۸۵، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۴/۲۴۶، تبيين الحقائق، امداديه ملتان ۶/۲۷، زكريا ۷/۶۰، البحرالرائق، زكريا ۹/۳۶۹، كوئٹه ۸/۲۰۱)

جن حضرات نے ہندوستان کو دارالحرب سمجھ کر یہاں کے غیر مسلم اور حکومت سے سود حاصل کرنا جائز اور حلال کہا ہے، ان کو فقہی عبارات کے سمجھنے میں دھوکہ ہوا ہے کہ امام صاحب کے نزدیک دارالحرب میں غیر مسلموں اور حکومت سے سود حاصل کرنا جو جائز کہا گیا ہے، اس میں ایک قید یہ بھی ہے کہ سود حاصل کرنے والا مسلمان خود اس ملک کا باشندہ نہ ہو؛ بلکہ کسی دوسرے ملک سے عارضی طور پر آیا ہو؛ لہٰذا ہندوستانی مسلمانوں کے لئے خود ہندوستان کے غیر مسلم اور حکومت سے سود حاصل کرنا جائز نہیں ہوگا؛ اگرچہ ہندوستان کو وہ لوگ دارالحرب سمجھتے ہوں؛ البتہ امریکہ اور برطانیہ میں عارضی طور پر رہتا ہو تو اس عارضی رہائش کے زمانہ میں وہاں کے غیر مسلم اور حکومت سے سود حاصل کرنا ہندوستان مسلمانوں کے لئے جائز اور حلال ہے۔

ولا بين حربي ومسلم مستأمن، ولو بعقد فاسد، أو قمار، ثمة لأن ماله ثمة مباح فيحل برضاه مطلقاً بلا عذر خلافاً للثاني والثلاثة.

(شامي، كتاب البيوع، باب الربا، زكريا ٤٢٢/٧، كراچي ١٨٦/٥)

اس عبارت میں مسلم مستأمن سے مراد وہ مسلمان ہے جو عارضی طور پر دارالحرب میں رہتا ہو۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ربیع الاول ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۹۷۲/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۳/۱۴ھ

بلاسودی قرض لے کر اس سے انتفاع

سوال [۹۳۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عمر ایک مکتب میں ملازم ہے، جس کو ۶۲۵/ روپئے ماہانہ نیز مسجد سے ۳۵۰/ روپئے ماہانہ ذمہ داران مسجد بطور ہدیہ پیش کرتے ہیں اور اس کے علاوہ آمدنی کا کوئی ذریعہ

نہیں ہے؛ جبکہ عمر کثیر العیال ہے۔ نیز اسی ماہانہ میں ۱۰۰؍روپیہ کرایہ مکان، نیز ۱۰۰؍روپیہ ماہانہ کچھ کم وبیش بل بھی جمع کرنا ہوتا ہے، اپنا ذاتی مکان یا جگہ ابھی تک مہیا نہیں ہوسکی، اس دور گرانی کے باعث کچھ قرض بھی سر پہ ہے، ان شکستہ حالات کے پیش نظر کوئی اس کو رقم بطور قرض دینے کے لئے تیار نہیں ہے، بعد ازاں اس نے حکومت کی جملہ اسکیموں کی چھان بین کی؛ لیکن جملہ اسکیموں میں اس کو سود کی رقم نظر آرہی ہے اتفاقاً صرف اور صرف ایک اسکیم نگر پالیکا کی شناخت پر منحصر ہے، جس میں ایک فارم بلاعوض بھرا جاتا ہے، پھر نگر پالیکا کا عہدہ دار اس پر شناختی کارروائی کر کے اس پر منظوری کا نشان لگا دیتا ہے اور اس کو کسی بینک میں بھیج دیتا ہے، جہاں اس نگر پالیکا کا کھاتہ ہوتا ہے، وہ بینک اس نگر پالیکا کی نشاندہی کے مطابق ایک چیک بنا دیتا ہے، جس کی مختصر اور طویل المدت قسط ہوتی ہے، یہ قرض بلا سود کہ جتنا روپیہ بذریعہ چیک دیا جاتا ہے، وہی بعینہ بغیر کسی کمی زیادتی کے واپس کرنا ہوتا ہے، آیا یہ رقم لے کر کسی ضرورت حالیہ میں اس طرح استعمال کرے کہ اس کی ادائے گی بغیر کسی کشش وپنچ کے ہوسکے، آیا اس کی شرعاً گنجائش ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عمر نہٹور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر سائل کا بیان صحیح ہے، تو اس بلاسودی قرض کو حاصل کر کے اس سے انتفاع بلا کسی کراہت کے جائز اور درست ہے۔ اور آیت کریمہ۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: يَـا اَيُّهَـا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ . [سورۃ البقرۃ: ۲۸۲]

کے دائرہ میں داخل ہو کر یہ معاملہ بلاشبہ جائز ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱؍۳۷۵۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۱۲/۱۹ھ

حکومت سے جتنا قرض لیں اتنا ہی ادا کریں تو کیسا ہے؟

سوال[۹۳۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرا بھٹہ کا کام ہے، امسال اسمیں کافی نقصان ہوگیا۔ اب حکومت تمام بھٹہ والوں کولون پر کچھ رقم دے دیتی ہے، تو شرعاً لون پر قرض لینا کیسا ہے؟

(۲) اگر ہم جتنا قرض لیں اتنا ہی ادا کریں تو کیسا ہے؟ مثلاً حکومت پانچ لاکھ قرض دیتی ہے اوراس پر ۲۵؍ فیصد چھوٹ دیتی ہے، تو جو چھوٹ ۲۵؍ فیصد ہوئی تھی، قرض پر سود بھی اتنا ہی ہوا اور ہمیں پانچ لاکھ ہی ادا کرنا پڑا تو یہ جائز ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: شرف الدین، ہیبت پور جویا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تجارت میں نقصان ہونے کی وجہ سے بھی حکومت سے لون قرض لینا شرعاً جائز نہیں ہے؛ کیونکہ یہ بھی سود ہے اور سود کی حرمت وقباحت قرآن وحدیث میں بیان کی گئی ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱؍۱۲۷، فتاوی محمودیہ ۴؍۲۰۵)

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [سورة البقرہ: ۲۷۵]

عن جابرؓ قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم آکل الربا، ومؤکلہ، وکاتبہ، وشاھدیہ، وقال: ھم سواء. (مسلم شریف، باب لعن آکل الربا، ومؤکلہ، النسخة الهندية، ۲/ ۲۷، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۸، سنن أبي داؤد، باب في آكل الربا ومؤكله، النسخة الهندية ۲/ ۴۷۳، دارالسلام رقم: ۳۳۳۳)

(۲) آپ نے سوال میں جو صورت قرض لینے اور ادا کرنے کی ذکر کی ہے، اگر واقعتاً ایسا ہی ہے، کہ برابر سرابر معاملہ ہے، جتنا آپ نے لیا تھا، اتنا ہی دینا پڑ رہا ہے، لکھنے میں چاہے جتنا بھی طے ہو، تو نام کا سود ہے، مگر حقیقت میں سود کے دائرہ میں داخل نہیں ہے، اگر واقعتاً یہی شکل ہے، تو پھر یہ معاملہ جائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ ۹؍۲۶۶، ۲۶۵،

جدید زکریا دیوبند ۹/ ۲۳۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۶۸۰۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۶/۲۸ھ

سبسڈی اور کم شرح سود کے ساتھ سرکاری قرض

سوال [۹۳۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کاشتکار اور معذورین کو منجانب حکومت قرض دیئے جاتے ہیں۔ ۳۵ یا ۵۰ فیصد سبسڈی بھی حکومت دیتی ہے، جس کا ادا کرنا ضروری نہیں ہوتا ہے اور مابقیہ رقم کم شرح سود کے ساتھ ادا کرنی ہوتی ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ کاشتکار اور معذورین کے ایسے قرض کو جس پر ۳۵ یا ۵۰ فیصد سبسڈی ہے اور شرح سود کم ہوتا ہے، ایسا قرضہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: مفتی سمیر صاحب، استاذ مدرسہ فلاح دارین، عثمان آباد (مہاراشٹر)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جس سرکاری قرضہ کا ذکر سوال نامہ میں کیا گیا ہے، اگر اس قرضہ کی ادائے گی میں سبسڈی سمیت جتنا سرکار سے ملا ہے، اس سے زائد دینا نہیں پڑتا ہے، تو شرعی طور پر جائز ہے؛ اس لئے کہ اس قرض پر ایک پیسہ بھی سود نہیں دینا پڑا؛ لیکن اگر سبسڈی سمیت جتنا سرکار سے ملا ہے، اتنی ادائے گی کے ساتھ مزید اس کے اوپر زائد ادا کرنا پڑ جائے تو زائد رقم سود ہے، تو ایسی صورت میں سودی معاملہ ہونے کی وجہ سے اس قرض کا لین دین شرعی طور پر جائز نہیں ہوگا؛ لہٰذا سرکار سے قرض لینے والے خود دیکھ لیں کہ ان کو لی ہوئی رقم کے اوپر زائد دینا پڑے گا یا نہیں؟ اگر زائد دینا نہیں پڑے گا، تو لے لیں اور اگر زائد دینا پڑے گا تو نہ لیں۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [البقرہ: ۲۷۵]

عن جابرؓ قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم آکل الربا، ومؤکلہ، وکاتبہ، وشاهدیه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، باب لعن آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ۲/ ۲۷، بيت الأفكار رقم: ۱۵۹۸، سنن النسائي، الزينة الموتشمات، النسخة الهندية ۲/ ۲۳۸، دارالسلام رقم: ۵۱۰۸، سنن أبي داؤد، باب في آكل الربا ومؤكله، النسخة الهندية۲/ ۴۷۳، دارالسلام رقم: ۳۳۳۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ شعبان المعظم ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/ ۱۱۶۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/ ۸/ ۱۴۳۵ھ

اقلیتی طبقہ کو ملنے والی سبسڈی کے ساتھ قرض لینے کا حکم

سوال [۹۳۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بندہ ایک کاروباری ہے، بندے کے کاروبار کے لئے ایک مشینری کی ضرورت ہے مشینری کی قیمت بہت زیادہ ہے، بندہ اس کی قیمت کا متحمل نہیں ہے، حکومت ہند کی جانب سے اقلیتی طبقہ کے لئے کاروبار کی ضروری اشیاء خریدنے کے لئے ایک اسکیم جاری ہوئی ہے، جس کی شکل یہ ہے کہ ہم اپنے کاروباری اشیاء سے متعلق جو کمپنی ہے، اس کمپنی کو اپنی ضرورت پیش کریں گے، کمپنی ہماری ضرورت کا تخمینہ بتائے گی کہ آپ کی ضرورت کی اشیاء کی یہ قیمت ہوگی، ہم اس تخمینہ کی تفصیل حکومت کے ایک ادارے کو پیش کریں گے، اس حکومتی ادارے والے ہمارے کاروبار کی پوری تحقیق کے بعد ہم سے کہتے ہیں کہ فلاں بینک سے رجوع ہوں، ہم اپنے پورے کاروبار کی تفصیل کے ساتھ متعینہ بینک سے رجوع ہوتے ہیں، وہ بینک ہمارے کاروبار کی تفصیل اور وہ خود ہمارے کاروبار کی تحقیق کے بعد حکومتی ادارے کے حکم پر ہمارے کاروباری اشیاء سے متعلق جو کمپنی ہے،

اس سے یہ معاہدہ کرتی ہے کہ مذکورہ تخمینہ کے مطابق مشینری اس کے کاروبار کے لئے حوالہ کریں اور ہم سے رجوع ہوتی ہے اور حکم کرتی ہے کہ آپ اقلیتی طبقہ میں ہونے کی وجہ سے تخمینہ کا پچیس فیصد رقم حکومتی ادارہ کو ادا کریں گے، بقیہ 75% فیصد رقم قسط وار بینک کو آپ ادا کریں گے؛ لہٰذا اس شکل میں حکومت ہند کی جانب سے اقلیتی طبقہ کو دی جانے والی اس رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کیا ہم اپنے کاروباری اشیاء خرید سکتے ہیں یا نہیں؟ شرعی مسئلہ بتا کر ممنون فرمائیں عین کرم ہوگا۔

المستفتی: سید سلیم بن سید سردار، نمبر ۶۹، نزد بالین، مسجد کولار، کرناٹک

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں درج کی ہوئی صورت سے سرکاری تعاون حاصل کرنا شرعی طور پر جائز ہے، بشرطیکہ اسمیں کوئی سودی لین دین نہ ہو۔

قال الفقيه أبو الليثؒ اختلف الناس في أخذ الجائزة من السلطان. قال بعضهم: يجوز ما لم يعلم أنه يعطيه من حرام. قال محمدؒ: وبه نأخذ مالم نعرف شيئاً حرامًا بعينه وهو قول أبي حنيفةؒ، وأصحابه، كذا في الظهيرية: وفي شرح حيل الخصاف لشمس الأئمةؒ، أن الشيخ أباالقاسم الحكيم كان يأخذ جائزة السلطان وكان يستقرض لجميع حوائجه وما يأخذ من الجائزة يقضي بها ديونه والحيلة في هذه المسائل أن يشتري نسيئة، ثم ينقد ثمنه من أي مال شاء. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الثاني عشر في الهدايا والضيافات، جديد زكريا ٥/٣٩٦، قديم ٥/٣٤٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴ ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۹۸۸/۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۴/۴ھ

قرض کی وجہ سے کرایہ نہ لینا

سوال [۹۳۰۴]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری ایک اراضی ہے جوکہ کرایہ پر دی ہوئی ہے، میں نے کرایہ دار سے کچھ رقم قرض لی ہے اوراس قرض کی وجہ سے میں نے کرایہ دار سے کہا کہ جب تک میں آپ کا قرضہ نہ ادا کردوں میں کرایہ نہیں لوں گا، تو آپ فرمادیں کہ قرض کے بدلے کرایہ چھوڑ دینے سے سودتو نہیں ہو جائے گا؟ مہربانی ہوگی۔

المستفتی: محمد شکیل، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شرعاً وہ سودی معاملہ ہے،اس سے بچنا لازم اورواجب ہے۔

عن فضالة بن عبيد صاحب النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: كل قرض جر منفعة، فهو وجه من وجوه الربا. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، كتاب البيوع، باب كل قرض جر منفعة فهو ربا، دارالفكر ۲۷۶/۸، رقم: ۱۱۰۹۲)

كل قرض جر نفعاً حرام، فكره للمرتهن سكنى المرهونة بإذن الراهن. (الدرمع الرد، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، مطلب كل قرض جر نفعاً حرام، زكريا ۳۹۵/۷، كراچي ۱۶۶/۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍صفرالمظفر ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/۲۱۳۴)

سودی قرض

سوال [۹۳۰۵]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں : کہ میں نے بطورقرض پچاس ہزارروپئے اپنے قریبی ملنے والے سے لیا، جس کی ادائے گی کی صورت یہ طے ہوئی کہ دو ہزار روپیہ ہر مہینے دینا ہوگا، اس طرح میں دو ہزار روپیہ ہر مہینے دیتا رہا، یہاں تک کہ چھیالیس ہزار روپئے تک ہوگیا۔اب ان کا انتقال ہوگیا، ان کے متعلقین مجھ سے یہ کہہ رہے ہیں کہ اب دو ہزار روپئے مہینہ ہمیں دو۔اوراب تک جورقم تم نے دیئے ہیں وہ بطورنفع کے تھے، اصل رقم اپنی جگہ پر برقرار ہے؛ جبکہ مرحوم کے بھائی بھتیجے موجود ہیں، ان کی طرف سے کوئی تقاضہ نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ مجھ کوکتنی رقم کی ادائے گی کرنی چاہئے اورکس کوکرنی چاہئے؟ ان کے بھائی بھتیجے کویا متعلقین کو؟

المستفتی: حفظ الرحمٰن، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر پچاس ہزارروپیہ واقعۃً اس شرط پرلیا تھا کہ پچاس ہزارروپیہ ہی ادا کرنا ہوگا اور ہر ماہ دو ہزارروپیہ دینا ہوگا، تو شرعی طور پراس طرح کا قرض لینا دینا جائز اور درست ہے۔اور جب اس میں سے چھیالیس ہزارروپیہ ادا کردیا گیا ہے، تو باقی صرف چار ہزارروپیہ واجب الاداء ہے اور یہ چار ہزار روپئے ان کے حقیقی وارثین کوادا کرنا چاہئے اوراگر پچاس ہزار کا قرض، اس شرط پرلیا تھا کہ ہرمہینہ دو ہزارادا کرتے رہیں گے اورمزیداس پرسود بھی دیں گے، تو شرعی طور پرایسا معاملہ ناجائز اورحرام ہے۔

لا يجوز أن يرد المقترض إلى المقرض إلا ما اقترضه منه، أو مثله تبعاً للقاعدة الفقهية القائلة كل قرض جر نفعاً حرام أي إذا كان مشروطاً. (فقه السنة ۱٦٦/۳)

فمن الربا ما هو بيع، ومنه ماليس ببيع وهو ربا أهل الجاهلية، وهو القرض المشروط فيه الأجل وزيادة مالٍ على المستقرض. (أحكام القرآن للجصاص، سورة البقرة، باب البيع، زكريا ٥٦٩/١، سهيل اكيڈمي لاهور ٤٦٩/١)

عن علي قال: كل قرض جر منفعة، فهو ربا. (كنز العمال الدين والسلم، دارالكتب العلمية بيروت ٦/٩٩، رقم: ١٥٥١٢، جامع الأحاديث الكبير للسيوطي ٦/٤٣٨، رقم: ١٥٨٢١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍رجب المرجب ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/۹۶۶۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۷/۱۴۲۹ھ

سود پر قرض دینا

سوال [۹۳۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ محلّہ کے کئی آدمی نے مل کر ایک کمیٹی قائم کی اور کمیٹی والے مقروض کو ایک ہزار روپئے دیتے ہیں اور مقروض سے ہر روز ۱۳؍روپیہ کر کے لیتے ہیں تین مہینہ تک، تین مہینہ ختم معاملہ صاف ہوگیا۔ کیا یہ صورت جائز ہے؟ دلائل کے ساتھ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: سعید الرحمٰن، بھنگنا ماری انچلک دینی تعلیم بورڈ (آسام)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ معاملہ میں ایک ہزار روپیہ قرض دے کر قسط وار روزانہ تین مہینہ تک ۱۳-۱۳؍روپئے وصول کرنے میں کل وصول شدہ رقم ۱۱۷۰؍روپئے بنتی ہے، جو اصل قرض کی رقم سے ۱۷۰؍روپئے زائد ہے؛ لہٰذا یہ صریح سودی معاملہ ہے، مسلمانوں کے لئے اس طرح قرض کا معاملہ کرنا قطعاً جائز نہیں ہے۔

قال الله تعالىٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [سورة البقرہ: ٢٧٥]

عن علي مرفوعاً: كل قرض جر منفعة فهو ربا، أي في حكم الربا، فيكون حراماً، وعقد القرض باطل. (السراج المنير ٤/٢٠، تكملة فتح الملهم، اشرفية ١/٥٦٨، اعلاء السنن بيروت ١٤/٥٦٦، كراچي ١٤/٤٩٨)

عن فضالة بن عبيد صاحب النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: كل قرض جر منفعة، فهو وجه من وجوه الربا. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، كتاب البيوع، باب كل قرض جر منفعة فهو ربا، دارالفكر ٨/٢٧٦، رقم: ١١٠٩٢)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۰۸۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/ ۲/ ۱۴۳۱ھ

بینک سے سودی قرض لینا

سوال [۹۳۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل جو بینکوں سے قرض لیا جاتا ہے، اس قرض کا ۱/۳ قرض معاف کر کے بقیہ رقم پر سود لگا کر قرض خواہ سے قرضے کی ادائے گی کا مطالبہ کرتے ہیں، تو اس طرح کا سودی لین دین درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: انجمن کمیٹی اصلاح المسلمین، سنسار پور، کھیری لکھیم پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: آج کل کے زمانہ میں بینک سے جو سودی قرض لیا جاتا ہے، وہ ایسی اضطراری ضرورت کی وجہ سے نہیں ہے کہ جس وجہ سے سود جیسی حرام چیز کا اختیار کرنا مباح ہو جائے؛ لہٰذا اگر کوئی ایسا قرض لے لیتا ہے، اور ادائے گی میں ۱/۳ معاف کیا گیا ہے اور ۲/۳ جو واجب الاداء ہے، اس پر جو سود بڑھتا ہے، وہ اگر معاف شدہ ۱/۳ سے زائد ہو جاتا ہے، تو سود کے دائرہ میں داخل ہو کر حرام اور ناجائز ہوگا۔

عن جابرؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، باب لعن آكل الربا،

مؤكله، النسخة الهندية، ۲/ ۲۷، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۸، مسند أحمد بن حنبل ۱/ ۸۳، رقم: ٦٣٥، ٦٦٠، ٦٧١، ٧٢١، ٨٤٤، ٩٨٠، ١٢٨٩، ١٣٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ ؍ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۳۹۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/ ۳/ ۱۴۱۵ھ

سودی قرض کالین دین

سوال [۹۳۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص نے اپنی مجبوری کے تحت ایک محترمہ سے پچیس ہزار روپئے بطور قرض کاروبار کے لئے لئے پیسے دیتے وقت اس محترمہ نے یہ شرط رکھی کہ جب تک وہ اس کا پیسہ واپس نہیں کرتا بطور فائدہ آٹھ سو روپیہ ماہوار مجھے ادا کرے گا، پانچ سال کے بعد اس شخص نے دس ہزار روپئے ادا کر دیئے اور پندرہ ہزار روپیہ جلدی دینے کو کہا، کچھ دنوں بعد اس شخص نے کچھ معزز لوگوں سے اس سلسلہ میں بات کی تو انہوں نے اسے غلط بتایا، پندرہ ہزار روپیہ پر ۵۰۰؍ روپیہ ماہوار اب بھی جاری ہے اور کل ملا کر لگ بھگ ۸۶۰۰۰ روپئے محترمہ کو ادا کر چکا ہے۔ کیا اس محترمہ کا اس طرح پیسہ لینا جائز ہے اور اصل رقم سے زائد جو محترمہ کو پہونچا وہ شرعاً واپس اس شخص کو ملنا چاہئے یا نہیں؟ شرعی حکم تحریر فرمادیں۔

المستفتی: وسیم احمد، محلّہ جامع مسجد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس معاملہ میں دونوں گنہگار ہیں اور یہ شرعاً سودی معاملہ ہے، اس طرح ہر ماہ رأس المال کے علاوہ متعین مقدار دینا اور لینا دونوں حرام ہیں، پچیس ہزار سے جو زائد رقم محترمہ نے لیا ہے، وہ سب ان کے حق میں حرام ہے، واپس کردینا لازم ہے۔

من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة والاستئجار على المعاصي والطاعات، أوبغير عقد كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه، وتجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامية، ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، البحر الرائق زكريا ۹/۳٦۹، كوئٹه ۸/۲۰۱، شامي زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ٦/۳۸۵، ، تبيين الحقائق، امداية ملتان ٦/۲۷، زكريا ۷/٦۰، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳٤/۲٤٦، هندية، زكريا قديم ۵/۵٤۹، جديد ۵/٤۰٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍محرم الحرام ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴؍۵۹۵۷)

سودی قرض لینے کا حکم

سوال [۹۳۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں برطانیہ میں رہائشی مکان کے تعلق سے خاص طور پر مسلمانوں کو بہت دشواریاں پیش آتی ہیں، جس کی تفصیل یہ ہے کہ وہاں اگر کوئی شخص رہائش کے لئے کرایہ پر مکان لینا چاہے، تو متوسط سہولیات والے مکان کا ماہانہ کرایہ عام طور پر ہزار بارہ سو پاؤنڈ ہوتا ہے، اور اگر مکان خریدنا چاہتا ہے، تو چونکہ ایسے متوسط مکان کی قیمت دو ڈھائی لاکھ پاؤنڈ کے قریب ہوتی ہے، اور معاشی حالت عام طور پر ایسی نہیں ہوتی کہ یکمشت اتنی رقم ادا کر کے مکان خرید سکے؛ اس لئے (Morgage) سودی قرض لینا پڑتا ہے، یعنی سودی قرض لے کر مکان خریدنا پڑتا ہے، پھر چند سالوں تک قسط وار سود کے ساتھ اس کی ادائے گی

ہوتی ہے، متوسط درجہ کے آدمی کو عام طور پر تقریباً ایک ہزار سے پندرہ سو پاؤنڈ یا جیسے بینک سے معاہدہ ہو، اس کے مطابق کم وبیش ماہانہ ادا کرنے پڑتے ہیں۔

اس طرح کرایہ کے متوسط مکان کے ہزار بارہ سو پاؤنڈ ماہانہ کرایہ پر برسہابرس تک ادا کرنے کے باوجود آدمی مکان کا مالک نہیں ہوتا؛ جبکہ ماہانہ قسط وار (Morgaje) سودی قرض چند سالوں تک ادا کرنے سے آدمی مکان کا مالک بن جاتا ہے، اور مملوکہ مکان نہ ہونے کا ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ جب تک مملوکہ مکان نہ ہو، تب تک بعض نوجوان لڑکے اور لڑکیاں شادی نہیں کرتے اور شادی نہ کرنے سے بے راہ روی کا شکار ہوجاتے ہیں اور مکانات چھوٹے ہونے کی وجہ سے نوجوان لڑکے لڑکیاں ماں باپ کے ساتھ ایک کمرہ میں سوتے ہیں، جس سے ماں باپ کی خانگی زندگی مختل ہوجاتی ہے۔

نیز مرور زمانہ سے دن بدن کرایہ میں بڑھوتری ہوتی ہے اور پندرہ بیس سالوں میں جو سود دے گا، اس سے زیادہ کرایا ہوگا اور مزید بے مکان رہے گا، اگر اس طرح نہیں لے سکتے تو بظاہر عامۃً مسلمانوں کے لئے مکان کا مالک ہونا ایک خواب ہے۔

پس دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس معاشی پریشانی ومجبوری میں، نیز بے راہ روی سے بچنے کے لئے (Morgage) یعنی سودی قرض لے کر مکان خریدنے کی شرعاً اجازت ہوگی؟

خیال رہے کہ وہاں Islamic Morgage کی صورتیں بھی رائج ہیں، جن میں بظاہر سود نہیں ہوتا، مگر اس میں پریشانی یہ ہے کہ اس طرح لینے میں مکان آدمی کو ڈیڑھ گنی یا دوگنی قیمت میں پڑتا ہے، یعنی وہ مکان جو پہلی صورت میں دو ڈھائی لاکھ پاؤنڈ میں ملتا، وہی مکان اس دوسری صورت میں تین چار لاکھ میں پڑتا ہے، اس صورت حال میں مسلمان کیا کریں؟ گذارش وامید ہے کہ مدلل ومفصل جواب عنایت فرمانے کی زحمت گوارہ فرمائیں گے۔

المستفتی: حاجی عمر جی نواب، لندن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سودی قرض لینے میں مسلمان کے ہاتھ میں سود کا پیسہ نہیں آتا ہے؛ بلکہ مسلمان اپنی حلال کمائی کے پیسہ کو سود میں دیتا ہے، اور سود کھانے والے پر دو طرح کی لعنت ہے: (۱) سود لینے کی لعنت۔ (۲) سود کھانے کی لعنت۔

سود دینے والے پر ایک قسم کی لعنت ہوتی ہے اور وہ سود دینے کی لعنت ہے، اور اس لعنت کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا، جب تک سودی قرضہ ادا کر کے فارغ نہ ہوجائے۔ سائل خود اپنے بارے میں غور کر لے کہ اس کو سودی قرض لینے کی جو ضرورت ہے، وہ کس درجہ کی شدید ضرورت ہے۔ کیا اس ضرورت کی وجہ سے سود دینے کی لعنت سے محفوظ ہوجائے گا؟ اس سلسلہ میں سائل خود اپنے بارے میں غور کر لے۔ حضور اکرم ﷺ نے سود دینے والے پر بھی لعنت فرمائی ہے۔

عن جابرؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، باب لعن آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ۲/ ۲۷، بيت الأفكار رقم: ۱۵۹۸، سنن أبي داؤد، باب في آكل الربا ومؤكله، النسخة الهندية ۲/ ۴۷۳، دارالسلام رقم: ۳۳۳۳، سنن الترمذي، باب ماجاء في آكل الربا، النسخة الهندية ۱/ ۲۲۹، دارالسلام رقم: ۱۲۰۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ رجب المرجب ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۱۵۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲/ ۷/ ۱۴۳۱ھ

بینک سے سود لینا

سوال [۹۳۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے یکمشت پانچ سال کے لئے پانچ ہزار روپئے سرکاری

بینک میں جمع کئے، جو کئی پانچ سال بینک میں رہیں گے، بعد میں دو گنا لوٹیں گا، یعنی پانچ ہزار کا دس ہزار روپیہ۔

(۲) بکر اپنی تھوڑی تھوڑی رقم پس انداز کر کے سرکاری بینک میں جمع کرتا ہے اورسال پورا ہونے پر بینک ایک معتدبہ رقم کا اس میں اضافہ کر دیتا ہے، شریعت کی نظر میں یہ اضافہ شدہ رقم اپنے صرفہ میں لانا زید اور بکر کے لئے مباح ہوگا یا نہیں یا یہ سود ہوگا؟

سبھی اہل مدارس دارالعلوم دیوبند ومظاہر العلوم سہارن پور وغیرہ حضرت مدنیؒ وحضرت تھانویؒ کے سلسلوں سے ہی منسلک ہیں۔ حضرت مدنیؒ وحضرت تھانویؒ کی تحریر اس سلسلہ میں ہمرشتہ ہے۔ حضرات مفتیان کرام اس تحریر کا بغور مطالعہ فرما کر جو بھی شریعت مطہر کی روشنی میں اس کا حل ہو، جواب باصواب سے نوازیں۔

المستفتی: عبدالواسع، افضل گڈھ، امام مسجد صغیر والی، بجنور،

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اخبار کا تراشہ اور سوال نامہ دونوں دیکھا گیا، اخبار کے تراشے میں لکھا ہوا ہے، کہ حضرت مدنیؒ نے حضرت تھانویؒ کی رائے کی تصدیق وتوثیق فرمائی ہے۔

اب سنئے حضرت تھانویؒ کی رائے: حضرت تھانویؒ کی رائے یہ ہے کہ اگر ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا جائے، تو خود ہندوستان کے باشندے اور ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے حکومت ہند اور غیر مسلموں سے سود لینا جائز نہیں ہے، یہ ایسا ہی سود ہے، جیسا کہ مسلمانوں سے لیا جاتا ہے، ہاں البتہ ایسے مسلمان کے لئے جائز ہے، جو خود اس ملک کے رہنے والے نہ ہوں؛ بلکہ دوسرے ملک سے ویزا اور امن لے کر کچھ دنوں کے لئے آئے ہوں یا نومسلم ہوں؛ لہٰذا اگر ہندوستان کو بالفرض دارالحرب بھی تسلیم کرلیا جائے، تو بھی ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایف ڈی کے ذریعہ سے یا کسی اور ذریعہ سے سود حاصل کرنا

جائز نہ ہوگا اور وہ سود حلال نہ ہوگا، ہاں البتہ اگر پاکستان یا سعودی عرب سے کوئی مسلمان عارضی طور پر کچھ وقت کے لئے ہندوستان آجائے، تو اس کے لئے حکومت یا غیر مسلم سے سود حاصل کرنا جائز ہوسکتا ہے۔ حضرت تھانویؒ کے فتوی کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

''معاملہ کرنے والا وہ مسلم ہو، جو دارالاسلام سے دارالحرب میں امن لے کر آیا ہو یا وہ مسلم ہو جو دارالحرب ہی میں اسلام لایا ہو، وہ مسلم اصلی نہ ہو جو خود دارالحرب میں رہتا ہو''

حضرت تھانویؒ کی یہ رائے اس عبارت کا مفہوم ہے۔

ولا بين حربي، ومسلم مستأمن، ولو بعقد فاسد، أو قمار ثمة.

(د مختار مع الشامي، كتاب البيوع، باب الربا، زكريا ٧/٤٢٢، كراچي ٥/١٨٦)

دارالعلوم دیوبند کے فتوی کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں، جو دارالعلوم دیوبند کے مفتیان کی رائے ہمیں معلوم ہے وہ یہی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ہندوستان کا سود جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍شعبان المعظم ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۵۴۶/۳۷)

بینک سے منافع (انٹریسٹ) اور مسلم معاشرہ

جناب عبد الواسع صاحب نے حضرت مدنیؒ اور حضرت تھانویؒ کے حوالہ سے اخبار کا جو تراشہ منسلک فرمایا ہے وہ حسب ذیل ہے جو آگے عنوان کے تحت میں آرہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے ۱۷۶۷ء سے یہ مسئلہ کم فہمی کے باعث بے حد اہم اور انتہائی پریشان کن بنا ہوا ہے۔ اسی طرح دنیا کے ان تمام ممالک کے مسلمانوں کو بھی یہی مسئلہ درپیش ہے، جہاں نہ اسلامی شریعت کے قوانین کی پابندی ہے اور نہ ہی شرعی قوانین نافذ ہیں اور نہ ہی مسلمانوں کی تنہا (بلا شرکت غیرے) حکومت ہے، مثلاً چین، نیپال، سری لنکا،

روس، امریکہ، یوروپین ممالک، برطانیہ، کناڈا، جاپان، ساؤتھ افریقہ، نیوزی لینڈ، آسٹریلیا وغیرہ۔

میں نے پہلی ہی سطر میں کم فہمی کا لفظ استعمال کیا ہے وجہ یہ ہے کہ بعض اعلی اکابرین وپائے کے اونچے علمائے کرام کو چھوڑ کر اکثر مولویان اور صرف سند یافتہ دینداروں نے اپنے ناقص علم اور کمزور مطالعہ کے باعث اعلی اکابردین سے استفادہ نہیں کیا؛ اس لئے اپنی اپنی آراء کو فوقیت دی اور خودساختہ تقریروں کو چمکانے کی کوششیں کیں؛ اس لئے مسلم معاشرہ غلط فہمیوں کا شکار ہوگیا، ان حضرات کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہندوستان میں مغلیہ دور میں اور اس سے قبل جو شرعی قوانین نافذ العمل رہے، وہ انگریزوں کی غلامی کے زمانے میں نافذ العمل نہیں رہے؛ کیوں کہ یہ ملک دار الحرب بن چکا تھا۔

مسلمانوں کے لئے مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کی تمام ایسی تحریریں اور آراء سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ مولانا مدنیؒ کی تحریر مشعل راہ ہے، جس میں انہوں نے مولانا تھانویؒ کی رائے کی تصدیق وتوثیق فرمائی ہے۔ دیکھئے مکتوبات شیخ الاسلام ۲/۷۵ اور ۲۱۲۔

یہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کی تحریر ہے، جس میں حضرت فرماتے ہیں: ''ہندوستان میں غدر اور خیانت (یعنی ڈکیتی اور چوری) کو چھوڑ کر باقی ہر طرح سے (قانون ملک کے مطابق) اموال حاصل کرنا مسلمانوں کے لئے مباح (جائز) ہے''۔

دار العلوم دیوبند کے ایک فتوی کے مطابق مباح کے معنی ہیں ایسا جائز کہ اس کے لینے میں کوئی گناہ نہیں اور اس کے نہ لینے میں کوئی ثواب نہیں۔ اس کا کھلا ہوا مطلب ہے کہ ملک کے قوانین کے تحت جو جو چیزیں حاصل ہورہی ہیں، یا حاصل ہوسکتی ہیں، وہ مسلمانوں کے لئے بھی لینا جائز اور مباح ہیں، اگر آپ ان منافع جات کو نہ لیں گے، تو کوئی ثواب نہیں۔

علمائے کرام اگر مجھے معاف فرمائیں تو تاریخی حقیقت بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ دین اور شریعت کے جو معاشرتی قانون وقاعدے مسلم اور مغلیہ حکمرانی کے زمانے میں بادشاہوں کی خوشنودی حاصل کرنے کیساتھ ملک میں رائج تھے، وہی قانون وقاعدے انگریزی غلامی

کے طویل زمانے میں بھی علماء نے رائج رکھے؛ جبکہ بقول حضرت تھانویؒ اور بقول حضرت مدنیؒ ہندوستان دارالحرب بن چکا تھا، اور جو ترمیمات اور اجتہادی اصلاحات قوانین شریعت کے مطابق ہونی چاہئے تھیں، وہ نہیں عمل میں لائی گئیں اور دارالحرب میں جو فوائد شریعت نے عطا کیے تھے، وہ انگریزوں کے طویل زمانے میں بھی امت مسلمہ حاصل نہ کرسکی۔ نتیجہ کے طور پر مسلمانوں میں غربت وافلاس عام ہوتا چلا گیا اور حضرت مدنیؒ کی تحریر کے مطابق جو لاکھوں کروڑوں روپئے کی مسلمانوں کی رقمیں انگریزی بینک ہضم کرتے رہے اور جس سے عیسائی مشینریاں اسکول، عیسائی کالج، عیسائی اسپتال قائم کرتے رہے، دارالحرب ہوتے ہوئے مسلمان اس سے فیضیاب نہ ہوسکتے تھے؛ جبکہ علمائے کرام وہی احکامات بیان کرتے رہے جو دارالشریعت میں یعنی شریعت کے قوانین کی حکمرانی اور شرعی اسلامی حکومت کے اندر نافذ العمل ہوتے ہیں، گذشتہ تقریباً ڈھائی سوسال سے مسلمان اس کے نقصانات اٹھارہے ہیں، حساب لگائیے تو یہ زبردست نقصان اربوں کھربوں روپئے کا شمار ہوگا۔

1980 میں خادم نے دارالعلوم دیوبند کولکھ کر مولانا مدنیؒ کی تحریر کے متعلق پوچھا تھا، تو ان کا جواب تھا کہ بینک سے ملنے والی اضافے کی رقم لینا قطعی درست اور مباح ہے، مگر اس کو لفظ''سود'' مت کہئے؛ بلکہ بینک کے منافع کہئے، اگلی ایک اور تحریر سے میں نے پھر استفسار کیا کہ مباح کی سند بتائے تو جواب آیا کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ (جو کہ امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد تھے) کے مسلک کے عین مطابق ہے۔ نتیجہ یہ کہ مذکورہ دواماموں اور دو عظیم فقیہوں حضرت تھانویؒ اور حضرت مدنیؒ کے موقف کے عین مطابق ہے، ان کے برخلاف دوسرے علمائے کرام کے خیالات و بیانات قطعی بے وقعت، ناقابل یقین اور لایعنی ہیں۔ انگریزوں کے زمانے کی ابتداء سے آج تک مسلمان اپنے ملک کے قانون اور قاعدوں پر چلنے کا پابند ہے اور یہاں اسلامی شریعت مطہرہ کا یہی قانون ہے کہ چوری اور ڈکیتی کے سوا، باقی ہر طرح سے قانونی فائدہ حاصل کرنا بھی مسلمانوں کے لئے مباح ہے، جس طرح مسلم اور غیر مسلم سب

کے لئے ملک کے تمام قوانین اور قاعدوں پر چلنا ضروری ہے، اسی طرح معاشی اور اقتصادی فائدے حاصل کرنا جو قانون کے تحت دستیاب ہوں انہیں حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔

یہ علمائے دین جو بلا تحقیق، بے سمجھے بوجھے احکامات صادر کرتے ہیں، ان کو اتنی بھی سمجھ نہیں کہ دارالشریعت جہاں اسلامی قوانین چلتے ہیں وہاں کے قوانین ہندوستان، نیپال، سری لنکا، روس، چین، امریکہ، آسٹریلیا، کناڈا، نیدر لینڈ اور دیگر یوروپی ممالک میں نہیں لاگو کیے جاسکتے۔ یہ دارالشریعت و دارالاسلام نہیں ہیں۔ یہاں وہی قواعد وضوابط چلیں گے، جن کی شریعت نے اجازت دی ہے، وہ محدود اور تشریح شدہ ہیں جیسا کہ مذکورہ بلند پایہ اکابر سے ثابت ہے اور جو کہ ملک کے اندر حکومت کے قانون سے اختلاف نہیں رکھتے۔ حکومت وقت کے قوانین اور ضوابط کی قدر وعزت کر کے ان کو پوری طرح مانتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

گذشتہ ڈھائی سو سال میں اگر تمام علمائے کرام اور اکابر ملت اور سب سر برآوردہ رہبران قوم با قاعدہ و باضابطہ طور پر زکوۃ، صدقات اور دیگر خیرات کا ایک مشترکہ فنڈ بنانے کا نظام قائم کر دیتے، تو اس سے کئی اقتصادی فائدے ملت اسلامیہ کو پہنچتے اور مسلم عوام کروڑوں کی تعداد میں ہوتے ہوئے اتنے کسمپرسی کے تنگدست حالات میں نہ ہوتے، تمام ملک میں صوبائی اور ضلعی اور شہری نظم کے ساتھ یہ ساری رقمیں ہر سال جمع ہوتیں اور اسی فنڈ سے اہل ضرورت لوگوں کو اور اہل ضرورت اسکولوں اور مدارس کو باقاعدگی کے ساتھ تعاون دیا جاتا، اس طرح کروڑوں خاندانوں کی امداد بھی ہوجایا کرتی اور ان لوگوں کو کوئی پریشانی بھی نہ ہوتی، جو سالانہ زکوۃ وصدقات اور خیرات ادا کرتے ہیں، ایماندار اور محنتی علمائے کرام اور دیگر اکابر کے لئے یہ ناممکن نہ تھا، اس فنڈ کی موجودگی اور تقسیم کار وغیرہ کے بہت سے کاموں میں ہزاروں غریبوں کو روزگار بھی ملتا اور غیر مستحق گداگروں کی مصیبت سے بھی ملک وملت کو چھٹکارہ ملتا۔

یقینی بات ہے کہ اس عظیم کام سے مستحق لوگوں کی غریبی اور مفلسی دور ہو جاتی اور ان کو صنعت وحرفت کاشتکاری، دست کاری، تعلیم دہندگی اور متفرق اقسام کے کاروبار مثلاً دوکانداری وغیرہ میں لگایا جاتا۔ اس طرح مسلم معاشرہ بڑی حد تک اقتصادی طور سے خوش حال اور ملک کے خوشحال شہری ہونے کے ناطے اپنے ملک کے غیر مسلم بھائیوں کی بھی امداد و تعاون کرتا اور اس طرح ملک سے غریبی اور بے روزگاری دور کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کرتا۔ جہاں یہ صحیح ہے کہ ملک اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتا جب تک غریبی اور بے روزگاری پھیلی ہوئی ہے۔ وہاں یہ بھی حقیقت ہے کہ ملک کی دوسری بڑی اکثریت یعنی مسلمان جب تک غریبی اور افلاس و بے روزگاری میں پھنسا رہے گا، اس وقت تک ملک ترقی یافتہ نہیں بن سکتا۔

قرض پر سود لینا اور دینا کیسا ہے؟

سوال [۹۳۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید گھریلو اعتبار سے پریشان تھا، جس بناء پر ایک آدمی سے بیس ہزار روپیہ قرض لیا تھا، ان قرضوں پر ماہانہ بائیس سو روپیہ سود کا بھی بڑھ جاتا ہے، اب تک زید نے دس ہزار روپیہ ادا کردیئے ہیں، مگر اصل قرضہ بیس ہزار اپنی جگہ بدستور باقی ہے، زید کے پاس ایک چھوٹی سی دوکان ہے، جس سے گھریلو خرچ تو آسانی چل جاتے ہیں، مگر اتنی آمدنی نہیں ہے کہ ایک مشت ادا کر کے قرضہ سے سبکدوش ہوجائے، جس سے مجبوراً تھوڑا تھوڑا اقسطوار ادا کر رہا ہے، جس سے سود کی بڑھتی ہوئی رقم ہی ادا ہو پاتی ہے، مگر قرضہ علی حالہ باقی ہے، اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ آمدنی نہیں یا سرمایہ نہیں ہے، جس سے قرضہ ادا کرسکے، تو کیا ایسے شخص کو زکوۃ کی رقم دی جاسکتی ہے اور اس طرح دینے سے زکوۃ ادا ہوجائے گی یا نہیں؟ بینوا وتوجروا۔

المستفتی: عطاء الرحمٰن، مغل پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں قرضہ لینے کا جوطریقہ لکھا ہے یہی زمانہ جاہلیت میں سودی کاروبار کا طریقہ تھا، جس کے بارے میں قرآن کریم میں بہت سخت وعید آئی ہے؛ اس لئے سود پر قرضہ لینا باعث لعنت ہے، جب تک سودی قرضہ سے چھٹکارا نہ ہوگا لعنت ہوتی رہے گی۔

نیز جس شخص سے بیس ہزار قرضہ سود پرلیا گیا ہے، اس شخص کے لئے بیس ہزار سے زیادہ وصول کرنا سود اور مال حرام ہوگا، وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھرے گا اور اس پر قرآنی حکم کے مطابق مسلسل لعنت ہوتی رہے گی؛ لہٰذا بیس ہزار روپیہ جو قرضہ پر دیا ہے، وہ وصول ہوجانے کے بعد زائد وصول کرنا قطعاً جائز نہیں ہے اور زید جو قرضہ لینے والا ہے، اس کے پاس دوکان ہے، جب تک دوکان میں مال ہے، اس وقت تک زکوۃ کا پیسہ لے کر قرضہ ادا کرنا جائز نہیں ہے، پہلے دوکان کا سارا سرمایہ لے کر قرضہ ادا کرے اس کے بعد بھی قرضہ کی مقدار کچھ باقی رہ جائے، تو زکوۃ کی رقم وصول کرسکتا ہے۔ نیز زکوۃ دہندگان کو اپنی زکوۃ کی حفاظت کرنی چاہئے کہ سودی قرض میں اپنی زکوۃ برباد نہ کریں۔

قال اللّٰه تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [سورة البقره: ۲۷۵]

عن جابرؓ قال: لعن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، باب لعن آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم: ۱۵۹۸، سنن ابن ماجه، التجارات التغليظ في الربا، النسخة الهندية ۲/۱٦٥، دارالسلام رقم: ۲۲۷۷، سنن النسائي، الزينة الموتشمات، النسخة الهندية ۲/۲۳۸، دارالسلام رقم: ۵۱۰۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱٦/ جمادی الآخرۃ ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۴۰۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۶/۱۵ھ

بینک سے سودی قرض لینے کی مختلف شکلیں

سوال [۹۳۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں معماری کا کام کرتا ہوں؛ لیکن اس کام پر جانے میں اولاً تو میرے کمر وغیرہ میں درد ہوتا ہے، اور ضعف بھی معلوم ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ اس کام میں اکثر نمازیں جماعت کیساتھ نہیں ہو پاتیں اور بسا اوقات نمازیں قضا بھی ہو جاتی ہیں اور تبلیغی کام میں بھی رکاوٹ ہوتی ہے، ویسے میں بارہویں کلاس فیل ہوں اور مہاراشٹر گورنمنٹ دسویں بارہویں کلاس پڑھے ہوئے لوگوں کو قرض دیتی ہے، یہ قرض پانچ سال کی مدت میں قسط وار مع سود کے ادا کرنا پڑتا ہے، قرض کی مکمل ادائے گی پر کچھ رقم معاف بھی ہو جاتی ہے، مثلاً اگر پچاس ہزار روپئے قرض لیا جائے، تو اسے پانچ سال کی مدت میں بہتر ہزار ادا کرنے پڑتے ہیں، اس کے بعد ساڑھے سات ہزار روپیہ معاف ہو جاتے ہیں۔

اب آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں بتلایئے بندہ یہ رقم لے کر بینک سے ٹیکسی اٹھا سکتا ہے یا نہیں؟ اس کے علاوہ معاش کا کوئی ذریعہ بھی نہیں۔

(۲) اگر بینک سے یہ رقم نہ لی جائے؛ بلکہ صرف چیک بنوا کر کسی کمپنی سے ٹیکسی لی جائے یعنی جتنی رقم کی کمپنی میں ٹیکسی نقد فروخت ہوتی ہے، اتنی رقم کا چیک بنوا کر کمپنی کے حوالہ کر دیا جائے اور کمپنی سے ٹیکسی لے لی جائے، تو یہ جائز ہوگا یا نہیں؟؛ لیکن اس صورت میں بھی جو چیک بنوایا جائے گا، اس کا سود چیک والے کو ہی ادا کرنا ہوگا۔

(۳) تیسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ گورنمنٹ سے نہ رقم لی جائے، نہ چیک بلکہ کوئی مشینری یا سیٹنگ کا سامان لیا جائے، پھر اسے فروخت کر کے ٹیکسی لی جائے، تو یہ جائز ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: عبدالسبحان، ہیورکھیڑ، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) بینک سے قرض لینے کی صورت میں واپسی میں سود دینا لازم آتا ہے؛ اس لئے بینک سے سودی قرض لینا جائز نہیں ہے، اگر چہ حکومت کچھ روپئے معاف ہی کیوں نہ کردیتی ہو؛ کیونکہ اس کے بارے میں حدیث میں سخت ممانعت آئی ہے۔

عن جابرؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، باب لعن آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۸، مشكاة۱/۲٤٤)

(۲) بینک سے چیک لینے کی صورت میں بھی سود دینا لازم آتا ہے؛ اس لئے یہ بھی شکل ناجائز ہے؛ کیونکہ یہ شکل کل قرض جر نفعا حرام کے تحت داخل ہوکر حرام ہوجاتی ہے، اس میں جواز کی شکل یہ ہوسکتی ہے کہ بینک اس شخص کو ٹیکسی خریدنے کے لئے اپنا وکیل بنالے، پھر یہ شخص پچاس ہزار روپیہ کا چیک لے کر ٹیکسی خرید کر بینک کے حوالہ کردے، پھر یہ شخص بینک سے پچپن ہزار روپیہ میں ٹیکسی خرید لے، اور بینک کے طے شدہ معاملہ کے مطابق قسط وار ۵۵/ ہزار روپیہ ادا کرتا رہے، تو اس طرح یہ معاملہ جائز اور درست ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱۰۹)

عن فضالة بن عبيد صاحب النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: كل قرض جر منفعة، فهو وجه من وجوه الربا. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، كتاب البيوع، باب كل قرض جر منفعة فهو ربا، دارالفكر ۸/۲۷٦، رقم: ۱۱۰۹۲)

(۳) اور بینک سے چیک یا رقم نہ لے کر؛ بلکہ مشنری یا سیٹنگ کا سامان لے کر اسے فروخت کرکے ٹیکسی لینے کا جواز اس وقت ہوگا؛ جبکہ اس مشنری اور سیٹنگ کا سامان خریدنے میں قیمت ادا کرتے وقت سود دینا لازم نہ آتا ہو، اور اگر سود دینا لازم آتا ہے، تو کل قرض جر نفعا حرام کے تحت داخل ہوکر یہ شکل بھی ناجائز ہوگی۔

عن علي قال: كل قرض جر منفعة، فهو ربا. (كنز العمال الدين والسلم،

دارالكتب العلمية بيروت ٦/٩٩، رقم: ١٥٥١٢، جامع الأحاديث الكبير للسيوطي ٦/٤٣٨، رقم: ١٥٨٢١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ر محرم الحرام ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴ر ۶۰۰۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۱/۲۶ھ

قرض سے زائد رقم وصول کرنا

سوال [۹۳۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے علاقہ صوبہ کرناٹک کے اندر سنگا کے نام سے جگہ جگہ ایک مہم چلاتے ہیں، جس کی شکل یہ ہے کہ کوئی مالدار مسلمان ہو یا کافر عامۃً تو یہ کفار لوگ ہی ہوتے ہیں، عورتوں میں سے کسی عورت کے گھر میں جمع ہوجاتے ہیں؛ جبکہ جس گھر میں جمع ہورہی ہیں اس کا تعلق اس مالدار سے ہوتا ہے، وہ سب عورتوں کو جمع کرنے کے بعد اس کو بلاتی ہے، وہ آکر سب کے آدھار کارڈ، ووٹ کارڈ اور کوپن (سوٹی) کارڈ اسی طرح گھر کے کاغذ کا عکس لے کر مکان خاص ہے یا بھاڑے کا، اس کی جانچ کرلیتا ہے، پھر ایک رقم دیتا ہے، اس میں جو عورتیں جمع ہیں آپس میں تقسیم کرلیتی ہیں، تو یہ آدمی ہر ایک عورت کے حصہ میں جتنا پیسہ ملتا ہے ہر ایک عورت کو ایک کارڈ میں مثلاً ۱۰ر ہزار ملے، تو ۳ر ہزار کی زائد رقم کے ساتھ ۱۳ر ہزار لکھ کر دے دیتا ہے، ہر ہفتہ قسطوار ادا کرنی پڑتی ہے، اگر کوئی عورت ایک قسط میں جمع نہ کرے تو وہ آدمی جس کے گھر میں عورت سنگا کی ذمہ دار تھی، اسے یا بقیہ شرکاء عورتوں سے جو عورت جمع نہیں کی، اس کی رقم لیتا ہے، تو کیا یہ شکل سود اور بے حیائی کے زمرہ میں ہوکر ناجائز ہوگی یا نہیں؟ یا پھر اس طرح آدھا قرض زائد رقم کے ساتھ دینا کیسا ہے؟ ضرورت مند عورتیں اس سے فائدہ اٹھاتی ہیں، مثلاً لڑکی کی شادی اور دیگر ضروریات میں برائے مہربانی اس مسئلہ کا شرعی حکم بیان

کردیئے ممنون ہوں گا مہربانی ہوگی۔

المستفتی: مفتی حسن قادری قاسمی، راۓچوٹی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں ذکرکردہ صورت صریح سود ہے؛ اس لئے کہ اس میں قرض دینے والا گھر وغیرہ کے کاغذات کو گروی رکھ کر جو رقم دیتا ہے، اس سے زائد قرضداروں سے وصول کرتا ہے؛ لہٰذا یہ کل قرض جر نفعا کے تحت داخل ہوکر ناجائز اورحرام ہوگا۔ بریں بناء مسلمانوں کو اس طرح کے قرض لینے سے اجتناب لازم ہے۔

عن علي مرفوعاً: كل قرض جر منفعة فهو ربا. (اعلاء السنن كراچي ١٤/٤٩٨، دار الكتب العلمية بيروت ١٤/٥٦٦)

عن فضالة بن عبيد صاحب النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: كل قرض جر منفعة، فهو وجه من وجوه الربا. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، كتاب البيوع، باب كل قرض جر منفعة فهو ربا، دارالفكر ٨/٢٧٦، رقم:١١٠٩٢)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰ر ۱۱۵۴۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹/۵/۱۴۳۵ھ

قرض پر ہر ماہ نفع لینا سود

سوال [۹۳۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے خالد سے ایک کروڑ روپئے قرض لیا اور یہ طے ہوا کہ جب تک ایک کروڑ یکمشت ادا نہیں کریگا، اس وقت تک زید ماہانہ خالد کو پانچ ہزار روپئے دیا کرے گا، یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا، جب تک پورا قرض ادا نہ کردے، یہ ماہانہ پانچ ہزار روپئے

جوخالد لے رہا ہے، یہ نفع ہے یا سود ہے؟ شرع محمدی کے مطابق جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: محمد، گجراتی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قرض پر جو ماہانہ پانچ ہزار روپئے طے ہوا ہے، یہ معاملۂ سود ہے جو ناجائز اور حرام ہے، جس سے احتراز کرنا لازم ہے، اس کو نفع کہنا غلط ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ میرٹھ ۲۴/۴۰۴، ڈابھیل ۱۶/۳۴۲، انوار رحمت ۲۳۳)

كل قرض جر نفعاً حرام أي إذا كان مشروطا كما علم ممانقله عن البحر. (الدر مع الرد، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، مطلب كل قرض جر نفعاً حرام، زكريا ۷/۳۹۵، كراچي ۵/۱۶٦)

أما ربا النسيئة، فهوالأمر الذي كان مشهوراً متعارفاً في الجاهلية، وذٰلك أنهم كانوا يدفعون المال على أن يأخذوا كل شهر قدراً معيناً، ويكون رأس المال باقياً، ثم إذا حل الدين طالبوا المديون برأس المال، فإن تعذر عليه الأداء زادوا في الحق والأجل، فهذا هو الربا الذي كانوا في الجاهلية يتعاملون به. (تفسير كبير للإمام الفخر الرازيؒ تحت تفسير رقم الآية:۲۷۵، من سورة البقرة۷/۹۱، روح البيان ۲/۹۳)

الربا هو الفضل الخالي عن العوض المشروط في البيع. (عناية على فتح القدير، كراچي٦/١٤٦، دارالفكر ۷/۳، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت۱۲/۱۰۹، هداية اشرفي ۳/۷۸، هندية، زكريا جديد ۳/۱۱۸، قديد ۳/۱۱۷)

عن علي أمير المؤمنين كل قرض جر منفعة، فهو ربا– وقال الموفق: كل قرض شرط فيه الزيادة، فهو حرام بلا خلاف. (إعلاء السنن، كراچي ۱٤/٤۹۸، دارالكتب العلمية بيروت ۱٤/٥٦٦)

لايجوز أن يرد المقترض إلى المقرض إلا ما اقترضه، أو مثله تبعاً

للقاعدة الفقهية القائلة كل قرض جر نفعاً فهو ربا. (فقه السنة، بيروت ١٦٥/٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۰۱/۴۰)

نفع لے کر ادھار روپئے دینا

سوال [۹۳۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید بکر کو نفع لے کر روپیہ ادھار دیتا ہے، آیا یہ روپیہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

نیز زید کے پاس کچھ روپئے جائز طریقے کے ہیں اور کچھ روپئے ناجائز طریقے کے دونوں کو اس نے ایک جگہ جمع کر دیا (ملا دیا) پھر اس روپیہ میں سے بکر شریعت کے مطابق روپئے ادھار لیتا ہے؛ جبکہ بکر کو معلوم بھی ہے کہ اس کے اندر ناجائز روپئے ملے ہوئے ہیں، تو ایسی صورت میں بکر کے لئے روپیہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد اکرم صدیقی، ٹیلر ماسٹر، کربلا روڈ علی خاں، کاشی پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں زید کے لئے نفع لے کر روپیہ ادھار دینا کھلا ہوا سود ہے، جس کی قرآن کریم اور احادیث طیبہ میں سخت وعیدیں آئی ہیں؛ اس لئے زید کے لئے نفع لے کر ادھار دینا قطعاً ناجائز اور حرام ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [البقرہ: ٢٧٥]

عبد اللّٰہ بن مسعودؓ قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه الحديث. (سنن أبي داؤد، باب في آكل الربا ومؤكله، النسخة الهندية ٢/ ٤٧٣، دار السلام رقم: ٣٣٣٣)

عن فضالة بن عبيد صاحب النبي صلى اللّٰہ علیه وسلم أنه قال: كل قرض

جر منفعة، فهو وجه من وجوه الربا. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، كتاب البيوع، باب كل قرض جر منفعة فهو ربا، دارالفكر ۸/۲۷٦، رقم: ۱۱۰۹۲)

نیز زید کے پاس اگر اکثر روپئے حرام اور ناجائز آمدنی سے ہیں، تو ایسی صورت میں بکر کو ادھار لینے سے احتراز کرنا چاہئے، اور اگر اکثر روپئے حلال اور جائز آمدنی سے ہیں، تو زید سے روپئے ادھار لینے میں کوئی حرج نہیں، یہی سمجھا جائے گا کہ بکر حلال آمدنی سے ادھار لے رہا ہے۔

وكاسب الحرام إذا كان غالب ماله حرام لا يقبل و لايأكل وإن كان المال حلالا فلابأس به. (هندية، كتاب الكراهية والاستحسان، الباب الثاني عشر في الهدايا والضيافات، زكريا قديم ۵/۳٤۳، جديد ۵/۳۹۷، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/۱۸٦-۱۸٦، مصري قديم ۲/۵۲۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/رجب المرجب ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/۳۳۵۷)

قرض کے بدلے نفع حاصل کرنا

سوال [۹۳۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ضمیر عالم کے ماموں محمد یسین پیتل کا کام کرتے ہیں، محمد یسین کسی بھی دوکان سے سلی ادھار لیتے ہیں، ادھار نقد کے مقابلہ میں ۴/روپیہ مہنگی ملتی ہے، تو ضمیر عالم نے اپنے ماموں سے کہا کہ آپ مجھ سے روپئے لے لیجئے اور دوکان سے نقد ۴/روپئے سستی خرید لیجئے، مثلاً ایک سلی بازار میں نقد ۴۶/روپیہ میں ملتی ہے اور ادھار ۵۰/روپیہ میں ملے گی، تو ضمیر عالم نے اپنے ماموں محمد یسین کو روپیہ دے کر کہا کہ نقد خرید لیجئے اور ہمیں ۴/روپیہ پرافٹ دیدیجئے، تو شرعاً یہ تجارت صحیح ہے یا نہیں؟ اگر یہ صورت جائز نہ ہو، تو کوئی جائز شکل تحریر فرمادیں۔

المستفتی: ضمیر عالم پکاباغ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ عقد شرعاً درست نہیں اور اس طرح کا روپیہ لینا شرعاً سود میں داخل ہے؛ کیونکہ دیئے ہوئے روپئے قرض کے حکم میں ہیں اور قرض کے بدلے نفع حاصل کرنا سود ہے؛ لہٰذا کل قرض جر نفعاً حرام کے تحت داخل ہوکر حرام ہوگا، اور اس کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [البقرہ: ٢٧٥]

لہٰذا اس نفع کو مالک کے پاس لوٹا نالازم ہے۔(مستفاد: احسن الفتاوی ۷/۲۱)

جواز کی شکل یہ ہے کہ ضمیر عالم خود سلی خرید کر پچاس روپیہ میں محمد یسین کے ہاتھ فروخت کردیں اور دوسری شکل جواز کی یہ ہے کہ ضمیر عالم نے جو روپئے دیئے ہیں، اس روپیہ کے نفع میں دونوں ثلث یا نصف کے حساب سے شریک ہوجائیں، تو یہ بھی جائز ہے۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ربیع الاول ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/۷۸۷ ۶۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۳/۱۴ھ

فیصد فائدہ پر قرض دینا

سوال [۹۳۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک مقام پر دس لوگ مل کر ایک کام کررہے ہیں، وہ یہ ہے کہ دس لوگ آپس میں ہر ماہ بیس روپئے جمع کرتے ہیں، ایک کے پاس کبھی واپس نہیں ملیں گے؛ بلکہ اس سے دو قسم کے فائدے ملتے ہیں۔

(۱) اگر ان دسوں میں سے کسی کو قرض کی ضرورت پیش آجاتی ہے، تو اس شرط پر قرض

ملتا ہے کہ اس کا فی سال سات فیصد فائدہ دینا پڑے گا؛ لیکن اگر قسط جمع کرنے میں تاخیر ہوجاتی ہے، تو اس پر کوئی جرمانہ نہیں لگتا ہے، اور اگر زیادہ پیسوں کی ضرورت پڑتی ہے، قرض کے لئے تو دوسری جگہ سے پیسے قرض لے کر دیئے جاتے ہیں؛ حالانکہ اس قرض کی رقم پر ان کو دس فیصد فائدہ اگلے کو دینا پڑتا ہے؛ لیکن یہ ممبران اپنوں میں سات فیصد ہی لگاتے ہیں، اس حال میں تیں فیصد کی کمی کو فائدہ کی رقم میں برابر کرتے ہیں۔

(۲) اب آپس میں قرض دینے سے جو منافع آتا ہے، اس کو دسوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، یہ فائدہ لینا یا اس طرح کا کام کرنے کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: سجاد الرحمٰن، اڑیسہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فیصد فائدہ کی شرط پر قرض دینا سودی معاملہ ہے؛ اس لئے یہ معاملہ شروع سے آخر تک ناجائز اور حرام ہے اور باعث لعنت ہے۔

عن جابرؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، باب لعن آكل الربا، ومؤكله، النسخة الهندية، ٢/ ٢٧، بيت الأفكار رقم: ١٥٩٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۲؍ شوال المکرّم ۱۴۳۰ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۷۹۹)	۱۴۳۰/۱۰/۲۲ھ

فائنس کے نام سے ۱۰؍ ہزار قرض لے کر ایک ماہ بعد ۱۲؍ ہزار ادا کرنا

سوال [۹۳۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل بہت سے مسلمانوں میں بڑے زوروں سے ایک بات گھر کر گئی ہے، وہ یہ ہے کہ فائنس کے نام سے دس ہزار روپیہ قرض دیتے ہیں اور اس کا ایک

ماہ بعد ۱۲؍ ہزار روپیہ لیتے ہیں، اسی طرح بڑی بڑی رقم موٹر، ٹریکٹر، موٹرسائیکل وغیرہ پر دیتے ہیں اور کچھ دنوں کے بعد یا مہینہ مہینہ میں ان سے رقم وصول کرتے رہتے ہیں، وہ لوگ اس کو بیاج نہیں مانتے۔ کیا ایسا کرنا یا روپیہ قرضدار سے زیادہ لینا جائز ہے؟ وہ لوگ پہلے ہی رقم زیادہ لینے کی بات کرتے ہیں۔

المستفتی: حاجی ماسٹر علی، راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں مذکور دو جزئیات ہیں:

اول تو صراحۃً سود ہے، جو نص قرآنی سے قطعاً ناجائز وحرام ہے، اس کی نوعیت کے حرام ہونے کے بارے میں آیات قرآنی اور احادیث نبوی میں بے شمار وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔

(فتاوی محمودیہ ۲۰۴/۴-۲۱۸، فتاوی رحیمیہ ۱۹۳/۲، ایضاح النوادر ۱۵۳/۱)

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا ، وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ ○ فَاِنْ لَمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ . [البقرة: ۲۷۵-۲۷۸-۲۷۹]

عن عبد اللّٰہ بن حنظلة غسيل الملائكة قال: قال رسول اللّٰہ صلى اللّٰہ عليه وسلم: درهم ربا يأكله الرجل، وهو يعلم أشد من ستة وثلاثين زنية.

(مسند أحمد بن حنبل ۲۲۵/۵، رقم: ۲۲۳۰۳، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ۳۰۹/۸، رقم: ۳۳۸۱، سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ۱۳/۳، رقم: ۲۸۱۹-۲۸۲۱، مشكاة ۲٤٦/۱)

اور دوسرے جزئیہ کا حکم یہ ہے کہ اگر ٹریکٹر یا موٹرسائیکل وغیرہ کے لئے بڑی بڑی رقم دے کر ماہانہ اور قسطوار رقم قرض کی مقدار تک وصول کیا جائے، تو یہ معاملہ درست ہے بیاج نہیں؛ لیکن اگر قرض سے زائد وصول کیا جائے، تو یہ سود ہے جو ناجائز وحرام ہے۔

(مستفاد: ایضاح النوادر ۳۹/۱-۴۰، فتاوی محمودیہ ۳۷۳/۱۳)

ثم إذا حل الدين طالبوا المديون برأس المال، فإن تعذر عليه الأداء زاد وافي الحق والأجل، فهذا هو الربا الذي كانوا في الجاهلية يتعاملون به. (تفسير كبير للإمام الفخر الرازيؒ، تحت تفسير رقم الآية: ۲۷۵، من سورة البقرة۷/ ۹۱، روح البيان ۲/ ۹۳، غرائب القرآن للنيسابوری ۲/ ۶۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲ر رجب المرجب ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۳۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/ ۷/ ۱۴۲۲ھ

تجارت کے لئے تین ہزار دے کر چار ہزار واپس لینا

سوال [۹۳۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے بکر کو تین ہزار روپیہ اس شرط پر دیا کہ سال بھر اس روپیہ سے کوئی کام تجارت وغیرہ کرے، ایک سال کے بعد چار ہزار روپیہ واپس لوں گا، کیا یہ لین دین شرعاً درست ہے یا نہیں؟ مفصل جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: حافظ رسول احمد، مدرس مدرسہ بحر العلوم، کملاپور، ضلع: سیتاپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: یہ بالکل صریح سود ہے قرآنی اعلان کے مطابق تین ہزار پر چار ہزار لینا حرام اور ناجائز ہے اور خدا اور رسول کے ساتھ مقابلہ آرائی ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: فَاِنْ لَمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ. [البقرہ: ۲۷۹] **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵ر رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/ ۲۸۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶/ ۹/ ۱۴۱۲ھ

اضافہ کی شرط کے ساتھ قرضہ

سوال [۹۳۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے بکر سے پندرہ سو روپیہ قرض لئے چھ مہینہ کے لئے، بکر نے زید کو قرض اس شرط پر دیا کہ دو ہزار روپئے دینے ہوں گے، زید نے اس شرط کو قبول کرلیا بکر کہتا ہے کہ پیسے سے پیسے کمایا جاتا ہے کیا اس کا کہنا جائز ہے؟

المستفتی: محمد شعیب میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قرض پر اس طرح رقم لینے دینے کا معاملہ کرنا شرعاً کھلا سود ہے۔ نیز پیسہ سے پیسہ کمایا جاتا ہے، یہ کہہ کر بکر کا قرض دینا اور اس کے اوپر نفع حاصل کرنا شرعاً سود ہے پیسہ کمانے کا طریقہ اور تجارت نہیں ہے؛ اس لئے اس طرح کے معاملہ سے اجتناب ضروری ہے۔ (مستفاد: محمود یہ ۳۱۲/۱۱، جدید ڈابھیل ۳۴۱/۱۶-۳۴۳-۳۴۴، ۲۱۸/۴، ۲۹۳/۶، رحیمیہ ۱۳۸/۶، جدید زکریا ۲۳۸/۹)

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا . [سورة البقرہ: ۲۷۵]

كل قرض جر نفعاً حرام (در مختار) أي إذا كان مشروطا كما علم مما نقله عن البحر. (شامي، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، مطلب كل قرض جر نفعاً حرام، زكريا ۳۹۵/۷، كراچي ۱٦٦/۵) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ / جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۶۶۵/۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۵/۲۰ھ

قرض دے کر قرض گیرندہ کی زمین سے انتفاع کرنا

سوال [۹۳۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ ایک شخص نے اپنی زمین دوسرے شخص کو دیدی اور کہا کہ ایک ہزار روپیہ مجھے دیدو اور میری زمین سے اس وقت تک فائدہ اٹھاتے رہو، جب تک کہ میں آپ کے روپئے نہ واپس کردوں، تو کیا یہ معاملہ شرعاً درست ہے۔

المستفتی: سعید الرحمٰن، آسامی متعلم مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مذکورہ میں شخص مذکور قرض کی مجبوری کی بناپر اپنی زمین سے اداءِ قرض تک انتفاع کی اجازت دے رہا ہے؛ اس لئے یہ معاملہ

كل قرض جر منفعة، فهو ربا. (كنز العمال الدين والسلم، دارالكتب العلمية بيروت ٦/٩٩، رقم: ١٥٥١٢، جامع الأحاديث الكبير للسيوطي ٦/٤٣٨، رقم: ١٥٨٢١)

کے تحت داخل ہوکر ناجائز اور فاسد ہوگا اور قرض دے کر زمین سے انتفاع حاصل کرنے والے کے لئے زمین کی پیداوار سود اور حرام ہوگی۔

إن من ارتهن شيئاً لا يحل له أن ينتفع بشيئ منه بوجه من الوجوه، وإن أذن له الراهن؛ لأنه إذن له في الربا؛ لأنه يستوفي دينه كاملاً فتبقي له المنفعة التي استوفىٰ فضلاً، فيكون ربًا وهذا أمر عظيم. (مجمع الأنهر، كتاب الرهن، دارالكتب العلمية بيروت ٤/٢٧٣-٢٧٤، مصري قديم٢/٥٨٨، شامي، مطلب كل جر نفعاً حرام، زكريا ٧/٤٢٢، كراچي ٥/١٦٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۷؍۲۴۷۲)

پیشگی گندم دے کر فصل پر زیادہ لینا

سوال [۹۳۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: کہ ایک شخص اپنے گاؤں میں لوگوں کو گندم یا چاول اس شرط پر دیتا ہے کہ جب تمہارے پاس تمہارا گندم یا دھان وغیرہ کٹ کر تیار ہوجائے گا، تو اس وقت تمہارے گندم یا دھان کی قیمت پانچ سو روپیہ کوئنٹل ہے اور تمہارے گندم یا دھان کے کٹتے وقت عام قیمت اگر ساڑھے چھ سو روپیہ کوئنٹل ہوجائے گی، تو میں پانچ سو روپیہ کوئنٹل ہی کے حساب سے لوں گا یا یہ کہا کہ ابھی تم چاول یا گندم لیجاؤ اور دو تین ماہ کے بعد جو عام قیمت رہتی ہے، اس قیمت کے حساب سے روپیہ یا گندم یا دھان لوں گا؛ حالانکہ دو یا تین ماہ کے بعد اس چاول یا گندم کی قیمت معاملہ کرنے کے وقت جو قیمت تھی اس سے بڑھ جاتی ہے، تو اس کا کیا حکم ہے؟ شرع کے مطابق جواب مرحمت فرمادیں۔

المستفتی: علی مرتضیٰ کٹیہاری، متعلم مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نمبر ا/ اور سوال نمبر ۲/ میں جو صورت نقل کی گئی ہے، وہ ربا ہونے کی وجہ سے شرعاً ناجائز ہے، گندم یا چاول دینے والے کو اتنا ہی لینا چاہئے جتنا دیا ہے، اس سے زائد لینا یا اس کے لئے شرطیں لگانا یا قیمت کے اعتبار سے وہی چیز زائد لینا ہرگز جائز نہ ہوگا۔

عن فضالة بن عبيد صاحب النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: كل قرض جر منفعة، فهو وجه من وجوه الربا. (السنن الكبریٰ للبيهقي، كتاب البيوع، باب كل قرض جر منفعة فهو ربا، دارالفكر ۲۷٦/۸، رقم: ۱۱۰۹۲)

الربوا محرم في كل مكيل، أو موزون إذا بيع بجنسه متفاضلاً. (هداية، كتاب البيوع، باب الربا، اشرفی ۷۷/۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/ شعبان المعظم ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/ ۵۴۱۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۸/۱۰ھ

قرض کی رقم باقی رکھ کر چاول وصول کرنا

سوال [۹۳۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کچھ لوگ ایک ہزار روپئے دوسرے آدمی کو دیتے ہیں اور ایک مہینہ میں پانچ کلو چاول لیتے ہیں، اصل ایک ہزار روپئے باقی رہ جاتے ہیں۔ کیا یہ صورت جائز ہے؟

المستفتی: محمد سعید الرحمٰن، بھنگنا ماری، انچلک دینی تعلیمی، بورڈ آسام

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قرض کی اصل رقم باقی رکھ کر ماہانہ پانچ کلو چاول وصول کرنا صریح سود ہے، جس کی حرمت قرآن وحدیث سے ثابت ہے؛ لہٰذا اس طرح معاملہ کرنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [سورة البقرہ: ۲۷۵]

کل قرض جر نفعاً حرام. (طحاوي، النسخة الهندية، ۲/۲۲۹، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، مطلب كل قرض جر نفعاً حرام، زكريا ۷/۳۹۵، كراچي ۵/۱۶۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ / جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۰۸۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۶/۱ھ

قرض کے عوض میں ملنے والے گیہوں کا حکم

سوال [۹۳۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کنٹرول والے غیر مسلم ہیں، وہ کسی مسلمان سے کچھ روپئے قرض کہہ کر لیتے ہیں، پھر بھی وہ کنٹرول والے مسلمان کو ہر ماہ روپئے کے عوض میں کچھ گیہوں دیتے ہیں، سال

دوسال بعد قرض پورا واپس کر دیتے ہیں، تو وہ گیہوں کھانا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد صلاح الدین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: کنٹرول والے قرض لینے کے بعد ہر ماہ روپے کے عوض جو گیہوں دیتے ہیں وہ سود ہے؛ لہٰذا اس کا کھانا جائز نہیں۔

كل قرض جر نفعاً حرام. (شامي، زكريا٧/٣٩٥، كراچي ٦/١٦٦)

عن عبد الله بن سلام عن بردة أتيت المدينة، فلقيت عبد الله بن سلام رضؓ، فقال: ألاتجئ فأطعمك سويقاً وتمراً وتدخل في بيت، ثم قال إنك بأرض الربا بها فاش، إذا كان لك على رجل حق فأهدىٰ إليك حمل تبن، أوحمل شعير فلا تأخذه فإنه ربا. (بخاري شريف، كتاب مناقب الانصار، باب مناقف عبد الله بن سلام١/٥٣٨، رقم: ٣٦٧٧، ف: ٣٨١٤)

فانظر كيف جعل عبد الله بن سلام كل زيادة على أصل الدين ربا مع أنها لم تكن مشروطة في العقد؛ لكونها معروفة فيما بينهم والمعروف كالمشروط. (تكمله فتح الملهم، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا اشرفيه ديوبند ١/٥٦٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۶؍ربیع الاول ۱۴۲۹ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۵۱۴/۳۸)	۱۴۲۹/۳/۱۷ھ

قرض پر نفع حاصل کرنا

سوال [۹۳۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کو سامان کی ضرورت ہے؛ لیکن اس کے پاس نقد رقم نہیں ہے اور سامان دس ہزار روپیہ کا ہے، عمرو زید سے کہتا ہے کہ تم سامان لے لو نقد رقم میں ادا

کردیتا ہوں اورتم یہ رقم مجھے ایک سال میں ادا کرنا اوراس پر مزید کچھ رقم مجھے نفع کے طور پر دےدینا تو کیا اس طرح کا معاملہ درست ہے؟

المستفتی: محمد زبیر، احمد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کے پاس نقد رقم نہ ہونے کی صورت میں عمرو کا اس سے یہ کہنا کہ تم سامان لے لو رقم میں ادا کردوں گا اور پھر ادائے گی کے وقت مزید کچھ رقم بطور نفع کے دینا، شرعاً یہ صورت سود کے دائرہ میں داخل ہے؛ اس لئے اس طرح کا معاملہ کرنا درست نہیں ہے، ہاں البتہ اس کے جواز کی متبادل شکل یہ ہے کہ عمرو یوں کہے کہ یہ سامان میں خرید رہا ہوں اور خرید کرکے پھر تمہارے ہاتھ میں ادھار بیچ رہا ہوں اور تم مجھے اتنی رقم اس کی قیمت کے طور پر بعد میں ادا کردینا اور بعد میں جو ادا کرے گا، وہ مدت بھی متعین ہوجانی چاہئے۔

عن علي قال: كل قرض جر منفعة فهو ربا. (كنز العمال الدين والسلم، دارالكتب العلمية بيروت ٦/٩٩، رقم: ١٥٥١٢، السنن الكبرىٰ للبيهقي، كتاب البيوع، باب كل قرض جر نفعا فهو ربا، دارالفكر بيروت ٢٧٦/٨، رقم:١١٠٩٢)

كل قرض جر منفعة فهو ربا. (شامي، كتاب البيوع، باب المرابحة، مطلب كل قرض جر نفعاً حرام، كراچي ١٦٦/٦، زكريا ٣٩٥/٧، إعلاء السنن، كراچي ٤٩٨/١٤، دارالكتب العلمية بيروت ٥٦٦/١٤، قواعد الفقه اشرفي ديوبند ١٠٢، رقم:٢٣٠)

أما الأئمة الأربعة و جمهور الفقهاء والمحدثين، فقد أجازوا البيع المؤجل بأكثر من سعر النقد بشرط أن يبين العاقدان بأنه بيع مؤجل بأجل معلوم وبثمن، متفق عليه عند العقد. (بحوث في قضايا فقهية معاصرة، أحكام البيع بالتقسيط ص:٧، بحواله محموديه ڈابهيل ١٥٥/١٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ ذی قعدہ ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۱۴۸/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۷/۱۲/۱۳ھ

پانچ من دھان لینے کی شرط پر قرض دینا

سوال [۹۳۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عبداللہ نے عبدالرحمٰن کو پانچ ہزار روپیہ دیا، ایک سال کے لئے اور پانچ ہزار کے بدلے میں پانچ من دھان لیتا ہے، اور سال کے آخر میں وہ پانچ ہزار روپئے بھی واپس لیتا ہے، کیا یہ معاملہ صحیح ہے؟

المستفتی: سعید الرحمٰن، بھنگنا ماری، انچلک دینی تعلیمی بورڈ (آسام)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پانچ ہزار روپئے اس شرط پر قرض دینا کہ سال پورا ہونے کے بعد پانچ ہزار روپئے واپس کرنے ہوں گے، اور مزید پانچ من دھان دینا ہوگا، صریح سودی معاملہ ہے اور شرعاً اس طرح معاملہ کرنا حرام ہے، مسلمانوں کو اس طرح کے سودی معاملات سے اپنے آپ کو دور رکھنا لازم ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [سورة البقرہ: ۲۷۵]

قال ابن المنذر: إن المسلف إذا شرط على المستسلف زيادةً، أوهديةً، فأسلف على ذٰلک، إن أخذ الزيادة على ذٰلک ربا. (إعلاء السنن، كتاب الحوالة، باب كل قرض جر نفعاً فهو ربا، دارالكتب العلمية بيروت ١٤/٥٦٦، كراچي ١٤/٤٩٩، مثله في تكملة فتح الملهم، المساقاة والمزارعة، باب الربا، اشرفي ديوبند ١/٥٦٨)

كل قرض جر منفعة، فهو ربا. (طحاوي ٢/٢٢٩، كنز العمال، كتاب الدين والسلم، دارالكتب العلمية بيروت ٦/٩٩، رقم: ١٥٥١٢، السنن الكبرىٰ للبيهقي، كتاب البيوع، باب كل قرض جر نفعاً فهو ربا، دارالفكر بيروت ٨/٢٧٦، رقم: ١١٠٩٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۰۸۵/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۶/۱ھ

تعلیمی لون

سوال[۹۳۲۷]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل کے زمانہ میں تعلیمی اخراجات وفیس وغیرہ اتنی بڑھ چکی ہے کہ عام آدمی کیا مڈل کلاس لوگ بھی ان اخراجات کے برداشت کے قابل نہیں ہوتے، خاص طور پر (پروفیشنل کورس Profeshnal Courses) جیسے میڈیکل، انجینئر نگ وغیرہ، گورنمنٹ کوٹا بہت کم ہوتا ہے، ایسے حالات میں اچھے ہونہار مسلم طلبہ داخلہ لینے کے لئے اگر لون اسکالرشب (Loan Scholar Ship) ایجوکیشنل انشورنس پلانس (Educational Insurance Plan) کے ذریعہ اپنی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ان سہولتوں کا فائدہ اٹھانا چاہیں، تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان ذرائع کو استعمال کرنے میں سود کا مسئلہ بھی درپیش ہوتا ہے، بینک بھی لون سود پر دیتا ہے، پھر کیا کیا جائے؟

المستفتی: عتیق الرحمٰن، کامٹی، ناگ پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سود کا لینا دینا دونوں باعث لعنت ہیں اورفقہاء نے سخت اضطراری ضرورت کی بناپر سودی قرض لینے کی گنجائش لکھی ہے، اورجن تعلیمی ضرورتوں کے لئے بینک سے سودی قرض لینے کا ذکر کیا گیا ہے، ان ضرورتوں کو صاحب معاملہ خود سمجھے، کیا ان ضرورتوں کی بناپر سودی قرض لینے کی لعنت سے حفاظت ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ خود ہی کریں۔

عن جابرؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، النسخة الهندية، ۲/ ۲۷، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۸، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في آكل الربا ومؤكله، النسخة الهندية ۲/ ۴۷۳، دار السلام

رقم: ۳۳۳۳، سنن الترمذي، باب ما جاء في آكل الربا، النسخة الهندية ۱/ ۲۲۹، دارالسلام رقم: ۱۲۰۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ شوال المکرم ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۴۹۸/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۱۰/۲۸ھ

بینک سے قرض لے کر مکان کی تعمیر

سوال [۹۳۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بینک سے قرضہ لے کر مکان تعمیر کرا سکتا ہوں؟

المستفتی: ناصر رام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سودی قرض لینا شرعی طور پر جائز نہیں ہے، مستحق لعنت ہے آپ خود سوچ لیں کہ جو سودی قرض لیا جا رہا ہے، اس کی لعنت اور اپنی ضرورت دونوں کو خود دیکھ لیں، کیا آپ ایسے ضرورت مند ہیں کہ جس کی وجہ سے لعنت سے بچ جائیں گے؛ اس لئے قرض لینا جائز نہیں ہے۔

كل قرض جر نفعاً فهو ربا. (طحاوي شريف، ۲/ ۲۲۹)

عن جابرؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، النسخة الهندية، ۲/ ۲۷، بيت الأفكار رقم: ۱۵۹۸، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في آكل الربا ومؤكله، النسخة الهندية ۲/ ۴۷۳، دار السلام رقم: ۳۳۳۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ صفر المظفر ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۷۳۳/۳۷)

سودی قرض لے کر مکان بنانا

سوال [۹۳۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید سرکاری ملازم ہے، جنہیں دس ہزار سات سوستہتر روپیہ نقد تنخواہ ملتی ہے، باقی رقم کٹوتی میں جمع ہو جاتی ہے، کٹوتی میں ماہانہ جمع ہونے والی اس رقم کی سالانہ مقدار تقریباً پچاس ہزار تین سو چھتیس روپئے سالانہ ہے، زید کے یہاں چار اولاد ہیں، دو لڑکے، دو لڑکیاں اور تقریباً سب ہی بالغ ہو چکے ہیں۔ زید کا اپنا کوئی ذاتی مکان نہیں، دونوں میاں بیوی کرایہ کے مکان میں تقریباً بیس سال سے زندگی گزار رہے ہیں، ان حالات میں زید کو مکان خریدنے یا بنانے کے لئے کئی ایجنسیاں لون دینے کی پیشکش کر رہی ہیں؛ لیکن یہ لون سود کے ساتھ دے رہی ہیں، مجموعی مندرجہ حالات میں رہبری فرمائیں کہ کیا اپنا رہائشی مکان خریدنے یا بنانے کے لئے مذکورہ ایجنسیوں سے یہ لون (سود) لیا جا سکتا ہے۔

المستفتی: محمد نسیم ولد محمد شکور، مادھیمک، شکشا بورڈ، راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سودی لون لے کر مکان بنانا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کوشش کر کے بلاسودی قرض لے کر مکان بنانا چاہئے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۱۹۳/۲، جدید زکریا ۳۳۸/۹)

عن جابرؓ قال: لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکل الربا، ومؤکلہ، وکاتبہ، وشاهدیه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، النسخة الهندية، ٢/٢٧، بيت الأفكار رقم: ١٥٩٨، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في آكل الربا ومؤكله، النسخة الهندية ٢/ ٤٧٣، دارالسلام رقم: ٣٣٣٣)

عن فضالة بن عبيد صاحب النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: كل قرض جر منفعة، فهو وجه من وجوه الربا. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، كتاب البيوع، باب كل قرض جر منفعة فهو ربا، دارالفكر ۸/۲۷٦، رقم: ۱۱۰۹۲، كنز العمال، دارالكتب العلمية بيروت ٦/۹۹، رقم: ۱۵۵۱۲)

كل قرض جر نفعًا حرام. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٥/١٦٦، زكريا ۹/۳۹۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ر شوال المکرّم ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/۸۱۶۹)

ہوم لون

سوال [۹۳۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید شیواجی نگر گووندی کے کوردہ جھونپڑ پٹی علاقے میں رہتا ہے، جہاں ہمیشہ پانی کی تکلیف رہتی ہے۔ نیز بچوں کی تعلیم وتربیت کے اعتبار سے یہ علاقہ قطعی سازگار نہیں ہے؛ کیونکہ ماحول بد سے بھی بدتر ہے۔ زید کے پاس دو قطعہ مکان روم ہے، ایک روم میں کارخانہ ہے اور دوسرے میں قیام۔ زید چاہتا ہے کہ موجودہ ناقص علاقہ چھوڑ کر قریب کے کسی ایک فلیٹ میں منتقل ہوجائے، جہاں ماحول اچھا اور تعلیمی ذرائع فراہم اور پانی وغیرہ کی سہولت میسر ہو؛ لیکن فلیٹ کی قیمت فی الحال بارہ لاکھ ہے؛ جبکہ زید کا موجودہ مکان بمشکل چار لاکھ میں فروخت ہوسکتا ہے، باقی ۸ر لاکھ روپیہ بینک سے لون پر لینا پڑے گا، تب ہی فلیٹ خریدا جاسکتا ہے تاکہ بچوں کی پرورش پرداخت، تعلیم وتربیت اسلامی دائرے میں ہوسکے۔

واضح فرمایا جائے کہ از روئے شرع شریف بینک سے لون لے کر فلیٹ خریدنا جائز ہے

یانا جائز؟ نیز یہ واضح رہے کہ قانونی طور پر (اگر کسی طرح کوئی شخص مطلوبہ رقم فراہم بھی کرے تو بلا لون لئے بارہ لاکھ رقم کے یکمشت ہونے پر انکم ٹیکس کی پیچیدگی میں الجھنا ہوگا۔

المستفتی: ریاض احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: فلیٹ خریدنے کے لئے بینک سے سود پر قرض لینا شرعاً ناجائز ہے؛ اس لئے کہ سودی قرض لینے کی صورت میں اپنے اوپر قرض کے ساتھ ساتھ سود کی لعنت مسلط کرنا لازم آئے گا۔ نیز سودی لین دین موجب لعنت ہے، آپ اپنی ضرورت کو خود محسوس کریں۔ کیا آپ کی ضرورت اتنی سخت ضرورت ہے، جس کی وجہ سے سودی قرض لینے کی صورت میں قرض کی لعنت سے بچ سکیں گے، اس کا فیصلہ آپ خود فرمائیں اور قانونی پیچیدگیوں سے بچنے کے لئے ایسا کیا جاسکتا ہے کہ اپنا پیسہ بینک میں رکھا جائے اور سودی قرض لے کر ضرورت پوری کر لی جائے اور اپنے پیسہ پر جو سود ملے گا وہی سود کا پیسہ لون کے سود میں مجریٰ کر دیا جائے اور ایسی شکل اختیار کی جائے جس سے نہ آپ کا سود لینا لازم آئے اور نہ آپ کا سود دینا لازم آئے، معاملہ دونوں جانب سے برابر سرابر ہو جائے، اگر اس طرح کیا جاسکتا ہے، تو کرنے کی گنجائش ہے ورنہ نہیں۔

عن جابرؓ قال: لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکل الربا، ومؤکلہ، وکاتبہ، وشاھدیہ، وقال: ھم سواء. (مسلم شریف، کتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بیت الأفکار رقم:۱۵۹۸، سنن أبي داؤد، کتاب البیوع، باب في آکل الربا ومؤکله، النسخة الهندية ۲/ ۴۷۳، دار السلام رقم: ۳۳۳۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸؍ ۹۲۱۲)

ہوم لون کا شرعی حکم

سوال [۹۳۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سرکاری ملازم کا کوئی ذاتی مکان نہیں، حکومت یا بینک مکان بنانے یا کسی اورضرورت کے لئے قرضہ دیتے ہیں وہ قرضہ تنخواہ سے ماہانہ قسط وار وصول کرتے ہیں، قرضہ مع سود ادا کرنا پڑتا ہے، یہ قرضہ لے کر مکان بنانا یا اپنی ضرورت پر خرچ کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد عادل

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ صورت ناجائز اور ممنوع ہے، اس کے لئے یہ صورت نکالی جاسکتی ہے کہ سود کے ساتھ کل رقم کی ادائے گی کے وقت جو جمع ہوسکتا ہے، پورے مکان کی وہی قیمت لگائی جائے، پھر رقم کی ادائے گی عمل میں لائی جائے، اس صورت میں مکان کی قیمت تو زیادہ تسلیم کی جائے گی؛ لیکن سود لازم نہیں آئے گا، اور اگر یہ صورت نہ بن سکے تو مذکورہ معاملہ جائز نہیں ہوگا۔

لو باع عبداً علی أن یستخدمه البائع شهرا، أو دارا علی أن یسکنها، أو علی أن یقرضه المشتري درهماً، أو علی أن یهدي له هدیة؛ لأنه شرط لایقتضیه العقد وفیه منفعة لأحد المتعاقدین؛ ولأنه نهي عن بیع و سلف.

(هدایة، کتاب البیوع، باب البیع الفاسد اشرفی دیوبند ۳/ ۶۰، مجمع الأنهر، دارالکتب العلمیة بیروت ۳/ ۹۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ربیع الاول ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/ ۱۷۱۴)

نقصان سے بچنے کے لئے لون لینے کا حکم

سوال [۹۳۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک تالاب مچھلیوں کا ہماری ملکیت ہے، چندلوگوں نے دھمکی دی ہے کہ ہم دوائی کے ذریعہ مچھلیاں ختم کردیں گے، اس سے پہلے بھی دوائی ڈالی جاچکی ہے؛ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ لون لے کر قسط ادا کرتے رہیں، اپنے مصرف میں نہ لاویں، لون کا فائدہ یہ ہوگا کہ اگر نقصان ہوتا ہے، تو سرکار سے تلافی ہوجائے گی، اس نیت سے ہم لون لے سکتے ہیں کہ نہیں؟

المستفتی: حافظ محمد طاہر، نگینہ، بجنور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نقصان کی صورت میں حکومت اس کی تلافی کرے گی، اس امید میں لون لینا جائز نہیں ہے، یہ سودی لین دین ہے جس پر سخت وعید آئی ہے۔

عن جابرؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه. الحديث (مسلم شريف، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، النسخة الهندية، ۲/ ۲۷، بيت الأفكار رقم: ۱۵۹۸، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في آكل الربا ومؤكله، النسخة الهندية ۲/ ۴۷۳، دارالسلام رقم: ۳۳۳۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۴۶۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۱۱/۷ھ

جلب منفعت کے لئے بینک سے لون لینا

سوال [۹۳۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سخت ضرورت کے تحت لون لینا کیسا ہے؟ ضرورت مندرجہ ذیل ہے۔

معاشی واقتصادی طور پر کاروبار بند ہوجانا یا کاشتکار کے لئے فصلوں کا ضائع ہوجانا، مکان یا دوکان میں چوری وغیرہ ہوجانا یا رقم کا کھوجانا وغیرہ شکلوں میں روزی ومعاشی حالات کی درستگی کے لئے سود یا لون کا لینا اس سے کاشت کرنا اور کاروبار کرنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عثمان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جلب منفعت یعنی معاش واقتصادی طور پر کاروبار کوفروغ دینے یا کاشتکاری اور دوکان کووسیع کرنے کے لئے لون لینا جائز نہیں ہے۔

(مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۲/۹۳، جدید زکریا ۹/۲۳۸، ایضاح النوادر ۱/۱۰۷)

عن جابر قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه. الحديث (صحيح مسلم، كتاب المساقاة والمزارعة، باب في الربا، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۸، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في آكل الربا ومؤكله، النسخة الهندية ۲/ ۴۷۳، دارالسلام رقم: ۳۳۳۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۴۳۰/۳۴)

قرض کی ایک اسکیم کا حکم

سوال [۹۳۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ''پردھان منتری روزگار یوجنا'' اسکیم کے تحت کم از کم میٹرک پاس نوجوانوں کوکاروبار کرنے کے لئے ایک لاکھ روپئے تک قرض دیا جاتا ہے، جس میں سات ہزار روپیہ سبسڈی کے نام پر معاف ہوتا ہے، اور بینک کو اتنی ہی رقم یعنی سات ہزار سود کے نام پر دینا ہوتا ہے، اس اسکیم کے تحت قرض لینے والے کوفائدہ یہ ہے کہ چار سال میں وہ رقوم لوٹاتا ہے،

جوکہ کاروبار کے جماؤاور ترقی کے لئے ایک موقعہ دیا جاتا ہےاور جتنی رقم اس اسکیم کے تحت ملی اتنی ہی لوٹاتا ہے۔صورت یہ ہے کہ کسی جگہ سے قرض ملنے کی امید نہیں ہے، کیا اس طرح سے قرض لینا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد خالد، جامع مسجد، دھنباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر قرض کی ادائے گی میں برابرسرابر دیتا ہے تو جائز ہے؛ لیکن اگر ادائے گی میں کچھ زائد رقم دینی پڑے تو یہ بلاشبہ ناجائز اور حرام ہے؛ کیونکہ یہ معاملہ سودی ہےاور سودی معاملہ کرنے والوں پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔(مستفاد: فتاوی رحیمیہ ۹/۲۶۵)

عن جابرؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله. الحديث (مسلم شريف، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۸، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في آكل الربا ومؤكله، النسخة الهندية۲/ ۴۷۳، دارالسلام رقم: ۳۳۳۳، سنن الترمذي، باب ماجاء في آكل الربا، النسخة الهندية ۱/۲۲۹، دارالسلام رقم: ۱۲۰۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/رجب المرجب ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/۵۸۴۶)

ٹیکس سے بچنے کے لئے سودی قرض لے کر تجارت کرنے کا حکم

سوال [۹۳۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کوئی شخص اپنے ذاتی پیسے سے تجارت کرتا ہے، تو سرکار اس کی تجارت اور حیثیت پر ٹیکس لگا دیتی ہے، تو ایسی صورت میں اگر بینک سے قرضہ لے کر تجارت کی جاتی ہے،

تو ٹیکس کی بچت ہوجاتی ہے، تو کیا بینک سے قرض لے کر تجارت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ اس قرضہ پر بینک سود بھی لیتا ہے۔ جواب سے مطلع کیجئے گا شکریہ۔

المستفتی: محمد عمران، شیرکوٹ محلّہ، شیرکوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مذکورہ قرض پر سود دینا پڑتا ہے، تو جائز نہیں ہے، اگر چہ اس سے ٹیکس کی بچت کیوں نہ ہو۔ حدیث شریف میں سودی معاملہ کرنے والوں کے لئے سخت لعنت آئی ہے۔ (فتاوی محمودیہ قدیم ۲۰۴/۴، جدید ڈابھیل ۲۸۳/۱۶، ۲۴۱/۴، جدید ڈابھیل ۳۰۲/۱۶)

عن جابرؓ قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم آکل الربا، ومؤکله، وکاتبه، وشاهدیه، وقال: هم سواء. (مسلم شریف، کتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، النسخة الهندیة، ۲/ ۲۷، بیت الأفکار رقم: ۱۵۹۸، سنن أبي داؤد، کتاب البیوع، باب في آکل الربا ومؤکله، النسخة الهندیة ۲/ ۴۷۳، دارالسلام رقم: ۳۳۳۳، سنن الترمذي، باب ماجاء في آکل الربا، النسخة الهندیة ۱/ ۲۲۹، دارالسلام رقم: ۱۲۰۶) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۱۴/ صفر المظفر ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۱۳/۲۴)

سودی قرض لے کر فیکٹری چلانا

سوال [۹۳۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ صورت معاملہ یہ ہے کہ ہماری فیکٹری جو گجرولہ روڈ پر ہے، اس پر حکومت کا لون ہے اور حکومت کی گرفت میں اور بھی جائیداد اس کے عوض میں ہے، فیکٹری

کو چلانے کے لئے مزید اور روپیہ کی ضرورت ہے، اگر ہم حکومت سے قرض نہ لیں اور فیکٹری نہ چلائیں تو ساری جائیداد کے ضبط ہونے کا ڈر ہے، تو ایسی صورت میں ایسی فیکٹری کو جائز طور پر محفوظ کرنے اور بچانے کے لئے حکومت سے قرض لے سکتے ہیں یانہیں؟ اگر فیکٹری چل گئی تو حکومت سے اپنی جائیداد کو بچالیا جا سکتا ہے، حکومت کے علاوہ اور کوئی دینی بھائی قرض حسنہ دینے کی پوزیشن میں نہیں ہے، اور نہ ہی کوئی دینے کو تیار ہے، اس کے علاوہ فیکٹری بیچنے کی کوشش بھی کی جارہی ہے، جس کے اوپر ابھی تک جتنا قرض ہے، اتنا پیسہ نہیں مل رہا ہے، جس کو بیچ کر قرضہ ادا کیا جا سکتا ہو۔ مذکورہ صورت کا دین کی روشنی میں آپ ہمیں شرعی حل سے مطلع فرما کر اجر عظیم کے مستحق ہوں۔

المستفتی: ظفر احمد، محلّہ مانپور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فیکٹری چلانے کے لئے سودی قرض لینا ناجائز اور مستحق لعنت ہے۔ حدیث میں سخت وعید آئی ہے۔

عن جابرؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۸، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في آكل الربا ومؤكله، النسخة الهندية ۲ / ۴۷۳، دارالسلام رقم: ۳۳۳۳، سنن الترمذي، باب ما جاء في آكل الربا، النسخة الهندية ۱ /۲۲۹، دارالسلام رقم: ۱۲۰۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍صفر المظفر ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۱۲۶/۲۶)

حکومت سے رائس مل کے لئے سودی قرض لینا

سوال [۹۳۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سرمایہ دار یا غیر سرمایہ دار کے لئے رائس مل قائم کرنے کی غرض سے حکومت سے سودی قرض لینا جائز ہے یا نہیں؟ ایک مولوی صاحب بڑے تشدد کیساتھ اس طرح سودی قرض لینے کو حرام کہتے ہیں کہ ایسا کرنے والا فاسق معلن ہے، اس کی امامت مکروہ ہے۔ بحوالہ کتب جواب مرحمت فرمائیں؛ کیونکہ بغیر سود دیئے قرض ادا نہیں کیا جاتا ہے، اور سود دینا بھی حرام ہے کیا یہ تشدد درست ہے؟

المستفتی: محمد شفیع، رامپور ٹانڈہ، دولپوری، ٹانڈہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: رائس مل وغیرہ کے لئے حکومت سے سودی قرض لینا شرعاً حرام اور مستحق لعنت ہے۔ مذکورہ مولوی صاحب کا کہنا صحیح ہے۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ سود لینے والے، دینے والے، شاہد بننے والے، اس کا معاملہ لکھنے والے سب مستحق لعنت ہے۔

عن جابرؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍شعبان المعظم ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/۱۹۳۴)

بینک یا بلاک سے لون پر روپیہ لینا

سوال [۹۳۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ بینک یا بلاک سے لون پر روپیہ لینا کیسا ہے؟

المستفتی: قمرالدین، سہرسہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک یا بلاک سے بھی لون پر روپیہ لینا حرام اور موجب وعید ہے۔

عن جابرؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/ ۶۷۸)

بینک سے سودی قرض لے کر تجارت کرنا

سوال [۹۳۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک آدمی انجن کی تجارت کرتا ہے اور دوسرا آدمی اس سے انجن خریدتا ہے، ان دونوں میں ایک انجن کی رقم طے ہو جاتی ہے؛ لیکن خریدار کے پاس فی الحال ادائے گی کے لئے رقم نہیں ہے؛ اس لئے انجن بیچنے والا شخص اس کو بینک میں لیجاکر قرض کی رقم دلاتا ہے اور وہ خود رقم لے کر وہ انجن خریدار کے سپرد کر دیتا ہے۔

اب اس صورت میں انجن فروخت کرنے والا سودی لین دین میں ملوث ہوا یا نہیں؟ یہ معاملہ درست ہوا یا نہیں؟

المستفتی: احمد نبی، ویرپورتھان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں جو صورت لکھی گئی ہے، اس سے

سودی معاملہ اورسودی لین دین میں ملوث ہوجانا لازم آجاتا ہے؛ اس لئے کہ بینک بغیرسود کے کوئی رقم قرض میں نہیں دیتا اور حدیث شریف میں سود لینے والا، دینے والا، اوراس کا حساب وکتاب کرنے والا، اس معاملہ میں گواہ بننے والا سب پرلعنت آئی ہے۔

عـن جـابرؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، النسخة الهندية، ۲/ ۲۷، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍رجب المرجب ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲؍ ۴۹۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷؍۷؍۱۴۱۷ھ

تجارت کوفروغ دینے کے لئے سودی قرض لینا

سوال [۹۳۴۰]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہم لوگ اپنے کاروبار میں سود بالکل نہیں لیتے ہیں؛ لیکن موجودہ زمانہ میں تجارت جاری رکھنے کے لئے بینک سے روپیہ لینے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، اور بینک سے روپیہ حاصل کئے بغیر کاروبارکومزید فروغ دینا ہندوستان میں ممکن نہیں ہے اور جب تک مسلمان معاشی طور پرمضبوط نہیں ہوتا ہے، اس وقت تک یہاں کے نامساعد حالات سے دوچار ہوتا رہے گا؛ کیونکہ جب تک تجارت میں اضافہ نہ ہوگا، مسلمانوں میں ترقی کے مواقع پیدا نہیں ہوسکتے۔

آج ہندوستانی مسلمانوں کا اگر تجارتی میدان میں برادران وطن سے موازنہ کیا جائے، تو یہ حقیقت آشکارہ ہوجائے گی کہ شاید اچھے نمایا کاروباری لوگوں کی فہرست میں کبھی مسلمانوں کا کئی سو افراد کے بعدہی نام آجائے، ایسے ناگفتہ بہ حالات کودیکھتے ہوئے مسلم تاجر اپنے کاروبارکومزیدفروغ دینے کے لئے بینک سے روپیہ سود پرحاصل کرسکتے ہیں؟

اور بینک کوسود دے سکتے ہیں؟ ایسا کرنا جائز ہے؟

المستفتی: عبید الرحمٰن، پرنس روڈ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کاروبار وتجارت وفیکٹریوں کوفروغ دینے کے لئے سودی لین دین ہرگز جائز نہیں؛ اگرچہ برادران وطن کے مقابلہ میں مسلمانوں کے مالی حالات کمزور کیوں نہ ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں تجارت کوفروغ دینے کے لئے سودی کاروبار کی سخت مذمت فرمائی ہے۔

قال اللّٰه تعالی: يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ. [سورة البقر:٢٧٦]

قال اللّٰه تعالیٰ: فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِه.

[سورة البقره:-٢٧٩]

عن جابرؓ قال: لعن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، النسخة الهندية، ٢/ ٢٧، بيت الأفكار رقم:١٥٩٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ رجب المرجب ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۲۹۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴/ ۷/ ۱۴۱۱ھ

کاروبار کے لئے گورنمنٹ سے لون لینا

سوال [۹۳۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ گورنمنٹ سے اپنے کاروبار کے سلسلے میں موجودہ حالات کے پیش نظر مسلمانوں کولون وغیرہ لےکر کاروبار، گاڑی وغیرہ خریدنا جائز ہے یانہیں؟

(۲) حکومت کا پیسہ جو بطور لون لیا گیا ہو اگر اس سے کاروبار، گاڑی وغیرہ خرید لی جائیں؛ لیکن جب تک پیسہ ادا نہ کردیا جاوے سود اور اصل اپنے استعمال میں نہ لایا جائے اور بعد ادائے گی اپنے استعمال وغیرہ میں لایا جائے، تو اس کی گنجائش ہے یا نہیں؟ بینوا وتو جروا۔

المستفتی: محمد عمر قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) گورنمنٹ سے لون پر قرض لینا ایسا سودی کاروبار ہے، جس کو قرآن کریم میں تاکید سے منع کیا گیا ہے۔ اور حدیث شریف میں اس کی لعنت آئی ہے۔

قال الله تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [سورة البقره: ۲۷۵]

عن جابرؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، ۲/ ۲۷)

اس لئے کاروبار وخریداری گاڑی وغیرہ کے لئے سودی قرض لینا ناجائز وموجب لعنت ہے، جب تک کہ سودی قرض ادا ہوتا رہے گا، اس وقت تک لعنت ہوتی رہے گی۔

(۲) سودی قرض سے جو گاڑی وغیرہ خریدی گئی ہے، شرعاً خریدنے والا اس کا مالک ہوجاتا ہے؛ کیونکہ اس میں سود کا پیسہ نہیں لگا ہے؛ بلکہ سود تو قرض لینے والا اپنی گاڑھی کمائی سے دیتا ہے، اس کے حق میں صرف سود دینا حرام اور موجب لعنت ہے۔ نیز سودی قرض ادا ہونے تک مسلسل لعنت ہوتی رہے گی۔

عن جابرؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، النسخة الهندية، ۲/ ۲۷، بيت الأفكار رقم: ۱۵۹۸)

اور گاڑی کا استعمال ومنافع اس کے حق میں جائز رہے گا سودی کاروبار کی لعنت کا حکم علیحدہ ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳ر رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/۱۳۸۲)

تجارت کوفروغ دینے کے لئے حکومت سے سودی قرض لینا

سوال [۹۳۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید ایک کام کرنا چاہتا ہے، جس میں حکومت کے روپئے لگائے بغیر کام نہیں ہوسکتا ہے، زید کی ایک زمین شہر کے باہر ہے، اس زمین پر حکومت لون دے گی، اول تو زید کے پاس اتنا روپیہ نہیں ہے، جو اتنا بڑا کام کر سکے اور اگر فیکٹری لگانے کے لئے ہوتا، تو انکم ٹیکس ودیگر حکومت کے آدمی زید کا پیچھا نہیں چھوڑتے؛ کیونکہ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت کی حکومت ہمارے حق میں نہیں ہے اور زید کا کام ایکسپورٹ کا بھی ہے جو کہ کئی سال سے نہیں چل رہا ہے، پچھلے سال آڈر آیا تھا روپئے کی کمی کی وجہ سے بینک سے روپئے لینا پڑا، مال جانے کے بعد اللہ نے ادائے گی کرادی۔ اب یہ فیکٹری بھی جو مال بنائے گی، اس کا ایکسپورٹ بھی ہوگا اور ہندوستان میں بھی مال سپلائی ہوگا؛ لہٰذا اس بارے میں آپ سے عرض ہے کہ آپ مجھے برائے مہربانی بتائیں کہ حکومت کے بغیر تعاون کیسے کام ہو؟ میری رب العزت سے دعا ہے کہ اس کام کے بعد گورنمنٹ سے نہ لینا پڑے۔

المستفتی: اشتیاق احمد، محلّہ پیرزادہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حکومت سے لون پر قرض لینا ایک سودی کاروبار ہے، اور فیکٹری لگانا اور ایکسپورٹ کرنا یہ تجارت کو فروغ دینا ہے اور تجارت کو فروغ

دینے کے لئے بینک وغیرہ سے سودی قرض لینا شرعی طور پر جائز نہیں ہے۔

عن جابرؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، النسخة الهندية، ٢/٢٧، بيت الأفكار رقم: ١٥٩٨)

اگر آپ سودی معاملہ سے محفوظ رہ کر تجارت کرنا چاہتے ہیں اور بڑی تجارت حکومت کی سودی مدد کے بغیر نہیں ہوسکتی ہے، تو چھوٹی تجارت کیجئے جس میں سودی قرض کی ضرورت نہ ہو اور اگر آپ نے سودی قرض لے کر فیکٹری لگا لی ہے، تو جب تک سودی قرض ادا نہ ہوگا گناہ ہوتا رہے گا اور ادائے گی کے بعد گناہ کا سلسلہ ختم ہوسکتا ہے اور چونکہ سود آپ نے لیا نہیں؛ بلکہ اپنے جائز مال سے دیا ہے؛ اس لئے آپ کا موجودہ سارا مال پاک اور حلال ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۶؍ ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸؍ ۲۹۴۰)	۲۶؍ ۱۲؍ ۱۴۱۲ھ

سرکار سے قرض لے کر تجارت کرنا

سوال [۹۳۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید ایک اسلامیہ ہائی اسکول (پرائیویٹ) میں ملازمت کرتا ہے، اور ایک مسجد میں امامت کے فرائض انجام دے رہا ہے، جس کی کل آمدنی تقریباً ساڑھے چار ہزار روپیہ ماہانہ ہے، رہائش کے لئے منجانب مسجد ایک کمرہ ہے، جس میں مع تین بچوں کے انتہائی پریشانی کے ساتھ زندگی گذار رہا ہے، ایسی صورت میں ارادہ یہ ہے کہ اگر کچھ پیسوں کا انتظام ہوجائے تو تجارت کرلے اور پیسوں کے انتظام کی کہیں سے کوئی شکل نہیں ہے، سوائے ایک

اسکیم کے تحت گورنمنٹ سے ایک لاکھ قرض مل رہا ہے، جس میں تقریباً پندرہ فیصد چھوٹ ہے، اس کو لے کر تجارت کی جاسکتی ہے؟ کیا ان صورتوں میں گنجائش ہے کہ قرض لے کر پیشۂ تجارت بھی کیا جاسکے تاکہ بفضلہٖ تعالیٰ کچھ پریشانیوں میں کمی واقع ہو۔

المستفتی: ظہیرالدین، قاسمی،

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آمدنی کی تنگی اور خرچ پورا نہ ہونے کی پریشانی کی وجہ سے سوال نامہ میں ذکر کردہ اسکیم کے تحت گورنمنٹ سے قرض لے لیا جائے، تو اگر اس قرض پر پندرہ فیصد چھوٹ کی وجہ سے سود دینا نہ پڑے، تو بلاشبہ قرض لے کر تجارت کرنا جائز اور درست ہے؛ لیکن اگر اس قرض پر سود بھی دینا پڑ جائے تو حدیث پاک میں سود لینے والے، سود دینے والے، سودی معاہدہ لکھنے والے اور اس معاملہ کے گواہ بننے والے سب پر لعنت آئی ہے؛ لیکن سنگین ضرورت اور بال بچوں کے فاقہ کی وجہ سے مجبوراً سودی قرض لینا پڑ جائے اور بلاسود قرض نہ ملے، تو ایسی صورت میں اللہ کی ذات سے امید کی جاتی ہے کہ ان شاء اللہ لعنت سے حفاظت ہوگی۔ اسی کو ’’الاشباہ والنظائر‘‘ میں ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح. (الأشباہ والنظائر قدیم مطبع دیوبند ١/١٤٩، جدید زکریا ١/٢٦٧)

اور سودی قرض میں سود کھانا لازم نہیں آتا، صرف سود دینا لازم آتا ہے؛ لہٰذا آپ اپنی ضرورت کا خود جائزہ لے لیں کہ آپ کی ضرورت آپ کو کہاں تک مجبور کرتی ہے، جس سے لعنت سے حفاظت ہوسکے۔ ماشاء اللہ آپ خود عالم دین ہیں اپنی ضرورت کو خود سمجھیں۔

(مستفاد: فتاویٰ محمودیہ جدید ڈابھیل ١٦/٣٠٢)

حدیث شریف ملاحظہ فرمائیں۔

عن جابرؓ قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم آکل الربا،

ومؤكله، و كاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، النسخة الهندية، ٢/ ٢٧، بيت الأفكار رقم:١٥٩٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ صفر المظفر ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۴۳۵/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۲/۴ھ

سخت مجبوری میں کیا لون لے کر تجارت کر سکتے ہیں؟

سوال [۹۳۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ پچیس سال پہلے تک ہماری کافی زمین جائیداد تھی؛ لیکن ایک شیعہ پڑوسی سے کچھ نا اتفاقی ہونے پر اس نے ہم پر خطرناک جادو کر دیا، جس سے ہم بہت خطرناک بیماری میں مبتلا ہو گئے، اس کے علاج کے لئے ہم بہت دور دور تک گئے اور اس کے لئے ہمیں اپنی جائیداد فروخت کرنی پڑی، اسی دوران میں نے اپنی تعلیم بھی مکمل کی اور اسی رقم سے کاروبار بھی شروع کیا؛ لیکن اس جادو کی وجہ سے کاروبار میں زبردست نقصان ہوا اور وہ ختم ہو گیا، اس طرح پچیس سال کے عرصہ میں ہماری تمام زمین جائیداد اور مکان سب فروخت ہو گیا اور مزید ستر اسی ہزار روپیہ کے قرض دار بھی ہو گئے ہیں، یعنی اس جادو نے ہمیں مکمل طور پر تباہ و برباد کر دیا۔ اب ہمارے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے؛ حالانکہ علاج کے بعد میری طبیعت میں کافی افاقہ ہوا ہے؛ لیکن میرے والد صاحب کی طبیعت ابھی بھی ناساز ہے، وہ اب نوکری کے بھی قابل نہیں ہیں، ان کی بینائی بھی بہت کمزور ہو گئی ہے، ڈاکٹر نے فوراً آپریشن بتایا ہے؛ لیکن میرے پاس کوئی کاروبار نہیں ہے اور نہ ہی رقم، مجھے اپنے قرض داروں کے قرض بھی ادا کرنے ہیں اور اپنی دیگر پریشانیوں کو بھی دیکھنا ہے؛ حالانکہ پریشانیاں تو اس سے بھی زیادہ ہیں؛ لیکن میں نے آپ کو مختصراً بتایا ہے؛ لہٰذا میں اپنی مارک شیٹ پر بینک سے

لون لے کر کاروبار کرنا چاہتا ہوں، تو کیا ان حالات میں بینک سے لون لینے کی شرع مجھے اجازت دیتی ہے؟

المستفتی: عبداللہ محلّہ تھانہ ٹین مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حسب تحریرسوال جبکہ آپ اس وقت لوگوں کے قرضے ادا کرنے پر قادر نہیں ہیں، تو سوال یہ ہے کہ بینک سے سودی قرض حاصل کرنے کے بعد قرض اور مزید اس کے اوپر سے سود آپ کس طرح ادا کرسکیں گے اور بینک کا قرض کبھی معاف نہیں ہوتا ہے، ساری جائیداد کی قرقی بھی ہوسکتی ہے، قرض کی مصیبت کے ساتھ مزید اپنے اوپر سودی قرض کی لعنت مسلط کرنا لازم آئے گا؛ اس لئے ہم آپ کو مجبوری کی حالت میں بھی سودی قرض لینے کی بات نہیں بتلا سکتے، اس سے بہتر یہی ہے کہ اگر کچھ جائیداد باقی ہے، تو اس میں سے کچھ حصہ فروخت کر کے اپنا کام شروع کرنا چاہئے ۔آپ کی موجودہ صورت میں دنیا میں سودی قرض کا بار لازم آئے گا اور آخرت میں مستحق لعنت قرار دیئے جانے کا خطرہ ہے۔

عن جابرؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶؍ربیع الاول ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۱۹۴/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۳/۷ھ

تجارت کوفروغ دینے کے لئے بینک سے سودی قرض لینا

سوال[۹۳۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ ایک شخص محض اپنے کاروبار کو بڑھانے کی غرض سے بینک سے لون لے کر مشین خریدتا ہے، اوران پر کپڑا بنا کر بیچتا ہے، کاروبار سب حلال ہے، مگر بینک سے لون لے کر کارخانہ بنایا ہے؛ کیونکہ اتنا بڑا قرض کوئی دے نہیں سکتا معلوم یہ کرنا ہے، ایسے شخص کے گھر کا کھانا پینا یا ہدیہ تحفہ لینا یا مسجد مدرسہ کی امداد کرنا یہ شرعاً درست ہے اور کیا جو روپیہ بینک سے لیا ہے، اس روپیہ میں کوئی خبث ہے یا اس شخص کا سود دینا ہی حرام ہے؟ شرعاً جو حکم ہو واضح فرمائیں۔

المستفتی: عبدالرشید، سیڑھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس نے سرکار سے لون کے طور پر قرض لیا ہے، اور مدیون جو قرض میں پیسہ لیتا ہے، تو قرض کا رأس المال حلال ہوتا ہے؛ لہٰذا اس پیسہ سے مشین خریدنا اور اس مشین سے کپڑے بنا کر بیچنا، اس سے تجارتی نفع حاصل کرنا یہ سب جائز اور حلال ہے، اور اس حلال مال کے ذریعہ وہ شخص جو بھی سود اور بیاج کے نام سے سرکار کو قرض پر اضافی سود ادا کرے گا، وہ باعث لعنت ہے، تو معلوم ہوا کہ اس تجارت میں حرام مال شامل نہیں ہوا؛ بلکہ اپنی محنت کے حلال پیسہ سے سود ادا کیا ہے یا ادا کرے گا؛ لہٰذا اس کے گھر کا کھانا پینا حلال ہے اور اس کا ہدیہ، تحفہ بھی بلاشبہ حلال ہے؛ کیونکہ اس نے سود دیا ہے لیا نہیں ہے۔

(مستفاد: امداد الفتاوی ۳/۱۷۰)

رجل أهدى إلي رجل شيئًا، أو أضافه، إن كان غالب ماله الحلال فلابأس به. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الثاني عشر في الهدايا والضيافات، زكريا قديم ٥/٣٤٢، جديد ٥/٣٩٦، تاتارخانية، زكريا ١٨/١٧٥، رقم: ٢٨٤٠٥، المحيط البرهاني، المجلس العلمي بيروت ٨/٧٣، رقم: ٩٦١٧، البناية، اشرفيه ديو بند ١٢/٢٠٩، مجمع الأنهر مصري قديم٢/٥٢٩، جديد دارالكتب العلمية بيروت ٤/١٨٦-١٨٧) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/ذی الحجہ ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/ ۱۱۷۰۱)

تجارت کے لئے لئے گئے سودی قرض سے خانگی ضرورت پوری کرنے کا حکم

سوال [۹۳۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں اپنے کاروبار کو بینک کے روپیہ کے ذریعہ کرتا ہوں اور جملہ مصارف بھی اسی کاروبار سے پورا کرتا ہوں، مثلاً زکوۃ، خیرات، صدقات، عطیات وغیرہ۔

نیز خانگی ضروریات بھی اسی کاروبار سے وابستہ ہیں اور اسی بینک کا قرضدار بھی ہوں اور واپسی کی استطاعت بھی نہیں رکھتا ہوں۔

غورطلب مسئلہ یہ ہے کہ اس صورت حال میں ایک کاروبار سے مذکورہ جملہ مصارف کی ادائے گی شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اور ہمارے اوپر زکوۃ واجب ہے یا نہیں؟ اور میرا کاروبار پیتل کا ہے یعنی دوسرے سے آرڈر لے کر عدد تیار کر کے دیتا ہوں اور اس کے علاوہ میں مزدوری بھی کرتا ہوں یعنی پیتل کے برتن پر پالش کرتا ہوں اور بینک کی نوعیت یہ ہے کہ جو روپیہ یعنی مثلاً ایک لاکھ روپیہ میں نے بینک سے لیا ہے، اس پر سالانہ بینک کو کم وبیش تقریباً بارہ ہزار روپیہ جمع کرتا ہوں۔ اب اس کو ٹیکس کہیں یا سود؟ یہ ہے بینک کی نوعیت۔

المستفتی: راحت جان، گلاب باڑی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال میں مذکورہ معاملہ سودی لین دین پر مشتمل ہے کہ بینک سے سودی قرضہ لے کر کاروبار کیا جاتا ہے، جیسا کہ سوال نامہ کے آخر میں درج ہے اور سودی لین دین مسلمانوں کے لئے قطعاً حرام ہے؛ لہٰذا سود دینے کا فعل حرام ہے، جس پر سخت ترین وعید قرآن وحدیث میں وارد ہوئی ہے؛ لہٰذا جب تک سود دینے کا سلسلہ باقی رہے گا لعنت بھی برابر رہے گی؛ لیکن چونکہ آپ سود لیتے نہیں ہیں؛ اس لئے آپ کا کاروبار اور نفع وغیرہ حرام نہیں ہے۔ آپ کا تمام مال اور کمائی حلال ہے، صرف سود لینے کا

معاملہ حرام ہے؛ اس لئے پوری پونجی پر زکوۃ دینالازم ہے اور دیگر صدقات وخیرات کی ادائے گی اور اس پونجی سے کھانا وغیرہ سب حلال ہے، جہاں تک ہو سکے جلد از جلد بینک کو سودی قرضہ دینے کی ذمہ داری سے آپ کو سبکدوشی حاصل کر لینی چاہئے تاکہ لعنت سے جلد از جلد چھٹکارامل سکے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۰۸، محمودیہ قدیم ۲۴۱/۴، جدید ڈابھیل ۳۰۲/۱۶، امداد الفتاوی ۱۷۰/۳، رحیمیہ قدیم ۱۳۶/۶، جدید زکریا ۲۳۷/۹)

قال الله تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا . [سورة البقره: ۲۷۵]

قال الله تعالى: يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ. [البقره: ۲۷۶]

عن جابرؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم: ۱۵۹۸، مشكوة شريف ۲۴۴)

(۲) زکوۃ آپ پر اس وقت لازم ہوگی؛ جبکہ بینک کا قرضہ ادا کرنے کے بعد آپ نصاب کامل کے مالک ہوں۔

وسببه أي سبب افتراضها ملك نصاب حولي –تام– فارغ عن الدين. (در مختار، كتاب الزكاة، زكريا ۱۷۴/۳، كراچي ۲۵۹/۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/شعبان المعظم ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۸۷۲/۳۵)

روزگار یوجنا کے نام سے لون لے کر حج کرنے اور زکاۃ دینے کا حکم

سوال [۹۳۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید اگر بینک سے ایسا لون لیتا ہے کہ جس کو سرکار نے روزگار یوجنا کے

نام جاری کیا ہے اور زید ضرورت مند بھی ہے، تو یہ لون لینا کیسا ہے؟ اور اس پیسے سے حج کرنا جائز ہے یا نہیں؟

نیز یہ بھی بتلا یئے کہ اس رقم کی زکوۃ نکالے گا یا نہیں؟ اگر زید کو یہ لون مل جاتا ہے، تو وہ رقم بخوبی بہت آسانی کے ساتھ ادا کرسکتا ہے اور اس مال کو اپنے زکوۃ ادا کیے ہوئے مال میں ملا کر کاروبار کرسکتا ہے؟

المستفتی: محمد انس، مرآبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: بلا شرعی واضطراری ضرورت کے لون لینا شرعاً جائز نہیں، اس سے مسلمانوں کو احتراز واجتناب لازم ہے؛ البتہ اگر کسی نے باوجود ممنوع ہونے کے لون لے لیا اور اس کو کاروبار میں لگا کر اتنا سرمایہ جمع کرلیا کہ جس پر حج و زکوۃ فرض ہوجائے، تو اس سے حج کرنا بھی جائز اور زکوۃ دینا بھی درست ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ لون پر جو قرضہ لیا جاتا ہے، اس میں سود کا پیسہ خود اپنے پاس نہیں آتا؛ بلکہ اپنی کمائی سے سود کے نام پر پیسہ جاتا ہے؛ لہٰذا سود دینے کا گناہ اس کے اوپر ہوگا، سود کھانے کا نہیں؛ کیونکہ حدیث شریف میں دونوں سے ممانعت ہے۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ۲۴۲/۴-۲۴۲/۴، جدید ڈابھیل ۳۰۲/۱۶، امداد الفتاوی ۱۷۰/۳)

عن جابرؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، النسخة الهندية، ۲/۲۷، بيت الأفكار رقم: ۱۵۹۸، مشكوة شريف ۲٤٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۱۵۵/۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸/۴/۱۴۲۲ھ

نرسنگ ہوم کھولنے کے لئے سودی قرض لینا

سوال [۹۳۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں سرکار سے قرض یعنی لون لے رہا ہوں، جس پر مجھ کو سود بھی ادا کرنا ہوگا، اور جن ذرائع سے روپیہ قرض کا برآمد ہوگا ان کو رشوت بھی دینی ہوگی، یہ دونوں چیزیں درست ہوں گی یا نہیں؟ مجھکو نرسنگ ہوم کھولنے کے لئے کافی سرمائے کی ضرورت ہوگی، اتنا بڑا سرمایا خود میرے پاس موجود نہیں ہے؛ لہٰذا قرض کی ضرورت درپیش ہے۔

(۲) نرسنگ ہوم چلانے پر جو ڈاکٹر میرے ساتھ تعاون کریں گے، یعنی کسی کو آپریشن کے لئے یا ایکسرے کے لئے روانہ کریں گے، وہ کیش کے طالب ہوں گے، ان کو دینا درست ہوگا یا نہیں؟ شرعی فیصلہ چاہئے۔

(۳) نرسنگ ہوم چلانے پر پوری آمدنی اگر دکھاؤں گا، تو ٹیکس زیادہ لگے گا، آمدنی مجموعی کے اعتبار سے کم ہوجائے گی، ایسی شکل میں کیا پوری آمدنی دکھانا ضروری ہے؛ جبکہ ہمارے لئے ہر طرح سے مشکلات سامنے ہیں، ملازمت میں ہم کو حصہ نہ دیا جائے، روزگار کریں گے تو دقتیں اور مشکلات پیدا کی جائیں، اس سلسلہ میں مسئلہ شرعی کیا ہے؟ بیان فرمائیں تاکہ مجھ کو تسلی ہو اور اپنا کام شروع کروں۔

المستفتی: سہیل احمد خان، ستیہ پریم نگر بارہ بنکی (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) نرسنگ ہوم کھولنے کے لئے سود پر قرض لینا اور سودی قرض حاصل کرنے کے لئے افسران کو رشوت دینا ناجائز اور حرام ہے اور حدیث شریف میں سود دینے والے، سود لینے والے، سودی کاروبار میں گواہ بننے والے سودی حساب وکتاب کرنے والے سب پر لعنت کی گئی ہے؛ اس لئے اپنے کاروبار کو فروغ دینے کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

عن جابرؓ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، النسخة الهندية، ۲/ ۲۷، بيت الأفكار رقم: ۱۵۹۸)

(۲) ان کو دینا آپ کے لئے جائز ہوگا اوران کے لئے لینے کی بھی گنجائش ہے؛ اس لئے کہ یہ ایک قسم کی دلالی ہے اور دلالی کی اجرت کی فقہاء نے گنجائش لکھا ہے۔

سئل عن محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به.

(شامي، كتاب الإجارة، مطلب في أجرة الدلال، زكريا ۹/ ۸۷، كراچي ۶/ ۶۳)

(۳) ٹیکس سے بچنے کے لئے اپنی آمدنی کو چھپانا جائز اور درست ہے، بس شرط یہ ہے کہ عزت کے خطرہ میں پڑنے کا اندیشہ نہ ہو۔

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَة. [البقرہ: ۱۹۵] **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹/ ۳۴۴۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/ ۴/ ۱۴۱۴ھ

مستحق زکوۃ مقروض کا سودی رقم سے قرض ادا کرنا

سوال [۹۳۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید صاحب نصاب تھا، ہر سال اپنے مال کی زکوۃ ادا کرتا تھا؛ لیکن اب وہ تقریباً پندرہ بیس ہزار روپیہ کا مقروض ہے اور مستحق زکوۃ ہے، زید کے پاس سود کی رقم تقریباً دس ہزار روپئے ہیں، کوئی مستحق زکوۃ نہ ملنے کی وجہ سے زید بلانیت ثواب نہ دے پایا۔

اب زید خود مستحق زکوۃ بن گیا ہے، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا وہ سود کی رقم بلانیت ثواب خود استعمال کرسکتا ہے اور اپنا قرض ادا کرسکتا ہے؟

(۲) اوراگراس رقم سے ہی قرض ادا کردے،تو اس کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: ضیاء الرحمٰن بن امیر الدین، ساکن تبوکھر، پوسٹ: باراہاٹ، بانکا، بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سود کی رقم بلانیت ثواب فقراء پر تقسیم کردینا لازم ہے،اس رقم کو اپنی ذات میں استعمال کرنا یا کسی ایسے کام میں استعمال کرنا جس کا نفع اسی شخص کو پہونچ رہا ہو جائز نہیں ہے؛ ہاں البتہ اگر یہ بات صحیح ہے، جو سوال نامہ میں زید نے اپنے فقیر اور محتاج ہونے کا اظہار کیا ہے اور اوپر سے مقروض ہونے کو ثابت کیا ہے، تو اگر واقعہ ایسا ہی ہے کہ زید خود مستحق زکوۃ بن گیا ہے اور اتنا قرضہ اس کے اوپر آچکا ہے، جس کی ادائے گی اپنی کمائی کے پیسہ سے دشوار کن ہے، تو مذکورہ سود کے پیسہ سے قرضہ ادا کرنے کی گنجائش ہے۔

والحيلة لمن ليس معه إلا مال حرام أو فيه شبهة أن يستدين للحج من مال حلال ليس فيه شبهة ويحج به ثم ليقضي دينه من ماله. (غنية قديم /۸، جديد اشرفيه ديوبند ۲۱، الخانية على هامش الهندية، كتاب الحج، فصل في المقطعات، زكريا جديد ۱/ ۱۹۱، وعلى هامش الهندية، زكريا ۱/ ۳۱۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۱۸؍ربیع الاول ۱۴۲۸ھ

(فتویٰ نمبر: الف ۳۸؍۹۲۲۶)

سودی رقم قرض میں دینے کا شرعی حکم

سوال[۹۳۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کوئی شخص ایسا کرے کہ مثلاً پانچ ہزار روپیہ بینک میں جمع کرا کے اس پانچ ہزار پر جو سود ملے اس سود کو اپنے قرضہ میں دیتا رہے، تو یہ درست ہوگا؟

المستفتی: عبداللہ، مقبرہ دوئم، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اس طریقہ سے ملے ہوئے سود سے اپنے قرض کی ادائے گی جائز نہیں۔ غریب ونادار پر بلانیت ثواب صدقہ کردینا واجب اور ضروری ہے۔

أما إذا كانت عند رجل مال خبيث......فليس له حيلة إلا أن يدفع الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مصري ١/١٤٨، يحيٰ، سهارنپور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث ٥٩)

صرح الحنفية، بأنه إذامات الرجل وكسبه خبيث......فالأولىٰ لورثته أن يرد المال إلى أربابه، فإن لم يعرفوا أربابه تصدقوا به؛ لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه. (الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/ ٢٤٦، شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٦/٣٨٥، زكريا ٩/٥٥٣، البحر الرائق، كوئٹه ٨/٢٠١، زكريا ٩/٣٦٩، هندية، زكريا قديم ٥/٥٤٩، جديد ٥/٤٠٤، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا٧/ ٦٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ رجمادی الاولیٰ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰۲۲/۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۵/۲۴ھ

۲۸/ کتاب الدیون

قرض دار کی روح معلق رہتی ہے

سوال [۹۳۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قرض دار کی نماز جنازہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض ادا نہ ہونے کی صورت میں نہیں پڑھائی ہے، یہ بات روایات سے ثابت ہے، اس امر کی وضاحت کتاب اللہ اور سنت کی روشنی میں کر دیں کہ قرض دار کے انتقال کے بعد قرض ادا نہ ہونے کی صورت میں کیا اس کی روح معلق رہتی ہے، جواب سے آ گاہ فرمائیں؟

المستفتی: محمد حنیف نو یدا ندرا چوک، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفیق: جی ہاں حدیث شریف سے یہ بھی ثابت ہے کہ قرض دار کے انتقال کے بعد جب تک اس کا قرض ادا نہیں ہوتا ہے، اس وقت تک اس کی روح کی نجات معلق رہتی ہے۔ حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: نفس المؤمن معلقة بدينه حتى يقضى عنه. (ابن ماجة، باب التشديد في الدين، النسخة الهندية ۲/ ۱۷۴، دارالسلام، رقم: ۲۴۱۳، سنن الترمذي، باب ماجاء عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: نفس المومن معلقة بدينه حتى يقضى عنه، النسخة

الهندية ١/ ٢٠٦، دارالسلام، رقم: ١٠٧٨، ١٠٧٩، مسند أبي داؤد الطيالسي، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٧٠٩، رقم: ٢٥١٢، مسند أبي يعلى الموصلي، دارالكتب العلمية بيروت ٥/ ٢٤٥، ٣٠٨، رقم: ٥٨٧٢، ٦٠٠٠)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– عن النبي ﷺ قال: لا تزال نفس ابن آدم معلقة بدينه حتى يقضي عنه. (مسند أحمد بن حنبل ٢/ ٥٠٨، رقم: ١٠٦٠٧، ٢/ ٤٤٠، رقم: ٩٦٧٧)

عن محمد بن عبدالله بن جحش قال: كنا جلوسا بفناء المسجد حيث توضع الجنائز ورسول الله صلى الله عليه وسلم جالس بين ظهرينا –إلى قوله– والذي نفس محمد بيده لو أن رجلا قتل في سبيل الله ثم عاش، ثم قتل في سبيل الله، ثم عاش، ثم قتل في سبيل الله، ثم عاش وعليه دين ما دخل الجنة حتى يقضي دينه. (مسند أحمد ٥/ ٢٨٩، ٢٩٠، رقم: ٢٢٨٦٠، سنن النسائي، التغليظ في الدين، النسخة الهندية ٢/ ٢٠٢، دارالسلام، رقم: ٤٦٨٤، المستدرك للحاكم، كتاب البيوع، مكتبة نزار مصطفى الباز جديد ٣/ ٨٣٩، قديم ٢/ ٢٥، رقم: ٢٢١٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۱۴۴)

قرض لینے کی شرط پر قرض دینا

سوال [۹۳۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں چند کپڑے کے تاجر ایسا کرتے ہیں کہ جب سورت سے ایک ساتھی مال لینے جاتا ہے، تو وہ اپنے دوسرے ساتھی سے ایک لاکھ روپئے قرض لیتا ہے اور یہ دینے والا

ساتھی اس شرط کے ساتھ ایک لاکھ روپے قرض دیتا ہے کہ جب میں مال لینے جاؤں گا تو میرے اصلی روپئے تو آپ کو دینا ہی ہے، ایک لاکھ روپئے مجھے بھی قرض دینا ہے، دونوں اس طرح کے قرض کے لینے دینے پر رضا مند ہیں۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا اس شرط پر قرض دینا کہ آپ بھی مجھے قرض دیں گے یہ صحیح ہے یا ''کل قرض جر نفعا'' کے تحت آئے گا؟

المستفتی: عبدالرشید قاسمی، سیڑھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس شرط کے ساتھ قرض دینا جائز نہیں ہے کہ قرض لینے والا بھی اس کو قرض دے گا، اس طرح کے معاملات سے حضور ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

ذكر عبدالله بن عمر أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل سلف وبيع، ولا شرطان في بيع ولا ربح مالم يضمن، ولا بيع ما ليس عندك، وهذا حديث حسن صحيح. قال إسحاق بن منصور: قلت لأحمد: ما معنى نهى عن سلف وبيع، قال: أن يكون يقرضه قرضا، ثم يبايعه عليه بيعا يزداد عليه، ويحتمل أن يكون يسلف إليه في شيء. (سنن الترمذي، باب ماجاء في كراهية بيع ما ليس عندك، النسخة الهندية ١/ ٢٣٣، دارالسلام، رقم: ١٢٣٤)

قال الموفق في المغني: وكل قرض شرط فيه -إلى قوله- وإن شرط أن يوجر داره أو يبيعه شيئا، أو أن يقرضه المقترض مرة أخرى لم يجز؛ لأن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن بيع وسلف. (إعلاء السنن، كتاب الحوالة، باب كل قرض جر منفعة فهو ربا، دارالكتب العلمية بيروت ١٤/ ٥٦٦، كراچی ١٤/ ٤٩٩، تحت رقم الحديث: ٤٨٥٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۹۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۵/۱۳ھ

تاخیر کی بنا پر اصل رقم سے زائد رقم لینا

سوال [۹۳۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: حامد نے محمود سے ایک مہینے کی مدت کے وعدے پر پانچ ہزار روپے کا مال ادھار لیا؛ لیکن مقررہ مدت پر پیسے ادا نہیں کرسکا اور چار پانچ روز تاخیر سے محمود کے پاس گیا اور اس سے یوں کہا کہ میرا مال ابھی بکا نہیں؛ اس لئے تم مجھے اور ایک مہینے کی مدت تک مہلت دے دو میں تم کو پورے پورے پیسے ادا کردوں گا، محمود نے کہا کہ ٹھیک ہے؛ لیکن میں نے جو تم کو پانچ ہزار روپئے کا مال دیا ہے، اس پر میں نے تم سے تین سو روپئے کمالیا ہے، اب اگر تم ایک مہینے کی مدت اور چاہتے ہو تو تم کو پانچ ہزار تین سو روپئے دینا پڑے گا، اس بات کو حامد نے قبول بھی کرلیا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ یہ جو محمود حامد سے دوسرے مہینے کی مدت پر تین سو روپئے لے رہا ہے، کیا وہ سود ہے؟

المستفتی: شیخ قاسم شیخ فرید مؤذن مبارک مسجد مقام ارنی، ضلع ایوت محل، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حامد کو اپنے وعدہ کے مطابق محمود کو پیسہ ادا کردینا چاہئے تھا؛ لیکن حامد جب وقت مقررہ پر رقم محمود کو نہ دے سکا تو محمود کو ایک مہینے کی تاخیر پر اصل رقم سے تین سو روپئے زائد لینے کا حق نہیں ہے۔ اور نہ حامد کے لئے دینا جائز ہے؛ کیوں کہ یہ سود ہے، جس کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے۔

﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾. [البقرة: ۲۷]

عن فضالة بن عبيد صاحب النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: كل قرض جر منفعة، فهو وجه من وجوه الربا. (السنن الكبرى للبيهقي، البيوع، باب كل قرض جر نفعا، دارالفكر ۸/ ۲۷۶، رقم: ۱۱۰۹۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۱۱۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶/ ۶/ ۱۴۲۴ھ

دائن کا مدیون کی دعوت قبول کرنا یا ہدیہ لینا

سوال [۹۳۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قرض دینے والا شخص کا قرض دار کی کوئی چیز ہدیۃً قبول کرنا یا ان کی دعوت پر کھانا پینا وغیرہ کرنا اس میں شرعاً کوئی ممانعت ہے یا جائز ہے؟

المستفتی: احقر مسیح الرحمٰن قاسمی غفرلہ جڑیاں بازار نج نج، ۲۴/ پرگنہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قرض دینے والے شخص کو قرض دار سے ہدایا قبول کرنا اور اس کے یہاں کھانا، پینا جائز نہیں؛ لیکن اگر دونوں کے درمیان پہلے سے اسی طرح کے تعلقات تھے، تو حسب سابق اس طرح کھانے پینے اور لین دین کرنے کی گنجائش ہے۔

عن يحيى بن أبي إسحاق الهنائي، قال: سألت أنس بن مالك الرجل منا يقرض أخاه المال، فيهدي له؟ قال: قال رسول الله ﷺ: إذا أقرض أحدكم قرضا، فأهدى له، أو حمله على الدابة، فلا يركبها، ولا يقبله، إلا أن يكون جرى بينه وبينه قبل ذلك. (سنن ابن ماجة، الصدقات، باب القرض، النسخة الهندية ۲/ ۱۷۵، دارالسلام، رقم: ۲۴۳۲، السنن الكبرى للبيهقي، البيوع، باب كل قرض جر منفعة، فهو ربا۔ دار الفكر ۸/ ۲۷۷، رقم: ۱۱۰۹۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ رجب ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۲۹۱)

سبسڈی کا شرعی حکم

سوال [۹۳۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: آج کل حکومت نے اقتصادی ترقی کے لئے جونیر ہائی اسکول کی مارک شیٹ پر اقتصادی ومعاشی سدھاراور عوام کی بے روزگاری اور پریشان حالی دور کرنے کے لئے یہ اسکیم نکالی ہے: کہ ایک یا دولا کھ روپئے سرکار سے لون کے طریقہ پرلواور اس سے اپنا روزگار چلاؤ، اور جورقم ہم سے لوگے تو ہم ایک لاکھ پر -/25,000 ہزار روپئے کی سبسڈی دیں گے۔ تواب اس صورت میں لون کی رقم اگر کسی شخص نے ایک لاکھ روپئے کی لی اور اس پر -/25,000 ہزار روپئے کا سود بنتا ہے اور -/25,000 ہزار روپئے کی سبسڈی دے کر سرکار قسطوں میں باندھ کر پوری پوری رقم ادا کرالے اور جورقم ایک لاکھ دی تھی اس سے نہ زیادہ ہو نہ کم پوری پوری لے لے، تو کیا ایسی صورت میں جونیر ہائی اسکول کی مارک شیٹ پر لون لے کر اپنے استعمال میں اور کاروبار میں خرچ کرسکتا ہے یا نہیں؟ مفصل جواب سے نوازیں۔

المستفتی: محمد سلیم کاشی پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: -/25,000 ہزار روپئے لون اور -/25,000 ہزار روپئے ''سبسڈی'' دونوں مل کر برابر سرابر ہوگیا اور بالآخر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس معاملہ میں نہ سود لیا جارہا ہے اور نہ دیا جارہا ہے؛ بلکہ حقیقت میں سرکار کو اتنا ہی واپس کرنا ہے، جتنا سرکار سے قرض لیا تھا؛ اس لئے اس کو سودی قرض کے دائرے میں داخل نہیں کیا جائے گا؛ لہٰذا ایسا قرض لینا درست اور جائز ہے اور یہ قرض حسنہ کے درجہ میں ہے۔ اور قرض حسنہ جائز ہے۔

(مستفاد: فتاوی رحیمیہ ۹/۲۳۳، جدید زکریا ۹/۲۳۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ ذیقعدہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۸۱۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۱۱/۵ھ

حکومت کی گرفت سے بچنے کے لئے بینک سے قرض لینے سے متعلق چند سوالات کے جوابات

سوال [۹۳۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: آج کل فی زمانہ کوئی بھی تاجر خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کا واسطہ بینک سے ہوتا ہی ہے، بعض دفعہ اپنے پاس رقم ہونے کے باوجود بینک سے قرض لینے کی ضرورت پیش آتی ہے، اگر ایسا نہ کیا جائے تو حکومت کی جانب سے سوال ہوتا ہے کہ روپئے کہاں سے آئے اب حساب پیش کرو جرمانہ ادا کرو؛ اس لئے اپنے پاس حسب ضرورت روپئے ہوتے ہوئے حکومت کی گرفت سے بچنے کے لئے بینک سے قرض لیا جاتا ہے اور بینک نقد رقم کبھی نہیں دیتا؛ بلکہ وہ ہمارے نام پر اپنے پاس جمع رکھتا ہے، جس کو ''سی،سی'' کہتے ہیں، جب ہم اپنی ضرورت کی کوئی بھی چیز خریدیں تو اس کے بدلہ چیک دیں گے، پھر وہ یعنی بینک حامل چیک کو نقد کی ضرورت ہو تو نقد ادا کرتا ہے یا اس کا بینک میں کھاتہ ہو وہیں رقم جمع بھی کر لیتا ہے، بہرحال حامل چیک کی مرضی کے مطابق عمل درآمد ہوتا ہے، مگر کسی بھی صورت میں مستقرض کو نقد رقم بینک نہیں دیتا اس میں چند دشواریاں پیش آتی ہیں، مثلاً زید کو ایک مشین خریدنی ہے وہ بازار سے نہیں خریدتا؛ بلکہ کسی شخص کی ذاتی مشین خریدتا ہے، بائع نقد روپئے چاہتا ہے، چیک سے ادائے گی نہیں چاہتا ادھر بینک رقم مشتری کو نہیں دیتا ایسی صورت میں وہ کسی اور دوکاندار کے نام پر چیک دیتا ہے اور اس دوکاندار سے طے کیا جاتا ہے کہ چیک کیش کروا کر مجھے ادا کر دو تو اس عمل کے عوض میں دوکاندار ڈیڑھ فیصد وصول کرتا ہے، اس کا کام صرف اتنا ہوتا ہے کہ مثلاً زید نے چیک بکر کے فرم کے نام دیا تو بکر چیک بینک میں داخل کر کے نقد حاصل کرتا ہے اور رقم لا کر اصل شخص کے حوالہ کرتا ہے، اس کے عوض میں ڈیڑھ فیصد یا ۲/ فیصد لیتا ہے، بکر کا کہنا ہے کہ مجھے اپنے فرم کا بل دینا ہے، اس کے عوض حکومت کو سیل ٹیکس دینا ہوتا ہے اور حساب وکتاب درست کرنا ہے، اس عمل کے عوض یہ رقم لی جاتی ہے کیا اس شخص کا یہ ڈیڑھ یا ۲/ فیصد لینا جائز ہے یا نہیں؟

(۱) بکر کا اس طرح ڈیڑھ یا ۲/ فیصد لینا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) یہ عمل بینک کو دھوکہ دینا ہوا یا نہیں؟

(۳) بعض دفعہ فرم کا بل پیش کیا جاتا ہے، مگر جو شئ بل میں درج ہے وہ نہیں خریدی جاتی؛

بلکہ دوسری چیز خریدی جاتی ہے، بعض مصالح ذاتیہ کی بنا پر اصل شئ کا اظہار نہیں کیا جاتا، ایسا کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

(۴) بعض دفعہ اپنی ہی رقم دوسروں کو دے کر واپس لی جاتی ہے، تاکہ وہ رقم حکومت کی نظر میں آجائے، جواب تک حکومت کی نظر میں نہیں تھی، اگرچہ وہ شرعاً حرام کمائی نہیں ہے، مثلاً زید کے پاس ڈیڑھ لاکھ روپئے حلال و پاک کمائی کے موجود ہیں، مگر حکومت اس رقم سے بے خبر ہے؛ اس لئے زید مذکورہ رقم کو بغیر حیلے کے اپنے بیوپار میں نہیں لگا سکتا ہے؛ اس لئے زید یہ حیلہ کرتا ہے کہ بکر سے اس کا کارخانہ خرید لیا بتاتا ہے، حالانکہ درحقیقت خریدتا نہیں ہے؛ بلکہ اس طرح کا بہانا بنا کر ڈیڑھ لاکھ روپئے بکر کو دیتا ہے، جس میں سے بکر ۲ر فیصد کمیشن لے کر باقی رقم زید کو واپس کر دیتا ہے، اب وہ کارخانہ جو حقیقت میں بکر کا ہے، زید حکومت کو اپنا بتا کر اس میں بننے والی اشیاء کی فروخت پر نفع بتلا کر اپنی پوشیدہ رقم کو بازار میں لاتا ہے، گویا اپنی رقم کی زید تبییض کرتا ہے، جس کے عوض میں مبیض بکر کو کمیشن دینا ہوتا ہے، اگر بکر کو کمیشن نہ دیا جائے تو پوری رقم بمد تسوید ہی رہتی ہے، جس پر چھاپہ مار کر حکومت کسی بھی وقت اپنے قبضے میں لے سکتی ہے؛ اس لئے دونوں ایسا عمل کرنے پر مجبور ہیں، یہ عمل شرعاً درست ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب مسلمانوں کے مال پر جبری قبضہ کا خطرہ ہو تو اس کو کسی بھی حیلہ سے حفاظت کرنے کی اجازت ہے؛ لہٰذا روپیوں کو نمبر ایک بنانے کے لئے سوال نامہ میں جو شکل لکھی گئی ہے، اس میں تھوڑی سی ترمیم کے بعد وہ شکل شرعاً جائز ہو جائے گی کہ بکر کو سیل ٹیکس ادا کرنے کے لئے فیصد کا حساب لگا کر دینا تو جائز ہے؛ اس لئے کہ خود سیل ٹیکس فیصد کے حساب سے ہی ادا کیا جاتا ہے، مگر بکر کو جو اجرت دی جاتی ہے وہ فیصد کے حساب سے دینا جائز نہ ہوگا؛ بلکہ اجرت کے لئے ایک رقم پہلے ہی متعین کر لی جائے وہی رقم اجرت میں دی جائے تو جائز ہو سکتا ہے، اگر بکر فیصدی اجرت کے بغیر کسی طرح تیار نہیں ہے، تو بکر کے لئے فیصدی اجرت لینا جائز نہیں اور دینے والے کے لئے دینا جائز ہے۔

ما حرم أخذه حرم إعطاء ه –إلی قوله– إلا في مسائل الرشوة لخوف ماله أو نفسه أو لیسوی أمره عند سلطان أو أمیر. (الأشباه، قدیم ۲۲۹)

(۲) اپنے مال کی حفاظت کے لئے اس طرح حیلہ اختیار کرنا جائز ہے۔

(۳) مال کی حفاظت کے لئے اس کی گنجائش ہے، مگر اس کا لحاظ رکھا جائے کہ کہیں حکومت کی گرفت میں نہ آ جائیں، اگر حکومت کی گرفت میں آنے کا خطرہ ہو تو جائز نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا:

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ. [البقرة: ۱۹۵]

(۴) اگر ایسا کرنے سے مال کی حفاظت ہو جاتی ہے، خطرہ ختم ہو جاتا ہے، تو صرف سیل ٹیکس کی مقدار میں فیصد متعین کرنے کی گنجائش ہے اور اس سے زائد جو اس عمل کے کرنے والے کو ملتا ہے اس میں فیصدی کا حساب جائز نہیں؛ بلکہ یکمشت متعین کرنا چاہئے کہ مثلاً آپ کو اتنی رقم دوں گا اور یہ عمل آپ کو کرنا ہے، تب جائز ہو سکتا ہے؛ کیوں کہ اجارہ میں اجرت کا متعین ہونا لازم ہوتا ہے۔

منها: أن تکون الأجرة معلومة. (هندیة، کتاب الإجارة، الباب الأول زکریا جدید ٤/ ٤٤١، قدیم ٤/ ٤١١)

ولا یصح حتی تکون المنافع معلومة، والأجرة معلومة. (هدایة، کتاب الإجارات، اشرفی ۳/ ۲۹۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۵۶۲)

دسواں وغیرہ منانے کے لئے قرض لینے دینے کا شرعی حکم

سوال [۹۳۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید اپنے والد صاحب کے انتقال پر تیجہ، دسواں، بیسواں، چالیسواں وغیرہ کرنا چاہتا

ہے، کیا یہ رسومات شریعت مطہرہ سے ثابت ہیں؟ زید وسعت نہ رکھنے کی بنا پر یہ سب رسومات قرض لے کرادا کرتا ہے، کیا قرض دینے والا قرض دینے کی بنا پر گنہگار ہوگا؟ تیجہ، دسواں، بیسواں، چالیسواں کرنے پر کونسا گناہ لازم آتا ہے؟

المستفتی: محمد ابراہیم، انوارالقرآن شکارپور، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تیجہ، دسواں، بیسواں، چالیسواں یہ سب رسومات نہ تو حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اور نہ ہی تابعین وتبع تابعین میں سے کسی سے ثابت ہیں؛ بلکہ حضرات فقہاء کرام نے ان کو بدعت قبیحہ فرمایا ہے، ان کی شریعت مطہرہ میں کوئی اصل نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ ۱۰/ ۳۹۴-۳۵۰، جدید زکریا ۲/ ۱۹۹-۲۰۲، فتاوی محمودیہ ۶/ ۱۴۵، جدید ڈابھیل ۳/ ۸۸، ۱۵/ ۴۰۸)

ویکره اتخاذ الطعام في اليوم الأول، والثالث، وبعد الأسبوع.
(طحطاوي مع المراقي، قديم ۳۳۹، دارالكتاب ديوبند جديد ۶۱۷)

ويكره الضيافة من أهل الميت؛ لأنها شرعت في السرور لا في الشرور، وهي بدعة مستقبحة. (مراقي الفلاح على الطحطاوي، قديم ۳۳۹، دارالكتاب ديوبند جديد ۶۱۷-۶۱۸، شامي، مطلب في كراهية الضيافة من أهل الميت، زكريا ۳/ ۱۴۸، كراچی ۲/ ۲۴۰، بزازية، زكريا جديد ۳/ ۲۱۶، وعلى هامش الهندية ۶/ ۳۷۹)

اور قرض لے کر اس طرح کی بدعات کو اختیار کرنا تو اور بڑا جرم ہے، ایسے مواقع پر قرض نہ دینا ہی بہتر ہے، تاکہ اعانت علی المعصیۃ لازم نہ آئے اور قرآن کریم میں اعانت علی المعصیۃ سے منع فرمایا گیا ہے:

وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة: ۲]

تیجہ، دسواں، بیسواں وغیرہ چونکہ بدعت قبیحہ ہیں، ان کے ارتکاب سے گناہ کبیرہ لازم آتا ہے، چنانچہ مجالس ابرار میں بدعت کی شناعت اور قباحت کے متعلق لکھا ہے:

البدعة شر من الفسق، فإن من يفعل البدعة فهو ينقض الرسول.

(مجالس الأبرار، مجلس نمبر: ١٨، ص: ١٢٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٦؍رجب ١٤٢١ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٥/ ٦٨٣٦)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٦/٧/١٤٢١ھ

قرض دینے والا غائب ہوجائے تو قرض کیسے ادا کریں؟

سوال [٩٣٥٨]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید پاکستان کا رہنے والا ہے، تقسیم ہند وپاک سے قبل اس نے ایک ہندو سے کافی رقم قرض میں لیا تھا، تقسیم کے وقت وہ ہندو ہندوستان چلا آیا تھا، فی الحال وہ کہاں رہتا ہے اس کا کوئی علم نہیں ہے اور نہ ہی اس کا کوئی وارث معلوم ہے۔ زید اس قرض کو ادا کرنا چاہتا ہے، اب قرض کی ادائے گی کی کیا شکل ہوگی اور عدم ادائے گی کی صورت میں زید کا عند اللہ مؤاخذہ ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: حبیب اللہ، متعلم دار الافتاء مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسی صورت میں زید قرض کی مقدار فقراء کو قرض سے سبکدوشی کی نیت سے صدقہ کردے تو انشاء اللہ اس طریقہ سے قرض کی ذمہ داری سے بری الذمہ ہوجائے گا اور صدقہ نہ کرنے کی صورت میں عند اللہ بری نہ ہوگا۔

وعليه ديون ومظالم جهل أربابها، وأيس من عليه ذلك من معرفتهم، فعليه التصدق بقدرها من ماله وإن استغرقت جميع ماله.

(درمختار، كتاب اللقطة، مطلب فيمن عليه ديون ومظالم جهل أربابها، زكريا ٦/ ٤٤٣،

کراچی ٤/ ٢٨٣، مجمع الأنهر، دارالکتب العلمیة بیروت ٢/ ٥٣١، مصري قدیم ١/ ٧٠٩، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ٢٦/ ٣٣٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٧/صفر ١٤١٥ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣١/ ٣٨٦٧)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٧/٢/١٤١٥ھ

کیا بلا وصیت بھی میت کا قرض ادا کرنے سے ادا ہو جائے گا؟

سوال [٩٣٥٩]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مقروض اپنا قرض چھوڑ کر مر گیا یعنی ادا نہیں کیا نہ وصیت کی ورثاء نے قرض ادا کر دیا تو کیا عنداللہ وعندالناس قرض ادا ہو گیا یا نہیں؟ نیز نمازوں کا فدیہ کیسے ادا ہو؟

المستفتی: محمد یوسف قاسمی خادم جامعہ شمس العلوم کاشی پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جی عنداللہ وعندالناس قرض ادا ہو جائے گا، نیز اگر ورثاء اپنی خوشی سے نمازوں کا فدیہ ادا کر دیں گے تو ادا ہونے کی امید ہے۔

ثم تقضی دیونه من جمیع ما بقي من ماله، أي بعد التجهیز والتکفین.

(شریفیة، ص: ٦، فتاوی رشیدیه قدیم ٥٢٤، جدید، ص: ٥٠٢)

وأما إذا لم یوص فتطوع بها الوارث فقد قال محمد رحمة الله علیه في الزیادات: یجزیه إن شاء الله تعالیٰ. (شامي، کتاب الصلاة، باب قضاء الفوائت، مطلب في إسقاط الصلاة عن المیت، زکریا ٢/ ٥٣٣، کراچی ٢/ ٧٢، المبسوط، دارالکتب العلمیة بیروت ٣/ ١٢٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ذی الحجہ ١٤٠٨ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٢٤/ ٩٩٦)

قرض کی ادائے گی کی غرض سے تجارت میں انہماک اور نمازوں سے دوری کا شرعی حکم

سوال [۹۳۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عمر متقی، پرہیزگار صاحب جائیداد کاشتکار ہے اور دیگر ذرائع آمدنی اولاد کی طرف سے موجود ہیں؛ لیکن غیر منقسم جائیداد اور والد و بھائیوں کے مشترکہ ہونے اور گھریلو خرچ زائد ہونے کی بنا پر عمر کو کم وبیش ایک لاکھ روپۓ مقروض ہونے کا شکار ہونا پڑا، اب چونکہ اخراجات طویل اور مقروضیت اور لڑکے لڑکیوں کی شادی بیاہ کی فکر کے باعث اور عمر صاحب نصاب بھی نہیں اور حلال طیب پاک وصاف کاروبار کرنے کے باعث کاروباری عروج بھی نہیں ہے؛ اس لئے یہ نظریہ ہے کہ چونکہ حلال طیب پاک وصاف کاروبار آج کے دور میں بہت ہی مشکل اور ''جوئے شیر'' لانے کا مصداق ہے؛ اس لئے صرف نماز یا احکام خداوندی میں اس قسم کی تاخیر یا سستی اللہ رب العزت انشاءاللہ معاف ہی فرمادیں گے اور جان کرتا خیر کرتا ہے اور روزی اللہ کی طرف سے طے ہے، اس سے انکار تو نہیں؛ البتہ سبب بھی اختیار کرنے کا حکم آیا ہے اور اس طرح کافی دیر پہلے سے دوکان سے اٹھنا اور گراہکوں کو پریشانی یا دوکان کا بند ہونا اچھا نہیں ہے، اس حالت اور سوچ میں کیا حکم ہے؟

المستفتی: احمد حسن نگینہ، معرفت حبیب الرحمٰن شیر کوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگرچہ قرض خواہوں کے قرض کی ادائے گی کی غرض سے تجارت میں اس قدر منہمک ہونا جائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم ۳/ ۶۳)

وخوف على ماله، أي من لص ونحوه إذا لم يمكنه غلق الدكان أو البيت مثلا. (الدرمع الرد، الصلاة، باب الإمامة، زكريا ۲/ ۲۹۳، كراچی ۱/ ۵۵۶)

مگر یہ خدا پر یقین کے خلاف اور تقوی سے بہت دور کرنے والا عمل ہے؛ اس لئے خدا پر یقین رکھ کر جماعت میں سستی نہ کرنی چاہئے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۷۸۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/ ۱۲/ ۱۴۱۴ھ

قرض کی ادائے گی میں قیمت کے تفاوت کا حکم

سوال [۹۳۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: یہ کہ بندہ کا مطالبہ اس وقت کا ہے جب کہ موجودہ گرانی کے حساب سے بعض چیزوں میں روپیہ ایک پرانے پیسے کا بھی نہیں ہے؛ لہٰذا مطالبہ کس حساب سے لینا جائز ہے؟

المستفتی: عبدالعزیز بازار برتن شاہی مسجد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ”الإقراض تقضی بأمثالها“ کے قاعدہ سے جس قسم کا روپیہ آپ نے قرض میں دیا تھا، اسی قسم کا روپئے لے سکتے ہیں، تفاوت فی القیمت کا کوئی اعتبار نہیں۔ (مستفاد: امدادالفتاوی ۳/ ۱۶۵)

وإن استقرض دانق فلوس أو نصف درهم فلوس، ثم رخصت أو غلت لم يكن عليه إلا مثل عدد الذي أخذه. (شامي، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، فصل في القرض، زكريا ٧/ ٣٩٠، كراچی ٥/ ١٦٢، كوئٹه ٤/ ١٩٢، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ١٤/ ٣٠، وهكذا في كتاب الفقه على المذاهب الأربعة، دارالفكر ٢/ ٣٣١، ٢/ ٣٤٢، ٢/ ٣٤٤) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۶۹۵)

قرض کا مطالبہ مقروض کے علاوہ سے کرنے کا حکم

سوال [۹۳۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: حاجی اشرف ایک آدمی کے ساتھ گوشت کا کاروبار کرتے ہیں، حاجی اسلام نے کہا: اگر

گنجائش ہوتو میرا بھی ایک شیئر ڈال دو، حاجی اشرف نے کہا کہ معلوم کر کے بتاؤں گا۔اور حاجی اسلام کا بھی ایک شیئر پڑ گیا،اس میں حاجی اشرف کے ایک لاکھ روپئے زیادہ تھے،مگر منافع تین جگہ تقسیم ہوتا تھا،۵۰ر پیسے وہ لیا کرتا تھا اور ۲۵ر پیسے حاجی اشرف اور ۲۵ر پیسے حاجی اسلام۔ کاروبار چلتا رہا، کچھ دنوں کے بعد اس آدمی کی نیت خراب ہونے لگی، حاجی اسلام نے حاجی اشرف سے کہا: میرا شیئر نکال دو اور آپ بھی اپنا شیئر نکال لو۔حاجی اشرف نے کہا کہ پہلے میں تمہارا شیئر نکال دیتا ہوں، بعد میں میں اپنا نکال لوں گا،غرض یہ حاجی اسلام نے اپنا شیئر نکال لیا اور رقم پوری لے لی۔حاجی اشرف نے بھی کوشش کر کے اپنا شیئر نکال لیا،مگر حاجی اشرف کے ایک لاکھ روپئے باقی رہ گئے، انہوں نے ایک لاکھ روپئے لینے میں ڈھیل شروع کردی، چونکہ ان کا مالوی نگر دہلی میں ایک بیسمنٹ تھا، جب وہ آدمی دہلی جاتا تو حاجی اشرف اس سے کہتے کہ مالوی نگر بھی ہوتے آنا، تاکہ لوگوں کو پتہ چلے کہ اس بیسمنٹ کی دیکھ بھال کرنے والے لوگ آتے جاتے ہیں،غرض یہ کہ مہینوں وہ آدمی اس بیسمنٹ کو دیکھا کرتا اور آتا جاتا۔ایک مرتبہ حاجی اشرف نے اس آدمی سے کہا کہ میرا لڑکا دوبئی سے آرہا ہے،اس کو ایئر پورٹ سے مرادآباد لے آنا، پھر ایک مرتبہ حاجی اشرف نے کہا: میرا لڑکا دوبئی جارہا ہے،اس کو ایئر پورٹ چھوڑ دینا، اس کار میں حاجی اشرف بھی شاید ایئر پورٹ گئے تھے،چونکہ ایک لاکھ روپئے کا اس آدمی پر دباؤ تھا،اس وجہ سے وہ ان کے کام کو انجام دیتا تھا،غرض یہ کہ اسی دوران اس آدمی کا دیوالہ نکل گیا، اب یہ اس آدمی سے اپنے روپئے کا تقاضہ کرتے ہیں، وہ کہتا ہے کہ آج دوں گا کل دوں گا،مگر اس نے ابھی تک نہیں دئے۔حاجی اشرف حاجی اسلام سے کہتے ہیں کہ آدھے پیسے تم دو،حاجی اسلام کا کہنا ہے کہ آپ کے لالچ کی وجہ سے یہ رقم نہیں ملی،ورنہ مل جاتی،اگر آپ اس آدمی سے اپنا کام نہ لیتے۔دوسری بات حاجی اسلام نے یہ کہی کہ میں اس آدمی کا ضامن نہیں تھا، نہ میں اس شخص کو جانتا تھا،میرے کہنے پر آپ نے مجھے پارٹنر بنایا۔اور میں اپنی مرضی سے الگ ہوا، اگر آپ کو لالچ نہ ہوتا،تو رقم جب ہی مل جاتی۔

نوٹ:- اگر حاجی اشرف کے ایک لاکھ روپئے زیادہ لگے ہوئے تھے،تو حاجی اسلام کی محنت

حاجی اشرف کے مقابلہ بہت زیادہ تھی، بار بار جاتا تھا اور راتوں کو دو دو تین بجے واپسی ہوتی، مگر حاجی اشرف اڑے ہوئے ہیں کہ ایک لاکھ کا آدھا نقصان دو، حالانکہ وہ آدمی بار بار یہ کہتا ہے کہ میں آپ کی رقم بہت جلد واپس کر دوں گا اور دینے سے انکار نہیں کرتا مہربانی فرما کر اس کا فتویٰ دین کی روشنی میں عنایت فرمادیں، عین نوازش ہوگی۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب مقروض شخص اس بات کا اقرار کر رہا ہے کہ میں آپ کا پیسہ ادا کر دوں گا اور قرض دینے سے انکار نہیں کر رہا ہے اور حاجی اسلام نے ایسی کوئی ضمانت نہیں لی تھی کہ اگر اس شخص نے نہیں دیا تو میں آپ کی رقم دوں گا؛ اس لئے از روئے شرع حاجی اشرف کا حاجی اسلام سے ۵۰/ ہزار کا مطالبہ درست نہیں ہے؛ کیوں کہ کوئی بھی دوسرے کے عمل کا ذمہ دار نہیں ہے۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى. [سورة الفاطر: ۱۸]

عن أبي حميد الساعدي، أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل لامرئ أن يأخذ مال أخيه بغير حقه، وذلک لما حرم الله مال المسلم على المسلم.

(مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٤٢٥، رقم: ٢٤٠٠٣)

لا يجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي. (شامي، كتاب الحدود، باب التعزير، زكريا ٦/ ١٠٦، كراچی ٤/ ٦١، هندية، زكريا قديم ٢/ ١٦٧، جديد ٢/ ١٨١، البحرالرائق، زكريا ٥/ ٦٨، كوئٹه ٥/ ٤١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ ذیقعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۸۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۴/ ۱۱/ ۱۴۳۴ھ

قرض کی ادائے گی کا مطالبہ مقروض کے گھر والوں سے کرنا

سوال [۹۳۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: ایک شخص ہے جس کی بیوی اور تین بیٹے اور ایک بیٹی وداماد انتہائی پریشانی میں ہیں، اس شخص نے شادی کے بعد سے تقریباً ۳۸؍ سال سے اپنی بیوی کو کوئی سکھ نہیں دیا، جب کہ بیوی کے میکے سے بیوی کو مکان دوکان زیور اور گھر کا قیمتی سامان ملا، وہ شخص رفتہ رفتہ بیوی کا زیور سامان خاموشی سے فروخت کر کے جوا اور سٹہ کھیلنے میں صرف کرتا رہا، بیوی شوہر کو بدنامی سے بچانے کے لئے خاموشی سے اس کی مدد اپنے والد سے بھی کراتی رہی، سسر نے دوکان کے لئے مال کے واسطے رقم بھی دی؛ لیکن اس شخص نے وہ بھی غلط کاموں میں پڑ کر ختم کردی، آئے دن گھر میں تقاضہ کرنے والے کھڑے ہوتے رہے، بچے بڑے ہوکر یہ بات برداشت نہیں کر سکے، باپ سے اسی بات کو لے کر کہا سنی ہونے لگی، اس شخص کی جب گھر سے ضرورت حل ہونا بند ہوگئی، تو اس نے باہر کے لوگوں سے ادھار لینا شروع کردیا، ادھار اس قدر بڑھ گیا کہ لوگوں کی دھمکیاں ملنے لگیں، تو بچے جان بچانے کے خوف سے ننہال سے ملا ہوا مکان بھی فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے اور باپ کے قرض چکانے میں ساری رقم ختم ہوگئی۔ اور بیوی بچوں کو کرایہ کے مکان میں منتقل ہونا پڑا، رشتہ داروں، عزیزوں اور دیگر دیندار لوگوں نے بہت سمجھایا؛ لیکن وہ شخص آج تک اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا، برے شوق اس قدر غالب ہیں کہ کسی کی سنتا ہی نہیں اور جھوٹی قسمیں کھانا قرآن اٹھانا اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے، بیوی بچوں نے اور بیٹی داماد نے تنگ آکر گھر میں آنے کو منع کردیا، اس شخص نے فی الحال اپنا ٹھکانہ اپنی بہن اور بہنوئی کے یہاں بنالیا ہے، اس شخص نے مزاروں پر جانا بھی شروع کردیا ہے، گھر والوں نے غصہ میں آکر گھر میں آنے کی ممانعت تو کردی؛ لیکن ان کو خدا کا خوف بھی غالب ہے، کہ اللہ کے یہاں ہماری پکڑ نہ ہو شوہر کے حقوق بیوی نے آج تک ادا کئے اور بچوں نے بھی والد کے حقوق کا احترام کیا؛ لیکن جب کچھ نہیں بچا تو مجبور ہوکر یہ قدم اٹھایا، وہ شخص اب بھی بازار سے کچھ نہ کچھ لوگوں کو پٹی پڑھا کر قرض لے رہا ہے، بچے اس بات سے پھر خوف زدہ ہیں کہ اب تقاضہ کہاں سے پورا کریں گے؛ اس لئے وہ اخبار کے ذریعہ اعلان کرانا چاہتے ہیں کہ اب ہمارا ان سے کوئی

واسطہ نہیں ہے، ہم کسی طرح کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ برائے کرم شریعت کی رو سے اس گھر کے افراد کو کیا کرنا چاہئے؟ جواب تحریر فرما کر مشکور فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں جتنی بھی باتیں لکھی گئی ہیں، اگر یہ باتیں بیوی بچوں کی طرف سے درست ہیں اور قرض لے لے کر خرافات میں پیسوں اور املاک کی بربادی اس حد تک پہنچ چکی ہے جو سوال نامہ میں مذکور ہے تو ایسے حالات میں بیوی اور بچوں کی طرف سے ضابطہ کے طور پر اس بات کا اعلان اخبار میں کرنے کی گنجائش ہے کہ فلاں شخص مالی اعتبار سے قلاش ہے، وہ اگر کسی سے قرض لے تو وہ قرض ادا نہیں کرسکتا؛ اس لئے اس بات کا اعلان کیا جارہا ہے کہ کوئی شخص ان کو قرض نہ دے اور پھر بھی اگر کوئی قرض دے گا تو اس کے بیوی بچے اس کا قرض ادا کرنے کے ذمہ دار نہ ہوں گے؛ بلکہ قرض دینے والے خود اس کے ذمہ دار ہوں گے؛ لہٰذا قرض کے مطالبہ کو لے کر کوئی بھی شخص ان کی بیوی بچوں کو پریشان نہ کرے، اس طرح کے اعلان کرنے میں بچوں کی طرف سے ان کی تذلیل مقصود نہیں ہے؛ بلکہ ایک اہم ترین نقصان سے ان کی حفاظت مقصود ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے:

عن ابن عباس – رضي الله عنه – قال: قال رسول الله ﷺ: لا ضرر ولا ضرار. (سنن ابن ماجة، الأحكام، باب من بنى في حقه ما يضر بجاره، النسخة الهندية ١/ ١٦٩، دارالسلام، رقم: ٢٣٤١، مسند أحمد بن حنبل ١/ ٣١٣، رقم: ٢٨٦٧، موطا إمام مالك، القضاء في المرفق، ص: ٣١١، رقم: ٢٧٥٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۳۵۸/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۴/۱۸ھ

قرض کی ادائے گی کا ذمہ لینے والے پر قرض ادا کرنا لازم ہے

سوال [۹۳۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: ڈاکٹر ایم عزیز صاحب (جو حکومت مہاراشٹر کے ایم ایل سی رہ چکے ہیں) اورنگ آباد مہاراشٹر میں واقع اردو ایجوکیشن سوسائٹی کے چیر مین اور میرے چچا خسر تھے، آپ اپنے اثر ورسوخ کی وجہ سے حکومت مہاراشٹر کے توسط سے بہت سے کاموں کو انجام دیا کرتے تھے۔
دریافت طلب امر یہ ہے کہ میں (شیخ منصور مصطفیٰ) نے ۱۹۹۲ء میں ’’الصباح ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی‘‘ اورنگ آباد کی بنیاد ڈالی، جس کے ماتحت اورنگ آباد سے قریب ایک تحصیل (پھلمبری) میں ڈگری کالج کے قیام کا منصوبہ تھا، جس کی کارروائیوں کے لئے میں نے دو لاکھ روپئے بطور امانت ڈاکٹر صاحب کے پاس رکھے تھے، اسی طرح میرے مزید سترہ ہزار روپئے ڈاکٹر صاحب کے پاس بطور قرض باقی تھے، مجموعی طور پر دو لاکھ سترہ ہزار روپئے ان کے ذمہ باقی ہیں، اسی دوران ڈاکٹر صاحب کا ۸/ مئی ۲۰۰۹ء کو انتقال ہوگیا، انتقال کے فوراً بعد اپنی رقم کے سلسلے میں میں نے ان کے چھوٹے بھائی عبدالوحید صاحب (سکریٹری اردو ایجوکیشن سوسائٹی اورنگ آباد) سے رابطہ قائم کیا، تو عبدالوحید صاحب نے کہا کہ آپ رقم کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ سے بات نہ کریں، ہم اپنی سوسائٹی سے رقم دیں گے، اس بات کے گواہ مرزا سلیم بیگ اور محمد ایوب ہیں، اس وجہ سے میں نے کسی سے کوئی تذکرہ نہیں کیا، تین سال کا عرصہ گذرنے کے بعد بھی انہوں نے میری رقم نہیں لوٹائی اور کہنے لگے کہ ہم یہ رقم نہیں دے سکتے، آپ ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ سے مانگ لیں، اب اگر ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ سے مانگتا ہوں تو بلا وجہ شک وشبہات جنم لیتے ہیں، اس مرحلہ پر میرا کہنا یہی ہے کہ عبدالوحید صاحب کو اگر دینا نہیں تھا تو ذمہ داری کیوں قبول کی؟ آیا رقم کا مطالبہ ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ سے ٹھیک بھی ہوگا یا نہیں؟۔
حل طلب مسئلہ یہی ہے کہ میرے روپیوں کی ادائے گی اس مرحلہ پر کس کے ذمہ ہوگی؟ امید کہ آپ جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں گے۔

المستفتی: شیخ منصور مصطفیٰ لیکچرر ڈاکٹر ذاکر حسین جونیر کالج اورنگ آباد، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ مسئلہ میں چوں کہ ڈاکٹر ایم عزیز صاحب کے بھائی

عبدالوحید نے قرض ادا کرنے کی ذمہ داری لے لی اور ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ سے اس تعلق سے بات کرنے کو منع کر دیا تھا؛ اس لئے قرض ادا کرنا عبدالوحید ہی کی ذمہ داری ہے، اس کے ذمہ اس قرض کی ادائے گی لازم ہے۔ حدیث پاک میں آیا ہے کہ جس کے اوپر قرض ہے اور اس کی ادائے گی کے لئے اس کے پاس اسباب نہیں ہیں، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے شخص کی نماز جنازہ نہیں پڑھتے تھے، ایسے ہی ایک شخص کا جنازہ آیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیا، حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے قرض کی ادائے گی کی ذمہ داری لی تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نماز جنازہ ادا فرمائی۔ اس حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد مرحوم کا قرض ادا کرنے کے لئے جس نے بھی ذمہ داری لی ہو اس کے اوپر اس کی ذمہ داری لازم ہے۔ حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

عن سلمة بن الأكوع –رضي الله عنه– قال: كنا جلوسا عند النبي ﷺ إذا أتى بجنازة، فقالوا: صل عليها، فقال: هل عليه دين؟ قالوا: لا، قال: فهل ترك شيئا؟ قالوا: لا، فصلى عليه، ثم أتى بجنازة أخرى، فقالوا: يا رسول الله صل عليها، قال: هل عليه دين؟ قيل: نعم، قال: فهل ترك شيئا؟ قالوا: ثلاثة دنانير، فصل عليها، ثم أتى بالثالثة، فقالوا: صل عليها، قال: هل ترك شيئا؟ قالوا: لا، قال: فهل عليه دين؟ قالوا: ثلاثة دنانير، قال: صلوا على صاحبكم، قال أبوقتادة: صل عليه يا رسول الله و علي دينه، فصلى عليه. (بخاري، باب إن أحال دين الميت على رجل جاز، النسخة الهندية ١/ ٣٠٥، رقم: ٢٢٣٤، ف: ٢٢٨٩، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ٧/ ٣١، رقم: ٦٢٩٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ ذیقعدہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۸۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/ ۱۱/ ۱۴۳۳ھ

مرض الوفات میں اقرار شدہ قرض کی ادائے گی کی ذمہ داری لینے والے پر اس کا ادا کرنا لازم ہے

سوال [۹۳۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک رائس مل میں زید منیم ہے، مالک مل نے زید کو ہر طرح کے اختیارات دے رکھے تھے؛ بلکہ زید کی حیثیت مالک کی طرح تھی، عمر نے زید کے بدست کچھ غلہ فروخت کیا مل کے لئے، زید نے غلہ کا حساب اپنے رجسٹر اور پیڈ پر بنا دیا اور عمر سے کہا کہ میرے پاس اس وقت رقم نہیں ہے، آپ شام کو یا صبح کو رقم لینا، جب مدرسہ جاؤ تو عمر کچھ عوارضات کی بنا پر شام کو گئے نہیں، صبح کو عمر کے جانے سے پہلے زید کی طبیعت خراب ہوگئی، تو زید کے رشتہ داروں نے کہا کہ آپ کے ذمہ کسی کا قرض تو نہیں ہے؟ ہو تو بتاؤ، زید نے کہا کہ میرے ذمہ کسی کا قرض نہیں ہے؛ لیکن مل کا حساب ہے جو پیڈ پر لکھا ہے، وہ عمر کو جانا ہے۔ زید نے کہا کہ منشی کو مل سے بلا لو میں حساب لکھوا لوں گا، منشی اس وقت مل پر موجود نہیں تھا، زید مرادآباد چلے گئے ہسپتال میں علاج کے لئے، زید کی جیب میں کچھ رقم تھی، زید کو ہسپتال میں بے ہوشی ہوگئی، اس بے ہوشی میں زید کی جیب سے مل مالک نے رقم نکال لی، جب زید کو ہوش آیا تو کہا میری جیب سے رقم کس نے نکالی ہے؟ تو ان کے لڑکے نے کہا کہ مل مالک نے نکالی ہے، اس وقت مل مالک صاحب بھی موجود تھے، تو مالک صاحب نے پوچھا کیا بات ہے؟ رقم میں نے نکالی ہے، تو زید نے کہا کہ یہ کسی کی امانت ہے، مل مالک نے پوچھا کہ کس کی ہے؟ زید نے کہا کہ عمر کی، تو مل کے مالک نے کہا کہ چلی جائے گی اور ہم دے دیں گے تم فکر مت کرو، اس کے بعد زید کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی، تو زید کے لڑکے نے پوچھا کہ کسی مسجد یا مدرسہ میں کچھ لینا دینا ہو تو بتاؤ، میں دے دوں گا، زید نے جواب دیا کہ میں نے اپنی زندگی میں کچھ دیا نہیں تو، تو کیوں؟ اس کے بعد مل مالک نے کہا میرے لئے کچھ حکم کردیں کیا کروں؟ تو جواب دیا کہ ابھی وہ بات نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو، اس کے بعد زید کا انتقال ہوگیا، انتقال کے بعد عمر نے مل مالک سے اپنی رقم کا مطالبہ کیا، تو مل کے مالک نے کہا کہ ہم دے دیں گے، جب آٹھ دس

دن ہوگئے، تو مل مالک نے رجسٹر اور پیڈ پر دیکھا اور عمر سے کہا کہ ہماری طرف آپ کا کوئی حساب نہیں ہے۔ان حالات میں عمر مل مالک سے رقم لینے کے حق دار ہے یا نہیں؟ از روئے شرع جواب دے کر ممنون فرمائیں۔ فقط والسلام

المستفتی: عبدالغنی لال پور کلاں، ضلع رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ کے درج شدہ حالات میں جب زید نے اپنے مرض الموت میں عمر کی رقم کا اقرار کیا ہے اور مل مالک نے ادائے گی کی ذمہ داری بھی لے لی ہے، تو مل مالک پر عمر کی رقم ادا کرنا واجب ہوگا۔ نیز اگر رجسٹر پر حساب صاف بھی ہے اور عمر حق دار کو رقم نہیں پہنچی ہے، تو بھی مل مالک پر عمر کی رقم ادا کرنا واجب ہوگا۔

إذا أقر الرجل في مرض موته بديون، وعليه ديون في صحته وديون لزمته في مرضه بأسباب معلومة فدين الصحة والدين المعروفة الأسباب مقدم –إلى قوله– لأن حق غرماء صحته تعلق بهذا المال استيفاء. (هداية، كتاب الإقرار، باب إقرار المريض، أشرفي ديوبند ٣/ ٢٤١)

وأما المحتال عليه فلأنه يلزمه الدين. (هداية، كتاب الحوالة، أشرفي ديوبند ٣/ ١٢٩)

ولو أحال المحال عليه المحتال على آخر جاز وبرئ الأول والمال على الآخر. (شامي، كتاب الحوالة، زكريا ديوبند ٨/ ٧، كراچی ٥/ ٣٤٢)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢ رصفر المظفر ١٤٠٩ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٢٤/١٠٩٧)

مدت مکمل ہونے پر دائن کے لئے قرض کی ادائیگی کا سخت مطالبہ کرنا

سوال [٩٣٦٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: میں نے کسی شخص سے کچھ رقم بطور قرض ایک معینہ مدت کے لئے لی مگر معینہ مدت پر وہ رقم حالات کی بنا پر ادا نہ کر سکا، تقاضہ اس پر سخت کیا جانے لگا، میں معاملہ داری جانتا ہوں، مگر حالات میرے موافق نہیں ہیں، مگر رقم دینے کا پابند بھی ہوں اور اقرار بھی کرتا ہوں، کہ رقم دینی ہے، تو کیا رقم کی واپسی کا سخت مطالبہ کرنا جائز ہے؟

المستفتی: قاری حسین احمد، ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس شخص سے متعین مدت تک کے لئے بطور قرض رقم لی گئی ہے، مدت پوری ہوجانے کے بعد اس شخص کے لئے اپنی رقم کا مطالبہ کرنا جائز اور درست ہے۔ اور مدت میں توسیع کرنا اس کے اختیار کی بات ہے، اگر آپ کے پاس مدت پوری ہونے پر دینے کی گنجائش نہیں ہے، تو اس شخص سے آپسی رضامندی کے ذریعہ سے مدت میں مزید توسیع کی گنجائش ہے۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. [البقرة: ٢٨٠]

عن أبي هريرة -رضي الله عنه- أن رجلا تقاضى رسول الله صلى الله عليه وسلم فأغلظ له فهم به أصحابه، فقال: دعوه، فإن لصاحب الحق مقالا، واشتروا له بعيرا، فأعطوه إياه، وقالوا: لا نجد إلا أفضل من سنه قال: اشتروه، فأعطوه إياه، فإن خيركم أحسنكم قضاء. (صحيح البخاري، الاستقراض، باب استقراض الإبل، النسخة الهندية ١/ ٣٢١، رقم: ٢٣٢٨، ف: ٢٣٩٠، صحيح مسلم، المساقاة والمزارعة، باب جواز اقتراض الحيوان واستحباب توفية خيرا مما عليه، النسخة الهندية ٢/ ٣٠، بيت الأفكار، رقم: ١٦٠١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ صفر ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۸۸۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۲/۷ھ

قرض کی وصولیابی تک مدیون کا جنازہ روکنے کا حکم

سوال [۹۳۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص کے ذمہ ہمارا تقریباً چودہ ہزار روپئے قرض ہے، وہ صاحب استطاعت ہونے کے باوجود ادا نہیں کرتا، اس کی حیثیت کے اعتبار سے ہم اس سے دباؤ کے ذریعہ وصول نہیں کرسکتے تو کیا ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ جب اس کا انتقال ہوجائے تو ہم اس کا جنازہ روک لیں اور قرض وصول ہونے تک روکے رکھیں؟ شرعی حکم سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی: غلام محمد پیپل سانہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: باوجود حیثیت کے قرض ادا کرنے میں ٹال مٹول کرنے والا شرعاً بہت بڑا ظالم اور سخت وعید کا مستحق ہے۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– أن رسول الله ﷺ قال: مطل الغني ظلم. (صحيح البخاري، الحوالة، باب في الحوالة، النسخة الهندية ١/ ٣٠٥، رقم: ٢٢٣٢، ف: ٢٢٨٧، صحيح مسلم، باب تحريم مطل الغني، النسخة الهندية ٢/ ١٨، بيت الأفكار رقم: ١٥٦٤)

اور صاحب حق اپنا قرض حاصل کرنے کا مطالبہ ہر وقت کرسکتا ہے، ابھی مقروض کی حیات میں اور اس کی موت کے بعد جنازہ قبرستان میں جانے سے پہلے اور بعد میں ہر حال میں مطالبہ کرکے وصول کرنے کا حق ہے؛ البتہ جنازہ روک لینے کی بات کسی کتاب میں نظر سے نہیں گذری۔ اور قرض ادا کرنے سے گریز کرنے پر مقروض کو گرفتار بھی کیا جاسکتا ہے۔

لأن قضاء الدين فرض عليه يجبر على أدائه في حال حياته –إلى قوله– لأنه يجبر على أداء الدين بالحبس. (شريفية، ص: ٦)

نیز جو آدمی قرض ادا کئے بغیر مرجاتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھتے تھے۔ اور لوگوں سے کہہ دیتے کہ تم لوگ پڑھ لو۔

عن عبدالله بن أبي قتادة يحدث عن أبيه، أن النبي ﷺ أتي برجل ليصلي عليه، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: صلوا على صاحبكم، فإن عليه دينا. (سنن الترمذي، باب ماجاء في الصلاة على المديون، النسخة الهندية ۱/ ۲۰۵، دارالسلام، رقم: ۱۰۶۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍ ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۴۳۱)

قرض لے کر واپس نہ کرنے پر قانونی کاروائی کرنا

سوال [۹۳۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کی کثیر رقم بکر کے ذمہ واجب ہے، جس کی شرعی طور پر یادداشت وتحریر بکر نے لکھ کر دی تھی، وہ زید کے پاس موجود ہے، چونکہ آپس میں بہت پرانے خاندانی تعلقات بھی تھے اور بکر بظاہر دیندار وایماندار بھی معلوم ہوتا تھا؛ اس لئے زید نے عدالتی رجسٹری وپختگی کی ضرورت نہیں سمجھی تھی، نیز آج کل عدالتی وقانونی پختگی کے باوجود عدالتی چارہ جوئی میں کثیر صرفہ وپریشانی کے علاوہ برسہا برس لگ جاتے ہیں، دیوانی عدالتوں میں بیس بیس سال تک فیصلے نہیں ہو پاتے؛ اس لئے بھی ظاہری قانونی پختگی کے بجائے شرعی تحریر کو کافی سمجھا تھا؛ لیکن اب بکر کے حالات بدل گئے اور دینداری کا ڈھونگ ختم کر کے بکر کسی طرح زید کا حق جو ایک لاکھ سے زیادہ ہے ادا نہیں کرتا۔ زید نے مقامی علماء کے سامنے بھی فیصلہ کرایا، ایک شرعی عدالت میں بھی مقدمہ پیش کیا؛ لیکن بکر نے فیصلہ کرنے سے صاف انکار کردیا، چونکہ شرعی عدالت کے پاس زبردستی کے اختیارات تو ہیں نہیں، زید کو چار سال ہوگئے انتظار کرتے اور کوشش کرتے ہوئے، اب کوئی امید باقی نہیں رہی کہ بکر شرعی فیصلہ کرے یا آسانی سے حق ادا کردے، صرف ایک شکل یہی ہے کہ بکر کے خلاف کوئی ایسا سخت مقدمہ لگایا جائے اور پولیس کے ذریعہ کوشش کی جائے، جس سے وہ پریشان ومجبور ہوکر

فیصلہ پر آمادہ ہوسکے اور زید کا حق ادا کرنے پر مجبور ہوجائے؛ لہٰذا دریافت یہ کرنا ہے کہ ایسے حالات میں مجبور ہوکر زید کو اپنا حق وصول کرنے کے لئے بکر کے خلاف اس قسم کی کارروائی کرنے کی شرعاً اجازت وگنجائش ہے یانہیں؟

المستفتی: عبدالستارخان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب زید کی رقم بکر پر واجب ہے اور بکر واجب الاداء رقم پر قادر ہونے کے باوجود شرعی عدالت کے فیصلہ کو ماننے سے انکار کررہا ہے، تو زید اپنا حق حاصل کرنے کے لئے حکومت کی عدالت میں قانونی کارروائی کرنے کا مجاز ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۳/ ۳۴۷، ۱۲/ ۴۰۲، جدید ڈابھیل ۱۶/ ۴۱۶)

روی أن معاذا کان یدّان فأتی غرماء ہ إلی النبي ﷺ فباع النبي ﷺ ماله کله في دینه حتی قام معاذ بغیر شيء. الحدیث (مشکوۃ ۱/ ۲۵۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ ذیقعدہ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۴۰۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/ ۱۱/ ۱۴۲۲ھ

قرض کی ادائے گی میں ٹال مٹول کرنا

سوال [۹۳۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید بجلی کے پنکھے فروخت کرنے کا کام کرتا ہے، زید نے عمر سے چار پنکھے ادھار لئے، ان چار میں سے عمر نے ایک پنکھا بکر کو فروخت کردیا، بکر کو یہ معلوم تھا کہ عمر نے یہ پنکھے زید سے خریدے ہیں، بکر کا پنکھا کچھ خراب ہوا تو بکر نے بجائے عمر کے (جس سے بکر نے خریدا تھا) زید کو ہی بلا کر پنکھا دکھایا اور کہا کہ یہ تمہارا پنکھا خراب ہے، زید نے یہ نہیں کہا کہ عمر سے کہو جس سے تم نے پنکھا خریدا ہے؛ بلکہ یہ کہا کہ پنکھا آپ میرے گھر بھیج دیں دوسرا بدل کردے دوں گا، یا قیمت واپس کردوں گا، یا اس پنکھے کو درست کردوں گا، یہ معاملہ زید نے بکر سے کیا، اب بکر نے زید کے کہنے کی وجہ سے وہ پنکھا زید کے گھر بھیج دیا، تاکہ اپنے قول کے مطابق وہ

بدل دے یا قیمت واپس کردے یا اس کو درست کردے۔ اور زید کی نیت بھی یہی تھی، اب عمر نے جو زید سے پنکھے ادھار لئے تھے، عمر زید کی رقم ادا کرنے میں ٹال مٹول کررہا ہے، زید کہتا ہے کہ میں بکر کا پنکھا نہیں دیتا، جب عمر میرے پیسہ نہیں دیتا، زید کا یہ کہنا کہ میں نے پنکھا زید کے پاس زید کے کہنے کی وجہ سے بھیجا ہے، اگر وہ زید کہتا ہے تو میں عمر سے ہی رجوع کرتا، تو کیا اس صورت میں زید بکر کو پنکھا یا اس کی قیمت واپس کرے جیسا کہ اس نے کہا تھا، یا بکر کا زید سے کوئی تعلق نہیں، اگر زید بکر کو پنکھا واپس نہیں کرتا یا اس کی قیمت اپنے قول کے مطابق ادا نہیں کرتا، تو زید کی طرف سے یہ بکر کو دھوکہ دینا ہوا یا نہیں؟ زید گنہگار ہے یا نہیں؟ زید کو بکر کا پنکھا یا اس کی قیمت یا ٹھیک کر کے اپنے قول و وعدہ کے مطابق واپس کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ زید کو عمر کا پنکھا فروخت کرنے کے وقت بھی علم تھا کہ عمر ایک پنکھا بکر سے خرید رہا ہے۔

المستفتی: قاری عبدالرحمٰن شیرکوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مذکورہ میں جب زید نے بکر سے وعدہ کرلیا کہ آپ میرے گھر پنکھا بھیج دیں دوسرا بدل کردوں گا، یا قیمت واپس کردوں گا یا درست کردوں گا، تو زید کے لئے وعدہ پورا کرنا ضروری ہے، وعدہ خلافی کرنا منافقت کی علامت ہے؛ لہٰذا عمر کے روپئے نہ دینے کی وجہ سے بکر کے حق کو روکنے کا حق نہیں؛ بلکہ اپنے وعدہ کے مطابق پنکھا واپس کرنا ضروری ہے؛ البتہ زید کو اپنا روپیہ عمر سے لینا چاہئے اور عمر کے روپئے دینے میں ٹال مٹول کرنا جائز نہیں۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– عن النبي ﷺ قال: مطل الغني ظلم. (سنن الترمذي، باب ما جاء في مطل الغني أنه ظلم، النسخة الهندية ١/ ٢٤٤، دارالسلام، رقم: ١٣٠٨، سنن الدارمي، دارالمغني ٣/ ١٦٨٤، رقم: ٢٦٢٨، مسند أحمد بن حنبل ٢/ ٧١، رقم: ٥٣٩٥، ٢/ ٢٦٠، رقم: ٧٥٣٢، ٢/ ٣١٥، رقم: ٨١٦٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۱۵/۶/۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰۶۶/۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۶/۵ھ

قرض کی ادائے گی میں ٹال مٹول کرنے کا شرعی حکم

سوال [۹۳۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص جو تجارت کرتا ہے اور تجارت کے قواعد وشرائط سے بخوبی واقف ہے، اس نے ہم سے تقریباً ۱۲/ لاکھ روپئے کا مال خریدا اور رقم کی ادائے گی کا ایک وقت مقرر تھا؛ لیکن اس نے مقررہ وقت کے نکلنے کے بعد بھی کافی عرصہ ہوگیا ہے، ابھی تک قرض ادا نہیں کیا اور نہ ہی وعدہ کرتا ہے کہ فلاں تاریخ یا فلاں وقت رقم ادا کرے گا؛ بلکہ ٹال مٹول کرر ہا ہے، جب کہ ہم یہاں تک تیار ہیں کہ ہمارا مال ہی واپس کردو؛ لیکن وہ مال بھی واپس نہیں کرتا، ہم نے معتبر حضرات کے بیچ معاملہ رکھا، جس سے اس نے ناراضگی کا اظہار کیا اور رقم ادا کرنے سے منکر ہوا۔ اور کہتا ہے کہ تم مجھ سے معافی مانگو اور مزید مال اور بھیجو تب پہلی رقم ادا کروں گا، تو معلوم یہ کرنا ہے کہ شریعت کا ایسے شخص کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اور اگر وہ مقروض ہونے کی حالت میں مرجائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح جواب عنایت فرمائیں۔ بینوا توجروا۔

المستفتی: محمد ناصر خاں، دریا گنج دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں اگر وہ شخص ادائے گیٔ قرض پر قادر ہے، پھر بھی ٹال مٹول اور ادائے گی میں کوتاہی کرر ہا ہے، تو شریعت مطہرہ میں ایسے شخص کو ظالم اور خائن کہا گیا ہے۔ اور اگر قرض ادا کئے بغیر اس کا انتقال ہوجائے تو آخرت میں سخت عذاب کا مستحق ہوگا، یہاں تک کہ قرض دار کی نیکیاں قرض خواہ کو دے دی جائیں گی، پھر بھی اگر قرض کا کچھ حصہ باقی رہ جائے گا تو قرض خواہ کے گناہ قرض دار پر لاد دیئے جائیں گے، نیز ایک حدیث شریف میں نہایت خوفناک عذاب کا ذکر آیا ہے، جس کی گردن پر لوگوں کے حقوق ہوں گے چاہے اس نے لوگوں سے قرض لے رکھا ہو یا دھوکہ دے کر حاصل کیا ہو یا

ادھار لے کر پیسوں کی ادائے گی میں لاپرواہی کی ہو یا کسی کی جائیداد اور مال لے کر ہڑپ کر لیا ہو، یا قرض لے کر ادا نہ کیا ہو، اس کو عذاب یوں ہوگا کہ انگاروں کا ایک صندوق ہوگا، اس میں اسے بند کر دیا جائے گا، پھر اس صندوق میں بند ہوکر بند گاڑیوں اور بند ہیلی کاپٹروں کی طرح جہنم کے طبقہ حمیم یعنی کھولتے ہوئے پانی اور طبقہ جحیم یعنی دہکتی ہوئی آگ کے درمیان چیخ وپکار کے ساتھ ادھر ادھر مارا مارا پھرے گا، اس کے عذاب سے دوسرے طبقہ کے لوگ بھی پریشان ہوں گے۔

عن شفي بن ماتع الأصبحي –رضی اللہ عنہ– عن رسول اللہ ﷺ أنه قال: أربعة يؤذون أهل النار على ما بهم من الأذى، يسعون بين الحميم والجحيم، يدعون بالويل والثبور، يقول: أهل النار بعضهم لبعض: ما بال هؤلاء قد آذونا على ما بنا من الأذى –إلى قوله– فيقال لصاحب التابوت: ما بال الأبعد قد آذانا على ما بنا من الأذى؟ قال: فيقول: إن الأبعد مات، وفي عنقه أموال إلى الناس، مانجد لها قضاء أو وفاء. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ۷/ ۳۱۰، رقم: ۷۲۲۶، مجمع الزوائد، دارالكتب العلمية بيروت ۱/ ۲۰۸، رقم: ۱۰۲۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ ذیقعدہ ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۶۰۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/ ۱۱/ ۱۴۲۵ھ

مقروض سے مقدمہ اور سفر خرچ کا مطالبہ

سوال [۹۳۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مراد آباد میں ایک حافظ صاحب کی کاروباری حالت خراب ہوگئی تھی، بندے نے ان کو روپئے دئے کہ کام بن جائے، عرصہ تقریباً چالیس سال ہوگیا، مگر ان کی حالت درست نہ

ہوسکی اور وہ پاکستان چلے گئے، بندے نے جائیداد میں ان کا ترکہ حاصل کرنے کے لئے حکومت سے مقدمہ بازی کی، مگر مقدمہ میں رقم بہت خرچ ہوگئی؛ اس لئے بندہ تھک کر چھوڑ بیٹھا، چندسال میں اللہ تعالیٰ نے حافظ صاحب پر فضل فرمایا، حافظ صاحب مرادآباد آئے اور بندے سے فرمایا کہ پاکستان آجاؤ پیسے ادا کردوں گا، جواباً بندے نے عرض کیا کہ پاکستان میں میرا کوئی کام تو ہے نہیں مگر قیامت کے دن اتمام حجت کے لئے پاکستان بھی آؤں گا، بندہ پاکستان گیا، اتفاق سے وہ کراچی سے باہر گئے ہوئے تھے، ملاقات نہ ہوسکی، سفرخرچ بیکار رہا، میرے سفر کے آنے کے بعد بھی حافظ صاحب اور ان کے اہل وعیال مرادآباد آئے، مگر کسی نے بندہ کا مطالبہ ادا نہ کیا، اب حافظ صاحب کے ایک عزیز نے خبر دی ہے کہ حافظ صاحب مرادآباد آنے والے ہیں، مطالبہ ادا کریں گے، خدا کرے کہ ادا کردیں؛ لہٰذا اس واقعہ سے حسب ذیل سوالات کے جوابات تحریر فرمادیں:

(۱) یہ کہ اصل رقم کے علاوہ خرچ مقدمہ وخرچ سفر وہرجہ کاروبار جب کہ وسعت ہوئے بھی تقریباً ۲۵ رسال ہوگئے، ان مطالبوں میں سے کون کون سا مطالبہ کرنا جائز ہے؟

المستفتی: عبدالعزیز برتن بازار شاہی مسجد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ﴿وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾. [البقرة: ۲۸۰]

بوقت مقدمہ حافظ صاحب تنگ دست تھے؛ اس لئے اصل رقم کے علاوہ کسی قسم کا مطالبہ خرچ مقدمہ وہرجہ کاروبار خرچ سفر وغیرہ کا حق نہیں ہے؛ بلکہ مذکورہ آیت کے تحت ان کو تا وسعت مہلت دینی چاہئے تھی۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ / جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۶۹۵)

قرض کے بدلے فصل پر گیہوں لینا

سوال [۹۳۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عبدالرحیم کے عبدالغفور پر سو روپئے ہیں، وعدے پر عبدالرحیم نے طلب کئے عبدالغفور نے جواب دیا کہ بھائی پیسے تو نہیں ہیں، فصل میں ایک کوئنٹل گیہوں لے لینا۔ عبدالرحیم کا عبدالغفور سے ان روپیوں کے عوض ایک کوئنٹل گیہوں لینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالمجید ہدایت پور، ضلع بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سو روپئے کے عوض میں پیسہ نہ ہونے کی صورت میں عبدالرحیم کے لئے عبدالغفور سے ان روپیوں کے عوض میں ایک کوئنٹل گیہوں لینا جائز ہے۔

ففي الذخيرة: اشترى من المقرض الكر الذى له عليه بمائة دينار جاز؛ لأنه دين عليه. (شامي، فصل في القرض، مطلب في شراء المستقرض من المقرض، زكريا ۷/ ۳۹۲-۳۹۳، كوئٹه ۴/ ۱۹۳، كراچی ۵/ ۱۶۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ رصفر ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/۵۴۲)

متعینہ مدت کے لئے چاول ادھار پر دینا

سوال [۹۳۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: چاول وغیرہ لگانا یعنی تم اس وقت مجھ سے چاول لے جاؤ اگھن کے ماہ میں جس بھاؤ سے ہو مجھے اس بھاؤ سے چاول دے دینا۔

المستفتی: محمد اطہر بن عبدالجلیل ارریہ، بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سوال میں چاول وغیرہ لگانے کی جو شکل بیان کی گئی ہے کہ تم مجھ سے اس وقت چاول لے جاؤ اور جتنی مقدار چاول لے جاؤ گے اتنی ہی مقدار دینا ہے، تو یہ ادھار کی شکل ہے، جو شرعاً جائز اور درست ہے۔ اور اس میں کوئی سود نہیں ہے۔ اور ادھار لینے والے پر مدت متعینہ کے اندر ان چاولوں کی ادائے گی ضروری ہے۔

ويستقرض الخبز وزنا وعددا عند محمد، وعليه الفتوىٰ. (تحته في الشامية:) وهو المختار لتعامل الناس وحاجاتهم. (الدر مع الرد، كتاب البيوع، باب الربا، زكريا ٧/ ٤٢١، كراچی ٥/ ١٨٥)

وجوز محمد استقراض الخبز عددا ووزنا لحاجة الناس وتعارفهم إياه، وإن لم يكن من ذوات الأمثال، وهذا هو المفتى به عند الحنفية؛ لتعامل الناس وحاجاتهم إليه. (الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹر نیشنل دیوبند ٤/ ٣٧٦، دارالفكر ٥/ ٣٦٢٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۳/۴/۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۶۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۴/۲۷ھ

کھلے کرنے کے لئے دئے گئے ۵۰۰ر میں سے ۳۰۰ر فوراً وصول کرنا بقیہ بعد میں

سوال [۹۳۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: خالد نے زید کو پانچ سو روپئے کھلے کرنے کے لئے دئے، زید نے خالد کو اسی مجلس میں تین سو روپئے دے دیئے اور دو سو روپئے بعد میں ادا کرنے کا وعدہ کیا، تو کیا اس طرح تبادلہ کرنا درست ہے؟ اور کیا یہ بیع صرف نسیئہ کی وجہ سے ناجائز تو نہیں؟

المستفتی: شاداب عالم، متعلم درجہ ششم دار العلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں تبادلہ کی جوشکل ذکر کی گئی ہے وہ جائز اور درست ہے، مجلس میں بدلین پر قبضہ ضروری نہیں ہے؛ بلکہ احدالبدلین پر قبضہ کافی ہے؛ لیکن تفاضل ہرگز درست نہیں ہے اور اسے بیع نہیں کہا جائے گا؛ بلکہ قرض کہا جائے گا، جتنا دیا ہے اتنا ہی لینا ہے؛ اس لئے کہ بیع میں منفعت مقصود ہوتی ہے اور قرض میں منفعت مقصود نہیں ہوتی، بدل مقصود ہوتا ہے۔ اور یہاں بدل ہی مقصود ہے، منفعت نہیں۔

وأما الأوراق النقدية وهي التي تسمى "نوت" ...... أن المختار عندنا قول من يجعلها أثمانا اصطلاحية، وحينئذ تجرى عليها أحكام الفلوس النافقة سواء بسواء. (تكمله فتح الملهم، كتاب المساقاة، والمزارعة حكم الأوراق النقدية، أشرفيه ديوبند ١/ ٥٨٨، ٥٩٠)

بيع الفلوس بمثلها، كالفلس الواحد بالفلس الواحد الآخر، وهذا إنما يجوز إذا تحقق القبض في أحد البدلين في المجلس قبل أن يفترق المتبايعان، فإن تفرقا ولم يقبض أحد شيئا فسد العقد. (تكملة فتح الملهم، كتاب المساقاة والمزارعة حكم العملة الرائجة أشرفيه ١/ ٥٨٧)

وقيد بالنقدين؛ لأنه لو باع فضة بفلوس، فإنه يشترط قبض أحد البدلين قبل الافتراق لا قبضهما. (شامي، كتاب البيوع، باب الصرف، زكريا ٧/ ٥٢٢، كراچی ٥/ ٢٥٩، البحرالرائق كوئٹه ٦/ ١٩٤، زكريا ٦/ ٣٢٤، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ١٠/ ٤١٢، رقم: ١٣١٣٨-١٣١٣٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۹۷۴/۳۸)

بیس ہزار روپئے قرض میں فریقین کا جھگڑا اور فیصلہ

سوال [۹۳۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: زید نے بکر کوبطورقرض یا بطورادھار بیس ہزار روپئے ایک گواہ کے سامنے دئے، بکر صاف انکار کرتا ہے کہ زید نے بالکل ہی مجھے روپئے نہیں دئے، جس گواہ کے سامنے دئے تھے اس کا انتقال ہوگیا ہے، اب فریقین میں جھگڑا ہے، دونوں خدا کی قسم کھانے کو تیار ہیں، مذکورہ صورت میں شریعت کا کیا فیصلہ ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: ظہیرالدین شریف نگر، تحصیل ٹھاکردوارہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سوال نامہ میں درج کردہ صورت میں زید مدعی اور بکر مدعیٰ علیہ ہے اور دونوں ایک دوسرے کی بات کے منکر ہیں، ایسی صورت میں جو دعویٰ کرنے والا ہوتا ہے، اس پر شرعی گواہ پیش کرنا لازم ہوجاتا ہے۔ اور جب اس کے پاس شرعی گواہ نہیں ہیں تو بکر سے قسم لی جائے گی، اگر بکر قسم سے منحرف ہوجائے تو زید کے حق میں فیصلہ کردیا جائے گا۔ اور اگر بکر قسم کھالے تو بکر ہی کے حق میں فیصلہ ہوگا۔

عن ابن عباس –رضي الله عنهما– أن رسول الله ﷺ قال: لو يعطى الناس بدعواهم لادعى رجال أموال قوم ودماء هم، ولكن البينة على المدعي واليمين على من أنكر. (السنن الكبرى للبيهقي، كتاب الدعوى والبينات، باب البينة على المدعي واليمين على المدعى عليه، دارالفكر ١٥/ ٣٩٣، رقم: ٢١٨٠٥)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۲۷۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۵/۳ھ

امریکی ڈالرقرض دے کر ہندوستانی رقم لینا

سوال [۹۳۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے بکر کو پانچ ماہ کے لئے قرض کے طور پر امریکی سوڈالردئے، جس کی قیمت اس

وقت ہندوستانی ۴۵۰۰؍روپئے تھی، پانچ ماہ کی مدت گذرنے کے بعد اسی سوڈالر کی قیمت مزید دوسوروپئے ہوگئی ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا قرض کی ادائے گی میں وہی سو ڈالر دیا جائے یا ہندوستانی ۴۵۰۰؍روپئے دیا جائے؟ اور اگر سوڈالر دیا جائے تو زید کے لئے مزید دوسوروپئے ''کل قرض جرنفعا فہو ربا'' کی بنا پرسود میں داخل تو نہ ہوگا؟

المستفتی: محمد سہیل قاسمی، مغربی بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زیدوبکر کے درمیان معاملہ ڈالر پر ہوا ہے؛ اس لئے جس وقت بھی قرض ادا کرے گا ڈالر ہی ادا کرنا لازم ہوگا، اس کی قیمت چاہے گھٹ جائے چاہے بڑھ جائے۔ اور اگر ڈالر کی جگہ ہندوستانی روپئے ادا کرے گا تو ادائے گی کے وقت کی قیمت کا اعتبار ہے؛ لہٰذا پانچ ماہ کے بعد کرنسی میں جب دوسوروپئے کا اضافہ ہوگیا ہے، تو اس کو دوسو روپئے کے ساتھ ادا کرنا ہوگا۔ اور یہ سود نہ ہوگا۔

وكان عليه مثل ما قبض. (تنوير الأبصار مع الشامي، فصل في القرض، مطلب في شراء المستقرض القرض من المقرض، زكريا ۷/ ۳۹٤، كراچی ٥/ ١٦٥)

أنه عند أبي يوسف تجب قيمتها يوم القبض أيضا، وعليه الفتوى، كما في البزازية، والذخيرة، والخلاصة. (شامي، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، فصل في القرض، زكريا ۷/ ۳۹۰، كراچی ٥/ ١٦٣، بزازية زكريا جديد ١/ ۳۹۹، وعلى هامش الهندية ٤/ ٥١٠)

وقال عليه قيمتها من الدراهم يوم وقع القبض الخ وقوله: يوم وقع القبض، أي في صورة القرض كما نبه عليه في النهر. (رسائل ابن عابدين، ثاقب بك ڈپو ديوبند ۲/ ٦٠)

قال القاضي: الفتوىٰ في المهر والقرض على قول أبي يوسف. (رسائل ابن عابدين، ثاقب بك ڈپو ديوبند ۲/ ٥٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍رجب ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۸۲۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۹؍۷؍۱۴۲۱ھ

تقسیم جائیداد سے پہلے قرض کی ادائے گی کا حکم

سوال [۹۳۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مجھے ایک دوکان اپنے والد مرحوم سے وراثت میں ملی ہے، میری پہلی بیوی کی تین اولادیں ہیں، دولڑکے ایک لڑکی، تینوں بچوں کی شادی کر چکا ہوں، بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کی تھی، جس سے چارلڑکے اور دولڑکیاں ہیں، دولڑکوں کی شادی ہوچکی ہے، شادی شدہ چاروں لڑکے الگ ہیں، دولڑکےاور دولڑکیوں کی شادی کرنی باقی ہے، سب ہی اولادیں چاہتی ہیں کہ دوکان بیچ کرسب کوتقسیم کیا جائے، میرے حالات یہ ہیں کہ کمزوری کی بنا پرکوئی بھی کام کرنے سے قاصر ہوں، مثلاً چار بچوں کی شادی کا مسئلہ میرے سامنے ہے جس میں لڑکےتو خودکما کراپنی شادی کر سکتے ہیں؛ لیکن لڑکیوں کی شادی کا فرض ادا کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اخیر میں میں نے لڑکے کی شادی کی تو مجھ پراسی ہزار روپئے کا قرض ہوگیا، اس قرض کوکوئی ادا کرنے والانہیں ہے، ان حالات میں اسے بیچ کرقرض ادا کرنا چاہتا ہوں، اور میرا جیب خرچ اور بیماری کا خرچ کہاں سے چلےان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہئے؟

المستفتی: محمد یوسف بروالان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ پرلازم ہے کہ تمام کاموں پرقرض خواہوں کے قرض کی ادائے گی کومقدم رکھیں، اگرآپ دوکان بیچیں گےتواس کے پیسہ سے پہلےقرض ادا کرنالازم ہوگا، اس کے بعد جو بچے گا وہ آپ اپنی مرضی سے جس طرح چاہیں خرچ کریں یا اولاد کے درمیان تقسیم کریں، اس کا آپ کواختیار رہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ ۳/۲۰۱، جدید زکریا ۱۰/۲۷۰)

المالک هو المتصرف في ملكه كيف شاء. (تفسير البيضاوي، مكتبه رشيديه، ص: ۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ رجب ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۸۴۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰/۷/۱۴۲۱ھ

دائن کے انتقال کی صورت میں قرض کس کو دیا جائے؟

سوال [۹۳۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: صورت مسئلہ یہ ہے کہ راشد کسی شہر میں رہتا ہے، وہاں کسی ہوٹل والے کے یہاں چائے ناشتہ کیا کرتا تھا، راشد کے ذمہ تقریباً تیس روپئے ہوٹل والے کے ہیں، اس دوران ہوٹل والے کا انتقال ہوگیا، ان کے لڑکوں کے بارے میں علم نہیں ہے؛ البتہ ان کے بھائی کو جانتا ہے، راشد پیسے ادا کرنا چاہتا ہے، مگر صاحب حق کا انتقال ہو چکا ہے، اور وہ لالہ جی ہیں، اب راشدان تیس روپیوں کا کیا کرے؟ کیا اسی کے نام صدقہ کردے؛ حالانکہ وہ ہندو ہے، یا اس کے بھائی کو پہنچا دے یا کوئی اور راستہ خلاصی کا ہو؟

المستفتی: احسن الہدیٰ دیناج پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئلہ مذکورہ میں ہوٹل والے کے بھائی کو جب آپ جانتے ہیں تو اس کے توسط سے ہوٹل والے کے وارث کو آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں؛ اس لئے وہ رقم اس کے وارثین ہی کو دینا لازم ہے۔

رجل باع أثوابا، فمات قبل استيفاء الديون، ولم يدع وارثا ظاهرا، فأخذ السلطان ديونه من الغرماء، ثم ظهر له وارث كان على الغرماء أداء الديون إلى الوارث ثانيا لأنه لما ظهر الوارث ظهر أنه لم يكن للسلطان حق الأخذ. (فتاوى قاضيخان، كتاب الغصب، فصل في براءة الغاصب والمديون، زكريا جديد ٣/ ١٧٦، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٥٧، هندية زكريا قديم ٥/ ١٥٨، جديد ٥/ ١٨٥)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ربیع الاول ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۷۰۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۴/۴/ ۱۴۱۹ھ

۲۹/ كتاب الوديعة والأمانة والضمان

امانت میں تصرف کرنے کا شرعی حکم

سوال [۹۳۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محی الاسلام نے اپنے بھتیجے محمد فرقان کو۷۷۰۰۰/روپئے بطور امانت دیئے۔اور دیتے وقت یہ صراحت کی کہ جب حج کا موقع آئے گا تو میں آپ سے لے لوں گا اس کے بعد جب حج کا موقع آیا تو محی الاسلام نے اس رقم کا مطالبہ کیا، تو اس پر محمد فرقان نے کہا کہ میں تو وہ رقم آپ کو ادا کر چکا ہوں، اس کے بعد برابر دونوں میں نوک جھوک ہوتی رہی، تو کسی وقت محمد فرقان نے کہا کہ اچھا اس رقم سے میں نے جو نفع حاصل کیا ہے وہ موجود ہے، وہ آپ لے لیجئے، تو محی الاسلام نے کہا کہ مجھ کو تو اپنی اصل رقم چاہئے، اس کے بعد بات چیت برابر چلتی رہی، حتی کہ حلف اٹھانے کی بات آئی محمد فرقان نے کہا کہ رقم ادھار میں پھنسی ہوئی ہے، جب وہاں سے وصول ہوجائے گی تو دے دوں گا یا یہ کہ میں ان کا پتہ آپ کو بتا دیتا ہوں، آپ وصول کر لیجئے، اس میں معلوم یہ کرنا ہے کہ شرعاً اس رقم کے حصول کے لئے کیا طریقہ ہے؟ اگر محمد فرقان انکار کرتا ہے، تو حلف اور قسم کس کے لئے ہے؟ شرعی مسئلہ سے آگاہ فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

المستفتی: محی الاسلام محلّہ بھٹی، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: محی الاسلام کی امانت جو محمد فرقان کے پاس رکھی گئی ہے،

اس میں تصرف کرنا فرقان کے لئے کسی طرح جائز نہیں تھا، یہ امانت میں خیانت ہے، پھر اس کے بعد امانت طلب کرتے وقت اس کا انکار کرنا یا اس کے دینے میں ادھر ادھر ٹال مٹول کرنا حرام اور ناجائز ہے، محمد فرقان کے اوپر لازم ہے کہ فوری طور پر محی الاسلام کی امانت واپس کردے، نیز اس امانت کا جو بھی حصہ فرقان دے رہا ہے محی الاسلام کے لئے اس کا لینا جائز ہے، اگر فرقان امانت کی ادائے گی میں لاپرواہی کرے گا یا انکار کرے گا، تو عذاب عظیم کا مستحق ہوگا، نیز جھوٹی قسم کھائے گا تو مزید اکبرالکبائر کا مرتکب ہوگا۔

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوْا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا . [النساء: ٥٨]

قال رسول الله ﷺ: من اقتطع مال امرء مسلم بيمين كاذبة لقي الله وهو عليه غضبان. الحديث (بخاري شريف، كتاب التوحيد، باب قول الله وجوه يومئذ ناظرة ٢/ ١١٠٩، رقم: ٧١٤٥، ف: ٧٤٤٥، مسلم شريف، كتاب الايمان، باب وعيد من اقتطع حق مسلم بيمين فاجرة بالنار، النسخة الهندية ١/ ٨٠، بيت الأفكار، رقم: ١٣٨، أبوداؤد شريف، كتاب الأيمان والنذور، باب في من حلف ليقتطع بها مالا، النسخة الهندية ٢/ ٤٦٢، داالسلام، رقم: ٣٢٤٣)

عن عمران بن حصين قال: قال النبي ﷺ من حلف على يمين مصبورة كاذبا، فليتبوأ بوجهه مقعده من النار. (أبوداؤد شريف، كتاب الأيمان والنذور، باب التغليظ في اليمين الفاجرة، النسخة الهندية ٢/ ٤٦٢، دارالسلام، رقم: ٣٢٤٢، مسلم شريف، النسخة الهندية ١/ ٨٠، بيت الأفكار، رقم: ١٣٨)

قال رسول الله ﷺ: الكبائر: الإشراك بالله، واليمين الغموس. (صحيح البخاري، كتاب الأيمان والنذور، باب اليمين الغموس ٢/ ٩٨٧، رقم: ٦٤١٩، ف: ٦٦٧٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۹؍ ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۱۵۸)	۱۴۲۲/۴/۱۰ھ

امانت اجازت لےکر استعمال کرنے کا حکم

سوال [۹۴۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: یہ واقعہ ۱۹۸۷ء کا ایام حج کا ہے، میں مع اپنی اہلیہ فریضہ حج کو گیا تھا، مراد آباد میں میرے قبیلہ کے چچازاد بھائی نے پانچ سو ریال اپنے حقیقی بھائی کے لئے دیئے، جو کہ بڑے ہیں اور مدینۃ المنورہ میں سکونت پذیر ہیں، جب یہ امانت میرے سپرد کی تو پچاس پچاس ریال کے (عشرہ) یعنی دس نوٹ تھے پہلے تو میں گھبرایا، پھر میں نے یہ امانت لے لی اور ان سے یہ اجازت لی کہ میرے پاس سعودی کرنسی نہیں ہے، اگر اس میں سے کوئی نوٹ خرچ ہوجائے تو کوئی حرج تو نہیں ہے، تو جواب ملا کوئی حرج نہیں ہے، اس کو دیتے وقت پورے کر دینا، ہم لوگ بذریعہ ہوائی جہاز جدہ پہنچے اور زرمبادلہ کی کرنسی اپنی اہلیہ کو دے دی، امانت کی کرنسی میں نے احرام کی پیٹی کی جیب میں رکھ لی؛ اس لئے کہ بدلی نہ ہوجائے، اس میں ہندی کرنسی بھی تھی شام کو بوقت مغرب مکہ مکرمہ پہنچے نماز پڑھی اور نماز کے بعد رہائش کا مکان اہل قافلہ نے تلاش کیا، مل گیا اور سامان لگایا اور کھانا کھانے ہوٹل میں گئے، عشاء کا وقت قریب تھا، اس امانت میں سے پچاس ریال کا نوٹ بھنایا اور باقی ماندہ ریال احرام کی پیٹی میں رکھ لئے، نماز پڑھی، کچھ دیر آرام کیا اور شب میں تہجد سے پہلے عمرہ کرنے حرم شریف گئے، عمرہ ادا کیا، بعد فجر غسل کیا، سر کے بال کٹائے اسی دوران حج کے دن قریب آگئے، حرم شریف میں بھیڑ ہونے لگی اسی دوران واللہ اعلم بالصواب حرم کے باہر یا اندر داخل ہوتے وقت یا نکلتے وقت میری پیٹی اور میرے ساتھی کی پیٹی کٹ گئی، ساتھی کی ڈبل پیٹی تھی، کرنسی بچ گئی، اندر کا پورا حصہ نہیں کٹا تھا، میری پوری کٹ گئی تھی، امانت اور ہندکی کرنسی پوری نکل گئی، کمرہ پر آئے، پیٹی کھولی، پہلے میرے ساتھی نے کھولی پیٹی کی حالت دیکھ کر بہت گھبرائے؛ لیکن اللہ نے ان کی کرنسی محفوظ کردی، پھر میں نے کھولی دیکھا کہ امانت کے ریال ہندکی کرنسی غائب تھی، صبر کیا، ہمت

باندھی،شکر خدا کیا اوراس کے بعد ہم لوگ مدینہ پہنچےاور اپنی سعودی کرنسی پانچ سو ریال ایک نوٹ واپس کیا، ان کا بقالا حرم نبوی کے ملحق ہے، آرام گاہ اللہ کے محبوب کے قریب ہے، میں نے جھوٹ نہیں بولا؛ کیوں کہ ایسی جگہ جھوٹ بولنا منافق کا کام ہے، میں نے جو واقعہ نقل کیا سچ بیان کیا، انہوں نے کہا یہ میں واپس نہیں لوں گا، گو کہ میری وقتی حالت کمزور ہے، میں نے اور میرے ساتھی نے اور ایک دن بیوی نے بھی جد وجہد جاری رکھی، انہوں نے جواب دیا میں امانت لوں گا نہیں، اگر ہندوستان میں واپس کروتو مفتی کا فتوی لے کر واپس کرنا، دو سال سے کوشش ہے کہ امانت واپس ہو جائے؛ کیوں کہ امانت ریال کی شکل میں اسی دن سے ہے، میں ہندوستان واپس آرہا تھا، یہ امانت واپس مدینہ جانی ہے؛ لیکن مدینہ سے خط آیا فتوی لے کر اس کی کاپی میرے پاس بھیجنا؛ اس لئے اس مضمون کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے قرآن اور حدیث کی روشنی میں فتوی جاری کیجئے، فتوی مدینہ جانا ہے اور مہر لگی ہو۔

المستفتی: احقر عاصی محمد مبین محلّہ سرائے حسین بیگم، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفیق: سوال نامہ کی درج شدہ صورت میں پچاس ریال جو اجازت سے لے کر خرچ کیا ہے، اس کا تاوان دینا واجب ہوگا اور بقیہ امانت کا شرعاً تاوان دینا واجب نہیں۔ (مستفاد: بہشتی زیور اختری ۵/۴۰)

إذا كانت الوديعة دراهم أو دنانير أو أشياء من المكيل والموزون، فهو كما لو أودعه ...... فأنفق أحدهما لا يكون ضامنا للآخر. (البحرالرائق، كتاب الوديعة، زكريا ۷/ ۴۷۰، كوئٹه ۷/ ۲۷۷، تكمله شامي، زكريا ۱۲/ ۴۷۲، كراچی ۸/ ۳۵۴، فتاوى قاضي خان، جديد زكريا ۳/ ۲۶۵، وعلى هامش الهندية، زكريا ۳/ ۳۷۲)

وان أنفق المودع بعضها، فهلك الباقي فضمن قدر ما أنفق فقط. (الدرالمنتقى، قديم ۲/ ۳۴۲، جديد دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۴۷۳، حاشية چلپى على

تبیین الحقائق، إمدادیه ملتان ٥/ ٧٨، زکریا دیوبند ٦/ ٢٢، تاتارخانیة زکریا ١٦/ ٥٦، رقم: ٢٤١٧٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/۱۵۲۴)

امانت رکھے ہوئے زیورات بلا اجازت امانت رکھنے والے بیٹے کو دینے کا حکم

سوال [۹۳۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: صورت مسئلہ یہ ہے کہ میری والدہ نے اپنے زیورات میری خالہ (اپنی حقیقی چھوٹی بہن) کے پاس امانت کے طور پر تقریباً سات یا آٹھ سال پہلے رکھے تھے، جن کی مالیت موجودہ وقت میں تیس لاکھ روپئے ہے، دو مہینہ پہلے والدہ نے اپنے زیورات خالہ سے مانگے تو خالہ نے کہا: تمہارے کچھ زیورات چار سال پہلے اور کچھ زیورات تقریباً دو سال پہلے تمہارے چھوٹے بیٹے (جنید مسرت) کو میں نے دے دیئے اور زیورات بیٹے کو دینے کی خبر بھی خالہ نے والدہ کو بہت اصرار کے بعد دی اور میرا چھوٹا بھائی (جنید مسرت) ان زیورات کے لینے کا مقر بھی ہے اور زیورات خالہ سے لینے کی تحریر بھی دے چکا ہے، اب پوچھنا یہ ہے کہ ان زیورات کا ضامن کون ہوگا، خالہ ہوں گی یا چھوٹا بھائی؟ کیوں کہ چھوٹا بھائی بغیر اجازت کے والدہ کے اکاؤنٹ سے پیسے بھی نکال چکا ہے، ایسے میں والدہ بہت پریشان ہیں، شریعت کے مطابق مسئلہ کی وضاحت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ والسلام

المستفتی: زبیر مسرت مان پوراسٹریٹ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو زیورات آپ کی والدہ نے آپ کی خالہ کے پاس بطور امانت رکھے ہیں ان کی ادائیگی کی ذمہ دار آپ کی خالہ ہے؛ لیکن جب یہ ثابت ہو چکا

ہے کہ خالہ نے وہ زیورات آپ کے چھوٹے بھائی کو دے دیئے ہیں اور چھوٹے بھائی نے اس کے لینے کا اقرار کرلیا ہے، تو ایسی صورت میں آپ کے چھوٹے بھائی کے ذمہ لازم ہے کہ وہ زیورات یا تو آپ کی خالہ کے واسطہ سے والدہ کو ادا کرے یا براہ راست آپ کی والدہ کو دے دے۔ اور اگر آپ کی والدہ کی مرضی سے خالہ نے آپ کے چھوٹے بھائی کو دئے تھے تو خالہ بریٔ الذمہ ہوچکی ہے ورنہ بریٔ الذمہ نہیں ہے، خالہ اور آپ کے چھوٹے بھائی دونوں ان زیورات کے ذمہ دار ہیں، اگر خالہ نے چھوٹے بھائی کو یہ سمجھ کر کے دئے ہیں، تا کہ بیٹا اس امانت کو لے کر ماں تک پہنچادے تو ایسی صورت میں ساری ذمہ داری آپ کے چھوٹے بھائی پر عائد ہوتی ہے۔

وأجمعوا على أن الأمانات مردودة إلى أربابها الأبرار منهم والفجار. (تفسير قرطبي ٥/ ٢٥٦)

حق الأمانة أن تؤدى إلى أهلها، فالخيانة مخالفة لها. (مرقاة المفاتيح، مكتبه أشرفيه ديو بند ١/ ١٢٦)

فإن حفظها أي المودع الوديعة بغيرهم أي بغير من في عياله فضاعت ضمن المودع أو ذلك الغير؛ لأن صاحبها لم يرض بيد غيره والأيدى تختلف في الأمانة، ولكن روي عن محمد: المودع إذا دفع الوديعة إلى وكيله وليس في عياله أودفع إلى أمين أمنائه ممن يثق به في ماله وليس في عياله لا يضمن، وفي النهاية: وعليه الفتوى، ثم قال: وعن هذا لم يشترط في التحفة في حفظ الوديعة بالعيال إلا إذا خاف المودع الحرق. (مجمع الأنهر بيروت ٣/ ٤٧٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍شعبان ۱۴۳۶ھ
(الف رجسٹر خاص)

امانت میں تصرف کرنے کے بعد ہلاکت کی صورت میں ضمان کا حکم

سوال [۹۳۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے ایک صاحب کے پاس ۲۲ ر ہزار روپئے بطور امانت رکھے تھے، انہوں نے اس میں سے کبھی کسی کو قرض دے دیا اور کبھی خود استعمال کرلیا اور پھر میری کل رقم اکٹھا رکھ دیتے تھے، اس کے بعد پھر کل رقم کی چوری ہوگئی تو دریافت یہ کرنا ہے کہ یہ کل رقم ۲۲ ر ہزار روپئے انہیں ادا کرنا ضروری ہے یا نہیں اور مذکورہ بالا تصرف وہ میری بغیر مرضی کے کرتے تھے، تو میں اپنی پوری رقم ان سے لینے کا حق دار ہوں یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: امین نے چونکہ امانت میں تصرف کرلیا؛ لہٰذا امانت ضمانت ہوگئی، ہلاکت کی صورت میں امین کو اس کا تاوان دینا لازم ہے۔ (مستفاد: فتاوی رشیدیہ قدیم ۵۲۹، جدید زکریا ۵۰۸)

وإذا تعدی علیها فلبس ثوبها أو رکب دابتها، أو أخذ بعضها، ثم رد عینه إلی یده حتی زال التعدی زال ما یؤدي إلی الضمان إذا لم یکن من نیته العود إلیه (درمختار) وفي الشامیة: حتی لو نزع ثوب الودیعة لیلاً، ومن عزمه أن یلبسه نهارا، ثم سرق لیلا لا یبرأ عن الضمان. (شامي، کتاب الإیداع، کراچی ٥/ ٦٦٩، زکریا ٨/ ٤٦٤، البحرالرائق، کوئٹہ ٧/ ٢٧٧، زکریا ٧/ ٤٧٠، مجمع الأنهر، دارالکتب العلمیة بیروت ٣/ ٤٧٢-٤٧٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳ ر رجب ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۸۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۷/۳ھ

امانت کی رقم اپنی رقم کے ساتھ مخلوط کرنے کے بعد ہلاک ہونے پر ضمان کا حکم

سوال [۹۳۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید انڈے کا تاجر ہے اور شہر میں دوسرے لوگ بھی انڈے کی تجارت کرتے ہیں، مال کی خریداری کے سلسلہ میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دوکانداروں میں سے ایک آدمی لکھنؤ جا کر سب کا مال لے آتا ہے، اتفاق سے زید لکھنؤ مال کی خریداری کے سلسلہ میں جارہا تھا، تین آدمیوں کا مال لانا تھا، زید کے اپنے ذاتی پیسے بیس ہزار تھے، دوسرے یعنی بکر کے بارہ ہزار پانچ سو روپیہ تھے اور خالد نے کوئی رقم نہیں دی تھی؛ لیکن ان کا مال آنا تھا، لکھنؤ پہنچ کر حادثہ یہ ہوا کہ ایک غیر معروف شخص نے تلاشی کے بہانے دس ہزار روپئے کی رقم دھوکہ سے نکال لی، رقم شمار کرنے پر واقفیت ہوئی، اب مسئلہ یہ ہے کہ ضائع شدہ رقم آیا تینوں آدمیوں پر تقسیم ہوگی یا جن دو آدمیوں کی رقم تھی ان پر تقسیم ہوگی، یا تنہا زید ہی اس نقصان کا ذمہ دار ہوگا؟

المستفتی: حاجی محمد خلیق مدرسہ اشرف العلوم لکھیم پور کھیری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر زید نے بکر کی رقم کو اپنی رقم کے ساتھ مخلوط کر دیا ہے اور مخلوط کرنے کی بکر کی طرف سے کوئی اجازت نہیں تھی، تو ایسی صورت میں پورا نقصان زید کو اٹھانا لازم ہوگا، بکر کا کوئی پیسہ نقصان کے دائرہ میں داخل نہ ہوگا۔ اور اگر بکر نے صراحت سے کہہ دیا کہ اپنی رقم کے ساتھ مخلوط کر کے لے جانا، تو ایسی صورت میں ہلاک شدہ رقم میں دونوں آدمی اپنی اپنی ملکیت کے تناسب سے شریک ہوں گے؛ لہٰذا بکر کی کل رقم ۱۲/ ہزار ہے؛ اس لئے وہ ۳۷۵۰/ روپئے کا نقصان اٹھائے گا اور زید کی کل رقم ۲۰/ ہزار روپئے ہے؛ اس لئے وہ ۶۲۵۰/ کا نقصان اٹھائے گا، اب رقم دیتے وقت کیا شکل پیش آئی تھی اس کے اعتبار سے مذکورہ طریقہ سے معاملہ سلجھا لینا چاہئے۔

أو خلطها بماله بغير الإذن، حتى لا تتميز منها؛ لأنه صار مستهلكا

لها. (البحرالرائق، كتاب الوديعة كوئٹه ٧/ ٢٧٦، زكريا ٧/ ٤٦٩، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٥/ ٧٧، زكريا ديوبند ٦/ ٢٠، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٧)

وإن خلطها بإذنه كان شريكا له. (البحرالرائق، زكريا ٧/ ٤٧٠، كوئٹه ٧/ ٢٧٦، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٥/ ٧٨، زكريا ديوبند ٦/ ٢١، الدرالمنتقى، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٧٢، تاتارخانية، زكريا ١٦/ ٤٥، رقم: ٢٤١٧٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍جمادی الثانیہ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۳۴۹۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲/۶/۱۴۱۴ھ

امانت کے ساتھ حاجی کا بیگ ’’بیت الخلاء‘‘ میں رہ گیا

سوال [۹۳۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے پاس ایک صاحب کے ایک ہزار ریال بطور امانت رکھے تھے، میں نے یہ امانت مع اپنے ۸۲۲؍ ریال بیگ میں رکھ لی، منی کی تیاری ہورہی تھی، اسی اثناء میں پیشاب کی ضرورت سے بیت الخلاء میں داخل ہوا، وہاں کنارے پر بیگ رکھ کر قضائے حاجت کر کے باہر آ گیا، بھول سے بیگ وہاں رہ گیا، بعد میں میں نے اور میرے ساتھیوں نے بہت تلاش کیا؛ لیکن کسی طرح بیگ ہاتھ نہیں آیا، وہ ساری رقم ضائع ہوگئی، اب سوال ہے کہ جن صاحب کے ایک ہزار ریال تھے، میرے اوپر شرعاً واجب الاداء ہیں یا نہیں؟ جب کہ ان کے ضائع ہونے میں میری کوئی اختیاری لاپرواہی نہیں ہے، جو بھی شرعی حکم ہو مطلع فرمائیں۔

المستفتی: ولی الدین رفعت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مذکورہ امانت کے ضائع ہونے میں آپ کی طرف سے کوئی تعدی اور لاپرواہی نہیں ہوئی ہے، جس میں آپ کے بھی ۸۲۲؍ ریال ضائع ہو گئے ہیں، تو اس طرح بغیر تعدی اور بغیر لاپرواہی کے امانت ہلاک ہوجانے سے شرعی طور پر تاوان

واجب نہیں ہوتا؛ اس لئے مذکورہ امانت کا تاوان شرعاً آپ پر ادا کرنا واجب نہیں ہے۔

عن عمرو بن شعيب عن أبيه، عن جده عن النبي ﷺ قال: ليس على المستعير غير المغل ضمان، ولا على المستودع غير المغل ضمان.
(سنن الدارقطني، البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۳٦، رقم: ۲۹۳۹)

وهي أمانة ...... فلا تضمن بالهلاك. (تنوير الأبصار على الدرالمختار، كتاب الإيداع، كراچی ٥/ ٦٦٤، زكريا ۸/ ٤٥٥، البحرالرائق، كوئٹه ۷/ ۲۷۳، زكريا ۷/ ٤٦٥، ملتقى الأبحر، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ٤٦۷، هدايه أشرفي ديوبند ۳/ ۲۷۳)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ رصفر ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۱۲۹)

مالک سے امانت کے چوری شدہ پیسہ کے مطالبہ کا حکم

سوال [۹۳۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک فرم میں نوکری کرتا ہے، ڈیوٹی کے ٹائم میں ہی زید کے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا، حادثہ یوں ہے کہ رمضان کے مہینے میں فرم مالکان زکوۃ تقسیم کرنے کے لئے ایک دن مقرر کرتے ہیں، زید کی فرم میں بھی زکوۃ تقسیم کے لئے ایک دن مقرر تھا، زکوۃ لینے والوں کی ایک بہت بڑی بھیڑ فرم کے گیٹ پر تھی، زید کہیں باہر سے زکوۃ میں بانٹنے کے لئے اپنے مالک کے روپئے لے کر آیا اور فرم کے گیٹ کی بھیڑ میں سے ہو کر روپئے لے کر فرم کے اندر جا رہا تھا، روپئے ایک بیگ میں رکھے تھے، زید ان روپیوں کو حفاظت سے لے جانے کے خیال میں اپنی جیب میں رکھے ہوئے روپئے کو بھول گیا، جو کسی کی امانت زید کے پاس جیب میں رکھی تھی اور بھیڑ میں زید کی جیب میں سے وہ روپئے بھیڑ کے لوگوں میں سے کسی نے نکال لئے اور بیگ کے روپئے محفوظ وسلامت رہے۔ زید اس قابل نہیں ہے کہ امانت داری کی رقم واپس

کر سکے، اس صورت میں زید اپنے مالک سے چوری شدہ رقم کو مانگ رہا ہے، جس سے امانت دار کی امانت واپس کر سکے، زید نے ایک نوکری پیشہ غریب اور پردیسی ہونے کی وجہ سے اپنے مالک کے سامنے یہ مانگ رکھی ہے، زید کو پوری جانکاری تھی کہ یہی روپئے زکوۃ میں تقسیم کئے جائیں گے جو میرے پاس ہیں، جب تک روپئے گیٹ کے اندر نہیں دیئے جائیں گے یہ بھیڑ ختم نہیں ہوگی؛ اس لئے زید بھیڑ میں سے ہوکر روپئے لےکر اندر جارہا تھا، زید کے پاس اپنے مالک کے کافی روپئے ہونے کی وجہ سے اپنی جیب میں رکھے ہوئے روپئے کا قطعی دھیان نہ رہا، اگر مالک کے روپئے زید کے پاس نہیں ہوتے تو زید بھیڑ میں نہیں گھستا اور جب بھیڑ میں نہیں گھستا تو زید کی جیب سے روپئے نہیں چوری ہوتے، اپنے مالک کی امانت کا پورا خیال رکھا، زید کا مالک اگر زید کو چوری شدہ روپئے نہیں دے گا، تو زید کافی دنوں تک قرض دار رہے گا، اس صورت میں زید کیا کرے؟

المستفتی: محمد اختر عیدگاہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں دو قسم کے روپیوں کا ذکر کیا گیا ہے:

(۱) کا روپیہ شخص مذکور کے پاس کسی آدمی کی امانت ہے۔

(۲) کا پیسہ شخص مذکور کے پاس اس کے مالک کے ہیں۔ اور مالک کا پیسہ بحفاظت لاتے ہوئے اس کے پاس سے امانت کے پیسے جیب سے چوری ہوگئے، تو ایسی صورت میں مالک کا اس امانت کے پیسے سے کوئی تعلق نہیں، مالک کے پیسہ کی حفاظت بہرصورت اس شخص پر لازم تھی اور امانت کے پیسہ کی حفاظت بھی اس کے اوپر لازم تھی، یہ دونوں ذمہ داریاں اس کے اوپر شرعی طور پر پہلے ہی سے لازم تھیں؛ لہٰذا مالک کے پیسہ کی حفاظت کی وجہ سے دوسری امانت کا چوری شدہ پیسہ کے مطالبہ کا مالک سے حق نہیں ہے، ہاں یہ بات الگ ہے کہ مالک اپنی مرضی سے چاہے ملازم کی امداد کرے یا نہ کرے، وہ اس کے اختیار کی بات ہے۔

إذا سرقت الوديعة من دار المودع، وباب الدار مفتوح والمودع

غـائـب عـن الـدار، قال محمد بن سلمة رحمه الله: كان ضامنا. (تـاتارخانية، زكريا ١٦/ ١٩، رقم: ٢٤٠٣٠، هندية، كتاب الوديعة، الباب الرابع، زكريا قديم ٤/ ٣٤٤، جديد ٤/ ٣٥٧)

ولـلـمـودع أن يـحفظها بنفسه وبعياله ...... ويشترط أن يكون من في عيـالـه أمـيـنـا؛ لأنـه لـو دفع إلى زوجته وهي غير أمينة، وهو عالم بذلک أو تـركهـا في بيته الذى فيه ودائع الناس، وذهب فضاعت ضمن. (البحرالرائق، زكـريـا ٧/ ٤٦٥، كوئٹه ٧/ ٢٧٤، مجمع الأنهر قديم ٢/ ٣٣٩،، جديد دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٦٩، شامي، زكريا ٨/ ٤٥٦، كراچی ٥/ ٦٦٤)

ورد فـى بـعـض الـروايـات: أن عـمـرؓ سأل أنساًؓ هل ذهب لک معها شـيء؟ قال: لا فضمنه كأنه رأى أن أنساًؓ لم يحفظ الوديعة كما حفظ متاعه. (أحكام القرآن للتهانوي ٢/ ٢٠١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ذیقعدہ ۱۴۳۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۸۲۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/ ۱۱/ ۱۴۳۰ھ

ادارے کا تجارت کے لئے روپئے دینے پر نقصان کی صورت میں ضمان کا مسئلہ

سوال [۹۳۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: امداد باہمی ادارے سے تجارت کے لئے ایک شخص کو روپئے دئے اوراس میں اس شخص کو نقصان ہوجاتا ہے، اس نقصان کا ذمہ دار کون ہوگا، تجارت کرنے والا یا باہمی امداد ادارہ؟

المستفتی: مولوی محمد الطاف، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: امداد باہمی ادارے کے روپئے اس شخص کے ذمہ امانت ہیں، جو اس کا ذمہ دار ہے؛ لہٰذا اس سے خود تجارت کرنا یا تجارت کے لئے کسی کو دینا درست

نہیں، اگر خود تجات کی یا تجارت کے لئے کسی کو دیا، پھر نقصان ہو گیا تو اس نقصان کا ضمان مذکورہ امداد باہمی ادارے کے ذمہ دار پر ہوگا، اس شخص پر نہ ہوگا جس کو تجارت کے لئے رقم دی ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۵/ ۲۸۹، جدید ڈابھیل ۱۵/۱ ۵۰)

الـوديعة لا تودع، ولا تعار، ولا تؤاجر، ولا ترهن، وإن فعل شيئا منها ضمن. (هندية، كتاب الوديعة، الباب الأول، زكريا قديم ٤/ ٣٣٨، جديد ٤/ ٣٤٩، كذا فـي خـلاصة الـفتـاوى، كتاب العارية، الفصل الأول، أشرفيه ديو بند ٤/ ٢٩١، البحرالرائق، كوئٹه ٧/ ٢٧٥، زكريا ٧/ ٤٦٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۶/۵/۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۷۲۱۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۵/۲۶ھ

دوران سفر امانت کی رقم چوری ہونے کا شرعی حکم

سوال [۹۳۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عمران نے اپنے دوست مہربان کو ایک ہزار روپے دئے کہ یہ روپئے آپ میرے گھر میرے والد محترم کو دے دیں گے، مہربان کے ایام سفر میں تمام ساز وسامان اور نقدی ذاتی اور دیگر دوست کی سب کچھ چوری کی نظر ہوگئی، کوئی شرط بھی نہیں ہے، عمران کا دعویٰ ہے کہ آپ کے اوپر میرا ہزار روپیہ لازمی بنتا ہے، آپ کو یہ رقم دینی ہوگی۔

المستفتی: مظہر الحق رحمت نگر کرولہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: دوران سفر مہربان نے نقدی روپئے وغیرہ ساز وسامان کی حفاظت میں غفلت اور لا پرواہی برتی ہے کہ اس کی غفلت اور لا پرواہی سے فائدہ اٹھا کر چور نے چوری کر لی ہے، تو عمران کے ہزار روپئے مہربان کے اوپر لازم ہوں گے، نیز اگر عمران نے مہربان کو بطور ضمانت یہ روپئے پہنچانے کے لئے دئے ہیں، تو ایسی صورت میں

حفاظت کے باوجود اگر چوری ہوگئے تب بھی مہربان کے اوپر عمران کے ہزار روپئے ادا کرنا لازم ہوگا، ہاں البتہ اگر بطور ضمانت نہیں دیا ہے بلکہ امانت کے طور پر دیا ہے اور پورے سفر میں چوکسی اور حفاظت کے باوجود چوری ہوگئے ہیں، جو مہربان کے ایمان دارانہ بیان سے معلوم ہوسکتا ہے، تب ہزار روپئے کی ادائے گی مہربان پر لازم نہ ہوگی۔ اور اگر بطور امانت ہی دیا ہے؛ لیکن مہربان نے یہ سوچ کر کے اسی میں سے کچھ رقم راستہ میں خرچ کرلی ہے کہ دوسرا پیسہ ہم اپنی طرف سے دے کر پورا کردیں گے اور راستہ بھر میں کوئی غفلت لاپرواہی نہیں برتی گئی اور چوری ہوگئے، تو ایسی صورت میں بھی مہربان کے اوپر ہزار روپئے کی ادائے گی لازم ہے؛ اس لئے کہ وہ امانت ضمانت بن گئی ہے۔

الوديعة أمانة في يد المودع، فإذا هلكت بلا تعد منه، وبدون صنعه وتقصيره في الحفظ لا يضمن. (شرح المجلة رستم باز مكتبه إتحاد ديوبند ١/ ٤٣١، رقم المادة: ٧٧٧)

الوديعة أمانة في يد المودع إذا هلكت لم يضمنها؛ لأن بالناس حاجة إلى الاستيداع، فلو ضمناه يمتنع الناس عن قبول الودائع، فتعطل مصالحهم. (هداية مع الفتح، كتاب الوديعة، زكريا ديوبند ٨/ ٥٠٨، كوئٹه ٧/ ٤٥١، ٤٥٢، دارالفكر بيروت ٨/ ٤٨٥، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٦٨)

وإذا تعدى عليها، فلبس ثوبها، أو ركب دابتها، أو أخذ بعضها، ثم رد عينه إلى يده حتى زال التعدي، زال ما يؤدي إلى الضمان، إذا لم يكن من نية العود إليه. (درمختار) وفي الشامية: حتى لو نزع ثوب الوديعة ليلا، ومن عزمه أن يلبسه نهارا، ثم سرق ليلا لا يبرأ عن الضمان. (شامي، كراچی ٥/ ٦٦٩، زكريا ٨/ ٤٦٤، البحرالرائق، كوئٹه ٧/ ٢٧٧، زكريا ٧/ ٤٧٠، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٧٢-٤٧٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰/ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۲۱۵)

امانت کی رقم چوری ہوگئی تو کیا حکم ہے؟

سوال [۹۳۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے اپنے کسی معتبر شخص کے پاس کچھ رقم بطور امانت رکھ دی، اتفاق سے جس کے پاس رقم رکھی گئی وہ کسی حادثہ کا شکار ہوگیا، مثلاً کوئی اس سے بیگ چھین لے گیا یا گھر میں رکھی رقم چوری ہوگئی، واقعی ایسا ہوگیا تو شرعی اعتبار سے اس کو کسی بھی حال میں رقم واپس کرنی ہوگی، جب کہ یہ صاحب استطاعت بھی نہیں ہے؟

المستفتی: قاری حسین احمد، ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس معتبر شخص کے پاس بطور امانت رقم رکھی گئی ہے اور اس کی طرف سے کسی قسم کی لاپرواہی اور تعدی کے بغیر وہ رقم کسی حادثہ کی شکار ہوگئی ہے، یا گھر میں حفاظت سے رکھنے کے باوجود چوری ہوگئی، تو ایسی صورت میں وہ امانت میں خیانت کرنے والا شمار نہیں ہوگا اور نہ اس پر تاوان لازم ہوگا۔

عن عمرو بن شعيب عن أبيه، عن جده عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ليس على المستعير غير المغل ضمان، ولا على المستودع غير المغل ضمان.

(سنن الدارقطني، البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۳۶، رقم: ۲۹۳۹)

الوديعة أمانة في يد المودع، فإذا هلكت بلا تعد منه، وبدون صنعه وتقصيره في الحفظ لا يضمن. (شرح المجلة رستم باز مكتبه إتحاد ديوبند ۱/ ۴۳۱، رقم المادة: ۷۷۷)

فلا يضمن أي لا يضمن المودع الموديعة بغير تعد بالهلاك، سواء أمكن من التحرز عنه أو لا –إلى– لقوله عليه السلام: ليس على المستودع غير المغل ضمان. (مجمع الأنهر، كتاب الوديعة، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۴۶۸، هداية، أشرفي ديوبند ۳/ ۲۷۳)

لیکن یہ یاد رکھیں کہ اسلم نامی آدمی جو روپیہ لے کر بیٹھ گیا ہے وہ امانت نہیں ہے؛ بلکہ ضمانت ہے اور ضمانت کی صورت میں اگر بلا تعدی ہلاک ہو جائے تب بھی اسلم ضامن ہوگا۔

ويجب رد عين المغصوب ما لم يتغير تغيرا فاحشا -إلى قوله- أو يجب رد مثله إن هلك. (درمختار، كتاب الغصب، مطلب في رد المغصوب وفيما لو أبى المالك قبوله، زكريا ۹/ ۲۶۶-۲۶۷، كراچی ۶/ ۱۸۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۱/۲/۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۸۸۲/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۲/۷ھ

کمرے سے بیگ چوری ہونے کا حکم

سوال [۹۳۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں ایک دینی ادارے کا مدرس ہوں، ہر سال رمضان میں چندہ کی غرض سے بمبئی جاتا ہوں اور مدرسہ کے حصے کی رقم جو حاصل ہوتی ہے زکوۃ، صدقات، فطرہ وغیرہ کی مدرسہ میں لاکر جمع کرتا ہوں، یہ سلسلہ عرصہ دراز سے چلا آرہا ہے، ایک سال ایک حادثہ پیش آگیا، وہ یہ کہ ہم اپنا بیگ جس میں چندہ کی رقم تھی اپنے کمرے میں رکھ کر معمول کے مطابق عصر کی نماز ادا کرنے مسجد میں چلے گئے، ہمارے مدرسہ کے ایک موقر استاذ بھی چندے کی حصولیابی کے لئے تشریف لے گئے تھے، انہوں نے بھی اپنی رقم میرے بیگ میں ایک کپڑے میں لپیٹ کر رکھ دی، ہم دونوں عصر کی نماز ادا کر کے واپس ہوئے تو دیکھا کہ بیگ کے نچلے حصہ پر بلیڈ لگا ہوا ہے، اور میری چندہ کی ہوئی رقم غائب ہے اور ہمارے رفیق استاذ کی رقم چونکہ علیحدہ کپڑے میں لپیٹ کر رکھی ہوئی تھی، شاید چور نے میری رقم کو کل رقم سمجھا اور رفیق استاذ کی رقم محفوظ رہ گئی۔ یہ واضح رہے کہ جس جگہ ہمارا قیام تھا وہ جانا پہچانا تھا، تقریباً ہر سال وہیں قیام رہتا تھا، کبھی اس قسم کا حادثہ پیش نہیں آیا تھا، بہر حال مسئلہ یہ معلوم کرنا ہے کہ چوری شدہ رقم کا

عوض میرے ذمہ لازم ہے؟ کیا وہ قرض کی طرح ہے جس کی ادائے گی میرے اوپر لازم ہے؟ شریعت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

المستفتی: عبداللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرسہ کے پیسہ کے ساتھ بیگ کو کسی کے کمرے میں چھوڑ کر اس کمرہ میں تالا لگائے بغیر یوں ہی چھوڑ کر مسجد میں نماز کے لئے چلے جانا امانت کے بارے میں لاپرواہی اور غفلت ہے؛ اس لئے اس پیسہ کا تاوان آپ کے اوپر لازم ہوجائے گا، آپ کو چاہئے کہ اتنا پیسہ اپنی طرف سے مدرسہ میں داخل کردیں۔

الإيداع تسليط المالك غيره على حفظ ماله، والوديعة ما يترك عند الأمين للحفظ، وهي أمانة ...... وللمودع أن يحفظها بنفسه. (مجمع الأنهر، كتاب الوديعة، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٦٦)

وأما حكمها فوجوب الحفظ على المودع وصيروة المال أمانة في يده ووجوب أدائه عند طلب مالكه. (هندية، زكريا جديد ٤/ ٣٤٩، قديم ٤/ ٣٣٨، البحرالرائق، كوئٹه ٧/ ٢٧٥، زكريا ٧/ ٤٦٧، درمختار كراچی ٥/ ٦٦٤، زكريا ٨/ ٤٥٥، تاتارخانية، زكريا ١٦/ ٣، رقم: ٢٣٩٦٧)

وفي فتاوى أبي الليث المودع إذا وضع الوديعة في الدار، وخرج والباب مفتوح، فجاء سارق، ودخل الدار وسرق الوديعة، فإن لم يكن في الدار أحد، ولا في موضع يمنع المودع الحبس يضمن؛ لأن هذا تضييع. (تاتار خانية زكريا ١٦/ ١٩، رقم: ٢٤٠٢٩)

وذكر الفقيه أبو الليث السمرقندي في خزانة الفقه: لا ضمان على المودع إلا في ثلاثة أشياء التقصير في الحفظ. (حاشية چلبي على تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٥/ ٧٧، زكريا ديوبند ٦/ ١٩)

الأمانة غير مضمونة، فإذا هلكت أو ضاعت بلا صنع الأمين ولا تقصير منه لا يلزمه الضمان سواء هلكت بما يمكن التحرز عنه كالسرقة، أما إذا هلكت بتعدى الأمين أو تقصيره، فإنه يضمن الوديعة أمانة في الوديع، فإذا هلكت بلا تعد منه وبدون صنعه وتقصيره في الحفظ لا يضمن، ولكن إذا كان الإيداع بأجرة، فهلكت أو ضاعت بسبب تمكن التحرز عنه لزم المستودع ضمانها. (شرح المجلة ۱/ ۳۲۶- ۴۳۱، رقم: ۷۶۸-۷۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۴۳/ ۱۱۵۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۵/۲۸ھ

کیا امانت کی رقم ضائع ہونے پر تاوان لازم ہے؟

سوال [۹۳۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک کاروبار مشترک دو فریق چلاتے تھے، ایک فریق اول جس کے پاس رقم اور حساب وکتاب رہتا تھا، اس کو اچانک باہر جانا ہوا اور اس نے رقم باہر کاروبار کی دینداری کی نکالی اور بقیہ رقم عجلت کی بنا پر اہلیہ کو دی کہ سنبھال کر رکھ دینا اس نے وقتی طور پر احتیاطاً چھوٹی بچی (عمر تقریباً چار سال) کی کم استعمال ہونے والی جیکٹ کی جیب میں رکھ دی، اس کے بعد وہ قطعاً بھول گئی اور رقم جیکٹ میں رکھی رہی، بعدہ شدید سردی ہونے کی وجہ سے وہ جیکٹ پہنا کر اس کو اسکول بھیج دیا، اسکول میں وہ رقم ٹیچروں وغیرہ کی معلومات میں بھی آ گئی، انہوں نے رقم اپنے پاس نہ رکھ کر اس بچی کی جیب میں رکھ کر اس کو معمولی طور پر سی دیا، کسی طرح بات باہر معلوم ہوئی اور ایک شاطر عورت نے بچی کے رکشہ میں تھوڑا راستہ ساتھ بیٹھ کر وہ رقم اس کی جیب سے نکال لی۔

جواب طلب مسئلہ یہ ہے کہ یہ نقصان کاروبار کا مانا جائے یا فریق اول کا؟ شریعت مطہرہ کی روشنی میں جواب عنایت فرما کرعنداللہ ماجور ہوں۔

المستفتی: توصیف احمد، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حسب تحریر سوال فریق اول کے پاس رقم رہنے کی وجہ سے وہ ساری رقم اس کی ضمانت میں آ گئی ہے، اب اس کی حفاظت فریق اول کے ذمہ لازم ہے؛ لیکن سوال میں ذکرکردہ تفصیل کے مطابق اس کی بیوی کی طرف سے حفاظت میں کوتاہی کی بنا پر وہ چوری ہوئی ہے؛ لہٰذا اس ضائع شدہ رقم کا پورا کا پورا تاوان فریق اول کو ہی دینا ہوگا۔ اور اس کا نقصان فریق اول ہی برداشت کرے گا، کاروبار میں اس نقصان کو نہیں ڈالا جائے گا؛ اس لئے کہ یہ امانت حفاظت میں نہیں رہی۔

لو انفتق زق رجل، فأخذه رجل، ثم تركه ولم يكن المالك حاضرا يضمن؛ لأنه لما أخذه فقد التزم حفظه دلالة. (مجمع الأنهر، كتاب الوديعة، قديم ٢/ ٣٣٧، جديد دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٦٦)

سئل ابن الفضل عمن دفع جواهر إلى رجل ليبيعها ...... فضاعت الجواهر قبل أن يريها قال: إن ضاعت أو سقطت بحركته ضمن. (هندية، الباب الرابع فيما يكون تضييعا للوديعة، زكريا جديد ٤/ ٣٥٤، قديم ٤/ ٣٤٢)

وللمودع أن يحفظها بنفسه وبعياله؛ لأنه يحفظها بما يحفظ به ماله ...... فدخل فيهم الزوجة ...... ويشترط أن يكون من في عياله أمينا؛ لأنه لو دفع إلى زوجته وهي غير أمينة، وهو عالم بذلك أو تركها في بيته الذى فيه ودائع الناس، وذهب فضاعت ضمن. (البحرالرائق، كتاب الوديعة، زكريا ٧/ ٤٦٥، كوئٹه ٧/ ٢٧٤، مجمع الأنهر قديم ٢/ ٣٣٩،، جديد دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٦٩، شامي، زكريا ٨/ ٤٥٦، كراچی ٥/ ٦٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢٦ر محرم الحرام ١٤٣١ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٩٨٦٥/٣٨)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
٢٦/١/١٤٣١ھ

کوتاہی کی بنا پر امانت کے ضائع ہونے کا شرعی حکم

سوال [۹۳۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مدرس مدرسہ ہذا اپنے پروگرام سے ہتورا جارہے تھے، مہتمم مدرسہ نے ہتورا سے کچھ کتب خرید کر لانے کی ذمہ داری ان کو سونپ دی وہ واپسی میں جب باندہ کی بس سے کانپور اترنے لگے، تو انہوں نے جلدا تر کر آگے کی بس تلاش کرنی شروع کر دی اور اپنا سامان اتارنے کی ذمہ داری (قولاً یا حالاً) اپنے رفقاء سفر کو دے دی، رفقاء سفر نے ان کا سامان تو اتارلیا، مگر کتابیں رہ گئیں اور یاد آنے پر جب بس کو تلاش کیا تو وہ بس جا چکی تھی، تو قابل امر سوال یہ ہے کہ ان کتب کی اضاعت کا ذمہ دار کون ہوگا؟ رفقاء سفر یا مدرس مدرسہ یا اس کا نقصان مدرسہ برداشت کرے گا جو مسئلہ ہو تحریر کریں؟

المستفتی: مولانا محمد اسلم مظاہری دارالعلوم ٹانڈہ، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرس صاحب کو اجنبی جگہ میں بس میں کتابیں چھوڑ کر دوسری گاڑی کی تلاش کے لئے اترنا نہیں چاہئے تھا، پہلے کتابیں بس سے نیچے اتار کر کسی مخصوص جگہ پر رکھ کر ساتھیوں کی نگرانی میں دے کر تب دوسری بس تلاش کرنی چاہئے تھی؛ اس لئے مدرس صاحب کی طرف سے امانت کی حفاظت میں کوتاہی ظاہر ہے؛ اس لئے ضائع شدہ کتابوں کی ذمہ داری مدرس صاحب ہی پر ہوگی اور نقصان کی تلافی انہیں کو کرنی چاہئے۔

كما استفيد من عبارة الهداية: ومن أودع رجلا وديعة، فأودعها آخر، فهلك، فله أن يضمن الأول، وليس له أن يضمن الآخر. (هداية، كتاب الوديعة، أشرفي ديوبند ٣/ ٢٧٧، مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر جديد دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٧٥، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٥/ ٨١، زكريا ديوبند ٦/ ٢٨، فتاوى بزازية، جديد زكريا ٣/ ١٠٢، وعلى هامش الهندية زكريا ٦/ ٢٠٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ ربیع الاول ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۷۱۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸؍۳؍ ۱۴۱۷ھ

امانت کو ضائع کرنے کا شرعی حکم

سوال [۹۳۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مشتاق علی صاحب نے وفات کے وقت ایک جائیداد چھوڑی اوران کے دولڑکے: عالم علی اور مظہر علی ہیں، تین لڑکیاں: رابعہ خاتون، زبیدہ خاتون، نعیمہ خاتون ہیں۔ اس کے بعد وہ جائیداد فروخت ہوگئی، دونوں بھائیوں کو نوے نوے ہزار روپئے ملے اور تینوں بہنوں کو پینتالیس پینتالیس ہزار روپئے ملے۔ عالم علی صاحب نے بہن زبیدہ کے حصہ میں جو ۴۵/ ہزار روپئے آئے تھے، وہ بطور امانت اپنی بیوی رابعہ خاتون کے پاس رکھ دئے اور رابعہ خاتون کے نام سے دوعورتیں ہیں، عالم علی کی بیوی اور عالم علی کی بہن، تو عالم علی نے زبیدہ کا حصہ اپنی بیوی رابعہ کے پاس بطور امانت رکھا، اور رابعہ خاتون نے اس پیسہ کو لے کر بجائے اپنے پاس رکھنے کے اپنی چھوٹی نند زبیدہ کی چھوٹی بہن نعیمہ کے پاس رکھ دیا اور یہ سوچ کر رکھا تھا کہ اس کے پاس زیادہ محفوظ رہے گا۔ اور یہ پیسہ اس طرح بطور امانت رکھنے کی اس لئے ضرورت پڑی کہ زبیدہ خاتون غیر ملک میں رہتی ہے؛ اس لئے زبیدہ تک پہنچانے میں تاخیر ہوئی اور نعیمہ خاتون نے یہ حرکت کی کہ اس امانت کو بطور حفاظت رکھنے کے بجائے اس میں سے چالیس ہزار روپئے اپنے بھتیجے محمد ظریف اور محمد یاسین کو جو کہ مظہر علی کے بیٹے ہیں، اپنی ضرورت کے لئے دے دئے، تو اب اس امانت کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ نعیمہ خاتون کے اوپر کیا ذمہ داری ہے؟ اوراس وقت نعیمہ خاتون بستر مرگ پر ہے، اگر نعیمہ کا انتقال ہوجاتا ہے، تو امانت کا پیسہ جو بھتیجوں کے ہاتھ میں ہے ضائع ہوجائے گا اور نعیمہ خاتون بات چیت کرنے پر بھی قادر نہیں ہے اور پھر دوسری طرف یہ بات پیش آئی کہ عالم علی اور مظہر علی کی ایک مشترکہ جائیداد تھی، جس میں دونوں بھائی برابر کے شریک تھے، اس مشترکہ جائیداد کی فروختگی کے نتیجہ میں ایک لاکھ روپئے آئے اور وہ پیسہ عالم علی کی بیوی کے پاس رکھا گیا، جس میں مظہر علی کے بیٹے ظریف اور یاسین کے پچاس ہزار روپئے ہوئے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ زبیدہ

کا پیسہ جو نعیمہ سے مظہر علی کے بیٹے ظریف اور یاسین نے ۴۵ ہزار امانت میں سے چالیس ہزار لے لئے تھے، اب دونوں بھائی ظریف اور یاسین کے ایک لاکھ روپے میں سے پچاس ہزار روپے بنتے ہیں، اس میں سے رابعہ خاتون مجری کر کے زبیدہ خاتون کی امانت کو محفوظ کرنے کے لئے چالیس ہزار روپے روک سکتی ہے یا نہیں؟ شرعاً کیا حکم ہے؟

المستفتی: ریحان علی لانکڑی والان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب عالم علی صاحب کی زوجہ رابعہ خاتون نے بغرض حفاظت ۴۵ ہزار روپے امانت کے طور پر اپنی چھوٹی نند نعیمہ خاتون کے پاس رکھے، تو نعیمہ کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس امانت کو حفاظت سے رکھتی اور کسی کے حوالہ نہ کرتی؛ لیکن نعیمہ نے ایسا نہیں کیا؛ بلکہ اپنے بھتیجوں ظریف اور یاسین کو ان کی ضرورت کے لئے دے دیا، تو یہ نعیمہ کی طرف سے خیانت ہوئی، اب جب کہ نعیمہ بستر مرگ پر ہے اور بات چیت بھی نہیں کرسکتی اور اس کے بھتیجے ظریف اور یاسین یہ پیسہ دینے سے انکار کررہے ہیں تو رابعہ خاتون کے پاس ان کے پچاس ہزار روپے میں سے چالیس ہزار روپے زبیدہ کے لئے اس روپے کے عوض روک لینا جائز ہے، جو روپے بذریعہ نعیمہ ظریف اور یاسین کو پہنچے ہیں اور وہ نہیں دے رہے ہیں اور یہ چالیس ہزار روپے اصل حق دار زبیدہ تک پہنچانا ذمہ داروں پر لازم ہے اور بقیہ دس ہزار روپے ظریف اور یاسین کو دے دئے جائیں۔

ولو أودع المودع، فهلكت ضمن الأول فقط، وعندهما ضمن أيا شاء، فإن ضمن الثاني رجع على الأول لا بالعكس. وفي مجمع الأنهر: ضمن أيا شاء، أي يخير المالك في التضمين؛ لأن الأول خائن بالتسليم إلى الثاني بغير إذن المالك، والثاني متعد بغير إذنه. (مجمع الأنهر، شرح ملتقى الأبحر، كتاب الوديعة، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۴۷۵، هداية مع الفتح، دارالفكر بيروت ۸/ ۴۹۵، زكريا ۸/ ۵۱۸، كوئٹه ۷/ ۴۶۱، تبيين الحقائق، زكريا ديوبند

٦/ ٢٨، إمـداديـه ملتان ٥/ ٨١، فتاوى بزازية، جديد زكريا ٣/ ١٠٢، على هامش الهندية، زكريا ٦/ ٢٠٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍رجب ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۷۵۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵؍۷؍۱۴۲۳ھ

بلا تعدی امانت کے ضائع ہونے کا شرعی حکم

سوال [۹۳۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک معمر بوڑھی خاتون نے بندہ کی اہلیہ صاحبہ کے پاس اپنی کچھ چیزیں بطور امانت رکھی تھیں، جو کئی سال سے ان کے پاس محفوظ رکھی رہیں، اس دوران میں کہ وہ ان چیزوں کو کبھی لے گئی اور کبھی پھر رکھ گئی اور میرے علم میں بھی تھا کہ فلاں بڑی بی خاتون کی کچھ چیزیں میری اہلیہ صاحبہ کے پاس امانت رکھیں ہیں؛ چونکہ ان بڑی بی خاتون کا میری اہلیہ کے پاس آنا جانا تھا، علاوہ ازیں ایک بار میری اہلیہ صاحبہ نے مجھ سے تذکرہ کیا تھا کہ فلاں کی کچھ چیزیں میرے پاس امانت رکھیں ہیں، یہاں تک کہ ایک دفعہ اس خاتون نے میری اہلیہ صاحبہ سے اپنی چیزوں کو طلب کیا اور دیکھا، پھر کہا ابھی رکھ لو پھر لے جاؤں گی، چنانچہ انہوں نے پھر ان چیزوں کو بدست خود اپنے صندوق میں بحفاظت رکھ دیا تھا اور مجھ سے بھی بتادیا کہ فلاں کی چیزیں یہاں صندوق میں رکھ رہی ہوں، اس کے چند روز بعد پھر ان کی علالت میں شدت پیدا ہوگئی چونکہ وہ کئی سال سے ایک مرض مہلک میں مبتلا تھیں، غرض دونوں کا انتقال ہوگیا اور انہوں نے انتقال سے قبل اپنی حالت ہوش میں ضروری امور کے متعلق اور جو ان کے اوپر کسی کا مطالبہ دین وغیرہ تھا اس کے متعلق ہمیں وصیت اور تاکید کی؛ لیکن ان چیزوں کے متعلق کوئی ذکر نہیں کیا اور نہ وہ ہمیں یاد آئیں ان کے انتقال کے بعد ایک روز ان چیزوں کا خیال آیا کہ شاید وہ لے گئی ہوں گی، اس وقت وہ بڑی بی خاتون باہر گئی ہوئی تھیں، ان کے انتقال کے ڈیڑھ دو مہینے کے

بعد وہ آئیں، تو میں نے ان سے دریافت کیا کہ تم چیز لے گئی تھیں؟ انہوں نے کہا کہ نہیں وہ تو ان ہی کے پاس تھیں، میں نے اس وقت بھی صندوق کھول کر نہیں دیکھا اور ان سے کہہ دیا کہ اچھا تو لے جانا، اس خیال سے کہ جب وہ نہیں لے گئی ہیں تو وہ صندوق میں محفوظ ہی ہیں، چند روز کے بعد وہ اپنی چیزیں لینے آئیں تو میں نے بغیر کسی تامل کے صندوق کھول کر دیکھا، تو اس میں وہ چیزیں نہیں ملیں، تمام گھر میں صندوق بکسوں میں تلاش کیا؛ لیکن کوئی سراغ ان کا نہیں ملا اور میں حیران ہوگیا کہ بڑی بی چیزیں نہیں لے گئیں تو اسمیں سے گئی کہاں، اگر چہ سرقہ بھی ممکن ہے؛ لیکن مشکل ہے؛ کیوں کہ دو صندوق ایک مکان ہی کے اندر دوسرے مکان میں محفوظ ہیں، بہر حال وہ چیزیں ضائع اور غائب ہوگئیں اور میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کو بڑی بی لے گئیں یا نہیں؛ اس لئے آنجناب مندرجہ بالا بیان پر غور فرما کر اور مندرجہ ذیل امور پر بھی نظر فرما کر خدا اور رسول کا جو فیصلہ ہو تحریر فرمائیں آپ کا عین کرم ہوگا:

(۱) میری اہلیہ مرحومہ نے ان چیزوں کی بقدر امکان حفاظت فرمائی اور سب کو معلوم ہے کہ وہ دیانت دار تھیں۔

(۲) میری اہلیہ مرحومہ نے میرے سپرد اور حوالہ نہیں کیا اور نہ ہی بڑی بی خاتون نے میرے حوالہ اور سپرد کیا؛ البتہ میری اہلیہ ان کو میرے علم میں لے آئی تھیں۔

(۳) نیز ان چیزوں کو نہ ہی میری آنکھوں نے دیکھا کہ وہ کیا چیزیں ہیں، اور کتنی ہیں اور کیسی ہیں؟ میرا تعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں رہا کہ فلاں کی چیزیں میری اہلیہ کے پاس رکھی ہیں۔

(۴) نیز خدا کو حاضر وناظر جان کر بحلف اقرار وعہد کرتا ہوں کہ واللہ باللہ مجھے اس بڑی بی خاتون کی چیزوں کا قطعاً کوئی علم نہیں ہے اور نہ میرے پاس ہیں، اگر میں خائن یا سارق ہوں، تو اللہ کے یہاں دین دار رہوں گا۔

(۵) ان جملہ امور کی وضاحت کے بعد اگر میں ان چیزوں کا ذمہ دار رہوں اور اس کا تاوان میرے ذمہ واجب ہے، تو میں حتی الامکان اس کو ادا کروں گا اور خدا کے یہاں اس کا دار خواہ ہوں گا؛ اس لئے عرض خدمت ہے کہ اس مسئلہ میں خدا اور رسول کا جو حکم

اور فیصلہ ہو اس کو بغیر خوف لومۃ لائم بیان فرمادیں۔ **بینوا بالصواب توجروا یوم الحساب.** فقط والسلام

المستفتی: قاری ضمیر احمد قاسمی مدرسہ تجوید القرآن مکی مسجد قدوائی نگر، شہر میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ کے درج شدہ حالات میں شرعاً آپ کی اہلیہ کی طرف سے کوئی تعدی نہیں ہے، اگر انہوں نے ادا کردیا ہے، نیز آپ نے بھی مذکورہ بیان کے اعتبار سے مذکورہ چیزوں میں کوئی تعدی نہیں کی ہے، اگر واقعی خاتون مالکہ اپنی چیزیں نہیں لے گئی ہیں۔ اور آپ نے اس میں کوئی تعدی بھی نہیں کی ہے، تو شرعاً آپ دَین دار نہیں ہیں، آپ پر کوئی تاوان نہیں ہے۔

ومنها: إذا ضاعت في يد المودع بغير صنعه لا يضمن لما روى عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه قال ليس على المستعير غير المغل الضمان، ولا على المستودع غير المغل الضمان. (بدائع الصنائع، كتاب الوديعة قبيل فصل وأما بيان ما يغير حال المعقود عليه من الأمانة إلى الضمان، كراچی ٦/ ٢١١، زكريا ديوبند ٥/ ٣١٤، هداية، اشرفی ديوبند ٣/ ٢٧٣)

االوديعة أمانة في يد المودع، فإذا هلكت بلا تعد منه، وبدون صنعه وتقصيره في الحفظ لا يضمن. (شرح المجلة رستم باز مكتبه إتحاد ديوبند ١/ ٤٣١، رقم المادة: ٧٧٧)

وإن سرقت الوديعة عند المودع ولم يسرق معها مال آخر للمودع لا يضمن عندنا. (فتاوى عالمگيري، الباب الرابع: فيما يكون تضييعا للوديعة وما لا يكون زكريا، قديم ٤/ ٣٤٦، جديد ٤/ ٣٥٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ جمادی الثانیہ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۳۰۴/۲۴)

بلاتعدی امانت کی رقم ضائع ہونے کا شرعی حکم

سوال [۹۳۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے ایک لڑکے کو روپئے دئے تھے، وہ لڑکا دیوبند جار ہا تھا اور روپئے دئے تھے، کتاب خرید کرلانے کے لئے، اب وہ لڑکا کہہ رہا ہے کہ جو روپئے تم نے دئے تھے وہ روپئے جیب کٹنے کی وجہ سے چوری ہو گئے، اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس کا اپنا روپیہ اپنی جیب ہی میں رہ گیا، اس صورت میں آپ کیا فرمارہے ہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عطافرمائیں۔ فقط والسلام

المستفتی: عزیزالرحمٰن جامعہ اشرفیہ وصیۃ العلوم ٹانڈہ بادلی، ضلع رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مذکورہ میں جس لڑکے کو دیوبند سے کتاب خرید کرلانے کے لئے وکیل بنا کر روپئے دئے گئے ہیں، شرعاً وہ روپئے امانت ہیں، اگر بلا تعدی چوری ہوجائیں اور واقعی جیب کٹ کر روپئے نکل جانا ثابت ہوجائے تو وکیل کے اوپر مذکورہ روپئے کا تاوان لازم نہیں ہوگا۔ اور اگر کذب ثابت ہوجائے یا تعدی وغفلت ثابت ہوجائے گی تو تاوان لازم ہوگا، نیز تعدی نہ کرنے کی صورت میں اگرچہ وکیل کا روپئے چوری نہ ہوتے ہوئے صرف موکل کا روپیہ چوری ہوگیا ہے تب بھی تاوان لازم نہ ہوگا، جب کہ حلفیہ بیان دیا ہو۔

إذا وکلہ بشراء شيء ودفع الثمن إلیہ، فھلک في یدہ، قال في البزازیة، وفي جامع الفصولین: دفع إلیہ ألفا لیشتري بہ فاشتری، وقبل أن ینقدہ للبائع ھلک فمن مال الآمر. (البحرالرائق، کتاب الوکالة، باب الوکالة بالبیع والشراء، زکریا ۷/ ۲٦٤، کوئٹہ ۷/ ۱٥٦، خلاصة الفتاوی اشرفیہ دیوبند ٤/ ٥٨ ١)

وھي أي الودیعة أمانة –إلی قولہ– فلا یضمن أي لا یضمن المودع الودیعة بغیر تعد بالھلاک، سواء أمکن التحرز عنہ أو لا ھلک معھا

للمودع شيء أولا لقوله عليه السلام: ليس على المستودع غير المغل ضمان. (مجمع الأنهر، كتاب الوديعة قديم ٢/ ٣٣٨، جديد دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٦٧-٤٦٨، البحرالرائق، كوئٹه ٧/ ٢٥٧، زكريا ديوبند ٧/ ٤٦٥، الجوهرة النيرة، إمدايه ملتان ٢/ ٣٥، دارالكتاب ديوبند ٢/ ٣٥)

المودع إذا قال: ذهبت الوديعة من منزلي ولم يذهب من مالي شيئا يقبل قوله مع يمينه. (الجوهرة النيرة، قبيل كتاب العارية، إمداديه ملتان ٢/ ٤٠، دارالكتاب ديوبند ٢/ ٣٩، هندية الباب التاسع، زكريا قديم ٤/ ٣٥٧، جديد ٤/ ٣٧٢)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٩/رجب المرجب ١٤٠٩ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٢٥/١٣٣٠)

الجواب صحیح:
محمد راشد عفی اللہ عنہ متعلم شعبہ افتاء
١٩/رجب المرجب ١٤٠٩ھ

ناظم مدرسہ کے پاس رکھی ہوئی امانت چوری ہوجائے تو کون ضامن ہوگا؟

سوال [٩٣٩٥]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک دینی مدرسہ میں مدرس ہے اور ساتھ ساتھ مدرسہ کا محاسب اور ناظم تعمیرات بھی ہے، مہتمم مدرسہ نے زید کو بسلسلہ تعمیر کچھ رقم مدرسہ سے پیشگی کام کرانے کے لئے دی، نیز محاسب ہونے کی وجہ سے دو مدرس کی تنخواہ ان لوگوں کے عدم موجودگی کی بناپر دی کہ کل ان لوگوں کے آجانے پر دے دیں۔ امر اتفاق اسی رات میں ایک مزدور جو ہفتہ عشرہ سے کام کررہا تھا اور مدرسہ میں مقیم تھا، زید کے کمرے سے ڈیکس کا تالا توڑ کر مبلغ:-/800 روپئے نکال کر فرار ہوگیا، اس مزدور کا کوئی پتہ نہیں، صرف اس نے بہار کا رہنے والا بتلایا تھا، ایسی صورت میں اس گم شدہ امانت کا تاوان زید کے ذمہ ہے یا مدرسہ کے؟ امید ہے کہ وضاحت کے ساتھ جواب باصواب سے مرحمت فرمائیں گے۔

المستفتی: محمد یونس الاعظمی خادم مدرسہ دارالرشاد بنکی، بارہ بنکی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ حالات میں زید شرعاً مہتمم مدرسہ کی طرف سے وکیل ہے اور جو رقم مہتمم مدرسہ نے زید کو حق دار کو دینے کے لئے دی ہے وہ شرعاً امانت ہے۔ اور سوال نامہ سے واضح ہوتا ہے کہ زید کی طرف سے بلا کسی تعدی کے مذکورہ رقم چوری ہوگئی ہے؛ اس لئے زید پر اس رقم کا تاوان واجب نہیں ہوگا؛ لہٰذا مدرسہ ہی کو نقصان برداشت کرنا ہوگا اور جن مدرسین کو تنخواہ نہیں ملی ہے، دوبارہ ان کو تنخواہ دینا لازم ہوگا۔

وهي أي الوديعة أمانة -إلى قوله- فلا يضمن أي لا يضمن المودع الوديعة بغير تعد بالهلاک، سواء أمكن التحرز عنه أولا هلک معها للمودع شيء أولا لقوله عليه السلام: ليس على المستودع غير المغل ضمان. (مجمع الأنهر، كتاب الوديعة قديم ٢/ ٣٣٨، جديد دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٦٧-٤٦٨، البحرالرائق، كوئٹه ٧/ ٢٥٧، زكريا ديوبند ٧/ ٤٦٥، الجوهرة النيرة، إمدايه ملتان ٢/ ٣٥، دارالكتاب ديوبند ٢/ ٣٥)

إذا دفع إلى إنسان ألف درهم، فأمره أن يشتري بها جارية، فاشترى، ثم هلک الثمن قبل أن ينقد للبائع هلک من مال الآمر. (خلاصة الفتاوى، الفصل الخامس في الوكالة بالشراء، أشرفيه ديوبند ٤/ ١٥٨، البحرالرائق، زكريا ٧/ ٢٦٤، كوئٹه ٧/ ١٥٦) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ رجب ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۳۴۲/۲۵)

عاریت پر لی گئی سائیکل گم ہوجائے تو ضامن کون؟

سوال [۹۳۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے خالد کو تقریباً ۱۱؍ بجے عاریت پر اپنی سائیکل دی، خالد ساڑھے گیارہ بجے زید کو

گیٹ پر سائیکل واپس کر رہا تھا، تو زید نے کہا کہ مدرسہ کے اندر جہاں پر سائیکل کھڑی تھی وہیں پر کھڑی کر دیجئے، زید اتنا کہہ کر چلا گیا، تو خالد نے سائیکل جہاں پر کھڑی تھی وہیں پر کھڑی کردی اور اس کی چابی اپنے پاس رکھی، زید بازار سے تقریباً ڈھائی بجے مدرسہ واپس آیا تو خالد نے زید کو سائیکل کی چابی واپس کردی، اب زید نے اپنی سائیکل رات کے نو بجے گم پائی، سائیکل کے گم ہونے پر زید نے خالد سے اس کا تاوان طلب کیا، تو آیا ایسی صورت میں سائیکل کے گم ہونے پر خالد اس کا تاوان دے گا یا نہیں؟

المستفتی: محمد راشد بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: زید نے خالد سے جس جگہ سائیکل کھڑی کرنے کے لئے کہا، خالد نے اسی جگہ کھڑی کردی اور سائیکل کھڑی ہونے کی جگہ بھی وہیں تھی اور حفاظت کے ساتھ تالا لگا کر چابی اپنے پاس رکھ لی؛ چونکہ زید اس وقت مدرسہ میں نہیں تھا؛ اس لئے واپس نہ کرسکا اور اس کے واپس آتے ہی چابی اس کے حوالہ کردی، تو اب خالد بریٔ الذمہ ہے، بعد میں شئ کے گم ہونے پر خالد کسی بھی قسم کا ضامن نہیں ہوگا۔

وإذا رد المستعير الدابة إلى أصطبل ربها، أو العبد والثوب إلى دار مالكه برئ عن الضمان إذا هلك الدابة أو هلك العبد والثوب استحسانا. (مجمع الأنهر، كتاب العارية، قديم ٢/ ٣٥١، جديد دار الكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٨٦)

وفي البدائع أو ردها بنفسه إلى منزل المالك وجعلها فيه لا يضمن استحسانا. (بدائع زكريا ٥/ ٣٢٤، وكذا في الهندية، الباب السادس في رد العارية، زكريا قديم ٤/ ٣٦٩، جديد ٤/ ٣٨٩)

وأما ما سوى ذلك من الأشياء، فيكفى إيصاله المحل الذي يعد التسليم فيه تسليما في العرف والعادة –إلى– مثلا الدابة المعارة يتم

تسليمها بإيصالها إلى أصطبل المعير، أو تسليمها إلى سائسه حتى لو هلكت بعد ذلك لا يضمن استحسانا. (شرح المجلة رستم باز، إتحاد ديوبند ١/ ٤٥٩، رقم المادة: ٨٢٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍رجب المرجب ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۲۸۵)

ملازم سے سائیکل چوری ہوگئی، تو کیا حکم ہے

سوال [۹۳۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: دوکان کے ایک ملازم کو دوکاندار نے ایک سائیکل دی تھی کام کرنے کے لئے اور اس ملازم نے ایک مسجد میں سائیکل کھڑی کردی اور سائیکل چوری ہوگئی، تو کیا ملازم سے تاوان لینا جائز ہے یا نہیں؟ جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد جان مدرسہ فلاح دارین، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر ملازم نے سائیکل کھڑی کرنے میں کوئی لاپرواہی نہیں کی ہے، عام لوگ جس طرح اپنی سائیکل رکھا کرتے ہیں اسی طرح سے اس نے مسجد میں باحفاظت کھڑی کردی ہے اور اس سے چوری ہوگئی، تو ایسی حالت میں ملازم پر تاوان ادا کرنا لازم نہیں ہے؛ اس لئے کہ اس نے امانت کی حفاظت میں لاپرواہی نہیں کی ہے۔

عن عمرو بن شعيب عن أبيه، عن جده عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ليس على المستعير غير المغل ضمان، ولا على المستودع غير المغل ضمان.

(سنن الدارقطني، البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٣٦، رقم: ٢٩٣٠)

والعارية أمانة إن هلكت من غير تعد لم يضمن. (هداية، كتاب العارية، أشرفي ديوبند ٣/ ٢٧٩)

ولو هلكت العارية بلا تعد من المستعير فلا ضمان. (مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٨١-٤٨٢، تاتارخانية، زكريا ١٦/ ٧٧، رقم: ٢٤٢٥١)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۹؍صفر المظفر ۱۴۱۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/۳۰۲۴)	۱۹/۲/۱۴۱۳ھ

کھیت میں لگائی گئی آگ دوسرے کے کھیت کو جلا دے تو کیا حکم ہے؟

سوال [۹۳۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے اپنے گنے کے کھیت کی صفائی کے لئے آگ لگائی؛ لیکن ہوا تیز ہونے کی وجہ سے آگ بغل والے گنے کے کھیت میں لگ گئی، آیا اس صورت میں آگ جلانے والے سے کوئی ضمان لینا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالرحمٰن ٹانڈہ، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر آگ لگاتے وقت ہوا تیز نہیں تھی، تو کوئی تاوان نہیں؛ لیکن اگر جس وقت آگ لگائی جارہی تھی اس وقت ہوا تیز تھی اس کے باوجود آگ لگائی ہے، تو آگ جلانے والے پر گنے کا ضمان ادا کرنا لازم ہوگا۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: النار جبار. (سنن أبي داؤد، كتاب الديات، باب في النار تعدى، النسخة الهندية ٢/ ٦٣١، دارالسلام، رقم: ٤٥٩٤، سنن ابن ماجة، أبو اب الديات، باب الجبار، النسخة الهندية ٨/ ١٩٢، دارالسلام، رقم: ٢٦٧٦)

لو أحرق حشيشا لا يكون ضامنا، قيل: إذا كانت الريح ساكتة حين أوقد النار، فأما إذا كان اليوم ريحا يعلم أن الريح تذهب بالنار إلى أرض

جاره كان ضامنا استحسانا. (هـندية، كتاب الجنايات الباب الحادي عشر في جناية الحائط والجناح، والكنيف وغيرها، زكريا قديم ٦/ ٤٧، جديد ٦/ ٥٧، فتاوی قاضی خان جديد زكريا ٣/ ٣٣٧، وعلى هامش الهندية زكريا ٣/ ٤٦٠، تاتارخانية، زكريا ١٩/ ٢٩٦، رقم: ٣١٥٢١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۱۹/۱۲/۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۵۰۷۴/۳۳)

موچی کے پاس سے چپل گم ہوگئی تو کیا حکم ہے؟

سوال [۹۳۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے موچی کو اپنی چپل صحیح کرنے کے لئے دی اور چپل اس روز صحیح نہ ہوسکی، دوسرے دن جس کے چپل تھے وہ باہر چلا گیا، باہر سے جب بارہ تیرہ دن میں واپس آیا تو موچی سے چپل والے نے پوچھا کہ میری چپل صحیح ہوئی نہیں؟ تو موچی نے جواب دیا کہ آپ کی چپل گم ہوگئی ہے۔ اور دوسری چپل یہاں موجود ہے، تو کیا اس صورت میں موچی سے تاوان لینا درست ہے یا نہیں؟ قرآن کی روشنی میں مسئلہ ہذا کو واضح فرمائیں۔

المستفتی: حافظ محمد شفیع، صدر مدرس مدرسہ فلاح دارین محلّہ کانٹھ دروازہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر موچی نے چپل کی حفاظت کی ہے اور اس کی طرف سے کوئی تعدی نہیں ہوئی ہے اور پھر گم ہوگئی ہے، تو موچی کے امین ہونے کی وجہ سے اس پر کوئی تاوان واجب نہ ہوگا۔

عن عمرو بن شعيب عن أبيه، عن جده عن النبي ﷺ قال: ليس على المستعير غير المغل ضمان، ولا على المستودع غير المغل ضمان.

(سنن الدارقطني، البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٣٦، رقم: ٢٩٣٠)

الوديعة أمانة في يد المودع، فإذا هلكت لم يضمنها. (الجوهرة، كتاب الوديعة، إمداديه ملتان ٢ / ٣٥، دارالكتاب ديوبند ٢ / ٣٥، تنوير الأبصار مع الدر المختار، كراچی ٥ / ٦٦٤، زكريا ٨ / ٤٥٥، البحرالرائق، كوئٹه ٧/ ٢٧٣، زكريا ٧/ ٤٦٥، ملتقى الأبحر، دارالكتب العلمية بيروت ٣ / ٤٦٧، هداية، أشرفي ديوبند ٣/ ٢٧٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍محرم ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۹۸۱)

دوسرے کی دیوار پر اپنی چھت کو ٹیکنے کا شرعی حکم

سوال [۹۴۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عبدالغفور کی دیوار پر عبدالقیوم نے چھت ٹیک لی، وہ خستہ ہوگئی، انہوں نے اس کو ہتھوڑے سے گرادی، عبدالغفور کا مکان پھٹ گیا، عبدالقیوم سے شکایت کی، انہوں نے کہا کہ تم ٹھیک کرالو، جو خرچ ہوگا وہ میں دے دوں گا، ایک ہزار روپئے خرچ ہوئے، عبدالقیوم نے نہیں دیئے لینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالغفور، ٹانڈہ بادلی، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب عبدالقیوم کے فعل سے عبدالعزیز کی دیوار کو نقصان پہنچا تو شرعاً اس میں نقصان کی تلافی کا ذمہ دار عبدالقیوم ہوگا۔ اور جب عبدالقیوم کے خرچ دینے کے وعدے سے عبدالغفور نے مرمت کرلی ہے، تو عبدالغفور کو عبدالقیوم سے مذکورہ خرچ وصول کرنا شرعاً جائز ہوگا۔

لو أتلف مال غيره بلا سبق إيداع، أو إقراض ضمن بالإجماع.
(الدرالمختار مع الشامي، كتاب الحجر، زكريا ٩ / ٢٠٣، كراچی ٦ / ١٤٦)

الضمانات تجب لها بأخذ أو بشرط. (قواعد الفقه، أشرفي ديو بند، ص: ۸۹)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳ر جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/۲۲۱۳)

فروخت شدہ بکرا واپس مالک کے پاس آجائے تو کیا حکم ہے؟

سوال [۹۴۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے ایک بکرا غیر معروف شخص (جو غیر مسلم تاجر ہے) کے ہاتھ فروخت کیا اور دو دن کے بعد وہ بکرا اچانک زید کے گھر واپس آگیا، اب زید نے کافی تلاش وجستجو کے بعد اس غیر معروف شخص کا پتہ لگایا، معلوم ہوا وہ کہیں باہر چلا گیا ہے، یہ صحیح نہیں معلوم ہے کہ کہاں گیا ہے اور کب آئے گا، نیز یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ بکرا اسی کے پاس سے آیا ہے یا اس نے کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کردیا تھا، اس کے پاس سے آیا ہے، قیاس ہے کہ شاید فروخت کر گیا ہوگا، بہر کیف صحیح معلوم نہیں ہے کہ اس بکرے کا مالک کون ہے؟ فی الحال بکرا زید کے پاس تقریباً چار ماہ سے پرورش پا رہا ہے، صورت مسئولہ میں اس بکرے کی پرورش کی جائے؟ یا فروخت کردیا جائے؟ اگر پرورش کی جاتی ہے، تو اس پر روزانہ جو خرچ آرہا ہے اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟ اور فروخت کردینے کی صورت میں اس کی قیمت کس کو دی جائے؟ اس پر جو خرچ آیا ہے، اس کو کاٹ کردی جائے یا مکمل، یا اگر کبھی اس کا مالک واپس آتا ہے، تو اس کو کتنی رقم دینی پڑے گی، جب کہ بکروں کی قیمت کم وبیش ہوتی رہتی ہے، اعتبار کب کا ہوگا؟ اس کی قیمت بیت المال میں جمع کردی جائے یا خیرات کردی جائے؟

المستفتی: حافظ محمد فاروق مہد پورسٹی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کو فروختگی کے دو دن کے بعد جو بکرا حاصل ہوا ہے، وہ در

حقیقت زید کے پاس بطور امانت ہے، جس کے بارے میں حکم شرعی یہ ہے کہ اولاً زید دو یا دو سے زائد لوگوں کو گواہ بنالے کہ یہ بکرا مجھے ملا ہے، جسے میں نے مالک تک پہنچانے کی غرض سے روک لیا ہے، اس کے بعد محکمۂ شرعیہ یا مستند علماء کے مشورہ سے مالک کی تلاش وتفتیش کرکے اگر صحیح مالک کا پتہ لگ جائے تو بلا ٹال مٹول مالک کو واپس کردے؛ البتہ اس درمیان بکرے پر کئے جانے والے خرچ کو زید مالک سے لینے کا حق دار ہے۔ اور اگر مالک کا کوئی سراغ نہ ملے تو پھر بکرے کو فروخت کرکے اس کی قیمت محفوظ رکھ لے، اگر مسلم حکومت ہے اور بیت المال ہے، تو پھر بیت المال میں جمع کردے۔ اور اگر مسلم حکومت نہیں ہے، جس میں اسلامی قانون کے مطابق بیت المال نہ ہو تو پھر وہاں پر بااثر لوگوں کی شہادت کے ساتھ اس پیسہ کو بینک میں محفوظ کرلیا جائے اور اس درمیان زید نے بکرے کے کھلانے پلانے پر جو خرچ کیا ہے، وہ اتنی رقم لینے کا حق دار ہے، بقیہ رقم مالک کے ملنے کی شکل میں واپس کردینا لازم ہے۔ اور اگر اتنے ایام گذر جائیں کہ یقین ہوجائے کہ مالک نہیں ملے گا، تو پھر قیمت کا صدقہ کردیا جائے۔

وإلا باعها، أي إن لم يكن لها نفع باعها القاضي، وحفظ ثمنها لصاحبها إبقاء له، يعني عند تعذر إبقائه صورة إلى قوله قالوا: إنما يأمر بالإنفاق يومين أو ثلاثة على قدر ما يرى رجاء أن يظهر مالكها، فإذا لم يظهر يأمر ببيعها؛ لأن دارة النفقة مستاصلة، فلا نظر في الإنفاق مدة مديدة، وإذا بيعت أخذ الملتقط ما أنفق بإذن القاضي. (البحر الرائق، كتاب اللقطة، زكريا ٥/ ٢٦١، كوئٹه ٥/ ١٥٦، فتح القدير، دارالفكر بيروت ٦/ ١٢٦، زكريا ٦/ ١١٨-١١٩، كوئٹه ٥/ ٣٥٥)

وفي القنية: وما يتصدق به الملتقط بعد التعريف وغلبة ظنه أنه لا يوجد صاحبه لا يجب إيصاءه، وإن كان يرجو وجود المالك وجب الإيصاء. (البحر الرائق، زكريا ٥/ ٢٥٨، كوئٹه ٥/ ١٥٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ محرم الحرام ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۸۶۱)

۳۰/ كتاب الهبة

۱/ باب شرائط الهبة

''ہبہ'' شرعاً کب معتبر ہے؟

سوال [۹۴۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسمیٰ محمد علی خان نے بذات خود اپنے اور دو پسران آصف علی خان اور شاکر علی خان کے ناموں سے مشترکہ طور سے بحصہ برابر ایک مکان واقع محلّہ قاضی ٹولہ المعروف اتوار کی پیٹھ، ضلع مرادآباد خریدا، بعدہ محمد علی نے خرید کردہ مکان مذکور میں اپنا حصہ ۱/۳ اپنی زوجہ خوشنودی بیگم کے حق میں زبانی ہبہ کردیا، جس کو قبول ومنظور کر کے خوشنودی بیگم مذکورہ موہوبہ حصہ پر مشترکاً قابض ودخیل ہوگئیں، جس کے بعد محمد علی کا انتقال ہوگیا، جنہوں نے اپنی وفات پر مذکورہ بالا دو پسران: آصف علی وشاکر علی خان وچار دختران: مسمیان صغیر جہاں، وشمیم جہاں، ونعیم جہاں وممتاز جہاں اور اپنی بیوہ خوشنودی بیگم کو اپنا شرعی وارث چھوڑا، بعدہ آصف علی خان کا بھی انتقال ہوگیا، جنہوں نے اپنی وفات پر اپنے برادر حقیقی شاکر علی خان اور مذکورہ بالا چار ہمشیرگان اور اپنی والدہ مذکورہ خوشنودی بیگم کو اپنا شرعی وارث چھوڑا، جس کے بعد دختر محمد علی ممتاز جہاں کا بھی انتقال ہوگیا، جنہوں نے اپنی وفات پر والدہ خوشنودی بیگم دو پسران دانش ومحمد سبحان اور ایک دختر اقراء بیگم کو اپنا شرعی وارث چھوڑا، مذکورہ بالا مکان کی مجموعی آمدنی کرایہ مبلغ آٹھ ہزار روپئے ماہانہ ہے۔ از روئے فرائض مکان مذکور میں مذکورہ بالا ورثاء کس قدر حصہ اور کس قدر کرایہ پانے کے مستحق ہیں؟

المستفتی: انتظار حسین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر ہبہ کا شرعی ثبوت یا اس کی معتبر تحریر موجود ہے اور قبضہ بھی ہو چکا تھا، تب تو یہ ہبہ معتبر ہے۔ اور اگر ہبہ کے لئے نہ معتبر تحریر ہے اور نہ شرعی گواہان موجود ہیں، تو ایسی صورت میں محض قبضہ کافی نہیں ہوگا، اس میں تمام ورثاء کا حق جاری ہوگا اور تقسیم اس کے بعد کی جاسکتی ہے، جب ہمارے پاس شرعی ثبوت کے ساتھ ہبہ نامہ کی تحریر آجائے، اس سے پہلے تقسیم کے مسئلہ میں ہم کچھ لکھنے سے قاصر ہیں۔

عن عبدالرحمن بن عبدالقاري قال: قال عمر –رضي الله عنه– ما بال رجال ينحلون أولادهم نحلا، فإذا مات أحدهم قال: مالي وفي يدي، وإذا مات هو قال: قد كنت نحلته ولدي، لا نحلة إلا نحلة يحوزها الولد، أو الوالد. (المصنف لابن أبي شيبة، البيوع، من قال: لا تجوز الصدقة حتى تقبض، موسسة علوم القرآن ١٠/ ٥٢٠، رقم: ٢٠٤٩٥)

وتتم الهبة بالقبض الكامل. (شامي، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٤٩٣، كراچى ٥/ ٦٩٠، هندية زكريا قديم ٤/ ٣٧٧، جديد ٤/ ٣٩٩، هداية أشرفي ٣/ ٢٨٣، مختصر القدوري، ص: ١٣٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ ربیع الاول ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۱۱۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۳/۱۴ھ

ہبہ میں محض نیت کافی نہیں

سوال [۹۴۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) میرا لڑکا ہے، جس کو بوقت پیدائش ہی والد نے اپنا لیا تھا اور آخر تک ان کی کفالت میں تھا، اب دادی کے پاس رہتا ہے، اسی طرح ایک نواسی کو بھی اپنی کفالت میں لے لیا تھا،

ان کے نام جو رقم بینک میں محفوظ کی ہے، اس کی تقسیم شرعی ورثاء میں ہوگی یا جن کے نام محفوظ کیا ہے انہیں کو ملے گی؟

(۲) نیز جو کچھ دینے یا نام کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور سب سے کہتے تھے وہ دیا جائے یا نہیں؟ اور جو عملاً کر گئے ہیں، اس کے بارے میں کیا حکم ہے، جس کے نام کر دیا ہے، اسی کو ملے گا یا نہیں؟

المستفتی: خرم سلطان ابن حاجی سلطان احمد مرحوم، بمبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: (۱) حاجی سلطان نے اپنی زندگی میں جو رقم پوتے یا نواسی کے نام بینک میں جمع کر دی ہے، اس سے شرعی طور پر قبضہ بھی ثابت ہو گیا؛ کیوں کہ جن کے نام سے جمع ہوا ہے، وہی نکال سکتے ہیں، دوسرا نہیں نکال سکتا ہے؛ لہٰذا ان کے نام بینک میں جمع شدہ رقم ان کی ملک ہوگی، ان میں دیگر ورثاء شریک نہیں ہوں گے۔

اتخذ لولده أو لتلميذه ثيابا، ثم أراد دفعها لغيره ليس له ذلك ما لم يبين وقت الاتخاذ أنها عارية. (درمختار، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٥٠١، كراچى ٥/ ٦٩٦، هندية زكريا قديم ٤/ ٣٩٢، جديد ٤/ ٤١٧)

تتم الهبة بالقبض الكامل. (درمختار، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٤٩٣، كراچى ٥/ ٦٩٠، هندية زكريا قديم ٤/ ٣٧٨، جديد ٤/ ٣٩٩، هداية، أشرفى ٣/ ٢٨٣)

(۲) محض ارادہ اور نیت کرنے سے کوئی شرعی حکم لاگو نہیں ہوگا؛ البتہ عملی طور پر اپنی زندگی میں جو اشیاء دوسروں کو ہبہ کر کے قبضہ دے دیا ہے، وہ شرعی طور پر ان کے مالک ہو جائیں گے، ان میں دیگر ورثاء شریک نہیں ہوں گے۔

ولو دفع إلى ابنه مالا فتصرف فيه الابن يكون للابن إذا دلت دلالة على التمليك. (شامي، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٥٠٢، كراچى ٥/ ٦٩٧، هندية زكريا قديم ٤/ ٣٩٢، جديد ٤/ ٤١٧)

وفي المنح عن الخانية بعد هذا قال: جعلته لابني فلان يكون هبة؛ لأن الجعل عبارة عن التمليک. (شامي، کتاب الهبة، زکریا ۸/ ٤٩١، کراچی ٥/ ٦٨٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳ر محرم الحرام ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۶۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۱/۳ھ

کیا ایجاب وقبول سے ہبہ منعقد ہو جاتا ہے؟

سوال [۹۴۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) محبوب احمد نے ایک مکان چھوڑا ان کے سامنے ان کی بیوی اور ایک لڑکی عزیزہ بی کا انتقال ہوگیا، مرحوم کے وارث میں تین لڑکے اور دو لڑکیاں جن کے نام اس طرح ہیں: مطلوب احمد، منصور احمد جو پاکستان میں رہتے ہیں۔ اور مسعود احمد، خدیجہ بی، سعیدہ بی مرحوم کے ترکہ میں سے ہر ایک وارث کو شریعت کی رو سے کتنے کتنے سہام ملیں گے؟

(۲) اور منصور احمد نے پاکستان کے اسٹام پر وصیت تحریر کر کے بھیجی ہے کہ میرے حصہ کے تین حصے کئے جائیں، ایک حصہ میری بہن خدیجہ کو اور دوسرا حصہ میری بہن سعیدہ کو اور تیسرا حصہ میری دونوں بھانجی نزہت اور رضیہ بی کو دے دیا جائے، تو منصور احمد کی وصیت کے مطابق منصور کے ترکہ میں سے خدیجہ بی وسعیدہ بی اور نزہت بی ورضیہ بی کو شریعت کی رو سے کتنے کتنے سہام ملیں گے؟

المستفتی: مقصود احمد بارہ سینی سرائے ترین سنبھل، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: منصور احمد نے پاکستان سے جو تحریر بھیجی ہے، اس تحریر کے عنوان میں وصیت نامہ لکھا ہے؛ لیکن پوری تحریر کے مضمون میں وصیت کا ذکر نہیں ہے؛ بلکہ

اپنی طرف سے مضمون میں ہبہ کا ذکر ہے؛ اس لئے شاید مسئلہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے عنوان میں لفظ ہبہ کے بجائے وصیت لکھ دیا ہوگا؛ لہٰذا ہم ہبہ کے نقطۂ نظر سے شرعی حکم لکھتے ہیں۔

سوال نامہ اور پاکستان سے ارسال کردہ تحریر کے مطابق منصور احمد کا حق تین حصوں میں تقسیم ہوکر ایک ایک حصہ دونوں زندہ بہنوں کو دیا جائے گا اور تیسرا حصہ مرحومہ بہن کی دونوں بیٹیوں کو برابر تقسیم کردیا جائے گا۔ اور سوال نامہ میں بھی لفظ وصیت استعمال کیا گیا ہے، جوکہ اصل مضمون کے خلاف ہے اور اصل مضمون کے اعتبار سے لفظ ہبہ استعمال ہونا چاہئے؛ لہٰذا جن لوگوں کے قبضہ میں منصور احمد کا حق ہے، ان پر لازم ہے کہ منصور احمد کا حصہ ان کی ہدایت کے مطابق دونوں بہنوں کے درمیان اور مرحومہ بہن کی دونوں لڑکیوں کے درمیان اس طرح تقسیم کردیں جس طریقہ سے منصور احمد نے ہدایت کی ہے۔

الهبة تـمليک العين مجانا، أي بلا عوض. (شـامي، كتاب الهبة، كراچی ٥/ ٦٨٧، زكريا ٨/ ٤٨٨)

الهبة تـمـليـک مـال لآخـر بـلا عـوض، أي بلا شرط عوض. (شرح المجلة رستم باز اتحاد ديوبند ١/ ٤٦٢، رقم: ٨٣٣)

تـنـعـقـد الهبة بـالإيـجـاب والـقبـول، وتتم بالقبض الكامل؛ لأنها من التبـرعات، والتبرع لا يتم إلا بالقبض. (شـرح الـمـجلة رستم باز اتحاد ديوبند ١/ ٤٦٢، رقم المادة: ٨٣٧)

الـمـوهـوب لـه إن كـان مـن أهـل القبض فحق القبض إليه، وإن كان الـمـوهوب له صغيرا أو مجنونا فحق القبض إلى وليه، ووليه أبوه، أو وصي أبيه، ثم جده، ثم وصي وصيه، ثم القاضي سواء كان الصغير في عيال واحد منهم أو لم يكن. (هندية، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا قديم ٤/ ٣٩٢، جديد ٤/ ٤١٨)

لـو قـال: نـحـلتک داري أو أعطيتک أو وهبت منک كانت هبة. (هندية، الباب الأول في تفسير الهبة، زكريا قديم ٤/ ٣٧٥، جديد ٤/ ٣٩٦)

ولو وكّل الواهب رجلا بالتسليم، ووكّل الموهوب له رجلا بالقبض وغابا صح التسليم من الوكيل، فإن امتنع وكيل الواهب خاصمه وكيل الموهوب ويتفرد أحد وكيلي التسليم به بخلاف وكيلي القبض لا يتفرد أحدهما والتوكيل بالهبة توكيل بالتسليم. (تاتارخانية ١٤/ ٤٢٤، برقم: ٢١٥٧٧، مطبع زكريا ديوبند) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ جمادی الثانیہ ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۴۳۲/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۶/۱۲ھ

زبانی ہبہ

سوال [۹۴۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمد نوشہ مرحوم نے زبانی ہبہ اس طرح کیا تھا کہ لے پالک بیٹی رخسانہ بی کو اپنے مکان کی دوسری منزل کا اپنے ہوش وحواس کی درستگی اور گواہوں کی موجودگی میں مالک وقابض بنا دیا تھا، اب بتلائیے کہ رخسانہ کو محمد نوشہ مرحوم کے مکان کی دوسری منزل پر حق ملکیت حاصل ہوگا یا نہیں؟ جب کہ مرحوم کے مکان کی دوسری منزل پر ہبہ زبانی سے پہلے بھی قبضہ اور بعد میں بھی قبضہ رخسانہ بی کو حاصل ہے، اس ہبہ زبانی کے گواہ مندرج ذیل ہیں:

فہمید احمد صابری سائلہ رخسانہ بی

میں اس بات کا گواہ ہوں کہ بار باران الفاظ کو انہوں نے ادا کیا کہ میرے بعد اس حصے کی حق دار یہ رہیں گی۔ عبد العزیز ولد عبد الشکور قانون گویان مرادآباد۔

المستفتية: رخسانہ بی گوئیاں باغ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: ہبہ میں ایسی معتبر تحریر ہونی چاہئے جس سے بعد میں انکار یا اختلاف کی نوبت نہ آنے پائے؛ لیکن اگر زبانی ہبہ کر دیا ہے اور اس پر گواہان بھی قابل اعتماد

لوگ ہیں اور جانبین اس زبانی ہبہ کا اقرار بھی کر رہے ہوں، تو ایسی صورت میں جس حصہ کو ہبہ کیا گیا اگر موہوب لہ نے اس پر قبضہ بھی کرلیا ہے، تو ہبہ صحیح اور معتبر ہوگا۔ اور محلّہ کے باا ثر لوگوں کی موجودگی میں گواہان کے دستخط کے ساتھ ایک سرکاری ایگریمنٹ بھی بہت جلد کر الینا چاہیے، تاکہ آئندہ پھر کوئی بات پیش نہ آنے پائے۔

عن النضر بن أنس قال: نحلني أبي نصف داره، فقال أبو بردة: إن سرك أن تجوز ذلک فاقبضه، فإن عمر بن الخطاب -رضي الله عنه- قضى في الأنحال ما قبض منه فهو جائز، وما لم يقبض منه فهو ميراث.

(المصنف لابن أبي شيبة، البيوع والأقضية من قال: لا تجوز الهبة إلا مقبوضة، موسسة علوم القرآن، جديد ١٠/ ٥٢١، رقم: ٢٠٥٠٢)

الهبة عقد مشروع، وتصح بالإيجاب والقبول والقبض، وقوله: لا يجوز الهبة إلا مقبوضة. (هداية، كتاب الهبة، أشرفي ٣/ ٢٨٣، مختصر القدوري، ١٣٥، شامي، زكريا ٨/ ٤٩٣، كراچى ٥/ ٦٩٠، هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٧٤، جديد ٤/ ٣٩٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳ر ذیقعدہ ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۸۹۸۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۱۱/۳ھ

زبانی ہبہ کا شرعی حکم

سوال [۹۴۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جو میراث کے باب سے متعلق ہے، میرے اس مسئلہ کی قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی فرما کر ممنون فرمائیں۔ والد محترم کو انتقال ہوئے عرصہ ہوا، ہم چار بھائی دو بہنیں ہیں، والدہ کا انتقال والد محترم کی رحلت سے قبل ہی ہو گیا تھا۔ والد مرحوم کے ترکہ کے بارے میں

کسی وارث کو اختلاف نہیں ہے، معاملہ ایک مکان کا ہے، جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:
رشتے کی ایک نانی (شیخانی نانی) نے اپنا مکان زندگی ہی میں مجھے ہدیۃً دے دیا تھا (اس بات کو محلے کے تمام افراد جانتے ہیں) پھر بیماری کے ایام میں جب وہ اپنی بیٹی کے گھر گئیں (واضح ہو کہ شیخانی نانی کی کوئی نرینہ اولاد نہیں ہے) تو انتقال کے وقت گاؤں کے پردھان کو بلوا کر اس کے سامنے اپنی بیٹی کو وصیت کی کہ میں نے اپنا حصہ (مکان) کلام کو دے دیا ہے؛ لہٰذا تمہارا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے، شیخانی نانی کے انتقال کے بعد ان کی بیٹی نے پردھان کے ساتھ آکر میری والدہ کو بتایا کہ اماں نے اپنا یہ مکان کلام کو دے دیا ہے، اس وقت میری والدہ شیخانی نانی کے ایصال ثواب کے لئے تقریباً ایک ہزار روپئے ان کی بیٹی کو دینے لگیں، تو ان کی بیٹی نے کہا کہ آپ اسے یہیں (مجھوڑہ کی) مسجد میں دے دیجئے؛ لیکن کچھ عرصہ بعد جب والدہ کا ان کی بیٹی کے یہاں جانا ہوا، تو تقریباً پندرہ سو روپئے مسجد میں دینے کے لئے ان کے پاس چھوڑ آئیں، تب سے یہ مکان میری تحویل میں ہے۔
مذکورہ تفصیل کے مطابق کیا شیخانی نانی کی ہبہ کردہ زمین والد مرحوم کے ترکہ میں شامل ہو کر تمام وارثین میں تقسیم ہوگی یا اس پر شرعی حق صرف میرا ہے؟ شرعاً اس مکان کی کیا حیثیت ہے؟ توضیح فرمائیں۔ فجزاکم اللہ احسن الجزاء۔

المستفتی: (حافظ) ابوالکلام عباداللہ مرحوم، آنند گجرات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی رشتہ کی نانی نے اپنی زندگی میں آپ کے لئے صرف زبانی ہبہ کیا ہے، آپ کا ان کی زندگی میں اس مکان پر قبضہ نہیں ہوا۔ اور ہبہ قبضہ کے بغیر مکمل نہیں ہوا کرتا۔ اور انتقال کے وقت جو پردھان وغیرہ کو بلوا کر انہوں نے اپنی بیٹی سے یہ کہا ہے کہ ''یہ مکان میں نے کلام کو دے دیا ہے، اس میں تمہارا کوئی حصہ نہیں'' یہ مرض الوفات میں کی گئی وصیت ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ وصیت کرنے والے کے انتقال کے بعد اس کی وصیت کا نفاذ صرف تہائی مال سے ہوا کرتا ہے، اس سے

زائد میں نہیں ہوتا، ہاں البتہ موت کے بعد اگر میت کے ورثاء تہائی مال سے زائد میں بھی وصیت کے نافذ کرنے پر راضی ہوں، تو اب یہ وصیت تہائی مال سے زائد پر بھی نافذ ہو جائے گی؛ لہٰذا اگر وہی ایک مکان تھا، تو اس مکان کا دو تہائی مرحومہ کے وارثین کے لئے میراث ہے، پورا مکان کلام کو نہیں ملے گا۔ اور یہ بھی اس صورت میں ہے جب کہ مرض الوفات کی وصیت کے بارے میں وارثین اور گواہان اقرار کرتے ہوں، ورنہ ایک تہائی کے بارے میں بھی وصیت نافذ نہ ہوگی اور کلام کو کچھ نہ ملے گا۔

عن النضر بن أنس قال: نحلني أنس نصف داره، قال: فقال أبو بردة: إن سرک يجوز ذلک فاقبضه، فإن عمر بن الخطاب -رضي الله عنه- قضى في الأنحال أن ما قبض منه، فهو جائز، وما لم يقبض منه، فهو ميراث، قال: فدعوت يزيد الرشک، فقسمها. (السنن الكبرى للبيهقي، الهبات، باب ماجاء في هبة المشاع، دارالفكر ٩/ ١٥٨، رقم: ١٢١٨٦)

عن سعد بن أبي وقاص -رضي الله عنه- قال: مرضت، فعادنى النبي ﷺ، فقلت: يا رسول الله! أدع الله أن لايردني على عقبي، قال: لعل الله يرفعک، وينفع بک ناسا، قلت: أريد أن أوصي، وإنما لي ابنة، قلت: أوصى بالنصف؟ قال: النصف كثير، قلت: فالثلث، قال: الثلث، والثلث كثير أو كبير، قال: فأوصى الناس بالثلث، وجاز ذلک لهم. (صحيح البخاري، باب الوصية بالثلث، النسخة الهندية ١/ ٣٨٣، رقم: ٢٦٦٣، ف: ٢٧٤٤)

ولا يتم الهبة إلا مقبوضة. (هندية، كتاب الهبة، الباب الثاني، زكريا قديم ٤/ ٣٧٧، جديد ٤/ ٣٩٩، هداية أشرفي ٣/ ٢٨٣، مختصر القدوري، ص: ١٣٥، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ٢/ ٩، دارالكتاب ديوبند ٢/ ١٠)

فإن الموصى إذا ترک ورثه قائما لا يصح وصيته بما زاد على الثلث إن لم تجز الورثة، وإن أجازوه صحت وصيته به. (البحرالرائق، كتاب الوصايا، زكريا ٩/ ٢١٢، كوئٹه ٨/ ٤٠٣)

رجل أوصى بجميع ماله للفقراء، أو لرجل بعينه لا تجوز ذلك إلا من الثلث –إلى قوله– وإن أجازوا بعد موته صحت الإجازة. (تاتارخانية، زكريا ١٩/ ٣٨١، رقم: ٣١٨٦٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍جمادی الثانیہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۷۲۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/۶/۱۴۳۳ھ

زبانی ہبہ کے لئے شرعی ثبوت لازم

سوال [۹۴۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زہرہ بیگم کا مکان بالعوض مہر دولہ جان خان نے اپنی زوجہ زہرہ بیگم کے نام کر دیا تھا، زہرہ بیگم نے اپنا پورا مکان بڑی بیٹی زاہدہ بیگم جو کہ شادی شدہ تھی کو ۲۷/۶/۹ کو زبانی ہبہ کر دیا تھا۔ اور چھوٹی بیٹی ساجدہ بیگم جو غیر شادی شدہ تھی اور بے سہارا تھی، اس کو ناحق کر دیا، جس کی شادی کی ذمہ داری والدین کی ہوتی تھی؛ لیکن والدین میں والد کے انتقال کے بعد یہ ذمہ داری والدہ نے پوری نہیں کی اور دیگر رشتہ داروں نے یہ فرائض پورے کرتے ہوئے ۹/ ۶/ ۲۳ کو نکاح محمد فرید حیدر سے کرا دیا، کیا ایسی حالت میں شرعاً یہ ہبہ زبانی جس کا کوئی گواہ نہیں صحیح ہوا یا غلط ہوا؟ ساجدہ بیگم شرعاً حق دار ہوگی یا نہیں؟

المستفتية: ساجدہ بیگم مقبرہ دوئم، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زہرہ بیگم نے جو اپنا مکان اپنی بڑی بیٹی زاہدہ بیگم کو زبانی ہبہ کیا ہے، اس کے لئے ثبوت شرعی یعنی ہبہ نامہ یا شرعی گواہ کی ضرورت ہے؛ لہٰذا اگر زاہدہ بیگم کے پاس ثبوت شرعی یا شرعی گواہ نہیں ہیں، تو اس زبانی ہبہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے؛ بلکہ وہ ترکہ میں شمار ہوگا۔ اور ساجدہ بیگم اس مکان میں حق دار ہوگی۔

وَاسۡتَشۡهِدُوۡا شَهِيۡدَيۡنِ مِنۡ رِّجَالِكُمۡ فَاِنۡ لَّمۡ يَكُوۡنَا رَجُلَيۡنِ فَرَجُلٌ وَّامۡرَاَتَانِ مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ. [البقرة: ٢٨٢]

وما سوى ذلك من الحقوق يقبل فيها شهادة رجلين، أو رجل وامرا تين، سواء كان الحق مالا أو غير مال. (هداية، كتاب الشهادة، أشرفي ٣/ ١٥٤، البناية، اشرفيه ٩/ ١٠٦، المبسوط، دارالكتب العليمة بيروت ٣/ ١٤٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۸۸۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/ ۶/ ۱۴۲۱ھ

زبانی ہبہ بغیر شہادت کے معتبر نہیں

سوال [۹۴۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: چھوٹی نے اپنے ایک لڑکے انوار حسین کو ایک اپنا مکان ہبہ زبانی کیا انوار حسین ہبہ کے وقت نابالغ تھے؛ اس لئے انہوں نے انوار حسین کے تایا عبد السلام کو ولی بنا کر قبضہ ودخل دے دیا، پھر چھوٹی کے ایک لڑکا لئیق احمد پہلے شوہر سے تھا، اب دریافت یہ کرنا ہے کہ مذکورہ ہبہ صحیح ہوا یا نہیں؟ اور چھوٹی کا مکان انوار حسین کو ملے گا، یا کہ اس میں دوسرے شوہر والے لڑکے لئیق احمد کو بھی ملے گا؟ شرعی حکم کیا ہے، تحریر فرمادیں۔

المستفتی: ابرار حسین، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: چھوٹی نے جو مکان انوار حسین کو زبانی ہبہ کیا ہے، اس کے ثبوت کے لئے شہادت شرعیہ کا موجود ہونا ضروری ہے، اگر شہادت شرعیہ موجود نہیں ہے، تو اس ہبہ کا اعتبار نہ ہوگا۔ اور چھوٹی کے دونوں لڑکے برابر کے شریک ہوں گے۔ (مستفاد: عزیز الفتاویٰ/ ۶۷۱)

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَاَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ. [البقرة: ٢٨٢]

وما سوى ذلك من الحقوق يقبل فيها شهادة رجلين، أو رجل وامراتين، سواء كان الحق مالا أو غير مال. (هداية، كتاب الشهادة، أشرفى ٣/ ١٥٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢٦ ر جمادی الاولیٰ ١٤٢١ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٦٦٧٢/٣٥)

زبانی ہبہ کرنے کے بعد تحریر لکھنے کا شرعی حکم

سوال [٩٤٠٩]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کوئی صاحب اپنی صاحبہ کے نام زبانی ہبہ کریں اور ہبہ کر کے قریب ساڑھے تین سال بعد اپنی صاحبہ کی اس یادداشت کو گواہوں کے روبرو تحریر کر دیں، تو اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

المستفتی: حاجی دولہ پیر غیب، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر زبانی ہبہ کرنے کے بعد پھر تحریر بھی گواہوں کے سامنے لکھ دی ہے تو شرعی طور پر ہبہ صحیح ہو چکا ہے۔ اور گواہوں کے ذریعہ سے اس کا ثبوت بھی ہو جائے گا۔ اور اگر قبضہ بھی دے دیا ہے تو مالک بھی ہو چکی ہے؛ لیکن اگر قبضہ نہیں دیا ہے اور بغیر قبضہ دیئے ہبہ کرنے والا گذر گیا ہے، تو ہبہ مکمل نہ ہوگا۔

الهبة عقد مشروع –إلى قوله– وتصح بالإيجاب والقبول والقبض –إلى قوله– والقبض لابد منه لثبوت الملک. (هداية، كتاب الهبة، اشرفى ديو بند ٣/ ٢٨٣)

تنعقد الهبة بالإيجاب والقبول، وتتم بالقبض الكامل؛ لأنها من التبرعات، والتبرع لا يتم إلا بالقبض. (شرح المجلة رستم باز، اتحاد ديوبند ١/ ٤٦٢، رقم المادة: ٨٣٧، شامي، كراچي ٥/ ٦٩٠، زكريا ديوبند ٨/ ٤٩٣، هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٧٧، جديد ٤/ ٣٩٩، مجمع الأنهر، جديد دارالكتب العليمة بيروت ٣/ ٤٩١، قديم ٢/ ٢٥٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۳۵۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۶/۱۹ھ

زبانی وتحریری ہبہ نامہ کے بعد قبضہ دینے کی شرعی حیثیت

سوال [۹۴۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے چچا حامد حسین نے دو مکان خریدے، ایک مکان خود حامد حسین نے اپنے نام سے خریدا، دوسرا مکان اپنی زوجہ زیتون بیگم کے نام سے خریدا اوران دونوں مکانوں کی تعمیر بھی خود حامد حسین نے کرائی تھی اور حامد حسین لاولد تھے اور مسماۃ زیتون بھی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے مایوس تھی اور دونوں نے زیتون کے سگے بھائی نوشہ کے لڑکے ثواب جان کو گود لیا تھا اوراس کی پرورش کرکے اس کی شادی شہر مرادآباد میں زر کثیر خرچ کرکے کرادی تھی اور حامد حسین کا کاروبار بمبئی میں تھا اوران کے بمبئی میں ایک دوکان ایک رہائشی کمرہ خود خرید کرکے وہیں پر رہتے تھے، اور جب حامد حسین ضعیف العمر ہوگئے تو بمبئی کی دوکان اور رہائشی جگہ کا اپنے لے پالک ثواب جان کو اس کا مالک اور ذمہ دار بنا کر مرادآباد آگئے اور حامد حسین اپنے حقیقی بھتیجے نواب دولہ کو مرادآباد میں اپنے پاس رکھ لیا اور نواب دولہ حامد حسین اوران کی اہلیہ کی خدمت اطاعت کرتے رہے، سن ۱۹۶۱ء میں حامد حسین اور زیتون دونوں نے عید کے

موقع پر خاندان اور محلّہ کے بہت سے لوگوں کے سامنے مراد آباد کے دونوں مکان نواب دولہ کو ہبہ کر کے نواب دولہ کو قبضہ دے دیا اور نواب دولہ نے اس کو قبول ومنظور کر لیا، اور ساتھ میں اس بات کی تصریح کر دی کہ بیوی کے بھتیجے نواب دولہ کو بمبئ کی جائیداد دے دی گئی ہے، مراد آباد کی جائیداد سے اس کا اور اس کے بچوں کو کوئی تعلق نہ رہے گا اور مراد آباد کی جائیداد نواب دولہ کو زبانی ہبہ کر دیا، اسی سال پندرہ بیس دن کے بعد اس زبانی ہبہ کو باضابطہ اسٹامپ پر تحریری شکل دے کر حامد حسین اور زیتون دونوں کے دستخطوں کے ذریعہ ہبہ نامہ پکا کر دیا اور اس ہبہ نامہ میں گواہان کے بھی دستخط اور انگوٹھے ہیں، اب اس واقعہ کے تقریباً نو سال بعد ۱۹۷۰ء میں زیتون کا انتقال ہو گیا اور زیتون کے انتقال کے چالیس دن کے بعد نواب جان عارف واصف چالیسویں میں شرکت کے لئے آئے اور موت کے بعد جنازہ میں شرکت کے لئے نہیں آئے اور جب چالیسویں میں یہ لوگ آئے تو نواب دولہ نے اپنے مکان میں ان لوگوں کو ٹھہرایا اور وہ لوگ رہتے رہے اور ٹھہرنے کے لئے ایک مکان خالی کر دیا تھا، پھر وہ لوگ اس میں رہتے رہے اور خالی کر کے بمبئ نہیں گئے، بعد میں پتہ چلا کہ وہ لوگ بمبئ کی ساری جائیداد بیچ کر آ گئے ہیں، اور جو مکان ٹھہرنے کے لئے ان کو دیا گیا تھا وہ خالی نہیں کیا اور اسی حالت میں ۲۰۰۱ء میں نواب جان کا انتقال ہو گیا اور ان کے دونوں بیٹے اس مکان پر قابض رہے جس میں ان کو ٹھہرنے کی اجازت دی گئی تھی، پھر سن ۲۰۱۲ء میں نواب جان کے لڑکے عارف واصف نے اس بات کا دعویٰ کیا کہ جس مکان میں ہم رہ رہے ہیں اس مکان کے بارے میں زیتون نے ہمارے لئے وصیت کر دی ہے اور اب تک کسی قسم کی وصیت کا نہ چرچا تھا نہ نواب جان نے ذکر کیا، نہ ان لوگوں نے اتنا زمانہ گذرنے کے بعد وصیت کا دعویٰ کیا، یہ سن ۱۹۸۸ء کا لکھا ہوا ایک وصیت نامہ لکھا لائے اور اس طرح کی وصیت کا زیتون نے اپنی زندگی میں نہ ہمارے سامنے اظہار کیا اور نہ ہی کسی اور کے سامنے ظاہر کیا اور نہ کوئی تبصرہ

تھا، تو ایسی صورت میں اس وصیت نامہ کی شرعی کیا حیثیت ہے؟ جب کہ نواب دولہ کے نام سے ضابطہ شرعی کے مطابق ہبہ اس مکان کے بارے میں ہو چکا تھا، اور نواب دولہ نے اس پر قبضہ بھی کر لیا تھا اور اس ہبہ کے نو سال کے بعد میں حامد حسین کا انتقال ہوا اور اس ہبہ کے ۲۹/ سال کے بعد زیتون بیگم کا انتقال ہوا اور دونوں میں سے کسی نے بھی اپنی زندگی میں ہبہ نامہ کے خلاف نہ کبھی تحریر کی نہ کسی قسم کی گفتگو کی ہے۔ اور زیتون بیگم کے مرنے تک زیتون کے اخراجات اور سارے خرچوں کی کفالت نواب دولہ نے کی ہے اور اس بارے میں نواب جان اور اس کے دونوں لڑکوں کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ اور یہ لوگ بمبئی میں رہتے تھے اور ان کی موت میں بھی شریک نہیں ہوئے چالیسویں میں آنے کے بعد ان کو ٹھہرنے کے لئے جو جگہ دی گئی تھی وہ ہمارے گلے کی ہڈی بن گئی، خالی نہیں کی اور زیتون کے تقریباً ۲۱/سال بعد وصیت نامہ نکال کر لائے؛ اس لئے مفتیان کرام سے گزارش ہے کہ شرعی طور پر اس وصیت نامہ کا اعتبار ہوگا یا نہیں؟ اور اگر اعتبار ہوگا تو کہاں تک ہوگا؟

المستفتی: نواب دولہ محلّہ لالباغ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہبہ نامہ وصیت نامہ اور سوال نامہ پر بار بار غور کیا گیا ہے۔ اور ان تحریرات سے یہ بات صاف طور پر واضح ہوتی ہے کہ سن ۱۹۶۱ء میں حامد حسین اور زیتون دونوں نے بخوشی مشترکہ طور پر نواب دولہ کو مذکورہ جائیداد زبانی اور پھر بعد میں تحریری طور پر ہبہ کر کے قبضہ دے کر مالک بنا دیا ہے۔ اور ہبہ مکمل ہو جانے کے بعد ان لوگوں کی طرف سے پوری زندگی میں کسی بھی موقع پر اس ہبہ کو منسوخ کرنا ثابت نہیں ہے۔ اور نہ ہی ہبہ کو منسوخ کرنے کے بارے میں کوئی تحریر ہے، اور نہ ہی اس بارے میں گواہان ہیں؛ اس لئے ہبہ اپنی جگہ صحیح اور درست ہوا ہے۔ اور اس ہبہ نامہ کی رو سے نواب دولہ مذکورہ جائیداد کے شرعی مالک ہیں۔ اور پھر اس ہبہ کے نو سال کے بعد سن ۱۹۷۰ء میں حامد حسین کا انتقال

ہوگیا، پھر ۱۹۹۰ء میں زیتون کا بھی انتقال ہوگیا، تقریبا۲۹ ؍سال کے درمیان اس ہبہ کے خلاف کسی قسم کا کوئی دعویٰ، یا کوئی تحریر سامنے نہیں آئی ہے۔ اور زیتون کے انتقال کے وقت میں بھی وصیت نامہ کے دعویٰ کرنے والے مرادآباد میں موجود نہیں تھے، اور چالیسویں کے زمانہ میں مدعیان آئے ہوئے تھے، اور ان کوٹھہرائے جانے کے بعد بھی دسیوں سال تک وصیت نامہ کا کہیں سے تذکرہ بھی نہیں آیا ہے، پھر زیتون کے انتقال کے تقریباً بیس سال کے بعد وصیت نامہ دکھا کر جو دعوی کیا جارہا ہے، اس کا شرعاً اعتبار نہیں ہوگا۔ اور مذکورہ جائیداد کا نواب دولہ ہی شرعی مالک ہوگا؛ اس لئے کہ زیتون نے اپنی پوری زندگی میں وصیت نامہ لکھنے یا لکھوانے کا کسی کے سامنے ذکر نہیں کیا۔ اور نہ ہی اس کا ثبوت ہے۔

عن عبدالرحمن بن عبدالقاري قال: قال عمر -رضي الله عنه- ما بال رجال ينحلون أولادهم نحلا، فإذا مات أحدهم قال: مالي وفي يدي، وإذا مات هو قال: قد كنت نحلته ولدي، لا نحلة إلا نحلة يحوزها الولد، أو الوالد. (المصنف لابن أبي شيبة، البيوع، من قال: لا تجوز الصدقة حتى تقبض، موسسة علوم القرآن ١٠/ ٥٢٠، رقم: ٢٠٤٩٥)

عن النضر بن أنس قال: نحلني أنس نصف داره، قال: فقال أبو بردة: إن سرك يجوز ذلک فاقبضه، فإن عمر بن الخطاب -رضي الله عنه- قضى في الأنحال أن ما قبض منه، فهو جائز، وما لم يقبض، فهو ميراث، قال: فدعوت يزيد الرشک، فقسمها. (السنن الكبرى للبيهقي، الهبات، باب ماجاء في هبة المشاع، دارالفكر ٩/ ١٥٨، رقم: ١٢١٨٦)

وتتم الهبة بالقبض الكامل. (درمختار، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٤٩٣، كراچی ٥/ ٦٩٠، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩١، مصري قديم ٢/ ٣٥٣)

ولا يتم حكم الهبة إلا مقبوضة. (هندية، الباب الثاني فيما يجوز من الهبة وما لا يجوز، زكريا قديم ٤/ ٣٧٧، جديد ٤/ ٣٩٩)

حكم الهبة ثبوت الملك للموهوب له. (تاتارخانية، زكريا ١٤/ ٤١٣، رقم: ٢١٥٣٧)

الهبة عقد مشروع -إلى قوله- وتصح بالإيجاب والقبول والقبض. (هداية، أشرفي ديوبند ٣/ ٢٨٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۷۰۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/ ۵/ ۱۴۳۳ھ

ہبہ میں قبضہ کی شرعی حیثیت

سوال [۹۴۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عبد المجید صاحب کا انتقال ہوا، انہوں نے اپنے ورثاء میں ایک بیوی وحیداً، چار لڑکے: (۱) محمد نعیم (۲) محمد اکرام (۳) محمد اسلام (۴) محمد یامین، ایک بیٹی، وارث چھوڑے، دریافت طلب یہ امر ہے کہ عبد المجید کی بیوی وحیداً اور ان کی ایک بیٹی کا کتنا کتنا حصہ ہوگا؟ کیوں کہ ان دونوں نے اپنا اپنا حصہ محمد اسلام کی بیوی نھیا کے نام ہبہ رجسٹری کر دیا ہے، آپ بتائیں کیا یہ ہبہ شرعاً معتبر ہے یا نہیں؛ لیکن یہ واضح رہے کہ اس ہبہ پر نھیا کو قبضہ نہیں دیا ہے؛ بلکہ ان لوگوں کے حصے مشترکہ جائیداد میں شامل ہیں۔

المستفتی: محمد مبین محلّہ اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کل ترکہ ۷۲/ سہام میں تقسیم ہو کر لڑکوں کو ۱۴-۱۴/ ملیں گے اور بیوہ کو ۹/ اور لڑکی کو ۷/ سہام ملیں گے۔ اور جب بیوہ نے اپنا حق ہبہ کر کے قبضہ نہیں دیا ہے، نیز بیٹی نے بھی ہبہ کر کے قبضہ نہیں دیا ہے، تو نھیا وحیداً اور عبد المجید کی بیٹی کے حصہ کی مالک نہیں ہوئی؛ اس لئے کہ ہبہ کے کامل ہونے کے لئے شرعی طور پر قبضہ شرط ہے۔ اور یہاں قبضہ نہیں ہوا ہے۔

والقبض لا بد منه لثبوت الملك. (هداية، كتاب الهبة، أشرفي ديوبند ٣/ ٢٨٣)

الهبة تتم بالقبض الكامل؛ لأنها من التبرعات، والتبرع لا يتم إلا بالقبض. (شرح المجلة رستم باز، اتحاد ديوبند ١/ ٤٦٢، رقم المادة: ٨٣٧)

يملك الموهوب له الموهوب بالقبض. (شرح المجلة ١/ ٤٧٣، رقم المادة: ٨٦١)

وتتم الهبة بالقبض الكامل. (شامي، كراچی ٥/ ٦٩٠، زكريا ٨/ ٤٩٣)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/۲۶۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۰/۴/۱۴۱۲ھ

ہبہ میں قبضہ کا شرعی حکم

سوال [۹۴۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اصغر حسین مرحوم کی پہلی بیوی نے ایک لڑکا تولد کر کے خدا کو پیاری ہوگئی، اس کے بعد اصغر حسین مرحوم نے دوسری شادی کی اس کے بطن سے چار لڑکے، چار لڑکیاں موجود ہیں، اب اصغر حسین مرحوم کی وراثت میں ایک بیوی اور ۵؍لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں، مرحوم نے ۱۵۲؍گز زمین چھوڑی ہے، اب ماں نے ساڑھے ۱۴؍گز زمین لڑکیوں میں سے تیسری لڑکی کے نام میں کردی ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ ماں نے جو ایک لڑکی کے نام زمین ساڑھے ۱۴؍گز رجسٹری کردی یہ جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: ارشاد حسین پیرزادہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ترکہ تقسیم کر کے اپنا حصہ الگ کرنے سے قبل مرحوم اصغر حسین کی دوسری بیوی کا اس میں سے کچھ حصہ اپنی تیسری لڑکی کے نام ہبہ اور رجسٹری کرنا صحیح نہیں؛ اس لئے کہ ہبہ مکمل ہونے کے لئے قبضہ دینا شرط ہے؛ لہٰذا پہلے مرحوم

اصغر حسین کی موروثہ ۱۵۲ر گز زمین شرعی طریقہ سے تقسیم ہوگی اور جب تمام وارثین کے حصے الگ الگ ہوجائیں تب وہ اپنے مقررہ حصہ میں سے جسے چاہے ہبہ نامہ یا رجسٹری کرواسکتی ہے۔

وشرائط صحتها (أي صحة الهبة) في الموهوب أن يكون مقبوضا غير مشاع، مميزا غير مشغول. (درمختار مع الشامي، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٤٨٩، كراچی ٥/ ٦٨٨، هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٧٤، جديد ٤/ ٣٩٥، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩١، مصري، قديم ٢/ ٢٥٣، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٠/ ٢٢٥)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ر جمادی الثانیہ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۲۸۹۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۷/۶/۹ھ

کیا ہبہ کی تکمیل کے لئے قبضہ شرط ہے؟

سوال [۹۴۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: والد محترم کا انتقال ہوا ۱۹۵۴ء میں، اس وقت ہمارے گھر کی حالت نہایت پریشان کن مفلسی کا دور تھا، کافی قرض بھی تھا، وہ اس لئے کہ والد محترم کافی عرصہ سے جلندھر کے مرض میں مبتلا رہے، میں یعنی سب سے بڑا لڑکا عمر اٹھارہ سال ہم سے چھوٹی بہن عمر پندرہ سال اس سے چھوٹی بہن عمر بارہ سال ایک بہن کا انتقال ہوگیا، پھر اس سے چھوٹا بھائی چھ سال اس سے چھوٹی بہن تین سال اس سے چھوٹا بھائی پانچ ماہ کا تھا اور والدہ محترمہ تھیں، گھر میں بنائی کا کام ہوتا تھا، والد صاحب کے وقت سے ہی والدہ محترمہ نے بھی بننے کا کام سیکھ لیا تھا، بہر حال جتنا ہوسکتا وہ بھی کام کرتی تھیں، میں یعنی بڑا بھائی والد محترم کے انتقال کے وقت گھر پر موجود نہیں تھا، مالیگاؤں روزی روٹی کے چکر میں گیا ہوا تھا، وہیں مالیگاؤں میں پاورلوم

چلاتا تھا، محنت مشقت کر کے گھر والوں کے پیٹ بھرنے کا انتظام کرتا تھا، قرض بھی تھا؛ اس لئے والد صاحب کے انتقال کے فوراً بعد میں گھر نہیں آیا؛ بلکہ محنت کر کے جو قرض تھا وہ ادا کر کے لگ بھگ دو سال بعد گھر آیا، پھر جلد ہی مالیگاؤں واپس چلا گیا، پھر ایک سال بعد آیا، تو میری شادی کی والدہ کو فکر ہوئی، گھر بہت چھوٹا سا تھا، اس لئے لڑکی ملنے میں بھی کافی دقت ہوئی، بہر حال ایک سال کے بعد ہماری اور ہم سے جو چھوٹی بہن تھی اس کی شادی ہوئی، اس کے بعد یہیں ہمارے قصبہ سے تین چار کیلومیٹر پر ایک قصبہ ہے مئوائمہ وہاں بھی پاورلوم چلنا شروع ہو گیا تھا، اب میں وہیں مستری کے طور پر کام کرنے لگا، اس وقت وہاں پر کوئی بڑا کار خانہ تو نہ تھا، چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں مستری یعنی مقاومی کرتا تھا، سائیکل لے لی تھی، اور سب میں دوڑتا رہتا، جیسی ضرورت پڑتی اسی دوران کارخانہ دار دو بھائی ایک زمین خرید رہے تھے، ہم سے کہا تم بھی لے لو؛ اس لئے کہ ہمارا مکان بہت چھوٹا ہے، ان کو معلوم تھا، ہمیں خیال ہوا مشورہ ٹھیک ہی ہے، زمین بھی اس وقت سستی تھی، پچاس روپئے بسوہ چار بسوہ ہم نے بھی لے لی، دو سو روپئے میں، بقیہ ان دونوں بھائیوں نے لے لی، اور ساتھ ہی رجسٹری ہو گئی، مگر وہ زمین گھر کی مناسبت سے ہم کو پسند نہ تھی؛ اس لئے دوسری زمین کا ہم کو چکر لگا تھا، تبھی تین چار سال بعد ایک شخص ہم سے ملا اور اپنی زمین بیچنے کے لئے کہا، جو نہایت مناسب جگہ پر تھی، تین بسوہ تھی، دام وغیرہ معلوم کیا اور اس سے کہا کہ کم سے کم تین ماہ کا موقع دے دو، تو ہم لے سکتے ہیں، اس نے ایک ہزار روپئے کا سوال کیا اور کہا ایک ہزار روپئے دے کر بیع نامہ لکھا لو، پھر تین ماہ بعد رجسٹری کرا لینا، بہر حال معاملہ طے ہو گیا، ایک ہزار اس کو دے دیا، پھر اپنی پرانی زمین بیچ کر جس میں کافی نفع بھی ہوا اور دوسری زمین رجسٹری کرا لی، ابھی تک بھائی کا کوئی تعاون ہم کو نہیں ملا تھا؛ اس لئے کہ وہ ابھی تک پڑھنے لکھنے میں لگا رہا اور پھر میں نے اس زمین پر تعمیر بھی شروع کر دی؛ اس لئے کہ ہمارے پاس دو چار پاورلوم ہو گئے تھے، اور وہ دوسروں کے یہاں چل رہے تھے، اور ہم نے کارخانہ کی شکل میں بنوایا تھا،

اوپر رہنے کے لئے نیچےلوم کے لئے، اب جس بھائی کی عمر ہم نے چھ سال لکھی تھی، آٹھ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد دو سال حافظہ پڑھا، مگر حافظہ میں نہیں چل سکا، تو اس کو بھی ہم نے کام میں لگا لیا، پھر دو سال کے بعد ہم نے اس کی شادی کی، شادی کے پانچ سال کے بعد گھر میں فتنہ کھڑا ہو گیا، اس دوران میں تو مئوائمہ والے نئے مکان کارخانہ والے میں رہتا، وہ آبائی مکان پرانے میں رہتا تھا، کہ ایک دن تین آدمیوں کو لے کر آیا اور نئے مکان میں بٹوارہ ہو گیا، پھر چھوٹا بھائی بھی اپنے بچوں کے ساتھ نئے والے مکان میں رہنے لگا، اب بات کرنا چھوڑ دیا، میں نے تو بہت کوشش کی کہ بات چیت ہوتی رہے، علاحدہ رہنا کوئی برا نہیں، مگر وہ شخص کسی طرح راضی نہ ہوا، پھر میں نے چھوٹے بھائی کے ایک دوست سے کہا کہ اس سے کہہ دو کہ اپنا حصہ جو اس کو ملا ہے، ہم سے رجسٹری کرالے، تو اس کے دوست نے ہم سے کہا کہ رجسٹر کا آدھا پیسہ تم کو دینا ہوگا، میں نے کہا: میں اپنی کمائی کی رجسٹری کی زمین بھی دوں اور خرچہ بھی کروں، یہ تو ہم سے نہ ہوگا، اس کے بعد چھوٹے بھائی نے دوسری زمین جو اس بٹوارے کی کل زمین سے زیادہ ہے، خود خرید کر اپنا الگ مکان تعمیر کر لیا اور ان کے بچے اس میں رہنے لگے، وہ یہاں بھی رہتے وہاں بھی رہتے؛ اس لئے کہ کھانا وہیں ان کے مکان میں تھا، پھر کبھی رجسٹری کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی اور وہ دنیا سے رخصت ہو گئے، ان کے بچے اپنے نجی مکان میں رہتے ہیں، متضاد مکان خالی پڑا ہے، اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ دونوں بھائیوں کے بیچ جو معاہدہ ہوا تھا وہ رد ہو گیا کہ نہیں اس مکان کا مالک کون ہے، چھوٹے بھائی کے لڑکے یا بڑا بھائی خود جس کے نام سے رجسٹری ہے؟

المستفتی: عبداللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سوال نامہ کی پوری تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ جو زمین بڑے بھائی نے اپنے خون پسینہ کی کمائی سے خریدی ہے، وہ پوری زمین اور مکان اسی بڑے بھائی کی ملکیت ہے، پھر گھر میں اختلاف پیدا ہونے کے بعد تین آدمیوں کی موجودگی میں بڑے

بھائی نے بخوشی بٹوارہ کرکے اپنی ملکیت کی زمین اور مکان کا جو حصہ چھوٹے بھائی کی ملکیت میں دے دیا ہے اور مزید بڑے بھائی نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اپنے حصہ کا مجھ سے رجسٹری کروالے یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جو حصہ بٹوارہ کرکے چھوٹے بھائی کو دے دیا ہے وہ بڑے بھائی کی طرف سے بطور ہبہ چھوٹے بھائی کی ملکیت میں منتقل ہوگیا ہے۔ اور چھوٹے بھائی نے باضابطہ قبضہ کرکے رہائش بھی اختیار کرلی ہے اور صرف سرکاری پیچیدگیوں سے بچنے کے لئے رجسٹری کا مسئلہ باقی تھا، اس صورت حال میں وہ حصہ چھوٹے بھائی کی ملکیت ہو چکا ہے اور چھوٹے بھائی کے انتقال ہوجانے کے بعد وہ حصہ چھوٹے بھائی کے وارثین کی ملکیت شمار ہوگی اور دونوں بھائیوں کے بٹوارہ کا معاہدہ بدستور باقی شمار ہوگا؛ اس لئے کہ ہبہ شدہ حصہ پر قبضہ ہو چکا تھا، ہاں البتہ اب بھی رجسٹری کا خرچ ان کے وارثین پر لازم ہے۔

عن عبدالرحمن بن عبدالقاري قال: قال عمر –رضي الله عنه– ما بال رجال ينحلون أولادهم نحلا، فإذا مات أحدهم قال: مالي وفي يدي، وإذا مات هو قال: قد كنت نحلته ولدي، لا نحلة إلا نحلة يحوزها الولد، أو الوالد. (المصنف لابن أبي شيبة، البيوع، من قال: لا تجوز الصدقة حتى تقبض، موسسة علوم القرآن ١٠/ ٥٢٠، رقم: ٢٠٤٩٥)

الهبة تمليك العين بلا عوض، وحكمها ثبوت الملك للموهوب له، وتتم الهبة بالقبض الكامل في محوز مقسوم. (شامي، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٤٨٨-٤٩٥، كراچی ٥/ ٦٨٧-٦٨٨)

وليس له حق الرجوع بعد التسليم في ذي الرحم المحرم، وفيما سوى ذلك له حق الرجوع إلا أن بعد التسليم لاينفرد الواهب بالرجوع بل يحتاج فيه إلى القضاء أو الرضاء. (هندية، كتاب الهبة، الباب الخامس في الرجوع في الهبة، زكريا ٤/ ٣٨٥، جديد ٤/ ٤٠٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۵۴۱/۳۸)

کیا قبضہ دینے سے ہبہ تام ہوجاتا ہے؟

سوال [۹۴۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کا انتقال ہوگیا، اس نے اپنے پیچھے ایک بیوی دو عمر اور بکر لڑکے ایک لڑکی چھوڑی اور میراث میں کچھ زیور ایک زمین کا ٹکڑا جس کا عرض ۳۵ رگز اور طول ۴۵ رگز ہے چھوڑا، جس میں دو پختہ مکان بنے ہوئے ہیں۔ اور فاضل زمین میں لپٹس کے درخت لگے ہیں، اور کوئی آمدنی کا ذریعہ نہیں ہے۔ اور باپ نے اپنی زندگی ہی میں مکان کا بٹوارہ کردیا تھا، اور ایک ایک مکان دونوں لڑکوں کو دے دیا تھا، اب میت کی بیوی کے گذارنے کی کیا صورت ہے؟ اور گزارہ کس طرح ہو آیا گزارے کا خرچ مثلاً ۷۵-۷۵ روپئے دونوں لڑکوں پر ماہانہ تقسیم کردیا جائے اور ماں یہ رقم لے کر جس کے پاس چاہے رہے یا الگ پکا کر کھائے یا باری باری دونوں لڑکوں کے گھر پر کھانا کھائے، مگر ماں کا دل چھوٹے لڑکے بکر سے لگا ہوا ہے؛ کیوں کہ بڑے لڑکے عمر نے ماں کو بہت ستایا اور وہ اس سے ناراض ہے۔

(۲) دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کسی حد تک باپ کا ترکہ اور اس کی جائیداد سمجھی جائے گی؛ کیوں کہ لڑکوں نے جوان ہونے تک اور شادی ہونے کے بعد بھی کچھ عرصہ تک ایک ساتھ اور ایک جگہ رہ کر کمایا ہے، کیا لڑکے اپنی اپنی کمائی ترکہ میں سے نکال لیں اور ترکہ میں شمار نہ ہو؟

(۳) نیز اگر کوئی لڑکی یا لڑکا اپنے باپ کا کٹر دشمن ہے اور اپنے باپ کو خوب گالیاں دیں اور خوب مارتا پیٹتا رہا تب بھی اس کو ترکہ میں حصہ دیا جائے گا؟

(۴) اور کیا باپ کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ اپنی زندگی ہی میں وصیت کرجائے کہ نافرمان اولاد کو ترکہ نہ دیا جائے؟

(۵) کیا وہ اپنی زندگی میں یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنی ساری جائیداد روپیہ پیسہ نافرمان مغضوب لڑکے کو چھوڑ کر باقی اولاد کو تقسیم کردے، یا ان کے نام کرادے؟ شریعت کے مطابق

نہایت واضح اور صاف عبارت میں جواب اسی پرچہ کے پشت پر عنایت فرمادیجئے۔

المستفتی: خلیل احمد انصاری، محلّہ ٹنڈولہ ٹانڈہ بادلی رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) بشرط صحت سوال اگر باپ نے اپنی حیات میں بحالت صحت دونوں مکان لڑکوں کو ہبہ کر کے قبضہ دے دیا ہے، تو دونوں لڑکے اپنے اپنے قبضہ شدہ مکان کے مالک ہو چکے ہیں، ان مکانات میں دیگر ورثاء کا حق نہیں ہوگا۔

وتتم الهبة بالقبض الكامل. (الدرالمختار، كتاب الهبة، كراچی ٥/ ٦٩٠، زكريا ٨/ ٤٩٣، هندية زكريا قديم ٤/ ٣٧٧، جديد ٤/ ٣٩٩، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩١)

اور ماں کا خرچ شرعاً دونوں لڑکوں پر واجب ہے۔ اور نفقہ کی مقدار اور ماں کی رہائش کے بارے میں آپسی مشورہ سے طے کیا جائے، باری باری کے طریقے سے اور کسی ایک کے پاس رہ کر اور کسی دوسری جگہ رہ کر آپسی صلح ورضا مندی سے ہر طرح جائز ہے، خرچ ہر حال میں دونوں لڑکوں پر لازم ہے۔

وعلى الرجل أن ينفق على أبويه، وأجداده، وجداته إذا كانوا فقراء.

(هداية، كتاب الطلاق، باب النفقة، أشرفی ديوبند ٢/ ٤٤٥)

(۲) باپ کے ساتھ رہ کر لڑکوں نے جو کمایا ہے وہ سب شرعاً باپ کی ملکیت ہے، باپ کے ترکہ میں سے اپنی کمائی کی مقدار الگ کرنے کا حق لڑکوں کو شرعاً نہیں ہوگا؛ بلکہ سب باپ کے ترکہ میں شمار ہوگا۔

الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيء، فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله؛ لكونه معينا له. (شامي، كتاب الشركة، فصل في الشركة، زكريا ٦/ ٥٠٢، كراچی ٤/ ٣٢٥)

(۳) وراثت کا حق شرعاً غیر اختیاری ہے، باپ کے نافرمان لڑکے کو بھی باپ کی موت کے بعد ترکہ میں سے شرعاً حصہ ملتا ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۵/۶۳، جدید ڈابھیل ۲۰/ ۴۸۷)

الإرث جبری لا یسقط بالإسقاط. (تکملة ردالمحتار، کتاب الدعویٰ، مطلب: واقعة الفتوی کراچی ۷/ ۵۰۵، زکریا ۱۱/ ۶۷۸)

(۴) نافرمان اولاد کوترکہ میں سے حصہ نہ دینے کی وصیت کوعرف میں عاق کرنا کہا جاتا ہے، شرعاً یہ وصیت معتبر نہیں ہوتی ہے۔اوراولاد نافرمان کوبھی ترکہ میں سے حصہ مل جائے گا۔
(مستفاد: امدادالفتاوی ۴/ ۳۱۸)

(۵) نافرمان اولاد کونہ دے کراپنی زندگی میں نیک صالح اولاد کودے دینا جائز ہے۔

لا بأس بأن یعطی من أولاده من کان عالما متأدبا، ولا یعطی منهم من کان فاسقا فاجرا. (مجمع الأنهر، قدیم ۲/ ۳۵۸، جدید دارالکتب العلمیة بیروت ۳/ ۴۹۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ ؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۲۰۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۱/۵/۶ھ

ہبہ کی تکمیل کے لئے قبضہ شرط ہے

سوال [۹۴۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زہرہ بیگم بیوہ نے اپنی حیات میں اپنا مکان نمبرایک اپنی اکلوتی بیٹی جمیلہ بیگم کوتحریری طور پر بگواہ خلیل الرحمٰن، عزیز الرحمٰن، غلام مصطفیٰ، محمد سلیمان، عبدالخالق، نورالحق، حبیب الحق، مظہر الحق، حفیظ الرحمٰن، محمد انوار، محمد ادریس، سراج الحق ہبہ کردیا اور مکان پر جمیلہ کو قبضہ بھی کرادیا؛ لہٰذا جمیلہ مع اہل وعیال اور والدہ زہرہ بیگم کے رہنے لگی اور دوسرا مکان جو زہرہ بیگم نے اپنی حیات میں اپنے نواسوں (محمد صالح، احتشام الحق، تنویرالاسلام کوتحریری طور پر مذکورہ بالا بارہ گواہوں کی گواہی کے ساتھ ہبہ کردیا؛ لیکن وہ مکان ہبہ سے پہلے سے کسی کوکرایہ پردے رکھا ہے اور کرایہ دار اس میں اسکول چلاتے ہیں اور کرایہ تینوں نواسے وصول کرتے ہیں۔اور تیسرا

مکان زہرہ بیگم نے اپنے چوتھے نواسے محبوب الحق کو ہبہ کردیا؛ لیکن وہ مکان ہبہ سے پہلے سے کسی غیر کے قبضہ میں ہے،اس کے تخلیہ کے لئے زہرہ بیگم نے اپنے داماد اور نواسے کے ذریعہ مکان پر قابض شخص سے عدالت میں مقدمہ چلایا اور مقدمہ کا فیصلہ عدالت نے زہرہ بیگم کے نام کردیا؛ لیکن مکان خالی نہیں ہوسکا کہ زہرہ بیگم کا انتقال ہوگیا، اب نواسے محبوب الحق کا لڑکا چلا رہا ہے۔سوال یہ ہے کہ زہرہ بیگم کا اپنے تینوں مکانوں کا شکل مذکورہ بالا میں ہبہ کرنا صحیح ہے یانہیں؟ اور جن کے نام ہبہ کیا گیا ہے وہ ان مکانوں کے مالک ہوئے یانہیں؟ بیوہ زہرہ بیگم اپنی بیٹی داماد اور نواسوں کے پاس ہی رہتی تھیں، اور وہی سب ان کے نان ونفقہ کسوہ کا بار اٹھاتے تھے، دوسرے نمبر کے مکان میں رہ رہے کرایہ دار سے کہا گیا کہ یا تو کرایہ بڑھا کردیجئے یامکان خالی کردیجئے؛ لیکن انہوں نے تاہنوز نہ ہی کرایہ بڑھایانہ ہی مکان خالی کیا ہے، کچھ عرصہ سے محمد صالح، احتشام الحق اور تنویرالاسلام نے کرایہ لینا موقوف کردیا، نیز کرایہ دار جب تک کرایہ دیتے رہے جب تک کرایہ کی رسید پر مالک مکان بنام زہرہ بیگم ہی رہا، تیسرا مکان جس کا عدالتی فیصلہ زہرہ بیگم کی حیات میں زہرہ بیگم کے حق میں ہوگیا تھا؛ لیکن مکان تاہنوز موہوب الیہ محبوب الحق بھی خالی نہیں کراسکے۔اور ۱۹۸۷ء میں زہرہ بیگم کا انتقال بھی ہوگیا اور محبوب الحق کا بھی انتقال ہوگیا۔اور اب محبوب الحق کے لڑکے شہاب عادل، تابش مسلم مکان کے تخلیہ کے لئے مقدمہ چلارہے ہیں۔

المستفتی: تنویرالاسلام،شاہ آباد، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) زہرہ بیگم نے اپنی اکلوتی بیٹی جمیلہ بیگم کو جو تحریری طور پر گواہوں کی موجودگی میں مکان ہبہ کیا ہے،جس پر جمیلہ کو اپنی زندگی میں قبضہ بھی دلادیا ہے، تو یہ ہبہ شرعاً معتبر ہے اور جمیلہ اس کی مالک ہوگئی۔

عن النضر بن أنس قال: نحلني أنس نصف داره، قال: فقال أبو بردة: إن سرک یجوز ذلک فاقبضه، فإن عمر بن الخطاب –رضي الله

عنه- قضى في الأنحال أن ما قبض منه، فهو جائز، وما لم يقبض، فهو ميراث، قال: فدعوت يزيد الرشک، فقسمها. (السنن الكبرى للبيهقي، الهبات، باب ماجاء في هبة المشاع، دارالفكر ٩/ ١٥٨، رقم: ١٢١٨٦)

وتتم الهبة بالقبض الكامل. (درمختار، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٤٩٣، كراچی ٥/ ٦٩٠، هندية زكريا قديم ٤/ ٣٧٤، جديد ٤/ ٣٩٥، بدائع الصنائع، زكريا ٥/ ١٧٦، كراچی ٦/ ١٢٣، هداية أشرفي ٣/ ٢٨٣، شرح المجلة رستم اتحاد ١/ ٤٢٢، رقم: ٥٧)

وقال: جعلت لک هذه الدار، أو هذه الدار لک، فاقبضها، فهو هبة هكذا في فتاوى قاضيخان. (هندية، كتاب الهبة، زكريا قديم ٤/ ٣٧٥، جديد ٤/ ٣٩٦)

(٢) اورزہرہ بیگم نے جو دوسرے نمبر کا مکان اپنے تین نواسوں: محمد صالح، احتشام الحق، تنویر الاسلام کوتحریری طور پر گواہوں کی موجودگی میں ہبہ کیا ہے اور زہرہ کی زندگی میں ہی ان تینوں کی طرف اس کا کرایہ منتقل ہونے لگا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ زہرہ نے ان کو قبضہ بھی دے دیا؛ لہٰذا یہ ہبہ بھی شرعاً معتبر ہے۔

عن النضر بن أنس قال: نحلني أبي نصف داره، فقال أبو بردة: إن سرک أن تجوز ذلک فاقبضه، فإن عمر بن الخطاب -رضي الله عنه- قضى في الأنحال ما قبض منه فهو جائز، وما لم يقبض منه فهو ميراث.

(المصنف لابن أبي شيبة، البيوع والأقضية من قال: لا تجوز الهبة إلا مقبوضة، موسسة علوم القرآن، جديد ١٠/ ٥٢١، رقم: ٢٠٥٠٢)

وتتم الهبة بالقبض الكامل. (درمختار، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٤٩٣، كراچی ٥/ ٦٩٠، هندية زكريا قديم ٤/ ٣٧٤، جديد ٤/ ٣٩٥، بدائع الصنائع، زكريا ٥/ ١٧٦، كراچی ٦/ ١٢٣، هداية أشرفي ٣/ ٢٨٣، شرح المجلة رستم اتحاد ١/ ٤٢٢، رقم: ٥٧)

(٣) زہرہ بیگم نے تیسرے نمبر کا مکان جو اپنے چوتھے نواسہ محبوب الحق کو ہبہ کیا ہے، یہ قبضہ نہ دلانے کی وجہ سے ہبہ تام نہیں ہوا؛ اس لئے یہ ہبہ نا قابل اعتبار رہوگا۔ اوراس مکان میں زہرہ بیگم کے شرعی ورثاء کا حق متعلق ہو جائے گا۔

عن عبدالرحمن بن عبدالقاري قال: قال عمر -رضي الله عنه- ما بال رجال ينحلون أولادهم نحلا، فإذا مات أحدهم قال: مالي وفي يدي، وإذا مات هو قال: قد كنت نحلته ولدي، لا نحلة إلا نحلة يحوزها الولد، أو الوالد. (المصنف لابن أبي شيبة، البيوع، من قال: لا تجوز الصدقة حتى تقبض، موسسة علوم القرآن ١٠/ ٥٢٠، رقم: ٢٠٤٩٥)

ومنها: أن يكون الموهوب مقبوضا حتى لا يثبت الملك للموهوب له قبل القبض. (هندية، كتاب الهبة، زكريا قديم ٤/ ٣٧٤، جديد ٤/ ٣٩٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۷۴۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۶/۶ھ

کیا الگ الگ کمروں میں رہائش دینے سے ہبہ مکمل ہو جاتا ہے؟

سوال [۹۴۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کا ایک مکان مع صحن دار چند کمروں مع برآمدہ پر مشتمل ہے، نیچے کے دو کمروں میں دو لڑکوں کو رہائش کرادی اور تیسرے لڑکے کو اپنے کمرہ کے اوپر کمرہ بنوا دیا اور زید ان کمروں میں بھی متصرف رہا ہے، یعنی اپنی کتابیں صندوق اور اناج وغلہ وغیرہ ان ہی کمروں میں برابر رکھتے رہے ہیں اور کمروں کی برابر مرمت بھی کراتے رہے ہیں اور زید کی طرف سے کسی کو ان کمروں کا مالک بنانا اور قابض بنا کر خود بے دخل ہونے کی صراحت نہیں ہے، مکان کے قابل بٹوارہ ہونے کے باوجود زید نے مکان میں سے کسی کو کوئی چیز اپنے اور دوسرے لڑکوں کے درمیان محدود ومتعین ومفرغ کر کے الگ الگ نہیں کیا ہے؛ بلکہ تمام کمروں کی چھت اور اوپر کے کمروں میں جانے کا زینہ اور راستہ اور تمام کمروں کی دیواریں اور صحن سب مشترکہ ومشاع ہیں، مقاسمت کا عمل جو قبضہ تام کے لئے ضروری ہے زید کی طرف سے کبھی بھی نہیں ہوا ہے، زید کا انتقال ہو چکا ہے، اس بات کے معتبر گواہ موجود ہیں کہ جب ان سے مکان کے بٹوارہ

کرنے کو کہا گیا تھا، توانہوں نے تقسیم کرنے سے یہ کہہ کر منع کر دیا تھا کہ تقسیم میراث مرنے کے بعد ہوتی ہے؛ لہٰذا ایسی صورت میں کسی ایک وارث کا ایسی چیز کو جو تملیک عین کے لئے قانوناً یا عرفاً موضوع نہیں ہے، ہبہ کا قرینہ قرار دے کر ہبہ کا دعویٰ کرنا کیا شرعاً درست ہے اور اس کو ایجاب ہبہ قرار دیا جا سکتا ہے جو کہ ہبہ کا رکن اعظم ہے، نیز صرف کیا دعویٰ کرنے سے ہبہ کا ثبوت ہو جائے گا؟ جب کہ کوئی شہادت بھی موجود نہیں ہے؟ اور دیگر وارثین ہبہ کے منکر ہیں یا پورے مکان کو ترکۂ زید قرار دے کر وارثین کے درمیان بقدر حصص شرعیہ تقسیم ہوگا؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب با صواب سے نواز کر عنداللہ ماجور وعندالناس مشکور ہوں۔ فقط والسلام

المستفتی: محمد حنیف احمد آباد جمال پور، چیپاواڑ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مکان کے الگ الگ کمروں یا الگ الگ منزلوں میں بیٹوں کو رہائش دینے سے باپ کی طرف سے نہ ہبہ شمار ہوتا ہے اور نہ ہی بیٹے رہائشی حصے کے مالک ہوتے ہیں۔ اور اس کو ہبہ کا قرینہ بھی نہیں قرار دیا جا سکتا؛ اس لئے باپ کے مرنے کے بعد رہائشی مکان کی ہر منزل میں ہر ایک شرعی وارث کا حق متعلق ہوگا۔ اور اسے شرعی طور پر تقسیم کرنا بھی لازم ہوگا۔ اور لڑکیاں بھی اس میں حصہ دار ہوں گی، اگر مکان قابل تقسیم نہیں ہے، تو اس کی قیمت لگا کر سارے حق داروں کے درمیان قیمت تقسیم کر دینا لازم ہے۔

وشرائط صحتها في موهوب: أن يكون مقبوضا غير مشاع مميزا غير مشغول، وركنها: هو الإيجاب والقبول. وتحته في الشامية: وذكر في الكرماني: أنها تفتقر إلى الإيجاب؛ لأن ملك الإنسان لا ينقل إلى الغير بدون تمليكه وإلى القبول؛ لأنه إلزام الملك على الغير. (الدر المختار مع الشامي، كتاب الهبة، زكريا ديوبند ٨/ ٤٩٠، كراچی ٥/ ٦٨٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ جمادی الثانیہ ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۳۰۲۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰/ ۶/ ۱۴۳۶ھ

دستخط شدہ سادہ کاغذ پر دستخط کنندہ کی مرضی کے خلاف لکھوانا

سوال [۹۴۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے شوہر کو اپنے انتقال سے ڈیڑھ سال پہلے پتھری کی بیماری ہوگئی تھی، تو آپریشن سے پہلے اپنے بھتیجے سے دو اسٹامپ پیپر منگوائے اور سادے کاغذ پر دستخط کر کے مجھے دے دیئے۔ اور کہا کہ اس میں جو چاہو لکھوا سکتی ہو، آج کل کی اولادوں کا کوئی بھروسہ نہیں، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ میں ان کی طرف سے ہبہ نامہ لکھوا سکتی ہوں اور اس کا شرعاً اعتبار ہوگا یا نہیں؟

المستفتیة: نسیم جہاں شیدی سرائے، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سادہ کاغذ پر دستخط کروانے کا کوئی اعتبار نہیں؛ بلکہ تحریر کے بعد دستخط کا اعتبار ہوتا ہے اور سادہ کاغذ پر دستخط کرا لینا اور لینے والے کا اپنی مرضی کے مطابق اس پر لکھنا اس آیت کریمہ کے مقصد کے خلاف ہے۔

فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ. [البقرة: ۲۸۲] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۴۸۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/ ۶/ ۱۴۱۶ھ

جس کا دماغی توازن درست نہ ہو اس سے ہبہ نامہ پر انگوٹھا لگوانا

سوال [۹۴۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: شریف احمد کے لڑکے کا دماغی توازن صحیح نہیں ہے، کیا اس کی حیات میں اس کا حصہ کوئی دوسرا شخص لے سکتا ہے؟ اگر کوئی اس سے انگوٹھا لگوا لے تو کیا ہبہ نامہ وغیرہ معتبر ہوگا؟

المستفتی: انصار احمد قاضی ٹولہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شریف احمد کے لڑکے کی موجودگی میں اس کا حصہ کوئی دوسرا شخص نہیں لے سکتا، اس کے مرنے کے بعد ہی اس کے ورثاء کے درمیان تقسیم ہوگا اور کسی کے شریف احمد کے لڑکے سے انگوٹھا لگوا لینے کی وجہ سے اس کا ہبہ معتبر نہ ہوگا؛ کیوں کہ ہبہ کے لئے عاقل وبالغ کا ہوش وحواس درست ہونا شرط ہے اور اس کے ہوش وحواس اور دماغی توازن درست نہیں؛ اس لئے اس کا ہبہ معتبر نہیں۔

وهل إرث الحي من الحي أم من الميت؟ المعتمد الثاني، وتحته في الشامية قوله من الحي: أي قبيل الموت في آخر جزء من أجزاء حياته.

(شامي، کتاب الفرائض، زکريا ۱۰/ ۴۹۳، کراچی ۶/ ۷۵۸-۷۵۹)

وشرائط صحتها فی الواهب العقل والبلوغ والملک فلا تصح هبة المجنون. (البحرالرائق، کتاب الهبة، کوئٹه ۷/ ۲۸۴، زکريا ۷/ ۴۸۳، هندية، زکريا قديم ۴/ ۳۷۸، جديد ۴/ ۳۹۵، الفتاوی التاتارخانية، زکريا ۱۴/ ۴۱۲، رقم: ۲۱۵۳۶، شامي، زکريا ۸/ ۴۸۹، کراچی ۵/ ۶۸۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ربیع الاول ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۹۶۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۵/۳/۱۴۲۴ھ

شرعی ثبوت کے بغیر محض سول جج کے فیصلہ سے ملکیت ثابت نہ ہوگی

سوال [۹۴۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: حکیم نوشہ خان صاحب، چندہ خان صاحب، حامد علی خان صاحب اور سلیمان خان صاحب، یہ چار بھائی تھے، ان چاروں میں سے سب سے بڑے بھائی حکیم نوشہ خان صاحب اور سب سے چھوٹے بھائی سلیمان خان صاحب نے شادی نہیں کی، یہ دونوں لاولد رہے،

چندہ خان صاحب اور حامد علی خان صاحب نے شادی کی اور چندہ خان کے ایک لڑکا چار لڑکیاں اور حامد علی خان کے چھ لڑکے اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ضروری بات یہ ہے کہ چندہ خان اور حامد علی خان کے کوئی مکان اپنی ملکیت کا باقی نہیں رہا، جو تھا وہ خرد برد کر کے ختم کر دیا۔اور حکیم نوشہ خان صاحب جنہوں نے شادی نہیں کی تھی ،ان کے دو مکان تھے، دونوں مکانوں میں سے ایک مکان واقع محلّہ بھٹی حامد علی کے دولڑکے حکیم شاکر علی خان اور کوثر علی کے نام ہبہ کر کے قبضہ دے دیا اور سول جج کے ذریعہ ہبہ کے اقرار نامہ پر حکیم نوشہ خان صاحب نے اقراری دستخط کیا ہے۔اور دوسرا مکان حامد علی کے لڑکے رحمت علی کے نام سول جج کے ذریعہ سے ہبہ کر دیا اور سول جج کے فیصلہ کے مطابق سرکاری کاغذات موجود ہیں۔اور سب سے چھوٹے بھائی سلیمان خان کے چار مکان تھے،ان میں سے ایک مکان واقع محلّہ کھوکران سرائے کشن لال اپنے بڑے بھائی نوشہ خان صاحب کے نام وصیت کر دی، پھر اس کے بعد نوشہ خان صاحب نے اپنے بھتیجے رحمت علی خان وشاکر علی خان کو زبانی ہبہ کر دیا، پھر اس کے بعد نوشہ خان صاحب کے مشورہ سے دونوں موہوب لہ نے مدرسہ شاہی کے نام وقف کر دیا۔باقی تین مکان واقع محلّہ بھٹی بڑے بھائی نوشہ خان صاحب کو وصیت کر دی اور پھر نوشہ خان صاحب نے ان تینوں مکانوں کو اپنے چھوٹے بھائی حامد علی خان کے لڑکے رحمت علی اور شاکر علی کے نام رجسٹری وصیت کر دی۔اور بقیہ بھتیجے زاہد علی خان، شرافت علی خان، شاہد علی خان، کوثر علی خان کے نام کچھ نہیں کیا۔اور چندہ خان کے بیٹے خورشید احمد خان کے نام بھی کچھ نہیں کیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جن پانچ بھتیجوں کو کچھ بھی نہیں دیا گیا ہے، ان کو اس جائیداد میں سے کچھ ملتا ہے یا نہیں؟ وہ پانچ حسب ذیل ہیں:

حامد علی خان کے بیٹے زاہد علی ،شرافت علی خان، شاہد علی خان، کوثر علی خان، لیاقت علی خان عرف چندہ خان کے بیٹے خورشید احمد خان۔ یہ پانچوں اس بات کے دعویدار ہیں کہ جو کچھ بھی وصیت سے متعلق رحمت علی خان اور شاکر علی خان دعویٰ کرتے ہیں کہ سلیمان علی خان

نے نوشہ علی خان کو وصیت کرنے کی بات اسی طرح رحمت علی خان اور شاکر علی خان کے نام ہبہ کرنے کی بات اور شاہی مسجد کے نام وقف کرنے کی بات یہ سب فرضی کاغذات بنا کر فرضی دعویٰ ہے؛ اس لئے ان میں ہم لوگوں کا بھی مکمل طریقہ سے حصہ ہے اور فرضی کاغذات بنا کر فرضی دعویٰ پیش کرنا چاہتے ہیں ؛ لہٰذا شریعت اسلامیہ کا اس سلسلہ میں کیا حکم ہے؟ اس سے ہم کو آگاہ کر دیا جائے کہ جن لوگوں کو ملا ہے وہی اس کے حق دار ہیں، یا جن کو نہیں ملا ہے وہ بھی حق دار ہیں؟

المستفتی: رحمت علی خان محلّہ بھٹی، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: تمام کاغذات کا بار بار مطالعہ کیا گیا، آخر ہم شرعی طور پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ حکیم نوشہ علی خان کے دو مکانوں کے بارے میں جو دعویٰ کیا گیا ہے کہ انہوں نے ان دو مکانوں میں سے ایک مکان واقع محلّہ بھٹی حامد علی خان کے دولڑکے شاکر علی خان اور کوثر علی خان کو ہبہ کر کے قبضہ کرا دیا اور سول جج کے فیصلہ نامہ پر حکیم نوشہ علی خان نے اقراری دستخط کر دیئے۔ اور دوسرا مکان حامد علی خان کے لڑکے رحمت علی خان کے نام سول جج کے ذریعہ ہبہ کر دیا، ان دونوں مکانوں کے بارے میں کاغذات پر خوب غور وخوض کر کے دیکھا گیا، تو اس میں نوشہ علی خان کی طرف سے ہبہ کی صراحت ہم کو نہیں ملی اور سول جج کا فیصلہ جو ہمارے پاس موجود ہے، اس میں شاکر علی خان اور کوثر علی خان کے نام سے ہبہ یا عویٰ کچھ نہیں ثابت ہے؛ اس لئے شاکر علی خان اور کوثر علی خان کے نام سے جو ہبہ کرنے کی بات ہے وہ ہمارے سامنے ثابت نہیں ہوسکی اور رحمت علی خان کے نام سے جو فیصلہ کی بات ہے، اس کے متعلق سول جج کا فیصلہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ سوال نامہ میں دعویٰ کیا گیا کہ نوشہ علی خان کے اس پر اقراری دستخط ہیں، سول جج کے فیصلہ میں ہمیں نوشہ علی خان کا اقراری دستخط نہیں ملا اور محض سول جج کے فیصلہ کی وجہ سے ملکیت کا ثبوت نہیں ہوتا، جب تک کہ اصل مالک کی طرف سے شرعی ہبہ کا ثبوت نہ ہو جائے اور اصل مالک کی

طرف سے شرعی ہبہ کا ثبوت ہم کو حاصل نہ ہوسکا؛ لہٰذا رحمت علی خان کے نام سے جس مکان کے ہبہ کا دعویٰ ہے وہ بھی شرعی طور پر ہمارے سامنے ثابت نہیں ہوسکا اور سلیمان خان کے چاروں مکانوں کے متعلق جو سوال نامہ میں ذکر ہے کہ سلیمان خان نے نوشہ علی خان کو چاروں مکانوں کی وصیت کر دی تھی اور سلیمان خان لا ولد تھے، تو سلیمان خان کے چاروں مکانوں کے بارے میں حکم شرعی یہ ہے کہ حکیم نوشہ علی خان شرعی طور پر سلیمان خان کے وارث ہیں اور شریعت کے نزدیک وارث کے حق میں وصیت نافذ نہیں ہوتی ہے؛ اس لئے حکیم نوشہ علی خان وصیت کے ذریعہ سلیمان خان کے چاروں مکانوں میں سے کسی ایک مکان کا بھی مالک نہیں ہوا، پھر اس کے بعد نوشہ علی خان کا موصیٰ لہ بن کر مالکانہ تصرف بھی صحیح نہیں ہوا؛ لہٰذا بعد میں ان چاروں مکانوں میں سے ایک مکان واقع محلّہ کھوکران سرائے کشن لال اپنے بھتیجے رحمت علی خان وشاکر علی خان کو زبانی ہبہ کر دینا بھی درست نہ ہوا، پھر اس کے بعد نوشہ خان کے مشورہ سے دونوں موہوب لہ کا اس مکان کو مدرسہ شاہی کے نام وقف کر دینا بھی درست نہیں ہوا؛ لہٰذا مدرسہ شاہی پر اصل واقعہ معلوم ہونے کے بعد وہ مکان وارثین کو واپس کر دینا لازم ہے، اس میں سلیمان خان کے تمام وارثین کا حق متعلق ہے، جو بھی اس کے وارث بن سکتے ہوں۔ اور سلیمان خان کے باقی تین مکانات واقع محلّہ بھٹی نوشہ علی خان کا ان مکانوں کا موصی لہ بن کر اپنے بھتیجے رحمت علی اور شاکر علی کے نام وصیت کر دینا بھی درست نہیں ہے، نیز نوشہ علی خان کو وراثت کے ذریعہ سے سلیمان خان کے مکانات میں سے جو کچھ بھی مل سکتا تھا، اس کی بھی دو بھتیجوں کے نام وصیت کر دینا اور باقی پانچ بھتیجوں کو اپنی وراثت سے محروم کر دینا درست نہیں ہوا؛ اس لئے تمام بھتیجے نوشہ علی خان کے وارث ہیں۔ اور بعض وارث کے حق میں شریعت میں وصیت درست نہیں ہے؛ اس لئے سلیمان خان کے چاروں مکانات اس کے شرعی وارثین کی وراثت میں منتقل ہوجائیں گے اور وصیت باطل ہوجائے گی، اسی طرح نوشہ علی خان کی وصیت بھی شرعی طور پر باطل ہوگی اور اس کی ملکیت کی چیزیں بھی اس کے تمام شرعی وارثین کے حق میں منتقل

ہوجائیں گی؛ لہٰذا مذکورہ مکانات کے مالک صرف رحمت علی خان وشاکر علی خان نہیں ہوسکتے؛ بلکہ ساتوں بھتیجے، رحمت علی خان، شاکر علی خان، شرافت علی خان، کوثر علی خان، شاہد علی خان، لیاقت علی خان، خورشید احمد خان، حقیقی بھائی کے زندہ نہ ہونے کی صورت میں سب برابر کے شریک ہوں گے اور یہ سب متفق ہوکر بلا کسی اختلاف کے بعد میں مدرسہ شاہی کے لئے کچھ وقف کرنا چاہیں تو وہ ان کے اختیار میں ہے۔ اوران پر کوئی زور اور دباؤ نہیں ہوسکتا۔

عن النضر بن أنس قال: نحلني أنس نصف داره، قال: فقال أبو بردة: إن سرک يجوز ذلک فاقبضه، فإن عمر بن الخطاب –رضي الله عنه– قضى في الأنحال أن ما قبض منه، فهو جائز، وما لم يقبض، فهو ميراث، قال: فدعوت يزيد الرشک، فقسمها. (السنن الكبرى للبيهقي، الهبات، باب ماجاء في هبة المشاع، دارالفكر ۹/ ۱۵۸، رقم: ۱۲۱۸٦)

عن أبي أمامة الباهلي –رضي الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول في خطبته عام حجة الوداع: إن الله تبارک وتعالىٰ قد أعطى كل ذي حق حقه، فلا وصية لوارث. (سنن الترمذي، باب ماجاء لا وصية لوارث، النسخة الهندية ۲/ ۳۲، دارالسلام، رقم: ۲۱۲۰، سنن ابي داؤد، باب في الوصية للوارث، النسخة الهندية ۲/ ۳۹٦، دارالسلام، رقم: ۲۸۷۰، سنن الدارمي، دارالمغني للنشر والتوزيع ٤/ ٦۳، رقم: ۳۳۰۳)

والقبض لا بد منه لثبوت الملک. (هداية، كتاب الهبة، اشرفي ۳/ ۲۸۳)

ولا تجوز لوارثه لقوله عليه السلام: إن الله أعطى كل ذي حق حقه، ألا لاوصية للوارث؛ ولأنه يتأذى البعض بإيثار البعض، ففي تجويزه قطيعة الرحم، ولأنه حيف بالحديث الذي رويناه. (هداية، كتاب الوصية، أشرفي ٤/ ٦۵۷)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/۷/۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۴۷۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/رجب ۱۴۲۵ھ

شرعی گواہوں کی شہادت یا ثبوت کے بغیر ہبہ کے دعویٰ کا اعتبار نہیں

سوال [۹۴۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مرحوم حاجی محمد جان صاحب کا انتقال ہوگیا اور انہوں نے اپنے وارثین میں چھ لڑکیاں اور چار پوتے چھوڑے اور ملکیت چھوڑی، کچھ بمبئی میں اور کچھ اپنے وطن میں اور بمبئی کی ملکیت کی تفصیل یہ ہے کہ بمبئی میں پگڑی کا ایک مکان ایک گاڑی اور ایک دوکان میں حصہ تھا، مرحوم کا ایک لڑکا محمد عمر نامی تھا، جس کا انتقال اپنے والد صاحب سے قبل ہوگیا تھا، محمد عمر کے چار لڑکے تھے، اب محمد عمر کی بیوی حمیدہ کا کہنا ہے کہ جان محمد بھائی نے اپنے لڑکے محمد عمر کو بمبئی کی تینوں ملکیتیں بخشش کردی تھیں۔ اور پگڑی کے مکان کی کرایہ داری اپنے لڑکے کے نام منتقل کردی تھی اور کرایہ کی رسید بھی لڑکے کے نام پر ہی آئی تھی اور کرایہ بھی لڑکا ہی ادا کرتا تھا اور قبضہ بھی دے دیا تھا، یعنی لڑکا ہی گاڑی دومکان اور مکان میں مالکانہ تصرف کرتا تھا اور حاجی جان محمد اپنے وطن تینی واڑہ چلے آئے تھے، ہبہ کے تقریباً چار سال بعد جان محمد بھائی کا لڑکا محمد عمر کا انتقال ہوگیا، لڑکے کے انتقال کے بعد مذکورہ تینوں ملکیتیں مرحوم کی بیوی بچوں کے تصرف میں رہیں، اس کے بعد حاجی جان محمد صاحب کا بھی انتقال ہوگیا، ان کے انتقال کے بعد بھی تقریباً ۱۹؍سال تک مذکورہ تینوں ملکیتیں محمد عمر کی بیوی بچوں کے تصرف میں رہیں۔ اب ۱۹؍سال کے بعد مرحوم حاجی جان محمد صاحب کی چھ لڑکیاں اپنے والد صاحب کی ملکیت میں حق وراثت مانگ رہی ہیں۔ اور ان کا کہنا ہے کہ ہمارے والد نے ان کی کوئی ملکیت ہمارے بھائی کو بخشش نہیں کی ہے۔ خلاصہ یہ کہ وہ ہبہ کی منکر ہیں؛ اس لئے والد صاحب کی تمام ملکیت میں ہمارا حق وراثت لگنا چاہئے اور ۱۹؍سال تک حق وراثت کا مطالبہ نہ کرنے کی وجہ یہ بتلاتی ہیں کہ چونکہ ہمارے بھتیجے بہت چھوٹے تھے؛ اس لئے ہم نے حق وراثت مانگنا مناسب نہ سمجھا اور ہم اس پر مطمئن تھے کہ جب وہ بڑے ہوجائیں گے تو وہ خود ہی اپنی فکر سے دے دیں گے، مگر انہوں نے ہم کو کسی طرح کا حق نہیں دیا، صرف سات سات

ہزار بغیر حساب کے اندازے سے دے دئے؛ اس لئے ہمارا حق وراثت باقی ہے، مذکورہ تفصیل کے پیش نظر چند امور دریافت طلب ہیں:

(۱) صورت مسئولہ میں مدعی کون ہے اور مدعی علیہ کون؟ جب کہ محمد عمر کی بیوی اور بچے جان محمد صاحب کی ملکیت میں ہبہ کے دعویدار ہیں اور لڑکیاں ہبہ کی منکر ہیں؟

(۲) جان محمد صاحب کی لڑکیاں وراثت میں مطالبہ کررہی ہیں، یہ صحیح ہے یا نہیں؟

(۳) لڑکیوں نے جو سات سات ہزار روپے لئے ہیں وہ بغیر حساب وکتاب کے اندازے سے لئے ہیں اور اس میں بھی ان کی رضامندی نہیں تھی، تو اس کو مصالحت قرار دیا جا سکتا ہے؟

المستفتی: ابوبکر بھائی پٹیل

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرحوم حاجی جان محمد صاحب کی ملکیت جوان کے لڑکے کی تحویل میں تھی اور لڑکا اس پر تصرف کررہا تھا، تو محض تصرف کرنے سے اس کی ملکیت نہیں سمجھی جائے گی اور حمیدہ (بیوی) کا یہ دعویٰ کرنا کہ جان محمد نے اپنے لڑکے محمد عمر کو بمبئی کی تینوں ملکیتیں ہبہ کردی تھیں تو اس کے لئے شرعی گواہوں کی شہادت یا اس کے ثبوت میں رجسٹری شدہ سرکاری طور پر پکا کاغذ ہونا لازم ہے، محض کسی کے نام پر کرایہ داری کو منتقل کردینے سے اس کی ملکیت نہیں ہوتی، اب جب کہ محمد عمر کے انتقال کے بعد حاجی جان محمد صاحب کا بھی انتقال ہوگیا ہے، تو حاجی جان محمد صاحب کی ساری جائیداد منقولہ وغیر منقولہ اس کے تمام وارثین کے درمیان شرعی طور پر تقسیم ہوگی۔ اور وراثت میں حاجی جان محمد کی تمام لڑکیوں کو مکمل حصہ ملے گا۔ اور لڑکیوں کو جو سات سات ہزار روپے دئے گئے ہیں، جب کہ لڑکیاں اس مصالحت پر راضی نہیں ہیں، تو اس کو مصالحت قرار نہیں دیا جائے گا؛ بلکہ اس کو ان کے حق وراثت میں مجریٰ کردیا جائے گا۔

عن النضر بن أنس قال: نحلني أبي نصف داره، فقال أبو بردة: إن سرک أن تجوز ذلک فاقبضه، فإن عمر بن الخطاب –رضي الله عنه–

قضى في الأنحال ما قبض منه فهو جائز، وما لم يقبض منه فهو ميراث. (المصنف لابن أبي شيبة، البيوع والأقضية من قال: لا تجوز الهبة إلا مقبوضة، موسسة علوم القرآن، جديد ۱۰/ ۵۲۱، رقم: ۲۰۵۰۲)

عن عبدالرحمن بن عبدالقاري قال: قال عمر –رضي الله عنه– ما بال رجال ينحلون أولادهم نحلا، فإذا مات أحدهم قال: مالي وفي يدي، وإذا مات هو قال: قد كنت نحلته ولدي، لا نحلة إلا نحلة يحوزها الولد، أو الوالد. (المصنف لابن أبي شيبة، البيوع، من قال: لا تجوز الصدقة حتى تقبض، موسسة علوم القرآن ۱۰/ ۵۲۰، رقم: ۲۰۴۹۵)

وتتم الهبة بالقبض الكامل، ولو الموهوب شاغلا لملك الواهب لا مشغولا به، والأصل أن الموهوب إن مشغولا بملك الواهب منع تمامها.
(درمختار مع الشامي، كتاب الهبة، زكريا ۸/ ۴۹۳، كراچى ۵/ ۶۹۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۱۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۶/۲۸ھ

جائیداد تقسیم ہونے سے قبل ہبہ کرنے کا شرعی حکم

سوال [۹۴۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ذکی الدین مرحوم کا انتقال ہوا، بوقت انتقال ان کے ورثاء میں صرف ایک بھائی تقی الدین تھے، پھر تقی الدین کا انتقال ہوا، انہوں نے اپنے ورثاء میں تین لڑکے محمد آصف، محمد خالد، محمد عثمان اور تین بیٹیاں نشاط پروین، نسرین فاطمہ، زرین فاطمہ اور بیوی تہذیب فاطمہ کو چھوڑا، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ ذکی الدین کا ترکہ مذکورہ وارثین میں شرعاً کس طرح تقسیم ہوگا، اور کس کو کتنے سہام ملیں گے؟ نیز واضح رہے کہ ذکی الدین

جو لا ولد فوت ہوگئے، انہوں نے اپنا حصہ اپنے بھتیجے محمد خالد کو ہبہ کردیا تھا، جب کہ جائیداد تقسیم نہیں ہوئی تھی، تو شرعاً یہ ہبہ کیسا ہے؟

المستفتی: محمد آصف محلّہ تمبا کو والان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ اور ہبہ نامہ دونوں پر غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ مرحوم ذکی الدین نے اپنا حصہ جو اپنے بھتیجے محمد خالد کو ہبہ کیا ہے، وہ مکان کے تقسیم ہونے سے پہلے ہبہ کیا ہے؛ لہٰذا جب انہوں نے تقسیم کرکے اپنا حصہ الگ کئے بغیر ہبہ کردیا ہے، تو ایسا ہبہ شرعاً معتبر نہیں؛ اس لئے کہ ہبہ کی تکمیل کے لئے قبضہ شرط ہے اور یہاں مال موہوب تقسیم شدہ نہ ہونے کی وجہ سے قبضہ کے قابل نہیں ہے؛ اس لئے یہ ہبہ درست نہیں ہوا۔

ومنها: أن يكون الموهوب مقبوضا حتى لا يثبت الملك للموهوب له قبل القبض، وأن يكون الموهوب مقسوما إذا كان مما يحتمل القسمة، وأن يكون الموهوب متميزا عن غير الموهوب، ولا يكون متصلا ولا مشغولا بغير الموهوب. (عالمگيري، كتاب الهبة، الباب الأول، زكريا قديم ٤/ ٣٧٤، جديد ٤/ ٣٩٥، شامي، زكريا ٨/ ٤٨٩، كراچى ٥/ ٦٨٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٠/ ٢٢٥، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩١، مصري قديم ٢/ ٢٥٣)

لہٰذا مرحوم ذکی الدین کی جائیداد ان کے شرعی وارثین کے درمیان درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگی:

ذکی الدین میـــــــــــــــت

بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی
تہذیب فاطمہ	محمد آصف	محمد خالد	محمد عثمان	نشاط پروین	نسرین فاطمہ	زرین فاطمہ
۱			۷			
۹	۱۴	۱۴	۱۴	۷	۷	۷

مرحوم ذکی الدین کا ترکہ ۲۷ر سہام میں تقسیم ہو کر ہر وارث کو اتنا ملے گا جو اس کے نام کے نیچے درج ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵ر شعبان ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۶۸۹)

والد کا اپنے کچھ لڑکوں کے نام سے زمین خریدنا

سوال [۹۴۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے چار لڑکے ہیں، ایک لڑکا تین سال قبل کچھ رقم لے کر چلا گیا تھا، تین لڑکے ماں باپ کے ساتھ رہے اور کاروبار وغیرہ میں دلجمعی سے لگے رہے، جس کی وجہ سے تجارت میں ترقی ہوتی گئی، اب وہ لڑکا واپس آ گیا؛ لیکن تجارت یا گھریلو ذمہ داریوں کو قبول نہ کر کے مستقل نافرمانی اور باعث تکلیف ماں باپ ہے، اب اگر زید کوئی جائیداد خریدنا چاہتا ہے تو کیا (۱) تینوں لڑکوں کے نام خریدے؛ کیوں کہ ان کی محنت سے کاروبار میں ترقی ہوگی، اس میں کسی کی حق تلفی تو نہیں ہے؟

(۲) اگر چاروں لڑکوں کے نام خریدی جائے تو اس میں کوئی غیر انصافی کی بات تو نہیں؟ یا تینوں لڑکوں کی محنت اور حق کاٹ کر تو نہیں دیا گیا؟

(۳) اگر زید اپنی زندگی میں کسی کو جتنا چاہے دے دے وصیت کر جائے تو اس کا اختیار اس کو حاصل ہے؟

المستفتی: ابوعثمان کانپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: زید کو اختیار ہے چاہے نافرمان لڑکا سمیت چاروں لڑکوں کے نام خریدے یا اس کو چھوڑ کر بقیہ تین لڑکوں کے نام خرید کر مالک بنا دے، شرعاً زید پر کوئی

چیز نہیں، جب کہ نافرمان کو محروم کردے۔ اور اگر دے دے تو دوسروں پر ظلم بھی نہیں ہے۔
(مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۵/۶۴، جدید ڈابھیل ۱۶/۴۹۹)

وفي الخانية: ولا بأس بتفضيل بعض الأولاد في المحبة؛ لأنه عمل القلب، وكذا في العطايا إن لم يقصد به الإضرار. (الدرالمختار، كتاب الهبة، كوئٹه ٤/ ٥٧٣، كراچی ٥/ ٦٩٦، زكريا ٨/ ٥٠١-٥٠٢، هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦، خانية جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية زكريا ٣/ ٢٧٩)

وإن كان له ولد فاسق لا يعطيه، وينبغي أن لا يعطيه من قوته كي لا يصير معينا له على المعصية. (تاتارخانية، زكريا ١٤/ ٤٦٢، رقم: ٢١٧٢٥)

ولو كان ولده فاسقا، فأراد أن يصرف ماله إلى وجوه الخير ويحرمه عن الميراث، هذا خير له من تركة. (هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦، البحرالرائق، كوئٹه ٧/ ٢٨٨، زكريا ٧/ ٤٩٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶ر شوال ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۹۱۹)

”ایف ڈی“ میں نام کرانے سے ہبہ کا ثبوت

سوال [۹۴۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) امام الدین کا انتقال ہوگیا، ان کے ورثاء میں ایک بیوی نور فاطمہ ایک لڑکا سراج الدین اور پہلی بیوی مرحومہ کے بطن سے ایک لڑکا علاء الدین، ایک لڑکی شاہدہ ہے، ترکہ میں تین لاکھ اکتالیس ہزار روپئے ہیں، جو والد نے اپنے نام ایف ڈی کرا رکھی ہے۔

(۲) میرے والد امام الدین نے دوسری ایف ڈی ایک لاکھ اکہتر ہزار-/1,71,000 روپئے کی کی، جس میں اپنا نام اور والدہ کا نام بھی ہے، مشترکہ ایف ڈی کرائی تھی۔

(۳) ایک تیسری ایف ڈی اس طرح کرائی تھی کہ صرف والدہ یعنی اپنی بیوی ہی کے نام کی تھی، جس میں ایک لاکھ انہتر ہزار-/1,69,000 روپئے ہیں۔ اور مذکورہ بالا تمام رقمیں والد صاحب ہی نے جمع کی تھیں؛ البتہ والد (اپنی دوسری بیوی) کا نام ڈلواتے تھے، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ ایف ڈی میں نام لکھوانے سے ملکیت وہبہ ثابت ہوگا یانہیں؟ یا تمام ایف ڈی شدہ اپنے نام مشترکہ (شوہر وبیوی) یا صرف بیوی کے نام والی سب شوہر کی ملکیت ہوگی؟ یا جس میں بیوی کا نام ہے اس میں بیوی کا حصہ ہوگا؟ شرعی حکم تحریر فرمادیں۔

المستفتی: سراج الدین درگاہ نئی آبادی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: برتقدیر صحت سوال وعدم موانع ارث وبعد ادائے حقوق ماتقدم مرحوم امام الدین کا ترکہ ان کے ورثاء کے درمیان درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

میـــــــــــــــــــــــــــــــــــــــت

	بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکی
	نورفاطمہ	سراج الدین	علاء الدین	شاہدہ
	ا		۷	
سہام	۵	۱۴	۱۴	۷
ترکہ	۵۳۳۱۲	۱۴۹۲۷۵	۱۴۹۲۷۵	۷۴۶۳۷

مرحوم کا کل ترکہ ۴۰؍ برابر سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا اتنا ملے گا جو اس کے نام کے نیچے ترکہ کے سامنے درج ہے، نیز دوسری بیوی کی اولاد کے ہوتے ہوئے اس بیوی کے نام ایف ڈی کرانا گویا اس کو اپنے حصہ کا مالک بنانا ہے؛ لہٰذا بیوی کے نام کا حصہ اسی بیوی کی ملکیت ہوگی۔ اور شوہر وبیوی دونوں کے درمیان مشترکہ ایف ڈی دونوں کی ملکیت ہے؛ لہٰذا شوہر کا آدھا حصہ اس کے ترکہ میں شامل ہوکر حسب حصص شرعیہ تقسیم ہوگا اور بیوی کا حصہ اس کی ملکیت ہے، اس میں کسی کو تصرف کا حق نہ ہوگا، نیز واضح رہے کہ ایف ڈی پر جو زائد رقم ملتی

ہے وہ سود ہے،وہ بلانیت ثواب غریبوں کودے دینالازم ہے۔

وتتم الهبة بالقبض الكامل. (شامي، كتاب الهبة، كراچی ٥/ ٦٩٠، زكريا ٨/ ٤٩٣)

ولا يتم حكم الهبة إلا مقبوضة ويستوى فيه الأجنبي والولد إذا كان بالغا. (هندية، جديد زكريا ٤/ ٣٩٩،قديم زكريا ٤/ ٣٧٧، هداية، أشرفي ديوبند ٣/ ٢٨٣)

الربا يقتضى أخذ مال الإنسان من غير عوض. (تفسير رازي، تحت تفسير الآية: ٢٧٥، من سورة البقرة ٧/ ٩٣)

لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه. (الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/ ٢٤٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیراحمد قاسمی عفااللہ عنہ
۲۷؍محرم الحرام۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر:۳۸/ ۹۸۶۹)

الجواب صحیح:
احقرمحمدسلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹؍۱؍۱۴۳۱ھ

موہو بہ مکان پر قبضہ کیا لیکن رجسٹری نہیں ہوئی

سوال [۹۴۲۴]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: نذیراحمد نے اپنی بہن کلثوم بانوکوان کے احسان کے بدلہ میں تیس گز زمین ہبہ کی اوراس زمین پرکلثوم بانو کا مالکانہ قبضہ کرادیا،جس کے بعدکلثوم بانو نے اس زمین پراپنی دوسری زمین ملاکرمکان تعمیرکرلیااورنذیراحمد نے ہاؤس ٹیکس کی رسیدبھی کلثوم بانو کے نام سے جاری کرادی؛ لیکن ابھی رجسٹری نہیں ہوئی تھی کہ نذیراحمدکاانتقال ہوگیا،تواب دریافت طلب امریہ ہے کہ یہ ہبہ شرعاً صحیح ہوایانہیں؟اورکلثوم بانواس مکان کی مالک بنی یانہیں؟ جب کہ محلّہ والوں کاکہنا ہے کہ نہ یہ ہبہ صحیح ہے اورنہ ہی کلثوم بانو مکان کی مالک بنی ہیں؛ بلکہ یہ مکان مرحوم کے ورثاءکاحق ہے،قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کاصحیح جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی:سلطان خان محلّہ گلاب کاباغ،مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نذیر احمد نے جب بحالت صحت تیس گز زمین کلثوم بانو کو ہبہ کر کے مالکانہ قبضہ دے دیا ہے اور کلثوم نے اس پر مکان بھی تعمیر کر لیا ہے، تو ہبہ شرعاً صحیح ہو چکا ہے۔ اور ہبہ کے صحیح ہونے کے لئے شرعاً رجسٹری شرط نہیں ہے؛ لہٰذا نذیر احمد کے انتقال کے بعد اس کے ورثاء کا اس میں حق کا دعویٰ کرنا جائز نہیں ہوگا اور نہ ہی محلّہ والوں کا یہ کہنا صحیح ہے کہ ہبہ صحیح نہیں ہوا ہے۔

عن أبي حميد الساعدي، أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل لمسلم أن يأخذ مال أخيه بغير حق. (مجمع الزوائد، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٧١)

صحة الهبة بالإيجاب والقبول في حق الموهوب له؛ لأنه عقد فينعقد بهما كسائر العقود. (البحرالرائق، كتاب الهبة، كوئٹه ٧/ ٢٨٥، زكريا ٧/ ٤٨٥، هداية، أشرفي ديوبند ٣/ ٢٨٣، درمختار كراچی ٥/ ٦٩٠، زكريا ٨/ ٤٩٢)

وتتم الهبة بالقبض الكامل. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، جديد دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩١، قديم ٢/ ٣٥٣، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٥/ ٩١، زكريا ديوبند ٦/ ٤٩، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ٢/ ٩، دارالكتاب ديوبند ٢/ ١٠، هندية زكريا ٤/ ٣٧٧، جديد ٤/ ٣٩٩، درمختار كراچی ٥/ ٦٩٠، زكريا ٨/ ٤٩٣) **فقط واللّٰہ** سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍ رجب ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/۱۳۳۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱؍ رجب المرجب ۱۴۰۹ھ

ہبہ صحیح ہونے کے لئے رجسٹری کی شرعی حیثیت

سوال [۹۴۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: ایک شخص بدرالدین نامی قصبہ بھگوان پور کا تھا، تجارت اس کا پیشہ تھا، اس کے منافع سے اس نے بتیس بیگہ زمین خریدی، جس کے دو پلاٹ تھے، ایک اٹھائیس بیگہ کا اور دوسرا چار بیگہ کا یہ زمین اس کی زرخرید تھی، دادالٰہی نہیں ہے، بدرالدین کا ایک لڑکا تھا شمس الدین بدرالدین کی بیوی کا انتقال ہوگیا تھا، پھر دوسری شادی کرلی اس سے دو لڑکے ہوئے ایک جمیل احمد اور ایک عبدالرشید، ان میں سے جمیل تو پاکستان چلا گیا، اب یہاں عبدالرشید رہ گیا، بدرالدین نے اپنی ہی زندگی میں کل جائیداد عبدالرشید کے نام بیع کردی، شمس الدین کو کچھ نہیں دیا، یہ بات اب سے چالیس سال پہلے کی ہے، بدرالدین کے انتقال کے بعد شمس الدین نے کہا کہ زمین میں کچھ حق ہم رکھتے ہوں گے، اب چونکہ بیع نامہ رشید احمد کے نام ہے، کچھ برادری اور کنبہ کے لوگ اکٹھا ہوئے اور انہوں نے رشید احمد سے کہا کہ ان کو کچھ دے دو، ان کے کہنے کے مطابق چار بیگہ دے دی؛ لیکن بیع نامہ نہیں کیا اور نہ ہی کاغذات پٹواری میں درج کرایا گیا، یہ بات اب سے پندرہ سولہ سال پہلے کی ہے۔ شمس الدین میں اور عبدالرشید میں کسی کے کہنے سننے سے کشیدگی ہوگئی ہے، عبدالرشید نے جو زمین چار بیگہ دی تھی ان سے قبضہ غاصبانہ چھڑا کر یہ زمین خیل پور نصر اللہ پور کی مسجد کو وقف بیع کردی، اب خیل پور نصر اللہ پور کی مسجد کے لوگ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ یہ زمین مسجد میں لینا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) اگر کوئی کاشتکار اپنی زمین کسی کاشتکار کو محض زبانی طریقہ پر دے جس کا کوئی تحریری معاہدہ نہ ہو اور کاغذات سرکاری میں اس کاشتکار کے قبضہ کا کوئی ذکر نہ ہو، تو سرکار اس قبضہ کو غاصبانہ مانتی ہے اور وہ ہر وقت بے دخلی کے قابل ہے۔

المستفتی: حافظ اسرار ہریدوار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب عبدالرشید نے لوگوں کی موجودگی میں زبانی ہبہ کرکے شمس الدین کو قبضہ دے دیا ہے، تو اگرچہ بیع نامہ رجسٹری وغیرہ نہیں ہوا وہ زمین شرعی طور پر شمس الدین کی ملکیت میں داخل ہو چکی ہے، اب شمس الدین کی مرضی کے بغیر وہ زمین

مسجد کی ملکیت نہیں بن سکتی، مسجد والوں کو چاہئے کہ وہ زمین شمس الدین کو واپس کردیں یا قیمت دے دیں؛ کیوں کہ شریعت میں زبانی ہبہ بھی معتبر ہوجاتا ہے۔

وَمَا اُوتِيتُم مِنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَابْقٰى اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ. [القصص: ٦٠]

الهبة عقد مشروع، وتصح بالإيجاب والقبول والقبض. (هداية، كتاب الهبة، اشرفيه ٣/ ٢٨٣، مختصر القدوري، ص: ١٣٥، هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٧٤، جديد ٤/ ٣٩٥، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩٧، مصري قديم ٢/ ٢٥٣)

لہٰذا ہبہ صحیح ہونے کے لئے سرکاری کاغذات شرط اور لازم نہیں ہیں۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۴۲۱۰)

رجسٹری کے طور پر مکان ہبہ کرنا

سوال [۹۴۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے والد محترم کا چند دن بیشتر انتقال ہوگیا، انہوں نے اپنی زندگی میں ایک مکان اپنی لڑکی کے نام رجسٹرڈ کردیا اور زبانی اقرار کیا تھا کہ یہ تیرا مکان ہے اور میں تجھے ہبہ کرتا ہوں، دراں حالانکہ یہ مکان ابھی تیار شدہ نیا ہے، مزید انہوں نے ایک مرتبہ یہ کہا کہ میں چونکہ فی الحال ایک کرایہ کے مکان میں ساکن ہوں، اب میں تیرے اس نئے مکان میں رہوں گا اور اس کا کرایہ تجھے دے دوں گا، اب جواب طلب امر یہ ہے کہ مذکورہ مکان اس لڑکی کا ہے یا وارثین میں تقسیم ہوگا؟

المستفتی: حبیب اللہ بنگلور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: والد کا نئے مکان کو لڑکی کے نام رجسٹری کرکے ہبہ کردینا اور یہ کہنا کہ یہ مکان تیرا ہے اور فی الحال کرائے کے مکان میں ساکن ہوں اور تیرے مکان میں

تجھے کرایہ دے کر رہوں گا، یہ سب باتیں ہبہ کے تام ہونے کی دلیل ہیں اور غیر منقول اشیاء میں ہبہ تام ہونے اور قبضہ شمار کئے جانے کے لئے اتنا کافی ہے کہ باپ بیٹی کو ہبہ کردہ مکان میں کرایہ دے کر رہے، نیز سرکاری رجسٹری سے بھی آج کے زمانے میں قبضہ شمار ہوتا ہے؛ لہٰذا باپ کے انتقال کے بعد مذکورہ مکان دیگر وارثین کے درمیان میراث کی حیثیت سے تقسیم نہ ہوگا؛ بلکہ اس پورے مکان کی مالک وہی لڑکی ہے جس کے نام رجسٹری کی گئی ہے۔

عن النضر بن أنس قال: نحلني أبي نصف داره، فقال أبو بردة: إن سرك أن تجوز ذلك فاقبضه، فإن عمر بن الخطاب –رضي الله عنه– قضى في الأنحال ما قبض منه فهو جائز، وما لم يقبض منه فهو ميراث. (المصنف لابن أبي شيبة، البيوع والأقضية من قال: لا تجوز الهبة إلا مقبوضة، موسسة علوم القرآن، جديد ١٠/ ٥٢١، رقم: ٢٠٥٠٢)

والقبض الكامل في المنقول ما يناسبه، وفي العقار ما يناسبه. (شرح المجلة رستم، مكتبه إتحاد ١/ ٤٦٣، رقم المادة: ٨٣٧)

وتفسير التسليم والقبض، فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية، والتخلي وهو أن يخلي البائع بين المبيع والمشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه، فيجعل البائع مسلما، والمشتري قابضا له. (بدائع الصنائع، كتاب البيوع، تفسير التسليم والقبض، زكريا ٤/ ٤٩٨، كراچی ٥/ ٢٤٤)

والمراد بالقبض الكامل في المنقول ما هو المناسب، وفي العقار أيضا ما يناسبه. (مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩٢، مصري قديم ٢/ ٣٥٤، اللباب ٢/ ١٧١، لسان الحكام ١/ ٣٦٩، دررالحكام شرح غرر الحكام ٢/ ٢١٨)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ربیع الاول ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۴۹۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۳/۴ھ

کسی کے نام جائیداد رجسٹری کرانے سے ہبہ کا ثبوت

سوال [۹۴۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمد ارشد ایک عالم دین ہے، ارشد کے دادا کی بہن نے اپنی کچھ جائیداد اپنی حیات میں ارشد کے نام کردی تھی اور ارشد کے پاس اس کا بیع نامہ موجود ہے، ارشد کی دادی نے ان کو وہ جائیداد اس نیت سے دی تھی کہ وہ اس میں مدرسہ قائم کرکے صدقہ جاریہ کا سلسلہ شروع کرے گا، ارشد کے دادا کی بہن کے وارثین میں صرف ان کے تین بھتیجے موجود ہیں اور کوئی نہیں ہے، نہ تو ان کا شوہر ہے اور نہ کوئی اولاد ہے، دادی کے بڑے بھتیجے ارشد کے گھر والوں سے کہہ رہے ہیں کہ مذکورہ جائیداد ہماری ہے، اس میں مدرسہ قائم نہیں کیا جاسکتا، تو مفتی صاحب سے دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس جائیداد میں دادی کے انتقال کے بعد ان کے بڑے بھتیجے کا اپنے لئے اس جائیداد میں دعویٰ کرنا درست ہے؟ جب کہ دادی نے وہ جائیداد ارشد کے نام اپنی حیات میں بخوشی کردی تھی، اب ارشد ان کی منشا کے مطابق مدرسہ قائم کرنا چاہتا ہے، اس بارے میں جو بھی حکم شرعی ہو بیان فرما کر عنداللہ ماجور ہوں؟

المستفتی: محمد ارشد، ساکن ذاکر کالونی ہاپوڑ روڈ میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں صاف طور پر وضاحت ہے کہ ارشد کے نام بیع نامہ کرکے رجسٹری کردی ہے، تو ایسی صورت میں ارشد اس کا مالک ہوچکا ہے، اب اس میں اور کسی کا کوئی دخل نہیں ہوسکتا۔

كل يتصرف في ملكه كيف شاء. (شرح المجلة رستم باز، إتحاد ديوبند ١/ ٦٥٤، رقم المادة: ١١٩٢)

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء. (بيضاوي شريف، كتب خانه رشيديه دهلی ١/ ٧)

لأن الملک ما من شأنه أن یتصرف فیه بوصف الاختصاص. (شامي، کتاب البیوع، مطلب في تعریف المال والملك والمتقوم، کراچی ۵/ ۵۰۲، زکریا ۷/ ۱۰)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ رجب ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۶؍ ۷؍ ۱۴۳۴ھ

کسی کے نام رجسٹری کرانے سے کیا وہ مالک ہو جائے گا؟

سوال [۹۴۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے اپنی زندگی میں ایک لڑکی کے نام زمین کا ایک حصہ رجسٹرڈ کر دیا ہے، اس کے بعد زید کا انتقال ہو گیا، اب سوال یہ ہے کہ آیا زمین کے اس حصے کو بھی تقسیم ترکہ میں شامل کیا جائے گا یا نہیں؟ بکر کہتا ہے کہ چونکہ زید نے لڑکی کے قبضہ میں نہیں دیا ہے؛ اس لئے وہ اس کی ملکیت نہیں ہوئی؛ لہٰذا اس زمین کے حصے کو بھی ترکہ میں شامل کیا جائے گا، بکر کا یہ کہنا کہاں تک درست ہے؟

المستفتی: سعید احمد قریشی، بنگلور کرناٹک

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب زید نے اپنی زندگی میں ایک لڑکی کے نام زمین کا ایک حصہ رجسٹری کر کے مالک بنا دیا ہے، تو وہ لڑکی اس حصہ کی مالک بن گئی اور زمین جائیداد میں سرکاری رجسٹری کر کے اس کے کاغذات پر قبضہ دے دینا زمین پر قبضہ کے درجہ میں ہے؛ لہٰذا زید کے مرنے کے بعد زمین کا جو حصہ لڑکی کے نام رجسٹری کر دیا گیا ہے میراث میں شامل نہیں ہوگا؛ بلکہ اس حصہ کی مالک وہی لڑکی ہے اور اس حصہ کو چھوڑ کر دیگر ترکہ وارثین کے درمیان تقسیم ہوگا۔

عن النضر بن أنس قال: نحلني أنس نصف داره، قال: فقال أبو بردة: إن سرک يجوز ذلک فاقبضه، فإن عمر بن الخطاب -رضي الله عنه- قضى في الأنحال أن ما قبض منه، فهو جائز، وما لم يقبض، فهو ميراث، قال: فدعوت يزيد الرشک، فقسمها. (السنن الكبرى للبيهقي، الهبات، باب ماجاء في هبة المشاع، دارالفكر ۹/ ۱۵۸، رقم: ۱۲۱۸٦)

والقبض الكامل في المنقول ما يناسبه، وفي العقار ما يناسبه. (شرح المجلة رستم، مكتبه إتحاد ۱/ ٤٦۳، رقم المادة: ۸۳۷)

وتفسير التسليم والقبض، فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية، والتخلي وهو أن يخلي البائع بين المبيع والمشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه. (بدائع الصنائع، كتاب البيوع، تفسير التسليم والقبض، زكريا ٤/ ٤۹۸، كراچی ٥/ ٢٤٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ربیع الاول ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۴۹۵/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۳/۴ھ

کیا نام کرنے کے بعد رجسٹری بیع نامہ کرانے سے ہبہ تام ہوجاتا ہے؟

سوال [۹۴۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) عبد الغنی کا انتقال ہوگیا وارثین میں بیوی دو بیٹے، بیوی انوری بیگم بیٹے عبید الغنی، انور حسین، مال متروکہ دو مکان، مکان نمبر ۱، ۳۵؍ لاکھ روپئے کا، یہ بیع نامہ ہے بیوی اور بڑے بیٹے کے نام۔ مکان نمبر ۲، ۵۲؍ لاکھ روپئے کا، یہ بیع نامہ خود مرحوم عبد الغنی کے نام ہے اور چھوٹے بیٹے کے نام بیع نامہ کچھ بھی نہیں اور دونوں مکان کا مالک عبید الغنی ہے۔

(۲) عبید الغنی کا انتقال ہوگیا، اس کے وارثین میں بیوی، والدہ، بھائی انور حسین گود لی ہوئی بیٹی تبسم ناز، مال متروکہ بارہ لاکھ روپئے، ان دونوں ترکوں کو تقسیم شرع کے مطابق فرمادیں۔

المستفتی: انور حسین پیشکار محلّہ نواب گلی دھوبیان کاس گنج، کاشی رام نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرحوم عبدالغنی نے بیوی اور بڑے بیٹے کے نام پینتیس لاکھ روپئے کا جومکان بیع نامہ رجسٹری کرر کھا ہے وہ اگر دونوں کے نام برابر برابر کردیا تھا اور ان کو مالک بنانے کے لئے کیا تھا، تو وہ دونوں اس کے نصف نصف کے مالک ہیں۔ اور اگر ان دونوں کے نام مالک بنانے کے لئے بیع نامہ رجسٹری نہیں کیا تھا؛ بلکہ کسی مصلحت یا کسی سرکاری قانونی پیچیدگی سے بچنے کے لئے کیا تھا، تو ایسی صورت میں یہ دونوں اس کے مالک نہیں ہیں؛ بلکہ اس مکان کے مالک بھی شرعی طور پر عبیدالغنی ہی ہوں گے؛ لہٰذا اصل واقعہ اور اصل حقیقت کیا ہے؟ مستفتی خود سمجھے۔ (مستفاد: امدادالفتاوی ۳/ ۳۸)

اس کے بعد عبدالغنی اور عبیدالغنی کے ترکہ کی تقسیم ملاحظہ فرمائیں۔ عبدالغنی کا کل ترکہ اولاً آٹھ سہام میں تقسیم ہوکر اس کی بیوی انوری بیگم کو ایک اور دونوں بیٹوں کو سات ملیں گے، پھر اس کے بعد دو کو آٹھ میں ضرب دینے سے سولہ ہوجائیں گے، تو عبدالغنی کی بیوی کو دو ملیں گے اور دونوں لڑکوں کو سات سات حصے ملیں گے، جیسا کہ درج ذیل نقشہ سے واضح ہوتا ہے:

عبدالغنی میت

بیوی انوری بیگم	بیٹا عبیدالغنی	بیٹا انوار حسین
۱	۷	
۲	۷	۷

اور عبیدالغنی کا کل ترکہ بارہ سہام میں تقسیم ہوکر اس کی بیوی کو تین سہام اور اس کی والدہ کو چار سہام اور باقی پانچ سہام اس کے بھائی انوار حسین کو ملیں گے، جیسا کہ درج ذیل نقشہ سے واضح ہوتا ہے:

عبیدالغنی میت

بیوی	ماں	بھائی
۳	۴	۵

اور گود لی ہوئی بیٹی تبسم ناز شرعی طور پر وارث نہیں ہوتی ہے، ہاں البتہ اگر زندگی میں اس کے نام سے ہبہ کردیا ہوتو وہ اس کو ملے گا یا وصیت کردی ہو اور وصیت کی مقدار ایک تہائی یا اس سے کم میں ہوتو وہ بھی ملے گا۔ اور اگر ایک تہائی سے زیادہ ہے تب بھی ایک تہائی میں وصیت نافذ ہوگی، اگر ہبہ یا وصیت کچھ نہیں کیا ہے، تو تبسم ناز کو وراثت کے طور پر کچھ بھی نہ ملے گا۔
فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/۴/۱۴۳۲ھ

مکان کا رجسٹری بیع نامہ کر کے دینے سے ہبہ کا ثبوت

سوال [۹۴۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عبد الحمید کے چار لڑکے: (۱) محمد یونس (۲) عبد القیوم (۳) محمد یعقوب سروری کے بطن سے اور ایک لڑکا محمد یوسف (پہلی بیوی سے) اس کے علاوہ دو لڑکیاں تھیں: (۱) فاطمہ بیگم سروری کے بطن سے اور (۲) بسم اللہ پہلی بیوی سے، عبد الحمید اپنے لڑکے محمد یونس سے بہت زیادہ ان کی خدمت کی بنا پر خوش تھے؛ لہٰذا وہ اپنا ایک مکان محمد یونس کے نام کرنا چاہتے تھے، تو محمد یونس نے کہا کہ ہمارا چھوٹا بھائی عبد القیوم ہے، اسے بھی ملنا چاہئے، تو والد صاحب نے دو لڑکوں محمد یونس اور عبد القیوم کے نام مکان بیع نامہ رجسٹری کرادیا، بقیہ اولادوں کو اس مکان میں سے کچھ نہیں دیا، تو شرعاً دریافت یہ کرنا ہے کہ اس مکان میں صرف محمد یونس اور عبد القیوم کا ہی حق ہوگا یا دیگر ورثاء کا بھی حق ہوگا؟ پھر اس مکان میں سے جو حصہ عبد القیوم کو ملا اس نے اپنے بھائی محمد یونس کے نام ۱۲/ ہزار روپئے لے کر دے دیا، تو اب یہ پورا مکان محمد یونس کا ہوگیا یا نہیں، جب کہ اس مکان میں ہمارے ایک بھائی محمد یعقوب بھی قابض ہیں، وہ خالی نہیں کرتے، تو شرعاً انہیں اس مکان کو خالی کردینا چاہئے یا نہیں؟ شریعت اسلامیہ کا جو بھی فیصلہ ہو تحریر فرمادیں، نوازش ہوگی۔

المستفتی: محمد یونس سرائے ترین سنبھل، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: برتقدیرِ صحت سوال جب کہ عبدالحمید نے اپنی زندگی میں اپنے دولڑکوں محمد یونس اور عبدالقیوم کے نام جو مکان بیع نامہ کرادیا تو شرعاً محمد یونس اور عبدالقیوم اس مکان کے مالک ہیں، باپ کے مرنے کے بعد اس میں دیگر ورثاء کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور عبدالقیوم نے بارہ ہزار روپئے لے کر جو اپنا حصہ محمد یونس کو دے دیا، تو اب شرعاً پورے مکان کا مالک محمد یونس ہے، آدھے کا باپ کے بیع نامہ کر دینے سے اور آدھے کا شریک بھائی سے خرید لینے کی وجہ سے، اب اس حصہ پر محمد یعقوب کا قبضہ شرعاً درست نہیں ہے؛ بلکہ ملک غیر میں تصرف ہے جو جائز نہیں۔ حدیث شریف میں اس پر سخت وعید آئی ہے۔

عن سعيد بن زيد قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أخذ شبرا من الأرض ظلما، فإنه يطوقه يوم القيامة من سبع أرضين. (مسلم شريف، باب تحريم الظلم وغصب الأرض وغيرها، النسخة الهندية ۲/ ۳۳، بيت الأفكار، رقم: ۱۶۱۰، صحيح البخاري، باب ماجاء في سبع أرضين، النسخة الهندية ۱/ ۴۵۴، رقم: ۳۰۹۴، ف: ۳۱۹۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴ رمحرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۴۱۸)

موہوب لہ کے لئے ہبہ کے بعد ملکیت کا ثبوت

سوال [۹۴۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید کی تین لڑکیاں تھیں، لڑکا کوئی نہیں تھا، زید کے انتقال کے وقت تینوں لڑکیاں حیات تھیں، زید کی وفات پر زید کے ان رشتہ داروں نے جن کا حصہ زید کی جائیداد میں ہوتا تھا، انہوں نے اپنا حصہ زید کی تینوں لڑکیوں کے حق میں برابر برابر چھوڑ دیا، یعنی اپنا حصہ نہیں

لیا، زید کے انتقال کے بعد زید کی دولڑکیوں کا انتقال ہوگیا، مگر ان دونوں لڑکیوں کے لڑکے حیات ہیں، زید اپنی جائیداد میں ایک مکان چھوڑ گیا تھا۔

(۲) زید کی بیوی ہندہ نے اپنی حیات میں ایک وصیت تحریر کروائی تھی، مکان کے تین برابر حصے ہوں گے، ایک حصہ میری حیات لڑکی کا ہوگا، دوسرا وتیسرا حصہ میری مرحوم لڑکیوں کے لڑکوں کا ہوگا، اب وضاحت طلب امر یہ ہے کہ مکان کی تقسیم کس طرح ہو؟

المستفتی: محمد طاہر آزادنگر ہلدوانی ضلع نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) زید کی موت کے بعد زید کی جائیداد میں سے زید کے تمام ورثاء کو حصہ ملے گا، اگر کسی حصہ دار نے مذکورہ طرز پر تقسیم کردیا ہے تو صرف اس حصہ دار کا حصہ تینوں لڑکیوں کے درمیان برابر تقسیم ہوجائے گا، باقی دوسرے حصہ داروں کے حصے تقسیم نہیں ہوں گے؛ بلکہ شرعی طریقہ سے دوسروں کے حصے دوسروں کو ملیں گے۔

عن أبي حميد الساعدي، أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل لامرئ أن يأخذ مال أخيه بغير حقه، وذلک لما حرم الله مال المسلم على المسلم. (مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٤٢٥، رقم: ٢٤٠٠٣)

لا يجوز لأحد أن يتصرف في ملک الغير بغير إذنه. (قواعد الفقه، أشرفي ١١٠، رقم: ٢٦٩، البحرالرائق، زكريا ٥/ ٦٨، كوئٹه ٥/ ٤١، شرح المجلة رستم مكتبه إتحاد ١/ ٦٢، رقم المادة: ٩٧)

(۲) زید کی بیوی ہندہ کی وصیت زید کے مکان میں صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ ہندہ کی ملکیت کا نہیں ہے اور غیر ملک میں شرعاً وصیت درست نہیں ہوتی؛ اس لئے زید کے ورثاء کے درمیان مذکورہ مکان شرعی طریقہ سے تقسیم ہوجائے گا، اس میں کسی کی وصیت کا کوئی دخل نہیں ہے۔

لأنه تمليک مضاف إلى حال زوال مالكيته. (هداية، كتاب الوصايا، أشرفي ٤/ ٦٥٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ رذی الحجہ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۵۴۴/۲۵)

غیر شرعی طریقہ سے ہبہ کا نفاذ

سوال [۹۴۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہاجرہ بی بی نے اپنے والدین کی جانب سے ملا ایک مکان اپنی زندگی میں اپنے چار لڑکوں میں سے ایک لڑکے انوار الحسن کو ہبہ کر دیا، جس کی سرکاری طور پر اسٹامپ پر تحریر دے کر رجسٹری بھی کروا دی، سرکاری قانون کے مطابق ریکارڈ میں نام تبدیل کروانے کے وقت ہاجرہ بی بی کے دو لڑکے اسرار الحق اور مظہر الحق نے اپنی رضا اور رغبت سے بغیر کسی عذر دستخط کر دیا ہے، ایک لڑکے محمد ظہیر کا انتقال ہاجرہ بی بی کی زندگی میں ہو گیا تھا۔

ہاجرہ بی بی کے شوہر نعمت اللہ کی ملکیت کا ایک مکان ہے، جس کو چند سال قبل پنچوں کے سامنے چاروں بھائی محمد ظہیر اور اسرار الحق اور مظہر الحق اور انوار الحق کے مابین برابر تقسیم کر دیا گیا، ایک بھائی اسرار الحق نے اپنا حصہ اپنے بھائی محمد مظہر کو قیمت لے کر دے دیا۔ اور انوار الحق کے حصہ میں آیا ہوا مکان مظہر الحق کے مکان میں شامل کر دیا اور اب بھی مظہر الحق کے مکان میں شامل ہے۔ اب انوار الحق اپنا حصہ جو والد کے مکان سے ملا ہے، چاہتا ہے تو تین بھائی یہ کہتے ہیں کہ کیوں تم کو تو ایک پورا مکان مل گیا ہے؛ اس لئے اس میں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا، جب کہ وہ مکان والدہ کا تھا، اسے اس کی والدہ نے اپنی زندگی میں ہبہ کر دیا تھا، اور دوسرا مکان جس میں سے انوار الحسن اپنا حصہ چاہتا ہے وہ والد کا تھا اور اس کی تقسیم میں انوار الحق کو برابر شریک کیا گیا تھا۔ دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ:

(۲) ہاجرہ بی بی نے اپنی زندگی میں جو مکان اپنے ایک لڑکے انوار الحق کو ہبہ کر دیا تو کیا دوسرے لڑکوں کی موجودگی میں جب کہ وہ راضی بھی ہوں صرف ایک کے نام ہبہ کیا جا سکتا ہے، جس کو ہبہ کیا گیا وہ شرعی طور پر اس کا مالک ہے؟ اور اب دوسرے لڑکوں کو اس میں سے اپنا حق مانگنے کا حق حاصل ہے؟

(۳) دوسرے بھائیوں کا یہ کہنا ہے کہ پہلے انوار الحق کو والدہ کی طرف سے ہبہ کئے گئے مکان میں سے ہمارا حق ہے، تب اس مکان میں سے جو والد کی ملکیت تھی، اس میں سے حق

ملے گا، کیا یہ کہنا صحیح ہے؟ جب کہ تقسیم ترکہ کے وقت اسے برابر شریک کیا گیا تھا اور اس طرح سے ہبہ کہہ کر اس کا حق نہ دینا دوسرے بھائیوں کے لئے جائز ہے؟ بینوا توجروا

المستفتی: انوار الحق بن نعمت اللہ اسماعیل پورہ، کامٹی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) اگر ہاجرہ بی بی نے اپنی زندگی میں بحالت صحت اپنا مکان اپنے لڑکے انوار الحق کو ہبہ کرکے قبضہ دے دیا ہے، تو اگرچہ ہاجرہ بی بی کے لئے ایسا کرنا درست نہ تھا؛ لیکن شرعاً انوار الحق اس پورے مکان کا مالک ہو چکا ہے، اس سے دوسرے بھائی کا کوئی حق وابستہ نہیں رہا ہے۔

عن أنس بن مالک -رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: من فر من ميراث وارثه قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة. (سنن ابن ماجة، باب الحيف في الوصية، النسخة الهندية ۲/ ۱۹٤، دارالسلام، رقم: ۲۷۰۳)

عن سليمان بن موسى قال: قال رسول الله ﷺ: من قطع ميراثا فرضه الله قطع الله ميراثه من الجنة. (سنن سعيد بن منصور، باب من قطع ميراثا فرضه الله، دارالكتب العلمية بيروت ۱/ ۹٦، رقم: ۲۸۵-۲۸٦)

رجل وهب في صحته كل المال للولد جاز في القضاء، ويكون آثما فيما صنع. (فتاوى قاضي خان، زكريا جديد ۳/ ۱۹٤، وعلى هامش الهندية ۳/ ۲۷۹، فتاوى بزازية، زكريا جديد ۳/ ۱۲۳، وعلى هامش الهندية ٦/ ۲۳۷، هندية زكريا قديم ٤/ ۳۹۱، جديد ٤/ ٤١٦، شامي، زكريا ۸/ ۵۰۲، كراچی ۵/ ٦۹٦)

(۲) موہوب لہ لڑکا ہبہ میں قبضہ شدہ مکان کا شرعی طور پر مالک ہو چکا ہے، اس میں دوسروں کا کوئی حق ثابت نہیں ہے۔

(۲) دوسرے بھائیوں کا مذکورہ دعویٰ شرعاً درست نہیں ہے، انوار الحق کو باپ کی جائیداد میں سے اپنا حصہ شرعاً ملے گا اور کسی کے لئے اس کو روکنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ اوپر کے حوالے سے واضح ہوتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶؍ ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۵۴۵)

۲/ باب ما یجوز من الهبة و ما لا یجوز

آدمی کو اپنی جائیداد میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار ہے

سوال [۹۴۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے والد صاحب کے چار بھائی تھے: (۱) عطرت علی (۲) شرافت علی (۳) شوکت علی (۴) مختار احمد نابینا، ان چاروں میں دو بھائیوں کی شادی ہوئی اور دو بغیر شادی کے رہے، بغیر شادی والوں میں سے ایک بھائی کا انتقال ہوگیا اور جن دو بھائیوں کی شادی ہوئی ان کے اولادیں پیدا ہوئیں، عطرت علی کا انتقال ہوگیا اور انہوں نے دولڑکے، پانچ لڑکیاں چھوڑیں، اب ان بچوں اور بیوہ کے گذراوقات کی ذمہ داری حافظ مختار نابینا نے سنبھالی اور بچوں کی پرورش کرتے رہے، جب ان بچوں نے ہوش سنبھالا، کام کرنے لگے، تو اب حافظ مختار احمد کی خدمت کرنے لگے، ان کے دوسرے بھائی شوکت علی خرچ اور مدد تو کیا کرتے بھائی ماننے ہی سے انکار کردیا اور باپ کی وراثت سے دور رکھنا چاہتے ہیں، حافظ مختار احمد نے عطرت علی کے بچوں کے نام اپنی کل جائیداد گھر اور جنگل کا بیع نامہ کردیا، اس کے بعد شوکت علی کے بچوں کو جب معلوم ہوا تو انہوں نے عدالت میں دعویٰ دائر کردیا، پنچایت وغیرہ منعقد ہوئی اور حافظ مختار احمد کو بلا کر سوال کیا گیا کہ آپ نے اپنی ملکیت کا کل اپنے بھائی کے بچوں کو دے دیا اور دوسرے بھائی کے بچوں کو کیوں محروم رکھا؟ حافظ مختار احمد نے کہا میرے تمام اخراجات یہ یتیم بچے اٹھاتے ہیں اور ہر طرح کی خدمت کرتے ہیں اور شوکت خود یا اس کے بچے میری کوئی بات نہیں سنتے اور نہ کھانے پینے یا کسی طرح کا خرچ اٹھاتے ہیں اور اوپر سے میرے بھائی ہونے سے بھی انکار کرتے ہیں؛ اس لئے میں نے اپنی کل جائیداد عشرت علی وحشمت علی کو بیع نامہ کردیا، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ اس طرح یہ بیع نامہ کرنا شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حافظ مختار اپنی جائیداد کے تنہا مالک ہیں، ان کو اختیار رہے کہ اپنی جائیداد جس کو چاہیں دے دیں اور جہاں چاہیں دے دیں، شرعی طور پر کسی کو اعتراض کرنا درست نہیں ہے؛ لہٰذا اس کا اپنی تمام جائیداد صرف دو بھتیجوں کو بیع نامہ کر کے مالک بنا دینا شرعاً جائز اور درست ہے۔

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء من الملك. (بيضاوي شريف ١/ ٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۸۹۸۴)

کیا والد کو اپنی جائیداد ہر طرح تقسیم کرنے کا حق ہے؟

سوال [۹۴۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم چار بھائی ہیں: (۱) الطاف حسین (۲) مشتاق حسین (۳) فیاض حسین (۴) ممتاز حسین۔ مشتاق والطاف کے اپنے اپنے مکانات ہیں، والد صاحب کا ایک مکان ہے، جس میں فیاض حسین رہتے ہیں، ممتاز حسین پردیس میں رہتے تھے، فیاض حسین نے والد صاحب سے وہ مکان خرید کر کے اپنے نام لکھوالیا، فیاض حسین کا کہنا ہے کہ جس نے کوئی پیسہ نہیں دیا والد صاحب کو، ممتاز کا کئی سال سے کوئی پتہ نہیں تھا، ممتاز کے آنے پر والد صاحب سوچنے لگے کہ میں نے یہ غلط کیا، مکان ایک بیٹے کے نام کر دیا، کہنے لگے والد صاحب یہ مکان میرا جس میں سے اپنے چھوٹے بیٹے کو بھی دینا چاہتا ہوں نہیں تو میں اپنی جان دے دوں گا، بہت ناراض رہے، اسی بات پر گھر چھوڑ کر نکل گئے، میرا چھوٹا بھائی کمزور ہے، اس کا کوئی مکان نہیں، میں اس مسئلہ سے آزاد ہونا چاہتا ہوں، تو ممتاز کا حق بنتا ہے کہ نہیں، ممتاز سے بھی کہا کہ فیاض سے آدھا مکان اپنے نام کرالے، میں نے ایسا نہیں کیا، مکان آج بھی میرے پاس

موجود ہے۔

المستفتی: فیاض حسین کٹار شہید مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر فیاض نے اپنے باپ سے مکان مذکور خریدا ہے تو فیاض پر لازم ہے کہ اس مکان کی پوری قیمت باپ کو ادا کردے، تاکہ باپ اپنی دوسری اولاد کو بھی جائیداد میں سے دے سکے، یا باپ جس طرح چاہے مکان کو اسی طرح تقسیم کردے۔

عن أبي حميد الساعدي، أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل لامرئ أن يأخذ مال أخيه بغير حقه، وذلك لما حرم الله مال المسلم على المسلم.

(مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٤٢٥، رقم: ٢٤٠٠٣)

لا يجوز لأحد أن يأخذ مال أحد بلا سبب شرعي. (قواعد الفقه، أشرفي ١١٠، رقم: ٢٦٩، هندية، زكريا قديم ٢/ ١٦٧، جديد ٢/ ١٨١، شامي، زكريا ٦/ ١٠٦، كراچی ٤/ ٦١، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٧/ ٣٥٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ ذیقعدہ ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۹۲۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/ ۱۱/ ۱۴۱۹ھ

اپنا سارا سرمایہ ہبہ کرکے وارثین کو بے یارو مددگار چھوڑنا

سوال [۹۴۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تین بھائی ہیں، سب سے بڑے جمیل اس کے بعد خلیل، اس کے بعد رفیق، تینوں کے حصے میں ۵۷-۵۷؍ گز زمین ہے، جس میں سے جمیل نے خلیل کا حصہ ان کی زندگی میں خرید کے رفیق کے بچوں کے نام کردیا؛ کیوں کہ جمیل کی دو بیٹیاں ہیں، خلیل کے کوئی بچہ نہیں تھا، رفیق کے چار لڑکے ہیں، اب جمیل یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنا حصہ بھی رفیق کے بچوں کے نام

کردوں، جب کہ جمیل کی بیٹیاں ناراض ہیں اس بات سے؛ اس لئے آپ بتائیے کہ شریعت کے حساب سے ایسا کرنا ٹھیک ہے یا نہیں؟ یا باپ کا حصہ دونوں لڑکیوں ہی کو ملے گا؟

المستفتی: محمد مستقیم اصالت پورہ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جمیل اپنے مال کا اپنی حیات میں خود مالک ہے، وہ جس طرح اس میں تصرف کرنا چاہے کرسکتا ہے، اس کو اختیار ہے؛ البتہ جمیل کے اوپر لازم ہے کہ اپنے بھتیجوں کے مقابلے میں اپنی بیٹیوں کو ترجیح دے؛ اس لئے کہ جمیل کے مرنے کے بعد حقیقی وارث اس کی بیٹیاں ہوتی ہیں۔ اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ اپنے بیوی بچوں کو بے یارومددگار نہ چھوڑے اور سب سے بڑا ثواب ان ہی پر خرچ کرنے کا ہے۔

عن عامر بن سعد بن أبي وقاص -رضي الله عنه- كان رسول الله ﷺ يعودني عام حجة الوداع من وجع اشتد بي -إلى أن قال- إنک أن تذر ورثتک أغنياء، خير من أن تذرهم عالة يتكففون الناس، وإنک لن تنفق نفقة تبتغي بها وجه الله إلا أجرت بها، حتى ما تجعل في في امرأتک. (بخاري شريف، باب رثاء النبي صلى الله عليه وسلم سعد بن خولة، النسخة الهندية ١/ ١٧٣، رقم: ١٢٨١، ف: ١٢٩٥)

كل يتصرف في ملكه كيف شاء؛ لأن كون الشيء ملكا لرجل يقتضي أن يكون مطلقا في التصرف فيه كيفما شاء. (شرح المجلة للأتاسي ١/ ٦٥٤، رقم المادة: ١١٩٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۹۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۶/ ۱۱/ ۱۴۳۴ھ

کچہری میں پیشکار کولوگوں کا ہدیہ دینا

سوال [۹۴۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) میں کچہری میں پیشکار ضلع جج ہوں، لوگوں کے جس دن مقدمات چھوٹتے ہیں، وہ خون اور قتل کے معاملوں سے بری ہوجاتے ہیں، تو ان کے گھر والے سبھی کو کورٹ میں پیسے بانٹتے ہیں اور خوشی میں چپراسی بابو اور مجھے بھی دیتے ہیں، کبھی کبھی چپراسی خود مانگ لیتے ہیں، تو یہ روپیہ میرے لئے جائز ہے یا نہیں؟

(۲) جب دو فریقوں میں کورٹ میں چل رہے قتل وخون، زنا کاری وغیرہ کے مقدمات میں فیصلہ ہوجاتا ہے، سمجھوتا ہوجاتا ہے، تو خلاف فریق دوسرے کے موافق بیانات دیتا ہے، تو وہ فیصلہ ہوجانے کی وجہ سے بیانات لکھنے کے بعد سرکاری وکیل کے ساتھ خوشی میں پیشکار کو بھی کچھ روپیہ دیتا ہے۔ اور اب تو فیصلہ ہونے پر لکھے گئے بیانات کے بعد فریق جس کے حق میں فیصلہ ہوجاتا ہے وہ ضرور پیشکار کو کچھ نہ کچھ رقم دیتا ہے، کبھی کبھی چپراسی یا سرکاری وکیل بھی کہہ دیتے ہیں کہ بھائی تم لوگوں کا فیصلہ ہوگیا ہے، کچھ دو خرچ کرو، تو یہ رقم میرے لئے جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: انور پیش کار ضلع جج، کاس گنج ریٹہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) کچہری میں مقدمات جیت جانے کے بعد جس کے حق میں فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے، وہ کسی کے دباؤ کے بغیر اپنی خوشی سے بابو چپراسی اور پیشکار کو کچھ پیسہ دے کر آجائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، وہ پیسہ ان لوگوں کے لئے حلال ہے۔ اور اگر کوئی نہیں لیتا ہے تو وہ اس کا اپنا تقویٰ ہے؛ اس لئے کہ وہ رشوت نہیں ہے بلکہ رشوت تو وہ ہوتی ہے جو فیصلہ سے پہلے دی جاتی ہے، تاکہ اس کے حق میں فیصلہ ہوجائے۔

ولو قضى حاجته بلا شرط ولا طمع، فأهدى إليه بعد ذلك فهو

حلال لا بأس به، وما نقل عن ابن مسعود من كراهته فورع. (شامي، كتاب القضاء، مطلب في الكلام على الرشوة والهدية، كراچی ٥/ ٣٦٢، زكريا ٨/ ٣٥)

وفي المصباح: الرشوة بالكسر ما يعطيه الشخص الحاكم وغيره؛ ليحكم له أو يحمله على ما يريد. (شامي، كراچی ٥/ ٣٦٢، زكريا ٨/ ٣٤)

(۲) فیصلہ ہوجانے کے بعد بابو چپراسی وغیرہ کو جس کے حق میں فیصلہ ہوا ہو وہ کچھ پیسہ اپنی خوشی سے دے دے تو وہ رشوت نہیں ہوتی ہے۔ اور اس پیسے کے لینے میں کوئی حرج نہیں؛ لیکن اگر جس کے حق میں فیصلہ ہوگیا ہو ان کے اوپر دباؤ ڈالا جائے اور مطالبہ کیا جائے اور وہ دباؤ میں آکر کچھ دے دے، تو اس کا لینا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ بطیب خاطر خوشی سے یہ پیسہ نہیں دیا جارہا ہے؛ بلکہ دباؤ میں دیا جارہا ہے۔

ألا لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب منه. رواه البيهقي وغيره.

(مشكوة/ ٢٥٥، شعب الإيمان للبيهقي، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٣٨٧، رقم: ٥٤٩٢، السنن الكبرى للبيهقي، دارالفكر بيروت ٨/ ٥٠٦، رقم: ١١٧٤٠)

وإن طلب منه أن يسوى أمره ولم يذكر له الرشوة وأعطاه بعد ما يسوى اختلفوا فيه، قال بعضهم: لا يحل له أن يأخذ، وقال بعضهم: يحل، وهو الصحيح. (البحر الرائق، زكريا ٦/ ٤٤١، كوئٹه ٦/ ٢٦٢، تاتارخانية، زكريا ١١/ ٧٨، رقم: ١٥٥١٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۴۱)

بادشاہوں کی طرف سے قضاۃ کو دی گئی زمین فروخت کرنا

سوال [۹۴۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک تحصیل کے قاضی صاحب جن کے متعلق تین تحصیلوں کے قضاۃ کی ذمہ

داری ہے، ان کو اپنے پچھلے قاضی حضرات سے کچھ زمین وجائیداد ورثہ میں ملتی آئی ہیں، یعنی یکے بعد دیگرے قاضی سے قاضی کو یہ زمینیں منتقل ہوتی ہوئی آئی ہیں، تو کیا موجودہ قاضی صاحب اس زمین کو فروخت کرکے اپنی آل اولاد میں تقسیم کرنے کا شرعاً حق رکھتے ہیں، جب کہ پچھلے قاضی صاحبان ان زمینوں کی کاشت وغیرہ سے استفادہ کرتے رہے ہیں، کیا اس طرح کی زمین فروخت کی جاسکتی ہے؟ ایک فریق کا کہنا ہے کہ قضاۃ کی زمین فروخت نہیں ہوتی ہے، مذکورہ زمینیں قاضی حضرات کو بادشاہوں اور نوابوں کی طرف سے بطورنذرانہ وتحفہ کے ملی تھیں۔

المستفتی: سیدزواراحمد، جے پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بادشاہوں کی طرف سے زمینیں قاضیوں کو بطورتحفہ اور ہدیہ کے ملی ہیں اور بادشاہوں کی طرف سے قبضہ دے کر مالک بنا دیا گیا ہے، تو قاضی حضرات ان زمینوں کے شرعی مالک ہو چکے، پھر ان کے بعد کے ورثاء میں بطناً بعدبطن منتقل ہوتی ہوئی آئی ہیں۔ اور جن جن وارثین کو شرعی وراثت کے طور پر وہ زمینیں ملی ہیں، ان کو ان زمینوں میں مکمل مالکانہ تصرف کا حق ہے؛ لہٰذا بیچنے کا بھی حق ہے، کسی کو تحفہ اور ہدیہ میں بھی دینے کا حق ہے اور کسی کا یہ کہنا کہ قضاۃ کی زمین فروخت نہیں ہوتی وہ درست نہیں ہے، ہاں البتہ یہ اس وقت درست ہوسکتا ہے کہ جب بادشاہوں کی طرف سے ہبہ یا تحفہ کے طور پر نہ دی گئی ہو؛ بلکہ زمین صرف قضاۃ کے لئے وقف کی گئی ہو اور اس زمین کی پیداوار اور آمدنی قاضیوں کو ملیں گی اور یہاں ایسا نہیں ہے، جیسا کہ سوال نامہ سے واضح ہے۔

تنعقد الهبة بالإيجاب والقبول، وتتم بالقبض الكامل؛ لأنها من التبرعات، والتبرع لا يتم إلا بالقبض. (شرح المجلة رستم باز، إتحاد ديوبند ١/ ٤٦٢، رقم المادة: ٨٣٧، شامي كراچی ٥/ ٦٩٠، زكريا ٨/ ٤٩٣، هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٧٧، جديد ٤/ ٣٩٩، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩١، قديم ٢/ ٢٥٣)

یملک الموهوب له الموهوب بالقبض. (شرح المجلة ١/ ٤٧٣، رقم المادة: ٨٦١)

المالک هو المتصرف في الأعیان المملوکة کیف شاء. (بیضاوي، سورة فاتحة، کتب خانه رشیدیه دهلي ١/ ٧، شرح المجلة رستم باز، إتحاد دیو بند ١/ ٦٥٤، رقم المادة: ١١٩٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ ذیقعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۰۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/ ۱۱/ ۱۴۳۴ھ

ہیجڑے کا ہدیہ قبول کرنا

سوال [۹۴۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید جو پیدائشی اعتبار سے بالکل صحیح وسالم انسان ہے، کسی قسم کی کمی نہیں، کچھ عرصہ پہلے ان کی شادی بھی ہوئی تھی، بال بچے بھی موجود ہیں؛ لیکن اب وہ دوسرا پیشہ اختیار کر چکے ہیں، جسے ''زنخا'' کہتے ہیں، یعنی ہجڑا پن، لوگوں سے پیسہ لیتے ہیں اور اپنی روزگاری اسی طرح چلاتے ہیں؛ لیکن سوال یہ ہے کہ اب اگر مذکورہ زید اپنی اس کمائی میں سے اپنے بہن، بہنوئی کو کچھ تحفہ دینا چاہیں تو ان کے بہن بہنوئی کے لئے اس کمائی میں سے تحفہ تحائف لینا کیسا ہے؟ نیز اس کے اس عمل کی بنیاد پر اس سے تعلقات رکھنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد ادریس، مدرسہ انصار العلوم قصبہ نرولی، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ہیجڑے کی کمائی حلال اور طیب نہیں ہے؛ لہٰذا زید اپنے اس روپیہ میں سے اگر اپنے بہن بہنوئی کے لئے ہدیہ کرنا چاہے تو ایسے ہدیہ کا قبول کرنا درست نہیں ہے، اس سے بچنا چاہئے۔

أهـدى إلـى رجـل شيـئا، فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لا يقبل الهدية. (هـنـدية، كتـاب الـكـراهية، الباب الثاني عشر في الهدايا والضيافات، زكريا قديم ٥/ ٣٤٢، جـديـد ٥/ ٣٩٦، تـاتـارخـانية زكـريـا ١٨/ ١٧٥، رقم: ٢٨٤٠٥، المحيط البـرهـانـي، الـمـجـلـس العلمي بيروت ٨/ ٧٣، رقم: ٩٦١٧، البناية شرح الهداية، أشرفيه ديوبند ١٢/ ٢٠٩، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٨٦-١٨٧)

نیز زید کا یہ عمل شرعاً قبیح ہے، جس کی وجہ سے تعلقات کے انقطاع کی گرچہ اجازت ہے؛ لیکن قطع تعلق اس دور میں زیادہ مفید نہیں ہے، میل جول رکھ کر اصلاح کی کوشش زیادہ مؤثر ومفید ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم/ ۲۹۹، جدید ڈابھیل ۱۸/ ۱۶۷، کفایت المفتی قدیم ۷/ ۶۸، جدید زکریا مطول ۱/۹ ۲۷ تا ۲۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ ربیع الاول ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۱۰۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۳/۱۰ھ

آبائی زمین بیچ کر لڑکوں کے لئے رہائشی مکان تیار کر دینا

سوال [۹۴۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے پاس اپنا ذاتی مکان نہیں ہے، آبائی مکان بھائیوں کے حصہ میں آ گیا تھا، زید کو کچھ پیسہ اور کچھ زمین ملی، زید یہ چاہتا ہے کہ اپنی زندگی میں آبائی زمین میں سے کچھ حصہ فروخت کر کے اس پیسہ سے لڑکوں کے لئے رہائش کے لئے فی الحال زمین خرید دے، زید کے لڑکیاں بھی ہیں، بعض شادی شدہ ہیں اور لڑکے بھی بعض شادی شدہ ہیں، ان کو رہائش کے لئے پریشانی ہے، اس ضرورت کے پیش نظر سب لڑکوں کو ان کی رہائش کی ضرورت کے لئے آبائی زمین میں سے کچھ بیچ کر زمین خرید دے تو شرعاً اس طرح صرف لڑکوں کے لئے ان کی ضرورت کی وجہ سے کرنے کی گنجائش ہے یا نہیں؟ یہ واضح رہے کہ آبائی زمین کا اکثر حصہ اس

طرح کرنے کے بعد بھی باقی رہے گا، ابھی باقاعدہ پوری جائیداد کی تقسیم کا ارادہ نہیں ہے؟ شرعی حکم تحریر فرمادیں۔

المستفتی: عبدالاحد گوئیاں باغ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: زید اپنی حیات میں اپنی زمین کا مالک ومختار ہے؛ لہٰذا زید کو اپنے حصہ میں آئی ہوئی زمین میں سے کچھ حصہ فروخت کر کے ضرورت مند بچوں کو زمین خرید کر کے دینے کی شرعاً اجازت ہے، البتہ جب لڑکوں کو دے کر مالک بنانا ہے، تو لڑکیوں کو بھی زندگی میں لڑکوں کے برابر دینا لازم ہے اور لڑکیوں کی بخوشی اجازت اور مرضی کے بغیر صرف لڑکوں کو دینے میں باپ گنہگار ہوگا۔

عن النعمان بن بشير -رضي الله عنه- أن أباه أتى به إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: إني نحلت ابني هذا غلاما، فقال: أكل ولدك نحلت مثله؟ قال: لا، قال: فارجعه. (بخاري شريف، كتاب الهبة، باب الهبة للولد الخ ١/ ٣٥٢، رقم: ٢٥١٤، ف: ٢٥٨٦)

وروي المعلى عن أبي يوسف أنه لا بأس به إذا لم يقصد به الإضرار، وإن قصد به الإضرار سوى بينهم، وهو المختار. (هندية، كتاب الهبة، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦، شامي، كراچى ٥/ ٦٩٦، زكريا ٨/ ٢٠١-٢٠٢، قاضي خان، فصل في هبة الوالد لولده الخ، جديد زكريا ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية، زكريا ٣/ ٢٧٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ذیقعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۱۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/ ۱۱/ ۱۴۳۴ھ

اپنی جائیداد بیوی کو ہبہ کر کے دخیل بنانا

سوال [۹۴۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: (۱) ایک جائیداد جو بنیاد علی کی خرید کردہ تھی، انہوں نے اپنی دوسری بیوی منی بیگم کو بذریعہ تحریر ہبہ نامہ قابض ودخیل بنادیا تھا، اس جائیداد میں کرایہ دار رہتے تھے، کرایہ بھی منی بیگم تاحیات وصول کرتی رہیں، پھر منی بیگم کے ایک لڑکے واجد علی نے اسی جائیداد کو کرایہ دار سے تقریباً ٦ رسال مقدمہ کے بعد چھڑالیا، مقدمہ والدہ منی بیگم کی حیات ہی میں شروع ہوگیا تھا، پھر یہ مقدمہ واجد علی نے جیت لیا تھا، منی بیگم کے ورثاء میں ایک لڑکا شفاعت خاں پہلے شوہر ایاز خاں سے اور ایک لڑکی اچھی بیگم بنت ایاز پہلے شوہر سے، اور دوسرے شوہر بنیاد علی سے دولڑکے (۱) واجد علی (۲) امجد علی ہیں۔

(۲) واجد علی نے جو مکان کرایہ دار سے چھڑانے میں مقدمہ وغیرہ میں خرچ کیا وہ اسے ملے گا؟ اور دیگر وارثان کو دینا پڑے گا یانہیں؟ شرعی حکم تحریر فرمائیں۔

المستفتی: واجد علی طویلہ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: (۱) بنیاد علی نے اپنی مملوکہ جائیداد اپنی زوجہ ثانیہ منی بیگم کو ہبہ کرکے اپنی زندگی ہی میں کلی اختیار دے کر مکمل قابض اور دخیل بنادیا تھا اور بنیاد علی کی حیات ہی میں وہ موہوبہ جائیداد کے کرایہ کی خود مالک اور مختار تھیں، تو یہ ہبہ صحیح ہوگیا تھا اور منی بیگم اس کی مالک تھیں۔

وتتم الهبة بالقبض الكامل. (شامي، كتاب الهبة، زكريا ۸/ ۴۹۳، كراچی ۵/ ۶۹۰)

وتصح الهبة بالإيجاب والقبول، والقبض ...... والقبض لابد منه لثبوت الملك. (هداية، كتاب الهبة، أشرفي ديوبند ۳/ ۲۸۳)

لہٰذا اس جائیداد میں منی بیگم کے تمام شرعی ورثاء حسب حصص شرعیہ حصے دار ہوں گے۔

ويقسم الباقي بعد ذلك بين ورثته، أي الذين ثبت إرثهم بالكتاب والسنة –إلى قوله– ويستحق الإرث، ولو لمصحف به يفتى برحم، ونكاح، وولاء. الخ (شامي، كتاب الفرائض، زكريا ۱۰/ ۴۹۷، كراچی ۶/ ۷۶۲)

اور بشرط صحت سوال و بعد ادائے حقوق ما تقدم وعدم موانع ارث مذکورہ جائیداد ورثائے مذکورہ میں حسب ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگی۔

نوٹ: یہ جواب اس وقت ہے جب کہ سوال عین واقعہ کے مطابق ہو۔

میــت

لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی
شفاعت خان	واجد علی	امجد علی	اچھی بیگم
۲	۲	۲	۱

منی بیگم کا ترکہ ۷/ سہام میں منقسم ہوکر لڑکوں کو دو دو اور لڑکی کو ایک سہام ملے گا۔

(۲) واجد علی نے مقدمہ پر جو خرچ کیا تو چونکہ مرحومہ منی بیگم کی طرف سے واجد علی کو مقدمہ لڑنے کی اجازت تھی؛ لہٰذا وہ بقیہ ورثاء سے حسب حصص خرچ وصول کرسکتا ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۴۸۵)

شركة الملك أن يملك إثنان عينا إرثا، أو شراء -إلى قوله- وكل أجنبي في قسط صاحبه، أي كل واحد من الشريكين ممنوع من التصرف في نصيب صاحبه لغير الشريك إلا بإذنه لعدم تضمنها الوكالة.

(البحر الرائق، كتاب الشركة، كوئٹه ٥/ ١٦٧، زكريا ٥/ ٢٨٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۴ ر رجب ۱۴۲۰ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۱ ۶۲)

ترکہ سے ملا ہوا حصہ بیوی کو ہبہ کرنا

سوال [۹۴۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کو اپنے والد کی طرف سے ایک مکان کا حصہ ترکہ میں ملا، زید کا اس پر قبضہ ہے، تو زید اس حصہ کو اپنی بیوی کے نام ہبہ کرنا چاہتا ہے، تو شرعاً اس کے لئے ہبہ کرنا درست ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید اپنے حصہ کا مالک ہے، اپنی بیوی کو ہبہ کرسکتا ہے۔

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء من الملك. (بيضاوي شريف، كتب خانه رشيديه دهلي ۱/ ۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰ر شعبان ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۸۸۲)

دو بیوی میں سے لاولد بیوی کو بطور ہبہ کوئی خاص چیز دینا

سوال [۹۴۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص کی دو بیویاں ہیں اور وہ شخص سرمایہ دار ہے، دونوں بیویوں کو الگ الگ رہائش دے رکھی ہے، اور دونوں کے خرچ واخراجات کے معاملہ میں برابری ہے، شب باشی میں بھی دونوں کے ساتھ برابری ہے، نیز دونوں کے سکون اور راحت رسانی میں بھی بالکل برابری کا معاملہ ہے، کسی قسم کا فرق نہیں، مگر ایک کے پاس اولاد ہے، دوسرے کے پاس نہیں ہے، جس کے پاس اولاد نہیں ہے، اس کے بعد کے سہارا کے لئے کوئی خاص چیز بطور ہبہ اس کو دینا چاہتا ہے، تو کیا شریعت میں اس کی گنجائش ہے؟ اس میں دوسری کو نقصان پہنچانا ہرگز مقصد نہیں ہے۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب خرچہ اخراجات رات گذاری اور راحت رسانی میں برابری کا معاملہ ہے، تو شوہر کے لئے کسی ایک بیوی کو مخصوص اشیاء یا جائیداد کا ہبہ کرنا شرعی طور پر جائز اور درست ہے، اس کی وجہ سے اللہ کے یہاں شوہر سے باز پرس نہیں ہوگی اور نہ شوہر گنہگار ہوگا، ہاں البتہ دوسری بیوی کی دلجوئی اور اس کو خوش کرنے کے لئے اس کو بھی ہبہ میں کچھ دے دیتا ہے، تو یہ شوہر کی طرف سے احسان ہے۔

إذا قام الزوج بالواجب من النفقة، والكسوة لكل واحدة من زوجاته، فهل يجوز له بعد ذلك أن يفضل إحداهن عن الأخرى في ذلك أم يجب عليه أن يسوي بينهن في العطاء فيما زاد على الواجب من ذلك كما وجبت عليه التسوية في أصل الواجب –إلى قوله– إن أقام لكل واحدة من زوجاته ما يجب لها، فلا حرج عليه أن يوسع على من شاء منهن بما شاء. (الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۳/ ۱۸٦، إرشاد الساري، دارالفكر ٦/ ۲۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۶۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۵/۶ھ

والدہ کا اپنی چھوٹی بیٹی کو زمین دینا

سوال [۹۴۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: حامد، محمود اور ساجد تینوں حقیقی بھائی ہیں، ان میں حامد اور محمود دونوں کی ساس ام سلمہ ہیں، جو کہ کٹرا میں رہتی تھیں، بعد میں انہوں نے اپنا گھر فروخت کر دیا اور اپنی لڑکیوں کے یہاں آکر گونڈہ رہنے لگیں، ان بھائیوں کے والد نے گھر کی ایک زمین ام سلمہ کے ہاتھ چار ہزار روپے میں فروخت کر دی، ساجد نے اپنی ماں کے انتقال کے بعد ان کے سارے زیورات فروخت کر دیئے اور قیمت اپنے استعمال میں لے آئے اور حامد نے سعودیہ جاتے وقت ام سلمہ یعنی اپنی ساس کے زیورات فروخت کر کے اپنا کرایہ پورا کیا، اس طرح محمود کو کچھ نہیں ملا، نہ ماں کا نہ ساس کا، اب ام سلمہ اس زمین کو اپنی چھوٹی بیٹی کے نام کرنا چاہتی ہیں، بڑے داماد اور بڑی بیٹی دونوں انتقال کر چکے ہیں، ان کے بچے موجود ہیں، اب حامد کے بچے اور ساجد دونوں اس کی مخالفت کر رہے ہیں، تو کیا ان کا یہ عمل صحیح ہے کہ وہ اپنی مذکورہ زمین صرف اپنی چھوٹی بیٹی کے نام کر سکتی ہیں، چھوٹی بیٹی داماد شروع یعنی ۱۹۷۱ء سے ہی اب تک

برابران کی خدمت اور علاج کرتے چلے آرہے ہیں اور ابھی کررہے ہیں، بڑی بیٹی داماد سے کوئی مطلب نہیں رہا، بس کبھی کبھی سو یا پانچ سو روپئے دے دیا کرتے تھے، واضح فرمادیں کہ شرعی اعتبار سے ایسا کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: ابومنہاج فیض آباد روڈ، گونڈہ، یوپی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہر شخص اپنی مملوکہ چیز میں مالکانہ تصرف کرنے کا مکمل طور پر اختیار رکھتا ہے، چنانچہ ام سلمہ کو شرعی طور پر یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی زمین چھوٹی بیٹی کو اگر دینا چاہے تو دے سکتی ہے، اس پر بڑی بیٹی کے بچوں اور کسی دوسرے کو اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے۔

عن أبي حميد الساعدي، أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل لمسلم أن يأخذ مال أخيه بغير حق. (مجمع الزوائد، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٧١)

كل يتصرف في ملكه كيف شاء. (شرح المجلة رستم باز، إتحاد ديوبند ١/ ٦٥٤، رقم المادة: ١١٩٢)

لأن الملك ما من شأنه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص. (شامي، كتاب البيوع، مطلب في تعريف المال والملك والمتقوم، كراچی ٥/ ٥٠٢، زكريا ٧/ ١٠)

المالك هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء من الملك. (بيضاوي، كتب خانه رشديه دهلى ١/ ٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۵؍محرم الحرام ۱۴۳۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۵۷۲/۳۹)	۱۴۳۲/۱/۵ھ

بحالت صحت مکان اپنی لڑکیوں کو ہبہ کرنا

سوال [۹۴۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے چار بھائی اور دو بہنیں ہیں، میں نے اپنے والد کی چھت پر اپنے ذاتی پیسوں سے

مکان تعمیر کرایا اور نیچے کے حصہ میں دوسرے بھائی رہتے ہیں، اب میں یہ چاہتا ہوں کہ جو میرا مکان ہے، وہ میرے مرنے کے بعد میری لڑکیوں کو ملے، میرے تین لڑکیاں ہیں، لڑکے نہیں ہیں، تو اس صورت میں کیا کروں کہ میری میراث صرف میری لڑکیوں کو ہی ملے؟

المستفتی: ضمیر الحسن کٹار شہید، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ نے والد کے مکان کی چھت پر ان کی اجازت سے یا ہبہ کے بعد اپنے ذاتی پیسوں سے جو مکان تعمیر کیا ہے، آپ کے مرنے کے بعد اس مکان میں لڑکیاں دوثلث کی حق دار ہوں گی، پورا مکان ان کو نہیں ملے گا، ہاں البتہ پورا مکان ملنے کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ آپ اپنی زندگی میں بحالت صحت لڑکیوں کو ہبہ کر کے قبضہ دے دیں۔

ولا ترث الكل بالعصوبة. (البحرالرائق، كتاب الفرائض، زكريا ٩/ ٤٩٧)

قال رحمه الله تعالى: وللبنت النصف؛ لقوله تعالى: ﴿وان كانت واحدة فلها النصف﴾ قال رحمه الله تعالىٰ: وللأكثر الثلثان، وهو قول عامة الصحابة رضي الله عنهم، وبه أخذ علماء الأمصار. (البحرالرائق، زكريا ٩/ ٣٧٤، كوئٹه ٨/ ٤٩٤، تبيين الحقائق ٦/ ٢٣٤)

صحت الهبة بالإيجاب والقبول في حق الموهوب له؛ لأنه عقد فينعقد بهما كسائر العقود. الخ (البحرالرائق، كتاب الهبة، زكريا ٧/ ٤٨٥، كوئٹه ٧/ ٢٨٥)

لابد من القبض فيها لثبوت الملك لا للصحة، والتمكن من القبض كالقبض. (البحرالرائق، زكريا ٧/ ٤٨٥، كوئٹه ٢٨٥)

لا تجوز الهبة إلا مقبوضة، والمراد نفى الملك. (تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٢/ ٩١، زكريا ديوبند ٦/ ٤٩، درمختار مع الشامي، كراچی ٥/ ٦٩٠، زكريا ٨/ ٤٨٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۲۹۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/۵/۱۴۱۸ھ

بیوہ کا اپنی اکلوتی لڑکی کے نام مکمل جائیداد کرنا

سوال [۹۴۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک بیوہ کی ایک لڑکی تھی، اس نے اپنی تمام زمین وجائیداد کو اپنی لڑکی کے نام کردیا، کچھ دنوں کے بعد بیوہ کی موجودگی میں ان کی لڑکی مرگئی اور چند دنوں کے بعد اس بیوہ کا بھی انتقال ہوجاتا ہے، ان کے مال متروکہ میں اب کن لوگوں کا حصہ ہوگا؟ آیا ان کے بھتیجے کو متروکہ مال میں سے کچھ ملے گا کہ نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں تفصیل سے جواب دیں۔

المستفتی: محمد سلیمان گوگرااررہ کورٹ (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت سوال اگر بیوہ نے اپنی ملکیت کی تمام زمین جائیداد لڑکی کے نام کر کے مالک بنادیا تھا اور قبضہ دے کر داخلی وخارجی ہر طرح کا اختیار دے دیا تھا، تو شرعی طور پر لڑکی تمام جائیداد کی مالک بن چکی ہے، لہٰذا کل جائیداد میں سے ایک تہائی لڑکی کی ماں کو ملے گا اور دو تہائی لڑکی کے چچا تایا وغیرہ کو ملے گا اور بیوہ کے انتقال کے بعد بیوہ کا حصہ اس کے والدین کو ملے گا۔ اور اگر والدین نہیں ہیں، تو اس کے بھائی بہنوں کو شرعی حصہ کے اعتبار سے ملے گا۔ اور اگر بھائی بہن بھی نہیں ہیں تو بھتیجوں کو ملے گا۔

أولهم بالميراث جزء الميت، أي البنون، ثم بنوهم وإن سفلوا، ثم أصله، أي الأب، ثم الجد، أي أب الأب وإن علا، ثم جزء أبيه، أي الإخوة، ثم بنوهم وإن سفلوا. (سراجي، ص: ۲۲)

تنعقد الهبة بالإيجاب والقبول، وتتم بالقبض الكامل؛ لأنها من

التبرعات، والتبرع لا يتم إلا بالقبض. (شرح المجلة رستم باز، إتحاد ديوبند ١/ ٤٦٢، رقم المادة: ٨٣٧، شامي كراچی ٥/ ٦٩٠، زكريا ٨/ ٤٩٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍شعبان ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳۳۶/۲۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۱/۸/۷ھ

والدہ کا اپنی بیٹی اور نواسی کے نام مکان ہبہ کرنا

سوال [۹۴۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مکان محلّہ باغ گلاب رائے میں ہے، جو میری والدہ رئیسہ خاتون نے ۱۹۴۲ء میں خریدا تھا، میری والدہ رئیسہ خاتون کی چار اولادتھیں، دولڑکے، دولڑکیاں محمودہ خاتون، مقصودہ خاتون، افسر علی، ظفر علی، محمودہ خاتون افسر علی اور ظفر علی کا انتقال والدہ کی زندگی میں ہی ہوگیا تھا، میری والدہ رئیسہ خاتون کے چار بھائی تھے، ریاست علی، مختار علی، لیاقت علی، احسان علی، تین بھائیوں کا انتقال میری والدہ رئیسہ خاتون کی زندگی میں ہوگیا تھا، سب سے چھوٹے بھائی احسان علی کا انتقال رئیسہ خاتون کے بعد ہوا، ان کی شادی نہیں ہوئی تھی؛ کیوں کہ وہ دماغی کمزور تھے، میرے والد نے میری شادی کردی اور میں اور میرے شوہر والدہ کے ہی پاس رہتے تھے، شادی کے دوسال کے بعد میرے شوہر کے والد پاکستان جانے لگے، تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانے کو کہا؛ لیکن میری والدہ نے نہیں بھیجا، اس میں میری بھی مرضی تھی؛ کیوں کہ میں پاکستان جانا نہیں چاہتی تھی؛ لہٰذا میرے شوہر مجھے طلاق دے کر اپنے والدہ کے ہمراہ پاکستان چلے گئے، میری گود میں ایک لڑکی تھی فریدہ خاتون، میں اور میری بچی والدہ کے پاس رہتے رہے، میں نے دوسری شادی بھی نہیں کی، بچی فریدہ خاتون بڑی ہوگئی، میری والدہ نے یہ سوچتے ہوئے کہ میرے والد یا والدہ کا کوئی عزیز میری والدہ کے بعد مجھے مکان کے بارے میں نہ ستائے؛ اس لئے والدہ نے اپنی زندگی میں ہی مکان کو میرے اور میری بچی

فریدہ خاتون کے نام بذریعہ رجسٹری ہبہ کردیا، والد نے فریدہ کی شادی بھی کردی،فریدہ اور اس کے شوہر اس مکان میں رہتے ہیں؛ کیوں کہ آدھا فریدہ خاتون کے نام ہبہ ہے، ہبہ کرنے کے تقریباً ۱۲؍سال بعد میری والدہ رئیسہ خاتون کا انتقال ہوا ہے؛ کیوں کہ میری والدہ نے اپنی زندگی ہی میں میرے اور فریدہ کے نام ہبہ کردیا تھا،تو اب والدہ یا والد کا کوئی عزیز حق دار تو نہیں بنتا،یہ بتایئے ؟ عین نوازش ہوگی۔

المستفتية: مقصودہ خاتون وفریدہ خاتون، محلّہ باغ گلاب رائے، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مذکورہ حالات میں پورا مکان آپ کی والدہ کی ملکیت تھی اور جب انہوں نے زندگی میں آپ کو اور آپ کی لڑکی کو باقاعدہ ہبہ کر کے قبضہ دے دیا اور اس میں آپ اور آپ کی لڑکی مع شوہر کے رہنے لگیں تو شرعی طور پر وہ مکان آپ ہی دونوں کا ہوگیا،اس میں کسی کا کوئی حق باقی نہیں رہا۔

الهبة: عقد مشروع –إلى قوله– والعقد ينعقد بالإيجاب والقبول، وقبضه لابد منه لثبوت الملك. (هداية، كتاب الهبة، أشرفي ديوبند ۳/ ۲۸۲ شرح المجلة رستم باز، إتحاد ديوبند ۱/ ٤٦٢، رقم المادة: ۸۳۷، درمختار كراچی ٥/ ٦٨۸، زكريا ۸/ ٤٩٣، هندية، زكريا قديم ٤/ ۳۷۷، جديد ٤/ ۳۹۹، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ٤٩۱، بدائع الصنائع، كراچی ٦/ ۱۲۳، زكريا ٥/ ۱۷٦) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/۱۲/۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۲۶۲/۳۲)

والدہ کا دو بیٹوں سے قرض معاف کر کے بقیہ سے وصول کر کے دوسروں کو دینا

سوال [۹۴۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: والدہ اور ۶؍بیٹوں کے درمیان مشترکہ کاروبار میں والدہ کے پیسے ہر بیٹے کے پاس نکل

رہے ہیں، والدہ نے اپنے دو بیٹوں کے اوپر سے واجب پیسوں کو معاف کردیا اور بقیہ بیٹوں سے اپنے پیسے لے کر انہیں دو بیٹوں کو دینا چاہتی ہیں، تو کیا والدہ کا ایسا کرنا درست ہے یانہیں؟ دوبیٹوں کے علاوہ کے ساتھ ناانصافی تونہیں ہے؟ شرعی حکم واضح فرمائیں۔

المستفتی: محمد سلیم کلکتہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ماں باپ پر اپنی حیات میں اولاد کو کچھ روپے پیسے یا دیگر اموال وجائیداد ہبہ کرنے میں برابری کرنا لازم ہے، برابری نہ کرنے کی صورت میں والدین گنہگار ہوں گے؛ لہٰذا مسئولہ صورت میں والدہ کا صرف دو بیٹوں کا قرض معاف کرنا اور بقیہ چار لڑکوں سے قرض وصول کر کے ان ہی دو لڑکوں کو ہبہ کردینا ناانصافی ہے، ایسا کرنے کی وجہ سے والدہ گنہگار ہوں گی؛ البتہ اگر وہ چاروں بیٹے والدہ کے نافرمان ہوں اور والدہ ان سے ناراض ہوں، تو وہ ان بیٹوں کے ساتھ مذکورہ معاملہ کرسکتی ہیں۔

عن النعمان بن بشير –رضي الله عنه– أنه قال: أن أباه أتى به رسول الله ﷺ، فقال: إني نحلت ابني هذا غلاما كان لي، فقال رسول الله ﷺ: أكل ولدك نحلته مثل هذا؟ فقال: لا، فقال رسول الله ﷺ: فارجعه. (مسلم، باب كراهة تفضيل بعض الأولاد في الهبة، النسخة الهندية ٢/ ٣٦، بيت الأفكار، رقم: ١٦٢٣)

يكره تفضيل بعض الأولاد على البعض في الهبة حالة الصحة إلا لزيادة فضل له في الدين، وإن وهب ماله كله لواحد جاز قضاء، وهو آثم. (البحرالرائق، كتاب الهبة، كوئٹه ٧/ ٢٨٨، زكريا ٧/ ٤٩٠، هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦، قاضيخان، زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍شعبان ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۱۷۱)

زندگی میں بحالت صحت اپنی اولاد کو کچھ دینا

سوال [۹۴۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گزارش یہ ہے کہ ہمارے والد صاحب نے اپنے ذاتی سرمایہ سے ایک مکان خریدا تھا، ان کی اولاد میں صرف ہم دولڑکیاں ہیں اور ہماری والدہ صاحبہ ہمارے والد صاحب کے دو بھائی ایک بہن ہے، ہمارے والد صاحب نے اپنی اور والدہ صاحبہ کی زندگی میں چند احباب کے سامنے ہبہ زبانی کردیا اور ہم دونوں بہنوں کا اس مکان پر قبضہ بھی دے دیا اور کہہ دیا کہ اس مکان کی مالک ومختار دونوں میری بیٹیاں ہیں اور مکان میں برابر برابر حصہ دار ہیں، والد صاحب کے مرنے کے بعد ہمارے چچا صاحب نے ہم پر اور والدہ صاحبہ پر تقسیم مکان کا عدالت میں دعویٰ کردیا اور کہا کہ ہم بھی حصہ دار ہیں، اس کے بعد ہمارے چچا صاحب کا انتقال ہوگیا اور کچھ عرصہ بعد ہماری والدہ صاحبہ کا بھی انتقال ہوگیا، پھر چچا کے وارثوں میں سے چچا کی بیوی یعنی ہماری چچی اور ان کی ایک لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ علیحدہ مکان میں رہتی ہیں اور چچا نے دو کو وارث بنادیا، اب بتائیے گا کہ یہ دعوئے تقسیم اور یہ وارثان قائم کرنا جائز ہے اور کس طرح جائز ہے؟ یا اس مکان میں ان کا حصہ شرعاً ہے یا نہیں؟

المستفتیہ: دختران قمر جہاں وچندہ بیگم، فیل خانہ تحصیل اسکول، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر والد صاحب نے اپنی زندگی میں بحالت صحت دونوں لڑکیوں کو ہبہ کرکے قبضہ دے دیا ہے، تو شرعی طور پر دونوں لڑکیاں مالک ہوچکی ہیں، اس میں اب کسی کا کوئی حق وابستہ نہ ہوگا۔

عن النضر بن أنس قال: نحلني أنس نصف داره، قال: فقال أبو بردة: إن سرک یجوز ذلک فاقبضه، فإن عمر بن الخطاب –رضي اللّٰه عنه– قضی في الأنحال أن ما قبض منه، فهو جائز، وما لم یقبض، فهو

میراث، قال: فدعوت یزید الرشک، فقسمها. (السنن الکبری للبیهقي، الهبات، باب ماجاء في هبة المشاع، دارالفکر ۹/ ۱۵۸، رقم: ۱۲۱۸۶)

والقبض لابد منه لثبوت الملک الخ. (هدایة، کتاب الهبة، أشرفي دیوبند ۳/ ۲۸۳، مختصر القدوري، ص: ۱۳۵)

لہٰذا اب عدالت کے ذریعہ اگر زبردستی حصہ دار بنتا ہے، تو وہ غاصب ہوگا۔

عن أبي حمید الساعدي، أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: لا یحل لامرئ أن یأخذ مال أخیه بغیر حقه، وذلک لما حرم الله مال المسلم علی المسلم. (مسند أحمد بن حنبل ۵/ ۴۲۵، رقم: ۲۴۰۰۳)

لا یجوز لأحد أن یأخذ مال أحد بلا سبب شرعي. (قواعد الفقه، أشرفي ۱۱۰، رقم المادة: ۲۶۹، شرح المجلة رستم، إتحاد ۱/ ۶۲، رقم المادة: ۹۷) **فقط واللہ** سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم جمادی الاخریٰ ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۷۳۱)

کسی ایک وارث کے نام مکان ہبہ کرنا

سوال [۹۴۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمد احمد مرحوم کے پاس ۹۸ رگز جگہ تھی، جس میں سے ۴۹ رگز اپنے چھوٹے بھائی کو دی تھی اور ۴۹ رگز جگہ اپنی بھتیجی کو (محمدی بیگم) کو دی، انہوں نے اپنا حصہ بیچ دیا اور اسی رقم سے کرولہ پر ۶۲ رگز کا بنا ہوا مکان خریدا۔ محمدی بیگم بیوہ ہیں، ان کے دو لڑکے ہیں اور دو لڑکیاں ہیں، سب کی شادی ہوچکی ہے، یہ چاہتی ہیں کہ ۶۲ رگز کا مکان اپنے چھوٹے بیٹے کے نام کردیں اور اسی لڑکے کے ساتھ رہتی ہیں، کیا شرعی اعتبار سے ان کے لئے ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

نوٹ: محمدی بیگم کی یہ جائیداد ان کے چچا سے ملی ہوئی ہے، شوہر کی یہ جائیداد نہیں ہے، اس صورت کا بھی لحاظ رکھا جائے۔

المستفتی: محمد فیصل کوہ نور تراہہ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: محمدی بیگم کا ۶۲ گز کا مکان اس کی ملکیت ہے، اس کے مرنے کے بعد اس کے چاروں بچے شرعی حق دار بنیں گے، صرف ایک بچے کو دے کر دوسروں کو محروم کرنا ماں کی طرف سے ظلم ہے، جب کہ دوسرے بچے نافرمان نہ ہوں، ہاں البتہ دوسروں کی مرضی سے کچھ حصہ چھوٹے بچے کو زائد دینا درست ہوسکتا ہے، دوسرے بچے جب کہ نافرمان نہ ہوں، ان کو سرے سے محروم کر دینا شریعت میں مشروع نہیں ہے۔

عن النعمان بن بشير –رضي الله عنه– أن أباه أتى به إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: إني نحلت ابني هذا غلاما، فقال: أكل ولدك نحلت مثله؟ قال: لا، قال: فارجعه. (بخاري شريف، كتاب الهبة، باب الهبة للولد الخ ١/ ٣٥٢، رقم: ٢٥١٤، ف: ٢٥٨٦)

عن أنس بن مالك –رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: من فر من ميراث وارثه قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة. (سنن ابن ماجة، باب الحيف في الوصية، النسخة الهندية ٢/ ١٩٤، دارالسلام، رقم: ٢٧٠٣، مشكوة/ ٢٦٦)

وروى المعلى عن أبي يوسف أنه لا بأس به إذا لم يقصد به الإضرار، وإن قصد به الإضرار سوى بينهم ...... وهو المختار. (هندية، كتاب الهبة، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا جديد ٤/ ٤١٦، قديم ٤/ ٣٩١، قاضي خان، زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩، بزازية، زكريا جديد ٣/ ١٢٣، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٣٧، البحرالرائق، كوئٹه ٧/ ٢٨٨، زكريا ٧/ ٤٩٠، شامي زكريا ٨/ ٥٠١، كراچی ٥/ ٦٩٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ ذیقعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۹۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۶/ ۱۱/ ۱۴۳۴ھ

والد کی جانب سے بیٹے کو ہبہ کرنے کی ایک صورت کا حکم

سوال [۹۴۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: والد صاحب نے مجھ کو ۳۶ رگز زمین میں مکان بنا کر علیحدہ کر دیا تھا اور میں نے اس میں اپنے طور پر بڑی جفاکشی سے کافی تصرفات والد صاحب کی زندگی ہی میں کر لئے تھے اور اس کو دو تین منزلہ بنا لیا تھا، میں نے اس مکان میں والد صاحب کی تقریباً بیس بائیس سالہ زندگی گذار دی، اب گذشتہ سال والد صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے، واضح رہے کہ زمین کا بیع نامہ والد صاحب ہی کے نام ہے اور والد صاحب کی اس کے علاوہ بھی کچھ زمین ہے، جس میں دو بھائی رہتے ہیں، اس میں دریافت یہ کرنا ہے کہ والد صاحب نے جو اپنی زندگی میں ۳۶ رگز میں مکان بنا کر مجھے علیحدہ کر دیا تھا اور اس میں ان کی بیس بائیس سالہ زندگی میں تصرفات کرتا رہا، تو کیا شرعاً یہ میرے لئے ہبہ ہے یا نہیں؟ یا میرے دو بھائی اور دو بہنیں بھی اس میں حق دار ہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

المستفتی: نثار احمد، نگینہ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: والد صاحب کے مکان دینے پر جو آپ نے اس میں تصرفات کئے ہیں اور والد صاحب نے اس پر کوئی روک تھام نہیں کی اور نہ دیگر بھائی بہنوں نے اس پر کوئی اشکال ونکیر کی، تو یہ ہبہ پر دال اور قرینہ ہے؛ لہٰذا اس طرح ہبہ کی تکمیل ہو گئی؛ اس لئے اب اس میں دوسرے ورثاء کا حق نہیں ہے۔

عن النضر بن أنس قال: نحلني أنس نصف داره، قال: فقال أبو بردة: إن سرک یجوز ذلک فاقبضه، فإن عمر بن الخطاب – رضي الله عنه – قضی في الأنحال أن ما قبض منه، فهو جائز، وما لم یقبض، فهو میراث، قال: فدعوت یزید الرشک، فقسمها. (السنن الکبری للبیهقي، الهبات، باب ماجاء في هبة المشاع، دارالفکر ۹/ ۱۵۸، رقم: ۱۲۱۸۶)

والمراد بالقبض الكامل في المنقول ما هو المناسب، وفي العقار أيضا ما يناسبه. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۴۹۲، مصري قديم ۲/ ۳۵۴، شرح المجلة رستم، مكتبه إتحاد ۱/ ۴۶۳، رقم المادة: ۸۳۷، بدائع الصنائع، زكريا ۴/ ۴۹۸، كراچی ۵/ ۲۴۴)

هي لک حلال لا يكون هبة إلا إذا دلت قرينة على إرادتها. (بزازية، كتاب الهبة، الباب الأول، زكريا جديد ۳/ ۱۲۳، وعلى هامش الهندية ۶/ ۲۳۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ / جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۹۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/ ۵/ ۱۴۲۱ھ

لڑکے کو بھائی بہنوں کی رضامندی سے مکان ہبہ کرنا

سوال [۹۴۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسئلہ درپیش یہ ہے کہ ہمارے والد صاحب نے اپنی حیات میں چند پراپرٹیاں خریدی تھیں، ان میں سے ایک مکان انہوں نے ہماری والدہ کو ہبہ کردیا تھا، جو والدہ کے تصرف میں تھا، والد صاحب نے الحمد للہ ہماری بہنوں کی شادیاں بڑے اچھے طریقہ سے کردی تھیں اور اپنے تین بیٹوں میں سے بڑے کی شادی کردی تھی، عمر کے آخری دور میں والد صاحب نے اپنی پراپرٹیوں میں سے بڑے بھائی (بیٹے) کو ایک دوکان، گوڈاؤن مع اموال تجارت دے کر ہبہ کردیا اور درمیانی بھائی کو ایک فلیٹ دے دیا اور چھوٹے بھائی کو دینے کے لئے کچھ نہیں تھا، تو والدہ نے کہا کہ میں یہ مکان چھوٹے کو دوں گی، یہ بات شروع سے کہی جارہی ہے اور سب جانتے ہیں کہ والدہ اپنا مکان چھوٹے کو ہی دیں گی، یہ اس کا حق ہے، الحمد للہ ساری بہنیں خوشحال ہیں اور اس طرح والد والدہ کی تقسیم پر راضی ہیں۔

والدہ نے چھوٹے بیٹے سے کئی مرتبہ کہا کہ یہ مکان تمہارا ہی ہے؛ لیکن مکمل ہبہ عمل میں نہیں آیا تھا کہ والدہ کی طبیعت بگڑ گئی اور انہیں تقریباً آج سے ۸-۹/ مہینے پہلے لقوہ کا جھٹکا آیا، علاج ہوا اور طبیعت سنبھل گئی؛ لیکن پھر تقریباً تین ماہ بعد لقوہ کا بڑا جھٹکا آیا اور والدہ بستر پر آ گئیں، فی الحال یہ حال ہے کہ زبان سے صاف بول نہیں سکتیں، کھانا وغیرہ خود پوری طرح کھا نہیں سکتیں، ہم کھلاتے ہیں، طبیعت کئی مرتبہ اچھی ہوئی، پھر خراب ہوئی، یہی معاملہ چل رہا ہے، اس طرح تقریباً ۸-۹/ ماہ ہو چکے ہیں۔

چند دنوں پہلے گھر والوں میں یہ بات نکلی کہ دوسرے بیٹوں کو تو ان کے مطابق کچھ نہ کچھ مل گیا، چھوٹے بیٹے کو تو ابھی تک کچھ نہیں ملا۔ اور والدہ کی حیات میں ان کے گھر کے متعلق فیصلہ ہو جائے اور وہ مکان چھوٹے بیٹے کو دے دیں، تو اس چھوٹے کو بھی کچھ نہ کچھ مل جائے گا؛ لہٰذا گھر والوں نے ارادہ کیا کہ والدہ سے پوچھا جائے (الحمدللہ والدہ سب کچھ پوری طرح سمجھتی ہیں) چنانچہ پوچھا گیا کہ کیا وہ اپنا مکان (جو فی الحال کرائے پر دیا ہوا ہے) چھوٹے بیٹے کو دیتی ہیں، تو انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا کہ ہاں دیتی ہوں، دراصل ان سے کہا گیا تھا کہ اگر دینا ہو تو ہاتھ اٹھاؤ اور نہ دینا ہو تو ہاتھ نہ اٹھاؤ، خیر انہوں نے اشارہ سے ہبہ کر دیا اور اب سب کا ارادہ ہے کہ پیپر بنا کر ان کے انگوٹھے کا نشان لے لیا جائے۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ کئی سالوں سے چھوٹا بیٹا والدہ کے اس مکان کا سالانہ ٹیکس اور ماہانہ میٹینیس بھرتا ہے، کیوں کہ وہ یہی سمجھ رہا ہے کہ گھر تو اسی کا ہے اور اسی کا ہوگا اور والدہ بھی خوش رہیں ان پر کوئی بوجھ نہ ہو، مگر اب چھوٹے بیٹے کے ذہن میں یہ بات آ رہی ہے کہ اس حالت میں جو ہبہ ہو رہا ہے وہ معتبر ہے یا نہیں؟ کہیں یہ مرض الموت تو نہیں؟ حالانکہ یہ کہا نہیں جا سکتا کہ یہ مرض الوفات ہے؛ لیکن بہر حال ہو تو کچھ بھی سکتا ہے۔ اور اگر بالفرض مرض الوفات ہو اور والدہ خود اور دیگر بھائی بہن تقریباً سب اس ہبہ پر راضی ہوں تو کیا حکم ہوگا؟ نیز کوئی متبادل شکل ہو جس سے گھر چھوٹے بیٹے کو مل جائے، کیا ہو سکتی ہے؟ کیا کچھ رقم کے عوض چھوٹا بیٹا وہ مکان اپنی والدہ سے خرید لے تو یہ شکل ہو سکتی ہے مرض الوفات کے ہبہ سے بچنے کی؟

تفصیل بالا سے آپ حالات سے بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ والدہ اورسب مکان دینا چاہتے ہیں، تو کون سی شکل اختیار کی جائے؟ براہ کرم جواب عنایت فرما کرعنداللہ ماجور ہوں۔

المستفتی:عبدالرشید،اندھیری،ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ کی تفصیل کے مطابق جب والدہ وہ مکان چھوٹے بیٹے کو دے رہی ہیں اوراس پر سب بھائی بہن راضی ہیں، تو ایسی صورت میں اگر مرض الوفات ہی کیوں نہ ہو یہ ہبہ جائز اور درست ہوگا۔ اور بہتر یہی ہے کہ ایک کاغذ پر اس ہبہ کی وضاحت لکھ کراس میں سب بھائی بہنوں کے دستخط کرا لئے جائیں، تاکہ بعد میں کسی قسم کا شک وشبہ باقی نہ رہے۔

لو أجاز الورثة هبة المريض بعد موته صح. (شرح المجلة رستم ١/ ٤٨٤، رقم المادة: ٨٧٩)

إن هبة المريض في مرض الموت لأحد ورثته لا تجوز إلا أن يجيزها الورثة الباقون بعد موت الواهب. (شرح المجلة لخالد الأتاسي ٣/ ٤٠٣، بحواله فتاوی محموديه مطبوعه ڈابهيل ١٦/ ٤٨٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ ؍رجب ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر:۳۹/۱۰۱۵۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵؍۷؍۱۴۳۱ھ

بڑے لڑکے کے نام بندوق منتقل کرنا

سوال [۹۴۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ساجد نے اپنی بندوق اپنے بڑے لڑکے فیصل کے نام پر منتقل کردی ۱۹۷۲ء میں، جب کہ ساجد کے دولڑکے عادل اورزاہد نابالغ تھے، جن کی عمر علی الترتیب ۹؍اور ۷؍سال تھی، پھر ۱۹۷۸ء

میں بڑے لڑکے فیصل کی شادی کردی، ۱۹۸۰ء میں فیصل کو علیحدہ کردیا اور ۱۹۸۴ء میں ساجد کا انتقال ہوگیا، تو کیا بندوق میں فیصل اور عادل اور زاہد تینوں حصے دار ہوں گے یا نہیں؟

المستفتی: صبغت اللہ خان سٹھلہ موانہ، میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ساجد نے اگر اپنی بندوق اپنے بڑے لڑکے فیصل کے نام پر منتقل کر کے اپنی زندگی ہی میں اس پر اس کا قبضہ دے دیا تھا، تو ہبہ تام ہونے کی وجہ سے اس میں عادل اور زاہد حصہ دار نہیں ہوں گے؛ لیکن اگر بغرض حفاظت دیگر دونوں نابالغ لڑکوں کو چھوڑ کر فیصل کے نام منتقل کیا ہے کہ میرے مرنے کے بعد سرکار بندوق پر قبضہ نہ کرلے اور نہ ہی اس پر فیصل کا قبضہ دلایا ہے، تو بندوق میراث ہے اور تینوں بھائی اس میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ (فتاوی محمودیہ قدیم ۸/ ۳۴۵، جدید ڈابھیل ۱۶/ ۴۹۵)

عن عبدالرحمن بن عبدالقاري، أن عمر بن الخطاب –رضي الله عنه– قال: ما بال أقوام ينحلون أولادهم نحلة، فإذا مات أحدهم قال: مالي في يدي، وإذا مات هو قال: قد كنت نحلته ولدي، لا نحلة إلا نحلة يحوزها الولد دون الوالد، فإن مات ورثه. (سنن الكبرى للبيهقي الهبات، باب يقبض للطفل أبوه، دارالفكر ۹/ ۱۵۶، رقم: ۱۲۱۷۹)

بيع التلجئة: البيع الصوري أن يضطر لإظهار عقد وإبطان غيره مع إرادة ذلک الباطن كأن يظهر بيع داره لئلا يستولى عليها السلطان. (مجمع لغة الفقهاء، کراچی، ص: ۱٤٤)

دفع مالا لابنه ليتصرف فيه، ففعل و كثر ذلک، فمات الأب إن أعطاه هبة، فالكل له وإلا فميراث. (الدر مع الرد، كتاب الهبة، باب الرجوع في الهبة، زکریا ۱۲/ ٦٦٦، کراچی ٥/ ۷۰۹)

وإن لم يعطه هبة بأن أعطاه قرضا أو دفع إليه ليعمل للأب فميراث.

(تكملة شامي، كتاب الهبة، باب الرجوع في الهبة، زكريا ١٢/ ٦٦٦، كراچی ٨/ ٤٩٩)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱/۷/۱۴۱۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۴۱۰۴)	۴/۷/۱۴۱۵ھ

زندگی میں صرف ایک بیٹے کو جائیداد دینا

سوال [۹۴۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: والدین نے اپنی حیات میں کچھ زمین اپنی اولادوں میں سے ایک لڑکے مظہر الحق کو دے دی تھی اوراس زمین کی رجسٹری بھی مظہر الحق کے نام کرادی تھی اور پھر زندگی میں ہی اس پر قبضہ ودخل بھی دے دیا تھا، اب والدین کے انتقال کے بعد اس رجسٹری شدہ زمین میں دیگر ورثاء حصہ کا مطالبہ کررہے ہیں، جب کہ اس زمین کے علاوہ بھی دیگر زمین ومکان وغیرہ والدین کے ترکہ میں ہے جو سب اولادوں میں تقسیم ہو چکا ہے، اب دریافت یہ کرنا ہے کہ اس مظہر الحق کی رجسٹری والی زمین میں دیگر ورثاء کا حق ہوگا یا صرف مظہر الحق ہی اس کا مالک ہوگا، شرعی حکم واضح فرمادیں؟

المستفتی: مظہر الحق سفیر جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: والدین کی زندگی میں ان کے مال وجائیداد میں کسی وارث کا کوئی حق نہیں تھا اور والدین کو اپنے مال میں ہر طرح تصرف کرنے کا حق تھا؛ لہٰذا اگر واقعی انہوں نے اپنی حیات میں جیسا کہ سوال نامہ میں وضاحت ہے اپنی کچھ زمین اپنے ایک لڑکے مظہر الحق کو ہبہ کر کے اس کے نام رجسٹری کرادی تھی اور قبضہ ودخل بھی دے دیا تھا، تو بلا شبہ اس زمین کا مالک تنہا مظہر الحق ہے، دیگر وارثین کا اس زمین میں شرعاً کسی طرح کا کوئی حق نہیں ہے اور نہ ہی ان کے لئے اس زمین میں سے اپنا حصہ مانگنا جائز ہے۔

كل يتصرف في ملكه كيف شاء. (شرح المجلة رستم باز، إتحاد ديو بند ١/ ٦٥٤، رقم المادة: ١١٩٢)

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء. (بيضاوي شريف، سورة الفاتحة، كتب خانه رشيديه دهلي ١/ ٧)

وشرائط صحته في الموهوب أن يكون مقبوضا غير مشاع مميزا غير مشغول. (شامي، كتاب الهبة، كراچی ٥/ ٦٨٨، زكريا ٨/ ٤٨٩)

وتتم الهبة بالقبض الكامل. (شامي، كراچی ٥/ ٦٩٠، زكريا ٨/ ٤٩٣)

وتتم بالقبض الكامل؛ لقوله عليه السلام: لا تجوز الهبة إلا مقبوضة. (مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍رجب المرجب ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۱۸۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸؍۷؍۱۴۳۴ھ

چھوٹے بھائی کا بڑے بھائی کی دوکان کو پختہ بنا کر رقم لینا

سوال [۹۴۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ساجد کے انتقال کے بعد گھر کی تمام ذمہ داری بڑے لڑکے فیصل پر تھی اور تینوں لڑکے بے روزگار تھے؛ لہٰذا سب نے متفق ہوکر گھر کا بیع نامہ کر دیا اور جو قرض اس درمیان لیا اس کو ادا کر دیا اور باقی رقم ایک بھائی کو دے دی اور ڈرائیوری کے لئے سعودی عرب بھیج دیا اور اس کے لئے بھی کچھ قرض لینا پڑا، تاکہ وہ سعودیہ جاکر کمائے اور بڑے بھائی فیصل کو برائے روزگار دوکان کرا دے، اب چونکہ ساری ذمہ داری اس سعودیہ والے پر تھی، تو اس نے گھر کے خرچ کے لئے وہاں سے روپئے بھیجے اور جب واپس آیا تو بڑے بھائی کے حصہ کی دوکان کو پختہ کرا دیا اور بڑے بھائی نے بینک سے قرض لے کر

خرید وفروخت کا سامان رکھ لیا، اب کافی عرصہ کے بعد دوکان میں لگائی ہوئی رقم واپس مانگتا ہے، تو کیا یہ رقم اس کو مانگنے کا شریعت میں حق ہے یا نہیں؟

المستفتی: صبغت اللہ خان سٹلہ موانہ، میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں جب انہوں نے اپنے بڑے بھائی فیصل کے بغیر طلب کئے اس کی خام دوکان پکی بنادی اور اخراجات لئے بغیر دوکان اسکو سپرد کردیا اور نہ ہی بعد میں لینے کی کوئی شرط لگائی ہے، تو ہبہ تام ہوگیا؛ لہٰذا وہ اب اس رقم کو اپنے بڑے بھائی فیصل سے واپس لینے کا حق دار نہیں ہے۔

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: قال النبي ﷺ: العائد في هبته كالعائد في قيئه. (صحيح البخاري، هبة، باب لا يحل لأحد أن يرجع في هبته وصدقته، النسخة الهندية ١/ ٣٥٧، رقم: ٢٥٤٧، ف: ٢٦٢١)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: الرجل أحق بهبته مالم يثب منها. (سنن ابن ماجة، باب من وهب هبته رجاء ثوابها، النسخة الهندية ٢/ ١٧٢، دارالسلام، رقم: ٢٣٨٧)

ليس له حق الرجوع بعد التسليم في ذي الرحم المحرم. (عالمگيري، كتاب الهبة، الباب الخامس في الرجوع في الهبة، زكريا جديد ٤/ ٤٠٩، قديم ٤/ ٣٨٥)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم رجب ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۴۱۰۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۷/۴ھ

صرف ایک بھائی کی اولاد پر خرچ کرنے کا حکم

سوال [۹۴۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: حاجی عبدالعزیز صاحب جو زندہ ہیں، ان کی ایک بیوی ہے، اور کوئی اولاد نہیں، اپنے ایک بھتیجے محمد شریف کو گود میں لے کر پالا ہے اور شریف کے علاوہ دوسرے بھتیجے بھی ہیں، حاجی صاحب موصوف اپنی ملکیت جائیداد نقد رقم سب شریف احمد کی اولاد پر خرچ کیا کرتے ہیں، دوسرے بھتیجوں پر خرچ نہیں کرتے، تو حاجی صاحب کے لئے جائز ہے اور حاجی صاحب کی ایک بہن بھی ہے، کیا بہن کا بھی حق ہوگا یا نہیں؟ صاف صاف واضح فرمائیں اور حاجی عبدالعزیز صاحب کے کوئی بھائی نہیں ہے صرف حاجی صاحب زندہ ہیں۔

المستفتی: عبدالعزیز، محلّہ پیرزادہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حاجی عبدالعزیز صاحب شرعاً اپنی تمام جائیداد اور نقد رقم کے خود مالک ہیں، اس میں کسی کا کوئی حق نہیں، حاجی صاحب موصوف اپنی زندگی میں جس پر چاہیں خرچ کریں اور جس پر چاہیں خرچ نہ کریں، ان پر کسی کو اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے؛ لہٰذا صرف شریف احمد کی اولاد پر خرچ کرتے رہیں اور دوسروں پر خرچ نہ کریں تو ان کو اختیار ہے۔ اور بہن کا اگر شوہر موجود ہے، تو اس کے اخراجات کا ذمہ دار شوہر ہوگا، حاجی صاحب پر کوئی ذمہ داری نہیں۔

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء من الملك.

(بیضاوي شريف، سورة الفاتحة، كتب خانه رشيديه دهلي ۱/ ۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱٦/ صفر ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱٦۴٦)

پوتی کو اپنی زندگی میں ہبہ کرنا

سوال [۹۴۵٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے ایک صاحبزادے نے پہلی زوجہ کو طلاق دے دی، اس کی چھوٹی بچی تھی، شاید عمر

ایک سال رہی ہوگی ، اس وقت اس کی پرورش کے لئے یکمشت رقم زوجہ کو دے دی گئی تھی ؛ لیکن ۷/سال بعد بچی کی پرورش وتعلیم کے سلسلہ میں صاحبزادے نے کوئی قدم نہیں اٹھایا اور بچی نانی کی دیکھ بھال میں پلتی رہی ہے،ادھر نانا کا بھی انتقال ہوگیا، مالی حالت بھی کوئی خاص نہیں، بچی کی تعلیم وغیرہ پر کوئی خاص توجہ کون دیتا نہ معلوم اس معصوم کا کیا حال ہے، یہ تو دو تین برس ہوئے بچی نے مجھے فون پر بتایا کہ ان کے والد کوئی خاص امداد نہیں کررہے ہیں، ایک ہزار روپیہ کچھ عرصہ پہلے بھجوایا تھا، میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ صاحبزادے مذکور کا جو شرعی حصہ میرے مکان میں ہوسکتا ہے وہ میں اس بچی کو منتقل کردوں، صاحبزادے مذکور کے پاس دہلی میں اپنے ذاتی دو تین مکان ہیں اور مالی حالت بھی اچھی خاصی ہے اور ان کی دوسری زوجہ سے دو لڑکے ہیں۔ کیا میری یہ سوچ بچی کی اشک شوئی کے لئے مناسب ہوگی یا میں خود جائز وارث کو محروم کرنے کا مجرم ٹھہروں گا کہ میری ذمہ داری اس بچی کو حق پہنچانے کی نہیں ہے یا ہے؟

المستفتی: تلخیص احمد قاضی ٹولہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس بچی کا سوال نامہ میں ذکر ہے،اس کے خرچ اخراجات شرعی طور پر باپ کے ذمہ لازم ہے، اور جب تک آپ زندہ ہیں تو آپ کی جائیداد میں کوئی بھی شرعی حصہ کا مالک نہیں ہے، آپ حالت صحت میں اپنی جائیداد میں سے جس کو چاہیں، جتنا چاہیں دے سکتے ہیں، اس بارے میں شرعاً آپ کو اختیار ہے اور یہ سوچ کر دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ کی موت کے بعد صاحبزادے کا جو شرعی حق بنے گا وہی آپ اس بچی کو دے دیں؛ کیوں کہ موت سے پہلے یہ فیصلہ کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے؛ اس لئے کہ یہ بھی ممکن ہوسکتا ہے کہ آپ کی موت سے پہلے صاحبزادے کی موت واقع ہوجائے، تو ایسی صورت میں صاحبزادہ آپ کا وارث ہی نہیں بنے گا، نیز مذکورہ بچی اپنے باپ کی اس طرح وارث شرعی ہے، جس طرح اس کی دوسری بیوی کی اولاد وارث ہوسکتی ہے، ایسی حالت میں

اس بچی کو بطور شفقت کے آپ اپنی مرضی سے اپنی ملکیت میں سے جو چاہیں، جتنا چاہیں دے سکتے ہیں، آخرت میں آپ کے اوپر اس بارے میں کسی قسم کی دار و گیر نہ ہوگی۔

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء. (بيضاوي ٦)

الملک ما من شأنه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص. (شامي، البيوع، مطلب في تعريف المال، زكريا ٧/ ٢٣٥، كراچی ٥/ ٥٠)

أما إذا كان الولد أنثى، فإن نفقتها تجب على والدها سواء كانت صغيرة أو كبيرة. (الفقه على المذاهب الأربعة مكمل، ص: ١٠٩٠)

قال مشايخ بلخ: الإرث يثبت بعد موت المورث. (البحرالرائق، كتاب الفرائض، زكريا ٩/ ٣٦٤، كوئٹه ٨/ ٤٨٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۳۸۳/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۱/۱۶ھ

یتیم پوتے پوتیوں کے ساتھ حسن سلوک کا طریقہ

سوال [۹۴۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک لڑکے کا انتقال ہوگیا اپنے باپ کی زندگی میں، اس لڑکے کی اولادیں موجود ہیں، اور دیگر بھائی بہن بھی ہیں، تو دادا کو اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہئے؟ کیا جائیداد سے کچھ دینا چاہئے یا اس حقیقی اولاد کو دیں؟

المستفتی: عبد اللہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسی صورت میں دادا کو چاہئے کہ مرحوم بیٹے کی اولاد کو جتنا حصہ بھی دینا ہوگا اتنے کا ہبہ کر کے ان کو قبضہ دے کر مالک بنا دے، اس طرح مرحوم بیٹے کی اولاد محروم نہ ہوں گی، اگر ایسا نہ کیا گیا تو دادا کے انتقال کے بعد پوتیوں کو کچھ بھی نہ ملے گا۔

عن النضر بن أنس قال: نحلني أبي نصف داره، فقال أبو بردة: إن سرك أن تجوز ذلک فاقبضه، فإن عمر بن الخطاب -رضي الله عنه- قضی في الأنحال ما قبض منه فهو جائز، وما لم يقبض منه فهو ميراث.
(المصنف لابن أبي شيبة، البيوع والأقضية من قال: لا تجوز الهبة إلا مقبوضة، موسسة علوم القرآن، جديد ١٠/ ٥٢١، رقم: ٢٠٥٠٢)

وتتم الهبة بالقبض الكامل. (درمختار علی الشامي، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٤٩٣، كراچی ٥/ ٦٩٠، هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٧٧، جديد ٤/ ٣٩٩، هداية، اشرفی ٣/ ٢٨٣، مختصر قدوري، ص: ١٣٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍شعبان ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳٦/۷۳۴۱)

متوفی لڑکے کا حصہ اس کی اولاد کو دینا

سوال [۹۴۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص جس کے پانچ لڑکے تھے، ان میں سے ایک لڑکے کا انتقال ہوگیا، اب وہ شخص چاہتا ہے کہ اپنی زندگی میں اپنی جائیداد تقسیم کرے تو کیا وہ شخص اپنے متوفی لڑکے کا حصہ اس کی اولاد یعنی اپنے پوتوں کو دے سکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: جاوید احمد، بمبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ شخص اپنی زندگی میں ساری جائیداد اور ساری دولت کا مالک ہے، مرحوم بیٹے کی اولاد شخص مذکور کی وارث نہیں ہوگی؛ اس لئے اپنی زندگی میں ان پوتوں کو جو کچھ بھی ہبہ کرکے قبضہ دے دے گا تو پوتے اس کے مالک ہوسکتے ہیں، اس کے بعد بقیہ جائیداد موجودہ چاروں بیٹوں کے درمیان برابر تقسیم کرکے دے سکتے ہیں۔

کل یتصرف في ملکه کیف شاء. (شرح المجلة تسلیم رستم باز، إتحاد دیوبند ۱/ ٦٥٤، رقم المادة: ۱۱۹۲)

المالک هو المتصرف في الأعیان المملوکة کیف شاء. (بیضاوي، کتب خانه رشدیه دهلی ۱/ ۷)

لأن الملک ما من شأنه أن یتصرف فیه بوصف الاختصاص. (شامي، کتاب البیوع، مطلب في تعریف المال والملك والمتقوم، کراچی ٥/ ٥٠٢، زکریا ۷/ ۱۰)

وتتم الهبة بالقبض الکامل. (شامي، کتاب الهبة، زکریا ۸/ ٤٩٣، کراچی ٥/ ٦٩٠، هدایة، اشرفی ۳/ ۲۸۳، هندیة، زکریا قدیم ٤/ ۳۷۷، جدید ٤/ ۳۹۹، مجمع الأنهر، دار الکتب العلمیة بیروت ۳/ ٤٩۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۱۱۹/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۵/۱۷ھ

نانا کا تبرعاً نواسہ کو کچھ دینا

سوال [۹۴۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے نانا عبدالکریم حیات ہیں اور ہماری والدہ مصطفائی کا انتقال ہوگیا ہے، تو کیا میں اپنے نانا سے کچھ مانگ سکتا ہوں اور وہ ہمیں بطور احسان دے سکتے ہیں اور ہمارے ایک ماموں اور خالہ بھی ہیں؟

المستفتی: محمد سالم لال مسجد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب آپ کے نانا کی اولاد موجود ہے تو آپ اپنے نانا کے وارث نہیں بن سکتے اور نہ ہی بطور حق نانا سے مانگنے کا حق ہے؛ البتہ نانا کی مرضی ہے وہ چاہیں تو دے دیں اور چاہیں تو نہ دیں، آپ کو ان سے کسی طرح کے مطالبہ کا حق نہیں ہے۔

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء. (بيضاوي، كتب خانه رشديه دهلى ١/ ٧)

كل يتصرف في ملكه كيف شاء. (شرح المجلة تسليم رستم باز، إتحاد ديو بند ١/ ٦٥٤، رقم المادة: ١١٩٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ / جمادی الاولیٰ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۰۲۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶/ ۵/ ۱۴۱۵ھ

ماموں کا اپنے بھانجے کو زمین ہبہ کرنا

سوال [۹۴۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں محمد صدیق ولد بدھن نے دو نکاح کئے، جس میں سے پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا تھا، دوسری بیوی حیات ہے، جس کے پانچ لڑکے اور ایک لڑکی ہے اور پہلی بیوی سے صرف ایک لڑکا ہے، پہلی بیوی کا لڑکا جس کا نام شفیق احمد ہے، اس کے ماموں جو اس کی ماں کا سگا بھائی ہے شفیق کو زمین بطور ہبہ اسٹامپ پر لکھ دی تھی اور اس میں جتنے بھی روپئے آج تک لگے ہیں وہ سب شفیق نے صرف اپنی کمائی کے لگائے ہیں، اب شفیق کے والد محمد صدیق اپنے نام کرانا چاہتے ہیں، مہربانی کرکے اس کا فتویٰ ارسال کردیجئے۔

المستفتی: محمد اسلم پیر غیب، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: شفیق کو جو زمین اس کے ماموں نے بطور ہبہ اسٹامپ پر لکھ کردی تھی، اس پر شفیق کی ملکیت ثابت ہوچکی ہے؛ لہٰذا اب اس کی رضامندی کے بغیر وہ زمین اس سے کسی کا لینا جائز نہیں ہے۔

كما في الدر: وتتم الهبة بالقبض الكامل. (الدرالمختار، كتاب الهبة،

كراچی ٥/ ٦٩٠، زكريا ٨/ ٤٩٣، هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٧٧، جديد ٤/ ٣٩٩، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩١)

وحكمها ثبوت الملك للموهوب له غير لازم. (تنوير الأبصار، كراچی ٥/ ٦٨٨، زكريا ٨/ ٤٩٠، تاتارخانية، زكريا ١٤/ ٤١٣، رقم: ٢١٥٣٧)

عن أبي حميد الساعدي –رضي الله عنه– أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لايحل لمسلم أن يأخذ مال أخيه بغير حق. (مجمع الزوائد، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٧١)

وفي الشامية: لا يجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي. (الشامي، كتاب الحدود، مطلب في التعزير بأخذ المال، كراچی ٤/ ٦١، زكريا ٦/ ١٠٦، البحرالرائق، کوئٹه ٥/ ٤١، زكريا ٥/ ٦٨، الموسوعة الفقهية ٢١/ ١١٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۷۷۳/۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷؍۴؍۱۴۱۷ھ

نکاح کے موقع پر دیا جانے والا کپڑا نکاح سے پہلے پہننا

سوال [۹۴۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: نکاح کے وقت لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی کا جو کپڑا جاتا ہے، کیا نکاح ہونے سے پہلے لڑکی اس کپڑے کو پہن سکتی ہے؟ اگر لڑکی پہن لے تو اس کپڑے سے اس کی نماز درست ہے کہ نہیں؟

المستفتی: عبدالوحید مدرسہ اصلاح المسلمین مجھنا ملک، مہراج گنج، یوپی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بوقت نکاح لڑکے کی طرف سے جو کپڑا وغیرہ دیا جاتا ہے، وہ بطور ہبہ یا ہدیہ کے ہوتا ہے؛ لہٰذا قبضہ کرنے کے بعد اس کا استعمال درست ہے۔

وشرائط صحتها في الموهوب أن يكون مقبوضا غير مشاع مميزا غير مشغول كما سيتضح. (در مختار مع شامي، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٤٨٩، كراچی ٥/ ٦٨٨، مجمع الأنهر، مصري قديم ٢/ ٣٥٣، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩١، هندية، زكريا جديد ٤/ ٣٩٥، قديم ٤/ ٣٧٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ ؍صفر ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۶۰۴۳/۳۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۲/۲۹ھ

ہبہ کی ایک صورت کا حکم

سوال [۹۴۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مجیدن زوجہ علیم کا انتقال ۴؍مئی ۱۹۸۰ء میں ہوا، بوقت انتقال شوہر کو چھوڑا اور کوئی اولاد نہیں تھی، مجیدن کے والد والدہ کا انتقال بھی پہلے ہی ہو چکا تھا، مجیدن کے چار بھائی تھے: (۱) عبدالحمید (۲) نظیر (۳) مجید (۴) منو، ان میں سے مجید اور منو کا لاولد ہونے کی حالت میں انتقال ہوگیا تھا اور عبدالحمید اور نظیر کی اولاد موجود ہیں، ان چاروں بھائیوں کا انتقال مجیدن کی حیات ہی میں ہوگیا تھا، بھائی عبدالحمید کی اولاد میں چھ لڑکے ہیں اور ایک لڑکی ہے: (۱) عبدالوحید (۲) عبدالعزیز (۳) محمد رفیق (۴) محمد شفیق (۵) محمد شریف (۶) محمد جمیل۔ اور لڑکی منی اور نظیر کی اولاد میں دو لڑکے: (۱) صدیق (۲) بنے اور کوئی لڑکی نہیں ہے۔

اس کے بعد علیم زوج مجیدن کا انتقال بروز جمعرات ۴؍جون ۱۹۸۷ء کو ہوا، بوقت انتقال کوئی اولاد نہیں تھی، وارثین میں سے علیم کے دو بھتیجے (۱) پیر بخش (۲) معشوق علی اور ایک بھتیجی عقیدن موجود ہے۔

نوٹ: علیم نے اپنی حیات میں ایک جگہ خرید کر اپنی زوجہ مجیدن کے نام کردی تھی اور بیع نامہ کرا دیا تھا، اس کے بعد علیم نے یہ وصیت کرالی تھی کہ اس جگہ کی مالک جیتے جی مجیدن رہے گی

اورمرنے کے بعد میں (علیم) مالک رہوں گا، تو اس وصیت کا شرع شریف میں کیا حکم ہے؟ اور مجیدن کا ترکہ کس طرح تقسیم کیا جائے گا؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرما کرشکریہ کا موقع عنایت فرمائیں گے۔

المستفتی: معشوق علی، محلّہ کٹگھر اڑ پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر سائل اپنے بیان میں سچا ہے تو علیم نے جو جگہ خرید کر اپنی بیوی مجیدن کے نام کردی تھی اور یہ وصیت کی تھی کہ مجیدن صرف جیتے جی تک مالک رہے گی، اس کے بعد علیم خود اس کا مالک بن جائے گا اور بعد میں جو وصیت کی شکل ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ مجیدن کے نام کسی مصلحت کی بناء پر بیع نامہ کردیا تھا، اس قسم کی بیع کو اسلامی شریعت میں ''بیع تلجیہ'' کہتے ہیں، اس صورت میں مجیدن کے لئے ملکیت ثابت نہیں ہوگی، بلکہ علیم کی ملکیت ہی میں باقی رہی ہے، مجیدن کے ورثاء کو اس میں سے کچھ حق نہیں ملے گا، پوری جگہ علیم کے ورثاء کو ملے گی، یہی صورت سوال نامہ اور حالات سے بھی ثابت ہوتی ہے۔

(مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۷ - ۳۸)

وبيع التلجئة ويأتي متنا في الإقرار، وهو أن يظهر عقدا وهما لا يريدانه يلجأ إليه لخوف عدو، وهو ليس ببيع في الحقيقة، بل كالهزل.

(الدرالمختار، كتاب البيوع، باب الصرف، مطلب في بيع التلجئة، كوئٹه ٤/ ٢٧٢، كراچی ٥/ ٢٧٣، زكريا ٧/ ٥٤٢، هندية، زكريا قديم ٣/ ٢٠٩، جديد ٣/ ١٩٦، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ٢٤/ ١٢٢، بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٣٨٩، كراچی ٥/ ١٧٦)

اور اگر ۱۲؍شوال المکرّم ۱۴۰۷ھ میں لکھے ہوئے فتوے ۲۳/ ۴/ ۲۷؍ کے مطابق بیع نامہ کو مصلحت پر محمول نہ کیا جائے؛ بلکہ ہبہ حقیقی مان لیا جائے تو بعد میں علیم کی ملکیت میں لوٹ آنے کی شرط شرعاً باطل ہے، اس طرح کے معاملہ کو شریعت میں عمری کہا جاتا ہے۔ اور اس صورت

میں مجیدن کے ورثاء کو بھی حق مل جائے گا جو بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ما تقدم وعدم موانعِ ارث حسب ذیل طریقے سے تقسیم ہوگا:

مجیدن میـــــــــــــــــــــــــــــــــت

زوج				بھتیجا					بھتیجی	
علیم	عبدالوحید	عبدالعزیز	رفیق	شفیق	شریف	جمیل	بنے	صدیق	منی	
۱				۱						
۸	۱	۱	۱	۱	۱	۱	۱	۱	۱	محروم

علیم میـــــــــــــــــــــــــــــــــت

بھتیجا		بھتیجی
پیر بخش	معشوق علی	عقیدن
۱	۱	محروم
۴	۴	

خرید کردہ جائیداد کے بیع نامہ کو اگر ہبہ تسلیم کرلیا جائے تو کل ۱۶/سہام میں تقسیم ہوکر مجیدن کے بھتیجوں کو ایک ایک اور پیر بخش کو چار اور معشوق علی کو چار سہام ملیں گے۔ اور اگر ہبہ تسلیم نہ کیا جائے؛ بلکہ بیع نامہ کے ذریعہ مصلحتاً نام کردینا سمجھا جائے جو زیادہ واضح بھی ہے، تو کل جائیداد ۲/سہام میں تقسیم ہوکر پیر بخش اور معشوق علی کو ایک ایک ملے گا۔ اور مجیدن کے تمام وارثین محروم ہوجائیں گے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ جمادی الثانیہ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۷۶۶)

عرصۂ دراز کے بعد مقبوضہ اراضی پر دعویٰ باطل

سوال [۹۴۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: ایک شخص بنام غلام رسول ایک کافی بڑے مکان کے ایک حصہ میں تقریباً سو سال سے رہائش اختیار کئے ہوئے ہے اور اس پر قابض ہے اور اس میں اپنا مالکانہ تصرف کرتا آیا ہے اور یہ مکان ۱۹۶۲ء میں بنایا گیا تھا، اسی وقت سے مکان کے مذکورہ حصہ میں غلام رسول کا مالکانہ قبضہ رہا ہے، اس کے دولڑکے تھے: حمایت اللہ اور ولایت حسین، غلام رسول کے انتقال کے بعد غلام رسول کا یہ مکان اس کے دونوں لڑکے حمایت اللہ اور ولایت حسین کے درمیان شرعی طور پر تقسیم ہوا، اس کے بعد حمایت اللہ نے اپنا حصہ آج سے تقریباً بارہ سال قبل فروخت کردیا، اس پر کسی نے دس بارہ سال کے درمیان کوئی اعتراض نہیں کیا؛ اس لئے کہ سب یہی سمجھتے تھے کہ حمایت اللہ کا دادالٰہی مکان ہے اور ولایت حسین کا انتقال ہوجانے کے بعد اس کی دولڑکیاں تھیں، انہوں نے اپنے باپ کا حصہ آج سے تقریباً بارہ سال قبل محمد عثمان اور محمد عمر کو فروخت کردیا، اس پر بھی کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اور آج بڑا مکان جس کا ایک حصہ غلام رسول کی اولاد نے فروخت کیا ہے، وہ پورا مکان خاندان کے درمیان تقسیم ہورہا ہے اور اب خاندان کے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ غلام رسول ہمارے خاندان کے آدمی نہیں تھے؛ لہٰذا غلام رسول کے ورثاء نے اپنا دادالٰہی سمجھ کر جو حصہ فروخت کیا ہے وہ صحیح نہ ہونا چاہئے؛ لہٰذا غلام رسول کے ورثاء کے علاوہ دوسرے لوگوں کے درمیان فروخت شدہ حصہ بھی تقسیم میں شامل ہونا چاہئے، اب مذکورہ تفصیل کے تحت حسب ذیل سوالات مطلوب ہیں:

(۱) کیا مذکورہ تفصیل کی روشنی میں غلام رسول کے ورثاء کا اپنا حصہ فروخت کرنا شرعاً غلط ہے؟ جب کہ پورے محلّہ اور پڑوس کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مکان غلام رسول کا ہے۔

(۲) اتنے لمبے عرصے تک غلام رسول اور اس کے ورثاء نے تقریباً سو سال تک اس مکان میں مالکانہ تصرف کیا ہے اور اس درمیان میں کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا، اور آج اتنے عرصے کے بعد کسی کا یہ دعویٰ کرنا صحیح ہوسکتا ہے کہ یہ مکان غلام رسول کا نہیں تھا؛ بلکہ ہمارا ہے، شرعاً یہ دعویٰ صحیح ہوسکتا ہے؟

(۳) بارہ اور آٹھ سال پہلے اس مکان کو غلام رسول کے ورثاء نے فروخت کیا ہے اور اس پر

کسی نے کوئی اعتراض یا اشکال نہیں کیا اور اب فروختگی کے اتنے سال بعد اس قسم کا اشکال اور دعویٰ صحیح ہوسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عثمان میاں سرائے سنبھل، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۲) غلام رسول اور اس کے ورثاء نے جب اتنے لمبے عرصے تک تصرف کیا ہے اور اس اثناء میں کسی نے کسی قسم کا حق یا ملکیت کا دعویٰ نہیں کیا ہے اور غلام رسول کے انتقال کے بعد اس طرح دعویٰ کیا جارہا ہے، تو شریعت اسلامی میں اس کا دعویٰ معتبر اور مسموع نہیں ہوتا ہے۔ اور ملکیت جس کے تصرف میں ہے اس کی ہوا کرتی ہے؛ لہٰذا مذکورہ دعویٰ نا قابل اعتبار اور باطل ہوگا۔

رجل تصرف في أرض زمانا، ورجل أخر يرى تصرفه فيها، ثم مات المتصرف ولم يدع الرجل حال حياته لا تسمع دعواه بعد وفاته. (شامي، كتاب الخنثى مسائل شتى، زكريا ١٠/ ٤٦٨، كراچی ٦/ ٧٤٢، كوئٹه ٥/ ٥٢٤)

نیز جب غلام رسول کے تصرف کے زمانہ میں موجودہ مدعی کے مورث اور والد نے کوئی دعویٰ نہیں کیا ہے اور اسی حالت میں مورث اور والد کا انتقال ہوچکا ہے، تو بعد میں اولاد کا مدعی بن کر دعویٰ کرنا شرعاً معتبر اور قابل سماعت نہ ہوگا اور غلام رسول کے ورثاء کا اپنا حق ثابت کر کے فروخت کرنا شرعی طور پر صحیح اور درست ہے۔

رجل تصرف زمانا في أرض، ورجل أخر يرى الأرض والتصرف، ولم يدع ومات على ذلک لا تسمع بعد ذلک دعوى ولده، فتترک على يد المتصرف. الخ (شامي، كتاب الخنثى مسائل شتى، زكريا ١٠/ ٤٦٨، كراچی ٦/ ٧٤٢، كوئٹه ٥/ ٥٢٤، تنقيح الفتاوى الحامدية ٢/ ٣)

(۳) جب غلام رسول کے ورثاء جس وقت فروخت کررہے تھے، اس وقت کسی نے کوئی شرعی ثبوت کے ساتھ دعویٰ نہیں کیا ہے اور خریدار کے خرید کر تصرف کرتے ہوئے پڑوس کے

لوگوں نے دیکھا اوران کومعلوم تھا، اس کے باوجود بوقت فروختگی دعویٰ نہیں کیا ہے اور آج عرصۂ دراز کے بعد دعویٰ کرتے ہیں، تو ان کا دعویٰ شرعاً نا قابل اعتبار اور مخدوش ہوگا۔

باع عقاراً، أو حيوانا، أو ثوبا –إلى قوله– سكت الجار وقت البيع والتسليم، وتصرف المشتري فيه زرعا وبناء، فحينئذ لا تسمع دعواه على ما عليه الفتوى قطعا للإطماع الفاسدة. الخ (شامي، كتاب الخنثى مسائل شتى، كراچی ٦/ ٧٤٢، زكريا ١٠/ ٤٦٨، كوئٹه ٥/ ٥٢٤، البحرالرائق، زكريا ٩/ ٣٥٤، كوئٹه ٨/ ٤٨٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۳۷۸)

۳/ باب هبة المشاع

ہبۂ مشاع

سوال [۹۴۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے والد فرید احمد (متوفی) کے ترکہ میں ان کی وفات کے وقت ہم پانچ بھائی اور ایک بہن شامل تھے۔ والد کے انتقال کو تقریباً ۲۲؍سال کا عرصہ گذر چکا ہے، والد کے انتقال کے ۴؍سال بعد والدہ کا بھی انتقال ہوگیا؛ لہٰذا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ایک بیکری والد مرحوم نے اپنی حیات ہی میں تین بھائیوں کے نام پاٹنرشپ بنایا اور اس کو رجسٹرڈ کرا دیا اور سارے کاغذات والد صاحب نے میرے حوالے کر دیئے کہ لو تم اس کو رکھو اور والدہ صاحبہ کے سامنے صراحتاً بتایا کہ پچاس فیصد شمس الدین کا اور پچیس پچیس نظام الدین اور علیم الدین کا ہے، والدہ نے اعتراض کیا کہ علیم الدین بعد میں لڑائی کر کے لے لے گا، تو والد مرحوم نے کہا کہ جب میں نے کاغذات شمس الدین نظام الدین اور علیم الدین کے نام بنوائے ہیں، تو وہ کیسے لے لے گا، پولیس کے ڈنڈے کھائے گا۔ اور واضح رہے کہ والد صاحب جائیداد کے سارے کاغذات اپنے پاس رکھتے تھے اور اسی بیکری کے کاغذات خاص طور سے مجھے دیئے اور کہا کہ لے جاؤ اور اپنے گھر پر رکھو؛ کیوں کہ میں اس وقت ماں باپ اور دیگر بھائیوں سے علاحدہ رہتا تھا؛ لہٰذا جواب طلب امر یہ ہے کہ مذکورہ تفصیلات کی رو سے شرعی اعتبار سے یہ بیکری تینوں بھائیوں کی ملکیت ہوگی یا والد مرحوم کا ترکہ ہوگا۔

المستفتی: شمس الدین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: حسب تحریر سوال جب آپ کے والد صاحب نے اپنی حیات میں ایک بیکری مشترک طور پر حصے متعین کر کے آپ تینوں بھائیوں کے نام رجسٹرڈ کرا دی اور بطور پاٹنرشپ استعمال کے لئے آپ تینوں بھائیوں کے سپرد کر دی تو وہ بیکری والد

صاحب کی جانب سے آپ تینوں بھائیوں کے نام ہبہ ہوگئی اور ہر بھائی اپنے ذکر کردہ حصے (یعنی شمس الدین پچاس فیصد اور نظام الدین وعلیم الدین پچیس پچیس فیصد حصے) کے مالک ہوگئے؛ لہٰذا والد کی وفات کے بعد یہ بیکری بطور میراث تقسیم نہیں کی جائے گی، بیکری کا ہبہ اگرچہ درست ہو چکا ہے؛ لیکن باپ اس وجہ سے گنہگار ہوگا کہ اس نے تینوں لڑکوں کے درمیان برابری کا معاملہ نہیں کیا۔

هبة المشاع فيما يحتمل القسمة من رجلين أو من جماعة صحيحة عندهما. (هندية، كتاب الهبة، الباب الثاني، زكريا جديد ٤/ ٤٠٠، قديم ٤/ ٣٧٨)

ولا يتم حكم الهبة إلا مقبوضة ويستوى فيه الأجنبي والولد إذا كان بالغا. (هندية، كتاب الهبة، الباب الثاني فيما يجوز من الهبة وما لا يجوز، زكريا جديد ٤/ ٣٩٩، قديم ٤/ ٣٧٧)

الهبة للولد الكبير لا تتم إلا بقبضه. (البحر الرائق، كتاب الهبة، زكريا ٧/ ٤٩٠، كوئٹه ٧/ ٢٨٨)

اتفق الفقهاء على أن قبض العقار يكون التخلية، والتمكين من اليد والتصرف. (الموسوعة الفقهية ٣٢/ ٢٥٩)

ويكره تفضيل بعض الأولاد على البعض في الهبة حالة الصحة. (البحرالرائق، كتاب الهبة كوئٹه ٧/ ٢٨٨، زكريا ٧/ ٤٩٠، وهكذا في البزازية، زكريا جديد ٣/ ١٢٣، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٣٧، قاضي خان، زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩، شامي، زكريا ٨/ ٥٠٢، كراچی ٥/ ٦٩٦)

نوٹ:- سوال نامہ میں پانچ بھائیوں کا ذکر ہے اور باپ نے صرف تین بھائیوں کے نام بیکری ہبہ کی، دوسرے دو بھائیوں کو بیکری کے ہبہ میں کیوں شریک نہیں کیا؟ اگر ان دو بھائیوں کو اسی کے برابر کوئی دوسری چیز ہبہ کردی تو ٹھیک ہے، ورنہ باپ گنہگار ہوگا۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱ر شعبان المعظم ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۱۶۲)

ہبۂ مشاع اور اس میں تصرف کا حکم

سوال [۹۴۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جناب الحاج عبداللطیف صاحب مرحوم جن کی کوئی اولا دنرینہ نہ تھی اور صرف ایک ہی لڑکی حمیرہ خاتون تھی جو ہم سب علی الترتیب: (۱) محمد عبداللہ (۲) طاہرہ خاتون (۳) سائرہ خاتون (۴) عباداللہ (۵) ہاجرہ خاتون (۶) ابوالقاسم (۷) محمد مسعود (۸) حبیب المرسلین (۹) صالحہ خاتون کی والدہ حقیقی تھیں۔ حمیرہ خاتون کے شوہر جناب محمد فاروق صاحب ہیں، جو ہم سب کے والد حقیقی ہیں۔

ہمارے نانا جناب الحاج عبداللطیف صاحب مرحوم کی ایک زمین جس کا رقبہ تین ہزار تین سو اسکوائر فٹ ہے، جسے انہوں نے انتقال سے قبل مشترکہ طور پر اپنی لڑکی حمیرہ خاتون اور داماد محمد فاروق صاحب کے نام لکھ کر ہندوستان کے قانون کے مطابق رجسٹرڈ کر دیا، اس جگہ میں دو پختہ کمرے تعمیر شدہ ہیں اور باقی ایک چوتھائی میں تقریباً خام کھپریل کا مکان تھا، جو اب زمین بوس ہو چکا ہے، اب سے تقریباً دس سال قبل ۱۹۹۰ء میں حمیرہ خاتون نے اپنی ایک لڑکی (۳) سائرہ خاتون کو گھر نہ ہونے کی مجبوری کے پیش نظر ایک پختہ کمرہ اور خام کھپریل کا سارا حصہ اس نیت سے دینا چاہا کہ مکان کے خام حصہ کی دیکھ بھال بھی ہو جائے گی اور وقتی طور پر سائرہ خاتون کی مشکل بھی آسان ہو جائے گی، مگر حمیرہ خاتون کے دیگر لڑکے اور لڑکیوں نے نمبروار ۲،۴،۵،۶،۷،۸،۹/ نے سختی سے مخالفت کی۔ ۸-۹/ نابالغ اور ناسمجھ تھے، صرف ہر دو جانب ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ اور گھر نہیں دیا گیا، چند دنوں کے بعد حمیرہ خاتون کے بڑے لڑکے جو بسلسلہ ملازمت دوسرے شہر میں مقیم تھے، گھر آئے اور ساری صورت حال ان کے سامنے آئی تو انہوں نے تمام بھائیوں اور بہنوں کے سامنے یہ بات رکھی کہ شرعی طور پر جو حصہ ماں باپ کی جائیداد میں بنتا ہے وہ آج نہیں تو کل سائرہ خاتون کو دیا جانا ہی ہے اور چونکہ ضرورت آج ہے؛ اس لئے بعد میں جب جائیداد کی تقسیم ہوگی اور پتہ نہیں کب ہوگی؛ اس

لئے اس وقت دینے سے کیا فائدہ ہوگا، ہوسکتا ہے اس وقت تک ان کو سائرہ خاتون کو مکان کی ضرورت باقی نہ رہے۔

بڑے لڑکے (ا) کی بات دیگر تمام بھائیوں اور بہنوں کے دل کو لگی اور گھر مع ایک پختہ کمرہ سائرہ خاتون کو رہنے کے لئے دے دیا گیا کہ گھر کے خام کھپریل کے حصہ کی دیکھ بھال بھی کرتی رہیں گی اور سائرہ خاتون نے یہ وعدہ بھی کرلیا کہ جب ہمارے شوہر کا اپنا گھر ہوجائے گا وہ اس گھر کو چھوڑ کر چلی جائیں گی۔ حمیرہ خاتون جو دل کی مریضہ تھیں اور اکثر و بیشتر بیمار رہتی تھیں، اچانک دل کا دورہ پڑجاتا تھا اور بیہوش ہوجایا کرتی تھیں، ایسے ہی اچانک دل کا دورہ پڑا اور بیہوش ہوگئیں اور ۹/دن بیہوشی کی حالت میں گذار کر ۱۵/نومبر ۱۹۹۳ء کو بیہوشی کی حالت میں ہی انتقال فرماگئیں، انتقال سے پہلے حمیرہ خاتون نے کہا تھا کہ میری خواہش ہے کہ سائرہ خاتون کو ا پختہ کمرہ اور اس کی سیدھ سے جو خالی جگہ سڑک تک کی ہے وہ سائرہ خاتون کو تم لوگ دے دینا، بڑے لڑکے ا نے والدہ حمیرہ خاتون سے کہا کہ جو جگہ اور جتنی آپ کہہ رہی ہیں وہ اس مقدار سے جوان کو شرعی طور پر ملنی چاہئے بہت زیادہ ہوجائے گی، اس پر والدہ محترمہ حمیرہ خاتون خاموش ہوگئیں بعد میں ایک مرتبہ پھر کہا کہ میں چاہتی ہوں کہ کمرہ ا کے سامنے سیدھی جگہ جو سڑک تک ہے وہ سائرہ کو مل جائے۔ الغرض مکان کا خام حصہ جو سائرہ خاتون کے زیر استعمال تھا، آہستہ آہستہ منہدم ہونے لگا، جس کی وجہ سے جگہ کی تنگی محسوس کرتے ہوئے کمرہ ۲ پختہ جو کمرہ ا پختہ سے ملحق تھا، جس کا دروازہ کمرہ ا کے اندر سے تھا، سائرہ خاتون نے کھول لیا، کمرہ ۲ جسے سائرہ نے بعد میں کھولا تھا، اس میں گھر کا مختلف سامان بغرض حفاظت رکھا ہوا تھا اور حمیرہ خاتون کے بڑے لڑکے محمد عبداللہ کا بھی تھوڑا سامان تھا، ایک مرتبہ محمد عبداللہ اپنا سامان دیکھنے گئے تو سائرہ خاتون نے کہا کہ کھپریل کا حصہ رہنے کے قابل نہیں ہے، جگہ کی تنگی محسوس ہوتی تھی؛ اس لئے اس کمرہ کو استعمال کررہی ہوں اور آپ کا سامان یہ ادھر رکھا ہوا ہے، اس کی بھی دیکھ بھال کرتی رہتی ہوں۔ محمد عبداللہ نے از راہ ہمدردی سائرہ خاتون کی پریشانی کو مدنظر رکھتے ہوئے کمرہ ۲ کے کھولے جانے پر کوئی

اعتراض نہ کیا اور خاموشی اختیار کرلی۔ یہاں یہ عرض کردینا بھی ضروری ہے کہ ان تمام معاملات کے طے ہونے اوراس پر عمل ہونے (سائرہ خاتون کو گھر دینے نہ دینے کے سلسلہ میں) والدمحترم نے کوئی کلیدی کردارادانہ کیااور بظاہرلاتعلق رہے۔والدہ محترمہ حمیرہ خاتون کے انتقال کے بعد کمرہ ۲ کے کھلنے کی اطلاع جب عباداللہ کو ملی تو بہنوں بھائیوں میں سب سے بڑی ہونے کے ناطے چونکہ محمدعبداللہ موجودنہیں تھے،عباداللہ نے طاہرہ خاتون کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ کمرہ ۲ کھول لیا گیا ہےاورکسی سے اجازت نہیں لی گئی ہے، جیسابند تھاویسابندرہناچاہئے،طاہرہ نے جواباً کہاکہ میرے کچھ کہنے سے میری بدنامی ہوگی، تم خودکہویاوالدصاحب کے سامنے یہ بات رکھو۔عباداللہ نے والدصاحب جناب محمدفاروق صاحب سےادباًواحتراماًکوئی بات نہیں کی اور معاملہ جوں کا توں رہا۔

کمرہ ۲ میں جوسامان بغرض حفاظت رکھا ہوا تھا،اس میں کا کچھ سامان سائرہ خاتون نے نکال کرخام کھپریل کے حصہ میں رکھ دیا،اب تک خام کھپریل کا تقریباً نوے فیصد حصہ منہدم ہوچکا ہے۔

اب ۲۰۰۰ء میں والدصاحب جناب محمد فاروق صاحب کی توجہ محمدعبداللہ نے اور دوسرے لڑکوں لڑکیوں نے اس جانب مبذول کرائی کہ تمام لڑکوں لڑکیوں کوان کے حصہ کی نشاندہی کردیں جوان کا شرعی طورپرہوتاہے،تاکہ ہرایک کوان کے حصےاوران کی جگہ معلوم ہوجائے اوروہ اپنی جگہ میں مکان تعمیرکرکے رہائش اختیارکرسکیں اور آئندہ کسی قسم کااختلاف نہ ہواور جس طرح اب تک سب بھائی بہن باہم میل ومحبت سے رہتے چلے آئے ہیں وہ آئندہ اسی طرح قائم رہے۔

والدمحترم محمد فاروق صاحب نے سب کی اس بات کوتسلیم کرلیا۔اوروالدہ محترمہ حمیرہ خاتون کے تمام وارثین جمع ہوئے بات چیت خوشگوار ماحول میں ہوئی۔اور جب اس جگہ کی پیمائش کی گئی جس میں سائرہ خاتون قیام پذیرہیں اور جتنی جگہ والدہ محترمہ نے انتقال سے قبل سائرہ کو دینے کی بات کہی تھی،تووہ اس سے بہت زیادہ بلکہ دوگنی سے بھی زائدنکلی،جوانہیں شرعی طورپر

تقسیم کیئے جانے پرملتی ہے۔اب سائرہ خاتون بضد ہیں کہ مجھے اتنی ہی جگہ دی جائے جس قدر والدہ محترمہ نے دینے کی وصیت کی تھی۔ جناب محمد فاروق صاحب کا بھی کہنا ہے کہ حمیرہ خاتون کی وصیت پوری کی جائے گی، باقی جگہ کوتم لوگ شرعی اعتبار سے تقسیم کرلو۔ نیز والد جناب محمد فاروق صاحب کا یہ بھی کہنا ہے کہ مجھے اختیار ہے جتنا چاہیں سائرہ کو دے سکتے ہیں، کسی سے مشورہ کی مجھے ضرورت نہیں ہے، نہ ہی کسی کے مشورہ کا پابند ہوں، جب کہ سارے بھائی بہن بخوشی اس بات پر رضا مند ہیں کہ سائرہ خاتون کوشرعی اعتبار سے جوجگہ ملتی ہے وہ دی جائے گی۔ سائرہ خاتون کا یہ بھی کہنا ہے کہ کمرہ ۲ بھی والدہ محترمہ نے مجھے دیا تھا، جب کہ اس سلسلے میں کوئی واضح بات کسی کومعلوم نہیں ہے اور وارثین بھی اس بات سے منکر ہیں کہ والدہ محترمہ حمیرہ خاتون نے کمرہ ۲ سائرہ خاتون کو دیا تھا، وارثین سائرہ خاتون کی اس بات کوتسلیم نہیں کرتے، یہ بات بھی واضح کردوں کہ والد صاحب اپنے تمام لڑکوں کے ہمراہ ہی رہتے ہیں اور سائرہ خاتون اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ اس گھر میں رہتی ہیں، جس کا تفصیلی ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ تفصیلات سے متعلق دریافت طلب امور:

(۱) کیا مرحومہ حمیرہ خاتون صاحبہ کا سائرہ کے حق میں وصیت جب کہ وہ ان کی لڑکی تھیں معتبر ہے؟

(۲) ایسی صورت حال میں جب کہ تمام حصہ دار و وارثین حمیرہ خاتون اس بات پر بخوشی تیار ہیں کہ سائرہ خاتون کا جو جائز شرعی حصہ بنتا ہے دیا جائے گا، جناب محمد فاروق صاحب کا سائرہ خاتون کو زیادہ دینا یا دلوانا باصرار درست ہے؟

(۳) کیا پختہ کمرے ۱، ۲ تنہا سائرہ خاتون کو اس حال میں کہ دو بھائیوں کو رہنے کے لئے جگہ نہیں ہے، باصرار جناب محمد فاروق صاحب دے دینا درست ہے؟

(۴) کیا سارے وارثین پختہ کمروں میں حصہ دار ہیں یا صرف سائرہ خاتون؟

(۵) کیا سائرہ خاتون کا منہدم شدہ خام حصہ کی اشیاء مثلاً لکڑی وغیرہ کا جلانا بغیر وارثین کی اجازت کے جائز ہے؟

(۶) اگرنہیں تو وارثین اس سلسلے میں استفسار کرنے کا حق رکھتے ہیں یانہیں؟

(۷) کیاشرعی حصہ سے زائد جگہ جب کہ دوسرے وارثین رضامند نہیں ہیں، سائرہ خاتون کودینا جائز ہے؟

(۸) کیامحمد فاروق صاحب کا ایسے وقت جب کہ وہ اپنی تمام جائیداد بشمول مشترکہ جائیداد اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں،تاکہ آئندہ ساری اولاد میں محبت و بھائی چارگی قائم رہے اورکسی قسم کی نااتفاقی نہ ہوصرف سائرہ خاتون کوزیادہ دینا درست ہے؟

(۹) کیامحمد فاروق صاحب کوازروئے شرع یہ اختیار حاصل ہے کہ جتنا چاہیں سائرہ خاتون کوبغیر رضامندی دیگر وارثین دے دیں؟

(۱۰) کیامحمد فاروق صاحب کا اپنی اورمرحومہ حمیرہ خاتون کی مشترکہ جائیداد کے بٹوارہ کے اورتقسیم کےوقت محمدعبداللہ یادیگر وارثین سے مشورہ کرنا ضروری ہے یانہیں؟

(۱۱) کیامحمد فاروق صاحب مذکورہ جائیداد کے بٹوارہ کےسلسلے میں کسی کےمشورہ کے پابند نہیں ہیں؟

(۱۲) کیامحمد فاروق صاحب کا مرحومہ حمیرہ خاتون کی وصیت کواسی طرح جس طرح ان کی مرضی تھی پوری کرنا ضروری ہے؟

(۱۳) کیاسائرہ خاتون کا یہ وعدہ کرنا کہ جب میرے اپنے شوہر کا گھر ہوجائے گا چلی جاؤں گی، جب کہ ان کی اپنے گھر کی جگہ موجود ہے، وہاں نہ جانا اور جوجگہ ان کورہنے کی لئے دی گئی تھی ،اسے نہ چھوڑنا اور جوشرعی حصہ بنتا ہےاس سے دوگنے کا مطالبہ کرنا یہ سب درست ہے؟

(۱۴) اگرتین ہزارتین سواسکوائر (مربع) فٹ جگہ جناب محمد فاروق صاحب اپنی تمام اولاد: جن میں اول الذکر ۵ رلڑ کے اور۴ رلڑکیاں ہیں، شرعی اعتبار سے تقسیم کرنا چاہیں تو کس کس کوکتنی کتنی جگہ ملے گی؟ والسلام مع الاحترام

المستفتی: محمدعبداللہ قاسمی ،امام وخطیب مسجد ابراہیم شاہ صاحب کمہارپیٹ ،بنگلور ۲

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ شکل میں حمیرہ کے والد نے اگر بطور ہبہ حمیرہ اور اس کے شوہر کے نام منتقل کردیا تھا اوران دونوں نے اس کے اوپر قبضہ بھی کرلیا تھا، تو حضرات صاحبینؒ کے قول پر بلا شبہ یہ ہبہ درست ہو چکا ہے۔ اور وہ دونوں اس جائیداد کے برابر مالک ہو چکے ہیں۔ اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ مشترکہ ہبہ درست نہیں ہوا؛ بلکہ یہ ہبہ فاسد ہوا ہے؛ لیکن اس فاسد شدہ ہبہ کو اپنی جگہ برقرار رکھا گیا ہے اور دونوں موہوب لہما نے اس پر اپنا قبضہ بھی جمالیا ہے، تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بھی ان دونوں کی ملکیت ثابت ہو چکی ہے۔ اب دوسرے درجے میں ان دونوں کے تصرف کی بات ہے، تو تصرف کے اندر حمیرہ نے اپنے مرض وفات میں دوسرے ورثاء کی رضامندی کے بغیر سائرہ کے حق میں جو وصیت کی ہے وہ شرعاً نافذ نہیں ہوئی؛ لہٰذا حمیرہ کا حصہ اس کے تمام وارثین کے درمیان شرعی حصوں کے اعتبار سے تقسیم ہوگا۔ اب رہی محمد فاروق کے حصہ کی بات تو وہ اگر صحیح اور تندرست ہے اور صرف ایک وارث کو اپنے حصہ میں سے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دینا چاہتا ہے اور دوسرے ورثاء اس پر راضی بھی نہیں ہیں، تو اس کا اپنی ملکیت کے حصہ میں سے زیادہ دینا جائز تو ہوگا؛ لیکن ساتھ ساتھ محمد فاروق اولاد کے درمیان برابری نہ کرنے کی وجہ سے گنہگار بھی ہوگا۔ نیز یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ محمد فاروق کو حمیرہ کے حصہ میں کسی قسم کے تصرف کا حق نہیں ہے اور نہ اس میں سے دوسرے ورثاء کی رضامندی کے بغیر سائرہ کو دینا جائز ہوگا، ہاں البتہ بیوی کی وراثت میں سے جو چوتھائی حصہ اس کا بیٹھتا ہے، اس میں سے دے سکتا ہے۔ اصل مسئلہ کا جواب تو یہی ہے؛ لیکن سوال نامہ میں جو نمبر وار سوالات کئے گئے ہیں ان کے جوابات نمبر وار درج ہیں:

(۱) حمیرہ نے جو سائرہ کے حق میں وصیت کی ہے، وہ شرعاً معتبر نہیں ہے؛ اس لئے کہ وارث کے حق میں دوسرے ورثاء کی اجازت کے بغیر وصیت درست نہیں ہے؛ کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

عن أبي أمامة الباهلي -رضي الله عنه- قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول في خطبته عام حجة الوداع: إن الله تبارك وتعالىٰ قد أعطى لكل ذي حق حقه، فلا وصية لوارث. (سنن الترمذي، باب ماجاء لا وصية لوارث، النسخة الهندية ۲/ ۳۲، دارالسلام، رقم: ۲۱۲۰، سنن أبي داؤد، باب في الوصية للوارث، النسخة الهندية ۲/ ۳۹٦، دارالسلام، رقم: ۲۸۷۰، سنن ابن ماجة، باب لا وصية لوارث، النسخة الهندية ۲/ ۱۹۵، دارالسلام، رقم: ۲۷۱۳، سنن الدارمي، دارالمغني للنشر و التوزيع ٤/ ۲٦۳، رقم: ۳۳۰۳)

(۲) محمد فاروق صاحب کو حمیرہ کی جائیداد میں سے سائرہ کو زیادہ دینا جائز نہیں، ہاں البتہ اپنی جائیداد میں سے اگر دے دیں گے تو مالک تو ہو جائے گی؛ لیکن برابری نہ کرنے کی وجہ سے وہ گنہگار ہوگا۔

رجل وهب في صحته كل المال للولد جاز في القضاء، ويكون آثما فيما صنع كذا في فتاوى قاضى خان. (كتاب الهبة، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا قديم ٤/ ۳۹۱، جديد ٤/ ٤١٦، بزازية، زكريا جديد ۳/ ۱۲۳، وعلى هامش الهندية ٦/ ۲۳۷، قاضيخان، زكريا جديد ۳/ ۱۹٤، وعلى هامش الهندية ۳/ ۲۷۹، الدر مع الرد، زكريا ۸/ ۵۰۲، كراچى ۵/ ٦۹٦)

(۳) اگر یہ حمیرہ کا حصہ ہے، تو مطلقاً جائز نہیں۔ اور اگر یہ محمد فاروق کا حصہ ہے، تو بے انصافی کی وجہ سے ایسا کرنے سے محمد فاروق گنہگار ہوگا۔ اور اگر مشترکہ شکل ہے محمد فاروق اور حمیرہ کا حصہ الگ الگ نہیں ہوا ہے، تو امتیاز سے پہلے محمد فاروق کو اس میں سے کوئی حصہ کسی کو دینا جائز نہیں ہے۔

(۴) تقسیم سے پہلے پختہ اور کچا اور خالی زمین سب کے اندر ہر ایک وارث کا حق متعلق ہے۔

(۵) چونکہ ہر چیز کے اندر تمام ورثاء کا حق متعلق ہے؛ اس لئے تنہا ایک وارث کا تصرف جائز نہیں ہے۔

(٦) جی ہاں! حق رکھتے ہیں۔ (۷) جی نہیں۔ (۸) جی نہیں۔ (۹) اس کا جواب اوپر آچکا ہے۔ (۱۰) جی ہاں! ضروری ہے۔ (۱۱) ذاتی حصہ میں پابند نہیں ہیں، حمیرہ کے حصہ میں پابند ہیں۔ (۱۲) حمیرہ کی وصیت نافذ نہیں ہوئی، جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے۔

(۱۳) یہ اس کی طرف سے وعدہ خلافی ہے جو شرعاً جائز نہیں ہے۔

(۱۴) الحاج عبداللطیف کی دی ہوئی جائیداد درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگی:

(۱) عبداللطیف میـــــــــــــــــــــــــت

موہوب لہ محمد فاروق	موہوب لہا حمیرہ خاتون
۱	۱
۵۶	

(۲) حمیرہ خاتون میـــــــــــــــــــــــــت

شوہر	ابن	ابن	ابن	ابن	ابن	بنت	بنت	بنت	بنت
محمد فاروق	عبداللہ	عباداللہ	ابوالقاسم	محمد مسعود	حبیب المرسلین	طاہرہ	سائرہ	ہاجرہ	صالحہ
۱				۳					
۱۴	۶	۶	۶	۶	۶	۳	۳	۳	۳

الإحیـــــــــــــــــــــــــاء

محمد فاروق	عبداللہ	عباداللہ	ابوالقاسم	محمد مسعود	حبیب المرسلین	طاہرہ	سائرہ	ہاجرہ	صالحہ
۷۰	۶	۶	۶	۶	۶	۳	۳	۳	۳

نوٹ: عبداللطیف کی جائیداد ۱۱۲ رسہاموں میں تقسیم ہوکر اسی تناسب سے جائیداد میں سے ہر ایک وارث کو اتنا حصہ ملے گا جو کہ اس کے نام کے سامنے درج ہے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ربیع الاول ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۶۵۱۴/۳۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۳/۴ھ

ہبۃ المشاع

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ أَمَّا بَعْد!

مسئلۂ ہبہ میں قبضۂ تام کا حکم زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور قبضۂ تام ہی کی وجہ سے ہبۂ مشاع میں ائمۂ ثلاثہ اور حنفیہ کے درمیان معرکۃ الآراء اختلاف پیش آیا ہے، پھر حنفیہ کے درمیان بھی جزئی اختلاف ہے؛ لہٰذا ہبۂ مشاع کے جواز کے بارے میں کیا کیا اختلاف اور جواز کی کیا کیا شکلیں نکل سکتی ہیں؟ اس بارے میں یہ مضمون پیش خدمت ہے، ملاحظہ فرمایئے:

''عقار'' اور ''اموال منقولہ'' دونوں کے ہبۂ مشاع کا مسئلہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے؛ لہٰذا اگر اس طریقہ سے ہبہ کیا جائے کہ وہ مالِ موہوب مشاع ہو، یعنی شئ واحد کو متعدد افراد کے درمیان اس طریقہ سے ہبہ کردیا جائے کہ کس کا کون سا حصہ ہے امتیاز نہ ہو، اسی طرح شئ واحد میں پہلے ہی سے متعدد شرکاء شریک ہوں اور تقسیم سے پہلے کوئی شریک اپنا حصہ کسی ثالث کو ہبہ کردے، تو اس طرح کا ہبہ شریعت میں جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں مسئلہ تفصیل طلب ہے اور شئ مشاع دو قسموں پر ہے: (۱) نا قابلِ تقسیم (۲) قابلِ تقسیم۔

نا قابل تقسیم اشیاء کا ہبۃ المشاع

اگر شئ موہوب ایسی ہے کہ اس میں تقسیم ممکن نہیں ہے، تو ایسی اشیاء کے بارے میں سب کا اتفاق اس بات پر ہے کہ مشاع ہونے کی حالت میں اس کا ہبہ جائز اور درست ہے، مثال کے طور پر کنواں، غسل خانہ اور بہت ہی چھوٹا کمرہ، کار، بس، اسکوٹر وغیرہ۔ ایسی اشیاء میں

جب دو یا دو سے زیادہ افراد مالکانہ طور پر شریک ہوں اور ان شرکاء میں سے کوئی شخص اپنا حق کسی ثالث کو ہبہ کرنا چاہے، یا ایک شخص ان اشیاء میں سے کسی ایک چیز کا مالک ہے اور وہ شخص دو یا دو سے زیادہ افراد کو ہبہ کرنا چاہے، تو سب کے نزدیک یہ ہبہ بغیر تقسیم کے جائز ہے اور شرکاء ان اشیاء سے باری قائم کرکے اپنی اپنی باریوں سے فائدہ اٹھائیں گے، اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے۔ ہندیہ کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

وَهِبَةُ الْمُشَاعِ فِيمَا لا يَحْتَمِلُ الْقِسْمَةَ تَجُوزُ مِنَ الشَّرِيكِ، وَمِنَ الْأَجْنَبِيِّ. (هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٧٨، جديد ٤/ ٤٠٠)

ایسی مشترک اور شائع شدہ اشیاء جن میں تقسیم کا احتمال نہ ہو، شریک کے ہاتھ اور اجنبی شخص کے ہاتھ ہبہ کردینا جائز اور درست ہے۔

صاحب بدائع نے اس کی علت اس طرح بیان فرمائی ہے کہ جو اشیاء قابل تقسیم نہیں ہیں، ان میں سے بعض کے ہبہ کرنے کی کبھی ضرورت پیش آتی ہے؛ لیکن بعض حصہ کو الگ کرکے قبضہ میں دینا ممکن نہیں ہے؛ کیوں کہ اس میں تقسیم کا احتمال ہی نہیں ہوتا؛ اس لئے ضرورتاً شریعت نے بغیر تقسیم کے ہبہ کی اجازت دی ہے۔

بدائع کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

وَهٰكَذَا نَقُولُ فِي الْمُشَاعِ الَّذِي لَايُقْسَمُ أَنَّ مَعْنَى الْقَبْضِ هُنَاكَ لَمْ يُوجَدْ لِمَا قُلْنَا، إِلَّا أَنَّ هُنَاكَ ضَرُورَةً؛ لِأَنَّهُ يُحْتَاجُ إِلٰى هِبَةِ بَعْضِهِ، وَلَا حُكْمَ لِلْهِبَةِ بِدُونِ الْقَبْضِ، وَالشِّيَاعُ مَانِعٌ مِنَ الْقَبْضِ

ایسا ہی ہم ایسی شئ مشاع کے بارے میں کہتے ہیں جو تقسیم نہیں ہوسکتی کہ بے شک قبضہ کا معنی یہاں پایا نہیں جاتا، اس دلیل کی وجہ سے جو ہم نے یہاں بیان کی، مگر یہ کہ یہاں پر ضرورت ہے؛ کیوں کہ کبھی اس کے بعض حصہ کے ہبہ کی ضرورت پیش آجاتی ہے اور بغیر قبضہ کے ہبہ کا حکم نہیں لگایا جاتا اور شئ کا مشاع

الْـمُمْكِنِ لِلتَّصَرُّفِ، وَلَا سَبِيْلَ إِلٰى إِزَالَةِ الْمَانِعِ بِالْقِسْمَةِ لِعَدَمِ احْتِمَالِ الْقِسْمَةِ ، فَمَسَّتِ الضَّرُوْرَةُ إِلَى الْجَوَازِ، وَإِقَامَةِ صُوْرَةِ التَّخْلِيَةِ مَقَامَ الْقَبْضِ الْمُمْكِنِ مِنَ التَّصَرُّفِ. (بدائع زكريا ٥/ ١٧١، كراچى ٦/ ١٢٠، الموسوعة الفقهية ٤٢/ ١٢٩)

ہوجانا ایسے قبضہ سے مانع ہے، جس میں تصرف پر قدرت ہو اور تقسیم کے ذریعہ سے اس مانع کو زائل کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، اس میں تقسیم کا احتمال نہ ہونے کی وجہ سے؛ لہٰذا جائز قرار دینے کی ضرورت پیش آ گئی۔ اور دست برداری کی شکل کو ایسے قبضہ کے قائم مقام قرار دیا گیا ہے، جس میں تصرف ممکن ہو۔

اور ''الفقہ الإسلامي وأدلتہ'' میں اس کو ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:

وَتَجُوْزُ الْهِبَةُ إِذَا كَانَ مُشَاعًا لَا يَحْتَمِلُ الْقِسْمَةَ كَالسَّيَّارَةِ، وَالْحَمَّامِ، وَالْبَيْتِ الصَّغِيْرِ، وَالْجَوْهَرِ، وَجَوَازُ الْهِبَةِ لِلضَّرُوْرَةِ؛ لِأَنَّهُ قَدْ يَحْتَاجُ إِلٰى هِبَةِ بَعْضِ ذٰلِكَ، وَيَكْتَفِي بِصُوْرَةِ التَّخْلِيَةِ مَقَامَ الْقَبْضِ. (الفقه الإسلامي وأدلته ٤/ ٦٨٦)

ایسی شئ مشاع کا ہبہ جائز ہے جس میں تقسیم کا احتمال نہ ہو، جیسا کہ گاڑی، غسل خانہ، چھوٹا کمرہ اور جواہرات وغیرہ۔ اور ضرورت کی وجہ سے اس ہبہ کو جائز قرار دیا گیا ہے؛ اس لئے کہ کبھی اس طرح ناقابل تقسیم شئ کے بعض کی ہبہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور دست برداری کی شکل کو قبضہ کی قائم مقامی کے لئے کافی قرار دیا جاتا ہے۔

قابل قسمت اشیاء کا ہبۂ مشاع

جو اشیاء تقسیم کے لائق ہیں، ایسی قابل قسمت اشیاء کا ہبۂ مشاع تقسیم سے پہلے جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں مسئلہ کی وضاحت انتہائی ضروری ہے اور اس بارے میں اولاً ائمۂ اربعہ کے درمیان جو اختلاف ہے اس کو واضح کرنا ضروری ہے، چنانچہ ائمہ اربعہ کے درمیان دو فریق ہو چکے ہیں:

فریق اول: ائمۂ ثلاثہ: حضرات ائمہ ثلاثہ کے نزدیک جس طرح نا قابل تقسیم اشیاء کا ہبہ مشاع جائز ہے، اسی طرح قابل قسمت اشیاء کا بھی ہبۂ مشاع ان کے نزدیک جائز ہے؛ لہٰذا ائمۂ ثلاثہ کے یہاں ہبۂ مشاع اور غیر مشاع کا کوئی فرق نہیں ہے۔ ''بداية المجتهد'' میں اس کو ان الفاظ سے نقل کیا گیا ہے:

وَاخْتَلَفُوا فِيْ هٰذَا الْبَابِ فِيْ جَوَازِ هِبَةِ الْمُشَاعِ غَيْرِ الْمَقْسُوْمِ فَقَالَ مَالِكٌ وَالشَّافِعِيُّ وَأَحْمَدُ وَأَبُوْ ثَوْرٍ: تَصِحُّ، وَقَالَ أَبُوْ حَنِيْفَةَ: لَاتَصِحُّ، وَعُمْدَةُ الْجَمَاعَةِ أَنَّ الْقَبْضَ يَصِحُّ فِيْهَا كَالْقَبْضِ فِي الْبَيْعِ، وَعُمْدَةُ أَبِيْ حَنِيْفَةَ أَنَّ الْقَبْضَ فِيْهَا لَايَصِحُّ إِلَّا مُفْرَدَةً كَالرَّهْنِ. (بداية المجتهد ٢/ ٣٢٩)

غیر مقسوم اشیاء کے ہبۂ مشاع کے جواز کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ حضرت امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور امام ابوثور وغیرہ نے فرمایا: کہ جائز اور درست ہے۔ اور امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا: کہ ہبۂ مشاع صحیح نہیں ہے۔ اور جمہور کی بنیاد یہ ہے کہ ہبۂ مشاع میں اسی طرح قبضہ صحیح ہو جاتا ہے جس طرح بیع میں قبضہ صحیح ہو جاتا ہے۔ اور امام ابوحنیفہ کی بنیاد یہ ہے کہ شئ مشاع میں قبضہ صحیح نہیں ہوتا؛ **الا** یہ کہ تقسیم کر کے الگ کر دیا جائے، جیسا کہ رہن کا قبضہ مشاع میں درست نہیں ہوتا۔

اور ائمۂ ثلاثہ کے قول کو ''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:

وَقَالَ الْمَالِكِيَّةُ وَالشَّافِعِيَّةُ وَالْحَنَابِلَةُ: إِنَّ هِبَةَ الْمُشَاعِ جَائِزَةٌ كَالْبَيْعِ، فَإِنَّ الْقَبْضَ فِيْ هِبَةِ الْمُشَاعِ يَصِحُّ كَالْقَبْضِ فِي الْمَبِيْعِ الْمُشَاعِ. (الفقه الإسلامي وأدلته ٤/ ٦٨٦)

اور مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ نے کہا ہے کہ بے شک شئ مشاع کا ہبہ بیع کی طرح جائز ہے؛ اس لئے کہ شئ مشاع کے ہبہ میں قبضہ اسی طرح صحیح ہو جاتا ہے جس طرح مبیع مشترک اور مشاع میں قبضہ صحیح ہو جاتا ہے۔

ائمۂ ثلاثہ کے دلائل

ائمۂ ثلاثہ کی طرف سے مختلف روایات بطور دلیل پیش کی جاتی ہیں، ہم یہاں پر ان کی طرف سے دو روایات پیش کرتے ہیں:

(۱) جب ہوازن کے لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے مال اور اپنے قیدیوں کو واپس کرنے کا مطالبہ کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کچھ میرے اور بنوعبد المطلب کے حصہ میں آیا ہے، وہ ہم تم کو دے دیتے ہیں، حالاں کہ جو حصے آپ ﷺ نے دینے کو فرمایا ان میں کوئی تعیین نہیں کہ کس کا مال کس کے یہاں پہنچا اور کتنا کس کے یہاں پہنچا؟ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے حصہ اور بنوعبد المطلب کے حصہ میں جو کچھ آیا تھا ان کو دینے کو فرمانا ایسی اشیاء کا ہبۂ مشاع ہے جو قابل تقسیم ہیں۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ: أَنَّهٗ وَفْدُ هَوَازِنَ لَمَّا أَتَوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْجِعِرَّانَةِ وَقَدْ أَسْلَمُوْا إِلٰى قَوْلِهٖ: فَلَمَّا صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالنَّاسِ الظُّهْرَ، قَامُوْا فَكَلَّمُوْهُ بِمَا أَمَرَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَمَّا مَا كَانَ لِيْ وَلِبَنِيْ عَبْدُ الْمُطَّلِبِ فَهُوَ لَكُمْ.

(مسند أحمد بن حنبل ۲/ ۴۷۳، رقم: ۶۷۲۹، تغليق التعليق على صحيح البخاري ۳/ ۴۷۳)

حضرت عمرو بن شعیب ”عن ابیہ عن جدہ“ کے طریق سے مروی ہے کہ: بے شک ہوازن کا وفد جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اسلام قبول کر کے مقام جعرانہ میں پہنچا (اور اپنے مال اور قیدیوں کی واپسی کا مطالبہ کیا) الی قولہ: پس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ظہر کی نماز پڑھا کر فراغت حاصل کر لی تو ان لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلہ میں گفتگو کی، جس پر آپ نے ان کو حکم فرمایا تھا، تو اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہر حال میرے اور بنوعبد المطلب کے حصہ میں جو کچھ آیا ہے وہ تمہارے لئے ہے۔

اور ''بخاری شریف'' کے ترجمۃ الباب میں اس کو ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:

قَوْلُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِوَفْدِ هَوَازِنَ حِيْنَ سَأَلُوا الْمَغَانِمَ، فَقَالَ: نَصِيْبِي لَكُمْ. (بخاري، وكالة، باب إذا وهب شيئا لوكيله ١/ ٣٠٩)

حضور ﷺ کا وفد ہوازن سے فرمانا جس وقت ان لوگوں نے مال غنیمت کی واپسی کا سوال کیا تھا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: میرا حصہ تمہارے لئے ہے۔

(۲) حضور ﷺ نے مسجد نبوی کی جگہ کو بنونجار کے لوگوں سے خرید کر لینے کی بات طے کر رکھی تھی اور وہ جگہ حضرت اسعد بن زرارہؓ اوران کی قوم کے دو آدمیوں کے درمیان مشترک تھی، تو اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے اپنا حصہ حضور ﷺ کو ہبہ کردیا، اس کے بعد پھر دوسرے دونوں آدمیوں نے بھی اپنا اپنا حصہ حضور ﷺ کو ہبہ کردیا اور آپ ﷺ نے پہلے اسعد بن زرارہؓ کے حصہ کو قبول فرمایا، پھراس کے بعد دوسرے دونوں آدمیوں کا بھی حصہ قبول فرمالیا۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حدیث شریف سے حضور ﷺ کا ایسی چیز کے ہبۂ مشاع کو قبول فرمانا ثابت ہے، جو قابل تقسیم ہے۔ روایت ملاحظہ فرمائیے:

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا دَخَلَ الْمَدِيْنَةَ نَظَرَ إِلٰى مَوْضِعِ الْمَسْجِدِ فَوَجَدَه بَيْنَ أَسْعَدَ بْنِ زُرَارَةَ وَبَيْنَ رَجُلَيْنِ مِنْ قَوْمِهِ، فَوَهَبَ أَسْعد -رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ- نَصِيْبَه لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ثُمَّ وَهَبَ الرَّجُلَانِ نَصِيْبَهُمَا مِنْهُ أَيْضًا، فَبَنَى الْمَسْجِدَ. (مبسوط سرخسي ١٢/ ٦٤، بدائع زكريا ٥/ ١٧٠، كراچی ٦/ ١٢٠، ١٢١)

بے شک رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ میں داخل ہوگئے، تو مسجد نبوی کی جگہ کو دیکھا تو اس کو حضرت اسعد بن زرارہؓ اوران کی قوم کے دوسرے دو آدمیوں کے درمیان مشترک اور شائع پایا، تو حضرت اسعد بن زرارہؓ نے (پہلے) اپنا حصہ حضور ﷺ کو (ہبۂ مشاع کے طور پر) ہبہ کردیا، اس کے بعد پھران کی قوم کے دونوں آدمیوں نے بھی اپنا اپنا حصہ آپ ﷺ کو ہبہ کردیا (آپ ﷺ نے یکے بعد دیگرے اس ہبۂ مشاع کو قبول فرما کر اس جگہ پر مسجد نبوی کی تعمیر فرمائی۔

ان روایات سے واضح ہوگیا کہ قابل تقسیم اشیاء میں بھی ہبۂ مشاع جائز ہے۔

فریق ثانی: حضرات حنفیہ: حضرات حنفیہ کے نزدیک ایسی چیز میں ہبۂ مشاع جائز اور درست ہے، جو قابل تقسیم نہ ہو، جیسا کہ ماقبل میں اس کی وضاحت ہوچکی ہے اور جو اشیاء قابل تقسیم ہوتی ہیں ان کو تقسیم کرنے سے پہلے مشترکہ حالت میں ان میں سے بعض کا ہبہ جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ ہبہ کی صحت کے لئے قبضۂ تام لازم ہے اور قبضہ تام کے لئے آزادانہ طور پر شئ موہوب پر قبضہ کرکے تصرف کے دائرہ میں لانے کا امکان موہوب لہ کے لئے واضح طور پر ثابت ہونا لازم ہے۔ اور مشاع اور مشترک حالت میں یہ شرط پائی نہیں جاتی اور چاہے ہبۂ مشاع کے طور پر واہب نے اپنے شریک کو ہبہ کردیا ہو یا اپنے شریک کے علاوہ کسی غیر کو ہبہ کیا ہو، دونوں صورتوں میں جائز نہیں ہے، اب رہی یہ بات کہ اگر مذکورہ شرط کے بغیر تقسیم سے پہلے مشترک اشیاء کے بعض حصہ کو مشاع کی حالت میں ہبہ کردیا جائے اور اسی حالت میں اس پر موہوب لہ قبضہ کرلے تو مفید ملک ہوگا یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں بعض جزئیات سے پتہ چلتا ہے کہ مفید ملک نہیں ہے؛ لیکن مفتی بہ اور راجح قول یہی ہے کہ چونکہ عقد باطل نہیں ہوتا؛ بلکہ فاسد ہوتا ہے؛ اس لئے مفید ملک ہوگا، اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

وَهِبَةُ الْمُشَاعِ فِيمَا يَحْتَمِلُ الْقِسْمَةَ تَجُوْزُ، سَوَاءٌ كَانَتْ فِيْ شَرِيْكِهٖ أَوْ مِنْ غَيْرِ شَرِيْكِهٖ، وَلَو قَبَضَهَا هَلْ تُفِيْدُ الْمِلْكَ؟ ذَكَرَ حُسَامُ الدِّيْنِ فِيْ كِتَابِ الْوَاقِعَاتِ: أَنَّ الْمُخْتَارَ أَنَّهُ لا تُفِيْدُ الْمِلْكَ، وَذَكَرَ فِي مَوْضِعٍ آخَرَ: أَنَّهُ تُفِيْدُ الْمِلْكَ مِلْكًا

اور ان چیزوں میں جو تقسیم کا احتمال رکھتی ہیں مشاع کا ہبہ جائز نہیں ہے، چاہے اپنے شریک کے ہاتھ ہبہ کرے یا شریک کے علاوہ غیر کے ہاتھ میں۔ اور اگر ایسے ہبہ میں قبضہ ہوجائے تو ملکیت کا فائدہ دے گا یا نہیں؟ تو امام حسام الدین نے کتاب الواقعات میں ذکر کیا ہے: کہ قول مختار یہ ہے کہ ملکیت کا

فَاسِدًا، وَبِهِ يُفْتَى، كَذَا فِي السِّرَاجِيَّةِ. (الفتاوى الهندية، زكريا قديم ٤/٣٧٨، جديد ٤/ ٤٠٠، وهكذا في مجمع الأنهر بيروت ٣/ ٤٩٤، الفتاوى التاتارخانية ١٤/ ٤٢٤، رقم: ٢١٥٨٠)

فائدہ نہیں دے گا۔ اور دوسری جگہ بیان فرمایا کہ ملک فاسد کے طور پر ملکیت کا فائدہ دے گا اور اسی پر فتویٰ ہے۔

حنفیہ کی طرف سے استدلال میں تین حدیثیں اور ایک اجماع پیش کیا جاتا ہے، ملاحظہ ہو:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے، جس میں حضور ﷺ نے قابل تقسیم اشیاء کو ہبہ کرنے کی صورت میں ہبہ کے صحیح ہونے کے لئے یہ شرط لگائی کہ ہبہ سے پہلے اس کو الگ کردے، جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مشاع ہونے کی حالت میں ہبہ مشروع نہیں ہے۔ حدیث شریف ملاحظہ فرمایئے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَيُّمَا رَجُلٌ نَحَلَ ابْنَه نَحْلًا، فَبَانَ بِهِ الابن، فَاحْتَاجَ الْأَبُ، فَالابْنُ أَحَقُّ بِهِ، وَإِنْ لَمْ يَكُنْ بَانَ بِهِ الابْنُ فَاحْتَاجَ الأبُ، فَالْأَبُ أَحَقُّ بِهِ. (المعجم الأوسط، دارالفكر ٣/ ٧١، رقم: ٣٨٩٥، إعلاء السنن بيروت ١٦/ ٩٩)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: کہ جو بھی آدمی اپنے بیٹے کو کوئی چیز ہبہ کردے، پھر اس کو بیٹا الگ کرکے اس پر قبضہ کرلے اس کے بعد باپ کو اس کی ضرورت پیش آجائے تو بیٹا ہی اس کا زیادہ حق دار ہے۔ اور اگر بیٹے نے اس کو الگ کرکے قبضہ نہیں کیا ہے، پھر باپ کو ضرورت پیش آجائے تو باپ اس کا زیادہ حقدار ہے۔

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت موطا امام مالک اور مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ میں مروی ہے، جس میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو عوالی اور غابہ کے علاقہ میں جو ہبہ کیا تھا، اس کا واقعہ مذکور ہے، ملاحظہ فرمایئے:

عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهَا قَالَتْ: إِنَّ أَبَا بَكْرِ الصِّدِّيْقَ كَانَ نَحَلَهَا جِدَادَ عِشْرِيْنَ وَسَقًا مِنْ مَالِهِ بِالْغَابَةِ، فَلَمَّا حَضَرَتْهُ الْوَفَاةُ قَالَ: وَاللّٰهِ يَا بُنَيَّةُ! مَا مِنَ النَّاسِ أَحَدٌ أَحَبَّ إِلَيَّ غِنًى بَعْدِيْ مِنْكِ وَلَا أَعَزَّ عَلَيَّ فَقْرًا بَعْدِيْ مِنْكِ، وَإِنِّيْ كُنْتُ نَحَلْتُكِ جَادَّ عِشْرِيْنَ وَسَقًا فَلَوْ كُنْتِ جَدَدْتِيْهِ وَاحْتَزْتِيْهِ كَانَ ذٰلِكَ، وَإِنَّمَا هُوَ الْيَوْمَ مَالُ وَارِثٍ. (موطا امام مالك، أقضية، باب ما لا يجوز من النحل/ ٣١٤، نصب الرأية ٤/ ١٢٢، إعلاء السنن ١٦/ ٨٩، المصنف لابن أبي شيبة جديد ١٠/ ٥٢٢، رقم: ٢٠٥٠٦، بدائع زكريا ٥/ ١٦٣)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بے شک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو مدینہ کے عوالی کے باغ میں سے بیس وسق کھجور تڑائی کے وقت میں ہبہ کرنے کو فرمایا (کھجور نہیں توڑی گئی تھی) پھر جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت آیا تو فرمایا کہ لوگوں میں کوئی آدمی میرے نزدیک مال داری میں تم سے زیادہ محبوب ترین نہیں ہے اور مجھ پر تمہارے فقر وفاقہ سے زیادہ بھاری کسی کا نہیں ہے، اور میں نے تم کو کٹائی کے وقت بیس وسق کھجور ہبہ کردی تھی؛ لہٰذا اگر تم نے اسے توڑ کر الگ کر کے قبضہ کیا ہوتا تو تمہارے لئے ہوتی (تم نے توڑ کر الگ نہیں کیا) اس لئے بے شک وہ آج وارثین کا مال ہوگیا۔

(۳) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حکم ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سختی سے ارشاد فرمایا کہ کچھ لوگ اپنی اولاد کو ہبہ کر کے قبضہ نہیں دیتے، پھر دعویٰ کرتے ہیں کہ میرا اپنا مال ہے؛ اس لئے یاد رکھو کہ وہ ہبہ معتبر ہوگا جس پر بیٹا یا باپ نے قبضہ کرلیا ہو۔

حضرت عمر کی روایت ملاحظہ فرمایئے:

عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَبْدِالْقَارِيْ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِؓ قَالَ: مَا بَالُ رِجَالٍ يَنْحَلُوْنَ أَبْنَاءَهُمْ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کہ لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ اپنی اولادوں کو کوئی چیز ہبہ کرتے ہیں، پھر اپنے پاس روکے رکھتے

نَحلاً، ثُمَّ يُمسِكُونَهَا، فَإِنْ مَاتَ ابنُ أَحَدٍ قَالَ: مَالِي بِيَدِي، لَمْ أُعطِهِ أَحَدًا، وَإِنْ مَاتَ هُوَ قَالَ: هُوَ لابنِي قَدْ كُنتُ أَعطَيتُهُ إِيَّاهُ مِنْ نَحلٍ نَحَلتُه، فَلَمْ يُخَيِّرهَا الَّذِيْ نَحَلَهَا حَتّٰى يَكُونَ إِنْ مَاتَ لِوَرَثَتِهِ فَهِيَ بَاطِلٌ. (موطا مالك، أقضية/ ٣١٤، بالفاظ ديگر مصنف ابن أبي شيبة ١٠/ ٥٢٠، رقم ٢٠٤٩٥، إعلاء السنن بيروتی ١٦/ ٩٠، رقم: ٥٢٦٠، مصنف عبدالرزاق ٩/ ١٠٢، رقم: ١٦٥٠٩، حاشية تاتارخانية ١٤/ ٤٢٥، رقم: ٢١٥٨٠)

ہیں، پھر اگر کسی کا بیٹا مرجاتا ہے تو کہتا ہے کہ میرا مال میرے قبضہ میں ہے، میں نے کسی کو نہیں دیا۔ اور اگر وہ خود مرجاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ وہ مال میرے بیٹے کا ہے، میں نے اس کو اس عطیہ میں سے دیا ہے جو عطیہ میں نے بطور ہبہ اس کو دے دیا ہے، پس اس کو اختیار نہیں دیتا ہے، جس کو اس نے ہبہ کیا ہے، یہاں تک کہ اگر خود مرجاتا ہے تو وہ اس کے وارث کے لئے ہے، تو ایسا ہبہ باطل ہے۔

(۴) سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشاد پر صحابہ کا اجماع ہے۔ صاحب بدائع نے اس کو ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

وَرُوِيَ عَنْ سَيِّدِنَا عَلِيٍّ قَالَ: مَنْ وَهَبَ ثُلُثَ كَذَا أَوْ رُبُعَ كَذَا لَا يَجُوزُ مَا لَمْ يُقَاسِمْ، وَكُلُّ ذٰلِكَ بِمَحْضَرٍ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَمْ يُنقَلْ أَنَّهُ أَنكَرَ عَلَيْهِمْ مُنكِرٌ، فَيَكُونُ إِجمَاعًا؛

سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: کہ جو شخص اپنی قابل قسمت چیزوں میں سے ایسا تہائی یا ایسا ایسا چوتھائی حصہ ہبہ کردے، تو وہ اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک تقسیم کر کے الگ نہ کردے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ سب کچھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی موجودگی میں فرمایا ہے۔ اور کسی سے یہ بات منقول نہیں کہ ان پر کسی نکیر

وَلِأَنَّ الْقَبْضَ شَرْطُ جَوَازِ هٰذَا الْعَقْدِ، وَالشُّيُوْعُ يَمْنَعُ مِنَ الْقَبْضِ؛ لِأَنَّ مَعْنَى الْقَبْضِ هُوَ التَّمَكُّنُ مِنَ التَّصَرُّفِ فِي الْمَقْبُوْضِ، وَالتَّصَرُّفُ فِي النِّصْفِ الشَّائِعِ وَحْدَهُ لا يُتَصَوَّرُ. (بدائع زكريا ٥/ ١٧١، كراچى ٦/ ١٢٠)

کرنے والے نے نکیر کی ہو؛ لہٰذا یہ مسئلہ صحابہ کے اجماع سے ثابت ہوگیا۔ اور اس لئے بھی جائز نہیں ہے کہ اس عقد کے جواز کی شرط میں سے قبضہ تام ہے اور شیوع وشرکت قبضہ سے مانع ہے۔ اور اس لئے بھی جائز نہیں ہے کہ قبضہ تام کا مطلب یہ ہے کہ شئ مقبوض میں تصرف پر قدرت ہو اور شرکت اور شائع شدہ اور مشاع ہونے کی حالت میں صرف ایک نصف میں تصرف متصور نہیں۔

ائمۂ احناف کے یہاں ہبۂ مشاع فاسد ہے یا ناتمام؟

حقیقت یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک شئ مشاع کا ہبہ تقسیم اور علاحدگی سے پہلے جو ناجائز کہا گیا وہ مطلقاً نہیں اور نہ ہی شئ مشاع کا ہبہ باطل یا فاسد ہے؛ بلکہ شیوع کے سبب سے قبضۂ تام نہ ہونے کی وجہ سے ہبہ ناقص رہ جاتا ہے، اس ہبہ غیر تام کو بعضِ فقہاء نے ''فاسد'' کے الفاظ سے اور بعض فقہاء نے ''لایجوز'' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے؛ لہٰذا اگر قابل تقسیم اشیاء کو تقسیم سے پہلے مشاع کی حالت میں ہبہ کردیا جائے اور پھر قبضہ سے پہلے اس کو تقسیم کرکے قبضہ تام کے قابل بنادیا جائے تو بالاتفاق ہبہ درست ہوجاتا ہے، ایسی صورت میں حنفیہ کے درمیان میں بھی کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

وَاخْتَلَفَ عِبَارَةُ الْمَشَايِخِ فِي بَيَانِ مَعْنَى ذٰلِكَ بَعْضُهُمْ قَالُوا: بِأَنَّ هِبَةَ الْمُشَاعِ عِنْدَنَا غَيْرُ فَاسِدٍ إِلَّا أَنَّهَا غَيْرُ تَامَّةٍ

اسی معنی کو بیان کرنے میں مشائخ کی عبارت مختلف ہے، بعض مشائخ نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ ہبۂ مشاع ہمارے نزدیک (حنفیہ کے نزدیک) فاسد نہیں ہوتا ہے، ہاں

لِانْعِدَامِ الْقَبْضِ عَلٰی وَجْهِ التَّمَامِ بِسَبَبِ الشُّيُوْعِ، فَإِذَا انْعَدَمَ الشُّيُوْعُ قَبْلَ الْقَبْضِ ذٰلِكَ مِنْ تَمَامِ الْقَبْضِ فَعَمِلَتْ الْهِبَةُ السَّابِقَةُ عَمَلَهَا وَبَعْضُهُمْ قَالُوا: بِأَنَّ التَّسْلِيْمَ فِي مَعْنَى شَرْطِ الْعَقْدِ فِي الْعَقْدِ فِيْ بَابِ الْهِبَةِ، فَإِذَا أَزَالَ الشُّيُوْعُ قَبْلَ الْقَبْضِ صَارَ كَأَنَّ الْعَقْدَ وَقَعَ عَلَى الْمُفْرَزِ الْمَقْسُوْمِ. (الفتاوى التاتارخانية ١٤/ ٤٢٥، رقم: ٢١٥٨١)

البتہ شیوع کے سبب سے علی وجہ التمام قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے غیر تام ہوتا ہے، لہٰذا جب اس کے قبضۂ تام سے پہلے شیوع کی علت ختم ہوجائے تو سابقہ ہبہ صحیح ہوکر نافذ ہوجائیگا۔ اور بعض مشائخ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ بابِ ہبہ میں صلب عقد کے اندر عقد کے شرط کے مفہوم کے اندر تسلیم کا معنی پایا جاتا ہے؛ لہٰذا جب قبضہ سے پہلے شیوع کی علت زائل ہوجائے تو ایسا سمجھا جائے گا کہ عقد ہبہ تقسیم شدہ شئ پر واقع ہوا ہے۔

حنفیہ کے درمیان ہبۂ مشاع کے جواز اور عدم جواز کا اختلاف

قابل تقسیم اشیاء میں تقسیم سے پہلے مشاع اور مشترک حالت میں ہبہ کے صحیح ہونے اور نہ ہونے کے بارے میں جو مسئلہ ہے وہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ مشاع اور مشترک چیزوں کا تقسیم شدہ ہونا عقد ہبہ کے وقت میں کسی کے نزدیک بھی لازم یا شرط نہیں ہے؛ بلکہ قبضہ اور سپردگی کے وقت میں تقسیم شدہ ہونا لازم ہوتا ہے، تاکہ اس ہبہ کی وجہ سے مفضی الی المنازعہ لازم نہ آئے۔ نیز حضرت امام ابوحنیفہؒ اور صاحبین کے درمیان اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ امام صاحب کے نزدیک شئ موہوب صرف قبضہ کے وقت غیر منقسم اور مشاع ہوتو ناجائز ہے۔ اور صاحبین کے نزدیک بوقت نفس عقد اور بوقت قبضہ دونوں میں بیک وقت مشاع ہوتو ناجائز ہے، اگر بیک وقت دونوں میں مشاع نہیں ہے تو جائز ہے۔ اس تمہید کے بعد صاحبین اور امام ابوحنیفہ کے درمیان کا اختلاف ملاحظہ فرمائیے۔

اوراختلاف کی کئی شکلیں ہیں، ان میں سے چار شکلیں یہاں پیش کی جارہی ہیں:
شکل (۱):- اگر قابل تقسیم اشیاء کو تقسیم سے پہلے مشاع کی حالت میں ایک یا دو شخص نے دو یا دو سے زیادہ افراد کے ہاتھ ہبہ کر دیا ہے، تو حضرات صاحبین کے نزدیک ہبہ صحیح ہو جائے گا اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہبہ باطل تو نہیں ہوگا؛ لیکن ایسا فاسد ہوگا جو قبضہ کے وقت مفید ملک ہوگا، یعنی امام صاحب کے نزدیک قبضہ تام پر ہبہ موقوف رہتا ہے اور حضرات صاحبین کے نزدیک موقوف نہیں رہتا ہے؛ بلکہ نافذ ہو جاتا ہے۔
اس کو صاحب تاتارخانیہ اور ہندیہ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

وَهِبَةُ الْمُشَاعِ فِيمَا يَحْتَمِلُ الْقِسْمَةَ مِنْ رَجُلَيْنِ أَوْ مِنْ جَمَاعَةٍ عِنْدَهُمَا صَحِيْحَةٌ، وَعِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ فَاسِدَةٌ، وَلَيْسَتْ بِبَاطِلَةٍ حَتّٰى يُفِيدَ الْمِلْكَ عِنْدَ الْقَبْضِ. وَفِي الْغِيَاثِيَةِ: هُوَ الْمُخْتَارُ الخ.
(هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٧٨، جديد ٤/ ٤٠٠، الفتاوى التاتارخانية ١٤/ ٤٢٤، رقم: ٢١٥٧٩)

قابل تقسیم اشیاء میں دو آدمیوں کے ہاتھ یا ایک جماعت کے ہاتھ غیر منقسم مشاع چیز کا ہبہ صاحبینؒ کے نزدیک جائز اور صحیح ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فاسد ہے، باطل نہیں، حتی کہ قبضہ کے وقت ملکیت ثابت ہو جائے گی اور غیاثیہ میں ہے کہ یہی قول مختار ہے۔

بدائع اور ''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' میں اس کو اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

لَوْ وَهَبَ إِنْسَانٌ دَاراً مِنْ رَجُلَيْنِ، أَوْ مُدًّا مِنْ حِنْطَةٍ، أَوْ أَلْفَ دِرْهَمٍ أَوْ نَحْوَ ذٰلِكَ مِمَّا يُقْسَمُ، فَإِنَّهُ لا يَصِحُّ عِنْدَ أَبِي

اگر کسی انسان نے دو آدمیوں کے ہاتھ ایک مکان یا گیہوں کا ایک مُد، یا ایک ہزار درہم، یا اس جیسی قابل تقسیم چیز ہبہ کر دی ہے، تو

حَنِيُفَةَ، وَعِنُدَ الصَّاحِبَيُنِ يَصِحُّ. (الفقه الإسلامي ٤/ ٦٨٧، بدائع زكريا ٥/ ١٧٣، كراچی ٦/ ١٢١)	حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک صحیح نہیں ہوگا اور صاحبینؒ کے نزدیک صحیح ہوجائے گا۔

شکل (۲):- حضرت امام ابوحنیفہؒ اور صاحبینؒ کے درمیان اصولی اختلاف یہ ہے کہ حضرت امام صاحبؒ کے نزدیک شئ موہوب صرف قبضہ کے وقت مشاع اور مشترک ہوتو ناجائز ہے۔ اور صاحبینؒ کے نزدیک نفس عقد کے وقت اور قبضہ کے وقت دونوں میں بیک وقت مشاع اور مشترک ہوتو ناجائز ہے، ورنہ جائز ہے؛ لہٰذا اگر دو آدمیوں نے ایک آدمی کے ہاتھ تقسیم سے پہلے شئ مشاع کو ہبہ کردیا تو بوقت قبضہ مشاع اور شرکت کے نہ ہونے کی بنا پر یہ صورت بالاتفاق جائز ہے؛ اس لئے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قبضہ کے وقت مشاع نہیں ہے؛ کیوں کہ شئ موہوب مکمل فرد واحد کے قبضہ میں آگئی ہے۔ اور حضرات صاحبینؒ کے نزدیک بیک وقت عقد اور قبضہ دونوں میں ساتھ ساتھ شیوع نہیں پایا گیا ہے؛ اس لئے ان کے نزدیک بھی جائز ہے۔ اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

إِنَّ أَبَا حَنِيُفَةَ يَعُتَبِرُ الشُّيُوُعَ عِنُدَ الُقَبُضِ مَانِعًا مِنُ صِحَةِ الُهِبَةِ، وَأَمَّا الصَّاحِبَانِ فَيَعُتَبِرَانِ الشُّيُوُعَ عِنُدَ الُعَقُدِ وَالُقَبُضِ مَعًا هُوَ الُمَانِعُ مِنُ صِحَةِ الُهِبَةِ، وَبِنَاءً عَلَيُهِ يَجُوُزُ هِبَةُ الاثُنَيُنِ مِنَ الُوَاحِدِ بِالاتِّفَاقِ لِعَدَمِ وُجُوُدِ الشُّيُوُعِ عِنُدَ الُقَبُضِ فِيُ رَأيِ أَبِيُ حَنِيُفَةَ، وَلانُعِدَامِ الشُّيُوُعِ فِي الُحَالَتَيُنِ مَعًا فِيُ	بے شک حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ قبضہ کے وقت شیوع کا اعتبار کرتے ہیں جو صحت ہبہ کو مانع ہے۔ اور بہر حال صاحبین رحمہما اللہ عقد اور قبضہ دونوں کے وقت ساتھ ساتھ شیوع کا اعتبار کرتے ہیں جو صحت ہبہ کو مانع ہے۔ اور اسی بنا پر دو آدمی کا ہبہ ایک آدمی کے ہاتھ بالاتفاق جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کی رائے کے مطابق قبضہ کے وقت شیوع کے نہ ہونے کی وجہ سے اور صاحبین رحمہما اللہ کی رائے کے مطابق عقد اور قبضہ

رَأيِ الصَّاحِبَيْنِ؛ لِأَنَّ الشُّيُوْعَ وُجِدَ عِنْدَ الْعَقْدِ وَلَمْ يُوْجَدْ عِنْدَ الْقَبْضِ. (الفقه الإسلامي وأدلته ٤/ ٦٨٧، بدائع زكريا ٥/ ١٧٣، كراچی ٦/ ١٢١)

دونوں حالتوں میں ساتھ ساتھ شیوع نہ ہونے کی وجہ سے؛ اس لئے کہ یہاں بوقت عقد شیوع پایا گیا ہے اور قبضہ کے وقت نہیں پایا گیا۔

شکل (۳):- جانبین میں مشاع اور شرکت ہو تو ایسی صورت میں بالاتفاق شئ مشاع کا ہبہ جائز نہیں ہے، مثال کے طور پر ہبہ کرنے والے دو شریک (پاٹنر) ہیں اور دونوں پاٹنر اپنی اپنی مشترکہ شئ مشاع اور شرکت کی حالت میں بلاتقسیم الگ الگ دو شخصوں کو ہبہ کردیں، تو ایسی صورت میں یکے بعد دیگرے دو شخصوں کے ہاتھ یہ ہبہ بالاتفاق صحیح نہیں؛ کیوں کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بوقت قبضہ شئ موہوب کو مشاع پایا گیا۔ اور صاحبینؒ کے نزدیک بوقت عقد اور بوقت قبضہ دونوں حالتوں میں مشاع پایا گیا؛ اس لئے ہبہ مشاع کی یہ صورت باتفاق احناف درست نہیں۔

اس کو حضرات فقہاء نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

فَالشُّيُوْعُ مِنَ الطَّرْفَيْنِ فِيْمَا يَحْتَمِلُ الْقِسْمَةَ مَانِعٌ صِحَةَ الْهِبَةِ وَتَمَامَهَا بِالإِجْمَاعِ. (الفتاوى التاتارخانية ١٤/ ٤٢٤، رقم: ٢١٥٧٩، فتاوى هنديه، زكريا قديم ٤/ ٣٧٨، جديد ٤/ ٤٠٠)

لہٰذا ایسی چیزوں میں جانبین سے شیوع اور شرکت جو تقسیم کا احتمال رکھتی ہوں، صحت ہبہ اور تمام ہبہ کو بالاجماع مانع ہے۔

شکل (۴):- واہب کی طرف سے مال موہوب میں شیوع ہو تو سب کے نزدیک ہبہ مشاع درست نہیں ہے، یعنی ہبہ کرنے والا واہب بھی ایک ہو اور موہوب لہ بھی فرد واحد ہو، مگر مالِ موہوب، شئ مشاع ہو اور بوقت عقد بھی مشاع ہے اور بوقت قبضہ بھی، مثلاً کوئی شخص دوسرے سے یہ کہتا ہے کہ میں اپنی زمین یا مکان کا نصف حصہ تم کو ہبہ کردیتا ہوں، تو ایسی صورت میں

بوقت عقد شیٔ موہوب میں مشاع پایا گیا اور چونکہ تقسیم سے پہلے ہبہ پایا گیا ہے جو قبضہ تام کے لئے مانع ہے؛ اس لئے باتفاق ائمہ احناف یہ شکل بھی درست نہیں۔ اور یہی شکل عوام میں زیادہ رائج ہے؛ لہٰذا اگر ہبۂ مشاع کی یہ شکل مفضی الی النزاع نہ ہو تو جائز ہے یا نہیں؟ اس پر علماء کو غور کرنا چاہئے۔ اس کی تفصیل ہبہ مشاع کے جواز کی تیسری شکل میں آ رہی ہے۔

اس کو حضرات فقہاء نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

وَإِذَا وَهَبَ الرَّجُلُ لِلرَّجُلِ نَصِيبًا مُسَمًّى مِنْ دَارٍ غَيْرَ مَقْسُومَةٍ وَسَلَّمَهُ إِلَيْهِ مُشَاعًا أَوْ سَلَّمَ إِلَيْهِ جَمِيعَ الدَّارِ لَمْ يَجُزْ يَعْنِي لايَقَعُ الْمِلْكُ لِلْمَوْهُوبِ لَهُ بِالْقَبْضِ قَبْلَ الْقِسْمَةِ عِنْدَنَا الخ. (مبسوط سرخسي ١٢/ ٦٤)

اور جب کوئی آدمی دوسرے آدمی کو اپنے مکان میں سے متعین حصہ بغیر تقسیم کئے مشاع کی حالت میں ہبہ کر کے حوالہ کر دے، یا پورا مکان حوالہ کر دے تو جائز نہیں، یعنی موہوب لہ کے لئے ہمارے نزدیک تقسیم سے قبل قبضہ سے ملکیت ثابت نہ ہوگی۔

اس کو صاحب بدائع نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

وَلَو وَهَبَ مِنْهُ نِصْفَ الدَّارِ وَسَلَّمَ إِلَيْهِ بِتَخْلِيَةِ الْكُلِّ، ثُمَّ وَهَبَ مِنْهُ النِّصْفَ الآخَرَ وَسَلَّمَ لَمْ تَجُزْ الْهِبَةُ، لِأَنَّ كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا هِبَةُ الْمُشَاعِ، وَهِبَةُ الْمُشَاعِ فِيمَا يُقْسَمُ لاتَنْفُذُ إِلَّا بِالْقِسْمَةِ وَالتَّسْلِيمِ، وَيَسْتَوِي فِيهِ الْجَوَابُ فِي هِبَةِ الْمُشَاعِ بَيْنَ

اور اگر کسی نے دوسرے کو اپنے مکان کا نصف حصہ ہبہ کر کے سونپ دیا ہے، پورے مکان کے تخلیہ کے ساتھ پھر اس کے بعد مکان کا دوسرا نصف بھی ہبہ کر کے سونپ دے تو یہ ہبہ جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ دونوں میں سے ہر ایک میں ہبہ مشاع کی شکل پائی گئی ہے اور قابل تقسیم اشیاء میں ہبہ مشاع نافذ نہیں ہوتا، ہاں البتہ تقسیم کے ذریعہ الگ کر کے سونپ دینے سے نافذ ہوتا ہے اور اس کے اندر مسئلہ

أَنْ يَكُوْنَ مِنْ أَجْنَبِيٍّ أَوْ شِرْكَةِ شَرِيْكِهِ. (بدائع زکریا ۵/ ۱۷۲، کراچی ٦/ ١٢١)

کا حکم برابر ہے، چاہے مشاع مالک اور اجنبی کے درمیان میں ہو، یا مالک اور شریک کی شرکت کے ساتھ ہو۔

صاحبینؒ کے درمیان اختلاف

حضرات صاحبینؒ کے نزدیک ماقبل میں ذکر کردہ چاروں شکلوں میں سے پہلی شکل جائز ہے۔ اور امام صاحبؒ کے نزدیک ناجائز ہے؛ لیکن پہلی شکل میں یعنی ایک آدمی دو آدمیوں کے ہاتھ قابل تقسیم چیز کو مشاع کے طور پر ہبہ کردے اور دونوں موہوب لہ کے درمیان نصفا نصفی ہو، تو امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ دونوں کے نزدیک جائز ہے؛ لیکن اگر دونوں موہوب لہ کے درمیان مال موہوب برابر نہ ہو؛ بلکہ کم وزیادہ ہو، مثلاً ایک کے لئے ثلث اور دوسرے کے لئے دو ثلث، اسی طرح ایک کے لئے ایک چوتھائی اور دوسرے کے لئے تین چوتھائی ہو، تو ایسی صورت میں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے درمیان میں اختلاف ہے۔ حضرت امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں: کہ دونوں موہوب لہ کے درمیان میں شئ موہوب میں تساوی اور برابری لازم ہے؛ اس لئے ان کے نزدیک یہ شکل جائز نہیں ہے۔ اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک تساوی شرط نہیں ہے؛ بلکہ تفاضل کے ساتھ بھی جائز ہے؛ اس لئے امام محمدؒ کے نزدیک یہ شکل بھی جائز ہے؛ کیوں کہ جب دو موہوب لہ کے درمیان مشاع کے طور پر ہبہ کو جائز کہا گیا ہے، تو اس میں تساوی اور تفاضل کی کوئی شرط نہیں ہونی چاہئے؛ بلکہ علی الاطلاق جائز ہونا چاہئے؛ کیوں کہ جب نصفا نصفی جائز ہے تو ثلث اور ثلثان بھی جائز ہونا چاہئے؛ لہٰذا امام محمدؒ کا قول زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے۔

اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

وَلَوْ قَالَ: وَهَبْتُ لَكُمَا هٰذِهِ الدَّارَ ثُلُثُهَا لِهٰذَا وَثُلُثَاهَا لِهٰذَا لَمْ يَجُزْ عِنْدَ أَبِي يُوسُفَ وَجَازَ عِنْدَ مُحَمَّدٍ، وَجْهُ قَوْلِ مُحَمَّدٍ: أَنَّ الْعَقْدَ مَتٰى جَازَ لِاثْنَيْنِ يَسْتَوِي فِيهِ التَّسَاوِي وَالتَّفَاضُلُ كَعَقْدِ الْبَيْعِ، وَجْهُ قَوْلِ أَبِي يُوسُفَ: أَنَّ الْجَوَازَ عِنْدَ التَّسَاوِي بِطَرِيقِ التَّفْسِيرِ لِلْحُكْمِ الثَّابِتِ بِالْعَقْدِ، وَذٰلِكَ لَا يُوجِبُ شُيُوعًا فِي الْعَقْدِ، وَلَمَّا فَضَلَ أَحَدُ النَّصِيبَيْنِ عَنِ الْآخَرِ تَعَذَّرَ جَعْلُهُ تَفْسِيرًا. (بدائع الصنائع زكريا ٥/ ١٧٤، كراچی ٦/ ١٢٢، الفقه الإسلامي ٤/ ٦٨٨)

اور اگر کہا کہ میں نے تم دونوں کے لئے یہ گھر ہبہ کردیا ہے اس کا ایک ثلث اس کے لئے اور دوثلث اس کے لئے، تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جائز نہیں اور امام محمدؒ کے نزدیک جائز ہے۔ امام محمدؒ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ بے شک جب عقد جائز ہوگیا دوآدمیوں کے لئے تو اس میں تساوی اور تفاضل دونوں کا حکم برابر ہوگا، جیسا کہ عقد بیع میں ہوتا ہے۔ اور امام ابو یوسفؒ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ تساوی کے وقت جائز ہے عقد کے ذریعہ سے ثابت شدہ حکم کی تفسیر کے طور پر اور یہ عقد کے اندر شیوع کو لازم نہیں کرتا اور جب دونوں حصوں میں ایک حصہ دوسرے سے زائد ہو تو اس کو تفسیر قرار دینا متعذّر ہو جائے گا۔

ہبۃ المشاع کے جواز کی شکلیں

ہبۂ مشاع کے جواز کی تین شکلیں یہاں پیش کردیتے ہیں۔

شکل (۱): قبضہ سے قبل تقسیم: قبضہ سے قبل تقسیم کے تفصیلی دلائل سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ شئ مشاع کو ہبہ کرنے کے بعد قبضہ دینے سے پہلے شئ موہوب کو تقسیم کرکے الگ کردیا جائے، اس کے بعد موہوب لہ کے قبضہ میں دے دیا جائے، تو سب کے نزدیک ہبۂ مشاع درست ہو جائے گا۔

لہٰذا اگر واہب نے اپنے شرکاء سے اپنا حصہ تقسیم کر کے الگ کرنے سے پہلے اپنا حصہ کسی کو ہبہ کر دیا ہے اور موہوب لہ کو قبضہ دینے سے قبل تقسیم کر کے اپنا حصہ الگ کرلیا ہے، اس کے بعد موہوب لہ کو قبضہ دے دیا ہے، تو بالاتفاق جائز ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے اپنی ذاتی ملکیت کی جائیداد میں سے کچھ حصہ الگ کرنے سے پہلے دوسرے کو مشاع کی حالت میں ہبہ کر دیا ہے اور قبضہ دینے سے پہلے اس حصہ کو الگ کر کے متعین کر دیا ہے، اس کے بعد موہوب لہ کو قبضہ دے دیا ہے، تو اس طرح کا ہبہ مشاع سب کے نزدیک جائز اور درست ہے۔

یہ حکم حضرات فقہاء کے اس طرح کے الفاظ سے واضح ہوتا ہے:

وَإِنَّمَا اشْتَرَطَ كَوْنُ الْمَوْهُوْبِ مَقْسُومًا وَمُفَرَّغًا وَقْتَ الْقَبْضِ وَالتَّسْلِيْمِ لا وَقْتَ الْهِبَةِ (قوله) فَإِذَا انْعَدَمَ الشُّيُوْعُ قَبْلَ الْقَبْضِ ذٰلِكَ مِنْ تَمَامِ الْقَبْضِ فَعَمِلَتِ الْهِبَةُ السَّابِقَةُ عَمَلَهَا (قوله) فَإِذَا أَزَالَ الشُّيُوْعُ قَبْلَ الْقَبْضِ صَارَ كَأَنَّ الْعَقْدَ وَقَعَ عَلَى الْمُفَرَّغِ الْمَقْسُومِ (وقوله) وَلَوْ وَهَبَ نِصْفَ الدَّارِ مِنْ رَجُلٍ ثُمَّ قَسَّمَ وَسَلَّمَ جَازَ. (الفتاوى التاتارخانية ١٤/ ٤٢٥-٤٢٦، رقم ٢١٥٨٠ تا ٢١٥٨٢)

بے شک شئ موہوب کا تقسیم شدہ ہو کر الگ ہونا بوقت قبضہ اور بوقت تسلیم ہی شرط ہے، بوقت ہبہ شرط نہیں ہے؛ لہٰذا جب قبضہ سے قبل شیوع ختم ہو جائے یہی قبضہ تام کے لئے کافی ہے؛ لہٰذا سابقہ ہبہ پر ہی عمل جاری ہو جائے گا، پس جب قبضہ سے قبل شیوع زائل ہو جائے تو ایسا ہو جائے گا کہ تقسیم شدہ الگ شئ پر ہی عقد واقع ہوا ہے (مصنف کا قول) اگر نصف مکان کسی شخص کے ہاتھ ہبہ کر دیا ہے، پھر اس کے بعد تقسیم کر کے موہوب لہ کو سونپ دیا ہے تو جائز اور درست ہے۔

ہبۃ المشاع میں آپس میں مل کر تقسیم کا جواز

شکل (۲):- اگر قابل تقسیم اشیاء کو واہب نے تقسیم سے قبل دو یا دو سے زیادہ افراد کے

درمیان ہبہ کر دیا ہے اور موہوب لہم سے کہہ دیا کہ اپنے شریک کے ساتھ آپس میں مل کر تقسیم کر لینا اور تقسیم کر کے اپنے اپنے حصوں پر قبضہ کر لینا، تو ایسی صورت میں بھی ہبۃ المشاع بلاشبہ جائز ہے۔ یا واہب کا حصہ اپنے شریک کے ساتھ پہلے سے مشترک ہے اور اس کو تقسیم کر کے الگ کرنے سے قبل اپنا حصہ کسی کو ہبہ کر دیا ہے، اور موہوب لہ سے کہہ دیا کہ ہمارے پاٹنر کے ساتھ مل کر تقسیم کر لو اور اس کے بعد اپنا حصہ قبضہ کر لینا، تو ایسی صورت میں بھی بلاشبہ ہبۃ المشاع جائز اور درست ہے۔ اس کو علامہ شامی نے ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

فَإِنْ قَسَّمَهُ أَيِ الْوَاهِبُ بِنَفْسِهِ أَوْ نَائِبُهُ أَوْ أَمَرَ الْمَوْهُوبَ لَهُ بِأَنْ يُقَسِّمَ مَعَ شَرِيكِهِ كُلُّ ذٰلِكَ يَتِمُّ بِهِ الْهِبَةُ كَمَا هُوَ ظَاهِرٌ لِمَنْ عِنْدَهُ أَدْنٰى فِقْهٍ.

(شامی زکریا ۸/۴۹۵، کراچی ۵/ ۶۹۲)

لہٰذا اگر شئ موہوب کو خود واہب یا اس کے نائب نے تقسیم کر دیا ہے، یا موہوب لہ سے کہہ دیا کہ اپنے شریک کے ساتھ ملکر آپس میں تقسیم کر لے، تو سب صورتیں ایسی ہیں جن سے ہبہ تام ہو جاتا ہے، جیسا کہ ان لوگوں کے لئے واضح ہے جو ادنی درجہ کا تفقہ اور ادنی درجہ کی سمجھ رکھتے ہیں۔

نزاع نہ ہو تو ہبۂ مشاع کا جواز

شکل (۳):- اگر شئ مشترک کو مشاع کی حالت میں ہبہ کر دیا ہے اور موہوب لہ کے درمیان تقسیم اور قبضہ سے متعلق کوئی نزاع اور اختلاف نہیں ہے، تو ایسی صورت میں یہ ہبۂ مشاع جائز اور درست ہو جائے گا؛ اس لئے کہ تقسیم سے قبل مشاع اور مشترک ہونے کی وجہ سے شئ موہوب کی تعیین میں جو جہالت مفضی الی النزاع ہوتی ہے وہ قبضۂ تام کے لئے مانع ہوتی ہے اور جو جہالت تقسیم اور قبضہ کے بارے میں مفضی الی النزاع نہ ہو وہ قبضۂ تام کے لئے مانع نہیں ہوتی۔ اور یہاں جہالت مفضی الی النزاع نہیں ہے؛ اس لئے یہ ہبۂ مشاع جائز اور درست ہو جائے گا۔ یہ مسئلہ مبسوط سرخسی کی اس عبارت سے واضح ہو جاتا ہے:

وَإِنْ وَهَبَ عَبْدَهُ لِرَجُلَيْنِ، أَوْ وَهَبَ رَجُلانِ لِرَجُلٍ، أَوْ وَهَبَ أَحَدُهُمَا نَصِيبَهُ لِشَرِيكِهِ أَوْ لِأَجْنَبِيٍّ وَسَلَّمَهُ، فَهُوَ جَائِزٌ كُلُّهُ؛ لِأَنَّ الْمَوْهُوبَ مَعْلُومٌ وَلا أَثَرَ فِي الشُّيُوعِ فِي الْمَنْعِ مِنَ الْهِبَةِ فِي هٰذَا الْمَحَلِّ، وَإِنْ قَالَ أَحَدُ الشَّرِيكَيْنِ لِرَجُلٍ: قَدْ وَهَبْتُ لَكَ نَصِيبِي مِنْ هٰذَا الْعَبْدِ فَاقْبِضْهُ وَلَمْ يُسَمِّه لَهُ وَلَمْ يَعْلَمْهُ إِيَّاهُ لَمْ يَجُزْ بِجَهَالَةِ الْمَوْهُوبِ، وَهٰذِهِ الْجَهَالَةُ تُفْضِي إِلَى الْمُنَازَعَةِ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الشَّرِيكِ الْآخَرِ، وَلِأَنَّ الْمَجْهُولَ لا يَجُوزُ تَمْلِيكه بِشَيْءٍ مِنَ الْمَعْقُودِ قَصْداً الخ. (مبسوط السرخسي ١٢/ ٧٤)

اور اگر کسی نے اپنے غلام کو دو آدمیوں کے درمیان ہبہ کردیا ہے، یا دو آدمیوں نے ایک شخص کو ہبہ کردیا ہے، یا دونوں میں سے کسی ایک نے اپنا حصہ اپنے شریک کے ہاتھ ہبہ کردیا ہے، یا کسی اجنبی کو ہبہ کردیا اور اسی حالت میں حوالہ کردیا ہے، تو یہ سب صورتیں جائز ہیں؛ اس لئے کہ شیٔ موہوب معلوم ومتعین ہے اور اس جگہ شیوع مانع ہبہ کو مؤثر نہیں ہے۔ اور اگر دونوں شریک میں سے ایک نے کسی اجنبی آدمی سے کہا کہ میں نے اس غلام میں سے اپنا حصہ تم کو ہبہ کردیا؛ لہٰذا تم اس پر قبضہ کرلو اور اس کا نام اس کو نہیں بتلایا اور نہ ہی اس کو متعین کرکے اس کو بتلایا ہے، تو یہ شیٔ موہوب کی جہالت کی وجہ سے جائز نہیں ہے اور یہ ایسی جہالت ہے جو اس کے اور دوسرے شریک کے درمیان اختلاف کو کھینچ کر لاتی ہے اور اس لئے بھی کہ بالقصد کسی بھی عقد کے ذریعہ مجہول شیٔ کا مالک بنانا جائز نہیں ہے۔

لہٰذا مبسوط کی اس عبارت سے واضح ہوگیا کہ شیٔ مشاع کو ہبہ کرنے میں اگر آپس میں قبضہ کرنے میں کسی قسم کا نزاع اور اختلاف نہیں ہے تو شیٔ مشاع کا ہبہ جائز اور درست ہے۔

مقالہ کا خلاصہ اور سوالات کے جوابات

اب یہاں سے اختصار کے ساتھ سوالات کے جوابات پیش کئے جاتے ہیں

شئ موہوب کے مقسوم میں ائمہ کا اختلاف

سوال نمبر۱:- شئ موہوب کے مقسوم ہونے کے بارے میں حضرات ائمۂ ثلاثہ اور حنفیہ کے درمیان اختلاف ہے کہ حضرات ائمۂ ثلاثہ کے نزدیک قابل تقسیم اشیاء کی تقسیم سے قبل مشاع کی حالت میں ہبہ کردینا جائز اور درست ہے۔ اور حنفیہ کے نزدیک قابل تقسیم اشیاء کا ہبہ تقسیم سے قبل جائز نہیں ہے۔

ائمۂ ثلاثہ کی طرف سے اپنے مدعیٰ کے ثبوت میں کئی روایات پیش کی جاتی ہیں، ان میں سے ہم نے اسی مقالہ کے شروع میں ان کی دو دلیلیں پیش کردی ہیں:

(۱) وفد ہوازن کا واقعہ ہے، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حصوں کو الگ کرنے سے پہلے فرمایا تھا کہ میرا حصہ اور بنی عبدالمطلب کا حصہ (فہولکم) تمہارے لئے ہماری طرف سے ہبہ ہے۔ یہ تفصیلی روایت ''مسند احمد ۲/۱۸۴، رقم: ۷۲۹، تغلیق التعلیق ۳/۳۷۴'' کے حوالہ سے پیش کی ہے۔

(۲) مسجد نبوی کی جگہ حضرت اسعد بن زرارہ اور دیگر دو آدمیوں کے درمیان مشترک تھی، حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے اپنا حصہ تقسیم سے قبل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مشاع کی حالت میں ہبہ کردیا تھا اور آپ نے اس کو قبول فرمالیا، پھر اس کے بعد دوسرے دونوں نے بھی اپنا اپنا حصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کردیا تھا اور آپ نے ان کے حصہ کو بھی بعد میں قبول فرمالیا تھا۔ اس سے ہبۂ مشاع کے جواز کا ثبوت ہوتا ہے۔ اس کو ہم نے ''بدائع ۵/۱۷۰، اور مبسوط سرخسی ۱۲/۶۴'' کے حوالہ سے پیش کردیا ہے۔

حضرات حنفیہ کی طرف سے بھی متعدد روایات پیش کی جاتی ہیں، ان میں سے تین دلیلیں ہم نے ماقبل میں پیش کی ہیں:

(۱) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حضرت ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کرنے کا واقعہ ہے، جس کے تقسیم نہ ہونے کی وجہ سے وارثین کے لئے میراث میں شامل ہوجانے کی بات ہے۔ اس کو ''مؤطا امام مالک/۲۱۴، نصب الرایہ۴/۱۲۲، مصنف ابن ابی شیبہ ۱۰/۵۲۲، رقم: ۲۰۵۰۶، بدائع ۵/۱۶۳، اعلاء السنن ۱۶/ ۸۹'' کے حوالہ سے پیش کی ہے۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت جس کو ''المعجم الاوسط ۳/ ۱۷، رقم: ۳۸۹، اعلاء السنن ۱۶/ ۹۹'' کے حوالہ سے پیش کی ہے۔

(۳) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اثر ہے، جس کو ''مؤطا مالک/۳۱۴، مصنف ابن ابی شیبہ ۱۰/۵۲۰، رقم: ۲۰۴۹۵، اعلاء السنن ۱۶/ ۹۰، رقم: ۵۲۶۰'' کے حوالہ سے پیش کر دیا ہے۔ نیز بدائع ۵/ ۱۷۱ر میں حضرت علیؓ کے قول پر صحابہؓ کا اجماع نقل کیا گیا ہے اور اجماع صحابہ بھی حجت ہے۔

ہبہ میں قبضہ کی حیثیت

ہبہ میں قبضہ کا مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے، چنانچہ ہبہ میں ملکیت کے ثبوت کے لئے ایسا قبضہ شرط کے درجہ میں ہے، جس میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہو، مثلاً ملک غیر کے ساتھ مشغول اور مشاع نہ ہو اور ایسی جہالت نہ ہو جو قبضہ تام کے لئے مفضی الی النزاع ہو، ہاں البتہ نفس عقد ہبہ قبضہ سے قبل سب کے نزدیک جائز ہے، مگر قبضہ تام کے بغیر ہبہ کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

وَشَرَائِطُ صِحَّتِهَا فِي الْمَوْهُوْبِ أَنْ يَكُوْنَ مَقْبُوضًا غَيْرَ مُشَاعٍ، وَتَحْتَهُ فِي الشَّامِيَةِ: وَأَمَّا الْقَبْضُ فَلا بُدَّ مِنْهُ لِثُبُوْتِ الْمِلْكِ إِذَا الْجَوَازُ ثَابِتٌ قَبْلَ الْقَبْضِ

شئ موہوب میں قبضہ کی شرائط میں سے ایسا قبضہ مشروط ہے جو شرکت کی وجہ سے مشاع نہ ہو اور اس کے نیچے تکملہ شامی میں ہے اور بہر حال قبضہ ثبوت ملک کے لئے لازم ہے؛ اس لئے کہ ہبہ کا جواز قبضہ سے قبل بالاتفاق ثابت

بِالاتِّفَاقِ، وَهٰذَا يُفِيْدُ أَنَّ الْقَبْضَ شَرْطٌ لِثُبُوتِ الْمِلْكِ لا لِلصَّحَةِ الخ. (تكمله شامي زكريا ١٢/ ٥٦٦، كراچى ٨/ ٤٢٣-٤٢٤)

ہے۔ اور یہ اس بات کو مستفاد ہے کہ قبضہ ثبوت ملک ہی کی شرط ہے نہ کہ صحت ہبہ کی۔

نابالغ کو ہبہ میں قبضۂ جدید کی ضرورت نہیں

اگر نابالغ کو ولی نے ہبہ کردیا ہے، مثلاً باپ، یا باپ کا وصی، اسی طرح باپ کے نہ ہونے کی صورت میں دادا یا چچا یا بھائی وغیرہ نے ہبہ کردیا ہے، جب کہ نابالغ انہیں لوگوں کی پرورش میں ہو، تو واہب کا موجودہ قبضہ بحیثیت ولی اور گارجین کے نابالغ کی طرف سے قبضہ کے لئے کافی ہے۔ اور قبضۂ جدید کی ضرورت نہیں؛ اس لئے کہ واہب نے جب ہبہ کردیا تو ہبہ ہوتے ہی محض عقد ہبہ سے ہبہ تام ہوگیا، پھر نابالغ کے بالغ ہوجانے کے بعد قبضۂ جدید کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ قبضۂ جدید کی بات کسی بھی فقیہ نے نہیں کہی؛ اس لئے بلوغت کے بعد قبضۂ جدید کی ضرورت نہ ہوگی؛ بلکہ سابقہ قبضہ جو ولی نے بحیثیت گارجین کیا ہے، وہی کافی ہوجائے گا۔

اسی طرح کسی اجنبی شخص نے صبیٔ نابالغ کو ہبہ کردیا ہے اور نابالغ کے ولی نے اس پر قبضہ کرلیا ہے، تو ولی کا قبضہ کافی ہوجائے گا اور بعد بلوغ جدید قبضہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

وَهِبَةُ مَنْ لَهُ وَلَايَةٌ عَلَى الطِّفْلِ فِي الْجُمْلَةِ وَهُوَ كُلُّ مَنْ يَعُوْلُهُ فَدَخَلَ الْأَخُ وَالْعَمُّ عِنْدَ عَدَمِ الْأَبِ لَوْ فِيْ عَيَالِهِمْ، تَتِمُّ بِالْعَقْدِ، وَالْأَصْلُ أَنَّ كُلَّ عَقْدٍ

اور اس شخص کا ہبہ جس کو نابالغ بچے پر فی الجملہ ولایت حاصل ہو، اور وہ ہر ایسا شخص ہے جس نے نابالغ کی پرورش کی ذمہ داری لے رکھی ہے؛ لہٰذا اس میں نابالغ کا بھائی، اس کا چچا وغیرہ باپ کے نہ ہونے کی حالت میں داخل ہوجائیں گے، اگر نابالغ ان کی فیملی میں ہو محض ہبہ سے عقد تام ہوجائے گا

يَتَوَلَّاهُ الْوَاحِدُ يَكْتَفِي فِيهِ بِالإِيجَابِ، وَإِنْ وَهَبَ لَهُ أَجْنَبِيٌّ تَتِمُّ بِقَبْضِ وَلِيِّهِ. (الدر المختار زكريا ١٢/ ٥٩٩، كراچی ٨/ ٤٤٩)

اور ضابطہ یہ ہے کہ ہر وہ عقد جس کی دونوں جانب کی ذمہ داری ایک ہی شخص لے سکتا ہے، اس میں عقد صرف ایجاب کے ذریعہ سے کافی اور تام ہوجاتا ہے۔ اور اگر اجنبی شخص نے نابالغ کو ہبہ کردیا ہے تو اس کے ولی کے قبضہ سے ہبہ تام ہوجاتا ہے۔

اس کو علامہ ابن عابدینؒ اور علاء الدین شامی رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

أَنْ يَهَبَ مَنْ لَهُ الْوِلَايَةُ عَلَى الطِّفْلِ لِلطِّفْلِ يَتِمُّ بِالْعَقْدِ وَلَا يَفْتَقِرُ إِلَى الْقَبْضِ؛ لِأَنَّهُ هُوَ الَّذِي يَقْبِضُ لَهُ، فَكَانَ قَبْضُه كَقَبْضِهِ، وَصَارَ كَمَنْ وَهَبَ لآخَرَ شَيْئًا وَكَانَ الْمَوْهُوبُ فِي يَدِ الْمَوْهُوبِ لَهُ، فَإِنَّهُ لَا يُحْتَاجُ إِلَى قَبْضٍ جَدِيدٍ. (تکملہ شامی زكريا ديوبند ١٢/ ٥٩٩، كراچی ٨/ ٤٤٩)

جس شخص کو نابالغ بچہ پر ولایت حاصل ہے وہ بچہ کو کوئی شئ ہبہ کردے تو محض ہبہ سے عقد تام ومکمل ہوجائے گا اور الگ سے اس کی طرف سے قبضہ کی ضرورت نہیں؛ اس لئے کہ یہی وہ شخص ہے جو نابالغ کے لئے قبضہ کرتا ہے؛ لہٰذا اس کا قبضہ اسی کے قبضہ کی طرح ہے، اور وہ اس شخص کی طرح ہوجائے گا، جو دوسرے کو کوئی چیز ایسی حالت میں ہبہ کردے کہ شئ موہوب پہلے سے موہوب لہ کے قبضہ میں تھی؛ لہٰذا قبضۂ جدید کی ضرورت نہیں ہوگی۔

نابالغ کی طرف سے صحتِ قبضہ کی شرائط

نابالغ کی طرف سے ولی کے قبضہ کے درست ہونے کے لئے تین شرطیں زیادہ اہم ہیں:

(۱) نابالغ کو ہبہ کردینے کے بعد ماحول اور خاندان میں اس کا اعلان کردینا لازم اور ضروری ہے۔

(۲) شئ موہوب معلوم اور متعین ہو، مجہول اور نامعلوم نہ ہو۔

(۳) اس پر شرعی گواہ بنالینا، اور گواہ بنالینا صحتِ عقد کی شرط نہیں ہے؛ بلکہ عقد تو بغیر گواہ کے بھی صحیح ہوجاتا ہے، مگر بعد میں آگے چل کر عقدِ ہبہ سے انکار کے خطرے سے حفاظت کے

لئے گواہ کوضروری کہا گیا ہے، تاکہ آئندہ اگر قابض کی نیت خراب ہو اور باپ کی موت کے بعد ورثاء اس ہبہ کا انکار کردیں تو گواہوں کے ذریعہ سے ثابت کر سکے۔ اس کو تکملہ شامی میں ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

وَإِذَا وَهَبَ أَحَدٌ لِطِفْلٍ يَنبَغِي أَنْ يَشْهَدَ، وَهٰذَا إِذَا أَعْلَمَهُ يَشْهَدُ عَلَيْهِ، وَالإِشْهَادِ لِلتَّحَرُّزِ عَنِ الْجُحُودِ بَعْدَ مَوْتِهِ، وَالإِعْلَامُ لَازِمٌ؛ لِأَنَّهُ بِمَنزِلَةِ الْقَبْضِ (وقوله قَالَ مُحَمَّدٌ كُلُّ شَيْءٍ وَهَبَهُ لابْنِهِ الصَّغِيرِ وَاشْهَدَ عَلَيْهِ، وَذٰلِكَ الشَّيْءُ مَعْلُومٌ فِي نَفْسِهِ فَهُوَ جَائِزٌ. (تکملہ شامی زکریا ۱۲/ ۶۰۰، کراچی ۸/ ۴۴۹)

اور جب کوئی شخص نابالغ بچے کو کوئی شئ ہبہ کردے تو مناسب یہی ہے کہ اس پر گواہ بنالے اور یہ اس وقت ہے کہ اس کا (خاندان) میں اعلان کرکے اس پر گواہ بنایا ہو اور گواہ بنانا اس کی موت کے بعد (ورثاء) کے انکار سے حفاظت کے لئے ہے اور اعلان کرنا لازمی شرط ہے؛ اس لئے کہ یہی اعلان بمنزلۂ قبضہ کے ہے۔ اور حضرت امام محمدؒ نے فرمایا کہ ہر وہ شئ جس کو اپنے چھوٹے بچے کو ہبہ کرتا ہے اور اس پر گواہ بنا لیا ہے اور وہ شئ فی نفسہ معلوم اور متعین ہے تو وہ ہبہ جائز اور درست ہے۔

نابالغ کو ہبۂ مشاع

اگر باپ نے نابالغ بچے کو شئ مشاع کا ہبہ کردیا ہے اور ہبہ کے بعد اس کو تقسیم کرکے الگ نہیں کیا ہے اور شئ موہوب باپ کے استعمال میں مشغول ہے، یا دیگر شخص کے استعمال میں مشغول ہے، تو ہبہ جائز اور درست ہوجاتا ہے، مثلاً باپ نے نابالغ کو اپنا رہائشی مکان ہبہ کردیا ہے اور ہبہ کے بعد بھی باپ نے اس سے اپنا قبضہ چھوڑا نہیں اور اس میں اپنی رہائش بدستور باقی رکھی ہے، یا باپ نے کسی اجنبی شخص کو اس میں بلا اجرت رہائش کے لئے دے رکھا ہے اور اس نے اس میں رہائش کر رکھی ہے، تو ان سب صورتوں میں یہ ہبۂ مشاع صحیح اور درست ہے۔ اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

هِبَةُ الْمَشْغُوْلِ لاتَجُوْزُ إِلاَّ إِذَا وَهَبَ الأَبُ لِطِفْلِهِ. وَتَحْتَهُ فِي تَكْمِلَتِهٖ: وَهَبَ لِابْنِ الصَّغِيْرِ دَارًا وَفِيْهَا مَتَاعُ الْوَاهِبِ أَوْ تَصَدَّقَ لِابْنِهٖ الصَّغِيْرِ بِدَارٍ وَفِيْهَا مَتَاعُ الأَبِ، وَالْأَبُ سَاكِنٌ فِيْهَا يَجُوْزُ، وَعَلَيْهِ الْفَتْوٰى أَوْ أَسْكَنَهَا غَيْرَه بِلا أَجْرٍ، وَالأُمُّ كَالأَبِ (قوله) وَالصَّدَقَةُ فِي هٰذَا كُلِّهٖ كَالْهِبَةِ. (الدر المختار مع تكملة الشامي زكريا ۱۲/ ۵۸۵، كراچی ۸/ ۴۳۸)

شئ مشغول اور شئ مشاع کا ہبہ جائز نہیں ہے، مگر یہ کہ جب باپ اپنے چھوٹے بچے کو (شئ مشاع) ہبہ کردے تو (درست ہے) اس کے نیچے تکملہ میں ہے: اپنے چھوٹے بچے کو رہائشی مکان ہبہ کردیا ہے اور اس میں واہب کا سامان موجود ہے، یا اپنے چھوٹے بچے کو کوئی رہائشی مکان صدقہ کردیا ہے اور اس میں باپ کا سامان ہے اور باپ خود اس میں رہائش پذیر ہے، تو یہ ہبۂ مشاع اور صدقۂ مشاع جائز ہے اور اسی پر فتوی ہے، یا باپ نے اس مکان کو کسی اجنبی شخص کو رہائش کے لئے بغیر اجرت کے دے رکھا ہے تب بھی جائز ہے اور ماں کا حکم اس مسئلہ میں باپ کی طرح ہے، ان سب میں صدقہ کا حکم ہبہ کی طرح ہے۔

حاصل یہ نکلا کہ ہبۂ مشاع کو نہ مطلقاً جائز کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی مطلقاً ناجائز؛ بلکہ قیود وشرائط کے ساتھ جواز کی بہت سی شکلیں ہیں، جیسا کہ اس مدلل مضمون سے واضح ہوگیا ہے۔ واللہ الموفق والمعین.

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا ☆ عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

شبیر احمد صاحب قاسمی عفا اللہ عنہ

جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد یوپی (الہند)

۱۳؍ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ

۴/ باب الرجوع في الهبة

شئ موہوب کوواپس لینا

سوال [۹۴٦٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: والد نے اپنے دولڑکوں کے درمیان اپنے ایک مکان کا زندگی میں تقسیم نامہ ۱۷/۶/ ۱۹۸۲ء کوکیا تھااور مکان کا نقشہ بھی قائم کر دیا گیا تھااور قبضہ بھی دے دیا تھا؛ لیکن ان میں سے بڑے لڑکے نے والد سے چھوٹے بھائی کی غیر موجودگی میں پچھلے تقسیم نامہ کی خلاف ورزی کر کے کچھ جگہ مزید اپنے کاغذ میں بڑھوالی اوراس کاعلم اپنے چھوٹے بھائی کو جب دیا جب کہ والد انتقال فرما چکے تھے،تو چھوٹے بھائی کی غیر موجودگی میں والد صاحب سے کئے گئے پچھلے بٹوارے کی خلاف ورزی کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: فہمود احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: زندگی میں جائیداداور دولت تقسیم کرنے میں تمام اولاد کو برابر برابر دینا لازم ہے، حتی کہ لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر دینا ضروری ہے، ورنہ گنہگار ہوگا۔

وفي الخانية: لا بأس بتفضيل بعض الأولاد في المحبة؛ لأنها عمل القلب، وكذا في العطايا إن لم يقصد به الإضرار، وإن قصد به فسوى بينهم يعطى البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتوى، ولو وهب في صحته كل المال للولد جاز وأثم. (شامي، كتاب الهبة، كراچى ٥/ ٦٩٦، زكريا ٨/ ٥٠١، ٥٠٢، هندية، الباب السادس في الهبة للصغير قديم زكريا ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦، قاضي خان فصل في هبة الوالد لولده الخ جديد زكريا ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية زكريا ٣/ ٢٧٩)

اگر پچھلے تقسیم نامہ کی خلاف ورزی بڑے بیٹے نے باپ پر دباؤ ڈال کر کی ہے اور مزید حصہ بڑھوالیا ہے، تو بڑے بھائی اور باپ دونوں گنہگار رہوں گے۔ اور اگر باپ نے اپنی مرضی سے کیا ہے تو دونوں بیٹوں کے درمیان برابری کا معاملہ نہ کرنے کی وجہ سے باپ سخت گنہگار رہوگا، نیز چونکہ پہلی تقسیم کے بعد قبضہ دے دیا تھا، اس سے ہبہ بھی مکمل اور تام ہو چکا تھا اور بیٹے کو ہبہ کر کے واپس لینا جائز نہیں ہے؛ اس لئے چھوٹے بھائی کے حصہ میں سے جتنا باپ کے توسط سے بڑے بھائی کے پاس گیا ہے اس کو واپس کر دینا واجب ہوگا۔

عن أنس بن مالك –رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: من فر من ميراث وارثه قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة. (سنن ابن ماجة، باب الحيف في الوصية، النسخة الهندية ٢/ ١٩٤، دارالسلام، رقم: ٢٧٠٣)

عن سمرة –رضي الله عنه– عن النبي ﷺ قال: إذا كانت الهبة لذي رحم محرم لم يرجع فيها. (المستدرك للحاكم، مكتبه نزاز مصطفى الباز بيروت ٣/ ٨٧٦، رقم: ٢٣٢٤، قديم ٢/ ٥٢، السنن الكبرى للبيهقي، دارالفكر بيروت ٩/ ١٨١، رقم: ١٢٢٥٧، سنن الدارقطني، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٣٩، رقم: ٢٩٥٥)

وإن وهب هبة لذي رحم محرم منه لم يرجع فيها. (هداية، كتاب الهبة، باب ما يصح رجوعه وما لا يصح، اشرفي ديو بند ٣/ ٢٩٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍رجب ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۵۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۷/۹ھ

موہوبہ مکان کو واپس لے کر وقف کرنے کا حکم

سوال [۹۴۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید کے تین لڑکے ہیں، زید نے زمین خرید کر تینوں لڑکوں کے لئے الگ الگ راستہ

کے ساتھ الگ الگ پوزیشن سے تین مکانات بنائے اور ہر ایک لڑکے سے یہ کہہ کر ایک ایک مکان پر قبضہ دے دیا کہ یہ مکان تمہارا ہے، تم کو دے دیا ہے، اس میں کسی کا حق نہیں ہے، چنانچہ باپ کے دینے پر ہر ایک بیٹے نے اپنے مکان پر اسی طریقہ سے قبضہ کرلیا اور قبضہ کرکے باقاعدہ طور پر خودمختارانہ قبضہ کے ساتھ رہائش اختیار کرلی، اب بعد میں کسی بات پر باپ کی بیٹوں سے ناراضگی ہوگئی، تو باپ نے ناراض ہوکر ان مکانات کو مزارات کے نام وقف کردیا، تو کیا دئے ہوئے مکانات کو بیٹوں سے واپس لینا شرعی طور پر جائز ہے اور ان کو مزارات پر وقف کرنا درست ہے یا نہیں؟

(۲) ہر ایک مکان کے سامنے خالی زمین پڑی ہوئی ہے، زید نے ہر ایک بیٹے کو مکان دیتے وقت خالی زمین اسی بیٹے کی ملکیت میں دے دی ہے۔

(۳) اور مکانات کے نیچے آٹھ دوکانیں بنی ہوئی ہیں، ان تمام دوکانوں کو چھوٹے بیٹے کی ملکیت میں دے دیا ہے اور سب دوکانوں کی تالی بھی چھوٹے بیٹے کے حوالہ کردی ہے؛ لیکن اب بعد میں والد زید ناراض ہوکر وہ بھی چھوٹے بیٹے سے واپس لے کر بڑے لڑکے کے نام کردینا چاہتا ہے، تو کیا شرعی طور پر یہ جائز ہوگا؟

المستفتی: تحسین الٰہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) سوال نامہ سے واضح ہوتا ہے کہ زید نے اپنی زندگی میں اپنے لڑکوں کے درمیان مذکورہ جائیداد تقسیم کرکے مالک بنادیا ہے، اس کو زبانی ہبہ کہا جاتا ہے، جس میں رجسٹری وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ہے، ایسے ہبہ کے کامل ہونے کے لئے قبضہ کرنا شرط ہے۔ اور سوال نامہ سے واضح ہو رہا ہے کہ لڑکوں نے مکانات میں سے دئے ہوئے اپنے اپنے حصوں پر قبضہ کرلیا ہے، تو ایسی صورت میں شرعی طور پر ہبہ مکمل ہوجاتا ہے اور شرعی طور پر اولاد کو اس طرح ہبہ میں دی ہوئی چیزوں کو واپس لینا باپ کے لئے جائز

نہیں ہے؛ اس لئے واپس لے کر مزارات وغیرہ پر وقف کر دینا درست نہیں ہوگا؛ بلکہ وہ مکانات ان ہی لڑکوں کی ملکیت میں ہی بدستور باقی رہیں گے۔

عن سمرة –رضي الله عنه– عن النبي ﷺ قال: إذا كانت الهبة لذي رحم محرم لم يرجع فيها. (المستدرك للحاكم، مكتبه نزاز مصطفى الباز بيروت ۳/ ۸۷٦، رقم: ۲۳۲٤، قديم ۲/ ۵۲، السنن الكبرى للبيهقي، دارالفكر بيروت ۹/ ۱۸۱، رقم: ۱۲۲۵۷، سنن الدارقطني، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۳۹، رقم: ۲۹۵۵)

وإن وهب هبة لذي رحم محرم منه لم يرجع فيها. (هداية، كتاب الهبة، باب ما يصح رجوعه وما لا يصح، اشرفي ديوبند ۳/ ۲۹۰)

تنعقد الهبة بالإيجاب والقبول، وتتم بالقبض الكامل؛ لأنها من التبرعات، والتبرع لا يتم إلا بالقبض. (شرح المجلة رستم باز، إتحاد ديوبند ۱/ ٤٦۲، رقم المادة: ۸۳۷، شامي كراچی ۵/ ٦۹۰، زكريا ۸/ ٤۹۳، بدائع الصنائع، كراچی ٦/ ۱۲۳، زكريا ۵/ ۱۷٦)

(۲) خالی زمین بھی مذکورہ تفصیل کے ساتھ لڑکوں کی ملکیت میں داخل ہوچکی ہے، واپس لینا جائز نہیں ہوگا۔

(۳) دوکانیں بھی مذکورہ تفصیل سے چھوٹے بیٹے کی ملکیت میں داخل ہوچکی ہیں، واپس لینا جائز نہیں ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵ر شوال ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۶۳۰)

لڑکے کے انتقال کے بعد جائیداد واپس لینا

سوال [۹۴٦۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: جناب سید عبدالوحید صاحب نے اپنی زندگی میں اپنے تین صاحب زادوں اور صاحب زادیوں کے درمیان اپنی جائیداد اپنی مرضی سے برابر طریقہ پر تقسیم کردی، بعدازاں سید عبدالوحید صاحب کے ایک فرزند جناب سید عبدالمنان صاحب کا سید عبدالوحید صاحب کی زندگی ہی میں انتقال ہوگیا، اب سید عبدالوحید صاحب اس فیصلہ سے مکر رہے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ باپ کی زندگی میں بیٹے کا انتقال ہوگیا ہے؛ اس لئے بیٹا میری جائیداد کا وارث نہیں ہوسکتا اور میں اپنی جائیداد مرحوم بیٹے کی بیوی اور بچوں یعنی پوتوں کو نہیں دوں گا، فیصلہ کی کاپی منسلک ہے، اس پر غور کرتے ہوئے فتویٰ جاری کریں کہ اس فیصلہ کی روشنی میں سید عبدالوحید کا یوں کہنا صحیح ہے؟ اور کیا اب دوبارہ ازسرنو تقسیم کرنی چاہئے؟

المستفتی: محمد ریاض الدین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سید عبدالوحید صاحب نے جب اپنی اولاد کے درمیان جائیداد تقسیم کردی، تو یہ ہبہ تام ہوکر اولاد اس کی مالک ہوگئی، اب عبدالوحید کا اپنے مرحوم بیٹے عبدالمنان کے حصہ کو واپس لینا جائز نہیں؛ بلکہ وہ مال عبدالمنان کا ترکہ ہوگا جو اس کے شرعی ورثاء کے درمیان حسب حصص شرعیہ تقسیم ہوگا، نیز رجوع فی الہبہ کا جو مسئلہ ہے وہ غیر قرابت داروں کے متعلق ہے، قرابت داروں کو ہبہ کرکے رجوع کرنا جائز نہیں ہے۔

عن سمرة –رضي الله عنه– عن النبي ﷺ قال: إذا كانت الهبة لذي رحم محرم لم يرجع فيها. (المستدرك للحاكم، مكتبه نزاز مصطفى الباز بيروت ٣/ ٨٧٦، رقم: ٢٣٢٤، قديم ٢/ ٥٢)

وإن وهب هبة لذي رحم محرم منه لم يرجع فيها؛ لقوله عليه السلام: إذا كانت الهبة لذي رحم محرم لم يرجع فيها. (هداية، كتاب الهبة، باب ما يصح رجوعه وما لا يصح، الأمين كتابستان ٣/ ٢٩٠ ديوبند، هندية، زكريا جديد ٤/ ٤١١، قديم ٤/ ٣٨٦، البحرالرائق، زكريا ٧/ ٥٠٠، كوئٹه ٧/ ٢٩٤، بدائع الصنائع،

زکریا ۵/ ۱۹۰، کراچی ۶/ ۱۳۲، مجمع الأنهر، دارالکتب العلمیة بیروت ۳/ ۵۰۰، شرح المجلة رستم باز، إتحاد دیوبند ۱/ ۴۷۶، رقم المادة: ۸٦٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍رجب ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۲۰۶)

اولاد کو ہبہ کرکے واپس لینے کا حکم

سوال [۹۴۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عبدالمجید ٹھیکیدار کے چار لڑکے ہیں، عبدالمجید ٹھیکیدار نے اپنے چاروں لڑکوں کو اپنی زندگی میں ایک مکان الگ الگ نام کردیا تھا، جن میں سے ایک لڑکے کو علیحدہ سے ایک مکان خرید کردے دیا تھا اور تینوں لڑکوں کے ایک مکان میں تین حصے الگ الگ مقرر کردئے تھے، ایک لڑکے نے جس کو الگ مکان خرید کردیا تھا، اس نے اپنا مکان باپ کی موجودگی میں فروخت کردیا اور جب اس لڑکے کو پریشان دیکھا، تو باپ نے ایک لڑکے کے حصہ میں سے اس کی عدم رضامندی اس لڑکے کو تھوڑا سا حصہ بنوادیا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا یہ لڑکا اب اس حصہ کا مالک ہوگا یا نہیں؟ اور اگر مالک ہوگا تو یہ لڑکا اسی حصہ کا مالک ہوگا جو باپ نے بنوا کردیا ہے یا برابر سرابر کا مالک ہوگا؟ صراحت کے ساتھ تحریر فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر باپ نے مذکورہ مکانات بطور ہبہ کے لڑکوں کو مالک بنا کر قبضہ دے دیا ہے، تو باپ کا کسی لڑکے کے حصے کو زبردستی لے کر دوسرے کو دے دینا شرعاً درست نہیں تھا؛ لہٰذا جس سے لیا ہے اس کو اس حصہ کی قیمت ملنی چاہئے یا اس سے معاف کرا لیا جائے اور جس کو باپ نے پریشان دیکھ کر دیا ہے وہ بھائی کے حصہ میں کسی طرح شریک نہ

ہوگا؛ اس لئے کہ باپ کا کسی لڑکے کو ہبہ کرکے قبضہ دینے کے بعد پھر اس سے واپس لینا شرعاً جائز نہیں ہے۔

عن سمرة -رضي الله عنه- عن النبي ﷺ قال: إذا كانت الهبة لذي رحم محرم لم يرجع فيها. (المستدرك للحاكم، مكتبه نزاز مصطفى الباز بيروت ٣/ ٨٧٦، رقم: ٢٣٢٤، قديم ٢/ ٥٢)

القاف القرابة فلو وهب لذي رحم محرم منه نسبًا ولو ذميًا، أو مستأمنًا لا يرجع. الخ (الدرالمختار، كتاب الهبة، باب الرجوع في الهبة، كراچی ٥/ ٧٠٤، زكريا ٨/ ٥١٢، هداية، أشرفی ٣/ ٢٩٠، هندية زكريا قديم ٤/ ٣٨٦، جديد ٤/ ٤١١، البحرالرائق، كوئٹه ٧/ ٢٩٤، زكريا ٧/ ٥٠٠، بدائع الصنائع، كراچی ٦/ ١٣٢، زكريا ٥/ ١٩٠، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٥٠٠، شرح المجلة رستم باز، إتحاد ديو بند ١/ ٤٧٦، رقم المادة: ٨٦٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/۲۴۳۰)

ہدیہ کی واپسی کا مطالبہ کرنا

سوال [۹۴۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے والد صاحب کی ایک ناجائز بچی تھی، اس کو ہم نے پال پوس کر بڑا کیا اور اس کی شادی بھی کرادی، اس کے بعد ہم نے اس کو ورثہ بھی دے دیا اور اس نے چار افراد کے سامنے فیصلہ کرکے ورثہ قبول بھی کرلیا، جب کہ ہم کو معلوم تھا کہ اس کا ورثہ نہیں نکلتا ہے، پھر بھی ہم نے دے دیا، اب کچھ وقت کے بعد اس نے اور مانگنا شروع کردیا اور بدتمیزی کر رہی ہے؛ لہٰذا دریافت یہ کرنا ہے کہ ہم نے جو کچھ اسے دیا ہے وہ ہم کو واپس مانگنے کا حق ہے یا نہیں؟

المستفتی: احمر رحمت

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: آپ کے والد کی جو ناجائز بچی ہے وہ شرعی طور پر آپ کے والد کی وارث نہیں ہے، آپ لوگوں نے جو کچھ بھی اس کو دیا ہے وہ تبرع اور ہدیہ ہے، مزید مانگنے کا اس کو کسی طرح حق نہیں ہے۔ اور اس کی بدتمیزی کی بنا پر دی ہوئی چیز واپس مانگنا شرعاً جائز نہیں ہے، اس کے ناجائز مطالبہ اور بدتمیزی کا گناہ اس کے سر ہوگا، اس معاملہ میں آپ لوگ صبر کریں تو اجر وثواب کا باعث بنے گا۔

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: قال النبي ﷺ: العائد في هبته كالعائد في قيئه. (مسلم شريف، باب تحريم الرجوع في الهبة والصدقة، النسخة الهندية ٢/ ٣٦، بيت الأفكار، رقم: ١٦٢٢، صحيح البخاري، هبة، باب لا يحل لأحد أن يرجع في هبته وصدقته، النسخة الهندية ١/ ٣٥٧، رقم: ٢٥٤٧، ف: ٢٦٢١)

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۷ر جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۳۰۰)	۱۷/۵/۱۴۲۸ھ

باپ کا اولاد کو چھت ہبہ کرنے کے بعد رجوع کرنا

سوال [۱۰۹۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (الف) میرا مکان تین منزلہ ہے، میں اس کو تین بیٹوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں، گراؤنڈ فلور پرانے طرز کا بنا ہوا ہے، باقی دو منزل نئے طرز کی بنی ہوئی ہیں، بڑے لڑکے کو گراؤنڈ فلور پر جو کہ پرانے طرز کا بنا ہوا ہے دیا تو بڑے لڑکے کا کہنا ہے کہ میں کرایہ پر نہیں دے سکتا؛ اس لئے مجھے مکان کی چھت پر دو کمرے بنانے کی اجازت دیجئے جس پر میں نے بنانے کی اجازت دے دی، کیا اس پر میرے دونوں لڑکوں کی رضا مندی ضروری ہے، کیا میں اپنی جائیداد کو اپنی مرضی سے جیسا چاہے ویسا تقسیم کرسکتا ہوں؟ کیا

شریعت میں اس کی اجازت ہے؟

(ب): جائیداد کی تقسیم کے سلسلے میں آپس میں والد صاحب کے ساتھ بیٹھ کر بات کرنے کے بعد دوبارہ زائد حصہ کا مطالبہ کرنا اور اس پر والد کی طرف سے اجازت مل جانا جس کی وجہ سے بڑے بھائی کا دونوں بھائیوں کے حصہ سے زائد حصہ ہوجاتا ہے، تو کیا شرعی اعتبار سے ایسا کرنا درست ہے؟

(ج): مکان تقسیم کردیا تینوں بیٹوں میں، اور چھت مشترکہ ہے، بڑے بیٹے کے دو کمرے مکان کی چھت پر بنے ہوئے ہیں، بڑے بیٹے کا مطالبہ ہے کہ دونوں بھائیوں کے کرایہ دار چھت پر نہ آئیں یا کوئی وقت متعین کریں کہ فلاں وقت پر ہی آئیں گے؛ کیوں کہ چھت پر بڑے بیٹے کی فیملی رہتی ہے، ان کی بے پردگی ہوگی، جب کہ بڑے لڑکے کا گراؤنڈ فلور پر بھی مکان ہے اس پر دوسرے لڑکے راضی نہیں ہیں؛ کیوں کہ چھت مشترکہ ہے، اب کیا کرنا درست رہے گا شرعی اعتبار سے؟ والسلام

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب باپ نے سب بھائیوں کی موجودگی میں مکان کو تقسیم کردیا ہے اور تقسیم کرکے ہر ایک کو اپنے اپنے حصے پر قبضہ دے دیا ہے اور چھت کو تینوں بھائیوں کے درمیان مشترک قرار دیا گیا ہے، تو اس اعتبار سے تینوں بھائی اپنے اپنے حصے کے مالک ہوچکے ہیں اور باب کا کوئی حق باقی نہیں رہا ہے اور باپ کے لئے اولاد کو ہبہ کرنے کے بعد رجوع کا حق نہیں ہوتا؛ لہٰذا جن شرائط کے ساتھ بیٹوں کو مالک بنادیا گیا ہے اور اس میں چھت مشترک قرار پائی ہے تو باپ کو چھت کا ہبہ واپس لے کر بڑے بیٹے کو دینے کا حق نہیں ہے؛ لہٰذا باپ نے جو چھت کے اوپر بڑے بیٹے کو دوسرے بیٹوں کی اجازت کے بغیر تعمیر کی اجازت دی ہے وہ درست نہیں ہے؛ لہٰذا اس چھت کے اوپر تینوں بھائیوں کا حق

بدستور باقی ہے؛ اس لئے آپس میں تینوں بھائی بیٹھ کر اس مسئلہ کا حل ڈھونڈ لیں، تیسرے بھائی نے جو چھت کے اوپر مکان بنایا ہے اس کے بارے میں صلح کرلیں، دیگر دونوں بھائیوں کا حق چھت کے اوپر باقی ہے، اس کے بارے میں قیمت دے دلا کر معاملہ نمٹا لیں، ورنہ روز کی لڑائی سامنے رکھی ہوئی ہے۔

كل من الشركاء في شركة الملك أجنبي في حصة سائرهم ...... لا يجوز له من ثم أن يتصرف في حصة شريكه بدون إذنه. (شرح المجلة ١/ ٦٠١، رقم المادة: ١٠٧٥، مجمع الأنهر ٢/ ٥٤٣)

من وهب لأصوله وفروعه أو لأخيه أو أخته أو لأولادهما أو لعمه أو لعمته أو لخاله أو لخالته شيئا فليس له الرجوع. (شرح المجلة ١/ ٤٧٦، رقم المادة: ٨٦٦، شامي، زكريا ٨/ ٥٥، كراچی ٥/ ٦٩٩)

ولو وهب لذي رحم محرم منه شيئا لا يرجع. (درمختار مع الشامي، زكريا ٨/ ٥١٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ ذی الحجہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۷۸۲)

۵/ باب: زندگی میں تقسیم جائیداد

زندگی میں تقسیم

سوال [۹۴۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں زیتون بیگم اپنا ترکہ اپنی زندگی میں اولادوں میں تقسیم کرنا چاہتی ہوں، تو شرعاً کتنا کتنا حصہ دینا ضروری ہے؟ میرے دولڑکے چھ لڑکیاں ہیں، کس طرح تقسیم کروں؟ اور اپنے لئے کتنا رکھوں، چودہ لاکھ روپئے ہیں۔

المستفتی: زیتون بیگم کرولہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر زیتون بیگم زندگی میں تقسیم کردینا چاہتی ہیں تو لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر دینا ضروری ہے؛ اس لئے چودہ لاکھ روپئے میں سے جتنا چاہیں اپنے لئے الگ کرکے رکھ لیں اور بقیہ رقم کو آٹھ حصوں میں تقسیم کرکے لڑکے اور لڑکی سب کو برابر کرکے ایک ایک حصہ دے دیں، یہ اس صورت میں ہے جب کہ یہ چودہ لاکھ روپئے زیتون بی بی کی اپنی ملکیت کے ہوں؛ لیکن اگر یہ شوہر کی ملکیت کے ہوں اور شوہر فوت ہوچکا ہے، تو ایسی صورت میں چودہ لاکھ روپئے اسی حصوں میں تقسیم ہوکر دس حصے زیتون بیگم کو ملیں گے اور لڑکوں کو چودہ چودہ اور لڑکیوں کو سات سات ملیں گے۔

وفي الخلاصة: المختار التسوية بين الذكر والأنثى في الهبة.

(البحرالرائق، کتاب الهبة، زکریا ۷/ ۴۹۰، کراچی ۷/ ۲۸۸)

وروى المعلى عن أبي يوسف: أنه لا بأس به إذا لم يقصد به الإضرار، وإن قصد به الإضرار سوى بينهم يعطى الابنة مثل ما يعطى الابن، وعليه الفتوىٰ. الخ (هندية، كتاب الهبة، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا قديم

٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦، شامي، كراچی ٥/ ٦٩٦، زكريا ٨/ ٥٠١، ٥٠٢، قاضي خان جديد زكريا ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية، زكريا ٣/ ٢٧٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴ر ذیقعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۷۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۱۱/۴ھ

زندگی میں تقسیم جائیداد

سوال [۹۴۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک عالم دین کے چار لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے، انہوں نے زندگی ہی میں اپنے لڑکے کو ایک منڈہ (بیگہ کا دسواں حصہ تقریباً ڈھائی ہزار اسکوائر فٹ) زمین دی، پھر کچھ سوچ کر انہوں نے لڑکیوں کو بھی ایک ایک منڈہ زمین دے دی، اس کے بعد ایک بڑی لمبی جائیداد منقولہ کے علاوہ مزید ساڑھے پانچ منڈہ، دو عدد بڑے مکانات موجود ہیں، لڑکیوں کو دینے کی مصلحت حسب ذیل ہے: (۱) **"تسوية بين الأولاد في النحل"** (۲) لڑکے کا مزاج جس کا اندازہ آگے کی سطور سے ہوگا، یوں بھی معاشرہ میں لوگ لڑکیوں کو باپ کے بعد کچھ نہیں دیتے، لڑکے کو زمین ملی تھی تو وہ بہت خوش تھا، لڑکیوں کو زمین ملی تو لڑکا بہت ناراض ہے، باپ پر ہر طرح دباؤ ڈالتا ہے کہ وہ زمین لڑکیوں سے واپس لے لیں، کبھی کہتا ہے میں شریعت وریعت نہیں جانتا اور مانتا؛ لیکن ان تمام وجوہ اور دھمکیوں کے باوجود باپ نے لڑکیوں سے زمین واپس لینے سے انکار کر دیا، تو اس نے باپ کی تجوری کھول کر زمین کے کاغذات اور لڑکیوں کے ہبہ نامہ کی اصل کاپیاں اور ایک خطیر رقم غائب کر دی اور لڑکیوں نے اپنی زمین الگ کرنے کے لئے جو بنیاد بنوائی تھی، اس کو مسمار کر دیا، ان حالات میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:

(۱) لڑکے کو باپ نے دے کر صحیح کیا اور لڑکیوں کو دینا غلط اور ناجائز تھا؟

(۲) باپ کے نہ رہنے پر کیا لڑکے کو لینا چاہئے اور ضرور لینا چاہئے اور لڑکیوں کو ہرگز نہیں لینا چاہئے ؟ کیا لینے اور نہ لینے میں لڑکے اور لڑکیوں میں کوئی تفریق شریعت میں کی گئی ہے؟

(۳) اگر معاشرہ میں لڑکیوں کے دینے کا رواج نہ ہو اور یقین ہو کہ لڑکا کسی صورت میں کچھ نہیں دے گا، تو ایسی صورت میں ایک خداترس باپ کی کیا ذمہ داری ہے؟

(۴) جو لڑکا یہ سوچتا اور کہتا ہو کہ بہنوں کو ہرگز ایک انچ زمین نہیں دیں گے اور اس سلسلے میں اوپر مذکور جملے بھی استعمال کرتا ہو، تو شرعاً ایسا آدمی کیسا ہے؟

(۵) موجودہ صورت میں کسی مرحلہ میں لڑکیاں اگر اپنا جائز حق قانون کے ذریعہ لے لیں تو کیا وہ شرعاً غلط کریں گی؟

(٦) موجودہ صورت میں باپ اور بیٹے کے نام آپ کا کوئی پیغام؟

المستفتی: نیاز احمد قاسمی، کیاری ٹولہ، مئو

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جب زندگی میں جائیداد اور دولت تقسیم کرنی ہو تو شرعی حکم یہ ہے کہ جتنی لڑکے کو دی جائے اتنی ہی لڑکی کو بھی دی جائے، سب کو برابر دینا باپ کی ذمہ داری ہے، ورنہ باپ گنہگار بھی ہوسکتا ہے؛ لہٰذا مذکورہ صورت میں لڑکے کو دینے کے بعد لڑکیوں کو بھی دے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور قانون شریعت پر عمل کیا ہے:

فسوى بينهم يعطى البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتوى، ولو وهب في صحته كل المال للولد جاز وأثم. (درمختار، كتاب الهبة، زكريا ۸/ ۵۰۱، كوئٹه ۵/ ٦۹٦، قاضيخان زكريا جديد ۳/ ۱۹٤، وعلى هامش الهندية ۳/ ۲۷۹، هندية، زكريا قديم ٤/ ۳۹۱، جديد ٤/ ٤۱٦)

(۱) لڑکیوں کو دے کر غلط نہیں بلکہ اچھا کیا ہے۔

(۲) باپ کے انتقال کے بعد لڑکیوں کو شرعی حق دینا واجب ہے، نیز باپ نے جو زندگی میں ہبہ کر دیا ہے اس کو بھی قبضہ کر کے باپ کی زندگی میں مالک بن جانے کا حق ہے۔

(۳) زندگی میں دولت تقسیم کرنے میں لڑکوں اور لڑکیوں میں کوئی تفریق نہیں، سب کو برابر دینا چاہئے۔

(۴) یہ کہنے کا کوئی حق نہیں ہے؛ بلکہ مذکورہ جملہ موجب کفر ہے، توبہ کرکے ایمان کی تجدید کر لینا ضروری ہے۔

(۵) لڑکیوں کو اپنا حق قانون کے ذریعہ حاصل کر لینا بلاتردد جائز ہے۔

(٦) اگر بیٹا نافرمان بن جائے، تو اس کو کچھ بھی نہ دے کر سب کچھ لڑکیوں میں تقسیم کردینے کی اجازت ہے۔

لا بأس بأن يعطى من أولاده من كان عالما متأدبا، ولا يعطى منهم من كان فاسقًا فاجرًا. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩٧، مصري قديم ٢/ ٣٥٨، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٤/ ٤٦٢، ٢١٢٢٥، البحرالرائق، كوئٹه ٧/ ٢٨٨، زكريا ٧/ ٤٩٠، بزازية، زكريا جديد ٣/ ١٢٣، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٣٧، هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱٦ محرم الحرام ۱۴۱۹ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۵۹۱)	۱۴۱۹/۱/۱٦ھ

زندگی میں جائیداد تقسیم کرنا

سوال [۹۴۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرا ایک لڑکا عبد اللہ اور تین لڑکیاں (۱) بشریٰ (۲) صبا (۳) عظمیٰ اور بیوی زاہدہ ہے، میں نے اپنے لڑکے عبد اللہ اور تینوں لڑکیوں بشریٰ، صبا، عظمیٰ کی شادی کردی ہے۔ میرے پاس کچھ نقد رقم کے علاوہ دو فیکٹری تین رہائشی مکان اور کھیتی کی کچھ اراضی ہیں، میں چاہتا ہوں کہ میں اپنی حیات ہی میں اپنے لڑکے عبد اللہ اور تینوں لڑکیاں: بشریٰ، صبا اور عظمیٰ اور بیوی

زاہدہ کو اپنی نقد رقم اور دیگر تمام غیر منقولہ جائیداد میں حصہ دے دوں، تاکہ میرے بعد آپس میں کسی قسم کی نااتفاقی نہ ہو، تو تقسیم کی کیا صورت ہوگی؟ نیز بعد الموت ورثاء کے درمیان جس طرح کی تقسیم کی جاتی ہے اس طرح کی تقسیم کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کی رو سے مدلل ومفصل وضاحت فرما کر ممنون ومشکور فرمائیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔

المستفتی: انور ڈپٹی گنج، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: آپ اپنی زندگی میں تمام جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ کے خود مالک ہیں، ان میں کسی کا کوئی حق یا مطالبہ نہیں ہے۔ اور اگر آپ اپنی مرضی اور خوشی سے اپنی زندگی ہی میں اولاد کے درمیان تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو اولاً بیوی کو جتنا چاہیں دے کر چاروں اولادوں کے درمیان بقیہ جائیداد برابر تقسیم کردیں اور زندگی میں دینے میں لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر دینے کا حکم ہے، تاکہ باپ کی طرف سے سب اولاد کے درمیان یکساں معاملہ رہے۔ اور اگر آپ کسی ایک اولاد کو زیادہ دینا چاہیں اور اس کا مقصد دوسری اولاد کو نقصان پہنچانا نہ ہو اور دیگر ورثاء کو کوئی اعتراض نہ ہو، تو دینے کی گنجائش ہے، اس میں آپ گنہگار نہ ہوں گے، مثلاً کل جائیداد کو پانچ حصہ کرکے بیٹے عبد اللہ کو دو حصہ دینا چاہیں اور تینوں بیٹیوں کو ایک ایک حصہ دینا چاہیں اور اس میں کسی کو نقصان پہنچانا مقصود نہ ہو تو جائز اور درست ہے۔

ولكل واحد منهم أن يتصرف في حصته كيف ما شاء. (شرح المجلة رستم، مكتبه إتحاد ١/ ٦٤٣، رقم المادة: ١١٦٢)

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء. (بيضاوي، كتب خانه رشيديه دهلى ١/ ٧)

عن عامر قال: سمعت النعمان بن بشير –رضي الله عنهما– وهو على المنبر يقول: أعطاني أبي عطية، فقالت عمرة بنت رواحة: لا أرضى

حتى تشهد رسول الله صلى الله عليه وسلم، فأتى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: إني أعطيت ابني من عمرة بنت رواحة عطية، فأمرتني أن أشهدک يا رسول الله! قال: أعطيت سائر ولدک مثل هذا؟ قال: لا، قال: فاتقوا الله واعدلوا بين أولادكم، قال: فرجع فرد عطيته. (صحيح البخاري، باب الإشهاد في الهبة، النسخة الهندية ١/ ٣٥٢، رقم: ٢٥١٥، ف: ٢٥٨٧)

لا بأس بتفضيل بعض الأولاد في المحبة، وكذا في العطايا إذا لم يقصد به الإضرار ...... يعطى البنت كالابن عند الثاني وعليه الفتوى. (شامي، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٥٠١-٥٠٢، كراچی ٥/ ٦٩٦)

ولو وهب رجل شيئا لأولاده في الصحة، وأراد تفضيل البعض على البعض -إلى- روى المعلى عن أبي يوسف رحمه الله تعالىٰ أنه لا بأس به إذا لم يقصد به الإضرار -إلى- يعطى الابنة مثل ما يعطى للابن، وعليه الفتوى، هكذا في فتاوى قاضي خان، وهو المختار كذا في الظهيرية. (هداية، كتاب الهبة، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦، قاضي خان، زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩)

اورآپ کی موت کے بعد اگر یہ چاروں اولاد اور بیوی زندہ رہے تو کل جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ ۴۰؍حصوں میں تقسیم ہوکر بیوی زاہدہ کو پانچ اور لڑکے عبداللہ کو ۱۴؍اور تینوں لڑکیوں کو سات سات حصے ملیں گے۔

﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾. [النساء: ١١]

أما للزوجات -إلى- الثمن مع الولد، أو ولد الابن وإن سفل. (سراجي، ص: ١٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۱۰۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۵/۱۴۳۴ھ

زندگی میں جائیداد کی تقسیم میں لڑکیوں کو لڑکوں کے برابر دینا

سوال [۹۴۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص اپنی زندگی میں ہی اپنی جائیداد تقسیم کرنا چاہتا ہے، اس کے ایک لڑکی اور تین لڑکے ہیں، تو وہ کس طرح تقسیم کرے گا، وراثت کے طریقے سے یا کسی اور طریقے سے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو شخص زندگی میں جائیداد تقسیم کرنا چاہتا ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر حصہ دے؛ کیوں کہ زندگی میں جائیداد وراثت کے طریقے پر تقسیم نہیں ہوتی ہے۔ (مستفاد: فتاوی عثمانی ۳/ ۴۶۷، فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۶/ ۵۰۰، میرٹھ ۲۵/ ۴۱۵)

عن ابن عباس – رضي الله عنه – قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: سووا بين أولادكم في العطية، فلو كانت مفضلا أحدا لفضلت النساء. (سنن كبرى بيهقي بيروت ١/ ١٧٧، بخاري، كتاب الهبة، باب الإشهاد في الهبة ١/ ٣٥٢، رقم: ٢٥١٥، ف: ٢٥٨٧)

ولو وهب رجل شيئا لأولاده في الصحة، وأراد تفضيل البعض في ذلک لا رواية في الأصل عن أصحابنا. وروى عن أبي حنيفة أنه لابأس به إذا كان التفضيل لزيادة فضل له في الدين، وإن كانا سواء يكره. وروى المعلى عن أبي يوسف – رحمه الله تعالىٰ – أنه لا بأس به إذا لم يقصد به الإضرار، وإن قصد به الإضرار سوى بينهم يعطى الابنة مثل ما يعطى للابن، وعليه الفتوى. (هندية، كتاب الهبة، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا جديد ٤/ ٤١٦، زكريا ٤/ ٣٩١، البحرالرائق، زكريا ٧/ ٤٩٠، كراچی ٧/ ٢٨٨، قاضي خان، فصل في هبة الوالد لولده، زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩)

حكم هبة الوالد لولده إذا أعطى، أي الأب بعض ولده شيئا لم يجز

حتى يعدل يعني في العطايا للكل. (عمدة القاري، كتاب الهبة، باب الهبة للولد، دار إحياء التراث العربي بيروت ۱۳/ ۱٤۲، زكريا ۹/ ٤۰۰، فتح الباري، اشرفيه ديوبند ٥/ ۲٦۹، دار الريان للتراث بيروت ٥/ ۲٥۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۲۹ر صفر ۱۴۳۵ھ

(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۵۷)

حالت حیات میں جائیداد تقسیم کرنا

سوال [۹۴۷٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں ریاست علی اپنی حیات میں مکان مذکور کو اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں، دس پر تقسیم کرنا ہے: (۱) محمد ندیم خان (۲) محمد جاوید خان (۳) محمد شاویز خان (۴) محمد پرویز خان (۵) شمیم اختر (٦) پروین اختر (۷) نسرین اختر (۸) رعنا جمال اختر (۹) فرزانہ شاہین (۱۰) سمیہ خان۔ یہ چار لڑکے اور چھ لڑکیاں ہیں، ان پر تقسیم ہونا ہے، مکان کی زمین کی پیمائش 89-86 ورگ میٹر ہے، کس کس کو کتنا ملے گا؟

المستفتی: ریاست علی کھوکران متصل مدینہ مسجد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زندگی میں اولاد کے درمیان جائیداد تقسیم کردینے میں لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر دینا لازم ہے اور موت کے بعد لڑکیوں کو لڑکوں کا آدھا ملتا ہے؛ لہٰذا اس کا خیال رکھتے ہوئے اگر آپ اپنی زندگی میں سب اولاد کے درمیان مذکورہ مکان تقسیم کرنا چاہتے ہیں، تو چار لڑکے اور چھ لڑکیوں کے درمیان دس حصوں میں تقسیم ہوگا، ہر لڑکے کو بھی ایک ایک اور ہر لڑکی کو بھی ایک ایک ملے گا۔

لا بأس بتفضيل بعض الأولاد في المحبة؛ لأنها عمل القلب، وكذا في العطايا إن لم يقصد به الإضرار، وإن قصد به فسوى بينهم يعطى البنت

کالابن عند الثاني، وعليه الفتویٰ، ولو وهب في صحته کل المال للولد جاز وأثم. وتحته في الشامية: وعليه الفتوی أي علی قول أبي يوسف من أن التنصيف بين الذکر والأنثی أفضل من التثليث الذي هو قول محمد.

(درمختار مع الشامي، کتاب الهبة، زکريا ۸/ ۵۰۱، کراچی ۵/ ۶۹۶، البحرالرائق، زکريا ۷/ ۴۹۰، کوئٹه ۷/ ۲۸۸، قاضي خان، زکريا جديد ۳/ ۱۹۴، وعلی هامش الهندية ۶/ ۲۷۹، الفتاوی التاتارخانية، زکريا ۱۴/ ۴۶۲، رقم: ۲۱۷۲۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ رصفر ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۴۴۶)

زندگی میں تقسیم جائیداد کا حکم

سوال [۹۴۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید کے تین بیٹے ہیں، زید کی حیثیت اچھی ہے اور صاحب مال وجائیداد بھی ہے، کیا زید اپنی جائیداد و مال منقولہ وغیر منقولہ چیزوں میں سے اپنے بچوں میں سے کسی کو کم کسی کو زیادہ بھی بعض وجوہات کی بنا پر دے سکتا ہے؟ کیا اس طرح دینے کا شرعی حق ہے؟ یا تفریق کرنے کا زید کو اپنی زندگی میں حق نہیں ہے؟ کیا زندگی میں سب کو برابر دینا پڑے گا؟ اور اگر وہ بچوں کو برابر کا حق نہیں دیتا تو کیا شرعی اعتبار سے گنہگار رہے گا؟

(۲) اور اگر کوئی نالائق بچہ ہو اور باپ اپنی زندگی ہی میں کل جائیداد و مال کسی مدرسہ یا مسجد کو دے دے اور اپنے بچوں کو کچھ نہ دے، تو شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا بچوں کے لئے کچھ چھوڑنا ضروری ہے؟

(۳) وارث کے لئے وصیت کرنا جائز نہیں ہے، اس کی تفصیل لکھیں۔

المستفتی: محمد ذاکر قریشی، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) اگر زندگی میں جائیداد تقسیم کرنی ہے، تو تمام اولاد کو برابر دینا باپ پر لازم ہے، ورنہ باپ گنہگار ہوگا، نیز لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر دینا لازم ہے۔

فسوى بينهم يعطى البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتوىٰ، ولو وهب في صحته كل المال للولد جاز وأثم. (درمختار مع الشامي، كتاب الهبة، كراچی ٥/ ٦٩٦، زكريا ٨/ ٥٠١، ٥٠٢)

(۲) نافرمان اولاد کو نہ دے کر ثواب کے لئے مساجد و مدارس کو دینا جائز ہے۔

لا بأس بأن يعطى من أولاده من كان عالما متأدبا، ولا يعطى منهم من كان فاسقا فاجرا. (مجمع الأنهر، قديم ٢/ ٣٥٨، جديد دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩٧)

اور فرماں بردار اولاد کے لئے چھوڑنا ضروری ہے۔

(۳) وارثین کو چونکہ میراث ملتی ہے؛ اس لئے ان کے لئے وصیت مشروع نہیں رکھی گئی ہے۔

عن أبي أمامة الباهلي -رضي الله عنه- قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول في خطبته عام حجة الوداع: إن الله تبارک وتعالىٰ قد أعطى كل ذي حق حقه، فلا وصية لوارث. (سنن الترمذي، باب ماجاء لا وصية لوارث، النسخة الهندية ٢/ ٣٢، دارالسلام، رقم: ٢١٢٠، سنن أبي داؤد، باب في الوصية للوارث، النسخة الهندية ٢/ ٣٩٦، دارالسلام، رقم: ٢٨٧٠)

ولا تجوز لوارثه لقوله صلى الله عليه وسلم: إن الله تبارک وتعالىٰ قد أعطى لكل ذي حق حقه، فلا وصية لوارث. (هداية، كتاب الوصايا، أشرفي ديوبند ٤/ ٦٥٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۶۲۴)

زندگی میں جائیداد تقسیم کرنے کا شرعی حکم

سوال [۹۴۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) عزیز احمد نے اپنے چار بیٹوں (۱) رفیق احمد (۲) ظہیر احمد (۳) شریف احمد (۴) ضمیر احمد کے نام اپنا ایک مکان ۸۰ رگز کا بذریعہ رجسٹری بیع کر دیا اور یہ چاروں لڑکے اور خود عزیز احمد اسی مکان میں رہتے رہے، پھر ایک لڑکے ظہیر احمد کا انتقال ہو گیا، اب ظہیر نے ورثاء میں ایک لڑکا سمیر احمد اور ایک بیوی نوشادا بیگم کو چھوڑا اور باپ بھی باحیات ہے، تو اب دریافت یہ کرنا ہے کہ ظہیر احمد کے نام والد کی طرف سے جو رجسٹری بیع شدہ مکان کا حصہ ہے وہ ورثاء کو ملے گا یا نہیں، اگر ظہیر احمد کے دیگر بھائی لوگ نہ دیں تو شرعاً ان کی گرفت ہوگی یا نہیں؟ شرعی حکم کیا ہے؟

(۲) عزیز احمد نے اپنی پانچ بیٹیوں کو جائیداد میں سے کچھ نہیں دیا تو کیا شرعاً آخرت میں مؤاخذہ ہوگا یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب زندگی میں جائیداد اولاد کے درمیان تقسیم کرنی ہو تو تمام اولاد کے درمیان برابری کرنی چاہئے اور لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر دینا لازم ہوتا ہے، ہاں البتہ اگر کوئی اولاد نافرمان سرکش ہو تو اس کو نہ دینے کی گنجائش ہے؛ لہٰذا جن پانچ بیٹیوں کو کچھ نہیں دیا ہے اگر وہ سب نافرمان سرکش نہ ہوں تو باپ گنہگار ہوگا۔ اور اگر نافرمان ہونے کی وجہ سے نہیں دیا ہے تو باپ کو اختیار تھا، نیز جن چار بیٹوں کے نام رجسٹری بیع کر دیا ہے اور باقاعدہ ملکیت ان کی طرف منتقل کر دی ہے اور وہ لوگ قبضہ کر کے اس میں رہ رہے ہیں، تو وہ اس کے مالک ہو چکے ہیں؛ لہٰذا ظہیر احمد کے انتقال کے بعد اس کے حصہ کے حق دار اس کا بیٹا سمیر احمد اور اس کی بیوی نوشادا بیگم ہی ہوں گے، بھائیوں کو نہ دینے کا حق نہ ہوگا۔

لا یجوز لأحد أن یأخذ مال أحد بلا سبب شرعي. (قواعد الفقه، أشرفي ص: ۱۱۰، رقم: ۲۶۹، شرح المجلة رستم إتحاد ۱/ ۶۲، رقم: ۹۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍ ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۲۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/۴/۱۴۱۸ھ

زندگی میں تقسیم جائیداد کی شرعی حیثیت

سوال [۹۴۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید اپنی زندگی میں اپنی جائیداد وغیرہ تقسیم کرنا چاہتا ہے، جب کہ اس کے ورثاء میں ایک بیوی ایک بیٹا اور پانچ بیٹیاں ہیں (جن میں تین غیر شادی شدہ ہیں) اور زید کی وراثت میں ایک ۷۰؍ کڑی پر مشتمل دو منزلہ مکان، ایک قطعہ زمین، جس کا احاطہ ۳۴؍ کڑی اور زید کے اپنے ایک مختصر کاروبار کی مختصر پونجی۔ اور زید ہی کا پچھلا کاروبار، کرائے کی ایک دوکان اور ایک لمبی پونجی جو اس کے بیٹے بکر کے قبضہ میں ہے۔ اب زید اس کڑی کے دو منزلہ مکان سے ۱۰؍ کڑی اپنا حصہ بچا کر بقیہ اپنے ورثاء کے درمیان تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ مذکورہ جائیداد و پونجی موجودہ ورثاء کے درمیان کس طرح تقسیم ہوگی؟ ہر ایک کا حصہ واضح فرمائیں، کیا بکر جو زید کے پچھلے کاروبار و پونجی پر زبردستی قابض ہے، اس کے عوض میں زید کی مختصر پونجی میں سے اس کا حصہ منہا کیا جاسکتا ہے؟ شرعی نقطۂ نظر سے مسائل کو واضح اور بیان فرمائیں۔

المستفتی: رشید احمد بن انور حسن، مئوناتھ بھنجن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شرعاً زید اپنی زندگی میں سارے سرمایہ کا مالک خود ہے اور زندگی میں اولاد کے درمیان تقسیم کرنا اس کے اختیار اور مرضی پر موقوف ہے، وہ نہ چاہے تو اس پر کسی کا کوئی دباؤ نہیں ہے، پھر بھی زید اپنی زندگی میں تقسیم کرنا چاہتا ہے، تو شرعاً اس کا حکم

یہ ہے کہ زندگی میں اولاد کے درمیان تقسیم کرنے کی صورت میں لڑکیوں کولڑکوں کے برابر ملتا ہے؛ لہٰذا اپنے لئے اور اپنی بیوی کے لئے جتنا مناسب سمجھے الگ کرلے، اس کے بعد بقیہ چیزیں ایک لڑکا اور پانچ لڑکیوں کے درمیان چھ حصوں میں تقسیم کرکے ہر ایک کو ایک ایک سہام دے سکتے ہیں۔ اور زید ایسا بھی کرسکتا ہے کہ واقعتاً بیٹا اگر سخت نافرمان ہے تو نافرمان بیٹے کو نہ دے کر فرماں بردار اولادوں کو دے دے۔

المختار التسوية بين الذكر والأنثى في الهبة. (البحرالرائق، كتاب الهبة، زكريا ۷/ ۴۹۰، كوئٹه ۷/ ۲۸۸، خلاصة الفتاوى أشرفيه ديوبند ۴/ ۴۰۰)

وإن وهب ماله كله لواحد جاز قضاء وهو آثم. (البحرالرائق، كتاب الهبة، زكريا ۷/ ۴۹۰، كوئٹه ۷/ ۲۸۸، شامي، زكريا ۸/ ۵۰۲، كراچی ۵/ ۶۹۶)

وعلى جواب المتأخرين، لا بأس بأن يعطى من أولاده من كان عالما متأدبا، ولا يعطى من كان فاسقا فاجرا. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۴۹۷، قديم ۲/ ۳۵۸)

ولو كان ولده فاسقا، وأراد أن يصرف ماله إلى وجوه الخير ويحرمه عن الميراث، هذا خير من تركه. (هندية، كتاب الهبة، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا قديم ۴/ ۳۹۱، جديد ۴/ ۴۱۶، بزازية، زكريا جديد ۳/ ۱۲۳، وعلى هامش الهندية ۶/ ۲۳۷، البحرالرائق، كوئٹه ۷/ ۲۸۸، زكريا ۷/ ۴۹۰، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ۱۴/ ۴۶۲، رقم: ۲۱۷۲۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍صفر ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۸۹۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/۲/۱۴۳۱ھ

زندگی میں تقسیم کی دوصورتوں کا بیان

سوال [۹۴۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: میں بنام عبدالوحید اپنی حیات میں اپنی وراثت اپنے ورثاء میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں ورثاء کی تفصیل یہ ہے:

(۱) میں بنام عبدالوحید کا کتنا حصہ ہوگا؟ (۲) تین بیٹے ان کا کتنا حصہ ہوگا؟

(۳) ایک بیٹی اس کا کتنا حصہ ہوگا؟

تفصیل وراثت کی یہ ہے کہ آراضی صحرائی (جنگل کی زمین) بارہ بیگہ تقریباً (بارہ ہزار گز) آراضی سکنائی (گھر کی زمین) دوسوبیس گز ہے۔

حضرت والا سے درخواست ہے کہ شریعت کے مطابق وراثت کی تقسیم فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں، مہربانی ہوگی۔ والسلام

المستفتی: عبدالوحید، ساکن محلّہ حکیم پورہ، قصبہ سہسپور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ اپنی زندگی میں اپنے مال کے تنہا مالک ومختار ہیں، آپ کے اوپر لازم نہیں ہے کہ زندگی میں ترکہ اولاد کے درمیان تقسیم کردیں، آپ جہاں چاہیں خرچ کرسکتے ہیں، پھر بھی اگر آپ اپنی زندگی میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں، تو اس کی دوشکلیں ہیں:

(۱) آپ باضابطہ تقسیم کرکے ان کو قبضہ دے کر فوری مالک بنا دینا چاہتے ہیں، تو ایسی صورت میں اپنے لئے اور اپنی بیوی کے لئے جتنا مناسب ہو الگ کرلینے کے بعد بقیہ مال کو اولاد کے درمیان برابر تقسیم کردیں اور اس میں لڑکی کو بھی لڑکے کے برابر دینا ضروری ہے؛ لہٰذا چار حصوں میں تقسیم کرکے تینوں لڑکوں کو ایک ایک حصہ اور لڑکی کو بھی ایک حصہ دینا چاہئے۔

عن عامر قال: سمعت النعمان بن بشير –رضي الله عنهما– وهو على المنبر يقول: أعطاني أبي عطية، فقالت عمرة بنت رواحة: لا أرضي حتى تشهد رسول الله صلى الله عليه وسلم، فأتى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: إني أعطيت ابني من عمرة بنت رواحة عطية، فأمرتني أن أشهدك يا رسول الله! قال: أعطيت سائر ولدك مثل هذا؟ قال: لا، قال:

فاتقوا الله واعدلوا بين أولادكم، قال: فرجع فرد عطيته. (صحيح البخاري، باب الإشهاد في الهبة، النسخة الهندية ١/ ٣٥٢، رقم: ٢٥١٥، ف: ٢٥٨٧)

يعطى البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتوى. (شامي، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٥٠٢، كراچی ٥/ ٦٩٦)

يعطى الابنة مثل ما يعطى للابن، وعليه الفتوى. (هندية، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا جديد ٤/ ٤١٦، قديم ٤/ ٣٩١، قاضي خان زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩)

وعند أبي يوسف بينهما سواء هو المختار لورود الآثار. (خلاصة الفتاوى، كتاب الهبة، أشرفيه ديوبند ٤/ ٤٠٠، البحرالرائق، كوئٹه ٧/ ٢٨٨، زكريا ٧/ ٤٩٠)

(۲) آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی موت کے بعد جائیداد کی تقسیم میں اولاد کے درمیان کوئی اختلاف نہ ہو اور ہر ایک کو اس کا حق شرعی طور پر مل جائے؛ اس لئے زندگی میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں، تو ایسی صورت میں آپ کی جائیداد سات حصوں میں تقسیم ہوگی، دو حصے لڑکوں کے لئے اور ایک حصہ لڑکی کے لئے، ان حصوں کے حساب سے تقسیم کر کے چاروں کے لئے الگ الگ جائیداد نامزد کر دی جائے اور ایک وصیت نامہ لکھ دیا جائے کہ میرے مرنے کے بعد چاروں اولادوں کو نامزد کی گئی جائیداد مل جائے گی، اس میں کوئی اختلاف بھی نہ ہوگا، تو اس طرح زندگی میں مرنے کے بعد کے واسطے سے تقسیم کر دینے کی گنجائش ہے۔

وأما إذا أراد الرجل أن يقسم أملاكه فيما بين أولاده في حياته، لئلا يقع بينهم نزاع بعد موته؛ فإنه وإن كان هبة في الاصطلاح الفقهي، ولكنه في الحقيقة والمقصود استعجال لما يكون بعد الموت، وحينئذ ينبغي أن يكون سبيله سبيل الميراث. (تكملة فتح الملهم، كتاب الهبات، مذهب الجمهور، التسوية بين الذكر و الأنثى، اشرفيه ديوبند ٢/ ٧٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۸۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۴/۱۴۳۵ھ

زندگی میں جائیداد کس طرح تقسیم کریں؟

سوال [۹۴۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عبدالشکور صاحب موجودہ وقت میں ایک مکان کے مالک ہیں، جس کے پورب پچھّم ۳۵/فٹ اور اتر دکھن ۷۰/فٹ ہے، بیچ میں پورب پچھّم ۳۷/فٹ ہے، اس طرح ۲۴۵۰/ ورگ فٹ جگہ ہے۔ عبدالشکور کی پہلی بیوی سے دولڑکے ہیں، دوسری بیوی سے ۶/لڑکے ۴/ لڑکیاں ہیں، ماں باپ حیات ہیں اور عبدالشکور اور اس کی بیوی حیات ہیں، اس طرح ۸/ لڑکے ۴/لڑکیاں ہیں، اس میں لڑکوں کو کتنا کتنا ورگ فٹ زمین ملے گی اور لڑکیوں کو کتنے کتنے ورگ فٹ زمین ملے گی؟

(۱) کیا والد کی حیات میں بچے باپ سے بٹوارہ کرا سکتے ہیں؟

(۲) پہلی بیوی کے لڑکے ان کی شادی والد نے کردی ہے، دوسری بیوی سے چھ لڑکے ان میں سے ایک لڑکے کی شادی ہوئی ہے، ۵/لڑکوں کی شادی کرنی ہے، والد کی عمر ۶۵/ برس کی ہے اور والدہ بھی ۶۰/برس کی ہیں، مکان کے علاوہ کوئی جگہ نہیں ہے کہ والد والدہ اپنی گذر اوقات چلا سکیں یا بیماری وغیرہ میں خرچ کرسکیں، دوسری بیوی کا ایک لڑکا مدد کرتا ہے، جس سے یہ خرچ پورے ہوتے ہیں، پہلی بیوی کے دونوں بچے ماں باپ سے علیحدہ رہتے ہیں، کوئی مدد نہیں کرتے ہیں، سبھی باتوں کا خیال کرتے ہوئے جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: عبدالشکور محلّہ گورھائی پرور یا، ضلع اٹاوہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب عبدالشکور از خود زندہ ہے اور اپنی زندگی میں جائیداد تقسیم کرنا چاہتا ہے، تو اس کو اختیار ہے کہ اپنے لئے جتنی چاہے روک لے اور اپنی بیوی کو جتنا چاہے دے دے، اس کے بعد بقیہ جائیداد تمام بچوں کے درمیان برابر کرکے تقسیم کردے۔ اور زندگی میں تقسیم کرنے میں لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر دینا چاہئے۔ اور یہ اختیار ہے کہ جو لڑکا خدمت میں لگا ہوا ہے اس کو سب سے زیادہ دے۔

وينبغي أن يعدل بين أولاده في العطايا، والعدل عند أبي يوسف أن يعطيهم على السواء، وإن كان بعض أولاده مشتغلا بالعلم دون الكسب لابأس بأن يفضله على غيره. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩٧، مصري قديم ٢/ ٣٥٨، بزازية، زكريا جديد ٣/ ١٢٣، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٣٧، البحرالرائق، كوئٹه ٧/ ٢٨٨، زكريا ٧/ ٤٩٠، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٤/ ٤٦٢، رقم: ٢١٧٢٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍صفر المظفر ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۶۶۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/ ۲/ ۱۴۱۷ھ

زندگی میں تقسیم جائیداد کا شرعی طریقہ

سوال [۹۴۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں احسان ایک ۲۰۸ رگز جائیداد کا تنہا مالک ہوں، بحالت موجودہ میرے وارثان میں چار پسران: انور احسان، سرور احسان، یاور احسان، احمد احسان اور ایک دختر مسماۃ حنا کوثر حیات ہیں۔ اور میں اپنے جملہ پسران اور دختر کی شادی کے فرائض انجام دے چکا ہوں، میں احسان الٰہی اپنی حیات میں اپنی جملہ جائیداد کو اپنے پسران اور دختر کو دینا چاہتا ہوں، بموجب فرائض شرعی کس کو کتنا حصہ دیا جائے بتانے کی زحمت فرمائیں۔ میری بیوی شمس النساء کا انتقال ہو چکا ہے، زمین میں نے خریدی تھی، انور احسان وسرور احسان نے اپنے روپیوں سے مکان کی تعمیر کو انجام دیا، اس مکان کی تعمیر کرانے میں یاور احسان اور احمد احسان ودختر حنا کوثر کا کوئی پیسہ نہیں لگا؛ کیوں کہ یہ تینوں لوگ چھوٹے تھے، اور پڑھ رہے تھے، ان تینوں لوگوں کا اس مکان میں حصہ بنتا ہے یا نہیں؟ مکان تعمیر کے وقت سب بیٹے والد کے ساتھ ہی ایک فیملی میں رہ کر کھانا پینا ساتھ کرتے تھے۔

المستفتی: احسان الٰہی ولد عبد الواحد مرحوم ہرتھلا مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر آپ اپنی حیات میں ہی اپنی جائیداد تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو لڑکوں اور لڑکیوں کو برابر برابر تقسیم کرنا ضروری ہے۔ اور جن دو لڑکوں سرور احسان اور انور حسان کا آپ نے ذکر کیا ہے، انہوں نے آپ کے ساتھ رہ کر جو پیسہ کمایا ہے وہ پیسہ شرعی طور پر آپ ہی کی ملکیت ہے، پھر آپ ہی کی سر پرستی میں رہ کر آپ ہی کی زمین پر بچوں کی محنت کا پیسہ لگایا گیا ہے، اس زمین پر جو مکان بنا ہے وہ مکان بھی شرعی طور پر آپ ہی کی ملکیت ہے؛ اس لئے اگر آپ اپنی زندگی میں جائیداد تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو سب بچوں کو برابر دینا لازم ہوگا۔ اور اگر آپ کی موت کے بعد تقسیم ہوتی ہے تو ۹ر حصوں میں تقسیم ہوکر ہر ایک لڑکے کو دو دو اور لڑکی کو ایک ملے گا۔

الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيء، فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله؛ لكونه معينا له. (شامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحدة واكتسبا، زكريا ٦/ ٥٠٢، كراچی ٤/ ٣٢٥، هندية، زكريا قديم ٢/ ٣٢٩، جديد ٢/ ٣٣٢)

وفى حديث جابر -رضي الله عنه-: "أنت ومالک لأبیک" أضاف مال الابن إلى الأب بلام التمليک، وظاهره يقتضى أن يكون للأب فى مال ابنه حقيقة الملک، فإن لم تثبت الحقيقة فلا أقل من أن يثبت له حق التمليک عند الحاجة. (بدائع الصنائع، كتاب النفقة، فصل في نفقة الأقارب، زكريا ٣/ ٤٣٩-٤٤٠، كراچی ٤/ ٣٠، مكتبة الباز، مكة المكرمة ٥/ ١٦٨)

يعطى الابنة مثل ما يعطى للابن، وعليه الفتوى. (هندية، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا جديد ٤/ ٤١٦، قديم ٤/ ٣٩١، قاضي خان زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩)

يعطى البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتوى. (شامي، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٥٠٢، كراچی ٥/ ٦٩٦)

يكره تفضيل بعض الأولاد على البعض في الهبة حالة الصحة.
(البحرالرائق، كتاب الهبة، زكريا ٧/ ٤٩٠، كوئٹه ٧/ ٢٨٨، بزازية، زكريا جديد ٣/ ١٢٣، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٣٧)

قال الطيبي: فيه استحباب التسوية بين الأولاد في الهبة، فلا يفضل بعضهم على بعض. (شرح الطيبي، البيوع، باب الهبة، الفصل الأول، كراچی ٦/ ١٨١، تحت رقم الحديث: ٣٠١٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۴۱۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰/۵/۱۴۳۲ھ

زندگی میں جائیداد تقسیم کرنے کا طریقہ

سوال [۹۴۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے پاس دولڑکے اور چندلڑکیاں ہیں، باپ نے اپنے بڑے لڑکے کو اپنی ذاتی رقم تجارت کی غرض سے سپرد کی، اس تجارت کے ذریعہ کچھ نفع حاصل ہوا، جس سے زید نے کچھ جائیدادیں خریدی، تو پوچھنا یہ ہے کہ زید اپنی زندگی میں وہ جائیداد صرف دونوں لڑکوں کو رجسٹری کرسکتا ہے یا لڑکے کے ساتھ لڑکیوں کو بھی دینا ضروری ہوگا؟ جب کہ باپ اور لڑکے ایک ہی فیملی میں رہتے ہیں اور کھانا پینا بھی ساتھ ہی ہوتا ہے۔

المستفتی: محمد شجاع الدین القاسمی، ۲۴/ پرگنہ، مغربی بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: صورت مسئولہ میں زید نے اپنے بڑے لڑکے کے ذریعہ تجارت کرکے جو کچھ جائیداد خریدی ہے، وہ زید ہی کی ملکیت ہے اور اب زید اپنی زندگی میں وہ جائیداد اولاد کے درمیان تقسیم کرنا چاہتا ہے، تو اس پر لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کو بھی لڑکوں

کے برابر حصہ دینا ضروری ہے، ورنہ وہ گنہگار ہوگا۔ اور اگر مرنے کے بعد تقسیم ہوتا ہے، تو لڑکوں کولڑکیوں سے دوگنا ملے گا۔

لما في القنية: الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة، ولم يكن لهما شيء، فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله؛ لكونه معينا له، ألا ترى! لو غرس شجرة تكون للأب. (شامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحدة واكتسبا زكريا ٦/ ٥٠٢، كراچی ٤/ ٣٢٥، هندية، الباب الرابع، جديد ٢/ ٣٣٢، قديم ٢/ ٣٢٩)

ولو وهب رجل شيئا لأولاده في الصحة، وأراد تفضيل البعض على البعض ...... إن قصد به الإضرار سوى بينهم يعطى الابنة مثل ما يعطى الابن، وعليه الفتوى. (هندية، كتاب الهبة، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، زكريا جديد ٤/ ٤١٦، قاضي خان، فصل في هبة الوالد لولده، زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩)

المختار التسوية بين الذكر والأنثى في الهبة. (البحرالرائق، كتاب الهبة، زكريا ٧/ ٤٩٠، خلاصة الفتاوى أشرفيه ديوبند ٤/ ٤٠٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۴ر صفر ۱۴۳۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۴۴۱/۴۰)	۱۴۳۵/۲/۱۴ھ

ایضاً

سوال [۹۴۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے والد صاحب تقریباً ایک لاکھ ۹۹ر ہزار نقد روپیہ اور ایک مکان کے مالک ہیں، جس کی قیمت تقریباً ساڑھے تین لاکھ ہے، ہم تین بھائی ہیں اور والد صاحب نے ایک لڑکی لے کر پالی تھی، اس طرح تین بھائی اور ایک بہن ہے۔ والد صاحب ابھی حیات ہیں، میں والد صاحب سے کھانے پینے اور کاروبار میں الگ ہوں؛ لیکن والد صاحب کے ساتھ ہی مکان میں رہتا ہوں، معلوم یہ کرنا ہے کہ مذکورہ مال اور جائیداد سے میرا کتنا حصہ شرعاً نکلتا

ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

المستفتی: محمد عارف اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں جب تک آپ کے والد صاحب زندہ ہیں، تمام مال وجائیداد روپئے وغیرہ کے مالک آپ کے والد ہیں، ان کی زندگی میں کسی کو بھی حق مانگنے کا اختیار نہیں، ہاں اگر زندگی ہی میں روپئے وغیرہ تقسیم کرنا چاہیں تو تمام بیٹوں کو برابر دینا چاہئے، آپ کے والد صاحب نے جس لڑکی کو لے کر لے پالک بنایا ہے، شرعاً اس کا کوئی حصہ نہیں بنتا؛ البتہ آپ کے والد صاحب اپنی زندگی میں اس کو جو کچھ دینا چاہیں تو اس کا اختیار ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ ۱۰/ ۵۲۰، جدید زکریا ۱۰/ ۲۵۶، معارف القرآن ۷/ ۸۴)

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآئَكُمْ اَبْنَآئَكُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِیْ السَّبِيْلَ. [الأحزاب: ٤]

قال النبي صلى الله عليه وسلم: اعدلوا بين أولادكم في العطية.

(صحيح البخاري، كتاب الهبة، باب الهبة للولد ١/ ٣٥٢، رقم الباب: ١٢)

وينبغي أن يعدل بين أولاده في العطايا، والعدل عند أبي يوسف أن يعطيهم على السواء. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، قديم ٢/ ٣٥٨، جديد دارالكتب العليمة بيروت ٣/ ٤٩٧، البحرالرائق، كوئٹه ٧/ ٢٨٨، زكريا ٧/ ٤٩٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۲۷۸)

ایضاً

سوال [۹۴۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سائل کے پانچ لڑکے ہیں اور تین لڑکیاں ہیں، سائل نے اپنے مکان کو بنیاد

ہی سے توڑ کر بنایا ہے، کچھ زمین خرید کراس میں بھی بنایا ہے، ہرطرح کے بنانے اور خریداری میں سائل کے کسی لڑکے نے زیادہ روپیہ لگایا ہے، کسی نے کم روپیہ لگایا ہے، کسی نے بالکل بھی نہیں لگایا ہے، تو سائل اپنی زندگی میں کس طرح تقسیم کرسکتا ہے، تعمیر کے وقت سب لڑکے باپ کی فیملی میں رہا کرتے تھے؟ اس طرح اس مکان کی تعمیر وخریداری میں باپ نے بھی اپنی رقم لگائی ہے۔

المستفتی: ایم شریف وارثی، ولدکلن، مغل پورہ سقہ اول نزد امام باڑہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زمین کی خریداری اوراس کی تعمیر کے زمانہ میں جب سائل کے سب لڑکے سائل ہی کی فیملی میں تھے،تو سب کی کمائی اورسائل کی خودکی کمائی سب شرعی طور پرسائل ہی کی ملکیت ہے۔اور جو زمین خریدی گئی وہ بھی سائل کی ملکیت ہوگی اور اس پر جوتعمیر کی گئی ہے وہ تعمیر بھی سائل ہی کی ملکیت میں شمار ہوگی ،اب اس میں کسی دوسرے کا حق نہیں ہے، اب اگرسائل اپنی اولاد کے درمیان زمین یاتعمیر شدہ عمارت یاروپیہ پیسہ جو کچھ بھی تقسیم کرنا چاہتا ہے،تواس میں سائل کے ذمہ یہ لازم ہے کہ سب بچوں کے درمیان برابر برابرتقسیم کردے،جس نے خریداری کےوقت پیسہ لگایا ہےاس کو جتنا دیا جائے اتنا ہی اس کو بھی دینا ضروری ہے جس کا کوئی بھی پیسہ نہیں لگ پایااور جو بچے اس زمانہ میں کمانے کےلائق نہیں تھے ،ان کوبھی کمانے والوں کے برابر دینا ضروری ہے۔

عن النعمان بن بشير –رضي الله عنه– أن أباه أتى به إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: إني نحلت ابنى هذا غلاما، فقال: أكل ولدك نحلت مثله؟ قال: لا، قال: فارجعه. (بخاري شريف، كتاب الهبة، باب الهبة للولد الخ ١/ ٣٥٢، رقم: ٢٥١٤، ف: ٢٥٨٦)

الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة، ولم يكن لهما شيء، فالكسب

كله للأب إن كان الابن في عياله؛ لكونه معينا له، ألا ترى! لو غرس شجرة تكون للأب. (شامي، كتاب الشركة، فصل في الشركة، زكريا ٦/ ٥٠٢، كراچی ٤/ ٣٢٥)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍ربیع الاول ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۲۸۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱؍۳؍۱۴۲۵ھ

زندگی میں جائیداد کس طرح تقسیم کریں؟

سوال [۹۴۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سائل کے پاس ۶۰؍گز زمین ہے، میرے تین لڑکے ہیں اور تین لڑکیاں ہیں، ان سب کی شادی کردی ہے، اور میاں بیوی ہم دونوں بھی حیات ہیں، تو کس کے حصہ میں کتنی زمین آئے گی؟

المستفتی: سعید احمد قریشی اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: آپ کی زندگی میں ساری جائیداد کے مالک آپ ازخود ہیں، اس میں کسی کا شرعی حق نہیں ہے۔ اور نہ ہی کسی کو آپ کی زندگی میں مطالبہ کرنے کا حق ہے، ہاں البتہ آپ کی وفات کے بعد آپ کے وارثین کا حق متعلق ہوگا؛ لہٰذا آپ کو ہر طرح کا اختیار ہے کہ آپ اپنی ملکیت کی چیز میں ہوش وحواس کی حالت میں جس طرح چاہیں تصرف کریں۔

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء. (بيضاوي ١/ ٧)

إن الملک ما من شانه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص. (شامي، كتاب البيوع، مطلب في تعريف المال، زكريا ٧/ ١٠، ٢٣٥، كراچی ٤/ ٥٠٢، ٥/ ٥٠، الموسوعة الفقهية الكويتية ١٤/ ٢٩)

ليس لأحد أن يأخذ مال غيره بلا سبب شرعي. (شرح المجلة رستم، مكتبه إتحاد ۱/ ٦٢، رقم: ٩٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳ر ربیع الاول ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۶۴۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۳/۱۵ھ

جھگڑے کے خوف سے زندگی میں میراث تقسیم کرنا

سوال [۹۴۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عبدالرشید اس ڈر سے کہ میرے مرنے کے بعد میری اولاد میں میراث کی تقسیم باعث انتشار ہوگی؛ اس لئے وہ قرآن کے حکم کے مطابق میراث کو اپنی زندگی ہی میں اپنی اولاد میں تقسیم کرنا چاہتا ہے، مسئلہ یہ ہے کہ کیا زندگی میں تقسیم میراث کی وجہ سے بیٹی اور بیٹے کا حق برابر ہو جاتا ہے یا پھر قرآن کے حکم کے مطابق بیٹے کو بیٹی سے دو گنا ہی ملے گا؟

المستفتی: ماسٹر عبدالحق ہلدوانی، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: قرآن کا حکم زندگی میں میراث تقسیم کرنے کا نہیں ہے۔ آں جناب نے بار بار قرآن کے حکم کے مطابق تقسیم کی بات لکھی ہے، ایسا ہے نہیں؛ بلکہ قرآن کریم میں مرنے کے بعد ہی مرحوم کی میراث تقسیم کرنے کا حکم مذکور ہے۔ اور مرنے سے پہلے کسی کی جائیداد اور ملکیت میراث نہیں بنا کرتی، ہاں البتہ اگر زندگی میں اولاد کو دے کر فارغ البال ہونا چاہتا ہے، تو یہ دینا میراث نہیں ہے؛ بلکہ ہبہ ہے اور ہبہ میں اولاد کے درمیان برابری کا حکم ہے۔ اور اس میں بیٹے بیٹی دونوں قسم کی اولادوں کے ساتھ یکسانیت کا حکم ہے، اگر یکسانیت نہ کی جائے تو باپ گناہ گار ہوگا۔

قال النبي صلى الله عليه وسلم: اعدلوا بين أولادكم في العطية.

(صحيح البخاري، كتاب الهبة، باب الهبة للولد ۱/ ۳٥٢، رقم الباب: ۱۲)

وفي الخلاصة: المختار التسوية بين الذكر والأنثى في الهبة.
(البحرالرائق، كتاب الهبة، زكريا ٧/ ٤٩٠، كراچی ٧/ ٢٨٨)

وفي السراجية: وينبغي أن يعدل بين أولاده في العطايا، والعدل عند أبي يوسف أن يعطيهم على السواء. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، قديم ٢/ ٣٥٨، جديد دارالكتب العليمة بيروت ٣/ ٤٩٧)

اوراگر کوئی شخص صرف یہ چاہتا ہے کہ زندگی میں اولاد کو مالک بنانا مقصود نہیں ہے؛ بلکہ مرنے کے بعد میراث کے جھگڑے سے بچانا مقصود ہے، تو ایسی صورت میں شرعی میراث کے مطابق تقسیم نامہ بنا کر شرعی گواہوں کے ساتھ وصیت نامہ تحریر کردیں اور مرنے کے بعد اس وصیت نامہ کے مطابق متروکہ میراث وارثین کے درمیان تقسیم ہوجائے گی۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ. [سورة النساء: ١١]

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍رجب ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۱۳۹/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/۷/۱۴۳۱ھ

زندگی میں اولاد کے درمیان جائیداد تقسیم کرنے کا طریقہ

سوال [۹۴۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عمر کے نہ والدین ہیں اور نہ کوئی بہن بھائی، اس کی بیوی بھی اللہ کو پیاری ہوچکی ہے، اس کے دو شادی شدہ لڑکیاں اور دو شادی شدہ لڑکے ہیں، عمر کی غیر منقولہ جائیداد میں ایک فلیٹ ہے جو فی الحال خالی ہے اور ایک مکان ہے جس میں وہ اپنے دونوں لڑکوں کے ساتھ رہتا ہے، عمر چاہتا ہے کہ اپنی زندگی میں فلیٹ کو فروخت کردوں اور پھر رہائشی مکان دو حصے کر کے بذریعہ قرعہ اندازی دونوں لڑکوں کے نام الگ الگ کردوں اور دونوں کو کچھ رقم دے دوں کہ وہ اپنا اپنا حصہ تعمیر کر کے قریب قریب، لیکن الگ الگ رہ سکیں، میں سوچتا ہوں کہ دونوں

لڑکیوں کو بھی تقریباً مساوی رقم دے دوں (ان کے حالات کے پیش نظرابھی یہ طے نہیں کر پایا کہ فوراً دے دوں یا یہ رقم ان کے نام سے محفوظ کر دوں) باقی منقولہ ورثاء کے بارے میں لڑکوں کی نیک نیتی اور دینی مزاج کے سبب پوری امید ہے کہ میرے انتقال کے بعد شرعی تقسیم کریں گے۔ (انشاء اللہ)

حضرت والا سے معلوم یہ کرنا چاہتا ہوں کہ کیا غیر منقولہ جائیداد کی مذکورہ تقسیم صحیح ہے؟ اگر یہ تقسیم صحیح نہیں ہے تو صحیح طریقہ تحریر فرما کر رہنمائی فرمائیں۔

المستفتی: ماسٹر افتخار احمد، چوہان بانگر، دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیر منقولہ جائیداد کی تقسیم صحیح نہیں ہے؛ اس لئے کہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ جب زندگی میں بعض اولاد کو کچھ دینا ہے، تو سبھی کو برابر درجہ میں قرار دے کر سب کو دینے کا حکم ہے، لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر دینے کا حکم ہے، اگر غیر منقولہ جائیداد لڑکوں کو دیتے ہیں اور لڑکیوں کو روپیہ پیسہ کی شکل میں دینا ہے تو جس وقت لڑکوں کو دیا جائے اسی وقت لڑکیوں کو روپیہ پیسہ دے دینا چاہئے۔

قال النبي صلى الله عليه وسلم: اعدلوا بين أولادكم في العطية.

(صحيح البخاري، كتاب الهبة، باب الهبة للولد ١/ ٣٥٢، رقم الباب: ١٢)

في الدرالمختار: لا بأس بتفضيل بعض الأولاد في المحبة ...... وكذا في العطايا إن لم يقصد به الإضرار، وإن قصده فسوى بينهم يعطى البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتوى. (شامي، كتاب الهبة، كراچی ٥/ ٦٩٦، زكريا ٨/ ٥٠١، ٥٠٢، عالمگيري جديد زكريا ٤/ ٤١٦، قديم ٤/ ٣٩١)

اور اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی موت کے بعد شرعی تقسیم صحیح طور پر ہو جائے، تو چھ حصے کر کے لڑکوں کو دو دو اور لڑکیوں کو ایک ایک ملے گا، تو ایسی صورت میں غیر منقولہ جائیداد کو

لڑکوں کے نام نہ کریں؛ بلکہ ایک تفصیلی وصیت نامہ لکھ دیں کہ میری موت کے بعد میری منقولہ وغیر منقولہ جائیداد چھ حصوں میں تقسیم ہوجائے گی۔ لڑکوں کو دو دو اور لڑکیوں کو ایک ایک سہام ملیں گے۔ اور جو غیر منقولہ جائیداد مکان وغیرہ لینا چاہیں گے تو وہ دوسروں کے حصہ کی قیمت اس میں سے مجری کر کے صحیح طور پر ادا کردیں گے۔

يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ. [سورة النساء: ۱۱]

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍شعبان ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۱۳۹)

زندگی میں مکان تقسیم کرنا

سوال [۹۴۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں اور میری شریک حیات ایک قطعہ مکان رقبہ دوسو گز مربع عمارتی واقع محلہ طباقیان کو اپنی اولادوں چھ لڑکیاں اور چار لڑکے جو سب بقید حیات ہیں اپنی حیات میں ہی تقسیم کرنا چاہتے ہیں، جواب سے نوازیں کس طرح تقسیم کریں؟

المستفتی: سید حامد علی ولد محمد علی طباقیان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر زندگی میں ہبہ کر کے قبضہ کرادینا چاہتے ہیں تو لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر دینا لازم ہے، ہاں البتہ اگر اس طرح کرنا چاہیں کہ ماں باپ کے مرنے کے بعد بچوں میں اختلاف وانتشار پیدا نہ ہو اور مرنے کے بعد جو شرعی حصہ بن سکتا ہے، اس کے بارے میں بطور وصیت کی جاتی ہے، تو لڑکوں کو لڑکیوں کے مقابلہ میں ڈبل دیا جائے گا۔ اور اس کی وصیت کردی جائے کہ جب تک ماں باپ زندہ رہیں گے وہی مالک رہیں گے اور

ماں باپ کی موت کے بعد اولادیں اپنے اپنے طے شدہ حصوں کے مالک ہوجائیں گی۔

يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ. [سورة النساء: ١١]

قال النبي صلى الله عليه وسلم: اعدلوا بين أولادكم. (شعب الإيمان، دارالكتب العلمية بيروت ٦/ ٤٠٨، رقم: ٨٦٩١)

يعطى الابنة مثل ما يعطى للابن، وعليه الفتوى وهو المختار. (شامي، هندية، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦، قاضي خان زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩)

المختار التسوية بين الذكر والأنثى في الهبة. (البحرالرائق، كتاب الهبة، زكريا ٧/ ٤٩٠، كوئٹه ٧/ ٢٨٨، خلاصة الفتاوى أشرفيه ديوبند ٤/ ٤٠٠)

﴿أو إصلاح بين الناس﴾ والمراد من الإصلاح بين الناس: التأليف بينهم بالمؤدة إذا تفاسدوا من غير أن يجاوز في ذلك حدود الشرع الشريف. الخ (روح المعاني، زكريا ٤/ ٢١٢)

والصلح خير: أي من الفرقة، وسوء العشيرة، أو من الخصومة. (روح المعاني، زكريا ٤/ ٢١٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۳؍ محرم الحرام ۱۴۳۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۵۶۹/۳۹)	۱۴۳۳/۱/۴ھ

زندگی میں ہی والدہ کا مکان تقسیم کرنا

سوال [۹۴۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مکان آراضی تقریباً ۵۲؍گز مربع، تعمیر شدہ ہے جس کی موجودہ قیمت لگ بھگ آٹھ لاکھ روپئے ہے، ملکیت ہماری والدہ زبیدہ خاتون جو کہ بقید حیات ہیں اوراس مکان کی بلا

شرکت غیر مالک ہیں، وارثان حسب ذیل ہیں: محمد اسحاق شوہر، اقبال فاطمہ، حسین فاطمہ، شمیم فاطمہ، نسیم فاطمہ لڑکیاں، محمد سلیم خان، محمد عارف خان لڑکے سائرہ لڑکی، کوثر لڑکی، ہماری والدہ زبیدہ خاتون اپنی حیات میں ہی ہر ایک کا حصہ دینا چاہتی ہیں، شریعت کی رو سے کس کا کتنا حصہ بنتا ہے؟

المستفتی: حکیم محمد مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ مکان زندگی میں آپ کی والدہ کی ملکیت ہے، اس میں کسی کا حق نہیں اوران کی زندگی میں کسی کو اس میں سے کسی جزو کے مطالبہ کا حق نہیں؛ البتہ کسی کے دباؤ کے بغیر تقسیم کرنا چاہتی ہیں تو شوہر کے لئے جتنا حصہ نکالنا چاہیں نکال لیں اور مابقیہ لڑکیوں اورلڑکوں کے درمیان برابر برابر تقسیم کردیں۔

وفي الخانية: لا بأس بتفضيل بعض الأولاد في المحبة؛ لأنها عمل القلب، وكذا في العطايا إن لم يقصد به الإضرار، وإن قصد يسوى بينهم يعطى البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتوى. قوله عليه الفتوى: أي على قول أبي يوسف من أن التنصيف بين الذكر والأنثى أفضل من التثليث الذي هو قول محمد. (الدرالمختار، کتاب الهبة، کراچی ٥/ ٦٩٦، زکریا ٨/ ٥٠١، ٥٠٢)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۱۱۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/ ۶/ ۱۴۲۴ھ

زندگی میں جائیداد تقسیم کر کے ہبہ کرنا

سوال [۹۴۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حاجی خلیل احمد صاحب نے دو شادیاں کیں، پہلی بیوی کے بطن سے دو لڑکے: (۱)

جمیل احمد (۲) عزیز احمد۔ پہلی بیوی کا انتقال حاجی خلیل احمد کی حیات میں ہی ہوگیا، پھر دوسری شادی بسم اللہ بیگم سے کی اس کے بطن سے ایک لڑکا حمید احمد ہے۔

(۲) ابھی حاجی خلیل احمد حیات ہی تھے کہ انہوں نے اپنی حیات میں تینوں لڑکوں اور اپنی بیوی بسم اللہ بیگم کو اپنے نئی بستی کے مکان کے شرعاً چار حصے کرکے دے دئے تھے، جن پر حاجی خلیل احمد کی حیات ہی میں تینوں لڑکوں اور بسم اللہ بیگم نے قبضہ کرلیا تھا، حاجی خلیل احمد کی یہ تقسیم اپنی حیات ہی میں صحیح ہوئی یا نہیں؟

(۳) حمید احمد نے اپنا حصہ اپنی بیوی شہناز بیگم کے نام ہبہ کردیا اور قبضہ بھی دلوادیا تو یہ ہبہ درست ہوا یا نہیں؟

(۴) بسم اللہ بیگم کا انتقال حمید احمد کے اپنے مکان کا ہبہ اپنی بیوی شہناز بیگم کے نام کرنے کے بعد ہوگیا، تو بسم اللہ بیگم کے ورثاء میں ان کا ایک حقیقی لڑکا حمید احمد ہے، تو کیا حمید احمد ہی بسم اللہ بیگم کے چھوڑے گئے حصہ کے صحیح وارث ہوئے یا نہیں؟

المستفتیة: شہناز بیگم، نئی بستی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۲) حاجی خلیل احمد صاحب کی اپنی زندگی میں مذکورہ تقسیم درست ہے۔

المالک هو المتصرف في الأعیان المملوکة کیف شاء. (بیضاوي، کتب خانه رشدیه دهلی ۱/ ۷)

(۳) حمید احمد کا اپنی بیوی شہناز بیگم کو اپنے حصے کا ہبہ درست ہے۔

وتتم الهبة بالقبض الکامل. (شامي، کتاب الهبة، زکریا ۸/ ۴۹۳، کراچی ۵/ ۶۹۰، هندیة، زکریا قدیم ۴/ ۳۷۷، جدید ۴/ ۳۹۹، مختصر القدوري، ص: ۱۳۵، هدایة، اشرفي ۳/ ۲۸۳)

(۴) بسم اللہ بیگم کے انتقال کے بعد ان کے ورثاء میں چونکہ صرف حمید احمد ہے؛ اس لئے ان کے کل ترکہ کا حق دار شرعاً حمید احمد ہے۔

ثم العصبات من جهة النسب، والعصبة كل من يأخذ ما أبقتهاأصحاب الفرائض، وعند الإنفراد يحرز جميع المال. (سراجی/ ٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/۱۱/۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۹۲۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲/۱۱/۱۴۲۱ھ

زندگی میں اپنی جائیداد متعلقین میں تقسیم کرنا

سوال [۹۴۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی آدمی اپنی ملکیت مثلاً سونا چاندی زمین وغیرہ کو اپنے متعلقین مثلاً بیٹا، پوتا، پوتی، بہن وغیرہ کو اپنی حیات کے اندر ہی دینا چاہے، تو کیا سب کو برابر برابر دیا جائے گا یا کچھ کمی بیشی کے ساتھ جیسا کہ وراثت میں ورثاء کے حصے متعین ہیں؟ تو کیا مذکورہ صورت میں بھی وراثت کے مطابق ہی مال تقسیم کیا جائے گا؟ نیز حالت حیات میں اصحاب الفرائض کے علاوہ کو بھی مال دیا جاسکتا ہے؟ اگر دیا جاسکتا ہے تو کتنا کتنا اور حالت صحت اور مرض میں کچھ فرق ہے یا نہیں؟

المستفتی: حافظ فرحت صاحب، استاذ مدرسہ تجوید القرآن سیانہ بلندشہر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر کوئی آدمی اپنی زندگی میں اپنی جائیداد وغیرہ تقسیم کرنا چاہے، تو اولاد میں برابری ضروری ہے، جتنا لڑکے کو دے اتنا ہی لڑکی کو دے، یہاں لڑکے کو لڑکی سے دوگنا نہیں ملے گا، جیسا کہ وراثت میں ملتا ہے۔

سوی بينهم يعطى الابنة مثل ما يعطى للابن، وعليه الفتوىٰ. (هندية، كتاب الهبة، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦،

قاضي خان جديد زكريا ۳/ ۱۹٤، وعلى هامش الهندية، زكريا ۳/ ۲۷۹البحرالرائق، كوئٹه ۷/ ۲۸۸، زكريا ۷/ ٤۹۰، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ٤۹۷، مصري قديم ۲/ ۳۵۸)

ہاں البتہ بھائی بہنوں میں سے جس کو جتنا چاہیں دے سکتے ہیں، ان کو دینے میں آپ کو اختیار ہے، برابری کے ساتھ دیں یا کمی بیشی کے ساتھ، آپ اپنے مال کے مالک ہیں۔

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء. (بيضاوي، كتب خانه رشديه دهلى ۱/ ۷)

لیکن حالت مرض میں اصحاب فرائض کے علاوہ کو تہائی مال سے زیادہ دینا جائز نہیں ہے۔

وهب المريض شيئا لا يخرج من الثلث، يرد الموهوب له مازاد على الثلث بلا خيار. (بزازية، كتاب الهبة، نوع في هبة المريض وغيره، زكريا جديد ۳/ ۱۲٦، وعلى هامش الهندية ٦/ ۲٤۰)

هبة المريض وصدقته ...... لم يجز إلا من ثلثه. (جامع الفصولين ۲/ ۱۸٦)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱ر جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ٦٦۵۹)

زندگی میں اولاد کے درمیان تقسیم ترکہ

سوال [۹۴۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے خسر جناب عزیز الرحمٰن سیفی کے سات لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ عزیز الرحمٰن کی ملکیت کل اس طرح ہے، تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔ عزیز الرحمٰن صاحب اور ان کی بیوی بھی حیات ہیں، اپنی زندگی میں شریعت پر تقسیم چاہتے ہیں:

(۱) ایک مکان سرائے شیخ محمود میں ہے، آراضی تین سوگز	10,00,000/-
(۲) چار مکان محلّہ گوئیاں باغ میں ہیں آراضی ۳۲۰رگز	3,00,000/-
(۳) دو کانیں محلّہ گنج قصائی میں ہیں، آراضی ۹۵رگز	2,00,000/-
(۴) ایک دوکان بازار گنج کی ابھی فروخت ہوئی قیمت وصول ہوئی	1,50,000/-
(۵) دودکانیں بازار گنج میں ہیں	6,00,000-
(۶) کرولہ پر ۱۶۰رگز کا ایک پلاٹ	30,000/-
(۷) بینک میں جمع شدہ رقم	5,00,000/-
(۸) ایک کلوسونا موجود ہے	4,00,000/-
دوکلوچاندی بھی موجود ہے	31,80,000/-

مذکورہ رقوم تقسیم مابین مذکورہ بالا سات لڑکے اور تین لڑکیوں کے شریعت مطہرہ کے اعتبار سے سہام نکالنے کی زحمت فرمائیں، نوازش ہوگی۔

المستفتی: اشتیاق حسین، سرائے شیخ محمود، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفیق: اگر جناب عزیزالرحمٰن صاحب سیفی اپنی زندگی ہی میں اولاد کے درمیان دولت تقسیم کرنا چاہتے ہیں، تو اولاً اپنے اختیار سے بیوی کو جو دینا چاہتے ہیں دے کر بقیہ ساری جائیداد نقدرقم، سونا چاندی کو دس سہام میں برابر تقسیم کرکے ہر ایک لڑکا لڑکی کو ایک ایک دے دیں۔ اور شرعاً زندگی میں اولاد کے درمیان دولت تقسیم کرنے میں لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر دینا ضروری ہے، ورنہ باپ گنہگار رہوتا ہے۔

سوی بینهم یعطی الابنة مثل ما یعطی للابن. قوله: رجل وهب في صحته کل المال للولد جاز في القضاء، ویکون آثما فیما صنع. (قاضی خان کتاب الهبة، فصل في هبة الوالد لولده وهبة الصغیر، زکریا ۳/ ۱۹٤، وعلی هامش الهندیة،

زكريا ٣/ ٢٧٩، شامي، زكريا ٨/ ٥٠١، ٥٠٢، كراچی ٥/ ٦٩٦، هندية، زكريا قديم ٣/ ٤٩٧، مصري قديم ٢/ ٣٥٨، بزازية، زكريا جديد ٣/ ١٢٣، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٣٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ / ذیقعدہ ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۰۲۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶/۱۱/۱۴۱۰ھ

زندگی میں اولاد کے مابین جائیداد کی تقسیم

سوال [۹۴۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) شمس العارفین اپنی زندگی میں اپنا حصہ اپنے بچوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں، ان کے ورثاء میں ایک بیوی پھول جہاں، چار لڑکے: (۱) محمد شعیب (۲) محمد جنید (۳) محمد زبیر (۴) محمد سہیل۔ دو لڑکیاں: (۱) سابقہ (۲) صادقہ۔ دریافت یہ ہے کہ کس کے حصہ میں کتنی زمین آئے گی؟ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد جنید چکر کی ملک، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: شمس العارفین اگر اپنی زندگی میں جائیداد اور ترکہ اپنی اولاد اور بیوی کے درمیان تقسیم کرنا چاہتا ہے، تو اپنی بیوی کو اپنی مرضی کے مطابق جتنا چاہے دے دے، اس کے بعد بقیہ تمام سرمایہ چار لڑکے اور دو لڑکیوں کے درمیان برابر کرکے تقسیم کردے؛ لہٰذا چھ سہام میں تقسیم ہوکر ہر ایک کو ایک ایک دے دے، لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر دینا ضروری ہے؛ اس لئے کہ زندگی میں تقسیم کرنے میں باپ کے اوپر لازم ہوجاتا ہے کہ لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر دے۔

يكره تفضيل بعض الأولاد على البعض في الهبة حالة الصحة إلا لزيادة فضل له في الدين، وإن وهب ماله كله لواحد جاز قضاء، وهو آثم

-إلی قوله- وفي الخلاصة، المختار التسوية بين الذكر والأنثى في الهبة.

(البحرالرائق، كتاب الهبة، کوئٹه ۷/ ۲۸۸، زكريا ۷/ ۴۹۰، شامي، کراچی ۵/ ۶۹۶، زكريا ۸/ ۵۰۱، ۵۰۲، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۴۹۷)

اور اگر یہ چاہتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد وارثین کو جتنا ملنا ہے وہ زندگی میں متعین کردے، مگر ملکیت اپنی رہے گی، تو ایسی صورت میں شمس العارفین کا کل ترکہ مرنے کے بعد اس نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا جو ذیل میں درج ہے:

شمس العارفین　میـــــــت

بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی
ا				۷		
۱۰	۱۴	۱۴	۱۴	۱۴	۷	۷

شمس العارفین کا کل ترکہ اسی سہام میں تقسیم ہوکر ہر ایک کو اتنا ملے گا جو اس کے نیچے درج ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۶۲۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۵/۶ھ

زندگی میں اولاد کے درمیان جائیداد کی تقسیم

سوال [۹۴۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: شیخ محمد اسحاق اپنی زندگی میں اپنا ایک مکان جو فروخت ہو چکا ہے، اس کی قیمت ۳۹/ لاکھ ۲۱/ ہزار روپئے اپنی زندگی میں اپنی اولاد کے درمیان تقسیم کرنا چاہتے ہیں، ان کے دو بیٹے تھے، ایک بیٹا بمبئی میں رہتا تھا، اس کا انتقال ہوگیا اور ان کا ایک مکان بمبئی میں تھا، مرحوم بیٹے کے بیوی بچوں کو بمبئی کا مکان دے دیا، اب جس مکان کی قیمت تقسیم کرنی ہے وہ

مکان پنچ مڑی میں ہے، دوسرا بیٹا زندہ ہے، ان کا نام شیخ محمد ناصر ہے۔ اور دولڑکیاں ہیں: سلطانہ بیگم اور رخسانہ قمر۔ اور شیخ محمد اسحاق کی بیوی کا انتقال پہلے ہو چکا ہے، اب ان تین اولادوں کے درمیان پنچ مڑی کے مکان کی قیمت تقسیم کرنا چاہتے ہیں، کس کو کتنا کتنا ملنا چاہئے؟ شریعت کی رو سے حکم شرعی سے آگاہ فرمائیں۔

المستفتی: رخسانہ قمر اہلیہ قمر شاہد، محلہ لال مسجد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مسئولہ صورت میں شیخ محمد اسحاق صاحب اپنی تمام جائیداد اور مال کے خود مالک ہیں، وہ اس میں جس طرح چاہیں تصرف کرسکتے ہیں، اگر وہ اپنی زندگی میں اپنی جائیداد کی قیمت تقسیم کرنا چاہتے ہیں، تو جتنا مناسب سمجھیں اپنے لئے الگ کرلیں، پھر مابقیہ مال ایک لڑکے اور دولڑکیوں کے درمیان برابر برابر تقسیم کردیں؛ لہٰذا مابقیہ کو اولاد کے درمیان تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو اس کو برابر تین حصوں میں تقسیم کرکے لڑکے کو ایک حصہ اور دونوں لڑکیوں کو ایک ایک حصہ ملے گا، یاد رکھیں کہ یہ تقسیم زندگی میں اولاد کو ہبہ کرنے کی شکل میں ہے۔ اور موت کے بعد جو میراث تقسیم ہوتی ہے، اس کا حکم دوسرا ہے، اس میں بجائے تین حصے کے چار حصے ہوں گے، دو حصے لڑکے کو اور ایک ایک حصہ لڑکیوں کو ملے گا۔

والمالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء من الملک.

(بیضاوي، کتب خانه رشیدیه دهلی ١/ ٧)

وفي الخلاصة: المختار التسوية بين الذكر والأنثى في الهبة.

(البحر الرائق، کتاب الهبة، زکریا ٧/ ٤٩٠، کوئٹه ٧/ ٢٨٨، خلاصة الفتاوی أشرفیه دیوبند ٤/ ٤٠٠)

وإن قصده فسوى بينهم يعطى البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتوى.

(درمختار، کتاب الهبة، زکریا ٨/ ٥٠١، کوئٹه ٥/ ٦٩٦، قاضیخان زکریا جدید ٣/ ١٩٤، وعلی هامش الهندیة ٣/ ٢٧٩)

سوى بينهم يعطى الابنة مثل ما يعطى للابن، وعليه الفتوى. (هندية، كتاب الهبة، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ رجب ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۱۱۹/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/۷/۱۴۳۱ھ

زندگی میں اولاد کے مابین ترکہ کی تقسیم

سوال [۹۴۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں، زید اپنے پانچ بیٹوں میں سے سب سے بڑے بیٹے کا حصہ اپنی ملکیت میں سے نکال کر دے چکا ہے، اب زید یہ چاہتا ہے کہ اپنی حیات میں باقی چار بیٹے اور تین بیٹیوں کا حصہ حسب منشاء شرع نکال دے۔ اب آپ سے دریافت طلب امر یہ ہے کہ والدین کی موجودگی میں ان کی اولاد یعنی چاروں بیٹے اور تینوں لڑکیوں کو کتنا اور والدین کو کتنا حصہ ملے گا؟

المستفتی: محمد عبد اللہ جھبو کا نالہ کسرول، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: زید اپنی زندگی میں اپنی ملکیت کے اندر تصرف کرنے کا مختار ہے؛ لہٰذا اگر زید اپنی زندگی میں اپنی ملکیت کو اولاد کے درمیان ہبہ کرنا چاہے، تو کر سکتا ہے۔ اور جو کچھ اپنے لئے رکھنا چاہے رکھ سکتا ہے؛ لیکن لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان تقسیم کرنے میں برابری کرنا اور بڑے لڑکے کو جتنا حصہ دیا ہے اتنا حصہ سب کو دینا ضروری ہوگا، کمی بیشی کرنے کی صورت میں زید گنہگار ہوگا۔

عن النعمان بن بشير –رضي الله عنه– قال: أتى بي أبي إلى رسول الله

صلى الله عليه وسلم فقال: إني نحلت ابني هذا غلاما، فقال: أكل بنيك نحلت، قال: لا، قال: فاردده. (مسلم شريف، كتاب الهبات، باب كراهية تفضيل بعض الأولاد في الهبة، النسخة الهندية ٢/ ٣٧، بيت الأفكار، رقم: ١٦٢٣، بخاري شريف، كتاب الهبة، باب الهبة للولد الخ ١/ ٣٥٢، رقم: ٢٥١٤، ف: ٢٥٨٦)

قال الطيبي: فيه استحباب التسوية بين الأولاد في الهبة، فلا يفضل بعضهم على بعض –إلى قوله– ولو وهب بعضهم دون بعض، فمذهب الشافعي ومالك وأبي حنيفة أنه مكروه، وليس بحرام، والهبة صحيحة، ولو وهب جميع ماله من ابنه جاز قضاء، وهو آثم نص عليه محمد. (شرح الطيبي، كتاب البيوع، باب الهبة، الفصل الأول، كراچی ٦/ ١٨١، تحت رقم الحديث: ٣٠١٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/رجب ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۴۹۶)

اولاد کے مابین جائیداد کی تقسیم زندگی میں کرنے کا شرعی حکم

سوال [۱۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے تین لڑکے: (۱) محمد شاہد (۲) محمد راشد (۳) محمد مجاہد اور دولڑکیاں: (۱) شبانہ نور (۲) اور فاطمہ نور، ایک بیوی دودانہ بیگم، میرے والد والدہ کا انتقال ہو چکا ہے، مکان سامان وغیرہ کو اپنی زندگی میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں، کس طرح تقسیم ہوگا؟

المستفتی: محمد شاہد شمسی لاجپت نگر، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر آپ اپنی زندگی ہی میں اولاد کے درمیان اپنی جائیداد تقسیم کرنا چاہتے ہیں، تو حسب مرضی بیوی کو جو کچھ دینا چاہیں دے دیں، اس کے بعد لڑکیوں

کوبھی لڑکوں کے برابر دینا لازم ہوگا۔

فسوى بينهم يعطى البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتوى. (شامي، كتاب الهبة، كراچی ٥/ ٦٩٦، زكريا ٨/ ٥٠١، ٥٠٢، هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦، قاضيخان زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩)

لہٰذا تین لڑکوں اور دو لڑکیوں کے درمیان کل جائیداد پانچ حصوں میں تقسیم ہوگی، ہر ایک کو ایک ایک حصہ ملے گا۔ اور اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ کی وفات کے بعد کس کو کتنا کتنا ملے گا تو کل ترکہ ۶۴ ر سہام میں تقسیم ہو کر بیوی کو آٹھ اور لڑکوں کو چودہ چودہ اور لڑکیوں کو سات سات حصے ملیں گے، جیسا کہ حسب ذیل نقشہ سے واضح ہوتا ہے:

میـــــــــــــــــــــــــت

بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی
دودانہ	محمد شاہد	محمد راشد	محمد مجاہد	شبانہ	فاطمہ
۸	۱۴	۱۴	۱۴	۷	۷

دونوں طرح کے مسئلے ہم نے بیان کر دیئے، اب آپ کو اختیار ہے جو طریقہ چاہیں اختیار کرلیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷ ر ربیع الاول ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۵۵۰/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۳/۷ھ

زندگی میں اولاد کے مابین جائیداد کی تقسیم کا طریقہ

سوال [۹۴۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عرض کہ میرے نانا عنایت حسین کی داد الٰہی ملکیت کی میری والدہ تنہا وارث تھی، میں دولر خان اپنی والدہ کے حصہ کے مکان کا تنہا وارث ہوں، یہ مکان دوسو گز آراضی پر تھا، جس میں

میں اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کے ساتھ سکونت پذیر تھا، میں نے اپنے تینوں بیٹوں کی شادی کردی اور دو بیٹیوں کی بھی شادی کردی اور پانچویں بیٹے نے اپنے بدمعاش ساتھیوں کے ساتھ ان میں سے ایک کو قتل کردیا، اس سلسلے میں پولیس نے مقدمہ بازی میں اس کی پٹائی بھی کی؛ اس لئے ان پریشانیوں سے بچ کر میں نے اپنا پورا مکان ۸/ لاکھ روپئے میں فروخت کردیا اور شہر کے کنارے چھ لاکھ کا مکان خریدلیا، بقیہ دو لاکھ میں سے پچاس ہزار روپئے پانچویں بیٹے کے مقدمہ میں لگائے اور بقیہ رقم سے میں نے اور میری اہلیہ نے حج کیا، اب دوبارہ مکان کو بیچ دیا ہے۔ اور اب میرے بڑے دو بیٹے اپنا حصہ مانگ رہے ہیں اور دونوں دوسری جگہ ایک ساتھ رہنا چاہتے ہیں؛ لہٰذا اسی فروخت ہوئے مکان میں مجھے اور میری اہلیہ کو شریعت محمدی میں کتنا حصہ ملتا ہے؟ اور بیٹوں کو کتنا؟ تینوں بہنوں کو حصہ نہیں دیا جارہا ہے، شرعی فتوی دے کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔ والسلام

المستفتی: دولر خان محلّہ بروالان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں جب تک آپ کی زندگی ہے، تو ساری جائیداد روپئے وغیرہ آپ کی ملکیت ہے، کسی کو اس میں سے حق مانگنے کا اختیار نہیں ہے، آپ جتنا چاہیں اور جہاں چاہیں، خرچ کرسکتے ہیں، آپ اپنی زندگی میں اپنی اولاد میں سے کسی کو کچھ دینا چاہیں تو اس کا بھی اختیار ہے، ہاں البتہ اگر اپنی جائیداد وروپیہ پیسہ وغیرہ اپنی زندگی میں ہی اولاد کے درمیان تقسیم کرنا چاہیں، تو اس تقسیم کے اندر لڑکیوں کو بھی شامل کیا جائے اور لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان جائیداد روپئے پیسہ وغیرہ کو برابر برابر تقسیم کیا جائے، انصاف کی بات یہی ہے، ہاں آپ کے مرنے کے بعد منجانب شریعت لڑکیوں کو لڑکوں کے بالمقابل آدھا ملے گا۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۵/ ۶۱، ڈابھیل ۱۶/ ۴۹۷، کفایت المفتی قدیم ۸/ ۱۸۰، جدید زکریا مطول ۱۳/ ۳۶۱)

وينبغي أن يعدل بين أولاده في العطايا، أن يعطيهم على السواء.

(مجمع الأنهر، کتاب الهبة، دارالکتب العلمیة بیروت ۳/ ٤٩٧، مصري قدیم ۲/ ۳٥٨، بزازیة، زکریا جدید ۳/ ۱۲۳، وعلی هامش الهندیة ٦/ ۲۳۷، البحرالرائق، زکریا ۷/ ٤٩٠، کوئٹه ۷/ ۲۸۸، خلاصة الفتاوی، اشرفیه دیوبند ٤/ ٤٠٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۲۱۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۵/۷ھ

زندگی میں کاروبار اور مکان تقسیم کرنا

سوال [۹۴۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں اپنے کاروبار اور مکان وغیرہ کو تقسیم کرنا چاہتا ہوں، ہم میاں بیوی ہیں اور چار لڑکے ایک لڑکی ہے، ان کی شادی وغیرہ سے فارغ ہو چکا ہوں، ایک لڑکے کا حصہ میں دے چکا ہوں، تین لڑکے اور ایک لڑکی اور دو ہم میاں بیوی ہیں، شرع کے حساب سے کس طرح تقسیم کروں؟

المستفتی: راحت علی گلشہید، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ابھی زندگی میں اپنی ساری دولت کے مالک تنہا آپ ہی ہیں اور آپ کی موجودگی میں نہ آپ کے لڑکے مالک ہیں نہ آپ کی لڑکی نہ آپ کی بیوی؛ بلکہ تنہا آپ ہی مالک ہیں، ہاں اگر آپ چاہتے ہیں کہ اپنی زندگی میں اولاد کے درمیان دولت تقسیم کردیں، تو پہلے اپنے لئے جتنا چاہیں الگ کرلیں اور بیوی کو بھی جتنا چاہیں دے دیں، اس کے بعد بقیہ مال تمام اولاد کے درمیان برابر تقسیم کردیں اور لڑکی کو بھی لڑکوں کے برابر ملے گا؛ لہٰذا پانچ حصوں میں تقسیم کرکے ایک ایک حصہ چاروں لڑکوں کو اور ایک حصہ لڑکی کو دیں گے۔ اور جس لڑکے کو پہلے جتنا حصہ دے چکے ہیں بقیہ لڑکوں

کو بھی اس سے کم نہیں دینا چاہئے۔

وفي الخلاصة: المختار التسوية بين الذكر والأنثى في الهبة. (البحر الرائق، كتاب الهبة، زكريا ٧/ ٤٩٠، كوئٹه ٧/ ٢٨٨، خلاصة الفتاوى أشرفيه ديوبند ٤/ ٤٠٠، بزازية زكريا جديد ٣/ ١٢٣، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٣٧)

وإذا ثبت هذا، فالتسوية المستحبة عند البعض أن يقسم بينهم على حسب قسمة الله تعالى الميراث ...... وقال أبوحنيفة ومالك والشافعي وابن المبارك: تعطى الأنثى مثل ما يعطى الذكر؛ لأن النبي صلى الله عليه وسلم قال لبشير بن سعد سو بينهم. (إعلاء السنن، كتاب الهبة، باب التسوية المستحبة بين الأولاد، دارالكتب العلمية بيروت ١٦/ ١٢٠، كراچی ١٦/ ٩٧)

قد ثبت بما ذكرنا أن مذهب الجمهور في التسوية بين الذكر والأنثى في حالة الحياة أقوى وأرجح من حيث الدليل. (تكملة فتح الملهم، كتاب الهبة، باب كراهة تفضيل بعض الأولاد في الهبة، أشرفيه ديوبند ٢/ ٧٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ ؍جمادی الثانیہ ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۳۴۴)

زندگی میں جائیداد تقسیم کرنے میں والدہ کا اپنے لئے کچھ باقی رکھنا

سوال [۹۵۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مکان سوگز کا میری والدہ کا ہے، ان کے چھ لڑکے چار لڑکیاں ہیں، والدہ زندگی میں اپنا مکان اپنی اولادوں میں تقسیم کرنا چاہتی ہیں، تو کیا تقسیم کرسکتی ہیں؟ اور اپنے لئے رکھ سکتی ہیں؟ اور اولادوں کو کتنا کتنا دیں؟ میرے والد تین سال سے لاپتہ ہیں۔

المستفتی: ظہیر عالم کرولہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر آپ کی والدہ اپنی زندگی میں اپنی جائیداد اولادوں کے درمیان تقسیم کرنا چاہتی ہیں تو اپنی مرضی سے اپنے لئے جتنا چاہیں روک لیں باقی مکان لڑکے اور لڑکی سب کے درمیان برابر برابر تقسیم کردیں اور یہ بات یاد رکھیں کہ مرنے کے بعد تقسیم کرنے میں لڑکیوں کو لڑکوں کے مقابلہ میں آدھا آدھا ملتا ہے اور زندگی میں تقسیم کرنے میں لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر ملتا ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ جدید ۲۰/ ۱۴۸)

ولكل واحد منهم أن يتصرف في حصته كيف ماشاء. (شرح المجلة رستم، مكتبه إتحاد ۱/ ٦٤٣، رقم المادة: ۱۱٦۲)

وفي الخلاصة: المختار التسوية بين الذكر والأنثى في الهبة. (البحرالرائق، كتاب الهبة، زكريا ۷/ ٤۹۰، كوئٹه ۷/ ۲۸۸، خلاصة الفتاوى أشرفيه ديوبند ٤/ ٤۰۰)

وينبغي أن يعدل بين أولاده في العطايا، والعدل عند أبي يوسف أن يعطيهم على السواء، وهو المختار. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ٤۹۷، مصري قديم ۲/ ۳٥۸، بزازية، زكريا جديد ۳/ ۱۲۳، وعلى هامش الهندية ٦/ ۲۳۷)

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۹۳۴/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۳/۱۴۳۱ھ

والدین کا اپنی جائیداد بچوں کے درمیان تقسیم کرنا

سوال [۹۵۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مکان جس کا رقبہ ۱۳۸؍گز ہے، جس کی قیمت ۳۰؍لاکھ روپئے ہیں، جس میں والدین کے علاوہ ۴؍لڑکے اور ۵؍لڑکیاں حق دار ہیں، والدین اپنی ہی حیات میں سبھی کو ان کا

حصہ تقسیم کرنا چاہتے ہیں، مکان کی والدہ مالک ہیں، والد بھی حیات ہیں؛ لہٰذا قرآن وشریعت کی روشنی میں سبھی کا حصہ متعین فرمائیں۔

المستفتی: نفیسہ بیگم، لائن نمبر ۱/۲۷ آزادنگر ہلدوانی، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: والدہ زندگی میں اپنی جائیداد کی خود مالک ہیں؛ لہٰذا انہیں اختیار ہے جتنا چاہیں اپنے لئے روک لیں، ان کے اوپر کسی کو دباؤ کا حق نہیں ہے، پھر بھی اگر وہ زندگی میں تقسیم کرنا چاہتی ہیں، تو اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ زندگی میں اولاد کے درمیان تقسیم کرنے کی صورت میں لڑکیوں کو لڑکوں کے برابر ملتا ہے۔

المختار التسوية بين الذكر والأنثى في الهبة. (البحرالرائق، كتاب الهبة، كراچی ٧/ ٢٨٨، زكريا ٧/ ٤٩٠، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩٧)

ويكره تفضيل بعض على البعض في الهبة حالة الصحة. (البحرالرائق، كراچی ٧/ ٢٨٨، زكريا ٤٩٠)

لہٰذا اپنے لئے جتنا مناسب سمجھیں الگ کر کے بقیہ چار لڑکے اور پانچ لڑکیوں کے درمیان نو حصے بنا کر برابر برابر تقسیم کردیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۹۸۰/۳۸)

زندگی میں ورثاء کے لئے وصیت اور ان کے درمیان تقسیم کا حکم

سوال [۹۵۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید نے اپنی زندگی میں اپنے ورثاء میں کسی کے نام کوئی وصیت کی ہے اور سب ورثاء بالغ ہیں اور وہ مرحوم کی محبت میں اسی وصیت پر عمل کریں تو کیا حکم ہے؟

(۲) مرحوم زید کی پانچ شادی شدہ لڑکیاں ہیں، جن کی شادی زید اپنی زندگی میں کر چکے، اب زید کے انتقال کے بعد زید کا ماں سے سوتیلا اور باپ سے سگا بھائی جو لڑکیوں کے چچا ہوئے، ایک لڑکی کے لئے تقریباً پونے دوسو گز زمین کا ٹکڑا بحیثیت وصیت نکلوانا چاہتے ہیں، جس کی کوئی تحریر نہیں ہے اور میراث سے علیحدہ کر دیا ہے؟

(۳) مرحوم زید نے اپنی زوجہ (جو کہ دوسری بیوی ہے اور لڑکیوں کی سوتیلی ماں ہے) کے نام کچھ وصیت کی جو کہ تحریر ہے، اس کے لئے کیا حکم ہے؟

(۴) زید نے اپنی زوجہ سے کہا کہ میں نے اپنی جائیداد پر تمہارے فوٹو لگوا دئے ہیں، جس کے تمام کاغذات سوتیلی لڑکیوں نے اپنے قبضے میں کر لئے ہیں، اب وہ جائیداد کس کی ہوگی؟

(۵) مرحوم زید کے کچھ پیسے ڈاک خانہ میں ہوں مرحوم اور دوسری بیوی کے نام سے، اور وہ اس کو بیوی کے لئے کہہ گئے ہوں اور اس کی کتابوں پر بھی بیوی ہی قابض ہو، اب وہ رقم اسی کی ہے یا پھر اس رقم کا بھی بٹوارہ ہوگا؟

(٦) گھر کا پورا ہاؤس ٹیکس زید کی پہلی بیوی یعنی سوتیلی لڑکیوں کی سگی ماں کے نام تھا، پھر زید ہی نے اپنی دوسری بیوی کے نام کرا دیا، اس کے بعد آدھا اپنے نام کرا لیا اور آدھا دوسری بیوی کے نام یعنی لڑکیوں کی سوتیلی ماں کے نام کرا دیا، جس پر وہ قابض ہے، اس کے لئے کیا حکم ہے، یعنی اپنے پورے گھر پر اور ہاؤس ٹیکس کی رسید پر بھی ایک نام تو زید کا ہے؛ لیکن وہ کسی اور کا ہے، اس کے لئے کیا حکم ہے؟ سو گز زمین پر کسی کا گھر بنوایا جا چکا ہے، کاغذ نہیں ہوا، زید کے ہی نام پر ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ اگر وصیت رجسٹرڈ ہو اور باقی کام اس لئے چھوڑ دیا ہو کہ وہ تو خود ہو جائے گا، یعنی نام تو خود ہی ہو جائے گا، تو کیا حکم ہے؟ عبدالعلیم صاحب کی بیوی اپنی رائے پیش کرنا چاہتی ہے، اگر جائز ہو تو علماء اس کو مان لیں؛ کیوں کہ وہ مرحوم کو کسی عذاب آخرت میں مبتلا نہیں چھوڑنا چاہتی، عبدالعلیم صاحب کی دوسری بیوی نے ہاؤس ٹیکس کی رسید 2000 کی گھر کی رسیدوں میں دیکھی تھی، جو کہ بلقیس بیگم (جو کہ عبدالعلیم کی مرحومہ بیوی تھیں) کے نام سے تھی، اگر ہاؤس ٹیکس کو ہی مان لیا جائے تو ماں کے نام ہاؤس ٹیکس

ہونے کے ناطے گھر کی حق دار پانچوں لڑکیاں اور عبدالعلیم صاحب خود حصہ دار ہوتے ہیں، یہ مان کر جو لڑکیوں کا حق نکلتا ہے وہ لڑکیوں کو اور جو عبدالعلیم صاحب کا حق نکلتا ہے وہ اس کی دوسری بیوی کو دے دیا جائے؛ کیوں کہ پورا ہاؤس ٹیکس دوسری بیوی کے نام کر دیا تھا، یہ ان کو پتہ نہیں تھا کہ میرے نام پورے گھر کا ہاؤس ٹیکس ہے، پھر کوئی درخواست لکھ کر اس پر دستخط کرائے، جس کی کاربن کاپی اس کو مل گئی، جس میں لکھا تھا کہ ہاؤس ٹیکس آدھا آدھا کر دیا جائے، بلقیس بیگم کے انتقال کے بعد ان کے نام کی ہر چیز وارثوں کی ہوگی، اس طرح یہ لڑکیوں اور عبدالعلیم صاحب کی ہوئی، بنا سوچے زید نے قانوناً نظریہ کو سامنے رکھتے ہوئے دوسری بیوی کے نام پورا ہاؤس ٹیکس کرا دیا، پھر خود ہی آدھا کر دیا، جس کا عبدالعلیم صاحب کی بیوی کو بعد میں علم ہوا، مرحوم عبدالعلیم صاحب کے ذمہ اسلامی لحاظ سے کچھ قرض نکلتا ہے، زید کی دوسری بیوی یہ چاہتی ہے کہ خاموشی سے اس کا قرض ادا کر دیا جائے۔

عمل کا دار ومدار نیت پر ہے، علیم صاحب نے اپنی زندگی میں یہ کہا کہ کھیتی کی زمین بیوی کی ہوتی ہے، کھیتی کی زمین تمہاری ہے، اس کو تم سے کوئی نہیں لے سکتا اور شاید ہر جگہ اس کے فوٹو لگوا دئے ہیں (جو کہ ساتھ میں روانہ ہے) جس کی کوئی رسید اس کے پاس نہیں ہے، ہاں زبانی کہا ہے، تو اس کا بٹوارہ کیوں ہوگا؟

سو گز زمین پر ایک لڑکی کا گھر بنا ہوا ہے، جس کا کاغذ نہیں ہوا تھا، اس کا بٹوار کیوں ہوگا؟ ایک ٹرک زید کے نام سے ہے، جس کا پیسہ داماد نے تھوڑا تھوڑا کر کے ادا کیا اور اب بھی کچھ باقی ہے، اس کا بٹوارہ کیوں ہوگا؟ میری عقل ناقص کے حساب سے جو چیز یا مال دے دیا گیا ہو اس کا بٹوارہ نہیں ہونا چاہئے۔

ڈاک خانہ کا پیسہ جو کہ دونوں کے نام سے ہے، اس میں سے مرحوم کا قرض نکال کر آدھا زید کی بیوی کا ہوا اور آدھے کا بٹوارہ کرلیا جائے تو کیسا ہے؟ اگر علماء کی سمجھ میں میرا مشورہ کتاب وسنت کی روشنی میں درست ہو تو اس کو مان لیا جائے، جو کمی بیشی ہو اس کو آپس میں معاف

کردیا جائے؛ کیوں کہ ہم ابھی زندہ ہیں اور سب وارث بالغ ہیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) کسی کے نام وصیت سے کیا مراد ہے؟ اگر غیر وارث مراد ہے تو غیر وارث کے لئے ثلث مال میں وصیت نافذ ہوجاتی ہے۔ اور اگر وارث مراد ہے تو وارث کے حق میں وصیت نافذ نہیں ہوتی، جب کہ اس سے دوسرے ورثاء کا حق مارا جارہا ہو۔

عن أبي أمامة الباهلي –رضي الله عنه– قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول في خطبته عام حجة الوداع: إن الله تبارك وتعالىٰ قد أعطى كل ذي حق حقه، فلا وصية لوارث. (سنن الترمذي، باب ماجاء لا وصية لوارث، النسخة الهندية ۲/ ۳۲، دارالسلام، رقم: ۲۱۲۰، سنن ابن ماجة، باب لا وصية لوارث، النسخة الهندية ۲/ ۱۹۵، دارالسلام، رقم: ۲۷۱۳، سنن أبي داؤد، باب في الوصية للوارث، النسخة الهندية ۲/ ۳۹٦، دارالسلام، رقم: ۲۸۷۰)

لا تجوز الوصية للوارث عندنا إلا أن يجيزها الورثة. (عالمگيري، كتاب الوصايا، زكريا قديم ٦/ ۹۰، جديد ٦/ ۱۰٦)

(۲) کسی وارث کے لئے وصیت نافذ نہیں ہوتی جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، اس لئے زبانی وصیت کی بنیاد پر کسی ایک لڑکی کے لئے جائیداد کا کچھ حصہ الگ سے نکالنا شرعاً جائز نہیں، اگر زبردستی کی جائے گی تو وہ لوٹ اور غصب کے درجہ میں ہوجائے گا، جیسا کہ اوپر کی دلیل سے واضح ہوتا ہے۔

(۳) بیوی بھی وارث ہوتی ہے؛ اس لئے میراث سے الگ زائد چیز کے لئے وصیت نافذ نہیں ہوگی، جیسا کہ اوپر کی دلیل سے ثابت ہوتا ہے۔

(۴) جس جائیداد کا ذکر سوال نامہ میں کیا جارہا ہے وہ جائیداد زید کے مرنے کے بعد تمام ورثاء کے درمیان شرعی طور پر تقسیم ہوگی، شرعی طور پر جس کا جتنا جتنا حصہ بنتا ہے اس کو اتنا اتنا ملے گا۔

(۵) اگر زندگی میں بیوی کو ہبہ کر کے قبضہ دے دیا ہے، تو وہ بیوی ہی کی ہے؛ اس لئے کہ یہ وصیت نہیں بلکہ ہبہ ہے۔ اور سرکاری بینک وغیرہ میں جمع شدہ رقم پر قبضہ کے لئے اتنا کافی ہے کہ اس رقم کو کسی دوسرے کے نام سرکاری قانون کے اعتبار سے منتقل کر دیا جائے۔ اور جب سرکاری ضابطہ کے مطابق بیوی کے نام منتقل کر دیا گیا ہے اور اس کا اکاؤنٹ بیوی کے نام سے بیوی کے قبضہ میں ہے، تو وہ بیوی کے نام سے ہبہ تام ہو چکا ہے؛ اس لئے وہ رقم بیوی ہی کی ہے، اس میں دوسروں کے لئے وراثت جاری نہ ہوگی۔

عن النضر بن أنس قال: نحلني أنس نصف داره، قال: فقال أبو بردة: إن سرک يجوز لک فاقبضه، فإن عمر بن الخطاب –رضي الله عنه– قضى في الأنحال أن ما قبض منه فهو جائز، وما لم يقبض فهو ميراث، قال: فدعوت يزيد الرشک، فقسمها. (السنن الكبرى للبيهقي، الهبات، باب ماجاء في هبة المشاع، دارالفكر ۹/ ۱۵۸، رقم: ۱۲۱۸٦)

وتتم الهبة بالقبض الكامل. (شامي، كتاب الهبة، زكريا ۸/ ٤۹۳، كراچی ۵/ ٤۹۰، هداية، اشرفي ۳/ ۲۸۳، مختصر القدوري، ص: ۱۳۵)

(٦) اگر مذکورہ مکان زید کی ملکیت ہے اور زید اس کا آدھا حصہ دوسری بیوی کو زندگی میں ہبہ کرنا چاہتا ہے اور ہبہ ہی کے واسطے ہاؤس ٹیکس کے کاغذات اس کے نام منتقل کر دیا ہے، تو آدھا مکان دوسری بیوی ہی کا ہے۔

عن النضر بن أنس قال: نحلني أبي نصف داره، فقال أبو بردة: إن سرک أن تجوز ذلک فاقبضه، فإن عمر بن الخطاب –رضي الله عنه– قضى في الأنحال ما قبض منه فهو جائز، وما لم يقبض منه فهو ميراث.

(المصنف لابن أبي شيبة، البيوع والأقضية من قال: لا تجوز الهبة إلا مقبوضة، موسسة علوم القرآن، جديد ۱۰/ ۵۲۱، رقم: ۲۰۵۰۲)

وتتم الهبة بالقبض الكامل. (شامي، كتاب الهبة، زكريا ۸/ ٤۹۳، كراچی

٥/ ٤٩٠، هداية، اشرفي ٣/ ٢٨٣، مختصر القدوري، ص: ١٣٥)

جس ٹرک کا ذکر کیا جارہا ہے وہ زید کے نام کیوں ہے؟ کسی اور کا ٹرک ہے، تو زید کے نام کیوں ہے؟ اس کو واضح کریں۔ سوگز زمین پر کسی دوسرے کا مکان بنایا گیا ہے، وہ زمین زید کی ہے یا کسی دوسرے کی؟ دوسرے کے لئے اس پر مکان کیوں بنایا گیا ہے؟ مستفتی سے گزارش ہے کہ ایسے سوالات نہایت غیر مناسب ہیں، ان سوالوں سے کیا مفتی کا امتحان لیا جارہا ہے؟ نہایت مہمل سوال ہے، اگر یہ واقعہ ہے تو بات کھل کر لکھنا چاہئے، کسی کے نام سے ٹرک کا کیا مطلب ہے؟ کسی دوسرے کے نام مکان کا کیا مطلب ہے؟ ان سب باتوں کو کھل کر وضاحت سے لکھنا چاہئے، اگر وصیت رجسٹرڈ ہو اور نام تو خود ہو جائے گا، یہ بھی غیر مناسب سوال ہے، اس کی بھی حقیقت ہے، تو حقیقت کو واضح کر کے واقعہ لکھنا چاہئے، تا کہ مفتی حقیقت پر واقف ہونے کے بعد حکم شرعی لکھ سکے، دو ایک مقامی علماء کو بٹھا کر مسئلہ کے ہر پہلو اور نزاکت کو سامنے رکھ کر جائیداد تقسیم کی جائے، اس کا لحاظ رکھا جائے کہ کسی کا حق نہ مارا جائے؛ لیکن ڈاک خانہ اور بیلنس میں جو پیسہ ہے، اگر وہ بیوی کے نام زندگی میں منتقل کر دیا ہے، تو وہ زندگی ہی میں اس کے نام سے ہبہ ہو چکا ہے، اس کے اختیار میں ہے کہ وہ چاہے تو دوسرے وارثین کو اپنی خوشی سے دے دے، یا نہ دے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ شعبان ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۱۲۲)

زندگی میں تمام اولاد کے درمیان برابر برابر تقسیم کرنا

سوال [۹۵۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: حافظ محمد یونس کے دو لڑکے پانچ لڑکیاں ہیں، سب ایک ہی مکان میں رہتے ہیں اور کھانا پینا سب کا الگ الگ ہے، ایک بیٹی ساتھ رہتی ہے، ساری جائیداد حافظ محمد یونس کے قبضہ میں

ہے،حافظ یونس اپنی ایک بیٹی سے ناراض ہیں،توان کو اپنی جائیداد سے الگ کرنا چاہتے ہیں، ان سے مکان خالی کرانا چاہتے ہیں،تو کیا شرعاً ان کے لئے ایسا کرنا جائز ہے، یا لڑکی کو اس مکان میں رہنے کا حق ہے، شرعی حکم سے مطلع فرمائیں۔

نوٹ:- مستفتی سے زبانی معلوم ہوا داماد سے خفا ہونے کی بناء پر لڑکی کو مکان میں نہیں رہنے دینا چاہتے۔

المستفتی: عبدالمنان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر حافظ یونس ابھی بحالت صحت صحیح تندرست ہے، تو وہ اپنی ملکیت میں جس طرح چاہے تصرف کرسکتا ہے، جس کو چاہے رکھے اور جس کو چاہے نکال دے۔

والمالک هو المتصرف في الأعیان المملوکة کیف شاء من الملک.

(بیضاوي، کتب خانه رشدیه دهلی ۱/ ۷)

لیکن اگر زندگی میں اولاد کے درمیان تقسیم کرنا ہے اوران میں کوئی نافرمان نہیں ہے، تو سب کو برابر دینا لازم ہے، اگر یہ بیٹی نافرمان نہیں ہے؛ بلکہ صرف داماد سے ناراض ہونے کی وجہ سے بیٹی سے بھی ناراض ہے تو بیٹی کو محروم نہ کرنا چاہئے؛ البتہ داماد کو کچھ نہ دے وہ اپنا انتظام خود کرے۔

عن أنس بن مالک -رضي اللّٰه عنه قال: قال رسول اللّٰه ﷺ: من فر من میراث وارثه قطع اللّٰه میراثه من الجنة یوم القیامة. (سنن ابن ماجة، باب الحیف في الوصیة، النسخة الهندیة ۲/ ۱۹۴، دارالسلام، رقم: ۲۷۰۳)

عن سلیمان بن موسی قال: قال رسول اللّٰه ﷺ: من قطع میراثا فرضه اللّٰه قطع اللّٰه میراثه من الجنة. (سنن سعید بن منصور، باب من قطع میراثا فرضه اللّٰه، دارالکتب العلمیة بیروت ۱/ ۹۶، رقم: ۲۸۵-۲۸۶)

وروى المعلى عن أبي يوسف: أنه لا بأس به إذا لم يقصد به الإضرار، وإن قصد به الإضرار سوى بينهم يعطي الابنة مثل ما يعطى الابن، وقال محمد -رحمه الله تعالى- يعطي للذكر ضعف ما يعطى للأنثى، والفتوى على قول أبي يوسف. (قاضی خان، الهبة، فصل في هبة الوالد لولده، زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية، زكريا ٣/ ٢٧٩، هندية، كتاب الهبة، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦، شامي، زكريا ٨/ ٥٠١، ٥٠٢، كراچی ٥/ ٦٩٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ رربیع الثانی ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۲۳۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶/۴/ ۱۴۱۸ھ

زندگی میں تقسیم کرنے کی صورت میں اولاد کے درمیان برابری

سوال [۹۵۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) میرے والد بزرگوار نے ایک نصف مکان چھوڑا ہے، جس کا میں اور میری بہن مالک ہیں اور باقی نصف مکان میرے چچا صاحب نے صرف میرے نام کر دیا ہے، کوئی اس میں شریک نہیں، اب میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میری بہن کا کتنا حق ہے اور میرا کتنا حق ہے؟

(۲) اس کے بعد وہ نصف حصہ باقی حصہ میں شامل کر دیا جائے؟

(۳) اور میرے دو لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں، وہ ان میں تقسیم کر دیا جائے اور بتائیں لڑکیوں کا کتنا حق ہے اور کتنا حق لڑکوں کا ہے؟

المستفتی: عبد الخالق ولد عبد الہادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: آپ کے سوال نامہ کے مطابق کل مکان چھ سہاموں میں تقسیم ہوکر آپ کی بہن کو ایک ملے گا، باقی ۵/سہام آپ کو ملیں گے اور اب اگر آپ اپنی زندگی میں اولاد کے درمیان تقسیم کرنا چاہتے ہیں، تو زندگی میں تقسیم کرنے میں لڑکیوں کو لڑکوں کے برابر دینا لازم ہوتا ہے،تو کل چھ اولاد کے درمیان چھ حصوں میں تقسیم ہوگا اور کل مکان ۳۶/سہام میں تقسیم ہوکر آپ کی بہن کو ۶/سہام اور آپ کی چھ اولاد میں سے ہر ایک کو ۵-۵/ ملے گا۔

سوى بينهم يعطى الابنة مثل ما يعطى الابن. (هندية، كتاب الهبة، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦، قاضي خان جديد زكريا ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية، زكريا ٣/ ٢٧٩، شامي، زكريا ٨/ ٥٠١-٥٠٢، كراچی ٥/ ٦٩٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/صفر ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۱۸۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۲/۲۲ھ

زندگی میں تقسیم کی صورت میں برابری کا حکم

سوال [۹۵۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سائل اپنی حیات میں اپنی تمام جائیداد اپنی اولاد لڑکے اور لڑکیوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے،سائل کے مکانات مختلف جگہوں پر اور مختلف رقبہ کے ہیں، جو نا قابل تقسیم بھی ہیں اور سب مکانات کی مالیت بھی مختلف ہے، ایسی صورت میں سب لڑکے اور لڑکیوں کو اگر ایک ایک مکان دیا جائے تو کسی کے پاس زیادہ مالیت کا مکان جائے گا اور کسی کے پاس کم مالیت کا، کیا سائل کو ایسا کرنے کا حق ہے؟ شریعت کا کیا حکم ہے؟ تفصیل سے بتانے کی زحمت گوارہ کریں۔

المستفتی: احقر جمیل احمد پیرزاده، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: اگر آپ زندگی میں اپنی جائیداد اولاد کے درمیان تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ آپ جتنا مال جائیداد ہر لڑکے کو دیں اتنا ہی ہر لڑکی کو بھی دیں، اگر مکانات مختلف مالیت کے ہیں، تو برابری کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس لڑکے یا لڑکی کے حصہ میں کم مالیت کا مکان آئے اس کو نقد پیسے الگ سے دے کر دوسروں کے حصے کے برابر کر دیا جائے۔

عن عامر قال: سمعت النعمان بن بشير –رضي الله عنهما– وهو على المنبر يقول: أعطاني أبي عطية –إلى– أعطيت سائر ولدک مثل هذا، قال: لا، قال: فاتقوا الله واعدلوا بين أولادكم، قال: فرجع فرد عطيته. (صحيح البخاري، باب الإشهاد في الهبة، النسخة الهندية ١/ ٣٥٢، رقم: ٢٥١٥، ف: ٢٥٨٧)

وفي الخانية: لا بأس بتفضيل بعض الأولاد في المحبة؛ لأنها عمل القلب، وكذا في العطايا إن لم يقصد به الإضرار، وإن قصد يسوى بينهم يعطى البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتوى. (شامي، كتاب الهبة، كراچی ٥/ ٦٩٦، زكريا ٨/ ٥٠١، ٥٠٢)

وروى المعلى عن أبي يوسف: أنه لا بأس به إذا لم يقصد به الإضرار، وإن قصد به الإضرار سوى بينهم يعطى الابنة مثل ما يعطى الابن، وعليه الفتوى، هكذا في فتاوى قاضيخان. (عالمگيري، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦، قاضى خان، الهبة، فصل في هبة الوالد لولده، زكرى جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية، زكريا ٣/ ٢٧٩)

وإذا كان أرض وبناء فعن أبى يوسفؒ أنه يقسم كل ذلک على اعتبار القيمة؛ لأنه لا يمكن اعتبار المعادلة إلا بالتقويم، وعن أبي حنيفة أنه

يقسم الأرض بالمساحة؛ لأنه هو الأصل في الممسوحات، ثم يرد من وقع البناء في نصيبه أو من كان نصيبه أجود دراهم على الآخر ، حتى يساويه، فتدخل الدراهم في القسمة ضرورة كالأخ لا ولاية له في المال، ثم يملك تسمية الصداق ضرورة التزويج، وعن محمد –رحمه الله تعالى– أنه يرد على شريكه بمقابلة البناء ما يساويه من العرصة، وإذا بقي فضل ولا يمكن تحقيق التسوية بأن لا تفى العرصة بقيمة البناء حينئذ يرد للفضل دارهم؛ لأن الضرورة في هذا القدر فلا يترك الأصل إلا بها، وهذا يوافق رواية الأصل.

(هداية، كتاب القسمة، فصل في كفية القسمة ٤/ ٤١٦-٤١٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۳۹)

زندگی میں تقسیم کرنے میں اولاد کے درمیان مساوات کرنے کا حکم

سوال [۹۵۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (الف) زید کے چھ لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں اور ان کے علاوہ ان کا کوئی شرعی وارث نہیں ہے، زید کو شبہ ہے کہ میری وفات کے بعد ان میں مخالفتیں پیدا ہوں گی؛ اس لئے اس نے اپنی زندگی میں ہی ان مکانات کو تقسیم کر کے اپنے بیٹوں کو ہبہ کر دیا اور مالکانہ قبضہ دے دیا اور وہ سب اس پر راضی ہو گئے اور ان لڑکوں نے وعدہ کیا کہ وہ اپنی بہنوں کو مبلغ پندرہ ہزار روپیہ فی کس ادا کریں گے، اس طرح ہر لڑکی کو تیس ہزار روپئے مل جائیں گے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید کا یہ عمل ہبہ خلاف شرع تو نہیں اور زید عند اللہ ماخوذ تو نہ ہوگا؟ جب کہ ان مکانات کا وہ خود مالک ہے اور ان لڑکوں کی کوئی جانی اور مالی محنت ان میں نہیں لگی۔

(ب): نیز ایک لڑکا نہایت ہی نافرمان اور تقریباً پچیس سال سے ماں باپ کی نافرمانی کرتا ہے

اور مقابلہ آرائی پر تیار رہتا ہے، زید نے اس کو بھی بلا کر سب بھائیوں کے برابر اس کو بھی دینا چاہا، مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا اور لکھنے سے بھی منع کر دیا، تب زید نے وہ مکان بھی اپنے دو فرماں بردار بیٹوں کو دے دیا اور کہہ دیا کہ اگر وہ لینا چاہے تو اس کو دے دینا، ورنہ وہ بھی تمہاری ہی ملکیت ہے، زید کا یہ عمل خلاف شرع تو نہیں ہے اور زید عنداللہ ماخوذ تو نہ ہوگا؟

(ج): زید کے دو بیٹے نہایت فرماں بردار ہیں اور سات آٹھ سال سے زید اور اس کی زوجہ یعنی ماں باپ انہیں دونوں کے ساتھ رہتے ہیں اور ہر قسم کی خدمت جانی اور مالی کرتے رہتے ہیں اور امید ہے کہ انشاء اللہ آئندہ بھی کرتے رہیں گے، زید نے اپنی تمام اشیاء منقولہ انہیں فرماں بردار بیٹوں کو ہبہ کر دی ہیں، یہاں تک کہ اپنے پہننے کے کپڑے بھی انہیں دونوں کو ہبہ کر دئے ہیں اور کہہ دیا ہے کہ جب تک ہم زندہ ہیں تم سے مستعار لے کر پہن لیا کریں گے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ جب کہ زید کی ملکیت میں اب کوئی چیز باقی نہیں ہے، تو کیا اب بھی زید کی وفات کے بعد مسئلہ میراث جاری ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: محی الدین نہٹور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (الف) زید نے اپنے چھ لڑکوں کے درمیان جو جائیداد اپنی زندگی میں تقسیم کر کے مالک بنا دیا تو زید کا یہ فعل شرعاً درست نہیں ہے؛ اس لئے کہ زندگی میں اولاد کے درمیان تقسیم میں برابری کرنے کا حکم ہے۔ اور سوال میں ذکر کردہ صورت میں زید نے مکانات کو صرف مذکر اولاد ہی میں تقسیم کیا، لڑکیوں کو کچھ نہیں دیا اور تیس تیس ہزار روپیہ لڑکیوں کو بھائیوں کی جانب سے دینے سے متعلق صرف وعدہ اور امید کا اظہار ہے، عملاً لڑکیوں کو کچھ نہیں ملا، اور زندگی میں اولاد کے درمیان تقسیم کرنے کی صورت میں لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر ملتا ہے؛ اس لئے باپ کی طرف سے یہ تقسیم شرعاً درست نہیں ہوئی اگرچہ اس تقسیم سے لڑکے اپنے اپنے حصے کے مالک بن چکے ہیں، مگر اس سے باپ گنہگار ہوگا۔

عن النعمان بن بشير –رضى الله عنه– قال: تصدق علي أبي ببعض ماله –إلى– فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: أفعلت هذا بولدك كلهم؟ قال: لا، قال: اتقوا الله واعدلوا في أولادكم، فرجع أبي فرد تلك الصدقة. (صحيح مسلم، باب كراهة تفضيل بعض الوالد في الهبة، النسخة الهندية ۲/ ۳۷، بيت الأفكار، رقم: ۱٦۲۳)

عن أنس بن مالك –رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: من فر من ميراث وارثه قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة. (سنن ابن ماجة، باب الحيف في الوصية، النسخة الهندية ۲/ ۱۹٤، دارالسلام، رقم: ۲۷۰۳)

عن سليمان بن موسى قال: قال رسول الله ﷺ: من قطع ميراثا فرضه الله قطع الله ميراثه من الجنة. (سنن سعيد بن منصور، باب من قطع ميراثا فرضه الله، دارالكتب العلمية بيروت ۱/ ۹٦، رقم: ۲۸۵-۲۸٦)

المختار التسوية بين الذكر والأنثى في الهبة. (البحرالرائق، كتاب الهبة، زكريا ۷/ ٤۹۰، كوئٹه ۷/ ۲۸۸، خلاصة الفتاوى، اشرفيه ديوبند ٤/ ٤۰۰)

يعطى للابنة مثل ما يعطى للابن، وقال محمد رحمه الله: يعطى للذكر ضعف ما يعطى للأنثى، والفتوى على قول أبي يوسف رحمه الله. (قاضي خان، فصل فى هبة الوالد لولده، والهبة للصغير، زكريا جديد ۳/ ۱۹٤، وعلى هامش الهندية ۳/ ۲۷۹)

ولو وهب جميع ماله من ابنه جاز، وهو آثم نص عليه محمدؒ. (بزازية، كتاب الهبة، زكريا جديد ۳/ ۱۲۳، وعلى هامش الهندية ٦/ ۲۳۷، قاضي خان، زكريا جديد ۳/ ۱۹٤، وعلى هامش الهندية ۳/ ۲۷۹، شامي، زكريا ۸/ ۵۰۲، كراچى ۵/ ٦۹٦، هندية، زكريا قديم ٤/ ۳۹۱، جديد ٤/ ٤۱٦)

زید نے جو اپنے نافرمان بیٹے کو مکان دینا چاہا اور اس نے لینے سے انکار کردیا تو اپنے دو فرماں بردار بیٹوں کو دے دیا اس کا یہ عمل خلاف شرع نہیں ہے؛ اس لئے کہ نافرمان اور فاسق

بچہ کو نہ دینے میں باپ پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔

وإن كان في ولده فاسق لا ينبغي أن يعطيه أكثر من قوته كيلا يصير معينا له في المعصية. (هندية، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦، البحر الرائق، كوئٹه ٧/ ٢٨٨، زكريا ٧/ ٤٩٠، بزازية، زكريا جديد ٣/ ١٢٣، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٣٧)

ج: میراث میت کے چھوڑے ہوئے مال میں جاری ہوتی ہے، جب زید نے حیات ہی میں اپنی تمام منقولہ وغیر منقولہ جائیداد اپنی اولاد کو دے دیا اور زید کی ملکیت میں کچھ رہا ہی نہیں تو میراث بھی جاری نہ ہوگی۔

لأن التركة في الاصطلاح ما تركه الميت من الأموال. (شامي، كتاب الفرائض، زكريا ١٠/ ٤٩٣، كراچی ٦/ ٧٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۵۳۵)

زندگی میں تقسیم کی صورت میں اولاد کے درمیان مساوات کرنا

سوال [۹۵۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ وصیت نامہ اپنی آراضی کا اس کے میں تین حصہ کرنا چاہتا ہوں، ایک حصہ لڑکے کا، ایک حصہ برابر لڑکی کا، ایک حصہ خود کا، ان حصوں کے بعد میں اپنا حصہ مسجد میں دینا چاہتا ہوں، اگر زندگی میں مجھے کبھی ضرورت پڑ جائے تو یہ مکان میں فروخت کرسکتا ہوں، اپنا حصہ میں بیس ہزار روپئے مسجد کو دے دوں گا، باقی حصہ جس کو چاہوں دے سکتا ہوں، اگر لڑکی کو ضرورت پڑی تو جب چاہے رہ سکتی ہے۔ اور اگر آپس میں مکان دونوں میں سے خریدنا چاہیں تو پہلے میرا حصہ نکال دیں مسجد کو، پھر آپس میں باٹیں، اگر کرایہ دار اس میں انہوں نے

رکھا تو تین حصوں میں جو میرا حصہ بنے مسجد کو پہنچائیں، اگر لڑکی اس میں رہی تو پچاس روپے لڑکا اور پچاس روپے لڑکی مسجد کو پہنچائیں، اور اگر مکان خالی رہے تو پچاس روپے مہینہ لڑکے کو مسجد کو دینا ہے میرے حصہ میں سے، قرآن وحدیث کی روشنی میں فتویٰ دیں۔

المستفتی: عبدالمجید، مقبرہ دوئم، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر آپ اپنی زندگی میں ہی لڑکا لڑکی کو حصہ دینا چاہتے ہیں، تو دونوں کو برابر کرکے دینا جائز ہے۔ اور تین حصہ کرکے ایک حصہ اپنے لئے رکھنا اور اس کے بارے میں اس طرح وصیت کرنا بھی جائز ہے کہ زندگی میں ضرورت کے وقت فروخت کرکے اقرار کردہ رقم بیس ہزار روپئے مسجد کو دے دے۔ اور اس کے ساتھ یہ وصیت بھی درست ہے کہ آپ کے مرنے کے بعد آپ کا ایک تہائی مسجد کو دے دیا جائے، مگر اگر زندگی میں لڑکا لڑکی دونوں کو دے کر قبضہ نہیں دیا ہے اور مرنے کے بعد برابر ملنے کی وصیت ہے، تو مسجد کے حق میں ایک ثلث کی وصیت درست ہوگی، مگر لڑکی کو لڑکے کے برابر دینے کی وصیت درست نہ ہوگی؛ بلکہ ترکہ میں سے لڑکی کو لڑکے کا آدھا ملے گا؛ اس لئے کہ وارث کے حق میں وصیت درست نہیں ہے۔

عن أبي أمامة الباهلي –رضي الله عنه– قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول في خطبته عام حجة الوداع: إن الله تبارك وتعالىٰ قد أعطى كل ذي حق حقه، فلا وصية لوارث. (سنن الترمذي، باب ماجاء لا وصية لوارث، النسخة الهندية ۲/ ۳۲، دارالسلام، رقم: ۲۱۲۰) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍صفر ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۱۷۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۲/۳ھ

زندگی میں تقسیم کی صورت میں اولاد کے درمیان مساوات کرنے کا حکم

سوال [۹۵۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) حاجی عبدالقدیر صاحب اپنی زندگی میں اپنی جائیداد اپنی ایک بیوی تین لڑکیوں اور ایک لڑکے کے درمیان تقسیم کرنا چاہتے ہیں، جائیداد ان کے درمیان کس طرح تقسیم ہوگی؟

(۲) کیا ان مذکورہ ورثاء کا حق سائل (عبدالقدیر) کے مال اور نقدی میں بھی ہے، اگر ہے تو کس طرح اور کس کس کا؟

(۳) انہیں کی ایک دوکان پگڑی کی ہے، تو کیا اس پر بھی ورثا کا حق ہے اور دوکان میرے اور میرے لڑکے کے نام ہے؟

(۴) اور جو مکان ہے وہ میری بیوی کے نام ہے، اسی مکان میں دو حصہ دار ہیں: (۱) میری پھوپھی کے لڑکے کی بیوی (۲) اور میری بیوی؛ لیکن سب کرایہ کے ہیں؛ البتہ نصف مکان میرے حصہ میں ہے۔

المستفتی: محمد ایوب مدرسہ اشاعت العلوم، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) اگر زندگی میں دولت تقسیم کرنا ہے، تو اپنی بیوی کو اپنی مرضی سے جتنا چاہیں دے دیں، اس کے بعد بقیہ مال کو لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان برابر تقسیم کردیں؛ لہٰذا بقیہ مال کے چار سہام بنا کر ہر ایک لڑکی کو ایک ایک اور لڑکے کو ایک سہام دے دیں؛ اس لئے کہ زندگی میں تقسیم کرنے سے لڑکیوں کو لڑکوں کے برابر دینا لازم ہوتا ہے، ورنہ باپ گنہگار رہوتا ہے۔

فسوى بينهم يعطى البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتوى، ولو وهب في صحته كل المال للولد جاز وأثم. (درمختار، كتاب الهبة، كراچی ٥/ ٦٩٦، زكريا ٨/ ٥٠١، ٥٠٢، هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦، البحرالرائق، كوئٹه ٧/ ٢٨٨، زكريا ٧/ ٤٩٠، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩٧)

(۲) اگر سائل اپنے نقدی اور مال دونوں کو تقسیم کرنا چاہے تو مذکورہ طریقہ سے ان کو بھی تقسیم کرنا لازم ہوگا۔

(۳) اگر پگڑی دے کر لی ہوئی دوکان ہے، تو دی ہوئی پگڑی واپس ملنے پر برابری کے ساتھ تقسیم کرنا لازم ہوگا۔ اور اگر پگڑی لے کر دی ہوئی دوکان ہے تو پگڑی واپس کرنے میں اور دوکان کی حصہ داری میں سب بچے برابر کے حق دار ہوں گے۔

(۴) جو نصف حصہ آپ کے حصہ میں ہے، اس میں بھی اولاد کے درمیان برابری کا حصہ ہوا کرے گا، یہ سب اس وقت ہے کہ جب آپ اپنی مرضی سے زندگی میں بحالت صحت تقسیم کر دینا چاہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ ذیقعدہ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۷۲۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲/ ۱۱/ ۱۴۱۴ھ

زندگی میں جائیداد تقسیم کرنے میں برابری کرنے کا حکم

سوال [۹۵۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک عرصہ پہلے میں نے اپنے اور اپنی بیوی کے نام سے ایک رہائشی مکان خریدا تھا، میں نے اپنے خرچہ سے ان کی تعمیر نو کرائی، میں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ اس مکان میں رہتا ہوں، اس مکان کے بالائی حصہ میں میری رہائش ہے اور نیچے حصہ میں میرا کارخانہ ہے، میں اپنے لڑکوں کے ساتھ کارخانہ میں پیتل کے برتن تیار کراتا ہوں، میری اولاد میں سات لڑکیاں اور پانچ لڑکے موجود ہیں، ان میں سے ایک لڑکی اور چار لڑکوں کی ابھی شادیاں کرنی باقی ہیں، دیگر ایک لڑکے اور چھ لڑکیوں کی میں شادی کر چکا ہوں۔

میں اپنے مکان اور اپنے دیگر اسباب کو شرعی اعتبار سے اپنے بیوی بچوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں، میری بیوی کو بہت کم نظر آتا ہے، بہت کمزور رہتی ہے، زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، میں چاہتا ہوں کہ اپنے جیتے جی میں اپنا مکان اور اپنا دیگر سارا مال اپنے بیوی لڑکے اور لڑکیوں

میں شرعی اعتبار سے جس کا جو حصہ بنتا ہو وہ اس کو دے دوں اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ میرے بعد میری لڑکیاں اپنی والدہ کی مزاج پرسی کے لئے ان کے پاس آتی رہیں۔

اس سال میرا حج بیت اللہ شریف جانے کا ارادہ ہے، الحمدللہ درخواست منظور ہوگئی ہے، سفر حج پر جانے سے پہلے میں مکان اور دیگر اشیاء اپنے بیوی، اولاد میں تقسیم کردوں، میرا مکان ۲۵۰/ مربع گز ہے۔ آنجناب سے گزارش ہے کہ اس معاملہ میں میری رہبری فرمائیں۔

المستفتی: راحت جان خان جامع مسجد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ اپنی زندگی میں اگر تقسیم کرنا چاہتے ہیں، تو لڑکیوں کو لڑکوں کے برابر دے دیں، کمی زیادتی نہ کریں اور بیوی کو جتنا چاہیں دے دیں؛ البتہ آپ کے مرنے کے بعد آپ کا کل ترکہ ۱۳۶/ سہام میں تقسیم ہوکر ۱۷/ سہام آپ کی بیوی کو ملیں گے اور ۱۴-۱۴/ سہام لڑکوں کو اور ۷-۷/ سہام لڑکیوں کو ملیں گے۔

ولو وهب رجل شيئا لأولاده في الصحة، وأراد تفضيل البعض في ذلك على البعض -إلى- روى المعلى عن أبي يوسف رحمه الله تعالىٰ أنه لا بأس به إذا لم يقصد به الإضرار -إلى- يعطى الابنة مثل ما يعطى للابن، والفتوى على قول أبي يوسف. (قاضي خان، كتاب الهبة، فصل في هبة الوالد لولده، والهبة للصغير، زكريا جديد ۳۲/۱۹٤، وعلى هامش الهندية ۳/ ۲۷۹، شامي، زكريا ۸/ ۵۰۱، كراچى ٥/ ٦۹٦، هندية زكريا قديم ٤/ ۳۹۱، جديد ٤/ ٤۱٦)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۳۰/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۸۳۷)	۲/۷/۱۴۱۹ھ

کیا زندگی میں جائیداد تقسیم کرنے کے لئے مساوات لازم ہے؟

سوال [۹۵۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے والد اور والدہ حیات ہیں، جن کی کل سات اولادیں موجود ہیں، جن میں مجھ سمیت دو لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہیں، ایک لڑکی طلاق شدہ گھر میں ہے، ایک لڑکی شادی شدہ اپنے شوہر کے گھر ہے تین کنواری ہیں، ایک لڑکا مجھ سے چھوٹا شادی شدہ ہے، میرے والد کا ایک آبائی مکان ہے، جس کی مالیت تقریباً دو لاکھ روپئے ہے، اس رقم کی شرعاً تقسیم تمام اولادوں پر کس طرح ہوگی؟

المستفتی: محمد سلیم ولد محمد لطیف، کنجری سرائے، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر آپ کے والد اپنی زندگی ہی میں اولاد کے درمیان اپنی جائیداد تقسیم کرنا چاہتے ہیں، تو حسب مرضی بیوی کو جو کچھ دینا چاہیں دے دیں، اس کے بعد لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر دینا لازم ہوگا اور تمام جائیداد کی قیمت لگا کر یا آپس کی تراضی سے جو جدھر کا حصہ لینا چاہے تقسیم کردیا جائے؛ لہٰذا دو لڑکے اور پانچ لڑکیوں کے درمیان کل جائیداد سات حصوں میں تقسیم ہوگی، ہر ایک کو ایک ایک حصہ ملے گا۔ اور اگر آپ کے والد یہ چاہتے ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد شرعی طور پر وارثین کے درمیان ترکہ تقسیم ہوجائے اور وہ زندگی ہی میں یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد کس کو کتنا ملے گا، تو کل جائیداد حسب ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگی:

والد میت

بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی
$\frac{۱}{۹}$	۱۴	۱۴	۷	۷	۷	۷	۷
۲۵۰۰۰	$\frac{۸}{۹}$	$\frac{۸}{۹}$	$\frac{۴}{۹}$	$\frac{۴}{۹}$	$\frac{۴}{۹}$	$\frac{۴}{۹}$	$\frac{۴}{۹}$

مرنے کے بعد کل ترکہ ۲۷؍ سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا ملے گا جو اس کے نیچے درج ہے، دونوں طرف کے مسئلے ہم نے بیان کردئے، اب آپ کے والد کو اختیار ہے جو طریقہ چاہیں اپنالیں۔

یکره تفضیل بعض الأولاد علی البعض في الهبة حالة الصحة إلا لزیادة فضل له في الدین، وإن وهب ماله کله لواحد جاز قضاء، وهو آثم -إلی قوله- وفي الخلاصة، المختار الستویة بین الذکر والأنثی في الهبة.

(البحرالرائق، کتاب الهبة، کوئٹه ۷/ ۲۸۸، زکریا ۷/ ۴۹۰، شامي، کراچی ۵/ ۶۹۶، زکریا ۸/ ۵۰۱، ۵۰۲، مجمع الأنهر، دارالکتب العلمیة بیروت ۳/ ۴۹۷) **فقط واللہ علم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۴۴۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰/۱/۱۴۲۳ھ

زندگی میں تقسیم سے متعلق ایک سوال وجواب

سوال [۱۱۵۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فریق اول اکبر علی نے اپنا ایک بیان تحریر کیا، جس سے ان کے تین بھائی متفق ہیں، اکبر علی کا بیان حسب ذیل ہے: زاہد ایک متمول اور مخیر شخص تھا، اس کے چھ لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں، جن میں سے ایک لڑکے کا انتقال زاہد کی زندگی میں ہوگیا، مرحوم لڑکے کا ایک لڑکا اور لڑکی موجود ہے، جن کو زاہد نے اپنی حیات ہی میں کچھ جائیداد دے دیا تھا، نیز زاہد کی حیات ہی میں موجودہ پانچ لڑکوں میں سے ایک لڑکے نے الگ رہنے اور الگ کاروبار کرنے کی خواہش ظاہر کی، تو زاہد نے اس لڑکے کا بھی کاروبار الگ کرکے اس کے حوالہ کردیا، پھر ایک موقع پر ہارڈ کے مرض میں شدت بڑھ گئی اور زندگی سے مایوسی ہوگئی، لڑکوں کو بلا کر دریافت کیا کہ تم چاروں ساتھ رہنا چاہتے ہو، یا الگ؟ اگر الگ رہنا ہے تو تم لوگوں کا حساب وکتاب بھی الگ الگ کردوں، اس

پرلڑکوں نے جواب دیا کہ ہم لوگ ساتھ رہیں گے، پھر زاہد نے ایک روز تینوں لڑکیوں کو بلاکر موٹی موٹی رقم ان کے حوالہ کیا اور زبانی فرمایا کہ اگر تمہارا حق میرے انتقال کے بعد زیادہ ہوتا اور میں نے زندگی میں کم دیا تو تم سب مجھے معاف کردو، اس پر سبھی لڑکیوں نے رضامندی اور خوشی کا اظہار کیا، بعدازیں ایک اورلڑکے نے زاہد کی حیات ہی میں الگ رہنے کی خواہش ظاہر کی، زاہد نے اس کو اپنے اندازے کے مطابق اس کا حق دے کر الگ کردیا اور بقیہ کاروبار اور جائیداد کے بارے میں زبانی بھی اس کا اظہار فرمایا کہ یہ سب کچھ ان بقیہ تینوں لڑکوں کے حوالہ ہیں۔ اور عملی طور پر بھی اپنے آپ کو بے دخل کرلیا، حتی کہ زاہد نے باوجود بے انتہاء مخیّر ہونے کے احباب و متعلقین اورضرورت مندوں سے یہ کہہ دیا کہ اب مجھ سے لین دین کا معاملہ نہ رکھیں؛ بلکہ ازسرنو اپنے روابط لڑکوں سے قائم کریں اوران تین لڑکوں میں ذمہ دار بڑا لڑکا ہے؛ لہٰذا جومعمول میرا آپ حضرات سے رہاہے، اس کے گوش گذار کردیں، اب وہ جیسا مناسب سمجھیں ویسا کریں، میں دخل نہیں دے سکتا۔

فریق ثانی: اصغرعلی کا کہنا ہے کہ مجھ سے میرے باپ زاہد نے بار بار کہا کہ میں نے تم کو جو کچھ دیا ہے وہ الگ سے دیا ہے، کاروبار میں تمہارا پورا پورا حصہ رہے گا؛ لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے: زاہد مال وجائیداد مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق لڑکے اورلڑکیوں کے حوالہ کرنے کے بعد واصل بحق ہوگئے۔ اورایسی صورت میں:

(۱) تقسیم میراث کا معاملہ ہوگا یانہیں؟

(۲) اگر تقسیم میراث ہوتو کیا جوکچھ زاہد نے لڑکےلڑکیوں کواپنی زندگی میں دیااوراس میں جو ترقی ہوئی، ان سب کواکٹھا کرکے وارثین کے درمیان میراث تقسیم ہوگی یاصرف اس کاروبار اورجائیداد کی تقسیم وارثین کے درمیان ہوگی جوزاہد نے اپنی زندگی میں تین لڑکوں کومشترک طورپر دیا ہے؟

(۳) کیا تین بیٹوں کومشترک طورپر بلاتقسیم کئے بقیہ کاروبار جملہ جائیداد اورنقدی رقوم پر قابض ودخیل بنادینے سے ہبہ شرعاً صحیح اور تام ہوگیا اور اب اس میں وراثت جاری نہیں

ہوگی، جب کہ ان تینوں بیٹوں نے زاہد کی حیات تک اس کو آپس میں تقسیم بھی نہیں کیا تھا؛ کیوں کہ (فتاوی رحیمیہ ۱۰/ ۲۶۳، احسن الفتاوی ۷/ ۲۶۱) دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہبہ تام اور مفید ملک نہیں ہوگا۔

(۴) فریق ثانی اصغرعلی کے بیان کا شرعاً اعتبار ہوگا یانہیں؟ خلاصہ سوال یہ ہے کہ بقیہ کاروبار اور جملہ جائیداد اور نقدی رقوم وغیرہ کے مالک زاہد کے صرف مذکورہ بالا تینوں بیٹے ہی ہوں گے یا زاہد کی سب اولاد یں بیٹے، بیٹیاں اس میں حصے پانے کے حق دار ہوں گے؟

المستفتی: محمد ضیاء الدین قاسمی، مدرسہ وصیۃ العلوم روشن باغ، الہ آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ کے مضمون کو شروع سے آخر تک بار بار غور کر کے سمجھنے کی کوشش کی گئی، اس کا پورا حاصل یہ نکلا کہ باپ نے اپنی زندگی میں اپنی ملکیت کے بارے میں یہ انتظام کردیا ہے کہ موت کے بعد وارثین اور اولاد میں کسی قسم کا جھگڑا اور اختلاف نہ ہونے پائے اور زندگی میں اولادوں کو دینے میں ان میں سے کسی کو ضرر یا نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رہا ہے، پہلے ایک لڑکے کو ایک تخمینی حصہ دے کر کے الگ کردیا، پھر اس کے بعد تینوں لڑکیوں کو ایک موٹی رقم دے کر ان سے کمی بیشی کی معافی کرالی، پھر اس کے بعد باقی چار لڑکوں میں سے ایک کی خواہش پر اس کو بھی تخمینی حصہ دے کر الگ کردیا اور مابقیہ تمام ملکیت کے بارے میں کہہ دیا کہ باقی لڑکوں کو دے کر انہیں قابض بنا دیا، چنانچہ لین دین کرنے والوں سے بھی کہہ دیا کہ اب میرا کچھ نہیں ہے، انہیں لڑکوں کی ملکیت ہے، انہیں کا قبضہ ہے، معاملات سب انہیں سے کیا جائے، میرے ساتھ نہیں، یہ سب باتیں اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ زندگی میں سب اولاد کو دے کر کے انہیں قابض بنادیا ہے۔ اور اپنے آپ کو ملکیت سے بالکل الگ کرلیا اور جس لڑکے سے یہ کہا تھا کہ اب جو دیا جارہا ہے وہ تمہارا ہی ہے، اور کاروبار میں تمہارا حصہ رہے گا؛ لیکن بعد میں جب سب کو دے کر معاملہ صاف کرلیا اور جس کو کاروبار میں سے حصہ دینے کو کہا تھا، اس کو نہیں دیا تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بیٹے

سے ایک وعدہ کیا تھا، مگر وہ وعدہ باپ نے پورا نہیں کیا؛ بلکہ اپنی زندگی میں مابقیہ دوسرے لڑکوں کو دے کر اس بات کو واضح کر دیا کہ کاروبار میں سے دینے کے لئے جو وعدہ کیا تھا وہ اسے نہیں دینا ہے۔ اور اس پر اس بیٹے نے کسی قسم کی پیش کش بھی نہیں کی، اگر پیشکش کرنا تھا تو باپ کی زندگی ہی میں کرنا چاہئے تھا، اب اس تفصیل کے بعد اصل مسئلہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ پہلے جس لڑکے کو دیا ہے وہ بھی غیر مشترک ہونے کی وجہ سے ہبہ اور قبضہ بالاتفاق درست ہے اور صحیح ہو گیا، اس کے بعد تینوں لڑکیوں کو جو دیا ہے اس میں بھی ہبہ اور قبضہ بالاتفاق درست ہے، پھر اس کے بعد چار لڑکوں میں سے ایک لڑکے کو الگ کر دیا ہے، اس میں بھی ہبہ اور قبضہ بالاتفاق درست ہو گیا۔ اور مرحوم بیٹے کی اولاد کو جو کچھ ہبہ کر دیا ہے وہ بھی درست ہو گیا، اب صرف مسئلہ ان تین بیٹوں کے بارے میں ہے جن کو مشترکہ طور پر بقیہ ملکیت کا ہبہ کیا گیا ہے، جس میں وہ تینوں بیٹے ایک ساتھ رہنے پر رضامند ہیں، تو اب یہ مشترک ہبہ درست ہوا ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں صاحبین اور امام صاحب کے درمیان اختلاف ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ یہ مشترک ہبہ فاسد ہے، باطل نہیں، واہب اور اس کے ورثاء کو رجوع اور استرداد کا حق باقی رہے گا؛ لیکن ہبۂ فاسدہ میں قبضہ کی وجہ سے ملکیت ثابت ہو جاتی ہے، یہی مفتی بہ قول ہے۔

الهبة الفاسدة تفيد الملک بالقبض، وبه يفتی. (الدرالمختار مع الشامي، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٤٩٦، كراچی ٥/ ٦٦٢)

وفي جامع الفصولين، والبزازية: أن الهبة الفاسدة تفيد الملک بالقبض، وبه يفتی، فقد اختلف التصحيح؛ لكن لفظ الفتوی آكد من لفظ التصحيح، كما أفاده في بعض المعتبرات. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩٥، مصري قديم ٢/ ٣٥٦، تنقيح الفتاوی الحامدية ٢/ ٨٥، درر الحكام، شرح غرر الحكام ٢/ ٢١٨-٢١٩)

اورحضرت امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک یہ مشترک ہبہ قبضہ کی وجہ سے جائز اور درست ہوگا؛ لہٰذا صاحبین کے قول کے مطابق مسئلہ بالکل صاف شفاف ہوگیا کہ ہبہ بھی درست ہوگیا اور قبضہ بھی صحیح ہوگیا اور ملکیت بھی ثابت ہوگئی۔ اور سوال نامہ میں جس خاندان کا ذکر کیا گیا ہے اس خاندان میں ہر فرد کو اپنے اپنے حقوق مل چکے ہیں، اب اگر بعد کے مشترک تین افراد کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کے قول کو پیش نظر رکھ کر مسئلہ بتایا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان تین کے علاوہ بقیہ دو لڑکے اور تینوں لڑکیوں کو جو کچھ مل چکا ہے وہ تو ان کی جیب میں رہے گا، اس کے بعد مشترک طور پر تینوں لڑکوں کو جو کچھ ملا ہے، اس میں سے بھی برابر کا حصہ ان دونوں لڑکوں کو مل جائے اور تینوں لڑکیوں کو بھی پھر دوبارہ ملے تو ایسی صورت میں مشترک تینوں لڑکوں پر ایک قسم کی زیادتی ہے؛ اس لئے احقر خاص طور پر مذکورہ خاندان کے بارے میں حضرات صاحبین کے قول پر فتویٰ دینا مناسب سمجھتا ہے۔ اور اسی کو صحیح قرار دیتا ہے۔ عربی عبارات ملاحظہ فرمائیے:

وذكر عصام: أنها تفيد الملك، وبه أخذ بعض المشايخ. (شامي، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٤٩٥، كراچی ٥/ ٦٩٢، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٥/ ٩٤، زكريا ٦/ ٥٥)

هبة المشاع فيما يحتمل القسمة من رجلين أو من جماعة صحيحة عندهما، وفاسدة عند الإمام، وليست بباطلة، حتى تفيد الملك بالقبض، وذكر صدر الشهيد: إذا وهب من رجلين ما يحتمل القسمة، حتى فسدت الهبة عنده، ثم قبضها يثبت الملك ملكا فاسدا، قال: وبه يفتى، ولا يثبت الملك للموهوب له إلا بالقبض هو المختار. (هندية، الباب الثاني فيما يجوز من الهبة وفيما لا يجوز، زكريا جديد ٤/ ٤٠٠، قديم ٤/ ٣٧٨)

ولو وهب داره من رجلين لا يجوز في قول أبي حنيفة رحمه الله تعالىٰ، وكذلك كل ما يقسم، وقال صاحباه رحمه الله تعالىٰ: جاز. (قاضي

خان، كتاب الهبة، فصل في هبة المشاع، زكريا جديد ٣/ ١٨٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٦٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۵۵۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۴/۵ھ

زندگی میں شرعی ورثاء کے درمیان نقدی رقم تقسیم کرنا

سوال [۹۵۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے پاس دو لاکھ پچیس ہزار روپئے ہیں، ان روپیوں کو اپنے ورثاء میں زندگی میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں، میری ایک بیوی ہے، چھ لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں، شرعاً ہر ایک کو کتنا حصہ دوں اور اپنے پاس کتنا رکھوں؟ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: عبدالرشید محلّہ اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ اپنے پاس جتنا رکھنا چاہتے ہیں رکھیں، اس میں آپ پر کوئی پابندی نہیں اور بیوی کو بھی اپنی مرضی سے جتنا دینا چاہیں دے دیجئے، اس میں بھی کوئی مقدار متعین نہیں ہے۔ اور اولاً اپنا اور بیوی کا حصہ حسب منشا نکال کر بقیہ رقم اپنی تمام اولاد کے درمیان برابر برابر تقسیم کر دیجئے۔ اور زندگی میں تقسیم کرنے سے لڑکی کو لڑکے کے برابر ملتا ہے؛ اس لئے بقیہ رقم آٹھ سہام میں تقسیم کر کے ہر ایک کو ایک ایک حصہ دید یجئے۔

يعطى البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتوى. (درمختار، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٥٠١، كراچى ٥/ ٦٩٦، هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦، قاضي خان، زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍محرم الحرام ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۹۴۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۳/۱/۲ھ

اولاد کے مابین زندگی میں فروخت شدہ مکان کی قیمت تقسیم کرنا

سوال [۹۵۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں اختر حسین اپنے مکان کوفروخت کرکے اس کی قیمت اپنی زندگی میں اپنی اولاد کے درمیان تقسیم کرنا چاہتا ہوں، تو اپنے لئے کتنا رکھوں اور چھ لڑکے چار لڑکیاں ہیں، ہر ایک کو کیسے تقسیم کروں؟ شرعی حکم تحریر فرمادیں۔

المستفتی: اختر حسین محلّہ مغل پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کی زندگی میں پورا مکان آپ کی ملکیت میں ہے، اس میں نہ کسی اولاد کا حق ہے اور نہ ہی کسی غیر کا۔ اور فروخت کردینے کے بعد اس کی قیمت بھی مکمل آپ کی ملکیت ہے، پھر آپ کا یہ کہنا کہ میں اپنے لئے کتنا رکھوں اور لڑکے لڑکیوں کو کتنا کتنا دوں صحیح نہیں؛ بلکہ یہ آپ کے اختیار کی بات ہے، ہاں البتہ زندگی میں جب اولاد کو کچھ دیا جائے تو سب کو برابر دینا چاہئے، آپ کے چھ لڑکے، چار لڑکیاں ہیں، کل دس ہیں، مثلاً اگر ۵۰ر ہزار روپئے تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو لڑکے اور لڑکی ہر ایک کو پانچ پانچ ہزار روپے ملیں گے۔ اور یہی چیز آپ کی وفات کے بعد تقسیم ہوتی ہے، تو لڑکیوں کو لڑکے کا آدھا ملے گا، مثلاً ۳۲ر ہزار روپئے ہیں تو آپ کی وفات کے بعد لڑکوں کو چار چار ہزار روپئے اور لڑکیوں کو دو دو ہزار روپئے کے حساب سے تقسیم ہوگا۔

وإن قصد به الإضرار سوى بينهم يعطي الابنة مثل ما يعطي للابن، وعليه الفتوى. (عالمگیري، كتاب الهبة، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا جديد ٤/ ٤١٦، قديم ٤/ ٣٩١، شامي، زكريا ٨/ ٥٠١، قاضي خان، زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰ر ربیع الاول ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۲۴۵/۳۸)

زندگی میں ہی لڑکے لڑکیوں کا حصہ متعین کرنا

سوال [۹۵۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی شخص اپنی حیات میں اپنے تمام لڑکوں کو اپنی زمین بانٹ دے اور لڑکیوں کا حصہ اپنی مرضی سے ایک جگہ متعین کردے، تاکہ مرنے کے بعد بھائیوں اور بہنوں میں اختلاف نہ ہوسکے اور وصیت کردے کہ میرے مرنے کے بعد ہی اپنے اپنے حصوں کے مالک ہوگے، مرنے سے پہلے سب مشترک رہیں گے، تو کیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کا مفصل جواب مع دلیل کے عنایت فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: محمد معراج الحق پورنوی، متعلم مدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر آپ کا مقصد زندگی میں مالک بنانا نہیں ہے؛ بلکہ مرنے کے بعد میراث کے جھگڑے اور اختلاف سے بچانا ہے، تو ایسی صورت میں شرعی میراث کے مطابق تقسیم نامہ بنا کر شرعی گواہوں کے ساتھ وصیت نامہ تحریر کر سکتے ہیں، اور مرنے کے بعد اس وصیت نامہ کے مطابق متروکہ میراث وارثین کے درمیان تقسیم ہوجائے گی، چونکہ یہ وصیت ہے، ملکیت نہیں؛ اس لئے اس میں برابری کی شرط نہیں؛ بلکہ آپ کے مرنے کے بعد اولاد کو جو شرعی حصہ ملے گا، اسی کی پیش قدمی کی وصیت ہے، تاکہ باپ کی وفات کے بعد اولاد میں کوئی اختلاف نہ ہو۔ اور ایسا کرنا جائز ہے۔

يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ. [سورة النساء: ۱۱]

﴿أو إصلاح بين الناس﴾ والمراد من الإصلاح بين الناس: التأليف بينهم بالمؤدة إذا تفاسدوا من غير أن يجاوز في ذلك حدود الشرع الشريف. الخ (روح المعاني، زكريا ٤/ ٢١٢)

والصلح خير: أي من الفرقة، وسوء العشيرة، أو من الخصومة. (روح المعاني، زكريا ٤/ ٢١٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ ذیقعدہ ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۵۶۳)

زندگی میں مکان تقسیم کرنا اورلڑکیوں کا حصہ

سوال [۹۵۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے دولڑکے اور پانچ لڑکیاں ہیں اور سب شادی شدہ ہیں۔ اور زید کا ایک مکان ہے، جس میں تین کمرے ہیں، دو کمروں میں دونوں لڑکے رہتے ہیں اور ایک کمرہ میں خود رہتا ہے۔ اور اس پورے مکان کی قیمت تقریباً تین لاکھ روپئے ہوگی۔ اور زید نے ابھی مکان تقسیم نہیں کیا ہے؛ بلکہ ایسے ہی رہتے ہیں اور دونوں لڑکے شادی کے بعد علیحدہ ہوگئے، اپنی کمائی اپنے پاس رکھتے ہیں، اب زید یہ چاہتا ہے کہ اپنے مرنے سے پہلے اس مکان کو تقسیم کردے، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ اس مکان میں لڑکیوں کا بھی حصہ ہے یا نہیں؟ شرعی اعتبار سے اگر ہے تو لڑکیوں کا کتنا حصہ ہے؟ اور لڑکوں کا کتنا حصہ ہے؟

المستفتی: العبد شفیق احمد چوچیلہ کلاں، امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ اپنی زندگی میں ساری جائیداد کے خود مالک ہیں، اگر آپ اپنی مرضی سے زندگی ہی میں اولاد کے درمیان جائیداد تقسیم کرکے دینا چاہیں، تو لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر دینا لازم ہے، آپ کے مرنے کے بعد اگر تقسیم ہوگی، تو لڑکیوں کو لڑکوں کا آدھا ملے گا؛ لہٰذا اگر زندگی میں تقسیم کرکے دینا چاہتے ہیں تو دونوں لڑکوں کو ایک ایک اور لڑکیوں کو بھی ایک ایک حصہ ملے گا۔ اور اگر زندگی میں تقسیم نہیں کریں گے تو آپ کی

بیوی کا حصہ نکال کر بقیہ جائیداد نو حصوں میں تقسیم ہوکر دونوں لڑکوں کو دو دو اور پانچوں لڑکیوں کو ایک ایک حصہ ملے گا۔

قال النبي صلى الله عليه وسلم: اعدلوا بين أولادكم في العطية.

(صحيح البخاري، كتاب الهبة، تحت ترجمة الباب الهبة للولد ١/ ٣٥٢، رقم الباب: ١٢)

وفي الخانية: لا بأس بتفضيل بعض الأولاد في المحبة؛ لأنها عمل القلب، وكذا في العطايا إن لم يقصد به الإضرار، وإن قصد يسوى بينهم يعطى البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتوى. (شامي، كتاب الهبة، كراچی ٥/ ٦٩٦، زكريا ٨/ ٥٠١، ٥٠٢، وكذا في العالمگيري، جديد زكريا ٤/ ٤١٦، قديم ٤/ ٣٩١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۸۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۵/۴ھ

زندگی میں جائیداد تقسیم کرنا اورلڑکیوں کو محروم کرنا

سوال [۹۵۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید کا انتقال ہوگیا، ان کے ورثاء میں تین بیٹے: (۱) عمرو (۲) بکر (۳) خالد، تین لڑکیاں: (۱) زینب (۲) فاطمہ (۳) عطیہ، ایک بیوی ذکیہ ہے، ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا؟

(۲) زید کا معمول یہ رہا ہے کہ اپنی زندگی میں جو جائیدادیں یا مکانات خریدتے تھے وہ اپنے لڑکوں کے نام کر دیتے تھے، مقصد یہ تھا کہ بٹوارہ کرتے وقت لڑائی جھگڑا نہ ہو، جیسا کہ عام طور پر ہوتا رہتا ہے، جو جائیداد جس کے نام ہے اس کا مالک وہی ان کی زندگی سے ہی ہے اور اب بھی وہی اس کا مالک ہے، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ ان جائیدادوں کے مالک وہی لڑکے ہیں یا پھر یہ جائیدادیں وراثت کے طور پر تقسیم ہوں گی؟

(۳) مرحوم کی تین لڑکیاں ہیں، جن میں سے دو کی شادی ہوگئی تھی، اور معیاری شادی کی تھی، زیورات جہیز وغیرہ بھی خوب دیا تھا؛ لیکن ایک لڑکی جس کی کسی وجہ سے شادی نہیں ہوسکی، اس کے نام مرحوم نے اس مقصد سے ایک مکان خریدا اور اس کے نام رجسٹری بھی کرادی اور اس کو کرایہ پر دے دیا اور اس کی آمدنی وغیرہ اسی کے کھاتے میں جمع کرتے تھے، تاکہ آئندہ زندگی میں اگر اس کی شادی نہ ہوسکے؛ اس لئے کہ عمر بھی زیادہ ہوچکی ہے، تو یہ کسی کی محتاج نہ رہے اور بھائیوں کے لئے بوجھ نہ رہے، اور اس کی زندگی اچھی طرح گذر جائے، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ وہ مکان اس لڑکی کا ہوگا یا دیگر ورثاء بھی شریک ہوں گے؟

(۴) ایک مکان مرحوم نے اپنی بیوی کے نام خرید کر دیا تھا، تاکہ یہ بھی خالی ہاتھ نہ رہے، یہ مکان بیوی کا ہی ہوگا یا نہیں؟ مرحوم کے لڑکوں میں سے ایک لڑکا خالد یہ دریافت کرنا چاہتا ہے کہ والد نے جو چیزیں ہمارے نام کی ہیں، ان میں سے بہنوں کو دینا ہمارے ذمہ ہے یا نہیں؟ اگر دینا ہے تو صرف ان بہنوں کو دینا ہے جن کو والد نے کچھ نہیں دیا ہے یا سب کو؟

المستفتی: عبداللہ بمبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر مرحوم نے جائیداد وغیرہ ہر بچہ کے نام سے خرید کر مالک بنادیا ہے، تو ان جائیدادوں کے مالک وہی بچے ہیں، جیسا کہ سوال نامہ میں اس کی صاف وضاحت ہے، لہٰذا مرحوم کے مرنے کے بعد دی ہوئی جائیداد الگ سے وراثت کے طور پر تقسیم نہ ہوگی اور جن کو کچھ نہیں دیا ہے، مرحوم کا فرض تھا کہ ان کے نام بھی کچھ کردیتے، تاکہ اپنی اولاد کے درمیان یکسانیت برقرار رہتی۔ اور مرحوم کی موت کے وقت میں مرحوم کی ملکیت کی جائیداد یا روپئے پیسہ رہ گئے ہوں وہ شرعی حصہ کے طور پر تقسیم کرنا لازم ہے، اور اس میں سب ورثاء مل کر اپنے اپنے حصوں میں سے کچھ حصے ان لڑکیوں کو اضافہ کرکے دے دیں، جن کو مرحوم نے کچھ نہیں دیا ہے، تو بھائیوں کی طرف سے ایک اچھا کردار ثابت ہوگا۔ اور

مرحوم نے اپنی بیوی کے نام جو جائیداد کردی ہے، بیوی کے انتقال کے بعد وہ جائیداد سارے لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان شرعی حصوں کے اعتبار سے تقسیم ہوگی۔

حکم الهبة ثبوت الملک للموهوب له. (تاتارخانية، زكريا ١٤/ ٤١٣، رقم: ٢١٥٣٧)

لا بأس بتفضيل بعض الأولاد في المحبة، وكذا في العطايا إذا لم يقصد به الإضرار فسوى بينهم، يعطى البنت كالابن عند الثاني وعليه الفتوى. (شامي، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٥٠١-٥٠٢، كراچی ٥/ ٦٩٦، قاضي خان، زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩، هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦، بزازية، زكريا جديد ٣/ ١٢٣، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٣٧)

المختار التسوية بين الذكر والأنثى في الهبة. (البحرالرائق، كتاب الهبة، كوئٹه ٧/ ٢٨٨، زكريا ٧/ ٤٩٠، خلاصة الفتاوى أشرفيه ديوبند ٤/ ٤٠٠) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ / ذیقعدہ ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۵۴۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۱۱/۲۷ھ

لڑکی کو مکان مع دوکان دینا اور لڑکوں کو کھیت کی زمین

سوال [۹۵۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے پاس ایک دوکان مع مکان ہے اور پندرہ بیگہ زمین ہے، کل زمین کی قیمت تقریباً بیس لاکھ روپئے ہے اور دوکان مع مکان کی قیمت تقریباً دس لاکھ روپئے ہے، میرے تین لڑکے اور ایک لڑکی ہے، دو لڑکے شادی شدہ ہیں، ایک لڑکی بھی شادی شدہ ہے، میرے تینوں لڑکے نالائق ہیں، کوئی بھی میرا خیال نہیں رکھتا، میری اہلیہ کا بھی انتقال ہوگیا ہے، مجھے اس کا خطرہ ہے کہ اگر میں نے زندگی میں بٹوارہ نہیں کیا تو تینوں لڑکے دوکان کو فروخت کردیں گے،

میری خواہش یہ ہے کہ دوکان سے میری ہی اولاد فائدہ اٹھائے؛ لیکن لڑکوں میں یہ اہلیت نہیں ہے، دوکان بھی اس طرح ہے کہ ایک آدمی کو دی جائے تو اس کو فائدہ پہنچے گا، تقسیم کرنے پر وہ دوکان بیکار ہو جائے گی؛ اس لئے میں یہ چاہتا ہوں کہ دوکان مع مکان اپنی لڑکی کو دے دوں اور کھیت تین بیٹے ہیں، ان کو دے دوں، کیا ایسا کرنا میرے لئے جائز ہے؟ اگر ایسا کرنا میرے لئے جائز نہیں ہے، تو شرعی اعتبار سے جو شکل بنتی ہوا سے تحریر فرمائیں، میرا مقصود یہ ہے کہ آخرت میں گرفت نہ ہو۔

المستفتی: محمد امجد دھانے پور، ضلع گونڈہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر آپ زندگی میں دینا چاہیں تو لڑکی کو لڑکوں کے برابر دے دیں، ورنہ گنہگار ہوں گے، اس کا آپ تناسب دیکھ لیں کہ دوکان مع مکان دس لاکھ کی بیٹھتی ہے اور پندرہ بیگہ زمین بیس لاکھ کی بیٹھتی ہے تو ہر ایک کو ساڑھے سات سات لاکھ مل جائے گا، ایسا کرنا جائز ہے اور کوئی بچہ اگر زیادہ فرماں بردار ہے تو اس کو زیادہ دینا بھی بلا تردد جائز ہے۔

عن النعمان بن بشير -رضي الله عنه- أن أباه أتى به إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: إني نحلت ابني هذا غلاما، فقال: أكل ولدک نحلت مثله؟ قال: لا، قال: فارجعه. (بخاري شريف، كتاب الهبة، باب الهبة للولد الخ ١/ ٣٥٢، رقم: ٢٥١٤، ف: ٢٥٨٦)

ولو وهب رجل شيئا لأولاده في الصحة، وأراد تفضيل البعض على البعض في ذلک، لا رواية لهذا في الأصل عن أصحابنا. وروى عن أبي حنيفة أنه لابأس به إذا كان التفضيل لزيادة فضل له في الدين، وإن كانا سواء يكره. وروى المعلى عن أبي يوسف -رحمه الله تعالىٰ- أنه لا بأس به إذا لم يقصد به الإضرار، وإن قصد به الإضرار سوى بينهم يعطى الابنة مثل

ما يعطى للابن، وعليه الفتوى. (هندية، كتاب الهبة، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا قديم جديد ٤/ ٤١٦، زكريا ٤/ ٣٩١، البحرالرائق، زكريا ٧/ ٤٩٠، كراچی ٧/ ٢٨٨، قاضي خان، فصل في هبة الوالد لولده، زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/۴/۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۵۶۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۴/۱۴۲۹ھ

زندگی میں بیوی اورلڑکیوں کے درمیان جائیداد کی تقسیم

سوال [۹۵۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میری پانچ لڑکیاں ہیں، لڑکا کوئی نہیں ہے، ایک بیوی ہے، میرے پاس صرف ایک مکان ہے، جس میں میں بیوی بچیاں رہتی ہیں، میرا کوئی بھائی اور نہ والد نہ والدہ ہیں، صرف بہن ہے، میں اپنی زندگی میں ہی تقسیم کرنا چاہتا ہوں، وہ مکان اپنی بچیوں اور بیوی کے نام کرسکتا ہوں۔

المستفتی: حافظ اشتیاق حسین محلّہ کنبہ مغل پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر آپ اپنی زندگی ہی میں اپنی بیوی اورلڑکیوں کے درمیان اپنی جائیداد تقسیم کرنا چاہتے ہیں، تو حسب مرضی بیوی کو جو کچھ دینا چاہیں دے دیں، اس کے بعد کل جائیداد پانچ حصوں میں تقسیم ہوگی، ہرلڑکی کو ایک ایک حصہ ملے گا۔ اور اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ کی وفات کے بعد کس کو کتنا ملے گا تو کل ترکہ ۱۲۰/ سہام میں تقسیم ہوکر بیوی کو پندرہ ہرلڑکی کو سولہ سولہ اور بہن کو ۲۵/ حصے ملیں گے، جیسا کہ درج ذیل نقشہ سے واضح ہوتا ہے:

اشتیاق میـــــــــــــــــــــــــــــــت

بہن	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	بیوی
۵/۲۵	۱۲/۱۲	۱۲	۱۲	۱۲	۱۲	۳/۱۵

دونوں طرح کے مسئلہ ہم نے بیان کردئے ہیں، اب آپ کو اختیار ہے جو طریقہ چاہیں اختیار کرلیں۔

فسوى بينهم يعطى البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتوى. (شامي، كتاب الهبة، كراچی ٥/ ٦٩٦، زكريا ٨/ ٥٠١، ٥٠٢، هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦، قاضيخان زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ربیع الاول ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۵۵۱/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۳/۷ھ

زندگی میں بیوی اوراولاد کے درمیان جائیداد کی تقسیم

سوال [۹۵۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں اپنی زندگی میں اپنی اولاد کے درمیان مندرجہ ذیل مکانات تقسیم کرنا چاہتا ہوں، میری زیر ملکیت دو مکان ہیں: (۱) مکان مربع ۱۴۳ ارگز، جو دو کمروں، تین دوکانوں، ایک بیٹھک اوراوپر کی منزل پر دو کمرے بڑے اورایک چھوٹا کمرہ پر مشتمل ہے، اسی مکان کے ایک کمرہ میں ہم دونوں میاں بیوی رہتے ہیں۔ (۲) دوسرا مکان جس کی آراضی اٹھاسی گز ہے، وہ دو کمروں، صحن، غسل خانہ ولیٹرین وغیرہ پر مشتمل ہے، میرے تین لڑکے: عبدالسلام، محمد اقبال، محمد الیاس اور تین لڑکیاں، سردار جہاں، شمع بیگم، قمر جہاں ہیں، ان میں ایک لڑکا

دوسرا مکان لینے پر راضی ہے اور بقیہ فریق دینے پر بھی راضی ہیں، تو مندرجہ بالا صورت میں ان مکانوں کی شرعاً تقسیم کیسے ہوگی؟

المستفتی: عبدالرحمٰن اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر عبدالرحمٰن اپنی زندگی ہی میں اولاد کے درمیان جائیداد تقسیم کرنا چاہتے ہیں، تو حسب مرضی بیوی کو جو کچھ دینا چاہیں دے دیں، اس کے بعد لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر دینا لازم ہوگا اور تمام جائیداد کی قیمت لگا کر یا آپس کی تراضی سے جو جدھر کا حصہ لینا چاہے برابر تقسیم کردیا جائے؛ لہٰذا تین لڑکے اور تین لڑکیوں کے درمیان کل جائیداد چھ حصوں میں تقسیم ہوکر ہر ایک کو ایک ایک حصہ ملے گا۔ اور اگر عبدالرحمٰن یہ چاہتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد شرعی طور پر وارثین کے درمیان ترکہ تقسیم ہوجائے اور وہ زندگی میں یہ چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد کس کو کتنا تقسیم ہو تو کل جائیداد ۷۲/سہام میں تقسیم ہوکر بیوی کو نو اور ہر لڑکے کو چودہ چودہ اور ہر لڑکی کو سات سات حصے ملیں گے، جیسا کہ درج ذیل نقشہ سے واضح ہوتا ہے:

عبدالرحمٰن میـــــــــــــــــت

بیوی لڑکا لڑکا لڑکی لڑکی لڑکی

۷

۱/۹ ۱۴ ۱۴ ۱۴ ۷ ۷ ۷

عبدالرحمٰن کا ترکہ ۷۲/سہام میں تقسیم ہوکر، ہر وارث کو اتنا ملے گا جو اس کے نام کے نیچے درج ہے، دونوں طرح کے مسئلے ہم نے بیان کردئے، اب عبدالرحمٰن جو طریقہ چاہیں اپنا لیں۔

وروی المعلی عن أبي یوسف: أنه لا بأس به إذا لم یقصد به الإضرار، وإن قصد به الإضرار سوی بینهم یعطی الابنة مثل ما یعطی الابن، وعلیه الفتویٰ، **وهو المختار.** (هندیة، کتاب الهبة، الباب السادس في الهبة للصغیر، زکریا قدیم ٤/

۳۹۱، جدید ٤/ ٤١٦، شامي، كراچى ٥/ ٦٩٦، زكريا ٨/ ٥٠١، ٥٠٢، قاضي خان جديد زكريا ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية، زكريا ٣/ ٢٧٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۴۲۰۷)

زندگی میں اولاد اور بیوی کے درمیان جائیداد کس طرح تقسیم کریں؟

سوال [۹۵۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اولاد اور ایک بیوی کے درمیان جائیداد تقسیم کرنا چاہتا ہے تو شرعاً کیسے تقسیم ہوگی، کیا بیوی کو بھی اولاد کی طرح برابر حصہ ملے گا؟ اور بذات خود کتنا رکھے گا؟

المستفتی: شبیر احمد جامع مسجد جل گاؤں، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر کوئی شخص اپنی جائیداد اپنی حیات میں تقسیم کرنا چاہے تو تمام اولاد کے مابین مساوات کا معاملہ کرنا ضروری ہے، یعنی جتنا حصہ لڑکے کو دے اتنا ہی لڑکی کو دے؛ البتہ بیوی کے سلسلہ میں وہ خود مختار ہے، اپنی صوابدید پر جتنا چاہے دے دے اور اپنے لئے جتنا چاہے رکھ لے، اس پر کوئی قید نہیں۔

وإن قصده فسوى بينهم يعطى البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتوى. (درمختار، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٥٠١، كراچى ٥/ ٦٩٦، هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦، قاضيخان زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩، بزازية، زكريا جديد ٣/ ١٢٣، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٣٧)

المالك هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء من الملك. (بيضاوي، كتب خانه رشديه دهلى ١/ ٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۴۰۹۵)

زندگی میں پوتے، نواسے اور نواسیوں کے درمیان مکان کی تقسیم

سوال [۹۵۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: شوہر اور بیوی کا ایک مشترکہ ذاتی رہائشی مکان ہے، ان کی دو اولادوں لڑکے اور لڑکی کا ان کی زندگی میں ہی انتقال ہو چکا ہے، اور کوئی اولاد نہیں ہے، لڑکے کی اولاد میں صرف ایک پوتا ہے، لڑکی کی اولاد میں دو نواسے اور دو نواسیاں ہیں، دونوں کا اپنا یہ ذاتی رہائشی مکان اپنی زندگی ہی میں اپنی خوشی سے اپنے لڑکے مرحوم کی اولاد پوتے کو اور اپنی لڑکی مرحومہ کی اولاد یں نواسہ اور نواسیوں کو دینے کا ارادہ ہے، تاکہ ان کے بعد پوتا اور نواسہ ونواسیاں اس مکان کی حق دار رہیں؛ لہٰذا از روئے شریعت اس رہائشی مکان کا پوتے کو کس قدر حصہ اور نواسہ ونواسیوں کو کس قدر حصہ تقسیم کر کے باضابطہ تحریر کرنا چاہئے؟

المستفتی: محمد شریف، ساکن کانکی نارہ، آندھرا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ دونوں اپنے مکان کے مالک ہیں۔ اور آپ لوگوں کو اس مکان میں ہر طرح کا تصرف کرنے کا اختیار ہے، آپ اپنی زندگی میں جس کو چاہیں دے سکتے ہیں؛ لیکن اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ آپ کے تصرف کرنے سے کسی مستحق کا حق نہ مارا جائے؛ لہٰذا مذکورہ بالا سوال میں آپ کے مرنے کے بعد صرف آپ کا پوتا وارث بنے گا، نواسہ اور نواسیوں کو کچھ نہیں ملے گا، جب آپ کا وارث شرعی پوتا ہے، جو آپ کے بعد پورے مکان کا مالک بنے گا؛ تو اگر آپ نواسہ نواسیوں کو بھی کچھ دینا چاہتے ہیں، تو اس کی دو شکلیں ہیں: (۱) اپنی زندگی میں بطور ہبہ نواسہ نواسیوں کو دے کر قبضہ دے دیں اور رجسٹری بھی کرا دیں۔ (۲) ایک تہائی سے کم مقدار کے بارے میں نواسہ، نواسیوں کے لئے وصیت کر دیں اور گواہوں کے ساتھ رجسٹری بھی کر دیں، تو آپ دونوں کی وفات کے بعد ایک تہائی سے کم مقدار جس کی وصیت کی گئی ہے، وہ نواسہ، نواسیوں کو مل جائے گا، ان دونوں شکلوں

کے علاوہ آپ کے نواسہ اور نواسیوں کو آپ کی جائیداد میں سے ملنے کے لئے کوئی اور شکل نہیں ہے۔

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء. (بيضاوي، كتب خانه رشديه دهلى ١/ ٧)

وإن كان ماله كثيرا، فإن كانت ورثته فقراء فالأفضل أن يوصى بما دون الثلث، ويترک المال لورثته، ...... وإن كان ورثته أغنياء، فالأفضل الوصية بالثلث، ثم الوصية بالثلث لأقاربه الذين لايرثون أفضل من الوصية به للأجانب. (بدائع الصنائع، كتاب الوصايا، زكريا ٦/ ٤٢٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ / جمادی الثانیہ ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۰۷۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/ ۶/ ۱۴۲۴ھ

زندگی میں جائیداد تقسیم کرنے کی صورت میں پوتوں کو دے سکتے ہیں یا نہیں؟

سوال [۹۵۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: احقر کے چھ لڑکے، دو لڑکیاں، ایک بیوی ہے، میری کچھ میراث ہے، میں اس کو تقسیم کرنا چاہتا ہوں۔(۱) چھ لڑکوں میں سے پانچ حیات ہیں، دو لڑکیاں ایک بیوی، میری میراث سے کس کا کتنا حق بنتا ہے؟ لڑکیاں شادی شدہ ہیں، میں بیمار رہتا ہوں، اپنے جیتے جی تقسیم کرنا چاہتا ہوں۔

(۲) میرے بڑے لڑکے کا انتقال ہوگیا ہے، اس کے پانچ بچے ہیں، ایک بیوہ ہے، اس کے بچوں کو کیا میرے زندہ ہوتے ہوئے کوئی حق میری میراث میں بنتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: اشتیاق حسین سہسپور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: زندگی میں جائیداد تقسیم کرنے میں لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے

برابر دینا لازم ہے۔ اور آپ اپنی بیوی کو اپنی مرضی سے جتنا دینا چاہتے ہیں اتنا اولاً بیوی کو دے دیں اور بڑے لڑکے کی اولاد کو بھی جتنا اپنی مرضی سے دینا چاہتے ہیں دے دیں؛ اس لئے کہ ان کے لئے کوئی شرعی حق نہیں ہے؛ بلکہ آپ کی مرضی پر موقوف ہے، اس کے بعد بقیہ جائیداد سات سہام میں تقسیم کرکے ہر ایک لڑکے اور لڑکی کو ایک ایک سہام دے دیں۔

فسوى بينهم يعطى البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتوى، ولو وهب في صحته كل المال للولد جاز وأثم. (درمختار، كتاب الهبة، كراچی ٥/ ٦٩٦، زكريا ٨/ ٥٠١، قاضي خان، زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩، البحرالرائق، كوئٹه ٧/ ٢٨٨، زكريا ٧/ ٤٩٠، خلاصة الفتاوى أشرفيه ديوبند ٤/ ٤٠٠)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۹۳۳)

زندگی میں جائیداد تقسیم کرنے کی صورت میں پوتوں اور نواسوں کو دینا

سوال [۹۵۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عائشہ بیگم جن کا مکان ہے، ان کی تین اولادیں ہیں: (۱) لڑکا عبدالوحید (۲) صاحبزادی (۳) سائرہ خاتون، جگہ ۱۰۶ رگز ہے، ہر کسی کے حصے میں کتنی زمین آتی ہے؟

نوٹ:- عبدالوحید کا عائشہ کے سامنے ہی انتقال ہوگیا؛ لیکن عائشہ بیگم اپنے پوتوں کو حصہ دینا چاہتی ہیں، شرعاً کتنا کتنا حق ملے گا؟ اور صاحبزادی کا بھی انتقال ہو چکا ہے، ان کی اولاد کو بھی دینا چاہتی ہے، کتنا کتنا دیں؟ جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: انور حسین اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں عائشہ کو اختیار ہے، چاہے جتنا حصہ

دے دیں؛ لیکن کسی مستحق کومحروم کرنے یا نقصان پہنچانے کا ارادہ نہ ہو، چنانچہ اپنی زندگی میں اپنے نواسے اور پوتوں کوبھی کچھ حصہ دے سکتی ہیں، شرعاً ان لوگوں کے لئے کوئی حصہ متعین نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۴/ ۴۳۷، جدید ڈابھیل ۲۰/ ۴۷۵)

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء. (بيضاوي، كتب خانه رشديه دهلی ۱/ ۷)

كل يتصرف في ملكه كيف شاء. (شرح المجلة رستم ۱/ ٦٥٤، رقم المادة: ۱۱۹۲)

الملک ما من شأنه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص. (الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۹/۱٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰/ ذیقعدہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۴۳۳)

زندگی میں بیٹے پوتے اور بہو کو کچھ دینا

سوال [۹۵۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جناب چودھری خلیل احمد صاحب کے دو صاحبزادے تھے، جمیل احمد صاحب، وکیل احمد صاحب، ان میں سے بڑے صاحبزادے جمیل احمد صاحب کا عرصہ بارہ سال پہلے انتقال ہوگیا تھا، ان کی حیات میں گھر وجائیداد کی کوئی تقسیم نہیں ہوئی تھی، کچھ آراضی کے وہ بھی مالک تھے، ان کے نام بھی آج تک سرکاری کاغذات میں زمین درج ہے، ان کے پسماندگان میں ان کی بیوی مسماۃ سلمی خاتون اور ایک لڑکا عبادالرحمٰن اور ایک لڑکی گلشن بانو بقید حیات ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ جناب چودھری خلیل احمد صاحب اپنی حیات میں اپنی جائیداد وغیرہ کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں، اور خود اپنا بھی حصہ رکھنا چاہتے ہیں، اب یہ حضرات بقید حیات

ہیں، ان کا لڑکا وکیل احمد مرحوم جمیل احمد کی بیوی سلمیٰ مرحوم کا لڑکا عباد الرحمٰن مرحوم کی ایک لڑکی گلشن بانو ان مذکورہ بالا حضرات کے مابین جائیداد مذکورہ کس طرح تقسیم ہوگی؟ اور کس کو کتنا حصہ پہنچے گا؟ ہم صرف چودھری خلیل احمد صاحب کی جائیداد سے متعلق معلوم کر رہے ہیں، مرحوم جمیل احمد کی جائیداد سے متعلق نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آدمی اپنی حیات میں اپنے مال کا مالک ہوتا ہے، اس میں اس کو ہر طرح کے تصرفات کی اجازت ہے؛ اس لئے خلیل احمد صاحب اپنے بیٹے، پوتے، پوتیاں اور بہو کے درمیان جس طرح اپنی ملکیت تقسیم کرنا چاہیں تقسیم کر سکتے ہیں اور جتنا مال اپنے لئے رکھنا چاہیں رکھ سکتے ہیں؛ البتہ خلیل احمد کے انتقال کے وقت اگر وکیل احمد زندہ رہے تو اس صورت میں وہ تمام مال کے مالک ہوجائیں گے اور پوتے، پوتیاں سب محروم ہوجائیں گی؛ البتہ خلیل احمد اپنی زندگی میں پوتے، پوتیاں اور بہو کو جو کچھ دے دیں گے اس کے وہ مالک ہوجائیں گے۔

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء. (بيضاوي، كتب خانه رشديه دهلى ١/ ٧)

المالک للشيء هو الذى يتصرف فيه باختياره ومشيئته. (بدائع الصنائع، كتاب النفقة، فصل في بيان ما يبطل به الخيار، زكريا ٢/ ٦٣٨، كراچى ٢/ ٣٢٧)

يتصرف المالک في ملكه كيف شاء. (البناية، أشرفيه ديوبند ٨/ ٢١٩)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ شعبان ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۸۷۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۸/۱۷ھ

زندگی میں جائیداد بھانجی بھانجوں کو ہبہ کرنا

سوال [۹۵۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سید محمود حسن نے اپنی زندگی میں بحالت ہوش وحواس اپنا مملوکہ مکان ۱۸۸ رگز اپنے چار بھانجے: (۱) اشرف علی (۲) مسرت علی (۳) انجم علی (۴) منور علی، ایک بھانجی قمر جہاں کے درمیان برابر برابر ہبہ کر کے قابض ومالک بنا دیا تھا، پھران کا انتقال ہوگیا۔

(۲) اس کے بعد قمر جہاں کا بغیر شادی ہوئے انتقال ہوگیا، اس کے ورثاء میں چار بھائی: (۱) اشرف علی (۲) مسرت علی (۳) انجم علی (۴) منور علی، دو بہنیں: (۱) آفتاب جہاں (۲) مہر جہاں ہیں۔

(۳) پھر اشرف علی کا انتقال ہوا، اس کے ورثاء میں دو لڑکے فیصل اشرف (۲) سید کمال اشرف اور ایک لڑکی ارم اشرف ہیں۔

(۴) پھر مسرت علی کا انتقال ہوا، اس نے ورثاء میں ایک بیوی فرحت جہاں، تین لڑکے: (۱) صدف علی (۲) صمد علی (۳) عمر آصف اور چار لڑکیاں: (۱) شائستہ مسرت (۲) شگفتہ مسرت (۳) ثمرین مسرت (۴) امین مسرت کو چھوڑا۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ مذکورہ مکان میں سے ہر وارث کو کتنا کتنا ملے گا؟

المستفتی: فیصل اشرف محلّہ لاکڑی والان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: محمود حسن کی طرف سے اپنے چار بھانجوں اور ایک بھانجی کے لئے جو ہبہ ہوا ہے، وہ ہبۂ مشاع کی ایک شکل ہے اور اس طرح ہبہ حضرات صاحبین کے نزدیک جائز اور درست ہے؛ لیکن جب ہبہ مبہم ہے کس کے لئے کتنا کتنا ہے، اس کی صاف وضاحت نہیں ہے، تو ایسی صورت میں سب کو برابر ملے گا، بھانجی کو بھی بھانجوں کے برابر ملے گا؛ لہٰذا کل مال برابر ۵ رحصوں میں تقسیم ہوکر ہر ایک کو ایک ایک حصہ ملے گا جو آگے آنے والے نقشہ سے واضح ہوتا ہے۔ عربی عبارات ملاحظہ فرمائیے:

ولو وهب من اثنين إن كانا فقيرين يجوز بالإجماع كالصدقة، وإن كانا غنيين فوهب لكل واحد منهما نصفا أو أبهم، فقال: وهبت منكما، أو وهب على التفاضل، فقال: لهذا ثلثها، ولهذا ثلثاها، قال أبوحنيفةؒ: لا تجوز في الفصول الثلاثة، وقال محمد: تجوز في الثلاثة، وقال أبويوسف: تجوز في فصلين، وهما إذا وهب بهما أو نصفين. (هندية، كتاب الهبة، الباب الثاني، زكريا قديم ٤ / ٣٧٨، جديد ٤/ ٤٠٠، بدائع الصنائع، زكريا ٥/ ٧٤، الفقه الإسلامي ٤ / ٦٨٨)

ذیل کے نقشوں سے حصوں کی تعیین ملاحظہ فرمایئے اور مرنے والوں کی ترتیب سے مسئلہ مناسخہ بھی ملاحظہ فرمایئے:

میت

بھانجہ	بھانجہ	بھانجہ	بھانجہ	بھانجی
اشرف	مسرت	انجم	منور	قمرجہاں
۱	۱	۱	۱	۱
۱۰	۱۰	۱۰	۱۰	
	۵۰	۵۰	۵۰	
		۲۰۰	۲۰۰	

قمرجہاں میت

بھائی	بھائی	بھائی	بھائی	بہن	بہن
اشرف	مسرت	انجم	منور	آفتاب جہاں	مہرجہاں
۲	۲	۲	۲	۱	۱
	۱۰	۱۰	۱۰	۵	۵
		۴۰	۴۰	۲۰	۲۰

میـــــــــت

لڑکا	لڑکا	لڑکی
فیصل	کمال اشرف	ارم
۲	۲	۱
۲۴	۲۴	۱۲
۹۶	۹۶	۴۸

میـــــــــت

بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی
فرحت	صدف	صمد	عمر	شائستہ	شگفتہ	ثمرین	فرحین
۱				۷			
۱۰	۱۴	۱۴	۱۴	۷	۷	۷	۷
۳۰	۴۲	۴۲	۴۲	۲۱	۲۱	۲۱	۲۱

الاحیـــــــــاء

ورثاء	سہام	ترکہ	ورثاء	سہام	ترکہ
انجم علی	۲۴۰	۴۵	صدف علی	۴۲	۷
منور علی	۲۴۰	۴۵	صمد علی	۴۲	۷
آفتاب جہاں	۲۰	۳	عمر آصف	۴۲	۷
مہر جہاں	۲۰	۳	شائستہ	۲۱	۳
فیصل اشرف	۹۶	۱۸	شگفتہ	۲۱	۳
کمال اشرف	۹۶	۱۸	ثمرین	۲۱	۳
ارم اشرف	۴۸	۹	فرحین	۲۱	۳
فرحت جہاں	۳۰	۵			

کل مکان ۱۰۰۰ر حصوں میں تقسیم ہوکر، ہر وارث کو اتنا اتنا ملے گا جتنا اس کے نام کے سامنے درج ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷ر محرم الحرام ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۸۱۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸/ ۱/ ۱۴۳۶ھ

زندگی میں جائیداد کی تقسیم سے متعلق چند سوالات کے جوابات

سوال [۹۵۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے والد صاحب نے تین شادیاں کیں، پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہے اور بیوی بھی انتقال کرگئی، دوسری بیوی سے صرف ایک لڑکا اور والدہ انتقال کرگئیں، پھر میرے والد صاحب نے تیسری شادی کی، ان سے چھ لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں اور ماں بھی حیات ہیں۔

(۱) تو کیا دونوں سے ہم ساتوں بھائی کے حق برابر ہیں اور ماں بھی باحیات ہیں اور تین بہنوں کے کیا حقوق ہیں؟

(۲) کیا میرے والد اپنی وراثت کو فروخت کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اور ہم سب بھائی بہن ان کے خلاف کچھ کرسکتے ہیں یا نہیں؟

(۳) کیا ہمارے والد صاحب اپنے حقوق کسی ایک لڑکا یا لڑکی کو فروخت کرسکتے ہیں یا نہیں؟

(۴) اگر کوئی اولاد والد کو پریشان کرے تو اسے وراثت سے بے دخل کرسکتے ہیں یا نہیں؟

(۵) اگر والد صاحب اپنی زندگی میں اپنی جائیداد تقسیم کرنا چاہیں تو کس طرح تقسیم کریں؟ شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: نفیس احمد بارہ دری سرائے حسینی بیگم، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) والدصاحب کی وفات کے بعد دونوں بیویوں کی اولاد اور دونوں بیویاں حصصِ شرعیہ کے حق دار ہیں، یعنی بیویاں آٹھویں حصہ اور لڑکے لڑکی کے مقابلہ میں ڈبل کے حق دار ہوں گے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيْبًا مَفْرُوْضًا. [النساء: ۷]

ثم يقسم الباقي بين ورثته الذين ثبت إرثهم بالكتاب والسنة. (درمختار، كتاب الفرائض، زكريا ١٠/ ٤٩٧، كراچى ٦/ ٧٦١، سراجي ص: ٥، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٤٩٥، مصري قديم ٢/ ٧٤٧، البحرالرائق، كوئٹه ٨/ ٤٨٩، زكريا ٩/ ٣٦٤)

لہٰذا دونوں بیویوں کی اولاد میں تفریق کرنا شرعاً درست نہ ہوگا۔

(۲) آپ کے والد صاحب کو اپنی زندگی میں اپنی جائیداد کے سلسلے میں مکمل اختیار ہے کہ وہ اس کو فروخت کردیں، اولاد کو اس سلسلے میں ان کے خلاف کارروائی کرنے کا شرعاً کوئی حق نہیں ہے۔

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء. (بيضاوي، كتب خانه رشديه دهلى ١/ ٧)

(۳) اولاد میں سے صرف ایسی اولاد کو اپنی جائیداد فروخت کرنا جائز ہے کہ جو باپ کی فیملی سے علیحدہ ہو۔ اور جو اولاد باپ کی فیملی میں شریک ہو اس کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ اس بیٹے کی تمام کمائی کا مالک شرعاً باپ ہی ہے۔

(۴) اگر کوئی لڑکا باپ کا نافرمان ہے، تو باپ کو شرعاً اس بات کا اختیار ہے کہ وہ اس نافرمان اولاد کو نہ دے کر دیگر فرماں بردار اولاد کو مال تقسیم کردے؛ لیکن اگر بیٹے نے نادم ہو کر باپ سے معافی تلافی کرلی ہے، تو باپ کو شفقت اور رحم کا معاملہ کرتے ہوئے بیٹے کو معاف کردینا چاہئے۔

ولو كان ولده فاسقا لا يعطى له. (البحرالرائق، كتاب الهبة، زكريا ٧/ ٤٩٠، كوئٹه ٧/ ٢٨٨)

لابأس -بأن- لا يعطى منهم من كان فاسقا فاجرا. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩٧، مصري قديم ٢/ ٣٥٨)

(۵) اگر آپ کے والد اپنی زندگی میں اولاد کے درمیان جائیداد تقسیم کریں، تو یہ ہبہ اور عطیہ ہے، جس میں تمام اولاد کے درمیان برابری کرنا لازم ہے، خواہ لڑکی ہوں یا لڑکا، تمام کو برابر برابر دینا چاہئے۔

وفي الخلاصة: المختار التسوية بين الذكر والأنثى في الهبة. (البحرالرائق، كتاب الهبة، زكريا ٧/ ٤٩٠، كراچی ٧/ ٢٨٨، خلاصة الفتاوى ٤/ ٤٠٠)

وينبغي أن يعدل بين أولاده في العطايا، والعدل عند أبي يوسف أن يعطيهم على السواء، وهو المختار كما في الخلاصة. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩٧، مصري قديم ٢/ ٣٥٨) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۳؍ رجب ۱۴۲۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۴۸۵۴)	۲۴؍۷؍۱۴۲۱ھ

زندگی میں تقسیمِ میراث اور ورثاء کے حق میں وصیت کیسے ہو؟

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ أَمَّا بَعْد!

مورث کی موت کے بعد عام طور پر تقسیمِ میراث کے بارے میں اعتدال باقی نہیں رہتا، لڑکیوں کو تو حیلہ بہانہ سے کسی طرح دست بردار رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور لڑکوں کے درمیان میں بھی صحیح طور پر مساوات قائم نہیں ہوتی؛ اس لئے مورث اپنی زندگی میں ضابطۂ شرعی کے مطابق تقسیم کر کے حصّوں کی تعیین کر دے۔ اور ورثاء کو موت کے بعد اسی تقسیم کو بروئے عمل لانے کی وصیت کر دے تو کیسا ہے؟ اسی طرح بیوی اور اجنبی کے حق میں بھی کبھی وصیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ مضمون اسی طرح کے مسائل سے متعلق ہے۔ تفصیل آگے ملاحظہ فرمایئے:

زندگی میں ترکہ تقسیم کرنا

اگر آدمی اپنی موت سے قبل زندگی میں اپنی جائداد اور مالِ متروک اولاد کے درمیان تقسیم کر دینا چاہتا ہے، تاکہ اس کی موت کے بعد اولاد کے درمیان کسی قسم کے جھگڑے اور لڑائی کی نوبت نہ آسکے، تو اس کی دو شکلیں ہیں: (۱) ہبہ کی شکل (۲) وصیت کی شکل۔

(۱) ہبہ کی شکل: زندگی میں تقسیم کر کے مالک بنا دینا

زندگی میں اولاد کے درمیان جائداد اور سرمایہ کو تقسیم کر کے مالک بنا دیا جائے، تاکہ مرنے کے

بعد کسی قسم کے جھگڑے کی نوبت نہ آسکے، تو ایسی صورت میں یہ معاملہ ہبہ کے حکم میں ہوجائے گا۔ اور زندگی میں جب اولاد کو ہبہ کر کے قبضہ دے دیا جائے تو اس حصہ اور عطیہ میں اولاد کے درمیان مساوات اور برابری قائم رکھنے میں تمام فقہاء کا اتفاق ہے، مگر اس میں دو باتوں میں اختلاف ہے: (۱) یہ حکم مستحب ہے یا واجب؟ (۲) ذکور و اناث دونوں میں مساوات کا حکم ہے یا الگ الگ؟

پہلی بات: یہ حکم مستحب ہے یا واجب؟

حضرت امام احمد بن حنبلؒ، اسحاق بن راہویہؒ، سفیان ثوریؒ، مجاہد بن جبیرؒ، عروہ بن زبیرؒ، طاؤس بن کیسانؒ اور داؤد بن علی ظاہریؒ وغیرہ کے نزدیک تساوی اور برابری قائم رکھنا واجب ہے اور اس کی خلاف ورزی حرام ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور جمہور علماء کے نزدیک یہ حکم واجب نہیں ہے؛ بلکہ صرف مستحب ہے اور اس کی خلاف ورزی مکروہ تنزیہی ہے۔ اور دونوں فریق حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کرتے ہیں، جس میں حضرت سید الکونین علیہ السلام کا یہ ارشاد وارد ہوا ہے:

فَاتَّقُوا اللهَ وَاعْدِلُوْا بَيْنَ أَوْلَادِكُمْ. (بخاری ۱/ ۳۵۲، مسلم ۲/ ۲۷)

پس تم اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان برابری قائم رکھو۔

اس عبارت کو فریق اول وجوب پر محمول کرتے ہیں۔ اور جمہور علماء اس کو استحباب اور ندب پر محمول فرماتے ہیں؛ کیوں کہ مسلم شریف میں اسی حدیث میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں:

فَأَشْهِدْ عَلٰى هٰذَا غَيْرِيْ ثُمَّ قَالَ: أَيَسُرُّكَ أَنْ يَكُوْنُوا إِلَيْكَ فِي الْبِرِّ سَوَاءً قَالَ: بَلٰى ،فَقَالَ فَلا إِذَنْ. (مسلم ۲/ ۲۷، رقم: ۱۶۲۳)

لہٰذا تم اس پر میرے علاوہ کسی اور کو گواہ بنالو پھر فرمایا کیا تم کو یہ بات اچھی لگے گی کہ تمہاری اولاد تمہارے ساتھ بھلائی کرنے میں برابر ہوں؟ تو کہا: جی ہاں، تو آپ نے فرمایا: یہ بھی ایسا ہی ہے۔

حدیث شریف کی اس عبارت پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ یہ حکم وجوب کے

لئے نہیں ہے؛ بلکہ ترغیبی اور استحبابی ہے؛ کیوں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس طرح تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری ساری اولادیں تمہارے ساتھ بھلائی اور تمہاری خدمت کرنے میں برابر ہوں، ایسا ہی اولادیں بھی چاہتی ہیں کہ عطیہ دینے میں ان کے درمیان برابری ہو؛ لہٰذا ’’فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْدِلُوْا بَیْنَ أَوْلَادِکُمْ‘‘ میں امر کا صیغہ وجوب کے لئے نہیں بلکہ اس میں امر کا صیغہ ترغیب کے لئے ہے، جو ندب واستحباب کو ثابت کرتا ہے۔

اب حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

(۱) عَنْ عَامِرٍ قَالَ: سَمِعْتُ النُّعْمَانَ بْنَ بَشِیْرٍ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ یَقُوْلُ: أَعْطَانِيْ أَبِيْ عَطِیَّةً فَقَالَتْ عَمْرَةُ بِنْتُ رَوَاحَةَ: لَا أَرْضَى حَتّٰى تُشْهِدَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، فَأَتَى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: إِنِّيْ أَعْطَیْتُ اِبْنِيْ هٰذَا مِنْ عَمْرَةَ بِنْتِ رَوَاحَةَ عَطِیَّةً فَأَمَرَتْنِيْ أَنْ أُشْهِدَکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: أَعْطَیْتَ سَائِرَ وَلَدِکَ مِثْلَ هٰذَا؟ قَالَ: لَا، قَالَ: فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْدِلُوْا بَیْنَ أَوْلَادِکُمْ. قَالَ فَرَجَعَ فَرَدَّ عَطِیَّتَهٗ. (بخاري شریف ۱/ ۳۵۲، رقم: ۲۵۱۵، ف: ۲۵۸۲، مسلم ۲/ ۲۷، رقم: ۱۶۲۳)

حضرت امام عامر شعبیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت نعمان بن بشیرؓ کو منبر پر خطبہ دینے میں فرماتے ہوئے سنا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے والد نے ایک چیز عطا کر دی تو عمرہ بنت رواحہ (میری والدہ) نے کہا کہ اس وقت تک اس پر راضی نہیں ہوں جب تک اس پر حضور ﷺ کو گواہ نہ بنا لو گے، تو حضور ﷺ کے پاس حاضر ہو کر فرمایا: بے شک میں نے اپنے اس بیٹے کو ایک چیز عطا کر دی ہے، اس پر عمرہ بنت رواحہ نے مجھے حکم کیا کہ یا رسول اللہ میں اس پر آپ کو گواہ بنا لوں، تو آپ نے فرمایا: کہ کیا تم نے اپنی ساری اولاد کو اس کی طرح دیا ہے؟ کہا کہ نہیں، تو آپ نے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان برابری قائم رکھو، فرمایا کہ انہوں نے لوٹ کر آ کر اپنے عطیہ کو واپس کر لیا۔

(۲) وَتَحْتَهُ فِي النَّوَوِي: فَمَذْهَبُ الشَّافِعِيِّ وَمَالِكٍ وَأَبِي حَنِيْفَةَ أَنَّهُ مَكْرُوْهٌ، وَلَيْسَ بِحَرَامٍ وَالْهِبَةُ صَحِيْحَةٌ، وَقَالَ طَاؤُسٌ وَعُرْوَةُ وَمُجَاهِدٌ وَالثَّوْرِيُّ وَأحمد وَإِسْحَاقُ وَدَاؤُدُ هُوَ حَرَامٌ، وَاحْتَجُّوا بِرِوَايَةِ لا أَشْهَدُ عَلٰى جَوْرٍ. (وقوله) اَنَّ قَوْلَهُ عَلَيْهِ السَّلامِ: اَشهد عَلٰى هٰذَا غَيْرِيْ دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّهُ لَيْسَ بِحَرَامٍ، فَيَجِبُ تَأْوِيْلُ الْجَوْرِ عَلٰى اَنَّهُ مَكْرُوْهٌ كَرَاهَةَ تَنْزِيْهَةٍ. (النووي ۲/ ۲۷، حاشیه بخاری ۱/ ۳۵۲)

اس کے نیچے نوویؒ میں ہے: پس امام شافعیؒ اور امام مالکؒ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہی ہے کہ ایسا کرنا مکروہ ہے اور حرام نہیں اور ہبہ صحیح ہوجاتا ہے۔ امام طاؤسؒ، عروہ، مجاہدؒ، ثوریؒ، احمدؒ، اسحاقؒ اور داؤدؒ فرماتے ہیں کہ یہ حرام ہے ''لا اشھد علی جور'' سے استدلال کرتے ہیں (میں ظلم پر گواہ نہیں بنوں گا)۔ (جمہور استدلال کرتے ہیں) حضور ﷺ کے اس قول سے کہ تم اس پر کسی دوسرے کو گواہ بنالو، یہ اس بات پر دلیل ہے کہ یقیناً یہ حرام نہیں ہے، پس لفظ جور کی تاویل کرنا لازم ہوگا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کراہت تنزیہی کے طور پر مکروہ ہے۔

دوسری بات: زندگی میں اولاد کو ہبہ کرنے میں مساوات

دوسری بات یہ ہے کہ زندگی میں اولاد کو ہبہ اور عطیہ دینے میں مساوات اور برابری قائم رکھنے کا کیا حکم ہے؟ تو اس میں دو صورتیں پیش آتی ہیں:

(۱) مذکر اولاد میں کم وزیادہ کا فرق، ساری اولاد ماں باپ کی خدمت گزاری اور فرماں برداری اور دینداری میں تقریباً برابر ہیں اور ایسے حالات میں بعض کو دے دے اور بعض کو نہ دے کر محروم کردے تو ہبہ تو فی نفسہٖ صحیح اور درست ہوجائے گا، مگر باپ گنہگار ہوجائے گا، ہاں البتہ اگر کوئی اولاد نافرمان ہے، یا بے دین ہے، تو اس کو نہ دے کر محروم کردیتا ہے اور صرف با ادب، دیندار کو دیتا ہے، تو بلا کراہت جائز ہے، باپ گنہگار بھی نہ ہوگا۔

اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

(۱) وَلَوْ وَهَبَ فِي صِحَّتِهِ كُلَّ الْمَالِ لِلْوَلَدِ جَازَ وَأَثِمَ. وَفِي الشَّامِيَةِ: وَلَوْ وَهَبَ جَمِيعَ مَالِهِ مِنْ اِبْنِهِ جَازَ قَضَاءً، وَهُوَ آثِمٌ.

(الدر المختار مع الشامي زكريا ۱۲/ ۶۰۷، كراچی ۸/ ٤٥٥)

اگر بحالتِ صحت کسی اولاد کو کلِ مال ہبہ کر دیا ہے تو جائز ہے، مگر باپ گنہگار ہوگا۔ اور شامی میں ہے کہ اگر سارا مال اپنے بیٹے کو ہبہ کر دیا تو قضاءً جائز ہے اور وہ گنہگار ہوگا۔

(۲) لاَ بَأْسَ بِأَنْ يُعْطِيَ مِنْ أَوْلَادِهِ مَنْ كَانَ عَالِمًا مُتَأَدِّبًا وَلَا يُعْطِيَ مِنْهُمْ مَنْ كَانَ فَاسِقًا فَاجِرًا.

(مجمع الأنهر بيروتي ۳/ ٤٩٧)

اس میں کوئی حرج نہیں کہ اپنی اولاد میں سے با ادب عالم کو دے دے اور ان میں سے جو فاسق وفاجر ہو اس کو کچھ بھی نہ دے۔

اور اگر ساری اولاد برابر ہیں کوئی بھی نافرمان نہیں ہے اور باپ زندگی میں تقسیم کر کے سب کو دیتا ہے، مگر بعض کو کچھ زیادہ اور بعض کو کم دیتا ہے اور دینے میں مساوات اور برابری قائم نہیں رکھتا ہے، مثلاً کوئی لڑکا حصول علم میں مشغول ہے اور اس کا کوئی دوسرا ذریعۂ معاش نہیں ہے، یا کوئی معذور اور مجبور ہے، یا کوئی ماں باپ کی خدمت زیادہ کرتا ہے؛ اس لئے اس کو دوسروں سے زیادہ دیتا ہے اور اس میں کسی کو نقصان اور ضرر پہنچانا بھی مقصد نہیں ہے، تو اس طرح زیادہ دینا مباح اور ''لابأس بہ'' کے درجہ میں ہے۔ اور اگر ایسی کوئی وجہ ترجیح نہیں ہے؛ بلکہ ساری اولاد کے حالات تقریباً برابر ہیں، اس کے باوجود بلا وجہ کسی کو زیادہ دیتا ہے اور کسی کو کم دیتا ہے، تو جس کو کم دیا جائے اس کو بالقصد نقصان وضرر پہنچانے کے مرادف ہوگا؛ کیوں کہ اس سے اندرونی طور پر اس کی دل شکنی اور دل آزاری لازم آئے گی، ایک باپ کے لئے ایسا کرنا مناسب نہیں ہے؛ اس لئے ایسا کرنا حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور جمہور علماء کے نزدیک مکروہ ہے؛ کیوں کہ اس میں بلا وجہ بعض اولاد کی دل شکنی ہے اور حدیث شریف کی خلاف ورزی بھی کی گئی ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْدِلُوا بَيْنَ أَوْلَادِكُمْ. (بخاری ۱/ ۳۵۲)

پس تم اللہ سے ڈرواور اپنی اولاد کے درمیان برابری کا معاملہ کرو۔

أَيَسُرُّكَ أَنْ يَكُوْنُوا إِلَيْكَ فِي الْبِرِّ سَوَاءً ؟ قَالَ: بَلٰى، فَقَالَ: فَلا إِذَنْ. (مسلم ۲/ ۲۷)

کیا تم کو یہ بات خوش کردے گی کہ وہ سب کے سب تمہارے ساتھ بھلائی کرنے میں برابر ہوں، تو کہا جی ہاں، تو آپ نے فرمایا: یہ بھی ایسا ہی ہے۔

اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

(۳) رُوِيَ عَنْ أَبِيْ حَنِيْفَةَ أَنَّهُ لَا بَأْسَ بِهٖ إِذَا كَانَ التَّفْضِيْلُ لِزِيَادَةِ فَضْلٍ لَهُ فِي الدِّيْنِ، فَإِنْ كَانَا سَوَاءً يُكْرَهُ. وَرَوَى الْمُعَلّٰى عَنْ أَبِيْ يُوْسُفَ أَنَّهُ لَابَأْسَ بِهٖ إِذَا لَمْ يَقْصِدْ بِهِ الإِضْرَارَ، وَإِنْ قَصَدَ بِهٖ الإِضْرَارَ سَوّٰى بَيْنَهُمْ.

(قاضیخان زکریا جدید ۳/ ۱۹۴، وعلی ھامش الهندية ۳/ ۲۷۹، تكمله شامي زكريا ۱۲/ ۶۰۸، كراچی ۸/ ۴۵۵)

حضرت امام ابوحنیفہؒ سے یہی مروی ہے کہ کسی کو دینی حیثیت سے فضیلت زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کو زیادہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ لہٰذا اگر دونوں برابر درجہ کے ہیں تو مکروہ ہوگا۔ اور حضرت معلّٰی رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابویوسفؒ سے یہی روایت فرمائی ہے کہ اگر زیادہ دینے میں ضرر ونقصان کا قصد نہ ہو تو کوئی حرج نہیں اور اگر ضرر ونقصان کا قصد ہے تو ان کے درمیان مساوات قائم کریں۔

مذکرّ ومؤنث کے درمیان مساوات

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ مذکر ومؤنث اولاد کے درمیان فرق کرتا ہے کہ مذکر کو زیادہ اور مؤنث کو کم دیتا ہے، تو اس طرح میراث کے اصول کے مطابق مذکر کو مؤنث کے مقابلہ میں دو گنا اور مؤنث کو مذکر کا نصف اور آدھا دینا کیسا ہے؟ تو اس بارے میں جمہور علماء کے درمیان

اختلاف ہے، چنانچہ اس میں دوفریق ہیں:

فریق اول: حضرت امام شافعیؒ، امام مالکؒ کے قول مشہور کے مطابق اور حنفیہ میں سے حضرت امام ابویوسفؒ کے نزدیک زندگی میں اولاد کے درمیان جائداد تقسیم کرکے مالک بنا دینے میں مذکر ومؤنث کے درمیان مساوات اور برابری قائم رکھنا مستحب ہے؛ لہٰذا لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر دینا مستحب ہوگا، اور اس کے خلاف کرنا مکروہ ہوگا۔ اور امام نوویؒ نے کراہت تنزیہی نقل فرمائی ہے۔ اور حنفیہ کا فتویٰ حضرت امام ابویوسفؒ کے قول پر ہے۔ اور وہ حضرات، حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت سے یہی مراد لیتے ہیں کہ مذکر ومؤنث دونوں میں برابری لازم ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی اس روایت سے بھی استدلال کرتے ہیں:

(۱) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَبَّاسٍؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: سَوُّوْا بَيْنَ أَوْلَادِكُمْ فِي الْعَطِيَّةِ فَلَوْ كُنْتُ مُفَضِّلًا أَحَدًا لَفَضَّلْتُ النِّسَاءَ. (المعجم الكبير ۱۱/ ۲۸۰، رقم: ۱۱۹۹۷)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم اپنی اولاد کے درمیان ہبہ اور عطیہ میں مساوات اور برابری قائم رکھو؛ لہٰذا اگر میں کسی کو عطیہ میں فضیلت دیتا تو عورتوں کو مردوں پر فضیلت دیتا۔

فریق ثانی: حنابلہ اور حنفیہ میں سے حضرت امام محمدؒ بن حسن شیبانیؒ کے نزدیک لڑکیوں کو لڑکوں کے برابر دینا مستحب نہیں؛ بلکہ تقسیم میراث کے اصول کے مطابق لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ کے ضابطہ سے ایک لڑکے کو دو لڑکیوں کے حصے کے برابر دینا ہوگا، یہی امام شافعیؒ کا بھی ایک قول ہے؛ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں تاکید کے ساتھ یہی حکم بیان فرمایا ہے؛ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ تقسیم کے طریقہ کو اختیار کرنا زیادہ اولیٰ اور زیادہ بہتر ہوگا، اور اس لئے بھی یہی طریقہ زیادہ بہتر ہے کہ باپ یہ سمجھتا ہے کہ اب موت کا وقت قریب ہے اور موت کے بعد اولاد کے درمیان کوئی جھگڑا پیدا نہ ہوجائے؛ لہٰذا اس طرح جھگڑے اور اختلاف کو ختم کرنے کے لئے پہلے ہی تقسیم کرکے ان کو دے دیا جائے اور آئندہ کسی طرح کے اختلاف کا خطرہ نہ ہو تو یہ بہتر اور مناسب اقدام ہے۔ حضرات فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمائیے:

(۲) يُعْطِي الْبِنْتَ كَالابْنِ عِنْدَ الثَّانِيْ، وَعَلَيْهِ الْفَتْوٰى. وَتَحْتَهُ فِي هَامِشِهِ: أَيْ عَلٰى قَوْلِ أَبِيْ يُوْسُفَ التَّنْصِيْفُ بَيْنَ الذَّكَرِ وَالأُنْثٰى أَفْضَلُ مِنَ التَّثْلِيْثِ الَّذِيْ هُوَ قَوْلُ مُحَمَّدٍ قَالَ فِي الْبَزَّازِيَةِ: اَلأَفْضَلُ فِيْ هِبَةِ الْبِنْتِ وَالابْنِ التَّثْلِيْثُ كَالْمِيْرَاثِ، وَعِنْدَ الثَّانِيْ التَّنْصِيْفُ وَهُوَ الْمُخْتَارُ (إلى قوله) وَقَالَ مُحَمَّدٌ: يُعْطِى لِلذَّكَرِ ضِعْفَ مَا يعطي للأنثى وَالْفَتْوٰى عَلٰى قَوْلِ أَبِيْ يُوْسُفَ. (درمختار مع هامشه، زكريا ١٢/ ٧/ ٦٠٧، قاضيخان زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩)

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک لڑکی کو لڑکے کے برابر دے اور اسی پر فتویٰ ہے، اور حاشیہ میں ہے یعنی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر فتویٰ ہے، مذکر ومؤنث کے درمیان نصف نصف کرنا اس تثلیث سے بہتر ہے جو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، اور بزازیہ میں کہا ہے کہ لڑکی اور لڑکے کو ہبہ کرنے میں میراث کی طرح تین حصے کرنا زیادہ افضل ہے، اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دو حصے کرنا ہے، وہی قول مختار ہے اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مذکر کو اس کا دو چند دیا جائے جو مؤنث کو دے اور قولِ ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ پر فتویٰ ہے۔

شیخ وہبہ زحیلی نے اس کو بہت واضح الفاظ سے نقل فرمایا، ملاحظہ فرمائیے:

(۳) قَالَ أَبُوْ يُوْسُفُ مِنَ الْحَنَفِيَّةِ وَالْمَالِكِيَّةُ وَالشَّافِعِيَّةُ وَهُوَ رَأْىُ الْجَمْهُوْرِ يُسْتَحَبُّ لِلأَبِ أَنْ يُسَوِّىَ بَيْنَ الْأَوْلَادِ الذُّكُوْرِ

حنفیہ میں سے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور مالکیہ، شافعیہ نے کہا اور یہی جمہور کی رائے ہے کہ باپ کے لئے مستحب یہی ہے کہ اپنی اولاد مذکر ومؤنث کے درمیان عطیہ اور ہبہ کرنے میں مساوات اور

وَالإِنَاثِ فِي الْعَطِيَّةِ فَتُعْطِي الْأُنْثٰى مِثْلَ مَا يُعْطِي الذَّكَرَ (إلى قوله) وَقَالَ الْحَنَابِلَةُ وَمُحَمَّدٌ مِنَ الْحَنَفِيَّةِ: لِلْأَبِ أَنْ يُقَسِّمَ بَيْنَ أَوْلَادِهِ عَلٰى حَسْبِ قِسْمَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى فِي الْمِيْرَاثِ فَيُجْعَلُ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ، لِأَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَسَّمَ بَيْنَهُمْ كَذٰلِكَ وَأَوْلٰى مَا اقْتُدِيَ بِهٖ هُوَ قِسْمَةُ اللّٰهِ الخ. (الفقه الإسلامي ٤ / ٧٠٤)

برابری قائم رکھے؛ لہٰذا مؤنث کو مذکر کے ہم مثل دے دے۔اور حنابلہ اور حنفیہ میں سے امام محمدؒ نے فرمایا باپ کے لئے افضل یہی ہے کہ اپنی اولاد کے درمیان اسی طرح تقسیم کردے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے میراث میں تقسیم فرمایا ہے؛ لہٰذا مذکر کو دو مؤنثوں کے حصے کے برابر دیا کرے؛ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان ایسے ہی تقسیم فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ کی تقسیم کی پیروی کرنا زیادہ اولی اور زیادہ افضل ہے۔

الحاصل: پوری تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ صرف مذکر اولاد کے درمیان تقسیم میں مساوات قائم رکھنا جمہور علماء کے نزدیک مستحب ہے اور کم زیادہ دینا مکروہ تنزیہی ہے، اور کسی کو دینا اور کسی کو بالکل محروم کردینا ظلم ہے اور باپ گنہگار ہوگا بشرطیکہ کوئی بھی نافرمان نہ ہو، اسی طرح مؤنث اولاد میں بھی برابری قائم رکھنا مستحب ہے اور مذکر ومؤنث کے درمیان مساوات کا مسئلہ اختلافی ہے، فریقِ اول حدیث نعمان بن بشیرؓ کے پیش نظر مساوات کے قائل ہیں۔اور فریقِ ثانی اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ تقسیم میراث کے پیش نظر مساوات کے قائل نہیں، اگرچہ اکثریت فریقِ اول کی ہے، مگر دلیل فریقِ ثانی کی زیادہ مضبوط ہے۔

(۲) وصیت کی شکل: زندگی میں تقسیم کر کے وصیت کر دینا

سوال نامہ میں اسی شکل کی وضاحت طلب کی گئی ہے کہ باپ اپنی زندگی میں اولاد کے درمیان

تقسیم کرکے ہبہ کرنا نہیں چاہتا اور پوری زندگی مالک ہی رہنا چاہتا ہے اور یہ بھی نہیں چاہتا ہے کہ اس کی موت کے بعد اس کی اولاد اور ورثاء کے درمیان کوئی اختلاف اور جھگڑے کی نوبت آجائے اور اس کو اس بات کا خطرہ ہے کہ اس کی موت کے بعد ورثاء کے درمیان تقسیمِ میراث کا جھگڑا کھڑا ہوجائے گا اور ہر وارث کو اپنا اپنا حقِ میراث صحیح طور پر نہیں مل پائے گا، تو اس کے لئے ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے کہ تقسیمِ میراث کے اصول کے مطابق اپنی نگرانی میں زندگی ہی میں تقسیم نامہ تیار کرکے ہر ایک کا شرعی حصہ متعین کرکے وصیت کردے اور اس کی موت کے بعد اسی وصیت کے مطابق ہر وارث اپنے اپنے متعین حصہ کو حق میراث کے طور پر قبضہ کرلے، آیا اس کے لئے اس طرح زندگی میں ورثاء کے درمیان پیشگی میراث تقسیم کرکے وصیت کردینا جائز ہے یا نہیں؟ کیا یہ ''لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ إِلَّا أَنْ يُجِيزَ الْوَرَثَةُ'' الحديث. (دارقطني ۴/ ۸۶، رقم: ۴۲۵۲، سنن بیہقی رقم: ۱۲۸۰۳) کے خلاف تو نہیں، تو اس بارے میں کوئی صریح جزئیہ جواز اور عدم جواز سے متعلق احقر کی نظر سے نہیں گذرا، مگر خود اسی حدیث شریف کے ہر پہلو پر غور کرنے سے اس کا جواز سمجھ میں آجاتا ہے، پہلے پوری حدیث شریف نقل کردیتے ہیں تاکہ اس کے الفاظ پر اچھی طرح غور ہوسکے۔ حضرت ابوامامہ باہلیؓ کی روایت ترمذی اور ابوداؤد میں ان الفاظ کے ساتھ وارد ہے۔

(۱) عَنْ أَبِي أُمَامَةَ الْبَاهِلِيِّ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ فِي خُطْبَتِهِ عَامَ حَجَّةِ الْوَدَاعِ: إِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالىٰ قَدْ أَعْطَى كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ. (ترمذي ۲/ ۳۲، رقم: ۲۱۲۰، أبوداؤد ۲/ ۳۹۶، رقم: ۲۸۷۰)

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے سال میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے خطبہ میں ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یقیناً اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر صاحبِ حق کو اس کا حق متعین کرکے دے دیا ہے؛ لہٰذا کسی بھی وارث کے لئے وصیت درست نہیں۔

دار قطنی شریف اور سنن بیہقی میں حضرت عمرو بن خارجہؓ کی روایت میں ”إِلَّا أَنْ يُجِيْزَ الْوَرَثَةُ“ کے الفاظ کا اضافہ ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں ”إلا أن يجيز“ کے بجائے ”إلا أن يشاء“ کے الفاظ ہیں۔ اب حدیث شریف کے الفاظ پر دو طرح سے غور کرنا ہے:

(۱) ”قَدْ أَعْطٰى كُلَّ ذِىْ حَقٍّ حَقَّهٗ“ ان الفاظ میں صاحبِ شریعت نے واضح فرمایا ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے ہر وارث کا حق متعین کرکے مقرر کر دیا ہے، اس کو اس متعین حق سے زیادہ نہیں ملے گا؛ لہٰذا ”لاَ وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ“ کا مطلب واضح ہوگیا کہ اس متعین حصہ سے ہٹ کر وصیت کے ذریعہ الگ سے کچھ نہیں ملے گا، اب اگر مُورِث اپنی موت سے قبل زندگی میں اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حصوں کو ہر متوقع وارث کے لئے متعین کرکے نامزد کر دے اور مورِث کی موت کے بعد ورثاء آپس میں مورث کے تیار کردہ تقسیم نامہ کو وصیت کے مطابق عملی جامہ پہنا دیں تو حدیث مذکور کی خلاف ورزی لازم نہیں آئے گی؛ بلکہ اس حدیث پر صحیح طور پر عمل کے لئے ایک خوبصورت پیش قدمی ہے؛ اس لئے زندگی میں اس طرح میراث کے اصول کے مطابق تقسیم کرکے اس پر عمل کرنے کی وصیت کر دینا بلاشبہ جائز اور درست ہوگا۔

(۲) حدیث شریف کا دوسرا جزو ”فَلاَ وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ إِلَّا أَنْ يُجِيْزَ الْوَرَثَةُ“ اس جزو پر غور کرنا ہے کہ وارث کے لئے نفس وصیت جائز ہے یا نہیں؟ حرف استثناء سے واضح ہوا کہ ورثاء کے لئے نفسِ وصیت جائز ہے، بس اس کا نفاذ دیگر ورثاء کی اجازت پر موقوف ہوتا ہے؛ کیوں کہ جن ورثاء کے متعین حق میں وصیت کی وجہ سے نقصان پہنچتا ہے ان کی مرضی کے بغیر نفاذ ممکن نہیں اور جب وہ بخوشی اپنا حق چھوڑ کر نفاذِ وصیت پر راضی ہو جائیں تو وصیت نافذ بھی ہو جاتی ہے؛ لہٰذا اس سے واضح ہوگیا کہ ورثاء کے حق میں نفس وصیت بنصِّ حدیث بالاتفاق صحیح اور درست ہے۔ اور ممانعت کے پہلو کا تعلق صرف کسی وارث کے حق میں نقصان پہنچنے سے ہے۔ اور جب مورث نے اپنی زندگی میں اولاد ذکور اور اولاد اناث اور بیوہ کے درمیان تقسیم کر دیا اور موت کے بعد اسی تقسیم کے مطابق میراث وصول کرنے کی وصیت کر دی تو کسی بھی وارث کے حق میں نقصان نہیں پہنچتا؛ بلکہ ہر ایک کو اپنا اپنا حق شریعت کے قانون کے

مطابق مکمل مل جاتا ہے، کسی کو کسی قسم کے نقصان کا خطرہ نہیں ہے؛ اس لئے زندگی میں نصِّ قرآنی کے ضابطہ کے مطابق تقسیم کر کے وصیت کر دینا بلاشبہ جائز ہوگا۔

مسلمان غیر مسلم کا وارث بن سکتا ہے یا نہیں؟

تمام اُمّت کا اس بات پر اجماع اور اتفاق ہے کہ غیر مسلم کسی بھی مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا اور اُمّت میں کسی نے بھی اس میں اختلاف نہیں کیا؛ البتہ اختلاف اس بارے میں ہے کہ مسلمان کسی غیر مسلم کا وارث بن سکتا ہے یا نہیں؟، چنانچہ اس مسئلہ میں دو فریق ہیں:

فریق اول: جمہورِ امّت جمہور صحابہ، تابعین، ائمہٴ اربعہ اور جمہور فقہاء کے نزدیک جس طرح غیر مسلم کسی مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا اسی طرح مسلمان بھی کسی غیر مسلم کا وارث نہیں بن سکتا، ان کی دلیل وہ حدیثِ مشہور ہے جو صحاح کی ہر کتاب میں موجود ہے۔ حدیث شریف ملاحظہ فرمایئے:

(۱) عَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لايَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ. (بخاري ۲/ ۱۰۰۱، رقم: ٦٥٠٧، مسلم شريف ۲/ ۳۳، رقم: ١٦١٤، ترمذي ۲/ ۳۱، رقم: ۲۱۰۷)

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ مسلمان کافر کا وارث نہیں بن سکتا اور نہ ہی کافر مسلمان کا وارث بن سکتا ہے۔

دوسری روایت مصنف ابن ابی شیبہ میں اصولی الفاظ کے ساتھ موجود ہے:

(۲) عَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لا يَتَوَارَثُ الْمِلَّتَانِ الْمُخْتَلِفَانِ. (مصنف ابن أبي شيبة ١٦/ ٣٣٠، رقم: ٣٢٠٨٨)

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ دو مختلف ملت والے ایک دوسرے کے وارث نہیں بن سکتے۔

فریق ثانی: دوسرے فریق میں حضرات صحابہ میں سے حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ اور تابعین میں سے حضرت امام حسن بصریؒ، امام سعید بن مسیّبؒ، امام مسروق بن اجدعؒ، امام محمد بن الحنفیہؒ اور امام باقر محمد بن علی بن حسینؒ کے نزدیک کافر تو مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا، مگر مسلمان کافر کا وارث بن سکتا ہے؛ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو بلند فرمایا اور مسلمانوں کو کافروں پر عزت وشرف اور بلندی عطا فرمائی ہے۔ یہ حضرات اپنے مدعی کے ثبوت میں مختلف دلائل پیش کرتے ہیں:

(۱) سنن دارقطنی اور سنن بیہقی کی مشہور روایت ہے ملاحظہ فرمایئے:

(۱) عَنْ عَائِذِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّهُ جَاءَ يَوْمَ الْفَتْحِ مَعَ أَبِي سُفْيَانَ بْنِ حَرْبٍ إِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم وَحَوْلَهُ أَصْحَابُهُ، فَقَالُوْا: هٰذَا أَبُوْ سُفْيَانَ وَعَائِذُ بْنُ عَمْرٍو فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: هٰذَا عَائِذُ بْنُ عَمْرٍو وَأَبُوْ سُفْيَانَ اَلْإِسْلَامُ أَعَزُّ مِنْ ذٰلِكَ، اَلْإِسْلَامُ يَعْلُوْ وَلَا يُعْلٰى. (السنن الكبرى للبيهقي ۹/ ۲۳۳، رقم: ۱۲۳۹۹، سنن دارقطني ۳/ ۱۷۲، رقم: ۳۵۷۸، بخاري شريف تحت ترجمة الباب، الجنائز ۱/ ۱۸۰)

حضرت عائذ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ بیشک وہ فتح مکہ کے دن ابوسفیان بن حرب کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس حالت میں آئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد صحابہ کرامؓ موجود تھے، تو صحابہ کرام نے فرمایا: کہ یہ ابوسفیان اور عائذ بن عمرو ہیں (جو قریش کے باعزت سردار ہیں) اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام (میں داخل ہونے والے) ان سے زیادہ باعزت ہیں، اور اسلام عزت وشرف میں بلند وبرتر ہے اور اسلام پر کوئی چیز بلند وبرتر نہیں۔

اس کو صاحبِ شریفیہ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

(۲) وَالْقِيَاسُ أَنْ يَرِثَ لِقَوْلِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ: اَلْإِسْلَامُ يَعْلُوْ

اور قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمان وارث بن جائے آپ کے قول: اسلام بلند ہوتا ہے اور

وَلاَ یُعْلٰی، وَمِنَ الْعُلُوِّ أَنْ یَرِثَ الْـمُسْـلِمُ مِنَ الْکَافِرِ وَلاَ یَرِثُ الْـکَـافِرُ مِنْهُ، وَإِلَیْهِ ذَهَبَ مُعَاذُ بْـنُ جَبَـلٍ وَمُـعَـاوِیَةُ بْـنُ أَبِـیْ سُـفْیَـانَ وَالْـحَسَـنُ الْبَصَرِيُّ وَمُـحَمَّدُ بْنُ الْحَنَفِیَّةُ وَمُحَمَّدُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ حُسَیْنٍ وَمَسْرُوْقٌ.

(شریفیه/ ١٤)

اس کے اوپر کسی کی بلندی نہیں ہوتی اور بلندی میں سے یہی ہے کہ مسلمان کافر کا وارث بن جائے اور کافر مسلمان کا وارث نہ بنے، اور یہی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ، امام باقرؒ محمد بن علی بن حسینؒ اور امام مسروق رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔

اس کو امام نوویؒ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

(٣) وَذَهَـبَ طَائِفَةٌ إِلٰی تَوْرِیْثِ الْمُسْلِمِ مِنَ الْکَافِرِ وَهُوَ مَذْهَبُ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍؓ وَمُعَاوِیَةَ وَسَعِیْدِ بْـنِ الْـمُسَیِّـبِ وَمَسْـرُوْقٍ وَغَیْـرِهِمْ، وَاحْتَجُّوا بِحَدِیْثِ "اَلإِسْلاَمُ یَعْلُو وَلاَ یُعْلٰی عَلَیْهِ".

(نووي علی المسلم ٢/ ٣٣)

اور ایک جماعت کا مذہب ہے کہ کافر کی میراث کا مسلمان وارث بنے گا اور وہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ حضرت معاویہؓ حضرت امام سعید بن مسیّبؒ، امام مسروقؒ وغیرہ کا مذہب ہے اور وہ لوگ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں: کہ اسلام بلند وبرتر ہے اور اس پر کسی کو برتری حاصل نہیں۔

اس کو فتاوی تاتارخانیہ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

(٤) لاَ خِلاَفَ أَنَّ الْکَافِرَ لاَ یَرِثُ الْمُسْلِمِیْنَ بِحَالٍ، وَکَذٰلِکَ الْـمُسْـلِـمُ لاَ یَرِثُ الْکَافِرَ فِيْ قَوْلِ أَکْثَرِ الصَّحَابَةِؓ وَهُوَ مَذْهَبُ

اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ کافر مسلمانوں کا کسی بھی حال میں وارث نہیں بن سکتا اور ایسا ہی اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قول کے مطابق مسلمان بھی کافر کا وارث نہیں بن سکتا

الْـفُـقَهَـاءِ. وَرُوِيَ عَـنْ مُـعَاذٍ وَمُـعَاوِيَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا أَنَّهُمَا قَالَا: يَرِثُ الْوَارِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ. (الفتاوى التاتارخانية ۲۰/ ۳۹۵، رقم: ۳۳۵۳٤)

اور یہی فقہاء کرامؒ کا مذہب ہے۔ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان دونوں نے فرمایا کہ مسلمان وارث کافر کا وارث بن سکتا ہے۔

اور یہ حضرات حسب ذیل روایات سے بھی استدلال کرتے ہیں:

مصنف ابن ابی شیبہ میں ان دونوں صحابہ کرامؓ کی کئی روایات ہیں، ملاحظہ فرمایئے:

(٤) عَـنْ أَبِـي الْأَسْوَدِ الدَّيْلِي قَالَ: كَانَ مُعَاذٌ بِالْيَمَنِ فَارْتَفَعُوا فِي يَهُودِيٍّ مَاتَ وَتَرَكَ أَخَاهُ مُسْلِمًا فَقَالَ مُعَاذٌ: إِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: إِنَّ الْإِسْلَامَ يَزِيدُ وَلَا يَنْقُصُ فَوَرَّثَهُ. (مصنف ابن أبي شيبة ١٦/ ٣٣٤، رقم: ٣٢١٠١، السنن الكبرى للبيهقي ۹/ ۳۳۷، رقم: ۱۲۷۲۳)

حضرت ابوالاسود دیلیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبلؓ یمن میں تھے، لوگوں نے ایک یہودی کا معاملہ ان کے پاس پیش فرمایا، جو یہودی مرگیا تھا اور اس نے ایک مسلمان بھائی کو چھوڑا تھا، تو حضرت معاذ بن جبلؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اسلام زیادہ اور اضافہ ہوکر آگے بڑھتا ہے اور اس میں کمی نہیں ہوتی ہے، پھر حضرت معاذؓ نے مسلمان بھائی کو اس یہودی کا وارث بنادیا۔

حضرت عبداللہ بن معقلؒ فرماتے ہیں: کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے فیصلہ کے بعد حضرت معاویہؓ کے فیصلہ سے بہترین اور خوبصورت فیصلہ ہم نے دوسرا کوئی نہیں دیکھا اور انہوں نے مسلمان کو اہل کتاب کا وارث بنا کر فرمایا کہ ہم ان کے وارث ہوتے ہیں اور وہ ہمارے وارث نہیں ہوسکتے۔ حدیث شریف ملاحظہ فرمایئے:

(٦) عَـنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَعْقَلٍ قَالَ: مَـا رَأَيْـتُ قَـضَـاءً بَعْدَ قَضَاءِ أَصْحَابِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحْسَنَ مِنْ قَضَاءٍ قَـضَـى بِـهِ مُـعَاوِيَةُ فِي أَهْلِ

حضرت عبداللہ بن معقل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے فیصلہ کے بعد کوئی بھی فیصلہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے فیصلہ سے زیادہ خوبصورت فیصلہ نہیں دیکھا، انہوں نے اہل

الْـكِتَـابِ، قَـالَ: نَـرِثُهُـمْ وَلَا يَرِثُوْنَنَا. (مصنف ابن أبي شيبة ١٦/ ٣٣٤، رقم: ٣٢١٠٢)

کتاب کے بارے میں فیصلہ کر کے فرمایا: کہ ہم ان کے وارث ہوتے ہیں اور وہ ہمارے وارث نہیں ہوسکتے۔

الحاصل: اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ فریق اول کے نزدیک جس طرح غیر مسلم کسی مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا، اسی طرح مسلمان بھی غیر مسلم کا وارث نہیں بن سکتا، یہی امت میں تواتر کے ساتھ مشہور ہے۔اور فریقِ ثانی کے نزدیک کافر تو مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا، مگر مسلمان کافر کا وارث بن سکتا ہے۔اور جانبین کے دلائل بھی سامنے آچکے ہیں۔اب اس تناظر میں علماء وقت کوغور کرنا ہے کہ ہندوستان جیسے غیر اسلامی ممالک میں فریقِ ثانی کی رائے پر عمل کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر فریقِ ثانی کی رائے پر ان ممالک میں پیش آمدہ مسائل اور مشکلات میں دینی مصلحت کے پیش نظر عمل کیا جائے تو شاید نامناسب نہ ہوگا۔اور نو مسلموں کی پریشانیاں اس سے ختم ہوسکتی ہیں۔

وارث کے لئے دیگر ورثاء کی مرضی سے وصیت

کسی شرعی وارث کے حق میں دیگر ورثاء کی مرضی اور اجازت کے بغیر وصیت کرنا شرعاً معتبر نہیں،ہاں البتہ اگر اس وارث کی کسی مجبوری یا زیادہ خدمت کی وجہ سے مورث کی خواہش ہے کہ اس کو کچھ زیادہ مل جائے اور مورث زندگی میں ہبہ کر کے قبضہ بھی نہیں دینا چاہتا ہے؛ بلکہ یہ چاہتا ہے کہ موت تک اپنی ملکیت سے خارج نہ ہو اور مرنے کے بعد موصی لہ کو حاصل بھی ہوجائے اور مورث دیگر ورثاء سے رابطہ قائم کر کے سب کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کردے اور دیگر تمام ورثاء نے مورث کے سامنے اس کی زندگی میں بخوشی تحریری رضامندی ظاہر کردی اور سب نے بخوشی اجازت دیدی،تو کیا مورث کی موت کے بعد اسی اجازت اور رضامندی سے وصیت نافذ ہوجائے گی؟ یا مورث کی موت کے بعد دوبارہ اجازت لازم اور ضروری ہوگی؟ تو اس بارے میں جمہور فقہاء کا اتفاق اس بات پر ہے کہ موت سے قبل زندگی میں جو اجازت دی گئی تھی،اس کا اعتبار نہیں؛ بلکہ موت کے بعد کی اجازت کا اعتبار ہوتا ہے۔اور دیگر ورثاء کو پورا اختیار ہے کہ چاہے مورث کی اجازت کو نافذ کردیں یا زندگی کی

اجازت کومسترد کردیں؛ لہٰذا زندگی کی اجازت کا اعتبار ہی نہیں بلکہ وہ اجازت کالعدم ہے۔ اورموت کے بعد کی اجازت معتبر ہوتی ہے۔ یہ حکم حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں ان الفاظ سے وارد ہوا ہے:

(۱) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَاتَجُوْزُ الْوَصِيَّةُ لِوَارِثٍ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ الْوَرَثَةُ. (السنن الكبرى للبيهقي ۹/ ۳۵٦، رقم: ۱۲۷۹۷-۱۲۷۹۸، دارقطني ٤/ ۸٦، رقم: ٤۲٥۱)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ کسی بھی وارث کے لئے وصیت صحیح نہیں ہوتی ہے، مگر یہ کہ دیگر ورثاء اس پر رضامندی ظاہر کردیں۔

اورحضرت عمرو بن خارجہؓ کی روایت میں کچھ فرق کے ساتھ یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

(۲) عَنْ عَمْرِو بْنِ خَارِجَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ إِلَّا أَنْ يُجِيْزَ الْوَرَثَةُ. (السنن الكبرى للبيهقي ۹/ ۳٥۸، رقم: ۱۲۸۰۳، دارقطني ٤/ ۸٦، رقم: ۲٤٥۲)

حضرت عمرو بن خارجہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ کسی وارث کے حق میں وصیت درست نہیں ہے، مگر یہ کہ دیگر ورثاء بخوشی اس کی اجازت دے دیں۔

موت کے بعد کی اجازت پر فقہاء کی وضاحت

حضرات فقہاء بھی اس کوخوب وضاحت سے نقل فرماتے ہیں، چنانچہ علامہ شمس الدین آفندیؒ تکملہ فتح القدیر میں صاف الفاظ سے نقل فرماتے ہیں: کہ زندگی کی اجازت درحقیقت اجازت ہی نہیں ہے؛ بلکہ موت کے بعد ہی کی اجازت درحقیقت اجازت ہے۔ ان کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

(٣) إِنَّ إِجَازَتَهُمْ فِيْ حَالِ حَيَاةِ الْمُوْرِثِ سَاقِطَةٌ؛ لِأَنَّ إِجَازَتَهُمْ فِيْ ذٰلِكَ الْوَقْتِ غَيْرُ مُعْتَبَرَةٍ أَصْلاً. (تكملة فتح القدير زكريا ١٠/ ٤٤٨، دار الفكر ١٠/ ٤١٧، كوئٹه ٩/ ٣٤٧)

بے شک ان کی اجازت مورث کی زندگی کی حالت میں ساقط الاعتبار ہے؛ اس لئے کہ اس وقت ان کی اجازت سرے سے معتبر ہی نہیں ہے۔

اورصاحبِ ہدایہؒ فرماتے ہیں کہ زندگی کی اجازت بے محل ہے؛ اس لئے کہ زندگی میں ورثاء کو اس مال میں کسی قسم کا حق حاصل نہیں ہے اور جس چیز میں کوئی حق نہیں ہے اس میں کسی کو اجازت دینے اور نہ دینے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ اور ورثاء کو مورث کی موت کے بعد ہی حق حاصل ہوتا ہے؛ لہٰذا زندگی کی اجازت کالعدم ہوگی اگر چہ اس پر تحریری دستخط بھی ہو گئے ہوں۔ اور مورث کی موت کے بعد ہی کی اجازت صحیح ہو سکتی ہے، اس وجہ سے مورث کی موت کے بعد دیگر ورثاء کو پورا اختیار ہے کہ چاہے موت کے بعد اجازت دے دیں اور چاہے نہ دیں، اگر اجازت دیں گے تو اس وارث کے حق میں وصیت نافذ ہو جائے گی ورنہ نہیں۔ عبارت ملاحظہ فرمایئے:

(٤) وَلاَ مُعْتَبَرَ بِإِجَازَتِهِمْ فِيْ حَالِ حَيَاتِهِ؛ لِأَنَّهَا قَبْلَ ثُبُوْتِ الْحَقِّ إِذِ الْحَقُّ يَثْبُتُ عِنْدَ الْمَوْتِ، فَكَانَ لَهُمْ أَنْ يَرُدُّوْهُ بَعْدَ وَفَاتِهِ بِخِلَافِ مَابَعْدَ الْمَوْتِ؛ لِأَنَّهُ بَعْدَ ثُبُوْتِ الْحَقِّ فَلَيْسَ لَهُمْ أَنْ يَرْجِعُوا عَنْهُ الخ. (هدايه رشيديه ٤/ ٦٣٩، الأمين كتابستان ٤/ ٦٥٥)

اور اس کی زندگی کی حالت میں ان کی اجازت معتبر نہیں؛ اس لئے کہ یہ اجازت ثبوتِ حق سے قبل ہے؛ کیوں کہ حق موت کے وقت ثابت ہوتا ہے؛ لہٰذا ان کے لئے مورث کی وفات کے بعد اجازت کو مسترد کر دینے کا حق حاصل ہے، بخلاف مابعد الموت کے اس لئے کہ موت کے بعد کی اجازت حق کے ثابت ہونے کے بعد ہوتی ہے؛ لہٰذا موت کے بعد کی اجازت کے بعد رجوع کرنا ان کے لئے جائز نہیں۔

صاحبِ بدائع جمہور علماء کی رائے نقل فرمانے کے ساتھ علامہ ابن ابی لیلیٰؒ کا قول بھی نقل

فرماتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک زندگی کی اجازت معتبر نہیں بلکہ موت کے بعد کی اجازت ہی معتبر ہوتی ہے، مگر علامہ ابن ابی لیلیٰ فرماتے ہیں کہ زندگی کی اجازت بھی معتبر ہوتی ہے۔ ان کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

(٥) ثُمَّ وَقْتُ الإجَازَةِ هُوَ مَا بَعْدَ مَوْتِ الْمُوْصِي، وَلا تُعْتَبَرُ الإجَازَةُ حَالَ حَيَاتِهِ حَتّٰى أَنَّهُمْ لَوْ أَجَازُوْا فِيْ حَيَاتِهِ لَهُمْ أَنْ يَرْجِعُوا عَنْ ذٰلِكَ بَعْدَ مَوْتِهِ، وَهٰذَا قَوْلُ عَامَّةِ الْعُلَمَاءِ، وَقَالَ ابْنُ أَبِي لَيْلیٰ: تَجُوْزُ إِجَازَتُهُمْ بَعْدَ مَوْتِهِ وَحَالَ حَيَاتِهِ، فَإِذَا أَجَازُوْا فِيْ حَيَاتِهِ فَلَيْسَ لَهُمْ أَنْ يَرْجِعُوا بَعْدَ مَوْتِهِ، وَلا خِلافَ فِي أَنَّهُمْ إِذَا أَجَازُوْا بَعْدَ مَوْتِهِ لَيْسَ لَهُمْ أَنْ يَرْجِعُوا بَعْدَ ذٰلِكَ الخ. (بدائع زكريا ٦/ ٤٨٣، كراچی ٧/ ٣٧٠)

پھر اجازت کا وقت وہ موصی کی موت کے بعد ہے اور اس کی زندگی میں اجازت معتبر نہیں حتی کہ اگر زندگی میں اجازت دی ہے، تو ان کو مورث کی موت کے بعد رجوع کرنے کا حق ہوگا اور یہ جمہور علماء رحمہم اللہ کا قول ہے۔ اور علامہ ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ زندگی اور بعد موت دونوں حالتوں کی اجازت جائز ہے؛ لہٰذا جب زندگی میں اجازت دے دیں، تو موت کے بعد ان کو رجوع کرنے کا حق نہیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جب موت کے بعد اجازت دے دیں، تو بعد میں ان کو رجوع کا حق حاصل نہیں۔

جمہور کا قول راجح اور مفتیٰ بہ ہے اور ''اعلاء السنن بیروت ۱۸/ ۳۲۹'' میں ابن ابی لیلیٰؒ کے ساتھ حسن بصریؒ، عطاءؒ، حمادؒ اور اوزاعیؒ وغیرہ کو ذکر فرمایا ہے، مگر ان کا قول مرجوح ہے؛ لہٰذا زندگی کی اجازت معتبر نہ ہوگی۔ اور موت کے بعد کی اجازت معتبر ہوسکتی ہے۔

وارث کے حق میں وصیت کے عدم جواز کی حکمت

شریعت اسلامی نے قانون بنادیا ہے کہ وارث کے حق میں وصیت نافذ نہیں ہوگی۔ اور اجنبی افراد کے حق میں نافذ ہوجائے گی، اس کے پیچھے کیا حکمت اور کیا راز ہے؟ اسلام نے ہر ایک

کا حق اعتدال میں رکھا ہے۔ ’’لاضرر ولاضرار‘‘ نہ تم خود نقصان کا شکار بنو اور نہ ہی تم سے کسی کو نقصان پہنچے، چنانچہ وارث کے حق میں وصیت نافذ نہ ہونے اور اجنبی کے حق میں نافذ ہونے کی دو حکمتیں یہاں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) پہلی حکمت: حدیث پاک میں وارد ہوا ہے کہ حضرت سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کا حق متعین کردیا ہے، چنانچہ ہر وارث کا حق قرآن مقدس کی سورۂ ’’نساء‘‘ میں واضح کرکے بیان فرمادیا ہے، ان کو وہی متعین حق ملا کرے گا؛ لہٰذا اگر کسی ایک کے حق میں وصیت کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس متعین حق میں ترمیم کرتا ہے، جس سے اس وارث کے حق میں اضافہ ہوگا اور دوسرے وارث کے حق میں کمی لازم آجائے گی جسکی وجہ سے اعتدال سے ہٹ جانا لازم آتا ہے۔ اور اجنبی کے لئے کوئی حق اللہ تعالیٰ نے متعین نہیں فرمایا؛ اس لئے اس کے حق میں وصیت کی اجازت دی گئی، مگر اس میں موصی کو اس بات کا پابند بنایا گیا ہے کہ تہائی سے زائد کی اجازت نہیں، جیسا کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی حدیث میں اس کی وضاحت ہے، جو اپنی جگہ پیش کی جائے گی۔ حکمت کی حدیث ملاحظہ فرمایئے:

(۱) عَنْ أَبِي أُمَامَةَ الْبَاهِلِيِّ ؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ فِيْ خُطْبَتِهٖ عَامَ حَجَّةِ الْوَدَاعِ: إِنَّ اللهَ تَبَارَكَ وَتَعَالىٰ قَدْ أَعْطَى كُلَّ ذِيْ حَقٍّ حَقَّهٗ فَلاَ وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ.

(ترمذي ۲/ ۳۲، رقم: ۲۱۲۰، أبوداؤد ۲/ ۳۹۶، رقم: ۲۸۷۰)

حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حجۃ الوداع کے سال حضور ﷺ سے اپنے خطبہ میں فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر حقدار کا حق متعین کردیا ہے؛ لہٰذا کسی بھی وارث کے حق میں وصیت درست نہیں۔

(۲) دوسری حکمت: یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہر ایک وارث کا حق متعین کرکے مقرر کردیا ہے تو ہر وارث کو متروکہ مال میں سے اپنا اپنا حق مکمل وصول کرنے کا حق ہے؛ لیکن

جب کسی وارث کے حق میں وصیت کی جائے گی تو اس کو اپنے مقررہ حق سے زیادہ مل جائے گا اور دوسرے ورثاء کو متعین اور مقررہ حق پورا نہیں ملے گا؛ بلکہ ان کے حق میں کچھ حصہ اس وارث کے حصہ میں پہنچ جائے گا جس کے حق میں وصیت کی گئی ہے۔ اور ایسی صورت میں دیگر ورثاء کا حق مارا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے ان کی دل شکنی اور ان کے ساتھ قطع رحمی لازم آجاتی ہے، جس سے ان کو سخت ایذا اور تکلیف پہنچنے کا خطرہ ہے، اس سے بچنے کے لئے شریعت نے وارث کے حق میں وصیت کی اجازت نہیں دی، تاکہ اعتدال باقی رہے۔اس کو صاحبِ ہدایہ نے ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

(۲) لِأَنَّهُ يَتَأَذّى الْبَعْضُ بِإِيْثَارِ الْبَعْضِ، فَفِي تَجْوِيْزِهِ قَطِيْعَةُ الرَّحِمِ. (هداية رشيديه ٤/ ٦٤١، الأمين كتابستان ٤/ ٦٥٧)	اس لئے کہ بیشک بعض ورثاء کو ترجیح دینے سے دوسرے بعض کو ایذا اور تکلیف پہنچتی ہے، پس اس کو جائز قرار دینے میں قطع رحمی لازم آتی ہے۔

بعض نے اجازت دی بعض نے نہیں دی

اگر مُورِث موصی کے انتقال کے بعد دیگر ورثاء میں سے بعض نے موصی کی وصیت کے مطابق اجازت دے دی اور بعض نے اجازت نہیں دی، تو ایسی صورت میں حکم شرعی یہ ہے کہ جن ورثاء نے اجازت نہیں دی ہے، ان کو متروکہ مال میں سے جو شرعی حق ملنا تھا وہی مکمل مل جائے گا اور جن ورثاء نے اجازت دی ہے ان کو جو میراث میں سے شرعی حق ملنا تھا اس میں سے حق کے تناسب کے حساب سے کم کر کے وصیت نافذ ہو جائے گی۔اس کو صاحبِ ہدایہ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

(۱) وَلِأَنَّ الْاِمْتِنَاعَ لِحَقِّهِمْ فَتَجُوْزُ بِإِجَازَتِهِمْ، وَلَوْ أَجَازَ	اور بیشک وصیت پر رکاوٹ پیدا کرنا ان کے اپنے حق کی وجہ سے ہے؛ لہٰذا ان کی اجازت سے

بَعُضٌ وَرَدَّ بَعُضٌ تَجُوزُ عَلَى الْمُجِيزِ بِقَدُرِ حِصَّتِهِ لِوَلايَتِهِ عَلَيْهِ، وَبَطَلَ فِي حَقِّ الرَّادِّ.

(هدايه رشيديه ٤ / ٦٤١، الأمين كتابستان ٤ /٦٥٧)

جائز اور جاری ہوجائے گی اور اگر بعض ورثاء نے اجازت دے دی اور بعض نے مسترد کر کے روک لگا دی ہے، تو جس نے اجازت دی اسکے حصہ کے تناسب سے کمی کر کے وصیت نافذ ہوجائے گی اور جس نے رد کر کے اجازت نہیں دی اس کے حق میں وصیت باطل ہوجائیگی۔

بیوہ کے لئے شوہر کی وصیت

یہ مسئلہ بھی آج کے دور میں زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ جب آدمی لاولد ہو اور اس کے پاس کچھ سرمایہ ہو تو قریب یا دور کے رشتہ داروں کی نگاہ اس کے سرمایہ پر ہوتی ہے۔ اور اس کی وفات کے بعد ہر طرف سے حقدار نکل آتے ہیں اور اس کی بیوہ بے سہارا ہو جاتی ہے، اب اس تناظر میں شوہر اپنی زندگی میں پیش قدمی کر کے بیوی کے حق میں کچھ انتظام کر دے، اسکے لئے سب سے بہتر شکل یہی ہے کہ بیوی کو حسب مناسب سرمایہ کا معقول حصہ ہبہ کر کے قبضہ دے دے؛ لیکن اگر ہبہ کی شکل اختیار کرنا نہیں چاہتا ہے؛ اس لئے کہ آج کے زمانہ میں ہبہ کی رجسٹری کے لئے بھی تقریباً بیع نامہ کی رجسٹری کے برابر اسٹامپ فیس لازم ہے، اس خرچہ سے بچنا چاہتا ہے یا یہ چاہتا ہے کہ زندگی میں مالِ متروکہ اس کے قبضہ اور اختیار سے باہر نہ نکل جائے؛ اس لئے وہ یہی مناسب سمجھتا ہے کہ بیوی کے نام سرمایہ کا کچھ حصہ وصیت کر دے، تو ایسے حالات میں اگر شوہر کا کوئی دوسرا وارث نہیں ہے، تو جتنے سرمایہ اور مال کی وصیت کریگا اتنے میں وصیت نافذ ہوجائے گی۔ اور بیوی کو شوہر کی وفات کے بعد وصیت کی وجہ سے متروکہ مال سے وہ مقدار مل جائے گی اور اس کے بعد مابقیہ کی چوتھائی بھی میراث کی وجہ سے مل جائے گی؛ کیوں کہ اولاد کے نہ ہونے کی صورت میں بیوی کا حق میراث میں چوتھائی حصہ ہے؛ لہٰذا بیوہ کو دو طرح کے مال مل جائیں گے: (۱) وصیت سے (۲) میراث سے۔ اور اگر شوہر کا دوسرا وارث بھی ہو تو شوہر کی وفات کے بعد وارث کی اجازت کے بغیر بیوہ کے حق

میں وصیت نافذ نہ ہوگی، ہاں البتہ اگر بیوہ کا حق میراث کے کل مال کا چوتھائی حصہ ہے اسی کے لئے وصیت نامہ بنا کر رجسٹری کر کے قانونی شکل دیدی ہے، تو اس کے نفاذ میں وارث کی اجازت کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ مسئلہ حضرات فقہاء کی اس طرح کی عبارات سے مستفاد ہوتا ہے۔ تاتارخانیہ میں ہے:

(۱) اِمْرَأَةٌ هَلَكَتْ وَتَرَكَتْ زَوْجًا وَلَا وَارِثَ لَهَا غَيْرُهُ (قوله) فَإِنْ كَانَتْ أَوْصَتْ لِلزَّوْجِ بِنِصْفِ الْمَالِ، فَالْمَالُ كُلُّهُ لِلزَّوْجِ النِّصْفُ بِحُكْمِ الإِرْثِ، وَالنِّصْفُ بِحُكْمِ الْوَصِيَّةِ، وَكَذٰلِكَ لَوْ تَرَكَتْ عَبْدَيْنِ قِيْمَتُهُمَا سَوَاءٌ أَوْصَتْ لِزَوْجِهَا بِأَحَدِ الْعَبْدَيْنِ بِعَيْنِهٖ فَهُمَا جَمِيْعًا لِلزَّوْجِ أَحَدُهُمَا بِحُكْمِ الإِرْثِ وَالآخَرُ بِحُكْمِ الْوَصِيَّةِ. (تاتارخانية ۲۰/ ۱٦۲، رقم: ۳۲۸۸۸)

ایک عورت کی موت ہوگئی اور شوہر کو وارث چھوڑا اور اس کے علاوہ کوئی وارث نہیں، پس اگر اس نے شوہر کے لئے نصف مال کی وصیت کی ہے تو کل ترکہ شوہر کو مل جائے گا، نصف حصہ میراث کی وجہ سے اور دوسرا نصف وصیت کی وجہ سے۔ اور اسی طرح اگر عورت نے دو غلام چھوڑیں دونوں کی قیمت برابر ہے اور دونوں میں سے متعین ایک کی وصیت شوہر کے لئے کردی ہے، تو دونوں شوہر کو مل جائیں گے، ایک میراث کی وجہ سے دوسرا وصیت کی وجہ سے

اور اسی طرح کی عبارت مبسوط سرخسی میں بھی ہے، ملاحظہ فرمایئے:

(۲) قَالَ فِي الزِّيَادَاتِ: فِي امْرَأَةٍ لَا وَارِثَ لَهَا إِلَّا زَوْجُهَا فَأَوْصَتْ لَهُ بِنِصْفِ مَالِهَا، فَإِنَّهُ يَأْخُذُ النِّصْفَ بِالْمِيْرَاثِ ثُمَّ النِّصْفَ الْبَاقِيْ بِالْوَصِيَّةِ. (مبسوط ۲۹/ ۲)

زیادات میں اس عورت کے بارے میں کہا ہے، جس کا شوہر کے علاوہ کوئی وارث نہیں ہے، پس اس نے شوہر کے لئے اپنے نصف مال کی وصیت کردی، تو شوہر نصف مال میراث کی وجہ سے لے لیگا، پھر باقی نصف وصیت کی وجہ سے حاصل کرلے گا۔

اور درمختار میں ہے کہ زوجین کے علاوہ جب کوئی وارث نہ ہو اور میاں بیوی دونوں میں سے ایک نے دوسرے کے لئے وصیت کردی ہے، تو وصیت درست ہو جاتی ہے۔ اس کو علامہ حصکفیؒ نے ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

حَتّٰى لَوْأَوْصٰى لِزَوْجَتِهٖ أَوْهِيَ لَهٗ وَلَمْ يَكُنْ ثَمَّةَ وَارِثٌ آخَرُ تَصِحُّ الْوَصِيَّةُ. (درمختار مع الشامي، زكريا ١٠/ ٣٤٧، كراچی ٦/ ٦٥٦)

حتی کہ اگر شوہر نے اپنی زوجہ کے لئے یا بیوی نے شوہر کے لئے وصیت کردی ہے اور وہاں دوسرا وارث نہیں ہے، تو بلاشبہ وصیت صحیح اور درست ہو جاتی ہے۔

وارث اور اجنبی کے حق میں ایک ساتھ وصیت

یہ مسئلہ واضح ہو چکا ہے کہ وارث کے حق میں دیگر ورثاء کی اجازت کے بغیر وصیت نافذ نہیں ہوتی ہے۔ اور اجنبی غیر وارث کے حق میں ثلث مال میں وصیت نافذ ہو جاتی ہے۔ اگر ثلثِ مال سے زائد کی وصیت کرے گا تب بھی صرف ثلث ہی کے دائرہ میں وصیت نافذ ہوتی ہے، اب اگر مالک نے اپنے ورثاء واجنبی شخص دونوں کو ایک ساتھ وصیت کردی ہے، تو بعض حضرات نے فرمایا کہ پورا ثلث مال اجنبی کو مل جائے گا اور وارث کے حق میں وصیت باطل ہو جائے گی۔ اور وہ لوگ کہتے ہیں: وارث محل وصیت ہی نہیں ہے۔ (بدائع زکریا دیوبند ۶/ ۴۳۴) تو ان کا یہ قول درست نہیں ہے؛ اس لئے کہ وارث کے حق میں وصیت باطل ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سرے سے وصیت کا وجود ہی نہیں ہوتا اور وہ محلِ وصیت ہی نہیں ہوتا؛ بلکہ اس کا مطلب یہی ہے کہ دیگر ورثاء کی اجازت پر وصیت موقوف رہتی ہے اور جب دیگر ورثاء اجازت دیں گے تو اس کے حق میں بھی نافذ ہو جاتی ہے، تو ایسی صورت میں پورا ثلثِ مال اجنبی کو کیسے مل سکتا ہے؟ اور وارث کو محلِ وصیت سے خارج کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے؟ اور جمہور امت کا قول یہ ہے کہ: اگر مالک نے اجنبی اور وارث دونوں کے حق میں وصیت کردی ہے اور موصی کی موت کے بعد دیگر ورثاء وارث کے حق میں نفاذ وصیت کی اجازت

دے دیں تو ثلثِ مال وصیت کی وجہ سے اجنبی اور وارث کے درمیان نصف نصف کے حساب سے تقسیم ہوجائے گا، یعنی اجنبی اور وارث دونوں کو کل مال میں سے چھٹا چھٹا حصہ مل جائے گا اور اگر موصی کی موت کے بعد دیگر ورثاء اجازت نہ دیں تو وارث کے حصہ میں وصیت باطل ہوجائے گی اور اجنبی کے حصہ میں نافذ ہوجائے گی اور اجنبی کو ثلث مال کا نصف حصہ یعنی کل مال کا چھٹا حصہ مل جائے گا۔ اس کو صاحب بدائع نے ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

(۱) وَلَوْ أَوْصٰى بِثُلُثِ مَالِهٖ لِبَعْضِ وَرَثَتِهٖ وَلِأَجْنَبِيٍّ، فَإِنْ أَجَازَ بَقِيَّةُ الْوَرَثَةِ جَازَتِ الْوَصِيَّةُ لَهُمَا جَمِيْعًا، وَكَانَ الثُّلُثُ بَيْنَ الْأَجْنَبِيِّ وَبَيْنَ الْوَارِثِ نِصْفَيْنِ، وَإِنْ رَدُّوا جَازَتْ فِيْ حِصَّةِ الْأَجْنَبِيِّ وَبَطَلَتْ فِيْ حِصَّةِ الْوَارِثِ. وَقَالَ بَعْضُ النَّاسِ: يُصْرَفُ الثُّلُثُ كُلُّهٗ إِلَى الْأَجْنَبِيِّ؛ لِأَنَّ الْوَارِثَ لَيْسَ بِمَحَلِّ الْوَصِيَّةِ الخ. (بدائع زكريا ٦/ ٤٣٤، كراچی ٧/ ٣٣٨، مبسوط سرخسي ٢٧/ ١٧٥)

اور اگر اپنے ثلثِ مال کی بعض ورثاء اور اجنبی کے لئے وصیت کردی تو اگر بقیہ ورثاء نے موصی کی موت کے بعد اجازت دے دی ہے، تو وصیت وارث اور اجنبی دونوں کے حق میں نافذ ہوجائے گی اور ثلثِ مال وارث اور اجنبی دونوں کے درمیان نصف نصف تقسیم ہوجائے گا۔ اور اگر دیگر ورثاء (موتِ موصی کے بعد) مسترد کردیں تو اجنبی کے حصہ میں وصیت نافذ ہوجائے گی اور وارث کے حصہ میں باطل ہوجائے گی۔ اور بعض لوگوں نے کہا کہ ثلثِ مال کل کا کل اجنبی کو مل جائے گا؛ اس لئے کہ وارث محلِ وصیت نہیں ہے۔

اور بعض لوگوں نے جو یہ کہا کہ کلِ ثلث اجنبی کو مل جائے گا اور وارث کو محلِ وصیت سے خارج کردیا ہے، یہ قول صحیح نہیں ہے، جیسا کہ مذکورہ عبارات سے واضح ہوچکا ہے۔

ایک تہائی سے زائد کی وصیت

ہر شخص کو شریعت نے اس بات کا اختیار دے رکھا ہے کہ وہ اپنے مالِ متروکہ میں سے ایک تہائی کسی کو دینے کے لئے وصیت کردے، چاہے کسی مسجد یا مدرسہ یا دیگر کار خیر میں یا کسی انسان کو دینے کی وصیت کردے، تو اس کو تہائی کے دائرہ میں اختیار ہے اور تہائی سے زائد میں اس کو شریعت نے اجازت نہیں دی۔ اور تہائی سے زائد میں نفاذِ وصیت کا مدار اس کے ورثاء کی اجازت پر ہے، اب اس پس منظر میں اگر مالکِ مال نے ورثاء سے اجازت لے کر تہائی سے زائد میں وصیت کردی ہے، تو اس کی موت کے بعد یہ وصیت نافذ ہوگی یا نہیں؟ تو اس بارے میں موصی لہ دو طرح کے ہو سکتے ہیں:

(۱) موصی لہ جس کے لئے وصیت کی جارہی ہے وہ مالک مال (موصی) کا وارث ہو، تو ایسی صورت میں وصیت مقدار تہائی کے دائرہ میں ہو یا تہائی سے زائد، دونوں صورتوں میں موصی کی موت کے بعد دیگر ورثاء کی اجازت کے بغیر وصیت نافذ نہیں ہوگی، اگر اجازت دے دیں تو تہائی میں اور تہائی سے زائد دونوں میں نافذ ہوجائے گی۔ اور اگر دیگر ورثاء مورث موصی کی موت کے بعد اجازت نہ دیں تو وصیت نہ تہائی میں نافذ ہوگی اور نہ ہی زائد میں؛ بلکہ پوری وصیت باطل ہوجائے گی۔ اور اگر زندگی میں دیگر ورثاء سے تحریری اجازت بھی لے لی ہے، تو اس کا بھی اعتبار نہ ہوگا۔ اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

(۱) إِذَا تَرَكَ الرَّجُلُ اِبْنَيْنِ فَأَوْصٰى لِأَحَدِهِمَا بِنِصْفِ مَالِهِ، فَأَجَازَ ذٰلِكَ لَهُ أَخُوهُ أَخَذَ نِصْفَ الْمَالِ بِالْوَصِيَّةِ وَالْبَاقِي بَيْنَهُمَا نِصْفَانِ، لِأَنَّ الْوَصِيَّةَ بِمَازَادَ عَلَى الثُّلُثِ وَالْوَصِيَّةُ لِلْوَارِثِ إِنَّمَا تَمْتَنِعُ لِحَقِّ الْوَرَثَةِ، فَإِنَّ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم قَالَ: لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ إِلَّا أَنْ يُجِيزَ الْوَرَثَةُ فَإِذَا وُجِدَتِ الْإِجَازَةُ فَقَدْ زَالَ الْمَانِعُ فَيَأْخُذُ الْمُوْصٰى لَهُ نِصْفَ الْمَالِ بِطَرِيقِ

جب مورث آدمی نے اپنے دو لڑکوں کو چھوڑا پس دونوں میں سے ایک کیلئے اپنے نصف مال کی وصیت کردی، پھر (موت) کے بعد اس کے بھائی نے اس کے لئے وصیت جائز رکھا ہے، تو وہ وصیت کی وجہ سے مال کا نصف حصہ لے لے گا اور باقی دوسرا نصف دونوں بھائیوں کے درمیان نصف نصف تقسیم ہوجائیگا؛ کیوں کہ یہ وصیت ثلث مال پر زائد ہے اور وارث کے حق میں دیگر ورثاء کے حق کی وجہ سے وصیت ممنوع ہوتی ہے، اسلئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وارث کیلئے وصیت نہیں، مگر یہ کہ دیگر ورثاء اس کو جائز رکھیں، پس جب اجازت پائی گئی تو یقیناً مانع اور رکاوٹ زائل ہوگی؛ لہٰذا موصی لہ وصیت

الْوَصِيَّةِ، وَيَبْقَى مَالُهُ النِّصْفُ الْبَاقِي فَيَكُونُ بَيْنَ الإِثْنَيْنِ نِصْفَيْنِ بِالْمِيْرَاثِ. (مبسوط للسرخسي ۲۹/ ۲)

کی وجہ سے نصف مال لے لیگا اور رہ گیا مال کا باقی نصف تو یہ نصف دونوں کے درمیان میراث کی وجہ سے نصف نصف تقسیم ہو جائے گا۔

(۲) ایسا موصی لہ جو موصی کا وارث نہ ہو؛ بلکہ اجنبی غیر وارث ہو، اور اس کے حق میں تہائی سے زائد کی وصیت کردی ہے، تو ایسی صورت میں ورثاء کی اجازت کے بغیر تہائی کے دائرہ میں وصیت نافذ ہو جائے گی؛ اس لئے کہ شریعت نے مورث موصی کو تہائی میں پورا اختیار دے رکھا ہے، البتہ تہائی سے جو کچھ زائد ہے اس میں وصیت نافذ ہونے کے لئے ورثاء کی اجازت لازم اور شرط ہے۔ اور اگر مُورِث (موصی) نے زندگی میں ورثاء سے تحریری طور پر بھی اجازت لے لی ہے، تو اس کا بھی اعتبار نہیں ہوگا؛ اس لئے کہ زندگی میں مالِ متروکہ میں ورثاء کا کوئی حق ثابت نہیں ہوتا اور حق کے ثبوت سے قبل اس میں اجازت کا تصرف بھی ثابت نہیں ہوسکتا؛ لہٰذا زندگی کی اجازت سرے سے کالعدم ہے اور موت کے بعد مستقل اجازت لازم ہوگی۔ اس کو صاحب ہدایہ نے ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

(۲) وَلَا تَجُوْزُ بِمَا زَادَ عَلَى الثُّلُثِ إِلَّا أَنْ يُجِيْزَهَا الْوَرَثَةُ بَعْدَ مَوْتِهِ وَهُمْ كِبَارٌ، لِأَنَّ الْإِمْتِنَاعَ لِحَقِّهِمْ، وَهُمْ أَسْقَطُوْهُ وَلَا مُعْتَبَرَةَ بِإِجَازَتِهِمْ فِيْ حَالِ حَيَاتِهِ لِأَنَّهَا قَبْلَ ثُبُوْتِ الْحَقِّ إِذَا الْحَقُّ يَثْبُتُ عِنْدَ الْمَوْتِ فَكَانَ لَهُمْ أَنْ يَرُدُّوْهُ بَعْدَ وَفَاتِهِ. (هدايه رشيديه ۴/ ۶۳۹)

اور ثلث مال سے زائد وصیت جائز نہیں، مگر یہ کہ موصی کی موت کے بعد ورثاء اس کی اجازت دیں، اس حالت میں کہ سارے ورثاء بڑے ہوں؛ کیوں کہ ممانعت انہیں کے حق کی وجہ سے ہے۔ اور انہوں نے اپنے حق کو چھوڑ دیا اور موصی مورث کی حالِ حیات میں ان ورثاء کی اجازت معتبر نہیں؛ اس لئے کہ یہ اجازت ثبوت حق سے پہلے ہے؛ کیوں کہ حق موت کے بعد ثابت ہوتا ہے؛ لہٰذا ان ورثاء کے لئے اس موصی کی وفات کے بعد اجازت کو مسترد کردنے کا حق حاصل ہے۔

ضروری وضاحت

ورثاء کی اجازت معتبر ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ اجازت دینے والے سارے ورثاء عاقل بالغ ہوں اور کوئی بھی وارث نابالغ نہ ہو؛ لہٰذا اگر کوئی نابالغ ہو تو اس کے حصہ میں وصیت کی وجہ سے کمی نہیں آئیگی، اس کو اپنا مکمل شرعی حق مل جائے گا، جیسا کہ "هم كبار" کے الفاظ سے واضح ہو چکا ہے۔

مقالہ کا خلاصہ

(۱) اگر زندگی میں اولاد کے درمیان سرمایہ تقسیم کرنا ہے، تو اس کی تفصیل مضمون کے شروع میں دلائل کے ساتھ پیش کی جاچکی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر ساری نرینہ اولاد باپ کے حق میں برابر ہیں، کوئی نافرمان نہیں تو سب کے درمیان مساوات باپ پر لازم ہے اور اگر کوئی نافرمان ہے تو اس کو نہ دے کر محروم کردیا جائے اور فرماں بردار اور باادب کو دے دیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ اور اسی طرح اگر کوئی علم دین میں لگا ہوا ہے اور اس کے پاس معاشی ذرائع نہیں ہے، یا کوئی معذور اور مجبور ہے اس کو دوسروں سے زیادہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(۲) زندگی میں تقسیم کرکے مالک بنانے میں مذکرّ ومؤنث کے درمیان مساوات کا مسئلہ اختلافی ہے۔

حنفیہ میں سے حضرت امام ابویوسفؒ کے نزدیک اور حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام مالکؒ کے قولِ مشہور کے مطابق لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر دینا مستحب ہے اور اس کے خلاف لڑکوں کو لڑکیوں سے زیادہ دینا مکروہ تنزیہی ہے۔

حضرت امام محمد بن حسن شیبانیؒ اور حنابلہ کے نزدیک اولی اور افضل یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ ضابطہ کے مطابق تقسیم میراث کے اصول کی رعایت کرتے ہوئے ایک لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر دینا چاہئے۔ دونوں فریق کے دلائل تفصیلی طور پر مضمون میں پیش کئے جاچکے ہیں۔

(۳) زندگی میں تقسیم کرکے مالک نہ بنایا جائے؛ بلکہ زندگی میں ملکیت اپنی رہے گی اور موت کے بعد ورثاء کو شرعی حق بلا کسی اختلاف اور نزاع کے پورا پورا مل جائے، اس کے لئے زندگی ہی میں انتظام کردیا جائے۔

چنانچہ تقسیمِ میراث کے اصول کے مطابق زندگی میں تقسیم کرکے ہر متوقع وارث کا حصہ متعین کردیا جائے اور اس بات کی وصیت کردی جائے کہ موت کے بعد اسی تقسیم نامہ کے مطابق ہر وارث اپنے اپنے حصے پر قبضہ کرلے، تو اس طرح تقسیم نامہ تیار کرکے وصیت کردینا بلا کراہت جائز اور درست ہے، تاکہ موت کے بعد کسی وارث کی حق تلفی کی نوبت نہ آسکے، اس کے بھی تفصیلی دلائل مضمون میں مذکور ہیں۔

(۴) مسلمان غیر مسلم کا وارث بن سکتا ہے یا نہیں؟ تو جمہور کے نزدیک مسلمان بھی اسی طرح غیر مسلم کا وارث نہیں بن سکتا ہے کہ جس طرح غیر مسلم مسلمان کا نہیں بن سکتا، مگر حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت امام حسن بصریؒ، امام سعید بن مسیّبؒ، امام محمد بن الحنفیہؒ، حضرت محمد بن علی بن حسینؒ (امام باقر) وغیرہ کے نزدیک مسلمان غیر مسلم کا وارث بن سکتا ہے؛ لہٰذا ہندوستانی نومسلموں کی مشکلات کے تناظر میں مصلحت اور مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ فریقِ ثانی کی رائے پر عمل کی گنجائش کے بارے میں غور کیا جائے، اگر اس قول پر علماء کا اتفاق ہو جائے تو بہتر معلوم ہوتا ہے۔

(۵) کسی وارث کے لئے دیگر ورثاء کی مرضی کے بغیر وصیت درست نہیں، نیز دیگر ورثاء کی اجازت اور مرضی کا اعتبار بھی موت کے بعد ہی کا ہے۔ اور موت سے قبل کی اجازت معتبر نہیں، اسی طرح موت کے بعد اگر کسی نے اجازت دی ہے، تو اس کے حصہ میں وصیت کا اعتبار رہوگا اور جس نے اجازت نہیں دی اس کے حصہ میں وصیت کا اثر نہیں پڑے گا۔

(۶) دیگر ورثاء کی عدم موجودگی میں بیوہ کے حق میں وصیت درست ہے۔

(۷) وارث اور اجنبی کے حق میں ایک ساتھ وصیت کردی ہے، تو وارث کے حق میں جو وصیت ہے وہ موت کے بعد دیگر ورثاء کی اجازت پر موقوف رہے گی اور اجنبی کے حق میں ثلثِ مال کے نصف یعنی سدس میں ورثاء کی اجازت کے بغیر وصیت نافذ ہو جائے گی۔

(۸) ایک تہائی سے زائد کی وصیت کے نفاذ کا مدار ورثاء کی اجازت پر ہے؛ لہٰذا اگر وارث کے حق میں تہائی سے زائد وصیت کی گئی ہے تو دیگر ورثاء کی اجازت موتِ مورث کے بعد لازم ہے، ورنہ نافذ نہ ہوگی۔

اور اگر اجنبی کے حق میں تہائی سے زائد وصیت کی گئی ہے، تو تہائی کے اندر اندر وصیت نافذ ہو جائے گی، اس میں ورثاء کی اجازت شرط نہیں ہے، ہاں البتہ تہائی سے زائد میں وصیت کا نفاذ ورثاء کی اجازت پر موقوف رہے گا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ ہو الموفق والمعین

(مفتی) شبیر احمد قاسمی

دارالافتاء جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد

۲۸؍ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ

۶/باب: اشیائے موہوبہ میں وراثت کا بیان

موہوبہ مقبوضہ میں وراثت کا شرعی حکم

سوال [۹۵۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمد ہارون صاحب نے اپنی حیات میں اپنی جائیداد میں سے تھوڑا سا حصہ جس میں ایک مکان اور چار دوکان ہیں، اپنے لڑکے شاہنواز کی بیوی ریحانہ پروین کے نام کردیا ہے، جس کے کاغذات اور گواہ موجود ہیں، اب اس نام کردہ جائیداد میں مرحوم محمد ہارون صاحب کے وارثوں سے کسی کا کوئی حصہ قرآن وحدیث کی روشنی میں بنتا ہے یا نہیں؟ نیز اس ہبہ پر واہب کے بڑے بھائی بھی راضی ہیں اور ان کی موجودگی میں ہبہ ہوا اور جس بیٹے کی بیوی کو ہبہ کیا ہے اس بیٹے کے دیگر ایک بڑے بھائی اور ایک چھوٹے بھائی بھی اس ہبہ پر راضی ہیں، ان دونوں بڑے اور چھوٹے بیٹے کو بھی الگ سے ہبہ کیا ہے، سب کے دستخط درج ذیل ہیں۔ محمد عاصم، محمد یوسف، محمد نبی۔

المستفتی: محمد شاہنواز کٹگھر، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: محمد ہارون صاحب نے اپنے لڑکے شاہنواز کی اہلیہ ریحانہ پروین کو چار دوکانیں ہبہ کرنے کے بعد چونکہ اس پر قبضہ دے کر مالک بنادیا ہے، جس سے ہبہ تام ہوگیا ہے۔ اور اس کے اوپر گواہان موجود ہیں؛ اس لئے اب اس میں صرف ریحانہ پروین کا حق ہے، اس کے علاوہ دیگر شرعی ورثاء کا اس میں کوئی حق نہیں ہے۔ سوال نامہ میں مکان کو ہبہ کرنے کا بھی ذکر ہے؛ لیکن ہبہ نامہ میں کہیں بھی مکان کا نہ تذکرہ ہے اور نہ ہی اس کے ہبہ کرنے کا ذکر ہے؛ اس لئے مکان میں تمام شرعی وارثان کا حق متعلق ہوگا۔ اور محمد ہارون کی وفات کے وقت جتنے شرعی وارث موجود تھے، ان سب کا شرعی حق اس مکان میں سے نکلے گا۔

عن النضر بن أنس قال: نحلني أنس نصف داره، قال: فقال أبو بردة: إن سرك يجوز لك فاقبضه، فإن عمر بن الخطاب -رضي الله عنه- قضى في الأنحال أن ما قبض منه، فهو جائز، وما لم يقبض، فهو ميراث، قال: فدعوت يزيد الرشك، فقسمها. (السنن الكبرى للبيهقي، الهبات، باب ماجاء في هبة المشاع، دارالفكر ۹/ ۱۵۸، رقم: ۱۲۱۸٦)

وتصح بالإيجاب والقبول والقبض ...... قوله عليه السلام: لا يجوز الهبة إلا مقبوضة. (هداية، كتاب الهبة، أشرفي ديوبند ۳/ ۲۸۳)

وتتم بالقبض الكامل؛ لأنها من التبرعات، والتبرع لا يتم إلا بالقبض. (شرح المجلة رستم، إتحاد ۱/ ٤٦٢، رقم المادة: ۸۳۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۵۰۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۴/۲۳ھ

شئ موہوب میں وراثت کی شرعی حیثیت

سوال [۹۵۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے والد صاحب نے ایک مکان تقریباً ۱۶۰/گز (ایک سو ساٹھ گز) میرے نام ہبہ کیا اپنی حیات میں باہوش وحواس، میرے والد کی پہلی بیوی میری والدہ ہاجرہ خاتون تھیں، ان سے میں اور میری بڑی بہن جمیلہ خاتون تھیں، دوسری بیوی افسری بیگم تھیں، ان کے چار لڑکے: اظہر الدین، رئیس الدین، منہاج الدین، نعیم الدین اور تین لڑکیاں: ناظرہ بی، شبانہ بی، ریحانہ بی پیدا ہوئے۔ رئیس الدین کا انتقال ہو چکا ہے، والد صاحب نے یہ مکان ۱۹۷۸ء میں ہبہ کیا اور ۱۹۸۰ء میں بذریعہ عدالت بیان دے کر پختہ کیا، افسری بیگم کا انتقال ۱۹۸۵ء میں ہوا اور میرے والد صاحب کا انتقال ۱۹۸۳ء میں ہوا، اس سلسلے میں میرے اور

مندرجہ بالا کے درمیان مقدمہ عدالت میں زیر سماعت رہا اور اظہر الدین وغیرہ کے خلاف ڈگری ہوئی اور کمرہ خالی کرنے کے لئے حکم ہوا، میری خدا کے فضل وکرم سے فتح ہوئی۔ براہ کرم فتویٰ عنایت فرمائیں کہ اس ہبہ شدہ مکان میں میرے اور بھائی بہنوں کا کوئی حصہ نکلتا ہے یا میں تنہا مالک ہوں؟

المستفتی: ممتاز الدین محلّہ کسرول کاٹھ کا پل نزد مسجد بڑھیا والی، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر آپ نے ممتاز الدین کو پورا مکان ہبہ کر کے قبضہ دے دیا تھا اور جس حصہ میں آپ کے والد رہا کرتے تھے، اس کا آپ کے والد آپ کو کرایہ ادا کرتے تھے اور یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح اور درست بھی ہے، تو آپ کے حق میں پورے مکان کا حصہ صحیح ہو گیا ہے، دوسرے ورثاء کا حق اس میں متعلق نہ ہوگا۔

عن النضر بن أنس قال: نحلني أبي نصف داره، فقال أبو بردة: إن سرک أن تجوز ذلک فاقبضه، فإن عمر بن الخطاب –رضي الله عنه– قضى في الأنحال ما قبض منه فهو جائز، وما لم يقبض منه فهو ميراث. (المصنف لابن أبي شيبة، البيوع والأقضية من قال: لا تجوز الهبة إلا مقبوضة، موسسة علوم القرآن، جديد ١٠/ ٥٢١، رقم: ٢٠٥٠٢)

وتتم الهبة بالقبض الكامل. (درمختار، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٤٩٣، كراچى ٥/ ٦٩٠، هداية، أشرفي ٣/ ٢٨٣)

والتبرع لا يتم إلا بالقبض، فإذا وهب أحد لآخر شيئا لا تتم هبة إلا بقبضه. (شرح المجلة رستم، إتحاد ١/ ٤٢، رقم المادة: ٥٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ محرم الحرام ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۵۹۹۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶/۱/۱۴۲۰ھ

شئ موہوب میں وراثت جاری ہوگی یا نہیں؟

سوال [۹۵۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے ایک لڑکا اور تین لڑکیاں ہیں۔ اور زید کے دوطرح کی جائیداد ہیں، رہائشی اور زرعی، زید نے ان تین لڑکیوں میں سے ایک کو اپنی حیات میں کچھ جائیداد (زمین کی شکل میں) سرکاری رجسٹری کے ذریعہ اس کے نام کردیا، بقیہ ورثاء اس سے راضی ہیں یا نہیں اس کا علم نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ زید کی موت کے بعد تقسیم ترکہ میں اس لڑکی کے نام کی ہوئی زمین کو شامل کیا جائے گا یا نہیں؟ اور صرف زرعی زمین تقسیم ہوگی یا دونوں؟ اس سلسلے میں مدلل ومفصل شرعی حکم بیان فرماکر شکریہ کا موقع دیں؟

المستفتی: عبدالاحد قاسمی مدھوبنی، بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مسئولہ صورت میں اگر باپ نے اپنی جائیداد کا کچھ حصہ ایک بیٹی کے نام رجسٹری کراکے ہبہ کی نیت سے اسے قبضہ دلایا تھا، تو وہ لڑکی اس زمین کی شرعاً مالک ہوگئی، اب والد کے انتقال کے بعد ہبہ کردہ زمین مذکورہ لڑکی کو دے کر باقی ماندہ جائیداد (رہائشی اور زرعی دونوں) وارثین کے درمیان حسب حصص شرعیہ تقسیم ہوگی؛ البتہ زندگی میں ایک لڑکی کو دے کر دوسری اولاد کو محروم کرنے کے سبب باپ عنداللہ مواخذہ دار ہوگا۔

عن النعمان بن بشير -رضي الله عنه- أن أباه أتى به إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: إني نحلت ابني هذا غلاما، فقال: أكل ولدك نحلت مثله؟ قال: لا، قال: فارجعه. (بخاري شريف، كتاب الهبة، باب الهبة للولد الخ ١/ ٣٥٢، رقم: ٢٥١٤، ف: ٢٥٨٦)

الهبة للولد الكبير لا تتم إلا بقبضه. (البحرالرائق، كتاب الهبة، زكريا ديوبند ٧/ ٤٩٠، كوئٹه ٧/ ٢٨٨)

حكم الهبة ثبوت الملك للموهوب له. (الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٤/ ٤١٣، رقم: ٢١٥٣٧)

يكره تفضيل بعض الأولاد على البعض في الهبة حالة الصحة.

(البحر الرائق، زكريا ٧/ ٤٩٠، كوئٹه ٧/ ٢٨٨)

لا شك أن أعيان الأموال يجرى فيها الإرث. (تاتارخانية ٢٠/ ٢١٣، رقم: ٣٠٧٦ ٢٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۴۲۲/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۵/۲۹ھ

ہبہ مکمل ہونے کے بعد وہ ترکہ میں شامل نہ ہوگا

سوال [۹۵۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گزارش یہ ہے کہ ہمارے والد نور الٰہی صاحب مرحوم نے ایک مکان اپنے ذاتی سرمایہ سے خریدا، نور الٰہی صاحب مرحوم کی اولاد میں صرف ہم دو قمر جہاں و چندا بی لڑکیاں ہیں، ہمارے والد صاحب نے اپنی زندگی میں چند احباب کے سامنے زبانی ہبہ کر کے ہم دونوں بہنوں کو قمر جہاں و چندا بی کا مکان پر قبضہ کرا دیا اور کہا کہ تم دونوں قمر جہاں و چندا بی بہنیں اس مکان کی مالک ومختار ہو، ہمارے والد صاحب کے دو بھائی احسان الٰہی صاحب مرحوم اور محبوب الٰہی اور ایک بہن شاہجہاں ہیں۔ والد صاحب کے مرنے کے بعد ہمارے چچا احسان الٰہی صاحب نے ہم پر دعویٰ تقسیم کا عدالت میں کر دیا، کچھ عرصہ بعد ہمارے چچا احسان الٰہی صاحب کا بھی انتقال ہو گیا، ان کے بعد ایک بھائی ایک بہن اور بیوی ایک لڑکی جو کہ اپنے شوہر کے ساتھ علیحدہ مکان میں رہتی ہے، ان کو اس مکان کا وارث مقدمہ بنا دیا گیا، آپ یہ بتائیے گا کہ یہ دعوئے تقسیم اور وارث قائم کرنا کس حد تک جائز ہے، یا یہ کہ اس مکان میں ان کا

حصہ شرعاً جائز ہے کہ نہیں؟ جب کہ کچھ آدمیوں عزیزوں کے سامنے مکان کو ہبہ کردیا ہے، کیا کہتے ہیں علماء دین؟ فقط والسلام۔

المستفتی: دختران نورالٰہی مرحوم، قمر جہاں، چندابی، فیل خانہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب نورالٰہی مرحوم نے اپنی زندگی میں بحالت صحت مکان مذکور اپنی لڑکی قمر جہاں اور چندابی کے نام ہبہ کرکے قبضہ بھی دے دیا ہے، تو شرعی طور پر ہبہ کامل ومکمل ہو چکا ہے؛ لہٰذا نورالٰہی کے انتقال کے بعد اس کے ورثاء میں سے کسی کا کوئی حق ہبہ شدہ جائیداد کے ساتھ متعلق نہ ہوگا۔ اور ان کا اپنے حق کے لئے دعویٰ کرنا ہرگز جائز نہ ہوگا۔

عن النضر بن أنس قال: نحلني أبي نصف داره، فقال أبو بردة: إن سرک أن تجوز ذلک فاقبضه، فإن عمر بن الخطاب –رضي الله عنه– قضى في الأنحال ما قبض منه فهو جائز، وما لم يقبض منه فهو ميراث. (المصنف لابن أبي شيبة، البيوع والأقضية من قال: لا تجوز الهبة إلا مقبوضة، موسسة علوم القرآن، جديد ١٠/ ٥٢١، رقم: ٢٠٥٠٢)

الهبة تصح بالإيجاب والقبول، وتتم بالقبض. (الجوهرة، كتاب الهبة، إمداديه ملتان ٢/ ٩، دارالكتاب ديوبند ٢/ ١٠، مختصر القدوري، ص: ١٣٥، هداية، أشرفي ٣/ ٢٨٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷رمحرم الحرام ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۹۷۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۱۳/۱/۱۷ھ

ہبہ تام میں وراثت جاری نہیں ہوتی

سوال [۹۵۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے والد صاحب صرف دو بھائی ہیں، میرے دادا صاحب نے اپنی حیات میں ہی کچھ

زمین میرے والد صاحب کے نام بطور تبرع کے کردی تھی، چونکہ وہ معاشی اعتبار سے کمزور تھے، جب دادا صاحب کا انتقال ہوا تو ان کی تمام متروکہ اشیاء میرے چچا صاحب کے قبضہ میں تھیں، انہوں نے ان کو اپنے صرفہ میں کرلیا اور میرے والد صاحب کو کچھ بھی نہیں دیا اور اب وہ والد صاحب سے اس زمین کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں جو دادا صاحب نے اپنی زندگی میں انتقال سے تقریباً تیس پینتیس سال پہلے رجسٹری یعنی بیع نامہ کردی تھی، اس وقت سے مالک وقابض والد صاحب ہی چلے آرہے تھے، تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس زمین میں بھی میراث جاری ہوگی یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ وہ تمام اشیاء جو چچا صاحب کے پاس قبضہ میں تھیں، ان میں والد صاحب کا حصہ تھا یا نہیں؟

المستفتی: شفیق احمد قاسمی، کوتوالی بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کے دادا نے جب باضابطہ بیع نامہ کر کے قبضہ میں دے دیا تھا، تو شرعاً وہ جائیداد آپ کے والد کی تنہا ملکیت ہوچکی ہے، اس میں کسی وارث کا حق نہیں ہے۔

عن النضر بن أنس قال: نحلني أنس نصف داره، قال: فقال أبو بردة: إن سرک یجوز لک فاقبضه، فإن عمر بن الخطاب –رضي الله عنه– قضی في الأنحال أن ما قبض منه، فهو جائز، وما لم یقبض، فهو میراث، قال: فدعوت یزید الرشک، فقسمها. (السنن الکبری للبیهقي، الهبات، باب ماجاء في هبة المشاع، دارالفکر ۹/ ۱۵۸، رقم: ۱۲۱۸۶)

الهبة: عقد مشروع –إلی قوله– وتصح بالإیجاب والقبول والقبض.

(هدایة، کتاب الهبة، أشرفی ۳/ ۲۸۳، مختصر القلوري، ۱۳۵)

اور پھر آپ کے دادا کی وفات کے وقت ان کی ملکیت میں جو کچھ تھی، اس میں آپ کے والد کا بھی شرعی حق ہے، جو میراث میں حصص شرعی کے طور پر ملتا ہے؛ لہٰذا دادا کا ترکہ

جس کے قبضہ میں ہے اس پر لازم ہے کہ وہ تمام حق داروں کو ان کا حق دے دے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍شوال ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۶۳۴۴)

شئ موہوب میں موہوب لہ کے علاوہ کسی کا حصہ نہیں

سوال [۹۵۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یعنی ساجد وخالد کے والد محمد یونس مرحوم کی نانی صاحبہ جمنی بی نے اپنی بیٹی ہاجرہ بی اور داماد جان محمد کے ہوتے ہوئے اپنی جائیداد مکان نمبر: ۵۰۰؍ا اپنے تین نواسوں (محمد یونس، محمد متین، محمد ایوب) کو Gift (تحفہ) کے طور پر رجسٹری کراکے دے دیا تھا، ۵۰؍سال پہلے سرکاری ریکارڈ پر انہیں تین نواسوں کا نام باقاعدہ خسرا کاپی پر لکھا ہوا ہے، یہ تین نواسے جمنی بی کی بیٹی ہاجرہ کے بیٹے ہیں، ان تینوں کے علاوہ اور بھی بیٹی اور بیٹے ہاجرہ کے ہیں، ہم دونوں بھائی ساجد وخالد اسی مکان میں رہتے ہیں، یہ مکان ہمارے دادا جان محمد کی ساس صاحبہ جمنی بی کا تھا، جنھوں نے اپنے تین نواسوں کو دیا ہے، جان محمد کی اپنی کوئی جائیداد نہیں تھی، ہمارے والد محمد یونس صاحب کا انتقال جمنی بی کے انتقال کے بعد اور جان محمد کے انتقال سے پہلے ہوا ہے، جان محمد کی اولاد ان تینوں کے علاوہ اور بھی ہے، متین اور ایوب، ان لوگوں کا کہنا ہے کہ مکان نمبر: V-500 جان محمد کے تمام وارثوں میں تقسیم ہونا چاہئے، ان لوگوں نے مقامی پنچ صاحبوں کو جمع کیا، پنچ لوگ بھی کہتے ہیں کہ جان محمد کے تمام وارثین کا حصہ ہونا چاہئے، ہمیں اس پر مجبور کیا جارہا ہے، جب کہ یہ جائیداد جمنی بی کی ہے، نہ کہ جان محمد کی۔ اور پنچ صاحبوں کو شرعی جانکاری نہیں ہے اور نہ ہی شرعی طور پر تقسیم کرنا چاہتے ہیں، مذکورہ مکان کی

شرعی تقسیم کس طرح ہوگی؟ کیا مکان صرف ان تین نواسوں کا ہے (محمد یونس، محمد متین، محمد ایوب) یا اور بھی وارثین کا حصہ بنے گا شرعاً؟ پنچ صاحبوں کا شرعی فیصلہ صحیح ہے کہ نہیں یا غیر شرعی فیصلہ پر مجبور کرنا ہے، کیا ہم ان کے فیصلے کو قبول کرلیں؟ مہربانی فرما کر شرعی تقسیم و فیصلے سے آگاہ کیا جائے۔

المستفتی: محمد خالد و محمد ساجد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر جمنی بی نے صرف مذکورہ تینوں نواسوں ہی کو ہبہ کردیا تھا اور زندگی میں ان کو قبضہ دے دیا تھا، تو اس جائیداد میں کسی دوسرے کا حق متعلق نہ ہوگا، صرف انہیں تینوں کی ملکیت ہوگی۔

عن النضر بن أنس قال: نحلني أبي نصف داره، فقال أبو بردة: إن سرک أن تجوز ذلک فاقبضه، فإن عمر بن الخطاب –رضي اللّٰه عنه– قضى في الأنحال ما قبض منه فهو جائز، وما لم يقبض منه فهو ميراث.
(المصنف لابن أبي شيبة، البيوع والأقضية من قال: لا تجوز الهبة إلا مقبوضة، موسسة علوم القرآن، جديد ١٠/ ٥٢١، رقم: ٢٠٥٠٢)

والقبض لا بد منه لثبوت الملک (قوله:) **ولا يجوز الهبة إلا مقبوضة الخ.** (هداية، كتاب الهبة، أشرفي ٣/ ٢٨٣، شرح المجلة رستم، مكتبه إتحاد ١/ ٤٢، رقم المادة: ٥٧، هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٧٤، جديد ٤/ ٣٩٥) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۲۳۶)

شئ موہوب پر قبضہ کے بعد اس میں وراثت جاری نہیں ہوتی

سوال [۹۵۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: زید نے اپنے قدیمی مکان سے رہائش ختم کر کے دوسرا مکان بنالیا ہے اور چند سال سے رہائش بھی ہے، اپنی بیوی اور لڑکے لڑکیوں کی رضا مندی سے کسی صاحب کو ہبہ کر دیا اور تحریر لکھ دی، زید کا ایک لڑکا جو ہندوستان سے باہر ملازمت کرتا ہے، وہ باپ کی اس عطا پر راضی نہ تھا اور نہ ہے، مگر جب باپ کو اس کی ناراضگی کا علم ہوا تو کہا کہ میں زمین خرید کر اس کو دے چکا ہوں، جس پر اس نے مکان بنوایا ہے، اس مکان میں کوئی حصہ نہیں۔ زید کا تقریباً ایک ماہ بعد انتقال ہوگیا اور اس کی ناراضگی بحالہ رہی، تو اس کی والدہ یعنی زید کی بیوی نے شوہر کی بات کو مضبوط کرنے کے لئے رجسٹری کرادی، علاوہ ازیں زید کے مرحوم لڑکے کا ایک یتیم لڑکا ہے جو دادا، دادی اور چچاؤں کی کفالت میں تھا اور ہے۔ یتیم بچہ کی ماں دوسری جگہ نکاح کر چکی ہے، بچہ دادی کے پاس رہتا ہے، کیا وراثت میں اس یتیم کا بھی حصہ ہے، اگر ہے تو کتنا؟ اب موجودہ صورت میں جب کہ زید کی بیوی نے لڑکے اور لڑکیوں کی رضامندی سے رجسٹری کرادی ہے اور اس لڑکے کو جو متفق نہیں بقول مرحوم باپ نے زمین خرید کر دے دی تھی اور یتیم بچہ کے لئے دادی اور چچا زمین خرید کر دینے کو تیار ہیں کہ بعد بلوغت وسعت ہونے پر مکان بنوالے جب تک دادی اور چچا پرورش کر رہے ہیں، کیا اس صورت میں جو ہبہ کرنے کے بعد قبضہ ہے، صحیح ہے لینے والا گنہگار ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: نورالعابدین، بارودگردان کالونی نولگڑھ، جھن جھنوں، راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید نے اگر ہبہ کر کے موہوب لہ کو قبضہ دے دیا تھا اور اب بیوی اور بچوں نے محض قانونی خانہ پری کرنے کے لئے رجسٹری کر دیا ہے، تو ان کا یہ کرنا صحیح ہے اور لینے والا گنہگار نہ ہوگا۔ اور اگر اپنی زندگی میں قبضہ نہیں دیا تھا تو اس کے انتقال کے بعد اس کی بیوی کے رجسٹری کرا دینے سے ہبہ تام نہیں ہوگا؛ بلکہ ایسی صورت میں اس مکان میں زید کے ناراض لڑکے اور دیگر وارثین کا حق متعلق ہو جائے گا۔

عن عبدالرحمن بن عبدالقاري قال: قال عمر –رضي الله عنه– ما

بال رجال ينحلون أولادهم نحلا، فإذا مات أحدهم قال: مالي وفي يدي، وإذا مات هو قال: قد كنت نحلته ولدي، لا نحلة إلا نحلة يحوزها الولد، أو الوالد. (المصنف لابن أبي شيبة، البيوع، من قال: لا تجوز الصدقة حتى تقبض، موسسة علوم القرآن ١٠/ ٥٢٠، رقم: ٢٠٤٩٥)

قال ابن عابدين تحت قوله: بطل يعني عقد الهبة، أي لانتقال الملك للوارث قبل تمام الهبة. (شامي، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٥٠٧، كراچی ٥/ ٧٠١)

نیز زید کے مرحوم لڑکے کے یتیم بچے کا وراثت میں کوئی حصہ نہیں؛ اس لئے کہ زید کے بیٹے موجود ہیں اور بیٹوں کی موجودگی میں پوتے محروم ہوتے ہیں۔

أولهم بالميراث جزء الميت، أي البنون، ثم بنوهم وإن سفلوا. (سراجي، نعيميه، ص: ٢٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/۱/۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۶۰۰۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۳۰/۱/۱۴۲۰ھ

پوتے کے نام کردہ زمین میں وراثت کا حکم

سوال [۹۵۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک عالم دین ہے، زید کے دادا کی بہن نے اپنی جائیداد اپنی حیات میں زید کے نام کردی تھی اور زید کے پاس بیع نامہ موجود ہے، اس نیت سے کہ وہ اس میں مدرسہ قائم کر کے صدقۂ جاریہ کا سلسلہ شروع کرے گا، زید کے دادا کی بہن کے وارثین میں صرف ان کے تین بھتیجے موجود ہیں اور کوئی نہیں ہے، نہ ان کا شوہر ہے اور نہ ہی کوئی آل واولاد ہے، دادی کے انتقال کے بعد ان کے سب سے بڑے بھتیجے زید سے یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ جائیداد ہماری میراث ہے، تمہارا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے، بقیہ دوسرے دو بھتیجے زید کے لئے اس ہبہ پر

راضی ہیں، جب کہ ان کے بڑے بھتیجے نے دادی کی زندگی میں ان کی خوب نافرمانی کی تھی اورآخر کار تنگ آکر زید کے گھر رہنے لگی اور زید کے گھر والوں نے دادی کی ۶ رسال تک پوری خدمت کی ہے اور زید ہی کے گھر میں ان کا انتقال ہوا ہے، تو مفتی صاحب سے دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا اس صحرائی جائیداد میں دادی کے انتقال کے بعد ان کے بھتیجوں کا وراثت کا دعویٰ کرنا درست ہے، جب کہ دادی نے وہ صحرائی جائیداد اپنی حیات میں زید کے نام کر دی تھی، اب زید ان کی منشاء کے مطابق اس زمین پر مدرسہ قائم کرنا چاہ رہا ہے، تو کیا زید کا یہ ارادہ درست ہے؟ اس بارے میں جو بھی حکم شرعی ہو بیان فرمائیں۔

المستفتی: محمد ارشد میرٹھی ذاکر کالونی، میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر زید کے نام رجسٹری کر کے بیع نامہ کر دیا ہے، تو زید اس کا مالک ہو چکا ہے، اس میں کسی وارث یا غیر وارث کا حق متعلق نہیں ہو سکتا؛ لہٰذا زید کا اس زمین پر مدرسہ وغیرہ قائم کرنا بلاتر دد جائز ہے۔

عن عبدالرحمن بن عبدالقاري قال: قال عمر -رضي الله عنه- ما بال رجال ينحلون أولادهم نحلا، فإذا مات أحدهم قال: مالي وفي يدي، وإذا مات هو قال: قد كنت نحلته ولدي، لا نحلة إلا نحلة يحوزها الولد، أو الوالد. (المصنف لابن أبي شيبة، البيوع، من قال: لا تجوز الصدقة حتى تقبض، موسسة علوم القرآن ۱۰ / ۵۲۰، رقم: ۲۰۴۹۵)

كل يتصرف في ملكه كيف شاء. (شرح المجلة رستم ۱ / ٦٥٤، رقم المادة: ۱۱۹۲)

المالک للشيء هو الذی يتصرف فيه باختياره ومشيئته. (بدائع الصنائع، كتاب النفقة، فصل في بيان ما يبطل به الخيار، زكريا ۲ / ٦٣٨، كراچی ۲/ ۳۲۷)

ولو كان ولده فاسقا، وأراد أن يصرف ماله إلى وجوه الخير ويحرمه

عن الميراث، هذا خير من تركه. (البحرالرائق، كتاب الهبة، زكريا ٧/ ٤٩٠، كوئٹه ٧/ ٢٨٨، هندية، كتاب الهبة، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦، بزازية، زكريا جديد ٣/ ١٢٣، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٣٧، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٤/ ٤٦٢، رقم: ٢١٧٢٥، قاضي خان، زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۴۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴/۴/۱۴۳۴ھ

بیوی کو ہبہ کئے گئے مکان میں لڑکے کا حصہ مانگنا

سوال [۹۵۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے ایک مکان خرید کر اپنی بیوی کے نام رجسٹری کر کے دے دیا تھا، میرے تین لڑکے ہیں، ایک لڑکی ہے، ہم دونوں میاں بیوی حیات ہیں، ہمارا بڑا لڑکا شادی شدہ نافرمان ہے اور اپنے بھائی بہن سے بھی جھگڑا کرتا ہے۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ وہ مکان مذکور میں اپنا حصہ مانگتا ہے، جب کہ ابھی ہم دونوں میاں بیوی حیات ہیں، دیگر لڑکے لڑکی کی شادی وغیرہ ہونی ہے، تو کیا اس کو شرعاً کوئی حصہ مل سکتا ہے؟ جب کہ نافرمان ہے، برا سلوک کرتا ہے، شریعت کا حکم تحریر فرما دیں۔

المستفتی: محمد زاہد اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو مکان آپ نے خرید کر اپنی بیوی کے نام رجسٹری کر کے مکمل طور پر ان کو مالک بنا دیا ہے، تو وہ ان کی ملک میں داخل ہو گیا اور اس مکان یا ان کی دوسری کسی جائیداد میں آپ کی بیوی کی حیات تک کسی کو مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے،

ان کو اس میں ہر طرح کے تصرف کا حق حاصل ہے، اگر وہ زندگی میں اس نافرمان لڑکے کو نہ دیں اور بقیہ کو دے دیں، تو اس پر کوئی گناہ ان کو نہیں ہوگا۔

إن القبض شرط جواز الهبة. (بدائع، کتاب الهبة، زکریا ٥/ ١٧٠، کراچی ٦/ ١١٩)

وتتم الهبة بالقبض الكامل، فيشترط القبض قبل الموت. (شامي، کتاب الهبة، زکریا ٨/ ٤٩٣، کراچی ٥/ ٦٩٠، الجوهرة النيرة، إمداديه ٢/ ٩، دارالکتاب دیوبند ٢/ ١٠)

لا بأس بأن يعطى من أولاده من كان عالما متأدبا، ولا يعطى منهم من كان فاسقا فاجرا. (مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩٧، مصري قديم ٢/ ٣٥٨، بزازية، زكريا جديد ٣/ ١٢٣، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٣٧، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٤/ ٤٦٢، رقم: ٢١٧٢٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۹۶۷)

تکمیل ہبہ کے ثبوت سے قبل اپنے حصہ کا مطالبہ کرنا

سوال [۹۵۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک عورت کا انتقال ہوگیا، اس نے دو کانیں اور دو مکانات چھوڑے ہیں، ورثاء میں ایک لڑکا، ایک لڑکی ہے، زندگی میں وہ مجھ سے کہتی تھیں کہ ایک ایک مکان دونوں بھائی بہن لے لو، دوکانوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا، اس کے بعد والدہ کا انتقال ہوگیا، اور اس پر عمل نہیں ہوا؛ کیوں کہ اس کی کچھ تحریر نہیں تھی، کچھ دنوں کے بعد ایک آدمی میرے پاس آیا اور اس نے کہا کہ تمہاری والدہ نے ایک مکان تمہارے بھائی کو دے دیا ہے اور اس بات کا گواہ اپنے آپ کو بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ بات میرے سامنے ہوئی ہے، اس آدمی کا میرے بھائی کے گھر آنا جانا ہے، بھائی نے اس مکان کو بیچ دیا ہے، کیا میں اس مکان میں حصہ دار ہوں

یانہیں؟ جب کہ اس دوسرے مکان میں سے بھی میرے بھائی نے ساڑھے چھیاسٹھ فیصدی حصہ لے لیا ہے؟

المستفتیۃ: انور جہاں، محلّہ بھٹی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ مکان ماں کی طرف سے بھائی کو ہبہ کرنے کا جب تک پختہ ثبوت نہ ہو اس وقت تک اس پورے مکان پر آپ کے بھائی کی ملکیت ثابت نہ ہوگی۔ اور آپ کو اس مکان میں اپنے حصہ کے مطالبہ کا حق حاصل ہے۔

وَاسۡتَشۡهِدُوۡا شَهِيۡدَيۡنِ مِنۡ رِّجَالِكُمۡ فَاِنۡ لَّمۡ يَكُوۡنَا رَجُلَيۡنِ فَرَجُلٌ وَّامۡرَاَتَانِ مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ. [البقرة: ٢٨٢]

وما سوى ذلك من الحقوق يقبل فيها شهادة رجلين، أو رجل وامرأتين، سواء كان الحق مالا أو غير مال. (هداية، كتاب الشهادة، أشرفي ٣/ ١٥٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/صفر ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۱۶۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۲/۸ھ

ہبہ تام ہونے کے بعد دوسرے لوگوں کا حصہ طلب کرنا

سوال [۹۵۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے دادا نے مجھے ایک مکان ۵۵/گز دے دیا، اسی میں ہم رہتے ہیں، ان کی زندگی میں بھی اسی میں رہ رہے تھے، میرے دادا نے یہ مکان مجھے دے دیا تھا، اس پر گواہان بھی موجود ہیں اور قبضہ بھی مجھے دے دیا تھا، اب ہمارے بھانجے حصہ طلب کر رہے ہیں، شرعاً انہیں ملے گا یا نہیں؟

المستفتی: شفیق احمد کانٹھ کی پلیا، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں جب دادا نے بطور ہبہ ۵۵؍گز مکان دے کر قبضہ کرا دیا، مزید براں دادا صاحب نے آئندہ نزاع کو ختم کرنے کے لئے دو گواہ بھی بنا کر دنیا سے چلے گئے، ایسی صورت میں ہبہ شرعاً تام ہو گیا ہے، اس میں بھانجے کا حصہ طلب کرنا ناحق مطالبہ ہے، شرعاً اس کی گنجائش نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد المفتیین ۱/ ۴۴۹)

عن النضر بن أنس قال: نحلني أنس نصف داره، قال: فقال أبو بردة: إن سرک یجوز لک فاقبضه، فإن عمر بن الخطاب –رضي الله عنه– قضی في الانحال أن ما قبض منه، فهو جائز، وما لم یقبض، فهو میراث، قال: فدعوت یزید الرشک، فقسمها. (السنن الکبری للبیهقي، الهبات، باب ماجاء في هبة المشاع، دارالفکر ۹/ ۱۵۸، رقم: ۱۲۱۸۶)

وتتم الهبة بالقبض الکامل. (درمختار مع الشامي، کتاب الهبة، زکریا ۸/ ۴۹۳، کراچی ۵/ ۶۹۰، هندیة، زکریا قدیم ۴/ ۳۷۴، جدید ۴/ ۳۹۵، بدائع الصنائع، زکریا ۵/ ۱۷۶، کراچی ۶/ ۱۲۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۷۱۰)

نابالغ کے ہبہ والی رقم میں تصرف کرنا

سوال [۹۵۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: والد صاحب کے انتقال کے وقت تقریباً ہم تین بھائی (۱) محمد یوسف (۲) حافظ عبد الحفیظ (۳) رحمۃ اللہ نابالغ تھے۔ اور آج تک جائیداد کی تقسیم نہیں ہوئی ہے اور یتیم نابالغ کا مال کھایا گیا ہے، تو اس کا گناہ ہوگا یا نہیں؟ اگر گناہ ہوگا تو اس کی تلافی کی کیا شکل ہوگی؟ اب فی الحال ایک چھوٹا بھائی رحمۃ اللہ ہی نابالغ ہے، اس کے حصہ کی کیا شکل ہوگی؟

المستفتی: محمد یوسف قاسمی مدرسہ عربیہ تعلیم المسلمین، ضلع پنچ محل

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر نابالغ کے ہبہ میں اس کے خرچ سے زائد خرچ کیا گیا ہے، تو خرچ کرنے والے بالغ ورثاء گنہگار رہوں گے، اس کی تلافی یوں ہوگی کہ جوزائد خرچ کیا گیا ہے اس کا تخمینہ لگاکران کے حوالہ کردیا جائے اوراب رحمت اللہ نابالغ کا حصہ حفاظت سے رکھنا لازم ہے۔ (مستفاد: بہشتی زیوراختری ۷/۴۲، معارف القرآن ۲/ ۳۱۶، کفایت المفتی قدیم ۸/ ۱۸۷، جدید زکریا ۸/ ۱۷۵)

وَآتُوا الْيَتَامَى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ وَلَا تَأْكُلُوا اَمْوَالَهُمْ اِلٰى اَمْوَالِكُمْ اِنَّهُ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا. [النساء: ۲]

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتَامَى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا. [النساء: ۱۰]

رجل اشترى لنفسه من مال ولده الصغير أو استهلك مال ولده الصغير، أو اغتصب حتى وجب عليه الضمان. (قاضي خان، الوصايا، فصل في تصرفات الوصي في مال اليتيم وتصرفات الوالد في مال ولده الصغير، زكريا ۳/ ۳۹۲، وعلى هامش الهندية ۳/ ۵۳۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/۱۷۷۴)

موہوب شئ میں حق کا دعویٰ کرنا

سوال [۹۵۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: چھدا کے تین بیٹے تھے: امجد حسین، علی حسین، لیاقت حسین، نواب کی زمین ٹھیکہ دار کی معرفت امجد حسین ۲۵/ ۱ ایکڑ اور علی حسین کو ۱۳/ ۱ ایکڑ اور لیاقت حسین کو ۹/ ۱ ایکڑ زمین ملی، چھدا کے کوئی زمین وغیرہ نہیں تھی، اس کا انتقال پہلے ہی ہوگیا تھا، اب امجد حسین کے ایک لڑکا

شفیع احمد، ایک لڑکی نثار بیگم ہیں، علی حسین کے دولڑکے بجھن اور احمد حسین ہیں اور دولڑکی صغریٰ اور چھوٹی ہیں اور لیاقت حسین کے ایک لڑکا کلن ہے، لیاقت حسین کے انتقال کے بعد اس کے لڑکے کلن کی پرورش اس کے تایا امجد حسین نے کی تھی، اس کے بعد امجد حسین کا انتقال ہوگیا، اب کلن اپنے تایازاد بھائی محمد شفیع کے ساتھ رہا کرتے تھے، امجد حسین کی جائیداد ۲۵/۱ ایکٹر زمین جو ٹھیکیدار کی معرفت ملی تھی، اس سے سات ایکٹر زمین اس کے لڑکے شفیع احمد نے اپنے چچازاد بھائی کلن کو دے دی تھی۔ نیز ایک دوسرے ٹھیکیدار نے ۱۳/۱ ایکٹر زمین شفیع احمد کو بطور ہدیہ کے دی تھی، اب اس وقت کلن کے آٹھ لڑکے موجود ہیں، وہ اپنے تایا شفیع احمد سے اپنے حق کا مطالبہ کرتے ہیں کہ اس ۱۳/۱ ایکٹر زمین میں سے ہمیں بھی حصہ ملنا چاہئے، نیز شفیع احمد نے اپنے باپ کی جائیداد میں سے ۳/۱ ایکٹر زمین مسجد کو دینے کا وعدہ کیا ہے، باقی پندرہ ایکٹر میں سے بھی یہ لوگ مطالبہ کررہے ہیں، کیا شرعاً انہیں مطالبہ کا حق پہنچتا ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عطا فرمائیں۔

المستفتی: محمد شفیع شکارپور ضلع نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ کی درج شدہ صورت میں ۱۳/۱ ایکٹر زمین جو شفیع احمد کو بطور ہبہ کے مل گئی ہے اور شفیع احمد نے اس میں مالکانہ قبضہ کرکے تصرف بھی شروع کردیا ہے، تو شرعاً شفیع احمد اس کا مالک ہوچکا ہے، تو اب کلن کی اولاد کو اس میں حق کا دعویٰ کرنا جائز نہیں اور نہ ہی اس میں ان کا کوئی حق ہے۔

عن أبي حرة الرقاشي عن عمه أن رسول اللّٰه صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه. (شعب الإيمان للبيهقي، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٣٨٧، رقم: ٥٤٩٢، السنن الكبرى للبيهقي، دارالفكر بيروت ٨/ ٥٠٦، رقم: ١١٧٤٠)

وتتم الهبة بالقبض الكامل. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، قديم ٢/ ٣٥٣، جديد دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩١، درمختار مع الشامي، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٤٩٣، كراچی ٥/ ٦٩٠، هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٧٧، جديد ٤/ ٣٩٩، الجوهرة النيرة، إمداديه

ملتان ۲/ ۹، دارالکتاب دیوبند ۲/ ۱۰، تبیین الحقائق، إمدادیه ملتان ۵/ ۹۱، زکریا ٦/ ٤٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍رجب ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۳۳۹)

شئ موہوب کو واہب کے مقصد میں صرف کرنا

سوال [۹۵۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدرسہ کے مطبخ کے لئے ایک صاحب خیر نے ایک بکرا ہبہ کیا یا صدقہ کیا اور اس کی نیت طلباء کے استعمال کی ہے؛ لیکن کم عمر بچہ ہونے کی وجہ سے ارباب مدرسہ اس کو فروخت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر کر سکتے ہیں تو وہ رقم صرف طلباء کے کھانے میں صرف ہوگی یا کسی اور مصرف میں بھی صرف کر سکتے ہیں؟ وضاحت فرمائیں۔

المستفتی: عبدالقدوس مرادآبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب معطی نے بکرا طلباء کے کھانے کے لئے دیا ہے، تو اس بکرے کو طلبہ کے کھانے میں ہی صرف کرنا لازم ہے، اس کے علاوہ دوسرے مقام پر صرف کرنا یا فروخت کرنا جائز نہیں، ہاں البتہ معطی کی اجازت سے فروخت کرنے کی گنجائش ہے۔ (ایضاح النوادر ۲/ ۵)

كما استفيد من هذه العبارة: ولو أن قوما بنو مسجدا وفضل من خشبهم شيء حتى قالوا: يصرف الفاضل في بنائه ولا يصرف إلى الدهن والحصير. (البحر الرائق، كتاب الوقف، فصل في أحكام المسجد، زكريا ٥/ ٤٢٠، كوئٹه ٥/ ٢٥٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۲۱۹)

۷/ باب الهبة للصغير

خدمت گذار لڑکے کو جائیداد زیادہ دینا

سوال [۱۰۴۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے زندگی میں چار لڑکوں میں سے تین لڑکوں کو پڑھایا اور ایک کو پڑھا نہیں پایا، اب میں یہ چاہتا ہوں کہ جس کو پڑھا نہیں پایا اس کو کچھ زیادہ جائیداد دے دوں، کیا میں دے سکتا ہوں؟ جب کہ نہ پڑھنے والا اور اس کے بچے میری خدمت کرتے ہیں۔

المستفتی: خلیل احمد معصوم پور، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اولاد ہونے میں سب برابر ہیں؛ اس لئے ان میں سے ایک کو زیادہ اور دوسرے کو کم دینے کی صورت میں ان کے ساتھ حق تلفی اور زیادتی ہے، جو شریعت میں جائز نہیں ہے؛ اس لئے ان کو جائیداد دینے میں برابری اور مساوات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے؛ البتہ اگر کوئی لڑکا دیندار، با ادب، عالم دین ہے، اس وجہ سے اس کو زیادہ دینا ہے، تو اس کی گنجائش ہے؛ لیکن دوسروں کو اس سے ضرر نہ ہو اور دوسرے لڑکے اس پر ناخوش بھی نہ ہوں۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۴/ ۴۴۶، ڈابھیل ۱۶/ ۴۹۸-۴۹۹، فتاوی رحیمیہ قدیم ۶/ ۱۴۸-۱۴۹، جدید ۹/ ۳۱۲، امداد الفتاوی ۳/ ۴۷۰)

عن عامر قال: سمعت النعمان بن بشير –رضي الله عنهما– وهو على المنبر يقول: أعطاني أبي عطية، فقالت عمرة بنت رواحة: لا أرضي حتى تشهد رسول الله صلى الله عليه وسلم، فأتى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: إني أعطيت ابني من عمرة بنت رواحة عطية، فأمرتني أن أشهدک يا رسول الله! قال: أعطيت سائر ولدک مثل هذا، قال: لا، قال:

فاتقوا الله واعدلوا بين أولادكم، قال: فرجع فرد عطيته. (صحيح البخاري، باب الإشهاد في الهبة، النسخة الهندية ١/ ٣٥٢، رقم: ٢٥١٥، ف: ٢٥٨٧)

ويكره تفضيل بعض الأولاد على البعض في الهبة حالة الصحة. (البحرالرائق، كتاب الهبة، كوئٹه ٧/ ٢٨٨، زكريا ٧/ ٤٩٠)

لا بأس بتفضيل بعض الأولاد في المحبة؛ لأنها عمل القلب، وكذا في العطايا إن لم يقصد به الإضرار. (شامي، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٥٠١، كراچی ٥/ ٦٩٦، هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦، قاضي خان زكريا جديد ٣/ ١٩٣، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۶۶۱۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۴/۲۴ھ

خدمت گذار اولاد کو ہبہ میں زیادہ دینا

سوال [۹۵۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: شفیع الدین ولد نصیر الدین ساکن محلّہ ڈیرہ یامراد آباد میری شادی ۱۹۴۹ء میں چھوٹی نام کی عورت کے ساتھ ہوئی، جس سے چار لڑکیاں اور ایک لڑکا پیدا ہوا، جن میں تین لڑکیوں کا انتقال ہوگیا، صرف ایک لڑکا اور ایک لڑکی حیات رہی، لڑکے کا نام رفیق الدین رکھا اور لڑکی کا نام رئیسہ رکھا گیا۔ ۱۹۵۶ء میں میری بیوی کا انتقال ہوگیا، ۱۹۶۱ء میں میں نے دوسری شادی کرلی اور پہلی بیوی کی جو اولاد تھی رفیق الدین اور رئیسہ ان دونوں کی شادی ۱۹۶۵ء میں کردی، رفیق الدین کی پانچ اولادیں ہوئیں، جس میں تین لڑکیاں اور دولڑکے ہیں اور رئیسہ کے بھی پانچ اولادیں ہیں، جس میں تین لڑکے دولڑکیاں ہیں۔

اور میں شفیع الدین نے دوسری شادی ۱۹۶۵ء میں کی تھی، میری دوسری بیوی کا نام شکیلہ ہے،

اس سے بھی پانچ اولادیں ہیں، دولڑکیاں تین لڑکے، اس میں سے لڑکیوں کی شادی کردی ہے اور دولڑکوں کی بھی شادی کردی ہے، صرف ایک لڑکا کنوارہ ہے، اب مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ میں جس مکان میں رہتا ہوں وہ تقریباً ۱۹۰ر گز ہے، جس میں دوکمرہ اور دو دروازہ ہیں، میری پہلی بیوی کا لڑکا رفیق الدین جس کی شادی میں نے ۱۹۶۵ء میں کردی تھی، اس کی پانچ اولادیں ہیں، میرے ہی گھر میں دوسری منزل میں رہتی ہیں، اس لڑکے کا ۱۹۸۵ء میں انتقال ہوگیا، صرف اس کی بیوی دولڑکے، جن کی عمر ۱۸-۲۰ر سال ہے اور تین لڑکیاں ہیں۔ اور دوسری بیوی کے تین لڑکے: نعیم الدین، فہیم الدین، معین الدین اور دولڑکیاں نچلی منزل میں رہتے ہیں، جس میں نعیم الدین کی بھی چار اولادیں ہیں، اب سوال یہ ہے کہ کیا میری پہلی بیوی کی جو اولادیں ہیں ان کو اس مکان میں سے شرعی حصہ پہنچتا ہے یا نہیں؟ اور اگر ان کا حق بنتا ہے تو وہ کتنی مقدار میں بنتا ہے؟ چونکہ میں ایک بوڑھا شخص ہوں، میری کوئی کمائی کا ذریعہ بھی نہیں ہے، صرف نعیم الدین اور معین الدین کی کمائی پر گھر کا خرچ چلتا ہے، اب آپ خود ہی فیصلہ کر کے بتائیں کہ میں کس طرح ان سب کا حق ادا کروں اور کوئی ناراض بھی نہ ہو؟

المستفتی: شفیع الدین صاحب ڈیریا، مرادآباد

دارالافتاء جامعہ نعیمیہ کا جواب

بعون الملک الوہاب

بسم الله الرحمن الرحيم، نحمده ونصلي على رسوله الكريم: آپ کی زندگی میں کوئی حصہ اولاد کا نہیں، ابھی آپ مکان کے تنہا مالک ہیں، اگر آپ چاہیں تو ہبہ کر سکتے ہیں، جس میں بہتر یہ ہے کہ لڑکیوں کو لڑکوں کے برابر دیں۔ درمختار جلد رابع، ص:۵۱۳ میں ہے:

وإن قصده يسوى بينهم يعطي البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتوى.

ہاں اس میں حرج نہیں کہ جو اولاد زیادہ خدمت کرتی ہو اسے کچھ زیادہ دے دیں، اسی میں ہے:

وفي الخانية: لا بأس بتفضيل بعض الأولاد في المحبة؛ لأنها عمل القلب، وكذا في العطاء الخ. والله سبحانه وتعالیٰ اعلم.

کتبہ: الفقیر محمد ایوب النعیمی غفرلہ
دارالافتاء جامعہ نعیمیہ، مرادآباد
مورخہ ۱۱/اگست ۲۰۰۴ء

دارالافتاء مدرسہ شاہی مرادآباد کا جواب

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: پہلی بیوی اور دوسری بیوی کے بطن سے جو آپ کے نطفہ سے اولاد ہیں، سب کا حکم برابر ہے، آپ کی موت کے بعد وہ سب آپ کی جائیداد میں برابر کے حصہ دار ہوں گے، لڑکوں کو لڑکیوں کے مقابلہ میں دوگنا ملے گا، ہاں البتہ رفیق الدین جس کا ۱۹۸۵ء میں انتقال ہوگیا ہے، اس کی اولاد اور اس کی بیوی کا آپ کی جائیداد میں شریعت اسلامی میں کوئی حق نہیں ہے، آپ کی موت کے بعد وہ لوگ آپ کے وارث نہیں ہوں گے۔ اوران کے علاوہ باقی پہلی بیوی کی اولاد اور دوسری بیوی کی اولاد جو زندہ ہیں وہ آپ کے ترکہ سے میراث کے حق دار ہوں گے۔ اور اگر آپ اپنی زندگی میں جائیداد تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان برابر حصہ دینا آپ کا فرض بنے گا کہ لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر حصہ دینا ضروری ہے، جیسا کہ جامعہ نعیمیہ کے جناب مفتی محمد ایوب صاحب کے جواب میں واضح کیا گیا ہے، ہاں البتہ جو خدمت گذار اولاد ہیں، ان کو اگر زیادہ دینا چاہیں تو شرعی اعتبار سے اس کی بھی اجازت ہے۔

لا بأس بأن يعطى من أولاده من كان عالما متأدبا، ولا يعطى منهم من كان فاسقا فاجرا. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۴۹۷،

مصري قديم ۲/ ۳۵۸، وهكذا في البزازية، زكريا جديد ۳/ ۱۲۳، وعلى هامش الهندية ٦/ ۲۳۷، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٤/ ٤٦٢، رقم: ٢١٧٢٥)

ويسقطن بالابن. (سراجي في الميراث، ص: ۱۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۴۷۸)

خدمت گذار اولاد کو زیادہ حصہ دینا

سوال [۹۵۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرا ایک مکان ہے، جس کی تقسیم تمام اولاد کو کردی گئی، سب کے حصے ان کی رضا مندی سے دے دئے گئے، ایک قطعہ آراضی باقی بچا ہے، ایک صاحب زادے جو بے روزگار ہیں، اس میں اپنا کاروبار کرنا چاہتے ہیں، وہ اس کو اپنے نام منتقل کرانے کو کہتے ہیں، میں تو ان کی ضرورت کے پیش نظر تیار ہوں، مگر دو دوسرے صاحبزادے راضی نہیں، اگر چہ یہ دونوں بڑے خوش حال وفارغ البال ہیں، میں نے ان دونوں سے ایثار وقربانی کے طور پر دینے کو کہا جس کا آخرت میں اجر بھی ملے گا، مگر وہ راضی نہیں ہورہے ہیں، کچھ ان حاجت مند صاحبزادے کی سخت مزاجی اور تلخ کلامی کی وجہ سے جس کے لئے بھی میں ان آسودہ حال صاحبزادوں سے درگذر کرنے کی درخواست کررہا ہوں، مگر وہ حاجت مند صاحبزادے کے رویہ سے اس قدر آزردہ ہیں کہ راضی نہیں ہو پارہے ہیں، اگر چہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی سنا دیا کہ جنت کا عمل یہ ہے کہ ”جو برائی کرے اس کے ساتھ نیکی کرو“ فارغ البال صاحبزادوں کے یہاں اپنے حصوں میں آباد ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے؛ کیوں کہ ان کے پاس دہلی دہرادون وغیرہ میں کافی رہائشی گنجائش ہے اور ان کے لئے ایثار کرنا آسان ہے، مگر وہ رضا مندی دینے کو تیار نہیں اور یہ حاجت منداپنی بے روزگاری سے بدحواس وپریشان ہیں اور چڑچڑانے لگے ہیں اور اسی وجہ سے سخت کلامی پر اتر آتے ہیں، میں ان سے کہتا ہوں کہ

اپنی سخت کلامی پر معافی مانگ لو، تو اس پر بھی اپنی ہٹ سمجھ کر آمادہ نہیں ہورہے ہیں، تو کیا میں ان کی حاجت مندی ذہنی پریشانی کے پیش نظر بقیہ زائد قطعہ ان کو دے دوں جو دوسروں سے زائد ہوگا؟ کیا میری گرفت تو نہیں ہوگی؟ میں نے ایک کو زائد دے دیا، تین فارغ البال میں سے ایک تو رضا مند ہیں، علاوہ اس کے ایک جائیداد سے جس کے حصوں کے لئے حاجت مند صاحبزادے نے ہی جدوجہد کی ہے، اسی سے حاصل ہونے والے سرمایہ سے ان دونوں معترض صاحبزادوں کو بھی دے دینے کی پیشکش کی ہے، جن کا اس کے حصوں کی کوشش میں کوئی حصہ بالکل نہیں ہے، مگر بداخلاقی کے رویہ سے اس قدر آزردہ ہیں کہ راضی ہونا گوارا نہیں ہے، یہ حاجت مند صاحبزادے ۲۰؍سال سے میری خدمت کی وجہ سے کہیں باہر بیرون ملک بھی نہیں جاسکے، اس کا اجر بھی اس زائد عطیہ سے شاید کچھ پورا ہوجائے۔ براہ کرم رہنمائی فرمائیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔

المستفتی: تلخیص احمد قاضی ٹولہ بیلداران، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں لڑکیوں کا کوئی ذکر نہیں ہے، اگر لڑکیاں بھی ہیں تو زندگی میں تقسیم کرکے دینے کی صورت میں لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر دینے کا حکم ہے، اگر سائل کی لڑکیاں بھی ہیں اور ان کو نہ دے کر صرف لڑکوں کو دے دیا ہے، تو اللہ کے دربار میں سخت پکڑ کا خطرہ ہے، اب رہی یہ بات کہ کمزور لڑکے کی بے روزگاری کی وجہ سے دوسروں کے مقابلہ میں اس کو کچھ زائد دینے میں آپ گنہگار نہیں ہوں گے، مگر لڑکے پر ضروری ہے کہ اپنی زبان پر کنٹرول کرے۔ اور سوال نامہ کے مطابق اس نے باپ کی خدمت بھی زیادہ کی ہے؛ اس لئے اس کو زیادہ دینے میں باپ گنہگار نہیں ہوگا۔

لا بأس بتفضيل بعض الأولاد...... إن لم يقصد به الإضرار. (شامي، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٥٠١، كراچی ٥/ ٦٩٦)

ولو وهب شيئا لأولاده في الصحة، وأراد تفضيل البعض على

البعض عن أبي حنيفةؒ لا بأس به إذا كان التفضيل لزيادة فضل في الدين، وإن كانا سواء يكره، وروى المعلى عن أبي يوسف أنه لا بأس به إذا لم يقصد به الإضرار، وإن قصد به الإضرار سوى بينهم، وهو المختار. (هندية، كتاب الهبة، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦، البحر الرائق، كوئٹه ٧/ ٢٨٨، زكريا ٧/ ٤٩٠، فتاوى بزازية، زكريا جديد ٣/ ١٢٣، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٣٧، قاضي خان، زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/۲/۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۴۵۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/۲/۱۴۳۵ھ

نافرمان بیٹے کو جائیداد نہ دے کر فرماں بردار لڑکے کو دینا

سوال [۹۵۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے چار لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں، دو لڑکوں کی شادی ہو چکی اور تین لڑکیوں کی شادی سے فارغ ہو گیا ہوں باقی دو لڑکے اور ایک لڑکی شادی کرنے کو باقی ہیں اور میں فالج کا مریض ہوں، کچھ نہیں کر سکتا اور آنکھوں سے بھی مجبور ہوں، میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اور بڑا لڑکا علیحدہ رہتا ہے، اس کے پانچ بچے ہیں اور بڑا نافرمان ہے، میرے مکان میں دو کرایہ دار رہتے تھے، اس نے ان کو پریشان کر کے بھگا دیا، جس سے میری گذر اوقات ہوتی رہتی تھی اور میرا قطعی خیال نہیں کرتا اور اوپر سے سینہ زوری کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ تم سے بولنے کی میری طبیعت نہیں کرتی اور تم سے واسطہ رکھنے میں مجھے نقصان ہے اور چھوٹے بھائی کی بیوی کو مارا پیٹا اور بھائیوں کو بھی آئے دن مارتا رہتا ہے، میں اس سے سخت پریشان ہوں اور میرے اوپر یہ تہمت لگا رہا ہے کہ آپ چھوٹے بھائی کی بیوی سے ملے ہوئے ہو، اس لڑکے سے پورا گھر

پریشان ہے، نہ تو آج تک مکان کا ہاؤس ٹیکس ادا کیا اور نہ ہی بجلی کا بل ادا کرتا ہے، اور بجلی کے بل کا اور ہاؤس ٹیکس کا کل روپیہ لگ بھگ -/7500 روپئے اس وقت موجود ہے، آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں مجھ کو اس کا جواب دیں عین نوازش ہوگی۔ اور آدھے مکان پر قبضہ کر رکھا ہے، میں مکان کو فروخت کرنا چاہتا ہوں، محلّہ والوں نے بھی کافی سمجھایا، مگر وہ کسی بات پر تیار نہیں ہے، میں مکان بیچنا چاہتا ہوں، اس کو اس میں حصہ دیا جائے یا نہ دیا جائے؟ مطلع فرمائیں۔

المستفتی: حاجی اختر حسین مقبرہ اول نئی آبادی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شرعی طور پر نا فرمان لڑکے کو نہ دے کر دوسرے فرماں بردار اولاد کو دینا جائز ہے، اس سے باپ گنہگار نہ ہوگا۔

لا بأس بأن يعطی من أولاده من كان عالما متأدبا، ولا يعطی منهم من كان فاسقا فاجرا. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دار الكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩٧، مصري قديم ٢/ ٣٥٨، وهكذا في الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٤/ ٤٦٢، رقم: ٢١٧٢٥)

نیز آپ اپنی ملکیت کا مکان فروخت کرنے میں خود مختار ہیں، اس میں لڑکے یا کسی دوسرے کو کوئی اختیار نہیں ہے۔

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء. (بيضاوي، كتب خانه رشديه دهلی ١/ ٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/۲/۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۱۸۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/۲/۱۴۱۸ھ

اولاد کی نافرمانی کی وجہ سے بحالت صحت جائیداد بیوی کو ہبہ کرنا

سوال [۹۵۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: (۱) اگر کسی شخص کی اولاد نافرمان ہو اور اس شخص کو یہ فکر لاحق ہو کہ بعد میرے مرنے کے میری بیوی کو اولاد پریشان کرے گی اور یہ سوچ کر وہ شخص اپنی زندگی میں ہی اپنی جائیداد یا مکان اپنی بیوی کے نام ہبہ کردے، تو وہ شریعت اور قانون کی رو سے اس جائیداد کی مالک ومختار ہو جائے گی یا نہیں؟

(۲) مذکورہ جائیداد میں اولاد کو مداخلت کرنے کا حق حاصل ہوگا یا نہیں؟

(۳) ہبہ ہو جانے کے بعد مذکورہ خاتون کو یہ حق حاصل ہوگا یا نہیں کہ وہ کسی ایک اولاد کے نام جائیداد کردے ایسا ہونے پر دیگر اولاد کو یہ حق حاصل ہوگا یا نہیں کہ وہ مذکورہ جائیداد میں سے اپنا حصہ طلب کریں، ان تمام باتوں کے لئے شریعت اور اسلامی قانون کا کیا حکم ہے؟ تفصیل سے تحریر کریں۔

المستفتیة: شبانہ پروین محلّہ طباقیان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) اگر اولاد صحیح معنی میں نافرمان ہیں، تو وہ شخص بحالت صحت اپنی پوری جائیداد بیوی کی ملکیت میں ہبہ کر کے قبضہ دیتا ہے، تو جائز ہے اور قانون شریعت کی رو سے بیوی اس جائیداد کی مالک ہو جاتی ہے۔

لا بأس بأن يعطى من أولاده من كان عالما متأدبا، ولا يعطى منهم من كان فاسقا فاجرا. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۴۹۷، مصري قديم ۲/ ۳۵۸، وهكذا في الفتاوى التاتارخانية، زكريا ۱۴/ ۴۶۲، رقم: ۲۱۷۲۵)

المالك هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء. (بيضاوي، كتب خانه رشديه دهلى ۱/ ۷)

(۲) مداخلت کا حق نہیں۔ (۳) دیگر اولاد کو طلب کرنے کا حق حاصل نہ ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ صفر المظفر ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۳۱۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۲/۱۴۱۴ھ

لڑکا بدکردار ہوتو اپنی جائیداد لڑکی کو ہبہ کرنے کا حکم

سوال [۹۵۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میری دو اولادیں ہیں، ایک لڑکا عمران مجتبیٰ اور ایک لڑکی شیریں مجتبیٰ، میرا لڑکا انتہائی آوارہ اور شرابی ہے، مجھے خطرہ ہے میرے بعد میری جائیداد کو میرا یہ نافرمان شرابی وکبابی لڑکا خورد بورد کر کے ضائع کردے گا؛ اس لئے میں بحالت صحت بحالت ہوش وحواس بلاکسی دباؤ کے اپنی جدی رہائشی مکان واقع بازی گران مرادآباد اپنی لڑکی شیریں مجتبیٰ کو ہبہ کر کے مالک بنا دینا چاہتا ہوں، کیا میرے لئے نافرمان لڑکے کو نہ دے کر صرف لڑکی کو ہبہ کردینا جائز ہے یانہیں؟ شرعی حکم سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی: غلام مجتبیٰ پسر حاجی غلام مصطفیٰ مرحوم، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر لڑکا نافرمان اور فسق وفجور اور شراب نوشی وغیرہ میں مبتلا ہے، تو اس کو نہ دے کر صرف لڑکی کو ہبہ کردینا شرعاً جائز ہے۔

لا بأس بأن يعطى من أولاده من كان عالما متأدبا، ولا يعطى منهم من كان فاسقا فاجرا. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩٧، مصري قديم ٢/ ٣٥٨، وهكذا في الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٤/ ٤٦٢، رقم: ٢١٧٢٥)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ شعبان ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۱۹۳۳)

زندگی میں ایک اولاد کو کل جائیداد کا مالک بنا کر بقیہ کو محروم کردینا

سوال [۹۵۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: عبدالحکیم مرحوم کے تین لڑکے ہیں، جن میں بڑے لڑکے نے اپنے والد کی کافی خدمت اورفرماں برداری کی ہے، مرنے سے دو سال پہلے مرحوم نے اپنی زندگی میں اپنی ملکیت اپنے بڑے لڑکے کے نام بیع نامہ کردی ہے، جس پر چھوٹے دولڑکوں کو سخت اعتراض ہے، کیا یہ بیع نامہ شرعاً درست ہے؟ ازراہ کرم مطلع فرمائیں۔

المستفتی: محمد ابراہیم اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر بڑے لڑکے کے حق میں بیع نامہ کرکے مالک بنادیا تھا اوردوسرے وارث کومحروم کرنے کے لئے کیا تھا تو بیع نامہ تو شرعاً جائز رہے گا، لیکن باپ سخت گنہگار رہوگا۔

عن أنس بن مالك –رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: من فر من ميراث وارثه قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة. (سنن ابن ماجة، باب الحيف في الوصية، النسخة الهندية ٢/ ١٩٤، دارالسلام، رقم: ٢٧٠٣)

عن سليمان بن موسى قال: قال رسول الله ﷺ: من قطع ميراثا فرضه الله قطع الله ميراثه من الجنة. (سنن سعيد بن منصور، باب من قطع ميراثا فرضه الله، دارالكتب العلمية بيروت ١/ ٩٦، رقم: ٢٨٥-٢٨٦)

ولو وهب في صحته كل المال لولده جاز وأثم. (الدر مع الرد، كتاب الهبة، مطبع نعمانيه ٤/ ٥١٣، زكريا ٨/ ٥٠٢، كراچى ٥/ ٦٩٦، هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦)

گناہ سے بچنے کی صورت یہ تھی کہ سب بچوں میں برابر حصوں کے حساب سے تقسیم کرکے بیع نامہ کردیتے اورزندگی میں تقسیم کرنے میں لڑکی اورلڑکے سب کو برابر حصہ دینا ہوگا۔

عن عامر قال: سمعت النعمان بن بشير –رضي الله عنهما– وهو على المنبر يقول: أعطاني أبي عطية، فقالت عمرة بنت رواحة: لا أرضي

حتـی تشهـد رسـول الله صلی الله علیه وسلم، فأتی رسول الله صلی الله علیه وسـلـم فـقـال: إنـي أعـطـيـت ابني من عمرة بنت رواحة عطية، فأمرتنی أن أشهـدک يـا رسول الله! قال: أعطيت سائر ولدک مثل هذا، قال: لا، قال: فـاتـقـوا الله واعدلوا بين أولادكم، قال: فرجع فرد عطيته. (صحيح البخاري، باب الإشهاد في الهبة، النسخة الهندية ١/ ٣٥٢، رقم: ٢٥١٥، ف: ٢٥٨٧)

وكذا في العطايا إن لم يقصد به الإضرار، وإن قصد به الإضرار سوى بيـنهـم، يـعطى البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتاوى. (شامي، كتاب الهبة، زكـريـا ٨/ ٥٠١-٥٠٢، كـراچـی ٥/ ٦٩٦، قـاضـي خان، زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩، هندية، كتاب الهبة، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا جديد ٤/ ٤١٦، زكـريـا قـديـم ٤/ ٣٩١، فتـاوى بـزازية، زكـريـا جديد ٣/ ١٢٣، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٣٧، البحرالرائق، زكريا ٧/ ٤٩٠، كوئٹه ٧/ ٢٨٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲ر رمضان ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۲۱۸)

اولاد کے درمیان ہبہ میں تفریق کا حکم

سوال [۹۵۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے جس کی سات اولادیں ہیں، جس میں چار لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں اور ایک عدد ان کی زوجہ۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایک عدد مکان خریدا اور اپنے لڑکے اور زوجہ کے نام کر دیا، باقی ایک لڑکا اور تین لڑکیوں کو کچھ نہ دیا (لڑکیاں تینوں شادی شدہ ہیں) اور ان لوگوں کو اپنی مالیت سے بالکل ناحق کر دیا۔ اب یہ لڑکیاں اور لڑکا اپنا حصہ یا حق مانگتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جب تم نے ایک مکان میں ہمارے تین بھائیوں کو حصہ دیا ہے تو ہمارا

بھی حصہ دو، جب کہ ہم بھی تمہاری ہی اولاد ہیں، پھر ہمیں کیوں ناحق کیا گیا؟ تو والد محترم فرماتے ہیں کہ میں ابھی زندہ ہوں میری زندگی میں کیوں مانگ رہے ہو؟ میں تم تینوں لڑکیوں کو تین دوکانیں بنوا کر دوں گا۔ اور لڑکے کو اپنی بیوی کا حصہ لیکن ان لڑکیوں کی نظر میں یہ غلط ہے، وہ چاہتی ہیں کہ ہمیں برابر سے ملے نہیں تو پھر شرعاً جو ہمارا حصہ ہوتا ہو وہ ملے، یہاں ہم کو نیچے لکھے کچھ سوالوں کے جواب بطور فتویٰ چاہئے، آپ کی مہربانی ہوگی شکریہ۔
لڑکیوں کے والد نے ان کا حق نہ دے کر کیا گناہ کیا؟ اگر گناہ کیا تو کس سزا کے خدا تعالیٰ کے یہاں حق دار ہوں گے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: بحالت صحت اگر باپ اپنی بعض اولاد کو دولت میں سے کچھ دے دے اور بعض کو نہ دے تو باپ کا دینا جائز و درست ہے؛ البتہ باپ اولاد کے درمیان یکسانیت اور برابری نہ کرنے کی وجہ سے گنہگار ہوگا۔

عن النعمان بن بشير –رضى الله عنه– قال: تصدق علي أبي ببعض ماله –إلي– فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: أفعلت هذا بولدك كلهم؟ قال: لا، قال: اتقوا الله واعدلوا في أولادكم، فرجع أبي فرد تلك الصدقة. (صحيح مسلم، باب كراهة تفضيل بعض الوالد في الهبة، النسخة الهندية ٢/ ٣٧، بيت الأفكار، رقم: ١٦٢٣)

وكذا في العطايا إن لم يقصد به الإضرار، وإن قصد به الإضرار سوى بينهم، يعطى البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتاوى. ولو وهب في صحته كل المال للولد جاز، وأثم. الخ (الدرالمختار، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٥٠١-٥٠٢، كراچى ٥/ ٦٩٦، قاضي خان، زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩، هندية، كتاب الهبة، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا جديد ٤/ ٤١٦، زكريا قديم

٤/ ٣٩١، فتاوى بزازية، زكريا جديد ٣/ ١٢٣، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٣٧، البحر الرائق، زكريا ٧/ ٤٩٠، كوئٹه ٧/ ٢٨٨)

اور سزا کیا ہوگی وہ اللہ کو معلوم ہے۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر:۲۶/۲۰۴۲/۲۰۴۲)

لڑکے کو الگ کرنے کی صورت میں جائیداد کی تقسیم

سوال [۹۵۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید اور عمر دونوں بھائی ہیں، ان کی ایک بہن زینب ہے اوران کے والدین بھی حیات ہیں، بھائی میں اتفاق نہ ہونے کی وجہ سے والد صاحب اپنے لڑکے کو الگ کرنا چاہیں تو ان کے لڑکے اور لڑکی کو حصہ کتنا ملے گا؟ جب کہ زینب کی شادی ہو چکی ہے، زید اور عمر کے والدین کے پاس صرف ۲۵/ روپیہ ہے اور یہ سب آدمی زندہ ہیں، لڑکی کو حق کتنا ملے گا؟ اگر باپ اپنی لڑکی کا حق ادا نہ کرے گا تو قیامت میں پکڑ بھی ہوگی؟

المستفتی:ضیاء الرحمٰن متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: باپ کو چاہئے کہ وہ لڑکوں کو اور لڑکی کو برابر حصہ دے، کسی کے حصہ میں کمی زیادتی نہ کرے، اگر باپ اپنی لڑکی کو حصہ نہ دے گا تو گنہگار ہوگا اور اللہ کے یہاں پکڑ ہوگی۔

عن أنس بن مالك –رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: من فر من ميراث وارثه قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة. (سنن ابن ماجة، باب الحيف في الوصية، النسخة الهندية ٢/ ١٩٤، دارالسلام، رقم: ٢٧٠٣)

عن سليمان بن موسى قال: قال رسول الله ﷺ: من قطع ميراثا

فرضه الله قطع الله ميراثه من الجنة. (سنن سعيد بن منصور، باب من قطع ميراثا فرضه الله، دارالكتب العلمية بيروت ١/ ٩٦، رقم: ٢٨٥-٢٨٦)

عن شعبي قال: سمعت النعمان بن بشير -رضي الله عنهما- يقول: أعطاني أبي عطية -إلي- فقال: أعطيت سائر ولدک مثل هذا، قال: لا، قال: فاتقوا الله واعدلوا بين أولادكم، قال: فرجع فرد عطيته. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الوصايا، في الرجل يفضل بعض ولده على بعض، مؤسسة علوم القرآن ١٦/ ٢٠٠، رقم: ٣١٦٣٦)

ويكره تفضيل بعض الأولاد على البعض في الهبة حالة الصحة. (البحرالرائق، كتاب الهبة، كوئٹه ٧/ ٢٨٨، زكريا ٧/ ٤٩٠)

وفي الخلاصة: المختار التسوية بين الذكر والأنثى في الهبة. (البحرالرائق، كتاب الهبة، زكريا ٧/ ٤٩٠، كراچی ٧/ ٢٨٨)

يعطي للابنة مثل ما يعطي للابن ...... والفتوى على قول أبي يوسف. (قاضي خان، فصل في هبة الوالد لولده، زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ رجب ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۳۹۱)

کیا والد کو نافرمان لڑکوں کو محروم کرنے کا حق ہے؟

سوال [۹۵۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے دو شادیاں کیں، پہلی بیوی سے ایک لڑکا ہے اور دوسری بیوی سے تین لڑکے ایک لڑکی ہے؛ لیکن پہلی بیوی بغیر طلاق دئے اپنے شوہر کو چھوڑ کر چلی گئی، بچہ بھی ساتھ چلا

گیا، جب کہ زید سخت بیمار بھی رہتا تھا، اب لڑکا جوان ہے، زید نے کئی دفعہ اپنی بیماری کی وجہ سے لڑکے کو بلایا؛ لیکن لڑکا نہیں آیا، یہاں تک کہ زید نے کہا کہ اگر تم نہیں آئے تو تم کو جائیداد میں سے کچھ بھی نہیں دیں گے، اس کے باوجود لڑکا نہیں آیا، تو اب چونکہ زید بیمار رہتا تھا اور لڑکے نے کوئی آرام نہیں پہنچایا، اس لئے زید دوسری بیوی سے جو بچے ہیں، ان کو اپنی زندگی میں پوری جائیداد نام کر دینا چاہتا ہے اور پہلی بیوی سے جو لڑکا ہے اس کو کچھ بھی دینا نہیں چاہتا ہے، تو ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پہلی بیوی جو شوہر کو چھوڑ کر چلی گئی ہے اور بالغ لڑکے نے باپ کی حکم عدولی اور نافرمانی کے ساتھ زید سے گریز کیا ہے، جو لڑکے کے لئے کسی طرح جائز نہیں تھا، تو اس طرح نافرمان لڑکے کو کچھ نہ دے کر مطیع اور فرماں بردار لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان دولت تقسیم کر دینا جائز ہے؛ لہٰذا فرار شدہ بیوی کی اولاد میں سے جو بالغ نافرمان ہیں، ان کو محروم کر دینا جائز ہوگا اور نابالغ اور فرماں بردار کو محروم کر دینا جائز نہ ہوگا۔

عن أنس بن مالک –رضي اللّٰہ عنہ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم: من فر من میراث وارثہ قطع اللّٰہ میراثہ من الجنۃ یوم القیامۃ. (سنن ابن ماجۃ، باب الحیف في الوصیۃ، النسخۃ الهندیۃ ۲/ ۱۹٤، دارالسلام، رقم: ۲۷۰۳)

عن سلیمان بن موسی قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم: من قطع میراثا فرضہ اللّٰہ قطع اللّٰہ میراثہ من الجنۃ. (سنن سعید بن منصور، باب من قطع میراثا فرضہ اللّٰہ، دارالکتب العلمیۃ بیروت ۱/ ۹٦، رقم: ۲۸۵-۲۸٦)

وإن أراد أن یصرف مالہ إلی الخیر وابنہ فاسق، فالصرف إلی الخیر أفضل من ترکہ لہ؛ لأنہ إعانۃ علی المعصیۃ، وکذا لو کان ابنہ فاسقا لا یعطیہ أکثر من قوتہ. (بزازیۃ، کتاب الهبۃ، الفصل الأول، الجنس الثالث زکریا، جدید ۳/ ۲۳/ ۱، وعلی هامش الهندیۃ ٦/ ۲۳۷، الفتاوی التاتارخانیۃ، زکریا ١٤/ ٤٦٢، رقم: ۲۱۷۲۵)

لا بأس بأن يعطى من أولاده من كان عالما متأدبا، ولا يعطى منهم من كان فاسقا فاجرا. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دار الكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩٧، مصري قديم ٢/ ٣٥٨، وهكذا في الهندية، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦، البحر الرائق، زكريا ٧/ ٤٩٠، كوئٹه ٧/ ٢٨٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۰۶۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/ ۶/ ۱۴۱۵ھ

نافرمان اولاد کو محروم کرنے سے والدین گنہگار نہیں ہوں گے

سوال [۹۵۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نسیم احمد صابر ولد جمال احمد مرحوم، ساکن کسرول مرادآباد میرے چار لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہیں، اور چاروں لڑکوں میں سے ایک لڑکا بنام محمد ناصر عرف نوری کو میں نے لاکھوں روپئے خرچ کر کے اعلیٰ تعلیم دلائی اور گلبرگہ کرناٹک کی یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی ڈگری دلائی، مگر اس لڑکے نے میرے اور میری بیوی دونوں کے ساتھ ایسی ایسی گندی حرکتیں کی ہیں کہ نافرمانی کی حد کردی، میں ایسے نافرمان لڑکے کو اپنی جائیداد اور سرمایہ میں سے ایک پیسہ بھی نہیں دینا چاہتا اور میں اپنی ہی زندگی میں ساری جائیداد اور سرمایہ اس نافرمان لڑکے کو چھوڑ کر دیگر اولادوں کے درمیان تقسیم کر دینا چاہتا ہوں، کیا شریعت میں اس کی اجازت ہے کہ نافرمان بیٹے کو کچھ نہ دے کر فرماں بردار اولاد کے درمیان اپنا سرمایہ تقسیم کر دیا جائے؟

المستفتی: نسیم احمد صابری، محلہ کسرول، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: نسیم احمد صابری کے بیٹے محمد ناصر عرف نوری کے بارے میں سوال نامہ میں ماں باپ کا نافرمان اور سرکش ہونے کی جو وضاحت کی گئی ہے اور وہ بھی

لاکھوں روپئے خرچ کرکے ماں باپ نے انجینئرنگ کی ڈگری دلائی، پھر بھی ماں باپ کا ایسا سخت نافرمان ثابت ہوا جس کے نتیجے میں ماں باپ پریشان پھر رہے ہیں، تو ایسی صورت میں ماں باپ کے لئے جائز ہے کہ اپنی ساری جائیداد اور سرمایہ فرماں بردار اولاد کے درمیان تقسیم کردیں اور نافرمان لڑکے کو کچھ نہ دیں اور شرعی طور پر نافرمان لڑکے کو کچھ نہ دینے سے ماں باپ گنہگار نہیں ہوں گے۔

لا بأس بأن يعطى من أولاده من كان عالما متأدبا، ولا يعطى منهم من كان فاسقا فاجرا. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩٧، مصري قديم ٢/ ٣٥٨)

إن كان التفضيل بالزيادة فلا بأس بذلك، وإن كان في البر سواء لا ينبغي أن يفعل ذلك، وإن كان له ولد فاسق لا يعطيه. (الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٤/ ٤٦٢، رقم: ٢١٢٧٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ / رجب ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۹۱۴/۳۸)

نافرمان بیٹے کو جائیداد سے محروم کرنا

سوال [۹۵۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) محمد کلیم الدین اپنی حیات میں اپنی جائیداد اپنی اولادوں کے درمیان تقسیم کرنا چاہتے ہیں، دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں، بیوی بھی حیات ہے، تو اگر زندگی میں تقسیم کرنا ہے، تو شرعاً کس طرح تقسیم کریں؟

(۲) ایک لڑکا نافرمان ہے، اس کو میں نے دو سال پہلے ناحق کردیا ہے، اس کو نہ دے کر بقیہ اولادوں کو دے دوں، تو کیا گناہ ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: کلیم الدین محلّہ جامع مسجد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کلیم الدین اگر اپنی حیات میں ہی اپنی جائیداد تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو اپنے اور بیوی کے لئے جو حصہ نکال کر رکھنا چاہیں رکھ لیں، اس کے بعد بقیہ جائیداد تمام لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان برابر تقسیم کر کے قبضہ دلا سکتے ہیں۔ اور اگر کوئی لڑکا نافرمان ہے، اس کو نہ دے کر دوسری اولادوں میں برابر کر کے تقسیم کر دیں، تو گنہگار نہ ہوں گے اور زندگی میں تقسیم کرتے وقت لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر دینے کا خیال رکھنا چاہئے۔

عن النعمان بن بشير –رضى الله عنه– قال: تصدق علي أبي ببعض ماله –إلى– فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: أفعلت هذا بولدك كلهم؟ قال: لا، قال: اتقوا الله واعدلوا في أولادكم، فرجع أبي فرد تلك الصدقة. (صحيح مسلم، باب كراهة تفضيل بعض الوالد في الهبة، النسخة الهندية ٢/ ٣٧، بيت الأفكار، رقم: ١٦٢٣)

كل يتصرف في ملكه كيف شاء. (شرح المجلة رستم مكتبه إتحاد ١/ ٦٥٤، رقم المادة: ١١٩٢)

ويكره تفضيل بعض الأولاد على البعض في الهبة حالة الصحة. (البحرالرائق، كتاب الهبة، كوئٹه ٧/ ٢٨٨، زكريا ٧/ ٤٩٠)

قال الطيبيؒ: فيه استحباب التسوية بين الأولاد في الهبة، فلا يفضل بعضهم على البعض. (شرح الطيبي، كتاب البيوع، باب الهبة، الفصل الأول، كراچی ٦/ ١٨١، تحت رقم الحديث ٣٠١٩)

يعطي الابنة مثل ما يعطى الابن، وعليه الفتوى، وهو المختار. (هندية، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦)

يعطى البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتوى. (شامي، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٥٠١، كراچی ٥/ ٦٩٦)

وعلى جواب المتأخرين لا بأس بأن يعطى من أولاده من كان عالما متأدبا، ولا يعطى منهم من كان فاسقا فاجرا. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۴۹۷، مصري قديم ۲/ ۳۵۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ رجب ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۴۴۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۳؍۷؍۱۴۳۲ھ

نافرمان بیٹے کو جائیداد سے محروم کرنے کا شرعی حکم

سوال [۹۵۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرا ایک مکان ایک سوچالیس گز کا ہے، میرے ہی نام ہے، میرا ایک بیٹا ہے، دو لڑکیاں ہیں، بیٹا نافرمان ناخلف ہے، مجھے بھی مارتا ہے اور میری لڑکیوں کو بھی مارتا اور ستاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ مکان میرا ہے، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ اس مکان کا میں مالک ہوں یانہیں؟ میں اپنے اس مکان کو اپنی زندگی میں فروخت کرنے کا اختیار رکھتا ہوں یانہیں؟

المستفتی: عبداللطیف عرف جمعہ بابو، بیگم والی مسجد اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اپنی زندگی میں اپنی تمام جائیداد کے مالک تنہا آپ (عبداللطیف عرف جمعہ بابو) ہیں، آپ کو اس میں ہر طرح کے تصرف کا مکمل اختیار ہے، جسے چاہیں، ہبہ کردیں یا فروخت کردیں؛ بلکہ اگر نافرمان لڑکے کو نہیں دیں گے، تو گنہگار نہ ہوں گے، آپ کے نافرمان بیٹے کا آپ کی حیات میں اس جائیداد میں کوئی حق نہیں ہے، اس کا مکان کی ملکیت کا دعویٰ کرنا سراسر ظالمانہ وغاصبانہ دعوی کرنا ہے، وہ آپ اور بہنوں کے ساتھ بدسلوکی اور زدوکوب کرنے کے سبب سخت گنہگار اور فاسق ہے، اس پر لازم ہے کہ وہ انتہائی ندامت اور شرمندگی کے ساتھ اللہ کے حضور میں توبہ واستغفار کرے۔

عن عبدالله بن عمرو –رضي الله عنه– عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: رضا الرب في رضا الوالد، وسخط الرب في سخط الوالد. (ترمذي، باب ماجاء من الفضل في رضا الوالدين، النسخة الهندية ۲/ ۱۲، دارالسلام، رقم: ۱۸۹۹، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ۶/ ۳۷۶، رقم: ۲۳۹۴، المستدرك للحاكم، كتاب البر والصلة، مكتبه نزار مصطفى الباز، جديد ۷/ ۲۵۸۹، قديم ٤/ ۱۳۲، رقم: ۷۲٤۹)

عن سعيد بن زيد –رضى الله عنه– قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أخذ شبرا من الأرض ظلما، فإنه يطوقه يوم القيامة من سبع أرضين. (صحيح مسلم، باب تحريم الظلم وغصب الأرض وغيرها، النسخة الهندية ۲/ ۳۳، بيت الأفكار، رقم: ۱۶۱۰، صحيح البخاري، باب ماجاء في سبع أرضين، النسخة الهندية ۱/ ٤٥٤، رقم: ۳۰۹٤، ف: ۳۱۹۸، مشكوة المصابيح /۲۵۵)

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء. (بيضاوي، كتب خانه رشديه دهلى ۱/ ۷)

كل يتصرف في ملكه كيف شاء. (شرح المجلة رستم مكتبه إتحاد ۱/ ٦٥٤، رقم المادة: ۱۱۹۲)

إن الملک ما من شأنه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص. (شامي، كتاب البيوع، مطلب في تعريف المال، زكريا ۷/ ۱۰، كراچى ٤/ ۵۰۲)

ولو كان ولده فاسقا، وأراد أن يصرف ماله إلى وجوه الخير ويحرمه عن الميراث، هذا خير من تركه. (هندية، كتاب الهبة، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا قديم ٤/ ۳۹۱، جديد ٤/ ٤۱٦، البحرالرائق، زكريا ۷/ ٤۹۰، كوئٹه ۷/ ۲۸۸)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۸ / ذی قعدہ ۱۴۳۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۲۱۸)	۱۴۳۱/۱۱/۲۸ھ

نافرمان لڑکے کو جائیداد سے محروم کرنا

سوال [۹۵۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) میرے لڑکے ہیں دو، وہ ایک ہی جگہ تھے، اب جدا جدا ہو گئے، ان کی والدہ نے کہا میں چھوٹے لڑکے کے پاس رہوں گی، میری بابت کہا تم کہیں رہو میں نے کہا میں لڑکی کے پاس چلا جاؤں گا، میرے بڑے لڑکے نے کہا تم میرے پاس رہو، میری تیمار داری خدمت گذاری بڑا لڑکا ہی کرتا ہے، چھوٹے لڑکے نے میرا مقابلہ کیا، مجھے ناگوار گذرا، میں کچھ آمدنی کا سلسلہ رکھتا ہوں، توان روپیوں کا حق دار کون ہے؟ شریعت مطہرہ کی رو سے جواب مرحمت فرمائیں۔

(۲) میرا چھوٹا لڑکا ایک لڑکی لے آیا، اس کے والد نے مقدمہ دائر کردیا، اس مقدمہ میں دونوں کا روپیہ لگا، لڑکی گرفتار ہوگئی، لڑکی کے بیان پر مقدمہ میرے چھوٹے لڑکے کے حق میں ہوگیا، اس کی دونوں بیوی ایک جگہ رہنے لگیں، چھوٹے لڑکے کی شادی پہلے ہی ہو چکی تھی، اب ان دونوں عورتوں نے اس کی والدہ کی خدمت میں بالکل کمی کردی، بیماری میں تیمارداری بھی نہیں کی، ان کی والدہ بہت پریشان، بڑے لڑکے کو معلوم ہوا تو وہ اپنی والدہ کی خبر لینے گیا، اسے دیکھ کر وہ رونے لگیں اور کہا کہ تو مجھے اپنے ساتھ لے جا، وہ والدہ کو ساتھ لے آیا۔ ۱۹۹۷ء سے ہم دونوں ساتھ ہی بڑے لڑکے کے پاس رہتے ہیں، میرے والد کی جائیداد تھی، وہ میں نے فروخت کردی، چھوٹا لڑکا کہتا ہے آدھا روپیہ مجھے دو، بڑا لڑکا کہتا ہے مقدمہ کا خرچ اور والدہ کے خرچ کا روپیہ لو، اب اس میں کیا کرنا چاہئے؟

المستفتی: برکت اللہ بانس کھیڑی، نوگاواں سادات، جے پی نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱-۲) باپ کو اپنی اولاد کے ساتھ نہایت شفقت رحم وکرم کا معاملہ کرتے ہوئے سب اولادوں کو ایک نظر سے دیکھنا چاہئے۔ حدیث شریف میں اولاد کے

درمیان مساوات وشفقت کا معاملہ نہ کرنے والے کے لئے سخت ترین وعید آئی ہے، لڑکا اگر نافرمان ہے، تو اس کا یہ عمل عند اللہ وعند الناس بہت برا ہے۔ اور یہ سخت ترین گنہگار ہے، اس کو چاہئے کہ باپ سے تمام غلطیوں کی معافی کرا کے باپ کو راضی کرلے، باپ کی ملکیت میں جو کچھ ہے خواہ آمدنی کی شکل میں ہو یا باپ کی جائیداد فروخت کرنے کے نتیجہ میں، اس میں باپ خود مختار ہے، جس کو چاہے دے اور جس کو چاہے نہ دے۔ اور باپ کو یہ بھی اختیار ہے کہ چھوٹے بیٹے کے نافرمان ہونے کی وجہ سے اس کو نہ دے کر بڑے کو دے دے۔

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء. (بيضاوي، كتب خانه رشديه دهلى ١/٧)

لا بأس بأن يعطى من أولاده من كان عالما متأدبا، ولا يعطى منهم من كان فاسقا فاجرا. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دار الكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩٧، مصري قديم ٢/ ٣٥٨)

وإن كان له ولد فاسق لا يعطيه. (الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٤/ ٤٦٢، رقم: ٢١٧٢٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۷/ ربیع الاول ۱۴۲۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۱۲۵)	۱۴۲۲/۳/۱۸ھ

نافرمان بچوں کو جائیداد سے محروم کرنے کی شرعی حیثیت

سوال [۹۵۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے چھ لڑکے اور ایک لڑکی ہے، میرے دو لڑکے نہایت بدتمیز اور مجھے پریشان کرنے والے ہیں، ان دونوں کی شادیاں بھی ہو چکی ہیں، ہر وقت ماں باپ کو ستانا اور تکلیفیں پہنچانا، گالیاں دینا اور جائیداد لینے کے لئے تھانہ میں رپورٹ کرنا ان کا معمول ہے، ان حالات

میں میں اپنا مکان وغیرہ اپنے فرماں بردار بچوں کے نام رجسٹری بیع نامہ کرانا چاہتا ہوں؛ اس لئے کہ فرماں بردار بچے ہی والدین کے خرچ واخراجات برداشت کررہے ہیں، میں تو کوئی کمائی نہیں کر پاتا ہوں،فرماں بردار بچوں میں سے تین بچوں کی ابھی شادی بھی باقی ہے، اہلیہ مستقل بیمار رہتی ہے،اس کے علاج میں کافی رقم لگ رہی ہے، ہمارے فرماں بردار بچے ہی دوا علاج کررہے ہیں، اب دریافت یہ کرنا ہے کیا شرعاً میرے لئے اس کی اجازت ہے کہ اپنی تمام جائیداد وغیرہ فرماں بردار بچوں کو دے کر مالک وقابض بنادوں؟

المستفتی: حاجی رفیق احمد عرف چھوٹے دولت باغ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نافرمان بیٹوں کو کچھ نہ دے کر فرماں بردار اولاد کے درمیان جائیداد تقسیم کردینا جائز ہے اور آپ اپنی زندگی میں اپنی جائیداد کے خود مالک ومختار ہیں، آپ کی زندگی میں کسی بھی اولاد کو اپنے حق کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہے؛ لہٰذا آپ کو یہ اختیار ہے کہ فرماں بردار اولادوں کے درمیان جائیداد رجسٹری کرکے ان کو مالک بنادیں اور نافرمان اولاد کو کچھ نہ دینے کا کوئی گناہ آپ پر نہیں ہوگا۔

ولو كان ولده فاسقا، فأراد أن يصرف ماله إلى وجوه الخير، ويحرمه عن الميراث هذا خير من تركه؛ لأن فيه إعانة على المعصية. (البحرالرائق، كتاب الهبة، زكريا ٧/ ٤٩٠، كوئٹه ٧/ ٢٨٨، هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦، بزازية، زكريا جديد ٣/ ١٢٣، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٣٧)

وإن كان له ولد فاسق لا يعطيه، وينبغي أن لا يعطيه أكثر من قوته كي لا يصير معينا له على المعصية. (الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٤/ ٤٦٢، رقم: ٢١٧٢٥)

وإن كان بعض أولاده مشتغلا بالعلم دون الكسب لا بأس بأن يفضله على غيره، وعلى جواب المتأخرين لا بأس بأن يعطى من أولاده من كان

عـالـمـا متـأدبـا، ولا يـعـطـي من كـان فاسقا فاجرا. (مـجـمـع الأنهر، كتاب الهبة، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩٧، مصري قديم ٢/ ٣٥٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۶۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/ ۴/ ۱۴۳۴ھ

نافرمان اولاد کو زندگی میں تقسیم جائیداد سے محروم کرنا

سوال [۹۵۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے تین بیٹے ہیں، عمر، بکر، طاہر، زید کے تینوں بیٹے شادی شدہ ہیں، زید کے پاس صحرائی وسکنائی جگہ ہے، زید کو یہ اختیار ہے یا نہیں کہ زید اپنی جگہ کاشت کی اور گھر کی اپنے تینوں بیٹوں میں تقسیم کردے اور ایک کو نہ دے یا دو کو نہ دے اور ایک کو دے دے یا تینوں کو نہ دیوے؟ ایک بیٹے کو نہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ ایک بیٹا ہم سے کسی طرح کا تعلق نہیں رکھتا اور نہ ہم سے کلام کرتا ہے اور نہ ہمارا کسی طرح خیال رکھتا ہے، زید کو شرعی اعتبار سے کتنے اختیارات ہیں؟

المستفتی: حافظ حمید الدین محلّہ چودھریان سلیم پور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کی زندگی میں اس کی ساری جائیداد اسی کی ملک ہے، وہ اپنی ملکیت کو جس طرح چاہے استعمال کرسکتا ہے، اولاد کے درمیان تقسیم کرنے یا کسی کو دینے یا نہ دینے کے بارے میں زید پر کسی کو دباؤ ڈالنے کا حق نہیں ہے، ہاں البتہ اگر زید اپنی مرضی سے اپنی جائیداد اولاد کے درمیان تقسیم کردینا چاہے تو لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے ساتھ برابر دینا لازم ہوجائے گا، ورنہ زید گنہگار ہوگا؛ البتہ اس کی گنجائش ہے کہ جو لڑکا نافرمان ہے اس کو کچھ نہ دے کر دوسری اولاد کے درمیان تقسیم کردے۔

كـل يتـصرف في ملكه كيف شاء. (شـرح الـمـجلة رستم مكتبه إتحاد ١/ ٦٥٤، رقم المادة: ١١٩٢)

وفي الخلاصة: المختار التسوية بين الذكر والأنثى في الهبة، ولو كان ولده فاسقا، فأراد أن يصرف ماله إلى وجوه الخير، ويحرمه عن الميراث هذا خير من تركه. (عالمگيري، كتاب الهبة، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦، البحرالرائق، كتاب الهبة، زكريا ٧/ ٤٩٠، کراچی ٧/ ٢٨٨)

وينبغي أن يعدل بين أولاده في العطايا والعدل عند أبي يوسف أن يعطيهم على السواء، وهو المختار، ولا يعطى منهم من كان فاسقا فاجرا. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩٧، قديم: ٢/ ٣٥٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍صفر ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۸۹۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/۲/۱۴۳۱ھ

نافرمان اولاد کو محروم کرنے کا شرعی حکم

سوال [۹۵۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں قمرالدین ولد مولا بخش محلہ لال مسجد کا رہنے والا ہوں سائل کے تین جوان لڑکے ہیں، ان کی ماں انہیں بچپن میں چھوڑ کر مرگئی تھی، اس کے انتقال کے بعد میں نے عقد ثانی کرلیا تھا، میری دوسری بیوی نے ان تینوں لڑکوں کو مثل اپنی اولاد کے پالا، اب یہ بڑے ہوکر میرا مقابلہ کرنے لگے ہیں اور طرح طرح کی تکلیفیں اور ایذائیں پہنچاتے ہیں، تمام اثاثہ چھین کرلے گئے اور بے روزگار کردیا، اب صرف دو مکان ہیں، جس میں نصف کے حق دار بتاتے ہیں، پہلی بیوی کی اولاد ہوتے ہوئے ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے میں انہیں کچھ دینا نہیں چاہتا، ایک عرصہ قبل ان کو عاق کرچکا ہوں، میری دوسری بیوی سے تین لڑکے اور ایک

لڑکی ہوشیار اور بالغ ہوگئے ہیں اور شادی کے لائق ہیں، ان کی شادی بھی کرنی ہے اور بیوی بھی حیات ہے، تو کیا پہلی بیوی کے لڑکے زندگی ہی میں اپنی سرکشی سے حصہ لے سکتے ہیں، شرعاً کتنا کتنا دینے کا سائل پابند ہے، زندگی میں بانٹ کر سائل کسی بھی وارث کا دست گریباں نہیں رہنا چاہتا۔

(۱) ایسی صورت میں سائل اپنے لئے کتنا بچا کر رکھے اور کیا عاق کر دینے کے بعد بھی پہلی بیوی سے لڑکے حق پانے کے مستحق ہیں؟

(۲) مجھ سے میری زندگی ہی میں یہ تینوں نافرمان لڑکے اپنا حق پا سکتے ہیں یا نہیں؟

(۳) کیا ان تینوں نافرمان لڑکوں کا حصہ ان کے بچوں کے نام یا معاوضہ ان کے نام کیا جا سکتا ہے؟

المستفتی: قمرالدین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفیق: آپ اپنی زندگی میں تمام جائیداد کے خودمختار مالک ہیں، آپ کا دل نہ چاہے تو کسی کو نہ دیں اور آپ کو یہ بھی اختیار رہے کہ فرماں بردار اولاد کو دے کر قبضہ دے دیں اور نافرمانوں کو محروم کر دیں، نیز اگر آپ زندگی میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو اپنے اختیار سے جتنا چاہیں اپنے لئے رکھ لیں اور جتنا اپنی مرضی سے موجودہ بیوی کو دینا چاہیں دے کر بقیہ کو اپنی فرماں بردار اولاد کے درمیان برابر برابر تقسیم کر دیں اور نافرمانوں کو محروم کر دیں۔

وینبغي أن یعدل بین أولاده في العطایا –إلی قوله– لابأس بأن یعطی من أولاده من کان عالما متأدبا، ولا یعطی منهم من کان فاسقا فاجرا.

(مجمع الأنهر، کتاب الهبة، دارالکتب العلمیة بیروت ۳/ ۴۹۷، قدیم: ۲/ ۳۵۸، بزازیة، زکریا جدید ۳/ ۱۲۳، وعلی هامش الهندیة ٦/ ۲۳۷، الفتاوی التاتارخانیة، زکریا ۱٤/ ٤٦۲، رقم: ۲۱۷۲۵، البحرالرائق، زکریا ۷/ ٤۹۰، کوئٹه ۷/ ۲۸۸، هندیة، زکریا قدیم ٤/ ۳۹۱، جدید ٤/ ۲۱٦)

نیز اگر آپ نے نافرمان اولاد کو صرف عاق کر کے چھوڑ دیا ہے اور جائیداد آپ کی ملکیت میں رہنے کی حالت میں آپ کا انتقال ہوجائے تو آپ کی میراث میں نافرمان اولاد بھی شریک ہوجائے گی اور شرعاً وہ آپ کے مرنے کے بعد آپ کے ترکہ سے محروم نہ ہوگی، ہاں البتہ اگر آپ اپنی زندگی میں فرماں بردار اولاد کو ہبہ کر کے قبضہ دے دیں گے، تو محروم ہوسکتی ہے، نیز زندگی میں باپ کی ملکیت میں اولاد کا کوئی حق نہیں ہوتا ہے، اس لئے ان کو اپنا حق مانگنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

أما بيان الوقت الذي يجري فيه الإرث ...... قال مشايخ بلخ: الإرث يثبت بعد موت المورث. (البحرالرائق، كتاب الفرائض، زكريا ۹/ ۳٦٤، كوئٹه ۸/ ٤۸۸)

الإرث جبري لا يسقط بالإسقاط. (تكملة رد المحتار، كراچی ۷/ ٥٠٥، زكريا ۱۱/ ٦۷۸، تنقيح الفتاوى الحامدية ۲/ ۲٦، ۲/ ٥۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم رمضان ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۱۶۹)

نافرمان اولاد کو محروم کرنے کی شرعی حیثیت

سوال [۹۵۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سائل محبوب الاسلام، ساکن موضع سلیم پور کا ہے، میرے یہاں دو بیویاں ہیں، پہلی بیوی سے تین لڑکے ایک لڑکی ہیں، مذکورہ تین لڑکوں میں سے بڑے دو لڑکوں کی شادیاں ہوچکی ہیں اور ایک لڑکی کی بھی شادی ہوچکی ہے، تیسرا چھوٹا لڑکا غیر شادی شدہ ہے، دوسری بیوی سے دو لڑکے، دو لڑکیاں ہیں، جن میں سے صرف ایک لڑکی کی شادی ہوئی، دو لڑکے اور ایک لڑکی غیر شادی شدہ ہیں، دونوں بیویوں کی اولاد میں چار کی شادی ہونی باقی ہے، پہلی بیوی کا بڑا لڑکا سخت نافرمان ہے اور میرا جانی دشمن ہے، ایک مرتبہ مجھ پر بندوق سے فائر بھی کر چکا

ہے، نشانہ خطا ہونے کی بنا پر میں بچ گیا، دوسری مرتبہ پھر مجھے ایک موقع پر مارنے کے ارادے سے بندوق اٹھا کر لایا، مگر لوگوں نے چھین لی اور مجھے بچالیا، یہی مذکورہ لڑکا مجھ سے اپنا بقدر حصہ آراضی صحرائی کا مطالبہ کرتا ہے، اس کی ماں یعنی میری بڑی بیوی اس کو ابھارتی ہے کہ تمہارے باپ کے پاس جو جائیداد ہے وہ خریدی ہوئی تو نہیں ہے، آبائی ہے؛ لہٰذا باپ کے مرنے پر اس کو جس طرح ملی ہے تم بھی ان سے جبراً اپنا حصہ لو، مذکورہ بڑے لڑکے کی دیکھا دیکھی دوسری نرینہ اولاد بھی چاہتی ہے کہ بٹوارہ ہو جائے؛ البتہ وہ کھل کر نہیں کہتے، ایسے حالات میں جب کہ مجھے چار نفر کی شادیاں کرنی ہیں، مذکورہ اولاد کو جائیداد تقسیم کرنی چاہئے یانہیں؟ میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے بڑے لڑکے کو اس کی سخت نافرمانی اور عناد کے عوض اپنی جائیداد سے محروم کردوں کیا میرے لئے مذکورہ حالات کے پیش نظر ایسا کرنا جائز ہے یانہیں؟ معلوم ہو کہ میں نے دونوں لڑکوں کی شادیوں میں جو زیور چڑھایا تھا وہ انہیں کے پاس ہے، جس سے انہوں نے اور کچھ تھوڑی سی رقم شامل کر کے چوبیس چوبیس بیگہ زمین صحرائی خریدی ہے، جو انہیں کے نام ہے اور ایک زمین تقریباً سولہ بیگہ میں نے خریدی تھی، جب کہ میری دوسری اولاد چھوٹی تھی وہ سولہ بیگہ زمین اسی بڑے لڑکے اور اس سے چھوٹے لڑکے کے نام ہے، دونوں کی آٹھ آٹھ بیگہ ہوئی ہے، مگر اس پر قابض میں ہی ہوں، مطلب یہ ہے کہ ان کی گذراوقات کے لئے یہ کافی ہے جو لڑکا میرا جانی دشمن ہے، اس کو میں اپنی جائیداد سے محروم کرنا چاہتا ہوں، شرعاً اس کا جواز ہے یانہیں؟

المستفتی: محبوب الاسلام سلیم پور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر بڑا لڑکا آپ کا جانی دشمن اور سخت نافرمان ہے، تو شرعاً آپ کو حق ہے، اپنی زندگی میں تمام جائیداد فرماں بردار اولاد میں برابر تقسیم کردیں اور نا فرماں کو کچھ بھی نہ دیں، ایسی صورت میں آپ گنہگار نہ ہوں گے اور جن کو دینا ہے، ان کو دے کر قبضہ بھی دے دینا لازم ہے، ورنہ ہبہ مکمل نہ ہوگا۔

لا بأس بأن يعطى من أولاده من كان عالما متأدبا، ولا يعطى منهم من كان فاسقا فاجرا. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ٤٩٧، مصري قديم ۲/ ۳٥۸، وهكذا في الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٤/ ٤٦٢، رقم: ٢١٧٢٥، بزازية، زكريا جديد ۳/ ۱۲۳، وعلى هامش الهندية ٦/ ۲۳۷)

نیز زندگی میں تقسیم کرنے میں لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر دینا لازم ہے، ورنہ آپ گنہگار ہوں گے، ہاں البتہ لڑکیاں اپنی خوشی سے بھائیوں کو زیادہ دینے پر راضی ہوجائیں تو الگ بات ہے۔

فسوى بينهم يعطى البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتوى، ولو وهب في صحته كل المال للولد جاز وأثم. (الدرالمختار، كتاب الهبة، زكريا ۸/ ٥٠١، ٥٠٢، كراچی ٥/ ٦٩٦، قاضي خان، زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩، هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۳؍ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/۳۰۶۳)	۱۴۱۳/۳/۱۴ھ

زندگی میں تقسیم کرنے پر نافرمان بیٹے کو محروم کرنا

سوال [۹۵۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرا ایک لڑکا جو مجھے ہر وقت پریشان کرتا رہتا ہے، یعنی گالم گلوچ اور مارتا پیٹتا ہے، ان کی بیوی سسرال والوں کے سامنے مجھے ذلیل کرتی ہے، ان کی بیوی مجھے چوری وغیرہ کی تہمت بھی لگاتی رہتی ہے، میں حد درجہ پریشان ہوکر آپ کے پاس آیا ہوں، آیا میں اس بیٹے کو مال سے محروم کرسکتا ہوں جو مجھے مارنے اور پیٹنے کے لئے تیار ہوجاتا ہے، ایک دفعہ میرا گلا بھی گھونٹ دیا کہ لوگ نہ پکڑتے تو میرا کام ہی تمام کرڈالتا، دوسری دفعہ بھی اس نے ایسا ہی

کیا، وہ مجھے جان سے ختم کرڈالتا، تو اس نافرمان لڑکے کے علاوہ چار لڑکے ایک لڑکی اور ہیں، کیا میں اپنی تمام جائیداد اس نافرمان لڑکے کے علاوہ سب کو دے دوں؟

المستفتی: امین الدین عمری کلاں، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حدیث پاک میں آیا ہے، آقائے نامدار علیہ الصلاۃ والسلام کا ارشاد ہے:

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ليس منا من لم يرحم صغيرنا، ولم يؤقر كبيرنا. (سنن الترمذي، باب ما جاء في رحمة الصبيان، النسخة الهندية ٢/ ١٤، دار السلام، رقم: ١٩٢١)

یعنی جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی عزت نہ کرے وہ ہمارے اسلامی طریقے اور سنت کے دائرہ میں نہیں ہے؛ لہٰذا مذکورہ مسئلہ میں اگر باپ نے بیٹے کے ساتھ رحمت وشفقت کا معاملہ نہیں کیا ہے؛ بلکہ بے رحمی کا معاملہ کیا ہے، تو باپ بھی گنہگار ہوگا، جیسا کہ حدیث شریف سے واضح ہے۔ اور اگر بیٹے نے باپ کے ساتھ بے ادبی اور گستاخی کا معاملہ کیا ہے، تو وہ سخت ترین گنہگار ہوگا۔ قرآن کریم کے اندر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا اُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا. [بني إسرائيل: ٢٣-٢٤]

یعنی باپ کے برا بھلا کہنے پر بیٹے کو اف تک کہنے کا حق نہیں؛ اس لئے بیٹے نے جو معاملہ باپ کے ساتھ کیا ہے وہ بہت برا کیا ہے، اس کو باپ کے پیروں میں پڑ کر معافی تلافی کرالینا ضروری ہے، نیز باپ کی ملکیت میں جو کچھ ہے اس میں باپ خود مختار ہے اور باپ کو یہ بھی اختیار ہے کہ نافرمان بیٹے کو نہ دے کر فرماں بردار بیٹوں کو دے دے۔

لا بأس بأن يعطى من أولاده من كان عالما متأدبا، ولا يعطى منهم من

کان فاسقا فاجرا. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دار الكتب العلمية بيروت ۳/ ۴۹۷، مصري قديم ۲/ ۳۵۸)

إن كان التفضيل بالزيادة فلا بأس بذلک، وإن كان في البر سواء لا ينبغي أن يفعل ذلک، وإن كان له ولد فاسق لا يعطيه. (الفتاوى التاتارخانية، زكريا ۱۴/ ۴۶۲، رقم: ۲۱۲۷۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۵۴۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۳/۱۴۲۱ھ

زندگی میں نافرمان اولاد کو جائیداد سے محروم کرنا

سوال [۹۵۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرا ۸۸؍ گز زمین میں ایک مکان ہے اور میں نے شادی کی تھی، میری بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی اور اس کے گذر جانے کے بعد میں نے دوسری شادی کی، اس بیوی سے ایک لڑکا محمد شریف پیدا ہوا اور اس بیوی کے گذر جانے کے بعد تیسری شادی کی، جس سے سات لڑکے اور ۵؍ لڑکیاں پیدا ہوئیں، محمد شریف اس وقت صاحب مال تھا اور ہے، میرے بارہ بچے چھوٹے چھوٹے تھے، میں نے اپنی مالی پریشانی میں یہ مکان رہن رکھا اور میں کئی سال تک بہت پریشان رہا، میں نے اپنے لڑکے محمد شریف سے خوشامدانہ طریقہ سے کہا کہ بیٹے محمد شریف مجھے زمین ادکرانے کے لئے رقم دے جو تیرے پاس ہے یا مجھے کچھ سہارا دے، میرے لڑکے محمد شریف نے مجھے کوئی پیسہ دینے سے انکار کردیا، میں اس وقت بہت ہی پریشان تھا، میں نے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو محمد لئیق محمد حنیف کو مجبوری میں کام پر ڈال دیا، جب وہ بچے کمانے کے لائق ہوئے تو انہوں نے مجھے بہت کچھ سہارا دیا، یعنی اپنی کمائی کا سارا پیسہ دیا جس سے پانچ سال میں زمین کی آزادی کا سہارا لیا اور لڑکے محمد شریف نے مجھے

آج تک کوئی پیسہ نہیں دیا اور نہ ہی میری پانچ لڑکیوں کی شادی میں کوئی سہارا دیا اور جب میرے یہ سات لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہوشیار ہوگئے، تو ان سے کہا اس گھر میں پیسہ لگاؤ اور رہو، تو محمد شریف نے منع کردیا۔

اب ہمیں علماء دین بتلائیں ان حالات پر دھیان دیتے ہوئے کہ محمد شریف کو کتنا حصہ پہنچتا ہے؟ اور میں بالکل ہوش وحواس میں ہوں اور میں نے خود اپنی مرضی سے یہ مضمون لکھوایا ہے اور یہ واقعہ رہن کا ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۶ء تک کا ہے۔ محمد شریف کے تین بچے اسی گھر میں پیدا ہوئے اور شادی بھی اسی رہن وپریشانی کے دور میں ہوئی۔

المستفتی: محمد رفیق اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ اپنی زندگی میں اپنے تمام مال وجائیداد کے خود مالک ہیں، اس میں کسی کا کوئی حق نہیں ہے، آپ کو اختیار ہے کہ نافرمان لڑکے کو دیں یا نہ دیں اور اس کو نہ دے کر دیگر اولاد کو زندگی میں ہبہ کردینے کا حق ہے؛ لیکن آپ کے مرتے وقت آپ کی ملکیت میں جو کچھ بھی باقی رہے گا، اس میں محمد شریف بھی دوسروں کی طرح حق دار ہوگا۔ اور دوسری اولاد کو اگر زندگی میں دے کر مالک بنادیں گے، تو اس میں محمد شریف کا حق نہ ہوگا۔

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء. (بيضاوي، كتب خانه رشديه دهلى ١/ ٧)

يتصرف المالک في ملكه كيف شاء. (البناية، أشرفيه ٨/ ٢١٩)

المالک للشيء هو الذي يتصرف فيه باختياره ومشيئته. (بدائع الصنائع، كتاب النكاح، فصل بيان مايبطل به الخيار، كراچى ٢/ ٣٢٧، زكريا ٢/ ٦٣٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍شوال ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۵۸۹۴/۳۴)

کلمات کفریہ بکنے والے کو جائیداد سے محروم کرنا

سوال [۹۵۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کالڑکا عالم دین مدرسہ اشرفیہ راندیر سے فارغ التحصیل ہے، ۶/بچوں کا باپ ہے، عمر ۳۸/سال ہے، کام نہیں کرتا بوڑھے باپ سے صرف اور صرف خرچ مانگتا ہے، اب تک خرچ دیا، اس کے بال بچوں کی پرورش کی اب تین سال سے الگ ہے، خرچ نہ ملنے پر کفریہ کلمات لکھتا ہے اور بولتا ہے، مثلاً کہتا ہے کہ اسلام میں کچھ نہیں ہے، صرف ''اوم'' میں یعنی ہندو دھرم میں سب ہے، روزانہ صبح دس ہزار بار ''رام، رام'' پڑھنا، روزانہ شام دس ہزار بار ''اوم، اوم'' پڑھنا، روزانہ دو پہر دس ہزار بار ''ہرے لکشمی'' پڑھنا، روزانہ سو بار ''کرشنا'' پڑھنا، اس سے سب مسئلے حل ہو جائیں گے، اللہ اللہ کہنے سے کچھ نہیں ملتا، یہ کلمات اس کے لکھے ہوئے ہیں۔ کیا یہ عالم دین مسلمان ہے؟ اس کو باپ کی جائیداد میں حصہ ملتا ہے یا نہیں؟ اس نے لکھا ہے: ''بھگوان کرشنا کے نام سے، عبدالرحمٰن کا خط:

(۱) ''خدا گیا بھاڑ میں (۲) محمد صلی اللہ علیہ وسلم چولہے میں (۳) قرآن گیا گڈھے میں (۴) پردہ گیا آگ میں (۵) اسلام گیا تیل لگانے (۶) حدیث گئی مرنے کو (۷) فقہ گیا بھونسڑی میں (۸) عربی گئی سنڈ اس میں (۹) مدینہ گیا جہنم میں۔ اسلام جھوٹا مذہب ہے، دہشت گرد مذہب ہے، اسلام مار پیٹ کرتا ہے، اسلام جھگڑے لگاتا ہے، اسلام غریب وفقیر بناتا ہے''۔ الخ

مذکورہ الفاظ خود اس کے قلم سے لکھے ہوئے لیٹر پیڈ میں ہیں۔

زید کے پاس ایک جائیداد ہے جو ۱۲/۱ ایکٹر زمین ہے، اور ۶/لڑکیاں دو لڑکے والدین زندہ ہیں، اس زمین کی تقسیم ۱۰/افراد پر ہوگی، ۱۲/۱ ایکٹر زمین اور باغ کی قیمت چالیس لاکھ روپئے ہے۔ اس نالائق لڑکے کی وجہ سے میں بیمار رہوں، اتنا دکھ اور غم ہے؛ اس لئے اس کو عاق کر دیا ہے، تو یہ عاق کر دینا صحیح ہے یا نہیں؟ باپ کے نہ ہونے کی صورت میں کتنا کتنا ملے گا؟ اور اگر

باپ لینا چاہے تو کتنا ملے گا؟ ۲ رلڑکے عفان، عبدالمتین، لڑکیاں: عائشہ، عطیہ، سمیہ، طیبہ، خدیجہ، شاہین والدہ جمیلہ، والد عبداللطیف، عاق کیا ہوا لڑکا عبدالرحمٰن۔

المستفتی: مولانا عبداللطیف بن اکبر نائکواڑ پورہ، بڑی مسجد کے بازو سنگم نیر، ضلع احمد نگر، گجرات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں باپ کے لئے بیٹے کے بارے میں جو باتیں لکھی گئی ہیں، وہ اگر درست ہیں اور واقعی میں سوال نامہ میں ذکر کردہ کفریہ کلمات بیٹے نے استعمال کئے ہیں، تو وہ قطعی طور پر اسلام سے خارج ہو چکا ہے اور اس کی بیوی کا نکاح بھی ختم ہو چکا ہے، اس کے اوپر ایمان کی تجدید اور نکاح کی تجدید لازم ہے۔ اور ساتھ میں سچی توبہ بھی لازم ہے، اس کے بغیر اس کے لئے بیوی کے ساتھ رہنا قطعاً جائز نہیں۔

أیما رجل مسلم سب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم، أو کذبہ أو عابہ، أو تنقصہ فقد کفر باللّٰہ تعالی، و بانت منہ امرأتہ. (شامي، کتاب الجهاد، باب المرتد، زکریا ٦/ ٣٧٣، کراچی ٤/ ٢٣٤)

یکفر إذا وصف اللّٰہ تعالیٰ بما لا یلیق بہ أو یسخر باسم من أسمائہ، أو بأمر من أوامرہ. (هندية، کتاب السیر، الباب التاسع في أحکام المرتدین، زکریا جدید ٢/ ٢٧١، قدیم ٢/ ٢٥٨، البحرالرائق، کوئٹہ ٥/ ١٢٠، زکریا ٥/ ٢٠٢)

من تکلم بکلمة الکفر هازلا أو لاعبا کفر عند الکل، ولا اعتبار باعتقادہ، کما صرح بہ قاضي خان في فتاواہ. (البحرالرائق، کتاب السیر، باب أحکام المرتدین، زکریا ٥/ ٢١٠، کوئٹہ ٥/ ١٢٥)

اور ایسے نافرمان اور بددین بیٹے کو اپنی جائیداد سے محروم کردینے میں باپ گنہگار نہ ہوگا۔

(۲) باپ کی زندگی میں اس کی جائیداد اور ملکیت کے اولاد مالک نہیں ہوتے؛ اس لئے باپ کی زندگی میں وراثت کے طور پر اس کی جائیداد اور ملکیت تقسیم نہیں ہوگی، سب کا مالک باپ ہی ہے، ہاں البتہ جھگڑے سے اولادوں کو بچانے کے واسطے زندگی ہی میں نافرمان اور بد

دین بیٹے کو نہ دے کر دوسری اولادوں کے درمیان جائیداد تقسیم کردینا چاہتے ہیں، تو اپنی مرضی سے جتنا چاہیں اپنے لئے اور اپنی بیوی کے لئے رکھ لیں اور بقیہ جائیداد فرماں بردار لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان برابر تقسیم کردیں۔ اور زندگی میں جائیداد تقسیم کرنے میں لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر ہی دیا جاتا ہے؛ اس لئے چھ لڑکیاں اور دو لڑکوں کے درمیان آٹھ حصہ کر کے سب کو برابر دے دیں۔

وينبغي أن يعدل بين أولاده في العطايا، والعدل عند أبي يوسف: أن يعطيهم على السواء هو المختار –إلى قوله– وعلى جواب المتأخرين لابأس بأن يعطى من أولاده من كان عالما متأدبا، ولا يعطى منهم من كان فاسقا فاجرا. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١٩٧، قديم: ٢/ ٣٥٨)

ولو كان ولده فاسقا، وأراد أن يصرف ماله إلى وجوه الخير ويحرمه عن الميراث، هذا خير من تركه. (هندية، كتاب الهبة، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦، البحرالرائق، زكريا ٧/ ٤٩٠، كوئٹه ٧/ ٢٨٨)

وإن أراد أن يصرف ماله إلى الخير وابنه فاسق، فالصرف إلى الخير أفضل من تركه له؛ لأنه إعانة على المعصية، وكذا لو كان ابنه فاسقا لا يعطيه أكثر من قوته. (بزازية، كتاب الهبة، الفصل الأول، الجنس الثالث زكريا، جديد ٣/ ١٢٣، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٣٧، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٤/ ٤٦٢، رقم: ٢١٧٢٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۹۲۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۳/۳ھ

زندگی میں تقسیم کرنے کی صورت میں لڑکیوں کو نہ دینا

سوال [۹۵۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: میرے والد عبداللطیف صاحب نے اپنی حیات میں اپنے تین لڑکوں کو الگ الگ مکان دے دیا تھا اورلڑکیوں کی صرف شادی کردی تھی، ان کو مکان میں سے کچھ نہیں دیا تھا، مجھے بھی میرے والد نے ایک مکان دے دیا تھا، ان کی زندگی ہی میں میں اس میں رہنے لگا تھا اور میرا قبضہ تھا، اب میں کچھ ضرورتوں کے تحت اپنے حصہ کے مکان کو بیچ رہا ہوں، تو اس میں ہماری بہنیں (۱) سکندر (۲) تارہ ہم سے اپنا حصہ مانگتی ہیں، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا شرعاً اب ہمارے مکان میں بہنوں کا حصہ نکلتا ہے، جب کہ باپ نے اپنی زندگی میں کچھ نہیں دیا تھا اور نہ مرنے کے بعد دینے کی کوئی صراحت کی تھی، ہمارے بھی چار لڑکیاں ہیں، شرعی حکم تحریر فرمادیں۔

المستفتی: لئیق احمد محلّہ فیل خانہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: باپ کا اپنی زندگی میں تینوں بھائیوں کو مکان دے دینا یہ ہبہ ہے اور ہبہ میں لڑکے اور لڑکیوں کو برابر حصہ دینا چاہئے۔

عن النعمان بن بشير –رضی الله عنه– قال: تصدق علي أبي ببعض ماله –إلى– فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: أفعلت هذا بولدك كلهم؟ قال: لا، قال: اتقوا الله واعدلوا في أولادكم، فرجع أبي فرد تلك الصدقة. (صحيح مسلم، باب كراهة تفضيل بعض الوالد في الهبة، النسخة الهندية ۲/ ۳۷، بيت الأفكار، رقم: ۱۶۲۳)

المختار التسوية بين الذكر والأنثى في الهبة. (البحرالرائق، كتاب الهبة، كراچی ۷/ ۲۸۸، زكريا ۷/ ۴۹۰)

يعطى البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتوى. (شامي، كتاب الهبة، زكريا ۸/ ۵۰۱، كراچی ۵/ ۶۹۶)

باپ کا لڑکوں کو دے کر لڑکیوں کو محروم کرنا درست نہیں تھا؛ البتہ جب باپ نے ہبہ کر کے قبضہ دے دیا تو ہبہ صحیح ہوگیا۔

رجل وهب في صحته كل المال للولد جاز في القضاء، ويكون آثما فيما صنع. (عالمگيري، كتاب الهبة، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦)

ولو وهب في صحته كل المال للولد جاز وأثم. (الدرمع الرد، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٥٠٢، كراچی ٥/ ٦٩٦)

باپ اپنے اس عمل کی وجہ سے گنہگار رہوگا اور لڑکیوں کو اس مکان میں کچھ نہیں ملے گا۔ (محمودیہ ۵/ ٦٦، ڈابھیل ١٦/ ٥٠١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳ر جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ٦٦٦٢)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰ر جمادی الاول ۱۴۲۱ھ

باپ کا لڑکیوں کو حصہ نہ دے کر صرف لڑکوں کو دینا

سوال [۹۵٦۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے علاقہ میں یہ دستور ہے کہ والد اپنی زندگی میں اپنے لڑکوں کے نام اپنی زمین کرا دیتا ہے اور باقاعدہ لڑکوں کو قبضہ دے دیتا ہے۔ اور لڑکیوں کے نام زمین وغیرہ نہیں کراتا ہے، تو سوال یہ ہے کہ والد کا ایسا کرنا درست ہے کہ صرف لڑکوں کو اپنی زندگی میں زمین دے دے اور لڑکیوں کو نہ دے؟ اور اسی طرح لڑکیوں کی حق تلفی تو نہیں ہوتی اور ایسے لوگوں کے بارے میں شریعت مطہرہ کا کیا فیصلہ ہے؟ نیز لڑکوں کو زمین دینے کے بعد لڑکیوں کے حقوق کی ادائےگی کیسے ہوسکتی ہے؟

المستفتی: محمد مشرف خان بہرائچی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر اپنی زندگی میں اولاد کے درمیان مال اور جائیداد تقسیم کرنا ہے، تو جس طرح جتنی مقدار لڑکوں کو دیا جائے اسی طرح اتنی مقدار لڑکیوں کو دینا بھی باپ پر لازم ہے، ورنہ باپ سخت گنہگار ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے یہاں جواب دہ ہوگا۔

عن أنس بن مالك –رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: من فر من ميراث وارثه قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة. (سنن ابن ماجة، باب الحيف في الوصية، النسخة الهندية ۲/ ۱۹٤، دارالسلام، رقم: ۲۷۰۳)

عن سليمان بن موسى قال: قال رسول الله ﷺ: من قطع ميراثا فرضه الله قطع الله ميراثه من الجنة. (سنن سعيد بن منصور، باب من قطع ميراثا فرضه الله، دارالكتب العلمية بيروت ۱/ ۹٦، رقم: ۲۸٥-۲۸٦)

فسوى بينهم يعطى البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتوى، ولو وهب في صحته كل المال للولد جاز وأثم. (الدرالمختار، كتاب الهبة، زكريا ۸/ ۵۰۱، ۵۰۲، كراچى ٥/ ٦٩٦، قاضي خان، زكريا جديد ۳/ ۱۹٤، وعلى هامش الهندية ۳/ ۲۷۹، هندية، زكريا قديم ٤/ ۳۹۱، جديد ٤/ ٤١٦، البحرالرائق، كوئٹه ۷/ ۲۸۸، زكريا ۷/ ٤٩٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۰۵۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۶/۴ھ

لڑکیوں کو محروم کر کے تمام جائیداد لڑکوں کے درمیان ہبہ کرنے کا حکم

سوال [۹۵۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمد سعید صاحب کا انتقال ہوگیا، ان کی کل جائیداد متروکہ ۸۰۰ر گز تھی، مرحوم نے اپنی زندگی میں اس جائیداد کو اپنے پانچ لڑکوں کے نام الگ الگ رجسٹری ہبہ کر کے قبضہ میں دے دیا تھا، محمد نسیم، محمد وسیم کو ۲۰۰-۲۰۰ر گز دیا تھا۔ اور محمد سلیم، محمد پرویز عالم، محمد جاوید عالم کو تقریباً ۱۳۳-۱۳۳ر گز دیا تھا، گزوں میں کمی زیادتی اس لئے تھی کہ جن کو کم دیا تھا ان کا حصہ فرنٹ کا تھا، محمد نسیم، محمد وسیم کا حصہ ۴۰۰ر گز والا کرایہ دار کے پاس تھا، اس کا کرایہ جب تک والد صاحب کے قبضہ میں تھا ان کے پاس آتا رہا، اس کے بعد جب محمد نسیم ومحمد وسیم کے قبضہ میں آگیا تو کرایہ ان کے پاس آنے لگا تھا؛ لیکن کرایہ دار کے خالی نہ کرنے کی وجہ سے ان دونوں نے اسے پندرہ سال پہلے پچیس لاکھ روپئے میں فروخت کر دیا تھا۔ یہ واضح رہے کہ محمد سعید صاحب کی ان پانچ لڑکوں کے علاوہ چار لڑکیاں بھی تھیں، ان کو کوئی حصہ نہیں دیا تھا، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا اس جائیداد میں لڑکیوں کا حصہ ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: محمد وسیم بارہ دری، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ سے واضح ہوتا ہے کہ باپ نے اپنی مذکورہ جائیداد زندگی میں لڑکوں کو ہبہ کر کے قبضہ دے کر مالک بنا دیا ہے، اس سے تمام لڑکے اپنے اپنے حصہ کے شرعی طور پر مالک ہو چکے ہیں؛ لیکن مرحوم نے اپنی جائیداد زندگی میں جب نرینہ اولاد کو دے کر لڑکیوں کو محروم کر دیا ہے، تو اس کی وجہ سے مرحوم سعید احمد عنداللہ سخت گنہگار رہوں گے، اگر لڑکوں کو اس بات کا احساس پیدا ہوگیا ہے کہ باپ نے لڑکیوں کو نہ دے کر ان کے ساتھ ظلم کا ارتکاب کیا ہے اور باپ کو اس گناہ سے سبکدوش کرنا چاہتے ہیں، تو ہر

لڑکا اپنے اپنے حصہ میں سے جتنا جتنا بہنوں کا حصہ آتا ہے، بہنوں کو دے دے تو اللہ سے امید ہے کہ باپ اللہ کے یہاں بری ثابت ہوجائیں گے۔

عن أنس بن مالك –رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: من فر من ميراث وارثه قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة. (سنن ابن ماجة، باب الحيف في الوصية، النسخة الهندية ۲/ ۱۹٤، دارالسلام، رقم: ۲۷۰۳، مشكوة/۲٦٦)

ولو وهب جميع ماله من ابنه جاز، وهو أثم. (بزازية، كتاب الهبة، الفصل الأول الجنس الثالث في هبة الصغير، زكريا جديد ۳/ ۱۲۳، وعلى هامش الهندية ٦/ ۲۳۷، هندية، زكريا قديم ٤/ ۳۹۱، جديد ٤/ ٤۱٦، شامي، زكريا ۸/ ۵۰۲، كراچی ۵/ ٦۹٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۵۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۳/۴ھ

لڑکیوں کو شادی میں جہیز دینے کی بنا پر جائیداد سے محروم کرنا

سوال [۹۵٦۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے پانچ سالے اور ایک سالی ہے، ان کے والدین بھی الحمد للہ باحیات ہیں، وہ اپنی حیات میں جائیداد تقسیم کرنا چاہتے ہیں، بلکہ یوں سمجھئے کہ تقسیم کر چکے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان کی تقسیم قرآن وحدیث کے مطابق ہے، تقسیم یوں عمل میں آئی کہ پانچ لڑکوں میں سے ہر ہر لڑکے کو ڈھائی ایکٹر زمین جن کی قیمت ٦ ؍لاکھ روپئے ہے۔ اور والدین بھی ایک ایکٹر زمین اور ایک سڑ کی مٹکی مڈگی جن کی قیمت بھی تقریباً ٦ ؍لاکھ سے زائد ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لڑکیوں کے والدین کی جائیداد شریعت کے مطابق لڑکیوں کو ملے گی یا نہیں؟ لڑکیوں سے ان کے والدین کا کہنا ہے کہ تمہاری شادیوں میں بہت خرچ ہوا ہے؛ اس لئے تم

کو حصہ نہیں ملے گا، حالانکہ لڑکوں کی شادی میں بھی خرچ ہوا ہے، تو کیا شرع اور قرآن وحدیث کے مطابق یہ تقسیم ہوئی ہے، کیا لڑکیاں حصہ دار ہیں یا نہیں؟ اگر لڑکیاں حصہ دار ہیں تو والدین سے اپنے حصے کے لئے لڑسکتی ہیں یا نہیں؟

المستفتی: مرزاانصار بیگ صاحب، امام جامع مسجد نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر والدین اپنی حیات میں اپنی جائیدادا اولاد کے درمیان تقسیم کرنا چاہتے ہیں، تو تمام لڑکوں اور لڑکیوں کو برابر برابر دینا لازم اور ضروری ہے اور والدین کا یہ کہہ کر لڑکیوں کو محروم کردینا کہ ہم نے تمہاری شادی کے موقع پر جو خرچ کیا تھا وہ تمہارا حصہ دے دیا ہے درست نہیں ہے؛ کیوں کہ شادی کے موقع پر جو خرچ ہوا ہے وہ والدین کی طرف سے محض تبرع اور احسان ہے؛ اس لئے اب جائیداد کی تقسیم کے وقت لڑکیوں کو حق حاصل ہے کہ وہ والدین سے اپنے حصہ کا مطالبہ کریں۔

عن أنس بن مالك –رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: من فر من ميراث وارثه قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة. (سنن ابن ماجة، باب الحيف في الوصية، النسخة الهندية ٢/ ١٩٤، دارالسلام، رقم: ٢٧٠٣)

عن النعمان بن بشير –رضي الله عنهما– يخطب قال: قال رسول الله ﷺ: اعدلوا بين أولادكم، اعدلوا بين أولادكم. (شعب الإيمان للبيهقي، باب فى حقوق الأولاد والأهلين، دارالكتب العلمية بيروت ٦/ ٤٠٨، رقم: ٨٦٩١)

ويكره تفضيل بعض الأولاد على البعض في الهبة حالة الصحة.

(البحرالرائق، كتاب الهبة، كوئٹه ٧/ ٢٨٨، زكريا ٧/ ٤٩٠)

قال الطيبي رحؒ: فيه استحباب التسوية بين الأولاد في الهبة، فلا يفضل بعضهم على بعض. (شرح الطيبي، كتاب البيوع، باب الهبة، الفصل الأول، كراچی ٦/

۱۸۱، تحت رقم الحديث ۳۰۱۹)

يعطي الابنة مثل ما يعطى الابن، وعليه الفتوى، وهو المختار. (هندية، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦)

يعطى البنت كالابن عند الثاني، وعليه الفتوى. (شامي، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٥٠١، كراچی ٥/ ٦٩٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۴۲۴)

۸/ باب هبة المريض

مرض الموت میں ہبہ کا حکم

سوال [۹۵۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمد نسیم صاحب ۲۴ر دسمبر ۲۰۰۶ء کوانتقال کرتے ہیں اوراپنے پیچھے وارثین چھوڑ جاتے ہیں، ایک بیوی، تین بیٹے اور چھ بیٹیاں، جن میں ایک بیٹی غیر شادی شدہ ہے اور ترکہ میں دیگر اشیاء کے علاوہ ایک کرایہ کی دوکان ہے، جس کی پوزیشن فی الحال تقریباً دس لاکھ روپئے ہوگی اور وہ دوکان محمد نسیم اینڈ سنس کے نام سے ہے، ابھی وراثت کی تقسیم عمل میں نہیں آئی تھی کہ محمد نسیم کے ایک وارث بڑے لڑکے عبدالکریم ساڑھے تین سال بعد ۶ر اگست ۲۰۱۰ء کوانتقال کر گئے اوراپنے پیچھے وارثین میں ایک بیوی، ایک لڑکا اور دولڑکی چھوڑ گئے، اب جب تقسیم وراثت کا مسئلہ آیا تو محمد نسیم صاحب کے چھوٹے بیٹے محمد جمال الدین نے کہا: میں ہر چیز میں تقسیم پر راضی ہوں سوائے اس دوکان کے۔ پوچھا گیا کیوں؟ تو یہ کہا کہ میرے والد نے یہ دوکان مجھے دے دی ہے، اس کے لئے انہوں نے ایک کورٹ پیپر پیش کیا، جس میں ۴ر دسمبر ۲۰۰۶ء کی تاریخ پڑی ہے اور یہ دعویٰ کیا کہ والد صاحب نے یہ کاغذ اپنی زندگی میں بنایا تھا اور اس میں یہ لکھا ہے کہ دوکان میں بیوی دونوں بیٹوں اور چھ بیٹیوں کو چھوڑ کر صرف ایک بیٹا کو دے رہا ہوں۔ واضح ہو کہ محمد نسیم صاحب کے انتقال کے ڈھائی تین سال بعد محمد جمال الدین نے دوکان مالک سے محمد نسیم اینڈ سنس کا نام ہٹا کر محمد جمال الدین اینڈ سنس کرالیا ہے، جب کہ والد محمد نسیم صاحب کے زمانے سے دونوں بیٹے آج تک دوکان پر بیٹھتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ محمد نسیم صاحب کے انتقال کے چار برس بعد اچانک اس طرح کے کاغذ کا سامنے آنا جب کہ نہ گھر والوں کو معلوم، نہ محلے والوں کو معلوم، لوگوں کو شبہ میں ڈالتا ہے کہ یہ کاغذ ان کا تیار کردہ نہیں معلوم ہوتا، تاہم بالفرض اگر

انہوں نے ایسا کیا ہے، تو از روئے شرع ایسا کرنا کیسا ہے؟ اپنے تمام وارثین میں سے ایک وارث کے نام کردینے سے تمام وارثین کا حق اس دوکان سے ختم ہوگیا یا باقی ہے؟ نیز بڑے بیٹے عبدالکریم کی بیوی اور اولاد کو کتنا کتنا ملے گا؟ اور چھوٹی بیٹی جو غیر شادی شدہ ہے، اس کی شادی کے خرچ کے لئے رقم الگ کر کے وراثت تقسیم ہوگی یا بغیر الگ کئے ہوئے؟ حنفی مسلک سے جواب دینے کی زحمت گوارہ کریں، کرم ہوگا۔

المستفتی: مانک پیر، کانکی نارہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں جس بات کا حکم شرعی معلوم کرنے کی اہمیت دی گئی ہے، وہ یہی ہے کہ محمد نسیم کے چھوٹے بیٹے محمد جمال الدین کا والد کی وفات کے تقریباً چار برس کے بعد اس طرح کا کاغذ نکال کر پیش کرنا، جس میں اس بات کا ذکر ہے کہ ''وفات سے بیس دن پہلے باپ نے محمد جمال الدین کو یہ ہبہ کیا ہے'' اگر اس وقت محمد نسیم بیمار اور کمزور چل رہے تھے اور اسی بیماری میں ان کی وفات ہوئی ہے، تو یہ ہبہ وارث کے حق میں وصیت کے حکم میں ہے، جو دوسرے وارثین کی اجازت کے بغیر نافذ نہیں ہوسکتی؛ لہٰذا اس ہبہ اور وصیت کا شرعی طور پر اعتبار نہیں اور وہ دوکان بھی تمام ورثاء کے درمیان شرعی حصوں کے اعتبار سے تقسیم ہوگی، نیز اگر مرض الوفات سے پہلے صحت اور تندرستی کے زمانہ میں یہ ہبہ کیا ہے، تو اس کے لئے شرعی ثبوت لازم ہے، محض کورٹ کا کاغذ بغیر شرعی ثبوت اور شرعی شہادت کے پیش کرنا معتبر نہیں؛ اس لئے وہ دوکان بھی تمام وارثین کے درمیان شرعی حصوں کے اعتبار سے تقسیم ہوگی۔

والهبة من المريض لوارثه نظير الوصية؛ لأنه وصية حكما. (مجمع الأنهر، كتاب الوصايا، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٤٢٤، مصري قديم ٢/ ٦٩٦)

وفي الذخيرة: مريضة وهبت صداقها من زوجها، فهذا على وجهين: إما إن برأت من مرضها أو ماتت في مرضها، ففي الوجه الأول صح، وفي

الوجه الثاني، فالمسألة على قسمين: إما إن كانت مريضة غير مرض الموت، أو مريضة مرض الموت، ففي القسم الأول كذلك الجواب، وفي القسم الثاني لم يصح إلا بإجازة الورثة. (الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٤/ ٤٨٨، برقم: ٢١٨٢٨)

مرحوم کی جو بیٹی غیر شادی شدہ ہے، اس کی شادی کے لئے ترکہ میں سے میراث کے علاوہ الگ سے کوئی سرمایہ متعین نہیں ہوگا؛ بلکہ میراث میں اس کو جو حصہ مل سکتا ہے وہی اس کا حق شرعی ہوگا۔ اور یہ بات الگ ہے کہ سب بھائی بہن مل کر اس بہن کا خرچ اپنے طور پر اٹھائیں، وہ ان کی مرضی ہے۔ اور وارثین میں سے ہر ایک کو کتنا کتنا ملے گا؟ اس سلسلے میں محمد نسیم کی بیوی اور اس کے لڑکے لڑکیوں کے نام لکھے جائیں اور عبد الکریم کی بیوی اور اس کے لڑکے لڑکیوں کے نام لکھ دیئے جائیں، اس کے بعد ہی سب کے حصے متعین کر کے لکھے جاسکتے ہیں۔

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: خطب رسول الله ﷺ فقال: إن الله عز وجل أعطى كل ذي حق حقه. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ١١/ ١٧٠، رقم: ١١٥٣٢، سنن الترمذي، باب ماجاء لا وصية لوارث، النسخة الهندية ٢/ ٣٢، دارالسلام، رقم: ٢١٢٠)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: من نفس عن أخيه كربة من كرب الدنيا، نفس الله عنه كرب يوم القيامة، والله في عون العبد ما كان العبد في عون أخيه. (مصنف ابن أبي شيبة، مؤسسة علوم القرآن ١٣/ ٥٢٩، برقم: ٢٧٠٩٨، صحيح مسلم، باب فضل الاجتماع على تلاوة القرآن، وعلى الذكر، النسخة الهندية ٢/ ٣٤٥، بيت الأفكار، رقم: ٢٦٩٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ ذیقعدہ ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۵۱۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۱۰/۲ھ

حالت مرض میں وارث کو ہبہ

سوال [۹۵۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بستر علالت میں باپ نے ۶/اولادوں میں سے ایک اولاد کے نام جائیداد کردی اور اس کی شکل یہ ہے کہ جس لڑکے کے نام جائیداد کی ہے، اس لڑکے نے باپ کی ذہن سازی کرکے رجسٹرار کو گھر بلاکر تمام کارروائیاں پوری کرا دیں، تو کیا اس طرح ۵/لڑکوں کو محروم کردینا اور صرف ایک لڑکے کے نام پوری جائیداد کردینا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفیق: حالت مرض میں وارث کو کیا ہوا ہبہ وصیت کے حکم میں ہے اور وارثین کے لئے وصیت کرنا جائز نہیں ہے۔ اور حالت مرض میں کیا ہوا ہبہ قبل القبض باطل ہوتا ہے؛ لہٰذا یہ ہبہ باطل ہے۔ (فتاوی عثمانی ۳/ ۴۶۸، محمودیہ ڈابھیل ۱۶/ ۴۸۹)

إذا وهب أحد في مرض موته شيئا لأحد ورثته، وبعد وفاته لم تجز الورثة الباقون لا تصح تلك الهبة؛ لأن الهبة في مرض الموت وصية، ولا وصية للوارث. (شرح المجلة رستم باز، إتحاد ديوبند ۱/ ۴۸۳، رقم المادة: ۸۷۹)

إن الوصية للوارث لا تجوز بدون إجازة الورثة؛ لقوله عليه السلام: لا وصية لوارث إلا أن يجيزه الورثة، فإن أوصى بعض ورثته ولأجنبي جازت حصة الأجنبي، وبطلت حصة الوارث. (المبسوط، دارالكتب العلمية بيروت ۲۷/ ۱۷۵، ۱۷۶)

وهب في مرض ولم يسلمه حتى مات بطلت الهبة. (بزازية، نوع في هبة المريض، جديد زكريا ۳/ ۱۲۶، وعلى هامش الهندية، زكريا ۶/ ۲۴۰) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۲/ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۵۶)

چند اولاد کو جائیداد دے کر بقیہ کو محروم کر کے مرض الموت میں ان کے لئے وصیت کرنے کا حکم

سوال [۹۵۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسماۃ شہزادی بیگم مرحومہ کے ۵/لڑکے ہیں اور ایک لڑکی ہے، شہزادی بیگم مرحومہ کے شوہر کا انتقال ان کی زندگی میں ہوگیا ہے اور ایک قطعہ زمین شہزادی بیگم کے نام ہے، شہزادی بیگم نے اپنی حیات میں ہی اپنی زمین کو دو حصوں میں منقسم کر کے اپنے دو چھوٹے صاحبزادوں کو دے دی۔ اور انہوں نے وہ زمین مرحومہ کی حیات میں ہی تعمیر بھی کرلی، مرحومہ نے ان دو صاحبزادوں سے کہہ دیا تھا کہ اپنے تینوں بھائیوں کو دو دو سو روپئے ادا کردیں اور بہن کنیزہ بیگم کو بھی دو سو روپئے دینے کے لئے کہا تھا اور ان تینوں صاحبزادوں نے ان کے سامنے کوئی اعتراض نہیں کیا، اب شہزادی بیگم مرحومہ کے بعد سب سے بڑے بھائی کی اولاد روپیہ لینے کو تیار نہیں؛ بلکہ زمین لینے پر مصر ہے، اور دوسرے دونوں بھائی اور ان کی اولاد خاموش ہیں، نیز سب سے بڑے بھائی بھی خاموش ہیں اور سب سے بڑے بھائی کی اولاد زمین تقسیم کرنے کے لئے مصر ہے، آیا اس تیسرے بھائی کی اولاد زمین کی حق دار ہوگی یا ان کو روپیہ دیا جا سکتا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب سے نوازیں، نیز مرحومہ شہزادی بیگم نے انتقال سے لگ بھگ ۲/ گھنٹہ پہلے بھی ۲۰۰/ دو سو روپیہ ادا کرنے کی وصیت کی ہے۔

المستفتی: راحت علی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب والدہ نے اپنی مملوکہ زمین کو اپنی حیات میں دو لڑکوں کے درمیان تقسیم کر کے مالک بنا دیا ہے اور ان دونوں نے والدہ کی زندگی میں قبضہ

کر کے تعمیر بھی کرلی ہے، تو وہ لوگ قانون شرعی کی رو سے اس کے مالک بن گئے ہیں، اس میں اب کسی کا حق باقی نہیں رہا؛ البتہ والدہ نے اپنی جائیداد میں دوسری اولاد کو محروم رکھا ہے اس کا گناہ والدہ پر ہوگا، رہا دوسو روپیہ کی وصیت تو شرعاً ورثاء کے حق میں وصیت درست نہیں ہوتی؛ اس لئے اگر مذکورہ دونوں لڑکے دوسرے بھائی وبہن کو ۲-۲ رسو روپئے دینا چاہتے ہیں تو وہ اس کو لے کر خاموش ہوجائیں، یہ ان کی طرف سے تبرع ہے، اس سے زائد یا زمین کے مطالبہ کا حق حاصل نہیں ہوگا۔

ولو وهب في صحته كل المال للولد جاز، وأثم. (الدرالمختار، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٥٠٢، كراچی ٥/ ٦٩٦)

رجل وهب في صحته كل المال للولد جاز في القضاء، ويكون آثما فيما صنع. (قاضي خان، كتاب الهبة، فصل في هبة الوالد لولده، زكريا جديد ٣/ ١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٧٩، بزازية، زكريا جديد ٣/ ١٢٣، وعلى هامش الهندية ٣/ ٢٣٧)

ولو دفع إلى ابنه مالا، فتصرف فيه الابن يكون للابن إذا دلت دلالة على التمليك. (شامي ، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٥٠٣، كراچی ٥/ ٦٩٧) **فقط واللہ** سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ ر ربیع الاول ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۱۵۶)

۳۱/ کتاب الإجارة

۱/ باب الإجارة الصحيحة

اجیر خاص اور اجیر مشترک کا فرق

سوال [۹۵۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اجیر خاص اور اجیر مشترک کسے کہتے ہیں اور اس کی شکل کیا ہوتی ہے، واضح فرمائیں، نوازش ہوگی۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اجیر خاص وہ اجیر ہے، جو متعین وقت کے اندر محض تسلیم نفس سے ہی اجرت کا مستحق ہوجائے اور اجیر مشترک وہ اجیر ہے جو عمل کرنے سے اجرت کا مستحق ہوتا ہے، محض تسلیم نفس سے اجرت کا مستحق نہیں ہوتا۔

أجير مشترک، الأجير المشترک من يستحق الأجر بالعمل لا بتسليم نفسه للعمل. أجير خاص، الأجير الخاص من يستحق الأجر بتسليم النفس وبمضى المدة، ولا يشترط العمل في حقه لاستحقاق الأجر. (تاتارخانية، زكريا ١٥/ ٢٨١، رقم: ٢٣٠٧٤، ٢٣٠٧٥، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ١٢/ ٣٨، رقم: ١٤٠٣٦، هندية، زكريا قديم ٤/ ٥٠٠، جديد ٤/ ٥٤٣)

الأجير الخاص: هو الشخص الذي يستأجر مدة معلومة ليعمل فيها، الأجير المشترک: هو الذي يعمل لأكثر من واحد، فيشتركون جميعا في نفسه كالصباغ والخياط. (فقه السنة، دارالكتاب العربي ٣/ ١٩٣)

الأجير قد يكون خاصا وهو الذي يعمل لواحد وهو المسمى بأجير الوحد، وقد يكون مشتركا وهو الذي يعمل لعامة الناس وهو المسمى بأجير المشترك. (بدائع الصنائع، كتاب الإجارة، فصل في ركن الإجارة، زكريا ٤/ ١٦، كراچی ٤/ ١٧٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۱۹)

سرکاری و پرائیویٹ ملازمین اجیر خاص ہوتے ہیں یا اجیر مشترک

سوال [۹۵۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدارس میں مدرسین اور ملازمین کی ذمہ داری چھ گھنٹوں کی ہوتی ہے، اسی طرح سرکاری ملازمین کی ذمہ داری چھ یا آٹھ گھنٹوں کی ہوتی ہے، یہ لوگ اجیر خاص ہیں یا اجیر مشترک؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب تحریر کریں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سرکاری اور پرائیویٹ اداروں کے ملازمین، اسی طرح مدارس کے مدرسین وملازمین جن کے کام اور ذمہ داری کے اوقات متعین ہوں وہ ان اوقات میں اجیرِ خاص ہیں، وہ ان اوقات میں دوسرا کام کرنے کا حق نہیں رکھتے، ہاں البتہ کوئی مختصر ایسا کام کرسکتے ہیں جس پر عرفاً چشم پوشی کی جاتی ہے۔ (مستفاد: فتاوی عثمانی ۳/ ۳۶۷، محمودیہ میرٹھ ۲۵/ ۱۰۹، محمودیہ ڈابھیل ۱۶/ ۵۷۳)

الأجير الخاص هو الشخص الذي يستأجر مدة معلومة ليعمل فيها.
(فقه السنة، دارالكتاب العربي ٣/ ١٩٣)

أما الخاص فهو الذي يجب عليه أن لا يعمل لغير من استأجره، وذلک کالأجير اليومي الذي له أجرة يومية، فإنه لا يصح أن يشغل وقته

بشيء غير العمل المستأجرة. (الفقه على المذاهب الأربعة، دارالفکر ۳/ ۱۴٦) **فقط**
واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ ذیقعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۱۸)

ٹھیکہ دار اجیر مشترک ہے یا خاص؟

سوال [۹۵۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں عمارت تعمیرات کی ٹھیکہ داری پر مزدوری سے کام کراتا ہوں، اس بابت مزدوروں سے مزدوری روزانہ پر طے کر کے کام شروع کراتا ہوں اور حسب معاملہ طے شدہ مزدوری ادا کرتا ہوں، مزدوری معہ دو وقت کھانا روزانہ پر طے ہے، جس دن بارش ہوتی ہے اس دن کی مزدوری نہیں ہوتی، مگر کھانا دیا جاتا ہے، مزدوری کے لینے دینے کا کام کے ہونے اور کرنے پر انحصار ہوتا ہے، اب اگران راجوں اور مزدوروں کو کسی دوسرے کام پر لگایا جائے یا وہ خود چلے جائیں اور وہاں سے مزدوری زیادہ لی جائے، مثلاً ہمارے یہاں روزانہ ۴۵/ روپیہ پر طے ہے۔ اور دوسری جگہ سے ٦۵/ روپئے روزانہ لیا جائے، تو یہ زیادہ والی رقم مبلغ: ۲۰/ روپئے ہمیں لینا شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟ دوسری جگہ کام کرنے پر کھانا ہمارے ہی ذمہ رہتا ہے، کام کے نفع ونقصان سے مزدوروں کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، ٹھیکہ داری میں نفع ونقصان ٹھیکہ دار برداشت کرتا ہے۔ فقط

المستفتی: نسیم احمد محلّہ بھٹی، ٹھیکیدار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر یوں طے کیا گیا ہے کہ روزانہ ۴۰/ روپیہ دے دیا کریں گے، چاہے ہم کہیں بھی کام کرائیں، نیز دوسری جگہ کام کی ذمہ داری آپ نے خود

اپنے ذمہ لی ہے، یا کسی کو اپنا قائم مقام بنایا ہے، تو مزدوروں کو طے شدہ مزدوری دے کر بقیہ آپ کے لئے حلال ہے؛ کیوں کہ وہ لوگ شرعاً اجیر خاص ہیں۔

أما الخاص: -إلى قوله- فهو الذي يجب عليه أن لا يعمل لغير من استأجره، وذلک کالأجير اليومي الذي له أجرة يومية، فإنه لا يصح أن يشغل وقته بشيء غير العمل المستأجر. (كتاب الفقه على المذاهب الأربعة، دارالفكر ٣/ ١٤٦، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ١/ ٣٢٣، دارالكتاب ديوبند ١/ ٣١٣)

اگر آپ نے ذمہ داری نہیں لی ہے اور مزدور آپ کے دخل کے بغیر خود جا کر کام کرتے ہیں تو پورے ساٹھ روپئے مزدور کا ہوگا، کھانا آپ کے ذمہ ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ذمہ داری اپنے اوپر لے رکھی ہے، ٹھیکہ دار اجیر مشترک ہوتا ہے، کہ وہ کام کے دوران دوسری جگہ بھی وقت دے سکتا ہے۔

فالمشترک هو الذي لا يجب أن يختص بواحد سواء عمل لغير أو لا. (كتاب الفقه على المذاهب الأربعة، دارالفكر، ٣/ ١٤٦)

اور بارش کے دن اگر مزدوری طے ہے اور وہ لوگ اپنے آپ کو کام کے لئے پیش کردیں تو شرعاً ان کو اس دن کی مزدوری ملنی چاہئے۔ اور اگر طے نہیں ہے، تو کھانا دینا آپ کی طرف سے محض تبرع واحسان ہے۔

الأجير الخاص: هو الذي يستحق الأجرة بتسليم نفسه في المدة. (الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ١/ ٣٢٣، دارالكتاب ديوبند ١/ ٣١٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ ذیقعدہ ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۳۷۸)

کیا ملازم پر اوقات کی پابندی لازم ہے؟

سوال [۹۵۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: بعدہ اینکہ احقر پرائمری اسکول میں ماسٹر ہے، یہاں ہروقت جھوٹ ہی جھوٹ کہنا پڑتا ہے، مثلاً آنے جانے کے وقت میں بچوں کی حاضری میں چھٹیوں کے سلسلہ میں اسکول آنے کے وقت ساڑھے چھ بجے اور جانے کا ساڑھے گیارہ بجے، ساتھی ماسٹر ڈیڑھ یا دو گھنٹے دیر سے آتے ہیں اور ایک ڈیڑھ گھنٹے پہلے جاتے ہیں، اب اگر احقر وقت پر نہ آئے تو اسکولوں کے بچوں کی دیکھ بھال مشکل ہے، اگست کے مہینہ سے ایک نصاب آیا ہے، جو جونیر تک کے بچوں کو سمجھ میں نہیں آسکتا ہے اور نہ کوئی ماسٹر اس کے مطابق پڑھا سکتا ہے؛ لیکن ڈائری جھوٹی اس کے متعلق بنائی جاتی ہے، سال میں چودہ چھٹیاں ملتی ہیں، جب کہ ساتھی ماسٹر اور میں بھی خود تیس چالیس چھٹیاں لیتے ہیں، کلرک لوگ تنخواہ کے سلسلہ میں بہت پریشان کرتے ہیں اور رشوت لے کر تنخواہ بھیجتے ہیں افسر لوگ منھ سے مانگ کر رشوت لیتے ہیں، ان حالات میں کیا کروں؟ خط کے ذریعہ سے جلد از جلد جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: احمد نبی اردو ٹیچر چندور، آگرہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کے لئے تعلیم کے اوقات مقررہ پر حاضر ہونا اور مفوضہ امور کو انجام دینا ضروری اور لازم ہے، جس درجہ کے بچے آپ کے تحت ہیں، آپ ان کی دیکھ بھال کریں اور ان کی اچھی تربیت کریں، جھوٹ بولنا بالکل جائز نہیں ہے۔ اور افسران کے پریشان کرنے کی وجہ سے اگر آپ کی تنخواہ پر کوئی اثر نہ پڑے تو رشوت دینا جائز نہیں ہے۔ اور اگر تنخواہ ہی رک جاتی ہے یا پوری تنخواہ نہیں ملتی ہے، تو رشوت دے کر اپنا حق الخدمت وصول کرنا جائز ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۸۸)

عن وهب بن منبة –رضي الله عنه– قال: ليست الرشوة التي يأثم فيها صاحبها، بأن يرشو فيدفع عن ماله ودمه، إنما الرشوة التي تأثم فيها أن ترشوا لتعطى ما ليس لک. (السنن الكبرى، للبيهقي، آداب القاضي، باب من أعطاها ليدفع بهما عن نفسه أو ماله، دارالفكر ۱۵/ ۱۴۶، رقم: ۲۱۰۶۹)

(قوله: ولخاص أن يعمل بغيره) بلى ولا أن يصلى نافلة، قال في الفتاوى خانية، وفي فتاوى الفضلي: وإذا استأجر الرجل يوما ليعمل كذا، فعليه أن يعمل ذلک العمل أي قام المدة ولا يشغل بشيء آخر سوى المكتوبة. (شامي، كتاب الإجارة، باب ضمان الأجير، مطلب ليس للأجير الخاص أن يصلى النافلة، زكريا ۹/ ۹۶، كراچی ٦/ ٧٠، کوئٹه ٥/ ٤٨، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ١١/ ٢٣٩، رقم: ١٣٦٢٩، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٥/ ٣٠، رقم: ٢٢٠٢٥، هندية، زكريا قديم ٤/ ٤١٦، جديد ٤/ ٤٤٧)

والأجير الخاص الذي يستحق الأجرة بتسليم نفسه في المدة –إلى قوله– والأجر مقابل للمنافع. (هداية، كتاب الإجارة، باب ضمان الأجير، أشرفی ٣/ ٣١٠)

دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له ليس برشوة، يعني فی حق الدافع. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، فصل في البيع، كراچی ٦/ ٤٢٣، زكريا ٩/ ٦٠٧، عون المعبود ٤/ ٣٢٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍ربیع الاول ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۴۲۰)

مالک نماز نہ پڑھنے دے تو کیا حکم ہے؟

سوال [۹۵۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بوجہ پابندی ملازمت اگر کام میں مشغول رہا، جماعت اس خیال سے چھوڑ دی کہ مالکان خفا ہوجائیں گے، یا نماز قضاء ہوجائے اور مشغول پابند نماز ہے، وہ اپنی نماز بعد میں منفرد پڑھ لیتا ہے اور قضاء لوٹا لیتا ہے، تو کیا ایسی حالت میں وہ قابل گرفت ہے؟

المستفتی: محی الدین قصبہ سہسپور، ضلع بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: واقعی مالکان باجماعت نماز پڑھنے سے خفا ہو جاتے ہیں، تو ایسی ملازمت ترک کرنا واجب ہے، ورنہ ترک جماعت کا گناہ ہوگا۔

عن عمران بن حصين قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق. الحديث (المعجم الكبير ۱۸/ ۱۷۰، رقم: ۳۸۱، ۳/ ۲۰۸، رقم: ۳۱۵۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ صفر ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۵۲۰/۳۳)

کیا ملازم دوران ملازمت نوافل ادا کرسکتا ہے؟

سوال [۹۵۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید عمر کے یہاں ملازم ہے، دوکان پر اور ادائے گی نماز کے لئے آداب ومستحبات کے ساتھ اذان کے فوراً بعد یعنی پندرہ یا تیس منٹ قبل مسجد میں پہنچنا چاہتا ہے، تاکہ استنجا وضو وغیرہ سے سہولت کے ساتھ فارغ ہوکر ''تحیۃ المسجد'' نوافل وسنن کی ادائے گی اور تکبیر اولیٰ وصف اول کا اہتمام کرسکے اور اس طرح جانے کو عمر مالک دوکان منع تو نہیں کرتا؛ لیکن عدم بشاشت یا قباحت محسوس ہو تو ایسی حالت میں ادائیگی فرائض میں ملازمت کے پیش نظر تاخیر کردینا اولیٰ ہے یا فوراً حاضری بہ بارگاہ ایزدی ضروری ہے؟

(۲) اگر زید باوجود عمر کی قباحت کے تمام گراہکوں اور خرید وفروخت کو چھوڑ کر بعد اذان مسجد میں چلا جائے تو شرعاً کیسا ہے؟

الف: عمر کی یہ عدم بشاشت وقباحت کیسی ہے؟

ب: چونکہ عمر بذات خود بھی متقی پرہیزگار، پابند صوم وصلاۃ اور ذمہ دار ہے؛ لیکن اذان کے

بعد انتظار اورٹال مٹول کی وجہ سے اکثر تکبیر اولیٰ فوت ہوجاتی ہے اورایک دو رکعت بھی ساقط ہوجاتی ہیں، یہ کیسا ہے؟

المستفتی: احمد حسن نگینہ، معرفت حبیب الرحمٰن انصاری شیر کوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: زید کوعمر کی مرضی کے بغیر صرف فرض وسنت پڑھنے کی مقدار وقت لینے کی گنجائش ہے، اگر عمر راضی نہیں ہے تو نوافل ترک کرکے ملازمت کی ذمہ داری ادا کیا کرے؛ لہٰذا اذان کے بعد اتنی دیر قبل جایا کرے کہ جس سے بآسانی طہارت حاصل کرکے سنت پڑھ کر جماعت میں شریک ہوسکے،اس سے پہلے نہ جایا کرے۔

إذا استأجر رجلا يوما يعمل كذا، فعليه أن يعمل ذلك العمل إلى تمام المدة، ولا يشتغل بشيء آخر سوى المكتوبة، وقال بعض مشايخنا: له أن يؤدي السنة أيضا، واتفقوا أنه لا يؤدي نفلا. (شامي، كتاب الإجارة، باب ضمان الاجير،مطلب ليس للأجير الخاص أن يصلي النافلة، زكريا ۹/ ۹۶، كراچی ۶/ ۷۰، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ۱۵/ ۳۰،رقم: ۲۲۰۲۶، ۲۲۰۲۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۷/ ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۷۷۹)	۲۷/ ۱۲/ ۱۴۱۴ھ

ملازمت کے وقت میں اپنا کاروبار کرنا

سوال [۹۵۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کسی کمپنی میں ملازم ہے، کمپنی کا مال سپلائی کرنا اس کا کام ہے، اس کے علاوہ، اس کا اپنا بھی کاروبار ہے، جب کسی گاہک کے پاس جاتا ہے، جو کہ کمپنی کے پرانے خریدار ہیں، تو کمپنی کے مال کے ساتھ اپنا مال بھی فروخت کرتا ہے۔ اور کبھی اپنے مال کا آرڈر لے کر ڈیوٹی

سے فراغت کے بعد دے آتا ہے، زید کا کہنا ہے کہ میں کمپنی کا کام مکمل کرتا ہوں، اور میرے کاروبار سے میری ڈیوٹی میں نہ کوئی خلل آتا ہے، نہ کمپنی پر کوئی اثر پڑتا ہے؛ لہٰذا میرا عمل جائز ہے۔ کیا زید کی یہ بات درست ہے؟ اور اگر صرف آرڈر ڈیوٹی کے بعد مال فروخت کرے، تو درست ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: محمد عمر لکھنوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: کمپنی کے مقررہ وقت کے اندر زید کے لئے ذاتی آرڈر لینا جائز نہیں، اسی طرح کمپنی کے لئے آرڈر لیتے وقت اپنا ذاتی آرڈر لینا بھی جائز نہیں، ایسی صورت میں کمپنی کی طرف سے زید پر پابندی لگانا شرعی طور پر درست ہے، ہاں البتہ زید کے لئے صرف اتنا جائز ہوسکتا ہے کہ کمپنی کے ٹائم سے الگ خارجی وقت میں اپنا ذاتی آرڈر لے اور خارجی وقت ہی میں سپلائی کرے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۵۶)

أما الخاص: فهو الذي يجب عليه أن لا يعمل لغير من استأجره، وذلک كالأجير اليومي الذى له أجرة يومية، فإنه لا يصح أن يشغل وقته غير العمل المستأجر. (الفقه على المذاهب الأربعة، دارالفكر ٣/ ١٤٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۳/۵/۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۶۵۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۵/۱۵ھ

ملازم غلطی کی معافی منیجر سے مانگے یا مالک سے؟

سوال [۹۵۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک ہوٹل اور ایک فیکٹری کے مالک نے اپنے ہوٹل اور فیکٹری میں ایک منیجر رکھا، جس کا

کام پوری فیکٹری اور ہوٹل کو دیکھنا، ملازم رکھنا ہٹانا وغیرہ سب کام تھے، اگر کوئی ملازم ہوٹل میں پیسے ہٹائے، غصب کرے، چوری کرے یا فیکٹری یا ہوٹل کا سامان بغیر منیجر کے مشورہ کے کسی کو دے دے، بعد میں اس ملازم کو احساس ہو، اب یہ معافی منیجر سے مانگے یا اصل مالک سے معافی مانگے اور حق تلفیاں معاف کرائے؟ شرعاً کیا حکم ہے؟

المستفتی: عبدالرشید قاسمی، سیڈھا، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جس ملازم سے اس طرح غلطی صادر ہو جائے اور اس نے کچھ پیسہ وغیرہ اٹھا لئے ہیں اور بعد میں اس کو احساس پیدا ہو جائے، تو اس کے لئے ایمان داری اور دیانت داری کی بات یہی ہے کہ وہ منیجر کے واسطے سے اصل مالک کو واپس کر دے اور دونوں سے معافی مانگ لے۔

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق –إلى– أو بغير عقد، كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه، ولكن إن أخذه من غير عقد ولم يملكه يجب عليه أن يرده على مالكه. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور، قديم ١/ ٣٧، دارالبشائر الإسلاميه ١/ ٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، هندية، زكريا قديم ٥/ ٣٤٩، جديد ٥/ ٤٠٤، شامي، زكريا ٩/ ٥٥٣، كراچی ٦/ ٣٨٥، البحرالرائق، زكريا ٩/ ٣٦٩، كوئٹه ٨/ ٢٠١، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٧، زكريا ٧/ ٦٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۵۲۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۵/۱۰ھ

کیا مالک کو یہ حق ہے کہ اپنی زمین جسے چاہے کرایہ پر دیدے؟

سوال [۹۵۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جناب حافظ سجاد حسین کی ایک زمین ہے، جس کو غلام حسین نے کرایہ پر لے رکھا ہے، اب غلام حسین کا انتقال ہو چکا ہے اور غلام حسین کے دو بھائی: عابد حسین، نبی حسین اوراب عابد حسین پوری زمین کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے اور مالک زمین حافظ سجاد حسین مذکورہ زمین کو کرایہ پر دینا چاہتا ہے، تو کیا مالک زمین کو یہ حق ہے کہ عابد حسین کو نہ دے کر نبی حسین کو کرایہ پر دے دے؟

المستفتی: نبی حسین عیدگاہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مالک زمین نبی حسین کو کرایہ پر دینا چاہتا ہے، تو شرعاً مالک کو اختیار ہے کہ عابد حسین کو نہ دے کر نبی حسین کو دے دے۔

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء من الملک. (بيضاوي شريف ١/ ٧)

يتصرف المالک في ملكه كيف شاء. (البناية، أشرفيه ٨/ ٢١٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ رشوال ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/۲۰۰۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰ رشوال ۱۴۱۰ھ

مالک کو اختیار ہے جس کو چاہے دوکان کرایہ پر دے

سوال [۹۵۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مسلمان شخص اپنی دوکان کسی دوسرے دینی بھائی کو کرایہ پر دیتا ہے، وہ شخص عقیدۃً

اپنی دوکان کے بورڈ پر سرفہرست ''یاوارث'' لکھوا دیتا ہے، مذکورہ مالک دوکان کو اس پر اعتراض ہوتا ہے اور وہ اپنی دوکان مذکورہ مسلم بھائی سے خالی کرالیتا ہے، اس کے بعد وہی دوکان ایک غیر مسلم کو کرایہ پر بھاری رقم پیشگی کے عوض دے دیتا ہے، وہ کرایہ دار چونکہ غیر مسلم ہے جو اپنی دوکان کے آغاز پر دوکان میں باقاعدہ ''ہوں اور سنکھ'' دیگر پوجا پاٹ کے بعد دوکان کھولتا ہے اور دوکان کے اندر کے سامنے کی دیوار پر عقیدۃً کچھ شلوک لکھوا دیتا ہے اور دوکان سجا کر آرام سے راحت حاصل کرتا ہے۔

مذکورہ بالا حالات کے مطابق مالک دوکان پنج گانہ نمازی اور حاجی بھی ہے، دیگر محلّہ کی مسجد میں پیش امامت کے فرائض بھی انجام دے رہا ہے، جس پر چند حضرات محلّہ ودیگر نمازی حضرات کو اختلاف قوی ہے، اس روشنی میں علماء حضرات کی رائے کی اشد ضرورت ہے۔

المستفتی: اسد علی شاہجہاں پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دوکان کے مالک کو اس معاملہ میں اختیار ہے کہ وہ جس کو چاہے اپنی دوکان کرایہ پر دے، کسی کو اس پر اعتراض کا حق حاصل نہیں ہے۔ اور مذکورہ غیر مسلم نے دوکان کرایہ پر حاصل کرنے کے بعد جو عمل کیا ہے، اس کا ذمہ دار مالک دوکان نہیں ہے اور نہ ہی اس کی وجہ سے اس کی امامت پر کوئی اثر پڑے گا۔ اور جو سوال نامہ میں ''یا وارث'' لکھنے اور ''ہوں اور سنکھ'' لکھنے کے درمیان مقابلہ کیا گیا ہے اور اسی مقابلہ کو پہلے کرایہ دار سے خالی کرانے کی بنیاد اور علت قرار دیا گیا ہے، یہ بات خود سوال نامہ کی اگلی عبارت کی وجہ سے درست نہیں معلوم ہوتی۔ سوال نامہ میں اگلی عبارت ہے کہ غیر مسلم کو بھاری کرایہ پر بھاری پیشگی رقم کے عوض دینے کا ذکر ہے، واضح رہے کہ مالک دوکان کا مقصد لفظ وارث اور ہوں اور سنکھ کا تقابل بنیاد نہیں ہے؛ بلکہ اس کا مقصد اپنی جائیداد سے بھاری آمدنی کا حصول ہے اور مالک کو اختیار ہے کہ جہاں سے زیادہ رقم ملے وہاں اپنی جائیداد کو کرایہ پر دے دے اس پر کسی کو اشکال اور اعتراض کا حق حاصل نہیں ہے۔ اور مالک اپنی بھاری آمدنی کے لئے

مسلمان کو بھی دے سکتا ہے اور غیر مسلم کو بھی دے سکتا ہے۔ اور جائیداد کو کرایہ پر دینے میں شرعاً ایمان وکفر کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

وجاز إجارة بيت بسواد الكوفة ...... **ليتخذ بيت نار، أو كنيسة، أو بيعة، أو يباع فيه الخمر.** (درمختار) وفي الشامية: **لأن الإجارة على منفعة البيت، ولهذا يجب الأجر بمجرد التسليم، ولا معصية فيه، وإنما المعصية بفعل المستأجر، وهو مختار، فينقطع نسبته عنه.** (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، فصل في البيع، زكريا ۹/ ۵٦۲، كراچی ٦/ ۳۹۲، الموسوعة الفقهية الكويتية ۹/ ۲۱۳، هداية، أشرفي ٤/ ٤۷۲، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ۲۹، زكريا ۷/ ۱٤، البناية أشرفيه ديوبند ۱۰/ ۵۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۱۹۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۳/۷ھ

شوہر کے کرایہ کی دوکان میں کس کا حصہ ہے خسر کا یا بیوی کا؟

سوال [۹۵۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے شوہر اور میرے بھائی دونوں اسلامیہ لوکل ایجنسی کی ایک دوکان کی کرایہ داری میں شریک تھے، یہ دوکان ان کو میری نانی نے کرائی تھی جو میرے شوہر کی بھی نانی ہوتی ہیں، پگڑی کے دس ہزار روپۓ بھی نانی ہی نے ادا کئے جو بعد میں ان دونوں سے واپس نہیں لئے، یہ دونوں اس میں برابر کی شرکت سے کام کرتے رہے، کچھ عرصہ کے بعد میرے بھائی نے تیس ہزار روپۓ لے کر علیحدگی اختیار کر لی اور علیحدگی کا اقرار نامہ بھی لکھ دیا، اب اس دوکان کے مکمل مالک میرے شوہر ہو گئے۔ ۱۶/ دسمبر ۱۹۹۰ء میں جب میرے شوہر شہید ہو گئے تو اس کے کچھ دن بعد خسر صاحب نے دوکان کی کرایہ داری کو اپنے چھوٹے لڑکے کے نام کرانی

چاہی، جب مجھے اس کا علم ہوا تو میں نے اپنے چھوٹے لڑکے فہیم کے نام سے ایجنسی کو درخواست دلوادی جس میں یہ تھا کہ میرے والد کا انتقال ہوگیا ہے؛ لہٰذا دوکان کی کرایہ داری میرے نام کردی جائے، اس پر اسلامیہ لوکل ایجنسی نے اپنے وکیلوں سے مشورہ کر کے نسیم مرحوم کی بیوہ کے نام کرایہ داری کردی، اب میرے ہی نام سے ہی رسید جاری ہے، اس میں دریافت طلب امر یہ ہے کہ کرایہ داری کے مستحق میرے خسر ہیں یا میں یا میرے بچے؟

المستفتی: نرگس جہاں، آگرہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہندوستان میں کرایہ کی جائیداد دو قسم کی ہیں: (۱) وہ جائیداد جن کو کرایہ دار سے خالی کرانے کا مالک کو اختیار رہوتا ہے اور حکومت اس سلسلہ میں مالک کا ہی ساتھ دیتی ہے، جیسا کہ اوقاف کی جائیداد۔

(۲) وہ جائیداد جن کو کرایہ دار سے خالی کرانے کا مالک کو اختیار نہیں ہوتا ہے۔ اور اس میں حکومت کرایہ دار ہی کا ساتھ دیتی ہے، اگر مالک مکان خالی کرانے کی کوشش کرے، تو اس کی کوشش اس وقت تک ناکام رہتی ہے جب تک کہ کرایہ دار بھاری رقم لے کر خود خالی کرنے پر آمادہ نہ ہوجائے، گویا ایسا ہوجاتا ہے جیسا کہ خرید وفروخت کا معاملہ ہورہا ہے اور مالک مکان کرایہ دار سے اپنے مکان کو خرید رہا ہے، اس طرح کی کرایہ داری میں شرعاً کرایہ دار کے تمام ورثاء کا حق متعلق ہوتا ہے، اس لئے کہ اگر تمام ورثاء کا حق ثابت نہ کیا جائے تو مالک مکان سے کرایہ دار کا ایک ہی وارث لاکھوں روپیہ وصول کر کے خود مالک ہوجائے گا۔ اور دوسرے ہمسر وارثین کو کچھ بھی نہیں دے گا؛ لہٰذا اس بناء پر خریدنے کی صورت میں حق خریداری اور منافع کی صورت میں حق منفعت تمام ورثاء کو حاصل ہوگا؛ کیوں کہ اگر مالک مکان سے خریدنا چاہے، تو کوڑیوں کے بھاؤ میں خرید سکتا ہے، اس لئے حق خریداری میں بھی تمام ورثاء کا حق متعلق ہوجاتا ہے اور منافع کی صورت میں حق منفعت تمام ورثاء سے متعلق ہوجاتا ہے اور پہلی قسم کی جائیداد کا معاملہ صرف قابض اور کرایہ دار تک محدود ہوتا ہے، ورثاء

سے متعلق نہیں ہوتا۔ اورسوال نامہ میں جس جائیداد کا ذکر ہے، وہ دوسری قسم کی جائیداد ہے؛ اس لئے اس میں تسیم کے تمام ورثاء کا حق شامل ہوگا۔

یجوز إن كانت الأرض بإجارة في أيدي الذين بنوها لايخرجهم السلطان عنها من قبل أنا رأيناها في أيدى أصحابنا البناء توارثوها، وتقسم بينهم لا يتعرض لهم السلطان فيها ولا يزعجهم. (شامي، كتاب الوقف، مطلب في زيادة أجرة الأرض المحتكرة، زكريا ٦/ ٥٩٢، ٥٩٣، كراچی ٤/ ٣٩١، الموسوعة الفقهية الكويتية ١٩/ ٢٩٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۲۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۵/۲ھ

حکومت کی اجازت کے بغیر دوسرے ملک میں تجارت کرنا

سوال [۹۵۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: حکومت کی اجازت کے بغیر ایک ملک کے آدمی کا دوسرے ملک میں تجارت کرنے کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: مظہر الحق مرشد آبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: حکومت کی اجازت کے بغیر ایک ملک کے آدمی کا دوسرے ملک سے تجارت کرنا اور ایک ملک کا مال دوسرے ملک منتقل کرنا اپنی عزت وآبرو کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے خطرات سے اپنے آپ کو بچانے کا حکم فرمایا ہے۔

قال الله تعالىٰ: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ. [البقرة: ١٩٥]

کہ تم اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو؛ لیکن پھر بھی کوئی شخص تجارتی مال خفیہ طور پر منتقل کرنے میں کامیاب ہوگیا تو وہ مال اور اس کا پیسہ اس کے لئے حلال ہے، مگر شریعت ایسی تجارت کی اجازت نہیں دیتی جو خطرات میں مبتلا کرسکتی ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۶/ ۲۷۸، جدید ۹/ ۲۲۲، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۳/ ۳۵۴، جدید ۴/ ۱۷۴، ڈابھیل ۱۶/ ۱۴۸، ۴/ ۱۷۴، احسن الفتاوی ۸/ ۹۵)

عن حذيفة –رضي الله عنه– عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لاينبغي لمسلم أن يذل نفسه، قيل: وكيف يذل نفسه؟ قال: يتعرض من البلاء لما لا يطيق.

(مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٤٠٥، رقم: ٢٣٨٣٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵ / جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۷۴۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۶/۶ھ

زمین کو بوقت ضرورت واپسی کی شرط پر کرائے پر دینا

سوال [۹۵۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خالد نے اپنی جائیداد زید کو کرایہ پر اس شرط اور وعدے کے ساتھ دی کہ جب خالد کو واپسی جائیداد کی ضرورت ہو تو زید بلا کسی عذر اور تاخیر کے واپس کردے گا۔ آج جب کہ خالد کو اپنی ذاتی ضرورت ہے اور مجبور ہے کہ جائیداد کو اپنے تصرف میں لائے، جیسا کہ جائیداد کرائے پر دیتے وقت زید نے بلا کسی عذر اور شرط کے واپس کردینے کا وعدہ کیا تھا، خالد نے واپسی جائیداد کا مطالبہ زید سے کیا تو زید واپسی جائیداد کے لئے خالد سے کثیر رقم کا مطالبہ کر رہا ہے، سارے وعدے خالد اور زید کے درمیان زبانی ہوئے تھے، کیا فرماتے ہیں علماء دین شریعت مطہرہ کی روشنی میں کہ زید کا عمل جائز ہے یا ناجائز؟ جزاک اللہ

المستفتی: رئیس احمد خان، بڑھیاں دوکان محلّہ تھانہ ٹین رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب خالد نے اپنی جائیداد اس شرط اور وعدے کے ساتھ زید کو کرایہ پر دی کہ جب خالد کو جائیداد کی واپسی کی ضرورت ہوگی تو بلا کسی عذر کے واپس کردے گا اور زید نے اس شرط کو قبول کیا تو آج جب خالد اپنی ذاتی ضرورت سے مجبور ہوکر جائیداد کی واپسی کا مطالبہ کررہا ہے، تو زید کو وعدے کے مطابق بلا کسی رقم کے واپس کر دینا لازم ہے، جائیداد کی واپسی کے لئے زید کا رقم کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہے اور جس رقم کا مطالبہ کررہا ہے، وہ رقم زید کے لئے حرام اور رشوت ہے اور اس رقم کی لینے کی وجہ سے زید پر ہمیشہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے لعنت ہوتی رہے گی۔

عن أبي حرة الرقاشي عن عمه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ألا لا تظلموا، ألا لا يحل مال امرء إلا بطيب نفس منه. (مشكوة شريف ۲/ ۲۵۵، مسند أحمد بن حنبل ۵/ ۷۲، رقم: ۲۰۹۷۱)

عن أبي حرة الرقاشي عن عمه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه. (مسند أبي يعلى الموصلي، دارالكتب العلمية بيروت ۲/ ۹۱، رقم: ۲۰۹۷۱، سنن الدارقطني، البيوع، دار الكتب العلمية بيروت ۳/ ۲۲، رقم: ۲۸۶۲، ۲۸۶۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ر شوال المکرّم ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۱۵۸)

مالک کا پانچ ہزار روپیہ پیشگی یا شٹر لگوانے کی شرط لگانا

سوال [۹۵۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے دوکان تعمیر کروائی، اس نے یہ اعلان کیا جو شخص کرایہ پر دوکان لے گا وہ

پانچ ہزار روپئے دے یا دوکان میں شٹر لگوائے اور یہ رقم نہ کرایہ میں مجری ہوگی اور نہ امانت ہے کہ بعد میں ملے گی، تو یہ شکل جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: حاجی ضمیر احمد شیر کوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال میں ذکر کردہ صورت اس طرح جائز ہوسکتی ہے کہ مالک دوکان کرایہ دار سے پانچ ہزار روپئے یا جوشٹر لگائے گا، اس کی قیمت یکمشت لے لے جس کو متعین مدت کا پیشگی کرایہ قرار دیا جائے گا اور یہ یکمشت لی ہوئی رقم ماہانہ یا سالانہ کرایہ کے علاوہ ہوگی؛ البتہ اس طرح کے معاملہ میں کرایہ دار جوشٹر لگوائے گا، اس کی قیمت کا متعین ہونا ضروری ہے، اسی طرح مدت اجارہ کا بھی متعین ہونا ضروری ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۱۰)

ثم الأجرة تستحق بأحد معان ثلاثة: إما بشرط التعجيل، أو بالتعجيل، أو باستيفاء المعقود عليه، فإذا وجد أحد هذه الأشياء الثلاثة، فإنه يملكها. (هندية، كتاب الإجارة، الباب الثاني في بيان أنه متى تجب الأجرة، زكريا جديد ٤/ ٤٤٣، قديم ٤/ ٤١٣، هداية، اشرفي ٣/ ٢٩٤، البحرالرائق، كوئٹه ٧/ ٣٠٠، زكريا ٧/ ٥١١)

ولا يصح حتى تكون المنافع معلومة، والأجرة معلومة. (هداية، كتاب الإجارات، اشرفي ٣/ ٢٩٣، هندية، زكريا قديم ٤/ ٤١١، جديد ٤/ ٤٤١) **فقط اللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍رجب المرجب ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۸۴۷)

کرایہ پر مکان دے کر ہر سال دس فیصد بڑھانے کی شرط

سوال [۹۵۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک دوکان مالک اپنی دوکان کرائے پر دے رہا ہے اور وہ دوکان مالک اپنے ہونے

والے کرائے دار کے سامنے ایڈوانس اور کرائے کی بات پیش کرتا ہے، جس پر کرائے دار راضی ہے، مگر دوکان مالک کی ایک شرط ہے، جو کرائے نامہ میں صاف طور پر لکھی ہوئی ہے کہ طے ہوئے کرایہ پر سالانہ کرایہ دس فیصد بڑھا کرے گا اس شرط پر بھی کرائے دار راضی ہے اور مسئلہ یہ ہے کہ وہ دس فیصد جو ہر سال بڑھے گا وہ طے شدہ کرائے پر بڑھے گا یا ہر سال کے بڑھے ہوئے دس فیصد پر بھی بڑھے گا، مثلاً ۱۰۰/ روپئے ماہوار کرایہ طے ہوتا ہے اور سال گزر جانے پر شرط کے مطابق اگلے سال کا کرایہ دس فیصد بڑھ کر ۱۱۰/ روپئے ہوجاتا ہے، اس طرح آئندہ سالوں میں دس فیصد صرف ۱۰۰/ روپئے پر ہی بڑھے گا یا ہر سال کے بڑھے ہوئے دس فیصد پر بھی بڑھے گا؟ مثلاً جیسے ایک سال گزر جانے پر ۱۰۰/ پر دس فیصد بڑھ کر ۱۱۰/ روپئے ہوجاتا ہے، پھر دوسرے سال میں ۱۱۰/ کا دس فیصد بڑھ کر ۱۲۱/ روپئے ہوجاتا ہے، اسی طرح سے تیسرے سال میں ۱۲۱/ کا دس فیصد ۱۳۳/ روپئے ، پھر چوتھے سال 133.10 روپئے کا 10% 146.41 روپئے، پھر پانچویں سال میں 146.41 روپئے پر 10% سے 161.051 روپئے ہوجاتے ہیں۔

تو اس طرح ہر سال کے بڑھے ہوئے دس فیصد کے حساب سے پانچ سالوں میں بڑھی ہوئی رقم بنی 161.051 روپئے۔ اور اگر طے شدہ کرایہ پر ہی دس فیصد بڑھتا ہے تو پانچ سالوں میں بڑھی ہوئی کل رقم بنتی ہے صرف -/50 روپئے ،تو قرآن وحدیث کی روشنی میں بتائیے کہ:

(۱) کیا طے شدہ -/100 روپئے پر ہی ہر سال دس فیصد بڑھے گا؟

(۲) کیا ہر سال کے بڑھے ہوئے دس فیصد پر بھی دس فیصد بڑھے گا؟

(۳) کیا کرایہ پر سالانہ بڑھنا جائز ہے؟

(۴) کیا دس فیصد پر ہر سال دس فیصد بڑھنا سود مانا جائے گا؟ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس بارے میں؟ شریعت کی روشنی میں بتائیے۔

المستفتی: ندیم حسین سرائے کشن لال کھوکران اسٹریٹ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اس طرح کے معاملات کا عرف اورتعامل پرمدار ہےاور عرف اور تعامل میں سلسلہ اس طرح جاری ہے کہ سالانہ دس فیصد جو بڑھے گا وہ ہرسال کے اضافی شرح پر بڑھے گا، جیسا کہ سرکاری یا پرائیویٹ اداروں میں سالانہ ترقی کے بعد جب اگلے سال فیصد ترقی ہوتی ہے تو پچھلے سال کے کل کے اوپر اضافہ ہوتا ہے؛ لہٰذا اگر سوروپئے کرایہ طے ہوا ہے تو اگلے سال ایک سودس روپئے ہوگا۔ اوراس کے بعد والے سال میں ایک سوگیارہ روپیہ پردس روپئے بڑھے گا؛ لہٰذا ایک سوایکیس روپئے ہوگا، اسی طریقہ سے ہرسال کا سلسلہ جاری ہوگا۔ اورشریعت کے اندراس طرح کے عرف اورتعامل کا اعتبار ہے۔

الثابت بالعرف كالثابت بالنص. (الأشباه والنظائر/ ١٥٦، عقود رسم المفتي قديم/ ٣٨، قواعد الفقه أشرفي ديو بند /٧٤، رسائل ابن عابدين، ثاقب بك ڈپو ديو بند /٤٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍شعبان ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۶ ۳/۳/۷۳۷)

کرایہ دار کب بجلی اور پانی کے بل کی ادائے گی کا ذمہ دار ہوگا؟

سوال [۹۵۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ف: ایک مؤمن حاجی مسلمان ہے، الف کرایہ دار ہے، ۱۵؍۴؍۱۹۹۸ء سے ۱۵؍۷؍۲۰۰۱ء تک کرایہ دار رہا، اس عرصہ میں قریب چار پانچ مہینے مکان بند رہا، مگر ف: کے قبضہ میں رہا اور ف کے بند مکان میں تالا بھی لگا رہا، چونکہ اس مکان میں تجارت کا سامان تھا، یقیناً ف کے ملازمین کو جب سامان کی ضرورت پڑتی ہوگی تو تجارتی سامان کو تالا کھول کر نکالتے ہوں گے اور بلب یا ٹیوب سے روشنی بھی کرتے ہوں گے اور کام سے فارغ ہوکر منہ ہاتھ بھی دھوتے ہوں گے اور بیت الخلاء بھی استعمال کرتے ہوں گے۔ ف: کے ۱۵؍۷؍۲۰۰۱ء کو مکان خالی کرنے کے بعد بجلی پانی کا بل آیا، بجلی کا بل -/5079 روپئے اور پانی کا بل

-/7584 روپئے تھا۔ اب چونکہ مکان خالی کر چکے تھے، الف: مالک جائیداد نے دونوں بل وصول کر کے ادائے گی کی ف: نے اپریل ۱۹۹۸ء سے ایک عرصہ تک بجلی کا بل ادا کیا اور اس کے بعد چونکہ بقول ف: کے بجلی اور پانی کا استعمال نہیں رہا، ہر دو بل بجلی اور پانی ادا نہیں کیا۔ اور کہتا یہ ہے کہ میں نے استعمال نہیں کیا، یہ بل غلط آئے ہیں، چونکہ ایک عرصہ سے مکان بند تھا۔ الف: کا کہنا یہ ہے کہ چونکہ ف: کا تالا مکان میں ۱۵/۷/۲۰۰۱ء تک لگا رہا، مکان ف: کے قبضہ میں تھا، ہر دو بل واجبات بجلی و پانی ۱۵/۷/۲۰۰۱ء تک ف: کے ذمہ ہیں، مسلسل ف: یہ کہتا چلا آرہا ہے کہ چونکہ مکان بند تھا، ف: کا تالا لگا ہوا تھا، بجلی اور پانی کا استعمال نہیں تھا۔ اور یہ بل غلط آئے ہیں، میں یہ بل جمع نہیں کروں گا۔ الف: کا کہنا یہ ہے کہ چونکہ ف: کے مکان قبضہ میں ہے، اس مدت کی بجلی اور پانی کے بل کے واجبات ف کے ذمہ ہیں، اور ف کو ادا کرنا واجب ہے۔

المستفتی: جی ایف نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کرایہ دار کے قبضہ میں جب تک مذکورہ مکان رہا ہے، اس وقت تک بجلی اور پانی کے بل کی ادائے گی کا ذمہ دار کرایہ دار ہی ہوگا، چاہے اس میں کرایہ دار نے رہائش یا کاروبار نہ کیا ہو یا تالا لگا کر بند رکھا ہو، جب تک اس مکان کی تالی مالک مکان کو واپس نہ کردے گا، اس وقت تک پانی، بجلی وغیرہ کے بلوں کی ادائے گی کا ذمہ دار کرایہ دار ہی ہوگا؛ لہٰذا مذکورہ صورت میں ف: کرایہ دار کے قبضہ میں رہنے کے زمانہ میں بجلی اور پانی کا جو بل آیا ہے، اس کی ادائے گی کا ذمہ دار کرایہ دار ف: ہی ہوگا۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۷/۳۱۰)

كما يجب الأجر باستفاء المنافع يجب بالتمكن من استيفاء المنافع إذا كانت الإجارة صحيحة حتى أن المستأجر دارا أو حانوتا مدة معلومة، ولم يسكن فيها في تلك المدة مع تمكنه من ذلك تجب الأجرة. (هندية، كتاب الإجارة، الباب الثاني في بيان أنه متى تجب الأجرة، زكريا جديد ٤/ ٤٤٣، قديم

٤/ ٤١٣، هداية، اشرفي ٣/ ٢٩٤، الدر مع الرد، زكريا ٩/ ١٥/ كراچی ٦/ ١١، بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٥٠، كراچی ٤/ ١٩٥، المبسوط دارالكتب العلمية بيروت ١٦/ ٤٦)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍صفر المظفر ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۴۹۲/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۲/۷ھ

کرایہ دار کا مالک سے مرمت کا خرچ وصول کرنے کا حکم

سوال [۹۵۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سائل ایک مکان میں تقریباً ۴۵؍سال سے کرایہ دار کی حیثیت سے رہتا ہے، جس کا کرایہ ماہ بماہ ادا کرتا رہا ہے، جب مالک مکان نے کرایہ لینے سے انکار کیا تو ہر ماہ کچہری میں جمع کر دیتا ہے، درمیان میں اس نے مالک مکان کی اجازت سے مکان کی مرمت کرائی، دیواریں بنوا کر چھت میں کڑیاں ڈالیں اور چھت بنوائی، فرش پختہ بنوایا، مکان میں پانی کے لئے نل نہیں تھا، تو ہینڈ پمپ لگوایا، اب مالک مکان مجھ سے مکان خالی کرانا چاہتا ہے، تو میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ جو روپیہ میں نے مکان میں وقتاً فوقتاً لگایا ہے، اس روپیہ کو میں مالک مکان سے طلب کروں تو از روئے شرع وہ روپیہ طلب کرنا اور لینا میرے لئے جائز ہے یا نہیں؟ مالک مکان نے کرایہ میں میرا کوئی روپیہ مجریٰ نہیں کیا ہے؛ لہٰذا آپ سے مؤدبانہ التماس ہے کہ اس مسئلہ کے بارے میں آپ فتویٰ صادر فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

المستفتی: سائل محمد حیات خاں فیل خانہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب آپ نے مالک مکان کی اجازت سے مکان کی مرمت کرائی ہے، تو غیر منقولی اشیاء کی قیمت مالک سے وصول کر سکتے ہیں۔ اور اگر مالک ہینڈ پمپ کی قیمت دینے کے لئے تیار ہو تو قیمت لے لیں، ورنہ آپ اس ہینڈ پمپ کو اپنے ساتھ

لے جاسکتے ہیں۔

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: لا ضرر ولا ضرار. (مسند أحمد بن حنبل ۱/ ۳۱۳، رقم: ۲۸۶۷)

الأصل أن من بنى في دار غيره بأمره، فالبناء لرب الدار ويرجع عليه بما أنفق استاجر دارا فجصصها أو فرشها بآجر، أو ركب فيه بابا، أو غلقا أو نحوه وأمر به الموجر، فأراد المستأجر قلعه فله قلعه لو لم يضر لا لو أضر فله قيمته يوم الخصومة. (جامع الفصولين ۲/ ۱۶۰، وهكذا في الشامي، كتاب الخنثى، زكريا ۱۰/ ۴۷۵، کراچی ۶/ ۷۴۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍صفر ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۶۴۹۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۲/۱۴۲۱ھ

مالک مکان کا کرایہ دار کا سامان فروخت کرنا

سوال [۹۵۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جون ۱۹۹۱ء میں ایک ہندو شخص پاٹھک نے اپنا انگریزی مدرسہ شروع کرنے کے لئے میرا مکان کرایہ پر لیا اور اپنے ابتدائی کام شروع کردئے، اشتہاروں کی چھپائی، کرسیاں اور میزیں، بورڈ اور دیگر ضروری سامان فراہم کرنے لگا کہ فلاں تاریخ کو میرا انگریزی اسکول شروع ہوجائے گا؛ لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ وہ مانیتا پراپت نہ ہوکر بھی چل سکتا، پندرہ بیس دن بعد جبل پور کی پولیس آئی اور ماسٹر پاٹھک صاحب کو گرفتار کر کے جبل پور لے گئی۔ سنا ہے کہ ان پر کیس چلا اور قانون کے مطابق سزا ہوگئی اور اب نہ جانے وہ ماسٹر صاحب کہاں ہیں، پھر ادھر میں نے ان کے سامان کو فروخت کر کے مکان خالی کرلیا اور دوسرے آدمی کو کرایہ پر دے دیا، پاٹھک پر میرا جو کرایہ تھا وہ میں نے سامان فروخت کر کے وصول کرلیا اور مکان خالی کرا کے دوسرے آدمی کو کرایہ پر دے دیا، اپنا کرایہ مجرا کر کے باقی رقم ایک ہزار

روپئے اسے واپس کرنے کے لئے اپنے پاس جمع کرلی، وہ نہ آج تک آیا نہ میں نے دی، وہ رقم ایک ہزار کے قریب میرے پاس جمع ہے، اس رقم کو نہ تو میں خود استعمال کرسکتا ہوں اور نہ ہی خیرات کرسکتا ہوں، نہ کسی اسلامی کام میں خرچ کرسکتا ہوں؛ اس لئے آپ سے استفتاء ہے کہ ازراہ کرم مجھے جلدی سے اس رقم کے خرچ کی بابت مطلع فرمادیں کہ اسے کیا کروں؟ کسے دوں؟ کیوں کہ اسلام میں تو اس کے خرچ کی کوئی گنجائش شاید نہ ہوگی؛ اس لئے شرعی حکم سے مطلع فرمائیں کہ وہ رقم کسے دوں؟ کیا کروں؟ کہاں خرچ کروں؟ خدانخواستہ اگر اس رقم کو خرچ کرنے سے پہلے ہی میرا خاتمہ ہوگیا تو میرا کیا حال ہوگا؟

المستفتی: سرور القادری آنند بھون

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کے لئے کرایہ دار کا سامان فروخت کرنا جائز نہیں تھا، نیز آپ صرف اتنے دنوں کا کرایہ لینے کے حق دار ہیں جتنے دن کرایہ دار نے استعمال کیا ہے، یا اس کے قبضہ میں رہا ہے؛ لہٰذا کرایہ دار کے سامان یا اس کی قیمت بطور امانت رکھنا لازم ہوگا، اور اس کو یا اس کے ورثاء کے حوالہ کردینا لازم ہوگا۔

وأما في حق الآجر فلا يجوز، ولا تنعقد حتى لو انفسخت الإجارة الأولى. (حموي على الأشباه، كراچی ٢/ ٤٦٥)

ويجب إن سكنها أجر المثل بالغا ما بلغ. (الدر مع الرد، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، زكريا ٩/ ٦٧، كراچی ٦/ ٤٩، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٥٣٠، مصري قديم ٢/ ٣٨٢، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٥/ ١٢١، زكريا ٦/ ١١٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۲۹۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴/۵/۱۴۱۸ھ

آپسی رضا مندی کی بنا پر کاروبار کی دو جائز شکلیں

سوال [۹۵۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: الحمد للہ میرا اپنا کاروبار اچھا چل رہا تھا، میں نے اپنی رقم سے زمین لی، عمارت بنائی، پھر کاروبار چلنے لگا، دوسرا بھائی ہم سے بالکل الگ تھا، کچھ کاروبار بھی کرتا تھا؛ لیکن اس میں اچھی آمدنی نہیں تھی، تو میں نے سوچا اپنے بھائی کو اپنے کاروبار میں سے پندرہ فیصد نفع میں شریک کرکے اس کا تعاون کروں، چنانچہ میں نے اپنے بھائی کو اپنے ساتھ لگالیا اور نفع وآمدنی میں سے ۱۵ ر فیصد دینے لگا، اس کے ہمارے ساتھ لگنے کی وجہ سے دونوں کو فائدہ ہوا، مجھے بھی سہولت ہوئی اور بھائی کو بھی اچھی رقم ملی اور کام کرنے کا اسے میدان ملا؛ لیکن میرے ساتھ یہ پریشانی ہونے لگی کہ پہلے جب میں نے اپنے بھائی کو اپنے ساتھ لگایا نہیں تھا، تو آزاد تھا، جہاں چاہتا تھا جیسے چاہتا تھا اپنے اور خیر کے کاموں میں آزادی سے خرچ کرتا، اس کا کوئی حساب رکھنے کی بھی ضرورت نہیں تھی، جب میں نے بھائی کو ۱۵ ر فیصد دینے کا وعدہ کرلیا، تو یہ خلجان پیدا ہوا کہ ہم نے ۱۵ ر فیصد بھائی کو دینے کا وعدہ کرلیا ہے اور اس میں سے حساب سے پہلے ہی بہت سے ضروری اخراجات ہوجاتے ہیں، ان پر بھائی کو فیصد نہیں ملتا، تو اب میں نے اپنے بھائی سے یہ طے کیا ہے کہ تم ہمارے یہاں ملازم کی حیثیت سے کام کرو، معقول تنخواہ دیں گے اور سال میں اپنی مرضی سے بطور انعام معقول رقم دیں گے، اس پر بھائی راضی بھی ہے، تو اب دریافت یہ کرنا ہے کہ اپنے بھائی کو اس طرح تنخواہ پر ملازم رکھنا شرعاً کیسا ہے؟ اور کچھ انعام الگ سے تنخواہ کے علاوہ دینا کیسا ہے؟ تاکہ اس کی دلداری بھی ہو اور مزید محنت سے کام کرتا رہے، شرعی حکم تحریر فرمادیں۔

المستفتی: عبدالرحمٰن لالباغ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں ایک ساتھ کاروبار کی دو شکلیں بیان کی گئی

ہیں۔ دونوں شکلیں آپس کی رضا مندی سے جائز اور درست ہیں، پہلی شکل یہ ہوئی کہ سائل نے اپنے بھائی کو اس طریقہ سے کاروبار میں شریک کرلیا کہ سارا سرمایہ سائل کا ہے اور اس کا بھائی ساتھ میں کام کرے گا اور نفع کا ۱۵/فیصد بھائی کو ملے گا اور باقی ۸۵/فیصد اپنے لئے ہوا کرے گا۔ دوسری شکل یہ ہوئی کہ شرکت ختم کردی گئی، پھر بھائی کو موٹی اور بھاری تنخواہ پر ملازم کی حیثیت سے رکھ لیا گیا، تو اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے ۱۵/فیصد کے ساتھ جو معاملہ طے ہوا تھا اس کا حساب وکتاب صاف کرلیا جائے، اس کے بعد معقول تنخواہ پر بھائی کو ملازم کی حیثیت سے رکھ لیا جائے تو شرعی طور پر ایسا کرنا بھی جائز اور درست ہے، جب کہ جانبین اس پر راضی ہوں اور الگ سے انعام دینا تنخواہ میں شامل نہیں ہے؛ بلکہ مالک کے رحم وکرم پر مبنی ہے، ہاں البتہ اگر سالانہ انعام متعین کردیا جائے تو وہ بھی تنخواہ میں شمار ہوگا اور اس کا دینا بھی مالک پر لازم ہوجائے گا۔ اور طے کئے بغیر جو دیا جائے وہ بھی انعام ہی ہوگا، مگر اس کے وصول کرنے پر مالک کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

وهذه العقد يشبه المضاربة من حيث أنه يعمل في مال الشريك، ويشبه الشركة اسما وعملا، فإنهما يعملان فعملنا يشبه المضاربة، وقلنا يصح اشتراط الربح من غير ضمان، ويشبه الشركة حتى لا يبطل باشتراط العمل عليهما. (هداية، كتاب الشركة، أشرفي ٢/ ٦٣٠)

والأجير الخاص: الذي يستحق الأجرة بتسليم نفسه فى المدة، وإن لم يعمل كمن استوجر شهرا للخدمة أو لرعي الغنم، وإنما سمى أجير وحد؛ لانه لا يمكنه أن يعمل لغيره؛ لأن منافعه في المدة صارت مستحقة له، والأجر مقابل بالمنافع، ولهذا يبقى الأجر مستحقا، وإن نقص العمل.

(هداية، كتاب الإجارات، باب ضمان الأجير، أشرفي ٣/ ٣١٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۹۸۶/۳۸)

اجارہ مشترکہ کی صورت میں کچھ ضائع ہوجائے تو ضامن کون ہوگا؟

سوال [۹۵۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تین فریقین ہیں، جن کا کاروباری سلسلہ الگ الگ ہے، یہ تینوں اپنا چاول زید کے ٹرک سے ٹانڈہ سے رام نگر لے جارہے تھے، یہ کل چالیس بوری چاول تھا، جس کی تفصیل اس طرح ہے: محمد جمیل ۱۲/ بوری چاول ٹوٹ۔ محمد علی ۲۰/ بوری ٹوٹ۔ بیوہ خدیجہ ۸/ بوری چاول سالم۔ جب ٹرک والا یہ چاول لے کر روڈ پر آیا تو چاول انسپکٹر نے اس ٹرک کو پکڑ لیا اور ٹانڈہ کے ایک میل میں لے جاکر کھڑا کردیا اور ڈرائیور سے جب انسپکٹر نے معلوم کیا کہ ٹرک میں کتنی بوری چاول ہے؟ تو ڈرائیور نے ۳۱/ بوری چاول بتلایا، مالکان میل نے یہ سن کر ۹/ بوری چاول ٹرک سے حکمت عملی سے اتر واکرا لگ کردیا؛ لہٰذا انسپکٹر نے بتلائی ہوئی ۳۱/ بوری کا مقدمہ بنام محمد علی درج کردیا، وہ جو ۹/ بوری ٹرک سے اتاری گئی ہیں، ان میں آٹھ بوری چاول سالم ہیں اور ایک بوری چاول ٹوٹ، ان میں ایک بوری مشخص طور پر زید کی ہے اور ۸/ بوری چاول سالم متعین طور پر بیوہ خدیجہ کے ہیں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان ۹/ بوری مال کا کون مالک ہے؟ آیا مندرجہ بالا اشخاص سب مستحق ہیں یا ان میں سے کوئی ایک؟

واضح رہے کہ مندرجہ بالا اشخاص کا مال قسم کے اعتبار سے بھی الگ الگ تھا، اب شرع متین کی روشنی میں واضح طور پر مطلع فرمائیں۔ بینوا توجروا

المستفتی: حاجی رئیس احمد ساکن محلّہ بھیل بوری ٹانڈہ بادلی، ضلع رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ معاملہ اجارۂ مشترکہ کا ہے، ٹرک والا زید اجیر مشترک ہے، اس نے ہر صاحب مال سے الگ الگ معاملہ کیا ہے اور ہر ایک کا مال بھی الگ الگ نوعیت کا ہے، ایک ٹرک میں مخلوط کرنے کے باوجود ہر شخص اپنا مال علیحدہ پہنچان سکتا ہے؛ اس

لئے حفاظت شدہ ۸؍سالم بوری اور ایک بوری ٹوٹ اصل مالک کی ملکیت میں ہی ہے، ان میں کسی دوسرے کا کوئی حق نہیں ہے، بیوہ خدیجہ کی قسمت اچھی ہے کہ اس کی سب بوری محفوظ ہوگئیں، نیز زید کی قسمت ہے کہ اس کی ایک بوری محفوظ ہوگئی، باقی ۳۱؍ بوری کا ذمہ دار زید ٹرک والا بھی نہیں ہوگا، مالکان کی ملکیت میں ہی نقصان ہوا ہے۔

إن استأجر حمالا ليحمل له طعاما في طريق كذا، فأخذ في طريق غيره يسلكه الناس، فهلك المتاع فلا ضمان عليه. (هداية، كتاب الإجارات، باب مايجوز من الإجارة، وما يكون خلافا فيها، أشرفي ۳/ ۳۰۰، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٥/ ٢٩٣، رقم: ٢٣١١٦، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ١٢/ ٤٦، رقم: ١٤٠٤٦، مجمع الضمانات ١/ ٣٧، البناية، أشرفيه ١٠/ ٢٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍شوال المکرّم ۱۴۰۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۹۲۷)

کرایہ پر لی ہوئی زمین پر مالک کی اجازت سے عمارت تعمیر کر لی تو اب کیا کرے؟

سوال [۹۵۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے عمر کی زمین کو ۲۵؍سال کے لئے کرایہ پر لے لیا اور زید نے زمین میں عمارت تعمیر کر لی، اب ۲۵؍سال پورے ہوجانے کے بعد عمر کو زمین واپس کرنی ہے، تو عمارت کے ملبہ کا کیا حکم ہوگا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: زید نے عمر کو زمین کرایہ پر دیتے وقت اگر عمارت بنانے کی اجازت دی تھی، تو اب مدت اجارہ ختم ہونے پر عمر زید سے اپنی عمارت میں خرچ ہونے والی رقم وصول کرے گا اور عمارت زید کو دے دینا لازم ہے؛ لیکن اگر زید نے عمر کو تعمیر کی اجازت نہیں دی تھی، تو اب زید کو دو اختیار ہیں کہ عمر کو عمارت کے توڑنے کا مکلّف بنادے یا زید عمر کو اس عمارت کی قیمت ادا کردے اور عمارت اپنے پاس رکھ لے۔

إذا بنی المستأجر أو غرس بدون إذن الموجر فلو بإذنه فيرجع عليه بما أنفق. (شرح المجلة رستم، مكتبة إتحاد ۱/ ۲۹۰، رقم المادة: ۵۳۱)

تصح إجارة أرض للبناء والغرس ...... فإن مضت المدة قلعهما وسلمها فارغة لعدم نهايتها إلا أن يغرم له الموجر قيمته أی البناء والغرس مقلوعا. (الدر مع الرد، كتاب الإجارة، باب ما يجوز من الإجارة، زكريا ۹/ ۴۰، ۴۱، كراچی ۶/ ۳۰)

لو أحدث المتسأجر بناء في العقار الماجور، أو غرس شجرة، فالآجر مخير عند انقضاء مدة الإجارة إن شاء قلع البناء والشجرة، وإن شاء ابقی ذلک وأعطی قيمته كثيرة كانت أو قليلة. (شرح المجلة رستم، مكتبه إتحاد ۱/ ۲۹۰، رقم المادة: ۵۳۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۵۴)

جس شخص نے تنہا اپنی کمائی سے کاروبار بڑھایا اس میں دوسرے بھائی کی حصہ داری نہ ہوگی

سوال [۹۵۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے پانچ بیٹے ہیں، بڑا لڑکا بکر بڑے ہونے کے بعد ٹرانسپورٹ کمپنی میں ملازمت کرنے لگا، اس کے بعد اس نے اپنی کمائی کے ذریعہ خود ٹرانسپورٹ کا کام شروع کیا، نہ بھائی کا اس میں پیسہ لگا نہ باپ کا کوئی سرمایہ، اس کے بعد اس نے اپنے دو بھائیوں کو اپنے ساتھ کاروبار میں لگالیا، اور کوئی وعدہ نہیں کیا کہ علیحدگی کے وقت ان کو کوئی حصہ دیا جائے گا، بلکہ بھائیوں کے پاس کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا؛ اس لئے ان کو ساتھ لگالیا اور اس بھائی نے بھائیوں اور بہنوں کی شادی کرادی، ایسے حالات میں ایک بھائی اس کے کاروبار سے الگ ہوجانا چاہتا ہے، کہتا ہے کہ تم الگ ہونا چاہتے ہو تو ہوجاؤ، مگر تم کو کوئی حصہ نہیں ملے گا؛ کیوں

کہ اس میں مکمل سرمایہ میرا ہے، تمہارا کچھ نہیں، اس صورت میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ سرمایہ سارا بکر کا ہے یا بھائیوں کو بھی کچھ حصہ ملے گا؟ اگر ملے گا تو کیا ملے گا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بکر نے ٹرانسپورٹ کا کام اپنے پیسوں سے شروع کیا ہے، باپ اور بھائیوں کا اس میں کوئی پیسہ نہیں لگا ہے اور اس نے بھائیوں کو ہمدردی کے طور پر اپنے ساتھ کام میں لگا لیا تھا اور ان کو ضرورت کے سارے اخراجات کے پیسے بھی دیتا رہتا تھا، اب کوئی بھائی علیحدہ ہونا چاہتا ہے اور کاروبار میں حصہ داری کا مطالبہ کرتا ہے، تو اس کو حصہ داری کے طور پر کچھ نہیں دیا جائے گا اور پورے کاروبار کا مالک بکر ہی ہوگا، الگ ہونے والا بھائی صرف اجرت مثل کا مستحق ہے۔

وإن احتطب أحدهما وأعانه الآخر للمعين أجر مثل عمله. (بزازية، كتاب الشركة، زكريا جديد ٣/ ١١٧، وعلى هامش الهندية ٦/ ٣٢٧)

فإن احتطب أو احتش أحدهما وأعانه الآخر في جمعه، فالمجموع كله للذي احتطب، وللآخر أجر مثله عندهم جميعا. (الفتاوى التاتارخانية، زكريا ٧/ ٥٠٣، رقم: ١١٠٠١)

فإن احتطب أحدهما وأعانه الآخر بأن قلع أحدهما وجمع الآخر، أو قلع أحدهما وجمع وحمل الآخر كان المجموع للذي احتطب لما قبل الشركة وللمعين أجر المثل. (الفتاوى الولوالجية، دارالأيمان سهارنپور ٣/ ٤٨، سراجية، مكتبة إتحاد ١/ ٣٧٠)

وما حصله أحدهما بإعانة صاحبه فله ولصاحبه أجر مثله. (الدر مع الرد، كتاب الشركة، زكريا ٦/ ٥٠٢، كراچی ٤/ ٣٢٥، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٥/ ١٥٧)

الأب والابن يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيء، فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله؛ لكونه معينا له. (شامی، كتاب

الشركة، مطلب أجتمعا في دار واحدة ...... زكريا ٦/ ٥٠٢، كراچی ٤/ ٣٢٥، هندية، زكريا قديم ٢/ ٣٢٩، جديد ٢/ ٣٣٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۱۴۳۴/۱۲/۲۸ھ

(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۴۴/۱۱۳۴)

بونس کا استعمال کرنا کیسا ہے؟

سوال [۹۵۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: صابر ایک سرکاری نوکر ہے، سال میں ایک بار اس کو بونس (انعام) کا پیسہ ملتا ہے، وہ اس پیسے کو اپنے خرچ میں استعمال کرسکتا ہے یا نہیں؟ بونس کی یہ رقم سال کے آخر میں ملازم کو بطور انعام دی جاتی ہے، جوکہ ماہانہ تنخواہ سے الگ ہوتی ہے، نیز یہ رقم حسن کارکردگی کی بنا پر ملازم کو ملتی ہے۔

المستفتی: ماسٹر محمد انیس سیوہارہ، محلّہ اسلام نگر، ضلع بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حسن کارکردگی کی بنا پر جو بونس بطور انعام ملتا ہے، اس کے لینے میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے؛ اس لئے اپنے خرچ میں استعمال کرنا شرعاً جائز ہے۔

(مستفاد: فتاوی احیاء العلوم ۱/ ۳۳۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۱۶/ شعبان ۱۴۰۹ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/۷۷/۱۳۷۷)

ملازم فسادات کے دوران کی تنخواہ کا مستحق ہے یا نہیں؟

سوال [۹۵۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: زید نے بکر کے مدرسہ میں چالیس سال خدمت کی اور بہت کم قلیل تنخواہ میں کام کرتا رہا، یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے تنخواہ ۱۹۸۰ء میں مبلغ: ۸۰/روپیہ ماہوار تھی، اس وقت تک زید کی صحت بھی اچھی تھی اور ٹیوشن وغیرہ بھی پڑھاتا تھا، اس طرح گذارا ہوجاتا تھا۔ اگست ۱۹۸۰ء میں کرفیو لگا، طلبہ جو عید الفطر پر اپنے گھر گئے ہوئے تھے واپس مدرسہ میں نہیں لوٹے؛ کیوں کہ مدرسہ ہندوؤں کے محلّہ میں واقع ہے، بچوں کے نہ ہونے کی وجہ سے مدرسہ بند ہوگیا، بکر نے یہ کہہ کر کہ اب مدرسہ میں بچے نہیں ہیں، زید کی تنخواہ بند کردی؛ لیکن زید ۱۹۸۰ء سے اب تک برابر مدرسہ کی دیکھ بھال وکرایہ کی وصولیابی کا کام کرتا رہا ہے ۱۹۸۱ء سے زید برابر بیمار چل رہا ہے، طعام کی بھی پریشانی ہے، مدرسہ کو خالی کرانے کی تنبیہ کی جارہی ہے، اور زید کو ہر طرح سے پریشان کیا جارہا ہے، زید کے یہاں کوئی جگہ رہنے کی نہیں ہے اور نہ ہی اتنا روپیہ ہے کہ انتظام کیا جاسکے، اس لئے زید نے بکر سے کہا کہ میری سن ۱۹۸۰ء سے روکی گئی تنخواہ کا حساب لگا کر میرا حساب صاف کردیا جائے، برائے کرم یہ ارشاد فرمادیا جائے کہ زید کو یہ روکی گئی تنخواہ لینا بکر سے شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: حافظ عبدالمجید خان مدرسہ سعیدیہ منڈی بانس، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہاں کا عرف بھی ہے کہ اگر کسی وجہ سے مدرسہ کچھ عرصہ تک بند ہوجائے اور مدرسین وملازمین استعفیٰ نہ دیں یا ان کو معزول نہ کیا جائے؛ بلکہ اپنے آپ کو مدرسہ کی خدمت کے لئے سپرد کئے رکھیں تو وہ لوگ تنخواہ کے حق دار ہیں، جیسا کہ ۱۹۸۰ء کے فساد کے موقع پر دو تین ماہ تک مرادآباد کے بڑے بڑے مدرسہ بندر ہے، مدرسہ جامعہ قاسمیہ شاہی، مدرسہ امدادیہ، جامع الہدیٰ وغیرہ بندرہے؛ لیکن مدرسین وملازمین کو تنخواہ بھی ملتی رہی، اسی طرح اگر سوال نامہ میں درج شدہ زید کی طرف سے کوئی تعدی نہیں ہوئی اور اس نے مسلسل مدرسہ کے لئے اپنے آپ کو پیش کررکھا ہے، نہ اس نے استعفیٰ دیا اور نہ اس کو معزول کیا گیا ہے، تو وہ روکی گئی تنخواہوں کا حق دار ہے۔ (مستفاد: امدادالفتاویٰ ۳/۳۴۹)

الثابت بالعرف كالثابت بالنص. (عقود رسم المفتي قديم/ ٣٨، قواعد الفقه أشرفي ديوبند / ٧٤، رسائل ابن عابدين، ثاقب بك ڈپو ديو بند / ٤٤)

وقول الفقهاء: المعروف كالمشروط. (عقود رسم المفتي/ ٩٤)

المعروف بالعرف كالمشروط شرطا الخ. (قواعد الفقه، اشرفی دیو بند/ ١٢٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم رجب المرجب ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۸۰ ۷)

کرفیو کے دوران بند مدرسوں اور کارخانوں کے ملازموں کی تنخواہ

سوال [۹۵۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گذشتہ دنوں دہلی، میرٹھ فساد کے دوران کرفیو نافذ ہونے کی وجہ سے علاقے میں کاروبار، کارخانے، اسکول و دینی مدارس بند رہے، کچھ ارباب مدرسہ اور کارخانے داروں نے اپنے ان ملازمین اور اساتذہ کی ان ایام کی تنخواہ وضع کرلی ہے، جو کئی سال سے ان میں کام کرتے ہیں، ان دنوں کی کوئی رخصت اور غیر حاضری بھی نہیں ہے اور نہ ہی شہر چھوڑ کر کہیں باہر گئے اور نہ کسی اور جگہ کام کیا؛ بلکہ اپنے آپ کو کارخانہ اور مدرسہ کے سپرد کئے رکھا، جب کہ تقرری کے وقت کوئی ایسا معاہدہ بھی نہیں ہے، شریعت مطہرہ کی روشنی میں مدلل ومفصل جواب مرحمت فرمایا جائے کہ یہ کٹوتی جائز ہے یا ناجائز؟

المستفتی: محبوب حسین، فراش دہلی ۶

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب ملازمین ومدرسین کی طرف سے کوئی تعدی نہیں ہوئی ہے، تو عرف کے مطابق وہ لوگ تنخواہ کے مستحق ہیں، مرادآباد میں ۱۹۸۰ء کے فساد کے موقع پر

دو تین مہینے تک مرادآباد کے بڑے بڑے مدارس بندرہے، مثلاً جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی، مدرسہ امدادیہ، مدرسہ جامع الہدیٰ وغیرہ بندرہے؛ لیکن ملازمین ومدرسین کی تنخواہیں وضع نہیں کی گئیں، برابر تنخواہ دی گئی، نیز ”امدادالفتاوی ۳/ ۳۴۹“ سے بھی یہی مستفادہوتا ہے۔

الثابت بالعرف كالثابت بالنص. (عقود رسم المفتي قديم/ ۳۸، قواعد الفقه أشرفي ديوبند / ٧٤، رسائل ابن عابدين، ثاقب بك ڈپو ديو بند / ٤٤)

وقول الفقهاء: المعروف كالمشروط. (عقود رسم المفتي/ ٩٤)

المعروف بالعرف كالمشروط شرطا الخ. (قواعد الفقه، اشرفى ديو بند/ ١٢٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیراحمدقاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر:۲۳/ ۶۱۱)

سرکاری ملازمت جائز ہے یا ناجائز؟

سوال [۹۵۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہندوستان کا نظام حکومت باطل نظام ہے، اس میں سرکاری ملازمت کرنا ایک مسلمان مرداورعورت کے لئے جائز ہے یانہیں؟ اگر جائز ہےتو کس طرح اور ناجائز تو کس طرح؟ وضاحت کے ساتھ تحریرفرمائیں۔

المستفتی: فاقر بیگ راج دوارہ، رامپور

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہندوستان کے نظام حکومت کو یکسر باطل کہنا درست نہیں ہے؛ بلکہ نظام حکومت میں بہت سے قوانین وضابطے جائز اور درست ہیں، مثلاً حکومت کا ایک نظام ہے ٹرین جس کے مختلف درجات ہیں اور ہرایک کے لئے الگ الگ ٹکٹ کا نظام ہے، تو نظام حکومت کے ماتحت رہ کر ٹکٹ خرید کر ان ٹرینوں میں سفر کرنا جائز اور درست ہے

اوراس کے خلاف کرنا شریعت میں بھی جائز نہیں ہے، اسی طرح نظام حکومت میں اسکولوں اوریونیورسٹیوں میں شعبہ جات ہیں، جس میں نظام حکومت کے تحت رہ کرملازمت کرنا جائز ہے، اسے ناجائز نہیں کہا جاسکتا، اسی طرح ہسپتالوں کے نظام ہیں کہ نظام حکومت کے تحت وہاں بھی ملازمت کرنا جائز ہے اوراس کی تنخواہ بھی جائز ہے؛ اس لئے تمام نظام حکومت کو باطل کہنا درست نہیں ہے۔اوراگراس طرح کی ملازمت کوئی مسلمان حاصل کرتا ہے، پھراپنی ذمہ داری ادا کرنے کے ساتھ تنخواہ وصول کرتا ہے، تواس میں کوئی قباحت نہیں ہے، ہاں البتہ کوئی ملازم ملازمت کے ساتھ ساتھ رشوت وصول کرتا ہے، تو وہ اس کا اپنا فعل ہے اور رشوت لینا حکومت کا نظام نہیں ہے؛ لہٰذا حکومت کی جائز ملازمت حاصل کرکے اس سے تنخواہ حاصل کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے، ہاں اگرکسی شعبہ کا نظام شرعی نقطہ نظر سے ناجائز اور باطل ہے، تومسلمانوں کوایسے شعبہ میں ملازمت حاصل کرنا جائز نہیں ہے، آپ نے سوال نامہ میں کوئی ایسا شعبہ متعین نہیں فرمایا ہے؛ اس لئے ہم اپنی طرف سے کسی شعبہ کی تعیین نہیں کریں گے۔(مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۲۷۰/۶، ڈابھیل ۵۶۹/۱۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ رمحرم الحرام ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۶۷۰/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۲/۲ھ

سرکاری مدرس کا عذر کی بناپرلڑکے کونائب بنانا

سوال [۹۵۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے والد صاحب سرکاری مدرسہ میں تدریس کی خدمت کررہے ہیں اوراس میں مختلف کتابیں پڑھاتے ہیں، بعض دفعہ والد کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے یا کسی اور مجبوری کی بناپر وہ اپنے لڑکے زید کو پڑھانے بھیج دیتے ہیں، توزید کے جانے سے سبق بھی مکمل ہوجاتا ہے اور حاضری بھی ہوجاتی ہے، توایسی صورت میں زید کے والد کو مکمل مہینہ کی

تنخواہ لینا اور زید کا پڑھانا صحیح ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبداللہ مدھوبنی، متعلم مدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر سرکاری ملازمین کو اس بات کی اجازت ہے کہ طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے یا کسی عذر کی وجہ سے ذمہ داری ادا کرنے سے قاصر ہونے کی صورت میں اپنا بدل پیش کیا جائے، تو ایسی صورت میں زید کے لئے باپ کی جگہ جا کر ذمہ داری ادا کرنا اور باپ کے لئے ماہانہ تنخواہ حاصل کرنا جائز اور درست ہے۔

الخليفة إذا أذن للقاضي في الاستخلاف، فاستخلف رجلا وأذن له في الاستخلاف جاز له الاستخلاف. (شامي، كتاب القضاء، مطلب في استخلاف القاضي نائبا عنه، زكريا ٨/ ٧٥-٧٦، كراچی ٥/ ٣٩١-٣٩٢، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٢٣٥، مصري قديم ٢/ ١٦٨، البحرالرائق، كوئٹه ٧/ ٦، زكريا ٧/ ١١)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ ؍ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۷۹۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/۴/۱۴۲۶ھ

ریلوے میں ملازم باپ کی جگہ متبنیٰ کی نوکری کا حکم

سوال [۹۵۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: شیخ شفیع کا لاولد انتقال ہوگیا، ریلوے ملازم تھے، ان کا ایک لے پالک لڑکا شیخ عاقب ہے، ریلوے ڈپارٹمنٹ اگر مرحوم کی جگہ لے پالک کو ریلوے میں نوکری دے دے تو کیا یہ اسلامی قانون میں منع ہے؟

المستفتی: زوجہ شفیع رئیسہ بی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر ریلوے سرکاری شفیع مرحوم کی جگہ پر اس کے لے پالک کو ملازمت دے دے تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، چونکہ سرکار لے پالک کو بھی مرحوم کے پسماندگان شمار کرتی ہے، اور اس کو بھی پسماندگان میں ہونے کی وجہ سے ملازمت دینے کے کالم میں رکھا ہے؛ اس لئے اس کے لئے ملازمت قبول کرنا اور اپنی ذمہ داری ادا کر کے تنخواہ وصول کرنا جائز اور درست ہے؛ لیکن اس کی وجہ سے لے پالک مرحوم کا شرعی وارث نہیں بنے گا۔

قال العلامة الحصكفي –رحمه الله– : كل أنواع الكسب في الإباحة سواء قال الشافعي تحته: أقول: فالمراد من قولهم: كل أنواع الكسب في الإباحة سواء أنها بعد إن لم تكن بطريق محظور لا يذم بعضها، وإن كان بعضها أفضل من بعض. (شامي، كتاب الصيد، كراچی ٦/ ٤٦٢، زكريا ١٠/ ٤٦، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٨٤، تاتارخانية، زكريا ١٨/ ١٥٦، رقم: ٢٨٣٣٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم صفر المظفر ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۸۷۲/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۲/۱ھ

ڈاکخانہ سے روپئے لاکر لوگوں کو دینے کی اجرت لینا

سوال [۹۵۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک گاؤں کا رہنے والا ہے، جہاں ڈاکیہ گھر گھر روپیہ پہنچاتا نہیں اور اگر پہنچاتا بھی ہے تو تاخیر سے؛ لہٰذا اس گاؤں میں ایک شخص ایسا ہے جو باہر سے ڈاک سے آئے ہوئے روپئے جاکر ڈاکخانہ سے لے آتا ہے، اور اس میں سے اپنے لئے فیصد ۱۵/ روپئے لیتا ہے اور لوگ بھی دیتے ہیں؛ اس لئے کہ ان کو روپئے جلد مل جاتے ہیں، تو کیا ان کا یہ روپیہ لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: ماسٹر منصور عالم، کشن گنج (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو شخص ڈاکخانہ سے بذریعہ ڈاک آئے ہوئے روپئے لاتا ہے، اگر وہ باتنخواہ ملازم نہیں ہے؛ بلکہ لوگوں نے اس طرح فیس کے ذریعہ اس کی اجرت متعین کی ہے، تو ایسے روپئے اس کے لئے جائز ہیں۔ اور اگر سرکار کی طرف سے باتنخواہ ملازم ہے تو لینا جائز نہیں ہے۔

إذا دفع الرشوة يسوي أمره عند السلطان حل للدافع، ولا يحل للآخذ أن يأخذه، فإن أراد أن يحل للآخذ يستأجر الآخذ يوما إلى الليل بما يريد أن يدفع إليه، فإنه تصح هذه الإجارة. (البحر الرائق، كتاب القضاء، زكريا ٦/ ٤٤١، كوئٹہ ٦/ ٢٦٢، رد المحتار، مطلب في الكلام على الرشوة، زكريا ٨/ ٣٥، كراچی ٥/ ٣٦٢، تاتارخانية، زكريا ١١/ ٧٧، رقم: ١٥٥٠٨) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷ رمحرم الحرام ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۹۷۲)

خلاف شرع کام ہونے والے ہوٹل کی ملازمت کا حکم

سوال [۹۵۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ذرائع مواصلات کی ترقی، سیاحت کے رجحانات میں اضافہ اور مسافر کی ضرورت کے لحاظ سے ''ہوٹل'' موجودہ سماج کی ضرورت بن گئے ہیں، اور یہ اس وقت ایک نفع بخش تجارت بھی ہے۔ ہوٹلوں کا بنیادی مقصد تو معاوضہ لے کر قیام وطعام کی سہولیات فراہم کرنا ہے؛ لیکن بڑے ہوٹلوں میں بہت سی ایسی چیزیں بھی شامل ہوتی ہیں جو شرعاً جائز نہیں ہیں، مثلاً شراب کی فراہمی، خنزیر اور حرام غذا کا انتظام، رقص موسیقی کی سہولت وغیرہ، اسی طرح پردہ کی رعایت کئے بغیر سوئمنگ پل تو کیا ایسے ہوٹلوں میں ملازمت اختیار کرنا جائز ہوگا؟ جب کہ حرام چیزوں کی

فراہمی سے اس کا براہ راست تعلق ہو یا براہ راست اس سے تعلق نہ ہو؟

المستفتی: محمد قمر عالم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسافروں کے ٹھہرنے کے لئے ہوٹلوں کا قائم کرنا اور کرایہ پر ہوٹلوں کا چلانا فی نفسہٖ جائز و درست ہے؛ لیکن ان ہوٹلوں میں شراب، خنزیر، حرام غذا کا انتظام اور رقص وموسیقی وغیرہ فواحش وناجائز چیزوں کا انتظام کرنا حرام اور گناہ کبیرہ ہونے کے ساتھ ساتھ جو لوگ ان حرام کاریوں میں اور حرام عمل میں شریک ہوں گے، ان کو جتنا گناہ ہوگا انہیں کے برابر گناہ اس کا انتظام کرنے والوں کے سر بھی ہوگا۔ ایسے ہوٹلوں میں ملازمت کی صورت میں ان حرام امور میں سے کسی میں ملوث ہونا پڑتا ہو یا ان کا انتظام کرنا پڑتا ہو، تو ایسی ملازمت شرعی طور پر جائز نہیں، ایسے ہوٹلوں میں ملازمت اختیار کرنے سے مسلمانوں کو اپنے آپ کی حفاظت کرنا لازم ہے۔

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّیْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ. [المائدة: ۹۰]

حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِیْرِ. [المائدة: ۳]

عن أنس بن مالک –رضي الله عنه– قال: لعن رسول الله ﷺ في خمر عشرة: عاصرها، ومعتصرها، وشاربها، وحاملها، ومحمولة إلیه، وساقیها، وبائعها، وآکل ثمنها، والمشتری لها، والمشتراة له. (ترمذي، أبواب البیوع، باب ماجاء في بیع الخمر والنهي عن ذلك، النسخة الهندیة ۱/ ۲۴۲، دارالسلام، رقم: ۱۲۹۵)

ولا تصح الإجارة لعسب التیس ولا لأجل المعاصي مثل الغناء، والنوح، والملاهي. (شامي، کتاب الإجارة، بالإجارة الفاسدة، مطلب في الاستیجار

علی المعاصي، کراچی ٦/ ٥٥، زکریا ٩/ ٧٥)

وقال أبو حنيفة –رحمه الله– : لا تجوز الإجارة على شيء من اللهو، والمزامير، والطبل وغيره؛ لأنها معصية، والإجارة على المعصية باطلة.
(تاتارخانية ١٥/ ١٣٢، رقم: ٢٢٤٣٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۴/۳۰ھ

کیمروں کے مرمت کی اجرت کا حکم

سوال [۹۵۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کیمرہ میکینک ہے اور تقریباً اڑتالیس سال سے کیمروں کی مرمت کرتا ہے، تو کیا یہ کام درست ہے یا نہیں؟ واضح رہے کہ اب اس جدید دور میں کیمروں میں یہ فرق ہوگیا ہے کہ پرانے کیمروں میں ریل اور فلم ڈالی جاتی تھی، پھر فوٹو کھینچا جاتا تھا، اس کے بعد اس کو دھو کر تصویر بنتی تھی؛ لیکن اب ڈیجیٹل کیمرے آگئے ہیں، جن میں فلم نہیں ہوتی؛ بلکہ یہ عکس کو الیکٹرونک طریقہ سے جذب کرتے ہیں اور کیمرہ پروسیس (محفوظ) کرکے آپ کو اسکرین پر تصویر دکھاتا ہے، آج جیسا کہ تصویر اور فوٹو کی ضرورت سے مطلقاً انکار نہیں کیا جاسکتا؛ کیوں کہ موقع بموقع فوٹو کی شدید ضرورت پیش آتی ہے، مثلاً سرکاری آفسوں میں ملازمتوں، بینکوں، مدارس اور کالج کے فارموں میں شناختی کارڈ اور حج کی درخواستوں میں وغیرہ وغیرہ اسی طریقہ سے پریس اور میڈیا والے حادثے کی تصویر کو بطور ثبوت پیش کرتے ہیں، نیز ڈاکٹر حضرات بھی زخموں کے علاج میں نیز دیگر بیماریوں مثلاً دانتوں اور آنکھوں کے علاج میں اور پیٹ کے اندرونی علاج میں بھی کیمروں کا استعمال کرتے ہیں، اسی طریقہ سے ریلوے اسٹیشنوں اور ہوائی اڈوں پر لوگوں کی نقل وحرکت پر نظر رکھنے کے لئے بھی

کیمروں کا استعمال ہوتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ R.N.D جو حکومت کا ایک حساس ادارہ ہے، جو نہ صرف عوام بلکہ پورے ملک کی حفاظت کے لئے کام کرتا ہے، اس میں بھی کیمروں کی ضرورت پڑتی ہے، اور اس شعبہ کے کیمروں کی مرمت کا کام بھی زید کے سپرد ہے۔ اب ایسی صورت حال اور ایسے مواقع کہ جن میں فوٹو کی شدید ضرورت پڑتی ہے اور شرعاً ایسے مواقع میں فوٹو کی اجازت بھی ہے، تو کیا ان حالات میں زید کے لئے کیمروں کی مرمت کرنا درست ہوگا یا نہیں؟ نیز زید کے لئے کیمروں کی مرمت پر حاصل ہونے والی اجرت اور کمائی حلال ہوگی یا نہیں؟ واضح رہے کہ زید صرف کیمروں کی مرمت کرتا ہے، فوٹو گرافری اور فوٹو سازی وغیرہ کا کام نہیں کرتا ہے، آپ سے درخواست ہے کہ اصول شرع کی روشنی میں مفصل جواب تحریر فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

المستفتی: شیخ محمد غوث کیمرہ ٹیکنیشن ایم جی روڈ ونڈر لینڈ، پونہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کیمرہ چونکہ فحش اور ذی روح کی تصاویر ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے؛ بلکہ اس کے ذریعہ بہت سے جائز اور مباح کام بھی انجام پاتے ہیں، نیز انسانی تصاویر شدید ضرورت کی وجہ سے کھنچوانے کی اجازت ہے؛ لہٰذا اگر غلط اور فحش فوٹو کھنچوائے جائیں اور اسی طرح کیمرہ اسکرین پر فحش فوٹو کھینچا جائے تو یہ گناہ عظیم ہے۔ اور اگر فحش اور غلط چیزوں سے گریز کر کے جائز چیزوں کی تصویر کھینچی جاتی ہے، تو یہ جائز ہے؛ اس لئے نفس کیمرہ کی مرمت جائز اور درست ہے اور اس کو ناجائز استعمال کرنے والے کے لئے ناجائز اور جائز استعمال کرنے والے کے لئے جائز اور درست ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ جدید ڈابھیل ۱۷/۱۱۰، کتاب الفتاوی ۵/۳۹۱)

الأمور بمقاصدها. (الأشباہ والنظائر، قدیم: ص: ۵۳)

إن ما تقوم المعصية بعينه ما توجد فيه على وصفه الموجود حالة البيع. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ۶/ ۳۹۱، زكريا ۹/ ۵۶۱)

وقال الشامي: الإجارة على الحمل وهو ليس بمعصية، ولا سبب لها، وإنما تحصل المعصية بفعل فاعل مختار. (شامي، زكريا ۹/ ۵٦۲، كراچی ٦/ ۳۹۲)

يجب الأجر بمجرد التسليم ولا معصية فيه، وإنما المعصية بفعل المستأجر وهو مختار، فينقطع نسبته عنه. (شامي، زكريا ۹/ ۵٦۲، كراچی ٦/ ۳۹۲، الموسوعة الفقهية ۹/ ۲۱۳، هداية، أشرفي ديوبند ٤/ ٤۷۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍ جمادی الثانیہ ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۴۴۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۶/۲۶ھ

جعلی سرٹیفکٹ کے ذریعہ نوکری کرنا

سوال [۹٦۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ہمارے آسام میں امسال بہت سے مدارس کی تنخواہ کا ذمہ خود سرکار نے لیا ہے، جن مدرسوں میں تنخواہ بھی زیادہ ہے اور ہمارے یہاں زیادہ تر علماء مالی اعتبار سے بہت کمزور ہیں؛ لہٰذا بہت سے علماء نے جو کہ آزاد مدارس کے تعلیم یافتہ ہیں، ان کے پاس سرکاری مدارس کا سرٹیفکٹ نہیں ہے، یعنی ایم ایم یا ایف ایم کا، مجبوراً روپیہ دے کر ایک سرٹیفکٹ حاصل کر کے سرکاری مدرسہ دینی کام انجام دے رہا ہے، تو جو سرٹیفکٹ روپیہ سے حاصل کیا ہے، اس کے ذریعہ سے ایم ایم سرکاری ادارہ میں امتحان دے کر بطریق اعلیٰ پاس کیا اور سرکاری مدارس میں دینی کام انجام دینے کا موقع ملا ہے اور اب جو تنخواہ علی الاجرت مل رہی ہے یہ لینا درست ہے یا نہیں؟

(۲) سرکاری مدرسہ واسکول میں نوکری کرنا عند اللہ کیسا ہے؟

(۳) اولاً مدرسہ پبلک کا تھا؛ لیکن مجبوراً اب سرکار کو دے دیا، اب قدیم اساتذہ اپنے عہدے قائم رکھنے کے لئے روپیہ پیسے دے کر سرٹیفکٹ حاصل کر کے اس مدرسہ میں دینی کام

انجام دے رہے ہیں۔

(۴) بہت سے مدارس میں پوسٹ خالی ہے، مثلاً فن حدیث، تفسیر، ادب وغیرہ؛ لیکن سرٹیفکٹ نہیں ہے، تو ایک سرٹیفکٹ روپیہ سے حاصل کر کے اس کے ذریعہ امتحان دے کر کامیاب ہو گیا اور دینی کام میں لگ جائے تو اس کی اجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟

(۵) آزاد مدرسہ میں کچھ پڑھا یعنی عالیہ پنجم تک اور کسی دوسرے آدمی سے امتحان دلوا کر اپنے نام کا سرٹیفکٹ حاصل کیا اور پھر اسکول یا مدرسہ میں تعلیم دے رہا ہے، عندالشرع کیسا ہے؟

المستفتی: معین الدین پٹی جامع مسجد، پوسٹ ناظرہ، ضلع سیب ساگر، آسام

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) صورت مسئولہ میں چونکہ آپ کو جو تنخواہ بطور اجرت مل رہی ہے، وہ آپ کی محنت کی مزدوری ہے؛ اس لئے فی نفسہٖ تنخواہ جائز ہوگی اور انشاء اللہ اس سلسلے میں کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا؛ البتہ سرکاری مدرسہ میں دینی کام انجام دینے کے لئے جعلی سرٹیفکٹ خریدنا یا خریدے ہوئے سرٹیفکٹ سے ایم ایم کی ڈگری حاصل کرنا یہ ایک قسم کا دھوکہ ہے، شرعاً یہ فعل درست نہیں، بہتر یہ ہے کہ کوئی ایسی صورت معاش اختیار کی جائے جس میں کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۴/ ۱۴۷، جدید ڈابھیل ۱۸/ ۴۷۷)

(۲) سرکاری مدرسہ اور اسکول میں نوکری کرنا اگر شریعت کے حدود کے دائرہ میں رہ کر ہو، مثلاً رشوت وغیرہ نہ دینی پڑے تو عندالشرع درست ہے۔

(۳) قدیم اساتذہ ہوں یا جدید اساتذہ، ہر ایک کو دینی خدمت انجام دینا اسلامی فریضہ ہے، مگر عہدہ سابقہ باقی رکھنے کے لئے جعلی سرٹیفکٹ حاصل کرنا یہ مکروہ دھوکہ ہے، جس کی شرعاً اجازت نہیں۔ (محمودیہ قدیم ۱۴/ ۱۴۷، جدید ڈابھیل ۱۸/ ۴۷۷)

(۴) صورت مذکورہ میں بھی تنخواہ لینا جائز ہوگا؛ البتہ جعلی سرٹیکفٹ خرید کر دینی مدارس میں درس وتدریس کا کام انجام دینا گورنمنٹ کو دھوکہ دینا ہے؛ اس لئے اس کی اجازت قطعاً نہ ہوگی۔ (محمودیہ قدیم ۱۴/ ۱۴۷، جدید ڈابھیل ۱۸/ ۴۷۷)

(۵) اس صورت میں بھی جعلی سرٹیفکٹ حاصل کر کے گورنمنٹ کودھوکہ دینا ہے؛ لہٰذا یہ جائز نہ ہوگا۔ (محمودیہ قدیم ۱۴/ ۱۴۷، جدید ڈابھیل ۱۸/ ۴۷۷)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– أن رسول الله ﷺ قال: من حمل علينا السلاح فليس منا، ومن غشنا فليس منا. (صحيح مسلم، كتاب الإيمان باب من غشنا فليس منا، النسخة الهندية ١/ ٧٠، بيت الأفكار رقم: ١٠١)

عن عبدالله –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: طلب كسب الحلال فريضة بعد الفريضة. (السنن الكبرى للبيهقي، دارالفكر بيروت ٩/ ٥٦، رقم: ١١٩٠٧، شعب الإيمان للبيهقي، دارالكتب العلمية بيروت ٦/ ٤٢٠، رقم: ٨٧٤١)

والأجرة إنما تكون في مقابلة العمل. (شامي، كتاب النكاح، باب المهر، كراچی ٣/ ١٥٦، زكريا ٤/ ٣٠٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ رجب ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۰۱۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۴؍ ۷؍ ۱۴۱۵ھ

جھوٹ اور جعلی سرٹیفکٹ کے ذریعہ نوکری حاصل کرنا

سوال [۹۶۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص مثلاً زید پانچویں کلاس تک پڑھا، اس کے بعد اسکول کی تعلیم چھوڑ کر دوسرے مشاغل میں لگ گیا، چند سال کے بعد ایک جعلی سرٹیفکٹ دسویں کلاس کا سرکاری ڈپارٹمنٹ کے سامنے پیش کر کے گورنمنٹ کا ملازم ہوگیا، جو نوکری انہوں نے حاصل کی ہے، وہ دسویں کلاس کے نیچے درجے کے لوگوں کو ملنی قانوناً جائز نہیں ہے، اس صورت میں واقعہ میں ایک طرف تو سرکاری قانون کی خلاف ورزی ہے، دوسری طرف جھوٹ اور فریب ہے، تیسری طرف ایک لائق شخص کا حق جس نے باقاعدہ پڑھائی کر کے باقاعدہ امتحانات دے کر دسویں

کلاس کا سرٹیفکٹ حاصل کیا ہے، سلب ہورہا ہے، اب دریافت یہ امر ہے کہ اس طرح سے نوکری حاصل کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: احقر ابوالکلام، محمد عبدالرشید

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید نے جھوٹ بول کر اور جعلی سرٹیفکٹ داخل کر کے جو نوکری حاصل کی ہے، اس سے ملنے والی تنخواہ تو حلال ہے؛ کیوں اس کی محنت اور ڈیوٹی کا عوض ہے، مگر جھوٹ بولنا اور خلاف قانون نوکری حاصل کرنا، دھوکہ اور فریب ہے، اس کا گناہ اس پر الگ سے ہوگا، رہی بات غیر کے حق کا سلب ہونا تو یہ ایک امر متردد فیہ ہے؛ کیوں کہ اس ڈگری کے حامل ہزاروں کی تعداد میں لوگ ملازمت کے امیدوار ہوتے ہیں؛ لیکن ملازمت کے فیصلہ سے پہلے اس پر کسی کا استحقاق نہیں ہوتا؛ اس لئے کسی کا حق مارا نہیں گیا۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– أن رسول الله ﷺ قال: من حمل علينا السلاح فليس منا، ومن غشنا فليس منا. (صحيح مسلم، كتاب الإيمان باب من غشنا فليس منا، النسخة الهندية ۱/ ۷۰، بيت الأفكار رقم: ۱۰۱)

والأجرة إنما تكون في مقابلة العمل. (شامي، كتاب النكاح، باب المهر، كراچی ۳/ ۱۵٦، زكريا ٤/ ۳۰۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸ محرم الحرام ۱۴۲٦ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸٦۵۰)

ٹھیکیدار کے پاس بچے ہوئے پیسے کے استعمال کا حکم

سوال [۹٦۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص سرکار سے رقم لے کر روڈ وغیرہ کی ٹھیکیداری کا کام کرتا ہے، اس کام کے لئے

مثلاً ایک لاکھ روپئے سرکار دیتی ہے اور کام میں صرف پچھتر ہزار روپئے خرچ ہوتے ہیں اور پچیس ہزار روپئے بچ جاتے ہیں، تو آیا ان پچیس ہزار روپئے کا سرکار کی اجازت کے بغیر ٹھیکیدار کے لئے استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ ٹھیکیدار کو اس کام میں محنت ومشقت بھی کرنی پڑتی ہے، تو کیا بچی ہوئی رقم اس کی محنت ومزدوری شمار ہوگی یا نہیں؟

(۲) اور اگر اس کے لئے وہ رقم استعمال کرنا جائز ہے، تو کیا اسے خود استعمال کرے یا غرباء وغیرہ میں تقسیم کردے؟ جواب باصواب سے نوازیں۔

المستفتی: حافظ طاہر حسین اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۲) ٹھیکیداری پر کام کرنے کی دو شکلیں ہیں: (۱) اگر ٹھیکیداری پر کام کرنے والا اجرت پر کام کررہا ہے، تو ایسی صورت میں ٹھیکیدار کو کام کرنے کے لئے جو رقم دی گئی ہے، کام کے مکمل ہونے کے بعد اگر اس رقم میں سے کچھ رقم بچ جائے تو یہ بچی ہوئی رقم اس کے پاس بطور امانت ہوگی، سرکار کی اجازت کے بغیر اس کو اپنے کسی بھی ذاتی مصرف میں استعمال کرنا جائز نہ ہوگا، تصرف کرنے کی صورت میں شرعاً فاسق اور گنہگار شمار ہوگا۔

(۲) اگر ٹھیکیدار اجرت پر کام نہیں کررہا ہے؛ بلکہ مطلقاً ٹھیکہ پر کام لے رکھا ہے،، مثلاً سرکار سے یہ کہا کہ میں اس کام کے لئے ایک لاکھ روپئے لوں گا، تو ایسی صورت میں کام مکمل کرانے کے بعد جو رقم بچ جائے وہ ٹھیکیدار کا حق ہے، سرکار کی اجازت کے بغیر کسی بھی ذاتی مصرف میں اس کا استعمال کرنا جائز اور درست ہے، یہ بچی ہوئی رقم سرکار کی شمار نہیں ہوگی۔

وإن أطلق العمل له فله أن يستأجر من يعمله؛ لأن المستحق العمل، ويمكن إيفاءه بنفسه وبالاستعانة بغيره بمنزلة إيفاء الدين. (هداية، كتاب الإجارة، باب الأجر متى يستحق، أشرفي ديوبند ٣/ ٢٩٧، بناية، قديم ٣/ ٦٣٤، أشرفيه ديوبند ١٠/ ٢٤٤، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ١/ ٣٣٠، دارالكتاب ديوبند ١/ ٣٢٠، فتح

القدیر، دارالفکر بیروت ۹/ ۷۸، زکریا ۹/ ۷۸، کوئٹه ۸/ ۲۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶ رجمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۷۰۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۶/۱۶ھ

لڑکیوں کے لئے ہاف آستین اور چست کپڑے سل کر دینا

سوال [۹۶۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عورتوں اور لڑکیوں کے ہاف آستین کے کپڑے یا بالکل چست کپڑے یا فلمی اسٹائل کے کپڑے سل کر دینا کیسا ہے؟ خواہ اپنے گھر کے لئے ہو، خواہ سلائی کے واسطے دوسروں کے لئے ہو، جس کی سلائی ملتی ہو سلائی کی رقم میں کراہت ہوگی یا حرمت؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورتوں کے لئے ناقص لباس جوان کے واجبی پردہ کے دائرہ سے باہر ہوتے ہیں جائز نہیں ہے، جیسے ہاف آستین، اسی طرح بالکل چست لباس جس سے جسم کی بناوٹ نظر آ جائے پہننا جائز نہیں ہے۔ حدیث شریف میں اس پر سخت وعید آئی ہے؛ اس لئے ایسا لباس سینا بھی بہتر نہیں ہے؛ البتہ سلائی کی اجرت حق المحنت ہے؛ اس لئے حلال وجائز ہے۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: صنفان من أهل النار لم أرهما قوم معهم سياط كأذناب البقر يضربون بها الناس، ونساء كاسيات عاريات مميلات مائلات رؤسهن كاسمنة البخت المائلة لايدخلن الجنة ولا يجدن ريحها، وإن ريحها لتوجد من مسيرة كذا وكذا.

(مسلم شريف، كتاب اللباس والزينة، باب النساء الكاسيات العاريات، النسخة الهندية

۲/ ۲۰۵، بیت الأفکار، رقم: ۲۱۲۸، أنوار رسالت ۷۰۵، ۷۰٦)

أو خیاطا أمرہ أن یتخذ له ثوبا علی زي الفساق یکرہ له أن یفعل.

(شامي، کتاب الحظر والإباحة، فصل في البیع کراچی ٦/ ۳۹۲، زکریا ۹/ ٥٦۲، مجمع الأنهر، دارالکتب العلمیة بیروت ٤/ ۱۸۸، تبیین الحقائق، إمدادیه ملتان ٦/ ۲۹، زکریا ۷/ ٦٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۳۸)

عورتوں کے نیم عریاں لباس تیار کرنے والی کمپنی میں کام کرنا

سوال [۹٦۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک آدمی ایسی کمپنی میں کام کرتا ہے، جس میں عورتوں کے لئے نیم عریاں لباس تیار کئے جاتے ہیں (یعنی فیشن شوگارمنٹس) جو لباس مسلم انڈسٹری میں مسلم عورتیں استعمال کرتی ہیں، کیا ایسی کمپنی میں کام کرنا جائز ہے؟ جب کہ اس آدمی کی معیشت کا دارو مدار اسی کام پر ہے؟

المستفتی: حیدر علی ہگلی، بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شخص مذکور مذکورہ کمپنی میں کام کرکے جو پیسہ حاصل کرتا ہے وہ فی نفسہٖ حلال اور جائز ہے؛ کیوں کہ یہ اس کی محنت کا عوض ہے، نیز ایسا لباس عورتیں صرف اپنے شوہر کے ساتھ لیٹنے کے لئے استعمال کریں تو جائز ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ ان لباسوں کے استعمال کا جائز محل بھی ہے؛ اس لئے لباس بنانے والے گنہگار نہیں ہوں گے؛ بلکہ ان لباسوں کو پہن کر نیم عریاں حالت میں غیروں کے سامنے آنا ناجائز اور حرام ہے، جس

کا گناہ ان ہی عورتوں پر ہوگا۔

وإنما المعصية في صورة إتخاذ المعصية بفعل المستأجر وهو مختار فيه، فقطع نسبه ذلک الفعل عن الموجر. (فتح القدير، كتاب الكراهية، فصل في البيع، دارالفكر بيروت ١٠/ ٦١، كوئٹه ٨/ ٤٩٤-٤٩٥، زكريا ١٠/ ٧٣، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٩، زكريا ٧/ ٦٤، هداية، أشرفی ديوبند ٤/ ٤٧٢، البناية، اشرفيه ديوبند ١٠/ ٥٩، شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ٦/ ٣٩٢، زكريا ٩/ ٥٦٢، الموسوعة الفقهية الكويتية ٩/ ٢١٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍صفر ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۷۵۹)

درزی کے پاس بچے ہوئے کپڑا کا حکم

سوال [۹۶۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کسی درزی کے پاس کوئی گراہک کپڑا سلوانے کے لئے آیا اور کپڑا درزی کے پاس ڈالتے وقت گراہک نے کچھ نہیں کہا اور گراہک کا کپڑا درزی کے پاس بچ گیا، اس درزی نے اس بچے ہوئے کپڑے سے کسی شخص کو کپڑا سلوا دیا یا کسی شخص نے اس درزی سے وہ بچا ہوا کپڑا خرید لیا یا درزی نے کسی کو مفت میں دے دیا اور اس شخص نے کپڑا سلوا کر پہن لیا، تو کیا ایسے کپڑے کو پہن کر نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟ اور نماز ادا ہوگی یا نہیں؟

نوٹ:- درزی صاحب نے جس شخص کو کپڑا دیا تھا، اس سے یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کو اس کپڑے سے کیا مطلب چاہے، گراہک کا ہو یا میرا ہو؟ کیوں کہ اس کپڑے کو تو میں دے رہا ہوں، تو ایسی صورت میں کیا حکم ہے؟ نماز ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: محمد فاروق علی گڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: گراہک کا جو کپڑا درزی کے پاس بچ گیا ہے وہ درحقیقت گراہک ہی کا ہے، درزی کا اس کپڑے کوفروخت کرنا یا کسی کو دینا قطعاً جائز نہیں ہے؛ بلکہ مالک کو واپس کرنا لازم ہے؛ لہٰذا علم ہو جانے کے بعد کسی دوسرے شخص کو اس کپڑے کا خریدنا درست نہیں ہے اور اس میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ٣/٤٣٠)

لا يحل له الانتفاع بها حتى يؤدي بدلها. (هداية، كتاب الغصب، فصل فيما يتغير بفعل الغاصب، اشرفی دیوبند ٣/ ٣٧٦، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ١١/ ٩٥، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٥/ ٢٢٦، زكريا ٧/ ٣٢٣)

لا يجوز التصرف في مال غيره بلا إذنه، ولا ولايته. (درمختار مع الشامي، زكريا ٩/ ٢٩١، كراچی ٦/ ٢٠٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٧/ ذیقعدہ ١٤٢٥ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٧/ ٨٦٠٨)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٩/١١/١٤٢٥ھ

تین ماہ بعد رفو گر کا کپڑے کو بیچ کر اپنی اجرت وصول کرنا

سوال [٩٦٠٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک صاحب کپڑے پر رفو کا کام کرتے ہیں، وصولیابی کے لئے پرچی دی جاتی ہے، جس پر شرائط تحریر ہوتی ہیں، اس کے پڑھنے کی تاکید بھی ہوتی ہے، اس میں سے ایک شرط یہ ہے کہ گراہک تین مہینے کے اندر اندر کپڑا وصول کرلے، تین مہینے کے بعد رفو گر کی کوئی ذمہ داری نہ ہوگی، تو اس صورت میں تین مہینے کے بعد کیا رفو گر کے لئے اس کا استعمال صحیح ہے یا نہیں؟ نیز تین مہینے کے بعد اکا دکا ہی کوئی آتا ہے، عام طور پر لوگ ہاتھوں ہاتھ لے جاتے ہیں، اس طرح کے کپڑوں کا رفو گر کے پاس ڈھیر لگ جاتا ہے، اب وہ ان کپڑوں کا کیا کرے؟ کئی کئی سال گذر جاتے ہیں، کوئی لینے نہیں آتا، عام طور پر رسید پر کپڑا اور کپڑے

والے کا نام لکھا جاتا ہے، پتہ یا نمبر وغیرہ تحریر کرنے کا رواج نہیں ہے۔

المستفتی: محمد ساجد قاسمی کانٹھ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: اس صورت میں جب کہ رفو کروانے والے پرچی پڑھنے کے باوجود تین مہینے گذرنے پر بھی اپنے کپڑے واپس لینے نہیں آتے ہیں، پھر بھی رفو گر کو پوری کوشش کرنی چاہئے کہ کپڑے والے اپنا کپڑا واپس لے جائیں، پوری کوشش کے باوجود بھی وہ لوگ اگر اپنا کپڑا واپس لینے نہ آئیں اور ظن غالب یہی ہو جائے کہ اب کپڑے والے نہیں آئیں گے، تو ان کپڑوں کو بیچ کر اپنا محنتانہ اور رفو میں جتنا خرچ آیا ہے وہ وصول کرلیا جائے اور بقیہ رقم کو بطور امانت اپنے پاس محفوظ رکھا جائے، اگر کبھی کوئی آگیا تو اس کو مابقیہ رقم دے دی جائے۔ اور اگر کبھی نہ آئے تو اس رقم کو اس کی طرف سے صدقہ کردیا جائے۔

(مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ١٤/١٦٦)

فينتفع الرافع ...... (تحته في الشامية) **أتى بالفاء فدل على أنه ينتفع بها بعد الإشهاد والتعريف إلى أن غلب على ظنه أن صاحبها لا يطلبها، والمراد جواز الانتفاع بها والتصدق وله إمساكها لصاحبها، وفي الخلاصة: له بيعها أيضا وإمساك ثمنها.** (شامي، كتاب اللقطة، كراچی ٤/ ٢٧٩، زكريا ٦/ ٤٣٧)

ثم بعد تعريف المدة المذكورة الملتقط مخير بين أن يحفظها حسبة وبين يتصدق بها، فإن جاء صاحبها فأمضى الصدقة يكون له ثوابها. (فتاوى عالمگيري، جديد زكريا ٢/ ٢٩٩، قديم ٢/ ٢٨٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٦ ربیع الاول ١٤٣٤ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٤٠/ ١٠٩٨٧)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
٦/٣/١٤٣٤ھ

قالین بننے والے کا مقدار معین سے زائد بننے کی اجرت نہ لینا

سوال [۹٦۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک عرصہ سے قالین کا کام کرتا ہے، قالین بن کر جب تیار ہوتی ہے، تو اس کی پیمائش کی جاتی ہے فٹ کے حساب سے اور اس کے بننے والے کو اجرت ادا کردی جاتی ہے، مگر فٹ کی پیمائش سے زائد جو ناپ ہوتی ہے، زید اس کی بنائی کی اجرت ادا نہیں کرتا، جب کہ بننے والے کو بھی یہ بات معلوم رہتی ہے کہ فٹوں سے اوپر جو انچ باقی رہتے ہیں اس بنائی کی اجرت نہیں ملتی اور بننے والا اس کو طلب بھی نہیں کرتا ہے، کیا شرعاً اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے؟ اگر ہے تو چونکہ ایک عرصہ گذر چکا ہے، اس کی تلافی کی جو ممکن صورت ہو اس کو واضح فرمائیں۔

المستفتی: اجمل علی ساکن زاوت پور کانٹ ضلع شاہجہاں پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قالین میں فٹوں سے تھوڑے بہت جو زیادہ انچ ہوتے ہیں اس میں آپس کی رضامندی کے ساتھ یہ تعامل جاری ہے کہ نہ قالین بنانے والے اجرت کا مطالبہ کرتے ہیں اور نہ ہی قالین تیار کرانے والے اجرت دیتے ہیں، تو معمولی زائد حصہ کی قیمت کے بغیر معاملہ کرنا جائز اور درست ہے۔

من اشترى ثوبا على أنه عشرة أذرع أو أرضا على أنها مائة ذراع، فوجدها أقل، فالمشتري بالخيار، إن شاء أخذها بجملة الثمن، وإن شاء ترك، وإن وجدها أكثر من الذراع الذى سماه فهو للمشتري؛ لأن الذراع وصف في الثوب، ألا ترى! أنه عبارة عن الطول والعرض والوصف لا يقابله

شيء من الثمن. (هداية، كتاب البيوع أشرفي دبوند ٣/ ٢٣، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٢١، البحرالرائق، كوئٹه ٥/ ٢٩٣، زكريا ٥/ ٤٨٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢٨/ جمادی الاولیٰ ١٤٢٤ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٧/ ٨٠٦٥)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٤٢٤/٥/٢٨ھ

مسلمانوں کا کرایہ پر دینے کے لئے ''شادی ہال'' بنانا

سوال [٩٦٠٨]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسلمانوں کو شادی محل بنانا اور اس میں نکاح خوانی کرنا درست ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شادی محل بنانا اور اس کو آمدنی کا ذریعہ بنانا الگ چیز ہے، جو جائز اور درست ہے۔ اور شادی محل میں نکاح خوانی کا مسئلہ دوسری مستقل چیز ہے، اگر اس میں منکرات اور فضول خرچی نہیں ہے، تو شادی ہال میں نکاح خوانی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (فتاوی محمودیہ قدیم ١٧/ ٢٩٤، جدید ڈابھیل ١٦/ ٥٦٨)

وجاز إجارة بيت بسواد الكوفة ...... ليتخذ بيت نار، أو كنيسة أو بيعة، أو يباع فيه الخمر، وتحته في الشامي: لأن الإجارة على منفعة البيت، ولهذا يجب الأجر بمجرد التسليم ولا معصية فيه، وإنما المعصية بفعل المستأجر، وهو مختار، فينقطع نسبته عنه. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع كراچی ٦/ ٣٩٢، زكريا ٩/ ٥٦٢، الموسوعة الفقهية الكويتية ٩/ ٢١٣، هداية، اشرفي ديوبند ٤/ ٤٧٢، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٩، زكريا ٧/ ٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢٣/ ربیع الاول ١٤٢٥ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٧/ ٨٣٠٢)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٤٢٥/٣/٢٣ھ

سودی قرض لے کر کاروبار کرنے کی آمدنی کا حکم

سوال [۹۶۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سائل نے بینک سے سودی قرض لے کر کاروبار شروع کیا ہے، سائل ہر مہینہ بینک کا سود ادا کرتا ہے، کاروبار خوب چل رہا ہے، تو سوال یہ ہے کہ بینک سے سودی قرض لے کر جو کاروبار کیا ہے، اس کاروبار کی آمدنی جائز ہے یا ناجائز؟ کیوں کہ سود کا لینا اور دینا دونوں حرام ہیں۔

المستفتی: عبدالرب جگر کالونی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سودی قرض لینا جائز نہیں ہے اور جب تک قرض ادا نہ ہوگا، قرض لینے والا مستحق لعنت رہے گا؛ لیکن اس قرض کے ذریعہ کاروبار کر کے جو نفع حاصل کیا ہے وہ اپنی محنت وکوشش کے ذریعہ حاصل ہوا ہے، اس میں کسی قسم کا سود یا حرام مال شامل نہیں ہے؛ کیوں کہ مسئولہ صورت میں صرف پاک مال میں سے سود دیا جارہا ہے، سود لے کر پاک مال میں مخلوط نہیں کیا جارہا ہے؛ البتہ جو شخص قرض دے کر بدلہ میں سود لیتا ہے، حرام مال اس کے پاس پہنچتا ہے۔

عن جابر –رضی اللہ عنہ– لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکل الربو ومؤکلہ. (أبوداؤد، البیوع، باب في آکل الربا وموکلہ، النسخۃ الھندیۃ ۲/ ۴۷۳، دارالسلام، رقم: ۳۳۳۳، صحیح مسلم، المساقاۃ، باب الربا، النسخۃ الھندیۃ ۲/ ۲۷، بیت الأفکار، رقم: ۱۵۹۸، سنن الترمذي، باب ماجاء في آکل الربا، النسخۃ الھندیۃ ۱/ ۲۲۹، دارالسلام، رقم: ۱۲۰۶)

قرض استثمار وذلک ما قصد بہ المستقرض التجارۃ فیہ ...... وقولہ: کذلک لما حرم القرآن الربیٰ فقد حرم حقیقتہ، وقولہ: فتدخل فی

الحرمة كل صورة تصدق عليها هذه الحقيقة سواء كانت تلك الصورة موجودة عند نزول القرآن، أو كانت محدثة فيما بعد من الزمان. (تكملة فتح الملهم، كتاب المساقاة، والمزارعة، الفرق بين ديون الاستثمار وديون الاستهلاك، أشرفيه ديوبند ۱/ ۵۷۰- ۵۷۱)

المقترض إنما يملك المال المقرض بالقبض. (الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۳/ ۱۲۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ ذیقعدہ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۲۲۷)

وکیل کی کمائی کا حکم

سوال [۹٦۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج کل وکلاء کی کمائی کا کیا حکم ہے؟ ان کے یہاں دعوت کھانا ان سے مسجد مدرسہ کے لئے چندہ لینا کیسا ہے؟

المستفتی: حافظ علاء الدین شیر کوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دورِ حاضر میں اگر چہ وکلاء عموماً اپنی کمائی میں حلال وحرام کی تمیز نہیں کرتے؛ لیکن جب تک یہ بات واضح نہ ہو جائے کہ ان کی کمائی میں حرام غالب ہے یا وہ حرام مال ہی سے دعوت کر رہے ہیں، تو اس وقت تک ان کی دعوت قبول کرنا ان سے مسجد ومدرسہ کے لئے چندہ وغیرہ لینا جائز ہے، اور اگر ان کی کمائی میں حرام مال کا غالب ہونا معلوم ہو جائے یا حرام ہی کو چندہ میں دینا اور دعوت میں کھلانا معلوم ہو جائے تو ناجائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۲/ ۳۸۱، ۱۳/ ۳۷٦، جدید ڈابھیل ۱٦/ ۴۵۲، فتاوی رحیمیہ قدیم ٦/ ۹۹، جدید زکریا ۹/ ۱۰۸)

لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه.
(شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ٦/ ٣٨٥، زكريا ٩/ ٥٥٣، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٧، زكريا ٧/ ٦٠، تاتارخانية، زكريا ١٨/ ١٥٧، رقم: ٢٨٣٤٨)

غالب مال المهدى إن كان حلالا لا بأس بقبول هديته، وأكل ماله ما لم يتعين أنه حرام، وإن غالب ماله الحرام لا يقبلها ولا يأكلها. (البزازية، كتاب الكراهية، الفصل الرابع في الهدية والميراث، جديد زكريا ٣/ ٢٠٣، وعلى هامش الهندية زكريا ٦/ ٣٦٠، هندية زكريا قديم ٥/ ٣٤٣، جديد ٥/ ٣٩٧، تاتارخانية، زكريا ١٨/ ١٧٥، رقم: ٢٨٤٠٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ ر جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۵۱۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۶/۲۴ھ

وکیلوں کی کمائی سے انتفاع اور صدقہ وخیرات

سوال [۹۶۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج کل جو وکیلوں کی کمائی ہے، اس سے فائدہ اٹھانا اور دوسروں کی اس سے امداد کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس سے صدقہ وخیرات کرکے ثواب حاصل ہوسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد شفیع بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر سچے مقدمات لیا کرتا ہے، تو وکالت، اجرت یا اس کمائی میں سے صدقہ، خیرات سب بلا کراہت جائز ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۱۹)

ادعى دعوى صادقة فأنكر الغريم فله تحليفه. (الأشباه، قديم ص: ٢٢٩)

اور اگر غلط اور ناجائز مقدمات لیتا ہے تو وکالت ناجائز اور حرام ہے۔

وقوله تعالىٰ: ﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ [المائدة: ٢]

ما حرم فعله حرم طلبه. (الأشباه، قديم ص: ٢٢٩)
اس کمائی سے امداد، صدقہ، خیرات کرنے میں ثواب نہیں مل سکتا؛ بلکہ ثواب کی امید رکھنا حرام ہے۔

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوْا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيْهِ. [البقرة: ٢٦٧]

فإذا تصدق بالمال الحرام يريد القبول والأجر يحرم عليه ذلك.

(بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مطبع سهارن پور ١/ ٣٧، دارالبشائر الإسلاميه بيروت ١/ ٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩)

ما حرم أخذه حرم إعطاءه. (الأشباه، قديم /٢٢٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٦ / جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ٦٦٧)

ڈاکٹر اور وکیل کی فیس کا حکم

سوال [۹٦۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: شریعت نے جس چیز کو متقوم قرار نہیں دیا اس پر معاوضہ لینا جائز نہیں، مثلاً رائے پر محنتانہ لینا جائز نہیں، یہ تو رشوت محض ہے، نیز آپ کا حق شفعہ تھا، آپ نے کچھ معاوضہ لے کر حق شفعہ چھوڑ دیا، تو یہ معاوضہ واجب الرد اور حق شفعہ بھی نہیں رہا؛ کیوں کہ شریعت نے شفعہ کی کوئی قیمت مقرر نہیں کی، حاکم سے سفارش کرانا بھی ایسا ہی فعل ہے۔ (مستفاد: العلم والعلماء، ص: ۸۵) تو سوال یہ ہے کہ کیا ڈاکٹر حضرات جو صرف اپنی ذاتی رائے دیتے ہیں اور دوائی نہ دے کر فیس کے نام سے معاوضہ لے لیتے ہیں درست ہے؟ نیز وکلاء حضرات جنہوں نے آج کل صرف مشغلہ رائے دینے کا ہی بنا رکھا ہے، یہ فیس کے نام سے معاوضہ

لیتے ہیں، درست ہے؟ (جدید فقہی مسائل ۱/ ۳۴۷) میں اس کو جائز لکھا ہے۔

المستفتی: محمد انوار قاسمی خادم مدرسہ اسلامیہ عربیہ دادری گوتم بدھ نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: حکیم اور ڈاکٹر کی رائے دہی اور مرض کی تشخیص اسی طرح وکیل کی وکالت کو حق شفعہ پر قیاس کرنا درست نہیں؛ کیوں کہ حق شفعہ مبیع اور مال کے ساتھ متصف ہوتا ہے اور ڈاکٹر اور وکیل کوئی مال ومبیع نہیں ہیں، مرض کی تشخیص کے لئے بیٹھنا اور وکالت کے لئے دفتر میں بیٹھنا، اسی طرح جج کے سامنے بحث کرنا یہ سب محنت کے کام ہیں اور محنت کے بدلہ معاوضہ لینا رشوت نہیں بلکہ اجرت ہے؛ اس لئے ڈاکٹر اور حکیم کو اپنی تجویز کا معاوضہ لینا اور نسخہ لکھنے کا پیسہ لینا جائز اور درست ہے، اسی طرح وکیل کو اپنی وکالت کی اجرت لینا بھی جائز اور درست ہے۔

تصح الوكالة بأجر وبغير أجر. (الفقه الإسلامي وأدلته، الفصل التاسع في الوكالة، الوكالة بأجر، هدى انٹرنیشنل ديوبند ٤/ ٧٤٥)

وفي الحديث: أعظم دليل على أن يجوز الأجرة على الرقى والطب، كما قاله الشافعيؒ، ومالكؒ وأبوحنيفةؒ وأحمدؒ. (بذل المجهود، كتاب الطب، باب ماجاء في كيف الرقى، مكتبه يحيى سهارنپور ٥/ ١١، دارالبشائر الإسلاميه، بيروت ١١/ ٦٢٨، تحت رقم الحديث: ٣٨٩٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ر شوال ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۱۸۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۱۰/۲۱ھ

بیٹری بھرنے اور کرائے پر دینے کا حکم

سوال [۹۶۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: ایک شخص بیٹری بھرنے اور کرایہ پر دینے کا کاروبار کرتا ہے، لوگ بیٹری بھرواتے ہیں اور کرایہ پر لے جاتے ہیں، دوکان دار جانتا ہے کہ یہ شخص بیٹری کو ناچ گانا اور سی ڈی وغیرہ کے لئے استعمال کرے گا، تو بیٹری بھرنے کی قیمت لینا اور کرایہ پر دینا کیسا ہے؟

المستفتی: جلال الدین ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بیٹری بھرنے اور کرایہ پر دینے والے کی نیت اپنی تجارت ہے، نہ کہ ان کو معصیت میں استعمال کرانا، اس لئے "**الأمور بمقاصدها**" کی رو سے کرایہ کا یہ عمل اور اجرت بھی لینا درست ہے، اب جو وہاں سے لے کر غلط کاموں میں اس کا استعمال کرے گا وہ خود اس کا ذمہ دار ہوگا، بیٹری بھرنے والا ذمہ دار نہیں ہوگا۔

الأمور بمقاصدها ...... أن بيع العصير ممن يتخذه خمرا إن قصد به التجارة فلا يحرم. (الأشباه، قديم ٥٣)

وجاز بيع عصير عنب ممن يعلم أنه يتخذه خمرا؛ لأن المعصية لا تقوم بعينه بل بعد تغييره. (درمختار مع الشامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ٦/ ٣٩١، زكريا ٩/ ٥٦٠، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٩، زكريا ٧/ ٦٤، هداية، أشرفي ديوبند ٤/ ٤٧٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/رجب ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۶۷۹)

معصیت والے امور میں لاؤڈ اسپیکر کرائے پر دینا

سوال [۹۶۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (الف) ہماری دوکان سے لاؤڈ اسپیکر کرائے پر دیئے جاتے ہیں، کرائے پر لے جانے

والے گاہک مختلف غرضوں سے لاؤڈ اسپیکر استعمال کرتے ہیں، جن میں سے بعض معصیت کے کاموں میں استعمال کرتے ہیں، مثلاً شادیوں میں گانے بجانے کے لئے وغیرہ، تو کیا ایسے استعمال کے لئے لاؤڈ اسپیکر کو کرائے پر دینا درست ہے یا نہیں؟

(ب) پروگراموں میں لاؤڈ اسپیکر کو کرائے پر دینے میں لاؤڈ اسپیکر کی سیٹنگ اور دوران پروگرام اس کی نگرانی ہمارے اسی دوکان کا ایک فرد کرتا ہے، تو کیا ایسے معصیت والے پروگراموں میں ہمارے اس شخص کی سیٹنگ اور نگرانی درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد جاوید رامپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: لاؤڈ اسپیکر کا استعمال مختلف غرضوں کے لئے ہوتا ہے، جن میں اچھے مقاصد بھی شامل ہیں؛ لہٰذا لاؤڈ اسپیکر کو بطور کرایہ دینا جائز اور درست ہے اور جولوگ اس کو غلط اور معصیت کے کام میں استعمال کرتے ہیں، وہ اس کے لئے ازخود ذمہ دار ہیں، آپ کے اوپر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ (محمود یہ میرٹھ ۲۴/ ۱۶۶)

وعلم من هذا أنه لا يكره بيع ما لم تقم المعصية به. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، زكريا ٩/ ٥٦١، كراچی ٦/ ٣٩١، النهر الفائق، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٢٦٨)

وإنما المعصية بفعل المستأجر وهو فعل فاعل مختار كشربه الخمر وبيعها ، وهو المختار فيه. (الموسوعة ٩/ ٢١٥، البحرالرائق، كوئٹه ٨/ ٢٠٢، زكريا ٨/ ٣٧٢)

وإنما المعصية بفعل المستأجر وهو مختار فيه فقطع نسبته عنه. (طحطاوي على الدر، كوئٹه ٤/ ١٩٤)

(۲) معصیت اور گناہ والے پروگرام میں اپنے کسی آدمی کو مائک وغیرہ کی سیٹنگ کے لئے

بھیجنا اوراس کا شروع سے آخر تک وہاں موجود رہنا اس معصیت کے کرنے والوں کے ساتھ برابر کا شریک رہنا ہے؛ اس لئے وہاں موجود رہنے والا شخص اسی طرح گنہگار ہوگا جس طرح اس پروگرام کے مرتکب ہونے والے گنہگار ہوتے ہیں، ہاں البتہ اگر پروگرام سے پہلے مائک کی سیٹنگ کرکے آپ کا آدمی واپس آجائے اور شروع سے آخر تک دوران پروگرام وہاں موجود نہ رہے، تو ایسی صورت میں آپ کا آدمی معصیت میں شامل نہیں ہوگا۔

استماع صوت الملاهي معصية، والجلوس عليها فسق، والتلذذ بها كفر. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ٩/ ٥٠٤، كراچی ٦/ ٣٤٩، البناية أشرفيه ١٢/ ٨٨)

السماع والقول والرقص الذى يفعله المتصوفة في زماننا حرام، لا يجوز القصد إليه والجلوس عليه وهو الغناء والمزامير سواء. (هندية، كتاب الكراهية و الاستحسان، الباب السابع عشر في الغناء واللهو، زكريا قديم ٥/ ٣٥٢، جديد ٥/ ٤٠٦)

أن الملاهي كلها حرام، واستماع الملاهي معصية، والجلوس عنده فسق، والتلذذ به كفر. (فتاوى النوازل، دارالأيمان سهارنبور، ص: ٢٨٢)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۶۵۴)

فلم کی شوٹنگ ہونے والے ہال کی چوکیداری کا حکم

سوال [۹۶۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید عمرو کا ملازم ہے اور عمرو کے مختلف ذرائع آمدنی ہیں، مثلاً ماربل (فرش) کی کمپنی وغیرہ لیکن عمرو نے زید کو اپنے ایک ہال کی نگرانی اور آمدنی پر مامور کیا، جب کہ وہ ہال فلم

ایکٹروں اور سنیما کی شوٹنگ کے لئے کرایہ پر دیا جاتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ آیا زید کو اس ہال کی نگرانی کی تنخواہ لینا درست ہے یا نہیں؟ حالانکہ عمرو کے اس ہال کے علاوہ اور بھی ذرائع آمدنی ہیں۔

المستفتی: محمد ریاض الدین آسامی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں وہ ہال فلم ایکٹروں کو شوٹنگ کے لئے کرایہ پر دیا جاتا ہے، تو اس عمل میں گنہگار عمرو ہوگا؛ لیکن عمرو کے لئے اس ہال کا کرایہ لینا حلال ہے، بعض لوگوں نے مکروہ بھی کہا ہے اور زید کے لئے ہال کی نگرانی کی اجرت لینا بلاتردد حلال اور جائز ہے؛ اس لئے کہ وہ محض ملازم ہے نہ کہ برائی میں شامل ہے؛ کیوں کہ وہ صرف اس ہال میں نقصان پہنچانے والے لوگوں سے اس کی نگرانی کرتا ہے اور اس کی اجرت لیتا ہے۔

وجاز إجارة بيت ...... ليتخذ بيت نار أو كنيسة أو بيعة أو يباع فيه الخمر. (درمختار مع الشامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ٦/ ٣٩٢، زكريا ٩/ ٥٦٢، الموسوعة الفقهية الكويتية ٩/ ٢١٣، هداية، أشرفي ديوبند ٤/ ٤٧٢، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٩، زكريا ٧/ ٦٤، البناية، أشرفيه ديوبند ١٠/ ٥٩)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ شعبان ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۰۸۸)

مورتی اور مزار پر کپڑا چڑھانے کے لئے فروخت کرنا

سوال [۹۶۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کی کپڑے کی دوکان ہے، کپڑے کی تجارت کرتا ہے، دوکان پر ہر طرح کے اور ہر

مذہب کے لوگ آتے ہیں، ہندوستان کے لوگ آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو کپڑا دومورتی پر چڑھانا ہے اور مسلمان آتے ہیں کہتے ہیں کہ اچھا کپڑا دو فلاں بزرگ کے مزار پر چڑھانا ہے اور یہ دونوں گناہ ہیں۔ اور قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلٰی الْبِرِّ وَالتَّقْوَی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلٰی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾

[المائدة: ٢]

دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان لوگوں کے صراحت کردینے کے بعد ان کے ہاتھ کپڑا فروخت یا چادر فروخت کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح نہیں ہے تو جواز کی کوئی صورت ہے یا نہیں؟

المستفتی: مدرسہ بستان رحمت محی الدین پور، سیوان بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں دوکاندار کو ذکر کردہ کپڑا بیچنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے؛ کیوں کہ کپڑے اصل میں ان گناہ کے کاموں کے لئے نہیں بنائے گئے؛ بلکہ انہیں ہر طرح سے استعمال میں لایا جاسکتا ہے؛ لہٰذا جو شخص کپڑا خرید کر گناہ کے کاموں میں استعمال کرتا ہے یہ اس کا ذاتی فعل ہے، اس کا گناہ دوکاندار اور کپڑا بنانے والے پر نہ ہوگا۔

لا يكره بيع الجارية المغنية، والكبش الفطوح، والديک المقاطع، والحمامة الطيارة؛ لأنه ليس عينها منكر، وإنما المنكر في استعماله المحظور. (تبيين الحقائق، قبيل كتاب اللقيط، زكريا ديوبند ٤/ ١٩٩، إمداديه ملتان ٣/ ٢٩٧)

رجل آجر بيتا ليتخذ فيه نارا، أو بيعة، أو كنيسة، أو يباع فيه الخمر فلا بأس به، وكذلک كل موضع تعلقت المعصية بفعل فاعل مختار.

(خلاصة الفتاوى ٤/ ٣٧٦، بحواله فتاوى محموديه ١٦/ ١٣٧)

لا يكره بيع الزنانير من النصراني، والقلنسوة من المجوسي. (تبيين الحقائق، كتاب الكراهية، فصل في البيع، إمداديه ملتان ٦/ ٢٩، زكريا ٧/ ٦٤-٦٥،

شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ٦/ ٣٩٣، زكريا ٩/ ٥٦٢، هندية، زكريا قديم ٥/ ٣٤٦، جديد ٥/ ٤٠١، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٨٨)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍محرم الحرام ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۲۵۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳؍محرم الحرام ۱۴۳۲ھ

مسلم ٹھیکیدار کا مندر تعمیر کرنا

سوال [۹۶۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک مسلم ٹھیکیدار ہے، وہ ڈی ایم صاحب کے زیر نگرانی تعمیرات کا کام کرتا ہے، ہندو مسلم سب کے مکانات تعمیر کرتا ہے؛ لیکن کثرت سے غیر مسلم کے تعمیرات کا کام کرتا ہے، اگر وہ غیر مسلم کے مکانات بناتا ہے تو وہ غیر مسلم مکانات کے حدود میں ہی مندر بھی تعمیر کراتے ہیں، کیا وہ مسلم ٹھیکیدار مندر تعمیر کرسکتا ہے؟ ہندوستان میں اس طرح کا کاروبار درست ہے؟ اگر مندر اس مکان میں بنانے سے انکار کرتے ہیں تو سرکاری ٹھیکیداری ہمارے ہاتھ سے جاتی ہے، ہمارے کاروبار کے بگڑنے کا خطرہ ہے۔

المستفتی: ڈاکٹر شعیب شوکت باغ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: غیر مسلم کا مکان بنانا اور اس کے مکان کی ضروریات کو تعمیر کرنا محض اپنی مزدوری حاصل کرنے کے لئے مسلم ٹھیکیدار کے لئے جائز ہے، مگر جس جگہ وہ مندر بنائے گا اس جگہ پر بھی اجرت لے کر تعمیر کرنے کی گنجائش ہے، ہاں البتہ مندر کے مجسمہ اور گنیش جی کے اعضاء اور اشوک کے لاٹ وغیرہ جانوروں کی صورت چہرہ سر وغیرہ

بنانا جائز نہیں ہے؛ اس لئے ان باتوں کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۷/ ۳۰۹)

وجاز تعمير كنيسة (درمختار) وفي الشامية: قال في الخانية: ولو آجر نفسه ليعمل في الكنيسة ويعمرها لا بأس به؛ لأنه لا معصية في عين العمل. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ٦/ ٣٩٢، زكريا ٩/ ٥٦٢)

ولو استأجر الذمي مسلما ليبنى له بيعة، أو كنيسة، جاز ويطيب له الأجر. (هندية، كتاب الإجارة، الباب السادس عشر، زكريا جديد ٤/ ٤٨٧، قديم ٤/ ٤٥٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ربیع الاول ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۲۱۰)

کمپنی کا تصویر والا لیبل شائع کرنا

سوال [۹۶۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کی تجارت پریس (چھپائی خانہ) ہے، جس میں کسی کمپنی کا لیبل وغیرہ تصویر کے ساتھ چھپتا ہے، اور آج کل کے دور میں بغیر تصویر کے کسی بھی کمپنی کا لیبل وغیرہ شائع نہیں ہوتا ہے، جیسے اخبار وغیرہ میں تصویریں شائع کی جاتی ہیں، تو کیا اس قسم کے تصویر والے لیبل کی چھپائی کرنا ازروئے شرع درست ہے یا نہیں؟ اور نیز اس کی آمدنی حلال ہے یا نہیں؟

المستفتی: حافظ محمد اسماعیل دی گلوسی آرٹ پریس

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: لیبل وغیرہ کی چھپائی میں تصویر اصل مقصود نہیں ہوتی؛ بلکہ اصل مقصود تو لیبل کی چھپائی ہوتی ہے اور تبعاً تصویر بھی چھپ جاتی ہے؛ اس لئے اصل

مقصود کو دیکھتے ہوئے سوال نامہ میں ذکر کردہ لیبل کی چھپائی درست ہے اور اس کے ذریعہ حاصل ہونے والی آمدنی حلال ہے۔ اور اگر مقصود تصویر ہی چھاپنے کا ہو تو جائز نہیں۔
(مستفاد: جواہر الفقہ جدید زکریا ۷/ ۲۴۹، قدیم ۳/ ۲۲۶)

الأمور بمقاصدها. (الأشباه، قديم، ص: ٥٣، قواعد الفقه أشرفي ديو بند، ص: ٦٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۳؍ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۲۴۱/۳۸)	۱۴۲۸/۶/۸ھ

تمباکو، گٹکا وغیرہ کی تجارت اور اس کی آمدنی

سوال [۹۶۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمد زید کا کاروبار گٹکھا، زردہ، پان وغیرہ کا ہے اور زید اس میں مندرجہ ذیل اشیاء ڈالتا ہے: سپاری، کتھا، چونا، الائچی، خوشبو لونگ، قوام، پیپل منٹ، سفید پاؤڈر جو مسالہ کو سفید کرتا ہے، گلسیری، تمباکو، بعض جگہ لوگ محمد زید سے مزید تیز کرنے کے لئے کہتے ہیں، تو زید ان اشیاء کے ساتھ ایک اور چیز شامل کرتا ہے، ٹرپن پیور کے نام سے ہوتی ہے جو کہ تمباکو کا ہی ایک جزو ہے، مگر اس میں اوپر والے تمباکو سے زیادہ تیزی ہوتی ہے، محمد خالد زید سے کہتا ہے کہ آپ کا کاروبار ناجائز ہے، جب کہ محمد خالد ایک مفتی ہے، مسجد کا امام ہے، مسئلہ یہ ہے کہ زید کا کاروبار کہاں تک درست ہے؟

المستفتی: سلیم احمد گھونچی فرید آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سوال نامہ میں تمباکو اور گٹکھا جس کو مختلف مسالے جات خوشبو اور قوام کے ذریعہ سے تیز کر کے بنایا جاتا ہے، اس کی تجارت جائز اور درست ہے، اس

کا پیسہ بھی حلال ہے، چاہے اس میں تیزی زیادہ ہو یا کم، بہرحال اس کی تجارت کا پیسہ حلال ہے۔ (مستفاد: فتاوی رشیدیہ قدیم، ص: ۴۹۰، جدید زکریا ۴۶۸، کفایت المفتی ۹/ ۱۳۶، جدید زکریا مطول ۱۱/ ۴۱، احسن الفتاوی ۶/ ۴۹۵، فتاوی محمودیہ جدید ۱۸/ ۳۹۷)

في الشامية: قلت: فيفهم منه حكم النبات الذي شاع في زماننا المسمى بانش، فتنبه. وفي الشامية: وهو الإباحة على المختار، أو التوقف، وفيه إشارة إلى عدم تسليم إسكاره، وتفتيره وإضراره. (درمختار مع الشامي، قبيل كتاب الصيد، زكريا ١٠/ ٤٤، كراچی ٦/ ٤٦٠)

وفي الأشباه: والنبات المجهول سمته الخ. وفي الحموي: يعلم منه حل شرب الدخان. (الأشباه مع الحموي ١/ ٩٨)

(وصح بيع غير الخمر) أي مفاده صحة بيع الحشيشة والأفيون. (درمختار، كتاب الأشربة، كراچی ٦/ ٤٥٤، زكريا ١٠/ ٣٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۵۰۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶/۳/ ۱۴۲۹ھ

غیر مسلم کو فوٹو گرافی کے لئے کرائے پر مکان دینا

سوال [۹۶۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے اپنی خالی جگہ (کمرہ) ایک غیر مسلم فوٹو گرافر کو سہ سالہ معاہدہ پر کرایہ سے دی ہے، اب شغل فوٹو گرافی کو ملحوظ رکھتے ہوئے دینی اور شرعی اعتبار سے بحیثیت مفتی اس پر آپ اپنی گراں قدر رائے دیجئے کہ آیا یہ کرایہ کی آمدنی میرے لئے جائز یا ناجائز ہوگی؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مالک مکان کرایہ دار کے فعل کا ذمہ دار نہیں، فوٹو گرافی کا

گناہ کرایہ دار ہی پر ہوگا، مالک کو اپنے مکان کا کرایہ لینا جائز اور حلال ہوگا، ہاں البتہ بہتر یہی ہے کہ ایسے کاموں کے لئے اپنا مکان کرایہ دار کو نہ دے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۷/۳۴۴، جدید مطول ۱۱/۴۴۸)

وجاز إجارة بيت بسواد الكوفة ...... ليتخذ بيت نار، أو كنيسة، أو بيعة، أو يباع فيه الخمر. وتحته في الشامة: لأن الإجارة على منفعة البيت، ولهذا يجب الأجر بمجرد التسليم، ولا معصية فيه، وإنما المعصية بفعل المستأجر، وهو مختار، فينقطع نسبته عنه. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ٦/ ٣٩٢، زكريا ٩/ ٥٦٢، الموسوعة الفقهية الكويتية ٩/ ٢١٣)

وإذا استأجر الذمي من المسلم دارا يسكنها فلا بأس بذلك، وإن شرب الخمر فيها أو عبد فيها الصليب، أو أدخل فيها الخنازير لم يلحق المسلم في ذلك شيء. (تاتارخانية، زكريا ١٥/ ١٣٣، رقم: ٢٢٤٤٥، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ١٦/ ٣٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/صفر ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۶۰۶)

بینک کو مکان کرایہ پر دینا

سوال [۹۶۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کا مکان خالی پڑا ہوا ہے، اس کو وہ کرایہ پر دینا چاہتا ہے۔ اور دوسری پارٹی اس کو کرایہ پر لے کر اس میں بینک چلانا چاہتی ہے، اور بینک میں سودی حساب وکتاب اور سود کا لین دین سب کچھ ہوتا رہے گا، تو ایسی صورت میں زید کے لئے اپنا مکان مذکورہ پارٹی کو کرایہ پر دینا جائز ہوگا یا نہیں؟ اور زید کا مقصد اپنے مکان کا کرایہ وصول کرنا ہے اور زید کو اس سے

کوئی مطلب نہیں ہے کہ کرایہ دار اس مکان میں کیا کام کرے گا، مفتی صاحب سے گزارش ہے کہ ایسی صورت میں زید اپنا مکان بینک والی پارٹی کو کرایہ پر دے سکتا ہے یا نہیں؟ مدلل جواب تحریر فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب زید کا مقصد اپنے مکان کا کرایہ وصول کرنا ہے اور اس کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ کرایہ دار اس مکان میں کیا کام کرے گا، تو ایسی صورت میں مذکورہ پارٹی کے ہاتھ مکان کو کرایہ پر دینا زید کے لئے جائز ہے اور جو کرایہ وصول ہوگا وہ زید کے لئے بلا کراہت جائز وحلال ہے، اور کرایہ دار اس مکان میں جائز کام کرے گا، تو گنہگار نہ ہوگا۔ اور اگر پارٹی ناجائز کام کرے گی، تو اس کا گناہ اسی کرایہ دار پارٹی پر ہوگا اور زید پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔

ولا بأس بأن يواجر المسلم دارا من الذمي ليسكنها، فإن شرب فيها الخمر أو عبد فيها الصليب، أو أدخل فيها الخنازير لم يلحق المسلم إثم في شيء من ذلک؛ لأنه لم يواجرها لذلک، والمعصية فى فعل المستأجر وفعله دون قصد رب الدار، فلا إثم على رب الدار في ذلک. (المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ١٦/ ٣٩، تاتارخانية، زكريا ١٥/ ١٣٣، رقم: ٢٢٤٤٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۴۵)

بینک کو زمین کرائے پر دینا

سوال [۹۶۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے اپنی زمین میں ایک بینک کمپنی کو P.N.B بینک لگانے کی اجازت دی اور یہ

معاہدہ ان کے درمیان دس سال کا ہوا ہے؛ لہٰذا دس سال سے پہلے اس کمپنی سے اس بینک کو ہٹانے کو نہیں کہا جا سکتا، ایسی صورت میں مسئلہ یہ دریافت کرنا ہے کہ: (۱) اس بینک سے ملنے والا کرایہ زید کے لئے جائز ہے یا نہیں؟

(۲) اگر نا جائز ہے تو پھر اس ملنے والے کرایہ کا مصرف کیا ہونا چاہئے؟

المستفتی: انصار احمد، رامپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید نے اگر محض اپنی زمین کرایہ وصول کرنے کی نیت سے دی ہے، تو زید نہ گنہگار ہوگا اور نہ اس کے کرایہ میں کسی قسم کی قباحت آئے گی اور زمین کو کرایہ پر لینے والے اس زمین پر جائز کام کریں یا نا جائز کام کریں، وہ ساری باتیں کرایہ دار کے ذمہ ہیں، اگر نا جائز کام کریں گے، تو گنہگار ہوں گے۔ اور اگر جائز کام کریں گے تو گناہ سے بچیں گے۔ اور اگر زید نے نا جائز کام کرنے کی نیت سے کرایہ پر زمین دی ہے، تو تعاون علی المعصیۃ کی وجہ سے زید بھی گنہگار ہوگا؛ لیکن زمین کا کرایہ زید کے لئے بہر حال حلال ہوگا؛ اس لئے کہ جو کچھ کرایہ آتا ہے اس کی زمین کی کرایہ داری کا معاوضہ ہے، جو اس کے لئے بہر حال حلال ہے۔

وجاز إجارة بيت بسواد الكوفة ، أي قرأها الخ. قال الشامي: هذا عنده أيضا؛ لأن المعصية بفعل المستأجر، وهو مختار، فينقطع نسبته عنه، فصار كبيع الجارية ممن لا يستبرأها، أو يأتيها من دبر، وبيع الغلام من لوطي. الخ (رد المحتار، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ٦/ ٣٩٢، زكريا ٩/ ٥٦٢، الموسوعة الفقهية الكويتية ٩/ ٢١٣، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٩، زكريا ٧/ ٦٤، البناية، أشرفيه ديوبند ١٠/ ٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ ذیقعدہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۸۶۱/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۱۱/۲۶ھ

بینک کو دوکان کرائے پر دینا

سوال [۹۶۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میری ایک دوکان ہے، جس کا میں تنہا مالک ومختار ہوں، میں ایک عمر رسیدہ آدمی ہوں اور میرا لڑکا ملازمت پیشہ ہے، موجودہ حالات میں میرے لئے دوکان چلانا مشکل ہو رہا ہے، صحت بھی ٹھیک نہیں ہے، ایک بینک میری دوکان کو کرایہ پر لینا چاہتا ہے، کیا بینک کو کرایہ پر دینا درست ہے؟ کیا کرایہ میرے لئے جائز ہوگا؟

المستفتی: عبدالسمیع بینا بازار، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: آپ کی نیت یہ ہونی چاہئے کہ آپ اپنی دوکان اور عمارت کا کرایہ حاصل کر رہے ہیں اور کرایہ دار کو آپ مدت کرایہ کے اندر اختیار دے دیں جو چاہے کرے، چاہے دوکان کا کاروبار کرے، چاہے رہائش کا کاروبار کرے، چاہے خالی رکھے یا بینک کا کاروبار کرے، اس کا تعلق آپ سے نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق کام کرنے والے سے ہے؛ اس لئے آپ کو اپنی دوکان کرایہ پر دے کر کرایہ حاصل کرنا اور اس کو اپنے استعمال میں لانا جائز ہے، اگر اس مکان میں رہ کر کوئی گناہ کا کام کرے گا تو اسی پر اس کا گناہ ہوگا، آپ پر نہیں۔

وجاز إجارة بيت بسواد الكوفة ...... ليتخذ بيت نار، أو كنيسة، أو بيعة، أو يباع فيه الخمر. وتحته في الشامة: هذا عنده أيضا؛ لأن الإجارة على منفعة البيت، ولهذا يجب الأجر بمجرد التسليم، ولا معصية فيه، وإنما المعصية بفعل المستاجر، وهو مختار، فينقطع نسبته عنه. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ۶/ ۳۹۲، زکریا ۹/ ۵۶۲، الموسوعة الفقهية الكويتية ۹/ ۲۱۳، هداية أشرفي ديوبند ٤/ ٤٧٢، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٩، زكريا ٧/ ٦٤، البناية، أشرفيه ديوبند ١٠/ ٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲ رشعبان ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۶۸۹/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۸/۲ھ

بینک کو مکان کرائے پر دینا جائز ہے یا ناجائز؟

سوال [۹۶۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: یہاں مقامی بازار میں ہماری ایک عمارت ہے، بینک کی انتظامیہ اس کو کرایہ پر لینا چاہتی ہے، تو کیا شرعی نقطۂ نظر سے ہم یہ عمارت بینک کو کرایہ پر دے سکتے ہیں؟

المستفتی: نثار احمد ہندوارہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اپنا مکان بینک کو کرایہ پر دے کر اس کا کرایہ حاصل کرنا جائز تو ہے؛ لیکن بہتر نہیں۔

وجاز تعمير كنيسة، وحمل خمر ذمي بنفسه، أو دابته بأجر ...... جاز إجارة بيت بسواد الكوفة ...... وقالا: لا ينبغي ذلك؛ لأنه إعانة على المعصية. (درمختار، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ٦/ ٣٩١، زكريا ٩/ ٥٦٢، الموسوعة الفقهية الكويتية ٩/ ٢١٣، هداية أشرفي ديوبند ٤/ ٤٧٢، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٩، زكريا ٧/ ٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍صفر المظفر ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۶۴۷)

بینک سے کرایہ لے کر اپنی ضروریات میں استعمال کرنا

سوال [۹۶۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید نے ایک جائیداد خریدی، جس میں بینک کرایہ دار ہے، شرعاً بینک سے کرایہ لینا اور اس کو اپنی ضروریات میں استعمال کرنا کیسا ہے؟

(۲) جائیداداسی نیت سے خریدی جائے اس میں کرایہ دار بینک رہے گا؛اس لئے کہ بینک کا کرایہ وقت پرمل جاتا ہے اورمحفوظ رہتا ہے،تو شرعاً یہ جائیداد خریدنا اوراس کا کرایہ استعمال کرنا کیسا ہے؟

المستفتی:محمداقبال رشید

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱-۲)زید کے لئے مذکورہ زمین جس کا بینک کرایہ دار ہے، شرعاً بینک سے کرایہ لینااوراس کواپنی ضرورت میں خرچ کرنا جائزاوردرست ہے۔

وجاز تعمير كنيسة، وحمل خمر ذمي بنفسه، أو دابته بأجر لا عصرها بقيام المعصية بعينه: قال في الشامية: هو صريح أيضا، أنه ليس مما تقوم المعصية بعينه. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ٦/ ٣٩٢، زكريا ٩/ ٥٦٢)

ومن آجر بيتا ليتخذ فيه بيت نار، أو كنيسة، أو بيعة، أو يباع فيه الخمر بالسواد فلا بأس به، وهذا عند أبي حنيفة –إلى– وله أن الإجارة ترد على منفعة البيت، ولهذا يجب الأجر بمجرد التسليم، ولا معصية فيه، وإنما المعصية بفعل المستأجر، وهو مختار، فينقطع نسبته عنه. (هداية أشرفي ديوبند ٤/ ٤٧٢، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٩، زكريا ٧/ ٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیراحمد قاسمی عفااللہ عنہ
۴؍شعبان المعظم ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر:۳۸/ ۹۰۸۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۲۷/۸/۵ھ

بلڈنگ بینک کوکرایہ پردینا

سوال [۹۶۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:بلڈنگ بینک کوکرایہ پردے سکتے ہیں یانہیں؟

المستفتی:لیاقت بیکرشولاپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس بینک کا معاملہ سود پر مشتمل ہو اور سود ہی اس کی آمدنی کا ذریعہ ہو، جیسا کہ آج کل اکثر بینکوں کا معاملہ ایسا ہی ہے، تو ایسے بینک کو بلڈنگ کرایہ پر دینا در پردہ معصیت پر تعاون ہے؛ اس لئے یہ غیر مناسب خلاف اولیٰ اور مکروہ تنزیہی کے درجہ میں ہے اور چونکہ سودی کاروبار فاعل مختار کا عمل ہے، جس میں مالک مکان کا کوئی دخل نہیں ہے؛ اس لئے اس کا گناہ صرف کرایہ دار پر ہوگا، مالک مکان پر نہیں ہوگا۔ اور بلڈنگ کا کرایہ مالک مکان کے حق میں حرام نہیں ہوگا؛ اس لئے کہ وہ اپنے مال کی اجرت لے رہا ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۹/۲۷۶، جدید ۹/۲۹۱)

ومن آجر بيتا ليتخذ فيه بيت نار، أو كنيسة، أو بيعة، أو يباع فيه الخمر بالسواد فلا بأس به، وهذا عند أبي حنيفة، وقالا: لا ينبغي، وله أن الإجارة ترد على منفعة البيت، ولهذا يجب الأجر بمجرد التسليم، ولا معصية فيه، وإنما المعصية بفعل المستأجر، وهو مختار، فينقطع نسبته عنه. (هداية كتاب الكراهية والاستحسان، فصل في البيع، أشرفي ديوبند ٤/ ٤٧٢، شامي، زكريا ٩/ ٥٦٢، كراچى ٦/ ٣٩٢، البحرالرائق، زكريا ٨/ ٣٧٢، كوئٹه ٨/ ٢٠٣)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ ذیقعدہ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۳۸۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸؍۱۱؍۱۴۲۲ھ

پوسٹ بکس رکھوانے کے عوض دوکان ٹیپ ٹاپ کروانا

سوال [۹۶۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعض بینک والوں نے ہمارے سامنے یہ اسکیم رکھی ہے کہ ہم آپ کی دوکان کو خوب ٹیپ

ٹاپ کرادیں گے، آپ کو صرف اتنا کرنا ہے کہ ایک پوسٹ بکس اپنی دوکان میں رکھنا ہے، جس پر کریڈٹ کارڈ کے فوائد درج ہوں گے، جب آپ سے کوئی پوچھے کہ یہ کیا چیز ہے؟ تو آپ اس سے کہیں کہ اپنا نام مع پتہ کے پرچہ پر لکھ کر اس میں ڈال دیں بینک کا نمایندہ آکر ساری تفصیل تم کو سمجھائے گا، تو کیا اس طرح پوسٹ بکس رکھنے کے عوض ہم اپنی دوکان ٹیپ ٹاپ کرواسکتے ہیں اور یہ رکھنا جائز تو نہ ہوگا، نیز اسی کے تحت ایک اسکیم ہم کو یہ بھی ملے گی، کہ ہماری دوکان پر اس کا پرچار دیکھ کر کوئی آدمی کریڈٹ کارڈ بنوائے گا تو اس پر بینک ہمیں کچھ فیصد رقم دے گی؟

المستفتی: محمد اعجاز، محمد زبیر، احمد آباد، گجرات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دوکان ٹیپ ٹاپ کرانے کا خرچ کتنا ہے وہ پہلے سے اگر متعین ہوجائے تو اتنے پیسے کے ذریعہ سے ٹیپ ٹاپ کرادے اور یہ خرچ بینک کے ڈبہ رکھنے کے لئے اجرت اور کرایہ شمار کرے تو جائز ہے؛ لیکن اس کے بعد فیصد کے حساب سے پیسہ لینا جائز نہیں ہے، ہاں البتہ ماہانہ کے اعتبار سے کرایہ وصول کرسکتے ہیں۔

عن أبي سعيد –رضي الله عنه– أن النبي ﷺ قال: من استأجر أجيرا فليسم له إجارته. (مصنف عبدالرزاق، المجلس العلمي بيروت ٨/ ٢٣٥، رقم: ١٥٠٢٤)

عن أبي سعيد الخدري –رضي الله عنه– أن رسول الله ﷺ نهى عن استئجار الأجير حتى يبين له أجره. (مراسيل أبي داؤد / ١٠)

ومنها: أن تكون الأجرة معلومة. (هندية، كتاب الإجارة، الباب الأول، زكريا قديم ٤/ ٤١١، جديد ٤/ ٤٤١)

ولا يصح حتى تكون المنافع معلومة، والأجرة معلومة. (هداية، أشرفي ديوبند ٣/ ٢٩٣، تاتارخانية، زكريا ١٥/ ٧، رقم: ٢١٩٢٠)

تفسد الإجارة بالشروط المخالفة لمقتضى العقد، فكل ما أفسد

البيع مما ير يفسد هما كجهالة مأجورة أو أجرة. (شامي، باب الإجارة الفاسدة، كراچی ٦/ ٣٦، زكريا ٩/ ٦٤)

وكـل شـرط يخالف موجب العقد مفسد للعقد. (المبسوط للسرخسي، باب الإجارة الفاسدة، دارالكتب العلمية بيروت ١٦/ ٤٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸ر ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۹۲۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸/ ۳/ ۱۴۳۱ھ

اپنی دوکان میں کریڈٹ کارڈ کی مشین رکھنے کا کرایہ وصول کرنا

سوال [۹۶۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مین روڈ پر ہمارا میڈیکل اسٹور ہے، مختلف بینکوں کے نمایندے ہمارے پاس آئے اور کہا کہ آپ اپنی دوکان میں کریڈٹ کارڈ کی مشین رکھ لیں، جس میں آپ کو یہ سہولت ہوگی کہ آپ کی رقم آپ کو نقد ملے گی اور گاہک کا فائدہ یہ ہے کہ وہ اپنی پوری دوائی بلا جھجھک خرید سکے گا اور اسے پیسے لینے گھر نہیں جانا پڑے گا، تو کیا ہم کریڈٹ کارڈ کی مشین رکھوا سکتے ہیں مشین دوکان میں رکھنے پر بینک ہمیں کچھ کرایہ ادا کرے یا ہماری دوکان ٹیپ ٹاپ کروا دے تو ہم کروا سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: محمد زبیر محمد اعجاز، گجرات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کریڈٹ کارڈ کی مشین سے متعلق جو بات سوال نامہ میں لکھی گئی ہے، وہ ہم کو سمجھ میں نہیں آسکی اس لئے کہ بینک کے ذمہ داروں سے جو بات ہم کو فراہم ہوئی ہے، اس کے حساب سے کچھ تر دد سا ہے، باقی یہ بات کہ کوئی بھی مشین دوکاندار کی دوکان میں دوسرا آدمی رکھے یا بینک رکھے تو جانبین کے طے شدہ کرایہ کو وصول کرنا دوکاندار کے لئے جائز ہے۔

وتصح إجارة حانوت أي دكان. (شامي، كتاب الإجارة، باب مايجوز من الإجارة ومـا يكـون خلافا فيها، زكريا ۹/ ۳۷، كراچی ٦/ ۲۷، هداية، اشرفی ديوبند ۳/ ۲۹۷، ملتقى الأبحر، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۵۲۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۹۲۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۳/۸ھ

ندی فروخت کرنا

سوال [۹۶۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہندوستان میں مچھلی کا شکار ہونے سے پہلے ندی فروخت ہو جاتی ہے، اور تقریباً یہی حال آم وغیرہ کے باغات کا ہے کہ پھل پھول ظاہر ہونے سے قبل خرید لیئے جاتے ہیں، تو کیا ایسی ندی کی مچھلی کھانا یا ایسے باغات کے پھل خریدنا اور کھانا اور ندی وباغات کے منافع کا استعمال کرنا جائز ہے؟۔

المستفتی: محمد اشتیاق نور قاسمی، بھاگلپور (بہاری)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جو ندی حکومت یا کسی شخص کی ملکیت کی ہے، اس کو مالک سے کسی خاص صورت کے لئے خریدنا اور فروخت کرنا شرعاً جائز ہے؛ اس لئے کہ یہ نام کی بیع ہے، درحقیقت یہ بیع نہیں ہے؛ بلکہ کرایہ اور اجارہ کا معاملہ ہے اور طے شدہ مدت میں کرایہ دار اور ٹھیکیدار کو اس ندی میں اپنے اختیار سے ہر طرح کا تصرف جائز ہے اور اس میں دوسروں کو آنے جانے سے روکنے کا بھی حق ہے، مگر جو مچھلیاں قدرتی پیداوار ہیں، ان کو مارنے سے روکنے کا حق کسی کو بھی نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۵۳۲)

وجاز إجارة القناة والنهر مع الماء به يفتى لعموم البلوى. (شامي،

كتاب الإجارة، مطلب في استئجار الماء مع القناة الخ كراچی ٦/ ٦٣، زكريا ٩/ ٨٦)

وإن استأجر النهر والقناة مع الماء لم يجز؛ لأن فيه استهلاک العين أصلا، والفتوى على الجواز لعموم البلوى. (هندية، الباب الخامس عشر في بيان ما يجوز من الإجارة، وما لا يجوز، زكريا قديم ٤/ ٤٤١، جديد زكريا ٤/ ٤٧٦)

ما نبت أي من الكلأ في أرض مملوكة بلا انبات صاحبها حكمه كما سبق، أي لا يمنع أحدا من الأخذ منه ولا رعى ماشيته فيه إلا أن لرب الأرض المنع من الدخول في أرضه. (الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٥/ ١٠٧)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹ر شعبان ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۱۵۲)

ندی کو چند سالوں کے لئے کرایہ پر لینا

سوال [۹۶۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہندوستان میں ندی اور تالاب بھی آم کے باغات کی طرح چند سالوں کے لئے فروخت ہوجاتے ہیں۔ ’’ہدایہ‘‘ میں ہے:

ولا يجوز بيع السمک قبل أن يصطاد. (آخرين، ص ٥١)

توجه: ایک استفتاء میں مدرسہ شاہی سے جواز کا فتویٰ آیا ہے اور وجہ جواز میں یہ کہا گیا ہے کہ: یہ نام کی بیع ہے، درحقیقت یہ بیع نہیں بلکہ کرایہ اور اجارہ کا معاملہ ہے۔ (پہلے والا استفتاء اور جواب کی فوٹو کاپی منسلک ہے)

الف: کیا یہی وجہ جواز آم کے باغات میں جاری ہوسکتی ہے، تاکہ خرید وفروخت حلال ہو، ورنہ دونوں میں وجہ فرق کیا ہے؟

ب: سیلاب میں آئی مچھلی اگر ہر کس وناکس پکڑے تو اس میں نقض امن کا خطرہ ہے؛ کیوں کہ حکومت صرف خرید نے والے کی حمایت کرتی ہے، کیا ایسی صورت میں عدم جواز کا مسئلہ بتایا جائے گا؟

المستفتی: اشتیاق نور قاسمی بھاگلپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ندی، تالاب کو چند سالوں کے لئے فروخت کرنے کے لئے جو بات کہی گئی ہے وہ درست نہیں ہے؛ بلکہ صحیح یہی ہے کہ اس کا معاملہ کرایہ داری کا ہوتا ہے، بیع کا نہیں ہوتا؛ اس لئے کہ بیع کا مطلب یہ ہے کہ خریدار کی ملکیت میں آئے گا اور واپس دینا چاہے تو خریدار ہی سے وہ واپس آئے گا اور کرایہ داری کا مطلب یہ ہے کہ ایک مدت تک کے لئے لیا جائے اور جب مالک کے پاس واپس کیا جائے، تو خالی ہاتھ واپس کیا جائے ندی تالاب وغیرہ کو جو لیا جاتا ہے، وہ خریداری کے ساتھ نہیں لیا جاتا ہے؛ بلکہ کرایہ داری کے ساتھ لیا جاتا ہے؛ اس لئے خریداری سے تعبیر کرنا درست نہیں؛ بلکہ کرایہ داری اور اجارہ داری سے تعبیر کرنا درست ہے؛ لہٰذا چند سالوں کے لئے جو نہر یا تالاب کرایہ پر لیا جاتا ہے اور اس درمیان آزاد مچھلیاں ان نہروں اور تالابوں میں داخل ہو جائیں، پھر ان کے نکلنے کا راستہ بند ہو جائے تو اس کرایہ دار کے لئے یہ حق ہو جاتا ہے کہ ان تالابوں اور نہروں سے مچھلیاں مارنے سے دوسروں کو روک دے؛ لیکن مچھلیاں بغیر حیلہ وکوشش اور بغیر جال کے ہاتھ سے پکڑی نہیں جاسکتیں؛ اس لئے غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے ان مچھلیوں کو پکڑنے سے پہلے بیچنا جائز نہیں، نیز ''امداد الفتاوی'' کے حوالے سے سابقہ فتویٰ میں جو دوسروں کے لئے پکڑنا جائز لکھا ہے یہ اس صورت میں ہے، جب نہروں میں آزاد مچھلیاں داخل ہو جائیں، پھر ان کے لئے نکلنے کا راستہ بند نہ کیا گیا ہو کہ کسی طرح سے وہ مچھلیاں ٹھیکیدار کے ایریا سے باہر نہیں نکل سکتیں، اسی طرح تالاب میں پانی آنے جانے کا راستہ ہے اور ان راستوں کو بند نہیں کیا گیا ہے، تو دوسروں کے لئے بھی ان نہروں سے مچھلیاں پکڑنے کی اجازت

ہے؛لیکن اگر راستہ بند کردیا گیا ہے، تو ٹھیکیدار کی اجازت کے بغیر دوسروں کے لئے ان مچھلیوں کو مارنا جائز نہیں یہی اس مسئلہ کا مطلب ہے جو ''امداد الفتاویٰ'' کے حوالہ سے پہلے والے استفتاء میں لکھا گیا اور ایک بہترین شکل یہ ہے کہ سرکاری نہروں کو کرایہ اور ٹھیکہ پر لیتے وقت نہر کے کناروں کو بھی ٹھیکہ پر لے لیا جائے اور ان کناروں میں پیدا ہونے والے درخت اور حفاظت کے ذریعہ سے اگنے والی گھاس وغیرہ ٹھیکیدار کی ہوجائے تو ٹھیکیدار اور کرایہ دار کو یہ حق ہوگا کہ ان نہروں اور تالابوں میں آنے سے روک دے۔

عن عبدالله بن مسعود –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: لا تشتروا السمک في الماء، فإنه غرر. (مسند أحمد ۱/ ۳۸۸، رقم: ۳۶۷۶، السنن الكبرى للبيهقي، دارالفكر بيروت ۸/ ۲۵۲، رقم: ۱۱۰۱۳)

لا يجوز بيع السمک قبل أن يصطاد؛ لأنه باع مالا يملكه. (هداية، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، أشرفي ديوبند ۳/ ۵۱، تاتارخانية، زكريا ۸/ ۳۳۶، رقم: ۱۲۱۱۲)

ومن استأجر أرضا على أن يكر بها ويزرعها ويسقيها فهو جائز. (هداية، كتاب الإجارة، باب إجارة الفاسدة، أشرفي ديوبند ۳/ ۳۰۶، البحرالرائق، كوئٹه ۸/ ۲۴، زكريا ۸/ ۴۳، شامي كراچي ۶/ ۶۰، زكريا ۹/ ۸۲، ملتقى الأبحر، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۵۴۰)

وجاز إجارة القناة والنهر مع الماء به يفتى لعموم البلوى. (شامي، مطلب في استئجار الماء مع القناة، كراچى ۶/ ۶۳، زكريا ۹/ ۸۶، هندية، زكريا قديم ۴/ ۴۴۱، جديد ۴/ ۴۷۶)

والحيلة في الكل أن يستأجر موضعا معلوما لعطن الماشية وسيح الماء والمرعى. (تقريرات رافعي، باب بيع الفاسد، كراچى ۵/ ۱۴۰، زكريا ۷/ ۱۴۰)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍صفر ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۷۱۶/۳۷)

سمندر کا ایک مخصوص حصہ ٹھیکہ پر لینا

سوال [۹۶۲۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں ساحلی علاقہ میں ایسا ہوتا ہے کہ حکومت سمندر کے کسی خاص جگہ کو کسی کے ہاتھ فروخت کردیتی ہے کہ اس خاص جگہ میں جتنی مچھلیاں ہیں، ایک متعینہ مدت تک وہی شخص ان مچھلیوں کا شکار کرسکتا ہے، کوئی اور استعمال نہیں کرسکتا ہے، کیا اس طرح کا معاملہ کرنا درست ہے؟ براہ کرام جواب سے نوازیں۔ فقط والسلام

المستفتی: عبدالمجید کیرالا متعلم جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: متعینہ مدت تک کے لئے فروخت کرنے کا مطلب باقاعدہ بیع نہیں ہے؛ بلکہ اجارہ داری اور کرایہ کا معاملہ ہے اور سمندر کا کنارہ چونکہ حکومت کی ملکیت ہے؛ اس لئے حکومت کو اپنی ملکیت کسی کو بھی کرایہ پر دینے کا حق ہے اور جو شخص متعین حصہ کو کرایہ پر لے گا، اسے اپنے حصہ میں آزادانہ طور پر آنے جانے کا حق ہے اور ساتھ میں اس حصہ کی مچھلیاں مارنے کا حق بھی حاصل ہو جائے گا۔ اور دوسروں کو اس حصہ سے مچھلیاں پکڑنے سے روکنے کا حق تو نہیں ہے؛ لیکن اس دائرہ کے حدود میں داخل ہونے سے منع کرنے کا حق ہے، جب وہ داخل نہیں ہوسکے گا، تو مچھلیاں بھی نہیں مارسکے گا، اس طریقہ سے حیلہ کے ساتھ اس معاملہ کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔

وجاز إجارة القناة والنهر مع الماء به يفتى لعموم البلوى. (شامي، مطلب في استئجار الماء مع القناة، زكريا ٩/ ٨٦، كراچی ٦/ ٦٣)

وإن استأجر النهر والقناة مع الماء لم يجز أيضا؛ لأن فيه استهلاك العين أصلا، والفتوى على الجواز لعموم البلوى –إلى قوله– ولو استأجر أرضا مع الماء تجوز تبعا. (هندية، الباب الخامس عشر، جديد زكريا ٤/ ٤٧٦، قديم زكريا ٤/ ٤٤١)

قال ابن عابدين: ما نبت أي من الكلأ في أرض مملوكة بلا إنبات صاحبها حكمه كما سبق، أي لا يمنع أحد من الأخذ منه ولا رعي ما شيته فيه إلا أن لرب الأرض منع من الدخول في أرضه. (الموسوعة الفقهية ۳۵/ ۱۰۷)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍صفر ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۹۱۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶/۲/۱۴۳۱ھ

کافر کو شامیانہ اور کھانے کے برتن کرایہ پر دینا

سوال [۹۶۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں ایک مسلمان کا ٹینٹ ہے، اس کے ٹینٹ سے شامیانے اور برتن جس طرح مسلمان لے جاتے ہیں اپنے مذہبی جلسہ میں لگانے اور کھلانے کے لئے، ایسے ہی غیر مسلم اپنے ناچ گانے اور رام لیلا وغیرہ کے لئے شامیانے دریاں وغیرہ لے جاتے ہیں اور بھنگی چمار وغیرہ بھی برتن لے جاتے ہیں اور خنزیر، شراب وغیرہ میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ معلوم یہ کرنا ہے کیا اس مسلمان کا غیر مسلموں کو شامیانے وغیرہ اور برتن وغیرہ دینا اور ان کا کرایہ لے کر اس کو استعمال کرنا درست ہے؟ اور کیا پھر وہی برتن جو بھی بھنگی وغیرہ کے یہاں سے آئے ہیں، اگر چہ انہوں نے دھوکر واپس کئے ہیں، کیا مسلمان ان برتنوں کو اپنی شادی وغیرہ میں استعمال کرسکتا ہے؟ عمومی طور پر ہر مذہب والے کا ٹینٹ اور برتن ہر مذہب والے استعمال کرتے ہیں، شرعاً جو فیصلہ ہو واضح فرمادیں۔

المستفتی: عبد الرشید قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مذکورہ مسلمان کا کاروبار چونکہ شامیانہ، ٹینٹ وغیرہ کرایہ پر دینے کا ہی ہے؛ اس لئے اس شخص کا مذکور چیزوں کو کرایہ پر دینا بلا شک وشبہ جائز ہوگا، اس

میں مسلمان وکافر کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اور کافر کے استعمال کئے ہوئے برتن تین تین مرتبہ دھوکر استعمال کرنا مسلمانوں کے لئے جائز ہے؛ لہٰذا جب غیر مسلموں کے یہاں سے برتن واپس آجائیں تو ٹینیٹ ہاؤس والوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان برتنوں کو اہتمام کے ساتھ تین تین مرتبہ دھوکر رکھیں، پھر مسلمانوں کو دیں، ورنہ ان کی ذمہ داری ہی ہوگی کہ وہ دوقسم کے برتن رکھیں، ایک قسم کے برتن صرف کافروں کے لئے ہوں اور دوسری قسم کے برتن خاص طور پر صرف مسلمانوں کو کرایہ پر دینے کے لئے ہوں۔

عن أبي ثعلبة الخشني –رضي الله عنه– أنه سأل رسول الله ﷺ: إنا نجاور أهل الكتاب، وهم يطبخون في قدورهم الخنزير ويشربون في آنيتهم الخمر، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن وجدتم غيرها فكلوا فيها واشربوا، وإن لم تجدوا غيرها فارحضوها بالماء، وكلوا واشربوا. (أبوداؤد، كتاب الأطعمة، باب في استعمال آنية أهل الكتب، النسخة الهندية ۲/ ۵۳۷، دار السلام، رقم: ۳۸۳۹)

ويكره الأكل والشرب في أواني المشركين قبل الغسل. (تاتارخانية، زكريا ۱۸/ ۱۶۵، برقم: ۲۳۷۰)

إذا استأجر الذمي من المسلم بيتا ليبيع فيه الخمر جاز عند أبي حنيفة. (تاتارخانية، زكريا ۱۵/ ۱۲۲، رقم: ۲۲۴۴۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۳۶۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۴/۲۲ھ

زمین کو کرایہ پر دینا

سوال [۹۶۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم نے ایک کسان سے دس بیگہ زمین دوسال کے لئے کرایہ پر لی ہے، جس کا دوسال کا

کرایہ چودہ ہزار روپئے ہے، دس بیگہ زمین میں لگ بھگ تیس کوئنٹل اناج پیدا ہوتا ہے، ہر فصل میں، جس کسان سے ہم نے زمین کرایہ پر لی ہے وہ کسان غیر مسلم ہے، اور ہم نے وہ زمین اس ہی کو جوتائی کے لئے دے دی ہے، وہ ہمیں دس بیگہ زمین میں صرف دس کنٹل اناج دے گا، اور بیس کنٹل وہ لے لے گا، اپنی محنت اور بیج کے اور پانی کے بدلے میں۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں آپ ہمیں بتائیں کہ یہ درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: صغیر احمد پیر غیب، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس طرح دو سال یا چند سال کے لئے مالک زمین سے پیشگی رقم لے کر زمین کو کرایہ پر لینا جائز اور درست ہے؛ لیکن جب کرایہ دار زمین کو اسی مالک کے ہاتھ بٹائی پر دے گا، تو اس میں دو شرطیں لازم ہیں:

پہلی شرط: یہ ہے کہ بٹائی پر دینے میں پیداوار کا نصف، ثلث، ربع وغیرہ کا اعتبار کیا جائے، مثلاً دس بیگہ زمین میں تیس کوئنٹل اناج پیدا ہونے کی امید ہے اور اس میں سے دس کوئنٹل کرایہ دار کو حاصل کرنا ہے، تو گویا کہ پیداوار کا تہائی حصہ کرایہ دار کو ملے گا اور دو تہائی جوتائی کرنے والے کسان کو ملیں گے، تو اس طرح معاملہ طے کریں کہ جو کچھ بھی پیدا ہوگا اسے تین حصے کر کے ایک حصہ کرایہ دار کو ملے گا اور دو حصے کسان کو ملیں گے۔

دوسری شرط: یہ ہے کہ بیج کرایہ دار کی طرف سے ہونا لازم ہے، ان دونوں شرطوں کے بغیر مذکورہ معاملہ درست نہیں ہوگا؛ لہٰذا تہائی حصہ کی قید لگائے بغیر دس کوئنٹل اناج کی شرط لگانا درست نہیں ہے؛ اس لئے اس معاملہ کو دوبارہ شریعت کے دائرہ میں داخل کر کے صحیح کر لیا جائے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۷۶)

دفع الأرض المستأجرة من الآجر مزارعة جاز إن البذر من المستأجر. (درمختار مع الشامي، قبیل کتاب المساقاة، ۵/ زکریا ۹/ ۴۱۰، کراچی ۶/ ۲۸۴)

وعنه أي محمد استأجر أرضا ودفعها إلى صاحبها مزارعة، فإن البذر

من قبل ربها لم يجر، وإن من قبل المستأجر جاز. (فتاوى بزازية، كتاب المزارعة، الفصل الأول في صحتها وشرائطها، جديد زكريا ٣/ ٥٠، وعلى هامش الهندية، زكريا ٦/ ١٠٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍ربیع الاول ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۶۲ ۸۷)

خالی زمین کرایہ پر لینا

سوال [۹۶۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زمین مالک سے خالی زمین دو چار سال کے لئے موقع پر طے شدہ رقم دے کر ٹھیکہ پر لینا کیسا ہے؟ اور دو چار سال کی پیداوار ٹھیکیدار لیتا ہے اور دو چار سال پورا ہونے کے بعد زمین مالک سے رقم واپس لئے بغیر زمین واپس کر دیتا ہے، جس طرح زمین خالی ٹھیکہ پر لی گئی اور بیچ میں جو بھی پیداوار یا غلہ ہوا وہ ٹھیکیدار نے لیا، اسی طرح کسی پھل کا باغ لینا جب کہ پھول و پھل سے خالی ہو، باغ مالک کو موقع پر طے شدہ رقم دے کر اس باغ کو ٹھیکہ پر لینا کیسا ہے؟ اگر اول جائز ہے اور ثانی نہیں، تو وجہ کیا ہے؟ یا کونسی صورت جائز ہے؟ دونوں میں کیا فرق ہے؟

المستفتی: عبدالصمد بلاسپور گیٹ، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: یہ شکل زمین کو کرایہ داری میں دینے کے دائرہ میں داخل ہے؛ اس لئے جائز اور درست ہے۔

من استأجر أرضا على أن يكربها ويزرعها ويسقيها، فهو جائز. الخ (هداية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، أشرفی ٣/ ٣٠٦، البحرالرائق، كوئٹه ٨/ ٢٤، زكريا ٨/ ٤٣، شامي، زكريا ٩/ ٨٢، كراچی ٦/ ٦٠)

نیز اسی طرح باغ کو زمین سمیت کرایہ اور ٹھیکہ پر دینا جائز ہے اور اس درمیان باغبان کو اس

میں کوئی چیز بوکر پیداوار حاصل کرنے کا بھی اختیار ہونا چاہئے۔

إذا استأجر أرضا على أن يكر بها ويزرعها أو يسقيها صح؛ لأنه شرط يقتضيه العقد، وهو ملائم له، فلا يفسد العقد. (البحر الرائق، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، زكريا ٨/ ٤٣، كوئٹه ٨/ ٢٤، شامي، زكريا ٩/ ٨٢، كراچی ٦/ ٦٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳ ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۴۰۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۴/۳ھ

قرض لے کر زمین کرایہ پر دینا

سوال [۹۶۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے ایک شخص سے بیس ہزار روپئے قرض مانگے اور یہ کہا کہ میری چار بیگہ زمین کرایہ واجارہ پر لے لو اور مذکورہ قرض میں سے ہر سال چھ سو روپئے بیگہ کے حساب سے کٹتے رہیں گے، واضح رہے کہ ایک بیگہ زمین کا کرایہ عموماً ایک ہزار روپیہ میں زید دیتا ہے، تو معلوم یہ کرنا ہے کہ اس طرح زید کو قرض دینا جائز ہے یا نہیں؟ نیز اس کی زمین کو استعمال کرنا مذکورہ صورت میں جائز ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: مجیب الرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں ذکر کردہ صورت میں آپس کی رضامندی سے زید کو قرض دینا جائز ہے اور پھر اس قرض کو زمین کے کرایہ میں مجری کرنا جائز اور درست ہے؛ لہٰذا مقررہ کرایہ کے حساب سے جتنی مدت میں زمین کا کرایہ بیس ہزار قرض کے برابر ہوجائے اس وقت تک قرض خواہ کے لئے زید کی زمین کو بطور کرایہ استعمال کرنا جائز ہے۔

(مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۲۱/ ۳۵۷، ڈابھیل ۱۶/ ۶۴۶)

الأجرة لا تجب بالعقد، وتستحق بإحدى معان ثلاثة: إما بشرط التعجيل، أو بالتأجيل من غير شرط، أو باستيفاء المعقود عليه. (هداية، كتاب الإجارة، باب الأجر متى يستحق؟ أشرفي ٣/ ٢٩٤، هندية، زكريا قديم ٤/ ٤١٣، جديد ٤/ ٤٤٣، البحرالرائق، كوئٹه ٧/ ٣٠٠، زكريا ٧/ ٥١١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍شعبان ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۱۳؍۹۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۸/۱۶ھ

باغ کو ٹھیکے پر دینا

سوال [۹۶۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارا ایک آم کا باغ ہے، جس کو لگائے ہوئے تقریباً دس بارہ سال ہوگئے ہیں، ہم لوگ اس باغ کے اندر برابر کاشت بھی کررہے ہیں، کچھ لوگ اس کو ٹھیکے پر لینا چاہتے ہیں، ٹھیکے پر لینے والے لوگ بھی اس میں کاشت کریں گے اور پیڑوں سے بھی فائدہ اٹھائیں گے، تو اس طرح ٹھیکے پر دے کر صرف اس پر رقم حاصل کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: حسین احمد مسجد دادا والی گلشہید، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: باغ اور زمین کو اگر اس طرح کرایہ پر دیا گیا ہے کہ مثلاً ایک ہزار روپیہ سالانہ مقرر ہوا ہے اور جائیداد کرایہ پر لینے والے کو اس بات کا مکمل اختیار رہے کہ وہ زمین میں کاشت کر کے اور باغ کے پھلوں سے فائدہ اٹھائے گا، تو یہ معاملہ شرعاً جائز اور درست ہے۔ (فتاوی محمودیہ قدیم ۱۳/ ۳۸۱، جدید ڈابھیل ۱۶/ ۵۵۷، ایضاح النوادر ۱/ ۷۴)

ومن استأجر أرضا على أن يكربها ويزرعها ويسقيها، فهو جائز. الخ

(هداية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، أشرفی دیوبند ٣/ ٣٠٦، البحرالرائق، کوئٹه ٨/ ٢٤/ زکریا ٨/ ٤٣، شامي، کراچی ٦/ ٦٠، زکریا ٩/ ٨٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ رجمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۸۲۴)

ٹھیکے پر زمین دینا

سوال [۹۶۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے پاس تقریباً ۲۵؍۱ ایکڑ زمین ہے، جب تک والد صاحب حیات رہے تو وہ کبھی بٹائی پر کبھی خود کاشت کیا کرتے تھے، ان کے انتقال کے بعد ہم چار بھائی اس زمین کے حق دار بنے، ہم دو بھائی دہلی میں سروس کرتے ہیں، زمین کی دیکھ بھال کبھی ایک بھائی کے ذمہ رہتی ہے تو کبھی دوسرے بھائی کے پاس، اب پچھلے چار سال سے ہمارے بڑے بھائی کبھی خود ہی کاشت کرتے ہیں اور کبھی پوری زمین ایک سال کے لئے -/3500 فی ایکڑ کے حساب سے ٹھیکے پر دے دیتے ہیں، اس طرح جو رقم آتی ہے وہ ہم چاروں بھائی آپس میں لیتے ہیں، آپ سے سوال یہ ہے کہ کیا ٹھیکے پر زمین دینا جائز ہے؛ کیوں کہ ٹھیکے پر زمین لینے والے کو فائدہ ہو یا نقصان اس کو تو آدھی رقم شروع میں اور آدھی رقم پہلی فصل کاٹنے کے بعد دینا ہوتی ہے، اس طرح جس نے ٹھیکے پر زمین لی اس کے لئے تو یہ کاروبار جائز ہونا سمجھ میں آتا ہے؛ کیوں کہ اس کے ساتھ فائدہ نقصان دونوں لگے ہیں، جب کہ ٹھیکے پر دینے والے کو فائدہ ہی فائدہ ہے، تو ہمارے لئے ٹھیکے پر زمین دینا جائز ہے یا نہیں؟ اور میرے حصہ کی رقم پر کتنی زکوۃ مجھے نکالنی ہوگی؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زمین کو سال بھر کے لئے معین اجرت کے ساتھ ٹھیکے پر

دینا جائز اور درست ہے اور ٹھیکیدار کے لئے اس میں کوئی بھی چیز بوکر فائدہ اٹھانے کا حق ہوگا اور مالک زمین کو اس میں کسی قسم کی پابندی لگانے کا حق نہ ہوگا، تو اس طرح ٹھیکے پر دے کر اجرت حاصل کرنا مالک زمین کے لئے بلاتردد جائز اور حلال ہے، ٹھیکیدار کو فائدہ ہو یا نقصان دونوں صورتوں میں یہ جائز ہے، ہم نے ''ایضاح النوادر ۱/۴۷'' پر اس مسئلہ کو بیان کردیا ہے، نیز جو رقم آپ کے حصے میں آئے گی اس کی زکوۃ ہزار میں ۲۵/روپئے کے حساب سے ادا کرنا آپ کو لازم ہوگا۔

عن علي –رضي الله عنه– عن النبي ﷺ قال: فإذا كانت لك مائتا درهم وحال عليها الحول ففيها خمسة دراهم، وليس عليك شيء يعني الذهب حتى تكون لك عشرون دينارا، فإذا كانت لك عشرون دينارا وحال عليها الحول ففيها نصف دينار. الحديث (سنن أبي داؤد، الزكوة، النسخة الهندية ١/ ٢٢١، دارالسلام، رقم: ١٥٧٣)

ومن استأجر أرضا على أن يكربها ويزرعها ويسقيها، فهو جائز. الخ (هداية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، أشرفي ديوبند ٣/ ٣٠٦، البحرالرائق، كوئٹه ٨/ ٢٤/ زكريا ٨/ ٤٣)

وتصح إجارة أرض للبناء والغرس، وسائر الانتفاعات. (شامي، كراچی ٦/ ٣٠، زكريا ٩/ ٤٠)

وفي الخانية: في كل مائتى درهم خمسة دراهم، وفي كل عشرين مثقالا نصف. (تاتارخانية، زكريا ٣/ ١٥٥، رقم: ٣٩٧٧، فتاوى قاضي خان، جديد زكريا ١/ ١٥٤، وعلى هامش الهندية زكريا ١/ ٢٤٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ ذیقعدہ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۳۶۹۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶/۱۱/۱۴۱۴ھ

درختوں کے ساتھ زمین کرایہ پر دینا

سوال [۹۶۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: دوسال کے لئے باغ کی زمین ٹھیکے پر دینے کے ساتھ باغ کی فصل (بہار) کوفروخت کردینے کے لئے لیتا ہے، یہ شکل جائز ہے یانہیں؟ یعنی زمین اور بہار باغ دونوں کوکرایہ پر دے دیا،تاکہ کرایہ دار زمین کی آمدنی اور باغ کی فصل دونوں سے منتفع ہوسکے،تو یہ شکل شرعاً کیاحکم رکھتی ہے؟ والسلام

المستفتی: خورشید احمد خادم الاسلام مدرسہ تعلیم القرآن حسن پور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ شکل شرعاً ناجائز ہے؛ کیوں کہ اس میں دومعاملہ ایک ساتھ ہیں، جس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے، ہاں اگرزمین صرف کرائے پر دی جائے اور درخت اور فصل کواس کے تابع شمار کیا جائے تو درخت کی آمدنی بھی حلال ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۴/ ۱۷۴، ڈابھیل ۱۶/ ۵۸۱، کفایت المفتی قدیم ۸/ ۲۵، جدید مطول ۱۱/ ۱۲۳-۱۲۴)

ویجوز کراء الأرض بالشجر الذي یمکث فیها زمنا طویلا. (کتاب الفقه علی مذاهب الأربعة، مباحث الإجارة، دارالفکر بیروت ۳/ ۱۳۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ محرم الحرام ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۴۷۷)

سالانہ دومن غلہ پر زمین کرایہ پر دینا

سوال [۹۶۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے اپنی زمین دوسرے کواس شرط پر دی کہ تم مجھ کو ہر سال دومن غلہ دے دیا

کرنا اور باقی جو کچھ بھی پیداوار ہوگی وہ تمہاری ہوگی۔ مفتی صاحب سے سوال ہے کہ اس طرح مذکورہ شرط کے ساتھ زمین دینا جائز ہے؟

المستفتی: سعید الرحمٰن آسامی، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفیق: یہ معاملہ شرعاً جائز ہے؛ اس لئے کہ یہ کرایہ داری کی صورت ہے، جس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔

ويجوز استيجار الأراضي للزراعة؛ لأنها منفعة مقصودة معهودة فيها. الخ (هداية، كتاب الإجارة، باب مايجوز من الإجارة وما يكون خلافا فيها، أشرفي ديوبند ٣/ ٢٩٧، ملتقى الأبحر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٥٢٢)

ومن استأجر أرضا على أن يكربها ويزرعها ويسقيها، فهو جائز. الخ (هداية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، أشرفي ديوبند ٣/ ٣٠٦، البحرالرائق، كوئٹه ٨/ ٢٤/ زكريا ٨/ ٤٣، شامي كراچی ٦/ ٦٠، زكريا ٩/ ٨٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۴۷۲)

باغات کو فروخت کرنے کی جائز شکل

سوال [۹۶۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہندوستان میں آم وغیرہ کے باغات پھل پھول ظاہر ہونے سے قبل ہی خرید لئے جاتے ہیں، ہمارے یہاں یہ رواج بالکل عام ہے، ایک سال سے لے کر دس سال تک کے لئے خرید وفروخت شائع اور ذائع ہے، فروخت کنندہ کو روپئے کی ضرورت ہے وہ پہلے مل جاتے ہیں اور خریدنے والے کو چونکہ وہ کئی سال پہلے رقم دیتا ہے؛ اس لئے پندرہ ہزار کا باغ صرف دس ہزار میں مل جاتا ہے۔

وجہ جواز یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہ خرید وفروخت کا معاملہ نہیں؛ بلکہ کرایہ اور اجارہ کا معاملہ ہے، میں نے باغ خریدا ہے نہ کہ پھل، حدیث میں پھل کی خرید وفروخت منع ہے، جب کہ ارشاد نبوی ہے:

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع السنين، وأمر بوضع الجوائح. (رواه مسلم، معارف الحديث ۷/ ۱۲۵)

مولانا منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے (معارف الحدیث ۷/۱۲۴) میں اس طرح کی بیع سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت لکھی ہے۔

الف: کیا مذکورہ وجہ جواز درست ہے؟ اگر درست ہے تو حدیث شریف کا کیا مطلب ہے؟ کیا یہ مطلب ہے کہ چند سالوں کا ٹھیکہ ناجائز اور غلط ہے اور ایک سال کا جائز اور درست ہے؟

ب: اگر مذکورہ وجہ جواز درست نہیں ہے، تو ایسی صورت میں جب کہ ۹۹ رفیصد باغ کی خرید وفروخت باطل ہوتی ہے، بازار سے اس کا پھل خریدنا کھانا یا ایسے باغوں کے منافع کا استعمال جائز ہے؟

المستفتی: اشتیاق نور قاسمی، بھاگلپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (الف، ب) ہمارے ہندوستان اور برصغیر میں ایک ایک دو دو فصل یا ایک ایک دو دو سال کے لئے باغات کی جو خرید فروخت ہوتی ہے، وہ شرعی ضابطہ کے مطابق ناجائز اور بیع فاسد ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ فصل کی فروختگی اور خریداری میں مبیع پھل ہی ہوتا ہے اور پھل ابھی اپنے وجود میں نہیں آیا اور شریعت میں ایسی معدوم شئ کی خریداری اور فروختگی جائز نہیں ہے، ہاں البتہ اس کے جواز کے لئے ایک متبادل حیلہ کی شکل اختیار کی جاسکتی ہے، اس کی شکل یہ ہے کہ باغ کی زمین قابل کاشت ہو یا اس زمین میں

کسی بھی چیز کی پیداوار ہوسکتی ہے، تو ایسی صورت میں زمین کومع باغ کے ایک سال یا متعدد سالوں کے لئے متعین اجرت سے کرایہ پر لے لیا جائے اوراس کرایہ داری کی مدت میں مالک کا کوئی اختیار باقی نہ ہو، سارا اختیار کرایہ دار کو حاصل ہوجائے اور کرایہ دار اس میں کسی بھی طرح کی پیداوار سے فائدہ اٹھائے، اور پیڑوں میں پانی وغیرہ دے کران کی خدمت کرکے اس مدت میں جو پھل آئیں گے ان سے بھی فائدہ اٹھائے، ایسی صورت میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس معاملہ میں ان پھلوں کی خرید فروخت ہوئی ہے جو اپنے وجود میں نہیں آئے؛ بلکہ پھل تابع ہیں اصل زمین کی کرایہ داری ہوتی ہے اور حدیث شریف میں بیع کی ممانعت ہے، کرایہ داری کی ممانعت نہیں ہے، تعامل ناس اور عموم بلویٰ کی وجہ سے حضرات فقہاء نے اس طرح کی اجارہ داری اور کرایہ داری کے ذریعہ سے باغات اور نہر وغیرہ سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی ہے، اور بازار سے خرید وفروخت بہر حال جائز ہے۔

عن حكيم بن حزام –رضی الله عنه– قال: سألت رسول الله ﷺ، فقلت: يأتيني الرجل فيسألني عن البيع ما ليس عندي اتباع له من السوق، ثم أبيع قال: لا تبع ما ليس عندك. (سنن الترمذي، ابواب البيوع، باب ماجاء في كراهية بيع ماليس عنده، النسخة الهندية ١/ ٢٣٣، دارالسلام، رقم: ١٢٣٢)

ومن استأجر أرضا على أن يكر بها ويزرعها ويسقيها فهو جائز. (هداية، كتاب الإجارة، باب إجارة الفاسدة، أشرفي ديوبند ٣/ ٣٠٦، الحبرالرائق، كوئٹه ٨/ ٢٤، زكريا ٨/ ٤٣، شامي كراچي ٦/ ٦٠، زكريا ٩/ ٨٢، ملتقى الأبحر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٥٤٠)

وجاز إجارة القناة والنهر مع الماء به يفتى لعموم البلوى. (شامي، مطلب في استئجار الماء مع القناة، كراچی ٦/ ٦٣، زكريا ٩/ ٨٦، هندية، زكريا قديم ٤/ ٤٤١، جديد ٤/ ٤٧٦)

والحيلة في الكل أن يستأجر موضعا معلوما لعطن الماشية وسيح الماء والمرعى. (تقريرات رافعي، باب بيع الفاسد، كراچی ۵/ ۱۴۰، زكريا ۷/ ۱۴۰)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍صفر ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۷۱۶)

کھیت اور باغات کو ٹھیکہ پر دینا اور گروی رکھنا

سوال [۹۶۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کیا کھیت اور باغات یا اسی شئ کے مثل ٹھیکے پر ایک دو سال یا ایک فصل کے لئے لینا اور دینا درست ہے؟

(۲) ایک شخص نے ایک کھیت گروی رکھا ہے، یہ درست ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو اس کی ادائے گی کی صورت کیا ہوگی؟

المستفتی: محمد توصیف لکھیم پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) اگر اس طرح لیا جائے کہ ایک سال یا دو سال تک لینے والے کو پوری زمین پر تصرف کا حق بھی دیا جاتا ہے کہ کرایہ دار کو اس اثنا میں باغ اور کھیت میں کوئی چیز بو کر فائدہ اٹھانے کا حق بھی حاصل ہے، تو جائز ہے؛ اس لئے کہ یہ صرف فصل کی بیع نہیں ہے؛ بلکہ پوری زمین اور باغ کو مقررہ مدت تک کے لئے کرایہ پر لینا ہے، جو کہ جائز ہے۔

ومن استأجر أرضا على أن يكربها ويزرعها ويسقيها فهو جائز.

(هداية، كتاب الإجارة، باب إجارة الفاسدة، أشرفي ديوبند ۳/ ۳۰۶، الحبر الرائق، كوئٹه ۸/ ۲۴، زكريا ۸/ ۴۳، شامي كراچي ۶/ ۶۰، زكريا ۹/ ۸۲، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۵۴۰)

(۲) کھیت گروی رکھنا جائز ہے، مگر شرط یہ ہے کہ مرتہن اس سے کوئی فائدہ اٹھا نہیں سکتا۔

كما استفيد من عبارة الهداية: فلو رهنه خاتما، فجعله في خنصره فهو ضامن؛ لأنه متعد بالاستعمال. (هداية، كتاب الرهن، أشرفی دیوبند ٤/ ٥٢٢)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۳۷۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/ ۳/ ۱۴۱۴ھ

عمارت بنانے کے لئے زمین کرایہ پر دینا

سوال [۹۶۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) بندہ کے علاقہ میں ایک معاملہ اس طرح ہوتا ہے کہ کسی غریب آدمی کی زمین کونٹرکٹر (ٹھیکیدار) اس شرط پر لیتے ہیں کہ وہ اس زمین پر اپنے خرچ سے عمارت بنائیں گے، پھر اس عمارت کا خرچ اس کی دوکانوں اور فلاٹوں کو بیچ کر مع نفع وصول کریں گے، پھر وہ اس معاملہ سے الگ ہوجائیں گے، اب وہ دوکاندار اور فلیٹ خریدنے والے دوکانوں اور فلیٹوں کا کرایہ زمین والے کو ادا کرتے رہیں گے، کیا یہ معاملہ صحیح ہے؟

(۲) ان دوکانوں اور فلیٹوں کے خریدنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صاحب ارض ان دوکانوں اور فلیٹوں کے مالک ہونے کے باوجود صرف کرایہ وصول کرنے کا مجاز ہوگا، جب کہ وہ دوکان لینے والا اس دوکان کو کسی کو بھی بیچ سکتا ہے اور پھر مشتری ثانی دوکانوں کا کرایہ صاحب ارض کو ادا کرے گا، یہ معاملہ ہمارے یہاں کے سبھی دوکانوں اسٹالوں میں چلتا ہے، ہماری بھی دوکان اسی طرح لی ہوئی ہے، تو کیا یہ طریقہ شرعاً صحیح ہے؟

المستفتی: علی اختر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں مذکورہ صورت اجارہ داری کا معاملہ ہے

اور ٹھیکیدار کا غریب شخص سے اس کی زمین اس شرط کے ساتھ لینا کہ میں اس پر عمارت وغیرہ بنا کر پھر اسے فروخت کرکے اپنا روپیہ مع نفع وصول کرلوں گا، شرعاً جائز اور درست ہے، اس کے بعد مذکورہ خریدار کے پاس کرایہ پر رہے گی اور اس پر زمین کا کرایہ ادا کرنا لازم ہوگا؛ البتہ وہ اپنی خریدی ہوئی عمارت کا بدون زمین کے مالک ہوجائے گا، اور صاحب زمین کو ہر حال میں شرعاً اپنی زمین کی قیمت کے مطالبہ کا اختیار رہے گا، اگر خریدار قیمت نہ دے تو مالک زمین کو یہ حق حاصل ہے کہ عمارت کی قیمت خریدار کو دے کر زمین اپنی ملکیت میں لے لے۔ اور اگر اس شرط کے ساتھ معاملہ کیا گیا ہے کہ مالک زمین کو بعد میں اپنی زمین کی واپسی کے مطالبہ کا اختیار نہ ہوگا تو اس طرح معاملہ کرنا جائز نہیں ہے۔

وتصح إجارة أرض للبناء والغرس، فإن مضت المدة قلعهما –إلى قوله– أو يرضى الموجر بتركه، أي البناء والغرس، فيكون البناء والغرس لهذا والأرض لهذا، وهذا الترك ان بأجر، فإجارة وإلا فإعارة. (شامي، كتاب الإجارة، باب مايجوز من الإجارة وما يكون خلافا فيها، كراچی ٦/ ٣٠-٣١، زكريا ٩/ ٤٠-٤١)

وتصح استئجار الأرض للبناء والغرس، وإذا انقضت المدة لزمه أن يقلعهما أو يسلمها فارغة –إلى قوله– أو يرضيا بتركه، فيكون البناء والغرس لهذا، أي للمستأجر والأرض لهذا، أي للموجر الذي هو صاحب الأرض. (مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٥٢٣)

وتفسد الإجارة بالشروط المخالفة لمقتضى العقد، فكل ما أفسد البيع أفسده. (الدر مع الشامي، باب الإجارة الفاسدة، كراچی ٦/ ٤٦، زكريا ٩/ ٦٤)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۹۶۳)

زمین کو کرایہ پر دینے کی چند شکلیں

سوال [۹۶۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ایک شخص نے کسی کو زمین دی اور ان سے مثلاً دس ہزار روپے لئے اور ان سے کہا کہ جب میرے پاس روپیہ ہوجائے گا تو روپیہ دے کر زمین واپس لے لوں گا، تو کیا اس میں بیاج یعنی سود کی صورت پائی جاتی ہے کہ جس کی وجہ سے یہ معاملہ ناجائز اور حرام ہو تو وضاحت فرمائیں؟

(۲) دوسری صورت اس میں یہ ہے کہ ایک شخص نے کسی کو زمین دی اور ان سے مثلاً پانچ ہزار روپیہ لئے اور کہا کہ سالانہ روپیہ کم ہوتا رہے گا اور جب میرے پاس روپیہ ہوگا سالانہ سو روپے کاٹ کر دے دوں گا۔

(۳) تیسری صورت اس میں یہ ہے کہ ایک شخص نے کسی کو زمین دی اور ان سے چار ہزار روپے لئے اور ان سے کہا کہ پانچ سال تک تم زمین اپنے پاس رکھو اس پانچ سال کے اندر کوئی غلہ ہو یا نہ ہو اس کے ہم ذمہ دار نہیں ہوں گے اور تم کو ایک بھی روپیہ نہیں ملے گا۔ اور زمین ہماری خود لوٹ جائے گی، تو کیا مذکورہ تینوں شکلیں یا ان میں سے کوئی ایک شکل صحیح اور درست ہو تو خلاصہ تحریر فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں؟

المستفتی: محمد عارف انصاری محلّہ نئی بستی، قصبہ نرولی، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں ذکر کردہ تینوں شکلوں میں سے اول الذکر دونوں شکلیں ناجائز ہیں اور تیسری شکل جائز اور درست ہے۔

تصح إجارة أرض للزارعة الخ. (الدرالمختار، کتاب الإجارة، باب مایجوز من الإجارة وما یکون خلافا فیها، زکریا ۹/ ۳۹، کراچی ۶/ ۳۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۳۰۹۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/ ۳/ ۱۴۱۳ھ

''کوتو'' اور ''ڈیڑھا'' کا حکم

سوال [۹۶۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ''کوتو'' یعنی زمین والا جو زمین لے رہا ہے، اس سے کہتا ہے کہ تم کو فصل کاٹنے کے بعد مجھے اتنا دینا ہوگا، چاہے اس زمین سے اتنا اُگتا بھی نہ ہو۔ ''ڈیڑھا'' یعنی تم کو میں ایک ہزار روپیہ دے رہا ہوں، چار مہینے یا چھ مہینے کے بعد تم کو پندرہ سو روپیہ دینا ہوگا۔

المستفتی: محمد اطہر بن عبد الجلیل، ارریہ بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) سوال میں کوتا کی جو صورت بیان کی گئی ہے کہ زمین دینے والا زمین دے کر کے کہتا ہے کہ تم کو فصل کٹنے کے بعد مجھے اتنا غلہ دینا ہوگا، چاہے کہیں سے بھی لا کر دو تو یہ مزارعت نہیں؛ بلکہ زمین کو کرایہ پر دینے کا معاملہ ہے؛ لہٰذا اجارہ کے تحت داخل ہو کر شرعاً یہ معاملہ جائز اور درست ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۱/ ۲۹۶، جدید ڈابھیل ۵۵۹/۱۲)

وما صلح أن يكون ثمنا في البيع كالنقود، والمكيل، والموزون صلح أن يكون أجرة في الإجارة، وما لا يصلح ثمنا في البيع صلح أجرة أيضا كالأعيان مثل العبيد والثياب. (عالمگيري، كتاب الإجارة، الباب الأول، جديد زكريا ٤/ ٤٤٢، قديم زكريا ٤/ ٤١٢)

وكل ما صلح ثمنا أي بدلا في البيع صلح أجرة؛ لأنها ثمن المنفعة. (درمختار، كراچی ٦/ ٤، زكريا ٩/ ٥، تاتارخانية، زكريا ١٥/ ١١، رقم: ٢١٩٣٧، شرح المجلة رستم باز، إتحاد ديوبند ١/ ٢٦٠، رقم المادة: ٤٦٣)

(۲) ڈیڑھا کی جو شکل بیان کی گئی ہے کہ ایک ہزار روپئے اس شرط کے ساتھ دینا کہ مثلاً چار

یا چھ مہینے کے بعد پندرہ سوروپئے دینے ہوں گے، تو یہ شکل شرعاً سود ہونے کی وجہ سے ناجائز اورحرام ہے۔اور پانچ سوروپئے جوزائدآرہے ہیں ان کا لینادرست نہیں ہے، وہ حرام ہیں، وہ روپئے مالک کوواپس کرنا ضروری ہے۔

عن فضالة بن عبيد صاحب النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: كل قرض جر منفعة، فهو وجه من وجوه الربا. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، دارالفكر بيروت ٨/ ٢٧٦، رقم: ١١٠٩٢)

كل قرض جر نفعا فهو حرام. (شامي، كراچی ٥/ ١٦٦، زكريا ٧/ ٣٩٥، قواعد الفقه، أشرفي ديو بند/ ١٠٢، رقم: ٢٣٠)

إن أخذه من غير عقد لم يملكه، ويجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء مصري ١/ ١٤٧، هندي ١/ ٣٧، دارالبشائر الإسلاميه بيروت ١/ ٣٥٩، رقم الحديث ٥٩)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۶۱۴/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۴/۲۴ھ

زمین کو ''کٹ بھرنے'' پر دینا

سوال [۹۶۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ''کٹ بھرنا'': یعنی کسی صاحب سے زمین لی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ تم نے مجھ سے زمین لی ہے، تمہارے روپئے میں سے ہر ماہ اتنا کٹتا رہے گا، یہ معاملہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد اطہر بن عبدالجلیل ارریہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: معلوم ہوا ہے کہ ہرمہینہ پیسہ کاٹنے کی قید لگانا بہار میں بھی نہیں ہے؛ بلکہ ہرسال یا ہرفصل میں پیسہ کاٹنے کا رواج ہے؛ لہٰذا اگر مطلب یہ ہے کہ ہرفصل میں مثلاً ایک ہزارروپئے کا ٹٹارہے گا اور دس فصل میں دس ہزارروپئے کا ٹٹارہے گا، تو یہ شرعاً زمین کی کرایہ داری کی شکل ہے، جو جائز ہے اوراس طرح زمین کوایک ایک فصل کے لئے کرایہ پر دینا اجارہ کے دائرہ میں داخل ہوکرشرعاً جائزاوردرست ہے۔(مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۳/ ۳۳۴، جدید ڈابھیل ۲۰/ ۱۲۹)

وشرطها كون الأجرة والمنفعة معلومتين؛ لأن جهالتهما تفضي إلى المنازعة. (شامي، كتاب الإجارة، زكريا ٩/ ٧، كراچى ٦/ ٥، هداية، اشرفي ٣/ ٢٩٣، مختصر القدوري، ص: ١٠٠، هندية زكريا قديم ٤/ ٤١١، جديد ٤/ ٤٤٣)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۶۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۷/ ۴/ ۱۴۲۳ھ

۲ / باب الإجارة الفاسدة

اجارہ میں اجرت کے مجہول ہونے کی شرعی حیثیت

سوال [۹۶۴۶]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زیداور بکر دونوں کی آپس میں دوستی ہے، زید کے پاس تین چار گائے ہیں اور بکر کے پاس نہیں ہیں؛ اس لئے زید بر بنائے دوستی بکر کوایک گائے کی بچی دیتا ہےاور کہتا ہے کہ اس بچی کو کھلا پلا کر بڑی کرو۔ اور جب وہ بڑی ہوکر بچہ دے دیگی تو اس بچہ سے جتنے دن گائے دودھ دے گی اتنے دن تک تم دودھ پیتے رہنا، اس کے بعد جب دودھ دینا چھوڑ دے گی تو اس گائے کو ہمیں واپس کر دینا اور بچہ تم لے لینا، تو اس طریقے سے معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: ابوسالک بردوانی، متعلم شعبہ افتاء جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ معاملہ شرعی طور پر ناجائز اور فاسد ہے؛ اس لئے کہ جانور کی پرورش کی اجرت متعین نہیں ہوئی اور شرعاً اجرت کا معلوم ومتعین ہونا اس قسم کا معاملہ صحیح ہونے کے لئے شرط ہے، نیز یہاں پر اجرت الخدمت مذکورہ جانور کے بعض اجزاء کو قرار دیا گیا ہے۔ اور اس طرح کا معاملہ بنص حدیث قفیز طحان ناجائز ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۴۲، اصلاح الرسوم/ ۱۴۳، فتاوی محمودیہ قدیم ۴/ ۲۶۰، جدید ڈابھیل ۱۶/ ۶۰۲)

عن أبي سعيد الخدري –رضي الله عنه– أن رسول الله ﷺ نهى عن استئجار الأجير حتى يبين له أجره. (مراسيل أبي داؤد/ ١٠)

ومن شرائط الإجارة –إلى قوله– ومنها: أن تكون الأجرة معلومة.

(عالمگيري، كتاب الإجارة، الباب الأول، زكريا قديم ٤/ ٤١١، جديد ٤/ ٤٤١، شامي،

کراچی ٦/ ٥، زکریا ٩/ ٧، هداية اشرفي ديوبند ٣/ ٢٩٣، تاتارخانية، زکریا ١٥/ ٧، رقم: ٢١٩٢٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۲۴۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۱/۶/۴ھ

بلا تعیین اجرت اجیر کی مزدوری کا مسئلہ

سوال [۹۶۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) مرحوم محمد عامر صاحب کا جو کاروبار ہے، اس کو چلانے کے لئے ایک بہنوئی کو مقرر کیا گیا ہے، ماہانہ خرچ پانچ ہزار روپئے بہنوئی اور پانچ ہزار والدہ، والد، بیوی، لڑکی کے خرچ کے لئے دوکان سے لئے جاتے ہیں، یہ چار لوگ مشترکہ ایک ہی گھر میں ہی خرچ کے ساتھ رہتے ہیں، یہ دوکان سے لی ہوئی رقم مشترکہ خرچ کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اور بہنوئی صاحب کو نہ ملازمت پر رکھا گیا ہے اور نہ پاٹنری پر بس تعلقات پر کام کرتے ہیں اور مرحوم کے والد بھی دوکان پر بیٹھے ہیں۔

(۲) اس کاروبار کے نفع ونقصان کے اندر جو کام چلا رہا ہے وہ اور وارثین برابر کے شریک رہیں گے یا نہیں؟

(۳) مرحوم کے استعمال شدہ کپڑوں وغیرہ کا کس طرح استعمال ہوگا مرحوم گھر کے لئے (جو مشترکہ رہائش ہے) جو سامان بازار سے خرید کر لائے اس کا کس طرح استعمال ہوگا۔

(۴) مرحوم کینسر کے مریض تھے، انہوں نے اپنی زندگی میں اپنے بہنوئی اور اپنے خسر سے کہا تھا کہ میری وصیت ہے کہ اپنے والد اور خسر کو عمرہ کے لئے بھیجنا ہے، اس کے لئے مرحوم نے اپنے کاروبار سے دوسو روپئے روز جمع کرنا شروع کر دیئے تھے، انتقال کے وقت تک مبلغ: -/32000 بتیس ہزار روپئے جمع ہوگئے تھے، وہ رقم رکھی ہے، اس کا استعمال کس طرح ہوگا؟

المستفتی: عزیز الرحمٰن شمسی لال بھائی دودھ والے محلّہ پنجابیان، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرحوم محمد عامر کے بہنوئی کو بلا کسی تعیین کے اور بلا کسی تنخواہ کی تعیین یا منافع میں شرکت کی شرط کے یوں ہی دوکان پر بٹھانا یہ شرعاً معاملہ فاسدہ ہے، نیز دوکان میں سے ماہانہ پانچ ہزار روپئے خرچ کے لئے عامر کے گھر والوں کو دینا اور بہنوئی کا اپنے خرچ کے لئے لینا اس فاسد معاملہ کے ساتھ درست نہیں، اس لئے آپس میں بیٹھ کر معاملہ کی صفائی اور کام کرنے کی تعیین ضروری ہے، اس کی دو شکلیں ہوسکتی ہیں: ایک شکل یہ ہے کہ دوکان مع سامان کے محمد عامر کے گھر والوں کی رہے اور بہنوئی کو ماہانہ متعین تنخواہ پر دوکان پر بیٹھنے کے لئے مقرر کیا جائے اور جو تنخواہ مقرر ہوجائے ماہانہ صرف وہی تنخواہ لیا کریں اور بقیہ تمام آمدنی مرحوم کے گھر والوں کا حق رہے۔ اور دوسری شکل یہ ہے کہ دوکان اور سامان مرحوم کے گھر والوں کا رہے اور ان کے بہنوئی پاٹنر کی حیثیت سے دوکان میں کام کریں، مثلاً دوکان اور رأس المال تو مالک کی ملکیت ہوگی اور اس پر جو نفع ہوگا اس کا نصف حصہ یا ثلث حصہ یا ربع حصہ بہنوئی لیا کریں گے اور سارا لین دین اور سارا کام بہنوئی کے ذمہ رکھ دیا جائے اور ان دونوں شکلوں کے علاوہ کوئی اور شکل جائز نہیں۔

ولا يصح حتى تكون المنافع معلومة والأجرة معلومة لما روينا؛ لأن الجهالةفي المعقود عليه، وفي بدله تفضي إلى المنازعة كجهالة الثمن والمثمن في البيع. (هداية، كتاب الإجارة، اشرفي ديوبند ٣/ ٢٩٣، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٥/ ١٠٥، زكريا ٦/ ٧٧، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ١/ ٣١٦، دارالكتاب ديوبند ١/ ٣٠٦)

والأجير الخاص الذي يستحق الأجرة بتسليم نفسه في المدة، وإن لم يعمل. (هداية، باب ضمان الأجير، أشرفي ديوبند ٣/ ٣١٠)

لو كان المال منهما في شركة العنان، والعمل على أحدهما إن شرطا

الـربح على قدر رؤوس أموالهما جاز، ويكون ربحه له ووضيعته عليه، وإن شرطا الربح للعامل أكثر من رأس مالـم يصح جاز على الشرط، ويكون مال الـدافع عند العامل بضاعة. (هـنـدية، كتـاب الشركة، الباب الثالث في شركة العنان، الفصل الثاني، زكريا قديم ٢/ ٣٢٠، جديد ٢/ ٣٢٦)

(٢) جب محمد عامر کا بہنوئی کاروبار میں کسی طرح بھی شریک نہیں ہے، تو اس کے نفع نقصان میں بھی شریک نہ ہوگا، صرف اجرت مثل مل سکتی ہے، مثلاً ان کی اگر پانچ ہزار روپئے ماہانہ تنخواہ ہے، تو ان کو پانچ ہزار روپئے دیئے جائیں گے۔ اور وہ کاروبار اور رأس المال میں وارثین کے ساتھ برابر کا شریک نہ ہوگا۔

والواجب في الإجارة الفاسدة أجر المثل لا يجاوز به المسمى.

(هداية، باب الإجارة الفاسدة، اشرفي ديوبند ٣/ ٣٠١، هندية، زكريا قديم ٤/ ٤٣٩، جديد ٤/ ٤٧٤، درمختار، كراچی ٦/ ٤٥، زكريا ٩/ ٦٢)

(٣) مرحوم کے استعمال شدہ کپڑے اور بازار سے خرید کردہ سامان وغیرہ ترکہ میں شامل ہوکر شرعی ورثاء کے درمیان ان کے حصوں کے بقدر تقسیم ہوگا۔

ثـم يقسم الباقي بين ورثته، أي الذين ثبت إرثهم بالكتاب والسنة.

(درمختار على هامش رد المحتار، كتاب الفرائض، كراچی ٦/ ٧٦١-٧٦٢، زكريا ١٠/ ٤٩٧)

(٤) اگر خسر کے عمرہ کا خرچ مرحوم کی ملکیت کی ایک تہائی یا اس سے کم ہو تو وصیت نافذ ہوگی اور عمرہ کے لئے بھیجنا لازم ہوگا اور باپ کی وصیت میں اگر دوسرے ورثاء بخوشی رضامندی کا اظہار کرتے ہوں، تو وصیت نافذ ہوگی اور اگر دوسرے ورثاء بخوشی رضامندی کا اظہار نہ کریں تو باپ کے حق میں وصیت نافذ نہیں ہوگی۔ اور اگر ایک تہائی سے عمرہ کا خرچ پورا نہیں ہوتا تو عمرہ کے لئے بھیجنا لازم نہیں اور عمرہ کی وصیت نافذ نہ ہوگی۔

ثـم تـصح للأجنبي في الثلث من غير إجازة الورثة، ولا تجوز بما زاد على الثلث. (هداية، كتاب الوصايا، اشرفی ديوبند ٤/ ٦٥٤)

ولا تجوز لوارثه -إلى قوله- إلا أن يجيزها الورثة. (هداية، اشرفي ديو بند ٤/ ٦٥٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍رجب المرجب ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۷۴۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱؍۷؍۱۴۲۳ھ

کم کرایہ پر لے کر زیادہ کرایہ پر دینا

سوال [۹۶۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کسی شخص نے کوئی دوکان یا مکان کم کرایہ پر لیا، پھر وہ کسی سے زیادہ کرایہ لے کر اس کو کرایہ پر دے سکتا ہے یا نہیں؟ ''کتاب الفتاوی'' میں عنوان ہے، کم کرایہ پر لے کر زیادہ کرایہ پر دینا، اس کے ذیل میں صاحب فتاوی نے جواب قائم فرمایا ہے، جواب یہ ہے:
''کہ یہ بات جائز ہے کہ کرایہ دار کرایہ پر حاصل کی ہوئی چیز کسی اور کو کرایہ پر دے، خواہ کرایہ دار پہلے کرایہ دار سے زیادہ ادا کرے یا کم ادا کرے؛ اس لئے جو صورت آپ نے لکھی ہے وہ جائز ہے۔ (کتاب الفتاوی ۵/ ۴۰۰)
''کتاب الفتاوی'' کا یہ جواب شرعاً درست ہے یا نہیں؟ یا اس میں کچھ سقم ہے؟ حضرات فقہاء کرام کی اس عبارت اور اس جیسی عبارتوں کا کیا مطلب ہوگا؟

ولو آجر بأكثر تصدق بالفضل إلا في مسئلتين إذا آجرها بخلاف الجنس أو أصلح فيها شيئا. (الدرالمختار، باب ما يجوز من الإجارة وما يكون خلافا فيها، زكريا ٩/ ٣٨)

وإن آجرها بأكثر مما استأجرها فهي جائزة أيضا إلا أنه إن كانت الأجرة الثانية من جنس الأجرة الأولى، فإن زيادة لا تطيب له ويتصدق بها. الخ (فتاوى عالمگيري ٤/ ٤٢٥)

حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی قدس سرہ نے ایک عنوان ”جتنے کرایہ پر مکان لیا اس سے زائد پر دینا“ کے ذیل میں جواب ارشاد فرمایا ہے، جو صورت آپ چاہتے ہیں کہ یہ تو حدود حرم مبارک سے باہر کسی اور جگہ بھی درست نہیں ہے، جتنی رقم کسی جگہ بھی کرایہ مکان کی ادا کرے اتنی رقم پر دوسرے کو دے سکتے ہیں، اگر اس سے زیادہ رقم لیں گے، تو اس کا صدقہ کردینا ہوگا۔

(فتاویٰ محمودیہ جدید ۱۶/۶۰۴، باب الاجارۃ الفاسدۃ)

ایک دوسرے سوال کے جواب میں حضرت تحریر فرماتے ہیں: یہ نفع لینا درست نہیں اگرچہ سود بھی نہیں۔ (فتاویٰ محمودیہ جدید ۱۶/۶۱۰)

دریافت یہ کرنا ہے کہ ”کتاب الفتاویٰ“ والا جواب درست ہے یا ”فتاویٰ محمودیہ“ کا؟ اور زیادتی کے تصدق کی بات جو فقہاء کرام نے نقل فرمائی ہے، اس کی کیا حیثیت ہے؟ وجوب کی یا استحباب کی یا یہ مسئلہ اختیاری ہے کہ چاہے تو صدقہ کرے یا نہ کرے؟ امید ہے کہ جواب باصواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں گے۔ فقط والسلام

المستفتی: محمد آزاد بیگ قاسمی، خادم التدریس والافتاء معراج العلوم چیتا کیمپ، ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر کرایہ کی اجرت روپئے پیسے کے ذریعہ سے دی جارہی ہے اور کرایہ دار نے دوسرے کرایہ دار کو بھی روپئے پیسے ہی کی اجرت کے عوض میں دیا ہے، تو ایسی صورت میں زیادتی اس کے لئے حلال نہیں ہے۔ اور اگر دوسرے کرایہ دار کو روپئے پیسے کی اجرت کے عوض میں نہیں دیا ہے؛ بلکہ روپئے پیسے کے علاوہ سامان کے عوض میں دیا ہے، تو اضافہ میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ”فتاویٰ محمودیہ“ میں جو لکھا گیا ہے وہی فقہاء کی عبارت سے منطبق ہے اور ”کتاب الفتاویٰ“ میں جو جواب لکھا گیا ہے، اس سے ہر صورت جائز معلوم ہوتی ہے؛ اس لئے ”فتاویٰ محمودیہ“ کی تحریر زیادہ صحیح اور درست ہے، ہاں البتہ روپئے پیسے کے عوض میں زیادہ کرایہ لینے کی گنجائش اس صورت میں بھی ہے کہ جب کرایہ دار نے کرایہ کی عمارت پر کچھ پیسہ خرچ کیا ہو، مثلاً اس کی مرمت کرلی ہو اور اس میں ضروری ترمیم کرکے اس

کی پوتائی وغیرہ کرلی ہو، پھر دوسرے کو کرایہ پر دے تو زیادہ پیسے کے کرایہ پر دینا جائز ہے اور وہ اس کے لئے حلال ہو جائے گا، اس اعتبار سے بھی فتاوی محمودیہ کی تحریر صحیح ہے۔ اور ''کتاب الفتاویٰ'' کی عبارت میں قیود وشرائط کے ذریعہ سے شبہ کو دور کرنا چاہئے اور جہاں زیادتی کے تصدق کی بات کہی گئی ہے، وہ حلت وحرمت کے مسئلہ میں ہے اور حلت وحرمت کے مسئلہ میں جب تصدق کی بات آتی ہے، تو اس میں تصدق واجب ہوا کرتا ہے؛ اس لئے حضرت مفتی محمود صاحبؒ نے تصدق کو واجب لکھا ہے۔ (فتاوی محمودیہ مطبع میرٹھ ۲۵/۴۷۱)

فإن آجر بأكثر مما استأجر به من جنس ذلك ولم يزد في الدار شيئا ولا آجر معه شيئا من ماله آخر من ماله مما يجوز عقد الإجارة عليه لا يطيب له الزيادة. وفي شرح الطحطاوي: ويتصدق به، أما إذا زاد في الدار شيئا بأن جصصها أو طينها، أو ما أشبه ذلك، أو آجر مع ما استأجر شيئا من ماله يجوز أن يعقد عليه عقد الإجارة يطيب له الزيادة، وكذلك إذا آجره بمجلس آخر يطيب له الزيادة. (تاتارخانية ١٥/ ٥٠، رقم: ٢٢١١٥)

ولو آجر بأكثر تصدق بالفضل إلا في مسألتين: إذا آجرها بخلاف الجنس، أو أصلح فيها شيئا (وتحته في الشامة:) أي جنس ما استأجر به، وكذا إذا آجر مع ما استأجر شيئا من ماله يجوز أن تعقد عليه الإجارة، فإنه يطيب له الزيادة كما في الخلاصة، أو أصلح فيها شيئا بأن جصصها أو فعل فيها مسناة، وكذا كل عمل قائم؛ لأن الزيادة بمقابلة ما زاد من عنده حملا لأمره على الصلاح، كما في المبسوط. (شامي، كتاب الإجارة، باب ما يجوز من الإجارة وما يكون خلافا فيها، كراچی ٦/ ٢٩، زكريا ٩/ ٣٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۵۱۴/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۵/۷ھ

مزدوری متعین کئے بغیر ٹھیکہ پر کام کرنے کی اجرت کا حکم

سوال [۹۶۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں زکریا شاہد فرم میں مالک امجد کے پاس ٹھیکیداری پر کام کر رہا تھا اور مزدوری طے نہیں ہوئی تھی، دس دن کے بعد میں نے ۱۵/روپئے فی عدد کا بل دیا، تو مالک امجد نے بل لے کر کہا کہ آپ کام کرتے رہو، میں آپ کا نقصان نہیں ہونے دوں گا، کام ختم ہونے پر مالک امجد نے ۴/روپئے فی عدد کا حساب دیا، جو مجھے نقصان کا باعث بنا اور مجھے زبردستی آفس میں بند کر کے پولیس کی دھمکی دے کر دستخط کروالئے ہیں، اور میرا حساب مزدوری صحیح نہیں دیا، جس سے میں نقصان سے بچ سکتا، میں آپ سے دریافت کر رہا ہوں کہ امجد فرم مالک حج کو جارہا ہے، کیا ایسے موقع پر حج قبول ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: سہیل انور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب آپ نے بلا مزدوری متعین کئے ہوئے ٹھیکیداری پر کام کیا تو یہ معاملہ فاسد ہوا، جس میں مالک امجد پر آپ کو اجرت مثل (آج کل اس کام کی جو مزدوری چل رہی ہے) دینا لازم ہے، اب اگر اس نے آپ کو آپ کا حق المحنت اور آپ کی اجرت نہ دے کر آپ کا جو حق بیٹھتا ہے، اسی پیسہ کو سفر حج میں لگایا ہے، تو اس کا حج قبول نہیں ہوگا؛ لیکن اگر وہ اس کے علاوہ اپنے جائز پیسہ کی کمائی سے حج کرے گا تو اس کا حج قبول نہ ہونے کی بات کہی نہیں جاسکتی اور آپ کا جو حق اس کے اوپر ہے وہ ہمیشہ اس کے سر رہے گا، قیامت کے دن وہ مواخذہ دار ہوگا۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا خرج الرجل حاجا بنفقة طيبة ووضع رجله في الغرز فنادى: لبيک اللهم لبيک ناداه مناد من السماء لبيک وسعديک زادک حلال

وراحلتک حلال وحجک مبرور غير ما زور، وإذا خرج بالنفقة الخبيثة فوضع رجله في الغرز، فنادی لبیک ناداه مناد من السماء لا لبیک ولا سعدیک زادک حرام ونفقتک حرام، وحجک غير مبرور.

(المعجم الأوسط، دارالفكر، بيروت ٤/ ٦٦، رقم الحديث: ٥٢٢٨، الترغيب والترهيب للمنذري ٢/ ١١٣، أنوار مناسك، ص: ٥٤-٥٥)

الإجارة إذا كانت فاسدة وجب أجر المثل. (الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٥/ ١٠١، رقم: ٢٢٣١٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ذیقعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۳۲۲/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۱۱/۲۹ھ

مدت متعینہ تک کام مکمل نہ ہونے پر ہر ہفتہ پانچ سو روپئے واپسی کی شرط کا حکم

سوال [۹۶۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے ایک مکان بنانے کو ٹھیکہ پر دیا ہے، اس طرح سے کہ ٹھیکیدار میرا مکان ایک سال کی مدت میں تیار کردے گا پچاس ہزار روپئے میں، اگر وقت کے مطابق تیار نہیں کیا تو ٹھیکیدار کے ذمہ ہر ہفتہ پانچ سو کے حساب سے واپس کرنے ہوں گے، یہ جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہیں ہے، تو جائز طریقہ اور ایسا حیلہ بتلائے جس سے نہ ٹھیکیدار کو ضرر ہو نہ مکان مالک کو؟ مدلل تحریر فرمائیں۔ فقط

المستفتی: عبدالرحمٰن مظفر نگری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ معاملہ جہالت، مفضی الی المنازعت اور تعلیق بالخطر ہونے کی وجہ سے ناجائز اور فاسد ہے اور اس کے لئے جائز اور متبادل طریقہ یہی ہے کہ

معاملہ طے کرتے وقت اس طرح بات صاف کرلیں کہ اگر ایک سال میں تیار کرے گا تو چالیس ہزار روپئے ملیں گے تو اس طرح متبادل شکل اگرچہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ممنوع ہے، مگر امام ابویوسف، امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک جائز اور درست ہے، اس کی نظیر مسئلہ خیاطت ہے۔

ولو قال: إن خطته اليوم فبدرهم، وإن خطته غدا فبنصف درهم -إلى قوله- وقال أبو يوسف ومحمد: الشرطان جائزان، وفي العناية: ففي أيهما خاط استحق المسمى فيه. (هداية مع فتح القدير، كتاب الإجارة، باب الإجارة على أحد الشرطين، دارالفكر بيروت ٩/ ١٣١، كوئٹه ٨/ ٧٠- ٧١، زكريا ٩/ ١٣٢، ١٣٣، البحر الرائق، كوئٹه ٨/ ٣١، زكريا ٨/ ٥٤، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٥٥٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍ذی قعدہ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۲۲۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶/۱۱/۱۴۱۵ھ

تالاب کو کرائے پر دینا

سوال [۹۶۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: **هل يجوز إجارة البرک والحياض لتنمية الأسماک كما يجري في بنغال؟**

المستفتی: شہید اللہ بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اجارہ کا انعقاد دراصل منافع پر ہوتا ہے نہ کہ عین پر اور تالاب وغیرہ کے اجارہ میں عین کا جو کہ پانی ہے، استہلاک پایا جاتا ہے؛ اس لئے حنفیہ نے

اس کو نا جائز قرار دیا ہے؛ البتہ متأخرین احناف نے تعامل ناس اور عموم بلویٰ کی وجہ سے مچھلی پالن کے تالاب کو مع ان کے حاشیہ کناروں کے جیسا کہ رائج ہے اجارہ پر لینے اور دینے کو جائز قرار دیا ہے۔ اور ''درمختار'' و''عالمگیری'' میں اسی پر فتوی ہے۔

وإن استأجر النهر والقناة مع الماء لم يجز أيضا؛ لأن فيه استهلاك العين أصلا، والفتوى على الجواز لعموم البلوى. (هندية، كتاب الإجارة، الباب الخامس عشر، زكريا قديم ٤/ ٤٤١، جديد ٤/ ٤٧٦)

إجارة الأرض مع الماء أو المرعى يجوز ذلك في الجملة اتفاقا لكن الحنفية لا يجيزون إجارة الآجام والأنهار للسمك ولا المرعى للكلأ قصدا، وإنما يوجر له الأرض فقط، ثم يبيع المالك المستأجر الانتفاع بالكلأ، وذلك لأن الانتفاع بالكلأ لا يكون إلا باستهلاك عينه. (الموسوعة الفقهية بيروت ١/ ٢٧٧)

ولكن جوز الفقهاء العظام المتأخرون من الحنفية إجارة البرك والحياض وغير ذلك مع موضع معلوم لعطن الماشية وسيح الماء والمرعى لصيد السمك وتنميه لعموم البلوى وتعامل الناس، قال الرافعي في تقريراته: فلا يصح إجارة الآجام والحياض لصيد السمك ورفع القصب، وقطع الحطب أو لسقي أرضه أو غنمه، وكذا إجارة المرعى والحيلة في الكل أن يستأجر موضعا معلوما لعطن الماشية وسيح الماء والمرعى. (تقريرات رافعي مع الشامي، كراچی ٥/ ١٤٠، زكريا ٧/ ١٤٠، شامي، مطلب الإجارة إذا وقعت على العين لا تصح كراچی ٦/ ٦٣، زكريا ٩/ ٨٧)

والفتوى عليه كما في الدرالمختار والهندية، وجاز إجارة القناة والنهر مع الماء، وبه يفتى لعموم البلوى. (الدرالمختار على الشامي، زكريا ٩/ ٨٦، كراچی ٦/ ٦٣)

والفتوی علی الجواز لعموم البلوی ولو استأجر أرضا مع الماء تجوز تبعا. (هندية، زكريا قديم ٤/ ٤٤١، جديد ٤/ ٤٧٦)

عن أبي الزناد قال: كتبت إلى عمر بن الخطاب في بحيرة يجتمع فيها السمک بأرض العراق أن نؤاجرها، فكتب إلي أن افعلوا. (البحرالرائق، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، كوئٹه ٦/ ٧٣، زكريا ٦/ ١٢٠، شامي، مطلب في حكم إيجار البرك للاصطياد، زكريا ٧/ ٢٤٩، كراچی ٥/ ٦١)

وكلم الشامي في هذا المقام، ورجحه عدم الجواز نقلا عن قول الإيضاح، ولكن لتعامل الناس وعموم البلوی ينبغي أن يكون هذا الأثر حجة على إجارة البرک والحياض، وأيده عبارة الدرالمختار والهندية، وانظر مزيد الشرح في كتابي المسمى "بأنوار رحمت" ص: ٢٩٢، إلى ٢٩٥. فقط والله سبحانه وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۷۵۶/۳۸)

گائے کا بچہ ادھیا پر دینا

سوال [۹۶۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے گائے کا بچہ کسی کو پالنے کے لئے دیا اور کہا کہ اس وقت اس کی قیمت چار سو روپئے ہے، یہ میرا رہے گا، پھر بڑا ہونے کے بعد جو روپئے میں اضافہ ہوگا، دونوں کے درمیان نصف نصف تقسیم ہوگا، شرعاً اس صورت کا کیا حکم ہے؟ تفصیل کے ساتھ تحریر فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: عبدالحمید بانکوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسا معاملہ کرنا شرعاً درست نہیں ہے، اگر کسی نے ایسا کر رکھا ہے، تو ایسا معاملہ فوری طور پر ختم کرنا لازم ہے اور پالنے والے کو گھاس وغیرہ کی قیمت اور دیکھ ریکھ کی اجرت دے کر جانور واپس لینا لازم ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل، ص: ۱۵۷، فتاوی محمودیہ قدیم ۴/ ۲۶۰، جدید ڈابھیل ۱۶/ ۵۹۵)

دفع رجل بقرة علی أن يعلفها وما يكون من اللبن والسمن بينهما أنصافا، فالإجارة فاسدة، وعلی صاحب البقرة أجر قيامه وقيمة علفه.

(عالمگيري، كتاب الإجارة، الباب الخامس عشر، الفصل الثالث، زكريا قديم ٤/ ٤٤٥، جديد ٤/ ٤٨١، فتاوى قاضي خان، جديد زكريا ٢/ ٢١٠، وعلى هامش الهندية، زكريا ٢/ ٣٣٠، فتاوى بزازية، جديد زكريا ٢/ ٢١-٢٢، وعلى هامش الهندية، زكريا ٥/ ٣٧، تاتارخانية، زكريا ٧/ ٥٠٥، رقم: ١١٠١٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۹۷۴)

جانور کو ادھیا پر دینا

سوال [۹۶۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی بھینس یا بکری وغیرہ کا بچہ کسی کو اس شرط پر دے کہ اس کے بڑا ہونے کے بعد اس کا دودھ، ایسے ہی اگر وہ بیچا جائے تو اس کی قیمت میں دونوں برابر کے شریک ہوں گے، تو کیا یہ صحیح ہے؟

المستفتی: محمد جاوید، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بھینس بکری کا بچہ کسی کو اس شرط پر دینا کہ بڑا ہونے کے بعد اس کا دودھ یا بیچنے کی صورت میں اس کی قیمت میں دونوں برابر کے شریک ہوں گے، اس کو عوام میں ادھیا پر دینا کہا جاتا ہے، جو کہ جائز نہیں ہے، اگر کسی نے ایسا کرلیا ہے تو جس کو دیا گیا ہے وہ اجرت مثل کا مستحق ہوگا اور جانور سے پیدا ہونے والا دودھ بچہ وغیرہ سب چیزیں مالک ہی کی ملکیت ہوں گی۔

دفع بقرة إلى رجل على أن يعلفها وما يكون من اللبن والسمن بينهما أنصافا، فالإجارة فاسدة، وعلى صاحب البقرة للرجل أجر قيامه وقيمة علفه إن علفها من علف هو ملكه لا ماسرحها في المرعى، ويرد كل اللبن. (عالمگيري، كتاب الإجارة، الباب الخامس عشر، الفصل الثالث، زكريا قديم ٣/ ٤٤٥، جديد ٤/ ٤٨١، فتاوى قاضي خان، جديد زكريا ٢/ ٢١٠، وعلى هامش الهندية، زكريا ٢/ ٣٣٠، فتاوى بزازية، جديد زكريا ٢/ ٢١-٢٢، وعلى هامش الهندية، زكريا ٥/ ٣٧)

إذا دفع البقرة إلى إنسان بالعلف ليكون الحادث بينهما نصفان فما حدث فهو لصاحب البقرة، ولذلك الرجل مثل علفه الذي علفها، وأجر مثله لمن قام عليها. (تاتارخانية، زكريا ٧/ ٥٠٥، رقم: ١١٠١٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۱۲۴/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۵/۱۹ھ

ادھیا پر جانور دینے کے ناجائز ہونے کی علت

سوال [۹۶۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مادہ جانوروں کو اگر کوئی شخص ادھیا پر دے تو اس کے ناجائز ہونے کی اصل علت کیا ہے،

جس کی وجہ سے ادھیا پر دینا جائز نہیں ہے، نیز مزارعت کے اندر اگر ایک شخص کی جانب سے زمین ہو اور باقی تمام کام (ہل، بیل، بیج وغیرہ) عامل کی جانب سے ہو تو یہ بھی ناجائز ہونا چاہئے؟ تمام مسئلہ دلائل سے واضح کریں۔ بینوا توجروا

المستفتی: صغیرالدین جامعہ ہٰذا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مادہ جانور کو ادھیا پر دینے کی صورت میں جو کچھ دیکھ ریکھ کرنے والے کو دودھ یا پیدا ہونے والے بچوں کی شکل میں ملتا ہے، یہ گویا کہ اس کے عمل ''دیکھ ریکھ اور چارہ'' وغیرہ کی اجرت ہے اور اجارہ میں مدت اجارہ اور اجرت ومنفعت کا متعین ہونا ضروری ہے، اگر مدت اجارہ یا اجرت ومنفعت متعین نہ ہو تو ایسا عقد شرعاً فاسد ہوتا ہے اور عقد فاسد جائز نہیں ہے۔ اور مادہ جانور کو ادھیا پر دینے کی صورت میں یہ سب چیزیں متعین نہیں ہوتیں، اسی بنا پر ادھیا کا معاملہ جائز نہیں ہے۔

ولا يصح أي الإجارة حتى تكون المنافع معلومة؛ لأن الجهالة في المعقود عليه، وفي بدله تفضي إلى المنازعة. (هداية، كتاب الإجارة، أشرفی ديوبند ٣/ ٢٩٣، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٥/ ١٠٥، زكريا ديوبند ٦/ ٧٧، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ١/ ٣١٦، دارالكتاب ديو بند ١/ ٣٠٦)

مزارعت میں بیج انسان اپنے ہاتھ سے بوتا ہے اور ادھیا کے معاملہ میں جانور کے بیج (مادہ منویہ) میں انسان کا کوئی دخل نہیں ہے؛ بلکہ اس میں جانوروں کا آپس کا دخل ہے، اسی طرح نر اور مادہ جانور کے مجانست کرنے کے بعد بچہ مادہ جانور کے پیٹ میں آچکا ہے یا نہیں؟ اس کا علم انسان کو نہیں ہوتا؛ بلکہ یہ سب خدا کے علم میں ہے اور مادہ جانور کے پیٹ میں جو بچہ پرورش پاتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی نگرانی میں پرورش پاتا ہے، انسان اور انسان کا کوئی دخل اور اختیار اس میں نہیں ہوتا، اس طرح ادھیا کے معاملہ میں ہر چیز غیر معلوم اور غیر متعین ہے۔ اور

زمین میں بیج بونے اور پھر پودا اگنے، اس کے بعد کھاد اوراس کی ہرطرح کی حفاظت سب کچھ انسان کی نگرانی میں ہوتا ہے، اس طرح مزارعت میں ہر چیز معلوم ومتعین ہے؛ اس لئے ادھیا کے معاملہ اور مزارعت کے معاملہ کے درمیان کوئی مناسبت نہیں ؛ لہٰذا ادھیا کے معاملہ کو معاملۂ مزارعت پر قیاس کرنا درست نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ رجب المرجب ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۳۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲؍ ۷؍ ۱۴۲۲ھ

ادھیا پر دیئے گئے جانور کے جواز کی شکل

سوال [۹۶۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے عمر کو ایک چھوٹا سا مادہ جانور گائے کا بچہ دیا کہ تم اس کی پرورش کرو، جب اس کا بچہ پیدا ہوگا تو وہ ہم دونوں میں مشترک ہوگا، مجھے کبھی کبھار تھوڑا بہت دودھ پینے کے لئے دینا اور اخیر میں جب چاہوں گا اپنا اصل جانور واپس لے لوں گا، تو کیا یہ معاملہ شرعاً جائز ہے؟ اگر جائز نہیں ہے تو اس کے جواز کی کوئی صورت بتلا دیں نوازش ہوگی؛ کیوں کہ علاقہ میں اس کا بہت رواج ہو چکا ہے۔ فقط والسلام

المستفتی: قاری ارشاد احمد جامع مسجد بہیڑی نل پورہ، بریلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: زید کا عمر کو مادہ جانور پرورش کے لئے اس شرط پر دینا کہ جب اس کا بچہ پیدا ہوگا، تو وہ دونوں کے درمیان مشترک ہوگا اور مجھے کبھی کبھار تھوڑا بہت دودھ پینے کے لئے دینا شرعی طور پر اس طرح کا معاملہ ناجائز اور فاسد ہے؛ البتہ اس کے جواز کی یہ شکل ہوسکتی ہے کہ مالک اس جانور کی مناسب قیمت لگا کر نصف حصہ پرورش کرنے والے کے ہاتھ فروخت کردے، پھر اس کی قیمت معاف کردے، تو ایسی صورت میں جانور

دونوں کے درمیان مشترک ہوگا اوراس کا بچہ اور دودھ بھی دونوں کے درمیان آدھا آدھا ہوگا اور پرورش کرنے والے نے جو چارہ کھلایا ہے، اس کی نصف اجرت جو مالک پر لازم ہوئی پرورش کرنے والا اس کو معاف کردے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر/ ۱۱۵، فتاوی محمودیہ قدیم ۴/ ۲۶۰، ۱۲/ ۴۰۵، جدید ڈابھیل ۱۶/ ۵۹۵، ۵۹۹، بہشتی زیور ۵/ ۵۰)

دفع بقرة إلى رجل على أن يعلفها وما يكون من اللبن والسمن بينهما أنصافا، فالإجارة فاسدة، والحيلة في جوازه أن يبيع نصف البقرة منه بثمن يبرئه عنه، ثم يأمر باتخاذ اللبن والمصل، فيكون بينهما. (عالمگيري، كتاب الإجارة، الباب الخامس عشر، الفصل الثالث، زكريا قديم ٤/ ٤٤٥، جديد ٤/ ٤٨١، فتاوى قاضي خان، جديد زكريا ٢/ ٢١٠، وعلى هامش الهندية، زكريا ٢/ ٣٣٠، فتاوى بزازية، جديد زكريا ٢/ ٢١-٢٢، وعلى هامش الهندية، زكريا ٥/ ٣٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۷۱۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۶/۲۴ھ

گابھن کرانے کی اجرت لینا

سوال [۹۶۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک صاحب کے یہاں بھینسہ ہے، وہ اس سے بھینس گابھن کراتے ہیں اوراس کی اجرت بھی لیتے ہیں، کیا اس کام کی اجرت لینا اور پیشہ کے طور پر یہ کام کرانا جائز ہے؟

المستفتی: قاری تسلیم احمد، مدرسہ انوار العلوم کرت پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس کی اجرت ناجائز اور حرام ہے۔

عن ابن عمر –رضي الله عنه– قال: نهى النبي صلى الله عليه وسلم

عن عسب الفحل. (صحيح بخاري، كتاب الإجارات، باب عسب الفحل ١/ ٣٠٥، رقم: ٢٢٢٩، ف: ٢٢٨٤، سنن الترمذي، البيوع، باب ماجاء في كراهية عسب الفحل، النسخة الهندية ١/ ٢٤٠، دارالسلام، رقم: ١٢٧٣)

ولا يجوز أجرة عسب التيس. (هداية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، اشرفی دیوبند ٣/ ٣٠٣، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ١/ ٣٢٧، دارالكتاب ديوبند ١/ ٣١٧، بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ١٧، شامي، كراچى ٦/ ٥٥، زكريا ٩/ ٧٥)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍شوال المکرّم ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۷-۳۶۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۱۰/۱۴۱۴ھ

گائے، بھینس جفتی کرانے کی اجرت لینا

سوال [۹۶۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے علاقہ میں بھینس اور گائے کی جفتی اجرت پر کراتے ہیں اور بغیر اجرت کے جفتی کرانے پر بھینسہ اور سانڈ والے راضی نہیں ہوتے ہیں، اس صورت حال میں کیا کرنا چاہئے؟

المستفتی: محمد علی رامپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جانور کی جفتی کرانے پر اجرت کا لینا دینا دونوں ناجائز ہے۔ حدیث شریف میں اس کی ممانعت آئی ہے۔

عن ابن عمر -رضي الله عنه- قال: نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن عسب الفحل. (صحيح بخاري، كتاب الإجارات، باب عسب الفحل ١/ ٣٠٥،

رقم: ۲۲۲۹، ف: ۲۲۸٤، سنن الترمذي، البيوع، باب ماجاء في كراهية عسب الفحل، النسخة الهندية ١/ ٢٤٠، دارالسلام، رقم: ١٢٧٣)

ولا تصح الإجارة لعسب التيس: وهو نزوه على الإناث، وفي الشامية: لأنه عمل لا يقدر وهو الإحبال. (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، مطلب في الاستئجار على المعاصي، كراچی ٦/ ٥٥، زكريا ٩/ ٧٥، بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ١٧، هداية، اشرفی ديوبند ٣/ ٣٠٣، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ١/ ٣٢٧، دارالكتاب ديوبند ١/ ٣١٧)

البتہ اگر نر جانور کا مالک بلا قیمت کسی بھی طرح سے تیار نہیں ہے،تو مادہ کے مالک کے لئے قیمت دے کر جفتی کروانا جائز ہے؛ لیکن نر کے مالک کے لئے وہ اجرت کسی بھی طرح سے حلال اور جائز نہیں ہے۔ اور مادہ کا مالک اس صورت میں گنہگار نہیں ہوگا، گنہگار صرف نر کا مالک ہوگا۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۱۰/ ۲۶۸، جدید زکریا ۹/ ۳۰۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ ر رجب ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۲۲/۷۷۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/۷/۱۴۲۳ھ

کمپنی کا اپنی تجارت کوفروغ دینے کے لئے ممبر در ممبر بنانا

سوال [۹۶۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: R.M.P. نام کی ایک تجارتی کمپنی ہے، جو اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لئے واسطہ در واسطہ ممبرس بناتی ہے، کمپنی اپنے ممبروں کو اپنے اپنے سلسلے کے تحت توسط در توسط بنائے ہوئے ہر ایک نئے ممبر کے حساب سے سلسلہ کے اوپر والے ہر ممبر کو -/500 کی مقدار میں اجرت دیتی ہے، اس طرح اجرت دینے کا یہ سلسلہ ہر ممبر کے نیچے دونوں جانب بنائے ہوئے

عموماً آٹھ ممبروں تک چلتا ہے،اس کے بعد دائیں اور بائیں دونوں جانب دو جوڑے ممبرس بنانے پر -/2000، چار جوڑے ممبر بنانے پر -/4000 اورابتدائی دو ممبرس بنانے والے کو ایک ہزار روپئے ملیں گے، نیز کسی بھی سلسلہ کا کوئی ممبر اپنے دونوں جانب ایک ایک سو کر کے دو سو ممبرس بنا کر اگر ایک لاکھ روپئے کما لے تو اس کے بعد ہر مہینہ میں آٹھ ممبرس بنانے پر مزید -/3000 روپئے بطور انعام ملتے رہیں گے، اسی طرح سلسلہ وار ممبرس بناتے ہوئے اگر کوئی دونوں جانب سے پانچ سو ممبرس بنا کر -/2,50,000 کما لے تو ہر مہینہ بارہ ممبرس بنانے کی شرط پر -/6000 روپئے مزید ملتے رہیں گے اور ہر ممبر پر الگ سے -/500 روپئے ملتے رہیں گے، اس طرح ممبرس بنانے والوں کو تجارتی منافع سے ایک بڑی رقم مل جاتی ہے، اس میں کسی کا حق نہیں مارا جاتا ہے، شرط اس میں یہ ہوتی ہے کہ ہر ایک ممبر نیچے تک دو دو ممبر بنائیں، جب تک دو ممبر نہ ہوں اس وقت تک اجرت نہیں ملتی، اس لئے اوپر والے ممبروں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہر ایک ممبر دو دو ممبر بنائیں، اس میں یہ شرط بھی ہوتی ہے کہ نیچے والے ممبرس نیا ممبر بنانے میں مدد کے لئے اس کے سلسلے کے اوپر والے ممبرس کو کسی بھی وقت بلا سکتے ہیں، ایسی صورت میں اوپر والے ممبرس کو حاضر ہونا ضروری ہے، ورنہ شکایت ہونے پر ممبر شپ ختم ہوسکتی ہے، اسی طرح اوپر والے نیچے والوں کو بلا سکتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسی کمپنی میں شرکت کرنا اور توسط در توسط ممبرس بنا کر ہر ایک ممبر کے حساب سے اجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟ ممبر بننے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس کمپنی سے کم از کم -/7000 روپئے کا مال خریدنا ضروری ہے، بعض کا کہنا ہے کہ پہلے جس کو ممبر بنائے اس کی اجرت جائز ہے، نیچے والوں کے توسط سے اجرت لینا جائز نہیں ہے، تو کہا جاتا ہے کہ نیچے والوں کے ممبر بنانے میں اوپر والوں کو ساتھ رہنا پڑتا ہے اور سمجھانا پڑتا ہے، اسی لئے تو کمپنی ان کو برضا ورغبت اجرت دیتی ہے اگر چہ نیچے والے ہر ایک ممبر کی مدد کے لئے حاضری

ضروری نہیں ہوتی؛ لیکن قوی امکان ہے، جیسے فوجی والے ہیں کہ ان کو ہر مہینہ میں کام کی نوبت نہیں آتی، پھر بھی تنخواہ ملتی ہے، تو پھر کمپنی اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لئے اپنے ممبروں کی امکانی مدد کے پیش نظر جو بسا اوقات واقعی صورت اختیار کرتی ہے، اجرت دیتی ہو تو یہ کیوں جائز نہیں؟ بالتفصیل مدلل جواب سے نوازیں۔

اگر ایسی کمپنیوں میں شرکت کرنا یا ممبر بننا جائز نہ ہو تو ممبروں سے اس کمپنی کا مال ذاتی استعمال کے لئے خریدنا ﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ [المائدة: ۲] کے زمرہ میں تو نہیں آئے گا؟ نیز جائز نہ ہو تو اس کی متبادل صورت کیا ہو سکتی ہے؟

سوال: موجودہ دور میں حالات کے پیش نظر مسلم بچیوں کے لئے عصری تعلیم کا حصول ضروری سمجھا جانے لگا ہے، ایسی صورت میں عوام کے لئے علماء بھی حتی المقدور پردہ کا لحاظ کرتے ہوئے سرکاری اسکولوں، کالجوں میں اپنی بچیوں کو عصری تعلیم دلائیں تو از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟ نیز راستہ میں آنے جانے کی سہولت اور اپنی تحفظ کی خاطر بچیاں سائیکل یا موٹر سائیکل استعمال کریں تو شریعت مطہرہ میں اس کی گنجائش ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد مسعود کریم مرشد آبادی، خادم التدریس والافتاء فی الجامعہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ کی تفصیل کے مطابق جب کوئی شخص کمپنی کا ممبر بنتا ہے اور وہ ممبر پھر کسی دوسرے شخص کو ممبر بناتا ہے، تو دوسرے شخص کو کمپنی کا ممبر بنانے میں چونکہ پہلے ممبر کا دخل ہے، اس لئے دوسرے شخص کو ممبر بنانے کی اجرت لینا تو جائز ہے؛ البتہ جب یہ دوسرا ممبر کسی تیسرے شخص کو ممبر بنائے گا تو اس تیسرے شخص کو ممبر بنانے میں پہلے ممبر کا کوئی عمل شامل نہیں ہے؛ اس لئے تیسرے ممبر کے نتیجہ میں پہلے ممبر کو جو اجرت ملتی ہے وہ جائز نہیں ہے، تاہم سوال نامہ سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ جب دوسرا شخص کسی تیسرے کو ممبر بناتا ہے تو تیسرے شخص کو ممبر بنانے میں پہلے ممبر سے مدد لینی پڑتی ہے اور کمپنی پہلے ممبر کو اسی

مدد کا عوض دیتی ہے، تو یہاں تک اس پہلے ممبر کی اجرت کو بھی جائز کہا جا سکتا ہے؛ لیکن جب تیسرا ممبر کسی چوتھے شخص کو ممبر بنائے گا تو اس کو سمجھانے کے لئے دوسرے ممبر کی ضرورت تو ہو سکتی ہے؛ لیکن پہلے ممبر کی اس میں کوئی ضرورت نہیں؛ اس لئے پہلے ممبر کو اجرت دینا جائز نہ ہوگا۔ اور کمپنی کا یہ طریقہ یکے بعد دیگرے یوں ہی چلتا رہتا ہے؛ اس لئے کمپنی کا طریقۂ کار مجموعی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ اور ایسی کمپنیوں میں شرکت کرنا اور اس کا ممبر بننا جائز نہیں ہے؛ البتہ اس کمپنی کا کوئی سامان ممبر بنے بغیر ذاتی استعمال کے لئے خریدنا بلا شبہ جائز اور درست ہے۔

عن الحكم وحماد عن إبراهيم وابن سيرين قالوا: لا بأس بأجر السمسار إذا اشترى يدا بيد. (المصنف لابن أبي شيبة، موسسة علوم القرآن، بيروت ١١/ ٣٣٩، رقم: ٢٢٥٠٠)

سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن كان في الأصل فاسدا لكثرة التعامل. (شامي، كتاب الإجارة، مطلب في أجرة الدلال، كراچی ٦/ ٦٣، زكريا ٩/ ٨٧، تاتارخانية، زكريا ١٥/ ١٣٧، رقم: ٢٢٤٦٢)

لا يجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي. (شامي، كتاب الحدود، مطلب في التعزير بأخذ المال، كراچی ٤/ ٦١، زكريا ٦/ ١٠٦، البحر الرائق، كوئٹه ٥/ ٤١، زكريا ٥/ ٦٨، الموسوعة الفقهية ٢١/ ١١٢، قواعد الفقه، أشرفي ديوبند/ ١١٠، رقم: ٢٦٩)

والحاصل: أن جواز البيع يدور مع حل الانتفاع. (شامي، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، كراچی ٥/ ٦٩، زكريا ٧/ ٢٦٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ شعبان ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۱۶۹)

''ایم وے'' کمپنی کی اسکیم کا حکم

سوال [۹۶۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج کل کمپنی والے تجارت کا جونیٹورک طریقہ اختیار کیے ہوئے ہیں، اس کا حکم کیا ہے؟ جس کی تفصیل یہ ہے: طریقہ کی تفصیل لکھنے سے پہلے کمپنی کا مختصر تعارف عرض خدمت ہے، اس کمپنی کا نام ''ایم وے'' ہے، یہ کمپنی امریکہ میں ہے، اس کے مالکان مذہباً عیسائی ہیں اور جیسا کہ اس کمپنی کے پرچار کرنے والوں کا کہنا ہے کہ یہ کمپنی کوئی ناجائز اور حرام اشیاء جیسے شراب وغیرہ نہیں بناتی، سامانوں کی فہرست بھی روانہ خدمت ہے اور یہ فہرست کمپنی کے پرچار کرنے والوں سے حاصل کی گئی ہے، یہ فہرست واقعتاً صحیح ہے یا نہیں؟ اور ان کے علاوہ کوئی ناجائز اشیاء کمپنی بناتی ہے یا نہیں؟ اس کی صحیح تحقیق خیلے دشوار است۔ طریقہ تجارت ملاحظہ ہو:

سب سے پہلے زید -/4400 روپئے کمپنی میں داخل کر کے کمپنی کا ممبر بنے گا، مذکورہ رقم داخل کرنے کے بعد کمپنی زید کو ایک کٹ دے گی، جس میں مذکورہ کمپنی ہی کا تیار کردہ عام استعمالی سامان جیسے صابن صرف وغیرہ -/2600 روپئے کا ہوگا، جو جمع کردہ -/4400 روپئے کے عوض میں ملے گا، جیسا کہ پرچار کنندہ کا کہنا ہے کہ کمپنی مذکورہ اشیاء اسی وجہ سے دیتی ہے، تا کہ ممبر پہلے خود ان اشیاء کو استعمال کر کے تجربہ کرلے کہ واقعتاً ''ایم وے'' کمپنی کا سامان دوسری کمپنیوں کے مقابلہ میں فضیلت رکھتا ہے یا نہیں؟ تا کہ دوسرے کو سمجھانے میں غلط بیانی سے کام نہ لے۔ اور بقیہ -/1800 روپئے اتنا کمپنی اپنے پاس جمع رکھ لیتی ہے، اب زید کمپنی کا ایک فرد یعنی ممبر بن گیا، اب زید کو دو فائدہ حاصل ہوگا: اول یہ ہے کہ اب جو بھی سامان زید کمپنی سے خریدے گا اس کو دوسروں کے مقابلہ میں ڈسکاؤنٹ ملے گا۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ زید عمر بکر خالد کو مذکورہ کمپنی کی تیار کردہ اشیاء کی خصوصیت سمجھا کر عمر بکر خالد کو کمپنی کا ممبر بنا دیا، ممبر بننے کی صورت وہی ہے جس طریقہ پر زید ممبر بنا تھا، مذکورہ

شخصوں کو ممبر بنانے کی وجہ سے کمپنی زید کو کچھ رقم بطور کمیشن دے گی، اسی طریقہ سے زید جتنے شخصوں کو ممبر بناتا رہے گا زید کو اس کا کمیشن ملتا رہے گا، اب جو لوگ زید کے سمجھانے سے ممبر بنے ہیں، وہ بھی مذکورہ دونوں فائدوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، یعنی اب وہ بھی کمپنی سے کوئی سامان خریدیں گے تو ان لوگوں کو بھی ڈسکاؤنٹ ملے گا۔ اور یہ عمر بکر اور خالد اگر کسی دوسرے شخص کو کمپنی کا ممبر بنا دیں تو کمپنی ان لوگوں کو بھی کمیشن دے گی، ساتھ ساتھ اس میں سے زید کو بھی کچھ کمیشن ملے گا۔ یہ سلسلہ جتنے نیچے تک چلا جائے ہر اوپر والے کو کمیشن ملے گا ہی، ساتھ ساتھ زید کو بھی اس کا کمیشن ملے گا، تو اس طرح لا متناہی کمیشن کے لالچ میں اگر ہر شخص جو کمپنی کا ممبر بنتا ہے، وہ دوسروں کو کمپنی کا ممبر بنانے کی فکر میں لگ جاتا ہے، تو اس صورت حال میں کمپنی کا ممبر بننا اور دوسروں کو ممبر بنا کر فائدہ حاصل کرنا از روئے شرع کہاں تک درست ہے؟

نوٹ: اگر زید کمپنی کے طریقہ کے مطابق کام کر لے تو وہ اپنی رقم واپس بھی لے سکتا ہے، پوری رقم اس کو واپس مل جائے گی۔

المستفتی: محمد ابرار، مدرسہ جامع العلوم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ''ایم وے'' کمپنی کی اسکیم کے متعلق متعدد استفتاء ہمارے دارالافتاء میں آئے، مذکورہ استفتاء بھی اسی کمپنی سے متعلق ہے۔ اور سوال نامہ میں کمپنی کی اسکیم کی پوری تفصیل ذکر نہیں کی ہے، سوال نامہ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ دو چیزیں حد جواز کے دائرہ میں داخل ہیں: (۱) ۴۴ رسو روپئے جمع کر کے کٹ صابن صرف وغیرہ جو ممبر کو ملے گا اس کا لینا جائز ہے۔ (۲) وہ شخص براہ راست ممبر بن کر جن لوگوں کو ممبر بنائے گا، اس ممبر سازی کی اجرت اس کے لئے لینا جائز ہے اور کمپنی کے لئے دینا بھی جائز ہے؛ کیوں کہ یہ دلالی کی اجرت ہے، جو جائز ہے۔

عن الحكم وحماد عن إبراهيم وابن سيرين قالوا: لا بأس بأجر

السمسار إذا اشترى يدا بيد. (المصنف لابن أبي شيبة، موسسة علوم القرآن، بيروت ١١/ ٣٣٩، رقم: ٢٢٥٠٠)

وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل، وفي الحاوي: سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن كان في الأصل فاسدا لكثرة التعامل، وكثير من هذا غير جائز، فجوزوه لحاجة الناس إليه. (شامي، كتاب الإجارة، مطلب في أجرة الدلال، کراچی ٦/ ٦٣، زكريا ٩/ ٨٧، تاتارخانية، زكريا ١٥/ ١٣٧، رقم: ٢٢٤٦٢)

ان کے علاوہ کمپنی نے اسکیم کے جتنے پہلو بتائے ہیں، وہ سب ناجائز ہیں اور وہ یہ ہیں کہ پہلا ممبر جن لوگوں کو براہ راست ممبر نہیں بناتا ہے۔ اور دوسرے ممبروں کی کارکردگی میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، تو دوسروں کی کارکردگی میں شرعی طور پر وہ نفع کا مستحق نہیں ہوسکتا ہے، اس کے علاوہ ایم وے کمپنی کی دوسری ناجائز شرطیں ہیں، جو اس سوال نامہ میں مذکور نہیں ہیں، اس قسم کی کمپنی میں ممبر بننا اور دوسروں کو بھی ممبر بنانا جائز نہیں ہے۔

لا يجوز لأحد أن يأخذ مال أحد بغير سبب شرعي. (قواعد الفقه، أشرفي ديوبند/ ١١٠، رقم: ٢٦٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍شوال ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۱۷۹/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۱۱/۳ھ

''ہیلوانڈیا'' کا ممبر بننا

سوال [۹۶۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک کمپنی جس کا نام ''ہیلوانڈیا'' ہے، اس کمپنی کا جو شخص بھی ممبر بنے اس کو پچیس سو روپئے جمع کرنے ہوتے ہیں، جس کے بدلہ میں کمپنی اس شخص کو ایک بیگ دے

گی، جس کی قیمت تقریباً چار سو روپئے ہوتی ہے، اور اس کے ساتھ کمپنی کے پچیس سو کو پن ہوتے ہیں، ان کو پن کو استعمال کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کمپنی نے کچھ دوسری کمپنیوں سے بات کر رکھی ہے، مثلاً اگر کسی کو موبائل لینا ہے، تو بازار میں اس کی قیمت اگر چھ ہزار روپئے ہے تو جس کے پاس کوپن ہے اور جو ''ہیلوانڈیا'' کمپنی کا ممبر ہے، اس کو یہ چھوٹ ملے گی کہ پانچ ہزار روپئے نقد اور بقیہ ہزار کوپن دے دے، تو اس کو موبائل مل جائے گا، یعنی ایک ہزار روپئے کا اس کو فائدہ ہوا، اسی طرح وہ بقیہ پندرہ سو کوپن کر کے فائدہ حاصل کرسکتا ہے؛ لیکن اس میں اصل کمائی یہ ہے کہ جو شخص ''ہیلوانڈیا'' کمپنی کا ممبر بنا وہ اپنے نیچے دو ممبر بنائے، تو اس کو پہلے ممبر سے پانچ سو روپئے اور دوسرے ممبر سے پانچ سو روپئے کمپنی کی طرف سے ملیں گے، خیال رہے کہ وہ دو ممبر بھی ڈھائی ہزار روپئے جمع کر کے ممبر بنیں گے، اب اگر وہ دونوں ممبر بھی اپنے اپنے نیچے دو دو ممبر بنائیں تو ان کو بھی پانچ پانچ سو روپئے ملیں گے۔ اور جو اوپر والا پہلا ممبر تھا اس کو انہیں ممبران سے تین تین سو روپئے ملیں گے، اب اگر یہ لائن جتنی زیادہ لمبی ہوگی اتنا ہی اس سے فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے، اور جس نے ڈھائی ہزار روپئے لگائے تھے، اگر اس کے ممبر زیادہ ہوتے رہے تو اس کی قیمت بڑھتی رہے گی اور کمپنی ہر ماہ اتنی رقم دیتی رہے گی، جتنے اس نے ممبر بنائے ہیں اول ممبران سے پانچ پانچ سو روپئے ملیں گے، اس کے بعد دس ممبروں سے تین تین سو روپئے ملیں گے، جب گیارھواں ممبر بنے گا تو چار سو روپئے ملیں گے، وہ شخص ممبر بنانے میں کافی محنت کر رہا ہے اور دوسروں کو ممبر بنانے کی ترغیب دیتا ہے، جس طرح کاروبار میں محنت کی جاتی ہے، اسی طرح اس کام میں محنت کر رہا ہے، اب اس سے جو رقم حاصل ہو رہی ہے، اس کا استعمال کرنا کیسا ہے۔

المستفتی: محمود الحق قصبہ محمدی لکھیم پور کھیری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ اور اس سے منسلک پرچہ کو بار بار پڑھنے کے

بعد اس میں سے تین چیزیں حد جواز کے دائرہ میں سمجھ میں آئیں۔ (۱) ۲۵/ سو روپئے جمع کرنے کے بعد ممبر کو جو بیگ کو پن قلم اور پیڈ ملے گا، اس کا لینا جائز ہے۔

(۲) کمپنی چھ ہزار کا موبائل ممبر کو ۵/ ہزار روپئے اور ایک ہزار کو پن کے عوض دیتی ہے، یہ شکل بھی جائز ہے، گویا کہ کمپنی کے نزدیک ایک ہزار کو پن کی حیثیت ایک ہزار روپئے کی ہے۔

(۳) وہ شخص براہ راست ممبر بن کر جن لوگوں کو ممبر بنائے گا، اس ممبر سازی کی اجرت اس کے لئے لینا جائز ہے اور کمپنی کے لئے دینا بھی جائز ہے؛ کیوں کہ یہ دلالی کی اجرت ہے، جو جائز ہے۔

عن الحكم وحماد عن إبراهيم وابن سيرين قالوا: لا بأس بأجر السمسار إذا اشترى يدا بيد. (المصنف لابن أبي شيبة، موسسة علوم القرآن، بيروت ۱۱/ ۳۳۹، رقم: ۲۲۵۰۰)

وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل، وفي الحاوي: سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن كان في الأصل فاسدا لكثرة التعامل، وكثير من هذا غير جائز، فجوزوه لحاجة الناس إليه. (شامي، كتاب الإجارة، مطلب في أجرة الدلال، كراچی ٦/ ٦٣، زكريا ۹/ ۸۷، تاتارخانية، زكريا ۱۵/ ۱۳۷، رقم: ۲۲٤٦۲)

ان کے علاوہ سوال اور منسلک پرچہ میں جتنے پہلو بتائے گئے ہیں، وہ سب ناجائز ہیں، ان میں ایک پہلو یہ ہے کہ اگر کسی ممبر کا کسی حادثہ میں انتقال ہو جائے تو کمپنی ایک لاکھ روپئے دے گی، یہ لائف انشورنس کی طرح سود اور قمار دونوں کی شکل پائے جانے کی وجہ سے ناجائز ہے اور حرام ہے۔

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [البقرة: ۲۷۵]

دوسرا پہلو یہ ہے کہ پہلا ممبر جن لوگوں کو براہ راست ممبر نہیں بناتا ہے اور دوسرے ممبروں کی کارکردگی میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، تو دوسروں کی کارکردگی میں شرعی طور پر وہ نفع کا مستحق نہیں ہوسکتا ہے، ایک تیسرا پہلو یہ ہے کہ اگر پہلا ممبر ١٥/ دن کے اندر ٥/ ممبر بناتا ہے اور اس ممبر نے جس دوسرے کو ممبر بنایا ہے، وہ دوسرا ممبر بھی ١٥/ دن کے اندر ١٠/ ممبر بنادے تو پہلے ممبر کو ایک ہزار روپئے یا ایک کیمرہ ملے گا یہ شکل بھی جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ اس میں بھی دوسرے کی کارکردگی اور عمل پر نفع کی شرط ہے؛ اس لئے اس قسم کی کمپنی میں ممبر بننا اور دوسروں کو بھی ممبر بنانا جائز نہیں ہے۔

لا يجوز لأحد أن يأخذ مال أحد بغير سبب شرعي. (قواعد الفقه، أشرفي ديوبند/ ١١٠، رقم: ٢٦٩، الموسوعة الفقهية ٢١/ ١١٢، هندية، زكريا ٢/ ١٦٧، جديد ٢/ ١٨١، البحرالرائق، كوئٹه ٥/ ٤١، زكريا ٥/ ٦٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١١/ جمادی الثانیہ ١٤٢٤ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٧/ ٨٠٨٠)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١١/ ٦/ ١٤٢٤ھ

''گلیز ٹریڈنگ انڈیا'' کی ممبری کا شرعی حکم

سوال [٩٦٦١]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ''گلیز ٹریڈنگ انڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ'' ایک کمپنی ہے اور اس کمپنی کے اندر کام کچھ اس طرح سے کیا جاتا ہے، مثلاً میں اس کمپنی کے اندر جو بنگ لیتا ہوں، تو جو بنگ -/30 روپئے کا فوم لینے سے ہوجاتی ہے، اس کے بعد میں کمپنی سے سامان خریدتا ہوں اپنے لئے جیسے: کریم، تیل، صابن، صرف کپڑے وغیرہ وغیرہ، اس کے بعد میں کچھ لڑکوں کو کمپنی سے سامان خریدواتا ہوں، تو کمپنی نے اس پر کچھ منافع رکھا ہے، جیسے میں ایک آدمی کو آٹھ ہزار آٹھ سو

روپئے کا سامان خریدوا تا ہوں تو کمپنی اس پر مجھ کو -/400 روپئے دیتی ہے، پھر میں یہی کام ان سے جن کو میں نے اس کمپنی میں لگایا ہے، اس وقت کراتا ہوں جب تک وہ اس بزنس کی پوری ٹریننگ نہیں دے دیتے وہ بھی ایسے ہی کام کرتے ہیں، تو کمپنی ان کو بھی ایسے ہی منافع دیتی ہے، جس طرح سے مجھ کو دیا تھا اور مجھ کو بھی (یعنی جتنی ہماری بزنس ID پر IP ہوتی ہے) اتنا ہی پیسہ ملتا ہے، رہی بات محنت کی جن آدمیوں کو میں کمپنی میں جوبنگ کراتا ہوں تو ان پر میری محنت یہ ہے کہ میں ان کو بلا کر کمپنی میں لگا رہا ہوں، اس کے بعد جن لڑکوں کو وہ بلاتے ہیں جن کو میں نے بلایا تھا، تو اس پر میری محنت یہ ہے کہ میں ان کو آفس کے اندر لے جا کر ان کا کام کراتا ہوں، ان کے کاغذات جو آفس کے اندر لیتے ہیں، ان کو بھرتا ہوں اس کے بعد ان کی جو ٹریننگ چلتی ہے اس کو خود سے ٹریننگ دس سے پندرہ دن دیتا ہوں، صبح وشام ۲-۲ گھنٹے اور اس کے لئے باضابطہ کرایہ پر ایک بہت بڑا ہال لیتا ہوں، اس کے بعد ان کے رہنے کے لئے روم دلانا ان کو روم میں رکھنا یہ ذمے داری ہے، تو اس طرح کا کام کرنا اور اس پر اجرت (یعنی نفع) لینا کیا ہمارے لئے جائز ہے یا ناجائز؟ آپ حضرات سے مودبانہ درخواست ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دے کر عنداللہ ماجور وعندالناس مشکور ہوں، جواب جلدی دے دیں؛ کیوں کہ ہماری ٹیم میں کچھ لڑکے فتویٰ آنے تک کام سے رکے ہوئے ہیں۔

نوٹ: یہ کمپنی ''ایم وے''، ''آر، سی، ایم'' اور دیگر کمپنیوں کی طرح نہیں ان کمپنیوں کے اندر جوبنگ لینے کے بعد گھر بیٹھے پیسے لیتے رہو، مگر اس کمپنی میں یہاں رہ کر خود سے محنت کرنی پڑتی ہے۔

المستفتی: ایم ایس مہیما ٹریڈرس، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس معاملہ کا نام بدلا ہوا ہے، شکل وہی ہے، جو ''ایم وے'' کمپنی کی اسکیم ہوتی ہے، اس میں اوپر والے کی محنت ایک دفعہ ہوتی ہے، نیچے والوں کو

ممبر بنانے کے لئے اس کی اجرت جائز ہے، بعد میں نیچے جو محنت کریں گے؛ کیوں کہ اس میں اوپر والوں کی محنت کا کوئی دخل نہیں ہے، ان کو اپنی اجرت مل چکی ہے؛ اس لئے نیچے والوں کی اجرت میں سے جو اوپر والوں کو مل رہا ہے، وہ جائز نہیں ہے؛ اس لئے شرعاً یہ معاملہ درست نہیں ہے۔ اور فیکٹری اور کمپنی کے مالک کی جو مثال پیش کی گئی ہے، وہ مثال غلط ہے، اس لئے کہ فیکٹری اور کمپنی مالک کی ملکیت میں ہوتی ہے اور یہاں نیچے والے اوپر والوں کی ملکیت میں نہیں ہوتے، نیز یہ جو کہا گیا ہے کہ نیچے والوں کو ٹریننگ دیتے ہیں، یہ محض بے جا بات ہے، کسی بھی سامان کی خریداری کے لئے ٹریننگ کی ضرورت نہیں ہے، نیز خریدار اپنے سامان کے خریدنے میں خود مختار ہوتا ہے، اور بچپن سے خود سیکھا ہوا ہوتا ہے۔

الوكيل بالبيع لا يملك شراءه لنفسه؛ لأن الواحد لا يكون مشتريا وبائعا، فيبيعه من غيره، ثم يشتريه منه. (البحرالرائق، كتاب الوكالة، باب الوكالة بالبيع والشراء، زكريا ٧/ ٢٨٢، كراچی ٧/ ١٦٦، منحة الخالق على البحر الرائق، زكريا ٧/ ٢٨٢، كراچی ٧/ ١٦٦، هندية، كتاب الوكالة، الباب الثالث في الوكالة بالبيع، زكريا قديم ٣/ ٥٨٩، جديد ٣/ ٥٠٠، شامي، زكريا ٨/ ٢٥٧، كراچی ٥/ ٥٢١)

إذا اشترى الوكيل بالبيع مال موكله لنفسه لا يصح، وإن أطلق له الموكل بقوله: بع ممن شئت؛ لأنه يصير حينئذ متوليا طرفي العقد، وهو لا يجوز. (شرح المجلة ٢/ ٨٠٨، رقم المادة: ١٤٩٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۳۰۱۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲/ ۶/ ۱۴۳۶ھ

۳/ باب أجرة الدلال والسمسار

دلال مستحق اجرت کب ہوتا ہے؟

سوال [۹۶۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک ایجنٹ میرے پاس آئے اور کہا کہ میں آپ کا مکان پینسٹھ لاکھ میں فروخت کرا دوں گا؛ لیکن کمیشن ایک پرسینٹ لوں گا، اس پر میں نے کہا کہ ستر لاکھ کا دلوا دو تو میں ایک پرسینٹ کمیشن دے دوں گا، اس پر ایجنٹ نے کہا کہ آپ خریدار کے سامنے ایک بار میٹنگ کرلو، آپ ستر لاکھ کا طے کرلو، بہر حال خریدار سے میٹنگ کرانے پر خریدار نے پینسٹھ لاکھ کی قیمت لگاتے ہوئے دولاکھ کا بیعانہ سامنے رکھا، جس کو میں نے لینے سے انکار کردیا، تو خریدار دولاکھ کا بیع نامہ اس شرط پر چھوڑ گئے کہ آپ واہل وعیال مشورہ کرلیں، یہ ہماری امانت سمجھ کر رکھیں؛ لہٰذا خریدار دولاکھ روپیہ چھوڑ کر چلے گئے، مکان میں فرنیچر وغیرہ لگا ہوا تھا، جو ڈیڑھ لاکھ کا سودا ایک دیگر شخص کو کردیا تھا، اگلے دن خریدار کے ساتھ میٹنگ ہوئی اور ڈیڑھ لاکھ والا فرنیچر چھوڑ کر سودا ہوگیا، قبل اس کے ایک میٹنگ خریدار کے مکان پر ہوئی کہ قیمت کم ہے، بڑھاؤ، تو اس پر ایجنٹ کے کمیشن پر تذکرہ کرتے ہوئے یہ طے ہوا کہ قیمت پینسٹھ لاکھ رکھو، ایجنٹ کا کمیشن دونوں پارٹیاں پچیس پچیس ہزار ہی ادا کریں گی، جس کی اطلاع خریدار نے ایجنٹ کو دے دی کہ پچیس ہزار کمیشن ملے گا؛ لہٰذا طے ہونے کے بعد آٹھ لاکھ روپئے بیع نامہ میں آکر دس لاکھ کا بیع نامہ ہوگیا، جس کی ایک تحریر لکھی گئی کہ بقایا پچپن لاکھ مارچ کے اندر ادا کر کے بیع نامہ کرالیا جاوے گا، بعد میعاد گذر جانے کے بیع نامہ سوخت وسودا منسوخ ہوجاوے گا، کچھ دن گذر جانے کے بعد خریدار کے اہل وعیال نے مکان دیکھ کر یہ خواہش ظاہر کی کہ شوروم میں جو فرنیچر لگا ہے وہ بہت پسند ہے، وہ مکان میں ہی شامل کردیں، جس کا سودا ڈیڑھ لاکھ کا بھاؤ دیگر شخص کو کر چکے

تھے؛ بلکہ میں اپنی بیٹی کو بھی فرنیچر دینے کے لئے تیار نہیں، ادھر بیع نامہ کرانے کی میعاد بھی نکل گئی، خریدار وایجنٹ یہ کہنے لگے کہ ہم مکان فرنیچر شوروم والے کے ساتھ لیں گے، ورنہ ہمارا بیع نامہ واپس کردو، جب کہ میعاد گذر جانے کے بعد بیعانہ سوخت (ختم) ہوگیا۔ ایجنٹ کے زیادہ دباؤ دینے پر کہ ایجنٹ سے خریدار کو کسی دیگر مکان کا سودا پچاس لاکھ میں کرا رہا ہے، میں نے ایجنٹ سے کہہ دیا کہ میں خریدار کو بیع نامہ واپس کردوں گا، اب تم سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے، ایجنٹ نے کہا کہ بیع نامہ میرے سامنے واپس کرنا، میں نے جواب دیا، آپ کے سامنے کی کوئی پابندی میرے اوپر نہیں ہے، آپ ان خریدار کو پچاس لاکھ والا مکان دلادیں؛ لہٰذا خریدار میرے گھر پر آئے اور انہوں نے اپنے اہل وعیال کی خواہش ظاہر کرتے ہوئے شوروم کے فرنیچر مفت چھوڑنے کی التجاء کی؛ لہٰذا حالات کے مدنظر دوبارہ قیمت پینسٹھ لاکھ کی مع سامان فرنیچر شوروم طے کی گئی اور بیع نامہ رجسٹری کی تیاریاں چل رہی ہیں۔

(۱) جوسودا ایجنٹ نے کرا کر فرنیچر کی نزاع پیدا کر کے بیع نامہ واپس لینے کی مانگ کی اور کہا کہ اس نے خریدار کو دوسرے مکان کا سودا کرا دیا ہے، ایسی حالت میں کوئی کمیشن ایجنٹ کو دینے کا حق ہی نہیں بنتا یا کوئی حق ہے؟

(۲) مندرجہ بیانات کے مدنظر بیع نامہ کی میعاد گذر جانے پر پہلا بیع نامہ سوخت ہوا یا نہیں؟ جس کی تحریر میں بھی پابندی ہے۔

(۳) ایجنٹ جائیداد کی فروختگی کرانے میں خریدار وجائیداد مالک سے یعنی دونوں طرف سے کمیشن لیتا ہے، کیا یہ جائز ہے؟

المستفتی: محمد رئیس قریشی ولد برکت اللہ اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) دلال اپنی اجرت کا مستحق اس وقت ہوتا ہے جب بائع اور مشتری کے درمیان جوڑ پیدا کر کے عقد کو شروع سے آخر تک پایۂ تکمیل کو پہنچا دے اور

یہاں پر دلال کے ذریعہ سے جو سودا ہوا تھا وہ ختم ہو چکا ہے اور فرنیچر کے جھگڑے سے لین دین کا معاملہ ترک ہو چکا تھا۔ اور اس کے بعد میں خریدار کے گھر والوں کو فرنیچر کے پسند آنے کی وجہ سے از سر نو معاملہ طے کیا گیا ہے اور اس معاملہ کی تکمیل میں دلال کا کوئی دخل نہیں رہا ہے؛ اس لئے دلال اجرت کا مستحق نہیں رہا۔

قال الفقيه أبو الليث رحمه الله تعالىٰ: لا شيء له (للدلال) لأن العادة فيما بين الناس أنهم لا يعطون الأجر إذا لم يتفق البيع. (هندية، كتاب الإجارة، الباب السادس عشر في مسائل الشيوع في الإجارة، زكريا قديم ٤/ ٤٥١، جديد ٤/ ٤٨٧)

قال لدلال: أعرض ضيعتي وبعها على أن لك الأجر كذا، فلم يقدر هو على إتمام الأمر فباعه دلال آخر، فليس للأول شيء؛ لأن العادة جرت بين الناس أنهم يأخذون ذلك بالبيع. (الولوالجية، مكتبة دارالأيمان سهارنپور ٣/ ٣٤٠)

(۲) خریدار اور بیچنے والے کے درمیان جو بیع نامہ دے کر کے معاہدہ ہوتا ہے، خریداری نہ ہونے کی صورت میں بیع نامہ کو سوخت کر دینا جائز نہیں ہے؛ بلکہ خریداری نہ ہونے کی صورت میں بیع نامہ جوں کا توں واپس کر دینا ضروری ہوتا ہے اور اس کو روک کر کے اپنے استعمال میں لینا بیچنے والے کے لئے ناجائز اور حرام ہے۔

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده، أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن بيع العربان. (ابن ماجة، البيوع، باب بيع العربان، النسخة الهندية ١/ ١٥٩، دارالسلام، رقم: ٢١٩٢، مسند أحمد بن حنبل ٢/ ١٨٣، رقم: ٦٧٢٣، سنن أبي داؤد، باب في العربان، النسخة الهندية ٢/ ٤٩٤، دارالسلام، رقم: ٣٥٠٢)

ويرد العربان إذا ترك العقد على كل حال بالاتفاق. (بذل المجهود، سهارنپور ٤/ ٢٨٧، دارالبشائر الإسلاميه، بيروت ١١/ ٢٢١)

(۳) دلال کے لئے جائیداد کی فروختگی کرانے میں بائع اور مشتری دونوں سے دلالی کی اجرت لینا جائز ہے۔

وإن سعى بينهما وباع المالك بنفسه يعتبر العرف، وتحته في الشامية: فتجب الدلالة على البائع، أو على المشتري أو عليهما بحسب العرف. الخ (شامي، كتاب البيوع، قبيل مطلب في حبس المبيع ...... زكريا ۷/ ۹۳، كراچی ٤/ ٥٦٠، تنقيح الفتاوى الحامدية ۱/ ۲٤۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۱۷۳)

کسی چیز کی دلالی پر اجرت لینے کا شرعی حکم

سوال [۹۶۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک آدمی وکیل ہے، جو وکالت کا پیشہ کرتا ہے، یہ وکیل شخص لوگوں کو انکم ٹیکس اور سیل ٹیکس جو سرکاری غیر واجبی ہے، اس کو کم بھرنے یا بالکل نہ بھرنے کی ترکیب بتاتا ہے اور مشورہ دیتا ہے، بسا اوقات مشورہ میں جھوٹ بھی بولنا پڑتا ہے، کیا وکیل شخص اس طرح ٹیکس کم بھرنے یا بالکل نہ بھرنے کا مشورہ دے سکتا ہے اور اس پر اجرت لے سکتا ہے؟ اگر سامنے والا بطور اجرت سودی رقم دے تو وکیل کے لئے کیا حکم ہے؟

المستفتی: نثار احمد کلا، خادم دار الافتاء دار العلوم گودھرا (گجرات)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: وکیل انکم ٹیکس کے بھرنے یا نہ بھرنے میں سچے مشورے دیتا ہو تو اس کے لئے اجرت کا لینا جائز ہے؛ کیوں کہ یہ دلالی کی اجرت ہے، جو جائز ہے۔

وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل. (شامي، كتاب الإجارة، باب ضمان الأجير، مطلب في أجرة الدلال، زكريا ۹/ ۸۷، كراچی ٦/ ٦٣، هندية، زكريا، قديم ٤/ ٤٥٠، جديد ٤/ ٤٨٧)

اور اگر اکثر و بیشتر جھوٹے مشورے دیتا ہو، تو پھر اس کے لئے اجرت لینا جائز نہیں ہے۔ اور سود کا پیسہ وکیل کی اجرت میں دینا یا افسر کی رشوت میں دینا جائز نہیں؛ بلکہ اپنی جیب خاص سے حلال پیسہ دے، ہاں البتہ انکم ٹیکس اور سیل ٹیکس میں سرکاری بینک سے ملا ہوا سود کا پیسہ اس نیت سے دینا جائز ہے کہ ناجائز پیسہ جہاں سے آیا ہے وہاں واپس کیا جارہا ہے؛ اس لئے کہ مال حرام میں اصل حکم شرعی یہ ہے کہ حرام جہاں سے آیا ہے کسی بھی عنوان سے اسے واپس کردیا جائے؛ لہٰذا سیل ٹیکس اور انکم ٹیکس کے عنوان سے سرکار کو واپس کردینا جائز ہے۔

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة والاستيئجار على المعاصي أو بغير عقد كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه، ولكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه، ويجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء سهارنپور ١/ ٣٧، دارالبشائر الإسلامية ١/ ٣٥٩، رقم الحديث ٥٩، هندية، زكريا قديم ٥/ ٣٤٩، جديد ٥/ ٤٠٤، شامي، زكريا ٩/ ٥٥٣، كراچی ٦/ ٣٨٥، البحرالرائق، زكريا ٩/ ٣٦٩، كوئٹه ٨/ ٢٠١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍ربیع الاول ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۹۷۱/۳۶)

کمیشن لینا جائز ہے یا نہیں؟

سوال [۹۶۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عرب کنٹری میں جو مال فروٹ وغیرہ پیکنگ ہوکر جاتا ہے، وہ پیکنگ کا کنٹراک چند

مسلمان بھائی لے لیتے ہیں اور ایکسپورٹر سے اپنی مزدوری طے کرلیتے ہیں کہ فی بوکس ہم یہ لیں گے، مثال کے طور پر روپیہ یا بارہ آنہ ہم نے ایکسپورٹر سے طے کئے، اب سوال یہ ہے کہ چند مزدوروں نے مل کر دس ایکسپورٹروں کا کام پیکنگ کا لے لیا، کام لینے والے دو یا چار ہیں اور کام دس ایکسپوٹروں کا ہے، لازمی دوسرے مزدوروں کو پکڑ کر اس کام کو کرائیں گے، مگر ان مزدوروں سے یہ طے کرلیا جاتا ہے کہ ہم کو روپیہ بوکس ملے یا بارہ آنہ ملے یا آٹھ آنہ بوکس ملے، ہم آٹھ آنہ بوکس دیں گے اور اس حساب میں سے ہم اپنی بھاگیداری بھی تم سے لیں گے، بھاگیداری بھی کام لینے والوں کو بچتی ہے، اور جو اوپر مزدوری لکھی ہوئی ہے اس میں سے چار آنہ یا دس پیسہ بوکس الگ بچتے ہیں، اور باقی مزدور اس شرط پر منظور ہو جاتے ہیں، کنٹراک لینے والوں کی یہ کمائی جائز ہے یا ناجائز؟

(۲) کرافورڈ مارکیٹ یا کسی بھی مارکیٹ کے جو فروٹ بیوپاری ہیں، ان کو دلی کے یا کہیں کے بھی لوگ اپنا مال بیچنے کے لئے بھیجتے ہیں اور ان کی یہ شرط ہے کہ اتنا کمیشن کاٹ کر ہمیں پیسہ بھیج دو اور مارکیٹ کے دلال اس شرط کو منظور کرتے ہیں اور مال بھیجنے والے نے مال بھیجا، کمیشن لینے والے نے ایک پیٹی سیب یا آم کی سو روپئے کی فروخت کردی اور اس کو بکری ساٹھ روپئے کی دی، وہ چالیس روپیہ ان کے لئے جائز ہے یا ناجائز؟ اور اگر انہوں نے سو روپئے کی پیٹی فروخت کی تو اس کو کمیشن کاٹ کر ڈیڑھ سو روپیہ پیٹی فروخت کی تو مسلمان کے لئے یہ دھندا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: ارشاد عظیم قریشی باندرہ ویسٹ، ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس طرح کنٹریوں کو ٹھیکہ پر لے کر مزدوروں کو طے شدہ مزدوری دے کر باقی ٹھیکیداروں کو اپنے لئے لے لینا جائز اور درست ہے۔

المسلمون عند شروطهم. (قواعد الفقه أشرفي، ص: ١٢١)

المعروف بين التجار كالمشروط بينهم. (قواعد الفقه أشرفي، ص: ١٢٥)

(۲) اگر تجارت اور دلالی کی مذکورہ طریقہ سے شرط طے کر لی جائے تو جائز ہے۔

المعروف بين التجار كالمشروط بينهم. (قواعد الفقه أشرفي، ص: ١٢٥)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷ر صفر المظفر ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۳/۳۸۷۳)

جانبین سے دلالی کی اجرت کا حکم

سوال [۹۶۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید زمین بیچنے والا ہے اور عمر خریدنے والا ہے اور درمیان میں شاکر ہے، جو یہ کہتا ہے کہ میں آپ کی زمین فروخت کرا دوں گا اور آپ سے دس پرسینٹ لوں گا، پھر خریدنے والے سے کہتا ہے کہ میں آپ کو زمین خریدوا دوں گا اور آپ سے دس پرسینٹ لوں گا، حالانکہ شاکر جو کہ فضولی ہے، ابھی زمین کا مالک بھی نہیں ہوا ہے، تو کیا شاکر کے لئے اس طرح روپئے لینا جائز ہے اور یہ روپئے لینا خفیہ طور پر بھی ہوتا ہے؟

المستفتی: محمد عالمگیر گڈاوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سوال نامہ میں مندرجہ صورت میں شاکر، زید (بائع) اور عمر (مشتری) دونوں کے درمیان دلالی کرنے والا ہے اور دلالی کی اجرت لینا مفتی بہ اور راجح قول کے مطابق جائز اور درست ہے؛ البتہ اجرت کا متعین ہونا لازم ہے اور چونکہ فیصد اور پرسینٹیز بھی تعیین کی ایک شکل ہے؛ لہٰذا شاکر (دلال) کا زید وعمر (بائع ومشتری) دونوں سے دلالی کی اجرت لینا جائز ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۲۷۲/۷، فتاوی دارالعلوم ۱۵/ ۲۸۸-۲۸۹، اسلام اور جدید معاشی مسائل ۱/ ۱۳۶، فتاوی محمودیہ میرٹھ ۲۵/ ۲۸۶-۲۸۷)

سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن كان في الأصل فاسدا لكثرة التعامل، وكثير من هذا غير جائز، فجوزوه لحاجة الناس إليه. (شامي، كتاب الإجارة، مطلب في أجرة الدلال، كراچی ٦/ ٦٣، زكريا ٩/ ٨٧، تاتارخانية، زكريا ١٥/ ١٣٧، رقم: ٢٢٤٦٢)

وأما الدلال: فإن باع العين بنفسه بإذن ربها فأجرته على البائع، وإن سعى بينهما وباع المالك بنفسه يعتبر العرف (تحته في الشامية: فتجب الدلالة على البائع أو المشتري أو عليهما بحسب العرف جامع الفصولين.
(شامي، كتاب البيوع، قبيل مطلب في حبس المبيع لقبض الثمن ...... زكريا ٧/ ٩٣، كراچی ٤/ ٥٦٠، تنقيح الفتاوى الحامدية ١/ ٢٤٧، مجمع الضمانات ١/ ٥٤)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰ ر صفر المظفر ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۹۶۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۰/ ۲/ ۱۴۳۴ھ

کیا دلال بائع ومشتری دونوں سے دلالی وصول کرسکتا ہے؟

سوال [۹۶۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بائع اور مشتری کے درمیان بھاؤ تاؤ ہو رہا تھا کہ ایک تیسرا شخص آ کر بائع کو کم پر دینے کو تیار کرتا ہے، اسی طرح مشتری سے بھی کچھ کہہ سن کر بیع نافذ کرا دیتا ہے، اس کے بعد جانبین سے یہ کہہ کر میں نے تم کو اتنے نفع پر فروخت کرایا اور خریدوایا ہے؛ لہٰذا ہم کو کچھ دو اس طرح دونوں سے کچھ نہ کچھ وصول کر لیتا ہے اور بائع مشتری اپنی رضا مندی سے اسے دے بھی دیتے ہیں، کیا اس تیسرے شخص کا ایسا عمل اختیار کرنا اور اس کو ذریعہ معاش بنانا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: سجاد حسین سنبھل، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ دلالی ہے اور دلالی میں اگر اجرت پہلے سے متعین ہو تو اس کی اجرت جائز ہے؛ لیکن اگر پہلے سے متعین نہیں کی جاتی ہے، تو مفضی الی النزاع کی وجہ سے جائز نہیں ہے، خاص طور پر جب بائع ومشتری خود دلال کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوں اور یہ تیسرا شخص یوں ہی جانبین کی اجازت کے بغیر دخل دے رہا ہو۔

سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن كان في الأصل فاسدا لكثرة التعامل، وكثير من هذا غير جائز. (شامي، كتاب الإجارة، مطلب في أجرة الدلال، كراچی ٦/ ٦٣، زكريا ٩/ ٨٧، فتاوى بزازية، زكريا جديد ٢/ ٢٣، وعلى هامش الهندية ٥/ ٤٠) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ذیقعدہ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۵۰۳۷)

''بروکروی'' سے متعلق چند سوالات وجوابات

سوال [۹۶۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ موجودہ دور میں زمین کی بروکروی (دلالی) لوگوں کے نزدیک ایک منافع کی چیز بنی ہوئی ہے اور اس میدان میں تقریباً ہر طبقہ کے افراد اترے ہوئے نظر آتے ہیں، عوام تو عوام خواص دینی حلقوں سے تعلق رکھنے والے یعنی مدرسوں کے مدرسین اور مساجد کے ائمہ حضرات بھی خوب سرگرمی کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، زمین کی بروکروی یعنی دلالی کے اندر ہونے والے اونچ نیچ کو دیکھتے ہوئے چند سوالات ذہن میں اٹھ رہے ہیں جو نمبروار اس طرح ہیں:

(۱) بروکر (دلال) کا زمین مالک اور خریدار دونوں سے ایک ہی زمین کا الگ الگ کمیشن لینا۔

(۲) زمین مالک کو بغیر رقم دیئے یعنی صرف زبانی قیمت طے کرنا، اس کے بعد خریداروں کے ہاتھوں اپنی مرضی کی قیمت پر زمین کا فروخت کرنا۔

(۳) زمین مالک سے قیمت طے کرنے کے بعد زمین مالک کو بطور پیشگی کچھ رقم دے کر باقی رقموں کی ادائے گی کے لئے تاریخ طے کر لینا، مگر تاریخ متعینہ آنے پر باقی ماندہ رقموں کا ادا نہ کرنا؛ بلکہ زمین مالک کی طرف سے تقاضہ کرنے پر بار بار تاریخ لے کر وعدہ خلافی کرنا۔

(۴) کسی شخص سے یہ کہہ کر قرض لینا کہ مجھے فلاں زمین خریدنی ہے، تم مجھے ایک لاکھ دو، میں ایک لاکھ کا سوا لاکھ دو یا تین ماہ میں ادا کردوں گا، اس زمین کے نفع یا نقصان سے تم کو کوئی لینا دینا نہیں۔

(۵) خریدار لوگوں سے فلاں تاریخ کو رجسٹری کروانے کا وعدہ کر کے اس تاریخ میں رجسٹری نہ کروانا اور جھوٹ بول کر ٹال مٹول کرنا۔

(۶) گھٹیا اور بیکار زمینوں کی خوب جھوٹی تعریفیں کر کے خریداروں کے ہاتھوں بھاری قیمتوں پر فروخت کرنا۔ شریعت کا اس طرح کے کاموں کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اگر امام مسجد اس کام کو کرتا ہو تو اس کی امامت کا کیا حکم ہے؟ کیا ایسے اماموں کے پیچھے معلوم ہونے کے بعد مقتدیوں کی نمازیں ہوں گی یا نہیں؟ کیا ایسے شخص کو امام رکھنا درست ہے کہ نہیں؟ برائے کرم تمام سوالوں کے جوابات قرآن وحدیث کی روشنی میں مفصل ومدلل عنایت فرما کر شکریہ کا موقع دیں، عین کرم ہوگا۔ فقط

المستفتی: احقر مناظر عالم گاڑیبان محلّہ پوسٹ وضلع کشن گنج، بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) حسب تحریر سوال اصالۃً دلالی کا معاملہ ناجائز ہے؛ لیکن عادت اور عرف کی بنا پر فقہاء نے اجازت دی ہے؛ اس لئے یہ دلالی بائع اور مشتری دونوں کی طرف سے جائز ہوگی۔ اور دلال کو اس عمل پر اجرت مثل دی جائے گی، اس طرح سے دلال کا بائع اور مشتری دونوں سے اجرت لینا درست ہوگا۔ (فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۶/ ۶۱۷، امداد الفتاوی ۲/ ۳۶۲)

وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل. وفي الحاوي: سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن كان في الأصل فاسدا لكثرة التعامل، وكثير من هذا غير جائز، فجوزوه لحاجة الناس إليه. (شامي، كتاب الإجارة، مطلب في أجرة الدلال، کراچی ٦/ ٦٣، زکریا ٩/ ٨٧، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٥/ ١٣٧، رقم: ٢٢٤٦٢، هندية زكريا قديم ٤/ ٤٥٠، جديد ٤/ ٤٨٧، الفتاوى الولوالجية، دارالأيمان سهارنپور ٣/ ٣٤٤، فتاوى بزازية، زكريا جديد ٢/ ٢٣، وعلى هامش الهندية ٥/ ٤٠)

(۲) ابھی زمین کے مالک سے صرف قیمت طے ہوئی ہے اور مشتری کا زمین پر قبضہ نہیں ہوا ہے، اور مشتری اس کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنا چاہتا ہے، تو اس کے لئے زمین کی فروختگی درست ہوگی؛ کیوں کہ زمین اشیاء غیر منقولہ میں سے ہے اور اشیاء غیر منقولہ کا قبضہ سے پہلے فروخت کرنا درست ہوتا ہے۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۱۵/ ۲۸۲)

صح بيع عقار لا يخشى هلاكه قبل قبضه من بائعه. (شامي، البيوع، باب المرابحة والتولية، فصل في التصرف في المبيع والثمن، زكريا ٧/ ٣٦٩، كراچی ٥/ ١٤٧)

(۳) حسب تحریر سوال زمین کے مالک سے قیمت طے کرنے کے بعد اور کچھ رقم پیشگی ادا کرنے کے بعد باقی رقم کے لئے تاریخ طے کر لینا درست ہے؛ اس لئے کہ بیع نقد اور ادھار دونوں طرح جائز ہو جاتی ہے؛ لیکن جب وہ تاریخ متعین پر قیمت ادا نہیں کر رہا ہے، تو اس کی طرف سے یہ دھوکہ دینا اور وعدہ خلافی کرنا ہے، جس کا اس پر گناہ ہوگا۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۶/ ۴۶)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: مطل الغني ظلم، أي تاخير أداء الدين من وقت إلى وقت ظلم، فإن المطل منع أداء ما استحق أداءه، وهو حرام من المتمكن، ولو كان غنيا، ولكنه ليس متمكنا جاز له التأخير إلى الإمكان. (مرقاة المفاتيح ٦/ ١٠٠، مكتبه إمداديه)

البيع مع تأجيل الثمن و تسقيطه صحيح يلزم أن تكون المدة معلومة في البيع بالتأجيل و التسقيط. (شرح المجلة رستم، إتحاد ١/ ١٢٥، رقم: ٢٤٥-٢٤٦)

(۴) صورت مذکورہ میں ایک لاکھ روپیہ دے کر سوا لاکھ روپیہ واپس کرنا ناجائز ہے؛ اس لئے کہ ایک لاکھ ۲۵/ ہزار روپئے واپس کرنے کی صورت میں صریح سود ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۶/۳۴۲)

كل قرض جر نفعا فهو ربا، أي إذا كان مشروطا. (شامي، مطلب: كل قرض جر نفعا حرام، كراچی ٥/ ١٦٦، زكريا ٧/ ٣٩٥)

لا يجوز أن يرد المقترض إلى المقرض إلا ما اقترضه أو مثله طبعا للقاعدة الفقهية القائلة كل قرض جر نفعا فهو ربا. (الفقه السنة ٣/ ١٤٧-١٤٨)

(۵) بائع کا لوگوں سے رجسٹری کا وعدہ کرکے نہ کروانا اور جھوٹ بول کر ٹال مٹول کرنا یہ دھوکہ دھڑی اور گناہ کبیرہ ہے۔

لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ. [آل عمران: ٦٠]

والكذب حرام لا في الحرب. (جمع الأنهر ٤/ ٢٢٧)

(٦) ہر ایک کی زمین اس کے لئے بڑھیا ہے اور جب خریدار زمین کو دیکھ کر خرید رہا ہے تو کسی قسم کی دھوکہ دھڑی نہیں ہے، ہر مالک کو حق ہے کہ اپنا سامان اور اپنی زمین کی قیمت جتنی چاہے لگائے اور خریدار کو اختیار ہے کہ اس قیمت پر خریدے یا نہ خریدے؛ لہٰذا ان باتوں کو لے کر امام کی امامت پر انگلیاں اٹھانے کا حق نہیں ہے۔

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء. (تفسير بيضاوي ١/ ٧)

كل يتصرف في ملكه كيف شاء. (شرح المجلة رستم، إتحاد ١/ ٦٥٤، رقم المادة: ١١٩٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ رشوال ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۶۸۴/۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹/۱۰/۱۴۳۵ھ

زمین خریدوانے کی دلالی لینا

سوال [۹۶۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: توقیر باری اور میں (ڈاکٹر مظفر علی خاں) ایک پراپرٹی بشکل آراضی گیارہ بیگہ واقع پنڈت نگلہ مرادآباد کی خریداری میں شریک تھے، چونکہ توقیر باری اس آراضی کو خریدنا چاہتے تھے؛ لیکن ان سے اس کا سودا نہیں ہو رہا تھا؛ اس لئے انہوں نے اس سلسلے میں مجھ سے رجوع کیا؛ کیوں کہ میرے مالکان آراضی (فروخت کرنے والوں ریحانہ ملک وغیرہ) سے بہترین تعلقات تھے۔ اور توقیر باری سے بھی میرے گھریلو تعلقات تھے؛ اس لئے توقیر باری نے مجھ سے کہا کہ تم اس آراضی کا سودا طے کروا دو، میں یہ آراضی خرید کر فروخت کروں گا اور تم بغیر رقم لگائے اس کے منافع کے تیس فیصد کے حصہ دار ہوگے، میں نے اس سلسلے میں انتہائی کوشش کر کے اس آراضی کا سودا کروا دیا، جس کی پاور آف اٹارنی مالکان نے توقیر باری کو کرا کر دے دی تھی۔ اور رقم کا لین دین ہوگیا تھا اور اس کاغذ پر میرے بحیثیت گواہ دستخط بھی ہیں۔ اور آراضی مذکور پر توقیر باری کا مالکانہ قبضہ بھی ہوگیا تھا اور انہیں پاور آف اٹارنی کی رو سے مثل مالک کے کسی دیگر کو فروخت کرنے کا حق واختیار حاصل ہوگیا تھا، ان تمام معاملات وشرکت کے بارے میں توقیر باری نے اپنی علالت کے دوران اپنی زوجہ ''عرشی بیگم'' بڑے لڑکے ''فضل باری'' بڑے بھائی ''تنویر باری'' اپنے بہنوئی ''نوراحمد'' اپنے سالے ''جمال الٰہی'' ودیگر عزیز واقرباء کو بھی باخبر کر دیا تھا، اس کے علاوہ اسی دوران مرادآباد اور رام پور کے کچھ معزز دوست احباب جن کے نام میرے علم میں ہیں، کو بھی انہوں نے باخبر کر دیا تھا کہ ڈاکٹر مظفر علی خاں اس سودے میں میرے تیس (۳۰) فیصد کے شریک ہیں، مزید توقیر باری نے اپنی وفات سے دس یوم پہلے اپنے ایک قریبی عزیز بزرگ ''احسان عظیم'' صاحب (سگریٹ والے) اور اپنے ملازم اکرام اور قیوم ساکن بہار جو کہ ان کے گھر جیسے فرد تھے رو برو بٹھا کر بھی یہ سب کچھ بتا دیا تھا؛ لیکن توقیر باری کے انتقال کے بعد جب میں نے اپنی

شرکت حصہ مذکور کی بابت بات کہی تو مرحوم کے سالے جمال الٰہی نے میرے ساتھ گئے ہوئے میرے ایک دوست جو کہ جمال الٰہی کے کلاس فیلو بھی ہیں (محمد اکرام مرادآباد) کے سامنے مجھ سے شہادت مانگی تو میں نے احسان عظیم صاحب اور اکرام (ملازم) کا ذکر کیا، تو جمال الٰہی ہم دونوں کو احسان عظیم صاحب کے پاس ان کے لڑکے شان عظیم صاحب کو ساتھ لے کر گئے، شہادت میں احسان عظیم صاحب نے کہا: ''ورڈنگس تو مجھے یاد نہیں؛ لیکن مفہوم یہی تھا جو ڈاکٹر مظفر علی خاں کہہ رہے ہیں''۔ اور اسی طرح اکرام (ملازم) نے بھی یہی حقیقت بیان کی۔ ان شہادتوں کے بعد عرشی بیگم کی عدت پوری ہونے کے بعد بات چیت دوبارہ کرنے کو کہا گیا، بعد عدت مرحوم کے سالے جمال الٰہی نے مجھ سے اور (محمد اکرام مرادآباد) سے محمد عمر اور شان عظیم صاحب کے سامنے کہا کہ میری بات اپنی بہن (عرشی بیگم) سے ہوگئی ہے، اورانہوں نے کہا کہ: ''ڈاکٹر مظفر علی خاں قرآن کی قسم مسجد میں کھالیں تو میں ایک ایک پیسہ دوں گی'' اس پر میں آمادۂ قسم ہوا؛ لیکن یہ قسم مجھ سے محمد عمر صاحب کے کہنے کی وجہ سے کہ ''اللہ یہاں بھی وہی ہے جو وہاں ہے'' شان عظیم صاحب کی فرم میں ان کی موجودگی میں اور محمد عمر صاحب اور (محمد اکرام مرادآباد) اور جمال الٰہی اور مرحوم کے لڑکے فضل باری کی موجودگی میں قرآن پاک پر ہاتھ رکھوا کر مجھ سے ان سب نے قسم کھلوائی کہ جو کچھ میں (مظفر علی خاں) کہہ رہا ہوں وہ بالکل سچ ہے، اس کے فوراً بعد میں نے مرحوم کی حیات میں ایک رکارڈ کیا ہوا کیسٹ بھی اسی سلسلے میں سب کو سنوایا، جس کو سن کر جمال الٰہی نے کہا کہ اگر آپ کے پاس یہ رکاڈنگ (ٹیپ) تھا، تو آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟

لیکن اب توقیر باری کے انتقال کے بعد ان کی زوجہ عرشی بیگم اور مرحوم کے بڑے بھائی تنویر باری و بہنوئی نور احمد نے اس آراضی کو جو کہ توقیر باری نے رقم ادا کر کے خریدی تھی؛ لیکن اپنی زندگی میں اس کو فروخت نہیں کر پائے تھے، اس کی دوسری پاور آف اٹارنی مالکان آراضی سے تبدیل کرا کر اس زمین کو فروخت کر دیا، جس میں انہیں بہت بڑا منافع ہوا ہے؛ لیکن ان لوگوں کی نیت میں بے ایمانی آگئی ہے اور وہ مجھے فائدہ میں سے میرے حصہ کی رقم جو کہ تیس فیصد بنتی

ہے ادا نہیں کر رہے ہیں، اس سلسلے میں شریعت مطہرہ کی روشنی میں فتوی دینے کی زحمت فرمائیں کہ کیا توقیر باری کے ذریعہ اپنی حیات میں میری کوششوں سے رقم کی ادائے گی کر کے خریدی گئی زمین میں میرا بحیثیت شریک اس رقم میں تیس فیصد کا حق بنتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: ڈاکٹر مظفر علی خان محلّہ مسجد دروغہ محبو جان گھیر مردان خاں، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: توقیر باری کو خریدوا کر دینے کی وجہ سے اس زمین کی اصل میں اور نفع میں آپ شریک نہیں ہوسکتے ہیں۔ اور نفع میں شریک ہونے کی جو شرط لگائی گئی ہے، وہ شرط شرعی طور پر باطل اور فاسد ہے، اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے، ہاں البتہ آپ نے جو بیچ میں پڑ کر خریدوانے میں محنت کی ہے، اس محنت کی محنتانہ اجرت آپ کو مل سکتی ہے۔ اور چونکہ اجرت متعین نہیں تھی اس لئے اس طرح کی زمین کے خریدوانے میں اس زمانہ میں عام طور پر دلال کو جو معتدل اور درمیانی اجرت ملا کرتی تھی وہ اجرت آج آپ کو ملے گی، اس کے علاوہ کسی اور چیز کا مطالبہ جائز نہیں ہے۔

فلو كل المال لأحدهما فللآخر أجر مثله، كما لو دفع دابته لرجل ليؤجرها والأجر بينهما، فالشركة فاسدة والربح للمالك ولآخر أجر مثله. (درمختار على الشامي، كتاب الشركة، مطلب يرجح القياس، زكريا ٦/ ٥٠٣، كراچى ٤/ ٣٢٦، النهر الفائق، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٣٠٧)

وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل. (هندية، كتاب الإجارة، الباب السادس عشر في مسائل الشيوع ...... زكريا قديم ٤/ ٤٥٠، جديد ٤/ ٤٨٧، الأشباه والنظائر، الفن الثاني، كراچى ٢/ ٦٠) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
١٦/ جمادی الثانیہ ١٤٣٣ھ
(الف فتویٰ نمبر: ١٠٧٣٢/٣٩)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٦/٦/١٤٣٣ھ

زمین کی خرید وفروخت کرانے میں دلالی کی اجرت لینا

سوال [۹۶۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فی زمانہ آراضی کی تجارت کی مختلف شکلیں رائج ہیں، جن کی وضاحت مطلوب ہے:

الف: اس میں ہوتا یوں ہے کہ کچھ لوگ ”پراپرٹی ڈیلر“ یا جن کو دلال بھی کہہ سکتے ہیں ہوتے ہیں، جو بائع اور مشتری کے درمیان معاہدہ کراتے ہیں اور قیمت کا تعین بھی وہ خود ہی کرتے ہیں، مشتری کو زمین کی موجودہ بازاری قیمت بتاتے ہیں، جس پر وہ مطمئن اور راضی ہوتا ہے۔ اور بائع کو مشتری کے مقابلے میں کم قیمت پر راضی اور مطمئن کر لیتے ہیں اور دونوں کے بیچ کی رقم بطور کمیشن کے خود حاصل کرتے ہیں، مثال کے طور پر مشتری کو پچاس ہزار روپئے بیگہ خریدنے پر راضی کیا، اور بائع کو پینتالیس ہزار روپئے بیچنے پر راضی کیا، اور پانچ ہزار روپئے فی بیگہ کے حساب سے خود حاصل کر لیئے، یہ شکل آج کل معروف ومشہور ہے۔ جن کا علم بائع اور مشتری کو بھی ہوتا ہے، آیا اس طرح کا معاہدہ کرانا اور کمیشن کی شکل میں کچھ رقم نکال لینا ہے درست ہے یا نہیں؟ باحوالہ تحریر فرمائیں۔

ب: دوسری شکل میں یہ دلال بائع مشتری دونوں سے ایک ہزار روپئے یا دو ہزار روپئے فی بیگہ کمیشن طے کرتے ہیں اور دونوں کا معاہدہ کراتے ہیں۔

ج: اس صورت میں خریدنے والا خود ان لوگوں سے کہتا ہے کہ ہمیں کہیں زمین دلاؤ، اس میں دو فی صد کے حساب سے رقم دلال کو دی جاتی ہے۔

نوٹ: مذکورہ بالا طریقے زرعی اور رہائشی دونوں طرح کی آراضی کی خرید وفروخت میں رائج ہیں اور مشہور ومعروف ہیں، تفصیلی جوابات سے نواز کر عند اللہ ماجور ہوں

المستفتی: محمد ذاکر خاں، بدایوں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) دلالی کی اجرت فی نفسہٖ جائز اور درست ہے، جب

کہ اجرت متعین ہو؛ لیکن سوال نامہ میں جو شکل پیش کی گئی ہے اس میں نہ بائع سے اجرت کی بات طے ہے اور نہ ہی مشتری سے؛ بلکہ وہ بائع کے سامنے جھوٹ بول رہا ہے کہ بائع سے کہتا ہے کہ میں پینتالیس ہزار روپئے میں بیچ رہا ہوں، حالانکہ وہ مشتری کو پچاس ہزار روپئے میں بیچ رہا ہے؛ اس لئے یہ صورت ناجائز ہے، ہاں البتہ اس کے جواز کی متبادل شکل یہ ہے کہ دلال بائع سے وضاحت کے ساتھ کہہ دے کہ آپ کو پینتالیس ہزار روپئے فی بیگہ ملے گا، تو ایسی صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ دلال نے بائع سے پینتالیس ہزار روپئے کے حساب سے خرید کر مشتری کو پچاس ہزار میں فروخت کر دیا، ایسی صورت میں اس کو دلال نہیں کہا جائے گا؛ بلکہ تاجر کہا جائے گا۔ اور یہ معاملہ شرعاً درست ہو جائے گا۔

عن عبادة بن الصامت –رضي الله عنه– أن رسول الله ﷺ قضى أن لا ضرر ولا ضرار. (ابن ماجة، الأحكام، باب من بنى في حقه ما يضر بجاره، النسخة الهندية ٢/ ١٦٩، دارالسلام، رقم: ٢٣٤٠)

أنه باعه مرابحة، فإن كان ما اشتراه به له مثل جاز سواء جعل الربح من جنس رأس المال الدرهم من الدراهم أو من غير الدراهم من الدنانير، أو على العكس إذا كان معلوما يجوز به الشراء؛ لأن الكل ثمن. (عناية مع فتح القدير، باب المرابحة والتولية، دارالفكر بيروت ٦/ ٤٩٥، زكريا ٦/ ٤٥٦، كوئٹه ٦/ ١٢٢)

(۲) یہ شکل دلالی کی ہے، اس میں اجرت بھی متعین ہے؛ لہٰذا اس میں شرعاً بائع سے ایک ہزار اور مشتری سے ایک ہزار روپیہ فی بیگہ لینا درست ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ میرٹھ ۲۵/۲۸۶)

سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به. (شامي، كتاب الإجارة، مطلب في أجرة الدلال، كراچی ٦/ ٦٣، زكريا ٩/ ٨٧، تاتارخانية، زكريا ١٥/ ١٣٧، رقم: ٢٢٤٦٢)

وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل. (هندية، الباب السادس عشر في مسائل الشيوع …… زكريا جديد ٤/ ٤٨٧، قديم ٤/ ٤٥٠)

إجارة السمسار والمنادي والحمامي والصكاك وما لا يقدر فيه الوقت ولا العمل تجوز لما كان للناس به حاجة، ويطيب الأجر المأخوذ.

(شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، زكريا ۹/ ٦٤، كراچی ٦/ ٤٧، بزازية، زكريا جديد ٢/ ٢٣، وعلى هامش الهندية ٥/ ٤٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ ؍شوال ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۵۱۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۱۰/۲۸ھ

انجینئر کا ٹھیکیدار سے کمیشن لینا

سوال [۹۶۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: انجینئر کے نقشہ پاس کرنے کے بعد ٹھیکیدار کو ٹھیکہ مل جاتا ہے اور بعد میں ٹھیکیدار کی طرف سے کمیشن کی رقم ملتی ہے، اس کو لینا کیسا ہے؟ اس کی مکمل شکل یہ ہے کہ گورنمنٹ کی طرف سے ایک پروجیکٹ تیار کرنے کے لئے انجینئر کو حکم ملا، مثلاً ایک اسکول یا دفتر کے روم کا پلاسٹر ہونا ہے، اس کی صحیح لاگت دس ہزار روپئے ہے؛ لیکن انجینئر صاحب نے اس کو بارہ ہزار روپئے کا اسٹیمیٹ بنا کر حکومت کو بھیجا، حکومت کی جانب سے بارہ ہزار روپئے جاری ہو گئے، اب دو ہزار روپئے بطور کمیشن تقسیم ہو گئے حصہ وار یا پھر پورے کے پورے دو ہزار روپئے جناب انجینئر صاحب کو مل گئے۔

حضرت آپ کے علم میں ہوگا کہ موجودہ دور میں سرکاری اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک اخیر تک کمیشن لیتے ہیں؛ بلکہ آج تو وزراء اعلیٰ تک بغیر رشوت کے اور کمیشن کے کوئی کام نہیں کرتے ہیں، اس رقم کو لینا کیسا ہے؟ اور لی جاتی ہے، تو پھر اس رقم سے موٹر گاڑی اسکوٹر وغیرہ خریدنا کیسا ہے، اس پیسہ سے سفر سیاحت پر جانا خرید وفروخت کرنا سفر میں اچھی غذائیں فروٹ میواجات کھانا کیسا ہے؟ بچوں کی تعلیم پر اس رقم کو خرچ کرنا کیسا ہے؟، پونجی جمع کرنا اس رقم کو

پونجی میں ملانا کیسا ہے؟ مدارس اسلامیہ میں چندہ کی رقم میں اس رقم کا لینا دینا درست ہے یانہیں؟

المستفتی: تفسیر احمد رشیدی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: انجینئر صاحب کا سرکار کو اخراجات سے زائد لاگت کاغذات پر دکھا کر اصل خرچ سے زائد رقم وصول کرنا دھوکہ دہی اور فریب ہے اور اس اضافی رقم سے اپنا کمیشن لینا بھی انجینئر صاحب کے لئے جائز نہیں ہے۔

عن أبي هريرة -رضي الله عنه- أن رسول الله ﷺ مر برجل -إلى- فقال رسول الله ﷺ: ليس منا من غش. (أبو داؤد، باب النهى عن الغش، النسخة الهندية ٢/ ٤٨٩، دارالسلام، رقم: ٣٤٥٢)

عن أبي حميد الساعدي، أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل لامرئ أن يأخذ مال أخيه بغير حقه، وذلك لما حرم الله مال المسلم على المسلم.

(مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٤٢٥، رقم: ٢٤٠٠٣، مجمع الزوائد، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٧١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢٧/ ذی الحجہ ١٤٣١ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٩/ ١٠٢٣٩)

ٹھیکیدار یا مستری وغیرہ کا کمیشن لینا

سوال [٩٦١٧]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عام طور پر ایسا دستور رہے جو تعمیرات کے ٹھیکیدار یا مستری یا رنگ کرنے والے کاریگر یا ٹھیکیدار یا اسی طرح دوسرے کام کرنے والے کاریگر یا ٹھیکیدار ہیں، ان سے دوکاندار یہ کہتا

ہے کہ آپ سامان ہمارے یہاں سے یعنی ہماری دوکان سے دلوانا ہم آپ کو دس یا پندرہ فی صد کمیشن دیں گے اور گاہک سے وہ پورے پیسے لیتے ہیں چاہے ٹھیکیدار یا مستری اس کمیشن کو لے یا نہ لے اور کبھی مالک ٹھیکیدار یا مستری سے ہی کہہ دیتا ہے کہ آپ ہی خود سامان لے آنا تو آیا یہ کمیشن کے پیسے مستری یا ٹھیکیدار کو لینا جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ گاہک کا کوئی نقصان بھی نہیں؛ کیوں کہ اس سے پورے ہی پیسے لئے جاتے ہیں۔

المستفتی: سید حافظ محمد محبوب منصور پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ٹھیکیداری کی دوصورتیں ہیں: (۱) یہ کہ جو بھی ضرورت کا سامان وغیرہ ہو اس کو ٹھیکیدار خود اپنے پیسے سے لائے اور مالک مکان اور مستری کے درمیان یہ معاملہ طے ہو کہ مثلاً آپ میرا مکان رنگ کر تیار کر دیں، ہم آپ کو اتنا روپیہ دیں گے، تو اس صورت میں ٹھیکیدار کا دوکاندار سے کمیشن لینا جائز ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مالک مکان سے روپیہ لے کر ضرورت کا سامان لائے اور اس میں سے کمیشن لے تو یہ نا جائز ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں ٹھیکیدار مالک مکان کا وکیل ہے (مستفاد: آپ کے مسائل اور ان کا حل، جدید زکریا ۷/ ۳۹۱، قدیم ۶/ ۲۸۲، احسن الفتاوی ۸/ ۱۰۲)

اور وکیل امین ہوتا ہے اور امین کے لئے امانت میں خیانت کرنا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۸/ ۱۰۲)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– عن النبي ﷺ قال: آية المنافق ثلاث: إذا حدث كذب، وإذا وعد أخلف، وإذا ائتمن خان. (بخاري شريف، الايمان، باب علامة المنافق، النسخة الهندية ۱/ ۱۰، رقم: ۳۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۷۱۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۶/۵ھ

بولی لگانے کے درمیان آڑھت والے کا مبیع میں سے کچھ نکال لینا

سوال [۹۶۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کی پھلوں اور سبزیوں کی آڑھت ہے اور اس جگہ پر رواج ہے کہ بولی لگانے کے درمیان آڑھت والا پھلوں اور سبزیوں سے کچھ نکال لیتا ہے، پھر بدستور اس بولی پر مشتری کو دے دیا جاتا ہے، تو ٹوکری میں سے نکالا ہوا مال زید کے لئے جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو کس طریقہ پر؟ اور اگر جائز نہیں تو جواز کی کیا صورت ہے؟

المستفتی: محمد یوسف مظہری امام جامع مسجد ٹھاکردوارہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر اس کا رواج ہو اور مالک بخوشی اس کو دے دیتا ہے اور اس کے دینے سے مالک پر کوئی زور بھی نہیں پڑتا ہے، تو لینے والے کے لئے گنجائش ہے، شاید مالک اس وجہ سے دینے کے لئے راضی رہتا ہے کہ وہ مالک کا مال بآسانی فروخت کروا دیتا ہے۔ (مستفاد: عزیز الفتاوی/ ۷۴۵)

عن أبي حرة الرقاشي، عن عمه، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه. (شعب الإيمان للبيهقي، باب في قبض اليد عن الأموال المحرمة، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٣٨٧، رقم: ٥٤٩٢، مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٧٢، رقم: ٢٠٩٧١، مسند أبي يعلى الموصلي، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٩١، رقم: ١٥٦٧)

لا يحل مال امرئ إلا بطيب نفس (أي بأمر أو رضاء) منه. (مرقاة، قديم ٣/ ٣٥٠، جديد إمداديه ملتان ٦/ ١١٨)

ولا بأس بشراء جوز الدلال الذي يعد الجوز، فيأخذ عن كل

ألف عشرة ...... إذا كان المالك راضيا بذلك عادة. (الأشباه، قديم ۱۷۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍رجب ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۶۸۲۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹؍۷؍۱۴۲۱ھ

ہسپتال کا مریض بھیجنے والے ڈاکٹر کو تحفہ دینا

سوال [۹۶۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی ڈاکٹر اپنے مریض کو آپریشن وایکسرے یا دیگر کسی جانچ کے لئے کسی دوسرے ہسپتال کو بھیجتا ہے، اور وہاں پر یعنی جہاں ڈاکٹر نے مریض کو بھیجا ہے، آپریشن وغیرہ کے لئے کچھ رقم بھی طے نہیں کر رکھی ہے، اس کے باوجود اگر وہ ہسپتال کچھ رقم یا تحفہ کے طور پر مریض کو بھیجنے والے ڈاکٹر کو پیش کرے، تو اس کے لئے جائز ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: ڈاکٹر وارث احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں بھیجنے والے ڈاکٹر کے لئے تحفہ میں دی ہوئی رقم بلاتردد حلال اور درست ہے، اگر پہلے سے بھیجنے اور مقرر رقم لینے کی بات طے کرلیتا ہے تو وہ بھی درست ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں بھیجنے والا ڈاکٹر کلینک والے کی طرف سے ایجنٹ شمار ہوگا، جس کی اجرت لینا جائز ہے، ہاں البتہ اگر جانبین میں کچھ طے نہیں ہوا تھا، پھر بھیجنے والا ڈاکٹر اجرت کا مطالبہ کرے، تو ایسی صورت میں بھیجنے والے کو مطالبہ کا حق نہیں ہے؛ اس لئے کہ نہ پہلے سے ان دونوں کے درمیان میں معاملہ طے ہوا ہے اور نہ بطور تحفہ دیا ہے۔

ولم ير ابن سيرين، وعطاء، وإبراهيم، والحسن بأجر السمسار بأسا.

(صحيح البخاري، باب أجر السمسرة، النسخة الهندية ۱/ ۳۰۳)

سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به، ...... لكثرة التعامل. (شامي، كتاب الإجارة، مطلب في أجرة الدلال، كراچی ٦/ ٦٣، زكريا ٩/ ٨٧، تاتارخانية، زكريا ١٥/ ١٣٧، رقم: ٢٢٤٦٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

٢٠ ربیع الثانی ١٤٣١ھ

(الف فتویٰ نمبر: ٣٨/ ٩٩٧٨)

آنکھوں کے ڈاکٹروں کا چشموں کی دوکان والوں سے کمیشن لینا

سوال [٩٦٧٤]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کچھ ڈاکٹر لوگ جو آنکھوں کی جانچ کرتے ہیں، وہ چشموں کی دوکان والوں سے کمیشن لیتے ہیں، ان کا کمیشن لینا یہ دلالی کی اجرت کے مرادف ہے یا نہیں؟ اور یہ کس حد تک درست ہے؟ اس سلسلے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: سبوح احمد محلّہ بھٹی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: آنکھوں کے ڈاکٹر کا مریض کو چشمہ کی دوکان پر بھیجنے کی وجہ سے اس پر کمیشن لینا یہ دلالی کی اجرت کے مرادف ہے اور اجرت دلال جائز ہے؛ اس لئے آنکھوں کے ڈاکٹر کا مریض بھیجنے پر چشمہ والوں سے اجرت لینا جائز ہے؛ لیکن اجرت متعین ہونا چاہئے اور فیصد کے حساب سے طے کرنا بھی تعیین کی ایک شکل ہے۔

وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل. –إلى قوله– سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن كان في الأصل فاسدا لكثرة التعامل، وكثير من هذا غير جائز، فجوزوه لحاجة الناس إليه. (شامي، كتاب الإجارة، باب ضمان الأجير، مطلب في أجرة الدلال، زكريا ٩/ ٨٧، كراچی ٦/ ٦٣، خلاصة الفتاوى، أشرفي ديوبند ٣/ ١١٦)

قال في الشامية عن البزازية: إجارة السمسار والمنادى والحمامي والصكاك وما لا يقدر فيه الوقت ولا العمل تجوز لما كان للناس به حاجة، ويطيب الأجر المأخوذ لو قدر أجر المثل. (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، زكريا ٩/ ٦٤، كراچی ٦/ ٤٧، بزازية، زكريا جديد ٢/ ٢٣، وعلى هامش الهندية ٥/ ٤٠)

وأما الدلال: فإن باع العين بنفسه بإذن ربها (تحته في الشامية) فتجب الدلالة على البائع أو المشتري أو عليهما بحسب العرف.
(شامي، كتاب البيوع، قبيل مطلب في حبس المبيع لقبض الثمن ...... زكريا ٧/ ٩٣، كراچی ٤/ ٥٦٠، تنقيح الفتاوى الحامدية ١/ ٢٤٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۰۹۸۳)

ڈاکٹر کا خون یا پیشاب جانچ کرانے کے لئے بھیجنے کی اجرت لینے کا حکم

سوال [۹۶۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ڈاکٹر حضرات اپنے مریض کو دوسرے کے پاس خون یا پیشاب جانچ کرنے کے لئے یا ایکسرا کرانے کے لئے بھیجتے ہیں، ایکسرا کرنے والے پیشاب خون جانچ کرنے والے بھیجنے والے ڈاکٹر کو طے شدہ رقم کمیشن دیتے ہیں، تو کیا مریض بھیجنے والا ڈاکٹر اس رقم کو استعمال میں لاسکتا ہے؟ اور بہت سے مسلم ڈاکٹروں کے پاس اس قسم کی رقمیں موجود ہیں، کیا اس رقم کو مدرسہ میں یا بیت الخلاء میں یا کسی رفاہ عام کے کام میں خرچ کرسکتے ہیں؟ حضرت والا سے التماس ہے کہ مسئلہ سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی: عبد الوحید اصلاحی، ساکن اسرینا پوسٹ پرسا ملک، مہراج گنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ڈاکٹر مریض کو دوسرے ڈاکٹر کے پاس خون پیشاب کی جانچ یا ایکسرے کے لئے بھیجے اوراس پر طے شدہ رقم کمیشن لے تو یہ دلالی کے حکم میں ہے اور دلالی کی اجرت مباح ہے؛ اس لئے اس کی گنجائش ہے۔

عن الحكم وحماد عن إبراهيم وابن سيرين قالوا: لا بأس بأجر السمسار إذا اشترى يدا بيد. (المصنف لابن أبي شيبة، في أجر السمسار، موسسة علوم القرآن ١١/ ٣٣٩، رقم: ٢٢٥٠٠)

وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل. وفي الحاوي: سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن كان في الأصل فاسدا لكثرة التعامل، وكثير من هذا غير جائز، فجوزوه لحاجة الناس إليه. (شامي، كتاب الإجارة، باب ضمان الأجير، مطلب في أجرة الدلال، زكريا ٩/ ٨٧، كراچی ٦/ ٦٣، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٥/ ١٣٧، رقم: ٢٢٤٦٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ ذی الحجہ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٦ ٣/ ٧٤٠٥)

ڈاکٹر کا الٹرا ساؤنڈ اور ایکسرے والوں سے کمیشن لینا

سوال [٩٦٧٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج کل ایک ڈاکٹر اپنے مریضوں کا آپریشن، الٹرا ساؤنڈ، پیتھولوجی (خون وغیرہ) کی جانچ کرانے کے لئے دوسرے ڈاکٹر کے یہاں مشورہ دیتا ہے کہ یہ کام وہاں کرالاؤ، وہ ڈاکٹر اسی چیز کا ماہر شمار کیا جاتا ہے، ماہر ڈاکٹر کے یہاں پہلے سے ہر چیز کے ریٹ مقرر ہیں، اگر

مریض خود ہی بغیر کسی کے بھیجے ماہر ڈاکٹر کے یہاں پہنچ جائے تو بھی مقررہ ریٹ کے مطابق اسے چارج ہوتا ہے، اگر کسی ڈاکٹر کے بھیجنے سے ڈاکٹر کا پرچہ لے کر پہنچتا ہے، تو ماہر ڈاکٹر بھیجنے والے ڈاکٹر کو کچھ رقم بھجوا تا ہے اور مریض سے مقررہ ریٹ ہی وصول کرتا ہے، اس رقم کو اصطلاحاً کمیشن کا نام دیا جاتا ہے، ایسی صورت میں دینا اور لینا کیسا ہے؟

(۲) دوسری صورت میں ایک ڈاکٹر ماہر ڈاکٹر سے یہ طے کرتا ہے کہ میں مریض تمہارے پاس بھیجوں گا اور مجھے اتنی رقم (جو بھی طے ہو جائے) چاہئے تم مریض سے جو چاہے لے لو، ایسی صورت میں ماہر ڈاکٹر مریض سے زیادہ رقم وصول کر کے بھیجنے والوں کو کمیشن دیتا ہے، تو اس طرح کمیشن لینا کیسا ہے؟ اور دینا کیسا ہے؟

المستفتی: انعام احمد قاسمی کاس گنج، ایٹہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: معالج ڈاکٹر کا الٹرا ساؤنڈ، ایکسرے وغیرہ کے ڈاکٹر سے یہ طے کر لینا کہ میں تمہارے پاس مریض بھیجوں گا، ایک مریض کے الٹرا ساؤنڈ میں اتنا روپیہ اور ایکسرے میں اتنا روپیہ تم کو دینا ہوگا، اس کے بعد مریض بھیجنے پر چیک اپ کرنے والے ڈاکٹر سے طے شدہ رقم لینا دلالی کے حکم میں ہے اور دلالی کی اجرت جائز اور مباح ہے؛ لیکن اگر مریض اپنے طور پر بلا معالج ڈاکٹر کے توسط کے بغیر چیک اپ کرنے والے ڈاکٹر کے یہاں جا کر چیک اپ کرا لیتا ہے، تو اس صورت میں طے شدہ رقم معالج ڈاکٹر سے لینا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں معالج ڈاکٹر دلال نہیں بنا ہے، یہی دونوں سوالوں کا جواب ہے۔

سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به.

(شامي، كتاب الإجارة، باب ضمان الأجير، مطلب في أجرة الدلال، زكريا ۹/ ۸۷، كراچی ٦/ ٦٣، خلاصة الفتاوى، أشرفي ديوبند ٣/ ١١٦)

وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل. (هندية، الباب السادس عشر

في مسائل الشیوع ...... زکریا قدیم ٤ / ٤٥٠، جدید ٤ / ٤٨٧، الفتاوی التاتارخانیة، زکریا ١٥ / ١٣٧، رقم: ٢٢٤٦٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۶۲/۱۰۳۶۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۴/۲۳ھ

ڈاکٹر کے پاس بھیجنے اور دوا فروخت کرنے پر کمیشن لینے کی شرعی حیثیت

سوال [۹۶۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: الحمد للہ بندہ کا شہر میں انگریزی دوا خانہ ہے، خدمت خلق کے جذبہ ونیت کے ساتھ مریضوں کا علاج کرتا ہوں، ہر وقت فکر ہوتی ہے کہ حلال کمائی کماؤں، حرام سے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے، اس سلسلے میں دو مسئلے آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں:

(۱) ایک کمپنی انگریزی دوائی بناتی ہے اور اس کا ریٹ مقرر کرتی ہے، مثلاً ''ایزی تھرومائن'' نام کی 250 پاور کی دس گولیوں کی قیمت -/60 روپئے مقرر کرتی ہے۔ دوسری کمپنی اسی نام کی اور اتنے ہی پاور کی گولیاں تیار کرتی ہے اور اس کی -/80 روپئے قیمت مقرر کرتی ہے، دونوں کمپنی سے بنی ہوئی گولیاں ایک جیسی ہوتی ہیں، مجھے معلوم نہیں کہ دونوں میں کیا فرق ہے؛ البتہ دونوں ایک ہی مرض میں استعمال کی جاتی ہیں، اب کم ریٹ میں فروخت کرنے والی کمپنی سے اعلان ہے جو ڈاکٹر ہماری بنی دواؤں کو مریضوں کے لئے تجویز کرکے لکھ کر دے، اس ڈاکٹر کو تیس فیصد منافع بطور انعام کے دیا جائے گا، وہ انعام یا منافع اس لئے دیا جاتا ہے کہ چونکہ ہم نے اس کمپنی کی دوائی لکھ کردی، جس کی وجہ سے دوائیاں زیادہ فروخت ہوں گی، اور جس کمپنی کی دوائیاں مہنگی ہیں، اگر ان کی دوائیاں مریضوں کو لکھ کردی جائیں تو ان کی طرف سے کچھ نہیں ملتا، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کم ریٹ والی کمپنی سے بنی ہوئی دواؤں کو مریضوں کے لئے لکھ کر دینا اور اس پر ملنے والے منافع استعمال کرنا میرے لئے جائز ہے یا نہیں؟

نوٹ: جب دونوں کمپنی سے بنی ہوئی گولیاں ایک ہی جیسی ہیں اور ایک ہی مرض کے لئے ہیں، تو ایک کم قیمت میں اور دوسری کمپنی زیادہ قیمت میں فروخت اس لئے کرتی ہے کہ کم قیمت میں فروخت کرنے والی کمپنی درمیان میں بہت کم واسطوں سے فروخت کرتی ہے، جن کا خرچ بچ جاتا ہے، اور جو کمپنی مہنگی فروخت کرتی ہے، وہ درمیان میں کئی واسطوں سے دوکانداروں تک پہنچاتی ہے، اس لئے وہ سارا خرچ دواؤں پر لگا کر مہنگی فروخت کرتی ہے۔

(۲) ایک مریض میرے پاس آتا ہے، تشخیص کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس مریض کو کسی دوسرے بڑے ڈاکٹر کے پاس بھیجنا ضروری ہے، تاکہ اس کا کامل علاج ہوسکے، میں پرچی لکھ کر ڈاکٹر کے پاس مریض کو بھیج دیتا ہوں، اب بڑے ڈاکٹر کے پاس جتنے روپیہ کا علاج ہوا اس کی تیس فیصد رقم بڑے ڈاکٹر کی طرف سے مجھے ملتی ہے، میری طرف سے کوئی مطالبہ نہیں ہوتا اور یہ تیس فیصد بڑے ڈاکٹر صاحب اپنی ہی رقم سے مجھے دیتے ہیں؛ کیوں کہ ایک مریض میں نے ان کی طرف بھیجا ہے، تو اب یہ ملنے والی رقم میرے لئے جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: ڈاکٹر سید واثق علی فردوس کالونی، آکولہ، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) مریضوں کے لئے ایک ہی معیار کی ایک ہی قسم کی دوامیں سے جو سستی دوا ہے، اسی کو لکھنا چاہئے اور مریضوں کے فائدے کا خیال رکھنا چاہئے، اسی لئے سستی اور کم قیمت کی دوا لکھنا زیادہ بہتر ہے، اب رہی یہ بات کہ کمپنی کی طرف سے دوا لکھنے والے ڈاکٹر کو کچھ پیسہ ملتا ہے، اگر ڈاکٹر اور کمپنی کے درمیان پہلے ہی سے یہ طے ہے کہ اس کمپنی کی دوا لکھنے پر ڈاکٹر کو اتنے پیسے مل جایا کریں گے، تو اس طرح طے شدہ پیسہ ڈاکٹر کے لئے لینا جائز اور درست ہے، ڈاکٹر دونوں نیتوں سے یہ دوا لکھا کرے، ایک تو مریض کا فائدہ اور کم خرچ اور دوسری اپنی ذاتی منفعت تو ایسا کرنا شرعاً جائز اور درست ہے۔ اور کمپنی سے پیسہ لینا اس لئے جائز ہے کہ اس کمپنی کی دوا لکھنے میں ایک طرح کا اس کمپنی کا ایجنٹ بنا ہوا ہے، ایجنٹ اور دلالی کی اجرت جائز ہے۔

(۲) اگر بڑے ڈاکٹر اور آپ کے درمیان یہ بات پہلے سے طے ہے کہ مریضوں کو بھیجنے سے طے شدہ رقم ملا کرے گی، تو مریضوں کو بھیجنے کے لئے ایک قسم کا دلال اور ایجنٹ ہے اور اس کی اجرت لینا جائز ہے۔(مستفاد: فتاوی محمودیہ جدید ڈابھیل ١٦/ ٦١٧-٦٣٢)

عن أم سلمة –رضي الله عنها– قالت: قال رسول الله ﷺ: المستشار مؤتمن. (ترمذي، باب أن المستشار مؤتمن، النسخة الهندية ٢/ ١٠٩، رقم: ٢٨٢٢، سنن الدارمي، دارالمغني ٣/ ٥٩١، رقم: ٢٤٩٣)

قال في التاتارخانية: وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل، وما تواضعوا عليه أن في كل عشرة دنانير كذا ، فذاك حرام عليهم. وفي الحاوي: سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن كان في الأصل فاسدا لكثرة التعامل، وكثير من هذا غير جائز، فجوزوه لحاجة الناس إليه. (شامي، كتاب الإجارة، مطلب في أجرة الدلال، كراچی ٦/ ٦٣، زكريا ٩/ ٨٧، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٥/ ١٣٧، رقم: ٢٢٤٦٢، الولوالجية، دارالأيمان سهارنپور ٣/ ٣٤٤، هندية زكريا قديم ٤/ ٤٥٠، جديد ٤/ ٤٨٧، بزازية، زكريا جديد ٢/ ٢٣، وعلى هامش الهندية ٥/ ٤٠الأشباه والنظائر، كراچی الفن الثاني ٢/ ٦٠، خلاصة الفتاوى، أشرفي ٣/ ١١٦)

ولو قال: إن بعت هذا المتاع لي فلك درهم، كان استئجار .
(مبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية ١٥/ ١١٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٧/ ربیع الاول ١٤٣١ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٩٩٦٨/٣٨)

جج کا وکیل کے پاس مقدمہ بھیجنے پر اس سے رقم لینے کا حکم

سوال [٩٦٧٨]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: احقر پیشکار ضلع جج ہے، لوگ ہمارے پاس آتے ہیں، جن کا کوئی مقدمہ ہوتا ہے اور آکر کہتے ہیں کہ کوئی وکیل بتاؤ، تو ہم جس وکیل کے پاس اس ضرورت مند کو بھیجتے ہیں، وہ وکیل آکر احقر کو -/500 روپئے یا اور کچھ کم زیادہ روپیہ دیتا ہے، تو احقر کے لئے ان روپیوں کا لینا درست ہے یا نہیں؟ جب کہ احقر کا وکیل سے نہ تو کوئی معاہدہ ہے لینے کا اور نہ کوئی اس قسم کی بات چیت؛ بلکہ احقر لیتا بھی نہیں ہے، تو وہ زبردستی یہ کہہ کر دیتے ہیں کہ ہم اپنی فیس میں سے خوشی سے دے رہے ہیں۔

المستفتی: انوار حسین پیشکار ضلع جج، کاس گنج، ایٹہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں آپ کے لئے جواز کی شکل یہ ہے کہ آپ وکیل سے طے کرلیں کہ ایک مقدمہ بھیجنے میں اتنے روپیہ لوں گا، ایسی صورت میں آپ دلال بنیں گے اور دلالی کی اجرت لینا جائز ہے۔ اور اگر طے نہیں ہوا؛ لیکن وہاں وکیل کے پاس مقدمہ بھیجنے کے بدلے میں اس وکیل کی جانب سے کچھ رقم بھیجنے کا عرف ورواج ہے، تو ایسی صورت میں وکیل اگر کچھ رقم بھیج دیتا ہے، تو وہ بھی دلالی کی اجرت میں شامل ہوگا اور اس کا لینا آپ کے لئے جائز ہوگا۔

وشرطها كون الأجرة والمنفعة معلومتين. (شامي، كتاب الإجارة، زكريا ٩/ ٧، كراچی ٦/ ٥، هندية، زكريا قديم ٤/ ٤١١، جديد ٤/ ٤٤١، هداية اشرفي ٣/ ٢٩٣)

المعروف كالمشروط. (الأشباه، قديم ص: ١٥٦)

سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن كان في الأصل فاسدا لكثرة التعامل، وكثير من هذا غير جائز، فجوزوه لحاجة الناس إليه. (شامي، كتاب الإجارة، مطلب في أجرة الدلال، زكريا ٩/ ٨٧، كراچی ٦/ ٦٣، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ١٥/ ١٥٥، بخاري شريف، أجر السمسرة، النسخة الهندية ١/ ٣٠٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۳۵۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۴/۲۳ھ

اقامہ بنانے کی اجرت لینا

سوال [۹۶۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:
(۱) زید سعودی عرب ملازمت کے لئے گیا اور اس کو وہاں رہنے کے لئے اقامہ کی ضرورت ہوتی ہے، جس کے بغیر رہائش کی اجازت نہیں ہوتی ہے؛ لیکن مالک زید کو اقامہ دینے کے لئے حکومت سے اقامہ بنوانے میں جتنا خرچ ہوا ہے، اس سے بہت زائد رقم کا مطالبہ کرتا ہے، تو کیا اقامہ حاصل کرنے کے لئے زید کا زائد رقم دینا اور مالک کا زائد رقم لینا درست ہے یا نہیں؟
(۲) اور بعض مالک ملازم کو یہ کہہ کر آزاد چھوڑ دیتے ہیں کہ ہم تمہیں کسی کام پر نہیں رکھیں گے؛ بلکہ تم آزاد ہو؛ لیکن یومیہ یا ماہانہ اتنی رقم لاکر ہم کو دینا ہوگا، تو کیا اس طرح کا معاملہ شرعاً درست ہے؟

المستفتی: حبیب الرحمٰن دیوریا (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) کفالت بالنفس ایک ایسی ذمہ داری ہوتی ہے جس پر اجرت لینا جائز ہوتا ہے؛ لہٰذا کفیل کے لئے اقامہ بنانے میں جو خرچ ہوا ہے اس کے علاوہ اپنی ذمہ داری کی وجہ سے مزید رقم کا لینا جائز اور درست ہے۔

ولأن الكفالة والرهن شرعا للتوثق والتوثق ملائم للأجر الخ. (بدائع الصنائع، كتاب الإجارة، باب حكم الإجارة، زكريا ٤/ ٦١، كراچی ٤/ ٢٠٢)

وإذا أدى الكفيل المال من عنده رجع بما كفل ولا يرجع بما أدى.
(تاتارخانية، زكريا ١٠/ ١١٤، رقم: ١٤١٨٩، المبسوط، دارالكتب العلمية بيروت ٢٠/ ٧٣)

(۲) کفیل بالنفس کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ مکفول لہ کو اپنے یہاں ملازم نہ رکھے؛ بلکہ حکومت کے اعتماد کے لئے اپنی کفالت اور ذمہ داری حکومت کو پیش کر کے مکفول لہ کو اقامہ دلوا کر آزاد چھوڑ دے اور سالانہ یا ماہانہ ذمہ داری کی جو رقم طے ہو جائے وہ وصول کرتا رہے۔

قال في البدائع: لأن الكفالة والرهن شرعا للتوثق والتوثق ملائم للأجر الخ. (بدائع الصنائع، كتاب الإجارة، باب حكم الإجارة، زكريا ٤/ ٦١، كراچی ٤/ ٢٠٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم رجب ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۱۸۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸/۷/۱۴۳۴ھ

ہوٹل والوں کا رکشہ یا ٹیکسی ڈرائیور کو کمیشن دینا

سوال [۹۶۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (ا) یہاں شہر آگرہ میں دوکانداروں اور ہوٹلوں کے مالکوں نے یہ طریقہ اپنا رکھا ہے کہ اگر کوئی رکشہ یا ٹیکسی والا کسی مسافر کو لے کر ہوٹل پر پہنچتا ہے اور مسافر اور ہوٹل کے مالک کا آپس میں قیام کے بارے میں معاملہ طے ہوجاتا ہے، ایسی صورت میں مسافر ہوٹل کا جتنا کرایہ ادا کرتا ہے اس میں سے ۵ر فیصد یا دس فیصد مالک رکشہ یا ٹیکسی والے کو (جو مسافر ہوٹل پر لایا ہے) دیتا ہے۔ اور اگر مسافر اور ہوٹل والے کا آپس میں معاملہ طے نہ ہوا، جس کی بنا پر مسافر ہوٹل میں نہ ٹھہر سکا تو رکشہ وغیرہ والوں کو ہوٹل کی جانب سے کچھ نہیں ملتا ہے، اسی طرح رکشہ یا ٹیکسی والے مسافر کو کسی دوکان پر سامان کی خریداری کے لئے لے جاتا ہے اور مسافر اس کی دوکان سے کوئی سامان خرید لیتا ہے، تو بھی دوکاندار رکشہ والے کو ۵ر فیصد ادا کرتا ہے کہ گاہک دوکان پر لایا ہے، دونوں صورتوں میں رکشہ اور ٹیکسی والے اپنا لانے لے جانے کا کرایہ مسافر سے وصول کرتے ہیں، فی صدی رقم ہوٹل اور دوکان پر لے جانے اور دوکاندار یا ہوٹل مالک اور مسافر کا آپس میں معاملہ طے ہونے پر ملتی ہے، اور دوکان پر خریداری نہ ہونے کی صورت میں بھی رکشہ والے کو دس پانچ روپیہ ملتے ہیں، تو از روئے شرع اس معاملہ کا حکم کیا ہے؟ اور اس معاملہ سے حاصل شدہ رقم کا کیا حکم ہے؟

(۲) یہاں ایک کمیٹی قائم ہے جو رمضان میں زکوۃ کی رقم اکٹھا کرتی ہے اور اس میں سے

پورے سال مستحقین کو دیتی رہتی ہے، کبھی کبھی اس کا کچھ حصہ رمضان تک بچ بھی جاتا ہے، کمیٹی مزید زکوۃ اکٹھا کر لیتی ہے اور اسی طرح یہ سلسلہ جاری ہے، اس میں شرعاً کوئی قباحت ہے یا نہیں؟ فقط والسلام

المستفتی: مفتی عبدالستار افضل العلوم، آگرہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں جب رکشہ یا ٹیکسی والے سواری کو لے کر کے ہوٹل یا مارکیٹ میں پہنچا دے اور سواری کا صاحب ہوٹل یا مارکیٹ سے آپس میں بیع وشراء ہو جانے کی صورت میں اگر صاحب ہوٹل یا صاحب مارکیٹ کچھ روپیہ رکشہ یا ٹیکسی والے کو بخوشی دے دے، تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں، اسی طرح اگر رکشہ یا ٹیکسی والے کا صاحب ہوٹل یا صاحب مارکیٹ سے فی سواری لانے میں ۵/ فیصد روپیہ آپس میں طے ہو جائے اور مارکیٹ والے فی سواری ۵/ فیصد روپیہ رکشہ والے کو دے دیں یا ٹیکسی والے کو دے دیں تو یہ درست ہے؛ لیکن مسافروں کے ساتھ دھوکہ بازی خرید وفروخت میں نہیں ہونی چاہئے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۱/ ۳۱۰، جدید ڈابھیل ۱۶/ ۶۱۹)

قال في التاتارخانية: وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل، وما تواضعوا عليه أن في كل عشرة دنانير كذا، فذاك حرام عليهم. وفي الحاوي: سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن كان في الأصل فاسدا لكثرة التعامل، وكثير من هذا غير جائز، فجوزوه لحاجة الناس إليه، كدخول الحمام. (شامي، كتاب الإجارة، مطلب في أجرة الدلال، كراچی ٦/ ٦٣، زكريا ٩/ ٨٧، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٥/ ١٣٧، رقم: ٢٢٤٦٢)

(۲) اگر کمیٹی زکوۃ کی رقم اکٹھا کر کے زکوۃ کے مستحقین تک پہنچا دیتی ہو، تو یہ کرنا جائز ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ (فتاوی محمودیہ قدیم ۱۷/ ۱۲۷، جدید ڈابھیل ۹/ ۵۶۲) فقط واللہ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۵۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۶/۲۶ھ

رقم پہنچانے کے فی سیکڑہ پانچ سوروپئے لینا

سوال [۹۶۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید دہلی میں کسی مسجد کا امام ہے اور عمر پٹنہ میں کسی مدرسہ کا مدرس ہے، پٹنہ کے رہنے والے جولوگ دہلی میں کام دھندہ کرتے ہیں، وہ اپنے روپئے گھر بھیجنے کے لئے زید کو روپئے دیتے ہیں، زید ان کے روپئے گھر پہنچانے کے عوض پانچ روپئے سیکڑہ کے حساب سے معاوضہ لیتا ہے، پھر زید عمر کو فون کے ذریعہ بتاتا ہے کہ فلاں شخص کو اتنا روپئے دے دو اور فلاں شخص کو اتنا روپئے دے دو، عمر جس شخص کا روپیہ ہوتا ہے اسے پہنچادیتا ہے، آمد ورفت اور فون وغیرہ کرنے میں جو روپئے خرچ ہوکر بچتے ہیں انہیں زید اور عمر آپس میں آدھا آدھا بانٹ لیتے ہیں، زید عمر کا پانچ روپئے سیکڑہ کے حساب سے روپئے لینا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: جابر حسین، امام خضری وویکانند کالونی آدرش نگر، جے پور، راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں زید وعمر کا لوگوں کے روپئے ان کے گھر پہنچانے پر اجرت طے کرکے لینا جائز اور درست ہے، اس لی گئی رقم کو ان کے عمل (نقل وحمل) کی اجرت قرار دیا جائے گا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/۱۴۶)

كان ابن زبير –رضي الله عنه– يأخذ من قوم بمكة دراهم، ثم يكتب لهم بها إلى مصعب بن الزبير بالعراق، فيأخذونها منه، فسئل عن ذلك بابن عباس –رضي الله عنه– فلم يربه بأسا. وروى عن علي –رضي الله عنه أنه سئل عن مثل هذا فلم ير به بأسا. (المغني لابن قدامة، دار الفكر ٤/ ٢١١)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۳۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶/۴/۱۴۳۲ھ

گراہک بڑھانے کی اجرت

سوال [٩٦٨٢]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے ایک کمپنی سے تجارت کا سلسلہ شروع کیا ہے، کمپنی کپڑا فروخت کرتی ہے اور کمپنی یہ کہتی ہے کہ ہمارے کپڑے کی قیمت تیرہ ہزار روپئے ہے اور جو ہمارا کپڑا خریدے گا وہ ہمارا پارٹنر ہو جائے گا، یہ کمپنی کا کہنا ہے؛ لیکن اس کی شکل یہ ہوگی کہ وہ ہمارا کپڑا دوسروں کو فروخت کروائے گا اور ایک گراہک پر ہم آپ کو پندرہ سو روپئے بطور چیک تمہارے گھر پہنچائیں گے، اسی طرح دو گراہکوں پر تین ہزار اور چار پر چھ ہزار کا چیک گھر پہنچے گا اور یہ چیک گراہک بنانے کے دس دن بعد پہنچے گا، اور کمپنی ایسا کر رہی ہے۔ اور اگر کسی کپڑا لینے والے نے ایک گراہک بھی نہ بنایا تو وہ صرف یہ کپڑا پہنے جو اس نے تیرہ ہزار کا خریدا ہے، اس کو اور کچھ نہ ملے گا؛ البتہ کمپنی یہ بھی کہتی ہے کہ آپ نے اگر ایک گراہک کو کپڑا دلوایا اور اس نے کسی اور کو دلوادیا اور یہ سلسلہ برابر سلسلہ وار چلتا رہا تو بھی کمپنی پہلے والے کو اور دیگر گراہکوں کو بھی سلسلہ وار کمیشن دے گی، تو یہ تجارت زید کی جائز ہوئی یا نہیں؟

مزید کمپنی کا یہ کہنا ہے کہ اگر کوئی ہمارا پارٹنر چار گراہک بنا دیتا ہے اور اس کے بعد اس کا یہ سلسلہ بند ہو گیا اور کوئی بھی کسی کو نہ بنا سکا تو ہم اپنے اس پارٹنر کو جس نے چار ہمارے گراہک بنائے ہیں، ایک مہینہ کی آمدنی سے ایک پرسینٹ اس کو روانہ کریں گے، یہ کمپنی ٹوس کے نام سے پہچانی جاتی ہے اور ہندوستانی ہے، تو زید کی یہ تجارت کہاں تک صحیح ہوئی؟

المستفتی: احقر محمد اکبر قریشی قریشیان گڑھی سلیم پور، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: آپ کے سوال نامہ میں کچھ چیزیں حد جواز میں داخل ہیں اور کچھ چیزیں حد جواز سے باہر ہیں، جو چیزیں حد جواز میں داخل ہیں ان میں: (ا) تیرہ ہزار روپئے جمع کر کے جو کپڑا آپ نے خریدا ہے، اس کا لینا اور استعمال کرنا جائز ہے۔

(٢) وہ شخص براہ راست ممبر بن کر جن لوگوں کو ممبر بنائے گا، اس ممبر سازی کی اجرت اس کے لئے لینا جائز ہے۔ اور کمپنی کے لئے اس کا دینا جائز ہے؛ اس لئے کہ یہ دلالی کی اجرت ہے، جو جائز ہے۔

وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل، وفي الحاوي: سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن كان في الأصل فاسدا لكثرة التعامل، وكثير من هذا غير جائز، فجوزوه لحاجة الناس إليه. (شامي، كتاب الإجارة، باب ضمان الأجير، مطلب في أجرة الدلال، زكريا ٩/ ٨٧، كراچى ٦/ ٦٣، الفتاوى الولوالجية، مكتبه دارالأيمان سهارنپور ٣/ ٣٤٤، الأشباه والنظائر، الفن الثاني، كراچى ٢/ ٦٠)

اس کے علاوہ کمپنی نے جو صورت بتائی ہے وہ جائز نہیں ہے، مثلاً پہلا ممبر جن لوگوں کو براہ راست ممبر نہیں بناتا ہے، نیچے والے ممبروں کی کارکردگی میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں ہے؛ اس لئے نیچے والے ممبروں کی کارکردگی میں وہ نفع کا مستحق نہیں ہوسکتا، اسی طرح سلسلہ وار ممبر بننا اور بنانا کسی طرح جائز نہیں ہے۔

لا يجوز لأحد أن يأخذ مال أحد بلا سبب شرعي. (قواعد الفقه، أشرفي، ص: ١١٠، رقم: ٢٦٩، شرح المجلة رستم، إتحاد ١/ ٦٢، رقم المادة: ٩٧)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٢/ ربیع الثانی ١٤٢٥ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٨٣١٦/٣٧)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٤٢٥/٤/١٣ھ

کمپنی کا گراہک کو بڑھانے پر اجرت دینے کا حکم

سوال [٩٦٨٣]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: ایک کمپنی پندرہ سو روپئے میں تین جوڑی کپڑے دے رہی ہے۔ اوراس نے اسکیم نکالی ہے کہ جوبھی ایک بار کپڑا لے گا اور کپڑے لینے والا، تین گراہک اور تیار کرے گا، تو کمپنی مہینہ میں پانچ سو پینسٹھ روپئے کمیشن دے گی اور جتنے گراہک بڑھیں گے اتنا ہی کمیشن بڑھتا جائے گا اور کپڑے لینے والے سے تین سو گراہک بن جائیں گے، تو کمپنی فری فوکٹ میں بیس ہزار روپئے مہینہ دے گی، کیا ایسا پیسہ لینے والے کے لئے یہ پیسہ جائز ہوگا یا حرام؟

المستفتی: حافظ چراغ الدین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کمپنی کی یہ اسکیم کہ پندرہ سو روپئے میں ۳/ جوڑی کپڑے ملیں گے، یہ تو بلا شبہ جائز اور درست ہے؛ لیکن کمپنی کی دوسری اسکیم کہ جو ممبر تین گراہک سے لے کر تین سو تک گراہک بنائے گا اس کو بیس ہزار روپئے ملیں گے، اس میں یہ صراحت نہیں ہے کہ پہلا گراہک اپنی محنت سے دوسروں کو ممبر بنائے گا یا اس کے بنائے ہوئے گراہک اپنی محنت سے تین سو ممبر بنائیں گے، جس میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، تو ایسی صورت میں اس کے لئے ان پیسوں کا لینا جائز نہیں ہے، خلاصہ یہ ہے کہ اگر اس کو اپنی محنت سے براہ راست تین سو ممبر بنانے پڑتے ہیں تو اس کے لئے پیسہ کا لینا دینا جائز اور درست ہے۔ اور اگر تین سو ممبر بنانے میں اس کی محنت کا دخل نہ ہو؛ بلکہ اس کے بنائے ہوئے ممبروں نے گراہک بنایا ہے، تو وہ پیسہ اس کے لئے حلال نہیں ہے۔

عن حماد أنه كان يكره أجر السمسار إلا بأجر معلوم. (المصنف لابن أبي شيبة، في أجر السمسار، موسسة علوم القرآن ۱۱/ ۳۳۹، رقم: ۲۲۴۹۹)

وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل، –إلى قوله– سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن كان في الأصل فاسدا لكثرة التعامل، وكثير من هذا غير جائز، فجوزوه لحاجة الناس إليه. (شامي، كتاب الإجارة، باب ضمان الأجير، مطلب في

أجرة الدلال، زكريا ۹/ ۸۷، كراچی ٦/ ٦٣، الفتاوی الولوالجية، مكتبه دارالأيمان سهارنپور ۳/ ٤٤ ۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵رصفر المظفر ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۹۱۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۲/۵ھ

ممبر سازی پر ملنے والا کمیشن جائز ہے یا ناجائز؟

سوال [۹۶۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) آج کے اس سائنسی دور میں بہت ساری کمپنیاں بالکل انوکھے اور جدید طریقے سے تجارت اور بزنس کر رہی ہیں اور اپنی اس تجارت اور بزنس میں ملک کے تمام عوام کو شرکت کی دعوت دے رہی ہیں، اس طرح کی کمپنی میں ایک کمپنی RCM ہے جو کچھ رقم لے کر لوگوں کو اپنا ممبر بناتی ہے، مثلاً ایک ممبر سے پندرہ روپئے لے کر اس کو تقریباً: -/1400 روپئے کا کپڑا وغیرہ دے دیتی ہے اور اس ممبر کو اپنی مصنوعات جو کھانے پینے پہننے اور برتنے کی چیزوں پر مشتمل ہے، کچھ کمیشن پر دیتی ہے۔

نیز اس کے بعد جو لوگ اس کے ڈاؤن میں یعنی اس کے نیچے ممبر بنتے ہیں ان ممبران کی خریداری پر بھی ان ممبران کی ذاتی کمیشن دے کر ایک خاص تناسب کے ساتھ اوپر والے ممبران کو کمپنی کچھ کمیشن دیتی ہے اور اس طرح ایک ممبر کے ڈاؤن میں یعنی اس سے نیچے جس قدر زیادہ ممبران ہوتے ہیں اور خریداری کرتے ہیں، اسی قدر زیادہ سے زیادہ اوپر والے ممبران کو کمیشن ملتا ہے، بایں وجہ ہر نیچے والا نیا ممبر اس بات کی جدوجہد کرتا ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ ممبر بنیں اور خریداری کریں، تاکہ اس کے ڈاؤن لائن کی کثرت سے اس کا کمیشن روز بروز بڑھتا رہے، کیا مذکورہ کمپنی کے ساتھ اس طرح کی بزنس اور تجارت میں شریک ہونا جائز ہے؟ دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کی طرف ایک فتوی اس کے جواز کا منسوب ہے، جو

اس سوال کے ساتھ منسلک ہے، اطمینان بخش اور مدلل جواب سے نوازیں۔ اللہ آپ حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

مذکورتجارت کے نفع سے کچھ رقم کمپنی فنڈ میں رکھتی ہے اور کچھ لوگوں کو قرعہ اندازی سے تقسیم کرتی ہے، اور کبھی کسی کی موت ایکسیڈنٹ ہو تو اس کے پسماندگان کو ایک خاص رقم عطیہ کی جاتی ہے، کیا یہ رقم لینا جائز ہے؟

المستفتی: محمد اشتیاق پیرپینتی بازار، بھاگلپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ پر غور کرنے سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) اول یہ کہ آر،سی، ایم کمپنی جو اپنے ممبر سے ۱۵۰۰/روپئے لے کر اس کو ۱۴۰۰/روپئے کا کپڑا دیتی ہے اور اس ممبر کو اپنی مصنوعات خریدنے پر کچھ کمیشن بھی دیتی ہے، تو بظاہر اس معاملہ میں کوئی حرج نہیں ہے؛ اس لئے کہ کوئی بھی کمپنی یا شوروم اگر اپنے ممبر کو اپنی مصنوعات خریدنے پر کچھ کمیشن دے، تو اس کو حق ہے کہ وہ اپنا مال جتنی رقم میں فروخت کرنا چاہے کرے۔ اور اس مال پر جتنی چھوٹ اور کمیشن رکھنا چاہے تو بھی اس کو اختیار ہے؟

(۲) دوسرے یہ کہ کمپنی سے جڑنے والا ممبر جب محنت کر کے اپنے نیچے ممبر بنائے گا اور پھر کمپنی اس نئے ممبر کی خریداری پر پہلے والے ممبر کو کچھ کمیشن دے گی، تو کمیشن کے طور پر ملنے والی رقم اس کی محنت کے عوض میں قرار دی جائے گی، بریں بنا یہ کمیشن اس ممبر کے لئے بلا شبہ جائز اور درست ہوگا۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ اس ممبر کے بنائے ہوئے ممبران جب اپنے نیچے نئے ممبران بنائیں گے اور پھر یہ ممبران بھی اپنے نیچے نئے ممبران بنائیں گے، تو اس تیسرے درجہ کے اسی طرح اس سے نیچے درجات کے تمام ممبران کی وجہ سے بھی پہلے درجہ کے ممبر کو کمیشن ملتا ہے، جب کہ اس صورت میں اس کی کوئی محنت نہیں ہوتی؛ اس لئے اس صورت میں اس کو ملنے والا یہ کمیشن کسی طرح جائز اور درست نہ ہوگا، اور اس طرح کا معاملہ شرعی طور پر جائز نہیں۔

يتصرف المالک في ملکه کيف شاء. (البناية، أشرفيه ديو بند ٨/ ٢١٩)

الـمـالک لـلشـيء هـو الـذي يتصرف فيه باختياره ومشيئته. (بدائع الصنائع، النفقة، باب ما يبطل به الخيار، زكريا ٢/ ٦٣٨، كراچی ٢/ ٣٢٧)

الـمـالک هـو الـمتـصرف في الأعيان المملوکة کيف شاء. (تفسير بيضاوي، رشيديه ١/ ٧)

سـئـل مـحـمـد بـن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به . (شامي، كتاب الإجارة، باب ضمان الأجير، مطلب في أجرة الدلال، زكريا ٩/ ٨٧، كراچی ٦/ ٦٣، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٥/ ١٣٧، رقم: ٢٢٤٦٢، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ١٥/ ١٥٥)

لا يـجـوز لأحـد مـن الـمسـلـميـن أخذ مال أحد بغير سبب شرعي. (شامي، كتاب الحدود، باب التعزير، زكريا ٦/ ١٠٦، كراچی ٤/ ٦٠)

عـن عـلـي –رضـي الله عنه– قال: کل قرض جر منفعة فهور با. (كنز العمال، الدين والسلم، دارالكتب العلمية بيروت ٦/ ٩٩، رقم: ١٥٥١٢)

لا يـحـل له أن يأخذ ما حکم له به الحاکم إذا کان لايستحقه. (نووي على هامش مسلم ١/ ٥٧)

عـن سليمان بن عمرو بن الأحوص، عن أبيه قال: سمعت رسول الله ﷺ يـقـول فـي حـجة الـوداع: ألا! إن کـل ربا کان فی الجاهلية موضوع عـنـکـم کـلـه، لـکم رؤس أموالکم، لا تظلمون ولا تظلمون. (أبوداؤد، باب الخطبة يوم النحر، النسخة الهندية ٢/ ٤٧٣، دارالسلام، رقم: ٣٠٥٥)

(۲) کسی ممبر کی موت ہونے کی صورت میں اس کے پسماندگان کو بطور عطیہ شرعی طور پر دینا جائز ہے، اس میں عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں؛ لیکن قرعہ اندازی کے ذریعہ سے کچھ ممبران کو دے دیا جائے اور کچھ ممبران کو نہ دیا جائے، یہ لاٹری کے مشابہ ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

القرعة ثلاث: الأولىٰ: لإثبات حق بإبطال حق آخر، وإنها باطلة.

(الفتاوى التاتارخانية، زكريا ۱۷/ ۱۷۷، رقم: ۲٦۸۷٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ذی الحجہ ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۵۵۰)

کمپنی کا ممبر بنانے پر ملنے والی اجرت کا حکم

سوال [۹۶۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کچھ کمپنیاں ہیں، جن سے ہونے والی آمدنی کے بارے میں شرعی حکم جاننا چاہتے ہیں، تفصیل اس کی یہ ہے کہ اس وقت کئی ایک کمپنیاں ہیں، جو ایک متعین رقم کے عوض میں اپنا ممبر بناتی ہیں، اس کے بعد ہر ہفتے ان کی طرف سے سروے آتا ہے جو کہ ممبر کو بھرنا ہوتا ہے، جس کے عوض وہ اپنے ممبر کو رقم فراہم کرتی ہیں، وضاحت کے لئے میں ایک کمپنی رام سروے کی مثال دیتا ہوں، رام سروے کمپنی ۳۵۰۰/روپئے کی رقم کے عوض میں کسی بھی فرد کو اپنا ممبر بناتی ہے، ایک ہفتے میں اس کا سروے آتا ہے، جس کے عوض میں ۵۰۰/روپئے ممبر کو دیا جاتا ہے، سروے کی رقم ۲۰۰/روپئے ہو جاتی ہے، تو ممبر اس کو حاصل کرسکتا ہے، رقم حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں:

الف: بینک کے ذریعہ اس صورت میں بینک T.D.s. 15% اور سروس چارج کے طور پر کاٹ لیتی ہے۔

ب: سروے کی رقم جب ۳۵۰۰/روپئے تک پہنچ جاتی ہے، تو اس سے کسی نئے شخص کو کمپنی میں جوڑ دیتے ہیں اور اس شخص سے ۳۵۰۰/روپئے نقد لے لیتے ہیں، سروے انکم کے علاوہ ایک اور طریقہ سے کمپنی اپنے ممبر کو رقم دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر کوئی پرانا ممبر کسی نئے فرد کو کمپنی کے ساتھ جوڑ دیا ہے، تو اس کو کمیشن کے طور پر ۲۵۰/روپئے ملتا ہے، نیز پہلے سے جڑ چکے کچھ دوسرے ممبر کو بھی اس کا فائدہ پہنچتا ہے، اس کمپنی کے ساتھ کچھ سامان بنانے والی کمپنیاں

منسلک ہیں، جوکہ اپنے سامانوں کے لئے سروے کرواتی ہیں،اگرچہ یہ پتہ لگانے کے لئے کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ یہ کمپنیاں رام سروے کی خدمت اپنے سامانوں کے سروے کے لئے لیتی ہیں یایہ کمپنی خودہی اپنی طرف سے سروے کرواتی ہیں؟ سروے کچھ اس طرح کا ہوتا ہے:
شیمپو کے لئے سروے: آپ کا نام،آپ کی جنس، ماہانہ آمدنی ،کیا آپ شیمپو استعمال کرتے ہیں؟ کون سا شیمپو استعمال کرتے ہیں، ہفتہ میں کتنی بار استعمال کرتے ہیں،کس کمپنی کا شیمپو استعمال کرتے ہیں؟ گھر کے کتنے افراد شیمپو استعمال کرتے ہیں؟ اپنے شیمپو میں آپ کون سی خوبی چاہتے ہیں؟ آپ شیمپو کہاں سے خریدتے ہیں،اس وقت رام سروے سا پیک ایشیاءاور اس جیسی کمپنیاں کام کررہی ہیں،جن کا طریقہ کار لگ بھگ ایک جیسا ہے ''ایرولائٹ'' کمپنی سروے کی جگہ ایک اشتہاری فلم دکھاتی ہے،اس اشتہاری فلم کو دیکھ کر دیئے گئے سوالوں کا جواب دینا ہوتا ہے، باقی سب کچھ بقیہ کمپنیوں کی طرح ہے۔
آنجناب سے گزارش ہے کہ ان کمپنیوں کے طریقہ کار اور ان سے ہونے والی آمدنی کے بارے میں شرعی حکم سے مطلع فرمائیں، ایسی صورت میں کمپنی سے ہونی والی آمدنی جائز ہے یانہیں؟ چندسوالات اور ہیں:
(١) مان لیجئے کسی کا ١٠٠٠٠/روپئے کمپنی میں لگا ہوا ہے،تو کیا وہ اپنی اصل رقم کے حصول تک کمپنی میں کام کرسکتا ہے؟
(٢) اپنی اصل رقم سے زائد جولوگ کمائی کرچکے ہیں،تو وہ اس رقم کا کیا کریں؟
(٣) ایسی صورت میں وہ رقم کسی غریب یارفاہی ادارے کو دے دیں،تو کمپنی کے ساتھ جڑا رہ سکتا ہے یانہیں؟ واضح ہوکہ جو ٣٥٠٠/روپئے لیا جاتا ہے، وہ ان کی ممبری فیس ہوتی ہے جو انہیں بعد میں واپس نہیں کی جاتی ہے۔

المستفتی: تنویراحمد بنارسی، پیلی کوٹھی،وارانسی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں غور کیا گیا کہ اس جیسی متعدد کمپنیاں اس وقت پورے ملک میں بہت سرگرم ہیں اوراس طرح کی کمپنیوں کے بارے میں شرعی طور پر

غور وخوض کیا گیا، ان میں سے کوئی بھی کمپنی کسی شرعی اصول کے دائرہ میں نہیں آتی ہے، شروع میں جو پیسہ داخل کیا جاتا ہے، بعد میں ملنے والی جتنی بھی زائد رقم ہے وہ سب سود کے دائرہ میں داخل ہوتی ہے۔ اور سروے کی جو بات کہی گئی ہے اس کا پورا حاصل کمپنی میں شامل ہونے والے کے بارے میں تحقیق کے ذرائع ہیں، نیز اصل رقم سے زائد جو لوگ پیسے حاصل کر چکے ہیں، وہ پیسے نادار غریب لوگوں کو ثواب کی نیت کے بغیر دے دیں۔ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ غریب اور نادار لوگوں کو زائد پیسے دے دیا کریں گے، اس غرض سے سودی کام کرنا جائز نہیں، نیز کسی دینی ادارے مسجد یا مدرسے کو سود کا پیسہ دینا جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس میں سودی رقم خرچ کرنا جائز ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ ابھی اسی ہفتہ میں معلوم ہوا کہ رام سروے کمپنی بھاگ گئی۔

وفي الشريعة: الربا: هو الفضل الخالي عن العوض المشروط في البيع لما بينا أن المبيع الحلال مقابلة مال متقوم بمال متقوم، فالفضل الخالى عن العوض إذا دخل في البيع كان ضد ما يقتضيه البيع، فكان حراما شرعا. (المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ۱۲/ ۱۰۹)

وأما ربا النسئة فهو الأمر الذي كان مشهورا متعارفا في الجاهلية، وذلک أنهم كانوا يدفعون المال على أن يأخذوا كل شهر قدرا معينا، ويكون رأس المال باقيا. (تفسير كبير ۷/ ۹۱)

الربا يقتضى أخذ مال الإنسان من غير عوض؛ لأن من يبيع الدرهم بالدرهم نقدا أو نسيئة تحصل له زيادة درهم من غير عوض، ومال المسلم متعلق حاجته وله حرمة عظيمة …… وأخذ الدرهم الزائد متيقن. (تفسير رازي ۷/ ۹۳، الموسوعة الفقهية ۲۲/ ۵۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۲/۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۴۴۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۶/۲۷ھ

''انڈیاروز'' کمپنی کاممبر بننا

سوال [۹۶۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ''انڈیاروز'' ایک کمپنی ہے، اس میں داخلہ فیس ۱۵/سوروپئے داخل کرکے دوسرے آدمی کواس کمپنی کا ایجنٹ بنانا پڑتا ہے، اگردائیں بائیں پانچ پانچ ایجنٹ بنا دیا ہے، تواس آدمی کی تنخواہ پندرہ سوروپئے ہوگی، اسی طریقہ سے جتنے ایجنٹ بنائے گا اتنا ہی تنخواہ بڑھ جائے گی، کیا اس کمپنی کا کام کرنا جائز ہے؟

(۲) اس کمپنی کی دوسری صورت یہ ہے کہ اگراس آدمی نے ایجنٹ نہیں بنایا تو پہلے جو پندرہ سو روپئے جمع کرایا تھا، اس کو سال میں دوگنا کرکے کمپنی دے دے گی، یہ صورت کیسی ہے؟ جواب عنایت فرمائیں۔ (یہاں پراس کمپنی کا بہت رواج ہورہا ہے)

المستفتی: دفتر دینی تعلیمی بورڈ آسام

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں ذکرکردہ شکل میں چونکہ کمپنی براہ راست ایجنٹ بنانے کے نتیجے میں اس کو ۱۵۰۰/روپئے کا معاوضہ دے رہی ہے؛ اس لئے یہ شکل تو جائز ہے اوراس کمپنی میں کام کرنا بھی درست ہے؛ لیکن اگر دوسرے درجہ کے ایجنٹ نے کوئی ممبر بنایا اوراس کے نتیجہ میں پہلے درجہ کے ایجنٹ کوکمیشن دیا جاتا ہے، تو یہ شکل جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: از انواررحمت، ص: ۲۵۸)

البيع مع تأجيل الثمن و تقسيطه صحيح. (شرح المجلة رستم، إتحاد ١/ ١٢٤، رقم المادة: ٢٤٥)

وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل. (شامي، مطلب في أجرة الدلال، زكريا ٩/ ٨٧، كراچى ٦/ ٦٣، هندية، زكريا قديم ٤/ ٤٥٠، جديد ٤/ ٤٨٧، بزازية، زكريا جديد ٢/ ٢٣، وعلى هامش الهندية ٥/ ٤٠)

لا يجوز لأحد أن يأخذ مال أحد بلا سبب شرعي. (قواعد الفقه، أشرفي ص: ١١٠، رقم: ٢٦٩)

(۲) ممبر نہ بنانے کی صورت میں گویا کہ کمپنی کا ایجنٹ نہیں رہا اور سال کے اخیر میں کمپنی اس کے پیسے کے ساتھ ممبری سے خارج کرتی ہے، تو ایسی صورت میں اس کے جو پیسے کمپنی کے پاس رہے وہ اس کی طرف سے امانت یا قرض کے حکم میں ہوں گے۔ اور دونوں صورتوں میں ۱۵۰۰/ روپئے پر زائد رقم سود کے درجہ میں ہے؛ اس لئے یہ صورت بھی جائز نہیں ہے۔

كل قرض جر نفعا حرام. (شامي، مطلب كل قرض جر نفعا حرام، زكريا ۷/ ۳۹۵، کراچی ۵/ ۱۶۶، طحاوي ۲/ ۲۲۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم جمادی الثانیہ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۰۸۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/ ۶/ ۱۴۳۱ھ

دوسرے شخص کی ممبر سازی کا کمیشن لینا

سوال [۹۶۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ''آر، ایم، پی'' ایک کمپنی ہے، جو اپنے پروڈکٹ (مثلاً انربی شیور، شولر لیمپ، پانی صاف کرنے کی مشین، گھر صاف کرنے کی مشین، مساجر، کپڑے، گھڑیاں، لیپ ٹاپ، فریج، موٹر سائیکل وغیرہ جیسے بیس سے پچیس پروڈکٹ ہیں) کو خریدار کے ہاتھ فروخت کرتی ہے، بغیر کسی شرط کے، نیز ہر پروڈکٹ کی قیمت متعین ہے، ہر کسی کے لئے ایک جیسی ہے، کمپنی خریدار سے کہتی ہے کہ اگر آپ کمپنی سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، تو کمپنی کا کوئی بھی ایک سامان خرید کر کمپنی کے ڈسٹری بیوٹرس بن جائیے اور کمپنی کا ہر دو عدد سامان فروخت کر کے ایک ہزار روپئے محنتانہ لیجئے، گویا کمپنی ہر دو عدد سامان فروخت کرنے پر ڈسٹری بیوٹرس کو ایک ہزار روپئے دیتی ہے، حامد نے کمپنی کا ایک سامان شولر لیمپ خریدا، کمپنی نے حامد کو اپنا ڈسٹری بیوٹرس بنالیا، اب کمپنی حامد سے کہتی ہے کہ آپ کمپنی کا کوئی بھی دو عدد سامان فروخت کرو تو ہم آپ کو ایک ہزار روپئے دیں گے، حامد نے اسلم اور اکرم کو ایک ایک سامان فروخت کیا اور

منافع لیا، اب کمپنی حامد سے کہتی ہے کہ اگر یہ اسلم اور اکرم بھی کمپنی سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، تو وہ لوگ بھی دو دو عدد سامان آپ کی رہنمائی مدد اور نگرانی میں فروخت کریں، تو انہیں بھی کمپنی ہر دو عدد فروخت کرنے پر ایک ایک ہزار روپئے اور حامد کو اپنے دو نئے ڈسٹری بیوٹرس کی نگرانی، مدد اور رہنمائی کی وجہ سے ہر دو عدد فروخت ہونے پر ایک ہزار روپئے دیتی ہے، گویا کمپنی ہر دو عدد سامان فروخت ہونے پر ہر ڈسٹری بیوٹرس کو جو ایک ساتھ مل کر کام کررہے ہیں، سبھی لوگوں کو ایک ایک ہزار روپئے دیتی ہے، اب حامد کے ساتھ اسلم اکرم اور نئے چار لوگ کل ملا کر سات عدد ڈسٹری بیوٹرس بن گئے، کمپنی کہتی ہے کہ اگر آپ ساتوں ڈسٹری بیوٹرس مل کر کمپنی کا آٹھ عدد سامان فروخت کرتے ہیں، تو کمپنی نئے بنے چار ڈسٹری بیوٹرس کو ایک ایک ہزار روپئے اور ان چاروں سے پہلے بنے کمپنی کے ڈسٹری بیوٹرس اسلم اور اکرم کو دو دو ہزار روپئے اور ان سے پہلے بنے دسٹری بیوٹرس حامد کو چار ہزار روپئے محنتانہ ادا کرتی ہے، گویا حامد کی ٹیم (جماعت) میں جوں جوں ڈسٹری بیوٹرس کی تعداد بڑھتی جاتی ہے، کمپنی کے سامان کی فروخت بڑھتی جاتی ہے اور ڈسٹری بیوٹرس کی محنتانہ رقم بڑھتی جاتی ہے، واضح رہے کہ کمپنی کے سامان کی خرید وفروخت میں کوئی شرط نہیں ہے، نیز خریدار بالکل آزاد ہے، اگر کمپنی کا ڈسٹری بیوٹرس بننا چاہے تو بنے ورنہ سامان لے کر جائے، کمپنی کی طرف سے کوئی شرط نہیں، کوئی جبر نہیں، اس طرح کا کاروبار کرنا ہم مسلمانوں کے لئے جائز ہے یا نہیں؟

حامد

1000 + 2000 + 4000

اسلم 1000 + 2000　　　　اکرم 1000 + 2000

1000　　1000　　1000　　1000

مندرجہ بالا نمونہ سے واضح ہورہا ہے کہ ہر ڈسٹری بیوٹرس کو ہر دو عدد سامان فروخت ہونے پر ایک

ایک ہزار روپئے ملتا ہے، چونکہ یہ بزنس اجتماعی شکل میں ٹیم بنا کر کیا جاتا ہے؛ اس لئے ٹیم کے ہر فرد کو منافع ملتا ہے اور ٹیم میں ڈسٹری بیوٹرس کی تعداد جتنی بڑھتی جاتی ہے منافع بڑھتا جاتا ہے۔

المستفتی: مفتی آزاد قاسمی، الجامعۃ العربیہ معراج العلوم، چیتا کیمپ ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: براہ راست ممبر سازی کی صورت میں اپنا کمیشن لینا جائز ہے؛ لیکن اپنے ذریعہ بنائے گئے ممبروں کے دوسرے ممبرس اور ڈسٹری بیوٹرس بنانے کی صورت میں پہلے ممبر کو اپنا کمیشن لینا ازروئے شرع جائز نہیں ہے اور اجرت یا کمیشن صرف اپنی محنت یا عمل کے بدلے میں لینا درست ہوتا ہے۔ اور نگرانی کی جو بات کہی جارہی ہے وہ صرف نام کی ہے، حقیقت میں نگرانی بھی دوسرے درجہ کے ممبر ہی کی ہے۔

عن أبي حميد الساعدي، أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل لامرئ أن يأخذ مال أخيه بغير حقه، وذلك لما حرم الله مال المسلم على المسلم.

(مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٤٢٥، رقم: ٢٤٠٠٣، مجمع الزوائد، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٧١)

سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به.

(شامي، كتاب الإجارة، مطلب في أجرة الدلال، كراچی ٦/ ٦٣، زكريا ٩/ ٨٧، تاتارخانية، زكريا ١٥/ ١٣٧، رقم: ٢٢٤٦٢)

الأجرة إنما تقوم بمقابلة العمل. (شامي، كتاب النكاح، باب المهر، زكريا ٤/ ٣٠٧، كراچی ٣/ ١٥٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍محرم الحرام ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۲۶۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۱/۱۸ھ

ایجنٹ کے ذریعہ سے سرکاری دفاتر کا کام کرانا

سوال [٩٦٨٨]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: زیدلوگوں کے سرکاری دفاتر کےکام کاج کراتا ہے،مثلاً ڈرائیورنگ لائسنس وغیرہ بنواتا ہے، اپنے آمدورفت کا خرچ اپنا حق المحنت اورافسران کورشوت دینے کی رقم لوگوں سے لے لیتاہے،لوگ بھی بخوشی یہ سوچ کرزیدکو ذمہ داری دے دیتے ہیں کہ اگرخود سے گئے تو کئی بار آنا جانا پڑے گا، اپنے کام کا حرج ہوگا،سوالگ اورزیادہ رشوت دے کراپنا مقصد حاصل ہوگا، زید کتنی رقم رشوت میں دے گا، کتنا آمدورفت وغیرہ کا خرچ ہوگااورکتنا حق المحنت لے گا، اس کی تفصیل بتائے بغیرلوگوں میں رقمیں لے لیتاہےاورلوگوں کے کام کراتا ہے،اسی کوزید نے اپناذریعہ معاش بنارکھا ہے،اس کا شرعاً کیاحکم ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) کسی ایجنٹ کے ذریعہ سرکاری یاغیرسرکاری کام کرانا جائز ہےاوراس کام میں آپس کے تراضی سے جوبھی پیسہ طے ہوجائے اس پیسہ کا دینااور لینا بھی جائز ہے، ہاں البتہ اگرایجنٹ سرکاری آفیسرکورشوت دے کرکام کراتا ہےاوروہ ایسا کام ہے جو بغیر رشوت کے بھی ہوسکتا ہے،تو رشوت دینے کا گناہ ایجنٹ کوہوگا، پیسہ دے کرکام کرانے والوں کونہیں ہوگا۔ اور اگروہ ایسا کام ہےجس کا کرانا بھی ضروری ہے اورآفیسر رشوت کے بغیرنہیں کرتا ہے،تواپنے حق کے وصول کے لئے یادفع مضرت کےطور پر رشوت دیناجائز ہے، رشوت دینے والے پرگناہ نہیں ہوگا ، لینے والے پرگناہ ہوگا۔

تصح الوكالة بأجر وبغير أجر؛ لأن النبي صلى الله عليه وسلم كان يبعث عماله لقبض الصدقات، ويجعل لهم عمولة، ولهذا قاله ابناء عمه لو بعثتنا على هذه الصدقات فنؤدي ما يؤدي الناس ونصيب ما يصيبه الناس: أي العمولة، ولأن الوكالة عقد جائز لا يجب على الوكيل القيام بها، فيجوز أخذ الأجرة فيها بخلاف الشهادة. (الفقه الإسلامي، وأدلته ٤/ ٧٤٥، مكتبة الهدى ديوبند)

الثالث أخذ المال ليسوى أمره عند السلطان دفعا للضرر أو جلبا للنفع، وهو حرام على الآخذ فقط. (شامي، مطلب في الكلام على الرشوة والهدية، زكريا ٨/ ٣٥، كراچی ٥/ ٣٦٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۱۱۰۳۸)

دو فیصد پر پلاٹ بکوانے کے معاملہ کا حکم

سوال [۹٦٨٩]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے محلّہ میں ایک صاحب نے زمین خریدی ہے، جوکہ ہر دھوکہ اور جھوٹ سے پاک صاف ہے، وہ اس زمین میں دوکانوں کی پلاٹنگ کررہے ہیں، ان صاحب کا کہنا ہے کہ ہماری یہ دوکانیں بکوایئے، ہم آپ کو دو پرسینٹ سے آپ کی محنت کا پیسہ دیں گے، اس میں خریدار سے کوئی لینا دینا نہیں۔ خریدار کو لانے میں کافی محنت کرنی پڑتی ہے۔ کیا یہ پیسہ لینا جائز ہے؟ شریعت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد رفیق محلّہ پیتل نگری، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ معاملہ دلالی کا ہے اور بیع وشراء اور خرید وفروخت میں بیچ میں جو دلال ہوتا ہے، اس کی اجرت جعالہ کے درجہ میں ہوکر جائز ہے۔ دو فیصد کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اجرت من وجہ مجہول ہے اور من وجہ متعین ہے، خریداری کا معاملہ پکا ہونے سے پہلے پہلے مجہول ہے اور معاملہ پکا ہونے پر لین دین سے پہلے ہی اجرت متعین ہوجاتی ہے، مثلاً دس لاکھ روپئے کے پلاٹ کی قیمت متعین ہوگئی ہے، تو دو فیصد کے حساب سے دلال کی

اجرت متعین ہوگئی ہے، یہ لین دین سے پہلے ہی متعین ہوگئی ہے، اس طرح کے معاملہ کو تعامل ناس کی وجہ سے فقہاء نے جائز لکھا ہے۔

الحاصل: أن الجهالة اليسيرة عفو في ما جرى به التعامل؛ لكونها لا تفضي إلى النزاع عادة. (إعلاء السنن، باب أجر السمسرة، کراچی ۱۶/ ۲۰۲، دارالكتب العلمية بيروت ۱۶/ ۲۴۵)

أجرة السمسار ...... مما لا تقدير فيه للوقت ولا مقدار لما استحق بالعقد، وللناس فيه حاجة فكانت جائزة، وإن كان في الأصل فاسدا لحاجة الناس إلى ذلك. (الفتاوى الولوالجية، دارالأيمان سهارنپور ۳/ ۳۴۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳ ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۹۷۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۴/۳ھ

”تم میرے لئے کوئی زمین تلاش کرو“ کہنے کا حکم

سوال [۹۶۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عمران نے خالد سے کہا کہ تم میرے لئے کوئی زمین تلاش کرو؛ لیکن خالد جواب میں یہ کہتا ہے کہ زمین تو دیکھ لوں گا؛ لیکن مقررہ قیمت میں سے پچاس فیصد میں لوں گا، مثلاً زمین کی قیمت ایک لاکھ روپئے ہے، اب مشتری ایک لاکھ روپئے بائع کو دیتا ہے اور پچاس فیصد کے اعتبار سے پچاس ہزار روپئے خالد کو دیتا ہے، تو اب کیا خالد کے لئے یہ پچاس ہزار روپئے لینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد حاکم چاند پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خالد کا عمران سے یہ کہنا کہ زمین تو دیکھ لوں گا؛ لیکن مقررہ قیمت میں سے پچاس فیصد لوں گا شرعاً اس طرح کا معاملہ وکالت اور دلالی کے دائرہ میں داخل ہونے کی وجہ سے جائز اور درست ہے۔ اور خالد اپنی محنت کے موافق مقررہ اجرت لے سکتا ہے۔

كل عقد جاز أن يعقده الإنسان بنفسه جاز أن يوكل به غيره. (هداية، كتاب الوكالة، أشرفي ديوبند ٣/ ١٧٧)

سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن كان في الأصل فاسدا لكثرة التعامل، وكثير من هذا غير جائز، فجوزوه لحاجة الناس إليه. (شامي، كتاب الإجارة، مطلب في أجرة الدلال، كراچی ٦/ ٦٣، زكريا ٩/ ٨٧، تاتارخانية، زكريا ١٥/ ١٣٧، رقم: ٢٢٤٦٢)

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢٢/ جمادی الثانیہ ١٤٢٦ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٨/ ٨٨٦٨)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٤٢٦/٦/٢٣ھ

۴/ باب في فسخ الإجارة

بوقت ضرورت مالک کرایہ داری ختم کرسکتا ہے

سوال [۹۶۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ احقر نے اپنی ایک دوکان بطور کرایہ لگ بھگ تیرہ سال پہلے ایک شخص قمر الدین ولد فخر الدین مرحوم کو دی تھی؛ لیکن اب مجھ کو اپنے چھوٹے لڑکے کے لئے ضرورت ہے، کافی کرایہ دار سے کہنے پر بھی وہ دوکان دینے کے لئے تیار نہیں ہے، جب کہ اس نے اس عرصہ میں اس دوکان کی آمدنی سے قصبہ عمری میں اپنے مکان کے ساتھ کچھ دوکانیں بھی بنوالیں اور اپنے تینوں لڑکوں کی شادیاں بھی کردیں، جب کہ ایک لڑکا گھر کی دوکان میں ہی دوکان کرتا ہے، حضرت والا سے درخواست ہے کہ کیا شرعی حیثیت سے بوجہ ضرورت کرایہ دار کو میری دوکان واپس کرنی چاہئے یا نہیں؟ مجبور ہوکر میں نے عدالت میں بھی مقدمہ دائر کردیا ہے، امید ہے کہ احقر کو صحیح مشورہ سے رہنمائی کریں گے۔

المستفتی: محمد یونس استاذ اردو سیکشن مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر قمر الدین نے اپنے لئے کرایہ پر لیا تھا تو شرعی طور پر قمر الدین مرحوم کی موت کے بعد دوکان اصل مالک کو واپس مل جانی چاہئے تھی؛ لہٰذا اب آپ کو اپنی دوکان واپس لینے کا شرعاً حق ہے، اگر آپ نے کرایہ پر دیتے وقت پگڑی کے نام سے کچھ لیا تھا تو اس کو واپس کردینا بھی لازم ہے، نیز مالک کو اپنی ضرورت کے لئے کرایہ پر دی ہوئی چیز واپس لینے کا حق ہوتا ہے۔

وإذا مات أحد المتعاقدين وقد عقد الإجارة لنفسه انفسخت الإجارة؛ لأنه لو بقي العقد تصير المنفعة المملوكة له أو الأجرة المملوكة

لـه لـغير العاقد مستحقة بالعقد؛ لأنه ينتقل بالموت إلى الوارث، وذلک لا يجوز. (هداية، كتاب الإجارة، باب فسخ الإجارة، اشرفی ٣/ ٣١٥، مختصر القدوري، ص: ١٠٥، المبسوط، دارالكتب العلمية بيروت ١١/ ١٤٣، شامي، زكريا ٩/ ١٤٤، كراچی ٦/ ٨٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۳۲۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱؍ ۶؍ ۱۴۱۸ھ

کیا مالک کو کرایہ کی دوکان وقت سے پہلے لینے کا حق ہے؟

سوال [۹۶۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے ایک دوکان لکڑی کا اسٹال تقریباً چھبیس سال پہلے دو ہزار روپئے ڈپازٹ اور ماہانہ دو سو روپئے کرائے پر لیا، ایگریمنٹ گیارہ مہینے کا بنایا گیا، اس کے بعد سے اب تک مالک دوکان نے نہ کبھی اس کی مرمت کروائی اور نہ ہی الیکٹرک کی سہولت دی، جس کا سب خرچ زید برداشت کررہا ہے اور کرایہ بھی اب تک برابر ادا کررہا ہے او راب تک دوسرا ایگریمنٹ بھی نہیں بنایا گیا ہے، اب مالک دوکان کی بیوی کہتی ہے کہ دوکان واپس کردو، دوکان کا مالک حیات ہے، زید کئی بار اس سے ملنے گیا؛ لیکن وہ سامنے نہیں آیا: لہٰذا اس صورت میں زید کو دوکان واپس کرنی چاہئے یا نہیں؟ زید کا اس دوکان پر شریعت کے اعتبار سے کیا حق بنتا ہے؟

المستفتی: نذیر آفتاب پاکیزہ مارکیٹ، مولانا شوکت علی روڈ ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر گیارہ مہینے کا ایگریمنٹ کرایا گیا ہے تو کاغذات کے اعتبار سے گیارہ مہینے کی مدت متعین ہے، اس سے پہلے خالی کرانے کا حق نہیں ہوگا۔ اور گیارہ

مہینہ مکمل ہوجانے کے بعد مالک مکان کو کسی بھی مہینے میں خالی کرانے کا حق حاصل ہے، مگر اتنا خیال رکھا جائے کہ مہینے کے بیچ میں خالی نہ کرائے؛ بلکہ مہینے کے اختتام میں خالی کرائے، اب جب کہ مالک دوکان یا اس کی بیوی خالی کرانے کے لئے مطالبہ کررہے ہیں تو کسی بھی مہینے کے اختتام پر ان کو خالی کرانے کا حق ہے اور جو روپئے دخل دیتے وقت ڈپازٹ کے طور پر پیشگی جمع کیا گیا تھا، خالی کراتے وقت مالک سے وہ روپئے لینے کا حق ہے۔

ومن استأجر دارا كل شهر بدرهم، فالعقد صحيح في شهر واحد فاسد في بقية الشهور إلا أن يسمي جملة الشهور معلومة؛ لأن الأصل أن كلمة "كل" إذا دخلت فيما لا نهاية له تنصرف إلى الواحد لتعذر العمل بالعموم. (هداية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، أشرفي ٣/ ٣٠٢، مختصر القدوري، ص: ١٠٤، مجمع الأنهر،دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٥٣٠، مصري قديم ٢/ ٣٨٢، هندية، زكريا قديم ٤/ ٤١٦، جديد ٤/ ٤٤٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰/صفر المظفر ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۷۳۲/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۲/۲۵ھ

کرایہ داری کی مدت ختم ہونے سے قبل مالک کا دوکان خالی کرانا

سوال [۹۶۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے دوکان کرایہ پر لی، مدت مقرر کی ہو یا نہ کی ہو؛ لیکن اب دوکان مالک خالی کرنے کے لئے کہتا ہے تو اسے دوکان خالی کرنا چاہئے یا نہیں؟ اگر وہ خالی نہ کرے اور اس میں سامان بیچتا رہے تو اس کا نفع اور کمائی حلال ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد فاروق فوجی نہٹور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مالک دوکان کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی

دوکان جب چاہے، خالی کرالے، کرایہ دار کا مطالبہ کے وقت خالی نہ کرنا اور زبردستی اس میں تجارت وغیرہ کرنا ظلم اور زیادتی ہے؛ البتہ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی بہرصورت کرایہ دار کے لئے حلال ہوگی واجب التصدق نہیں ہوگی، ہاں مدت ختم ہونے کے بعد سے جتنے دن اس دوکان کو خالی نہیں کیا اتنے دنوں کا مناسب اور صحیح کرایہ ادا کرنا اس کے اوپر لازم ہے۔ اور چاند پور کے مفتی صاحب کا لکھا ہوا فتویٰ جس میں دوکان کی آمدنی کو واجب التصدق کہا گیا ہے اس پر مفتی صاحب کو نظر ثانی کرنی چاہئے۔

استأجر دارا، أو حماما، أو أرضا شهرا، فسكن شهرين هل يلزمه أجر الثاني؟ إن معدا للاستغلال نعم وإلا لا، وبه يفتى. (شامي، كتاب الإجارة، باب فسخ الإجارة، زكريا ٩/ ١١٥، كراچی ٦/ ٨٤)

ولو آجر دارا شهرا بمائة، فسكنها المستأجر شهرين لزمه الأجر المسمى عن الشهر الأول، وأجر المثل عن الشهر الثاني إذا كانت الدار معدة للاستغلال. (شرح المجلة، إتحاد ١/ ٢٦٤، برقم: ٤٧٢)

فإن أعدها للإيجار فالخارج للزارع وعليه أجر المثل. (شامي، كتاب الغصب، مطلب مهم، زكريا ٩/ ٢٨٥، كراچی ٦/ ١٩٦، تنقيح الفتاوى الحامدية ٢/ ١٥٨)

وفي الذخيرة: وإن لم يحضر المالك حتى أدرك الزرع، فالزرع للغاصب وللمالك أن يرجع على الغاصب بنقصان الأرض بسبب الزراعة. (البحر الرائق، كتاب الغصب، كوئٹه ٨/ ١١١، زكريا ٨/ ٢٠٢، هندية، زكريا قديم ٥/ ١٤٣، جديد ٥/ ١٦٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۳؍ جمادی الثانیہ ۱۴۳۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۲/۱۰۷)	۱۴۳۳/۶/۳ھ

اپنی ذاتی دوکان کرایہ دار سے جبراً خالی کرانا

سوال [۹۶۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: ہماری ایک دوکان کرائے پر ہے، کرایہ دار خالی نہیں کرتا، عدالت کے ذریعہ اگر خالی کرائی جائے تو نہ معلوم کتنا وقت لگے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ خالی ہوجائے، اگر جبراً اس سے خالی کرالے تو اس شکل میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

نوٹ: اگر اس سے ہم دھوکہ سے کسی کاغذ پر اس کا انگوٹھا لگوا کر اپنی مرضی سے یہ لکھالیں کہ میں نے دوکان خالی کردی ہے، تو کیا حکم ہے؟

المستفتی: حافظ جنرل اسٹور بستی کرتپور، ضلع بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کرایہ دار کو دیتے وقت آپ پیشگی پگڑی کے نام سے زائد رقم لے چکے ہیں، تو جبراً یا دھوکہ دہی کا معاملہ آپ کے لئے درست نہیں۔ اور اگر شروع میں آپ نے پگڑی وغیرہ نہیں لیا ہے اور اب آپ کی ضرورت کے باوجو بغیر عذر شدید کے خالی نہیں کرتا ہے، تو دھوکہ سے دستخط یا انگوٹھا وغیرہ کے ذریعہ سے قانون کے تحت لانے کی گنجائش ہے۔

وقد اتفق الفقهاء على أنه لو جاء ظالم –إلى قوله– ليطلب وديعة لإنسان ليأخذها غصبا، وسأل عن ذلک وجب على من علم ذلک إخفاء ه وإنكار العلم به، وهذا كذب جائز. (نووي على هامش مسلم، النسخة الهندية ١/ ٢٦٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰/۱۱/۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۴۴۷)

کرایہ دار پر مدت کرایہ داری پوری ہونے پر دوکان خالی کرنا لازم ہے

سوال [۹۶۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمد ابراہیم نے ایک دوکان رفعت عالم کو دی، گیارہ ماہ کے لئے کرایہ نامہ لکھا گیا تھا اور

کرایہ دار نے پیشگی بارہ ہزار روپے ادا کردیئے تھے، حالانکہ ساڑھے پانچ ہزار روپے گیارہ ماہ کے ہوتے ہیں، اب محمد ابراہیم جو کہ مالک دوکان ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ ساڑھے چھ ہزار روپئے جو باقی ہیں وہ رفعت صاحب لے لیں اور میری دوکان خالی کردیں؛ کیوں کہ مجھے ضرورت ہے اور یہی بات تحریراً دوکان دینے کے وقت طے تھی اور اسی طرح سے کرایہ دار سے یہ بھی طے تھا کہ دوکان میں کسی طرح کی تعمیری کام کرانا منع ہے اور کرایہ دار نے کچھ کام کرالیا ہے، تو کیا یہ جائز ہے ان کو، اور کیا مالک کو اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی، فرش مارول کا اور فرنیچر بنوایا اس کی قیمت مانگتا ہے، تو اس مسئلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اور کیا یہ بات جائز ہے یا ناجائز ہے؟ مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔

المستفتی: محمد ابراہیم محمد اسماعیل تمباکو مرچنٹ محلّہ چمن سرائے سنبھل

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صرف گیارہ ماہ کے لئے کرایہ داری کا معاملہ طے ہوا ہے، تو مدت کرایہ صرف گیارہ ماہ ہوگی اور مدت پوری ہونے پر کرایہ دار کو دوکان خالی کردینا لازم اور واجب ہوگا۔

الشرط لما صح به وجب الوفاء به شرعا. (قواعد الفقه، أشرفي ۸۵، رقم: ۱۵۱)

اور جب مالک نے کسی بھی قسم کے تصرف سے منع کردیا ہے، تو کرایہ دار کو فرش وغیرہ بنانے کا حق نہیں تھا۔

لا يجوز لأحد أن يتصرف في ملک الغير بغير إذنه. (قواعد الفقه، اشرفي، ص: ۱۰۰، رقم: ۲۷۰، شرح المجلة رستم، إتحاد ۱/ ۶۱، رقم المادة: ۹۶)

لہٰذا کرایہ دار اس عمل کی وجہ سے گنہگار رہوگا۔ اور اگر فرنیچر وغیرہ جو کچھ بھی بنوایا ہے، وہ بآسانی بغیر نقصان الگ کرلیا جاسکتا ہے، تو الگ کرلے، ورنہ مالک اس کے ملبہ کی لاگت ادا کردے اور دوکان پر قبضہ کرلے اور کرایہ دار بغیر اجازت بنانے کی وجہ سے گنہگار تو ہوگا؛ لیکن اس کی چیز کو برباد کرنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔

فإن كانت قيمة البناء أكثر يملكها صاحبه بالقيمة، وإن كانت قيمتها أكثر من قيمته لم ينقطع حق المالك عنها. الخ (الأشباه والنظائر، قديم، ص: ١٤٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ذیقعدہ ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/۲۸۸۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۲/۱۱/۶ھ

مالک مکان کا بخوشی کرایہ دار کو دوسری جگہ انتظام کرنے کے لئے روپئے دینا

سوال [۹۶۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مکان جو کہ نئی آبادی گوئیاں باغ میں کھپریل پوش میں کرایہ دار رہتے تھے، بہت عرصہ سے تقریباً اس مکان میں بیس سال رہتے ہوئے ہوگئے، اچانک مالک مکان کو مکان کی ضرورت پڑی، مالک مکان نے اپنے تین کرایہ داروں سے کہا کہ ہمارا مکان خالی کردو، ہمیں مکان کی ضرورت ہے، اس پر تینوں کرایہ دار بولے کہ ہم کہاں جائیں گے، ہمارے پاس کوئی جگہ فوراً رہنے کے لئے نہیں ہے، مگر مالک مکان برابر اپنے تینوں کرایہ داروں سے اصرار کرتا رہا، کہ ہمارا مکان خالی کردو؛ لیکن تینوں کرایہ دار کی طرف سے مکان خالی کرنے میں تاخیر ہونے لگی، اس پر مالک مکان نے اپنے تینوں کرایہ داروں پر مقدمہ دائر کردیا، مقدمہ برابر تین سال تک چلتا رہا، تین سال کے بعد ان تین کرایہ داروں میں سے دو کرایہ داروں نے آپس میں فیصلہ کرکے مالک مکان سے مقدمہ اٹھوالیا اور پھر دونوں کرایہ دار نے مالک مکان سے پانچ پانچ ہزار روپئے لے کر مکان خالی کردیا، ان میں سے اب صرف ایک کرایہ دار بچے ہیں، جو کہ ایک مسجد کے امام ہیں، ان سے مالک مکان نے کہا کہ ان دو کرایہ دار کی طرف سے پانچ ہزار روپئے کا اقدام تھا، کہ آپ ہمیں پانچ ہزار روپئے دے دو، تو ہم مکان خالی کردیں گے، ان کو میں نے پانچ ہزار روپئے بالجبر دیا ہے؛ لیکن آپ کی طرف سے کوئی جبر نہیں ہے روپئے پیسے کا، نہ آپ سوال کررہے ہیں؛ لہٰذا میری خواہش ہے کہ میں آپ

کو بھی پانچ ہزار روپئے دے دوں اور میں اپنی خوشی سے آپ کا بھی مقدمہ عدالت سے اٹھالیتا ہوں اور میں آپ کو اپنی خوشی سے پانچ ہزار روپئے دوں گا، آپ اس روپئے کو خوشی سے لے لو؛ کیوں کہ یہ روپئے میں آپ کو خوشی سے دے رہا ہوں؛ کیوں کہ آپ نے مجھ سے مانگا نہیں، نیز آپ ایک غریب آدمی ہیں، ایک مسجد کے امام بھی ہیں، آپ اس روپئے کو لے کر اپنی خوشی سے دوسرا انتظام کر لیجئے گا، مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے، اب ایک شبہ رہ جاتا ہے کہ یہ روپئے جو امام صاحب کو ملا ہے یہ روپئے امام صاحب کے لئے حرام ہے یا حلال؟ اس امام صاحب کے پیچھے مقتدیوں کا نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق فیصلہ صحیح فرمائیں۔ بینوا توجروا

نوٹ: اس مکان کے بارے میں میں نے تقریباً چار ہزار روپئے خرچ کئے ہیں۔

المستفتی: حافظ سلطان احمد، امام مسجد لال کوٹھی والی محلہ مغل پورہ اول، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر واقعی کرایہ دار مجبور ہے، مکان خالی کر دینے میں اہل وعیال پریشانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اپنی حیثیت کے مطابق دوسرا مکان نہ ملے اور مالک مکان بار بار اصرار اور مجبور کرتا ہو اور مکان کے مالک نے اپنی مرضی سے غریب نادار کے عائلی انتظام کے لئے کچھ دیا ہو، تو وہ حلال ہے، اس صورت میں امام صاحب کو فاسق قرار دے کر ان کے پیچھے نماز کو مکروہ ثابت کرنا صحیح نہیں ہوگا؛ بلکہ نماز بلا کراہت درست ہے۔

(مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۳/ ۲۵۸، جدید زکریا ۹/ ۲۸۶)

نیز اگر کرایہ دار نے اپنے آرام وراحت کے لئے کچھ خرچ کیا ہے، وہ مالک مکان اپنی خوشی سے دے دے تو لینا جائز ہے، زبردستی نہیں۔ (فتاوی رحیمیہ) اور مذکورہ اعذار کے نہ ہونے کی صورت میں کرایہ دار سے مالک مکان جب چاہے مکان خالی کرا سکتا ہے، کرایہ دار کا ٹال مٹول کرنا اور پگڑی وصول کرنا ناجائز ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴ ؍صفر ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۵۱۷)

کرایہ دار کا مکان میں لگایا ہوا پیسہ مکان مالک سے وصول کرنا

سوال [۹۶۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کرایہ دار نے جو پیسہ مکان میں اس کی درستگی کے لئے لگایا ہے، کیا وہ اس پیسے کو مکان خالی کرتے وقت مکان مالک سے لے سکتا ہے؟

المستفتی: امیر حسین اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مکان مالک نے مرمت کی اجازت دی ہے، تو صورت مسئولہ میں کرایہ دار کو مکان پر صرف کیا ہوا پیسہ لینا درست ہے، وہ اس کا حق ہے اور مکان مالک پر واجب ہے کہ اس کو ادا کردے ورنہ گنہگار رہوگا۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ۱۳/ ۳۹۰، ۱۱/۳۲۳، ڈابھیل ۱۷/ ۱۲۹)

وعمارة الدار المستأجرة وتطيينها وإصلاح الميزاب، وما كان من البناء على رب الدار. (درمختار على الشامي، كتاب الإجارة، باب فسخ الإجارة، زكريا ٩/ ١٠٩، كراچی ٦/ ٧٩، تنقيح الفتاوى الحامدية ٢/ ٩٨، هندية، زكريا قديم ٤/ ٤٥٥، جديد ٤/ ٤٩٢، المبسوط دارالكتب العلمية بيروت ١٥/ ١٤٤، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٥٥٥، مصري قديم ٢/ ٣٩٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ رجب المرجب ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۵۵۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۸/۹ھ

کیا کرایہ دار کے مرنے سے کرایہ داری ختم ہوجاتی ہے؟

سوال [۹۶۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: ایک شخص ڈاکٹر محمد ایوب صاحب نے اپنی زندگی میں ایک آراضی کرایہ پر لے کر مالک آراضی کی مرضی سے اپنے پیسہ ورقم سے اس پر عمارت تعمیر کر لی تھی، اب ان کا انتقال ہو گیا، ان کے کوئی بیٹا نہیں ہے، انہوں نے اپنے مرنے کے بعد اپنی بیوہ بلقیس بیگم اور ایک دختر بازغہ ایوب اور تین بھتیجے چھوڑے جو بڑے بھائی کے بیٹے ہیں، اس طرح شرعی حیثیت سے عمارت اور اس کی کرایہ داری میں کس کس کو کتنا کتنا حق پہنچتا ہے؟

نوٹ: ضروری مسئلہ دریافت یہ کرنا ہے کہ مذکورہ بالا صورت میں حق کرایہ داری کس کو حاصل ہوگا، محمد ایوب کی لڑکی بازغہ کو یا بیوی بلقیس کو یا بھتیجوں کو یا تمام ورثاء کو، جو بھی شرعی حکم ہو تحریر فرمائیں؟

المستفتی: اکبر حسین محلّہ بھٹی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: محمد ایوب کرایہ دار کا جب انتقال ہو گیا تو شرعی طور پر کرایہ داری ختم ہو چکی ہے، اس میں محمد ایوب مرحوم کے ورثاء کے درمیان وراثت جاری نہیں ہوگی؛ بلکہ اصل مالک کو واپس کر دینا لازم ہوگا؛ البتہ محمد ایوب نے مالک کی اجازت سے اس کی تعمیر میں جو رقم خرچ کی ہے، وہ رقم مالک سے وصول کر سکتے ہیں اور وہ رقم آٹھ سہام میں تقسیم ہو کر بیوی بلقیس کو ایک دختر بازغہ کو چار اور بھتیجوں کو ایک ایک ملے گا اور عمارت وآراضی مالک کو واپس کر دیں۔

وإذا مات أحد المتعاقدين وقد عقد الإجارة لنفسه انفسخت الإجارة

(هندية، كتاب الإجارة، باب فسخ الإجارة، اشرفي ٣/ ٣١٥، شامي، زكريا ٩/ ١١٤، كراچی ٦/ ٨٣، مختصر القدوري، ص: ١٠٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ رمحرم الحرام ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۶۲۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/۱/۱۴۱۷ھ

کرایہ دار کے انتقال ہونے کی صورت میں کرایہ داری کا حکم

سوال [۹۶۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمد انیس مرحوم بحیثیت کرایہ دار مسجد سے ملحقہ جگہ پر جو کہ مسجد کی ہے، اپنا ذاتی کاروبار کرتے تھے، جس میں ان کا کوئی شریک نہیں تھا، چونکہ وہ جگہ مسجد کی ہے؛ اس لئے اس کا کرایہ بھی اپنے نام سے رسید لےکر وہ مسجد کو ہی ادا کرتے تھے، ان کے وارثین میں بیوہ زوجہ کے علاوہ ۲/لڑکے اور ۴/لڑکیاں ہیں، جو کہ نابالغ ہیں، ہاں ایک لڑکا اس عمر کو پہنچ چکا ہے، کہ وہ اپنا کاروبار بذات خود اچھی طرح کر سکے، جب کہ مرحوم کے والد اور بھائی بھی حیات ہیں، ایسی صورت میں جناب والا سے استدعا ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں یہ بتانے کی زحمت گوارہ کریں کہ اس جگہ پر اب کس کا حق بنتا ہے؟ زوجہ، بیوہ اور بچوں کا یا والد اور بھائی کا؟
(نوٹ): مذکورہ آراضی پر قبضہ کرتے وقت پگڑی یا یکمشت رقم دیئے بغیر صرف سادہ کرایہ داری پر معاملہ ہوا تھا۔

المستفتی: محمد جاوید محلّہ اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سوال نامہ کے مطابق واضح ہوتا ہے کہ یہ خالص اجارہ کا معاملہ ہے، اور ایسے امور میں شرعی حکم یہی ہے کہ جب کرایہ دار کا انتقال ہو جائے، تو معاملہ شرعاً فسخ ہو جاتا ہے؛ اس لئے مذکورہ جگہ مسجد کو واپس کر دینا لازم ہے۔ اور پھر مسجد کے ذمہ داران اپنی مرضی سے جس کو مناسب سمجھیں کرایہ پر دے سکتے ہیں۔ اور اگر چاہیں کسی کو نہ دیں؛ لہٰذا اس میں مرحوم کے ورثاء کا کوئی حق شرعاً متعلق نہیں ہے۔

وإذا مات أحد المتعاقدين وقد عقد الإجارة لنفسه انفسخت الإجارة

(هداية، كتاب الإجارة، بـاب فسـخ الإجـارة، اشرفي ۳/ ۳۱۵، مجمع الأنهر، دارالكتب العليمة بيروت ۳/ ۵۵۹، مصري قديم ۲/ ۴۰۱، شامي، زكريا ۹/ ۱۱۴، كراچی ۶/ ۸۳)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/صفر ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۳۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۲/۲۶ھ

کیا کرایہ دار کے مرتے ہی معاملۂ اجارہ فسخ ہوجاتا ہے

سوال [۹۷۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ لال محمد نے ایک زمین کرایہ پر جنگو خاں سے لی، پھر لال محمد کا انتقال ہوگیا، تو انہوں نے اپنے ورثاء میں تین لڑکے: (۱) احمد حسین (۲) اقبال حسین (۳) جبار حسین چھوڑے (ایک لڑکی مجیداُ جو باپ لال محمد کے سامنے انتقال کرگئی) پھر مذکورہ زمین کرایہ پر اقبال حسین کے نام آگئی اور رسید اقبال حسین کے نام آتی رہی اور پھر اقبال حسین کا انتقال ہوگیا، تو انہوں نے اپنے ورثاء میں ۴/لڑکے: (۱) اعجاز حسین (۲) ممتاز حسین (۳) مختار حسین (۴) سرفراز حسین، ایک لڑکی عشرت جہاں کو چھوڑا، پھر ممتاز حسین کے نام رسید جاری ہوگئی، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ اس زمین میں مذکورہ بالا تمام ورثاء حق دار رہوں گے یا جن کے نام کرایہ کی رسید آتی ہے وہی کرایہ دار مانے جائیں گے اور انہیں کو اس زمین کو لینے کا حق ہوگا؟

نوٹ: مالک زمین کے ورثاء نے اس کو خالی کرانے کے لئے اور اپنے اختیار میں لینے کے لئے مقدمہ بھی دائر کر رکھا ہے، ایسی صورت میں زمین شریعت کی رو سے کس کو ملے گی؟

المستفتی: مختار حسین اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: جب لال محمد نے اپنے لئے مذکورہ زمین مالکِ زمین جنگو خاں سے کرایہ پر لی ہے، تو شرعی طور پر لال محمد کے مرنے کے بعد جنگو خاں یا ان کے ورثاء کو واپس ملنی چاہئے، اب جب جنگو خاں کے ورثاء واپس لینا چاہتے ہیں، تو ورثاء کو واپس کر دینا لازم ہوگا۔

وإذا مات أحد المتعاقدين وقد عقد الإجارة لنفسه انفسخت الإجارة

(هداية، كتاب الإجارة، باب فسخ الإجارة، اشرفي ٣/ ٣١٥، مختصر القدوري، ص: ١٠٥، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ١١/ ١٤٣، مجمع الأنهر، دارالكتب العليمة بيروت ٣/ ٥٥٩، مصري قديم ٢/ ٤٠١، شامي، زكريا ٩/ ١١٤، كراچی ٦/ ٨٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۲۵۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۲/۲۳ھ

۵/ باب الاستئجار على الطاعات

اجرت لےکر دینی تعلیم دینا اور طلبہ کی غیر حاضری پر مالی جرمانہ وصول کرنا

سوال [۱۰۷۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قرآن مجید اور دینیات کی تعلیم پر ماہانہ طلبہ سے فیس مقرر کرکے پڑھانا کیسا ہے؟

(۲) طلبہ کی غیر حاضری پر یومیہ مالی جرمانہ مقرر کرنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: ابصار احمد موضع براؤتی حسن پور، امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جی ہاں ماہانہ فیس لےکر دینیات کی تعلیم جائز ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۲/ ۱۵، جدید زکریا مطول ۱۱/ ۵۰۷)

وبعض مشايخنا استحسنوا الاستئجار على تعليم القرآن اليوم؛ لأنه ظهر التواني في الأمور الدينية، ففي الامتناع تضييع حفظ القرآن وعليه الفتوى . (هداية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، أشرفي ۳/ ۳۰۳، شامي، زكريا ۹/ ۷٦، كراچی ٦/ ٥٥، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٥/ ۱۲٤، زكريا ٦/ ۱۱۷، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۳/ ۱۰۰)

(۲) غیر حاضری کا مالی جرمانہ لینا جائز نہیں ہے، ہاں البتہ مصلحت کے طور پر جرمانہ لیا جائے اور آخری سال میں سب ان کو واپس کردیا جائے تو اس کی گنجائش ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۲/ ۵۴۳)

ولا يكون التعزير بأخذ المال من الجاني في المذهب لكن ...... أن التعزير بأخذ المال إن رأى القاضي ذلك أو الولي جاز، ومن جملة ذلك رجل لا يحضر الجماعة يجوز تعزيره بأخذ المال –إلى قوله– وأرى أن يأخذه فيمسكه مدة للزجر، ثم يعيده لا أن يأخذه لنفسه، أو لبيت المال.

(مجمع الأنهر، كتاب الحدود، فصل في التعزير، دارالكتب العلمية بيروت ۲/ ۳۷۱-۳۷۲، مصري قديم ۱/ ۶۱۷، شامي، زكريا ۶/ ۱۰۶، كراچی ٤/ ٦٠- ٦١، البحر الرائق، زكريا ٥/ ٦٨، كوئٹه ٥/ ٤١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۵۶۶)

امامت کی اجرت طے کرنا

سوال [۹۷۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا پنجوقتہ نماز پڑھانے والے امام کو طے کر کے نماز پڑھانے کی اجرت لینا جائز ہے؟ اور کیا امام نماز پڑھانے کی اجرت طے کرسکتا ہے؟ اور کیا طے کر کے نماز پڑھانے والے امام کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے؟

المستفتی: ایم آر جامعی گلشہید، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پنجوقتہ امام کو طے کر کے امامت پر اجرت لینا جائز ہے اور ایسے امام کے پیچھے بلا کراہت نماز صحیح ہوگی، مگر رمضان میں صرف قرآن سنانے کی اجرت جائز نہیں اور نہ ختم تراویح کی۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۴۰)

ويفتى اليوم بصحتها لتعليم القرآن والفقه والإمامة. (الدرالمختار مع الشامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، مطلب تحرير مهم في عدم جواز الاستئجار على التلاوة والتهليل، زكريا ۹/ ۷٦، كراچی ٦/ ٥٥، تبيين الحقائق، زكريا ٦/ ١١٧، إمداديه ملتان ٥/ ١٢٤، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ٥٣٣، مصري قديم ۲/ ۳۸٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۹۲۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶/ ۶/ ۱۴۱۷ھ

ائمہ مساجد ومؤذنین کے لئے حکومت سے ملنی والی تنخواہ لینا کیسا ہے؟

سوال [۹۷۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بنگال حکومت نے بطور امداد ائمہ مساجد ومؤذنین کو کچھ رقم دینے کا اعلان کیا ہے، ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ حکومت مسلمانوں کے لئے دینی معاملہ میں کوئی دخل اندازی نہیں کرے گی؛ لہٰذا حکومت کی اس امداد کو لینا کیسا ہے؟

المستفتی: خورشیدر بانی، امام بلال مسجد، توپسیہ روڈ، کلکتہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مساجد اور مدارس کے نظام میں اگر سرکاری امداد کی وجہ سے کوئی خلل اندازی نہیں ہوتی ہے اور آئندہ سرکار کی طرف سے کسی قسم کی دخل اندازی کا اندیشہ نہیں ہے، تو ایسی صورت میں سرکاری امداد لینے کی گنجائش ہے، ورنہ سرکاری امداد لینے سے احتیاط ضروری ہے۔

فصح وقف الذمي بشرط كونه قربة عندنا وعندهم، وقوله: بخلاف ما لو وقف على مسجد بيت المقدس، فإنه صحيح؛ لأنه قربة عندنا وعندهم. (البحرالرائق، كتاب الوقف، زكريا ديوبند ٥/ ٣١٦، كوئٹه ٥/ ١٨٩-١٩٠)

ولو أوصى بثلث ماله بأن يحج عنه قوم من المسلمين أو يبنى به مسجدا للمسلمين إن كان ذلك لقوم بأعيانهم صحت الوصية، وتعتبر تمليكا لهم. (هندية، كتاب الوصايا، الباب الثامن: في وصية الذمي والحربي، زكريا قديم ٦/ ١٣٢، جديد ٦/ ١٥٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/صفر المظفر ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۸۷۴/۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۲/۷ھ

آدمی کا لڑکیوں کو اور خاتون کا لڑکوں کو تعلیم دینا

سوال [۹۷۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تدریس ایک معزز پیشہ ہے، جس کا انسانی شخصیت کی تعمیر سے گہرا تعلق ہے؛ لیکن موجودہ دور میں اولاً تو مخلوط تعلیم کے نظام کا غلبہ ہے اور استاذ کو بعض اوقات اس طرح تدریس کا فریضہ انجام دینا ہوتا ہے کہ اس کے مخاطب لڑکے بھی ہوتے ہیں اور لڑکیاں بھی ہوتی ہیں، اسی طرح لڑکیوں کی مخصوص درسگاہوں میں مرد اساتذہ بھی کام کرتے ہیں اور لڑکوں کی درسگاہوں میں خاتون اساتذہ بھی کام کرتی ہیں، تو کیا ایسی ملازمت جائز ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: قمر عالم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: عورتوں کے لئے بالغ لڑکوں کو باقاعدہ درس وتدریس کے طور پر پڑھانا جائز نہیں ہے، کبھی بھی فتنہ ہوسکتا ہے، اسی طرح مرد کے لئے بالغ لڑکیوں کو پڑھانا جائز نہیں، اس میں بھی فتنہ اور برائی میں ابتلاء کا اندیشہ ہے اور ایسے ہی بالغ لڑکے اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم شریعت میں جائز نہیں؛ اس لئے کہ کبھی بھی لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان ناجائز تعلقات پیدا ہونے کا خطرہ موجود ہے اور موجودہ دور میں مخلوط تعلیمی نظام کا غلبہ ہونے کی وجہ سے ناجائز چیز جائز نہ ہوگی؛ کیوں کہ خلاف شرع رواج کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں ہے۔

قال الله تعالیٰ: ﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ.﴾ [النور: ۳۰-۳۱]

وقال الله تعالیٰ: ﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ.﴾ [الأحزاب: ۳۳]

عن جابر – رضي الله عنه – عن النبي ﷺ قال: لاتلجوا على

المغيبات، فإن الشيطان يجري من أحدكم مجرى الدم. (ترمذي، باب ماجاء في كراهية الدخول على المغيبات، النسخة الهندية ۱/ ۲۲۲، دارالسلام، رقم: ۱۱۷۲، سنن الدارمي، دارالمغني ۳/ ۱۸۳۱، رقم: ۲۸۲٤، حجة الله البالغة ۲/ ۳۲۹)

عن عبدالله –رضي الله عنه– عن النبي ﷺ قال: المرأة عورة، فإذا خرجت استشرفها الشيطان. (ترمذي، باب ماجاء في كراهية الدخول على المغيبات، النسخة الهندية ۱/ ۲۲۲، دارالسلام رقم: ۱۱۷۳، مسند البزار ٥/ ٤۲۷، رقم: ۲۰٦۱، صحيح ابن خزيمة، المكتب الإسلامي ۲/ ۸۱۳–۸۱٤، رقم: ۱٦۸۳–۱٦۸٦)

عن عبدالله بن مسعود –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: إن النظرة سهم من سهام إبليس مسموم. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ۱۰/ ۱۷۳، رقم: ۱۰۳٦۲، رستم المفتي، ص: ۹۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۲۴۲)

ٹیوشن کی اجرت کا شرعی حکم

سوال [۹۷۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج کل بہت سارے لوگ اپنے بچوں کو گھروں پر ٹیوشن کے ذریعہ قرآن کریم پڑھواتے ہیں، کیا اس کی اجرت متعین یا غیر متعین کرکے لینا درست ہے؟ البتہ اگر لڑکی نابالغ مشتہاۃ ہو یا نابالغ غیر مشتہاۃ ہو تو ان کا کیا حکم ہے؟ وضاحت فرمادیں۔

المستفتی: محمد شاکر رامپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گھر میں بچوں کی تعلیم کے لئے کسی معلم کا انتظام کرنا شرعاً جائز ہے اور پڑھانے والے کے لئے اجرت لینا بھی جائز ہے؛ اس لئے کہ یہ تلاوت

قرآن کی اجرت نہیں ہے؛ بلکہ تعلیم قرآن کی اجرت ہے اور تلاوت قرآن اور تعلیم قرآن میں بہت بڑا فرق ہے؛ البتہ جو لڑکیاں قریب البلوغ اور مشتہاۃ ہیں، وہ بالغہ کے درجہ میں ہیں ان کو شرعی پردہ اور شرعی حدود کے بغیر کسی معلم مرد کا تعلیم دینا جائز نہیں؛ بلکہ ایسی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے کسی پڑھی لکھی عورت کا انتظام کرنا بہتر ہے۔

عن ابن عمر –رضي الله عنه– قال: خطبنا عمر بالجابية ...... ألا! لا يخلون رجل بامرأة إلا كان ثالثهما الشيطان. (سنن الترمذي، باب ماجاء في لزوم الجماعة، النسخة الهندية ۲/ ۳۹، دارالسلام، رقم: ۲۱٦۵، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ۹/ ۲۷۱، رقم: ۳۸۱۷)

المفتى به جواز الأخذ استحسانا على تعليم القرآن لا على القراءة المجردة. (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، مطلب تحرير مهم في عدم جواز الاستئجار على التلاوة والتهليل، زكريا ۷/ ۷۷، كراچی ٦/ ۵٦)

وعن محمد: وإذا كانت تشتهى ويجامع مثلها، فهي كالبالغة. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ۹/ ۵۳۱، كراچی ٦/ ۳٦۹)

وتمنع المرأة الشابة من كشف الوجه لا لأنه عورة بل لخوف الفتنة. (شامي، كتاب الصلاة، باب شروط الصلاة، زكريا ۲/ ۷۹، كراچی ۱/ ٤۰٦، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤۱/ ۱۳٤، ٤۲/ ۳٦۵)

نغمة المرأة عورة وتعلمها القرآن من المرأة أحب. (شامي، كتاب الصلاة، باب شروط الصلاة، زكريا ۲/ ۷۸، كراچی ۱/ ٤۰٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۷۰۳/۳۹)	۱۴۳۳/۵/۲۵ھ

حرام کاروباری کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا اور اس کی اجرت لینا

سوال [۹۷۰٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: خنزیر کے برش بنانے والوں کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر اجرت لینا، نیز نکاح پڑھانا، نذرانہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: علی صدیقی اصغر منزل شیر کوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر حرام مال ہی سے اجرت یا ہدیہ دیتا ہے اور ٹیوشن پڑھانے والے اور نکاح پڑھانے والے کو ان کا علم بھی ہے تو جائز نہیں ہے۔

عن ابن مسعود –رضي الله عنه– قال: جاء إليه رجل، فقال: إن لي جارا يأكل الربا، وإنه لا يزال يدعوني، فقال: مهنأة لک وإثمه عليه، قال سفيان: إن عرفته بعينه لاف تصبه. (مصنف عبدالرزاق، باب طعام الأمراء وآكل الربا، المجلس العلمي ۸/ ۱۵۰، رقم: ۱٤٦۷۵)

وإن غالب ماله الحرام لا يقبلها ولا يأكل إلا إذا قال: إنه حلال أو ورثته أو استقرضته. (مجمع الأنهر، كتاب الحظر والإباحة، فصل في الكسب، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ۱۸٦، مصري قديم: ۲/ ۵۲۹، هندية، زكريا قديم ۵/ ۳٤۳، جديد ۵/ ۳۹۷، البناية، اشرفيه ۱۲/ ۲۰۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۰۲۹)

قبروں پر قرآن پڑھنے کے عوض جوڑا ہدیہ قبول کرنا

سوال [۹۷۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک امام درگاہ والی مسجد میں امامت کرتا ہے اور قبروں پر قرآن پڑھتا ہے، اس کے بعد قبر والوں کے ورثاء سے جوڑا کپڑا، مٹھائی، پیسہ وغیرہ لیتا ہے، تو اس طرح قبروں پر قرآن پڑھنا اور اس پر جوڑا، کپڑا، مٹھائی وغیرہ لینا کیسا ہے؟ جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: تنوشاہ عیدگاہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جوڑا کپڑا، مٹھائی وغیرہ حاصل کرنے کی نیت سے جو قرآن پڑھا جاتا ہے، اس کا ثواب نہیں ملتا ہے اور قرآن پڑھ کر جوڑا کپڑا، پیسہ، مٹھائی وغیرہ لینا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۱/ ۵۱۵، فتاوی محمودیہ قدیم ۷/ ۱۷۱، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۶۹، رشیدیہ جدید مبوب ۴۹۰)

إن القرآن بالأجرة لا يستحق الثواب لا للميت ولا للقارئ، ويمنع القارئ للدنيا والآخذ والمعطى آثمان. (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، مطلب تحرير مهم في عدم جواز الاستئجار على التلاوة والتهليل، زكريا ۹/ ۷۷، كراچی ۶/ ۵٦، البناية، أشرفيه ديو بند ۱۲/ ۲۳۷، تنقيح الفتاوى الحامدية / ۲/ ۱۲۷)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱ر محرم الحرام ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۸۰۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱/۱/۱۴۱۵ھ

مقرر کا وعظ کے لئے رقم طے کرنا

سوال [۹۷۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعض مقررین تقریری پروگرام کے لئے رقم طے کرتے ہیں اور یہاں تک کہتے ہیں کہ اتنے روپئے دو گے تو جاؤں گا ورنہ نہیں، تو مقررین کا یہ طے کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو ایسے مقررین اور طے شدہ رقم دے کر مقررین سے تقریر کروانے والے کا کیا حکم ہے؟ نیز اگر یہ معلوم ہو کہ فلاں مقرر احکام شرع پر عمل نہیں کرتا یہاں تک کہ فرائض و واجبات کا بھی تارک ہے، تو اس مقرر کو تقریر کے لئے مدعو کرنا عند الشرع کیسا ہے؟

المستفتی: راشد علی (کاتب) پیپل سانہ، ضلع مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر کسی مقرر اور خطیب کا پیشہ ہی وعظ گوئی ہے، تو اس کے لئے اجرت طے کرنا جائز اور درست ہے۔ (فتاوی رشیدیہ، ص:۵۱۳، جدید مبوب:۴۹۱)

ويفتي اليوم بصحتها لتعليم القرآن، والفقه، والإمامة، والأذان (تحته في الشامية:) وزاد بعضهم الأذان، والإقامة، والوعظ. (الدر مع الرد، مطلب تحرير مهم في عدم جواز الاستئجار على التلاوة والتهليل، زكريا ٩/ ٧٦، كراچی ٦/ ٥٥، سكب الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٥٣٣، مصري قديم ٢/ ٣٨٤)

اور اگر نوکری اور پیشہ نہیں ہے، تو طے کرنا ممنوع اور ناجائز ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۸۹)

اور کرایہ لینا اور بخوشی پیش کردہ نذرانہ کا قبول کرنا بلا تردد جائز اور درست ہے۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: تهادوا تحابوا. (مسند أبي يعلى الموصلي، دارالكتب العلمية بيروت ٥/ ٢٦٣، رقم: ٦١٢٢، السنن الكبرى للبيهقي، باب التحريض على الهبة، دارالفكر ٩/ ١٥٤، رقم: ١٢١٦، الأدب المفرد، ص: ١٨٠، رقم: ٥٩٤)

فرائض وواجبات کا بالقصد بلا عذر ترک کرنے والا شرعاً فاسق ہے۔ اور فاسق کی عظمت واعزاز ممنوع ہے۔ اور امور دینیہ میں اس کی اہانت کا حکم ہے؛ لہٰذا فرائض وواجبات کے تارک کو دینی جلسوں کے اسٹیج کی زینت بنانا ممنوع ہے؛ اس لئے اس کو خطیب کی حیثیت سے مدعو کرنا بھی ممنوع اور مکروہ ہوگا۔

كما استفيد من عبارة المراقي ولذا كره إمامة الفاسق العالم لعدم اهتمامه بالدين، فتجب إهانته شرعا، فلا يعظم بتقديمه. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، الصلاة، باب الإمامة، قديم، ص: ١٦٥، دار الكتاب ديوبند، ص: ٣٠٢-٣٠٣، الموسوعة الفقهية الكويتية ٦/ ٢١١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ جمادی الاولی ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۱/ ۳۱۷۸)

مقررین حضرات کا تقریروں پر اجرت لینا

سوال [۹۷۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں بہت سے مقررین حضرات ہیں جو اپنی تقریروں پر اجرت لیتے ہیں اوران میں سے بعض ایسے ہیں جو ایک ایک تقریر پر اب دو ہزار روپیہ سے زائد لے رہے ہیں، تو کیا ان حضرات کا تقریر پر اجرت لینا شرعاً درست ہے؟ اگر درست ہے تو کیوں؟ جب کہ تقریر طاعت ہے، دلائل کے ساتھ تفصیلی جواب سے نوازیں اللہ آپ کو اجر عظیم عطا فرمائے۔

المستفتی: محمد عثمان غنی، متعلم مدرسہ بحر العلوم بکولتلہ ،۲۴ر پرگنہ، مغربی بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مطالبہ کئے بغیر بطور نذرانہ دئے جانے پر لیتے ہیں تو گنجائش ہے۔ اور اگر واعظ از خود مطالبہ کر کے لیتا ہے، تو یہ جائز نہیں ہے؛ البتہ اپنے حبس الوقت کی مناسب اجرت لے سکتا ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۸۹)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: تهادوا تحابوا. (مسند أبي يعلى الموصلي، دارالكتب العلمية بيروت ٥/ ٣٦٢، رقم: ٦١٢٢)

ويفتي اليوم بصحتها لتعليم القرآن، والفقه، والإمامة، والأذان (تحته في الشامية:) وزاد بعضهم الأذان، والإقامة، والوعظ. (الدر مع الرد، مطلب تحرير مهم في عدم جواز الاستئجار على التلاوة والتهليل، زكريا ٩/ ٧٦، كراچى ٦/ ٥٥، سكب الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٥٣٣، مصري قديم ٢/ ٣٨٤)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲ر ربیع الاول ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۵۸۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۲/۳/۱۳ھ

نعت وتقریر، قوالی اور تراویح کی اجرت کا حکم

سوال [۱۰۷۱۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) جلسہ سیرت النبی میں نعت وتقریر کرتے وقت علماء وشعراء کو سامعین یا علماء بطور شکریہ روپیہ دے سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر اجازت ہے تو قوالی مشاعرہ اور رقص وغیرہ کی مجلسوں میں روپیہ دینے میں کیا فرق ہے؟ حدیث: ''**من تشبه بقوم فهو منه**'' آیت: ﴿**والشعراء يتبعهم الغاؤن**﴾

ان نصوص کی صراحتاً وضاحت فرمائیں، تاکہ کوئی تعارض باقی نہ رہے۔

(۲) ایک شاعر کا دعویٰ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو شعر پڑھتے وقت اپنی چادر عنایت کی تھی مع سند رجال تحریر کریں؟

(۳) کچھ پیشہ ور اور صاحب نصاب کروڑ پتی علماء شعراء، نعت خوانی اور وعظ ونصیحت کی اجرت باقاعدہ طے کرتے ہیں کیسا ہے؟

(۴) اگر جواز ہے تو رمضان شریف میں حفاظ کرام کو تحفہ دینا کیسا ہے؟ اس سلسلہ میں سلف صالحین اور اکابرین امت کا کیا عمل رہا ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

المستفتی: محمد حنیف قاسمی ککرا ٹاؤن، لکھیم پور، کھیری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) قوالی اور موجودہ زمانے کے مشاعرے اور رقص وغیرہ شرعاً جائز نہیں ہیں؛ اس لئے ان میں پیسے لینے دینے کا بھی سوال نہیں ہوتا، ہاں البتہ جلسۂ سیرت النبی وغیرہ میں نعت پڑھنے والے کو نعت پڑھتے وقت اور تقریر کرنے والے کو تقریر کرتے وقت سامعین کچھ دے دیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

وعلى هذا الحداء وقراءة الشعر وغيره ولا أجر في ذلك هذا كله عند أئمتنا الثلاثة. (هندية، كتاب الإجارة، الباب السادس عشر في مسائل الشيوع ……

زکریا قدیم ٤/ ٤٤٩، جدید ٤/ ٤٨٦، البناية، أشرفيه ١٠/ ٢٨٣، حاشية چلپی، إمداديه ملتان ٥/ ١٢٥، زكريا ٦/ ١١٨)

وفي المحيط: إذا أخذ المال من غير شرط يباح له؛ لأنه عن طوع من غير عقد. (مجمع الأنهر، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٥٣٣، مصري قديم ٢/ ٣٨٤، البناية، اشرفيه ديوبند ١٢/ ٢٠٩، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٥/ ١٢٥، زكريا ٦/ ١١٩)

آیت شریفہ: ﴿**والشعراء يتبعهم الغاؤن**﴾ کی وعید میں قوالی اور رقص کرنے والے اور موجودہ زمانے کے مشاعرے جن میں شاعرہ عورتوں کی بھی شرکت ہوتی ہے، داخل ہیں، اس لئے ان سے دور رہنا چاہئے۔

(۲) حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو چادر عنایت فرمانے کا ثبوت ہماری نظر سے نہیں گذرا، ہاں البتہ حضرت کعب بن زہیر بھی شاعر تھے، ان کے نعت پڑھنے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چادر پیش فرمائی ہے، اس حدیث شریف کی روشنی میں جلسہ سیرت النبی وغیرہ میں نعت رسول پڑھنے پر سامعین کچھ دے دیں، تو اس کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم قد أعطاه بردة له. (أسد الغابة، دارالفكر ٤/ ١٧٧)

(۳) نعت خوانی اور وعظ ونصیحت کی اجرت باقاعدہ طے کر کے لینا شریعت سے ثابت نہیں ہے، ہاں البتہ اگر بطور خوشی کچھ تحفہ دے دیں تو کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ کے واقعہ کے مطابق لینا جائز ہے۔

(۴) رمضان شریف میں تراویح میں قرآن کریم سنا کر کے اجرت لینا ''**وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا**'' [البقرة: ٤١] وعید کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔ اور بطور تحفہ کے لینا بھی اس لئے جائز نہیں ہے کہ اگر قرآن نہ سنایا جاتا تو یہ تحفہ نہیں ملتا، تو معلوم ہوا کہ قرآن سنانے کی وجہ سے دیا جارہا ہے، جو نام کا تحفہ ہے، اصلاً اجرت ہے۔ اور آیت قرآنی ''**وَلَا تَشْتَرُوا**

بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا‘‘ [البقرة: ٤١] کی وعید میں شامل ہے۔اورنعت خوانی اورتقریریں قرآنی آیات نہیں ہوتی ہیں؛اس لئے نعت خوانی اورتقریر پرتلاوت قرآن کوقیاس کرنا درست نہیں ہے۔اورتلاوت قرآن کے لئے اللہ نے مستقل حکم نازل فرمایا ہے،اسی وجہ سے ہمارے اکابر اورسلف صالحین سے قرآن سنا کربطورتحفہ کے لینا بھی ثابت نہیں۔

المعروف عرفا كالمشروط شرعا. (الأشباه والنظائر، قديم، ص: ١٥٦)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ رصفرالمظفر ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر:۴۰/ ۱۰۹۶۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۲/۶ھ

فاتحہ خوانی،تقریر بموقع عید میلا دالنبی اورجھاڑ پھونک کی اجرت لینا

سوال [۱۱۷۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مروجہ فاتحہ خوانی جائز ہے یاناجائز؟ نیز فاتحہ خواں جواشیاء لیتے ہیں جب کہ چراغاں اور تبرک سے موسوم کرتے ہیں، نیز میلا دالنبی کے نام سے تقریر کرنا قیام کرنا اورفیس مقرر کرنا کیسا ہے؟ نیز قرآنی آیات پڑھ کرجسم پر دم کرنا اوراس کی اجرت لینا کیسا ہے؟ قرآن مجید پڑھ کر یاپڑھوا کر دعوت کرنا یا کھانا کیسا ہے؟ کیاان چیزوں میں جواز کی صورت ہے یانکل سکتی ہے؟

المستفتی:محمد اسلم قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مروجہ فاتحہ خوانی بے اصل ہے،اس کا ثبوت نہ تو قرآن سے ہے اور نہ حدیث سے؛ بلکہ اس کوفقہاء نے بدعت لکھا ہے۔(مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱/ ۲۲۹،جدیدڈابھیل۳/ ۶۰)

وقراء ة الفاتحة، والإخلاص، والكافرون على الطعام بدعة. (فتاوى سمرقندي، بحواله فتاوى رحيميه قديم ۳/ ۱۹۳، جديد زكريا ۲/ ۱۱۵، مجموعة الفتاوى ۱/ ۸۱)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک خواہ ذکر ولادت ہو خواہ جہاد وصلاۃ ونکاح وغیرہ باعث برکت وموجب ثواب ہے؛ لیکن اس زمانہ میں مجلس میلاد بہت سے منکرات وممنوعات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے شرعاً ممنوع ہے اوراس پر اجرت لینا بھی ناجائز ہے، وعظ وتقریر اگر منکرات شرعیہ سے خالی ہو تو اس پر متاخرین فقہاء نے اجرت لینے کی اجازت دی ہے۔

(فتاوی محمودہ قدیم ۱۱/ ۴۸-۵۰، جدید ڈابھیل ۳/ ۱۸۱)

نیز قرآنی آیات پڑھ کر جھاڑ پھونک کرنے کی اجرت لینا جائز ہے۔

إن المتقدمين المانعين الاستئجار مطلقا جوزوا الرقية بالأجرة ولو بالقرآن. الخ (شامي، كتاب الإجارة، تحرير مهم في عدم جواز الاستئجار على التلاوة والتهليل، زكريا ۹/ ۷۸، كراچی ٦/ ٥٧)

ومعنى قوله صلى الله عليه وسلم: إن أحق ما أخذتم عليه أجرا كتاب الله، يعني: إذا رقيتم به. (عمدة القاري كتاب الإجارة، باب ما يعطى في الرقية على أحياء العرب ...... مكتبة دارالإحياء التراث العربي بيروت ۱۲/ ۹٦، زكريا ديوبند ۸/ ٦۲۸)

فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن أحق ما أخذتم عليه أجرا، أي أيها الأمة! كتاب الله، قال القاضي: فيه دليل على جواز الاستئجار لقراء ة القرآن والرقية به، وجواز أخذ الأجرة على تعليم القرآن. (مرقاة المفاتيح باب الإجارة، الفصل الأول مكتبة إمداديه ملتان، ٦/ ۱۳٦، تحت رقم الحديث: ۲۹۸٥، فتاوى محموديه قديم/ ۱۱/ ۳۲۱، جديد ڈابهيل ۱۰/ ۱۰۱)

قرآن کریم کی تلاوت کرنا ایصال ثواب کے لئے خیر وبرکت کے لئے فی نفسہ بلا شبہ جائز ہے، مگر آج کل اس کو لوگوں نے رسم بنالیا ہے، قرآن کریم کے لئے اجتماع کا اہتمام اورساتھ

ساتھ دعوت وغیرہ کا التزام کرنا یہ سب امور بدعت وناجائز ہیں۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۱/ ۳۶۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۴۴۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/ ۴/ ۱۴۱۴ھ

قبر کھودنے، کفن کی سلائی، میت کے غسل کی اجرت کا حکم

سوال [۹۷۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) قبر کھودنے کی اجرت ہونی چاہئے یا نہیں؟

(۲) کفن کی سلائی کی اجرت طے کی جائے یا نہیں؟

(۳) میت کے غسل کی اجرت طے کی جائے یا نہیں؟

ہمارے گاؤں میں یہ دستور ہے کہ قبر کھودنے والا ایک آدمی ہے، جو بوقت ضرورت اس کام کو کرتا ہے، اس کو کفن کی چادر اور اناج جس کی مقدار متعین ہے، قبرستان میں دیا جاتا ہے، علاوہ ازیں وہ ہر جمعرات کو گھر گھر سے روٹی بھی لیتا ہے، فصل کے موقع پر کھیتوں میں سے اناج بھی لاتا ہے، ان تمام چیزوں کو وہ استحقاقاً لیتا ہے، شرعی حیثیت مذکورہ بالا مسائل میں کیا ہے؟ بالدلیل جواب سے مطلع فرماویں۔ فقط والسلام

المستفتی: باشندگان محلّہ چودھریان سلیم پور، ضلع مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۲-۳) بہتر یہی ہے کہ قبر کھودنے، کفن سینے، غسل دینے کی اجرت نہ لی جائے، اگر کوئی اجرت لینے ہی پر آمادہ ہے، تو اس کے لئے اجرت متعین کرکے لینا بھی درست ہے، نیز اگر محلّہ والے اپنی خوشی سے جمعرات کو روٹی دیا کرتے ہیں، تو وہ اس کے لئے حلال ہے، اسی طرح فصل کے موقع پر اناج بھی کسان اپنی خوشی سے دیا

کرتے ہیں، تو جائز ہے؛ لیکن یہ اس شخص کی اجرت میں شامل نہ ہوگا؛ بلکہ دینے والے کی طرف سے تبرع ہے، اگر نہ دیں تو اس شخص کو بطور حق کے مطالبہ کا حق حاصل نہ ہوگا۔

والأفضل أن يغسل الميت مجانا، فإن ابتغى الغاسل الأجر جاز إن كان ثمة غيره، وإلا لا لتعينه عليه، وينبغي أن يكون حكم الحمال والحفار كذلك. الخ (الدرالمختار، باب صلاة الجنازة، مطلب: في حديث "كل سبب ونسب منقطع إلا سببي ونسبي"، زكريا ٣/ ٩٢، كراچی ٢/ ١٩٩، هندية، زكريا قديم ١/ ١٥٩، جديد زكريا ١/ ٢٢٠، الدرالمنتقى مصري قديم ١/ ١٨١، دارالكتب العلمية بيروت ١/ ٢٦٧، البحرالرائق، كوئٹه ٢/ ١٧٣، زكريا ٢/ ٣٠٤)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ شعبان ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۳۶۷)

۶/ باب الاستئجار علی المعصية

شراب، میتہ وغیرہ کوٹرک پرلادنے کی اجرت لینا

سوال [۹۷۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید کے پاس ٹرک ہے، اس سے وہ کرایہ وغیرہ کی اشیاء لادکر، مختلف جگہوں پر لے جاتا ہے اور کرایہ حاصل کرتا ہے، تو کیا وہ شراب، میتہ، خنزیر کو بطور اجرت اپنے ٹرک میں لاد کرکرایہ وصول کرسکتا ہے یا نہیں؟

(۲) شراب خانہ میں مزدوری کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد قربان، مقیم مدرسہ فیض العلوم تھانہ ٹین، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) شراب، میتہ اور خنزیر کو بطور اجرت اپنے ٹرک پر لاد کرکرایہ وصول کرنے کی امام ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق تو گنجائش ہے؛ لیکن حضرت امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک اعانت علی المعصیت ہونے کی وجہ سے یہ کام مکروہ تحریمی ہے اور اس کی کمائی بھی مکروہ ہوگی؛ لہٰذا مسلمانوں کو ایسا کام نہیں کرنا چاہئے۔

ومن حمل لذمي خمرا بأجر طاب له عند الإمام، وعندهما يكره له ذلک لوجود الإعانة على المعصية. (مجمع الأنهر، كتاب الكراهية، فصل في الكسب، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٨٨، مصري قديم ٢/ ٥٣٠، شامي، زكريا ٩/ ٥٦٢، كراچی ٦/ ٣٩٢، هداية، أشرفي ٤/ ٤٧٣، البحرالرائق، زكريا ٨/ ٣٧٢، كوئٹه ٨/ ٢٠٣)

(۲) شراب خانہ میں مزدوری باعث لعنت ہے۔

عن أنس بن مالک -رضي الله عنه- قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم في الخمر عشرة: عاصرها، ومعتصرها، وشاربها، وحاملها،

والمحمولة إليه، وساقيها، وبائعها، وآكل ثمنها، والمشتری لها، والمشتراة له. (ترمذي شريف، باب النهي أن يتخذ الخمر خلا، النسخة الهندية ١/ ٢٤٢، دارالسلام، رقم: ١٢٩٥، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ٦/ ٢٣٣، رقم: ٢٤٤٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۵۹۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰/۴/۱۴۲۱ھ

نائی کی کمائی کا حکم

سوال [۹۷۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید حجامت یعنی نائی گری کا پیشہ کرتا ہے، جو غیر شرعی انگریزی بال بھی کاٹتا ہے اور داڑھی بھی مونڈتا ہے، جیسا کہ آج کل بہت سے حضرات گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ، شہر شہر دوکان کئے ہوئے ہیں اور یہ کام کرتے ہیں، اس کے دوست نے اس کو بتایا کہ یہ پیشہ جائز نہیں ہے اور جو اجرت اس پر لی جاتی ہے وہ بھی جائز نہیں ہے، اسی وقت سے اس کو فکر لاحق ہوگئی کہ میں نے جو آج تک کمایا ہے وہ سب ناجائز ہے جو خود نے بھی کھایا ہے اور اہل خانہ کو بھی کھلایا ہے، حضرت مفتی صاحب ہماری رہنمائی فرمائیں کہ یہ پیشہ درست ہے یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو بتایئے کہ اس پر لی گئی اجرت کا کیا حکم ہے؟ اس کا استعمال درست ہے یا نہیں؟ اگر درست نہیں ہے تو جو اس پیشے سے کما لیا ہے، اس کا کیا کیا جائے؟

المستفتی: محمد جنید صبدل پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: نائی اپنی دوکان میں شرعی انگریزی شوقیہ ہر طرح کے بال کاٹتا ہے اور لوگوں کے کہنے پر داڑھیاں بھی مونڈتا ہے، اس میں خود اپنی داڑھی منڈوانے

والے گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں اور تعاون علی المعصیت کی بناء پر نائی کے لئے یہ عمل مکروہ ہے؛ لیکن اس کی جو اجرت ملتی ہے وہ ناجائز اور حرام نہیں ہے، وہ اس کا حق المحنت ہونے کی وجہ سے حلال ہے، بس زیادہ سے زیادہ خلاف اولیٰ کہا جاسکتا ہے، یہ ایسا ہے جیسا کہ لوگوں کے حکم سے درزی ان کے لئے فساق کا لباس بنا کر دیتا ہے، مگر درزی کے لئے اجرت حلال ہے، اسی طرح دیوار پر تصویری نقش بنانے کے لئے کسی نقاش اور پینٹر کو لگا دیا جائے، تو اس کے لئے یہ عمل مکروہ ہے، مگر حق المحنت ہونے کی وجہ سے اجرت حلال ہے، ایسا ہی نائی کی اجرت بھی حق المحنت ہونے کی وجہ سے حلال ہے؛ لہٰذا مذکورہ نائی نے اب تک جو کمایا ہے وہ حرام اور ناجائز نہیں ہے، حلال ہے؛ البتہ نائی کے لئے یہی بہتر ہے کہ داڑھی مونڈنے سے انکار کردیا کرے۔

أو خياطا أمره أن يتخذ له ثوبا على زي الفساق يكره له أن يفعل؛ لأنه سبب التشبه بالمجوس والفسقة. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، فصل في البيع، زكريا ۹/ ۵۶۲، كراچی ۶/ ۳۹۲، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ۶/ ۲۹، زكريا ۷/ ۶۵، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ۴/ ۱۸۸، مصري قديم ۲/ ۵۳۰)

وعن محمدؒ: رجل استأجر رجلا ليصور له صورا، أو تماثيل الرجال في بيت أو فسطاط، فإني أكره ذلک، وأجعل له الأجر. (هندية، كتاب الإجارة، الباس السادس عشر فی مسائل الشيوع ...... زكريا قديم ۴/ ۴۵۰، جديد ۴/ ۴۸۶، الفتاو ى التاتارخانية، زكريا ۱۵/ ۱۳۰، رقم: ۲۲۴۳۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲؍ربیع الاول ۱۴۲۹ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۴۹۰/۳۸)	۱۴۲۹/۳/۲ھ

مورتیوں کی تجارت کا حکم

سوال [۹۷۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: زید مورتیوں کی تجارت کرتا ہے اور اس کی آمدنی سے دین کی بھی خدمت کرتا ہے، برکت کے لئے سورہ بقرہ کبھی پڑھواتا ہے، تو مورتیوں کی تجارت کرنا اور ایسی جگہوں پر قرآن کا پڑھوانا درست ہے یا نہیں؟ نیز مسجد کے امام کا ایسی جگہوں پر قرآن پڑھنا اور پھر امامت کرنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: ولی الرحمٰن شمسی محلّہ عیدگاہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں جن مورتیوں کی تجارت کا ذکر ہے، اس کی دوشکلیں ہمارے سامنے ہیں:

(۱) اگر وہ مورتیاں مٹی یا پتھر سے بنی ہوئی ہوں، تو ان کو بنانا بھی حرام ہے اور ان کی تجارت خرید وفروخت بھی حرام ہے اور ان کا پیسہ بھی حرام ہے؛ اس لئے کہ مٹی یا پتھر کے ٹوٹ جانے کے بعد پھر وہ کسی کام میں نہیں آتی، اس کی مالیت تقریباً ختم ہو جاتی ہے۔

(۲) دوسری شکل یہ ہے کہ وہ مورتیاں پیتل، تانبہ، اسٹیل، المونیم، لوہا وغیرہ کسی دھات سے بنائی جاتی ہیں، تو ان کا بنانا حرام اور عظیم ترین گناہ ہے اور وہ ''اشد الناس عذابا'' کی وعید میں شامل ہو جائیں گے؛ لیکن ان مورتیوں کو توڑ دینے کے بعد اور ان کو گلا دینے کے بعد بھی تانبا، پیتل وغیرہ کی پوری مالیت باقی رہتی ہے؛ اسی لئے ان کی تجارت میں مالیت کی تجارت ہوگی اور ان کا پیسہ حرام نہیں ہوگا، ہاں البتہ تعاون علی المعصیت کی وجہ سے نفس تجارت مکروہ ہوگی؛ لیکن ایک مسلمان کا ایمانی تقاضہ یہ ہے کہ ایسی مورتیوں کی تجارت بھی قطعاً نہ کرے اور قرآن خوانی کے لئے جو لوگ جاتے ہیں، ان کا ایسی جگہوں پر جانا ایمانی غیرت وحمیت کے خلاف ہے، ان کو بھی احتیاط کرنی چاہئے؛ لیکن اگر وہاں جا کر قرآن خوانی کر لی ہے، تو اس کی امامت میں کوئی فرق نہیں آئے گا، مگر امام صاحب کو احتیاط کرنی چاہئے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر، ص: ۸۲)

عن عبداللّٰہ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: إن أشد الناس

عذابا یوم القیامة المصورون. (مسلم شریف، باب لا تدخل الملائکة بیتا فیه کلب ولا صورة، النسخة الهندیة ۲/ ۲۰۱، بیت الأفکار، رقم: ۲۱۰۹، صحیح البخاري، باب عذاب المصورین یوم القیامة، النسخة الهندیة ۲/ ۸۸۰، رقم: ۵۷۱۷، ف: ۵۹۵۰)

اشتری ثوبا أو فرسا من خزف لأجل استیناس الصبي لا یصح ولا قیمة له. (تحته في الشامیة:) لو کانت من خشب أو صفر جاز إتفاقا فیما یظهر لإمکان الانتفاع بها. (شامي، کتاب البیوع، باب المتفرقات، زکریا ۷/ ۴۷۸، کراچی ۵/ ۲۲۶)

وکذا بطل بیع مال غیر متقوم کالخمر والخنزیر، ویدخل فیه فرس أو ثور من خزف لاستیناس الصبي. (الدرالمنتقی، کتاب البیوع، باب البیع الفاسد، دارالکتب العلمیة بیروت ۳/ ۷۸)

وإن قامت المصعیة بعینه یکره بیعه تحریما وإلا فتنزیها. (شامي، کتاب الجهاد، باب البغاة، مطلب في کراهة بیع ما تقوم المعصیة بعینه، زکریا ۶/ ۴۲۱، کراچی ۴/ ۲۶۸)

ثم الأورع أي الأکثر اتقاء للشبهات (درمختار) ویلزم من الورع والتقوی. (شامي، کتاب الصلاة، باب الإمامة، زکریا ۲/ ۲۹۴، کراچی ۱/ ۵۵۷)

فمقصود الحدیث التحرز من أخلاء السود وتجانب أهل الریب لیکون موفور العرض سلیم العیب، فلا یلام بلاغه غیره. الخ (فیض القدیر ۵/ ۲۴۳۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ ذیقعدہ ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۵۲۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/ ۱۱/ ۱۴۳۲ھ

لکڑی کے مندر بنا کر فروخت کرنا

سوال [۹۷۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: زید لکڑی کے چھوٹے چھوٹے مندر بنا کر غیر مسلموں کو فروخت کرتا ہے، جب کہ اس میں کوئی تصویر یا مورتی نہیں ہوتی، کیا لکڑی کے یہ مندر بنانا اوران کو فروخت کرنا یہ تجارت صحیح ہے؟ فقہاء کرام کی کیا رائے ہے؟

المستفتی: عبدالرشید سیڈھا، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایک مسلمان کی طبیعت کیسے گوارہ کرسکتی ہے کہ وہ لکڑیوں کے مندر بنا کر غیر مسلموں کے ہاتھ فروخت کرے اور اس کام کو اپنا روزگار بنائے اور مندروں کی پوجا کرنا شرک ہے، تو اس عظیم گناہ پر یہ تعاون ہے اور شریعت معصیت پر تعاون کی اجازت نہیں دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں فرمایا:

وَتَعَاوَنُوْا عَلٰى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلٰى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدۃ: ۲] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍صفر ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۹۷۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۲/۲۴ھ

خود نہ بنا کر غیر مسلم سے تصویر والے آرڈر بنوانے کی اجرت کا حکم

سوال [۱۰۷۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعض زیورات میں کبھی کسی بت اور مورتی کی تصویر بنانے کا آرڈر رہتا ہے، تو اس کو ہندو کاریگروں سے بنوا کر گاہکوں کو دیتا ہوں اور گاہک اس کی مزدوری میں روپیہ یا سونا دیتے ہیں، تو ایسا کرنا جائز ہے؟ اور اس طرح کی آمدنی جائز ہے یا ناجائز؟

المستفتی: حبیب الرحمٰن، کلکتہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بت یا مورتی وغیرہ کی تصویر خود بنانا تو حرام ہے؛ لیکن اگر

تصویر ہندو اور غیر مسلم کاریگروں سے بنوائی جائے تو اس کا گناہ بنوانے والے پر نہ ہوگا؛ بلکہ بنانے والا خود اس کا ذمہ دار ہے، نیز اس سے حاصل ہونے والی آمدنی حرام نہیں ہوگی؛ البتہ تعاون علی المعصیت کی وجہ سے مکروہ ہوگی۔

إن بلالا قال لعمر بن الخطاب –رضي الله عنه– إن عمالک يأخذون الخمر والخنازير في الخراج، فقال: لا تأخذوها منهم، ولكن ولوهم ببيعها وخذوا أنتم من الثمن. (إعلاء السنن، كتاب البيوع، باب صرمة بيع الخمر والميتة، كراچی ١٤/ ١١١، دارالكتب العلمية بيروت ١٤/ ١٣٤)

فهذا عمر قد أجاز لأهل الذمة بيع الخمر والخنازير، وأجاز للمسلمين أخذ أثمانهما في الجزية والخراج، وذلک حضر من الصحابة ولم ينكر عليه منكر. (إعلاء السنن، كراچی ١٤/ ١١٣، دارالكتب العلمية بيرت ١٤/ ١٣٦)

رجل استأجر رجلا ليصور له صورا، أو تماثيل الرجال في بيت أو فسطاط، فإني أكره ذلک، وأجعل له الأجر. (هندية، كتاب الإجارة، الباب السادس عشر في مسائل الشيوع ...... زكريا قديم ٤/ ٤٥٠، جديد ٤/ ٤٨٦، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٥/ ١٣٠، رقم: ٢٢٤٣١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۶۶۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۴/۱۸ھ

جاندار کی تصویر کی ڈھلائی کا آرڈر لینا

سوال [۹۷۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک فرم سے آرڈر لیتا ہے، کبھی کبھی کسی جاندار کی تصویر بنانے کا آرڈر بھی مل جاتا ہے، مثلاً ہرن، بیل، گھوڑا وغیرہ زید آرڈر لے کر ڈھلائی کرالیتا ہے اور مال تیار کرا کر فرم پہنچا دیتا ہے،

کیا شرعاً اس کی گنجائش ہے؟ یہ جاندار کی تصویر بنانے والے کے گناہ میں شامل ہوگا؟

المستفتی: محمد سلیم رحمت نگر، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جاندار کی تصویر بنانا اور تصویر کے مجسمہ کی ڈھلائی کرنا گناہ عظیم ہے، شرعی طور سے ناجائز اور حرام ہے، کسی مسلمان کے لئے ایسی چیز کا آرڈر لینا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/ ۱۱۸)

قال النبي صلى الله عليه وسلم: إن أشد الناس عذابا عند الله المصورون. (بخاري، كتاب اللباس، باب عذاب المصورين يوم القيامة ۲/ ۸۸۰، رقم: ۵۷۱۷، ف: ۵۹۵۰)

اشترى ثورا، أو فرسا من خزف لأجل استيناس الصبي لا يصح ولا قيمة له، فلا يضمن متلفه. (شامي، كتاب البيوع، باب المتفرقات، زكريا ۷/ ۴۷۸، كراچی ۵/ ۲۲۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۳۱)

تصویریں اور مجسمے بنانا

سوال [۹۷۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایکسپورٹر اور ایمپورٹر ہے، فیکٹری میں اکثر جانوروں کی تصویریں بنائی جاتی ہیں اور بیرون ممالک ایکسپورٹ کیا جاتا ہے، زید کی دائمی تجارت ہے، اس پر بندش بہت ہی دشوار ہے، مزید زید اس تجارت پر ہی حیات وزندگی کا مدار سمجھتا ہے، تو آیا ایسی تجارت کرنا کیسا ہے؟ اور تصویریں بنانا کیسا ہے؟ جواز کی گنجائش ہے یا ممانعت؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد ہارون بھاگلپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تصویریں اور مجسمے بنانا ناجائز اور حرام ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب ان لوگوں پر ہوگا جو کسی جاندار کی تصویر اور شکل بناتے ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوگا کہ تم ہی اس میں جان ڈالو اور وہ اس میں جان نہیں ڈال سکیں گے، جس کی وجہ سے ان پر مسلسل سخت ترین عذاب ہوتا رہے گا؛ لہٰذا مسلم کاریگروں اور ایکسپورٹروں پر لازم ہے کہ ایسا آرڈر لینے سے صاف انکار کردیں رزق کا مالک خدائے رزاق ہے، وہ سب کو رزق دیتا ہے؛ اس لئے اس کی پرواہ نہ کریں۔ (ایضاح النوادر ۱/ ۷۹-۸۰)

عن عبداللہ بن مسعود –رضي اللہ عنه– قال: سمعت النبي صلی اللہ علیه وسلم یقول: إن أشد الناس عذابا یوم القیامة المصورون. (صحیح البخاري، باب عذاب المصورین یوم القیامة، النسخة الهندیة ۲/ ۸۸۰، رقم: ۵۷۱۷، ف: ۵۹۵۰، مسلم شریف، باب لا تدخل الملائکة بیتا فیه کلب و لا صورة، النسخة الهندیة ۲/ ۲۰۱، بیت الأفکار، رقم: ۲۱۰۹)

عن ابن عباس –رضي اللہ عنه– قال: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یقول: من صور صورة في الدنیا کلف أن ینفخ فیها الروح یوم القیامة، ولیس بنافخ. (صحیح البخاري، باب من صور صورة کلف یوم القیامة أن ینفخ فیها الروح ولیس بنافخ، النسخة الهندیة ۲/ ۸۸۱، رقم: ۵۷۳۰، ف: ۵۹۶۳، صحیح مسلم، باب لا تدخل الملائکة بیتا فیه کلب ولا صورة، النسخة الهندیة ۲/ ۲۰۲، بیت الأفکار، رقم: ۲۱۱۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
کیم جمادی الاولیٰ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۸۰۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/ ۵/ ۱۴۱۷ھ

فوٹو کھینچنے کی اجرت کا حکم

سوال [۹۷۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک مسلمان ہوکر پنجوقتہ نماز پڑھتا ہے، اوراس کا کام فوٹو کھینچنا ہے اور دوکان بھی فوٹو کھینچنے کی ہے، کیا اس کا اس پیسہ سے اپنی اولاد کو پڑھانا اور نان ونفقہ میں استعمال کرنا درست ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کے جواب سے نوازیں۔

المستفتی: عبدالقادر بھاگلپوری خادم مدرسہ دینیہ مسلم یتیم خانہ شاہی عیدگاہ جونپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فوٹو اور تصویریں کھینچنا سخت گناہ ہے، حدیث میں سخت وعید آئی ہے، اس کی آمدنی اگرچہ بالکلیہ حرام نہیں ہے؛ لیکن مکروہ ضرور ہے، کراہت کے درجہ کے مال سے فائدہ اٹھانا اور بچوں پر خرچ کرنا بھی مکروہ ہوگا۔

عن عبداللّٰہ –رضي اللّٰہ عنہ– قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: إن أشد الناس عذابا یوم القیامة المصورون. (المصنف لابن أبي شیبة، في المصورین وما جاء بهم، مؤسسة علوم القرآن ۱۲/ ۶۰۶، رقم: ۲۵۷۱۹)

وعن محمدؒ: رجل استأجر رجلا لیصور له صورا، أو تماثیل الرجال في بیت أو فسطاط، فإني أکره ذلک، وأجعل له الأجر. (الفتاوی التاتارخانیة، زکریا ۱۵/ ۱۳۰، رقم: ۲۲۴۳۱، هندیة، کتاب الإجارة، الباس السادس عشر فی مسائل الشیوع …… زکریا قدیم ۴/ ۴۵۰، جدید ۴/ ۴۸۶)

إنسان أن یتخذ له خفا علی زي المجوس أو الفسقة أو خیاطا أمره أن یتخذ له ثوبا علی زي الفساق یکره له أن یفعل. (شامي، کتاب الحظر والإباحة، فصل في البیع، زکریا ۹/ ۵۶۲، کراچی ۶/ ۳۹۲، مجمع الأنهر، دارالکتب

العلمية بيروت ٤/ ١٨٨، مصري قديم ٢/ ٥٣٠، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٩، زكريا ٧/ ٦٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍شوال ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۴۹۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۱۰/۲۵ھ

فوٹو گرافی اور اس کی اجرت

سوال [۹۷۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: دو بھائیوں میں ان بن ہوئی، ایک بھائی حافظ ہے، دوسرا بھائی فوٹو گرافر ہے، حافظ صاحب کا اپنے بھائی فوٹو گرافر کے یہاں نہ جانا اور نہ کسی کو جانے دینا، نہ فوٹو گرافر کے یہاں کھانا کھانا اور نہ کسی کو کھانے دینا، عید ہو چاہے بقرعید، نہ مسجد میں اس کا مال لینے دینا اور یہ کہنا کہ اس کا کھانا حرام ہے، فوٹو گرافر اور اس کے اہل وعیال کہتے ہیں: اس سے بہتر تو ہم ہندو وغیر مسلم ہی ہو جائیں، اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ کیا اس کا مال مسجد ومدرسہ میں لے سکتے ہیں؟ کیا اس کے گھر کا کھانا جائز ہے؟

المستفتی: محمد یامین، میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: فوٹو گرافی سخت حرام اور گناہ کبیرہ ہے، اس کے ذریعہ کمایا ہوا پیسہ مکروہ ہے، ایسے مال کو مسجد یا مدرسہ میں دینا لینا سب ناجائز ہے۔ اور ایسے شخص کے یہاں دعوت کھانا بھی درست نہیں ہے۔

عن عمران بن حصين –رضي الله عنه– قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن إجابة طعام الفاسقين. (شعب الإيمان للبيهقي، فصل في طيب المطعم والمشرب، دارالكتب العلمية بيروت ٥/ ٦٨، رقم: ٥٨٠٣)

وقال أصحابنا وغيرهم من العلماء: تصوير صورة الحيوان شديد التحريم، وهو من الكبائر. (شرح المسلم للنووي ۲/ ۱۹۹)

أما لو أنفق في ذلک مالا خبيثا ومالا سببه الخبيث والطيب، فيكره؛ لأن الله تعالىٰ لا يقبل إلا الطيب، فيكره تلويث بيته بمالا يقبله. (شامي، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، قبيل مطلب في أفضل المساجد، كراچی ۱/ ٦٥٨، زكريا ۲/ ٤٣١، درر الحكام شرح غرر الأحكام ۱/ ۱۱۱)

صورت مسئولہ میں حافظ صاحب کو چاہئے کہ وہ فوٹوگرافر کو سمجھا بجھا کر دین سے قریب لائیں، اگر ترک تعلق سے کام چلے تو مناسب ہے، ورنہ زیادہ شدت اختیار کرنا مناسب نہیں ہے۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ. [النحل: ۱۲۵] **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۸۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۰؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۷ھ

''فوٹوگرافی'' اور ''ویڈیوسازی'' کا حکم

سوال [۹۷۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عمر فوٹو کا کام کرتا ہے، جہاں اسے فوٹو کھینچنا، مختلف پروگراموں میں ویڈیو فلم بنانا وغیرہ کا کام کرنا پڑتا ہے، تو عمر کا یہ کام جائز ہے یا ناجائز؟ شریعت کی روشنی میں جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔

المستفتی: محمد زکریا دارالعلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فوٹوگرافی یا ویڈیو سازی اگرمحض تفریح یا خبر رسانی یا مختلف دنیاوی اور فحش پروگراموں یا خالص اصلاحی ودینی پروگراموں میں کی جائے تو وہ ناجائز ہے؛ البتہ اگر دین کی ضرورت مثلاً باطل فرقوں کے پیروپیگنڈوں کے خلاف مسلمانوں کی آواز کو مضبوط اور باوزن بنانے کی غرض سے ہو یا پاسپورٹ اور ویزا کے لئے سادی تصویریں کھینچی جائے تو اصلا ناجائز ہونے کے باوجود ''**الضرورات تبیح المحضورات**'' کے ضابطہ کے تحت علماء نے اس کی گنجائش رکھی ہے۔ یہی تفصیل فوٹوگرافی یا ویڈیو سازی کا پیشہ اپنانے میں بھی ہے، اگر ان آلات کا جائز استعمال کیا جائے تو یہ پیشہ جائز اور اگر ناجائز استعمال کیا جائے تو ناجائز ہے؛ لیکن بہر دوصورت حاصل ہونے والی آمدنی چونکہ اپنی محنت اور عمل کا بدلہ ہے؛ اس لئے وہ حلال ہے اور اس کا حکم بھی بینک کی تنخواہ کی طرح ہے، تاہم احتیاط یہاں بھی بہتر ہے۔

عن عبدالله بن مسعود –رضي الله عنه– يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن أشد الناس عذابا يوم القيامة المصورون. (مسند أحمد بن حنبل ۱/ ۳۷۵، رقم: ۳۵۵۸)

عن أبي الحوراء السعدي، قال: قلت للحسن بن علي –رضي الله عنه–: ما حفظت من رسول الله؟ قال: حفظت من رسول الله: دع ما يريبك إلى مالايريبك. (سنن الترمذي، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ۲/ ۷۸، دارالسلام، رقم: ۲۵۱۸) **الأمور بمقاصدها.** (الأشباه/ ۵۳)

رجل استأجر رجلا ليصور له صورا، أو تماثيل الرجال في بيت أو فسطاط، فإني أكره ذلك، وأجعل له الأجرة. (هندية، كتاب الإجارة، الباس السادس عشر في مسائل الشيوع …… زكريا قديم ٤/ ٤٥٠، جديد ٤/ ٤٨٦)

الأجرة إنما تكون في مقابلة العمل. (شامي، كتاب النكاح، باب المهر، زكريا ٤/ ٣٠٧، كراچی ٣/ ١٥٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍رجب المرجب ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۴۶۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۷/۱۵ھ

فوٹوگرافی اور اس کے رول کا کاروبار کرنا

سوال [۹۷۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فوٹوگرافی کے لئے جو رول استعمال کئے جاتے ہیں، جس میں تصویر محفوظ ہوتی ہے، اس کا کاروبار کرنا اور بصورت مجبوری فوٹوگرافی کا کاروبار کرنا جب تک دوسری کوئی کاروبار کی شکل نہ ملے؛ اس لئے یہ کاروبار کر سکتے ہیں یا نہیں؟ بیان فرمائیں۔

المستفتی: بشیر احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فوٹوگرافی کے رول کے اندر معصیت استعمال کرنے والے کے فعل سے پائی جاتی ہے کہ اگر خریدار اس کو ناجائز تصویر کشی کے لئے خریدتا ہے تو اس کا یہ فعل ممنوع اور ناجائز ہے؛ لیکن اس کو جائز تصویر کشی کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے؛ لہٰذا اس رول کی نفس تجارت تو جائز ہے؛ لیکن چونکہ اکثر وبیشتر اس کا استعمال ناجائز تصویر کشی ہی کے لئے کیا جاتا ہے؛ لہٰذا اس کا کاروبار کرنا مکروہ ہوگا۔

وإنما تحصل المعصية بفعل فاعل مختار. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، كراچى ٦/ ٣٩٢، زكريا ٩/ ٥٦٢، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٩، زكريا ٧/ ٦٤)

بخلاف الاستئجار لكتابة الغناء والنوح إنه جائز؛ لأن الممنوع عنه نفس الغناء والنوح لا كتابتهما. (بدائع الصنائع، كتاب الإجارة، باب الاستئجار على المعاصي، زكريا ٤/ ٣٩، كراچى ٤/ ١٨٩)

اور فوٹوگرافی سخت گناہ ہے، اس کی آمدنی بھی مکروہ تحریمی ہے؛ لہٰذا اس کاروبار کو چھوڑ دینا لازم ہے۔

وعلى هذا يخرج الاستئجار على المعاصي أنه لا يصح؛ لأنه استئجار على منفعة غير مقدورة الاستيفاء شرعا كاستئجار الإنسان للعب واللهو، وكاستئجار المغنية والنائحة للغناء والنوح. (بدائع الصنائع، كتاب الإجارة، باب الاستئجار على المعاصي، زكريا ٤/ ٣٩، كراچی ٤/ ١٨٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍شعبان ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۵۳۴/۳۷)

''ڈش انٹینا'' کا کاروبار کرنے کا حکم

سوال [۹۷۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زاہد کا کاروبار ''ڈش انٹینا'' کا ہے، یعنی ٹیلی ویزن پر صرف دو اسٹیشن لگتے ہیں، اگر ڈش انٹینا کا کنکشن لگا دیا جائے تو متعدد اسٹیشن لگتے ہیں، ڈش انٹینا کی وجہ سے بڑھنے والے اسٹیشنوں پر فلمیں بھی آتی ہیں، تفریحی ناجائز پروگرام بھی آتے ہیں، اور خبریں بھی آتی ہیں، جائز معلوماتی پروگرام بھی آتے ہیں، ڈش کا کنکشن لینے والے پر یہ ہے کہ وہ اس کا جائز استعمال کرے، جائز چیزوں کے لئے کنکشن دینے والے کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام اسٹیشنوں کا مرکز سے کنکشن دے، جس کا وہ کرایہ ادا کرتا ہے اور پھر جن کو کنکشن دیتا ہے ان سے کرایہ وصول کرتا ہے، کنکشن کو جائز کام کے لئے استعمال کریں یا ناجائز کے لئے یہ کنکشن لینے والے پر منحصر ہے، زاہد اسی ڈش انٹینا کا کاروبار کرتا ہے، تو دریافت یہ ہے کہ یہ کاروبار کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ اگر جائز ہے تو کوئی بات نہیں، اگر ناجائز ہے؟ تو کیا زاہد کی آمدنی حرام ہے؟ اس کے گھر کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد یامین آزاد، دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ٹیلی ویژن اور ڈش انٹینا کا کنکشن دوسروں کو دینا اور اس کو اپنا ذریعہ معاش بنانا مکروہ اور ممنوع ہے، چاہے کنکشن لینے والے اس کو معلوماتی چیزوں کے لئے استعمال کریں یا فلموں کے لئے؛ کیوں کہ یہ معلوماتی پروگرام دینے سے بڑھ کر عیاشی اور فحاشی کا آلہ ہے؛ اس لئے تعاون علی المعصیت کی وجہ سے ڈش انٹینا کا کنکشن دے کر اس سے روپیہ حاصل کرنا ممنوع ہے۔ اور ایسے شخص کے یہاں اگر دوسری حلال آمدنی نہ ہو تو اس کے یہاں کھانا کھانے سے احتیاط رکھنی چاہئے۔ (احسن الفتاوی ۶/ ۵۳۵)

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة: ۲]

عن عمران بن حصين –رضي الله عنه– قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن إجابة طعام الفاسقين. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ۱۸/ ۱۶۸، رقم: ۳۷۶)

إذا استأجر الذمي من المسلم بيتا ليبيع فيه الخمر لم يجز؛ لأنه معصية فلا ينعقد العقد ولا أجر له عندهما. (مبسوط سرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ۱۶/ ۳۸)

ولا تجوز الإجارة على شيء من الغناء والنوح والمزامير والطبل، وشيء من اللهو؛ لأنه معصية والاستئجار على المعصية باطل. (مبسوط سرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ۱۶/ ۳۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍ رجب ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۷۵۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸؍ ۷؍ ۱۴۲۳ھ

حرام اور جائز پروگرام والے چینل کی آمدنی کا حکم

سوال [۹۷۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: چینل یہ ایک طرح کا ٹی وی چینل ہے، جس پر ہر قسم کے پروگرام مثلاً ناچ گانے، گندے ڈرامے، فحش وعریاں فلمیں، کھیل کود، نیز اسلامی پروگرام جیسے تلاوت کلام پاک، تقاریر، تفسیر قرآن، رمضان کی تراویح، مکہ معظّمہ کے مناظر، حج بیت اللہ شریف وغیرہ سب ہی آتے ہیں، زید بحیثیت کاروبار یہی کام کرتا ہے، یعنی گھر گھر کنکشن بانٹ کر ماہانہ کثیر آمدنی کرتا ہے، اس وقت یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا ایسا کاروبار شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

(۲) عدم جواز کی صورت میں حاصل شدہ مال پر زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

(۳) صدقہ کرنا اس مال کا کیسا ہے؟ یعنی ثواب کا مستحق ہوگا یا نہیں؟

(۴) ایسے شخص کی دعوت قبول کرنی چاہئے یا نہیں؟ یا صراحتاً انکار کردے؟

(۵) ایسے شخص سے قرض وغیرہ لینے میں کوئی قباحت ہے یا نہیں؟

المستفتی: قاری شکیل صاحب، ٹانڈہ رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۲) اس میں جائز اور ناجائز دونوں طرح کے پروگرام آتے ہیں، اس لئے یہ کاروبار کراہت تحریمی کے حکم میں ہے اور اس کا پیسہ بھی مکروہ تحریمی اور مشتبہ ہے۔ اور مشتبہ مال سے زکوۃ نکالنا ضروری ہوتا ہے؛ لہٰذا اس سے زکوۃ نکالنا لازم ہوگا؛ کیوں کہ اس کو بالکل حرام نہیں کہا گیا ہے، مسلمانوں کو اس قسم کا کاروبار کرنا، حلال کمائی سے اپنے آپ کو محروم کر کے مکروہ اور مشتبہ رزق میں ملوث کرنا ہے، جو کسی وقت بالکل حرام خوری تک پہنچا سکتا ہے؛ اس لئے مسلمانوں کو ایسے کاروبار سے دور رہنا چاہئے اور حلال رزق حاصل کرنے کی کوشش کرنی ضروری ہے۔

عن عبد الله –رضی الله عنه– قال: قال رسول الله صلی الله عليه وسلم: طلب كسب الحلال فريضة بعد الفريضة. (السنن الكبرى للبيقهي، باب كسب الرجل وعمله وبيده، دارالفكر ۹/ ۵۶، رقم: ۱۱۹۰۷، شعب الإيمان، باب في حقوق الأولاد والأهلين، دارالكتب العلمية بيروت ٦/ ٤٢٠، رقم: ٨٧٤١)

(۳) ایسے مال کے صدقہ کرنے میں بالکل حلال اور صاف مال کے صدقہ کی طرح ثواب کی امید نہیں ہے۔

وَتَعَاوَنُوْا عَلٰى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلٰى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة: ٢]

(۴) جیسے اس کا مال مشتبہ ہے ایسے ہی اس کی دعوت بھی مشتبہ ہے؛ اس لئے ایسے شخص کے یہاں دعوت قبول نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

عن عمران بن حصين –رضي الله عنه– قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن إجابة طعام الفاسقين. (المعجم الأوسط للطبراني، دارالفكر ١/ ١٣٨، رقم: ٤٤١، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ١٨/ ١٦٨، رقم: ٣٧٦، مشكوة ١/ ٢٧٩، شعب الإيمان للبيهقي، فصل في طيب المطعم والمشرب، دارالكتب العلمية بيروت ٥/ ٦٨، رقم: ٥٨٠٣)

وفي هامش المشكوة: ويسقط الإجابة بأعذار نحو كون الشبهة في الطعام. (مشكوة ١/ ٢٧٩)

(۵) بہتر تو یہ ہے کہ جس کے یہاں بالکل پاک وصاف مال ہوتا ہے، اس کے یہاں سے قرض لیا جائے، اگر ایسا نہ ہو سکے تو ضرورت میں اس کے یہاں سے بھی قرض لینے کی گنجائش ہے۔

الضرورات تبيح المحضورات. (الأشباه، ص: ١٤٠، قواعد الفقه أشرفي، ص: ٨٩، رقم: ١٧٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ شعبان ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۷۹۰)

''ٹی وی'' مرمت کرنے کی اجرت

سوال [۹۷۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید صرف ''ٹی وی'' ٹھیک کرنے کا کام کرتا ہے، اس کے علاوہ کوئی اور کام نہیں جانتا ہے اور وہ ''ٹی وی'' کی اجرت لے کر اپنا گھر چلاتا ہے، ''ٹی وی'' کی اجرت لے کر اپنے مصرف میں لانا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) زید کسی عالم کی دعوت کرتا ہے اور اسی پیسہ سے کھانا کھلاتا ہے، تو کیا وہ عالم اس کی دعوت قبول کرسکتا ہے یا نہیں؟ اگر قبول کر کے کھانا کھالیا تو وہ کھانا اس عالم کے لئے حرام ہوگا یا نہیں؟ (۳) ٹی وی میں خبریں سننا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبد الشکور، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسی رقم کے بارے میں حضرات صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ تعاون علی المعصیت ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے۔ اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بلا کراہت حلال ہے؛ لہٰذا متقی آدمی اگر اس کے یہاں مدعو ہو تو دعوت قبول کر لینے میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے قول پر کوئی مضائقہ نہیں ہے اور حضرت امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے قول پر قبول نہ کرنا بہتر ہے؛ لہٰذا حسب گنجائش احتیاط بہتر ہے۔

لو آجره دابة لينقل عليها الخمر، أو آجره نفسه ليرعى له الخنازير يطيب له الأجر عنده، وعندهما يكره. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، كراچی ۶/ ۳۹۲، زكريا ۹/ ۵۶۲، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية

بیروت ٤/ ١٨٨، مصري قديم ٢/ ٥٣٠، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٩، زكريا ٧/ ٦٤-٦٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ر ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۸۹۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۳/۹ھ

''ٹی وی''، ''وی سی آر'' کی فلمیں بنانا اور اس کی اجرت

سوال [۹۷۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید اپنا کام کرتا تھا، جس سے ضروریات کا تکفل ہوتا رہتا تھا، اب ضعف اور مسلسل امراض کی وجہ سے کام کرنے سے بالکل معذور ہے، زید کا ایک لڑکا مزدوری وغیرہ کرلیتا ہے، جو ضروریات کے لئے بالکل ناکافی رہتی ہے، دوسرا لڑکا ٹھیکہ داری کا کام کرتا ہے، اب اس نے یہ کام چھوڑ کر وی سی آر اور ٹی وی کی فلمیں بنانا شروع کردیں ہیں، اور اب وہ اس آمدنی سے اپنے بوڑھے والدین زید وزوجہ زید اور چھوٹے بہن بھائی کی ضروریات زندگی علاج معالجہ، کپڑے وغیرہ میں تعاون کرتا رہتا ہے، اگر اس کا تعاون قبول نہ کیا جائے تو ضروریات پوری ہونے میں بڑی دشواری ہوگی اور مزید مشکلات اور پریشانیاں ہوں گی، ایسی صورت میں زید اپنے اس لڑکے کا تعاون قبول کرسکتا ہے یا نہیں؟ بصورت دیگر کیا کرے؟

المستفتی: شریف احمد مدرسہ شمس العلوم بریلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ''ٹی وی''، ''وی سی آر'' کی فلمیں بنانا یا اس میں کام کرنا قطعاً حرام اور ناجائز ہے۔ اور اس کی آمدنی بھی ناجائز ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۷/ ۳۰۷)

زید کو چاہئے کہ حلال کسب معاش اختیار کرے، دنیا میں حلال کمائی کے بہت سے ذرائع موجود ہیں۔

عن عبد الله -رضي الله عنه- قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: طلب كسب الحلال فريضة بعد الفريضة. (شعب الإيمان، باب في حقوق الأولاد والأهلين، دارالكتب العلمية بيروت ٦/ ٤٢٠، رقم: ٨٧٤١، السنن الكبرى للبيقهي، باب كسب الرجل وعمله وبيده، دارالفكر ٩/ ٥٦، رقم: ١١٩٠٧)

باپ کو چاہئے کہ بیٹے کو حلال ذریعہ معاش اختیار کرنے کی تلقین کرے اور حرام آمدنی سے جو کچھ حاصل ہوا اس کو نہ لے۔

كما تستفاد من عبارة الهندية: سئل الفقيه أبو جعفر عمن اكتسب مالا من أمر السلطان، وجمع المال من أخذ الغرامات المحرمة، وغير ذلك، هل يحل لآخذ عرف ذلك أن يأكل من طعامه؟ قال: أحب إلي في دينه أن لا يأكل منه. (هندية، كتاب الكراهية والاستحسان، الباب الخامس عشر في الكسب، زكريا قديم ٥/ ٣٥٠، جديد ٥/ ٤٠٤، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ٨/ ٦٤، رقم: ٩٥٩٤، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٨/ ١٥٨، رقم: ٢٨٣٥١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍رجب ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۳۸۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۷/۱۶ھ

''ٹی وی''، ''سی ڈی'' کی مرمت کی اجرت

سوال [۹۷۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید الیکٹرانک مستری ہے اور الیکٹرانک سامان کی خرید وفروخت بھی کرتا ہے اور مرمت بھی، مثلاً ''ٹی وی، ''سی ڈی''، ''ریڈیو''، ''ڈیگ'' وغیرہ کی مرمت بھی کرتا ہے اور خرید وفروخت بھی چارجر، اسٹیپلائزر، ایف ایم ویڈیو گیم، چارجنگ، ٹارچ، وی سی پی کو سدھارتا ہے، دوکان کئے ہوئے تقریباً دس سال کا عرصہ گذر گیا، اب کسی دوست نے صلاح دی کہ

بھائی زید یہ کام دھندہ چھوڑ دو؛ کیوں کہ اس کی آمدنی ناجائز اور روزی حرام ہے، ان باتوں کو سن کر زید کافی غمزدہ ہے کہ اب دوسرا کام سیکھنے کی نہ تو عمر ہے اور نہ ہی وقت اجازت دیتا ہے؛ اس لئے زید مجبوری کے تحت کیا کرے؟ کیا حقیقت میں ان کے کاروبار کی آمدنی ناجائز اور حرام ہے؟ للہ قرآن وحدیث کی روشنی میں رہنمائی کریں، نوازش ہوگی۔

نوٹ: کیا ''ٹی وی''، سی ڈی، ریڈیو، ڈیگ کی ریپرنگ کرسکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: فیضان میڈیکل اسٹور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ''ٹی وی'' کی مرمت جائز نہیں؛ اس لئے کہ اس کا استعمال اصالۃً اور اکثریت فلمی پروگرام میں ہوتا ہے اور آلات لہو ولعب کی مرمت تعاون علی المعصیۃ کی وجہ سے جائز نہیں۔ اور اس کی اجرت بھی مکروہ ہے حرام نہیں۔

وعلى هذا يخرج الاستئجار على المعاصي أنه لا يصح؛ لأنه استئجار على منفعة غير مقدورة الاستيفاء شرعاً كاستئجار الإنسان للعب واللهو، وكاستئجار المغنية والنائحة للغناء والنوح. (بدائع، كتاب الإجارة، باب الاستئجار على المعاصي، زكريا ٤/ ٣٩، كراچی ٤/ ١٨٩)

سی ڈی، ریڈیو، ڈیگ اور کیسٹ، اسٹپلائزر، چارجر وغیرہ اکثر وبیشتر جائز امور میں استعمال ہوتے ہیں؛ اس لئے ان اشیاء کی مرمت کی گنجائش ہے؛ چنانچہ اس سال حج کے موقع پر بڑے بڑے علماء کرام نے قرآن کریم اور احادیث کی سی ڈی لاکر اپنے اپنے کمپیوٹر میں داخل کر لی ہے؛ لہٰذا مرمت کے بعد جو لوگ ان اشیاء کو ناجائز امور میں استعمال کریں گے انہیں پر گناہ ہوگا، مرمت کرنے والے پر نہیں۔

وإنما تحصل المعصية بفعل فاعل مختار. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، كراچی ٦/ ٣٩٢، زكريا ٩/ ٥٦٢، تبيين الحقائق، إمداديه

ملتان ٦/ ٢٩، زکریا ٧/ ٦٤)

بخلاف الاستئجار لكتابة الغناء والنوح إنه جائز؛ لأن الممنوع عنه نفس الغناء والنوح لا كتابتهما. (بدائع الصنائع، كتاب الإجارة، باب الاستئجار على المعاصي، زكريا ٤/ ٣٩، كراچی ٤/ ١٨٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم صفر ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۲۲۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۲/۱۴۲۵ھ

ٹی وی، ٹیپ ریکارڈ اور ریڈیو کی مرمت اور اس کی اجرت

سوال [۹۷۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈ اور ٹی وی کی مرمت کرتا ہوں اور مرمت کرنے میں جو پرزے خراب ہوتے ہیں ان کی جگہ نئے پرزے لگاتا ہوں، تو مرمت کی اجرت اور ان نئے پرزوں کی قیمت وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

ٹی وی، وی سی آر اور ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ کے صرف پرزے کی دوکان کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: دلشاد احمد لالباغ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) یہ کام تعاون علی المعصیت ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے، مگر اس کی اجرت اور پرزے کی قیمت حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بلا کراہت حلال ہے۔ اور حضرت امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ کے نزدیک مکروہ تنزیہی ہے۔

آجره نفسه ليرعى له الخنازير يطيب له الأجر عنده، وعندهما يكره. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، كراچی ٦/ ٣٩٢، زكريا ٩/ ٥٦٢، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٨٨، مصري قديم ٢/ ٥٣٠، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٩، زكريا ٧/ ٦٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

(۲) تعاون علی المعصیت کی وجہ سے مکروہ ہے۔

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ.

[المائدۃ: ۲] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷ر صفر ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۸۷۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۲/۱۷ھ

ٹی وی کی مرمت پر اجرت لینا اور اس کے استعمال کا حکم

سوال [۹۷۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج کل چونکہ ٹی وی ایک وبا کی طرح پھیل چکا ہے، ایک شخص جو ٹی وی کی مرمت کرتا ہے، اور اس سے کما کر کھاتا ہے، اور دوسروں کو بلا کر دکھاتا ہے، جب اس سے کہا گیا کہ یہ کام غلط ہے، تو کہتا ہے کہ یہ تو میری روزی ہے اور یہی پیشہ ہے، کیا ایسے شخص کے یہاں کھانا کھانا اور تعلیم دینا درست ہے یا نہیں؟ اور اس سے ٹیوشن کا پیسہ لینا کیسا ہے؟ اور اس کے کمرے میں ٹی وی ہے جبکہ وہ مسلمان بھی ہے؛ اس لئے عرض ہے کہ ایسے شخص کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ فقط والسلام

المستفتی: محمد یونس مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ٹی وی کی مرمت کرنا اور اس کو ذریعۂ معاش بنانا اور لوگوں کو بلا کر دکھانا یہ سب ناجائز ہے، اس کا ترک لازم ہے۔ اور ٹی وی کی مرمت سے جو آمدنی حاصل ہوئی ہے وہ محنت کا پیسہ ہے، اس لئے وہ حرام نہیں ہے؛ لیکن اعانت علی المعصیت کی وجہ سے وہ آمدنی کراہت کے درجہ میں ہوگی اور اس کے یہاں کھانا کھانا مکروہ ہے اور تعلیم دے کر اجرت لینا درست ہے۔

لو آجره دابة لينقل عليها الخمر، أو آجره نفسه ليرعى له الخنازير يطيب له الأجر عنده، وعندهما يكره. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، كراچی ٦/ ٣٩٢، زكريا ٩/ ٥٦٢، هداية أشرفي ٤/ ٤٧٣، البحرالرائق، زكريا ٨/ ٣٧٢، كوئٹہ ٨/ ٢٠٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍شعبان ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/۱۹۱۲)

مندر کی تعمیر میں مزدوری کرنا

سوال [۹۷۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مستری رفیق احمد راج گیری کا کام کرتے ہیں، وہ آج کل ایک مندر کی تعمیر کا کام کررہے ہیں، جب کہ مندر میں پوجا پاٹ اور اللہ کے ساتھ شرک اور کفر کے کام ہوتے ہیں، ان کو بہت سے لوگوں نے منع بھی کیا، تو اس پر انہوں نے کہا کہ ہم خود تو اس میں پوجا نہیں کررہے ہیں؛ بلکہ صرف مزدوری کررہے ہیں، اگر ہم نہیں کریں گے، تو دوسرے آدمی سے وہ کام کرالیں گے، ہمارے کام نہ کرنے سے مندر بننا رک نہیں جائے گا، تو کیا ان کے لئے وہاں کام کرکے پیسہ لینا جائز ہے؟ اور ان کے یہاں کھانا پینا کیسا ہے؟ شریعت کی روشنی میں جواب دیں۔

المستفتی: محمد ندیم، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مندر وغیرہ کی تعمیر میں مزدوری کرنا تعاون علی المعصیت کی وجہ سے مکروہ وممنوع ہے اور اس کی اجرت بھی مکروہ ہے؛ اس لئے مسلمانوں کو مندر وغیرہ میں مزدوری سے گریز کرنا ضروری ہے۔

وعندهما يكره؛ لأنه إعانة على المعصية. (الدر المنتقى، كتاب الكراهية، فصل في الكسب، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٨٧، مصري قديم ٢/ ٥٣٠، شامي، زكريا ٩/ ٥٦٣، كراچی ٦/ ٣٩٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۰۴۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/۱/۱۴۲۲ھ

انشورنس کمپنی یا بینک کی ملازمت

سوال [۹۷۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: الف: انشورنس کمپنی یا بینک والے کسی فرد کو ایجنٹ بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر کسی کو لائف انشورنس کا ممبر بنا دو یا کسی کو ہمارے بینک سے قرض دلا دو تو تم کو چند فیصد معاوضہ دیں گے، از روئے شرع یہ معاوضہ درست ہے یا نہیں؟

ب: انشورنس کمپنی یا بینک میں ملازمت اور اس کی تنخواہ کیسی ہے؟

ج: کسی کو بینک یا انشورنس کمپنی تک رہنمائی کرکے بینک سے یا انشورنس کمپنی سے طے شدہ رقم لینا کیسا ہے؟

د: موجودہ دور میں بینک سے بغیر کاروبار کئے اور انشورنس کمپنی سے دوکان اور جان کا بغیر انشورنس کئے گذارہ تقریباً ناممکن ہے، انشورنس کمپنی کا اصول ہے، اگر کوئی فرد دوکان یا جان کا انشورنس کراکے صرف ایک قسط رقم جمع کرے اور ناگہانی موت ہوگئی یا دوکان جل گئی تو مکمل رقم دیتی ہے، یہ رقم لینا کیسا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: الف-ب: انشورنس کمپنی یا بینک کا ایجنٹ بننا یا اس کی

ملازمت کرنا ناجائز اوراعانت علی المعصیت ہے،اسی طرح ممبر بنانے کا معاوضہ یا تنخواہ لینا بھی ناجائز اورحرام ہے۔اورایسے شخص پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔

عن جابر –رضي الله عنه– قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربو ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء، وفي التكملة: لأن كتابة الربا إعانة عليه، ومن هنا ظهر أن التوظف في البنوك الربوية لا يجوز –إلى قوله– كذلك حرام لوجهين الأول إعانة على المعصية، والثاني أخذ الأجرة من المال الحرام. (تكملة فتح الملهم، كتاب المساقاة والمزارعة، باب لعن آكل الربو وموكله، أشرفيه ديوبند ١/ ٦١٩)

ج: یہ بھی معصیت کی ملازمت ہے، ایسی ملازمت بھی جائز نہیں ہے۔

وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة: ٢]

د: یہاں پر دو چیزیں ہیں: (۱) زندگی کا بیمہ کرانا یا ذمہ داری کا بیمہ کرانا،ان کے اندر سوداور قماردونوں موجود ہونے کی وجہ سے یہ دونوں مستحق لعنت اور گناہ ہیں، اوراس میں جو رقم ملتی ہے،اس کا کھانا قطعی حرام ہے اور یہ جولکھا گیا ہے کہ زندگی کا بیمہ کرائے بغیر گذارہ نہیں ہوتا یہ درست نہیں ہے۔

(۲) املاک یعنی دوکان، مکان اورگاڑی وغیرہ کا بیمہ کرانا یہ ضرورت کی بنا پر جائز ہےاوراس میں کسی طرح کا بھی سود نہیں ہوتا؛ بلکہ متعینہ مدت کے لئے جورقم جمع کی گئی ہے، وہ واپس نہیں آتی ہے؛اس لئے اس میں سود کے کوئی معنی موجود نہیں ہوتے ہیں، ہاں البتہ کبھی حادثہ پیش آجائے تو منجانب کمپنی اس کی تلافی کی مدد پیش کرتی ہےاورایسا واقعہ آنا امر متردد فیہ ہے، جو حقیقی قمار نہیں ہے؛ بلکہ شبہۃ الشبہ ہے،جس کی کسی درجہ میں ضرورت اورعموم بلویٰ کی وجہ سے گنجائش ہے۔

بإذن السلطان يقبض من التجار مال السوكرة، وإذا هلك من مالهم في البحر شيء يؤدي ذلك المستأمن للتجارة بدله تماما، والذي يظهر لي

أنه لا یحل للتأجر أخذ بدل الهالک. (شامي، کتاب الجهاد، باب المستأمن، مطلب مهم فیما یفعله التجار من دفع ما یسمی سوکره ...... زکریا ٦/ ٢٨١، کراچی ٤/ ١٧٠)

الضرورات تبیح المحظورات. (الأشباه، قدیم/ ١٤٠)

إذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضررا بارتکاب أخفهما.

(الأشباه، قدیم/ ١٤٥، مستفاد: إیضاح النوادر ١/ ١٤٣-١٤٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍رجب ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۰۴۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶؍۷؍۱۴۲۷ھ

پتنگ بنانے کی اجرت

سوال [۹۷۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں پتنگ بناتا ہوں، ایک مولانا صاحب کا کہنا ہے کہ جیسے پتنگ اڑانا ناجائز ایسے ہی پتنگ بنانا ناجائز، جب کہ ہمارے کئی رشتہ داروں کا خرچ اسی سے چلتا ہے؟

المستفتی: رئیس احمد مسجد بڑی توڑی پرسدھی دروازہ اوجین، ایم پی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پتنگ بنانے کی اجرت تو فی نفسہٖ جائز ہے؛ لیکن یہ عمل اعانت علی المعصیت ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے اور یہ عمل قابل ترک ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۶/ ۲۷۲، جدید زکریا ۱۰/ ۱۴۷، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۲/ ۳۹۱، ڈابھیل ۱۶/ ۱۳۴، احسن الفتاوی ۸/ ۱۸۶)

فإن کان یطیرها فوق السطح مطلعا علی عورات المسلمین، ویکسر زجاجات الناس برمیه تلک الحمامات عزر، ومنع أشد المنع، فإن لم یمتنع بذلک ذبحها. (درمختار مع الشامي، کتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغیره، فصل في البیع، زکریا ٩/ ٥٧٥، کراچی ٦/ ٤٠١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍رجب ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۶۸۳۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۷/۱۶ھ

''ویڈیو گیم'' کرایہ پر چلانا

سوال [۹۷۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ''ویڈیو گیم'' کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ ویڈیو گیم، ٹی وی کی طرح ہوتا ہے اور اس ٹی وی کا تعلق رموٹ کنٹرول سے ہوتا ہے، رموٹ میں چند بٹن ہوتے ہیں، جن کو دبانے سے سامنے رکھے ہوئے ٹی وی پر مختلف قسم کی تصویریں ابھرتی ہیں، جیسے لڑکا، ہوائی جہاز، میزائل، ٹینک، کاروں کی ریس دوڑ ہوتی ہے، اسی طرح میزائل سے حملہ کیا جاتا ہے، یہ ایک قسم کا کھیل ہے، جو زیادہ تر بچے کھیلتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ ویڈیو گیم کو کرایہ پر چلانا، مثلاً ایک روپیہ منٹ کیسا ہے؟ اور ویڈیو گیم کی تجارت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: مسعود الظفر معرفت مولانا امام الدین نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ''ویڈیو گیم'' ایک نیا کھیل ہے، اس میں اگر جاندار تصویر نہیں ہیں، صرف غیر جاندار کی تصویریں ہیں، جیسا کہ سوال نامہ میں درج ہے، تو یہ کھیل لوڈو اور شطرنج کے مشابہ ہے اور شطرنج کھیلنا ناجائز اور ممنوع ہے؛ اس لئے کہ اس سے انسان فضول اوقات گذارنے اور وقت ضائع کرنے کا عادی ہوجاتا ہے اور اپنی ذمہ داریوں سے آزاد ہوجاتا ہے۔ اور اگر اس میں جاندار کی تصویریں بھی آتی ہیں تو ناجائز اور ممنوع ہونے میں ایک قدم اور آگے بڑھ جائے گا؛ اس لئے مسلمان بچوں کو ویڈیو گیم کھیلنے سے روکنا لازم ہوگا۔

كل لهو ما سوى الشطرنج حرام بالإجماع، وأما الشطرنج فاللعب به حرام عندنا. (هندية، كتاب الكراهية، الباب السابع عشر في الغناء واللهو وسائر

المعاصي والأمر بالمعروف، زکریا قدیم ٥/ ٣٥٢، جدید ٥/ ٤٠٧)

اور ایسا کاروبار تعاون علی المعصیت کی وجہ سے امام ابو یوسفؒ ومحمدؒ کے نزدیک مکروہ ہے۔ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بلا کراہت جائز ہے؛ لیکن فتوی حضرات صاحبین رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر ہے۔

لو آجره دابة لينقل عليها الخمر، أو آجره نفسه ليرعى له الخنازير يطيب له الأجر عنده، وعندهما يكره. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، كراچی ٦/ ٣٩٢، زكريا ٩/ ٥٦٢، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٨٨، مصري قديم ٢/ ٥٣٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۸۰۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۶/۶ھ

چاول میں ملاوٹ کرنے والے مزدوروں کی مزدوری کا حکم

سوال [۹۷۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید چاولوں میں ملاوٹ کرتا ہے، تو یہ ملاوٹ تو بالاتفاق حرام ہے؛ لیکن جو مزدور اس کو ملاتے ہیں، ان کی مزدوری جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: ظہیر الاسلام، متعلم مدرسہ رحمانیہ ٹانڈہ بادلی، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فی نفسہ ملاوٹ کرنا حرام نہیں ہے؛ بلکہ اعلیٰ قسم کے چاول میں ادنی قسم کا چاول ملا کر اعلیٰ قسم کا چاول کر کے فروخت کرنا ناجائز ہے؛ کیوں کہ اس طرح فروخت کرنے میں خریدار کو دھوکہ دینا ہے، جو شرعاً ناجائز ہے؛ لہٰذا بعد میں جب خریدار کو ملاوٹ کا علم ہو جائے گا تو واپس کر دینے کا حق ہو گا۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: نهی رسول الله ﷺ: عن بيع الحصاة، وعن بيع الغرر. (صحيح مسلم، باب بطلان بيع الحصاة والبيع الذي فيه غرر، النسخة الهندية ۲/ ۲، بيت الأفكار، رقم: ۱۵۱۳)

هو كل بيع دخله الغرر بوجه من الوجوه. (إعلاء السنن، باب النهي عن بيوع الغرر، كراچی ۱٤/ ۱۱٦، دارالكتب العلمية بيروت ۱٤/ ۱٤۰، رقم: ٤٦٤۷)

وإذا أطلع المشتري على عيب في المبيع فهو بالخيار، إن شاء أخذه بجميع الثمن، وإن شاء رده. (هداية، كتاب البيوع، باب خيار الرؤية، اشرفي ۳/ ۳۵)

اور جو مزدور چاول میں ملاوٹ کی مزدوری کرتے ہیں، ان کی مزدوری جائز ہے؛ کیوں کہ ملاوٹ کو اسی کے معیار کے مطابق بھاؤ مقرر کر کے فروخت کیا جا سکتا ہے، اور جو غلط بتا کر بیچے گا، گنہگار وہی ہوگا۔

وإنما تحصل المعصية بفعل فاعل مختار. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في المبيع، كراچی ٦/ ۳۹۲، زكريا ۹/ ٥٦۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ رجب ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/۱۳۳۶)

❁❁❁

بحمد اللہ تعالیٰ

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ

فتاویٰ قاسمیہ

منتخب فتاویٰ

حضرت مولانا مفتی شبیر احمد القاسمی

خادم الافتاء و الحدیث جامعه قاسمیه

مدرسه شاهی مرادآباد، الهند

(جلد ۲۲)

المجلد الثانی والعشرون

الغصب، الرهن، الصید، الذبائح بتمام انواعها

الاضحیة بتمام انواعها، العقیقة، الحقوق باکثر

ابوابها إلی باب حقوق الاقارب

۹۷۳۶ ——— ۱۰۲۴۵

ناشر

مکتبه اشرفیه، دیوبند، الهند

01336-223082

مکمل اجمالی فہرست ایک نظر میں

❖❖ ❍❖❍

فہرست عناوین

مسئلہ نمبر	۳۲ کتاب الغصب	صفحہ

۳۳ کتاب الرہن ۶۵

٣٤ كتاب الصيد ۹۳

۳۸ کتاب الحقوق

(۳) باب حقوق الأقارب ۶۴۸

٣٢ کتاب الغصب

کاغذ میں ناحق اندراج کرانے کی شرعی حیثیت

سوال [۹۷۳٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کی زمین ہے اس نے ۲۵؍سال قبل مکان تعمیر کروایا تھا، بغل میں اور سامنے اپنی کچھ زمین چھوڑ رکھی تھی، بکر نے رشوت دے کر زید کی زمین کو چکروڑ میں خفیہ طور پر تبدیل کرادیا جس کی کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی کہ بکر نے کیا کیا ہے، امسال جون ۱۹۹۸ء زید نے اپنی بقیہ زمین پر تعمیر کے لیے بنیاد کھودنی چاہی تو بکر مع خاندان جھگڑا فساد کرنے پر اتر آیا، علاقہ کے لوگ اور گرام پردھان وغیرہ اکٹھا ہوئے سب نے کہا کہ یہ زمین زید کی ہے، چکبندی کے زمانہ میں کبھی یہاں چکروڑ کا تذکرہ نہ ہوا تھا اور بکر نے خود چکروڑ کی چکبندی کے زمانہ میں مخالفت کی تھی لیکن اب بکر زبردستی قبضہ کرنے پر آمادہ ہے جبکہ علاقہ والے متفقہ طور پر کہہ رہے ہیں اور گرام پردھان بھی، کہ زمین زید ہی کی ہے؛ لیکن بکر نے حکام کو رشوت دے کر فرضی مقدمہ میں زید کو کھڑا کردیا ہے، لہٰذا مندرجہ بالا دونوں سوالات کے جوابات قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جھوٹا دعویٰ کر کے زید کی زمین عدالت میں ناحق اندراج کرانے اور اس پر غاصبانہ قبضہ کر لینے کے باوجود زمین زید کی ملکیت سے خارج نہیں ہوئی، بلکہ اس طرح ناحق کسی کی زمین دبالینے پر حدیث شریف میں سخت ترین وعید آئی ہے۔

أن سعيد بن زيد قال سمعت رسول الله ﷺ يقول: من ظلم من الأرض شيئا طوقه من سبع أرضين. (بخاری شریف، کتاب المظالم، باب أثم من ظلم شيئا من الأرض ١/٣٣٢، رقم: ٢٣٨٨، ف: ٢٤٥٢، ابو داؤد شریف، کتاب الأدب، باب من ياخذ الشيئ من مزاح، النسخة الهندية ٢/٦٨٣، دار السلام رقم: ٥٠٠٣، صحيح

مسلم، کتاب المساقات والمزارعة، باب تحريم الظلم و غصب الأرض، النسخة الهندية ۳۲/۲، بيت الأفكار رقم: ۱٦۱۰، مشكوٰة شريف ۲٥٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۸۰۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۶/۶ھ

بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کے مکان کو اپنے نام کرالیا

سوال [۹۷۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص امیر قریشی نے ایک مکان خریدا اس کے بعد اس کو کچھ روپیوں کی ضرورت ہوئی، تو اس نے اس مکان کو رہن پر رکھ دیا، پھر جب اس کے پاس روپئے ہو گئے تو اس نے اپنے بڑے بھائی بندن کو روپئے دیئے اور کہا کہ رہن پر رکھا ہوا مکان چھڑا لینا تو اس نے اس روپئے سے مکان چھڑا کر اپنے نام کر لیا، پھر ایک تہائی اپنے چھوٹے بھائی امیر قریشی کے نام وصیت کی اس کے بعد اس کا انتقال ہو گیا تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ وہ شخص بندن اس مکان کا مالک ہوا یا نہیں؟ اور اس کی وصیت نافذ ہو گی یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر امیر قریشی نے اپنے بڑے بھائی بندن کو رہن چھڑا لینے کے لیے وکیل بنا کر بھیجا ہے اور بندن نے بجائے رہن چھڑانے کے مالک مکان امیر قریشی کی مرضی کے خلاف اپنے نام کرالیا ہے تو بندن شرعاً غاصب ہے، اور اس غصب کی وجہ سے بندن مذکورہ مکان کا مالک نہیں ہوا ہے، اس پر لازم تھا کہ امیر کو واپس کر دیتا اور اس کی موت کے بعد اس کے ورثاء پر لازم ہے کہ امیر کو پورا مکان واپس کر دیں اور جب مالک نہیں ہوا تو وصیت بھی نافذ نہیں ہوگی۔

عن عبد الله بن السائب بن يزيد عن أبيه عن جده أنه سمع النبي ﷺ يقول: لا يأخذن أحدكم متاع أخيه لاعبا و لا جادا، وقال سليمان: لعبا

و لا جدا، ومن أخذ عصا أخيه فليردها. (سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب من يأخذ الشيئ من مزاح، النسخة الهندية ۲/ ۶۸۳، دار السلام رقم: ۵۰۰۳، سنن الترمذی، الفتن، باب ماجاء لا يحل لمسلم أن يروع مسلما الخ، النسخة الهندية ۲/ ۳۹، دار السلام رقم: ۲۲۴۹)

لقوله عليه السلام: لايحل لأحدكم أن يأخذ مال أخيه لاعبا ولاجادا و إن أخذه فليرده عليه الخ. (شامی، کتاب الغصب، مطلب فی رد المغصوب وفيما لو أبی المالك، زکريا ۹/ ۲۶۶، کراچی ۶/ ۱۸۲، هدايه اشرفی ديو بند ۳/ ۳۷۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰؍ ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۵۰۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۱/۱۲/۳۰ھ

دعا تعویذ کرا کے دو بھائی کی زمین پر قبضہ کرنے کا حکم

سوال [۹۷۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جناب مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے اپنے بھائی کو دعا تعویذ کھلا پلا کر دماغ خراب کر کے اس کی ساری زمین و جائیداد بھی لے لی اور اس کے ساتھ ساتھ شرک کروایا ہے جو شرک کروایا ہے اس میں پورا حصہ لیا ہے، جو روپیہ لگا وہ سب انہوں نے دیا، کیا شرک کروانے پر شرعاً کوئی حکم ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت واقعہ صورت مسئولہ میں مالک زمین کو ایسے تعویذ کھلا پلا کر جس سے اس کا ذہنی توازن برقرار نہیں رہا اس کی زمین و جائیداد پر قبضہ کر لینا اور اپنے نام بیع نامہ کرا لینا ناجائز وحرام ہے؛ بلکہ مذکورہ شخص مظلوم ہے، اس کی زمین سے کسی قسم کا فائدہ حاصل کرنا جائز نہیں ہے بلکہ اس کو واپس کرنا ضروری ہے۔

عن أبی حرة الرقاشی عن عمه أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه. (شعب الإيمان للبيهقی، دار الكتب العلمية بيروت

۳۸۷/٤، رقم: ٥٤٩٢، السنن الکبریٰ للبیهقی دار الفکر بیروت ٥٠٦/٨، رقم: ١١٧٤٠)

نیز اس طرح کے تعویذات جو انسانی ذہنوں کو ماؤف کردیں سحر کے حکم میں ہیں اور سحر ناجائز وحرام ہے۔

عـن أبـی هريرة عن النبی ﷺ قال: اجتنبوا السبع الموبقات، قالوا: يـا رسـول الـلـه! وماهن قال: الشرک بالله والسحر الخ. (صحیح البخاری، کتـاب الـوصـايـا، بـاب قـول الـلـه تعالیٰ: إن الذين ياكلون اموال اليتٰمی ظلما الخ، النسخة الهندية ۳۸۸/۱، رقم: ۲٦۸٥، ف: ۲۷٦٦)

الســحـر حـرام بلا خلاف بين أهل العلم. (شـامی، کتاب الجهاد، مطلب: فی الساحر والزندیق، زکریا ۳۸۱/٦، کراچی ٢٤٠/٤)

اور صورت مذکورہ میں جو شرک وغیرہ کروایا گیا اس سے توبہ کرنا اور تجدید اسلام ضروری اور لازم ہے۔

﴿**اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُشْرَکَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ يَشَآءُ وَمَنْ يُشْرِکْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰی اِثْمًا عَظِيْمًا.**﴾ [النساء: ٤٨] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵۰۳/۳۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۶/۱۶ھ

بھانجے کی جائیداد پر ماموں کا ناحق قبضہ

سـوال [۹۷۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری والدہ کا انتقال ہو گیا اس کے بعد والد کا بھی انتقال ہو گیا، بوقت انتقال ہم لوگ یعنی میں محمد عمران گیارہ سال کا تھا اور ایک مجھ سے بڑی بہن تھی، ہم دونوں کی پرورش ماموں کے حق میں آئی، انہوں نے میرے والد والدہ کا سامان، جائیداد جس میں سونا، چاندی، پیتل اور تانبا وغیرہ سبھی تھا، اپنے قبضہ میں لے لیا، اور کہا کہ ہم ان دونوں کی پرورش کریں گے،

اس کے بعد بہن کی شادی ماموں نے کی اور وہ فرماتے ہیں کہ میں نے سب کچھ تمہاری بہن کی شادی میں خرچہ کردیا، اور بہن بھی اس بات کی مقر ہے کہ ماموں نے مجھے چڑھایا ہے، تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ ہمارے والد والدہ کے مال وجائیداد کے کیا مالک ماموں تھے؟ ان کو دینا پڑے گا یا نہیں؟ اس میں ہمارا حق ہے یا نہیں؟ ماں باپ کے ترکہ سے مجھے کچھ بھی نہیں ملا، کیا شرعاً ماموں پر لازم ہے کہ وہ مجھے میرا حق دیں؟

المستفتی: محمد عمران لاالباغ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کو شرعاً اپنے والدین کے ترکہ میں سے شرعی حق حاصل ہے، اور کل ترکہ کو تین حصوں میں تقسیم کرکے دو حصے آپ (محمد عمران) کو اور ایک حصہ آپ کی بہن کو ملے گا اور آپ کے ماموں کو صرف حفاظت کا حق تھا اس میں تصرف کا حق نہیں تھا، لہٰذا جو بھی چیز ترکہ میں سے تھی اس میں سے آپ کو دو تہائی اور آپ کی بہن کو ایک تہائی حصہ ملے گا، لہٰذا جو اشیاء موجود ہیں، ان کو بعینہٖ آپ حاصل کرسکتے ہیں، اور جو بعینہٖ موجود نہیں ہیں ان کا تاوان آپ کے ماموں پر لازم ہوگا، کیونکہ ماموں کو آپ کے حصہ کا مال نہ آپ کی بہن کو دینے کا حق تھا اور نہ ہی اس میں مالکانہ تصرف کا۔

عن أبی حرة الرقاشی عن عمه أن رسول الله ﷺ قال: لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفس منه. (شعب الإیمان للبیهقی، دار الکتب العلمیة بیروت ٤/٣٨٧، رقم: ٥٤٩٢، السنن الکبریٰ للبیهقی دار الفکر بیروت ٨/٥٠٦، رقم: ١١٧٤٠)

لایجوز لأحد أن یتصرف فی ملک الغیر بغیر إذنه. (قواعد الفقه اشرفی دیو بند ص: ١١٠، الأشباه، کتاب الغصب، کراچی ٢/٩٨)

یبیع الأب لأن له ولایة التصرف لا الأم، ولا بقیة أقاربه. (الدر المختار باب النفقة زکریا ٥/٣٦٧، کراچی ٣/٦٣١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ ربیع الاول ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۵۹۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲/۳/۱۴۱۲ھ

دوسرے کی زمین ہڑپنے کا حکم

سوال [۹۷۴۰]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں افسری اور میری بہن جعفری نے مل کر ایک بیگہ زمین خریدی جو تقریباً ایک ہزار گز ہے میں نے دوسو روپیہ دیئے تھے، میری بہن نے ڈیڑھ سو روپیہ دیئے تھے، پھر بیعنامہ کے وقت جعفری نے کل ایک بیگہ ایک ہزار گز اپنے نام بیعنامہ کرالیا، میرا نام بھی نہیں ڈلوایا اور یہ کہتی رہی کہ میں تمہارے ساتھ دھوکہ نہیں کروں گی، پھر اس نے ایک ہزار گز میں سے مجھے دوسو گز دی اور خود آٹھ سو گز لے لی، میں نے اپنی زمین پر مکان بھی بنالی تھا، اب وہ کہتی ہے کہ تم کو صرف ۲۵/گز دوں گی، اور سب میری ہے تو آپ سے دریافت یہ کرنا ہے کہ اس ایک ہزار گز میں سے شرعاً ہمارا کتنا حق بنتا ہے، جبکہ ہم نے دوسو روپیہ دیئے تھے، اور اس جعفری نے ڈیڑھ سو دیئے تھے، شریعت کا فیصلہ تحریر فرمادیں، نوازش ہوگی۔

المستفتی: افسری خاتون، محلّہ پی اے سی نیا گاؤں مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کی بہن جعفری کا یہ کہنا کہ مذکورہ زمین میں سے تم کو پچیس گز دوں گی، یہ سراسر ظلم وزیادتی ہے، حدیث شریف میں اس پر سخت وعید آئی ہے، بلکہ سوال نامہ کے مطابق ہزار گز زمین میں سے دوسو روپیہ کے تناسب سے افسری کو ۷/۳-۵۷۱ گز اور ڈیڑھ سو روپیہ کے تناسب سے جعفری کو ۷/۴-۴۲۸ گز زمین ملے گی، اس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے، اگر اس کے خلاف کرے گی تو جعفری گنہگار ہوگی، اور قیامت کے دن سات زمینوں اور سات آسمانوں کا طوق اس کو پہننا پڑے گا۔

عن سعید بن زید بن عمرو بن نفیل أن رسول الله ﷺ قال: من اقتطع شبرا من الأرض ظلماً طوقه الله إیاه یوم القیامة من سبع أرضین. (مسلم شریف، کتاب المساقات والمزارعة، باب تحریم الظلم وغصب الأرض، النسخة الهندیة ۲/۳۲، بیت الأفکار، رقم: ۱۶۱۰، صحیح البخاری، کتاب المظالم، باب إثم من ظلم شیئا من الأرض، النسخة الهندیة ۱/۳۳۲، رقم: ۲۳۸۸، ف: ۲۴۵۲، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب من

يأخذ الشيئ من مزاح، النسخة الهندية ۲/ ۶۸۳، دار السلام رقم: ۵۰۰۳) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۵۴۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۳/۱۴ھ

دوسروں کی زمین پر ناحق قبضہ کا حکم

سوال [۹۷۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اللہ عز وجل اور آپ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا فرمان ہے ان لوگوں کے متعلق جو دوسروں کی زمینوں پر ناجائز قبضہ کرکے اپنی ملک بنالیتے ہیں؟

المستفتی: مسٹر ریاست علی ترمذی قدیری، بابریاب، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: جولوگ دوسروں کی زمین اور جائیداد پر ناجائز قبضہ جما کر مالکانہ تصرف کرتے ہیں ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں سخت ترین وعید نازل فرمائی ہے، ان کے ساتھ آخرت میں سخت خطرناک اور سنگین معاملہ ہوگا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا، وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيهِ نَارًا وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرًا. (النساء: ۲۹)

ترجمہ: اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال وجائیداد کو ناجائز اور حق تلفی کرکے نہ کھاؤ، ہاں البتہ آپسی رضامندی اور خریداری کے ساتھ کھاسکتے ہو اور آپس میں خونریزی مت کرو، بے شک اللہ تمہارے ساتھ رحم کا معاملہ کرنے والا ہے، اور قرآن وحدیث کے باوجود اگر کوئی شخص ظلم وتعدی سے کسی کا مال ناحق لے لے تو عنقریب اس کو جہنم میں ڈالا جائے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ ربیع الثانی ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۱۸۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۱/۴/۷ھ

بیوی سے زبردستی اس کا زیور لینا

سوال [۹۷۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے والد نے ہماری امی کو دو زیور کان اور ناک کے دیے تھے، پھر انہوں نے دوسری شادی کرلی اور وہ زیورات لے لیے تھے، اب ہماری امی کو نانی نے کچھ چاندی کے زیورات دیے تھے جس میں سے کچھ بیچ کر نانی کا علاج ومعالجہ ہوا، کچھ بچے ہیں ان کے بارے میں بھی ہمارے والد کہتے ہیں کہ مجھے دو ورنہ گھر سے نکال دیں گے، اس سے پہلے بھی کئی دفعہ گھر سے نکال چکے ہیں، تو آپ سے دریافت یہ کرنا ہے کہ نانی کے دیئے ہوئے زیور زبردستی مانگنا شرعاً کیسا ہے؟ اور اپنی بیوی کو بار بار گھر سے نکال دینا اور کھانا خرچہ نہ دینا شرعاً کیسا ہے؟ شرعی حکم کیا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو زیور آپ کی نانی نے آپ کی والدہ کو دیا ہے وہ والدہ کی ذاتی ملکیت ہے، آپ کے والد صاحب کے لیے اسے زبردستی ان سے لینا قطعاً جائز نہیں ہے۔

عن أبی حرۃ الرقاشی عن عمه أن رسول الله ﷺ قال: لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفس منه. (شعب الإیمان للبیهقی، دار الکتب العلمیة بیروت ۳۸۷/٤، رقم: ٥٤٩٢، السنن الکبریٰ للبیهقی دار الفکر بیروت ٨/٥٠٦، رقم: ١١٧٤٠)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍ذی قعدہ ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۶۰۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۱۱/۲۱ھ

سالے کی چیز اس کی اجازت کے بغیر لینا

سوال [۹۷۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: اگر مفتی محمد ہارون قاسمی اپنے سالے کی کوئی چیز بغیر اس کی اجازت کے لیں تو اس کا کیا حکم ہے؟ جواب سے نوازیں۔

المستفتی: عبداللہ خاں محلّہ نت گنجا بازار، ملاواں ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مفتی محمد ہارون کو یہ معلوم ہے کہ سالے کی چیز لینے سے وہ ناراض نہ ہوگا بلکہ خوش ہونے کی امید ہے تو مفتی محمد ہارون گنہگار نہ ہوں گے اور اگر سالے کو معلوم ہونے پر ناراض ہونے کا خطرہ ہے تو لینا جائز نہ ہوگا۔

عن أبی حرة الرقاشی عن عمه أن رسول الله ﷺ قال: لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفس منه. (شعب الإیمان للبیهقی، دار الکتب العلمیة بیروت ۳۸۷/٤، رقم: ٥٤٩٢، السنن الکبریٰ للبیهقی دار الفکر بیروت ٥٠٦/٨، رقم: ١١٧٤٠)

لایجوز لأحد أن یتصرف فی ملک الغیر بغیر إذنه. (قواعد الفقه، اشرفی دیوبند ص: ١١٠، الأشباه کراچی ٩٨/٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/۲۸۵۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۲/۹/۲۳ھ

بھائی کی اجازت کے بغیر اس کا حصہ فروخت کرنا

سوال [۹۷۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے اپنے بھائی کی کچھ جائیداد بھائی کی رضامندی کے بغیر فروخت کردی، اس طرح کیا وہ غاصب نہ ہوا؟

المستفتی: محمد ارشد نگم قاضی سرائے

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دوسرے کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر

تصرف کرنا جائز نہیں اور احادیث میں اس کی وعید آئی ہے لہٰذا وہ غاصب اور سخت گنہگار ہے، اور یہ گناہ محض توبہ کر لینے سے معاف نہیں ہو جاتا، کیونکہ اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔

عن سعيد بن زيد بن عمرو بن نفيل أن رسول الله ﷺ قال: من اقتطع شبرا من الأرض ظلما طوقه الله إياه يوم القيامة من سبع أرضين. (مسلم شريف، كتاب المساقات والمزارعة، باب تحريم الظلم وغصب الأرض، النسخة الهندية ۲/۳۲، بيت الأفكار، رقم: ۱۶۱۰، صحيح البخاري كتاب المظالم، باب إثم من ظلم شيئا من الأرض، النسخة الهندية ۱/۳۳۲، رقم: ۲۳۸۸، ف: ۲۴۵۲، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب من يأخذ الشيئ من مزاح، النسخة الهندية ۲/۶۸۳، دار السلام رقم: ۵۰۰۳)

لا يجوز التصرف من مال غيره بلا إذنه ولا ولايته. (الدر المختار، كتاب الغصب، مطلب: فيما يجوز من التصرف بمال الغير الخ، كراچی ۶/۲۰۰، زكريا ۹/۲۹۱، الأشباه كراچی ۲/۹۸، قواعد الفقه، اشرفی دیوبند ص: ۱۱۰، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۸/۲۹۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۳۵۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۶/۲۷ھ

مشترکہ زمین پر کسی ایک شریک کے تنہا قبضہ کرنے کا حکم

سوال [۹۷۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: والد صاحب کی متروکہ جائیداد میں ایک حصہ پر کچھ مکان تعمیر تھا، اور اس کے برابر میں تھوڑی زمین خالی پڑی ہوئی تھی، مذکورہ جائیداد ہم دو بھائی، محمد نعیم ومحمد یوسف کے درمیان تقسیم ہونی تھی، جس کی صورت یہ ہوئی کہ تعمیر شدہ مکان آدھا آدھا ان دونوں بھائیوں کے درمیان تقسیم ہو گیا اس کے بعد محمد یوسف نے محمد نعیم کے حصہ سے تقریباً ۷؍ فٹ زمین راستہ سے نکلنے کے لیے بلا معاوضہ لے لی، جبکہ ان کے مکان کے قریب میں مین روڈ موجود تھا، اس کے بعد محمد نعیم نے اپنا مکان از سر نو تعمیر کیا پھر محمد یوسف نے تعمیر کیا، اور اپنی

چھت بوقت تعمیر محمد نعیم کی دیوار پر رکھنا چاہتے تھے، محمد نعیم نے بلا معاوضہ دیوار پر چھت رکھنے سے منع کر دیا، اور معاوضہ طلب کیا تو محمد یوسف نے معاوضہ دینے سے انکار کرتے ہوئے اپنی چھت محمد نعیم کی دیوار پر نہیں رکھی، اس کے بعد محمد یوسف نے خالی زمین جس میں نصف حصہ محمد نعیم کا بھی تھا، اس پر اپنا قبضہ کرلیا، محمد نعیم کو نہ زمین دی اور نہ معاوضہ دیا، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ: (۱) محمد یوسف نے محمد نعیم کے مکان سے جو راستہ لیا ہے تو کیا محمد نعیم اپنے اس حصے کا معاوضہ لینے کا حقدار ہے یا نہیں؟

(۲) کیا محمد یوسف محمد نعیم کی دیوار پر بلا معاوضہ چھت رکھنے کا حقدار تھا یا نہیں؟

(۳) محمد یوسف نے خالی پڑی ہوئی زمین جس میں محمد نعیم کا آدھا حصہ تھا اس پر قبضہ کرلیا تو محمد نعیم کو اس کا معاوضہ یا آدھی زمین لینے کا حق ہے یا نہیں؟ تفصیلاً لکھئے۔

نوٹ: جو راستہ محمد یوسف نے لیا ہے اس میں محمد نعیم کی شرکت نہیں ہے بلکہ ان کا راستہ علیحدہ ہے البتہ اس میں محمد نعیم نے بند نالی بنوائی تھی جس کو محمد یوسف نے توڑ کر پھینک دیا۔

المستفتی: مولانا نعیم الدین صاحب ضلع بستی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: محمد یوسف کے لیے محمد نعیم کے مکان کا حصہ جس میں اس نے بند نالی بنا رکھی تھی، اس کو توڑ کر اپنے ذاتی راستہ میں شامل کرنا جائز نہیں ہے، محمد نعیم کو شرعی طور پر اس کا معاوضہ ملنا چاہیے، نیز مشترکہ زمین جس میں دونوں برابر کے حصہ دار ہیں اس پر تنہا محمد یوسف کا قبضہ جما لینا جائز نہیں ہے، اس کے آدھے حصے کا حقدار محمد نعیم ہے، لہٰذا محمد نعیم کو نصف زمین یا اس کی قیمت دیدینا لازم ہے، ورنہ محمد یوسف سخت ترین ظالم ہوگا اور عنداللہ سخت ترین عذاب کا مستحق ہوگا۔

من أخذا شبرا من الأرض بغير حقه طوقه في سبع أرضين يوم القيامة الحديث. (مسلم شريف، كتاب المساقاة والمزارعة، باب تحريم المظالم و غصب الأرض، النسخة الهندية ۲/ ۳۲، بيت الأفكار رقم: ۱۶۱۰، صحيح البخاري، كتاب المظالم باب من أثم من ظلم شيئا من الأرض، النسخة الهندية ۱/ ۳۳۲، رقم: ۲۳۸۸، ف:

٢٤٥٢، معجم كبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ١٦٣/١٢، رقم: ١٢٩٢١)

اور جہاں تک محمد نعیم کی دیوار پر چھت رکھنے کی بات ہے اس میں محمد نعیم کی طرف سے اخلاقاً اجازت ہوئی تو وہ مستحق ثواب ہوگا، لیکن اگر وہ اجازت نہیں دیتا ہے تو اس پر اس کو مجبور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

لايمنع جار جاره أن يغرز خشبة في جداره و تحته في فتح الباري: اشتراط إذن المالك فإن امتنع لم يجبر و هو قول الحنفية الخ. (فتح الباري، كتاب المظالم، باب لا يمنع جار جاره، دار إحياء التراث العربي بيروت ١٣٢/٥، اشرفيه ديو بند ١٣٩/٥، تحت رقم الحديث ٢٤٦٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍صفر المظفر ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۳۳/۵۶۳۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۲/۱۳ھ

کرایہ دار کا مطالبہ کے باوجود دوکان خالی نہ کرنا اور نفع کا حکم

سوال [۹۷۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: احقر نے آپ کی خدمت میں چند روز قبل دو فتوے ارسال کیے تھے، ان میں سے ایک کرایہ دار کے مطالبہ کے باوجود دوکان خالی نہ کرنے اور اس میں سامانِ فروخت کرتے رہنے کے سلسلے میں لکھا تھا کہ جو آج تک نفع کمایا وہ اس کرایہ دار کے لیے گندہ، خبیث اور حرام مال ہوگا، اس کی دلیل میں بندہ نے مجمع الأنہر ۴/ ۸۱ کی بھی عبارت پیش کی تھی، اس کا آخری جزء یہ تھا:

و (يأخذ) الغاصب (رأس ماله) ...... **(ويتصدق بالفضل) عند الطرفين** ...... **(وعند أبي يوسف لا يتصدق) أي بالباقي لأن الزيادة حصلت في ضمانه وملكه ولهما أنه صار ملكا له ملكا خبيثا و حراما لخبث السبب وهو التصرف في ملك الغير.**

آپ نے اس عبارت کا کوئی جواب نہیں دیا، کہ آیا طرفین رحمہما اللہ کا قول مفتیٰ بہ ہے یا

نہیں؟ اب اس دلیل مذکور کے علاوہ مزید دلائل حدیث شریف، محدثین اور فقہاء کرام کے اقوال سے قلمبند کرتا ہوں، پھر آپ تحریر فرمائیں کہ ان دلائل کا کیا مطلب ہے؟ اور مفتی بہ قول کیا ہے؟

دلائل

(۱) **قال رسول الله ﷺ من زرع فی أرض قوم بغیر إذنهم فلیس له من الزرع شيئ وله نفقته.** (رواه أبو داؤد، رقم: ۳٤۰۳)

قـال الشیـخ مولانا خلیل احمد رحمه الله تعالیٰ ”فمعنی قوله “لیس لـه من الزرع شيئ” أی لا یـحل له من الزرع شیئ ، لأنـه حصل له بطریق غصب الأرض. (بـذل الـمـجـهـود، باب فی زرع الأرض بغیر إذن صاحبها ۱۱/۱۰۸، مطبوعه دار البشائر الإسلامیة)

(۲) **وکـان یـنبغی أن یتصدق بما زاد علی ما ضمن عندهما لا بالغلة کلها کمافی المسألة الأولیٰ.** (تبیین الحقائق زکریا، کتاب الغصب ٦/۱۳۲)

(۳) شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم اپنی معروف کتاب درس ترمذی ۳۱۰/۴ ”**باب ما جاء من زرع فی أرض قوم بغیر إذنهم**“ کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے کی زمین میں اس کی اجازت کے بغیر کاشت کرتا ہے تو اول وہ زمین کو غصب کرنے کا گناہگار ہوگا، دوسرے اس مسئلہ پر صاحب ارض کے لیے ضمان نقصان ہوگا، تیسرے جو پیداوار حاصل ہوگی وہ اگر چہ اس کی ملکیت ہوگی، لیکن ملک خبیث ہوگی، اس پیداوار سے انتفاع اس کے لیے طیب نہ ہوگا ، البتہ نفقہ کے بقدر طیب ہوگا، پھر آگے مفتی صاحب نے حنفیہ کی دلیل ذکر کی، پھر قیاس کا تقاضہ اور پھر حدیث باب کا جواب دیا کہ ”لیس لہ من الزرع شئ“ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پیداوار سے انتفاع اس کے لیے جائز نہیں، طیب نہیں، اگر چہ وہ اس کی ملکیت میں آگئی ہے، آپ نے ذخیرہ کی جو عبارت بحر الرائق کے حوالہ سے ذکر فرمائی ہے اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ غاصب نے ارض مغصوبہ میں جو کھیتی کی ہے وہ اس کی ملکیت ہے، لیکن وہ

ملکیت کیسی ہے؟ آیا خبیث، حرام یا حلال؟ یہ معلوم نہیں ہو رہا ہے بلکہ اس کی وضاحت مجمع الانہر وغیرہ کتب سے ہو رہی ہے کہ وہ ملکیت ''ملکا خبیثا وحراما'' ہے۔(۸۱/۴)

آپ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ وہ آمدنی واجب التصدق نہیں، جبکہ آپ کی ذکر کردہ بحرالرائق کی عبارت سے تقریباً ۱۸ ر سطر نیچے لکھا ہے:

وفی الکافی: ویأخذ الغاصب رأس ماله أی البذر و ما أنفق و ماغرم من النقصان و یتصدق بالفضل و هذا عند أبی حنیفة و محمد، و عند الثانی لا یتصدق. (البحر الرائق زکریا ۲۰۳/۹)

اور اسی کتاب کے دو صفحہ بعد یہ لکھا ہے:

و کان ینبغی أن یتصدق بما زاد علی ما ضمن عندهما لا بالغلة کلها کما فی المسألة الأولیٰ. (البحر الرائق زکریا ۲۰۵/۹ کتاب الغصب)

حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک بھی وہ نفع واجب التصدق اس وقت نہ ہوگا جبکہ غاصب نے ضمان ادا کر دیا ہو اور اگر ضمان ادا نہ کرے تو وہ نفع واجب التصدق ہوگا۔

وقال أبو یوسف رحمة الله لا یتصدق به لأن المنهی ربح مالم یضمن وهو قد ضمن. (الکفایة علی الهدایة ص: ۹، مع البحر الرائق زکریا ص: ۹۳)

اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کرایہ دار مالک دوکان کی مرضی کے مطابق یا اس جیسی دوکان کے کرایہ کے مطابق کرایہ ادا نہیں کرتا بلکہ سالہا سال سے بہت مختصر کرایہ ادا کرتا ہے جبکہ مالک دوکان بار بار کہہ چکا کہ کرایہ بڑھاؤ ورنہ دوکان خالی کرو، تو یہ نہ دوکان خالی کرتا ہے اور نہ کرایہ بڑھاتا ہے اور اگر خالی بھی کرتا ہے تو بقیہ مناسب کرایہ ادا نہیں کرتا جیسا کہ عصر حاضر میں ہو رہا ہے بلکہ برعکس کرایہ دار مالک سے خالی کرنے کے پیسے مانگتا ہے، تو ان شکلوں میں حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک بھی وہ نفع واجب التصدق ہوگا، یہ جو کچھ بندہ نے لکھا ہے اگر اس میں کچھ خامی ہو تو بحوالہ کتب اصلاح فرمادیں، اصح اور مفتی بہ قول کی نشاندہی فرمائیں، احسان عظیم ہوگا۔

المستفتی: عبدالقادر قاسمی، خادم دارالافتاء اشرفیہ سعدالعلوم چاندپور بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضرت مولانا مفتی عبدالقادر صاحب، ۳۰/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۳ھ کو لکھا ہوا جواب جو مدرسہ شاہی مرادآباد کے دارالافتاء سے جاری ہوا ہے اس جواب سے متعلق آنجناب کا بھیجا ہوا والا نامہ موصول ہوا، اور اس میں تحریر کردہ تمام جزئیات ودلائل پر خوب اچھی طرح غور کیا گیا، پھر یہاں سے لکھے ہوئے جواب پر بھی غور کیا گیا، بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہمارے یہاں سے لکھا ہوا جواب اپنی جگہ بدستور صحیح اور درست ثابت ہوا ہے، اور اس جواب میں اصل مسئلہ سے متعلق شامی زکریا ۹/ ۱۱۵، شرح المجلۃ ۱/ ۲۶۴ رقم: ۴۷۲ سے نقل کردہ جزئیات بھی جواب کے مطابق صحیح ہیں، اور اس کے بعد آخر میں شامی زکریا ۹/ ۲۸۵ اور البحر الرائق کوئٹہ ۸/ ۱۱۱ کے جزئیات اس مسئلہ میں بے موقعہ نقل کیے گئے ہیں، اور ان جزئیات کے نقل کرنے میں ہم سے غلطی ہوئی ہے، اس لیے اس مسئلہ سے متعلق ان جزئیات کو نقل کرنے کے بارے میں ہم رجوع کا اعلان کرتے ہیں کہ یہ دونوں جزئیات اس مسئلہ سے متعلق نہیں ہیں، اور ان دونوں جزئیات کو چھوڑ کر لکھا ہوا اصل جواب اور اوپر کے دونوں جزئیات اپنی جگہ صحیح اور درست ہیں، اور آخر کے دونوں جزئیات کی وجہ سے آنجناب کو اتنے سارے جزئیات نقل کر کے پیش کرنے کا موقع ملا، جو اصل مسئلہ سے متعلق نہیں، اور ایسے ہی دو جزئیہ احقر نے بھی خواہ مخواہ نقل کردیئے، جو اصل مسئلہ سے متعلق نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ دوکان ومکان اور اسی طرح کسی بھی عمارت کی کرایہ داری اور کھیتی کی زمین کی کرایہ داری کا مسئلہ بالکل الگ الگ ہے، ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، اور دونوں مسئلوں کا حکم بھی الگ الگ ہے، کیونکہ کرایہ کی عمارت میں سے کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی، بلکہ باہر سے خارجی اشیاء کو لاکر کے اس جگہ پر بیچا جاتا ہے، اس میں کبھی نفع بھی ہوسکتا ہے، گھاٹا بھی ہوسکتا ہے، اور کھیتی کی زمین ایسی نہیں ہے بلکہ اس میں بیج بونے کے بعد زمین خود پیداوار اگا کر دیتی ہے، اس لیے دونوں میں بہت بڑا فرق ہے، اور فقہاء کرام نے دونوں کے لیے الگ الگ جزئیات پیش کیے ہیں، آنجناب نے جتنے بھی جزئیات اپنی تحریر میں پیش

کیے ہیں وہ سب کے سب کھیتی کی پیداوار سے متعلق ہیں، اور زیر بحث مسئلہ کھیتی کی پیداوار سے متعلق نہیں ہے، بلکہ کرایہ کی دوکان سے متعلق ہے، جس کے جزئیات اسی کے موافق فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں، اس کا حکم شرعی یہی ہے کہ کرایہ داری کی مدت ختم ہونے کے بعد باقی جتنے عرصہ تک اس دوکان کو قبضہ میں رکھ کر اس میں تجارت کر کے نفع حاصل کرے گا وہ سارا نفع کرایہ دار کے لیے حلال ہے، اور اس عرصہ کا کرایہ مالک کے لیے اس کے اوپر لازم ہے، اور اس عرصہ کا مثلی کرایہ جو ان دنوں کا مناسب اور صحیح ہوسکتا ہے وہ ادا کرنا کرایہ دار پر لازم ہے۔

استاجر دارا أو حماما أو أرضا شهرا فسكن شهرين هل يلزمه أجر الثاني إن معدا للاستغلال؟ نعم و إلا لا . (شامی، کتاب الإجارة، باب فسخ الاجارة کراچی ٦/٨٤، زکریا ٩/١١٥)

لو آجر دارا شهرا بمائة فسكنها المستاجر شهرين لزمه الأجر المسمى عن الشهر الأول و أجر المثل عن الشهر الثاني إذا كانت الدار معدة للاستغلال. (شرح المجلة، اتحاد دیوبند ١/٢٦٤، رقم المادة: ٤٧٢)

إذا استأجر الرجل من أخر دارا، وفي الفتاویٰ الخلاصة: أو حماما شهرا فسكنها شهرين فعليه أجر الشهر الأول –إلى قوله– و ذكر في بعض الروايات أنه يجب عليه الأجر في الشهر الثاني أيضا. (تاتارخانية زكريا ١٥/٥٨، رقم: ٢٢١٥١)

إذا سكن بعد الموت أو بعد انقضاء المدة فلا أجر عليه قبل الطلب و إذا سكن بعد الطلب فعليه الأجر لما سكن بعد الطلب سواء كان في الشهر الأول أو في الشهر الثاني. (المحیط البرهانی کوئٹه ٩/١٣٧، المجلس العلمی ١١/٢٨٣، رقم: ١٣٦٩٤)

غصب حانوتا فعمل و ربح طاب له الربح؛ لأنه حصل بالتجارة.

(تاتارخانية زكريا ١٦/٥٣٩، رقم: ٢٦٠٣٧)

غصب حانوتا و اتجر فيه وربح يطيب الربح كذا في "الوجيز" لكردری.

(هندیه کتاب الغصب، الباب الثامن زکریا قدیم ٥/١٤٢، جدید ٥/١٦٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍ جمادی الثانیہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۳۱/۱۰۷۳۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/۶/۱۴۳۳ھ

کرایہ دار کا مکان خالی نہ کرنا ظلم اور گناہ ہے

سوال [۹۷۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں ایک قطعہ مکان دومنزلہ کی مالکہ کامل ہوں، اس مکان کا اوپری حصہ میں نے اپنی ضرورت کے لیے عدالت سے خالی کرا کر اپنی دختر کلدن کے واسطے رہائش بنا کسی لالچ وطمع اور بغیر کسی رقم کے لیے اور بغیر کرایہ طے کیے ہوئے دیدیا اور میرا ارادہ نیچے کی منزل بھی خالی کرا کر اپنے کسی بچے کو دے دینے کا ہے، اور یہ کام میں اپنی زندگی ہی میں کرنا چاہتی ہوں چونکہ زندگی مستعار ہے، اور ایک لمحہ کا بھی بھروسہ نہیں ہے، لیکن نیچے کے مکان میں جو صاحب رہتے ہیں بطور کرایہ داری کے تقریباً چودہ سال سے رہتے ہیں وہ مکان مذکور کو خالی کرنے پر تیار نہیں ہیں اور آمادۂ مقدمہ بازی ہیں، مجبوراً میں نے عدالت سے رجوع کیا ہے ایسی حالت میں کرایہ دار موصوف بغیر مالکہ کی رضامندی کے مکان مذکورہ بالا میں شرعاً رہنے کے مستحق ہیں یا نہیں؟

المستفتیہ: نواب بیگم مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مالک جب کرایہ داری ختم کر کے اپنا مکان واپس لینا چاہے تو کرایہ دار پر لازم اور ضروری ہے کہ مکان خالی کر کے مالک کو واپس کردے ورنہ کرایہ دار شدید ظلم اور معصیت کا مرتکب ہوگا، اور مالک کی بغیر مرضی کے مکان میں رہنا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۳/۲۵۷، جدید زکریا ۹/۲۸۵)

وللمؤجر بيعها اليوم وتبطل الإجارة به يفتیٰ الخ. (الدر المختار كتاب الإجارة كوئٹه ٥/٤ كراچی ٦/٦، زكريا ٩/٨)

(وقوله) والفتویٰ على أنه يجوز البيع وتبطل الإجارة المضافة. (شامي قبيل كتاب المكاتب، كراچی ٦/٩٦، زكريا ٩/١٣٢، كوئٹه ٥/٦٦، حاشية چلپی علی التبيين، امداديه ملتان٥/١٤٨، زكريا ٦/١٦٥، مجمع الأنهر قديم ٢/٣٦٩، دار

الکتب العلمیة بیروت ۳/ ۵۱۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم رجب المرجب ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۷۷۸)

چوری کی بجلی کرایہ پر لینا

سوال [۹۷۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید سلائی کا کام کرتا ہے اس کا اپنا میٹر بھی ہے، زید نے دوسری لائن بھی لے رکھی ہے جو کرایہ کی ہے، جہاں سے کرایہ پر زید نے بجلی لے رکھی ہے وہ بتی چوری کی ہے، اس چوری کی بتی کو زید کرایہ پر استعمال کرسکتا ہے یا نہیں؟ اگر اس کی اجازت نہیں ہے تو زید کیا کرے؟ ضرورت کے بقدر ایک لائن تو آتی نہیں، ایسی حالت میں زید کرایہ پر وہ بتی حاصل کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اور اتنی گنجائش نہیں ہے کہ زید جنریٹر وغیرہ کا انتظام کرسکتا ہو، قرآن و حدیث کی روشنی میں مدلل جواب تحریر فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد نعیم بڑا احاطہ اصالت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ جانتے ہوئے کہ یہ بجلی چوری کی ہے زید کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہے، اس کے بجائے کوئی جائز طریقہ اختیار کرے ان شاء اللہ اسی میں برکت ہوگی۔ (مستفاد: آپ کے مسائل اوران کا حل قدیم ۶/ ۵۱، جدید زکریا ۴/۷، فتاویٰ محمودیہ قدیم ۶/ ۳۴۸، جدید ڈابھیل ۱۸/ ۴۳۷)

عن أبی هریرة عن النبی ﷺ أنه قال: من اشتریٰ سرقة و هو یعلم أنه سرقة فقد شرک فی عارها و إثمها. (المستدرك للحاکم، مکتبه نزار مصطفی الباز بیروت ۳/ ۸۵۲، رقم: ۲۲۵۳، المنصف لابن أبی شیبة، مؤسسة علوم القرآن بیروت ۱۱/ ۳۳۶، رقم: ۲۲۴۹۵، شعب الإیمان، دار الکتب العلمیة بیروت ٤/ ۳۸۹، رقم: ۵۵۰۰)

أما لو رأی المکاس مثلا یأخذ من أحد شیئا من المکس ثم یعطیه آخر ثم یأخذ من ذٰلک الآخر آخر فهو حرام. (شامی، کتاب البیوع، باب البیع الفاسد، مطلب الحرمة تتعد، کراچی ۵/ ۹۸، زکریا ۷/ ۳۰۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ شعبان المعظم ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۴۰۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/ ۸/ ۱۴۱۸ھ

سرکاری زمین میں مکان تعمیر کرنا

سوال [۹۷۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ممبئی میں ایک شخص نے حسب معمول سرکاری زمین پر قابض ہوکر ایک کمرہ بنالیا اسے دیکھ کر کچھ متعلقین نے کہا کہ ہمیں بھی یہاں کمرہ بنوادیں، اس شخص نے کہا میرا فی کمرہ اتنا خرچ آیا ہے، اتنی رقم تم دیدو تمہارے کمرے بھی بن جائیں گے، لوگوں نے رقمیں دیں، لہٰذا کمرے بھی بنے، ابھی تکمیل ہونے ہی والی تھی کہ سرکاری عملہ آگیا، اور اس نے سارے کمروں کو مسمار کردیا، اور تمام سامان تعمیری جو لاکھوں روپیوں کا تھا مع زمین کے اپنی تحویل میں لے لیا، اس کے بعد ایک شخص آیا اس نے کہا میں تمہیں زمین کا قبضہ مع سامان دلاسکتا ہوں اور کاغذات بھی بنوادیتا ہوں، اس میں اتنی اتنی رقمیں خرچ ہوں گی، جو لاکھوں میں تھی، مشورہ کیا تو لوگ راضی ہو گئے، رقم دیدی گئی، مگر وہ شخص بھی دھوکہ باز نکلا اور رقم لے کر بیٹھ گیا، کچھ کر کے نہ دیا، صورت مذکورہ میں کیا یہ رقم جو لوگوں کی تھی شرعی اعتبار سے سائل پر واجب الأدا ہوگی؟ جبکہ زمین کی نوعیت اور تعمیر سے سبھی واقف تھے، خیال رہے کہ اس میں سائل کو کوئی منافع کمانا مقصد نہیں تھا۔

المستفتی: قاری حسین احمد ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سرکاری زمین پر سرکار کی باضابطہ اجازت کے بغیر تعمیر کرنا درست نہیں تھا، اور بعد میں سرکاری عملہ کا آکر عمارت کو مسمار کر کے زمین کو قبضہ میں لینا ان کا حق تھا۔

عن سعيد بن عمرو بن نفيل أن رسول الله ﷺ قال: من اقتطع شبراً من الأرض ظلماً طوقه الله إياه يوم القيامة من سبع أرضين. (مسلم شريف، كتاب المساقات والمزارعة، باب تحريم الظلم وغصب الأرض، النسخة الهندية ٢/٣٢، بيت الأفكار رقم: ١٦١٠، صحيح البخارى، كتاب المظالم، باب إثم من ظلم شيئا من الأرض، النسخة الهندية ١/٣٣٢، رقم: ٢٣٨٨، ف: ٢٤٥٢، سنن أبى داؤد، كتاب الأدب، باب من يأخذ الشيئ من مزاح، النسخة الهندية ٢/٦٨٣، دار السلام رقم: ٥٠٠٣)

غصب من آخر دارا أو أرضا فبنى فيها أو زرع فيها زرعا فقلع صاحبها الزرع و هدم البناء لايضمن. (هنديه، كتاب الغصب، الباب الثانى، زكريا قديم ٥/١٢٥، جديد ٥/١٤٦)

ومن بنى أو غرس فى أرض غيره بغير إذنه أمر بالقلع والرد. (شامى كراچى ٦/١٩٤، زكريا ٩/٢٨٣)

پھر اس کے بعد اسلم نامی آدمی کا زمین اور عملہ کی واپسی کی ذمہ داری کا پیسہ لینا اور پیسہ لے کر بیٹھ جانا اس کی طرف سے دھوکہ دہی ہے، شرعی طور پر اس پر لازم ہے کہ جس سے جتنا جتنا پیسہ لیا ہے اتنا اتنا سب کو واپس کردے، یا سرکار سے اس زمین کی منظوری کرادے۔

عن أبى حميد الساعدى أن رسول الله ﷺ قال: لايحل لمسلم أن يأخذ مال أخيه بغير حق. (مجمع الزوائد، دار الكتب العلمية بيروت ٤/١٧١، مسند أحمد بن حنبل ٥/٤٢٥، رقم: ٢٤٠٠٣)

لايجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعى. (شامى، كتاب الحدود، مطلب: فى التعزير بأخذ المال، كراچى ٤/٦١، زكريا ٦/١٠٦، البحر الرائق كوئٹه ٥/٤١، زكريا ٥/٦٨، هنديه زكريا قديم ٢/١٦٧، جديد ٢/١٨١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍صفر المظفر ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۸۸۲/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۲/۷ھ

کسی شخص کی مقبوضہ سرکاری زمین کوخفیہ طور پر اپنے نام کرانے کا حکم

سوال [۹۷۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے ایک دوکان پر اپنی تجارت کو جاری کیا جو واقعی حکومت کی جگہ ہے کیونکہ وہ نالہ کے کنارے پر ہے، ایک شخص نے اس کو اپنے نام کرالیا تھا، زید نے اس زمین کو نواب کے دور کی تاریخ ڈلوا کر اپنے نام کرالیا گویا کہ زید کے نام سے پہلے ہوئی اور دوسرے فریق کے نام بعد میں اب دریافت یہ کرنا ہے کہ اس پر شرعی اعتبار سے ملکیت کس کی ہے، شرعی دلائل سے مدلل فرمائیں؟

المستفتی: عبدالرحمٰن سول لائن رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب شروع ہی سے زید کا قبضہ چلا آ رہا ہے اور حکومت نے زید ہی کو اجازت دے رکھی ہے اور دوسرے نے خفیہ طور پر اپنے نام کرالیا ہے، اس کا یہ عمل درست نہیں ہے، اور اس کی کاٹ کے لیے زید نے دوسرا خفیہ ہتھکنڈہ استعمال کیا کہ اس سے پہلے کی تاریخوں سے اپنے نام کرالیا تو اس معاملہ میں دونوں آدمی جھوٹے ہیں اس لیے دونوں میں سے کسی ایک کے بھی عمل کو صحیح نہیں کہا جائے گا، ہاں البتہ اگر زید نے حکومت کی اجازت سے تجارت شروع کی ہوتی پھر کوشش کرکے اپنے نام بھی کرالیا ہوتا تو یہ صحیح اور درست ہوجاتا۔

إن أذن له الإمام في ذٰلک و لو ترکها بعد الإحیاء و زرعها غیره فالأول أحق بها في الأصح. (تنویر الأبصار مع الشامی، کتاب احیاء الموات، کراچی ۶/، زکریا ۱۰/ ۵، هندیه زکریا قدیم ۵/ ۳۸۶، جدید ۵/ ۴۴۳، تبیین الحقائق، امدادیه ملتان ۶/ ۳۵، زکریا ۷/ ۷۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍ محرم الحرام ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۶۴۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/۱/۱۴۲۶ھ

سرکار کی طرف سے بھائی کو دی گئی زمین پر بہن کا قبضہ

سوال [۹۷۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک معذور اور مفلس شخص ہے اس کی ایک بہن فاطمہ ہے جو مالی حیثیت سے ٹھیک ہے اب سرکار کی طرف سے کچھ زمین غریبوں اور معذوروں کو دی جاتی ہے ان کی مفلسی کی وجہ سے فاطمہ اپنے بھائی زید (جو مفلس ومعذور اور مستحق زمین ہے) کے نام سے وہ زمین لے لیتی ہے حالانکہ فاطمہ زمین کی مستحق نہیں ہے اور زید اپنے نام سے زمین دلانے پر راضی بھی ہے، اور سرکاری کارروائی مکمل کرانے میں جو خرچ ہوتا ہے اس کو فاطمہ ہی برداشت کرتی ہے، اور سرکاری کارروائی مکمل ہونے سے پہلے اور فاطمہ کو قبضہ دینے سے پہلے زید اور فاطمہ کے مابین جھگڑا ہوجاتا ہے جس کی بناپر زید اپنے نام پر دلانے والی زمین کو اسے دینے سے انکار کردیتا ہے اور اپنے قول سے رجوع کرلیتا ہے اور سرکاری کاروائی مکمل کرانے میں فاطمہ نے جو خرچ برداشت کیا تھا، زید اسے بھی فاطمہ کو واپس دینے پر راضی ہوجاتا ہے، لیکن فاطمہ نے زمین پر جبراً قبضہ کرلیا اس کے بعد زید کا انتقال ہوجاتا ہے، انتقال کے بعد زید کے ورثاء فاطمہ سے اس مقبوضہ زمین کا مطالبہ کرتے ہیں، آیا ان کا مطالبہ کرنا شریعت کی روشنی میں جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد شہزاد بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غریبوں کے لیے سرکار کی طرف سے دی جانے والی زمین میں سے زید مفلس غریب کے نام سے سرکار نے جو زمین دی ہے اس کا مالک صرف زید ہی ہے اور زید کے جتنے بھی شرعی ورثاء ہیں وہ سب اس میں حصہ شرعی کے حساب سے شریک ہوں گے، اور فاطمہ کا قبضہ اس زمین پر غاصبانہ ہے، لہٰذا فاطمہ پر یہ زمین زید کے ورثاء کو واپس کرنا لازم ہے۔

عن سعید بن زید بن عمرو بن نفیل أن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: من أخذ شبرا من الأرض ظلما فإنہ یطوقہ یوم القیامۃ من سبع أرضین. (مسلم شریف، کتاب

المساقات والمزارعة، باب تحريم الظلم وغصب الأرض، النسخة الهندية ٢/٣٢، بيت الأفكار رقم: ١٦١٠، صحيح البخارى، كتاب المظالم، باب إثم من ظلم شيئا من الأرض، النسخة الهندية ١/٣٣٢، رقم: ٢٣٨٨، ف: ٢٤٥٢، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب من يأخذ الشيئ من مزاح، النسخة الهندية ٢/٦٨٣، دار السلام رقم: ٥٠٠٣، مشكوٰة المصابيح ص: ٢٥٥)

عن عبد الله بن عمر عن النبى ﷺ قال: الكبائر: الإشراک بالله ...... واليمين الغموس. (صحيح البخارى، الأيمان والنذور، باب اليمين الغموس، النسخة الهندية ٢/٩٨٧، رقم: ٦٤١٩، ف: ٦٦٧٥)

عن جابر قال قال رسول الله ﷺ لا يحل لمسلم أن يأخذ مال أخيه بغير حق . (مجمع الزوائد، دار الكتب العلمية بيروت ٤/١٧١، مسند أحمد بن حنبل ٥/٤٢٥، رقم: ٢٤٠٠٣)

التركة ما بقى بعد الموت من ماله صافيا عن تعلق حق الغير بعينه.

(دليل الوارث على هامش السراجى ص: ٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ ذی قعدہ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۲۲۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۱۱/۲۹ھ

جنگلات کی لکڑیاں سرکاری اجازت کے بغیر استعمال کرنا

سوال [۹۷۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم لوگ جنگل میں رہتے ہیں اور جنگل کی لکڑی کاٹنے کا حکم نہیں ہے، مگر پھر بھی ہم ان کو جلاتے ہیں اور چارپائی بھی بناتے ہیں اور بہت سے کام کرتے ہیں، تو کیا اس لکڑی کا پکا ہوا کھانا درست ہوگا اور اس چارپائی پر لیٹنا درست ہوگا یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جنگلات کی لکڑیاں حکومت کی اجازت کے بغیر لا

کر استعمال کرنا جائز نہیں ہے، البتہ ان سے تیار کردہ کھانا اور چارپائی وغیرہ کا استعمال مباح ہے، لیکن ایسا عمل کرنا جس سے عزت وآبرو کو خطرہ لاحق ہو شرعاً درست نہیں۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۸/ ۱۲۵، فتاویٰ محمودیہ قدیم ۶/ ۳۵۳، جدید ڈابھیل ۱۸/ ۴۲۳)

بـخـلاف الأشـجـار لأن الـكـلأ مـا لا ساق له والأشجار لها ساق فلا تدخل فيه حتى جاز بيعها إذا نبت في أرضه. (هنديه، كتاب البيوع، الباب التاسع، قبيـل الـفـصـل الثـالـث، زكـريـا قديم ۳/ ۱۱۰، جديد ۳/ ۱۱۱، شامي، باب البيع الفاسد، مـطـلـب: استثـنـاء الـحـمل في العقود على ثلاث مراتب، زكريا ۷/ ۲۵٦، كراچی ۵/ ٦٦، البحر الرائق كوئٹه ٦/ ۷۸، زكريا ٦/ ۱۲۷)

لايجوز التصرف في مال غيره بلا إذنه. (در مختار، كتاب الغصب، مطلب: فيما يجوز من التصرف بمال الغير، كراچی ٦/ ۲۰۰، زكريا ۹/ ۲۹۱، الأشباه كراچی ۲/ ۹۸، قواعد الفقه اشرفی ديو بند ص: ۱۱۰، الموسوعة الفقهية ۲۸/ ۲۹٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/ رجب المرجب ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ٦٨٢٧)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۰/ ۷/ ۱۴۲۱ھ

انجانے میں دوسرے کی زمین میں لگائے گئے درخت کا حکم

سوال [۹۷۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص کی زمین تھی لیکن اس کو معلوم نہیں تھا کہ یہ زمین میری ہے، بلکہ یہ معلوم تھا کہ یہ زمین چیتو نامی غیر مسلم کی ہے اور اس نے الکھی نامی شخص کو ہبہ کر دیا ہے اور اس نے زمین میں آم کے درخت بھی لگا لیے اور برابر اس سے فائدہ اٹھاتا رہا ہے، تقریباً بیس سال کے بعد جب زمین کی پیمائش ہوئی اور نقشہ سامنے رکھا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ زمین نجیب احمد صاحب کی ہے تو اب اس کا کیا حکم ہے؟ وہ درخت کس کے ہوں گے، نجیب احمد صاحب ان درختوں کو بغیر کسی چیز کے دیئے لے سکتے ہیں، یا نہیں؟ جبکہ الکھی اس سے مسلسل فائدہ

اٹھا تا رہا ہے اس کے پھلوں، لکڑیوں اور زمین سے، اگر ان درختوں کے بدلے کوئی چیز دینی پڑے تو پھر اس نے اتنے دنوں تک جو فائدہ اٹھایا ہے، اس کا کیا حکم ہوگا؟ عند الشرع ان درختوں کا لینا کیسا ہے؟ وہ درخت کس کے ہوں گے، بالتفصیل مع دلائل تحریر فرمائیں گے۔

المستفتی: نجیب احمد صاحب ضلع بہرائچ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مسئولہ صورت میں چیتو نامی غیر مسلم شخص ہی ان درختوں کا مالک ہے، نجیب احمد کا ان درختوں کو بلا معاوضہ لینا شرعاً درست نہیں، البتہ سالوں سے جو اس غیر مسلم نے زمین پر مالکانہ قبضہ کر رکھا تھا، اس کا کرایہ نجیب احمد کے لیے وصول کرنا شرعاً درست ہے۔

عن سعيد بن زيد عن النبي ﷺ قال: من أحى أرضا ميتة فهى له وليس لعرق ظالم حق، وعن محمد بن المثنى قال: سألت أبا الوليد الطيالسى عن قوله ”وليس لعرق ظالم حق“ فقال: العرق الظالم الغاصب الذى يأخذ ماليس له، قلت: هو الرجل الذى يغرس فى أرض غيره قال: هو ذاك. (سنن الترمذی، الأحكام، باب ما ذكر فى أرض إحياء الموات، النسخة الهندية ۱/۲۵٦، دار السلام، رقم: ۱۳۹٤-۱۳۹٦)

ومن غرس فى أرض غيره بغير إذنه أمر بالقلع – وعليه أجر مثل الأرض. (در مختار على شامى، كتاب الغصب، كراچى ٦/۱۹٤، زكريا ۹/۲۸۳، جامع الفصولين ۲/۱۵۹، هدايه اشرفى ديوبند ۳/۳۷۹، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/۸۷، تبيين الحقائق، امداديه ملتان ٥/۲۲۹، زكريا ديوبند ٦/۳۲۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ ذیقعدہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ٦۹۵۷)

غاصب کے مال سے اپنے حصہ کی مقدار وصول کرنا

سوال [۹۷۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: میرے مکان میں ایک شخص ۱۸/سال قبل میری اجازت کے بغیر قابض ہوگیا اب کسی طرح اس مکان کا قبضہ مجھ کو مل گیا، اس مکان میں اس شخص کا کچھ سامان رہ گیا ہے جس کی مالیت میرے کرایہ سے جو آج سے ۱۸/سال پہلے کسی شرعی پیسے سے کم تھی، اس سے بھی کم ہے، کیا میں اس سامان کو کرایہ میں مجریٰ سمجھ کر اپنے استعمال میں لاسکتا ہوں، شرعاً کیا حکم ہے؟

المستفتی: مَنن محلّہ نئی سڑک مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر باوجود مطالبہ کے آپ کا کرایہ ادا نہ کرے تو حاکم کی اجازت سے مجریٰ کر لینا درست ہے۔ (مستفاد: حاشیہ امداد الفتاویٰ ۳/ ۴۴۶، کفایت المفتی قدیم ۸/۱۶۳، جدید زکریا مطول ۱۱/ ۱۵۹)

إن عدم جواز الأخذ من خلاف الجنس كان في زمانهم لمطاوعتهم في الحقوق والفتویٰ اليوم على جواز الأخذ عند القدرة من أي مال كان لا سيما في ديارنا لمدواتهم العقوق. (شامي، كتاب الحجر، مطبوعه كوئٹه ۵/ ۱۰۵، كراچی ۶/ ۱۵۱، زكريا ۹/ ۲۲۱، كفاية السرقة ۳/ ۲۲۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/جمادی الثانیہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۲۴ ۷۶)

دوسرے کی زمین پر مکان تعمیر کر لیا تو اب کیا کرے؟

سوال [۹۷۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کسی کی زمین پر زبردستی مکان بنا لیا گیا ہے تو ایسی صورت میں صاحب زمین اپنی زمین پر کیسے قبضہ کرے گا؟ مدلل تحریر کریں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب غاصب زمین پر قبضہ کر کے مکان بنائے تو

صاحب زمین کے لیےزمین پر قبضہ کرنے کی دوصورتیں ہیں ایک صورت یہ ہے کہ وہ غاصب کو مکان توڑ کرزمین خالی کرنے کا حکم دے دوسری صورت یہ ہے کہ اس سے صلح کرے اور مکان کو باقی رکھ کر غاصب کومکان کے ملبے کی رقم دیدے۔ (مستفاد: محمودیہ ڈابھیل ۱۷/۱۴۴، میرٹھ ۲۶/۲۸)

عن سعيد بن زيد عن النبي ﷺ قال: من أحي أرضا ميتة فهي له وليس لعرق ظالم حق، وعن محمد بن المثنى قال: سألت أبا الوليد الطيالسي عن قوله "وليس لعرق ظالم حق" فقال: العرق الظالم الغاصب الذي يأخذ ماليس له، قلت: هو الرجل الذي يغرس في أرض غيره قال: هو ذاك. (سنن الترمذي، الأحكام، باب ما ذكر في أرض إحياء الموات، النسخة الهندية ۱/۲۵٦، دار السلام رقم: ۱۳۹٤-۱۳۹٦)

إن كان المغصوب أرضا فبنى الغاصب فيها بناء يؤمر بقلعها و رد الأرض. (شرح المجلة رستم باز اتحاد ديوبند ۱/۵۰۲، ماده نمبر ۹۰٦)

من غصب أرضا فغرس فيها أو بنى قيل له اقلع البناء والغرس و ردها...... فإن كانت الأرض تنقص بقلع ذلك فللمالك أن يضمن له قيمة البناء و قيمة الغرس مقلوعا ويكونان له لأن فيه نظراً لهما ودفع الضرر عنهما. (هدايه، كتاب الغصب، فصل فيما يتغير بفعل الغاصب، اشرفي، ۳/۳۷۹، شامي، كتاب الغصب، كراچى ٦/۱۹٤، زكريا ۹/۲۸٤، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/۸۷، تبيين الحقائق، زكريا ديوبند ٦/۳۲۹، امداديه ملتان ۵/۲۲۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۴۵۵)

ایک شخص نے دوسرے کی زمین زبردستی جوت لی تو کیا کرے؟

سوال [۹۷۵٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کسی شخص نے دوسرے شخص کی زمین پر اس کی اجازت کے بغیر زمین کو جوت کر کھیتی کا غلہ بودیا، اوراسی غلہ سے پیداوار ہوگئی اب سرکاری دباؤ کے ذریعہ سے اسی درمیان صاحب زمین کو زمین پر قبضہ مل گیا تو اب مذکورہ صورت میں کھیت کا غلہ کس کو ملے گا اور کھیتی کرنے والے کو کیا ملے گا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب مالک زمین نے اپنی زمین پر قبضہ کرلیا تو وہ بلا اجازت کھیتی کرنے والے کو کھیتی کاٹنے کا حکم دے سکتا ہے اور زبردستی کھیتی کرنے والے پر مالک زمین کو اتنی مدت کا زمین کا کرایہ دینا لازم ہے، یہ حکم قضاء ہے لیکن اگر یہ دونوں مصالحت کریں اور مالک زمین کھیتی کو رکھ لے اور غاصب کو اس کھیتی میں خرچ ہونے والی رقم ادا کردے تو جائز ہے۔

عن رافع بن خديج أن النبي ﷺ قال من زرع في أرض قوم بغير إذنهم فليس له من الزرع شيئ و له نفقته. (ترمذی شریف، أبواب الأحكام، باب ماجاء من زرع في أرض قوم بغير إذنهم، النسخة الهندية ۲۵۳/۱، دار السلام رقم: ۱۳۶٦)

ما حصل من الزرع فهو لصاحب البذر و عليه أجرة الأرض من يوم غصبها إلى يوم التفريغ. (هامش الترمذی، ابواب الأحکام، باب ما جاء من زرع فی أرض قوم بغير إذنهم، رقم الحاشية: ۲۵۳/۱۵)

مذهب الجمهور: أن الزرع لمن زرع فيها و لصاحب الأرض المؤنة والأجرة. (التقرير للترمذی ص:۳۹)

من زرع فی أرض قوم بغير إذنهم قال أبو حنيفة أن الزرع تبع البذر فإذا زرع فی أرض مغصوبة فالغاصب له الخارج بملک خبيث و عليه كراء الأرض. (العرف الشذی ۲۵٤/۱)

فحكم القضاء أنه إن أدرک الزرع فهو للغاصب و عليه ضمان نقصان الأرض. (اعلاء السنن، كتاب الغصب، باب الزرع فی الأرض المغصوبة، كراچی ۳۲۹/۱٦، دار الكتب العلمية بيروت ۳۹۱/۱٦)

ينبغی أن يحمل الحديث على حكم المصالحة ويقال أنه ﷺ قضى

بهذا الحكم على وجه المصالحة لكونه أنفع الفريقين. (إعلاء السنن، کراچی ١٦/٣٢٩، دار الكتب العلمية بيروت ١٦/٣٩١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢؍ربیع الاول ١٤٣٥ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ٤٠/١١٤٥٦)

دوسرے کی مملوکہ زمین پر عرس کے لیے مزار تعمیر کرنا

سوال [٩٧٥٧]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے ٧؍جنوری ١٩٧٥ء کو محمد شاہ رحمت شاہ اور ننھے شاہ سے ١٦٥ گز مربع آراضی خریدی تھی، جس کا بیع نامہ منسلک ہے، آراضی کے متصل پچھم جانب چاہ پختہ میونسپل بورڈ کا ہے اور اس سے متصل ایک مزار ہے اس آراضی کی ١٠٠ گز زمین میں نے بیچ دی تھی، اور تقریباً ٦٥؍گز زمین باقی ہے، جس پر مجاور مزار نے ٧٧-١٩٧٨ء سے غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے اور چاہ پختہ کے لیے میونسپل بورڈ سے مزار کے نام پر اجازت لے لی ہے اور اس پر عرس کے لیے مکان بنانا چاہتا ہے، جس میں میری آراضی بھی آرہی ہے، اور میں دینا نہیں چاہتا۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طرح میری ملکیت کی زمین پر قبضہ غاصبانہ کر لینا اور اس کو مزار کے لیے مکان میں شامل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ میں درج شدہ صورت میں آپ کی مرضی کے بغیر آپ کی مملوکہ آراضی پر مجاور مزار کا قبضہ غاصبانہ کر کے ذاتی یا عرس کے لیے مکان تعمیر کرنا ناجائز اور حرام ہے، مجاور مزار پر واجب ہے کہ آپ کی زمین کو واپس کر دے ورنہ عند اللہ سخت ترین دردناک عذاب کا مستحق ہوگا۔

عن سعيد بن زيد بن عمرو بن نفيل أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من أخذ شبراً من الأرض ظلما فإنه يطوقه يوم القيامة من سبع أرضين. (مسلم شریف، کتاب

المساقات والمزارعة، باب تحريم الظلم وغصب الأرض، النسخة الهندية ٣٢/٢، بيت الأفكار رقم: ١٦١٠، صحيح البخارى كتاب المظالم، باب إثم من ظلم شيئا من الأرض، النسخة الهندية ٣٣٢/١، رقم: ٢٣٨٨، ف: ٢٤٥٢، سنن أبى داؤد، كتاب الأدب، باب من يأخذ الشيئ من مزاح، النسخة الهندية ٦٨٣/٢، دار السلام رقم: ٥٠٠٣، مشكوٰة شريف ٢٥٤/١)

الغصب (إلى قوله) أنه حرام محرم على الغاصب ذٰلك و حكمه وجوب رد المغصوب إن كان قائما الخ. (البحر الرائق، كتاب الغصب، كوئٹه ١٠٨/٨، زكريا ١٩٦/٨، هكذا الدر المنتقى قديم ٤٥٥/٢، جديد دار الكتب العلمية بيروت ٧٨/٤ مجمع الأنهر قديم ٤٥٥/٢، جديد دار الكتب العلمية بيروت ٧٨/٤، هكذا فى الهندية زكريا قديم ١١٩/٤، جديد ١١٩/٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/ رجب المرجب ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۷۹۵)

غیر کی آراضی میں اس کی اجازت کے بغیر قبریں بنانا اور مردے دفن کرنا

سوال [۹۷۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرا ذاتی مکان تھا لوگوں نے وہ مکان مجھے اکیلا سمجھ کر میری غیر موجودگی میں بالکل مسمار کر دیا، اور سب محلے والوں نے سازش کر کے چند فرضی قبریں بنا دیں، اب آئندہ اس میں مردے دفن کرنے کا باقاعدہ پروگرام ہے تو کیا کسی کی آراضی میں کسی مسلمان کو بغیر اس کی اجازت کے دفن کرنا جائز ہے، نیز اگر اس میں زبردستی دفن کر دیا جائے تو پولیس کی مدد سے اس قبر کو اکھاڑ کر اس مردے کو کہیں اور دفن کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد یاسین پہلوان، مغل پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اسلامی شریعت میں کسی کی زمین میں مالک کی

اجازت اوراس کی مرضی کے بغیر مردہ دفن کرنا جائز نہیں ہے، اور دفن کرنے والے شرعاً غاصب ہیں، اور مالک کو اختیار ہے کہ مردہ کے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے قبر سے نکال کر دوسری جگہ منتقل کرادے اوراگر ورثاء منتقل نہ کریں اور نہ ہی مالک زمین کو منتقل کرنے دیتے ہیں تو ایسے حالات میں مالک زمین کو اختیار رہے کہ قبر کی زمین کو برابر کرکے اپنے استعمال میں لائے، نیز بصورت مجبوری پولیس کی مدد سے بھی یہ کام کیا جاسکتا ہے۔

إذا دفـن الـميـت فـي أرض غيره بغير إذن مالكها، فالمالک بالخيار إن شاء أمر بإخراج الميت و إن شاء سوى الأرض وزرع فيها الخ. (فتاویٰ عالمگیری، باب الجنائز، الفصل السادس، زکریا قديم ۱/۱٦۷، جديد ۱/۲۲۸، تبيين الحقائق امداديه ملتان ۱/۲٤٦، زكـريـا ديـو بند ۱/٥۸۸، در مختار الشامي كراچی ۲/۲۳۸، زكريا ديوبند ۳/۱٤٥، البحر الرائق زكريا ۲/۳٤۱، كوئٹه ۲/۱۹٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍صفر المظفر ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۵٦۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۲/۲/۲۹ھ

تعزیہ رکھنے کے لیے کسی کا گھر چھیننا

سوال [۹۷۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خالد کے گھر میں تعزیہ رکھا جاتا ہے اب اس کو معلوم ہوا تعزیہ کے حرام ہونے کے بارے میں اور جس وقت تعزیہ رکھنے کی اجازت دی تھی تو اس وقت خالد کے پاس گھر زائد تھے، لیکن اب اس کے پاس گھروں کی کمی ہے تو اس نے تعزیہ رکھنے سے لوگوں کو منع کیا تو گاؤں والے لوگ اس کا ایک گھر چھین لینا چاہتے ہیں تو کیا خالد کو اپنا گھر بچانے کے لیے اور ان لوگوں کو تعزیہ رکھنے کے لیے دوسری جگہ خرید کر دینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: علی احمد رامپوری، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اپنا حق بچانے کے لیے دوسری جگہ خرید کر دینا جائز ہوگا،

اس زمین میں جولوگ نا جائزاورخلاف شرع حرکات کرنے والے ہوں گے، وہ لوگ گنہگار رہوں گے، زمین خرید کردینے والے پرکوئی گناہ نہیں ہوگا، کیونکہ شرعاً یہ صلح عن الانکار ہے جوجائز ہے۔

الصلح علی ثلاثة أضرب: صلح مع إقرار، و صلح مع سکوت، وهو لا یقر المدعی علیه ولاینکر و صلح مع إنکار و کل ذٰلک جائز لإطلاق قوله تعالیٰ "الصلح خیر" (إلی قوله) **لأن المدعی یأخذه عوضا عن حقه فی زعمه وهذا مشروع والمدعی علیه یدفعه لدفع الخصومة عن نفسه وهذا مشروع أیضا إذا المال و قایة الأنفس ودفع الرشوة لدفع الظلم أمر جائز.** (هدایه، کتاب الصلح، اشرفی دیوبند ۲۲۹/۳، مجمع الأنهر، دار الکتب العلمیة بیروت ۴۲۳/۳)

وکما استفاد عن عبارة الشامی ولو آجر نفسه لیعمل فی الکنیسة و یعمرها لا بأس به لأنه لا معصیة فی عین العمل. (شامی، کتاب الحظر والإباحة، فصل فی البیع، کراچی ۳۹۱/۶، زکریا ۵۶۲/۹)

فلو ادی مجریٰ فی دار أو مسیلا علی سطح أو شربا فی نهر فأقر أو أنکر ثم صالحه علی شئ معلوم الخ. (شامی، کتاب الصلح، کراچی ۶۳۰/۵، زکریا دیوبند ۴۰۸/۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶رصفر المظفر ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۳۶/۲۴)

ناجائز طریقہ سے حاصل شدہ زمین سے انتفاع اور صدقہ وخیرات کرنا

سوال [۹۷۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جو زمین ناجائز طریقہ سے حاصل کی گئی ہو اس کی پیداوار سے کھانا یا کسی طرح کا فائدہ اٹھانا یا کرانا مثلاً اس زمین کی پیداوار اور جو اس شخص کے قبضہ میں ہے کسی شخص کو بطور امداد دینا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس کی پیداوار کا کیا حکم ہے؟ جائز ہے یا نہیں؟ اور اس سے

صدقہ وخیرات کرسکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: محمد شفیع بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس کی زمین ہے اس کو واپس کردینا واجب ہے، مالک کی بلا اجازت اس کی پیداوار سے کھانا، فائدہ اٹھانا، اور بنیت ثواب اس میں سے صدقہ وخیرات کرنا یا کسی کو بطور امداد دینا سب ناجائز ہے، بلکہ اصل مالک کو واپس کرنا واجب ہے، مگر مالک تک رسائی کی کوئی شکل نہ ہو تو بلا نیت ثواب فقراء کو دیدینا لازم ہے، اپنے تصرف میں لانا جائز نہیں ہے۔

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة، والاستئجار على المعاصي، والطاعات أو بغير عقد كالسرقة والغصب والخيانة والغلول ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه ولكن إن أخذه من غير عقد ولم يملكه يجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالک (إلى قوله) لايمكنه أن يرده إلى مالكه و يريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مكتبه يحيىٰ سهارنپور ١/٣٧، دار البشائر الاسلاميه بيروت ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩)

اوراس مال سے صدقہ وخیرات کرنے سے ثواب نہیں مل سکتا۔

فيلزم عليه أن يدفعه إلى الفقراء ولكن لا يريد بذٰلک الأجر والثواب ولكن يريد دفع المعصية عن نفسه . (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مكتبه يحيىٰ سهارنپور ١/٣٧، دار البشائر الاسلاميه بيروت ١/٣٦٠، تحت رقم الحديث: ٥٩) فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٦/ جمادی الاولی ١٤٠٨ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٢٣/ ٦٦٨)

٣٣ کتاب الرھن

زمین کو رہن پر رکھنا

سوال [۹۷۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں عام رواج ہے کہ کسی ضرورت کے موقع پر اپنی زمین بطور رہن دوسرے کو دیدیتے ہیں اور قرض لے کر اپنی ضروریات میں استعمال کرتے ہیں اور جب روپئے کا انتظام ہو جاتا ہے تو روپئے واپس دے کر زمین اپنے قبضہ میں کر لیتے ہیں، اس دوران مرتہن زمین سے فائدہ اٹھاتا رہتا ہے، کھیتی کرتا ہے، تو کیا ایسی صورت میں یہ طریقہ درست ہے؟ اور مرتہن کا فائدہ اٹھانا یا مدت متعینہ تک کے لیے زمین کو رکھنا یا جب کھیتی کھڑی ہو اس وقت زمین واپس کر سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: عبداللہ مدھوبنی متعلم مدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ضرورت کی وجہ سے اپنی زمین دوسرے کو رہن کے طور پر دینا اور اس سے قرض لینا جائز ہے اور قرض کی ادائیگی کے بعد اپنی زمین کو واپس بھی لے سکتا ہے، لیکن مرتہن کے لیے مرہونی زمین سے نفع اٹھانا جائز نہیں ہے۔

عن فضالة بن عبيد صاحب النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: كل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربا. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، البيوع، باب كل قرض جر منفعة فهو ربا، دار الفكر ٨/٢٧٦، رقم: ١١٠٩٢)

عن علي رضي الله عنه قال كل قرض جر منفعة فهو ربا. (كنز العمال، الدين و السلم، دار الكتب العلمية بيروت ٦/٩٩، رقم: ١٥٥١٢، جامع الأحاديث الكبير للسيوطي ٦/٤٣٨، رقم: ١٥٨٢١)

لايحل للمرتهن أن ينتفع بشيئ منه بوجه من الوجوه و إن أذن له الراهن لأنه أذن له في الربا. (شامي، كتاب الرهن، زكريا ١٠/٨٣، كراچى ٦/٤٨٢، مطلب: كل قرض جر نفعا حرام، زكريا ٧/٣٩٥، كراچى ٥/١٦٦، مجمع الأنهر مصرى قديم ٢/٥٨٨، دار الكتب العلمية بيروت ٤/٢٧٣، ٢٧٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢٨؍ربیع الثانی ١٤٢٦ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٧/٨٧٩٥)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
٢٨/٤/١٤٢٦ھ

والد کے رہن میں رکھے ہوئے مکان کو لڑکا چھڑالے تو کیا حکم ہے؟

سوال [٩٧٦٢]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک صاحب ماسٹر نذیر احمد مرحوم ایک سو چھبیس گز کے ایک مکان کے مالک تھے، انہوں نے اپنی ضرورت سے اس مکان کو ١٩٣٦ء میں ساہوکار کے پاس رہن رکھ دیا، بعد کو ان کا انتقال ہوگیا، ان کے وارثوں کی تفصیل یہ ہے کہ عبد اللطیف، عبد السلام دولڑکے، مسماۃ اختری بیگم ایک لڑکی اور ایک اپنی بیوہ مسماۃ امیر اُیہ کل چار وارث چھوڑے، مکان میں سب کی رہائش تھی، ١٩٤٣ء میں عبد السلام نے ساہوکار کا تمام روپیہ مع سود کے ادا کردیا، ساہوکار نے کاغذ کی پشت پر لکھ دیا کہ میں نے اپنا روپیہ وصول کر کے کاغذ عبد السلام کو واپس کردیا، لڑکی شادی کے بعد اپنے گھر چلی گئی تھی، بعد ازاں عبد السلام نے اسی ١٢٦؍گز کے کل مکان کو ١٩٧٥ء میں اپنی بیوی مسماۃ جمیلہ بیگم کو ہبہ زبانی وتحریری کردیا، اب ١٩٨٨ء میں اس مکان کے صرف ٤٤؍گز کو اپنا حصہ مان کر ایک دیگر شخص کو فروخت کردیا، اور رجسٹری کروالی، جمیلہ بیگم کا کہنا ہے کہ مکان سب میرا ہے، عبد السلام ہبہ کے منکر ہیں، جبکہ کاغذ پر جو دستخط ہیں انہیں کے ہیں، درج ذیل سوال کا جواب مطلوب ہے۔

کیا عبد السلام کل مکان کے مالک تھے، کیا یہ صرف انہیں کا ترکہ تھا؟

المستفتی: عبد القیوم انصاری مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اپنے پیسے سے باپ کا رہن چھڑانے کی وجہ سے عبد السلام پورے مکان کے مالک نہیں بن سکتے ہیں بلکہ اس مکان میں تمام ورثاء کا حق ہے البتہ رہن چھڑانے میں جو رقم خرچ ہوئی ہے ورثاء سے اپنے اپنے حصہ کے بقدر منہا کر کے لے سکتے ہیں صرف پورے مکان میں ٢/٢٠-۴۴ گز عبد السلام کو مل سکتا ہے مابقیہ دوسرے ورثاء کا حق ہے۔

ولو قضى الولد دين أبيه وأفتك الرهن لم يكن متبرعا ويرجع بجميع ما قضى على أبيه لأنه مضطر إلى قضاء الدين (إلى قوله) فكان له أن يرجع عليه بما قضى الخ. (بدائع الصنائع، كتاب الرهن، كراچی ٦/١٣٦، زكريا ٥/١٩٦، هنديه زكريا قديم ٥/٤٣٢، جديد ٥/٤٨٩)

لايبطل الرهن بموت الراهن و لابموت المرتهن ولا بموتهما ويبقى الرهن رهناً عند الورثة. (الدر مع الرد، كتاب الرهن، قبيل فصل فى مسائل متفرقة، زكريا ١٠/١٤٢، كراچی ٦/٥٢٠، هنديه زكريا قديم ٥/٤٣٨، جديد ٥/٤٩٤، تنقيح الفتاوىٰ الحامدية دار الكتب العلمية ٢/٢٣٨، لسان الحكام ١/٣٧٥، مجمع الضمانات ١/١٠٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٣/صفر المظفر ١۴٠٩ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٢۴/ ١١٠٨)

رہن بالدرک باطل کیوں؟ جبکہ کفالت بالدرک باطل نہیں؟

سوال [٩٧٦٣]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ رہن بالدرک جائز نہیں ہے اس کے ناجائز ہونے کی وجہ کیا ہے؟ اس کے برخلاف کفالت بالدرک جائز ہے، اس کے جواز کی کیا وجہ ہے؟ واضح فرمائیے۔

المستفتی: ذاکر اللہ میسور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: رہن بالدرک کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بائع نے مشتری کو کوئی چیز فروخت کی اور مشتری کے حوالہ کردی، لیکن مشتری کو خوف ہے کہ اس کا کوئی مستحق نہ نکل آئے تو اس لیے اس نے بائع سے ثمن کے عوض کوئی چیز رہن رکھ لی، اور رہن کا مقصد یہ ہے کہ مبیع کے استحقاق کے وقت اس شیٔ مرہون سے ثمن کا ضمان حاصل کرلے، یہ رہن بالدرک ہے جس کو فقہاء کرام نے باطل قرار دیا ہے، اور اس کے بطلان کی وجہ یہ ہے کہ رہن ادائیگی کو پختہ کرنے کے لیے ہوتا ہے لیکن کسی چیز کے وجوب اور ثبوت سے پہلے اس چیز کی ادائیگی ممکن نہیں ہے، اس لیے رہن بالدرک شرعاً باطل ہے اس کے برخلاف کفالت بالدرک جائز ہے، اس کے جواز کی وجہ یہ ہے کہ کفالت مطالبہ کو لازم کرنے اور افعال کو لازم کرنے کے لیے ہوتا ہے، مطالبہ اور افعال کا زمانۂ مستقبل پر معلق کرنا اور منسوب کرنا جائز ہے، جیسا کہ صوم منذور اور صلاۃ منذورہ کا زمانۂ مستقبل پر معلق کرنا درست ہے اسی طرح کفالت بالدرک بھی جائز اور درست ہے۔

قال: والرهن بالدرک باطل، والكفالة بالدرک جائزة، والفرق أن الرهن للاستيفاء ولا استيفاء قبل الوجوب وإضافة التمليک إلى زمان فى المستقبل لا تجوز. (هدايه، كتاب الرهن، اشرفى ٤/٥٢٧، بنايه اشرفيه ديوبند ١٢/٥٠١)

صورته: أن يبيع شيئا ويسلمه إلى المشترى فيخاف المشترى أن يستحقه أحد فيأخذ من البائع رهنا بالثمن. (هامش الهداية اشرفى ديوبند ٤/٥٢٧)

يراد به ضمان الثمن عن استحقاق المبيع. (البناية اشرفيه ١٢/٥٠١)

والكفالة بالدرک جائزة ...... أما الكفالة فلالتزام المطالبة والتزام الأفعال يصح مضافا إلى المآل كما فى الصوم والصلاة ولهذا تصح الكفالة. (هدايه اشرفى ٤/٥٢٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍شعبان المعظم ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۲۳۷)

شئ مرہون کے چھڑانے میں لگی رقم سے زائد رقم وصول کرنا

سوال [۹۷۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسمی یعقوب علی نے چندہ بیگم سے ایک مکان بذریعہ رجسٹری خرید کیا، جس میں شرط یہ تھی کہ ۵/سال کے بعد مکان واپس کردیا جائے، اب ۲۲/سال کے بعد چندہ بیگم یہ چاہتی ہیں کہ یہ مکان انہیں واپس مل جائے، تو یعقوب علی نے یہ شرط لگائی کہ پانچ سال کا عرصہ کم کرکے ۱۷/سال کا ۳۰۰/روپیہ ماہوار کے حساب سے چندہ بیگم سے مکان کا کرایہ وصول کرکے ان کے نام رجسٹری کرسکتا ہوں، واضح رہے کہ ۲۲/سال کے عرصہ کے درمیان چندہ بیگم اس مکان سے فائدہ اٹھاتی رہیں کچھ فروخت کیا اور کچھ کرایہ داری وغیرہ پر دیا اور اسی وقت سے اب تک رہائش بھی اختیار کررکھی ہے، اور اس وقت بھی مکان اونچی پوزیشن پر ہے، شرعی مسئلہ تحریر فرمائیں کہ یعقوب علی کرایہ وصول کرسکتے ہیں یا نہیں، یا جواز کی کیا شکل ہوسکتی ہے؟

نوٹ: یہ مکان ایک بنئے کے پاس رہن تھا یعقوب علی نے بنئے سے اس کی رقم ادا کرکے اپنے نام رجسٹری کروالیا تھا اور چندہ بیگم نے رجسٹری کردی تھی۔

المستفتی: محمد یعقوب علی محلّہ مغل پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ کے نوٹ سے معلوم ہوا کہ یعقوب علی صاحب نے چندہ بیگم سے باقاعدہ خریدا نہیں ہے بلکہ اس رہن کے مکان جس کو چھڑانے سے چندہ بیگم عاجز ہوگئی تھی، یعقوب علی نے چندہ بیگم کی اجازت سے اس کو اپنے نام سے چھڑوالیا تھا، لہٰذا اب شرعی حکم یہ ہوگا کہ یعقوب علی نے جتنی رقم دے کر رہن کا مکان چھڑایا ہے اتنی ہی رقم چندہ بیگم سے وصول کرکے مکان چندہ بیگم کے حوالہ کرسکتا ہے اور سوالنامہ میں جو ۳۰۰/سوروپیہ ماہانہ کا طریقہ لکھا ہے وہ شرعاً غلط ہے۔

ولو أن الراهن عجز عن فكاك الرهن فقضى المعير دين الراهن كان للمعير ان يرجع على الراهن بقدر ما سقط من الدين عند الهلاك ولايرجع

بأكثر من ذلك. (فتاویٰ قاضی، خان، كتاب الرهن فصل فيمن يرهن مال الغير، زكريا جديد ٣/٤٥١، وعلى هامش الهندية ٣/٦٠٤، مجمع الضمانات ١/٦٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

كتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ربیع الاول ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۲۳۸۵)

شئ مرہونہ کے حفاظت کی اجرت

سوال [۹۷۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جدید اسلامی بیت المال یا مسلم فنڈ میں زیور رکھ کر قرض دیا جاتا ہے اور زیور کی رکھوالی اور حفاظت کے بدلے معمولی اجرت لی جاتی ہے تو کیا یہ اجرت لینا جائز ہے اگر جائز ہے تو کیا اس طرح کے ادارے کچھ لوگ کمیٹی بنا کر تنہا تجارت کے طور پر چلا سکتے ہیں، جس میں غریب عوام کا بھی فائدہ ہو اور ادارہ چلانے والے کو بھی فائدہ پہنچے؟

المستفتی: وکیل احمد نگینہ بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) گروی رکھی اشیاء کی حفاظت کی اجرت ظاہر روایت کے مطابق لینے کی گنجائش ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۷۱)

وأجرة البيت الذى يحفظ فيه الرهن على المرتهن وكذلك أجرة الحافظ والراعى (إلى قوله) وهذا فى ظاهر الرواية. (هدايه، كتاب الرهن، اشرفى ٤/٥٢٣)

وعن أبى يوسف أن كراء المأوىٰ على الراهن بمنزلة النفقة. (هدايه، كتاب الرهن، اشرفى ٤/٥٢٣)

(۲) اس طرح کے ادارے تجارت وغیرہ کی غرض سے چلانے کی اجازت نہیں ہے البتہ اگر مسلمانوں کو سودی لین دین سے بچانے اور ان کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے چلائے جائیں تو اس کی اجازت ہے، اور مسئولہ صورت میں چونکہ سودی لین دین سے بچانا مقصود

نہیں، بلکہ تجارت مقصود ہے،اس لیے ایسے اداروں کے قیام کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔

عن فضالة بن عبيد صاحب النبي ﷺ أنه قال: كل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربا. (السنن الكبریٰ للبيهقي، البيوع، باب كل قرض جر منفعة فهو ربا، دار الفكر ۲۷٦/۸، رقم: ۱۱۰۹۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍رجب المرجب ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ٦۸۵٦)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵؍۷؍۱۴۲۱ھ

مرتہن کے پاس شئ مرہون ضائع ہوجائے تو کیا حکم ہے؟

سوال [۹۷٦٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں نے ایک شخص سے بطور قرض پچاس ہزار روپئے لیے اور اس کے عوض اپنی بیوی کے زیورات جو تقریباً گیارہ تولے سونے کے تھے، ان کے پاس رکھ دیئے، کچھ سال بعد ہمارے اور ان کے درمیان یہ بات ہوئی کہ آپ کے روپئے دے کر میں اپنے زیورات واپس لینا چاہتا ہوں، تو ان صاحب نے کہا کہ زیورات کو میں نے تلاش کیا، مگر مل نہیں رہے ہیں، اور اب پرانے حساب سے اپنے زیورات کے روپئے لے لو جبکہ اس وقت سونے کا بھاؤ ساڑھے چار ہزار روپئے تولہ تھا تو کیا ان کا قول وعمل درست ہے؟ جبکہ میں اپنا سونا لینا چاہتا ہوں، جواب سے سرفراز فرمائیں۔

المستفتی: عبد السلام لکڑی کا احاطہ اصالت پورہ مراد آباد

دار العلوم دیوبند کا جواب

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ (راہن) کا مطالبہ درست ہے، وہ صاحب (مرتہن) اگر زیورات مل جائیں تو زیورات دیدیں اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں تو

کوئی نزاع ہی نہیں اگر زیورات مرہونہ نہیں ملتے تو سونے کی موجودہ (بوقت ادائیگی) قیمت کومحسوب کر کے ادائیگی کریں۔

فتاویٰ محمودیہ میں ہے کہ جس وقت رہن کا معاملہ ختم کیا جارہا ہے، اس وقت کی قیمت کا اعتبار ہوگا......اگر زیور ڈوب گیا اور رہن ختم کردیا گیا تو اس کی موجودہ قیمت لازم ہوگی۔ (مستفاد محمودیہ ۲۰/ ۱۴۰)

وفی شرح المجلة الودیعة متی وجب ضمانها فإن كانت من المثليات تضمن بمثلها وإن كانت من القيميات تضمن بقيمتها يوم لزوم الضمان.

(شرح المجلة، رستم اتحاد ۱/ ٤٤٦، رقم: المادة: ۸۰۳) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: محمود الحسن بلندشہری غفرلہ، دارالعلوم دیوبند
۱۸/۱۱/۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۷۵۵)

الجواب صحیح
فخر الاسلام عفی عنہ
حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ

جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد کا جواب

[۹۷٦۷]:

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سائل نے سوالنامہ میں جو واقعہ ذکر فرمایا ہے اس کو شریعت میں معاملۂ رہن کہا جاتا ہے اور اردو میں ”گروی رکھنے کا معاملہ“ کہا جاتا ہے، یعنی اپنا سامان زیور یا کوئی دوسری اشیاء گروی میں رکھ کر بطور قرض پیسہ لیا اور جب قرض کا پیسہ واپس ہو جائے گا تو گروی میں رکھی ہوئی چیز واپس ہو جائے گی اور اس طرح کے رہن کا معاملہ پیش آجانے کے بعد اگر گروی میں رکھی ہوئی چیز ہلاک ہو جائے یا ڈوب جائے یا چوری ہو جائے یا ضائع ہو جائے تو ایسی صورت میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ تو اس سلسلے میں کتب فقہ میں اس حکم کی صراحت موجود ہے کہ اس کا حکم یہ ہے کہ جس دن وہ شئ یعنی زیورات رکھ کر پیسہ لیا گیا ہے اس دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا، لہٰذا سائل نے جو واقعہ لکھا ہے اس واقعہ میں جس وقت گیارہ تولہ

سونا گروی میں رکھ کر پچاس ہزار روپئے بطور قرض لیے تھے، اس وقت سونے کی جو قیمت تھی اس قیمت کے اعتبار سے حساب لگانے کا حکم ہے اور سائل کی تحریر کے مطابق گروی رکھتے وقت سونے کا بھاؤ ساڑھے چار ہزار روپئے فی تولہ تھا، تو اس حساب سے گیارہ تولہ کی قیمت ساڑھے انچاس ہزار بیٹھتی ہے، اور سائل کے کہنے کے مطابق جس شخص کے پاس سونا رکھا تھا اس کے ہاتھ سے سونا ضائع ہو چکا ہے، لہٰذا اس کے دیئے ہوئے پچاس ہزار کے قرض میں سے ساڑھے انچاس ہزار سونے کی قیمت میں مجریٰ ہو جائے گا قرض لینے والے کے اوپر پانچ سو روپئے واپس کرنا لازم ہوگا، اس حکم کی صراحت فتاویٰ کی مشہور کتاب فتاویٰ تاتارخانیۃ، فتاویٰ عالمگیری، اور محیط برہانی میں صاف الفاظ کے ساتھ موجود ہے، ملاحظہ فرمایئے:

لو هلك المرهون في يد المرتهن أو في يد العدل ينظر إلى قيمته يوم القبض و إلى الدين فإن كان قيمته مثل الدين سقط الدين بهلاكه و إن كان قيمته أكثر من الدين سقط الدين وهو في الفضل أمين وإن كانت قيمته قل من الدين سقط من الدين قدر قيمة الرهن و يرجع المرتهن على الراهن بفضل الدين، و في الكافي: بيانه إذا رهن ثوبا قيمته عشرة بعشرة فهلك عند المرتهن سقط دينه فإن كان قيمة الثوب خمسة يرجع المرتهن على الراهن بخمسة أخرىٰ وإن كانت قيمته خمسة عشر فالفضل أمانة عندنا و عند زفر رحمه الله يرجع الراهن على المرتهن بخمسة لأن الرهن عنده مضمون بالقيمة. (فتاویٰ تاتارخانية زكريا ١٨/ ٥٢٧، رقم: ٢٩٨٨٣- ٢٩٨٨٤، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ١٨/ ٧١، رقم: ١٨٠٢٥، هنديه زكريا قديم ٥/ ٤٤٧، جديد ٥/ ٥٠٢)

سائل نے جو دارالعلوم دیوبند کا جواب سوالنامہ کے ساتھ پیش کیا ہے اس کو بھی دیکھ لیا گیا ہے اس جواب میں معاملہ ودیعت اور مسائل غصب سے متعلق ایک عبارت سے استدلال کر کے یوم الأداء اور یوم لزوم کی قیمت کا اعتبار کرنے کو لکھا گیا ہے اور یہاں سائل کے مسئلہ کا تعلق مسئلہ ودیعت اور مسئلہ غصب سے نہیں ہے بلکہ مسئلہ رہن سے متعلق ہے اور سائل کے مسئلہ کے مطابق مسئلہ رہن کا حکم صراحت کے ساتھ ہم نے عبارت میں لکھ دیا ہے، لہٰذا ہم کو دار

العلوم دیو بند کے جواب سے اتفاق نہیں ہو سکا، شئ مرہون چونکہ پہلے ہی دن سے مضمون ہوجاتی ہے اس لیے دار العلوم دیو بند کے جواب میں جو عربی عبارت لکھی گئی ہے اس پر غور کیا جائے تو وہ عبارت بھی ہمارے ہی فتویٰ کی تائید میں ہو جاتی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۷۵۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸/۴/ ۱۴۳۰ھ

شئ مرہون کی ہلاکت کے ضمان میں کس وقت کی قیمت کا اعتبار ہوگا؟

سوال [۹۷۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تقریباً ۲۲/ ۲۳؍ سال قبل زید نے عمر کے پاس کچھ سونے کے زیورات رکھ کر پچاس ہزار قرض کا مطالبہ کیا دونوں کے درمیان نہ ادائیگی کی مدت متعین ہوئی، اور نہ اس کی بابت کوئی تحریر لکھی گئی، عمرو نے وہ زیورات اپنے بھائی خالد کو دے دیئے، اور پچاس ہزار کی رقم خالد سے زید کو دلوادی، عرصہ دراز تک زید نے قرض کی رقم زیورات سے زائد ہونے کی بناء پر عمر سے کوئی مطالبہ ہی نہ کیا، جس کی بنا پر یہ معاملہ عمرو کے ذہن سے نکل گیا اور نہ اس دوران کبھی عمرو نے اپنے بھائی خالد سے اس کا تذکرہ کیا یہاں تک کہ خالد نے اپنا سابقہ مکان چھوڑ کر دوسرے مکان میں رہائش اختیار کرلی اور زید نے نہ تو اس معاملہ کی یاد دہانی کرائی اور نہ کبھی رقم کی ادائیگی کے متعلق کوئی تذکرہ کیا، اب ۲۰۰۹ء میں خالد کو ایک دوسرے مکان میں رہتے ہوئے بھی ایک عرصہ ہوگیا، اور سونے کی قیمت بھی سترہ ہزار روپئے تولہ ہوگئی یعنی زیورات کی قیمت مقدار قرض سے بڑھ گئی، اب زید خالد سے کہتا ہے کہ اپنے پچاس ہزار روپئے لو اور ہمارے ۱۱؍ تولہ سونے کے زیورات واپس کردو جبکہ خالد کو نہ تو زیورات کی مقدار کا کوئی علم ہے اور نہ عمرو کو، زید کی یاد دہانی پر خالد نے ان زیورات کو انتھک تلاش کیا لیکن وہ نہ مل سکے، اور خالد حلفیہ یہ بات کہتا ہے کہ مجھے ذرہ برابر بھی یہ بات نہیں یاد رہی کہ عمر نے زید کے زیورات میرے پاس رکھوا کر مجھ سے پچاس ہزار روپئے دلوائے ہیں، البتہ طویل عرصہ کے بعد جبکہ زیورات کی رقم مقدار قرض سے کئی گنا

زیادہ ہوگئی، زید کی یاد دہانی پر کچھ کچھ یاد آیا اور تلاش بسیار کے باوجود وہ امانت نہ مل سکی، ایسا لگتا ہے کہ وہ امانت گھریلو پرانے زیورات کے ساتھ فروخت ہوگئی ہو کیونکہ ۲۰۰۶ء میں پرانے زیورات فروخت ہوئے تھے اب ایسی صورت میں دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا خالد شرعی اعتبار سے موجودہ سونے کی قیمت کے اعتبار سے رقم کی ادائیگی کرے گا یا اس پر کوئی ادائیگی لازم نہیں ہوگی؟ شریعت کے مطابق جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔

المستفتی: سعود عالم گلشہید مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ۲۳/۲۲ سال پہلے جو زیور گروی میں رکھا گیا ہے اور اس کے عوض میں پچاس ہزار روپئے قرض لیے گئے اور طویل مدت تک قرض کی واپسی نہیں ہوسکی، اور اس درمیان میں مذکورہ زیورات ہلاک ہو گئے یا فروخت ہو چکے ہیں تو ایسی صورت میں ۲۳/۲۲ سال بعد اس زیور کی جو قیمت بنتی وہ قیمت نہیں ملے گی، بلکہ جس وقت گروی رکھا جارہا تھا اس وقت کی جو قیمت ہے اسی قیمت کا اعتبار ہوگا، ہاں البتہ اگر معلوم ہو جائے کہ کس دن وہ زیورات فروخت کیے گئے ہیں تو اس دن کی جو قیمت بنتی ہے اس قیمت کا بھی اعتبار کیا جاسکتا ہے، لہٰذا اگر ۲۰۰۶ء میں یہ زیور بیچا گیا ہے تو ۲۰۰۶ء میں اس کی جو قیمت بنتی ہے اس میں سے پچاس ہزار روپیہ روک کر باقی زائد روپیہ قرض دار کو واپس کردینا لازم ہے اور ۲۰۰۶ء کے بعد سونے کی قیمت مزید بڑھ جانے کی وجہ سے قرض دار کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جتنے کا سونا فروخت کیا گیا ہے اس سے زیادہ کا مطالبہ کرے، عربی عبارت ملاحظہ فرمائیں: گروی رکھنے کے دن کی قیمت کے اعتبار کی عبارتیں ملاحظہ فرمائیں:

وإذا استهلک المرتهن الرهن أو أتلفه بتعد أو تقصير من جهته ضمن قيمته إن كان قيميا و مثله إن كان مثليا والمعتبر قيمته يوم قبضه.

(الفقه الاسلامی و أدلته، هدی انٹر نیشنل دیوبند ۱۶۰/۵، دار الفکر ۴۳۰۷/۶)

واحترز بهذا عن استهلاک المرتهن حيث يجب عليه قيمته يوم قبض وكذٰلک إذا هلک بدون الاستهلاک يعتبر قيمته يوم القبض لا يوم

الهلاک قوله فإنه يعتبر قيمته يوم القبض و سواء فی ذٰلک الهلاک والاستهلاک. (حاشية چلپی، كتاب الرهن زكريا ١٨٦/٧، امدادیه ملتان٦/٨٧)

بخلاف ضمانه على المرتهن تعتبر قيمته يوم القبض -إلى- والمضمون من جنسه حقه استوفىٰ المرتهن منه دينه و رد الفضل على الراهن إن كان فيه فضل. (مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٢٩٦/٤، مصرى قديم ٦٠٥/٢)

وقيمة الرهن معتبرة يوم قبضه الخ. (الفقه الحنفى و أدلته دار الكتب العلمية بيروت ١٠٣/٢)

وإنما قيد بقوله على هذا المستهلک احترازا عن استهلاک المرتهن، فإن عليه قيمته يوم قبضه. (البناية، كتاب الرهن، اشرفيه ٢٦/١٣، حاشية الطحطاوى على الدر كوئٹه ٢٤٨/٤)

فروختگی کے دن کی قیمت کی عبارتیں ملاحظہ فرمائیں:

قال الشامی: أقول يمكن حمل مافى الأشباه على ما إذا استهلكه المرتهن ولذا قال الرملی بعد كلام: وأنت إذا أمعنت النظر ظهر لک الفرق بين الهلاک والاستهلاک فقطعت فی صورة الهلاک بأن المعتبر قيمته يوم القبض وفی صورة الاستهلاک يوم الهلاک. (شامی، كتاب الرهن زكريا ٨١/١٠، كراچی ٣٨٠/٦)

ووجب عليه الباقی بالإتلاف وهو قيمته يوم التلف. (مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٢٩٦/٤، مصرى قديم ٦٠٥/٢)

قال بعض الفضلاء: و أنت إذا أمنعت النظر فی كلام الزيلعی و غيره قطعت بأنه فی صورة الهلاک تعتبر القيمة يوم القبض و فی صورة الاستهلاک يوم الهلاک. (الحموى مع الأشباه، كراچی الفن الثالث ٦٢١/٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٣٠ رجب المرجب ١٤٣٤ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٤٠/١١٢٠٨)

مرتہن مرہونہ سونے کو فروخت کردے تو کس قیمت سے واپس کرے گا

سوال [۹۷۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے بکر کے پاس ۱۹۹۰ء میں گیارہ تولہ سونا گروی رکھ کر پچاس ہزار روپیہ قرض لیا اور اس زمانہ میں سونے کا بھاؤ ڈیڑھ ہزار روپیہ تولہ تھا، اس کے بعد زید لوٹ کر واپس نہیں آیا، اس لیے کہ گیارہ تولہ سونے کی قیمت اس زمانے میں پچاس ہزار روپیہ سے بہت ہی کم تھی، پھر ۲۰۰۶ء میں تقریباً سولہ سال کے بعد بکر نے وہ سونا فروخت کردیا اس لیے کہ اس سونے کا مالک کون ہے؟ یہ بھی یاد نہیں رہا اور اس وقت گیارہ تولہ سونے میں سے ٹانکے کاٹ کر جو پیسے ملے ہیں وہ لگ بھگ بہتر ہزار چھ سو روپئے ہیں، پھر زید ۲۰۰۹ء میں تقریباً ۱۹/سال بعد جب سونے کی قیمت ۱۷/۱۸/ ہزار روپیہ ہوگئی تو زید آکر مطالبہ کرتا ہے کہ پچاس ہزار روپئے لے لو اور ہمارا گیارہ تولہ سونا دیدو، بکر کہتا ہے کہ تو نے ۱۹/سال تک پیسہ واپس نہیں کیا اس پیسے سے فائدہ اٹھالیا اور ہم نے تیرا اتا پتہ نہ ہونے کی وجہ سے سولہ سال تک انتظار کرنے کے بعد وہ گیارہ تولہ سونا فروخت کردیا، اور اس میں سے ہمیں تقریباً ۷۲/ ہزار روپیہ ملا ہے، لہٰذا تیرا صرف ۲۲/ ہزار چھ سو روپیہ بنتا ہے، لہٰذا ۲۲/ ہزار چھ سو روپیہ لے اور چلا جا مگر زید اس بات پر بضد ہے کہ میں سونا ہی لوں گا جبکہ اس کا سونا ۲۰۰۶ء میں فروخت ہو چکا ہے اب شریعت کی رو سے مفتی صاحب بتلایئے کہ زید کو سونا ہی ادا کرنا لازم ہے یا اس کا سونا جو ۷۲/ ہزار چھ سو روپیہ میں بکا ہے اسی کا مستحق ہے، جس میں سے پچاس ہزار روپیہ قرضہ میں مجریٰ ہو گئے اور اب ۲۲/ ہزار چھ سو روپیہ دینے سے ۷۲/ ہزار چھ سو روپئے پورے ہو جاتے ہیں اس لیے مفتی صاحب دلائل کی روشنی میں حکم شرعی واضح فرمادیں، اور قرضہ کی ادائیگی کی کوئی مدت متعین نہیں ہوتی جب پیسہ لاکر واپس دیں تب شئ مرہون واپس کردیں گے۔

المستفتی: شاہ زماں گل شہید مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب زید بکر کے پاس گیارہ تولہ سونا گروی رکھ کر

پچاس ہزار روپئے قرض لے کر گیا اور ۱۹۹۰ء تک تقریباً سولہ سال گزر جانے تک قرض کا پیسہ واپس لے کر نہیں آیا ہے اور بکر نے سولہ سال کے بعد گیارہ تولہ سونے کے زیورات ۲۰۰۶ء کے بھاؤ کے حساب سے ۲۷/ ہزار چھ سو روپیہ میں بیچ دیے ہیں، تو اس رقم میں سے پچاس ہزار روپیہ بکر کو اپنے پاس قرض کے عوض روک لینے کا حق ہے، اور بقیہ ۲۲/ ہزار چھ سو روپیہ زید کو واپس کر دینا لازم ہے، اور ۲۰۰۶ء کے بعد سونے کی قیمت مزید بڑھ جانے کی وجہ سے زید کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جتنے میں سونا فروخت کیا گیا ہے اس سے زیادہ قیمت کا مطالبہ کرے، یا گیارہ تولہ سونا جو فروخت ہو چکا ہے اسی سونے کا مطالبہ کرے، بلکہ شرعی طور پر زید کو صرف ۲۲/ ہزار چھ سو روپیہ کے مطالبہ کا حق ہے اس سے زائد کا مطالبہ کرنا شرعی طور پر جائز نہیں ہے؛ بلکہ اکثر فقہاء نے یہی لکھا ہے کہ زید کو اس دن کے سونے کی قیمت لینے کا حق ہے جس دن گروی میں رکھا تھا یعنی ۱۹۹۰ء کی قیمت کا، مگر بعض فقہاء نے اس کی بھی گنجائش دی ہے کہ جس دن سونا فروخت ہو چکا ہے اس دن کی قیمت کا حساب لگایا جائے، لہٰذا زید کو نہ گیارہ تولہ سونے کے حساب سے مطالبہ کرنے کا حق ہے اس لیے کہ سونا فروخت ہو چکا ہے اور نہ ہی ۲۰۰۹ء کی قیمت کے اعتبار سے مطالبہ کا حق ہے، یوم القبض کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

وإذا استهلك المرتهن الرهن أو أتلفه بتعد أو تقصير من جهته ضمن قيمته إن كان قيميا و مثله إن كان مثليا والمعتبر قيمته يوم قبضه.

(الفقه الاسلامی و أدلته، هدی انٹر نیشنل دیوبند ٥/١٦٠، دار الفكر ٦/٤٣٠٧)

واحترز بهذا عن استهلاك المرتهن حيث يجب عليه قيمته يوم قبض وكذٰلك إذا هلك بدون الاستهلاك يعتبر قيمته يوم القبض لا يوم الهلاك قوله فإنه يعتبر قيمته يوم القبض و سواء فى ذٰلك الهلاك والاستهلاك. (حاشية چلپی، كتاب الرهن، زكريا ٧/١٨٦، امدادیه ملتان ٦/٨٧)

بخلاف ضمانه على المرتهن تعتبر قيمته يوم القبض –إلى– والمضمون من جنسه حقه استوفىٰ المرتهن منه دينه و رد الفضل على الراهن إن كان فيه فضل. (مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/٢٩٦، مصری قديم ٢/٦٠٥)

وقيمة الرهن معتبرة يوم قبضه فإن تصرف المرتهن فيه ببيع أو إجارة أو إعادة أو رهن و نحوه ضمنه بجميع قيمته. (الفقه الحنفى و أدلته، دار الكتب العلمية بيروت ۲/۱۰۳)

والواجب على هذاالمستهلک احترازا عن استهلاک المرتهن، فإن عليه قيمته يوم قبضه. (البناية، كتاب الرهن، اشرفيه ۱۳/۲٦، حاشية الطحطاوى على الدر كوئٹه ٤/۲٤۸)

فروختگی کے دن کی قیمت کی عبارتیں ملاحظہ فرمائیں:

قال الشامي: أقول يمكن حمل مافي الأشباه على ما إذا استهلكه المرتهن ولذا قال الرملي بعد كلام: وأنت إذا أمعنت النظر ظهر لک الفرق بين الهلاک والاستهلاک فقطعت في صورة الهلاک بأن المعتبر قيمته يوم القبض وفي صورة الاستهلاک يوم الهلاک. (شامی، كتاب الرهن، زكريا ۱۰/۸۱، كراچی ٦/۳۸۰)

ووجب عليه الباقي بالإتلاف وهو قيمته يوم التلف. (مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/۲۹٦، مصرى قديم ۲/٦۰۵)

قال بعض الفضلاء: و أنت إذا أمنعت النظر فى كلام الزيلعى و غيره قطعت بأنه فى صورة الهلاک تعتبر القيمة يوم القبض و فى صورة الاستهلاک يوم الهلاک. (الحموى مع الأشباه، كراچى الفن الثالث ۲/۲۲۱) **فقط** واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ جمادالاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۱۲٦)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۵/۲۲ھ

گروی رکھی زمین سے نفع اٹھانا

سوال [۹۷۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک کسان دو بیگھے زمین تین ہزار روپیہ میں ایک سال کے لیے رہن رکھنا چاہتا ہے جس کے بدلے دو کوئنٹل باسمتی دھان اور دو کوئنٹل گیہوں دینا چاہتا ہے، تو ایسا کرنا جائز

ہے یا نہیں؟ اور ایک سال پورا ہونے کے بعد مجھے اپنے تین ہزار روپیہ واپس کرنے ہیں؟

المستفتی: ریاض الدین سرائے مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: زمین گروی رکھنے والے کے لیے اس زمین سے نفع اٹھانا جائز نہیں ہے، اس کا نفع زمین والے کسان کا حق ہے، پیسہ دینے والے کو صرف گروی لینے کا حق ہوتا ہے کہ اگر مقروض پیسہ ادا نہ کر سکے تو زمین بیچ کر اپنا پیسہ وصول کر سکے، اس لیے آپ کا مذکورہ معاملہ شرعی طور پر جائز نہیں ہے۔

لايحل للمرتهن أن ينتفع بشيئ منه بوجه من الوجوه و إن أذن له الراهن لأنه اذن له فى الربا لأنه يستوفى دينه كاملا فتبقى له المنفعة فضلا فتكون ربا وهذا أمر عظيم. (شامی، کتاب الرهن، زكريا ١٠/٨٣، كراچی ٦/٤٨٢، مطلب: كل قرض جر نفعاحرام، زكريا ٧/٣٩٥، كراچی ٥/١٦٦، مجمع الأنهر، مصرى قديم ٢/٥٨٨، دار الكتب العلمية بيروت ٤/٢٧٣، ٢٧٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ر صفر المظفر ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۱۹۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۲/۲۹ھ

ارض مرہونہ سے فائدہ اٹھانے کی شرط

سوال [۹۷۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص کو کچھ پیسوں کی ضرورت پڑی لیکن کسی نے بھی اس شخص کو پیسے نہیں دیئے، اس نے مجبور ہو کر ایک شخص کو اپنی زمین گروی رکھی، جس میں یہ بات طے پائی کہ تم مجھے ایک ہزار روپئے دیدو اور میری زمین لے لو، چھ مہینے کے بعد تمہارے ایک ہزار روپئے واپس کر دوں گا، تو آپ مجھے زمین واپس کر دینا تو کیا زمین کو گروی رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ شرعی حکم تحریر فرمائیں۔

المستفتی: سعید احمد دھنگیر پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ میں قرض لے کر زمین کو گروی رکھنے کی جو شکل بیان کی گئی ہے وہ جائز نہیں ہے کیونکہ مالک زمین کو جو اس نے روپیہ قرض دیا ہے اس کی وصولیابی کی اعتماد کے لیے اس نے زمین کو رہن میں لیا ہے تاکہ اگر وہ روپیہ نہ دے سکے تو زمین بیچ کر اپنا قرض وصول کیا جا سکے، لیکن اس درمیان روپئے دینے والا زمین سے جو فائدہ حاصل کرے گا وہ شرعاً جائز نہیں ہے، اس لیے یہ معاملہ شرعاً فاسد ہے، ہاں البتہ اس کے جواز کی یہ شکل ہوسکتی ہے کہ قرض دینے والا اس زمین کی ہر فصل کے لیے کرایہ متعین کر دے اور جو قرض مالک زمین نے لے رکھا ہے اس قرض میں سے کرایہ مجریٰ ہوتا رہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۱/ ۳۱۵، جدید ڈابھیل ۲/ ۱۳۵، امداد الفتاویٰ ۳/ ۴۰۴)

لایحل للمرتهن أن ینتفع بشيئ منه بوجه من الوجوه و إن أذن له الراهن لأنه أذن له في الربا. (شامی، کتاب الرهن، زکریا ۱۰/ ۸۳، کراچی ۶/ ۴۸۲، مطلب: کل قرض جر نفعا حرام، زکریا ۷/ ۳۹۵، کراچی ۵/ ۱۶۶، مجمع الأنهر، مصری قدیم ۲/ ۵۸۸، دار الکتب العلمية بیروت ۴/ ۲۷۳، ۲۷۴)

ولیس للمرتهن أن ینتفع بالرهن لابالاستخدام و لا سکنیٰ ولا لبس. (هدایه، کتاب الرهن، اشرفی ۴/ ۵۲۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۶۲۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۵/۵ھ

مرہون زمین میں راہن ومرتہن کا غلہ پیدا کرنا

سوال [۹۷۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے اپنی زمین بکر کو دس ہزار روپئے میں گروی پر دی، پھر بکر نے زید سے کہا کہ اس زمین کی کاشت تم کرو اور جو غلہ پیدا ہوگا اس میں کا آدھا غلہ ہمارا اور آدھا غلہ تمہارا ہوگا، بکر نے زید سے کہا کہ جب ہم کو پورا روپیہ واپس کرو گے تو تم اپنی زمین کی کاشت کا پورا غلہ لے لینا، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرتہن کا شئ مرہون سے نفع حاصل کرنا ناجائز ہے، لہٰذا جو زمین زید نے بکر کے پاس گروی رکھی ہے اسی زمین کو بکر کا زید کو اس شرط پر بٹائی پر دینا کہ اس کی پیداوار کا آدھا حصہ ہمارا ہوگا اور آدھا تمہارا ہوگا اس طرح کا معاملہ کرنا ناجائز ہے کیونکہ اس صورت میں بکر کا شئ مرہون سے نفع حاصل کرنا لازم آتا ہے جو ناجائز ہے۔
(مستفاد: احسن الفتاویٰ زکریا ۸/ ۴۹۵، امداد الفتاویٰ زکریا ۳/ ۴۶۱)

لایحل للمرتهن أن ينتفع بشيئ منه بوجه من الوجوه و إن أذن له الراهن لأنه إذن له في الربا لأنه يستوفيٰ دينه كاملا فتبقى له المنفعة فضلا فتكون ربا وهذا أمر عظيم. (شامی، کتاب الرهن، زکریا ۱۰/ ۸۳، کراچی ۶/ ۴۸۲، مطلب: کل قرض جر نفعا حرام، زکریا ۷/ ۳۹۵، کراچی ۵/ ۱۶۶، مجمع الأنهر، مصری قدیم ۲/ ۵۸۸، دار الکتب العلمية بيروت ۴/ ۲۷۳، ۲۷۴)

ثم رأيت في جواهر الفتاویٰ إذا كان مشروطا صار قرضا فيه منفعة وهو ربا. (شامی، کتاب الرهن، زکریا ۱۰/ ۸۳، کراچی ۶/ ۴۸۲، مطلب: کل قرض جر نفعا حرام، زکریا ۷/ ۳۹۵، کراچی ۵/ ۱۶۶، مجمع الأنهر، مصری قدیم ۲/ ۵۸۸، دار الکتب العلمية بيروت ۴/ ۲۷۳، ۲۷۴) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۵۷۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۴/۲۳ھ

مرتہن کا شئ مرہون سے فائدہ اٹھانا

سوال [۹۷۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے خالد سے کچھ روپیہ قرض لیا اور اس کے عوض خالد نے زید کی زمین لی، اس شرط پر کہ جب زید روپیہ واپس کردے گا تو خالد زمین واپس کردے گا، اور زمین زید کو

واپس مل جائے گی، تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ خالد کے لیے رہن کی زمین سے فائدہ اٹھانا کیسا ہے؟ اور شرعاً اس معاملہ کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد غفران گونڈوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: خالد کے لیے زید کو قرض دے کر قرض کی واپسی تک اس کی زمین کو رہن میں لے کر اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، ہاں البتہ زمین کا کرایہ متعین کر دیا جائے، اور وہ کرایہ قرض کے روپیہ میں سے کٹتا جائے تو یہ جائز ہے یا الگ سے اس کا کرایہ متعین کرلیا جائے، چاہے اس کی مقدار کم زیادہ کچھ بھی ہو، تب بھی جائز ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ جدید ڈابھیل ۲۰/۱۳۴)

ایسی صورت میں رہن کا معاملہ ختم ہو جائے گا اور اجارہ کا معاملہ ہو جائے گا۔

وليس للمرتهن الانتفاع بالرهن لأن حق المرتهن الحبس إلى أن يستوفي دينه دون الانتفاع. (مجمع الأنهر، كتاب الرهن، دار الكتب العلمية بيروت ٤/٢٧٣ مصرى قديم ٢/٥٨٧)

كل قرض جر نفعاً حرام فكره للمرتهن، سكنى المرهونة بإذن الراهن. (الدر المختار، مطلب: كل قرض جر نفعا حرام زكريا ٧/٣٩٥، كراچى ٥/١٦٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/محرم الحرام ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۸۵۲/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۶/۱/۱۴۳۱ھ

مسلم فنڈ کا تین مہینے زیور رکھنے کے عوض رقم وصول کرنا

سوال [۹۷۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسلم فنڈ، زیور رہن رکھ کر قرض دیتا ہے اور ۳/مہینے کی مدت مقرر کرتا ہے اور اس

۳؍مہینے زیور رکھنے پر کچھ پیسے لیتا ہے اگر متعینہ مدت تک قرض ادا نہیں ہو پاتا تو پھر ۳؍مہینے کی مدت بڑھا کر پھر ۳؍مہینے کا چارج لیتا ہے کیا یہ طریقہ مسلم فنڈ کا صحیح ہے، اگر صحیح نہیں ہے تو صحیح طریقہ تحریر فرما دیجئے، تاکہ مسلم فنڈ والوں کو بتا دیا جائے۔

المستفتی: عبدالرشید سیڈھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسلم فنڈ والوں کا تین مہینے زیور رہن رکھنے کے عوض رقم وصول کرنا شرعاً درست نہیں ہے، اس لیے کہ زیور کی حفاظت کرنا مسلم فنڈ والوں پر ضروری ہے، کیونکہ مسلم فنڈ مرتہن کے درجہ میں ہے، اور مرتہن پر مال رہن کی حفاظت لازم ہے۔

ولو استقرض دراهم و سلم حماره إلى المقرض ليستعمله إلى شهرين حتى يوفيه دينه أو داره ليسكنها فهو بمنزلة الإجارة الفاسدة. (شامی، کتاب الرهن، زکریا ۱۰/ ۸۷، کراچی ٦/ ٤٨٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍شعبان المعظم ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۱۳۴/۳۸)

ارض مرہونہ سے استفادہ کی متبادل شکل

سوال [۹۷۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سود بھرنا، یعنی ایک آدمی کا کھیت ہے، دوسرا آدمی اس کھیت کو لیتا ہے جو کھیت لے رہا ہے وہ اس کو روپیہ دیتا ہے، جب کھیت والا اس سے اپنی زمین لینا چاہتا ہے تو اس کو پورا روپیہ واپس کرنا پڑتا ہے، جب اس کو پورا روپیہ مل جاتا ہے تب وہ کھیت چھوڑتا ہے اسی کے درمیان اس زمین کو بوتا ہے اور فائدہ اٹھاتا ہے، اور اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ میں نے اس کو اپنی زمین دی ہے اور اس سے روپیہ لیا ہے، اب میرے پاس روپیہ ہوگیا ہے تم روپیہ لے کر میری زمین واپس دیدو اس پر وہ کہتا ہے کہ بھائی آپ سے زمین لی روپیہ دیا، جب تک اس زمین

سے ایک فصل نہ لےلوں اس وقت تک نہیں دیتا؟

المستفتی: محمد اطہر بن عبد الجلیل اررریہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سود بھرنے کی جو شکل لکھی گئی ہے، یہ قرضہ لے کر زمین کو رہن رکھنے کی شکل ہے، مالک زمین کو جو پیسہ قرض میں دیا گیا ہے اس کی وصولیابی کے اعتماد کے لیے زمین رہن میں ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر قرض وصول نہ کر سکے تو زمین بیچ کر اپنا قرض وصول کیا جا سکے، لیکن اس درمیان زمین سے فائدہ حاصل کرنا مرتہن کے لیے جائز نہیں ہے، اس لیے یہ معاملہ شرعاً فاسد ہے، اس کے جواز کی صرف یہ شکل ہو سکتی ہے کہ مرتہن اس زمین کا ہر فصل کے لیے کرایہ متعین کردے، اور جو قرضہ مالک زمین نے لے رکھا ہے اس قرضہ سے کرایہ مجریٰ ہوتا جائے، اس کے بغیر یہ جائز نہیں ہو سکتا ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۱/۳۱۵، جدید ڈابھیل ۲۰/۱۳۵)

لایحل للمرتهن أن ینتفع بشيئ منه بوجه من الوجوه و إن أذن له الراهن لأنه أذن له في الربا. (شامی، کتاب الرهن، زکریا ۱۰/۸۳، کراچی ۶/۴۸۲، مطلب: کل قرض جر نفعاحرام، زکریا ۷/۳۹۵، کراچی ۵/۱۶۶، مجمع الأنهر، مصری قدیم ۲/۵۸۸، دار الکتب العلمیة بیروت ۴/۲۷۳، ۲۷۴)

ولیس للمرتهن أن ینتفع بالرهن لا باستخدام و لا سکنیٰ ولا لبس.

(هدایه، کتاب الرهن، اشرفی ۴/۵۲۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۶۱۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳؍۴؍۱۴۲۳ھ

زمین سے فائدہ اٹھانے کی شرط پر قرض لینا

سوال [۹۷۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک ایکڑ زمین ایک سال کے لیے آٹھ ہزار روپیہ میں اٹھتی ہے لیکن زمین

والے کوبیس ہزار روپیہ کی ضرورت ہے وہ بات چیت کرتا ہے کہ مجھے بیس ہزار روپیہ دیدو، میری ایک ایکڑ زمین میں ایک سال تک تم کاشت کرو میں تمہیں ایک سال میں بیس ہزار روپیہ واپس کردوں گا، اور اپنی زمین لے لوں گا، اس صورت کو کاشت کار جائز نہ سمجھتے ہوئے صاحب زمین کو پانچ سوروپیہ چھوڑ دیتا ہے بتلایئے یہ صورت جائز ہوگی یانہیں؟

المستفتی: قمر الدین قاسمی معرفت مولانا عبدالناصر صاحب

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگرایک ایکڑ زمین ایک سال تک کے لیے آٹھ ہزار روپیہ میں دیدی جاتی ہے تو آٹھ ہزار روپیہ لے کر زمین کوایک سال تک کے لیے دینا جائز ہے، مگران میں سے کوئی پیسہ پھر واپس نہ ہوگا اب ایک سال کے درمیان کرایہ دار کوکچھ بھی بونے کا حق ہوگا، لیکن جوصورت سوالنامہ میں ہے کہ بیس ہزار روپیہ میں ایک سال کے لیے زمین دے کر بیس ہزار روپیہ ادھارلیا گیا اور سال گذرنے پر بیس ہزار روپیہ واپس کرنے کے بعد زمین واپس ہوگی یہ قطعاً جائز نہیں ہے اس لیے کہ بیس ہزار روپیہ قرض ہوا اور قرض دینے والے نے قرض دے کر ایک سال تک زمین سے فائدہ اٹھایا یہ **''کل قرض جر نفعا''** کے قاعدہ کے تحت داخل ہوکر ناجائز اور حرام ہے اور بعد میں پانچ سوروپیہ چھوڑ دینے سے وہ جائز نہیں ہوگا، کیونکہ معاملہ شروع ہی سے فاسد ہو چکا ہے۔

عن فضالة بن عبيد صاحب النبي ﷺ أنه قال: كل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربا. (السنن الكبریٰ للبیهقی، البیوع، باب كل قرض جر منفعة فهو ربا، دار الفكر ۲۷۶/۸، رقم: ۱۱۰۹۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ذیقعدہ ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۱۸۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۱۱/۴ھ

ارض مرہونہ سے فائدہ اٹھانا

سوال [۹۷۷۷]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: زید نے بکر سے پانچ ہزار روپیہ لیا اور بکر کو زید نے ایک بیگہ زمین اس کے عوض میں دی اور اس سے یہ کہا کہ جب تک میں پانچ ہزار روپیہ واپس نہ کردوں آپ اس کی پیدا وار کھاتے رہیں اور اس کھیت کو جس طرح چاہیں استعمال کریں، جب میں تمہارے روپئے واپس کردوں گا، تو تم میرے حوالے وہ کھیت کردینا اس صورت میں شریعت کی رو سے اس طرح کا تبادلہ روپئے کے عوض صحیح ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد حبیب الرحمٰن بھاگلپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پانچ ہزار روپیہ قرض دے کر مقروض کی ایک بیگھہ زمین جو بطور رہن ہے اس سے پیداوار وغیرہ کے ذریعہ نفع اٹھانا جائز نہیں اور یہ شرعاً سود ہے جس کا لین دین مسلمانوں کے لیے ناجائز اور حرام ہے، لہٰذا از روئے شرع مذکورہ تبادلۂ جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/۴۵۴)

لایحل للمرتهن أن ينتفع بشيئ منه بوجه من الوجوه و إن أذن له الراهن لأنه أذن له فى الربا لأنه يستوفىٰ دينه كاملا فتبقى له المنفعة فضلا فتكون ربا وهذا أمر عظيم. (شامی، کتاب الرهن، زكريا ١٠/٨٣، كراچی ٦/٤٨٢، مطلب: كل قرض جر نفعا حرام، زكريا ٧/٣٩٥، كراچی ٥/١٦٦، مجمع الأنهر، مصری قديم ٢/٥٨٨، دار الكتب العلمية بيروت ٤/٢٧٣، ٢٧٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ربیع الاول ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۰۸۸)

ارض مرہونہ سے فائدہ اٹھانے کا حیلہ

سوال [۹۷۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے اپنی ایک بیگھہ زمین خالد کو دوسال کے لیے ایک ہزار روپیہ کی شرط

پر دیدی پھر دو سال گذرنے کے بعد زید نے خالد کو ایک ہزار روپیہ دے کر زمین واپس لے لی تو خالد کے لیے اس زمین میں دو سال تک پیداواری کرنا اور غلہ کو اپنے مصرف میں لانا جائز ہے یا نہیں یا سود کے حکم میں داخل ہو جائے گا۔

المستفتی: صغیر الدین دیناجپور مدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں خالد کے لیے اس زمین سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔

لأن المرتهن لايجوز له الانتفاع. (بدائع الصنائع، كتاب الرهن، زكريا ٥/ ٢١٠، كراچی ٦/ ١٤٥، شامی زكريا ١٠/ ٨٣، كراچی ٦/ ٤٨٢، هدايه اشرفی ٤/ ٥٢٢)

البتہ بیع الامانۃ کے طور پر اس کی صورت نکل سکتی ہے، یعنی جتنے روپئے میں زمین کو رہن رکھا اتنے ہی روپئے میں زبانی طور پر یہ عقد کرلیا جائے کہ اتنے روپئے میں مرتہن کے ہاتھ اس طور پر فروخت کردے، کہ جب بھی زمین والا اتنے روپیہ مہیا کر کے مرتہن کو پیش کرے گا، تو دوبارہ اتنے روپئے میں مالک کے ہاتھ فروخت کردے گا، البتہ رجسٹری کا معاملہ اس میں نہ کرے لہٰذا اس طرح سے دونوں کی ضرورت بلا کسی نقصان کے پوری ہوجائے گی۔

وصورته أن يقول البائع للمشترى بعت منک هذا العين بدين لک على أنى متى قضيت الدين فهو لى أويقول البائع بعتک هذا بكذا على أنى متى دفعت لک الثمن تدفع العين إليَّ. (البحر الرائق، كتاب البيوع، باب خيار الشرط، كوئٹه ٦/ ٧، زكريا ٦/ ١١، شامی زكريا ٧/ ٥٤٦، كراچی ٥/ ٢٧٦، هنديه زكريا قديم ٣/ ٢٠٩، جديد ٣/ ١٩٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

كتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸ر محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۰۱۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱/۸ھ

ارض مرہونہ سے فائدہ اٹھانے کی شکل

سوال [۹۷۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک آدمی نے اپنی ایک بیگہ زمین کسی کے پاس دو ہزار روپیہ کے عوض رہن رکھی، اور کہا تم میری زمین سے نفع حاصل کرتے رہو جب میں تمہارا دو ہزار روپیہ واپس کروں گا تب میری زمین میرے حوالہ کرنا تو کیا اس طرح رہن رکھنا درست ہے۔

المستفتی: امین الحق آسامی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زمین رہن رکھ کر دو ہزار قرضہ لینے کے لیے یہ شرط لگانا کہ قرضہ کی وصولی تک آپ زمین سے فائدہ ونفع حاصل کرتے رہیں، یہ معاملہ شرعاً جائز نہیں اور نہ ہی قرض دینے والے کے لیے رہن شدہ زمین سے فائدہ حاصل کرنا شرعاً درست ہے۔

لأن المرتهن لايجوز له الانتفاع. (بدائع الصنائع، كتاب الرهن، زكريا ٥/ ٢١٠، كراچی ٦/ ١٤٥، شامی زكريا ١٠/ ٨٣، كراچی ٦/ ٤٨٢، هدايه اشرفی ٤/ ٥٢٢)

البتہ اس کے جواز کی شکل بیع الامانت کی ہوسکتی ہے اور بیع الامانت کا مطلب یہ ہے کہ جتنے روپیہ میں زمین کو رہن رکھا جائے اتنے میں زبانی عقد کرلیا جائے کہ اتنی رقم میں مرتہن کے ہاتھ اس شرط پر فروخت کردے کہ جب بھی زمین والا اتنا پیسہ مہیا کرکے زمین لینے والے کو پیش کردے گا تو اس پیسہ میں مالک کے ہاتھ دوبارہ فروخت کردے گا، اس معاملہ میں رجسٹری وغیرہ نہ کرائے تو اس طرح سے دونوں کا مقصود پورا ہوجائے گا کہ دو ہزار قرضہ زمین کی قیمت کے نام سے مل گیا اور روپیہ دینے والے کو زمین سے نفع اٹھانے کا موقع بھی مل گیا اور جب دو ہزار کا انتظام کرکے قرض خواہ کو واپس کرے گا تو زمین بھی واپس مل جائے گی۔

وصورته أن يقول البائع للمشترى بعت منك هذا العين بدين لك علی أنی متی قضيت الدين فهو لی. (البحر الرائق، كتاب البيوع، باب خيار الشرط،

کوئٹہ ۶/۷، زکریا ۶/۱۱، شامی زکریا ۷/۵۴٦، کراچی ۵/۲۷٦، ہندیہ زکریا قدیم ۳/۲۰۹، جدید ۳/۱۹٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷رمحرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۰۰۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/۱/۱۴۲۲ھ

شیٔ مرہون سے نفع اٹھانے کا عدم جواز

سوال [۹۷۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے کاروباری ضرورت کے لیے بکر سے ایک بڑی رقم تین سال کے لیے بطور قرض لی، اور تین سال کے لیے اپنے ذاتی مکان کے مالکانہ حقوق بکر کو دیدئے، لیکن بکر اس مکان کو کرایہ پر دینا چاہتا ہے، زید نے بکر سے کرایہ کی رقم طے کرکے وہ مکان اس وقت تک کے لیے لے لیا جب تک وہ بکر کی ملکیت میں ہے تین سال کے اندر زید نے تھوڑی تھوڑی کرکے رقم ادا کردی اور ہر ماہ مکان کا کرایہ بھی ادا کرتا رہا، آخر میں رقم ادا ہونے پر مالکانہ حقوق اور مکان کے کاغذات واپس لے لیے، اس طرح کا قرض لینا اور کرایہ کی رقم ادا کرنا جائز ہے یا نہیں، شرعی جواب سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی: صدر علی بردوانی مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: بطور قرض رقم لینے کا مطلب یہ ہے کہ یہ معاملہ شرعاً رہن کا معاملہ ہے، اور معاملۂ رہن میں مرتہن کے لیے شیٔ مرہون سے کسی طرح بھی نفع اٹھانا جائز نہیں ہے، اس لیے صورت مذکورہ میں بکر مذکورہ مکان کو بطور امانت محفوظ رکھ سکتا ہے، اس میں رہائش اختیار کرنا یا کسی کو کرایہ پر دے کر کرایہ وغیرہ کے نام سے کوئی رقم حاصل کرنا بکر کے لیے حلال نہیں ہے، بلکہ زید کو واپس کردینا واجب ہے۔

ولو أعار المرتهن من الراهن أو آجره أو أودعه كان للمرتهن أن

یسترده و الإجارة باطلة. (قاضیخان، کتاب الرهن، فصل فی الانتفاع بالرهن، زکریا جدید ۳/۴۴۸، وعلی هامش الهندیة ۳/۶۰۲)

وإن آجـر بأمر الراهن بطل الرهن والأجر للراهن. (فتاویٰ بزازیه زکریا جدید ۳/۳۷، وعلی هامش الهندیة ۶/۷۲)

لایحل للمرتهن أن ینتفع بشیئ منه بوجه من الوجوه و إن أذن له الراهن لأنه أذن له فی الربا لأنه یستوفیٰ دینه کاملا فتبقی له المنفعة فضلا فتکون ربا وهذا أمر عظیم. (شامی، کتاب الرهن، زکریا ۱۰/۸۳، کراچی ۶/۴۸۲، مطلب: کل قرض جر نفعاحرام، زکریا ۷/۳۹۵، کراچی ۵/۱۶۶، مجمع الأنهر، مصری قدیم ۲/۵۸۸، دار الکتب العلمیة بیروت ۴/۲۷۳، ۲۷۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۴۷۴)

گروی رکھے ہوئے مکان کو چھڑانے کے بعد کون مالک ہوگا؟

سوال [۹۷۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حاجی چھوٹن کا انتقال ہوا بوقت انتقال انہوں نے ورثاء میں زوجہ انوری بیگم لڑکا مختار احمد، لڑکی نور جہاں بیگم کو چھوڑا، اس کے بعد لڑکے مختار احمد کا انتقال ہوا، بوقت انتقال ماں انوری بیگم تین لڑکے: استفسار احمد، امتیاز احمد، جاوس اور تین لڑکیاں: میسر جہاں، قیصر جہاں، منی اور اپنی زوجہ اخلاصی بیگم کو چھوڑا حاجی چھوٹن نے اپنے انتقال کے وقت ایک مکان چھوڑا وہ مکان گروی رکھا ہوا تھا، حاجی چھوٹن کے انتقال کے بعد زوجہ انوری بیگم اور لڑکا مختار احمد اور لڑکی نور جہاں بیگم کے نام وہ مکان واپس لیا گیا اور تمام پیسے زوجہ انوری بیگم نے ادا کیے، تو اب شرعی نقطۂ نظر سے وہ مکان کس طرح تقسیم ہوگا؟

نوٹ: مختار احمد کی زوجہ اخلاصی بیگم کو مختار احمد نے اپنی حیات میں ہی طلاق دیدی تھی لیکن

اب وہ زبردستی اسی مکان میں رہتی ہے اور اپنا حصہ مانگتی ہے، اور مختار احمد کی مذکورہ اولاد بھی اسی اخلاصی بیگم سے ہے اور زوجہ انوری بیگم اپنا حصہ بیٹی نور جہاں کو ہبہ کرنا چاہتی ہے تو کیا ہبہ کرسکتی ہے؟

المستفتی: انوری بیگم، پکا باغ گل شہید مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ما تقدم وعدم موانع ارث مرحوم چھوٹن کا ترکہ ان کے شرعی ورثاء میں حسب ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا۔

چھوٹن میـــــــــــــــــــــــــــــت

زوجہ	لڑکا	لڑکی
اندری بیگم	مختار احمد	نور جہاں
۱ / ۳ / ۸۱	۷ / ۱۴	۷

توافق بالنصف

مختار احمد میـــــــــــــــــــــــــــــت

زوجہ	ماں	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی
خلاصی بیگم محروم	۱ / ۹	۱۰ / ۷۰	۱۰ / ۷۰	۱۰ / ۷۰	۵ / ۳۵	۵ / ۳۵	۵ / ۳۵

کل مکان ۶۴۸ سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا ملے گا جو اس کے نیچے درج ہے، اگر انوری بیگم نے اپنی خوشی سے تمام پیسے ادا کیے ہیں تو اس کا عوض نہیں ملے گا اور اگر تمام ورثاء کی اجازت سے ادا کیے تو جتنے پیسے انوری بیگم نے ادا کیے ہیں وہ اس کو مکان کی قیمت سے علیحدہ ملیں گا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱؍ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۶۱۴)

٣٤ كتاب الصيد

شکار کا مسنون طریقہ

سوال [۹۷۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جن جانوروں کا گوشت حلال ہے ان کے شکار کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

المستفتی: محمد اقبال شمسی ہاؤس، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جن جانوروں کا گوشت حلال ہے ان کے شکار کے بہت سے مسنون اور شرعی طریقے ہیں، ان میں تیر، کلب، باز، چیتا، معلم وغیرہ کے ذریعہ شکار کرنا ہے، ان کو بسم اللہ پڑھ کر شکار پر چھوڑا جائے، اگر یہ شکار کو اس طرح زخمی کردے کہ آپ کے پہنچنے سے پہلے ہی شکار زخم کی وجہ سے مرجائے تو اس کا کھانا حلال ہوگا، اور اگر شکاری نے شکار کو پکڑ لیا یا تیر دھار دار کی طرف سے شکار کو نہیں لگا تو ایسی صورت میں شرعی طریقہ پر ذبح کیے بغیر اس کا کھانا جائز نہ ہوگا۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ۱۱/۵۳۷، ۱۴/۳۵۴، ۶/۳۱۹، جدید ڈابھیل ۱۷/۲۱۷، ۲۱۵)

﴿قال الله تعالىٰ: يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا اُحِلَّ لَهُمْ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ فَكُلُوْا مِمَّا اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوْا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ. [المائدة: ٤]﴾

فالصيد هو الحيوان المتوحش الممتنع عن الآدمي مأكولا أو غير مأكول. (هنديه، كتاب الصيد، الباب الأول، زكريا قديم ٥/٤١٧، جديد ٥/٤٧٤، هدايه، اشرفي ديوبند ٤/٥٠١، شامي، زكريا ١٠/٤٦، كراچي ٦/٤٦١، البحر الرائق، كوئٹه ٨/٢٢٠، زكريا ٨/٤٠٦، تاتارخانية زكريا ١٨/٤٤٤، رقم: ٢٩٥٣٣)

ويجوز الاصطياد بكلب المعلم والفهد والبازي وسائر الجوارح المعلمة. (هدايه اشرفي ديوبند ٤/٥٠٢، شامي زكريا ١٠/٤٨، كراچي ٦/٤٦٣، البحر الرائق

کوئٹه ۸/ ۲۲۰، زکریا ۸/ ۴۰۶، تاتارخانیة ۱۸/ ۴۶۶، رقم: ۲۹۶۰۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۲۱۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۵/۱۰ھ

بندوق کے شکار کا شرعی حکم

سوال [۹۷۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کسی شخص نے بسم اللہ پڑھ کر بندوق سے شکار کیا اور خون بھی نکلا، بغیر ذبح کیے ہوئے مر گیا تو اس کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: فضل الرحمٰن مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خون نکلنے کے باجود بغیر ذبح کیے ہوئے گولی کا شکار کھانا حلال نہیں ہوتا ہے اس لیے کہ گولی درحقیقت دھار اور نوک سے ذبح نہیں کرتی، بلکہ اپنی قوت مدافعت کے ذریعہ توڑتی اور کوٹتی چلی جاتی ہے اور جو خون گولی سے نکلا ہے وہ چوٹ کا ہوتا ہے کاٹ کا نہیں ہوتا۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۸/ ۲۶۰، جدید زکریا مطول ۱۱/ ۶۰۰، فتاویٰ احیاء العلوم ۱۸/ ۲۴۰، امداد الفتاویٰ ۳/ ۲۱۹)

عن ابن عمر: أنه كان لا يأكل ما أصابت البندقة والحجر. (مصنف ابن أبي شيبة، الصيد في البندقة والحجر يرمى به فيقتل، مؤسسة علوم القرآن بيروت ۱۰/ ۴۰۸، رقم: ۲۰۰۸۷)

وقال ابن عمر في المقتولة بالبندقة: تلك الموقوذة، وكرهه سالم والقاسم ومجاهد وإبراهيم وعطاء والحسن. (صحيح البخاري، الذبائح والصيد، باب صيد المعراض ۲/ ۸۲۳)

لايحل صيد بندقة والحجر والمعراض والعصا وما أشبه ذٰلك وإن جرح. (شامي، كتاب الصيد زكريا ديوبند ۱۰/ ۶۰، كراچي ۶/ ۴۷۱)

ولا یوکل ما أصابه البندقة فمات بها لأنها تدق و تکسر، و لاتجرح فصار کالمعراض. (هدایه اشرفی دیوبند ٤/٥١١، تبیین الحقائق امدادیه ملتان ٦/٥٩، زکریا دیوبند ٧/١٢٩، هندیه زکریا قدیم ٥/٤٢٥، جدید ٥/٤٨٢، تاتارخانیة زکریا ١٨/٤٧٥، رقم: ٢٩٦٤١)

بندوق آلۂ جارحہ (قاطعہ) نہیں ہے بلکہ آلہ مکرہ اورمدقہ ہے۔

لأنها تدق و تکسر ولا تجرح فصار کالمعراض. (هدایه اشرفی دیوبند ٤/٥١٢)

و البندقیة لاتجرح. (تبیین الحقائق امدادیه ملتان ٦/٥٩، زکریا دیوبند ٧/١٢٩، الجوهرة النیرة امدادیه ملتان ٢/٢٧٣، دار الکتاب دیوبند ٢/٢٦٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ / ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۷۷۶)

چھری اوپر پھینکنے سے ٹڈی کی حلت اور نیچے پھینکنے سے مچھلی کی حلت کا حکم

سوال [۹۷۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مچھلی اور ٹڈی بغیر ذبح کیے ہوئے کیوں حلال ہیں؟ اس کے بارے میں ایک شخص کہتا ہے کہ کسی نے چھری اوپر کو پھینکی تو ٹڈی حلال ہوگئی اور نیچے کو پھینکی تو مچھلی حلال ہوگئی اس کا یہ کہنا مناسب ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ میں جو باتیں مذکور ہیں وہ سب بے اصل اور بے بنیاد ہیں بلکہ اس سلسلے میں اصل حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ہمارے لیے ٹڈی اور مچھلی بغیر ذبح کیے ہوئے حلال ہیں اور یہی حلت کی دلیل ہے اس طرح کی روایت متعدد کتب حدیث میں موجود ہے۔

أحلت لنا المیتتان و الدمان المیتتان الحوت و الجراد و الدمان الکبد و الطحال. (مشکوٰۃ شریف ص: ٣٦١)

نیز باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْکُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا أی وهو السمک.

(جلالین، سورۂ نحل: ۱۴، مکتبه رشیدیه دهلی ۱/۲۱۶، روح المعانی زکریا دیو بند ۸/۱۶۵)

اور مچھلی اور ٹڈی دیگر جانوروں کی طرح نہیں ہیں ان میں دم مسفوح نہیں ہوتا اور دم مسفوح کی وجہ سے ذبح کی ضرورت ہوا کرتی ہے، اور مچھلی کے اندر خون جیسی جو چیز نظر آتی ہے وہ محض رطوبت ہے خون نہیں، لہٰذا اس وجہ سے بھی مچھلی اور ٹڈی بغیر ذبح کیے ہوئے حلال ہیں۔ (مستفاد: معارف القرآن اشرفی دیوبند۳/ ۲۸، ۵/ ۳۲۵، فتاویٰ رحیمیہ قدیم۶ /۳۳۷، جدید زکریا ۱۰/۳/۷، محمودیہ قدیم۱۳/ ۴۳۵، جدید ڈابھیل۱۸/ ۲۰۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍رجب المرجب ۱۴۲۱ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۳۵/۶۸۱۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۴؍۷؍۱۴۲۱ھ

غیر مسلم کے گولی مارنے کے بعد مسلم کا شرعی طریقہ سے ذبح کرنا

سوال [۹۷۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے چند ساتھی جانور یعنی ہرن وغیرہ کا شکار کرتے ہیں، ان میں غیر مسلم بھی ہیں لیکن بندوق غیر مسلم لڑکا ہی چلاتا ہے، جانور کے گولی غیر مسلم ہی مارتا ہے پھر اس جانور کو ہمارے مسلم ساتھی شرعی طریقہ سے ذبح کرتے ہیں، کیا یہ ذبیحہ حلال ہے؟ کیا غیر مسلم کے بندوق چلانے سے اس پر کوئی فرق تو نہیں پڑے گا؟

المستفتی: محمد اکرم سیڈھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب شکار اس حالت میں پکڑا جائے کہ اس میں زندگی باقی ہے تو اس کے حلال ہونے کے لیے ذبح شرط ہے اور ذبح بھی مسلمان کے ہاتھ سے بسم اللہ پڑھ کر ہونا لازم ہے اس سے پہلے پہلے غیر مسلم نے اس کو مار کر کمزور کر دیا ہو تو

اس کا اعتبار نہیں بلکہ بوقت ذبح کا اعتبار ہے، اس لیے مسلمان جب اپنے ہاتھ سے ذبح کرتے ہیں تو شکار حلال ہوگا۔ (مستفاد:احسن الفتاویٰ ۷/ ۳۸۷)

فإن أدركه الرامي أو المرسل حيا ذكاه وجوبا فلو تركها حرم والحياة المعتبرة هنا أى فى الصيد ما يكون فوق ذكاة المذبوح. (در مختار مع الشامی، کتاب الصید، کراچی ٦/ ٤٦٩، زکریا دیوبند ١٠/ ٥٥)

ولو أن قوما من المجوس دعوا سهامهم فأقبل الصيد نحو مسلم (إلى قوله) إن كان سهم المجوس لم يقع على الأرض حتى رماه المسلم لم يحل أكله إلا أن يدركه المسلم و يذكيه فحينئذ يحل لأنهم أعانوه فى الرمى دون حقيقة الذكاة ولا معتبر بالرمى مع وجود حقيقة الذكاة. (هنديه زكريا قديم ٥/ ٤٢٦، جديد ٥/ ٤٨٢، ٤٨٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۷۵۴)

دوا کے ذریعہ مچھلی پکڑنا یا کچی مچھلی کھانا کیسا ہے؟

سوال [۹۷۸٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (الف) بڑے تالاب میں دوا ڈال کر مچھلی پکڑنا کیسا ہے نیز تالاب میں دوا ڈالنے کی وجہ سے جو مچھلی خود بخود مر کر اوپر آجاتی ہے اس کا کھانا حلال ہے یا حرام؟

(ب) اور کچی مچھلی یا گوشت کھانا کیسا ہے؟

المستفتی: ہارون رشید کرناٹکی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: (۱) جب مچھلی شکار کرنے کے دوسرے ذرائع موجود ہیں تو دوا کے ذریعہ شکار کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ تالاب میں دوا ڈالنے کی

صورت میں جو بالکل معمولی مچھلیاں ہیں ابھی انڈے سے نکلی ہیں، جو انسان کے کام میں نہیں آتیں، وہ سب بھی مر جائیں گی، تو بلا ضرورت ایسی مچھلیوں کو اس طرح ضائع کردینا لازم آئے گا، جس کی شرعاً اجازت نہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۴/۲۶۳)

وحـرقهـم لكن جواز التحريق و التغريق مقيد إلى قوله بما إذا لم يتمكنوا مـن الـظفـر بهـم بـدون ذٰلک بـلا مشقة عظيمة فإن تمكنوا بدونها فلايجوز.

(شامی، كتاب الجهاد مطلب فی أن الكفار مخاطبون ندبا، كراچی ٤/١٢٩، زكريا ٦/٢١٠)

(ب) اور جو مچھلیاں دوا کی وجہ سے مر کر اوپر آگئی ہیں ان کا کھانا حلال ہے۔

(مستفاد: احسن الفتاویٰ ۷/۳۹۰)

إلقـاء شيئ و كـان يعلم أنها تموت منه قال فی المنع أو أكلت شيئا ألقاه فی الـمـاء لتأكله فماتت منه وذٰلک معلوم (إلى قوله) جميع ما ذكر وهو الأصل فی الحل.

(شامی، كتاب الذبائح، كراچی ٦/٣٠٧، زكريا ٩/٤٤٥، طحطاوی على الدر كوئٹه ٤/١٥٧)

(ج) طبی نقصان نہ ہونے کی صورت میں کچی مچھلی یا گوشت کھانا فی نفسہ حلال ہے مگر انسانی معدہ ایسی چیزوں کا متحمل نہیں ہوتا اور یہ بھی شریعت کا حکم ہے کہ ایسی چیز نہ کھائی جائے جو صحت کے لیے نقصان دہ ثابت ہو، اگر کسی شخص کا معدہ برداشت کر لیتا ہے تو اس کے کھا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۹ رجمادی الثانیہ ۱۴۲۰ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۶۱۹۹)	۱۴۲۰/۶/۹ھ

چھینگر، چھوٹی مچھلی وغیرہ لگا کر بڑی مچھلی کا شکار کرنا

سوال [۹۷۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) چھینگر اور تیلغی از قسم مکوڑا ہے مچھلی پکڑنے والے کانٹے میں لگا کے مچھلی کا شکار کرتے ہیں حکم کیا ہے؟

(۲) چھوٹی زندہ مچھلی کانٹے میں لگاکے سطح آب پر چلائی جاتی ہے اور بڑی مچھلی اس طرح کانٹے میں پھنس جاتی ہے دوسری شکل مچھلی کو سڑا کے شکار کرنا ہے، الگ الگ حکم تحریر فرمائیں؟

(۳) سیپ کے اندر جو گوشت ہوتا ہے اسکو کانٹے میں لگاکے مچھلی پکڑی جاتی ہے نیز شراب آمیز مصالحہ اور گائے بھینس، بکری وغیرہ کی تلی سے مچھلی کا شکار کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: عبدالکریم آسامی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مذکورہ تینوں قسم کی اشیاء اور جانوروں سے مچھلی کا شکار جائز ہے، مگر شرط یہ ہے کہ زندہ جانور کو کانٹے میں نہ لگایا جائے، بلکہ پہلے اس کو جان سے ماردیا جائے اس کے بعد مردہ چیز کو کانٹے میں لگاکر شکار کیا جائے، زندہ جانور کو اس طرح تکلیف دینا سخت گناہ ہے۔

أن رسول الله ﷺ لعن من اتخذ شيئا فيه روح غرضا. (مسلم، كتاب الصيد والذبائح، باب النهي عن صبر البهائم، النسخة الهندية ۱۵۳/۲، بيت الأفكار رقم: ۱۹۵۸) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۱۵/شوال المکرّم ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۹۹۶/۳۲)

جالی پھندا لگاکر جانور اور گھیسا سے مچھلی کے شکار کا حکم

سوال [۹۷۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جالی اور پھندا لگاکر پرندوں کا یا دیگر حلال جانوروں کا شکار کرنا اسی طرح کانٹے میں گھیسا لگاکر مچھلی کا شکار کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جال اور پھندے سے پرندوں اور حلال جانوروں کا شکار کرنا جائز ہے، اسی طرح کانٹے میں گھیسا لگاکر مچھلی شکار کرنا جائز ہے لیکن

گھیسے کو کانٹے میں لگانے سے پہلے ماردیا جائے اورمردہ حالت میں لگایا جائے۔(مستفاد: امدادالفتاویٰ ۳/ ۵۵۷، فتاویٰ محمودیہ قدیم ۵/ ۱۲۹، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۲۱۸)

عن ابن عباس أن النبی ﷺ قال: لاتتخذوا شيئا فيه الروح غرضا.
(صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، باب النھی عن صبر البھائم، النسخة الھندیة ۲/ ۱۵۳، بیت الأفکار رقم: ۱۹۵۸)

أن من نصب شبكة فتعقل بها صيد ملكه صاحب الشبكة. (عالمگیری، کتاب الصید، الباب الثانی، زکریا قدیم ۵/ ۴۱۷، جدید ۵/ ۴۷۴، شامی کراچی ۶/ ۴۶۲، زکریا ۱۰/ ۴۷، تاتارخانیة زکریا ۱۸/ ۴۵۳، رقم: ۲۹۵۵۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۴۳۵)

زندہ جانور کو کانٹے میں پھنسا کر مچھلی کا شکار کرنا

سوال [۹۷۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم لوگ اکثر مچھلی کے شکار میں جاتے ہیں، شکار میں ایک قسم کا سمندری کیڑا زندہ کانٹے میں لگاتے ہیں، ایک دوست پاکستان سے آیا، اس نے بتایا یہ حرام ہے، جاندار کو کانٹے میں لگاتے ہو اس طرح تکلیف پہنچانا حرام ہے، ہم لوگ پریشان ہوگئے کیونکہ چار پانچ سال سے ہم لوگ ایسے ہی شکار کھیلتے چلے آرہے ہیں؟

المستفتی: حبیب اللہ تاج شارجہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: زندہ جانور (کیڑا) کو کانٹے میں پھنسا کر شکار کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں تعذیب حیوان ہے، ہاں اس کو مار کر کانٹے میں پھنسا کر شکار کرنا جائز ہے۔(مستفاد: فتاویٰ رشیدیہ قدیم ۵۹۶، جدید زکریا ۵۸۸)

عن سعيد بن جبير قال: إن رسول الله ﷺ لعن من اتخذ شيئا فيه الروح غرضا. (صحيح مسلم، كتاب الصيد والذبائح، باب النهى عن صبر البهائم، النسخة الهندية ۲/۱۵۳، بيت الأفكار رقم: ۱۹۵۸)

ويكره تعليم البازي بالصيد الحى يأخذه ويعذبه ولا بأس بأن يعلم بالمذبوح كذا فى المحيط. (هنديه، كتاب الكراهية، الباب الحادى والعشرون، زكريا قديم ۵/۲۶۳، جديد ۵/۴۱۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ربیع الاول ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۶۹۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۳/۲۲ھ

سیلاب سے آئی ہوئی مچھلیوں کو پکڑنا

سوال [۹۷۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں کا عام رواج ہے کہ جو ندی سیلاب سے بھرتی ہے اور سیلاب ہی کے ذریعہ اس میں مچھلی آتی ہے تو آس پاس کے لوگ اس ندی کے خریدار سے مفت میں سالن اور ترکاری کے نام پر مچھلی لے کر کھاتے ہیں، اور ندی کا مالک عام رواج کا خیال کر کے دیتا ہے، نہ کہ دلی خوشی سے تو کیا مفت کی مچھلی کھانا جائز ہے؟

المستفتی: محمد اشتیاق نور قاسمی بھاگلپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سیلاب سے آئی ہوئی مچھلیوں کو پکڑنا ہر شخص کے لیے جائز ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/۵۳۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍شعبان المعظم ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۴۱۵۲)

زندہ مینڈک، چوہیہ، کانٹے میں پھنسا کر مچھلی کا شکار کرنا

سـوال [۹۷۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) درج ذیل جانوروں کے ذریعہ شکار ماہی کرنا کیسا ہے، (۱) گھیسا (۲) مینڈک (۳) چوہیہ زندہ، مردہ گھیسا کا کیا حکم ہے؟

(۲) مینڈک یا مینڈکی زندہ یا مردہ کانٹے میں لگا کر سطح آب پر چھپکی دیتے ہیں یہ شکل ہے، شکار کرنے کی، اس کا حکم کیا ہے؟

(۳) زندہ یا مردہ چوہیہ، مچھلی پکڑنے والے کانٹے میں لگا کے مچھلی پکڑتے ہیں، حکم کیا ہے؟ مدلل جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد اعظم نانگل سوتی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۲-۳) گھیسا، مینڈک اور چوہیہ جب زندہ ہوں تو ان کو کانٹے میں لگا کر اس سے مچھلی شکار کرنا جائز نہیں، شریعت میں زندہ جانوروں کو عذاب وتکلیف دینے کی ممانعت وارد ہے، لہٰذا ان کو مار کر یا جو مرے ہوئے ہوں، ان کے ذریعہ شکار کرنا چاہئے اور ان چیزوں کے ذریعہ شکار کردہ مچھلی بلاشبہ حلال وجائز ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/ ۵۵۷)

عن سعيد بن جبير قال: إن رسول الله ﷺ لعن من اتخذ شيئا فيه الروح غرضا. (صحيح مسلم، كتاب الصيد والذبائح، باب النهى عن صبر البهائم، النسخة الهندية ۲/ ۱۵۳، بيت الأفكار رقم: ۱۹۵۸)

ويكره تعليم البازي بالصيد الحى يأخذه ويعذبه ولا بأس بأن يعلم بالمذبوح كذا فى المحيط. (هنديه، كتاب الكراهية، الباب الحادى والعشرون، زكريا قديم ۵/ ۲۶۳، جديد ۵/ ۴۱۸)

ولايكره أكل الدجاج المخلى و إن كان يتناول النجاسة لأنه لا يغلب عليه

أكل النجاسة. (هنديه كتاب الذبائح، الباب الثاني، زكريا قديم ٥/ ٢٩٠، جديد ٥/ ٣٣٤)

وقتل النملة قيل لا بأس به مطلقا ...... ويكره إلقاؤه في الماء. (البحر الرائق، كتاب الكراهية، فصل البيع، کوئٹہ ٨/ ٢٠٤، زكريا ٨/ ٣٧٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ شعبان المعظم ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۹۷۴)

نیل گائے کا شکار کرتے وقت دماغ پھاڑ ڈالنا

سوال [۹۷۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: نیل گائے کا شکار اس طرح سے کرنا کہ ایک جانب جال لگا کر اور بقیہ سب جانب سے بھگاتے ہیں جب وہ نیل گائے اس جال میں پھانسی کے پھندے کی طرف اپنی گردن پھانس لیتی ہے تو یہ شکاری حضرات اس کے پھنسنے کی حالت میں اتنے ڈنڈے اور لاٹھیاں مارتے ہیں کہ بعض مرتبہ اس کی آنکھیں باہر نکل آتی ہیں اور دماغ پھٹ جاتا ہے، یہ سب عمل اس کو قابو میں لانے کے لیے کرتے ہیں، پھر اس کے بعد ذبح کر کے کھاتے ہیں تو ایسا کر کے کھانا کیسا ہے، یہ ایک شکل ہے دوسری شکل یہ ہے کہ اس کو ذبح کر کے دوری اور مجبوری کی وجہ سے مثلاً ندی کے اس پار شکار کیا اب اس کو اس پار لانے کے لیے ذبح کی ہوئی نیل گائے ندی کے پانی میں ڈال کر بہاتے ہوئے چلے آتے ہیں، جب اپنے گاؤں کے قریب آجاتے ہیں تو اس کو نکال کر آپس میں تقسیم کر کے اس کو کھاتے ہیں، تو ایسا کر کے کھانا یا لاٹھی ڈنڈوں سے مار کر کھانا کیسا ہے؟ حرام، حلال، جائز ناجائز، مکروہ تحریمی یا تنزیہی ہے؟

المستفتی: عبدالسلام غوث گنج ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شکار کو قابو میں لانے کے لیے لاٹھیوں اور ڈنڈوں وغیرہ سے مارنا جائز ہے، لیکن اس طرح مارنا کہ بلا وجہ جانور کو ایذاء اور تکلیف پہنچے

جائز نہیں ہے، کیونکہ شکار کی حلت منصوص ہے، اور جب اسے ذبح کرلیا گیا تو اس کا کھانا بلا کراہت جائز ہے، یہ ایذاء اس کی حلت پر اثر انداز نہیں ہوگی۔

إن لهـذه البهـائـم أوابـد كأوابد الوحش و ما فعل منها هذا فافعلوا به مثل هـذا أى الجرح و القتل، و الظاهر أن السهم أصاب المقتل فمعنى حبسه أى قتله و يحتمل أنه لم يصب المقتل فحينئذ معنى قوله حبسه كفه عن الشرود –إلى– فـإن الـمتوحش إذا ند يكون فى حكم الصيد فإذا أخذ وفيه الحياة المستقرة لم يبق فى حكم الصيد فلا يحل بالذكاة الاضطرارية بل يلزم ذبحه وإلا حرم أكله.

(بـذل الـمـجهود فى حل أبى داؤد، كتاب الضمايا، باب الذبيحة بالمروة، مكتبه يحى سهارنپور ٤/٨٠، دار البشائر الإسلامية بيروت ٩/٥٨٢ تحت رقم الحديث ٢٨٢١)

دوسری شکل میں جب باضابطہ جانور ذبح کے بعد دریا میں ڈال دیا جائے تو جائز ہے، دریا میں ڈالنے سے اس کے اندر کوئی کراہت نہیں آئے گی، ہاں اگر بقدر حیات جان باقی ہو اس وقت دریا میں ڈال دیا جائے تو پھر اس کا کھانا حرام ہے۔

ألا تـرىٰ أنـه لـو وقع فى الماء وهو لهذه الحالة لا يحرم كما إذا وقع بـعـد مـوته لأن موته لايضاف إليه. (البـحـر الـرائق، كتاب الصيد، زكريا ٨/٤١٢، كوئٹه ٨/٢٢٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۶۴۶۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۱/۲۶ھ

گھر کی حفاظت کے لیے کتا پالنا

سوال [۹۷۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اپنے گھر یا دوکان کی حفاظت کے لیے کتا پال سکتے ہیں یا نہیں؟ جبکہ میرا گھر گاؤں کے کنارے پر ہے اور چوروں اور ڈاکوؤں کا خطرہ لگا رہتا ہے۔

المستفتی: ارشد خان شاہد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: احادیث میں کتا پالنے کی سخت ممانعت آئی ہے جہاں کتا ہوتا ہے وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے ہیں۔

لاتدخل الملائكة بيتا فيه كلب و لا تصاوير. (بخاری شریف، کتاب اللباس، باب التصاوير ۲/۸۸۰، رقم: ۵۷۱۶، ف: ۵۹۴۹)

اسی طرح دوسری حدیث میں آیا ہے:

من اقتنى كلبا إلا كلب ماشية أو ضاري، نقص من عمله كل يوم قيراطان. (مسلم شريف كتاب المساقاة والمزارعة، باب الأمر بقتل الكلاب النسخة الهندية ۲/۲۱، بيت الأفكار رقم: ۱۵۷۴)

اس حدیث شریف میں کچھ کتوں کا استثناء بھی کیا گیا ہے اور علماء نے ضرورت شدیدہ کے وقت کتا پالنے کی اجازت بھی دی ہے، مگر وہ کتے بھی دخول ملائکہ سے مانع ہیں۔

قال النووی: والأظهر أنه عام فی كل كلب و كل صورة و أنهم يمتنعون من الجميع لإطلاق الأحاديث. (شرح نووی علی هامش مسلم، کتاب اللباس والزينة، باب تحريم تصوير صورة الحيوان، ۲/۲۰۰، مرقاة شرح مشكوٰة، باب التصاوير امداديه ملتان ۸/۳۲۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ جمادی الاولی ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۶۱۸۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۶/۴ھ

جانی مالی حفاظت کی غرض سے کتا پالنا

سوال [۹۷۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: چوروں اور ڈاکو سے مامون ومحفوظ رہنے کے واسطے اپنے گھر میں کتا پال سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: ایم، زیڈ، شاہد خان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر واقعی چوروں کا شدید خوف ہے اور کتا پالنے سے جان و مال کی حفاظت ممکن ہو تو ایسی صورت میں کتا پالنے کی گنجائش ہے، لیکن آج کل کے زمانے میں ایسی ضرورت کا وجود ناپید ہے، جس کی وجہ سے کتا پالنے کی گنجائش ہو، اس لیے کتا پالنے والے اپنے حالات کو دیکھ کر خود اپنی خیر منائیں۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ۶/۳۷۲، ۶/۳۶۵، ۱۷/۳۶۵، جدید ڈابھیل ۱۹/۴۷۱، ۱۸/۲۶۵، ۲۶۷)

وفي الأجناس لاينبغي أن يتخذ كلبا إلا أن يخاف من اللصوص أو غيرهم ويجب أن يعلم بأن اقتناء الكلب لأجل الحرس جائز شرعاً. (هنديه، كتاب الكراهية، الباب الحادى والعشرون، زكريا قديم ۵/۳۶۱، جديد ۵/۴۱۶، تاتارخانية زكريا ۱۸/۲۲۳، رقم: ۲۸۵۸۰)

وأما اقتناء الكلاب فمذهبنا أنه يحرم اقتناء الكلب بغير حاجة ويجوز اقتنائه للصيد وللزرع وللماشية وهل يجوز لحفظ الدور والدروب ونحوها الخ. (شرح المسلم للنووى، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الأمر بقتل الكلاب ۲/۲۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۲۴۳/۳۵)

شکاری کتے کا ہرن کو مار ڈالنا

سوال [۹۷۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید نے شکار کے لیے ایک کتا پالا، زید اس کو لے کر جنگل گیا اور شکار پر نظر پڑتے ہی بسم اللہ پڑھ کر زنجیر سے کتا کھول کر ہرن کے پیچھے چھوڑ دیا، کتے نے ہرن کو جان سے مار ڈالا، صورت مسئولہ میں کیا اس ہرن کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ زید نے گھر کی حفاظت کے لیے ایک کتا پالا اس کتے کو بسم اللہ

پڑھ کر کسی ہرن کے پیچھے چھوڑ دیا، کتے نے ہرن کو دبوچ کر مار ڈالا تو اس ہرن کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عباس قاسم رام جی والا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) زید نے شکار کے لیے جو کتا پال رکھا ہے اس کتے کو شکار کی تربیت دی گئی ہو اور اس پر مکمل اعتماد ہو چکا ہو کہ اب یہ کتا شکاری بن چکا ہے، اور یہ کوئی بھی شکار کو مارنے کے بعد اس میں سے نہیں کھاتا ہے بلکہ مالک کے پاس لاکر پیش کر دیتا ہے اگر اس طرح تربیت یافتہ کتا ہے اور اس کو بسم اللہ پڑھ کر ہرن پر چھوڑ دیا ہے اور اس نے ہرن کو جان سے مار دیا ہے اور ہرن میں سے کچھ نہیں کھایا تو ایسی صورت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق وہ ہرن حلال ہے، لیکن اگر کتا مکمل تربیت یافتہ نہیں ہے تو ہرن حلال نہیں ہے۔

عن عائذ الله بن عبد الله أنه سمع أبا ثعلبة الخشني قال: قلت: يا رسول الله إنا أهل صيد فقال إذا أرسلت كلبك و ذكرت اسم الله عليه فأمسك عليك فكل، قلت و إن قتل، قال و إن قتل. (ترمذی شریف، أبواب الصيد، باب ماجاء ما يؤكل من صيد الكلب، النسخة الهندية ١ / ٢٧١، دار السلام رقم: ١٤٦٤)

(۲) جو کتا گھر کی حفاظت کے لیے پالا گیا ہے اور اس کو شکار کی تربیت نہیں دی گئی ہے پھر اس کو بسم اللہ پڑھ کر ہرن پر چھوڑ دیا ہے اور اس نے ہرن کو مار ڈالا ہے تو وہ ہرن حلال نہیں ہے، یہ بات سوال (۱) میں آچکی ہے فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۱۷؍رجب المرجب ۱۴۲۸ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۳۷۹/۳۸)	۱۴۲۸/۷/۱۷ھ

مسلمان کے لیے خنزیر کے شکار کی صورت میں قیمت لینے کا حکم

سوال [۹۷۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: زید غیر مسلم مزدوروں کے ساتھ جنگل میں کام کررہا تھا، اسی درمیان وہاں ایک خنزیر آگیا، مزدوروں نے یہ سمجھا کہ یہ غیر مسلموں میں سے کسی کی ملک نہیں ہے بلکہ جنگلی ہے، لہٰذا اسے مار کر گوشت تقسیم کیا، لیکن زید کو انہوں نے گوشت کے بجائے اس کے حصہ کی قیمت دی اور کہا کہ تمہارے مذہب میں اس کا گوشت کھانا جائز نہیں ہے، زید نے قیمت لے کر استعمال کرلی، تو کیا زید کا قیمت لے کر استعمال کرنا درست ہے، اور بعد میں یہ معلوم ہونے پر کہ وہ خنزیر جنگلی نہیں تھا بلکہ گاؤں میں سے کسی کا تھا، اس کی قیمت بھی ادا کرنی پڑی، تو کیا زید کو بھی اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی؟، یہ ضرور بتلایا جائے کہ اپنے حصہ کی قیمت استعمال کرنے سے ایمان میں تو کوئی خرابی نہیں آئی؟

المستفتی: محمد فہیم صفدر گنج، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب بعد میں یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ وہ خنزیر کسی غیر مسلم کی ملکیت تھا تو لی ہوئی قیمت کا واپس کرنا زید کے اوپر واجب ہے، اور زید نے خنزیر بیچا نہیں ہے، بلکہ خنزیر کا پورا قبضہ غیر مسلموں کے ہاتھوں میں رہا ہے، اور انہوں نے اس کو خنزیر سے حصہ دینے کے بجائے حصہ کی قیمت کے نام سے پیسہ دیا ہے اور انہوں نے خود اس بات کی وضاحت کردی ہے کہ تمہارے لیے اس کا گوشت کھانا جائز نہیں ہے اس لیے ہم تمہیں پیسے دے رہے ہیں اور اس میں ایسا بھی نہیں ہے کہ ایک حصہ پر قبضہ کرکے زید نے اسے غیر مسلموں کے ہاتھ بیچا ہو بلکہ غیر مسلموں نے اپنے گمان کے مطابق اس کو ایک مقدار پیسہ دیا ہے، اور بعد میں غیر مسلموں کے عقیدے اور گمان کے مطابق پوری قیمت واپس کرنی پڑی اس لیے زید کو بھی جس سے پیسہ لیا تھا اس کو پیسہ واپس کرنا ضروری ہوگا، اور خنزیر کو غیر مملوک جنگل کا جانور سمجھ کر اس کی قیمت جو زید نے استعمال کی ہے اس کی وجہ سے اس کے ایمان میں کوئی فرق نہیں آئے گا، مگر پھر بھی توبہ واستغفار کرلینا چاہیے۔

إن بلالا قال لعمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ إن عمّالک یأخذون الخمر والخنازیر فی الخراج فقال لاتاخذوھا منھم، ولکن ولوھم ببیعھا وخذوا أنتم من الثمن. (اعلاء السنن، کتاب البیوع، أبواب البیوع الفاسدۃ، باب حرمۃ

بیع الخمر، دار الکتب العلمیة بیروت ۱۴/ ۱۳۴، کراچی ۱۴/ ۱۱۱)

فهذا عمر قد أجاز لأهل الذمة بيع الخمر والخنازير و أجاز للمسلمين أخذ أثمانها في الجزية والخراج وذٰلك بمحضر من الصحابة ولم ينكر عليه منكر. (اعلاء السنن، دار الکتب العلمیة بیروت ۱۴/ ۱۳۵، کراچی ۱۴/ ۱۱۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۰۳۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۴/۲۵ھ

ایذا پہنچانے والی چیونٹیوں کو مارنا

سوال [۹۷۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرا ایک کمرہ ہے جس میں کالی کیڑی (چیونٹی) اتنی زیادہ تعداد میں نکلتی ہیں کہ ساری چھت اور ساری دیواروں پر چیونٹیاں ہی چیونٹیاں نظر آتی ہیں، کمرے میں بیٹھنا اور سونا مشکل ہو جاتا ہے ایسی صورت حال میں کئی بار کمرہ چھوڑ کر باہر نکلنا پڑا، لیکن ٹھنڈک اور ایک بالکل چھوٹے بچے کے ساتھ نکلنا مشکل تھا اس وجہ سے وہ جب بھی نکلیں دوائی ماردی، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی اور باقی ہیں اب اگر چیونٹی اور نکلتی ہیں تو میں کیا کروں، اور جو چیونٹیاں ماردی گئی ہیں ان کے بارے میں میرے لیے شریعت کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد معین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جن چیونٹیوں کی وجہ سے آپ کو گھر چھوڑ کر باہر نکلنا پڑتا ہے، ان کو مارنے میں کوئی گناہ نہیں، مگر جو بلوں کے اندر ہیں ان کو مارنا جائز نہیں، بہتر یہی ہے کہ کمرہ کو خوب صاف رکھا جائے اور جہاں سوراخ ہو اس کو بند کر دیا جائے، ایذاء پہنچانے والی کو مارنے کی گنجائش ہے، اور ایذاء نہ پہنچانے والی کو مارنا ممنوع ہے۔

عن أبی هریرة أن النبی ﷺ قال: نزل نبی من الأنبیاء تحت الشجرة فلدغته نملة فأمر بجهازه فأخرج من تحتها ثم أمر بها فأحرقت فأوحیٰ الله إلیه فهلا نملة واحدة. (مسلم، کتاب قتل الحیات وغیرها، باب النهی عن قتل النمل، النسخة الهندیة ۲/۲۳۶، بیت الأفکار رقم: ۲۲٤۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۵۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۲/۲۱ھ

شوقیہ کتا پالنا کیسا ہے؟

سوال [۹۷۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں شوق میں کتا پال سکتا ہوں یا نہیں؟ کتا پالنے سے ہمارے گھر میں رحمت کے فرشتے آئیں گے یا نہیں؟ کیا میں کتے کی تجارت کرسکتا ہوں؟

المستفتی: محمد جاوید کارخانہ دار، تحصیل اسکول

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شوقیہ کتا پالنا جائز نہیں ہے، اور جس کے گھر میں شوقیہ کتا ہو اس کے گھر میں رحمت کے فرشتے نہیں آتے اور شوقیہ کتے کی تجارت بھی جائز نہیں ہے، حدیث پاک میں آیا ہے کہ اس کی تجارت اور اس کا پیسہ ناپاک اور خبیث ترین پیشہ ہے۔

عن عوف بن أبی جحیفة رضـ **قال: ...... نهی النبی ﷺ عن ثمن الکلب و ثمن الدم.** (صحیح البخاری، باب موکل الربا، النسخة الهندیة ۱/۲۸۰، رقم: ۲۰۳۹، ف: ۲۰۸٦)

عن أبی مسعود الأنصاري رضـ **أن النبی ﷺ نهی عن ثمن الکلب و مهر البغی و حلوان الکاهن.** (صحیح البخاری، باب ما جاء في کسب البغي والإماء، النسخة الهندیة ۱/۳۰۵، رقم: ۲۲۲۷، ف: ۲۲۸۲)

عن رافع بن خدیج رضـ **عن رسول الله ﷺ قال: ثمن الکلب خبیث و**

مهر البغي خبيث. (صحيح مسلم، باب تحريم ثمن الكلب، النسخة الهندية ٢/ ١٩، بيت الأفكار رقم: ١٥٦٨)

نیز حنبلی مسلک کے علماء نے لکھا ہے: کلب معلم کی تجارت بھی ناجائز اور حرام ہے۔

وبيع الكلب باطل وإن كان معلما لايختلف المذهب في أن بيع الكلب باطل أى كلب كان. (المغنى لابن قدامه، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ١٧١)

وطائفة ذهبت إلى تحريم أثمان ما لايحل الانتقام به منها و إباحة أثمان غيرها وهو مذهب أبى حنيفة و أصحابه هو أولىٰ القولين بالقياس. (إعلاء السنن، باب النهى عن بيع الكلب، كراچى ١٤/ ٤٣٠، اعلاء السنن بيروت ١٤/ ٤٩٢)

ويدل لذٰلک أن النهى إنما يتناول الكلاب التى لا نفع فيها. (حاشية چلپى على تبيين الحقائق، كتاب البيوع، باب المتفرقات، زكريا ٤/ ٥٣٠، امداديه ملتان ٤/ ١٢٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۹۶۶)

۳۵ کتاب الذبائح

۱ باب شرائط الذبح وسننه و آدابه

ذبح کرنے کا مسنون طریقہ

سوال [۹۷۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بوقت ذبح جانور کو دائیں پہلو پر لٹایا جائے یا بائیں پہلو پر، صحیح اور مسنون طریقہ کون سا ہے؟ اور حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام نے بوقت ذبح حضرت اسماعیل علیہ السلام کو کس پہلو پر لٹایا تھا؟

المستفتی: محمد عثمان القاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) ذبح کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ جانور کو بوقت ذبح بائیں پہلو پر رو بقبلہ لٹایا جائے اور اپنا دایاں پیر اس کے شانے پر رکھے۔ (مستفاد: مسائل قربانی وعقیقہ ص:۴۵)

واتفقوا على أن اضجاعها يكون على الجانب الأيسر فيضع رجله على الجانب الأيمن. (حاشية أبو داؤد شريف، النسخة الهندية ٢/٣٨٦)

(۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بوقت ذبح اس طرح کروٹ پر لٹایا تھا کہ پیشانی کا ایک کنارہ زمین سے چھونے لگا، لغت کے اعتبار سے یہی تفسیر راجح ہے، اسی لیے حضرت حکیم الامت نے کروٹ پر لٹانے سے ترجمہ کیا ہے بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ اوندھے منھ زمین پر لٹایا تھا تاکہ بیٹے کے چہرے کو دیکھ کر جوش پدری غالب نہ آسکے، بہر حال اول حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سیدھا لٹایا تھا، پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے کہنے پر چہرے کے بل کروٹ سے لٹایا تھا۔ (مستفاد: معارف القرآن مطبوعہ دہلی ۷/ ۴۶۱)

وتـلـه أی صـرعـه علی الأرض للجبین قال ابن عباس أضجعه علی جنبه علی الأرض والجبهة بین الجنبین. (تفسیر مظهری زکریا دیوبند قدیم ۱۲۹/۸ – ۱۳۰، جدید ۸/۸۵، تحت تفسیر رقم الآیة ۱۰۳ من سورة الصافات) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍محرم الحرام ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۶۵۵/۳۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۱/۱۹ھ

بسم اللہ پڑھ کر ذبح کرنا

سوال [۹۸۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر ذبح کرے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: مزمل الحق

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اللہ پاک کے جس نام سے ذبح کریں ذبیحہ درست ہے، لہٰذا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہنے سے ذبیحہ درست ہے اور کھانا بھی جائز ہے، لیکن مستحب طریقہ یہ ہے کہ بسم اللہ اللہ اکبر کہے:

﴿**فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِيْنَ.** [الأنعام: ۱۱۸]﴾

عن أنس قال: ضحی النبی ﷺ بکبشین أملحین أقرنین، ذبحهما بیده، وسمی وکبر، ووضع رجله علی صفاحهما. (صحیح البخاری، باب التکبیر عند الذبح، النسخة الهندیة ۸۳۵/۲، رقم: ۵۳۵۰، ف: ۵۵٦٥، صحیح مسلم، باب استحباب استحسان التضحیة ...... النسخة الهندیة ۱۵۵/۲ بیت الأفکار رقم: ۱۹٦٦)

والشرط فی التسمیة هو الذکر الخالص بأی اسم کان مقرونا بصفة کألله أکبر أو أجل أو أعظم. (شامی، کتاب الذبائح، زکریا ۴۳۷/۹، کراچی ۳۰۱/٦)

وإن قال بسم الله الرحمن الرحیم فهو حسن. (شامی زکریا ۴۳۸/۹،

کراچی ۶/۲/۰۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۴/۶۰۷)

کیا بوقت ذبح بسم اللہ واللہ اکبر کہنا مکروہ ہے؟

سوال [۹۸۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آپ کا رسالہ ندائے شاہی ماہ دسمبر ۲۰۰۷ء کا زیرِ نظر آیا جس میں آپ نے قربانی سے متعلق چند مسائل تحریر فرمائے تھے، صفحہ ۴۶ پر یہ مسئلہ لکھا ہے کہ بوقت ذبح بسم اللہ واللہ اکبر کہنا مکروہ ہے، اس کے برخلاف مشکوٰۃ شریف کے صفحہ ۱۲۷/ پر حضرت انسؓ سے مروی ہے جو کہ متفق علیہ روایت ہے:

عن أنس قال: ضحى رسول ﷺ بكبشين أملحين أقرنين، ذبحهما بيده، وسمى و كبر، ووضع رجله على صفاحهما ويقول بسم الله والله أكبر.

اور صفحہ ۱۲۸ پر احمد، ابوداؤد اور ترمذی کی دوسری حدیث ہے:

ذبح بيده وقال بسم الله والله أكبر اللهم هذا عني و عمن لم يضحي من أمتي.

ان دونوں حدیثوں میں بسم اللہ واللہ اکبر واؤ کے ساتھ ہے، جبکہ آپ نے واؤ کے ساتھ مکروہ بتلایا ہے، بظاہر آپ کے مسئلہ اور مذکورہ احادیث میں تضاد ہے۔

ازراہ کرم دونوں میں تطبیق کی شکل تحریر فرما کر ارسال فرمائیں؟

المستفتی: محمد عبداللہ قاسمی، پرنس میڈیکل اسٹور، گند یوڑ، چھٹمل پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آنجناب نے مشکوٰۃ شریف کے حوالے سے جو حدیث شریف نقل فرمائی ہے وہ صحیح اور درست ہے اور اسی طرح ابوداؤد، ترمذی اور مسلم شریف وغیرہ اکثر کتب حدیث میں واؤ کے ساتھ موجود ہے اس لیے واؤ کے ساتھ تسمیہ کو مکروہ کہنا واقعی خلجان کا باعث ہے، لیکن احقر نے یہ مسئلہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے اول اور پہلے مفتی تھے، اور اپنے زمانہ کے مفتی اعظم کہلاتے

تھے، ان کے فتویٰ سے نقل کر کے اسی کا حوالہ دیا ہے، اور ان سے بھی اس مسئلہ پر اشکال کیا گیا تھا، اس کا جواب انہوں نے تقریباً دو صفحہ میں مدلل پیش کیا ہے جو عزیز الفتاویٰ ۶۹۹ ر میں موجود ہے، نیز درمختار کی عبارت میں بھی واؤ کے ساتھ مکروہ لکھا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

المستحب أن يقول بسم الله ألله أكبر بلا واو و كره بها لأنه يقطع فور التسمية. (در مختار مع الشامی، كتاب الذبائح، زكريا ۹/۴۳۷، كراچی ۶/۳۰۱)

اور ایسی ہی عبارت ہدایہ کی شرح عینی میں بھی ہے:

و ذكر شمس الأئمة الحلواني ويستحب أن يقول بسم الله الله أكبر بدون الواو. (البناية شرح هداية اشرفيه ۱۱/۵۴۹)

اور ہدایہ کے حاشیہ میں بھی اسی طرح واؤ کے ساتھ مکروہ لکھا ہے، اور عالمگیری میں بھی واؤ کے ساتھ مکروہ لکھا ہے، ملاحظہ ہو:

قال البقالي: المستحب أن يقول بسم الله الله أكبر بدون الواو و مع الواو يكره لأن الواو يقطع فور التسمية. (عالمگيرى، كتاب الذبائح، الباب الأول، زكريا قديم ۵/۲۸۸، جديد ۵/۳۳۲)

حضرات فقہاء نے واؤ کے ساتھ اس لیے مکروہ یا خلاف اولیٰ لکھا ہے کہ واؤ کی وجہ سے بسم اللہ اللہ اکبر کے کلمہ کے درمیان فصل واقع ہو جاتا ہے، آنجناب کی طرف سے توجہ دلانے پر احادیث شریفہ کی مختلف کتابیں اس موضوع پر دیکھنے کا اتفاق ہوا تقریباً سب میں واؤ کے ساتھ ہے اور نصب الرایہ میں مستدرک حاکم کے حوالہ سے بغیر واؤ کے ایک حدیث نقل کی گئی ہے، مگر مستدرک کی حدیث ۷۵۷۱ ر میں براہ راست دیکھ لیا گیا ہے، تو اس میں بھی واؤ کے ساتھ مذکور ہے، اس لیے آئندہ کی اشاعت میں ان شاء اللہ اس کی اصلاح کر دی جائے گی، اور واؤ کے ساتھ کو جن فقہاء نے مکروہ کہا ہے وہ واقعی خلجان کا باعث ہے، اس لیے احقر خود بھی اب واؤ کے ساتھ مکروہ یا خلاف اولیٰ نہیں سمجھتا، بلکہ جس طرح بغیر واؤ کے مستحب یا مسنون ہے ایسا ہی واؤ کے ساتھ بھی مسنون ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ ر محرم الحرام ۱۴۲۹ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۴۱۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۱/۶ھ

بسم اللہ کے علاوہ اللہ کے اسماء حسنیٰ اور حمد وثنا کے ذریعہ ذبح کرنا

سوال [۹۸۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ’’الحمد للہ سبحان اللہ‘‘ کہہ کر کسی نے ذبح کیا تو کیا اس سے بھی ذبیحہ حلال ہو جائے گا یا نہیں؟ مدلل تحریر کریں؟

المستفتی: محمد شعیب مانپور مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ’’الحمد للہ، سبحان اللہ‘‘ پڑھ کر جانور کو ذبح کرنے سے بھی ذبیحہ حلال ہو جاتا ہے، بشرطیکہ اس میں تسمیہ کی نیت بھی کی ہو۔

﴿فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِيْنَ. [الأنعام: ۱۱۸]﴾

ولو سبح أو حمد الله أو كبر يريد به التسمية على الذبيحة تحل، وإن لا فلا؛ لأن هذه الألفاظ كناية عن التسمية والكناية إنما تقوم مقام الصريح بالنية. (البحر الرائق، كتاب الذبائح، زكريا ۸/۳۰۷، كوئٹه ۸/۱۶۸، هنديه زكريا قديم ۵/۲۸۵، جديد ۵/۳۳۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۸۱)

قربانی اور عقیقہ کے مشترک جانور میں دعاؤں کی ترتیب کیا ہو؟

سوال [۹۸۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قربانی اور عقیقہ کے مشترک جانور میں دعاؤں کی کیا ترتیب رہے گی، اور یہ ادعیہ کس وقت پڑھیں؟

المستفتی: محبّ الرحمٰن قاسمی سرائے سنبھل

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دعا پڑھنا واجب نہیں ہے بلکہ بسم اللہ اللہ اکبر واجب ہے، لیکن اگر دعا پڑھنی ہے تو جو دعا عقیقہ میں پڑھی جاتی ہے اور جو قربانی میں پڑھی جاتی ہے دونوں کو پڑھ کر پھر تسمیہ پڑھ کر ذبح کردیں، ترتیب میں جس کو چاہے مقدم کرسکتے ہیں۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ ۲/ ۹۵، جدید زکریا ۱۰/ ۲۵، محمودیہ قدیم ۴/ ۲۹۶، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۵۱۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ر ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۰۱۶)

بڑے جانور کو بیٹھے بیٹھے ہی قربان کردینے کا حکم

سوال [۹۸۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سات افراد نے مل کر قربانی کے لیے ایک بڑا جانور ایام اضحیہ سے قبل خریدا، قربانی کے دن نماز عید کے بعد ذبح کے لیے اس کو اٹھانے کی بہت کوششیں ہوئیں لیکن وہ کسی طرح اٹھا نہیں، بیٹھا ہی رہا، مجبوراً لوگوں نے بنیت قربانی وہیں ذبح کردیا، یہ نہیں معلوم کہ جانور بیمار ہوگیا تھا اس کو ٹھنڈک لگ گئی تھی، یا کوئی اور بات تھی، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

(۱) ایسے جانور کی قربانی درست ہوئی یا نہیں؟

(۲) اس میں شریک ہونے والے امیر وغریب کا حکم یکساں ہے یا الگ الگ؟

المستفتی: ابوالمکارم المعروفی مئو

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ جانور کو پتہ چل جاتا ہے کہ اب مجھے ذبح کیا جائے گا تو جانور ڈر کی وجہ سے بیٹھ جاتا ہے اور اٹھانے میں بہت مشکل پیش آتی ہے لہٰذا اگر جانور بظاہر صحیح سالم ہے تو اس کی قربانی درست ہوگئی، خواہ تمام شرکاء مالدار ہوں، یا کچھ مالدار اور کچھ غریب ہوں، سب کی قربانی ادا ہوگئی۔

أمـا مـا يرجع إلى محل التضحية فنوعان: أحدهما سلامة المحل عن العيـوب الفـاحشة فلاتجوز العمياء والمريضة البين مرضها. (بدائع، كتاب التضحية، باب محل التضحية، زكريا ٤/ ٢١٤، كراچی ٥/ ٧٥) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۱۴/ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۵۷۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۴/۱۴ھ

قربانی کے جانور کی تین ٹانگیں باندھ کر گرانا

سوال [۹۸۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کہتا ہے کہ قربانی کے جانور کی تین ٹانگیں باندھ کر گرانا مسنون ہے، عمرو کہتا ہے کہ اس کا ثبوت کہاں ہے؟ مفتی صاحب سے گزارش ہے کہ کتابوں کے حوالہ سے اس کا جواب تحریر فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: قربانی کے جانور کواس طرح ذبح کرنا چاہیے جس میں اسے کم سے کم تکلیف ہو، تین ٹانگیں باندھ کر گرانے میں راحت ہے اس لیے یہ طریقہ مندوب ومستحب ہوسکتا ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ ۱۰/ ٦٩)

احقر کو اس کے متعلق کوئی جزئیہ صراحت سے نہیں ملا مگر روایات سے اس کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔

عـن شـداد بـن أوس قـال: ثنتان حفظتهما عن رسول الله ﷺ قال: كتب عليكم الإحسان على كل شيئ، فإذا قتلتم فأحسنوا القتلة وإذا ذبحتم فأحسنوا الذبح وليحد أحدكم شفرته فليرح ذبيحته. (صحيح مسلم، الصيد والذبائح، باب الأمر بإحسان الذبح، النسخة الهندية ٢/ ١٥٢، بيت الأفكار رقم: ١٩٥٥)

الـمـراد بالإحسان فى طريق القتل و هيئته وهو عام فى كل قتل من الـذبح والقصاص والحدود وغيرها. (تكملة فتح الملهم، الصيد والذبائح، باب

الأمر بإحسان الذبح، اشرفیه ۳/ ۵٤٠)

ويستحب أن يوجهها إلى القبلة ويشد قوائمها. (تاتارخانية زكريا ۳۹۷/۱۷، رقم: ۲۷٦۲۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۹۴)

اونٹ کو لٹا کر ذبح کرنے کے بجائے نحر کرنا

سوال [۹۸۰٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اونٹ کو کیسے ذبح کیا جائے؟ اور کس جگہ پر چھری پھیری جائے؟ اس کی کتنی نسوں کا کٹ جانا لازم ہے؟

المستفتی: عبد اللہ مدھوبنی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اونٹ میں نحر مسنون ہے اور نحر کے بجائے لٹا کر ذبح کرنا ترک سنت کی وجہ سے مکروہ ہے، نحر کا طریقہ یہ ہے کہ کھڑے کھڑے اونٹ کی گردن کے نچلے حصے میں ''بسم اللہ'' پڑھ کر نیزہ یا چھری ماری جائے جس سے ساری رگیں کٹ جائیں اور دم مسفوح نکل جائے۔

عن زياد بن جبير، أن ابن عمر، أتى على رجل وهو ينحر بدنته باركة، فقال: ابعثها قياما مقيدة، سنة نبيكم ﷺ. (صحيح مسلم، باب استحباب نحر الإبل قياما معقولة النسخة الهندية ١/ ٤٢٤، بيت الأفكار رقم: ١٣٢٠، صحيح البخاري، باب نحر الإبل المقيدة النسخة الهندية ١/ ٢٣١ رقم: ١٦٨٢، ف: ١٧١٣)

عبد الرحمن بن سابط، أن النبي ﷺ و أصحابه كانوا ينحرون البدنة معقولة اليسرىٰ قائمة على ما بقي من قوائمها. (سنن أبي داؤد، باب

کیف تنحر البدن النسخة الهندية ۲/۱٤٦، دار السلام رقم: ۱۷٦۷)

وسن نحر الإبل و إنما كان هذا الفعل مسنونا لأنه هذا المنقول عن رسول الله ﷺ قال تعالیٰ: فصل لربک و انحر، والنحر قطع العروق فی أسفل العنق عند الصدر. (البحر الرائق کتاب الذبائح زکریا ۸/۳۱۲، کوئٹہ ۸/ ۱۷۱)

هو قطع عروق الإبل الكائنة فی أسفل عنقها عند صدورها. (الموسوعة الفقهية الكويتية ۴۰/ ۱۲۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۲۹۱)

اونٹ کی گردن تین جگہ سے کاٹنا ممنوع

سوال [۹۸۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: یہاں ہندوستان میں اونٹ کی گردن پر تین جگہ سے چھری پھیری جاتی ہے اس کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد اشتیاق نور قاسمی بھاگلپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اونٹ کی گردن تین جگہ سے کاٹنا جائز نہیں ہے، اس میں جانور کو زیادہ تکلیف ہوتی ہے، بلکہ اس کا نحر کرنا ہی زیادہ بہتر ہے۔

عن شداد بن أوس قال: ثنتان حفظتهما عن رسول الله ﷺ قال: كتب عليكم الإحسان على كل شيء، فإذا قتلتم فأحسنوا القتلة وإذا ذبحتم فأحسنوا الذبح وليحد أحدكم شفرته فليرح ذبيحته. (صحيح مسلم، الصيد والذبائح، باب الأمر بإحسان الذبح، النسخة الهندية ۲/۱۵۲، بيت الأفكار رقم: ۱۹۵۵)

أما الإساءة فلأنه زاد في ألمها زيادة لايحتاج إليها في الذكاة فيكره ذلک. (بدائع الصنائع، کتاب الذبائح، زکریا ٤/۱۵٦، کراچی ۵/٤۲، ہندیہ

زکریاقدیم ٥/٢٨٨، جدید ٥/٣٣٢، هدايه اشرفی ٤/٤٣٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۷/ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ

(الف خاص فتویٰ نمبر: ۱۱۲۸۱/۴۰)

ذبح میں کتنی نسوں کا کٹ جانا لازم ہے؟

سوال [۹۸۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کسی شخص نے ''بسم اللہ اللہ اکبر'' کہہ کر بکرے کو ذبح کیا اور اس نے تین رگیں کاٹ دی تھیں، تین رگیں کاٹنے کے بعد اس سے چھری قصاب نے لے لی، یا اس نے دیدی پھر باقی رگ قصاب نے بغیر بسم اللہ پڑھے کاٹ دی، تو کیا اس کا گوشت کھانا حلال ہوگا یا حرام؟ مدلل تحریر کریں۔

المستفتی: محمد شعیب مانپور مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جانور کے گلے میں چار نسیں ہوتی ہیں (۱) حلقوم: جس کو نرخرہ بھی کہتے ہیں، اسی سے سانس آتا جاتا ہے، (۲) مری جس کے اندر کھانے اور پینے کا راستہ ہوتا ہے، (۳-۴) دائیں بائیں کی شاہ رگیں ہیں، حضرت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ان چار نسوں میں سے ذبح کے صحیح ہونے کی لیے لاعلی التعیین تین نسوں کا کٹ جانا کافی ہے اسی کو حضرت تھانویؒ نے امداد الفتاویٰ ۳/۵۳۷ میں تحریر فرمایا ہے اور حضرات صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک حلقوم اور مری کا کٹ جانا لازم ہے، اور اس کے بعد دونوں شاہ رگوں میں سے کسی ایک کا کٹ جانا کافی ہے، اور امام محمد رحمۃ اللہ کا ایک قول یہ ہے کہ حلقوم اور مری کٹ جانے کے بعد دونوں شاہ رگوں میں سے ہر ایک کا اکثر حصہ کٹ جانا بھی لازم ہے اور اس کو اصح الجوابات سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی میں احتیاط بھی ہے اسی لیے امام محمدؒ کے قول کے مطابق ہی مسئلہ بتادینا زیادہ صحیح ہے۔

إذا قطع الحلقوم والمرئی والودجين فقد أتم الذكاة ...... اختلفت الروايات فی تفسير ذٰلک روی الحسن عن أبی حنيفة وهو قول أبی يوسف الأول أنه إذا قطع الثلاث من الأربعة أی ثلث ما قطع فقد قطع الأكثر ثم رجع أبو يوسف عن هذا وقال: يشترط قطع الحلقوم والمرئی وأحد الودجين وعن محمد رحمة الله أنه يعتبر قطع الأكثر عن كل واحد من هذه الأشياء الأربعة وعنه أيضا إذا قطع الحلقوم والمرئی والأكثر من كل الودجين يحل ومالا فلا قال مشائخنا رحمهم الله وهو أصح الجوابات. (تاتارخانية زكريا ۱۷/۳۹۳، رقم: ۲۷۶۰۸)

فعند أبی حنيفة إذا قطع أكثر الأوداج وهو ثلاثة منها أی ثلاثة كانت وترک واحدا يحل وقال أبو يوسفؒ: لا يحل حتى يقطع الحلقوم والمرئی وأحد العرقين، وقال محمدؒ: لا يحل حتى يقطع من كل واحد من الأربعة أكثره. (بدائع الصنائع زكريا ۴/۱۵۷، كراچی ۵/۴۱)

والعروق التی تقطع فی الذكاة أربعة ...... فإن قطع كل الأربعة حلت الذبيحة وإن قطع أكثرها فكذٰلک عند أبی حنيفة رحمه الله، وقالا: لابد من قطع الحلقوم والمرئی وأحد الودجين والصحيح قول أبی حنيفة رحمه الله لما أن للأكثر حكم الكل، وعن محمد رحمه الله إذا قطع الحلقوم والمرئی والأكثر من كل ودجين يحل ومالا فلا وقال مشائخنا رحمهم الله: وهو أصح الجوابات. (هنديه، كتاب الذبائح، زكريا قديم ۵/۲۸۷، جديد ۵/۳۳۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍رجب المرجب ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/۱۱۵۹۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸؍۷؍۱۴۳۵ھ

دو آدمیوں نے ذبح کیا تین نسوں میں سے ایک یا دو بغیر بسم اللہ کے کاٹیں

سوال [۹۸۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: جانور ذبح کرتے وقت ایک آدمی نے بسم اللہ پڑھ کر چھری چلادی اور تین نسوں میں سے ایک نس کاٹ دی پھر دوسرے نے چھری لے لی، اور دوسرے نے بسم اللہ نہیں پڑھی تو یہ جانور حلال ہے یا نہیں؟ اور اگر پہلے شخص نے بسم اللہ پڑھ کر دو نسیں کاٹ دیں اور دوسرے نے بغیر بسم اللہ کے تیسری نس کاٹی تو کیا حکم ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جانور ذبح کرتے وقت ذابح کے معاون پر بھی بسم اللہ پڑھنا واجب ہے، اگر کسی ایک نے بھی بسم اللہ نہیں پڑھی تو ذبیحہ حلال نہ ہوگا اور ذبح کرتے وقت تین رگوں کا کٹنا ضروری ہے؛ لہٰذا مذکورہ دونوں صورتوں میں ذبیحہ حلال نہ ہوگا، کیونکہ دوسرے آدمی نے تیسری رگ کٹنے سے پہلے چھری لے لی ہے، اور بسم اللہ بھی نہیں پڑھی ہے۔ (مستفاد: محمودیہ ڈابھیل ۱۷/۲۴۳)

رجل أراد أن يضحی فوضع صاحب الشاة يده علی السكين مع يد القصاب حتی تعاونا علی الذبح قال الشيخ الإمام يجب علی كل واحد منهما التسمية حتی لو ترك أحدهما التسمية لايجوز. (هنديه، كتاب الأضحية، الباب السابع فی التضحية عن الغير، زكرياقديم ٥/٣٠٤، جديد ٥/٣٥٠)

إذا قطع الحلقوم والمرئی والأكثر من كل ودجين يؤكل و مالا فلا. (شامی، كتاب الذبائح، زكريا ٩/٤٢٦، كراچی ٦/٢٩٥)

وعن محمد إذا قطع الحلقوم والمرئی والأكثر من كل ودجين يحل و مالا فلا، قال مشائخنا: وهو أصح الجوابات. (هنديه، كتاب الذبائح، زكريا قديم ٥/٢٨٧، جديد ٥/٣٣٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۱۱۲۸۰/۴۰)

حلقوم اور مری کٹ جانا اور دونوں شہ رگوں میں سے اکثر کا کٹ جانا لازم

سوال [۹۸۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کسی شخص نے ''بسم اللہ اللہ اکبر'' کہہ کر بکرے کو ذبح کیا، اور اس نے تین رگیں کاٹ دی تھیں، تین رگیں کاٹنے کے بعد اس سے چھری قصاب نے لے لی، یا اس نے دیدی، پھر باقی رگ قصاب نے بغیر بسم اللہ پڑھے کاٹ دیں تو کیا اس کا گوشت کھانا حلال ہوگا یا حرام؟ مدلل تحریر کریں۔

المستفتی: محمد شعیب مان پور مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جب ذابح نے بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر تین رگیں کاٹ دیں، تو اگر حلقوم مری دونوں رگیں کٹ گئیں اور بقیہ رگوں میں سے ہر ایک میں سے اکثر حصہ کٹ گیا ہو تو جانور حلال ہوگا ورنہ نہیں۔

أصح الأجوبة في الأكثر عنه إذا قطع الحلقوم والمرئى والأكثر من كل ودجين يؤكل و مالا فلا . (شامی، کتاب الذبائح، زکریا ۹/۴۲۶، کراچی ۶/۲۹۵، هندیه زکریا قدیم ۵/۲۸۷، جدید ۵/ ۳۳۰، بدائع الصنائع زکریا ٤/١٥٧، کراچی ٥/٤١، الفتاویٰ التاتارخانية زکریا ۱۷/ ۳۹۳، رقم: ۲۷۶۰۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ ؍ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۲۸۱)

گردن کے اوپر سے مذبوحہ جانور کا شرعی حکم

سوال [۹۸۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کسی نے بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر عمداً کسی جانور کو گردن کے اوپر سے ذبح کیا تو

اس کا کھانا جائز ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: محمد عباس لکھیم پوری، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر گردن کے اوپر کی جانب سے ذبح کرتا ہے اور جان نکلنے سے پہلے ذبح کی رگ کٹ جاتی ہے تو ذبح صحیح اور جانور حلال ہوگا البتہ اس طرح ذبح کرنے میں جانور کو زیادہ تکلیف ہوتی ہے اس لیے یہ فعل مکروہ اور خلاف سنت ہے۔

وإن ذبح الشاة من قفاها فبقيت حية حتى قطع العروق حل لتحقق الموت بما هو ذكاة ويكره لأن فيه زيادة الألم من غير حاجة. (هدايه، كتاب الذبائح، اشرفی ٤/٤٣٩، الفتاویٰ التاتارخانية زكريا ١٧/٣٩٣، رقم: ٢٧٦٠٩، المحيط البرهانی، المجلس العلمی ٨/٤٤٩، رقم: ١٠٧٥٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/۲۶۵۷)

بوقت ذبح غیر مسلم کا جانوروں کو پکڑنا

سوال [۹۸۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعض مرتبہ جانور طاقتور ہوتا ہے اس کو جب ذبح کرنے کے لیے لٹاتے ہیں تو غیر مسلم بھی ہاتھ سے پکڑتے ہیں، مگر ذبح ہم لوگ ہی کرتے ہیں، کیا غیر مسلم کے بوقت ذبح جانور پکڑنے سے ذبیحہ پر کوئی اثر تو نہیں پڑے گا؟

المستفتی: محمد اکرم سیڈھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ذبح میں اعتبار چھری چلانے والے کا ہے اگر مسلمان بسم اللہ پڑھ کر چھری چلاتا ہے تو جانور حلال ہوگا چاہے پکڑنے والا مسلمان ہو یا کافر۔

المسلم إذا ذبح فأمر المجوسی السکین بعد الذبح لم یحرم ولو ذبح المجوسی و أمر المسلم بعده لم یحل. (الفتاویٰ التاتارخانیة زکریا ۱۷/ ۳۹۱، رقم: ۲۷٦۰۱، هندیه زکریا قدیم ۵/ ۲۸۷، جدید ۵/ ۳۳۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۷۵۴)

میتہ کس کو کہتے ہیں؟

سوال [۹۸۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: شریعت میں میتہ کس کو کہتے ہیں؟

المستفتی: محمد عباس لکھیم پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو جانور شریعت کے متعین کردہ ذبح کے بغیر مرجائے وہ میتہ ہے۔

الذکاة شرط حل الذبیحة لقوله تعالیٰ: إلا ما ذکیتم الخ. (هدایه، کتاب الذبائح، اشرفی ٤/ ٤٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲٦۵۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/ ۴/ ۱۴۱۲ھ

ٹڈی اور مچھلی بغیر ذبح کے حلال ہیں یا حرام؟

سوال [۹۸۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ٹڈی اور مچھلی بغیر ذبح کے حلال کب سے ہیں، تخلیق کے وقت سے یا حضور ﷺ

کے زمانہ سے، یہ دونوں مردے حلال کیوں؟ حکمت کیا ہے؟

المستفتی: انورالحق امام بڑی مسجد ہنومان گڈھ راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے پہلے کے احکام کے ہم مکلّف نہیں ہیں، بلکہ ہم اس کے مکلّف ہیں کہ حضورا کرم ﷺ نے جسے حلال کہا ہے اسے حلال سمجھیں اور جسے حرام کہا ہے، اسے حرام جانیں، ٹڈی اور مچھلی کو بغیر ذبح کے حلال بتلایا ہے اس لیے اسے ہم حلال سمجھتے ہیں اور بلا ذبح کے کھاتے ہیں، حضور ﷺ سے پہلے کے زمانہ کی بات ہم کو معلوم نہیں ہے۔

عن ابن عمر رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: أحلت لنا ميتتان و دمان، فأما الميتتان: فالحوت والجراد، وأما الدمان: فالكبد والطحال. (مسند أحمد بن حنبل ۲/ ۹۸، رقم: ۵۷۲۳، سنن ابن ماجه، باب الكبد والطحال، النسخة الهندية ۲/ ۲۳۸، دار السلام رقم: ۳۳۱٤، سنن الدار قطني، كتاب الأشربة وغيرها، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ۱۸٤، رقم: ٤٦۸۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
یکم ذیقعدہ ۱۴۲۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۸۵۸۷)	۱/ ۱۱/ ۱۴۲۵ھ

مذبوحہ جانور کو الٹا لٹکانا

سوال [۹۸۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جانور کے ذبح کرنے کے بعد دونوں پاؤں میں موٹی زنجیر لگا کر الٹا اوپر لٹکانا صحیح ہے یا نہیں؟ کیونکہ پاؤں کی جانب ہلکا ہوتا ہے، الٹا دھڑ وزن دار ہوتا ہے؟

المستفتی: محمد جاوید قریشی، باندرہ ممبئ ویسٹ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جانور ذبح کرنے کے بعد رسی یا زنجیر کے ذریعہ

لٹکانا ٹھنڈا ہونے کے بعد بلا کراہت جائز ہے، چونکہ کراہت کی علت ایذاء پہنچانا ہے اور ٹھنڈا ہونے کے بعد یہ علت نہیں پائی جاتی ہے اس لیے جائز ہے اور ٹھنڈا ہونے سے پہلے یہ علت پائی جاتی ہے، اس لیے مکروہ ہے۔

ویکره أن یجر ما یرید ذبحه برجله إلی المذبح و أن تنخع الشاة قبل أن تبرد یعني تسکن من الاضطراب و بعده لا ألم فلا یکره النخع و السلخ. (هدایه، کتاب الذبائح، اشرفی ٤/٤٣٩، شامی زکریا ٩/٤٢٧، کراچی ٦/٢٩٦، هندیه زکریا قدیم ٥/٢٨٨، جدید ٥/٣٣٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ ذیقعدہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۸۱۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۱۱/۴ھ

مذبوحہ جانور کو ٹھنڈا ہونے تک چھوڑے رکھنا

سوال [۹۸۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جانور، بھینس، گائے یا اونٹ کو ذبح کرنے کے بعد کتنی دیر تک خون نکلنے کے لیے چھوڑنا چاہیے، کوئی وقت کی قید ہے، یا نہیں؟ ذبح کرنے کے بعد کتنی دیر تک چھوڑنا چاہیے؟

المستفتی: محمد جاوید قریشی باندرہ ممبئی ویسٹ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جانور کو ذبح کرنے کے بعد اتنی دیر تک چھوڑ دیا جائے کہ وہ ٹھنڈا ہو جائے اور حرکت بند ہو جائے، ٹھنڈا ہونے سے پہلے کھال اتارنے اور صاف کرنے وغیرہ کو فقہاء حضرات نے مکروہ لکھا ہے۔

عن شداد بن أوس قال: ثنتان حفظتهما عن رسول الله ﷺ قال: کتب علیکم الإحسان علی کل شيء، فإذا قتلتم فأحسنوا القتلة وإذا ذبحتم فأحسنوا الذبح ولیحد أحدکم شفرته فلیرح ذبیحته. (صحیح مسلم، الصید والذبائح، باب الأمر بإحسان الذبح، النسخة الهندیة ٢/١٥٢، بیت الأفکار رقم: ١٩٥٥)

وكره كل تعذيب بلا فائدة مثل قطع الرأس والسلخ قبل أن تبرد. (الدر المختار، كتاب الذبائح، زكريا ۹/۴۲۷، كراچی ۶/۲۹۶، هدايه اشرفی ۴/۴۳۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ ذیقعدہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۸۱۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۱۱/۴ھ

گابھن گائے ذبح کرنا

سوال [۹۸۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک گائے ذبح کرنے کے لیے خرید کرلائی گئی تو کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ گائے گابھن ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ گائے گابھن نہیں ہے، لوگوں میں اختلاف ہوگیا پھر گائے کو ذبح کیا گیا تو ذبح کرنے کے بعد پیٹ سے بچہ نکلا تو اس بچہ کے ضائع ہونے کی وجہ سے ذبح کرنے والا شخص گنہگار ہوگا یا نہیں؟ اور بچہ کا کیا ہوگا؟

المستفتی: صغیر الدین دیناجپوری مدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گائے کو ذبح کرنے کے بعد اگر بچہ زندہ نکلے تو اس کو بھی ذبح کردیا جائے گا، اور اگر چاہے تو پالا بھی جاسکتا ہے، مردہ نکلے تو اس کو پھینک دے، دونوں صورتوں میں گائے کے گوشت کا استعمال جائز اور درست ہے، ذبح کرنے والے پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۲/۸۳، ۹/۳۲۴، جدید زکریا ۱۰/ ۲۷)

فإن خرج من بطنها ولد حيٌّ يفعل بالولد ما يفعل بالأم. (عالمگیری، الباب السادس فی بیان ما يستحب فی الأضحية والانتفاع، زكريا قديم ۵/ ۳۰۲، جديد ۵/ ۳۴۸، شامی زكريا ۶/ ۳۲۲، زكريا ۹/ ۴۶۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۰۱۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱/۱۲ھ

ذبح شدہ گائے کے پیٹ سے بچہ نکلے تو کیا کریں؟

سوال [۹۸۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں قصائی نے ایک گائے کاٹی، اس کے پیٹ میں بچہ نکلا تو لوگوں نے اس گائے کا گوشت نہیں خریدا، اور یوں کہہ دیا کہ یہ حرام ہے، اور یہ جو بچہ نکلا ہے اس کو بھی ذبح کر دیا جائے یا نہیں؟

المستفتی: صغیر الدین مدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گائے کو ذبح کرنے کے بعد اگر بچہ زندہ نکلے تو اس کو ذبح کر دے اور اگر بچہ مردہ نکلے تو ذبح کیے بغیر اس کو پھینک دے، اور دونوں صورتوں میں گائے کا گوشت بلا کراہت جائز و درست ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۲/۸۳، جدید زکریا ۱۰/ ۲۷)

فإن خرج من بطنها ولد حيّ يفعل بالولد ما يفعل بالأم. (عالمگیری، الباب السادس في بيان ما يستحب في الأضحية والانتفاع، زكريا قديم ٥/ ٣٠٢، جديد ٥/ ٣٤٨، شامي زكريا ٦/ ٣٢٢، زكريا ٩/ ٤٦٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ر محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۰۴۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/۱/۱۴۲۳ھ

مسلم شرابی کا ذبیحہ حلال ہے یا نہیں؟

سوال [۹۸۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسلم شرابی بحالت نشہ بغیر بسم اللہ پڑھے اگر ذبح کرے کیونکہ وہ نشہ میں ہے اس لیے بسم اللہ نہیں پڑھی تو کیا یہ ذبیحہ حلال ہوگا اور اگر مسلم شرابی بحالت نشہ بسم اللہ پڑھ لے تو کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد اکرم سیڈھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صبی لا یعقل، مجنون اور سکران کا ذبیحہ حلال

نہیں ہے، لیکن اگر شرابی اس حالت میں ہے کہ وہ مسلمان ہے اور ہوش باقی ہے اور بسم اللہ پڑھ کر ذبح کرے تو ذبیحہ حلال ہو جائے گا۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ جدید ڈابھیل ۱۷/۲۲۷)

﴿فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِيْنَ. [الأنعام: ۱۱۸]﴾

لا تؤكل ذبيحة الصبى الذى لايعقل والمجنون والسكران الذى لا يعقل لكن فى التبيين: ولو سمى ولم تحضره النية صح. (شامی، کتاب الذبائح، زکریا ۹/ ۴۳۰، کراچی ۶/۲۹۷، تبیین الحقائق امدادیه ملتان ۵/ ۲۸۸، زکریا ۶/ ۴۵۲)

فمنها أن يكون عاقلا فلا تؤكل ذبيحة المجنون والصبى الذى لايعقل فإن كان الصبى يعقل الذبح ويقدر عليه تؤكل ذبيحته وكذا السكران. (هنديه زکریا قدیم ۵/ ۲۸۵، جدید ۵/ ۳۲۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۷۵۴)

شیعوں کے ہاتھ کا ذبیحہ حلال ہے یا حرام؟

سوال [۹۸۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: شیعہ کے ہاتھ کے ذبح کیے ہوئے جانور کا گوشت کھانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: شفیع احمد اعظمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غالی شیعہ جو صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کی شان میں مغلظات بکتے ہیں اسی طرح فرقۂ اثنا عشریہ اور فرقہ اسماعیلیہ کے ہاتھ کا ذبیحہ حلال نہیں، بلکہ حرام ہے، اور جو شیعہ فی زماننا ہندوستان میں ہیں وہ سب غالی شیعہ ہیں ان کا ذبیحہ بھی حرام ہے؛ کیونکہ ان سب کے خارج از اسلام اور مرتد ہونے پر تمام علماء اسلام کا اجماع ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۱/ ۲۷۶، جدید زکریا مطول ۱/ ۴۳۵، فتاویٰ مظاہر علوم ۱/۲۱۳، امداد

الفتاویٰ۴/۱۴۱/۵،مجموعۃ الفتاویٰ ۲/۳۹۶،۱/۳۳۰)

عن الحسن بن محمد ابن الحنفية قال: كتب رسول الله ﷺ إلى مجوس هجر يعرض عليهم الإسلام فمن أسلم قبل منه ومن أبى ضربت عليهم الجزية على أن لاتؤكل لهم ذبيحة، ولاتنكح لهم امرأة هذا مرسل و إجماع أكثر الأمة عليه يؤيده. (السنن الكبرىٰ للبيهقى، الضحايا، باب ماجاء فى ذبيحة المجوس، دار الفكر ١٤/ ٢٢١، رقم: ١٩٧٠٨)

فلاتؤكل ذبيحة أهل الشرك والمرتد؛ لأنه لايقر على الدين الذى إنتقل اليه. (فتاوىٰ عالمگیری، كتاب الذبائح، زكريا قديم ٥/ ٢٨٥، جديد ٥/ ٣٢٨، زكريا ٩/ ٤٣١، ٤٣٢، كراچى ٦/ ٢٩٨، كوئٹه ٥/ ٢٠٩، هدايه اشرفى ٤/ ٤٣٤) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۲۶/ ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۵۸۰)

بیمار گائے کا گوشت کھانا

سوال [۹۸۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی جانور کسی وجہ سے بیمار ہے اور مرنے کے قریب ہے تو اس کو ذبح کر کے اس کا گوشت کھانا کیسا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بیمار جانور کو اگر ذبح کر دیا جائے تو اس کا گوشت کھانا حلال اور درست ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۲/ ۸۳، جدید زکریا ۱۰/ ۲۷)

عن ابن عمر: أن امرأة كانت ترعى لآل كعب بن مالك غنما بسلع، فخافت على شاة منها أن تموت، فأخذت حجرا فذبحتها به و إن ذلك ذكر لرسول الله ﷺ فأمرهم بأكلها. (سنن الدارمى، باب ما يجوز به

الذبح، دار المغنی ۲/۱۲۵۵، رقم: ۲۰۱٤، صحیح البخاری، باب انهر الدم من القصب والمروة والحدید، النسخة الهندیة ۲/۸۲۷، رقم: ۵۲۸۷، ف: ۵۵۰۱)

ذبح شاة مریضة حلت. (شامی، کتاب الذبائح، زکریا۹/٤٤۷، کراچی ٦/۳۰۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ جمادی الثانی ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۲۴۷)

مرغی کو بلی کے منھ سے چھڑا کر فوراً ذبح کرنا

سوال [۹۸۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مرغی کو بلی کے منھ سے چھڑا کر فوراً ذبح کرلیا، خون نکلا، لیکن حرکت محسوس نہیں ہوئی تو اسے کھانا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد سالم محلّہ بھٹی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرغی کو بلی سے چھڑانے کے بعد فوراً ذبح کرتے وقت اسی طرح خون نکلتا ہو جیسے زندہ صحیح مرغی ذبح کرتے وقت نکلتا ہے تو اس کا کھانا جائز ہے، اگرچہ اس کی حرکت کا احساس نہ ہو۔

عن أبی مرة، مولی عقیل أنه وجد شاة لهم تموت فذبحها فتحرکت قال: فسألت زید بن ثابت فقال: إن المیتة لتتحرک، قال: وسأل أبا هریرة فقال: کلها إذا طرفت عینها أو تحرکت قائمة من قوائمها. (مصنف عبد الرزاق، المناسك، باب ذكاة البهیمة وهی تتحرك، المجلس العلمی ٤/٤۹۹، رقم: ۸٦۳٦)

ذبح شاة مریضة فتحرکت أو خرج الدم کما یخرج من الحی حلت وإلا لا إن لم یدر حیاته عند الذبح وإن علم حیاته حلت مطلقا وفی شرح

الطحاوی خروج الدم لا یدل علی الحیاۃ إلا إذا کان یخرج من الحی عند الإمام وهو ظاهر الروایة. (شامی، کتاب الذبائح، زکریا ۹/۴٤۷، کراچی ٦/۳۰۸، مجمع الأنهر، مصری قدیم ۲/۵۱۵، دار الکتب العلمیة بیروت ٤/۱٦٤، تبیین الحقائق امدادیه ملتان ۵/۲۹۷، زکریا ٦/ ٤٧١-٤٧٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ جمادی الاول ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۰۴۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۵/۱۶ھ

کنویں میں افتادہ بھینس کا ذبح

سوال [۹۸۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بھینس کنویں میں گر جائے تو اس کے ذبح کرنے کا کیا طریقہ ہوگا؟

المستفتی: عبد الحمید بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: بھینس وغیرہ اگر کنویں میں گر جائے اور شرعی طور پر اسے ذبح کرنا مشکل ہو تو کہیں بھی بسم اللہ پڑھ کر اس کے ایسا زخم لگا دیا جائے جس سے خون بہہ جائے تو کافی ہے۔

عن عباية بن رفاعة عن جده رافع قال: كنا مع النبي صلى الله عليه وسلم في سفر، فند بعير من الإبل، قال: فرماه رجل بسهم فحبسه، قال: ثم قال: إن لها أوابد كأوابد الوحش، فما غلبكم منها فاصنعوا به هكذا الحديث. (صحیح البخاری، الذبائح والصيد، باب إذا ند بعير لقوم، النسخة الهندية ۲/۸۳۲، رقم: ۵۳۲۹، ف: ۵۵٤٤)

وما توحش من النعم فذكاته العقر والجرح وكذا ما تردىٰ من النعم في بئر ووقع العجز عن ذكاة الاختيار. (ہدایہ، کتاب الذبائح، اشرفی ٤/٤٣٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ رجب المرجب ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۶۲۴۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۷/۹ھ

مرغ کے پر چھڑانے کے لیے گرم پانی میں ڈالنا

سوال [۹۸۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: یہاں مرادآباد میں بعض دوکانوں پر مرغ کو ذبح کرکے اس کے پر کو چھڑانے کے لیے گرم پانی میں ڈال دیتے ہیں، کیا ایسا کرنے سے اس مرغ کا گوشت پاک وحلال ہے یا نہیں؟ مدلل تحریر فرمائیں

المستفتی: کریم بخش مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مرغ کو ذبح کرنے کے بعد اگر کھولتے ہوئے پانی میں اتنی دیر تک چھوڑے رکھے جس سے اس کی اندرونی نجاست کا اثر گوشت میں آجائے تو اس کا کھانا جائز نہیں ہے، اور اگر گرم پانی میں ڈالتے ہی فوراً گرمی کا اثر اس کے پیٹ کی نجاست تک پہنچنے سے پہلے پہلے باہر نکال لیا ہے تو وہ بلا کراہت حلال ہے، اس لیے کہ نجاست کے اثرات گوشت میں منتقل نہیں ہوئے۔

ولو ألقيت دجاجة حال الغليان في الماء قبل أن يشق بطنها لنتف الريش أو كرش قبل الغسل لايطهر أبدا. (كبيرى لاهور پاكستان ۲۰۵، شامى، كتاب الطهارة، باب الأنجاس، زكريا ۱/ ٥٤٤، كراچى ۱/ ٣٣٤، مجمع الأنهر، مصرى قديم ۱/ ٦١، دار الكتب العلمية بيروت ۱/ ٩١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ جمادی الاولی ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۰۳۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۵/۹ھ

بجلی کرنٹ کی شاٹ لگا کر ذبح کرنا

سوال [۹۸۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بڑے بڑے سیلٹر ہاؤس میں جانور کو بجلی کے ہلکے کرنٹ کے ذریعہ سے سن کیا

جاتا ہے جسے اسٹنگ کہتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس طرح اسٹنگ کے ذریعہ سے جانور کو سن کر کے ذبح کرنا غیر شرعی امر ہے یا شرعاً جواز کے کسی دائرے میں شامل ہے؟

المستفتی: نیاز احمد فاروق، حلال ٹرسٹ، جمعیۃ علماء ہند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جانور کو ذبح کرنے سے پہلے بجلی کا شاٹ لگا کر بے دم اور بے بس بنا دینا یا کلی طور پر بے ہوش کر دینا غیر شرعی عمل ہے جو کہ مکروہ ہے، اس لیے کہ یہ ذبح سے پہلے زندہ جانور کو تکلیف پہنچانے کی ایک شکل ہے جس کو شریعت میں ممنوع قرار دیا گیا ہے، البتہ جانور کو قابو میں رکھنے کے لیے اس طرح کی کوئی معمولی شکل اختیار کی جائے تو اس کی گنجائش ہے، جیسا کہ جانور کو ذبح کرنے سے پہلے رسی سے باندھ کر گرانے میں بھی جانور کو تکلیف ہوتی ہے، جس کو شریعت نے جائز قرار دیا ہے، مگر بے ہوش کرنے والا شاٹ لگانا مکروہ ہے اور ذبح کرنے کا جو شرعی طریقہ ہے اس کو وحشیانہ قرار دینا غلط ہے۔

(مستفاد: فتاویٰ محمودیہ ڈابھیل ۱۷/ ۲۶۱، میرٹھ ۲۶/ ۱۵۶، قاموس الفقہ ۳/ ۴۵۶)

(۱) اس مسئلہ سے متعلق ہندیہ اور ہدایہ کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

والحاصل أن كل ما فيه زيادة الألم إليه في الذكاة مكروه. (هنديه، كتاب الذبائح، الباب الأول، زكريا قديم ۵/۲۸۸، جديد ۵/۳۳۲، هدايه اشرفی ۴/ ۴۳۹)

(۲) درمختار کی عبارت سے بھی یہ مسئلہ واضح ہوتا ہے ملاحظہ فرمائیے:

وندب إحداد شفرته قبل الإضجاع، وكره بعده كالجر برجلها إلى المذبح. (در مختار مع الشامی، كتاب الذبائح، كراچی ۶/۲۹۶، زكريا ۹/ ۴۲۷)

(۳) حدیث پاک میں بھی ذبح سے قبل تکلیف پہنچانے سے ممانعت آئی ہے ملاحظہ فرمائیے:

عن ابن عباسؓ أن رجلا أضجع شاة يريد أن يذبحها وهو يحد شفرته، فقال له النبی صلی اللہ علیہ وسلم: أتريد أن تميتها موتات، هلا حددت شفرتك قبل أن تضجعها. (مستدرك حاكم، مكتبه نزار مصطفیٰ الباز ۷/ ۲۶۹۶، رقم: ۷۵۶۳)

عن شداد بن أوس قال: ثنتان حفظتهما عن رسول الله ﷺ قال: كتب عليكم الإحسان على كل شيئ، فإذا قتلتم فأحسنوا القتلة وإذا ذبحتم فأحسنوا الذبح وليحد أحدكم شفرته فليرح ذبيحته. (صحيح مسلم، الصيد والذبائح، باب الأمر بإحسان الذبح، النسخة الهندية ۲/ ۱۵۲، بيت الأفكار رقم: ۱۹۵۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ ذی قعدہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۶۹۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۱۱/۸ھ

مشینی ذبح

سوال [۹۸۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) دوسو، ایک سو، پچاس، پانچ سو جانوروں کو بیک وقت ذبح کرنے کے لیے ایک آدمی بسم اللہ پڑھ کر مشین کو دبا دیتا ہے کیا ایسے ذبح کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ حلال ہوا یا نہیں؟

(۲) اگر جانور کا پورا دھڑ کٹ گیا تو اس صورت میں اس کا گوشت کھا سکتے ہیں؟ حلال ہوا یا نہیں؟

المستفتی: محمد جاوید قریشی باندرہ ویسٹ ممبئ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱-۲) سوالنامہ میں مشینی ذبیحے سے متعلق دو سوال ہیں، ایک سوال میں سو، پچاس سے لے کر پانچ سو جانوروں کو ایک دفعہ بٹن دبا کر ذبح کر دیا جاتا ہے، دوسرے سوال میں اس بات کا ذکر ہے کہ مشینی ذبیحہ میں دھڑ کٹ جاتا ہے اس کے بارے میں وضاحت یہ ہے کہ مشینی ذبیحہ سے متعلق سیمینار بھی ہو چکا ہے اور احقر نے بھی ان سیمیناروں میں شرکت کی ہے، اور احقر کا تفصیلی مقالہ ''انوار رحمت'' کا جزو بن کر شائع ہو چکا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مشینی ذبیحہ کی جتنی شکلیں ہیں ان میں کوئی شکل جواز کے دائرے میں داخل نہیں ہوتی، اس لیے مشینی ذبیحات سے احتراز کرنا چاہیے۔ (مستفاد:

انوار رحمت ۳۶۹ تا ۳۸۳، فقہی مقالات ۴/۲۵۳ تا ۲۶۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ ذیقعدہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۸۱۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۴/ ۱۱/ ۱۴۳۳ھ

چار پانچ مرغیوں پر ایک ساتھ صرف ایک مرتبہ چھری پھیرنا

سوال [۹۸۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج کل تقریبات میں جس مرغی کا گوشت استعمال کیا جاتا ہے اس کو اکثر ذبح کرنے والے صرف ایک بار گردن پر چھری پھیر کر ڈرم میں ایک پر ایک پھینکے جاتے ہیں، دوسرا شخص اس کی پوست اتار کر ٹکڑے کرتا جاتا ہے، تڑپتی حالت میں، اس کا بھی کوئی اعتبار نہیں کہ وہ کلمہ بھی چھری پھیرتے وقت پڑھتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ اس کو چار پانچ مرغیاں ایک ساتھ کاٹنی ہیں؟

المستفتی: ماسٹر عبد الحق، خادم دینی لائبریری مدرسہ احیاء العلوم ہلدوانی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرغی ذبح کرنے کی جو صورتیں سائل نے سوالنامہ میں نقل فرمائی ہیں ان میں تین باتیں قابل توجہ ہیں:

(۱) ایک آدمی ذبح کر کے ڈرم میں ڈالتا ہے اور دوسرا آدمی تڑپتی ہوئی حالت میں کھال اتار کر بوٹیاں بناتا ہے، ایسی صورت میں اس کے حلال ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے لیکن ان کا یہ عمل سنت کے خلاف ہے، کہ تڑپتی ہوئی حالت میں کھال اتار کر بوٹیاں بنائی جائیں، یہ ایک قسم کی وحشیانہ حرکت ہے، مگر اس حرکت کی وجہ سے جانور کے حلال ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا ہے۔

﴿**فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ**. [الأنعام: ۱۱۸]﴾

وتحل ذبيحة مسلم. (ملتقى الأبحر مع مجمع الأنهر، كتاب الذبائح، دار الكتب العلمية بيروت ۴/ ۱۵۳، مصرى قديم ۲/ ۵۰۷)

وكره قطع الرأس والسلخ قبل أن تبرد ...... إذ هو عذاب فوق العذاب. (ملتقى

الأبحر مع مجمع الأنهر، کتاب الذبائح، دار الکتب العلمية بيروت ٤/١٥٩، مصری قديم ٢/٥١٢)

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ کلمہ بھی ہرایک پر پڑھتا ہے یا نہیں اس کا اعتبار نہیں، یہ ایک مسلمان کے بارے میں سوء ظن ہے اور اس سوء ظن کے مطابق قائم رہنا مناسب نہیں ہے بلکہ مناسب یہی ہے کہ ان لوگوں سے تحقیق کر لی جائے کہ ہر مرغی پر بسم اللہ اللہ اکبر پڑھتے ہیں یا نہیں؟

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ. [الحجرات: ١٢]﴾

عن أبی هريرة رضؓ قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: إياكم و الظن فإن الظن أكذب الحديث. (بخاری شريف، کتاب الأدب، باب قوله يايها الذين آمنوا اجتنبوا كثيرا من الظن، النسخة الهندية ٢/٨٩٦، رقم: ٥٨٣١، ف: ٦٠٦٦، صحيح مسلم، باب تحريم الظن، والتجسس...... النسخة الهندية ٢/٣١٦، بيت الأفكار رقم: ٢٥٦٣، مشكوٰة شريف ص:٤٢٧)

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ چار پانچ مرغیوں پر ایک ساتھ چھری پھیرنا بجائے خود ایک غیر تحقیقی بات ہے کیونکہ متعدد مرغیوں پر ایک ساتھ چھری پھیرنا یہ ایک مشکل کام ہے اس لیے سائل کے لیے مناسب ہے کہ براہ راست جا کر مشاہدہ کرے کہ چار پانچ مرغیوں پر واقعی ایک ساتھ چھری پھیری جاتی ہے یا نہیں؟ محض سنی سنائی باتوں کو حقیقت کی شکل دینا غیر مناسب بات ہے۔

عن أبی هريرة رضؓ قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: كفى بالمرء كذبا أن يحدث بكل ما سمع. (صحيح مسلم، مقدمة، النسخة الهندية ١/٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۲۸؍ ذیقعدہ ۱۴۳۰ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۸۲۷)	۲۸؍۱۱؍۱۴۳۰ھ

مشینی ذبح کا شرعی حکم

مشینی ذبح اس وقت دنیا میں ایک عالمگیر مسئلہ بن گیا ہے، بین الاقوامی مارکیٹوں میں مشینی ذبح کا مرغ ملتا ہے، اور اس مسئلہ کو علماء نے موضوع بحث بنا لیا ہے، اور یہ جائز ہے یا

نہیں؟ اس کا شرعی حکم واضح ہونا لازم ہے، اس لیے یہ تحقیقی مضمون مسلمانوں کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے تاکہ مسلمان مشینی ذبیحہ سے احتراز واحتیاط کریں۔

﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ. [الحج: ٣٤]﴾

ترجمہ: ہر امت کے واسطے ہم نے قربانی مقرر کردی ہے کہ اللہ کے نام پر ذبح کریں، ان چوپایوں کو جو اللہ نے ان کو عطا کیے۔

﴿لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ. [الحج: ٣٧]﴾

ترجمہ: اللہ کو نہیں پہنچتا ان کا گوشت اور نہ ہی ان کا خون، لیکن اس کو تمہارے دل کا تقویٰ پہنچتا ہے۔

ذبح کی حقیقت

ذبح کے معنی لغت میں قطع الاوداج (یعنی گردن کی شہ رگ کے کاٹنے کے ہیں) اور اصطلاحِ شرع میں ذبح کے معنی جانور کے حلقوم اور شہ رگ کو ایک ساتھ بسم اللہ پڑھ کر کاٹ دینے کے ہیں، اور ذبح کے لیے ذکوٰۃ لفظ بھی بکثرت استعمال ہوتا ہے، اور ذکوٰۃ کا لفظ جب کتاب الطہارۃ میں بولا جاتا ہے تو اس سے مراد طاہر اور پاک ہونا ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے "ذکاۃ الارض یبسہا" اور جب "ذ" سے کتاب الذبائح میں بولا جاتا ہے تو شرعی طریقہ سے جانور کو ذبح کرنے کے معنی میں ہوتا ہے۔

ذبح کے اقسام وشرائط

ذبح کی دو قسمیں ہیں: (۱) ذبح اختیاری۔

(۲) ذبح اضطراری، دونوں کی تفصیل الگ الگ طور پر پیش کی جاتی ہے۔

(۱) ذبح اختیاری

ذبح اختیاری کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جانور کو آسانی کے ساتھ لٹا کر اس کے گلے پر بسم

اللہ پڑھ کر چھری چلادی جائے، اور اس کے حلقوم اور ودجان یعنی دونوں شہ رگ کٹ جائیں، یا اونٹ وغیرہ کو کھڑے کھڑے نحر کر دیا جائے، اور نحر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اونٹوں کی تمام رگوں کا تعلق گردن کی ایک جگہ پر ہوتا ہے، اور کھڑے کھڑے اس جگہ پر چھری پھیر دی جائے یہ ذبح اختیاری کے دائرے میں داخل ہے۔

وهي اختيارية و اضطرارية: فالأول الجرح فيما بين اللبة واللحيين.

(البحر الرائق كراچی ۸/۱٦۷، زكريا ۸/۳۰٥)

اختیاری ذبح کے شرائط

(۱) بوقت ذبح بسم اللہ پڑھنا، صحت ذبح کے لیے قرآن کریم کے اندر شرط قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿**فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِيْنَ**. [الأنعام: ۱۱۸]﴾

لہٰذا اگر بسم اللہ نہ پڑھی جائے تو وہ ما اہل لغیر اللہ کے تحت داخل ہوکر نا جائز وحرام ہوجائیگا۔

(۲) ایسے آلۂ جارحہ کا ہونا کہ جس کے ذریعہ سے محل ذبح سے خون جاری ہو جائے اس کو فقہاء نے اس عبارت سے نقل فرمایا ہے۔

وأما شرطها فأربعة: الأول: آلة قاطعة جارحة. (البحر الرائق زكريا ۸/۳۰٥، كوئٹه ۸/۱٦۷)

ترجمہ: بہرحال ذبح کی شرائط چار ہیں، ان میں سے پہلی شرط آلۂ ذبح یعنی چھری جو تیز ہو کاٹنے والی ہو اور زخم کرنے والی ہو۔

(۳) ذابح کا اعتقادی یا ادعائی طور پر صاحب ملت ہونا، اس کو فقہاء نے ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

والثاني أن يكون ممن له ملة حقيقة كالمسلم أو ادعاء كالكافر.

(البحر الرائق زكريا ۸/۳۰٥، كوئٹه ۸/۱٦۷)

ترجمہ: اور دوسری شرط یہ ہے کہ ذبح کرنے والا ایسے انسانوں میں سے ہو جس کا حقیقت میں کوئی دین وشریعت ہو، جیسے کہ مسلمان یا ایسا انسان ہو جو کسی دین کا دعویٰ کرتا ہو جیسا کہ کافر یہودی یا عیسائی۔

(۴) ذبح کرنے والے کا عاقل ہونا، بالغ ہونا شرط نہیں ہے، لہٰذا نابالغ سمجھدار بچے کا ذبیحہ صحیح اور حلال ہوگا، اور وہ بچہ جو سمجھ دار نہیں ہے اس کا ذبیحہ اور مجنون کا ذبیحہ حلال نہیں ہوگا، حضرات فقہاء نے اس کو ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

فمنها أن يكون عاقلا فلا تؤكل ذبيحة المجنون والصبى الذى لايعقل فإن كان الصبى يعقل الذبح ويقدر عليه تؤكل ذبيحته. (هنديه زكريا قديم ٥/ ٢٨٥، جديد ٥/ ٣٢٨، بدائع الصنائع زكريا ٤/ ١٦٤، كراچى ٥/ ٤٥)

ترجمہ: پس ان میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ ذبح کرنے والا عاقل سمجھ دار ہو، لہٰذا مجنون اور ایسے بچے کا ذبیحہ کھانا جائز نہ ہوگا جو سمجھ دار نہ ہو، پھر اگر ایسا ہو کہ جو سمجھ دار ہو اور صحیح طریقہ سے ذبح کرنے پر قدرت رکھتا ہو تو اس کے ذبیحہ کا کھانا جائز ہوگا۔

(۵) محل ذبح یعنی ایسا جانور ہونا جو کلی طور پر یا جزئی طور پر ذبح کے ذریعہ سے قابل انتفاع ہو، اور کلی طور پر قابل انتفاع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حلال ماکول اللحم جانور ہو تو اس کا گوشت بھی حلال اور چمڑا بھی پاک ہے، اور جزئی طور پر قابل انتفاع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ذبح شرعی کے بعد اس کا گوشت حلال نہیں ہے، مگر اس کا چمڑا قابل انتفاع ہے، جیسا کہ جب غیر ماکول اللحم جانور کو شرعی طور پر ذبح کرلیا جائے، اس کو حضرات فقہا نے ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے۔

وكون المحل من المحللات إما من كل وجه كماكول اللحم أو من وجه كغيره وهو ما يباح الانتفاع بجلده وشعره. (البحر الرائق زكريا ٨/ ٣٠٥، كوئٹه ٨/ ١٦٧)

ترجمہ: اور محل ذبح یعنی جانور کا حلال جانوروں میں سے ہونا، یا تو کلی طور پر حلال و پاک ہو جیسا کہ حلال وماکول اللحم جانور یا جزوی طور پر پاک ہو، جیسا کہ غیر ماکول اللحم جانور اس کو ذبح کرنے کے بعد اس کی کھال اور بال قابل انتفاع اور مباح ہے۔

ان شرائط میں سے اگر ایک شرط بھی نہ پائی جائے تو شرعی ذبح کے دائرہ میں داخل نہ ہوگا۔

(۲) ذبح اضطراری

ذبح اضطراری کا مطلب یہ ہے کہ جب ذبح اختیاری پر قدرت نہ ہو،اور کسی طرح اس پر کامیابی نہ ہوسکےتو جانور کے بدن کے کسی بھی حصہ میں ایسازخم کردیا جائے جس سے خون جاری ہوجائے، اور ذبح اختیاری پر قدرت ہوتے ہوئے ذبح اضطراری کواختیار کرے گاتو شرعی طور پر ذبح درست نہ ہوگا،اور جانور بھی حلال نہ ہوگا،اس کوحضرات فقہاءنے ان الفاظ سے نقل فرمایاہے:

الثاني الجرح في أي موضع كان من البدن وهذا كالبدل عن الأول لأنه لايصار إليه إلا عند العجز عن الأول. (البحر الرائق زكريا ٨/٣٠٦، كوئٹه ٨/١٦٧)

ترجمہ: ذبح کی دوسری قسم جانور کے بدن میں سے کسی بھی جگہ پر زخم کردینااور یہ ذبح اختیاری کابدل ہے،اس لیے کہ ذبح اضطراری کی طرف حلیت منتقل نہیں ہوسکتی،مگراول یعنی ذبح اختیاری سے عاجز ہونے کے وقت۔

ذبح اضطراری کے اقسام

ذبح اضطراری کی تین قسمیں نصوص سے ثابت ہیں:

(ا) جانور بدک جائےاور کسی طرح انسان کےقابو میں نہ آئے،یا جنگلی جانور ہرن وغیرہ ہوتوایسی صورت میں ذبح اضطراری جائز ہوجاتاہے،یعنی بدن کے کسی بھی حصہ پرزخم کردیاجائے۔

عن أبي العشراء عن أبيه قال: قلت يا رسول الله! أما يكون الذكاة إلا في الحلق واللبة قال لو طعنت في فخذها لأجزأك. (سنن النسائي، تهانوي ٢/٢٠٦، اشرفي ٢/١٨٢،دار السلام رقم: ٤٤١٣)

ترجمہ: حضرت ابوالعشراءاپنے والد سےروایت کرتے ہیں کہ انہوں نےفرمایا کہ میں نے کہایارسول اللہ! کیاحلق اورلبہ کےعلاوہ کسی اورجگہ بھی ذبح ہوسکتاہےتو آپ ﷺ نےفرمایا کہ بدکے ہوئے جانوریاجنگلی جانور کے پیریاران میں زخم کردو،تو تیرے لیے جائزاورکافی ہوگا۔

(۲) آلہ جارحہ کے ذریعہ ذبح اضطراری اختیار کیا جائے، مثلاً تیر وغیرہ سے بسم اللہ پڑھ کر جانور کو مارا جائے، اور تیر جانور کو زخمی کر دے، اور تیر مارنے والے کے قبضہ میں آنے سے پہلے پہلے اس کی روح نکل جائے تو ایسی صورت میں تیر کا زخم بھی ذبح کے قائم مقام ہو جاتا ہے، اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور کو مال غنیمت میں کچھ اونٹ حاصل ہوئے، ان میں ایک اونٹ بدک گیا تو صحابہ کرامؓ نے تیر مار کر اسے روکوالیا تو حضور ﷺ نے اسی کو ذبح قرار دیا، اور حضور ﷺ نے فرمایا: جو تمہارے تیر کے ذریعہ سے زخمی ہو جائے اس کو کھالیا کرو، اور جس میں تیر الٹا پڑ جائے اور زخم نہ ہو تو اس کو نہ کھایا جائے، حضرت عدی بن حاتمؓ نے حضور سے کہا یا رسول اللہ:

إنا نرمي بالمعراض قال ما خرق فكل وما أصاب بعرضه فلا تأكل.

(سنن الترمذي، النسخة الهندية ۱/۲۷۱، دار السلام رقم: ۱٤٦٥، صحيح البخاري، النسخة الهندية ۲/۸۲۳، رقم: ٥۲٦٤، ف: ٥٤۷۷)

ترجمہ: بیشک ہم تیروں سے شکار کو مارتے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شکار کو تیر نے زخمی کر دیا ہو وہ حلال ہے کھاؤ جس کو تیر کی چوڑائی یا پشت لگ جائے اسے مت کھاؤ۔

(۳) شکاری جانوروں کے ذریعہ سے جانور کا شکار کیا جائے، اور چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھ کر چھوڑا جائے تو ایسی صورت میں اگر جانور کو شکاری جانور زخمی کر دے اور اس سے خون نکل آئے اور مالک کے قبضہ میں آنے سے پہلے پہلے زندہ نہ رہے تو اس کا کھانا جائز ہے، اور اگر زندہ رہے تو اس کا ذبح کرنا لازم ہو جاتا ہے، حضور ﷺ نے شکاری کتوں کے شکار کردہ جانوروں کے حلال ہونے کو ان الفاظ سے ارشاد فرمایا ہے:

إذا أرسلت كلبك و ذكرت اسم الله عليه فأمسك عليك فكل، قلت: و إن قتل قال: وإن قتل. (سنن الترمذي النسخة الهندية ۱/۲۷۱، دار السلام رقم: ۱٤٦٤)

ترجمہ: جب تم اپنے تربیت یافتہ شکاری کتے کو بسم اللہ پڑھ کر شکار پر چھوڑ دو پھر وہ شکار کو تمہارے لیے پکڑ کر روک لے تو تم اسے کھاؤ اس پر میں نے کہا کہ اگر چہ جان سے مار دے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر چہ جان سے مار دے تب بھی کھا سکتے ہو۔

مشینی ذبیحہ

ذبح اختیاری میں دو چیزیں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں: (۱) چھری چلاتے وقت طاقت صرف کرنا (۲) چھری چلاتے وقت بسم اللہ پڑھنا۔اور یہ دونوں امور شخص واحد سے صادر ہونا لازم ہیں۔

لہٰذا اگر چھری پر طاقت لگانے والا اور چلانے والا ایک شخص ہو، اور تسمیہ پڑھنے والا کوئی دوسرا شخص ہو تو جانور حلال نہیں ہوگا، اسی طریقہ سے ذبح اضطراری میں بھی دو چیزیں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں:

(۱) آلہ جارحہ استعمال کرتے وقت، اور اسی طریقہ سے شکاری کتے یا پرندہ کے چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھنا۔

(۲) آلہ جارحہ کا جانور کو زخمی کر کے خون نکال دینا، یا شکاری کتے یا پرندہ کا جانور کو زخمی کر کے خون نکال دینا۔

یہ دونوں چیزیں ذبح اضطراری میں لازم اور مشروط ہیں، ان میں سے اگر ایک چیز بھی نہ پائی جائے تو جانور حلال نہیں ہوگا، اب اس کے بعد مشینی ذبیحہ کی حقیقت اور اس کے فلسفہ پر غور کرنا ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ مشینی ذبیحہ ذبح اختیاری کے دائرہ میں داخل ہے یا ذبح اضطراری کے دائرہ میں، تو اس سلسلے میں ماقبل میں ذبح کے شرائط کے ذیل میں فقہی جزئیات سے ثابت کیا گیا ہے کہ ذبح اضطراری اس وقت جائز ہے جبکہ ذبح اختیاری پر کسی طرح قدرت حاصل نہ ہوسکے، مگر جب ذبح اختیاری پر کسی طرح بھی کامیابی حاصل ہو جائے تو ذبح اضطراری کا طریقہ اختیار کرنا ہرگز جائز نہیں ہے تو ہم نے مشینی ذبیحہ کے فلسفہ پر غور کر کے دیکھا تو اس کے اندر ایسی کوئی شرعی مجبوری نہیں ہے جس کی وجہ سے ذبح اضطراری کو اختیار کیا جائے اس لیے کہ ذبح اختیاری کو طلب کرنے کے لیے جو اعذار اور مجبوریاں ہوتی ہیں وہ یہاں پر مفقود ہیں، اور اس سے مانع کوئی سبب اور وجہ بھی یہاں موجود نہیں ہے، محض اس وجہ

سے کہ جانوروں کی زیادہ تعداد ذبح کرنے میں دیر زیادہ لگے گی، اس لیے ذبح اختیاری کو چھوڑ کر اضطراری کو اختیار کیا جائے، یہ قابل قبول عذر نہیں ہے، کیونکہ اگر مختصر وقت میں کثیر تعداد میں جانور ذبح کرنا ہے تو اتنی تعداد میں مزدور اور افراد بھی مہیا ہو سکتے ہیں، اس لیے مشینی ذبیحہ میں ذبح اضطراری کا طریقہ اختیار کرنا ہرگز جائز نہ ہوگا، حضرات فقہاء نے اس قسم کے مضامین کو بہت واضح الفاظ میں نقل فرمایا ہے، ذبح اضطراری کے بارے میں فرمایا:

وهذا كالبدل عن الأول لأنه لايصار إليه إلا عند العجز عن الأول، وإنما كان كذٰلك لأن الأول، أبلغ في إخراج الدم من الثاني فلايترك إلا بالعجز عنه ويكتفى بالثاني للضرورة. (البحر الرائق زكريا ۸/۳۰۶، كوئٹه ۸/۱۶۷)

ترجمہ: اور یہ اول یعنی ذبح اختیاری کا بدل ہے، اس لیے کہ اس ذبح اضطراری پر عمل جائز نہیں ہے، مگر ذبح کی پہلی قسم یعنی ذبح اختیاری سے عاجز ہونے کے وقت اور یقیناً حکم شرعی ایسا ہی ہے، اس لیے کہ ذبح کی پہلی شکل اخراجِ دم میں دوسری شکل کے مقابلے میں زیادہ مفید اور مؤثر ہے، لہٰذا پہلی شکل کو بغیر مجبوری کے چھوڑا نہیں جائے گا، اور ضرورت کی وجہ سے دوسری شکل کافی ہے۔

اب اس عبارت پر غور کر کے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ عجز کا لفظ طاقت جسمانی سے ناکام ہونے کے لیے بولا جاتا ہے، اور عذر کا لفظ عام ہے، اور یہاں ذبح اضطراری کو اختیار کرنے کے لیے طاقت جسمانی سے ناکامی کا کوئی سوال نہیں بلکہ محض یہ مقصد ہے کہ کم وقت کے اندر کثیر تعداد میں جانور ذبح ہو جائیں، یہ دفع مضرت نہیں ہے، جس کی وجہ سے امر ممنوع مباح ہو جائے، بلکہ یہ جلب منفعت ہے، اور جلب منفعت کے لیے امر ممنوع مباح نہیں ہوتا، اس لیے مشینی ذبیحہ میں ذبح اضطراری کا طریقہ اختیار کرنا جائز نہ ہوگا، اور مشینی ذبیحہ کا ذبح اختیاری کے دائرے سے خارج ہونا معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے، کیونکہ ۱۰/۱۵ رفیصد مشینی ذبیحہ میں ایسا ہوتا ہے کہ گلے میں چھری لگنے کے بجائے پیٹ میں چھری لگ جاتی ہے اور کسی کے سر پر چھری لگ جاتی ہے اور کسی کے منھ پر چھری لگ جاتی ہے، یہ سارے کے سارے اسباب اور وجوہات اس کی واضح دلیل ہیں کہ مشینی ذبیحہ ذبح اختیاری کے دائرہ میں داخل نہیں ہے، لہٰذا مشینی ذبیحہ کی جتنی

شکلیں ہیں ان میں سے کوئی شکل ذبح اختیاری کے دائرے میں داخل نہیں ہوگی۔

مشینی ذبیحہ سے متعلق ایک سوال یہ کیا جاتا ہے کہ صرف بٹن دبا دیا جاتا ہے کہ بقیہ سارا کام مشین اور بجلی کی قوت سے ہوتا ہے، اور ذبح اختیاری میں یہ شرط ہے کہ جو بسم اللہ پڑھے گا اسی کی طاقت وقوت سے چھری چلے، اور بٹن دبانے کا مطلب یہ ہے کہ چھری پر کوئی شخص ہاتھ میں لے کر بسم اللہ پڑھ دے، اور بسم اللہ پڑھ کر دوسرے کے ہاتھ میں دیدے اور دوسرا بلا بسم اللہ کے اپنی قوت سے چھری چلا دے اور اس طرح کرنا ذبح اختیاری میں جائز نہیں ہے، اور ذبح اختیاری پر قوت ہونے کی وجہ سے ذبح اضطراری کی مذکورہ تمام صورتیں جو مشینی ذبح کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں ان میں سے کسی بھی صورت میں جانور حلال نہیں ہوگا، جس کی تفصیل ہم ابھی بیان کر چکے ہیں، اور اسی طریقہ سے مشینی چھری چلتے وقت بغل میں کھڑے ہو کر صرف بسم اللہ پڑھنا کافی نہیں، کیونکہ بسم اللہ پڑھنے والے کی قوت کا کوئی دخل نہیں، لہٰذا یہ بھی جائز نہیں۔

اور ایک سوال یہ بھی کیا جاتا ہے کہ چھری کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر بسم اللہ پڑھتا ہے اور چھری چلنے میں ہاتھ رکھنے والے کی کوئی قوت نہیں ہوتی، بلکہ ساری کی ساری قوت مشین اور بجلی کی ہوتی ہے، لہٰذا یہ شکل بھی دائرہ جواز میں نہیں آسکتی۔

اور ایک سوال یہ بھی کیا جاتا ہے کہ جانور کے حلق کی نلکی میں چھری رکھ کر اس کو چیر دیا جاتا ہے یہ بھی ذبح اختیاری کے دائرہ میں داخل نہیں ہے، اس لیے کہ اس ذبح میں حلقوم تو کاٹا جاتا ہے، مگر دونوں جانب کے ودجان یعنی شہ رگ نہیں کاٹے جاتے، اور صحتِ ذبح کے لیے ودجان کا کاٹا جانا شرط ہے، لہٰذا یہ ذبح بھی دائرہ جواز میں نہیں آسکتا۔

اور ایک سوال یہ بھی کیا جاتا ہے کہ ذبح سے قبل بجلی شاٹ کے ذریعہ سے نیم بیہوش کر دیا جاتا ہے، اس کے بعد مشین کے ذریعہ سے اس پر چھری چلائی جاتی ہے اس کے اندر دو ضرر یہاں ہیں:

(۱) ذبح سے قبل جانور کو نیم بے ہوش کر دینا یہ بھی ایک وحشیانہ حرکت ہے۔

(۲) اس کے بعد جانور پر مشینی چھری چلانا جو انسانی قوت سے نہیں چلتی ہے، بلکہ مشین اور بجلی کی قوت سے چلتی ہے اس میں انسانی قوت کا کوئی دخل نہیں ہوتا ہے، اس لیے ان دونوں خرابیوں کی وجہ سے مشینی ذبیحہ کا یہ طریقہ بھی جائز نہیں ہوگا۔

مسائل ذبح اور شرعی اصول

مسائل ذبح میں تین اصولوں کو پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے ان کے بغیر مسائل ذبح میں مغالطہ واقع ہوسکتا ہے

اصول(۱): ذبح کی دو قسمیں ہیں: (۱) ذبح اختیاری (۲) ذبح اضطراری

ذبح اختیاری کا مطلب یہ ہے کہ جانور ذابح کے اختیار اور قابو میں ہے اور جانور کو لٹا کر سنت طریقے سے اپنے ہاتھ سے گلے پر چھری پھیر دی جائے۔

اور ذبح اضطراری کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جانور ذابح کے اختیار سے باہر ہے تو ذابح کی طاقت اور قابو سے باہر ہونے کی وجہ سے اس کو سنت طریقہ سے ذبح کرنا لازم نہیں ہوتا ہے بلکہ بسم اللہ پڑھ کر کسی بھی جگہ پر زخم کر کے خون بہا دیا جائے، چاہے ہتھیار اور اوزار کے ذریعہ سے ہو یا شکاری جانور کے ذریعہ سے۔

اصول(۲): ذبح اختیاری میں یہ شرط ہے کہ ذابح خود بسم اللہ پڑھ کر ذبح کرے اور اگر ذابح کے ساتھ کوئی دوسرا شخص تعاون کے لیے ہاتھ لگا دیتا ہے تو معین پر بھی بسم اللہ پڑھنا لازم ہوتا ہے، ورنہ جانور حلال نہ ہوگا۔

نیز اگر ذابح نے بسم اللہ پڑھ کر ذبح کر دیا ہے لیکن ساری رگیں کٹنے سے رہ جائیں اور دوسرا آدمی جا کر بغیر بسم اللہ کے بقیہ رگ کاٹ دیتا ہے یا کسی دھاردار چیز پر جانور خود جا کر گرنے کی وجہ سے اس کی گردن کٹ کر الگ ہو جاتی ہے تو ایسی صورت میں وہ جانور حلال نہیں ہوگا اس لیے کہ بقیہ رگوں کے کاٹنے میں اصل ذابح کا کوئی دخل نہیں ہے۔

اصول(۳): ذبح اضطراری میں جانور کے حلال ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ ذبح اختیاری کو اختیار کرنے کی کوئی صورت نہ بن سکے، اگر ذبح اختیاری کا امکان ہو تو ذبح اضطراری جائز نہیں ہے، لہٰذا ذبح اضطراری میں جانور کے حلال ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ جانور ذابح کے قبضہ اور اختیار سے خارج ہو، لہٰذا اگر جانور ذابح کے قبضہ اور اختیار میں

داخل ہوگا تو ذبح اضطراری کے طریقہ سے جانور حلال نہیں ہوسکے گا، حاصل یہ ہے کہ ذبح اضطراری کا پورا مدار جانور کا ذابح کے قبضے اور اختیار سے خارج ہونے پر ہے۔

اب دیکھنا ہے کہ مشینی ذبح ذبح اختیاری میں داخل ہے یا اضطراری میں تو ظاہر ہے کہ مشینی ذبح کا وہ طریقہ جس میں ذابح بسم اللہ پڑھ کر صرف بٹن دبا دیتا ہے، باقی سارا کام مشین اور بجلی کی طاقت سے ہوتا ہے، اس میں جانور بہر حال ذابح کے قبضہ اور اختیار کے دائرہ میں داخل رہتا ہے، لہٰذا مشینی ذبح ذبح اضطراری کے دائرہ میں داخل نہیں ہوسکتا، لازمی طور پر ذبح اختیاری میں داخل ہوگا، اور ذبح اختیاری میں اصول (۲) کی رعایت شرط ہے، اور اصول (۲) کی رو سے مشینی ذبح میں ذبح اختیاری کے شرائط مفقود ہیں گویا کہ مشینی ذبح اس کے مرادف ہے کہ بسم اللہ پڑھ کر ذابح نے ذبح کی ابتداء کی اس کے بعد ذابح نے اپنے اختیار سے جانور کو رگوں کے کاٹنے سے پہلے پہلے چھوڑ دیا ہے اور وہ جانور پریشان ہوکر غیر اختیاری طور پر کسی دھار دار چیز پر گر پڑا جس کی وجہ سے اس کی گردن کٹ کر دو ٹکڑے ہو جائیں تو ایسی صورت میں یہ جانور کسی کے نزدیک حلال نہیں ہے تو اسی طرح مشینی ذبح کے مذکورہ طریقہ سے بھی جانور حلال نہیں ہوسکتا۔

درمیان میں شئ بے اختیاری کا واسطہ

یہ جو کہا جاتا ہے کہ ذابح کا فعل اور نتیجۂ فعل کے درمیان اگر شئ بے اختیاری کا واسطہ ہو تو نتیجۂ فعل کو فعل ذابح کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، یہ اصول ذبح اضطراری میں تو صحیح اور مطابق ہوتا ہے مگر ذبح اختیاری میں صحیح نہیں ہوتا، اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر ذبح اختیاری میں ذابح نے بسم اللہ پڑھ کر گلے پر چھری چلا دی ہے، اور حلق کٹ گیا ہے، مگر ودجان کٹنے سے رہ گئی ہیں اور ذابح نے جانور کو بالقصد چھوڑ دیا ہے، اتفاق سے جانور اس جگہ کسی دھار دار چیز پر گر پڑا یا اوپر سے کوئی دھار دار چیز گر پڑی تو ان تمام صورتوں میں جانور حلال نہیں ہوتا بلکہ حرام ہوجاتا ہے، حالانکہ ان میں شئ بے اختیاری کا فعل ہے، اس کے باوجود نتیجۂ فعل کو ذابح

کی طرف منسوب نہیں کیا جارہا ہے، نیز اگر اس صورت میں ذابح نے دوبارہ جاکر بغیر بسم اللہ کے بقیہ رگ کاٹ دی ہیں تب بھی جانور حرام ہے، اس لیے ذبح اختیاری میں مشینی ذبح کو داخل کرکے جائز قرار دینے کی کوئی شکل نہیں نکل سکتی۔

قانونی مجبوری

قانونی مجبوری کا عذر بھی درست نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ ہندوستان اور پورے ایشیاء کے اندر مسئلہ ذبح میں کسی قسم کی قانونی مجبوری نہیں ہے، اور رہے مغربی ممالک تو مغربی ممالک میں بھی قانونی مجبوری عذر نہیں بن سکتی، اس لیے کہ وہاں پر یہ قانون ہرگز نہیں ہے کہ ہاتھ سے ذبح کرنا حکومت کی طرف سے ممنوع ہو، البتہ قانوناً صرف اس کی ممانعت ہے کہ جہاں چاہے جس جگہ چاہے ذبح کیا جائے، بلکہ ذبح کے لیے مخصوص مقامات متعین کیے گئے ہیں انہیں مقامات کے حدود میں ذبح کیے جاسکتے ہیں، ان کے باہر نہیں، اور ایسے قوانین ہر بڑے شہر میں ہوتے ہیں، تاکہ خونوں کی گندگیاں ہر جگہ منتشر نہ ہوجائیں، اور ایسے مخصوص مقامات میں ہاتھ کے ذریعہ سے روزانہ ہزاروں کی تعداد میں جانور سہولت کے ساتھ ذبح کیے جاسکتے ہیں، اس کی مثال منیٰ کا مذبح ہے کہ ڈھائی روز کے اندر دسیوں ہزار جانور ہاتھ سے ذبح کیے جاتے ہیں، اور کسی حاجی کی قربانی بھیڑ اور ازدحام کی وجہ سے اس مدت کے اندر باقی نہیں رہتی، اس لیے قانونی مجبوری بھی ایسا عذر نہیں ہے جس کی وجہ سے امر ممنوع کو جائز قرار دیا جاسکے، ورنہ سالوں پہلے منیٰ میں مشینی ذبح کا سلسلہ جاری ہوجانا چاہیے تھا، حالانکہ بلاکسی پریشانی کے منیٰ میں تمام حاجیوں کی قربانی شرعی طریقہ سے ہاتھوں سے ذبح ہوجاتی ہے۔

مشین سے صرف مرغ ذبح ہوتا ہے

یہاں یہ بات بھی ناظرین کو عجیب معلوم ہوگی کہ مشینی ذبیحہ سے متعلق لمبی بحث ہورہی ہے، اور فقہ اکیڈمی کے سیمینار میں سینکڑوں علماء نے اس موضوع پر مختلف انداز سے مقالات لکھے ہیں۔

حالانکہ مشینوں سے صرف مرغ ذبح کیا جاتا ہے، چوپائے ذبح نہیں ہوتے اور کافی تعداد میں مقالہ نگار حضرات نے چوپائے کو بھی موضوع بحث کے دائرہ میں داخل کر کے کافی عرق ریزی فرمائی ہے۔

چوپایوں کو صرف اتنا کیا جاتا ہے کہ ایک بہت بڑی پلیٹ جو بجلی سے چل کر آتی جاتی ہے، دس دس، بیس بیس جانوروں کو ایک ساتھ پلیٹ پر لایا جاتا ہے پھر یہ پلیٹ ان جانوروں کو لے کر گہرے گڈھے کے اوپر پہنچ جاتی ہے، اور جانور اس میں پہنچنے کے بعد بدحواس ہو جاتے ہیں پھر اس میں آدمی پہنچ کر اپنے ہاتھ سے جانوروں کے گلے میں باضابطہ ہاتھ سے چھری پھیر دیتے ہیں، اس لیے مشینی ذبح کو چوپایوں اور بڑے جانوروں کے لیے موضوع بحث بنانے کی ضرورت نہیں، بلکہ موضوع بحث صرف مرغ کو بنایا جانا چاہیے، احقر نے اس طرح کی حقیقت کا خود مشاہدہ کیا ہے۔

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب دامت برکاتہم کا فتویٰ

فقہ اکیڈمی کی طرف سے سوالنامہ میں بطور دلیل حضرت مفتی نظام الدین صاحب دامت برکاتہم کا فتویٰ اور اس پر فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ دامت برکاتہم کی تصدیق کو مشینی ذبح کے جواز کے لیے دلیل میں پیش کیا گیا تھا، اور واقعتاً ان دونوں حضرات نے مشینی ذبح کی مذکورہ صورت کو اپنے اس فتویٰ میں جائز قرار دیا تھا، جو نظام الفتاویٰ ۱/۳۴۴ میں شائع بھی ہو گیا تھا، مگر ان دونوں حضرات نے صاف لفظوں میں ۱۱/ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ میں مفتیانِ کرام اور علماء کرام کے ایک مجمع میں اس فتویٰ سے رجوع کا اعلان فرما دیا ہے، نیز باقاعدہ تحریری طور پر صاف لفظوں میں رجوع فرمالیا ہے، اور دونوں حضرات کے رجوع کی تحریر دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کی مہر کے ساتھ احقر کے پاس بھی موجود ہے، نیز اس کی فوٹو کاپی بہت سے علماء کے پاس بھی موجود ہے، اس لیے ان دونوں حضرات کے مذکورہ فتویٰ کو جواز کی دلیل میں پیش کرنا درست نہ ہوگا۔

لہٰذا مشینی ذبح کی مذکورہ صورت جواز کے دائرہ میں آنے کے لیے کوئی شکل نظر نہیں

آتی، اس لیے مشینی ذبح قطعاً جائز نہ ہوگا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب کا رجوع

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب دامت برکاتہم اور حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ دامت فیوضہم کے رجوع کا فتویٰ بعینہ یہاں نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

کیا فرماتے ہیں علماء دین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ:

آج کل مشینی ذبیحہ کا یہ طریقہ رائج ہونے جارہا ہے کہ بسم اللہ اللہ اکبر پڑھ کر بٹن دبا دیا جائے باقی جانور کے گلے پر چھری کا چلنا اور رگوں کا کاٹ دینا اور چھری کا جانور کے گلے تک پہنچنا سب بجلی کی طاقت سے ہوتا ہے، بٹن دبانے کے علاوہ ذابح کا کوئی دخل نہیں ہوتا، حالانکہ اس طرح کی ضرورت بھی نہیں محسوس ہوتی، کیونکہ منیٰ میں دو ڈھائی دن کے اندر ہزاروں اونٹ ذبح ہوتے ہیں پھر بھی مشینی ذبح کا یہ طریقہ وہاں اختیار نہیں کیا گیا اور ڈھائی دن کی مدت میں اتنے جانور ذبح ہوجاتے ہیں، اور اونٹوں کا ذبح منیٰ میں ایک جگہ ہوتا ہے ایک ساتھ دس دس جانور کو ایک پلیٹ میں کھڑا کرکے گڈھے کے پاس لے جاتے ہیں اور ایک آدمی اپنے ہاتھ سے بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر چھری چلاتا ہے جس کا خاکسار نے بچشم خود مشاہدہ کیا ہے، حضرت اقدس استاذی حضرت مفتی نظام الدین صاحب دامت برکاتہم نے نظام الفتاویٰ جلد اول صفحہ ۳۴ میں بٹن دبا کر ذبح کرنے کے مذکورہ بالا طریقہ کو جائز قرار دیا ہے حضرت سے درخواست ہے کہ اس مسئلہ پر نظر ثانی فرمالیں۔ فقط

شبیر احمد عفا اللہ عنہ

خادم دارالافتاء مدرسہ شاہی مرادآباد

۵/ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

حضرت مفتی شبیر احمد صاحب مفتی جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد ثقہ ومعتمد شخص ہیں، خود مشاہدہ کر کے فرماتے ہیں تو احقر اپنے سابق فتویٰ سے رجوع کرتا ہے، احقر کو معلومات اس سے زائد نہیں ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

العبد نظام الدین
مفتی دار العلوم دیوبند
۱۱ر ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ

حضرت مفتی نظام الدین صاحب نے اپنے فتویٰ سے رجوع فرمالیا ہے، اس لیے احقر بھی رجوع کرتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

بقلم:
ابوالقاسم نعمانی غفرلہ
۱۱ر ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ

املاہ: العبد محمود عفی عنہ
دار العلوم دیوبند
۱۱ر ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ

۲ باب ما أهل لغير الله

سائبہ کا گوشت مسلمانوں کے لیے کب حلال ہے؟

سوال [۹۸۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مثلاً کسی ہندو نے دیوی دیوتاؤں کے نام بھینس کی جنس سے کٹڑے کے کان کاٹ کر چھوڑ دیا، آگے چل کر بھینسہ (بجار) ہو گیا، کافی دنوں کے بعد پاگل سا ہو گیا، جو عام طور پر انسانوں کا جان لیوا بن گیا، ہندوؤں نے عاجز آ کر مسلمانوں سے کہا کہ اس بھینسہ کو پکڑ کر مار ڈالو، مسلمان لڑکوں نے دوڑ بھاگ کر کے پکڑ لیا اور ذبح کر کے کھا گئے، تو براہ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل جواب دیں کہ از روئے شرع اس طرح کے جانور کا گوشت کھانا حلال ہے، یا حرام؟ نیز اگر حرام ہے تو جس کسی نے عمداً یا سہواً کھا لیا تو کون سے گناہ کا مرتکب ہوا اور اس کے ازالہ کی صورت کیا ہوگی؟

المستفتی: محی الدین ضلع پورنیہ بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: دیوی دیوتاؤں کے نام بھینس یا بیل کے کان کاٹ کر جو چھوڑ دیا جاتا ہے جیسا کہ سڑکوں پر سانڈ پھرتے ہیں یہ مالک کی ملکیت سے نہیں نکلتے وہ سائبہ کے حکم میں ہیں؛ اس لیے مالک کو انہیں فروخت کرنے اور ہبہ کرنے کا بھی حق باقی رہتا ہے، لہٰذا مالک کی اجازت سے مسلمانوں کا ایسے جانور کا ذبح کر کے کھانا جائز ہے، اب سوالنامہ میں جس ہندو نے مسلمان کو اسے مار کر استعمال کی اجازت دی ہے اگر وہی مالک ہے تو مسلمان لوگوں کے لیے اس کو ذبح کر کے کھانا جائز ہے۔ (مستفاد: امداد المفتیین ۹۳۵، امداد الفتاویٰ ۴/ ۹۹، احسن الفتاویٰ ۱/ ۵۲، معارف القرآن کلاں ۱/ ۳۶۷-۳۶۸، ۳/ ۲۴۶، تفسیر شیخ الہند ۱۶۵)

﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ. [المائدة: ۱۰۳]﴾

وروى البخاري عن سعيد بن المسيب قال...... والسائبة التي كانو يسيبونها لآلهتهم ولا يحمل عليها شيئ. (بخاری شريف، التفسير باب ما جعل الله من بحيرة و لا سائبة ...... النسخة الهندية ٢/٦٦٥، رقم: ٤٤٣٧، ف: ٤٦٢٣، تفسير مظهری زکریا قدیم ٣/١٩٤، جدید ٣/٢٢٠، تفسير خازن ١/٤٩٥)

ولم يرد حقيقة الجعل لأن الكل خلقه و تقديره. (فتح الباری، کتاب التفسير باب ما جعل الله من بحيرة و لا سائبة، اشرفيه ٨/٣٦٠، دار الفكر ٨/٢٨٣، تحت رقم الحديث ٤٦٢٤، مكتبه دار البيان، قاهره ٨/١٣٣)

من سيب دابته فلايزول ملكه عنها. (الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٤/١١١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷ر رجب المرجب ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۷۴۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/۷/۱۴۲۳ھ

مندروں اور مزاروں پر چھوڑے جانے والے جانوروں کا حکم

سوال [۹۸۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جو گائیں بھینسیں یا کوئی بھی جانور، دیوی شوالہ دیوتا کے نام پر چھوڑتے ہیں پھر وہ بڑا ہو جاتا ہے، اس کو مندر کے پجاری فروخت کرتے ہیں تو کیا اس کو یعنی اسی بکرے کو جس کو مندر کے نام پر چڑھایا گیا تھا کوئی مسلمان خرید کر قربانی کر سکتا ہے؟ اس کا کھانا مسلمان کے لیے جائز ہے؟

المستفتی: جمیل اختر عثمانی، کھادروالا مظفر نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ جانور ما اہل بہ لغیر اللہ میں داخل نہیں ہے بلکہ بحیرہ اور سائبہ میں داخل ہے کہ محض بتوں اور مزارات کے نام پر چھوڑ دینے سے اس طرح کے جانوروں میں حلت وحرمت سرایت نہیں کرتی ہے اور نہ ہی وہ ملکِ مالک سے خارج ہوتے ہیں، لہٰذا جب مالک

سے خرید کر قربانی کی جائے یا مالک کے موہوب لہ سے خرید کر قربانی کی جائے تو شرعاً ان جانوروں کی قربانی جائز اور صحیح ہو جائے گی، اور اگر عرف میں مندر کے پجاریوں اور مزارات کے مجاوروں کے لیے ہبہ نہیں ہوتے ہیں تو مالک غیر کے تعلق ہونے کی وجہ سے پجاریوں اور مجاوروں سے خرید کر قربانی جائز نہیں ہوگی۔ (مستفاد: فتاویٰ عبدالحی ۲/ ۹۰، امداد الفتاویٰ ۴/ ۹۸، ۵/ ۳۵۹، معارف القرآن اشرفی دیوبند ۱/ ۳۹۸)

من سيب دابته فلايزول ملكه عنها. (الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٤/ ١١١)

فلايزول ملكه في الوجهين كمن سيب دابته. (المبسوط دار الكتب العلمية بيروت ١٢/ ١٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ شعبان المعظم ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۱۹۰۲)

بزرگوں کے نام پر چھوڑے ہوئے بکرے کو ذبح کرنا

سوال [۹۸۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بزرگوں کے نام بکرے، مرغ چھوڑنا کیسا ہے اور ان کا کھانا کیسا ہے؟

المستفتی: گلزار احمد سہارنپوری امام مسجد جھاڑی ضلع سیکر راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ فعل حرام وباعث گناہ کبیرہ ہے، اور وہ بکرا مالک کی ملکیت سے خارج نہیں ہوتا ہے، اس کو اللہ کا نام لے کر ذبح کرنے میں اگر مالک سے دوبارہ اجازت لی جائے تو کھانا جائز ہے، ورنہ بحکم غصب ناجائز ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۴/ ۹۸)

من سيب دابته فلايزول ملكه عنها. (الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٤/ ١١١، وهكذا في المبسوط للسرخسي دار الكتب العلمية بيروت ١٢/ ١٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ ذی قعدہ ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۰۳۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/ ۱۱/ ۱۴۱۰ھ

مہمان نوازی کے طور پر جانور ذبح کرنا

سوال [۹۸۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی مسلمان اللہ کا نام لے کر کسی جانور کو ذبح کرے بطور مہمان نوازی کے تو کیا اس میں شرک شامل ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: مرسلین مدنا پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر کسی مہمان کی آمد پر جانور ذبح کیا جاتا ہے تاکہ مہمان کو اس جانور کا گوشت کھلایا جائے تو اس طرح کھلانا اور تواضع کے ارادے سے جانور ذبح کرنا جائز اور درست ہے، مثلاً اگر کسی گھر میں مرغ موجود ہے، مہمان کی آمد کی اطلاع ملنے پر جلدی سے مرغ ذبح کر کے اس کی بوٹیاں بنا کر کھانا تیار کیا جائے اسی طرح اسی ارادہ سے بکرا ذبح کر کے کھانا تیار کیا جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، ہاں البتہ اگر کسی بڑے شخص کی تعظیم اسی میں سمجھی جا رہی ہے اور کھلانا مقصد نہیں بلکہ اس کی عظمت میں جانور ذبح کر رہا ہے، اور اس ذبح کے اندر نہ آنے والے کو کھلانا مقصود ہو اور نہ خود کھانا مقصد ہو بلکہ جانور ذبح کرنا ہی اس کی عظمت اور اعزاز سمجھا گیا ہو تو یہ جانور حلال نہیں بلکہ میتہ کے حکم میں ہوگا، اس لیے کہ یہ " مَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (مائدہ: ۳)" میں داخل ہو گیا۔

ولو ذبح للضيف لايحرم لأنه سنة الخليل وإكرام الضيف إكرام الله تعالىٰ والفارق أنه إن قدمها ليأكل منها كان الذبح لله تعالىٰ والمنفعة للضيف أو للوليمة أو للربح وإن لم يقدمها ليأكل منها بل يدفعها لغيره كان لتعظيم غير الله فتحرم (وقبله) ذبح لقدوم الأمير و نحوه كواحد من العظماء يحرم لأنه أهل به لغير الله. (شامی مع در مختار، کتاب الحظر و الإباحة، باب الاستبراء وغيره، کراچی ٦/ ٣٠٩، زکریا ٩/ ٤٤٩)

سمعت أباحامد يقول: سألت أبا عاصم العامری و كان تلميذا له عن رجل

ذبح للضيف شاة و ذكر الله فقال: يحل أكله. (تاتارخانية ١٧/ ٣٩٠، رقم: ٢٧٥٩٦)

ولو ذبحه لأجل قدوم الأمير أو قدوم واحد من العظماء و ذكر اسم الله فقال: يحرم أكله لأنه ذبحها لأجله تعظيما له. (الفتاویٰ التاتارخانية زكريا ١٧/ ٣٩٠، رقم: ٢٧٥٩٧)

وكذا لو سمى و ذبح لقدوم الأمير أو غيره من العظماء لايحل لأنه ذبح تعظيما له لا لله تعالىٰ بخلاف ما إذا ذبح للضيف فإنه لله تعالىٰ. (مجمع الأنهر، كتاب الذبائح، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ١٥٥، مصرى قديم ٢/ ٥٠٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۹۹۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/۳/الاول ۱۴۳۴ھ

صدقہ کی بکری میں کفار کا طریقہ اختیار کرنے کا حکم

سوال [۹۸۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میری طبیعت اکثر خراب ہوجایا کرتی ہے، میری زوجہ نے ایک کالے رنگ کا بکرا منگایا، اس کے سارے جسم پر میرا ہاتھ پھرایا گیا اور مکان کے اس حصہ میں بکرا کو گھمایا پھرایا گیا جہاں خصوصاً میرا اٹھنا بیٹھنا رہتا ہے، اس کے بعد اسے ذبح کرا دیا گیا اور اس کا گوشت نادار لوگوں میں تقسیم کرا دیا گیا، اور مجھے یہ باور کرایا گیا کہ کوئی بلا پریشان کررہی ہے اور یہ فعل رد بلا ہے، آسمان سے جو بلا آتی ہے اسے یہ گوشت یا یہ فعل آسمان ہی کی طرف واپس کردے گا، اور یہ بھی کہ یہ فعل ہمارے مذہب اسلام کے مطابق ہے، برعکس اس کے میری تجویز کچھ اس طرح ہے کہ بکرے والی رقم کو کسی ایسے دینی مدرسہ کو دیدیا جائے جس میں بیرونی طلباء تعلیم حاصل کرتے ہوں، یا گندم خرید لیا جائے اور اسے مستحق لوگوں میں تقسیم کرادیا جائے، یا آلو چاول کی ایک یا دو دیگ بنا کر غرباء اور نادار لوگوں کو کھانا کھلا دیا جائے، میرا خیال ہے کہ بکرے کا گوشت پکانے میں نادار لوگوں کو زیر باری خرچ کی ہوگی، تو کیا میری تجویز بیگم کے فعل سے بہتر ہے یا اگر دونوں تجاویز بہتر ہیں تو افضل کیا ہے؟

المستفتی: جمیل احمد ابن بشیر مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کی بیگم کا تجویز کردہ طریقہ کفار اور اغیار کا طریقہ ہے اسلامی طریقہ نہیں ہے، ایسے بکروں کا گوشت غریبوں اور نادار لوگوں کے لیے بھی کھانا جائز نہیں اور اس کا گوشت مردار کے حکم میں ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۸۷/۷، ڈابھیل ۱۸۰/۹، ایضاح المسائل ۱۳۸)

اور آپ کی تجویز کردہ تمام صورتیں شرعاً جائز اور مناسب ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍ شعبان المعظم ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۱۵۵)

کاروبار میں برکت کے لیے بکرا ذبح کرنا

سوال [۹۸۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کاروبار میں برکت اور پریشانی دور کرنے کے لیے دو بکرے خریدے تاکہ اس کو ذبح کر کے غرباء ومساکین میں تقسیم کریں، رواج ہے کہ اس گوشت کو گھر کے افراد نہیں کھاتے، پھر بعد میں ارادہ ہوا کہ ان کی قربانی کریں تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ اور دوبارہ دوسرے خرید کر کے ان کی جگہ تقسیم کروں تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

نیز دو بکروں کے خریدتے وقت کسی قسم کی نذر ومنت کی نیت نہیں کی تھی؟

المستفتی: محمد انیس محلّہ فیل خانہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر محض بطور شکر اور خیر وبرکت کے لیے ذبح کرنا مقصود ہے تو اس میں دو صورتیں ہیں ایک صورت یہ ہے کہ محض ذبح اور خون بہانے ہی کو باعث قربت سمجھا جائے، شرعاً اس طرح ذبح کرنا اور کسی کو کھلانا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۵۷۰/۳)

دوسری صورت یہ ہے کہ ذبح کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ فقراء ومساکین کو کھلانا اور کچھ عطیہ عطا کرنا مقصود ہے جو قصائی کی دوکان سے لے کر بھی پورا ہوسکتا ہے، تو اس صورت میں

خریدشدہ دونوں بکروں کوقربانی کے لیے رکھ سکتے ہیں اورقصائی کی دوکان سے گوشت لے کر فقراء کوکھلادیں یاپیسہ دیدیں۔

دوبارہ بکرے خریدنے کی ضرورت نہیں بلکہ نہ خریدنا ہی بہتر اوراولیٰ ہوگا۔(مستفاد: امدادالفتاویٰ ۵۷۰)فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیر احمدعفا اللہ عنہ
۲۱رذی قعدہ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر:۲۵/۱۴۹۶)

بیماری کے لیے بکرا ذبح کرنا

سوال [۹۸۳۴]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے منت مانی کہ میرا بچہ اگر بیماری سے شفایاب ہوگیاتو جان کے بدلہ جان دوں گا،منت میں نہ تو بکرے کانام لیانہ کسی بڑے جانور کااللہ کے فضل وکرم سے بچہ شفایاب ہوگیا۔

اب دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا بکرا ذبح کرکے غریبوں میں تقسیم کرنے سے ذمہ ساقط ہو جائے گا،کیا بکراایک سال کاہوناضروری ہےاگر چھ سات مہینہ کاہوتو درست ہوگایانہیں؟،کیا بکرا کسی مدرسہ یامستحق زکوٰۃ ہی کودیناضروری ہے یاکسی مسجد میں بھی دیاجاسکتاہے،جان کے بدلہ جان دوں اس طرح کےالفاظ سےنذر ماننا صحیح ہے یانہیں؟اگرنہیں تواگرکسی نے انہی الفاظ سےنذر مان لی تواس کاکیا کفارہ ہے براہ کرم چاروں جزوخصوصاً چوتھے جزو کاجواب تسلی بخش عنایت فرمائیں۔

المستفتی: ضیاءالرحمٰن قاسمی،مسجد کلیان،اہڑیان خانپور بلندشہر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جان کے بدلے جان دینے کی منت مانناشرعاً جائز نہیں ہےاور نہ ایسی منت معتبر ہوتی ہےاور نہ ہی ایسی منت کوپورا کرنا لازم ہے،لہٰذا شفایابی کے بعد بکرا ذبح کرنایاکسی اورجانور کاذبح کرنا درست نہ ہوگا،ہاں البتہ بہترشکل یہ ہے کہ ایک سال کے بکرے کی قیمت روپئے کی شکل میں نادارفقیروں ومسکینوں میں تقسیم کردیں تاکہ آپ کو

بھی تسلی ہو جائے اور صحت وتندرستی کا شکریہ ادا ہو جائے اور غریبوں کا فائدہ ہو جائے یہ صدقہ آپ پر واجب ولازم نہیں ہے، بلکہ امر مستحب ہے جو بطور مشورہ بتایا گیا ہے، اسی سے چاروں سوالوں کے جوابات کا مقصد سامنے آ گیا۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/۵۷۰، ایضاح المسائل ۱۳۹)

ولـو قـال إن بـرئـت مـن مرضى هٰذا ذبحت شاة أو عليَّ شاة أذبحها فبـر ئ لا يـلزمه شيئ لأن الذبح ليس من جنسه فرض بل واجب كالأضحية فلا يصح. (شامی، كتاب الأيمان، زكريا ٥/٥٢٣، كراچی ٣/٧٣٩، ٣٤٠، حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح، دار الكتاب ديوبند ١/٦٩٤، هنديه زكريا قديم ٢/٦٦، جديد ٢/٧٢، البحر الرائق كوئٹه ٤/٢٩٦، زكريا ٤/٤٩٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ رصفر المظفر ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۹۳۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۲/۲۰ھ

بیماری کا بکرا

سوال [۹۸۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) بعض جگہوں پر رواج ہے کہ مدرسہ اسلامیہ میں لوگ زندہ بکرا یا ذبح کیا ہوا بکرا مقیم طلبہ کے لیے بھیجتے ہیں، اور یہ صدقہ ہوتا ہے کیا اس کو اساتذہ کرام بھی کھا سکتے ہیں جبکہ ان کا کھانا بھی مدرسہ سے طے ہے؟

(۲) اس بکرے اور گوشت کا اکثر وبیشتر حال یہ ہے کہ مریض کے اوپر اتار کر یا مریض کا اس پر ہاتھ پھرا کر یا مریض کی چارپائی کے پائے سے ایک دو دن باندھ کر لاتے ہیں؟

(۳) یا کوئی نئی مشین لگاتا ہے تو اس کے سامنے ذبح کر کے یا بھٹہ شروع کرتا ہے تو جس جگہ آگ لگائی جائے گی اس جگہ بکرا ذبح کر کے اور خون بھٹہ پر چڑھا دیتا ہے پھر گوشت طلبہ کے لیے مدرسہ میں بھیج دیا جاتا ہے یا گھر پر پکا کر کھلا دیا جاتا ہے تو کیا ایسے گوشت کو طلبہ اور مدرسین کے لیے کھانا از روئے شرع جائز ہے؟

(۴) یہ صورتیں ''و ما ذبح علی النصب'' کے تحت تو نہیں آتیں؟

(۵) اگر کسی مدرسہ کا منتظم ایسا گوشت طلبہ اور مدرسین کو کھلائے تو طلبہ یا مدرسین اس کے کھانے سے گنہگار تو نہیں ہوں گے؟ اور ناظم مدرسہ کا یہ فعل از روئے شرع کیسا ہے؟

المستفتی: محمد ساجد قاسمی مدرسہ فیض العلوم منجھولی بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) اگر صدقہ سے مراد نذر کا بکرا ہے تو اس کا گوشت صرف طلبہ کے لیے جائز ہے، صاحب نصاب مدرسین وملازمین کے لیے اس کا گوشت کھانا جائز نہیں ہے، اگر چہ ان کا کھانا منجانب مدرسہ ہی کیوں نہ ہو۔ (مستفاد: فتاویٰ دارالعلوم ۱۱/۱۱۰)

وهو مصرف أيضا لصدقة الفطر و الكفارة و النذر. (شامی، کتاب الزکوٰۃ، باب المصرف، زکریا ۳/۲۸۳، کراچی ۲/۳۳۹)

(۲) یہ عقیدہ اہل ہنود کا ہے اس طرح کا جانور فقیروں کے لیے بھی حلال نہیں ہے، اہل مدارس کو اس طرح کے جانوروں کا گوشت واپس کر دینا چاہیے، حضرت تھانویؒ نے امداد الفتاویٰ میں اس کو ناجائز لکھا ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/۵۷۰، ایضاح المسائل ۱۳۹)

(۳) ایسے جانور کا گوشت فقیروں وغریبوں کے لیے ناجائز اور حرام ہے، یہ جانور میتۃ کے حکم میں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۴/۵۷۰، ایضاح المسائل ۱۳۹، فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۰/۸۴، جدید ڈابھیل ۱/۳۳۱)

(۴) اگر ایسا جانور ہے جس کو ذبح کر کے اس کا خون بھٹہ یا بنیاد میں ڈالدیا گیا ہے اگر چہ گھروں میں پکا کر ہی کھلایا جائے اس کا کھانا جائز نہیں ہے، یہ ''**ما ذبح علی النصب**'' کی طرح حلال نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۴/۵۷۰ فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۰/۸۴، جدید ڈابھیل ۱/۳۳۱)

(۵) مسئلہ معلوم ہو جانے کے بعد اس کے کھانے اور کھلانے سے باز آجانا چاہیے اور مدرسہ کے منتظمین کو چاہیے کہ ایسا گوشت واپس کر دیں اور گوشت لانے والوں کو مسئلہ سمجھا دیا کریں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۴۴۹۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۶/۱۵ھ

مکان کی تعمیر پر بکرا ذبح کرنا

سوال [۹۸۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے مکان بنایا اور اس نے ایک بکرا صدقہ کیا، اس کو ذبح کراکر مدرسہ میں پورا گوشت مع سری پائے، گردہ کلیجہ وغیرہ بھیج دیا، نیز قیمت چرم بکرا مبلغ پچیس روپیہ بھی مدرسہ کو دیدیئے، کیا اس گوشت کو مدرسہ میں طلبہ کے علاوہ جو حضرات صاحب نصاب ہیں وہ بھی کھا سکتے ہیں یا نہیں؟ نیز جس نے صدقہ کیا اس نے اپنے گھر کے خرچ کے لیے کچھ نہیں رکھا جیسا کہ قربانی کے گوشت سے خود بھی کھاتے اور رکھتے ہیں، برائے کرم مسئلہ مندرجہ بالا سے ازروئے شرع مطلع فرما کر مشکور فرمائیں۔

المستفتی: عبد الرشید تحویلدار مدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ میں مکان بنانے پر بکرا ذبح کرنے کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں: (۱) پہلے سے منت یہ مان رکھی تھی کہ اگر بآسانی یہ مکان بن گیا تو اللہ کے نام پر بکرا ذبح کر کے مساکین کو کھلاؤں گا، تو ذبح کرنا درست ہے اس کا گوشت صرف فقراء کھا سکتے ہیں، خود یا مالدار نہیں کھا سکتے ہیں۔

(۲) منت نہیں مانی گئی بلکہ مکان بآسانی بن جانے پر بطور شکریہ غریبوں کو کھلانے کے لیے ذبح کیا ہے تو اس کا گوشت خود اور مالدار اور فقراء سب کو کھلا سکتے ہیں اس کی علامت یہ ہے کہ بکرا خود ذبح کیے بغیر کسی دوسری جگہ سے گوشت حاصل کر کے کھلانے میں مقصود میں کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔

(۳) مقصود فقراء کو کھلانا نہ ہو بلکہ ذبح کرنا ہی مقصود ہو، امداد یا کھلانا مقصد نہ ہو تو اس طرح ذبح کر کے خود کھانا اور مالدار کو یا مساکین وفقراء کو بھی کھلانا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/۵۷۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۸۸۸)

پیر یا دیوتا کے نام پر نیاز دیئے گئے جانور کا گوشت کھانا

سوال [۹۸۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی شخص کسی جانور کو کسی پیر صاحب یا دیوتا کے نام سے نیاز دیتا ہے تو اس گوشت کو کھانا کیسا ہے؟

المستفتی: قمرالدین بریاہی بازارسہرسہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اس طرح نیاز دینا حرام ہے اس کا گوشت وغیرہ کھانا سب ناجائز اور حرام ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۱/۲۱۱، جدید زکریا مطول ۱/۲۵۳، امداد الفتاویٰ ۴/ ۹۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱ر جمادی الاول ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۶۷۶)

غیر اللہ کے نام پر ذبح شدہ مذبوحہ کا کھانا

سوال [۹۸۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: غیر اللہ کے نام پر بہت سے کھانے پکاتے ہیں مثال کے طور پر جیسے نیاز ان سب کا کھانا جائز ہے یا ناجائز؟ میں نے بہت سے مدارس کے طلباء کو دیکھا ہے کہ بچے دعوت میں جاتے ہیں اور علماء کرام بھی ان بچوں کو بھیجتے ہیں، کیا ان کے لیے غیر اللہ کا کھانا حلال ہے؟

المستفتی: محمود محمدی جل گاؤں مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر غیر اللہ کے نام سے ذبح کر کے کھانا کھلاتے ہیں تو ایسا کھانا شرعاً حرام اور ناپاک ہے اس کا کھانا کسی کے لیے بھی جائز نہیں ہے۔ (مستفاد:

کفایت المفتی قدیم ۱/ ۲۱۱، جدید زکریا مطول ۱/ ۲۳۴، امداد الفتاویٰ ۲/ ۵۵۳)

اور اگر اللہ کے نام سے ذبح کرے اور اس کا ثواب کسی بزرگ کی روح کو بخش دے تو یہ جائز ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۲/ ۵۵۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ ؍ رجب المرجب ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۷۶۸)

اللہ کے نام پر منت یا صدقہ کا جانور ذبح کرنا

سوال [۹۸۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اللہ کے نام پر یا منت یا صدقہ پر جو جانور بکرا یا بھیڑ ذبح کیا جائے اس کا گوشت کیا خود ذبح کرنے والا استعمال کرسکتا ہے اور کھال وغیرہ کی قیمت کیا کرے، یا صرف فقراء ومساکین کو گوشت تقسیم کر دیا جائے؟

المستفتی: اعجاز احمد پیر غیب زکریا ہاؤس مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ میں جانور ذبح کرنے کی تین صورتیں مذکور ہیں اللہ کے نام پر بطور شکریہ کے ذبح کرنے کی دو صورتیں ہیں:

(۱) محض بطور شکریہ کے فقراء ومساکین کو کھلانا اور مدد کرنا مقصود ہو، جانور ذبح کرنا مقصود نہ ہو، اور بغیر ذبح کیے دوکان سے گوشت خرید کر کھلانے میں بھی مقصود میں کوئی فرق نہ پڑتا ہو، تو ذبح کر کے فقراء ومساکین کو کھلانا اور خود کھانا بھی جائز ہے۔

(۲) مقصود کھلانا اور امداد کرنا نہیں بلکہ ذبح کرنا ہی مقصود ہے، اور جانور کے بغیر مقصود میں فرق سمجھا جاتا ہے تو اس طرح جانور ذبح کرنا اور کھانا اور دوسروں کو کھلانا سب ناجائز ہے، اس کو ترک کرنا لازم ہے، بلکہ ایسی صورت میں جانور ذبح کیے بغیر روپیہ پیسہ وغیرہ سے صدقہ وخیرات کر دیا کریں۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/ ۵۷۰)

(۲) منت کے جانور کا گوشت خود کھانا جائز نہیں بلکہ فقراء کو کھلانا ضروری ہے، اور مالداروں کو کھلانا ناجائز ہے، اور اس کی کھال بھی فقراء کا حق ہے، اس کی قیمت خود استعمال کرنا جائز نہیں۔

مصرف الزكاة (إلى قوله) وهو أيضا مصرف لصدقة الفطر والكفارة والنذر وغير ذٰلک من الصدقات الواجبة. (شامی، کتاب الزکوٰۃ، باب مصرف الزکاۃ، زکریا ۳/۲۸۳، کراچی ۲/۳۳۹، مصری ۲/۷۹)

(۳) صدقہ سے مراد نذر کا جانور ہے، تو خود یا مالداروں کو کھلانا جائز نہیں ہے اور اگر اس سے مراد نفلی صدقہ ہے تو خود بھی کھا سکتا ہے اور مالداروں کو بھی کھلا سکتا ہے، لیکن فقراء کو کھلانا زیادہ بہتر اور اولیٰ ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ دار العلوم ۱۲/ ۱۴۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/۶۴۹)

٣٦ كتاب الأضحية

(١) باب: قربانی کے مسنون اعمال

قربانی کرنے والے کا بال وناخن وغیرہ نہ کٹوانا فقیر کے لیے یہ حکم نہ ہونا

سوال [٩٨٤٠]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہم نے سنا ہے کہ بقرعید کا چاند دیکھنے کے بعد بال، ناخن وغیرہ کٹوانا مکروہ ہے، یہ حکم صرف قربانی کرنے والوں کے حق میں ہے یا غریب فقیر جو قربانی نہیں کرے گا اس کے لیے بھی ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جو شخص قربانی کا ارادہ رکھتا ہو اس کے لیے مستحب ہے کہ عشرۂ اولیٰ ذی الحجہ میں قربانی سے پہلے بال اور ناخن وغیرہ نہ کٹوائے، اور جو شخص غریب وفقیر ہے اور قربانی کا ارادہ نہیں رکھتا ہے تو اس کے لیے یہ مستحب نہیں ہے بلکہ اس کے لیے بال وغیرہ کٹوانا درست ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ زکریا ١٠/ ٣١، فتاویٰ دار العلوم ١٥/ ٥٢٠، کتاب الفتاویٰ ٤/ ١٦٦، احسن الفتاویٰ ٧/ ٤٩٧)

عن أم سلمة قالت: قال رسول الله ﷺ: إذا دخلت العشر و أراد أحدكم أن يضحى فلايمس من شعره و بشره شيئا وفى رواية: فلايأخذن شعرا ولا يقلمن ظفرا. (صحيح مسلم، باب نهى من دخل عليه عشر ذى الحجة وهو مريد التضحية ...... النسخة الهندية ٢/ ١٦٠، بيت الأفكار رقم: ١٩٧٧)

أقول: نهى النبى ﷺ من أراد التضحية عن قلم الأظفار و قص الشعر فى العشر الأول، والنهى محمول عندنا على خلاف الأولىٰ. (إعلاء السنن، باب ما يندب للمضحى فى عشر ذى الحجة، كراچى ١٧/ ٢٦٨، دار الكتب العلمية بيروت ١٧/ ٢٩١، تحت رقم الحديث ٥٦٠١)

وقال الشامى: بعد نقل هذا الحديث: هذا محمول على الندب دون الوجوب بالإجماع. (شامى، باب العيدين، مطلب: فى إزالة الشعر والظفر فى ذى

الحجة، زکریا ۳/ ٦٦، کراچی ۲/ ۱۸۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۹۳)

قربانی کے دن کس کی قربانی سے گوشت کھانا افضل؟

سوال [۹۸۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عیدالاضحیٰ کے دن جو قربانی کے گوشت ہی کا کھانا سب سے افضل ہے، اس سے مراد اپنی قربانی کا گوشت ہے، یا کسی کی بھی قربانی کے گوشت سے ابتداء کرلی تو افضلیت مل جائے گی؟

المستفتی: عبدالرشید قاسمی سیڈھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عیدالاضحیٰ کو جس شخص کو قربانی کرنی ہوتی ہے اس کے لیے اپنی قربانی کے گوشت سے کھانے کی ابتداء کرنا افضل اور بہتر ہے یہی حدیث سے بھی ثابت ہے، اور جن لوگوں کو قربانی نہیں کرنا ہے، ان کے لیے بھی کھانے کی ابتداء کسی کی بھی قربانی کے گوشت سے کرنا افضل اور بہتر ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ ڈابھیل ۱۷/ ۴۸۵)

عن بريدة أن النبي صلى الله عليه وسلم كان لايخرج يوم الفطر حتى يطعم، وكان لايأكل يوم النحر شيئا حتى يذبح فيأكل من أضحيته. (سنن الدار قطني، كتاب العيدين، دار الكتب العلمية بيروت ۲/ ۳٤، رقم: ۱٦۹۹، مسند أحمد بن حنبل ٥/ ۳٥۳، رقم: ۲۳۳۷۲)

الأكل من أضحية التطوع والواجب غير المنذور سنة لما ثبت عن النبي صلى الله عليه وسلم في حديث بريدة رضـ أنه صلى الله عليه وسلم كان لايخرج يوم الفطر حتى يطعم وكان لايأكل يوم النحر شيئا حتى يذبح فيأكل من أضحيته. (إعلاء السنن، باب التصدق بلحوم الأضاحي وغيرها، كراچی ۱۷/ ۲٦۷، دار الكتب العلمية بيروت ۱۷/ ۲۸۹، تحت رقم الحديث ٥٦۰۰)

وهي أحكام الأضحىٰ لكن هنا يؤخر الأكل ...... و أطلقه فشمل من

لایضحی. (البحر الرائق، باب صلاة العیدین، زکریا ۲/ ۲۸٤، کوئٹه ۲/ ۱٦۳)

ویندب تاخیر أکله عنها وإن لم یضح فی الأصح. (الدر المختار، باب العیدین، مطلب: لا یلزم من ترك المستحب ثبوت الکراهة، زکریا ۳/ ٦۰، کراچی ۲/ ۱۷٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰؍ ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۵۳)

کیا عورت کا بھی اپنے ہاتھ سے قربانی کرنا افضل ہے؟

سوال [۹۸۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مضحی کے لیے اپنے ہاتھ سے اپنی قربانی کا جانور ذبح کرنا افضل ہے، تو اسی طرح اگر عورت ذبح کرنا جانتی ہو اور اس کو ذبح کرنے کی ہمت بھی ہو تو اس کے لیے ذبح کرنا افضل ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: محمد قاسم گودھروی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر کوئی عورت ٹھیک طرح ذبح کرنا جانتی ہو اور ذبح کی جگہ پر پردہ وغیرہ کا معقول نظم ہو تو عورت کے لیے بھی اپنے ہاتھ سے اپنی قربانی کا جانور ذبح کرنا مستحب ہوگا۔ (مستفاد: بہشتی زیور حصہ سوم ۳۸، کتاب الفتاویٰ ۴/ ۱۹۷)

وندب أن یذبح بیده إن علم ذلک. (الدر المختار، کتاب الأضحیة، زکریا ۹/ ٤۷٤، کراچی ٦/ ۳۲۸)

المستحب هو أن یذبح أضحیته بیده إن کان یحسن الذبح. (البنایه اشرفیه ۱۲/ ٦۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ جمادی الثانیہ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۱۰۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۶/۲۲ھ

قربانی کرنے والے کے ہر بال یا قربانی کے جانور کے ہر بال کے برابر ثواب ملے گا؟

سوال [۹۸۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید داڑھی منڈواتا ہے اور انگریزی بال کٹواتا ہے، عیدالاضحیٰ کا چاند نظر آنے سے ایک دن پہلے حجامت بنوالیتا ہے، اس کے بعد قربانی کرکے بعد میں حجامت بنواتا ہے، کیا اس کو بھی ہر بال کے بدلے ایک نیکی کا ثواب ملے گا؟

المستفتی: عبدالحمید انصاری، قصبہ پاکبڑہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی کرنے والے کے ہر بال کے مقابلہ میں نیکی کا حکم نہیں ہے، بلکہ قربانی کا جانور جس کو ذبح کیا جاتا ہے اس کے ہر بال کے بدلہ میں ایک نیکی ملتی ہے، داڑھی منڈانے کا گناہ الگ ہے اور قربانی کا ثواب الگ ہے، اور خلوص سے جو بھی قربانی کرتا ہے اس کو قربانی کے جانور کے ہر بال کے بدلے میں ایک نیکی کا ثواب ملے گا۔

عن النبی ﷺ أنه قال: في الأضحية لصاحبها بكل شعرة حسنة. (سنن للترمذی، الأضاحی، باب ما جاء فی فضل الأضحية، النسخة الهندية ١/ ١٨٠، دار السلام رقم: ١٤٩٣، سنن ابن ماجه، باب ثواب الأضحية، النسخة الهندية ٢/ ٢٢٦، دار السلام رقم: ٣١٢٧، المعجم الكبير للطبرانی، دار إحياء التراث العربی بيروت ٥/ ١٩٧، رقم: ٥٠٧٥، المستدرك للحاكم، مكتبه نزار، مصطفیٰ الباز بيروت ٤/ ١٣٠٢، قديم ٢/ ٣٨٩، رقم: ٣٤٦٧، مسند أحمد بن حنبل ٤/ ٣٦٨، رقم: ١٩٤٩٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ جمادی الثانیہ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۱۰۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۶/۲۲ھ

۲ باب في أيام الأضحية ووقتها و قضائها

قربانی کے ایام تین ہیں یا چار؟

سوال [۹۸۴۴]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ قربانی کتنے روز کرنی چاہیے، ہم لوگ تین روز کرتے ہیں اور غیر مقلدین حدیث سے چار دن ثابت کرتے ہیں، آپ صحیح جواب دیں۔

المستفتی: زبیرعالم تجویدی، قصبہ دڑھیال رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ہم بھی صحیح اور معتبر احادیث شریفہ سے قربانی کے تین دن ثابت کرتے ہیں اور ہم اہل سنت والجماعت جن روایات سے تین دن قربانی ثابت کرتے ہیں وہ زیادہ واضح اور صریح ہیں اور وہ لوگ جن روایات سے ثابت کرتے ہیں چار دن کے لیے لفظ اربعہ ایام کہیں نہیں آیا ہے، ہم ثلاثۃ ایام کے لفظ کے ساتھ ثابت کرتے ہیں، چند روایات حسب ذیل ہیں:

عن عبد الله بن عمر قال: الأضحىٰ يومان بعد يوم الأضحىٰ. (مؤطا امام مالك، كتاب الضحايا، اشرفى ديوبند ١٨٨)

عن عبد الله بن عمر رضى الله عنهما كان يقول: الأضحىٰ يومان بعد يوم الأضحىٰ. (السنن الكبرىٰ للبيهقى، قديم ٢٩٧/٩، جديد دار الفكر بيروت ٢٤٨/١٤، رقم: ١٩٧٩٣)

عن ابن عباسؓ قال: أيام النحر ثلاثة أيام (الحديث). (إعلاء السنن، باب أن الأضحية يومان بعد يوم الأضحىٰ، كراچى ٢٣٥/١٧، دار الكتب العلمية بيروت ٢٥٦/١٧)

عن سليمان ابن موسىٰ أنه قال: النحر ثلاثة أيام فقال مكحول: صدق. (السنن الكبرىٰ قديم ٢٩٧/٩، جديد دار الفكر بيروت ٢٤٨/١٤، رقم: ١٩٧٩١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍محرم الحرام ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۹۸۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۱/۱۴۱۳ھ

قربانی تین ہی دن کیوں کی جاتی ہے؟

سوال [۹۸۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قربانی تین ہی دن کیوں کی جاتی ہے، تین دن کی تخصیص کیوں ہے؟

المستفتی: نعیم الدین سیتامڑھی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی کے ایام کے بارے میں اہل ظاہر کے نزدیک محرم کا چاند دیکھنے تک جائز ہے، اور حضرت امام شافعی کے نزدیک چار دن قربانی جائز ہے، مگر حضرت امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام احمد بن حنبل اور امام سفیان ثوری وغیرہ کے نزدیک صرف تین دن جائز ہے اس کے بعد جائز نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بارے میں جتنی روایات مروی ہیں ان میں سے سب سے صحیح اور معتبر روایت تین دن والی ہے، اس لیے تین ہی دن جائز ہے، اس کے بعد جائز نہیں اس کی تفصیل (بنایہ شرح ہدایہ، کتاب الأضحیۃ قدیم ۴/ ۷۶، جدید اشرفیہ دیوبند ۱۲/ ۲۶) میں موجود ہے اور مختلف روایات (اعلاء السنن باب أن الاضحیۃ یومان بعد یوم الاضحیٰ کراچی ۱۷/ ۲۳۶، دارالکتب العلمیۃ بیروت ۱۷/ ۲۵۷) میں ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۳۵۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۶/۱۷ھ

یوم النحر وایام التشریق کی وضاحت

سوال [۹۸۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) یوم النحر ماہ ذی الحجہ میں کون سے دن کو کہتے ہیں؟

(۲) ایام تشریق کسے کہتے ہیں اور کتنے ہوتے ہیں، اور کون کون سی تاریخ میں ایام

تشریق ہوتے ہیں۔

المستفتی: سعید دانش ٹانڈہ رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) یوم النحر ماہ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو کہا جاتا ہے، اور ایام النحر دسویں، گیارھویں اور بارھویں تاریخوں کو کہا جاتا ہے۔

وأيام النحر ثلاثة و أيام التشريق ثلاثة والكل يمضي بأربعةأولها نحر لا غير. (هدايه مع البناية، كتاب الأضحية قديم ٤/ ١٧٨، جديد اشرفيه ديوبند ١٢/ ٣٠)

(۲) ایام تشریق تین دن ہیں: گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں ذی الحجہ، تو معلوم ہوا کہ گیارھویں اور بارھویں تاریخ ایام النحر اور ایام تشریق دونوں میں داخل ہیں۔

وأيام النحر ثلاثة و أيام التشريق ثلاثة، والكل يمضي بأربعة أولها نحر لا غير، يعني غير تشريق و آخرها تشريق لا غير يعني و آخر أيام الأربعة تشريق من غير نحر والمتوسطان وهما الحادى عشر والثانى عشر من الشهر نحر و تشريق فيساويان فى يومين ويشابهان فى يومين. (بنايه قديم ٤/ ١٧٨، جديد اشرفيه ديوبند ١٢/ ٣٠، فتح القدير، باب صلاة العيدين، فصل فى تكبيرات التشريق، دار الفكر بيروت ٢/ ٨١، كوئٹه ٢/ ٤٨، زكريا ٢/ ٧٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

كتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ ذیقعدہ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۷۰۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۱۱/۱۵ھ

کیا دسویں ذی الحجہ سے قبل قربانی ہوسکتی ہے؟

سوال [۹۸۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ذی الحجہ کے مہینے میں اگر قربانی کے جانور کو بیماری کی وجہ سے ۱۰/ تاریخ سے پہلے ہی ذبح کرلے اور گوشت تین حصہ کرلے اور سب حق ادا کرے تو یہ قربانی درست ہے یا نہیں؟

میرا ایک ہی بکرا تھا وہ بیمار ہوگیا، مرنے کے قریب ہوگیا اس لیے میں بہت پریشان تھا تو ایک مولانا صاحب سے کہا کہ ایسی ایسی بات ہے تو مولانا صاحب نے کہا بکرا لاؤ، ذبح کردو، قربانی ہوگئی، کیونکہ ذی الحجہ کا چاند ہوچکا ہے اور تمہارا واجب ادا ہوگیا تو کیا شرعاً یہ قربانی درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد دلشاد ٹھرکی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی کا وقت ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کی صبح صادق سے شروع ہوتا ہے اس سے قبل قربانی کا وقت ہی نہیں ہوتا، اور وقت آنے سے قبل قربانی صحیح نہیں ہوتی، لہٰذا اگر آپ نے دسویں ذی الحجہ کی صبح صادق سے قبل ذبح کردیا ہے تو قربانی درست نہیں ہوئی، مذکورہ مولانا صاحب کی بات صحیح نہیں۔

وأما الذي يرجع إلى التضحية فهو أنها لا تجوز قبل دخول الوقت لأن الوقت كما هو شرط الوجوب فهو شرط جواز إقامة الواجب كوقت الصلاة فلا يجوز لأحد أن يضحي قبل طلوع الفجر الثاني من اليوم الأول من أيام النحر. (بدائع الصنائع، كتاب التضحية، فصل و أما ما بيان يرجع إلى وقت التضحية زكريا ٤/٢١١، تاتارخانية زكريا ١٧/٤١٦، رقم: ٢٧٦٨٧)

وأول وقتها أي أول وقت تضحية الأضحية بعد فجر النحر. (مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/١٦٩، هدايه اشرفي ديوبند ٤/٤٤٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴ محرم الحرام ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۰۹۵)

دس ذی الحجہ کی مغرب کے بعد قربانی کرنا

سوال [۹۸۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قربانی کا جانور نویں ذی الحجہ کو بیمار ہوجائے اور اتنا بیمار ہوجائے کہ دس تاریخ کی

صبح تک روکنا ممکن نہ ہوتو اگر اس کی قربانی دس تاریخ شروع ہوتے ہی متصلاً مغرب کے بعد کردی جائے تو کیا اس کی قربانی ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: محمد جنید لکھیم پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: قربانی کا وقت دس ذی الحجہ کی طلوع صبح صادق سے شروع ہوتا ہے اس لیے مسئولہ صورت میں جانور کے بیمار ہونے کی وجہ سے دس ذی الحجہ کی مغرب کے بعد جانور کو ذبح کرنے سے قربانی ذمہ سے ساقط نہیں ہوئی بلکہ قربانی کا وجوب اس کے ذمہ بدستور باقی ہے اب قربانی تو نہیں ہوسکتی اس کی تلافی کی یہی شکل ہے کہ ایک اوسط درجہ کا بکرا جو قربانی کے لائق ہو اس کی قیمت فقیروں کو صدقہ کردے۔

وأما الذى يرجع إلى وقت التضحية فهو أنها لاتجوز قبل دخول الوقت لأن الوقت كما هو شرط الوجوب فهو شرط جواز إقامة الواجب كوقت الصلاة فلا يجوز لأحد أن يضحى قبل طلوع الفجر الثانى من اليوم الأول من أيام النحر. (بدائع الصنائع، كتاب التضحية، فصل و أما بيان ما يرجع إلى وقت التضحية، زكريا ٤/ ٢١١، تاتارخانية زكريا ١٧/ ٤١٦، رقم: ٢٧٦٨٧)

وأول وقتها أى أول وقت تضحية الأضحية بعد فجر النحر. (مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ١٦٩، هدايه اشرفى ديو بند ٤/ ٤٤٥)

ولايجوز التضحية فى الليلة الأولىٰ من أيام النحر، ويجوز فى الليلة الثانية والثالثة، فلم يجعل الليلة الأولىٰ هنا تبعا للنهار إنما جعلها تبعا لنهار ماض، وفى سائر الأوقات جعل الليل تبعا للنهار الآتى من أيام النحر، إنما جعل ذٰلك رفقا بالناس حتى لايفوتهم الحج لو وقفوا فى الليلة الأولىٰ من يوم النحر. (تاتارخانية زكريا ١٧/ ٤١٩، رقم: ٢٧٦٩٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ر محرم الحرام ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۸۷۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/ ۱/ ۱۴۲۴ھ

پہلے دن کسی عذر کی بنا پر نمازعیدالاضحیٰ نہ پڑھی گئی ہوتو قربانی کب کریں؟

سوال [۹۸۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جس طرح عذر کے پائے جانے کی صورت میں عیدین کی نماز دوسرے دن پڑھنے کا حکم ہے تو کیا ایسی صورت میں عیدالاضحیٰ کے موقعہ پر قربانی نماز پر موقوف ہوگی یا پہلے ہی دن قربانی کی جاسکتی ہے، جبکہ عذر کے پائے جانے کی بنا پر عیدالاضحیٰ کی نماز پہلے دن نہیں پڑھی گئی؟

المستفتی: عبداللہ مدرسہ فرقانیہ گونڈہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عیدالاضحیٰ کی نماز اگر کسی عذر کی بنا پر پہلے دن نہیں پڑھی جاسکی تو زوال کے بعد قربانی کرسکتے ہیں، اس سے پہلے قربانی کرنا جائز نہ ہوگا۔
(مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۴/ ۳۰۷، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۴۵۳)

وأول وقتها بعد الصلاة إن ذبح في مصر (إلى قوله) وبعد مضي وقتها لو لم يصلوا لعذر. (شامی، کتاب الأضحية، کراچی ٦/ ۳۱۸، زکریا ۹/ ٤٦٠)

ولو لم يصل الإمام العيد في اليوم الأول، أخروا التضحية إلى الزوال، ثم ذبحوا، ولا تجزئهم التضحية مالم يصل الإمام العيد في اليوم الأول إلا بعد الزوال فحينئذ يجوز لخروج وقتها. (تبيين الحقائق امداديه ملتان ٦/ ٤ زكريا ديوبند ٦/ ٤٧٧، الدر المنتقى، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ١٦٩، تاتارخانية زكريا ١٧/ ٤١٨، رقم: ٢٧٦٩١، طحطاوى على المراقى، باب العيدين قديم ص:٢٩٤، جديد دار الكتاب ديوبند ص: ٥٣٨) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۷/ ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۵۳۰)

قربانی کرنے کا وقت

سوال [۹۸۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قربانی بعد نماز کریں یا قبلِ نماز عید الاضحیٰ؟

المستفتی: مظاہر حسن پورنوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جہاں نماز واجب ہوتی ہے وہاں نماز عید الاضحیٰ سے قبل قربانی جائز نہیں ہے، اگر وہاں کسی ایک جگہ نماز عید ہو جائے تو وہاں ان لوگوں کی بھی قربانی جائز ہو جائے گی، جنہوں نے ابھی اپنی نماز ادا نہیں کی ہے۔

عن أنس بن مالک قال: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: من ذبح قبل الصلاة فإنما ذبح لنفسه، ومن ذبح بعد الصلاة فقد تم نسكه و أصاب سنة المسلمين.

(صحيح البخاری، الأضاحی، باب سنة الأضحية، ۲/ ۸۳۲، رقم: ۵۳۳۱، ف: ۵۵٤٦)

أول وقتها بعد الصلاة إن ذبح فی مصر أی بعد أسبق صلاة عيد. (در مختار، كتاب الأضحية، كراچی ٦/ ۳۱۸، زكريا ۹/ ٤٦٠، تاتارخانية زكريا ۱۷/ ٤۱٦، رقم: ۲۷٦۸۷، هدايه اشرفی ديوبند ٤/ ٤٤٥، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ۱٦۹)

ولو ضحى بعد ما صلى أهل المسجد ولم يصل أهل الجبانة أجزأه استحسانا، لأنها صلاة معتبرة حتى لو اكتفوا بها أجزأتهم. (شامی، كراچی ٦/ ۳۱۸، زكريا ۹/ ٤٦٠، تبيين الحقائق زكريا ديوبند ٦/ ٤۷۷، امداديه ملتان ٦/ ٤، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ۱۷۰، البحر الرائق زكريا ۸/ ۳۲۲، كوئٹه ۸/ ۱۷۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ محرم الحرام ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۵۸۴)

نماز عید سے پہلے قربانی کرنے کا حکم

سوال [۹۸۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک گاؤں جس کی آبادی ۲۰ یا ۲۵ / ہزار کے لگ بھگ ہے اور کچھ کم وبیش ہے اس میں پہلے سے جمعہ وعیدین کی نماز ہوتی ہے تو کیا ایسے گاؤں میں عید کی نماز سے قبل قربانی کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر کوئی نماز عید سے پہلے قربانی کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ نیز ایک ایسا گاؤں جس میں تقریباً ۳۰۰۰ / ہزار ووٹ ہیں، کیا اس میں نماز عید سے قبل قربانی کرنا جائز ہے کہ نہیں، وہاں ضروریاتِ سامان مہیا ہیں، اس گاؤں کی آبادی کتنی ہونی چاہیے، شرط کیا ہے جس میں نماز عید سے پہلے قربانی کرنا جائز نہیں ہے؟

المستفتی: انیس الرحمٰن معصوم پور مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ۲۵/۲۰ / ہزار کی آبادی شرعی طور پر شہر اور بڑے قصبہ کے حکم میں ہے اسی طرح جس گاؤں میں ۳۰۰۰ / ووٹ ہیں وہ بھی بڑے قصبہ کے حکم میں ہے ان دونوں قسم کی آبادی میں جمعہ فرض ہے، اور اسی طرح عیدین کی نماز بھی واجب ہے، ان دونوں قسم کی آبادیوں میں عید کی نماز سے پہلے قربانی جائز نہیں ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص نماز سے پہلے وہاں قربانی کردے گا تو عید کی نماز کے بعد دوبارہ قربانی کرنا لازم ہوگا۔

عن أنس بن مالک قال: قال النبی ﷺ: من ذبح قبل الصلاة فإنما ذبح لنفسه، ومن ذبح بعد الصلاة فقد تم نسکه و أصاب سنة المسلمين.

(صحيح البخاری، الأضاحی، باب سنة الأضحية ۲/ ۸۳۲، رقم: ۵۳۳۱، ف: ۵۵۴۶)

ولايجوز لأهل الأمصار الذبح حتى يصلى الإمام العيد. (هدايه، كتاب الأضحية، اشرفی ديوبند ٤/ ٤٤٥، تاتارخانية زكريا ١٧/ ٤١٦، رقم: ٢٧٦٨٧، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ١٦٩)

نیز یہ بات بھی یاد رکھنی ہے کہ قربانی کرنے والوں کو اپنی نماز پڑھنا لازم نہیں ہے؛

بلکہ پوری آبادی میں کہیں بھی نماز عید ہوگئی ہے تو اس آبادی کے ان لوگوں کے لیے بھی قربانی جائز ہوجاتی ہے، جنہوں نے اپنی نماز ابھی ادا نہ کی ہو۔

ولو ضحیٰ بعد ما صلی أهل المسجد ولم یصل أهل الجبانة أجزأه استحسانا لأنها صلاة معتبرة. (شامی کراچی ٦/٣١٨، زکریا ٩/٤٦٠، تبیین الحقائق امدادیہ ملتان ٦/٤، زکریا دیوبند ٦/٤٧٧، مجمع الأنهر، دار الکتب العلمیة بیروت ٤/١٧٠، البحر الرائق کوئٹه ٨/١٧٥، زکریا ٨/٣٢٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۷۶۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۵/۲۱ھ

نمازِ عید سے قبل قربانی کرنے سے وجوب ساقط نہیں ہوگا

سوال [۹۸۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) مسجد میں عید کی نماز سے پہلے فجر کے فوراً بعد قربانی کرنا درست ہے یا نہیں؟

(۲) اگر کسی نے قربانی کرلی، عید کی نماز سے پہلے، تو کیا حکم ہے؟ قربانی ہوئی یا نہیں؟ اگر نہیں ہوئی تو کیا کریں؟ اور بعد میں نماز پڑھتا ہے عیدگاہ جاکر یا مسجد میں؟ تو کیا حکم ہوگا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱-۲) عید کی نماز سے پہلے جن لوگوں نے قربانی کی ہے، ان کی قربانی صحیح نہیں ہوئی، ان پر عید کی نماز کے بعد دوبارہ قربانی واجب ہوگی۔

فقال النبی ﷺ: من ذبح قبل الصلاة فلیست تلک الأضحیة إنما الأضحیة ما ذبح بعد الصلاة. (المعجم الأوسط، دار الفکر ٦/٣٨٥، رقم: ٩١٤٩)

عن جندب، قال ﷺ: یوم النحر، ثم خطب ثم ذبح، فقال: من ذبح قبل أن یصلی، فلیذبح أخریٰ مکانها، ومن لم یذبح، فلیذبح باسم الله.
(صحیح البخاری، باب کلام الإمام والناس في خطبة العید، النسخة الهندیة ١/١٣٤، رقم:

۹۷۵، ف: ۹۸۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۴۲۱)

نماز عید سے قبل قربانی اور اس کی قضاء کا طریقہ

سوال [۹۸۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ایسی بستی جس میں پانچ ہزار سے زائد ووٹ ہیں اور آٹھ نو مسجدیں ہیں جن میں نماز جمعہ ادا کی جاتی ہے، سرکاری ہسپتال، صرافہ، پردھان روڈ، تین عیدگاہیں جن میں عیدین کی نماز ادا کی جاتی ہے نیز جمعہ بھی ہوتا ہے، ڈاکخانہ اور ہفتہ میں تین بازار لگتے ہیں۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسی بستی میں دس ذی الحجہ کو فجر کے بعد نماز عید ادا کرنے سے پہلے کسی نے قربانی کر لی تو یہ قربانی ادا ہو جائے گی یا اسے دوسری قربانی کرنا واجب ہوگا؟

(۲) نیز اس صورت میں ایام قربانی گذرنے کے بعد معلوم ہوا کہ قربانی درست نہیں ہوئی تو غیر ایام نحر میں اس کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی؟

المستفتی: شریف احمد رتن پوری کلاں مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) جس بستی میں پانچ ہزار سے زائد ووٹ ہیں اس کی مردم شماری بچے بوڑھے مسلم غیر مسلم سب ملا کر دس ہزار سے کم نہ ہوگی، ایسی آبادی شرعی طور پر شہر کے حکم میں ہوتی ہے، وہاں نماز عید الاضحیٰ سے قبل قربانی درست نہیں ہے، اگر کسی نے نماز سے قبل قربانی کر لی ہے تو اس پر نماز کے بعد دوسری قربانی کرنا لازم ہے۔

عن أنس بن مالک قال: قال النبی ﷺ: من ذبح قبل الصلاة فإنما ذبح لنفسه، ومن ذبح بعد الصلاة فقد تم نسكه و أصاب سنة المسلمين.

(صحیح البخاری، الأضاحی، باب سنة الأضحية ۲/۸۳۲، رقم: ۵۳۳۱، ف: ۵۵۴۶)

أنـه شـرط لـلمصري تقديم الصلاة عليها فعدم الجواز لفقد الشرط.
(شامي، كتاب الأضحية، كراچی ٦/٣١٨، زكريا ٩/٤٦٠، هدايه اشرفی ديوبند ٤/٤٤٥)

(۲) ایام نحر گذر جانے کے بعد اس کی ادائیگی کی شکل یہ ہے کہ سال بھر کا ایک بکرا صدقہ کردے یا اس کی قیمت فقراء میں اسی نیت سے صدقہ کردے۔

وإن كـان مـن لـم يضح غنيا ولم يوجب على نفسه شاة بعينها تصدق بقيمة شاة اشترىٰ أو لم يشتر. (عالمگیری، زکریا قدیم ٥/٢٩٦، جدید ٥/٣٤٢)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲ر محرم الحرام ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۵۷۳)

پندرہ سو کی آبادی والے گاؤں میں نمازِ عید سے قبل قربانی کرنے کا حکم

سوال [۹۸۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے گاؤں میں دو مسجدیں ہیں، اور ایک عیدگاہ بھی ہے، دونوں مسجدوں میں علیحدہ علیحدہ جمعہ بھی ہوتا ہے، ایک مسجد میں عیدین کی نماز بھی ہوتی ہے جس طرح عیدگاہ میں ہوتی ہے، جبکہ گاؤں کی کل آبادی چھوٹے بڑے سب ملا کر پندرہ سو سے کم ہی کم ہے، کہ زید کے گاؤں کے لوگ عیدگاہ ومسجد کی نماز سے قبل صبح صادق ونماز فجر کے بعد قربانی کے جانور ذبح کردیتے ہیں، کیا ان کی قربانی مسلک حنفی کے نزدیک درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: رئیس احمد واہل بستی، چودھر پور رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ سے واضح ہوا کہ مذکورہ گاؤں کی کل آبادی مردم شماری کے حساب سے پندرہ سو سے بھی کم ہے، یہ گاؤں شرعاً دیہات ہے، بڑے گاؤں اور قصبہ کے حکم میں نہیں ہے اس لیے اس گاؤں میں جمعہ اور عیدین جائز نہیں ہے، اور جمعہ پڑھنے

والوں پر ظہر کی فرضیت باقی رہ جائے گی اور وہاں چونکہ عید کی نماز شریعت اسلامی کی رو سے مشروع نہیں ہے، اس لیے صبح صادق کے بعد قربانی کے جانور کو ذبح کرنا جائز ہے۔

وعبارة القهستاني: تقع فرضا في القصبات والقریٰ الكبيرة التي فيها أسواق. (شامی، باب الجمعة، کراچی ۱۳۸/۲، زکریا ۶/۳)

وفيما ذكرناه إشارة إلى أنه لايجوز في الصغيرة التي ليس فيها قاض و منبر (إلى قوله) ألا ترىٰ أن في الجواهر: لو صلوا في القرىٰ لزمهم أداء الظهر. (شامی زکریا ۷/۳، کراچی ۱۳۸/۲)

وقد قال قاضيخان: فأما أهل السواد والقرىٰ والرباط عندنا يجوز لهم التضحية بعد طلوع الفجر. (شامی، کتاب الأضحية، کراچی ۳۱۸/۶، تاتارخانية زکریا ۴۱۶/۱۷، رقم: ۲۷۶۸۷، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ۱۶۹/۴، هدايه اشرفی دیوبند ۴۴۵/۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳ رمحرم الحرام ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۹۲۲/۴۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۱/۳ھ

قصبہ کے باشندوں کا نماز عید سے پہلے گاؤں کے قریب جا کر قربانی کرنے کا حکم

سوال [۹۸۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارا گاؤں سیڈھا ہے بڑی بستی ہے جمعہ اور عیدین ہوتی ہے، قربانی ہمارے گاؤں میں عید کی نماز سے پہلے جائز نہیں ہے عرصہ دراز سے ہمارے گاؤں والے ایسا کرتے ہیں کہ قریب ہی میں ایک گاؤں دوگھری ہے، چھوٹی سی بستی ہے ہم سیڈھے والے اس گاؤں کے جنگل اور کھیت میں پہنچ کر یعنی اپنے گاؤں کی حدود سے نکل کر عید سے پہلے اپنی قربانی کر لیتے ہیں، زید کہتا ہے کہ یہ قربانی درست نہیں ہے، بلکہ دوگھری گاؤں کی آبادی میں قربانی کرنا ضروری ہے، قابل استفتاء یہ ہے کہ بڑے گاؤں یا قصبہ والے کو اگر عید سے پہلے اپنی قربانی کرنی ہو تو وہ

چھوٹے گاؤں کے اندر ہی پہنچ کر یا اس گاؤں کے قریب کسی کھیت وغیرہ میں پہنچ کر قربانی کرسکتا ہے جیسا کہ سیڑھے کے لوگ ایک عرصہ سے ایسے ہی اپنی قربانی کرتے چلے آرہے ہیں؟

المستفتی: عبد الرشید قاسمی سیڑھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سیڑھا گاؤں جو قصبہ کے حکم میں ہے اس کے باشندوں کے لیے موضع دوگھری کے پاس جا کر عید سے قبل قربانی کرنا جائز ہے اور گاؤں کی آبادی کے اندر ذبح کرنا لازم نہیں ہے، بلکہ قصبہ سیڑھے کے حدود سے سے باہر لے جانا کافی ہے۔

ثم المعتبر فی ذٰلک مکان الأضحیة حتی لو کانت فی السواد والمضحی فی المصر یجوز کما انشق الفجر ولو کان علی العکس لایجوز إلا بعد الصلاة، وحیلة المصری إذا أراد التعجیل أن یبعث بها إلی خارج المصر فیضحی بها کما طلع الفجر. (هدایه، کتاب الأضحیة، اشرفی دیوبند ٤/٤٤٦، تبیین الحقائق امدادیه ملتان ٦/٤، زکریا دیوبند ٦/٤٧٧، البنایه فی شرح الهدایة، اشرفیه دیوبند ١٢/ ٢٤، مجمع الأنهر، دار الکتب العلمیة بیروت ٤/١٧٠، تاتارخانیة زکریا ١٧/٤٢٢، رقم: ٢٧٧٠٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ ؍صفر المظفر ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/۳۳۲۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰؍۲؍۱۴۱۴ھ

قصبات میں نمازِ عید سے قبل قربانی

سوال [۹۸۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے گاؤں کی قربانی عمر کے گاؤں میں ہوتی ہیں اور عمر کے گاؤں کی آبادی تیرہ ہزار کی ہے، جس میں دس گیارہ مسجدیں بھی ہیں اور سات آٹھ گاؤں کی قربانی اور عیدین کی نماز بھی وہیں ہوتی ہے، کیا زید کے گاؤں والوں کو عمر کے مذکورہ گاؤں میں عید الاضحیٰ کی

نماز سے پہلے قربانی کرنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عمران بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جس کی آبادی تیرہ ہزار ہو وہ قصبات اور قریۂ کبیرہ میں داخل ہے اس میں جمعہ اور عیدین ادا کرنا واجب ہے، وہاں عید کی نماز سے قبل قربانی صحیح نہیں ہوگی، چاہے قربانی کرنے والے وہاں کے ہوں یا دوسری جگہ کے۔

تقع فرضا فی القصبات والقریٰ الكبيرة التی فيها أسواق. (شامی باب الجمعة کراچی ۲/ ۱۳۸، زکریا ۳/ ۶)

ويعتبر فی الذبح مكان الأضحية لا مكان الرجل فی المصر. (الجوهرة النيرة كتاب الأضحية امداديه ملتان ۲/ ۴۳۰، دار الكتاب ديوبند ۲/ ۲۶۹)

ثم المعتبر فی ذلک مكان الأضحية حتى لو كانت فی السواد والمضحى فی المصر تجوز. (هدايه اشرفی ديوبند ۴/ ۴۴۶، تبيين الحقائق امداديه ملتان ۶/ ۴، زكريا ديوبند ۶/ ۴۷۷، البناية فی شرح الهداية اشرفيه ديوبند ۱۲/ ۲۴، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ۴/ ۱۷۰، تاتارخانية زكريا ۱۷/ ۴۲۲، رقم: ۲۷۷۰۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۳۸۱)

بڑے گاؤں میں نماز عید سے پہلے قربانی کرنے کا حکم

سوال [۹۸۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کا بڑا گاؤں ہے، جس میں شرعاً جمعہ ہوتا ہے، ہر سال عیدین کی نماز اپنی مسجد میں پڑھ لیا کرتے تھے، کچھ لوگ یا اکثر لوگ پڑوس کے گاؤں کی عیدگاہ میں چلے جاتے تھے، قربانی اپنی مسجد میں نماز عید ہوجانے کے بعد ہی کرتے تھے، اس سال زید کے پورے گاؤں کے لوگ

عیدالاضحیٰ کی نماز پڑوس کے گاؤں کی عید گاہ میں پڑھنے چلے گئے اور اپنی مسجد میں نماز عید نہیں پڑھی معلوم یہ کرنا ہے کہ قربانی زید کے گاؤں کے لوگ اپنی بستی میں فجر کی نماز کے بعد کر سکتے ہیں یا نہیں، یا جہاں پر گاؤں کے لوگ نماز عید پڑھنے گئے ہیں اس نماز عید کے بعد قربانی کریں، جبکہ ایک دوسری عیدگاہ پڑوس ہی کے ایک بڑے گاؤں کی بھی ہے اس میں نماز عید اور پہلے ہوگئی لیکن زید کے گاؤں والوں نے نماز دوسری عیدگاہ میں پڑھی تو شرعاً کون سی عیدگاہ کی نماز ہونے کے بعد زید کے گاؤں والوں کو قربانی کرنا درست ہوگا، زید کے گاؤں میں کوئی عیدگاہ نہیں ہے؟

المستفتی: عبدالرشید قاسمی، سیڑھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ کی تحریر کے مطابق زید کا گاؤں ایسا بڑا گاؤں ہے جس میں جمعہ وعیدین کی نماز جائز اور مشروع ہے، ایسا بڑا گاؤں شرعاً قصبہ کے حکم میں ہے، اس میں فجر کی نماز کے بعد نماز عید سے پہلے قربانی جائز نہیں ہے، اگر قربانی کردی جائے تو وہ صرف گوشت خوری میں شمار ہوگی، اس سے قربانی کا فریضہ ادا نہیں ہوگا، مگر جب اس گاؤں کے لوگ عیدگاہ نہ ہونے کی وجہ سے دوسرے گاؤں کی عیدگاہ میں نماز عید پڑھنے کے لیے جاتے ہیں تو جس گاؤں کی عیدگاہ میں یہ لوگ نماز عید پڑھتے ہیں اس عیدگاہ میں نماز پڑھنے کے بعد ہی زید کے گاؤں میں قربانی درست ہوگی، ہاں البتہ پڑوس کے گاؤں کی عیدگاہ میں عید کی نماز پہلے ہوتی ہے اور زید کے گاؤں کا کوئی بھی فرد پڑوس کے گاؤں کی عیدگاہ کی نماز میں شریک ہوتا ہے تو اس کی نماز کے بعد زید کے گاؤں میں قربانی درست ہوجائے گی اور اگر پڑوس کی عیدگاہ میں کوئی بھی فرد نماز پڑھنے کے لیے نہ جائے تو پھر اس عیدگاہ کا اعتبار ہوگا جس میں اس گاؤں کے سب لوگوں نے نماز عید پڑھی ہو۔

حدثنا الأسود بن قیس سمعت جندب ابن سفیان البجلیؓ قال: شهدت النبی ﷺ یوم النحر فقال ﷺ: من ذبح قبل الصلاة فلیعد مکانها أخریٰ ومن لم یذبح فلیذبح. (بخاری شریف، کتاب الأضاحی، باب من ذبح قبل الصلاة أعاده ۲/ ۸۳۴، رقم: ۵۳۴۷، ف: ۵۵۶۲)

فأول وقتها فی حق المصری والقروی طلوع الفجر إلا أنه شرط للمصری تقديم الصلاة عليها. (شامی، کتاب الأضحية، زکريا ٩/ ٤٦٠، کراچی ٦/ ٣١٨)

وقت الأضحية يدخل بطلوع الفجر من يوم النحر إلا أنه لايجوز لأهل الأمصار الذبح حتى يصلی الإمام العيد. (هدايه اشرفی ديوبند ٤/ ٤٤٥، بدائع زکريا ٤/ ١٩٨، هنديه زکريا قديم ٥/ ٢٩٥، جديد ٥/ ٣٤١)

ولو كانت الأضحية فی المصر لم يصح قبل صلاة العيد فإن صلی فی أحد المسجدين إما فی مسجد الجبانة أو فی مسجد الجامع ثم ذبح جاز. (فتاویٰ سراجيه ص: ٣٨٧-٣٨٨)

إن كان يصلی فی المصر فی موضعين ...... إذا صلی أهل أحد المسجدين أيهما كان جاز ذبح الأضاحی. (بدائع الصنائع زکريا ديو بند ٤/ ٢١١، مجمع الأنهر دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ١٧٠، در مختار مع الشامی زکريا ٩/ ٤٦٠، کراچی ٦/ ٣١٨، تاتارخانية زکريا ١٧/ ٤١٩، رقم: ٢٧٦٩٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٣٠/ ذی الحجہ ١٤٣٤ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٤٠/ ١١٣٥٢)

ہندوستان میں رہنے والے کا سعودیہ میں قربانی کرانا

سوال [٩٨٥٨]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہندوستان میں رہنے والا شخص سعودیہ میں اپنی قربانی کرادے تو کیا حکم ہے، جبکہ ہندوستان میں ابھی اس پر قربانی کا وقت ہی نہیں آیا، کیونکہ سعودیہ میں ایک تاریخ عموماً آگے رہتی ہے؟

المستفتی: ممتاز احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ہندوستان میں رہنے والا شخص اگر سعودیہ میں

اپنی قربانی کرائے تو جب تک ہندوستان میں سبب وجوب یعنی دسویں ذی الحجہ کی صبح صادق نہ ہوجائے اس وقت تک سعودیہ میں اس کی واجب قربانی ادا نہ ہوگی، کیونکہ مالک قربانی پر اس وقت تک قربانی واجب ہی نہیں ہوتی ہے جب تک کہ اس کے یہاں دسویں ذی الحجہ کی صبح صادق نہ ہوجائے۔ (انوار رحمت ص:۳۹۱، کتاب المسائل۲/۳۰۱)

وأما الذی یرجع إلی وقت التضحیة فهو أنها لاتجوز قبل دخول الوقت لأن الوقت کماهو شرط الوجوب فهو شرط جواز إقامة الواجب کوقت الصلاة فلا یجوز لأحد أن یضحی قبل طلوع الفجر الثانی من الیوم الأول من أیام النحر.

(بدائع الصنائع، کتاب التضحیة، فصل و أما بیان ما یرجع إلی وقت التضحیة، زکریا ٤/ ٢١١)

وأما وقت الوجوب فأیام النحر فلا تجب قبل دخول الوقت لأن الواجبات المؤقتة لاتجب قبل أوقاتها کالصلاة والصوم و نحوهما و أیام النحر ثلاثة یوم الأضحیٰ وهو الیوم العاشر من ذی الحجة والحادی عشر و الثانی عشر و ذٰلک بعد طلوع الفجر فی الیوم الأول إلی غروب الشمس من الثانی عشر ...... فإذا طلع الفجر من الیوم الأول فقد دخل وقت الوجوب فتجب عند استجماع شرائط الوجوب. (بدائع الصنائع، فصل فی وقت الوجوب، زکریا ٤/ ١٩٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۴۱۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/۱/۱۴۳۵ھ

سعودیہ میں رہنے والے کی قربانی ہندوستان میں ۹؍ذی الحجہ کو کرنا

سوال [۹۸۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید سعودی عرب میں رہتا ہے، اس نے ہندوستان میں اپنی قربانی کے لیے اپنے رشتہ دار کو اطلاع کردی، اور سعودی عرب میں جب ۱۰؍ذی الحجہ ہوتی ہے تو ہندوستان میں ۹؍

ذی الحجہ ہوتی ہے تو ہندوستان میں اس کی قربانی ۹؍ذی الحجہ کو درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد احمد مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سعودیہ کی ۱۰؍ذی الحجہ جو ہندوستان کی ۹؍ذی الحجہ ہوتی ہے تو زید کی قربانی ہندوستان میں، ہندوستان کی ۹؍ذی الحجہ کو کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اگرچہ مالک جانور کے یہاں دس ذی الحجہ ہوگئی ہو مگر مقام اضحیہ میں دس ذی الحجہ نہیں آئی ہے اور صحت قربانی کے لیے مقام اضحیہ میں بھی دس ذی الحجہ کا ہونا لازم ہوتا ہے اور وہ یہاں مفقود ہے۔ (مستفاد: انوار رحمت ۳۹۴، کتاب المسائل ۲/ ۳۰۱)

ولو كان هو فى مصر وقت الأضحية وأهله فى مصر آخر فكتب إلى الأهل وأمرهم بالتضحية فى ظاهر الرواية يعتبر مكان الأضحية. (خانية، كتاب الأضحية، فصل فى صفة الأضحية، جديد زكريا ٣/ ٢٤٣، وهلى هامش الهندية زكريا ٣/ ٣٤٥)

أن الرجل إذا كان فى مصر و أهله فى مصر آخر فكتب إليهم ليضحوا عنه فإنه يعتبر مكان التضحية. (هنديه زكريا قديم ٥/ ٢٩٦، جديد ٥/ ٣٤٢)

وأول وقتها أى أول وقت تضحية الأضحية بعد فجر النحر و لكن لاتذبح فى المصر قبل صلاة العيد و هذا الشرط لمن تجب عليه صلاة العيد (إلى قوله) ثم المعتبر فى ذٰلک مكان الأضحية حتى لو كان فى السواد والمضحى فى المصر يجوز من انشقاق الفجر وعلى عكسه لايجوز إلا بعد الصلاة. (مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ١٦٩)

وإنما يعتبر فى هذا مكان الشاة لامكان من عليه هٰكذا ذكر محمد عليه الرحمة فى النوادر وقال: إنما أنظر إلى محل الذبح ولا أنظر إلى موضع المذبوح عنه وهٰكذا روى الحسن عن أبى يوسف يعتبر المكان الذى يكون فيه الذبح ولايعتبر المكان الذى يكون فيه المذبوح عنه و إنما كان كذٰلک لأن الذبح هو القربة فيعتبر مكان فعلها لامكان المفعول عنه. (بدائع زكريا ٤/ ٢١٣)

والمعتبر مكان الأضحية لامكان المضحى. (بزازيه جديد زكريا ۱۵٦/۳، وعلى هامش الهندية زكريا ٦/٢٨٩)

ثم المعتبر فى ذٰلك مكان الأضحية حتى لو كانت فى السواد والمضحى فى المصر يجوز كما انشق الفجر ولو كان على العكس لايجوز إلا بعد الصلاة. (هدايه، الأمين كتابستان ٤/٤٤٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۱۱۳۱۸/۴۰)

سعودیہ کی دس ذی الحجہ کو ہندوستان میں رہنے والے کی قربانی درست نہیں

سوال [۹۸٦۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلۂ ذیل کے بارے میں: خالد حج کو جارہا تھا، بکر جو ہندوستان میں رہتا ہے، اس نے خالد سے کہا کہ مکہ میں قربانی کرنے کا زیادہ ثواب ہے، اس لیے میری طرف سے بھی مکہ میں قربانی کردینا، اور قربانی کی رقم بھی دیدی، اب خالد نے مکہ میں ۱۰/ ذی الحجہ کو اپنی قربانی کے ساتھ بکر کی طرف سے بھی قربانی کردی جبکہ اس دن ہندوستان میں ۹/ ذی الحجہ ہی تھی تو بکر کی طرف سے یہ قربانی درست ہوئی یا نہیں؟

المستفتی: محمد دلشاد ٹھرکی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: صحتِ قربانی کے لیے قربانی کے وجوب کا پایا جانا ضروری ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں بکر کی طرف سے قربانی درست نہ ہوگی اس لیے کہ جب خالد نے ۱۰/ ذی الحجہ کو سعودیہ میں قربانی کی اس وقت ہندوستان میں ۹/ ذی الحجہ تھی اور ۹/ ذی الحجہ کو بکر پر قربانی واجب نہیں ہوئی، لہٰذا جب سبب وجوب نہیں پایا گیا تو قربانی بھی درست نہ ہوگی۔ (مستفاد: کتاب المسائل ۲/۳۰۰)

وأما الذى يرجع إلى وقت التضحية فهو أنها لاتجوز قبل دخول الوقت

لأن الـوقت كماهو شرط الوجوب فهو شرط جواز إقامة الواجب كوقت الصلاة فـلا يـجوز لأحد أن يضحى قبل طلوع الفجر الثانى من اليوم الأول من أيام النحر.
(بدائع الصنائع، كتاب التضحية، فصل و أما بيان ما يرجع إلى وقت التضحية، زكريا ٤/ ٢١١)

أما وقت الوجوب فأيام النحرفلاتجب قبل دخول الوقت لأن الواجبات المؤقتة لاتجب قبل أوقاتها كالصلاة والصوم ونحوهما. (بدائع زكريا ٤/١٩٨)

وسببها الوقت وهو أيام النحر. (مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ١٦٦/٤)

أن سبب وجوب الأضحية الوقت وهو أيام النحر. (فتح القدير زكريا ٩/ ٥١٩، كوئٹه ٨/ ٤٢٥، دار الفكر بيروت ٩/ ٥٠٦)

وسببهـا الـوقـت وهـو أيـام الـنـحر وتحته فى الشامية: والدليل على سببية الـوقـت امتنـاع التـقـديم عليه كامتناع تقديم الصلاة. (شامى زكريا ٩/ ٤٥٣، كراچى ٦/ ٣١٢-٣١٣)

وإنـمـا اشتـرط ...... الـوقـت وهوأيام النحر لأنها مختصة بها. (تبيين الـحـقائق امداديه ملتان ٦/ ٣، زكريا ٦/ ٤٧٤-٤٧٥، البحر الرائق كراچى ٨/ ١٧٣، زكريا ٨/ ٣١٧، تاتارخانية زكريا ١٧/ ٤٠٤، رقم: ٢٧٦٤٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۲۰)

سعودیہ کے رہنے والے کی قربانی ہندوستان میں ۱۲/ ذی الحجہ کو

سوال [۹۸۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید سعودی عرب میں رہتا ہے وہاں کی ۱۳/ ذی الحجہ کو ہندستان میں ۱۲/ ذی الحجہ ہوتی ہے تو زید کی قربانی ہندوستان میں ۱۲/ ذی الحجہ کو جائز ہے یا نہیں جبکہ سعودیہ میں اس دن ۱۳/ ذی الحجہ ہے؟

المستفتی: محمد جنید لکھیم پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صحت قربانی کے لیے مقام قربانی میں ایام نحر کا پایا جانا ضروری ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں زید جو سعودی عرب میں رہتا ہے اس کی قربانی یہاں ہندوستان میں ۱۲/ ذی الحجہ کو درست ہے، اس لیے کہ ہندوستان میں یوم نحر موجود ہے، مثلاً اگر زید اس دن ہوائی جہاز سے ہندوستان آجاتا ہے تو اس کے لیے اس دن ہندوستان میں اپنی قربانی کرنا بلاشبہ جائز ہے تو اسی طرح اس کے وکیل کے لیے بھی بلاشبہ جائز ہے۔ (مستفاد: انوار رحمت ص: ۲۹۴)

وإن كان الرجل في مصر و أهله في مصر آخر فكتب إليهم أن يضحوا عنه روى عن أبي يوسف أنه اعتبر مكان الذبيحة. (بدائع الصنائع كتاب التضحية، فصل في بيان ما يرجع إلى وقت التضحية، زكريا ٤/٢١٣)

والمعتبر مكان الأضحية لا مكان المضحي. (بزازيه جديد زكريا ٣/١٥٦، وعلى هامش الهندية ٦/٢٨٩)

ثم المعتبر في ذلك مكان الأضحية حتى لو كانت في السواد والمضحي في المصر يجوز كما انشق الفجر ولو كان على العكس لايجوز إلا بعد الصلاة. (هدايه، الأمين كتابستان ٤/٤٤٦)

ولو كان هو في مصر وقت الأضحية و أهله في مصر آخر فكتب إلى الأهل، وأمرهم بالتضحية في ظاهر الرواية: يعتبر مكان الأضحية. (خانيه جديد زكريا ٣/٢٤٣، وعلى هامش الهندية زكريا ٣/٣٤٥)

أن الرجل إذا كان في مصر و أهله في مصر آخر فكتب إليهم ليضحوا عنه فإنه يعتبر مكان التضحية. (هنديه زكريا قديم ٥/٢٩٦، جديد ٥/٣٤٢)

وأول وقتها أي أول وقت تضحية الأضحية بعد فجر النحر لكن لاتذبح في المصر قبل صلاة العيد وهذا الشرط لمن تجب عليه صلاة العيد (إلى قوله) ثم المعتبر في ذلك مكان الأضحية حتى لوكان في السواد والمضحي في المصر يجوز من انشقاق الفجر وعلى عكسه لايجوز إلا

بعد الصلاۃ. (مجمع الأنهر، فقيه الأمت ٤/ ١٦٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ ذی قعدۃ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۲۱/۱۱۳۲۱)

قربانی میں مقام ذبح کا اعتبار ہے یا مقام مالک کا؟

سوال [۹۸۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک آدمی ایسے ملک میں ہے کہ وہاں عید الاضحیٰ کا دن آیا نہیں مگر اس کی قربانی کا جانور جس ملک میں ہے وہاں عید کا دن ہے تو اس دن یہ قربانی ادا نہیں ہوگی، اس مسئلہ کی تفصیل ماہنامہ ندائے شاہی جنوری ۲۰۰۵ء ص: ۴۱ پر اور مفتی شبیر صاحب مدظلہ کی کتاب انوار رحمت کے ص: ۲۸۶ پر آچکی۔

(۱) مگر گذشتہ بقرعید کو اس کے علاوہ صورت مسئلہ سے واسطہ پڑا وہ اس طرح کہ مثلاً کویت میں ۱۰؍ ذی الحجہ بدھ کو تھی، اور ان کی قربانی کا آخری دن جمعہ تھا، یعنی ۱۲؍ ذی الحجہ تھی اور ہندوستان میں جمعہ کے دن ۱۰؍ ذی الحجہ تھی، عید کا پہلا دن تھا (دو دن کا فرق تھا) کویت والوں کے قربانی کے جانور ہندوستان میں تھے، مہاراشٹر کی مختلف جگہوں سے معلوم کیا جانے لگا کہ ہم جمعہ کے دن یعنی ۱۰؍ ذی الحجہ کو مقامی قربانیوں اور کھالوں کے جمع کرنے میں انتہائی منہمک رہیں گے، تو کیا ہم کویت والوں کی قربانی اپنی ۱۱؍ ذی الحجہ بروز سنیچر کر سکتے ہیں یا نہیں؟ جبکہ کویت میں قربانی کا وقت ختم ہو چکا ہوگا وہاں ۱۳؍ ذی الحجہ ہوگی۔

کویت والوں کے قربانی کے جانور عام طور پر تو نفل کی مد والے ہوتے ہیں، مگر ضروری نہیں ان کے ذاتی وجوب والے بھی ہو سکتے ہیں، آئندہ بھی ایسا سابقہ پڑ سکتا ہے تو کیا دونوں طرح کی قربانی کویت کی ۱۳ اور یہاں کی ۱۱؍ ذی الحجہ کو کی جا سکتی ہے یا نہیں، جواب عنایت فرمائیں کہ اس موقع پر فون سے مفتی صاحبان کی طرف بندہ نے رجوع کیا جس میں مدرسہ شاہی کے مفتیان کرام بھی تھے مگر سب حج میں تھے الا ماشاء اللہ۔

(۲) ہندکا حاجی حج میں ہے اورصورت مسئلہ اوپر والی ہے تو کیا اس حاجی کی ذاتی مال والی قربانی وہاں کی ۱۳/ ذی الحجہ اور یہاں ہند کی ۱۱/ ذی الحجہ کو ہوسکتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبداللہ مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سعودی عرب امارت اورکویت وغیرہ میں قمری مہینہ ہندوستان کے مقابلہ میں ایک دن پہلے شروع ہو جاتا ہے، اگرکویت والوں نے ہندوستان کے دوست کے پاس اپنی قربانی کا پیسہ بھیج دیا ہے اور کویت میں ذی الحجہ کی تیرہویں تاریخ جب ہوئی تو اس دن ہندوستان میں ۱۱/ویں یا ۱۲ویں تاریخ ہے تو ایسی صورت میں ہندوستان کی ۱۱ویں ۱۲ویں ذی الحجہ کوکویت والوں کی قربانی ہندوستان میں کرنا جائز اور درست ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قربانی میں تین شرطیں لازم ہیں:

(۱) قربانی کے واجب ہونے کے لیے جس کی طرف سے قربانی کی جارہی ہے، اس کا صاحب نصاب ہونا۔

(۲) صاحب نصاب پرایام نحر کا شروع ہوجانا اورایام نحر دسویں ذی الحجہ کی صبح صادق سے شروع ہوکر ۱۲/ویں ذی الحجہ کے غروب پرختم ہوجاتے ہیں، اور دسویں ذی الحجہ کی صبح صادق ہوتے ہی صاحب نصاب پرقربانی واجب ہوچکی ہے، اور یہ وجوب بارہویں تاریخ گزرجانے کے بعد بھی ذمہ میں باقی رہتا ہے۔

(۳) جہاں قربانی کی جارہی ہے وہاں بوقت قربانی دسویں ذی الحجہ کی صبح صادق ہو چکی ہو، اور بارہویں ذی الحجہ کی غروب سے پہلے پہلے تک وقت باقی رہتا ہے، اورشہر میں قربانی شہر کی کسی بھی جگہ عید کی نماز ہوجانے کے بعد جائز ہے، اوراگر عید کی نماز شہر میں کہیں بھی نہیں ہوئی ہے تو شہر میں قربانی جائز نہیں۔

لہٰذا کویت کی تیرہویں تاریخ میں کویت والوں کی قربانی ہندوستان کی ۱۱/اور ۱۲ویں تاریخ میں کرنا جائز ہے، اس لیے کہ مقام اضحیہ میں قربانی کا وقت باقی ہے۔

قال فی البدائع: وأما وقت الوجوب فأيام النحر فلا تجب قبل دخول

الوقت لأن الواجبات المؤقتة لا تجب قبل أوقاتها كالصلاة والصوم و نحوهما و أيام النحر ثلاثة يوم الأضحیٰ وهو اليوم العاشر من ذی الحجة والحادی عشر و الثانی عشر و ذٰلک بعد طلوع الفجر من اليوم الأول إلی غروب الشمس من الثانی عشر ...... فإذا طلع الفجر من اليوم الأول فقد دخل وقت الوجوب فتجب عند استجماع شرائط الوجوب ثم لجواز الأداء بعد ذٰلک شرائط آخر. (بدائع الصنائع، كتاب التضحية، فصل فی وقت الوجوب زكريا ۱۹۸/٤)

ويعتبر مكان المذبوح لا مكان المالک..... ولو كان هو فی مصر وقت الأضحية و أهله فی مصر آخر فكتب إلی الأهل و أمرهم بالتضحية، فی ظاهر الرواية: يعتبر مكان الأضحية. (خانيه جديد زكريا ۲٤۳/۳، وعلی هامش الهندية زكريا ۳٤٥/۳)

وفی البحر: وأما شرائط أدائها فمنها الوقت فی حق المصری بعد صلاة الإمام والمعتبر مكان الأضحية لا مكان المضحی وسببها طلوع فجر يوم النحر. (البحر الرائق زكريا ديوبند ۳۱۷/۸، كوئٹه ۱۷۳/۸)

(۲) اگر ہندوستان کا حاجی مکہ مکرمہ میں ہے اور مکہ میں ذی الحجہ کی ۱۳ر تاریخ ہے، اور اسی دن ہندوستان میں ذی الحجہ کی ۱۱ر یا ۱۲ر تاریخ ہے تو اس حاجی کی مال والی قربانی ہندوستان میں ہندوستان کی ۱۱ر یا ۱۲ر تاریخ میں کرنا جائز ہے، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

ويعتبر مكان المذبوح لا مكان المالک ولو كان هو فی مصر وقت الأضحية و أهله فی مصر آخر فكتب إلی الأهل و أمرهم بالتضحية فی ظاهر الرواية يعتبر مكان الأضحية. (خانية جديد زكريا ۲٤۳/۳، وعلی هامش الهندية زكريا ۳٤٥/۳)

والمعتبر مكان الأضحية لا مكان المضحی. (البحر الرائق زكريا ديوبند ۳۱۷/۸، كوئٹه ۱۷۳/۸) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۱۴ر محرم الحرام ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۴۲۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۱/۱۴ھ

قربانی کرنے میں مکان اضحیہ کا اعتبار ہے یا مکان مضحی کا؟

سوال [۹۸۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں قربانی سے متعلق ایک تنازعہ کھڑا ہو گیا ہے اس سلسلے میں حضرت والا سے تحقیق مطلوب ہے، مسئلہ یہ ہے کہ قربانی کرنے میں جانور کی جگہ کا اعتبار ہوگا یا ذبح کرنے والے کی جگہ کا فتاویٰ رحیمیہ ۹/۳۱۴ اور مسائل قربانی ۱۵۹ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کی جگہ کا اعتبار ہے جبکہ پاکستان سے حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کے فتویٰ کی ایک کاپی ارسال خدمت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذابح کے مکان کا اعتبار ہوگا، واضح رہے کہ اس فتویٰ کی زیروکس کافی ناقص ہی دستیاب ہے؟

المستفتی: مولانا محمد اسحاق ٹوپیاپانولی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اس مسئلہ میں تین چیزوں کوالگ الگ سمجھنا لازم ہے:

(۱) سبب وجوب یعنی قربانی واجب ہونے کا سبب، یہ قربانی کا وقت ہے جو یوم النحر کی طلوع صبح صادق سے شروع ہوکر بارھویں تاریخ کے غروب آفتاب تک رہتا ہے۔

(۲) شرط وجوب یعنی قربانی واجب ہونے کی شرط، آزاد مسلمان کا مالک نصاب ہونا۔

(۳) شرط ادا یعنی مالک نصاب پر قربانی کے ایام اور وقت داخل ہونے کی وجہ سے قربانی واجب ہو جاتی ہے، پھر اس کے قربانی ادا کرنے کے لیے ایک مزید شرط ہے، وہ یہ ہے کہ شہری آدمی کے لیے نماز عید الاضحیٰ کی ادائیگی لازم ہے، یہی شہری کے لیے ادائیگی کی شرط ہے، مگر یہ شرط دیہاتی پر لاگو نہیں ہوتی، اور شرط ادا میں مکان اضحیہ کا اعتبار ہے، مکان مضحی کا اعتبار نہیں۔

لہٰذا جہاں جانور رہوگا وہاں کا اعتبار ہوگا اور جہاں مالک ہو وہاں کا اعتبار نہیں، یہ مسئلہ صرف تیسری شرط کے اعتبار سے ہے اور پہلی اور دوسری شرط کے وجوب کے بغیر تیسری شرط کا تصور ہی نہیں ہوسکتا؛ لہٰذا سب سے پہلے اول شرط یعنی دونوں جگہ قربانی کے زمانہ کا آنا لازم

ہے، پھر شرط ثانی یعنی زمانۂ قربانی میں مسلمان کا مالک نصاب ہونا، ان دونوں شرطوں کے ایک ساتھ پائے جانے کے بعد تیسری کا مسئلہ سامنے آتا ہے اور تیسری شرط ایک خصوصی اور جزوی شرط ہے، عمومی اور کلی نہیں، صرف شہری کے ساتھ یہ شرط لگی ہوئی ہے، دیہاتی کے ساتھ نہیں؛ لہٰذا شہری اور دیہاتی کے اعتبار سے مکان اضحیہ کا اعتبار ہوگا، مکان مضحی کا اعتبار نہیں ہے اور مسائل قربانی میں مسامحت ہوگئی ہے، کہ اس میں تیسری شرط کو سبب وجوب یعنی پہلی شرط کے درجہ میں لے جا کر لکھا گیا ہے، جو درست نہیں ہے، اور ساتھ میں ہدایہ، درمختار اور شامی کے تین جزئیہ بھی نقل کیے ہیں ان تینوں جزئیات کا تعلق تیسری شرط کے ساتھ ہے، پہلی شرط کے ساتھ نہیں ہے، ان جزئیات کو اس مسئلہ سے متعلق سمجھنے میں مسامحت ہوگئی ہے اور بہشتی زیور اور فتاویٰ محمودیہ کا مسئلہ اپنی جگہ صحیح اور درست ہے۔

اب اصل مسئلہ کا جواب یہ ہے کہ مکان اضحیہ کا اعتبار کرنا اس وقت درست ہے کہ جب مالک اضحیہ کے یہاں شرط یعنی سبب وجوب جو کہ قربانی کے ایام ہیں (دسویں ذی الحجہ سے بارہویں ذی الحجہ کا درمیانی زمانہ) دونوں جگہ پایا جانا لازم ہے، اس لیے اگر ہندوستان کا آدمی سعودی عرب قربانی کا پیسہ بھیج دیتا ہے اور وہاں ہندوستان سے ایک دن پہلے قربانی کا دن شروع ہو جاتا ہے ہندوستان میں ابھی قربانی کا زمانہ شروع نہیں ہوا ہے، اب اگر مالک قربانی ہندوستان میں اسی دن مر جاتا ہے تو اس پر قربانی واجب ہی نہیں ہوئی حالانکہ مکان اضحیہ میں جہاں قربانی ہونی ہے وہاں پر وقت ہو چکا تھا، لہٰذا اضحیہ اور مکان مالک دونوں جگہ قربانی کا سبب وجوب یعنی دسویں ذی الحجہ کی صبح صادق کا ہونا شرط ہے اور شہر میں قربانی ہو رہی ہے تو شہر میں کسی جگہ نماز عید الاضحیٰ کا ہو جانا بھی شرط ہے۔

اس اصول سے دارالعلوم کراچی کا فتویٰ صحیح ہے، مگر اس میں ایک مثال میں مسامحت ہوگئی، لکھا ہے کہ جب پاکستان میں صبح ساڑھے چھ بج رہے ہیں اس وقت برطانیہ میں رات کا ڈیڑھ بج رہا ہوتا ہے، لہٰذا اگر ایک آدمی برطانیہ میں رہ رہا ہے اور وہ اپنی قربانی پاکستان میں کراتا ہے تو جب تک برطانیہ میں یوم نحر کی صبح صادق طلوع نہ ہو اس وقت تک اس کا جانور

پاکستان میں ذبح کرنا درست نہیں، یہ مثال اس لیے درست نہیں کہ دنیا میں مہینے کی ابتداء سعودی عرب اور اس کے اطراف سے ہوتی ہے اور برطانیہ میں اس دن قمری ماہ کی ابتدا ہو جاتی ہے، جس دن سعودیہ میں ہوتی ہے اور ہندو پاک میں اس کے ایک یوم کے بعد ہوتی ہے، لہٰذا سعودیہ اور برطانیہ میں سبب وجوب ہمیشہ پہلے پایا جاتا ہے اس کے بعد ہی ہند و پاک میں قربانی ہوتی ہے اس کے علاوہ دار العلوم کراچی کا فتویٰ مع بقیہ مثالوں کے صحیح ہے۔

اب عربی جزئیات ملاحظہ فرمائیے: (۱) سبب وجوب یعنی قربانی کے ایام کا مکان مضحی میں پایا جانا ضروری ہے۔

وأما الذی یرجع إلی وقت التضحیة فهو أنها لاتجوز قبل دخول الوقت لأن الوقت کما هو شرط الوجوب فهو شرط جواز إقامة الواجب کوقت الصلاة فلا یجوز لأحد أن یضحی قبل طلوع الفجر الثانی من الیوم الأول من أیام النحر ویجوز بعد طلوعه سواء کان من أهل المصر أو من أهل القری غیر أن للجواز فی حق أهل المصر شرطا زائدا وهو أن یکون بعد صلاة العید لایجوز تقدیمها عندنا. (بدائع الصنائع، کتاب التضحیة، فصل و أما بیان ما یرجع إلی وقت التضحیة، زکریا ٤/٢١١)

(۲) وأما وقت الوجوب فأیام النحر فلا تجب قبل دخول الوقت لأن الواجبات المؤقتة لاتجب قبل أوقاتها کالصلاة والصوم و نحوهما و أیام النحر ثلاثة یوم الأضحیٰ وهو الیوم العاشر من ذی الحجة والحادی عشر و الثانی عشر و ذٰلک بعد طلوع الفجر من الیوم الأول إلی غروب الشمس من الثانی عشر ...... فإذا طلع الفجر من الیوم الأول فقد دخل وقت الوجوب فتجب عند استجماع شرائط الوجوب ثم لجواز الأداء بعد ذٰلک شرائط آخر نذکرها فی مواضعها إن شاء الله. (بدائع الصنائع، فصل فی وقت الوجوب، زکریا ٤/١٩٨، مجمع الأنهر قدیم ٢/٥١٦، جدید دار الکتب العلمیة بیروت ٤/١٦٦)

(٣) **وسببهـا الوقت وهو أيام النحر.** (مجمع الأنهر قديم ٥١٦/٢، جديد دار الكتب العلمية بيروت ١٦٦/٤)

(۴) **أن سبب وجـوب الأضحية الوقت وهو أيام النحر.** (فتح القدير زكريا ديوبند ٥١٩/٩، كوئٹه ٤٢٥/٨، دار الفكر بيروت ٥٠٦/٩)

شرط وجوب: یعنی قربانی واجب ہونے کی شرط یعنی آزاد مسلمان مقیم کا مالک نصاب ہونا اس کے متعلق عبارتیں ملاحظہ فرمائیے:

(١) **وإنـمـا تـجـب عـلـى حر مسلم مقيم موسر.** (مـجـمع الأنهر قديم ٥١٦/٢، جديد دار الكتب العلمية بيروت ١٦٦/٤)

(٢) **قـال: الأضـحية واجبة عـلـى كـل حـر مسلم مقيم موسر في يوم الاضحىٰ.** (فتح القدير زكريا ديو بند ٥١٩/٩، كوئٹه ٤٢٥/٨، دار الفكر بيروت ٥٠٦/٩)

(٣) **ولهـا شـرائـط وجـوب ...... فـالأول كـونـه مـقيما موسرا من أهل الأمصار والقرىٰ والبوادى، والإسلام شرط.** (البحر الرائق كوئٹه ١٧٣/٨، زكريا ديو بند ٣١٧/٨)

(۴) **فتـجـب التـضحية على حر مسلم مقيم موسر بمصر أو قرية أو بادية.** (تنوير الأبصار مع الشامى زكريا ٤٥٧/٩، كراچى ٣١٥/٦)

شرط ادا: یعنی قربانی کا فریضہ ادا کرنے کی شرط:

(١) **وأمـا شـرائـط أدائها فمنها الوقت فى حق المصرى بعد صلاة الإمام والـمـعتبر مكان الأضحية لا مكان المضحى و سببها طلوع فجر يوم النحر و ركنها ذبح ما يجوز ذبحه.** (البحر الرائق كوئٹه ١٧٣/٨، زكريا ديو بند ٣١٧/٨)

(٢) **وأول وقتهـا أى أول وقـت تضحية الأضحية بعد فجر النحر لكن لا تذبح فى المصر قبل صلاة العيد، وهذا الشرط لمن تجب عليه صلاة العيد ثـم الـمعتبر فى ذٰلک مكان الأضحية حتى لو كان فى السواد و المضحى فى الـمـصر يجوز من انشقاق الفجر على عكسه لايجوز إلا بعد الصلاة.** (مجمع

الأنھر قدیم ۲/ ۵۱۶، جدید دار الکتب العلمیة بیروت ٤/ ١٦٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۹۸۰/۳۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۳/۱۴ھ

قربانی میں کس جگہ کا اعتبار ہے مقام ذبح یا مقام مالک؟

سوال [۹۸۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے ایک عزیز عمر سعودیہ میں رہتے ہیں اس سال وہاں بقرعید ہندوستان سے دو روز قبل ہوئی تھی، اور وہ کسی وجہ سے اپنے یہاں کے اعتبار سے تیسرے روز بھی قربانی نہیں کرا سکے، وقت گذر جانے کے بعد ان کو احساس ہوا تو انہوں نے اپنے گھر ہندوستان میں فون کیا کہ میری قربانی یہاں نہیں ہوسکی ہے وہاں ابھی ایک روز باقی ہے، لہٰذا میری قربانی وہاں کی بارہ تاریخ میں کرادی جائے، چنانچہ گھر والوں نے ہندوستان کے اعتبار سے ۱۲؍ ذی الحجہ میں ان کی قربانی کردی، جبکہ ان کے یہاں ایام نحر گذرے ہوئے دو روز ہوگئے، آیا ان کی جانب سے قربانی درست ہوئی یا نہیں؟ زید نے اس سلسلے میں اپنے یہاں ایک مفتی صاحب سے رجوع کیا تو انہوں نے کہا کہ قربانی نہیں ہوگی، کیونکہ قربانی تین دن کے ساتھ منصوص ہے، تو جب عمر کے یہاں ایام نحر گذر گئے تو اب اس کے ذمہ تصدق واجب ہے، راشد نے کہا کہ قربانی میں مکان اضحیہ کا اعتبار ہے، مکان مالک کا اعتبار نہیں ہے اور استدلال میں فقہ کی ایک عبارت پیش کی "**والمعتبر في مكان الأضحية**" تو مفتی صاحب نے کہا "**والمعتبر في مكان الاضحية**" اس کا تعلق ایک ملک اور علاقہ کے شہر اور دیہات سے ہے کہ دونوں جگہ نفس وجوب ساتھ ہی ساتھ ہے اور شہری کے ساتھ بنص حدیث یہ ایک قید زائد ہے، کہ عید کی نماز سے پہلے قربانی نہیں کرسکتا اور دیہاتی اس قید سے مستثنیٰ ہے، لہٰذا "والمعتبر فی مکان الاضحیۃ" سے دور دراز ملکوں کے احکام پر استدلال کرنا درست نہیں ہوگا، آپ سے درخواست ہے کہ صحیح صورت مدلل تحریر فرما کر شکریہ کا موقع دیں؟

المستفتی: محمد عثمان غنی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس مسئلہ میں چار چیزوں کو الگ الگ سمجھنا لازم ہے، اس کے بعد اصل مسئلہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

(۱) قربانی کا سبب وجوب: یہ قربانی کا وقت ہے جو یوم النحر کی طلوع صبح صادق سے شروع ہوکر بارہویں تاریخ کی غروب آفتاب تک رہتا ہے۔

(۲) شرط وجوب: یعنی قربانی واجب ہونے کی شرط، آزاد مسلمان کا مالک نصاب ہونا۔

(۳) شرط ادا یعنی مالک نصاب پر قربانی کے ایام اور وقت داخل ہونے کی وجہ سے قربانی کرنا واجب ہو جانا، لہٰذا وقت سے قبل جائز نہیں۔

(۴) شہری آدمی کی قربانی شہر میں کسی بھی جگہ نماز عیدالاضحیٰ کی ادائیگی کے بعد میں ہونا۔

یہ شرط صرف شہر والوں پر لازم ہے، دیہاتی پر لاگو نہیں ہوتی، اور شرط ادا میں مکان اضحیہ کا اعتبار ہے، مکان مالک کا اعتبار نہیں، ہاں البتہ مکان مالک میں قربانی کرنے کا زمانہ اور ایام آچکے ہوں اور اس کے بعد مکان اضحیہ میں قربانی کرنے کا زمانہ موجود ہو، تو اس وقت مکان اضحیہ کا اعتبار ہوگا۔

لہٰذا جب سعودی عرب میں تیرہویں ذی الحجہ ہو اور اسی دن ہندوستان میں بارہویں ذی الحجہ ہو تو سعودیہ میں مقیم شخص کی قربانی ہندوستان میں ہندوستان کی بارہویں ذی الحجہ کو جائز ہو جائے گی، اور ہندوستان میں مقیم شخص کی قربانی ہندوستان کی بارہویں کو سعودیہ میں سعودیہ کی تیرہویں تاریخ کو جائز نہیں ہے اس لیے کہ مکان اضحیہ میں قربانی کا زمانہ ختم ہو چکا ہے اور سوالنامہ میں پہلی صورت ہے کہ سعودیہ کی تیرہویں کو ہندوستان میں بارہویں ذی الحجہ ہے اور مکان اضحیہ میں قربانی کا زمانہ باقی ہے اس لیے ہندوستان کی بارہ ذی الحجہ کو سعودیہ میں مقیم شخص کی قربانی جائز ہے۔

وأما الذی یرجع إلی وقت التضحیة فهو أنها لاتجوز قبل دخول الوقت لأن الوقت کما هو شرط الوجوب فهو شرط جواز إقامة الواجب

كوقت الصلاة فلا يجوز لأحد أن يضحى قبل طلوع الفجر الثانى من اليوم الأول من أيام النحر ويجوز بعد طلوعه سواء كان من أهل المصر أو من أهل القرى غير أن للجواز فى حق أهل المصر شرطا زائدا وهو أن يكون بعد صلاة العيد لايجوز تقديمها عليه عندنا. (بدائع الصنائع، كتاب التضحية، فصل و أما بيان ما يرجع إلى وقت التضحية زكريا ٤/٢١١)

وأما وقت الوجوب فأيام النحر فلا تجب قبل دخول الوقت وأول وقتها أى أول وقت تضحية للأضحية بعد فجر النحر لكن لاتذبح فى المصر قبل صلاة العيد وهذا الشرط لمن تجب عليه صلاة العيد ثم المعتبر فى ذلک مكان الأضحية حتى لو كان فى السواد والمضحى فى المصر يجوز من انشقاق الفجر وعلى عكسه لايجوز إلا بعد الصلاة. (مجمع الأنهرقديم ٢/٥١٦، جديد دار الكتب العلمية بيروت ٤/١٦٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳ رذی قعدہ ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۲۳/۹۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۱۱/۳ھ

مقام مرسل اور مقام اضحیہ دونوں جگہ سبب وجوب ضروری ہے

سوال [۹۸۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ صدیوں سے یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ قربانی کے موقع پر لوگ قربانی کی رقم بیرونی مما لک انڈیا، پاکستان، بنگلہ دیش بھیجتے ہیں اور ان کی طرف سے قربانی وہاں کی جاتی ہے، یہاں تک کہ بڑے بڑے مدارس ہند و پاک میں بقرعید کے موقع پر کٹرے وغیرہ کاٹے جاتے ہیں، جنوبی افریقہ، برطانیہ، لندن اور امریکہ وغیرہ والوں کی طرف سے اس پر نہ کسی کا انکار تھا نہ نکیر۔

اب کچھ علماء حضرات کی تحقیق کی رو سے اگر بیرونی مما لک میں جہاں وہ قربانی کی رقم بھیج دیتے ہیں ان میں بقرعید ایک یا دو دن قبل واقع ہو، مرسل کے مقام سے تو مرسل کی

طرف سے قربانی ادا نہیں ہوتی، ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ ابھی مرسل پر قربانی کا سبب وجوب یعنی عید کا دن شروع ہی نہیں ہوا، جب اس کے وطن میں قربانی کے ایام ابھی شروع نہ ہوئے تو ان کی طرف سے قربانی کرنا اضحیہ واجبہ کے لیے صحیح نہیں، لہٰذا چاہیے کہ ایسے دن میں قربانی کی جائے کہ مرسل کے ہاں ایام قربانی بھی ہوں۔

دوسری طرف دیگر اہل علم حضرات نے اس جدید تحقیق کا رد کیا ہے، یہ حضرات کہتے ہیں کہ مقام اضحیہ کا اعتبار ہے نہ کہ من علیہ الاضحیۃ کا مقام، نیز قربانی عبادت مالیہ کے قبیل سے ہے، جس طرح کہ زکوٰۃ وصدقۃ الفطر، اور مؤخر الذکر دونوں عبادتیں قبل از وقت وجوب ادا کی جاسکتی ہیں تو اضحیہ میں بھی یہی حال ہوگا، صرف اتنی بات ضروری ہے کہ ایام قربانی ہوں مرسل الیہم کے یہاں اگر ایام قربانی داخل ہوگئے تو یہ کافی ہے؟

المستفتی: احقر محمد شعیب جنوبی افریقہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی کی صحت ادائیگی کے لیے مقام مرسل اور مقام اضحیہ دونوں جگہ سبب وجوب یعنی ایام قربانی کا وجود ضروری ہے، جیسا کہ نماز کے لیے سبب وجوب وقت کا پایا جانا ضروری ہے کیونکہ سبب وجوب کے پائے جانے سے پہلے عبادت کو انجام نہیں دیا جاسکتا، اور مقام اضحیہ کا اعتبار اس وقت ہے جب بوقت قربانی مرسل اور مرسل الیہ دونوں کے مقام میں ایام قربانی کا وجود ہو اس کے پیش نظر مسئولہ صورت کا جواب یہ ہے کہ جنوبی افریقہ، برطانیہ اور امریکہ وغیرہ والوں کی طرف سے ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش میں کی جانے والی قربانی درست ہے، کیونکہ سبب وجوب یعنی ایام قربانی کا وجود سعودی عرب، جنوبی افریقہ، برطانیہ اور امریکہ میں پہلے پایا جاتا ہے، اور ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں بعد میں ہوتا ہے، اس لیے کہ مہینہ کی ابتداء یعنی چاند دیکھنے کی ابتداء سعودی عرب سے شروع ہوتی ہے، اس کے بعد سلسلہ وار مغربی ممالک سے ہوتے ہوئے ہندوستان و پاکستان میں بعد میں ہوتی ہے، اور سوالنامہ میں جو اشکال پیش کیا گیا ہے وہ اشکال اس وقت بجا ہوتا جب قربانی کے پیسے ہندوستان و پاکستان والے سعودی عرب، یا

جنوبی افریقہ، برطانیہ وغیرہ بھیجتے اور واقعہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس ہے اس لیے مغربی ممالک سے ہندوستان، پاکستان میں قربانی کا جو پیسہ بھیجا جاتا ہے ان کی قربانی ہندوستان و پاکستان کے قربانی کے ایام میں بلاتر دد جائز اور درست ہے، اس لیے کہ پیسہ بھیجنے والوں کے یہاں قربانی کے ایام اس سے پہلے شروع ہو چکے ہوں گے، زکوٰۃ اور صدقہ فطر بھی سبب وجوب سے پہلے ادا نہیں ہوتے ، اور زکوٰۃ میں سبب وجوب مالک نصاب ہونا ہے، اور وہ سال گزرنے سے پہلے پایا جاتا ہے، اور حولان حول سبب وجوب نہیں بلکہ وجوب ادا ہے، اسی طرح صدقہ فطر میں شرط وجوب رمضان ہے اور وجوب ادا یوم الفطر کے دن سے شروع ہوتا ہے، اور قربانی میں سبب وجوب صرف مالدار ہونا نہیں ہے بلکہ سرمایہ دار کا ایام قربانی پالینا سبب وجوب ہے اس لیے ایام قربانی سے پہلے پہلے قربانی کسی حال میں جائز نہیں، لہٰذا قربانی کے مسئلہ کو اس سلسلے میں زکوٰۃ اور صدقہ فطر پر قیاس کرنا درست نہیں۔

وأما الذی یرجع إلی وقت التضحیة فهو أنها لاتجوز قبل دخول الوقت لأن الوقت کما هو شرط الوجوب فهو شرط جواز إقامة الواجب کوقت الصلاة فلا یجوز لأحد أن یضحی قبل طلوع الفجر الثانی من الیوم الأول من أیام النحر ویجوز بعد طلوعه سواء کان من أهل المصر أو من أهل القری غیر أن للجواز فی حق أهل المصر شرطا زائدا وهو أن یکون بعد صلاة العید لایجوز تقدیمها علیه عندنا. (بدائع الصنائع، کتاب التضحیة، فصل و أما بیان ما یرجع إلی وقت التضحیة، زکریا ٤/ ٢١١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍رجب المرجب ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۴۹۲/۳۷)

”قربانی میں مقام ذبح کا اعتبار ہے یا مقام مالک کا“ سے متعلق چند فتاویٰ

سوال [۹۸۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ ماہنامہ ندائے شاہی جنوری ۲۰۰۵ء کے شمارہ میں قربانی کے وجوب ادا کے وقت سے متعلق آپ کا تحقیقی وتفصیلی فتویٰ شائع ہوا تھا جس کو پڑھ کر احقر کو مسرت ہوئی، آپ محترم نے سبب وجوب، وقت وجوب، شرائط وجوب اور شرائط ادا کی روشنی میں مسئلہ کی عمدہ اور دلنشیں وضاحت فرمائی تھی، اب چند روز قبل دار العلوم دیوبند کے دار الافتاء کی جانب سے حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب دامت برکاتہم کا لکھا ہوا ایک فتویٰ نظر سے گذرا جو آپ کے جواب کے معارض ومخالف ہے، احقر نے مناسب سمجھا کہ آپ محترم کو اس سے مطلع کروں اور اس کی نقل بھی آپ کو ارسال کروں تاکہ آپ محترم دار العلوم دیوبند کے فتویٰ میں اور آپ کے جواب میں کھلا ہوا جو تعارض ہے اس کا مطالعہ کر کے اس مسئلہ کی مزید علمی وتحقیقی وضاحت فرمائیں۔

امید ہے کہ آپ محترم اس مسئلہ کے متعلق جس کی عملی ضرورت ہر سال اور ہمیشہ پیش آنے والی ہے، مذکورہ تعارض ختم ہو، اس کی سعی جمیل فرمائیں گے، تاکہ امت اختلاف و انتشار کا شکار نہ ہو، اور آئندہ اگر یہ تعارض ہو تو احقر کو بھی اس سے مطلع فرمائیں گے، باقی سب خیریت ہے، دعاؤں کی درخواست ہے۔

المستفتی: مفتی محمد اسماعیل بن محمد ابراہیم بھڈ کودروی، بھروچ کنتھاریہ گجرات

دار العلوم دیوبند کا جواب

سوال: باہر ممالک سے قربانی کے لیے ہندوستان میں اپنے رشتہ دار اور اعزاء و اقارب کے یہاں عید الاضحیٰ کے موقعہ پر افریقہ، لندن، امریکہ، فرانس وغیرہ سے کاغذ اور فون کے ذریعہ کہتے ہیں کہ بکریوں یا سات حصہ والے جانوروں کی قربانی کرنا، تو ان لوگوں کی طرف سے ہم لوگ یہاں پر جس دن عید الاضحیٰ ہوتی ہے اس دن عید کی نماز کے بعد بکریوں یا سات حصہ والے جانوروں کی قربانی کرتے ہیں، دس، گیارہ، بارہ، تین دن تو شریعت کے اعتبار سے یہ صحیح ہے یا نہیں، اس کا تفصیلی جواب مع حوالہ تحریر فرمائیں؟

دوسرے ملک والے ہندوستان کو قربانی کرنے کے لیے وکیل بناتے ہیں تو اب قربانی کرنے

میں وکیل کے ایام قربانی کا اعتبار ہوگا یا جن حضرات کی قربانی ہیں ان کے ایام قربانی کا اعتبار ہوگا؟

المستفتی: محمد اسماعیل

الجواب هو الموفق: قربانی جہاں کی جاتی ہے اس کا اعتبار ہوتا ہے، لہٰذا ہندوستان میں قربانی ہوگی تو اسی ملک کی تاریخ ۱۰/۱۱/۱۲/ ذی الحجہ کا اعتبار ہوگا، اور انہیں تاریخوں میں قربانی کی جائے گی، افریقہ، لندن وغیرہ ملکوں کا اعتبار نہ ہوگا۔

کتبہ: محمد ظفیر الدین غفرلہ
مفتی دار العلوم دیوبند

الجواب صحیح
حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ

الجواب صحیح
کفیل الرحمٰن

دارالافتاء مدرسہ شاہی مرادآباد کا جواب

بخدمت عالیہ حضرت اقدس مولانا مفتی محمد اسماعیل صاحب بھڈ گودھروی دامت برکاتہم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر وعافیت ہوں گے، اور یہ خاکسار آنجناب کی دلی دعاؤں اور بفضلہٖ تعالیٰ بخیر وعافیت ہے، آنجناب کا والا نامہ دار العلوم دیوبند کے فتویٰ کے ساتھ کچھ عرصہ پہلے موصول ہوا تھا، اور اسی وقت حضرت مولانا مفتی محمد سلمان صاحب کو بھی دکھا دیا تھا، اور یہ سوچا تھا کہ جب کبھی دار العلوم دیوبند میں حاضری کی سعادت ہوگی تو دار الافتاء خود حاضر ہوکر مفتیانِ دار العلوم سے اس جواب کا مطلب زبانی طور پر بھی معلوم کرلیتا اور دار العلوم کا جواب حضرت الاستاذ مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مدظلہ العالی کے قلم سے لکھا ہوا ہے، سائل کے سوال میں دو گوشے تھے:

(۱) افریقہ، امریکہ، لندن، فرانس وغیرہ کی طرف سے قربانی کے لیے ہندوستان کے رشتہ داروں کو وکیل بنا دیا جائے تو ہندوستان والے اپنے یہاں ایام قربانی یعنی دسویں ذی الحجہ سے ۱۲ ذی الحجہ تک قربانی کر سکتے ہیں یا نہیں؟

(۲) دوسرا گوشہ یہ تھا کہ دوسرے ملک والے ہندوستان والوں کو قربانی کرنے کا

وکیل بناتے ہیں تو ایام قربانی میں مقامِ قربانی کا اعتبار ہے یا مقام وکیل کا؟

حضرت الاستاذ مفتی ظفیر الدین صاحب مدظلہ نے دونوں گوشوں کا جواب ایک ساتھ دیا ہے کہ ہندوستان میں قربانی ہوگی تو اسی ملک کی تاریخ کا اعتبار ہوگا، اس جواب میں غور کیا جائے تو دو پہلو نکل سکتے ہیں: (۱) جیسا سوال ہے ویسا ہی جواب، یعنی سوال میں افریقہ، لندن، امریکہ، فرانس وغیرہ میں رہنے والے لوگوں کی طرف سے قربانی ہندوستان میں کی جارہی ہے ظاہر بات ہے کہ جن ممالک کا ذکر سوالنامہ میں ہے ان ممالک میں دسویں ذی الحجہ ہندوستان کے بعد نہیں ہوتا، دنیا کی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ملے گا کہ دسویں ذی الحجہ پہلے ہندوستان میں ہو جائے اور بعد میں ان ممالک میں ہو بلکہ اس کے برعکس ہوسکتا ہے کہ دسویں ذی الحجہ پہلے ان ممالک میں ہو اور ہندوستان میں بعد میں ہو، تو جواب کے اس پہلو کے اعتبار سے حضرت الاستاذ مفتی ظفیر الدین صاحب کا جواب سوال کے مطابق ہے، اور واقع کے مطابق بھی ہے۔

اور اس خاکسار کا جواب ندائے شاہی جنوری ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا ہے اس کے مطابق بھی ہے اور یہی اصل ہے...... اور دوسرا پہلو یہ ہے اور یہی جواب کا مطلب بھی ہے کہ علی الاطلاق اسی جگہ کا اعتبار ہے جس جگہ قربانی ہوتی ہو تو ایسی صورت میں سعودی عرب، افریقہ، مراکش، لندن، فرانس، امریکہ وغیرہ کی طرف سے ہندوستان والوں کو قربانی کا وکیل بنا دیا جائے اور ہندوستان والے اپنے یہاں کی دسویں ذی الحجہ سے قربانی شروع کردیں تو چونکہ موکل، مضحی اور مالک کے یہاں دسویں ذی الحجہ پہلے ہو چکی ہے اس لیے مقام اضحیہ کا اعتبار ہوگا اور قربانی بھی ہندوستان والوں کی دسویں ذی الحجہ کے اعتبار سے درست ہو جائے گی اور دارالعلوم کا فتویٰ اس اعتبار سے بھی سوال کے مطابق ہو جائے گا نیز مقام اضحیہ کا یوں بھی اعتبار ہو جاتا ہے کہ اگر مالک اور مضحی کے یہاں بارہویں ذی الحجہ ہو اور جہاں قربانی کی جارہی ہے وہاں تیرہویں ذی الحجہ ہو تو مقام اضحیہ کا اعتبار کرکے قربانی کو صحیح قرار دیا جائے گا اس لیے کہ سبب وجوب دونوں جگہ پہلے پایا جا چکا ہے، ہاں البتہ اگر اس کے برعکس ہو جائے کہ ہندوستان والے افریقہ، لندن، امریکہ، سعودی عرب والوں کو قربانی کا وکیل بنائیں مثلاً کوئی ہندوستانی یہ چاہتا ہے کہ اپنی قربانی حرم مکی کے حدود میں کرا دے۔

چنانچہ کسی حاجی کے ہاتھ قربانی کا پیسہ یہ کہہ کر روانہ کردیتا ہے کہ میری قربانی حدودِ حرم میں کر دینا تاکہ مجھے زیادہ ثواب مل جائے، پھر وہ حاجی دسویں ذی الحجہ کو اپنے ہدی کی قربانی کے ساتھ ہندوستانی کی بھی قربانی کردیتا ہے تو ہندوستانی کی قربانی درست نہ ہوگی، کیونکہ ہندوستان میں ابھی نویں ذی الحجہ ہے اس لیے اس کے اوپر ابھی قربانی واجب ہی نہیں ہوئی۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ہندوستان کے جس آدمی نے وکیل بنایا ہے وہ اگر ہندوستان میں نویں ذی الحجہ کو مرجاتا ہے تو اس کے اوپر قربانی کا وجوب ہی باقی نہیں رہتا حالانکہ اسی دن حرم شریف میں دسویں ذی الحجہ ہے تو اس پہلو کے اعتبار سے حضرت الاستاذ مفتی ظفیر الدین صاحب کے جواب کے بارے میں ان سے براہ راست گفتگو کرنے کا ارادہ تھا لیکن مصروفیت زیادہ ہونے کی وجہ سے ازخود اب تک سفر نہیں کرسکا، اور آنجناب کا ٹیلیفون میں بھی تقاضہ آگیا تو اس لیے دارالافتاء کے ایک طالب علم کو احقر کے جواب کی نقل لے کر دارالعلوم دیوبند روانہ کیا گیا چنانچہ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور کے مفتیان کرام نے پوری تحریر کا مطالعہ کرکے احقر کے جواب کی تصدیق کردی ہے اور اس تصدیق کا مطلب یہ ہے کہ دارالعلوم کے جواب میں احقر نے جو مختلف گوشے متعین کیے ہیں ان میں سے آخری گوشہ میں شبہ تھا مگر مفتیان دارالعلوم دیوبند کے احقر کے جواب کی تصدیق کردینے سے وہ شبہ بھی دور ہو گیا، اب آنجناب کی خدمت عالیہ میں تمام تحریرات پیش ہیں، اور ساتھ میں یہ گذارش بھی ہے کہ احقر کی تحریر جو آنجناب کو لکھی جارہی ہے کہ اس کو ہمارے نقل فتویٰ کے ساتھ منسلک رکھا جائے اور منسلک کرکے تمام تحریرات دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور بھی روانہ فرمادیں تاکہ وہاں کے مفتیان کرام بھی ہمارے اور آنجناب کے درمیان گفتگو سے آگاہ ہوجائیں اور اصل مسئلہ کے بارے میں باخبر ہوجائیں۔

نیز حضرت اقدس قابل احترام مفتی احمد صاحب خانپوری مدظلہ کی خدمت میں بھی تمام کاغذات کی فوٹو کاپی روانہ کردی جائے تاکہ وہ بھی ان تمام کاغذات سے واقف ہوجائیں ان کی ایک تحریر مفتی محمد سلمان صاحب کے واسطے سے احقر کو دیکھنے کو ملی، ان کی خدمت میں بشرط

سہولت سلام بھی پیش فرمادیں، حضرت مفتی عبداللہ صاحب اور حضرت اقدس مولانا اسماعیل منوبری صاحب مہتمم مدرسہ کنتھاریہ کی خدمت میں بھی سلام و دعاء کی درخواست فرمادیں، نیز حضرت مفتی احمد صاحب دیولہ کی خدمت میں بھی سلام و دعاء کی گذارش ہے۔

نوٹ: اگر مناسب معلوم ہوتو یہ تمام تحریریں بنگلور کے سیمینار میں ساتھ لے چلئے، حضرت مفتی ظفیر الدین صاحب دامت برکاتہم سے مزید کوئی بات معلوم کرنی ہوتو ان سے براہ راست معلوم کیا جا سکےاور احقر کی شرکت کی بھی امید ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

طالب دعا: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۶ ربیع الاول ۱۴۲۶ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۸۷۵۱/۳۷)

قربانی میں مکانِ ذبح کا اعتبار ہے یا مکان مالک کا؟ مفصل فتویٰ

سوال [۹۸۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: معلوم یہ کرنا ہے کہ قربانی کرنے میں جہاں جانور ہے وہاں کا اعتبار ہے، یا جہاں پر قربانی کرنے والا ہے وہاں کا اعتبار ہے، اختری بہشتی زیور حصہ سوم ۳۷ر پر جہاں جانور رہے وہاں کا اعتبار کیا ہے، ایسے ہی فتاویٰ محمودیہ ۴/ ۳۰۷، فتاویٰ رحیمیہ ۹/ ۳۱۴ پر درج ہے، اور فتاویٰ رحیمیہ میں یوں درج ہے:

سوال: بھائی عبدالرشید نے مدراس سے یہاں حیدرآباد میں قربانی کرنے کو لکھا ہے وہاں عید پیر کو ہے اور یہاں اتوار کو، تو ان کی قربانی ہم یہاں اتوار کو کر سکتے ہیں یا نہیں؟ یا پیر کو کرنا ہوگی؟

الجواب: قربانی کا جانور جس جگہ ہو اس جگہ کا اعتبار ہوتا ہے، قربانی کرنے والے کی جگہ کا اعتبار نہیں ہوتا، عربی حوالوں کے بعد مفتی عبدالرحیم صاحب لکھتے ہیں کہ صورت مسئلہ میں عبدالرشید بھائی نے مدراس سے آپ کو حیدرآباد میں اپنی قربانی کرنے کے لیے لکھا ہے اور مدراس میں پیر کو عید الاضحیٰ ہے اور آپ کے یہاں اتوار کو تو آپ بلا تکلف ان کی قربانی اتوار کو کر سکتے ہیں ان کی قربانی صحیح ہو جائے گی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

لیکن رسالہ البلاغ کراچی میں فتاویٰ رحیمیہ والی صورت مسئلہ کا جواب دوسرا دیا گیا ہے اور اس پر مفتیان کرام کی مہریں ودستخط موجود ہیں، جس پر تاریخ ۱۴۲۰/۸/۱۵ھ درج ہے، آپ اس بارے میں کیا فتویٰ دیتے ہیں، برائے مہربانی مطلع کریں تاکہ مسئلہ کی اچھی طرح وضاحت ہو جائے، اس استفتاء کے ساتھ رسالہ ''البلاغ'' کی اس مسئلہ سے متعلق زیروکس بھی روانہ کررہا ہوں۔

المستفتی: عبدالسلام پونوی، آکولہ مہاراشٹر

دارالعلوم کراچی پاکستان کا فتویٰ

سوال [۹۸۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جو پاکستانی پاکستان میں رہ رہا ہو اور وہ اپنی قربانی مثلاً افغانستان میں کراتا ہو اور افغانستان میں عید ایک دن قبل ہو جائے جیسا کہ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے اور اس کا جانور وہاں پر پہلے دن ذبح ہو جائے تو یہ قربانی شرعاً معتبر ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عبداللہ کراچی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: قربانی کے نفس وجوب کا سبب وقت ہے جو کہ یوم نحر کی طلوع صبح صادق سے شروع ہوکر بارہویں تاریخ کے غروب آفتاب تک ہے اور غنی یعنی مالک نصاب ہونا یہ شرطِ وجوب ہے اور مثلاً شہری کے حق میں قربانی کا نماز عید کے بعد انجام دینا یہ شرطِ ادا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ یوم نحر کی طلوع صبح صادق سے پہلے قربانی کا سرے سے وجوب ہی نہیں ہوتا جیسا کہ نماز ہے کہ وقت نماز داخل ہونے سے پہلے نماز فرض ہی نہیں ہوتی، لہٰذا اگر کسی نے وقت داخل ہونے سے پہلے نماز ادا کی تو فرض ادا نہیں ہوگا، اسی طرح اگر کسی نے یوم نحر سے پہلے قربانی کی یا کرائی تو وہ بھی شرعاً معتبر نہیں ہوگی، فقہاء کرام کی وہ عبارات جن سے صراحتًا یا دلالۃً یہ معلوم ہوتا ہے کہ قربانی میں مکان اضحیہ کا اعتبار ہے ان عبارت کا تعلق اداء سے ہے اور قربانی کے سلسلہ میں اداء میں بلاشبہ مکانِ اضحیہ کا اعتبار رہتا ہے:

(۱) شہری آدمی اگر اپنا جانور دیہات بھیج دے اور خود وہ شہر میں ہے تو یہ جانور دیہات میں اگر طلوع فجر کے ساتھ ہی ذبح ہوا تو بھی یہ قربانی شرعاً معتبر ہوگی، اگر چہ ابھی اصل قربانی کنندہ کے شہر میں نماز عید نہ ہوئی ہو۔

(۲) مسئلہ (۱) کے برعکس اگر دیہاتی آدمی اپنا جانور شہر کو بھیج دے اور خود وہ دیہات میں ہے تو یہ جانور شہر میں اگر طلوع فجر کے ساتھ ذبح ہوا تو قربانی شرعاً معتبر نہیں ہوگی حالانکہ اصل ذبح کرانے والے کے یہاں عید کی نماز واجب ہی نہیں۔

(۳) زید خود کراچی میں ہے اور اس کے اہل وعیال پشاور میں ہیں وہ اپنے گھر والوں کو خط لکھتا ہے کہ پشاور میں میری طرف سے قربانی کے طور پر بکرا مثلاً ذبح کریں، چنانچہ وہ لوگ ذبح کر لیتے ہیں تو اس کے معتبر ہونے یا نہ ہونے میں پشاور میں نماز عید ادا ہونے یا نہ ہونے کا اعتبار ہوگا نہ کہ کراچی کا جہاں قربانی کرانے والا یعنی زید رہ رہا ہے، ان تمام مثالوں کا تعلق ادا سے ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اداء میں مکانِ اضحیہ کا اعتبار ہے لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اداء کا اعتبار اس وقت ہوگا جب اس عمل کا پہلے سے مکلّف کے ذمہ نفس وجوب ہو چکا ہو جیسا کہ شروع میں مذکور ہوا، کیونکہ وجوب سے قبل اداء کا اعتبار نہیں، اور نفس وجوب کا تعلق ذمہ مکلّف سے ہوتا ہے اور ذمہ کا محل مکلّف ہے، مال نہیں، لہٰذا نفس وجوب میں مکلّف (فاعل) کے فعل کا اعتبار ہوگا اور نفس وجوب کا سبب یوم نحر ہے، جیسا کہ گذشتہ صفحہ میں مذکور ہوا، لہٰذا نفس وجوب میں یہ دیکھا جائے گا کہ جہاں مضحی (قربانی کرنے یا کرانے والا) رہ رہا ہے وہاں یوم النحر ہو چکا ہے یا نہیں، اگر یوم نحر ہو چکا ہے تو نفس وجوب ہو گیا اب دیگر شرائط کے پائے جانے کی صورت میں خود قربانی کرے یا اس کی اجازت سے دوسرا کوئی آدمی کرے دونوں صورتوں میں یہ قربانی شرعاً ادا ہو جائے گی، لیکن مضحی جہاں رہ رہا ہے وہاں یوم نحر اگر نہیں ہوا ہے تو جس طرح اس وقت یہ خود قربانی نہیں کرسکتا اسی طرح اس کی طرف سے کوئی اور بھی قربانی نہیں کرسکتا، اگر چہ وکیل (دوسرا شخص) کے شہر یا ملک میں یوم نحر شروع ہو چکا ہو۔

اس تفصیل سے یہ بات بالکل صاف طور پر معلوم ہوگئی کہ اگر کوئی شخص مثلاً پاکستان

میں رہ رہا ہے اور وہ اپنی قربانی مثلاً افغانستان میں کراتا ہے تو نفس وجوب کے وقت میں پاکستان کا اعتبار ہوگا، لہٰذا اگر افغانستان میں پاکستان سے ایک دن پہلے عیدالاضحیٰ ہوئی اور اس پاکستانی کا جانور افغانستان میں پہلے دن ذبح ہوا، تو یہ قربانی شرعاً معتبر نہیں ہوگی، اس لیے دوسرے ممالک میں قربانی کرنے والوں پر واجب ہے کہ وہ اپنے وکیلوں کو اس بات کا پابند بنائیں کہ ہمارے جانور کو اس دن ذبح کریں جس دن ہمارے یہاں بھی ایام نحر میں سے کوئی دن ہو، مذکورہ بالا اصول سے ضمناً ایک اور مسئلہ کا حکم بھی معلوم ہوا اور وہ یہ کہ مثلاً برطانیہ کا وقت پاکستان کے وقت سے پانچ گھنٹہ پیچھے ہے، مثلاً جب پاکستان میں صبح ساڑھے چھ بج رہے ہوتے ہیں تو اس وقت برطانیہ میں رات کا ڈیڑھ بج رہا ہوتا ہے، لہٰذا اگر آدمی برطانیہ میں رہ رہا ہے اور وہ اپنی قربانی پاکستان میں کراتا ہے تو جب تک برطانیہ میں یوم نحر کی صبح صادق طلوع نہ ہو، اس وقت تک اس کا جانور پاکستان میں ذبح کرنا درست اور معتبر نہیں۔

لأن نفس الوجوب لم يتحقق في ذمته كما مر في قتح القدير: أن سبب وجوب الأضحية الوقت وهو أيام النحر والغنى شرط الوجوب. (فتح القدير، كتاب الاضحية، دار الفكر بيروت ٩/٥٠٦، كوئٹه ٨/٤٢٥، زكريا ديوبند ٩/٥١٩)

وفي البدائع: أما شرئط الوجوب ...... الغنى لما روى عن رسول الله ﷺ السعة وهي الغنى. (بدائع الصنائع قديم ٥/٦٤، جديد زكريا ديوبند ٤/١٩٦)

وفي الهندية: وأما شرائط الوجوب منها اليسار وهو ما يتعلق به وجوب صدقة الفطر. (هنديه زكريا قديم ٥/٢٩٢، جديد ٥/٣٣٦)

وفي رد المحتار: فأول وقتها في حق المصرى والقروى طلوع الفجر إلا أنه شرط للمصرى تقديم الصلاة عليها فعدم الجواز لفقد الشرط لا لعدم الوقت. (شامى كراچى ٦/٣١٨، زكريا ديوبند ٩/٤٦٠)

وفي البدائع: وأما الذى يرجع إلى وقت التضحية فهو أنها لاتجوز قبل دخول الوقت لأن الوقت كما هو شرط الوجوب فهو شرط جواز إقامة الواجب كوقت الصلاة فلا يجوز لأحد أن يضحى قبل طلوع الفجر الثانى

من اليوم الأول من أيام النحر ويجوز بعد طلوعه. (بدائع الصنائع، كتاب التضحية، فصل و أما بيان ما يرجع إلى وقت التضحية، زكريا ٤/ ٢١١)

وفيه: فإذا طلع الفجر من اليوم الأول فقد دخل وقت الوجوب فتجب عند استجماع شرائط الوجوب ثم لجواز الأداء بعد ذٰلك شرائط آخر نذكرها في موضعها إن شاء الله تعالىٰ. (بدائع الصنائع زكريا ٤/ ١٩٨)

وفي الخانية: ويعتبر مكان المذبوح لامكان المالك وفي صدقة الفطر يعتبر مكان المولىٰ لامكان العبيد. (خانية جديد زكريا ٣/ ٢٤٣، وعلى هامش الهندية زكريا ٣/ ٣٤٥)

وفيه: ولو كان هو في مصر وقت الأضحية و أهله في مصر آخر فكتب إلى الأهل و أمرهم بالتضحية في ظاهر الرواية يعتبر مكان الأضحية. (خانيه جديد زكريا ٣/ ٢٤٣، وعلى هامش الهندية زكريا٣/ ٣٤٥)

وفي الدر المختار: ويقوم في البلد الذى المال فيه، وفي الشامية: فلو بعث عبدا للتجارة في بلد آخر يقوم في البلد الذى فيه العبد بحر. (البحر الرائق زكريا ديوبند ٣/ ٣١٠، در مختار كتاب الزكاة، باب زكاة الغنم، كراچى ٢/ ٢٨٦)

وفي رد المحتار: ويعتبر في الزكاة مكان المال في الروايات كلها واختلف في صدقة الفطر كما يأتي. (شامى باب المصرف، كراچى ٢/ ٣٥٣، زكريا ٣/ ٣٠٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

الجواب صحیح احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ ۱۴۲۰/۸/۱۶ھ	عصمت اللہ عصمہ اللہ دارالافتاء دارالعلوم کراچی ۱۴۲۰/۸/۱۵ھ	الجواب صحیح محمد رفیع عثمان عفا اللہ عنہ ۱۴۲۰/۸/۱۵ھ
الجواب صحیح محمد عبداللہ عفی عنہ ۱۴۲۰/۸/۲۱ھ	الجواب صحیح بندہ عبدالرؤف غفرلہ ۱۴۲۰/۸/۲۰ھ	الجواب صحیح محمد عبدالمنان عفی عنہ ۱۴۲۰/۸/۲۱ھ
الجواب صحیح محمد کمال الدین راشدی ۱۴۲۰/۸/۲۲ھ	الجواب صحیح اصغر علی درانی ۱۴۲۰/۸/۲۲ھ	

فتویٰ منجانب دارالافتاء جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس مسئلہ میں تین چیزوں کوالگ الگ سمجھنالازم ہے:

(۱) سبب وجوب یعنی قربانی واجب ہونے کا سبب، یہ قربانی کا وقت ہے جو یوم النحر کی طلوع صبح صادق سے شروع ہوکر بارھویں تاریخ کے غروب آفتاب تک رہتا ہے۔

(۲) شرط وجوب یعنی قربانی واجب ہونے کی شرط، آزاد مسلمان کا مالک نصاب ہونا۔

(۳) شرط ادا یعنی مالک نصاب پر قربانی کے ایام اور وقت داخل ہونے کی وجہ سے قربانی واجب ہوجاتی ہے، پھر اس کے قربانی ادا کرنے کے لیے ایک مزید شرط ہے، وہ یہ ہے کہ شہری آدمی کے لیے نماز عیدالاضحیٰ کی ادائیگی لازم ہے، یہی شہری کے لیے ادائیگی کی شرط ہے، مگر یہ شرط دیہاتی پر لاگو نہیں ہوتی، اور شرط ادا میں مکان اضحیہ کا اعتبار ہے، مکان مضحی کا اعتبار نہیں، لہٰذا جہاں جانور ہوگا وہاں کا اعتبار ہوگا اور جہاں مالک ہو وہاں کا اعتبار نہیں، یہ مسئلہ صرف تیسری شرط کے اعتبار سے ہے اور پہلی اور دوسری شرط کے وجوب کے بغیر تیسری شرط کا تصور ہی نہیں ہوسکتا؛ لہٰذا سب سے پہلے اول شرط یعنی دونوں جگہ قربانی کے زمانہ کا آنا لازم ہے، پھر شرط ثانی یعنی زمانۂ قربانی میں مسلمان کا مالک نصاب ہونا، ان دونوں شرطوں کے ایک ساتھ پائے جانے کے بعد تیسری کا مسئلہ سامنے آتا ہے اور تیسری شرط ایک خصوصی اور جزوی شرط ہے، عمومی اور کلی نہیں، صرف شہری کے ساتھ یہ شرط لگی ہوئی ہے، دیہاتی کے ساتھ نہیں؛ لہٰذا شہری اور دیہاتی کے اعتبار سے مکان اضحیہ کا اعتبار ہوگا، مکان مضحی کا اعتبار نہیں ہے اور مسائل قربانی میں مسامحت ہوگئی ہے، کہ اس میں تیسری شرط کو سبب وجوب یعنی پہلی شرط کے درجہ میں لے جاکر لکھا گیا ہے، جو درست نہیں ہے، اور ساتھ میں ہدایہ، درمختار اور شامی کے تین جزئیے بھی نقل کیے ہیں ان تینوں جزئیات کا تعلق تیسری شرط کے ساتھ ہے، پہلی شرط کے ساتھ نہیں ہے، ان جزئیات کو اس مسئلہ سے متعلق سمجھنے میں مسامحت ہوگئی ہے

اور بہشتی زیور اور فتاویٰ محمودیہ کا مسئلہ اپنی جگہ صحیح اور درست ہے۔

اب اصل مسئلہ کا جواب یہ ہے کہ مکان اضحیہ کا اعتبار کرنا اس وقت درست ہے کہ جب مالک اضحیہ کے یہاں شرط یعنی سبب وجوب جو کہ قربانی کے ایام ہیں (دسویں ذی الحجہ سے بارہویں ذی الحجہ کا درمیانی زمانہ) دونوں جگہ پایا جانا لازم ہے، اس لیے اگر ہندوستان کا آدمی سعودی عرب قربانی کا پیسہ بھیج دیتا ہے اور وہاں ہندوستان سے ایک دن پہلے قربانی کا دن شروع ہو جاتا ہے ہندوستان میں ابھی قربانی کا زمانہ شروع نہیں ہوا ہے، اب اگر مالک قربانی ہندوستان میں اسی دن مر جاتا ہے تو اس پر قربانی واجب ہی نہیں ہوئی حالانکہ مکان اضحیہ میں جہاں قربانی ہونی ہے وہاں پر وقت ہو چکا تھا، لہٰذا اضحیہ اور مکان مالک دونوں جگہ قربانی کا سبب وجوب یعنی دسویں ذی الحجہ کی صبح صادق کا ہونا شرط ہے اور شہر میں قربانی ہو رہی ہے تو شہر میں کسی جگہ نماز عید الاضحیٰ کا ہو جانا بھی شرط ہے، اس اصول سے دار العلوم کراچی کا فتویٰ صحیح ہے، مگر اس میں ایک مثال میں مسامحت ہوگئی، لکھا ہے کہ جب پاکستان میں صبح ساڑھے چھ بج رہے ہیں اس وقت برطانیہ میں رات کا ڈیڑھ بج رہا ہوتا ہے۔

لہٰذا اگر ایک آدمی برطانیہ میں رہ رہا ہے اور وہ اپنی قربانی پاکستان میں کراتا ہے تو جب تک برطانیہ میں یوم نحر کی صبح صادق طلوع نہ ہو اس وقت تک اس کا جانور پاکستان میں ذبح کرنا درست نہیں، یہ مثال اس لیے درست نہیں کہ دنیا میں مہینے کی ابتداء سعودی اور اس کے اطراف سے ہوتی ہے اور برطانیہ میں اس دن قمری ماہ کی ابتدا ہو جاتی ہے، جس دن سعودیہ میں ہوتی ہے اور ہند و پاک میں اس کے ایک یوم کے بعد ہوتی ہے، لہٰذا سعودیہ اور برطانیہ میں سبب وجوب ہمیشہ پہلے پایا جاتا ہے اس کے بعد ہی ہند و پاک میں قربانی ہوتی ہے اس کے علاوہ دار العلوم کراچی کا فتویٰ مع بقیہ مثالوں کے صحیح ہے۔

اب عربی عبارتوں کے ساتھ جزئیات ملاحظہ فرمائیے: (۱) سبب وجوب یعنی قربانی کے ایام مکان مضحی میں پایا جانا ضروری ہے۔

وأما الذی یرجع إلی وقت التضحیة فهو أنها لاتجوز قبل دخول

الوقت لأن الوقت كما هو شرط الوجوب فهو شرط جواز إقامة الواجب كوقت الصلاة فلا يجوز لأحد أن يضحى قبل طلوع الفجر الثانى من اليوم الأول من أيام النحر ويجوز بعد طلوعه سواء كان من أهل المصر أو من أهل القرى غير أن للجواز فى حق أهل المصر شرطا زائدا وهو أن يكون بعد صلاة العيد لايجوز تقديمها عليه عندنا . (بدائع الصنائع، كتاب التضحية، فصل و أما بيان ما يرجع إلى وقت التضحية زكريا ٤/٢١١)

(٢) وأما وقت الوجوب فأيام النحر فلا تجب قبل دخول الوقت لأن الواجبات المؤقتة لاتجب قبل أوقاتها كالصلاة والصوم و نحوهما و أيام النحر ثلاثة: يوم الأضحىٰ وهو اليوم العاشر من ذى الحجة والحادى عشر و الثانى عشر و ذٰلک بعد طلوع الفجر من اليوم الأول إلى غروب الشمس من الثانى عشر ...... فإذا طلع الفجر من اليوم الأول فقد دخل وقت الوجوب فتجب عند استجماع شرائط الوجوب ثم لجواز الأداء بعد ذٰلک شرائط آخر نذكرها فى مواضعها إن شاء الله. (بدائع الصنائع، فصل فى وقت الوجوب، زكريا ٤/١٩٨، مجمع الأنهر قديم ٢/٥١٦، جديد دار الكتب العلمية بيروت ٤/١٦٦)

(٣) وسببها الوقت وهو أيام النحر. (فتح القدير زكريا ديوبند ٩/٥١٩، كوئٹه ٨/٤٢٥، دار الفكر بيروت ٩/٥٠٦)

(۴) أن سبب وجوب الأضحية الوقت وهو أيام النحر. (مجمع الأنهر قديم ٢/٥١٦، جديد دار الكتب العلمية بيروت ٤/١٦٦)

شرط وجوب: یعنی قربانی واجب ہونے کی شرط یعنی آزاد مسلمان مقیم کا مالک نصاب ہونا اس کے متعلق عبارتیں ملاحظہ فرمائیے:

(۵) وإنما تجب على حر مسلم مقيم موسر. (فتح القدير زكريا ديوبند ٩/٥١٩، كوئٹه ٨/٤٢٥، دار الفكر بيروت ٩/٥٠٦)

(٦) قال: الأضحية واجبة على كل حر مسلم مقيم موسر فى يوم

الاضحیٰ. (البحر الرائق کوئٹه ۸/۱۷۳، زکریا دیوبند ۸/۳۱۷)

(۷) **ولها شرائط وجوب کونه مقیما موسرا من أهل الأمصار والقریٰ والبوادی والإسلام شرط.** (فتح القدیر زکریا دیوبند ۹/۵۱۹، کوئٹه ۸/۴۲۵، دار الفکر بیروت ۹/۵۰۶)

(۸) **فتجب التضحية على حر مسلم مقيم موسر بمصر أو قرية أو بادية.** (تنوير الأبصار مع الشامی زکریا ۹/۴۵۷، کراچی ۶/۳۱۵)

شرط ادا: یعنی قربانی کا فریضہ ادا کرنے کی شرط:

(۹) **وأما شرائط أدائها فمنها الوقت فی حق المصری بعد صلاة الإمام والمعتبر مکان الأضحية لا مکان المضحی و سببها طلوع فجر یوم النحر و رکنها ذبح ما یجوز ذبحه.** (البحر الرائق کراچی ۸/۱۷۳، زکیا دیوبند ۸/۳۱۷)

(۱۰) **وأول وقتها أی أول وقت تضحية الأضحية بعد فجر النحر لکن لا تذبح فی المصر قبل صلاة العید، وهذا الشرط لمن تجب علیه صلاة العید ثم المعتبر فی ذٰلک مکان الأضحية حتی لو کان فی السواد و المضحی فی المصر یجوز من انشقاق الفجر علی عکسه لایجوز إلا بعد الصلاة.** (مجمع الأنهر قدیم ۲/۵۱۶، جدید دار الکتب العلمیة بیروت ۴/۱۶۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍صفر المظفر ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۲۶۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۲/۲۳ھ

جواب صحیح اور درست ہے اور محقق ہے۔

الجواب صحیح
العبد محمد طاہر عفا اللہ عنہ
دار الافتاء مظاہر علوم سہارنپور
۲؍ربیع الاول ۱۴۲۶ھ

الجواب صحیح
محمد ظفیر الدین
مفتی دار العلوم دیوبند
۳؍ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ

الجواب صحیح
حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ
مفتی دار العلوم دیوبند
۱۴۲۰/۸/۱۵ھ

فتویٰ منجانب دارالافتاء جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آنجناب کی ارسال کردہ تحریر کو جو مسئلہ قربانی سے متعلق ہے از اول تا آخر پڑھا گیا، سنا گیا، احقر نے بھی اور مفتی محمد سلمان صاحب نے بھی اچھی طرح تحریر کے دونوں پہلوؤں پر غور کیا اس کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کے جواب میں نئی تحریر لکھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس موضوع سے متعلق دارالعلوم کراچی اور مدرسہ شاہی کا جواب جو پہلے آچکا ہے وہی پیش کر دیا جائے، نیز دارالعلوم دیوبند کا ایک مختصر جواب جس میں دو پہلوؤں کا احتمال تھا اس کے متعلق حضرت مولانا مفتی محمد اسماعیل صاحب بھڈکودروی مفتی دارالعلوم کنتھاریہ کے استفسار کا جواب بھی شامل کر کے آنجناب کی خدمت میں روانہ کر دیا جائے، نیز ملاقات کے موقع پر مفتی محمد اسماعیل صاحب اور بہت سے علماء اور مفتیان کرام نے مدرسہ شاہی کے فتویٰ اور وضاحتی بیان پر اطمینان کا اظہار فرمایا ہے وہ پوری تحریر آنجناب کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے، اس سے ان شاء اللہ تعالیٰ آنجناب کو اطمینان ہو جائے گا اور مدرسہ شاہی کے جواب پر دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور کی تصدیق اور مہر بھی شامل ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۲۶۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/۵/۱۴۲۶ھ

قربانی میں کس جگہ کا اعتبار ہے؟

سوال [۹۸۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں نے ایک استفتاء آپ کی خدمت میں ارسال کیا تھا جس کا حاصل یہ تھا کہ

سعودیہ میں مقیم شخص کے لیے سعودیہ اور ہندوستان دونوں جگہ قربانی کے ایام ہونا ضروری ہے یا صرف مکان اضحیہ میں ایام نحر ہونا کافی ہے، جناب والا کے فتویٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں جگہ قربانی کے ایام ہونا ضروری نہیں بلکہ اگر سعودیہ میں قربانی کے ایام گذر گئے ہوں اور ہندوستان میں ایام نحر باقی ہوں تو سعودیہ میں مقیم شخص کی قربانی ہندوستان میں ہوسکتی ہے، مسئلہ کی نزاکت کے پیش نظر مذکورہ استفتاء احقر نے دارالعلوم بھی بھیجا تھا، دارالعلوم کا جواب ہے کہ سعودیہ اور ہندوستان دونوں جگہ قربانی کا دن ہونا ضروری ہے، اگر سعودیہ میں قربانی کے دن گذر چکے ہیں اور ہندوستان میں قربانی کے ایام باقی ہیں تو سعودیہ میں مقیم شخص کی قربانی ہندوستان میں نہ ہوگی، غور فرمانے کے لیے دارالعلوم کا فتویٰ ارسال خدمت ہے۔

المستفتی: محمد عثمان اعظمی

دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ

کیا فرماتے ہیں علماء دین مسئلہ ذیل کے بارے میں:

زید کے اعزاء و اقارب سعودیہ عربیہ میں رہتے ہیں، عام طور سے سعودیہ میں ہندوستان سے ایک روز یا دو روز قبل عیدیں ہوتی ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر سعودیہ میں مقیم شخص وہاں کے ایام نحر گذرنے کے بعد اپنی قربانی ہندوستان میں کرادے جبکہ یہاں ابھی ایام نحر باقی ہیں تو کیا سعودیہ میں مقیم شخص کی قربانی اس صورت میں صحیح ہوگی؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: مذکورہ صورت میں سعودیہ میں مقیم شخص کی قربانی صحیح نہ ہوگی، صحیح جب ہوگی جبکہ سعودیہ میں بھی قربانی کا دن ہو اور ہندوستان میں بھی قربانی کا دن ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ
مفتی دارالعلوم دیوبند
۸رشوال ۱۴۲۹ھ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی
مفتی دارالعلوم دیوبند
۸رشوال ۱۴۲۹ھ

فتویٰ مدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سعودیہ میں مقیم شخص اپنے یہاں ایام نحر گذرنے کے بعد ۱۳؍ذی الحجہ کو ہندوستان میں کسی شخص کو اپنی قربانی کا وکیل بنادے جبکہ ہندوستان میں ایام نحر باقی ہیں، ۱۲؍ذی الحجہ ہے اور ہندوستان میں ۱۲؍ذی الحجہ کو اس کی قربانی کردی جائے تو یہ قربانی صحیح اور درست ہوجائے گی؛ کیونکہ یہاں پر تین باتوں پر توجہ دینا نہایت ضروری ہے:

(۱) سبب وجوب (۲) ادائے وجوب (۳) قربانی کے ایام میں اصل قربانی ہی کرنا۔

سبب وجوب: مالدار شخص پر قربانی کے ایام کا آنا، اس میں مکان مالک کا اعتبار ہے، یعنی مکان مالک میں قربانی کے ایام آچکے ہوں۔

ادائے وجوب: قربانی کے ایام کا پایا جانا، اور اس میں مکان اضحیہ کا اعتبار ہے۔

قربانی کے ایام میں اصل قربانی ہی کرنا ہے: بدرجہ مجبوری ایام فوت ہونے کی وجہ سے بدل میں تصدق واجب ہوتا ہے؛ لہٰذا اگر دنیا میں کہیں بھی ایام نحر باقی ہوں اور وہاں آسانی کے ساتھ قربانی کرائی جاسکتی ہو تو بجائے تصدق کے قربانی ہی کرانا چاہیے، کیونکہ وہی اصل ہے، اصل پر قدرت کے باوجود بدل کی ادائیگی نہیں ہوتی، لہٰذا اگر ہندوستان میں ۱۲؍تاریخ کو وکیل بناکر قربانی کرادی جائے تو جائز ہے کیونکہ ادائیگی کا وقت مکان اضحیہ میں موجود ہے، اور سبب وجوب کا زمانہ مکان مالک میں آچکا ہے، یعنی جہاں پر مالک ہے وہاں قربانی کا زمانہ آچکا ہے، اگرچہ آنے کے بعد وقت نکل چکا ہے، اس لیے کہ مالک کے اوپر قربانی کے ایام آنے کے بعد اب قربانی کرنے کے لیے قربانی کی جگہ کا اعتبار ہوتا ہے کہ جہاں بھی قربانی ہو وہاں پر قربانی کا زمانہ موجود ہونا لازم ہے، اور مذکورہ سوال میں ذکر کردہ واقعہ میں ہندوستان میں جب قربانی کی جارہی تھی اس وقت ہندوستان میں قربانی کے ایام موجود تھے، سائل کی طرف سے پیش کردہ دونوں جوابوں کو بار بار دیکھا گیا ہم نے جو جواب لکھا تھا اس کی تائید میں جزئیات اور فقہی عبارات ملتی ہیں، اور دارالعلوم دیوبند کے جواب کی تائید میں ہم کو کوئی صریح جزئیہ نہیں مل سکا، اس لیے دارالعلوم دیوبند کے جواب سے ہم کو اتفاق نہیں ہوسکا،

نیز جو فقہی عبارت اور جزئیات ہمارے سامنے ہیں ان کی روشنی میں دار العلوم دیوبند یا ہندوستان کے دیگر مدارس میں سعودیہ عربیہ، مصر، افریقہ، اور انگلینڈ والوں کی طرف سے بھیجی ہوئی قربانی ہندوستان کے تیسرے دن بھی جائز ہے، اگر چہ قربانی کے پیسے بھیجنے والوں کے یہاں تیسرا دن گذر چکا ہو، جزئیات ملاحظہ ہوں:

ولو كان هو في مصر وقت الأضحية وأهله في مصر آخر فكتب إلى الأهل و أمرهم بالتضحية، في ظاهر الرواية: يعتبر مكان الأضحية. (خانية، كتاب الأضحية، فصل في صفة الأضحية جديد زكريا ۳/۲٤۳، على هامش الهندية زكريا ۳/۳٤٥)

روى فيها: أن الرجل إذا كان في مصر و أهله في مصر آخر فكتب إليهم أن يضحوا عنه فإنه يعتبر مكان الذبيحة. (المحيط البرهاني، مكتبه رشيديه كوئٹه ٦/٤٧٧، المجلس العلمي بيروت ٨/٤٦٤، رقم: ١٠٨٠٩)

وإنما يعتبر في هذا مكان الشاة لا مكان من عليه هكذا ذكر محمد رحمه الله في النوادر وقال: إنما أنظر إلى محل الذبح ولا أنظر إلى موضع المذبوح عنه، وهكذا روى الحسن عن أبي يوسف رحمه الله يعتبر المكان الذي يكون فيه الذبح ولا يعتبر المكان الذي يكون فيه المذبوح عنه وإنما كان كذٰلك لأن الذبح هو القربة فيعتبر مكان فعلها لا مكان المفعول عنه وإن كان الرجل في مصر و أهله في مصر آخر فكتب إليهم أن يضحوا عنه روى عن أبي يوسف أنه اعتبر مكان الذبيحة. (بدائع الصنائع فصل في بيان ما يرجع إلى وقت التضحية، زكريا ٤/٢١٣)

والمعتبر مكان الأضحية لامكان من عليه. (در مختار شامي زكريا ٩/٤٦١)

إن الرجل إذا كان في مصر و أهله في مصر آخر فكتب إليهم ليضحوا عنه فإنه يعتبر مكان التضحية. (هنديه زكرياقديم ٥/٢٩٦، جديد ٥/٣٤٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ر محرم الحرام ۱۴۳۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۷۳۳/۳۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶/۱/۱۴۳۰ھ

کیا تاریخ کے اختلاف کے باوجود وکیل قربانی کرسکتا ہے؟

(۹۸۷۰) **(دلائل کی روشنی میں)**

پچھلے چند سالوں سے قربانی کے دو مسئلے موضوع بحث بن گئے ہیں:

(۱) مؤکل کے مکان پر قربانی کا وقت شروع نہیں ہوا ہے، اور وکیل کے مکان پر قربانی کا وقت شروع ہو چکا ہے۔

(۲) مؤکل کے مکان پر قربانی کا وقت ختم ہو چکا ہے اور وکیل کے مکان پر قربانی کا وقت موجود ہے۔

ان دونوں مسئلوں میں وکیل کا اپنے مؤکل کی طرف سے قربانی کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کے بارے میں تین نقطہائے نظر پائے جاتے ہیں:

(۱) پہلے مسئلہ میں درست نہیں اور دوسرے مسئلے میں درست ہے۔

(۲) دونوں مسئلوں میں درست ہے۔

(۳) دونوں مسئلوں میں درست نہیں ہے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ پہلے نقطۂ نظر والے جن دلائل سے صرف ایک مسئلہ میں جواز ثابت کرتے ہیں، انہیں دلائل سے دوسرے نقطۂ نظر والے دونوں مسئلوں میں جواز ثابت کرتے ہیں، اور انہیں دلائل سے تیسرے نقطہ نظر والے دونوں مسئلوں میں عدم جواز ثابت کرتے ہیں، اس لیے اتنی بات تو طے ہے کہ دلائل ایک ہی نقطۂ نظر کی تائید کرسکتے ہیں، سب کی تائید نہیں، بالفاظ دیگر ایک ہی نقطۂ نظر درست ہوسکتا ہے، سب نہیں، اب وہ کون سا ہے، ہم اس تک رسائی کی کوشش کرتے ہیں، لیکن مطلوب تک رسائی مندرجہ ذیل امور کی تعیین پر موقوف ہے، لہٰذا پہلے ان کی تعیین کرتے ہیں۔

(۱) قربانی کا سبب نفس وجوب، وقت ہے یا نصاب؟

(۲) ذبح کے قربت بننے اور قربت باقی رہنے اور درست ہونے میں کس کے مقام کا اعتبار ہے؟

(۳) شہری اور دیہاتی کے حق میں قربانی کا وقتِ ادا کب شروع ہوتا ہے؟ اور شہر اور دیہات میں قربانی کا وقت ادا کب شروع ہوتا ہے؟

(۴) قربانی کے وقتِ ادا، شروع وختم ہونے میں کس کے مقام کا اعتبار ہے؟

قربانی کا سبب نفس وجوب وقت ہے یا نصاب؟

قربانی کا نفس وجوب مکرر ثابت ہوتا ہے اور نفس وجوب کا تکرار، سبب نفس وجوب کے تکرار سے ثابت ہوتا ہے، لہٰذا سبب نفس وجوب ایسی چیز ہونی چاہیے جس میں تکرار ہو اور وہ وقت ہی ہوسکتا ہے نہ کہ نصاب قربانی، کیونکہ نصاب قربانی میں مال نامی ہونے کی شرط نہ ہونے کی وجہ سے اس میں تکرار ہے ہی نہیں۔

ولایشترط فیه النماء لا بالتجارة ولابالحول. (شرح العنایة مع فتح القدیر ۲/۲۸۸)

اور نصاب زکوٰۃ میں صفت نمو ہی کی وجہ سے تکرار ثابت ہوتا ہے اور صدقۂ فطر کا سبب نفس وجوب جو کہ رأس ہے اس میں بھی فقہاء نے تقدیراً تکرار ثابت کیا ہے، تا کہ نفس وجوب کا تکرار ہو سکے۔

فإن الوصف لأجله كان الرأس موجبا وهو المؤنة يتجدد بمضى الزمان كما أن النماء الذى لأجله كان المال سببا للوجوب يتجدد بتجدد الحول. (المحرر فی اصول الفقه للسرخسی ۱/۷۸)

حاصل یہ کہ جب قربانی کا نفس وجوب مکرر ثابت ہوتا ہے تو سبب نفس وجوب ایسی چیز ہونی چاہیے جس میں تکرار ہو اور وہ بالیقین وقت ہی ہے نہ کہ نصاب قربانی اور فقہاء کی صراحت بھی موجود ہے۔

إن سبب وجوب الأضحية الوقت وهو أيام النحر والغناء شرط الوجوب. (تكملة فتح القدير، كتاب الأضحية، دار الفكر بيروت ۹/۵۰۶، کوئٹہ ۸/۴۲۵، زکریا دیوبند ۹/۵۱۹)

اور غنا یعنی ملک نصاب سبب نفس وجوب نہیں، بلکہ شرط نفس وجوب ہے، اسی لیے سبب نفس وجوب یعنی ایام نحر ہی میں غنا کا اعتبار ہے ان سے پہلے نہیں۔

هـذه قربة موقتة فيعتبر الغنى في وقتها. (بدائع الصنائع، فصل في شرائط الوجوب زكريا ديوبند ٤/١٩٦)

بالفرض اگر قربانی کا سبب نفس وجوب ملک نصاب کو تسلیم کرلیں، تو یہ ممکن بھی نہیں، اس لیے کہ مکلّف پر ملک نصاب کی وجہ سے یوم نحر سے پہلے ہی قربانی کا نفس وجوب ہوجائے گا، لیکن مکلّف کے لیے یوم نحر کی آمد سے پہلے قربانی ادا کرنا درست نہ ہوگا، حالانکہ نفس وجوب کے لیے جواز ادا لازم ہے، یعنی جب مکلّف پر کسی عبادت کا نفس وجوب ہوتا ہے، تو اس کے لیے عبادت کی ادائیگی جائز ہوجاتی ہے اگرچہ وجوب ادا نہ ہوا ہو، جیسے ملک نصاب سے زکوٰۃ کا نفس وجوب ہوجاتا ہے، تو مالک نصاب بنتے ہی زکوٰۃ کی ادائیگی درست ہوجاتی ہے اگرچہ وجوب ادا حولانِ حول پر ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے حج میں وقت کو اصح قول کے مطابق نفس وجوب کی شرط قرار دیا ہے، کذا فی الفتح، والبحر، والدرالمختار، والشامی والطحطاوی علی المراقی والبدائع، شریعت میں اس کی کوئی نظیر نہیں کہ مکلّف پر کسی عبادت کا نفس وجوب ہوجائے اور جواز ادا متعین وقت کی آمد پر موقوف ہو، کیونکہ جواز ادا نفس وجوب کے لوازمات میں سے ہے۔

لـمـا صـار الجزء الأول سببا أفاد الوجوب بنفسه و أفاد صحة الأداء لكنه لم يوجب الأداء للحال (قوله أفاد صحة الأداء) لأن الوجوب لما ثبت كـان جـواز الأداء من ضروراته على ما عليه عامة الفقهاء والمتكلمين، فإن الوجوب يفيد جواز الأداء عندهم. (كشف الأسرار عن اصول البزدوى ١/٣١٧ - ٣١٨، باب تقسيم المامور به فى حكم الوقت)

حاصل یہ کہ مضحّی کے مقام پر یوم نحر کی آمد سے پہلے قربانی کا نفس وجوب ہوتا ہی نہیں، اور نفس وجوب سے پہلے عبادت کی ادائیگی جائز نہیں۔

ذبح کے قربت بننے اور قربت باقی رہنے اور درست ہونے میں کس کے مقام کا اعتبار ہے؟

(۱) ذبح کا قربت بننا یعنی جانور کو ذبح کرنا عبادت بن جائے اور قربانی کا نفس وجوب ہی ذبح کا قربت بنا ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ مضحی پر یوم نحر سے پہلے ذبح واجب نہیں تھا، اس لیے ذبح اس کے لیے قربت بھی نہیں تھا، لیکن جب مضحی پر یوم نحر کی آمد سے قربانی کا نفس وجوب ہوا اور جانور ذبح کرنا واجب ہوا تو ذبح اس کے لیے قربت بھی بن گیا، پس ثابت ہوا کہ مضحی کے مقام پر یوم نحر کی آمد سے ذبح قربت بنتا ہے، مقام اضحیہ کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

(۲) ذبح کا قربت باقی رہنا، جب مضحی کے مقام پر یوم نحر کی آمد سے ذبح قربت بن گیا، تو جب تک مضحی کے مقام پر وقت قربانی باقی رہے گا اور اس پر ذبح واجب رہے گا، تب تک ذبح اس کے لیے قربت رہے گا اور جس وقت مضحی کے مقام پر وقت قربانی ختم ہو جائے اور اس پر قربانی کی قضا یعنی صدقہ کرنا واجب ہو جائے، ذبح واجب نہ رہے تو ذبح اس کے لیے قربت بھی نہ رہے گا، بلکہ صدقہ قربت بن جائے گا، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ذبح قربت موقتہ ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ ذبح کے قربت بننے میں جس کے مقام کا اعتبار ہو، اس کے قربت باقی رہنے میں بھی اسی کے مقام کا اعتبار ہو، دوسری وجہ یہ ہے کہ مضحی پر قربانی کی قضا واجب ہونا یعنی ذبح واجب نہ رہنا اور ذبح کا قربت ہونا، یعنی ذبح کا واجب ہونا دونوں میں منافات ہے، اس لیے قربانی کی قضا واجب ہونا اور ذبح کا قربت ہونا دونوں کبھی جمع نہیں ہو سکتے ہیں، حاصل یہ کہ ذبح کے قربت بننے اور قربت باقی رہنے میں صرف مضحی کے مقام کا اعتبار ہے، اس میں مقام اضحیہ کا مطلقاً کوئی دخل نہیں، بلکہ ذبح کے قربت بننے اور قربت باقی رہنے میں جانور کے مقام کا اعتبار کرنا خود جانور ہی کو مکلّف بنا دینا ہے، یہی وجہ ہے کہ کسی دلیل سے ذبح کے قربت بننے اور قربت باقی رہنے میں مقام اضحیہ کا معتبر ہونا ثابت نہیں، اور نہ ثابت کیا جا سکتا ہے، اور نہ فقہاء نے اس سے بحث کی ہے کہ ذبح کے قربت بننے اور قربت باقی رہنے میں کس کے مقام کا اعتبار ہے؟ اور نہ تو اس کی کوئی ضرورت تھی، عدم ضرورت کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ذبح

کے قربت بننے اور قربت باقی رہنے کا تعلق صرف مضحی سے ہے، اضحیہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں، لہٰذا اس سلسلے میں کوئی اشتباہ تھا ہی نہیں کہ ضابطہ بیان کرنے کی ضرورت لاحق ہو، دوسری وجہ یہ کہ قربانی کے نفس وجوب ہی سے ذبح کا قربت بننا محقق ہوتا ہے، اور قربانی کی قضا واجب ہوتے ہی ذبح کا قربت ہونا ختم ہو جاتا ہے اور قربانی کے نفس وجوب اور وجوب قضا میں مضحی کے مقام کا معتبر ہونا مسلم ہے، پھر ذبح کے قربت بننے اور قربت باقی رہنے میں کس کے مقام کا اعتبار ہے؟ یہ سوال ہی کب پیدا ہوتا ہے؟ کہ اس سلسلے میں کوئی ضابطہ ذکر کیا جائے۔

(۳) ذبح کا درست ہونا یعنی قربت کی صحت، جب مضحی کے لیے ذبح قربت ہو (اس کے مقام پر ایام نحر موجود ہوں) اور اس کے لیے عبادت جانور ذبح کرنے میں ہو، تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قربت کی صحت یعنی ذبح کے درست ہونے میں کس کے مقام کا اعتبار ہے؟ مضحی کے یا اضحیہ کے؟ کیونکہ ذبح قربت کا تعلق مضحی و اضحیہ دونوں سے ہے، یعنی ذبح کے قربت بننے اور قربت باقی رہنے کا تعلق مضحی سے ہے اور ذبح کا محل اضحیہ ہے، اور بسا اوقات مضحی کے لیے ذبح کے قربت ہونے کی صورت میں بھی مضحی و اضحیہ میں سے ایک مقام پر وقت ادا موجود ہوتا ہے اور دوسرے کے مقام پر وقت ادا موجود نہیں ہوتا ہے جیسے ایک شہر میں ہو اور دوسرا دیہات میں ہو۔

لہٰذا ضرورت پیش آئی ایک ایسے ضابطے کی جس سے بآسانی معلوم ہو جائے کہ قربت کی صحت میں کس کے مقام پر وقت ادا موجود ہونا ضروری ہے؟ تو فقہاء کرام نے ضابطہ بیان کر دیا کہ قربت کی صحت میں مقام اضحیہ اور مقام فاعل کا اعتبار ہے، یعنی صرف مقام اضحیہ میں وقت ادا موجود ہونا ضروری ہے، مقام مضحی میں وقت ادا موجود ہونا ضروری نہیں، کیونکہ مضحی کے مقام پر ایام نحر موجود ہونے کی وجہ سے ذبح اس کے لیے قربت ہے اور اس قربت کی ادائیگی جانور ذبح کرنے میں ہے، اب صرف فعل ذبح یعنی قربت کی ادا باقی ہے، جس کا تعلق صرف اضحیہ سے ہے اور جس کو تنہا وکیل بھی انجام دے سکتا ہے، پھر مضحی کے مقام پر وقت ادا موجود ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر مضحی کے مقام پر ایام نحر موجود نہ

ہوں (خواہ آئے ہی نہ ہوں یا ختم ہو گئے ہوں) تو اس کے لیے ذبح قربت نہیں، قربانی کی ادا درست نہیں، پھر ادا کی صحت کا مسئلہ اور اس کی صحت میں کس کے مقام کا اعتبار ہے؟ یہ سوال ہی سرے سے ختم ہو جاتا ہے، حاصل یہ کہ قربانی کے ادا وقضا ہونے کا تعلق صرف موکل کے مقامی وقت سے ہوتا ہے، البتہ قربانی کے ادا ہونے کی صورت میں صرف صحت ادا کا تعلق وکیل کے مقامی وقت سے ہوتا ہے اگر بذریعہ وکیل قربانی کروائے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ضابطہ صرف یہ ہے کہ صحت ادائے قربانی کے لیے مقام اضحیہ میں وقت ادا موجود ہونا ضروری ہے، مضحی کے مقام پر وقت ادا موجود ہونا ضروری نہیں، لیکن فقہاء نے یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ مضحی کے مقام پر ایام نحر کا موجود ہونا ضروری نہیں، یہی وجہ ہے کہ کسی دلیل سے یہ ثابت نہیں، مگر اس کے باوجود مضحی کے مقام پر وقت ادا کے موجود ہونے کے ضروری ہونے کی نفی سے مضحی کے مقام پر ایام نحر کے موجود ہونے کے ضروری ہونے کی نفی ذہن نشیں کر لی ہے، یعنی وقت ادا اور ایام نحر میں تساوی کی نسبت سمجھ لی گئی ہے، حالانکہ دونوں کے درمیان عموم و خصوص مطلق کی نسبت ہے، یوم نحر عام مطلق ہے اور وقت ادا خاص مطلق ہے، لہٰذا ہر یوم نحر کے پورے وقت کا مقام کے اعتبار سے وقت ادا ہونا ضروری نہیں، جیسے شہر میں نماز عید سے پہلے کا وقت یوم نحر ہے، وقت ادا نہیں، البتہ مقام کے اعتبار سے ہر وقت ادا کا یوم نحر ہونا ضروری ہے، تو گویا فقہاء نے مضحی کے مقام پر خاص مطلق یعنی وقت ادا کے موجود ہونے کے ضروری ہونے کی نفی کی ہے، لیکن عام مطلق یعنی یوم نحر کے موجود ہونے کے ضروری ہونے کی نفی سمجھ لی گئی ہے، حالانکہ خاص کی نفی سے عام کی نفی ثابت نہیں ہو سکتی، لہٰذا مضحی کے مقام پر یوم نحر کا موجود ہونا تو ضروری ہے اور اسی بات کے پیش نظر نہ رہنے کی وجہ سے موضوع بحث دونوں مسئلوں کے بارے میں تین نقطہائے نظر پیدا ہو گئے ہیں۔

☆☆☆

شہری اور دیہاتی کے حق میں قربانی کا وقتِ ادا کب شروع ہوتا ہے؟ اور شہر اور دیہات میں قربانی کا وقتِ ادا کب شروع ہوتا ہے؟

ہر شخص کے لیے خواہ شہری ہو یا دیہاتی اس کے مقام پر یوم نحر کی صبح ہوتے ہی اس کے حق میں وقت ادا شروع ہوجاتا ہے، خود شہری اور دیہاتی کے حق میں وقت ادا کی ابتداء وانتہاء میں کوئی فرق نہیں، دونوں کے لیے مکمل تین دن وقت ادا ہے، ایام نحر کا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں کہ جس میں شہری کے حق میں وقت ادا نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ شہری شہر میں رہتے ہوئے بھی نماز عید سے پہلے دیہات میں کسی کو وکیل بنا کر قربانی کراسکتا ہے، اگر شہری کے حق میں نماز عید سے پہلے وقت ادا شروع نہ ہوتا، تو وہ جس طرح شہر میں قربانی نہیں کرسکتا ہے، اسی طرح وہ دیہات میں بھی قربانی نہ کرسکتا۔

فلايجوز لأحد أن يضحى قبل طلوع الفجر الثانى من اليوم الأول من أيـام النحر ويجوز بعد طلوعه سواء كان من أهل المصر أو من أهل القرىٰ.

(بدائع، فصل فى بيان ما يرجع إلى وقت التضحية دار الكتاب ديوبند ٤/ ٢١١)

البتہ شہر ودیہات میں وقت ادا شروع ہونے میں فرق ہے، شہر میں نماز عید کے بعد وقت ادا شروع ہوتا ہے جبکہ دیہات میں یوم نحر کی صبح ہوتے ہی وقتِ ادا شروع ہوجاتا ہے، پس ہر شخص خواہ شہری ہو یا دیہاتی اگر شہر میں قربانی کرنا چاہتا ہے تو وہ نمازِ عید سے پہلے قربانی نہیں کرسکتا، قربانی نہ کرسکنے کی وجہ یہ نہیں کہ مضحی کے حق میں وقت ادا موجود نہیں، بلکہ مضحی کے حق میں تو وقت ادا موجود ہے، لیکن وہ جس مقام پر قربانی کرنا چاہتا ہے (شہر) اس میں وقت ادا موجود نہیں، اور اگر مضحی خواہ شہری ہو یا دیہاتی، دیہات میں قربانی کرنا چاہتا ہے تو وہ صبح ہوتے ہی قربانی کرسکتا ہے، اور وقت ادا ختم ہونے میں شہر ودیہات میں کوئی فرق نہیں، دونوں جگہ ایک ساتھ ۱۲/ ذی الحجہ کے غروب ہوتے ہی وقت ادا ختم ہوجاتا ہے اور چونکہ شہری عموما شہر میں قربانی کرتا ہے اور دیہاتی عموماً دیہات میں قربانی کرتا ہے، اس لیے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ شہری کے لیے وقت ادا نماز عید کے بعد شروع ہوتا ہے اور دیہاتی کے لیے وقت ادا

یوم نحر کی صبح ہوتے ہی شروع ہوتا ہے، ورنہ حقیقت وہی ہے جو سابق میں ذکر کی گئی۔

قربانی کے وقت ادا شروع وختم ہونے میں کس کے مقام کا اعتبار ہے؟

قربانی کے وقت ادا شروع وختم ہونے میں صرف مضحی کے مقام کا اعتبار ہے، اس میں مقام اضحیہ کا کوئی دخل نہیں، اور فقہاء نے اس کی تصریح بھی کردی ہے، چنانچہ ملک العلماء علامہ کاسائیؒ قربانی کا وقت بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

وأما الذی یرجع إلی وقت التضحیة فهو أنها لاتجوز قبل دخول الوقت لأن الوقت کما هو شرط الوجوب فهو شرط جواز إقامة الواجب کوقت الصلاة فلا یجوز لأحد أن یضحی قبل طلوع الفجر الثانی من الیوم الأول من أیام النحر ویجوز بعد طلوعها. (بدائع الصنائع، کتاب التضحیة،، فصل و أما بیان ما یرجع إلی وقت التضحیة، زکریا ٤/ ٢١١)

فإذا خرج الوقت تحول الواجب من الإراقة إلی التصدق. (بدائع الصنائع، فصل فی کیفیة الوجوب، زکریا ٤/ ٢٠٠)

مذکورہ دونوں عبارتوں میں مضحی کے مقام میں دخول وقت اور مضحی کے مقام سے خروج مراد ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ دخول وقت ادا اور خروج وقت ادا میں صرف مضحی کے مقام کا اعتبار ہے، اس سلسلے میں مقام اضحیہ کا مطلقاً کوئی اعتبار نہیں، یہی وجہ ہے کہ جب مقام مضحی میں وقت قربانی موجود ہو اور مقام اضحیہ میں وقت قربانی ختم ہوجائے تو بالاتفاق وقت ادا ختم ہونے میں مقام اضحیہ کا اعتبار نہیں، وقتِ قربانی کے آغاز واختتام کے بارے میں مقام اضحیہ کے معتبر ہونے کی تصریح تو دور کی بات ہے، کتب فقہ میں جس موقع پر وقت ادا شروع وختم ہونے کو فقہاء نے بیان کیا ہے وہاں مقام اضحیہ کا تذکرہ تک نہیں، اور یہ بات عقل سے بھی سمجھ میں آتی ہے کہ وقت ادا مکلّف کو عبادت کی ادائیگی کے لیے دیا جاتا ہے کہ فلاں وقت سے فلاں وقت کے اندر ہی عبادت کو انجام دیدیا جائے، تو کیا یہ ممکن ہے کہ ایک مکلّف انسان کے ایک اہم فریضہ کی

ادائیگی کا وقت جانور کے گاؤں میں وقتِ ادا شروع ہونے سے شروع ہو اور جانور کے گاؤں میں وقتِ ادا ختم ہونے سے ختم ہو؟ ہاں یہ تو ہوسکتا ہے کہ انسان کے فریضہ کی ادا کا محل جانور ہو، تو فریضہ کی ادائیگی کے وقت، جانور کے مقام پر وقت ادا موجود ہونا ضروری ہو۔

ولا سبيل إلى التقرب بالإراقة بعد خروج الوقت لما قلنا انتقل الواجب. (بدائع الصنائع زكريا ٤/ ٢٠٣، كراچی ٥/ ٦٨)

اس عبارت میں نکرہ نفی کے تحت لاکر مضحی کے مقام سے خروج وقت اور تحول واجب کے بعد ذبح کے قربت ہونے اور ادائے عبارت کے درست ہونے کی تمام راہوں کو فقہاء نے مسدود کر دیا ہے، اب مضحی کے لیے اپنے مقام پر رہتے ہوئے ذبح کے ذریعہ عبادت ادا کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں، الا یہ کہ خود مضحی سفر کر کے مقام اضحیہ، جہاں وقت قربانی موجود ہے، پہنچ جائے، تو وہ اضحیہ کے مقامی باشندوں کے حکم میں ہوجائے گا، ذبح اس کے لیے قربت بن جائے گا، اور اس کے حق میں وقت ادا لوٹ آئے گا، اب اس کے لیے قضائے قربانی جائز ہی نہیں نہ اصالۃً نہ نیابۃً جیسے سورج کے غروب ہونے کے بعد لوٹ آنے سے وقت عصر لوٹ آتا ہے۔

فلو غربت ثم عادت هل يعود الوقت؟ الظاهر نعم. (الدر المختار، كتاب الصلاة، مطلب: لو ردت الشمس بعد غروبها، كراچی ١/ ٣٦٠، زكريا ديوبند ٢/ ١٦)

لیکن موکل کے اپنے مقام، جہاں وقت قربانی ختم ہوگیا ہے، پر رہتے ہوئے مقام اضحیہ میں کسی کو وکیل بنانے سے اس کے حق میں وقت ادا کا لوٹ آنا اور ذبح کا قربت بن جانا یعنی ذبح کا واجب ہوجانا نہ تو درست ہے اور نہ تو کسی دلیل سے ثابت ہے، کما مر تفصیلہ، مذکورہ تفصیل سے حقیقت تو واضح ہوچکی ہے کہ تیسرا نقطۂ نظر (دونوں مسئلوں میں عدم جواز) ہی درست ہے، لیکن مزید شرح صدر کے لیے دلائل میں غور کرتے ہیں۔

مضبوط دلیل کا جائزہ

موضوع بحث دونوں مسئلوں کے بارے میں پیش کیے جانے والے دلائل کا مدار بظاہر دو

باتوں پر ہے، ذبح کا قربت ہونا اور جانور کا اضحیہ ہونا، لیکن درحقیقت ان کا مدار صرف ایک ہی بات ''ذبح کے قربت'' ہونے پر ہے، کیونکہ مضحی کے لیے ذبح کے قربت ہونے کی صورت میں جانور اضحیہ ہوتا ہے اور ذبح کے قربت نہ ہونے کی صورت میں جانور اضحیہ نہیں ہوتا ہے، اب ان دلائل میں غور کرتے ہیں جن سے تینوں نقطہائے نظر والوں نے استدلال کیا ہے کہ وہ کس نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہیں اور کس کا نقطۂ نظر ان سے ثابت ہوتا ہے، بلکہ تمام دلائل میں بھی غور کرنے کی ضرورت نہیں، صرف ایک ہی دلیل کا جائزہ لیتے ہیں جو ہر نقطۂ نظر کی سب سے مضبوط دلیل شمار کی جاتی ہے جس سے دوسرے دلائل کا حال بھی خود بخود واضح ہو جائے گا، وہ مضبوط دلیل یہ ہے:

إن القربة فی الذبح و القربات المؤقتة یعتبر فی حق فاعلها لا فی حق المفعول عنه. (بدائع الصنائع زکریا ٤/٢١٣)

یہاں ایک بات قابل توجہ ہے کہ فقہاء نے یہ دلیل اور دیگر دلائل جن سے استدلال کیا جاتا ہے شہری اور دیہاتی کے مسئلہ میں بیان فرمائی ہیں، اس لیے شہری اور دیہاتی کے مسئلہ کی مکمل نوعیت پیش نظر رکھ کر ہی ان کا صحیح مفہوم و مصداق متعین کیا جا سکتا ہے، لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں کچھ تفصیل درج کی جائے:

(۱) دیہات شہر کے تابع ہوتے ہیں، ایام نحر دونوں جگہ ایک ساتھ شروع اور ختم ہوتے ہیں، جیسا کہ فقہاء نے بھی اس کی صراحت کر دی ہے۔

ودخول الوقت لا یختلف فی حق أهل الأمصار والقریٰ و إنما یختلفون فی وجوب الصلاة فلیس علی أهل القریٰ صلاة العید. (المبسوط للسرخسی، دار الکتب العلمیة بیروت ١٢/١٠)

(۲) شہری اور دیہاتی کے مسئلہ میں مضحی اور اضحیہ کے مکان میں اختلاف کی صورت میں کوئی ایسی صورت ممکن ہی نہیں کہ اضحیہ کے مقام پر وقت ادا موجود ہو اور مضحی کے مقام پر یوم نحر موجود نہ ہو، لہٰذا اضحیہ کے مقام پر جب بھی وقت ادا موجود ہوگا تو مضحی کے مقام پر بھی ضرور یوم نحر موجود ہوگا، اس سلسلے میں کسی ضابطہ کی ضرورت ہی نہیں، البتہ یہ صورت ممکن ہے کہ مضحی کے مقام پر وقت ادا موجود نہ اور اضحیہ کے مقام پر وقت ادا موجود ہو یا اس کے

برعکس، پس مضحی کے مقام کے وقتِ ادا اور اضحیہ کے مقام کے وقت ادا میں عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہے، کبھی مضحی کے مقام کا وقت ادا عام مطلق اور اضحیہ کے مقام کا وقت ادا خاص مطلق ہوتا ہے اور کبھی اس کے برعکس، لہٰذا مضحی اور اضحیہ کے مقام کے وقت ادا میں اختلاف ہی کی وجہ سے ضابطہ بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔

إنما يعتبر في هذا مكان الشاة لا مكان من عليه. (بدائع الصنائع زکریا ٤/ ٢١٣)

اس ضابطہ کا مقصد صرف مضحی کے مقام میں وقت ادا کے موجود ہونے کے ضروری ہونے کی نفی ہے، لیکن مضحی کے مقام پر یوم نحر کے موجود ہونے کے ضروری ہونے کی نفی مقصود نہیں، اور یہ نفی مقصود بھی کیسے ہوسکتی ہے؟ جبکہ شہری اور دیہاتی کے مسئلے میں یہ ممکن بھی نہیں۔

(۳) شہری اور دیہاتی کے مسئلہ میں مضحی کے مقام اور اضحیہ کے مقام میں وقت ادا ختم ہونے میں کوئی اختلاف نہیں، لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ اضحیہ کے مقام پر وقت ادا موجود ہو اور مضحی کے مقام پر وقت ادا ختم ہو گیا ہو یا اس کے برعکس، حاصل یہ کہ فقہاء نے مضحی اور اضحیہ دونوں کے مقام پر ایام نحر موجود ہونے کی صورت ہی میں صرف وقت ادا کے اختلاف کو پیش نظر رکھ کر مقام اضحیہ کے معتبر ہونے کا ضابطہ وضع کیا ہے، یہ ضابطہ ایام نحر میں اختلاف کی صورت کے لیے ہے ہی نہیں۔

اب مضبوط دلیل میں غور کرتے ہیں، اس کا پہلا جملہ "**إن القربة في الذبح**"، منطقی اعتبار سے صغریٰ ہے اور "والقربات المؤقتة" کبریٰ ہے اور نتیجہ محذوف ہے، اس قیاس میں حد اوسط یعنی علت قربت ہے، اور ذبح کے لیے حد اوسط یعنی قربت کی علت سے مقام فاعل کے وقت کے معتبر ہونے کا حکم ثابت کیا ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ نتیجہ کی صحت صغریٰ اور کبریٰ کی صحت پر موقوف ہوتی ہے، دلیل کا صغریٰ ہے "**إن القربة في الذبح**"، یعنی عبادت ذبح کرنے میں ہے اور عبادت ذبح کرنے میں اسی وقت ہوسکتی ہے جب کہ خود ذبح کرنا بھی فی الحال عبادت ہو، شہری اور دیہاتی کے مسئلہ کے اعتبار سے صغریٰ بالکل درست ہے، کیونکہ مؤکل خواہ شہری ہو یا دیہاتی اس کے مقام پر ایام نحر موجود ہونے کی وجہ سے اس کے لیے ذبح قربت ہے، اور اس کے لیے عبادت جانور ذبح کرنے میں ہے، صدقہ کرنے میں نہیں، اور کبریٰ کی صحت کے بارے میں تو کس کو کلام ہوسکتا ہے؟ وہ تو ہے ہی قاعدۂ کلیہ، پس جب

شہری اور دیہاتی کے مسئلہ میں صغریٰ و کبریٰ صحیح ہے، تو نتیجہ یعنی ذبح کے قربت ہونے کی صورت میں مقام فاعل کے وقت کا معتبر ہونا بھی بالکل درست ہے۔

یہ دلیل قربانی کے ہر اس مسئلہ کی دلیل بن سکتی ہے جس میں اس دلیل کا صغریٰ درست ہو، اور ہمارے موضوع بحث دونوں مسئلوں میں اس دلیل کا صغریٰ ہی درست نہیں ہے، پہلے مسئلہ میں صغریٰ درست نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مؤکل کے مقام پر یوم نحر نہ آنے کی وجہ سے اس پر قربانی کا نفس وجوب نہیں ہوا ہے، یعنی ذبح اس کے لیے قربت نہیں بنا ہے، ابھی اس کے لیے قربت جانور ذبح کرنے میں نہیں ہے، لہٰذا صغریٰ کاذب ہے، اور دوسرے مسئلہ میں صغریٰ درست نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب مؤکل کے مقام پر ایام نحر ختم ہو جانے کی وجہ سے اس پر قربانی کی قضا (صدقہ کرنا) واجب ہوگئی، ذبح واجب نہ رہا، تو اب ذبح مؤکل کے لیے قربت نہ رہا اور وہ من علیہ الاضحیہ بھی نہ رہا، بلکہ من علیہ الصدقہ ہوگیا اور اس کی طرف سے ذبح کیا جانے والا جانور بھی اضحیہ نہ رہا، پس دوسرے مسئلہ میں بھی صغریٰ کاذب ہے، لہٰذا ذبح کے لیے مقام فاعل کا اعتبار کر کے موضوع بحث کسی ایک مسئلہ میں بھی قربانی کا جواز ثابت کرنا درست نہیں، بلکہ بلا دلیل ہے۔

موضوع بحث دونوں مسئلوں میں یا صرف ایک مسئلہ میں قربانی کا جواز اس وقت ثابت ہوتا جبکہ قیاس میں حد اوسط یعنی علت "یعتبر وقتها" ہوتی اور حکم قربت ہوتا، اور ذبح کے لیے مقام فاعل میں وقت ادا موجود ہونے کے واسطے سے قربت نہ ہونے کا حکم ثابت کیا جاتا، حالانکہ "یعتبر وقتها الخ" قیاس میں حد اوسط یعنی علت نہیں ہے، کیونکہ وہ مکرر نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود "یعتبر وقتها" کو حد اوسط یعنی علت سمجھ کر ذبح کے لیے مقام فاعل میں وقت ادا موجود ہونے کے واسطے سے قربت ہونے کا حکم ثابت کر کے دونوں مسئلوں میں یا ایک میں جواز ثابت کیا ہے (حکم کو علت اور علت کو حکم بنا کر جواز ثابت کیا ہے) جو درست نہیں ہے، بلکہ فقہاء نے قربت کو علت اور مقام فاعل کے وقت کے معتبر ہونے کو حکم بنایا تھا اور ذبح کے لیے قربت کی علت سے مقام فاعل کے وقت کے معتبر ہونے کا حکم ثابت کیا تھا، پس گویا قیاس تو ذبح کے لیے قربت ہونے کے واسطے سے مقام فاعل کے وقت کے معتبر ہونے کا حکم ثابت کر رہا ہے۔

یہ دلیل تیسرے نقطہ نظر کو ثابت کررہی ہے کہ جب موکل کے لیے اس کے مقام پر ایام نحر موجود نہ ہونے کی وجہ سے ذبح قربت نہیں، اس کے لیے عبادت ذبح کرنے میں نہیں، تو پھر مقام فاعل کے وقت کا اعتبار بھی نہیں، اگرچہ وہاں وقت ادا موجود ہو، کیونکہ ذبح کے لیے قربت کی علت سے مقام فاعل کے وقت کے معتبر ہونے کا حکم ثابت تھا، پس جب علت یعنی قربت ہی معدوم ہے تو حکم یعنی مقام فاعل کے وقت کا معتبر ہونا بھی معدوم ہوگا، ''لأن الحکم یدور مع العلۃ'' حاصل یہ ہے کہ جب مضبوط دلیل سے بھی کسی ایک مسئلہ میں جواز ثابت نہ ہوا تو دوسرے دلائل کا حال بھی واضح ہے، لہٰذا تیسرا نقطۂ نظر ہی بالکل درست، دلائل کے اعتبار سے مضبوط اور تمام فقہی عبارت اس کی تائید میں ہیں، لیکن اس کے باوجود جو حکم تھا اس کو علت اور جو علت تھی اس کو حکم بنا کر دونوں مسئلوں میں یا صرف ایک مسئلہ میں جواز ثابت کیا گیا ہے۔ فیا للعجب

لمحۂ فکریہ

مضبوط دلیل کا کبریٰ ''والقربات المؤقتة الخ'' قاعدۂ کلیہ ہے یعنی مقام فاعل کے وقت کا معتبر ہونا یہ قربانی کی کوئی تخصیص نہیں، بلکہ تمام قربات موقتہ کا حکم ہے، پس کیا کوئی ایسی قربت موقتہ ہے کہ جس کا موکل پر نفس وجوب نہ ہوا ہو، یا وقت ادا فوت ہونے کی وجہ سے قضا واجب ہو جاتی ہو، اس کے باوجود وکیل اپنے مقام پر وقت قربت موجود ہونے کی وجہ سے اس کو ادا (قضا نہیں) کرسکتا ہو؟ اگر نہیں، تو پھر قربانی کی کیا خصوصیت ہے؟ کہ وکیل کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ اتنا بڑا کارنامہ انجام دے سکے یعنی موکل کی قضا شدہ غیر معقولہ عبادت کو بصورت ادا بجالائے یا غیر واجب شدہ عبادت کو قبل الوجوب ہی ادا کردے۔

ایک اور غلط فہمی یا مغالطہ

یہاں دو چیزوں میں فرق کرنا ضروری ہے:

(۱) ثبوت شئ یعنی کسی چیز کا ثابت ہونا۔

(۲)صحت شیٔ یعنی شیٔ کا درست ہونا۔

پہلے کوئی چیز ثابت ہوتی ہے پھر وہ صحیح اور درست ہوتی ہے، ذبح کا ادائے قربانی یعنی قربت ہونا ثبوت شیٔ ہے اور ذبح کا ادائے قربانی ہونا ثابت ہوجانے کے بعد اس کا درست ہونا یہ صحت شیٔ ہے، قائلین جواز صحت شیٔ کے دلائل سے ثبوت شیٔ اور صحت شیٔ یعنی قربت اور صحت دونوں کو ثابت کرتے ہیں جبکہ اہل علم پر یہ بات مخفی نہیں کہ صحت شیٔ کے دلائل ثبوت شیٔ کے لیے کافی نہیں، مانعین جواز کا کہنا ہے کہ جب مؤکل کے مقام پر ایام نحر موجود نہ ہوں تو وکیل کا مؤکل کی طرف سے جانور ذبح کرنا ادائے قربانی یعنی قربت ہے ہی نہیں، لہٰذا یہاں قربانی کا جواز صرف صحت ادا کے دلائل اور ضابطے بیان کرنے سے ثابت نہیں ہوسکتا ہے، بلکہ موضوع بحث دونوں مسئلوں میں پہلے ذبح کا ادائے قربانی یعنی قربت کا ہونا دلائل سے ثابت کرنے کی ضرورت ہے اور اس کا قربت ہونا کسی دلیل سے ثابت نہیں، بلکہ ذبح کا قربت نہ ہونا دلیل سے ثابت ہے، اور وہ دلیل یہ ہے کہ اگر یہاں ذبح ادائے قربانی یعنی قربت ہوتا تو دوسرے مسئلہ میں قضا واجب اور درست نہ ہوتی۔

ومنها أن لا يقوم غيرها مقامها حتى لو تصدق بعين الشاة أو قيمتها في الوقت لايجزيه عن الأضحية لأن الوجوب تعلق بالإراقة، والأصل أن الوجوب إذا تعلق بفعل معين أنه لايقوم غيره مقامه. (بدائع الصنائع، كتاب الأضحية، زكريا ٤/ ٢٠٠)

قربانی کا جواز مفاسد پر مشتمل ہے

پہلے مسئلے میں عدم جواز کے سلسلے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مزید لکھنے کی ضرورت نہیں، البتہ دوسرے مسئلہ میں قربانی کا جواز مندرجہ ذیل مفاسد پر مشتمل ہے: (۱) وقت ادا: ایک مرتبہ شروع ہوکر ایک ہی مرتبہ ختم ہوتا ہے، اس کے باوجود وقت ادا کا دو مرتبہ ختم ہونا لازم آئے گا، ایک مرتبہ وقت ادا ختم ہوگا مضحی کے مقام پر جس سے قضا واجب ہوگی، اور دوسری مرتبہ وقت ادا ختم ہوگا مقام اضحیہ میں جس سے ادا درست نہ رہے گی کیا یہ ممکن ہے؟

(۲) اگر وقت ادا ختم ہونے میں صرف مقام اضحیہ کا اعتبار کیا جائے تو لازمی طور پر وجوب قضا میں بھی صرف مقام اضحیہ کا اعتبار ہوگا، کیونکہ وقت ادا ختم ہوتے ہی قضا واجب ہوتی ہے، لہٰذا جب مؤکل کے مقام پر وقت قربانی موجود ہو اور اضحیہ کے مقام پر وقت قربانی ختم ہوگیا، تو مؤکل پر قضائے قربانی واجب ہوجانی چاہیے، حالانکہ کوئی وجوب قضا بلکہ جواز قضا کا بھی قائل نہیں۔

(۳) موقف جواز کے لحاظ سے مؤکل پر نہ ادا واجب ہے اور نہ قضا واجب ہے، بلکہ مؤکل کو اختیار ہے کہ ادا و قضا میں سے جو چاہے انجام دے، متعین طور پر کوئی ایک واجب نہیں، تو کیا شریعت میں اس کی کوئی نظیر ہے کہ مکلّف کو بیک وقت قضا و ادا میں سے جو چاہے انجام دینے کا اختیار ہو؟

(۴) مؤکل نے مقام اضحیہ میں کسی کو وکیل بنا کر قربانی ادا کی اور مؤکل کے مقام پر دوسرا شخص قضا کرتا ہے، موقف جواز کے لحاظ سے دونوں کی ادا و قضا درست ہے، پس ایک ہی مقام پر رہتے ہوئے بیک وقت ایک شخص کا ادا اور دوسرے شخص کا قضا کرنا لازم آئے گا تو کیا یہ ممکن ہے اور اس کی کوئی نظیر نہیں؟

(۵) خود مؤکل بیک وقت ادا و قضا پر قادر ہوجائے گا، حالانکہ یہ محال ہے۔

(۶) وقت قربت کا شروع و ختم ہونا غیر اختیاری شئ ہے اس میں بندے کے اختیار کو کوئی دخل نہیں، لیکن اگر ہم وقت ادا شروع و ختم ہونے میں مقام اضحیہ کا اعتبار کریں تو یہ بندے کی اختیاری چیز بن جائے گی۔

(۷) موکل بیک وقت نیابۃً ادا و قضا دونوں پر قادر ہو جائیگا، کیا یہ درست ہے؟

(۸) وقت ادا موجود ہونے کے باوجود درمیان میں قضا کا واجب ہونا لازم آئے گا، کیا یہ محال نہیں ہے؟

حاصل یہ کہ مجوزین کی طرف سے المعتبر مکان الاضحیۃ کا جو مفہوم پیش کیا جارہا ہے بالفرض اگر وہی فقہاء کی مراد ہوتا تو مندرجہ بالا مفاسد لازم نہ آتے۔

دفع شبہات

(۱) ”انما یعتبر فی هذا مکان الشاة لا مکان من علیه اور المعتبر فی

ذٰلک مکان الأضحية" وغیرہ میں ھذا اور ذٰلک کا مشار الیہ صرف نماز عید سے پہلے قربانی کا جواز یا عدم جواز ہے، مطلقاً جواز یا عدم جواز مراد نہیں جیسا کہ ان کا سیاق وسباق اس پر دال ہے۔

(۲) حجاج کرام کے ذریعہ مکہ مکرمہ میں قربانی کروانے والے کے تعامل سے استدلال تام نہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر واجب قربانی کروانے کا تعامل ہوتا تو فقہاء ضرور اس مسئلے کو بیان کرتے، کیونکہ ''المعتبر فی ذٰلک مکان الاضحية'' ضابطہ کی وضاحت کے لیے اس کا ذکر اہم تھا، نہ کہ شہری اور دیہاتی کے مسئلہ کا، حالانکہ تمام کتب فقہ ساکت ہیں، جبکہ فقہاء نے بعض فرضی مسائل بھی بیان کر دیئے ہیں، لہٰذا اگر کتب فقہیہ میں اس قسم کا کوئی تذکرہ یا قصہ ملے تو اس کو زیادہ سے زیادہ نفلی قربانی پر محمول کیا جائے گا، جس سے فراغ ذمہ مقصود نہیں ہوتا، لیکن واجب قربانی مراد لینے کے لیے معتبر و مضبوط دلیل کی ضرورت ہے جو موجود نہیں۔

(۳) دوسرے مسئلہ میں قربانی ناجائز کہنے کی صورت میں یہ شبہ کہ بیرون ملک باشندوں کی قربانی ہندوستان میں ہوتی ہے، لہٰذا حرج وتنگی لازم آئے گی، درست نہیں، اولاً اس لیے کہ سب جگہ ایام نحر کے ایک یا دو دن مشترک ہوتے ہیں، مضحی کے مقامی وقت کا لحاظ آسان ہے اگر کرنا ہو، ثانیاً بالفرض اگر کچھ حرج بھی ہو تو کیا یہ حرج شرعاً معتبر بھی ہے؟ جبکہ مؤکل خود اپنے مقام پر اور قرب وجوار میں، بلکہ ہندوستان میں بھی بسہولت وقت کے اندر قربانی کرسکتا ہے۔

(۴) یہ شبہ کہ اگر قربانی کو ناجائز کہا جائے تو وکیل پریشانی میں مبتلا ہو جائے گا اور اس کو یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ مؤکل کے مقام پر وقت موجود ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں صرف اتنی بات عرض ہے کہ مؤکل کی قربانی میں وکیل کے حرج اور پریشانی کا شرعاً کوئی اعتبار بھی ہے؟ کہ جس کی رعایت ضروری ہو؟

(۵) دوسرے مسئلہ میں قربانی کے جواز کو ثابت کرنے کے لیے حج عن الغیر فرضاً کو پیش کرنا ایک مغالطہ کہا جائے گا، کیونکہ مؤکل پر حج کی ادائیگی واجب ہے، اور اس کی ادائیگی کا وقت پوری زندگی ہے، مؤکل جب بھی حج کرے گا ادا ہی شمار ہوگا پس مؤکل پر حج کی ادائیگی واجب ہے، اور وکیل بھی ادا کر رہا ہے، اور قربت موقتة (حج بھی من وجہ موقت ہے)

کی ادائیگی میں فاعل یعنی وکیل کے مقام کا معتبر ہونا مسلم ہے، اور قربانی کے دوسرے مسئلہ میں مؤکل پر قضا یعنی صدقہ واجب ہے اور وکیل ادا یعنی ذبح کررہا ہے، لہٰذا دونوں میں بہت بڑا فرق ہے، یہ قیاس مع الفارق ہے، حاصل یہ کہ جواز کی کوئی قابل ذکر دلیل نہیں ہے اور جس حرج کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ بھی قابل اعتبار نہیں، کیونکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق قربانی نہ کرسکنے کا حرج ہے یا صرف ایک فون کرنے کو بھی حرج میں داخل مانا ہے۔

عدم قائل بالفصل

موضوع بحث دونوں مسئلوں میں قائل بالفصل ہونا درست ہی نہیں، اگر پہلے مسئلے میں قربانی کو ناجائز کہا جائے تو لازمی طور پر دوسرے مسئلے میں بھی قربانی کا عدم جواز ثابت ہو جائے گا، کیونکہ عبادت کی ادائیگی جس طرح وقت سے پہلے درست نہیں اسی طرح وقت ادا ختم ہونے کے بعد بھی درست نہیں اور جب پہلے مسئلہ میں وقت ادا شروع ہونے میں مضحی کے مقام کا اعتبار کیا تو لازمی طور پر دوسرے مسئلہ میں بھی وقت ادا ختم ہونے میں مضحی کے مقام کا اعتبار ہوگا، اور اگر دوسرے مسئلہ میں قربانی کو جائز کہا جائے تو لازمی طور پر پہلے مسئلہ میں بھی قربانی کا جواز ثابت ہو جائے گا، کیونکہ جب صرف مقام اضحیہ میں وقت ادا موجود ہونے سے مؤکل کے حق میں بھی وقت ادا موجود رہ سکتا ہے، تو پہلے مسئلہ میں بھی صرف مقام اضحیہ میں وقت ادا شروع ہونے سے مؤکل کے حق میں بھی وقت ادا شروع ہوسکتا ہے، دونوں میں فصل کی کوئی وجہ نہیں، اور وقت ادا شروع ہونے سے نفس وجوب بھی خود بخود ہو جائے گا، حاصل یہ ہے کہ جب پہلے مسئلہ میں تقریباً سب کے نزدیک عدم جواز مسلم ہے تو دوسرے مسئلہ میں بھی عدم جواز مسلم ہونا چاہیے ورنہ آدھا تیتر اور آدھا بٹیر والا مسئلہ بن جائے گا۔

خلاصہ بحث

تیسرا نقطۂ نظر یعنی دونوں مسئلوں میں عدم جواز ہی دلائل کے اعتبار سے درست ہے،

لہٰذا صحت ادائے قربانی کے لیے مضحی واضحیہ دونوں کے مقام پر ایام نحر کا موجود ہونا تو بہر حال ضروری ہے، البتہ وقتِ ادا کا صرف مقام اضحیہ میں موجود ہونا ضروری ہے، مضحی کے مقام پر موجود ہونا ضروری نہیں، بالخصوص اراقۃ الدم یعنی قربانی کا قربت ہونا، موقت ہونا، غیر معقول ہونا، اس کے ادا وقضا کے طریقہ کا مختلف ہونا، ان میں سے ہر چیز احتیاط در احتیاط کی متقاضی ہے، جب کہ کوئی قابل ذکر دلیل بھی نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

احقر: محمد سلمان قاسمی پالنپوری

مفتی مدرسہ جامعہ خلیلیہ ماہی، شمالی گجرات

الجواب صحیح	الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
وقار علی غفرلہ	مفتی دارالعلوم دیوبند	زین الاسلام قاسمی
معین مفتی دارالعلوم دیوبند	۱۰؍ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ	نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

تصدیق: مفتی حبیب الرحمٰن خیرآبادی مفتی دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قربانی کے موضوع پر ۸؍صفحات پر مشتمل آپ کا لکھا ہوا فتویٰ پڑھا، ماشاء اللہ آپ نے بڑے سلیقے کے ساتھ اور مدلل جواب لکھا ہے، یقیناً آپ کو دلائل مہیا کرنے میں غیر معمولی مشقت ومحنت اٹھانی پڑی ہوگی، مگر آپ اپنی محنت میں کامیاب وبامراد ہیں، مسئلہ بھی صحیح لکھا ہے اور دلائل بھی صحیح لکھے ہیں۔

احقر آپ کے لکھے ہوئے فتویٰ کی تصدیق وتائید کرتا ہے، اور آپ کی اصابت رائے پر مبارکباد پیش کرتا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو بہت بہت جزاء خیر عطا فرمائے اور آپ کی رہنمائی سے امت کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچائے۔ آمین

المصدق
حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ
مفتی دارالعلوم دیوبند
۱۰؍ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ

مکرم ومحترم حضرت مولانا مفتی شبیراحمد صاحب زید مجدہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوں گے!

دیگر عرض ہے کہ قربانی کے دو مسئلے جو ارسال کردہ مضمون میں درج ہیں، پچھلے چند سالوں سے موضوع بحث بنے ہوئے ہیں جن کی عملی ضرورت ہر سال اور ہمیشہ پیش آنے والی ہے، ان کے بارے میں تین نقطہائے نظر پائے جاتے ہیں:

(۱) پہلے میں عدم جواز، دوسرے میں جواز۔

(۲) دونوں میں جواز۔

(۳) دونوں میں عدم جواز۔

اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہر فریق کے مستدلات وہی ہیں جو تقریباً دوسرے کے ہیں، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں صرف ایک ہی نقطۂ نظر درست ہوسکتا ہے سب نہیں، اب وہ کون سا ہے؟ احقر نے اپنی بساط علمی کے مطابق کتب فقہ کی طرف مراجعت کی اور تینوں نقطہائے نظر کے دلائل میں غور کرکے صحیح نقطہ نظر تک پہنچنے کی سعی کی تھی، اور نتیجۂ تحقیق، برائے تحقیق دار العلوم دیوبند بھیجا تھا، الحمد اللہ دار العلوم دیوبند کے مفتیان کرام نے اس کی تصدیق وتائید کردی ہے، امید ہے کہ آپ محترم بھی اس کو بنظر تحقیق وتنقید ملاحظہ فرما کر اپنی تحقیق وموقف سے مطلع فرمائیں گے، واضح رہے کہ اس مضمون کے ارسال کا مقصد کسی کے فتویٰ کی تردید یا مخالفت نہیں، بلکہ مقصود صرف اور صرف یہ ہے کہ صحیح نقطہ نظر منقح اور واضح ہوکر سامنے آجائے، تاکہ فتاویٰ میں تعارض اور امت میں انتشار پیدا نہ ہو، قوی توقع ہے کہ جواب سے محروم نہیں فرمائیں گے، اخیر میں دعا کی درخواست ہے۔

احقر محمد سلمان پالنپوری

مفتی مدرسہ جامعہ خلیلیہ ماہی، شمالی گجرات

نوٹ: اگر ارسال کردہ مضمون آپ محترم کی رائے کے مطابق ہو تو اسی پر تصدیق

کے دستخط اور دارالافتاء کی مہر لگا کر روانہ فرمائیں تو عین کرم ہوگا، اور اگر حضرت کی تحقیق کے خلاف ہو تو استدلالی غلطی بھی واضح فرمائیں، تا کہ مزید غور وخوض اور نظر ثانی کی جاسکے، اور صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں مدد ملے، گجرات کے ایک بڑے مشہور مفتی صاحب جو میرے محسن بھی ہیں اور اہم مسائل میں اکثر میں ان کی طرف رجوع کرتا ہوں، انہوں نے آپ کے پاس یہ مضمون بھیجنے کا حکم فرمایا ہے، لہٰذا یہ ارسال کردہ مضمون ان کے حکم کی تعمیل بھی ہے، اور تحقیق مسئلہ بھی مطلوب ہے، دیوبند کے مفتیان کرام کی تصدیق اگرچہ احقر کے شرح صدر کے لیے کافی ہے، لیکن مسئلہ کی نزاکت اور اس میں اختلاف کو دیکھتے ہوئے بڑے بڑے مفتیان کرام جو مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی تصدیق وتائید کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، تا کہ یہ سب کے لیے باعث اطمینان ہو، اور انتشار ختم ہوجائے۔ **اللهم أرنا الحق حقا و ارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا و ارزقنا اجتنابه.** (آمین)

دارالافتاء مدرسہ شاہی مرادآباد کا جواب

قربانی کے موضوع پر آنجناب کا مفصل مکتوب موصول ہوا جس میں فقہی دلائل کے ساتھ ساتھ منطقی اسلوب اور منطقی دلائل کے ذریعہ سے مسئلہ قربانی کو اجاگر کیا گیا ہے، اور آپ کے مکتوب گرامی کے ساتھ ساتھ مولانا رشید احمد فریدی کی بھی دو مفصل تحریریں موصول ہوئیں ان کی ایک تحریر اکیس صفحات پر مشتمل ہے، جو لگ بھگ ڈیڑھ سال پہلے بار بار یہاں آچکی ہے جس کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا گیا، شروع میں ایک آدھ دفعہ مختصراً جواب دیا گیا تھا جو حضرت مولانا مفتی محمد سلمان صاحب منصور پوری کے قلم سے جاری کیا گیا تھا، اور ان کی دوسری تحریر ۹ رصفحات پر مشتمل ہے جس کا حاصل سیمینار کے شرکاء اور ذمہ داروں سے ناراضگی اور خفگی ہے، ان دونوں تحریروں کا جواب دینا ہم نے ضروری نہیں سمجھا، چونکہ آنجناب کی تحریر میں دلائل، محنت اور سوجھ بوجھ غالب ہے اس لیے آپ کی تحریر پر توجہ دینا مناسب سمجھا گیا، اب آنجناب کی تحریر سے جو باتیں سمجھی گئی ہیں وہ یہ ہیں کہ مسئلہ کی کل چار شکلیں ہیں:

(۱) مؤکل یعنی مضحی کے مکان پر ایام نحر شروع نہیں ہوئے اور وکیل اور اضحیہ کے مکان پر ایام نحر شروع ہو گئے تو آنجناب نے اس شکل میں عدم جواز کو ثابت فرمایا ہے، احقر بھی اس بارے میں آنجناب کی تائید کرتا ہے، کہ ایسی صورت میں موکل کی طرف سے قربانی درست نہیں ہوگی۔

(۲) مکان مضحی اور مکان اضحیہ دونوں میں ایام نحر موجود ہیں تو ایسی صورت میں آنجناب کی مفصل تحریر میں دیہات اور شہر کے مسئلہ میں دلائل کے تحت جواز کو ثابت کیا گیا ہے اس مسئلہ میں بھی احقر آنجناب کی تائید کرتا ہے۔

(۳) مکان مضحی میں ایام نحر شروع ہو چکے ہیں مگر مکان اضحیہ اور مکانِ وکیل میں ایام نحر ابھی شروع نہیں ہوئے اس مسئلہ کے بارے میں بھی آنجناب کی تحریر سے احقر نے یہ سمجھا کہ جائز نہیں ہے اور اس کے بارے میں بھی احقر آنجناب کی تائید کرتا ہے۔

(۴) مکان مضحی میں ایام نحر شروع ہو کر گذر چکے یعنی بارہویں ذی الحجہ گذر چکی ہے اور مکان اضحیہ ومکان وکیل میں بارہویں ذی الحجہ ابھی شروع نہیں ہوئی یا شروع ہو چکی ہے تو ایسی صورت میں چونکہ مکان مضحی میں ایام نحر گذر چکے ہیں اس لیے قضا کے علاوہ کوئی شکل نہیں ہے اور جو چیز مؤکل ادا نہیں کر سکتا وکیل کیسے ادا کر سکے گا، یہ آنجناب کے دلائل اور تحریر کا حاصل ہے، اس چوتھی شکل کے بارے میں آنجناب سے گذارش کی جاتی ہے کہ آپ کے دلائل میں اس بات کو خوب واضح کیا گیا ہے کہ جس کی ادائیگی مؤکل کے لیے ممکن نہیں وہ وکیل ادا نہیں کر سکتا اور جس کی ادائیگی مؤکل کے لیے ممکن ہے وہ وکیل بھی ادا کر سکتا ہے، آنجناب کے منطقی دلائل اور اسلوب کے بارے میں ایک بات ذہن میں آرہی ہے وہ پیش خدمت ہے غور فرمایا جائے کہ پوری دنیا میں قمری مہینہ کی ابتداء سعودی عرب سے ہوتی ہے کیونکہ دنیا میں سب سے پہلے رؤیت ہلال سعودی عرب میں ہوتی ہے اس کے بعد سلسلہ وار پوری دنیا میں جاری ہوتی ہے، اس لیے سعودی عرب اور ہندوستان کے درمیان ہمیشہ کم از کم ایک دن کا آگے پیچھے رہنا ہوتا ہے کہ سعودیہ میں ایک دن پہلے اور ہندوستان میں ایک دن بعد اور کبھی دو دن بعد بھی ہوتا ہے، اور ہر سال یہ واقعہ پیش آتا رہتا ہے کہ بعض حجاج کرام

شروع کے جہازوں سے چلے جاتے ہیں اور مکۃ المکرّمہ میں مقیم رہتے ہیں اور سرمایہ دار اور مقیم ہونے کی وجہ سے ان کے اوپر بقرعید کی قربانی بھی لازم ہوتی ہے اور انہوں نے بقرعید کی قربانی ہندوستان میں اپنے گھر پر کرنے کا انتظام کردیا اور ان کی واپسی کا جہاز سعودیہ میں بارہویں ذی الحجہ گذر کر رات میں ہے، اور وہ سعودیہ کی تیرہویں ذی الحجہ کی صبح کو ہندوستان پہنچ جاتے ہیں جبکہ ہندوستان میں ابھی بارہویں ذی الحجہ شروع ہوئی ہے۔

تو معلوم ہوا کہ بارہویں ذی الحجہ کے غروب کے بعد سعودیہ والوں کے یہاں ایام قربانی ختم ہو چکے ہیں اور سعودیہ میں قضا کے علاوہ کوئی شکل نہیں ہے لیکن جس پر ایام قربانی ختم ہو چکے تھے اور قضاء کے علاوہ کوئی شکل نہیں تھی وہی آدمی ہندوستان آگیا، اور اس کو ادائے قربانی کا زمانہ مل گیا ہے تو کیا اس کی طرف سے وکیل سعودیہ کی تیرہویں تاریخ اور ہندوستان کی بارہویں تاریخ میں قربانی کردے تو درست ہوسکتی ہے یا نہیں؟ نیز منطقی دلائل کے اعتبار سے مؤکل کے لیے امکان ادا کافی ہے یا نہیں؟ اسی طرح ایک شخص تبوک میں رہتا ہے اس نے اپنی قربانی کا انتظام ہندوستان میں اپنے دوستوں کے حوالہ کردیا ہے وہ سعودیہ کی بارہویں ذی الحجہ گذر جانے کے بعد رات میں ہندوستان آسکتا ہے اس کے لیے امکان ادا مکمل محفوظ ہے تو کیا اس کی طرف سے ہندوستان کی بارہویں تاریخ میں قربانی کی جائے تو ادا ہوسکتی ہے یا نہیں؟ آنجناب سے گذارش ہے کہ مسئلہ کے اس گوشہ پر منطقی اسلوب سے نظر ثانی فرمائیں، اس گوشہ کے علاوہ آنجناب کی بقیہ پوری تحریر کی ہم تائید کرتے ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم جمادی الثانیہ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۰۸۳/۳۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۶/۱ھ

جس کی طرف سے قربانی کی جائے اس کا نام لینا ضروری نہیں

سوال [۹۸۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: بکر اپنی اہلیہ کے نام سے قربانی کی دعا پڑھنے کے وقت اہلیہ کے نام کے ساتھ شوہر کا نام لے یا اہلیہ کے والد کا یا دونوں میں سے کسی کا بھی لے سکتا ہے؟

المستفتی: محمد احمد مدرسہ بشیریہ بھوجپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس کی طرف سے قربانی ہوتی ہے اس کا نام لینا ضروری نہیں ہے، قربانی نام لیے بغیر بھی ہو جاتی ہے، صرف نیت کافی ہے۔

وأما ركنها فذبح ما يجوز ذبحه في الأضحية بنية الأضحية في أيامها لأن ركن الشيئ ما يقوم به ذٰلك الشيئ والأضحية إنما تقوم بهٰذا الفعل.

(عالمگیری، کتاب الأضحیة، زکریا قدیم ۵/ ۲۹۱، جدید ۵/ ۳۳۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۲۰۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۶/۱۶ھ

قربانی کی قضا میں بڑے جانور کا حصہ صدقہ کرنے کا حکم

سوال [۹۸۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قربانی واجب تھی، لیکن قربانی نہ کر سکا، ایام قربانی گذرنے کے بعد قیمت صدقہ کرنا چاہتا ہے، تو کون سے جانور کی قیمت صدقہ کرے؟ اگر بڑے جانور کے ایک حصہ کی قیمت صدقہ کر دے تو صحیح ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالرشید مدرسہ مرادیہ مظفرنگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی کے قابل متوسط درجہ کی بھیڑ یا بکری کی قیمت صدقہ کرنا واجب ہے، سبع بقر کی قیمت کا تصدق کافی نہیں، اس لیے کہ قربانی سے مراد اراقۂ دم ہے جس میں شرکت متصور نہیں اور گائے وغیرہ میں شرکت ایام نحر میں خلاف قیاس تھی

بعد میں وجوب قیمت کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

قال الحصکفیؒ: ولو ترکت التضحیة ومضت أیامها تصدق بها حیة ناذر فاعل تصدق لمعینة ولو فقیرا، وقال الشامی: قوله ومضت أیامها قید به لما فی النهایة: إذا وجبت بإیجابه صریحا أو بالشراء لها فإن تصدق بعینها في أیامها فعلیه مثلها مکانها لأن الواجب علیه الإراقة و إنما ینتقل إلی الصدقة إذا وقع الیأس عن التضحیة بمضی أیامها و إن لم یشتر مثلها حتی مضت أیامها تصدق بقیمتها لأن الإراقة إنما عرفت قربة فی زمان مخصوص. (شامی، کتاب الأضحیة، کراچی ۶/۳۲۰، زکریا ۹/۴۶۳)

وقال العلامة الحصکفی: وتصدق بقیمتها غنی شراها أو لا، لتعلقها بذمته بشرائها أولا، فالمراد بالقیمة قیمة شاة. (درمختار کراچی ۶/۳۲۱، زکریا دیوبند ۹/۴۶۵)

من وجبت علیه الأضحیة فلم یضح حتی مضت أیام النحر ...... فقد وجب علیه التصدق بقیمة شاة. (بدائع الصنائع، فصل فی کیفیة الوجوب، زکریا دیوبند ۴/۲۰۳)

وإن کان من لم یضح غنیا ولم یوجب علی نفسه شاة بعینها تصدق بقیمة شاة اشتریٰ أو لم یشتر. (هندیه زکریا قدیم ۵/۲۹۶، جدید ۵/۳۴۲) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۲۹؍ربیع الاول ۱۴۲۰ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۶۰۹۳)	۱۴۲۰/۳/۲۹ھ

کتابچہ ’’مسائل قربانی‘‘ کے ایک مغالطہ کا حل

سوال [۹۸۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں قریۂ کبیرہ کی قربانی لوگ فجر کی نماز پڑھ کر نماز عید سے پہلے پہلے ایک چھوٹے گاؤں میں لے جاکر کرلیتے ہیں، جس کو علماء کرام نے صحیح بتایا ہے، لیکن آپ کے ایک اردو کتابچہ ’’احکام قربانی‘‘ کو پڑھ کر سب لوگ تشویش میں پڑ گئے، اس میں لکھا ہے کہ

شہری کی قربانی دیہات میں صبح صادق سے پہلے پہنچنا ضروری ہے، ورنہ قربانی نہیں ہوگی، دار العلوم دیوبند کے مفتیان کرام کا فتویٰ بھی یہ ہے کہ ہم کو اس بارے میں کوئی جزئیہ نہیں ملا کہ صبح صادق سے پہلے جانور کا دیہات میں پہنچنا ضروری ہے، آں محترم سے اس جزئیہ کا حوالہ مع تفصیل درکار ہے، تاکہ بستی والوں کی تشویش دور کی جاسکے؟

المستفتی: عبدالرشید قاسمی سیڑھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسائل قربانی میں یہ جو لکھا گیا کہ جانور کا صبح صادق سے قبل دیہات پہنچ جانا لازم ہے اس قید میں مغالطہ ہوا ہے، صبح صادق سے قبل نہیں بلکہ نماز عید سے قبل پہنچ جانا لازم ہے، آئندہ ان شاء اللہ تعالیٰ کتاب سے یہ قید نکال دی جائے گی۔

وحيلة المصرى إذا أراد التعجيل أن يبعث بها إلى خارج المصر فيضحى بها كما طلع الفجر. (هدايه، كتاب الأضحية، اشرفى ديو بند ۳/ ٤٤٦)

وإذا أراد المصرى أن يتعجل له اللحم فى يوم الأضحىٰ، فينبغى أن يأمر بإخراج الأضحية إلى بعض هذه القصور فيضحى هناك قبل الصلاة، فيجوز اعتباراً لمكان الأضحية. (تاتارخانية زكريا ١٧/ ٤٢٢، رقم: ٢٧٧٠٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍ذی قعدہ ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۶۱۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۱۱/۲۱ھ

قصاب کے گھر جانور مرنے سے قربانی ادا نہ ہوگی

سوال [۹۸۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کسی شخص نے قصائی سے بھینسا اس شرط پر خریدا کہ کل قربانی کر دینا، سو روپئے پیشگی معاملہ طے ہونے پر دیدیئے، قبل از وقت بھینسا قصائی کے گھر پر مرگیا تو قربانی دوسری کرنی ہوگی یا نہیں؟ اور قصائی قیمت پانے کا حقدار رہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد اسحاق نولگڑھ راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی کا جانور قصائی کے گھر مرجانے کی وجہ سے قربانی ادا نہیں ہوئی، لہٰذا دوسری قربانی لازم ہے۔

إذا اشتریٰ من آخر دابة علی أن یعلفها فالبیع جائز وکذٰلک إذا قال علی أن ینحرها . (هندیه کتاب البیوع، الباب العاشر فی الشروط التی تفسد البیع زکریا قدیم ۱۳۵/۳، جدید ۱۳۶/۳)

إذا اشتریٰ شاة للأضحیة وهو مؤسر ثم أنها ماتت ...... فی أیام النحر یجب علیه أن یضحی بشاة أخریٰ. (بدائع الصنائع، کتاب التضحیة، فصل فی کیفیة الوجوب، زکریا دیوبند ۱۹۹/٤، تاتارخانیة زکریا دیوبند ٤٥٨/١٧ رقم: ۲۷۸۲۲، هدایه اشرفی دیوبند ٤٤٨/٤) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍صفر المظفر ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۶۰۳۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۲/۱۴ھ

وکیل قربانی کرنا بھول گیا

سوال [۹۸۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص قربانی کے دنوں میں قربانی کراتا ہے، امسال ایسا ہوا کہ جن حضرات نے قربانی کے حصوں کی رقمیں اپنے ناموں کے ساتھ بھیجی تھیں، قربانی کرنے والا ان کے حصوں کی قربانی کرانا ہی بھول گیا، تو مؤکل بھی بے قصور ہے اور وکیل بھی سبب نسیان کی بناء پر بے قصور ہے؟

حضرت مفتی صاحب سے درخواست ہے کہ مؤکلین کی قربانی درست ہے؟ اگر درست نہیں ہے تو انہیں کرنا کیا ہے؟ جو بھی درست مسئلہ ہو تحریر فرما دیں۔

المستفتی: محمد رضوان القاسمی سورت گجرات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: قربانی کی ذمہ داری لینے والا حقوق اللہ اور حقوق العباد میں مالی حقوق دونوں چیزوں کی ذمہ داری لیتا ہے اور اتنی بڑی ذمہ داری لینے کے بعد مؤکلین کی طرف سے قربانی کرنا بھول جانا وکیل کی طرف سے انتہائی لاپرواہی اور غفلت ہے اس لیے ساری ذمہ داری وکیل کے سر رہے گی، اور سوالنامہ میں سائل کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ وکیل بے قصور ہے اور مؤکلین بھی بے قصور ہیں، اور وکیل کے اوپر امانت داری اور دیانت داری کے اعتبار سے یہ لازم ہے کہ مؤکلین کا ایک ایک پیسہ واپس کردے، اور ایماندارانہ طور پر مؤکلین کو واضح کردے کہ قربانی نہیں ہوسکی اور قربانی نہ ہونے کی وجہ بھی بتادے تاکہ مؤکلین اپنی فوت شدہ قربانی کی تلافی از خود کرسکیں، اور اگر الگ الگ سے الگ الگ حصے آئے ہیں تو ہر ایک حصہ کے بدلے میں ایک بکرا یا اس کی قیمت صدقہ کرنا لازم ہوجائے گی، لیکن اگر ایک جگہ سے سات حصے کی بات آئی ہے تو ایک بڑا جانور یا اس کی قیمت صدقہ کرسکتے ہیں۔
(مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۸/ ۲۲۵-۲۲۶، جدید زکریا ۸/ ۲۰۸، جدید زکریا مطول ۱۲/ ۱۲۷)

ولو تركت التضحية ومضت أيامها تصدق بها حية (در مختار) لوقوع اليأس عن التقرب بالإراقة و إن تصدق بقيمتها أجزأه أيضا لأن الواجب هنا التصدق بعينها وهذا مثله فيما هو المقصود. (شامی، کتاب الأضحية، زكريا ديوبند ۹/ ٤٦٣، كراچی ٦/ ٣٢٠)

ومنها أنها تقضى إذا فاتت عن وقتها ثم قضائها قد يكون ...... بالتصدق بعين الشاة حية وقد يكون بالتصدق بقيمة الشاة. (هنديه، الباب الأول، زكريا قديم ٥/ ٢٩٤، جديد ٥/ ٣٣٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ رصفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۴۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۲/۲۱ھ

غفلت کی بناء پر قربانی نہیں کی تو کیا حکم ہے؟

سوال [۹۸۷۶]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قربانی کے دن گذر گئے اور صاحب نصاب کسی غفلت کی وجہ سے قربانی نہیں کرسکا اب وہ اس کی قیمت صدقہ کرنا چاہتا ہے تو کیا وہ بڑے جانور کے ساتویں حصہ کی قیمت مثلاً ۳۰۰ ؍روپیہ صدقہ کرے یا پورے جانور کی قیمت صدقہ کرنا ضروری ہے؟

المستفتی: مولانا عبد الماجد مبارک نگر، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: صاحب نصاب اگر کسی وجہ سے ایام قربانی میں قربانی نہ کرسکا حتی کہ ایام قربانی گذر گئے تو اس پر قربانی کے لائق متوسط درجہ کی بھیڑ یا بکری کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے، بڑے جانور کے ساتویں حصہ کی قیمت صدقہ کرنا کافی نہ ہوگا۔(مستفاد: احسن الفتاویٰ ۷/۴۸۰)

وإن كان لم يوجب على نفسه ولا اشترىٰ وهو موسر حتى مضت أيام النحر تصدق بقيمة شاة تجوز في الأضحية. (بدائع الصنائع، كتاب التضحية، فصل في كيفية الوجوب، زكريا ديوبند ٤/٢٠٣، هنديه زكريا قديم ٥/٢٩٦، جديد ٥/٣٤٢)

ولو تركت التضحية ومضت أيام النحر تصدق ...... بقيمتها غني شراها أو لا لتعلقها بذمته بشرائها أولا، والمراد بالقيمة قيمة شاة تجزئ فيها وتحته في الشامي قيمة شاة وسط. (در مختار مع الشامي، كتاب الأضحية، زكريا ديوبند ٩/٤٦٣ تا ٤٦٥، كراچی ٣٢٠- ٣٢١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍صفر المظفر ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۵۰۸/۳۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۲/۹ھ

قربانی وعقیقہ کا جانور اگر ضائع ہوجائے تو کیا حکم ہے؟

سوال [۹۸۷۷]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: قربانی وعقیقہ کا جانور اگر راستہ میں ضائع ہو جائے تو کیا حکم ہے؟ کیا صاحب جانور پر یہ قربانی وعقیقہ دوبارہ ضروری ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: قربانی اور عقیقہ میں اصل مقصد اِراقت دم ہوتا ہے اس لیے اگر قربانی اور عقیقہ کا جانور گم ہو جائے اور صاحب جانور مالدار ہے یا ہلاک ہو جائے تو دوسرا اس کے بدلے میں کرنا لازم ہوتا ہے۔

إذا ماتت المشتراة للتضحية على موسر مكانها أخرىٰ. (هدايه، كتاب الأضحية، اشرفي ديو بند ٤/٤٤٨، تاتارخانية زكريا ١٧/٤٥٨، رقم: ٢٧٨٢٢)

إذا اشترىٰ شاة للأضحية وهو موسر ثم إنها ماتت أو سرقت أو ضلت في أيام النحر أنه يجب عليه أن يضحي بشاة أخرىٰ. (بدائع الصنائع زكريا ديوبند ٤/١٩٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ذی قعدہ ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸۹۲/۲۸)

ایام اضحیہ کے بعد گم شدہ جانور مل جانے پر اسی کا تصدق لازم

سوال [۹۸۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایام قربانی میں کسی کا جانور گم ہوگیا اور تیسرا دن گذرنے تک نہیں ملا، بلکہ تین چار دن کے بعد ملا اور یہ شخص سرمایہ دار ہے تو اب یہ شخص اسی جانور کا صدقہ کرے گا یا اس کی قیمت صدقہ کرے گا؟

المستفتی: محمد عمر بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جب اس مالدار شخص کا جانور ایام قربانی گذرنے کے بعد مل گیا تو اس شخص پر عین اسی جانور کا تصدق لازم ہے، اس کی قیمت صدقہ کرنے کا

اس کو اختیار نہیں ہے۔(مستفاد: فتاویٰ دار العلوم جدید ۱۵/ ۵۱۵)

أقول: ذكر في البدائع: أن الصحيح أن الشاة المشتراة للأضحية إذا لم يضح بها حتى مضى الوقت يتصدق الموسر بعينها حية كالفقير بلا خلاف بين أصحابنا. (شامی، کتاب الأضحية، زکریا ۹/ ٤٦٥، کراچی ٦/ ٣٢١)

ولو سرقت أضحية فلم يجدها حتى مضت أيام النحر فعليه أن يتصدق بها إذا وجدها ولا يذبحها فإذا ذبحها وتصدق بلحمها جاز. (خلاصة الفتاویٰ اشرفیه ٤/ ٣١٢)

لأن الأصل في الأموال التقرب بالتصدق بها لا بالإتلاف وهو الإراقة إلا أنه نقل إلى الإراقة مقيدا في وقت مخصوص (إلى قوله) فإذا مضى الوقت عاد الحكم إلى الأصل وهو التصدق بعين الشاة سواء كان معسرا أو موسرا. (بدائع الصنائع زکریا ٤/ ٢٠٢)

فإن كان قد أوجب التضحية على نفسه بشاة بعينها فلم يضحها حتى مضت أيام النحر فيتصدق بعينها حية سواء كان موسرا أو معسرا. (هنديه زكريا قديم ٥/ ٢٩٤، جديد ٣٣٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۸۵)

جانور گم ہو جانے پر دوسرے کی قربانی کر دی پھر گم شدہ مل گیا تو کیا کرے؟

سوال [۹۸۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سات آدمی نے مل کر ایک بڑا جانور خریدا، ان میں سے چار نے نفلی قربانی کا ارادہ کیا اور واجب قربانی کا ارادہ نہیں کیا، ان کی واجب قربانی کسی اور جانور میں ہے اور بقیہ تین آدمیوں نے اپنی واجب قربانی کی نیت کی بارہویں تاریخ کی شام کو قربانی کرنی تھی، اتفاق سے شام کو وہ جانور گم ہو گیا اور کسی اور جانور کی قربانی کا وقت نہیں رہا اور ان میں سے ہر ایک آدمی سرمایہ دار ہے، کوئی فقیر نہیں ہے، ایام نحر گذرنے کے بعد وہ جانور مل گیا تو نفلی قربانی

کرنے والوں کی قربانی کا کیا حکم ہے؟ اور واجب قربانی کرنے والوں کا کیا حکم ہے؟ کیونکہ نفلی قربانی کرنے والوں پر قربانی لازم نہیں تھی، انہوں نے اپنی واجب قربانی الگ کردی تھی، اب نفلی والے اپنے اپنے حصوں کی قیمت وصول کرلیں تو واجب قربانی والے کیا کریں؟

المستفتی: عبدالرشید قاسمی، سیڈھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: جن لوگوں نے نفلی قربانی کے لیے حصہ لیا ہے اور واجب قربانی دوسرے جانور میں کرچکے ہیں ان کے لیے اپنے اپنے حصوں کی قیمت وصول کرکے اپنے استعمال میں لانا جائز ہے، کیونکہ ان پر اس جانور کی قربانی کی قضا لازم نہیں ہے، اور واجب قربانی کرنے والوں کو اپنے اپنے حصوں کی قیمت کا صدقہ کرنا لازم ہے، لہٰذا جب گم شدہ جانور مل گیا تو اس کو فروخت کرکے اس کی قیمت تناسب کے ساتھ تقسیم کرکے وہی عمل کریں جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ دار العلوم جدید ۱۵/ ۵۱۵)

ضلت أو سرقت فاشتریٰ أخریٰ ثم وجدها ...... وإن ذبح الأولیٰ جاز ...... إن وجبت عن يسار فكذا الجواب. (در مختار علی الشامی، کتاب الأضحية کراچی ٦/٣٢٣، زکریا ٩/٤٦٧)

اشتریٰ شاتين للأضحية فضاعت إحداهما فضحى بالثانية ثم وجدها في أيام النحر أو بعد أيام النحر فلا شيئ عليه. (تاتارخانية زكريا ١٧/٤٥٨، رقم: ٢٧٨٢٠)

وقالوا: إن أدائها في وقتها بإراقة الدم وقضائها بعد مضى وقتها بالتصدق بعينها أو بقيمتها. (فتح القدير اشرفی ٩/٥٢٠، کوئٹه ٨/٤٢٦)

اشتریٰ شاة ليضحي بها فلم يفعل حتى مضت أيام النحر تصدق بها حية فإن باعها تصدق بثمنها. (هنديه، الباب الرابع فيما يتعلق بالمكان والزمان، زكريا قديم ٥/٢٩٧، جديد ٥/٣٤٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱؍ ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۱۱۳۲۳/۴۰)

تیسرے دن قربانی نہ کرسکا تو قیمت کا تصدق لازم

سوال [۹۸۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص پر قربانی واجب ہے، اس نے یہ سوچا کہ تیسرے دن قربانی کریں گے، اتفاق سے تیسرے دن اس کا جانور گم ہوگیا اور اس کی تلاش میں تیسرے دن کا سورج غروب ہوگیا لیکن وہ ہاتھ نہ آیا تو اب یہ شخص کیا کرے؟

المستفتی: ممتاز احمد سیتاپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب تیسرے دن کے غروب تک اس شخص کا جانور نہ ملا جس کی بناء پر یہ شخص قربانی نہ کرسکا تو ایسی صورت میں اس پر اس جانور کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہوگا۔ (مستفاد: فتاویٰ دارالعلوم جدید ۱۵/۵۱۴، احسن الفتاویٰ زکریا ۷/۲۸۰)

من وجبت عليه الأضحية فلم يضح حتى مضت أيام النحر فقد وجب عليه التصدق بقيمة شاة. (بدائع كتاب التضحية فصل في كيفية الوجوب زكريا ٤/٢٠٣)

أن الموسر إذا اشترىٰ شاة للأضحية في أول يوم النحر ولم يضح حتى مضت أيام النحر ثم افتقر كان عليه أن يتصدق بعينها أو بقيمتها. (البحر الرائق زكريا ٨/٣١٨، كراچی ٨/١٧٤، فتح القدير زكريا ٩/٥٢١، كوئٹه ٨/٤٢٧)

وإنما ينتقل إلى الصدقة إذا وقع اليأس عن التضحية بمضى أيامها. (شامی زكريا ٩/٤٦٣، كراچی ٦/٣٢٠)

لو اشترىٰ شاة للأضحية عن نفسه أو عن ولده فلم يضح حتى مضت أيام النحر كان عليه أن يتصدق بتلك الشاة أو بقيمتها. (خانية، جديد زكريا ٣/٢٤٣، وعلى هامش الهندية زكريا ٣/ ٣٤٦، وكذا في الفتاوىٰ التاتارخانية ١٧/٤٢٣، رقم: ٢٧٧٠٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۱۰)

بعد تصدق گم شدہ جانور ایام قربانی کے بعد مل گیا

سوال [۹۸۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کسی شخص کا ایام قربانی میں جانور گم ہو گیا اور ایام قربانی کے گزرنے کے تقریباً ایک ہفتہ بعد ملا، اور یہ شخص پہلے ہی صدقہ کر چکا تو اب جانور ملنے کے بعد اس کو بھی صدقہ کرنا پڑے گا یا نہیں؟

المستفتی: محمد احمد مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: صورت مذکورہ میں ایام قربانی کے ایک ہفتہ بعد گم شدہ جانور مل گیا لیکن وہ پہلے ہی صدقہ کر چکا تو ایسی صورت میں جانور ملنے کے بعد اس کا تصدق لازم نہیں بلکہ اس کو اپنے کسی بھی کام میں لا سکتا ہے۔ (مستفاد: کتاب الفتاویٰ ۴/۱۶۴، فتاویٰ دارالعلوم جدید ۵۱۵/۱۵)

ولو اشترىٰ شاتين للأضحية فضاعت إحداهما فضحى بالثانية ثم وجدها في أيام النحر فلا شيئ عليه. (البحر الرائق، كتاب الأضحية زكريا ٩/٣٢١، كوئٹه ٨/١٧٥)

وإن ضحى بالثانية أجزأه وسقطت عنه الأضحية وليس عليه أن يضحي بالأولىٰ؛ لأن التضحية بها لم تجب بالشراء بل كانت الأضحية واجبة في ذمته بمطلق الشاة فإذا ضحى بالثانية فقد أدى الواجب بها. (بدائع الصنائع زكريا ٤/١٩٩)

رجل اشترىٰ شاة بدينار فضلت واشترىٰ الشاة الأخرىٰ بدينارين وذٰلك قيمتها وضحى بها ثم وجد الأولىٰ لم يلزمه التضحية بالتي وجدها.

(تاتارخانية زكريا ١٧/٤٥٩، رقم: ٢٧٨٢٣)

ولو أن رجلا اشترىٰ شاة للأضحية فضلت ثم اشترىٰ شاة أخرىٰ ثم وجد الأولىٰ قبل أن يذبح الثانية كان له الخيار إن شاء ضحى الأولىٰ وإن شاء ضحى الثانية ولو أنه ضحى الثانية ثم وجد الأولىٰ هل عليه أن يضحي الأولىٰ ...... إن كان غنيا لا يجب عليه. (خانية جديد زكريا ٣/٢٤٥، وعلى هامش الهندية زكريا ٣/٣٤٨)

فقير اشترىٰ أضحية فسرقت فاشترىٰ أخرىٰ مكانها ثم وجد الأولىٰ

ضحی بهما ولو کان غنیا ضحی بواحدة منهما. (فتاویٰ سراجیہ، مکتبہ اتحاد ص: ٣٨٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۱۱۳۱۹/۴۰)

بڑے جانور کے حصہ کے ذریعہ قربانی کی قضاء کرنے کا حکم

سوال [۹۸۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قربانی قضا ہونے کی صورت میں عام کتب فقہ وفتاویٰ میں متوسط جانور کی قیمت کا صدقہ لکھا ہوا ہے، تو کیا بڑے جانور کے ساتویں حصہ کی قیمت کا صدقہ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد قاسم گودھروی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی قضا ہونے کی صورت میں متوسط درجہ کے بڑے جانور کے ساتویں حصہ کے صدقہ کے متعلق صریح جزئیہ نہیں ملا، البتہ بکری صدقہ کرنے کے متعلق جزئیہ کی صراحت ہے، اس لیے متوسط درجہ کی بکری کی قیمت صدقہ کردینی چاہیے۔

ولو تركت التضحية ومضت أيام النحر تصدق بقيمتها غنى شراها أولا لتعلقها بذمته بشرائها أولا، والمراد بالقيمة قيمة شاة تجزئ فيها (در مختار) وفي الشامية تحت قوله: فالمراد بالقيمة الخ، قال القهستاني: أو قيمة شاة وسط. (در مختار مع الشامي، كتاب الأضحية، زكريا ٩/٤٦٣-٤٦٥، كراچی ٦/٣٢٠-٣٢١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/جمادی الثانیہ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۱۱۳/۳۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۶/۲۲ھ

ایام قربانی گذر جانے کے بعد بڑے جانور کے ساتویں حصہ کی قیمت کا صدقہ

سوال [۹۸۸۳]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قربانی کے ایام گذر جانے کے بعد قربانی کے جانور کی قیمت کا صدقہ کردینا واجب ہے، لیکن اگر اس صورت میں بکرے کی قیمت کا اعتبار کرکے صدقہ کیا جائے تو تقریباً دو ہزار روپئے لگتے ہیں، اس لیے کہ بکرا مہنگا ہے اور اگر کسی بڑے جانور کے ساتویں حصہ کی قیمت کا اعتبار کرکے صدقہ کیا جائے تو پانچ سو روپئے لگتے ہیں، اب آپ وضاحت فرمائیں کہ ایام قربانی گذر جانے کے بعد ہر دو صورت میں فراغ ذمہ ہوجائے گا، یا ایک بکرے کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہوگا، یا اعتبار کسی ایک جانور کی قیمت کا ہوگا، یا کسی بڑے جانور کے ساتویں حصہ کی قیمت کا صدقہ کردینا بھی کافی ہے؟

المستفتی: ضیاء الرحمٰن بابر پور شاہدرہ دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فقہاء نے صدقہ کرنے میں شاۃ یا قیمت شاۃ کی قیمت لگائی ہے اس لیے بڑے جانور کے ساتویں حصہ یا اس کی قیمت کافی نہ ہوگی؛ کیونکہ قربانی میں مکمل جانور مد تقرب میں ہونا لازم ہے اور ساتویں حصہ یا اس کی قیمت کے تصدق میں بقیہ حصوں کا تقرب نہ ہونے کی وجہ سے اشکال لازم ہے۔

صار قيمة شاة صالحة دينا في ذمته يتصدق بها متى وجدها. (هنديه، كتاب الأضحية، الباب الأول في تفسيرها و ركنها وصفتها، زكريا قديم ٥/٢٩٣، جديد ٥/٣٣٩، بدائع الصنائع زكريا ديوبند ٤/٢٠٣، شامي كراچي ٦/٣٢٠، زكريا ٩/٤٦٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ ذی قعدہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۵۰۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۱۱/۴ھ

قربانی کے حصہ کی قیمت مدرسہ میں دینا

سوال [۹۸۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں ذبیحہ نہیں ہوتا ہے اس وجہ سے دوسرے گاؤں میں قربانی کرنے کو راس لے جاتے ہیں جس میں بہت دقت وپریشانی ہوتی ہے، دوسرے گوشت کی بھی بہتات ہوجاتی ہے، اس صورت میں اگر کوئی آدمی اپنے حصہ کی قیمت کسی بڑے مدرسہ جیسے شاہی، مدرسہ حیات العلوم، یعنی جن مدارس میں درس نصابی کی مکمل تعلیم ہوتی ہے، دیدے، تو اس کی قربانی ادا ہوجائے گی یا نہیں؟ مثلاً ایک راس ایک ہزار روپئے کی ملتی ہے اس ایک ہزار کے ساتویں حصہ کی قیمت مذکورہ مدرسہ میں دیدیں تو قربانی ادا ہوجائے گی یا نہیں؟

المستفتی: عبدالکریم تاج پورہ بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر آپ اپنی قربانی کے حصہ کی قیمت مذکورہ بالا مدرسہ میں کسی ذمہ دار کو دے کر وکیل بنادیں کہ میری طرف سے قربانی کردیں اور وہ آپ کی طرف سے وکیل بن کر جانور خرید کر قربانی کردے تو قربانی ادا ہوجائے گی۔

ولو ذبح عن غيره بأمره جاز. (شامی، كتاب الأضحية، كراچی ٦/٣٣٥، زكريا ديوبند ٩/٤٨٣، فتاویٰ قاضی خان جديد زكريا ٣/٢٥١، وعلى هامش الهندية زكريا ٣/٣٥٥)

ومنها أن تجزئ فيها النيابة فيجوز للإنسان أن يضحي بنفسه وبغيره بإذنه. (بدائع الصنائع، فصل فی كيفية الوجوب، كراچی ٥/٦٧، زكريا ٤/٢٠٠، هنديه زكريا قديم ٥/٢٩٤، جديد ٥/٣٣٩) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
یکم رجب المرجب ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۱۳۰۶)

۳ باب من یجب علیه الأضحیة و من لا یجب

قربانی کس پر واجب ہے؟

سوال [۹۸۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قربانی کس پر واجب ہوتی ہے؟

المستفتی: انور جمال، محلّہ بھٹی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسا آزاد شخص جو ایام قربانی میں بقدر نصاب مال، روپیہ پیسہ، سونا چاندی یا مال تجارت یا ضرورت سے زائد ساز وسامان کا مالک ہو، ایسے شخص پر قربانی واجب ہے۔ (مستفاد: کتاب المسائل ۲/۲۲۰)

عن أبی هريرة -رضی اللّٰه عنه- قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: من وجد سعة فلم يضح فلا يقربن مصلانا. (مسند أحمد بن حنبل ۳/۳۲۱، رقم: ۸۲۵٦)

وأما شرائط الوجوب: منها اليسار، وهو ما يتعلق به وجوب صدقة الفطر (إلى قوله) والموسر في ظاهر الرواية: من له مأتا درهم أو عشرون ديناراً أو شيء يبلغ ذٰلك سوىٰ مسكنه و متاع مسكنه ومركوبه و خادمه في حاجته التي لا يستغني عنها. (هنديه، كتاب الأضحية، زكريا قديم ٥/٢٩٢، جديد ٥/٣٣٦- ٣٣٧، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ٨/٤٥٥، رقم: ١٠٧٧٦، الفتاوىٰ التاتارخانية زكريا ١٧/٤٠٥، رقم: ٢٧٦٤٩، شامي زكريا ٩/٤٥٣، كراچی ٦/٣١٢) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ ذی الحجہ ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۵۵۳)

قربانی واجب نہ ہونے کے باوجو قربانی کرنے کا حکم

سوال [۹۸۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر میں صرف اپنا حصہ ہی کروں اور اپنی بیوی کی طرف سے نہ کروں تو ایک حصہ قربانی نہ کرنے کا گنہگار کون ہوگا؟

المستفتی: محمد اسماعیل، سلیم پور، سہس پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر آپ کی بیوی صاحب نصاب نہیں ہے تو اس پر قربانی واجب نہیں ہے اور اس کی طرف سے قربانی نہ کرنے سے نہ آپ پر گناہ ہوگا اور نہ آپ کی بیوی پر۔

وأما شرائط الوجوب: منها اليسار، وهو ما يتعلق به وجوب صدقة الفطر. (هنديه، كتاب الأضحية، زكريا قديم ٥/ ٢٩٢، جديد ٥/ ٣٣٦ - ٣٣٧، جواهر الفقه قديم ١/ ٤٤٨، جديد زكريا ٦/ ٢٧٠، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ٨/ ٤٥٥، رقم: ١٠٧٧٦، الفتاوىٰ التاتارخانية زكريا ١٧/ ٤٠٥، رقم: ٢٧٦٤٩، شامي زكريا ٩/ ٤٥٣، كراچی ٦/ ٣١٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ محرم الحرام ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۰۸۰)

قربانی کے وجوب کی شرط

سوال [۹۸۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے چار بیٹے ہیں اور ہر ایک کی اولاد بھی ہے، اور چاروں بیٹے زید کے ساتھ مالک نصاب ہیں؛ لیکن سب ایک فیملی میں زید کے ساتھ رہتے ہیں، اب جواب طلب مسئلہ یہ ہے کہ زید اگر قربانی کا جانور خرید کر قربانی کرے تو کیا چاروں بیٹوں کی طرف سے قربانی

ساقط ہوجائے گی جبکہ اس جانور میں ان کو شریک نہیں کیا گیا، یا ان سے قربانی ساقط ہونے کے لیے ان کو الگ الگ شریک کرنا اور نام لینا لازم ہوگا؟ مدلل تحریر فرمائیں۔

المستفتی: اشرف الہدیٰ بیر بھومی، مغربی بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کے چاروں لڑکے جو باپ کی فیملی میں رہتے ہیں ان کی کمائی اور آمدنی باپ کی ملکیت ہوا کرتی ہے، لیکن اگر باپ نے اجازت دے رکھی ہے کہ جو جتنا کمائے وہ اپنے پاس اپنی ملکیت میں الگ رکھے تو ایسی صورت میں لڑکوں کے پاس جب نصاب کے بقدر یا اس سے زائد پیسے ہوں تو ہر ایک پر اپنی اپنی قربانی الگ سے کرنا واجب ہوگا، باپ کا اپنی طرف سے ایک قربانی کرنے سے ان لڑکوں کا فریضہ ادا نہ ہوگا۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۱۹۳/۸، جدید زکریا مطول ۱۶۶/۶)

عن ابن عمر أنه كان لا يضحى عن حبل، ولكن كان يضحى عن ولده الصغار والكبار، ويعق عن ولده كلهم. (مصنف عبد الرزاق، المناسك، باب الضحايا، المجلس العلمي ٤/ ٣٨٠، رقم: ٨١٣٦)

فتجب التضحية على حر مسلم مقيم مؤسر عن نفسه. (تنوير الأبصار مع الدر المختار، كتاب الأضحية، ياسر نديم ٢/ ٢٣١)

ولو ضحى عن أولاده الكبار و زوجته لايجوز إلا بإذنهم. (شامي، كتاب الأضحية، زكريا ٩/ ٤٥٧، كراچی ٦/ ٣١٥، بزازيه زكريا جديد ٣/ ١٦٠، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٩٥، قاضيخان زكريا جديد ٣/ ٢٤٣ وعلى هامش الهندية ٣/ ٣٤٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ رجب المرجب ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۴۹۸)

صاحب نصاب پر ہر سال قربانی کا لزوم اور سات کی تحدید کا حکم

سوال [۹۸۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ ایک شخص نے سات قربانیاں دے دی ہیں، اب آئندہ اس کو اور قربانیاں دینے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ ادھر ہمارے ایریے میں سات قربانیاں دینا زندگی میں حد رکھی ہے؟

المستفتی: غلام حسین، مدرس رام نگر، ضلع اودھم سنگھ نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زندگی بھر ہر سال قربانی واجب ہے، جب تک نصاب کے بقدر مال موجود ہے۔

عن أبي هريرة –رضی الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: من وجد سعة فلم يضح فلا يقربن مصلانا. (مسند أحمد بن حنبل ۳/۳۲۱، رقم: ۸۲۵۶)

ويشترط في وجوبها اليسار لأنها حق في مال يجب على وجه القربة كالزكاة. (الجوهرة النيرة، كتاب الأضحية، مكتبه امداديه ملتان ۲/۲۸، دار الكتاب ديوبند ۲/۲۶۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍محرم الحرام ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/۴۳۲۲)

جائیداد کی پیداوار بقدر نصاب ہو تو قربانی واجب ہے یا نہیں؟

سوال [۹۸۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرا ۲۲؍سال کا لڑکا ہے اور کالج میں پڑھتا ہے، اس کے پاس بیس بیگھے زمین ہے، تو اس پر قربانی واجب ہے یا نہیں؟

المستفتی: زوجہ عبدالکریم خاں مرحوم، محلہ مغل پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مذکورہ زمین کی پیداوار بقرعید کے دن نصاب کے برابر ہو جائے تو قربانی واجب ہوگی اور اگر بقدر نصاب نہ ہو تو قربانی واجب نہیں ہے۔

ولـو كانت له دور و حوانيت للغلة وهى لاتكفى عياله فهو من الفقراء، وعلى هذا الكرم والآراضى إذا كانت غلتها لاتكفى. (البناية باب صدقة الفطر، اشرفيه ۳/۴۸۲، مجمع الأنهر مصرى قديم ۱/۲۲۷، دار الكتب العلمية بيروت ۱/۳۳۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰/ ذی قعدہ ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۰۴۰/۲۶)

کیا چھ ہزار کی مالیت رکھنے والے شخص پر قربانی واجب ہے؟

سوال [۹۸۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک صاحب کے پاس دو مکان ہیں، ایک میں خود رہتے ہیں، دوسرا خالی پڑا رہتا ہے، کبھی کرایہ پر دیتا ہے، لیکن اس کے پاس نقد پیسہ یا زیور نہیں ہے، پانچ چھ ہزار کی مالیت کا سامان ہے، کیا اس پر قربانی واجب ہے؟

المستفتی: امیر احمد ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جومکان خالی پڑا ہوا ہے کبھی کبھی اس کو کرایہ پر دیتا ہے وہ اس کی آمدنی کا ذریعہ ہے، کبھی کرایہ پر دینے کا مطلب یہ ہے کہ جب مناسب پیسہ ملتا ہوگا تب کرایہ پر دیتا ہوگا، اور ذریعہ آمدنی پر زکوٰۃ اور صدقہ فطر واجب نہیں ہوتے اور قربانی اس پر واجب ہوتی ہے، جس پر صدقۂ فطر واجب ہو اور آج کے زمانہ میں پانچ چھ ہزار کا سامان قربانی کے نصاب کو نہیں پہنچتا ہے، لہٰذا مذکورہ شخص پر قربانی واجب نہیں ہے۔

وإن كان لـه عقار و مستغلات ملك اختلف المشايخ المتأخرون (إلى قوله) وأبو على الدقاق وغيره اعتبروا الدخل. (هنديه، كتاب الأضحية، الباب الأول، زكريا قديم ۵/۲۹۲، جديد ۵/۳۳۷، الفتاوىٰ التاتارخانية زكريا ۱۷/۴۰۶،

رقم ١٢٧٦٥١، المحيط البرهانى، المجلس العلمى ٨/٤٥٥، رقم: ١٠٧٧٨)

وفـى الـفتـاوىٰ الـعتابية: وفى حق صاحب المستغلات يعتبر الفضل على قوت شهر. (الفتاوىٰ التاتارخانية كوئٹه ٢/٤١٨ زكريا ٣/٤٥٤، رقم: ٤٨٣٤)

وذكـر فى الفتاوىٰ فيمن له حوانيت و دور للغلة لكن غلتها لا تكفيه ولـعياله أنه فقير. (شـامـى، كتـاب الزكاة، باب المصرف، قبيل مطلب: فى جهاز المرأة هل تصير به غنية، زكريا ٣/٢٩٦، كراچى ٢/٣٤٨)

فـالـغنـى فى الأضحية ما هو الغنى فى صدقة الفطر. (قـاضيخان زكريا جديد ٣/٢٤٢، وعلى هامش الهندية ٣/٣٤٤) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۲۱؍ صفر المظفر ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۸۹۲/۳۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۲/۲۱ھ

بے نمازی کی قربانی کا حکم

سوال [۹۸۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بے نمازی کی قربانی کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: زوجہ عبدالکریم خاں مرحوم، مغل پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی اس صورت میں واجب ہوتی ہے جبکہ وہ بقرعید کے دن مالک نصاب ہو، وجوب قربانی کے لیے عدالت اور پابند صوم وصلاۃ ہونا مشروط نہیں ہے۔

وشـرائـطهـا: الإسـلام والإقامة واليسار الذى يتعلق به وجوب صدقة الفطر.

(الدر المختار، كتاب الاضحية، زكريا ٩/٤٥٢-٤٥٣، كراچى ٦/٣١٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰؍ ذی قعدہ ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۰۴۰/۲۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۰/۱۱/۳۰ھ

داڑھی کٹوانے والے کی قربانی صحیح ہے یانہیں؟

سوال [۹۸۹۲]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کسی شخص کو بقرعید کی قربانی کرنی ہے اور اس شخص نے بھول کر اپنی داڑھی بنوالی تو کیا اس کی قربانی صحیح ہوجائے گی یانہیں؟

المستفتی: محمد مستقیم مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایک مشت سے کم ڈاڑھی منڈوانا یا کٹوانا کسی شخص کے لیے جائز نہیں ہے، اس کا بہت بڑا گناہ ہوتا ہے، حدیث شریف سے ثابت ہے، اس کا گناہ مستقل ہے، مگر اس کی وجہ سے قربانی میں کوئی خلل نہیں ہوتا، قربانی جائز ہوجائے گی۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۷/۲۰۴)

عن ابن عمر رضی اللّٰہ عنه عن النبی ﷺ قال: احفوا الشوارب واعفوا اللحیٰ. (صحیح مسلم، باب خصال الفطرة، النسخة الهندية ۱/۱۲۹، بيت الأفكار رقم: ۲۵۹)

وأما الأخذ منها وهی دون ذٰلک كما يفعله بعض المغاربة و مخنثة الرجال فلم يبحه أحد. (الدر المختار، باب ما يفسد الصوم وما لا يفسد، مطلب: فی الأخذ من اللحية، زكريا ۳/۳۹۸، كراچی ۲/۴۱۸)

قال النووی نقلاً عن المذاهب: فقال أبو حنيفة لايكره. (شرح النووی على مسلم، النسخة الهندية ۱/۱۶۰) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۹/ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۵۳۷)

غریب پر کس جانور کی قربانی لازم ہے؟

سوال [٩٨٩٣]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بڑے جانور کے سات شریکوں میں سے ایک شریک غریب ہے اور جانور گم ہوگیا ہے تو سب نے مل کر دوسرا خرید لیا، اب پہلا جانور مل گیا، دوسرے مالدار شرکاء پہلے جانور کی قربانی نہیں کرتے، تو کیا غریب پر اس پہلے جانور کی قربانی واجب ہوگی؟

المستفتی: عبدالحمید، نورتن پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفیق: غریب پر دونوں جانوروں کی قربانی واجب ہوگی، البتہ اگر اس نے دوسرا جانور خریدتے وقت یہ نیت کی ہو کہ پہلا جانور جو گم ہوگیا اس کی جگہ پر خریدتا ہوں تو ایک قربانی واجب ہوگی؛ اس لیے فقیر پر ضروری ہے کہ پہلے جانور میں سے اپنے حصہ کی قیمت شرکاء سے وصول کر کے صدقہ کردے پھر اس جانور میں فقیر کا کچھ حق نہیں رہے گا، شرکاء کی ملک ہوجائے گا۔

وفی فتاویٰ سمرقند: الفقیر إذا اشتریٰ شاة للأضحیة فسرقت فاشتریٰ مکانها ثم وجد الأولیٰ فعلیه أن یضحی بهما، ولو ضلت فلیس علیه أن یشتری أخریٰ مکانها. (البحر الرائق، کتاب الأضحیة، زکریا ٨/ ٣٢٠، کوئٹہ ٨/ ١٧٥، الفتاویٰ تاتارخانیة زکریا ١٧/ ٤١٣، رقم: ٢٧٦٧٤، المحیط البرهانی، المجلس العلمی ٨/ ٤٥٩، رقم: ١٠٧٩٠-١٠٧٩١)

رجل اشتریٰ أضحیة وأوجبها فضلت ثم اشتریٰ أخریٰ، فأوجبها ثم وجد الأولیٰ إن کان أوجب الثانیة بلسانه فعلیه أن یضحی بهما، وإن أوجبها بدلا عن الأولیٰ فعلیه أن یذبح أیهما شاء، ولم یفصل بین الفقیر والغنی. (البحر الرائق زکریا ٨/ ٣٢٠، کوئٹہ ٨/ ١٧٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢٩/ ربیع الاول ١٤٢٠ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٤/ ٦٠٩٣)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
٢٩/ ٣/ ١٤٢٠ھ

کیا آٹو رکشہ کرایہ پر لگانے والے پر قربانی واجب ہے؟

سوال [۹۸۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے پاس دو آٹو رکشہ ہیں دونوں کرایہ پر چلا رکھے ہیں، ان کے کرایہ پر ہی گذر بسر ہے، کیا زید پر قربانی واجب ہے؟ کیا آٹو رکشہ کی مالیت کو دیکھتے ہوئے قربانی کا وجوب آئے گا؟

المستفتی: امیر محمد، وارد حال ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مذکورہ صورت میں آٹو رکشہ حوائج اصلیہ اور آلات آمدنی میں داخل ہے، اس کی آمدنی کا اعتبار ہوگا، اس کی مالیت کا اعتبار نہ ہوگا، لہٰذا آٹو رکشہ کے علاوہ دیگر سامان وغیرہ نصاب کے بقدر موجود ہیں تو اس شخص پر قربانی واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

وإن كان له عقار و مستغلات ملك اختلف المشايخ المتأخرون (إلى قوله) وأبو على الدقاق وغيره اعتبروا الدخل. (هنديه، كتاب الأضحية، الباب الأول، زكريا قديم ٥/٢٩٢، جديد ٥/٣٣٧، الفتاوىٰ التاتارخانية زكريا ١٧/٤٠٦، رقم ٢٧٦٥١، المحيط البرهانى، المجلس العلمى ٨/٤٥٥، رقم: ١٠٧٧٨)

وفى الفتاوىٰ العتابية: وفى حق صاحب المستغلات يعتبر الفضل على قوت شهر. (الفتاوىٰ التاتارخانية كوئٹه ٢/٤١٩ زكريا ٣/٤٥٤، رقم: ٤٨٣٤)

من له متاع فاضل عن حاجته الأصلية مقدار ما يساوى مأتى درهم إلا أنه ليس للتجارة فإنه لايحل له أخذ الزكاة وتجب عليه الأضحية.

(الفتاوىٰ التاتارخانية زكريا ٣/٢١٥ رقم: ٤١٦٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ صفر المظفر ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۸۹۲/۳۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۲/۲۱ھ

ذمہ دارانِ مدرسہ کا مدرسہ سے قرض لے کر قربانی کرنا

سوال [۹۸۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سات آدمیوں نے مدرسہ کے ذمہ دار سے ٹیلی فون پر اپنے اپنے حصے بک کرالیے اور رقم جمع نہیں کی، مدرسہ والوں نے مدرسہ کی رقم سے جانور خرید کر قربان کردیا، اس کے بعد ساتوں شرکاء نے اپنے اپنے حصے کے پیسے ادا کئے، تو ایسی صورت میں کیا ساتوں شرکاء کی قربانی درست ہوگئی، نیز ذمہ دارانِ مدرسہ کا مدرسہ کے پیسے سے جانور خرید کر قربانی کرنا درست ہے؟ نیز اگر وہ جانور مر جاتا تو اس کا تاوان کس پر لازم آتا؟

المستفتی: محمد تعظیم القاسمی، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جن سات آدمیوں نے مدرسہ کے ذمہ داران کو ٹیلیفون پر اپنے اپنے حصے کی قربانی کرنے کی اجازت دی ہے اور ذمہ داران نے ان کے یہاں سے پیسہ آنے سے پہلے مدرسہ سے بطور قرض پیسہ لے کر ان کی طرف سے قربانی کردی، اور بعد میں وہ پیسہ وصول ہوگیا ہے تو ایسی صورت میں ان سب کی قربانی تو درست ہوگئی ہے، لیکن مدرسے سے مذکورہ شرکاء کے لیے جو قرض لیا گیا ہے وہ عمل ذمہ دارانِ مدرسہ کے لیے مکروہ ہے؛ اس لیے اس میں احتیاط ضروری ہے، ہاں البتہ ذمہ داران اگر اپنی جیب سے بطور قرض دے کر قربانی کردیں، تو کوئی مضائقہ نہیں۔

وإذا دفع الوكيل بالشراء الثمن من ماله من غير صريح إذن الموكل وقبض المبيع فله أن يرجع به على الموكل لوجود الإذن دلالة؛ لأن الحقوق لما كانت إلى العاقد وقد علمه المؤكل يكون راضياً بدفعه.

(اللباب في شرح الكتاب، كتاب الوكالة، دار الكتب العلمية بيروت ۲/۱٤۳)

وفي البحر: قال في جامع الفصولیين: ليس للمتولي إيداع مال الوقف والمسجد إلا ممن في عياله ولا إقراضه فلو أقرضه ضمن وكذا المستقرض.

(البحر الرائق كتاب الوقف كوئٹه ٥/٢٣٩، زكريا ٥/٤٠١، تنقيح الفتاوىٰ الحامدية دار الكتب العلمية بيروت ١/٢٢٩، مجمع الضمانات ١/٣٣٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵ر صفر المظفر ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۴۳۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۲/۵ھ

جس کا عقیقہ نہ ہوا ہو اس کی طرف سے قربانی کرنا

سوال [۹۸۹٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جس شخص کا عقیقہ نہیں ہوا ہے تو کیا اس شخص کے نام سے قربانی درست ہے یا نہیں؟ تفصیل سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی: محمد منظور الحق، سمستی پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں جس شخص کا عقیقہ نہیں ہوا ہے اس کی طرف سے قربانی کرنا درست ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۸/۲٦۳، جدید زکریا مطول ۱۲/ ۱۵۹)

نیز عقیقہ مستحب ہے واجب نہیں، قربانی واجب ہے، نیز عقیقہ قربانی کی شرائط میں سے بھی نہیں ہے۔

عن معمر عن قتادة قال: من لم يعق عنه أجزأته أضحيته. (مصنف عبد الرزاق، المجلس العلمي ٤/٣٣١، رقم/ ٧٩٦٧)

وذكر محمدؒ في العقيقة: فمن شاء فعل ومن شاء لم يفعل، وهذا يشير إلى الإباحة. (عالمگيرى، كتاب الكراهية الباب الثانى والعشرون، زكريا قديم ٥/٣٦٢، جديد ٥/٤١٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٦/١٠٧، بدائع الصنائع كراچى ٥/٦٩، زكريا ديوبند ٤/٢٠٤، شامى كراچى ٦/٣٢٦، زكريا ٩/٤٧٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸ر جمادی الثانیہ ۱۴۱٦ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۴۷۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱٦/٦/۸ھ

جس نے عقیقہ نہ کیا ہو، کیا وہ قربانی میں حصہ لے سکتا ہے؟

سوال [۹۸۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جس شخص نے عقیقہ نہ کیا ہو، کیا وہ قربانی میں حصہ لے سکتا ہے؟

المستفتی: عابد حسین، محمود پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: لے سکتا ہے، بلکہ اگر مالک نصاب ہے تو حصہ لینا واجب ہے۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: من وجد منكم سعة فلم يضح فلا يقربن مصلانا. (سنن الدار قطني، الأشربة،باب الصيد والذبائح والأطعمة، دار الكتب العلمية بيرت ٤/ ١٨٩، رقم: ٤٧١٧)

عن معمر عن قتادة قال: من لم يعق عنه أجزأته أضحيته. (مصنف عبد الرزاق، المجلس العلمي ٤/ ٣٣١، رقم: ٧٩٦٧)

ذبح حيوان مخصوص بنية القربة في وقت مخصوص، و شرائطها الإسلام والإقامة واليسار الذي يتعلق به وجوب صدقة الفطر. (تنوير الأبصار مع الدر، كتاب الأضحية، كوئٹه ٥/ ٢١٩، زكريا ٩/ ٤٥٢-٤٥٣، كراچی ٦/ ٣١٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۲۸/ ذی قعدہ ۱۴۰۷ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۳۷۲)

قربانی میں دی ہوئی رقم بچ جائے یا گھٹ جائے تو کیا کریں؟

سوال [۹۸۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عوام مدارس کے سفراء کو اپنی طرف سے قربانی کرنے کے لیے رقم دیتے ہیں، بعد میں

ایسا اتفاق پیش آتا ہے کہ بعض کی قربانی کرنے کے بعد کچھ رقم بچ جاتی ہے اور بعض کی کم رہ جاتی ہے، تو کیا اس صورت میں بچے ہوئے روپیوں سے دوسرے کی کمی پوری کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اگر ناجائز ہے تو اس کمی کو مدرسہ پوری کرے یا سفیر؟ لیکن دونوں اس پر تیار نہ ہوں تو پھر اس کے لیے کیا شکل اختیار کی جائے؟ اس لیے کہ ان لوگوں کا پتہ معلوم نہیں کہ بعد میں اس رقم کا مطالبہ کرلیا جائے؟

المستفتی: سعید احمد قاسمی، ٹانڈہ رام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر واقعی ایسا واقعہ پیش آتا ہے تو بہت سخت خطرناک طریقہ ہے، سفراء پر پورا پتہ لکھنے کی پابندی لگانا ضروری ہے، مذکورہ صورت میں اگر کسی کی رقم سے قربانی کا مکمل ایک حصہ پورا نہیں ہوتا ہے اور اس کو کسی جانور میں اس حالت میں شریک کرلیا جائے تو اس جانور میں شریک ہونے والے دوسرے شرکاء میں سے کسی کی قربانی صحیح نہیں ہوگی، کیونکہ جب کسی ایک شریک کی قربانی صحیح نہیں ہوتی ہے تو تمام شرکاء کی قربانی بیکار ہو جاتی ہے، نیز جن لوگوں کی رقم ہے ان کی قربانی کے بعد کچھ رقم بچ جائے وہ ان کو واپس لوٹا دینا واجب ہے، اگر واپسی کی کوئی صورت ہی نہ ہو، تو زائد رقم کا فقراء پر صدقہ کردینا لازم ہوگا۔

ولو لأحدهم أقل من سبع لم يجز عن أحد. (الدر المختار، كتاب الأضحية، زكريا ٩/٤٥٧، كراچى ٦/٣١٥-٣١٦)

وكذا إذا كان نصيب أحدهم أقل من سبع بدنة لا يجوز عن الكل؛ لأن بعضه إذا خرج عن كونه قربة خرج كله. (البحر الرائق، كتاب الأضحية، كوئٹه ٨/١٧٤، زكريا ٨/٣١٩)

لأن الزيادة هناک بدل ملک الموكل فتكون له، أى لأن الزيادة عوض ملک الآمر فلايجوز أن يستحقه الوكيل إلا بإذن الموكل ولا بغير إذنه. (البناية اشرفيه ٩/٢٤٦)

ورد بأن الدرهم ملک الموكل فتكون الزيادة بدل ملكه. (العناية على هامش فتح القدير، دار الفكر ٨/٤٤، زكريا ٨/٤٨، كوئٹه ٧/٤١) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۲۷۱)

صاحب نصاب اپنی طرف سے قربانی کرے یا والدین کی طرف سے؟

سوال [۹۸۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ہم نے ایک بکرا پالا، اس میں ہم پہلے والدین کے نام کی قربانی کریں یا پہلے اپنے نام کی اور دوسرا بکرا پالنے کی ہمارے پاس گنجائش نہیں ہے، اس کے لیے کیا فرماتے ہیں؟

(۲) اگر ہم بھینس میں حصہ لے رہے ہیں تو وہ سات سال میں پورا ہوگا یا ایک حصہ میں پورا ہوگیا؟

المستفتی: محمد دانش، اصالت پورہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) پہلے آپ پر قربانی کرنی واجب ہے، اس کے بعد گنجائش ہو تو والدین کی طرف سے قربانی کر سکتے ہیں، اگر والدین نے وصیت نہیں کی ہے اور نہ ان کے ترکہ کے ثلث میں گنجائش ہے، تو والدین کی طرف سے قربانی واجب نہیں، اپنی طرف سے واجب ہے۔

عن أبي هريرة – رضي الله عنه – قال: قال النبي ﷺ: من كان له مال فلم يضح فلا يقربن مصلانا، وقال مرة: من وجد سعة فلم يذبح فلا يقربن مصلانا. (المستدرك للحاكم، أضاحی، قديم ٤/ ٢٣٢، مكتبه نزار مصطفىٰ الباز جديد ٧ ٢٦٩، رقم: ٥ ٦ ٥ ٧ – ٦ ٦ ٥ ٧)

الأضحية واجبة على كل حر مسلم مقيم موسر في يوم الأضحىٰ عن نفسه. (هدايه، كتاب الأضحية، اشرفی ٤/ ٤٤٣، قدوری ص: ٢٢٨، شامی زكريا ٩/ ٤٥٢ – ٤٥٣، كراچی ٦/ ٣١٢)

(۲) اگر بھینس میں حصہ لیا جائے تو جائز ہے، مگر زندگی بھر ہر سال قربانی کرنی واجب ہے، چاہے بھینس میں حصہ لیا کریں یا بکرا کیا کریں، جبکہ آپ مال نصاب کے مالک

ہیں، لوگوں کا جو عقیدہ ہے کہ بھینس میں حصہ لینے میں سات سال میں فریضہ مکمل ہوجاتا ہے، آئندہ قربانی کرنا واجب نہیں ہے غلط ہے، بلکہ موسر مالدار پر ہر سال قربانی کرنا واجب ہے۔

عن أبی هریرة –رضی الله عنه– قال: قال النبی ﷺ: من کان له مال فلم یضح فلا یقربن مصلانا، وقال مرة: من وجد سعة فلم یذبح فلا یقربن مصلانا. (المستدرك للحاکم، أضاحی، قدیم ٤/٢٣٢، مکتبه نزار مصطفیٰ الباز جدید ٢٦٩٧، رقم: ٧٥٦٥ - ٧٥٦٦)

الأضحیة واجبة علی کل حر مسلم مقیم موسر فی یوم الأضحیٰ عن نفسه. (هدایه، کتاب الأضحیة، اشرفی ٤/٤٤٣، قدوری ص:٢٢٨، شامی زکریا ٩/٤٥٢- ٤٥٣، کراچی ٦/٣١٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۷۴۶)

شوہر کے صاحب نصاب ہونے کی وجہ سے بیوی پر قربانی وغیرہ کا حکم

سوال [۹۹۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں یعنی محمد اسماعیل شریعت کے حساب سے مالدار شخص ہوں، میرے اوپر زکوٰۃ فرض ہے، اس لیے قربانی بھی واجب ہوتی ہے، میری ایک بیوی ہے، ہندوستانی رواج کے مطابق وہ میرے ہی ساتھ رہتی ہے، اس کی اپنی کوئی جائیداد نہیں ہے، اس کا جو کچھ بھی جہیز ہے وہ میرے پاس ہے اور گھر کے استعمال میں آرہا ہے، اور وہ بھی اپنے آپ کو مالدار سمجھتی ہے، جیسا کہ ہندوستانی دستور ہے کہ شوہر اگر مالدار ہو تو بیوی بھی اپنے کو مالدار اور اگر شوہر غریب ہو تو بیوی بھی اپنے کو غریب سمجھتی ہے، اب مجھے آپ سے یہ مسئلہ دریافت کرنا ہے کہ: جس طرح مجھ پر قربانی واجب ہے اس طرح سے میری بیوی پر قربانی واجب ہے یا نہیں؟ کیونکہ وہ میرے ساتھ ہی اپنے کو مالدار سمجھتی ہے؟

المستفتی: محمد اسماعیل، سلیم پور، سہسپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر آپ کی بیوی کے پاس پرسنل طور پر، ذاتی زیور یا دیگر رقم بقدر نصاب نہیں ہے تو اس پر قربانی واجب نہیں ہے، اگر چہ وہ اپنے کو آپ کے ساتھ مالدار سمجھتی ہو۔

ولم تجب إلا بملک النصاب فدل أن وجوبها بالقدرة الميسرة؛ لأن اشتراط النصاب لاينافي وجوبها بالممكنة. (البحر الرائق، كتاب الأضحية، كوئٹه ۸/۱۷٤، زكريا ۸/۳۱۹)

وأما شرائط الوجوب أي شرائط الأضحية منها اليسار، وهو ما يتعلق به وجوب صدقة الفطر دون ما يتعلق به وجوب الزكاة. (فتاویٰ عالمگیری، كتاب الأضحية، زكريا قديم ۵/۲۹۲، جديد ۵/۳۳٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ر محرم الحرام ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۱۰۸۰)

شوہر کا اپنی طرف سے قربانی نہ کر کے بیوی کی طرف سے کرنے حکم

سوال [۹۹۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر شوہر اپنا حصہ نہ کر کے بیوی کا حصہ کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد اسماعیل، قصبہ سہس پور، سیوہارہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شوہر پر اپنی قربانی ادا کرنا واجب ہے اگر بیوی کی طرف سے قربانی کر کے اپنی طرف سے قربانی نہ کرے تو شوہر سخت گنہگار ثابت ہوگا اور قربانی کا وجوب اس پر باقی رہ جائے گا۔

عن أبي هريرة - رضي الله عنه- قال: قال رسول الله ﷺ: من وجد

سعة فلم یضح فلا یقربن مصلانا. (مسند أحمد بن حنبل ۳/۳۲۱، رقم: ۸۲۵٦)

ولیس علی الرجل أن یضحی عن أولاده الکبار و امرأته. (قاضیخان، کتاب الأضحیة، زکریا جدید ۳/۲۴۳، وعلی هامش الهندیة ۳/۳۴۵، شامی زکریا ۹/۴۵۷، کراچی ٦/۳۱۵، بزازیه زکریا جدید ۳/۱٦۰، وعلی هامش الهندیة ٦/۲۹۵، هندیه زکریا قدیم ۵/۲۹۲، جدید ۵/۳۳٦)

ومن وجد سعة ولم یضح فلا یقربن مصلانا، هذا وعید یلحق بترک الواجب. (مجمع الأنهر، دار الکتب العلمیة بیروت ٤/١٦٦، مصری قدیم ۲/۵۱٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم صفر المظفر ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۱۰۹۵)

صاحب نصاب کا اپنی طرف سے قربانی نہ کر کے میت کی طرف سے قربانی کرنا

سوال [۹۹۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص کے پاس ایک ہی جانور ہے اور وہ اس جانور کو مردہ کے نام پر قربانی کرنا چاہتا ہے، اور خود صاحب نصاب ہونے کے باوجود اپنے نام پر قربانی نہیں کرتا، تو کیا اس کی یہ قربانی درست ہے؟ اور مردہ کے نام کی قربانی کے گوشت کا حکم زندہ لوگوں کی قربانی کے گوشت کی طرح ہے یا کچھ فرق ہے؟

المستفتی: شاہد جمال، مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ شخص کے پاس ایک ہی جانور ہے اور صاحب نصاب ہونے کی وجہ سے خود اس پر قربانی واجب ہے، تو یہ شخص میت کی طرف سے قربانی نہیں کرے گا، بلکہ اپنی طرف سے قربانی کرنا لازم ہے، البتہ بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ ایسی صورت میں میت کی طرف سے قربانی نہ ہوگی بلکہ خود قربانی کرنے والے کی طرف سے

واجب قربانی ادا ہو جائے گی۔

تجب علی حر مسلم عن نفسه. (تنویر الأبصار، کتاب الأضحية، زکریا ۹/۴۵۷، کراچی ۶/۳۱۵)

وإن تبرع بها عنه له الأکل لأنه یقع علی ملک الذابح، والثواب للمیت، ولهذا لو کان علی الذابح واحدة سقطت عنه أضحیته کما فی الأجناس. (شامی، کتاب الأضحية، زکریا ۹/۴۸۴، کراچی ۶/۳۳۵) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۱۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۰۵۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۵/۱۳ھ

مرحوم والد کی طرف سے کی گئی قربانی سے واجبی قربانی ساقط ہوگی یا نہیں؟

سوال [۹۹۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید اپنی واجب قربانی اگر اپنے والد مرحوم یا کسی دوسرے کے نام سے کر دے تو زید سے قربانی ساقط ہوگی یا نہیں؟ ایک مفتی صاحب سے اس سلسلے میں گفتگو ہوئی تو انہوں نے کہا کہ ہم مرحوم والد یا میت کی طرف سے کرنے کی صورت میں سقوط اضحیہ کا فتویٰ دیتے ہیں، رہا زندہ کی طرف سے تو ساقط نہیں ہوگی، اس سلسلے میں انہوں نے شامی اور عالمگیری کی عبارت پیش کی، لیکن بندہ نے ان سے کہا کہ دونوں صورتوں میں سقوط اضحیہ کا قول مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اشباہ کے قاعدہ کے مطابق تزاحم کی موجودگی میں نیت ضروری ہے اور یہاں نیت نہیں پائی گئی، سقوط کا قول کرنا درست نہیں ہونا چاہیے، اس سلسلے میں موجودہ مفتیان کرام کا رجحان کیا ہے؟

المستفتی: شمس الرحمٰن الاعظمی، اعظم گڈھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید پر جو قربانی واجب ہے اگر وہ قربانی اپنی جانب سے کرے اور والد صاحب کو ثواب پہنچانے کی نیت کرے تب تو زید سے قربانی کا

فریضہ ساقط ہو جائے گا، دوسری قربانی کرنے کی ضرورت نہیں، شامی اور عالمگیری کی عبارت کا محمل بھی یہی ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۸/ ۲۱۸، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۳۳۰)

وإن تبرع بها عنه له الأكل لأنه يقع على ملك الذابح والثواب للميت؛ ولهذا لو كان على الذابح واحدة سقطت عنه أضحيته. (شامی، كتاب الأضحية، زكريا ٩/ ٤٨٤، كراچی ٦/ ٣٣٥)

اور اگر قربانی اپنی جانب سے نہیں کر رہا ہے بلکہ والد محترم کی جانب سے کر رہا ہے تو زید کے ذمہ سے فریضہ ساقط نہ ہوگا، اور یہ واجب کا تارک ہو کر گنہگار ہوگا۔

وهي واجبة على حر موسر عن نفسه لأنه أصل في الوجوب عليه.

(مجمع الأنهر، كتاب الأضحية، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ١٦٦، مصری قديم ٢/ ٥١٦)

اور زندہ کی طرف سے قربانی کا مسئلہ: تو اگر غیر کی اجازت سے قربانی کی ہے تب تو غیر کی قربانی ادا ہو جائے گی، اور یہ اجازت اور حکم صراحتاً بھی ہوسکتا ہے، دلالۃً بھی اور معمول کے مطابق بھی، مثلاً زید کی قربانی ہمیشہ اس کا وہ بھائی کرتا ہے جو اس سے دور رہتا ہے، اور زید کی جانب سے یہ اجازت پہلے ہی سے ملی ہوئی ہے، اب اس سال نئی اجازت لازم نہیں، بلکہ معمول کے مطابق قربانی کر دی گئی تو قربانی درست ہوگی جبکہ زید بھی اس بھروسے پر رہتا ہو کہ میرا بھائی میری قربانی کر دے گا۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۷/ ۵۴۱)

ولو ضحى عن أولاده الكبار و زوجته لايجوز إلا بإذنهم. (شامی، كتاب الاضحية، زكريا ٩/ ٤٥٧، كراچی ٦/ ٣١٥، بزازيه زكريا جديد ٣/ ١٦٠، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٩٥، قاضيخان زكريا جديد ٣/ ٢٤٣، وعلى هامش الهندية ٣/ ٣٤٥)

اور اگر بغیر اجازت قربانی کی ہے جس میں نہ تو دلالۃً نہ صراحتاً اجازت ہو اور نہ معمول کے مطابق قربانی ہوئی ہو تو اب غیر کی جانب سے کی ہوئی قربانی ادا نہ ہوگی۔

إن فعل بغير أمرهم أو بغير أمر بعضهم لاتجوز عنه ولا عنهم في قولهم جميعاً. (هنديه زكريا قديم ٥/ ٣٠٢، زكريا جديد ٥/ ٣٤٨)

اس طرح سے قربانی کرنے کی صورت میں دیگر شرکاء کی قربانی بھی درست نہ ہوگی۔

لایجوز عن أحدهم. (مجمع الأنهر قديم ۲/ ۵۱۷، دار الكتب العلمية بيروت ۱۶۷/٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۸۶۵۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۱/۱۹ھ

دوسرے کی طرف سے قربانی کرنے سے اپنا واجب ساقط نہ ہوگا

سوال [۹۹۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے ذمہ قربانی واجب ہے زید اپنی طرف سے قربانی نہ دے کر کسی دوسرے کی طرف سے خواہ دوسرا زندہ ہو یا مردہ قربانی دیدے، تو کیا زید کے ذمہ سے واجب ساقط ہو جائے گا؟

المستفتی: محمد غفران غفرلہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جی نہیں، زید کے اوپر اپنی طرف سے قربانی کرنا واجب ہے، دوسرے کی طرف سے کرنے سے پہلے اپنا واجب ساقط نہ ہوگا۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۲۲۲/۸، جدید زکریا مطول ۱۲/ ۱۰۳)

وإنما تجب على حر مسلم مقيم موسر عن نفسه؛ لأنه أصل في الوجوب عليه. (مجمع الأنهر، كتاب الأضحية، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ١٦٧، مصری قديم ٢/ ٥١٦، هدايه اشرفی ٤/ ٤٤٣-٤٤٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ربیع الاول ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۳۰۷۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۳/۳/۱۵ھ

کیا صاحب نصاب پر ہر سال قربانی واجب ہے؟

سوال [۹۹۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: زید اہل نصاب ہے، اس پر قربانی واجب ہے، زید نے پہلے سال قربانی اپنے نام کی کردی، زید نے دوسرے سال اپنے باپ یاماں یااولاد کے نام سے کی لیکن اپنے نام سے نہیں کی اور وہ ہرسال یہی کرتا ہے، تو زید کا واجب اس طرح سے ادا ہوگیا یا اس کو ہرسال اپنے نام سے کرنا ہوگی؟

المستفتی: بشیر احمد نرولی، نئی بستی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید پر صاحب نصاب ہونے کی وجہ سے ہرسال اپنی جانب سے قربانی کرنا واجب ہے، اس طرح ماں باپ یا اولاد کے نام سے قربانی کرنے سے زید کے ذمہ سے واجب ادا نہ ہوگا، اور ہرسال واجب کا تارک ہونے کی وجہ سے گنہگار ہوگا۔ (مستفاد: مسائل قربانی ص:۱۴، فتاویٰ محمودیہ قدیم ۴/ ۲۸۸، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۳۱۱)

لأنـه أصل في الوجوب عليه. (مجمع الأنهر، كتاب الأضحية، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ١٦٧، مصری قديم ٢/ ٥١٦، هدايه اشرفی ٤/ ٤٤٣-٤٤٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ٦٤٢٩)

جس پر قربانی واجب ہے اس کا دوسرے کی طرف سے قربانی کرنا

سوال [۹۹۰٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید پر قربانی واجب ہے، مگر کسی سال اپنے مرنے والے والدین کے نام سے کردیتا ہے، کسی سال اپنی بیوی کے نام سے کردیتا ہے، کسی سال اپنے کسی چھوٹے بچے یا بڑے بچے کے نام سے کردیتا ہے، کسی سال اپنے نام سے کرلیتا ہے، معلوم یہ کرنا ہے کہ جب قربانی زید پر واجب ہے، اور زید دوسروں کے نام سے قربانی کررہا ہے، تو کیا زید کے ذمہ سے اس طرح قربانی کا وجوب باقی رہے گا، یا اتر جائے گا اور زید کو ثواب ملے گا، یا نہیں؟ یا جن کے نام سے قربانی کی ہے ان کی طرف سے ہی قربانی ہوکر ان کو ہی ثواب ملے گا،

ہمارے علاقے میں یہ رواج بعض جگہوں پر ہے، اس لیے وضاحت سے تحریر فرمادیں؟

المستفتی: امیر احمد ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جس شخص پر خود قربانی واجب ہے اس کے لیے اپنی طرف سے قربانی کرنا لازم ہے، اس کے بعد اگر گنجائش ہو تو مرحوم والدین اور بیوی بچوں کی طرف سے کرسکتا ہے، ابتداءً ہی غیر کی جانب سے قربانی کرنے کی صورت میں واجب قربانی ادا نہ ہوگی، لہٰذا مذکورہ شخص نے جب اپنی طرف سے قربانی نہیں کی ہے تو ایام قربانی گذر جانے کے بعد ایک قربانی کا پیسہ صدقہ کرنا اس پر لازم ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ جدید ڈابھیل ۱۷/۳۳۰)

وتجب على كل حر مسلم موسر مقيم عن نفسه، وقوله عن نفسه لأنه أصل في الوجوب عليه. (البحر الرائق، كتاب الأضحية، زكريا ۸/۳۱۸-۳۱۹، كوئٹه ۸/۱۷۳-۱۷٤)

ولو تركت التضحية ومضت أيامها -إلى قوله- وتصدق بقيمتها غنى شراها أو لا. (الدر مع الرد، كتاب الأضحية، كراچی ٦/۳۲۰-۳۲۱، زكريا ۹/٤٦۳ تا ٤٦٥)

وقضاؤها بعد مضى وقتها بالتصدق بعينها أو بقيمتها. (فتح القدير، كتاب الاضحية، دار الفكر ۹/۵۰۷، زكريا ۹/۵۲۰، كوئٹه ۸/٤۲٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍صفر المظفر ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۸۹۲/۳۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۲/۱۸ھ

غریب کے قربانی کی نیت سے خریدے ہوئے جانور کا حکم

سوال [۹۹۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: شمیم احمد نامی ایک شخص نے ایک بکری کا بچہ (بکرا) چھوٹا سا خریدا اور خریدتے وقت یہ نیت کی کہ میں اس بچہ کو پال کر پوری عمر ہو جانے پر اس کی قربانی کروں گا، اب وہ بچہ بڑا پوری عمر کا ہو چکا ہے، شمیم احمد یہ چاہتے ہیں کہ میں اس بکرے کو فروخت کر کے کسی جانور میں

حصہ کرلوں اور باقی ماندہ رقم اپنے کسی دوسرے کام میں صرف کرلوں، کیونکہ شمیم کی مالی حالت اس وقت کافی کمزور ہے اوراس وقت بھی مالی حالت کمزور ہی تھی جبکہ قربانی کی نیت سے وہ بچہ خریدا تھا، شریعت مطہرہ کی روشنی میں جواب دیں کہ شمیم احمد اس بکرے کوفروخت کرکے کسی جانور میں حصہ لے کر باقی ماندہ رقم اپنے کسی دوسرے مصرف میں خرچ کرسکتے ہیں یانہیں؟

المستفتی: شمیم احمد، گڑھی سلیم پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غریب اورفقیر قربانی کی نیت سے جو جانور خریدتا ہےاس کےاوپراسی جانور کی قربانی واجب ہے۔(مستفاد: مسائل قربانی ص:۲۴)

وأما الذی یجب علی الفقیر دون الغنی فالمشتری للأضحیة إذا کان المشتری فقیرا بأن اشتریٰ فقیر شاۃ ینوی أن یضحی بھا. (بدائع الصنائع، کتاب التضحیة، زکریا ۱۹۲/٤، کراچی ٦٢/٥، ھندیه زکریا قدیم ۲۹۱/٥، جدید ۳۳٦/٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/شعبان المعظم ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۱۴۳/۳۷)

فقیر کا پورے جانور کی قربانی کی نیت کرنا

سوال [۹۹۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ذاکر نے ایک بھینس پال رکھی تھی پھراس کو قربانی کرنے کی نیت کرلی، پوری کی پوری اپنی ہی جانب سے، حالانکہ ذاکر ایسا شخص ہے کہ جس پر ایک بھی قربانی واجب نہیں تھی، مالک نصاب نہ ہونے کی وجہ سے اور ذاکر کے والدین نے اس طرح کا کوئی لفظ نہیں کہا تھا، کہ میں پورا حصہ اپنی طرف سے کروں گا، لیکن ذاکر کواس کا مالک بنادیا تھا، اور ذاکر نے پوری کی پوری اپنے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے نیت کرلی تھی، پھراس کے بعد بقرعید کے قریب کچھ لوگ اس سے بھینس میں حصہ کے لیے کہنے لگے تو پانچ حصے ذاکر نے دوسرے

لوگوں کو دے دیٔے، اوران سے پیسے حاصل کر لیے اور گذشتہ بقرعید میں اس بھینس کی قربانی ہوچکی ہے، لہٰذا اس شکل میں ان لوگوں کے اوپر شریعت کے کیا احکام نافذ ہوں گے؟

المستفتی: محمد ذاکر بہرایچی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: جب ذاکر فقیر نے پورا جانور اپنی جانب سے قربانی کے لیے متعین کرلیا تو پورے جانور کی اپنی طرف سے قربانی کرنی لازم تھی، کسی کو اس میں شریک کرنا جائز نہیں تھا، مگر جب اس نے دیگر پانچ افراد کو شریک کرلیا تو پورے جانور کی قربانی اسی کی طرف سے ہوگی، جن پانچ افراد کو شریک کیا ان کے حصوں کا تاوان ذاکر فقیر پر لازم ہوگا۔

وإن كان فقيراً معسراً فقد أوجب بالشراء فلايجوزأن يشرك فيها، وكذا لو أشرك فيها ستة بعد ما أوجبها لنفسه لم يسعه لأنه أوجبها كلها للّٰه تعالىٰ، و إن أشرك جاز ويضمن ستة أسباعها. (هـنـديـه، كتاب الأضحية، الباب الثامن فيما يتعلق بالشركة فى الضحايا، زكريا قديم ٥/٣٠٤، جديد ٥/٣٥١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۱۷/ ذیقعدہ ۱۴۲۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۸۵۳)	۱۴۲۳/۱۱/۱۷ھ

میت کی طرف سے واجبی قربانی کرنے میں کسی اور کو شریک کرنے کا حکم

سوال [۹۹۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کسی مرحوم کے نام قربانی کرنا جبکہ ان پر قربانی فرض تھی، اور موت ہوگئی یا وصیت کی ہو تو کسی اور کو ثواب میں شامل کرنے میں کیا کوئی حرج ہے؟

المستفتی: عبدالرشید بانکوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: میت پر قربانی فرض ہونے کی صورت میں یا اس

کی قربانی کی وصیت کو پورا کرنے کے لیے کسی اور کو ثواب میں شامل کرنا جائز نہیں۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۲/ ۸۶، جدید زکریا ۱۰/ ۲۶)

اور اس قربانی کے گوشت وغیرہ کو صدقہ کر دینا واجب ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۲/ ۸۶، جدید زکریا ۱۰/ ۲۶)

وعن میت أی لو ضحیٰ عن میت وارثه بأمره ألزمه بالتصدق بها وعدم الأكل منها. (شامی، کتاب الأضحية، زکریا ۹/ ٤٨٤، کراچی ٦/ ٣٣٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۵۱۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۶/۲۶ھ

بالغ اولاد کی طرف سے قربانی کرنا

سوال [۹۹۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: یہ بتلائیں کہ مثال کے طور پر گھر کا مالک والد ہے اور اس کے اوپر قربانی کا وجوب ہو گیا ہے، تو اگر والد چاہے کہ میں ایک دو ماہ کے لیے اپنے لڑکے کو گھر کا مالک بنا کر اس کی جانب سے قربانی کر دوں تو آیا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: ثناء اللہ پرتا پگڈھی، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: محض باپ کے چند روز کے لیے اپنے لڑکے کو گھر کا مالک بنا دینے کی وجہ سے لڑکا گھر کی دولت کا شرعاً مالک نہ ہوگا بلکہ مالک باپ ہی رہے گا، اس لیے باپ کے اوپر سے قربانی ساقط نہ ہوگی، ہاں البتہ لڑکے کی اجازت سے باپ بخوشی لڑکے کے نام سے بھی قربانی کر دینا چاہے تو شرعاً اس کی اجازت ہے، اور ساتھ ساتھ باپ کو اپنی قربانی کرنا واجب ہے۔

ولو ضحیٰ عن أولاده الكبار وزوجته لايجوز إلا بإذنهم. (شامی، کتاب

الأضحية، زكريا ٩/٤٥٧، كراچی ٦/٣١٥، بزازیه زکریا جدید ٣/١٦٠، وعلی هامش الهندیة ٦/٢٩٥، قاضیخان زکریا جدید ٣/٢٤٣، وعلی هامش الهندیة ٣/٣٤٥) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۹؍ربیع الاول ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/۲۵۷۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۲/۳/۹ھ

کیا مالدار کی غریب لڑکی پر قربانی واجب ہے؟

سوال [۹۹۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ۱۴؍سال کی لڑکی ہے اس کے نام تو جائیداد نہیں ہے، مگر اس کے والدین کے پاس بہت زیادہ مال ہے تو اس لڑکی کی طرف سے قربانی واجب ہے یا نہیں؟

المستفتی: زوجہ عبدالکریم خاں، محلّہ مغل پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ایسی بالغہ لڑکی جس کی ملکیت میں بقدر نصاب مال بقرعید کے دن نہ ہو تو اس پر قربانی واجب نہیں ہے۔

وشرائطها الإسلام والإقامة واليسار الذى يتعلق به وجوب صدقة الفطر. (الدر المختار، کتاب الأضحية، زکریا ٩/٤٥٢-٤٥٣، کراچی ٦/٣١٢، هدایه اشرفی ٤/٤٤٣، مختصر القدوری ص: ٢٢٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰؍ذی قعدہ ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/۲۰۴۰)

شوہر کے صاحب نصاب ہونے کی وجہ سے بیوی پر قربانی کے وجوب کا حکم

سوال [۹۹۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: ہمارے ہندوستان میں زیادہ تر شوہر ہی پوری جائیداد کا مالک ہوتا ہے اور بیوی کی مالیت بھی اسی کے قبضہ میں رہتی ہے، چاہے وہ زیور ہو یا کاشت کی زمین اس حالت میں قربانی شوہر و بیوی دونوں میں سے کس پر واجب ہے؟

المستفتی: محمد اسماعیل، قصبہ سیوہارہ، ضلع بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر بیوی کی ملکیت میں بقدر نصاب زیور وغیرہ ہوتو بیوی پر قربانی واجب ہے، اگرچہ زیورات ودیگر مالیت شوہر ہی کے قبضہ میں کیوں نہ ہو۔

وأما شرائطها منها اليسار وهو ما يتعلق به وجوب صدقة الفطر (إلى قوله) وملك نصاباً تجب عليه الأضحية (إلى قوله) وجميع ما ذكرنا من الشرائط يستوى فيه الرجل والمرأة. (هندیه، كتاب الأضحية، زكريا جديد ٥/٣٣٦، قديم ٥/٢٩٢، شامی زكريا ٩/٤٥٣، كراچی ٦/٣١٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱؍صفر المظفر ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۱۰۹۵)

مشترکہ خاندان کے بالغ غیر مستطیع کی قربانی کس پر واجب؟

سوال [۹۹۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص کے چار لڑکے ہیں جو کہ بالغ ہیں اور صاحب نصاب ہیں، باپ اور لڑکوں کی کمائی مشترک کر کے گھر کے اخراجات پورے کیے جاتے ہیں، تو کیا ایک ہی حصہ قربانی کافی ہے، یا پانچ الگ الگ حصے قربانی میں لگانا ضروری ہے۔

المستفتی: عبد المعید غفرلہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مذکورہ شخص کے چار لڑکے اس کی فیملی میں

شامل ہیں تو ان لڑکوں کی آمدنی سب کی سب باپ کی ملکیت ہے، البتہ اگر باپ کی اجازت سے لڑکوں کے پاس الگ الگ اتنا پیسہ موجود ہے، جو حد نصاب کو پہنچ جاتا ہے تو ایسی صورت میں باپ پر اور ان چاروں لڑکوں پر الگ الگ قربانی کرنا لازم ہے، لیکن اگر لڑکوں کے پاس الگ الگ بقدر نصاب ملکیت نہیں ہے تو صرف باپ کے اوپر قربانی لازم ہے، لڑکوں پر نہیں ہے، اب سوال نامہ میں اگر لڑکوں کو پہلی شق کے اعتبار سے صاحب نصاب کہا جا رہا ہے تو ان پر قربانی واجب ہے، جیسا کہ جواب میں لکھا ہے اور اگر معاملہ دوسری شق کی طرح ہے اور مسئلہ نہ سمجھنے کی وجہ سے ان کو صاحب نصاب کہہ دیا گیا ہے تو شرعاً وہ صاحب نصاب نہیں ہیں۔

وليس عليه أن يضحي عن أولاده الكبار و زوجته إلا بإذن. (حاشية الطحطاوي على الدر كوئٹه ٤/ ١٦١، قاضيخان زكريا جديد ٣/ ٢٤٣، وعلى هامش الهندية ٣/ ٣٤٥، بزازيه زكريا جديد ٣/ ١٦٠، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٩٥، شامي زكريا ٩/ ٤٥٧، كراچی ٦/ ٣١٥)

فتجب التضحية على حر مسلم مقيم موسر. (تنوير الأبصار مع الدر، كراچی ٦/ ٣١٢، زكريا ٩/ ٤٥٢-٤٥٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍محرم الحرام ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۹۵۴)

باپ بیٹے کا مال مشترک ہو تو قربانی کس پر؟

سوال [۹۹۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر باپ بیٹا ایک ہی میں ہوں، مال الگ الگ نہ ہو تو کیا اگر مال نصاب کی حد کو پہنچ جائے تو قربانی باپ بیٹے پر ہوگی یا صرف باپ پر یا بیٹے پر؟

المستفتی: جمیل احمد عفا اللہ عنہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ایسی صورت میں قربانی صرف باپ پر واجب

ہوگی، بیٹے پر نہیں، جبکہ بیٹے کے پاس باپ سے الگ کوئی مال بقدر نصاب نہیں ہے، البتہ باپ اپنی خوشی سے کردے تو بیٹے پر احسان اور تبرع ہوگا، کیونکہ سارے مال کا مالک باپ ہے۔

الأب و ابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيئ فالكسب كله للأب إن كان الإبن في عياله لكونه معيناً له . (شامی، کتاب الشركة، مطلب: اجتمعا في دار واحدة واكتسبا...... زكريا ٦/٢ ٥٠، كراچی ٣٢٥/٤، هنديه زكريا قديم ٣٢٩/٢، جديد ٣٣٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۰۷۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۰/۱۲/۲۹ھ

بیٹے باپ کے ساتھ کاروبار میں شریک ہوں تو بیٹوں پر قربانی واجب ہے یا نہیں؟

سوال [۹۹۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہم پانچ بھائی ہیں، تمام شادی شدہ ہیں، اور والدین کے ساتھ اکٹھا رہتے ہیں، تمام برادران جو کماتے ہیں والد صاحب کو دے دیتے ہیں، صرف جیب خرچ اپنے پاس رکھتے ہیں تو اس صورت میں ہم پر قربانی واجب ہوتی ہے یا نہیں؟ اب تک والدین اپنی قربانی کرتے ہیں اور ہم نہیں کرتے؛ لیکن اس دفعہ ہم شش و پنج میں پڑ گئے ہیں، کیونکہ، والد صاحب کے پاس تقریباً چالیس ہزار روپیہ کا سرمایہ ہے، برائے کرم از روئے شرع ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ والدین کا قربانی کرنا کافی ہے یا ہم بھی کریں؟ نیز ہمارے پاس سونا یا چاندی یا نقد روپیہ یا مال تجارت کچھ نہیں ہے، اور جو کچھ بھی ہے سب والد صاحب کی ملکیت میں ہے، تو ایسی صورت میں کیا حکم ہے؟

المستفتی: ضیاء الرحمٰن، سلیم مسجد چوہان نگر، دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب آپ لوگ اپنے والد کی فیملی میں ہیں اور جو کچھ سرمایہ ہے سب والد کی تحویل میں ہے، تو ایسی صورت میں سارے سرمایہ کے مالک والد

صاحب ہیں انہیں پر قربانی واجب ہوگی، آپ لوگوں پر واجب نہیں ہے۔

الأب و ابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيئ فالكسب كله للأب إن كان الإبن في عياله لكونه معينا له . (شامی، کتاب الشرکة، مطلب: اجتمعا في دار واحدة واكتسبا...... زکریا ۶/۲ ۵۰، کراچی ۳۲۵/۴، ھندیہ زکریا قدیم ۳۲۹/۲، جدید ۳۳۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ذی قعدہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۴۹۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۱۱/۱ھ

صاحب نصاب پر قربانی نہ کرنے کی وجہ سے کیا واجب ہے؟

سوال [۹۹۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید صاحب نصاب ہے اس پر قربانی کرنا واجب ہے، مگر اتنی استطاعت نہیں ہے کہ تنہا ایک جانور کی قربانی کر سکے، البتہ جانور میں ایک حصہ لے سکتا ہے، مگر باوجود کوشش کے جانور میں اس کو حصہ نہ مل سکا اور قربانی کرنے کے ایام ختم ہوگئے اور وہ قربانی کرنے سے محروم رہ گیا، اس صورت میں اس کا یہ واجب ازروئے شرع کس طرح ادا ہو؟ ازروئے شرع جواب سے مستفید فرمائیں۔

المستفتی: عزیز الرحمٰن، رحمٰن منزل محلّہ قانون، گویان مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر زید صاحب نصاب ہے اور ایام قربانی میں قربانی نہیں کی ہے تو اس پر سال بھر کی ایک بکری یا بکرے کی قیمت صدقہ کرنا لازم ہے۔

وتصدق بقيمتها غني شراها أو لا لتعلقها بذمته بشرائها أو لا فالمراد بالقيمة قيمة شاة تجزئ فيها. (الدر المختار، كتاب الأضحية، كراچی ۳۲۱/۶، زکریا ۴۶۵/۹)

إن كان من لم يضح غنياً ولم يوجب على نفسه شاة بعينه تصدق بقيمة الشاة اشترىٰ أو لم يشتر. (عالمگیری، کتاب الأضحية، الباب الرابع فيما

يتعلق بالمكان والزمان، زكريا قديم ٥/٢٩٦، جديد ٥/٣٤٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ رصفر المظفر ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/۲۱۳۶)

غیر موجود شخص کی طرف سے قربانی کرنا

سوال [۹۹۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے اپنے ساتھی سے کہا کہ تم جب قربانی کا جانور خریدو تو میرے لیے بھی دو حصہ اس میں رکھ لینا، اس کے ساتھی نے ایک جانور خرید لیا اور اپنے ساتھی کے لیے دو حصہ کی نیت کرلی، مگر جب جانور ذبح کیا گیا تو جس کے دو حصہ متعین کیے گئے تھے، وہ موجود نہیں تھا تو کیا اس غیر حاضر شخص کی جانب سے ان دو حصوں کی قربانی ادا ہوگی یا نہیں؟ تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: قاری محمد میاں جان محلّہ سرائے گیٹ رام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جی ہاں غیر موجود شخص کی جانب سے قربانی ہوجاتی ہے، جبکہ اس نے اجازت دے دی ہو۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۴/۳۳۲، جدید ڈابھیل ۱۷/۳۲۰)

ولو ذبح أضحية غيره عن المالك بغير أمره صريحا يقع عن المالك.

(هنديه، الباب السابع فی التضحية عن الغير، زكريا قديم ٥/ ٣٠٢، جديد ٥/٣٤٨، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/١٧٥، مصرى قديم ٢/ ٥٢٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ رصفر المظفر ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۱۱۲۸)

غلطی سے زید نے بکر کا جانور قربانی میں ذبح کردیا

سوال [۹۹۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: زید قربانی کے لیے ایک جانور خرید لایا اور بکر بھی قربانی کے لیے اپنا ایک جانور خرید لایا، نماز عیدالاضحیٰ کے بعد زید نے قصائی سے کہا: کہ میرے جانور کی قربانی کردو، قصائی نے زید کے جانور کے بجائے بکر کے جانور کی قربانی کردی، تو یہ کس کی طرف سے قربانی ہوگی، یا قربانی ہوئی ہی نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید اور بکر نے قربانی کے لیے ایک ایک جانور خریدا اور قصائی نے بعد نماز عیدالاضحیٰ غلطی سے زید کے جانور کے بجائے بکر کے جانور کی قربانی کردی تو یہ قربانی درست ہوجائے گی اور یہ قربانی بکر کی طرف سے ہوگی نہ کہ زید کی طرف سے اور یہ قصائی دلالۃً بکر کی طرف سے وکیل ہوگا۔ (مستفاد: محمودیہ ڈابھیل ۱۷/ ۴۹۹)

ولو غلط إثنان وذبح كل شاة صاحبه عن نفسه صح استحساناً فيكون كل واحد وكيلاً عن الآخر دلالةً. (در مختار مع الشامی، كتاب الأضحية، زكريا ۹/ ٤٧٦، كراچی ٦/ ٣٢٩)

ولو غلط و ذبح كل أضحية صاحبه صح ولا يضمنان، وهذا استحسان ووجهه أنه تعينت للذبح لتعينها للأضحية حتى وجب عليه أن يضحي بها بعينها في أيام النحر، يكره أن يبدل بها غيرها فصار المالك مستعيناً بمن يكون أهلا للذبح فصار مأذوناً له دلالة. (تبيين الحقائق، كتاب الأضحية، زكريا ٦/ ٤٨٧، امداديه ملتان ٦/ ٩)

ولو ذبح أضحية غيره بغير أمره جاز استحسانا للإذن دلالة. (مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ١٧٥، مصرى قديم ٢/ ٥٢٢)

رجل دعا قصاباً ليضحى له، فضحى القصاب عن نفسه فهو عن الآمر. (هنديه، الباب السابع فى التضحية عن الغير، زكريا قديم ٥/ ٣٠٣، جديد ٥/ ٣٤٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۲۰)

ناقص مکان اور وطن کا مکان حاجت اصلیہ میں داخل ہے یا نہیں؟

سوال [۹۹۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قربانی کے دو مسئلے قابل توجہ ہیں:

(۱) ایک شخص جائے ملازمت میں فیملی کے ساتھ ذاتی یا کرایہ یا آجر کے دیئے ہوئے مکان میں سکونت پذیر ہے، اور اس کا اپنے وطن میں بھی ایک ذاتی مکان ہے، اور وہ عید، بقرعید اور تعطیلات میں وہاں جا کر قیام بھی کرتا ہے، سال میں کئی بار سکونت کی ضرورت پیش آتی ہے۔

(۲) ایک شخص کرایہ کے مکان میں سکونت پذیر ہے، اس کا ذاتی مکان نہیں ہے، اس نے اپنی تنخواہ یا آمدنی میں سے کچھ رقم پس انداز کر کے ذاتی مکان تعمیر کرنے کے لیے پلاٹ خریدا، یا پلاٹ خرید کر کچھ تعمیر بھی کر دی، لیکن تعمیر ناقص ہے، وہ مکان قابل رہائش نہیں بنا ہے اور اس کے پاس کچھ رقم بھی نہیں ہے کہ باقی کام مکمل کر سکے، تو کیا پہلے مسئلے میں وطن کا مکان اور دوسرے مسئلے میں پلاٹ یا ناقص تعمیر کردہ مکان، حاجت اصلیہ میں داخل ہے یا نہیں؟ کیا وہ مانع اخذ زکوٰۃ اور موجب قربانی وصدقۂ فطر ہے؟ اور کیا اس کی وجہ سے استطاعتِ حج ثابت ہوگی؟

عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ حاجت اصلیہ میں صرف وہ چیزیں داخل ہیں جن کی انسان کو ضرورت ہو، اور زیر استعمال بھی ہوں، حالانکہ انسان کی بنیادی ضرورت کی چیزیں حاجات اصلیہ ہیں، خواہ ملکیت میں ہو یا نہ ہوں، پس اگر یہ ملکیت میں ہیں اور قابل استعمال بھی ہیں، تو ان کا زیر استعمال ہونا ضروری ہے، ورنہ عدم استعمال کی وجہ سے فاضل شمار ہوں گی، اور جن فقہی عبارات سے زیر استعمال ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے وہ صرف اسی صورت میں ہے، اور اگر یہ قابل استعمال نہیں ہیں، اور انسان ان کو قابل استعمال بنانے کی فکر اور کوشش میں ہے، تو بھی یہ حاجت اصلیہ میں داخل ہیں، فقہاء نے اس صورت سے کہیں تعرض نہیں کیا ہے، اور عدم تعرض کی وجہ آگے آرہی ہے، اور اگر ان کو یوں ہی چھوڑے رکھا ہے، ان کو قابل استعمال بنانے کی فکر اور کوشش نہیں کرتا ہے تو یہ فاضل شمار ہوں گی، اور اگر یہ چیزیں کسی کی ملکیت میں نہ ہوں، تو بھی یہ اس کی حاجات اصلیہ

ہیں، بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے ملکیت میں ان کے ہونے کی ضرورت ہے،لیکن ان کا حاجات اصلیہ میں سے ہونا حج،قربانی وصدقۂ فطر کے وجوب سے مانع نہ ہوگا، کیونکہ ابھی ان چیزوں میں رقم صرف نہیں ہوئی ہے،وہ چیزیں ملکیت میں موجودنہیں ہیں۔

ایک ضروری وضاحت

فقہاء نے ایک زائد مکان کوفاضل قراردے کراس کی قیمت کا غنامیں اعتبار کیا ہے۔

وما زاد على الدار الواحدة ...... يعتبر في الغنى. (بزازيه على الهندية ١/٢٢٧)

اور یہ فقہاء کے زمانہ کے عرف وعادت کے لحاظ سے ہے، کیونکہ ان کے زمانے میں جدید تیز رفتار ذرائع ابلاغ ومواصلات کے فقدان کی وجہ سے عام طور پرلوگ مستقل رہائش ایک ہی بستی یا شہر میں رکھتے تھے، اور دوسرے شہر میں تجارت یا اورکسی ضرورت سے جاتے تھےتو بحیثیت مسافر کے جاتے تھے، پھر جب ضرورت پوری ہو جاتی تھی ،تو وہاں سے کوچ کرکے اپنے وطن کی طرف لوٹ آتے تھے،اورکبھی ایسا ہوتا تھا کہ اپنے وطن کوترک کرکے کسی دوسری جگہ جاکرآباد ہوجاتے تھے،اس کووطن بنالیتے تھے،اپنے وطن سابق سے ایسا تعلق کہ سال کے درمیان آمد ورفت ہو،نہیں رکھتے تھے، پس جب فقہاء کے زمانہ میں عموماً سکونت ایک ہی شہر یابستی میں ہوتی تھی،توایک شہر میں رہائش کی ضرورت عادۃً ایک مکان سے پوری ہوجاتی ہے،ایک شہر میں عادتاًلوگ ایک ہی مکان میں رہتے ہیں،اگرمکان چھوٹا اورتنگ ہو، تو عموماً یہ کیا جاتا ہے کہ چھوٹے مکان کوفروخت کردیتے ہیں یا کرایہ پردے دیتے ہیں اور دوسرابڑامکان خریدتے ہیں، یا کرایہ پرلیتے ہیں،لیکن رہائش ایک ہی مکان میں رکھتے ہیں، چھوٹےاور بڑے دونوں مکان میں بیک وقت رہائش اختیارنہیں کرتے ہیں،فقہاء نے اپنے زمانے کے اسی عرف وعادت کے تناظر میں یہ بات کہی ہے کہ ایک سے زائدمکان فاضل ہے، چنانچہ المحیط البرہانی میں اس کی صراحت بھی موجود ہے:

ويعتبر ما زاد على الدار الواحدة في العادة. (المحيط البرهاني ٢/٢٨٥)

یہ عبارت تصریح کررہی ہے کہ ایک سے زائد مکان کو فاضل کہنا عادۃً عدم حاجت کی وجہ سے تھا، اس لیے نہیں کہ سکنیٰ کی ضرورت ہر شخص کے حق میں ایک مکان سے پوری ہو جاتی ہے، ایک سے زائد مکان کا بہر صورت فاضل نہ ہونا مسلم بھی ہے، جیسے کسی شخص کی دو بیویاں اور دو مکان ہیں، ہر بیوی کو ایک مکان میں ٹھہرایا ہے، تو سب دونوں مکان کو حاجت اصلیہ میں داخل مانتے ہیں۔

عرض کیا جا چکا ہے کہ پہلے زمانہ میں عام طور پر لوگ ایک ہی جگہ کو اپنی مستقل قیام گاہ بناتے تھے، لیکن موجودہ دور میں معاشی دوڑ دھوپ میں اضافہ، معاشی وسائل ومواقع کے پھیلاؤ اور ذرائع مواصلات میں ترقی کی وجہ سے ایک نئی صورت حال پیدا ہوگئی ہے کہ بہت سے لوگ ملازمت وغیرہ کے لیے اپنے وطن اصلی سے تعلق باقی رکھتے ہوئے کسی اور جگہ اقامت اختیار کر لیتے ہیں، اور ان کا سال کا زیادہ تر حصہ اسی مقام پر گذرتا ہے، عید، بقرعید اور تعطیلات میں اپنے وطن کی طرف جاتے ہیں، پھر لوٹ آتے ہیں، فقہاء نے قرآن وحدیث کو سامنے رکھتے ہوئے انسان کی جائے رہائش کی درجہ بندی کی ہے اور اسے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، وطن اصلی، وطن اقامت اور وطن سکنیٰ، اس کے باوجود عصر حاضر میں جائے ملازمت اور موضع ارتزاق کے وطن اقامت یا وطن اصلی میں داخل ہونے کے سلسلے میں دور حاضر کے اکابرین اور مفتیان کرام کے درمیان اختلاف خود یہ بتا رہا ہے کہ جائے ملازمت میں قیام کی نوعیت و حیثیت، وطن اقامت میں قیام کی نوعیت سے مختلف ہے، ورنہ یہ اختلاف نہ ہوتا۔

پہلا مسئلہ

اگر کوئی شخص جائے ملازمت میں فیملی کے ساتھ ذاتی یا کرایہ یا آجر کے دیے ہوئے مکان میں سکونت پذیر ہے، اس کا اپنے وطن میں بھی ایک ذاتی مکان ہے، اور وہ عید، بقرعید اور تعطیلات میں وہاں جا کر قیام کرتا ہے، سال میں کئی بار وطن میں جانے اور اپنے مکان میں سکونت کی ضرورت پیش آتی ہے، تو یہ دونوں مکان اس کی حاجت اصلیہ میں داخل ہوں گے، اگر اس کے پاس ان مکانات کے علاوہ دوسرا فاضل مال بقدر نصاب موجود نہیں ہے تو اس پر

نہ قربانی اور نہ صدقۂ فطر واجب ہے اور نہ حج فرض ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ فقہاء نے ''**فاضل عن سکناہ**'' اور ''**دار لایسکنہا**'' کو موجب قربانی وصدقہ فطر اور مانع اخذ زکوٰۃ قرار دیا ہے، بشرطیکہ اس کی قیمت بقدر نصاب ہو، اور فقہاء نے ایک سے زائد مکان کو جو فاضل کہا ہے وہ ان کے زمانہ کے عرف و عادت اور طرز معاشرت کی وجہ سے عدم حاجت کی بنا پر تھا، جیسا کہ اس کی تفصیل سابق میں گذر چکی ہے، کتب فقہ میں یہ صراحت موجود ہے، کہ فاضل وہ مکان ہے جس میں سکونت نہ کی جائے، اور جس میں آدمی رہتا ہے، جس مکان کی سکونت کے لیے ضرورت ہے، وہ حاجت اصلیہ میں داخل ہے۔

وإذا كان له دار لايسكنها ويؤاجرها أو لايؤاجرها يعتبر قيمتها في الغنىٰ وكذا إذا سكنها وفضل عن سكناه شيئ يعتبر فيه قيمة الفاضل في النصاب. (بزازیه على الهندية ۱/۲۲۷، جديد زكريا مطول ۱/۷۱)

ودار لايحتاج إلى سكنها فإن كان محتاجاً إلى ما ذكرنا حاجة أصلية فهو فقير يحل دفع الزكاة إليه. (فتح القدير زكريا ۲/۲٦٦، كوئٹه ۲/۲۰۲)

فلا تثبت الاستطاعة بدار يسكنها ...... وتثبت الاستطاعة بدار لايسكنها. (البحر الرائق ۲/۳۱۳)

فقہاء نے کہیں یہ تصریح نہیں کی ہے کہ کسی کے دو مکان ہوں اور دونوں میں رہائش کی ضرورت ہو، اور رہائش رکھتا بھی ہو، تو بھی دوسرا مکان حاجت اصلیہ سے زائد ہے، ہاں یہ صراحت موجود ہے کہ کسی کے دو مکان ہوں، ایک میں وہ سکونت پذیر ہے اور دوسرے میں سکونت نہیں کرتا، تو دوسرا مکان فاضل ہے۔

ولو كان له دار إن يسكن في إحداهما ولا يسكن في الأخرىٰ تعتبر قيمة الثانية. (مجمع الأنهر ۱/۳۲۹)

اسی طرح کا مسئلہ بزازیہ میں بھی ہے:

ولو كان في دار باجارة فاشترىٰ أرضاً بنصاب وبنى فيها منزلاً يسكنه لزمت. (بزازيه على الهندية ٦/۲۸۷، جديد زكريا مطول ۳/۱۵۵)

بزازیہ کے جزئیہ سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کرایہ کے مکان میں سکونت پذیر تھا اور اس کے پاس بقدر نصاب مال تھا جس سے زمین خرید کر سکونت کے لیے مکان بنایا، لیکن ابھی تک اس میں رہائش اختیار نہیں کی ہے، تو یہ مکان فاضل شمار ہوگا اور اس پر قربانی واجب ہوگی، کیونکہ مکان قابل استعمال ہونے کے باوجود زیر استعمال نہیں ہے، اور اگر کرایہ کا مکان ترک کر کے ذاتی بنائے ہوئے مکان میں سکونت پذیر ہو چکا ہے تو کوئی اس کو فاضل نہیں کہہ سکتا ہے۔

کسب معاش انسان کی بنیادی ضرورت ہے، اسی لیے اس کے تمام وسائل وذرائع خواہ کاشتکاری کے لیے بیل اور ہل ہوں یا دیگر پیشہ وروں کے آلات واوزار یا دوکان وغیرہ سب کو کسب معاش کی ضرورت کے تحت حاجت اصلیہ میں شمار کیا گیا ہے، عصر حاضر میں جائے ملازمت پر رہائش کے لیے مکان کا ہونا، کسب معاش کے لیے ضرورت کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، اور جائے ملازمت میں سکونت کی ضرورت، وطن کے مکان سے پوری نہیں ہوسکتی ہے، اور نہ وطن میں سکونت کی ضرورت جائے ملازمت کے مکان سے پوری ہوسکتی ہے اور وطن اصلی ترک کر کے موضع ملازمت کو وطن اصلی بنا دینا، نہ تو شرعاً ضروری ہے اور نہ ہی ہر ایک کے لیے آسان ہے، بلکہ اب تو وطن اصلی کو وطن بنائے رکھنا بچند وجوہ ضروری سا ہو گیا ہے، پس جب ملازم کو سال میں دو جگہوں میں سکونت کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت دو مکانوں ہی سے پوری ہوسکتی ہے، تو دونوں مکان حاجت اصلیہ میں داخل ہوں گے، اور کسی چیز کے حاجت اصلیہ میں داخل ہونے کے لیے اس کا پورے سال استعمال میں آنا بھی ضروری نہیں؛ بلکہ سال کے بعض حصے میں اس کی ضرورت پیش آنا اور استعمال میں آنا کافی ہے۔

ولو كان له دار فيها بيتان شتوى و صيفي و فرش شتوى و صيفي لم يكن بها غنياً. (الفتاویٰ الهندية زكريا قديم ٥/٢٩٣، زكريا جديد ٥/٣٣٨)

وحلت لمن له كسوة الشتاء لايحتاج إليها فى الصيف. (البحر الرائق كوئٹه ٢/٢٤٥، زكريا ٢/٤٢٧)

فاضلاً عن حاجته فى جميع السنة هٰكذا فى الزاهدى. (الفتاویٰ الهندية زكريا قديم ١/١٨٩، زكريا جديد مطول ١/٢٥١)

فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ حاجت اصلیہ میں تقدیر نہیں کہ اتنی مقدار مثلاً ایک مکان حاجت اصلیہ میں داخل ہو اور اس سے زائد بہر صورت خواہ سکونت کے لیے اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو، فاضل ہو، بلکہ کفایت کا اعتبار ہے۔

قال فی المراقی: والمعتبر فیها الکفایة لا التقدیر. (حاشیة الطحطاوی علی المراقي ص: ۷۲۳)

اس لیے جس کو سکونت کے لیے دو مکان کی ضرورت ہے اس کے لیے دو مکان بھی حاجت اصلیہ میں داخل ہوں گے، اور جس کو سکونت کے لیے ایک مکان کا کچھ حصہ کافی ہے، تو اس کے لیے ایک مکان کا باقی حصہ بھی فاضل ہوگا۔

ولو کان له دار واحدة وفضلت عن سکناه شیئ یعتبر الفاضل إن کانت قیمته نصاباً. (مجمع الأنهر ۱/۳۳٤)

نیز ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ کم سے کم مقدار جو حاجت پوری کرنے کے لیے انتہائی ناگزیر ہو، اتنی ہی مقدار حاجت اصلیہ میں داخل ہو، اور باقی فاضل ہو، بلکہ جتنی مقدار حاجت میں مشغول ہو، وہ سب حاجت اصلیہ میں داخل ہے۔

فلایعتبر فی الحاجة قدر ما لا بد منه. (بدائع الصنائع ۲/۲۹۸)

مذکورہ تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس مسئلہ میں دونوں مکان حاجت اصلیہ میں داخل ہیں، کسی کو فاضل قرار نہیں دیا جائے گا، لہٰذا مذکور شخص پر نہ قربانی واجب ہے اور نہ صدقۂ فطر، بشرطیکہ اس کے پاس دوسرا فاضل مال بقدر نصاب موجود نہ ہو، اور اس پر حج بھی فرض نہیں۔

دوسرا مسئلہ

اگر کوئی شخص کرایہ کے مکان میں سکونت پذیر ہے، اس کا ذاتی مکان نہیں ہے، اس نے اپنی تنخواہ یا آمدنی میں سے کچھ رقم پس انداز کی اور اس رقم سے مکان تعمیر کرنے کے لیے پلاٹ خریدا، یا پلاٹ خرید کر کچھ تعمیر بھی کردی، لیکن تعمیر ناقص ہے، وہ مکان قابل رہائش نہیں بنا ہے،

اور اس کے پاس مزید کچھ رقم بھی نہیں ہے کہ باقی کام مکمل کر سکے، تو کیا یہ پلاٹ یا ناقص تعمیر کردہ مکان جس کی قیمت نصاب سے زائد ہے، فاضل شمار کر کے موجب قربانی وصدقۂ فطر اور مانع اخذ زکوٰۃ قرار دیا جائے گا یا نہیں؟ اور کیا اس کی وجہ سے استطاعت حج ثابت ہوگی یا نہیں؟

اس کا جواب بھی ظاہر ہے کہ جب سکنیٰ انسان کی بنیادی ضرورت ہے، اور مذکورہ شخص نے پس انداز کردہ رقم اسی بنیادی ضرورت میں استعمال کی ہے، اس لیے یہ اس کی حاجت اصلیہ میں داخل ہے، رہ گیا یہ شبہ کہ کسی چیز کا حاجت اصلیہ میں داخل ہونے کے لیے اس کا زیر استعمال ہونا ضروری ہے، اور یہ زیر استعمال نہیں ہے، لہٰذا یہ حاجت اصلیہ میں داخل نہ ہونی چاہیے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی چیز کا قابل استعمال ہونے کے باوجود استعمال میں نہ آنا، اس کے حاجت اصلیہ میں داخل ہونے سے مانع ہے اور یہ اس کے فاضل ہونے کی علامت ہے، البتہ کسی ضروری چیز کا ناقابل استعمال ہونے کی وجہ سے استعمال میں نہ آنا، اس کے حاجت اصلیہ میں داخل ہونے سے مانع نہیں، اور نہ یہ اس کے فاضل ہونے کی علامت ہوسکتی ہے، کیونکہ زیر استعمال نہ ہونا، عدم حاجت کی وجہ سے نہیں، بلکہ مجبوراً نا قابل استعمال ہونے کی وجہ سے ہے، چنانچہ احسن الفتاویٰ میں غیر آباد زمین کے مانع اخذ زکوٰۃ ہونے کی تفصیل کے بارے میں فتویٰ موجود ہے:

سوال: ایک عیال دار عالم دین جو کہ دینی تعلیم کا کام لوجہ اللہ کرتا ہے اس کی زمین تو ہے، لیکن قابل کاشت جو حصہ ہے وہ نفقۂ عیال کے لیے کافی نہیں، ہاں مجموعہ زمین یعنی قابل کاشت وغیر قابل کاشت کی قیمت پندرہ بیس ہزار روپئے ہوجاتی ہے، آیا ایسے عالم دین کو زکوٰۃ لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: اگر غیر آباد زمین آباد ہونے کے بعد صرف بقدر کفایت ہی رہے گی تو زکوٰۃ لے سکتے ہیں اور اگر قدر کفایت سے زائد ہوگی اور زائد حصہ کی قیمت بقدر نصاب ہو، تو یہ مانع اخذ زکوٰۃ ہے۔ (احسن الفتاویٰ ۴/ ۲۹۶)

مذکورہ فتویٰ سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کا حاجت اصلیہ میں داخل ہونے کے لیے زیر استعمال ہونا اس وقت ضروری ہے جبکہ وہ قابل استعمال ہو، لیکن اگر کوئی ضروری چیز نا قابل

استعمال ہونے کی وجہ سے زیر استعمال نہ ہو، تو یہ حاجت اصلیہ میں داخل ہونے سے مانع نہیں ہے، جیسا کہ غیر آباد اور غیر قابل کاشت زمین کو جو فی الحال زیر استعمال نہیں، اور اس وقت اس سے ضرورت پوری نہیں ہو رہی ہے، اس کے باوجود اس کو حاجت اصلیہ میں شمار کیا ہے، بشرطیکہ آباد ہونے کے بعد بقدر کفایت رہے۔

اگر کسی شخص نے نقد رقم اپنی واقعی اور بنیادی ضرورت کی خاطر جمع کر رکھی ہے مثلاً: رہائش کا گھر نہیں ہے، ابھی اس ضرورت کی تکمیل ہونے نہ پائی تھی کہ اس سے پہلے اس پر سال پورا ہو جاتا ہے تو کیا اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟ اور یہ رقم حاجت اصلیہ میں شمار کی جائے گی، اس سلسلے میں فقہاء کے اقوال مختلف ہیں، محقق ابن نجیم شرح المجمع لابن الملک سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فإذا كان له دراهم مستحقة ليصرفها إلى تلك الحوائج صارت كالمعدومة ...... فقد صرح بأن من معه دراهم و أمسكها بنية صرفها إلى حاجته الأصلية لاتجب الزكاة إذا حال الحول وهي عنده. (البحر الرائق ۲/ ۲۰۶)

یہ قول مفتی بہ ہے یا نہیں؟ یہاں اس سے بحث مقصود نہیں، بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ جب بنیادی ضرورت کے لیے جو رقم جمع کر رکھی ہے، ابھی صرف بھی نہیں کی ہے، اس کو بھی بعض فقہاء نے حاجت اصلیہ میں شمار کیا ہے، پس اگر وہ رقم بنیادی ضرورت میں استعمال کر دی جائے تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے حاجت اصلیہ میں مشغول ہونے کے بارے میں کسی فقیہ کا اختلاف نہ رہے گا، چنانچہ جواہر الفقہ ۷/ ۷۰ پر فقہاء کرام کی بیان کردہ جزئیات کے پیش نظر دراہم و دنانیر کے حاجت اصلیہ میں مشغول ہونے کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ دراہم و دنانیر کو ایسی چیز میں صرف کیا جائے جو انسان کی بنیادی ضرورت کے کام آتی ہے، اور ظاہر ہے کہ مکان انسان کی بنیادی ضرورت سکنیٰ کے کام آتا ہے؛ لہٰذا اس میں صرف کردہ رقم بھی حاجت اصلیہ میں مشغول ہے۔

ذاتی مکان کا ہونا انسان کی بنیادی ضرورت ہے

انسان اپنے معاش میں کچھ بنیادی ضرورتوں یعنی روٹی، کپڑا، رہائشی مکان، گھریلو

سامان، سواری، خادم وغیرہ کا محتاج ہوتا ہے، جن کے بغیر زندگی گذارنا دشوار ہے، فقہاء نے ان ہی چیزوں کو جن سے انسان کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، حاجات اصلیہ قرار دیا ہے۔

لأن هذه الأشياء من الحوائج اللازمة التى لابد للإنسان منها.

(شامی، کتاب الزکاة ۳/۲٦٦)

ان کو حاجت اصلیہ میں داخل کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اگر یہ چیزیں کسی کی ملکیت میں موجود ہوں اور زیر استعمال ہوں، تو ان کی قیمت خواہ کتنی ہی ہو اس کی وجہ سے وہ غنا ثابت نہ ہوگا جس کی وجہ سے زکوٰۃ لینا حرام اور قربانی وصدقۂ فطر واجب ہوتا ہے اور نہ ہی ان کی قیمت کی وجہ سے استطاعت حج ثابت ہوگی، اگر یہ چیزیں ملکیت کی نہ ہوں بلکہ اجارہ یا اعارہ کی ہوں، تو ان کو حاجت اصلیہ میں داخل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ جب یہ شخص ان کا مالک ہی نہیں ہے، تو ان کی قیمت کی وجہ سے غنا حرمت اخذ زکوٰۃ اور غنا موجب قربانی و صدقہ فطر وغیرہ کے ثابت ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے، کہ ان کو حاجت اصلیہ میں داخل کرنے کی ضرورت پیش آئے، رہ گیا کرایہ تو اگر وہ واجب ہو چکا ہے تو وہ دین میں داخل ہے، اور رہ گیا یہ شبہ کہ اجارہ اور اعارہ کے مکان کو حاجت اصلیہ میں داخل کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے دوسرے ذاتی مکان کا فاضل ہونا ثابت ہوگا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ دوسرے ذاتی مکان کا فاضل ہونا، اجارہ یا اعارہ کے مکان کی وجہ سے نہیں، بلکہ صرف عدم سکونت کی وجہ سے ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ کتب فقہ میں جا بجا اس کی تصریح موجود ہے۔

بس کیا یہ ممکن ہے کہ بنیادی ضرورت کی چیزیں اگر کسی کی ملکیت میں موجود ہوں، تو ان کا ہونا تو اس شخص کے لیے ضروری ہو اور وہ اس کی حاجت اصلیہ میں داخل ہوں، اور اگر یہ چیزیں اسی شخص کی ملکیت میں موجود نہ ہوں اور وہ ان کی تحصیل کے لیے رقم صرف کرتا ہے تو جب تک وہ چیزیں قابل استعمال بن کر اس کے زیر استعمال نہ آجائیں، تب تک وہ چیزیں اس کے لیے ضروری نہ ہوں اور اس کی حاجت اصلیہ میں داخل نہ ہوں؟ ہرگز نہیں، حاصل یہ کہ حاجت اصلیہ کے ذیل میں ذکر کردہ چیزوں سے ذاتی اور ملکیت کی چیزیں مراد ہیں، پس ذاتی رہائش کا مکان

ہونا انسان کی بنیادی ضرورت ہے، اب ظاہر ہے کہ جب تک کسی شخص کا ذاتی مکان نہ بن جائے تب تک مجبوراً وہ کسی نہ کسی مکان میں سکونت اختیار کرے گا اور مجبوراً اجارہ یا اعارہ کے مکان میں سکونت پذیر ہونے سے سکونت کی ضرورت کا پورا ہونا نہیں کہا جا سکتا ہے، کیونکہ سکنیٰ انسان کی بنیادی اور دائمی ضرورت ہے جس کے لیے ذاتی مکان کی حاجت ہے، لہٰذا اگر کسی شخص کا ذاتی مکان نہیں ہے، اور وہ اس کی تعمیر میں رقم صرف کرتا ہے تو وہ رقم بھی حاجت اصلیہ میں مشغول ہے، اگر چہ وہ فی الحال قابل استعمال نہ بنا ہو، کیونکہ جب اس کو قابل استعمال بنائے گا تب ہی تو استعمال کر سکے گا، اس سے پہلے کیسے استعمال کر سکتا ہے؟ محض عدم استعمال کی وجہ سے اس کو حاجت اصلیہ سے خارج کر دینا دانش مندی نہیں ہے، بلا شبہ فقہاء نے حاجت اصلیہ میں داخل اشیاء کو عدم استعمال کی وجہ سے فاضل قرار دیا ہے، لیکن وہ اسی وقت ہے جبکہ وہ قابل استعمال ہوں، جیسا کہ اس کا حوالہ ''ایک شبہ کا ازالہ'' کے عنوان کے تحت آ رہا ہے۔

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ فقہاء نے حاجت اصلیہ کے ذیل میں جن چیزوں کا تذکرہ کیا ہے، ان میں مکان کے علاوہ باقی سب چیزیں بنی بنائی تیار قابل استعمال مل جاتی ہیں، اور اکثر لوگ بھی تیار ہی خریدتے ہیں، اگر کوئی ان کو بذات خود بنائے، تو بھی زیادہ وقت درکار نہیں، حاجت اصلیہ میں مکان ایسی چیز ہے جس کو لوگ تیار بھی خریدتے ہیں اور اکثر خود بھی بنواتے ہیں، فقہاء کے زمانہ میں چونکہ طرز معاشرت سادہ تھا، اس لیے ان کے مکان بھی عموماً کچے اور سادہ ہوتے تھے، مکان کی تعمیر کے لیے کچھ دن یا مہینہ کافی ہو جایا کرتا تھا، کیونکہ پانی کی لائن، گٹر لائن، اور لائٹ فٹنگ وغیرہ کئی جھمیلے تھے ہی نہیں جو آج مکان کا ایک ضروری حصہ بن چکے ہیں، لہٰذا مکان کی تعمیر کے لیے سال دو سال کی لمبی مدت درکار نہیں ہوتی تھی جیسا کہ اب درکار ہے، اسی لیے فقہاء نے اس مسئلہ سے کہیں تعرض ہی نہیں کیا ہے کہ اگر کسی شخص کا ذاتی مکان نہیں ہے اور وہ کرایہ کے مکان میں سکونت پذیر ہے اور اس نے ذاتی مکان کی تعمیر شروع کی، لیکن ابھی وہ قابل سکونت نہیں بنا ہے، اور قربانی، عید الفطر یا حج کا وقت آ گیا، تو یہ حاجت اصلیہ میں داخل ہوگا یا فاضل شمار ہوگا؟ عصر حاضر میں مہنگائی، معاشرت اور طرز تعمیر

کے پیش نظر مکان تعمیر کرنا پیسوں کا پانی کرنے کے مترادف ہے، بلکہ پیسوں کا پانی کردینے کے باوجود معمار اور مزدوروں کی بدعنوانیوں، وعدہ خلافیوں اور وقت پر کام نہ کرنے کی وجہ سے آنکھوں میں پانی آجاتا ہے، اور اپنی مٹی پلید ہوجاتی ہے، مزدوری پیٹ بھر کر لینے کے باوجود اس شان سے کام کرتے ہیں کہ گویا مفت میں کام کرکے ہم پر احسان کررہے ہیں، ہفتے کا کام مہینے میں اور مہینے کا کام کئی مہینوں میں مشکل سے پورا کرتے ہیں، آج کل پیسے والوں کو مکان بناتے بناتے کم از کم سال تو لگ ہی جاتا ہے، تو وہ ملازم اور قلیل آمدنی والا طبقہ جس کو مکان بنانے کے لیے پیسوں کا پانی کرنے سے پہلے خون کا پانی کرنا ہوتا ہے اور کما کما کر کچھ رقم پس انداز کرکے مکان بنانا پڑتا ہے، اگر اس کو مکان بناتے بناتے دو تین سال بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت بیت جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں، اس مدت میں پلاٹ یا ناقص تعمیر کردہ مکان کو فاضل قرار دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ طبقہ اس کو فروخت کرکے حج کرلے، مکان نہ بنائے، کیونکہ اس طبقہ کی اکثریت اپنی زندگی میں دونوں کی استطاعت نہیں رکھتی ہے۔

کیا کرایہ کے مکان سے سکونت کی ضرورت پوری ہوجاتی ہے؟

کرایہ کے مکان میں سکونت پذیر ہونے والے کے بارے میں یہ کہنا کہ کرایہ کے مکان سے اس کی سکونت کی ضرورت پوری ہوچکی ہے، اب سکونت کے لیے ذاتی مکان کی حاجت نہیں، لہٰذا ذاتی مکان تعمیر کرنے کے لیے خریدا ہوا پلاٹ یا ناقص تعمیر کردہ مکان اس کی حاجت اصلیہ سے زائد ہے، نہ تو درست ہے اور نہ ہی فقہی عبارت سے اس کی تائید ہوتی ہے، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جیسے خادم اور سواری حاجت اصلیہ میں داخل ہیں، پس اگر کسی شخص کے پاس خادم رکھنے اور سواری خریدنے کے لیے روپئے نہ ہوں جس کی وجہ سے بجائے خادم کے خود کام کرتا ہے اور سواری نہ ہونے کی وجہ سے پیدل چل کر اپنی حاجتیں پوری کرتا ہے، تو اس شخص کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کی ضرورت خود کام کرنے اور پیدل چل کر کام کرنے سے پوری ہورہی ہے؛ لہٰذا اب اس کو خادم اور سواری کی ضرورت نہیں ہے، درست نہیں۔ کیونکہ یہ

شخص بدرجۂ مجبوری خادم اور سواری نہ ہونے کی وجہ سے مشقت برداشت کرکے اپنا کام چلا رہا ہے، اس کو ضرورت کا پورا ہونا نہیں کہا جاسکتا ہے، اسی طرح کرایہ کے مکان میں سکونت پذیر ہونے والا بدرجۂ مجبوری ذاتی مکان نہ ہونے کی وجہ سے بہ مشقت بادل ناخواستہ کرایہ کے مکان میں رہ رہا ہے، اس کو سکونت کی ضرورت کا پورا ہونا نہیں کہا جاسکتا ہے، بلکہ ابھی بھی اس کو سکونت کے لیے ذاتی مکان کی ضرورت ہے، کیونکہ ذاتی مکان میں جو بےفکری، فارغ البالی اور چین وسکون حاصل ہوتا ہے وہ کرایہ کے مکان میں کہاں میسر ہوسکتا ہے؟ کرایہ کے مکان میں دن گذارنے والا قرار وفرار کی حالت کے درمیان دائر رہتا ہے۔

جو ٹوٹی ہوئی جھونپڑی بےدخل ہو ☆ بھلی اس محل سے جہاں کچھ دخل ہو

اسی لیے وہ اس عرصہ میں اپنے دل میں ضیق اور تنگی محسوس کرتا ہے اور صحیح معنی میں ہر وقت اس فکر میں غرق رہتا ہے کہ کسی طرح میرا ذاتی مکان بن جائے، تاکہ دردر پھرنے کی مصیبت اور محتاجی کی زندگی سے نجات مل جائے، چنانچہ وہ اپنی حاجت اصلیہ یعنی روٹی کپڑا وغیرہ میں بھی تنگی و ترشی کے ساتھ گذر بسر کرکے ذاتی مکان بنانے کے لیے اپنی تنخواہ یا آمدنی سے ہر ماہ کچھ رقم پس انداز کرتا ہے اور ذاتی مکان کی تعمیر میں صرف کرتا ہے اور جب تک ذاتی مکان بنا کر اس میں سکونت پذیر نہیں ہو جاتا ہے تب تک سکون کا سانس نہیں لیتا ہے، گویا وہ خود بھی کرایہ کے مکان سے سکونت کی ضرورت ہوجانے کے حق میں نہیں ہے، حاجت اصلیہ میں حاجت کا بروقت موجود ہونا ضروری ہے، اور کرایہ کے مکان میں سکونت پذیر ہونے والا ذاتی مکان اس لیے نہیں بنارہا ہے کہ آئندہ کسی زمانہ میں اگر کرایہ کا مکان نہ ملے تو رہائش کے کام آئے گا، بلکہ وہ اس لیے بنارہا ہے کہ ذاتی مکان بنتے ہی کرایہ کا مکان ترک کرکے اس میں سکونت پذیر ہوجائے تاکہ دردر پھرنے کی مصیبت سے نجات مل جائے اور وہ چین وسکون حاصل ہوجائے جو کرایہ کے مکان میں میسر نہیں، اگر ذاتی مکان آج تیار ہوجائے تو آج ہی اس میں سکونت پذیر ہوجائے، لہٰذا ذاتی مکان کی حاجت بروقت موجود ہے، جب انسان اپنی بنیادی ضرورت سکنیٰ کے بارے میں بےفکر ہوجائے تو کہا جائے گا کہ اس کی سکنیٰ کی ضرورت پوری ہوگئی، حالانکہ کرایہ کے مکان میں سکونت پذیر

ہونے والا اپنی بنیادی حاجت سکنیٰ کے بارے میں صحیح معنی میں ہر وقت متفکر رہتا ہے، بلکہ عملی طور پر بھی ہر ممکن کوشش کرتا ہے، ملازم اور مزدور طبقہ کی اکثریت ایسی ہے جو مرحلہ وار کئی قسطوں میں زندگی بھر میں خدا خدا کر کے بہ مشکل ایک مکان تعمیر کر پاتی ہے، اب ظاہر ہے کہ وہ ملازم جس کی تنخواہ چار پانچ ہزار روپئے کے قریب ہے، کئی کی تو اتنی بھی نہیں ہوتی، چند ماہ میں مکان کھڑا کر دینا اس کے بس میں نہیں، لہٰذا جب کچھ رقم جمع ہو جائے گی تو پلاٹ خریدے گا، پھر کچھ رقم جمع ہوگی تو بنیادیں رکھے گا، اور دیواریں کھڑی کرے گا، پھر کچھ رقم جمع ہونے پر چھت ڈالے گا۔

بسا اوقات مکان کی تعمیر مکمل کرتے کرتے کئی سال گذر جاتے ہیں، اس مدت میں اس کو اگر فاضل ہی قرار دیا جائے تو اس پر قربانی وصدقہ فطر واجب ہوگا، انتہائی پریشانی میں ہونے کے باوجود مستحق زکوٰۃ بھی نہ ہو سکے گا، بلکہ حج بھی فرض ہو جائے گا، اس کو فروخت کر کے حج کرنا لازم ہوگا، پس اگر یہ غریب اپنی اس کل کائنات کو فروخت کر کے حج کا فریضہ ادا کر لے، تو اس کا مکان بنانے کا خواب تو ادھورا ہی رہ جائے گا اور اپنی باقی زندگی میں دوبارہ مکان بنانے کی سکت نہ رکھ سکے گا، اور زندگی بھر مکان بنانے کی فکر اس کو ستاتی رہے گی اور مکان بنانے کی حسرت دل میں لے کر قبر میں چلا جائے گا، اور اگر اس کو فروخت کر کے حج نہ کرے تو حج نہ کرنے کے وبال کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوگا۔

کرایہ کے مکان میں در در پھرنے میں جو پریشانی اور مصیبت ہے اس کا صحیح اندازہ اسی شخص کو ہوسکتا ہے جو اس مصیبت سے دوچار رہے، یا رہ چکا ہے، اب تو حال یہ ہوگیا ہے کہ بڑے شہروں کو تو چھوڑیئے چھوٹے دیہاتوں میں بھی کرایہ کا مکان ملنا مشکل ہو رہا ہے، اور جب مالک کرایہ کا مکان خالی کرواتا ہے تو کرایہ دار کے پیروں تلے سے زمین کھسک جاتی ہے اور بے چارہ دوسرے مکان کی جستجو میں لوگوں کی خوشامد کرتا ہوا مارا مارا پھرتا ہے، پھر مکان کا پورا اثاثہ ادھر سے ادھر کرنا یہ بھی دردسر ہے، بالخصوص جبکہ حاجت اصلیہ میں حاجت اور استعمال سے مراد اضطراری نہیں، بلکہ نفس حاجت ہے، تو کیا ان افکارِ پریشان اور حالات کے باوجود یہ کہنا درست ہوسکتا ہے کہ کرایہ کے مکان سے سکونت کی ضرورت پوری ہو جاتی

ہے، ذاتی مکان کی ضرورت نہیں، اس لیے ذاتی مکان بنانے کے لیے خریدا ہوا پلاٹ یا ناقص تعمیر کردہ مکان اس کی حاجت اصلیہ سے زائد ہے؟ جبکہ سکونت کی ضرورت کا کرایہ کے مکان سے پورا ہوجانا اور اب ذاتی مکان کی تعمیر کا فاضل ہونا، اسی طرح کسی ضروری چیز کا حاجت اصلیہ میں داخل ہونے کے لیے اس کا بہر صورت (قابل استعمال ہو یا نہ ہو) زیر استعمال ہونا کسی فقہی عبارت سے ثابت بھی نہیں، ہاں قابل استعمال ہونے کی صورت میں بلاشبہ زیر استعمال ہونا ضروری ہے، البتہ اگر کوئی شخص ذاتی مکان بنانے پر قادر ہے، اس کے باوجود ذاتی مکان نہیں بناتا ہے، اپنی آمدنی ذاتی مکان کی تعمیر میں صرف نہیں کرتا ہے بلکہ بہ رضا ورغبت کرایہ کے مکان میں سکونت پذیر ہے، تو ایسے شخص کے بارے میں یہ کہنا بجاہے کہ کرایہ کے مکان سے اس کی سکونت کی ضرورت پوری ہوچکی ہے ورنہ ذاتی مکان کے بارے میں متفکر ہوتا، اور اپنی آمدنی اس میں صرف کرتا، جیسے ذاتی مکان ہونے کے باوجود اس میں سکونت اختیار نہ کرنا عدم حاجت کی علامت ہے، لیکن ہر کرایہ دار پر یہ تیر چلانا کہ کرایہ کے مکان سے اس کی سکنیٰ کی ضرورت پوری ہوچکی ہے درست نہیں ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

مکان بنانے کے لیے خریدے ہوئے پلاٹ یا ناقص تعمیر کردہ مکان کے فاضل ہونے کے سلسلے میں بزازیہ کے ایک جزئیہ سے شبہ پیدا ہوسکتا ہے اور وہ جزئیہ یہ ہے:

ولو كان في دار بإجارة فاشترىٰ أرضاً بنصاب و بنى فيها منزلاً يسكنه لزمت. (بزازيه على الهندية ٦/٢٨٧)

اس جزئیہ میں ذاتی مکان کے فاضل ہونے کے سلسلے میں دو احتمال ہیں:

(۱) پہلا احتمال یہ ہے کہ ذاتی مکان کے فاضل ہونے کی وجہ اجارہ کے مکان سے سکونت کی ضرورت پوری ہوجانا ہے۔

(۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ ذاتی مکان کے فاضل ہونے کی وجہ قابل سکونت ہونے کے

باوجود عدم سکونت ہے، یعنی جب ذاتی مکان قابل رہائش بن چکا ہے اس کے باوجود اس کو استعمال نہ کرنا اور کرایہ کے مکان ہی میں سکونت پذیر رہنا، اس کے فاضل ہونے کی علامت ہے، اب سوال یہ ہے کہ یہاں کون سا احتمال مراد ہے؟ اور فاضل ہونے کی کون سی وجہ درست ہے؟

تو اس کا جواب یہی ہوسکتا ہے کہ فقہی عبارت سے جس احتمال اور وجہ کی تائید ہوتی ہو وہی احتمال مراد اور وجہ درست ہے، اور فقہی عبارت سے پہلے احتمال کی تائید نہیں ہوتی ہے، کسی جزئیہ سے سکونت کی ضرورت کا کرایہ کے مکان سے پورا ہوجانا اور ذاتی مکان کا اس کی وجہ سے فاضل ہونا ثابت نہیں، لہٰذا پہلا احتمال مراد نہیں ہوسکتا ہے، البتہ دوسرے احتمال کی فقہی عبارات سے تائید ہوتی ہے، اس لیے دوسرا احتمال اور وجہ ہی درست ہے، چنانچہ بدائع الصنائع میں ہے:

وذكر ابن شجاع أنه إذا كانت له دار لايسكنها ولايؤاجرها ومتاع لا يمتهنه وعبد لايستخدمه وجب عليه أن يبيعه ويحج به وحرم عليه أخذ الزكاة إذا بلغ نصاباً لأنه إذا كان كذٰلك كان فاضلاً عن حاجته. (بدائع الصنائع ۲/۲۹۸)

اس عبارت سے دو باتیں معلوم ہوئیں: (۱) اس عبارت میں ذاتی مکان کے فاضل ہونے کی وجہ، عدم سکونت بتائی ہے، نہ کہ سکونت کی ضرورت کا اجارہ یا اعارہ یا اور کسی مکان سے پورا ہوجانا، حالانکہ دار غیر مسکونہ کا مالک کسی نہ کسی مکان میں سکونت پذیر ہوگا۔

(۲) فقہاء نے کوئی بھی ضروری چیز جو قابل استعمال ہے اس کے زیر استعمال نہ ہونے کو فاضل ہونے کی علامت قرار دیا ہے، چنانچہ فتاویٰ رحیمیہ میں بھی اس کے متعلق فتویٰ موجود ہے:

سوال: جس کے پاس ایک ہی مکان ہو، لیکن اس میں خود نہیں رہتا ہے کرایہ پر دے رکھا ہے اور وہ خود کرایہ کے گھر میں رہتا ہے، تو قربانی کے متعلق مالداری میں اس گھر کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا؟

جواب: اپنا گھر چاہے کرایہ پر دیا ہو یا مفت یا خالی پڑا ہو، اور خود دوسرے مکان میں کرایہ پر رہتا ہے یا مفت، ہر ایک صورت میں قربانی اور فطرہ کے متعلق مالداری میں اس مکان کی قیمت کا اعتبار ہوگا، کیونکہ یہ مکان فی الحال حاجت اصلیہ سے زائد ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ بترتیب جدید ۱۰/۲۳۱)

لہٰذا اگر کوئی ضروری چیز قابل استعمال نہ ہونے کی وجہ سے زیر استعمال نہ ہو، تو اس کو فاضل نہیں کہا جاسکتا ہے، کیونکہ استعمال میں نہ آنا عدم حاجت کی وجہ سے نہیں، بلکہ مجبوراً نا قابل استعمال ہونے کی وجہ سے ہے، پس اس کے استعمال میں نہ آنے کو فاضل ہونے کی علامت کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ جبکہ استعمال میں نہ آنے کی معتبر وجہ (نا قابل استعمال ہونا) موجود ہے۔

خلاصہ بحث

سکونت کی ضرورت کا ایک مکان سے پورا ہوجانا اور ایک سے زائد مکان کا بہر صورت خواہ سکونت کے لیے اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو، فاضل ہونا، اسی طرح سکونت کی ضرورت کا کرایہ کے مکان سے پورا ہو جانا، اور ذاتی مکان کے لیے خریدے ہوئے پلاٹ یا ناقص تعمیر کردہ مکان کا فاضل ہونا کسی فقہی عبارت سے ثابت نہیں، بلکہ اس کے فاضل نہ ہونے کی تائید فقہی عبارات سے ہوتی ہے، بالخصوص جبکہ حاجت اصلیہ میں حاجت سے مراد اضطراری نہیں، بلکہ نفس حاجت ہے، وجوب اضحیہ کا مدار چونکہ قدرت ممکنہ پر ہے، اس لیے جس طرح اس میں زیادہ توسیع منشاء شارع اور تصریحات فقہاء کے خلاف ہے، اسی طرح حاجت اصلیہ میں داخل اشیاء کو فاضل قرار دینا بھی منشاء شارع اور تصریحاتِ فقہاء کے مطابق نہیں، افراط وتفریط سے بچ کر راہِ اعتدال پر گامزن ہونا ضروری ہے، حاصل یہ ہے کہ پہلے مسئلے میں وطن کا مکان بھی اور دوسرے مسئلے میں مکان بنانے کے لیے خریدا ہوا پلاٹ یا ناقص تعمیر کردہ مکان بھی حاجت اصلیہ میں داخل ہے، لہٰذا مذکورہ شخص کے پاس اس کے علاوہ بقدر نصاب فاضل مال موجود نہ ہو، تو اس پر قربانی وصدقہ فطر واجب نہیں، اور حج بھی فرض نہیں، بلکہ وہ مستحق زکوٰۃ ہے۔

تنبیہ

ممکن ہے کہ اس مضمون سے کچھ لوگ اپنا مکان زکوٰۃ کی رقم سے عمدہ سے عمدہ بنانے کا جواز سمجھ لیں، اس لیے اس کا سد باب ضروری ہے، تو اس سلسلے میں دو باتیں عرض ہیں:

(۱) مستحقین زکوٰۃ کو یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ شریعت نے مفت خوری، گدا گری اور سوال کرنے کی مذمت بیان کرکے ہاتھ کی کمائی کھانے اور خود کفیل بننے کا حکم، بلکہ دوسروں کے پاس سے لینے والا بننے کے بجائے خود دینے والا بننے کی فضیلت بیان فرمائی ہے، اور زکوٰۃ کو مال کا میل بتایا ہے، لہٰذا زکوٰۃ کا مال بوقت ضرورت بقدر ضرورت ہی اپنی حاجت روائی میں صرف کرنا چاہیے، زکوٰۃ کی رقم سے اگر کوئی محتاج اپنا مکان اعتدال کے ساتھ بنائے تو کوئی بری بات نہیں، لیکن زکوٰۃ وصول کرکر کے بے محابا تعمیر میں صرف کرنا اور شاہانہ خرچ کرکے مالداروں کے مکانوں جیسا عالیشان مکان تعمیر کرنا بے مروتی اور بے غیرتی ہے، اس سے احتراز چاہیے۔

(۲) معطین زکوٰۃ اس بے اعتدالی کا تنہا ایک ہاتھ سے سد باب کر سکتے ہیں اور یہ ان کی ذمہ داری بھی بنتی ہے، اور وہ اس طرح کہ کفایت شعار واقعی ضرورت مندوں ہی کو زکوٰۃ دیں، تاکہ مقصدِ زکوٰۃ کی تکمیل کے ساتھ ساتھ خود بھی زیادہ اجر وثواب کے مستحق ہوں، نیز مال زکوٰۃ سے شاہانہ خرچ بے جا صرف اور بے اعتدالیاں جیسی برائیوں کا بآسانی سد باب بھی ہو جائے۔

لیکن کچھ لوگوں کی بے اعتدالیوں کے سد باب کے لیے یہ تو نہیں کیا جا سکتا ہے کہ واقعی مستحقین زکوٰۃ کی ایک بڑی تعداد کو ہی غیر مستحق قرار دے دیا جائے، بلکہ ان پر حج، قربانی وصدقہ فطر بھی واجب کر دیا جائے، ورنہ بڑی تعداد حرج میں مبتلا ہو جائے گی، جبکہ اس کا بآسانی سد باب ممکن بھی ہے۔ (کمامر)

هذا ما ظهر لي إلى الآن، والله تعالىٰ اعلم بالصواب

احقر محمد سلمان قاسمی پالنپوری

مفتی مدرسہ جامعہ خلیلیہ ماہی شمالی گجرات

حضرت مولانا مفتی محمد سلمان صاحب پالن پوری .... مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آنجناب کی ارساد کردہ تحریر جو دس صفحہ پر مشتمل ہے، موصول ہوئی اور اس دس صفحہ پر مختصر سے دو مسئلے ہیں: (۱) کوئی ملازم شخص جائے ملازمت میں فیملی کے ساتھ ذاتی یا کرائے کے مکان

یا کسی کے مفت دیئے ہوئے مکان میں رہائش اختیار کرتا ہواور اس کا ذاتی مکان اپنے وطن میں ہوتوایسی صورت میں اس کے وطن اصلی کا مکان حاجت اصلیہ سے فاضل سمجھا جائے گا یا نہیں؟

(۲) ایک شخص کرائے کے مکان میں رہتا ہواور اس کا ذاتی کوئی مکان نہ ہواور اس نے اپنی تنخواہ سے یا کسی طرح کی آمدنی کے پیسہ سے ذاتی مکان کی غرض سے پلاٹ خرید کر ڈال دیا ہو یا اس پلاٹ میں ناقص تعمیر کردی ہو جو ابھی قابل رہائش نہیں ہے، دونوں مسئلوں سے متعلق جناب والا کا دس صفحہ پر تحریر کردہ جواب پڑھا گیا ہے جس میں تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹہ صرف ہوا، حالانکہ دونوں مسئلوں کا جواب ایک صفحہ کے اندر آسانی کے ساتھ ہضم کر سکتے ہیں، اس لیے جناب والا سے گذارش ہے کہ آئندہ اگر تحریر بھیجیں تو اس کا خلاصہ اور حاصل لکھ کر روانہ فرمائیں، جو ایک ڈیڑھ صفحہ سے زائد نہ ہو، اس لیے کہ ہمارے یہاں ناقل فتاویٰ کو مکمل نقل کرنا پڑتا ہے، آنجناب کی تحریر تین چار گھنٹہ میں بھی مشکل سے نقل ہوسکتی ہے، اس لیے ہمارے دار الافتاء میں مفتیان کرام کے درمیان مشورہ ہوا ہے کہ آنجناب سے گذارش کی جائے کہ اتنی لمبی تحریر جس میں ضرورت سے زائد مثالیں اور نظائر لکھی جاتی ہیں نہ بھیجا کریں، اس لیے کہ یہاں کے دار الافتاء میں ہر وقت استفتاء اور سوالات کا ہجوم رہتا ہے، نہ مفتیوں کے پاس اتنی لمبی تحریر پڑھنے کا وقت ہوتا ہے اور نہ ہی نقل کرنے والے اتنی لمبی تحریر رجسٹر میں نقل کر سکتے ہیں، اس لیے بار بار گذارش ہے کہ اتنی طویل تحریر روانہ کرنے کی زحمت نہ فرمائیں۔

اب اس کے بعد آنجناب کی تحریر سے متعلق ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے مسئلے میں اس کے وطن کا مکان حاجت اصلیہ میں شامل ہے، حاجت اصلیہ سے فاضل نہیں ہے، اور اسی طرح دوسرے مسئلے میں بھی خریدا ہوا پلاٹ یا ناقص تعمیر کردہ پلاٹ حاجت اصلیہ سے فاضل نہیں ہے، وہ بھی حاجت اصلیہ میں داخل ہے، لہٰذا دونوں شخص اگر ایسے ہیں کہ ان کے پاس وطن کے مکان یا ناقص تعمیر شدہ مکان کے علاوہ بقدر نصاب مال نہیں ہے تو ان پر قربانی اور صدقہ فطر واجب نہیں ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍شعبان المعظم ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۲/۱۰۱۷۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۸/۸ھ

صاحب نصاب ہونے کے لیے کیا کاشت کی زمین کا اعتبار ہے؟

سوال [۹۹۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) اگر کسی کے پاس رہائشی مکان کے علاوہ ایک اور بھی مکان ہے، جس کو بچوں کی شادی کے بعد ان کی ملک میں دے دینا ہے، مگر ابھی خالی پڑا ہوا ہے؟

(۲) ایسے ہی کاشت کار کے پاس دو بیگہ کاشت کی آراضی ہے جس کی قیمت دس بارہ ہزار روپئے، اس وقت کے اعتبار سے ہوتی ہے، صاحب زکوٰۃ نہیں ہے، مگر اس کی قیمت مقرر کرنے پر نصاب کو پہنچ جاتی ہے، تو ایسے عالم میں فطرہ اور قربانی ان دونوں پر واجب ہوگی یا نہیں، جواب بحوالۂ کتب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد شفیع غفرلہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) اگر زائد مکان کسی قسم کے استعمال میں نہیں ہے، اور نہ ہی اس کو کرایہ پر دے رکھا ہے بلکہ صرف خالی پڑا ہوا ہے، تو اگر اس مکان کی قیمت نصاب کے بقدر ہو تو قربانی اور صدقہ فطر واجب ہے۔ (مستفاد: بہشتی زیور ۳/۳۴)

وكدار لا تكون للسكنىٰ ولا للتجارة، ولو كان له دار واحدة يسكنها وفضلت عن سكناه يعتبر الفاضل إن كانت قيمته نصابا. (مجمع الأنهر، كتاب الزكاة، باب صدقة الفطر، دار الكتب العلمية بيروت ١/٣٣٤، مصرى قديم ١/٢٢٦)

اور اگر زائد مکان کرایہ پر دے رکھا ہے اور اس سے آمدنی حاصل کر کے گذارا کرتا ہے، تو وہ اسباب کے حکم میں ہے، اس کی آمدنی میں نصاب کا اعتبار کیا جائے گا، بقدر نصاب ہو تو قربانی وفطرہ واجب ہے، ورنہ نہیں۔

ولو كانت له دور وحوانيت للغلة وهى لا تكفى عياله فهو من الفقراء. (مجمع الأنهر، كتاب الزكاة، باب صدقة الفطر، دار الكتب العلمية بيروت ١/٣٣٥،

مصری قدیم ۱/۲۲۷، البنایه اشرفیه دیوبند ۳/۴۸۲)

(۲) کاشت کی زمین کی قیمت نصاب میں شامل نہیں ہوگی؛ کیونکہ وہ گذارہ کے اسباب میں سے ہے، ہاں البتہ اس کی پیداوار میں نصاب کا اعتبار ہوگا، اگر پیداوار عید و بقرعید کے دن بقدر نصاب ہے تو قربانی وفطرہ واجب ورنہ نہیں۔

وعلی هذا الکرم والأرض ولایعتبر ما قیمته لصاحب من قوت شهر بلا خلاف عندنا. (مجمع الأنهر، باب صدقة الفطر، دار الکتب العلمية بيروت ۱/۳۳۵، مصری قدیم ۱/۲۲۷، البنایه اشرفیه دیوبند ۳/۴۸۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/۲۰۴۴)

٤ باب التضحية عن الغير

زندہ اور مردہ دونوں کی طرف سے قربانی کا جواز

سـوال [۹۹۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم نے سنا ہے کہ آدمی اپنی واجب قربانی بھی کرسکتا ہے اور اپنے زندہ اور مرحوم عزیزوں کی طرف سے بھی نفلی قربانی بھی کرسکتا ہے، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر سو جانور قربان کیے، کچھ اپنی طرف سے کچھ اپنی امت کی طرف سے تو کیا خلفائے راشدین یا صحابہ کرامؓ سے بھی یہ عمل ثابت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کتبِ حدیث کے حوالے کے ساتھ جواب تحریر فرمادیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے ابھی اپنی قربانی کے ساتھ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اور اپنے مرحومین کی طرف سے قربانی کرنا ثابت ہے، چنانچہ حضرت علیؓ نے ہمیشہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قربانی فرمائی ہے، اسی طرح زندہ عزیزوں کی طرف سے قربانی کرنا بھی ثابت ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنے بچوں کی طرف سے قربانی کیا کرتے تھے۔

عـن حـنـش قال: رأيت علياً رضـ يضحى بكبشين فقلت له: ما هذا؟ فقال: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم أوصاني أن أضحى عنه فأنا أضحى عنه. (أبوداؤد شريف، كتاب الضحايا، باب الأضحية عن الميت، النسخة الهندية ۳۸۵/۲، دار السلام رقم: ۲۷۹۰، سنن الترمذى، أبواب الأضاحى،باب فى الأضحيةبكبش، النسخة الهندية ۲۷۵/۱، دار السلام رقم: ۱٤۹٤، مجمع الزوائد، كتاب الأضاحى، باب فيمن أوصىٰ بأن يضحى عنه، دار الكتب العلمية بيروت ۲۳/٤، المستدرك للحاكم مكتبه نزار مصطفىٰ الباز بيروت ۲۵۵/٤، رقم: ۷۷۵٦)

عـن نـافع عن ابن عمر رضـ أنه كان لايضحى عن حبل ولكن كان يضحى

عـن ولـده الصغار والكبار، ويعق عن ولده كلهم. (المصنف عبد الرزاق، المجلس العلمي بيروت، كتاب المناسك، باب الضحايا ٤/ ٣٨٠، رقم: ٨١٣٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۲۵)

”وقد صح أن رسول الله ﷺ ضحى بكبشين أحدهما عن نفسه“

حدیث کا مطلب

سوال [۹۹۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: پیغمبر علیہ الصلاۃ نے اس طرح قربانی دی ہے، ”**وقد صح أن رسول الله ﷺ ضحى بكبشين أحدهما عن نفسه والآخر عمن لم يذبح من أمته**“ اس حدیث پاک کا مطلب کیا ہے، پوری امت کی طرف سے قربانی فرمائی، یا قربانی تو اپنی طرف سے دی اور اس کا ثواب ”**عمن لم يذبح من أمته**“ کو ہدیہ کر دیا، اگر نا گوار نہ ہو تو برائے مہربانی امداد الفتاویٰ ۵/ ترجیح الراجح کا مطالعہ فرما کر مسئلہ کی توضیح فرمادیں، ان اطراف میں کچھ لوگوں میں اختلاف ہو گیا ہے، صحیح مسئلہ سمجھنا ہے، شبہات کو دور کرنا ہے۔

المستفتی: محمد غفران غفرلہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ حدیث شریف میں حضور ﷺ کا مقصود امت کی طرف سے قربانی کرنا نہیں ہے، بلکہ جنہوں نے قربانی نہیں کی ہے ان کو قربانی کے ثواب میں شریک کرنا مقصود ہے، تفصیل امداد الفتاویٰ ۳/ ۵۷۳ تا ۵۷۴ میں موجود ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۳۰۷۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/ ۳/ ۱۴۱۳ھ

حضور پاک علیہ وسلم ﷺ کی طرف سے قربانی

سوال [۹۹۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عرض یہ ہے چھ افراد نے مل کر ایسے جانور کی قربانی کی جس میں سات حصہ ہو سکتے ہیں، چھ حصے چھ افراد نے لے لیے اور ساتواں حصہ کئی افراد نے یا چھ افراد نے ہی مشترک طور پر حضرت محمد ﷺ کے لیے لے لیا، اس مذکورہ بالا شکل میں قربانی درست ہو جائیگی، یا نہیں؟ کیا اس طرح مشترک طور پر حضرت محمد ﷺ کے لیے حصہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ حضور پاک ﷺ کے لیے جو حصہ لیا وہ قربانی ہی کا لیا؟

المستفتی: عبداللہ مدھوبنی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: چھ آدمی مل کر ساتواں حصہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قربانی کر دیں تو شرعاً جائز اور درست ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۴/ ۲۸۸، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۴۰۵، فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۲/ ۹۰، جدید زکریا ۱۰/ ۵۷)

وإن مات أحد السبعة المشتركين في البدنة، وقال الورثة: اذبحوا عنه وعنكم صح عن الكل استحسانا لقصد القربة من الكل. (الدر المختار، كتاب الأضحية، كراچی ٦/ ٣٢٦، زكريا ديوبند ٩/ ٤٧١، تبيين الحقائق امداديه ملتان ٦/ ٧، زكريا ديوبند ٦/ ٤٨٤، البحر الرائق كوئٹه ٨/ ١٧٧، زكريا ديوبند ٨/ ٣٢٥، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ١٧٣، هنديه زكريا قديم ٥/ ٣٠٥، جديد ٥/ ٣٥٢، تاتارخانية زكريا ١٧/ ٤٥٣، رقم: ٢٧٨٠٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۶۵۲)

مردے کی طرف سے قربانی کرنا

سوال [۹۹۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کسی مردے کے نام سے قربانی کی جائے تو قربانی اس مردہ کے نام سے جائز ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں مع حوالہ اس فتویٰ کا جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد یوسف ضلع پورنیہ بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جی جائز ہے۔(مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/۵۳۲، کفایت المفتی قدیم ۸/۲۲۲، جدید زکریا مطول ۱۲/۱۰۲، فتاویٰ محمودیہ قدیم ۴/ ۲۸۸، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۳۲۵، فتاویٰ رشیدیہ قدیم ص: ۴۵۶، جدید زکریا ص: ۵۳۷، فتاویٰ خلیلیہ ص: ۲۲۲)

من ضحى عن الميت يصنع كما يصنع في أضحية نفسه من التصدق والأكل والأجر للميت والملك للذابح. (شامي، كتاب الأضحية، كراچی ٦/٣٢٦، زكريا ديوبند ٩/ ٤٧٢، فتاویٰ بزازيه جديد زكريا ٣/ ١٦٠، وعلى هامش الهندية زكريا ٦/٢٩٥، تاتارخانية زكريا ١٧/ ٤٤٤، رقم: ٢٧٧٧١، فتاویٰ قاضيخان جديد زكريا ٣/٢٤٨، وعلى هامش الهندية زكريا ٣/ ٣٥٢، البحر الرائق كوئٹه ٣/ ٥٩، زكريا ٣/١٠٥، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ١٧٣، هدايه اشرفی ديوبند ٤/ ٤٤٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۹۹۹)

میت کی طرف سے قربانی کا حکم

سوال [۹۹۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میت کی طرف سے قربانی کرنے کا کیا حکم ہے؟ میت کو ثواب پہنچتا ہے یا نہیں اور

ہمیں کیا ثواب ملتا ہے؟

المستفتی: زوجہ عبدالکریم خاں مرحوم محلہ مغل پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: میت کی طرف سے قربانی کرنا جائز ہے اور میت کو اس کا پورا ثواب مل جاتا ہے اور قربانی کرنے والے کو بھی پورا ثواب مل جائے گا۔ (ان شاء اللہ)

عن أبی هريرة أن رسول الله ﷺ كان إذا أراد أن يضحی اشتری كبشين عظيمين سمينين أقرنين أملحين موجوءين فذبح أحدهما عن أمته لمن شهد للّٰه بالتوحيد وشهد له بالبلاغ و ذبح الآخرعن محمد و عن آل محمد ﷺ. (سنن ابن ماجه، الأضاحی، باب أضاحی رسول الله ﷺ، النسخة الهندية ۲/ ۲۲۵-۲۲۶، دار السلام رقم: ۳۱۲۲)

لأن الموت لايمنع التقرب عن الميت بدليل أنه يجوز أن يتصدق عنه ويحج عنه وقد صح أن رسول الله ﷺ ضحی بكبشين أحدهماعن نفسه والآخر عمن لم يذبح من أمته و إن كان منهم من قد مات قبل أن يذبح. (شامی، کتاب الأضحية، کراچی ۶/ ۳۲۶، زکریا ۹/ ۴۷۱)

سئل عمن يضحی عن الميت قال:يصنع به كما يصنع بأضحيته ...... فقيل له أتصير عن الميت قال: الأجر للميت والملك للمضحی وبه قال سلمة و ابن مقاتل وأبو مطيع. (تاتارخانية زکریا ۱۷/ ۴۴۴، رقم: ۲۷۷۷۱، فتاویٰ قاضیخان جدید زکریا ۳/ ۲۴۸، وعلی هامش الهندية زکریا ۳/ ۳۵۲)

الأفضل لمن يتصدق نفلا أن ينوی لجميع المومنين والمؤمنات لأنه تصل إليهم ولا ينقص من أجره شيئ. (شامی، کتاب الحج، باب الحج عن الغير مطلب: فی إهداء ثواب الأعمال للغير، زکریا دیوبند ۳/ ۱۰، کراچی ۲/ ۵۹۵) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۳۰/ ذی قعدہ ۱۴۱۰ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۰۴۰)

ایک حصہ چار مرحومین اور امت محمدیہ کی طرف سے کرنا

سوال [۹۹۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے خاندان کے چار افراد مرحوم ہو چکے ہیں، زید قربانی کررہا ہے ایک اپنے نام پر دوسرا حصہ چاروں مرحومین کے نام پر تو کیا ایک حصہ میں چند مرحومین کے نام سے قربانی درست ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اور پھر ان چاروں کے ساتھ ثواب میں امت محمدیہ کو بھی شریک کرتا ہے تو ان چاروں کی طرف سے قربانی ہو جائے گی؟

المستفتی: رشید احمد بانکوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جی ہاں ایک حصہ چاروں کے ایصال ثواب کے لیے ان کے نام سے کرنا جائز ہے، نیز تمام امت محمدیہ کو بھی ثواب میں شریک کر لینا جائز ہے، اور یہ چونکہ نفلی قربانی ہے اس لیے ان چاروں کی طرف سے صحیح ہو جائے گی اور وہ حصہ بہر حال ذابح کی ملکیت ہے، مرحومین کے لیے ثواب ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/۵۷۲)

عن أبی هريرة أن رسول الله ﷺ كان إذا أراد أن يضحى اشترى كبشين عظيمين سمينين أقرنين أملحين موجوءين فذبح أحدهما عن أمته لمن شهد لله بالتوحيد وشهد له بالبلاغ و ذبح الآخر عن محمد و عن آل محمد ﷺ. (سنن ابن ماجه، الأضاحی باب أضاحی رسول الله ﷺ النسخة الهندية ۲/۲۲۵-۲۲۶، دار السلام رقم: ۳۱۲۲)

لأن الموت لا يمنع التقرب عن الميت بدليل أنه يجوز أن يتصدق عنه ويحج عنه وقد صح أن رسول الله ﷺ ضحى بكبشين أحدهما عن نفسه والآخر عمن لم يذبح من أمته و إن كان منهم من قد مات قبل أن يذبح. (شامی، کتاب الأضحية، کراچی ۶/۳۲۶، زکریا ۹/ ۴۷۱)

سئل عمن يضحى عن الميت قال: يصنع به كما يصنع بأضحيته ...... فقيل له أتصير عن الميت قال: الأجر للميت والملك للمضحى وبه قال سلمة و ابن مقاتل وأبو مطيع. (تاتارخانية زكريا ۱۷/ ٤٤٤، رقم: ۲۷۷۷۱، فتاویٰ قاضيخان جديد زكريا ۳/ ۲٤۸، وعلى هامش الهندية زكريا ۳/ ۳٥۲) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۲۵ر محرم الحرام ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۳۰۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۱/۲۵ھ

ایک حصۂ قربانی متعدد اموات کی طرف سے کرنا

سوال [۹۹۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک حصہ قربانی متعدد مردوں کی طرف سے دینا درست ہے یا نہیں؟ مثلاً ایک دنبہ ہے اس کی قربانی بہت سے مردوں کی طرف سے کردی جائے، ذبح کر کے یہ دعا پڑھے "**اللّٰھم تقبله من زيد، عمر، بكر، خالد**" اس طرح قربانی درست ہوگی؟

المستفتی: محمد غفران غفرلہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جی ہاں ایک دنبہ یا بکرا یا بڑے جانور کا ایک حصہ متعدد مردوں کی طرف سے بطور قربانی دیا جائے تو صحیح اور درست ہے، حضرت تھانویؒ نے کسی زمانہ میں عدم جواز کا فتویٰ صادر فرمایا تھا لیکن ایک سال کے بعد اس فتویٰ سے رجوع کر کے جواز کا اعلان کردیا ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/ ۵۷۳)

عن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ كان إذا أراد أن يضحى اشترى كبشين عظيمين سمينين أقرنين أملحين موجوءين فذبح أحدهما عن أمته لمن شهد لله بالتوحيد وشهد له بالبلاغ و ذبح الآخر عن محمد و عن آل محمد ﷺ. (سنن ابن ماجه، الأضاحي، باب أضاحي رسول الله ﷺ، النسخة الهندية ۲/ ۲۲٥-۲۲٦، دار السلام رقم: ۳۱۲۲)

لأن المـوت لايـمـنع التقرب عن الميت بدليل أنه يجوز أن يتصدق عـنه ويحج عنه وقد صح أن رسول الله ﷺ ضحى بكبشين أحدهماعن نفسه والآخـر عـمـن لـم يـذبح من أمته و إن كان منهم من قد مات قبل أن يذبح.
(شامی کتاب الأضحية كراچی ٦/٣٢٦، زکریا ٩/ ٤٧١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ربیع الاول ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/۳۰۷۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۳/۳/۱۵ھ

نفلی قربانی کر کے سب کو ثواب پہنچانا

سوال [۹۹۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کسی کے نام پر قربانی کرنا اور دیگر حضرات کو ثواب میں شامل کرنے کا کیا معنی اور مطلب ہے؟

المستفتی: عبدالرشید بانکوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: کسی میت کے نام نفلی قربانی کر کے دوسروں کو ثواب پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایک میت کے لیے قربانی کر کے دوسروں کو بھی ثواب میں شامل کرنا جائز ہوگا۔

عـن أبي هريرة أن رسـول الـله ﷺ كان إذا أراد أن يضحي اشترى كبشيـن عـظيمين سمينين أقرنين أملحين موجوءين فذبح أحدهما عن أمته لـمـن شهـد لله بالتوحيد وشهد له بالبلاغ و ذبح الآخرعن محمد و عن آل محمد ﷺ. (سنن ابن ماجه، الأضاحي، باب أضاحي رسول الله ﷺ، النسخة الهندية ٢/٢٢٥-٢٢٦، دار السلام رقم: ٣١٢٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۴۵۱۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۶/۲۲ھ

بڑے جانور میں تین لوگوں کا مل کر ایک حصہ میت کی طرف سے قربانی کرنیکا حکم

سوال [۹۹۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک بڑے جانور میں ۶/ حصے دوسرے لوگوں کے ہوں، اور ایک حصہ تین لوگ مل کر کسی میت کی طرف سے لے لیں تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

نوٹ: جواب دینے سے قبل احسن الفتاویٰ اور فتاویٰ محمودیہ پر بھی ایک نظر ڈالیں، نیز جس پہلو میں زیادہ احتیاط ہو تحریر فرمائیں۔

المستفتی: عبد السلام رحمت نگر سہارنپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر کسی بڑے جانور میں چند لوگ مشترکہ طور پر ایک حصہ کسی میت کے لیے لیں اور اس قربانی کا ثواب اسے پہنچائیں تو یہ جائز اور درست ہے۔

وإن مات أحد السبعة المشتركين في البدنة، وقال الورثة: اذبحوا عنه وعنكم صح عن الكل استحسانا لقصد القربة من الكل. (الدر المختار، كتاب الأضحية، كراچی ٦/٣٢٦، زكريا ديوبند ٩/٤٧١، تبيين الحقائق امداديه ملتان ٦/٧، زكريا ديوبند ٦/٤٨٤، البحر الرائق كوئٹه ٨/١٧٧، زكريا ديوبند ٨/٣٢٥، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/١٧٣، هنديه زكريا قديم ٥/٣٠٥، جديد ٥/٣٥٢، تاتارخانية زكريا ١٧/٤٥٣، رقم: ٢٧٨٠٧)

نوٹ: سوالنامہ میں درج کردہ نوٹ میں فتاویٰ محمودیہ اور احسن الفتاویٰ کے حوالہ سے جو بات لکھی گئی ہے، وہ مقام ہمارا دیکھا ہوا ہے، صاحب احسن الفتاویٰ کی تحریر کا جواب صاحب فتاویٰ محمودیہ نے دے رکھا ہے اور حضرت فقیہ الامت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی نور اللہ مرقدہ کا فتویٰ صاحب احسن الفتاویٰ کے ذکر کردہ مسئلہ کے مقابلہ میں زیادہ صحیح اور معتبر ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ ذی قعدہ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۲۱۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۱۱/۱۵ھ

چندآدمیوں کا ایک دنبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قربانی کرنا

سوال [۹۹۳۰]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ظفر کے کمرہ میں چار آدمی رہتے ہیں، عید الاضحیٰ کے موقع پر آپس میں یہ بات طے ہوئی کہ تھوڑا تھوڑا پیسہ جمع کرکے ایک دنبہ لے کر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی فرد واحد کے نام سے قربانی کردیں، تو یہ قربانی جائز ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: شفیع احمد بحرین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جائزاور درست ہوجاتی ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/۵۷۳، فتاویٰ محمودیہ قدیم ۴/ ۲۸۸، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۴۰۵)

وإن مات أحد السبعة المشتركين فى البدنة، وقال الورثة: اذبحوا عنه وعنكم صح عن الكل استحسانا لقصد القربة من الكل. (الدر المختار، كتاب الأضحية، كراچى ٦/٣٢٦، زكريا ديوبند ٩/ ٤٧١، تبيين الحقائق امداديه ملتان ٦/٧، زكريا ديوبند ٦/٤٨٤، البحر الرائق كوئٹه٨/١٧٧، زكريا ديوبند ٨/٣٢٥، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/١٧٣، هنديه زكريا قديم ٥/٣٠٥، جديد ٥/٣٥٢، تاتارخانية زكريا ١٧/٤٥٣، رقم: ٢٧٨٠٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵ر صفر المظفر ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/۱۶۴۳)

ایک قربانی پوری امت محمدیہ کی طرف سے کرنے کا حکم

سوال [۹۹۳۱]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قربانی کے لیے ایک جانور اور بڑے جانوروں میں ایک حصہ فی کس ادائے

واجب کے لیے ضروری ہے، کیا اس طرح نفلی قربانی میں بھی حکم ہے، اگر شخص واحد ایک جانور یا ایک حصہ پوری امت محمدیہ یا تمام صحابہ کی طرف سے کردے تو اس کے ثواب میں سب کی شرکت ہوگی یا نہیں؟ اور اس قربانی کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: عبداللہ مدرسہ فرقانیہ گونڈہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شخص واحد اگر ایک جانور یا ایک حصہ کی قربانی چند اشخاص یا پوری امت محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کی طرف سے کرتا ہے تو اس میں تمام لوگوں کی شرکت ہوتی ہے، اور اس کا ثواب سب کو پہنچتا ہے اور اس طرح قربانی صحیح ہوجاتی ہے۔ (مستفاد: مسائل قربانی ۲۸، فتاویٰ محمودیہ قدیم ۴/ ۲۸۸، ۱۴/ ۳۳۶، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۴۰۴-۴۰۵)

عن أبی هريرة أن رسول الله ﷺ كان إذا أراد أن يضحی اشتری كبشين عظيمين سمينين أقرنين أملحين موجوءين فذبح أحدهما عن أمته لمن شهد لله بالتوحيد وشهد له بالبلاغ و ذبح الآخر عن محمد و عن آل محمد ﷺ. (سنن ابن ماجه، الأضاحی، باب أضاحی رسول الله ﷺ، النسخة الهندية ۲/ ۲۲۵-۲۲۶، دار السلام رقم: ۳۱۲۲)

لأن الموت لا يمنع التقرب عن الميت بدليل أنه يجوز أن يتصدق عنه ويحج عنه وقد صح أن رسول الله ﷺ ضحی بكبشين أحدهما عن نفسه والآخر عمن لم يذبح من أمته و إن كان منهم من قد مات قبل أن يذبح. (شامی، كتاب الأضحية، كراچی ۶/ ۳۲۶، زكريا ۹/ ۴۷۱)

وإن مات أحد السبعة المشتركين فی البدنة، وقال الورثة: اذبحوا عنه وعنكم صح عن الكل استحسانا لقصد القربة من الكل. (الدر المختار، كتاب الأضحية، كراچی ۶/ ۳۲۶، زكريا ديوبند ۹/ ۴۷۱، تبيين الحقائق امداديه ملتان ۶/ ۷، زكريا ديوبند ۶/ ۴۸۴، البحر الرائق كوئٹه ۸/ ۱۷۷، زكريا ديوبند ۸/ ۳۲۵، مجمع

الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/١٧٣، هنديه زكريا قديم ٥/٣٠٥، جديد ٥/٣٥٢، تاتارخانية زكريا ١٧/٤٥٣، رقم: ٢٧٨٠٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۵۳۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/۱۲/۱۴۱۸ھ

۵ باب الشركة فى الأضحية

اجتماعی قربانی

سوال [۹۹۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا اجتماعی قربانی جائز ہے، جبکہ صاحب قربانی کو نہ اپنے جانور کا علم ہے اور نہ ہی اپنے جانور کی قیمت کا علم ہے؟

المستفتی: حنیف اندوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اجتماعی قربانی دو طرح سے ہوسکتی ہے (۱) سات آدمی بڑے جانور میں شریک ہوکر قربانی کر دیں، سات آدمی برابر پیسہ دیکر سات بکرے اکٹھے لے آئیں، اور کس کا جانور کونسا ہے؟ یہ متعین کیے بغیر ذبح کر دیں، تو اس طرح قربانی جائز اور درست ہے۔

اشترىٰ سبعة نفر سبع شياه بينهم، ولم يسم لكل واحد منهم شاة بعينها فضحوا بها كذٰلک، فالقياس أن لايجوز وفى الاستحسان يجوز. (هنديه، كتاب الأضحية، الباب الثامن فيما يتعلق بالشركة فى الضحايا، زكريا قديم ۵/۳۰۶، جديد ۵/۳۵۳)

(۲) دوسری شکل یہ ہے کہ ایک شخص کے پاس مختلف لوگوں نے اپنی اپنی قربانی کے لیے پیسہ بھیج دیا اور وہ شخص سب کی طرف سے وکیل بن کر سب کی قربانی کی نیت سے بڑا جانور خرید لے یا ان لوگوں کی تعداد کے مطابق چھوٹے جانور خرید لے، پھر ان سب کی طرف سے تعیین کیے بغیر ان کی طرف سے قربانی کی نیت سے سب جانوروں کو ذبح کردے، تو اس طرح سے بھی سب کی طرف سے قربانی جائز اور درست ہوجاتی ہے، لہٰذا مدارس میں مختلف لوگوں کی جو اجتماعی قربانی ہوتی ہے، وہ بلاشبہ جائز اور درست ہے، اسی طرح اگر صرف خریداری کے وقت ہر ایک کا جانور متعین ہو جائے کہ فلاں جانور فلاں کے لیے پھر اس کے بعد ذبح کے وقت ان کی طرف

سے نیت کیے بغیر صرف بسم اللہ پڑھ کر حلال کر دینے سے قربانی درست ہو جاتی ہے۔

ومنها أن تجزئ فيها النيابة فيجوز للإنسان أن يضحى بنفسه و بغيره بإذنه. (بدائع الصنائع، كتاب التضحية، فصل في كيفية الوجوب، زكريا ٤/٢٠٠، كراچی ٥/٦٧، هنديه زكريا جديد ٥/٣٣٩، قديم ٥/٢٩٤)

وأما الضحايا فلا بد فيها من النية لكن عند الشراء لا عند الذبح.
(الأشباه والنظائر، قديم ١/٤٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۵۲۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری
۱۵/۳/۱۴۲۹ھ

اجتماعی قربانی میں نیت کا حکم

سوال [۹۹۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا اجتماعی قربانی میں بوقت ذبح نام لینا ضروری ہے یا صرف نیت کافی ہے؟

المستفتی: حنیف اندوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اجتماعی قربانی میں بوقت ذبح نام لینا ضروری نہیں ہے، صرف خریدتے وقت نیت کر لینا کافی ہے، اور اگر خریدتے وقت نیت نہیں کی ہے تو بوقت ذبح نیت کر لینا بھی کافی ہے۔

وأما الضحايا فلا بد فيها من النية لكن عند الشراء لا عند الذبح.

(الأشباه والنظائر قديم ص: ٤٠ وهكذا في الهندية زكريا قديم ٥/٢٩٤، جديد ٥/٣٤٠، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/١٧٥، مصرى قديم ٢/٥٢٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۵۲۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۳/۱۴۲۹ھ

بڑے جانور میں عین قربانی کے وقت شریک ہونا

سوال [۹۹۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص اپنے گھر والوں کے لیے ایک قربانی کا جانور خرید کر لایا اور عین قربانی کے وقت ایک دوسرا شخص شامل ہونا چاہتا ہے؟ تو کیا حکم ہے؟

المستفتی: فروغ احمد کشن گنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گھر والوں میں سے جن پر قربانی واجب ہے، ان سب کے حصوں کے بعد بھی ایک دو حصے فاضل ہیں تو ذبح سے پہلے پہلے ان فاضل حصوں میں دوسروں کو شامل کر لینا جائز ہے، کوئی مضائقہ نہیں۔

عن جابر –رضی اللہ عنہ– قال: نحرنا بالحديبية مع رسول الله ﷺ البدنة عن سبعة والبقرة عن سبعة. (مسند أحمد بن حنبل ۲۹٤/۳، رقم: ۱٤۱۷۳– ۱٤۲۷۸– ۱٥۱۰۹ – ۱٥۱۱۱)

لأن المراد أنها تجزئ عن سبعة بنية القربة من كل منهم. (شامی، کتاب الأضحية، زکریا ٤٥۷/۹، کراچی ۳۱٦/٦، مجمع الأنهر، دار الکتب العلمية بيروت ۱٦۸/٤، مصری قديم ۵۱۷/۲، بدائع الصنائع زکریا ۲۰۷/٤، کراچی ۷۱/۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۲۴۴/۳۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۱۲/۱ھ

دو، تین یا چار افراد ایک بڑے جانور میں برابر شریک ہو سکتے ہیں؟

سوال [۹۹۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک بڑا جانور دو شخص کے درمیان برابر تقسیم یا تین کے درمیان برابر تقسیم یا چار یا

پانچ کے درمیان برابر تقسیم کے بارے میں مدلل جواب تحریر فرمائیں؟

المستفتی: محمد صابر غفرلہ، خادم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ایک بڑے جانور میں دو آدمی، تین آدمی، چار آدمی، پانچ آدمی، چھ آدمی بھی شریک ہو سکتے ہیں، سات آدمی کا ہونا ضروری نہیں ہے، لہٰذا اگر دو آدمی برابر برابر تقسیم کرلیں یا تین آدمی مل کر قربانی کردیں تو یہ جائز اور درست ہے۔

ولو كانت البدنة بين اثنين نصفان يجوز في الأصح؛ لأن نصف السبع يكون تبعا لثلاثة أسباع. (تبيين الحقائق، كتاب الأضحية، امداديه ملتان ٦/٤، زكريا ٦/٤٧٦)

ويجوز ذٰلک عن سبعة أو أقل من ذٰلک (إلى قوله) ولا شک في جواز بدنة أو بقرة عن أقل من سبعة بأن اشترک اثنان أو ثلاثة، أو أربعة، أو خمسة أو ستة في بدنة أو بقرة؛ لأنه لما جاز السبع فالزيادة أولىٰ. (بدائع الصنائع، كتاب التضحية، زكريا ٤/٢٠٧، كراچی ٥/٧١، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/١٦٨، مصرى قديم ٢/٥١٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۵۳۰/۲۵)

بڑے جانور میں صرف پانچ یا دو آدمیوں کا قربانی کرنا

سوال [۹۹۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کہ قربانی کے لیے ایک بڑا جانور خریدا گیا اس میں پانچ آدمی حصہ دار ہیں ابھی پورے سات حصے مکمل نہیں ہوئے تھے، اور آخر تک بقیہ دو حصوں کے لیے کوئی تیار نہ ہوسکا، پھر اس جانور کی قربانی انہیں پانچ لوگوں کی طرف سے کردی گئی۔

اب دریافت یہ کرنا ہے کہ پانچ لوگوں کی طرف سے اس پورے جانور کی قربانی صحیح

ہوئی یا نہیں؟ جبکہ اس میں ابھی دو حصے متعین نہیں ہوئے تھے؟

(۲) اسی طرح اگر ایک بڑا جانور دو آدمیوں نے برابر برابر رقم دے کر خریدا اور دونوں نے سات حصے متعین نہ کرکے اپنے اپنے ناموں سے قربانی کردی، تو شرعاً یہ قربانی درست ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: سید محمد ضیاء الاسلام سہارنپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر پانچ آدمیوں نے برابر برابر قیمت دے کر پورے جانور کی قربانی کردی ہے تو سب کی طرف سے قربانی صحیح ہوگی اور جانور بجائے سات حصے کے پانچ کا ہوجائے گا۔

وتجوز عن ستة و خمسة أو أربعة أو ثلاثة لأنه لما جاز عن سبعة فما دونها أولیٰ. (البحر الرائق، کتاب الأضحية، کوئٹه ۸/۱۷٤، زکریا ۸/۳۱۹، مجمع الأنهر، دار الکتب العلمية بيروت ٤/۱٦۸، مصری قديم ۲/۵۱۷، تبيين الحقائق امداديه ملتان ٦/٤، زکريا ٦/٤۷٦، هنديه زکريا قديم ۵/۳۰٤، جديد ۵/۳۵۱، هدايه اشرفی ٤/٤٤٤)

(۲) اسی طرح سات حصے والے بڑے جانور کو صرف دو آدمی مل کر برابر برابر قیمت دے کر اپنی طرف سے قربانی کردیں تب بھی جائز ہے۔

ولو کانت البدنة بين اثنتين نصفين تجوز فی الأصح. (هدايه کتاب الأضحية، اشرفی ٤/٤٤۵، تبيين الحقائق امداديه ملتان ٦/٤، زکريا ٦/٤۷٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰ر محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۶۳۹۸)

ایک جانور کے چھ شرکاء کا ساتویں حصہ میں برابر کا شریک ہونا؟

سوال [۹۹۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر چھ افراد نے ایک جانور بھینس کٹڑا وغیرہ مبلغ ۶۰۰ر سو روپیہ سے خریدا، اور چھ کے چھ نے اس جانور میں برابر کی شرکت کے ساتھ قربانی کردی، یعنی ہر ایک نے سوسو روپئے ادا کیے، ساتویں حصے کا کوئی تذکرہ نہیں، گوشت برابر تقسیم کردیا، تو کیا تمام چھ افراد کی قربانی درست ہوئی یا نہیں؟ اس صورت میں ساتواں حصہ ناقص رہا، جو چھ جگہ تقسیم ہوگیا جبکہ قربانی میں کوئی حصہ ناقص نہ ہونا چاہیے؟

المستفتی: محمد صابر خادم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بڑے جانور میں چھ افراد شریک ہوکر ہر ایک مستقل ایک ایک حصہ لے کر ساتواں حصہ میں سب کا برابر شریک ہوجانا درست اور جائز ہے، اس سے کسی کی قربانی پر کسی قسم کا اثر مرتب نہ ہوگا، سب کی قربانی صحیح ہوجائے گی، کیونکہ ساتواں حصہ اگرچہ مستقل حصہ نہیں ہے لیکن مستقل حصوں کے تابع ہوکر فی الجملہ تقرب الی اللہ میں داخل ہے۔

وتجوز عن ستة أو خمسة أو أربعة أو ثلاثة ذكره محمد في الأصل، لأنه لما جاز عن سبعة فما دونها أولىٰ. (البحر الرائق، كتاب الأضحية، كوئٹه ۸/۱۷٤، زكريا ۳۱۹/۸، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/۱٦۸، مصرى قديم ۲/۵۱۷، بدائع الصنائع، زكريا ٤/۲۰۷، كراچى ۵/۷۱، تبيين الحقائق امداديه ملتان ٦/۳، زكريا ٦/٤۷٦، شامى زكريا ۹/٤۵۷، كراچى ٦/۳۱٦، هدايه اشرفى ٤/٤٤٤، هنديه زكريا قديم ۵/۳۰٤، جديد ۵/۳۵۱)

لأن ذٰلك النصف وإن لم يصر أضحية؛ لكنه صار قربة تبعاً للأضحية، وكم من شيئ ثبت ضمناً ولا يثبت قصداً وله نظائر كثيرة؛ منها إذا ضحى شاة فخرج من بطنها جنين حي، فإنه يجب عليه أن يضحيها وإن لم تجز أضحيته ابتداءً. (البناية اشرفيه ۱۲/۱۹، قديم ٤/۱۷۳) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۲ر ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۵۳۰/۳۵)

قربانی کے جانور میں آٹھ لوگوں کا شرکت کرنا

سوال [۹۹۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک بڑے جانور کے اندر غلطی سے آٹھ حضرات شریک ہوگئے اور سب کی طرف سے اس بڑے جانور کو قربان کردیا گیا، جب گوشت تقسیم کرنے کا نمبر آیا تو اس وقت معلوم ہوا کہ شرکاء آٹھ ہوگئے ہیں، اگر ان آٹھ شرکاء میں سے اس وقت کوئی ایک شریک علاحدہ ہوجائے اور اس کے پیسے واپس کردیے جائیں تو باقی سات شرکاء کی طرف سے قربانی درست ہوسکتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد انور حسین، نوگاؤں، آسام

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آٹھ آدمی کی شرکت میں اگر یکے بعد دیگرے علی الترتیب پیسے جمع کیے ہیں اور سات آدمی مکمل ہونے کے بعد آخر میں آٹھویں آدمی نے پیسے جمع کیے ہیں تو ایسی صورت میں آخر میں جس سے پیسے جمع کیے گئے ہیں اس کی طرف سے قربانی درست نہیں ہوئی ہے، کیونکہ اس کی شرکت ہی درست نہیں ہوئی ہے، اس لیے آٹھویں کو چھوڑ کر بقیہ ساتوں کی قربانی درست ہوگئی اور اگر بغیر ترتیب کے آٹھ آدمی شریک ہوگئے ہیں اور آخر میں کس کے پیسے جمع ہوئے ہیں، اس کا پتہ ہی نہیں ہے بلکہ آٹھ آدمیوں نے شریک ہوکر ایک جانور خریدلیا ہے، بعد میں پتہ چلا کہ سات کے بجائے آٹھ کی طرف سے قربانی ہوئی ہے تو ایسی صورت میں کسی کی بھی قربانی درست نہیں ہوئی ہے۔

والبقر والبعير يجزئ عن سبعة إذا كانوا يريدون به وجه الله تعالىٰ، والتقدير بالسبع يمنع الزيادة ولايمنع النقصان ...... ولو اشترىٰ بقرة يريد أن يضحى بها ثم أشرك فيها ستة يكره ويجزيهم (إلى قوله) إلا أن يريد حين اشتراها أن يشركهم فيها فلا يكره و إن فعل ذٰلك قبل أن يشريها كان أحسن. (عالمگیری، الباب الثامن فيما يتعلق بالشركة فى الضحايا، زكريا قديم ٥/٣٠٤، جديد ٥/٣٥١)

وإذا كان الشركاء فى البدنة أو البقرة ثمانية لم يجزهم لأن نصيب أحدهم

أقل من السبع. (عـالمگیری، الباب الثامن فیما یتعلق بالشرکة فی الضحایا زکریا قدیم ۳۰۵/۵، جدید ۳۵۲/۵، البحر الرائق کوئٹه ۱۷٤/۸، زکریا ۳۱۹/۸)**فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ر صفر المظفر ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۹۷۶/۴۰)

سات سو افراد کی طرف سے لاعلی التعیین سو بڑے جانور کی قربانی

سـوال [۹۹۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مغربی مما لک سے مختلف لوگوں نے ہندوستان کے مدرسے میں قربانی کے لیے پیسے بھیجے، مدرسے والوں نے سب کی فہرست تیار کی ،جس میں سات سو حصے جمع ہو گئے، اب مدرسے والوں نے ان سات سو لوگوں کی طرف سے قربانی کے لیے لم سم سو بڑے جانور خریدے، اس میں یہ تعین نہیں ہوا کہ کس جانور میں کس کا حصہ ہے، تو مدرسے والوں نے سو جانور خرید کر ان سات سو کی طرف سے قربانی کردی ہے، تو سب کی قربانی درست ہوگئی یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفیق: مدرسے والوں نے ان سات سو کی طرف سے سو بڑے جانور خرید کر لاعلی التعیین ایک ایک حصہ سب کی طرف سے نیت کر کے کر دیا تو سب کی قربانی درست ہوگئی۔

اشتریٰ کل واحد منهم شاة للأضحية، أحدهم بعشرة والآخر بعشرين والآخر بثلاثين وقيمة كل واحدة مثل ثمنها فاختلطت حتى لايعرف كل واحد منهم شاته بعينها واصطلحوا على أن يأخذ كل واحد منهم شاة فيضحى بها أجزأتهم. (هـندیه، الباب الثامن فیما یتعلق بالشرکة فی الضحایا، زکریا قدیم ۳۰۵/۵، جدید ۳۵۲/۵، شامی کراچی ۳۲۷/٦، زکریا ٤۷۲/۹)

اشتریٰ سبعة نفر سبع شياه بينهم ولم يسم لكل واحد منهم شاة بعينها

فضحوا بها كذٰلك فالقياس أن لايجوز، وفي الاستحسان يجوز. (هنديه، كتاب الأضحية، الباب الثامن فيما يتعلق بالشركة في الضحايا، زكريا قديم ٥/٣٠٦، جديد ٥/٣٥٣)

وعلى هذا إذا غلط رجلان فذبح كل واحد منهما أضحية صاحبه عن نفسه أنه يجزئ كل واحد منهما أضحية عنه استحسانا. (بدائع الصنائع، كتاب التضحية، زكريا ٤/٢٠١، كراچی ٥/٦٧، هدايه اشرفی ٤/٤٥١، هنديه زكريا قديم ٥/٣٠٢، جديد ٥/٣٤٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۴/۱۲/۵ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: (۴۰/۱۱۳۴۰)

پانچ بڑے جانوروں میں ۳۵؍لوگوں کا حضور ﷺ کی طرف سے قربانی کرنے کا حکم

سوال [۹۹۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے علاقہ میں ایک مدرسہ ہے جس کے زیر انتظام بڑے جانوروں کی قربانی ہوتی ہے، مدرسہ کی طرف سے عید الاضحیٰ کے موقعہ پر تخمینہ لگا کر اعلان کر دیا جاتا ہے کہ بڑے جانور میں فی حصہ قربانی کا اتنا صرفہ ہوگا، مختلف حضرات اپنے اور متعلقین کے لیے قربانی کا وکیل بنا کر متعینہ رقم مدرسہ کو ادا کرتے ہیں، بعض حضرات حضور ﷺ اور دیگر انبیاء اور اولیاء کی طرف سے قربانی کا بھی وکیل بناتے ہیں ذمہ داران مدرسہ کا یہ طریقہ ہے کہ جس ترتیب سے نام آتے ہیں وہ اسی ترتیب سے سات سات ناموں کے لیے ایک ایک جانور متعین کرتے چلے جاتے ہیں لیکن ایک نام سے ہونے والی متعدد قربانیوں کو ترتیب سے ہٹا کر ایک ساتھ کر لیتے ہیں، مثلاً حضور ﷺ کی طرف سے قربانی کے لیے ۳۵؍ حصے آئے تو یہ قربانیاں اندراج کی ترتیب سے نہ کر کے ایک ساتھ پانچ جانور قربان کر دیتے ہیں، گذشتہ کئی سالوں سے یہ معمول جاری تھا، لیکن اس سال بعض احباب نے یہ شبہ پیش کیا کہ اس صورت میں حضور ﷺ کی طرف سے صرف پانچ قربانیاں منعقد ہوتی ہیں، ۳۵؍نہیں، اور آپ کو ۳۵؍

قربانیوں کا وکیل بنایا گیا ہے اس لیے یا تو آپ ۳۵؍ جانور قربان کریں یا ایک جانور میں ایک ایک حصہ حضور ﷺ کا رکھیں، اس سے ۳۵؍ قربانیاں بھی ادا ہو جائیں گی، اور جن قربانیوں میں حضور ﷺ کے حصہ کی شرکت ہو جائے گی وہ عند اللہ زیادہ مقبول ہوں گی، برائے مہربانی وضاحت فرمائیں کہ پہلے سے جاری طریقہ پر قربانی کرنے میں مؤکلین کی منشاء کے مطابق ۳۵؍ قربانیاں ادا ہوں گی یا نہیں؟ بہر صورت بہتر شکل کیا ہوگی؟

مزید ایک بات کی وضاحت فرمائیں کہ جانوروں کی کثرت کی وجہ سے یہ بہت مشکل ہوتا جا رہا ہے کہ ہر ہر جانور پر ذبح کرنے والا ناموں کی پرچی لے کر کھڑا رہے، اور ذبح کے بعد سارے نام لیا کرے، تو کیا اس بات کی گنجائش ہے کہ دل میں نیت کر لے کہ وکلاء نے جن لوگوں کے نام دیئے ہیں ان میں سے سات افراد کی طرف سے یہ قربانی کر رہا ہوں، اور زبانی تمام نام نہ لے؟

المستفتی: عبدالرحمٰن بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ فی السوال صورت میں پانچ بڑے جانوروں میں بلا شبہ ۳۵؍ قربانیاں حضور پاک ﷺ کے نام سے درست ہو جاتی ہیں، اس لیے کہ ایک بڑے جانور میں سات حصے کرنا شرعاً درست ہے، لہٰذا پانچ جانوروں میں پینتیس آدمیوں کی طرف سے حضور پاک ﷺ کے نام سے حصے کرنا بلا شبہ درست ہے، اور جو لوگ اس کو ناجائز کہتے ہیں ان کی بات درست نہیں ہے، سوالنامہ میں دوسرا جزئیہ پوچھا گیا ہے کہ ذبح کے وقت ہر ایک حصہ دار کا نام لینا ضروری ہے یا صرف دل میں نیت کرنا کافی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جانور خریدتے وقت جن جن لوگوں کے نام متعین کر لیے جاتے ہیں وہی کافی ہو جاتا ہے وہ جانور انہیں ناموں کے ساتھ متعین سمجھا جاتا ہے، پھر ذبح کرتے وقت سب کا نام لینے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ صرف نیت کر لینا کافی ہے، اور بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کر دیا جائے۔

ذبح المشتراة لها بلا نية الأضحية جازت اكتفاء بالنية عند الشراء.

(عالمگیری، کتاب الأضحية، الباب الثاني في وجوب الأضحية بالنذر وما هو في معناه، زكريا قديم ۵/۲۹٤، جديد ۵/۳٤٠، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/۱۷۵، مصري قديم ۲/۵۲۲)

وأما الضحايا فلا بد فيها من النية لكن عند الشراء لا عند الذبح. (الأشباه والنظائر قديم ص: ۴۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۰۱۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۳/۱۷ھ

سو آدمیوں کی طرف سے لاعلی التعیین سو بکرے قربان کردینا

سوال [۹۹۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدرسے میں سو آدمیوں نے قربانی کا پیسہ بھیجا، مدرسے والوں نے سو بکرے خرید کر ان کی طرف سے قربان کردے، یہ متعین نہیں کیا کہ کونسا بکرا کس کی طرف سے ہے، اس صورت میں ان سب کی قربانی درست ہوگئی یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مدرسہ میں سو آدمیوں نے قربانی کے لیے پیسے بھیجے، مدرسے والوں نے سو بکرے خرید کر لاعلی التعیین ان کی طرف سے قربان کردیئے تو سب کی قربانی درست ہوگئی۔

اشترىٰ سبعة نفر سبع شياه بينهم ولم يسم لكل واحد منهم شاة بعينها فضحوا بها كذٰلك، فالقياس أن لايجوز وفى الاستحسان يجوز. (هنديه، كتاب الأضحية، الباب الثامن فيما يتعلق بالشركة فى الضحايا، زكريا قديم ۵/۳۰۶، جديد ۵/۳۵۳)

لو اختلطت الغنم فضحى كل واحد واحدة ورضوا بذٰلك جاز. (هنديه، الباب الثامن فيما يتعلق بلشركة فى الضحايا، زكريا قديم ۵/۳۰۶، جديد ۵/۳۵۳، شامی کراچی ۶/۳۲۹، زكريا ۹/۴۷۷، بدائع الصنائع زكريا ۴/۲۰۱، كراچی ۵/۶۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۳۷)

نائی کی شرکت کے ساتھ دوسرے شرکاء کی قربانی بلا کراہت درست

سوال [۹۹۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قربانی کے جانور کے شرکاء میں اگر کوئی نائی ہو جو داڑھی بھی مونڈتا ہو تو اس کی وجہ سے اس جانور کی قربانی میں کوئی فرق آئیگا یا نہیں؟

المستفتی: عبداللہ مدرسہ فرقانیہ گونڈہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صاحبین کے اصول کے مطابق تعاون علی المعصیت کی وجہ سے نائی کی کمائی مکروہ تنزیہی ہے اور مکروہ تنزیہی حلال کے قریب قریب ہوتا ہے، اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کے اصول کے مطابق بلا کراہت حلال ہے۔

لہٰذا جس جانور میں نائی کی شرکت ہو اس جانور کی قربانی میں کوئی فرق نہیں آئے گا، بلکہ تمام شرکاء کی قربانی بلا شبہ درست ہو جائے گی۔

كراهة تنزيهية ما كانت إلى الحل أقرب وهي تقابل ترك السنة. (لغة الفقهاء ص: ۳۷۹)

إذا استاجر رجلا لينحت له طنبورا أو بربطا ففعل يطيب له الأجر إلا أنه يأثم في الإعانة على المعصية. (تاتارخانية زكريا ۱۵/ ۱۳۱، رقم: ۲۲۴۳۷)

ويكره له أن يستاجر امرأة حرة أو أمة ليستخدمها و يخلو بها لقوله صلى الله عليه وسلم: لايخلون رجل بامرأة ليس منها بسبيل فإن ثالثهما الشيطان ولأنه لا يأمن من الفتنة على نفسه أو عليها إذا خلا بها ولكن هذا النهي لمعنى من غير العقد فلا يمنع صحة الإجارة وجوب الأجر إذا عمل كالنهي عن البيع وقت النداء. (المبسوط للسرخسي، دار الكتب العلمية بيروت ۱۶/ ۵۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۴۷)

سات شرکاء میں سے ایک کا پیسہ سود یا صدقہ کا ہے

سوال [۹۹۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سات آدمیوں نے مل کر ایک بڑا جانور قربانی کے لیے خریدا، ان سات میں سے ایک کا پیسہ سود کا ہے، اور ایک کا سٹے کا ہے تو ایسی صورت میں اس پورے جانور کی قربانی کا کیا حکم ہے؟ سود اور سٹے داروں کی قربانی کا کیا حکم ہے؟ ان کے حرمت کی خباثت کی نحوست دوسرے شرکاء کے حصوں میں پہنچے گی یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سات آدمیوں نے قربانی کے لیے جو بڑا جانور خریدا ہے جس میں سود اور سٹے کا پیسہ شامل ہے تو ایسی صورت میں اولاً جس کا پیسہ سود کا ہے، اور جس کا سٹے کا ہے، ان کی قربانی درست نہ ہوگی، نیز ان کی حرمت کی خباثت کی وجہ سے سارے شرکاء کی قربانی صحیح نہ ہوگی۔ (مستفاد: جامع الفتاویٰ ۴/ ۲۷۷، کفایت المفتی زکریا ۱۹۰، جدید زکریا مطول ۱۲/ ۹۲، احسن الفتاویٰ ۷/ ۵۰۳)

ولـو ذبـحـوهـا بلا إذن الورثة لم يجزهم لأن بعضها لم يقع قربة وإن كـان شـريك الستة نـصـرانيـا أو مريدا اللحم لم يجز عن واحد منهم لأن الإراقة لا تتجزأ. (شامی، کتاب الأضحية، زكريا ٩/ ٤٧٢، كراچی ٦/ ٣٢٦)

وكـذا إذا كـان عبدا أو مدبرا يريد الأضحية لأن نيته باطلة لأنه ليس مـن أهـل هـذه الـقـربة فكان نصيبه لحما فمنع الجواز أصلا. (شامی، کتاب الأضحية، كراچی ٦/ ٣٢٦، زكريا ٩/ ٤٧٢)

أو كـان شـريک السبـع مـن يـريد اللحم أو كان نصرانيا و نحو ذلک لايـجوز للآخرين. (هـنـديـه، الباب الثـامـن فيـمـا يتعلق بالشركة فی الضحايا، زكريا قديم ٥/ ٣٠٤، جديد ٥/ ٣٥١، فتاویٰ سراجیه اتحاد ص: ٣٨٦)

وفـى الـكـافـى: وإن كان شريک الستة نصرانيا أو رجلا يريد اللحم لم يجز عن واحد منهم. (فتاویٰ تاتارخانية زكريا ١٧/ ٤٥٤، رقم: ٢٧٨١١)

وفي الكافي: ولو ذبحها الباقون بغير إذن الورثة لايجزيهم لأنه لم يقع بعضها قربة لعدم الإذن منهم فلم يقع الكل قربة ضرورة عدم التجزئ.

(تاتارخانية زكريا ۱۷/٤٥٤، رقم: ۲۷۸۰۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۱۱)

بینک کے ملازم کو قربانی میں شریک کرنے کا حکم

سوال [۹۹۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں ایک صاحب بینک میں ملازم ہیں جو تنخواہ ملتی ہے اسی پران کا گذران ہے، انہوں نے قربانی کے جانور میں حصہ لیا، معلوم یہ کرنا ہے کہ اس ملازم کی قربانی درست ہے؟ اوراس کے ساتھ جن بقیہ چھ حصہ داروں نے شرکت کی تھی، ان کی قربانی درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالرشید قاسمی سیڈھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: احسن الفتاویٰ میں بینک میں ملازمت کرنے والے کی تنخواہ اور اجرت کو بالکل ناجائز کہا ہے، اور اس کے ساتھ شریک ہوکر قربانی کرنے والوں میں سے کسی کی بھی قربانی درست نہ ہوگی، اس مسئلے کے لکھنے کے بعد انہوں نے دلیل میں جو جزئیات پیش کیے ہیں، وہ اس مسئلہ کے موافق نہیں ہیں، کیونکہ جزئیات میں جو نظائر پیش کیے گئے ہیں وہ غیر مسلم، یہودی اور نصرانی کے ساتھ قربانی میں شرکت سے متعلق ہیں، اورغیر مسلم، یہودی اور نصرانی کی قربانی شرعی طور پر صحیح نہیں ہوتی ہے، اس لیے ان کی پیش کردہ دلیل اور مسئلہ ہمارے حلق سے نیچے نہیں اترتا۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ زکریا ۷/۵۰۳)

بلکہ اس کے خلاف دلیل اور نظائر ہمارے سامنے ہیں، مثلاً اگر کسی شخص نے دوسرے کو اپنی دیوار پر تصویر بنانے کے لیے اجرت پر لیا تو تصویر بنانے کا کام اس کے لیے ناجائز اور

مکروہ ہے، مگر حق المحنت کی وجہ سے اجرت اس کے لیے جائز ہے، اسی طرح کسی مسلمان کو، کوئی غیر مسلم مندر بنانے کے لیے اجرت پر لائے، اور مسلمان، مندر یا گردوارہ یا عیسائیوں کا چرچ بنا دے تو اس مسلمان کے لیے حق المحنت کی وجہ سے اجرت حلال اور جائز ہے، نیز غیر مسلم نے کسی مسلمان کو خنزیر چرانے کے لیے اجرت پر لیا، اور مسلمان خنزیر چرالے، تو خنزیر چرانا تو اس کے لیے جائز نہیں، لیکن حق المحنت کی وجہ سے اس کی اجرت اس کے لیے جائز ہے، نیز شراب بنانے والا، شراب نچوڑنے والا، بیچنے والا، اس کی خدمت کرنے والا، ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے والا، سب مستحق لعنت اور گنہگار ہوتے ہیں، لیکن شراب ڈھو کر لے جانے والے کے لیے اپنی حق المحنت اور اجرت لینا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بلا کراہت جائز ہے، اور صاحبین کے نزدیک کراہت کے ساتھ جائز ہے۔

اسی طرح حضور ﷺ نے سود لینے والے، سود دینے والے، اس کا حساب و کتاب لکھنے والے اور اس کا گواہ بننے والے پر لعنت فرمائی ہے، اس لیے بینک کے ملازم کے لیے سودی حساب و کتاب کا لکھنا باعث لعنت اور باعث گناہ ہے، لیکن اس ملازمت کی تنخواہ، حق المحنت کی وجہ سے مذکورہ دلائل کی روشنی میں اس کے لیے حرام نہیں ہونی چاہیے، بلکہ حلال اور جائز ہوگی، اس لیے ہم بینک کے ملازم کی تنخواہ کو جائز سمجھتے ہیں، اور اس کے ساتھ قربانی میں شرکت بھی جائز سمجھتے ہیں، جن نظائر کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے وہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیے:

عن محمد: رجل استاجر رجلا ليصور له صورا أو تماثيل الرجال في بيت أو فسطـاط فإني أكره ذٰلک و أجعل له الأجر ...... وقوله ...... ولو استاجر الذمي مسلما ليبني له بيعة أو كنيسة جاز ويطيب له الأجر كذا في المحيط. (هنديه كتاب الإجارة، الباب السادس عشر في مسائل الشيوع في الإجارة، زكريا قديم ٤/ ٤٥٠، جديد ٤/ ٤٨٦، الفتاویٰ التاتارخانية زكريا ١٥/ ١٣٠، رقم: ٢٢٤٣١، ١٥/ ١٣١، رقم: ٢٢٤٣٨)

وفـي الشـامية: وعلى هذا الخلاف لو آجره دابته لينقل عليها الخمر أو أجـره نفسه ليرعى له الخنازير يطيب له الأجر عنده و عندهما يكره ......

وقوله ...... أو خياطا أمره أن يتخذ له ثوبا على زى الفساق يكره له أن يفعل لأنه سبب التشبه بالمجوس والفسقة. (شامی، کتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغیره، فصل فی البیع زکریا ۹/۵٦٢، کراچی ٦/۳۹۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ربیع الاول ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۴۸۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۳/۲ھ

مالداروں کے ساتھ فقیروں کی قربانی

سوال [۹۹۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سات آدمیوں نے مل کر ایک بڑا جانور خریدا، ان میں سے ۲؍آدمی فقیر ہیں جن کے اوپر قربانی واجب نہیں ہے، تو ایک ہی جانور کے اندر سرمایہ داروں کے ساتھ ۲؍فقیروں کی قربانی درست ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صحت قربانی کے لیے قربت شرط ہے، خواہ قربت کی جہت میں اختلاف ہی کیوں نہ ہو، لہٰذا مسئولہ صورت میں سرمایہ داروں کے ساتھ فقیروں کی قربانی بھی درست ہے، جبکہ سب کی نیت قربت کی ہو۔ (مستفاد: فتاویٰ دارالعلوم ۱۵/۵۵۴)

ولو أرادوا القربة أي الأضحية أو غيرها من القرب أجزأهم و سواء كانت القربة واجبة أو تطوعا أو وجب على البعض دون البعض سواء اتفقت جهات القربة أو اختلفت. (هنديه، الباب الثامن فيما يتعلق بالشركة فى الضحايا، زكريا قديم ٥/٣٠٤، جديد ٥/٣٥١)

ووجهه أن البقرة تجوز عن سبعة لكن من شرطه أن يكون قصد الكل القربة و إن اختلفت جهاتها كالأضحية والقران والمتعة عندنا لاتحاد المقصود وهو القربة. (هدايه، كتاب الأضحية، اشرفى ٤/٤٤٩)

ولو أرادوا القربة الأضحية أو غيرها من القرب أجزأهم سواء كانت القربة واجبة أو تطوعا أو وجبت على البعض دون البعض وسواء اتفقت جهات القربة أو اختلفت بأن أراد بعضهم الأضحية وبعضهم جزاء الصيد وبعضهم هدى الإحصار وبعضهم كفارة شيئ أصابه في إحرامه وبعضهم هدى التطوع وبعضهم دم المتعة والقران وهذا قول أصحابنا الثلاثة. (بدائع زكريا ٤/ ٢٠٩، كراچی ٥/ ٧١، حاشيه چلپی امداديه ملتان ٦/ ٨، زكريا ٦/ ٤٨٥)

ولو كان بعض الشركاء صغيرا أو أم ولد بأن ضحى عن الصغير أبوه و عن أم الولد مولاها وإن لم يجب عليهما جاز لأن كلها وقعت قربة. (تبيين الحقائق، زكريا ٦/ ٤٨٥، امداديه ملتان ٦/ ٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۱۴)

سات شرکاء میں سے کسی کی نیت گوشت خوری کی ہو تو کیا حکم ہے؟

سوال [۹۹۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سات آدمیوں میں سے ایک نے قربانی کی نیت نہیں کی ہے بلکہ گوشت کی نیت کی ہے اور وہ جانور خرید کرلا یا گیا، اگر اس شخص نے ذبح ہو جانے کے بعد تک قربانی کی نیت نہیں کی، تو یہ قربانی ہوئی یا نہیں؟ اور اگر ذبح کے بعد نیت کی تو کیا حکم ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بڑے جانور میں حصہ لینے والے سبھی شرکاء کا قربت وعبادت کی نیت کرنا لازم ہے، لہٰذا سات شرکاء میں سے اگر کسی نے گوشت کی نیت کی اور ذبح ہو جانے کے بعد تک قربانی کی نیت نہیں کی یا ذبح ہونے کے بعد نیت کی تو قربانی کسی کی بھی درست نہ ہوگی۔

وإن كان أحدهم يريد اللحم لم يجز عن واحد منهم. (تاتارخانية زكريا ١٧/ ٤٥٠، رقم: ٢٧٧٩٣)

أو كان شريك السبع من يريد اللحم أو كان نصرانيا ونحو ذٰلك لايجوز للآخرين أيضا. (هنديه، الباب الثامن فيما يتعلق بالشركة فى الضحايا، زكريا قديم ٥/ ٣٠٤، جديد ٥/ ٣٥١، سراجيه، مكتبه اتحاد ١/ ٣٨٦)

وإن كان شريك الستة نصرانيا أو مريدا اللحم لم يجز عن واحد. (در مختار مع الشامى، كتاب الأضحية، زكريا ٩/ ٤٧٢، كراچى ٦/ ٣٢٦)

فلو أراد أحدهم بنصيبه اللحم ...... لايجوز عن واحد منهم. (ملتقى الأبحر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٦٨، مصرى قديم ٢/ ٥١٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۲۰)

گوشت خوری کی نیت تھی مگر ذبح سے قبل قربانی کی نیت کرلی

سوال [۹۹۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سات آدمیوں میں سے دو نے گوشت خوری کی نیت کی تھی، لیکن ذبح سے پہلے انہوں نے قربانی کی نیت کرلی، تو قربانی ہوئی یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: سات شرکاء میں سے دو نے پہلے گوشت خوری کی نیت کی تھی، لیکن ذبح سے پہلے ان دونوں نے قربانی کی نیت کرلی تو ایسی صورت میں سب کی قربانی درست ہوجائے گی، اس لیے کہ اعتبار آخری نیت کا ہوتا ہے، اور جب اخیر میں انہوں نے ذبح سے پہلے قربانی کی نیت کرلی تو سب کی قربانی درست ہوجائے گی۔ (مستفاد: انوار مناسک ص: ۵۱۲)

أو سبع البقرة بأن اشترك مع ستة فى بقرة أو بعير و كل يريد القربة وهو من

أهلها. (مجمع الأنهر، کتاب الأضحية، دار الكتب العلمية بيروت ١٦٨/٤، مصری قديم ٥١٧/٢)

إن البقرة تجوز عن سبعة إذا كانوا يريدون وجه الله. (هندیه جدید ٣٥١/٥، قديم ٣٠٤/٥)

إن البدنة تجزئ عن سبعة بنية القربة من كل منهم. (شامی، زکریا ٤٥٧/٩، کراچی ٣١٦/٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۱۲)

مختلف جہات کی نیت ایک جانور میں کرنے کا حکم

سوال [۹۹۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سات آدمیوں نے مل کر بڑا جانور قربانی کے لیے خریدا، ان میں سے دو آدمیوں نے اپنی واجب قربانی کی نیت کی، اور دو نے نذر کی قربانی کی نیت کی، ایک نے مرحوم والد کی طرف سے قربانی کی نیت کی، اور ایک نے اپنی نفلی قربانی کی نیت، کی تو ایسی صورت میں مختلف قسم کی قربانیوں کی نیت ایک جانور میں جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چونکہ سب کی نیت تقرب الی اللہ کی ہے اس لیے مختلف جہات کی نیت کرنے والوں میں سے ہر ایک کی قربانی درست ہوگئی۔

ولو أرادوا القربة الأضحية أو غيرها من القرب أجزأهم سواء كانت القربة واجبة أو تطوعا أو وجبت على البعض دون البعض، وسواء اتفقت جهات القربة أو اختلف بأن أراد بعضهم الأضحية، وبعضهم جزاء الصيد، وبعضهم هدى الإحصار، وبعضهم كفارة شيئ أصابه فى إحرامه، وبعضهم هدى التطوع، وبعضهم دم المتعة والقران ...... ولنا أن الجهات وإن اختلفت صورة فهى فى

المعنى واحد؛ لأن المقصود من الكل التقرب إلى الله عز شأنه. (بدائع، كتاب التضحية، زكريا ٤/٢٠٩، كراچی ٥/ ٧١، هنديه زكريا قديم ٥/٣٠٤، جديد ٥/ ٣٥١)

والإبل والبقر يجوز عن سبعة إذا أراد الكل القربة اختلفت جهة القوبة أو اتحدت. (قاضيخان زكريا جديد ٣/٢٤٦، وعلى هامش الهندية ٣/٣٤٩)

ولو نوىٰ بعض الشركاء الأضحية وبعضهم هدى المتعة، وبعضهم هدى القران، وبعضهم جزاء الصيد، وبعضهم دم العقيقة، جاز عن الكل فى ظاهر الرواية، عن محمد في النوادر كذلك. (تاتارخانية زكريا ١٧/ ٤٥٢، رقم: ٢٧٨٠٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۱۱۲۹۱/۴۰)

بڑے جانور کی قربانی میں مختلف جہات کا حکم

سوال [۹۹۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے بنگال میں یہ عام دستور ہے کہ لوگ ایک ساتھ مل کر ایک گائے میں تین چار شخص قربانی کرتے ہیں، اب ایک شخص نے ایک ہی گائے میں اپنی طرف سے قربانی، عقیقہ، دم جنایت، دم شکر، نفلی قربانی وغیرہ کی نیت کی، تو سوال یہ ہے کہ مذکورہ شخص کی قربانی مختلف جہات کے ساتھ ایک ہی گائے میں درست ہے یا نہیں؟ اگر اس طرح سے نیت کر کے قربانی کر لی تو کونسی جہت ادا ہوگی؟ وضاحت کے ساتھ مع حوالہ جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: مفتی فخر الدین قاسمی مغربی بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایک گائے یا بھینس میں سات حصے ہو سکتے ہیں اور بجائے سات آدمی کے تین یا چار آدمی برابر حصہ داری کے ساتھ بھی ایک گائے یا بھینس میں شریک ہو سکتے ہیں، نیز اسی طرح ایک ہی شخص ایک گائے میں اپنی طرف سے قربانی کا

حصہ ایک عقیقہ کا حصہ ایک دم جنایت کا حصہ ایک دم شکر کا حصہ ایک نفلی قربانی کا حصہ کرسکتا ہے، چاہے یہ قربت مختلف جہات کی کیوں نہ ہو تب بھی جائز ہے۔

وتجوز عن ستة أو خمسة أو أربعة أو ثلاثة ذكره في الأصل لأنه لما جاز عن سبعة فما دونها أولىٰ. (البحر الرائق، كتاب الأضحية، زكريا ۸/ ۳۲۵، كوئٹه ۸/ ۱۷۸)

سواء اتفقت جهات القربة أو اختلفت بأن أراد بعضهم الأضحية، وبعضهم جزاء الصيد، وبعضهم هدى الإحصار، وبعضهم كفارة عن شيئ أصابه في إحرامه، وبعضهم هدى التطوع، وبعضهم دم المتعة أو القرآن وهذا قول أصحابنا الثلاثة رحمهم الله تعالىٰ وكذٰلك إن أراد بعضهم العقيقة عن ولد وُلد له من قبل كذا ذكر محمدفي نوادر الضحايا. (هنديه، الباب الثامن فيما يتعلق بالشركة في الضحايا، زكريا قديم ۵/ ۳۰٤، جديد ۵/ ۳۵۱) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۴؍ ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۸۸۱)

ایک شخص نے بڑے جانور میں واجب، نفلی قربانی، عقیقہ کی نیت کی ہو تو؟

سوال [۹۹۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک بڑے جانور میں ایک ہی شخص واجب قربانی کے ساتھ دیگر چھ حصوں میں سے بعض عقیقہ اور بعض نفلی قربانی کی نیت کرسکتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں مفتی رشید احمد صاحب لدھیانویؒ کیا فرماتے ہیں؟ اور مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ کیا فرماتے ہیں؛ نیز مفتی بہ قول تحریر کیجئے۔

المستفتی: عبد اللہ لدھیانوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایک شخص بڑے جانور میں مختلف جہات کی نیت کرسکتا ہے یا نہیں؟ اس کو مفتی رشید صاحبؒ نے ناجائز لکھا ہے مگر حضرت فقیہ الامت مفتی

محمود صاحبؒ نے اس کو جائز لکھا ہے اور جواز کا قول ہی زیادہ صحیح اور مفتی بہ ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ زکریا ۳/۵۳۲، فتاویٰ دارالعلوم ۱۵/۵۵۲)

لـو ذبـح بـدنة عـن أضـحية و متعة و قران مع اختلاف جهة قربتهم جاز عندنا لاتحاد المقصود وهو القربة. (مجمع الأنهر، كتاب الأضحية، دار الكتب العلمية بيروت ٤/١٧٣، مصرى قديم ٢/٥٢١، هدايه اشرفى ٤/٤٤٩، بدائع الصنائع زكريا ٤/٢٠٩، كراچى ٥/٧١، الفتاوىٰ التاتارخانية زكريا ١٧/٤٥٢، رقم: ٢٧٨٠٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۲۹۲)

شخص واحد کا بڑے جانور میں جہات متعددہ کی نیت کرنا

سوال [۹۹۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فتاویٰ محمودیہ ۱۷/ ۲۵۱ پر فتویٰ ہے جس میں اشرف المدارس کراچی کے فتویٰ کا جواب دیا ہے، کیا یہ جواب درست ہے؟ جبکہ ص ۲۵۵ پر تحریر ہے کہ اگر ایک شخص ایک گائے خریدتے وقت جہات متعددہ تقرب کی نیت کرلے تو اس کا حکم صراحتاً کتب فقہ میں نہیں ملا اس سے اوپر مفتی بہ قول میں پورا جانور قربان کرنے میں ایک ہی قربانی کا حصہ ہونا مذکور ہے، احسن الفتاویٰ ۷/ ۵۴۳ پر رسالہ ''گائے کی قربانی'' میں ایک شخص کے دو حصے ہیں، اس کا بھی مطالعہ فرمالیں تو بہتر ہو، خاص کر رسالہ کے اخیر صفحہ کا مطالعہ ہو تو اور بہتر ہوگا، اس میں یہ ہے کہ تحریر مذکور کے بعد بندہ نے حضرت مفتی محمود حسن صاحب کی خدمت میں لکھا کہ ملتقی الابحر کے جزئیہ میں ''ذبح'' صیغہ مجہول ہے اس لیے اس سے استدلال تام نہیں، اس کے جواب میں مفتی صاحب نے تحریر فرمایا کہ ''ملتقی الابحر کا جزئیہ اگر بصیغۂ مجہول ہو تو اس سے صراحتاً شخص واحد کی طرف سے تعدد جہات پر استدلال قوی نہیں ہوگا''، اسی صفحہ کے ختم پر ہے، غرض کہ اب تک متعدد واجبات کی صحت کے بارے میں بھی کوئی صریح جزئیہ نہیں ملا اور تزاحم

النفل بالواجب تو اس سے بھی ابعد ہے اس کا جواز کیسے ثابت ہوگا؟

المستفتی: نور محمد جھنجھانوی مظفرنگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہ العالی کی رائے کا مدار اس پر ہے کہ حدیث شریف کو اپنے مورد پر رکھا جائے مگر حدیث شریف بھی تو اپنی جگہ مطلق ہے، اس میں علی الاطلاق سات حصوں اور سات افراد کی طرف سے جواز کی قربانی کا ذکر ہے نہ ان ساتوں کا ازقبیل واجب ہونا ذکر ہے، اور نہ ہی ازقبیل تطوع ہونا اور نہ ہی واجب وتطوع کے اختلاط کی ممانعت ہے البتہ فقہاء کی عبارات صاف اور واضح نہیں ہیں؛ بلکہ فقہاء کی عبارات سے جواز تزاحم النفل بالواجب اور عدم جواز دونوں پہلوؤں کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے اس لیے عدم جواز پر زور دینا سمجھ میں نہیں آتا اس لیے کہ خود ائمہ اربعہ نے اس مسئلہ کو قیاسی ثابت کرکے کافی اختلاف کیا ہے، اس کی تفصیل اوجز المسالک قدیم ۴/۳۰۱ تا ۳۰۲، جدید دارالقلم بیروت ۱۰/ ۲۵۸ تا ۲۶۰ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ حدیث شریف یہ ہے:

عن جابر بن عبد الله قال كنا نتمتع في عهد رسول الله ﷺ نذبح البقرة عن سبعة والجزور عن سبعة نشترك فيها. (أبوداؤد شريف، باب في البقر والجزور عن كم تجزئ، النسخة الهندية ۲/ ۳۸۸ دار السلام رقم: ۲۸۰۷)

اب حدیث شریف میں اشتراک بالکل مطلق ہے اس میں تزاحم النفل بالواجب کے عدم جواز کی بات کرنا صرف قائل کی اپنی رائے ہے، لہٰذا دوسروں کا اس کے خلاف پہلو کو اختیار کرنا ممنوع کیوں ہو، لہٰذا ہم ''فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۷/ ۲۵۵، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۴۱۰'' کے فتویٰ کی رو سے حدیث کا مفہوم مناسب سمجھ کر جائز کہتے ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ شوال المکرّم ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۴۸۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۱۰/۳ھ

بڑے جانور میں شخص واحد کی طرف سے متعدد جہات قربت کی نیت

سوال [۹۹۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کہ کتاب ''مسائل قربانی وعقیقہ'' کے صفحہ ۱۵ / پر مسئلہ ہے کہ ایک بڑے جانور میں قربانی کے ساتھ اگر کوئی اپنے بچے کے عقیقہ کا حصہ لینا چاہے تو قربانی وعقیقہ دونوں جائز ہیں، عالمگیری اور شامی مع جلد وصفحہ کے ساتھ لکھا ہے، اس سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ واحد شخص واجب قربانی کے ساتھ نفلی حصہ قربانی کا جمع کرسکتا ہے لیکن شامی وعالمگیری کہہ رہی ہے: **أراد بعضهم الأضحية وبعضهم جزاء الصيد.**

''عالمگیری ۵/۳۰۴، عالمگیری اردو ۴۶۹'' پر ہے اور اگر سب نے قربانی کا ارادہ کیا یا قربانی کے سوا دوسری قربت کا قصد کیا تو سب کی مراد ادا ہو جائے گی، خواہ یہ قربت واجب ہو یا نفلی یا بعض نے واجب اور بعض نے نفل ادا کی ہو اور خواہ جہات قربت ایک ہی ہوں یا مختلف ہوں، جیسے بعض نے ہدی احصار کا اور بعض نے احرام میں کسی جرم کے کفارہ کا اور بعض نے ہدی تطوع کا اور بعض نے دم متعہ یا قران کا ارادہ کیا اور یہ ہمارے اصحاب ثلاثہ کا قول ہے، اسی طرح اگر بعض نے اپنے فرزند کے عقیقہ کا جو بیشتر پیدا ہوا ہے، قصد کیا تو بھی جائز ہے، ایسا ہی امام محمدؒ نے نوادر الضحایا میں ذکر کیا اور اگر کسی نے ولیمہ کا یعنی نکاح کی ضیافت کا قصد کیا تو یہ صورت مذکور نہیں ہے مگر چاہیے کہ جائز ہووے، اور امام ابوحنیفہؒ سے ایک روایت ہے کہ انہوں نے جہات قربت مختلف ہونے کی صورت میں شرکت کو مکروہ فرمایا ہے، اور امام اعظم سے یہ بھی مروی ہے کہ اگر یہ اشتراک ایک ہی نوعِ قربت میں ہو تو مجھے زیادہ پسند ہے اور ایسا ہی امام ابو یوسفؒ نے فرمایا ہے اس اردو عبارت سے اور بندہ نے مدرسہ مراد یہ میں شامی کی عبارت اور اس کا ترجمہ حاصل کیا تھا، یہی معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ عقیقہ وغیرہ وغیرہ کے حصے اس بڑے جانور میں لے سکتے ہیں، واحد شخص کا ایک جانور میں واجب حصہ کے ساتھ نفلی حصہ جمع کرنا ثابت نہیں معلوم ہوتا۔

(۲) ''احسن الفتاویٰ جلد ہفتم ۴۹۸'' پر گائے میں جتنے مالک ہوتے ہیں اس میں حصے بھی صرف اتنے ہی ہوتے ہیں ایسے ہی مذکورہ کتاب کے ۵۴۱ پر ہے، البتہ اگر کسی نے گائے میں اپنے حصہ کے ساتھ غیر کی طرف سے نفل قربانی یا عقیقہ کا حصہ رکھا تو چونکہ یہ شخص ان سب حصوں کا خود مالک ہے، اس لیے قول راجح پر اس کے سب حصوں کو ملا کر اس کی ایک ہی قربانی شمار ہوگی۔

''عالمگیری اردو ۴۵۹، سوال ۱۸'' پر ہے، اور مشائخ نے باہم اختلاف کیا ہے کہ بدنہ افضل ہے یا ایک بکری سو بعضے مشائخ نے فرمایا کہ اگر بکری کی قیمت بہ نسبت بدنہ کے زیادہ ہو تو بکری افضل ہے، کیونکہ بکری پوری فرض ہوگی، اور بدنہ کا ساتواں حصہ فرض ہوگا اور باقی نفل ہوگا، اور شیخ امام ابوبکر محمد بن الفضل نے فرمایا کہ بدنہ افضل ہے کیونکہ اس میں بہ نسبت بکری کے گوشت زیادہ ہوتا ہے اور یہ جو مشائخ نے کہا کہ بدنہ کا باقی حصہ نفل ہوگا سو ایسا نہیں ہے بلکہ جب ایک ہی شخص نے قربانی کی تو پورا فرض ہوگا اور اس کو نماز کی قرأت کے ساتھ مشابہ کیا ہے کہ اگر نماز میں صرف اسی قدر قرأت پر اقتصار کیا جس سے نماز جائز ہو جاتی ہے یعنی تین آیت پر تو جائز ہے، لیکن اگر اس سے زیادہ پڑھی تو سب فرض ہوگی، اس موقع پر کتاب ''ایضاح المسالک ۴۲ تا ۴۳'' سے کچھ عبارت نقل کر دوں شاید کام میں آوے، مگر مقلد محض کے لیے ایسے مسائل میں عالم محقق کی تقلید جائز نہیں ہے بلکہ اپنے امام کے قول راجح اور قول مفتی بہ پر عمل کرنا لازم ہے، ایک بڑا جانور اگر ایک ہی شخص قربانی کریگا تو حصہ ایک ہی واجب کا ادا ہوگا، اسی طرح اسی کتاب ''احسن الفتاویٰ جلد ۷'' کے ختم پر حضرت مفتی صاحبؒ کا ارشاد نقل فرما رہے ہیں، ''ملتقی الابحر'' کا جزئیہ اگر بصیغہ مجہول ہو تو اس سے صراحتاً شخص واحد کی طرف سے تعدد جہات پر استدلال قوی نہیں ہوگا، حضرت مفتی صاحب گنگوہیؒ کے نزدیک ''لو ذبح بدنة'' صیغۂ مجہول ہونا معلوم ہوتا ہے۔

اسی کتاب کے ص: ۵۴۷ پر ہے، مزید یہ کہ تعدد اشخاص کی صورت میں لحم واجب التصدق ہے یعنی اراقۃ میں سنین ماضیہ کی نیت غیر معتبر اور لحم میں معتبر ہے، مگر شخص واحد کی صورت میں وجوب تصدق مذکور نہیں، اس فرق سے خوب واضح ہو گیا کہ تعدد نیت کا اعتبار

نہیں ورنہ تو واحد شخص کی صورت میں بھی لحم واجب التصدق ہوتا؟

المستفتی: حافظ نور محمد جھنجھانوی مظفرنگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: متعدد افراد کی طرف سے مختلف جہات سے تقرب کی نیت ہو تو حضرت امام ابوحنیفہؒ کے دو قول ہیں:

(۱) قول مشہور جو ظاہر الروایہ ہے اس کے مطابق بلاکراہت تعدد جہات کے ساتھ قربانی جائز ہے اسی کو حضرات صاحبین نے اختیار فرمایا ہے اور اسی کو فقہاء نے

هذا قول أصحابنا الثلاثة. (بدائع کراچی ۵/۷۲، زکریا ۴/۲۰۹)

سے ذکر فرمایا ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے۔

(۲) حضرت امام صاحب کا قول غیر مشہور جس کو روی یا قیل سے بیان کیا جاتا ہے کہ متعدد افراد کی طرف سے متعدد جہات کے تقرب کی نیت ہو تو مکروہ ہے اور پسندیدہ یہی ہے کہ تعدد جہات نہ ہو اور اسی کے موافق امام زفرؒ کا قول ہے یا ان کا قول اس سے بھی سخت ہے:

وقال زفر لایجوز إلاإذا اتفقت جهات القربة. (بدائع کراچی ۵/۷۲، زکریا ۴/۲۰۹)

مگر حضرت امام صاحب کے اس قول پر فتویٰ نہیں ہے اور امام ابو یوسفؒ کی بھی ایک روایت اسی طرح ہے جس پر اعتماد نہیں کیا گیا، اب غور فرمایئے کہ فقہاء کے ان اقوال میں شخص واحد کی طرف سے تعدد جہات سے تقرب کی نیت سے قربانی کا حکم کہاں بیان کیا گیا ہے کہیں بھی مذکور نہیں ہے بلکہ بالکل خاموشی ہے اس لیے اس حکم کو امام صاحب کے قول مشہور اور قول مفتی بہ کے ساتھ شامل کرنا ہوگا اور قول غیر مشہور کے ساتھ لاحق کرنا درست نہ ہوگا، کیونکہ قول مشہور کی موجودگی میں غیر مشہور کو مقیس علیہ بنانا درست نہیں ہے اسی وجہ سے شخص واحد کی طرف سے واجب قربانی نفل قربانی، عقیقہ وغیرہ کو جائز کہا جاتا ہے، اب آنجناب سے گذارش ہے کہ ایضاح المسالک کی عبارت دوبارہ ملاحظہ فرمائیں، مقلد محض پر لازم ہے کہ مقلد محقق کے تفرد کو اختیار نہ کرے بلکہ امام صاحبؒ کے مذہب اور قول مشہور کو اختیار کرے تو کیا قول مشہور کی موجودگی میں قول ضعیف کو اختیار کرسکتا ہے بلکہ قول مشہور ہی کو

اختیار کرنا ہوگا، لہٰذا آنجناب کا ایضاح المسالک کی عبارت سے اپنا استدلال پیش کرنا درست نہ ہوگا اور شخص واحد کی طرف سے متعدد جہات کے تقرب کی نیت سے قربانی وغیرہ جائز ہوگی۔

آنجناب جن عبارات سے شخص واحد کی طرف سے جہات مختلف کی نیت سے عدم جواز پر استدلال کرنا چاہتے ہیں ان سے استدلال تام نہیں ہوتا اس لیے کہ وہ تمام عبارات اشخاص متعددہ کی صورت میں ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

ولو أرادوا القربة الأضحية أو غيرها من القرب اجزأهم سواء كانت القربة واجبة أو تطوعاً أو وجبت على البعض دون البعض وسواء اتفقت جهات القربة أو اختلفت بأن أراد بعضهم الأضحية وبعضهم جزاء الصيد وبعضهم هدى الإحصار وبعضهم كفارة شيئ أصابه في إحرامه وبعضهم هدى التطوع وبعضهم دم المتعة والقران وهذا قول أصحابنا الثلاثة وقال زفر لايجوز إلا إذا اتفقت جهات القربة بأن كان الكل بجهة واحدة ...... وكذٰلك إن أراد بعضهم العقيقة عن ولد ولد له من قبل لأن ذٰلك من جهة التقرب ...... كذا ذكره محمد في نوادر الضحايا، ولم يذكر ما إذا أراد أحدهم الوليمة وهي ضيافة التزوج وينبغي أن يجوز ...... وروى عن أبي حنيفةؒ كره الاشتراك عند اختلاف الجهة وروى عنه أنه قال لو كان هٰذا من نوع واحد لكان أحب إلى وهكذا قال أبو يوسفؒ. (بدائع الصنائع، كتاب التضحية، فصل شرائط جواز إقامة الواجب، كراچی قديم ٥/ ٧١-٧٢، زكريا ٤/ ٢٠٩، هنديه زكريا قديم ٥/ ٣٠٤، جديد ٥/ ٣٥١، شامی زكريا ٩/ ٤٧٣، كراچی ٦/ ٣٢٦)

ان عبارات پر غور فرمائیں، معلوم ہو جائے گا کہ شخص واحد کی طرف سے تعدد جہات کے جواز و عدم جواز سے متعلق کوئی لفظ نہیں ہے، بلکہ بالکل خاموشی ہے اور آنجناب کے استدلال میں یہی عبارات ہیں، لہٰذا استدلال تام نہیں، وہی کہنا ہوگا جو اوپر ہم نے لکھا ہے، اور آنجناب نے احسن الفتاویٰ سے بھی استدلال فرمایا ہے اور احسن الفتاویٰ میں استدلال کی کل کائنات دو عبارتیں ہیں اور دونوں استدال میں ناتمام ہیں:

(۱) ولو ضحى بالكل فالكل فرض كأركان الصلاة. (در مختار زكريا

۴۸۲/۹، کراچی ۳۳۳/۶)

واضح ہو کہ اس عبارت سے صاحب درمختار یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کوئی مالدار شخص ایک بڑا جانور قربانی کرتا ہے اور اس میں اس نے اپنی واجب قربانی کے ساتھ نفل قربانی وغیرہ کی کوئی نیت کی تو پورا جانور صرف ایک قربانی شمار ہوگی، ایسا نہ ہوگا کہ ساتواں حصہ واجب کی طرف سے ہو جائے اور باقی چھ حصے خود بخود بلانیت کے نفل قربانی ہو جائیں اس لیے کہ فعل واحد میں تعدد کے لیے نیت شرط ہے، ہاں البتہ فعل متعدد ہوں تو اس میں نیت کی ضرورت نہیں بلکہ بلانیت ایک فعل واجب قربانی کی طرف سے ہو جائے گا اور دوسرا فعل نفل کی طرف سے ہو جائیگا، لہٰذا اگر مالدار بلانیت دو بکری قربان کرے گا تو ایک واجب کی طرف سے اور دوسری نفل قربانی ہو جائے گی، لہٰذا صاحب احسن الفتاویٰ کا اس عبارت سے شخص واحد کی طرف سے تعدد جہات کے عدم جواز پر استدلال تام نہیں ہے، پوری عبارت ملاحظہ فرمائیں جو علامہ شامی نے اس کے نیچے درج فرمائی ہے:

الظاهر أن المراد لو ضحى ببدنة يكون الواجب كلها لا سبعها بدليل قوله في الخانية ولو أن رجلا موسرا ضحى ببدنة عن نفسه خاصة كان الكل أضحية واجبة عند عامة العلماء وعليه الفتوىٰ ...... لو ضحى الغني بشاتين فالزيادة تطوع عند عامة العلماء...... لعل وجه الفرق أن التضحية بشاتين تحصل بفعلين منفصلين وإراقة دمين فيقع الواجب إحداهما فقط والزائدة تطوع بخلاف البدنة فإنها بفعل واحد ما وإراقة واحدة فيقع كلها واجبا. (شامی زکریا ۴۸۲/۹، کراچی ۳۳۳/۶)

(۲) ولو ذبح ببدنة عن أضحية و متعة وقران لإتحاد المقصود وهو القربة. (ملتقى الأبحر، دار الكتب العلمية بيروت ۱۷۳/۴، مصری قدیم ۵۲۱/۲)

اس میں ذبح کے صیغۂ مجہول ہونے پر کوئی دلیل نہیں بلکہ اس کے بعد متصلاً صیغۂ معروف ''**ويأكل من لحم أضحية ذبح**'' کے صیغۂ معروف ہونے پر دلیل ہے، لہٰذا صیغۂ مجہول کہہ کر عدم جواز پر استدلال تام نہیں، بلکہ صیغۂ معروف قرار دیکر جواز ہی پر

استدلال تام ہوتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷ ربیع الاول ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۶۸۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۳/۱۸ھ

بڑے جانور میں ایک نے واجب، دو نے نذر، ایک نے مرحوم، اور ایک نے نفلی قربانی کی نیت کی تو؟

سوال [۹۹۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سات آدمیوں نے مل کر ایک بڑا جانور قربانی کے لیے خریدا ان میں سے دو آدمیوں نے اپنی واجب قربانی کی نیت کی، دو نے نذر کی قربانی، ایک نے مرحوم والد کی طرف سے قربانی اور ایک نے اپنی نفلی قربانی کی نیت کی، ایسی صورت میں مختلف قسم کی قربانیاں ایک جانور میں جائز ہیں یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چونکہ شرکت کرنے والوں میں سب کی نیت تقرب الی اللہ کی ہے اس لیے مختلف جہات کی نیت کرنے کے باوجود سوالنامہ میں درج کردہ سب طرح کے لوگوں میں سے ہر ایک کی قربانی درست ہوگئی۔

ولو أرادوا القربة الأضحية أو غيرها من القرب اجزأهم سواء كانت القربة واجبة أو تطوعاً أو وجبت على البعض دون البعض وسواء اتفقت جهات القربة أو اختلفت بأن أراد بعضهم الأضحية وبعضهم جزاء الصيد وبعضهم هدى الإحصار وبعضهم كفارة شيئ أصابه في إحرامه وبعضهم هدى التطوع . (بدائع الصنائع، كتاب التضحية، فصل شرائط جواز إقامة الواجب، كراچی قديم ٥/ ٧١- ٧٢، زكريا ٤/ ٢٠٩، هنديه زكريا قديم ٥/ ٣٠٤، جديد ٥/ ٣٥١،

شامی زکریا ۹/۴۷۳، کراچی ۶/۳۲۶)

وإن نوى بعض الشركاء التطوع وبعضهم أضحية العام الماضى صار دينـا عـليـه وبـعـضـهـم الواجبة عن عامه ذٰلک جاز الكل. (تـاتـارخـانية زكريا ۱۷/۴۵۲، رقم: ۲۷۸۰۲)

قـد عـلـم أن الشـرط قـصـد الـقربة من الكل ...... وشمل ما لو كانت القربة واجبة على الكل أو البعض اتفقت جهاتها أو لا، كأضحية وإحصار و جـزاء صيد و حلق ومتعة وقران ...... لأن المقصود من الكل القربة. (شامی، كتاب الأضحية، زكريا ۹/۴۷۲، کراچی ۶/۳۲۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ر محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۴۱۵)

واجب قربانی میں نفلی قربانی کی نیت کرنا

سوال [۹۹۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص اپنی واجب قربانی کے ساتھ میت کی طرف سے ایک حصہ ایک جانور میں رکھ سکتا ہے؟

المستفتی: عبدالجبار لکھیم پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایک بڑے جانور میں اپنی واجب قربانی کے حصہ کے ساتھ اپنے کسی مرحوم عزیز کی طرف سے حصہ رکھنا بلاشبہ جائز اور درست ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ ڈابھیل ۱۷/۴۰۸-۴۰۹)

وإن مـات أحد السبعة المشتركين فى البدنة وقالت الورثة اذبحوا عنه و عنكم صح عن الكل لقصد القربة عن الكل. (شامی، كتاب الأضحية، زكريا ۹/۴۷۱، کراچی ۶/۳۲۶، البنایه اشرفیه ۱۲/۴۹، هندیه زکریا قدیم ۵/۳۰۵، جدید ۵/۳۵۱)

واختلفوا فی البقرة قال بعض العلماء یقع سبعها فرضا والباقی تطوعا.
(شامی، کتاب الأضحیة، زکریا ۹/۴۶٦، کراچی ٦/۳۲۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ ذی قعدہ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۲۱۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۱۱/۱۴۳۱ھ

بڑے جانور میں قربانی کرنے والوں کے ساتھ عقیقہ کرنے والے کی شرکت کا حکم

سوال [۹۹۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قربانی کے ایک جانور میں چھ حصہ دار ہیں، پانچ حصہ دار قربانی کی نیت سے حصہ لیے ہوئے ہیں، اور چھٹا شخص ایک حصہ قربانی کے لیے اور ایک حصہ بنیت عقیقہ لیتا ہے، تو کیا اس طرح ایک جانور میں متعدد جہات قربت جائز ہے، جبکہ صاحب احسن الفتاویٰ نے اس شکل کو ناجائز بتایا ہے، اور محمودیہ میں جائز لکھا ہے، اس میں درست قول کی تعیین فرمائیں؟

المستفتی: مفتی محمد سمیر عثمان آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی کے جانور میں چھ حصے قربانی کے اور ایک حصہ عقیقہ کا رکھنا جائز اور درست ہے، اور احسن الفتاویٰ اور فتاویٰ محمودیہ میں سے فتاویٰ محمودیہ میں جو مسئلہ لکھا ہوا ہے وہی صحیح ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/۵۳۲، فتاویٰ دار العلوم ۱۵/۵٦۴، فتاویٰ رحیمیہ کراچی ۴/۲۷، جدید زکریا ۱۰/۲۷، آپ کے مسائل اور ان کا حل ۵/۴۸۳، کتاب المسائل ۲/۳۴۰)

وکذا لو أراد بعضهم العقیقة عن ولد قد ولد له من قبل لأن ذٰلک جهة التقرب بالشکر علی نعمة الولد. (شامی، کتاب الأضحیة، زکریا ۹/۴۷۲، کراچی ٦/۳۲٦)

ولو أرادوا القربة الأضحیة أو غیرها من القرب أجزأهم سواء کانت القربة واجبة أو تطوعا أو وجب علی البعض دون البعض (الی قوله) وکذٰلک إن أراد بعضهم العقیقة عن ولد له. (هندیه، الباب الثامن فیما یتعلق

بالشركة في الضحايا، زكريا قديم ٥/ ٣٠٤، جديد ٥/ ٣٥١، بدائع الصنائع زكريا ٤/ ٢٠٩، كراچى ٥/ ٧١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۳۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۲/۲۲ھ

قربانی کے جانور میں عقیقہ کا حصہ لینا

سوال [۹۹۵٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید مالک نصاب ہے اور خالد نصاب کی تعداد کا مالک نہیں اور یہ دونوں بجائے اپنی قربانی کرنے کے اپنے لڑکے یا لڑکی کا عقیقہ کرتے ہیں، تو کیا ان دونوں کا عقیقہ کرنا درست ہے؟ اور قربانی نہ کرنا درست ہے؟ جواب مع الدلیل عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد عرفان غفرلہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر یہ دونوں بڑے جانور میں اپنے لڑکوں کی طرف سے عقیقہ کا ارادہ رکھتے ہیں تو ان کا عقیقہ اور دوسروں کی قربانی صحیح اور درست ہوجائیگی اور الگ الگ بکرے سے عقیقہ کیا تب بھی درست ہے۔

لأن المقصود عن الكل القربة وكذا بعضهم العقيقة عن ولد له من قبل لأن ذٰلك جهة التقرب بالشكر على نعمة الولد. (شامي، كتاب الأضحية، زكريا ٩/ ٤٧٢، كراچى ٦/ ٣٢٦، هنديه زكريا قديم ٥/ ٣٠٤، جديد ٥/ ٣٥١، بدائع الصنائع زكريا ٤/ ٢٠٩، كراچى ٥/ ٧١)

البتہ اگر ان دونوں حضرات نے اپنی قربانی نہیں کی ہے تو زید جو صاحب نصاب ہے قربانی نہ کرنے کی وجہ سے گنہگار ہوگا، اس لیے کہ صاحب نصاب پر قربانی کرنا واجب ہے اور خالد جو صاحب نصاب نہیں ہے، وہ قربانی نہ کرنے کی وجہ سے گنہگار نہیں ہوگا۔

ومنها اليسار وهو ما يتعلق به وجوب صدقة الفطر دون ما يتعلق به وجوب الزكاة (إلى قوله) وملك نصابا تجب عليه الأضحية. (فتاویٰ عالمگیری، کتاب الأضحية، الباب الأول، زکریا قدیم ۵/ ۲۹۲، جدید ۵/ ۳۳۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ رجب المرجب ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۲۸۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۱/۷/۵ھ

قربانی کے جانور میں عقیقہ کرنے کا حکم

سوال [۹۹۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے گھر والوں نے قربانی کا جانور خریدا جس میں سے زید کے والد نے چار حصہ لیے، اس میں سے ایک حصہ اپنے لیے اور ایک حصہ بیوی کے لیے، بقیہ دو حصے زید کے جدین مرحوم کے لیے متعین کیے، بقیہ تین حصے میں سے دو حصے چچا کے لیے اور تیسرا حصہ تیسرے چچا نے لے لیا، مگر اپنی فرضیت کی ادائیگی کے بجائے عقیقہ کی نیت کرلی تو زید نے کہا کہ عقیقہ ترک کرکے فرضیت ادا کریں یا تیرے والد نے دادا، دادی کے لیے جو حصہ لیا ہے ان میں سے ایک آپ لے لیں تاکہ عقیقہ اور فرضیت دونوں ادا ہوجائیں اور ایک ہی حصہ میں دادا اور دادی کو بھی شریک کریں تو پھر قربانی کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی شامل کیا تو ائمہ اربعہ میں سے کن کے یہاں قربانی ہوئی اور کن کے یہاں نہیں، جبکہ بعض نے مذکورہ مسئلہ شافعیہ کی طرف منسوب کیا ہے، حنفیہ کے یہاں ہوئی یا نہیں، اگر نہیں ہوئی تو پھر ادائیگی کی کیا شکل ہوگی؟

المستفتی: عبدالرشید بانکوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: قربانی کے جانور کے اندر بعض لوگ عقیقہ کی نیت کریں اور بعض قربانی کی یا ایصال ثواب کی بہرصورت قربانی صحیح ہوجائے گی، شرط یہ ہے کہ سب شرکاء کی نیت قربت خداوندی ہو اور ثواب کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی شامل کرنا

درست ہے، جن لوگوں پر قربانی واجب تھی وہ لوگ اپنی قربانی ترک کر کے عقیقہ یا دوسروں کو ایصال ثواب کے لیے ان کی طرف سے قربانی کریں گے تو ان پر اپنی قربانی نہ کرنے کا گناہ ہوگا۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۲/ ۸۰، جدید زکریا ۱۰/ ۲۵)

ولو أرادوا القربة الأضحية أو غيرها من القرب أجزأهم سواء كانت القربة واجبة أو تطوعاً أو وجبت على البعض دون البعض وسواء اتفقت جهات القربة أو اختلفت بأن أراد بعضهم الأضحية وبعضهم جزاء الصيد وبعضهم هدى الإحصار (إلى قوله) **وكذٰلك إن أراد بعضهم العقيقة عن ولد له من قبل** (هنديه، كتاب الأضحية، الباب الثامن فيما يتعلق بالشركة في الضحايا، زكريا قديم ٥/ ٣٠٤، جديد ٥/ ٣٥١، شامي زكريا ٩/ ٤٧٢، كراچی ٦/ ٣٢٦، بدائع الصنائع زكريا ٤/ ٢٠٩، كراچی ٥/ ٧١) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۲۶/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۵۱۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۶/۲۶ھ

قربانی کے جانور میں عقیقہ کا حصہ لینا

سوال [۹۹۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سات آدمیوں نے مل کر قربانی کے لیے ایک بڑا جانور خریدا ان سات میں سے ایک شخص بچہ کے عقیقہ کا حصہ لینا چاہتا ہے تو قربانی میں عقیقہ کا حصہ لینا کیسا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: قربانی کے جانور میں عقیقہ کا حصہ لینا جائز ہے، اس لیے کہ عقیقہ بھی قربت میں داخل ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۷/ ۵۳۶، محمودیہ ڈابھیل ۱۷/ ۵۱۵، محمودیہ میرٹھ ۲۶/ ۴۱۱ تا ۴۱۴، باقیات فتاویٰ رشیدیہ ۲۳۷)

ولو نوى بعض الشركاء الأضحية وبعضهم هدى المتعة وبعضهم دم

العقيقة لولد ولد له في عامه ذٰلك جاز عن الكل في ظاهر الرواية.
(تاتارخانية زكريا ۱۷/۴۵۲، رقم: ۲۷۸۰۳)

وكذا لو أراد بعضهم العقيقة عن ولد قد ولد له من قبل لأن ذٰلك جهة التقرب بالشكر على نعمة الولد. (شامي، كتاب الأضحية، زكريا ۹/۴۷۲، كراچی ۶/۳۲۶)

ولو أرادوا القربة الأضحية أو غيرها من القرب اجزأهم سواء كانت القربة واجبة أو تطوعاً أو وجبت على البعض دون البعض وسواء اتفقت جهات القربة أو اختلفت بأن أراد بعضهم الأضحية وبعضهم جزاء الصيد وبعضهم هدى الإحصار. (بدائع الصنائع، كتاب التضحية، فصل شرائط جواز إقامة الواجب، كراچی ۵/۷۱-۷۲، زكريا ۴/۲۰۹، هنديه زكريا قديم ۵/۳۰۴، جديد ۵/۳۵۱، شامي زكريا ۹/۴۷۳، كراچی ۶/۳۲۶، تبيين الحقائق زكريا ۶/۴۸۴-۴۸۵، امداديه ملتان ۶/۸)

ويستوى إن كان قصدهم جميعا التضحية أو قصد بعضهم قربة أخرىٰ.
(المبسوط للسرخسي، دار الكتب العلمية بيروت ۱۲/۱۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۱۵)

قربانی کے جانور میں ولیمہ کا حصہ لینا

سوال [۹۹۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: چار آدمیوں نے مل کر ایک بڑا جانور خریدا تین آدمیوں نے کہا کہ ہمیں قربانی کا حصہ لینا ہے، چوتھا آدمی یہ کہتا ہے کہ بیٹے کا ولیمہ ہے، ہم ولیمہ کے لیے بقیہ ۴؍ حصہ لیں گے، ایک شخص نے ولیمہ کے لیے چار حصہ لے لیے تو باقی شرکاء کی قربانی درست ہوگی یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایک ہی شخص نے قربانی کے جانور میں ۴؍ حصہ

ولیمہ کے لے لیے، تو اس سے دیگر شرکاء کی قربانی پر کوئی اثر نہ پڑے گا بلکہ تمام شرکاء کی قربانی صحیح ہو جائے گی؛ کیونکہ ولیمہ بھی فی الجملہ تقرب الی اللہ ہی ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۷/ ۵۳۶، محمودیہ ڈابھیل ۱۷/ ۴۲۲، محمودیہ میرٹھ ۲۶/ ۳۳۴)

ولم يذكر الوليمة ولكن ينبغي أن تجوز لأنها تقام شكراً لله على نعمة النكاح، وردت بها السنة فإذا قصد بها الشكر إو إقامة السنة فقد أراد القربة. (شامي، كتاب الأضحية، زكريا ۹/ ۴۷۲، كراچی ۶/ ۳۲۶)

ولم يذكر ما إذا أراد أحدهم الوليمة وهي ضيافة التزويج و ينبغي أن يجوز لأنها إنما تقام شكراً لله على نعمة النكاح. (تبيين الحقائق زكريا ۶/ ۴۸۵، امداديه ملتان ۶/ ۸، هنديه زكريا قديم ۵/ ۳۰۴، جديد ۵/ ۳۵۱، بدائع الصنائع زكريا ۴/ ۲۰۹، كراچی ۵/ ۷۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۲۱)

ایک بڑے جانور میں قربانی، صدقہ، نذر وغیرہ کی نیت کرنا

سوال [۹۹۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بڑے جانور میں قربانی کے سات حصہ ہوتے ہیں تو اگر کوئی شخص ایک حصہ صدقہ کا، دوسرا شخص ایک حصہ نذر کا لینا چاہے تو دوسروں کی قربانی درست ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: محمد زبیر مظاہری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بڑے جانور میں سات حصے ہو سکتے ہیں، اور حنفی مسلک میں، راجح اور مفتی بہ قول یہی ہے کہ ساتوں حصے کسی بھی جہت سے تقرب الی اللہ کے ہوں، لہٰذا اگر شرکاء میں سے کوئی قربانی کا حصہ لیتا ہے اور کوئی نذر کا حصہ لیتا ہے اور کوئی نفلی قربانی

کا حصہ لیتا ہے اور کوئی عقیقہ کا حصہ لیتا ہے، تو یہ تمام حصے کسی نہ کسی جہت سے رضائے الٰہی اور تقرب الی اللہ کی قبیل سے ہیں، اس لیے سب کی طرف سے حصے صحیح ہو جائیں گے، لیکن افضل اور بہتر یہ ہے کہ جہت کا اختلاف نہ ہو، مگر فریضہ سب کی طرف سے ہر اعتبار سے صحیح ہو جائے گا۔

إن الدماء أنواع ثلاثة (إلى قوله) فالأول دم الأضحية نفلا كان أو واجبا منذوراً كان أو واجبا متبدأً. (بدائع الصنائع، كتاب التضحية، زكريا ٤/٢٢٣، ٢٢٤، كراچى ٥/٨٠)

ولو أرادوا القربة الأضحية أو غيرها من القرب أجزأهم سواء كانت القربة واجبة أو تطوعاً أو وجبت على البعض دون البعض وسواء اتفقت جهات القربة أو اختلفت بأن أراد بعضهم الأضحية وبعضهم جزاء الصيد وبعضهم هدى الإحصار وبعضهم كفارة شيئ أصابه في إحرامه وبعضهم هدى التطوع وبعضهم دم المتعة والقران وهذا قول أصحابنا الثلاثة. (بدائع كراچى ٥/٧١-٧٢، زكريا ٤/٢٠٩، هنديه زكريا قديم ٥/٣٠٤، جديد ٥/٣٥١، شامى زكريا ٩/٤٧٢، كراچى ٦/٣٢٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ رجب المرجب ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۱۷/۹۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/۷/۱۴۲۸ھ

غریب شریک کے درمیان سے نکل جانے کا حکم

سوال [۹۹۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سات افراد نے مشترکہ طور پر قربانی کے لیے ایک جانور خریدا ان شرکاء میں امیر غریب دونوں طرح کے لوگ تھے، اس کے بعد ایک غریب جس پر قربانی واجب نہیں تھی، علاحدہ ہو گیا، اب سوال یہ ہے کہ:

(الف) بقیہ شرکاء کسی دوسرے شخص (امیر وغریب) کو شامل کر کے قربانی کر سکتے ہیں یا نہیں؟ یا اسی کو شریک کرنا ضروری ہے؟

(ب) اگرکسی کوشامل کیےبغیر بقیہ چھ افرادقربانی کرلیں تو کیاقربانی درست ہوگئی؟

المستفتی: ابوالمکارم المعروفی مئو

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: قربانی کے جانور میں شریک افراد میں سے اگر کوئی غریب شخص علاحدہ ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے دوسرے شرکاء کی قربانی بھی درست نہ ہوگی، لہٰذا اسی کوشریک کرنا ضروری ہے، اس کی جگہ کسی دوسرے امیر یا غریب کوشریک کرنا کافی نہیں، نیز اگر اس کی جگہ کسی کوشامل کیے بغیر بقیہ چھ شرکاء اس جانور کی قربانی کرلیں تو بھی کسی کی قربانی درست نہ ہوگی ۔(مستفاد: کفایت المفتی ۸/ ۲۰۶، جدید زکریا مطول ١٢/٩٨-٩٩)

فإما إذا كان فقيراً فلا يجوز له أن يشرك فيها لأنه أوجبها على نفسه بالشراء للأضحية فتعينت للوجوب فلا يسقط عنه ما أوجبه على نفسه.

(بدائع الصنائع، كتاب التضحية، زكريا ٤/ ٢١٠، كراچی ٥/٧٢ دار الكتب العلمية بيروت ٦/٣٠٧، البنايه اشرفيه ١٢/٢١، شامی كراچی ٦/٣١٧، زكريا ٩/٤٥٩، هنديه زكريا قديم ٥/٣٠٤، جديد ٥/ ٣٥١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٢/ربیع الثانی ١٤٢٩ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٨/٩٥٧٠)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٤٢٩/٤/١٤ھ

فقیر نے قربانی کا بکرا خریدنے کے بعد فروخت کردیا اور بڑے جانور میں حصہ لے لیا

سوال [٩٩٦٢]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فقیر نے قربانی کے لیے جو بکرا خریدا ہے وہ اس کو بیچ کر کسی بڑے جانور میں حصہ لینا چاہتا ہے اور اس بکرے کی قیمت حصہ کی قیمت سے زیادہ ہے، مثلاً بکرا تین ہزار کا ہے اور حصہ دو ہزار کا ہے، اور ایک ہزار جو اس کے پاس بچ رہے ہیں ان کو اپنی ضروریات میں خرچ کرنا چاہتا ہے ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فقیر کے لیے قربانی کا بکرا بیچ کر کسی بڑے جانور میں حصہ لینا جائز نہیں ہے، بلکہ اسی بکرے کی قربانی لازم ہے، لیکن اگر بیچ دیا تو مکروہ ہوگا، اور جو زائد قیمت ہے اس کو اپنے استعمال میں نہیں لاسکتا ہے، اس کا صدقہ کرنا واجب ہے۔

أما الذی یجب علی الفقیر دون الغنی فالمشتری للأضحیة. (هندیه، کتاب الأضحیة، زکریا قدیم ٥/ ٢٩١، جدید ٥/٣٣٦، بدائع الصنائع کراچی ٥/٦٢، زکریا ١٩٢/٤)

رجل اشتریٰ شاة للأضحیة و أوجبها بلسانه، ثم اشتریٰ أخریٰ جاز له بیع الأولی فی قول أبی حنیفة و محمد، وإن کانت الثانیة شرا من الأولیٰ، وذبح الثانیة، فإنه یتصدق بفضل ما بین القیمتین؛ لأنه لما أوجب الأولیٰ بلسانه فقد جعل مقدار مالیة الأولیٰ لله تعالیٰ، فلایکون له أن یستفضل لنفسه شیئا، ولهذا یلزمه التصدق بالفضل. (هندیه، کتاب الأضحیة، الباب الثانی فی وجوب الأضحیة بالنذر، زکریا قدیم ٥/٢٩٤، جدید ٥/٣٣٩، بدائع الصنائع زکریا ٤/ ٢٠٠، کراچی ٥/٦٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۲۱۰)

سات شرکاء میں سے دو فقیر ہیں اور جانور گم ہوکر ملا ہی نہیں تو کیا کریں؟

سوال [۹۹۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سات آدمیوں نے مل کر ایک بڑا جانور قربانی کے لیے خریدا، ان میں دو آدمی فقیر ہیں، ان پر قربانی واجب نہیں، عید الاضحیٰ کے روز وہ جانور غائب ہوگیا، ایام قربانی گذر گئے اس کا اب تک پتہ نہیں چلا، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ ان فقیروں کی قربانی کا کیا حکم ہوگا، اور

سرمایہ داروں کی قربانی کا کیا حکم ہوگا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مالدار اور فقیروں نے مل کر قربانی کے لیے جو جانور خریدا تھا، وہ عید کے روز گم ہوگیا اور ایام نحر گذرنے پر بھی نہیں ملا، اس کے بارے میں حکم یہ ہے کہ مالداروں سے قربانی ساقط نہیں ہوتی ہے، ان پر دوسرے جانور کی قربانی لازم ہے، اس صورت میں ایام نحر گذرنے کی وجہ سے مالداروں پر جانور کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہوگا۔ اور فقیروں پر کوئی چیز لازم نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ دار العلوم ۱۵/۵۱۴)

إن المنذور لو هلكت أو ضاعت تسقط التضحية بسبب النذر غير أنه إن كان موسرا تلزمه أخرىٰ بإيجاب الشرع ابتداءاً لا بالنذر، ولو معسرا لا شيئ عليه أصلا. (شامي، كتاب الأضحية، زكريا ۹/۴۷۱، كراچی ۶/۳۲۵-۳۲۶)

إذا اشترىٰ شاة للأضحية وهو موسر ثم إنها ماتت أو سرقت أو ضلت في أيام النحر أنه يجب عليه أن يضحي بشاة أخرىٰ ...... ولو اشترىٰ شاة للأضحية وهو معسر ...... ثم ضلت فلا شيئ عليه ولا يجب عليه شيئ آخر. (بدائع الصنائع زكريا ۴/۱۹۹-۲۰۰، كراچی ۵/۶۶)

الفقير إذا اشترىٰ أضحية فضلت فليس عليه أن يشتري مكانها أخرىٰ ولو كان غنيا فعليه ذٰلك. (تاتارخانية زكريا ۱۷/۴۱۳، رقم: ۲۷۶۷۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۱۲)

بڑے جانور میں غیر مسلم کی شرکت

سوال [۹۹۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کسی مسلمان نے کسی غیر مسلم کے بیل کو پالا اور جب بیل قربانی کے لائق ہوگیا تو

غیر مسلم نے کہا میری طرف سے اس کی قربانی کردو اور مسلمان چاہتا ہے کہ میں نے اس کو پالا ہے میں اپنے بچہ کا نام ڈال دوں، تو کیا ایک قربانی میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شریک ہو سکتے ہیں؟ پھر اس کا گوشت مسلمان کھا سکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: قسمت علی بردوان مغربی بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیر مسلم کی طرف سے قربانی معتبر نہیں ہے، اور قربانی کے اندر تمام شرکاء کا نفس قربانی میں شریک ہونا لازم اور ضروری ہے، اسی لیے قربانی کے بڑے جانور میں غیر مسلم کی شرکت درست نہیں ہے، اس کی شرکت کی وجہ سے مسلمانوں کی قربانی درست نہیں ہے۔

وإن كان شريك الستة نصرانيا أو مريدا اللحم لم يجز عن واحد منهم لأن الإراقة لا تتجزأ. (شامي، كتاب الأضحية، زكريا ۹/ ۴۷۲، كراچی ۶/ ۳۲۶، هنديه زكريا جديد ۵/ ۳۵۱، قديم ۵/ ۳۰۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ جمادی الاول ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۲۹۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۵/۱۵ھ

مابقیہ رقم غرباء کو دینے کا وکیل بنانا

سوال [۹۹۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک صاحب نے مجھے کئی قربانی کرانے کے لیے پیسے دیئے تھے، قربانی کرادی گئی لیکن اس میں سے کچھ رقم بچ گئی، تو رقم دینے والے کو بتادیا گیا کہ اتنی رقم بچ گئی ہے اس کا کیا کرنا ہے، اس پر انہوں نے کہا ضرورتمندوں کو دیدیں، تو دریافت کرنا ہے کہ:

(۱) کیا اس پیسے سے کسی ضرورت کی جگہ پر نل لگوا سکتے ہیں؟

(۲) غریب بستی میں شادی بیاہ کے موقع پر کھانے پکانے کے برتن خرید کر دے سکتے ہیں؟

(۳) کسی غریب کو بکری خرید کر پالنے کے لیے دے سکتے ہیں؟

(۴) یا کسی مدرسہ کی ضرورت میں دے سکتے ہیں؟

(۵) کسی غریب بچے کو کورس کی کتابیں خرید کر دے سکتے ہیں یا نہیں؟ شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: حکیم شمیم الدین جھبو کا نالہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حسب تحریر سوال رقم دہندہ نے آپ کو مابقیہ رقم غریب اور نادار لوگوں کو دینے کا وکیل بنایا ہے، بریں بنا آپ پر لازم ہے کہ آپ وہ رقم براہ راست کسی غریب کے ہاتھ میں دیدیں یا بکری یا کورس کی کتابیں نیز اسی طرح کی دیگر ضروریات کی چیزیں خرید کر حاجت مند لوگوں کو ان کا مالک بنادیں، تاہم بعینہ رقم خیرات کرنا ہی افضل ہے۔

الوکیل إنما یستفید التصرف من الموکل وقد أمره بالدفع إلی فلان فلا یملک الدفع إلی غیره. (شامی، کتاب الزکاۃ، زکریا ۳/۱۸۹، کراچی ۲/۲۶۹)

لایجوز لأحد أن یتصرف فی ملک غیره بلا إذنه وبلا وکالة منه أو ولایة علیه وإن فعل کان ضامنا. (الأشباه ۲/۴۴، شرح المجلة رستم اتحاد ۱/۶۱، رقم المادة: ۹۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۰۴۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۵/۱۴۳۱ھ

٦ باب: قربانی کے جانوراوران کی عمروں کا بیان

بھینس کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

سوال [۹۹۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: غیر مقلدین کا کہنا ہے کہ بھینس کی قربانی جائز نہیں، جبکہ ائمۂ اربعہ کے نزدیک گائے کی طرف بھینس کی قربانی بھی جائز ہے، گزارش ہے کہ بھینس کی قربانی کے تعلق سے کوئی حدیث مع حوالہ تحریر کریں، نیز فقہ کی کتابوں سے بھی حوالے پیش کریں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: بھینس کی قربانی بلاشبہ جائز اور درست ہے، اور اس کی قربانی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں نہیں کی، اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ عرب کی سرزمین میں بھینس زندہ نہیں رہ سکتی تھی، اور آج بھی یہی حال ہے اور جہاں بھینس زندہ رہتی ہے، وہاں تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسلام نہیں پہنچ سکا، بلکہ صحابہؓ کے آخری دور اور تابعین کے زمانے میں ان علاقوں میں اسلام پہنچا جن میں بھینس زندہ رہتی ہے، چنانچہ جب ان علاقوں میں اسلام پہنچ گیا تو اجلۂ تابعین میں امام حسن بصریؒ وغیرہ نے ”الجواميس بمنزلة البقر“ کے الفاظ کے ذریعہ حکم شرعی بیان فرما دیا ہے، ذیل میں عبارات ملاحظہ فرمائیے:

عن الحسن أنه كان يقول: الجواميس بمنزلة البقر. (مصنف ابن أبی شیبة، کتاب الزکاة فی الجوامیس تعد فی الصدقة، مؤسسة علوم القرآن ٦٥/٧، رقم: ١٠٨٤٨)

مصنف عبد الرزاق کی لمبی روایت کا مختصر حصہ ملاحظہ ہو:

وتحسب الجواميس مع البقر. (مصنف عبد الرزاق، باب البقر، المجلس العلمی بیروت ٢٤/٤، رقم: ٦٨٥١)

الجاموس نوع من البقر بدليل أنه يضم ذٰلک إلى الغنم والبقر فی

باب الزكاة. (بدائع الصنائع، كتاب التضحية، زكريا ٤/٢٠٥، كراچی ٥/٦٩)

ويجزئ الجاموس في الأضحية عن سبعة. (تاتارخانية زكريا ١٧/٤٣٤، رقم: ٢٧٧٤٢)

الجاموس يجوز في الضحايا والهدايا استحسانا. (خلاصة الفتاویٰ، اشرفی ديوبند ٤/٣١٤، البحر الرائق زكريا ٨/٣٢٤، كوئٹه ٨/١٧٧، قاضيخان زكريا جديد ٣/٢٤٥، وعلى هامش الهندية ٣/٣٤٨، بزازيه زكريا جديد ٣/١٥٧، وعلى هامش الهندية ٦/٢٨٩)

يجوز التضحية بالجاموس عن سبعة هو المختار. (فتاویٰ سراجية، اتحاد ص: ٣٨٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۲۱)

گائے کی قربانی کا شرعی حکم

سوال [۹۹۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گاؤ پرستی کے اس ملک میں گائے کا ذبیحہ ممنوع ہے، پھر بھی بعض مسلم آبادی والے خطے میں بلا روک ٹوک گائے کا ذبیحہ ہوتا ہے، نیز بعض وہ ہندوستانی خطے جہاں ہندوؤں کی کثیر آبادی ہے، ایسی جگہوں پر کچھ مسلمان رہتے ہیں وہ چوری چھپے گائے کا ذبیحہ کرتے رہتے ہیں، یہاں صرف دریافت یہ کرنا ہے کہ ایسے ماحول ومعاشرے میں عید قربانی کے موقع سے اگر کوئی بندۂ خدا چوری چھپے گائے کی قربانی پیش کرتا ہے تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟ ڈرے، سہمے اور ملک کے قوانین کی بندشوں کو توڑتے ہوئے گائے کی قربانی پیش کرنا کیسا ہے؟ کیا اس قسم کی قربانی سے قربانی کی روحانیت متأثر نہیں ہوتی؟ مفصل اور مدلل وضاحت فرمائیں۔

المستفتی: ابوحارث عثمانی علی گنج ضلع ایٹہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: گائے کا ذبیحہ شرعی نقطۂ نظر سے بلاشبہ جائز ہے

اور گائے کی قربانی کرنے کی صورت میں قربانی کرنا بلا کراہت درست ہو جاتی ہے، حکومت کے قانون کی وجہ سے اس کی روحانیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، نیز گائے کے ذبیحہ سے ممانعت، مداخلت فی الدین ہے، اور حکومت کو مداخلت فی الدین کا اختیار نہیں ہے، لیکن گائے کا ذبیحہ قانونی اعتبار سے بہت بڑا جرم تصور کیا جاتا ہے، اس لیے مسلمانوں کو اپنی عزت وآبرو کی تحفظ کی خاطر گائے کے ذبیحہ سے باز رہنا چاہیے، اس لیے کہ گائے کے بجائے بھینس اور کٹڑے کے ذریعہ سے مسلمانوں کی قربانی اور دوسری ضروریات کا بدل بآسانی حاصل ہو جاتا ہے۔ (مستفاد: امداد المفتیین ۲/۹٦۳)

قال الله تعالیٰ: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ. (البقرة: ۱۹۵)

عن حذيفة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: ليس للمؤمن أن يذل نفسه، قالوا: يا رسول الله! وكيف يذل نفسه؟ قال: يتعرض من البلاء لما لا يطيق. (مسند البزار، مكتبه العلوم والحكم ۷/۲۱۸، رقم: ۲۷۹۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍صفر المظفر ۱۴۲٦ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۷۱۸)

خصی کی قربانی

سوال [۹۹٦۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قربانی کے جانوروں میں خصی بکرے کی قربانی ہوتی ہے جبکہ بکرے کا خصی ہونا ہی ایک نقص ہے، بعض آدمی اعتراض کرتے ہیں کہ یہ فیملی پلاننگ کی قسم ہے، جبکہ فیملی پلاننگ حرام ہے علماء کے نزدیک، تو خصی بکرے کا کیا جواز ہے؟ اس کا بھی شرعی دلیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

ہمارے یہاں پر اس مسئلہ پر لوگوں میں بحث چل رہی ہے اس لیے مجھے معلومات کی ضرروت پیش آئی۔

المستفتی: گل بہار عالم کشن گنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جانوروں میں خصی ہونا شریعت اسلامی میں عیب نہیں ہے، البتہ انسانوں کے حق میں عیب ہے، اور جانور میں زینت اور خوبصورتی کا ذریعہ ہے اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خصی جانوروں کی خود قربانی فرمائی ہے۔

عن جابرؓ قال: ذبح النبی ﷺ یوم الذبح کبشین أقرنین أملحین موجوء ین. (سنن أبی داؤد، الضحایا، باب ما یستحب من الضحایا، النسخة الهندیة ۲/ ۳۸٦، دار السلام رقم: ۲۷۹۵، مشکوٰة شریف ۱/ ۱۲۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ربیع الاول ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۵۹۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۲/۳/۱۶ھ

خصی بکرے کی قربانی

سوال [۹۹۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ایک بکرا خصی کرایا گیا وہ پورے طور پر خصی نہ ہوسکا یعنی ایک فوطہ نکل گیا اور ایک باقی رہ گیا ہے، ویسے اس کی قوتِ مردانہ بھی ختم ہوگئی ہے، لہٰذا ایسے بکرے کی قربانی کرنا جائز ہوگی یا نہیں؟ مدلل تحریر فرمائیں۔

(۲) اور اس بکرے کو قربانی کے نام سے رکھا گیا ہے اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اگر اس کی قربانی جائز نہ ہو تو اس کی قیمت کا دوسرا بکرا خرید کر قربانی کرنا واجب ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: محمد اسلم مانیاوالا ضلع بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خصی کرنا شرعاً عیب نہیں ہے، اس لیے ایسے جانور کی قربانی بلا کراہت جائز اور درست ہے، نیز حضور ﷺ نے خود خصی جانور کی قربانی فرمائی ہے۔

عن جابرؓ قال: ذبح النبی ﷺ یوم الذبح کبشین أقرنین أملحین

موجوء ین. (سنن أبی داؤد، الضحایا، باب ما یستحب من الضحایا، النسخة الهندیة ۲/۳۸٦، دار السلام رقم: ۲۷۹۵، مشکوٰة شریف ۱/۱۲۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/شوال المکرم ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۸۴۷)

ایک بکرا ایک فرد کی طرف سے اور گائے بھینس، اونٹ سات کی طرف سے

سوال [۹۹۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک بکرے کو ایک ہی حصہ میں قرار دیا گیا ہے، متعدد افراد کی طرف سے جائز نہیں ہے، یہ کس روایت سے ثابت ہے، اور گائے یا بدنہ کی قربانی سات آدمی کی طرف سے جائز ہے؟ اس سلسلے میں کتابوں کے حوالے سے جواب عنایت فرمائیں، نوازش ہوگی۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بدنہ اور گائے کی قربانی سات افراد کی طرف سے جائز ہے اور بکرے کی قربانی صرف ایک فرد کی طرف سے جائز ہے، متعدد افراد کی طرف سے جائز نہیں ہے۔

وقال بعض أهل العلم لا تجزئ الشاة إلا عن نفس واحدة وهو قول عبد الله بن المبارک، وغیره من أهل العلم. (ترمذی شریف، باب ماجاء أن الشاة الواحدة تجزئ عن أهل البیت، النسخة الهندیة ۱/۲۷۷، تحت رقم الحدیث ۱۵۰۵)

عن أبی سعید قال: کان النبی ﷺ یضحی بکبش أقرن فحیل، ینظر فی سواد، ویأکل فی سواد، ویمشی فی سواد. (أبو داؤد شریف، باب ما یستحب من الضحایا، النسخة الهندیة ۲/۳۸٦، دار السلام رقم: ۲۷۹٦)

عن ابن عباس أن النبی ﷺ أتاه رجل فقال: إن علی بدنة، وأنا موسر بها، ولا أجدها فأشتریها فأمره النبی ﷺ أن یبتاع سبع شیاه فیذبحهن.

(سنن ابن ماجه، باب کم یجزئ من الغنم عن البدنة، النسخة الهندیة ۲/۲۲٦، دار السلام

رقم: ٣١٣٦، مسند أحمد بن حنبل ١/٣١١-٣١٢، رقم: ٢٨٤٠-٢٨٥٣)

عن جابر بن عبد الله أنه قال: نحرنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم بالحديبية البدنة عن سبعة والبقرة عن سبعة. (ترمذی شریف، الأضحية، باب ماجاء فی الاشتراك فی الأضحية، النسخة الهندية ١/٢٧٦، دار السلام رقم: ١٥٠٢، صحيح مسلم، باب الاشتراك فی الهدی ...... النسخة الهندية ١/٤٢٤، بيت الأفكار رقم: ١٣١٨، مؤطا إمام محمد مكتبه فيصل رقم: ٢٨٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۲۸)

ایک بڑے جانور کو ایک آدمی تنہا اپنی طرف سے قربان کردے تو؟

سوال [۱۰۹۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حدیث وفقہ میں ہے کہ بڑے جانور میں سات آدمی شریک ہوسکتے ہیں، کیا بڑا جانور جس میں سات حصے ہوسکتے ہیں، ایک آدمی کی طرف سے ہوسکتا ہے یا نہیں؟ کیا اس میں افضلیت کا پہلو رہے گا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بڑے جانور کی قربانی جس میں سات آدمی شریک ہوسکتے ہیں، ایک آدمی تنہا اپنی طرف سے پورا جانور کردے تو افضل اور زیادہ بہتر ہے۔

ولو أن رجلا موسرا أو امرأة موسرة ضحى بدنة عن نفسه خاصة كان الكل أضحية واجبة عند عامة العلماء وعليه الفتوىٰ. (خانيه، كتاب الأضحية، فصل فيما يجوز فی الضحايا ومالا يجوز، زكريا جديد ٣/٢٤٦، وعلى هامش الهندية ٣/٣٥٠)

ويجوز ذٰلک عن سبعة أو أقل من ذٰلک، ولا شک فی جواز بدنة أو بقرة عن أقل من سبعة بأن اشترک اثنان أو ثلاثة أو أربعة أو خمسة أو ستة فی بدنة أو بقرة لأنه

لما جاز السبع فالزيادة أولیٰ. (بدائع الصنائع، کتاب التضحية، زکريا ٤/٢٠٧، کراچی ٥/٧١)

بدنة تجوز عن واحد أيضا ...... ويجوز اشتراک أقل من سبعة، قال العيني في شرح الكنز: وتجوز عن ستة أو خمسة أو أربعة أو ثلاثة، ذكره محمد في الأصل لأنه لما جاز عن السبعة فمن دونه أولیٰ. (مجمع الأنهر، کتاب الأضحية، دار الکتب العلمية بيروت ٤/١٦٨، مصری قديم ٢/٥١٧)

ويجزئ عما دون سبعة بالأولیٰ. (شامی، کتاب الأضحية، زکريا ٩/٤٥٧، کراچی ٦/٣١٦)

وما قالوا: إن البدنة تكون بعضها نفلا فليس كذٰلک بل إذا ذبحت عن واحد كان كلها فرضا. (خانيه، فصل فيما يجوز في الضحايا و مالا يجوز، زکريا جديد ٣/٢٤٦، وعلى هامش الهندية ٣/٣٤٩) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۵/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۳۸)

بڑے جانور میں سات، اور چھوٹے میں ایک کا حکم، زندہ اور مردہ دونوں کیلئے

سوال [۹۹۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بڑے جانور کی قربانی میں سات آدمی تک شریک ہو سکتے ہیں اور دنبہ خصی چھوٹے جانور میں ایک ہی حصہ ہوسکتا ہے، یہ مسئلہ احیاء واموات کے لیے مساوی ہے یا کچھ فرق ہے؟

المستفتی: محمد غفران غفرلہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جی ہاں! یہ مسئلہ احیاء اور اموات میں مساوی ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/ ۵۳۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۳۰۷۰)

۷/۸/ ماہ کے فربہ بکرے کی قربانی درست ہے یا نہیں؟

سوال [۹۹۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ایک بکرا عمر تقریباً ۷/ یا ۸/ ماہ ہے وہ دانتا ہوا نہیں ہے، لیکن دیکھنے میں تندرست اور سال بھر کا معلوم ہوتا ہے اس بکرے کی قربانی کر سکتے ہیں یا نہیں؟

(۲) اگر بکرا اگلے سال کی قربانی کی نیت سے لیا تو اس کی اس سال قربانی کر سکتے ہیں یا نہیں؟ جب کہ اس کی عمر ایک سال ہے؟

المستفتی: ڈاکٹر محمد نسیم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) سال بھر سے کم عمر کے بکرے کی قربانی جائز نہیں ہے اگرچہ تندرست ہی کیوں نہ ہو اس لیے مذکورہ بکرے کی قربانی درست نہ ہوگی۔

(مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۳/ ۱۸۰، جدید ۱۰/ ۴۷)

(۲) اگر سال پورا ہو چکا ہے تو اس سال بھی اس کی قربانی جائز اور درست ہے، اس لیے کہ اس میں مانع قربانی نہیں ہے۔

عن جابر –رضی الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: لاتذبحوا إلا مسنة إلا أن يعسر عليكم فتذبحوا جذعة من الضأن. (صحيح مسلم، باب سن الأضحية، النسخة الهندية ۲/ ۱۵۵، بيت الأفكار رقم: ۱۹۶۳)

ويشترط الكامل، فلايجوز الناقص سواء كان النقصان من حيث السن أو من حيث الذات. (قاضيخان، كتاب الأضحية، فصل فيما يجوز فى الضحايا ومالايجوز، زكريا جديد ۳/ ۲۴۵، وعلى هامش الهندية ۳/ ۳۴۹)

ويجزئ فى الأضحية الثني، فصاعدا من كل شيئ، ولايجزئ ما دون ذلك من كل شيئ ...... والثنى من الغنم الذى تم عليه سنة. (المحيط البرهانى،

المجلس العلمی ۸/ ٤٦٦، رقم: ١٠٨١٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۹۱۸)

کیا تیرہویں ذی الحجہ کو پیدا ہونے والے بکرے کی آئندہ سال قربانی درست ہے؟

سوال [۹۹۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر تیرہویں ذی الحجہ کو بکری کا بچہ پیدا ہوا تو کیا آئندہ سال اس کی قربانی کر سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: نثار احمد بستوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر ۱۳/ ذی الحجہ کو پیدا ہوا ہے تو وہ آئندہ سال ایام قربانی میں پورے سال کا نہیں ہوگا، اور سال پورے ہونے سے ایک آدھ یوم کی کمی کی وجہ سے بھی قربانی درست نہیں ہوتی ہے، اس لیے مذکورہ صورت میں آئندہ سال مذکورہ بچہ کی قربانی درست نہ ہوگی۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/ ۵۶۸)

عن جابر -رضی الله عنه- قال: قال رسول الله ﷺ: لاتذبحوا إلا مسنة. (سنن أبی داؤد، باب ما یجوز من السن فی الضحایا، النسخة الهندیة ١/ ٣٨٦، دار السلام رقم: ٢٧٩٧، المکتب الإسلامي ٤/ ٢٩٤، رقم: ٢٩١٨)

وتقدیر هذه الأسنان لما قلنا، یمنع النقصان ولا یمنع الزیادة حتی لو ضحی بأقل من ذٰلک شیئا لایجوز. (عالمگیری، کتاب الأضحیة، الباب الخامس فی بیان محل إقامة الواجب، زکریا قدیم ٥/ ٢٩٧، جدید ٥/ ٣٤٣، بدائع الصنائع کراچی ٥/ ٧٠، زکریا ٤/ ٢٠٦)

ویشترط الکامل، فلایجوز الناقص سواء کان النقصان من حیث السن أو من حیث الذات. (قاضیخان، کتاب الأضحیة فصل فیما یجوز فی الضحایا

ومالا يجوز، زكريا جديد ۳/ ۲٤٥، وعلى هامش الهندية ۳/ ۳٤٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱ر جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۲۴۷)

بغیر دانتے ایک سالہ بکرے کی قربانی

سوال [۹۹۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بکرا ایک سال کا ہے لیکن دانت نہیں ہیں تو کیا قربانی کر سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد فراز بڑی مسجد بلندشہر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر واقعتاً بکرا ایک سال کا ہے اور آپ کو حتمی طور پر معلوم ہے کہ بکرے کی عمر ایک سال ہے تو اس کی قربانی شرعاً درست ہے، دانت پر قربانی کی صحت کا مدار نہیں ہے، بلکہ صحت کا مدار عمر پر ہے، دانت عمر معلوم کرنے کی احتیاطی طور پر ایک علامت ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۸/ ۲۳۷، جدید زکریا مطول ۱۲/ ۸۵، احسن الفتاویٰ ۷/ ۵۲۰، محمودیہ قدیم ۴/ ۳۱۵، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۳۶۲)

وصح حول من الشاة فلو ضحى بسن أقل لايجوز و بأكبر يجوز.
(شامی، كتاب الأضحية، زكريا ۹/ ٤٦٦، كراچی ٦/ ۳۲۲)

و تقدير هذه الأسنان بما قلنا، لمنع النقصان لا لمنع الزيادة حتى لو ضحى بأقل من ذٰلک سنا لايجوز، ولو ضحى بأكثر من ذٰلک سنا يجوز و يكون أفضل. (بدائع الصنائع، كتاب التضحية، زكريا ٤/ ٢٠٦، كراچی ٥/ ٧٠، هنديه زكريا قديم ٥/ ٢٩٧، جديد ٥/ ٣٤٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ر ذی الحجہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۹۵۴)

کیا ایک موٹھ سے بڑی سینگ کا جانور دوسال کا ہے؟

سوال [۹۹۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدارس کے علماء کہتے ہیں کہ اگر ایک موٹھ سے بڑی سینگ ہو تو جانور دوسال کا مانا جائے گا، اس کی حقیقت کیا ہے؟

المستفتی: حنیف اندور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ایک موٹھ سے بڑی سینگ کا ہونا جانور کے دوسال ہونے کے لیے علامت کی جو بات کہی گئی ہے وہ ہم کو معلوم نہیں، یہ جانوروں سے متعلق تجربہ رکھنے والے بتائیں گے، حضراتِ فقہاء نے سینگوں کے اوپر کوئی مدار نہیں رکھا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵ ؍ربیع الاول ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۵۲۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۳/۱۵ھ

بڑے جانور کی عمر کتنی ہو؟

سوال [۹۹۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) گائے، بیل، بھینس، بھینسا دوسال کا ہونا ضروری ہے؟ اس سے کم عمر کے جانور کی قربانی درست نہ ہوگی، اب وضاحت طلب امر یہ ہے کہ گائے، بیل، بھینس، بھینسا دو سال کے کب ہوتے ہیں، اس کی علامت کیا ہے؟ بحوالہ مدلل کریں۔

(۲) بڑے جانور میں دوسال کا تعین قصائی کے کہنے پر ہوگا یا نہیں؟ کیونکہ قصائی بیچوان ہوتا ہے، اور اس کا کہنا ہے کہ میں تو بیچوان ہوں، مجھے جو جتنی رقم دے گا اس کے حساب سے مال دوں گا، اس میں عمر کا کوئی تعلق نہیں ہے؛ اس صورت میں عمر کا تعین کس طرح ہو؟

المستفتی: حنیف اندور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) گائے، بیل، بھینس وغیرہ بڑے جانور کی عمر دو سال مکمل ہونا لازم ہے، دو سال سے کم کے جانور کی قربانی جائز نہیں ہے، اور چھوٹے جانور بکری، بھیڑ وغیرہ کی عمر ایک سال پوری ہونا لازم اور ضروری ہے، اور عمر پوری ہونے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ جانور دونتا ہوا ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ عمر پوری ہونے سے پہلے جانور دونتا نہیں ہوتا، بلکہ عمر پوری ہونے کے بعد دونتا ہونے لگتا ہے تو اس سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ دونتا ہونے سے پہلے بھی عمر پوری ہوسکتی ہے، لہٰذا اگر مالکِ جانور باوثوق طریقہ سے کہتا ہے کہ عمر پوری ہوگئی اور دیکھنے سے بھی عمر پوری معلوم ہوتی ہے تو ایسی صورت میں میں جانور کی عمر پوری تسلیم کرلی جائے گی، اور بہتر بات یہ ہے کہ اگر جانور دونتا ہوا نہیں ہے تو اس سلسلے میں تجربہ کار آدمی کو دکھا دیا جائے اور وہ بتا دے کہ اس کی عمر پوری ہوگئی ہے اور دیکھنے میں بھی عمر پوری معلوم ہوتی ہے اور مالک بھی پوری عمر بتلاتا ہے تو پھر اس کا اعتبار کرلیا جائے گا اور اس کی قربانی بلاتردد جائز ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۸/ ۲۳۷، جدید زکریا مطول ۱۲/ ۸۵، جواہر الفقہ قدیم ۱/ ۴۴۹، جدید زکریا ۶/ ۳۲۵)

(۲) بڑے جانور میں دو سال کا تعین صرف قصائی کے کہنے سے نہ ہوگا، بلکہ دیکھنے میں بھی جانور دو سال کا معلوم ہوتا ہو اور دو ایک تجربہ کار آدمی بھی کہتے ہوں کہ اس کی عمر پوری ہوگئی ہے، یہ اس وقت ہے جبکہ جانور اونا ہو، لیکن اگر جانور دونتا ہے تو پھر مزید تحقیق کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ عمر پوری ہونے کے بعد ہی جانور دونتا ہوتا ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۸/ ۲۳۷، جدید زکریا مطول ۱۲/ ۸۵، جواہر الفقہ قدیم ۱/ ۴۴۹، جدید زکریا ۶/ ۳۲۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵ ؍ربیع الاول ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۵۲۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۳/۱۵ھ

بڑے جانور کی عمر دو سال ہونا ضروری ہے یا چار دانت

سوال [۹۹۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ ایک عالم صاحب کا کہنا ہے کہ بڑے جانور کی عمر دو سال ہونا ضروری ہے اور اس میں چار دانت ہونا یہ علامت ہے، دو سال کے ہونے کی، لہٰذا اگر کسی بیل کی عمر دو سال ہو گئی ہے لیکن یا تو اس کے دانت ابھی آئے نہیں یا آ کر سب ٹوٹ گئے یا کچھ ٹوٹ گئے اور جانور چارہ کھا سکتا ہے تو اس کی قربانی درست ہے؟

المستفتی: محمد زبیر مظاہری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اصل حکم یہ ہے کہ گائے اور بھینس کی قربانی کے لیے دو سال کی عمر پوری ہونا لازم ہے، دانتوں پر مدار نہیں ہے، ہاں عام طور پر گائے اور بھینس کے دو سال پورے ہونے سے پہلے مادر زاد دانت ٹوٹتے نہیں، بلکہ دو سال پورے ہونے کے بعد مادر زاد دانت ٹوٹ جاتے ہیں اور نئے دانت نکلتے ہیں، اس کو دونتا کہا جاتا ہے، اگر جانور دونتا ہوتا ہے تو اس کی عمر پوری ہونا یقینی ہو جاتی ہے، اس لیے دونتا جانور کی تلاش ہوتی ہے، لہٰذا اگر کسی نے اپنے گھر جانور پال رکھا ہے، اور دو سال جانور کی عمر پوری ہو چکی ہے تو اس کے دانت دیکھنے کی ضرورت نہیں اور بازار سے جو جانور خریدا جاتا ہے اس کا دانت اس لیے دیکھا جاتا ہے کہ عمر پوری ہونے کے بارے میں یقینی معلوم نہیں اور دانت کے ذریعہ یقین ہو جاتا ہے نیز اگر جانور کے دانت اکثر یا سب ٹوٹ جاتے ہیں، مگر بدستور چرنے پر قادر ہے، تو وہ عیب دار نہیں ہے اور اس کی قربانی بلاتردد جائز ہے۔

وأما الهتماء وهي التي لا أسنان لها فإن كانت ترعى وتعتلف جازت وإلا فلا. (بدائع الصنائع، كتاب التضحية، باب محل التضحية، زكريا ٤/ ٢١٥، كراچی ٥/ ٧٥، المبسوط، دارالكتب العلمية بيروت ١٢/ ١٧، هدايه اشرفی ٤/ ٤٤٨)

ولا يجوز بالهتماء التي لا أسنان لها إن كانت لا تعتلف وإن كانت تعتلف جاز هو الصحيح. (البحر الرائق، كتاب الأضحية، كوئٹه ٨/ ١٧٦، زكريا ٨/ ٣٢٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍ رجب المرجب ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۳۷۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/ ۷/ ۱۴۲۸ھ

اُونا جانور کی قربانی

سوال [۹۹۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: خالد نے ایک بکرا قربانی کے لیے خریدا، بعد میں پتہ چلا کہ وہ اُونا ہے، دونتا نہیں تو اس بکرے کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خالد کے اس بکرے کی عمر ایک سال ہے تو اس کی قربانی بلا شبہ درست ہے، خواہ وہ دونتا ہو یا نہ ہو، اس لیے کہ صحت قربانی کے لیے بکرے کا ایک سال کا ہونا ضروری ہے، دونتا ہونا ضروری نہیں، بلکہ دونتا ہونا سال بھر کا ہونے کی علامت ہے، کہ اکثر بکرا سال بھر کا ہونے کے بعد ہی دونتا ہوتا ہے۔

فلا يجوز شيئ مما ذكرنا من الإبل والبقر والغنم عن الأضحية إلا الثني من كل جنس والثني من الغنم إبن سنة. (هنديه، كتاب الأضحية، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب، زكريا قديم ٥/ ٢٩٧، جديد ٥/ ٣٤٣)

ويجزئ في الأضحية الثني فصاعدا من كل شيئ ...... والثني من الغنم الذي تم له سنة. (تاتارخانية زكريا ١٧/ ٤٢٥، رقم: ٢٧٧١٣-٢٧٧١٤)

وصح الثني فصاعدا من الثلاثة والثني هو ابن خمس من الإبل وحولين من البقر والجاموس وحول من الشاة. (در مختار مع الشامي، كتاب الأضحية، زكريا ٩/ ٤٦٦، كراچی ٦/ ٣٢٢)

ويجزئ في الأضحية الثني فصاعدا من كل شيئ ...... والثني من الغنم الذي تم عليه سنة وطعن في الثانية. (المحيط البرهاني رشيديه ٦/ ٤٧٨، المجلس العلمي ٨/ ٤٦٦ رقم: ١٠٨١٣)

وأما سنه: فلايجوز شيئ مما ذكرنا من الإبل والبقر والغنم من الأضحية إلا الثني من كل جنس ...... وأما معاني هذه الأسماء فقد ذكر

القدوری أن الفقهاء قالوا الجذع من الغنم ابن ستة أشهر والثنی منه ابن سنة. (بدائع الصنائع زكريا ٤/ ٢٠٦، كراچی ٥/ ٧٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۹۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱/ ۱۱/ ۱۴۳۴ھ

فقیر نے بنیت قربانی ایک سال سے کم عمر کا بکرا خرید لیا

سوال [۹۹۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فقیر نے بقرعید کے زمانہ میں قربانی کے ارادے سے ایک بکرا خریدا وہ بکرا نابالغ ہے، اور پوری عمر کا نہیں ہے، قربانی کے شرائط پر نہیں اترتا ہے تو ظاہر بات ہے کہ اس کی قربانی درست نہیں ہوگی تو اب فقیر اس جانور کا کیا کرے؟ اور فقیر کے قربانی کے جانور خریدنے سے عملی نذر منعقد ہوجاتی ہے یہاں شرائط پر نہ اترنے کی وجہ سے عملی نذر منعقد ہوگئی یا نہیں؟

المستفتی: مولانا عبدالناصر مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اس مسئلہ سے متعلق بعینہٖ صریح جزئیہ دستیاب نہیں ہوسکا لیکن اس سے متقارب اور مؤید جزئیات حاصل ہوگئے ان جزئیات کا خلاصہ یہ ہے کہ جب فقیر نے قربانی کی نیت سے بکرا خرید لیا ہے اور وہ بکرا ایام قربانی تک عمر اور جسامت کے لحاظ سے کمسن اور نابالغ ہے اس عمر کا جانور قربانی میں شرعاً درست نہیں تو ایسی صورت میں بھی فقیر کی طرف سے نذر فعلی منعقد ہوگئی ہے اس جانور کو کسی اور کام میں لینا اس فقیر کے لیے جائز نہیں ہوگا اور نہ ہی ایام قربانی میں اس کو ذبح کرنا درست ہوگا بلکہ ایام قربانی گذر جانے کے بعد وہ جانور بعینہٖ غریبوں کو صدقہ کردینا لازم ہوگا، جزئیات ملاحظہ ہوں:

إن الشراء للأضحية ممن لا أضحية عليه يجری مجریٰ الإيجاب وهو النذر بالتضحية عرفا لأنه إذا اشتریٰ للأضحية مع فقره فالظاهر أنه

يضحي فيصير كأنه قال جعلت هذه الشاة أضحية. (بدائع الصنائع، كتاب التضحية، زكريا ٤/١٩٢، كراچى ٥/٦٢)

ثم قضائها قد يكون بالتصدق بعين الشاة وقد يكون بالتصدق بقيمة الشاة فإن كان أوجب التضحية على نفسه بشاة بعينها فلم يضحها حتى مضت أيام النحر يتصدق بعينها حية، وكذٰلك المعسر إذا اشترىٰ شاة ليضحي بها فلم يضح حتى مضت الوقت لأن الشراء للأضحية من الفقير كالنذر بالتضحية. (بدائع الصنائع زكريا ٤/٢٠٢، كراچى ٥/٦٨، هنديه زكريا قديم ٥/٢٩٤، جديد ٥/٣٣٩)

ولو تركت التضحية ومضت أيامها تصدق بها حية ناذر لمعينة. (در مختار مع الشامى، كتاب الأضحية، زكريا ٩/٤٦٣، كراچى ٦/٣٢٠)

فإن كان أوجب على نفسه أو كان المضحي فقير وقد اشترىٰ شاة بنية الأضحية فلم يفعل حتى مضت أيام النحر تصدق بها حية. (عالمگيرى، الباب الرابع فيما يتعلق بالمكان والزمان، زكريا قديم ٥/٢٩٦، جديد ٥/٣٤٢، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/٤٥، بدائع الصنائع كراچى ٥/٦٨، زكريا ٤/٢٠٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۲۷؍صفر المظفر ۱۴۲۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۲۸۷)	۱۴۲۵/۲/۲۷ھ

قربانی کی نیت سے پالے گئے جانور کی ہی قربانی واجب ہے یا دوسرے کی بھی؟

سوال [۹۹۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا یہ بات صحیح ہے کہ وہ جانور جس کو قربانی کی نیت سے خریدا ہو، جس پر نویں ذی الحجہ قائم ہوگئی اس کی قربانی واجب ہے چاہے غریب کا ہو یا مالدار کا، نویں ذی الحجہ سے پہلے اگر کوئی غریب بنیت قربانی جانور خرید ے تو اس پر وجوب نہ ہوگا، لہٰذا وہ نویں تاریخ سے پہلے بنیت قربانی جانور خرید کر فروخت کرسکتا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مالدار نے بنیت قربانی خریدا ہے تو وہی جانور قربان کرنا واجب نہ ہوگا اور اگر غریب نے بنیت قربانی خریدا ہے تو اسی جانور کی قربانی کرنا واجب ہوگا۔

وأما الذی یجب علی الفقیر دون الغنی فالمشتری للأضحیة إذا کان المشتری فقیرا، بأن اشتریٰ فقیر شاة ینوی أن یضحی بها. (بدائع الصنائع، کتاب التضحیة، کراچی ٥/٦٢، زکریا ٤/١٩٢، هندیه زکریا قدیم ٥/٢٩١، جدید ٥/٣٣٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍صفر المظفر ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۱۱۲۲)

قربانی کی نیت سے پالے ہوئے جانور کی قربانی کا حکم

سوال [۹۹۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کسی جانور کو ابتدائے سال ہی سے بنیت قربانی پالا گیا ہو تو اسی جانور کی قربانی واجب ہوگی یا اس کو فروخت کر کے دوسرا جانور بھی قربان کیا جا سکتا ہے، غریب و مالدار کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے جواب عنایت فرمائیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مالدار نے بنیت قربانی خرید کر پالا ہے تو فروخت کر کے دوسرا جانور قربان کر سکتا ہے، اور اگر غریب نے بنیت قربانی خریدا ہے تو فروخت کرنا جائز نہ ہوگا، بلکہ اسی جانور کی قربانی واجب ہوگی، اور اگر جانور گھر کا ہے یا بوقت خریداری قربانی کی نیت نہیں تھی، اور بعد میں قربانی کی نیت سے چارا کھلانا شروع کیا ہے تو مالدار وفقیر دونوں کے لیے فروخت کر کے دوسرا جانور قربان کرنا جائز ہے۔

وأما الذی یجب علی الفقیر دون الغنی فالمشتری للأضحیة إذا کان

المشتری فقیرا، بأن اشتریٰ فقیر شاة ینوی أن یضحی بها (إلی قوله) وإن کان غنیا لایجب علیه بالشراء شیئ بالاتفاق (وقوله) ولو کان فی ملک انسان شاة فنویٰ أن یضحی بها أو اشتریٰ شاة ولم ینو الأضحیة وقت الشراء ثم نویٰ بعد ذٰلک أن یضحی بها لایجب علیه سواء کان غنیا أو فقیرا لأن النیة لم تقارن الشراء فلا تعتبر. (بدائع الصنائع، کتاب التضحیة، زکریا ۱۹۲/٤-۱۹۳، هندیه زکریا قدیم ۲۹۱/٥، جدید ۳۳٦/٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ر صفر المظفر ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۱۱۲۲)

کیا بنیت قربانی خریدنے سے جانور متعین ہوجاتا ہے؟

سوال [۹۹۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایام اضحیہ میں قربانی کا جانور بنیت قربانی خریدنے سے قربانی کے لیے متعین ہوتا ہے یا ایام اضحیہ سے قبل خریدنے سے بھی متعین ہوجاتا ہے؟

المستفتی: ابوالمکارم المعروفی مئو

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غریب شخص قربانی کی نیت سے قربانی کا جانور ایام اضحیہ سے پہلے خریدے یا ایام اضحیہ کے اندر خریدے بہرصورت وہ جانور قربانی کے لیے متعین ہوجاتا ہے اور مالدار شخص کے قربانی کی نیت سے جانور خریدنے سے وہ جانور متعین نہیں ہوتا خواہ ایام اضحیہ سے پہلے خریدے یا ایام اضحیہ کے اندر خریدے۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۷/۵۲۹، فتاویٰ نظامیہ ص: ۳۳۹)

وأما الذی یجب علی الفقیر دون الغنی فالمشتری للأضحیة إذا کان المشتری فقیرا، بأن اشتریٰ فقیر شاة ینوی أن یضحی بها وإن کان غنیا لاتجب علیه بشراء شیئ بالاتفاق. (بدائع الصنائع، کتاب التضحیة، کراچی ٦۲/٥،

زکریا ۱۹۲/٤، هندیه زکریا قدیم ۲۹۱/٥، جدید ۳۳۲/٥) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۱۲؍ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۰۷ ۹۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۴/۱۲ھ

متعینہ جانور دوسرے کے نام سے ذبح کرنا

سوال [۹۹۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید وبکر نے قصائی سے دو بھینسے مع اجرت ذبح کسی قیمت پر خریدے اور مقرر کردیا کہ یہ میری طرف سے قربانی ہوگی، مگر بوقت ذبح قصائی نے بکر کا بھینسا زید کے لیے ذبح کردیا، مالک کو جب معلوم ہوا تو اس نے اپنا مقرر کردہ ذبح کرایا، اگر مالک راضی ہو جائے تو کیا اس کی قربانی صحیح ہوگئی؟ اور اگر راضی نہیں جیسے معلوم ہونے پر اپنا مقرر کردہ ذبح کرایا تو بکر کی قربانی کا کیا حکم ہوگا؟ اگر قربانی نہیں ہوئی تو یہ تاوان کس پر ہوگا؟

المستفتی: محمد اسحاق نولگڑھ راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید وبکر نے قصائی سے جو دو بھینسے خرید کر اپنا اپنا بھینسا قربانی کیلئے مقرر کردیا اور قصائی نے بکر کا مقرر کردہ بھینسا زید کیلئے ذبح کردیا تو وہ بکر کی طرف سے قربانی ہوگئی، اور زید کا اپنا مقرر کردہ بھینسا ذبح کرانا بھی درست ہوگیا؛ لہٰذا دونوں کی قربانی صحیح ہوگئی۔

ولو غلط اثنان وذبح کل شاۃ صاحبه یعني عن نفسه ...... فیکون کل واحد وکیلا عن الآخر دلالة. (شامی، کتاب الأضحیة، زکریا ٤٧٦/٩، کراچی ٣٢٩/٦)

أنه لو اشتراها بینة الأضحیة فذبحها غیره بلا إذن فإن أخذها مذبوحة ولم یضمنه أجزأته وإن ضمنه لا تجزیه. (الأشباه کراچی ٣٢/١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ صفر المظفر ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۳۱ ۶۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۲/۱۴ھ

دودھ دوہنے اور قربانی کی نیت سے خریدے گئے جانور کا حکم

سوال [۹۹۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (الف) زید نے سال کے شروع میں ایک گائے اس نیت سے خریدی کہ عید الاضحیٰ کے دن آنے تک اس کے دودھ وغیرہ سے فائدہ حاصل کرتا رہے گا، اس وقت تک اگر یہ جانور اللہ نے زندہ رکھا تو قربانی بھی اسی جانور کی کرے گا، تو اس طرح سال کے شروع یا عید الاضحیٰ سے چند دن پہلے ایسی مشترک نیت سے جانور خریدنا اور فائدہ حاصل کرتے رہنا اور پھر اسی کی قربانی کرنا درست ہے یا نہیں؟

(ب) نیز قربانی کے دن سے پہلے اگر کوئی ضرورت پیش آجائے تو تقریب میں اس جانور کو ذبح یا فروخت کر کے اس کا پیسہ استعمال کرنا درست ہے یا نہیں؟

(ج) اگر قربانی کا جانور قربانی سے پہلے بیمار ہو جائے تو کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد ہارون رشید کرناٹک

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: (الف) زید اگر مالدار ہے اور دودھ دوہنے اور قربانی کی نیت سے جانور خریدتا ہے تو اس طرح خریدنا اور اس طرح خریدے ہوئے جانور سے بلاضرورت کسی قسم کا نفع حاصل کرنا مکرہ ہے، کیونکہ مالدار ہونے کی وجہ سے یہ جانور اس کے حق میں ایسا متعین تو نہیں ہوتا کہ اسی کا ذبح کرنا واجب ہوگا مگر اتنی تعیین ضروری ہو جاتی ہے کہ بلاضرورت اس کو بدلنا یا اس سے نفع حاصل کرنا مکروہ ہو جاتا ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۸/۲۱۴، جدید زکریا مطول ۱۲/۱۲۴)

وأما المشتراة من المؤسر للأضحية فلا بأس أن يحلبها و يجز صوفها. (بدائع الصنائع، كتاب التضحية، زكريا ٤/ ٢٢٠، كراچی ٥/ ٧٨، هنديه زكريا قديم ٥/ ٣٠١، جديد ٥/ ٣٤٧)

والصحيح: الموسر والمعسر في حلبها و جز صوفها سواء في الكراهة. (هنديه، كتاب الأضحية، الباب السادس في بيان ما يستحب في الأضحية والانتفاع بها، زكريا جديد ٥/ ٣٤٧، قديم ٥/ ٣٠١)

اور اگر وہ غریب ہے تو اس کے لیے ایسی مشترکہ نیت سے جانور خریدنا اور ذبح سے پہلے اس سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا ہر حال میں مکروہ ہے، کیونکہ اس کے حق میں بنیت قربانی خریدا ہوا جانور قربانی کے واسطے متعین ہو کر نذر کے حکم میں ہو جاتا ہے اور ہر حال میں اس پر اسی کی قربانی واجب ہے۔

ولو اشتریٰ شاة للأضحية يكره أن يحلبها أو يجز صوفها فينتفع به لأنه عينهاللقربة فلا يحل له الانتفاع بجزء من أجزائها قبل إقامة القربة بها كما لا يحل له الانتفاع بلحمها، إذا ذبح قبل وقتها. (فتاویٰ عالمگیری، کتاب الأضحية، الباب السادس فی بیان ما یستحب فی الأضحية والانتفاع بها، زکریا قدیم ۳۰۰/۵، جدید ۳۴۷/۵، بدائع الصنائع زکریا ۲۱۹/٤، کراچی ۷۸/۵)

(ب) ایامِ قربانی سے پہلے اگر کوئی ضرورت شدیدہ پیش آجائے تو مالدار کے لیے بنیت قربانی خریدے ہوئے جانور کو ذبح کرنا یا بیچ کر اس کا پیسہ استعمال کرنا بلا کراہت جائز ہے، بشرطیکہ اس کے بدلے میں دوسرے جانور کی قربانی کی نیت ہو اور غریب کے لیے کسی حال میں بھی قربانی سے قبل انتفاع جائز نہیں۔

إن المشتراة للأضحية متعينة للقربة إلى أن يقام غيرها مقامها. (شامی، کتاب الأضحية، زکریا ٤٧٦/۹، کراچی ۳۲۹/٦، بدائع الصنائع کراچی ۷۸/۵، زکریا ۲۲۰/٤)

(ج) قربانی سے پہلے اگر وہ جانور اتنا بیمار ہو جائے کہ قربانی کے قابل نہ رہے تو مالک اگر مالدار ہے تو اس پر اس کے بدلے میں دوسرے جانور کی قربانی واجب ہے اور اگر وہ فقیر ہے تو اس پر اسی جانور کی قربانی واجب ہے۔

ولـو اشتریٰ أضحية وهی صحيحة العين ثم أعورت عنده وهو مؤسر (إلی قوله) لا تجزی عنه وعليه مكانها أخریٰ بخلاف الفقير وفی موضع: وفی حق المعسر تجوز علی كل حال. (هـنـديه، کتاب الأضحية، الباب الخامس فـی بیان محل إقامة الواجب، زکریا قدیم ۲۹۹/۵، جدید ۳٤۵/۵، بدائع الصنائع کراچی ۷٦/۵، زکریا ۲۱٦/٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۶۲۱۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۶/۱۴۲۰ھ

قربانی کی نیت سے خریدے گئے بکرے کو عقیقہ کے لیے رکھنے کا حکم

سوال [۹۹۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک بکرا قربانی کے لیے خریدا مگر اس بکرے کو عقیقہ کے لیے رکھ لیا اور کسی بڑے جانور میں قربانی کا ایک حصہ لے لیا تو کیا ایسا کرنا صحیح اور درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد صلاح الدین نو ہٹہ سہرسا بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر آپ اس قدر سرمایہ دار ہیں کہ آپ پر قربانی کرنا واجب ہے اور اس واجب کی ادائیگی کے لیے آپ نے بکرا خریدا ہے تو ایسی صورت میں آپ کو اختیار ہے چاہے اس بکرے کو قربانی کے لیے رکھیں یا عقیقہ کے لیے ارادہ کریں یا اسے بیچ دیں، اور پھر واجب قربانی کی ادائیگی کے لیے کسی بڑے جانور میں حصہ لے لیں اس طرح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ووجهه أن نية التعيين قارنت الفعل وهو الشراء فأوجبت تعيين المشترى للأضحية إلا أن تعيينه للأضحية لا يمنع جواز التضحية بغيرها. (بدائع الصنائع، كتاب التضحية، باب كيفية الوجوب، زكريا ٤/٢٠٢، كراچی ٥/٦٨)

إذا اشترىٰ شاة ينوى بها الأضحية ففى هذا الوجه فى ظاهر الرواية لاتصير أضحية مالم يوجبها بلسانه. (تاتارخانية زكريا ١٧/٤١٢، رقم: ٢٧٦٧١)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ذی قعدہ ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۵۲۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۱۱/۱۷ھ

فقیر کا ایامِ نحر سے قبل خرید کردہ جانور کو بدلنا

سوال [۹۹۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ اگر فقیر نے ایامِ نحر سے پہلے قربانی کے ارادے سے کوئی جانور خریدا ہو پھر اس کا ارادہ بدل جائے کہ اس جانور کو بیچ کر دوسرا جانور اس کے بدلے میں لے کر قربانی کر دے تو اس کے لیے ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

اسی طرح اگر فقیر خریدنے کے بعد پچھتانے لگے اور یہ ارادہ کر لے کہ اسے بیچ کر اس کا پیسہ گھر کی ضرورت میں استعمال کروں گا تو ایسا کرنا فقیر کے لیے جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد یعقوب غازی آبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فقیر نے جو جانور ایامِ نحر سے پہلے قربانی کے ارادے سے خریدا ہے اب اس جانور کو اس کے لیے بدلنا جائز ہے یا نہیں؟ اسی طرح خریدنے کے بعد پچھتانے لگے تو اسے بیچ کر اس کا پیسہ اپنی ضرورت میں استعمال کرنا چاہے تو ایسا کرسکتا ہے یا نہیں؟ تو یہ بات قابل غور ہے، اس کے بارے میں فتاویٰ دار العلوم قدیم ۲۰/۷، عزیز الفتاویٰ میں مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر ایامِ نحر سے پہلے فقیر نے قربانی کے ارادے سے جانور کو خریدا ہے تو اس کا بدل دینا جائز ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایام نحر سے پہلے خریدنے کی وجہ سے فقیر کے اوپر نہ اس کی قربانی واجب ہوئی اور نہ ہی فقیر کی طرف سے خریدنے کی وجہ سے نذر منعقد ہوئی، لہٰذا اس فقیر کے لیے اس کا بدلنا بھی جائز ہوا اور یہ بھی جائز ہوا کہ اس جانور کو بیچ کر اس کا پیسہ اپنی ذاتی ضروریات میں خرچ کرے، حضرتؒ نے اس کے جواز میں شامی کی یہ عبارت دلیل کے طور پر پیش فرمائی ہے:

ووقع في التاتارخانية: التعبير بقوله شراها لها أيام النحر وظاهره أنه لو شراها لها قبل لاتجب. (شامي، كتاب الأضحية، زكريا ۹/٤٦٥، كراچی ٦/٣٢١)

حضرت کے زمانہ میں فتاویٰ تاتارخانیہ طبع ہوکر شائع نہ ہوسکا تھا، اس لیے حضرت مفتی صاحبؒ اصل کی طرف مراجعت نہ کرسکے، اور اب الحمد للہ فتاویٰ تاتارخانیہ مکمل شائع ہوکر عام ہوچکا ہے، اس لیے اصل کی طرف مراجعت ضروری ہے، فتاویٰ تاتاخانیہ کی اصل عبارت ملاحظہ فرمائیے:

وفی العتابية: المختار أن الفقير لو اشتراها بنية التضحية فی أيام النحر تصير التضحية واجبة فی حقه وإن لم يقل بلسانه شيئا فی جواب ظاهر الرواية هذا اختيار الصدر الشهيد وعليه الفتویٰ. (تاتارخانية زكريا ١٧/ ٤١٢، رقم: ٢٧٦٦٩)

اس عبارت میں اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ فقیر نے ایامِ نحر میں قربانی کی نیت سے کوئی جانور خرید لیا ہے تو اس کی قربانی اس کے اوپر واجب ہو جاتی ہے اگرچہ اس نے اپنی زبان سے قربانی کی صراحت نہ کی ہو اور یہی مفتی بہ قول ہے، اب اس عبارت پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ایامِ نحر میں خریدنے کی صورت میں فقیر کے حق میں وہ جانور اضحیہ منذورہ بن جاتا ہے، جس بناء پر نہ اس کے لیے اسے بدلنا جائز ہے اور نہ ہی اس کو بیچ کر کے اس کا پیسہ اپنی ضرورت میں خرچ کرنا جائز ہے، اور حضرت مفتی صاحب نے آگے کی جو عبارت شامی سے نقل فرمائی ہے کہ:

وظاهره: أنه لو اشتراها لها قبلها لاتجب.

یہ عبارت فتاویٰ التاتارخانیہ میں نہیں ہے، بلکہ علامہ شامی نے تاتارخانیہ کی عبارت سے مفہوم مخالف کے طور پر اپنی طرف سے لکھا ہے، اس لیے ایام نحر سے پہلے خرید کردہ جانور سے متعلق صراحت کے ساتھ کسی بھی فقہ کی عبارت میں موجود نہیں ہے، ہاں البتہ فتاویٰ تاتارخانیہ اور محیط برہانی میں شمس الائمہ سرخسی اور شمس الائمہ حلوانی اور زعفرانی کے حوالہ سے یہ بات صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ فقیر نے اگر قربانی کی نیت سے قربانی کا جانور خرید لیا ہے تو قربانی کی نیت سے خریدنے کی وجہ سے اس کے اوپر اس جانور کی قربانی واجب نہیں ہے، اور اگر زبان سے صراحت کر دی ہے کہ میں اس کی قربانی کروں گا تب قربانی کرنا واجب ہوتا ہے، تو ان فقہاء کرام کی صراحت کے مطابق جب اس کی قربانی کرنا واجب نہ ہوا تو اس کا بدلنا بھی جائز ہوا، اور اس کو بیچ کر اس کا پیسہ اپنی ضرورت میں استعمال کرنا فقیر کے لیے جائز ہو جائے گا اور اس میں ان فقہاء کی طرف سے ایام قربانی سے پہلے یا ایام قربانی کے درمیان میں خریدنے کی کوئی صراحت نہیں بلکہ مطلق ہے، لیکن چونکہ آگے عتابیہ کے حوالہ سے ایامِ قربانی میں خریدنے کی صراحت آ رہی ہے، اس لیے اس مطلق حکم کو ایام قربانی سے پہلے

خریدے جانے پر محمول کیا جانا ممکن ہے، اوراس کے برخلاف ایام قربانی سے پہلے یا ایام قربانی کے درمیان کی قید کے بغیر شیخ الاسلام خواہرزادہؒ اورامام طحاویؒ کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے کہ فقیر نے جو جانور قربانی کے ارادے سے خریدا ہے اس کے خریدتے ہی فقیر کے اوپر اس کی قربانی واجب ہو جاتی ہے، لہٰذا فقیر کی طرف سے وہ جانور اضحیہ منذورہ ہوگیا اب ایام قربانی میں متعین طور پر اس جانور کی قربانی کرنا لازم ہوجائیگا۔

اب اس تفصیل کے بعد یہ بات واضح ہوگئی کہ ایام نحر سے پہلے فقیر نے جو قربانی کی نیت سے جانور خریدا ہے اس کی قربانی اس کے اوپر واجب ہونے میں تردد اور شک واقع ہو چکا ہے، حتمی طور پر اس کے وجوب کی بات نہیں کہی جاسکتی، اس لیے کہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب اور علامہ شامیؒ دونوں عظیم الشان شخصیت ہیں، ان دونوں کی رائے اس بارے میں یہی ہے کہ ایام نحر سے پہلے فقیر کا خریدا ہوا جانور اضحیہ منذورہ نہیں ہوتا ہے اس کو بدلنا بھی جائز ہے، اور جب بدلنا جائز ہے تو اس کو بیچ کر ان پیسوں کو اپنی ضرورت میں خرچ کرنا بھی جائز ہوگا، مگر احتیاط اسی میں ہے کہ حتی الامکان فقیر اس جانور کو بدلنے یا بیچنے کا ارادہ نہ کرے البتہ کوئی مجبوری ہو تو بات الگ ہے۔

اس کے بدلنے اوراس کو بیچ کھانے کے بارے میں فقیر کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے، اب الفتاویٰ التاتارخانیہ اور المحیط البرہانی کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

وإن كان المشترى فقيرا، ذكر شيخ الاسلام خواهرزاده فى شرح كتاب الأضحية إن فى ظاهر رواية أصحابنا تصير واجبة الأضحية، وروى الزعفرانى عن أصحابنا أنها لا تصير واجبة و إلى هذا أشار شمس الأئمة السرخسى رحمه الله فى شرحه و ذكر شمس الأئمة الحلوانى فى شرحه: أن فى ظاهر رواية أصحابنا لاتصير واجبة الأضحية وذكر الطحاوى فى مختصره أنها تصير واجبة وأما إذا صرح بلسانه وقت الشراء أنه اشتراها ليضحى بها فقد ذكر شمس الأئمة الحلوانى أنها تصير واجبة ذكره

الزعفرانی فی أضاحیه. (الفتاویٰ التاتارخانیة زکریا ۱۷/ ۴۱۱، رقم: ۲۷۶۶۸، المحیط البرهانی، المجلس العلمی ۷/ ۲۵۹، رقم: ۱۰۷۸۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/ ذی قعدہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۷۴۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۱۱/۲۴ھ

ایام نحر میں فقیر کا خریدے ہوئے جانور کو بدلنا

سوال [۹۹۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص غریب اور فقیر ہے اس نے ایامِ اضحیہ میں قربانی کی نیت سے ایک جانور خریدا ہے تو کیا اس کے لیے اس جانور کو بدلنا جائز ہے یا نہیں؟ اسی طرح اگر وہ جانور خرید کر پچھتاتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ قربانی نہیں کروں گا اور اس جانور کو بیچ کر اس کا پیسہ اپنی ضرورت میں لگائیں گے، تو کیا ایسا کرنا اس شخص کے لیے جائز ہے؟

المستفتی: محمد یعقوب غازی آبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفیق: فقیر نے جو جانور ایام اضحیہ میں قربانی کی نیت سے خریدا ہے، اس کے لیے اس جانور کی قربانی واجب ہوگئی ہے اب اس کا بدلنا اس کے لیے جائز نہیں ہے، اسی طرح اگر خدانخواستہ وہ جانور گم ہوجائے یا ہلاک ہوجائے تو اس کی جگہ پر دوسرے جانور کی قربانی فقیر کے اوپر لازم نہیں ہے، اسی طرح اگر اس کا ارادہ بدل جائے کہ قربانی نہیں کرنی ہے بلکہ جانور کو بیچ کر پیسہ اپنی ضرورت میں استعمال کریں گے تو ایسا کرنا بھی اس کے لیے جائز نہیں ہے، اس لیے کہ قربانی کی نیت سے جانور خریدنے کے بعد اس کے لیے نذر کے درجے میں ہوگیا، لہٰذا وہ جانور اضحیۂ منذورہ ہوگیا اس کی قربانی ہر حال میں لازم ہے، اس کو بیچ کر اس کا پیسہ استعمال میں لانا جائز نہیں۔

وفی العتابیة: المختار أن الفقیر لو اشتراها بنیة التضحیة فی أیام النحر

تصير التضحية واجبة فى حقه وإن لم يقل بلسانه شيئا فى جواب ظاهر الرواية هذا اختيار الصدر الشهيد وعليه الفتوىٰ. (تاتارخانية زكريا ۴۱۲/۱۷، رقم: ۲۷٦٦۹)

وفيه أيضا الفقير إذا اشترىٰ أضحية فضلت فليس عليه أن يشترى مكانها أخرىٰ ولو كان غنيا فعليه ذلك. (الفتاوىٰ التاتارخانية ۴۱۲/۱۷، رقم: ۲۷٦۷۴)

إن كان معسرا فاشترىٰ شاة للأضحية فهلكت فى أيام النحر أو ضاعت سقطت عنه ليس عليه شيئ آخر لما ذكرنا أن الشراء من الفقير للأضحية بمنزلة النذر فإذا هلكت فقد هلك محل إقامة الواجب فيسقط عنه وليس عليه شيئ آخر. (بدائع الصنائع، كتاب التضحية، فصل فى كيفية الوجوب، زكريا ۱۹۹/۴، كراچى ٦٦/۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۲۴؍ذی قعدہ ۱۴۳۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۷۴۲/۴۰)	۱۴۳۵/۱۱/۲۴ھ

قربانی کے ارادے سے خریدے گئے جانور کی جگہ دوسرے جانور کی قربانی کرنا

سوال [۹۹۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص مالدار ہے، اس نے ایام نحر سے پہلے یا ایام نحر میں قربانی کی نیت سے ایک جانور خریدا اور بعد میں اس کا ارادہ بدل گیا کہ اس جانور کو بیچ کر دوسرا جانور اس کی جگہ پر ذبح کریں گے تو اس کے لیے جانور کا بدلنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر جائز ہے تو کیونکر جائز ہے؟ اور اگر نا جائز ہے تو کیوں نا جائز ہے؟

المستفتی: عبد اللہ لالباغ مرد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صاحب نصاب آدمی کے لیے قربانی کی نیت سے خریدے ہوئے جانور کو بدلنا جائز اور درست ہے، چاہے ایام نحر سے پہلے خریدا ہو یا ایام نحر

کے درمیان میں خریدا ہو ہر صورت میں جائز ہے، لیکن اتنی بات لازم ہے کہ دوسرا جانور پہلے جانور کے برابر ہو یا اس سے بہتر ہو اور پہلے جانور کے مقابلہ میں کمزور اور گھٹیا جانور سے بدلنا جائز نہیں، اگر پہلے جانور سے دوسرا جانور کمزور ہے اور اس کی قیمت بھی کم ہے تو جتنی قیمت کم ہے اتنی قیمت کا صدقہ کرنا لازم ہو جائے گا۔

إذا اشتریٰ أضحية و باعها حتى جاز البيع في ظاهر رواية أصحابنا: ثم قال اشترى مثلها وضحى بها فإن كانت الثانية مثل الأولىٰ أو خيرا منها جاز ولايلزمه شيئ آخر وإن كانت الثانية شرا من الأولىٰ فعليه أن يتصدق بفضل القيمتين. (الفتاویٰ التاتارخانية زكريا ۱۷/٤١٤، رقم: ٢٧٦٨٧، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ٨/٤٦٠، رقم: ١٠٧٩٢)

فإذا اشتریٰ أضحية ثم باعها فاشتریٰ مثلها فلا باس بذٰلك ...... والأصل فيه ماروى أن النبي ﷺ دفع دينارا إلى حكيم بن حزام رضـ ليشترى له شاة للأضحية فاشتریٰ شاة ثم باعها بدينارين ثم اشتریٰ شاة بدينار وجاء بالشاة والدينار إلى رسول الله ﷺ فأخبره بذٰلك فقال ﷺ: بارك الله في صفقتك أما الشاة فضح بها وأما الدينار فتصدق به فقد جوز رسول الله ﷺ – بيعه مااشتراها للأضحية وإن كانت الثانية شرا من الأولىٰ وقد كان أوجب الأولىٰ فتصدق بالفضل فيما بين القيمتين. (المبسوط للسرخسي، دار الكتب العلمية بيروت ١٢/١٣) **فقط** واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ذی قعدہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/۱۱۷۴۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۱۱/۲۴ھ

عیدگاہ میں قربانی کرنا

سوال [۹۹۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: ذبح کے لیے جگہ میسر نہ ہونے کی صورت میں کیا قربانی کے جانور کو عیدگاہ میں ذبح کرنا درست ہے؟

المستفتی: سخاوت حسین مرادآبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر قربانی کے لیے کوئی دوسری جگہ ہی نہ ہوتو شدت ضرورت کی بنا پر اس کی گنجائش ہے۔

المشقة تجلب التيسير. (الأشباه والنظائر ۱/۱۲۵)

البتہ دم مسفوح کو وہاں سے صاف کردینا ضروری ہے، کیونکہ عیدگاہ کی تنظیف و تطییب کا اہتمام رکھنا ہی اولیٰ ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۲/ ۶۵۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۶۵۱/۲۳)

قربانی کے جانور پر کفن رکھ کر ذبح کرنا

سوال [۹۹۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بکر کا کہنا ہے کہ قربانی کے جانوروں پر کفن رکھ کر قربانی کرنا، ادب ہے، اچھا ہے، بہتر ہے، لہٰذا شرعاً بکر پر کیا حکم ہوگا؟

المستفتی: بشیر الدین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی کے جانور پر کفن رکھ کر قربانی کا ثبوت کسی حدیث اور کتب فقہ میں نہیں ہے، ہاں البتہ بوقت قربانی، قربانی کے جانور پر قدم رکھ کر قربانی کرنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور بکر کا دعویٰ بلا دلیل ہے۔

عن أنس رضی اللہ عنہ **أن النبي** صلی اللہ علیہ وسلم **كان يضحي بكبشين أملحين أقرنين، ويضع رجله**

علی صفحتهما ویذبحهما بیده (بخاری شریف، باب وضع القدم علی صفح الذبیحة، النسخة الهندیة ۲/ ۸۳۵، رقم: ۵۳۴۹، ف: ۵۵٦٤، صحیح مسلم، الأضاحی، باب استحباب استحسان التضحیة و ذبحهما مباشرة بلا توکیل، النسخة الهندیة ۲/ ۱۵۵، بیت الأفکار رقم: ۱۹٦٦) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۱۴؍محرم الحرام ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۵۲۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۲/۱/۱۴ھ

ناجائز اور حرام رقم سے قربانی کرنا

سوال [۹۹۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ناجائز اور حرام پیسے سے قربانی کرے تو کیا فریضۂ قربانی ادا ہو جائے گا اس میں کسی قسم کی کراہت تو نہیں؟

المستفتی: فصیح احمد مدھوبنی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ناجائز اور حرام پیسے سے قربانی کا فریضہ ادا نہیں ہوگا۔

غصب شاة فضحی بها عن نفسه لاتجزیه لعدم الملک. (شامی، کتاب الأضحیة، زکریا ۹/ ۴۷۸، کراچی ٦/ ۳۳۱، البنایه ۱۲/ ٦۳، بدائع الصنائع کراچی ۵/ ۷٦، زکریا ٤/ ۲۱۷، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۵/ ۸۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍جمادی الثانیہ ۱۴۲٦ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۸۱٦)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲٦/٦/۲۰ھ

شیعوں سے قربانی کا جانور خریدنا

سوال [۹۹۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: شیعوں سے قربانی کا جانور خرید کر قربانی کرنا کیسا ہے؟ نیز ان کے یہاں کھانا پینا ازروئے شرع کیا حیثیت رکھتا ہے؟

المستفتی: ابوالمکارم المعروفی، مئو

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی کا جانور شیعوں سے، غیر مسلموں سے ہر قوم سے خریدنا جائز ہے، البتہ شیعوں کے یہاں کھانے پینے سے احتیاط رکھنا چاہیے تاکہ ان کے ساتھ موالات اور دوستی کا سلسلہ شروع نہ ہو، اور نفس کھانا پینا حرام نہیں۔

﴿**قال اللّٰہ تعالیٰ: لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَآءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ.** [آل عمران: ۲۸]﴾

لا بأس بأن يكون بين المسلم والذمي معاملة إذا كان لابد منه . (هنديه، كتاب الكراهية، الباب الرابع عشر في أهل الذمة والأحكام التي تعود إليهم، زكريا قديم ٥/٣٤٨، جديد ٥/٤٠٢)

ولم يذكر محمدؒ الأكل مع المجوسي وغيره من أهل الشرك أنه هل يحرم أم لا؟ حكى عن الحاكم الإمام عبد الرحمن الكاتب أنه ان ابتلى به المسلم مرة أو مرتين فلا بأس به وأما الدوام عليه فيكره. (هنديه، كتاب الكراهية، الباب الرابع عشر في أهل الذمة والأحكام التي تعود إليهم، زكريا قديم ٥/٣٤٧، جديد ٥/٤٠١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۰ ۹۵۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۴/۱۲ھ

قربانی کے جانور کو ذریعۂ آمدنی بنانا

سوال [۹۹۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: ایک شخص نے ایک بڑا جانور بنیت قربانی مثال کے طور پر چار ہزار میں خریدا، اور دوسرے لوگوں کو قربانی کے لیے چار ہزار سات سو روپئے کے حساب سے شریک کیا، واضح رہے کہ اس شخص کا ارادہ بوقت خریداری خود اس میں شریک ہونے کا اور دوسرے چھ افراد کو شریک کرنے کا تھا تو:

(الف) اس کے لیے ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

(ب) اس جانور کی قربانی شرعاً درست ہوگی یا نہیں؟

(ج) اگر قیمت خرید بتا کر شریک کرے تو کیا حکم ہے؟ اگر قیمت خرید بتائے بغیر شریک کرے تو کیسا ہے؟

(د) اگر بنیت تجارت خریدا ہے اور بعد میں مذکورہ طریقہ پر کسی کو شریک کرتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: ابوالمکارم المعروفی مئو

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی کی نیت سے جانور چار ہزار میں خرید کر سات سو کے نفع کے ساتھ سینتالیس سو کے حساب سے دوسرے لوگوں کو اس میں شریک کرنا جائز نہیں، اس لیے کہ قربانی کے جانور کو ذریعۂ آمدنی بنانا اور اس سے نفع اٹھانا جائز نہیں، البتہ اس جانور کی قربانی درست ہو جائے گی، اور جو زائد پیسے لیے ہیں اسے دوسرے شرکاء کو واپس کرنا ضروری ہے، ہاں اگر جانور کو تجارت کی نیت سے چار ہزار میں خریدا ہو تو سات سو کے نفع کے ساتھ سینتالیس سو کے حساب سے لوگوں کو اس میں شریک کرنا جائز ہے۔

إن المشتراة للأضحية متعينة للقربة إلى أن يقام غيرها مقامها فلا يحل الانتفاع بها مادامت متعينة. (بدائع الصنائع، كتاب التضحية، مايستحب قبل التضحية وعندها وبعدها، زكريا ٤/ ٢٢٠، كراچى ٥/ ٧٨، دار الكتب العلمية بيروت ٦/ ٣٢١، شامى زكريا ٩/ ٤٧٦، كراچى ٦/ ٣٢٩)

إذا ثمنه بما قام عليه وبفضل مؤنة ...... ثم باعه مرابحة على تلك القيمة جاز.

(شامی، کتاب البیوع، باب المرابحة والتولية، زکریا ۷/ ۳۵۰، کراچی ۵/ ۱۳٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۵۷۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۴/۱۴ھ

۷ باب مایکون عیبا فی الأضحیة ومالایکون عیبا

کون سا عیب مانع قربانی ہے؟

سوال [۹۹۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ معلم الحجاج میں لکھا ہے کہ اگر بکری کے دوتھن میں سے ایک تھن سوکھ جائے اور اس سے دودھ نہ نکلے تو ایسے جانور کی قربانی جائز نہیں، اسی طرح گائے وغیرہ چار تھن والے جانور کے دوتھن سوکھ جائیں اوران سے دودھ نہ نکلے تو ایسے جانور کی بھی قربانی جائز نہیں، لیکن اگر جانور کی عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کے کسی بھی تھن سے دودھ نہ نکلے بلکہ سارے تھن سوکھ جائیں اور یہ دودھ نہ نکلنا کسی خاص وجہ یا بیماری کی وجہ سے نہیں ہے تو ایسی صورت میں اس جانور کو عیب دار شمار نہیں کیا جائیگا،تو مفتی صاحب سے گذارش ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ بکری کے تھن اور گائے وغیرہ کے دوتھن سوکھ جانے کی وجہ سے اس کی قربانی جائز نہیں ہوتی؟ اس کے بر خلاف بکری کے دوتھن اور گائے وغیرہ کے چاروں تھن سوکھ جانے کی صورت میں قربانی کیوں جائز ہے؟ مدلل طور پر اس سوال کا جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: مولانا خلیل اللہ مقیم مکہ مکرمہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی میں حکم شرعی یہی ہے کہ جانور عیب دار نہ ہو اور عیب سے ایسا عیب مراد ہے جو فطری طور پر نہ ہو بلکہ بعد میں کسی خاص وجہ یا بیماری کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہو تو ایسے عیب سے پاک ہونا لازم ہے، لہٰذا دوتھن والے مادہ جانور کے ایک تھن سے دودھ نکلے اور دوسرے تھن سے دودھ نہ نکلے بلکہ سوکھ جائے،اسی طرح چار تھن والے مادہ جانور کے دوتھن سوکھ جائیں اوران سے دودھ نہ نکلے تو یہ ایسا عیب ہے جس کی وجہ سے قربانی جائز نہیں لیکن اگر مادہ جانور ایسا ہو جو فطری طور پر بانجھ ہو اور اس کے سارے تھن سوکھے ہوئے ہوں اسی طرح وہ جانور جس کی زیادہ عمر کی وجہ سے سارے تھن سوکھ گئے ہوں

اور کسی سے بھی دودھ نہ نکلتا ہوتو ایسے جانور کی قربانی بلاشبہ جائز اور درست ہے، اس لیے کہ یہ ایسا عیب نہیں ہے کہ جو بعد میں عارض ہوا ہو، جس کی وجہ سے اس جانور کی قربانی جائز نہ ہوتی ہو، لہٰذا اگر جانور دودھ دینے کے لائق ہو مگر کسی بیماری کی وجہ سے اس کے تھن سوکھ گئے ہوں تو اس کی قربانی جائز نہیں اور معلم الحجاج کی عبارت کا بھی یہی مطلب ہے، جیسا کہ فقہی جزئیات سے واضح ہوتا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

وذكر فيها جواز التي لاينزل لها لبن من غير علة. (شامي، كتاب الأضحية، كراچى ٦/ ٣٢٥، زكريا ٩/ ٤٧٠، خلاصة الفتاوىٰ، اشرفى ديوبند ٤/ ٣٢١)

يجوز العاجزة عن الولادة لكبر سنها والتي بها كي والتي لاينزل لها لبن من غير علة. (هنديه زكريا قديم ٥/ ٢٩٧، جديد ٥/ ٣٤٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ذی الحجہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۷۸۵)

کیا ادھیا پر دی ہوئی بکری کے بچوں کی قربانی درست ہے؟

سوال [۹۹۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے اپنی بکری پالنے کے لیے اس شرط پر خالد کو دی کہ تم اس بکری کو کھلاؤ پلاؤ، اس کے بعد جو بچہ پیدا ہوگا اس میں آدھا آدھا ہوگا اس کے بعد اس بکری سے دو بچے مذکر پیدا ہوئے تو ایک زید کا ہوا اور ایک خالد کا تو زید نے اپنے حصہ والے بکرے کو قربانی کے لیے چھوڑ دیا تو اس قسم کے بکرے کی قربانی درست ہے یا نہیں اور ایک شخص صاحب نصاب نہیں ہے اس نے اس قسم کی قربانی کر لی، تو اس کے لیے کیا حکم ہے؟ وہی قربانی اس کے لیے کافی ہے یا کوئی اور دوسرا کرے گا؟ اس قسم کی قربانی لوگوں میں بہت رائج ہے؟

المستفتی: نذیر احمد نیپال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اس طرح کا معاملہ اجارۂ فاسدہ ہونے کی وجہ

سے جائز نہیں ہے اور نہ ہی ایسے معاملات سے حاصل شدہ جانور کی قربانی جائز ہوگی، ہاں البتہ فقہاء نے اس طرح کے معاملہ جائز ہونے کے لیے ایک حیلہ لکھا ہے کہ مالک جانور راس کی مناسب قیمت لگا کر نصف جانور رلینے والے کے ہاتھ فروخت کردے تو جانور دونوں کے مابین مشترک ہوجائے گا، پھر اس کے بعد مشتری کو قیمت معاف کردے، اس کے بعد آدھے آدھے کا معاملہ دونوں کے درمیان صحیح ہوجائے گا اور حاصل شدہ جانور کی قربانی بھی جائز ہو جائے گی۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/ ۱۱۵)

دفع بقرة إلى رجل على أن يعلفها ومايكون من اللبن والسمن بينهما انصافا، فالإجارة فاسدة ...... والحيلة في جوازه أن يبيع نصف البقرة منه بثمن ويبرئه عنه ثم يأمر باتخاذ اللبن والمصل فيكون بينهما. (هنديه، كتاب الإجارة، الباب الخامس عشر، الفصل الثالث، زكريا قديم ٤/ ٤٤٥، جديد ٤/ ٤٨١، فتاویٰ قاضی خان جديد زكريا ٢/ ٢١٠، وعلى هامش الهندية زكريا ٢/ ٣٣٠، فتاویٰ بزازيه جديد زكريا ٢/ ٢١-٢٢، وعلى هامش الهندية زكريا ٥/ ٣٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ ر ذی قعدہ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۵۰۳۹)

بٹائی پر دی ہوئی بکری کے بچہ کی قربانی

سوال [۹۹۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے ایک بکری بٹائی پر دی، اور دوسرے شخص نے آدھے حصہ پر لیا ہے، تھوڑے دن کے بعد اس بکری کے دو بچہ ہوئے، ایک نر اور ایک مادہ، تو اس نے نر قربانی کے لیے رکھا ہے تو وہ قربانی دونوں کی ہوگی یا کس کی ہوگی؟ جس نے پرورش کی ہے اس کی یا جس کی بکری ہے یا دونوں کی ہوگی، مع دلائل جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: عبد الغفور سنبھلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس طرح بٹائی پر دینا جائز نہیں ہے، بکری اور اس کے بچے سب اصل مالک کی ملکیت ہیں، بٹائی پر دینے والے کو اپنے عمل کی اجرت اور اس گھاس کی قیمت ملے گی، جس کو اس نے اپنے کھیت وغیرہ سے کاٹ کر کھلایا ہے، اس کی قربانی اصل مالک کی طرف سے ادا ہوسکتی ہے، چرانے والے کی طرف سے قربانی ادا نہیں ہوگی۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۴/۲۶۰، جدید ڈابھیل ۱۶/۵۹۴)

دفع بقرة إلى رجل على أن يعلفها ومايكون من اللبن والسمن بينهما انصافا، فالإجارة فاسدة وعلى صاحب البقرة للرجل أجر قيامه وقيمة علفه إن علفها من علف هوملكه لا ما سرحها فى المرعىٰ. (هنديه، كتاب الإجارة، الباب الخامس عشر، الفصل الثالث، زكريا قديم ٤/٤٤٥، جديد ٤/٤٨١، فتاویٰ قاضی خان جديد زكريا ٢/٢١٠، وعلى هامش الهندية زكريا ٢/٣٣٠، فتاویٰ بزازيه جديد زكريا ٢/٢١-٢٢، وعلى هامش الهندية زكريا ٥/٣٧) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ذی قعدہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۹۹۳)

ادھیا پر پالنے والے کا مالک کے بکری کی قربانی کرنے کا حکم

سوال [۹۹۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم نے دوسرے کی ایک بکری پالی تھی، اس سے دو بچے پیدا ہوئے، کچھ دنوں کے بعد وہ بچے بڑے ہوگئے، ایک ایک کر کے دونوں آدمیوں نے تقسیم بھی کرلیا، اس کی ہم قربانی کرسکتے ہیں یا نہیں اور جس کی بکری تھی وہ قربانی کرسکتا ہے یا نہیں؟ لیکن ہم قربانی کرنے کی حیثیت رکھتے ہیں؟

المستفتی: اہل اللہ دانیال پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ادھیا پر بکرا پالنے والے کے حق میں ناجائز ہے، پالنے

والے کو پالنے کی اجرت ملے گی، جانور اصل مالک کی ملکیت میں ہوگا، اس لیے مالک کے لیے اس کی قربانی جائز ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۴/۲۶۰، جدید ڈابھیل ۱۶/۵۹۴، اصلاح الرسوم ص: ۱۴۳)

دفع بقرة إلى رجل على أن يعلفها ومايكون من اللبن والسمن بينهما انصافا، فالإجارة فاسدة وعلى صاحب البقرة للرجل أجر قيامه وقيمة علفه إن علفها من علف هوملكه لا ما سرحها في المرعىٰ. (هنديه، كتاب الإجارة، الباب الخامس عشر، الفصل الثالث، زكريا قديم ٤/٤٤٥، جديد ٤/٤٨١، فتاویٰ قاضی خان جديد زكريا ٢/٢١٠، وعلى هامش الهندية زكريا ٢/٣٣٠، فتاویٰ بزازيه جديد زكريا ٢/٢١-٢٢، وعلى هامش الهندية زكريا ٥/٣٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ رجب المرجب ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۱۸۷۵)

ادھیا پر دیئے ہوئے جانور کے بچوں کی قربانی کا حکم

سوال [۹۹۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے اپنی بکری ادھیا پر پرورش کے لیے خورشید کو دی، بعدہٗ بکری نے دو بچے دیئے، اور دونوں نے طے شدہ بات کے مطابق ایک ایک بچہ تقسیم کر کے لے لیا، اب زید بکری کا مالک اپنے حصہ کے بچہ کو اپنے لیے حلال سمجھ کر اس کی قربانی دیتا ہے، آیا بکری کے مالک زید کے لیے اس بچہ کی قربانی بلا کسی شرط کے مطلقاً جائز اور درست ہے، یا اس بچہ میں کسی قسم کا خبث ہے؟

ہمارے گاؤں میں کتب فتاویٰ کے نہ ہونے کی وجہ سے لوگ حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتاب بہشتی زیور کے مسائل کو مفتی بہ سمجھ کر اس پر عمل کرتے ہیں جس میں یہ ہے کہ ''مسئلہ ۳۹'' اگر کوئی جانور کسی کو حصہ پر دیا ہے تو یہ جانور پرورش کرنے والے کی ملک نہیں ہوا بلکہ اصل مالک کا ہی ہے، اس لیے اگر کسی نے اس پالنے والے سے خرید کر قربانی کر دی تو قربانی نہیں ہوئی، اگر ایسا جانور خریدنا ہو تو اصل مالک سے جس نے حصہ پر دیا ہے خرید لیں۔ (بہشتی زیور طبع جدید جسیم بکڈپو جامع مسجد دہلی ص: ۱۶۳)

لیکن ایک صاحب دوسال سے یہ بتارہے ہیں کہ بکری کے مالک کی قربانی بھی جائز اور درست نہیں ہورہی ہے اوراب تک ان تمام لوگوں کی قربانی جوایک مدت دراز سے بغیر اجرت ادا کئے کرتے آئے ہیں نہیں ہوئی، اور قربانی کے درست ہونے کی شرط یہ ہے کہ پرورش کرنے والے کو پہلے اس کی اجرت ادا کردے کیونکہ اس معاملہ کا تعلق اجارۂ فاسدہ سے ہے، نیز بہشتی زیور کے مسائل مفتی بہ نہیں ہیں، اور میں جو کچھ بیان کررہا ہوں وہی فتاویٰ محمودیہ، فتاویٰ رحیمیہ، عالمگیری، شامی اور بدائع کے اندر بھی موجود ہے؟

المستفتی: حافظ اشتیاق احمد بھاگلپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ادھیا پر دیئے ہوئے جانور مالک کی ملکیت ہیں اور جو بچہ مالک کے پاس آیا ہوا ہے وہ بھی مالک کی ملکیت ہے، اس لیے اس بچہ میں قربانی کے شرائط پائے جانے کے بعد اس بچہ کی قربانی مالک کے لیے بلاشبہ جائز ہے اور یہی مسئلہ بہشتی زیور، فتاویٰ محمودیہ، فتاویٰ عالمگیری، اور بدائع الصنائع وغیرہ میں موجود ہے، اور یہی بات صحیح ہے، اور بہشتی زیور کے مسائل مفتی بہ ہیں، اور بکر کے لیے اس کی قربانی اس وقت تک درست نہیں جب تک کہ معاملہ فاسدہ کو درست نہ کرلے اور معاملہ فاسدہ کو درست کرنے کی شکل یہ ہے کہ ادھیا پر لینے والے کو مالک کی طرف سے پرورش کی اجرت دی جائے اور بچہ نہ دیا جائے اور بچہ کی قیمت لگا کر کے ادھیا پر لینے والے کے ہاتھ فروخت کردے اور پھر مالک قیمت کو معاف کردے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ ڈابھیل ۱۶/ ۵۹۸، بہشتی زیور ۳/ ۴۱)

وعلی هذا إذا دفع البقرة بالعلف ليكون الحادث بينهما نصفين فما حدث فهو لصاحب البقرة وللآخر مثل علفه وأجر مثله. (رد المحتار، كتاب الشركة، فصل في الشركة الفاسدة، مطلب: يرجع القياس، زكريا ٦/ ٥٠٤، كراچی ٤/ ٣٢٧، عالمگيری، الباب الخامس عشر، الفصل الثالث، زكريا قديم ٤/ ٤٤٥، جديد ٤/ ٤٨١، تاتارخانية زكريا ٧/ ٥٠٥، رقم: ١١٠١٠) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍محرم الحرام ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۹۴۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۳۴/۱/۲۰ھ

ادھیا پردی ہوئی بکری سے پیدا شدہ بچہ کی قربانی

سوال [۱۰۰۰۰]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے ایک شخص سے ایک بکری اس شرط پر لی کہ اس سے جتنے بچے پیدا ہوں گے ان کا آدھا زید کو ملے گا اور آدھا مالک کو اور اصل بکری مالک کو واپس کردی جائے گی۔

اب سوال یہ ہے (۱) کہ یہ معاملہ ازروئے شرع درست ہے یا نہیں؟

(۲) اگر فتویٰ عدم جواز پر ہو تو جواز کی کیا شکل ہوگی؟

(۳) ایسے معاملہ سے حاصل کردہ بکری کی قربانی کرنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: حبیب اللہ شعبۂ افتاء مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) اس طرح کا معاملہ اجارۂ فاسدہ ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

(۲) جواز کی صورت یہ ہے کہ مالک جانور کی مناسب قیمت لگا کر نصف حصہ پرورش کرنے والے کے ہاتھ فروخت کردے، پھر قیمت معاف کردے، تو ایسی صورت میں جانور دونوں کے درمیان مشترک ہوجائے گا اور جانور کے بچے وآمدنی وغیرہ نصف نصف تقسیم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۱۵)

(۳) ایسے معاملہ سے حاصل کردہ بکری کی قربانی مالک کے لیے جائز اور درست ہے، البتہ پرورش کرنے والے (مستاجر) کے لیے جائز اور درست نہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/۶۰۲)

دفع بقرة إلى رجل على أن يعلفها ومايكون من اللبن والسمن بينهما انصافا، فالإجارة فاسدة (إلى قوله) والحيلة في جوازه أن يبيع نصف البقرة منه بثمن ويبرئه عنه ثم يأمر باتخاذ اللبن والمصل فيكون بينهما. (هنديه، كتاب الإجارة، الباب الخامس عشر، الفصل الثالث، زكريا قديم ٤/٤٤٥، جديد ٤/٤٨١،

فتاویٰ قاضی خان جدید زکریا ۲/ ۲۱۰، وعلی هامش الهندية زكريا ۲/ ۳۳۰، فتاویٰ بزازیه جدید زکریا ۲/ ۲۱-۲۲، وعلی هامش الهندية زكريا ۵/ ۳۷) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۹ ؍ شعبان المعظم ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۱۴۴)

مخنث اور خنثیٰ بکرے کی قربانی

سوال [۱۰۰۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مخنث اور خنثیٰ بکرے کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟ اگر ان کو بغیر قربانی کے ذبح کر کے کھایا جائے تو ان کا گوشت جائز ہے یا نہیں؟ دونوں مسئلوں کو مدلل واضح فرمائیں۔

المستفتی: مقصود احمد قاسمی مدرسہ فیضان القرآن بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: خنثیٰ کی قربانی ناجائز اور مخنث کی جائز ہے، کیونکہ مخنث وہ ہوتا ہے جو حقیقت میں مذکر ہوتا ہے مگر مادہ پر قادر نہیں ہوتا ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/ ۱۵۱)

لاتجوز التضحية بالشاة الخنثىٰ. (هنديه، كتاب الأضحية، الباب الخامس فى بيان محل إقامة الواجب، زكريا قديم ۵/ ۲۹۹، جديد ۵/ ۳۴۵)

ويجوز المجبوب العاجز عن الجماع. (هنديه زكريا قديم ۵/ ۲۹۷، جديد ۵/ ۳۴۳، بزازيه جديد زكريا ۳/ ۱۵۹، وعلى هامش الهندية زكريا ۶/ ۳۲۵، شامى زكريا ۹/ ۴۷۰، كراچى ۶/ ۳۲۵)

اور فقہاء نے خنثیٰ جانور کی قربانی کے عدم جواز کی علت یہ بیان کی ہے کہ اس کا گوشت پکنے میں گلتا نہیں، لہٰذا اگر گوشت گل جاتا ہے اور پکنے میں کوئی دشواری نہ ہو تو اس کی قربانی بلا تردد جائز ہے، جیسا کہ شامی اور ہندیہ کے حاشیہ میں اس کی وضاحت موجود ہے۔

لاتجوز التضحية بالشاة الخنثىٰ لأن لحمها لاينضج وتحته فى الحاشية:

وبهـذا التعـليل اندفع ما أورده ابن وهبان من أنها لا تخلوا إما أن تكون ذكرا أو أنثىٰ وعلى كل تجوز. (هـنـديـه، كتـاب الأضـحية، البـاب الـخامس فى بيان محل إقامة الواجب، زكريا قديم ٥/٢٩٩، جديد ٥/ ٣٤٥، شامي كراچي ٦/٣٢٥، زكريا ٩/ ٤٧٠)

قربانی کے علاوہ گوشت خوری سب کی جائز ہے۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍رجب المرجب ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر :۲۴/ ۸۱۵)

خنثیٰ جانور کی قربانی کیوں ممنوع ؟

سوال [۱۰۰۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: خنثیٰ یعنی ہجڑے جانور کی قربانی کا کیا حکم ہے؟ جبکہ وہ ہر اعتبار سے تندرست ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: خنثیٰ جانور کی قربانی جائز نہیں،فقہاء نے اس کے عدم جواز کی علت گوشت نہ گلنا بیان کی ہے،لہٰذا علت معدوم ہوتو حکم بدل جائیگا،اگر گوشت آسانی سے گل جائےتو خنثیٰ جانور کی قربانی میں بھی کوئی حرج نہیں۔

ولا بـالـخـنثىٰ لأن لحمها لاينضج شرح وهبانية، وتحته فى الشامية وبهذا التعـليل اندفع ما أورده ابن وهبان من أنها لاتخلو إما أن تكون ذكرا أو أنثىٰ وعلى كل تجوز. (در مختار مع الشامي، كتاب الأضحية، كراچي ٦/٣٢٥، زكريا ٩/ ٤٧٠)

لاتـجـوز التـضـحية بـالشـاة الخنثىٰ لأن لحمها لاينضج . (هـنـديه، كتاب الأضحية، الباب الخامس فى بيان محل إقامة الواجب، زكريا قديم ٥/٢٩٩، جديد ٥/ ٣٤٥)

ولا بالخنثىٰ لأن لحمها لاينضج. (مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/١٧٢)

مـن الـمسلّـم لـدى الفقهاء إن الحكم يدور على العلة وجودا و عدما فإن وجدت العلة ثبت الحكم وإن انعدمت العلة انتفى الحكم. (المصباح فى رسم المفتى،

المبحث الأول، تغیر الحکم بتغیر العلة، مکتبه اتحاد دیوبند ص: ٤٩٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۹۵)

باؤلے جانور کی قربانی

سوال [۱۰۰۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قربانی کے لیے ایک جانور خریدا وہ جانور باؤلا نکلا، کسی پر بھی حملہ کردیتا ہے، ایسے حملہ کرنے والے جانور کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: باؤلے جانور کی قربانی جائز ہے، بشرطیکہ وہ چارہ وغیرہ چرلیتا ہو، لیکن اگر وہ اس حد تک باؤلا ہو کہ چر بھی نہ سکتا ہو تو اس کی قربانی جائز نہیں۔

ویضحی بالجماء والثولاء أی المجنونة إذا لم یمنعها من السوم والرعی وإن منعها لاتجوز التضحیة بها. (شامی، کتاب الأضحیة، کراچی ٦/٣٢٣، زکریا ٩/٤٦٨)

وتجوز الثولاء وهی المجنونة إلا إذا کان ذٰلک یمنعها عن الرعی والاعتلاف لاتجوز؛ لأنه یفضی إلی هلاکها فکان عیبا فاحشا. (بدائع الصنائع زکریا ٤/٢١٦)

ویجوز أن یضحی بالثولاء وهی المجنونة، هٰذا إذا کانت تعتلف لأنه لایخل بالمقصود، وأما إذا کانت لاتعتلف لاتجزیه. (هدایه اشرفی ٤/٤٤٨)

عن الحسن قال: لابأس أن یضحی بالثولاء. (إعلاء السنن، کراچی ١٧/٢٥٥، دار الکتب العلمية بيروت ١٧/٢٧٨، رقم: ٥٥٩٧)

وتجوز الثولاء وهی المجنونة إلا إذا کان ذٰلک یمنع الرعی والاعتلاف فلاتجوز. (هندیه زکریا جدید ٥/٣٤٤، قدیم ٥/٢٩٨)

ولابـأس بالخصی والثولاء وهی المجنونة إذا كانت سمينة. (تاتارخانية زكريا ١٧/٤٢٦، رقم: ٢٧٧١٥، تبيين الحقائق امداديه ملتان ٦/٥، زكريا ديوبند ٦/٤٧٩)

تـجـزئ الـجـرباء والثولاء يعنی المجنونة إذا كانت سمينة ولم يكن بها ما يمنعها الرعی. (فتاویٰ سراجية ص: ٣٨٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۸۹)

بانجھ جانور کی قربانی

سوال [۱۰۰۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بانجھ جانور کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: بانجھ جانور کی قربانی بھی جائز اور درست ہے۔

يـجـوز الـمـجبـوب الـعاجز عن الجماع والتی بها السعال والعاجزة عن الولادة لكبر سنها. (هـنـديه، كتاب الأضحية، الباب الخامس فی بيان محل إقامة الواجب، قديم زكريا ٥/٢٩٧، جديد زكريا ٥/٣٤٣)

تجوز التضحية بالمجبوب العاجز عن الجماع والتی بها سعال والعاجزة عن الولادة لكبر سنها. (شامی، كتاب الأضحية، كراچی ٦/٣٢٥، زكريا ٩/٤٧٠)

ويجوز ...... العاجزة عن الولادة لكبر سنها. (بزازيه جديد زكريا ٣/١٥٩، وعلى هامش الهندية زكريا ٦/٢٩٣، خلاصة الفتاویٰ اشرفی ديوبند ٤/٣٢١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۹۲)

بانڈھے جانور کی قربانی

سوال [۱۰۰۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بانڈھے جانور کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟ یعنی وہ جانور جس کی ٹانگ درست نہیں ہے، بلکہ ٹیڑھا میڑھا ہے اور پیروں کو چوڑائی میں پھیلا کر چلتا ہے اسے بانڈھا کہا جاتا ہے۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: بانڈھے جانور کی قربانی درست ہے، اس لیے کہ اس کے پیر اگرچہ درست نہیں ہوتے اور یہ ٹیڑھا میڑھا چلتا ہے لیکن چونکہ چاروں پیروں سے چل لیتا ہے اور چل کر قربان گاہ تک بھی پہنچ سکتا ہے اور ایسا جانور جو چاروں پیر زمین پر رکھ کر کے چل لیتا ہو تو اس کی قربانی درست ہوتی ہے، لہٰذا اس بانڈھے جانور کی بھی قربانی درست ہوگی۔

عن علي عنه: أنه سئل عن البقرة؟ فقال: عن سبعة قال: مكسورة القرن؟ قال: لاتضرك، قال: العرجاء؟ قال: إذا بلغت المنسك. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، دار الفكر بيروت ٢٠٠/١٤، رقم: ١٩٦٤٠، سنن الترمذي، الأضاحي، النسخة الهندية ٢٧٦/١، دار السلام رقم: ١٥٣٩)

العرجاء التي لا تمشي إلى المنسك أي التي لايمكنها المشي برجلها العرجاء إنما تمشي بثلاث قوائم حتى لو كانت تضع الرابعة على الأرض وتستعين بها جاز. (شامي، كتاب الأضحية، زكريا ٤٦٨/٩، كراچی ٣٢٣/٦)

والعرجاء إذا كانت تمشي فلابأس بها، وإذا كانت لا تقوم ولا تمشي لاتجوز. (تاتارخانية ٤٢٦/١٧، رقم: ٢٧٧١٦)

والعرجاء: البين عرجها؛ وهي التي لاتقدر أن تمشي برجلها إلى المنسك. (هنديه زكريا قديم ٢٩٧/٥، جديد ٣٤٣/٥)

كذاالعرجاء إذا مشت على رجلها إلى المنسك. (فتاوىٰ سراجية ص: ٣٨٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۱۱)

دواءً شراب پلائے گئے جانور کی قربانی

سوال [۱۰۰۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں ایک بیل نے زہر کھالیا، لوگوں نے بتایا کہ اس کو شراب پلائی جائے تو ٹھیک ہو جائے گا، چنانچہ شراب پلائی گئی تو وہ صحیح ہو گیا تو کیا اس جانور کی قربانی درست ہے اور شراب پلا کر علاج کرانا کیسا ہے؟

المستفتی: عمران ارریاوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں بقدر ضرورت جانور کو دواءً شراب پلانے کی گنجائش ہے، البتہ اس جانور کی قربانی اس وقت درست ہے کہ جب اس کی غذا بدل جائے، اور شراب کے آثار اس کے گوشت سے بالکل ختم ہو جائیں، فقہاء نے اس کے لیے بیس دن کی مدت مقرر کی ہے، اس لیے ۲۰/۲۵ دن تک پاک وصاف چارہ کھلایا جائے، اس کے بعد اس کی قربانی بلا کراہت درست ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ ڈابھیل ۱۷/۳۹۲)

فإن كانت إبلا تمسك أربعين يوما حتى يطيب لحمها والبقر عشرين وللغنم عشرة. (شامی، كتاب الاضحية، زكريا ديوبند ۹/ ٤٧٠، كراچی ٦/ ٣٢٥، هنديه زكريا قديم ٥/ ٢٩٨، جديد ٥/ ٣٤٤)

لو أن مريضا أشار إليه الطبيب بشرب الخمر روى عن جماعة من أئمة بلخ أنه ينظر: إن كان يعلم يقينا أنه يصح حل له التناول. (هنديه، كتاب الكراهية، الباب الثامن عشر، جديد زكريا ٥/ ٤١٠، قديم ٥/ ٣٥٥، تاتارخانية زكريا ١٨/ ٢٠٠، رقم: ٢٨٥٠٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۲۴۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۴/۸ھ

بازاری ٹیکس کی رسید کٹائے بغیر خرید شدہ جانور کی قربانی کا حکم

سوال [۷-۱۰۰۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں قربانی کا جانور لینے گیا تھا قربانی کا جانور طے کرلیا، معلوم ہوا کہ ٹھیکیدار موقعہ سے فائدہ اٹھا کر پچاس روپئے کے بجائے ایک سو پچاس روپئے رسید کا کرایہ وصول کررہا تھا، خریدار یعنی میں نے بازار سے ہٹ کر فروخت کنندہ کو قربانی کے جانور کی قیمت دے کر بنا رسید کٹائے جانور لے کر چلا آیا، تو قربانی پر کوئی اثر ہوا یا نہیں؟

المستفتی: محمد شہزاد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جانور فروخت کرنے والا اپنے جانور کا مکمل مالک ہے، چاہے بازار میں فروخت کرے چاہے بازار سے ہٹ کر دوسری جگہ فروخت کرے اسی طرح خریدار اپنے پیسہ کا پورا مالک ہے اور وہ اپنے پیسہ سے قربانی کا جانور چاہے بازار سے خریدے، چاہے بازار سے ہٹ کر کسی بھی جگہ سے خریدے، اس کو پورا اختیار ہے، اس لیے مذکورہ سوال میں بازار سے ہٹ کر مالک نے جو بیچا ہے اور خریدار نے جو خریدا ہے وہ بلاشبہ جائز اور درست ہے، اور خریدار کی قربانی میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی۔

والمالک هو المتصرف فی الأعیان المملوكة كيف شاء. (تفسیر بیضاوی، کتب خانه رشیدیه دهلی پاره: ۱، ص: ۷)

كل يتصرف فی ملكه كيف شاء. (شرح المجلة رستم باز، اتحاد دیوبند ۱/ ٦٥٤، رقم المادة: ١١٩٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹ر محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۴۳۴)

دودھ پیتے بچہ والی گائے کی قربانی

سوال [۱۰۰۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جس گائے کا دودھ پیتا بچہ ہو کیا اس کی قربانی درست ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: دودھ دینے والے جانور کی قربانی فی نفسہ جائز ہے، لیکن اس کے دودھ پیتے بچے کے ضائع ہونے خطرہ ہو تو قربانی تو جائز ہے لیکن بہتر اور مناسب نہیں۔

عن مغيرة بن خذف العبسي قال: كنا مع عليؓ بالرحبة فجاء رجل من همدان يسوق بقرة معها ولدها، فقال: إني اشتريتهاأضحي بها و إنها ولدت قال: فلا تشرب من لبنها إلا فضلا عن ولدها، فإذا كان يوم النحر فانحرها هي وولدها عن سبعة. (سنن الكبرىٰ للبيهقي، دار الفكر بيروت ١٤/٢٢٩، رقم: ١٩٧٢٩)

عن أبي هريرةؓ قال: خرج رسول الله ﷺ: في ساعة (إلى قوله) فقال النبي ﷺ: لاتذبحن ذات در فذبح لهم عناقا. (ترمذي، أبواب الزهد، باب ما جاء في معيشة أصحاب النبي ﷺ، النسخة الهندية ٢/٦٢، دار السلام رقم: ٢٣٦٩، صحيح مسلم، كتاب الأشربة، باب جواز استتباعه غيره إلى دار من يثق برضاه بذلك، النسخة الهندية٢/١٧٧ بيت الأفكار رقم: ٢٠٣٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍محرم الحرام ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۵۸۴/۳۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۱/۱۲ھ

گابھن جانور کی قربانی یا عقیقہ کرنا

سوال [۱۰۰۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) اگر بکری یا بقرہ کے پیٹ میں بچہ ہے اس کا علم تمام قرائن سے ظاہر ہے کہ

ان مذکورہ جانوروں کے پیٹ میں بچہ ہے تو آیا ان جانوروں کی قربانی وعقیقہ وذبح کرکے کھانا درست ہے یا نہیں؟ اور آیا کہ محض شک ہو کہ ان کے پیٹ میں بچہ ہے یا نہیں؟ تو ان کا کیا حکم ہے؟ آیا قربانی وعقیقہ یا ذبح کرکے کھانا درست ہے یا نہیں؟

(۲) اور اگر قربانی کرنے کے بعد اچانک بچہ نکل آیا کچھ نہیں معلوم تھا کہ پیٹ میں بچہ ہے یا نہیں ہے تو کیا اس کی قربانی میں کچھ حرج لازم آئیگا یا نہیں؟ اور بچہ زندہ بھی رہ گیا اور بڑا بھی ہوگیا تو آیا اس کو صدقہ وغیرہ کردیا جائے گا یا اس کو استعمال کرنا درست ہو جائے گا؟

المستفتی: ثناء اللہ پرتا پگڈھی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) اگر قربانی یا عقیقہ کے جانور کے پیٹ سے زندہ بچہ نکلے تو بچہ کو بھی ماں کی طرح ذبح کردیا جائے اور ماں اور بچہ دونوں کا گوشت کھانا شرعاً جائز اور حلال ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۳۱۲/۴، جدید ڈابھیل ۳۵۴/۱۷)

عن علی قال: البقرة عن سبعة قلت: فإن ولدت؟ قال: إذبح ولدها معها. (سنن الترمذی، الأضاحی، باب فی الضحیة بعضباء القرن والأذن، النسخة الهندية ٢٧٦/١، دار السلام رقم: ١٥٠٣)

فإن خرج من بطنها حيا فالعامة أنه يفعل به ما يفعل بالأم. (شامی، کتاب، الأضحية، کراچی ٣٢٢/٦، زکریا ٤٦٧/٩، هنديه زکریا قديم ٣٠١/٥، جديد ٣٤٨/٥، تاتارخانية زکریا ٤٤٣/١٧، رقم: ٢٧٧٦٥

اور اگر بچہ کو ذبح نہیں کیا گیا اور ایام قربانی گذرجائیں تو بچہ کو صدقہ کرنا لازم ہے۔

فإن لم يذبحه حتى مضت أيام النحر يتصدق به حيا. (شامی، کتاب الأضحية، کراچی ٣٢٢/٦، زکریا ٤٦٧/٩، هنديه زکریا قديم ٣٠١/٥، جديد ٣٤٨/٥، تاتارخانية زکریا ٤٤٣/١٧، رقم: ٢٧٧٦٦)

نیز گابھن جانور ذبح کرنا شرعاً مکروہ ہے لیکن قربانی اور عقیقہ درست ہو جاتے ہیں۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۲۶۲/۸، جدید زکریا مطول ۱۶۲/۱۲)

ویکره ذبح الشاة إذا تقارب ولادتها لأنه یضیع ما فی بطنها. (البحر الرائق، کتاب الذبائح، قبیل فصل فیما یحل و مالایحل، کوئٹه ۸/۱۷۱، زکریا ۸/۳۱۲-۳۱۳، شامی کراچی ۶/۳۰۴، زکریا ۹/۴۴۱، هندیه زکریا قدیم ۵/۲۷۸، جدید ۵/۳۳۱، خلاصة الفتاویٰ اشرفی دیوبند ۴/۳۰۷، فتاویٰ قاضیخان جدید زکریا ۳/۲۶۱، وعلی هامش الهندیة زکریا ۳/۳۶۷)

(۲) قربانی صحیح ہوگی اور اس پر کوئی جرم بھی شرعاً نہیں ہے، صرف مکروہ فعل ہوا، اور بچہ کا صدقہ کردینا واجب ہے۔

فإن لم یذبحه حتی مضت أیام النحر یتصدق به حیا. (شامی کتاب الأضحیة کراچی ۶/۳۲۲، زکریا دیوبند ۹/۴۶۷، هندیه زکریا قدیم ۵/۳۰۱، جدید ۵/۳۴۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍ربیع الاول ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۵۷۹)

چوروں سے خریدے ہوئے جانور کی قربانی

سوال [۱۰۰۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعض لوگ جو جانوروں کی تجارت کرتے ہیں وہ چوری کا مال بھی خرید کر لاتے ہیں اور اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ جو لوگ چوری کرتے ہیں وہ ڈیرہ ڈال کر جنگل میں رہتے ہیں اور جن جانوروں کی چوری کرتے ہیں، وہ جانور یا تو جنگل چرنے جاتے ہیں یا جنگل میں رہتے ہیں، یہ کرتے یہ ہیں کہ ان کو ہنکا کر اپنے ڈیروں پر لے جاتے ہیں یہ خریدار وہاں پہنچتے ہیں، اور معاملہ طے کرتے ہیں وہ رقم لے کر ان تاجروں کو گاڑی بھروا دیتے ہیں، تاجر لوگ یہاں آکر ان کو فروخت کرتے ہیں، قربانی کرنے والے حضرات بھی ان جانوروں کو خرید لیتے ہیں، دریافت یہ کرنا ہے کہ اس طرح لائے ہوئے جانوروں کی قربانی درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عارف، محلّہ حاجی پورہ رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: اس طرح چوری کر کے جانور فروخت کرنا حرام ہے اور اس کا پیسہ بھی اس کے لیے ناجائز ہے، اب رہی بات ایسے جانور خریدنے والے کی، تو اگر خریدار کو یہ معلوم نہیں ہے کہ جانور چوری کا ہے تو اس کے لیے جانور خریدنا اور اس کی قربانی کرنا جائز اور درست ہے، لیکن اگر اس کو معلوم ہے کہ یہ جانور چوری کا تو پھر ایسے جانور کا خریدنا جائز نہیں ہے، اور نہ ہی اس کی قربانی درست ہے، اور نہ اس کا گوشت کھانا جائز ہے، بلکہ ایسی صورت میں اس پر دوبارہ قربانی کرنا لازم اور ضروری ہوگا۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۸/ ۱۸۱، جدید زکریا مطول ۱۱/۳۳-۷۴، امداد الفتاویٰ ۳/ ۵۵۰، فتاویٰ رشیدیہ قدیم ۴۸۵، جدید زکریا ۴۷۷، احسن الفتاویٰ ۶/ ۵۲۷)

عن أبی هريرة عن النبی ﷺ: أنه قال: من اشتریٰ سرقة وهو يعلم أنها سرقة فقد شرک فی عارها و إثمها. (المستدرك للحاكم، مكتبه نزار مصطفىٰ الباز بيروت ۸۵۲/۳، رقم: ۲۲۵۳، المصنف لابن أبی شيبة، مؤسسة علوم القرآن بيروت ۳۸۹/٤، رقم: ۵۵۰۰)

ومن باع ملك غيره ثم اشتراه و سلم إلى المشترى لم يجز ويكون باطلا فاسدا ...... ولو كان المشترى من الغاصب باعه ثم أجاز المالك البيع الأول لاينفذ بيع المشترى. (فتاویٰ عالمگیریه، كتاب البيوع، الباب التاسع، الفصل الثالث، زكريا قديم ۳/ ۱۱۱، جديد ۳/ ۱۱۲)

وفی الدر المختار: الحرمة تتعدد مع العلم بها وفی الشامی: مثلاً يأخذ من أحد شيئا من المكس ثم يعطيه آخر ثم يأخذ من ذلك الآخر آخر فهو حرام. (الدر المختار مع الشامی، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد مطلب: الحرمة تتعدد، كراچی ۹۸/۵، زكريا ۳۰۱/۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۴۱۱)

چوری کا چارہ کھانے والے جانور کی قربانی

سوال [۱۱۰۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جس جانور کو چوری سے سرکاری پیڑ کے پتے یا کسی کے کھیت میں چوری سے کھلایا یا پلایا پھر اسی جانور کا عقیقہ یا قربانی کی جائے تو ایسے جانور کا گوشت کھانا کیسا ہے؟

المستفتی: جرار احمد قاسمی بھنڈیہ سیتاپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سرکاری پیڑ کے جو پتے کھلائے، اگر وہ پتے سرکار کے قیمتی ہیں تو پتہ کھلانے کی وجہ سے مالک گنہگار ہوگا، اور اگر ان پتوں کی سرکار کے یہاں کوئی قیمت نہیں ہے تو مالک گنہگار بھی نہیں ہوگا، دوسروں کے کھیت سے جانور کو چوری سے جو کھلایا پلایا گیا ہے تو جتنا کھلایا ہے، اتنے کا تاوان جانور کے مالک کے اوپر لازم ہوجائے گا، مگر وہ جانور یا اس کے گوشت کے حلال ہونے میں کوئی فرق نہیں آئیگا، جانور اور اس کا گوشت ہر حال میں حلال ہے، دوسروں کے مال کھلانے کی وجہ سے جانور کے مالک کے اوپر اس کا تاوان واجب ہوتا ہے، لہٰذا ایسے جانور کی قربانی یا عقیقہ شرعاً جائز اور درست ہے، اور اس کا گوشت بھی حلال ہے۔

وإن انفلتت الدابة وأتلفت زرعا فلا ضمان علی مالكها ليلا كان أو نهارا عند أبی حنيفةؒ. (معارف السنن أبواب الزكاة، باب ما جاء أن العجماء جرحها جبار، اشرفيه ديوبند ۵/۲٤۰)

ولو أن بقارا رعیٰ بقرا فی أجمة مملوكة لإنسان فليس له ذٰلک وهو ضامن لما رعیٰ. (بدائع الصنائع، كتاب الأراضی، فصل فی أرض الموات، زكريا ۵/۲۸۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ر محرم الحرام ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۶۶۳)

امریکن اور جرسی گائے کی قربانی

سـوال [۱۰۰۱۲]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: امریکن گائے جس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ خنزیر کے مادہ منویہ سے پیدا ہوتی ہے کیا اس کا دودھ وگوشت استعمال کر سکتے ہیں اور اس کی قربانی ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اور دیسی گائے کو مشینوں کے ذریعہ جرسی گائے بناتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟ اس کی قربانی کر سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: ریاست علی بدایونی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجـواب وبـالـلّٰه التوفيق: امریکن گائے کا دودھ وگوشت کا استعمال کرنا جائز ہے، اور اسی طرح جرسی گائے کا بھی دودھ وگوشت استعمال کرنا جائز ہے، اور اس کی قربانی بھی جائز ہے۔

والمتولد بين الأهلي والوحشي يتبع الأم. (الدر المختار، كتاب الأضحية، زكريا ٩/٤٦٦، كراچی ٦/٣٢٢)

وفي المتولد بين الوحشي والأهلي يعتبر الأم إن كانت وحشية لاتجزئ في الأضحية وإن كانت الأم أهلية تجزئ. (تاتارخانية زكريا ١٧/٤٣٣، رقم: ٢٧٧٣٩، هنديه زكريا قديم ٥/٢٩٧، جديد ٥/٣٤٣)

قال في البدائع: فلو نزا ثور وحشي على بقرة أهلية فولدت ولدا يضحى به دون العكس لأنه ينفصل عن الأم وهو حيوان متقوم تتعلق به الأحكام، ومن الأب ماء مهين ولذا يتبع الأم في الرق الحرية. (شامی، كتاب الأضحية، زكريا ٩/٤٦٦، كراچی ٦/٣٢٢، بدائع الصنائع زكريا ديوبند ٤/٢٠٣) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍رجب المرجب ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۵۳۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۷/۳ھ

دوسرے کے کھیت سے چرنے والے جانوروں کی قربانی

سوال [۱۰۰۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: وہ جانور جو آزاد چھوڑ دیئے جاتے ہیں یا چرائے جاتے ہیں اور چرانے والے کھڑے دیکھا کرتے ہیں کہ جانور دوسرے کے کھیت میں یا غلہ کے ڈھیر میں کھا رہا ہے، اور انجانے بنے کھڑے رہتے ہیں، تو اگر ایسے جانور کی قربانی کی جائے تو اس جانور کا گوشت استعمال کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: جرار احمد قاسمی بھنڈیہ ضلع سیتاپور یوپی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: دوسرے کے کھیت میں بالقصد چرایا ہے تو جتنا چرایا ہے اتنے کا تاوان جانور کے مالک کے اوپر واجب ہو جائیگا، مگر خود جانور یا اس کے گوشت کے حلال ہونے میں کوئی فرق نہیں آئیگا، اور اس کی قربانی بھی بلا تردد جائز ہے۔

رجل أرسل حماره فدخل زرع إنسان و أفسده إن أرسله و ساقه إلى الزرع بأن كان خلفه كان ضامنا. (عالمگیری، کتاب الجنایات، الباب الثانی عشر فی جنایة البهائم، زکریا قدیم ٦/٥٢، جدید ٦/٦٢، تاتارخانية زكريا ١٩/٢٩٠، رقم: ٣١٤٩٩، فتاویٰ قاضیخان جدید زکریا ٣/٣٣٣، وعلى هامش الهندية زكريا ٣/٤٥٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ رمحرم الحرام ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۷۷ ۸۶۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/۱/۱۴۲۶ھ

عورت کا دودھ پینے والے بکرے کی قربانی

سوال [۱۰۰۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک عورت نے اپنے گھر کے بکری کے بچے یعنی خصی بکرے کو بیس دن خود اپنے پستان سے دودھ پلایا ہے اور امسال اسی بکرے کی بقرعید میں قربانی کرنا چاہتی ہے تو

کیا حکم ہے؟ جائز ہے یا نہیں؟ کیا کرنا چاہیے؟

المستفتی: ریاض الدین گودھنا ضلع سیتاپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورت کا دودھ پینے کی وجہ سے بکری کے بچہ کی حلیت میں کوئی فرق نہیں آتا ہے، بعد میں پتے اور گھاس وغیرہ کھا کر غذاء بدل جانے کی وجہ سے دودھ کا اثر ختم ہو چکا ہے، اس لیے اس کی قربانی میں کوئی تردد نہیں ہونا چاہیے۔

قال أصحابنا فی جدی ارتضع بلبن خنزیر حتی کبر إنه لایکره أکله لأن لحمه لایتغیر ولاینتن …… لأنه بمنزلة الجلالة . (بدائع الصنائع، کتاب الذبائح، فصل فی بیان ما یکره من الحیوانات، کراچی ٥/ ٤٠، زکریا دیوبند ٤/ ١٥٤، هندیه زکریا قدیم ٥/ ٢٩٠، جدید ٥/ ٣٣٤، الجوهرة النیرة امدادیه ملتان ٢/ ٢٨١، دار الکتاب دیوبند ٢/ ٢٦٧، فتاویٰ قاضیخان جدید زکریا ٣/ ٢٥٤، وعلی هامش الهندیة زکریا ٣/ ٣٥٩، در مختار، کتاب الحظر والإباحة ٦/ ٣٤١، زکریا ٩/ ٤٩١، ٤٩٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ذیقعدہ ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۴۶۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۱/۱۱/۲۷ھ

قربانی کا بکرا تبدیل کرنا

سوال [۱۰۰۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بکری سے دو بچوں کا تولد ہوا، ایک کچھ ایام کے بعد خصی کردیا گیا، دوسرے کو بوجہ کمزوری خصی نہ کیا جاسکا، بلکہ ثانی الذکر کے بارے میں صاحب نصاب نے یہ نیت کرلی کہ اس کو ایام قربانی کے آنے پر قربان کردوں گا، اب وہ بکرا کافی فربہ ہوگیا ہے جس کی وجہ سے وہ کافی پریشان کرتا ہے، ارادہ اب ہو رہا ہے کہ اس کو فروخت کرکے دوسرا خرید لیا جائے کیا یہ تبدیلی درست ہے؟

اور اس نیت کی وجہ سے یہ قربانی کیا ضروری ہوگئی ہے؟ اگر غریب ایسا کرتا ہے تو کیا

پھر بھی یہی حکم ہوتا ہے یا غیر؟

المستفتی: محمد صراحت حسین قاسمی بھگوان بچھرایوں، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دوسرا بکرا قیمت وفربہ کے اعتبار سے برابر یا فائق ہے تو بتدیلی جائز ہے، اگر زبان سے کہہ کر اپنے اوپر نذر کی طرح لازم نہیں کرلیا تھا تو اس میں غنی وغریب دونوں برابر ہیں، ورنہ اس کی قربانی لازم ہوگی۔

وکان فی ملک إنسان شاۃ فنویٰ أن یضحی بها أو اشتریٰ شاۃ ولم ینو الأضحیة وقت الشراء ثم نویٰ بعد ذٰلک أن یضحی بها لایجب علیه سواء کان غنیا أوفقیرا. (بدائع الصنائع، کتاب التضحیة، کراچی ٥/٦٢، زکریا ٤/١٩٣، هندیه زکریا قدیم ٥/٢٩١، جدید ٥/٣٣٦، فتاویٰ قاضیخان جدید زکریا ٣/٢٤٤، وعلی هامش الهندیة زکریا ٣/٣٤٦، شامی کراچی ٦/٣٢١، زکریا ٩/٤٦٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍رجب المرجب ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/۱۳۳۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰؍۷؍۱۴۰۹ھ

سڑکوں پر پھرنے والے سانڈ کی قربانی

سوال [۱۰۰۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سڑکوں پر پھرنے والا جو سانڈ ہے وہ ما اہل لغیر اللہ میں شامل ہے یا سائبہ کے حکم میں ہے، وہ مالک کی ملکیت میں باقی رہتا ہے یا مالک کی ملکیت سے نکل جاتا ہے، اس کی قربانی کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: نبیر الدین دیناج پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سڑکوں پر پھرنے والا سانڈ ما اہل لغیر اللہ میں شامل نہیں ہے، بلکہ وہ سائبہ کے حکم میں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَ لاسَائِبَةٍ الخ.

اللہ نے سائبہ وغیرہ کو کوئی حیثیت نہیں دی ہے، لہٰذا اس نذر کا کوئی اعتبار نہ ہوگا، اور وہ جانور مالک کی ملکیت پر علی حالہ باقی رہے گا، یہی حکم سڑکوں پر پھرنے والے سانڈ کا ہے، یہ مالک کی ملکیت سے نہیں نکلے گا، مالک سے اجازت لے کر اس کو ذبح کرنا حلال اور جائز ہے۔ (غیر مقلدین کے ۵۶/اعتراضات کے جوابات ۱۳۴، امداد المفتیین ۹۳۶، امداد الفتاویٰ ۴/۱۰۰، کفایت المفتی ۸/ ۲۲۹، جدید زکریا مطول ۱/ ۲۳۱، محمود یہ ڈابھیل ۱/ ۳۲۸)

لہٰذا مالک سے خرید کر اس کی قربانی بھی جائز ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۴/ ۹۹)

ومن ههنا علم أن البقرة المنذورة للأولياء كما هو الرسم في زماننا حلال طيب لأنه لم يذكر اسم غير الله عليها وقت الذبح وإن كانوا ينذرونها. (تفسيرات احمديه، سورة بقرة آيت: ۱۷۳ اشرفيه ديو بند ص: ۴۲)

إن بدل المتقرب نيته قبل ذبح البقرة وقصد التقرب بإراقة دمها إلى الله تعالىٰ وتاب عن ماصدر منه من قصد التقرب إلى غيره تعالىٰ ثم ذبحها إلى الله تعالىٰ حلت البقرة وحل أكلها. (كفايت المفتى جديد زكريا ۸/۲۳۳، جديد زكريا مطول ۱/۲۴۱)

وما ذبح على النصب المعنى والنية فيها تعظيم النصب لا أن الذبح غير جائز. (تفسير قرطبى، سورة المائدة تحت تفسير الآية: ۳، دار الكتب العلمية بيروت ۶/۳۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۱۲)

ناک میں ناتھ والے جانور کی قربانی

سوال [۱۰۰۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ قربانی کے جانور جن کی ناک میں ناتھ پڑا ہوا ہوتا ہے، قابو میں کرنے کے

لیے ناتھ ناک میں ڈال دیتے ہیں، لہٰذا اس کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالستار نچھرایوں ضلع مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسے جانور کی قربانی بلا کراہت جائز ہے، یہ شرعاً عیب نہیں ہے۔

کل عیب یزیل المنفعة علی الکمال أو الجمال علی الکمال یمنع الأضحیة وما لایکون بهذه الصفة لایمنع. (عالمگیری، کتاب الأضحیة، الباب الخمس، زکریا قدیم ۲۹۹/۵، جدید ۳۴۵/۵، تاتارخانیة زکریا دیوبند ۴۳۱/۱۷، رقم: ۲۷۷۳۳، حاشیة چلپی علی التبیین امدادیه ملتان ۶/۶، زکریا دیو بند ۴۸۲/۶) فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍محرم الحرام ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۶۱۰/۲۵)

عنین جانور کی قربانی کا حکم

سوال [۱۰۰۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہماری ریاست جموں کشمیر میں جنگلی بیل جس کو یاک Yak کہتے ہیں اور کشمیری زبان میں اسے زمبسہ کہا جاتا ہے، یہ جنگل میں رہنے کو زیادہ پسند کرتا ہے، اگر چہ پہاڑی علاقے کے لوگوں کے اسے پالنے کی وجہ سے وہ جانور اب پالتو بن گیا ہے، پھر اس کی نسل جب مطلوب ہوتی ہے تو اس کو گائے سے جفتی کرائی جاتی ہے جس کے نتیجے میں بھینسر نام کی نسل آتی ہے لیکن اس بھینسر کی کوئی نسل نہیں ہوتی، (چلتی) اس لیے کہ وہ جفتی پر قادر ہی نہیں ہوتا، حالانکہ اس کے تمام اعضاء بظاہر صحیح سالم نظر آتے ہیں، اور یہ جانور بڑا فربہ ہوتا ہے، تو اب یہ سوال یہ ہے کہ ''یاک'' کی اس نسل بھینسر کی قربانی کرنا درست ہے یا نہیں؟ جبکہ وہ لا ولد ہے، اور یہاں کے کچھ لوگ اسے مخنث اور عنین قرار دیتے ہیں، تو کیا عنین

جانور کی قربانی کی جاسکتی ہے، یا نہیں؟ مدلل ومفصل جواب سے نواز کر مشکور فرمائیں۔

المستفتی: غلام احمد آخون ضلع ڈوڈہ جموں وکشمیر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پالتو گائے سے پیدا شدہ جانور کی قربانی شرعاً جائز اور درست ہے، خواہ نر پالتو ہو یا وحشی ہو، کیونکہ جانوروں میں نسل کا اعتبار ماں سے ہوتا ہے، لہٰذا سوالنامہ میں مذکور بھینسر کی پیدائش جبکہ پالتو گائے سے ہوتی ہے تو اس کی قربانی بلا تردد جائز اور درست ہوگی اور اس کے جفتی پر قادر نہ ہونے اور لاولد ہونے کی بنا پر قربانی کے جواز پر کوئی اثر نہیں ہوگا، البتہ اگر بھینسر کی ماں وحشی ہو تو اس کی قربانی درست نہ ہوگی۔

(مستفاد: احسن الفتاویٰ ۷/ ۵۲۱، امداد الفتاویٰ ۳/ ۵۵۹)

والمتولد بين الأهلي والوحشي يتبع الأم. (الدر المختار، كتاب الأضحية، زكريا ۹/ ٤٦٦، كراچی ٦/ ۳۲۲، تاتارخانية زكريا ۱۷/ ٤۳۳، رقم: ۲۷۷۳۹، هنديه زكريا قديم ٥/ ۲۹۷، جديد ٥/ ۳٤۳)

ولايجوز في الأضاحي شيئ من الوحشي فإن كان متولداً من الوحشي والأنسي فالعبرة للأم فإن كانت أهلية تجوز وإلا فلا، حتى لو كانت البقرة وحشية والثور أهليا لم تجز. (عالمگيری زكريا قديم ٥/ ۲۹۷، جديد ٥/ ۳٤۳، تاتارخانية زكريا ۱۷/ ۳۳۱، رقم: ۲۷۷۳۹)

تجوز التضحية بالمجبوب العاجز عن الجماع والتي بها سعال والعاجزة عن الولادة لكبر سنها. (شامی كراچی ٦/ ۳۲٥، زكريا ۹/ ٤۷۰، هنديه زكريا قديم ٥/ ۲۹۷، جديد ٥/ ۳٤۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ شعبان المعظم ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۸۹۳۱)

بیمار جانور کی قربانی کا حکم

سوال [۱۰۰۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے قربانی کی نیت سے ایک بکرا خریدا، ابھی بقرعید کے دن دور ہیں، اور جانور کی گردن میں ایک گانٹھ بھی ظاہر ہوگئی ہے جس کی وجہ سے لوگوں نے دیکھ کر کہا کہ غدود نہیں بلکہ یہ گانٹھ جان لیوا بھی ہوسکتی ہے، اب زید نے اس بکرے میں صدقہ کی نیت کرلی ہے، لہٰذا مفتیان حضرات سے مشورہ ہے کہ شریعت کی روشنی میں اس بکرے کو بقرعید کے علاوہ صدقہ میں ذبح کرسکتے ہیں یا نہیں؟ زید نصاب کا مالک ہے فقیر نہیں ہے؟

المستفتی: محمد یامین کچا باغ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید جب صاحب نصاب ہے تو قربانی کی نیت سے جس جانور کو پالا ہے اور اس میں بیماری کا خطرہ ہے تو اس جانور کو بدلنے کا اختیار ہے، چاہے اس کو بیچ کر کے اس کے پیسے کو اپنے کام میں لائے یا ذبح کر کے کھالے یا صدقہ کردے، ہر طرح کا اختیار ہے لیکن بقرعید کے زمانہ میں دوسرے جانور کی قربانی لازم ہوجائے گی۔

ولو اشتریٰ أضحية وهي صحيحة العين ثم أعورت عنده و هو موسر أو قطعت أذنها كلها أو أليتها أو ذنبها أو انكسرت رجلها فلم تستطع أن تمشي لاتجزئ عنه وعليه مكانها أخرىٰ بخلاف الفقير. (عالمگیری، كتاب الأضحية، الباب الخامس، زكريا قديم ٥/٢٩٩، جديد ٥/٣٤٥)

ولو اشتراها سليمة ثم تعيبت بعيب مانع فعليه إقامة غيرها مقامها إن كان غنيا، وإن كان فقيرا أجزأه ذلك. (درمختار كراچی ٦/٣٢٥، زكريا ٩/٤٧١، تاتارخانية زكريا ١٧/٤٣٢، رقم: ٢٧٧٣٥، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/١٧٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ جمادی الاول ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۲۷۶/۳۸)

بیمار جانور کی قربانی

سـوال [۱۰۰۲۰]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بیمار جانور کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الـجـواب وبـالله التوفيق: اگر جانور میں بیماری معمولی ہوتو اس کی قربانی جائز ہے اور اگر زیادہ بیمار ہو کہ اس کا مرض نمایاں ہوتو اس کی قربانی درست نہیں۔ (مستفاد: محمودیہ میرٹھ ۲۶/۲۹۳، ڈابھیل ۱۷/ ۳۸۸)

عـن البـراء بـن عـازب رفعـه قـال: لايـضـحى بالعرجاء بين ضلعها، ولا بـالـعـوراء بيـن عـورها، ولا بالمريضة بين مرضها (سنـن التـرمذی، الأضاحی، باب مالايجوز من الأضاحی، النسخة الهندية ١/ ٢٧٥، دار السلام رقم: ١٤٩٧)

وأما الـذی يرجع إلى محل التضحية فنوعان: أحدهما سلامة المحل عن العيوب الفاحشة فلاتجوز المريضة البين مرضها. (بدائع الصنائع، كتاب التضحية، زكريا ٤/ ٢١٤)

ولاتجوز المريضة البين مرضها. (هنديه جديد زكريا ٥/ ٣٤٣، قديم ٥/ ٢٩٧)

ولا الـمريضة البين مرضها. (شـامی كراچی ٦/ ٣٢٣، زكريا ٩/ ٤٦٨) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۲۴/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۱۳)

ہتھیلی سے بڑے زخم والے جانور کی قربانی

سـوال [۱۰۰۲۱]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص نے قربانی کا ایک جانور خریدا، بعد میں ٹریکٹر سے ٹکر کھا کر اس کی کھال

چھل گئی، جس کی وجہ سے گوشت نمایاں طور پر نظر آرہا ہے، اوراس میں سے خون بھی نکلا ہے، تو اس کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ اس کے بقیہ اعضاء صحیح سالم ہیں اور وہ زخم ہتھیلی سے بڑا ہے۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ٹریکٹر سے ٹکر کھانے کی وجہ سے جس جانور کی کھال چھل گئی اور گوشت نمایاں طور پر نظر آرہا ہے اوراس میں سے خون بھی نکلا ہے تو اس کی قربانی جائز نہیں، فقہاء کرام نے اس سلسلے میں یہ ضابطہ نقل کیا ہے کہ اگر قربانی کے جانور میں کوئی عیب فاحش پیدا ہو جائے تو قربانی نہیں ہوگی اور عیب یسیر میں قربانی جائز ہو جائے گی، لہٰذا اگر مذکورہ زخم کی وجہ سے اس کا گوشت متأثر ہو چکا ہو تو جائز نہیں، اور اگر اس کا گوشت متأثر نہیں ہوا ہے تو اس کی قربانی جائز ہے۔

والأصل فيه أن العيب الفاحش مانع واليسير غير مانع لأن الحيوان قلما ينجو عن يسير العيب واليسير مالا أثرله فى لحمها. (عنايه مع الفتح، كتاب الأضحية، زكريا ديوبند ٥٢٧/٩، كوئٹه ٤٣٣/٨، دار الفكر بيروت ٥١٤/٩)

وكل عيب يزيل المنفعة على الكمال أو الجمال على الكمال يمنع الأضحية ومالايكون بهذه الصفة لايمنع. (تاتارخانية زكريا ٤٣١/١٧، رقم: ٢٧٧٣٣، حاشيه چلپى، تبيين الحقائق، امداديه ملتان ٦/٦، زكريا ٤٨٢/٦)

وفى الخانية: ويشترط الكمال فلا يجوز الناقص سواء كان النقصان من حيث السن أو من حيث الذات. (تاتارخانية ٤٢٧/١٧، رقم: ٢٧٧١٨)

اعلم أن الكل لايخلو عن عيب والمستحب أن يكون سليما عن العيوب الظاهرة فما جوزها هنا جوز مع الكراهة كما فى المضمرات. (شامى زكريا ٤٦٨/٩، كراچى ٣٢٣/٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۱۱۳۱۴/۴۰)

جس بکرے کا نیچے کا ہونٹ چھوٹا ہو اس کی قربانی کا حکم

سوال [۱۰۰۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک بکرے کا نیچے کا ہونٹ اوپر کے ہونٹ سے کافی چھوٹا ہو تو اس کی قربانی کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: ممتاز احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ایسا بکرا کہ جس کے نیچے کا ہونٹ اوپر کے ہونٹ کے مقابلہ میں چھوٹا ہو اور اس کے چرنے اور کھانے میں پریشانی نہ ہوتی ہو تو وہ شرعی طور پر عیب دار نہیں ہے، اس لیے اس کی قربانی جائز ہے۔

فإن كانت ترعى و تعتلف جاز وإلا فلا. (هنديه، كتاب الأضحية، الباب الخامس، زكريا قديم ٥/ ٢٩٨، جديد ٥/ ٣٤٤، تاتارخانية زكريا ديوبند ١٧/ ٤٢٨، رقم: ٢٧٧٢٢، بدائع الصنائع زكريا ديوبند ٤/ ٢١٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ر محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۴۱۱/۴۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/۱/۱۴۳۵ھ

جو جانور ایک آنکھ سے نہیں دیکھتا اس کی قربانی

سوال [۱۰۰۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک جانور قربانی کے لیے خریدا، وہ ایک آنکھ سے دیکھتا نہیں ہے، اس کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جس جانور کی ایک آنکھ خراب ہوگئی، اس سے دیکھتا ہی نہیں، اور وہ صرف ایک آنکھ سے دیکھتا ہے، ایسے جانور کی قربانی جائز نہیں ہے۔

عن البراء بن عازب قال: سمعت رسول الله ﷺ -إلى- يقول: لايجوز من الضحايا العوراء البين عورها، والعرجاء البين عرجها (سنن النسائي، الضحايا، باب العجفاء، النسخة الهندية ٢/ ١٧٩، دار السلام رقم: ٤٣٧٦، سنن الترمذي، الأضاحي، باب مالا يجوز من الأضاحي، النسخة الهندية ١/ ٢٧٥، دار السلام رقم: ١٤٩٧)

ولايجزئ العمياء ولا العوراء وهي ذاهبة إحدى العينين بكماله. (المحيط البرهاني، المجلس العلمي بيروت ٨/ ٤٦٦، رقم: ١٠٨١٥، کوئٹہ ٦/ ٤٧٨، تاتارخانية زكريا ١٧/ ٤٢٦، رقم: ٢٧٧١٨)

ولا بالعمياء والعوراء. (شامي، كتاب الأضحية، زكريا ٩/ ٤٦٨، کراچی ٦/ ٣٢٣)

لاتجزئ من الضحايا أربع: العوراء البين عورها. (بدائع الصنائع زكريا ٤/ ٢١٤)

ولايضحى بالعوراء، وفي الهامش: العوراء: لايبصر بعين واحد. (ہدایہ اشرفی دیوبند ٤/ ٤٤٧)

ولو ذهب عينها الواحدة ...... أنه لايجوز. (خانیہ جدید زكريا ٣/ ٢٤٩، وعلى هامش الهندية زكريا ٣/ ٣٥٢، تبيين الحقائق امدادیہ ملتان ٦/ ٥، زكريا ديوبند ٦/ ٤٧٩)

ولا العوراء البين عورها. (فتاویٰ سراجیہ اتحاد ١/ ٣٨٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ ذیقعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۰۹)

جس جانور کی ثلث سے زیادہ بینائی چلی گئی اس کی قربانی

سوال [۱۰۰۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک جانور قربانی کے لیے خریدا گیا، اس کی ایک آنکھ میں روشنی کم ہے، تو روشنی کتنی کم ہونے سے قربانی پر اثر پڑے گا، اور جانور کی آنکھوں کی روشنی کا پتہ کیسے لگایا جائے گا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ایسا جانور جس کی ایک آنکھ کی روشنی ایک تہائی یا

اس سے کم چلی گئی ہو اس کی قربانی درست ہے، لیکن جس کی بینائی تہائی سے زیادہ چلی گئی ہو اس کی قربانی جائز نہیں، کتنی بینائی گئی ہے اس کا پتہ اس طرح لگایا جائیگا کہ جانور کو دو ایک دن چارہ نہ دیا جائے، جب وہ شدید بھوکا ہو جائے تو اس کی وہ آنکھ بند کردی جائے جس کی بینائی کم ہے اور صحیح روشنی والی آنکھ کھلی رکھی جائے، اور دور سے چارہ جانور کے قریب لایا جائے، جہاں سے جانور کو چارہ نظر آجائے وہاں نشانی لگادی جائے، پھر اس کی وہ آنکھ کھول دی جائے اور پوری روشنی والی آنکھ بند کردی جائے اور اسی طرف سے پھر دھیرے دھیرے چارہ جانور کے قریب لایا جائے اور جہاں سے جانور کو چارہ نظر آجائے وہاں پر نشانی لگادی جائے، پھر ان دونوں نشانوں کے درمیانی فاصلے کو ناپا جائے، اگر یہ فاصلہ پہلے والے نشان کا نصف ہے تو آنکھ کی نصف بینائی کم ہے اور اگر یہ فاصلہ ثلث ہے تو ثلث بینائی کم ہے، مثلاً: صحیح آنکھ سے جانور نے تیس میٹر دور سے چارہ دیکھ لیا اور دوسری آنکھ سے جس کی بینائی کم ہے ۲۰/ میٹر سے دیکھا تو درمیان میں ۱۰/ میٹر کا فاصلہ ہے جو پہلی دوری یعنی ۳۰/ کا ثلث ہے، لہٰذا اس جانور کی آنکھ کی ثلث بینائی کم ہوگئی ہے۔

ولو ذهب بعض هذه الأعضاء دون بعض من الأذن والألية والذنب والعين، ذكر في ''الجامع الصغير'' إن كان الذاهب كثيرا يمنع جواز التضحية، وإن كان يسيرا لايمنع، واختلف أصحابنا بين القليل والكثير فعن أبي حنيفةؒ أربع روايات، والصحيح: أن الثلث ومادونه قليل و مازاد عليه كثير، وعليه الفتوىٰ. (هنديه، كتاب الأضحية، الباب الخامس، زكريا قديم ٥/٢٩٧، جديد ٥/٣٤٤)

ولا مقطوع أكثر الأذن أو العين أي التي ذهب أكثر نورعينها (در مختار) واختلف أصحابنا في الفاصل بين القليل والكثير فعن أبي حنيفة أربع روايات، والصحيح: أنه الثلث و مادونه قليل وما زاد عليه كثير، وعليه الفتوىٰ. (شامي زكريا ديوبند ٩/٤٦٨، كراچی ٦/٣٢٣)

وإذا ذهب بعض العين الواحدة ...... إن كان الذاهب قليلا لايمنع جواز الأضحية، وإن كان كثيرا يمنع ...... وتكلموا في الحد الفاصل بين

القليل والكثير ...... والصحيح أن الثلث ومادونه قليل، ومازاد عليه كثير وعليه الفتوىٰ. (تاتارخانية زكريا ١٧/ ٤٢٩، رقم: ٢٧٧٢٩)

إنما يعرف ذهاب النصف أو الثلث من العين بأن يشد المعيبة بعد أن لا يعتلف الشاة يوما أو يومين، ثم يقرب العلف إليها قليلا فإذا رآه من موضع علم ذٰلک المكان، ثم يشد العين الصحيح، ويقرب العلف إلى الشاة قليلا قليلا، فإذا رآه من مكان علم ذٰلک المكان ثم يقدر ما بين الأولىٰ والثانية من التفاوت، فإذا كان التفاوت بينهما الثلث فقد ذهبت الثلث وبقى الثلثان، وإن كان النصف فقد ذهب النصف وبقى النصف.

(تاتارخانية ١٧/ ٤٣٠، رقم: ٢٧٧٣٠، شامي زكريا ٩/ ٤٦٨، كراچی ٦/ ٣٢٤، هنديه جديد زكريا ديوبند ٥/ ٣٤٤، قديم ٥/ ٢٩٨، هدايه اشرفى ديوبند ٤/ ٤٣٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۸۹)

کان کٹے جانور کی قربانی

سوال [۱۰۰۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بکر نے قربانی کے لیے ایک بکرا خریدا تھا بعد میں پتہ چلا کہ اس کا ایک کان کٹا ہوا ہے تو ایسے بکرے کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بکر نے جو قربانی کے لیے بکرا خریدا ہے اگر اس کا کان تہائی یا تہائی سے کم کٹا ہوا ہے تو اس کی قربانی جائز ہے اور اگر تہائی سے زیادہ کٹا ہوا ہے تو اس کی قربانی جائز نہیں۔

وفي الجامع: أنه إذا كان ذهب الثلث أو أقل جاز وإن كان أكثر

لایجوز، والصحیح: أن الثلث و مادونه قلیل وما زاد علیه کثیر و علیه الفتویٰ کذا فی فتاویٰ قاضیخان. (هندیه، کتاب الأضحیة، الباب الخامس، جدید زکریاه/۳٤٤، قدیم، ۲۹۸/٥)

وقال الفقیه أبو اللیث رحمه الله تعالیٰ إن کانت الأضحیة مقطوعة الأذن الواحدة أکثر من الثلث لایجوز فی قول أبی حنیفة رحمه الله تعالیٰ.

(خانیه جدید زکریا ۲٤۸/۳، وعلی هامش الهندیة زکریا ۳٥۲/۳)

إن کان المقطوع أکثر من الثلث لایجزئه وإن کان الثلث أو أقل یجزئه. (المبسوط، بیروت۱۲/٥۱-۱٦)

ومقطوع أکثر الأذن وتحته: واختلف أصحابنا فی الفاصل بین القلیل والکثیر فعن أبی حنیفة أربع روایات، رویٰ محمد فی الأصل والجامع الصغیر: أن المانع ذهاب أکثر من الثلث وعنه أنه الثلث وعنه أنه الربع ...... والأولیٰ هی ظاهر الروایة، وصححها فی الخانیة حیث قال: والصحیح أنه الثلث وما دونه قلیل ومازاد علیه کثیر وعلیه الفتویٰ. (شامی زکریا ٤٦۸/۹، کراچی ۳۲۳/٦-۳۲٤)

والصحیح أن الثلث ومادونه قلیل ومازاد علیه کثیر وعلیه الفتویٰ.

(خانیة، جدید زکریا ۲٤۹/۳، وعلی هامش الهندیة زکریا ۳٥٤/۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۲۳؍ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ

(الف خاص فتویٰ نمبر: ۱۱۲۹۵/۴۰)

جس جانور کے دانت نہیں اس کی قربانی

سوال [۱۰۰۲٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جس جانور کے دانت ہی نہیں ہیں اس کی قربانی درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: مفتی نبیر الدین دیناجپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس جانور کے دانت نہیں ہیں؛ اگر وہ بغیر دانت کے گھاس چرتا ہے تو درست ہے، اگر چر نہیں سکتا تو قربانی درست نہیں ہے۔

أما الهتماء وهي التي لا أسنان لها، فإن كانت ترعى وتعتلف جازت وإلا فلا. (هندیه، کتاب الأضحية، الباب الخامس، زکریا قدیم ۲۹۸/۵، جدید ۳٤٤/۵، التاتارخانية ۴۲۸/۱۷، رقم: ۲۷۷۲۲، بدائع الصنائع زکریا دیوبند ٤/۲۱۵، تبيين الحقائق امدادیه ملتان ٦/٦، زکریا دیو بند ٦/٤٨١، شامی زکریا ٩/٤٦٩، کراچی ٦/٣٢٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۳؍ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ

(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۹۹)

دم کٹے جانور کی قربانی

سوال [۱۰۰۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: خالد نے قربانی کے لیے ایک بکرا خریدا تھا اب بعد میں دیکھا کہ اس کی دم کٹی ہوئی ہے تو اس کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خالد کے بکرے کی دم ثلث یا ثلث سے کم (تہائی) سے کم کٹی ہوئی ہے تو اس کی قربانی جائز ہے اور اگر تہائی سے زائد کٹی ہوئی ہے تو اس کی قربانی جائز نہیں۔

ولو ذهب بعض هذه الأعضاء دون بعض من الأذن والألية والذنب والعين، ذكر في ”الجامع الصغير“ إن كان الذاهب كثيرا يمنع جواز التضحية، وإن كان يسيرا لايمنع، واختلف أصحابنا بين القليل والكثير فعن أبي حنيفة أربع روايات، والصحيح: أن الثلث ومادونه قليل و مازاد عليه كثير، وعليه الفتوىٰ. (هنديه، کتاب الأضحية، الباب الخامس، زکریا قدیم ۲۹۷/۵، جدید ۳٤٤/۵)

ولا مقطوع أكثر الأذن أو العين أى التى ذهب أكثر نور عينها (در مختار) **واختلف أصحابنا فى الفاصل بين القليل والكثير فعن أبى حنيفة أربع روايات، والصحيح: أنه الثلث و مادونه قليل وما زاد عليه كثير، وعليه الفتوىٰ.** (شامی زکریا دیوبند ٤٦٩/٩، کراچی ٣٢٣/٦)

والصحيح أن الثلث ومادونه قليل ومازاد عليه كثير وعليه الفتوىٰ.
(خانية جديد زكريا ٢٤٩/٣، وعلى هامش الهندية زكريا ٣٥٤/٣)

ولاتجزئ مقطوعة الأذن والذنب ولا التى ذهب أكثر أذنها و ذنبها و إن بقى أكثر الأذن والذنب جاز. (مختصر القدوری، امدادیه دیوبند ص: ٢٢٩)

إن كان المقطوع أكثر من الثلث لايجزئه وإن كان الثلث أو أقل يجزئه.
(المبسوط للسرخسی، دار الكتب العلمية بيروت ١٢/١٥-٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۰۸)

مذبح تک جاسکنے والے مریض بکرے کی قربانی

سوال [۱۰۰۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قربانی کا بکرا دس بارہ دن سے بیمار ہے، پہلے کے مقابلہ میں آدھا بھی نہیں رہا ہے، دوا کھا رہا ہے، لیکن صحیح نہیں ہوتا لیکن دو چار دن سے چارہ بھی کھانے لگا ہے اور مذبح تک جانے کی اس میں طاقت ہے تو اس کی قربانی درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالسمیع نجیب آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر مرض کی وجہ سے آدھا بھی نہیں رہا ہے، وہ مرض بین کے دائرے میں داخل ہو چکا ہے، لہٰذا جب تک کہ اس درجہ صحیح نہ ہو جائے کہ دیکھنے

والے اس کی صحت یابی خوب اچھی طرح سمجھ لیں، اس وقت تک قربانی جائز نہیں ہوگی۔

عن البراء بن عازب قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: لايجوز من الضحايا العوراء البين عورها، والعرجاء البين عرجها، والمريضة البين مرضها، والعجفاء التي لاتنقى. (سنن النسائي، الضحايا، باب العجفاء، النسخة الهندية ۲/۱۷۹، دار السلام رقم: ۴۳۷۶، الترمذي، الأضاحي، باب مالايجوز من الأضاحي، النسخة الهندية ۱/۲۷۵ دار السلام رقم: ۱۴۹۷)

لايجوز في الضحايا أربعة: العوراء البين عورها والعرجاء البين عرجها ...... والمريضة البين مرضها اى التي يبين أثر المرض عليها. (بنايه، كتاب الأضحية، قديم ۴/۱۸۰، جديد اشرفيه ديوبند ۱۲/۳۳-۳۴، تبيين الحقائق امداديه ملتان ۶/۵، زكريا ديوبند ۶/۴۷۹، هنديه زكريا قديم ۵/۲۹۷، جديد ۵/۳۴۳، بدائع الصنائع زكريا ديوبند ۴/۲۱۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۷۷۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶/۱۲/۱۴۱۴ھ

تین پیروں سے چلنے والے جانور کی قربانی

سوال [۱۰۰۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مرض سرن (جانور کھڑا ہوا ٹھیک معلوم ہوتا ہے لیکن چلانے پر کچھ دور تک لنگ کرتا ہے اور پھر چلنے سے اس میں اتنی گرمی آجاتی ہے کہ لنگ ختم ہوجاتا ہے، اور ٹھیک ہو کر چلتا ہے، اگر پھر وہ چلنے سے رک جائے تو دوبارہ چلنے پر قدرے لنگ محسوس ہوگا اور پھر ٹھیک چلنے لگے گا) والے جانور کی قربانی درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: مطلوب احمد بچھرایوں مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر اس کا وہ پیر زمین پر نہیں رکھا جاتا ہے، صرف تین

پروں سے چلتا ہے تو اس کی قربانی جائز نہیں اور اگر اس پیر کو زمین پر رکھتا ہوا چلتا ہے تو اس کی قربانی جائز ہے، گو چلتے وقت لنگڑاتا ہوا چلتا ہو۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۱/۳۵۲، جدید ڈابھیل ۱۷/۳۷۶)

عن علي رضی الله عنه: أنه سئل عن البقرة؟ فقال: عن سبعة، قال: مكسورة القرن؟ قال: لاتضرک، قال: العرجاء؟ قال: إذا بلغت المنسک. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، دار الفكر بيروت ١٤/٢٠٠، رقم: ١٩٦٤٠، سنن الترمذي، الأضاحي، النسخة الهندية ١/٢٧٦، دار السلام رقم: ١٥٣٩)

العرجاء: التي لا تمشي إلى المنسک أي التي لايمكنها المشي برجلها العرجاء، إنما تمشي بثلاث قوائم حتى لو كانت تضع الرابعة على الأرض وتستعين بها جاز. (شامي، كتاب الأضحية، كراچی ٦/٣٢٣، زكريا ٩/٤٦٨، تاتارخانية زكريا ١٧/٤٢٦، رقم: ٢٧٧١٦، هنديه زكريا قديم ٥/٩٢٧، جديد ٣٤٣١) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ربیع الاول ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۴۴۱۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۳/۱۹ھ

بدکنے والے جانور کی ٹانگ کاٹ دی کیا اس کی قربانی درست ہے؟

سوال [۱۰۰۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک جانور کو قربان گاہ میں گرانے کے لیے باندھا گیا، وہ بدک گیا، کسی طرح قابو میں نہیں آیا اور بھاگتے ہوئے قصائی نے ''بسم اللہ'' پڑھ کر اس کی ٹانگ کاٹ دی، اسی میں وہ دور جا کر گر گیا، ابھی لوگ وہاں تک پہنچ نہیں پائے تھے کہ اس کی روح نکل گئی، ذبح اختیاری نہیں ہوسکا، اس کی قربانی درست ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب جانور قربان گاہ سے بدک کر بھاگ گیا، بھاگتے وقت قصاب نے قربانی کی نیت سے بے قابو جانور کی ٹانگ پر بسم اللہ پڑھ کر چھری

ماری جس سے اس کی ٹانگ کٹ گئی تو اس ذبح اضطراری میں اس کی قربانی بھی درست ہے۔
(مستفاد: کفایت المفتی ۸/۲۵۳، جدید زکریا مطول ۱۱/ ۲۲۶)

عن رافع قال: كنا مع النبي صلى الله عليه وسلم في سفر فند بعير من الإبل قال: فرماه رجل بسهم فحبسه قال: ثم قال: إن لها أوابد كأوابد الوحش فما غلبكم منها،فاصنعوا به هكذا. (صحيح البخاری، الذبائح، باب إذا ند بعير لقوم، ٢/٨٣٢، رقم: ٥٣٢٩، ف: ٥٥٤٤، صحيح مسلم، الأضاحی، باب جواز الذبح بكل ما نهر الدم، النسخة الهندية ٢/١٥٦ بيت الأفكار رقم: ١٩٦٨، سنن الترمذی، الصيد، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ١/٢٧٥ دار السلام رقم ١٥٢٤)

شاة ندت و توحشت فرماها صاحبها و نوى الأضحية فأصابها أجزأه عن الأضحية. (التاتارخانية زكريا ١٧/٤٥٨، رقم: ٢٧٨١٩)

إذا ندت أو وقع منها شيئ في بئر فلم يقدر على نحره فإنه يطعنه في أى موضع قدر عليه فيحل أكله. (الجوهرة النيرة، كتاب الصيد والذبائح، امداديه ملتان ٢/٢٧٨، دار الكتاب ديوبند ٢/٢٦٤)

جاز جرح نعم مثل الغنم والإبل والبقر توحش بأن ند عن أهله ودخل في البادية وصار وحشيا لا الذكاة الاختيارية تعذرت فيذكى بالجرح في بدنه حيث اتفق. (مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ١٦٠، المحيط البرهانی، كوئٹه ٦/٤٥٢، المجلس العلمی بيروت ٨/٤٨١، رقم: ١٠٨٥٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۰۰)

اسکوٹر سے ٹکر کھا کر جانور کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تو کیا کریں؟

سوال [۱۰۰۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: زید نے قربانی کے لیے ایک بکرا خریدا، اتفاق سے کسی کے اسکوٹر سے ٹکر کھا کر اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی اب اس کی قربانی کا کیا حکم ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کے بکرے کی ٹانگ اگر حادثہ میں اس قدر ٹوٹ گئی کہ بکرا صرف تین ٹانگوں سے چلتا ہے اور چوتھا پیر زمین پر رکھ ہی نہیں سکتا تو ایسے بکرے کی قربانی درست نہیں ہے اور اگر چوتھے پیر کو زمین پر رکھ کر لنگڑا کر چل سکتا ہو تو اس کی قربانی درست ہے۔

إذا كانت تمشي بثلاث قوائم وتجافي الرابع عن الأرض لايجوز وإذا كانت تضع الرابع على الأرض تستعين بها، إلا أنه تتمايل مع ذٰلك وتضعه وضعا خفيفا يجوز وأما إذا كانت ترفع أو تحمل المنكسر لايجوز. (تاتارخانية زكريا ١٧/٤٢٦، رقم: ٢٧٧١٧)

العرجاء التي تمشي بثلاث قوائم ولا تضع الرابعة على الأرض لا وإن كانت تضعها وضعا ضعيفا إلا أنها تتمايل مع ذٰلك يجوز. (بزازيه، كتاب الأضحية، الفصل الخامس في عيوبها، جديد زكريا ٣/١٥٩، وعلى هامش الهندية زكريا ٦/٢٩٣)

والعرجاء التي لايمكنها المشي برجلها العرجاء إنما تمشي بثلاث قوائم حتى لو تضع الرابعة على الأرض وتستعين بها جازت. (شامي، زكريا ٩/٤٦٧، كراچى ٦/٣٢٣)

ولايجوز العرجاء التي لا تقدر على القيام والمشي إلى المذبح وإن قدرت جاز. (خانية جديد زكريا ٣/٢٤٩، وعلى هامش الهندية زكريا ٣/٣٥٣) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۲۷)

جانور قربانی کے لیے گراتے وقت ٹانگ ٹوٹ کر عیب دار ہو گیا

سوال [۱۰۰۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہم نے سنا ہے کہ عیب دار جانور کی قربانی جائز نہیں ہے تو سوال یہ ہے کہ ایک

جانورکوقربانی کے لیے باندھ کرگرایا جارہا تھا اسی میں اس نے خوب اچھل کودکی، جس سے اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی، جس سے وہ پیر زمین پر رکھ نہیں سکتا، اور یہ عیب گرانے کے دوران پیدا ہوا ہے تو اس کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی کے لیے گراتے وقت اگر جانور میں کوئی عیب پیدا ہوا ہو تو یہ عیب صحت قربانی کے لیے مانع نہیں ہے، لہٰذا جس جانور کی ٹانگ گراتے وقت ٹوٹی ہے اس کی قربانی بلا شبہ جائز ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ڈابھیل ۱۷/ ۳۸۷، میرٹھ ۲۶/ ۲۹۲)

عن أبی سعید الخدری قال: اشتریت شاة لأضحی بها، فخرجت فأخذ الذئب إلیتها، فسألت النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال: ضح بها. (السنن الکبریٰ للبیهقی، دار الفکر بیروت ۱۴/ ۲۳۰، رقم: ۱۹۷۳۰)

وإن أصابها شیئ من العیوب فی اضطرابها حین أضجعها للذبح، وذبحها علی مکانها جاز استحسانا وإذا انفلتت ثم أخذت وذبحت روی عن أبی یوسف فی غیر روایة الأصول إن أخذت من فور ذٰلک جاز وإلا فلا، وعن محمد أنه تجوز فی الحالین وعلیه الفتویٰ. (التاتارخانیة ۱۷/ ۴۳۲، رقم: ۲۷۷۳۷، المحیط البرهانی، مکتبه رشیدیه کوئٹه ۶/ ۴۷۹، المجلس العلمی بیروت ۸/ ۴۶۷، رقم: ۱۰۸۱۹)

ولو قدم أضحیة لیذبحها فاضطربت فی المکان الذی یذبحها فیه فانکسرت رجلها ثم ذبحها علی مکانها أجزأه. (بدائع الصنائع زکریا ۴/ ۲۱۶)

ولایضر تعیبها من اضطرابها عند الذبح. (شامی کراچی ۶/ ۳۲۵، زکریا ۹/ ۴۷۱)

ولایضر تعیبها من اضطرابها عند الذبح، وفی الهدایة ولو اضجعها فاضطربت فانکسر رجلها فذبحها أجزأ استحسانا عندنا خلافا لزفر والشافعی لأن حالة الذبح ومقدماته ملحق بالذبح فکأنه حصل به اعتبارا أو حکما. (مجمع الأنهر مکتبه فقیه الأمت دیوبند ۴/ ۱۷۲، هدایه، الأمین کتابستان ۴/ ۴۴۸) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۳۴)

جس جانور کو کتے نے کاٹ لیا ہو اس کی قربانی

سوال [۱۰۰۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قربانی کے ایک جانور کو کتے نے کاٹ لیا ہے اس کی قربانی ہوسکتی ہے یا نہیں؟ کتا زہریلا نہیں ہے، کئی آدمیوں کو کاٹ چکا ہے۔

المستفتی: حفیظ اللہ مدرسہ اصلاح المسلمین مہراج گنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کتے کے کاٹنے کی وجہ سے اس کا زخم نمایاں نہ ہو تو اس کی قربانی بلا کراہت جائز ہے، قرآن کریم میں شکاری کتے کے کاٹے ہوئے جانور کو کھانے کی اجازت دی گئی ہے۔

﴿وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ فَكُلُوْا مِمَّا اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ. [المائدة: ٤]﴾ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ر شوال المکرّم ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۸۹۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۱۰/۲۱ھ

جس جانور کے کولہے گراتے وقت اتر گئے اس کی قربانی

سوال [۱۰۰۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گرانے کے دوران ایک جانور کے کولہے اتر گئے وہ جانور عیب دار شمار ہوگا یا نہیں؟ اور اس کی قربانی کا کیا حکم ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی کے لیے گراتے وقت اگر جانور میں کوئی عیب

پیدا ہو جائے تو اس سے قربانی پر کوئی فرق نہیں پڑتا، لہٰذا گراتے ہوئے جس جانور کے کولہے اتر گئے، اس کی قربانی جائز ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ ڈابھیل ۳۸۷/۱۷، محمودیہ میرٹھ ۲۹۲/۲۶)

عن أبی سعید الخدری قال: اشتریت شاة لأضحی بها، فخرجت فأخذ الذئب إلیتها، فسألت النبی ﷺ فقال: ضح بها. (السنن الکبریٰ للبیهقی، دار الفکر بیروت ۱۴/ ۲۳۰، رقم: ۱۹۷۳۰)

وإن أصابها شیئ من العیوب فی اضطرابها حین أضجعها للذبح، وذبحها علی مکانها جاز استحسانا وإذا انفلتت ثم أخذت وذبحت روی عن أبی یوسف فی غیر روایة الأصول إن أخذت من فور ذٰلک جاز وإلا فلا، وعن محمد أنه تجوز فی الحالین وعلیه الفتویٰ. (التاتارخانیة ۴۳۲/۱۷ رقم: ۲۷۷۳۷، المحیط البرهانی، مکتبه رشیدیه کوئٹه ۴۷۹/۶، المجلس العلمی بیروت ۴٦۷/۸، رقم: ۱۰۸۱۹)

ولو قدم أضحیة لیذبحها فاضطربت فی المکان الذی یذبحها فیه فانکسرت رجلها ثم ذبحها علی مکانها أجزأه. (بدائع الصنائع زکریا ۲۱۷/۴)

ولایضر تعیبها من اضطرابها عند الذبح. (شامی کراچی ۳۲۵/٦، زکریا ۴۷۱/۹)

ولایضر تعیبها من اضطرابها عند الذبح، وفی الهدایة ولو اضجعها فاضطربت فانکسر رجلها فذبحها أجزأ استحسانا عندنا خلافا لزفر والشافعی لأن حالة الذبح ومقدماته ملحق بالذبح فکأنه حصل به اعتبارا أو حکما. (مجمع الأنهر، مکتبه فقیه الأمت دیوبند ۱۷۲/۴، هدایه، الأمین کتابستان ۴۴۸/۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۱۱۳۴۵/۴۰)

ایک خصیہ والے بکرے کی قربانی کا حکم

سوال [۱۰۰۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: ایک بکرے کا پیدائشی ایک خصیہ ہے اور ایک نہیں ہے تو اس کی قربانی کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: ممتاز احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسا بکرا جس کا پیدائشی ایک خصیہ نہ ہو تو اس کی قربانی درست ہے، نیز یہ بات ہے کہ اس کا جو ایک خصیہ موجود ہے اس کو بھی نکال دیا جائے تو قربانی کا گوشت اور اچھا ہو جائے گا۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ میرٹھ ۲۶/۳۰۱)

عن جابر بن عبد الله قال: ذبح النبی ﷺ یوم الذبح کبشین أقرنین أملحین موجئین. (أبو داؤد، الضحايا، باب ما يستحب من الضحايا، النسخة الهندية ٢/٣٨٦ دار السلام رقم: ٢٧٩٥)

ويضحى بالجماء والخصى. (شامی، كتاب الأضحية، زكريا ٩/٤٦٧ كراچی ٦/٣٢٦، البحر الرائق كوئٹه ٨/١٧٦، زكريا ٨/٣٢٣، تاتارخانية ١٧/٤٢٦، رقم: ٢٧٧١٥)

والخصى أفضل من الفحل لأنه أطيب لحما. (هنديه زكريا قديم ٥/٢٩٩، جديد ٥/٣٤٥، تاتارخانية زكريا ١٧/٤٣٤، رقم: ٢٧٧٤٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۲۳؍محرم الحرام ۱۴۳۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۴۱۱/۴۰)	۲۵/۱/۱۴۳۵ھ

جس جانور کا خصیہ پیدائشی طور پر نہ ہو اس کی قربانی

سوال [۱۰۰۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جس بکرے کا خصیہ پیدائشی طور پر نہ ہو تو اس کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ اس کا پورا بدن صحیح سالم اور تندرست ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس بکرے کا خصیہ پیدائشی طور پر نہ ہو تو اس کی

قربانی جائز ہے اور وہ خصی کے حکم میں ہے۔

عن جابر بن عبد الله قال: ذبح النبی صلى الله عليه وسلم يوم الذبح كبشين أقرنين أملحين موجئين. (أبو داؤد، الضحايا، باب ما يستحب من الضحايا، النسخة الهندية ٣٨٦/٢ دار السلام رقم: ٢٧٩٥)

ويضحی بالجماء والخصی. (شامی، كتاب الأضحية، زكريا ٤٦٧/٩ كراچی ٣٢٦/٦، البحر الرائق كوئٹه ١٧٦/٨، زكريا ٣٢٣/٨، تاتارخانية ٤٢٦/١٧، رقم: ٢٧٧١٥)

والخصی أفضل من الفحل لأنه أطيب لحما. (هنديه، كتاب الأضحية، الباب الخامس ، زكريا قديم ٢٩٩/٥، جديد ٣٤٥/٥، تاتارخانية زكريا ٤٣٤/١٧، رقم: ٢٧٧٤٣)

وعندهم أيضا سواء كان فوات الجزء خلقة أو كان طاريا بقطع فجائز. (الموسوعة الفقهية ١٢٥/١٩)

تجوز الجماء والخصی. (تبيين الحقائق زكريا ٤٧٩/٦، امداديه ملتان ٥/٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۳۰)

جس بکرے کا عضو تناسل ایک دوانچ پیچھے ہو اس کی قربانی کا حکم

سوال [۱۰۰۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) بکرے کے عضو تناسل کی سپاری سے ایک دوانچ قبل سوراخ ہو پیدائشی طور پر اور پیشاب کرتے وقت اس سوراخ سے بھی پیشاب کے قطرے گرتے ہیں اس صورت میں اس بکرے کی قربانی کا کیا حکم ہے؟

(۲) عضو تناسل اپنی عام جگہ سے ایک دوانچ پیچھے ہو تو ایسے بکرے کی قربانی کی جاسکتی ہے؟

المستفتی: ممتاز احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۲) جس بکرے کے عضو تناسل کی سپاری سے ایک دو انچ قبل پیدائشی طور پر سوراخ ہو یا عضو تناسل اپنی عام جگہ سے ایک دو انچ پیچھے ہو تو بھی اس کی قربانی درست ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے نہ تو جانور کی منفعت پر اثر پڑتا ہے اور نہ ہی خوبصورتی متأثر ہوتی ہے۔

کل عیب یزیل المنفعة علی الکمال أو الجمال علی الکمال یمنع الأضحیة ومالایکون بهذه الصفة لایمنع. (هندیه، کتاب الأضحیة، الباب الخامس، زکریا قدیم ۵/۲۹۹، جدید ۵/۳۴۵، حاشیة چلبی علی تبیین الحقائق امدادیه ملتان ٦/٦، زکریا دیوبند ٦/٤٨٢، تاتارخانیة زکریا دیوبند ۱۷/٤٣١، رقم: ۲۷۷۳۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۴۱۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/۱/۱۴۳۵ھ

جس جانور کے پیدائشی طور پر سینگ نہ ہو اس کی قربانی

سوال [۱۰۰۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جس جانور کے سینگ قدرتی طور پر نہیں ہے اس کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس جانور کے پیدائشی طور پر سینگ نہ ہوں اس کی قربانی درست ہے۔

عن علی قال: البقرة عن سبعة قلت: فإن ولدت؟ قال: إذبح ولدها معها، قلت: فالعرجاء، قال: إذا بلغت المنسک، قلت: فمکسورة القرن، قال: لابأس، أمرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أن نستشرف العینین والأذنین. (سنن الترمذی، الأضاحی، باب فی الضحیة بعضباء القرن والأذن، النسخة الهندیة ۱/۲۷٦، دار السلام رقم: ۱۵۰۳)

ویضحی بالجماء هی التی لا قرن لها خلقة. (شامی کتاب الأضحية کراچی ٦/٣٢٣، زکریا ٩/٤٦٧، هندیه زکریا قدیم ٥/٢٩٧، جدید ٥/٣٤٣، مجمع الأنهر دار الکتب العلمية بیروت ٤/١٧١، تاتارخانية زکریا ١٧/٤٢٦، رقم: ٢٧٧١٥، بدائع الصنائع زکریا دیوبند ٤/٢١٦، فتاویٰ سراجية اتحاد دیوبند ص: ٣٨٥، تبیین الحقائق امدادیه ملتان ٦/٥، زکریا دیوبند ٦/٤٧٩، المحیط البرهانی کوئٹه ٦/٤٧٨، المجلس العلمی بیروت ٨/٤٦٦، رقم: ١٠٨١٤، فتح القدير زكريا ديوبند ٩/٥٢٩، کوئٹه ٨/٤٣٤، دار الفکر بیروت ٩/٥١٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰/ ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۱۱۳۱۰/۴۰)

سینگ ٹوٹے جانور کی قربانی

سوال [۱۰۰۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ماجد نے ایک بکرا خریدا ہے لیکن بعد میں کسی چیز سے ٹکرا کر اس کا سینگ ٹوٹ گیا تو اس بکرے کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ماجد کے بکرے کے سینگ کا کچھ حصہ اوپر سے ٹوٹ گیا یا اس کا خول اتر گیا تو اس کی قربانی درست ہے، لیکن اگر اس کا سینگ جڑ سے ٹوٹا، بعد میں اس کا اثر دماغ تک پہنچ گیا تو پھر اس کی قربانی درست نہ ہوگی۔ (مستفاد: آپ کے مسائل اور ان کا حل ۵/۴۳۹)

عن علی قال: البقرة عن سبعة قلت: فإن ولدت؟ قال: إذبح ولدها معها، قلت: فالعرجاء، قال: إذا بلغت المنسک، قلت: فمکسورة القرن، قال: لابأس، أمرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أن نستشرف العینین والأذنین. (سنن الترمذی، الأضاحی، باب فی الضحية بعضباء القرن والأذن، النسخة الهندية ١/٢٧٦، دار السلام رقم: ١٥٠٣)

ویـجـوز أن یـضـحـی بالجماء التی لا قرن لها خلقة وتسمی الجلجا أیضا، وکذٰلک القصما وهو التی انکسر غلاف قرنها. (الجوهرة النیرة امدادیه ملتان ۲/۲۸۵، دار الکتاب دیوبند۲/ ۲۷۰)

ویـضـحـی بـالـجماء التی لا قرن لها خلقة وکذا العظماء التی ذهب بعض قرنها بالکسر أو غیره فإن بلغ الکسر إلی المخ لم یجز. (شامی، کتاب الأضحية، زکریا ۹/۴٦۷، کراچی ٦/۳۲۳، مجمع الأنهر، دار الکتب العلمية بیروت ٤/ ۱۷۱، بدائع الصنائع زکریا ٤/۲۱٦، هندیه زکریا قدیم ٥/۲۹۷، جدید ٥/۳٤۳، تبیین الحقائق، امدادیه ملتان ٦/٥، زکریا دیوبند ٦/٤۷۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۱۳)

خول اترے ہوئے جانور کی قربانی کا حکم

سوال [۱۰۰۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے بکرے کے سینگ کا خول اتر گیا ہے اس صورت میں ایسے جانور کی قربانی درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبد المنان بروالان مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جس بکرے کے سینگ کا خول اتر گیا ہو اس کی قربانی جائز ہے، بشرطیکہ خول کے اندر کا حصہ صحیح وسالم موجود ہو۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۱۶۱/۶، جدید زکریا ۵۱/۱۰)

ویـجـوز أن یـضـحـی بـالـجـمـاء وهو التی لا قرن لها خلقة وتسمی الـجـلـحـا أیضا وکذٰلک القصما وهو التی انکسر غلاف قرنها. (الجوهرة

النیرة، کتاب الأضحیة، امدادیه ملتان ۲/ ۲۸۵، دار الکتاب دیوبند ۲/ ۲۷۰، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۱۵/ ۲۹۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ربیع الاول ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۶۹۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۳/۱۴۲۴ھ

جس جانور کے سینگ کیمیکل کی بناپر اندر ہی رہ گئے ہوں اس کی قربانی

سوال [۱۰۰۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بہت سی جگہ جرسی گائے سے بچہ پیدا ہونے کے بیس پچیس دن کے بعد بچہ کے سینگ میں کیمیکل ڈال دیتے ہیں، جس کی وجہ سے سینگ اندر ہی رہ جاتے ہیں اوپر کو نہیں آتے یہ صرف جانور کو خوبصورت دکھنے کی وجہ سے کرتے ہیں، کیا ایسے جانور کی قربانی جائز ہے؟ جبکہ انسانی فعل کا اس میں دخل ہے، نیز ایسا کرنا گناہ ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد جسیم الدین برولان مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جن جانوروں کے سینگ سرے سے نکلے ہی نہ ہوں، خواہ پیدائشی طور پر ہو یا کیمیکل وغیرہ کے ذریعہ نکلنے سے روک دیئے گئے ہوں تو اس کی قربانی بلاشبہ جائز ہے اور ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، جبکہ جانور کے اندر اس کی وجہ سے تندرستی اور حسن زیادہ آنے کی امید ہو۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۷/ ۲۶۱، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۳۸۳)

ویضحی بالجماء هی التی لا قرن لها خلقة. (شامی، کتاب الأضحیة، کراچی ۶/ ۳۲۳، زکریا ۹/ ۴۶۷)

والجماء هی التی لا قرن لها خلقة وكذا مكسورة القرن تجزئ. (بدائع الصنائع زکریا ۴/ ۲۱۶، عالمگیری زکریا قدیم ۵/ ۲۹۷، جدید ۵/ ۳۴۳، مجمع الأنهر، دار الکتب العلمیة بیروت ۴/ ۱۷۱، تبیین الحقائق امدادیه ملتان ۶/ ۵، زکریا

٦/٤٧٩، تاتارخانية زكريا ١٧/٤٢٦، رقم: ٢٧٧١٥) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۱۰؍جمادی الثانیہ ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۸۴۹/۳۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۶/۱۰ھ

سینگ نیچے لٹکے ہوئے اور ہلنے والے جانور کی قربانی

سوال [۱۰۰۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جس بیل کے سینگ نیچے لٹکے ہوئے ہوں اور ہلتے بھی ہوں (جس کو ہمارے یہاں ہونڈ کا کہتے ہیں) ایسے بیل کی قربانی درست ہے کہ نہیں؟

المستفتی: عبدالسلام پورنوی، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سینگ کا ہلنا اور نیچے لٹک جانا ایسا عیب فاحش نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے قربانی میں خرابی آسکے، لہٰذا مذکورہ بیل کی قربانی شرعاً درست ہوگی۔

كل عيب يزيل المنفعة على الكمال أو الجمال على الكمال يمنع الأضحية ومالايكون بهذه الصفة لايمنع. (هنديه، كتاب الأضحية، الباب الخامس، زكريا قديم ٥/٢٩٩، جديد ٥/٣٤٥، حاشية چلبي على تبيين الحقائق امداديه ملتان ٦/٦، زكريا ديوبند ٦/٤٨٢، تاتارخانية زكريا ديوبند ١٧/٤٣١ رقم: ٢٧٧٣٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴۹۰/۲۷)

قدرتی طور پر ایک تھن والی بکری کی قربانی

سوال [۱۰۰۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: ایک بکری کے قدرتی طور پر صرف ایک ہی تھن ہے، اس سے خوب دودھ نکلتا ہے، اس کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس بکری کے پیدائشی طور پر ایک ہی تھن ہو یا کسی آفت سے ایک تھن ضائع ہوگیا، اس کی قربانی جائز نہیں۔

عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ: لاتجوز في النذر العوراء والعجفاء، والجرباء، والمصطلمة أطباؤها كلها. (المستدرك للحاكم، مكتبه نزار مصطفیٰ الباز بيروت ۲۶۸۹/۷، رقم: ۷۵۳۷)

ونقل الهيثمي هذا الحديث، وفسر المصطلمة اطباؤها أي المقطوعة ضروعها. (مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ۱۹/۴)

وفي الشاة والمعز إذا لم تكن لهما إحدى حلمتيها خلقة أو ذهبت بآفة وبقيت واحدة لم تجز. (هنديه، كتاب الأضحية، الباب الخامس، زكريا قديم ۲۹۹/۵، جديد ۳۴۵/۵، شامي زكريا ۴۷۰/۹، كراچی ۳۲۵/۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۲۵/ ذیقعدہ ۱۴۳۴ھ

(الف خاص فتویٰ نمبر: ۱۱۳۱۹/۴۰)

گائے یا بھینس کے چار تھنوں میں سے دو نہ ہوں تو اس کی قربانی

سوال [۱۰۰۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گائے یا بھینس کے چار تھنوں میں سے دو تھن ہیں، اور دو نہیں ہیں، تو اس کی قربانی درست ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گائے یا بھینس کے چار تھنوں میں سے دو ہوں

اور دو نہ ہوں خواہ پیدائشی طور پر ہی غائب ہوں، یا کسی آفت کی وجہ سے غائب ہو گئے ہوں یا خشک ہو گئے ہوں، تو اس کی قربانی جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: محمودیہ میرٹھ ۲۶/ ۳۰۱، محمودیہ ڈابھیل ۱۷/ ۳۸۱، کتاب المسائل ۲/ ۳۱۹)

عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ: لاتجوز فی النذر العوراء والعجفاء، والجرباء، والمصطلمة اطباؤها كلها. (المستدرك للحاكم، مكتبه نزار مصطفىٰ الباز بيروت ٧/ ٢٦٨٩، رقم: ٧٥٣٧)

ونقل الهيثمي هذا الحديث، وفسر المصطلمة اطباؤها أي المقطوعة ضروعها. (مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ١٩)

وفي الإبل والبقر إن ذهبت واحدة تجوز، وإن ذهبت اثنتان لاتجوز كذا في الخلاصة. (هنديه، كتاب الأضحية، الباب الخامس، زكريا قديم ٥/ ٢٩٩، جديد ٥/ ٣٤٥)

والشطور لايجزئ: وهي من الإبل والبقر إذا انقطع اللبن من ضرعيها. (تاتارخانية ١٧/ ٤٣٠، رقم: ٢٧٧٣١، شامي كراچی ٦/ ٣٢٥، زكريا ٩/ ٤٧٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۱۷)

دو تھن والی گائے کی قربانی

سوال [۱۰۰۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کسی گائے یا بھینس کے پیدائشی دو تھن ہوں تو اس کی قربانی درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد مقصود ٹانڈہ رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر کسی گائے، بھینس کے پیدائشی طور پر دو تھن ہوں اس کی قربانی درست نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۷/ ۲۴۹، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۳۸۰)

وفي الشاة والمعز إذا لم تكن لهما إحدى حلمتيها خلقة أو ذهبت بآفة وبقيت واحدة لم تجز، وفي الإبل والبقر إن ذهبت واحدة تجوز وإن ذهبت اثنتان لاتجوز، كذا في الخلاصة. (هـنديه، كتاب الأضحية، الباب الخامس، زكريا قديم ۵/۲۹۸، جديد ۵/۳۴۵، شامی زكريا ۹/۴۷۰، كراچی ۶/۳۲۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۴۱۰/۳۶)

دو تھن والی بھینس کی قربانی

سوال [۱۰۰۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں ایک بھینس قربانی کے لیے خریدی گئی جس کے پیدائشی صرف دولر (تھن) ہیں اور قصاب یہ کہتا ہے اس کی ماں کو بھی دولر تھے، کیا اس کی قربانی درست ہے، جبکہ ہمارے یہاں کے مفتی صاحب نے اس بھینس کی قربانی کے جواز کا فتویٰ دیا اور اس بھینس کی قربانی کی گئی اور انہوں نے شامی کے کسی جزئیہ سے جواز کی صورت نکالی ہے، جبکہ فتاویٰ محمودیہ اور دیگر اردو فتاویٰ میں عدم جواز کا قول منقول ہے، اگر دولر والی بھینس کی قربانی درست ہے تو مدلل وضاحت فرمائیں؟

المستفتی: ابوالہاشم ادروی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس بھینس کے چار تھنوں میں سے دو تھن پیدائشی ہوں، یا بعد میں دو کسی آفت کی وجہ سے بالکل جڑ سے ختم ہو گئے ہوں، اور صرف دو باقی ہوں، تو اس بھینس کی قربانی جائز نہیں ہے، ہاں البتہ اگر صرف ایک تھن ضائع ہوا ہو اور تین باقی ہوں، تو اس کی قربانی جائز ہے، اور مفتی صاحب نے شامی کے حوالہ سے جو مسئلہ بتایا ہے، بہتر ہے کہ وہ شامی کی عبارت پر دوبارہ غور کر لیں۔

وفی الشاة والمعز إذا لم تكن لهما إحدی حلمتيها خلقة أو ذهبت بآفة وبقيت واحدة لم تجز، وفی الإبل والبقر إن ذهبت واحدة تجوز أو اثنتان لاتجوز. (هنديه، كتاب الأضحية، الباب الخامس، زكريا قديم ٥/٢٩٩، جديد ٥/٣٤٥، شامی زكريا ٩/٤٧٠، كراچی ٦/٣٢٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰رمحرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۷۰۲۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱/۱۰ھ

تین تھن والے جانور کی قربانی

سوال [۱۰۰۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک گائے کے تین تھن ہیں تو اس کی قربانی درست ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گائے کے چار تھنوں میں سے ایک غائب ہو اور بقیہ تین صحیح سالم ہوں تو ایسی گائے کی قربانی درست ہے۔ (مستفاد: محمود یہ ڈابھیل ۱۷/۳۸۱، میرٹھ ۲۶/۳۰۱، کفایت المفتی جدید ۸/۱۸۹، جدید مطول ۱۲/۹۰)

وفی الإبل والبقر إن ذهبت واحدة تجوز، وإن ذهبت اثنتان لاتجوز كذا فی الخلاصة. (هنديه، كتاب الأضحية، الباب الخامس، زكريا قديم ٥/٢٩٩، جديد ٥/٣٤٥)

والشطور لايجزئ: وهی من الإبل والبقر إذا انقطع اللبن من ضرعيها. (تاتارخانية ١٧/٤٣٠، رقم: ٢٧٧٣١، شامی كراچی ٦/٣٢٥، زكريا ٩/٤٧٠)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳رذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۱۸)

گائے یا بھینس کے دوتھنوں سے دودھ نہیں نکلتا تو اس کی قربانی

سوال [۱۰۰۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گائے یا بھینس کے چار تھنوں میں سے دو سے دودھ نکلتا ہے اور دو سے نہیں نکلتا تو اس کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گائے یا بھینس کے چار تھنوں میں سے دو سے دودھ نکلتا ہے اور دو خشک ہوں جن سے دودھ نہ نکلتا ہو تو ایسی گائے اور بھینس کی قربانی جائز نہیں ہے۔

والشطور لایجزئ: ......ومن الإبل والبقر إذ انقطع اللبن من ضرعیها. (تاتارخانية ۱۷/۴۳۰، رقم: ۲۷۷۳۱)

ولا الجداء: وهي التي يبس ضرعها. (تبيين الحقائق، كتاب الأضحية، امداديه ملتان ٦/٦، زكريا ديوبند ٦/٤٨٢)

والجذاء مقطوعة رؤوس ضرعها أو يابستها. (شامي كراچی ٦/٣٢٤، زكريا ٩/٤٦٩)

وفي الإبل والبقر إن ذهبت واحدة تجوز، وإن ذهبت اثنتان لاتجوز كذا في الخلاصة. (هنديه، كتاب الأضحية، الباب الخامس، زكريا قديم ٥/٢٩٩، جديد ٥/٣٤٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ ذیقعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۱۹)

ایک تھن سوکھے ہوئے بکری کی قربانی

سوال [۱۰۰۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: ایک بکری کا ایک تھن درست ہے، دوسرا سوکھا ہوا ہے، تھن تو ہے لیکن اس سے دودھ نہیں نکلتا، اس کی قربانی کا کیا حکم ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس بکری کا ایک تھن خشک ہوگیا ہے اور اس سے دودھ نہیں نکلتا، تو اس کی قربانی درست نہیں ہے۔

ولا الجداء: وهي التي يبس ضرعها. (هنديه، كتاب الأضحية، الباب الخامس، زكريا قديم ٥/٢٩٨، جديد ٥/٣٤٤، تبيين الحقائق، كتاب الأضحية، امداديه ملتان ٦/٦، زكريا ديوبند ٦/٤٨٢)

والشطور لايجزئ: وهي من الشاة ما قطع اللبن عن إحدى ضرعها. (تاتارخانية ١٧/٤٣٠، رقم: ٢٧٧٣١، شامی زکريا ٩/٤٧٠، کراچی ٦/٣٢٥) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۱۸/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۱۱۳۰۴/۴۰)

۸ باب فی مصرف جلد الأضحية

چرم قربانی

سوال [۱۰۰۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (الف) چرم قربانی کی رقم سے مدرس کی تنخواہ دینا حرام ہے، ایک صاحب فرماتے ہیں، جبکہ آپ کی کتاب میں ہے کہ خود صاحب نصاب یعنی قربانی کرنے والا خود بھی کھال استعمال کرسکتا ہے، اور صاحب نصاب نے بعینہٖ کھال مدرس کو دیدی تو پھر کھال کا مالک صاحب مدرسہ کو دیدے پھر فروخت کر کے مدرس تنخواہ میں لگاتا ہے یا دوسرے مدرسہ کے بیت المال سے مہتمم دیدیں، حضرت سے معلوم کرنا یہ ہے کہ مدرس کو تو دوہرا اجر ملنا چاہیے، جبکہ یہاں حرام قرار دیا جارہا ہے، اگر حرام ہے تو تفصیل سے تحریر کریں، اور منع ہے تو کس درجہ کی ممانعت ہے؟

(ب) چرم قربانی کی رقم تملیک کر کے دیگر دینی کاموں میں لگا سکتے ہیں یا نہیں؟ جیسے مدرس کی تنخواہ میں یا قبرستان کی یا مسجد کی تعمیر میں دے سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد فرمود کٹگھر مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: چرم قربانی سے خود قربانی کرنے والے کے لیے استعمال کر کے فائدہ اٹھانا جائز ہے، اور یہ بھی جائز ہے کہ بعینہٖ قربانی کے جانور کی کھال کسی کو ہبہ کردے، چاہے مالدار ہو یا غریب، لیکن جب مالک اس کو فروخت کردے گا یا مالک کی طرف سے صراحتاً یا دلالۃً وکیل بن کر کے فروخت کرے گا تو پھر اس کی قیمت کا خود استعمال کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ مستحق زکوٰۃ فقراء کو صدقہ کردینا لازم ہے، اور سوالنامہ میں یہ جو لکھا گیا ہے کہ قربانی کرنے والا خود بھی کھال کو استعمال کرسکتا ہے اور صاحب نصاب نے مدرس کو بعینہٖ کھال ہبہ کردی ہے تو مدرس اس کا مالک ہوجائے گا، اس کے بعد اگر فروخت کرے گا تو

وہ قیمت کا بھی ما لک ہو جائے گا، ایسی صورت میں تنخواہوں میں دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا، شاید سائل کو یہ شبہ ہو رہا ہے کہ قربانی کی کھال وصول کرنے کے لیے منجانب مدارس جو مدرسین قربانی کرنے والوں کے پاس پہنچتے ہیں اور قربانی کرنے والے بعینہٖ ان کو کھال دیدیتے ہیں، وہ دینا مدرس کو ما لک بنانا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ مدرس منجانب مدرسہ وکیل ہوتا ہے، اور کھال دینے والے کی طرف سے فروخت کرنے کا وکیل ہوتا ہے، اس لیے مدرس نہ اس کا ما لک ہوتا ہے اور نہ ہی بلا تملیک شرعی کے اس پیسے کو تنخواہوں میں لگانا جائز ہے۔

عن جابر بن عبد الله أن أبا قتادة أتى أهله ...... قال: ولا تبيعوا لحوم الهدى والأضاحى فكلوا وتصدقوا واستمتعوا بجلودها...... (مسند أحمد بن حنبل ٤/١٥، رقم: ١٦٣١١)

وله أن ينتفع بجلد أضحيته فى بيته بأن يجعله سقاء أو فروا. (بدائع الصنائع، كتاب التضحية، ما يستحب فى الأضحية، زكريا ٤/٢٢٥، كراچى ٥/٨١)

فإن بيع اللحم أو الجلد به أى بمستهلك أو بدراهم تصدق بثمنه. (شامى كتاب الأضحية زكريا ٩/٤٧٥، كراچى ٦/٣٢٨)

(ب) قربانی کی کھال فروخت ہو جانے کے بعد رقم کو حیلۂ تملیک کر کے دینی مدارس کی ضروریات میں اور مدرسین کی تنخواہوں میں لگانا شرعاً جائز ہے، لیکن یاد رہے کہ حیلۂ تملیک ہر جگہ جائز نہیں، مسجد کی تعمیر اور قبرستان کی چہار دیواری وغیرہ امداد خاص سے ہونی چاہیے۔

ويشترط أن يكون الصرف تمليكا لا إباحة لا يصرف إلى بناء نحو مسجد كبناء القناطر والسقايات وإصلاح الطرقات وكرى الأنهار والحج والجهاد وكل مالاتمليك فيه. (شامى، كتاب الزكاة، باب المصرف، زكريا ٣/٢٩١، كراچى ٢/٣٤٤)

والاحتيال للهروب عن الحرام والتباعد عن الوقوع فى الآثام لا بأس به بل هو مندوب إليه وأما الاحتيال لإبطال حق المسلم فإثم و عدوان وقال النسفى فى الكافى عن محمد بن الحسن: ليس من أخلاق المومنين الفرار من أحكام الله بالحيل الموصلة إلى إبطال الحق. (عمدة القارى، كتاب الحيل،

باب ترك الحيل، زكريا ١٦/٩/٢٣٩، دار إحيار التراث العربي ٢٤/١٠٨، تحت رقم الحديث ٦٩٥٣، الفتاویٰ التاتارخانية زكريا ١٠/١/٣١١، رقم: ١٤٨٤٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍محرم الحرام ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۸۹۶۴)

چرم قربانی کا مصرف

سوال [۱۰۰۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: چرم قربانی کا مصرف کیا ہے؟ کیا جو مصارف زکوٰۃ ہیں وہی اس کے ہیں، کوئی شخص اپنی نواسی کو (جو مستحق) ہے، چرم قربانی کی قیمت دے سکتا ہے؟

المستفتی: زبیر احمد مظاہری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: چرم قربانی کا حکم قربانی کے گوشت کی طرح ہے جیسے نفس گوشت ہر شخص کو کھانا اور ہر شخص کو دینا جائز ہے، اسی طرح چرم قربانی بھی خود قربانی کرنے والے کا استعمال کرنا یا کسی کو بھی بعینہٖ کھال دے دینا جائز ہے، لہٰذا آپ اپنی نواسی کو قربانی کی کھال بعینہٖ دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں، لیکن اگر آپ چرم قربانی کو فروخت کر کے اس کی قیمت حاصل کر لیتے ہیں، تو پھر اس کی قیمت کا مستحق فقراء پر صدقہ کرنا واجب ہے، مگر صدقات واجبہ اپنے اصول وفروع کو دینا جائز نہیں، اصول کا مطلب یہ ہے کہ اپنے باپ، دادا، پردادا، دادی، پردادی، وغیرہ اسی طرح ماں نانا، نانی وغیرہ، اور فروع کا مطلب یہ ہے کہ اپنی اولاد اور اپنے بیٹے یا بیٹی کی اولاد کو دینا جائز نہیں ہے، لہٰذا آپ اپنی نواسی کو چرم قربانی فروخت کرنے کے بعد اس کی قیمت نہیں دے سکتے۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۶/ ۱۶۷، ۲/ ۸۶، ۶/ ۱۶۴، جدید زکریا ۱۰/ ۳۳ - ۳۷، عزیز الفتاویٰ ص: ۱۰۷)

عن جابر بن عبد الله أن أبا قتادة أتى أهله فوجد قصعة ثريد من قديد

الأضحى ......قال: ولا تبيعوا لحوم الهدى والأضاحى فكلوا وتصدقوا واستمتعوا بجلودها وإن أطعمتم من لحومها فكلوا إن شئتم. (مسند أحمد بن حنبل ٤/١٥، رقم: ١٦٣١١)

ولو باع الجلد أو اللحم بالدراهم أو بما لاينتفع به إلا بعد استهلاكه تصدق بثمنه وفى البناية: فإذا تمولته بالبيع وجب التصدق. (البناية، كتاب الأضحية، اشرفيه ١٢/٥٥، شامى زكريا ٩/٤٧٥، كراچى ٦/٣٢٨)

وفى الكنز: وأصله و إن علا و فرعه و إن سفل، وفى البحر أى لايجوز الدفع إلى أبيه وجده و إن علا ولا إلى ولده وولد ولده وإن سفل –إلى قوله– وفيه إشارة إلى أن هذا الحكم لايخص الزكاة بل كل صدقة واجبة لايجوز دفعها لهم كأحد الزوجين كالكفارات وصدقة الفطر والنذور. (البحر الرائق، كتاب الزكاة، باب المصرف، كوئٹه ٢/٢٤٣، زكريا ٢/٤٢٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/رجب المرجب ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۳۷۲/۳۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/۷/۱۴۲۸ھ

چرم قربانی کہاں دیں؟

سوال [۱۰۰۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج سے تقریباً چھ سات پہلے ہماری بستی میں ایک مدرسہ دیوبندی اور بریلوی خیالات والوں نے مل جل کر چلانا شروع کیا اس کے واسطے بقرعید کے موقع پر چرم قربانی سے روپیہ جمع کیا کچھ دنوں چلنے کے بعد یہ مدرسہ بند ہوگیا اور قربانی کی رقم قریب چارسو روپیہ میرے پاس آج تک جمع ہیں، اب وہ مدرسہ پھر چالو ہوگیا ہے اور اب بریلوی فرقہ کے لوگوں کا ہے، جن صاحبان سے یہ چرم قربانی اکٹھی کی تھی ان کا کوئی صحیح پتہ نہیں ہے؟

المستفتی: عبد السبحان لنڈھورہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفیق: چرم قربانی کی رقم کا مستحق فقیر نادار ہی ہے، مدارس کے ذمہ داران فقیر ونادار طلبہ پر خرچ کرنے کے لیے وکیل ہوا کرتے ہیں، اور شرعاً فقراء میں اشخاص متعین نہیں ہوا کرتے ہیں، اس لیے جب مذکورہ قسم کے لیے اشخاص متعین نہیں ہیں، اور غالباً آپ بھی من جملہ ذمہ داران میں سے ایک ذمہ دار ہیں، اس لیے آپ مذکورہ مدرسہ میں نہ دے کر صحیح مسلک کے مدارس یا فقراء پر خرچ کر سکتے ہیں۔

مصرف الزكاة والعشر ...... هو فقير وهو من له أدنى شيئ (تحته في الشامية) وهو مصرف أيضا لصدقة الفطر والكفارة والنذر وغير ذلك من الصدقات الواجبة. (شامی، کتاب الزکاۃ، باب المصرف، زکریا ۳/ ۲۸۳، کراچی ۲/ ۳۳۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۱۵۲)

چرم قربانی کا مصرف اور تملیک کا طریقہ

سوال [۱۰۰۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) چرم قربانی کا مصرف غرباء ومساکین ہی ہیں یا اس کی رقم کو بعد تملیک مدرسہ کی تعمیر میں لگایا جاسکتا ہے؟

(۲) شریعت مطہرہ میں تملیک کا طریقہ کیا ہے بیان فرمایئے؟

المستفتی: عیاض احمد میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفیق: (۱) چرم قربانی کا مصرف غرباء اور مساکین ہی ہیں اور حیلۂ تملیک کی نیت سے چرم قربانی کو فروخت کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

اللحم بمنزلة الجلد فی الصحیح حتی لایبیعه بما لا ینتفع به إلا بعد الاستهلاک فإن بدل اللحم أو الجلد به أی بما ینتفع بالإستهلاک جاز ویتصدق به لانتقال القربة إلی البدل. (مجمع الأنهر، کتاب الأضحیة، دار الکتب العلمیة بیروت ٤/١٧٤، مصری قدیم ٢/٥٢١، البنایة اشرفیه ١٢/٥٥، شامی زکریا ٩/٤٧٥، کراچی ٦/٣٢٨)

نیز حیلۂ تملیک کوئی شریعت کا اصل مسئلہ نہیں ہے، بلکہ ضروریات دین کی حفاظت میں دشواری پیش آجائے تو بقدر ضرورت گنجائش ہے، اور محض تعمیر وغیرہ کی غرض سے حیلہ کرنا ہرجگہ جائز نہیں ہے۔

إن کل حیلة یحتال بها الرجل لإبطال حق الغیر أو لإدخال شبهة فیه أو لتمویه باطل فهی مکروهة. (فتاویٰ عالمگیری، کتاب الحیل، الفصل الأول، زکریا جدید ٦/٣٩٣، قدیم ٦/٣٩٠، الفتاوی التاتارخانیة زکریا ١٠/٣١١، رقم: ١٤٨٤٥)

(۲) تملیک کا طریقہ یہ ہے کہ کسی فقیر کو باقاعدہ مالک بنا کر قبضہ دیدیا جائے اس کے بعد اس سے چندہ مانگنے کی طرح مانگ لیا جائے اب اس کی مرضی ہے چاہے دیدے اور چاہے نہ دے۔

والحیلة أن یتصدق علی الفقیر ثم یأمره بفعل هذه الإشیاء فتکون لرب المال ثواب الزکاة وللفقیر ثواب هذه التقرب. (الدر المنتفی، کتاب الزکاة، باب فی بیان أحکام المصارف، دار الکتب العلمیة بیروت ١/٣٢٩، الدر مع الرد، زکریا ٣/٢٩٣، کراچی ٢/٣٤٥، هندیه زکریا قدیم ٦/٣٩٢، جدید ٦/٣٩٥، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ٣٦/٢٤٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۳۷۸۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۱۲/۲۸ھ

چرمِ قربانی کی رقم کہاں کہاں دی جاسکتی ہے؟

سوال [۱۰۰۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: چرم قربانی کی رقم کو کہاں کہاں صرف کیا جاسکتا ہے؟ تعمیر مسجد، عیدگاہ اور قبرستان میں لگانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد جمال سہاگ پور شیڈول

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چرم قربانی کی رقم کو صدقہ کرنا واجب ہے، لہٰذا تعمیر مسجد، عیدگاہ اور قبرستان میں چرم قربانی کا پیسہ لگانا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ زکریا ۵۳۶/۳، احسن الفتاویٰ ۵۳۱/۷، مسائل قربانی وعقیقہ ص: ۴۰، جواہر الفقہ قدیم ۴۵۷/۱، جدید زکریا ۲۷۴/۶)

فإن بيع اللحم أو الجلد به أى بمستهلك أو بدرهم تصدق بثمنه.

(در مختار على الشامى، كتاب الاضحية، زكريا ۹/ ۴۷۵، كراچى ۳۲۸/۶، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ۱۷۴/۴، مصرى قديم ۵۲۱/۲، تبيين الحقائق امداديه ملتان ۹/۶، زكريا ۴۸۶/۶، هدايه اشرفى ۴۵۰/۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۶۵۴۶/۳۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۳/۷ھ

کھال کا معاملہ قصاب کے حوالہ کرنا

سوال [۱۰۰۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے ایک بھینس مع اجرت ذبح قصائی سے خریدی اور کہا کہ کھال کا معاملہ تم جانو، جس کو چاہو دو، اس طرح کھال کا معاملہ کرنے سے قربانی پر تو کچھ اثر نہ ہوگا؟

المستفتی: محمد احسان راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کھال کا معاملہ قصائی کے سپرد کردینے سے قربانی پر کوئی اثر نہیں پڑا، بشرطیکہ کھال کو اجرت کے طور پر نہ دیا ہو۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ

۷/ ۴۸۷، فتاویٰ دار العلوم جدید ۸/ ۶۷۸)

عن علی رضی الله عنه قال: امرنی رسول الله ﷺ أن أقوم علی بدنه و أن أتصدق بلحمها، وجلودها، وأجلتها، وأن لا أعطی الجزار منها، قال: نحن نعطيه من عندنا. (صحيح مسلم، باب الصدقة بلحوم الهدايا …… النسخة الهندية ۱/ ٤۲۳، بيت الأفكار رقم: ۱۳۱۷)

ويهب منها ما شاء للغنی و الفقير. (هنديه، كتاب الأضحية، الباب الخامس فی بيان محل إقامة الواجب، زكريا قديم ٥/ ۳۰۰، جديد ٥/ ۳٤٦) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ صفر المظفر ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۰۳۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۲/۱۴ھ

شریک قصاب کا شرکاء سے اجرت لینا کیسا ہے؟

سوال [۱۰۰۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سات آدمیوں نے مل کر ایک بڑا جانور خریدا اور ان سات آدمیوں میں سے ایک قصاب بھی ہے، اب سوال یہ ہے کہ اگر ذبح کرنے کے لیے الگ سے کوئی قصاب بلایا جاتا ہے تو گوشت بنانے کے سات سو روپئے لے گا اور شرکاء میں سے جو قصاب ہے وہ یہ کہتا ہے کہ میں خود قصاب ہوں دوسروں کو کیا پیسہ دیا جائے میں اچھی طرح گوشت بنا دیتا ہوں، مجھے ہی فی کس کے اعتبار سے سو روپئے دیدینا تو ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: مجیب الرحمن موانہ میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سات شرکاء میں سے جو شخص قصاب ہے اس کو مناسب اجرت دے کر اسی کے ذریعہ سے گوشت بنوانا اصول اجارہ کے مطابق ناجائز ہے، اس لیے کہ خود قصاب کے حصہ کا تعلق پورے جانور کی ایک ایک بوٹی بوٹی کے ساتھ ہوتا ہے،

اورعدم جواز کی جزئیات حسب ذیل ہیں ملاحظہ فرمائیے:

إذا استاجر رجلا علی العمل فی شيئ هو فیه شریکه نحو ما إذا کان بین إثنین طعام فاستاجر أحدهما صاحبه علی أنه یحمل نصیبه إلی مکان معلوم والطعام غیر مقسوم فحمل الطعام کله...... لاتجوز هذه الإجارة عند أصحابنا وقولنا أنه أجر ما لا یقدر علی ایفائه لتعذر تسلیم الشائع بنفسه فلم یکن المقدور علیه مقدور الاستیفاء وإنما لایجب الأجر أصلا لأنه لایتصور استیفاء المعقود علیه إذ لا یتصور حمل نصف الطعام تبایعاً ووجوب أجر المثل یقف علی استیفاء المعقود علیه ولم یوجد فلا یجب. (بدائع الصنائع، کتاب الإجارة، باب الاستیجار علی الطاعة، زکریا ۴/۴۳، کراچی ۴/۱۹۰)

وفی الکبریٰ: ذکر القدوری کل شيئ لا یستحق به الأجرة إلا بإیقاع العمل فی العین المشترکة فإذا استاجر أحد الشریکین الآخر لم یجز مثل أن یستاجر لنقل الطعام بنفسه أو بغلامه أو دابته. (الفتاویٰ التاتارخانیة ۱۵/۱۵۶، رقم: ۲۲۵۵۵)

ہاں البتہ اس کی متبادل شکل یہ ہے کہ جانورکو سب مل کر ذبح کردیں اور ذبح کرنے بعد اس کی کھال اتار کر بڑے بڑے ٹکڑے کر کے سات حصوں میں تقسیم کردیں یا کم از کم قصاب کا حصہ متعین کر کے الگ کردیں، اس کے بعد یہ قصاب دوسرے شرکاء کے گوشت بنانے کی اجرت لے سکتا ہے، اس لیے کہ اب دوسرے شرکاء کے حصوں میں اس کی شرکت باقی نہیں رہی جیسا کہ حسب ذیل جزئیہ سے معلوم ہوتا ہے:

کل ما یستحق الأجرة فیه من غیر إیقاع العمل فی المال المشترکة فالإجارة جائزة مثل أن یستاجر دارا یجوز فیها الطعام أو سفینة أو جوالقا وعن أبی یوسف إن الإجارة فی الدور والسفینة لاتجوز، قال القاضی فخر الدین: الفتویٰ علی ما ذکره فی العیون والقدوری. (الفتاویٰ التاتارخانیة زکریا ۱۵/۱۵۶، رقم: ۲۲۵۵۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ذی قعدہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/۱۱۷۵۶)

قربانی کا جانور ذبح ہونے سے قبل کھال کی رسید کاٹ لینا

سوال [۱۰۰۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ قربانی کے موقع پر جانور ذبح ہونے سے قبل ہی کھال کی رسید کاٹ لی جاتی ہے جبکہ جانور کھو جانے، ہلاک ہو جانے وغیرہ کا اندیشہ ہے تو کیا از روئے شرع یہ عمل جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد نور العین مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: کھال کو جانور کے بدن سے جدا ہونے سے قبل فروخت کرنا تو جائز نہیں البتہ فروختگی کا وعدہ اور معاہدہ جائز ہے، اور مدارس اسلامیہ میں قبل از وقت کھال کی رسید کٹا لینا یا کاٹ دینا بھی ایک قسم کا وعدہ اور معاہدہ ہے، اس لیے کہ مدارس کو کھال فروخت نہیں کی جاتی بلکہ مفت میں دی جاتی ہے، لہٰذا اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

(مستفاد: محمودیہ قدیم ۱۴/ ۳۴۶، جدید ڈابھیل ۱۶/ ۱۱۳، مسائل قربانی ص: ۴۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ رمحرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۰۵۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱/۲۹ھ

قربانی کی کھال گم ہو جائے تو کیا حکم ہے؟

سوال [۱۰۰۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص پر قربانی واجب نہیں تھی، اس نے قربانی کر کے کھال بغرض ضرورت حفاظت سے رکھ دی، اب کچھ دن پہلے وہ کھال غائب ہوگئی تو کیا اس کھال کی قیمت صدقہ کرنا واجب ہوگی؟ یا کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد خالد ٹانڈہ رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب کھال غائب ہوگئی تو اب اس کھال کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب نہیں خواہ صاحب معاملہ غریب ہو یا مالدار، اس لیے کہ کھال کا حکم گوشت کی طرح سے ہے، کہ جس طرح گوشت کے ضائع ہونے پر گوشت کا صدقہ واجب نہیں اسی طرح کھال کے گم ہونے پر اس کی قیمت کا صدقہ واجب نہیں۔

لابأس بأن ينتفع بإهاب الأضحية. (قاضيخان، كتاب الأضحية، فصل في الانتفاع بالأضحية، زكريا جديد ۳/۲٤۹، وعلى هامش الهندية ۳/۳٥٤)

واللحم بمنزلة الجلد في الصحيح. (هنديه، كتاب الأضحية، الباب السادس، زكريا قديم ٥/۳۰۱، جديد ٥/۳٤۷، حاشية الطحطاوي على الدر كوئٹه ٤/۳۲٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۱۵۰۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۴/۶ھ

قربانی کی کھال گم ہونے کی صورت میں کیا کریں؟

سوال [۱۰۰۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص ایسا ہے کہ جس پر قربانی واجب نہیں ہے مگر اس نے پھر بھی قربانی کردی، قربانی کرنے کے بعد کھال بحفاظت رکھی ہوئی تھی، اتفاقاً وہ کھال غائب ہوگئی، اب اس کھال کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا اس شخص کو کھال کی قیمت صدقہ کرنی پڑے گی یا نہیں؟ اور اگر مالدار صاحب نصاب شخص کے ساتھ یہ معاملہ پیش آجائے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد شمیم قاسمی مہاراشٹری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کھال غائب ہوگئی تو اب کھال کی قیمت کا

صدقہ کرنا واجب نہیں ہے، خواہ معاملہ غریب شخص کے ساتھ پیش آئے یا صاحب نصاب کے ساتھ، اس لیے کہ کھال واجب التصدق نہیں ہے، بلکہ اس کا حکم ایسا ہے جیسا کہ قربانی کے گوشت کا جس طرح گوشت غائب ہوجائے، یا کوئی لے جائے تو قربانی کرنے والے پر کوئی تاوان لازم نہیں آتا، اسی طرح کھال گم ہوجانے پر تاوان لازم نہیں آئے گا۔

قال في الهندية: واللحم بمنزلة الجلد في الصحيح. (هنديه، كتاب الأضحية، الباب السادس، زكريا قديم ٥/ ٣٠١، جديد ٥/ ٣٤٧، حاشية الطحطاوي على الدر، كتاب الأضحية كوئٹه ٤/ ١٦٦، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ١٧٤، مصري قديم ٢/ ٥٢١، هدايه اشرفي ٤/ ٤٥٠)

لابأس بأن ينتفع بإهاب الأضحية. (قاضيخان، كتاب الأضحية، فصل في الانتفاع بالأضحية، زكريا جديد ٣/ ٢٤٩، وعلى هامش الهندية ٣/ ٣٥٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۷/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۴۹)

قربانی کی کھال کو بعینہٖ اپنے استعمال میں لانا یا مالدار کو دینا

سوال [۱۰۰۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قربانی کی کھال خود استعمال کرسکتا ہے یا نہیں؟ اسی طرح کسی غنی کو تحفہ میں دے سکتا ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی کی کھال بعینہٖ اپنے استعمال میں لانا جائز ہے، اسی طرح بعینہٖ کسی غنی کو تحفہ میں دینا بھی جائز ہے۔ (مستفاد: محمودیہ ڈابھیل ۱۷/ ۴۶۹، میرٹھ ۲۶/ ۱۷۳، فتاویٰ دار العلوم ۱۵/ ۵۷۸، کفایت المفتی جدید زکریا ۸/ ۲۲۲، زکریا مطول ۱۲/ ۱۴۶)

ويتصدق بجلدها أو يعمل منه نحو غربال وجراب و قربة وسفرة و

دلو. (شامي، كتاب الأضحية، زكريا ٩/٤٧٥، كراچى ٦/٣٢٨)

ويجوز الانتفاع بجلد الأضحية وهدى المتعة والتطوع بأن يتخذها فروا أو بساطا أو جرابا أو غربالا أو نطعا. (تاتارخانية زكريا ١٧/٤٣٩، رقم: ٢٧٧٥٦)

ويتصدق بجلدها أو يعمله آلة كجراب أو خف أو فرو ...... واللحم بمنزلة الجلد فى الصحيح ...... ولهذا يطعم من شاء من غنى. (مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/١٧٤، مصرى قديم ٢/٥٢١)

ويأكل من لحم الأضحية ويؤكل غنيا ويدخر ولأنه لما جاز له أن يأكل منه وهو غنى فأولىٰ أن يجوز له إطعام غيره و إن كان غنيا. (تبيين الحقائق زكريا ٦/٤٨٥، امداديه ملتان ٦/٩)

واللحم بمنزلة الجلد فى الصحيح. (تبيين الحقائق زكريا ٦/٤٨٦، امداديه ملتان ٦/٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۲۹۵)

چرم قربانی یا اس کی رقم کے استعمال کا حکم

سوال [۱۰۰۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ چرم قربانی یا اس کے پیسے اپنے مصرف میں صاحب قربانی استعمال کرسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد دستگیر عالم قاسمی، محلہ کسرول مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اپنی قربانی کی کھال کی رقم صاحب قربانی کے لیے اپنے مصرف میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ غریب ونادار کو صدقہ کردینا واجب ہے، البتہ خود کھال اپنے مصرف میں لانا جائز ہے۔

وعن عائشة رضي الله عنها أم المؤمنين: أن يجعل من جلد الأضحية، سقاء ينبذ فيه، وعن مسروق أنه كان يجعل من جلد أضحية مصلى يصلي فيه، وصح عن الحسن البصري، انتفعوا بسوك الأضاحي، ولا تبيعوها. (المحلی لابن حزم، دار الكتب العلمية بيروت ٦/٢٥، رقم المسئلة: ٩٨٦)

ولو باعها بالدراهم يتصدق بها جاز. (هنديه، كتاب الأضاحي، الباب السادس، زكريا قديم ٥/٣٠١، جديد ٥/٣٤٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/۲۹۳۰)

قربانی کی کھال سے چھلنی، مشک یا ڈول بنانا

سوال [۱۰۰۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بہشتی زیور حصہ سوئم میں ہم نے صفحہ ۲۱۷ پر یہ مسئلہ پڑھا ہے کہ قربانی کی کھال سے چھلنی یا مشک یا ڈھول (ڈول) یا جانماز وغیرہ بنائی جاسکتی ہے، یہ درست ہے، ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ ڈھول سے مراد کیا ہے، لہٰذا اس کی قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

المستفتی: صغیر احمد سرکڑا مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: بہشتی زیور ۳/۴۱، اختری میں ڈھول نہیں لکھا ہے بلکہ ڈول لکھا ہے اس سے مراد وہ مشکیزہ ہے جو بالٹی کا کام دیتا ہے، اور بہشتی زیور میں دیگر جن اشیاء کے بنانے کی اجازت دی ہے وہ سب صحیح اور درست ہے۔

ويتصدق بجلدها أو يعمل منه نحو غربال وجراب و قربة وسفرة و دلو.

(شامی، كتاب الأضحية، زكريا ٩/٤٧٨، كراچی ٦/٣٢٨، الفتاویٰ التاتارخانية زكريا ١٧/٤٣٩، رقم: ٢٧٧٥٦، هدایه اشرفی ٤/٤٥٠، مختصر القدوری ص: ٢٣٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/۲۹۳۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰/۱۲/۱۴۱۲ھ

گوشت لے جانے والوں کا ہڈی کو فروخت کرنے کا حکم

سوال [۱۰۰۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے قربانی کی اور اس کے پاس گوشت بہت جمع ہو گیا، اس لیے اس نے لوگوں کو عام اجازت دے رکھی ہے کہ جو چاہے لے جائے، چنانچہ کچھ لوگ گوشت لے کر ہڈی نکال لیتے ہیں اور اس ہڈی کو بیچتے ہیں، کیا اس طرح ہڈی بیچنا جائز ہے؟

المستفتی: ابوالخیر ۲۴ ؍ پرگنہ، مدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فروخت کرنے میں قربانی کے جانور کا گوشت ہڈی، کھال سب ایک حکم میں ہے، ان کے بارے میں اولاً تو حکم یہ ہے کہ ان کو فروخت نہ کیا جائے لیکن اگر اعذار کی بناء پر فروخت کر دیا جائے تو اس کا پیسہ فقراء پر تقسیم کر دینا لازم ہے، لہٰذا قربانی کے جانور کی کھال کا فروخت کرنا جس درجہ میں ہے، ہڈی کا فروخت کرنا بھی اسی درجہ کے حکم میں ہے، لہٰذا اگر ہڈی ضائع وبرباد ہو رہی ہو تو ایسی شکل میں ہڈی کو فروخت کر کے پیسوں کو غریبوں کے درمیان تقسیم کرنا ایسا ہی جائز ہے جیسا کہ کھال کے فروخت میں ہے، نیز یہ بھی واضح رہے کہ یہ حکم صرف مالک کے لیے ہے لیکن اگر مالک نے تحفہ میں یا ہبہ میں دیدیا ہے تو اس دوسرے کے لیے فروخت کر کے پیسوں کو اپنے تصرف میں لانا بھی جائز ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں ہڈی فروخت کر کے پیسہ حاصل کرنا بھی جائز ہے۔

وإذا دفع اللحم إلی فقیر بنیة الزکاة لایحسب عنها فی ظاهر الروایة، لکن إذا دفع لغنی ثم دفع إلیه بنیتها یحسب. (شامی، کتاب الأضحیة، زکریا ۹/ ۴۷۵، کراچی ۶/ ۳۲۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۰۷۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۶/۱۸ھ

ڈاکٹر کا فی کھال پاسنگ کے نام سے ۲۵/روپئے لینا

سوال [۱۰۰٦۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بہت سے احباب ہمارے مدرسہ میں ایام قربانی میں قربانی کرنے کے لیے جانور روانہ کرتے ہیں، جن کی قربانی مدرسہ کے ذمہ دار قصاب کے ذریعہ ادا کرتے ہیں، اور کھال مدرسہ کو دی جاتی ہے، لیکن قربانی کی کھال کے فروخت کرتے وقت جو رقم کھال کی بنتی تھی اس میں سے ڈاکٹر کے پاسنگ کے نام سے فی کھال پچیس روپئے کے حساب سے رقم مدرسہ کو کم دی جاتی ہے، کیا یہ عمل درست ہے؟ جبکہ قربانی ذبح اور کٹائی کی رقم علاحدہ سے ادا کردی جاتی ہے، وضاحت فرمائیں یہ کیسا ہے؟

المستفتی: شیر محمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: قربانی کے جانور ذبح کرنے کا خرچہ مالک قربانی کے اوپر لازم ہے اس لیے اس کا خرچہ علاحدہ سے دینا پہلے ہی سے لازم ہو چکا ہے، اور اس کے بعد کھال کی فروختگی میں داکٹر کے پاسنگ کے نام سے جو الگ سے دینا پڑتا ہے اس کا دینا بھی اپنی جگہ درست ہے، لہٰذا اس کے نام سے فی کھال ۲۵/روپیہ یا جو کچھ بھی بنتا ہے فروختگی کے وقت میں اتنا کٹوا دینا بھی درست ہے، اس کے بعد جو پیسہ بچے گا وہی مدرسہ کو ملے گا اس سے قربانی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

عن علی رضی الله عنه قال: أمرني رسول الله ﷺ أن أقوم على بدنه و أن أتصدق بلحمها، وجلودها، وأجلتها، وأن لا أعطي الجزار منها، قال: نحن نعطيه من عندنا. (صحيح مسلم، باب الصدقة بلحوم الهدايا ...... النسخة الهندية ۱/۴۲۳، بيت الأفكار رقم: ۱۳۱۷)

ولا يعطي أجر الجزار منها. (شامي، كتاب الأضحية، زكريا ۹/۴۷۵، كراچی ٦/۳۲۸)

العامل على الزكاة يجوز إعطاؤه حقه من الزكاة نفسها بالشروط المتقدمة في الساعي. (الموسوعة الفقهية ۲۳/ ۳۰۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ربیع الاول ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۲۸۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/ ۳/ ۱۴۲۵ھ

میونسپلٹی والوں نے چرم قربانی جبراً لے لی تو کیا حکم ہے؟

سوال [۱۰۰٦۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قربانی کے جانور حکومت نے چند مخصوص جگہوں پر ذبح کرنے کی اجازت دی تھی، یعنی مذبح وغیرہ میں، ان قربانی کے جانوروں کے چمڑوں کو بعض کو تو وہاں کے منتظم (جو غیر مسلم ہیں) نے زبردستی لے لیا اور بعض لوگ چونکہ شہر سے دور ہونے کی بنا پر لے آئے ہیں، سمجھ بوجھ کر اور پھر اس کو لے آ کر کہاں دیں گے، اس وجہ سے وہیں چھوڑ آئے، اب ان زبردستی لینے والے (میونسپلٹی والے کی وجہ سے) اور چھوڑ آنے والوں کو اس چمڑے کی قیمت الگ سے ادا کرنی ضروری ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالرحیم رنگون

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی کے جانور کی کھال یا گوشت اگر کوئی غیر مسلم جبراً لے لے یا مذبح خانہ میں چھوڑ کر آ جائے تو اس کی قیمت صدقہ کرنا لازم نہیں ہے، کیونکہ قربانی کا گوشت یا کھال غیر مسلم کو تبرعاً دیا جا سکتا ہے۔ (احسن الفتاویٰ ۷/ ۴۹٦، فتاویٰ محمودیہ ۴/ ۳۰۹، فتاویٰ رحیمیہ ٦/ ۱٦۵، کفایت المفتی ۸/ ۲۴۷)

ویهب منها ما شاء للغني والفقير والمسلم والذمي كذا في الغياثية. (فتاویٰ عالمگیری، كتاب الأضحية، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب، زكريا قديم ۵/ ۳۰۰، جديد ۵/ ۳٤٦، حاشية الطحطاوي على الدر كوئٹه ٤/ ١٦٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍شعبان المعظم ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۸۷۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲/ ۸/ ۱۴۱۹ھ

چرم قربانی کا پیسہ قبرستان کی چہاردیواری میں لگانا

سوال [۱۰۰۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک قبرستان ہے جس میں مالدار وغریب جملہ قسم کے لوگ مدفون ہوتے ہیں، کافی طول وعرض میں قبرستان ہے، درمیان میں لوگوں نے راستہ بنا رکھا ہے، ان تمام حالات کے پیش نظر کیا چرم قربانی کی رقم قبرستان کی چہاردیواری میں لگائی جاسکتی ہے یا نہیں؟

نیز کچھ حضرات نے یہ کہا ہے کہ تملیک کرا کے قربانی کی کھالوں کی رقم لگائی جاسکتی ہے، جبکہ یہاں ایسے حضرات موجود ہیں جن کی رسیدات ۵۰۰۰ ہزار، ۸۰۰۰ ہزار روپیہ تک کٹی ہوئی ہیں، یعنی اکثر لوگ اہل ثروت وصاحب نصاب ہیں۔

المستفتی: شفقت حسین سنبھل

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چرم قربانی کا پیسہ قبرستان کی چہاردیواری پر لگانا جائز نہیں ہے، اور نہ ہی چرم قربانی کے پیسہ کی اس کام کے لیے حیلۂ تملیک جائز ہے، اس لیے کہ یہ غریبوں کا حق ہے، غریبوں ہی کو دینا واجب ہے۔

ولو باع الجلد أو اللحم بالدراهم أو بما لاینتفع به إلا بعد استهلاكه تصدق بثمنه لأن القربة انتقلت إلى بدله. (هدايه، كتاب الأضحية، اشرفيه ٤/ ٤٥٠، هنديه زكريا قديم ٥/ ٣٠١، جديد ٥/ ٣٤٧)

إن كل حيلة يحتال بها الرجل لإبطال حق الغير أو لإدخال شبهة فيه أو لتمويه باطل فهي مكروهة. (فتاویٰ عالمگیری، كتاب الحيل، الفصل الأول، زكريا جديد ٦/ ٣٩٣، قديم ٦/ ٣٩٠، الفتاوى التاتارخانية زكريا ١٠/ ٣١١ رقم: ١٤٨٤٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰/ ذیقعدہ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۲۴۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۱۱/۳۰ھ

قصاب کو اجرت میں کھال دینا

سوال [۱۰۰۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قصاب کو ذبح کے عوض میں چمڑا دیدیا تو کیا ایسی صورت میں قربانی پر فرق آئیگا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قصاب کو ذبح کے عوض میں قربانی کی کھال دینا جائز نہیں، ہاں اگر دیدی تو اس سے قربانی میں کوئی فرق نہیں آئیگا، البتہ کھال کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہوگا۔ (مستفاد: کفایت المفتی زکریا جدید ۸/ ۲۱۹، جدید مطول ۱۲/ ۱۳۴)

عن علی رضی الله عنه قال: أمرني رسول الله ﷺ أن أقوم على بدنه و أن أتصدق بلحمها، وجلودها، وأجلتها، وأن لا أعطي الجزار منها، قال: نحن نعطيه من عندنا. (صحيح مسلم، باب الصدقة بلحوم الهدايا ...... النسخة الهندية ١/٤٢٣، بيت الأفكار رقم: ١٣١٧)

لا يعطى أجر الجزار من الأضحية. (هدايه، كتاب الأضحية، اشرفى ٤/ ٤٥٠)

وفي الظهيرية: ولا يعطى جلد الأضحية ولا لحمها أجرة الذباح والسلاخ. (التاتارخانية زكريا ١٧/ ٤٤٢، رقم: ٢٧٧٦٣)

ولو باع الجلد أو اللحم بالدراهم أو بما لا ينتفع به إلا بعد استهلاكه تصدق بثمنه لأن القربة انتقلت إلى بدله. (هدايه، كتاب الأضحية، اشرفيه ٤/ ٤٥٠، هنديه زكريا قديم ٥/ ٣٠١، جديد ٥/ ٣٤٧)

ولا يعطى جلد الأضحية ولا لحمها أجرة الذباح والسلاخ من باع جلد أضحية فلا أضحية له لأن معناه أن من باع جلد أضحية، بما لا ينتفع به إلا ما استهلاكه ولم يتصدق به فلا أضحية له. (اعلاء السنن، باب بيع جلد الأضحية، كراچى ١٧/ ٢٥٨، دار الكتب العلمية بيروت ١٧/ ٢٨٠، تحت رقم الحديث ٥٥٩٩) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۲۴/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۰۷)

قربانی کی کھال فروخت ہوجانے کے بعد قیمت کا تصدق لازم

سوال [۱۰۰۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ قربانی کی کھال فروخت کرنے کے بعد اسکا پیسہ واجب التصدق ہے، یا نہیں؟ یا جہاں چاہے صرف کرسکتا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کھال فروخت کرنے کے بعد اس کی قیمت کا صدقہ واجب ہے، اپنے استعمال میں اس کی قیمت کولا نا جائز نہیں۔

فإن بيع اللحم أو الجلد به ...... أو بدراهم تصدق بثمنه. (شامی، کتاب الأضحية، کراچی ٦/٣٢٨، شامی زکریا ٩/٤٧٥)

ولا بأس ببيعة بالدراهم ليتصدق بها وليس له أن يبيعها بالدراهم لينفقه على نفسه أو عياله ولو فعل ذٰلک تصدق بثمنها. (تاتارخانية زکریا ١٧/ ٤٤٠، رقم: ٢٧٧٥٧)

ولا يبيعه بالدراهم لينفق الدراهم على نفسه و عياله والمعنى فيه أنه لا يتصرف على قصد التمول. (تبيين الحقائق زکریا ٦/٤٨٦، امدادیه ملتان ٦/٨، البحر الرائق زکریا ٩/٣٢٦، کوئٹه ٨/١٧٨)

ولا يبيع جلدها ...... فإن عليه تصدق بثمنه. (غنية الناسك جديد ص: ٢٦٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۲۹۳)

مدارس والوں کا قربانی کا جانور گاؤں بھیجنا

سوال [۱۰۰۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بہت سارے مدارس میں باہر سے لوگ قربانی کے لیے اپنے جانور بھیج دیتے ہیں، مدرسہ والے اپنے مدرسہ میں ذبح کرنے کے بجائے اس کو گاؤں میں بھیج دیتے ہیں، اور ساتھ میں یہ ہدایت کرتے ہیں کہ جانور کی کھال کو ہمیں دینا ہوگا، اور ساتھ میں مزید ایک کھال اور دینی ہوگی، اب گاؤں میں جو لوگ اس جانور کو لیتے ہیں وہ اپنے پیسہ سے اس جانور کی کھال کے ساتھ مزید ایک کھال خرید کر دیتے ہیں، اور اس جانور کے تمام گوشت کو اپنے استعمال میں لاتے ہیں، کسی دوسرے کو اس سے نہیں دیتے، کیا مدرسہ والوں کا یہ معاملہ شرعاً درست ہے؟ اس طرح کرنے سے قربانی والے کی قربانی ادا ہوگی یا نہیں؟ نیز جو لوگ اس جانور کے گوشت کو کھا رہے ہیں ان کے لیے کھانا جائز ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: عبدالرحیم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مدرسہ میں گوشت کی فراوانی ہے اور مزید قربانی سے گوشت ضائع ہونے کا خطرہ ہے اور آس پاس کے گاؤں میں گوشت کی ضرورت ہے تو ایسی صورت میں باہر سے آئے ہوئے قربانی کے جانوروں کو دیہات لے جا کر اس لیے ذبح کرنا کہ گاؤں والے گوشت کو کام میں لائیں گے اور گوشت ضائع نہ ہوگا، تو اس مقصد کے لیے گاؤں بھیجنے میں کوئی حرج نہیں۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۱/۳۴۴، جدید ڈابھیل ۱۷/۵۰۰)

اگر اس شرط کے ساتھ بھیجتے ہیں کہ کھال مدرسہ والوں کو مل جائے تو ایسی صورت میں منجانب مدرسہ کسی کو وکیل بنانا چاہیے، تاکہ وہ جانور ذبح کر کے گوشت بانٹ دے، اور کھال مدرسہ کے لیے لے آئے یا کھال بیچ کر قیمت لے آئے تو یہ شکل بھی جائز ہے۔ (مستفاد: مسائل قربانی ص:۲۱)

اور یہ شرط لگانا کہ اس جانور کی کھال تو دینی ہی دینی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے جانور کی کھال بھی دینا ہے، تو یہ جائز نہیں ہے، اور نہ گاؤں والوں کے لیے ایسی شرط

پر کھال یا اس کی قیمت کا دینا جائز ہے۔

لأنه كبيع لأن كلا منهما معاوضة ...... والبيع مكروه فكذا في معناه .

(شامی، كتاب الأضحية، زكريا ۹/۴۷۵، كراچى ۶/۳۲۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۱۴/۷۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۶/۲۲ھ

چرم قربانی کی رقم سے مسلمانوں کی حفاظت کے لیے ہتھیار خریدنا

سوال [۱۰۰۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قربانی کی کھال کی رقم میں سے کچھ رقم گاؤں کے ذمہ داروں کے پاس جمع کرتے ہیں اور وہ ذمہ دار اس رقم سے کچھ غرباء کو دیتے ہیں اور باقی رقم سے مسلمانوں کی حفاظت کے لیے ہتھیار خریدتے ہیں، یا اس جیسے کام میں لگاتے ہیں، تو اس طرح کرنا جائز ہے؟

المستفتی: عبد العلیم بردوانی مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: قربانی کی کھال کا پیسہ پورا کا پورا غرباء اور فقراء کو تقسیم کر دینا واجب ہے، باقی کسی دوسرے مصرف میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے، نیز ہتھیار خریدنا یا رفاہ عام میں خرچ کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۴/ ۳۳۱، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۴۶۱)

ولو باع الجلد أو اللحم بالدراهم أو بما لا ينتفع به إلا بعد استهلاكه تصدق بثمنه. (هداية، كتاب الأضحية، اشرفيه ۴/ ۴۵۰، هنديه زكريا قديم ۵/ ۳۰۱، جديد ۵/ ۳۴۷، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ۴/ ۱۷۴، مصرى قديم ۵/ ۵۲۱، شامى زكريا ۹/ ۴۷۵، كراچى ۶/ ۳۲۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۵۰۴۷)

چرم قربانی کا پیسہ فنڈ میں جمع کر کے وقتاً فوقتاً ضرورتمندوں کو دینا

سوال [۱۰۰۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں ایک فنڈ قائم ہے جس میں یہ ہوتا ہے کہ قربانی یا فطرہ کی رقم جمع کر لیتے ہیں، پھر حسب ضرورت غریب اور ضرورتمندوں کو ایک مدت تک دیتے ہیں، پھر واپس لے لیتے ہیں، تملیک کے طور پر نہیں دیتے، کیا یہ فنڈ قائم کرنا شرعاً درست ہے؟ اس سے صدقات ادا ہوں گے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عبدالرحمٰن بنگالی مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی اور فطرہ وغیرہ کی رقم غرباء ومساکین کو دینا چاہیے، وہی اس کے مستحق ہیں، اس طرح کے فنڈ میں جمع کرنا خطرہ سے خالی نہیں اور نہ ہی فنڈ کے اس طرح کے عمل سے صدقات واجبہ ادا ہوتے ہیں، بلکہ صدقات واجبہ کے وجوب سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تملیک فقراء ضروری ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ص:۱۱۳، فتاویٰ دار العلوم ۶/۲۹۴-۲۸۷، محمودیہ قدیم ۱۷/۸۵، جدید ڈابھیل ۱۷/۴۶۲)

ولایخرج عن العهدة بالعزل بل بالأداء للفقراء. (شامی، کتاب الزکاۃ، زکریا ۳/۱۸۹، کراچی ۲/۲۷۰، حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح، دار الکتاب دیوبند ۷۱۵)

ویشترط أن یکون الصرف تملیکا لا إباحة. (شامی، کتاب الزکاۃ، باب المصرف، زکریا ۳/۲۹۱، کراچی ۲/۳٤٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ربیع الاول ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۶۵۵۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۳/۱۹ھ

چرم قربانی کی رقم سے میت کی چارپائی خریدنا

سوال [۱۰۰۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ قربانی کے چمڑوں (چرسا) کوفروخت کرکےاس کے پیسوں سے میت کے لیے کھاٹ کھٹولہ تیار کیا گیا، مگر بعض عالموں نے روک دیا، کہ اس کھاٹ کا استعمال درست نہیں ہے، لہٰذا اس کے بارے میں شرعاً فیصلہ فرمادیں دلیل کے ساتھ کہ اس پر عمل کیا جائے؟

المستفتی: محمد عبداللہ میجر گنج سیتامڑھی بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی کے چمڑوں کا پیسہ کسی فقیر محتاج زندہ مسلمانوں کو صدقہ کردینا ضروری ہے، لہٰذا میت کے لیے کھاٹ وغیرہ بنانا جائز نہیں۔ (مستفاد: ایضاح المناسک ص:۱۶۷)

ولو باع الجلد أو اللحم بالدراهم أو بمالاينتفع به إلا بعد استهلاكه تصدق بثمنه لأن القربة انتقلت إلى بدله. (هداية، كتاب الأضحية، اشرفيه ٤/ ٤٥٠، شامي زكريا ٩/ ٤٧٥، كراچی ٦/ ٣٢٨، هنديه زكريا قديم ٥/ ٣٠١، جديد ٥/ ٣٤٧، مجمع الأنهر دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ١٧٤، مصری قديم ٢/ ٥٢١، هنديه زكريا قديم ٥/ ٣٠١، جديد ٥/ ٣٤٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ذی الحجہ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۳۹۳)

چرم قربانی کی رقم سے غرباء کو رضائی بنوا کر دینا

سوال [۱۰۰۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مدرسہ فیض العلوم ملحقہ مسجد شیخان سیوہارہ میں زکوٰۃ و چرم قربانی وغیرہ کا کوئی پیسہ نہیں لگتا لیکن پھر بھی کافی عرصہ سے مدرسہ میں چرم قربانی جمع ہوتی آئی ہیں، جنہیں فروخت کرکے سردی کے موسم میں غرباء میں رضائی تقسیم کردی جاتی ہیں، یا اس سے پہلے بھی کسی ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کردیا جاتا ہے، کہ آیا وہ اس پیسہ کا حقدار ہے یا نہیں؟

ایسی حالت میں ہماری رہنمائی فرمائیں عنایت ہوگی۔

المستفتی: قیام الدین سیوہارہ بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر چرم قربانی فروخت ہونے کے بعد اس کی قیمت غریب مستحق زکوٰۃ ضرورتمندوں میں تقسیم ہوجاتی ہیں تو آپ کا یہ عمل صحیح اور درست ہے۔

فإن بیع اللحم أو الجلد به أو بدراهم تصدق بثمنه. (تنویر الأبصار مع الشامی، کتاب الأضحیة، زکریا ۴۷۵/۹، کراچی ۳۲۸/۶، ہدایہ، کتاب الأضحیة، اشرفیہ ۴/ ۴۵۰، ہندیہ زکریا قدیم ۳۰۱/۵، جدید ۳۴۷/۵، مجمع الأنهر، دار الکتب العلمیة بیروت ۱۷۴/۴، مصری قدیم ۵۲۱/۲، ہندیہ زکریا قدیم ۳۰۱/۵، جدید ۳۴۷/۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۵۰۵۸/۳۲)

چرم قربانی کی رقم مسجد کی ضروریات میں صرف کرنا

سوال [۱۰۰۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: علاقہ چیتا کیمپ بمبئی ۸۸ میں ایک مسجد جی سیکٹر میں ''مسجد نور'' کے نام سے ساؤتھ انڈین سنی جماعت کے زیر سرپرستی ہے جس میں ایک مستند عالم امام وخطابت کے فرائض انجام دے رہے ہیں، مقتدی حضرات اور عوام ان کے کردار اور امامت وخطابت کے انداز سے مطمئن اور خوش ہیں، موصوف نے عید الاضحیٰ کے موقع پر مسائل شرعیہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ چرم قربانی کا مصرف مسجد نہیں اس کو امام کی تنخواہ اور مسجد کے دیگر امور میں خرچ کرنا جائز نہیں، چنانچہ امسال مسجد میں چرم قربانی کم تعداد میں آئیں اسی بنا پر مسجد کی انتظامیہ کے ذمہ دار لوگوں نے مولانا کو بلا کر زجر وتوبیخ کی اور عہدۂ امام سے مستعفی ہونے کا حکم کیا، مولانا صاحب نے پوچھا کہ یہ کس جرم کی سزا ہے، تو ایک صاحب نے کہا کہ آپ نے عید

الاضحیٰ سے پہلے خطاب جمعہ میں چرم قربانی کا مسئلہ بیان کر کے مسجد کا نقصان کیا ہے، مولانا نے فرمایا یہ تو شریعت کا مسئلہ ہے جو میں نے بیان کیا ہے وہ صاحب کہنے لگے اس زمانہ میں شریعت تو کتابوں میں بند ہے، آپ کو یہ مسئلہ بیان کرنے کے لیے کس نے کہا تھا، اگر مسئلہ پر عمل کریں گے تو بھوکے مریں گے۔

آپ سے گذارش ہے کہ مسئلہ کی نوعیت اور اس شخص مذکورہ کی شرعی حیثیت کی وضاحت فرمادیں؟ تا کہ عوام کے سامنے صحیح صورت حال آجائے؟

المستفتی: سید معصوم علی چیتاکیمپ بمبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفیق: مذکورہ امام صاحب نے جو چرم قربانی کی رقم مسجد کی ضروریات میں صرف کرنے سے متعلق شرعی مسئلہ بیان کیا ہے وہ بالکل صحیح اور درست ہے، کہ مسجد کی ضروریات اور امام ومؤذن کی تنخواہوں میں چرم قربانی کی رقم خرچ کرنا جائز نہیں ہے، اور اس رقم کو فقراء کے درمیان تقسیم کرنا دینا لازم ہے۔

واللحم بمنزلة الجلد فی الصحیح حتی لا یبیعه بما لا ینتفع به إلا بعد الاستهلاک ولو باعها بالدراهم لیتصدق بها جاز لأنه قربة کالتصدق. (هندیه، کتاب الأضحیة، الباب السادس فی بیان ما یستحب فی الأضحیة والانتفاع بها، زکریا قدیم ۳۰۱/۵، جدید ۳۴۷/۵، مجمع الأنهر، دار الکتب العلمیة بیروت ۱۷۴/۴، مصری قدیم ۵۲۱/۲)

اور جس شخص نے امام مذکور سے یہ کہا کہ ”العیاذ باللہ“ شریعت تو کتابوں میں بند ہے آپ کو یہ مسئلہ بیان کرنے کے لیے کس نے کہا، اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے مسائل بیان کرنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے کہا ہے۔

﴿قال الله تعالیٰ: **كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ.** [آل عمران: ۱۱۰]﴾

عن طارق بن شهاب ...... سمعت رسول الله ﷺ یقول: من رأی منکم منکرا فلیغره بیده، فإن لم یستطع فبلسانه، فإن لم یستطع فبقلبه

وذٰلک أضعف الإیمان. (صحیح مسلم، الإیمان، باب بیان کون النهی عن المنکر من الإیمان، النسخة الهندیة ۱/ ۵۱، بیت الأفکار رقم: ۴۹)

اس شخص کا قول کہ مسئلہ پر عمل کریں گے تو بھوکے مریں گے یہ سخت خطرناک جملہ ہے اس کو اپنے ایمان کی خبر لینی چاہئے، اس پر ضروری ہے کہ سچے دل سے توبہ کر کے ندامت کا اظہار کرے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ صفر المظفر ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۸۶۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۲/۱۶ھ

چرم قربانی کی رقم سے مسجد ومدرسہ کا گیٹ بنانا

سوال [۱۰۰۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کچھ رقم چرم قربانی سے وصول ہوئی تھی جو کہ جمع ہے اور ایک گیٹ ہے مسجد اور مدرسہ کا مشترک، تو کیا گیٹ پر چوکھٹ وغیرہ اس پیسہ سے لگوا سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد صلاح الدین مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چرم قربانی کی رقم سے مدرسہ ومسجد کا گیٹ بنانا جائز نہیں ہے، بلکہ غریب و نادار کو صدقہ کرنا واجب ہے۔ (فتاویٰ دار العلوم ۶/ ۲۹۶، جواہر الفقہ قدیم ۱/ ۴۵۴، جدید زکریا ۶/ ۳۳۶)

ولو باع الجلد أو اللحم بالدراهم أو بما لا ینتفع به إلا بعد استهلاکه تصدق بثمنه. (هدایه کتاب الأضحیة اشرفیه ۴/ ۴۵۰، شامی زکریا ۹/ ۴۷۵، کراچی ۶/ ۳۲۸، هندیه زکریا قدیم ۵/ ۳۰۱، جدید ۵/ ۳۴۷، مجمع الأنهر دار الکتب العلمیة بیروت ۴/ ۱۷۴، مصری قدیم ۲/ ۵۲۱) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۱۸؍ صفر المظفر ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۱۲۰)

چرمِ قربانی کی رقم مسجد میں لگانا

سوال [۱۰۰۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قربانی کی کھال کا روپیہ مسجد کی تعمیر میں لگ سکتا ہے یا نہیں؟ شریعت مطہر کی روشنی میں جواب عطا فرمائیں۔

المستفتی: محمد اقبال سیفی رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: قربانی کی کھال فروخت کرنے کے بعد اس کی قیمت مسجد کی تعمیر میں لگانا جائز نہیں، بلکہ غریب فقراء میں تقسیم کر دینا لازم ہے۔

ويتصدق بجلدها أو يعمل منه نحو غربال و قربة ...... فإن بيع اللحم أو الجلد به أى بمستهلک أو بدراهم تصدق بثمنه وتحته فى الشامية: لقوله عليه السلام لعليؓ: تصدق بجلالها و خطامها ولا تعط أجر الجزار منها شيئا. (در مختار مع الشامی، کتاب الأضحية، زكريا ۹/ ۴۷۵، كراچی ۶/۳۲۸، هدايه اشرفی ۴/ ۴۵۰، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ۴/ ۱۷۴، مصری قديم ۲/ ۵۲۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۸۸۶)

کھال کا پیسہ مدرسہ یا مسجد کی تعمیر میں لگانا

سوال [۱۰۰۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں عرصہ دراز سے یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ بقر عید کے موقعہ پر چرمِ قربانی جو آتی ہے، اسے مدرسے کی تعمیر اور مسجد کی تعمیر میں لگاتے ہیں، جبکہ مدرسہ میں صرف محلّہ کے بچے پڑھتے ہیں، بیرونی بچہ ایک بھی نہیں ہے کیا ایسے مدرسہ میں چرمِ قربانی دینا جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چرم قربانی کا پیسہ مدرسہ یا مسجد کی تعمیر میں لگانا جائز نہیں ہے، لہٰذا ایسے مدرسہ میں نہیں دینا چاہیے، جہاں مطبخ نہ ہو، کیونکہ چرم قربانی کے پیسہ کے مستحق صرف فقراء ہوتے ہیں۔

ویتصدق بجلدها أو یعمل منه نحو غربال و قربة ...... فإن بیع اللحم أو الجلد به أی بمستهلک أو بدراهم تصدق بثمنه وتحته فی الشامیة: لقوله علیه السلام لعلیؓ: تصدق بجلالها و خطامها ولا تعط أجر الجزار منها شیئا. (در مختار مع الشامی کتاب الأضحیة، زکریا ۹/ ۴۷۵، کراچی ۳۲۸/۶، هدایه اشرفی ۴/ ۴۵۰، مجمع الأنهر، دار الکتب العلمیة بیروت ۴/ ۱۷۴، مصری قدیم ۲/ ۵۲۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶؍محرم الحرام ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۵۵۸۴/۳۳)

مسجد کی ضروریات میں خرچ کرنے کیلئے متولی کو چرم قربانی ہدیہ کرنا

سوال [۱۰۰۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قربانی کی کھال متولی یا ممبروں میں سے کسی ممبر کو گاؤں کے لوگ ہدیہ کردیں، اور متولی یا تمام ممبر مل کر اس ہدیہ شدہ کھال کو فروخت کر کے مدرس امام ومؤذن وغیرہ کو تنخواہ میں دے سکتے ہیں یا نہیں؟ جبکہ گاؤں کے لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ کھال جو ہدیہ دے رہے ہیں وہ فروخت ہونے کے بعد اس کی قیمت سے تنخواہ دی جائیگی، نیز اگر کسی بھی حیلہ سے قربانی کی کھال سے تنخواہ ادا ہوسکتی ہو تو ضرور مطلع فرمائیں؟

المستفتی: ایم زیڈ شاہد خاں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی کی کھال اگر متولی یا کسی دوسرے شخص کو

اپنے ذاتی استعمال کے لیے ہدیہ کردی جائے تو یہ جائز ہے،لیکن امام ومؤذن کی تنخواہوں میں دینے کے لیے یا مسجد کی کسی ضرورت میں خرچ کرنے کے لیے متولی یاممبروں میں سے کسی کو دینا جائز نہیں۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ ۶/ ۱۶۷،عزیز الفتاویٰ ۶۷۸)

ویأکل من لحم الأضحية ویؤ کل غنیا ...... ویتصدق بجلدها. (در مختار مع الشامی، کتاب الأضحية، زکریا ۹/ ۴۷۵، کراچی ۶/ ۳۲۸، هندیه زکریا قدیم ۵/ ۳۰۱، جدید ۵/ ۳۴۷، هدایه اشرفی ۴/ ۴۵۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۲۴۳)

چرم قربانی کی رقم امام صاحب کو دینا

سوال [۱۰۰۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعض جگہوں پر لوگ بقرعید کے ایام میں اماموں کو چرم قربانی کی رقم دیتے ہیں، کیا اس کا دینا اور اماموں کا لینا صحیح ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد رستم علی گریڈھی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چرم قربانی فروخت کردینے کے بعد اس کی قیمت کو غریبوں پر صدقہ کرنا واجب ہے امام صاحب کو امامت کی اجرت میں نہیں دے سکتے ہیں، البتہ امام صاحب غریب ہوں اور ان کی امامت کی تنخواہ مستقل ہو اور قربانی کی قیمت امامت کی اجرت میں نہ دیتے ہوں تو ایسی صورت میں امام صاحب مستحق ہونے کی وجہ سے لے سکتے ہیں۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۴/ ۳۳۴، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۴۶۶)

ویتصدق بجلدها إلی قوله ولو باعها بالدراهم لیتصدق بها جاز لأنه قربة کالتصدق. (هندیه، کتاب الأضحية، الباب الخامس في بیان ما یستحب في

الأضحية والانتفاع بها، زكريا قديم ۳۰۱/۵، جديد ۳۴۷/۵، هدايه اشرفی ۴۵۰/۴، شامی زکریا ۴۷۵/۹، کراچی ۳۲۸/۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۴۹۵)

چرم قربانی کی قیمت سے مدرسہ تعمیر کرنا

سوال [۱۰۰۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے پاس کچھ رقوم چرم قربانی اور کچھ رقوم فطرے کی جمع ہیں اس رقوم کو ہم تعمیر مدرسہ میں خرچ کرنا چاہتے ہیں، خرچ کر سکتے ہیں یا نہیں؟ یا کس طرح اس کو خرچ کریں؟ اس بارے میں صحیح جواب سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی: حاجی روشن علی چکر کی ملک مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: چرم قربانی کو فروخت کرنے کے بعد اس کی قیمت تعمیر وغیرہ میں لگانا جائز نہیں، بلکہ غریب نادار طلبہ وفقراء پر خرچ کرنا واجب ہے، اسی طرح صدقۂ فطر کی رقم بھی غریب طلبہ اور فقراء پر خرچ کرنا واجب ہوگا، اس کو تعمیر میں لگانا جائز نہیں ہوگا۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۱۸۰/۶، محمودیہ قدیم ۳۱۲/۴، جدید ڈابھیل ۴۶۰/۱۷، امداد الفتاویٰ ۵۵۰/۳)

فإن بيع اللحم أو الجلد به أی بمستهلک أو بدراهم تصدق بثمنه .

(در مختار مع الشامی، کتاب الأضحية، زكريا ۹/ ۴۷۵، کراچی ۳۲۸/۶، البحر الرائق کوئٹه ۱۷۸/۸، زكريا ۳۲۶/۸، تبيين الحقائق زكريا ۴۸۶/۶، کوئٹه ۹/۶، فتاویٰ بزازیه زكريا جديد ۱۵۹/۳، وعلى هامش الهندية ۲۹۴/۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍ محرم الحرام ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۶۰۳/۲۵)

چرمِ قربانی کی قیمت مدرسہ کی تعمیر میں استعمال کرنا

سوال [۱۰۰۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: چرمِ قربانی مدرسہ اشرف العلوم نیماج میں عیدالاضحیٰ کے موقعہ پر جمع کی گئی اس کی رقم اپنے پاس رکھی ہے، مدرسہ میں تعمیری کام چل رہا ہے، اور مدرسہ مقروض بھی ہے، اور اس محلہ میں غریب لوگ رہتے ہیں، ایسی صورت میں اس رقم کو تملیک کرا کے مدرسہ کے تعمیری کام میں صرف کیا جائے تو کوئی حرج تو نہیں؟ اور تملیک کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

المستفتی: شبیر احمد قاسمی نیماج راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی کی کھال بیچ دینے کے بعد اس کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے اور اس کے مستحق غرباء ومساکین ہیں، جب وہاں اس کے مستحق غرباء ومساکین موجود ہیں تو وہی اس کے حقدار ہیں، تملیک کر کے مدرسہ کی تعمیر میں صرف کرنا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۹/ ۳۱۵، عزیز الفتاویٰ ص:۷۱۱)

ولو باع الجلد تصدق بثمنه. (هدايه، كتاب الأضحية، اشرفی ٤/ ٤٥٠)

ومصرف الزكاة (وفي الشامية) والكفارة والنذر وغير ذٰلک من الصدقات الواجبة وهو فقير . (شامی، كتاب الزكاة، باب المصرف، زكريا ۳/ ۲۸۳، كراچی ۲/ ۳۳۹)

ويشترط أن يكون الصرف تمليكا لا إباحة لايصرف إلى بناء . (شامی، كتاب الزكاة، باب المصرف، زكريا ۳/ ۲۹۱، كراچی ۲/ ۳٤٤) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۲۵ ؍صفر المظفر ۱۴۲۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۰۷۸)	۱۴۲۲/۲/۲۵ھ

چرمِ قربانی کی رقم سے مدرسہ کے برتن اور تپائی خریدنا

سوال [۱۰۰۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: ہمارے گاؤں میں شادیوں میں استعمال ہونے والے برتن چرم قربانی اور زکوٰۃ کی رقم سے خریدے ہوئے ہیں، ہمارے اسی گاؤں میں ایک اسلامیہ مدرسہ مشکوٰۃ العلوم کے نام سے چل رہا ہے، گاؤں والوں کے بچے اسی مدرسے میں پڑھتے ہیں، مسجد کے امام صاحب بچوں کو پڑھاتے ہیں، ان کی تنخواہ مسجد سے دی جاتی ہے، گاؤں والوں کے یہاں جو شادی ہوتی ہے وہ ان برتنوں کو کرایہ پر لیتے ہیں، ان کا کرایہ اسی مدرسہ مشکوٰۃ العلوم میں لگایا جاتا ہے، ہمارے اس مدرسہ میں کوئی باہر کا بچہ نہیں پڑھتا ہے، صرف ہمارے گاؤں والوں ہی کے بچے پڑھتے ہیں، جو کہ صاحب نصاب ہیں، چرم قربانی کی رقم سے مدرسہ میں پڑھنے والے بچوں کی تپائیاں، بیٹھنے کے لیے فرش خریدے گئے ہیں اور ان کے خریدنے میں برتنوں کا کرایہ بھی شامل کیا ہے، ان برتنوں کو ہمارے گاؤں والوں کو استعمال کرنے کا حق ہے یا نہیں؟ ان برتنوں کو اگر مسجد خرید لے تو اس رقم کا کہاں استعمال کریں، مسجد برتنوں کو ادھار خرید کر برتنوں کا کرایہ جمع کر کے ان برتنوں کی قیمت دے تو ایسا کرنا بہتر ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد اسلم انصاری حکیم پورہ شکر گنج دھامپور بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چرم قربانی کو فروخت کرنے کے بعد اس کا پیسہ کسی غریب فقیر کو صدقہ کر دینا لازم ہوتا ہے اور اس پیسہ کے ذریعہ مدرسہ کے برتن اور تپائی وغیرہ خریدنا جائز نہیں ہے۔

ولو باع الجلد أو اللحم بالدراهم أو بما لاينتفع به إلا بعد استهلاكه تصدق بثمنه لأن القربة انتقلت إلى بدله وقوله عليه السلام من باع جلد أضحية فلا أضحية له. (هدايه، كتاب الأضحية، اشرفيه ٤/ ٤٥٠)

ولايشترى به مالاينتفع به إلا بعد الاستهلاك نحو اللحم والطعام ولا يبيعه بالدراهم. (عالمگيرى، الباب السادس فى بيان ما يستحب فى الأضحية والانتفاع بها، زكريا قديم ٥/ ٣٠١، جديد ٥/ ٣٤٧)

ويتصدق بجلدها ...... لا بمستهلك كخل و لحم ونحوه كدراهم

فإن بيع اللحم أو الجلد به أى بمستهلك أو بدراهم تصدق بثمنه. (شامی، کتاب الأضحية، زكريا ديوبند ٩/ ٤٧٥، كراچی ٦/ ٣٢٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم صفر المظفر ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۹۵۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۲/۱ھ

چرم قربانی کی رقم مدرس کو تنخواہ میں دینا

سوال [۱۰۰۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی مولوی صاحب کسی گاؤں میں پڑھا رہے ہیں، گاؤں والوں نے بقرعید میں کھال کی قیمت تنخواہ میں دی اس مدرسہ میں کسی غریب یتیم لڑکے کے کھانے پینے کا انتظام نہیں ہے تو کھال کا روپیہ مولوی صاحب اپنی تنخواہ میں لے سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد ابراہیم منگل پوری نئی دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: چرم قربانی کی رقم تنخواہ میں لینا یا دینا جائز نہیں ہے، اگر تنخواہ میں لے لی ہے تو اسی کی نیت سے اتنا پیسہ غریبوں کو تقسیم کردے اور اپنی تنخواہ گاؤں سے اور مکتب کے ذمہ داران سے وصول کرے۔

ولو باع الجلد أو اللحم بالدراهم أو بما لا ينتفع به إلا بعد استهلاكه تصدق بثمنه لأن القربة انتقلت إلى بدله. (هداية، كتاب الأضحية، اشرفيه ٤/ ٤٥٠، هندية زكريا قديم ٥/ ٣٠١، جديد ٥/ ٣٤٧، مجمع الأنهر دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ١٧٤، مصرى قديم ٢/ ٥٢١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ر صفر المظفر ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۶۹۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۷/۲/۲۷ھ

طالب علم کو چرم قربانی کی رقم دینا

سوال [۱۰۰۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک طالب علم کسی مدرسہ سے پڑھ کر کے آگیا پھر وہ بقرعید کے موقع پر اس مدرسہ کا چمڑا وغیرہ وصول کرتا ہے جس کے انعام میں مہتمم اس کو کچھ روپئے دیتے ہیں تو کیا مہتمم صاحب کا اس چمڑے کے پیسہ سے دینا اور اس طالب علم کے لیے لینا جائز ہے؟

المستفتی: محمد غفران

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر طالب علم مستحق زکوٰۃ ہے تو طالب علم کا چرم قربانی کے پیسہ لینا اور مہتمم صاحب کا دینا جائز ہے، اس لیے کہ قربانی کی کھالوں کی رقم کو صدقہ کرنا واجب ہے، اور اس کے مصارف وہی ہیں جو زکوٰۃ کے مصارف ہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/۵۳۶، احسن الفتاویٰ ۷/۵۳۱، آپ کے مسائل اوران کا حل قدیم ۴/۲۱۴، جدید زکریا ۵/۴۶۶)

فإن بيع اللحم أو الجلد به أى بمستهلك أو بدراهم تصدق بثمنه.

(در مختار مع الشامی، كتاب الأضحية، زكريا ٩/ ٤٧٥، كراچی ٦/ ٣٢٨ هدايه، اشرفی ٤/ ٤٥٠، هنديه زكريا قديم ٥/ ٣٠١، جديد ٥/ ٣٤٧) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۲۴/ ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۹۳۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۲/۲۴ھ

چرم قربانی کی رقم اپنے طالب علم بیٹے کو دینے کا حکم

سوال [۱۰۰۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عمر قربانی کر رہے ہیں اور بکر اس کا بیٹا طالب علم ہے اور دونوں میں سے کوئی مالک نصاب نہیں ہے تو کیا بیٹے کے لیے کھال کا پیسہ اپنے مصرف میں لانا درست ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مالک نصاب نہ ہونے کی وجہ سے اس پر قربانی واجب نہیں ہے، لیکن جب قربانی کردی تو اس کھال کی قیمت اپنے بیٹے کو دینا درست نہیں ہے، بلکہ اس کو صدقہ کرنا واجب ہے، البتہ اگر کھال کا پیسہ نہیں دیتا بلکہ خود کھال کو دباغت دے کر اپنے یا اپنے بیٹے کے استعمال میں لاتا ہے تو درست ہے۔

أن أبا سعيد الخدري أتى أهله ...... ولا تبيعوا لحوم الهدى والأضاحي، فكلوا وتصدقوا، واستمتعوا بجلودها، ولا تبيعوها، وإن أطعمتم من لحومها فكلوا إن شئتم. (مسند أحمد بن حنبل ٤/١٥، رقم: ١٦٣١٢)

ويتصدق بجلدها أو يعمل منه نحو غربال و جراب. (تنوير الأبصار مع الرد، كتاب الأضحية، زكريا ٩/٤٧٥، كراچی ٦/٣٢٨، هدايه اشرفی ٤/٤٥٠، هنديه زكريا قديم ٥/٣٠١، جديد ٥/٣٤٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ ذی الحجہ ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۵۷۷)

کیا مدرسہ کو دی گئی کھال کی رقم طالب علم استعمال کرسکتا ہے؟

سوال [۱۰۰۸٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک غریب گھرانے کا طالب علم ہے زید نے بقرعید میں قربانی کی کھال لے لی اس ارادے سے کہ میں اس کو لے لوں گا، اس وجہ سے کہ میں غریب ہوں اور یہ بھی ارادہ کیا کہ اگر میں اس کا مستحق نہ ہوں گا تو مدرسہ میں دیدوں گا لیکن دینے والے نے اس خیال سے دی کہ میری کھال مدرسہ میں جائیگی کیونکہ زید مدرسہ ہی میں پڑھتا ہے تو وہ اس کے علاوہ اور کہاں دے سکتا ہے، دے گا، تو مدرسہ ہی میں دے گا تو زید اس صورت میں کھال کا مالک ہوگیا یا مدرسہ میں دے گا؟

المستفتی: وکیل احمد سیتاپوری مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کھال کے مالک نے جب آپ کو اس خیال سے کھال دی کہ وہ جا کر مدرسہ میں دیدے گا تو اب آپ کے لیے اس کھال یا اس کی قیمت کا استعمال جائز نہیں ہے، مدرسہ میں دینا ضروری ہے۔

الوكيل إنما يستفيد التصرف من الموكل وقد أمره بالدفع إلى فلان فلا يملك الدفع إلى غيره. (شامی، كتاب الزكاة، زكريا ۳/ ۱۸۹، كراچی ۲/ ۲۶۹)

ويتصدق بجلدها ...... ولو باعها بالدراهم ليتصدق جاز لأنه قربة كالتصدق. (هنديه، الباب السادس في بيان ما يستحب في الأضحية والانتفاع بها، زكريا قديم ۵/ ۳۰۱، جديد ۵/ ۳۴۷، هدايه اشرفی ۴/ ۴۵۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰ر صفر المظفر ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۱۹۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۲/۳۰ھ

چرم قربانی کی رقم مکتب میں صرف کرنا

سوال [۱۰۰۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مکتب میں کچھ مقامی بچے زیر تعلیم ہیں، جن میں صاحب حیثیت لوگوں کے بچے بھی ہیں، اور غرباء کے بچے بھی، ارباب مدرسہ چرم قربانی وصول کر کے ان غرباء کے بچوں کے ذریعہ تملیک کرنے کے بعد اس رقم سے ان بچوں کا کچھ تعاون کر کے بقیہ رقم تنخواہ مدرسین وتعمیر وغیرہ کے کام میں لانا چاہتے ہیں، ایسا کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عباس قاسمی موانہ کلاں میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: وہ مکتب جہاں غریب مستحق زکوٰۃ طلبہ کی کفالت نہ کی جاتی ہو ایسے مکتب میں صدقہ فطر وچرم قربانی اور زکوٰۃ کی رقم دینا جائز نہیں ہے۔

لایصرف إلی بناء مسجد (تحت قوله) کبناء القناطر والسقایات واصلاح الطرقات وکری الأنهار والحج والجهاد وکل ما لا تملیک فیه.

(در مختار مع الشامی، کتاب الزکاۃ، باب المصرف، زکریا ۳/ ۲۹۱، کراچی ۲/ ۳٤٤)

اور ایسے مکتبوں میں حیلۂ تملیک کی بھی گنجائش نہیں ہے بلکہ ایسے مکتبوں کو علاقہ کے لوگ اپنی امداد کے پیسہ سے چلایا کریں۔ (ایضاح النوادر ۲/ ۱۶۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍جمادی الثانیہ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۸۸۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲/۶/ ۱۴۱۷ھ

چرم قربانی کی رقم مکتب کی تعمیر میں لگانا

سوال [۱۰۰۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے گاؤں میں مکتب چھوٹا ہے اور بچوں کی تعداد بڑھتی رہتی ہے، اور ہمارے پاس چرم قربانی کی رقم موجود ہے کیا بغیر تملیک کے تعمیری کام میں لگا سکتے ہیں یا پھر تملیک کی بہتر صورت کیا ہے؟ ارشاد فرمائیں۔

المستفتی: ظہور الحسن مہاراشٹری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: چرم قربانی کو فروخت کرنے کے بعد اس کی رقم نادار وفقیروں کو صدقہ کر دینا لازم ہے، تعمیرات میں لگانا جائز نہیں اور مکتب کی تعمیر کی ذمہ داری اس کے متعلق آبادی اور محلّہ والوں پر ہے، اس لیے اس کام کے لیے چرم قربانی کے پیسے جو فقیروں کا حق ہے، تملیک کر کے فقیروں کو اس سے محروم کرنے کی اجازت نہیں۔

ویشترط أن یکون الصرف تملیکا لا إباحة لایصرف إلی بناء نحو مسجد إلی آخره، وفی الشامیة: کبناء القناطر والسقایات و اصلاح الطرقات وکری الأنهار والحج والجهاد. (شامی، کتاب الزکاۃ، باب المصرف، زکریا ۳/ ۲۹۱،

کراچی ۳٤٤/۲، مجمع الأنهر، دار الکتب العلمیة بیروت ۳۲۹/۱، مصری قدیم ۲۲۲/۱)

إن کل حیلة یحتال بها الرجل لإبطال حق الغیر أو لإدخال شبهة فیه أو لتمویه باطل فهو مکروهة . (هندیه، کتاب الحیل، الفصل الأول، زکریا قدیم ۳۹۰/٦، جدید ۳۹۳/٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ / صفر المظفر ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۵۲۹/۳۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۲/۲۸ھ

چرم قربانی غنی کو بطور ہدیہ دینے کے بعد فروخت کروا کر روپیہ مکاتب میں لگانا

سوال [۱۰۰۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کسی مالدار شخص کو چرم قربانی ہدیۃً دینا کیسا ہے؟ اگر جائز ہے جیسا کہ مسائل عیدین وقربانی ص: ۱۹۰ میں بحوالہ جواہر الفقہ ۴۸۷/۱ پر ہے، تو پورے محلّہ اور گاؤں کی چرم قربانی اجتماعی طور پر کسی غنی کو بطور ہدیہ دیں پھر وہ شخص فروختگی کے بعد بغیر کسی جبر واکراہ کے ان کی رقم مکاتب ومدارس میں صرف کرنا چاہے تو درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ساجد، ممتاز احمد قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غنی کو چرم قربانی بعینہٖ دیدینا جائز ہے، مگر اس نیت سے غنی کو دیدینا جائز نہیں ہے، کہ غنی اس کو فروخت کرکے مدرسہ یا مکتب کو دیدیگا کیونکہ اس صورت میں وہ غنی مالک نہ ہوگا، بلکہ فروخت کرکے روپیہ مدارس یا مکاتب کو دینے کے لیے وکیل ہوجائے گا، اور وکیل کا وہی حکم ہوتا ہے جو مالک کا ہے، لہٰذا جس طرح مالک کا فروخت کرنے کے بعد پیسوں کو غرباء وفقراء اور غریب طلبہ پر خرچ کرنا لازم ہوجاتا ہے اسی طرح اس غنی پر بھی لازم ہوجائے گا، ہاں البتہ غنی کو ہی مالک ہونے کے لیے دیدینا جائز ہے جس کو فروخت کرکے اپنے مصرف میں خرچ کرنے میں کوئی اشکال نہ ہو اس کی علامت اور امتحان یہ ہے کہ وہ غنی چرم

قربانی کو فروخت کرکے اپنی حوائج میں خرچ کرے تو اہل عطاء کو ناگوار اور گراں نہ ہو، اور اس کی شکایت و مذمت نہ ہو اور دل میں کدورت اور انقباض نہ ہو اور اگر شکوہ شکایت ہے تو وہ غنی ان چرم قربانی کا مالک ہی نہیں ہوا۔ (تفصیل :امدادالفتاویٰ ۳/۵۳۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍صفر المظفر ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۹۰۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۲/۵ھ

گائے رون کا حکم

سوال [۱۰۰۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے گائے کی قربانی کی، گائے کے پیٹ میں سے گائے رون نکلی، کیا زید اس گائے رون کو بیچ کر گائے رون سے حاصل شدہ رقم خود استعمال کرسکتا ہے؟

کیا زید کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ قربانی کے جانور میں نکلی ہوئی گائے رون کو خالد سے کسی ایسی چیز کے عوض میں تبدیل کرے کہ وہ چیز باقی رہے اور زید اس چیز سے فائدہ اٹھاتا رہے، حضرت والا سے درخواست ہے کہ جواب مدلل عنایت فرمائیں۔

المستفتی: روشن شاہ اکولوی، مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر روپیہ پیسہ کے عوض فروخت کیا جائے تو رقم کا تصدق کردے اور اگر ایسے سامان سے تبدیل کروایا جائے جو قابل استعمال ہے، تو وصول شدہ سامان کا ذاتی استعمال میں رکھنا جائز ہے۔

ولابأس بأن يشترى به ما ينتفع بعينه مع بقائه استحسانا. (هنديه، الباب السادس فى بيان ما يستحب فى الأضحية والانتفاع بها، زكريا قديم ٥/٣٠١، جديد ٥/٣٤٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۴۹۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۱/۱۲/۲۶ھ

سماج والوں کا دوثلث قربانی کا گوشت جمع کر کے غریبوں میں تقسیم کرنے کا حکم

سوال [۱۰۰۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آسام کے بعض دیہی علاقوں میں لوگ سماجی زندگی گذارتے ہیں، اور ایک دوسرے سے مؤدت ومحبت کے ساتھ پیش آتے ہیں، چنانچہ قربانی کے موقع پر ان میں کوئی اپنا جانور قربان کرے تو اس کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، دو حصے سماج میں جمع کرتے ہیں اور ایک حصہ اپنے گھر لے آتے ہیں، اور سماج کا قانون یہی ہے، لہٰذا کوئی شخص اپنا مذبوحہ جانور کے حصے سماج میں جمع نہ کرے تو اسے سماج سے نکال دیا جاتا ہے، اور جب تمام مذبوحہ جانور کے متعین حصے اکٹھے جمع ہو جاتے ہیں تو اس گوشت کو اولاً تولتے ہیں، پھر فی کس یا گھر کے اعتبار سے سماج میں جتنے لوگ رہتے ہیں، ان کے درمیان تقسیم کر دیتے ہیں، اور اس کی تقسیم میں قربانی کرنے والے اور نہ کرنے والے دونوں قسم کے لوگوں کو یکساں طور پر فی کس کے حساب سے گوشت ملتا ہے۔

اب دریافت مسئلہ یہ ہے کہ اس طرح گوشت کے جمع کرنے کو لازم سمجھنا اور جمع نہ کرنے کی صورت میں سماج سے نکال دینا از روئے شرع کیسا ہے؟ نیز جمع شدہ گوشت میں سے قربانی کرنے والے کا فی کس کے حساب سے اپنا متعینہ حصہ حاصل کرنا کیسا ہے، جبکہ وہ تمام گوشت اعزاء واقرباء اور فقراء کے لیے ہر قربانی کرنے والے نے اپنے مذبوحہ جانور سے الگ کر کے سماج میں جمع کیا ہے؟

المستفتی: مولانا ربیع الاسلام آسامی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر علاقہ کے لوگوں نے سماج میں اتحاد کو باقی رکھنے کے لیے اور غریبوں کی مدد کے لیے آپس کی رضا مندی سے یہ ضابطہ بنا لیا ہے کہ قربانی کے گوشت کا مخصوص حصہ سماج کے نام سے ایک جگہ جمع کیا جائے، پھر اسے تول کر پورے محلے کے تمام لوگوں کو برابر تقسیم کر دیا جائے، جس سے غریب لوگ جنہوں نے قربانی نہیں کی، ان کو بھی پورا حصہ مل جائے، اور گوشت جمع کرنے والوں کو بھی پورا حصہ مل جائے تو یہ غریبوں

کے تعاون کی ایک بہترین شکل ہے، اس میں سب لوگوں کو متحد رہنا چاہیے، اور جو آدمی اپنی قربانی کا گوشت جمع نہیں کرتا ہے، شرعی طور پر اس کے اوپر کوئی گناہ اور الزام نہیں، لیکن اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ رضا کارانہ طور پر وہ بھی بخوشی گوشت جمع کرے، تاکہ سماج کے لوگوں میں اس کو الگ نہ سمجھا جائے، اور سماجی اتحاد میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔

عن ابن عمر قال رسول الله صلی الله علیہ وسلم: إن الله لایجمع أمتی علی ضلالة وید الله علی الجماعة.......... (سنن ترمذی، باب ماجاء فی لزوم الجماعة، النسخة الهندیة ۲/ ۳۹، دار السلام رقم: ۲۱۶۷)

ویستحب أن یأکل من أضحیته ویطعم منها غیره والأفضل أن یتصدق بالثلث ویتخذ الثلث ضیافة لأقاربه و أصدقائه ویدخر الثلث ویطعم الغنی والفقیر جمیعا. (هندیه، الباب الخامس زکریا جدید ۵/ ۳۴۶، قدیم ۵/ ۳۰۰، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۵/ ۱۰۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۹۷۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/ ۴/ ۱۴۳۶ھ

کیا چرم قربانی کے روپیہ سے جنازہ کی چوکی بنوائی جاسکتی ہے؟

سوال [۱۰۰۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ چرم قربانی کے روپئے سے جنازہ کی چوکی بنائی جاسکتی ہے یا نہیں؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں واضح دلائل کے ساتھ تحریر فرمائیں، نوازش ہوگی۔

المستفتی: محمد طارق شمسی، محلّہ رفعت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عین چرم قربانی کا استعمال کرنا فقیر وغنی سب کے لیے جائز ہے، لیکن اگر چرم قربانی فروخت کردی جائے تو اس کی قیمت کسی غریب کو صدقہ کردینا

لازم ہے،اس کی قیمت سے جنازہ کی چوکی بنانا جائز نہیں ہے۔(مستفاد:فتاویٰ محمودیہ ۴/۳۱۲)

فإن باع لذلک تصدق بالثمن أيضا. (بزازيه، كتاب الأضحية زكريا جديد ۳/۱۵۹، وعلى هامش الهندية ٦/٢٩٤)

فإن بيع اللحم أو الجلد به أى بمستهلك أو بدراهم تصدق بثمنه.

(در مختار مع الشامی، كتاب الأضحية، زكريا ۹/ ٤٧٥، كراچی ٦/٣٢٨هدایه، اشرفی ٤/ ٤٥٠، هندیه زكريا قديم ٥/٣٠١، جديد ٥/٣٤٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ذی الحجہ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر:۲۷/۲۴۹۰)

گائے رون کا شرعی حکم

سوال [۱۰۰۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گائے بیل کے پیٹ میں سے ذبح کرنے کے بعد شاذ ونادر گائے رون نکلتی ہے (جو قیمتی شئ ہوتی ہے) اگر یہ گائے رون قربانی کے جانور کے پیٹ میں پائی جائے تو کیا اس کو قربانی کرنے والا خود اپنے استعمال میں لاسکتا ہے یا نہیں؟

کیا صاحب قربانی کے لیے اس گائے رون کے استعمال کے جواز کی شرعی اعتبار سے کوئی صورت نکل سکتی ہے؟

المستفتی: عبد السلام پونوی مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جی ہاں قربانی کرنے والا قربانی کے جانور کے ہر جزء سے فائدہ اٹھا سکتا ہے،اور اسی طرح اگر پیٹ سے گائے رون جیسی قیمتی چیز نکل جائے تو اس سے فائدہ اٹھانا بھی جائز ہے، نیز اگر جانور خریدا ہوا ہے تب گائے رون صاحب قربانی کی ملکیت میں ہوگی کیونکہ جو چیز غذا کے اثرات سے پیدا ہو جائے وہ خریدار کی ملکیت میں آجاتی ہے۔

ولـو كـان فيـه عـنبـر يـكـون لـلـمشتري (قوله) وكل شيئ يوجد في حوصلة الطير مما يأكله فهو للمشتري. (هنديه، كتاب البيوع، قبيل الباب السادس في خيار الشرط، زكريا قديم ۳/۳۸، جديد ۳/۴۰، تاتارخانية زكريا ديوبند ۸/۳۰۱، رقم: ۱۲۰۰۰)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/۲۴۹۰)

اضحیہ منذورہ کا گوشت کھانا جائز اور ذبیحہ منذورہ کا جائز نہیں

سوال [۱۰۰۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک صاحب نے اپنی گابھن بھینس کے بارے میں کہا کہ اگر اس نے کٹرا دیا تو اس کو ایام قربانی میں اللہ کے واسطے ذبح کریں گے اور اگر کٹری دی تو وہ ہماری ہوگی، اتفاق سے اس نے کٹرا دیا اب وہ کٹرا تقریباً تین سال کا ہے، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ کٹرے مذکور کی قربانی کرنے کے بعد اس کا گوشت گھر میں استعمال کر سکتے ہیں یا اس کے گوشت کا صدقہ کرنا لازم ہے؟ نیز بوقت نذر ناذر کے اوپر قربانی واجب نہیں تھی، اب وہ جانور قربانی کے لائق ہوگیا ہے۔

المستفتی: علی احمد رائے پور ضلع مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: صورت مذکورہ میں ناذر اور غنی کے لیے مذکورہ جانور کی قربانی کا گوشت کھانا جائز نہیں ہوگا، بلکہ پورے کا صدقہ کرنا واجب ہوگا۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/۵۶۳)

احقر نے تقریباً ۲۶/ سال قبل حضرت تھانویؒ کے جواب کے مطابق اضحیہ منذورہ کے گوشت کو خود ناذر اور غنی کے کھانے کو ناجائز لکھا تھا، اور پورے کو واجب التصدق لکھا تھا اور حضرت تھانویؒ نے ہندیہ کی عبارت:

نـذر أن يـضحى ولم يسم شيئا عليه شاة ولا يأكل منها وإن أكل عليه قيمتها.

(هنديه، كتاب الأضحية، الباب الثاني في وجوب الأضحية زكريا قديم ٥/٢٩٥، جديد ٥/٣٤٠)

وإن وجبت بالنذر فليس لصاحبها أن يأكل منها شيئا ولا يطعم غيره من الأغنياء سواء كان الناذر غنيا أو فقيرا. (هنديه، قديم ٥/٣٠٠، جديد ٥/٣٤٦)

بھی نقل فرمائی ہے، اوراحقر نے نیچے بدائع کی عبارت کا اقتباس نقل کردیا تھا، مگراب سارے جزئیات پرغور کرنے کے بعد یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ نذر ذبح اور نذر اضحیہ دونوں بالکل الگ الگ ہیں، کیونکہ فعل ذبح عبادت نہیں اور فعل اضحیہ عبادت ہے، اور نذر ذبح کا گوشت ناذر اورغنی کے لیے کھانا جائز نہیں، اور نذر اضحیہ کا گوشت کھانا خود ناذر اورغنی کے لیے جائز ہے، لہٰذا ۷رذی الحجہ ۱۴۰۹ھ کا لکھا ہوا مسئلہ امدادالفتاویٰ کے مطابق تو ہے مگر اس میں تسامح ہے اورصحیح یہی ہے کہ اضحیہ منذورہ کا گوشت ناذر اورغنی کے لیے کھانا جائز ہے، اسی کی طرف صاحب بدائع نے اشارہ فرمایاہے: بدائع کی عبارت یہ ہے:

إن الدماء أنواع ثلاثة: نوع يجوز لصاحبه أن يأكل منه بالإجماع، ونوع لايجوز له أن يأكل منه بالإجماع، ونوع اختلف فيه، فالأول دم الأضحية نفلا كان أو واجبا، منذورا كان أو واجبا مبتدأً والثاني دم الإحصار و جزاء الصيد و دم الكفارة الواجبة (إلى قوله) **وغير ذٰلك من الجنايات ودم النذر بالذبح.** (بدائع الصنائع قديم ٥/٨٠، زكريا ٤/٢٢٣، بذل المجهود، كتاب الأضحية، باب حبس لحوم الأضاحي، قديم ٤/٧٦، جديد دار البشائر الإسلاميه بيروت ٩/٥٦٦-٥٦٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷رذی الحجہ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/۱۵۵۰)

فقیراپنی قربانی کا گوشت خود بھی اور مالدار کوبھی کھلاسکتا ہے

سوال [۱۰۰۹۵]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ سات آدمیوں نے مل کر ایک بڑا جانور قربانی کے لیے خریدا، ان میں سے تین آدمی فقیر ہیں، اور فقیروں کے حصے نذر کے ہو جاتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ ان فقیروں کے لیے اپنے اپنے حصہ کا گوشت کھانا جائز ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فقیر اپنی قربانی کے جانور کا گوشت خود بھی کھا سکتا ہے اور دوسروں کو بھی کھلا سکتا ہے کیونکہ یہ حقیقت میں نذر نہیں ہے بلکہ نذر کی طرح ہے۔

(مستفاد: فتاویٰ دار العلوم ۱۵/ ۵۶۸، امداد الفتاویٰ ۳/ ۵۶۳، احسن الفتاویٰ ۷/ ۵۲)

سئل قاضی بدیع الدین عن الفقیر إذا اشتریٰ شاة للأضحیة حتی تصیر واجبة علیه فإذا ضحی هل یحل له أکله؟ قال: نعم. (تاتارخانیة زکریا ۱۷/ ٤١٣، رقم: ٢٧٦٧٣)

ویأکل من لحم الأضحیة ویؤکل غنیا وتحته فی الشامیة: هذا فی الأضحیة الواجبة والسنة سواء إذا لم تکن واجبة بالنذر ...... وأراد بالأضحیة السنة أضحیة الفقیر. (شامی، کتاب الأضحیة، زکریا ٩/ ٤٧٣، کراچی ٦/ ٣٢٧) فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۵/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۸۵)

مرحوم کی طرف سے کی گئی قربانی کے گوشت کا مصرف

سوال [۱۰۰۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کسی مرحوم کی قربانی کرنی ہو تو اس قربانی سے مرحوم کا وارث جو قربانی کر رہا ہے وہ کھا سکتا ہے یا نہیں؟ یا غریب فقیر کو اس کا دینا ضروری ہے؟

المستفتی: محمد اسلام پریس والے شیر کوٹ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مرحوم کی طرف سے قربانی کی وصیت تھی تو فقراء کو دیدینا چاہیے خود نہ کھائے اور اگر مرحوم نے وصیت نہیں کی ہے، ورثاء اپنے طور پر مرحوم کی طرف سے قربانی کرتے ہیں تو اپنی قربانی کے گوشت کی طرح اس کا گوشت بھی استعمال کرنا بلاتردد جائز ہے۔

من ضحیٰ عن المیت یصنع کما یصنع فی أضحیة نفسه من التصدق والأکل والأجر للمیت، قال الصدر: والمختار أنه إن بأمر المیت لایأکل منها وإلا یأکل. (شامی، کتاب الأضحیة، زکریا ٤٧٢/٩، کراچی ٣٢٦/٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ر محرم الحرام ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹۹۲/۲۸)

قربانی کے وکیل کو گوشت پر ہر طرح سے اختیار

سوال [۱۰۰۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مغربی ممالک سے ایک شخص نے بڑے جانور کی قربانی کا پیسہ ہندوستان بھیج دیا، اور شرکاء کا نام بھی لکھ دیا، اور گوشت ہندوستان کے لوگ ہی کھائیں گے کسی کو بھی کھانے کی اجازت نہیں ہے تو ایسی صورت میں ہندوستان میں قربانی کرنے والا جانور کا گوشت تول کر تقسیم کرے گا یا اس کو ہر طرح کی اجازت ہے، جتنا چاہے دے جتنا چاہے رکھ لے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہندوستان میں قربانی کرنے والے کو جب گوشت کے بارے میں پورا اختیار ہے تو جس طرح چاہے تقسیم کرے چاہے تول کر تقسیم کرلے چاہے اندازے سے تقسیم کرے اسی طرح جتنا چاہے لوگوں کے درمیان تقسیم کرے اور جتنا چاہے رکھ لے ہر طرح جائز ہے۔

وفي الخانية: رجل دفع مالا إلى رجل و أمره أن يتصدق بذٰلك المال فتصدق الوكيل على ابن كبير له جاز في قولهم بدليل أنه لو دفع ماله إلى رجل وقال ضع مالي حيث شئت كان له أن يضعه في نفسه. (تاتارخانية زكريا ۱۲/ ۳۱۰، رقم: ۱۷۵۸۷)

رجل دفع إلى رجل عشرة دراهم وقال: تصدق بهذه العشرة على عشرة مساكين فتصدق بها على مسكين واحد دفعة واحدة جاز. (تاتارخانية زكريا ۱۲/۳۱۱، رقم: ۱۷۵۸۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۲۸۸)

ایامِ نحر میں فقیر کے خریدے ہوئے جانور کا گوشت خود اور غنی کا کھانا

سوال [۱۰۰۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ فقیر نے ایامِ نحر میں جو جانور کی قربانی کی نیت سے خریدا ہے وہ اضحیہ منذ ورہ ہو گیا اس کا بدلنا بھی اس کے لیے جائز نہیں ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جب وہ اضحیہ منذورہ ہو گیا ہے تو فقیر اور غنی دونوں کے لیے اس کا گوشت کھانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد شعیب میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نذر کی دو قسمیں ہیں:

(۱) نذرِ ذبح جس میں تقرب الی اللہ مقصد نہیں ہوتا ہے، بلکہ اراقۃ دم اور تصدق مقصد ہوتا ہے، یعنی ذبح کر کے صدقہ کرنا مقصد ہوتا ہے تو ایسے جانور کا گوشت ناذر اور غنی دونوں کے لیے جائز نہیں ہے بلکہ دوسرے فقراء وغرباء میں تقسیم کرنا واجب ہوتا ہے۔

(۲) نذرِ اضحیہ اس میں تقرب الی اللہ مقصد ہوتا ہے اور ساتھ میں گوشت کھانا بھی مقصد

ہوتا ہے، اور جو جانور تقرب الی اللہ کے لیے خرید کر ذبح کیا جائے اس کا گوشت کھانا حلال اور جائز ہوتا ہے، اس لیے ناذر اور غنی دونوں کے لیے اضحیہ منذورہ کا گوشت کھانا راجح اور مفتی بہ قول کے مطابق حلال اور جائز ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ دار العلوم جدید ۱۵/ ۵۶۸، احسن الفتاویٰ ۷/ ۵۲۵تا ۵۲۸)

ظاهر كلامه أن الواجبة على الفقير بالشراء له الأكل منها. (شامی، كتاب الأضحية، زكريا ۹/ ۴۷۳، كراچی ۶/ ۳۲۷)

وفی فتاویٰ آهو: سئل قاضی بديع الدين عن الفقير إذا اشتریٰ شاة للأضحية حتى تصير واجبة عليه فإذا ضحى هل تحل له أكله؟ قال: نعم. (تاتارخانية زكريا ۱۷/ ۴۱۳، رقم: ۲۷۶۷۳)

إن الدماء أنواع ثلاثة: نوع يجوز لصاحبه أن يأكل منه بالإجماع، ونوع لايجوز له أن يأكل منه بالإجماع، ونوع اختلف فيه، فالأول دم الأضحية نفلا كان أو واجبا، منذورا كان أو واجبا مبتدأً والثانی دم الإحصار و جزاء الصيد و دم الكفارة الواجبة (إلى قوله) وغير ذلک من الجنايات ودم النذر بالذبح، والثالث: دم المتعة والقران فعندنا يؤكل وعند الشافعی لا يوكل. (بدائع الصنائع قديم ۵/ ۸۰، زكريا ۴/ ۲۲۳، بذل المجهود، كتاب الأضحية، باب حبس لحوم الأضاحی، قديم ۴/ ۷۶، جديد دار البشائر الإسلامية بيروت ۹/ ۵۶۶ -۵۶۷)

وإن نذر أضحية فی ذمته ثم ذبحها فله أن يأكل منها، وقال القاضی من أصحابنا من منع الأكل منها وهو ظاهر كلام أحمد و بناه على الهدی المنذور. (المغنی للابن قدامة ۹/ ۳۶۲) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۲۴/ ذی قعدہ ۱۴۳۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۷۴۳)	۱۴۳۵/۱۲/۴ھ

قربانی کا گوشت کس حساب سے تقسیم کریں؟

سوال [۱۰۰۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: ایک شخص نے ایک بکرے کی قربانی کی سینہ کو اپنے پاس رکھنے کے بعد بقیہ گوشت کے تین حصے کیے تو شریعت مطہرہ کی رو سے جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد یوسف چومکھا پل مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: قربانی کا سارا گوشت قربانی کرنے والے گھر میں استعمال کر سکتے ہیں، تین حصے کرنے واجب یا فرض نہیں ہیں بلکہ صرف مستحب ہیں، لہٰذا اگر کوئی شخص سینہ رکھ کر تین حصے کرتا ہے، تو کوئی گناہ نہیں ہے، البتہ بہتر تو یہ ہے کہ سارے گوشت کا تین حصہ کرے۔

والأفضل أن يتصدق بالثلث ويتخذ الثلث ضيافة لأقربائه و أصدقائه و يدخر الثلث، ويستحب أن يأكل منها لو حبس الكل لنفسه جاز. (شامی، كتاب الأضحية، زكريا ٩/٤٧٤، كراچی ٦/٣٢٨، هنديه زكريا قديم ٥/٣٠٠، جديد ٥/٣٤٦، بدائع الصنائع كراچی ٥/٨١، زكريا ٤/٢٢٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٥/١٠٢، ٣٥/٢١٠، المبسوط، دار الكتب العلمية بيروت ٤/٧٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍رجب المرجب ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۳۸۲)

قربانی کے گوشت کی تقسیم کا طریقہ

سوال [۱۰۱۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ قربانی کے گوشت کو کس طرح تقسیم کیا جائے، مہربانی فرما کر وضاحت فرمائیں۔

اکثر لوگ سارے گوشت کو کھچڑا یا بریانی وغیرہ بنوا کر دعوت کے اعتبار سے لوگوں کو کھلا دیتے ہیں کیا یہ صحیح طریقہ ہے، آپ تفصیل سے قربانی کے گوشت کو کس طرح استعمال کیا جائے، بتادیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر شرکاء کے درمیان حصہ تقسیم کرنا ہے تو وزن کر کے

تقسیم کیا جائے، اور اگر اپنا حصہ تقسیم کرنا ہے تو تین حصہ کر کے ایک تہائی فقراء کو صدقہ کر دینا، اور ایک تہائی اعزاء اور دوستوں کی مہمان داری میں خرچ کرنا، اور ایک تہائی اپنے لیے رکھنا مستحب طریقہ ہے، اور اگر پورا اپنے لیے رکھ لیتا ہے یا بریانی وغیرہ بنا کر لوگوں کو کھلا دیتا ہے تو بھی جائز ہے۔

ويقسم اللحم وزنا لا جزافا. (الدر المختار، كتاب الأضحية، زكريا ٩/٤٦٠، كراچی ٦/٣١٧، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/١٦٨، مصرى قديم ٢/٥١٧)

والأفضل أن يتصدق بالثلث ويتخذ الثلث ضيافة لأقربائه و أصدقائه و يدخر الثلث ويستحب أن يأكل منها لو حبس الكل لنفسه جاز. (شامی، كتاب الأضحية، زكريا ٩/٤٧٤، كراچی ٦/٣٢٨، هنديه زكريا قديم ٥/٣٠٠، جديد ٥/٣٤٦، بدائع الصنائع كراچی ٥/٨١، زكريا ٤/٢٢٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٥/١٠٢، ٣٥/٢١٠، المبسوط، دار الكتب العلمية بيروت ٤/٧٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ذی قعدہ ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۰۲۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۷/۱۱/۱۴۱۰ھ

ایک حصہ دار کو اس کے حصہ سے زیادہ گوشت دینا

سوال [۱۰۱۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے شہر میں بہت سے ادارے اور تنظیمیں بڑے جانور کی اجتماعی قربانی کا اہتمام کرتی ہیں، اس سلسلے میں چند باتیں دریافت طلب ہیں: اجتماعی قربانی میں حصہ لینے والے اکثر حضرات اپنے حصہ کا گوشت نہیں لیتے بلکہ ذمہ دار حضرات ہی کو غرباء میں گوشت تقسیم کر دینے کا بخوشی کلی اختیار دیتے ہیں، لیکن کچھ لوگ اپنا حصہ بھی لیتے ہیں، تو کیا ایسی صورت میں کسی حصہ دار کو اس کے حصہ سے زیادہ دینے میں (جبکہ دوسرے بہت سے شرکاء اپنا حصہ لیتے ہی نہیں) کوئی حرج تو نہیں؟ کیونکہ اتنی بڑی قربانی میں ہر ایک کا حصہ برابر کا نکالنا ایک مشکل ترین کام ہے؟

المستفتی: محمد آصف

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی کرنے والا اپنی قربانی کے گوشت میں سے جس کو چاہے ہبہ بھی کرسکتا ہےاور صدقہ بھی، لہٰذا جب دیگر شرکاء نے یا زیادہ تعداد میں قربانی کرنے والوں نے گوشت کسی کو بھی تقسیم کرنے کی اجازت دے دی ہےتو وہ شرکاء جنہوں نے اپنے حصے کا گوشت لے لیا ہے وہ مزید گوشت لینا چاہیں تو دیگر شرکاء کے اجازت دیئے ہوئے حصوں میں سے حسب ضرورت لے سکتے ہیں، ان کو دینا بھی جائز ہے۔

ویطعم الغنی والفقیر ویهب منها ما شاء لغنی ولفقیر و لمسلم وذمی ولو تصدق بالکل جاز ولو حبس الکل لنفسه جاز. (حاشية الطحطاوی علی الدر المختار، کتاب الاضحية، کوئٹه ٤/١٦٦، هندیه زکریا قدیم ٥/٣٠٠، جدید ٥/٣٤٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷ر جمادی الثانیہ ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۶۳۸/۳۸)

گوشت کو وزن کر کے تقسیم کرنا

سوال [۱۰۱۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جانور کے گوشت کا وزن ۱۰۵ کلو ہےتو سات حصوں میں سے ہر ایک کا حق ۱۵/ کلو آیا تو گوشت کے مطالبہ کرنے والے دو حصہ داروں کو ۱۵/۱۵/ کلو دیدیا گیا، اس کے بعد باقی ۷۵/ کلو رہا جس میں ۵/ حصے ہیں، وہ بھی انہیں دونوں کو لینا ہےتو ان دونوں کے لیتے وقت تخمینہ سے تقسیم کرنا جائز ہے یا تول کر تقسیم کرنا لازم ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سات لوگوں نے مل کر قربانی کی اور ان میں دو گوشت لینا چاہتے ہیں بقیہ نہیں لینا چاہتے ہیں، صورت حال یہ ہے کہ گوشت کا مکمل وزن ۱۰۵ کلو ہےتو پہلے ان

دونوں کا حصہ ۱۵/۱۵/کلو دینے کے بعد ان کو اختیار ہوگا کہ مابقیہ ۷۵ کلو جیسے چاہیں لے لیں کیونکہ قربانی کرنے والے باقی لوگوں کی طرف سے مکمل وکھلی اجازت ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۷/۵۰۱)

وذکر فی مسائل الحوجینی: إذا جعلوا اللحم والشحم سبعة أسهم وقسموا بینهم جزافا جازت القسمة. (المحیط البرهانی، کتاب الأضحیة، الفصل الثامن ما یتعلق بالشرکة فی الضحایا کوئٹه ٦/٤٨٧، المجلس العلمی ٨/٤٨٠ رقم: ١٠٨٥٥، لسان الحکام ١/٣٨٧، مجمع الأنهر، دار الکتب العلمیة بیروت ٤/١٦٨، مصری قدیم ٢/٥١٧، تاتارخانیة زکریا ١٧/٤٥٥، رقم: ٢٧٨١٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۸۸)

قربانی کے گوشت کو تول کر تقسیم کرنا

سوال [۱۰۱۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سات آدمیوں نے مل کر ایک بڑا جانور قربانی کے لیے خریدا، کسی کی واجب قربانی ہے کسی کی نفلی، اب اس میں گوشت برابر کر کے تقسیم کرنا لازم ہے یا نہیں؟ جبکہ ہر ایک کی طرف سے کھلی اجازت ہے جس کی جتنی مرضی ہو لے جائے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: قربانی کا گوشت برابر تول کر تقسیم کرنا ضروری ہے کیونکہ برابر تقسیم نہ کیا گیا تو احتمال ربا کی وجہ سے اس تقسیم پر راضی شرکاء گنہگار ہوں گے، اس لیے اٹکل سے تقسیم کرنا جائز نہیں ہے، اگرچہ شرکاء ایک دوسرے کے لیے زیادتی کو حلال قرار دیں، البتہ اگر وہ ایک دوسرے کی اجازت سے اٹکل سے تقسیم کریں اور ہر ایک کے حصہ میں سری پائے وغیرہ بھی آجائیں تو یہ جائز ہے۔ (مستفاد: محمودیہ ڈابھیل ۱۷/۴۲۴، میرٹھ ۲۶/۳۳۲)

وقسم لحمها وزنا، لأنه موزون لا جزافا لاحتمال الربا. (الدر المنتقی،

کتاب الأضحية، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ١٦٨، مصرى قديم ٢/ ٥١٧)

لـو أنهـم اقتسـمـوا لـحـمهـا جـزافا وحلل كل واحد منهم لأصحابه الـفـضـل لايـجـوز، لأن الربا لايحتمل الحل بالتحليل ...... اقتسموا اللحم جـزافـا وفـى نـصـيـب كل واحد منهم شيئ مما لا يوزن كالرجل والرأس لا بأس به إذا حلل بعضهم بعضا. (قـاضيخان، كتاب الأضحية، زكريا جديد ٣/ ٢٤٧، وعلى هامش الهندية ٣/ ٣٥١)

يـقـسـم اللحم وزنا لا جزافا ...... ولو حلل بعضهم بعضا ...... فلأن فيه مـعـنـى التـمـليـک واللحم من أموال الربا فلا يجوز تمليكه مجازفة ...... إلا إذا ضـم مـعـه من الأكارع أو الجلد. (شـامـی، کتـاب الأضـحية، زكريا ٩/ ٤٦٠، كـراچـى ٦/ ٣١٧، البـحـر الـرائـق زكـريـا ٨/ ٣١٩، كـراچـی ٨/ ١٧٤، تـاتارخانية زكريا ١٧/ ٤٥٥، رقم: ٢٧٨١٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۸۹)

قربانی کا گوشت تول کر تقسیم کرنے کا حکم

سوال [۱۰۱۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بڑے جانور میں گوشت برابر تول کر تقسیم کیا جاتا ہے لیکن اگر کسی مدرسہ والے تول کر تقسیم نہ کرے یا شرکاء میں سے ہر ایک کو پانچ چھ کیلو دے کر چھٹی کر دیں، تو کیا قربانی صحیح ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: زبیر مظاہری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بڑے جانور میں اگر سارے حصے دار یہ چاہتے ہیں کہ اپنا اپنا حصہ الگ الگ طور پر وصول کر کے قبضہ کریں گے تو ایسی صورت میں تول کر

سب کا حصہ متعین کر لینا چاہیے اور اگر کوئی اپنا حصہ کم کر کے سر، پایہ وغیرہ لینا چاہیں تو اس کی بھی اجازت ہے، لیکن اگر سب شرکاء اپنا اپنا حصہ مکمل طور پر وصول کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے ہیں کچھ لیں، کچھ دیدیں، یا سب دیدیں، یا شرکاء میں سے کسی کو اپنے حصہ کے بارے میں اختیار دیدیں یا سب شرکاء کسی اور کو اختیار دیدیں تو ایسے حالات میں بڑے جانور کا گوشت تول کر تقسیم کرنا لازم نہیں جیسا کہ مدارس میں جو قربانیاں ہوتی ہیں تو ان میں شرکاء کی طرف سے عام طور پر اپنا اپنا حصہ مکمل طور پر وصول کرنے کا ارادہ نہیں ہوتا اس لیے جن مدارس میں گوشت تول کر تقسیم نہیں کرتے ان پر کوئی اعتراض کی بات نہیں، وہ اسی کی گنجائش کے تحت کرتے ہیں، ہاں البتہ اگر کوئی شریک اپنا حصہ متعین کر کے وصول کرنا چاہتا ہے تو اس کا ساتواں حصہ تول کر اسے دیدینا چاہئے جیسا کہ بعض فقہاء نے کہا کہ اگر شرکاء میں سے کوئی فقیر ہو تو اس کا حصہ تول کر علاحدہ کر دینا چاہیے تاکہ اس کو اپنا حصہ صدقہ کرنے میں سہولت ہو۔

ویقسم اللحم وزنا (در مختار) وفی الشامی: أنظر هل هذه القسمة متعينة أو لا؟ حتى لو اشترىٰ لنفسه ولزوجته وأولاده الكبار بدنة ولم يقسموها تجزيهم أو لا؟ والظاهر أنها لاتشترط لأن المقصود منها الإراقة وقد حصلت، وفی فتاویٰ الخلاصة والفيض تعليق القسمة على إرادتهم وهو يؤيد ما سبق غير أنه إذا كان فيهم فقير و الباقی أغنياء يتعين عليه أخذ نصيبه ليتصدق به، وحاصله: أن المراد بيان شرط القسمة إن فعلت لا أنها شرط لكن فی استثنائه الفقير نظر إذ لا يتعين عليه التصدق كما يأتی. (شامی، کتاب الأضحية، زکریا ۹/ ٤٦٠، کراچی ٦/ ٣١٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ / رجب المرجب ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۳۷۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/ ۷/ ۱۴۲۸ھ

قربانی کا گوشت تول کر اور اندازے سے تقسیم کرنا

سوال [۱۰۱۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ قربانی کے جانور کے گوشت کو تول کر برابر تقسیم کرکے الگ کرنا لازم ہے، یا نہیں؟ جبکہ ہر ایک کی طرف سے پورا اختیار ہے کہ جو جتنا چاہے لیجائے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی کے جانور کے گوشت کو تول کر تقسیم کرنا ضروری ہے، اندازے سے تقسیم کرنا جائز نہیں، البتہ اندازے سے اس طرح تقسیم کر سکتے ہیں کہ ہر ایک کے حصہ میں سری، پائے وغیرہ بھی آجائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔
(مستفاد: محمودیہ ڈابھیل ۱۷/۴۲۴، محمودیہ میرٹھ ۲۶/۳۳۱)

لو اشتریٰ عشرة عشر أغنام فضحى كل واحد واحدة جاز ويقسم اللحم بينهم بالوزن، وإن اقتسموا مجازفة يجوز، إذا كان أخذ كل واحد شيئا من الأكارع أو الرأس أو الجلد. (هنديه، كتاب الأضحية، الباب الثامن فيما يتعلق بالشركة فى الضحايا، زكريا جديد ٥/٣٥٢- ٣٥٣، قديم ٥/٣٠٦)

سبعة ضحوا بقرة واقتسموا لحمها وزنا جاز ...... فإن اقتسموا اللحم جزافا لايجوز ...... ولو أنهم اقتسموا لحمها جزافا و حلل كل واحد منهم لأصحابه الفضل لايجوز ...... ولو اقتسموا اللحم الجزور المشترك فى الأضحية جزافا وفى نصيب كل واحد منهم شيئ مما لايوزن كالرجل والرأس و نحو ذٰلك لا بأس به إذا حلل بعضهم بعضا. (قاضيخان، كتاب الأضحية، زكريا جديد ٣/٢٤٧، وعلى هامش الهندية ٣/ ٣٥١)

إذا جاز على الشركة فيقسم اللحم وزنا بين الشركاء لأنه موزون لا جزافا لأن فى القسمة معنى التمليك فلا يجوز التحليل فى معنى الهبة، وهبة المشاع فيما يقسم لاتجوز إلا إذا خلط وضم به أى باللحم من أكارعه أو جلده أى يكون فى كل جانب شيئ من اللحم ومن الأكارع أو يكون فى جانب شيئ من اللحم وبعض الجلد أو يكون فى جانب لحم و أكارع و فى آخر لحم و جلد فحينئذ يجوز صرفا للجنس إلى خلاف

الجنس. (مجمع الأنهر، دار الکتب العلمية بيروت ١٦٩/٤، مصري قديم ٥١٧/٢)

ويقسم وزنا لا جزافا، لأن القسمة فيها حتى معنى المبادلة ولو حلل بعضهم بعضا ...... إلا إذا ضم معه من الأكارع أو الجلد صرفا للجنس لخلاف جنسه بأن يكون مع أحدهما بعض اللحم مع الأكارع ومع البعض الآخر مع الجلد. (شامي، كتاب الأضحية، زكريا ٤٦٠/٩، كراچي ٣١٧/٦-٣١٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۹۱)

قربانی کی کھال اور گوشت کا حکم فروختگی میں یکساں

سوال [۱۰۱۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قربانی کا گوشت زیادہ ہوگیا ہے، لینے والے بھی نہیں ہیں، ایسی صورت میں گوشت کو بوچڑ خانے میں پھینک دینا چاہیے، یا اس گوشت کو سلیٹر ہاؤس وغیرہ کے ہاتھ فروخت کر کے اس کی رقم مصرف خیر میں خرچ کردی جائے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: قربانی کا گوشت اگر زیادہ ہوجائے اور لینے والا بھی کوئی نہ ہوتو اس کو بوچڑ خانوں میں پھینکنے کے بجائے سلیٹر ہاؤس وغیرہ کے ہاتھ اس کو فروخت کر کے اس سے حاصل شدہ رقم کو مصرف خیر میں خرچ کرنا جائز اور مباح ہی نہیں بلکہ بہتر ہے، کیونکہ فروختگی اور پیسہ میں قربانی کی کھال کا جو حکم ہے وہی گوشت کا بھی ہے۔

فإن باع الجلد أو اللحم به أي بمستهلك أو بدراهم تصدق بثمنه. (اعلاء السنن، باب بيع جلد الأضحية، كراچي ٢٦٢/١٧، دار الكتب العلمية بيروت ٢٨٥/١٧)

لو باع اللحم يتصدق بثمنه. (الولوالجية، دار الإيمان سهارنپور ٧٧/٣)

ولا بأس ببيعه بالدراهم ليتصدق بها. (المحيط البرهاني كوئٹه ٤٨١/٦،

المجلس العلمی ۸/ ٤٧٠ رقم: ١٠٨٢٩)

ولـو باع الجلد أو اللحم بالدراهم أو بمالاينتفع به إلا بعد استهلاكه تصدق بثمنه. (هدايه، كتاب الأضحية، اشرفيه ٤/ ٤٥٠)

فإن بيع اللحم أو الجلد به أی بمستهلک أو بدراهم تصدق بثمنه.

(در مختار، كتاب الأضحية، زكريا ٩/ ٤٧٥، کراچی ٦/ ٣٢٨) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۳؍ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۲۹)

قربانی کے گوشت کو شادی میں کھلانا

سوال [۱۰۱۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک آدمی بھینس کی قربانی کر رہا ہے، ان کی ایک بھتیجی یا اور کوئی دوسری لڑکی ہے، جس کے والدین نہیں ہیں، مگر ماں ہے، اس لڑکی کی شادی ہونی ہے اس قربانی کے جانور کے گوشت کو شادی کے مصرف میں لا سکتے ہیں یا نہیں؟ لہٰذا حضور والا سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ احقر کو اس مسئلہ کو اچھی طرح بیان کر کے بتلائیں، یعنی قربانی کے دن لڑکی کو رخصت کرنا ہے تو کیا قربانی کا گوشت براتیوں کو کھلانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عبد الستار عیدگاہ روڈ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر بوقت ذبح قربانی ہی کی نیت رہی ہے گوشت خوری اصل مقصد نہیں ہے تو قربانی کے گوشت سے براتیوں کی ضیافت جائز ہے۔

ويأكل من لحم الأضحية و يطعم الأغنياء والفقراء ويدخر لقوله عليه الصلاة والسلام كنت نهيتكم عن آكل لحوم الأضاحی فكلوا منها وادخروا ومتى جاز اكله وهو غنی جاز أن يوكل غنيا. (هدايه، كتاب الأضحية،

اشرفی ٤/٤٤٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ذی قعدہ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/۱۴۸۲)

قصاب کا جانوروں کی ہڈیاں اور پوٹری لے جانے کا حکم

سوال [۱۰۱۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں جہاں مدارس میں مجموعی طور پر عید الاضحیٰ میں قربانی کا نظم کیا جاتا ہے تو ساتھ ہی ساتھ جانوروں کی کھالوں کو فروخت کر کے مصلہ رقم طلبہ پر خرچ کردی جاتی ہے اور جانوروں کی ہڈیاں اور اس کی پوٹری قریشی حضرات اٹھالے جاتے ہیں، جبکہ ہڈیاں تقریباً ۶۰۰/ روپیہ کوئنٹل کے حساب سے بکتی ہیں، اور ایک جانور کی پوٹری تقریباً ۱۲۵/روپیہ میں بکتی ہے تو کیا اس کی قیمت کو جانور بنانے والے اپنے اوپر خرچ کر سکتے ہیں، اور ہم جاننے کے باوجود ان کے اس فعل سے انہیں منع نہیں کرتے ہیں، تو کیا اس حال میں ہماری قربانی جائز ہوئی یا ناجائز رہی؟

المستفتی: محمد عرفان پینتے پور، سیتاپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قصاب کو ان کے کام کی پوری اجرت دی جائے، اس کے بعد قربانی کے جانور کے وہ اجزاء جو زائد از ضرورت ہوں، انہیں وہ قصاب حضرات اگر ذمہ داران کی اجازت سے لے جائیں تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اس کی وجہ سے اجرت میں کمی کرنا اور ان چیزوں کو اس کا بدل قرار دینا جائز نہیں ہے، البتہ قربانی بہر دو صورت ادا ہوجائے گی۔

﴿**لَنْ يَنَالَ اللّٰهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَى مِنْكُمْ.**﴾ [الحج: ٣٧]

ولايعطى أجر الجزار منها. (شامی، کتاب الأضحية، زكريا ٤٧٥/٩، کراچی ٣٢٨/٦)

ولايعطى أجر الجزار والذابح منها. (هندیه زكريا قديم ٣٠١/٥، جديد ٣٤٧)

ويهب منها ما شاء للغني والفقير والمسلم والذمي. (هنديه زكريا قديم

۳۰۰/۵، جدید ۳٤٦/٥، حاشية الطحطاوى على الدر كوئٹہ ٤/١٦٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ربیع الاول ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۳۲۷)

قربانی کی ہڈیاں اور سینگ فروخت کرنا اور قیمت کا تصدق

سوال [۱۰۱۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ قربانی کے جانور کی ہڈیاں اور سینگ فروخت کرنا کیسا ہے؟ اگر فروخت کر دیا تو اب اس کی قیمت واجب التصدق ہے یا نہیں؟ دلائل کی روشنی میں واضح فرمائیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی کے جانور کی ہڈیاں اور سینگ ضائع ہونے سے بچانے کے لیے فروخت کرنا جائز ہے اور اس کی قیمت کا صدقہ کرنا لازم ہے۔ (مستفاد: مسائل قربانی وعقیقہ ص:۴۵)

باع لحمها أو جلدها بمستهلک أو بدراهم أو أعطى الجزار أجره منها أو أتلفها أو ضيعها يجب التصدق بالثمن فى البيع وبالقيمة فى غيره. (غنية الناسك ص: ٢٦٨)

فإن بيع اللحم أو الجلد به ...... أو بدراهم تصدق بثمنه. (شامى، كتاب الأضحية، كراچى ٦/٣٢٨، زكريا ٩/٤٧٥)

ويتصدق بثمنه لأن القربة ذهبت عنه فيتصدق به. (بدائع الصنائع زكريا ٤/٢٢٥)

ولو باع الجلد أو اللحم بالدراهم أو مما لاينتفع به إلا بعد استهلاكه تصدق بثمنه لأن القربة انتقلت إلى بدله. (هدايه، كتاب الأضحية، اشرفى ٤/٤٥٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۴۴)

جانور کی چربی سے صابن بنا کر خود استعمال کرنا

سوال [۱۰۱۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قربانی کے جانور کی چربی سے صابن بنا کر استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: صابر علی ٹانڈہ رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی کی چربی سے صابن بنا کر اپنے استعمال میں لانا شرعاً درست ہے، لیکن اس کا فروخت کرنا جائز نہیں، اگر فروخت کیا تو اس قیمت کا صدقہ کرنا لازم ہوگا۔ (مستفاد: مسائل قربانی ۱۴۱، امداد الفتاویٰ ۳/۵۷۲)

ویتصدق بجلدها أو یعمل منه نحو غربال و جراب وقربة و سفرة و دلو أو یبدله بما ینتفع به باقیا لا بمستهلک کخل ولحم ونحوه کدراهم فإن بیع اللحم أو الجلد به بمستهلک أو بدراهم تصدق بثمنه. (در مختار مع الشامی، کتاب الأضحیة، زکریا ۹/ ٤٧٥، کراچی ٦/ ٣٢٨، هدایه اشرفی ٤/ ٤٥٠، هندیه زکریا قدیم ٥/ ٣٠١، جدید ٥/ ٣٤٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ربیع الاول ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۷۱۱۳)

قربانی کی ہڈی نمک سے بدلنا

سوال [۱۰۱۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قربانی کے گوشت کی جو ہڈیاں ہوتی ہیں ان سے بعض لوگ نمک بدل لیتے ہیں، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ اپنی قربانی کے گوشت کی ہڈیوں سے نمک بدل کر اپنے استعمال میں لا سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: شمیم اختر مدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: قربانی کی ہڈیوں سے نمک بدلنا جائز نہیں، اگر کسی نے ایسا کرلیا ہے تو اس کا صدقہ کرنا ضروری ہے۔

ویتصدق بجلدها ...... ولایشتری به مالاینتفع به إلا بعد الاستهلاک نحو اللحم والطعام. (هنديه، الباب السادس فی بيان ما يستحب فی الأضحية والانتفاع بها، زكريا قديم ٥/ ٣٠١، جديد ٥/٣٤٧، هدايه اشرفی ٤/ ٤٥٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ربیع الاول ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۱۱۳۷)

قربانی کے جانور کی ہڈی کتے کو ڈالنا

سوال [۱۰۱۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بقرعید میں جو قربانی ہوتی ہے تو قربانی کے گوشت کی ہڈی اگر کتے وغیرہ کو دیدی جائے تو یہ قربانی کے گوشت کے احترام کے خلاف ہوگا یا نہیں؟ جبکہ بعض لوگ اس کو قبیح خیال کرتے ہیں؟

المستفتی: جلیل احمد ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: قربانی کی ہڈیوں کو فروخت کرنا بہتر ہے، کتے بلی وغیرہ کو بھی دے سکتے ہیں، اس میں کوئی قباحت نہیں، اور نہ ہی قربانی کے گوشت کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۴/۳۴۷، جدید ڈابھیل ۱۷/۴۸۲) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۲۹؍رجب المرجب ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۴۵۶۰)

قربانی کا گوشت غیر مسلم کو دینا

سوال [۱۰۱۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر قربانی کا گوشت کسی غیر مسلم کو دیدیا جائے تو جائز ہے یا نہیں؟ حالانکہ علماء کرام اس مسئلہ میں اختلاف کرتے ہیں کہ قربانی کا گوشت غیر مسلم کو دینا مطلقاً جائز نہیں ہے، جبکہ حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنی کتاب ''بہشتی زیور'' میں لکھا ہے کہ قربانی کا گوشت کافر کو دے سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد جنید لکھیم پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: قربانی کا گوشت غیر مسلم کو دینا جائز ہے، اور حضرت تھانویؒ نے جواز کا جوقول بہشتی زیور میں لکھا ہے وہ درست ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۷/ ۴۹۷)

ويهب منها ما شاء للغني والفقير والمسلم والذمي كذا في الغياثية.

(عالمگیری، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب، زكريا قديم ٥/ ٣٠٠، جديد ٥/ ٣٤٦، حاشية الطحطاوي على الدر كوئٹه ٤/ ١٦٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ رمحرم الحرام ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۸۷۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۱/۹ھ

قربانی کا گوشت مسلم یا غیر مسلم کے ہاتھ فروخت کرنا

سوال [۱۰۱۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہماری بستی میں غرباء کی تعداد کم ہے، اس لیے قربانی کے جانور کا جو گوشت غرباء کے حصے میں آتا ہے ان کے لیے بہت زیادہ ہوتا ہے، لہٰذا کیا وہ اپنے حصے میں آئے ہوئے

گوشت کو اپنے اخراجات کی خاطر بیچ سکتے ہیں یا نہیں؟ کیا غیر مسلم کو بھی بیچ سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: عبد العظیم صدیقی رائے گڑھ مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قربانی کا گوشت فروخت کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے، نیز غیر مسلموں کے ہاتھ فروخت کرنا بھی ناجائز ہے، بلکہ اس کو بھی مفت میں کھلایا جاسکتا ہے۔

و ليس له أن يبيع الجلد لينفق الثمن على نفسه أو عياله و لا يبيع لحم الأضحية ليتصدق بل يأكله أو يطعم. (قاضيخان، كتاب الأضحية، زكريا جديد ٣/٢٤٩، و على هامش الهندية ٣/٣٥٤، شامي كوئٹه ٥/٢٣١، كراچی ٦/٣٢٨، زكريا ٩/٤٧٥، هنديه زكريا قديم ٥/٣٠١، جديد ٥/٣٤٧، البحر الرائق كوئٹه ٨/١٧٨، زكريا ٨/٢٦٦)

ويهب منها ما شاء للغني والفقير والمسلم والذمي كذا في الغياثية. (عالمگيری، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب، زكريا قديم ٥/٣٠٠، جديد ٥/٣٤٦، حاشية الطحطاوی على الدر كوئٹه ٤/١٦٦) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ جمادی الثانیہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۷۶۲)

قربانی کے جانوروں کے خون کی رقم مدرسہ یا مسافر خانہ میں لگانا

سوال [۱۰۱۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مذبح سے جانوروں کا خون فروخت کیا جاتا ہے اور اس کی رقم کو مدرسہ میں یا مسافر خانہ کی عمارت میں لگانا جائز ہے، اس کا کاروبار کر سکتے ہیں؟ اگر نہیں لگا سکتے تو پھر اس رقم کا کیا کریں؟ کسی مستحق طالب علم سے تملیک کرا کر لگا سکتے ہیں، یا مطبخ کے صرفہ میں استعمال کر سکتے ہیں؟ مطبخ میں اور تعمیر میں بھی سخت ضرورت ہے؟

المستفتی: رحمت اللہ قاسمی سنبھل مراد آبد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خون کوفروخت کرنا اور اس کا پیسہ مسلمان کا اپنے تصرف میں صرف کرنا مسجد یا مدرسہ کی تعمیر یا کسی بھی مد میں لگانا ناجائز اور حرام ہے، چاہے مدرسہ کتنا ہی ضرورت مند ہو، خون کا پیسہ دینی مدرسہ میں کسی طرح جائز نہیں ہے۔

البيع بالميتة و الدم باطل. (هدايه، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، اشرفی ۳/ ٤٩)

اور نہ اس کی تملیک جائز ہے، اور جو رقم موجود ہے اس کو مالکان کو واپس کر دینا لازم ہے، ورنہ فقراء نادار کو بلانیت ثواب دیدینا واجب ہے۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث فإما إن ملكه بعقد فاسد أو حصل له بغير عقد ولايمكنه أن يرده إلى مالكه ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور قديم ۱/ ۳۷، دار البشائر الاسلاميه ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث ٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ / ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۴۲۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲/ ۴/ ۱۴۱۶ھ

۳۷ کتاب العقیقه

عقیقہ کا مقصد اور ثبوت

سوال [۱۰۱۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عقیقہ کرنے کا منشاء کیا ہے؟ کن برزگ سے رائج ہوا؟

المستفتی: عابد حسین محمود پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: عقیقہ کے بغیر بچہ امراض، میل کچیل کا شکار رہتا ہے، اس سے حفاظت مقصود ہے۔

حدثنا سلمان بن عامر الضبی قال سمعت رسول الله ﷺ يقول: مع الغلام عقيقة فأهريقوا عنه دما وأميطوا عنه الأذىٰ. (صحيح البخاری، باب إماطة الأذىٰ عن الصبى فى العقيقة، النسخة الهندية ۲/۸۲۲، رقم: ۵۲۵۹، ف: ۵٤۷۱)

عقیقہ کسی بزرگ کی رائج شدہ رسم نہیں ہے، بلکہ آنحضور ﷺ سے ثابت ہے، آپ علیہ السلام نے حضرت امام حسن وحسین رضی اللہ عنہما کی طرف سے عقیقہ فرمایا ہے۔

عن ابن عباس أن رسول الله ﷺ: عق عن الحسن والحسين رضى الله عنهما كبشا كبشا. (أبو داؤد شريف، باب فى العقيقة، النسخة الهندية ۲/۳٦/ دار السلام رقم: ۲۸٤۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ ذی قعدہ ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷۲/۲۳)

عقیقہ کا شرعی حکم

سوال [۱۰۱۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: عقیقہ ولادت کے کتنے دن بعد سنت ہے، یا پوری عمر میں کبھی بھی کرے تو سنت ہوگا یا مستحب؟ اور عقیقہ کی ہڈیاں اور کھال فروخت کر کے اپنے استعمال میں لائے یا عقیقہ کا کھانا کھلانے میں خرچ کیا جائے؟

المستفتی: محمد اصغر پرانا بازار مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بچہ کی پیدائش کے ساتویں دن عقیقہ کرنا سنت ہے، لیکن اگر کسی عذر کی وجہ سے ساتویں دن نہ کرسکتے تو چودہویں دن اور چودہویں دن نہ کرسکے تو اکیسویں دن بھی عقیقہ کرنے سے سنت ادا ہوجائے گی، لیکن اکیسویں دن کے بعد وقت کی فضیلت ختم ہوجائے گی البتہ نفس عقیقہ ذمہ میں باقی رہے گا جو کسی بھی وقت ادا کرنے سے ذمہ سے بری ہو جائے گا۔ (مستفاد: ایضاح المسائل جدید اضافہ شدہ ۱۵۱، فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۲/۹۲، جدید ۱۰/۶۰)

عن سمرة قال: قال رسول الله ﷺ: الغلام مرتهن بعقيقة يذبح عنه يوم السابع، ويسمىٰ، ويحلق رأسه ...... والعمل على هذا عند أهل العلم يستحبون أن يذبح عن الغلام العقيقة يوم السابع فإن لم يتهيأ يوم السابع فيوم الرابع عشر فإن لم يتهيأ عق عنه يوم حاد و عشرين. (سنن الترمذی، باب من العقيقة، النسخة الهندية ۱/۲۷۸، دار السلام رقم: ۱۵۲۲، فتح الباری، باب إماطة الأذىٰ عن الصبی فی العقيقة، دار الفكر ۹/۵۹۴، اشرفيه ۹/۷۴۲، تحت رقم الحديث: ۵۴۷۱، عمدة القاری، دار إحياء التراث العربی ۲۱/۸۸، زكريا ۱۴/۴۶۹)

اور عقیقہ کی ہڈی اور کھال فروخت کر کے ان کی قیمت اپنے استعمال میں یا عقیقہ کے کھانے میں صرف کرنا جائز نہیں ہے بلکہ اس کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے، جس طرح قربانی کی کھال کا حکم ہے۔ (مستفاد: امداد المفتیین ص: ۹۶۸، عزیز الفتاویٰ ص: ۷۱۰)

ہاں بغیر فروخت کیے اپنے استعمال میں کھال وغیرہ لاسکتا ہے۔

ويتصدق بجلدها أو يعمل منه نحو غربال و جراب ولا يبيعه بالدراهم لينفق الدراهم على نفسه و عياله. (هنديه، الباب السادس فی بيان ما يستحب فی الأضحية

والانتفاع بها، زكريا قديم ٥/٣٠١، جديد ٥/٣٤٧، البحر الرائق كوئٹه ٨/١٧٨، زكريا ٨/٣٢٦، هدايه اشرفى ٤/٤٥٠، شامى زكريا ٩/٤٧٥، كراچى ٦/٣٢٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۷۱۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۶/۵ھ

عقیقہ مسنون ہے یا واجب؟

سوال [۱۰۱۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرا بچہ عریب حسین جس کی عمر آج چھ سال ہے، اس کے عقیقہ کی نیت کی تھی تو کیا مجھ پر عقیقہ کرنا واجب ہے، حالانکہ اب میرے پاس حیثیت نہیں ہے؟

المستفتی: نوید حسین کالا پیادہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عقیقہ کرنا واجب نہیں بلکہ مسنون ہے، اس وقت اگر گنجائش نہیں ہے تو جب اللہ تعالیٰ گنجائش دیں تو اس وقت کیا جا سکتا ہے۔

وإنما أخذ أصحابنا الحنفية فى ذٰلك بقول الجمهور وقالوا باستحباب العقيقة. (اعلاء السنن، باب العقيقة، كراچى ١٧/١١٣، دار الكتب العلمية بيروت ١٧/١٢٦، تحت رقم الحديث ٥٥١٣، حاشية ترمذى ١/٢٧٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۶۷۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۶/۷ھ

کیا عقیقہ صرف لڑکے کے لیے مسنون ہے؟

سوال [۱۰۱۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: حلق رأس المولود یوم سابعة هل هو خاص بالذكر كما هو عند الحنابلة أم أن ذٰلک یشمل الأنثیٰ أیضا فتكون السنة عامة فی حق كل مولود ذكرا كان أم أنثیٰ؟

المستفتی: محمد عمر اللکنوی، جدة مسجد الفخریة، سعودیہ عربیہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: أن حلق رأس المولود یوم سابعة غیر مخصوص بالذكر بل الذكر والأنثیٰ فیه سواء كما هو مذهب الحنفیة والشافعیة والمالكیة، لما ورد فیه إن فاطمة بنت رسول الله ﷺ حلقت شعر حسن و حسین و زینب و أم كلثوم فتصدقت بزنة ذٰلک الشعر فضة كما فی سنن البیهقی عن جعفر بن محمد بن علی عن أبیه أنه قال: وزنت فاطمة بنت رسول الله ﷺ: شعر حسن و حسین و زینب و أم كلثوم فتصدقت بزنة ذٰلک فضة. (السنن الكبریٰ للبیهقی، باب العقیقة سنة، دار الفكر ۱۴/۲۵۳- ۲۶۲، رقم: ۱۹۸۰۹-۱۹۸۳۷، مؤطا إمام مالك، باب ما جاء فی العقیقة ۱/۱۸۶، رقم: ۱۸۳۹)

ویستحب أن یتصدق بوزن شعره ذهبا فإن لم یفعل ففضة سواء فیه الذكر والانثیٰ. (إعلاء السنن، باب أفضلیة ذبح الشاة فی العقیقة، كراچی ۱۷/ ۱۱۹، دار الكتب العلمیة بیروت ۱۷/۱۳۲، تحت رقم الحدیث ۵۵۱۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۶۵۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۵/۱۴۲۳ھ

بچہ پیدا ہونے کے وقت کے مسنون اعمال

سوال [۱۰۱۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بچہ پیدا ہونے کے وقت سنت طریقہ کیا ہے؟ اور بچہ کا نام کب رکھنا ہے؟ وغیرہ۔

المستفتی: محمد شہزاد اتراکھنڈ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: بچہ پیدا ہونے کے وقت سنت طریقہ یہ ہے کہ اس کو اچھی طرح نہلا دھلا کر اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں تکبیر کہہ دی جائے اور کسی دیندار بزرگ سے تھوڑا چھوہارہ چبوا کر اس کے تالو میں لگا دیا جائے یہی سنت ہے، باقی اس کے علاوہ سب فضول اور رسمیں ہیں۔ (بہشتی زیور ۶/۱۱۲)

عن أسماء بنت أبی بكر أنها حملت بعبد الله بن الزبير قالت: فخرجت و أنا متم فأتيت المدينة فنزلت بقباء فولدته بقباء ثم أتيت به النبی ﷺ فوضعته فی حجره ثم دعا بتمرة فمضغها ثم تفل فی فيه فكان أول شيئ دخل جوفه ريق رسول الله ﷺ ثم حنكه بتمرة ثم دعا له وبرك عليه، (الحديث). (صحيح البخاری، باب هجرة النبی ﷺ و أصحابه إلى المدينة، النسخة الهندية ۱/۵۵۵، رقم: ۳۷۷۱، ف: ۳۹۰۹، مشکوٰة شريف ۳۶۲)

روى عن عمر بن عبد العزيز كان يؤذن فی اليمنىٰ ويقيم فی اليسرىٰ إذا ولد الصبی. (شرح السنة، باب الأذان فی أذن المولود، دار الكتب العلمية بيروت ۲۷۳/۱۱، رقم: ۲۸۲۲، شعب الإيمان، دار الكتب العلمية بيروت ۳۸۹/۶، حاشية مشكاة ۳۶۳/۲)

اور بچہ پیدا ہونے کے ساتویں دن نام رکھنا بہتر ہے۔

عن سمرة قال: قال رسول الله ﷺ: الغلام مرتهن بعقيقة يذبح عنه يوم السابع، ويسمىٰ، ويحلق رأسه ...... والعمل على هذا عند أهل العلم يستحبون أن يذبح عن الغلام العقيقة يوم السابع فإن لم يتهيأ يوم السابع فيوم الرابع عشر فإن لم يتهيأ عق عنه يوم حاد و عشرين. (سنن الترمذی باب من العقيقة النسخة الهندية ۲۷۸/۱، دار السلام ۱۵۲۲، فتح البارى، باب إماطة الأذىٰ عن الصبی فی العقيقة، دار الفكر ۵۹۴/۹، اشرفيه ۷۴۲/۹، تحت رقم الحديث: ۵۴۷۱، عمدة القارى، دار إحياء التراث العربی ۸۸/۲۱، زكريا ۴۶۹/۱۴)

یستحب لمن ولد له ولد أن یسمیه یوم أسبوعه. (رد المحتار، قبیل کتاب الحظر والإباحة، کراچی ۶/۳۳۶، زکریا ۹/۴۸۵، کوئٹه ۵/۳۲۸)

نیز ساتویں دن عقیقہ کردے اور اس کے بالوں کو تول کر اس کی مقدار کے برابر چاندی صدقہ کردے۔

عن علی بن أبی طالب قال: عق رسول الله ﷺ عن الحسن بشاة وقال: یا فاطمة! احلقی رأسه، وتصدقی بزنة شعره فضة فوزنته فکان وزنه درهما أو بعض درهم. (سنن الترمذی، باب العقیقة بشاة، النسخة الهندیة ۱/۲۷۸، دار السلام رقم: ۱۵۱۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳ ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۶۰۹۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۴/۳ھ

عقیقہ کے وقت بال کے برابر چاندی صدقہ نہ کرسکا تو؟

سوال [۱۰۱۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ایک صاحب نے چند سال پہلے اپنے بچہ کا عقیقہ کیا تھا لیکن وہ اس وقت کسی وجہ سے چاندی صدقہ نہیں کرسکے، اب سوال یہ ہے کہ مذکورہ صاحب کو از سر نو دوبارہ عقیقہ کرنا ہوگا، یا صرف چاندی صدقہ کردی جائے بہر دوصورت کتنی چاندی صدقہ کی جائیگی اس لیے کہ بالوں کا وزن معلوم نہیں ہے؟

(۲) اور اب عقیقہ یا صدقہ کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟ آیا واجب یا سنت یا مستحب؟

المستفتی: مسعود الظفر رام نگر نینی تال، یوکے

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) دوبارہ عقیقہ کرنے کی ضرورت نہیں، عقیقہ صحیح ہو چکا تھا اور چاندی یا اس کی قیمت کا صدقہ اگر اس وقت نہیں کرسکا ہے تو مادر زاد بالوں

کے وزن کا تخمینہ لگا کر اب بھی صدقہ کر سکتے ہیں۔

(۲) عقیقہ اور صدقہ کرنا دونوں مسنون ہیں، حدیث میں حضور ﷺ نے اس کی ترغیب دی ہے، اور اس کی وجہ سے بچہ ہر امراض سے محفوظ ہوجاتا ہے۔

عن سمرة قال: قال رسول الله ﷺ: الغلام مرتهن بعقيقة يذبح عنه يوم السابع، ويسمى، ويحلق رأسه. (سنن الترمذی، باب من العقيقة، النسخة الهندية ۱/۲۷۸، دار السلام رقم: ۱۵۲۲، مسند البزار، مكتبه العلوم و الحكم ۱۰/۴۴۰، رقم: ۴۵۹۵، المعجم الكبير للطبرانی دار احياء التراث العربی ۶/۴۷۴ رقم: ۶۲۰۱) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۲۷/ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۵۵۶۰/۳۳)

دو سال میں کیے گئے عقیقہ میں بالوں کی مقدار چاندی کے تصدق کا حکم

سوال [۱۰۱۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کسی شخص کے یہاں بچہ پیدا ہو تو اس کا اپنے بچہ کا عقیقہ کرانے کا ارادہ ہو مگر کسی وجہ سے ساتویں دن عقیقہ نہ کر سکے، اور اس بچہ کے سر کے بال کئی مرتبہ کٹوا چکا ہو تو پھر جب چھ مہینہ یا سال بھر بعد یا دو سال بعد عقیقہ کا ارادہ کرے تو وہی سر کے بال کٹوا کر کے ان کی مقدار کے برابر چاندی خیرات کر دے تو عقیقہ درست ہو جائے گا یا نہیں؟

المستفتی: محمد ابراہیم رتن پورا سوپول بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عقیقہ کا سنت طریقہ یہ ہے کہ بچہ کی پیدائش کے ساتویں دن کیا جائے، اگر کسی وجہ سے ساتویں دن نہ کر سکا تو چودہویں روز یا اکیسویں روز کر لے۔

عن سمرة أن رسول الله ﷺ قال: كل غلام رهين بعقيقة تذبح عنه يوم السابع ويحلق رأسه ويسمّى. (مسند أحمد بن حنبل ۵/۸، رقم: ۲۰۳۴۳، ۲۰۳۹۵،

۲۰۴۰۱، ۲۰۴۵۱، ۲۰۴۵۶، ۲۰۴۵۷، ۲۰۵۲۰، مسند البزار، مكتبه العلوم والحكم ۱۰/۴۰۸، رقم: ۴۵۴۹، سنن النسائی، باب متی یعق، النسخة الهندية ۲/۱۶۷، دار السلام رقم: ۴۲۲۰)

اگران مذکورہ ایام میں عقیقہ نہ کرسکا بلکہ تاخیر سے کیا اور بچہ کے بال بڑے ہونے کے بعد کٹوا دیئے تو ایسی صورت میں عقیقہ درست ہوگیا لیکن سنت کے مطابق نہ ہوا اور جن بالوں کی مقدار کے برابر چاندی خیرات کرنی ہے وہ بچہ کے مادر زاد بال ہیں، نہ کہ بعد کے بال۔

(مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۲/۹۳، جدید زکریا ۱۰/۶۰، محمودیہ قدیم ۱۷/۲۶۶، جدید ڈابھیل ۱۷/۵۱۱، مسائل قربانی وعقیقہ ص:۴۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ربیع الاول ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۶۵۲۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۳/۳ھ

عقیقہ کا مسنون طریقہ

سوال [۱۰۱۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عقیقہ کرنے کے لیے شریعت میں عمر کی کوئی تعیین ہے یا نہیں؟ یا کسی وقت بھی کرسکتے ہیں؟ مسنون طریقہ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد یونس محلّہ نواب خیل سنبھل مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عقیقہ کا مسنون طریقہ یہی ہے کہ پیدائش کے ساتویں یوم کو عقیقہ کیا جائے اور اگر یہ نہ ہو تو چودھویں یوم کو کردیا جائے اگر یہ نہ ہو سکے تو ۲۱ویں یوم کو کیا جائے اس کے بعد سنت طریقہ باقی رہنے کا ذکر کسی صحیح روایت میں نظر سے نہیں گذرا۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۲/۹۰، جدید زکریا ۱۰/۶۰)

البتہ اگر کسی عذر کی وجہ سے وقت پر عقیقہ نہیں ہوا ہے تو بڑے ہونے کے بعد بھی عقیقہ جائز ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۶/۱۷۸، جدید ۱۰/۶۳)

عن سمرة قال: قال رسول الله ﷺ: الغلام مرتهن بعقيقة يذبح عنه يوم السابع، ويسمى، ويحلق رأسه ...... والعمل على هذا عند أهل العلم يستحبون أن يذبح عن الغلام العقيقة يوم السابع فإن لم يتهيأ يوم السابع فيوم الرابع عشر فإن لم يتهيأ عق عنه يوم حاد و عشرين. (سنن الترمذی، باب من العقيقة، النسخة الهندية ۱/۲۷۸، دار السلام رقم: ۱۵۲۲، فتح الباری، باب إماطة الأذیٰ عن الصبی فی العقيقة، دار الفكر ۹/۵۹٤، اشرفيه ۹/۷٤۲، تحت رقم الحديث: ۵٤۷۱، عمدة القاری، دار إحياء التراث العربی ۲۱/۸۸، زکريا ۱٤/٤٦۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/۳۲۰۰)

عقیقہ کا وقت اور طریقہ

سوال [۱۰۱۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عقیقہ کیا ہے؟ کیا اس کے لیے شریعت میں کوئی مخصوص میعاد طے ہے؟ اگر لڑکا پیدا ہو تو عقیقہ کس طرح ہوگا؟ خاص طور پر قربانی کے موقع پر ایک بکرا یا زیادہ ذبح کرنا ہے اور اسی طرح اگر گائے بھینس میں عقیقہ کریں تو کتنے حصے قربانی کے ہوں گے؟

امید ہے کہ مزاج بعافیت ہوں گے، قاری محی الدین صاحب تو غالباً حج بیت اللہ کے سفر پر گئے ہیں، قبلہ عبد الرشید صاحب ومحمد عمر صاحب کی خدمت میں سلام کہہ دیں۔

المستفتی: افضال احمد سنبھل مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) عقیقہ کے لیے وقت یہ ہے کہ ولادت کے ساتویں روز عقیقہ کیا جائے، اگر یہ نہ ہو سکے تو چودھویں روز اگر اس دن بھی نہ ہو سکے تو اکیسویں روز کر دیا جائے، وقت کی سنت یہاں تک باقی رہتی ہے، اس کے بعد وقت کا ثواب نہ ہوگا،

بلکہ صرف عقیقہ کا حکم باقی رہے گا، جب چاہے کر دیا جائے۔ (مستفاد: مسائل قربانی وعقیقہ ص:۴۹)

عـن سمرة قال: قال رسول الله ﷺ: الغلام مرتهن بعقيقة يذبح عنه يـوم السـابـع، ويسـمـى، ويحلق رأسه ...... والعمل على هذا عند أهل العلم يستـحبـون أن يـذبـح عن الغلام العقيقة يوم السابع فإن لم يتهيأ السابع فيوم الـرابـع عشـر فإن لم يتهيأ عق عنه يوم حاد و عشرين. (سـنن الترمذی باب من الـعـقيـقة النسخة الهندية ۱/۲۷۸، دار السلام رقم: ۱۵۲۲، فتح البارى، باب إماطة الأذىٰ عـن الـصبى فى العقيقة دار الفكر ۹/۵۹٤، اشرفيه ۹/۷٤۲، تحت رقم الحديث: ۵٤۷۱، عمدة القارى، دار إحياء التراث العربى ۲۱/۸۸، زكريا ۱٤/٤٦۹)

(۲) ایام قربانی ہوں یا غیر ایام قربانی ہر زمانہ میں اگر گنجائش ہو تو لڑکے کی طرف سے دو بکرے یا حصہ مستحب ہے، لہٰذا اگر ایام قربانی میں گائے بھینس میں عقیقہ کا حصہ لینا ہے تو لڑکے کے لیے دو حصہ عقیقہ میں لے کر باقی پانچ حصے قربانی کے لیے لے سکتے ہیں۔ (مستفاد: مسائل قربانی ص:۱۵)

و كـذا لـو أراد بـعضهم العقيقة عن ولد ولد له من قبل. (شـامی، كتاب الأضحية، زكريا ۹/٤۷۲، كراچی ٦/۳۲٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۵۵۵)

عقیقہ کب کیا جائے؟ نیز عقیقہ کے بکروں کا الگ الگ جگہ پر ذبح کرنا

سـوال [۱۰۱۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) فی زمانہ عموماً بچوں کی ولادت ہسپتال میں ہوتی ہے اور زچہ بچہ سات یوم سے پہلے گھر واپس نہیں کئے جاتے ہیں اور نہ ہی اسپتال میں حلق رأس کی اجازت ملتی ہے، ایسی صورت میں اگر ساتویں دن عقیقہ کی قربانی کرادی جائے اور جب بچے کو حلق کی اجازت

ہو، مسنون ایام کا لحاظ کر کے بال منڈوا کر چاندی وغیرہ صدقہ کر دی جائے تو کیا عقیقہ کی شرف وفضیلت حاصل ہو جائی گی؟

(۲) نومولود اگر لڑکا ہو تو کیا دو جدا جدا جگہوں پر مثلاً دادھیال میں ایک بکرا یا بکری، دوسرا بکرا نانہال میں بنیت عقیقہ کرا دیئے جاتے ہیں تو عقیقہ کی فضیلت سے محرومی تو نہ ہوگی؟

المستفتی: محمد علاؤ الدین ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) ساتویں دن بچے کا سر منڈانا اور عقیقہ کرنا مسنون ہے، لیکن اگر ہسپتال سے اجازت نہ ملنے یا کسی اور مجبوری کی وجہ سے ساتویں دن نہ ہو سکے تو چودھویں دن کو کر دیں، اور اگر کسی وجہ سے چودھویں دن کو نہ ہو سکے تو اکیسویں دن ضرور کر دیں تاکہ سنت طریقہ سے عمل ہو جائے۔

عن سمرة قال: قال رسول الله ﷺ: الغلام مرتهن بعقيقة يذبح عنه يوم السابع، ويسمى، ويحلق رأسه ...... والعمل على هذا عند أهل العلم يستحبون أن يذبح عن الغلام العقيقة يوم السابع فإن لم يتهيأ يوم السابع فيوم الرابع عشر فإن لم يتهيأ عق عنه يوم حاد و عشرين. (سنن الترمذی باب من العقيقة النسخة الهندية ۱/۲۷۸، دار السلام رقم: ۱۵۲۲، فتح الباری، باب إماطة الأذیٰ عن الصبی فی العقيقة، دار الفكر ۹/۵۹٤، اشرفیه ۹/۷٤۲، تحت رقم الحديث: ۵٤۷۱، عمدة القاری، دار إحياء التراث العربی ۲۱/۸۸، زكريا ۱٤/٤۶۹)

(۲) عقیقہ کے تمام اعمال اسی جگہ ادا کرنا بہتر اور افضل ہیں جہاں بچہ موجود ہو لیکن اگر دو جدا جدا جگہوں پر ایک ایک بکرا بکری ذبح کر دی جائے تو اس سے بھی عقیقہ کی فضیلت حاصل ہو جائے گی۔ (کفایت المفتی قدیم ۸/۲۶۳، جدید زکریا مطول ۱۲/۱۵۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ ربیع الاول ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۴۷۵۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/۳/۱۴۱۷ھ

بلوغ کے بعد عقیقہ اور سر منڈانے کا حکم

سـوال [۱۰۱۲٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک لڑکے کا بچپن میں عقیقہ نہیں ہوا، اور وہ لڑکا جوان ہوگیا، اب اس لڑکے کا عقیقہ شادی کے بعد تک کیا جارہا ہے، اور وہ بال منڈانے سے انکار بھی کررہا ہے، کیا بغیر بال منڈائے عقیقہ صحیح ہوسکتا ہے؟

المستفتی: عبدالغنی بیکن پور مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: عقیقہ میں سنت طریقہ یہ ہے کہ ساتویں روز عقیقہ کردیا جائے، اور بال منڈوادیئے جائیں، اور بچے کا نام رکھا جائے۔

عن سمرة قال: قال رسول الله ﷺ: الغلام مرتهن بعقيقة يذبح عنه يوم السابع، ويسمىٰ، ويحلق رأسه. (سنن الترمذی، باب من العقيقة، النسخة الهندية ١/ ٢٧٨، دار السلام رقم: ١٥٢٢، مسند البزار، مكتبه العلوم و الحكم ١٠/ ٤٤٠، رقم: ٤٥٩٥، المعجم الكبير للطبرانی، دار إحياء التراث العربی ٦/ ٢٧٤ رقم: ٦٢٠١)

اب اگر جوان ہونے تک عقیقہ نہیں کیا ہے اور اب کرنا چاہتے ہیں تو بال بھی ساتھ ساتھ منڈوانا مسنون رہے گا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ رشوال المکرّم ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۲۸۷)

بچہ کا عقیقہ کب کریں؟

سـوال [۱۰۱۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بچہ کا عقیقہ کرنا مستحب ہے لیکن حالت طفولیت میں بچہ کا عقیقہ ہوسکتا ہے یا بعد

البلوغ جب چاہیں والدین اپنے بچہ کا عقیقہ کر سکتے ہیں؟

المستفتی: مہتمم مدرسہ خزینۃ العلوم ضلع مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عقیقہ پیدائش کے ساتویں روز مستحب ہے اگر نہ ہو سکے تو چودہویں روز، اگر نہ ہو سکے تو اکیسویں روز کر دینا چاہیے، اس سے تاخیر کرنا مستحب طریقہ کے خلاف ہے، تاہم اگر بالغ ہونے کے بعد کردے تب بھی والدین کے اوپر سے ذمہ داری ساقط ہو جائیگی، لیکن بلا عذر خلاف استحباب ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۲/۹۳، جدید زکریا ۱۰/۶۰، رسالہ عقیقہ ۱۰)

بعد بلوغ طاق سالوں کا خیال رکھے تو اچھا ہے۔

عن سمرة قال: قال رسول الله ﷺ: الغلام مرتهن بعقيقة يذبح عنه يوم السابع، ويسمى، ويحلق رأسه ...... والعمل على هذا عند أهل العلم يستحبون أن يذبح عن الغلام العقيقة يوم السابع فإن لم يتهيأ يوم السابع فيوم الرابع عشر فإن لم يتهيأ عق عنه يوم حاد و عشرين. (سنن الترمذی باب من العقيقة النسخة الهندية ۱/۲۷۸، دار السلام رقم: ۱۵۲۲، فتح الباری، باب إماطة الأذىٰ عن الصبی فی العقيقة، دار الفكر ۹/۵۹٤، اشرفيه ۹/۷٤۲، تحت رقم الحديث: ۵٤۷۱، عمدة القاری، دار إحياء التراث العربی ۲۱/۸۸، زكريا ۱٤/٤٦۹) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍محرم الحرام ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۰۴۷)

کیا پانچویں دن عقیقہ کرنے سے سنت ادا ہو جائے گی؟

سوال [۱۰۱۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عقیقہ ساتویں دن کرنا سنت ہے، مثلاً اگر بچہ جمعرات کو پیدا ہوا تو عقیقہ بدھ کو

کرنا چاہیے، لیکن اگر ہم کسی مجبوری کی بنا پر بجائے بدھ کے اتوار کو کریں تو کیا شرعاً اس کی اجازت ہے، سنت کا ثواب ملے گا؟

المستفتی: حامد علی سنبھلی گیٹ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اتوار کو کرنے سے عقیقہ تو ہو جائے گا مگر وقت کی سنت یہی ہے کہ بدھ ہی کے دن کیا جائے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر بدھ یعنی ساتویں دن کو نہ کر سکے تو چودھویں کو، اس دن نہ کر سکے تو اکیسویں کو کرنا چاہئے، اور جمعرات کو پیدا ہونے کی صورت میں ۷/۱۴/۲۱/ دن بدھ ہی کا پڑیگا، اس لیے سنت بدھ ہی کو ہوگی، اتوار کو نہیں۔

عن سمرة قال: قال رسول الله ﷺ: الغلام مرتهن بعقيقة يذبح عنه يوم السابع، ويسمى، ويحلق رأسه ...... والعمل على هذا عند أهل العلم يستحبون أن يذبح عن الغلام العقيقة يوم السابع فإن لم يتهيأ يوم السابع فيوم الرابع عشر فإن لم يتهيأ عق عنه يوم حاد و عشرين. (سنن الترمذى باب من العقيقة النسخة الهندية ۱/۲۷۸، دار السلام رقم: ۱۵۲۲، فتح البارى، باب إماطة الأذىٰ عن الصبى فى العقيقة، دار الفكر ۹/۵۹۴، اشرفيه ۹/۷۴۲، تحت رقم الحديث: ۵۴۷۱، عمدة القارى، دار إحياء التراث العربى ۲۱/۸۸، زكريا ۱۴/۴۶۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ صفر المظفر ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۶۳۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۲/۱۵ھ

تاریخ پیدائش یاد نہ ہو تو عقیقہ کب کریں؟

سوال [۱۰۱۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عقیقہ کے بارے میں ساتویں دن کا لحاظ رکھنے کا حکم ہے لیکن اگر تاریخ پیدائش نہ یاد ہو تو کیا کرے؟

المستفتی: عنایت اللہ گودھنا سدھولی، سیتا پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عقیقہ ساتویں روز ہی مسنون ہے، اور اگر یہ نہ ہوسکے تو تو چودھویں روز، یہ نہ ہو تو اکیسویں روز کا حساب لگا کر اس طرح کر سکتے ہیں تو بہتر ہے اور اگر حساب لگانا دشوار ہے تو کیف ما اتفق کر دینا بھی جائز ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۲/۹۲، جدید زکریا ۱۰/۶۰)

عن سمرة قال: قال رسول الله ﷺ: الغلام مرتهن بعقيقة يذبح عنه يوم السابع، ويسمى، ويحلق رأسه ...... والعمل على هذا عند أهل العلم يستحبون أن يذبح عن الغلام العقيقة يوم السابع فإن لم يتهيأ يوم السابع فيوم الرابع عشر فإن لم يتهيأ عق عنه يوم حاد و عشرين. (سنن الترمذی باب من العقيقة النسخة الهندية ۱/۲۷۸، دار السلام رقم: ۱۵۲۲، فتح الباری، باب إماطة الأذیٰ عن الصبی فی العقيقة، دار الفكر ۹/۵۹٤، اشرفيه ۹/۷٤۲، تحت رقم الحديث: ۵٤۷۱، عمدة القاری، دار إحياء التراث العربی ۲۱/۸۸، زكريا ۱٤/٤٦۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ رمحرم الحرام ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/۳۰۰۰)

عقیقہ کون کرے؟

سوال [۱۰۱۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عقیقہ کرنا کیسا ہے؟ اور کس کو کرنا چاہیے؟

المستفتی: انور جمال محلّہ بھٹی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بچہ یا بچی کی پیدائش پر شکرانہ کے طور پر عقیقہ کرنا مستحب اور مسنون ہے، اور عقیقہ میں اگر ماں باپ سرمایہ دار ہوں تو لڑکے کی طرف سے دو بکرے یا دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکرا یا ایک بکری ذبح کرنے کا حکم ہے، اور اگر

ماں باپ سرمایہ دار نہ ہوں تو لڑکے کی طرف سے اور لڑکی کی طرف سے صرف ایک بکرا یا ایک بکری بھی عقیقہ میں درست ہے۔

والعقيقة في الاصطلاح: ما يذكى عن المولود شكرا لله تعالىٰ بنيته وشرائط مخصوصة. (مرقات، امداد ملتان ۷٤/۸، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۷٦/۳۰)

وقالوا: باستحباب العقيقة. (اعلاء النسنن، باب العقيقة كراچی ۱۱۳/۱۷، دار الكتب العلمية بيروت ۱۲٦/۱۷)

عن أم كرز قالت: سمعت النبي ﷺ يقول: عن الغلام شاتان مكافئتان و عن الجارية شاة. (ترمذی، باب ماجاء في العقيقة، النسخة الهندية ۲۷۸/۱، دار السلام رقم: ۱۵۱۳، سنن الدارمي، دار المغني ۱۲۵۱/۲، رقم: ۲۰۱۱)

وأما الغلام فيحتمل أن يكون أقل الندب في حقه عقيقة واحدة، وكماله ثنتان والحديث يحتمل أنه لبيان الجواز في الاكتفاء بالأقل. (مرقات، باب العقيقة، امداديه ملتان ۱۵۸/۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ ذی الحجہ ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۵۵۳)

اپنا عقیقہ خود کرنا

سوال [۱۰۱۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گذارش یہ ہے کہ میں اپنا عقیقہ کرنا چاہتی ہوں، اور مجھے اپنی پیدائش کا دن معلوم نہیں ہے، کیونکہ میرے والدین حیات نہیں ہیں، آپ مجھے براہ کرم یہ مشورہ دیجئے کہ میں اپنا عقیقہ کس دن کرسکتی ہوں، اس سلسلے میں حدیث کیا ہے؟ آپ کی اس ذرہ نوازی کی بیحد مشکور ہوں گی آپ کی بہت بہت مہربانی ہوگی۔

المستفتیہ: روشن جہاں بنت محمد ناصر مرحوم محلہ بھٹی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر آپ اپنا عقیقہ خود کرنا چاہتی ہیں تو جب چاہیں جس دن چاہیں کرسکتی ہیں، البتہ پیدائش کے ساتویں سال کا اعتبار ولحاظ رکھ سکتی ہیں تو بہتر ہے، مثلاً ۲۱/ ۲۸/ ۳۵/ ۴۲/ ۴۹/ ۵۶، ان سالوں میں اگر اتفاق ہوجائے تو بہتر ورنہ کوئی ضروری نہیں ہے۔ (مستفاد: رسالہ عقیقہ ص:۱۰)

عن سمرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الغلام مرتهن بعقيقة يذبح عنه يوم السابع، ويسمى، ويحلق رأسه ...... والعمل على هذا عند أهل العلم يستحبون أن يذبح عن الغلام العقيقة يوم السابع فإن لم يتهيأ يوم السابع فيوم الرابع عشر فإن لم يتهيأ عق عنه يوم حاد و عشرين. (سنن الترمذی باب من العقيقة النسخة الهندية ۱/ ۲۷۸، دار السلام رقم: ۱۵۲۲، فتح الباری، باب إماطة الأذیٰ عن الصبی فی العقيقة، دار الفكر ۹/ ۵۹٤، اشرفيه ۹/ ۷٤۲، تحت رقم الحديث: ۵٤۷۱، عمدة القاری، دار إحياء التراث العربی ۲۱/ ۸۸، زكريا ۱٤/ ٤٦۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۰۵۰)

کیا شوہر بیوی کا عقیقہ کرسکتا ہے؟

سوال [۱۰۱۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک لڑکی کی شادی کی بات چیت ہوگئی اور اس لڑکی کا عقیقہ اس کے ماں باپ کسی مجبوری کے تحت یا بے خیالی میں نہیں کرسکے، پھر لڑکی نے اپنے شوہر سے کہا۔

تو اب سوال یہ ہے کہ کیا بغیر عقیقہ کیے ہوئے اس لڑکی کے نام پر قربانی درست ہے یا نہیں؟ اور کیا بیوی کا عقیقہ اس کا شوہر کرواسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبد القیوم ٹھٹھیرہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عقیقہ کی ذمہ داری بہر حال ماں باپ پر ہوتی ہے اور جس کا عقیقہ نہیں ہوا ہے اس کی طرف سے قربانی جائز ہو جاتی ہے، اگر شوہر اپنی خوشی سے چاہے تو بیوی کا عقیقہ کروا سکتا ہے، لیکن بہر حال یہ والدین کے ذمہ کی چیز تھی، اس لیے کہ اولاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت ہے اس کے شکریہ میں عقیقہ کا حکم ہے۔

لأن ذٰلک جهة التقرب بالشکر علی نعمة الولد. (شامی، کتاب الأضحية، زکریا ۹/۴۷۲، کراچی ۶/۳۲۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۲۴۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۱۲/۲ھ

عقیقہ کے جانور کی شرطیں

سوال [۱۰۱۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا عقیقہ کے بکرے کی وہی شرائط ہیں جو قربانی کے بکرے کی ہیں یعنی بکرا ایک سال کا ہونا لازم ہے، اسی طرح گائے یا بھینس ۲؍سال کی ہونی لازم ہے، یا پھر بکرا ایک سال سے کم اور گائے وغیرہ ۲؍سال سے کم بھی درست ہے؟

المستفتی: محمد سلمان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عقیقہ کے جانور میں بھی وہی شرائط ہیں جو قربانی کے جانور میں ہیں۔

وفيه دليل لقول الجمهور: لايجزئ في العقيقة إلا ما يجزئ في الأضحية فلا يجزئ فيه ما دون الجزعة من الضأن و دون الثنية من المعز ولايجزئ فيه إلا السليم من العيوب لأنه ﷺ سماه نسكا فلا يجزئ فيه إلا ما يجزئ في النسک.

(اعلاء السنن، باب أفضلية ذبح الشاة فی العقيقة، دار الكتب العلمية بيروت ۱۷/ ۱۳۰)

وقالوا: لايجزئ فی العقيقة من الشاة إلا مايجزئ فی الأضحية. (سنن الترمذی، باب من العقيقة، النسخة الهندية ۱/ ۲۷۸، رقم: ۱۵۲۲) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۲۵/ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۷۱۴)

عقیقہ میں کون کون سے جانور ذبح کیے جاسکتے ہیں؟

سوال [۱۰۱۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عقیقہ میں کون کون سے جانور ذبح کیے جاسکتے ہیں؟

المستفتی: محمد یونس، سرائے ترین سنبھل مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بکرے اور اس سے بڑے جانور عقیقہ میں کرسکتے ہیں اور ایک بکرا ایک بچہ سے زائد کی طرف سے جائز نہیں بلکہ ایک بچہ کی طرف سے کم ازکم ایک بکرا یا بڑے جانور میں سے ساتواں حصہ ہونا لازم ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ص: ۱۳۵، فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۶/ ۱۷۸، جدید زکریا مطول ۱۰/ ۶۳، امداد الفتاویٰ ۳/ ۶۲۰)

عن أم كرز قالت: سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم يقول: عن الغلام شاتان مكافئتان و عن الجارية شاة. (ترمذی، باب ماجاء فی العقيقة، النسخة الهندية ۱/ ۲۷۸، دار السلام رقم: ۱۵۱۳، سنن الدارمی، دار المغنی ۲/ ۱۲۵۱، رقم: ۲۰۱۱)

وقالوا: لايجزئ فی العقيقة من الشاة إلا مايجزئ فی الأضحية. (سنن الترمذی، باب من العقيقة النسخة الهندية ۱/ ۲۷۸ دار السلام رقم: ۱۵۲۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۳۲۰۰)

شراء کے وقت کی نیت معتبر ہے نہ کہ ذبح کے وقت کی

سوال [۱۰۱۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید وعمر دو سگے بھائی ہیں، زید نے اپنے بچہ بکر کے عقیقہ کے لیے سال بھر سے ایک خصی پال رکھا تھا اور عمر نے اپنے بچے صفی کے لیے ایک خصی خریدا، دونوں بچوں کا عقیقہ ایک ہی دن ہونا طے پایا، کیونکہ زید وعمر دونوں بھائی ایک ہی میں ہیں، امام مسجد نے دونوں خصیوں کو ذبح کیا، ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ دونوں خصی دو بچوں کے لیے الگ الگ ذبح کرنا ہے اور نہ انہوں نے وارث سے معلوم ہی کیا اس لیے دونوں خصی کو صفی کے حق میں ہی ذبح کردیا، ایسی صورت میں شریعت محمدی کی تعلیم کی روشنی میں دونوں بچوں کا عقیقہ ہوگیا یا محض صفی کا عقیقہ ہوا، جس کے حق میں دونوں خصی ذبح ہوگئے؟

المستفتی: محمد ادریس جونیر ہائی اسکول بدھوچا گھاٹ ضلع دیوریا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب زید نے اپنے بچہ کے لیے پال رکھا تھا اور عمر نے اپنے بچہ کے لیے علیحدہ عقیقہ کی نیت سے خریدا تو دونوں بچوں کی طرف سے عقیقہ صحیح ہوگیا کیونکہ بوقت ذبح نیت یا الفاظ کا اعتبار نہیں بلکہ بوقت شراء کا اعتبار ہے۔

وأما الضحايا فلابد فيها من النية لكنه عند الشراء لا عند الذبح . (الأشباه والنظائر قديم ٤٠، وهكذا في الهندية زكريا جديد ٥/ ٣٤٠، قديم ٥/ ٢٩٤، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ١٧٥، مصري قديم ٢/ ٥٢١)

عقیقہ وقربانی کا حکم یکساں ہے۔

لايجزئ في العقيقة إلا ما يجزئ في الأضحية. (إعلاء السنن، دار الكتب العلمية بيروت ١٧/ ١٣٠، كراچی ١٧/ ١١٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍صفر المظفر ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۵۰۵)

کیا عقیقہ کا جانور خریدنے سے متعین ہوجاتا ہے؟

سوال [۱۰۱۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے اپنے دو بچوں کے عقیقہ کی نیت سے ایک جانور خریدا ۱۵۰۰سو روپیہ کا، حسن اتفاق، بھینس گابھن نکلی، زید نے اس کو عقیقہ میں کاٹنے سے روک لیا کچھ دنوں بعد وہ بھینس مریض ہوگئی یہاں تک کہ وہ مرنے کے قریب ہوگئی، لیکن زید نے اس کا علاج کرایا، وہ بھینس صحیح ہوگئی، کچھ فربہ ہونے کے بعد زید نے اس کو ۲۴۰۰ سو روپیہ کی فروخت کردی، تو معلوم یہ کرنا ہے کہ اب زید کتنی رقم کی بھینس خریدیگا، اس قیمت کی جس کی اس نے خریدی تھی، یا اس قیمت کی جس کی اس نے فروخت کی ہے؟

المستفتی: محمد طالب ٹانڈہ رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: عقیقہ زیادہ سے زیادہ مسنون یا مستحب ہے، لازم وواجب نہیں، نیز عقیقہ کی نیت سے خریدا ہوا جانور متعین نہیں ہوجاتا، لہٰذا زید نے اگر مذکورہ عذر کی بناء پر بھینس کو فروخت کردیا تو بعد میں پندرہ سو سے زائد یا کم میں جانور خرید کر عقیقہ کرسکتے ہیں، قیمت خرید یا قیمت فروخت کے مطابق جانور خریدنا لازم نہیں۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ۱۱/۳۵۰، جدید ڈابھیل ۱۷/۵۲۹)

العقيقة ...... مباحة لا سنة ولا واجبة ...... هذا يشير إلى الإباحة فيمنع كونها سنة. (عالمگیری، کتاب الکراهية، الباب الثاني والعشرون، زكريا قديم ٥/٣٦٢، جديد ٥/٤١٨، شامي زكريا ٩/٤٧٢، كراچی ٦/٣٢٦، اعلاء السنن، دار الكتب العلمية بيروت ١٧/١٢٦، كراچی ١٧/١١٣، رقم: ٥٥١٣، حاشية ترمذی ١/٢٢٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۷۰۱۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱/۸ھ

کسی عذر کی بناء پر عقیقہ کے جانور کو بیچنا

سوال [۱۰۱۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: احقر نے اپنے لڑکے کے لیے عقیقہ کا بکرا خریدا اور عقیقہ کی تاریخ متعین بھی ہوگئی عقیقہ سے پہلے یعنی تین یوم قبل میری رشتہ داری میں ایک صاحب کا انتقال ہوگیا، دوسرے دن دوسرے رشتہ دار کا انتقال ہوگیا، ایک ساتھ دو اموات ہوگئیں تو میں نے عقیقہ ملتوی کردیا، اور جو عقیقہ کا بکرا ہے اس کو بیچ دیا، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ اس رقم کو اپنے کام میں لا سکتے ہیں یا نہیں؟ یا وہ روپیہ الگ رکھنا پڑے گا؟

المستفتی: محمد انصار تحصیل اسکول مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عقیقہ کے لیے خریدے ہوئے جانور کو بیچنا اوران پیسوں کا استعمال جائز ہے، لیکن عقیقہ ساتویں دن یا اکیسویں دن کرنا افضل ہے، ان میں نہ کرسکے تو ان کے بعد جتنی جلدی کیا جائے تو بہتر ہے، لہٰذا جب بکرا موجود ہے تو فوراً عقیقہ کردینا بہتر ہے۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ۱۱/ ۳۴۶، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۵۰۸)

ویستحب لمن ولد له ولد أن یسمیه یوم أسبوعه ...... ثم یعق عند الحلق عقیقة إباحة. (شامی، کتاب الأضحیة، زکریا ۹/ ۴۸۵، کراچی ۶/ ۳۳۶، کوئٹه ۵/ ۲۲۸، اعلاء السنن، کراچی ۱۷/ ۱۱۳، دار الکتب العلمیة بیروت ۱۷/ ۱۲۶)

العقیقة عن الغلام و عن الجاریة وهی ذبح شاة فی سابع الولادة وضیافة الناس و حلق شعره مباحة لا سنة و لا واجبة. (عالمگیری، کتاب الکراهیة الباب الثانی والعشرون، زکریا قدیم ۵/ ۳۶۲، جدید ۵/ ۴۱۸) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۷۵۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/ ۴/ ۱۴۱۷ھ

ایک بھینس میں سات عقیقہ کرنا

سوال [۱۰۱۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں تین بچوں کا باقاعدہ عقیقہ کررہا ہوں جس میں ایک لڑکا اور دو لڑکی ہیں، مشورہ دیں کہ میں ایک بھینس لاکر عقیقہ کرسکتا ہوں، اگر کرسکتا ہوں تو کتنے بچوں تک ایک بھینس میں جائز ہے، اور جانور کیسا ہونا چاہیے؟

المستفتی: طاہر حسین محلّہ مقبرہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عقیقہ کے جانور میں وہی شرائط ہیں جو قربانی میں ہیں، ایک بھینس میں سات حصے ہوں گے، ہر لڑکے کی طرف سے دو دو حصے اور ہر لڑکی کی طرف سے ایک ایک حصہ دیا جاسکتا ہے، اگر زیادہ حصہ دیدیں تو مضائقہ نہیں، اگر استطاعت نہ ہو تو لڑکے کے لیے ایک ایک حصہ بھی درست ہے۔

وفيه دليل لقول الجمهور: لايجزئ في العقيقة إلا ما يجزئ في الأضحية فلا يجزئ فيه ما دون الجزعة من الضأن و دون الثنية من المعز ولايجزى فيه إلا السليم من العيوب لأنه سماه نسكا فلا يجزئ فيه إلا ما يجزئ في النسك. (اعلاء السنن، باب أفضلية ذبح الشاة في العقيقة، دار الكتب العلمية بيروت ۱۷/۱۳۰، كراچی ۱۷/۱۱٦، تحت رقم الحديث ٥٥١٤، سنن الترمذی باب من العقيقة النسخة الهندية ۱/۲۷۸، دار السلام رقم: ۱۵۲۲) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۴۸۷)

قربانی کے علاوہ دنوں میں عقیقہ کا حکم

سوال [۱۰۱۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ غیر قربانی کے دنوں میں بھی گائے بھینس میں عقیقہ کے حصہ لگائے جاسکتے ہیں، مثلاً دولڑ کے تین لڑکیوں کا عقیقہ کرنا ہے تو ایک بھینس میں حصہ لگا کر یہ سنت ادا کی جاسکتی ہے؟

المستفتی: محمد زاہد پیرزادہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیر قربانی کے دنوں میں بھی ایک گائے یا بھینس میں سات حصہ عقیقہ کے واسطے کیے جاسکتے ہیں، ۲؍لڑکوں کے لیے چار سہام اور تین لڑکیوں کے لیے تین سہام ۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ ۶/ ۱۷۹، جدید زکریا ۱۰/ ۶۳، امداد الفتاویٰ ۳/ ۶۲۰، رسالہ عقیقہ ص: ۳۰، فتاویٰ محمودیہ قدیم ۴/ ۳۲۶، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۵۲۲)

الجمهور على أجزاء الإبل والبقر أيضا وفيه حديث عند الطبرانى و أبى الشيخ عن أنس رضي الله عنه رفعه يعق عنه من الإبل والبقر (الى قوله) انها تتأدى بالسبع كما فى الأضحية. (فتح البارى، باب إماطة الأذىٰ عن الصبى فى العقيقة، اشرفيه ديوبند ۹/ ۷٤۰، دار الفكر ۹/ ۵۱۲، تحت رقم الحديث ۵٤۷۲) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۴۳۹)

غیر مستطیع شخص کا کٹرہ میں یا شادی میں کئی بچیوں کا عقیقہ

سوال [۱۰۱۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) ہماری مالی حیثیت اتنی نہیں ہے جو ہم اپنے گھر کے سب بچوں کے عقیقے کر سکیں، موجودہ بچے ۵؍ ہیں؟

۲؍ بچوں کا انتقال ہوگیا، کل میزان سات بچے ہیں، اور میں خود اپنا عقیقہ کروں گا، قربانی کے ایک کٹرہ میں ۷؍ حصے ہوتے ہیں وہ عیدالاضحیٰ پر ہی ادا کرسکتے ہیں؟ یا اس کے علاوہ کسی مہینے میں بھی کرسکتے ہیں، موجودہ اولاد میں دولڑکے تین لڑکیاں ہیں؟

(۲) لڑکی کی شادی کی رخصتی میں عقیقہ کردیں تو جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ابراہیم سیدھی سرائے مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) ایک کٹرہ پانچوں کی طرف سے جائز ہے، دونوں لڑکوں کی طرف سے ۲-۲ حصے اور تینوں لڑکیوں کی طرف سے ایک ایک حصہ، کل میزان سات حصے۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۶/ ۱۷۹، جدید زکریا ۱۰/ ۶۳، امداد الفتاویٰ ۳/ ۶۲۰، رسالہ عقیقہ ۳۰، فتاویٰ محمودیہ قدیم ۴/ ۳۲۶، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۵۲۴)

الجمهور على أجزاء الإبل والبقر أيضا وفيه حديث عند الطبراني و أبي الشيخ عن أنسؓ رفعه يعق عنه من الإبل والبقر (الى قوله) انها تتأدى بالسبع كما في الأضحية. (فتح الباری، باب إماطة الأذىٰ عن الصبی فی العقيقة، اشرفیہ دیوبند ۹/ ۷٤٠، دار الفکر ۹/ ۵۱۲، تحت رقم الحديث ۵٤۷۲)

(۲) اگر آپ کو یقین ہے کہ آپ کا عقیقہ نہیں ہوا ہے تو مذکورہ جانور میں سے ایک یا دو حصے آپ اپنے نام بھی کر سکتے ہیں، اور بقیہ بچوں کے لیے ہو جائے گا۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۶/ ۱۷۸، جدید زکریا ۱۰/ ۶۳)

(۳) یہ سمجھنا کہ قربانی کے علاوہ دنوں میں بڑا جانور عقیقہ کے لیے نہیں چل سکتا صحیح نہیں ہے، غلط ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۶/ ۱۷۹، جدید زکریا ۱۰/ ۶۳)

(۴) اگر آپ مجبور ہیں تو شادی کی رخصتی میں بھی عقیقہ کر سکتے ہیں۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ جدید زکریا ۱۰/ ۶۱)

مرحوم بچوں کے لیے عقیقہ ثابت نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۶/ ۱۷۳، جدید ۱۰/ ۶۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۲/ ۲۶۶)

ولیمہ کے لیے لائے گئے جانور میں عقیقہ کی نیت کرنا

سوال [۱۰۱۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے لڑکے کی شادی ہے، ولیمہ کے لیے زید نے ایک بھینس ذبح کی، زید کے دو چھوٹے بچے ہیں، زید ایک بھینس میں اپنے دو چھوٹے لڑکوں کا عقیقہ کرنا چاہتا ہے کیا ایک بھینس میں دو لڑکوں کا عقیقہ ہوسکتا ہے؟

المستفتی: عبد الرشید سیڈ ہا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ایک بھینس میں دو بچوں کا عقیقہ کرنا درست ہے ایک کی طرف سے چار اور ایک کی طرف سے تین حصے کی نیت کرلی جائے اور عقیقہ کا گوشت ولیمہ میں بھی کھلانا جائز اور درست ہے۔

لو كانت البدنة أو البقرة بين إثنين فضحيا بها اختلف المشائخ فيه والمختار أنه يجوز. (هنديه، الباب الثامن فيما يتعلق بالشركة فى الضحايا، زكريا قديم ۳۰۵/۵، جديد ۳۵۲/۵)

العقيقة بمنزلة النسك والضحايا. (تحفة المودود بأحكام المولود ص: ٦٤ بحواله فتاوىٰ محموديه ڈابهيل ۵۱۳/۱۷)

ويطعم من شاء من غني وفقير. (مجمع الأنهر، كتاب الأضحية، دار الكتب العلمية بيروت ۱۷۳/٤، مصرى قديم ۵۲۰/۲، هنديه زكريا قديم ۳۰۰/۵، جديد ۳٤٦/۵، حاشية الطحطاوى على الدر كوئٹه ١٦٦/٤) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۲۳ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۳۶۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۴/۲۳ھ

ولیمہ کے ساتھ عقیقہ کرنا

سوال [۱۰۱۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ولیمہ کے ساتھ عقیقہ کرنا کیسا ہے؟ نیز نئے گھر کے افتتاح کے ساتھ بچوں کا عقیقہ کرنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: شمیم احمد کرناٹک

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عقیقہ کے گوشت سے ولیمہ کھلانا جائز اور درست ہے اسی طرح سے عقیقہ کے گوشت سے نئے گھر کی دعوت کھلانا بھی جائز ہے۔

ولم يذكر الوليمة وينبغي أن تجوز لأنها تقام شكرا لله تعالىٰ على نعمة النكاح ووردت بها السنة. (در مختار مع الشامی، کتاب الأضحية، زکریا ۹/ ۴۷۲، کراچی ۶/ ۳۲۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۲؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۸ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۳۲۵)	۱۴۲۸/۶/۲ھ

ایام قربانی کے علاوہ ایک بڑے جانور میں چند بچوں کا عقیقہ

سوال [۱۰۱۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایام قربانی کے علاوہ حصے والے جانوروں میں عقیقہ کر سکتے ہیں یا نہیں؟ مثلاً ایام قربانی کے علاوہ گائے بھینس وغیرہ میں عقیقہ کر سکتے ہیں، تو اس کی صورت کیا ہوگی؟ مثلاً میرے چند بچے ہیں اور عقیقہ کرنا چاہتا ہوں، تو سب کے لیے ایک ہی گائے کر دوں شریعت کے رو سے مع حوالہ تحریر کر دیں۔

المستفتی: شہادت حسین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایام قربانی کے علاوہ بھی بڑے جانور گائے بھینس وغیرہ میں حصہ لینا جائز ہے، لیکن اگر بڑا جانور ایک ہی بچے کی طرف سے ہوتو پورا جانور عقیقہ میں ذبح کرنا لازم ہے اور اگر متعدد بچوں کی طرف سے کریں تو ان کے حصوں کا حساب لگالیا جائے، کہ سات حصے سے زائد نہ ہوں، پورا جانور عقیقہ میں ذبح کردیا جائے۔

(مستفاد: مسائل قربانی ۵۵،محمودیہ قدیم ۱۷/ ۲۶۵، ڈابھیل ۱۷/ ۵۲۲، امداد الفتاویٰ ۳/ ۶۲۱)

والجمهور على أجزاء الإبل والبقر أيضا وذكر الرافعي بحثا أنها تتأدى بالسبع كما في الأضحية. (فتح الباري، باب إماطة الأذىٰ عن الصبي في العقيقة، اشرفيه ديوبند ۹/ ۷٤۰، دار الفكر ۹/ ۵۱۲، تحت رقم الحديث ۵٤۷۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰ر شعبان ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۸۸۱)

بڑے جانور میں ایک ساتھ دولڑکیوں کا عقیقہ کرنا

سوال [۱۰۱۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص کی دولڑکیاں ہیں، ایک کی عمر تین سال ہے اور دوسری کی عمر ایک سال ہے، اور وہ دونوں لڑکیوں کا عقیقہ ایک ساتھ کرنا چاہتا ہے اور عقیقہ میں دونوں لڑکیوں کی طرف سے ایک کٹرہ ذبح کرنا چاہتا ہے، اور ایک کٹرہ میں سات حصے ہوتے ہیں اور عقیقہ دو لڑکیوں کا ہورہا ہے، کیا یہ عقیقہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور یہ عقیقے عید الاضحیٰ کے علاوہ کرنا چاہتا ہے، اسی طرح ان لڑکیوں کے باپ کا عقیقہ نہیں ہوا ہے تو کیا ان لڑکیوں کا عقیقہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبد اللطیف لال باغ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس طرح ایام قربانی میں بڑے جانور میں عقیقہ کا

حصہ لینا جائز ہے، اسی طرح ایام قربانی کے علاوہ دوسرے ایام میں بڑے جانور سے عقیقہ کرنا جائز ہے، چاہے پورا جانور ایک بچہ کی طرف سے ذبح کیا جائے یا متعدد بچوں کی طرف سے۔

لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ پورا جانور عقیقہ کے لیے ہی ذبح کیا جائے اور کوئی حصہ فروخت نہ کیا جائے، اس کی شکل یہ ہے کہ ایک لڑکی کی طرف سے چار حصے اور دوسری لڑکی کی طرف سے تین حصے مان لیے جائیں، اور لڑکیوں کا عقیقہ کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ پہلے ان کے والد کا عقیقہ کیا جائے، چاہے ان کے والد کا عقیقہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، لڑکیوں کا عقیقہ کرنا بلاتردد جائز اور درست ہے۔ (مستفاد: مسائل قربانی وعقیقہ ص:۵۴-۵۵)

الجمهور علي أجزاء الإبل والبقر أيضا وفيه حديث عند الطبراني و أبي الشيخ عن أنس رضي الله عنه رفعه يعق عنه من الإبل والبقر (الى قوله) انها تتأدى بالسبع كما في الأضحية. (فتح الباري، باب إماطة الأذىٰ عن الصبي في العقيقة، اشرفيه ديوبند ۹/ ۷٤٠، دار الفكر ۹/ ۵۱۲، تحت رقم الحديث ۵٤۷۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ربیع الاول ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۱۹۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۳/۱ھ

عقیقہ میں لڑکے کی طرف سے دو اور لڑکی کی طرف سے ایک حصہ

سوال [۱۰۱۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تین لڑکیوں اور دو لڑکوں کا عقیقہ کرنا ہے، تو کتنے حصے ہر ایک کے لیے بھینس وغیرہ میں کریں؟

المستفتی: عبد الجلیل لال مسجد مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہر ایک لڑکی کی طرف سے ایک ایک حصہ اور ہر ایک لڑکے کی طرف سے دو دو حصے عقیقہ میں کر دیئے جائیں، تو جائز اور درست ہو جائے گا۔

(مستفاد: ایضاح المسائل ص:۱۳۵، امداد الفتاویٰ ۳/ ۶۲۰)

الجمهور علي أجزاء الإبل والبقر أيضا وفيه حديث عند الطبراني و أبي الشيخ عن أنسؓ رفعه يعق عنه من الإبل والبقر (الى قوله) انها تتأدى بالسبع كما في الأضحية. (فتح الباری، باب إماطة الأذیٰ عن الصبی فی العقیقة، اشرفیه دیوبند ۹/۷۴۰، دار الفکر ۹/۵۱۲، تحت رقم الحديث ۵۴۷۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍شوال المکرّم ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶۵۱/۳۱)

عقیقہ کے گوشت کا حکم

سوال [۱۰۱۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کسی شخص نے اپنے بچے کا عقیقہ کیا تو وہ شخص اس گوشت کو کھا سکتا ہے یا نہیں اگر کھا سکتا ہے تو کون کون کھا سکتا ہے اور کون کون نہیں کھا سکتا؟

المستفتی: قسمت علی بردوانی ضلع بردوان بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: عقیقہ کا گوشت بھی قربانی کے گوشت کی طرح ہے، لہٰذا عقیقہ کا گوشت خود کھانا اور اعزاء واقارب کو کھلانا اور فقیروں میں تقسیم کرنا جائز اور درست ہے، اور سارا گوشت اپنے لیے بھی رکھنا درست ہے۔

يصنع بالعقيقة مايصنع بالأضحية (الى قوله) وفي قوله يأكل أهل العقيقة ويهدونها دليل على بطلان ما اشتهر على الألسن، أن أصول المولود لايأكلون منها فإن أهل العقيقة هم الأبوان أولا ثم سائر أهل البيت.

(إعلاء السنن، قبيل باب ما يقول الذابح عند الذبح، كراچی ۱۷/۱۲۷، دار الكتب العلمية بيروت ۱۷/۱۴۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۲۹۴/۳۸)

کیا عقیقہ کا گوشت دادا، دادی اور ماں، باپ نہیں کھا سکتے؟

سوال [۱۰۱۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عقیقہ کا گوشت دادا، دادی اور ماں باپ نہیں کھا سکتے اوران کے لیے الگ سے عقیقہ کے دن کھانا پکواتے ہیں تو کیا یہ شرعاً درست ہے، نیز عقیقہ کا گوشت کون کون لوگ کھا سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد فرقان خوشحال گنج لکھنؤ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بعض لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ عقیقہ کا گوشت دادا، دادی اور ماں باپ نہیں کھا سکتے، عقیقہ کا گوشت سب لوگ کھا سکتے ہیں، لہٰذا ان کے لیے عقیقہ کے دن الگ سے کھانا پکوانے کی ضرورت بھی نہیں ہے، البتہ مستحب طریقہ یہ ہے کہ گوشت کے تین حصے کیے جائیں جیسا کہ قربانی کے گوشت میں کیا جاتا ہے، کہ ایک حصہ گھر والوں کے لیے اور ایک حصہ رشتہ داروں اور دوست احباب کو ایک حصہ غرباء کو دیا جائے۔
(مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۸/۲۶۳، جدید زکریا مطول ۱۲/ ۱۵۷، رحیمیہ قدیم ۹/۳۱۹، جدید ۱۰/ ۶۵)

والأفضل أن يتصدق بالثلث و يتخذ الثلث ضيافة لأقربائه و أصدقائه ويدخر الثلث. (شامی، کتاب الأضحية، زكريا ۹/ ٤٧٤، کراچی ٦/ ٣٢٨، بدائع الصنائع زكريا ٤/ ٢٢٤، كراچی ٥/ ٨، هنديه زكريا قديم ٥/ ٣٠٠، جديد ٥/ ٣٤٦، الموسوعة الفقهية الكويتية ٥/ ١٠٢، ٣٥/ ٢٠١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۵۹۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰/ ۴/ ۱۴۲۱ھ

عقیقہ میں گوشت پکا کر کھلانے کا حکم

سوال [۱۰۱۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: عقیقہ میں گوشت پکا کر کھلانا کسی حدیث سے ثابت ہوتو حدیث کو درج فرمادیں؟

المستفتی: محمد اسلم انصاری حکیم پورہ شکر گنج دھامپور بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عقیقہ کا ثبوت صحیح حدیث میں موجود ہے، حضرات فقہاء کرام صحیح حدیث سے استدلال کر کے عقیقہ کی سنیت کو ثابت کرتے ہیں، لیکن پکا کے کھلانے کی شرط حضرات فقہاء نہیں لگاتے ہیں بلکہ یہی کہتے ہیں کہ جو شرائط واحکام قربانی میں معتبر ہیں، وہ عقیقہ میں بھی، ’’ہر چہ در اضحیہ معتبر است از شرائط واحکام در عقیقہ نیز معتبر است‘‘۔ (اشعۃ اللمعات ۳/۴۸۰)

البتہ بعض آثار میں اتنا ملتا ہے کہ نمک کے پانی میں ابال کر پڑوسیوں میں تقسیم کریں۔

قال ابن جريج، تطبخ بماء و ملح أعضاء أو قال: آرابا ويهدى في الجيران والصديق ولايتصدق منها بشيئ. (مصنف عبد الرزاق، المجلس العلمي ٤/ ٣٣١ رقم: ٧٩٦٧)

عن سمرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الغلام مرتهن بعقيقة يذبح عنه يوم السابع، ويسمىٰ، ويحلق رأسه. (سنن الترمذي، باب من العقيقة، النسخة الهندية ١/٢٧٨، دار السلام رقم: ١٥٢٢، مسند البزار، مكتبه العلوم و الحكم ١٠/ ٤٤٠، رقم: ٤٥٩٥، المعجم الكبير، للطبراني دار احياء التراث العربي ٦/ ٤٧٤ رقم: ٦٢٠١) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ رشعبان المعظم ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/۱۹۰۴)

عقیقہ کا کھانا کون لوگ کھا سکتے ہیں؟

سوال [۱۰۱۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عقیقہ کے کھانے میں کیا اپنے دوسرے رشتہ داروں کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے، اور

کن کن لوگوں کو دعوت میں مدعو کیا جائے؟

المستفتی: محمد ساجد محلّہ سرائے مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عقیقہ کا کھانا خود کھانا رشتہ داروں کو کھلانا اور مالداروں اور غریبوں کو کھلانا جائز ہے اور درست ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۶/۱۷۲، جدید ۱۰/ ۶۱)

یصنع بالعقیقة مایصنع بالأضحیة (الی قوله) وفی قوله یأكل أهل العقیقة ویهدونها دلیل علی بطلان ما اشتهر علی الألسن، أن أصول المولود لایأكلون منها فإن أهل العقیقة هم الأبوان أولا ثم سائر أهل البیت.

(إعلاء السنن، قبیل باب ما یقول الذابح عند الذبح، کراچی ۱۷/ ۱۲۷، دار الکتب العلمیة بیروت ۱۷/ ۱٤۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍شوال المکرّم ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۸۴۵)

عقیقہ سے متعلق چند سوالات کے جوابات

سوال [۱۰۱۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) میری بیٹی کی عمر ۱۹؍سال ہے میں نے اس کی پیدائش کے بعد نامساعد حالات اور مسئلہ سے ناواقفیت کی بنا پر اس کا عقیقہ نہیں کیا تھا، میں اپنی بیٹی کا عقیقہ کرنا چاہتا ہوں، بعض احباب کا کہنا ہے کہ عقیقہ کا وقت پیدائش کے ۲۱؍دن بعد تک ہے اس کے بالمقابل بعض احباب کہتے ہیں کہ عمر بھر میں چاہے سات عدد کی رعایت کے ساتھ عقیقہ کر سکتے ہیں، اب دریافت یہ کرنا ہے کہ عقیقہ کی صحیح شرعی مدت کیا ہے؟ نیز بذات خود عقیقہ کی شرعی حیثیت کی تعیین کریں؟

(۲) عقیقہ کا گوشت کن لوگوں کو کھلانا چاہیے؟ اور اس کا مستحب طریقہ کیا ہے؟ کیا قربانی کی طرح اس کے گوشت کے بھی تین حصے کرنا افضل ہے؟ ہمارے یہاں عقیقے کے

گوشت سے احباب واعزاء کی ضیافت کرتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟

(۳) عقیقہ کے بعد نومولود بچہ کے سر کے بال کے وزن کے برابر چاندی صدقہ کرنا کیا حکم رکھتا ہے؟ ولیمہ کے جانور میں ایک حصہ عقیقہ کا رکھنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد اکرم خاں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) عقیقہ کرنا فی نفسہ مستحب ہے، اور عقیقہ میں ساتویں دن کی رعایت کرنا افضل ہے، اگر کسی عذر کی بنا پر ساتویں دن نہ ہو سکے تو چودھویں دن کر دیا جائے، اور اگر چودھویں دن نہ ہو سکے تو اکیسویں دن کر دیا جائے، اس کے بعد وقت کی سنیت ختم ہو جاتی ہے مگر عقیقہ کی سنیت باقی رہتی ہے، اب جب بھی موقع ہو یہ سنت ادا کی جائے، اب ۱۹؍سال کی عمر میں موقع ہوا ہے یا احساس ہوا ہے تو کسی بھی دن عقیقہ کر سکتے ہیں۔

عن سمرة قال: قال رسول الله ﷺ: الغلام مرتهن بعقيقة يذبح عنه يوم السابع، ويسمى، ويحلق رأسه ...... والعمل على هذا عند أهل العلم يستحبون أن يذبح عن الغلام العقيقة يوم السابع فإن لم يتهيأ يوم السابع فيوم الرابع عشر فإن لم يتهيأ عق عنه يوم حاد و عشرين. (سنن الترمذی باب من العقيقة النسخة الهندية ۱/۲۷۸، دار السلام رقم: ۱۵۲۲، فتح الباری، باب إماطة الأذیٰ عن الصبی فی العقيقة، دار الفكر ۹/۵۹۴، اشرفیه ۹/۷۴۲، تحت رقم الحديث: ۵۴۷۱، عمدة القاری، دار إحياء التراث العربی ۲۱/۸۸، زکریا ۱۴/۴۶۹)

عن قتادة عن عبد الله بن بريدة عن أبيه عن النبی ﷺ قال: العقيقة تذبح بسبع، ولأربع عشرة، ولإحدى عشرين . (السنن الكبریٰ للبيهقی، باب ما جاء فی وقت العقيقة و حلق الرأس والتسمية، دار الفكر ۱۴/۲۶۱ رقم: ۱۹۸۳۴)

الذبح يكون يوم السابع بعد الولادة إن تيسر، وإلا ففی اليوم الرابع عشر وإلا ففی اليوم الواحد والعشرين من يوم ولادته، فإن لم يتيسر ففی أی يوم من الأيام . (فقه السنة، دار الكتاب العربی ۴/۲۱۳)

ثم أن الترمذی أجاز بها إلی یوم أحد و عشرین، قلت: بل یجوز إلی أن یموت لما رأیت فی بعض الروایات أن النبی ﷺ: عق عن نفسه بنفسه . (فیض الباری کراچی ۴/۳۳۷)

(۲) عقیقہ کے گوشت کا حکم قربانی کے گوشت کی طرح ہے، اوراس میں بھی بہتر اور مستحب یہ ہے کہ اس کے گوشت کے تین حصے کر لیے جائیں ایک حصہ اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے، ایک حصہ اعزاء واقرباء کے لیے اور ایک حصہ فقراء میں تقسیم کرنے کے لیے اوراعزاء کی ضیافت کرکے انہیں عقیقہ کا گوشت کھلایا جاسکتا ہے اور اگر پورا پورا اپنے استعمال میں لے لے تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں ہے۔

یصنع بالعقیقة مایصنع بالأضحیة عن عطاء قال یأکلها أهل العقیقة ویهدونها . (إعلاء السنن، قبیل باب ما یقول الذابح عند الذبح، کراچی ۱۷/۱۲۷، دار الکتب العلمیة بیروت ۱۷/۱۴۰)

وأنه یستحب الأکل منها والإطعام والتصدق کما فی الأضحیة .

(اعلاء السنن کراچی ۱۷/۱۱۷، دار الکتب العلمیة بیروت ۱۷/۱۳۱)

والأفضل أن یتصدق بالثلث ویتخذ الثلث ضیافة لأقربائه وأصدقائه ضیافة ویدخر الثلث، ویستحب أن یأکل منها ولو حبس الکل لنفسه جاز .

(شامی، کتاب الأضحیة، زکریا ۹/ ۴۷۴، کراچی ۶/۳۲۸، بدائع الصنائع کراچی ۵/۸، زکریا ۴/۲۲۴، هندیه زکریا قدیم ۵/۳۰۰، جدید ۵/۲۴۶)

(۳) عقیقہ کے وقت نومولود کے سر کے بال مونڈ کر بالوں کے وزن کے برابر چاندی یااس کی قیمت صدقہ کرنا مستحب ہے۔

عن علی بن أبی طالب قال: عق رسول الله ﷺ عن الحسن بشاة وقال: یا فاطمة! احلقی رأسه، وتصدقی بزنة شعره فضة فوزنته فکان وزنه درهما أو بعض درهم، وفی روایة: ثم ولد حسین بعد ذٰلک فصنعت مثل ذٰلک . (سنن الترمذی، باب ما جاء فی العقیقة، النسخة الهندیة ۱/۲۷۸، دار السلام رقم:

١٥١٩، مسند أحمد بن حنبل ٣٩٢/٦ رقم: ٢٧٧٣٨)

ایسا کرنا درست ہے کہ بچہ کے عقیقہ کی نیت سے جانور ذبح کیا جائے اور اس کا گوشت ولیمہ میں کھلایا جائے، اور جانور کو بجائے ولیمہ کی نیت کے عقیقہ کی نیت سے ذبح کیا جائے، تو زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ عقیقہ کے جانور کا حکم قربانی کے جانور کی طرح ہے۔

ولو ذبح بدنة أو بقرة عن سبعة أولاد أو اشترک فيها جماعة جاز سواء أرادوا كلهم العقيقة أو أراد بعضهم العقيقة و بعضهم اللحم كما فى الأضحية.

(شرح المهذب، بحواله إعلاء السنن ٢٩/٨،دار الكتب العلمية بيروت ١٣٢/١٧)

قلت: مذهبنا فى الأضحية بطلانها بإرادة بعضهم اللحم فليكن كذلک فى العقيقة. (إعلاء السنن كراچى ١١٩/١٧، دار الكتب العلمية بيروت ١٣٢/١٧) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۱۹؍ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۰۲۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰/۴/۱۴۳۱ھ

نومولود کے کان میں اذان دینا مشروع ہے

سوال [۱۰۱۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ لڑکی کی پیدائش کے بعد کانوں میں اذان دینا شریعت سے ثابت ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دے کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

المستفتی: عبد العلیم مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حدیث شریف میں نومولود بچوں کے کانوں میں اذان واقامت میں صراحت آئی ہے، اور فقہاء نے بھی نومولود بچوں کے کان میں اذان سے متعلق صراحت کی ہے اور عربی میں مولود کا لفظ لڑکا لڑکی دونوں کے لیے مستعمل

ہوتا ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۲/۲۷۶)

عن حسين بن على رضى الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ: من ولد له مولود فأذن فى أذنه اليمنى و أقام فى أذنه اليسرىٰ لم يضره أم الصبيان. (عمل اليوم والليلة لإبن السنى، باب ما يعمل بالولد إذ ولد، مؤسسة علوم القرآن ١/٥٧٨، رقم: ٦٢٣، مسند أبى يعلى الموصلى، دار الكتب العلمية بيروت ٦/٣٢، رقم: ٦٧٤٧، وهكذا فى المعجم الأوسط، دار الفكر ٦/٤١٤، رقم: ٢٩٥٠، مصنف عبد الرزاق، المجلس العلمى ٤/٣٣٦، رقم: ٧٩٨٥، شرح السنة للبغوى بيروت ١١/٢٧٣، رقم: ٢٨٢٢، شعب الإيمان، دار الكتب العلمية بيروت ٦/٣٨٩، حاشية مشكاة ٢/٣٦٣)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ بچہ بچی اس کی وجہ سے بہت سے امراض سے محفوظ رہتے ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ ذی قعدہ ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۴۵۴)

نومولود کے کان میں اذان واقامت کا طریقہ

سوال [۱۰۱۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: نومولود بچے کے کان میں اذان واقامت کا کیا طریقہ ہے؟ کیا جس طرح نماز کے لیے اذان واقامت کہی جاتی ہے اسی طرح کہیں گے؟ یا اس میں کچھ فرق ہے؟ نیز کس کان میں اذان کہیں گے اور کس کان میں اقامت؟ جواب سے نواز کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد انصاف بلند شہری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نومولود بچے کے کان میں اذان کہنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ اس کے دائیں کان میں اذان کے کلمات کہے جائیں، اور اس کے بائیں کان

میں اقامت کے کلمات کہے جائیں، اس میں فرق صرف اتنا ہے کہ اقامت کے کلمات میں دو مرتبہ قد قامت الصلاۃ کا اضافہ ہے، اور اس میں اذان کہتے وقت اذان دینے والے کا اپنے کان میں انگلی ڈالنا ضروری نہیں، بچے کو اذان دینے والے سے قبلہ کی جانب کر کے اذان دی جائے اور اقامت کے کلمات اذان کے کلمات کے مقابلے میں کچھ جلدی جلدی کہے جائیں اور حی علی الصلاۃ کے وقت میں اذان دینے والا تھوڑا سا دائیں طرف اپنی گردن موڑ دے، اور حی علی الفلاح کے وقت بائیں طرف۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ جدید ڈابھیل ۵/ ۴۵۷، کتاب المسائل ۱/ ۲۴۷)

عن أبی رافع قال: رأیت رسول الله ﷺ أذن الحسن بن علی رضی الله عنهما حین ولدته فاطمة بالصلاة. (ترمذی، باب الأذان فی أذن المولود، النسخة الهندیة ۱/ ۲۷۸ دار السلام رقم: ۱۵۱٤، سنن أبی داؤد، باب فی المولود یؤذن فی أذنه، النسخة الهندیة ۲/ ۶۹۶ دار السلام رقم: ۵۱۰۵، مسند البزار، مکتبه العلوم و الحکم ۹/ ۳۲۵ رقم: ۳۸۷۹، مسند أبی داؤد الطیالسی، دار الکتب العلمیة بیروت ۱/ ۵۱۸ رقم: ۱۰۱۳، مصنف عبد الرزاق، المجلس العلمی ٤/ ۳۳۶، رقم: ۷۹۸۶)

قال السنوی: فیرفع المولود عند الولادة علی یدیه مستقبل القبلة ویؤذن فی أذنه الیمنی ویقیم فی الیسریٰ، ویلتفت فیهما بالصلاة لجهة الیمین وبالفلاح لجهة الیسار. (تقریرات رافعی علی الشامی کراچی ۱/ ٤۵، زکریا ۲/ ٤۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ ؍رجب المرجب ۱۴۳۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۷۷۲)

نومولود بچہ کے کان میں اذان دینے کا طریقہ

سوال [۱۰۱۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بچے کی اذان کے وقت بچے کو کس ہاتھ میں لیں، دائیں یا بائیں اور یہ ہاتھ میں

لینا کیسا ہے؟ اوراذان کسی بھی سمت کھڑے ہوکر کہہ سکتے ہیں یا صرف مغرب کی طرف بعض مرتبہ لوگ ایسا کرتے ہیں کہ دروازہ پر ہی سے اذان کہہ دیتے ہیں؟

المستفتی: معراج الدین سپولوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بچے کے کان میں اذان دینے کے لیے صرف ہاتھوں میں لینے کا ذکر ملتا ہے، دائیں بائیں کا ذکر نہیں، ہاں البتہ دونوں ہاتھوں کا ذکر ملتا ہے اور قبلہ رخ کا بھی ذکر ملتا ہے، مگر کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر وغیرہ کی بات نہیں ملتی، لہٰذا افضل اور اولیٰ یہی ہے کہ بچے کو دونوں ہاتھ میں اٹھا کر روبقبلہ ہوکر پہلے دائیں کان میں اذان کے الفاظ کہے جائیں پھر بائیں کان میں اقامت کے الفاظ کہے جائیں، پھر شیطان سے حفاظت کی دعا کی جائے۔

فيرفع المولود عند الولادة على يديه مستقبل القبلة ويؤذن في أذنه اليمنىٰ ويقيم في اليسرىٰ ويلتفت فيها بالصلاة لجهة اليمين وبالفلاح لجهة اليسار وفائدة الأذان في أذنه أنه يدفع أم الصبيان عنه. (تقريرات رافعي، زكريا ٢/٤٥، كراچی ١/٤٥، مرقات، امداديه ملتان ٨/١٦٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ رصفر المظفر ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۲۴۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۲/۱۵ھ

بچہ کے کان میں اذان واقامت کیسے کہیں؟

سوال [۱۰۱۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بچہ کی پیدائش کے بعد اس کے کان میں اذان واقامت پڑھنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا اس کے لیے کوئی مدت متعین ہے یا نہیں؟ بسا اوقات ہوتا ہے کہ ہسپتال میں بچہ کی پیدائش ہوتی ہے جہاں اذان واقامت پڑھنے والا کوئی نہیں ہوتا ہے تو ایسی صورت میں دو دن یا ہفتہ کے بعد آدمی ملنے پر اذان واقامت دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: فضل حق متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ولادت کے بعد بچہ کے کان میں اذان وتکبیر کہنا سنت ہے، یہی شرعی حکم ہے، مجبوری میں تاخیر کی گنجائش ہے، لیکن کوشش یہ کرنی چاہیے کہ جہاں تک ہوسکے، جلد از جلد بچہ کے کانوں میں اذان کی آواز پہنچ جائے۔

عن عاصم بن عبيد الله بن رافع عن أبيه قال: رأيت رسول الله ﷺ أذن في أذن الحسن بن على حين ولدته فاطمة بالصلاة. (ترمذی، باب الأذان فی أذن المولود، النسخة الهندية ١/٢٧٨ دار السلام رقم: ١٥١٤، سنن أبی داؤد، باب فی المولود يؤذن فی أذنه، النسخة الهندية ٢/٦٩٦ دار السلام رقم: ٥١٠٥، مسند البزار، مكتبه العلوم والحكم ٩/٣٢٥، رقم: ٣٨٧٩، مسند أبی داؤد الطيالسی، دار الكتب العلمية بيروت ١/٥١٨، رقم: ١٠١٣، مصنف عبد الرزاق، المجلس العلمی ٤/٣٣٦، رقم: ٧٩٨٦)

قال الملا على قارى تحته حين ولدته فاطمة يحتمل السابع و قبله.

(مرقاة المفاتيح امداديه ملتان ٨/١٥٩)

قال السندى: فيرفع المولود عند الولادة على يديه مستقبل القبلة ويؤذن فى أذنه أنه يدفع أم الصبيان عنه. (تقريرات رافعی علی الشامی كراچی ١/٤٥، زكريا ٢/٤٥)

يسن الأذان فی أذن المولود حين يولد. (الموسوعة الفقهية ٢/٣٧٣) **فقط** واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۰۲۳/۳۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۴/۱۸ھ

کیا بچہ کے کان میں اذان غسل سے قبل دے سکتے ہیں؟

سوال [۱۰۱۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: نومولود بچہ کے کان میں اذان بعد غسل کے دی جائے گی یا اس کے جسم سے گندگی و آلائش دور کرنے کے بعد بھی دی جاسکتی ہے، کیونکہ بعض نومولود بچے انتہائی کمزور واقع ہوتے ہیں؟

المستفتی: محمد رضوان مدرسہ امداد العلوم حیدر آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض کمزور بچوں کو نہلایا نہیں جاتا ہے صرف گندگی اور آلائش دور کردی جاتی ہے، ہماری معلومات کے مطابق یہ بات درست نہیں ہے اس لیے کہ پانی سے صفائی کے بغیر صرف کپڑے سے آلائش دور کردی جائے تو بچہ کے بدن میں زہریلا مادہ پھیلنے کا خطرہ ہوتا ہے، چاہے بچہ کمزور ہو یا تندرست ہو، بلکہ پیدا ہوتے ہی سب سے پہلے یہ کام کیا جاتا ہے کہ نیم گرم پانی سے بچہ کو نہلا کر صاف کیا جاتا ہے، اور اس کے بعد ہی اذان دینی چاہیے، یہی مسنون طریقہ ہے۔ (مستفاد: باقیات فتاویٰ رشیدیہ ص: ۲۳۸)

عن عاصم بن عبيد الله بن رافع عن أبيه قال: رأيت رسول الله ﷺ أذن فى أذن الحسن بن على حين ولدته فاطمة بالصلاة. (ترمذى، باب الأذان فى أذن المولود، النسخة الهندية ١/٢٧٨ دار السلام رقم: ١٥١٤، سنن أبى داؤد، باب فى المولود يؤذن فى أذنه، النسخة الهندية ٢/٦٩٦ دار السلام رقم: ٥١٠٥، مسند البزار، مكتبه العلوم والحكم ٩/٣٢٥، رقم: ٣٨٧٩، مسند أبى داؤد الطيالسى، دار الكتب العلمية بيروت ١/٥١٨، رقم: ١٠١٣، مصنف عبد الرزاق، المجلس العلمى ٤/٣٣٦، رقم: ٧٩٨٦)

قال السندى: فيرفع المولود عند الولادة على يديه مستقبل القبلة ويؤذن فى أذنه اليمنى ويقيم فى اليسرىٰ، ويلتفت فيهما بالصلاة لجهة اليمين وبالفلاح لجهة اليسار. (تقريرات رافعى على الشامى كراچى ١/٤٥، زكريا ٢/٤٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۱۰۱۴)

بچوں کے کان میں اذان وتکبیر تاخیر سے دینا

سوال [۱۰۱۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا ہے، نہ اذان ہوئی اور نہ تکبیر ہوئی، اور نہ کسی کو خیال رہا آج تقریباً ایک ماہ ہو رہا ہے اور گاؤں کی بات ہے اور ساتھ ہی ساتھ لڑکی پیدا ہوئی ہے، نہ اذان ہوئی ہے نہ تکبیر، قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب سے نوازیں؟

المستفتی: شمس الحق محلہ اصالت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر اب تک بچہ اور بچی کے کان میں اذان وتکبیر نہیں کہی ہے تو اب فوراً اذان وتکبیر کہی جائے۔ (احسن الفتاویٰ ۲/۲۷۶)

عن عاصم بن عبيد الله بن رافع عن أبيه قال: رأيت رسول الله ﷺ أذن في أذن الحسن بن على حين ولدته فاطمة بالصلاة. (ترمذی، باب الأذان فی أذن المولود، النسخة الهندية ۱/۲۷۸ دار السلام رقم: ۱۵۱٤، سنن أبی داؤد، باب فی المولود يؤذن فی أذنه، النسخة الهندية ۲/٦۹٦ دار السلام رقم: ۵۱۰۵، مسند البزار، مكتبه العلوم والحكم ۹/۳۲۵، رقم: ۳۸۷۹، مسند أبی داؤد الطيالسی، دار الكتب العلمية بيروت ۱/۵۱۸، رقم: ۱۰۱۳، مصنف عبد الرزاق، المجلس العلمی ٤/۳۳٦، رقم: ۷۹۸٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۸۲۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۲/۹/۱۵ھ

پیدائش کے کئی سالوں کے بعد اذان دینے سے کیا سنت ادا ہو جائیگی؟

سوال [۱۰۱۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جس بچہ کے کان میں اذان نہیں دی گئی کافی عرصہ کے بعد اس کا انتقال ہو جاتا

ہے تو اس صورت میں کیا نماز جنازہ کے بعد اذان قبر پر پڑھ لیں تو کوئی حرج تو نہیں ہے، اور قبر پر اذان پڑھنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد یاسین محمود پور مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بچہ کے کان میں پیدائش کے بعد ہی اذان دینا مسنون ہے، کافی عرصہ کے بعد اذان دینے سے سنت ادا نہیں ہوگی، نیز قبر پر اذان دینا بھی شرعاً بے اصل ہے، اس کا ترک لازم ہے، نیز اس سے اذان تولد کی قضا بھی ادا نہیں ہوسکتی۔ (مستفاد: فتاویٰ دارالعلوم ۵/۳۸۲، احسن الفتاویٰ ۱/۳۳۷)

وهـذا يـدل على سنية الأذان في أذن المولود (إلى قوله) إذا ولد الصبي. (مرقاة مصري باب العقيقة ٤/ ٣٦٠، امداديه ملتان ٨/ ١٥٩، حاشية ترمذي ١/ ١٨٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ رصفر المظفر ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/۳/۱۶۷)

آٹھ سال کے بعد بچہ کے کان میں اذان دینا

سوال [۱۰۱۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: لڑکا پیدا ہوتا ہے تو آنگن میں ایک صاحب کھڑے ہوکر صرف اذان کہہ دیتے ہیں اور لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اذان بھی نہیں دیتے ہیں، تکبیر تو دور کی بات، اور لڑکا اگر سات آٹھ سال کا ہوجائے اور جانکار آدمی کو معلوم ہوجائے کہ اس کے کان میں اذان وتکبیر نہیں ہوئی ہے تو اس وقت اس کے کان میں اذان وتکبیر کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟ مفصل جواب سے نوازیں۔

المستفتی: محمد صلاح الدین طویلہ سہرسا بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس سلسلے میں کوئی صریح جزئیہ احقر کی نظر سے نہیں گذرا،

البتہ مدت قلیل کی تاخیر میں بھی مسنون ہونے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔(مستفاد:احسن الفتاویٰ ۲/۲۷۶)

عن عاصم بن عبيد الله بن رافع عن أبيه قال: رأيت رسول الله ﷺ أذن في أذن الحسن بن على حين ولدته فاطمة بالصلاة. (ترمذی، باب الأذان في أذن المولود، النسخة الهندية ١/ ٢٧٨ دار السلام رقم: ١٥١٤، سنن أبي داؤد، باب في المولود يؤذن في أذنه، النسخة الهندية ٢/ ٦٩٦ دار السلام رقم: ٥١٠٥، مسند البزار، مكتبه العلوم والحكم ٩/ ٣٢٥، رقم: ٣٨٧٩، مسند أبي داؤد الطيالسي، دار الكتب العلمية بيروت ١/ ٥١٨، رقم: ١٠١٣، مصنف عبد الرزاق، المجلس العلمي ٤/ ٣٣٦، رقم: ٧٩٨٦)

وفي المرقات: يحتمل السابع وقبله وقوله وهذا يدل على سنية الأذان في أذن المولود. (مرقات امداديه ملتان ٨/ ١٥٩)

اور چونکہ اذان فی نفسہٖ دفع بلاء و ہموم کے لیے مفید ہے اس لیے آٹھ سال کے بعد بھی اذان وتکبیر کہنے میں مضائقہ نہ ہوگا۔

وذكر الأذان في أذن المهموم. (أوجز المسالك ١/ ١٨٣، جديد دار القلم دمشق ٢/ ٣٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵ ؍ جمادی الثانیہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۷۴۰)

عورت کا نومولود بچے کے کان میں اذان دینا

سوال [۱۰۱۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عورتوں کا نومولود بچہ کے کان میں اذان دینے کا کیا حکم ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: افضل تو یہی ہے کہ بچے کے کان میں مرد ہی اذان دے، لیکن اگر مرد کی عدم موجوگی میں عورت نے اذان پڑھ دی تو اذان درست ہوگئی،

اس لیے کہ نماز کے لیے اذان دینے کی کراہت کی جو علت ہے یعنی رفع صوت یا فتنہ، وہ یہاں نہیں پائی جا رہی ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمود یہ ڈابھیل ۵/ ۴۵۵، میرٹھ ۹/ ۱۶۰)

وأذان المرأة، لأنها إن خفضت صوتها أخلت بالأعلام وإن رفعته ارتكبت معصية لأنه عورة تحته فى حاشية الطحطاى ''أنه عورة'' ضعيف والمعتمد أنه فتنة. (حاشية الطحطاوى على المراقى، دار الكتاب ديوبند ١٩٩، شامى زكريا ٢/ ٧٨، كراچى ١/ ٤٠٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۵۴۳)

عورت کی ختنہ کا حکم

سوال [۱۰۱۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کچھ ہندی اخبارات میں عورتوں کی ختنہ (سنت) کے بارے میں چھپا ہے جسے حقوق انسانی کے خلاف بتایا گیا ہے، میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا نائجیریا، اتھوپیا، مصر، سوڈان و کینیا وغیرہ میں جاری یہ عمل شرعاً جائز ہے۔

کیا کلام اللہ میں اور احادیث میں اس کا ذکر ہے؟ کیا یہ سنت ہے؟ اس کا سنت ابراہیمی سے کوئی تعلق ہے؟ اس عادت غرب پر ایسی روشنی ڈالیں کہ کسی طرح کی تشنگی نہ رہ جائے۔

المستفتی: ایم اے کنول، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورتوں کی ختنہ کے بارے میں ''سنن ابی داؤد اور مسند امام احمد بن حنبل'' میں حدیث شریف وارد ہوئی ہے، اسی کو شامی میں نقل کیا ہے، اور اس میں علت یہ بیان کی گئی ہے کہ عورتوں کی ختنہ سے جانبین مین رغبت اور لذت پیدا ہوتی ہے، مگر امام ابو داؤد نے اس حدیث کی سند پر کلام کر کے ضعیف کہا ہے، اور ''البدایہ والنہایہ'' میں لکھا ہے کہ

دنیا میں سب سے پہلے عورتوں میں حضرت ہاجرہ کی ختنہ ہوئی، اورانہیں کا کان بنا گیا ہے۔

إن سارة تغضبت على هاجر فحلفت لتقطعن ثلاثة أعضاء منها فأمرها الخليل أن تثقب أذنيها و أن تخفضها فتبر قسمها، قال السهيلي: فكانت أول من اختتن من النساء و أول من ثقبت أذنها منهن الخ. (البدايه والنهايه، دار الفكر ١٥٤/١)

اورطبرانی واوسط کے حوالے سے **مجمع الزوائد** میں اس مضمون کی حدیث کوحسن کہا ہے۔ (مجمع الزوائد، باب الختان، دار الكتب العلمية بيروت ١٧٢/٥، المعجم الأوسط، دار الفكر ٦١٣/١، رقم: ٢٢٥٣، المعجم الصغير للطبراني، دار الكتب العلمية بيروت ٩١/١، رقم: ١٢٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰ رصفر المظفر ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۵۱۹۸)

مختون پیدا شدہ بچے کے ختنہ کا حکم

سوال [۱۰۱٦۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی بچہ ختنہ شدہ پیدا ہوتو اس کا کیا حکم ہے، آیا پھر ختنہ کرانا ضروری ہے یا اسی پر اکتفا کیا جائے، ازروئے شرع جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: نظیر احمد، انجیر والی مسجد محلّہ بھٹی، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر کوئی بچہ ختنہ شدہ پیدا ہوجائے یا دیکھنے میں ختنہ شدہ معلوم ہوتو شرعاً دوبارہ اس کے ختنہ کی ضرورت نہیں اوراس کو شرعاً مختون کے حکم میں شمار کیا جاتا ہے۔

صبي حشفته ظاهرة بحيث لو رآه إنسان ظنه مختونا و لاتقطع جلدة ذكره إلا بتشديد ألمه ترك على حاله كشيخ أسلم. (الدر المختار، كتاب

الخنثیٰ، زكريا ١٠/ ٤٨٠، كراچی ٦/ ٧٥١، هنديه، زكريا قديم ٦/ ٤٤٥، جديد ٦/ ٤٣٩، تبيين الحقائق، امداديه ملتان ٦/ ٢٢٦، زكريا ٧/ ٢٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۷۰۷۲)

ختنہ نہ کرانے والا کیا مستحق عذاب ہے؟

سوال [۱۰۱۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ختنہ کرانا سنت ہے، اگر کوئی مسلمان ختنہ نہ کرائے تو وہ سنت کے ثواب سے محروم ہوگا یا اسے سزا ملے گی؟

المستفتی: محمد احمد خاں فیض گنج، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ختنہ کرانا سنت ہے، اور شعائر اسلام میں سے ہے، اگر کوئی شخص ختنہ نہ کرائے اور اسے کوئی عذر نہ ہو تو ترک ختنہ کی وجہ سے گنہگار ہوگا اور سزا دینا اللہ کے بس میں ہے۔

عن أبی مليح بن أسامة، عن أبيه، أن النبی ﷺ قال: الختان سنة للرجال، مكرمة للنساء. (مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٧٥، رقم: ٢٠٩٩٤، المصنف لابن أبی شيبة، مؤسسة علوم القرآن ١٣/ ٤٧٤، رقم: ٢٦٩٩٨، المعجم الكبير للطبرانی، دار إحياء التراث العربی ٧/ ٢٧٣، ٢٧٤، رقم: ٧١١٢، ٧١١٣، ١١/ ٢٣٣، ٣٥٩، رقم: ١١٥٩، ١٢٠٠٩، ١٢/ ١٨٢، رقم: ١٢٨٢٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۶۴۱۹)

کیا عقیقہ میں متعین جانور ذبح کرنا لازم ہے؟

سوال [۱۰۱۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کسی نے منت مانی کہ اگر میرے گھر میں لڑکے کی پیدائش ہوئی تو میں ایک بھینس عقیقہ میں قربانی کروں گا، پس اگر لڑکے کی پیدائش ہوگئی تو کیا متعینہ جانور ہی قربان کرنا ضروری ہوگا؟ یا اس جانور کے علاوہ کوئی اور بھی جانور قربان کرسکتا ہے؟ نیز اس منت شدہ عقیقہ کے جانور کے گوشت کا کیا حکم ہے؟ مع حوالہ جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد غلام مرتضیٰ، متعلم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: عقیقہ من جانب اللہ ایک مسنون عمل ہے، اور عقیقہ میں اگر صاحب ثروت آدمی ہے، تو لڑکے کے لیے دو بکرے اور لڑکی کے لیے ایک بکرا کرنا مسنون ہے، اور اگر صاحب وسعت نہیں ہے تو لڑکے کے لیے بھی ایک بکرا کافی ہے، نیز عقیقہ بڑے جانور میں حصہ لے کر بھی ادا ہوسکتا ہے اور بڑا مکمل جانور بھی عقیقہ میں ذبح کرنا جائز ہے، یہ ایک مسنون فریضہ کی ادائیگی ہے، لہٰذا جب اس نے لڑکے کی پیدائش پر بھینس ذبح کرکے عقیقہ کرنے کی نذر مانی ہے تو بھینس ذبح کرکے یا اسی معیار کی گائے، بیل ذبح کرکے عقیقہ کرسکتا ہے، جو عقیقہ مسنونہ اس کو کرنا تھا دو بکرے کے ذریعہ تو اس نے نذر مان لی دو بکرے کی جگہ بڑے جانور بھینس کی، تو اس کے لیے عقیقہ میں بھینس ہی کرنا زیادہ بہتر ہے۔

عن أم كرز قالت: سمعت النبي ﷺ يقول: عن الغلام شاتان مكافئتان و عن الجارية شاة. (سنن ابن ماجه ۲/۲۲۸، سنن الترمذی ۱/۲۷۸)

نذر أن يتصدق بعشرة دراهم (إلى قوله) كتصدقه بثمنه. (الدر المختار، كتاب الأيمان، مطلب: في أحكام النذر، كراچی ۳/۷٤۱، زكريا ۵/۵۲۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/۱۲۱۸۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۸/۱۱ھ

۳۸ کتاب الحقوق

۱ باب ما یتعلق بنفس الحق

حق کی واپسی کا شرعی حکم

سوال [۱۰۱٦۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عبدالحمید بھائی نے آج سے دس سال قبل ایک مکان خریدا، ایک غیر مسلم سے، اور خریدا ہوا مکان آج تک اسی حالت میں ہے جس وقت یہ مکان بنا تھا اس وقت اس مکان کے سامنے کی جگہ خالی تھی پھر اس خالی جگہ پر دوسرے آدمی نے مکان بنایا پھر اس دوسرے مکان کو ایک غیر مسلم بھائی نے خریدا اب اس دوسرے بھائی کو کسی نے بتلایا کہ جو تو نے مکان خریدا ہے اس مکان کی کچھ زمین عبدالحمید بھائی والے مکان میں چلی گئی ہے، اس بھائی نے آکر عبدالحمید بھائی سے بات کی تو انہوں نے زمین پیمائش کرنے والوں کو بلوا کر دونوں مکانوں کی زمینی پیمائش کرائی تو واقعی کچھ زمین عبدالحمید بھائی کے مکان میں زیادہ آگئی ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے: (۱) کہ عبدالحمید بھائی کے پاس جو زمین زیادہ آگئی ہے تو اس زمین کا واپس کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

(۲) یہ دوسرے بھائی اس زمین کا مطالبہ کرتے ہیں تو یہ مطالبہ صحیح ہے یا نہیں؟

(۳) دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اس دوسرے بھائی کے مکان کے پاس کی جگہ ۳۳/ مکانوں کی مشترکہ ہے اور ان ۳۳/ مکانوں کی ایک کمیٹی ہے اس کمیٹی سے اجازت لے کر اس مکان کو وہ اپنے استعمال میں لا سکتے ہیں یا نہیں؟ شرعی مسئلہ بتا کر عنداللہ ماجور ہوں۔

المستفتی: عبدالحمید ایسٹ افریقہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) مذکورہ صورت میں جب عبدالحمید کے مکان میں دوسرے کا حق نکل آیا تو اس کا واپس کرنا ضروری ہے، اب واپس کرنے کی شکل یہ

ہے کہ اگر عمارت کی قیمت زیادہ ہے زمین سے، تو زمین کی قیمت ادا کردے، اور اگر زمین کی قیمت عمارت سے زیادہ ہے تو مالک زمین کو عمارت منہدم کرا کے زمین حاصل کرنے کا حق ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ مالک زمین کو زمین کی قیمت لینے پر راضی کرلیا جائے۔

ومنها لو غصب أرضا فبنى فيها أو غرس فإن كانت قيمة الأرض أكثر قلعها فلما وردت وإلا ضمن له قيمتها. (الأشباه والنظائر كراچی ۱/۱۲۲، شامی، كتاب البيوع، باب الاستحقاق، زكريا ۷/۴۴۸-۴۴۹، كراچی ۵/۲۰۵، الموسوعة الفقهية الكويتية ۸/۲۰۹، تنقيح الفتاوىٰ الحامدية، دار الكتب العلمية بيروت ۲/۱۶۰)

(۲) جی ہاں! دوسرا شخص اپنے حق کا مطالبہ کرسکتا ہے۔

عن أبي هريرةؓ قال أتى النبي ﷺ رجل يتقاضاه فأغلظ له فهمَّ به أصحابه فقال دعوه فإن لصاحب الحق مقالا. (بخاری شریف، كتاب الاستقراض، باب لصاحب الحق مقال، النسخة الهندية ۱/۳۲۳، رقم: ۲۳۳۹، ف: ۲۴۰۱، مشكوٰة شريف ۱/۲۵۱)

(۳) ۳۳/ مکانوں کی شرکت کیسی ہے؟ اور ان مکانات کی کمیٹی کیسی ہے؟ کیا وہ ۳۳/ مکانات سب کے سب وقف ہیں یا کسی کی ملکیت ہیں؟ جس کمیٹی کا ذکر کیا گیا ہے یہ کمیٹی مالک ہونے کی وجہ سے ہے؟ یا وقف شدہ جائیداد کی منتظم ہونے کی وجہ سے ہے ان تین باتوں کی وضاحت کے بعد سوال نمبر ۳/ کا جواب لکھا جاسکتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۷۴۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۶/۱۴ھ

حقدار کو اس کا حق لوٹانا واجب ہے

سوال [۱۰۱۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بشیر کے پاس ایک لڑکا تھا جو ابھی نابالغ تھا، اور اتنے میں بشیر کے انتقال کا وقت قریب آگیا، قبل ازیں بشیر نے اپنے ایک رشتہ دار (نظیر) کو یہ کہہ کر زمین ان کے حوالہ کردی کہ جب میں مرجاؤں گا اور میرا بچہ بڑا ہوجائیگا، اس وقت زمین میرے بچہ کو لوٹا دینا اتنے میں

نظیر کا بھی انتقال ہوگیا اور وہ بچہ بالغ ہوگیا لیکن اس بچہ کو زمین ابھی تک واپس نہیں ملی، جبکہ اس بچہ کے حق میں چار گواہ موجود ہیں، اوراس کے حق میں گواہی دے رہے ہیں اوراس زمین کی پیداوار نظیر کی اولاد استعمال کررہی ہے، کیا ان کے لیے زمین کا استعمال کرنا درست ہے؟ اور مذکورہ بالا صورت میں زمین کی واپسی ضروری ہے یا نہیں؟ شرعی اعتبار سے جواب دیں۔

المستفتی: ابن بشیر وتحسین الاسلام اکبر پور ضلع مظفر نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جب گواہوں کے ذریعہ یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ نظیر کی اولاد جو زمین استعمال کررہی ہے وہ بشیر کی زمین ہے جو بشیر کے لڑکے کا حق ہے، لہٰذا نظیر کی اولاد پر لازم اور ضروری ہے کہ وہ زمین بشیر کے لڑکے کو واپس کردے نظیر کے لڑکوں کو اس زمین سے فائدہ اٹھانا ہرگز جائز ودرست نہیں ہے۔

عن سعيد بن زيد بن عمرو بن نفيل ان رسول الله ﷺ قال: من أخذ شبرا من الأرض بغير حقه طوقه في سبع أرضين يوم القيامة. (مسلم شريف، باب تحريم الظلم وغصب الأرض، النسخة الهندية ٢/٣٣، بيت الأفكار رقم: ١٦١٠)

لايجوز لأحد من المسلمين أخذ مال بغير سبب شرعي. (هنديه، كتاب الحدود، فصل في التعزير، زكريا قديم ٢/١٦٧، جديد ٢/١٨١، شرح المجلة رستم اتحاد ١/٦٢، رقم المادة: ٩٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۱۷/ربیع الاول ۱۴۲۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۱۲٦/۷)	۱۴۲۲/۳/۱۸ھ

اپنا حق دوسرے سے وصول کرنا

سوال [۱۰۱٦٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں حکومت کے مدرسے میں نوکری کرتا ہوں جب میری نوکری کی مدت ختم ہو

گئی اس وقت مدرسہ کے ذمہ حکومت کی طرف سے جو روپیہ مجھ کو دینا قانونی طور پر ضروری ہے اس کا حساب ڈی آئی، آف اسکول کی طرف سے ڈائریکٹر کی طرف بھیجنا پڑتا ہے، میں نے ایسا ہی کیا، ڈی آئی صاحب نے جو رقم منظور کی، ڈائریکٹر صاحب نے اس سے چالیس ہزار روپئے گھٹا کر دی، میں نے نائب ڈائریکٹر کو اس واقعہ کے بارے میں بتایا، انہوں نے کہا ڈی آئی صاحب نے جو حساب منظور کیا تھا وہ صحیح ہے، اس سے جو کم کر دیا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے، آپ مقدمہ کر سکتے ہیں، لیکن اس میں کافی وقت گذر جائے گا، اور پیسہ بھی خرچ کرنا پڑے گا، اس لیے میں نے اس کم کردہ رقم کو ہی لے لیا، مجبوراً میں اس پر راضی ہو گیا، کئی سال گذر جانے کے بعد سال رواں میں میں نے ۴۵/ ہزار روپئے بینک سے وصول کیے، لیکن دوسرا آفیسر جو حساب کو درست کر کے کتنا وصول ہوا کتنا باقی رہا ٹھیک کر دیتا ہے، اس کی غلطی سے وہ ۴۵/ ہزار روپئے پاس بک میں نہیں آئے، یعنی چالیس ہزار جو میں نے لیے اس کو پاس بک میں نہیں لکھا گیا، اب میں پہلے کی کمی کی وجہ سے جو مجھ کو نقصان ہوا تھا اس کے عوض میں اس روپیہ کو لے سکتا ہوں یا نہیں؟ شرعاً اس طرح حاصل شدہ روپئے کو قبضہ میں کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: خدابخش بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) سوالنامہ کے مطابق جتنی رقم ڈی آئی ایف صاحب نے منظور کر کے ڈائریکٹر صاحب کے پاس بھیجی تھی اس پوری رقم کا دینا ڈائریکٹر صاحب پر لازم تھا، اس میں سے چالیس ہزار گھٹا کر دینا یہ آپ کے ساتھ ظلم ہے اور آپ کے مال پر ناجائز قبضہ ہے، لہٰذا آپ اس رقم کا مطالبہ براہ راست ڈائریکٹر صاحب سے یا عدالتی قانون کے واسطہ سے کر سکتے ہیں، اور جو بینک سے ۴۵/ ہزار آپ نے نکالے اور غلطی سے وہ آپ کے پاس بک میں نہ چڑھ سکے اس کو اس چالیس ہزار کا عوض اور بدل قرار دے کر لینا جائز نہ ہوگا، کیونکہ یہ حکومت کے ساتھ دھوکہ دہی ہے جو شرعاً جائز نہیں۔

عن أبي حرة الرقاشي عن عمه أن رسول الله ﷺ قال: ألا! لا يحل

مال امرئ إلا بطيب نفس منه. (شعب الإيمان للبيهقي، باب في قبض اليد عن الأموال الحرمة، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ٣٨٧ رقم: ٥٤٩٢، السنن الكبرىٰ للبيهقي، دار الفكر بيروت ٨/ ٥٠٦، رقم: ١١٧٤٠)

وحق الأمانة أن تؤدى إلى أهلها فالخيانة مخالفة لها، وإخلاف الوعد ظاهر. (مرقاة، بيان علامة المنافق والكلام عليها، امداديه ملتان ١/ ١٢٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳ رجب المرجب ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۴۵۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۳/ ۷/ ۱۴۳۲ھ

حقدار اپنا حصہ نہ لیں تو کیا حکم ہے؟

سوال [۱۰۱۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مکان ہمارے والد اور والدہ کے درمیان آدھا آدھا مشترک تھا، جس میں متعدد کرائے دار رہتے تھے، ہمارے والد صاحب کا انتقال ہو گیا انہوں نے ایک بیوی اور آٹھ لڑکے اور پانچ لڑکیاں وارث چھوڑے، ہم بھائیوں کی رہائش علاحدہ علاحدہ مکانوں میں تھی، میں انیس الرحمٰن تمام بھائیوں میں چھوٹا تھا اور والدہ کے ساتھ رہنا سہنا تھا، انیس الرحمٰن نے والدہ کے حکم سے اس مذکورہ مشترکہ مکان کو کرایہ داروں سے خالی کروا کر از سر نو تعمیر کرا دیا، خالی کروانے میں تقریباً ساٹھ ہزار روپئے کرایہ داروں کو دینے پڑے، تعمیر میں تقریباً سات لاکھ روپئے لگے، اب والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا تو میں انیس الرحمٰن نے خدا کے یہاں گرفت سے بچنے کے لیے ایک فتویٰ تقسیم ترکہ سے متعلق حاصل کیا اور تمام بھائی بہنوں سے یہ کہہ دیا کہ جس کا جتنا حصہ نکل رہا ہے:

(۱) وہ اپنا حصہ لے لے۔

(۲) یا مارکیٹ ریٹ کے مطابق اس کی قیمت لے لے۔

(۳) اور اگر نہ لینا چاہے تو حقوق منتقلی تحریر لکھ دے، تا کہ آنے والے وقت میں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

تو بعض وارثین نے اس سے اتفاق کیا لیکن بار بار کہنے کے باوجود کچھ حصہ دار نہ تو حصہ لے رہے ہیں اور نہ قیمت لے رہے ہیں، اور حصہ منتقلی کی تحریر پر خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں، اور بیہودہ جواب دیتے ہیں، کہ یہ گندے خیالات تمہارے ذہن میں کیوں پیدا ہوئے ہیں اور تم اسی طرح مکان میں رہتے رہو، نیز تم سے حصہ کون مانگ رہا ہے، یا ہمارے انتقال کے بعد تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میری اولاد تم سے حصہ مانگے گی، لہٰذا آپ سے مؤدبانہ گذارش ہے کہ شریعت کا جو بھی حکم ہو اس سے آگاہ فرمائیں تا کہ فتویٰ طلب گار انیس الرحمٰن آخرت کی گرفت سے بچ جائے؟

المستفتی: انیس الرحمٰن سیدھی سرائے مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ میں انیس الرحمٰن کی تحریر اور منسلک فتویٰ بغور پڑھا گیا ہے، شرعی طور پر انیس الرحمٰن نے ہر حقدار کو اس کو حق دینے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا ہے، وہ عین شریعت کے مطابق ہے، ہر ایک حقدار کو اس پر عمل کرنا لازم ہے، اور جو لوگ اس پر عمل کرنے سے گریز کررہے ہیں ان کو سمجھا بجھا کر اس پر عمل درآمد کرنے پر آمادہ کیا جائے تا کہ آئندہ نسلوں میں کسی قسم کا اختلاف اور انتشار کا شبہ بھی باقی نہ رہے، اور انیس الرحمٰن خدا کے یہاں کی گرفت سے محفوظ ہو جائے، اور پھر بھی اگر کوئی عمل درآمد کرنے سے گریز کرے اور مزید اس بات پر انیس الرحمٰن کو برا بھلا کہے، تو وہ خود گنہگار رہوں گے، نیز انیس الرحمٰن کی اس پیش کش کے باوجود حقدار لوگ اپنا حق لینے کے لیے تیار نہیں ہیں، اور اسی حالت میں ۳۳؍ سال گذر جانے کے بعد دوسرے حقدار یا ان کے وارثین کو اس میں حق دعویٰ کرنے کا حق باقی نہیں رہے گا۔

رجل ترک الدعویٰ ثلاثا و ثلاثین سنة بلا مانع لا تسمع ثم قال: وقد أفتيت بعدم سماع الدعویٰ بعد خمسة عشرة سنة لنهي السلطان.

(علی هامش قواعد الفقه، اشرفی ص:۷۷، تحت رقم الأصول: ۱۱۶)

رجل ترک الدعویٰ ثلاثا و ثلاثين سنة و لم يكن له مانع من الدعویٰ، ثم ادعی لم تسمع دعواه، لأن ترک الدعویٰ مع التمكن يدل علی عدم الحق ظاهرا. (تکملة شامی، کتاب الدعویٰ، مطلب: لا تسمع الدعویٰ بعد

مضی المدة، زکریا ۱۱/ ٦٥٣، کراچی ٧/ ٤٨٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۳۹۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۴/۲۳ھ

مالی حقوق کے اثبات کے لیے شرعی شہادت کا لزوم

سوال [۱۰۱٦۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: رامپور شہزادنگر میں ایک آکسیجن گیس فیکٹری تقریباً ۲۰؍ ۲۵؍ سال پہلے قائم کی گئی تھی، اس میں بہت سارے پارٹنرس تھے، جنہوں نے اپنا روپیہ لگایا اور بینک سے لون بھی لیا تھا، ایک وقت ایسا آیا کہ فیکٹری جو فائدہ میں چل رہی تھی اس میں نقصانات بڑھنے لگے اور دھیرے دھیرے پارٹنرس الگ ہوتے گئے، آخر میں ۲۰۰۴/۵ء میں چار پارٹنرس رہ گئے، چاروں پارٹنرس نے مل کر کام چلانے کی کوشش کی، لیکن وہ بھی نقصانات سے نہیں بچ سکے، ان چاروں پارٹنرس میں بھی نااتفاقیاں بڑھتی گئیں، فیکٹری پر جو بینک کا قرضہ تھا عدم ادائیگی کی وجہ سے بینک نے نوٹس دیا، ان چاروں پارٹنرس میں ساجد صاحب، کلن صاحب، زبیر صاحب اور ریحان میاں (عرضی گذار کا لڑکا) تھے، طے پایا آپس میں کہ اس گیس فیکٹری کو فروخت کر دیا جائے تو بہتر ہوگا، چاروں پارٹنرس میں سے کوئی بھی اس فیکٹری کو خرید لے یا کوئی اور پارٹی خریدار مل جائے تو اس کی فروختگی کر دی جائے۔

فیکٹری میں زمین جائیداد، پلانٹ، مشینری، جنریٹر اور بلڈنگ چاروں آفسوں کا سامان کل جملہ چل اور چل سمپتی و جملہ ساز وسامان کو فروختگی میں رکھا گیا، ساتھ ہی یہ بھی طے پایا کہ فیکٹری کو چالو کر کے چاروں پارٹنرس کے خرچہ پر دی جائے گی، اور جس کسی کا جو لینا دینا ہوگا اور بینک کے قرضہ کی ادائیگی وہ سب اس فروختگی کی رقم سے کی جائے گی، مزید یہ بھی طے پایا کہ اگر چاروں پارٹنرس میں سے کوئی خرید لے تو بہتر ہوگا، فیکٹری کی خریداری کے سلسلے میں چاروں ہم پارٹنرس میں سے آپس میں شریک بنے اور فیکٹری کی خریداری و بکری کے لیے

وقت اور تاریخ مقرر کر دی گئی، اس تاریخ پر نیلامی شروع کر دی گئی، نیلامی سے چار پارٹنرس میں سے دو، دو آپس میں زبیر اور رفعت وریحان ایک پارٹی وکلن بھائی وساجد صاحب دوسری پارٹی آپس میں پارٹنرس بنے، زبیر فیکٹری خریدنا نہیں چاہتے تھے، رفعت کے ذریعہ زبیر کو بتایا گیا کہ اگر فیکٹری نہیں خریدو گے تو رقم تتر بتر ہو کر رہ جائے گی، جس سے ہم دونوں کو زبردست نقصان ہوگا، بہرحال ۵۰-۵۰ پرسنٹ کی شرکت میں زبیر راضی ہوگئے، اور آپسی بولی شروع ہوئی، آخری بولی ۳۲ / لاکھ روپئے تک رفعت وزبیر کی پہنچ گئی، تب یہ نیلامی رفعت وزبیر کے نام چھوڑ دی گئی، اللہ تعالیٰ کے حکم سے زبیر ورفعت وریحان اس فیکٹری کے مالک قرار دیئے گئے۔

ریحان میاں کی طبیعت علیل کافی وقت سے چل رہی تھی، رفعت اور زبیر کے درمیان مشورہ ہوا کہ فیکٹری کو مل کر چلایا جائے اور آکسیجن گیس بنائی جائے تو بہتر ہوگا، دونوں رفعت وزبیر آپس میں مل کر فیکٹری کو چلالیں، لیکن زبیر نے کہا کہ فیکٹری کو ایک آدمی چلائے گا تو بہتر ہوگا، اور فیکٹری کو بھی میں خود ہی چلاؤں گا، رفعت نے بتلایا کہ تم اکیلے فیکٹری کو چلاؤ گے تو تمہاری دوکان کون دیکھے گا، فیکٹری کو تو فل ٹائم دینے کی ضرورت پڑے گی، تو تم کیسے فل ٹائم دے پاؤ گے، زبیر نے کہا کہ فیکٹری میں خود چلاؤں گا اور بارہ ہزار روپئے ماہانہ اپنی محنت کے لوں گا اور فل ٹائم دوں گا، جیسا کہ پہلے پارٹنر محنتانہ لیا کرتے تھے، اور فیکٹری کا کام کاج دیکھا کرتے تھے، مال کی تیاری وبکری کی رقم وصول یابی اور فیکٹری کی ضرورت کے مطابق ساری خرید وفروخت واسٹاف کو اپنی نگرانی میں رکھ کر اس فیکٹری کا کام کاج چلاؤں گا، اور باقاعدہ حساب وکتاب میں تفصیل کے ساتھ تاریخ وائس رکھوں گا، جیسا کہ ایک فیکٹری میں حساب و کتاب رکھا جاتا ہے، اور کوئی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔

رفعت نے زبیر کی اس بات پر یقین کرلیا، ملازمین و چوکی داروں واسٹاف کو فیکٹری کے لیے رکھ لیا گیا، کام کاج شروع کر دیا گیا، سوا مہینے تقریباً یہ فیکٹری چل پائی، پھر نقصانات سامنے آنے لگے، مجبوراً فیکٹری کو بند کرنا پڑا، مزید یہ بھی طے پایا کہ فیکٹری کا پلانٹ اور جنریٹر اور سارا ساز وسامان فروخت کر دیا جائے اور اخبار میں اشتہار دیا گیا اور مشینری پلانٹ

وجنریٹر کو ۲۰۰۵ء میں سیل کر دیا گیا، ریحان میاں کی طبیعت علیل چل رہی تھی، ان کو گردے فیل ہو جانے کا مرض ہو گیا تھا، اور ہم سب لوگ اور ریحان ذہنی طور پر بے حد پریشان تھے، کڈنی کا ٹرانسپلانٹ ہوتا تھا، یہاں کڈنی کا انتظام تو نہیں ہوسکا، تو مجبوراً پاکستان جانا طے پایا۔

دسمبر ۲۰۰۷ء میں زبیر صاحب ریحان کے پاس چپکے و خاموشی سے آئے کہ رفعت کو بھنک نہ لگ جائے، ریحان میاں سے چکنی چپڑی باتیں کی ہوں گی، اور ان سے کہا کہ فیکٹری کے آدھے حصے کی قیمت ۱۵/ لاکھ روپئے میں میرے ہاتھ فروخت کر دیں، ریحان میاں کے منع کرنے کے بعد زبیر نے دوسرا داؤں پھینکا کہ میرے پاس سے سات لاکھ سینتیس ہزار آٹھ سو ستائیس روپئے آپ کی لاگت سے زیادہ میرے پاس سے خرچ ہو چکے ہیں، یہ رقم آپ کی طرف نکل رہی ہے، لیکن زبیر صاحب نے کسی قسم کا کوئی حساب وکتاب کا پرچہ ریحان میاں کو نہیں دیا، صرف زبانی اس رقم کے بارے میں بتایا، اس عرصہ میں زمین و جائیداد کی قیمتیں بڑھتی دیکھ کر زبیر کے دل میں لالچ پیدا ہو گیا کہ اس رقم کی ادائیگی کر دیں، یا میرا حصہ (شیر) بڑھا دیں، اور ساٹھ پرسینٹ مجھ کو اور چالیس پرسینٹ آپ لے لیں، کیونکہ زبیر اپنا مقصد حاصل کرنے میں اور بات چیت کرنے میں کافی مہارت رکھتے ہیں، زبیر نے ریحان میاں کو اتنا بھی موقع نہیں دیا کہ ریحان میاں اس بارے میں اپنے والد رفعت علی شمسی سے مشورہ بھی کر لیتے، اور رفعت سے مشورہ کیے بغیر ساٹھ اور چالیس پرسینٹ حصہ کی بات کو طے کرا لیا، ساتھ ہی یہ بھی طے پایا کہ فیکٹری کی جگہ و جائیداد فروخت ہونے تک سات لاکھ سینتیس ہزار آٹھ سو ستائیس روپئے جو آپ کے میرے ذمہ نکل رہے ہیں اور آئندہ ہونے والے اخراجات جو بھی ہوں گے، وہ ریحان میاں سے نہیں لیں گے، اور نہ کچھ لینا اور نہ کچھ دینا ہوگا، زبیر نے اس بات کی گواہی میں ریحان میاں کی اہلیہ کو گواہ بنالیا اور رفعت کو اس بارے میں کوئی خبر بھی نہیں کی اور نہ زبیر کے ذریعہ اس بارے میں پہلے بھی کوئی ذکر کیا گیا اور نہ ہی مشورہ کیا گیا چونکہ زبیر جانتے تھے کہ اگر رفعت کو اس بارے میں خبر کی گئی، تو رفعت ایسا نہیں ہونے دیں گے۔

اس کے بعد ریحان میاں کو علاج کے سلسلے میں لاہور جانے کے لیے ۱۸/۱/۲۰۰۸ء

کو روانہ کر دیا گیا، انہیں ہم سب لوگ لے کر چلے گئے، اور وہاں ان کا کڈنی ٹرانسپلانٹ کرادیا گیا اور واپس آنے کے بعد اپولو ہاسپٹل میں داخل کرادیا گیا، تقریباً تین مہینے تک اپولو ہاسپٹل میں ان کا علاج ہوتا رہا، لیکن حکم ربی صحت یابی نہ ملی اور دہلی ہاسپٹل میں ۲۹/۴/ ۲۰۰۸ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

کچھ عرصہ بعد رفعت نے زبیر سے سات لاکھ سینتیس ہزار آٹھ سو ستائیس روپئے جو ریحان میاں کو زبیر کے ذریعہ بتائے گئے تھے، ان کا مطالبہ کیا تو زبیر نے کچھ نامکمل کتابوں اور پرچوں پر نامکمل حساب دیا، یہ حساب اس قدر خلاف قاعدہ تھا کہ وہ حسابات کسی بھی طرح سمجھ میں نہیں آسکا، تب ان حسابات کو بنوانے میں رفعت کے ذریعہ ایک کے بعد ایک اکاؤنٹینٹ بدلے گئے لیکن اکاؤنٹینٹ لوگ حسابات کو بنانے میں ناقابل رہے، جبکہ رفعت کے ذریعہ ان حسابات کو بنانے میں ان لوگوں کو کافی پیسہ دیا گیا چونکہ حسابات کافی بے ترتیب اور سلسلہ وار نہیں دیئے گئے تھے، اسی کشمکش وجد وجہد میں کافی عرصہ گذر گیا، زبیر کے ذریعہ بارہ ہزار روپئے کی تنخواہ طے کرتے وقت جو فیکٹری کو ٹائم درکار تھا، جیسا کہ انہوں نے یقین دہانی کرائی تھی وہ ٹائم نہیں دے سکے، جس کی وجہ سے تقریباً پونے گیارہ لاکھ روپئے کا نقصان دکھا رہے ہیں، مال کی بکری کی وصولیابی خود جا کر نہیں کر سکے، جس کی وجہ سے خریداروں نے پینتالیس ہزار روپئے مار لیے، جس آدمی کو وصول یابی کے لیے رکھا تھا وہ آدمی بھی وصول یابی کی رقم میں سے پینتیس ہزار روپئے لے کر بھاگ گیا، زبیر اپنی کارکردگی کے درمیان صحیح طریقے سے حساب وکتاب نہیں رکھ سکے، اور نہ کیش بک اور لیجر صحیح طریقے سے تاریخ وائس حساب وکتاب بنا سکے، اور جو پرچوں کا حساب وکتاب زبیر کے ذریعہ دیا گیا، وہ بھی لم سم میں بنا کسی تاریخ و واؤچر کے جس کی نہ اول ہے نہ چول، اور نہ کوئی خریداری کے پرچہ اور تعداد اور تفصیل جیسا کہ ایک دکاندار یا فیکٹری یا ادارہ اپنا حساب رکھتا ہے، تو پھر ایک پارٹنر دوسرے پارٹنر سے آنے پائی کا حساب نہ دے کر اپنے اخراجات وڈمانڈ کی وصول یابی دوسرے پارٹنر کے ساتھ کیسے کر سکتا ہے؟ اور دوسرا پارٹنر کیوں دے گا؟ پچاس ساٹھ لاکھ روپئے کے حسابات

کیا بنا کسی کیش بک اور لیجر کے بن سکتے ہیں، اگر زبیر ایک منشی رکھ لیتے تو وہ حسابات کو صحیح اصول کے مطابق رکھ لیتا، محض اس لالچ کے بنا پر منشی نہیں رکھا کہ اس کی تنخواہ زبیر کو اپنی تنخواہ بارہ ہزار روپئے مہینے میں سے دینی پڑتی، ان نامکمل اور بے ترتیب حسابات کی وجہ سے زبیر اور رفعت کے درمیان کشیدگیاں بڑھتی جارہی تھیں، تب حالات کے مطابق ان حسابات کو حل کرنے کے لیے برادری کے اشخاص کو متوجہ کیا گیا، ان لوگوں نے اپنا بہت سا قیمتی ٹائم ان حسابات کو سمجھنے اور بنانے میں لگایا، جس میں تقریباً کئی مہینے لگ گئے، جو ڈمانڈ ریحان میاں سے سات لاکھ سینتیس ہزار آٹھ سو ستائیس روپئے کا مطالبہ کیا گیا تھا وہ حساب ایک لاکھ تریسٹھ ہزار روپئے کا بنا، جس کو بڑھا چڑھا کر زبیر نے ریحان میاں کو گمراہ کیا اور اپنا حصہ پچاس پرسینٹ کی جگہ ساٹھ پرسینٹ حاصل کرنے کی زبیر کے ذریعہ کوشش کی گئی، ذرا آپ غور فرمائیں کہ اتنی لمبی چوڑی رقم بتا کر ایک پارٹنر دوسرے پارٹنر کے ساتھ غلط بیانی کرکے اور بنا کوئی حساب وکتاب ریحان میاں کو دیئے اپنے مقصد کو حاصل کرلینے کی سازش کی۔

ہمارا یہ کہنا ہے کہ زبیر کو اگر ساٹھ پرسینٹ کا حصہ لینا ہی تھا تو خریداری کے وقت اس بات کو طے کرلینا چاہیے تھا جبکہ اخراجات کی رقم بھی ساٹھ پرسینٹ اور چالیس پرسینٹ کے حساب سے زبیر کو لینا چاہیے تھی، جبکہ وہ آج تک پچاس پرسینٹ کے حساب سے اخراجات کی وصولیابی کررہے ہیں، زبیر نے اپنی تنخواہ ناقص کارکردگی اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے بارہ ہزار روپئے مہینہ سے آٹھ مہینہ کی ایک لاکھ بیس ہزار روپئے گیس کی بکری میں سے نقد حاصل کرلی، یہاں تک کہ اپنے ذاتی اسکوٹر سے فیکٹری تک کے آنے جانے کا پٹرول کا خرچہ بھی گیس کی بکری کی نقدی سے حاصل کرلیا، اور مزید یہی نہیں بلکہ اپنے پرانے اسکوٹر کو فیکٹری کے ہاتھ دس ہزار سات سو روپئے میں بیچ کر اس کی بھی رقم گیس کی وصول یابی کی رقم میں سے کاٹ لی جبکہ اسکوٹر اپنے پاس ہی رکھا ہوا ہے۔

ڈیزل کا خرچہ پانچ لاکھ چوہتر ہزار پانچ سو روپئے بنا کسی تفصیل کے اور بنا کسی تیل کی آمد اور خرچ کے اور بنا کسی تاریخ کے دکھا رہے ہیں، جبکہ گیس کی بکری کی رقم کی وصولیابی

چار لاکھ تین ہزار دوسو چونتیس روپئے دکھا رہے ہیں، اپنی اور ملازمین اور اسٹاف کی تنخواہ تین لاکھ سترہ ہزار چار سو اڑسٹھ روپئے اور اپنی تنخواہ کے ایک لاکھ دو ہزار روپئے دکھا رہے ہیں، جبکہ فیکٹری کل سوا مہینہ ہی چلائی گئی

کیا فرماتے ہیں علماء دین: کہ زبیر صاحب ریحان میاں مرحوم کے سامنے جو اپنی رقم کی ڈمانڈ سات لاکھ سینتیس ہزار آٹھ سو ستائیس روپئے بغیر کسی حساب وکتاب کے ریحان میاں کو دھوکے میں رکھ کر غلط بیانی کرکے اور ان کی بیماری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پچاس پرسینٹ شیر کی جگہ ساٹھ پرسینٹ شیر طے کرالیا گیا، ریحان میاں نے زبیر صاحب کی سات لاکھ سینتیس ہزار آٹھ سو ستائیس روپئے کی ڈمانڈ کے عوض میں یہ بات کہی کہ فیکٹری کی زمین و جائیداد فروخت ہونے تک سارے اخراجات اور آئندہ بھی کسی بھی قسم کے اخراجات چارج نہیں کریں گے، جبکہ برادری کے دانشوروں نے زبیر صاحب کے حسابات کی رقم سات لاکھ سینتیس ہزار آٹھ سو ستائیس کی جگہ ایک لاکھ تریسٹھ ہزار تین سو پچاس روپئے کی ڈمانڈ نکالی، جبکہ ریحان میاں کے انتقال کے بعد سے بھی اب تک کے سارے اخراجات بھی زبیر صاحب پچاس پرسینٹ یعنی آدھے آدھے مصارف کی رقم لے رہے ہیں، اور اس بات کا گواہ ریحان میاں کی بیوی کو بنایا گیا ہے، اور ان کے علاوہ اس طے شدہ بات کی جانکاری باقی ورثاء کو نہیں تھی، ریحان میاں کے انتقال کے بعد ہی باقی ورثاء کو اس معاہدہ کا علم ہوا۔

برائے مہربانی قرآن وسنت کی روشنی میں ہماری رہنمائی فرمائیں کہ زبیر صاحب پچاس پرسینٹ کی جگہ ساٹھ پرسینٹ کا حصہ شیر ہم وارثان سے ان تمام نقصانات کرنے کے باوجود لینے کا اختیار رکھتے ہیں یا نہیں؟

وارثان ریحان میاں مرحوم: والد، والدہ، اہلیہ کے علاوہ دو لڑکے اور ایک شادی شدہ لڑکی۔

المستفتی: آر۔اے شمسی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مالی حقوق کے ثبوت میں دو عادل، باشرع مرد یا ایک عادل مرد اور دو عورتوں کی شہادت لازم ہے، اور مذکورہ معاملہ میں پچاس پرسینٹ کی جگہ

پر ساٹھ پرسینٹ کے ثبوت میں زبیر کے پاس ایسی شرعی شہادت موجود نہیں ہے اس لیے معاملہ حسب سابق پچاس پرسینٹ پر ہی ثابت ہوگا، لہٰذا حسب سابق پچاس پرسینٹ کے حساب سے معاملہ صاف کرنا لازم ہوگا۔

﴿قال الله تعالیٰ: وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ فَاِنْ لَمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَاَتَانِ. [البقرة: ۲۸۲]﴾

وما سویٰ ذلک من الحقوق يقبل فيها شهادة رجلين أو رجل وامرأتين سواء كان الحق مالا أو غير مال. (هدايه، كتاب الشهادة، اشرفی ۳/ ۱۵٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم رجب المرجب ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۱۸۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۷/۱۴۳۴ھ

مال جس کے قبضہ میں ہو اس کی ملکیت مانی جائے گی

سوال [۱۰۱۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید عمران دونوں کی بکری گم ہوگئی، پہلی جولائی کو، اور ۳۱/ جولائی کو زید کی بکری مل گئی، عمر کہہ رہے ہیں کہ یہ بکری ہماری ہے، اور زید کہہ رہے کہ یہ بکری ہماری ہے، اور ان دونوں بکریوں میں کوئی شناخت نہیں ہے تو اب بکری کس کو ملنی چاہئے؟

المستفتی: مسعود احمد رام نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ زید کی بکری مل گئی اور بکری زید ہی کے قبضہ میں ہے، اب عمر جو اپنی بکری ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے اس کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟ اگر عمر اپنی بکری ہونے کا دو شرعی گواہوں سے ثبوت پیش کردے تو بکری عمر کو مل سکتی ہے، ورنہ بکری زید ہی کی رہے گی۔

ولا تقبل بينة صاحب اليد في الملك المطلق وبينة الخارج أولیٰ ...... ولنا

أن بينة الخارج أكثر إثباتا أو اظهارا لأن قدر ما يثبته بينة اليد لا يشبته بينة ذى اليد إذ اليد دليل مطلق الملك. (هدایہ، کتاب الدعویٰ، باب الیمین، اشرفی ۲۰۳/۳) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۱۵/شعبان ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۵۸۸۲/۳۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۸/۱۵ھ

مظلوم کا حق ضائع نہیں ہوگا

سوال [۱۰۱۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری عدم موجودگی میں میرے گھر میں بلا اجازت داخل ہو کر بچوں کی چھوٹی سی حرکت کی بنا پر میرے بچوں اور میری بیوی کے ساتھ بدسلوکی اور ظلم تشدد امام صاحب نے کیا اور اس واقعہ کے گواہ ایسے موجود ہیں جو میرے پڑوسی ہیں اور نمازی و پرہیز گار ہیں، ویسے بھی یہاں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ امام صاحب ترش مزاج اور غصہ ناک اور لڑنے والے ہیں، جس کی ایک جیتی جاگتی مثال یہ ہے کہ کچھ دن پہلے ایک فقیر سے بلا کسی وجہ یہ امام صاحب الجھے اور اس فقیر کے نازک مقام پر لاتیں مار کر سڑک پر لوٹنے پر مجبور کر دیا، آپ سے گذارش ہے کہ مطلع فرمائیں کہ ایسے امام کے بارے میں علماء دین کیا فرماتے ہیں؟

المستفتی: محمد ابرار بلی تال نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر آپ کا بیان صحیح ہے تو اس معاملہ میں آپ اور آپ کی بیوی بچے مظلوم ہیں اور مذکورہ امام شہر میں ظالم ہوگا، اگر اس دنیا میں اس سے بدلہ نہیں لیا ہے اور نہ ہی اس نے آپ سے معافی مانگی ہے تو آخرت میں عند اللہ آپ کو اس کا بدلہ ملے گا، نیز حدیث میں آیا ہے کہ مظلوم کی بددعا واپس نہیں ہوتی ہے، ضرور قبول ہوتی ہے۔

عن أبى هريرة رضى الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: ثلاث دعوات مستجابات لاشک فيهن: دعوة المظلوم و دعوة المسافر و دعوة الوالد

علی ولده. (سنن الترمذی، باب ما جاء فی دعوة الوالدین، النسخة الهندیة ۲/ ۱۳ دار السلام رقم: ۱۹۰۵، سنن أبی داؤد، باب الدعاء بظهر الغیب النسخة الهندیة ۱/ ۲۱۵ دار السلام رقم: ۱۵۳٦، مسند أحمد بن حنبل ۲/ ۲۵۸، رقم: ۷۵۰۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍صفر المظفر ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۱۸۲۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۲/۱۸ھ

حق تلفی کرنے کا حکم

سوال [۱۰۱۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: حق تلفی کرنے والا کیا گناہ کبیرہ کا مستحق ہے؟ جواب دینے کی زحمت فرمائیں۔

المستفتی: محمد فہیم بن محمد کلیم مغل پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حق تلفی کرنا اور کسی کا حق مارنا جائز نہیں۔

عن سعید بن زید بن عمرو بن نفیل فإنی سمعت ان رسول اللہ ﷺ یقول: من أخذ شبرا من الأرض بغیر حقه طوقه فی سبع أرضین یوم القیامة.

(مسلم شریف، باب تحریم الظلم وغصب الأرض، النسخة الهندیة ۲/ ۳۳، بیت الأفکار رقم: ۱٦۱۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۱۵)

اپنی ملکیت میں تصرف کرنے کا حکم

سوال [۱۰۱۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے اپنی جائیداد کو اپنی زندگی میں اپنے بیٹوں کے درمیان زبانی تقسیم

کردی جس میں کسی بیٹے کے پاس کچھ کم اور کسی کے پاس کچھ زیادہ زمین آئی، اس کو سب بیٹوں نے تسلیم کرلیا اور اپنی جگہ پر مکانات بھی بنالیے ایک بیٹے نے باپ کی زندگی ہی میں اپنا مکان بیچ کر دوسرا مکان خریدا تھا اب باپ کے انتقال کے پندرہ بیس سال کے بعد وہ بیٹا جس نے اپنا حصہ بیچ کر دوسرا مکان بنالیا تھا یہ کہتا ہے کہ باپ کی جائیداد میں میرا حصہ نکل رہا ہے، اور میں اس حصہ کو لے کر مسجد کو دوں گا، جس بھائی کے پاس کچھ زمین زیادہ تھی، اس نے اس بھائی کو دس ہزار روپیہ دیدیئے یہ روپیہ لینا یا حصہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور وہ روپیہ لے کر مسجد کو نہیں دیا، روپیہ مسجد کو دینا ضروری ہے یا نہیں؟

المستفتی: شریف حسین اصالت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب مدعی کے مطالبہ کرنے پر مدعیٰ علیہ نے دس ہزار روپیہ دے دیئے ہیں، اور مدعیٰ علیہ نے دینے سے انکار بھی نہیں کیا، بخوشی دیدیئے ہیں، تو مدعی اس رقم کا مالک ہو چکا ہے، اور سوالنامہ سے اسی طرف اشارہ مل رہا ہے کہ زائد حصہ میں سب کا حق ہے، اسی وجہ سے مدعیٰ علیہ نے دیدی ہے۔

المالک ھو المتصرف فی الأعیان المملوکة کیف شاء من الملک. (بیضاوی ص: ۷)

یتصرف المالک فی ملکه کیف شاء. (البنایہ اشرفیہ ۸/۲۱۹)

الحق لایسقط بتقادم الزمان. (قواعد الفقہ اشرفی ص:۷۷، رقم: ۱۱۶، الموسوعة الفقهية الكويتية ۸/۱۱۷، ۱۳/۱۱۸، ۲۸/۲۷۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۱۵؍ربیع الاول ۱۴۱۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۳۹۲۸)	۱۴۱۵/۳/۱۵ھ

سالوں سے جاری نالی کو مالک زمین کا بند کروانا

سوال [۱۰۱۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے مکان کی نالی جب وہاں کھیت تھا جب بھی چلتی تھی، جب میرے والد نے اس کھیت میں سے جگہ خرید لی جو میرے مکان سے ملی ہوئی تھی، جب بھی ادھر کو نالی چلتی رہی اسی کھیت میں سے حکیم محمد علی صاحب نے جگہ خرید لی جب بھی نالی ادھر ہی کو چلتی رہی، انہوں نے اس میں باغ لگادیا، اب بھی آم کے درخت ہیں اور دوسری چیزوں کے بھی، میں نے اپنے چچا سے تحقیق کی تو انہوں نے بتایا کہ جب دیوار بنائی تھی تو کوئی جگہ نہیں چھوڑی تھی، اب بھی نالی کا پانی ادھر ہی کو جارہا ہے، حکیم محمد علی صاحب کا کہنا ہے کہ آپ نالی بند کرلو، تو قرآن وسنت کی روشنی میں بتائیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟

المستفتی: مرشد علی دلپت پور مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حکیم محمد علی کو حق ہے کہ وہ اپنی زمین میں جاری ہونے والی نالی کو بند کرادیں اور نالی والے کو روکنے کی بات مان لینی چاہیے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/ ۴۴۵)

المالک للشیئ هو الذی یتصرف فیه باختیاره و مشیئته. (بدائع الصنائع، فصل فی بیان ما یبطل به الخیار، زکریا ۲/ ۶۳۸، کراچی ۲/ ۳۲۷)

کل یتصرف فی ملکه کیف شاء. (شرح المجلة رستم اتحاد ۱/ ٦٥٤، رقم المادة: ۱۱۹۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ رجب المرجب ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۵۴۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/ ۷/ ۱۴۱۶ھ

مالک کا اپنی زمین میں راستہ بنانے سے روکنے کا حکم

سوال [۱۰۱۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) سگے بھائی کا پوتا شخص اجنبی ہوتا ہے یا نہیں؟

(۲) ایک فیصلہ ثالثی کی دفعہ ۵/ کی عبارت مندرجہ ذیل ہے:

کہ مکان نمبر D28/21 واقع محلّہ پانڈے حویلی شہر بنارس حلقہ دشاسمیدھ کا شمالی حصہ حاجی عبدالعزیز کو دیا گیا ہے، اس شمالی طرف جو دروازہ آمد ورفت حاجی عبدالعزیز کا ہے یا جو وہ اپنی سہولت سے مکان کے اندر آنے جانے کے لیے آئندہ لگوائیں گے اس میں سے ہوکر رعایتاً مسمیان حاجی عبدالاسماعیل وحافظ محمد سلیمان اوران کے خاندان والے نسلاً بعد نسل آجاسکیں گے، لیکن یہ لوگ اس راستے میں کسی قسم کی کوئی گندگی نہیں کریں گے، نہ کوئی جانور وغیرہ اس میں رکھیں گے، سوائے رعایتاً آمد ورفت کے کسی قسم کا کوئی بھی رعایتی حق ان کو نہیں رہے گا، اور وہ ملکیت ہمیشہ حاجی عبدالعزیز کی رہے گی لیکن اگر کسی وقت حاجی عبدالاسماعیل و حافظ سلیمان یا ان کے وارثان یا قائم مقامان اپنے حصے مکان کو کسی شخص اجنبی کو منتقل کریں گے تو شخص اجنبی منتقل علیہ کو کسی قسم کا کوئی حق اس میں رعایتاً آمد ورفت کا نہیں رہے گا، اور یہ زائل سمجھا جائے گا، حاجی عبدالعزیز و حاجی عبدالاسماعیل و حافظ محمد سلیمان و قاری عبدالحکیم برادران تھے، حافظ محمد سلیمان کے انتقال کے بعد ان کے پسر نے حافظ محمد سلیمان کے کل حق و حصہ کو حافظ محمد سلیمان کے سگے بھائی قاری عبدالحکیم کے سگے پوتوں کو بیع کردیا، منتقل علیہ قاری عبدالحکیم کے پوتوں کو راستہ مذکورہ بالا سے آمد ورفت کا رعایتی حق رہے گا، یا زائل ہوجائے گا؟ جواب باصواب سے نوازیں؟

المستفتی: شمیم احمد بن حاجی عبدالاحد بنارس

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اقرارنامہ کی فوٹو کاپی دیکھنے کی ضرورت تھی، تا

ہم اولادوں میں نکاح بیاہ شادی کے اعتبار سے شریعت کے نقطۂ نظر سے عبدالعزیز کی اولاد کے لیے عبدالحکیم کے پوتے اجنبی ہیں، لہٰذا عبدالعزیز کے پوتے پوتی کا نکاح عبدالحکیم کے پوتے پوتی کے ساتھ جائز ہے، اس اعتبار سے ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں، اور اجنبی کے ہاتھ فروخت کرنے کی صورت میں حق مرور ختم ہونے کی بات ثابت ہوجائے گی۔

یہ بات واضح رہے کہ جائیداد کی تقسیم میں اس طرح کی رعایتی شرط لگانا شرعاً درست نہیں ہے، اور جب حاجی عبدالعزیز اس کا مالک ہے تو جب تک وہ چاہے وہاں سے گذر سکتا ہے اور جب نہ چاہے تو گذر نہیں سکتا، اور جب سلیمان اور اس کی اولاد نے اپنا حصہ فروخت کردیا ہے تو عبدالعزیز نے اس کو اور اس کی اولاد کو جو حق دیا ہے وہ کسی بھی خریدار کو حاصل نہ ہوگا، چاہے خریدار خاندان کا ہو یا غیر خاندان کا، لہٰذا اب فروخت کے بعد عبدالحکیم کو یا اس کے خاندان کو اس پر سے گذرنے کا حق نہیں ہے، بلکہ خریدار اپنی جائیداد کی حقیقی گذرگاہ کا جو اس کی جائیداد کا حق مرور ہے، اسی سے گذر سکتا ہے۔

ویستحق کل واحد من أهل الطريق غير النافذ، الارتفاق بما بين رأس الدرب و باب داره لأن ذٰلک هو محل تردده و مروره، وماعداه هو فيه كالأجنبي من الطريق. (الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۸/ ۳۵٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۱۲/ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۲۵۵)	۱۴۲۸/۴/۱۳ھ

جائیداد بیچنے پر لڑکوں کا اعتراض کرنا

سوال [۱۰۱۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں ایک غریب آدمی ہوں، میرے کچھ بچے اپنے پیروں پر کھڑے ہیں، مگر وہ میری مدد نہیں کرتے، دو بچے میرے ساتھ ہیں، ایک معذور ہے ایک غیر شادی شدہ ہے مجھے اس کی شادی کرنی ہے، میرے پاس کچھ جائیداد ہے میں اس جائیداد کو بیچ سکتا ہوں یا نہیں؟ اور بیچ کر

میرے ساتھ میں جولڑکا ہے اس کی شادی کردوں اور بعض وہ لڑکے جوا لگ رہتے ہیں وہ اس معاملہ میں آڑے آرہے ہیں تو کیا میری جائیداد بیچنے میں کسی کودخل اندازی کرنے کا حق ہے؟

المستفتی: حافظ محمد حسین سرائے حسینی بیگم مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کواپنی جائیداد میں ہرطرح کے تصرف کرنے کا ہروقت حق ہے، چاہے فروخت کردیں، چاہے کسی کو ہبہ کردیں یا صدقہ کردیں،اس میں نہ آپ کے لڑکوں کواعتراض کا حق ہےاور نہ ہی کسی دوسرے کو،لہٰذا آپ اپنی جائیداد جب چاہیں جس طرح چاہیں فروخت کرسکتے ہیں۔

والمالک هو المتصرف فی الأعیان المملوکة کیف شاء من الملک. (بیضاوی شریف رشیدیه، سوره فاتحه ۱/ ۷)

الملک ما من شانه أن یتصرف فیه بوصف الاختصاص. (شامی، مطلب فی تعریف المال، زکریا ۷/ ۱۰، کراچی ٤/ ٥٠٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۱۹۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۶/۸ھ

مالک کا کنویں کی زمین کو اپنے استعمال میں لانا

سوال [۱۰۱۷۶]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں کہ ممتاز حسین ولد حاجی مشتاق حسین کا ایک مکان آراضی محلہ پیرزادہ غلام سرورکی برابر میں ہے،جس میں کنواں تھا، یہ۱۶/ گز زمین ہے جس کا حاجی مشتاق حسین کے نام سے بیع نامہ ہے، میں عمارت کو بنانے چلا تو محلہ کے چندلوگوں نے حاجی محمد یونس پہلوان کے کارخانہ میں میٹنگ کی اورکہا کہ وہ رفاہ عام ہے میں نے کہا کہ یہ ہماری جگہ ہے،محلہ کے آدمیوں نے کہا کہ اگرتمہاری آراضی ہے توتم بھرلواس کا عذاب تمہارے اورتمہارے بچوں

کے سر رہے گا، اس میٹنگ میں میں نے کہا تھا کہ کاتب سے نپوانا چاہو تو نپوادوں گا، غلط ایک گرہ نہیں بھروں گا، اس میٹنگ میں ہادی حسن، شکیل احمد، جلیل احمد، ذاکر حسین، محمد اکرام، شمشاد حسین، اعجاز احمد، شریف احمد، ممتاز احمد، حاجی احسان صاحبان موجود تھے۔

میں نے اس جگہ کو بنالیا تو کئی مرتبہ اور میٹنگ ہوئی، اس میٹنگ میں کبھی کوئی بات تو کبھی کوئی بات نکلی، اب محلے کے حضرات کا کہنا ہے کہ آپ کے پاس کوئی تحریر ہو تو دکھادو، یہ کنواں ۲۰/۲۵ر سال سے بند چلا آرہا ہے، اس کنویں کے سبھی محلّہ کے حضرات اس حق میں تھے کہ یہ کنواں بند ہونا چاہیے، تو میں نے بھرلیا، اب دریافت یہ کرنا ہے کہ اس کنویں کو بند کردینے کی وجہ سے شرعاً ہم گنہگار تو نہیں ہوں گے، جبکہ اس کنویں سے تقریباً ۳۰ر سال سے کوئی پانی نہیں بھرتا تھا، شرعی حکم تحریر فرمادیں؟

المستفتی: مختار حسین پیرزادہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: برتقدیر صحت سوال جب کنواں مختار حسین کی ملکیت کی زمین میں ہے اور ۳۰/۲۵ر سال سے اس کنویں سے پانی بھرنے کا سلسلہ بھی منقطع ہو چکا ہے تو ایسی صورت میں کنویں کی زمین کو اپنے استعمال میں شامل کرنے کا مالک زمین کو حق ہے، اس پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہے۔

ولو كانت البئر أو الحوض أو النهر في ملك رجل فله أن يمنع مريد الشفة من الدخول في ملكه إذا كان يجد ماء بقربه. (درمختار كتاب إحياء الموات، فصل في الشرب، زكريا ١٠/ ١٥، كراچی ٦/ ٤٤٠، البنايه اشرفی ١٢/ ٣١٨، هنديه زكريا قديم ٥/ ٣٩١، جديد ٥/ ٤٥٠)

والمالك هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء من الملك. (بيضاوی شريف رشيديه، سوره فاتحه ١/ ٧)

الملك ما من شأنه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص. (شامی مطلب في تعريف المال زكريا ٧/ ١٠، كراچی ٤/ ٥٠٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ر جمادی الثانیہ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۹۱۴/۳۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/۶/۱۴۱۷ھ

قانون کے تحت جو حقوق ہیں وہ خود بخود لازم ہوجاتے ہیں

سوال [۱۰۱۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (الف) ہمارے یہاں ایک استاذ طویل زمانہ سے میرے اور میرے بھائیوں کے بچوں کو قرآن پاک حفظ کراتے ہیں، زبانی معاملہ کے وقت قیام وطعام اور ماہانہ تنخواہ طے ہوئی تھی، جو ہم ادا کرتے رہے، لیکن حکومت ہند اور حکومت سعودیہ کے اگریمنٹ وقوانین کے تحت ان کے اور بھی حقوق ہمارے ذمہ عائد ہوتے ہیں جن کی رقم تقریباً (۵۰/ ہزار ریالات بنتی ہے، کیا یہ رقم پچاس ہزار ریال ہمارے ذمہ شرعاً وقانوناً واجب الأ داء ہے جبکہ زبانی معاملہ کے وقت ان حقوق کا کوئی ذکر نہیں تھا؟

(ب) قیام و طعام اور ماہانہ تنخواہ کے علاوہ ہم استاذ موصوف کو دو سال میں اپنی طرف اور خوشی سے ایک ٹکٹ آنے جانے کا چھٹی پر جانے کے وقت دیتے رہے ہیں، یہ ٹکٹوں کی رقم ہم حساب میں اب شامل کرسکتے ہیں یا نہیں؟ کیونکہ اس وقت تو ابتداء میں ہم نے اس ٹکٹ کو اپنی طرف سے ہدیہ کہا تھا؟

(ج) مذکورہ رقم پچاس ہزار ریالات ادا نہ کرنے کی صورت میں کیا ہم پر آخرت میں دینداری رہے گی؟

(د) استاذ موصوف اپنی یہ رقم پچاس ہزار ہم سے جبراً اور بغیر ہماری منشاء کے لینے کا استحقاق رکھتے ہیں؟

(ہ) معاملہ کے وقت جمعرات کی چھٹی طے تھی، مگر استاذ نے جمعرات میں بھی پڑھایا ہے (یہ مجھے واستاذ کو یاد نہیں کہ استاذ نے خود پڑھایا تھا یا میرے کہنے پر پڑھایا تھا) کیا ان ایام کی بھی تنخواہ علاحدہ سے ہمارے ذمہ شرعاً وقانوناً واجب الأ داء ہے، اور ادا نہ کرنے کی صورت میں آخرت کا مؤاخذہ ہم پر رہے گا یا نہیں؟

المستفتی: عبدالہادی مکہ مکرمہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (الف) حکومت کے قوانین کے تحت جو حقوق پہلے ہی سے عائد ہیں وہ معاملہ طے کرتے وقت ذکر کیے بغیر خود بخود لازم ہوجائیں گے۔

(ب) جب آپ نے بطور ہدیہ ٹکٹ دیا تو وہ ہدیہ ہی رہے گا بعد میں کسی اور حق کے ساتھ محسوب نہ ہوگا۔

(ج) سرکاری کی طرف سے عائد ہونے والے حقوق کو جب جانبین لازمی سمجھتے ہیں تو وہ لازمی حقوق میں شامل ہوں گے، ان کا ادا کرنا بھی لازم ہوگا ورنہ عنداللہ مواخذہ ہوگا۔

(د) استاذ موصوف اس حق کے مطالبہ کے مجاز ہیں۔

(ہ) جمعرات کی طے شدہ چھٹی میں اگر اپنی مرضی اور خوشی سے پڑھایا ہے تو ان ایام کی الگ سے اجرت کا حقدار نہ ہوں گے، اور اگر آپ کے کہنے پر پڑھایا ہے تو ان ایام کی بھی اجرت کے حقدار ہیں، اب کیسے پڑھایا تھا دونوں خود فیصلہ فرمائیں، مسلمانوں کے اس طرح کے معاملات کا شرعی حکم اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔

عن عمرو بن عوف المزنی أن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا أو أحل حراما والمسلمون على شروطهم إلا شرطا حرم حلالا أو أحل حراما. (ترمذی، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ فی الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/۲۵۱، دار السلام رقم: ۱۳۵۲، المستدرك، الأحكام، مكتبه نزار مصطفى الباز ۷/۳۵۲۳، قديم ۴/۱۰۱، رقم: ۷۰۵۹، المعجم الكبير للطبرانی، دار إحياء التراث العربی ۱۷/۲۲، رقم: ۳۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍شوال المکرّم ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۸۳۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۱۰/۲۷ھ

تنگ دست ہوجانے کی صورت میں ادائے حقوق کی شکل

سوال [۱۰۱۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص نے دوسروں کے حقوق دبائے، چاہے وہ روپیوں کی شکل میں ہوں یا زمین وجائیداد کی شکل میں، اب اسے سمجھ آئی تو وہ اپنی غلطی پر نادم ہے، اور ارادہ ہے کہ اگر

اللہ نے مجھے وسعت دی تو دوسروں کے حقوق جو ہم نے دبائے ہیں ان کو ضرور ادا کروں گا فی الحال ادائیگی کی وسعت نہیں، اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے، اگر اس ارادے کے ساتھ وہ مرجائے تو کیا آخرت میں پھر بھی اس کی گرفت ہوگی؟ یا اللہ تعالیٰ اس کی توبہ اور ادائیگی کے ارادہ کی وجہ سے معاف فرمادیگا؟ اور اہل حقوق کے حق کو اپنے پاس سے ادا کریگا، یا کہ اس کی نیکیاں اہل حقوق کو دی جائیں گی؟ جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: امیر حسن مدرسہ حبیبیہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس شخص نے دوسروں کے حقوق دبائے ہیں ان کی توبہ کی قبولیت کے لیے اور آخرت کی گرفت سے بچنے کے لیے شرائط توبہ میں سے ایک شرط یہ ہے کہ وہ صاحب حق کو اس کا حق ادا کردے، اور اگر فی الحال ادائیگی کی وسعت نہیں رکھتا تو حصول قدرت پر ادائیگی کی نیت کرے، اور صاحب حق سے مہلت لے لے اور مرنے سے پہلے اپنے ترکہ میں سے ادا کرنے کی وصیت کر جائے۔

التوبة واجبة من كل ذنب ...... وإن كانت المعصية تتعلق بآدمي فشروطها أربعة: هذه الثلاثة و أن يبرأ من حق صاحبها فإن كانت مالا أو نحوه رده إليه (تحته) وظاهر كلامه توقف صحة التوبة على ما ذكر من الرد والتمكين أي إن أمكنه ذٰلك وإلا نویٰ ذٰلک إذا قدر أو طلب العفو.

(رياض الصالحين مع دليل الفالحين ١/٤٥-٥٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۳۲ ۵۸۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۶/۲۸ھ

صلوٰۃ الحاجۃ پڑھ کر اللہ سے حقوق العباد معاف کرانے کا حکم

سوال [۱۰۱۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: عبداللہ اکثر دورکعت نماز حاجت پڑھ کر یہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ اس نماز کی برکت سے جن کے حقوق میرے ذمہ ہیں ان کے حقوق کی ادائیگی فرما اور اپنا حق معاف کردے، اس طرح حقوق العباد معاف ہوسکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: شفیع احدالاعظمی الرفاع

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جی نہیں، حقوق العباد صاحب حق سے معاف کرائے بغیر معاف نہیں ہوتے۔

عن أبی هریرة رضی الله عنه أن رسول الله ﷺ: لتؤدن الحقوق إلی أهلها یوم القیامة حتی یقاد للشاة الجلحاء من الشاة القرناء. (صحیح مسلم، باب تحریم الظلم، النسخة الهندیة ۲/ ۳۲۰ بیت الأفکار رقم: ۲۵۸۲، مشکوٰة ۲/۴۳۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/رجب المرجب ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/۳۲۵۳)

کسی وجہ سے ایک ہزار روپیہ بینک میں رہ جائے تو کیا حکم ہے؟

سوال [۱۰۱۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے اے ٹی ایم سے دو ہزار روپئے نکالے، مگر اے ٹی ایم نے دو ہزار کے بجائے تین ہزار روپئے کاٹے، بغیر کسی غلطی کے اور پاس بک میں بھی اے ٹی ایم کے مطابق تین ہزار ہی درج ہیں اس بات کی شکایت بینک سے کی گئی تو اس نے کہا میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہیں، اور میرے پاس بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ اس کی کوئی کارروائی کرسکوں، اس رقم کو پورا کرنے کے لیے بینک سے جو بیاج ملتا ہے اس میں سے اس رقم کو پورا کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد قاسم لال مسجد مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں آپ کی جو ایک ہزار کی رقم

اے ٹی ایم مشین کی ناقص کارکردگی کی بنا پر بینک کے ذریعہ باقی رہ گئی ہے اور آپ کے اکاؤنٹ سے وہ رقم کٹنے کے باوجود آپ کو وہ رقم حاصل نہ ہوسکی تو اس صورت میں بینک کی جانب سے ملنے والی اضافی رقم کے ذریعہ اس عنوان سے اپنا حق وصول کرنے کی گنجائش ہے؛ کیونکہ اپنا حق غاصبِ حق کے مال سے کسی بھی عنوان سے وصول کرنا شرعاً جائز ہے اور اضافی رقم بینک کا مملوکہ پیسہ ہے۔

وجد دنانير مديونة وله عليه درهم له أن يأخذه لإتحادهما جنسا في الثمنية ...... والفتویٰ اليوم على جواز الأخذ عند القدرة من أي مال كان.

(شامي، كتاب الحجر، زكريا ۹/ ۲۲۱، كراچی ٦/ ١٥١)

الأمور بمقاصدها. (الأشباه والنظائر كراچی ص:٤٣، قواعد الفقه اشرفی ص: ٦٢، رقم: ٥١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷رمحرم الحرام ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۲۵۲/۳۹)

گرام سماج کی زمین پر مکان بنانے کا حکم

سوال [۱۰۱۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک گاؤں میں ایک حافظ صاحب پڑھاتے تھے، گاؤں کی کھلیان وغیرہ کے لیے کچھ زمین پڑی تھی، مدرسہ کے قریب ہی تھی، گاؤں کے کچھ لوگوں نے اس زمین پر الگ الگ حصہ متعین کر کے قبضہ کر رکھا تھا، پھر جن لوگوں نے اس پر قبضہ کیا تھا ان لوگوں نے اپنے اپنے قبضہ کی زمین ملکیت میں پڑھانے والے حافظ صاحب کو دیدی، اوران سے کہا کہ اس زمین پر آپ اپنا مکان بنالیں، پردھان نے بھی اس زمین کو دینے کی منظوری کردی تھی، اور تھانہ میں بھی بات چیت کرلی تھی اور حافظ صاحب کے نام تحریر دیدی تھی، حافظ صاحب نے اس پر

قبضہ کیا اور بنیاد بھر کر ڈال دی، پھر ایک سال کے بعد تعمیر شروع کی جب اچھی خاصی دیواریں کھڑی ہوگئیں تو گاؤں ہی کے ایک شخص انور نے اوراس کے کچھ حامیوں نے اس تعمیر پر روک لگوادی، اور پولیس کے ذریعہ ممانعت ہوگئی، اب چارونا چار حافظ صاحب کو اپنی اینٹیں اکھاڑ کر اپنے گاؤں لے جانا پڑیں، حافظ صاحب کا کافی نقصان ہوا۔

تو اب دریافت یہ کرنا ہے کہ جس شخص نے اس تعمیر پر روک لگائی ہے اس زمین پر اس کا قبضہ بھی نہیں تھا، اور زمین گرام سماج کی تھی، اور پردھان اور قابض لوگوں نے اجازت دی تھی، تو اب جس نے روک لگوائی ہے جس کے نتیجہ میں حافظ صاحب کا نقصان ہوا ہے اب وہ نقصان روک لگانے والے پر ادا کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ جبکہ مکان کی تعمیر کے بارے میں اسے پہلے سے ہی معلوم تھا، ایک سال تک بنیاد بھری پڑی رہی اس وقت اشکال نہیں کیا پھر تعمیر کی شروعات میں نہیں روکا، اور جب کافی تعمیر ہوگئی تو اس نے ایسی حرکت کی تو کیا شرعاً نقصان کے برابر رقم انور کو دینا پڑے گی، یا شرعاً جن لوگوں نے تعمیر کی اجازت دی تھی ان پر نقصان والی رقم ادا کرنا ضروری ہے؟ اس معاملہ میں جو بھی شریعت کا حکم ہو مطلع فرمائیں، اور اگر یہ لوگ نقصان والی رقم ادا نہیں کریں گے تو کیا آخرت میں ان لوگوں کو دینا پڑیگا، اور آخرت میں ان لوگوں سے باز پرس ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: محمد طیب سیتاپوری متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: ایسی زمین جو گرام سماج کی ہو، اس کا استعمال گرام سماج کی اجازت پر موقوف ہوتا ہے، اگر گرام سماج اجازت دیدے تو اس میں ہر طرح کا تصرف جائز ہو جاتا ہے، لہٰذا مذکورہ سوال میں چونکہ حافظ صاحب کو گرام سماج یعنی پردھان کی جانب سے اجازت تحریر کے ساتھ مل چکی تھی، اس لیے انور صاحب کو مکان بنانے سے رکوانے کا کوئی حق نہیں تھا، لہٰذا اس روکنے پر حافظ صاحب کو جو نقصان ہوا اس نقصان کی رقم انور صاحب کو دینا پڑے گی، اگر بقدر نقصان رقم واپس نہ کرے اور حافظ صاحب سے معافی تلافی بھی نہ کرے تو

آخرت میں حقوق العباد کے تحت باز پرس ہوسکتی ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۸/۴۶۱)

عن أبی هریرة رضی الله عنه أن رسول الله ﷺ: لتؤدن الحقوق إلی أهلها یوم القیامة. (مسند أحمد بن حنبل ۲/۵۳۲، رقم: ۷۲۰۳) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۱۲؍محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۳۴۲۴ ۶)

ایک امام صاحب سے متعلق چند سوالات کے جوابات

سوال [۱۰۱۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک مسجد کے امام صاحب شادیوں کے موقع پر نکاح پڑھاتے ہیں، ایک بار تین لڑکیوں کا نکاح پڑھا دیا، لڑکی والے نے امام صاحب کو نکاح کے بعد روپیہ دیا تو امام صاحب نے پورے مجمع میں کہا کہ شادیوں میں تو آپ لوگ لاکھوں روپیہ خرچ کرتے ہیں اور امام صاحب کو جو نکاح پڑھاتے ہیں اس کو اتنے سے روپیہ میں تو فی لڑکی کے حساب سے ۲۵۲ روپیہ لوں گا، موجود لوگوں نے امام صاحب کو سمجھایا اور پھر لڑکی والے نے اور رقم کا اضافہ کیا تب امام صاحب مانے پھر ایک شادی پر مفتی صاحب تشریف لائے تو لڑکی والوں نے مفتی صاحب سے نکاح پڑھوالیا اس پر لڑکی والے ایک سو روپیہ ایک جوڑا اور ایک جوڑا امام کے والد محترم کو اور ۵۰؍ روپیہ بھی دینے آئے تو امام صاحب نے یہ لینے سے انکار کردیا کہ آپ نے مجھ سے نکاح کیوں نہیں پڑھوایا، اس ناراضگی کی وجہ سے یہ سامان نہیں لیا، پھر کافی کہنے کے بعد امام صاحب نے وہ سامان لیا پھر ایک دو نکاح ہوئے جس میں امام صاحب کو لڑکی والوں نے ۱۰۵ روپیہ بھیجے، تو امام صاحب نے یہ کہہ کر واپس کردیئے کہ میں ۲۵۲؍ روپیہ لوں گا، ایک مرتبہ مسجد کے واسطے کچھ رقم آئی، ذمہ دار مسجد نے وہ رقم امام صاحب کو دیدی، امام صاحب نے اس امانت کو بلا بتائے خرچ کرلیا، ذمہ دار کے معلوم کرنے پر امام صاحب نے فرمایا آپ میری تنخواہ سے کاٹ لینا، وہ رقم خرچ ہوگئی ہے، پھر علاقہ کے لوگوں

نے امام صاحب سے بات کی کہ آئے دن نکاح پر اس طرح کی باتیں ہوتی ہیں یہ ٹھیک ہے؟
تو امام صاحب نے فرمایا کہ نکاح پڑھانے کی اجرت لینا جائز ہے، اگر کم ملے تو زیادہ مانگنی چاہیے اور جو جتنا خرچ کرے گا اتنا ہی ثواب ملے گا، تو امام کا یہ فرمانا کہ نکاح کی اجرت لینا جائز ہے اور کم ملے تو زیادہ مانگنی چاہیے اس بات سے سائل کے دل میں امام صاحب کی طرف سے کدورت ہوگئی ہے، سائل نے امام صاحب سے یہ کہہ دیا کہ جب تک یہ مسئلہ معلوم نہ کرلوں گا آپ کے پیچھے نماز نہیں پڑھوں گا، لہٰذا سائل امام صاحب کے پیچھے نماز نہیں پڑھ رہا ہے اس بات کے علاوہ اور بھی امام صاحب کی باتیں ہیں جیسے ایک آدمی نے بقرعید کی قربانی کے وقت جانور کے حلال کرنے پر جو دعا پڑھی جاتی ہے اس دعا کے واسطے اور ساتھ چلنے کی درخواست کی کہ امام صاحب میرے بکرے پر دعا پڑھ دیں تو امام صاحب نے فرمایا کہ قربانی میں دعا پڑھنا بدعت ہے، صرف تین مرتبہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کردو، اسی وقت دوسرا ایک آدمی آیا، امام صاحب آپ یہاں کھڑے ہیں وہاں گھر پر جانور کے پاؤں بندھے پڑے ہیں، آپ چل کر دعا پڑھ دیں تو امام صاحب فوراً اس آدمی کے ساتھ چل دیئے۔

مسجد میں اکثر دیر سے نماز پڑھاتے ہیں، کبھی کبھی تو فجر کی نماز میں نمازی امام صاحب کو گھر سے بلا کر لاتے ہیں اور اگر کبھی کوئی شکایت کرتا ہے تو کہتے ہیں، تسبیح وذکر کرتے رہو ثواب ملتا رہے گا، یا فرماتے ہیں کوئی اور امام تلاش کرلو، سائل نے ایک دفعہ کہا، نماز پڑھائیے وقت ہوگیا تو امام صاحب نے فرمایا مہمان سنت پڑھ رہے ہیں اس کے بعد نماز ہوگی، سائل نے کہا یہ بھی مسئلہ ہے تو کہا ہاں یہ بھی مسئلہ ہے، اور پھر نماز ۲۰ رمنٹ بعد ہوئی، اور امام صاحب آئے دن اپنی تنخواہ میں اضافہ کے لیے فرماتے ہیں، جبکہ معقول آمدنی امام صاحب کی ہے، مسجد مبلغ ایک ہزار روپیہ مدرسہ سے پانچ سو روپیہ کی آمدنی اور رمضان شریف میں ختم قرآن پر چار ہزار روپئے سے زیادہ مل جاتے ہیں اور وقت وقت پر امام صاحب کی خدمت ہوتی رہتی ہے، شادیوں میں نکاح خوانی کے علاوہ نوازا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ، مندرجہ بالا سوالات کے جوابات مطلوب ہیں؟

المستفتی: اصغر علی قریشی بلندشہر یوپی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) بطیب خاطر اور خوش دلی سے اولیائے زوجین نکاح پڑھانے والے کو جو رقم دیں وہ لینا جائز ہے۔(مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۴/۲۵۹،جدید ڈابھیل ۱۷/ ۹۸)

وکل نکاح باشره القاضی ...... ولم یجب علیه مباشره حل له أخذ الأجرة علیه. (تاتارخانیة زکریا ۱۱/۱۱۹، رقم: ۱۵۶۳٤، هندیه زکریا قدیم ۳/۳٤٥، جدید ۳/۳۰٦)

(۲) قربانی کرتے وقت ایک مرتبہ بسم اللہ اللہ اکبر کہنا ضروری ہے، اس کے علاوہ دعاؤں کا پڑھنا لازم نہیں ہے، بلکہ جس کو دعا یاد ہے اس کے لیے پڑھنا مستحب ہے اور یہ سمجھنا کہ اس کے بغیر قربانی نہیں ہوتی ہے یہ بدعت سے خالی نہیں ہے۔

تشترط التسمیة من الذابح حال الذبح. (در مختار مع الشامی، کتاب الذبائح، کراچی ٦/۳۰۲، زکریا ۹/٤۳۸، هدایه اشرفی دیوبند ٤/۳٤٦)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ذبح کرتے وقت جو دعا پڑھی تھی وہ مستحب ہے۔

عن جابر بن عبد الله قال: ذبح النبی ﷺ یوم الذبح کبشین أقرنین أملحین موجئین فلما وجههما قال: إنی وجهت وجهی للذی فطر السمٰوات والأرض علی ملة ابراهیم حنیفا وما أنا من المشرکین، إن صلاتی و نسکی ومحیای ومماتی لله رب العالمین لاشریک له وبذٰلک أمرت وأنا من المسلمین، اللهم منک و لک عن محمد و أمته بسم الله والله أکبر ثم ذبح. (سنن أبی داؤد، کتاب الضحایا، باب ما یستحب من الضحایا، النسخة الهندیة ۲/۳۸٦، دار السلام رقم: ۲۷۹٥، مشکوٰة شریف ۱/۱۲۸)

(۳) نماز اپنے وقت مقررہ پر پڑھانی چاہیے، مہمان کی دلجوئی کے لیے برضاء مقتدی وقت کے اندر تاخیر کی گنجائش بھی ہے۔(مستفاد: فتاویٰ دارالعلوم ۵/۴۲)

أما الإنتظار قبل الشروع فی غیر ما یکره کمغرب، وعند ضیق وقت، فالظاهر عدم الکراهة ولو لمعین إلا إذا ثقل علی القوم. (حاشیة الطحطاوی علی الدر المختار کوئٹه ۱/۲۲۰)

(۴) رمضان شریف میں قرآن کریم سنانے کی اجرت لینا اور دینا دونوں ناجائز ہیں۔

یمنع القاری للدنیا والآخذ والمعطی آثمان. (شامی، باب الإجارة الفاسدة، مطلب: فی الأجرة علی الطاعات، زکریا ۹/۷۷، کراچی ٦/٥٦)

اور امام صاحب کو جو ہزار روپئے دیئے جاتے ہیں اگر وہ دینا طے ہیں خواہ امام صاحب سنائیں یا نہ سنائیں تو وہ روپئے امام صاحب کو دینا جائز ہیں، اور صرف قرآن سنانے کی وجہ سے دیئے جاتے ہیں تو امام صاحب کے لیے لینا جائز نہیں اور دینے والے بھی گنہگار ہوں گے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۴/۲۷۶، جدید ڈابھیل، ۱۷/۶۸)

(۵) امام صاحب کا تنخواہ میں اضافہ کا مطالبہ کرنا ناجائز نہیں ہے، اور اضافہ کا مطالبہ کرنا نہ تو توکل کے خلاف ہے اور نہ امام پر یہ الزام عائد ہوسکتا ہے کہ لوگوں کی جیبوں پر نظریں رہتی ہیں، اللہ پر توکل وبھروسہ کم رہتا ہے، بلکہ امام صاحب کا گذر وبسر کرنے کے لیے تنخواہ میں اضافہ کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔

ثم ما هو أقرب لعمارته كإمام مسجد و مدرس مدرسة يعطون بقدر كفايتهم. (شامی، کتاب الوقف، مطلب یبدأ من غلة الوقف بعمارته، زکریا ٦/٥٦٠، کراچی ٤/٣٦٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ رشعبان المعظم ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر ۳۱/ ۳۵۷۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰/۸/۱۴۱۴ھ

۲ باب حقوق الوالدین

ماں باپ اور اولاد کے ایک دوسرے پر کیا حقوق ہیں؟

سوال [۱۰۱۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) اولاد کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ماں باپ پر کیا فرائض رکھے ہیں؟

(۲) اور ماں باپ پر اولاد کے کیا فرائض ہیں؟

(۳) کیا بہو کو بھی ساس سسر کو گالیاں دینا، کوسنا اور برا بھلا کہنے کا حکم ہمارے مذہب میں ہے؟ یعنی اگر ساس یا سسرا اپنے بیٹے کی بہو کو گالیاں دیں یا اپنی اولاد کو یہ حکم دیں کہ اس کو مارو پیٹو اور خود بھی گالیاں کوسنا وغیرہ کریں، تو کیا یہ ہی شرع کا حکم بہو کو بھی ہے؟

(۴) ماں باپ کے پاس ایک گھر ہے جس میں چار کمرے ہیں جن میں سے ایک پر بڑا بیٹا قابض ہے، اور دو پر وہ خود، چوتھے کمرہ پر دوسرا بیٹا اور یہ کہا جائے کہ جگہ چھوٹی ہے اور تم یہ جگہ خالی کرو تو کیا یہ جگہ خالی کرنے کا حکم ہے؟

(۵) ماں باپ کا جائز یا ناجائز کوسنا اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوگا یا نہیں؟ جس میں سراسر غلطی اولاد کی نہ ہو تو کیا اللہ تعالیٰ جائز یا ناجائز نہیں دیکھے گا؟

(۶) اگر ماں باپ کو کوسنے دیں اور اولاد خاموشی توڑ کر کوئی جواب دیدے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی پکڑ ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: حبیب احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) اللہ تبارک وتعالیٰ نے اولاد پر ماں باپ کے یہ حقوق رکھے ہیں کہ ان کے ساتھ احسان وہمدردی، رواداری، عاجزی وانکساری، ادب واحترام، ان کی دل جوئی کرنے نیز ان کے سامنے جھکے رہنے اور ان کی مرضی کی رعایت

کرنے کا حکم فرمایا ہے، اوران کی دل شکنی حتی کہ اف کہنے سے بھی منع فرمایا ہے۔

﴿فَلَا تَقُلْ لَهُمَا اُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا. [إسراء: ٢٣]﴾

(۲) ماں باپ پراولاد کے حقوق یہ ہیں کہ جب بچہ پیدا ہو جائے تو اس کا اچھا نام رکھیں، اور پیدائش کے ساتویں دن یا چودھویں یا اکیسویں دن اس کی طرف سے عقیقہ کردیں اوراس کے بعد سر منڈادیں اور بالوں کے برابر چاندی یا اس کی قیمت صدقہ کردیں، اوراس کو اچھی تعلیم وتربیت دیں، یہ تمام ذمہ داری بچہ کے بالغ ہونے سے قبل ماں باپ کے ذمہ عائد ہوتی ہیں،اور جب بالغ ہو جائے تو اس کی شادی کردیں،اور تاخیر نہ کریں،حدیث پاک میں آیا ہے کہ اگر بچہ کے بالغ ہونے کے بعد ماں باپ اس کی شادی میں لاپرواہی اور تاخیر کرتے رہے جس کی وجہ سے یہ بچہ معصیت میں مبتلا ہوجائے تو اس معصیت کا وبال ماں باپ کے سر پر ہوگا۔(معارف الحدیث ۶/۴۲)

(۳) بہو کو ڈانٹ ڈپٹ، گالم گلوج اور مار پیٹ وغیرہ کرنے کا خسر وساس کو کوئی حق نہیں ہے، اگر یہ لوگ ایسا کریں گے تو سخت ترین ظالم ثابت ہوں گے البتہ یہ حقوق صرف شوہر کو حاصل ہیں۔

﴿وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ. [النساء: ٣٤]﴾

(۴) باپ اپنی جائیداد روپیہ پیسہ کا خود مالک ہے اور باپ کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی بالغ شادی شدہ اولاد کو یہ کہیں کہ مکان خالی کردیں، اوراپنے مکان کا خود انتظام کرلیں اس پر اولاد کو اعتراض کا کوئی حق نہیں۔

والمالک هو المتصرف فی الأعیان المملوکة کیف شاء من الملک. (بیضاوی شریف رشیدیه، سوره فاتحه ۱/۷)

یتصرف المالک فی ملکه کیف شاء. (البنایة اشرفیه ۸/۲۱۹)

(۵) اولاد کے اوپر لازم ہے کہ ماں باپ کو ایسا موقع ہرگز نہ دیں کہ ماں باپ اولاد کے بارے میں کوستے رہیں، اوراس لیے کوستے ہوں گے کہ اولاد نے ماں باپ کی دل شکنی کررکھی ہوگی، اس لیے کہ اولاد کا فریضہ ہے کہ ماں باپ کے پیروں میں پڑ کر ان کو راضی

کرے صرف دکھاوا کے لیے کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اسی کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ اِنْ تَكُوْنُوْا صَالِحِيْنَ فَاِنَّهُ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا. [بنی اسرائیل: ٦٤]﴾

(٦) جی ہاں اگر اولاد خاموش نہ رہ کر ماں باپ کو جواب دیں گی تو لازمی بات ہے کہ ماں باپ کی اور دل شکنی ہوگی اس سے اللہ کے یہاں اولاد کی سخت گرفت ہوگی، اسی کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَلَا تَقُلْ لَهُمَا اُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا، وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ. [بنی اسرائیل: ٢٤]﴾ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍صفر المظفر ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ٦۴۹٦)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۲/۱۷ھ

باپ کے حقوق بیٹوں پر

سوال [۱۰۱۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید باہر کسی شہر میں رہتا ہے، اور اس کے بیوی بچے کسی دوسرے گاؤں میں، اب اگر زید کا لڑکا عمر کوئی غلط کام کرتا ہے تو زید دنیا والوں کے سامنے یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیتا ہے کہ اس کی والدہ نے اس کو بگاڑ دیا تو کیا زید آخرت میں بھی یہ بات کہہ کر پیچھا چھڑا لے گا اور کیا زید کے پیچھے نماز پڑھنا ٹھیک ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد راغب سہسپور بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: زید آخرت میں یہ بات کہہ کر اپنی ذمہ داری سے چھٹکارا نہیں پا سکتا، اس لیے کہ ہر ایک دوسرے کا ذمہ دار ہے، مرد اپنے اہل وعیال کا ذمہ دار ہے، آخرت میں اپنی ذمہ داری کے بارے میں پوچھ ہوگی، لہٰذا زید کو چاہیے کہ اپنے بیٹے کی

اصلاح کرنے کی فکر کرے چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

عن عبد الله بن عمر يقول: سمعت رسول الله ﷺ يقول: كلكم راع و كلكم مسئول عن رعيته، الإمام راع و مسئول عن رعيته والرجل راع في أهله وهو مسئول عن رعيته. (بخاری شریف، باب الجمعة فی القریٰ والمدن، النسخة الهندية ١/ ١٢٢، رقم: ٨٨٣، ف: ٨٩٣)

اور زید کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۴۵۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۱/۱۹ھ

والد کے ذمہ بیٹوں کے کتنے حقوق ہیں

سوال [۱۰۱۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک بہتر سالہ انسان ہے، زید بذات خود تعلیم یافتہ انسان ہے، زید کا تعلیمی معیار کچھ اس طرح ہے کہ زید بذات خود کلام پاک کے سترہ پارہ کا حافظ ہے، قرأت کے فن سے اچھی طرح واقف ہے، قرآن پاک با قاعدہ تجوید کے ساتھ پڑھتا ہے، علاوہ ازیں دینی تعلیم کافیہ تک پڑھا ہوا ہے، دنیوی تعلیم اردو گجراتی اور انگریزی دس درجہ تک پڑھا ہوا ہے، با قاعدہ مقرر ہے، تقاریر بھی قرآن وحدیث کی روشنی میں کرتا ہے، زید کا مطالعہ کافی وسیع ہے، زندگی کے پچاس سال امامت اور درس وتدریس میں ہی گذرے ہیں، مختصر یہ کہ زید بذات خود ذی علم شخص ہے، زید کا کہنا ہے کہ باپ کے اوپر بیٹے کے تین حق ہیں، یعنی تین فرض ہیں:

(۱) لڑکا پیدا ہو تو خدا اور رسول کے ناموں میں سے کوئی نام رکھ دے۔

(۲) لڑکے کے سن بلوغت تک پہنچنے تک اسے دینی تعلیم اتنی ضرور دلائے کہ لڑکا خود کو مسلمان سمجھے اور خدا اور رسول کے احکام کو پہچان سکے، نماز روزہ کے مسائل سے پوری طرح واقف ہو جائے، بزرگوں کے مقام کو پہچان سکے، اسلام کے تقاضوں کو سمجھ سکے، زید یہ

بھی کہتا ہے کہ لڑکے کو حافظ وقاری یا عالم بنانا ضروری نہیں ہے، ہاں باپ کو اپنی آخرت کی فکر ہو تو حافظ قاری یا عالم بنادے باقی باپ پر یہ چیزیں فرض نہیں ہیں۔

(۳) لڑکا جب جوان ہو جائے تو کسی نیک لڑکی سے اس کی شادی کر دے اس کے بعد زید کا کہنا ہے کہ باپ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گیا، اب لڑکے کا فرض ہے کہ باپ کو مرتے دم تک سنبھالے، لیکن بکر کا کہنا ہے کہ باپ کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ لڑکے کی شادی کے بعد اسے رہنے کے لیے مکان بھی بنا کر دے، ورنہ پرائی لڑکی کہاں آ کر رہے گی؟ اور زید بکر کی یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں اب شرعی حکم کیا ہے؟ زید اپنی جگہ صحیح ہے اور بکر کا کہنا غلط ہے یا بکر کا کہنا صحیح ہے؟

المستفتی: عبدالرشید فاروقی سریندر نگر گجرات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بکر کا یہ کہنا کہ شادی کے بعد رہنے کے لیے مکان بھی دے تو باپ کے ذمہ یہ نہیں ہے بلکہ صرف شادی تک کی ذمہ داریاں ہیں، اس لیے کہ شادی کے بعد بیوی کی تمام ذمہ داری شوہر پر لازم ہوتی ہیں، شوہر کے باپ پر نہیں، لہٰذا بیوی کا نان ونفقہ تمام اخراجات رہائش وغیرہ سب شوہر پر لازم ہوتے ہیں؟ لیکن دوسری طرف یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر باپ سرمایہ دار ہے، رہائش کی اتنی گنجائش اس کے پاس موجود ہے کہ بیٹے کو آسانی سے رہائش گاہ دے سکتا ہے تو باپ کا بیٹے کو رہائش دینا شہری زندگی اور گھریلو زندگی کے عرف وتعامل میں شامل ہے، اس لیے اخلاقی فریضہ ہے، شرعی فریضہ باپ پر نہیں ہے، اخلاقی طور پر ایسا باپ بیٹے کو رہائش دے جس کے پاس گنجائش ہو اور اگر باپ رہائش گاہ نہ دے تو باپ شرعی طور پر گنہگار نہ ہوگا، نیز اگر باپ کے پاس رہائش کی گنجائش نہیں ہے تو باپ کی رہائش کا نظم بیٹے پر لازم ہے، اور جو مرد بیوی کا نان ونفقہ دینے پر قادر ہے وہ بیوی کے لیے رہائش کرایہ پر بھی لے سکتا ہے، لہٰذا رہائش کا انتظام کرنا باپ پر شرعی فریضہ نہیں ہے، اس اعتبار سے زید کا قول صحیح ہے، اور بکر کی بات ایسے باپ کے حق میں درست نہیں ہے، جس کے پاس گنجائش نہ ہو ہاں البتہ جس باپ کے پاس گنجائش ہو تو اس

پر بھی شرعی فریضہ نہیں ہے، صرف اخلاقی فریضہ ہے، اور نصوص میں جن فرائض کا ذکر ہے ان میں وہی تین فرائض کا ذکر آتا ہے، جن کے بارے میں زید نے سوال میں ذکر کیا ہے۔

وعن أبی سعید وابن عباس قالا قال رسول الله ﷺ: من ولد له ولدا ذکرا أو أنثیٰ فلیحسن اسمه و أدبه معرفة أدبه الشرعی وإذا بلغ فلیزوجه فإن بلغ: أی وهو فقیر ولم یزوجه أی الأب وهو قادر فأصاب أی الولد إثما أی من الزنا ومقدماته فإنما إثمه علی أبیه أی جزاء إثمه علیه وهو محمول علی الزجر و التهدید للمبالغة. (مرقاة المفاتیح، قبیل باب إعلان النکاح، الفصل الثالث، امدادیه ملتان ۲۰۹/٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍محرم الحرام ۱۴۲٦ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸٦۵۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲٦/۱/۲۰ھ

بیٹی پر والد کے حقوق کیا کیا ہیں؟

سوال [۱۰۱۸٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میری شادی ۱۹۴۹ء میں ایک پرائیویٹ سروس پیشہ شخص سے ہوئی تھی، سسرال پہنچ کر مجھے مزید بی ایڈ کرنا پڑا، اور ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت کرنی پڑی جو کہ آج تک کر رہی ہوں، میری دو لڑکیاں ہوئیں، جن کی تعلیمی اور تمام تر ضروریات بذات خود میں نے پوری کیں، میرے شوہر نے کبھی بھی پورے طور پر گھر کے اخراجات نہیں اٹھائے، جب میری لڑکی ۲۰؍سال کی عمر میں کڈنی فیل ہونے کی وجہ طویل بیمار ہوئی اور انتقال کرگئی اس کے علاج کے تمام تر اخراجات خود میں نے اور میرے بھائیوں نے کیے، اس وقفہ میں صرف چند دن ہی میرے شوہر بچی کی بیماری میں میرے ہمراہ رہے، میرے خسر اور ساس کے انتقال ہو جانے کی وجہ سے میرا سسرال میں رہنا مزید دشوار ہو گیا، اور ۱۹۹۱ء سے آج تک اپنے بھائیوں کے ہمراہ رہ رہی ہوں، میں نے چھوٹی بیٹی کی شادی پر اپنے شوہر سے ہر طرح سے شادی میں

شرکت کی درخواست کی لیکن وہ نہ تو شریک ہوئے اور نہ ہی کسی قسم کا تعاون کیا، اب اپنی بیٹی اور داماد سے اپنی بیماری کا تذکرہ کر کے مدد چاہتے ہیں کیا مجھے اور بیٹی داماد کو ان کی مالی مدد کرنا چاہیے جبکہ داماد نے آج تک ان کو دیکھا بھی نہیں ہے؟

اس سال میں نے اپنی چھوٹی بہن کے ہمراہ حج بیت اللہ پر جانے کی درخواست دی ہے، براہ کرم میری رہنمائی فرمائیں کہ کیا میرا اپنے شوہر سے ابھی بھی ازدواجی تعلق باقی ہے؟

کیا مجھے حج بیت اللہ پر جانے کے لیے اپنے شوہر کی اجازت کی ضرورت ہے، شرعی طور پر میری رہنمائی فرمائیں؟

المستفتیہ: خورشیدہ زیدی معرفت عزیز خاں چودھری، پیر غیب، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب کوئی ضرورت مند مسلمان کسی دوسرے مسلمان سے مدد طلب کرے تو اس مسلمان پر حق بنتا ہے کہ اپنی وسعت کے مطابق اس کی مدد کرے تو جب ایک باپ اپنی بیٹی سے بیٹی ہونے کے ناطہ مدد چاہ رہا ہے تو بیٹی کو چاہیے کہ اپنے باپ کی بھر پور مدد کرے اور اس کی ضرورت پوری کرے اور اسی طرح بیوی کو بھی اپنے شوہر کی پوری مدد کرنی چاہیے اور پچھلی رنجش اور اختلاف کو بھول جانا چاہیے۔

عن أبی موسیٰ عن النبی ﷺ قال: المومن للمؤمن کالبنیان یشد بعضه بعضا، ثم شبک بین أصابعه، وکان النبی ﷺ جالسا إذا جاء رجل یسأل او طالب حاجة أقبل علینا بوجهه، فقال: اشفعوا فلتؤجروا ولیقض الله علی لسان نبیه ماشاء. (بخاری شریف، الأدب، باب تعاون المؤمنین بعضهم بعضا، النسخة الهندیة ۲/ ۸۹۰، رقم: ۵۷۹۲، ف: ۶۰۲۷)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا ارشاد ہے:

عن أبی هریرة رضی الله عنه عن النبی ﷺ قال: ...... والله فی عون العبد ما کان العبد فی عون أخیه. (سنن الترمذی، باب ما جاء فی الستر علی المسلم، النسخة الهندیة ۲/ ۱۴، دار السلام رقم: ۱۹۳۰، صحیح مسلم، باب فضل الاجتماع علی تلاوة القرآن والذکر، النسخة الهندیة ۲/ ۳۴۵، بیت الأفکار رقم: ۲۶۹۹)

اور جب شوہر نے طلاق نہیں دی ہے تو آپ بدستور اسی شوہر کی بیوی ہیں چاہے ایک زمانہ تک دونوں کے درمیان ملاقات نہ ہوئی ہو، پچھلی رنجش کو بھول کر دونوں کو ساتھ رہنا چاہیے۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۶/ ۸۸)

اور آپ کو اگر حج کو جانا ہے تو محرم یا شوہر کے ساتھ جانا چاہیے اگر شوہر کے ساتھ نہیں جاتی ہیں اور کسی محرم کے ساتھ جانا ہے تو بہتر ہے کہ شوہر سے بھی اجازت لے لی جائے، نیز بہن ایسی محرم نہیں ہے جو رفیق سفر بن سکے، بلکہ محرم مرد ہی ہوا کرتا ہے، اس لیے بہن یا بہنوئی کے ساتھ حج کو جانا جائز نہیں ہے۔

أن يكون معها زوجها أو محرم لها فإن لم يوجد أحدهما لايجب عليها الحج. (بدائع الصنائع، کتاب الحج فصل شرائط فرضية الحج، زکریا ۲/ ۲۹۹، کراچی ۲/ ۱۲۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۹؍ رجب المرجب ۱۴۲۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۴۵۱)	۹/ ۷/ ۱۴۲۵ھ

ماں کی خدمت کس کے سپرد ہے لڑکوں یا لڑکیوں کے؟

سوال [۱۰۱۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عمر نے اپنے پیچھے ایک زوجہ تین لڑکے اور تین لڑکیاں چھوڑی ہیں اور وراثت میں ایک مکان، لہٰذا شریعت کے اعتبار سے اس کی تقسیم کی کیا صورت ہے، کیا لڑکوں کے حصہ کے ساتھ ساتھ بیوہ اور لڑکیوں کا بھی حصہ بنتا ہے، کس کا کتنا بنتا ہے، تحریر فرمائیں، اور شرعی اعتبار سے ماں کی خدمت کس کے سپرد ہے، لڑکیوں کے یا لڑکوں کے؟

المستفتی: مصطفیٰ حسن لین ۱۰، ہلدوانی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: بشرط صحت سوال وبعد اداء حقوق وعدم موانع

ارث عمر کا ترکہ حسب ذیل طریقہ سے تقسیم ہوگا:

عمر میـــــــــــــــــــــــــــت ۷۲/۸						
بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی
۱/۹	۱۴	۱۴	۷/۱۴	۷	۷	۷

کل ترکہ ۷۲/ سہام میں ہوکر ہر وارث کو اتنا ملے گا جو اس کے نام کے نیچے درج ہے اور ماں کی مالی خدمت لڑکوں پر لازم ہے، اور اگر لڑکیوں کے پاس ذاتی ملکیت کی معقول دولت ہے تو لڑکیوں پر بھی ماں کی خدمت میں برابر شریک ہونا لازم ہے اور اگر لڑکیوں کے پاس ذاتی کوئی معقول رقم نہیں ہے تو وہ خود تنگ دست شمار ہوں گی، اور ان پر ماں کی خدمت لازم نہ ہوگی۔

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده أن رجلا أتى النبي ﷺ فقال: يا رسول الله! إن لي مالا وولدا و أن والدي يحتاج مالي، قال: أنت و مالك لوالدك، إن أولادكم من أطيب كسبكم فكلوا من كسب أولادكم. (سنن أبي داؤد، البيوع، باب الرجل ياكل من مال والده، النسخة الهندية ۲/ ۴۹۸ دار السلام رقم: ۳۵۳۰)

فإن كان الأولاد ذكورا و إناثا موسرين فنفقة الأبوين عليهم بالسوية في أظهر الروايتين وفي الخانية وعليه الفتوىٰ. (الفتاویٰ التاتارخانية زكريا ۵/ ۴۲۵، رقم: ۸۳۶۶، المبسوط للسرخسي، دار الكتب العلمية بيروت ۵/ ۲۲۲، حاشية چلپي، امداديه ملتان ۳/ ۶۴، زكريا ۳/ ۳۲۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم صفر المظفر ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۳۰۰)

ماں کی خدمت کی وجہ سے نکاح نہ کرنے کا حکم

سوال [۱۰۱۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: زید عالم دین ہے، صاحب استطاعت ہے عمر چالیس سال ہو چکی ہے، مگر اپنا نکاح نہیں کرتے جب معلوم کیا تو بتلاتے ہیں کہ میری والدہ بیمار رہتی ہیں، والدہ کی خدمت کی وجہ سے نکاح نہیں کرتا، نکاح کرنے سے والدہ کی خدمت میں کوتاہی ہوگی، معلوم یہ کرنا ہے کہ والدہ کی خدمت کی وجہ سے نکاح نہ کرنا درست ہے؟ اس سلسلے میں شرعاً کیا فیصلہ ہے؟

المستفتی: عبدالرشید سیڑھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: عام حالات میں نکاح کرنا شرعاً مسنون ہے، اس لیے زید کو چاہیے کہ نکاح کر لے، اور محض اس عذر کے سبب کہ والدہ کی خدمت میں کوتاہی ہوگی، نکاح نہ کرنا باعث معصیت ہے، اس لیے نکاح بھی کرنا چاہیے اور والدہ کی خدمت بھی کرنی چاہیے، دونوں ضروری ہیں:

عن أبي أمامة قال قال رسول الله ﷺ: أربعة لعنوا في الدنيا والآخرة و أمنت الملائكة: رجل جعله الله ذكرا فأنث نفسه و تشبه بالنساء وامرأة جعلها الله أنثى فتذكرت و تشبهت بالرجال والذي يضل الأعمى و رجل حصور ولم يجعل الله حصوراً إلا يحى بن زكريا عليه السلام.

(المعجم الكبير، دار إحياء التراث العربي ۸/ ۲۰۴، رقم: ۷۸۲۷) فقط واللّٰہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد عفا اللّٰہ عنہ
۲۱ رشوال المکرّم ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۱۳۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۷/۱۰/۱۹ھ

قوانین شریعت میں والدین کے حکم پر پابندی کا لزوم

سوال [۱۰۱۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے والدین بزرگوار تبلیغی نصاب کتاب کا مطالعہ کرنے سے سخت منع کرتے ہیں، والدین کا حکم ماننا بھی شریعت میں لازم ہے، یہ بات میری سمجھ سے بالکل باہر ہے، میں

کشمکش میں پڑ گیا ہوں، اب آپ سے مشورہ لینا چاہتا ہوں کہ میں اس کتاب کو اپنے والدین سے چھپا کر پڑھ سکتا ہوں کہ نہیں، ویسے میرے پاس دوسری کتابیں ہیں، میرے والد صاحب نے میری غیر حاضری میں اسے پتہ نہیں کہاں چھپا کر رکھ دیا ہے، آپ سے گذارش ہے کہ آپ مجھے صحیح مشورہ دے کر میرے دل ودماغ کو سکون پہنچانے کی زحمت گوارہ کریں؟ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش وخرم رکھے۔ (آمین)

المستفتی: حارث احمد، احمد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تبلیغی نصاب جیسی دینی کتاب کا مطالعہ کرنے سے اگر والدین ممانعت کرتے ہیں تو اس طرح دینی امور میں والدین کے حکم کا پابند رہنا لازم نہیں ہے، والدین کے حکم کی پابندی موافق شریعت حکم میں لازم ہے، مخالفت شریعت حکم میں لازم نہیں، لہٰذا والدین کے آداب ملحوظ رکھتے ہوئے آپ تبلیغی نصاب کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ (معارف القرآن ٥/٤١٥)

عن علی رضی الله عنه أن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم بعث جیشا –إلی– وقال لا طاعة فی معصیة الله، إنما الطاعة فی المعروف. (صحیح مسلم، باب وجوب طاعة الأمر فی غیر معصیة ...... النسخة الهندیة ٢/١٢٥، بیت الأفكار رقم: ١٨٤٤)

عن ابن عمر رضی الله عنه عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: السمع والطاعة حق مالم یؤمر بالمعصیة، فإذا أمر بمعصیة فلاسمع ولاطاعة. (صحیح البخاری، الجهاد، باب السمع والطاعة للإمام مالم یامر بمعصیته، النسخة الهندیة ١/٤١٥، رقم: ٢٨٦٦، ف: ٢٩٥٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢٤ رشوال المکرم ١٤٠٩ھ
(الف فتویٰ نمبر: ١٤٥٣/٢٥)

کیا ماں کا نان ونفقہ اولاد پر ضروری ہے؟

سوال [۱۰۱۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں چھمن بیگم بیوہ زوجہ مقبول خاں مرحوم اپنے بچوں کے ساتھ باہم ممبئ میں ایک کرایہ کے مکان میں سکونت پذیر ہوں، اس جائے رہائشی مکان کا کرایہ نامہ میرے نام ہے، میرے حق دار بچوں میں تین لڑکیاں اور دو لڑکے ہیں جن میں دو لڑکیاں اور دو لڑکوں کی شادی ہو چکی ہے، ایک لڑکی غیر شادی شدہ ہے، جس کی شادی کی، اس کے بھائی کسی طور پر بھی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے، گھر کی کفالت کے ذرائع بالکل نہیں ہیں، جس کی وجہ سے میں بیوہ ضعیفہ بے حد پریشان رہتی ہوں، میری بڑی لڑکی جو شادی شدہ ہے اور اسکول ٹیچر ہے، اس کا شوہر عرب ملک میں ملازمت کرتا ہے اس لڑکی کو میں نے اپنی مدد کے لیے اپنے مکان میں اپنے ساتھ رکھ رکھا ہے، زیادتر وہی گھر کے اخراجات بذات خود روپئے پیسے سے برداشت کرتی ہے، مکان کا کرایہ بھی لڑکی ہی ادا کرتی ہے۔

(۱) میرا چھوٹا لڑکا جو اپنے والد کے انتقال کے بعد عرب ملک میں ملازمت کرتا تھا، وہ وہاں سے میرے یعنی اپنی والدہ بیوہ اور بہنوں کے لیے گھر کے اخراجات کے لیے پیسہ بھیجتا تھا، جو اس کی ذمہ داری تھی، اپنی شادی ہونے کے بعد عرب ملک سے ملازمت چھوڑ کر ممبئ آ گیا ہے اور آ کر مکان میں رہنے لگا ہے اور شادی کے بعد ذہنی اخلاقی طور سے اس قدر بدل گیا ہے کہ عرب ملک میں جو بھی ملازمت کرتے ہوئے روپیہ اس نے گھر کے اخراجات کے لیے بھیجا تھا، اور جو سامان اس نے گھر کی ضرورت اور زینت کے لیے بھیجا یا لایا تھا یا جو سامان اس نے اپنی بہنوں کو شادی کے لیے بھیجا تھا، اب وہ تمام اپنا بھیجا ہوا روپیہ اور سامان سختی سے واپس لینے کا مطالبہ کرتا ہے اور اس مطالبہ کو لے کر آئے دن گھر میں رنجش رکھتا ہے اور جھگڑا کرتا ہے اور میرے ساتھ کسی طرح کا بھی تعاون نہیں کرتا جبکہ اس رہائشی مکان کے سڑک کی جانب کھلے حصہ کو دوکان کی صورت میں استعمال کیا جاتا ہے،

جس میں یہ لڑکا بجلی کا کام کرتا ہے، اور اسی طرح میرا بڑا لڑکا دوکان کے حصے کے نصف جگہ میں درزی کا کام کرتا ہے، وہ بھی مجھے گاہ گاہ پانچ روپئے دے کر احسان جتاتا ہے، ان لڑکوں سے ضروریات وگھر کے اخراجات کے لیے پیسہ طلب کرتی ہوں تو یہ لڑکے میرے ساتھ بے عزتی اور ناروا سلوک کے ساتھ پیش آتے ہیں اور اپنی بہنوں پر بھی، دشنام طرازی اور الزام تراشی کرتے ہیں، میرے ساتھ کچھ بھی تعاون نہ کرتے ہوئے مکان کو فروخت کرکے اپنا اپنا حصہ طلب کرتے ہیں؟

المستفتی: خورشیدہ خاتون ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) آپ کے دونوں لڑکوں پر آپ کے اخراجات وضروریات کا پورا کرنا واجب ہے، اگر یہ لوگ آپ کے اخراجات برداشت نہ کریں یا جو کچھ آپ پر خرچ کر چکے ہیں اس پر طعن وتشنیع کرنے لگیں تو وہ لوگ عنداللہ سخت گنہگار اور نافرمان ثابت ہوں گے۔

﴿وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا. [لقمان: ۱۵]﴾

عن طارق المحاربی قال: قدمنا المدينة فإذا رسول الله ﷺ قائم على المنبر يخطب الناس وهو يقول: يد المعطى العليا، وابدأ بمن تعول: أمک، وأباک، وأختک وأخاک ثم أدناک أدناک. مختصر (سنن النسائی، باب أيتهما اليد العليا، النسخة الهندية ۱/ ۲۷۲ دار السلام رقم: ۲۵۳۳، مسند البزار، مكتبه العلوم والحكم ۵/ ۱۳۸-۳۲۴)

وعلى الرجل أن ينفق على أبويه و أجداده و جداته إذا كانوا فقراء. (مختصر القدوری كتاب النفقات ص:۱۹۳، هدايه اشرفی ۲/ ۴۴۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ جمادی الثانیہ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۲۹۱)

کیا نادار والدین کا خرچہ اولاد کے ذمہ واجب ہے؟

سوال [١٠١٩١]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (١) زید کے دولڑکے ہیں اور دونوں بالغ ہو چکے ہیں اور دونوں کہتے ہیں کہ تمہارا میرے ذمہ کوئی احسان نہیں ہے اور نہ کھلانے کا کوئی ذمہ ہے، حالانکہ زید ضعیف بھی ہو چکا ہے تو کیا ان دونوں بالغ لڑکوں پر زید کو کوئی جبر وزبردستی کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

(٢) زید کی ماں اور بیوی دونوں موجود ہیں اور دونوں کو کھانا کھلانے کا ذمہ دار زید ہے، اور زید کے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ دونوں کو کھلا سکے، بلکہ صرف ایک ہی کو کھلا سکتا ہے تو ایسی صورت میں بیوی کو کھلائے یا ماں کو؟ شرعاً کس کو ترجیح دی جائے گی، کیونکہ اگر ماں کو نہیں کھلایا تو وہ مفلسی کی وجہ سے دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرے گی، اور بیوی کو نہ کھلائے تو اس کا بھی یہی حال ہوگا ایسی صورت میں شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: محمد بہادر حسین مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (١) اگر زید فقیر اور نادار ہے تو اس کا خرچہ اس کے دونوں لڑکوں پر واجب ہے اور خرچہ حاصل کرنے میں زور وجبر زید کے لیے جائز ہوگا۔

وعلى الرجل أن ينفق على أبويه و أجداده و جداته إذا كانوا فقراء و إن خالفوا في دينه. (هدايه، كتاب الطلاق، فصل نفقة الأولاد الصغار على الأب، اشرفي ديوبند ٢/٤٤٥)

ويجبر الرجل الموسر على نفقة أبيه و أمه إذا كانا محتاجين لقوله تعالىٰ: ووصينا الإنسان بوالديه حسنا (العنكبوت: ٨) **فقد أوجب على الولد الإحسان بوالديه، ورأس الإحسان بوالديه في إحيائهما، وكذٰلک بالإنفاق عليهما وقال عليه السلام: إن أطيب ما ياكل الرجل من كسبه و إن ولده**

لمن كسبه فكلوا من اكتساب أولادكم إذا احتجتم إليه بالمعروف.

(المحيط البرهاني، المجلس العلمي بيروت ٤/٣٤٩، رقم: ٤٥٤١)

(۲) جب ماں فقیر ہے تو بیوی کی طرح ماں کا خرچ بھی زید پرواجب ہے لیکن دونوں کا خرچہ برداشت نہ ہوسکے تو قرضہ لے کر دونوں کے ساتھ خرچہ میں رواداری کا معاملہ کرنا ہوگا۔

ومن أعسر بنفقة امرأته لم يفرق بينهما و يقال لها استديني عليه.

(هدايه باب النفقة اشرفي ديوبند ٢/٤٣٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۲۸/ذی قعدہ ۱۴۱۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۴۲۳۶)	۱۴۱۵/۱۱/۲۸ھ

کمزور والدین اور بھائی بہن کا خرچہ بھی واجب ہے

سوال [۱۰۱۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کسی ماں باپ کی وہ اولاد جس کی شادی ہوگئی ہو اور لڑکے کے چھوٹے بھائی بہن ہوں اور ماں باپ کا کوئی ذریعہ آمدنی نہ ہو (خواہ وہ کسی بھی اعتبار سے) کیا ان ماں باپ کے شادی شدہ لڑکے پر یہ فرض ہوتا ہے کہ لڑکے اپنی بیوی اور بچوں کے پرورش کے علاوہ اپنے ماں باپ اور بھائی بہن کی پرورش کی ذمہ داری بھی لیں یا اس کی کچھ حدود ہیں کہ کسی ایک حد تک ہم ان کی معاشی زندگی کے اعتبار سے تعاون کریں؟

المستفتی: عبدالصبور اڑیسہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کمزور اور غریب والدین اور معذور بھائی بہن ہوں جو کمانے سے عاجز ہیں ان کے اخراجات بھی ایسے ہی واجب ہیں جیسا کہ بیوی کے اخراجات ہیں۔

إن جميع ما وجب للمرأة وجب للأب و الأم على الولد من طعام و شراب و كسوة وسكنىٰ حتى الخادم. (شامی، باب النفقة مطلب: في نفقة

الأصول، کوئٹہ ۲/ ۷۳٦، کراچی ۳/ ٦۲۲، زکریا ٥/ ۳٥٥، البحر الرائق زکریا ۸/ ۳٥۰، کوئٹہ ۸/ ۲۰٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/ محرم الحرام ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۴٦٦)

اولاد کا والد کے ساتھ بدکلامی اور مار پیٹ کرنا

سوال [۱۰۱۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے گاؤں میں کسی وجہ سے باپ بیٹے میں نوک جھوک ہوگئی تو باپ نے بیٹے سے کہا کہ اللہ سے ڈرو، نماز پڑھو، تو جواباً بیٹے نے باپ سے کہا کہ جنت میں میرا گھوڑا تم سے آگے ہوگا اور باپ کو مارنے کے لیے اٹھا اور بیٹا کسی صاحب نسبت بزرگ سے بیعت بھی ہے تو اس سے بیٹے کے ایمان میں کوئی خطرہ ہے؟ جواب سے نوازیں۔

المستفتی: مولانا محمد وسیم صاحب بھاگلپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: باپ بیٹے کی گفتگو کے دوران باپ کا بیٹے سے یہ کہنا کہ اللہ سے ڈرو اور نماز پڑھو یہ شریعت کی تعلیمات کے مطابق صحیح اور درست ہے اور قرآن کریم کی آیت

﴿قال اللہ تعالیٰ: یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ. [آل عمران: ۱۰۲]﴾

﴿قال اللہ تعالیٰ: وَاَقِیْمُوْا الصَّلَاۃَ وَآتُوْا الزَّکَاۃَ. [البقرۃ: ۴۳]﴾

کے تقاضہ کے عین مطابق ہے، اور پھر بیٹے کا جواباً باپ سے یہ کہنا کہ جنت میں میرا گھوڑا آگے رہے گا، اور باپ کو مارنے کے لیے اٹھنا بیٹے کی دنیا اور آخرت کی تباہی و بربادی کا سبب ہے، حدیث میں آیا ہے کہ اولاد کے حق میں باپ کی بددعا مسترد نہیں ہوتی، قرآن میں آیا ہے کہ جس درجہ میں اللہ کی عبادت لازم ہے تقریباً اسی درجہ میں ماں باپ کا ادب و

احترام اوران کے ساتھ رواداری بھی لازم ہے، اس لیے بیٹے پر لازم ہے کہ باپ کے پیروں میں پڑ کر معافی مانگ لے، ورنہ دنیا اور آخرت میں تباہی اور بربادی کا خطرہ ہے۔

﴿وَقَضَى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوْا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا. [الاسراء: ۲۳]﴾

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: ثلاث دعوات مستجابات لا شك فيهن دعوة المظلوم و دعوة المسافر و دعوة الوالد على ولده.

(ترمذی، باب ما جاء في دعوة الوالدين، النسخة الهندية ۲/۱۳ دار السلام رقم: ۱۹۰۵، سنن أبي داؤد، باب الدعاء بظهر الغيب، النسخة الهندية ۱/۲۱۵ دار السلام رقم: ۱۵۳٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۳۵۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۶/۲۴ھ

والدین کے ساتھ ہر حال میں حسن سلوک لازم

سوال [۱۰۱۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں جتنی باتیں لکھ رہا ہوں بالکل سچ ہیں، پیسہ کی کمی کی وجہ سے پوسٹ کارڈ میں لکھ رہا ہوں، براہ کرم غور فرما کر جواب دیں، احسان ہوگا، میں صرف آخرت کی فکر میں لکھ رہا ہوں اس لیے کہ اس سٹنے سے دنیا وآخرت کا نقصان ہی ہے، فائدہ نہیں ہے، کیونکہ میں بھی آدمی ہوں، دنیا بگڑنے میں زیادہ صبر نہیں کرپاتا ہوں، کچھ نہ کچھ بول ہی دیتا ہوں، اور جدا رہتا ہوں تو صرف ایک بگاڑ ہے کہ جدا رہنے کا گناہ ہوگا، اور میل کرنے پر سینکڑوں بگاڑ ہیں، اس لیے بتایا جائے کہ ایسی حالت میں جدا رہوں یا میل کروں، حالات یہ ہیں کہ میرے والدین مجھ سے بچپن سے کام لیتے رہے، جب کام میں کبھی کمی آتی بس تم کون ہو، ہم کون، ہونے لگا، اگر جدا ہوئے تو ان لوگوں کو کوئی پرواہ نہیں، اور سٹتے تو سب چھوڑ کر کے میرا کام کرو

اور میرے دوسرے بیٹے کو خوش رکھو چاہے وہ کہے کہ سماج سے جدا ہو جاؤ تو جدا ہو جاؤ، مسجد جانا بند کرو تو بند کرو، بیوی بچوں کی دیکھ بھال کرنا چھوڑ دو تو چھوڑ دو، اور بیوی بچوں کو چھوڑ کر میرے کام میں لگے رہو، ورنہ ان کو میری کوئی پرواہ نہیں، اس لیے کہ مال سے پر ہیں، دوسرے بیٹے بیوی بچوں کو چھوڑ کر ان کے حکم میں لگے ہوئے ہیں، اور کوئی کمائی نہیں کرتے ہیں صرف اسی حکم میں لگنے سے مکان ملا، بینک میں رکھنے کو پیسے ملے، تیسرے بیٹے اپنی ہوشیاری سے اپنی بیوی بچوں کو تو الگ رکھتے ہیں مگر پیسہ لوٹتے رہتے ہیں، میری مخالفت میں ان کی جے جے ہے، مجھ سے شروع سے یعنی بچپن سے ہی نفرت ہے، اور کام لینے میں خوب آگے ہیں، میں خدا کے ڈر سے کام سب کر دیتا ہوں، بجز دنیا وآخرت کی تباہی کے، مثلاً انہوں نے کہا کہ پڑھائی چھوڑ دو تو پڑھائی چھوڑ دی، نوکری کرلو تو نوکری کر لی، شادی کرلو تو شادی کر لی، پہلی شادی اپنے دوست کی لڑکی سے کی مگر جب مال ومتاع نہیں ملا تو اسے بھگا دیا یہاں تک کہ وہ میکہ چلی گئی، اور پہلی ولادت میں انتقال کرگئی، اس سے میں مایوس رہنے لگا، تو دوسری شادی کر دی، اس کے بعد اس کو بھی نکال دیا، چنانچہ میں اسے لے کر وہاں چلا گیا، جہاں کام کرتا تھا، وہ بڑی حسین تھی، اوباشوں نے اس کا پیچھا کیا، اور مجھ سے چھڑا دیا، پھر میں مایوس رہنے لگا اور گھر لوٹ آیا، ان لوگوں کی جھڑکی، سیاست اور کام کرنے کے حکم کو پورا کرنے وغیرہ سہتا رہا، بالآخر یہ لوگ محلہ میں بدنام ہوگئے، جس سے بعد میں محلہ چھوڑ کر ان لوگوں کو ہی بھاگنا پڑا، بدنامی کی شہرت سے متأثر ہو کر ان لوگوں نے میری تیسری شادی کر دی، مگر یہ عورت اپنے شہر کی ہے، ہمارے والدین اور بھائیوں کے حالات سے ناواقف ہے، آتے ہی اس نے لڑائی شروع کر دی، اور جیسی تیری ویسی میری کرنے لگی، جس سے والدین اور بھائی بوکھلا گئے کہ اب سیدھے کی معاون کڑی آگئی، پھر نکال دیا، یہ نکلی تو ضرور مگر شہر میں ہلا ہو گیا، بھائیوں نے یہ حالات دیکھ کر مجھے دس فٹ چوڑی اور ۴۰ر فٹ لمبی ایک زمین دے کر ساری جائیداد دونوں بھائیوں نے اپنے اپنے نام کر لی، اور محلّہ چھوڑ کر دوسرے محلّہ میں جا بسے، والدین دونوں ریٹائر ہیں، سرکاری ٹیچر تھے، اب پنشن پا رہے ہیں، اس پیسے سے یہی چاروں آدمی مصرف لے رہے ہیں، ذرا بھی سٹتا ہوں تو یہ لوگ چوکنا ہو جاتے

ہیں، اب بتایا جائے کہ ایسی حالت میں جدائی اختیار کی جائے اور جدائی کی پکڑ ہوگی، اگر ہوگی تو اس کا بدل اور تدارک بتایا جائے، یا کوئی عمل بتایا جائے کہ ان لوگوں کی نفرت ختم ہو اور مجھ سے میرے من کے مطابق سلوک کریں، کیونکہ اس طرح میں نے ۵۳/ برس گذار دیئے، اب نہ صحت نہ بیوی، بچے، موافق اگر سٹتے ہیں تو بیوی بچوں سے جدا ہوتے ہیں، مالی حالت ہمیشہ میری خراب رہی، میں کبھی غیر مقروض نہیں رہا، اس کے لیے بھی دعا کریں؟

المستفتی: محمد فیاض گوڑاگڑھ بہار شریف نالندہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: والدین سے دلی محبت رکھیں وہ اگرچہ بیزار ہوں، مگر آپ ان سے بیزار نہ ہوں، موقع ملے تو ان کی خدمت بھی کیا کریں، بھائی اگر نقصان پہنچانے پر آمادہ ہوں تو ان سے تعرض نہ کریں، بس اپنے کام سے کام رکھیں، قرآن کریم میں ہر حالت میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی گئی ہے۔

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا. [العنكبوت: ٨]﴾

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا. [الأحقاف: ١٥]﴾ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۴/ربیع الاول ۱۴۲۰ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۶۰۵۸)	۱۴۲۰/۳/۴ھ

والد کے فاسد العقیدہ ہونے کے باوجود ان کا احترام ضروری

سوال [۱۰۱۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک دیندار لڑکے کے والد صاحب اس واسطے اس سے ناراض ہیں کہ وہ ان سے عقائد کے لحاظ سے جداگانہ ہے، والد صاحب دوسرے فرقہ سے واسطہ رکھتے ہیں جب کہ لڑکا صوم وصلاۃ کا پابند ہے اور والد صاحب صوم وصلاۃ کے پابند نہیں ہیں، دینیات کی کتابیں پڑھتے ہیں، مگر عمل نہیں کرتے، لیکن لڑکے سے ناراض رہتے ہیں، لڑکا اپنا علاحدہ

کما تا اور خرچ کرتا ہے، لڑکے کی شادی کو قریب دس سال ہو گئے ہیں، بچے بھی ہیں، کبھی کبھی مکان وغیرہ سے بے دخل کرنے کی دھمکی بھی دے چکے ہیں، اور لڑکا ان کے بدعتی عقائد کو پسند نہیں کرتا، بڑوں کا احترام کرنا واجب جانتا ہے اس کو کیا کرنا چاہیے؟ آگاہ کیجئے۔

المستفتی: اشفاق احمد محلہ سرسی مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: باپ کا احترام وعزت واطاعت ہر حال میں واجب ہے چاہے باپ بدعت یا کفریہ عقیدہ کیوں نہ رکھتا ہو، لڑکا اپنا عقیدہ مضبوط رکھتے ہوئے باپ کا احترام بھی ملحوظ رکھا کرے۔

عن أسماء بنت أبي بكر رضي الله عنهما قالت: قدمت علي أمي وهي مشركة في عهد قريش، إذ عاهدوا رسول الله ﷺ و مدتهم مع أبيها، فاستفتت رسول الله ﷺ فقالت: يا رسول الله! إن أمي قدمت علي وهي راغبة أفأصلها؟ قال: نعم صليها. (صحيح البخاري، باب إثم من عاهد ثم غدر، النسخة الهندية ١/٤٥٢، رقم: ٣٠٨٠، ف: ٣١٨٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍رجب المرجب ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۸۰۷)

باپ کی شان میں گستاخی، اور نافرمان اولاد کو محروم کرنا

سوال [۱۰۱۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ۲۰؍ربیع الاول ۱۴۱۷ھ کو معزز ومکرم مفتیان کرام دار العلوم دیوبند نے جو فتویٰ صادر فرمایا ہے وہ سوالنامہ کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے، مگر سوال واقعہ کے خلاف اور غلط تھا، واقعہ یہ ہے کہ جس وقت میں نے دوسری شادیاں کی تھیں، اس وقت میرے بیٹے ظہیر عالم کی عمر دس بارہ سال سے زیادہ نہیں تھی، اس نے جو تحریر کیا ہے بالکل جھوٹ ہے؟

المستفتی: ابوالحسن بارہ دری مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دارالعلوم دیوبند کا جواب سوال کے لحاظ سے صحیح ہے، نیز حضرت مجیب مدظلہ العالی نے احتیاط کا جملہ بلاوجہ شرعی کی قید لگا کر بار بار تحریر فرمایا ہے کہ سب کچھ باپ کی ملکیت ہے اور اولاد کے درمیان وجہ شرعی کے بغیر فرق نہ کیا اور اب باپ کے وضاحتی سوالنامہ نے وجہ شرعی کی علت نافرمانی کو واضح کر دیا ہے۔ (مستفاد: مجمع الانہر دار الکتب العلمیۃ بیروت ۳/ ۴۹۷، مصری قدیم ۲/ ۳۵۸، ہندیہ زکریا قدیم ۴/ ۳۹۱، جدید ۴/ ۴۱۶، محمودیہ قدیم ۱۴/ ۴۴۶، جدید ڈابھیل ۱۶/ ۵۰۴، فتاویٰ احیاء العلوم ۱/ ۲۸۳، احسن الفتاویٰ ۷/ ۲۵۶)

میں نافرمان اولاد کو کچھ بھی نہ دینے کی اجازت موجود ہے اور نہ دینے سے باپ گنہگار بھی نہ ہوگا، اب سوالات کے جوابات حسب ذیل ہیں، باپ کی تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ باپ نے جس وقت دوسری شادیاں کیں تھی اس وقت بیٹے کی عمر صرف دس بارہ سال کی تھی اور اسکول میں پڑھ رہا تھا، اور پھر بیٹے کا یہ کہنا کہ شرکت اور محنت ومشقت کی کمائی سے باپ نے دوسری شادیاں کر کے اولاد میں اضافہ کیا ہے اور باپ کے بارے میں یہ کہنا کہ کاروبار سے زیادہ اپنے نفس پر توجہ دی ہے، یہ باپ کی شان میں گستاخی ہے، جو بیٹے کی دنیا اور آخرت کی بربادی کا سبب بن سکتی ہے، باپ کو اذیت دینا اور باپ سے زبان درازی کرنا باپ کو دلی صدمہ پہنچانا یہ سب بیٹے کے لیے نہایت خطرناک اور بربادی کا باعث ہے، بلاتاخیر باپ سے عاجزی وانکساری کے ساتھ معافی مانگ لینا ضروری ہے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ باپ کی بددعا بیکار نہیں جاتی ہے:

عن أبی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: ثلاث دعوات مستجابات لا شک فيهن دعوة المظلوم و دعوة المسافر و دعوة الوالد على ولده. (ترمذی، باب ما جاء فی دعوة الوالدين، النسخة الهندية ۲/ ۱۳ دار السلام رقم: ۱۹۰۵، سنن أبی داؤد، النسخة الهندية ۱/ ۲۱۵ دار السلام رقم: ۱۹۰۵)

تین قسم کی دعاؤں کی قبولیت میں کوئی شک نہیں ہے: (۱) مظلوم کی بددعا (۲) مسافر

کی بددعا (۳) بیٹے پر باپ کی بددعا یہ ضرور قبول ہوجاتی ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۴۷۹۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴/۴/۱۴۱۷ھ

والد صاحب کی نافرمانی وبے عزتی کرنا اوران کے مال پر قبضہ کرنا

سوال [۱۰۱۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مجھے میرے لڑکے اور بیوی بے حد پریشان کررہے ہیں، تقریباً ایک سال ہوا گھر سے نکال دیا، اور ادھر ادھر رہتا ہوں، اس وقت میں حد سے زیادہ پریشان ہوں، نیز بدن بھی کمزور ہو چکا ہے، میری اس کمزوری کی حالت میں لڑکوں اور بیوی کا یہ معاملہ شرعاً کیسا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں تحریر فرمائیں، نوازش ہوگی۔

اب صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ مال میرا، مکان میرا، اور کھیت وغیرہ ساری جائیداد میری اور لوگ اس پر قابض ہیں، تو کیا شرعاً اس کے وہ لوگ حقدار ہیں یا میری جائیداد مجھے ملنی چاہیے جو بھی شرعی فیصلہ ہو تحریر فرمائیں۔

المستفتی: بھوندا، ساکن سکڑا، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جن لڑکوں نے اپنے باپ کو گھر سے نکال دیا اور اپنے باپ کی بے عزتی کی ہے ان کا انجام بہت سخت خطرناک ہے، عند اللہ سخت وعید کے مستحق ہوں گے، اللہ تعالیٰ قرآن کریم کے اندر باپ کو اُف کہنے سے بھی منع فرماتا ہے۔

﴿فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا. [بنی اسرائیل: ۲۳]﴾

نیز بیوی کا اپنے شوہر کے ساتھ اس طرح معاملہ کرنا بیوی کے لیے باعث لعنت ہے، حالانکہ حضور ﷺ نے یہاں تک بیان فرمایا ہے کہ اگر کسی کو کسی کے لیے سجدہ کا حکم کرتا تو بیوی کو حکم کرتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

عـن قيـس بـن سـعـد قـال: أتيـت الحيرة فرأيتهم يسجدون لمرزبان لهم، فـقـلـت: يـا رسـول الـلـه! ألا نسـجد لک؟ قال: لو أمرت أحدا أن يسجد لأحد لأمـرت الـنـسـاء أن يسـجـدن لأزواجهـن، لـما جعل الله عليهن من حقهم. (سنن الـدارمـی، بـاب النهی أن يسجد لأحد، دارالمغنی ۹۱۷/۲، رقم: ۱۵۰۴، سنن أبی داؤد، باب فی حق الـزوج عـلـى المرأة، النسخة الهندية ۲۹۱/۱، دار السلام رقم: ۲۱۴۰، سنن ابن ماجه، باب حق الزوج على المرأة، النسخة الهندية ۱۳۳/۱ دار السلام رقم: ۱۸۵۲، مشكوة شريف ۲۸۲/۲)

نیز باپ کو اختیار ہے کہ وہ مکان و جائیداد کو جس طرح چاہے استعمال کرے، چاہے فروخت کردے یا ہبہ کردے یا اپنے استعمال میں رکھے اور لڑکوں میں سے کسی کو نہ دے اور نا فرمان لڑکوں کو نہ دے کر فروخت کردے تو باپ پر شرعی اعتبار سے کوئی اعتراض نہیں ہے۔

الـمـالک وهـو الـمتـصـرف فی الأعيـان الـمملوكة كيف شاء من الملک. (بيضاوی شريف، رشيديه ۷/۱)

الـمـلک مـا مـن شـانـه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص. (شـامی مطلب: فی تعريف المال زكريا ۲۳۵/۷، كراچی ۵۰/۵)

كل يتصرف فی ملكه كيف شاء. (شرح المجلة رستم اتحاد ۶۵۴/۱، رقم المادة: ۱۱۹۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ رصفر المظفر ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۱۴۲/۲۶)

والدین کی ناراضگی میں عبادات کی قبولیت کا حکم

سـوال [۱۰۱۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک قاری صاحب نے مسئلہ بیان فرمایا ہے کہ اگر کسی شخص کے والدین اس سے ناراض ہوں تو اس شخص کا کوئی بھی عمل اللہ رب العزت کی بارگاہ میں قبول نہیں، جیسے روزہ،

نماز، حج، زکوٰۃ، تلاوت قرآن، حتی کہ نفلی عبادت بھی، آپ سے درخواست ہے کہ اس مسئلے کے بارے میں خلاصہ بیان فرمائیں کہ جب ماں باپ کی ناراضگی کی بنیاد پر اس شخص کا کوئی بھی عمل مقبول نہیں ہے اور حالات کے تحت والدین سے مصالحت بھی ناممکن ہو تو کیا یہ شخص درج بالا اعمال کرتا رہے یا پھر چھوڑ دے؟

المستفتی: محمد اعظم لال مسجد سرائے ترین سنبھل مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز روزہ وغیرہ عبادات کی ذمہ داری ساقط ہونا اور ساقط ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت کے درجہ تک پہنچنا بالکل الگ الگ دو باتیں ہیں، لہٰذا کسی شخص سے اگر اس کے والدین ناراض ہوں، تو نماز روزہ وغیرہ ادا کرنے سے بہرحال اس کے اوپر سے فرائض وواجبات کی ذمہ داری پوری ہو کر ادا ہو جائے گی، مثال کے طور پر نماز پڑھے گا تو نماز کی ذمہ داری پوری ہو جائے گی، روزہ رکھے گا تو روزہ کی فرضیت ساقط ہو جائے گی، حج کرے گا تو حج کا فریضہ پورا ہو جائے گا، زکوٰۃ ادا کرے گا تو زکوٰۃ کی ذمہ داری پوری ہو جائے گی، لیکن ان عبادات کا اللہ کے یہاں مقبولیت کے ساتھ اجر اور ثواب کا ذخیرہ ہونا بالکل الگ بات ہے، اور ماں باپ کی ناراضگی سے ان عبادات کے اجر و ثواب سے محروم ہو جائے گا، لہٰذا نماز پڑھنے کا حکم اپنی جگہ بدستور باقی رہے گا، پڑھتے رہنا لازم اور ضروری ہے، بس اللہ کے یہاں ان کا ثواب جمع نہیں ہوگا، البتہ نہ پڑھنے کے عذاب سے حفاظت ہو جائے گی، اور یہ کہنا کہ حالات کے تحت والدین سے مصالحت ناممکن ہو رہی ہے، نہایت غلط بات ہے، لہٰذا اس پر اپنے کام سے توبہ کر کے ماں باپ کے پیروں میں پڑ کر ان سے معافی مانگ لینا لازم اور ضروری ہے۔

روی عن ثوبانؓ عن النبی ﷺ قال: ثلاثة لاينفع معهن عمل الشرک باللہ و عقوق الوالدين والفرار من الزحف. (المعجم الكبير، دار إحياء التراث العربي ٢/٩٥، رقم: ١٤٢٠)

عن أبي أمامةؓ قال قال رسول اللہ ﷺ: ثلاثة لا يقبل منهم يوم

القيامة صرف و لا عدل، عاق و منان ومكذب بقدر . (المعجم الكبير للطبرانى، دار إحياء التراث العربى ۸/۱۱۹، رقم: ۷۵٤۷)

قوله صرفا و لا عدلا : اختلف فى تفسيرها، فعند الجمهور الصرف الفريضة والعدل النافلة، قال عياض : معناه لا يقبل قبول رضا و إن قبل قبول جزاء إلى ما قال و أنه لا يلزم من نفى القبول نفى الصحة وهذا كالصلاة فى الدار المغصوبة فإنها صحيحة أى مجزئه غير مقبولة أى لا ثواب عليها فى القول الصحيح فلا يلزم من نفى القبول نفى الصحة. (فتح الملهم، اشرفيه ۳/٤۰۳-٤۰٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۰۳۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۵/۷ھ

گستاخ لڑکا اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنی گستاخی کا ازالہ کیسے کرے؟

سوال [۱۰۱۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کے والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے اور زید نے اپنے والد کی شان میں گستاخی کی تھی اس کا ازالہ کس طرح ہوسکتا ہے، زید اس بارے میں کافی نادم ہے؟

المستفتی: حبیب الرحمٰن شہباز پور کلاں مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس کے ازالہ کے لیے صرف ایک شکل ہے کہ باپ کے لیے مغفرت کی دعا کرتے رہیں، اور ایصال ثواب کرتے رہیں، مستقل اور ہمیشہ کرتے رہیں، ان شاء اللہ زید کو اللہ پاک بری کردیں گے۔

عن أنس بن مالك رضـ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن العبد ليموت والداه أو أحدهما و إنه لهما لعاق فلا يزال يدعولهما، ويستغفر لهما حتى

یکتبه الله بارا. (شعب الإیمان، فصل فی حفظ حق الوالدین بعد موتهما، دار الکتب العلمیة بیروت ۶/۲۰۲ رقم: ۷۹۰۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ربیع الاول ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۶۱۱)

مطلقہ کو ساتھ نہ رکھ کر دوسری شادی کرنے پر اولاد کی ناراضگی

سوال [۱۰۲۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے اپنی بیوی عذراء کو تین طلاق دو سال پہلے دیدی تھیں، اور میرے بچے اسی کو ساتھ رکھنے پر مجبور کر رہے تھے، بالآخر میں نے خدا کا خوف کھا کر اس کو ساتھ نہ رکھ کر دوسری شادی خیر النساء سے کرلی، دوسرے شادی کرنے کے بعد میرے بچوں کا رویہ اور سلوک کافی برا ہو گیا، مجھے گھر سے نکال دیا اور مجھ سے ملنا جلنا چھوڑ دیا، اور پورے خاندان کو بھی مجھ سے الگ کر دیا، میرے مکانات اور فرم کو بھی دھوکہ دے کر اپنے ناموں میں کرالیا تو بچوں کا یہ عمل کیسا ہے؟ اور میرے نکاح ثانی کے لیے ان کی ناراضگی شرعاً کیسی ہے؟ کیا دھوکہ دے کر مکانات، فرم کو اپنے ناموں میں کرالینے سے ان کے نام ہو جائیں گے، یا میں ہی مالک رہوں گا، کیا ان کو میرے ساتھ اس طرح کا سلوک کرنا جائز ہے؟ کیا پہلی بیوی کو رکھنا جائز ہے؟ شرعی حکم تحریر فرمادیں۔

المستفتی: حاجی محمد ذاکر محلہ اصالت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تین طلاق کے بعد مطلقہ عورت کو ساتھ میں رکھنا بدکاری اور زناکاری ہے، عذاب خداوندی کا سخت خطرہ ہے، شرعی طور پر دوسری شادی کرنے کا مرد کو پورا اختیار ہے، اس میں کسی کو شکوہ وشکایت اور نکتہ چینی کا حق نہیں ہے، اور اولاد کے اوپر فرض ہے کہ باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ اور حسن سلوک کا معاملہ باقی رکھے اور خاندان کے

لوگوں کو بھی اس بارے میں اعتراض کا حق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا: کہ ماں باپ کے ساتھ برا سلوک مت کرو اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

﴿فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا. [بنی اسرائیل: ۲۳]﴾

اور حدیث میں آیا ہے کہ ماں باپ اگر کافر بھی ہوں تب بھی ان کے ساتھ بدسلوکی جائز نہیں، حسن سلوک کرنا لازم ہے۔

عن أبيه سعد قال: أنزلت فی أربع آيات فذكر قصة، وقالت أم سعد: أليس قد أمر الله بالبر والله لا أطعم طعاما ولا أشرب شرابا حتى أموت أو تكفر قال: فكانوا إذا أرادوا أن يطعموها شجروا فاها فنزلت هذه الآية "ووصينا الإنسان بوالديه حسنا". (ترمذی، من سورة العنكبوت، النسخة الهندية ۲/۱۵٤ دار السلام رقم: ۳۱۸۹)

اور مکانات وجائیداد دھوکہ سے اپنے نام کرا لینے کی وجہ سے اولاد ان چیزوں کی مالک نہیں ہوگی، اصل ملک باپ کی ملکیت میں بدستور باقی رہے گی۔

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة أو بغير عقد كالسرقة والغصب والخيانة والغلول ففی جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه ولكن إن أخذه من غير عقد و لم يملكه الخ. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور قديم ۱/۳۷، دار البشائر الإسلامية ۱/۳۵۹، تحت رقم الحديث ۵۹) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۱۶؍ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۷۷۸)

والد صاحب کے کہنے پر بیوی کو طلاق دیں یا نہ دیں؟

سوال [۱۰۲۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید کے والد اور زید کی اہلیہ کے درمیان تناؤ اور نزاع رہتا ہے، زید کے والد

اس کی اہلیہ کی خامیاں بیان کرتے ہیں اور زید سے یہ کہتے ہیں کہ تم اہلیہ کو اپنے ساتھ ہی رکھو، لیکن زید اپنے والد کی خدمت گذاری کی وجہ سے والد کے ساتھ رہنا چاہتا ہے تو ایسی صورت میں زید کیا کرے؟ اہلیہ کو رکھے یا والد کے ساتھ رہے؟

(۲) اس سے قبل ایک پنچایت ہو چکی ہے، نیز دوسری پنچایت ہونے والی ہے اگر اس پنچایت میں زید کی اہلیہ اور اس کے خسر اپنی لڑکی کی غلطی کو تسلیم کرتے ہیں تو زید کے والد اہلیہ کو اپنے گھر رہنے کی اجازت دیتے ہیں اور اگر غلطی تسلیم نہیں کرتے ہیں، بلکہ زید کے والد کی غلطیاں بیان کرتے ہیں تو زید کو طلاق دینے کو کہتے ہیں تو ایسی صورت میں زید طلاق دے یا نہ دے؟

المستفتی: زبیر عالم مدرسہ حیات العلوم پیرزادہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب زید کے والد زید کو یہ اجازت دے رہے ہیں کہ بیوی کے ساتھ دوسری جگہ رہے محض بیوی سے نا اتفاقی اور ان بن کی بنا پر اپنے گھر میں رہنے کو مناسب نہیں سمجھ رہے ہیں، تو زید کے لیے یہ جائز ہے کہ بیوی کے ساتھ علاحدہ رہے اور باپ کے ساتھ ہمدردی اور رواداری بدستور باقی رکھے۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۵/۲۸۲، جدید زکریا ۸/۲۶۴)

عن عبد اللہ بن عمرو عن النبی ﷺ قال: رضی الرب فی رضی الوالد وسخط الرب فی سخط الوالد. (سنن الترمذی، باب ماجاء من الفضل فی رضا الوالدین، النسخة الهندية ۲/۱۲ دار السلام رقم: ۱۸۹۹، مسند البزار مكتبه العلوم و الحكم ٦/٣٧٦ رقم: ٢٣٩٤)

لايجب على الزوج تطليق الفاجرة. (الدر مع الرد، كتاب النكاح، مطلب فيما لو زوج المولى أمته، زكريا ٤/١٤٣-١٤٤، كراچی ٣/٥٠، مصری قديم ٢/٤٠٢، النهر الفائق، دار الكتب العلمية بيروت ٢/١٩٩)

اگر اس بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہے تو اس کو طلاق دینے کی گنجائش ہے۔

فإن طلقها لرضاء الوالدين فهو جائز. (حاشية مشكوٰة ٢/٤٢١)

اور اگر اس بیوی سے اولاد ہے یا فتنے میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہے تو صبر سے کام لے

اورطلاق دینے میں عجلت نہ کرے اور باپ کو راضی کرنے کی کوشش کرے اور بیوی کو باپ کے احترام پر مامور کرے۔ (مستفاد: امدادالفتاویٰ ۲/ ۴۶۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۴۶۲)

ماں و بہنوں کے دباؤ سے بیوی کو طلاق دینا

سوال [۱۰۲۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر ماں اور بہنیں شادی کے آٹھ سال بعد دو بچوں کی پیدائش کے بعد بیوی کو طلاق دینے کی تلقین کریں اور دباؤ ڈالتی ہیں جبکہ اس سے پہلے بھی ایک بیوی کو طلاق کی شکل میں ختم کرا چکی ہیں یہ سب باتیں صرف مال اور جائیداد کے لالچ میں کرتی ہیں کیا ایسی صورت میں ماں اور بہنوں کے ساتھ تعلقات رشتہ داری ختم کرنا جائز اور صحیح ہے؟

المستفتی: سید مہتاب علی محلہ بھٹی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ماں بہنوں کی طرف سے آپ کو دباؤ ڈال کر مال وجائیداد کے لالچ میں بیوی کو طلاق دینے پر مجبور کرنا ہرگز جائز نہیں ہے اور وہ اس عمل کی وجہ سے اللہ کے یہاں سخت گنہگار ہوں گی، لیکن ان کے اس عمل کی وجہ سے آپ کو ان سے رشتہ داری ختم کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے، البتہ ان کے اس عمل کی وجہ سے آپ کو اپنا گھر بسانے کے لیے بیوی کے ساتھ الگ رہنا جائز ہے، اور الگ رہتے ہوئے ان کے خرچہ و اخراجات کا خیال رکھنا بھی آپ پر ضروری ہے۔

﴿**وَقَضَى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا**. [الاسراء: ۲۳]﴾

﴿**من البر بهما والإحسان إليهما ألا يتعرض لسبّهما ولا يعقهما فإن ذٰلک من الكبائر بلاخلاف**. (قرطبی، سورۃ الإسراء، تحت رقم الآیة: ۲۳، دار

الکتب العلمية بيروت ١٥٦/١٠)

فإنه دل على الاجتناب عن جميع الأقوال المحرمة و الإتيان بجميع كرائم الأقوال والأفعال من التواضع والخدمة والإنفاق عليهما ثم الدعاء لهما فى العاقبة. (مرقاة، باب البر والصلة، امداديه ملتان ١٩١/٩)

ووصينا الإنسان بوالديه أى أمرناه أن يبرهما ويشكرهما ...... يجب بهذه الآية الإنفاق على الأبوين الفقيرين وصلتهما وإن كانا كافرين. (تفسير مظهرى، سورة لقمان، تحت رقم الآية: ١٤، زكريا ٢٥٥/٧)

عن طارق المحاربى قال قدمنا المدينة فإذا رسول الله ﷺ قائم على المنبر يخطب الناس وهو يقول يد المعطى العليا وابدأ بمن تعول أمك و أباك و أختك و أخاك ثم أدناك أدناك. (نسائى، باب أيتهما اليد العليا، النسخة الهندية ٢٧٢/١ دار السلام رقم: ٢٥٣٣)

عن معاذ رضى الله عنه قال: أوصانى رسول الله ﷺ ...... ولاتعقن والديك و إن أمراك أن تخرج من أهلك و مالك. (مسند أحمد بن حنبل ٢٣٨/٥، رقم: ٢٢٤٢٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۴۶)

والدین کوراضی کرنے کے لیے بیوی کو مارنے اور طلاق دینے کی شرعی حیثیت

سوال [۱۰۲۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید کے والد محترم زید کی بیوی سے ہمیشہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے ناراض ہوتے رہتے ہیں، کیا زید اپنے والد محترم کو خوش کرنے کے لیے معمولی غلطی پر بیوی کو مار پیٹ کرسکتے ہیں یا نہیں؟

(۲) والدین کوراضی رکھنے کے لیے بیوی کوطلاق دینا کیسا ہے؟ جبکہ بیوی سے غلطی نہ کے برابر ہوتی ہے؟

المستفتی: مظفر الاسلام نئی بستی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) زید کی بیوی کی طرف سے زید کے والد کے حق میں کوئی نازیبا حرکت نہیں ہوتی ہے اور زید کے والد بلاوجہ اس کی بیوی سے ناراض ہوتے رہتے ہیں تو زید کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ محض والد کو خوش کرنے کے لیے اپنی بیوی کی پٹائی کرے اگر زید اس طرح بلاوجہ بیوی کو مارتا ہے تو یہ زید کی طرف سے بیوی پر بیجا ظلم ہے جو قطعاً جائز نہیں ہے۔

وقد نص بعض أصحابنا أن للزوج أن يضرب المرأة على أربع خصال وما هو في معنى الأربع ترك الزينة، والزوج يريدها و ترك الإجابة إذا دعاها إلى فراشه، و ترك الصلاة، في رواية: والغسل، والخروج من البيت إلا لعذر شرعي. (تفسير روح المعاني، سورة النساء، تحت رقم الآية ٣٤، زكريا ٤/٣٨)

(۲) اگر بیوی میں دینی واخلاقی معاشرتی کسی قسم کی خرابی نہیں ہے اور وہ اپنے شوہر کے والدین کو ستاتی بھی نہیں ہے اس کے باوجود اگر شوہر کے والدین اس سے ناراض رہتے ہوں تو ایسی صورت میں محض والدین کو خوش کرنے کی غرض سے بیوی کو طلاق دینا اس پر ظلم ہے، اور طلاق دینے سے شوہر گنہگار ہوگا۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۴/۵۱، جدید ڈابھیل ۱۲/ ۱۶۱)

وأما الطلاق فإن الأصل فيه الحظر والإباحة للحاجة إلى الخلاص فإذا كان بلا سبب أصلا لم يكن فيه حاجة إلى الخلاص بل يكون حمقا و سفاهة رأى و مجرد كفران النعمة. (شامی، كتاب الطلاق، زكريا ٤/٤٢٨، کراچی ۳/۲۲۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۷۶۸۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۶/۱۳ھ

والدین کا دوسری بیوی کو طلاق دینے پر مجبور کرنا

سوال [۱۰۲۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے ایک دوست ہیں، اعظم گڑھ کے رہنے والے ہیں، انہوں نے دو شادیاں کی ہیں، ایک شادی ماں باپ نے کی تھی، اور دوسری شادی کی خبر ماں باپ کو نہیں تھی، اب ان کو معلوم ہوا ہے جس کی بنا پر ماں باپ اور دوسرے گھر والے ناراض ہیں اور کہتے ہیں کہ دوسری بیوی کو طلاق دیدو، ورنہ ہم بد دعا کریں گے، اب وہ بیچارے بہت پریشان ہیں، اگر والدین کا کہنا مانیں، تو دوسری بیوی جس سے تین اولاد بھی ہے، ان کا کیا ہو؟ اور اگر طلاق نہ دیں تو ماں باپ کی بد دعائیں ہیں؟ ان کو کیا کرنا چاہیے؟ تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: مولانا سہیل احمد صاحب دوحہ قطر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ حالات میں طلاق دینے میں بچوں کا نقصان اور عورت بے گناہ و بے قصور کی زندگی برباد ہونے کا قوی امکان ہے، اس لیے مصلحت طلاق نہ دینے میں ہے، جبکہ عورت کی وجہ سے والدین کے حقوق کی پامالی نہ ہو رہی ہو، اور طلاق نہ دینے میں نہ والدین کی نافرمانی ہے اور نہ گنہگار ہوگا، تاہم والدین کو کسی طرح راضی کرلیا جائے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۴/۵۰، جدید ڈابھیل ۱۲/۱۶۱، امداد الفتاویٰ ۲/۴۶۷)

قال الفقهاء إن كان القصور من الزوجة فالإطاعة واجبة وإلا فمستحبة. (تقریر ترمذی ص:۴۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ر صفر المظفر ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/۵۴۳)

حصول رزق کی خاطر والدین کو چھوڑنا

سوال [۱۰۲۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کیا روزی حاصل کرنے کے لیے والدین کو چھوڑا جا سکتا ہے؟ جبکہ چھوٹا بھائی ان کے پاس موجود ہے اور چھوٹا بھائی ان کے اخراجات برداشت کرتا ہے؟

المستفتی: ابوفرمان، بھٹی اسٹریٹ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر والدین کے اخراجات وضروریات کا پورا انتظام موجود ہے اور راستہ بھی مامون ہے، تو جائز رہے گا ورنہ نہیں۔

و إن كان لا يخاف الضيعة عليهما بأن كانا موسرين ولم تكن نفقتهما عليه إن كان سفرا لايخاف على الولد الهلاك فيه كان له أن يخرج بغير إذنهما . (هنديه، كتاب الكراهية، الباب السادس والعشرون، زكريا قديم ٣٦٥/٥، جديد ٤٢٢/٥، الموسوعة الفقهية ٨٣/٢٩، الفتاوىٰ التاتارخانية زكريا ٢٤٢/١٨، رقم: ٢٨٦٤٧، المحيط البرهاني، المجلس العلمى ١١٠/٨، رقم: ٩٧٠٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۱۴/۲۳)

اولاد پر والد کا خرچ غرباء پر صدقہ کرنے سے مقدم اور لازم

سوال [۱۰۲۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص کے کئی لڑکے ہیں اور ان تمام لڑکوں میں سے صرف ایک لڑکا اپنے والد محترم کو جو کہ ضعیف نہیں، ہفتہ میں خرچ دیتا ہے، اور ان کے والد اسی خرچ میں سے اپنی ضروریات پوری کر لیتے ہیں اور اب وہ لڑکا بھی والد محترم کو ہفتہ میں خرچ دینے سے گریز کرتا ہے اور دیگر فقیر وغیرہ کو خیرات وزکوٰۃ دیتا ہے اور دستی وخفیہ بھی لوگوں کو دیتا رہتا ہے، تو کیا اس کے لیے جائز ہے کہ اپنے والد محترم کو پہلے خرچ نہ دے اور مندرجہ بالا کو پہلے دے، اس مسئلہ کی توضیح فرما کر جواب سے نوازیں۔

المستفتی: محمد زکریا مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: صورت مذکورہ میں سب لڑکوں پر اپنے والد کی ضروریات کا خرچ دینا واجب ہے۔

ويجب على الأولاد ذكورهم و إناثهم نفقة الوالدين. (بنايه اشرفيه ٥/٦٩٩)

فإن كان الأولاد ذكورا و إناثا موسرين فنفقة الأبوين عليهم بالسوية في أظهر الروايتين وفي الخانية: وعليه الفتوىٰ. (الفتاوىٰ التاتارخانية زكريا ٥/٤٢٥، رقم: ٨٣٦٦، المبسوط للسرخسي، دار الكتب العلمية بيروت ٥/٢٢٢، حاشية چلپي، امداديه ملتان ٣/٦٤، زكريا ٣/٣٢٩)

استطاعت کے باوجود جولڑکا والد کا خرچ نہ دے گا وہ گنہگار ہوگا، نیز ایک لڑکا جو باپ کا خرچ دیا کرتا ہے، اس پر لازم ہے کہ باپ کی ضروریات پوری کرے، بعد میں حسب استطاعت فقراء کو دیا کرے، باپ کو خرچ دینے سے گریز کرنا ناجائز ہے، عنداللہ سخت گنہگار ثابت ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/۶۶۱)

تمام اولاد پر والد کی ضروریات کا خرچ دینا واجب

سوال [۱۰۲۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص کے کئی لڑکے ہیں اوران تمام لڑکوں میں صرف ایک لڑکا اپنے والد محترم کو تیس روپیہ ہفتہ دیتا ہے اوران کے والد اسی تیس روپیہ میں دواوغیرہ پوری کر لیتے ہیں، اور اب وہ لڑکا اپنے والد محترم کو روپیہ دینے میں دیر کرتا ہے، اور بھی روپیہ دوسرے فقیر وغیرہ کو دیتا ہے اور دستی خفیہ بھی لوگوں کو دیتا رہتا ہے، تو کیا اس کے لیے جائز ہے کہ اپنے والد محترم کو پہلے روپیہ نہ دے اور فقیر وغیرہ کو پہلے دے، اس مسئلہ کی توضیح فرمائیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مذکورہ میں سب لڑکوں پر والد کی ضروریات کا خرچ دینا واجب ہے۔

ویجب علی الأولاد ذکورهم و إناثهم نفقة الوالدين. (بنایه کتاب النفقات، اشرفیه ٥/ ٦٩٩)

فإن كان الأولاد ذكورا و إناثا موسرين فنفقة الأبوين عليهم بالسوية في أظهر الروايتين وفي الخانية: وعليه الفتوىٰ. (الفتاوىٰ التاتارخانية زكريا ٥/ ٤٢٥، رقم: ٨٣٦٦، المبسوط للسرخسي، دار الكتب العلمية بيروت ٥/ ٢٢٢، حاشية چلپي، امداديه ملتان ٣/ ٦٤، زكريا ٣/ ٣٢٩)

اگر استطاعت کے باوجود کوئی لڑکا نہ دے تو گنہ گار رہوگا، نیز جولڑکا تیس روپیہ دے رہا ہے، اس کو چاہیے کہ فقراء غریبوں کو خیرات کرنے سے پہلے اپنے والد کی ضروریات پوری کرے، اس کے بعد فقراء کو دے، ورنہ گنہگار رہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
یکم ربیع الاول ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۵۵۳)

والد کے قرض کا مطالبہ اولاد سے کرنے کی شرعی حیثیت

سوال [۱۰۲۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہم تین بھائی اور ایک والد محترم ایک کاروبار ۲۴/ ۸/ ۱۹۸۶ء تک ساتھ چلاتے تھے اس میں پانچ شریک تھے، تین بھائی ایک والد اور ایک صاحب باہر کے کچھ آپس میں غلط فہمیاں ہوئیں اور باہر کے شریک کے ساتھ شراکت ختم ہوگئی اس کے بعد ۶/ ماہ کے اندر بھائیوں اور والد صاحب کے بیچ بھی شراکت ختم ہوگئی، سب روپیہ والد صاحب کا ہی تھا، بھائی جوان ہوگئے، اور والد صاحب کے ساتھ کاروبار میں شریک ہوگئے۔

شراکت ختم ہونے پر ایک فیصلہ پنچوں کے درمیان ہوا، اس میں تمام باتیں طے ہوگئیں، تمام حساب کتاب پنچوں کی موجودگی میں والدصاحب کے سپرد کردیئے گئے، اس کے بعد آج تک جوروپیہ دینا تھا ابھی بھی دینا باقی ہے، اور لینا تھا وہ تقریباً وصول ہو چکا ہے، جس کو دینا تھا وہ اب میرے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو ہمارا روپیہ دو جبکہ ایک صاحب جو خود بھی اس فیصلہ میں پنچ تھے، ان کا روپیہ فرم پر چاہیے تھا، انہوں نے خود بھی فیصلے میں تحریر کیا ہے اور زبانی بھی فیصلہ کے وقت بات صاف ہوگئی تھی کہ دینداری تمام والدصاحب دیں گے، اس کے باوجود بھی برابر ان کا تقاضہ آتا رہتا ہے اور دوسرے اور تیسرے صاحب کا تقاضہ جاری ہے، اس سلسلے میں شرع کی روشنی میں خلاصہ فرمادیں کہ دینداری ہمارے اوپر واجب ہوتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: تحسین الٰہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب مذکورہ کاروبار کے تمام روپئے اور مالیت والدصاحب کو دیدی ہے اور اس کاروبار کے تمام لین دین کے ذمہ دار بھی وہی ہیں، اور اس کاروبار کی مالیت سے متعلق تمام ذمہ داریاں بھی انہیں کے سپرد کی جا چکی ہیں، اور فیصلہ نامہ سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے اس لیے تمام لین دین کا تعلق بھی آپ کے والدصاحب کے ساتھ ہوگا اور جب لین دار خود بھی اس فیصلہ میں موجود رہا ہے اور اس فیصلہ کو تسلیم کر چکا ہے تو لینے والے کو صرف آپ کے والدصاحب سے ہی مطالبہ کا حق ہوسکتا ہے، آپ سے شرعی طور پر کوئی واسطہ نہیں رہا ہے، شریعت نے مسلمانوں کو اپنی شرائط کا پابند بنایا ہے اور کسی کے مال کو اس کی مرضی کے بغیر حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔

عن أبی حمید الساعدی، أن رسول اللّٰہ ﷺ قال: لایحل لامرئ أن یأخذ مال أخیه بغیر حقه وذٰلک لما حرم اللّٰہ مال المسلم علی المسلم.

(مسند أحمد بن حنبل ٥/٤٢٥ ط رقم: ٢٤٠٠٣)

المسلمون علی شروطهم. (قواعد الفقه اشرفی ص: ١٢١، رقم: ٣١٩، صحیح البخاری، باب آجر السمسرة، النسخة الهندیة ١/٣٠٣، سنن أبی داؤد، باب فی

الصلح، النسخة الهندية ۲/ ۵۰۶ دار السلام رقم: ۳۵۹۴)

لايجوز لأحد أن يأخذ مال أحد بلا سبب شرعي. (قواعد الفقه اشرفی ص: ۱۱۰، رقم: ۲۶۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍شوال المکرم ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۶۶۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۱۰/۱۶ھ

کیا باپ اپنی اولاد کو دیئے ہوئے قرض کا مطالبہ کرسکتا ہے؟

سوال [۱۰۲۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے اپنی بیوی رئیسن کے کہنے سے اپنے لڑکوں نورعالم، رضاعلی، ایوب علی، و نسیم علی کو کچھ نقد رقم اور تقریباً چھ کوئنٹل پیتل کے برتن اور ایک سو چھتیس کلو سلی پیتل دیا تھا، وہ لڑکے اسے واپس نہیں کررہے ہیں، مانگنے پر مار پیٹ اور جھگڑا کرتے ہیں، میں نے لڑکوں کو یہ سب چیزیں قرض کے طور پر دی تھیں، مجھے ان چیزوں کے مطالبہ کا حق ہے یا نہیں؟

المستفتی: غلام رسول لال مسجد مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کے بیان کے مطابق آپ نے بیٹوں کو نقدی رقم اور پیتل کے برتن وغیرہ بطور قرض دیئے ہیں، لہٰذا آپ کو ان کے مطالبہ کا حق ہے، اور بیٹوں پر واپس کرنا واجب ہے، اور مطالبہ کرنے پر بیٹوں کا باپ کے ساتھ گستاخی کرنا اور ادائیگی نہ کرنا ظلم ہے، اور اپنی دنیا وآخرت کو برباد کرنا ہے۔

﴿**فَلَا تَقُلْ لَهُمَا اُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا، وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا.**﴾ [بنی اسرائیل: ۲۳]

إن الديون تقضى بأمثالها على معنى أن المقبوض مضمون على القابض لأن قبضه بنفسه على وجه التملک، ولرب الدين على المدين

مثله. (شامی، الأیمان، باب الیمین فی الضرب والقتل وغیر ذٰلك، مطلب: الدیون تقضی بأمثالها، زکریا ٥/٧٦٥، کراچی ٣/٨٤٨)

یجب علی المقترض أن یرد مثل المال الذی اقترضه، إن کان المال مثلیا بالاتفاق. (الفقه الإسلامی وأدلته، هدی انٹرنیشنل دیوبند ٤/٥١٥، دار الفکر ٥/٣٧٩٣)

ولو دفع إلی ابنه مالا فتصرف فیه الابن، یکون للأب، إلا إذا دلت دلالة علی التملیک کذا فی الملتقط. (هندیه، الباب السادس فی الهبة للصغیر، زکریا قدیم ٤/٣٩٢، جدید ٤/٤١٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۰۴۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶/۵/۱۴۳۱ھ

لڑکے کا والد کی اجازت کے بغیر ان کا مال خفیہ طریقے سے لینے کا حکم

سوال [۱۰۲۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ باپ کا مال لڑکے اور لڑکی نے بغیر اجازت کے گھر سے نکالا اور کسی شخص کے یہاں لے جا کر رکھا ان کو بھی یہ معلوم ہوگیا کہ یہ مال بغیر اجازت کے چوری سے لائے ہیں، اس مال کو لڑکی لڑکے کو کھانا یا استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس فعل سے ان کی عبادت میں تو کوئی فرق نہیں آتا، اور جن حضرات کے یہاں مال لے جا کر رکھا انہوں نے بھی لڑکے کے باپ سے کچھ نہیں کہا اور مال جانے دیا، کیا وہ بھی مجرم ہیں، اس طرح عبادت میں تو فرق نہیں آتا؟

المستفتی: عبدالحکیم نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: لڑکے کا باپ کی اجازت کے بغیر اپنے والد کا مال خفیہ طریقہ پر لے لینا جائز نہیں ہے۔

لایجب علی الأب نفقة الذکور الکبار. (عالمگیری، الفصل الرابع فی نفقة

الأولاد، زکریا قدیم ۱/۵۶۳، جدید ۱/۶۰۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ شعبان المعظم ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۳۵۸۰)

باپ کی زندگی میں اس کی جائیداد میں اولاد کا حق نہیں

سوال [۱۰۲۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) میرا ایک مکان ساڑھے اکیاسی گز کا ہے، میری بیوی بھی حیات ہے، میرے پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں، سب لڑکے لڑکیوں کی شادی کر دی تھی، لیکن ایک لڑکی بیوہ ہے اس کی دو لڑکیاں ہیں جو میرے پاس رہ رہی ہیں، میرے لڑکے میرے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں، کوئی کھانا خرچہ نہیں دیتے ہیں، میں بوڑھا کمزور ہوں، میری حالت ایسی نہیں ہے کہ مزدوری یا کوئی اور کام کرسکوں، میرے لڑکے میری زندگی میں میرے مکان میں حصہ مانگتے ہیں، کیا میں خود مالک ہوں، یا لڑکوں کا بھی اس میں حق ہے؟ کیا لڑکوں کو مجھ سے مکان کا مطالبہ کرنا یا اس کو بیچنے پر مجبور کرنا جائز ہے؟

(۲) ان کا بدتمیزی کرنا اور مجھے ستانا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد شفیق مقبرہ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) شرعاً باپ اپنی زندگی میں سارے مکان اور جائیداد وغیرہ سب چیزوں کا خود مالک ہوتا ہے اس کی زندگی میں اس کی اولاد میں سے کوئی بھی مالکانہ حق نہیں رکھتی ہے، اور نہ ہی اولادوں کے درمیان تقسیم پر مجبور کرنے کا حق ہے اور اس کو پورا پورا اختیار ہے کہ اپنے مکان وجائیداد میں جس طرح چاہے تصرف کرے، چاہے بیچ کھائے، چاہے کسی کو دیدے، اور چاہے کسی کو بھی نہ دے اس کے اوپر کسی کا جبر ودباؤ نہیں ہے، اولاد میں سے کسی کا کوئی حصہ اس میں نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی حصہ کے طور پر مانگنے کا حق ہوتا ہے۔

المالک هو المتصرف فی الأعیان المملوكة كيف شاء من الملک. (بیضاوی شریف، رشیدیه ۱/ ۷)

المالک للشیئ هو الذی یتصرف فیه باختیاره و مشیئته. (بدائع الصنائع، فصل بیان ما یبطل به الخیار، زکریا ۲/ ٦٣٨، کراچی ۲/ ۳۲۷)

(۲) اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنی عبادت کے ساتھ ماں باپ کے ساتھ رواداری اور ہمدردی کا حکم اسی طرح فرمایا ہے جس درجہ میں اپنی عبادت کا حکم دیا ہے اور ماں باپ کے سامنے اُف کہنے سے بھی منع فرمایا ہے، لہٰذا بیٹوں کے اوپر باپ کی فرمانبرداری اور باپ کے سامنے عاجزی وانکساری اختیار کرنا لازم اور واجب ہے اور باپ کوستانا عظیم گناہ ہے، دنیا وآخرت کی بربادی ہے۔

﴿قال الله تعالیٰ: فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا، وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا. [الاسراء: ۲۳]﴾

عن عبد الله بن عمرو عن النبی ﷺ قال: رضا الرب فی رضا الوالد وسخط الرب فی سخط الوالد. (ترمذی، باب جاء من الفضل فی رضا الوالدین، النسخة الهندیة ۲/ ۱۲ دار السلام رقم: ۱۸۹۹، مسند البزار، مکتبه العلوم و الحکم، ٦/ ۳۷٦، رقم: ۲۳۹٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ جمادی الثانیہ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۰۹۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۶/۱۶ھ

والد کی فیملی میں رہ کر کمائی گئی جائیداد کا مالک کون؟

سوال [۱۰۲۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے پانچ بھائی ہیں، اور والد ابھی بقید حیات ہیں، والد کی ملکیت میں کچھ

زمین وطن میں موجود ہے، اور یہاں یعنی بمبئی میں کچھ زمین بڑے بھائی کی ملکیت میں ہے، جس میں صرف دو بڑے بھائیوں کا سرمایہ صرف ہوا ہے، اب میرے بڑے بھائی کا کہنا ہے کہ جو زمین یہاں میری ملکیت میں ہے اس میں اگر میں چاہوں گا تو تم کو حصہ دوں گا ورنہ نہیں، اور اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اسے اپنے سرمایہ سے کمایا ہے لہٰذا اس پر میرا حق ہے، اور دینا یا نہ دینا میری مرضی پر موقوف ہے؟

تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ میرے بھائی کا یہ کہنا از روئے شرع درست ہے یا نہیں؟ اور ہمارا اس میں حصہ شریعت کی جانب سے متعین ہوتا ہے یا نہیں؟ مہربانی فرما کر اس مسئلہ کا حل قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل تحریر فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

نوٹ: ہم تمام بھائی وطن میں والد کو سرپرست مانتے ہیں اور ممبئی میں بڑے بھائی کو ہی سرپرست تسلیم کرتے ہیں اور یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جب گھر میں بہت سے لوگ کمانے والے ہوں تو ظاہر سی بات ہے کہ کوئی کم کمانے والا ہوگا اور کوئی زیادہ کمائے گا، اور جو زمین یہاں موجود ہے اس میں صرف دو بڑے بھائیوں کا پیسہ لگا ہے اسی لیے میرے بڑے بھائی کا کہنا ہے کہ جب الگ ہوں گے تو اس میں حصہ صرف سرمایہ لگانے میں شریک بھائی ہی کو دوں گا، اور دوسروں کو حصہ نہیں دوں گا، تو یہ کہنا صحیح ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد اجمل بمبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: والد کی ماتحتی میں کام کرنے والے تمام لڑکوں کی آمدنی والد ہی کی ملکیت شمار ہوگی، لہٰذا والد کے انتقال کے بعد والد مرحوم کی تمام جائیداد ورثاء کے درمیان برابر تقسیم ہوگی، کسی ایک کو زیادہ کمانے کی بنا پر اس کو وراثت سے زیادہ حصہ نہیں دیا جائے گا، ہاں البتہ اگر بمبئی میں رہنے والے بھائیوں نے والد سے الگ ہو کر سرمایہ کمایا ہے اور اس میں والد کا کوئی تعاون نہیں رہا ہے، نہ کام کی ابتداء میں والد کا کم زیادہ سرمایہ رہا ہے بلکہ ان دونوں بھائیوں نے بلا کسی سرمایہ کے بے سروسامانی کے عالم میں اپنا کاروبار شروع کیا ہے پھر اسی سرمایہ سے زمین خریدی تو وہ انہیں دونوں بھائیوں کی شمار ہوگی، ورنہ والد کی ملکیت ہوگی، جس میں والد کے مرنے کے بعد باضابطہ وراثت جاری ہوگی۔

الأب و ابـنه يكتسبان فى صنعة واحدة ولم يكن لهما شيئ فالكسب كله للأب إن كان الابن فى عياله لكونه معينا له. (فتاویٰ شامی، الشركة، مطلب: اجتمعا فى دار واحدة واكتسبا …… زكريا ٦/٢ ٥٠، كراچی ٤/٥ ٣٢، هنديه زكريا قديم ٢/٩ ٣٢، جديد ٢/٢ ٣٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰ر شعبان المعظم ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۱۱۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۷/۸/۱۰ھ

زندگی میں والد کے مکان میں لڑکوں کا کوئی حق نہیں

سوال [۱۰۲۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید اپنے والد کے ساتھ والد صاحب کے گھر میں رہتے ہیں، یعنی باپ بیٹے ایک ساتھ رہتے ہیں، زید کا کوئی خاص گھر نہیں ہے، جس وقت چاہیں اس کے والد گھر سے نکال سکتے ہیں، اس حالت میں زید کا گھر کون سا ہوگا؟ مع حوالہ جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد دانش علی محمد ارشد علی مغربی بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب زید باپ کے ساتھ ہے تو گھر اس کا نہیں ہے بلکہ باپ کا ہے۔

الأب و ابـنه يكتسبان فى صنعة واحدة ولم يكن لهما شيئ فالكسب كله للأب إن كان الابن فى عياله لكونه معينا له. (فتاویٰ شامی، الشركة، مطلب: اجتمعا فى دار واحدة واكتسبا …… زكريا ٦/٢ ٥٠، كراچی ٤/٥ ٣٢، هنديه زكريا قديم ٢/٩ ٣٢، جديد ٢/٢ ٣٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷ر ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۴۲۷۱)

باپ کو قتل کی دھمکی اور مار پیٹ کرنے والے کا باپ کی جائیداد میں حصہ

سوال [۱۰۲۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بیٹے نے باپ کو قتل کردینے کی دھمکی دی، گالیاں دیں، مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا اور بدسلوکی کی، باپ کے ساتھ اس طرح کا غلط عمل کرنے والا بیٹا کیا باپ کے کاروبار، مال اور دولت میں حقدار ہے؟

المستفتی: عبدالرب جگر کالونی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: باپ کی زندگی میں کسی بیٹے کا کوئی حق اس کے کاروبار وجائیداد میں نہیں ہے اور باپ کے لیے ایسا کرنا جائز ہے کہ اس نافرمان بیٹے کو کچھ نہ دے کر دوسری فرمانبردار اولاد کو دیدے اور اگر دوسری اولاد نہیں ہے تو ساری جائیداد کسی کو ہبہ کردے یا بیچ دے یا کارِ خیر میں وقف کردے۔

ولو كان ولده فاسقا و أراد أن يصرف ماله إلى وجوه الخير ويحرمه عن الميراث هذا خير من تركه. (هنديه، الباب السادس فى الهبة للصغير، زكريا قديم ٤/ ٣٧١، جديد ٤/ ٤١٦)

الإرث جبرى لايسقط بالإسقاط. (تكمله شامى، مطلب فى حادثة الفتاوىٰ زكريا ١١/ ٦٧٨، كراچى ٧/ ٥٠٥)

وعلى جواب المتأخرين لابأس بأن يعطى من أولاده من كان عالما متأدبا ولايعطى من كان فاسقا فاجرا. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دار الكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩٧، مصرى قديم ٢/ ٣٥٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ ذی قعدہ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۲۲۸)

والدہ نے اپنی کمائی سے مکان تعمیر کرایا تو اس میں لڑکا حقدار ہے یا نہیں؟

سوال [۱۰۲۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مجھے ۲۵/سال ہوگئے بیوہ ہوئے، میں نے اپنی کمائی کر کے اپنا مکان بنایا، میرے دو بچے ہیں، ایک لڑکا ایک لڑکی، دونوں کی شادی کردی، لڑکا بڑا ہے، لڑکے کی شادی ۱۹/سال میں اور لڑکی کی شادی ۱۰/سال میں کردی تھی، شادی سے پہلے میں نے حج کیا ہے، آج وہی لڑکا مجھ سے لڑ رہا ہے، تین بار میرا گلا گھونٹ چکا ہے، اور رات بھی گلا گھونٹا ہے، میں رات مرنے سے بچ گئی، مکان میرے نام ہے اور میری لڑکی اپنا حصہ لینے سے منع کر رہی ہے، لڑکا کہہ رہا ہے کہ میری کمائی کا ہے، اس کا فیصلہ میں کیا کروں، آپ اس کا فیصلہ بتا دیجئے، اور میرے ماں باپ کو برا بھلا کہتا ہے، میرے ماں باپ دنیا سے چلے گئے، ماں ابھی زندہ ہیں اور مجھے کوستا ہے اور کہتا ہے کہ تیری قبر میں کیڑے پڑیں گے، اور کہتا ہے کہ اس گھر سے نکل جاؤ، عورت عورت کر کے بولتا ہے، اسی نسل کا اس کا باپ تھا اس نے پہلا گھر بیچ کر کے طلاق دیدی، آپ اس کا فتویٰ دیدیجئے؟

المستفتیه: ہاجرہ خاتون محلّہ کٹار شہید مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر سائلہ اپنے بیان میں سچی ہے اور اپنی ہی کمائی سے مکان خریدا ہے تو وہ سائلہ کی ملکیت ہے، اس میں لڑکے کا کوئی حق نہیں ہے، سائلہ اگر چاہے تو فروخت کرسکتی ہے۔

المالک وهو المتصرف فی الأعیان المملوکة کیف شاء من الملک. (بیضاوی شریف، رشیدیه ۱/ ۷)

کل یتصرف فی ملکه کیف شاء. (شرح المجلة، رستم اتحاد ۱/ ٦٥٤، رقم المادة: ۱۱۹۲)

نیز لڑکے کا اپنی والدہ کو مارنا اور گلا گھوٹنا بہت بڑا گناہ عظیم ہے۔

عن أنس بن مالک رضی الله عنه قال: ذکر رسول الله ﷺ الکبائر فقال الشرک بالله وقتل النفس وعقوق الوالدین. (مسلم شریف، باب بیان الکبائر و أکبرها، النسخة الهندیة ۱/ ٦٤ بیت الأفکار رقم: ٨٨، صحیح البخاری، باب عقوق الوالدین من الکبائر، النسخة الهندیة ۲/ ٨٨٤، رقم: ٥٧٤٣، ف: ٥٩٧٧)

نیز گذرے ہوئے لوگوں کو برا بھلا کہنا جائز نہیں ہے۔

عن ابن عمر –رضی الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: أذکروا محاسن موتاکم، وکفوا عن مساویهم. (سنن أبی داؤد، باب النهی عن سب الموتیٰ، النسخة الهندیة ۲/ ٦٧١ دار السلام رقم: ٤٩٠٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍صفر المظفر ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/۳۰۲۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۳/۲/۱۹ھ

والد کو مکان کے لیے بطور قرض دی ہوئی رقم سے کیا لڑکا مکان کا مالک ہو جائے گا؟

سوال [۱۰۲۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ تقریباً ۱۲؍سال قبل میرے ماموں نے کچھ رقم بطور ہدیہ مجھے دی تھی، البتہ میرے قبضہ میں نہ دیتے ہوئے انہوں نے وہ رقم میرے والدین کے پاس رکھوا دی تھی، والدین نے اسے کاروبار میں لگایا، جس میں کچھ نفع ونقصان ہوا، جس کی تفصیلات کا مجھے علم نہیں، پھر سات سال پہلے میری شادی ہوئی، اس میں بھی ماموؤں نے کچھ رقم والد صاحب کو دی تھی۔ (ولیمہ وغیرہ میں خرچ کرنے کے لیے)

شادی کے ڈیڑھ سال بعد والد صاحب نے سارے پیسوں کا حساب کیا، جو رقم ماموؤں نے پہلے دی تھی یا میری شادی میں دی تھی یا بچپن میں میرے نام سے دی ہوئی کسی کی رقم جو والد صاحب نے اپنے استعمال میں لے لی تھی، ان سب کو جوڑ کر اور ان میں اپنی طرف سے ۵۰۰۰۰ ہزار مزید ملا کر پوری رقم اپنے پاس رکھ لی، جس کی مقدار مجھے معلوم نہیں۔

پھر ایک زیر تعمیر عمارت میں میرے لیے گھر بک کروایا، بکنگ کے وقت اس گھر کو میرے ہی نام سے بک کروایا، کاغذات پر دستخط بھی میں نے ہی کیے، اس وقت میں بیرون ملک رہتا تھا، چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا۔

کچھ قیمت اسی وقت ادا کی گئی، اور بقیہ قسط وار ادا کی گئی، جس میں سے ۳/ لاکھ ۲۷/ ہزار روپئے والد صاحب نے دیئے، اور دو لاکھ روپئے میں نے دیئے، یوں وہ گھر ہمیں ۵/ لاکھ ۲۷/ ہزار روپئے میں پڑا۔

تعمیر مکمل ہو جانے کے وقت میں بیرون ملک تھا، اس لیے والدین نے اسے مشترکہ طور پر اپنے نام رجسٹر کروالیا، کچھ سال تک اس کی دیکھ ریکھ اور اس کا خرچ بھی والد صاحب ہی برداشت کرتے رہے، البتہ ۲۰۰۸ء میں بیرون ملک سے واپس آجانے کے بعد سے اس کی دیکھ ریکھ صاف صفائی میں ہی کررہا تھا، اور ۲۰۰۹ء میں، میں نے اسے کرایہ پر دیدیا، اس کے بعد سے اس کا خرچ بھی میں اٹھا رہا تھا، بیرون ملک سے لوٹنے کے بعد اسے میرے نام کرنے کی بات آئی مگر والد صاحب نے کہا کہ اس میں بہت پیسے خرچ ہوں گے، اس کی کیا ضرورت ہے؟ مگر اب سے کچھ مہینوں پہلے میں نے پھر درخواست کی کہ اب اسے میرے نام کر دیجئے، تو امی ابا دونوں راضی ہوگئے، والد صاحب نے خود ہی وکیل سے بات کی اور پیپر بنانے کے لیے کہا، اپنی تصویریں بھی مجھے دیں کہ یہ وکیل صاحب کو دیدینا، مگر جب سارے کاغذات بن گئے والد صاحب نے اسے پڑھ کر اس کی تصحیح بھی کروائی، اب صرف ان کے دستخط باقی تھے کہ اچانک والدین کا رویہ بدل گیا، کئی دن تک تو ٹالتے رہے، پھر ایک دن صاف کہہ دیا کہ وہ گھر ہم تجھے نہیں دیں گے، پہلے ہماری نیت تھی، دینے کی مگر وصیت آخری وقت میں بھی بدلی جاسکتی ہے، لہٰذا اب ہم وہ گھر تجھے نہیں دیں گے، ہاں آئندہ کبھی دل ہوا تو دیکھیں گے، حالانکہ اس سے پہلے ہمیشہ اس گھر کو میرا گھر کہا جاتا تھا، میری والدہ نے میرے بھائیوں سے بھی کہا تھا، کہ دیکھو وہ گھر آصف کا ہے، کرایہ داروں سے خالی کروا کر وہ گھر میں اپنے تابع میں بھی لے چکا تھا، کہ یہ حادثہ پیش آیا، لہٰذا میں جاننا چاہتا ہوں کہ:

(۱) وہ گھر میرا ہے یا نہیں؟

(۲) اگر نہیں تو اس میں میرا حق ہے یا نہیں؟ ہے تو کتنا؟ اس وقت اس گھر کی قیمت تقریباً ۱۵/ لاکھ روپئے ہے، جبکہ ہم نے اسے ۵/ لاکھ ۲۷/ ہزار روپئے میں خریدا تھا؟

(۳) والدہ کا کہنا ہے کہ ہم تجھے ۲/ لاکھ روپئے دیدیں گے، تو کیا میرا حق بس ۲/ لاکھ روپئے ہے؟

(۴) کبھی والدہ صاحبہ کہتی ہیں کہ ہم نے تجھ پر بچپن میں بہت خرچ کیا تھا، لہٰذا اب تیرا کوئی حق نہیں، ان کا یہ کہنا درست ہے یا نہیں؟

(۵) والدین کو اس گھر کی ضرورت نہیں، ان کے پاس ماشاء اللہ، اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا بہت ہے، اور مجھے اس وقت پیسوں کی سخت ضرورت ہے، تو کیا میں ان سے اپنے حق کا مطالبہ کرسکتا ہوں؟ اس میں ان کی بے ادبی تو نہیں ہوگی؟

المستفتی: محمد آصف بن محمد اسماعیل شیخ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کے ماموؤں نے جو پیسہ بچپن میں دیا ہے اس کا حساب متعین ہونا چاہیے تب کوئی بات کہی جاسکتی ہے اس کے بغیر نہیں، اور شادی کے موقع پر ولیمہ میں خرچ کرنے کے لیے جو دیا ہے اس سے مکان کا کوئی تعلق نہیں وہ تو ولیمہ میں خرچ ہوگیا، اب رہی یہ بات کہ مکان کی خریداری کے وقت میں دو لاکھ روپیہ جو آپ نے والد کو دیئے ہیں صرف اس کا مسئلہ رہ جاتا ہے، اس سلسلے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر آپ باپ کی فیملی میں رہ رہے ہیں اور باپ کی فیملی میں آپ نے اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر باہر جا کر کمایا ہے اور آپ کی بیوی بچوں کا خرچ والد ہی اٹھارہے ہیں تو ایسی صورت میں آپ جو باہر سے کما کر لائے ہیں وہ بھی آپ کے والد کی ملکیت ہے، اور پورا مکان بھی باپ کی ملکیت ہوگا، اور اگر آپ باپ کی فیملی سے الگ رہ رہے ہیں اور علاحدگی کے زمانہ میں باہر سے کما کر دو لاکھ روپیہ باپ کو بطور قرض دیئے ہیں جو واپس لینے ہیں اور باپ نے اس پیسہ کو تعمیر میں لگا دیا ہے تو ایسی صورت میں آپ اپنے

والد سے صرف اس دولاکھ روپیہ کا مطالبہ کرسکتے ہیں اور دولاکھ روپیہ نہ ملنے کی صورت میں مکان کے اندر اسی کے بقدر شریک ہوسکتے ہیں۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ٦/٤٠٤)

ثم هذا في غير الإبن مع أبيه لما في القنية: الأب و ابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيئ فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله لكونه معينا له. (فتاویٰ شامي، الشركة، مطلب: اجتمعا في دار واحدة واكتسبا …… زكريا ٦/٥٠٢، كراچی ٤/٣٢٥، هنديه زكريا قديم ٢/٣٢٩، جديد ٢/٣٣٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢٥/ربیع الاول ١٤٣٤ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٤٠/١١٠٣٤)

کیا بیٹے بہو پر ساس سسر کا نفقہ لازم ہے؟

سوال [١٠٢١٧]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرا لڑکا محمد اکرم اور اس کی بیوی نے میرے ساتھ اتنی بدتمیزی کی ہے کہ ناقابل ذکر ہے، مثلاً مجھے نمک حرام، جنگلی کتا تک بتایا ہے، اور ایسے ایسے الزام لگائے، مثلاً میرے دوسرے لڑکے محمد اسلام کے بچوں کو یہ کہہ دیا کہ اولاد میرے لڑکے اسلام کی نہیں، بلکہ مجھ سے (میرے سے ہے) اور بہت سے الزامات ہیں، اور میرا لڑکا ان باتوں پر اس کی سرزنش نہیں کرتا بلکہ تمام گالیوں کو سنتا رہتا ہے، تو شریعت کی نظر میں میرے لڑکے اور اس کی بیوی کی یہ حرکتیں جائز ہیں یا ناجائز؟ ایسے لوگوں کے لیے شریعت میں کیا حکم ہے؟

(٢) میرے لڑکے محمد اکرم نے میرے داماد اور میری لڑکی اور میرے دوسرے لڑکے اسلام کو بلا کر کہا کہ میرا ان ماں باپ سے پیچھا چھڑا دو، میں ان کو روٹی نہیں کھلاسکتا، تو یہ بیچارے ماں باپ اپنی روزی روٹی کے لیے کہاں جائیں؟ کیا خوشحال لڑکے پر اور اس کی بیوی پر بوڑھے اور لاچار ماں باپ کا نفقہ نہیں ہے؟ شریعت کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد یعقوب پیرزادہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) شریعت میں جانبین کی کچھ ذمہ داریاں ہیں، ساس سسر کے اوپر لازم ہے کہ بہو کے ساتھ انتہائی شفقت اور رواداری سے پیش آئے اور اس کو اپنی بیٹی کی طرح بنائے رکھیں تاکہ اس کے دل میں ساس سسر کے بارے میں کسی قسم کا تکدر پیدا نہ ہو، اگر ساس سسر کی طرف سے اس طرح شفقت ومحبت کا معاملہ ہو تو بہو اس پر مجبور ہو جائے گی کہ ساس سسر کا خیال رکھے اور ان کو ماں باپ کا درجہ دے، اور سوالنامہ میں جس طرح کے جھگڑے کا ذکر ہے وہ جانبین سے اس طرح کی باتیں نہ ہونے کی وجہ سے ہے بہت سی جو غلطیاں ہو جائیں، ان کو معاف کر کے محبت کا معاملہ کرنا چاہئے اور بہو کے اوپر لازم ہے کہ ساس اور سسر کا ماں باپ کی طرح عظمت واحترام کرے اور کوئی غلط جملہ ان کے حق میں استعمال نہ کرے اور سوالنامہ میں جس طرح کی مغلظ اور الزام کی باتیں ہیں یہ جانبین کے لیے قطعاً جائز نہیں ہیں، اس طرح کی باتوں سے گریز کرنا ہر ایک پر لازم ہے، ورنہ گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوں گے۔

عن عبد اللّٰہؓ قال قال رسول اللّٰہ ﷺ: لیس المؤمن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذی (وفی روایة) ولم یکن النبی ﷺ فاحشا ولا متفحشا. (صحیح البخاری، باب خوف المومن أن یحبط عمله وهو لایشعر، النسخة الهندیة ۱/۲ ۱، رقم: ۴۸)

(۲) اگر ماں باپ بوڑھے لاچار ہیں تو بیٹے کے اوپر ان کا خرچہ لازم ہے، لیکن ماں باپ کے اوپر بھی لازم ہے، کہ بدزبانی اور سخت گیری سے اپنے کو دور رکھیں، اور بہو و بیٹے کے ساتھ انتہائی شفقت و رواداری کا معاملہ کریں، ساتھ رہنے میں اگر نبھاؤ نہیں ہوسکتا، تو بیٹے کو چاہیے کہ ماں باپ سے الگ رہائش اختیار کرلے، اور اپنی کمائی میں سے ماں باپ کے خرچ کا خیال رکھا کرے۔

قال ویجبر الولد الموسر علی نفقة أبیه و أمه إذا کانا محتاجین هکذا ذکر الإمام خواهرزاده و شمس الأئمة السرخسی والخصاف فی کتابه ...... وفی الهدایة:

لایشارک الولد أحد فی نفقة أبویه. (تاتارخانیة ٥/٤٢٤، رقم: ٨٣٦٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۱۴۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۶/۱۸ھ

اولاد کی جائیداد میں والدین کا حق

سوال [۱۰۲۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ضعیف ہو گیا ہے، کوئی کام کرنے کے قابل نہیں رہا اور علاوہ مکان کے کوئی ایسی جائیداد نہیں جس کو فروخت کر کے اپنی اور اپنی اہلیہ کا گذر بسر ہو سکے، زید کے دو لڑکے ہیں اور یہ دونوں اب الگ الگ ہو گئے ہیں، اور انہوں نے جو کچھ کمایا تھا وہ روپیہ آپس میں آدھا آدھا تقسیم کر لیا ہے، اور زید کو ایک حبہ نہیں دیا تو بتائیے لڑکوں کی کمائی و بنوائی جائیداد میں والدین کا شرعاً کتنا حق ہوتا ہے یا نہیں ہوتا ہے؟

المستفتی: حبیب الرحمٰن شہباز پور کلاں مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر دونوں لڑکوں نے باپ کے ساتھ باپ کی فیملی میں رہ کر کمایا تھا، اور بعد میں دونوں لڑکے جدا ہو رہے ہیں تو ایسی صورت میں دونوں لڑکوں کی ساری کمائی باپ کی ملکیت ہے، باپ کی مرضی ہے جتنا چاہے تقسیم کر دے اور جتنا چاہے اپنے پاس رکھ لے، اور چاہے تو ابھی دونوں لڑکوں کو کچھ نہ دے، اس لیے باپ سے الگ ہوتے وقت سارا مال باپ کو نہ دے کر، دونوں لڑکوں کا آپس میں تقسیم کر لینا قطعاً جائز نہیں۔

الأب و ابنه یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما شیئ فالکسب کله للأب إن کان الابن فی عیاله لکونه معینا له. (فتاویٰ شامی، الشرکة، مطلب: اجتمعا فی دار واحدة واکتسبا …… زکریا ٦/٥٠٢، کراچی ٤/٣٢٥، هندیه زکریا قدیم ٢/٣٢٩، جدید ٢/٣٣٢)

اور اگر باپ کے ساتھ رہنے کے زمانہ میں دونوں لڑکوں نے کچھ نہیں کمایا ہے اور خالی ہاتھ

الگ ہوگئے ہیں اس کے بعد کما کر دونوں نے آپس میں تقسیم کرلیا ہے تو ایسی صورت میں ساری کمائی کے مالک وہ دونوں لڑکے ہوں گے، لڑکوں پر برابری کے ساتھ ماں باپ کا خرچہ اخراجات نان ونفقہ واجب ہوگا، جس درجہ کا خرچہ اپنی بیوی پر خرچ کرتے ہیں اسی درجہ کا ماں باپ پر کرنا لازم ہے۔

وفی الخانية: فإن كان للفقير ابنان أحدهما فائق في الغنى والآخر يملك نصابا كانت النفقة عليهما على السواء. (البحر الرائق، كتاب الطلاق، باب النفقة، كوئٹه ٤/ ٢٠٦، زكريا ٤/ ٣٥٠)

وأشار بقوله ولأبويه إلى أن جميع ما وجب للمرأة يجب للأب والأم على الولد من طعام و شراب و كسوة وسكنىٰ حتى الخادم أو جارية إذا كان الأب محتاجا إلى من يخدمه. (البحر الرائق، كتاب الطلاق، باب النفقة، كوئٹه ٤/ ٢٠٦، زكريا ٤/ ٣٥٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ر صفر المظفر ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۹۴۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۲/۲۹ھ

بھائی اور والدہ کا اولاد کا حق مارنا

سوال [۱۰۲۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بڑے بھائی نے مکان مبلغ پچاس ہزار روپئے میں فروخت کر دیا اس بات کو تقریباً ۲۰ر سال ہوگئے ہر بھائی کے حصہ میں بارہ ہزار پانچ سو روپئے آئے، میرا حصہ بڑے بھائی نے اپنے مکان میں صرف کرلیا، میرے حصہ کی آج کی موجودہ رقم تقریباً تین لاکھ بنتی ہے، اس کے علاوہ میری زمین کی ۶ر سال کی پیداوار بھی انہوں نے ضبط کرلی، مجھے فقط ۱۱۰۰۰ ہزار روپئے دیئے ہیں، مفتی صاحب اگر یہ میری رقم دیدیتے ہیں تو میں اپنے معصوم بچوں کے رہنے کا ٹھکانہ بنالیتا، فی الوقت میرا اپنا کوئی مکان نہیں ہے، اس کے علاوہ میری والدہ نے چودہ سال کی زمین کی پیداوار میری بغیر مرضی کے دوسرے رشتہ داروں پر خرچ کردی جو کہ تقریباً ایک

لاکھ بنتی ہے، میں نے جب والد سے والدہ کے مکان میں اس رقم کے بدلے میں حصہ مانگا تو دینے سے انکار کردیا، پھر میں نے کہا کہ مکان میں حصہ نہیں دیتے ہو تو میری رقم مجھے دیدو، تو مجھے رقم دینے سے بھی انکار کردیا جبکہ اس مکان کی تعمیر میں فدوی نے جانی ومالی طور پر اہم کردار ادا کیا ہے؟

المستفتی: لیاقت حسین ولد امانت حسین بریلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کا جو کچھ بھی شرعی حق ہے وہ آپ کو ملنا چاہیے، اور جو بھی آپ کے حق کو دبائے گا قیامت کے دن اللہ کے دربار میں پکڑا جائے گا، اور جس بھائی نے آپ کا پیسہ مکان میں صرف کردیا، ضروری تھا کہ وقت پر آپ کا پیسہ آپ کو ادا کردیتا اور آپ کو نہ دینے کا گناہ اس کے سر رہے گا، مگر ۱۲۵۰۰ کے بجائے اس پر زائد پیسہ آپ کو نہیں ملے گا، اس لیے کہ زائد پیسہ سود کے درجے میں ہوجائے گا، اور بڑے بھائی نے جو آپ کی چھ سال کی پیداوار کو ضبط کرلیا ہے اگر آپ کو ادا نہیں کرے گا تو اللہ کے یہاں ماخوذ ہوگا، اس کو چاہیے کہ آپ کا حق آپ کو ادا کردے، اور اسی طرح والدہ نے جو آپ کی زمین کی آمدنی آپ کی اجازت کے بغیر دوسروں پر صرف کردی ہے اس کا گناہ آپ کی والدہ پر ہوگا یہ الگ بات ہے کہ والدہ ہونے کی وجہ سے آپ معاف کردیں۔

عن سعيد بن زيد بن عمرو بن نفيل ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من اقتطع شبرا من الأرض ظلما طوقه الله إياه يوم القيامة من سبع أرضين. (مسلم شريف، كتاب المساقات والمزارعة، باب تحريم الظلم وغصب الأرض، النسخة الهندية ۲/ ۳۲، بيت الأفكار رقم: ۱۶۱۰)

لايجوز لأحد أن يتصرف فى ملك الغير بغير إذنه. (قواعد الفقه اشرفى ص: ۱۱۰ رقم: ۲۶۹، شرح المجلة رستم اتحاد ۱/ ۶۱، رقم المادة: ۹۶) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
یکم ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۸۸۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۱۲/۱ھ

۳ باب حقوق الأقارب

اہل خانہ کے حقوق کی ترتیب

سوال [۱۰۲۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص بال بچوں دار ماں باپ بھائی بہن، عزیز وا قارب سب موجود ہیں، تو اس کے اوپر ان کے حقوق کس ترتیب سے واجب ہوتے ہیں؟

المستفتی: محمد ہارون راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بیوی کا خرچہ اس وقت لازم ہوتا ہے کہ جب فرمانبردار ہو اور شوہر ہی کے پاس رہ کر اس کا حق ادا کرتی ہو اس کے بعد نابالغ اولاد پھر والدین پھر نابالغ بہن کا خرچہ لازم ہوتا ہے۔

عن طارق المحاربی قال: قدمنا المدينة فإذا رسول الله ﷺ قائم على المنبر يخطب الناس وهو يقول: يد المعطى العليا، وابدأ بمن تعول: أمك، وأباك، وأختك وأخاك ثم أدناك أدناك. (سنن النسائی، باب أيتهما اليد العليا، النسخة الهندية ۲۷۲/۱ دار السلام رقم: ۲۵۳۲، مسند البزار، مكتبه العلوم والحكم ۱۳۸/۵-۳۲٤)

الأصل في نفقة الوالدين والمولودين القرب بعد الجزئية دون الميراث أى تعتبر أو لا الجزئية أى جهة الولاد أصولا أو فروعا. (شامی، كتاب الطلاق، باب النفقة، زكريا ۳٥٦/٥، كراچی ٦۲۳/۳، الفتاوىٰ التاتارخانية زكريا ٤۲۸/٥ رقم: ۸۳۷۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ صفر المظفر ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۵۶۲۱/۳۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۲/۸ھ

یتیم بچوں کی کفالت کا حق

سوال [۱۰۲۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے بھائی محمد خالد کا اچانک سال گذشتہ انتقال ہو گیا، دوسرے دن ان کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا، دریافت یہ کرنا ہے کہ مرحوم بھائی کے یتیم بچے کس کی کفالت میں رہیں گے، اور نانی ماموں اور چچا میں سے کون ان کا ولی ہوگا؟ از روئے شرع جواب دیں؟

المستفتی: محمد طیب محمد ناظر دیبا سرائے سنبھل

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں ان بچوں کی کفالت کا زیادہ مستحق مذکورین میں سے وہ ہے جو اپنی جیب خاص سے بخوشی ان پر تبرع واحسان کرتے ہوئے ان کا خرچہ برداشت کر سکے، اس لیے کہ اس میں یتیم کا زیادہ فائدہ ہے، اور ان کی وراثت وغیرہ کا مال آپس کے مشورہ سے کسی ایک کو ذمہ دار بنا کر اس کے پاس محفوظ رکھنا ضروری ہے، اس میں سے کسی کو بھی اپنے ذاتی مصرف میں استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے، اور بالغ ہونے کے بعد یہ مال ان کے حوالہ کر دینا لازم ہے، اور اگر مذکورین میں سے کوئی بخوشی اپنی جیب خاص سے خرچ کرنے والا نہیں ہے تو اب بلوغ تک پرورش کا حق نانی کو ہے، اور نانی ان بچوں کے مال سے ان کا خرچہ لے سکتی ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ دار العلوم ۱۱/۱۰۰، امداد الاحکام ۴/ ۴۴۹)

قال اللہ تعالیٰ: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَأْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتَامٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَأْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا. [النساء: ۱۰]﴾

والحاصل أنه كالقاضي إلى في مسائل. (در مختار، قبیل باب كتاب القاضي إلى القاضي، زكريا ٨/ ١٣٠، كراچی ٥/ ٤٣١)

تثبت الحضانة للأم ...... ثم أم الأم. (در مختار، كتاب الطلاق، باب الحضانة، زكريا ٥/٢٥٣-٢٦٢، كراچی ٣/٥٥٥-٢٦٣)

وليس لغير أبيه و جده و وصيها التصرف في ماله هذا إذا لم يكن في

حجرہ. (جامع الفصولین ۲/۱۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍شعبان المعظم ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۶۸۹۶/۳۵)

نابالغ بچوں کے مال کو ماں کا فروخت کرنا

سوال [۱۰۲۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک صاحب کا انتقال ہوا اور انہوں نے دو لڑکے اور ایک نابالغ کو چھوڑا تو کیا ان نابالغ بچوں کا مال ماں بیچ سکتی ہے یا نہیں؟ جواب سے نوازیں۔

المستفتی: ریاست حسین محلّہ سرائے کشن لال مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: نابالغ بچوں کا مال ماں کو فروخت کرنے کا شرعی طور پر حق نہیں ہے، اگر فروخت کرے گی تو واپسی لازم ہے۔

بخلاف التصرف فی المال؛ لأنه يتكرر فلا يمكن تدارك الخلل، فلا تفيد الولاية إلا ملزمة. (هدايه، كتاب النكاح، باب فى الأولياء والأكفاء اشرفى ديو بند ۲/۳۱٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍شعبان المعظم ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷۹۹/۲۸)

بیوہ اور یتیم بچوں کے مکان پر قبضہ کرنا

سوال [۱۰۲۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص صاحب مال ہے، تجارت کرتا ہے، اور اس نے بیوہ اور یتیم کے مکان کا حصہ زبردستی

قبضہ کررکھا ہے، اوراس کا بڑا رشتہ دار بجائے حصہ دلانے کے وہ اپنے پاس سے کچھ روپیہ زکوٰۃ کا دے کراس حصہ کو اپنا بنانا چاہتا ہے، جبکہ اس حصہ کی قیمت کہیں زیادہ ہے تو کیا یہ درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: مظہر الاسلام ٹھٹھیرہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بیوہ اور یتیم کے مکان کے جس حصہ پر قبضہ کیا گیا ہے اس حصہ کو بیوہ ویتیم کی رضا مندی کے بغیر کچھ رقم دے کر لینا جائز نہیں ہے اس لیے کہ بیع میں بائع ومشتری دونوں کی رضا مندی ضروری ہے۔

إذا فقد الرضا لايسمى فى اللغة بيعا بل غصبا. (البحر الرائق، كتاب البيوع، زكريا ٥/ ٤٣١، كوئٹه ٥/ ٢٥٧)

پھر اگر بیوہ ویتیم وہ حصہ دینے پر رضامند ہوجائیں تو اس کی قیمت میں زکوٰۃ کی رقم دینا جائز نہیں ہے اس لیے کہ زکوٰۃ کی رقم سے صاحب مال کے لیے کسی قسم کا انتفاع درست نہیں ہے، اس رقم کا مصرف تو غرباء ومساکین ہیں، اس شرط کے ساتھ کہ جس کو زکوٰۃ کی رقم دی جارہی ہے اس سے کسی قسم کا نفع وابستہ نہ ہو۔

فهى تمليك المال ...... بشرط قطع المنفعة عن الملك من كل وجه. (عالمگیری، كتاب الزكوٰة، الباب الأول ...... زكريا قديم ١/ ١٧٠، جديد ١/ ٢٣٢، الدر مع الرد، كراچى ٢/ ٢٥٨، زكريا ٣/ ١٧٣، حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح، دار الكتاب ديوبند ٧١٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۹۰۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۷/۶/۱۹ھ

شریعت اسلامی میں متبنیٰ کو بیٹا تسلیم کیا جاتا ہے یا نہیں؟

سوال [۱۰۲۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: زید نے اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ایک بچہ کو لے پالک بنایا زید اور اس کی بیوی نے اپنی حیات میں اس لے پالک بچہ کو تمام اختیارات اور اپنی جائیداد وغیرہ کے تمام کاغذات بعد مرنے کے بینک وغیرہ میں جمع رقم کی وصولیابی اور چونکہ زید کی بیوی سرکاری ملازم تھی، اس لیے اپنے بعد میں ملازمت کی سفارش کی کہ میرے بعد میرے بیٹے کو یعنی اس لے پاک کو ملازمت ملے یہ تمام ہی اختیارات زید کی بیوی نے اور زید نے اپنی حیات میں ہی دیدیئے تھے، اسی بنا پر اس کی بیوی کی بینک میں جمع کی ہوئی رقم سب کچھ بچہ کو مل گئی، مگر سرکاری حکام یہ تصدیق چاہتے ہیں کہ شریعت اسلام میں اس لے پاک کو بیٹا تسلیم کیا جاتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: لے پالک ملک محمد شفیع رام نگر نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: چونکہ سرکار لے پالک کو بھی مرحوم کے پسماندگان میں شمار کرتی ہے اور اس کو بھی پسماندگان میں شامل ہونے کی وجہ سے ملازمت دینے کے کالم میں رکھا گیا ہے، اس لیے اس کے لیے ملازمت قبول کرنا اور ذمہ داری ادا کرنے کی تنخواہ وصول کرنا جائز اور درست ہے، لیکن اس کی وجہ سے لے پالک مرحوم کا شرعی وارث نہیں بنے گا، سوالنامہ میں یہ بات بھی واضح کی گئی ہے کہ زید اور اس کی بیوی نے اپنی ساری جائیداد اور بینک بیلینس وغیرہ لے پالک کے نام حلف نامہ کے ساتھ ہبہ کر کے قبضہ دیدیا ہے اس لیے سوالنامہ میں مذکورہ تمام جائیداد اور بینک بیلینس وغیرہ اسی لے پالک کی ملک ہے اور لے پالک کی یہ ملک وراثت کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ زندگی میں ہبہ کر دینے کی وجہ سے ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: ﴿وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآئَكُمْ اَبْنَآئَكُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِىْ السَّبِيْلَ. [الأحزاب: ٤]﴾

فلايثبت بالتبني شيئ من أحكام البنوة من الإرث وحرمة النكاح وغير ذٰلك. (تفسير مظهري، الأحزاب: ٤، زكريا قديم ٧/ ٢٨٤، جديد ٧/ ٢٩٢)

قال العلامة الحصكفي: كل أنواع الكسب في الإباحة سواء على المذهب الصحيح، قال الشامي تحته: فالمراد من قولهم كل أنواع الكسب في

الإباحة سواء أنها بعد إن لم تكن بطريق محظور لايذم بعضها، وإن كان بعضها أفضل من بعض. (الدر المختار مع الشامي، كتاب الصيد، زكريا ۱۰/۴۶، كراچی ٦/٤٦٢، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۸/۱۱۵، المبسوط للسرخسي، دار الكتب العلمية بيروت ۳۰/۲۵۸)

وأما حكمها فثبوت الملك للموهوب له. (هنديه، كتاب الهبة، زكريا قديم ٤/٣٧٤، جديد ٤/٣٩٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۹۵۴)

متبنیٰ سے متعلق چند سوالات کے جوابات

سوال [۱۰۲۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی شخص صاحب اولاد یا بےاولاد کسی بچے کو گود لے کر اس کی پرورش کرے شادی بیاہ کرے، یا کسی بھی طرح اس لے پالک کی کفالت کرے تو شریعت مطہرہ میں اس کا کیا حکم ہے؟

(۱) کیا وہ بچہ گود لینے والے کی جائیداد میں حقدار ہوگا، اگر چہ اس پالنے والے کی اولاد بھی موجود ہو؟

(۲) اگر گود لینے والے کی کوئی اولاد نہ ہو تو کیا یہ بچہ اس کی وراثت کا حقدار ہوگا؟

(۳) اس بچے نے اگر پالنے والی عورت کا دودھ بھی پیا ہو تو شرعاً اس کی کیا حیثیت ہوگی؟

(۴) کیا اس بچے کی شادی بیاہ پالنے والے کی دوسری اولاد سے ہوسکتی ہے؟

(۵) کیا شرعی قانون مقامات کے مطابق تبدیل ہوتے ہیں، مثلاً کسی بچے کو گود لینا کسی وقت کشمیر میں جائز تھا اور اب جائز نہیں رہا، یا مرادآباد میں جائز نہ ہو اور کشمیر میں جائز ہو؟

المستفتی: عظیم علی خان ولد مبارک علی خاں مقرب پور مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱-۲) پالنے والے کی اولاد ہو یا نہ ہو دونوں

صورتوں میں گودلیا بچہ شریعت اسلامی میں پالنے والے کا وارث نہیں بنتا۔

(۳-۴) اگر گود لئے ہوئے بچہ نے شیر خواری کے زمانے میں پالنے والے کی بیوی کا دودھ پیا ہے تو وہ بچہ پالنے والے اور اس کی بیوی کے لیے رضاعی بیٹا بن جاتا ہے اور پالنے والے اور اس کی بیوی کی اولاد سے اس کی شادی شرعاً جائز نہیں ہوتی، ہاں البتہ اگر صرف اس کو پالا ہے اور شیر خوارگی کے زمانہ میں بیوی نے اس بچہ کو دودھ نہیں پلایا ہے تو اس بچہ کی شادی پالنے والے کی اولاد کے ساتھ شرعا جائز اور درست ہے۔

(۵) مقامات کے اعتبار سے بچے کو گود لینے میں دنیا کے کسی خطہ اور کسی علاقہ کا اعتبار نہیں ہے، ہر زمانہ میں گود لینے کا مسئلہ ہر علاقہ میں برابر کا حکم رکھتا ہے، کشمیر اور مرادآباد، یوپی اور پنجاب، ہندوستان اور پاکستان یا عرب وعجم کا کوئی فرق نہیں ہے، سب جگہ کا حکم یکساں ہے۔

عن عائشة زوج النبی صلی الله علیه وسلم أن النبی ﷺ قال: یحرم من الرضاعة ما یحرم من الولادة. (أبو داؤد، باب ما یحرم من الرضاعة ما یحرم من النسب، النسخة الهندیة ۱/۲۸۰ دار السلام رقم: ۲۰۵۵، صحیح البخاری، باب ما یحل من الدخول والنظر إلی النساء فی الرضاع، النسخة الهندیة ۲/۷٦٤، رقم: ٤۹۰۸، ف: ٥۲۳۹، صحیح مسلم، باب یحرم من الرضاعة ما یحرم من الولادة، النسخة الهندیة ۱/٤٦٦، بیت الأفکار رقم: ۱٤٤٤)

عن ابن عباسؓ قال قال النبی ﷺ فی بنت حمزة: لاتحل لی، یحرم من الرضاعة ما یحرم من النسب هی بنت أخی من الرضاعة. (صحیح البخاری، باب الشهادة علی الأنساب والرضاع المستفیض، النسخة الهندیة ۱/۳٦۰، رقم: ۲٥۷۱، ف: ۲٦٤٥، صحیح مسلم، باب تحریم ابنة الأخ من الرضاعة، النسخة الهندیة ۱/٤٦۷، بیت الأفکار رقم: ۱٤٤۷)

وما جعل ادعیاء کم ابناء کم فلایثبت بالتبنی شیئ من أحکام البنوة من الإرث وحرمة النکاح وغیر ذٰلک. (تفسیر مظهری زکریا قدیم ۷/۲۸٤، جدید ۷/۲۹۲)

والمتبنی لایلحق فی الأحکام بالإبن فلا یستحق المیراث ولا یرث عن

المدعی. (أحکام القرآن لمفتی محمد شفیعؒ ۳/ ۲۹۱ بحواله کتاب الفتاویٰ ۶/ ۳۷۵)

یحرم علی الرضیع أبواه من الرضاع و أصولهما وفروعهما من النسب والرضاع جمیعا. (هندیه، کتاب الرضاع، زکریا جدید ۱/ ۴۰۹، قدیم ۱/ ۳۴۳) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد عفا اللہ عنہ
۱۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۷۵۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۰/۵/۱۴ھ

مرحوم کے نام سے آنے والے رسالے کس کی ملکیت ہوں گے؟

سوال [۱۰۲۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک مدرسہ میں بحیثیت ایک ذمہ دار کے ملازم ہے، ایک دینی رسالہ اس کے نام آرہا ہے، وہ اعزازی ہے یا قیمتاً آرہا ہے اس کا علم کچھ نہیں، اب زید کا انتقال ہوگیا ہے لیکن اب بھی اس کے نام رسالہ آرہا ہے، کئی رسالے جمع ہوگئے ہیں، تو اب وہ رسالے کتب خانہ میں جمع کردیئے جائیں یا زید کے ورثاء کے حوالے کیے جائیں، نیز ناظم مدرسہ کے نام مستقل طور پر رسالہ کتب خانہ میں بھی آرہا ہے؟

المستفتی: احمد علی خادم مدرسہ اشرف المدارس ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس کے نام سے رسالہ آرہا ہے وہ رسالہ اسی کی ملکیت ہے، جب اس کا انتقال ہوگیا تو جتنے رسالے آچکے ہیں وہ سب اس کے وارثین کی ملکیت ہیں، کتب خانہ میں جمع کرنا جائز نہ ہوگا، ہاں اگر سب وارثین بہ خوشی کتب خانہ میں جمع کرادیں تو الگ بات ہے، نیز جہاں سے رسالہ آرہا ہے وہاں سے معلومات حاصل کرلی جائے کہ یہ رسالے قیمتاً ہیں یا اعزازی؟

الحق متی ثبت لا یبطل بالتاخیر ولا بالکتمان. (قواعد الفقه اشرفی

ص: ۷۰، قاعدہ: ۱۱۷،الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۶/۱۵۳)

لايجوز لأحد أن يأخذ مال أحد بلا سبب شرعي. (قواعد الفقه اشرفی ص: ۱۱۰، قاعدہ: ۲۶۹، شرح المجلة رستم اتحاد ۱/۶۱ رقم المادة ۹۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۶۲۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱/۶/۱۴۲۹ھ

بہن کے بھائی پر کتنے حقوق ہیں؟

سوال [۱۰۲۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کسی خاتون کے اپنے سگے بھائی پر شرعاً کتنے حقوق ہیں؟

المستفتی: عبدالشکور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بھائی پر بہن کا حق یہ ہے کہ اس کے ساتھ صلہ رحمی کا معاملہ کرے، باقی مستفتی کیا پوچھنا چاہتے ہیں، سوال میں کوئی وضاحت نہیں ہے، جیسا مجمل سوال ہے جواب بھی ویسا ہی ہے۔

حدثنا بهز بن حكيم ثنى أبى عن جدى قال قلت: يا رسول الله! من أبر، قال: أمك، قال: قلت: ثم من، قال: أمك، قال: قلت: ثم من؟ قال: أمك، قال: قلت: ثم من؟ قال: ثم أباك ثم الأقرب فالأقرب. (ترمذی شریف، باب ماجاء في بر الوالدين، النسخة الهندية ۲/۱۱ دار السلام رقم: ۱۸۹۷، مسند البزار، مكتبة العلوم و الحكم ۱۷/۱۷۹، رقم: ۹۸۰۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۱۰۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۵/۱۴۳۴ھ

بعض ورثاء کا اپنی جائیداد پر دوسرے وارث کو قبضہ دینا

سوال [۱۰۲۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کہ محمد نعیم خانصاحب کا انتقال ہوگیا ان کے ورثاء میں تین لڑکے شہاب الدین، صلاح الدین، بدرالدین ایک لڑکی پھول جہاں ہے، ہر وارث کو کتنا ملے گا؟

(۲) پھر شہاب الدین نے اپنا حصہ لے لیا اور صلاح الدین اور پھول جہاں کا حصہ اور خود بدرالدین نے اپنا حصہ اپنے قبضہ میں رکھا، اور صلاح الدین اور پھول جہاں نے بدرالدین کو کل اختیارات دیدیئے تھے، پھر بدرالدین نے حالات سے مجبور ہوکر ان تینوں حصوں میں سے زمین فروخت کرنا شروع کردی، اور اسی روپیہ سے اپنا گذر بسر کرتا رہا، صلاح الدین اور پھول جہاں اس فروختگی کو خوب جانتے تھے، لیکن کبھی فروختگی پر روک نہیں لگائی کہ ان کا بھائی بدرالدین ان کی زمین کیوں فروخت کررہا ہے، صلاح الدین اور پھول جہاں کے شوہر صاحب ثروت تھے، اس لیے بھائی کی کمزوری پر ترس کھا کر گویا ان کو فروخت کرنے کی اجازت دیدی ہے، اپنے اور دونوں کے اکثر حصہ کو فروخت کرکے خرچ کرلیا اس کے بعد جو کچھ زمین بچی وہ پھول جہاں کے شوہر فیض خان نے قبضہ کرکے اشفاق کو مختار عام بنادیا، اشفاق نے وہ بقیہ زمین قبضہ کرکے دوسرے کے ہاتھ فروخت کردی اس میں سے کچھ رقم اشفاق نے خود لی اور کچھ فیض خاں کو دی۔

تو اب دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا شرعاً صلاح الدین اور پھول جہاں کی زمین جو بدرالدین نے بیچ کر کھالی ہے اور وہ لوگ خاموش رہے یہ صلاح الدین اور پھول جہاں کی طرف سے فروختگی کی اجازت سمجھی جائے گی یا نہیں؟

(۳) پھر پھول جہاں کے شوہر پر فیض خاں نے جو بقیہ زمین قبضہ کرکے اشفاق کو مختار عام بنا کر بیچ دی اس میں پھول جہاں اور فیض خاں کی اولادوں کو یہ حق ہے کہ اشفاق کو جو زمین مختار عام بنا کر بیچ دی ہے اس سے حصہ طلب کریں یا بدرالدین نے جس کے ہاتھ فروخت کردی ہے اس سے حصہ طلب کرنا شرعاً کیسا ہے؟

المستفتی: صلاح الدین نوہٹہ سرسا، بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ما تقدم وعدم موانع ارث مرحوم محمد نعیم خانصاحب کا ترکہ مذکورہ ورثاء کے درمیان حسب ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا۔

میت

لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی
شہاب الدین	بدرالدین	صلاح الدین	پھول جہاں
۲	۲	۲	۱

کل ترکہ سات سہام میں تقسیم ہوکر تینوں بیٹوں کو دو دو اور بیٹی پھول جہاں کو ایک ملے گا۔

(۲) جب صلاح الدین اور پھول جہاں نے اصل میراث سے اپنا حصہ حاصل کرکے اسے بدرالدین کے قبضہ میں رہنے دیا اور اس کو کل اختیارات دیدیئے، اور بدرالدین کے فروختگی کے علم ہونے کے باوجود اس پر روک نہیں لگائی اور خریدنے والے نے اس میں تصرف بھی کردیا، تو یہ صلاح الدین اور پھول جہاں کی جانب سے فروخت کرنے کی اجازت ہوگی، لہٰذا ان کا حق ساقط ہوگیا، اب انہیں بھی اور ان کی اولاد کو بھی مطالبہ کرنے کا حق باقی نہیں رہتا ہے، نہ تو بدرالدین اور اس کے ورثاء سے اور نہ ہی خریداروں سے۔

(۳) بدرالدین نے جن لوگوں کے ہاتھ فروخت کیا ہے نہ ان لوگوں سے فیض خاں کی اولاد کو مطالبہ کا حق ہے، اور نہ ہی ان لوگوں سے مطالبہ کا حق ہے، جن کے ہاتھ اشفاق نے فروخت کردیا ہے۔

رآہ یبیع أرضا أو دارا فتصرف فیہ المشتری زمانا وھو ساکت یسقط دعواہ. (الأشباہ والنظائر کراچی ص:۲۲۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۳۲۱/۳۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۴/۲۰ھ

ہر بھائی اپنی ملکیت میں خود مختار ہے

سوال [١٠٢٢٨]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عرض اینکہ ہمارے والد صاحب مرحوم نے اپنے مسکونہ ومملوکہ مکان کے متعلق اپنی حین حیات ہم چاروں بھائیوں کو بتادیا تھا کہ سڑک کی جانب جو چار ملگیاں ہیں ان میں ایک ایک ملگی ایک ایک بھائی کی ہوگی، اوران ملگیوں کے متصل پیچھے گراؤنڈ فلور پر جو مکان کا حصہ ہے، وہ چوتھے لڑکے جو حافظ قرآن ہیں ان کا ہوگا، اس کے بعد والا گراؤنڈ فلور کا حصہ تیسرے بھائی کا ہوگا اور فرسٹ فلور کے دو حصے پہلے اور دوسرے لڑکے کے ہوں گے، حافظ قرآن کے لیے جو حصہ تجویز ہوا تھا، حافظ صاحب اسی کے ایک حصہ میں رہتے تھے، والد صاحب کی حین حیات اس حصہ کے متعلق جو حافظ قرآن لڑکے کا تھا، کوئی سوال اٹھتا تو والد صاحب کہتے وہ حصہ حافظ صاحب کو دیدیا نہیں کا ہے، اس میں تبدیلی نہیں ہوگی، پھر والد صاحب کے انتقال کے بعد والدہ محترمہ کی موجودگی میں والد صاحب کے حسب منشاء مذکورہ بالا تقسیم کے مطابق رجسٹری ہوگئی، جس کو سات آٹھ سال کا عرصہ گذر چکا ہے، اب حکومت کی جانب سے سڑک کی توسیع کی وجہ سے سڑک کی چاروں ملگیاں روڈ کٹنگ میں جارہی ہیں، اور وہ حصہ جو حافظ صاحب کا ہے، لب سڑک آرہا ہے، اس وجہ سے اب دیگر بھائیوں کا تقاضہ ہے کہ حافظ صاحب اپنا مکان چھوڑ دیں، اور پورے مکان کی از سر نو تعمیر کی جائے، سڑک کی جانب چار ملگیاں نکال کر سب ایک ایک لے لیں، اور پیچھے کا حصہ پارکنگ کے لیے چھوڑ دیا جائے، اور فرسٹ فلور پر ایک پوشن (حصہ) حافظ صاحب کو دیدیا جائیگا، لیکن حافظ صاحب اس کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا دیگر بھائیوں کا اس تجویز پر اصرار کرنا اور حافظ صاحب کو اپنے حصے کے تخلیہ اور نئی تقسیم پر مجبور کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اور حافظ صاحب کے لیے شرعی حکم کیا ہے؟ تفصیلی جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

المستفتی: عبداللہ حیدرآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حافظ صاحب کو اپنی ملکیت کے بارے میں ہر طرح کا اختیار ہے، وہ اگر اپنے حصہ میں دو کانیں نکال کر بھائیوں کو دینے سے انکار کر رہے ہیں تو ان کو اس بات کا اختیار ہے، اس لیے کہ جب باضابطہ رجسٹری کر کے ہر ایک کو اپنی اپنی ملکیت حاصل ہو چکی ہے اور حافظ صاحب کو بھی اپنی ملکیت حاصل ہو چکی ہے، تو جس طرح دوسرے بھائیوں کو اپنے حصوں میں ہر طرح کے تصرف کا حق ہے اسی طرح حافظ صاحب کو بھی اپنے حصہ میں ہر طرح کے تصرف کا حق حاصل ہے، دوسرے بھائیوں کی بات ماننا ان پر لازم نہیں ہے، یہ بات الگ ہے کہ اخلاقی طور پر حافظ صاحب اپنی طرف سے بھائیوں کے ساتھ رواداری کا معاملہ کر کے انہیں کچھ دیدیں، لیکن شرعاً انہیں مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

ولكل واحد منهم أن يتصرف في حصته كيف شاء. (شرح المجلة، رستم باز اتحاد ديوبند ١/٦٤٣، رقم المادة: ١١٦٢)

كل يتصرف في ملكه كيف شاء. (شرح المجلة، رستم باز اتحاد ديوبند ١/٦٥٤، رقم المادة: ١١٩٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۴ ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۹۸۰/۴۱)	۱۴۳۶/۴/۴ھ

ایک بھائی کا دوسرے بھائی کی اجازت کے بغیر اس کی بجلی استعمال کرنے کا حکم

سوال [۱۰۲۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) میرا ایک پاور لائٹ کنکشن چھ کلوواٹ کا ہے جس میں سے میرے بھائی نے میری اجازت کے بغیر اور مجھے بتائے بغیر اپنے پورے کارخانہ اور پورے گھر کی لائٹ میرے کنکشن و میرے کیبل سے لے رکھی ہے، کیا ان کا مجھ سے لائٹ لینا جائز ہے؟ جبکہ میں قانونی اعتبار سے زیادہ پاور چلا کر (اگر بجلی محکمہ کی سرکاری وقانونی کارروائی ہوتی ہے تو اس شکل میں میرے

اوپر میرے نام کے کنکشن ہونے کے ناطے جرمانہ وسزا ہوسکتی ہے)میں اس دباؤ اور ٹینشن میں زندگی گذار رہا ہوں، کیا یہ میرے ساتھ ظلم نہیں ہے، اس کا صحیح جواب دے کر مجھے مطمئن کیا جائے تاکہ میں انہیں اس جواب کو دکھا کر اپنا بجلی کنکشن ان سے کہہ کر الگ کرواسکوں؟

(۲) میں نے اپنے بھائی کے سامنے بجلی کے بارے میں بجلی کا بل دینے کی بات کر رکھی ہے جب تک وہ اسے چلاتے ہیں یا فیض اٹھا رہے ہیں یا اس پر کوئی بھی قانونی کارروائی جرمانے کی یا سزا کی ہوتی ہے تو اس کی ذمہ داری تحریری شکل میں چار فریقین کے سامنے لیں تاکہ میری ضمانت وحفاظت ہوسکے؟

المستفتی: حفظ الرحمٰن ٹھٹھیرہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: (۱) آپ کی مرضی اور اجازت کے بغیر آپ کے بھائی کا اپنے گھر اور کارخانہ میں آپ کی لائٹ کا استعمال کرنا جائز نہیں اور یہ آپ کے ساتھ صریح ظلم وزیادتی ہے، خاص طور سے جبکہ ان کے اس فعل کی وجہ سے آپ کی عزت اور مال کے خطرہ میں پڑنے کا اندیشہ ہو تو اس کی قباحت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

عن أبي حرة الرقاشي عن عمه أن رسول الله ﷺ قال: ألا! لا تظلموا، لا يحل مال امرئ إلا بطيب نفس منه. (مسند أحمد بن حنبل ٥/٧٢، رقم: ٢٠٩٧١، شعب الإيمان للبيهقي، باب في قبض اليد عن الأموال المحرمة، دار الكتب العلمية بيروت ٤/٣٨٧، رقم: ٥٤٩٢، سنن الدار قطني، البيوع، دار الكتب العلمية بيروت ٣/٢٢/ ٢٨٦٢- ٢٨٦٣)

(۲) جب آپ کے بھائی کا آپ کے کنکشن کی لائٹ استعمال کرنے کی وجہ سے قانونی کارروائی اور سزا کا خطرہ ہے تو بل دینے کی شرط پر بھی اپنے کنکشن سے لائٹ استعمال کرنے کی اجازت دینا آپ کے لیے درست نہیں۔

﴿**قال الله تعالىٰ: وَلَا تُلْقُوا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ.** [البقرة: ١٩٥]﴾

درء المفاسد أولىٰ من جلب المصالح فإذا تعارضت مفسدة و مصلحة

قدم دفع المفسدة غالبا. (الأشباه والنظائر قديم ص:١٤٧، قواعد الفقه اشرفی ص: ٨١، رقم: ١٣٣، شرح المجلة رستم اتحاد ٣٢/١ رقم المادة: ٣٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍رجب المرجب ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۶۶۲/۳۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۷/۵ھ

بھائی کا بہنوں کے حقوق دبا کر رکھنے اور ان کو محروم کرنے کا حکم

سوال [۱۰۲۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے والد صاحب (سینٹرل اکس سائز اور کسٹم ڈپارٹمنٹ میں سروس کرتے تھے، اور نادرست طبیعت کی وجہ سے چالو سروس میں ہی نوکری سے استعفیٰ نامہ دیا جس کی وجہ سے سرکار سے پرائیوڈنٹ فنڈ اور سب ملا کر اچھے پیسے آئے، جن پیسوں میں سے ہمارے والد نے ہماری ماں کے نام پر ایک مکان پیرے ماؤنٹ سوسائٹی آنند میں لیا، اور ایک دوکان سپر مارکیٹ میں ہمارے بھائی کے نام سے لی تھی، ہمارے والد صاحب کے ہم پانچ افراد ہیں اس میں ایک بھائی اور چار بہنیں ہیں؟

ہمارے والد صاحب دوکان اور مکان کا ورثہ تقسیم کئے بنا انتقال کر گئے، تھوڑے سال بعد ہماری والدہ کا بھی انتقال ہو گیا، وہاں تک مکان ہماری والدہ کے نام پر ہی تھا، ماں اور باپ کے انتقال کے بعد بھائی نے ہم چاروں بہنوں کو اکٹھا کر کے کہا کہ وہ دوکان میں بڑا دھندا کرنا چاہتا ہے، مگر بینک سے لون لینا پڑیگا، اگر بینک سے اچھا لون لے کر مال وسامان لاؤں گا، تو دھندا اچھا چلے گا، اور تم سب بہنوں کو تمہارا حق حصہ دوں گا، یہ کہہ کر ہم چاروں بہنوں کو کاغذات جو لکھے ہوئے تھے جس میں کیا لکھا ہوا تھا وہ ہمیں معلوم نہیں تھا اس پر ہمارے دستخط کروالئے، ہمارے بھائی نے اس وقت ہم سے یہ کہا تھا کہ میرے پاس پیسے آتے ہی آپ چاروں بہنوں کو مکان اور دوکان میں سے جو حصہ دینے کا بنتا ہے وہ پیسے آتے ہی دے دونگا، ہم چاروں بہنوں کو یہ پتہ بھی نہ تھا کہ ہمارا بھائی یہ دستخط کرواکے ہمارا حق چھین

لے گا، ہم نے اپنے بھائی پر بھروسہ کر کے دستخط کر دیئے تھے۔

ہم کو ایک دو سال کے بعد پتا چلا کہ بھائی نے الگ الگ بینکوں سے تین لاکھ روپے جیسی بڑی رقم قرضے کے طور پر لے رکھی تھی، جب ہم اپنے بھائی سے اپنے حصہ حق کی بات کرتے تھے، تو وہ ہمیشہ کہتا تھا کہ میں تمہارا حصہ دے دوں گا، تھوڑا صبر کرو کئی بار ہم نے اپنا حصہ لینے کے لیے بھائی سے جھگڑا کیا مگر ہمارے بھائی نے ہم چاروں بہنوں کو حصہ نہیں دیا، آخر میں اس کا بھی انتقال ہو گیا۔

بھائی کی اولاد میں حال میں ایک بھابھی اور دولڑکے اور ایک لڑکی ہے لڑکی کی شادی ہو چکی ہے، بڑے لڑکے کی بھی شادی ہو چکی ہے، ہمیں پتہ چلا ہے کہ بڑے لڑکے نے حال ہی میں سپر مارکیٹ میں بھائی کے نام کی دوکان بائیس یا ستائیس لاکھ کی بیچ دی ہے ہم چاروں بہنوں نے اپنے حق حصہ کی اپنے بھائی کے لڑکے سے مانگ کی تو وہ بھی ہمیں حق حصہ دینے سے انکار کرتا ہے۔

نوٹ: بھائی نے جو مکان اور دوکان ہمارے والد کے پیسے سے بنائی تھی وہ لون لینے کے بہانے سے ہم سے بغیر پڑھائے، بغیر سمجھائے دستخط کروا لیے، ہم کو اپنے بھائی پر بھروسہ تھا کہ بھائی اپنی بہنوں کا حصہ دیدے گا، اور بھائی بار بار اس کے مطابق بولتا بھی تھا، لیکن ان کی اولاد ہمارا حصہ دینے سے انکار کر رہی ہے کہ آپ چاروں نے دستخط کر کے اپنا حصہ بھائی کی حیات میں چھوڑ دیا، جب کہ ہم کو یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ ہمارے یہ دستخط ہمارے حصے کو ختم کروا رہے ہیں، دوکان بیچنے کے بعد بینک کا جو قرض تھا وہ دینے کے بعد ہمارے بھائی کے لڑکے نے منافعہ کے پیسے سے زمین اور پلاٹ وغیرہ لیا ہے، ہمارے بھائی کا لڑکا دوکان اور مکان میں سے حصہ دینے سے انکار کرتا ہے۔

اس کے علاوہ ہم چاروں بہنوں نے اپنے بھائی کی اس کے خراب وقت میں روپیوں سے مدد کی تھی، مگر وہ بھی ہمارا بھتیجا دینے سے انکار کر رہا ہے، آپ صاحب دین اور دنیا بھی ہو اللہ نے آپ کو دین کی حقیقت سے خوب نوازا ہے تو آپ سے اوپر لکھے ہوئے مسئلے کی روشنی میں فتویٰ چاہتے ہیں، کہ ہم چاروں بہنوں کا حصہ دوکان اور مکان میں ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو

کتنا ہے؟ برائے کرم اس کی وضاحت فرما دیجئے کہ کس کو کتنا ملنا چاہئے؟

المستفتیہ: قمر النساء، آنند گجرات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بھائی نے بہنوں کا حق دھوکہ میں رکھ کر جو دبایا ہے اس کی وجہ سے بہنوں کا حق ختم نہیں ہوگا، بلکہ بدستور باقی ہے، اگر دنیا میں بھائی نے نہیں دیا، اور بھتیجہ بھی نہیں دیتا ہے تو قیامت کے دن سات زمین کا طوق ان کے گلے میں ڈالا جائے گا، بھتیجے پر لازم ہے، کہ جو حق دبایا گیا ہے فوری طور پر وہ حق مستحقین کو دیدے۔

عن سعید بن زید بن عمرو بن نفیل ان رسول اللّٰہ ﷺ قال: من اقتطع شبرا من الأرض ظلما طوقه اللّٰه إياه يوم القيامة من سبع أرضين. (مسلم شريف، كتاب المساقات والمزارعة، باب تحريم الظلم وغصب الأرض، النسخة الهندية ٢/٣٢، بيت الأفكار رقم: ١٦١٠، صحيح البخاري، كتاب المظالم، باب إثم من ظلم شيئا من الأرض، النسخة الهندية ١/٣٣٢، رقم: ٢٣٨٨، ف: ٢٤٥٢، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب من يأخذ الشيئ من مزاح، النسخة الهندية ٢/٦٨٣، دار السلام رقم: ٥٠٠٣) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۱۸؍ شوال المکرّم ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۲۶۵/۴۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/۱۰/۱۴۳۴ھ

بڑے بھائی کا چھوٹے بھائی کی کمائی سے فائدہ اٹھانا

سوال [۱۰۲۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عطرت علی کے دو لڑکے عشرت علی وحشمت علی تھے، عشرت علی اپنے والد صاحب کے زمانہ میں پڑھنے لکھنے بیٹھ گئے، اور حشمت علی زیادہ کمسن تھے، جب باپ کا انتقال ہوگیا تو عشرت علی پڑھ لکھ کر سرکاری ملازم ہو گئے، اور حشمت علی جب بڑے ہوئے تو گھر کے اقتصادی حالات کی وجہ سے پڑھ نہ پائے، کاشتکاری کے کام میں لگ گئے اور گھر کی پوری

ذمہ داری سنبھالنی شروع کی اور کاشتکاری میں برابر محنت کرتے رہے، اللہ نے حالات بدلے تو ٹھیکہ پر زمین لینی شروع کی ، اور اس کی آمد دس پندرہ ہزار روپیہ سالانہ ہوتی، تقریباً بیس سال سے یہ سلسلہ چل رہا ہے، اور اس کی آمد سے چھ بیگھہ زمین خریدی اور اپنے بھائی عشرت علی کا بھی نام اپنے ساتھ بیعنامہ میں لکھوادیا۔

تینوں بہنوں کی شادی اور والدہ کے اخراجات سب کچھ حشمت علی ہی کو برداشت کرنے پڑے ، اور عشرت علی اپنی ملازمت کرتے رہے انہوں نے گھر کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، نہ تو بہنوں کی شادیوں میں اور نہ والدہ کے اخراجات میں کوئی پائی پیسہ دیا، سب سے لاپرواہی برتتے رہے، اور عشرت علی کی شادی ہوئی، تو ساڑھے تین بیگھہ زمین بیچ کر شادی کی جوکہ شرکت کی زمین تھی، دونوں بھائیوں کی، اور جب ان کی لڑکی کی شادی ہوئی تو ۹۰؍ ہزار روپئے حشمت علی نے لگائے، اور جس وقت حشمت علی کی شادی ہوئی تو خرچ کیا کرتے، شادی میں شرکت بھی نہ کی، ادھر حشمت علی جو کاشتکاری کے پیسہ سے برابر گھر کی تعمیرات میں اضافہ کرتے رہے، عشرت کے رٹائیر ہونے کے بعد گھر جنگل کی زمین کا بٹوارا ہوا تو پکے مکان جو شروع میں کچے تھے چھپر وغیرہ تھے، اس میں تو پورا حصہ لینا چاہتے ہیں اور اپنی کمائی کا کوئی حصہ دینا نہیں چاہتے جبکہ ان کی ایک بلڈنگ لکھنؤ میں بھی ہے؟

المستفتی: حشمت علی سہس پور بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر حشمت علی نے اپنی ہی کمائی اور محنت سے نیا مکان بنایا ہے تو وہ اسی کی ملکیت ہے اور عشرت علی نے اپنی کمائی سے لکھنؤ میں جو بلڈنگ لے رکھی ہے اس کا وہی مالک ہے اور اپنی کمائی اپنے پاس الگ جمع کرتا رہے، ہاں البتہ اگر ایسا کیا جاتا تو درست ہوتا کہ دونوں بھائی اپنی اپنی کمائی ایک جگہ جمع کر کے مشترکہ طور پر خرچ کیا کرتے تو پھر تقسیم میں بھی ہر چیز میں دونوں کا برابر حصہ ہوتا، لیکن واقع میں ایسا نہیں ہے، جیسا کہ سوال نامہ سے واضح ہے۔

لایجوز لأحد من المسلمین أخذ مال أحد بغیر سبب شرعي. (هندیه،

كتـاب الـحـلـو د، فـصـل فـى التعزير، زكريا قديم ٢/ ١٦٧، جديد ٢/ ١٨١، شرح المجلة، رستـم اتـحاد ١/ ٦٢، رقم المادة: ٩٧، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٧/ ٣٥٤، شامي زكريا ٦/ ١٠٦، كراچی ٤/ ٦١، البحر الرائق زكريا ٥/ ٦٨، كوئٹه ٥/ ٤١)

لـو تـصـرف أحـد الـورثة فـى الـتـركة المشتركة و ربح فـالـربح للمتصرف وحده. (هـنـديـه، كتاب الشركة، الباب السادس فى المتفرقات، زكريا قديم ٢/ ٣٤٦، جديد ٢/ ٣٤٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰/ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۴۹۸۵)

ایک بھائی کا دوسرے کو جائیداد سے محروم کرنا

سوال [۱۰۲۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسماۃ فاطمہ بیوہ کے تین لڑکے ہیں: محمد یاسین، محمد عثمان، عبد الغنی، تینوں لڑکوں نے محنت ومزدوری کر کے سب سے پہلے مکان کے لیے ایک زمین خریدی اور مشورہ سے اس زمین کو والدہ کے نام کر دیا، پھر اس زمین پر پہلے کچا پھر پکا، مکان بنایا، اور اسی مکان میں ایک دوکان نکالی اسی مکان میں تینوں بھائیوں کی رہائش تھی، پھر دوکان کی کمائی اور بھائیوں کی محنت سے ایک کھیت خریدا گیا، کچھ دنوں بعد اس کھیت کو فروخت کر دیا گیا، بیچنے کے بعد رجسٹری کے وقت محمد عثمان نے کچھ اپنی مجبوری کی وجہ سے کاغذ پر سائن کرنے سے پہلے اپنا حق لے لیا، اس طرح محمد عثمان کو کھیت کا حصہ حاصل ہو گیا، لیکن محمد عثمان کے اپنا حق لے لینے کی وجہ سے دونوں بھائیوں کو ناگواری ہوئی اور انہوں نے اسی وجہ سے محمد عثمان کو گھر کے حصہ سے اس طرح محروم کر دیا کہ محمد عثمان کی عدم موجودگی میں عبد الغنی نے مکان میں اپنا حصہ لے کر بقیہ دو حصوں کو اپنے بڑے بھائی محمد یاسین کے نام پر کر دیا اور والدہ سے بیماری کی حالت میں والدہ کی لاعلمی میں اس کاغذ پر انگوٹھا بھی لگوا دیا، جب محمد عثمان کو معلوم ہوا تو فوراً والدہ کے

پاس گیا اور پوچھا کہ اماں کیا آپ نے اس طرح کیا ہے، کہ محمد یاسین کو دیدیا، اور محمد عثمان کو محروم کردیا، والدہ نے کہا بیٹا: میں نے یہ نہیں کیا ہے، لیکن والدہ نے جو مجھے نفی میں جواب دیا اس پر میرے لیے سوائے خدا کے کوئی گواہ نہیں ہے، اور اب والدہ بھی حیات نہیں ہیں، تو کیا اس طرح محمد عثمان شرعاً اپنے حق واجبی سے محروم ہوجائے گا؟

المستفتی: محمد عثمان کھنڈورہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: محمد عثمان کا حق گھر کے حصہ میں شرعی طور پر مکمل باقی ہے، ماں دستخط کردے یا نہ کرے، دونوں صورتوں میں واجبی حصہ لینے کا حق اس کو ہر وقت حاصل ہے، لہٰذا ماں کے دستخط کے بعد بھی وہ اپنا شرعی حق لے سکتا ہے، اس میں کسی گواہ وغیرہ کی بھی ضرورت نہیں۔

لایجوز لأحد أن یأخذ مال أحد بلا سبب شرعی، لایجوز لأحد أن یتصرف فی ملک الغیر بغیر إذنه. (قواعد الفقه اشرفی ص: ۱۱۰، قاعدہ: ۲۶۹، ۲۷۰، شرح المجلة رستم اتحاد ۱/ ۶۲،۶۳، رقم المادة ۹۶-۹۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۳۵۲/۳۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/۴/۱۴۳۲ھ

ایک بھائی کا دوسرے بھائی کی آمدنی میں حق

سوال [۱۰۲۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے جس فرم میں قانونی مصلحت کی بنا پر اس کا نام شامل کیا تھا وہ فرم اس کے جدا ہونے کے ساتھ ساتھ ختم ہو چکی تھی، اور اس کو دس لاکھ روپیہ نقد دے کر اور کافی مقدار جائیداد دے کر الگ فرم قائم کرادی تھی، اور بعد میں بھی پھر اس نے دو لاکھ روپئے لئے اور یہ لڑکوں کی شرکت میں دوسری فرم قائم کی جس میں اس کا کوئی تعلق نہیں اور میرا نام بھی اس فرم

میں نہیں ہے، البتہ یہ چارلڑکے اپنی فرم چلانے میں میرا مشورہ ضرور لیتے ہیں اور میری مرضی کے خلاف کوئی کام یہ لوگ نہیں کرتے ہیں اور اب جو جائیداد خریدی گئی ہیں وہ سب اس دوسری فرم کی آمدنی سے ہیں تو کیا اس میں ظہیر عالم کا کوئی حق ہوسکتا ہے؟

المستفتی: ابوالحسن بارہ دری مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب باپ نے بیٹے کو الگ کرتے وقت کاروبار کے لیے جائیدادیں اور دس بارہ لاکھ روپیہ دے کر الگ سے فرم قائم کروا دی ہے تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ باپ نے بیٹے کے ساتھ بدخواہی یا نقصان پہنچانے کا معاملہ نہیں کیا ہے، نیز جب بڑے بیٹے کی فرم الگ قائم ہوگئی اور دوسرے چار بیٹوں کی الگ فرم قائم ہوگئی تو جس طرح ظہیر عالم کی فرم کی آمدنی سے دوسرے لڑکوں کو مطالبہ کا حق نہیں ہے اسی طرح ظہیر عالم کو بھی دوسرے بھائیوں کی فرم کی آمدنی سے مطالبہ کا کوئی حق نہیں ہے۔

لایجوز لأحد أن یأخذ مال أحد بلا سبب شرعی. (قواعد الفقه اشرفی ص: ۱۱۰، قاعده: ۲۶۹، شرح المجلة رستم اتحاد ۱/ ۶۲، رقم المادة: ۹۶، هندیه زکریا قدیم ۲/ ۱۶۷، جدید ۲/ ۱۸۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۷۹۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴؍ ۴؍ ۱۴۱۷ھ

بھائی کے مکان پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنا

سوال [۱۰۲۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے چار لڑکے میری مرضی اور میرے مشورہ پر چلتے ہیں، میری فیملی میں نہیں، سب کی فیملیاں الگ الگ ہیں اور رہائشی مکان بھی سب کے الگ الگ ہیں، میرا بڑا مکان جو بارہ دری میں ہے، اس کے اوپر کے حصہ میں میرا نافرمان بیٹا ظہیر عالم رہتا ہے اور نیچے

کے مکان میں میرا فرمانبردار لڑکا ماہ عالم رہتا ہے، اور اس مکان میں میرے چھ لڑکوں کا نام ہے، ظہیر عالم چاہتا ہے کہ پورا مکان وہ خود لے کر اپنے چھوٹے بھائی کو اس مکان سے نکال دے، جبکہ اس میں صرف چھٹا حصہ ظہیر عالم کے نام ہے، یہی جھگڑے کی اصل بنیاد ہے کہ وہ پورا مکان میں کسی بنا پر ظہیر عالم کو دیدوں جبکہ اس کا کاروبار بالکل الگ ہے، اس میں میرا کوئی دخل نہیں ہے، اور اس کے پاس اس وقت ہزار بیگھہ سے اوپر ہی زمین موجود ہے، پھر بھی چھوٹے بھائی کو رہائشی مکان سے نکال کر پورا اپنے قبضے میں لینے کے لیے ہر قسم کی جھوٹی اسکیمیں بنا رہا ہے اور عدالتی دھمکیاں بھی دیتا رہتا ہے اس کا خیال یہ ہے کہ سب کچھ اس کو مل جائے اور دوسرے بھائیوں کو چاہے کچھ بھی نہ ملے، اور اس وقت تنہا اس کے پاس جتنی دولت ہے ان چاروں لڑکوں کی کل دولت سے کم نہیں ہے؟

المستفتی: ابوالحسن بارہ دری مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر جھگڑے کی اصل بنیاد چھوٹے بھائی کو مشترکہ مکان سے نکالنے کی اسکیم ہے اور سوالنامہ سے واضح ہو رہا ہے کہ اس کے پاس ہزار بیگھہ سے زائد جائیداد اور سب بھائیوں سے زیادہ دولت ہے تو نہایت افسوس اور بے رحمی کی بات ہے کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی کو پورے مکان سے نکال کر خود پورے مکان پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے، تو ایسے حالات میں باپ کو اختیار ہے، کہ اپنی مصلحت کے مطابق جو چاہے فیصلہ کرے اور باپ کو شرعاً یہ بھی اجازت ہے کہ نافرمان بیٹے کو کچھ بھی نہ دے کر ساری دولت دوسری اولاد کو یا کار خیر میں صرف کردے۔

لابأس بأن يعطى من أولاده من كان عالما متأدبا ولا يعطى منهم من كان فاسقا فاجرا. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دار الكتب العلمية بيروت ٤٩٧/٣، مصرى قديم ٣٥٨/٢)

ولو كان ولده فاسقا و أراد أن يصرف ماله إلى وجوه الخير ويحرمه عن الميراث هذا خير من تركه. (عالمگیری، الباب السادس فی الهبة للصغیر، زکریا قدیم ٣٩١/٤، جدید ٤١٦/٤)

فتاویٰ احیاء العلوم ۱/۲۸۳، احسن الفتاویٰ ۷/۲۵۶، فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۴/۶ ۴۴، جدید ڈابھیل ۱۶/۵۰۴ میں بھی یہی حکم موجود ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۴۷۹۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴/۴/۱۴۱۷ھ

لڑکے کی کمائی میں کیا اس کے بھائیوں کا حق ہوگا

سوال [۱۰۲۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک نے اپنی کمائی سے کانی گھر زمین میں دوکان بنالی، باپ کی کوئی وراثت نہیں ہے تو کیا اس صورت میں اس کی کمائی میں سے کوئی حصہ لے سکتا ہے یا نہیں؟ مثال کے طور پر اس شخص کے چھوٹے بھائی ہیں یا اور عزیز واقارب ہیں اور ماں باپ بھی زندہ ہیں، اگر یہ لوگ حصہ مانگیں تو کیا یہ لوگ حقدار ہوں گے یا نہیں؟

المستفتی: اصغر علی بارہ دری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر شخص مذکور نے باپ کی فیملی میں رہ کر یہ ترقی کی ہے تو ساری دولت شرعاً باپ کی ملکیت میں شمار ہوگی، اور اگر باپ سے الگ ہوکر کمائی ہے تو اس میں کسی دوسرے کا حق نہ ہوگا، پہلی صورت میں باپ کے تمام ورثاء کا حق ہوگا۔

الأب و ابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيئ فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله لكونه معينا له. (فتاویٰ شامی، الشرکة، مطلب: اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ...... زکریا ۶/۵۰۲، کراچی ۴/۳۲۵، ہندیہ زکریا قدیم ۲/۳۲۹، جدید ۲/۳۳۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱ ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۳۹۰۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱/۳/۱۴۱۵ھ

گھر کا چھجہ سڑک پر نکال سکتے ہیں یا نہیں؟

سوال [۱۰۲۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک زمین ہم نے دوسوا کیس گز خریدی اس میں ہم نے بھراؤ کر کے اس کو پورا ناپ لیا تھا، اب دوسرا فریق جو کہ ہمارا پڑوسی ہے، ایک دن صبح فجر کے بعد وہ ہم کو کوس رہے تھے، ہم نے اس سے معلوم کیا آپ ہم کو کیوں کوس رہے ہیں، جواب دیا کہ تم نے بہت زیادہ زمین پر قبضہ کرلیا ہے اور ہمارے پاس بہت کم رہ گئی ہے، لہٰذا آپ ہم کو اس میں سے کچھ زمین دیدو، نمبر ایک فریق نے خدا سے ڈر کر اس کو تقریباً چھ فٹ چوڑائی اور ۴۰رفٹ لمبی زمین دیدی، اس کے بعد آگے والا حصہ کو جب بنانے چلے تو محلّہ کے کچھ لوگوں نے چھ فٹ چوڑائی تقریباً ۳۰رفٹ لمبی زمین چھوڑوائی، وہ زمین سڑک میں گئی، اب نمبر ایک فریق اس سڑک کے اوپر اپنا چھجہ نکالنے کا حق رکھتا ہے، یا نہیں؟ اور نمبر دو فریق سے واپس لینے کا حق دار ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبداللطیف پیرزادہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مذکورہ میں فریق اول کو راستہ میں اس طرح چھجہ نکالنے کا حق ہوسکتا ہے کہ جس سے لوگوں کے گذرنے میں پریشانی نہ ہو۔

عن ابن عباس – رضی الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ لاضرر ولاضرار. (مسند أحمد بن حنبل ۱/ ۳۱۳، رقم: ۲۸٦۷)

لاتدخل الظلة فی بیع الدار إلا إذا قال بکل حق وهی الساباط الذی یکون أحد طرفیه علی الدار. (البحر الرائق، کتاب البیوع، باب الحقوق، کوئٹه ٦/ ۱۳۲، زکریا ٦/ ۲۲۹)

(۲) فریق اول نے فریق ثانی کو جو حصہ دیا ہے وہ شرعاً ہبہ ہے اور ہبہ کی ہوئی زمین پر جب تعمیر ہو جائے تو اس کو واپس لینا جائز نہیں ہے۔

عن ابن عباس – رضی الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: العائد

فی هبته كالعائد فی قیئه. (صحیح البخاری، هبة، باب لايحل لأحد أن يرجع فی هبته وصدقته، النسخة الهندية ۱/۳۵۷، رقم: ۲۰۴۷، ف: ۲۶۲۱)

لایرجع الواهب فی هبته لحدوث الزيادة فی العين. (البحر الرائق، كتاب الهبة، باب الرجوع فی الهبة، كوئٹه ۷/۲۹۱، زكريا ۷/۴۹۶) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۵۹۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۹/۱۴۱۰ھ

کیا میکہ والوں کو اپنی لڑکی اور اس کی اولاد کے خرچہ کے مطالبہ کا حق ہے؟

سوال [۱۰۲۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری چھوٹی بیٹی امۃ اللہ کی شادی محمد عقیلی ساکن موضع میر غیاث چک سے آج سے تقریباً چھ برس پہلے ہوئی تھی، جس میں میری بیٹی امۃ اللہ اپنی سسرال موضع میر غیاث چک میں اپنے شوہر کی مرضی سے جانا آنا کرتے کراتے، چھ ماہ رہی ہوگی، بقیہ ساڑھے پانچ برس سے اپنے شوہر کے مشورہ سے مگر بغیر میری اجازت کے میرے یہاں یعنی میکے میں رہ رہی ہے، اس ساڑھے پانچ برس میں کبھی بھی محمد عقیلی مذکور نے اپنے بیوی بچوں کا کھانا خرچہ مجھے نہیں دیا اور نہ ہم سے انہوں نے اس طرح کی بات کبھی کی کہ ابھی اتنے سال اپنے یہاں رکھئے، اس کے بعد ہم کھانا خرچہ دیں گے یا اپنے ساتھ لے جائیں گے، کبھی کبھی ہم نے محمد عقیلی سے امۃ اللہ کے کھانا وغیرہ کا خرچا مانگا تو وہ خاموش رہے اور ان کی جگہ پر میری بیٹی امۃ اللہ اپنا سر اور سینہ پیٹنے لگی، پتہ نہیں، ان دونوں کے درمیان کچھ طے ہوا ہے، یا شوہر نے امۃ اللہ مذکورہ کو سمجھایا ہے یا دھمکایا ہے یا پھسلایا ہے، جس سبب سے میری مذکورہ بیٹی اس طرح کرنے لگتی ہے، جبکہ اس ساڑھے پانچ برس میں محمد عقیلی خود بھی آنا جانا کرتے کراتے میرے یہاں کم سے کم چار برس کھانا پینا کئے ہوں گے، اور میرے یہاں رہے ہوں گے اور ابھی بھی میرے یہاں رہتے آرہے ہیں؟

نوٹ: محمد عقیلی بیوی بچوں کا بوجھ اٹھانا نہیں چاہتے ہیں۔

اب میری بیٹی کے دو بچہ (ایک تین برس کا اور ایک سوا برس کا ہے) جبکہ شادی سے پہلے محمد عقیلی نے سات ایکڑ زمین کا اپنے کو مالک بتایا تھا، میں نے ڈر کے مارے کسی دار القضاء میں مقدمہ بھی نہیں کیا کہ پتہ نہیں کہ محمد عقیلی میری مذکورہ بیٹی امۃ اللہ کے ساتھ کیا کر بیٹھے، لہٰذا یہ بتایا جائے کہ صورت مسئولہ میں (۱) محمد عقیلی کی پکڑ خدائے پاک کے یہاں ہوگی یا نہیں؟ اور (۲) مجھے اس ظلم کا صلہ آخرت یا دنیا میں اللہ پاک کی طرف سے ملے گا یا نہیں؟ (۳) میری بیٹی امۃ اللہ کی پکڑ ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: مولانا فیاض الدین بہار شریف نالندہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شریعت کا حکم یہ ہے کہ شوہر کے اوپر اپنی بیوی کا خرچہ واخراجات اور کھانے پینے کا نظم کرنا لازم اور واجب ہے، اگر وہ بیوی بچوں کا خرچہ نہیں دیتا ہے اور بغیر خرچہ دیئے ہوئے بیوی کے پاس آنا جانا رکھتا ہے تو اس سے کہا جا سکتا کہ تم اپنے بیوی بچوں کو اپنے یہاں لے جا کر ان کے خرچہ اخراجات کا انتظام کرو اور اگر انہیں میکہ میں چھوڑو گے تو ان کا خرچہ دینا پڑے گا، لہٰذا میکہ والوں کو اس طرح خرچہ دینے کا مطالبہ کرنے کا حق ہے۔

تجب على الرجل نفقة امرأته المسلمة والذمية والفقيرة والغنية دخل بها أو لم يدخل كبيرة كانت المرأة أو صغيرة. (خانية، باب النفقة، جديد زكريا ١/٢٥٤، وعلى هامش الهندية ١/٤٢٤، هنديه زكريا قديم ١/٥٤٤، جديد ١/٥٩٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ رجب المرجب ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۲۱۶۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲/۷/۱۴۳۶ھ

دو منزلہ مکان کی تقسیم

سوال [۱۰۲۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: ایک قطعہ مکان ۱۰۰ گز میں ہے وہ بالکل پٹا ہوا ہے، مین روڈ پر ہے، اس مکان کے دو بھائی مالک ہیں، ایک بھائی نیچے کی جگہ پر قابض ہے اور دوسرا بھائی اس کے اوپر کے حصہ پر قابض ہے، آپس میں تقسیم ہونی ہے شرع کے حساب سے، تو کیا نیچے اوپر کی قیمت برابر رہے گی؟ کس طرح تقسیم ہوگی شرع کیا کہتی ہے؟

المستفتی: محمد نسیم تمبا کو اسٹریٹ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پچاس پچاس گز کے اعتبار سے پورا مکان دونوں بھائیوں کے درمیان برابر تقسیم ہوگا، اور اگر دونوں ہی چاہتے ہیں کہ ایک اوپر رہے اور دوسرا نیچے رہے تو اوپر کی قیمت الگ لگائی جائے گی، اور نیچے کی قیمت الگ لگائی جائے گی، جس کے حصے کی قیمت کم ہے وہ دوسرے سے قیمت لے کر تلافی کر لے۔

وسفل له علو قوم كل واحد على حدته وقسم بالقيمة ولا معتبر بغير ذٰلك. (هدايه، كتاب القسمة، اشرفي ديوبند ٤/٤١٨، رشيديه ٤/٤٠٢، البحر الرائق زكريا ٨/٢٧٩، كوئٹه ٨/١٥٤، هنديه زكريا قديم ٥/٢٠٤، جديد ٥/٢٣٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ربیع الاول ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۵۱۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۳/۳ھ

٤ باب النفقة

کئی سالوں سے معلق بیوی کے نان ونفقہ کا حکم

سوال [١٠٢٣٩]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہندہ کی زید سے جس روز شادی ہوئی اسی روز زید نے ہندہ کو مہر معاف کرانے کے لیے مارا پیٹا، اوراس ہی شب میں رات کو واپس کردیا (لیکن یہ واپسی تو دستور کے مطابق ہوئی) دوسرے روز پھر ہندہ کو رخصت کیا اور زید کے پاس بھیج دیا، برادری کے لوگ آئے اور کہہ سن کر لے گئے، دوسری مرتبہ میں ہندہ سات یوم زید کے یہاں رہی لیکن زید نے ہندہ سے دوری اختیار کی، اورحق زوجیت ادا نہیں کیا، بلکہ اپنے دوسرے بھائی کے یہاں قیام کیا، ایک ماہ پھر سسرال بھیجا، تیسری مرتبہ میں قریب پونے تین ماہ بعد رہی، لیکن پھر بدچلنی کا الزام لگا کر واپس کردیا۔

دوسال بعد ہندہ کی طرف سے طلاق کا مطالبہ ہوا تو پنچایت کے درمیان یہ طے ہوا کہ اب میں مار پیٹ نہیں کروں گا، اورسسرال والوں کا احترام کروں گا، اب اگر کوئی ناراضگی کی بات ہوجائے تو میں ساٹھ روپیہ ماہانہ ہندہ کو دیتا رہوں گا، اسٹامپ پر یہ اقرارنامہ تحریر پایا، زید اوراس کے بھائیوں کا بیت الخلاء مشترک تھا، زید کے بھائیوں اور بھاوج وغیرہ نے ہندہ کے لیے پیشاب، پاخانہ کے لیے بیت الخلاء میں داخلہ بند کردیا، ہندہ کو پیشاب لگا اس نے شدت پیشاب کی وجہ سے باہر ہی پیشاب کردیا اس پر بھاوج نے باہر پیشاب کرنے کی شکایت کی اس پر زید نے پھر ہندہ کو مارا، اور مار کر بھگا دیا، جب بچہ کی پیدائش کا وقت قریب ہوا تو پھر چند حضرات آکر ہندہ کو لے گئے، شادی پر چڑھے زیور کو منگانے کے لیے پھر مار پیٹ کی اور زیور کے لیے پھر میکے بھیج دیا، کہ زیور اگر لائے تو آنا ورنہ مت آنا، ہندہ کے والد نے کہا کہ دو معتبر آدمیوں کو بلالاؤ اور اپنا زیور لے جانا، لیکن وہ دو معتبر آدمی نہیں لائے لیکن ہندہ اپنے شوہر کے یہاں چلی گئی پھر رات کو مار پیٹ کی، ہندہ فجر میں پھر اپنے والدین کے گھر آگئی، اپنے والدین

کے گھر قیام کے دوران راستہ سے زید ہندہ کو اٹھا کر لے گیا، چار ماہ بعد پھر مار پیٹ کر بھگا دیا، لیکن پھر ہندہ کو سسرال بھیج دیا گیا، اس نے خرچہ کے پیسہ مانگے لیکن اسے خرچہ نہ دے کر بھگا دیا گیا، کل ملا کر لڑکی اپنے شوہر کے یہاں تقریباً پندرہ ماہ رہی، اکیس سال سے میکے میں ہے، اب اکیس سال کے نان ونفقہ کا ذمہ دار شوہر ہے یا نہیں؟ بیوی نفقہ کا مطالبہ کرسکتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ابراہیم ہلدوانی نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر واقع میں سائل کا سوال صحیح اور درست ہے اور بیوی کو پریشان کر کے میکے بھیج دینے پر ٦٠ روپیہ ماہانہ دینے کا معاملہ طے کیا ہے اور بعد میں مختلف مراحل سے گذرتے ہوئے واقعی زید نے بلاوجہ ظلماً مار پیٹ کر کے ہندہ کو میکے بھیج دیا ہے اور ہندہ ازخود شوہر کی حکم عدولی کر کے نہیں آئی ہے بلکہ شوہر نے مذکورہ ظالمانہ حرکتوں کے ساتھ میکے بھیج دیا ہے اور بغیر طلاق کے یوں ہی معلق چھوڑ رکھا ہے تو ماہانہ ٦٠ روپئے کے حساب سے ہندہ کو اپنا خرچہ ملے گا، اور وہ اس کی حقدار ہے۔

القاضی فرض لهما النفقة أو صالحت الزوج على مقدار نفقتها فيقضى لها بنفقة ما مضى. (هدایه، کتاب الطلاق، باب النفقة، اشرفی دیو بند ٢/ ٤٤٠)

وإذا طالبت المرأة زوجها بالنفقة وهي امرأته على حالها وقالت: إنه يضيق علي ويضربني، فالقاضي يأمره بالنفقة. (تاتارخانية زکریا ٥/٣٦٩، رقم: ٨٢٦٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٧ر ربیع الاول ١٤١٣ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٢٨/ ٣٠٧٨)

ناشزہ، والدہ، بہن اور چھوٹے بھائی کے نفقہ کا حکم

سوال [١٠٢٤٠]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: زید کی شادی تقریباً چار سال قبل ہندہ سے ہوئی تھی، دونوں کا آبائی وطن اعظم گڑھ ہے، مگر ہندہ کے والدین سہارنپور کے علاقے میں رہتے ہیں، اس کے والد ایک مدرسہ میں شیخ الحدیث ہیں، شادی کے بعد سے ہندہ اکثر اپنے میکے رہی، جب زید رخصتی کی بات کرتا تو اس کے والدین ٹال مٹول کرتے اور پھر رخصت کرتے، ان چار سالوں میں ہندہ بمشکل آٹھ ماہ اپنی سسرال رہی ہوگی، زید ہندہ کے خرچ کے لیے اپنی استطاعت کے بقدر ہزار پانچ سو کی رقم دیدیتا اور کبھی نہیں بھی دی، ہندہ اکثر بیمار رہتی ہے اس کی دوا وغیرہ اگر میکے میں رہتی ہے تو اس کے والدین کراتے ہیں یا اگر کبھی شوہر وہاں پہنچ گیا تو دلا دیتا ہے اور اگر ہندہ اپنی سسرال رہتی ہے تو دوا وغیرہ اس کا شوہر ہی لاکر دیتا ہے۔

ایک روز سسرال میں ہندہ اور اس کی ساس اور نند سے کسی بات پر کہا سنی ہوئی تو ہندہ کہتی ہے کہ میرے شوہر نے نہ تو کبھی مجھے ایک پیسہ دیا اور نہ ہی کبھی ایک ٹیبلیٹ (دوا کی ٹکیہ) لاکر دی، اور کہتی ہے کہ میں اس پر حلف اٹھا سکتی ہوں، حالانکہ واقعہ اسکے برعکس ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، نیز زید کے خسر جوکہ زید کے استاذ بھی ہیں وہ کہتے ہیں کہ زید بیوی کے حقوق صحیح طور پر ادا نہیں کر رہا ہے، اب زید سسرال جانا چاہتا ہے، تو زید کی ساس اس سے لڑائی کرنے پر تلی ہیں اور کہتی ہیں کہ اگر آ گئے تو تمہاری خیر نہیں اور زید کے خسر بھی آنے سے منع کر رہے ہیں جبکہ اس عرصہ میں دو ماہ سے زائد گذر چکے ہیں۔

یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیے کہ زید کی ماہانہ تنخواہ چھ ہزار روپئے ہے اس کے گھر میں اس کی والدہ ایک چھوٹا بھائی اور چھوٹی بہن ہے، جبکہ والد کا انتقال ہو چکا ہے، ایک بڑے بھائی ہیں جو بیوی بچوں کے ساتھ ان لوگوں سے الگ رہتے ہیں تو دریافت امر یہ کہ زید ان لوگوں کا خرچ کس طرح سے ادا کرے گا کیا اپنی والدہ وغیرہ کو چھوڑے یا سب کو ساتھ لے کر چلے اور بیوی کو ماہانہ کتنی رقم دیا کرے، نیز زید کو سسرال جانے سے اس کے ساس سسر کا روکنا اس کا کیا حکم ہے؟ امید ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

المستفتی: عبیداللہ شمیم قاسمی جامعہ اسلامیہ مظفرپور اعظم گڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: بیوی کا نان ونفقہ خرچ واخراجات شوہر کے اوپر اس وقت لازم ہوتے ہیں، جب بیوی شوہر کے گھر پر رہتی ہو، اور اگر شوہر کی مرضی کے بغیر میکہ یا کسی اور جگہ جا کر رہتی ہو، تو ایسی صورت میں شرعی طور پر بیوی ناشزہ کہلاتی ہے اور اس کا نان ونفقہ خرچ واخراجات اس وقت تک شوہر پر لازم نہں ہوتے، جب تک شوہر کے پاس لوٹ کر نہ آ جائے، اور سوالنامہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بیوی شوہر کی مرضی کے بغیر میکہ جا کر رہ رہی ہے اور شوہر بیوی کو لانے کے لیے پریشان ہے، لہٰذا ایسی صورت میں جب تک بیوی آپ کے پاس نہ آ جائے اس وقت تک کسی قسم کا خرچہ دینا آپ پر لازم نہیں ہے۔

عن الشعبي: أنه سئل عن امرأة خرجت من بيتها عاصية لزوجها، ألها نفقة؟ قال: لا، وإن مكثت عشرين سنة. (مصنف ابن أبي شيبة، مؤسسة علوم القرآن بيروت ۱۵۲/۱۰، رقم: ۱۹۳٦۹، مصنف عبد الرزاق، المجلس العلمي بيروت ۹۵/۷، رقم: ۱۲۳۵۲)

وإن نشزت فلا نفقة لها، حتى تعود إلى منزله لأن فوت الاحتباس منها. (هدايه، كتاب الطلاق، باب النفقة، اشرفی دیوبند ۴۳۸/۲)

لا نفقة لخارجة من بيته بغير حق وهي الناشزة حتى تعود. (در مختار زكريا ۲۸٦/۵، كراچی ۵۷٦/۳)

المعتبر في إيجاب النفقة احتباس ينتفع به الزوج بالوطئ أو الدواعي. (مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ۱۸۰/۲)

وفي الشامية: فالمختار وجوب النفقة لقيام الاحتباس. (شامی کراچی ۵۷۵/۳، زكريا ۲۸۵/۵)

اب رہی یہ بات کہ والدہ اور بہن کا خرچہ، تو یہ آپ کے اوپر حسب حیثیت لازم ہے، اور چھوٹا بھائی اگر نابالغ ہو تو اس کا خرچہ بھی لازم ہوگا، اور جب بیوی واپس آ جائے، تو بیوی کا خرچہ بھی آپ پر آپ کی حیثیت کے اعتبار سے لازم ہوگا، حیثیت سے زیادہ لازم نہ ہوگا، اور

جب سب لوگ ایک ساتھ ایک ہی فیملی میں رہتے ہوں، تو ان کے لیے الگ الگ خرچ دینا لازم نہیں ہے، بلکہ مجموعی خرچ سے سب لوگوں کا گذارا ہوسکتا ہے۔

ویعتبر فی هذه النفقة مایکفیها وهو الوسط من الکفایة وهی غیر مقدرة. (هندیه، الفصل الثالث نفقة المعتدة، زکریا قدیم ١/٥٥٨، جدید ١/٦٠٦)

وقال الکرخیؒ: یعتبر حال الزوج. (هدایه اشرفی دیو بند ٢/٤٣٧)

والأم إذا کانت فقیرة فإنه یلزم الإبن نفقتها. (هندیه، الفصل الخامس فی نفقة ذوی الأرحام، زکریا قدیم ١/٥٦٥، جدید ١/٦١١)

والأم إذا احتاجت أو الأب کذٰلک جاز أن یصرف إلیها من هذا الکسب مقدار حاجتها. (تاتارخانیة زکریا ٥/٤١٩، رقم: ٨٢٥٠)

وتجب أیضا لکل ذی رحم محرم صغیر أو أنثی بالغة صحیحة أو کان الذکر بالغا لکن عاجزا عن الکسب. (در مختار مع الشامی زکریا ٥/٣٦٢، کراچی ٣/٦٢٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٣/ ذی قعدہ ١٤٣٢ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٩/١٠٥٠٨)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
٣/١١/١٤٣٢ھ

۵ باب الحضانة

کیانافرمان بالغ لڑکیوں کےنان ونفقہ کی ذمہ داری والدپر ہے

سوال [۱۰۲۴۱]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زیدنے اپنی بیوی کوسات سال پہلے طلاق دیدی تھی،اس کی دولڑکیاں اپنی ماں کے پاس رہ رہی ہیں،جواس وقت بالغ ہیں، دریافت یہ کرنا ہے کہ زیدان لڑکیوں کواپنے پاس رکھنے کاحق رکھتا ہے یانہیں؟

(۲) اگر یہ لڑکیاں زید(باپ)کے پاس آنے کے لیے تیارنہ ہوں یاان کی ماں نہ آنے دےتوکیازید پران لڑکیوں کاخرچہ مع شادی وغیرہ لازم ہے یانہیں،اگرلازم ہےتوشرعاًباپ کی آمدنی وحیثیت کےمطابق خرچہ ہوگایابیوی کےمطالبہ کےمطابق؟شرعی حکم تحریرفرمادیں؟

المستفتی: محمدممتازاصالت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) جب ماں باپ کےدرمیان تفریق واقع ہو جائےتوچھوٹےبچوں کی پرورش کاحق ماں کوحاصل رہتاہےاگرلڑکاہوتوسات سال تک ماں کواپنے پاس رکھنےکاحق ہے،اوراگرلڑکی ہوتوبالغ ہونےتک رکھنےکاحق ہے،اس کے بعد باپ کواپنے پاس رکھنےکاحق ہوتاہے۔

وأما في الجارية: فحد الاستغناء على أن تحيض أو تبلغ مبلغ النساء بالسن فبعد ذٰلک الأب أولیٰ. (تاتارخانية زكريا ۵/۲۷۳، رقم: ۷۸۳۳)

وذكر الخصاف في كتاب النفقات: أن الأم أحق بالغلام مالم يبلغ سبع سنين أو ثمان سنين وفي الكافي: والفتویٰ على سبع سنين. (تاتارخانية زكريا ۵/۲۷۳، رقم: ۷۸۳۲)

(۲) اگر دونوں لڑکیوں کو بالغ ہونے کے بعد ماں اپنے پاس روک لیتی ہے اور لڑکیاں بھی باپ کے پاس آنا نہیں چاہتیں اور باپ اپنے پاس لانا چاہتا ہے مگر باپ کے چاہنے کے باوجود وہ لڑکیاں باپ کے پاس نہیں آتی ہیں تو لڑکیاں باپ کی نافرمان ہیں، ایسی صورت میں ان لڑکیوں کے خرچ واخراجات شادی بیاہ وغیرہ کی ساری ذمہ داری ماں کے اوپر عائد ہو جائے گی، اور باپ کے اوپر یہ دباؤ نہیں ڈالا جاسکتا ہے کہ بالغ لڑکیوں کا خرچہ ماں کے پاس بھیجا کرے، بلکہ اپنے پاس رکھ کر اپنی حیثیت کے مطابق لڑکیوں پر خرچ کریگا، اور ان کی شادی وبیاہ کا انتظام کرے گا۔

والأم والجد أحق بالجارية حتى تحيض، لأن بعد الاستغناء تحتاج إلى معرفة آداب النساء والمرأة على ذٰلک أقدر وبعد البلوغ تحتاج إلى التحصين والحفظ، والأب فيه أقوىٰ واهدىٰ وعن محمدؒ أنها تدفع إلى الأب إذا بلغت حد الشهوة لتحقق الحاجة إلى الصيانة. (هدايه، كتاب الطلاق، باب حضانة الولد، اشرفی ديوبند ۲/ ۴۳۵)

أن النفقة جزاء الاحتباس و كل من كان محسوبا بحق مقصود لغيره كانت نفقته عليه. (هدايه، باب النفقة، اشرفی ديوبند ۲/ ۴۳۷)

وأقول: الحق الذى تقبله الطباع المستقيمة ولا تنفر منه الأذواق السليمة القول بوجوبها لذى الرشد لا غيره. (شامی باب النفقة، مطلب: الكلام فی نفقة الأقارب كراچی ۳/ ۶۱۴، زكريا ۵/ ۳۴۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۰۱۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۴/۱۴ھ

وضع حمل کا خرچ اور بچہ کے نان ونفقہ کا حکم

سوال [۱۰۲۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید نے اپنی حاملہ زوجہ کو (جس کا مہر وہ ادا کرچکا تھا) اپنے اہل خانہ کے

سامنے تین طلاقیں دیں بوقت طلاق زید کی زوجہ اپنے والدین کے گھر تھی، جس کا وضع حمل بذریعہ آپریشن نرسنگ ہوم میں ہوا، (اسپتال میں وضع حمل کی تجویز زید کی تھی) اور بچہ بھی ساڑھے پانچ سال کی مدت سے اپنی ماں کے زیر پرورش ہے جو اپنے والد کے ساتھ رہتی ہے، وضع حمل کا ڈاکٹری خرچ اہلیہ و بچہ کے نان ونفقہ کی مدت کے بارہمیں شریعت کا حکم واضح فرمائیں؟

(۲) بیٹی اپنی مطلقہ ماں کے زیر سرپرستی کتنی مدت تک رہ سکتی ہے اور اس کا نان ونفقہ کتنے سال کی مدت تک اس کے باپ کے ذمہ ہوگا؟

المستفتی: محمد ادریس صدیقی محمد علی خاں کاشی پوراودھم سنگھ نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) اگر یہ بات صحیح ہے کہ بیوی کا وضع حمل ہسپتال میں شوہر کی مرضی اور اس کی اجازت سے ہوا ہے، اور ہسپتال کا خرچہ بھی اسی کی مرضی سے ہوا ہے، تو اس خرچہ کا ذمہ دار شوہر ہے، اور اگر خرچہ اس کی مرضی کے مطابق نہیں ہوا ہے تو اس خرچہ کا ذمہ دار وہ نہیں ہے، بلکہ جس نے خرچ کیا ہے وہی ذمہ دار ہوگا۔

وأجرة القابلة ...... ولو استاجرها الزوج فعليه. (هنديه، كتاب الطلاق، الباب السابع عشر في النفقات، زكريا قديم ۱/۵۴۹، جديد ۱/۵۹۹)

وأجرة القابلة على من استاجرها من زوجة و زوج. (شامي كراچی ۳/۵۷۹، زكريا ۵/۲۹۱)

لايلزمه مداواتها أى اتيانه لها بدواء المرض ولا أجرة الطبيب . (شامي كراچی ۳/۵۷۵، زكريا ۵/۲۸۵)

ولايجب الدواء للمرض ولا أجرة الطبيب. (هنديه زكريا قديم ۱/۵۴۹، جديد ۱/۵۹۹)

(۲) بچہ کی ولادت کے بعد عدت پوری ہوجاتی ہے اور عدت گذرنے کے بعد شوہر پر خرچ واخراجات کی کوئی ذمہ داری نہیں رہتی، البتہ بچہ کے لیے اخراجات کی ذمہ داری شوہر پر رہتی ہے۔

إذا طلق الرجل امرأته فلها النفقة والسكنىٰ في عدتها. (هدايه اشرفی

دیو بند ۲/ ٤٤٣، اللباب، دار الایمان ۱/ ۲۱۱)

وإذا مضت مدة لم ينفق الزوج عليها وطالبته بذٰلک فلا شيئ لها.
(هدایه اشرفی دیو بند ۲/ ٤٤٠)

ونفقة الأولاد الصغار على الأب لايشاركه فيها أحد. (هدايه اشرفی دیو بند ۲/ ٤٤٤، هندیه زکریا قدیم ۱/ ٥٦٠، جدید ۱/ ٦٠٧)

إذا لم يكن للصبى مال فالنفقة على والده. (تاتارخانية ٥/ ٤١٢، رقم: ٨٣٣٤)

وتجب النفقة بأنواعها على الحر لطفله يعم الأنثىٰ والجمع الفقير أى إن لم يبلغ حد الكسب. (شامی، باب النفقة، مطلب: الصغير والمكتسب نفقة فى كسبه، کراچی ۳/ ٦١٢، زکریا ٥/ ٣٣٦)

(۳) اور اگر لڑکی ہے تو اس کے بالغ ہونے تک ماں کے پاس رہنے کا حق ہے، اور بالغ ہونے کے بعد باپ کو اپنے پاس لے آنے کا حق ہوگا۔

والأم والجدة لأم و لأب أحق بها بالصغيرة حتى تحيض أى تبلغ فى ظاهر الرواية. (در مختار، باب الحضانة، کراچی ٣/ ٥٦٦، زکریا ٥/ ٢٦٨)

وأما الجارية فهى أحق بها حتى تحيض كذا ذكر فى ظاهر الرواية.
(بدائع زکریا ٣/ ٤٥٩)

والجارية عند الأم أو الجدة حتى تحيض. (مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٢/ ١٦٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۳؍محرم الحرام ۱۴۳۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۵۴۰/۳۹)	۱۴۳۳/۱/۳ھ

نابالغ لڑکیوں کا خرچ اور شادی باپ پر لازم ہے نہ کہ بالغ لڑکوں کا

سوال [۱۰۲۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: محمد شعیب کسرول کا رہنے والا ہوں میری بیوی میری مرضی کے خلاف چلتی تھی، اوراس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے اس کا فائدہ اٹھاتی تھی، اپنے بچوں کو اپنی طرف کر رکھا تھا، اس پر تکرار ہوتا تھا، اس لیے ۱۸/۱۰/۲۰۰۵ء کو مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ میری ایک بیٹی کو فرم میں کام کرنے کے لیے لے جانے لگی، اسے چلے جانے کو کہا کہ اپنے میکے چلی جاؤ وہ ۱۸/۱۰/۲۰۰۵ء کو ساڑھے پانچ چھ بجے کے دوران چلی گئی اور میرے پیچھے آکر میرے سات بچوں کو اپنے ساتھ لے گئی، جب میں رات کو دس گیارہ بجے بلانے گیا تو انہوں نے نہیں بھیجا ۱۹/۱۰/۲۰۰۵ء کو جب میں پھر گیا تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارے یہاں نہیں ہیں، اس وقت کے بارے میں ایس ایس پی تھانہ ناگ پھنی ایس او تحصیل اسکول چوکی کو بھی معلوم ہے، نام محشر جہاں، عمر: ۲۴/سال جس کی شادی کر دی ہے، نوشاد حسین ۲۳/سال، فیصل جہاں ۲۲/سال، شاداب ۲۱/سال، سلطان جہاں ۲۰/سال، شاکر حسین ۱۶/سال شمع پروین ۱۳/سال رانی ۸/سال کی ہے اب یہ کبھی بھی آئیں تو بچوں کو رہنے کا حق کس کے ساتھ ہوگا اور والد پر کیا حقوق ہوں گے، میں محمد شعیب اپنی شادی کرنا چاہتا ہوں شریعت کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد شعیب کسرول

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو لڑکیاں بالغ ہوگئی ہیں ان کی شادی ہونے تک باپ کو اپنی پرورش میں رکھنے کا حق ہے، اوران کی شادیاں کرنا بھی باپ پر لازم ہے، اور بالغ لڑکوں کا خرچہ باپ کے اوپر لازم نہیں ہے وہ خود اپنے اخراجات کے ذمہ دار ہیں، ہاں البتہ نابالغ لڑکوں کے اخراجات کا ذمہ دار باپ ہوتا ہے اور بیوی کا نان ونفقہ شوہر پر اس وقت لازم ہوتا ہے کہ جب بیوی شوہر کے پاس رہے اور جب بیوی شوہر کی اجازت کے بغیر شوہر کو چھوڑ کر چلی جائے تو شوہر کے اوپر ایسی بیوی کا خرچہ اور نان ونفقہ لازم نہیں ہوتا اسی طرح لڑکیوں کا خرچہ باپ کے اوپر اس وقت لازم ہوتا ہے کہ جب باپ کے اختیارات کے دائرے میں رہیں، اب رہا محمد شعیب کا اپنی دوسری شادی کرنا تو اس کو اس کا اختیار رہے جبکہ

بیوی کے اخراجات کی پوری ذمہ داری ادا کرسکتا ہو۔

ونفقة الإناث واجبة مطلقا على الآباء مالم يتزوجن إذا لم يكن لهن مال. (عالمگيرى، كتاب الطلاق، الباب السابع عشر فى النفقات، زكريا قديم ١/٥٦٣، جديد ١/٦٠٩)

وبعد ما استغنى الغلام وبلغت الجارية فالعصبة أولىٰ يقلم الأقرب فالأقرب. (عالمگيرى، الباب السادس عشر فى الحضانة، زكريا قديم ١/٥٤٢، جديد ١/٥٩٣)

وإذا كان الابن قادراً على الكسب لا تجب نفقته على الأب. (البحر الرائق، كتاب الطلاق، باب النفقة، زكريا ٤/٣٥٠)

نفقة الأولاد الصغار على الأب لا يشاركه فيها أحد. (عالمگيرى زكريا قديم ١/٥٦٠، جديد ١/٦٠٧)

لا نفقة لأحد عشر مرتدة (الى قوله) و خارجة من بيته بغير حق وهى الناشزة حتى تعود. (شامى زكريا ٥/٢٨٦، كراچى ٣/٥٧٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍محرم الحرام ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۱۵۴/۳۸)

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۱/۵ھ

میکہ میں رہنے والی بیوی کا خرچ شوہر پر لازم نہیں

سوال [۱۰۲۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: احقر کی شادی تقریباً ۴؍سال قبل ہوئی تھی، احقر کے دو بچے ہیں لیکن اس وقت میری سسرال کے لوگ میری بیوی کو میرے گھر نہیں بھیجنا چاہتے ہیں، جبکہ میری خواہش ہے کہ میری بیوی اور بچے میرے ساتھ رہیں، نیز سسرال والوں کی طرف سے یہ دباؤ ہے کہ تم بیوی اور بچیوں کا خرچ سسرال ہی پہنچاؤ گے، تو معلوم یہ کرنا ہے کہ اس طرح گھر بیٹھ کر بیوی کے لیے خرچہ لینا درست ہے جبکہ میں اپنے بچوں اور بیوی کو اپنے گھر لانا چاہتا ہوں؟

المستفتی: محمد انتخاب عالم حسن پور مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ میں بیوی کے بارے میں جوصورت حال لکھی گئی ہے ایسی صورت میں بیوی شرعی طور پر ناشزہ اورنافرمان ہے،شوہر کی مرضی کے بغیر بیوی کامیکہ جا کر بیٹھ جانا،خرچہ کامطالبہ کرنااور بچوں کوبھی ساتھ میں لے جانانافرمانی کے ساتھ ساتھ انتہائی ظالمانہ حرکت ہے، ایسی بیوی کے لیےاس وقت تک نان ونفقہ اورکسی قسم کا خرچہ شوہر پر لازم نہیں ہوتا جب تک شوہر کے گھر واپس آ کر شوہر کے حقوق صحیح طور پرادا نہ کرے۔(مستفاد:محمودیہ ڈابھیل۱۳/ ۴۴۵)

عن الشعبی: أنه سئل عن امرأة خرجت من بیتها عاصیة لزوجها، ألها نفقة؟ قال: لا، وإن مکثت عشرین سنة. (مصنف ابن أبی شیبة، مؤسسة علوم القرآن بیروت ۱۰/۱۵۲، رقم: ۱۹۳٦۹، مصنف عبد الرزاق، المجلس العلمی بیروت ۷/۹۵،رقم: ۱۲۳۵۲)

وإن نشزت فلا نفقة لها، حتی تعود إلی منزله لأن فوت الاحتباس منها. (هدایه، کتاب الطلاق، باب النفقة، اشرفی دیوبند ۲/۴۳۸)

لانفقة لخارجة من بیته بغیر حق وهی الناشزة حتی تعود. (در مختار زکریا ۵/۲۸٦، کراچی ۳/۵۷٦)

المعتبر فی إیجاب النفقة احتباس ینتفع به الزوج بالوطئ أو الدواعی. (مجمع الأنهر، دار الکتب العلمیة بیروت ۲/۱۸۰)

وفی الشامیة: فالمختار وجوب النفقة لقیام الاحتباس. (شامی کراچی ۳/۵۷۵، زکریا ۵/۲۸۵) **فقط واللّٰہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیر احمد عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۲۷؍شوال المکرّم ۱۴۳۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر:۳۹/ ۱۰۴۹۱)	۱۴۳۲/۱۰/۲۸ھ

الگ رہنے والی بیوی کا ۱۲؍۱۴؍سالہ بچوں کا خرچ شوہر سے وصول کرنا

سوال [۱۰۲۴۵]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ میاں بیوی میں اختلاف ہوگیا، طلاق نہیں ہوئی، لیکن دونوں الگ الگ رہتے ہیں، بیوی چاہتی ہے کہ الگ رہتے ہوئے بچوں کا خرچ شوہر سے وصول کرے اس وقت ایک بچہ کی عمر ۱۲؍سال دوسرے بچے کی عمر ۱۴؍سال ہے، باپ چاہتا ہے کہ اپنے بچوں کو اپنے پاس ہی رکھوں تو کیا ان حالات میں بیوی کو یہ حق ہے کہ زبردستی بچوں کو اپنے پاس روک کر شوہر سے بچوں کا خرچ وصول کرے جبکہ شوہر چاہتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اپنے پاس رکھ کر ان کی پرورش کرے تو ان حالات میں شریعت کا کیا فیصلہ ہے؟

المستفتی: صغیر احمد منڈاوار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جب بچے ۱۲؍ا ور ۱۴؍سال کے ہوگئے ہیں تو اب بیوی کو کوئی حق نہیں پہنچتا ہے کہ بچوں کو زبردستی روک کر شوہر سے بچوں کا خرچ وصول کرے، بلکہ جب شوہر خود اپنے بچوں کی پرورش کرنا چاہتا ہے تو اس کو شریعت کی رو سے پورا پورا حق پہنچتا ہے کہ بیوی کے پاس سے بچوں کو لے آئے اور خود پرورش کرے اور بیوی کو بھی چاہیے کہ بچے شوہر کے حوالے کردے، ماں کے لیے بچوں کو اپنے پاس رکھنے کا حق صرف سات سال کی عمر تک رہتا ہے۔

والأم أحق بالغلام حتى يأكل وحده ويشرب وحده (الى قوله) والأب أقدر على التأديب والتثقيف، والخصاف قدر الاستغناء بسبع سنين اعتباراً للغالب. (هدايه، كتاب الطلاق، باب حضانة الولد ومن أحق به، اشرفی ديوبند ٢/٤٣٥)

وفي الفتح: وعليه الفتوىٰ كذا في الكافي وغيره. (فتح القدير، دار الفكر بيروت ٤/ ٣٧١، كوئٹه ٤/ ١٨٧، زكريا ٤/ ٣٣٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۱۷۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۵/۲۵ھ

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ

فتاویٰ قاسمیہ

منتخب فتاویٰ

حضرت مولانا مفتی شبیر احمد القاسمی

خادم الافتاء و الحدیث جامعہ قاسمیہ

مدرسہ شاہی مرادآباد، الہند

(جلد۲۳)

المجلد الثالث و العشرون

بقية الحقوق الرويا، الطب و الرقىٰ

بتمام انواعها كتاب الخطر والاباحة

إلى باب السابع مايتعلق باللحية

•• ——— ••

ناشر

مکتبہ اشرفیہ، دیوبند، الہند

01336-223082

فتاویٰ قاسمیہ

صاحب فتاویٰ

حضرت مولانا مفتی شبیر احمد القاسمی

بحق صاحبِ فتاوی شبیر احمد القاسمی 09412552294

بحق مالک مکتبہ اشرفیہ دیوبند 09358001571

01336-223082 08810383186

پہلا ایڈیشن محرم الحرام ۱۴۳۷ھ

ناشر

مکتبہ اشرفیہ، دیوبند، ضلع سہارنپور، الہند

01336-223082

ASHRAFI BOOK DEPOT

DEOBAND, SAHARANPUR, INDIA

Phone: 01336-223082

Mob. : 09358001571،08810383186

مکمل اجمالی فہرست ایک نظر میں

المجلد التاسع	٣٤٢٤	٣٨٩٣	بقية الصلوة، صلوة المريض، الجمعة، العيدين، الجنائز إلي حمل الجنازة.
المجلد العاشر	٣٨٩٤	٤٤٠٤	بقية الجنائز من صلوة الجنائز إلي باب الشهيد، كتاب الزكوة.
المجلد الحادي عشر	٤٤٠٥	٤٨٧٣	بقية الزكوة، كتاب الصدقات، الصوم، بتمام أبوابها إلي صدقة الفطر.
المجلد الثاني عشر	٤٨٧٤	٥٣٤٨	كتاب الحج بتمام أبوابها، النكاح إلى باب نكاح المكره.
المجلد الثالث عشر	٥٣٤٩	٥٩٤٣	بقية النكاح إلي باب المهر.
المجلد الرابع عشر	٥٩٤٤	٦٤٦٢	الرضاع، الطلاق إلي باب الكناية.
المجلد الخامس عشر	٦٤٦٣	٦٩٠٢	بقية الطلاق، الرجعة، البائن، الطلاق بالكتابة، الطلاق الثلاث، الشهادة في الطلاق، الحلالة.
المجلد السادس عشر	٦٩٠٣	٧٤٠٢	بقية الطلاق، تعليق الطلاق، التفويض، الفسخ والتفريق، الظِهار، الإيلاء، الخلع، الطلاق على المال، العدة، النفقة، ثبوت النسب، الحضانة.
المجلد السابع عشر	٧٤٠٣	٧٨٦٧	الأيمان والنذور، الحدود، الجهاد، اللقطة، الامارة والسياسة، القضاء، الوقف إلي باب المساجد.
المجلد الثامن عشر	٧٨٦٨	٨٤٠٨	بقية الوقف من الفصل الثالث، المسجد القديم إلي مصلى العيد، والمقبرة. (قبرستان)

فہرست مضامین

٣٨/ بقیة كتاب الحقوق

مسئلہ نمبر	٤/باب حقوق الزوجين	٣١

٥/باب الحضانة　　١٠٢

	۳۹ / کتاب الرؤیا	۱۹۲

٤٠ / كتاب الطب والرقیٰ

۱/ باب ما يتعلق بالطب وغيره

صفحہ	۲/باب أعضاء الإنسان وأجزائه	

۲۶۰

۳ / باب ما يتعلق بحمل المرأة و موانعه

٤/باب التداوی بالمحرم

۵/باب الرقية

(۶) باب الأجرة على الرقية

۴۱ / كتاب الحظر والإباحة

(۱) باب السلام، والمصافحة والمعانقة

۳/ باب اللباس

٤/ باب الزينة

۵/ باب الحجاب

٦/ باب مایتعلق بالشعر (بالوں سے متعلق)

۷/ باب ما يتعلق باللحية

بقية كتاب الحقوق

(۴) باب حقوق الزوجين

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا ☆ عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

میاں بیوی کے حقوق

سوال: [۱۰۲۴۶]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید اپنی بیوی سے اگر کسی کام کو کہتا ہے، تو بیوی کہنا نہیں مانتی اور غلط الفاظ بولتی ہے اور یہ کہتی ہے کہ میرے منہ لگنے کی ضرورت نہیں ہے، اور کسی دوسرے کام کو کہتا ہے تو کہنے پر عمل نہیں کرتی اور اپنے پاس موبائل رکھتی ہے شوہر کی غیر موجوگی میں بات کرتی ہے، شوہر موبائل کو منع کرتا ہے، تو نہیں مانتی شوہر اپنی سسرال والوں سے شکایت کرتا ہے، تو داماد کو گالی گلوچ کرتے ہیں، اور لڑکی کی ہمدردی کرتے ہیں، اسی بنا پر شوہر بیوی میں جھگڑا رہتا ہے، ایسی بیوی کے بارے میں شرعاً کیا حکم ہے؟

المستفتي: اختر علی، بیر پور تھان، کاشی پور روڈ، ضلع: مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: میاں بیوی کی زندگی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت ومودت اور ایک دوسرے کی غلطیوں پر چشم پوشی اور مراعات کیساتھ صحیح طور پر گذرتی ہے لٰہذا شوہر پر لازم ہے، کہ بیوی کی غلطیوں کو درگذر کرتا رہے، اور اس کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کرتا رہے، اسلئے کہ اس کو ٹیڑھی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے، ان کے اندر

ٹیڑھاپن باقی رہے گا، اور گھر کو بگڑنے سے بچانے کا یہی طریقہ ہے، کہ بیوی کی غلطیوں پر چشم پوشی کی جائے، اور اپنے غصہ کو ہضم کیا جائے، اور بیوی پر ضروری ہے کہ اپنے آپ کو غیر محرموں سے دور رکھے اور حلال وحرام کے معاملہ میں شوہر کی مرضی کی خلاف ورزی نہ کرے، اور نافرمانی کرنے پر شوہر کو سرزنش کرنے کا بھی حق ہے۔

قال صلى الله عليه وسلم استوصوا بالنساء خيراً فإنهن خلقن من ضلع فإن ذهبت تقيمه كسرته، وإن تركته لم يزل أعوج—وقوله – قال صلى الله عليه وسلم إذا دعا الرجل امرأته إلىٰ فراشه فأبت فبات غضبان لعنتها الملائكة حتى تصبح – قوله– وكون السياسة بيده يقتضى أن يكون لهٗ تعزيرها وتأديبها إذا بغت وليأخذ بالأسهل فالأسهل، فالأول بالوعظ ثم الهجر فى المضجع يعنى ترك مضاجعتها ولا يخرجها من بيته ثم الضرب غير المبرح أى الشديد.

(حجة الله البالغه، مكتبه حجاز ۲/ ۳۵۳، ۳۵۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۸۹۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۱۲/۲۲ھ

کیا بیوی شوہر کی ملکیت ہوتی ہے؟

سوال: [۱۰۲۴۷]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بیوی کے مرجانے کے بعد اس شخص نے دوسری شادی کرلی اس دوسری بیوی سے متعدد اولادیں پیدا ہوئیں جو بفضلہٖ تعالیٰ موجود ہیں، پہلی بیوی کا بچہ بھی نانا وغیرہ کی وفات کے بعد باپ کے گھر آ گیا جسکی اب عمر ۴۷/ سال ہے، اس جہیز کا تنہا پہلی بیوی کا لڑکا مالک ہے، یا باپ مالک ہے، یا مزید دوسری بیوی سے پیدا شدہ بچے بھی مالک ہیں، جبکہ باپ ۵۰/ سال سے اس مال کی حفاظت کررہا ہے، خرد برد نہیں ہونے دیا شرعی حکم کی ضرورت ہے، شرط یہ ہے کہ

جب لڑکی کوشوہر کے حوالہ کیا جاتا ہے، تو اسکی ملکیت بنا کر دی جاتی ہے، وہ جس طرح چاہے ظلم کے علاوہ اپنے تصرف میں لائے؟

المستفتي: محمد شجاع الدین، بھوجپور، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: شوہر کو بیوی پر ظلم کرنے کا کسی طرح حق نہیں ہے، نیز بیوی ملکیت بن کر نہیں جاتی ہے، بلکہ زندگی کا ساتھی بن کر جاتی ہے، اس کے ساتھ ہر طرح کی رواداری کا معاملہ کرنا شوہر پر واجب ہوتا ہے، حدیث شریف میں حضور ﷺ نے یہی حکم فرمایا ہے۔

عن سليمان بن عمرو بن الأحوص ، قال: حدثنا أبي ، أنه شهد حجة الوداع مع رسول الله ﷺ فحمد الله وأثنى عليه وذكر ووعظ ثم قال........ ألا استوصوا بالنساء خيراً فإنما هن عوان عندكم ليس تملكون منهن شيئا غير ذلك الخ . (ترمذی شریف ، باب و من سورة التوبة ، النسخة الهندية ١/ ٢٢٠، دار السلام رقم: ٣٠٨٧) **فقط اللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ رجب ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۲۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸/ ۷/ ۱۴۱۳ھ

زوجین ایک دوسرے کو کیا کہہ کر پکاریں؟

سوال: [۱۰۲۴۸]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ رشتہ کی حیثیت سے بیوی کو کیا کہکر بلایا جائے، اور اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو بہن (دیدی) کہکر بلائے تو اس سے نکاح میں کوئی خرابی ہوگی یا نہیں؟ یہ بھی اگر فرط محبت کی وجہ سے ہو؟

المستفتي: محمد عبدالجلیل، جنتا میڈیکل ہال، فریکنگ نوگاؤں، آسام

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شوہر کیلئے بیوی کو نام لیکر پکارنا جائز ہے، لیکن بیوی کے لئے شوہر کو نام لے کر پکارنا مکروہ ہے اور بیوی کو بہن یا دیدی کہہ کر پکارنا بھی مکروہ ہے۔

عن أبي تميمة الهجيمي، أن رجلا قال لامراته: يا أخية، فقال رسول الله ﷺ: أختك هي فكره ذلك ونهى عنه. (سنن أبي داؤد، باب في الرجل يقول لامرأته يا اختي، النسخة الهندية ١/٣٠١، دارالسلام رقم: ٢١٠ ٣)

ويكره أن يدعو الرجل أباه وأن تدعو المرأة زوجها باسمه وفي الشامي، بل لابد من لفظ يفيد التعظيم كياسيدي ونحوه لمزيد حقهما على الولد والزوجة الخ. (الدرالمختار، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، زكريا ٩/٥٩٩، كوئٹه ٥/٢٩٧، كراچی ٦/٤١٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ١١/٣٣٨، ٤٥/١٩٩)

ويكره قوله يا ابنتي ويا أختي ونحوه وفي الشامية فقد صرحوا بأن قوله لزوجته يا أخية مكروه الخ. (الدرالمختار مع الشامي، كتاب الطلاق، باب الظهار، زكريا ٥/١٣١، كراچی ٣/٤٧٠، كوئٹه ٢/٦٢٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍شعبان ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۳۹/۲۴)

شوہر کو تعظیماً بھائی کہنا

سوال: [۱۰۲۴۹]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر بیوی دوسرے شہر سے ٹیلیفون کرتی ہے تو وہ شوہر کے نام کے آگے یا بعد میں تعظیماً بھائی یا صرف صاحب لگاسکتی ہے یا نہیں؟ اس سے نکاح میں خرابی تو نہیں آتی ہے، شرعاً بیوی شوہر کو کیا کہہ سکتی ہے؟ مفصل بیان فرمائیں؟ نوازش ہوگی؟

المستفتي: محمد اسلام، بھٹی محلّہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر تعظیم کیلئے بھائی کا لفظ شوہر کیلئے استعمال کیا جائے تو اس کی وجہ سے نکاح میں کوئی فرق نہیں آئے گا، البتہ شوہر کو سردار اور سرتاج وغیرہ کے الفاظ سے پکارنا زیادہ بہتر ہے۔

ویکره أن یدعو "إلی قوله" بل لابد من لفظ یفید التعظیم کیا سیدی ونحوه لمزید حقهما علی الولد والزوجة. (شامی فصل فی البیع، زکریا ۹/۵۹۹، کراچی ۶/۴۱۸، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۱۱/۳۳۸، ۴۵/۱۹۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۳۵۹۴)

کیا بیوی کے گناہ میں شوہر بھی شریک ہے؟

سوال: [۱۰۲۵۰]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید پیسہ کمانے کیلئے دوسرے ملک مثلاً سعودیہ عرب کویت وغیرہ دو سال کے ایگریمنٹ کیساتھ گیا، اس درمیان بیوی اپنے نفس پر قابو نہ پاسکی اور غیر لوگوں کے ساتھ اس نے اپنی نفسانی خواہش پوری کرنا شروع کردی (زناکاری پر اتر گئی) تو آیا اس کی بیوی اپنے غلط عمل کی گنہگار تنہا ہوگی یا اس کا شوہر بھی اس جرم میں شامل ہوگا؟

المستفتي: محمد ضیاء الرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر زید عورت کی خوشی اور مرضی سے پیسہ کمانے کیلئے سعودیہ عرب، کویت وغیرہ گیا ہوا ہے، اور دو سال کا اگریمنٹ کر کے بیوی کی مرضی پر گیا ہے، تو ایسی صورت میں اس کی عدم موجودگی میں بیوی کے گناہوں میں مبتلا ہونے کی

ذمہ داری بیوی کے سر پر ہوگی، شوہر پرنہیں ہوگی، اور اگر بیوی کی مرضی کے بغیر گیا ہوا ہے، تو ایسی صورت میں اس گناہ میں شوہر بھی شامل ہوگا، اس لئے کہ جوان بیوی کو چھوڑ کر چار مہینے سے زیادہ اس کی مرضی کے بغیر دور دراز سفر میں چلے جانا شرعاً ممنوع ہے اگر جانا پڑ جائے تو بیوی کو بھی ساتھ میں لیجانے کا حکم ہے۔

ولا يبلغ مدة الإيلاء إلا برضاها قال الشامي، ثم قولهٗ ، وهو أربعة أشهر يفيد أن المراد إيلاء الحرة، ويؤيد ذلک أن عمرؓ لما سمع في الليل امرأة تقول: فوالله لو لا الله تخشیٰ" فسأل عنها فإذا زوجها في الجهاد، فسأل بنته حفصة كم تصبر المرأة عن الرجل؟ فقالت : أربعة أشهر فأمر أمراء الأجناد أن لا يتخلف المتزوج عن أهله أكثر منها. (شامی، کتاب النكاح، باب القسم، زکریا ٤/٣٨٠، کراچی ٢٠٣/٣، الموسوعة الفقهية الكويتية٢٢/١٤٤، سنن سعيد بن منصور، باب المغازی يطيل الغيبة عن أهله ،دارالكتاب العلمية بيروت ١٧٤/٢، رقم: ٢٤٦٢، مصنف عبدالرزاق ، المجلس العلمی ١٥٢/٧ ،رقم: ١٢٥٩٤، فتاویٰ محمودیہ ڈابھیل ٥٩٣/١٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰؍۱۰۸۸۰)

شوہر کی اجازت کے بغیر بیوی کا اس کے جیب سے روپیہ نکالنا

سوال: [۱۰۲۵۱]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں نے اپنی پہلی بیوی کو اس لئے طلاق دیدی کہ وہ میری جان لینے پر تلی ہوئی تھی، اور اس نے مجھ پر جھوٹے الزامات لگا کر جیل بھی بھیجا میں نے دوسری شادی ایک غریب لڑکی سے کی، اسے لکھا یا پڑھایا اور لکچرر کی نوکری بھی دلوائی کیونکہ میں ملازمت سے سبکدوش ہونے والا تھا، مجھے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد (۲۰) لاکھ روپئے بھی ملے اس رقم سے میں نے دوسری

بیوی کے نام سے دومنزلہ مکان بھی تعمیر کیا جس کی وجہ سے تین لاکھ کا قرضہ بھی ہوگیا، اس قرض کی وجہ سے اس نے مجھے گھر سے نکال دیا؟

(۱) اگر بیوی شوہر کے جیب (پاکٹ) میں سے بغیر اجازت کے نقد رقم، ATM کے دو بینکوں کے کارڈ اور شناختی کارڈ نکال لے اور اسے واپس کرنے سے انکار کردے، اور شوہر کو گھر سے نکال دے تو ایسی بیوی کے متعلق اسلام میں کیا احکامات ہیں؟

(۲) اگر بیوی اپنے شوہر پر یہ غلط اور بے بنیاد الزام لگائے کہ شوہر اس کی سگی بہن کے ساتھ اسکے ناجائز تعلقات ہیں، تو شوہر کو بیوی کیساتھ اسلام کی روشنی میں کیا سلوک کرنا چاہئے؟

المستفتی: ڈاکٹر رحیم رامش،
مکان نمبر ۱۵۷-۶-۲ محلّہ: نوگاؤں بستی،
کاغذنگر، تلنگانہ، ضلع عادل آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بیوی کا شوہر کی اجازت کے بغیر اسکی جیب سے نقد رقم نکالنا اور اے، ٹی، ایم کارڈ جس سے بینکوں سے پیسے نکالے جاتے ہیں، ان سب کو نکال کر اپنے قبضہ میں لے لینا قطعاً جائز نہیں ہے، جبکہ شوہر اپنی حیثیت اور معیار کے اعتبار سے بچوں پر ازخود خرچہ کرتا ہو، بیوی پر لازم ہے، کہ وہ ساری چیزیں رضا کارانہ طور پر شوہر کے حوالہ کردے، ورنہ چوری اور غصب کے حکم میں داخل ہوکر بیوی سخت گنہگار ہوگی، اور طرح طرح کے الزامات لگا کر شوہر کو گھر سے باہر نکالنا انتہائی بیہودہ حرکت ہے، نیز یہ الزام لگانا کہ شوہر اسکی حقیقی بہن کیساتھ غلط تعلق کئے ہوئے ہے، یہ انتہائی حیاسوز بات ہے، ان سب باتوں سے بیوی کو توبہ کرنی چاہئے۔

لايجوز لأحد أخذ مال أحد بغير سبب شرعي. (شامی، کتاب الحدود، باب التعزير، زكريا ٦/١٠٦، كراچی ٤/٦١، هنديه زكريا قديم ٢/١٦٧، جديد ٢/١٨١، شرح المجلة رستم اتحاد ١/٦٢، رقم: ٩٧)

عن عروۃ أن عائشة قالت: جاء ت هند بنت عتبة ، فقالت : يارسول الله ! إن أبا سفيان رجل مَسِّيکٌ ، فهل علي حرج أن أطعم من الذي له عيالنا ؟ قال : لا ، إلا بالمعروف. (بخاری شریف ، باب نفقة المرآۃ إذا غابت عنها زوجها، ونفقة الولد ، النسخة الهندية ٢/٨٠٧، رقم: ٥١٥٠، رقم : ٥٣٥٩، صحيح مسلم، باب قضية هند ، النسخة الهندية ٢/٧٥، بيت الافكار رقم: ١٧١٤)

عن أبي الدرداء ؓ قال : قال: رسول الله ﷺ من ذكر امرأً بما ليس فيه ليعيبه بما ليس فيه حبسه الله فی نار جهنم حتى يأتی بنفاذ ماقال فيه .

(المعجم الأوسط، دارالفكر ٦/٣٢٧، رقم: ٨٩٣٦، مجمع الزوائد ٤/٣٦٣)

عن البراء بن عازب ؓ قال قال رسول الله ﷺ : ...... وأربى الربا استطالة الرجل فی عرض أخيه. (المعجم الأوسط ، دارالفكر ٥/٢٢٧،رقم: ٧١٥١، مصنف عبدالرزاق ، المجلس العلمي ٨/٣١٤، رقم : ٥٣٤٥، شعب الإيمان ، باب في قبض اليد عن الأول المحرمه ، دارالكتب العلمية بيروت ٤/٣٩٥، رقم: ٥٥٢٢)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍ محرم الحرام ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/۱۱۸۲۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۱/۱۴۳۶ھ

نکاح کے بعد بیوی سے بات چیت کرنے کا حق

سوال: [۱۰۲۵۲]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کا نکاح تو ہو گیا لیکن رخصتی تین سال کے بعد ہوگی، تو کیا زید کو بیوی کے والدین کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت ہے یا نہیں، زید کے تو سسر نے اپنے داماد کو گھر میں آنے کی اجازت دیدی ہے، اور یہ کہا کہ یہ اسکی چیز ہے، اب چاہے زید اس کو کچھ بھی لاکر دے، یا اس سے ملے جلے کچھ بھی کرے اسکی امانت ہے، لیکن زید کی ساس کی باتوں

سے ظاہر ہوتا ہے، کہ اس کا گھر میں آنا اس کو ناگوار گذرتا ہے، کیونکہ زید کی بیوی کے والدین کے یہاں کسی بھی آدمی کا بار بار آنا ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے، کیونکہ ان کے یہاں اس جیسی شادی اس سے پہلے نہیں ہوئی ہے، اور گھر پر جو بھی آتا ہے، وہ بیٹھک میں ہی بیٹھتا ہے اور زید جس وقت بھی سسر کے گھر جاتا ہے، ڈائریکٹ اندر داخل ہو جاتا ہے، اور گھر پر تمام عورتیں رہتی ہیں، اسلئے ان کا آنا نامناسب سمجھتی ہے، اور تقریباً سبھی گھر والے برا سمجھتے ہیں، جب تک کہ رخصتی نہ ہو!

المستفتي: محمد فاروق، نانگل سوتی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب نکاح ہوگیا ہے، تو اب زید کو اپنی بیوی کے پاس جانے اور اس سے بات چیت کرنے کا ہر حال میں حق ہے، لہٰذا خسر صاحب کی بات صحیح ہے نیز نکاح ہو چکا ہے، اب بیوی کو زید کے حوالہ کردینا لازم ہے، بلاوجہ روکے رکھنے کی اجازت نہیں ہے، زید کی ساس کو اسلئے ناگوار گذرتا ہوگا کہ رخصتی سے قبل داماد کا گھر میں آنا جانا معاشرہ میں برا سمجھا جاتا ہے، اگر یہی بات ہے تو فوری رخصت کردینا چاہئے، اور زید کیلئے اپنی بیوی کے پاس جانا اور ساس سے بات کرنا شرعی طور پر جائز ہے، ہاں البتہ غیر محرم عورتوں سے بات کرنا نکاح سے پہلے اور نکاح کے بعد رخصتی سے پہلے اور رخصتی کے بعد کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے۔

هو عقد يفيد ملك المتعة أي حل استمتاع الرجل من امرأة قال الشامي: وهو اختصاص الزوج بمنافع بضعها وسائر أعضائها استمتاعاً.

(الدر المختار مع الشامي، كتاب النكاح، زكريا ٤/ ٦٠، و٥٩، كراچی ٣/٣، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤١/ ٢٠٥)

وحرم على المتزوج " إلىٰ قوله " أم زوجته وجداتها بمجرد العقد الصحيح. (الدر المختار مع الشامي، كتاب النكاح، فصل في المحرمات،

زکریا ٤/ ١٠٠، ١٠٤، کراچی ٣/ ٢٨، ٣٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍رجب ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳؍ ۵۳۹۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶؍۷؍۱۴۱۸ھ

بیوی کی غیر شرعی شرائط پر عمل کرنا لازم نہیں

سوال: [۱۰۲۵۳]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عمر کی شادی ہوئی زینب کیساتھ زینب عمر کے گھر آتے ہی اپنے اوپر قبضہ دینے کیلئے یہ سب شرائط لگاتی ہے، مثلاً کہتی ہے، داڑھی کٹالو، شرعی لباس کو ترک کردو، مجھے سینما دیکھنے کی اجازت دو، اگر یہ سب کام نہیں کرتے تو ہمیں طلاق دے دو، تو ایسی صورت میں عمر کیا کرے گا، آیا طلاق دیگا یا ان سب کاموں پر راضی ہو جائیگا، حالانکہ داڑھی کٹانا شرعاً منع ہے، اور طلاق دینا بھی شرعاً منع ہے؟

المستفتي: محمد اکرم، متعلم مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: عمر پر ایسی صورت میں بیوی کو طلاق دینا لازم نہیں ہے، اور نہ ہی بیوی کی شرائط پر عمل کرنا لازم ہے، بلکہ بیوی پر لازم ہے، کہ تمام شرائط واپس لے اور تابعدار بیوی بن کر شوہر کی ماتحتی کو قبول کرلے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں عورتوں کو شوہروں کی کھیتی قرار دیا ہے، اور شوہروں کو کھیت کا مالک قرار دیا ہے۔

نِسَاءُكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ. (البقرة: ٢٢٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍۳؍۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱؍ ۳۸۹۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹؍۳؍۱۴۱۵ھ

بیویوں کے درمیان مساوات کا حکم

سوال: [۱۰۲۵۴]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک آدمی کی دو بیویاں ہیں، اور وہ پہلی بیوی کو خرچ نہیں دیتے ہیں، اور اس کے ساتھ رہتے بھی نہیں ہیں، اور دوسری بیوی کو خرچ بھی دیتے ہیں، اور اس کے پاس رہتے ہیں، اور اب وہ یہ کہہ رہے ہیں، کہ تم دونوں میں سے کوئی بھی اگر دوسرے کے یہاں مزدوری کرنے جائے گی ،تو دونوں کو ایک دو تین طلاق اور پہلی بیوی کیلئے کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں ہے، مزدوری کر کے وہ اپنی پرورش کرتی ہے، اب اس صورتحال میں پہلی بیوی کیا کرے گی، اور اگر وہ ایسی صورت میں دوسرے کے یہاں مزدوری کرنے جاتی ہے، تو کیا واقعی طلاق ہو جائیگی؟

المستفتی: نورالہدیٰ، وعبدالجبار،
متعلم مدرسہ حبیبہ، اسماعیل روڈ محلّہ:
اصالت پورہ، ضلع: مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: دونوں بیویوں کے درمیان رہائش میں، ساتھ رہنے میں، خرچ دینے میں برابری کرنا شوہر کے اوپر واجب ہے، اور برابری نہ کرنے سے شوہر سخت گنہگار ہوگا۔

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً . (النساء: ۳)

نیز جب شوہر نے یہ کہہ دیا ہے کہ تم دونوں میں سے کوئی بھی اگر مزدوری کرنے جائیگی تو تین طلاق تو دونوں میں سے جو بھی جائے گی اس پر تین طلاق واقع ہو جائیگی ،خرچہ دونوں کا شوہر پر لازم ہے۔

وتنحل اليمين بعد وجود الشرط مطلقاً لكن إن وجد فى الملك طلقت الخ. (درمختار، كتاب الطلاق، باب التعليق، مطلب هم الأضافة للتعريف لا

للتقیید، زکریا ۹/۶۰۹، کراچی ۳/۳۵۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍صفر المظفر ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۶۰۲۳/۳۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۲/۱۰ھ

کیا شوہر کیلئے اپنی بیوی کے حصے کے مطالبہ کا حق ہے؟

سوال: [۱۰۲۵۵]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک خستہ حال مکان میں چار بہنیں حصہ دار ہیں یہ مکان چاروں بہنوں کو اپنے والد کی وراثت سے ملا ہے، چھوٹی بہن اس مکان میں رہتی ہے، چاروں بہنیں صحیح ہوش وحواس میں ہیں ایک بہن کے شوہر اپنا حصہ لینے کیلئے بضد ہیں، اس کے شوہر کو حصہ مانگنے کا کوئی حق پہونچتا ہے یا نہیں؟ اور اس خستہ حال مکان کی تعمیر کیلئے چاروں بہنیں تیار ہیں، سب کی رائے سے مکان کی تعمیر شروع ہوتی ہے، تو وہ یعنی اسی بہن کے شوہر تعمیر رکوا دیتے ہیں، ان کو تعمیر رکوانے کا کوئی حق پہونچتا ہے یا نہیں؟ تسلی بخش اور مفصل جواب عنایت فرمائیں؟ نوازش ہوگی۔

المستفتي: حافظ محمد سلمان،
تمباکو والان اسٹریٹ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صاحب حق یعنی بیوی کی اجازت سے شوہر کو اپنی بیوی کی طرف سے وکالت کرکے بیوی کا حصہ بیوی کو دلانے کیلئے دوسرے لوگوں کو اس کے حصہ پر تعمیر کرنے سے روک لگانے کی اجازت ہے۔

ویجوز الوکالة فی سائر الحقوق وکذا بإیفائها و استیفائها إلا فی الحدود والقصاص. (هدایه، کتاب الوکالة، اشرفی، ۳/۱۷۷، شامی، زکریا ۸/۲۴۴،

کراچی ٥/١٣ ٥، البحرالرائق، زکریا ٢٤٦/٧، کوئٹه ١٤٦/٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ ماد ی الثانی ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۸۰۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۶/۹ھ

شوہر بیوی کے کتنے جسم کا حقدار ہوتا ہے

سوال: [۱۰۲۵۶]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شوہر بیوی کے پورے جسم کا حقدار ہوتا ہے، یا صرف شرمگاہ کا خلاصہ کریں، باندی کا حق بیوی سے زیادہ تھا یا کم یا برابر کا تھا؟

المستفتی: محمد حنیف، لال مسجد، سرائے ترین، سنبھل، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: شوہر کیلئے اپنی منکوحہ سے ہر قسم کا استمتاع درست ہے، لیکن وطی شرمگاہ یعنی آگے کے راستہ میں ہونی چاہئے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۲/ ۳۱۱، ڈابھیل ۱۸/ ۴۲۴)

يجوز له أن يلمس بجميع بدنه حتیٰ بذكره جميع بدنها ......**فكذا هي لها أن تلمس بجيمع بدنها**...... **جميع بدنه حتى ذكره .** (شامی، کتاب الطهارة، باب الحيض زكريا ٤٨٧/١، كراچی ٢٩٣/١)

اور باندی کا حق بیوی سے کم تھا، اسی بناپر اگر کسی کے نکاح میں کوئی باندی تھی تو اسکے نکاح میں رہتے ہوئے آزاد عورت سے نکاح کرنا جائز تھا، البتہ اگر کوئی آزاد عورت نکاح میں ہوتی تو اسکے لئے آزاد عورت کے نکاح میں رہتے ہوئے باندی سے نکاح کرنا جائز نہیں تھا۔

(**والحرة على الأمة لا عكسه**)**أى حل إدخال الحرة على الأمة ولا يحل إدخال الأمة على الحرة المتزوجة بنكاح صحيح .** (البحرالرائق، كتاب النكاح، فصل في المحرمات، زكريا ١٨٥/٣، كوئٹه ١٠٥/٣، هنديه زكريا قديم

۱/ ۳۵۹، جدید ۱/ ۳٤٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۵۷۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/۴/ ۱۴۲۱ھ

شب زفاف میں بیوی سے ملاقات کے وقت دو رکعت نماز

سوال: [۱۰۲۵۷]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شب زفاف میں بیوی کے پاس جا کر دو رکعت نماز نفل پڑھنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے، اس کا حدیث شریف سے ثبوت ہے یا نہیں؟ مفصل بیان فرمائیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: شب زفاف میں بیوی کے پاس جانے کے بعد ملاقات سے قبل دو رکعت نماز نفل پڑھنا درست ہے، اور حدیث شریف میں اسکا ثبوت ہے۔

عبدالرزاق عن الثوری عن الأعمش عن أبی وائل قال جاء رجل من بُجَیلة إلیٰ عبدالله فقال إنی قد تزوجت جاریة بکرا وإنی قد خشیت أن تفرکنی ، فقال عبد الله إن الإلف من الله ، وإن الفرک من الشیطان لیکره إلیه ما أحل الله له فإذا اُدخِلتُ علیک فمرها فلتصل خلفک رکعتین .

(مصنف عبدالرزاق ، المجلس العلمی٦/ ١٩١، رقم: ١٠٤٦٠)

حدثنا ابن ادریس عن داؤد عن أبي نضرة عن أبی سعید مولی أبی أسید قال: تزوجت وأنا مملوک فدعوت نفرا من أصحاب النبی صلی الله علیه وسلم فیهم ابن مسعود ، وأبوذر وحذیفة ،قال وأقیمت الصلاة، قال فذهب أبو ذر لیتقدمُ فقالوا إلیک قال أو کذلک؟ قالوا، نعم قال فتقدمت إلیهم وأنا عبد مملوک وعلمونی فقالوا إذا أدخل علیک أهلک فصل رکعتین ثم سل الله تعالیٰ من خیر ما دخل علیک،وتعوذ به من شره ثم شأنک وشأن أهلک . (مصنف ابن ابي شيبة ، جديد موسهه علوم القرآن بيروت

۹/۳۳٤، ۳۳٥، رقم: ۱۷٤۳۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۴۲۳/۴۰)

شب زفاف میں بیوی کے ڈوپٹہ پر نماز پڑھنا

سوال: [۱۰۲۵۸]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شب زفاف میں زوجہ کے خمار کولیکراس پر دورکعت نماز پڑھنا اوراپنا رومال اس کو دیدینا کہ اس سے عورت فرماں بردار رہے گی، کیا اس نماز کا ثبوت ہے، نیز حل ازار کے وقت کوئی دعا بھی منقول ہے یا نہیں؟ مفصل بیان کریں، مہربانی ہوگی؟

المستفتي: حسیب الرحمٰن، گوری نوادا، فرخ آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: شب زفاف میں بیوی سے ملاقات کرنے سے قبل دورکعت صلوٰۃ الحاجۃ پڑھکر خیر وبرکت اور محبت وموافقت کی دعا کرنا علماء نے لکھا ہے۔ (مستفاد: تحفۃ النکاح/ ۲۹)

مگر بیوی کے ڈوپٹہ پر پڑھنے کی بات کہیں نظر سے نہیں گذری اور حل ازار کے وقت کی دعا حدیث شریف میں منقول ہے جو ذیل میں درج ہے۔

عن ابن عباس یبلغ به النبی صلی اللہ علیه وسلم قال: لو أن أحدکم إذا أتی أهله قال: بسم اللہ اللّٰهم جنبنا الشیطان وجنب الشیطان مارزقتنا، فقضی بینهما ولد لم یضره. (صحیح البخاری، کتاب الوضوء، باب التسمیة، علی کل حال ۱/۲٦، رقم: ۱٤۱، مصنف عبدالرزاق، المجلس العلمی بیروت ٦/۱۹۳، رقم: ۱۰٤٦٥، المعجم الکبیر للطبرانی، دار احیاء التراث العربي بیروت ۱۱/٤۲۲، رقم: ۱۲۱۹٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍محرم الحرام ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۱۳۶)

ہمبستری کے وقت قبلہ رو ہونے کا حکم

سوال: [۱۰۲۵۹]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بعض حضرات کا خیال ہے، کہ ہمبستری کے وقت قبلہ رو نہیں ہونا چاہئے، اور نہ پیٹھ قبلہ کی طرف ہونی چاہئے تو کیا یہ بات صحیح ہے، اگر یہ بات صحیح ہے تو کس طرف رخ کر کے ہمبستری کریں؟

المستفتي: زبیر مظاہری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ہمبستری کے وقت حتی الامکان یہ کوشش کرنی چاہئے کہ قبلہ کی طرف چہرا یا پیر نہ ہونے پائیں، کیونکہ یہ مکروہ ہے، لیکن مکان کی تنگی یا کسی اور عذر کی وجہ سے بوقت استنجاء بھی قبلہ کی طرف پشت کرنا جائز ہے، جبکہ عام حالات میں یہ مکروہ اور ممنوع ہے۔

ویکره مد الرجلین إلیٰ القبلة فی النوم وغیره عمداً و کذا فی حال مواقعة أهله . (شامی، باب الأنجاس ، فصل فی الأستنجاء ،کراچی ۳٤۱/۱، زکریا ۵۵٤/۱، هندیه ، زکریاقدیم ۳۱۹/۵، جدید ۳٦۹/۵، تاتارخانیة، زکریا ٦۹/۱۸، رقم: ۲۸۰٦۹)

فإن جلس مستقبلا لها ثم ذکره إنحرف إن أمکنه وإلا فلا بأس وفی الشامیةأی وإن لم یمکنه فلا بأس والمراد نفی الکراهة أصلاً . (شامی، زکریا۱/۵۵٤، کراچی ۳٤۱/۱، عنیة الطالبین مع ترجمة /۱۰٤، فتاویٰ محمودیه ۳۹۷/۱٤،ڈابهیل ٦۲۹/۱۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍رجب ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۳۶۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/ ۷/ ۱۴۲۸ھ

دوران حمل جماع کا حکم

سوال: [۱۰۲۶۰]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شادی کے بعد میاں بیوی کے اندر جو سہاگ منایا جاتا ہے، (یعنی جماع کیا جاتا ہے) شرعاً اس کے بعد کتنے دن تک میاں بیوی جماع کر سکتے ہیں، کیونکہ حدیث میں ہے، کہ چالیس دن تک نطفہ رہتا ہے، پھر گوشت کا ٹکڑا چالیس دن تک اسی طرح چالیس چالیس دن میں اس کا ذکر فرمایا ہے، اب جماع کا حد تعین کیا ہے؟ اور آخری حد کیا ہے، اور جماع کے کتنے دن بعد میں حمل شمار ہوتا ہے؟ بیان فرمائیں؟

المستفتی: ابو درداء، امام مسجد علی بہادر خان، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جس دن نطفہ ٹھہر جائے اسی وقت سے حمل کی مدت شمار ہوگی، اور حالت حمل میں اپنی زوجہ سے مجامعت کرنے میں کچھ حرج نہیں ہے، ساتویں آٹھویں نویں ماہ میں بھی مباشرت درست ہے، شرعاً کچھ ممانعت نہیں ہے، البتہ جس حالت میں مضرت ہو اس حالت میں بچنا بہتر ہے، شرعی ممانعت نہیں ہے۔

لو تضررت من كثرة جماعه لم تجز الزيادة على قدر طاقتها. (درمختار مع الرد المحتار، کتاب النکاح، باب القسم، زکریا ٤/ ٣٨٠، کراچی ٣/ ٢٠٣)

فعلم من هذا كله أنه لايحل له وطؤها بما يؤدى إلىٰ إضرارها. (شامی، کتاب النکاح، باب القسم، زکریا ٤/ ٣٨١، کراچی ٣/ ٢٠٤، البحرالرائق، زکریا ٣/ ٣٨٤، کوئٹہ ٣/ ٢٢٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم / ربیع الثانی ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۷۰۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۴/ ۱۴۱۹ھ

حالت حیض میں جماع

سوال: [۱۰۲۶۱]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید باہر ملازمت کرتا ہے، اور جب بھی گھر جاتا ہے، بیوی اسے حیض میں ملتی ہے، اب زید کو اتنی طاقت نہیں ہے، کہ وہ اپنے آپ کو جماع سے روک سکے تو کیا اس صورت میں وہ حیض میں جماع کرسکتا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حالت حیض میں بیوی سے ہمبستری کرنا کسی حال میں جائز نہیں، اگرچہ شوہر پریشان ہوجاتا ہو اسلئے کہ اس کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ وَلاَ تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّى يَطْهُرْنَ ، الأية: (سوره بقره ۵/ ۲۲۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/ ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۷۷۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴/ ۱۲/ ۱۴۱۴ھ

زوجین کا آپس میں برہنہ جسم دیکھنا

سوال: [۱۰۲۶۲]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میاں بیوی آپس میں برہنہ جسم کو دیکھیں یا شرمگاہوں کو ہاتھ لگائیں یہ حیاداری کے ہی خلاف ہے یا معصیت بھی ہے؟

المستفتي: عبدالرحیم، بڑبڑوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: میاں بیوی میں سے ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھنا یا چھونا جائز ہے، اس میں کوئی گناہ اور معصیت نہیں ہے ہاں البتہ حیاداری کے خلاف ہے۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ۱۴/ ۳۸۷، ڈابھیل ۱۸/ ۶۲۳)

عن بهز بن حكيم، عن أبيه، عن جده، قال: قلت: يارسول الله! عوراتنا، ما نأتي منها، وما نذر؟ قال: احفظ عورتک إلا من زوجتک، أو ماملكت يمينك. (سنن ابن ماجه، باب التستر عند الجماع، النسخة الهندية ۱/ ۱۳۸، دارالسلام رقم: ۱۹۲۰)

وينظر الرجل من أمته التى تحل لهٗ وزوجته إلىٰ فرجها والأصل فيه قوله صلى الله عليه وسلم غض بصرك إلا عن أمتك وامرأتك ولأن مافوق ذلك من المسيس والغشيان مباح فالنظر أولىٰ إلا أن الأولىٰ أن لا ينظر كل واحد منهما إلىٰ عورة صاحبه. (هدايه، كتاب الكراهية، فصل فى اللبس، اشرفى ٤/ ٤٦١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ ۱۱/ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۳۸۳)

بیوی کا پستان منہ میں لینا

سوال: [۱۰۲۶۳]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید اپنی بیوی سے ملتے وقت فرط محبت میں کہتا ہے، کہ اماں دودھ پلاؤ بیوی بھی فرطِ محبت میں کہتی ہے بیٹا لو دودھ پیو اور پستان منہ میں دیکر خوب پلاتی ہے، حالانکہ دودھ نہیں ہوتا ہے، اس کیلئے کیا حکم ہے؟ ایسا کرنیوالا گنہگار تو نہیں ہے؟

المستفتی: شائق احمد، مدرسہ زینت

العلوم، جامع مسجد، مانگپیر کانکی نارہ،
۲۴/ پرگنہ۔(مغربی بنگال)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: بیوی کا پستان منھ میں لینا شوہر کیلئے جائز ہے، لیکن دودھ پینا حرام اور ناجائز ہے، لیکن اس سے نکاح میں کوئی فرق نہیں آئیگا، اور بیوی کو ماں کہد ینا، اور شوہر کو بیٹا کہد ینا مکروہ ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ ۶/ ۲۵۷، جدید زکریا...... فتاویٰ محمودیہ قدیم ۸/ ۱۲۶، جدیدڈابھیل ۱۸/ ۶۲۴)

عن أبي تميمة الهجيمي ، قال: مرا لنبي صلى اللّٰه عليه وسلم برجل وهو يقول : لا مرأته يا أخية فزجره . (مصنف عبدالرزاق، باب الرجل يقول لا مراته يا أخية ، المجلس العلمي ۷/ ۱۵۲،رقم: ۱۲۵۹۵)

بأن قال أنت أمي لايكون مظاهرا لكنه مكروه لقربه من التشبيه الخ.

(البحرالرائق، كتاب الطلاق، باب الظهار ، زكريا ٤/ ١٦٥، كوئٹه ٤/ ٩٨، الدر مع الرد، زكريا ٥/ ١٣١، كراچی ٣/ ٤٧٠) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۲۴/ ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۶۵۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/ ۴/ ۱۴۱۲ھ

بیوی کا دودھ پینا

سوال: [۱۰۲۶۴]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ
(۱) اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کا دودھ منھ میں لے لیا تو نکاح پر اثر پڑے گا یا نہیں؟
(۲) اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کا دودھ منھ میں دودھ پینے کی نیت کے ساتھ لیا اور وہ عورت اولا د والی ہے، اور دودھ حلق تک پہونچ گیا، تو کیا نکاح برقرار رہے گا؟

المستفتي: محمد طارق انور رشیدی، مغلپورہ دوئم، ضلع: مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: بیوی کا پستان منھ میں لینے میں کوئی حرج نہیں لیکن اگر دودھ نکلنے کا ظن غالب ہو تو پھر ایسا نہ کیا جائے، اور اگر دودھ اتر آیا اور شوہر نے اس کو نگل لیا تو یہ اس کا فعل حرام ہے، مگر اس سے نکاح پر کوئی اثر نہ پڑیگا، بیوی بدستور نکاح میں باقی رہے گی۔

إذامص الرجل ثدی امرأته وشرب لبنها لم تحرم علیه امرأته. (خانیة، باب الرضاع، جدید زکریا ۱/ ۲۵۰، وعلی هامش الهندیة، زکریا۱/ ۴۱۷، شامی، کراچی ۳/ ۲۲۵، زکریا ٤/ ٤٢١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍شعبان ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۸۹۱)

صحبت کے دوران بیوی کا دودھ پینا

سوال: [۱۰۲۶۵]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے صحبت کے وقت اس کے پستان کو منھ میں لے لیا اور مستی میں آکر اس کے پستان کو چوس لیا جس کی وجہ سے دودھ نکل آیا اور شوہر نے دھوکہ سے پی بھی لیا، تو اس کا شرعاً کیا حکم ہے؟

المستفتي: ڈاکٹر خالد، کندرکی، نزد مغلوں والی مسجد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: بیوی کے پستان کو منھ میں لینے کی وجہ سے نکاح میں کوئی خرابی نہیں آتی ہے، اور اگر دودھ منھ میں آگیا ہے، تب بھی کوئی خرابی نہیں آتی ہے، ہاں البتہ اسکو فوراً نکال دینا ضروری تھا، اگر حلق میں چلا گیا تو نکاح میں کوئی خرابی نہیں آئی البتہ اس نے ایک گندہ کام کیا ہے، آئندہ اس طرح کی حرکت کہ جس سے بیوی کا دودھ اس

کے حلق میں چلا جائے نہ کرنے کا عہد کرلے، اور اللہ سے توبہ کرلے۔

إذا مص الرجل ثدی امرأته وشرب لبنها لم تحرم علیه أمرأته لما قلنا أنه لارضاع بعد الفصال. (فتاویٰ قاضیخان ، علی هامش الهندیة،زکریا ۴۱۷/۱، جدید زکریا ۲۵۰/۱)

مص رجل ثدی زوجته لم تحرم الخ. (الدرالمختار مع الشامی ، زکریا ۴۲۱/۴، کراچی ۲۲۵/۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/جمادی الأخریٰ ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۴۰۸/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۶/۱۶ھ

بیوی کی شرمگاہ کو بوسہ دینا

سوال: [۱۰۲۶۶]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کہتا ہے کہ فرط شہوت کے وقت اپنی بیوی کی شرمگاہ پر بوسہ دینا جائز ہے یا نہیں اور وہ بھی مجامعت کے قبل آیا یہ ازروئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

المستفتي: عبدالجلیل نوگاؤں، آسام

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: فرط شہوت میں بھی عورت کی شرمگاہ کو بوسہ دینا چومنا سخت مکروہ اور گناہ اور بہائم وچوپایوں کی خصلت ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۲۷۰/۶، جدید زکریا ۱۷۸/۱۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/شعبان ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۳۹/۲۴)

کیا عزل بالحرۃ جائز ہے؟

سوال: [۱۰۲۶۷]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عزل بالحرۃ جائز ہے یا نہیں؟ اس کا جواز تو ابن ماجہ شریف/۱۰، حاشیہ/۵، کی عبارت سے سمجھ میں آتی ہے، حنفیہ کے قول کے مطابق ''لکن بأنها'' کی قید کے ساتھ اور بخاری شریف ۲/۵۹۳ میں ابوسعید خدریؓ کے قول سے بھی جواز ثابت ہوتا ہے، اور دیگر فقہی کتابوں سے بھی (حالانکہ) قرآن شریف، کی آیت ''وَلاَ تَقْتُلُوْا أَوْلاَدَکُمْ خَشْیَةَ اِمْلاَقٍ'' اس کے صریح مخالف ہے، جس سے عزل کی حرمت سمجھ میں آتی ہے، لہٰذا مسئلہ کی مدلل وضاحت فرما کر شکریہ کا موقع دیں؟

المستفتی: قاضیم الدین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: عزل بالحرۃ اس لئے جائز ہے کہ اس سے تولد کی صلاحیت ختم نہیں ہوتی ہے، اور اس منی سے تولد بھی نہیں ہوتا ہے، اور جس منی سے قضاء الٰہی میں تولد ہوتا ہے، اس سے عزل ہی نہیں کر سکے گا، اور بچہ ہو کر ہی رہے گا، لہٰذا عزل مانع تولد نہیں ہے۔

عن أبی سعید الخدری سمعه یقول: سئل رسول اللہ ﷺ عن العزل؟ فقال: مامن کل الماء یکون الولد وإذا أراد اللہ خلق شئیی لم یمنعه شیئی. (صحیح مسلم شریف، کتاب النکاح، باب حکم العزل، النسخة الهندیة ۱/ ٤٦٥، بیت الافکار رقم: /۱٤۳۷)

عن جابر قال: جاء رجل فی من الأنصار إلیٰ النبی صلی اللہ علیه وسلم فقال: یا رسول اللہ! إن لی جاریة أعزل عنها؟ قال: سیأتیهاماقدر لها فأتاه بعدذلک فقال: قد حملت الجاریة، فقال النبی صلی اللہعلیه وسلم: ماقدر لنفس شیء إلا هی کائنة. (سنن ابن ماجه، باب فی القدر، النسخة الهندیة، ۱/ ۱۰، دارالسلام، رقم: ۸۹)

آیت کریمہ **وَلَا تَقْتُلُوْا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ.** (الآیۃ: سورہ بنی اسرائیل آیت: ۳۱)
حدیث عزل کے منافی اور مخالف نہیں ہے، کیونکہ آیت کریمہ سے قتل اولاد کی ممانعت اور حرمت ثابت ہوتی ہے، اور تولد کی ابتدا مرد کا مادہ عورت کے مادہ کے ساتھ مل کر مستقر ہونے کے بعد ہوتی ہے، اس سے پہلے نہیں اور عزل میں مرد کے مادہ کا التقاء عورت کے مادہ کے ساتھ ہوتا ہی نہیں ہے، اسلئے آیت کریمہ اور حدیث عزل کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہوگا۔

مبدأ سبب الوجود من حيث وقوع المني في الرحم لا من حيث الخروج من الإحليل لأن الولد لايخلق من مني الرجل وحده بل من الزوجين جميعا إما من مائه ومائها أو من مائه ودم الحيض الخ. (إحياء العلوم ۲/ ۳۰، امام غزالی عربی) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ربیع الاول ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۷۰۸)

بیوی کی اجازت سے نرودھ کا استعمال

سوال: [۱۰۲۶۸]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بیوی کی رضامندی اور خوشی سے نرودھ استعمال کرسکتا ہوں یا نہیں؟

المستفتي: محمد تسلیم، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خوف رزق اور اولاد نہ ہونے کی غرض سے بیوی کی خوشی ورضامندی سے بھی نرودھ استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

(قولہ تعالیٰ) **لَا تَقْتُلُوْا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ.**

(الآیۃ: سورہ بنی اسرائیل آیت: ۳۱)

عن معقل بن يسارؓ، قال: جاء رجل إلىٰ النبي صلى الله عليه وسلم

فقال: إني أصبت امرأة ذات حسب وجمال، وأنها لاتلد أفتزوجها؟ قال: لا، ثم أتاه الثانية، فنهاه، ثم أتاه الثالثة، فقال: تزوجوا الودود الولود فإني مكاثر بكم الأمم. (سنن أبي داؤد، باب في تزويج الأبكار، النسخة الهندية ۱/ ۲۸۰، دارالسلام رقم: ۲۰۵۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰ / جمادی الثانیہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۷۷۷)

عذر شدید کی بنا پر نرودھ کا استعمال

سوال: [۱۰۲۶۹]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر عمر اپنی بیوی سے اجازت لے کر نرودھ استعمال کرے اس خوف سے کہ ماقبل میں پیدا شدہ بچہ کو مابعد کے بچہ سے کسی قسم کی کمزوری نہ ہو جائے، تو وجہ مذکورہ کی بنا پر نرودھ کا استعمال کرنا کیسا ہے؟

المستفتي: علاء الدین، متعلم دورۂ حدیث مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بیوی کی رضامندی سے عزل کرنے کی گنجائش شریعت میں ہے، لہٰذا اس کے مشابہ نرودھ کا استعمال ممنوع نہ ہوگا، ہاں اس بات کا خیال رہے کہ عدم حصول اولاد کی وجہ سے نہ ہو بلکہ وقتی طور پر اعذار شدیدہ کی بنا پر کرے جیسا کہ سوال میں لکھا گیا ہے، اور اس عذر کے ختم ہونے کے بعد پھر اسکی اجازت نہیں ہے۔

عن أبي سعيد ن الخدري رضي قال: أصبنا سبيا، فكنا نعزل، فسألنا رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال: أو إنكم لتفعلون قالها ثلثا ما من نسمة كائنة إلىٰ يوم القيمة إلا هي كائنة. (بخاري شريف، باب العزل، النسخة الهندية ۲/ ۷۸٤، رقم: ٥٠١٤، ف: ٥٢١٠)

وجاز عزله عن أمته بغير إذنها وعن عرسه به أي بإذن حرة أو مولىٰ

أمة. (شامی، کتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغیره ،زکریا ۹/ ۵۳۷، کراچی ۶/ ۳۷۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ رجب ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۸۶۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/ ۷/ ۱۴۲۱ھ

بیوی کا شوہر کی اجازت کے بغیر میکہ جانا

سوال: [۱۰۲۷۰]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کیا شوہر کی اجازت کے بغیر بیوی اپنے میکہ اور غیر محرم رشتہ داروں کے پاس جاسکتی ہے؟

المستفتي: غلام رسول، سرینگر، کشمیر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: میکہ جانے کا اس کو حق ہے، لیکن شوہر کی اجازت سے جانا چاہئے، اور میکہ جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر ہفتہ میکہ جاتی رہے، اور یہاں شوہر کے گھر کا نظام خراب ہوجائے، مہینہ دو مہینہ میں شوہر کی مرضی سے جتنے دن بھی آپس میں طے ہوجائے، اتنے دن کیلئے میکہ جاتی رہے، اور اس آنے جانے کو مسئلہ بنا کر کے میاں بیوی کے تعلقات کو خراب نہیں کرنا چاہئے، اور غیر محرم رشتہ داروں کے یہاں شوہر کی اجازت کے بغیر جانا قطعاً جائز نہیں ہے۔

لیس للمرأة أن تخرج بغیر إذن الزوج. (خانیة، کتاب النکاح، فصل فی حقوق الزوجیة، زکریا جدید ۱/ ۲۶۴، وعلی هامش الهندیة ۱/ ۴۴۳)

وحقه علیها أن تطیعه فی کل مباح یأمربه. (شامی، کتاب النکاح، باب القسم، زکریا ۴/ ۳۸۸، کراچی ۳/ ۲۰۸، النهر الفائق، دارالکتب العلمیة بیروت ۲/ ۲۹۷)

لأنها کانت مأمورة إلیٰ طاعة زوجها فی غیر معصیة. (مرقاة، باب عشرة النساء، ومالکل واحد من الحقوق، امدادیه ملتان ۶/ ۲۶۷)

ویمنعها من زیارة الأجانب وعیادتهم والولیمة. (درمختار مع الشامی،

کتاب الطلاق ، باب النفقة ، زكريا ٥/ ٣٢٤، کراچی ٣/ ٦٠٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ　　الجواب صحیح:
٢١/ ذیقعدہ ١٤٣٢ھ　　احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٩/ ١٠٥٣٨)　　٢٣/ ١١/ ١٤٣٢ھ

شوہر کی اجازت کے بغیر میکہ جانے والی عورت معلقہ ہے یا ناشزہ؟

سوال: [١٠٢٧١]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شوہر کی اجازت بغیر لڑکی میکہ گئی، اور بلانے پر بھی نہیں آئی، لڑکی کی شادی بالغہ ہونے کے بعد ہوئی ہے، رخصتی کیلئے لڑکا خود گیا نیز لڑکے کے گھر والے بھی رخصتی کیلئے گئے، لیکن پھر بھی نہیں آئی کمیٹی انجمن بھی رخصتی کے لئے گئی، پھر بھی نہیں آئی، یعنی ٹال مٹول کر کے لڑکی میکہ میں قریب قریب ٩/ مہینہ سے ہے، اس درمیان لڑکے کی طرف سے رخصتی کا مطالبہ بار بار ہوتا رہا، اب اگر یہ لڑکی کالمعلقہ کہلاتی ہے تو بالدلیل جواب تحریر فرمائیں؟

المستفتي: عبد الجليل

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: شریعت کی اصطلاح میں معلقہ اس عورت کو کہا جاتا ہے، جس کے حقوق زوجیت کو شوہر ادا نہ کرتا ہو، اور نہ ہی اس کو طلاق وغیرہ کے ذریعہ آزاد کرتا ہو، سوالنامہ کے درج شدہ حالات میں عورت ناشزہ اور نافرمان ہے، معلقہ نہیں ہے۔

كالمعلقة وهي كما قال ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنهما التي ليست مطلقة ولا ذات بعل الخ. (روح المعاني ، قديم ٥/ ١٦٣ ، جديدزكريا ٥/ ٢٣٨، سورة نساء تحت الآية: ١٢٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢٧/ ربیع الاول ١٤٠٩ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٢٤/ ١١٧١)

والدین کا لڑکی کو اس کے شوہر کی اجازت کے بغیر گھر بلانا

سوال: [۱۰۲۷۲]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بعض حضرات اپنی لڑکیوں سے بہت زیادہ محبت رکھتے ہیں، شادی کے بعد بھی ماں باپ یہ چاہتے ہیں کہ گاہے بگاہے میکے میں ۱۵/دن ایک ماہ رہے، خود لڑکی بھی چاہتی ہے، مگر اس کا شوہر یا خسر اس بات کو نہیں چاہتا کیونکہ شوہر کے گھر کھانا بنانے والا کوئی نہیں ہے، کیا لڑکی کے ماں باپ جبراً عید بقرعید تیوہار وغیرہ میں بلا سکتے ہیں، یا ناراض ہو سکتے ہیں کہ ہماری لڑکی کو نہیں بھیجتے، کیا ہم نے فروخت کر دیا ہے، لڑکی کا شوہر یا خسر ضرورت کے تحت ایک دو دن کیلئے بھیجنے کو کہتے ہیں، ان تمام صورتوں میں لڑکی کے ماں باپ کا ناراض ہونا یا جبر کرنا شرعاً کیسا ہے؟ نیز لڑکی شوہر کے گھر ناراض ہو کہ مجھے میکہ نہیں جانے دیتے تو کیا لڑکی کا ناراض ہونا شرعاً درست ہے؟

المستفتي: محمد علی، ڈرھیال، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: والدین کو جبراً عید بقرعید میں بلانے کا حق نہیں ہے، البتہ شوہر اجازت دے دے تو درست ہے۔

تقييد خروجها بأن لا يقدرا على إتيانها فإن قدرا لا تذهب وهو حسن وقد اختار بعض المشائخ منعها من الخروج إليهما الخ. (شامی، کتاب الطلاق، باب النفقة، زکریا ۵/ ۳۲۴، کراچی ۳/ ۶۰۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰/ ذیقعدہ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۷۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۳۰/ ۱۱/ ۱۴۱۴ھ

شوہر کا بیوی کو نوکری کرنے سے روکنا

سوال: [۱۰۲۷۳]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر بوقت شادی لڑکی سرکاری ملازمت کررہی ہے، اورشادی کے بعد ملازمت کے مسئلہ کو لے کر دونوں میں اختلاف ہوا اورشوہر کی مرضی یہ ہو کہ بیوی ملازمت نہ کرے، مگر بیوی یہ کہہ کر انکار کردے، کہ یہ بات شادی ہونے سے پہلے ہی کہنی چاہئے تھی، لٰھذا مجھے تمہاری یہ بات کسی بھی صورت میں منظور نہیں ہے، اور میں ملازمت سے دستبردار نہیں ہوسکتی ہوں، شوہر کا کہنا ہے کہ ملازمت ضروری اور لازم نہیں ہے، بلکہ رشتہ ازدواج ضروری ہے، اورجس کام سے اس مقدس رشتہ میں دراڑ پیدا ہوجائے اس کو ترک کرنا لازم ہے؟

صورت مذکورہ میں بیوی کے لئے شرعاً کیا حکم ہے، آیا وہ شوہر کی اجازت کے بغیر ملازمت کرتی رہے یا یہ کہ اس کو شوہر کا حکم ماننا چاہئے، کیا شوہر کی رضامندی اور خوشی اس سلسلہ میں ضروری نہیں؟

المستفتي: محمد امین، اننت ناگ، کشمیر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس معاملہ میں عورت پرشوہر کی بات ماننا ضروری ہے، اوراس کیلئے شوہر کی اجازت کے بغیر ملازمت کرنا جائز نہیں ہے، اورعورت کا یہ کہنا کہ شادی سے پہلے سے ملازمت چل رہی ہے، لہٰذا شادی کے وقت میں ملازمت ترک کرنے کی شرط لگانی چاہئے تھی، یہ محض فضول بات ہے، شریعت میں اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اگر نہیں مانے گی تو گنہگار ہوگی، کیونکہ اس کا خرچہ شوہر پر لازم ہے، لٰھذا اس کو نوکری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ليس للمرأة أن تخرج بغير إذن الزوج إلا بأسباب معدودة. (قاضی خان، كتاب النكاح، فصل فی حقوق الزوجية، زكريا جديد ١/٢٦٤، وعلى هامش الهندية ١/٤٤٣)

لهٗ أن يمنعها من الأعمال كلها المقتضية للكسب لأنها مستغنية عنه لوجوب كفايتها عليه . (شامی، کتاب النكاح ، باب النفقة ، زكريا٥/ ٣٢٥، كراچی ٣/ ٦٠٣)

وفي أدب القاضي لهٗ أن يغلق عليها الباب من غير الأبوين . (بزازيه ، كتاب النكاح ، الفصل الثامن عشر ...... زكريا جديد ١/ ١٠٢، وعلى هامش الهندية ٤/ ١٥٧، تنقيح الفتاویٰ الحامدية بيروت ١/ ٣٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢٠ ر ذیقعدہ ١٤٣٢ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٩ / ١٠٥٣٥)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
٢٠ / ١١ / ١٤٣٢ھ

شوہر کے کہنے پر کیا نوکری چھوڑ نا لازم ہے؟

سوال: [١٠٢٧٤]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری شادی ہوئے عرصہ قریب ۴ رسال ہو چکے ہیں اور پانچواں سال یکم جنوری ٢٠١١ء سے شروع ہو رہا ہے، میرے والدین نے میرا نکاح شرع محمدی کے مطابق میرے شوہر اشتیاق احمد عرف عرفان علی کے ساتھ کر دیا تھا، حسب حیثیت جہیز بھی دیا تھا، لیکن جہیز کے لالچی میرے شوہر اور انکے اعزاء واقرباء نیز انکے ولی نے کم جہیز پانے کی پاداش میں مجھے روحانی اور جسمانی اذیتیں دینا شروع کیں اور والدین کو بھی بلیک میل کرنا شروع کیا ابھی پورا سال بھی نہ گذرا تھا، کہ گھر سے مار پیٹ کر کے نکال دیا میں اس وقت حاملہ تھی، میکہ آنے کے بعد میرے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا سارا بار میرے میکے والوں نے اٹھایا، اور لڑکی لگ بھگ چار سال کی ہے، گھر سے نکالنے کے بعد مجھے شوہر اور اس کے گھر والوں نے تاکید کی تھی، کہ جب تک موٹر سائیکل فرج واشنگ مشین اور کولر نیز بیس ہزار روپیہ نقد لے کر واپس نہیں آ ؤ گی اور خالی ہاتھ آ ؤ گی تو کسی دن یا رات میں تمہیں زندہ جلا دیا جائے گا، ایسی حالت میں والدین نے مجھے سسرال واپس نہیں بھیجا، والدین نے ان کی خوش آمد درآمد کی مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا مجبوراً مجھے جہیز کی دفعات کے تحت مقامی تھانہ میں رپورٹ درج

کرانی پڑی، جس میں ان کے گھر کے سبھی لوگ قید کئے گئے، اور بعد میں ضمانت پر چھوٹ گئے، مقدمہ عدالت میں چل رہا ہے، ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا ہے، کیس جاری ہے، ادھر ہمارے شوہر نے دوسری شادی کرلی ہے، اور وہ آرام سے رہ رہا ہے، اور کہتا ہے، مقدمہ چلنے دو برسوں چلتا رہے گا، ہماری ذات پر کیا اثر پڑتا ہے، اب وہ نہ تو ہمیں طلاق دیتا ہے، نہ مجھے اور میری بیٹی کو نان نفقہ یا کوئی خرچ دیتا ہے، وہ بھی ٹیچر ہے اور میں بھی ٹیچر ہوں، وہ کہتا ہے، کہ خرچ کے تو تم کمارہی ہو، اب کیسا خرچ اور نان ونفقہ اور کیسا حق زوجیت، اس کے لئے نہ شریعت مجھے پابند کرسکتی ہے، اور نہ قانون؛ کیونکہ شریعت میں چار شادیاں ایک آدمی کرسکتا ہے، جو جائز ہے، تو دریافت طلب بات یہ ہے کہ۔

(۱) شوہر کا یہ رخ اور روّیہ ازروئے شرع شریف درست ہے یا نہیں؟

(۲) ایسی حالت میں عدالت سے خلع یا طلاق لے کر میں دوسرا نکاح کرسکتی ہوں یا نہیں؟

(۳) میں اپنی بیٹی عریشہ کو سن بلوغ تک اپنی سرپرستی میں ازروئے شرع اور قانون اپنے پاس رکھ سکتی ہوں یا نہیں؟

(۴) جب تک میں اپنی دوسری شادی نہ کروں میں اور میری بیٹی باپ سے نان ونفقہ کی حقدار ہے یا نہیں؟

(۵) ان حالات کے پیش نظر اگر میرا شوہر میری بیٹی کو اپنی سرپرستی میں لینا چاہے، تو شرع وقانون کے مطابق کیا میری مرضی اور اجازت کے بغیر لے سکتا ہے یا نہیں؟

(۶) میرے شوہر کا یہ بھی کہنا ہے، کہ میں طلاق زندگی بھر نہیں دوں گا بلکہ دونوں بیویوں کو رکھونگا، اگر تم سوکن کیساتھ رہ سکو تو تمہیں اس شرط پر رکھ سکتا ہوں، کہ نوکری کی ساری تنخواہ جو تم پاتی ہو ہر ماہ ہمیں دینی ہوگی؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شوہر کے ذمہ بیوی کا خرچ واخراجات اور اس کے ساتھ حسن سلوک کرنا لازم ہے، اور سوالنامہ میں ذکر کردہ شوہر کا سلوک ازروئے شرع

درست نہیں ہے، آپ کیلئے شوہر سے طلاق حاصل کر کے یا کسی محکمۂ شرعیہ سے تفریق حاصل کر کے باضابطہ عدت گذارنے کے بعد دوسری جگہ نکاح کرنے کی گنجائش ہوسکتی ہے، اس کے بغیر دوسری جگہ نکاح درست نہ ہوگا، اور بیٹی کے بلوغ تک اس کی پرورش کی ذمہ داری ماں پر ہوتی ہے، لھذا آپ بیٹی کو اسکے بالغ ہونے تک اپنی سرپرستی میں رکھ سکتی ہیں، اس مدت میں شوہر کا بیٹی کو اپنی سرپرستی میں لینا یا اس کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہے، اور جب تک آپ شوہر کی منکوحہ ہیں، اسی طرح جب تک لڑکی کی شادی نہ ہوجائے، آپ دونوں کے تمام خرچ واخراجات کی ذمہ داری اصلاً شوہر پر ہے، اور شوہر کا آپ کو اپنے ساتھ رکھنے کے لئے آپ کی پوری تنخواہ اپنے قبضہ میں لینے کی شرط لگانا جبریہ ہے اس کے لئے یہ مطالبہ جائز نہیں ہے، البتہ اگر شوہر حق زوجیت ادا کرنے کو تیار ہو، اور آپ سے نوکری چھوڑنے کو کہے تو آپ نوکری چھوڑ کر شوہر کے پاس رہ کر حق زوجیت ادا کریں اور شوہر کے ذمہ آپ کا سارا نفقہ ادا کرنا لازم ہوگا۔

عن أبي هريرة –رضى الله عنه– قال: من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يؤذى جاره، واستوصوا بالنساء خيراً فإنهن خلقن من ضلع ، وإن أعوج شئى فى الضلع أعلاه ، فإن ذهبت تقيمه كسرته ، وإن تركته لم يزل أعوج ،فاستوصوا بالنساء خيراً . (صحيح البخارى ، باب الوصاة ، بالنساء النسخةالهندية٢/٧٧٩، رقم: ٤٩٩١، ف: ٥١٨٦)

تجب على الزوج نفقة امرأته المسلمة............ والغنية . (هندية ، الباب السابع عشر ، فى النفقات ،زكريا قديم ١/٥٤٤، جديد ١/٥٩٥)

والأم والجدة أحق بالجارية حتى الخ. (هنديه ، الباب السادس عشر ، فى الحضانة ،زكريا قديم ١/٥٤٢، جديد ١/٥٩٣)

ونفقة الإناث واجبة على الآباء مطلقا مالم يتزوجن . (هندية، الفصل الرابع فى نفقة الأولاد، زكرياقديم ١/٥٦٣، جديد ١/٦٠٩)

له منعها من الغزل وكل عمل . (شامى، كتا بالطلاق، باب النفقة ،زكريا

۳۲۵/۵، کراچی ۳/۶۰۳۵)

وحقه عليها أن تطيعه فی كل مباح يأمرها به وتحته فی الشامية: ظاهره أنه عند الأمر به منه يكون واجباً عليها. (شامی، کتاب النکاح، باب القسم، زکریا ٤/٣٨٨، کراچی ٣/٢٠٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ربیع الاول ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۳۳۱)

صحت مند آدمی پر بیوی کے حقوق کتنے دنوں میں ادا کرنا واجب ہے

سوال: [۱۰۲۷۵]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شادی شدہ باصحت شخص کو اپنی بیوی کے پاس کتنے دن بعد جانا چاہئے کیا ساڑھے چار ماہ کی مدت سے پہلے نہیں جا سکتا ہے، اور اتنے دنوں بعد جانے سے شریعت کی نظر میں بیوی کا حق ادا ہوگا یا نہیں؟ لفظ صحت پر غور فرما کر فتویٰ عنایت فرمائیں؟

المستفتي: انور علی، سیتاپوری، متعلم
مدرسہ شاہی، مرادآباد (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: عام حالات میں چار ماہ کے اندر اندر ایک دفعہ حق زوجیت ادا کرنا شوہر پر واجب ہے، اور اگر بیوی جوان ہو، اور فتنہ کا خطرہ ہو، تو ہر چار یوم میں بیوی کا حق مقدم ہوگا۔

ويسقط حقها بمرة ويجب ديانة أحيانا ولا يبلغ مدة الإيلاء إلا برضاها فی الشامی: أن المراد إيلاء الحرة ويؤيد ذلك أن عمر رضی الله تعالیٰ عنه لما سمع فی الليل امرأة تقول – فوالله لولا الله تخشیٰ عواقبه لزحزح من هذا السرير جوانبه (إلی قوله) عن أبي حنيفةؒ أن لها يوماً وليلة

من كل أربع ليال وباقيها له لأن له أن يسقط حقها في الثلاث بتزوج ثلاث حرائر الخ. (الدرالمختار مع الشامي كتاب النكاح، باب القسم، كوئته٢/٤٣٢، كر چی ٣/٢٠٣، زكريا٤/٣٨٠، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٢/١٤٤، سنن سعيد بن منصور، باب الغازي، يطيل الغيبة عن أهله، دارالكتب العلمية بيروت ٢/١٧٤، رقم: ٢٤٦٣، مصنف عبد الرزاق، المجلس العلمي ٧/١٥٢،رقم: ١٢٥٩٤،وهكذا في احسن الفتاویٰ ١/٣٩٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ جمادی الأول ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر:۲۳/۶۷۳)

بیوی کا شوہر سے برے الفاظ سے بات کرنا گستاخی ہے

سوال: [۱۰۲۷۶]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید اور فریدا دونوں میاں بیوی ہیں، گھریلو جھگڑا ہوا اس پر زید کی بیوی فریدا نے اپنے شوہر کو کہا، کہ آج کی تاریخ سے تم ہمارا کھانا کھاؤ گے تو اپنی ماں سے زنا کرو گے، چونکہ زید کے پاس اپنی زمین نہیں ہے، اور زید اپنی سسرال میں رہ کر زندگی گذار رہا ہے، اور بیوی ہی کی جائداد ہے اور زید کے پاس بھی اپنے والد کی زمین تھوڑی بہت ہے، لیکن وہ زید کی سسرال سے قریب ۶۰/میل کے فاصلہ پر ہے، یہ بات پہلی مرتبہ زید کی بیوی نے زید سے کہی اس سے زید نے قریب ۶/مہینے اپنی بیوی کے یہاں اس کی جائداد سے یا سامان سے کھانا پینا چھوڑ دیا بعد میں زید کی بیوی نے توبہ کی زید کو پھر اپنی جائداد سے کھانے کا حکم دیا اور اپنے شوہر سے معافی طلب کی زید پھر اپنی سسرال میں کھانے پینے لگا پھر کچھ روز بعد زید کی بیوی سے پھر زید کا جھگڑا ہوا، زید کی بیوی نے پھر ان الفاظ کو دہرایا تم میرا کھانا مت کھاؤ، پھر ماں والی قسم دی، اب اس مسئلہ میں علماء دین کیا فتویٰ دیتے ہیں، کہ زید اپنی بیوی کے گھر سے کھانا کھا سکتا ہے یا نہیں؟ اور بیوی پھر توبہ کر رہی

ہے ، کہ اب غلطی نہیں ہوگی ،تو کیا زید بیوی کے ترکہ سے کھانا کھا سکتا ہے،اگر زید کھانا کھا سکتا ہے،تو کسی طرح اس کا کوئی کفارہ بھی دینا ہوگا یا نہیں؟

کفارہ زید کو دینا ہوگا، یا اس کی بیوی کو دینا ہوگا؟ خلاصہ قرآن وحدیث کے حوالہ جات دیکر جواب دیں گے۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق : بیوی کا شوہر کو مذکورہ الفاظ سے مخاطب کرنا مغلظ گالی اور سخت قسم کی گستاخی ہے، بیوی پر لازم ہے، کہ توبہ کرے اور شوہر سے معافی مانگ لے، بیوی چاہے تو اپنی جائداد سے کھلا سکتی ہے، اور شوہر کیلئے کھانا جائز ہے، لیکن شوہر کو سخت سست کہنا جائز نہیں ہے، بلکہ ادب سے بات کرنا لازم ہے، اور اس کا کوئی کفارہ نہیں ہے۔

ویکره أن یدعو الرجل أباه وأن تدعو المرأة زوجها باسمه ، وفی الشامیة: لا بد من لفظ یفید التعظیم الخ. (الدرالمختار ، کتاب الحظر والإباحة، فصل فی البیع ، کوئٹه ۲۹۷/۵، کراچی ۴۱۸/۶، زکریا ۵۹۹/۹، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۳۳۸/۱۱، ۱۹۹/۴۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۵۱۹/۲۵)

شوہر کی نافرمانی کرنا

سوال : [۱۰۲۷۷]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں : کہ ایک بیوی اپنے شوہر کی اجازت اور رضا مندی کے بغیر اپنی بہن بھانجوں سے ملتی ہے، ان کے گھر جا کر رہتی ہے، ساتھ کھاتی ہے لیکن شوہر اپنی بیوی کی ایسی حرکات سے سخت ترین ناراض ہے تو ایسی صورت حال میں بہنوں بھانجوں عزیزوں سے ملنے اور ان کے گھر جا کر رہنے والی بیوی کا شرعاً کیا حکم ہے؟

المستفتي:عبدالواحد، چوراہاگلی، نیو مارکیٹ، برتن بازار، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جب بیوی شوہر کی مرضی کے بغیر شوہر کے گھر سے باہر جاتی ہے، تو شوہر کو تین مرتبہ تنبیہ کرنے کے بعد اس طرح مارنے کا بھی حق ہے کہ جس سے بیوی کی ہڈی نہ ٹوٹے نیز اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسی بیوی کا حال بہت براہوگا، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس سلسلہ میں آیت کریمہ نازل فرمائی ہے!

(**قوله تعالیٰ**) **وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِیْ الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلاَ تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلاً**. (سورۂ نساء آیت: ٣٤)

وقد نص بعض أصحابنا أن للزوج أن يضرب المرأة علىٰ أربع خصال وما هو فى معنى الأربع ترك الزينة والزوج يريد ها وترك الإجابة إذا دعاها إلى فراشه وترك الصلوٰة فى رواية والغسل والخروج من البيت الخ. (روح المعاني، زكريا ٤/٣٨، تحت تفسير رقم الآية: ٣٤، من سورة النساء، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ٤/٢٣٥، رقم: ٤١٤١، حاشية چلبي، امداديه ملتان٣/٢١١، زكريا ٣/ ٦٤٠، ٦٤١، قاضيخان، زكريا جديد١/٢٦٤، وعلى هامش الهندية١/٤٤٣، نفع المفتي والسائل/١١٨)

اسی طرح اگر شوہر بیوی کے بھانجوں اور بہنوں کے یہاں جانے سے بیوی سے ناراض ہوجاتا ہے، تو بیوی کو ہرگز ان کے یہاں نہیں جانا چاہئے، کیونکہ ان کے یہاں جانے کے کے مقابلہ میں شوہر کی فرمانبرداری بہت ضروری اورلازم ہے! فقط اللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۲۳۵/۲۴)

عورت کا بغیر شوہر کے زیادہ دنوں تک میکہ میں رہنا

سوال [۱۰۲۷۸]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری اہلیہ ہر تین ماہ بعد اپنے میکہ جانا چاہتی ہے، اور میکہ میں ایک ماہ یا ۲۵؍دن رہنا چاہتی ہے، میں چاہتاہوں کہ وہ صرف ایک ہفتہ یا ۱۰؍دن میکہ میں رہے، اور زیادہ سے زیادہ ۱۵؍دن میکہ میں رہے، پھر میرے گھر سہارنپور میں آجائے تو اس سلسلہ میں شرعی حکم کیا ہے؟ اور دونوں کے حقوق کیا ہیں؟ مفصل بیان فرمائیں؟ مہربانی ہوگی؟

المستفتي: مبین احمد، کرولہ، اسلام نگر، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورتوں کا شوہر کو گھر چھوڑ کر زیادہ دنوں تک میکے میں رہنا جبکہ شوہر اس بات پر راضی نہیں ہے، کسی طرح مناسب نہیں ہے، اور میکہ میں بہت کم وقت رہنے کا حکم ہے، لہٰذا اگر میکہ دور ہے، تو ہفتہ بھر سے زیادہ نہ رہے، اور اگر میکہ قریب ہے اور اسی شہر میں ہے، تو ایک دن دو دن سے زیادہ نہ رہے، زیادہ دن رہنے میں جانبین میں فتنہ کا اندیشہ رہتا ہے۔

فإن فی کثرۃ الخروج فتح باب الفتنۃ خصوصاً إذا کانت شابۃ والزوج من ذوی الھیئات الخ. (شامی، مطلب فی الکلام علی المؤنسۃ، کراچی ۳/۶۰۲، زکریا ۵/۳۲۴، النھر الفائق، دارالکتب العلمیۃ بیروت ۲/۵۱۵)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۴۷۵۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۴/۳/۱۴۱۷ھ

ناراضگی کی وجہ سے علیٰحدہ رہنے سے نکاح ختم نہیں ہوتا

سوال: [۱۰۲۷۹]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید اپنی بیوی اور بچوں سے تقریباً چار سال سے الگ ہے چار سال پہلے زید کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے، ایکسیڈنٹ کے اندر ایک پاؤں سے معذور ہوگیا ہے، زید پرائیویٹ ڈرائیور ہے، پانچ ماہ

ہوسپٹل میں زیرِعلاج رہا، ہوسپٹل سے واپس آیا تو پندرہ دن بیوی اور بچوں کے ساتھ رہا اسی دوران بیوی سے ہمبستر ہوا، اس موقع پر بیوی بچوں سے کہا کہ ہم سب مل کر اپنے آبائی وطن میں یا کسی دوسری جگہ رہیں گے، اس کیلئے زید کی بیوی تیار نہیں ہوئی، زید نے اپنی بیوی کو بہت سمجھایا لیکن وہ نہیں مانی زید اپنے بڑے سالہ اور سسر سے بھی رابطہ کیا اور اس وقت بہت پریشانی کے عالم میں ہے، بیوی نے بچوں کو بھی جدا کر دیا اور اکیلی بچوں کے ساتھ رہتی ہے، زید کی تین لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے، بچے سب جوان ہیں، زید نے بیوی سے چار سال پہلے بات کی تھی، تب سے اب تک بات نہیں ہوئی ہے، زید کی عمر اس وقت پچپن سال ہے، اب زید کو کیا کرنا چاہئے، چار سال میں زید تین چار مرتبہ بیوی سے ملنے گیا، ہر مرتبہ دروازہ بند ہی رکھا گیا پھر زید نے اپنی بیوی بچوں سے ملنا چھوڑ دیا؟

المستفتی: ناصر احمد ابن ٹپو صاح،
مکان نمبر ۸۵۰، شیٹی کیرے گیٹ،
چکنا یکنا ھلی، ٹمکور، کرناٹک

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سوالنامہ میں ذکر کردہ تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ زید نے اپنی بیوی کو طلاق نہیں دی ہے، صرف ۴/۵ سال تک میاں بیوی ایک دوسرے سے الگ رہے ہیں، تو ایسی صورت میں میاں بیوی کے ایک دوسرے سے الگ رہنے سے نکاح پر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے چاہے رضامندی وخوشی سے الگ رہیں، یا ناراضگی سے دونوں صورتوں میں جانبین کا نکاح بدستور باقی ہے، زید شوہر کے لئے بیوی کو اپنے پاس رکھنے کا حق ہے، اور بیوی کو زید شوہر کے پاس رہنے کا حق ہے، اور میاں بیوی کے بارے میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ شوہر بیوی کا حق ادا کرے، اور بیوی شوہر کا حق ادا کرے، اور ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ (مستفاد: محمودیہ جدید ڈابھیل ۱۲/۲۵۱)

عن الأحوص في حديث طويل أن النبي صلى الله عليه وسلم ذكر

قصة فقال: واستوصوا بالنساء خيراً فإنما هن عوان عندكم .... (إلىٰ قوله) ألا إن لكم على نساء كم حقا ولنساء كم عليكم حقاً ، فأما حقكم على نساء كم فلا يؤطين فرشكم من تكرهون ولا يأذن في بيوتكم لمن تكرهون ألا وحقهن عليكم أن تحسنوا إليهن في كسوتهن وطعامهن . (ترمذی، باب ما جاء في حق المرأة على زوجها ، النسخة الهندية ١/ ٢٢٠، دارالسلام ، رقم : ١١٦٣، سنن ابن ماجه ، حق المرأة على الزوج ، النسخة الهندية ١/ ١٣٣، رقم : ١٨٥١)

عن أبي هريرة – رضي الله تعالىٰ عنه – عن النبي صلى الله عليه وسلم قال : إذا دعا الرجل امرأته إلىٰ فراشه ، فأبت أن تجيئي ، لعنتها الملائكة حتى تصبح . (صحيح البخاري ، باب إذا باتت المرأة مهاجرة فراش زوجها ، النسخة الهندية ٢/ ٧٨٢، رقم: ٤٩٩٩، ف: ٥١٩٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۹۵۳/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۳/۹ھ

شوہر کے بلانے پر بیوی کا اس کے پاس نہ جانا

سوال: [۱۰۲۸۰]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہماری بہن پونے دوسال سے زیادہ عرصہ سے ہمارے گھر پر ہے، بہنوئی رکھنے کو تیار ہیں، بہن جانا نہیں چاہتی ہے، وہ کہتی ہے جب میرا مقصود پورا ہو جائیگا، چلی جاؤں گی، ان کو ماہواری نہیں ہوتی ہے، بہن کی عمر اس وقت چالیس سال ہے، شادی ہوئے تین سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے، حال ہی میں بہنوئی کی طرف سے یہ آواز آئی کہ جب وہ یہاں رہنا نہیں چاہتی تو سامان اٹھوالے بہن کو سامان اٹھوانا بھی منظور ہے، کیا اس حالت میں بہن کا ہمارے یہاں رہنا صحیح ہے، شریعت کیا کہتی ہے؟

المستفتي:غیاث الدین محلّہ کٹارشہید، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگرشوہر بلا رہا ہے، اورآپ کی بہن نہیں جارہی ہے، تو آپ کی بہن عنداللہ سخت گنہگار اور شوہر کی نافرمان ثابت ہوگی، آپ سب لوگوں پر لازم ہے، کہ بہن کوفوراً شوہر کے حوالہ کردیں اور بہن پرلازم ہے، کہ بلا تاخیر شوہر کے پاس جاکراس کا حق ادا کرے، حدیث شریف میں آیا ہے، کہ اگر میں کسی انسان کوسجدہ کرنے کی اجازت دیتا تو عورت کوحکم کرتا کہ وہ اپنے شوہر کوسجدہ کیا کرے۔

عن عائشة– رضي الله عنها– أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: لو أمرت أحداً أن يسجد لأحد، لأمرت المرأة أن تسجد لزوجها.

(سنن ابن ماجه، باب حق الزوج على المرأة، النسخة الهندية ١/ ١٣٣، دارالسلام رقم: ١٨٥٢، مشكوٰة شريف ٢/ ٢٨٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفااللہ عنہ
۲۶؍ربیع الاول ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۳۸۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۲۶/ ۳/ ۱۴۱۴ھ

بیوی کا شوہر وبچوں کو چھوڑ کر غیر مرد کے ساتھ رہنا

سوال: [۱۰۲۸۱]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری بیوی حمیدہ خاتون کوایک شخص بہلاکر لے گیا، اور ناجائز طریقہ سے اپنے پاس رکھے ہوئے ہے، میری بیوی سے چار بچے ہیں، ایک لڑکی جس کی عمر ۱۶؍سال ہے، دوسری لڑکی کی عمر ۱۳؍سال ہے، دولڑکے ایک بارہ سال کا ہے، اور دوسرا ساڑھے دس سال کا ہے، میری بیوی ان سب کوچھوڑ کر غیر مرد کیساتھ ناجائز طریقہ پر رہ رہی ہے، میں نے اسے طلاق بھی نہیں دی ہے، تو دریافت یہ کرنا کہ ہے میری بیوی کا اس طرح غیر مرد کیساتھ رہنا

کیسا ہے؟ اور اس شخص کا میری بیوی کو ناجائز طریقہ سے رکھنا کیسا ہے؟ شریعت اسلامیہ کی نظر میں ان کے یہ کرتوت کیسے ہیں، کیا بیوی پر اپنے شوہر اور بچوں کے پاس آ کر رہنا لازم نہیں ہے، شرعی حکم تحریر فرما دیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں آپ کے طلاق دیئے بغیر آپ کی بیوی کا غیر مرد کے ساتھ رہنا اور اس شخص کا اس کو رکھنا بدکاری، اور زنا کاری حرامکاری اور گناہ عظیم ہے، اگر اسلامی حکومت ہوتی تو ان دونوں کو سنگسار کر کے ہلاک کر دیا جاتا، لہٰذا اس کو چاہیے کہ فوراً اس شخص سے علیحدہ ہو کر آپ کی تابعداری اختیار کرے اور اپنے گھر واپس آ جائے، اور اس فعل حرام سے توبہ واستغفار کرے۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ ۸/ ۴۱۸)

وَلاَ تَقْرَبُوْا الزِّنیٰ إِنَّهٗ کَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِیْلاً . (بنی اسرائیل، آیت: ۳۲)

مَنْ یَأْتِ مِنْكُمْ بِفَاحِشَةٍ مُبَیِّنَةٍ یُضَاعَفُ لَهَا الْعَذَابُ إِلَیْهِمْ فِیْ الدُّنْیَا وَالْآخِرَةِ . (النور، آیت: ۲۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۵۸۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۴/۱۴ھ

حقیقی اولاد کے بارے میں بیوی پر شبہ کرنا

سوال: [۱۰۲۸۲]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص جو اپنی حقیقی اولاد کے بارے میں اپنی بیوی سے کہتا ہے، کہ مجھے اس بات میں شبہ ہے کہ یہ اولاد میری ہے، اور میرے نطفہ سے ہے، اس شخص کی اس بدکلامی کی دنیا وآخرت میں کیا سزا ہے؟

المستفتي: عبدالرؤف، گونڈوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اپنی بیوی کے بارے میں بلا ثبوت اس طرح شک وشبہ کرنا حرام ہے، ایسا کرنے والا مرتکب حرام ہے، دنیا میں اس گناہ کی نحوست اٹھانی پڑے

گی، اور آخرت میں اللہ کے یہاں اس کی سزا الگ ہوگی جس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، اور اس طرح کی بدزبانی کے جملوں سے بیوی کو ایذا پہونچانا گناہ کبیرہ ہے، اب تک جو کچھ ہو چکا ہے، اس سے توبہ کرنا لازم ہے، ہاں البتہ بیوی اگر نامحرم مردوں سے بات چیت اور اختلاط سے باز نہیں آتی تو وہ بھی مرتکب گناہ کبیرہ ہوگی، اس پر بھی توبہ کرنا لازم ہے۔

ومنه مايحرم كالظن في الالٰهيات والنبوات وحيث يخالفه قاطع وظن السوء بالمؤمنين ففي الحديث: إن الله تعالىٰ حرم من المسلم دمه وعرضه وأن يظن به ظن السوء. (روح المعاني، سورة الحجرات تحت تفسير الآية: ١٢، جز ٢٦، مكتبه زكريا ١٤/ ٢٣٥)

عن عبد الله بن عمرو عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: ليس المؤمن بالطعان ولاباللعان ولا الفاحش ولا البذئ. (شعب الإيمان للبيهقي، دارالكتب العلمية بيروت ٥/٢٨٦، رقم: ٦٦٧٦، مشكوٰة ١/ ١٤٠)

عن أبي موسىٰ عن النبي ﷺ كل عين زانية والمرأة إذا استعطرت فمرت بالمجلس فهي كذا وكذا يعني زانية. (سنن الترمذي، الأداب، باب ماجاء في كراهية خروج المرأة متعطرة، النسخة الهندية ٢/١٠٦، دارالسلام رقم: ٢٧٨٦، مشكوٰة /٩٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم رجب ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۸۸۴/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۴/۷/۱۴۲۶ھ

عورت عیسائی ہوگئی اور بچے اس کے قبضہ میں ہیں، تو شوہر پر کوئی مؤاخذہ نہیں

سوال: [۱۰۲۸۳]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خالد کی بیوی مرتد ہو کر عیسائی ہوگئی ہے، شخص مذکور کے اسی بیوی سے کئی بچے ہیں، جو بیوی کیساتھ

ہیں، اب بیوی کو اپنے پاس لانا طاقت سے باہر ہے، اور بچوں کو بھی بیوی سے جدا کرنا اور لانا قانونی طور پر استطاعت سے باہر ہے، اب ان حالات میں بیوی کیساتھ بچوں کو چھوڑ دینا کیسا ہے؟ کیا شرعاً آخرت میں مؤاخذہ ہوگا یا نہیں؟

المستفتي: امیر الاسلام، کچھاڑی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر بیوی سے علیٰحدہ کر کے اولاد کو اپنے پاس لا کر دین اسلام کی تربیت دینے پر شوہر قادر نہیں ہے، تو عنداللہ شوہر سے باز پرس ومؤاخذہ نہ ہوگا۔

لقوله تعالیٰ: لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْساً إِلَّا وُسْعَهَا. (الآیة: سورہ بقرہ آیت: ٢٨٦)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم/ ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۰۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/ ۱۲/ ۱۴۱۰ھ

نافرمان بیوی کا شوہر کے حقوق ادا نہ کرنا

سوال: [۱۰۲۸۴]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری بیوی شاہانہ ۵/ ماہ قبل اپنی چچیری بہن کی شادی میں کچھ کپڑا زیور اور بچے کیساتھ اپنے والد ریاست خاں اور بھائی کے ساتھ گئی تھی، شادی کے وقت سے میکہ میں جا کر بیٹھ گئی ہے، مجھے نہیں معلوم کہ وہاں جا کر اس پر کیا دباؤ پڑ رہا ہے، کہ وہ آنے کیلئے تیار نہیں ہے، میرے والدین بھائی بہن، عزیز واقارب اور محلّہ والوں نے اس کو لانے کی ہر چند کوششیں کی ہیں کہ وہ آ جائے، مگر اس کے والدین کسی مشیر کے دباؤ میں ہیں، جس کی وجہ سے وہ نہیں آ رہی ہے، بلکہ اس کے والدین نے ابھی تک کئی بار مجھکو جان سے مارنے اور طلاق دلوانے کی دھمکیاں دی ہیں، جس کی وجہ سے میری والدہ والدا ور پورا

گھر پریشانی میں مبتلا ہے، میں اپنی بیوی بچے کی وجہ سے بے حد پریشان ہوں، آپ سے گذارش ہے کہ ایسی صورت میں آپ ہماری مدد فرمائیں، اور میری بیوی بچے کو ملانے کی تدبیر بیان فرمائیں؟ مہربانی ہوگی؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر آپ کی بیوی بلا کسی شرعی وجہ کے میکہ جا کر بیٹھ گئی ہے، اور آپ کی طرف سے ظلم وزیادتی نہیں ہوئی ہے، محض نافرمانی کے طور پر میکہ جا کر بیٹھ گئی ہے تو بیوی سخت گنہگار ہوگی، اس پر لازم ہے کہ واپس آ کر شوہر کے حقوق کی ادائیگی کیساتھ زندگی گذارے اور خدا کا خوف رکھے اور آپ پر بھی لازم ہے، کہ بیوی کے حقوق کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہ کریں، اور اسکے ساتھ خوشگوار طریقہ سے زندگی گذاریں۔

عن أبي هريرة– رضى الله عنه – قال النبى ﷺ إذا باتت المرأة مهاجرة فراش زوجها لعنتها الملائكة حتى ترجع. (بخاری شریف، باب إذا باتت المرأة مهاجرة فراش زوجها، النسخة الهندية۲/ ۷۸۲، رقم: ۴۹۹۹، ف:۵۱۹۴)

عن جابر بن عبد الله قال: قال رسول الله ﷺ ثلثة لاتقبل لهم صلاة ولايصعد لهم إلیٰ الله حسنة السكران حتى يصحو، والمرأة الساخط عليها زوجها الخ. (المعجم الأوسط دارالفكر ٦/ ٤٠٨، رقم: ٩٢٣١، صحيح ابن خزيمه ،المكتب اسلامى ، شعب الإيمان للبيهقى، دارالكتب العلمية بيروت ٥/ ١١،رقم: ٥٥٩٢، صحيح ابن حبان ، دارالفكر ٥/ ٢٧٣، رقم: ٥٣٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ رجب ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۵۰۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/ ۷/ ۱۴۲۵ھ

کیا بیوی میکے میں شوہر کی مرضی کے مطابق قیام کرے گی؟

سوال: [۱۰۲۸۵]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں سہیل ناصر رحمت نگر مرادآباد کا رہنے والا ہوں میرا نکاح گذشتہ سال سعادت گنج ضلع بارہ بنکی میں الحاج محمد نفیس صاحب کی بیٹی سے ہوا تھا، اگر میری اہلیہ اپنے والدین کے گھر جاتی ہے، تو والدین کی مرضی کے مطابق وہاں قیام کرے گی یا شوہر کی مرضی کے مطابق یعنی جتنے دن کی کی اجازت شوہر کی طرف سے ملے گی اتنے دن یا جتنے دن والدین چاہیں گے اتنے دن، (ہر مرتبہ میری طرف سے تقریباً بارہ سے پندرہ یوم کی اجازت ہے) نیز احقر اس بات کی وضاحت کا متمنی ہے کہ والدین کے گھر قیام کے دوران اہلیہ کو واپس بلانے کے سلسلہ میں شرعی طور پر شوہر کو کیا حقوق حاصل ہوں گے؟

المستفتي: سہیل ناصر، رحمت نگر، کرولہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورت اپنے میکہ میں اتنے دن قیام کرسکتی ہے، جتنے دن کی شوہر اجازت دے، شوہر کی رضامندی کے بغیر اس سے زیادہ قیام کرنے کی صورت میں وہ نافرمان شمار ہوگی، اور شوہر کو اگر ضرورت ہو تو جتنے دن اس نے قیام کی اجازت دی ہے، اس سے پہلے بھی اس کو واپس بلا سکتا ہے۔

ولا يمنعها من الخروج إلى الوالدين في كل جمعة إن لم يقدرا على إتيانها وفي الشامي: فإن قدرا لا تذهب وهو حسن وقد اختار بعض المشائخ منعهامن الخروج إليهما والحق الأخذ بقول أبي يوسف إذا كان الأبوان بالصفة التي ذكرت وإلا ينبغي أن يأذن لها في زيارتهما في الحين بعد الحين على قدر متعارف أما في كل جمعة فهو بعيد. (شامی، کتاب الطلاق، باب النفقة، زکریا ۳۲٤/۵، کراچی ۶۰۲/۳)

وخارجة من بيته بغير حق وهي الناشزة حتى تعود. (شامی، کتاب الطلاق، باب النفقة زکریا ۲۸۶/۵، کراچي ۵۷۶/۳)

عن زيد بن أرقم رضي الله عنه عن النبي ﷺ قال: إذا وعد الرجل

أخاه ومن نيته أن يفي فلم يف ولم يجئى للميعاد فلا إثم عليه . (ابو داؤد شريف، باب في العدة، النسخة الهندية ٢/ ٦٨٢، دارالسلام رقم: ٤٩٩٥، المعجم الكبير للطبراني ، داراحياء الثرات العربي ١٩٩/٥، رقم: ٥٠٨٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸؍ ۹۵۹۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۵/۵ھ

بیوی کا شوہر کو چھوڑ کر اسکی مرضی کے بغیر خالو کے ساتھ رہنا

سوال: [۱۰۲۸۶]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری بیوی محشر جہاں بنت عبدالرشید موضع مانیا والا گڑھی، اب سے تقریباً ساڑھے تین سال پہلے خود ہی اپنے غلط چال چلن کے نتیجہ میں فرار ہوگئی، بہت سے زیورات کپڑے اور نقدی بھی چرا کر اپنے ساتھ لے گئی، جبکہ میں یعنی اس کا شوہر بسلسلہ روزگار سعودی عرب میں رہتا تھا، شوہر نے اپنی بیوی کو لانے کیلئے کئی لوگوں کو بیوی کے میکہ بھیجا لیکن بیوی نے آنے سے انکار کر دیا جو لوگ بیوی کو لینے کیلئے گئے تھے، ان کو یہ جواب دیا کہ میں نہیں جاؤں گی، میرے شوہر سے کہدو کہ وہ دوسری شادی کرلیں، سعودی عرب سے لوٹ کر شوہر نے بھی اپنی بیوی کو اپنے گھر لانے کی بہت کوشش کی لیکن بیوی نے آنے سے انکار کر دیا، مجبور ہو کر شوہر نے اپنی بیوی کو بلانے کیلئے عدالت میں حق زوجیت کا ایک دعویٰ دائر کر دیا، بیوی نے حق زوجیت کے مقدمہ کی جواب دہی نہ کر کے دوسرے جھوٹے مقدمے قائم کر دیئے، جو خارج ہوگئے، اس کے بعد میاں بیوی کا آپسی ایک فیصلہ ہوا، جو محلّہ کے ذمہ دار لوگوں کے سامنے ہوا لیکن بیوی اس فیصلہ سے بھی مکر گئی اور اب بیوی نے ایک نیا مقدمہ قائم کیا، یہ مقدمہ بیوی نے اپنے دور کے خالو کے پتہ سے کیا ہے، کیونکہ بیوی اس وقت اپنے ایک دور کے خالو کے یہاں مقیم ہے، جبکہ بیوی کے ماں باپ اور بھائی اپنے گاؤں مانیا والا گڑھی میں رہتے ہیں، صرف تنہا میری بیوی قصبہ

سیوہارہ میں اپنے خالو کے پاس رہنے چلی گئی ہے، اور قریب ایک سال سے اپنے خالو کے ساتھ رہ رہی ہے، کیا بیوی کا اپنے شوہر کو چھوڑ کر شوہر کی مرضی کے خلاف اپنے خالو کے یہاں رہنا جائز ہے؟

المستفتي: نعمت اللہ، محلّہ چھپی پاڑہ، نگینہ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: شوہر کی اجازت کے بغیر عورت کا گھر سے نکلنا اور دوسرے کے یہاں رہنا قطعاً جائز نہیں ہے، حدیث شریف میں آیا ہے، کہ جس عورت کا شوہر ناراض ہو اس کی نماز قبول نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کی کوئی نیکی اللہ کے دربار میں پہونچتی ہے، بلکہ اس پر لعنت برستی رہتی ہے، اسلئے عورت کیلئے جائز نہیں ہے کہ شوہر کو اس طرح پریشان کرے، بلکہ شوہر کی اطاعت اور رضا جوئی اس کے ذمہ لازم ہے اور اگر شوہر سے نااتفاقی کی بنا پر صلح یا تفریق تک الگ رہ رہی ہے، تو اپنے ماں باپ کے پاس رہنا ضروری ہے، اسلئے کہ خالو شرعی طور پر محرم نہیں ہوتے ہیں، لٰھذا شوہر کی زوجیت میں رہ کر غیر محرم کے یہاں رہنا قطعاً جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۹/ ۲۱۸، جدید ڈابھیل ۱۸/ ۵۸۱، ۵۸۲)

للزوج أن يضرب زوجته على أربعة أشياء ومافى معنا ها ومنه ماإذا كشفت وجهها لغير محرم أو كلمت أجنبياً. (البحرالرائق، كتاب الحدود، باب حد القذف، كوئٹه ٥/ ٤٩، زكريا ٥/ ٨٢)

عن جابر بن عبد الله قال قال رسول الله ﷺ ثلاثة لا تقبل لهم صلوة ولا يصعد لهم إلىٰ الله حسنة السكران حتى يصحو والمرأة الساخط عليها زوجها الخ. (المعجم الأوسط، دارالفكر ٦/ ٤٠٨، رقم: ٩٢٣١، صحيح ابن خزيمه، المكتب الإسلامى ١/ ٤٦٦، رقم: ٩٤٠، صحيح ابن حبان، دارالفكر ٥/ ٢٧٣، رقم: ٥٣٦٤، شعب الإيمان للبيقهى، دارالكتب العلمية بيروت٥/ ١١، رقم: ٥٥٩٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۸۵۴/۳۸)

نافرمان بیوی اور اولاد کے نفقہ کا حکم

سوال: [۱۰۲۸۷]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری دو بیویاں ہیں، پہلے ایک سے نکاح کیا اس سے تین لڑکے ایک لڑکی ہے، اور سب شادی شدہ بالغ ہیں، پھر میں نے پہلی بیوی کی اجازت سے دوسرا نکاح کیا اس پر لڑکوں نے گھر سے نکال دیا، اور پہلی بیوی نے بھی مجھے نکالنے میں ان کا ساتھ دیا اور مکان اور باغ پر زبردستی قبضہ کرلیا، جبکہ پہلی بیوی کے نام میں نے نو بیگہ زمین کردی ہے، اور ان بچوں کے نام بھی پانچ پانچ بیگہ زمین کردی ہے، فی الحال میں اپنے قبضہ کی زمین سے کچھ آمدنی حاصل کرتا ہوں، تو پہلی بیوی اور بچے اس کو چھین لیتے ہیں، اور منع کرنے پر مارتے ہیں، اور میرے ذمے دوسری بیوی اور اس کی نابالغ پانچ اولاد کا خرچہ بھی ہے، جو بمشکل اٹھا پاتا ہوں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا میرے لئے پہلی بیوی کو نفقہ دینا ضروری ہے، جبکہ وہ میرے مکان اور باغ پر قابض ہے، اور مجھے گھر سے نکال دیا ہے، اور دینے کی صورت میں دوسری بیوی کے نابالغ بچے بھوکے رہتے ہیں، وضاحت کیساتھ بیان فرمائیں اور نہ دینے کی صورت میں کیا میں گنہگار رہوں گا؟

المستفتي: اقرار نبی، سرائے کھجور، تھانہ چھجلیٹ، مراد آباد۔ یوپی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: شریعت نے ایک مرد کو بیک وقت اپنے نکاح میں چار عورتوں کے رکھنے کی اجازت دی ہے، لھذا اس دوسری شادی کی وجہ سے لڑکوں کا اپنے باپ کو گھر سے نکال دینا اور باپ کی مملوکہ زمین کی آمدنی چھیننا جائز نہیں ہے، نیز ایسی صورت میں پہلی بیوی شرعاً ناشزہ کہلائے گی، اور نافرمان بیوی اور نافرمان اولاد کیلئے باپ کے اوپر کوئی خرچہ وغیرہ لازم نہیں ہے، اس کے باوجود آپ نے زمین ان کو دی ہے جو نان نفقہ کے

خرچہ سے بھی زیادہ ہے حالانکہ شرعاً لازم نہیں تھا، اور آپ کو آپ کے گھر سے نکالنے کا کسی کو حق نہیں ہے، بلکہ آپ کو حق ہے کہ نافرمان بیوی اور نافرمان اولاد کو گھر سے نکال دیں، اور دوسری بیوی اور اس کے نابالغ بچوں کا خرچہ آپ کے اوپر لازم ہے، اور پہلی بیوی کی بالغ اولاد کو کچھ نہ دینے سے آپ گنہگار نہیں ہوں گے۔

وصح نكاح أربع من الحرائر والإماء . (درمختار كتاب النكاح، زكريا ٤/١٣٨، كراچی ٣/٤٨)

فَانكِحُوا مَاطَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبَاعَ. (النساء :٣)

ولا نفقة للناشزة لفوات التسليم بمعنىٰ من جهتها وهو النشوز . (بدائع الصنائع، كتاب النفقة، فصل في شرط وجوب النفقة، زكريا٣/٤٢٨، كراچی ٤/٢٢، شامی، زكريا ٥/٣٢٩، كراچی ٣/٦٠٦، هدايه، اشرفی٢/٤٣٨، تنقيح الفتاوىٰ، الحامديه، دار الكتب العلمية بيروت ١/٧٥)

ولا يمنع الشخص من تصرفه فى ملكه . (درمختار، مطلب إقتسموا داراً وأراد كل منهم، فتح، باب لهم ذلك ! زكريا٨/١٥٢، كراچی ٥/٤٤٦، تنقيح الفتاوىٰ الحادميه، دار الكتب العلمية بيروت ١/٣١١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۸۶۱/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۶/۲۰ھ

مطلقہ کیلئے شوہر سے کن کن چیزوں کے مطالبہ کا حق ہے؟

سوال: [۱۰۲۸۸]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری شادی ۲؍مئی ۲۰۰۵ء کو شاہ عالم ولد نسیم وارثی سے ہوئی جو محلّہ ٹھیرا میں رہتے ہیں، اور شادی سے پہلے سسرال والے آتے رہتے تھے، شادی کے بعد چار مہینہ مجھے اپنی سسرال میں رکھا اسکے بعد مجھے طرح طرح سے پریشان کرنے اور میرے ماں باپ کو برا بھلا کہنے لگے، اسی عرصہ میں ایک بچہ پیدا ہوا جو میرے پاس ہے، اور دوسرا بچہ میرے

شکم میں ہے،جسکی تاریخ دوماہ باقی ہے، دوسروں کے کہنے میں آ کر میرے شوہر ساس سسرا ور دیور نے مجھے پریشان کیااور کئی بار مجھے گھر سے نکالدیا لیکن میرے والد نے مجھے سسرال بھیج دیا، شادی کے چار مہینہ کے بعد میرا زیور مجھ سے چھین لیا آخر ۹/اپریل کی شام کومیرے سسرنسیم وارثی نے میرا بچہ چھین کرا ور ہاتھ میں پرچہ دیکر مجھے گھر سے نکالدیا میں اپنے میکہ آ گئی میرے والد نے ہر چند کوشش کی لوگوں نے سمجھانے کی کوشش کی امن کمیٹی کے لوگوں نے بھی سمجھایا لیکن میری سسرال والے مجھے طلاق دینے پر آمادہ رہے، پھر مجھے مجبور ہوکر پولس کا سہارا لینا پڑا ، افسر ایس پی صاحب اور سی او صاحبہ مہیلا نے کوشش کی اور میرا بچہ مجھے دلوایا لیکن میرے شوہر نے ایس پی صاحب اورشہر امام کے سامنے طلاق دیدی اس کے بعد فتویٰ لاکر طلاق کی تصدیق کردی ، میں ایک دین دار باپ کی بیٹی ہوں اور دینداری مجھے پسند ہے مہربانی فرماکر مجھے بتایا جائے، کہ کیا نیچے لکھا مطالبہ میں اپنے شوہر شاہ عالم سے کرسکتی ہوں ؟ دین مہر میں بیس ہزار روپیہ، عدت کا نفقہ چودہ ہزار ، نرسنگ ہوم خرچ دس ہزار، ۲۰۰۰ء میں جواب آیا پینتیس ہزار (۳۵۰۰۰) ،تاریخ شادی طے ہوئی چار ہزار، علاوہ شادی کے جہیز ایک لاکھ دس ہزار، دوبچوں کا خرچ دو ہزار۔میزان دو لاکھ انتیس ہزار (۲۲۹۰۰۰) روپئے ہوئے۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق :(۱)دین مہر بہرحال آپ کا شرعی حق ہے،اسکے مطالبہ کا حق آپ کو ہر وقت حاصل ہے۔

وتجب العشرة إن سماهاأو دونها ويجب الأكثر منها إن سمى الأكثر ويتأكد عند وطء أو خلوة صحت من الزوج أوموت أحدهما .

(شامی، کتاب النکاح، باب المهر ، زکریا ٤/۲۳۳، کراچی ۳/۱۰۲)

وحكى الطحاوى فى هذه المسئلة إجماع الصحابة من الخلفاء الراشدين وغيرهم لأن المهر وجب بنفس العقد –إلىٰ قوله – إلا أن

الوجوب بنفس العقد ثبت موسعا ويتضيق عند المطالبة والدين المضيق واجب القضاء . (بدائع الصنائع ، زكريا ٢/٥٨٦، كراچى ٢/٢٩٢)

(۲) عدت کا خرچہ جانبین کی رعایت اور معیار زندگی کے اعتبار سے چند افراد کے ذریعہ سے متعین ہونا چاہئے، نہ بے تکہ زیادہ مطالبہ کی اجازت ہے، اور نہ ہی اتنا کم ہو جس سے تین ماہواری کے درمیان کھانے پینے کی ضرورت پوری نہ ہو سکے، اور چودہ ہزار روپیہ جو لکھا گیا ہے، وہ آپ کا اپنی طرف سے مطالبہ ہے اس کا اعتبار نہیں ہے، بلکہ اعتبار اسی کا ہوگا جس کو غیر جانبدار سمجھدار لوگ معتدل اور درمیانی درجہ کا خرچہ متعین کریں گے۔

عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ . (البقرة: ٢٣٦)

ولا يقدر نفقتها بالدراهم والدنانير على أي سعر كانت بل يقدر بها على حسب اختلاف الأسعار غلاء ورخصا رعاية للجانبين. (عالمگیری ، الباب السابع عشر فی النفقات ، زكريا قديم ١/٥٤٧، جديد ١/٥٩٧، بدائع الصنائع ، كراچى ٤/٢٣، زكريا ٣/٤٢٩)

وتجب لمطلقة الرجعي والبائن – إلىٰ قوله – والنفقة والسكنىٰ والكسوة وفي الشامية وفي المجتبىٰ: نفقة العدة كنفقة النكاح . (شامى، مطلب في نفقة المطلقة ، زكريا ٥/٣٣٣، كراچى ٣/٦٠٩)

(۳) نرسنگ ہوم کا خرچہ شوہر کے اوپر اس وقت لازم ہوتا ہے، جب شوہر کے مشورہ اور اسکی اجازت سے خرچ کیا گیا ہو جس نرسنگ ہوم میں علاج اور ولادت ہوئی ہے، اگر شوہر نے اس نرسنگ ہوم میں علاج اور ولادت کی اجازت دی ہے، تب اسکے اوپر خرچ لازم ہوگا، اور اگر شوہر کا نہ مشورہ رہا ہے اور نہ شوہر نے اجازت دی ہے تو ایسی صورت میں اس کا خرچہ شوہر پر لازم نہیں۔

وأجرة القابلة عليها إن استاجرتها ولو استاجرها الزوج فعليه .

(عالميگرى ، الباب السابع عشر فى النفقات ، زكريا قديم١/٥٤٩، جديد١/٥٩٩، الدرمع

الرد،زکریا ۲۹۱/۵، کراچی ۵۷۹/۳)

(۴) ۲۰۰۰ء میں ۳۵/ ہزار روپیہ جواب کے خرچ کا کیا مطلب ہے،؟ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض جگہ جواب کے نام سے لڑکے والوں کی طرف سے سوٹوں کا مطالبہ ہوتا ہے، جس میں چالیس چالیس پچاس پچاس اور ستر ستر سوٹوں کا مطالبہ ہوتا ہے، اور لڑکی والے دباؤ میں آ کر مجبوراً دیتے ہیں، اگر جواب کا یہی مطلب ہے تو اس کی واپسی لازم ہے اور اگر کوئی دوسرا مطلب ہے تو واضح فرما دیں۔

لو أخذ أهل المرأة شيئاً عند التسليم فللزوج أن يسترده لأنه رشوة. (شامي، كتاب النكاح، باب المهر مطلب أنفق على معتدة الغير، زكريا ٣٠٧/٤، كراچی ١٥٦/٣، هنديه، زكريا قديم ٣٢٧/١، جديد ٣٩٣/١)

إن أخذه من غير عقد لم يملكه و يجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور، قديم ٣٧/١، دار البشائر الإسلامية ٣٥٩٥/١، تحت رقم الحديث: ٥٩)

(۵) شادی کی تاریخ طے ہوتے وقت چالیس ہزار روپیہ لڑکی والوں نے اپنے اختیار اور مرضی سے خرچ کیا ہے لہٰذا تو طلاق کے وقت لڑکی والوں کو اسکے مطالبہ کا حق نہیں ہے، بلکہ یہ مہمانداری اور تبرع کے درجہ میں ہے۔

وأما إذا كانت بغير أمره فظاهر لأنه لا يملك الرجوع على المحيل فكان تبرعاً بابتدائه وانتهائه. (بدائع الصنائع، شرائط الحوالة، زكريا ٩/٥، كراچی ١٦/٦)

(٦) جہیز کا سامان جس حالت میں بھی ہو اسی حالت میں لڑکی کو ملنا ضروری ہے، اور اسکے علاوہ شادی کے موقع پر لڑکی والوں نے جو خرچ کیا ہے، اسی طرح لڑکے والوں نے جو خرچ کیا ہے، وہ اپنے اختیار سے خرچ کیا ہے، لہٰذا نہ لڑکی والوں کو لڑکے والوں سے مطالبہ کا حق ہوگا، نہ لڑکے والوں کو لڑکی والوں سے مطالبہ کا حق ہوگا۔

وأما إذا كانت بغير أمره فظاهر؛ لأنه لا يملك الرجوع على

المحيل ، فكان تبرعاً بابتدائه و انتهائه. (بدائع الصنائع ، شرائط الحوالة ، زكريا٥/٩، كراچی ٦/١٦)

(۷) بچوں پر خرچ کرنیکا اختیار باپ کو حاصل ہے ان کی پڑھائی کے خرچ کا اختیار بھی باپ کو ہے، اگر باپ بچوں کو صرف روٹی کھلا کر پالنا چاہے، تو اسکے اختیار میں ہے، اسی طرح اگر باپ ان کو مفت کے اسکول اور مدرسہ میں پڑھانا چاہے، تو اسکے اختیار میں ہے، اس لئے باپ سے بچوں کے خرچ کے نام پر اپنی مرضی سے جو چاہے مطالبہ کا حق نہیں ہے، اور یہ جو مسئلہ لوگوں کے ذہن میں ہے کہ لڑکے کو سات سال تک اور لڑکی کو بالغ ہونے تک رکھنے کا حق ماں کو حاصل ہے، اسکے بعد باپ کو حاصل ہو جاتا ہے، شریعت کا حکم ایسا ہی ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جتنے دن ماں کے پاس رہیں گے اتنے دنوں میں ماں جیسا چاہے، بچوں کے خرچ کا مطالبہ باپ سے کرے، بلکہ مناسب انداز کا خرچ باپ اپنی معیار زندگی کے اعتبار سے اس وقت دیگا جب سات سال کی عمر پوری ہونے کے بعد بیٹا باپ کو مل جائے گا، اور بالغ ہونے کے بعد لڑکی باپ کو مل جائے گی۔

وتجب النفقة بأنواعها على الحر لطفله الفقير –إلىٰ قوله – فلو كانا فقيرين فالأب يكتسب أو يتكفف وينفق عليهم وفى الشامية: تحته – وفى القستانى عن المحيط وتفرض على المعسر بقدر الكفاية وعلى الموسر بقدر مايراه الحاكم . (شامی، كتاب الطلاق، باب النفقة ، زكريا ٥/٣٣٧، كراچی ٣/٦١٢)

وبعد الفطام يفرض القاضى نفقة الصغار على قدر طاقة الأب .
(عالمگیری ، الباب السابع عشر فی النفقات ، الفصل الرابع في نفقة الاولاد ، زكريا قديم ١/٥٦١، جديد ١/٦٠٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍شعبان ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۳۹۰/۳۸)

مطلقہ معتدہ کے شوہر پر حقوق

سوال: [۱۰۲۸۹]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ احقر کی شادی روبینہ اقبال سے تقریباً بیس سال قبل ۵/لاکھ روپیہ مہر پر ہوئی تھی، آرام سے زندگی گذر رہی تھی، اس درمیان دو بچوں کی ولادت ہوئی جن کی عمر فی الحال لڑکا ۱۷/سال اور لڑکی ۱۳/سال کی ہے، فروری ۲۰۱۰ء میں اچانک روبینہ اقبال جو اس وقت میری زوجیت میں تھیں دونوں بچوں کو لے کر اپنی مرضی سے میری اجازت کے بغیر میرے گھر سے چلی گئیں اس بیچ کچھ وقفہ میرے رشتہ داروں اور کچھ لوگوں کے یہاں مقیم رہیں، اس کے بعد انہوں نے مجھ سے مطالبہ کر کے ایک مکان اپنی اور بچوں کی رہائش کیلئے مانگا، میں نے اپنی زوجہ سے کہا کہ آپ واپس آجائیں یہ ٹھیک نہیں ہے، لیکن انھوں نے قطعی طور پر خود اور بچوں کو آنے سے منع کر دیا تو میں نے مجبور ہو کر کانپور میں ایک رہائشی مکان فراہم کرادیا، اور تب سے اب تک مکان کا کرایہ اور گھر کا خرچہ بچوں کی فیس کی مد میں تیس ہزار روپیہ ماہانہ دیتا چلا آرہا تھا، بار بار سمجھانے اور بلانے کے باوجود جب وہ میرے گھر پر نہیں آئی تو مجبوراً ہو کر شوال ۱۴۳۲ھ میں اپنی زوجہ کو طلاق دیدی، طلاق کے بعد صرف بچوں کی فیس اور پڑھائی کا خرچہ برداشت کر رہا ہوں، اور مہر جو پانچ لاکھ روپیہ تھی اسکو بھی چیک کی صورت میں اپنے ایک عزیز کے پاس جوان کے عزیز بھی ہیں دیدی ہے کہ وقت پر ادا کر دیں، اب مسئلہ یہ ہے کہ طلاق کے بعد مطلقہ بیوی کی جانب سے شوہر کے اوپر کیا کیا ذمہ داریاں ہیں، جن کو پورا کرنا ہے؟

بچوں کے بارے میں شریعت کے مطابق والد کے اوپر کیا ذمہ داریاں ہیں؟ شریعت کے مطابق بچے عمر بلوغت سے پہلے اور بعد میں کس کے پاس پرورش پائیں گے؟

المستفتی: شارق رسول (مرحوم) بانسمنڈی، کانپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: طلاق دینے کے بعد شوہر کے اوپر بیوی کی تین ماہواری گذرنے کی مدت تک عدت کا خرچہ دینا لازم ہوتا ہے، بشرطیکہ بیوی ایسی جگہ عدت گذارتی ہو، جہاں رہ کر عدت گذارنے میں شوہر کی مرضی ہو، اور عدت پوری ہوجانے کے بعد جبکہ مہر بھی ادا ءکردیا ہو، شوہر کے اوپر بیوی کی طرف سے کسی قسم کا مطالبہ باقی نہیں رہتا ہے، پھر بھی اگر بیوی مطالبہ کرے، تو شرعی طور پر ناجائز مطالبہ ہوگا، ہاں البتہ بچوں کے بارے میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ اگر لڑکا ہے تو سات سال تک ماں کو اپنی پرورش میں رکھنے کا حق ہے، اس زمانہ میں بچہ کا خرچہ باپ پر لازم ہوتا ہے، اور سات سال کے بعد باپ اپنی پرورش میں اپنے پاس منتقل کرسکتا ہے، اور اگر لڑکی ہے تو اس کے مہینہ آنے کے زمانہ تک ماں کو اپنی پرورش میں رکھنے کا حق ہے، اور اس زمانہ میں بچی کا خرچہ باپ ادا کریگا، اور مہینہ آنے کا سلسلہ شروع ہوجائے تو باپ کو اپنی پرورش میں منتقل کرنے کا حق ہے۔

وإذا لم تخاصم المعتقة في نفقتها حتى انقضت عدتها فلا نفقة لها وكذلك التي طلقها زوجها لأن نفقة العدة لاتكون أوجب من نفقة النكاح وقد بينا أن نفقة النكاح لاتصير دينا بمضى المدة قبل الفرض ولايكون لها أن تطالب بها بعد زوال النكاح. (مبسوط للسرخسی، دارالکتب العلمیة بیروت ٥/ ٢٠٤)

سبب استحقاق هذه النفقة العدة والمستحق بهذا السبب في حكم العلة ، فلا بد من قيام السبب لاستحقاق المطالبة . (البحرائق، کتاب الطلاق، باب النفقة ، زکریا ٤/ ٣٣٨، کوئٹه ٤/ ١٩٩)

وإذا مضت مدة ولم ينفق عليها الزوج فلا شيئى لها من ذلك . (تبیین الحقائق، امدادیه، ملتان ٣/ ٥٥،زکریا ٣/ ٣١١)

والحاضنة أما أو غيرها أحق به أي بالغلام حتىٰ يستغني عن النساء وقدر بسبع وبه يفتى لأنه الغالب. (شامی، کتاب الطلاق، باب الحضانة ، زکریا

۲٦٧/٥، كراچی ٥٦٦/٣، هنديه زكريا قديم ٥٤٢/١، جديد ٥٩٣/١)

وأما الجارية فهي أحق بها حتى تحيض كذا ذكر في ظاهر الرواية .

(بدائع الصنائع ، فصل في وقت الحضانة ، زكريا ٤٥٩/٣، كراچی ٤٢/٤، المبسوط للسرخسی ، دارالكتاب العلمية بيروت ٢٠٧/٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ رصفر ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۶۲۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۲/۲۴ھ

تکمیل عدت کے بعد بیوی کا شوہر کے گھر رہنا

سوال: [۱۰۲۹۰]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں نے اپنی بیوی شاہانہ بیگم کو ۱۶ / جون ۱۹۹۸ء کو طلاق دیدی عدت بھی پوری ہوگئی مگر عدت کے بعد بھی شاہانہ بیگم اپنے شوہر کے گھر میں مقیم ہے، تو کیا مطلقہ عورت عدت گذر جانے کے بعد میرے گھر میں رہ سکتی ہے، جبکہ وہ میرے گھر میں زبردستی مقیم ہے، کیا اس کو اس کا حق حاصل ہے، کہ وہ ہمارے گھر میں عدت گذارنے کے بعد مقیم رہے، اور اگر رہنے کا حق ہے تو کب تک قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں، عین نوازش ہوگی؟

المستفتی: ڈاکٹر جعفر علی، ولد جناب حلیم
وزیر علی صاحب، ساکن، محلّہ: کٹار شہید، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر واقعی عورت کی عدت ختم ہو چکی ہے، اور عورت انقطاع عدت کا اقرار بھی کر رہی ہے، تو عورت کو شوہر کے گھر میں رہنا جائز نہیں ہے، اور شوہر کے ذمہ یہ لازم نہیں ہے کہ وہ اسے اپنے گھر میں رکھے، بلکہ شاہانہ بیگم پر ضروری ہے کہ وہ قرآن وحدیث کا لحاظ رکھتے ہوئے شوہر کا گھر چھوڑ کر اپنے اقرباء کے یہاں چلی جائے۔

ولا تخرجوهن من بيوتهن . الآية: أى من مساكنهن عند الطلاق

إلیٰ أن تنقضي عدتهن . (روح المعاني ، زکریا ۱۵/ ۱۹۷، تحت تفسیر رقم الآیة: ۱ من سورة الطلاق)

شوہر کے گھر میں ایسی حالت میں رہنا حرام ہے، خدا کے عذاب کا ہر وقت خطرہ ہے، کیونکہ عدت کے بعد دونوں ایک دوسرے کیلئے اجنبی ہیں، اور عدت کے بعد شاہانہ کا اس کے گھر میں رہنا غیر مرد کے گھر میں رہنے کی طرح ہے ۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ شعبان ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۳۱۶)

وقت گذرنے کے بعد عدت اور بچوں کا خرچہ شوہر سے ساقط ہوجاتا ہے

سوال: [۱۰۲۹۱]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے شوہر نے طلاق کے بعد کوئی بھی خرچ میرا یا میرے بیٹے کا نہیں دیا یہاں تک کہ عدت کے زمانہ کا خرچ بھی نہیں دیا، کیا ان پر یہ خرچ واجب نہیں تھا؟ اور نہ ہی مہر ادا کیا مہر کی رقم چار ہزار روپئے ۱۹۷۷ء میں طے ہوئی تھی، اسے بھی ادا نہیں کیا تو مہر ادا کرنا لازم ہے یا نہیں؟ اب کتنا مہر ملیگا، میرے شوہر نے مجھے تیس سال قبل طلاق دیدی تھی؟

المستفتي: اختری بیگم، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: طلاق کے بعد شوہر پر عدت کے زمانہ کا نان ونفقہ لازم ہوتا ہے، لیکن جب طلاق کو تیس سال گذر چکے ہیں تو ماضی یعنی گذشتہ زمانہ کا خرچہ ساقط ہوچکا ہے، اسی وقت مطالبہ کیا جاتا تو مل سکتا تھا، اب نہیں ملے گا، اسی طرح بیٹے کو سات سال کی عمر تک ماں اپنے پاس رکھتی ہے اور اس زمانہ میں اس کا خرچہ باپ کو دینا لازم ہوتا ہے، لیکن اس وقت خرچہ کا مطالبہ نہیں کیا گیا، تو اب اتنے سالوں کے بعد ماضی کا خرچہ مانگنے کا حق نہیں ہے، اور سات سال کی عمر کے بعد باپ کو اپنے بیٹے کو اپنے پاس رکھنے کا حق ہوجاتا ہے،

یہ سب باتیں اتنے سالوں کے بعد ختم ہوچکی ہیں، البتہ مہر کی رقم شوہر کے ذمہ باقی ہے، اگر چار ہزار روپیہ مہر تھا، تو اب بھی چار ہزار ہی مہر میں ملیں گے۔

والنفقة لاتصير ديناً إلا بالقضاء أو الرضاء .... فقبل ذلك لايلزمه شيئی (تحته فی الشامی) أي إذا لم ينفق عليها بأن غاب عنها أو كان حاضراً فامتنع فلا يطالب بها بل تسقط بمضي المدة . (شامی، کتاب الطلاق ، باب النفقة ، زکریا ۳۱۱/۵، کراچی ۵۸۵/۳)

ثم اعلم أن المراد بالنفقة نفقة الزوجة بخلاف نفقة القريب فإنها لاتصير ديناً، ولو بعد القضاء والرضاء حتى لومضت مدة بعد هما تسقط كمايأتي . (شامی، زکریا ۳۱۱/۵، کراچی ۵۸۵/۳)

قضیٰ بنفقة غير الزوجة زاد الزيلعی والصغير ومضت مدة أی شهر فأكثر سقطت لحصول الاستغناء فيما مضیٰ . (وفی الشامی) وفی الهداية، ولو قضی القاضی للولد والوالدين وذوی الأرحام بالنفقة فمضت مدة سقطت لأن نفقة هؤلاء تجب كفاية للحاجة حتى لاتجب مع اليسار وقد حصلت بمضي المدة بخلاف نفقة الزوجة إذا قضیٰ بها القاضی . (شامی، مطلب فی مواضع لایضمن فیها المنفق ، إذا قصد الاصلاح، زکریا ۳۷۰/۵، کراچی ۶۳۳/۳)

وإذا فرض القاضی نفقة المعتدة فی عدتها و قد استدانت علیٰ الزوج أولم تستدن ثم انقضت عدتها قبل أن تقبض شيئاً من الزوج فإن استدانت بأمر القاضی كان لها الرجوع بذلك علیٰ الزوج وإن استدانت بغير أمر القاضی أولم تستدن أصلاً ، قيل تسقط وهو الصحيح هٰكذا فی جواهر الأخلاطی . (عالمگیری ، الفصل الثالث فی نفقة المعتدة ،زکریا قدیم ۵۵۹/۱، جدید ۶۰۶/۱)

وتجب النفقة لمطلقة الرجعی والبائن .... ولا تسقط النفقة

المفروضة بمضي العدة . تحته في الشامية) أي إذا مضت مدة العدة ولم تقبضها فلها أخذ ها لو مفروضة أي أو مصطلحاً عليها لكن لو مستدانة بأمر القاضي فلا كلام وإلافيه خلاف، اختار الحلواني أنها لاتسقط أيضاً وأشار السرخسي، إلىٰ أنها تسقط وفي الذخيرة وغير ها أنه الصحيح قال في البحر : وعليه فلا بد من إصلاح المتون فإنهم صوحوا بأن النفقة تجب بالقضاء أو الرضاء وتصير ديناً وهنا لاتصير ديناً الخ. (شامی، مطلب فی نفقة المعتدة ، زکریا ٥/٣٣٣، کراچی ٣/ ٦١٠)

الديون تقضى بأمثالها . (شامی، باب اليمين فی الضرب والقتل وغیر ذلك ، مطلب لأقضين مالك اليوم ، زکریا ٥/ ٦٦٤، کراچی ٣/ ٨٤٨، الاشباه والنظائر ، الفن الثانی/٢٥٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰؍رجب ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۲۱۱/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۸/۱ھ

طلاق کے بعد شوہر سے اپنا قرض مانگنا

سوال: [۱۰۲۹۲]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری شادی کو تقریباً چار سال ہو چکے ہیں، میرے پاس تین سال کی ایک بیٹی بھی ہے، میرے دو بچے انتقال کر گئے میرے شوہر پہلے مجھے ٹھیک رکھتے تھے، شادی کے ڈیڑھ سال بعد ان کا چکر پیلی بھیت کی ایک لڑکی سے چل گیا، ۲۴؍ستمبر ۲۰۰۹ء میں میرا لڑکا پیدا ہوا اور وہ دوسرے دن انتقال کر گیا، ۱۰؍اکتوبر ۲۰۰۹ء میں میرے شوہر نے اس لڑکی سے نکاح کرلیا اور اس کے ساتھ بمبئی میں رہ رہے ہیں، جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے بھی بمبئی جانے کو کہا جب میرا چلہ پورا ہوا تو گھر والوں نے مجھے بمبئی بھیجدیا انھوں نے مجھے بمبئی میں ایک ہفتہ کسی ملنے والے کے مکان پر رکھا اور میرے ساتھ اچھے سلوک نہیں کئے، میں

تو اس سوکن پر بھی رہنے کو تیار تھی مجھے اپنا گھر بنانا تھا، جب انھوں نے ٹھیک طرح سے نہیں رکھا تو میں پھر مرادآباد آ گئی ایک دومہینے مرادآباد رہی پھر میری بچی نے اپنے ابو کے پاس جانے کی ضد کی تو میں پھر چلی گئی، میرے گھر والے، مجھے نہیں بھیجنا چاہ رہے تھے، لیکن میں پھر بھی چلی گئی، جب میں وہاں پر گئی تو انھوں نے مجھے مارا پیٹا اور دوسری عورت میرے بارے میں ان کو چڑھاتی تھی، تو وہ مجھے مارتے پیٹتے تھے، مارنے کی دھمکی دیتے تھے، حتیٰ کہ دونوں نے مل کر وہاں مجھے بہت پریشان کیا میں اب مرادآباد آ گئی ہوں، میں بہت پریشان ہوں، اور ان حالات میں طلاق لینا چاہتی ہوں۔

جب میں شادی ہوکر اپنی سسرال گئی تھی، تو میرے شوہر نے شادی کے دن مجھ سے کہا تھا، کہ یہ زیور جو تم نے پہن رکھا ہے، اس کی قیمت تمہاری مہر کی قیمت کے برابر ہے، یہ چیز آج سے تمہاری ہے، میرے مہر کی قیمت پچیس ہزار ہے، اس کے بعد انھوں نے وہ سب زیور حتی کہ میری امی کے یہاں کا بھی سب بیچ دیا مجھ سے اجازت نہیں لی، بعد میں مجھے بتادیا، ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے، مجھے فتویٰ دیں کہ میرا ان حالات میں مہر کی قیمت لینا جائز ہے جبکہ میرے پاس ایک بچی ہے، میں وہ بچی دینا نہیں چاہتی ہوں آپ فتویٰ دیجئے۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: جب شوہر نے مہر کے عوض میں آپ کو زیور دیدئے ہیں، تو وہ زیورات آپ کی ملکیت بن گئے، اور شوہر کی طرف سے مہر ادا ہوگیا، لیکن جب اس کے بعد مہر کے زیورات میکے سے ملے ہوئے زیورات بطور قرض لئے ہیں، تو شوہر کے اوپر قرض کے طور پر آپ کے مہر کے زیور اور میکے سے ملے ہوئے زیور کی واپسی لازم ہے اور طلاق کی صورت میں آپ کو اپنا حق واپس مانگنے کا مکمل حق ہے، اور اگر وہ زیورات موجود نہیں ہیں، تو ان کی قیمت مانگنے کا حق ہے اور بچی کو بالغ ہونے تک آپ کو اپنے پاس رکھنے کا حق ہے۔

إن الديون تقضى بأمثالها على معنىٰ أن المقبوض مضمون على القابض . (شامي، مطلب الديون ، تقضى بأمثالها ، زكريا ٥/٦٧٥، كراچی ٣/٨٤٨)

والأم والجدة أحق بالجارية حتى تحيض . (هنديه، الباب السادس عشر في الحضانة، زكريا قديم ۱/ ۵۴۲، جديد ۱/ ۵۸۳، بدائع، زكريا ۳/ ۴۵۹، كراچی ۴/ ۴۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ جمادی الاً ولیٰ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۰۵۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۵/۱۴۳۱ھ

داماد اور خسر کی ذمہ داری

سوال: [۱۰۲۹۳]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر بیوی شوہر کی رضا مندی سے میکے والد کے گھر جاتی ہے، تو وہاں جا کر اس کا باپ اسے زبردستی جہالت کی بنا پر روک لیتا ہے، اور ساتھ میں بلانے پر داماد سے بدکلامی اور گستاخانہ طور پر پیش آتا ہے، اور اپنی لڑکی کو ورغلانا شروع کرتا ہے، جبکہ شادی کو عرصہ ۱۵/ سال گذر چکے ہیں، تا حال آپس میں دونوں میاں بیوی میں محبت ہے کسی طرح کوئی شرعی تفریق نہیں صرف لڑکی کا والد لڑکی کی مرضی کیخلاف رکاوٹ ڈالتا ہے، یہاں تک کہ اپنی لڑکی کے سامنے اس کی طلاق کا مطالبہ بلا کسی شرعی عذر کے کرتا ہے، اسکی لڑکی بھی اپنے والد کے خلاف ناراضگی کا اظہار کرتی ہے، والد کا یہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا سزا ہے؟

المستفتي: عبداللطیف، جموں کشمیر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: داماد پر لازم ہے کہ وہ اپنے خسر صاحب کی عزت کرے اور خسر کو باپ کے درجہ میں سمجھ کر باپ کی طرح عزت کرے، اور خسر کیلئے بلاوجہ ایسا کرنا کہ جو لڑکا لڑکی کے درمیان ازدواجی زندگی برباد ہونے کا سبب ہو جائز نہیں ہے ان کے ساتھ شفقت کا معاملہ کرنا لازم ہے، ورنہ سخت گنہگار ہوں گے۔

عن عبد الله بن عمرو بن العاص، قال: قال رسول الله ﷺ : ليس

منا من لم یرحم صغیرنا ، ویؤقر کبیرنا . (الأدب المفرد، باب إجلال الکبیر ، دار الکتب العلمیة بیروت/۱۱٤ ، رقم: ۳٥۸ ، سنن الترمذی ، باب ماجاء فی رحمة المصبیان ، النسخة الهندیة ۲/ ۱٤ ، دارالسلام رقم: ۱۹۱۹ ، المعجم الکبیر للطبرانی ، داراحیاء الثراث العربي ۱۱/٤٤۹ ، رقم: ۱۲۲۷٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/صفر ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۵۱۷/۴/۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱/۲/۱۴۱۸ھ

بہو کا ساس وخسر کی خدمت کرنا

سوال: [۱۰۲۹۴]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کی والدہ کا انتقال ہوگیا ہے، زید کے گھر میں والد اور ایک چھوٹا بھائی رہتا ہے، زید باہر کام کرتا ہے، ہفتہ ۱۵/دن میں گھر آتا ہے، زید چاہتا ہے، کہ اسکی اہلیہ والد اور بھائی کی خدمت کرے، مگر زید کے خسر اور ساس نہیں چاہتے کہ شوہر کے علاوہ اور کسی کی خدمت کی جائے، مثلاً کھانا پکانا کپڑے دھونا اسی طرح کے اور کام کاج زید کی اہلیہ بھی کھلکر تو نہیں مگر تھوڑا ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی نہیں چاہتی، شرعاً کیا حکم ہے؟ زید سختی کرتا ہے تو اہلیہ کے ماں باپ کہتے ہیں، کہ نکاح زید کیساتھ ہوا ہے نہ کہ والد کے ساتھ؟

المستفتي: شمشاد احمد، پیرزادہ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر زید کی اہلیہ بخوشی ان کی خدمت کرتی ہے، تو زید کے خسر وساس کو دخل دینے کا حق نہیں اور اگر زید کی اہلیہ خود نہیں چاہتی ہے تو زید کو اہلیہ پر خدمت والدین کیلئے زور ودباؤ دینے کا حق نہیں ہے۔

لیس للرجل أن یستخدم امرأته الحرة. (المحیط البرهاني ، المجلس العلمی ٤/۲۳۷ ، رقم: ٤۱٥۱ ، الفتاویٰ التاتار خانیة ، زکریا ٤/۳۰۹ ، رقم: ٦۲۷۱)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ رذی الحجہ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۴۰-۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۱۲/۶ھ

شوہر کا بیوی کو اہل خانہ کی خدمت پر مجبور کرنا

سوال: [۱۰۲۹۵]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کے گھر میں والد اور ایک چھوٹا بھائی رہتا ہے، زید چاہتا ہے، کہ اسکی اہلیہ والد اور بھائی کی خدمت کرے، مثلاً کھانا پکانا کپڑے دھونا اسی طرح کے اور کام کاج مگر زید کی اہلیہ ظاہراً نہیں چاہتی تو شرعاً کیا حکم ہے؟ زید سختی کرتا ہے، تو اہلیہ کے ماں باپ کہتے ہیں، کہ نکاح زید کیساتھ ہوا ہے، نہ کہ والد اور بھائی کے ساتھ؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر زید کی اہلیہ بخوشی ان کی خدمت کرتی ہے، تو زید کے خسر وساس کو دخل دینے کا حق نہیں اور اگر زید کی اہلیہ خود نہیں چاہتی ہے تو زید کو اہلیہ پر اس بات پر سختی کرنا اور دباؤ ڈالنا جائز نہیں کہ اہلیہ اس کے باپ اور بھائی کی خدمت کرے۔

ليس للرجل أن يستخدم امراته الحرة الخ. (تاتار خانية، كوئته ۳/ ۲۱۴، زكريا ۴/ ۳۰۹، رقم: ۶۲۷۱، المحيط البرهاني المجلس العلمي ۴/ ۲۳۷، رقم: ۴۱۵۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹ رذی الحجہ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۵۹-۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۱۲/۲۰ھ

بہو کا ساس وسسر کے ساتھ گستاخی کرنا

سوال: [۱۰۲۹۶]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص نے اپنے لڑکے کی بیوی کو اس کی بداخلاقی وبدکلامی کرنے پر اس کو اپنے لڑکے کی موجودگی میں ہدایت کی جس پر اس کی بیوی نے اپنے خسر کو جو باپ کے مرتبہ کے برابر ہے، یہ مقابلہ میں جواب دیا کہ ''چپ بے بدمعاش'' خسر نے غصہ میں آکر اس کو جواب دینا چاہا تو اس کے شوہر نے اپنی بیوی کو اپنے کمرہ میں بند کردیا اور اپنے والد سے کہا کہ تم کچھ نہ کہنا خاموش ہوجاؤ، دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ لڑکے کی والدہ اپنے بیٹے کی خدمت گذاری کی تعریف کررہی تھی، تو فوراً اسی عورت نے اپنی خوشدامن سے طنزیہ یہ کہا کہ اگر تجھے تیرا بیٹا اچھا لگتا ہے، تو اس کے ساتھ اپنا نکاح کرلے، وہ بھی اس کی اس بداخلاقی پر بیحد غمگین ہوگئی، اور اس کی اس بیہودگی کا کوئی جواب نہیں دیا، اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ صرف ان ہی دونوں بداخلاقی کے جواب میں اس عورت کے ساتھ شرعی نقطہ نظر سے اس کے شوہر اور شوہر کے ماں باپ کو کیا سلوک کرنا چاہئے، اور اس کیلئے شرعی حکم کیا ہے، جبکہ شوہر کے اس کی حمایت کرنے کی وجہ سے اس عورت کو جو نہایت بداخلاق اور بدکردار ہے، یہ جرأت ہوئی کہ اپنے خسر وخوشدامن سے اس طرح پیش آئی جواب باصواب مرحمت فرمائیں؟

المستفتي: محمد جان، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اس عورت نے اپنے سسر اور خوشدامن کے ساتھ نہ صرف گستاخی کی ہے، بلکہ فحش باتیں تک کہدی ہیں، لہٰذا شوہر کو چاہئے کہ اپنی پوری احساس ذمہ داری کے ساتھ اپنی بیوی کو اس طرح نازیبا حرکتوں پر اچھی طرح تنبیہ کرے اور ایسی تنبیہ کرے کہ آئندہ بدزبانی کی جرأت نہ ہو اور سمجھائے کہ وہ باادب اور نیک بیوی بن جائے، اور خود شوہر پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے، کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرے، ان کی نافرمانی کرنے پر حدیث شریف میں وعید آئی ہے۔

وَاللّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ، الآية: (سوره نساء:۱ ٤ ۳)

وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا . (سوره بقره: ۳٦)

عن عبيد الله بن أبي بكر قا ل سمعت أنس بن مالك قال: ذكر رسول الله ﷺ الكبائر أو سئل عن الكبائر فقال: الشرك بالله، وقتل النفس، وعقوق الوالدين، الحديث: (بخاری شریف، باب عقوق الوالدين من الكبائر، النسخة الهندية ۲/ ۸۸٤، رقم: ۵۷٤۳، ف: ۵۹۷۷)

إن عبد الله بن عمر يقول سمعت رسول الله ﷺ يقول كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته (إلیٰ قوله) والرجل راع فی أهله وهو مسئول عن رعيته، و المرأة راعية فی بيت زوجها ومسئولة عن رعيتها، الحديث. (بخاری، الجمعة، باب الجمعة فی القریٰ والمدن، النسخة الهندية ۱/۱۲۲، رقم: ۸۸۳، ف: ۸۹۳، مسند أحمد بن حنبل ۲/۵، رقم: ٤٤۹۵، ۲/۵۵، رقم: ۵۱٦۷)

والضابط كل معصية لاحد فيها فللزوج والمولیٰ التعزيز قال العلامة بن عابدين رحمه الله تعالیٰ (تحت قوله) الضابط: أی سواء كان جناية علی الزوج أو غيره . (درمختار، كتاب الحدود ط باب التعزير، زكريا٦/ ۱۲۹، كراچی ٤/ ۷۷)

بأن كانت ناشزة فله أن يؤدبها لكن علی الترتيب . (بدائع الصنائع، فصل وجوب طاعة الزوج علی الزوجة، إذا دعاها إلیٰ الفراش، كراچی ۲/ ۳۳٤، زكريا ۲/ ۵۰٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳؍ ۵۲۰۷)

خسر کا بہو پر ظلم کرنا

سوال: [۱۰۲۹۷]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کیا خسر اپنی بہو کو مار سکتا ہے، یا اس کے ماں باپ کو شب وشتم کرسکتا ہے، اسی طرح چولھے یا اس کے قریب میں بیٹھ کر پکی ہوئی روٹیوں میں نکتہ چینی کرنا فضول باتیں کرنا اوران پر ظلم وستم کے امور لاحق کرنا اور اپنی جوان اولاد پر بدکاری کا الزام لگانا کیسا ہے؟ اولاد اپنے علم یا باپ کے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کچھ نہیں کہتی ہے، تو اتنا ظلم کرنے کے بعد اولاد اپنے باپ کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے کچھ کہہ سکتی ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: خسر بہو کو مار نہیں سکتا ہے، بہو خسر کے حق میں صرف محرم ہے، مگر بہو کے حق میں خسر وغیرہ کی خدمت وغیرہ کا حق لازم نہیں ہے، اور نہ خسر کو یہ حق ہے کہ بہو کو سب وشتم کرے، یا مارے البتہ یہ حقوق شوہر کو حاصل ہیں، اور نہ خسر بہو کے ماں باپ کو سب وشتم کرسکتا ہے۔

عن عبدالله بن مسعود قال: رسول الله صلى الله عليه وسلم: سباب المسلم فسوق وقتاله كفر. (ترمذی شریف، باب ماجاء فی الشتم، النسخة الهندية ۲/ ۱۹، دارالسلام رقم: ۱۹۸۳)

نیز چولھے کے قریب بیٹھ کر نکتہ چینی کرنا اور فضول باتیں کرنا اور ظلم وستم کے امور لاحق کرنا جائز نہیں ہے۔

عن أبي هريرة رضى الله عنه عن النبى صلى الله عليه وسلم، قال:...... ولا تحسسوا ولا تجسسوا ولا تباغضوا ولاتدابروا وكونوا عباد الله إخوانا. (صحيح البخارى، با ب ما ينهى عن التحاسد والتدابر، النسخة الهندية ۲/ ۸۹٦، رقم: ۵۸۲۹، ف: ٦٠٦٤)

عن عبد الله بن عمرو عن النبي ﷺ قال : المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده . (صحيح البخاری ، الإيمان ، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويد، النسخة الهندية ١/٦، رقم: ١٠)

عن أبي هريرة رضی الله عنه أن رسول الله ﷺ قال: إياكم والظن فإن الظن أكذب الحديث، ولا تحسسوا ولا تجسسوا والتجس هو البحث والتفتيش عن معائب الناس وسرائرهم . (ابوداؤد، باب فی الظن، النسخة الهندية٢/ ٦٧٣، دارالسلام رقم: ٤٩١٧)

اور کسی پر بغیر چار گواہوں کے بدکاری کی تہمت لگانا گناہ کبیرہ اور حرام ہے، ایسے شخص پر اسلامی حکومت میں حد قذف ۸۰/اسی کوڑے لگائے جائیں گے، لیکن ہندوستان میں اسلامی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے حد تو نہیں لگائی جائیگی البتہ اسے اپنے اس فعل قبیح سے توبہ کرنا چاہئے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً وَلَاتَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَداً وَاُولٰئِکَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ . (سورۂ نور آیت/٤)

اولاد اپنے باپ کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے ایسی بات کہہ سکتی ہے، جس کی وجہ سے باپ کو ذرہ برابر ناگواری نہ ہو۔

وَلاَ تَقُلْ لَهُمَا اُفٍّ وَلاَتَنْهَرْ هُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلاً كَرِيْماً. (سورۂ بنی اسرائیل، آیت:٢٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۶ محرم ۱۴۲۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۶۴۶۳/۳۴)	۱۴۲۱/۱/۲۶ھ

بہنوئی پر جھوٹا الزام قائم کر کے بہن کے نام جائیداد کرانا

سوال: [۱۰۲۹۸]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اسلام الدین ونظام الدین جو کہ آپس میں سگے بھائی ہیں، یہ دونوں اپنے بہنوئی کے پاس گئے اور

کہنے لگے تم اپنی جائیداد میں سے اپنی زندگی میں ہماری بہن کے نام پر کچھ وصیت لکھ کر دیدو، کیوں کہ اسلام ونظام کا کہنا ہے کہ ہمارے بہنوئی کے کسی دوسری عورت سے ناجائز تعلقات ہیں، اور ہماری بہن کو بعد میں کچھ ملنے والا نہیں ہے، اسلام ونظام نے ہر طرح سے بہنوئی پر دباؤ ڈالا ہے کہ بہن کے نام کچھ جائیداد کردے، اس معاملہ میں ایک حاجی نمازی دین دار شخص نے بھی اسلام ونظام کا پورا پورا تعاون کیا ہے؟

غورطلب امور یہ ہیں!

(۱) کیا قبل الموت کسی پر دباؤ ڈال کر کسی کیلئے اس طرح جائیداد نام کروانا یا لکھوانا شرعاً جائز اور درست ہے؟

(۲) اسلام ونظام کا اپنے بہنوئی پر جائیداد نام کرانے کیلئے دباؤ ڈالنا صحیح ہے؟ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ خود اسلام ونظام نے اپنے باپ کی ملکیت سے اپنی بہن کو کوئی حصہ نہیں دیا ہے، اسلام ونظام کا اپنی بہن کے ساتھ ہمدردی کا یہ دوہرا پیمانہ کھلی ہوئی منافقت ہے یا نہیں؟ اور جن حاجی صاحب نے اسلام ونظام کا اس معاملہ میں تعاون کیا ہے، جبکہ حاجی صاحب کو پوری حقیقت کا علم ہے، کیا یہ عمل حاجی صاحب کے شایان شان ہے؟

(۳) کیا مرنے سے پہلے کوئی اپنی ائیداد اپنی اولاد میں تقسیم کرسکتا ہے؟ اور اس کا طریقۂ کار کیا ہے؟

(۴) حاجی صاحب کی شرعاً کیا ذمہ داری بنتی ہے؟ تفصیلی جواب مرحمت فرمائیں؟

المستفتی: امام الدین جوئے، سابق صدر ضلع وقف کمیٹی، کھرگون، مدھیہ پردیش

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۲) اسلام الدین ونظام الدین کا اپنے بہنوئی کے بارے میں کسی غیر عورت کے ساتھ ناجائز تعلق کی بات کرنا بلا دلیل ہے اور بغیر

کسی قطعی دلیل کے کسی مسلمان کے بارے میں ایسی نازیبا بات کہنا شرعاً ناجائز ہے، بہنوئی کو اختیار ہے کہ اسلام الدین ونظام الدین کی بہن کے نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے بھی نکاح کر کے دونوں کے حقوق برابری کیساتھ ادا کرے، اسمیں بہن اور سالوں کو اعتراض کا حق نہیں ہوتا، نیز مذکورہ بہنوئی کے اوپر اسلام ونظام کا بلا وجہ دباؤ ڈال کر اسکی جائداد اپنی بہن کے نام کرانا قطعاً ناجائز اور باعث لعنت ہے، ہاں البتہ اسلام ونظام پر لازم ہے کہ اپنے باپ کے ترکہ میں سے بہن کا جو حق بنتا ہے، وہ بہن کے نام کر کے اسکے قبضہ میں دیدیں، یہ انکے اوپر واجب اور فرض ہے، اور نہ دیگر خود قبضہ کر لینے کی صورت میں میں سخت ترین عذاب کے مستحق ہوں گے۔

عن أبی هريرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ المسلم: أخو المسلم، لايخونه ولا يكذبه ولا يخذله كل المسلم على المسلم حرام عرضه وماله ودمه، التقوىٰ ههنا، بحسب امرئی من الشر أن يحتقر أخاه المسلم. (ترمذی، باب ماجاء في شفقة المسلم على المسلم، النسخة الهندية ۲/ ۱۴، دارالسلام رقم: ۱۹۲۷، مسند البزار، مكتبه العلوم والحكم ۱۵/ ۳۳۵، رقم: ۸۸۹۱)

قال الله تعالىٰ: فَانْكِحُوْا مَاطَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنىٰ وَثُلاَثَ وَرُبَاعَ فَإِنْ خِفْتُمْ اَنْ لاتَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً الخ. (النساء: ۳)

أی كما لم تعدلوا فی حقهن فاختاروا أو ألزموا واحدةً الخ. (روح المعانی، زكريا ۳/ ۳۰۶)

عن أبي حميد الساعدي، أن رسول الله ﷺ قال: لايحل لامرئی أن يأخذ مال أخيه بغير حقه وذلک لما حرم الله مال المسلم على المسلم. (مسند احمد بن حنبل ۵/ ۴۲۵، رقم: ۲۴۰۰۳)

لايجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي. (شامی، كتاب الحدود، باب التعزير، زكريا ۶/ ۱۰۶، كراچی ۴/ ۶۱، هنديه، زكريا قديم ۲/ ۱۶۷، جديد ۲/ ۱۸۱)

عن أنس بن مالک رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ : من فرّ من میراث وارثہٖ قطع اللہ میراثہ من الجنة یوم القیامة. (ابن ماجہ شریف، باب الحیف فی الوصیة ، النسخة الهندیة ۲/ ۱۹٤، دارالسلام رقم : ۲۷۰۳)

(۳) مرنے سے پہلے آدمی کا اپنی اولاد کے درمیان جائداد تقسیم کرنا لازم نہیں ہے، ہاں البتہ مرنے کے بعد اولاد کے درمیان اختلاف وانتشار کو ختم کرنے کیلئے اس طرح وصیت کرسکتا ہے، کہ جس کا جتنا شرعی حصہ بن سکتا ہے، اس کو شرعی حق مل جائے، نیز حاجی صاحب ہوں یا کوئی اور ہو کسی کو بھی خلاف شرع امور پر تعاون کرنا جائز نہیں۔

المالک هو المتصرف فی الأعیان المملوکة کیف شاء . (بیضاوی شریف رشید۱/ ۷)

إن الملک مامن شأنه أن یتصرف فیه بوصف الإختصاص . (شامی، مطلب في تعریف المال ، زکریا ۷/ ۱۰، کراچی ٤/ ۵۰۲، الموسوعة الفقهیة الکویتیة٤ ۲/۹ ۱)

قال العبد الضعیف عفااللہ عنه : قد ثبت بماذکرنا أن مذهب الجمهور فی التسویة بین الذکر والأنثیٰ فی حالة الحیاة أقویٰ وأرجح من حیث الدلیل ، ولکن ربما یخطر بالبال أن هذا فیما قصد فیه الأب العطیه والصلة ، وأما إذا أراد الرجل أن یقسم أملاکه فیما بین أولادہٖ في حیاته لئلا یقع بینهم نزاع بعد موته فإنه وإن کان هبة فی الإصطلاح الفقهی ولکنه فی الحقیقة ، والمقصود استعجال لما یکون بعد الموت ،وحینئذ ینبغی أن یکون سبیله سبیل المیراث فلو قسم رجل فی مثل هذه الصورة للزکر مثل حظ الأنثیین علی قول الإمام أحمد ومحمد بن الحسن ، فالظاهر أن لهٗ ذلک یسع لهٗ . (تکمله ، فتح الملهم ، اشرفی، کتاب الهبات، فذهب الجمهور التسویة بین الذکر والأنثیٰ، اشرفیه ۲/ ۷۵)

قال اللہ تعالیٰ : وَلَاتَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوْا اللّٰهَ الخ. (سورة

المائدة: ۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍محرم الحرام ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹؍۱۰۵۹۸)

۵/باب الحضانة

دوسرے کے بچے کی پرورش کرنا

سوال: [۱۰۲۹۹]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری عمر تقریباً چالیس سال ہے، شادی کو نو سال ہو گئے ہیں، ابھی تک کسی بچہ کی پیدائش نہیں ہوئی ہے، تمام ٹیسٹ کرا لئے ہیں، مستقبل میں بھی کوئی امید نہیں ہے، اب میں کسی بچہ کو گود لینا چاہتا ہوں، والد صاحب اس کام کیلئے سختی سے منع کرتے ہیں، اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں، کہ اگر تو نے کسی بچہ کو گود لیا تو میں تجھے وراثت کے حصہ سے بے دخل کر دوں گا، ان حالات میں میرے لئے شریعت کا حکم کیا ہے، بچہ گود لینے پر والد صاحب کا وراثت سے محروم کر دینا کیسا ہے، اور کیا اس حالت میں بچہ گود لینے پر مجھ کو والد صاحب کی نافرمانی کا گناہ ہوگا یا نہیں؟

المستفتي: اکرام الدین، حسن پور، امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: شریف خاندان یا انتہائی غریب خاندان کے جائز بچہ کو پرورش کی غرض سے گود لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن یہ بچہ آپ کا شرعی وارث نہیں بنے گا، اور والد صاحب جب آپ کو اس بات سے منع کر رہے ہیں، تو والد کی مرضی پر عمل کرنے میں آپ کیلئے خیر ہے، تاہم اگر آپ کو یہ آرزو پوری کرنی ہی ہے، تو والد کے مشورہ سے بھائی یا بہن کی اولاد میں سے کسی کو گود لے کر یہ آرزو پوری کر لیں، کہ اس صورت میں والد بھی ناراض نہ ہونگے۔

قال الله تعالىٰ: وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ اَبْنَائِكُمْ (وفى المظهرى) فلا يثبت بالتبنى شيء من أحكام البنوة من الإرث وحرمة النكاح وغير ذلك. (التفسير المظهرى، سورة الأحزاب، تحت تفسير الآية بقرآن الكريم ۷/ ۲۸٤، جديد ۷/ ۲۹۲)

عن سهل أن النبی صلی الله علیه وسلم قال: أنا و کافل الیتیم کهاتین فی الجنة وقرن بین إصبعیه الوسطیٰ والتی تلي الإبهام .
(ابوداؤد، الأدب، باب فی من ضم یتیما ، النسخة الهندیة ۲/ ۷۰۱، دارالسلام رقم: ۵۱۵۰، سنن الترمذی ، ابواب البر والصلة ، باب ما جاء فی رحمة الیتیم و کفالتہ ، النسخة الهندیة ۲/ ۱۳، دارالسلام رقم: ۱۹۱۷)

عن عبد الله بن عمرو عن النبی صلی اللّٰہعلیه وسلم ، قال: رضا الرب في رضا الوالد وسخط الرب في سخط الوالد. (ترمذی ،ابواب البر والصلة ، باب ماجاء من الفضل فی رضا الوالدین ، النسخة الهندیة ۲/ ۱۲، دارالسلام رقم: ۱۸۹۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰ر محرم الحرام ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۸۶۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۱/۳۰ھ

ناجائز حمل خرید کر پرورش کرنا

سوال: [۱۰۳۰۰]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ وہ عورتیں جو ناجائز حمل ساقط کراتی ہیں، اور بعض اوقات بچہ زندہ رہتا ہے،اس بچہ کو وہ عورتیں خرید لیتی ہیں جن کی اولاد نہیں ہوتی ایسے بچہ کی پرورش اور اسکے کان میں اذان وتکبیر کا شرعی حکم کیا ہے؟ مفصل بیان فرمائیں؟

المستفتي: حافظ محمد صدیق، لال مسجد، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفیق: تہمت سے بچنے کیلئے بچہ کو ضائع کرنے والی گنہگار ہوگی اور اس کو لے کر پالنے والی ثواب کی مستحق ہوگی۔

عن یحیٰ -إلیٰ- قال: وزعم أبو جمیلة أنه أدرک النبی صلی الله

علیہ وسلم أنه کان خرج معه عام الفتح فأخبره أنه وجد منبوذاً فی خلافة عمر بن الخطابؓ فأخذه قال: فذکر ذلک عریفی، فلما رآنی عمر قال: عسی الغویر أبوسا، ماحملک علی أخذک هذه النسمة ؟ قال: قلت: وجدتها ضائعة فأخذ تها، فقال: عریفی : إنه رجل صالح، قال: کذلک ، قال: نعم ، قال: فاذهب به فهو حر: ولک ولاؤه وعلینا نفقته. (السنن الکبریٰ للبیهقی، دارالفکر بیروت ۲۲۳/۹، رقم: ۱۲۳۷٤)

نبذ خوفاً من العیلة أو فراراً من التهمة مضیعه آثم ومحرزه غانم وأخذه أفضل من ترکه الخ. (الجوهرة، کتاب اللقیط ، امدادیه، ملتان۴۳/۲، دارالکتاب دیوبند ۴۳/۲، تاتار خانیة، زکریا۴۰۱/۷، رقم: ۱۰۷۵۸)

لیکن اسکوخرید کرلینا، فروخت کرنا حرام ہے، اور بیع باطل ہے، کیونکہ وہ شرعاً آزاد ہے۔

اللقیط حرٌ الخ، (الجوهرة ، امدادیه ، ملتان۴۳/۲، دارالکتاب دیوبند ۴۳/۲، تاتار خانیة ، زکریا۴۰۱/۷، رقم: ۱۰۷۵۸)

نیز عام مسلمان بچوں کی طرح اس کے دائیں کان میں آذان اور بائیں میں تکبیر کہی جاوے، کہ شرعاً وہ مسلمان ہے اور پرورش کرنے والی جوخرچ کریگی وہ تبرع ہوگا، بعد میں مطالبہ نہیں کرسکتی۔

عن الحکم أن امرأة التقت صبیاً فانفقت علیه، ثم جاء ت شریحا تطلب نفقتها ، فقال: لانفقة لک، وولاؤه لک. (مصنف عبدالرزاق، المجلس العلمی بیروت۴۵۱/۷، رقم: ۱۳۸٤۵)

فإن أنفق علیه الملتقط من ماله فهو متطوع ولا یرجع به علی اللقیط لعدم ولایته علیه. (الجوهرة امدادیه ملتان۴۳/۲، دارالکتاب ۴۳/۲)

نیز اگر بعد میں اس کا کوئی شرعی وارث نکل آئے تو واپس کرنا بھی ہوگا۔

وإن ادعاه غير الملتقط أنه ابنه فهو للمدعى صدقه الملتقط أو كذبه الخ. (جوهره، امداديه، ملتان ۲/ ٤٤، دارالكتاب ديوبند۲/ ٤٣، تاتار خانية، زكريا۷/ ٤٠٥، رقم: ١٠٧٦٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۴۰۷)

شرعی عذر کے بغیر طلاق کا مطالبہ نیز شوہر کی اجازت کے بغیر لڑکے کو گود دینا

سوال: [۱۰۳۰۱]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری شادی ۲۵؍ اپریل ۲۰۰۴ء نعمانہ قدسیہ سے ہوئی تھی، ۲۶؍ نومبر ۲۰۰۴ء کو بیوی کے والد اور چچا اپنی بیٹی کو اپنے گھر لے کر گئے پھر اس کے بعد ۳؍ اپریل ۲۰۰۵ء کو ایک لڑکا پیدا ہوا، اب لڑکی طلاق لینا چاہتی ہے، میں اسے طلاق دینا نہیں چاہتا ہوں، بیوی اس بچہ کو اپنے کسی رشتہ دار کو دینا چاہتی ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ وہ لڑکا کس کو ملنا چاہئے شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: راحت علی، نیا کنواں، کسرول، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر سوالنامہ میں لکھی ہوئی سب باتیں حقیقت اور واقعہ کے مطابق ہیں، اور شوہر کی طرف سے بے جا ظلم وتعدی بھی نہیں ہے، تو ایسی صورت میں بیوی کیلئے شوہر سے بغیر وجہ شرعی کے طلاق کا مطالبہ کرنا جائز نہیں ہے، وہ اللہ کی طرف سے لعنت کی مستحق ہوگی، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ نعمانہ قدسیہ کو اس کے والد نے اپنے گھر لیجا کر کیوں بٹھالیا اور درمیان میں اتنا عرصہ گذر گیا، شوہر نے اس درمیان کیا خبر گیری کی ہے، وہ بلا کر اپنے گھر کیوں نہیں لایا، اس کے پیچھے کیا کیا اسباب ہیں، جانبین میں کیا کیا کمزوریاں

ہیں، سوالنامہ میں اس میں سے کسی بات کا ذکر نہیں ہے، اگر ۲۶/ نومبر ۲۰۰۴ء کو بیوی میکہ جا کر بیٹھ گئی تو ۳/ اپریل تک تقریباً پانچ مہینے ہوگئے ، نیز شوہر کا یہ کہنا کہ طلاق نہیں دیں گے، کس مقصد کیلئے طلاق نہیں دیں گے، اپنے پاس بیوی بنا کر رکھنے کیلئے یا اسے معلق چھوڑے رکھنے کیلئے نیز اس بات کی وضاحت نہیں ہے، کہ ۳/ اپریل کو جب بیوی کی ولادت کا وقت تھا، تو شوہر دیکھنے کیلئے گیا تھا، یا نہیں اور ولادت کا خرچہ کس نے ادا کیا اس میں اس طرح کسی بات کی وضاحت نہیں ہے، اگر شوہر کی طرف سے لاپرواہی ظلم وستم ثابت ہوجائے، تو بیوی کو طلاق کا مطالبہ کرنے کا حق ہے، ہاں البتہ باپ کی اجازت کے بغیر کسی دیگر شخص کے یہاں گود دلانا جائز نہیں ہوگا۔ (مستفاد: فتاویٰ دارالعلوم ۱۰/ ۲۵۰، الحیلۃ الناجزہ ص:/ ۶۱)

عن ثوبان أن رسول الله صلى الله عليه وسلم ، قال: أيما امرأة سألت زوجها طلاقاً من غير بأس فحرام عليها رائحة الجنة. (سنن الترمذی، ابواب الطلاق واللعان ، باب ماجاء في المختلعات، النسخة الهندية ۱/ ۲۲۶، دارالسلام رقم: ۱۱۸۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
یکم/ ربیع الاول ۱۴۲۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۷۴۰)	۱/ ۳/ ۱۴۲۶ھ

کافرہ زانیہ کا بچہ مسلمان پال سکتا ہے یا نہیں؟

سوال: [۱۰۳۰۲]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ پرمیلا کماری جو ہریجن گھرانیکی غیر شادی شدہ لڑکی ہے اسکو کسی بڑے گھر کے کافر سے ناجائز تعلقات کی بناپر حمل ٹھہر گیا وضع حمل ہسپتال میں ہوا لڑکی تولد ہوئی ، اسکو ایک مسلمان اٹھالایا وہ بچی تقریباً پانچ ماہ بعد اسی مسلمان کے گھر وفات پاگئی اس مسلمان نے آبادی کے امام صاحب سے اپنی بچی بتا کر نماز جنازہ پڑھوا کر مسلمان قبرستان میں دفن کردیا دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسے بچے کو لے کر پالنا جبکہ اسے کوئی لینے والا نہ ہو یا

مانگ کر مسلمان کو پالنا جائز ہے یا نہیں؟ واضح رہے کہ یہاں پر بہت سی غلط کار مزنیہ عورتیں ناجائز حمل کا بچہ ہسپتالوں میں چھوڑ کر چلی آتی ہیں، اور لوگ اسکو اجر عظیم سمجھ کر پال لیتے ہیں، کہ ہم اس کو پال کر مسلمان بنالیں گے، نیز جس امام صاحب نے لاعلمی میں نماز جنازہ پڑھادی ان کے لئے کیا حکم شرع ہے؟ زحمت فرما کر یہ بات بھی بتادیں، کہ اگر بچہ ولدالزنا نہیں ہے بایں طور کہ بچے کے کافر ماں باپ تنگدست ہیں، تو کیا مسلمان اس بچے کولیکر پال سکتا ہے، بحوالہ کتب جواب عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں؟

المستفتي: علی احمد صدیقی قادری،
خادم: جامع مسجد، ہری پر پور کیہ، ضلع،
کرناٹک، پن: ۵۷۷۱۲۰

جواب جامعہ نعیمیہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ایسے بچے کا حال لقیط (اٹھائے ہوئے بچے) کے حال کی طرح ہے، اور لقیط کا پالنا اگر اسکی ہلاکت کا اندیشہ ہوتو ضروری ہے، ورنہ مستحب ہے۔ (درمختار جلد ثالث: صفحہ: ۳۴۴، میں ہے)۔

التقاطه فرض كفاية إن غلب على ظنه هلاكه لو لم يرفعه وإلا فمندوب لما فيه من الشفقة والإحياء الخ. (شامی زکریا٦/٤٢٣)

اورظاہر ہے کہ اس نیت سے اٹھانے میں کہ بچہ مسلمان ہوگا، اس پر شفقت وزندگی کے ساتھ ہدایت کا جذبہ بھی کارفرما ہے، لہٰذا اس کا لینا پالنا بلاشبہ اجر وثواب کا موجب ہے، اورانتقال پر نماز جنازہ صحیح ہے، اسی کے جلد اول میں ہے۔

وشرطها إسلام الميت (ملخصا) درمختار میں ہے کہ **ولو بطريق التبعية لأحد أبويه أو للدار الخ.** (شامی، زکریا۳/۱۰۳، مطلب فی صلوة

الجنازة:) **اللہ اعلم**. فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: الفقیر محمد ایوب
دار الافتاء جامعہ نعیمیہ مرادآباد
۲۹؍رمضان ۱۴۱۱ھ

جواب دارالافتاء مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ایسے بچوں کو لے کر مذہب اسلام کی تعلیم وتربیت دے کر پالنا ہر حال میں جائز ہے، نیز ایسے بچوں کو لقیط کا حکم دیا گیا ہے، اگر ضائع ہونے کا خطرہ ہے تو لیکر پرورش کرنا وجوب کے درجہ میں ہوجاتا ہے، اور اگر کوئی خطرہ نہیں ہے، اور اسلامی تربیت میں لانے کو اجر عظیم سمجھ کر لیا جاتا ہے، تو بھی یہ کار ثواب ہے اور بچہ شرعاً مسلمان ہی ہوا کرتا ہے چاہے بچہ ولد الزنا ہو یا ثابت النسب اور ایسے بچوں کے مرنے پر ان پر نماز جنازہ پڑھکر مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کردینا لازم ہوجاتا ہے۔

وفي المحيط عند عدم أحد الأبوين يكون تبعاً لصاحب اليد وعند عدم صاحب اليد يكون تبعاً للدار ولعلهٗ أولیٰ" إلیٰ قوله " ويجعل مسلماً تبعاً لصاحب اليد الخ. (فتح القدير، باب الجنائز، قبيل فصل في حمل الجنازة، دارالفكر بيروت ۲/ ۱۳۲، زكريا ۲/ ۱۳۸، كوئٹه ۲/ ۹۴، البنايه قديم ۱/ ۱۱٤، اشرفيه جديد۳/ ۲۳٦)

اللقيط سميٰ به باعتبار ماله لما أنه يلقط والإلتقاط مندوب إليه لما فيه من إحيائه، وإن غلب عليٰ ظنه ضياعه فواجب الخ. (هدايه، كتاب اللقيط، اشرفی ديوبند۲/ ٦۱۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍رمضان ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷؍۲۴۱۷)

بچیوں کی پرورش کا حقدار اور خرچہ کا ذمہ دار کون ہے؟

سوال: [۱۰۳۰۳]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے ایک عورت سے اٹھارہ سال قبل شادی کی، اس عورت سے دو بیٹیاں پیدا ہوئیں، جب ایک بیٹی پیدا ہوئی تو اس عورت کا شوہر اپنی بیوی سے ناراض ہوگیا، اس کے بعد دوسری لڑکی پیدا ہوئی، اس پر اور زیادہ اپنی بیوی سے ناراض ہوگیا اور اپنی بیوی کو مارنا پیٹنا شروع کردیا حتی کہ گھر سے اپنی بیوی اور دونوں بیٹیوں کو نکال دیا اس کے بعد وہ عورت اپنی لڑکیوں کو لے کر اپنے میکے چلی آئی اور اپنے باپ کے گھر رہنے لگی، اور تقریباً ڈیڑھ سال تک کوئی خبر نہیں لی نہ کوئی خرچہ بیوی اور بچیوں کا بھیجا ڈیڑھ سال بعد اس نے یعنی شوہر نے اپنی بیوی کو طلاق نامہ تحریری طور پر ڈاکخانہ کے ذریعہ بھیج دیا اس طلاق نامہ کے بعد بھی چھ سال تک کوئی خبر نہ لی نہ لڑکیوں کو کوئی خرچہ دیا، اور نہ کسی طرح کی کوئی دیکھ بھال کی لڑکیاں اپنی والدہ کے ساتھ اپنے نانا کے مکان میں انہیں کی پرورش میں رہیں، اب ایک لڑکی سترہ سال کی ہے اور دوسری چودہ سال کی ہے، اب پریشان ہوکر لڑکیوں نے اپنا خرچہ لینے کیلئے عدالت میں مقدمہ دائر کردیا، جج نے فیصلہ سناتے ہوئے ایک ایک ہزار روپیہ دونوں لڑکیوں کے خرچ کے واسطے ہر ماہ مقرر کردیا ہے، اب وہ شخص اس خرچ سے بچنے کیلئے ان لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے، لڑکیاں کسی قیمت پر راضی نہیں کیونکہ وہ باپ کا سلوک دیکھ چکی ہیں، اور اس نے دوسری شادی بھی کرلی ہے، ان لڑکیوں کو باپ سے کوئی بھلائی کی امید نہیں، اور ماں تو سوتیلی ہو ہی جائے گی، اس سے بھی کیا امید کیجائے، صورت مذکورہ میں باپ ان لڑکیوں کو لے جانا چاہتا ہے، شرعاً کیا حکم ہے؟

المستفتي: محمد اشرف، چودھری سرائے، آدم پور روڈ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: لڑکیوں کے بالغ ہونے تک ماں کو اپنے پاس ان

کو رکھنے کا حق ہے، البتہ ان کا خرچہ باپ کے ذمہ لازم ہے، اور بالغ ہوجانے کے بعد ماں کا حق ساقط ہوجاتا ہے، اور باپ کو اپنے پاس رکھنے اور نگرانی کرنے کا حق ہوجاتا ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کی شادیوں کا انتظام کرنا ہوتا ہے، اور شادیوں کے انتظام اور خرچ واخراجات کا بار باپ ہی برداشت کرسکتا ہے، لہٰذا اگر باپ ان لڑکیوں کو خرچہ دینے اور ان کی ضروریات پوری کرنے کا وعدہ کرتا ہو تو باپ کو اپنے ساتھ لیجانے کا حق ہے، باپ کو اپنے ساتھ لے جانے میں رکاوٹ نہیں ڈالنا چاہئے۔

الأم والجدة أحق بالصغيرة حتى تحيض لأن بعد الاستغناء تحتاج إلیٰ معرفة آداب النساء والمرأة على ذلک أقدر وبعد البلوغ تحتاج إلیٰ التحصين والحفظ والأب فيه أقویٰ وأهدیٰ. (البحر الرائق، كتاب الطلاق، باب الحضانة، زكريا٤ /٢٨٧، كوئٹه ٤ / ١٧٠)

وإن كانت البالغة بكراً فللأولياء حق الضم وإن كان لا يخاف عليها الفساد إذا كانت حديثة السن. (هنديه، الباب السادس عشر في الحضانة، زكريا قديم ١ /٥٤٢، جديد ١ /٥٩٣)

ونفقة الإناث واجبة مطلقاً على الآباء مالم يتزوجن إذالم يكن لهن مال. (هنديه، زكريا قديم١ /٥٦٣، جديد ١ /٦٠٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ / ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۵۹۰/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۴/۲۸ھ

بچہ کی پرورش کا حقدار کون؟

سوال: الف: [۱۰۳۰۴]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں نے دو سال قبل اپنی بیوی کو تین طلاق دے دی تھی، طلاق کے وقت میرا ایک بیٹا تھا، جو تقریباً ڈیڑھ سال کی عمر کا تھا، جسکو میری بیوی اپنے ساتھ لے گئی تھی، وہ اپنی ماں کے پاس

ہی رہا اور ہمیں بھی کوئی زیادہ فکر نہیں رہی کہ تربیت متاثر ہونے کا قوی اندیشہ ہے، اگر ماں بچے کو اپنے شوہر کے گھر لے کر جاتی ہے، تو سوتیلا باپ اور سوتیلی بہن بھائیوں کے درمیان بچے کی اچھی دیکھ بھال ہونا بہت مشکل ہے، اور اگر اپنے والدین کے گھر چھوڑ کر جاتی ہیں، تو ماں باپ کی شفقتوں سے محروم رہے گا، فی الحال میں یہ چاہتا ہوں کہ بچہ جب تک سات سال کا ہو تب تک اپنی ماں کے پاس بھی رہے، اور میرے پاس بھی رہے، اور جب سات سال کا ہو جائے تو مستقل میری کفالت میں آ جائے، ہاں ماں سے ملنا جلنا بھی جاری رہے، تو کیا بچے کے نہال والوں یا ماں کو یہ حق ہے کہ میرے بیٹے کو مجھ سے ملنے سے روک دیں کیا مجھے فی الحال اپنے بیٹے سے ملنے کا حق حاصل نہیں ہے؟ اور سات سال کے بعد بچے کا کیا حکم ہے؟ جبکہ بچے کی تربیت خراب ہونے کا بھی اندیشہ ہو قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں، عین نوازش ہوگی، بینوا وتوجروا۔

المستفتی: محمد سہیل، محلّہ پختہ
باغ، گلشہید، ضلع: مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سات سال کی عمر تک ماں کے لئے بچہ کو اپنی پرورش میں رکھنے کا حق حاصل ہے، بشرطیکہ ماں نے غیر خاندان میں شادی نہ کی ہو اگر غیر خاندان میں شادی کر لی ہے، تو نانی کو حق پرورش حاصل ہے، اگر نانی زندہ ہے، اور اگر نانی زندہ نہیں ہے، تو پھر دادی کو حق پرورش حاصل ہو جاتا ہے، ان تمام صورتوں میں باپ کو اپنے بیٹے سے ہر وقت ملنے کا حق باقی رہتا ہے، اور نہال والوں کا اس درمیان باپ سے ملنے نہ دینا ظلم وزیادتی ہے، اور سات سال کی عمر پوری ہونے کے بعد باپ کیلئے بیٹے کو اپنی کفالت میں لے لینے کا حق شریعت نے دے رکھا ہے۔

وإن لم يكن له أم تستحق الحضانة بأن كانت .... فأم الأم أولىٰ من كل واحدة وإن علت فإن لم يكن للأم أم، فأم الأب أولىٰ . (هنديه، كتاب الطلاق، الباب السادس عشر فى الحضانة ، زكريا قديم ۱/ ۵۴۱، جديد۱/ ۵۹۲)

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده: أن امرأة قالت: يارسول الله! إن ابني هذا كان بطني له وعاء، وثديي له سقاء، وحجري له حواء، وإن أباه طلقني وأراد أن ينزعه مني، فقال: لها رسول الله صلى الله عليه وسلم: أنت أحق به مالم تنكحي. (سنن أبي داؤد، الطلاق، باب من أحق بالولد، النسخة الهندية ۱/ ۳۱۰، دارالسلام رقم: ۲۲۷٦)

وإنما يبطل حق الحضانة لهٰؤلاء النسوة بالتزوج إذا تزوجن بأجنبي. (هنديه كتاب الطلاق،الباب السادس عشر في الحضانة، زكريا قديم ۱/ ۵٤۱، جديد ۱/ ۵۹۲)

والحاضنة أما أو غيرها أحق بالغلام حتى يستغني عن النساء وقدر بالسبع وبه يفتىٰ لأنه الغالب ...... ولو اختلفا في سنه فإن أكل وشرب ولبس واستنجى وحده دفع إليه ولو جبرأ وإلا لا. (شامي، كراچي ۳/ ۵٦٦، جديد زكريا۵/ ۲٦۷، هنديه ۱/ ۵٤۲، جديد زكريا ۱/ ۵۹۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ر محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۰۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶/۱/۱۴۳۵ھ

لڑکی کی پرورش کا حق کس کو ہے؟

سوال: ب: [۱۰۳۰۴]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری بچی کی عمر اس وقت تقریباً ۹ رسال ہے، بچی کی والدہ کے انتقال کو تقریباً ۷ رسال ہوگئے اور ہمارے یہاں طلاق کو ۸ رسال ہوگئے شروع کے دو سال لڑکی ننہال میں رہی والدہ کا دوسری جگہ نکاح ہوگیا تھا، وہاں پر اس کو قتل کردیا گیا، قتل کے بعد بچی کو ہم اپنے یہاں لے آئے کچھ دن بچی اپنی سب سے بڑی پھوپھی کے یہاں رہی اب بچی کے والد کا دوسرا نکاح ہوگیا اب وہ لڑکی اپنے والدین کے ساتھ رہ رہی ہے، قانونی کاروائی کے ذریعہ لڑکی کو لینے کی کوشش کی جاری ہے، شرعاً لڑکی کو رکھنے کا کون حقدار رہے، والد یا ننہال

والے، مفصل جواب عنایت فرمائیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب لڑکی کی ماں نے کسی اجنبی شخص سے نکاح کرلیا تھا، اسی وقت باپ کو اپنے یہاں لے آنے کا حق ہو چکا تھا، اور ماں کے بعد دادی کو حق مل جاتا ہے، نیز بالغ ہونے پر ہر حال میں باپ کو رکھنے کا حق ہوجاتا ہے، اور لڑکی ۹؍سال میں بھی بالغ ہوسکتی ہے۔

عن عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده: عبد الله بن عمرو :أن امرأة قالت: یارسول الله! إن ابنی هذا کان یطنی له وعاء، وثدیی له سقاء، وحجری له حواء، وإن أباه طلقنی وأراد أن ینزعه منی، فقال: لها رسول الله صلی الله علیه وسلم : أنت أحق به مالم تنکحی. (سنن أبی داؤد، الطلاق، باب من أحق بالولد، النسخة الهندیة ۱/ ۳۱۰، دارالسلام رقم: ۲۲۷۶)

وإنما یبطل حق الحضانة لهولاء النسوة بالتزوج إذا تزوجن بأجنبی. (هندیه، کتاب الطلاق، الباب السادس عشر فی الحضانة، زکریا قدیم ۱/ ۵۴۱، جدید ۱/ ۵۹۲)

الحاضنة یسقط حقها بنکاح غیر محرمة أي الصغیر (وقوله) والأم والجدة لأم أو لأب أحق بها أي بالصغیر حتی تحیض الخ. (درمختار، کراچی ۳/ ۵۶۵، زکریا ۵/ ۲۶۶ تا ۲۶۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍شوال ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۶۲۹)

سوا ماہ کی بچی کی پرورش کا حقدار کون ہے؟

سوال: [۱۰۳۰۵]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ احقر کے بڑے بھائی ابوالحسن ولد نورالحسن مرحوم کا بیاہ (شادی) ۲؍مارچ ۱۹۹۷ء کو

شاہانہ پروین دختر محمد فاروق کے ہمراہ ہوا شادی کے دس ماہ بعد ابوالحسن علیل ہو گئے، اس بیچ بھابھی صاحبہ رسم ورواج کے مطابق اپنے میکہ آتی جاتی رہیں، علالت کے پانچ ماہ بعد شاہانہ پروین صاحبہ جو کہ امید سے تھیں، تنہا اپنے میکے چلی گئیں ان کے میکے جانے کے بعد ابوالحسن صاحب کی علالت میں مزید شدت آ گئی اس بیچ ان کی سسرال سے کوئی عیادت تک کو نہیں آیا، بھابھی صاحبہ کے اسی اثناء میں لڑکی تولد ہوئی طبیعت میں کچھ بہتری ہونے پر ابوالحسن بچی اور زوجہ کی خیر وعافیت معلوم کرنے اسپتال گئے اور انھیں گھر لانے کے خیال کا اظہار کیا بھابھی صاحبہ اسپتال سے فراغت پا کر اپنے میکہ واپس چلی گئیں ابوالحسن صاحب پھر اپنی سسرال گئے، تو ساس نے انھیں بیوی اور بچی سے ملے دیئے بغیر یہ بہانا کر کے کہ بچی علیل ہے اسے پیلیا کا عارضہ ہے اور تم اس وقت تک یہاں آنے کی کوشش مت کرنا جب تک صحت یاب نہ ہو جاؤ، ابوالحسن سرطان کے عارضہ میں مبتلا تھے، انھوں نے ان خیالات کا اظہار گھر آ کر گھر کے افراد اور دوستوں کے سامنے کیا اور پھر وہ شدید بیمار ہو گئے، ان کا انتقال یکم اگست ۱۹۹۸ء کو رات ساڑھے آٹھ بجے ہوا، ابوالحسن مرحوم کے انتقال سے آٹھ یوم قبل ان کے سسر فاروق صاحب ابو الحسن کے ماموں عبدالرشید صاحب کے گھر آئے اور انھوں نے طلاق کی بابت خیال ظاہر کیا، عبدالرشید صاحب نے ابوالحسن کی شدید علالت فاروق صاحب کے سامنے بیان کی انتقال سے دو یوم قبل فاروق صاحب (سسر ابوالحسن) داماد کے چھوٹے ماموں اور ابوالحسن کی والدہ کے ماموں کے گھر آئے اور انھوں نے وہاں بھی طلاق کی بابت اظہار کیا، ابوالحسن کے انتقال پر شاہانہ پروین بھابھی صاحبہ سسرال نہیں آئیں اور انھوں نے ہمارے یہاں کے معزز اور بزرگ اشخاص کے روبرو مہر وغیرہ معاف کئے، اب فریقین بچی کو جو کہ سوا ماہ کی ہے، ددھیال کو سونپنے کا اصرار کر رہے ہیں، ایسی صورت میں شرعی احکامات سے مطلع فرمائیں؟

المستفتي: طاہر حسین، شیدی سرائے، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگرلڑکی اورلڑکی والوں نےاس بچی کی پرورش کرنے سے انکارکردیا ہےتو شوہر کے وارثین جوکہ بچی کے شرعی ولی ہیں، چاہے بچی کا داداہو یاچچاوغیرہ ان پرضروری ہے کہ اس بچی کی پرورش کی ذمہ داری لے لیں ،اورکسی بھی عورت کے ذریعہ سے اس کی دودھ پلائی اور پرورش کاانتظام کریں اگر دادی یاپھوپھی وغیرہ دودھ پلاسکتی ہیں،تو فبہاورنہ دودھ پلانے کیلئے کسی بھی عورت کومنتخب کرلیا جائے، اور بچی دادی یاپھوپھی کی پرورش میں رہے۔

ولیس علی أمة أرضاعه قضاء بل دیانة إلا إذا تعینت ویستأجر الأب من ترضعه عندها قال العلامة الشامی تحت قوله عندها أي عندالأم وظاهر التعلیل أن کل من ثبتت لهاالحضانة فی حکم الأم. (شامی، کتاب الطلاق ،باب النفقة ، مطلب فی ارضاع الصغیر ، زکریا دیوبند ۵/۳٤۷، کراچی ۳/٦١٨، ھندیه ، زکریا قدیم۱/٥٦٠، جدید۱/٦٠٧، ٥/٣٤٧، زکریا) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیراحمدقاسمی عفااللّٰہ عنہ
۱۶/ربیع الاول ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر:۳۳/۲۲/۵۷۲۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۴/۱۴۱۹ھ

تین ماہ کی لڑکے کی پرورش کاحق ماں کوہے یاباپ کو

سوال: [۱۰۳۰٦]: کیافرماتے ہیں علماءکرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے اپنی بیوی کوایک مجلس میں تین طلاقیں دیں،اس کامہراور نان نفقہ بھی اداکردیا، بیوی اپنے میکہ چلی گئی ہم دونوں کے ایک لڑکا ہے جس کی عمر وقت طلاق تین ماہ تھی ، طلاق کا واقعہ ۱۴/شعبان ۱۴۱۴ھ کا ہے، بیوی بچہ کواپنے پاس رکھنا چاہتی ہے،اوراسکی پرورش کا کچھ خرچہ بھی نہیں لینا چاہتی ہے، بیوی کے پاس اس خیال سے چھوڑنا نہیں چاہتا ہوں کہ وہ اگر دوسری شادی کرے تو بیٹا کسی دوسرے مرد کے زیرسایہ پرورش پائے گا زید بھی بخوشی اپنی کفالت

میں پرورش کرنا چاہتا ہے، زید کے بیٹے کے دادا دادی چچا پھوپھی سب موجود ہیں، انکی بھی یہی خواہش ہے، قرآن وحدیث کا کیا حکم ہے؟ مفصل بیان فرمائیں؟ نوازش ہوگی؟

المستفتي: نور محمد سیفی، شیدی سرائے، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب تک بیوی دوسری شادی نہیں کریگی اس درمیان سات سال کی عمر تک بیوی کو اپنے پاس بچہ رکھنے کا حق ہے، اور خرچہ بچہ کے باپ پر لازم ہے، اور اگر بیوی دوسری شادی کر لیتی ہے، تو باپ کو اپنے یہاں بچے کو رکھنے کا حق ہوگا، اور بیوی کا حق ختم ہو جائیگا۔

إذا كا ن للرجل ولد صغير وقد فارق أمه، فالأم أحق بالولدمن الأب إلا أن يستغنىٰ عنها، وفى الحجة ! مع بقاء النكاح وبعد النكاح مالم تتزوج، وفى الهداية ! والنفقة على الأب. (تاتار خانية، زكريا ٢٧٣/٥، رقم: ٧٨٣١)

والحاضنة يسقط حقها بنكاح غير محرمة الخ. (درمختار، كراچی ٥٦٥/٣، زكريا ٢٦٦/٥) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۲۴؍محرم ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸۳۹/۳۱)

ایک سالہ بچہ کی پرورش کا حقدار کون؟

سوال: [۱۰۳۰۷]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسماۃ نرگس بنت مختار حسین کی شادی بتاریخ ۲؍مارچ ۱۹۹۷ء کو ہمراہ محمد سلیم ولد رضا حسین محلہ مانپور سے ہوئی تھی، شادی کے کچھ ماہ بعد تک حالات سازگار رہے، اس کے بعد ظلم اور زیادتی کا سلسلہ شروع ہوگیا، ہر کام میں عیب جوئی کرنا اور مارنا پیٹنا روز کا معمول بن گیا، غلط کام نہ ماننے کی صورت میں اور بھی ظلم زیادتی کی جاتی، جیسے جنسی فعل پر آمادہ کرنا اور غیر مرد سے

زبردستی تعلقات استوار کرنا، اب تقریباً ایک سال سے گھر پر موجود ہے، ٹی بی کی مریضہ ہے شیر خوار بچہ ہے جس کی عمر اس وقت ایک سال ہے، کوئی بھی شخص آج تک کسی طرح کی خبر گیری کرنے والا نہیں علاج اور دیگر اخراجات پورے کرنے والا کوئی نہیں، تو اب لڑکی طلاق لینا چاہتی ہے، اور شوہر بھی طلاق دینا چاہتا ہے، تو پوچھنا یہ ہے کہ مہر اور عدت کا خرچہ شوہر کو دینا پڑیگا، یا نہیں؟ اور ایک سال کا بچہ ہے وہ کس کے پاس رہے گا، اور اس کی پرورش وغیرہ کا خرچہ کون برداشت کریگا؟ شرعی حکم کیا ہے؟ تحریر فرمادیں؟

المستفتي: مختار حسین ولد
رضا حسین، محلّہ گلشہید، ضلع: مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر بلا شرط شوہر طلاق دے رہا ہے، تو مہر کی ادائیگی بہر حال اس پر لازم ہے، نیز عدت کا خرچہ بھی دینا پڑے گا، اور چھوٹے بچے کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اس کی پرورش کا سب خرچ باپ کے ذمہ ہے، البتہ جب تک وہ سات سال کا نہ ہوجائے، وہ ماں کے پاس رہے گا، کیونکہ اس عمر میں ماں سے بہتر اس کی پرورش کوئی اور نہیں کرسکتا ہے، سات سال کے بعد باپ اگر چاہے تو اسے اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔

(مستفاد: فتاویٰ دارالعلوم ۲۴۹/۸، احسن الفتاویٰ ۴۶۱/۵، امداد الاحکام ۴۴۳/۳)

أفاد أن المهر وجب بنفس العقد ...... وإنما يتأكد لزوم تمامه بالوطئ...... وإذا تأكد المهر بما ذكر لايسقط بعد ذلك، وإن كانت الفرقة من قبلها. (شامی، کتاب النکاح، باب المهر، کراچی ۱۰۲/۲، زکریا ۲۳۳/٤)

المعتدة عن الطلاق تستحق النفقة والسكنىٰ كان الطلاق رجعياً أو بائناً أو ثلاثاً حاملا كانت المرأة أو لم تكن . (فتاویٰ عالمگیری، کتاب الطلاق، باب النفقة، الفصل الثالث فی نفقة المعتدة، زکریا قدیم۱/۵۵۷، جدید۱/۶۰۵)

ونفقة الأولاد الصغار على الأب لايشاركه فيها أحد الخ. (عالمگیری،

زکریا قدیم ۱/ ۵٦۰، جدید۱/ ٦۰۷)

أحق الناس بحضانة الصغير حال قيام النكاح أو بعد الفرقة الأم.

(فتاویٰ عالمگیری، زکریا قدیم ۱/ ۵٤۱، جدید ۱/ ۲ ۵۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
ارصفر المظفر ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٦ ۳/ ۷۴۷۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۲/۱ھ

دوسال دس مہینہ کا بچہ کس کے پاس رہے گا؟

سوال: [۱۰۳۰۸]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں نے اپنی بیوی کو دوسال پہلے دوطلاق دی تھی، پھر مفتی صاحب سے مسئلہ معلوم کر کے رجوع کر کے ساتھ رہنے لگا، اوراب چار ماہ پہلے فون پر ایک طلاق دی ہے، اوراس آخری طلاق کے بارے میں میری بیوی کا دعویٰ ہے کہ میں نے طلاق نہیں سنی جب کہ میں نے طلاق دے دی ہے، ہمارے اوراسکے درمیان اس آخری طلاق سے جدائیگی ہے، اس سلسلے میں میری بیوی کے گھر والوں نے ڈاکٹر ذاکر نائک سے انٹرنیٹ کے ذریعہ سے معلوم کیا جس میں انھوں نے فرمایا کہ طلاق واقع نہیں ہوئی ہے، اوراس بیوی سے میرا ایک لڑکا ہے، جس کی عمر دوسال دس مہینہ ہے، اگر طلاق واقع ہوگئی ہے، تو کیا اس صورت میں میرا بیٹا اپنی ماں کے ساتھ اپنی نانی کے گھر رہے گا، اورجب تک بچہ اپنی ماں کے پاس رہے گا، اس عرصہ کا خرچ مجھے دینا ہوگا یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرما کرممنون فرمائیں؟

المستفتي: محفوظ عالم، محلّہ مقبرہ
درگاہ متصل بڑی مسجد، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شریعت نے شوہر کو زندگی بھر میں تین طلاق دینے کا اختیار دیا ہے، جن کو وہ جب ضرورت ہو دے سکتا ہے، لہٰذا جب شوہر نے دوسال پہلے

دوطلاق دے کر رجعت کرلی تھی، اس کے بعد تیسری طلاق دے دی تو اس سے بیوی شوہر کیلئے قطعی طور پر حرام ہوگئی ،لہٰذا اس کو بغیر حلالہ شرعی کے اپنے پاس زوجہ بنا کر رکھنا ناجائز اور حرام ہے، اور سات سال سے کم عمر کے لڑکے کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہوتا ہے، اور اس دوران بچہ کا مناسب خرچہ شوہر کے ذمہ لازم ہے، اور سات سال کے بعد ماں کو حق پرورش باقی نہیں رہتا ہے،اس لئے سات سال کے بعد باپ لڑکے کو اپنے پاس رکھنا چاہے، تو اسے اس کا اختیار ہے۔(مستفاد: فتاویٰ محمودیہ ڈابھیل ۱۳/ ۵۶۸)

وإن كان الطلاق ثلاثا في الحرة وثنتين في الأمة لم تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره نكاحاً صحيحاً ويدخل بهاثم يطلقها أويموت عنها. (هندية، زكريا قديم ۱/ ۴۷۳، جديد ۱/ ۵۳۵، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ۲/ ۸۸، هداية، اشرفي ديوبند ۲/ ۳۹۹)

ولوقال: أنت طالق، طالق، طالق طلقت ثلاثاً. (الاشباه قديم ص: ۲۱۹، جديد زكريا ص: ۳۷۶)

الحاضنة أما أو غيرها أحق به أي بالغلام حتى يستغنىٰ عن النساء وقدر بسبع وبه يفتىٰ. (الدرالمختار مع الشامي، زكريا ۵/ ۲۶۷، كراچی ۳/ ۵۶۶، باب الحضانة)

ويجبر الأب على أخذ الولد بعد استغنائه عن الأم لأن نفقته و صيانته عليه بالإجماع. (شامی، كراچی ۳/ ۵۶۶، زكريا ۵/ ۲۶۸، ملتقىٰ الابحر مع مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ۲/ ۱۶۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۹؍محرم ۱۴۳۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۸۵۳)	۱۴۳۶/۱/۲۹ھ

۴؍سالہ بچی کی پرورش کا حق دادی کو ہے یا نانی کو؟

سوال: [۱۰۳۰۹]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ محمد

عامر کا انتقال ہو گیا، انھوں نے ایک لڑکی، والدہ، زوجہ، والد، ساس، خسر، کو چھوڑا ہے، جملہ ارباب اب تک بقید حیات ہیں، بچی کی عمر تقریباً پونے چار سال ہے، اور عامر کے انتقال کو ساڑھے تین سال ہو چکے ہیں، بچی کی ماں (زوجہ محمد عامر مرحوم) اب تک اپنی سسرال میں رہتی تھیں، اب اس نے دوسرا نکاح کرلیا ہے، موجودہ شوہر بچی کے غیر خاندان سے ہیں ان کی پہلی بیوی فوت ہو چکی ہے، ان کے دولڑکے بڑے ہیں، جن میں سے بڑے لڑکے کی عمر تقریباً دس سال ہے، دوسرے کی تقریباً سات سال ہے، اور لڑکی کی تقریباً پانچ سال ہے، محمد عامر مرحوم کی بچی اپنی ماں کے پاس ہے، وہ اپنے پاس رکھ کر اس کو تعلیم دلانا چاہتی ہے، ادھر دادا دادی بچی کی مفارقت سے بے چین ہیں، بیقراری کا یہ عالم ہے، کہ بچی کے نہ ملنے پر اکثر روتے ہیں، اور بچی کو اپنے پاس رکھنا نیز اس کی پرورش کرنا چاہتے ہیں، دادا دادی اپنے گھر میں تنہا ہیں، لڑکیاں تھیں سب کی شادی ہوگئی اور ماشاء اللہ سب صاحب اولاد اور اپنے اپنے گھر ہیں، نانی نانا صاحب اولاد ہیں، نیز اسی گھر میں جس میں نانی نانا رہتے ہیں، ان کے بڑے بھائی (نانا کے) اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہتے ہیں، کمرہ دالان الگ الگ ہے، صحن اور آمدورفت کا راستہ ایک ہی ہے، ایسے حالات میں حق پرورش کس کو ملے گا، دادادادی بچی کو اپنے پاس رکھ کر اسکی پرورش اور تعلیم وتربیت کرنا چاہتے ہیں، مذکورہ حالات میں حکم شرعی کیا ہے؟

المستفتي: سائلہ زوجہ ابرار احمد، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب بچی کی ماں کا نکاح غیر خاندان میں ہو گیا ہے، اور دادی اور نانی میں سے ہر ایک اپنے پاس رکھنے کیلئے تیار ہیں، اور سوالنامہ سے یہ بات معلوم ہورہی ہے، کہ دادی اور دادا زیادہ شفیق ہیں، اور شرعی طور پر باپ کے بعد ولی شرعی دادا ہی ہوتا ہے، جس میں نکاح وغیرہ کی ساری ذمہ داری دادا کے اوپر عائد ہوتی ہے، اسلئے مناسب یہی ہے، کہ امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق مذکورہ واقعہ میں بچی کی پرورش کا حق

نانی کے بجائے، دادی کو دیا جائے، اسلئے کہ بچی کی ماں بھی باپ کی وفات کے بعد ایک مدت تک دادی ہی کے پاس رہی ہے، لہٰذا اس واقعہ میں امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق نانی کے بجائے دادی کو حق پرورش دے دینا چاہئے۔

الأم أحق بحضانة ولدها قبل الفرقة وبعدها ...... أي بعد الأم بأن ماتت أولم تقبل أو تزوجت بغير محرم أو ليست أهلا (إلىٰ قوله) وعن أبى يوسفؒ أن أم الأب أولىٰ . (مجمع الأنهر، جديد، دارالكتب العلمية بيروت ۲/۱٦٦، تاتا خانية قديم ٤/ ۹۱، جديد زكريا ٥/ ۲۷٤، رقم: ۷۸۳۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ / صفر ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷ / ۸۶۹۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶ / ۲ / ۱۴۲۶ھ

سات سال سے کم عمر کے بچے کی پرورش کا حق کسے ہے؟

سوال: [۱۰۳۱۰]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر میاں بیوی میں جدائی ہو جائے تو شیر خوار یا تین چار سال کے بچے کو۔

(الف) شرعاً اپنے پاس رکھنے کا کون حقدار ہے، ماں یا باپ؟

(ب) شرعا ماں بچہ کو کب تک اپنے پاس رکھنے کی حق دار ہے، جبکہ باپ بچہ کی پرورش میں نہ تو ایک پیسہ خرچ کرتا ہے، اور نہ ہی شمع برابر انسیت دکھاتا ہے؟

(ج) جب بچہ ۷ / ۸ / سال کا ہوشیار ہو جائے، اور باپ کے پاس نہ رہنا چاہے تو کیا باپ شرعاً اور جبراً بچہ کو اپنے پاس رکھ سکتا ہے؟

(۲) بیوی اگر خلع کرانا چاہے تو کیا شوہر شیر خوار یا تین چار سال کے بچہ کو اپنے پاس لینے کی شرط رکھ سکتا ہے؟ کیا شرعاً ایسا کرنا درست ہے؟

المستفتي: شفیع الزماں، نور پور، برونی ویل، بیگوسرائے

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: [الف وب] جب تک ماں کسی اجنبی شخص سے نکاح نہ کرے اس وقت تک بچوں کی والدہ کو حق پرورش ہوگا، شوہر کے لئے جائز نہیں ہے کہ بچوں کو والدہ سے علیحدہ کرے، لڑکے کو سات سال کی عمر تک اور لڑکی کو بالغ ہونے تک ماں اپنی پرورش میں رکھنے کی حقدار رہے۔ (مستفاد: فتاویٰ دار العلوم ۱۱/ ۹۰)

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده: أن امرأة قالت: يارسول الله! إن ابني هذا كان بطني له وعاء، وثديي له سقاء، وحجري له حواء، وإن أباه طلقني وأراد أن ينزعه مني، فقال: لها رسول الله صلى الله عليه وسلم: أنت أحق به مالم تنكحي. (سنن أبي داؤد، الطلاق، باب من أحق بالولد، النسخة الهندية ۱/ ۳۱۰، دارالسلام رقم: ۲۲۷٦)

والحضانة تثبت للأم الخ. (درمختار، كتاب الطلاق، باب الحضانة، كراچی ۳/ ۵۵۵، زكريا ۵/ ۲۵۳)

والحاضنة أما أو غيرها أحق به أي بالغلام حتى يستغني عن النساء، وقدر بسبع وبه يفتي ....أحق بها أي بالصغيرة حتى تحيض أي تبلغ الخ. (الدرالمختار مع الشامي، زكرياه/ ۲٦۷، كراچی ۳/ ۵٦٦)

(ج) بچہ سات سال کا ہو جائے، اور ہوشیار ہو جائے تو اسکے بعد شرعی طور پر والد کو حق ہے، کہ وہ اپنے بچے کو اپنے ساتھ رکھے اسلئے کہ بچہ کی صحیح تعلیم وتربیت اور مردانگی سکھانا والد ہی بحسن وخوبی انجام دے سکتا ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۹/ ۲۲۹، جدید ڈابھیل ۱۳/ ۵٦۲)

لأنه يحتاج إلىٰ معرفة آداب الرجال والتخلق بأخلاقهم، فإذا طال مكثه مع الأم يتخلق بأخلاق النساء وفي ذلك من الفساد مالا يخفىٰ الخ.

(الهنديه، زكريا قديم ۱/ ۴۹۰، جديد ۱/ ۵۵۰)

اور جبراً بھی اسے اپنے باپ کے پاس سپرد کردیا جائے۔ (مستفاد: فتاویٰ دار العلوم ۱۱/ ۹۵)

فإن أكل وشرب ولبس واستنجىٰ وحده دفع إليه ولو جبراً، قال: ابن عابدين: وفي الفتح: ويجبر الأب على أخذ الولد بعد استغنائه عن الأم الخ. لأنه أقدر على تأديبه و تعليمه. (الدرالمختار مع الشامي، زكريا ٥/٢٦٨، كراچی ٣/٥٦٦، فتح القدير، زكريا ٤/٣٣٣، كوئٹه ٤/١٨٧، دارالفكر بيروت ٤/٣٧١)

(۲) شوہر شیر خوار یا تین چار سال کے بچے کو اپنے پاس رکھنے کی شرط پر خلع کرے تو خلع صحیح ہوجائیگا، مگر پھر بھی بچہ اپنی ماں ہی کے پاس رہے گا، اسلئے کہ بچہ کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے، اور شرط باطل ہوجائیگی۔

رجل خلع امرأته وبينهما ولد صغير على أن يكون الولد عند الأب سنين معلومة صح الخلع ويبطل الشرط، لأن كون الولد الصغير عند الأم حق الولد الخ. (الهنديه، زكرياقديم ١/٤٩١، جديد ١/٥٥٠، قاضيخان، جديد زكريا ١/٣٣٧، وعلى هامش الهندية، زكريا ١/٥٣٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱ر ذیقعدہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۵۰۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۱۱/۲ھ

۷ر سالہ بچہ کی تعلیم وتربیت کا ذمہ دار کون؟

سوال: الف: [۱۰۳۱۱]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری بیوی کو اس کے بھائیوں نے ایکسیڈنٹ کے بہانے بلایا اور وہاں لیجا کر گھر بٹھالیا پھر وہ میرے گھر نہیں آئی، میرے دو بچے ہیں، ایک کا نام حجاز الدین تاریخ پیدائش ۱۹ر نومبر ۱۹۹۲ء اور دوسرا اثار الدین، تاریخ پیدائش یکم اکتوبر ۱۹۹۴ء ہے، اب انھوں نے کورٹ کے ذریعہ مجھ سے خرچہ لینا شروع کردیا اور سو روپیہ مہینہ فی بچہ خرچ جاتا رہا، اچانک میرے پاس ایک ہزار روپیہ فی بچہ کے حساب سے کورٹ کا کاغذ آیا، میں نہیں چاہتا کہ میرے بچے مجھ سے الگ رہیں، میں اپنے بچوں کو اپنے پاس رکھ کر تعلیم کا انتظام خود کروں گا، اور دونوں بچوں میں

سے ایک کی عمر۱۲؍سال دس ماہ اور دوسرے کی عمر دس سال گیارہ مہینہ ہے، اب اس سلسلہ میں شریعت کا حکم کیا ہے؟ کیا ان بچوں کی پرورش کا مجھے حق ہے یا نہیں؟

المستفتي: نفیس الدین، لالباغ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب لڑکے کی عمر سات سال کی ہوجائے، اس وقت پرورش اور تعلیم وتربیت کا ذمہ دار شرعی طور پر باپ ہوتا ہے، اسلئے جب لڑکے کی عمر سات سال یا اس سے تجاوز کر جائے، تو باپ کو حق پہونچتا ہے، کہ بیٹے کو ماں کے یہاں سے اپنے پاس لاکر اس کی تعلیم وتربیت خود کرے اور اب ماں کو حق نہیں ہے، کہ بچوں کو اپنے پاس روک کر کے ان کے اخراجات کا مطالبہ بچوں کے باپ سے کرے، بلکہ بچوں کو باپ کے حوالہ کردینا لازم ہے، لہٰذا اگر باپ کے مطالبہ کے باوجود بچوں کو باپ کے حوالہ نہ کردیا جائے یا بچے خود باپ کے پاس نہ آئیں تو ایسے بچوں کے اخراجات کی ذمہ داری باپ کے اوپر عائد نہیں ہوتی اور نہ ہی باپ کو خرچہ دینے پر شرعاً مجبور کیا جاسکتا ہے۔

وإذا استغنى الغلام عن الخدمة أجبر الأب (قوله) لأنه أقدر على تأديبه وتعليمه. (شامی، کتاب الطلاق، باب الحضانة، زکریا ۵/۲۶۸، کراچی ۳/۵٦٦، هندیه، زکریا قدیم ۱/۵٤۱، جدید ۱/۵۹۲، ملتقیٰ الأبحر، دارالکتب العلمية بيروت ۲/۱٦۸، ۱٦۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲٦ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۸۳۴)

بچوں کی پرورش کا حق ماں کو سات سال تک حاصل ہے

سوال: ب: [۱۰۳۱۱]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے بہنوئی صاحب نے خود اپنے بدن پر مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگالی تھی، جس کے نتیجہ

میں ان کا انتقال ہوگیا، اولاد میں انھوں نے دولڑکے کے جن میں سے ایک کی عمر تقریباً ڈھائی سال ہے اور ایک بچہ کی عمر ایک ماہ کچھ دن ہے، اور ایک لڑکی ہے، جس کی عمر تقریباً ساڑھے تین سال ہے، ان کو وارث چھوڑا ہے لڑکے کے بھائیوں نے لڑکی کے بھائیوں کے خلاف تھانہ میں رپورٹ درج کرادی کہ یہ آگ سسرال والوں نے لگائی ہے، محلّہ کے لوگوں کے سمجھانے پر وہ لوگ آپس میں فیصلہ کیلئے راضی ہوگئے، اورلڑکے والوں نے کہا ہم تین شرطوں کے ساتھ یہ فیصلہ کرسکتے ہیں۔

(۱) پولیس رپورٹ کو ختم کرنے کیلئے جو روپئے خرچ ہوں گے وہ لڑکی کے بھائیوں کو دینا ہوگا۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ تینوں بچوں کے نام کی ایف ڈی کرادی جائے۔

(۳) تیسری شرط یہ ہے کہ بچے چچا تاؤ کے گھر جائیں گے، ماں کو چھوڑنا پڑے گا، اب دریافت یہ کرنا ہے، کہ ان تینوں شرطوں میں سے کون سی شرط جائز ہے اور کون سی شرعاً مانی جائے، اور کون سی ناجائز ہے؟

المستفتي: اشتیاق حسین، کٹار شہید، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: لڑکے والوں کی طرف سے پیش کردہ تینوں شرطیں ناجائز ہیں، اس لئے کہ جب مقدمہ لڑکے والوں نے کیا ہے، تو اس کو ختم کرانے کے خرچ کی ذمہ داری بھی انہی کی ہوگی، لڑکی والوں پر اس سلسلہ میں دباؤ ڈالنا درست نہیں۔

لایحل لمسلم أن یأخذ مال أخیه بغیر حق . (مجمع الزوائد، دارالکتب العلمية بیروت ٤/ ١٧١)

(۲) بچپن کے زمانہ میں چھوٹے بچوں کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے، چچا کو حاصل نہیں ہے۔

وحق الحضانة جعل إلیٰ النساء لأنهن أبصر و أقوم علی حفظ

الصبیان من الرجال لزیادة شفقتهن الخ. (البحرالرائق، کتاب الطلاق، باب الحضانة، زکریا ٤/ ٢٨٠، کوئٹه ٤/١٦٦)

(۳) بچوں کے مال کی ایف ڈی جائز نہیں ہے، البتہ تحفظ کیلئے غیر سودی کھاتے میں جمع کر سکتے ہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/ ۱۵۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ر محرم ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۶۸۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/۱/۱۴۲۶ھ

۷ر سال تک لڑکے اور نو سال تک لڑکی کی پرورش کا حق ماں کو ہے

سوال: [۱۰۳۱۲]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور دونوں میں تفریق بھی ہوگئی تقریباً چار سال ہوئے اس کے تین بچے ہیں، ایک کی عمر تقریباً ۱۲ر سال، دوسرے کی عمر تقریباً ۸ر آٹھ سال، اور تیسرے کی عمر تقریباً چھ سال ہے، اور وہ تینوں بچے اپنے باپ کے پاس رہتے ہیں، ان کی ماں میکہ میں رہتی ہے، مگر ان کی ماں کبھی کبھی عید وغیرہ کے موقعہ پر اپنے بچوں کو ان کے باپ کی اجازت کے بغیر چپکے سے کچھ کپڑے یا کھانے پینے کی چیزیں دینا چاہتی ہے، تو کیا شرعاً وہ ان کے باپ کی اجازت کے بغیر اس طرح کی چیزیں دے سکتی ہے یا نہیں؟ جبکہ ان کے باپ بچوں کو اس طرح کی دی ہوئی چیزوں کو کھانے یا پینے میں ان کی جان پر خطرہ محسوس کرتے ہیں، اسلئے از روئے شرع اس کا کیا حکم ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: میاں بیوی کے درمیان اگر تفریق ہو جائے اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچے موجود ہوں، تو ان کی ماں کو سات سال تک لڑکے کی اور نو سال تک لڑکی کی پرورش کا حق حاصل ہے، اور اس دوران ان کی تعلیم و پرورش کا خرچہ باپ کے ذمہ

واجب ہے، اوران میں سے بچے چاہے کسی کے پاس ہوں دوسرے کوان کی دیکھ بھال کرنے یاہدیہ وغیرہ دینے سے منع کرناناجائز ہے۔

إذاكان للرجل ولد صغير وقدفارق أمه فالأم أحق بالولد من الأب إلا أن يستغني عنها وفي الهداية: والنفقة على الأب ، فإذا استغنى ، فالأب أحق به، وحد الاستغناء في الغلام أن يأكل وحده ويشرب وحده .... وذكر الخصاف في كتاب النفقات: أن الأم أحق بالغلام مالم يبلغ سبع سنين ، أو ثمان سنين ، والفتوىٰ على سبع سنين ، وأما في الجارية فحد الإستغناء إلىٰ أن تحيض الخ. (تاتار خانية ، زكريا ٥/٢٧٣، رقم: ٧٨٣١، ٧٨٣٢)

وفي الحادي : الولد متى كان عند أحد الأبوين لايمنع الاٰخر عن النظر إليه وعن تعاهده. (فتاویٰ تاتار خانية ، زكريا ٥/٢٧٤، رقم: ٧٨٣٥، شامي، كتاب الطلاق ، باب الحضانة ،زكريا ٥/٢٧٥، كراچی ٣/٥٧١)

اس لئے جداہونے کے بعدبھی ماں اپنی طرف سے بچوں کوان کے باپ کی اجازت کے بغیر کھانے پینے کی چیزیں اور کپڑاوغیرہ دے سکتی ہے، اس سے باپ کومنع کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیراحمدقاسمی عفااللہ عنہ
۱۵؍جمادی الاول ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴؍۶۳۱۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۸/۱۴۲۰ھ

آٹھ سال کے بچہ کی پرورش کا حق

سوال: [۱۰۳۱۳]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ محمد سعید بن محمد رفیق (ساکن لال پور، کچھا، ضلع ادھم سنگھ نگر) اور دلشاد بیگم بنت حاجی محمد معروف (ساکن مسجد قریشیان محلہ دوئم پورہ، ٹانڈہ بادلی، ضلع رامپور) دونوں میاں بیوی تھے، طلاق مغلظہ کے بعد دونوں میں علیحدگی واقع ہوئے چھ سال ہو چکے ہیں، ان دونوں

سے شاہ نور نامی ایک لڑکا ہے شاہ نور کی عمر آئندہ تین جون کو اس کی تاریخ پیدائش ۳/۶/۲۰۰۴ء کے لحاظ سے پورے آٹھ سال کی ہوجائے گی، اب دلشاد بیگم کا یہ مطالبہ ہے کہ بحیثیت ماں شاہ نور کا حق حضانہ مجھے حاصل ہے اس لئے محمد سعید شاہ نور پر آئندہ خرچ ہونے والی رقم مجھے ادا کرے، جبکہ محمد سعید کا کہنا ہے کہ شرعی لحاظ سے شاہ نور کے تعلق سے دلشاد بیگم کا حق حضانہ ختم ہو چکا ہے، اس لئے شاہ نور کو فوری طور پر میرے سپرد کیا جانا چاہئے، اب دلشاد بیگم کی سپردگی میں رہتے ہوئے شاہ نور پر خرچ ہونے والی رقم مجھ پر واجب نہیں ہوتی میں خود شاہ نور کو اپنی سپردگی میں لے کر ہی پرورش کرنا چاہتا ہوں، آپ صورت مسئولہ کے پیش نظر محمد سعید اور دلشاد بیگم دونوں کے دعوے اور مطالبہ کی مدلل انداز میں حقیقت بیان فرمادیں؟ نوازش ہوگی؟

المستفتي: محمد توفیق، لال پور، کچھا، اودھم سنگھ نگر، اتراکھنڈ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر شوہر اور بیوی کے درمیان طلاق اور جدائی ہوجائے، تو لڑکے کی پرورش کا حق ماں کو اس وقت تک حاصل رہتا ہے، جب تک بچہ سات سال کی عمر کا نہ ہوجائے، اور سات سال یا اس سے زائد عمر ہوجائے تو پھر ماں کو حق پرورش کے مطالبہ کا حق باقی نہیں رہتا ہے، بلکہ سات سال کی عمر کے بعد باپ کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ بچہ کو اپنے پاس رکھ کر پرورش کرے۔ (مستفاد: محمودیہ ڈابھیل ۱۳/ ۵۶۷، ۵۶۸)

تثبت للأم ولو بعد الفرقة .... والحاضنة أما أو غيرها أحق به أي بالغلام حتى يستغني عن النساء بأن يأكل ويشرب ويستنجىٰ وحده وقدر بسبع وبه يفتىٰ؛ لأنه الغالب. (درمختار مع الشامی، کتاب الطلاق، باب الحضانة کراچی ۳/ ٥٦٦، زکریا ٥/ ٢٦٧)

يجبر الأب علىٰ أخذ الولد بعد استغنائه عن الأم؛ لأن نفقته وصيانته عليه بالاجماع. (شامی، زکریا ٥/ ٢٦٨، کراچی ٣/ ٥٦٦، هندیه،

زکریا قدیم ۱/۵٤۱، جدید ۱/۵۹۲)

والأم والجدة أحق بالغلام حتیٰ یستغنیٰ وقدر بسبع سنین، وقال القدوری حتی یأکل وحده ویشرب وحده ویستنجیٰ وحده، وقدره أبوبکر الرازي بتسع سنین والفتویٰ علی الأول. (فتاویٰ عالمگیری، زکریا قدیم، ۱/۵٤۲، جدید ۱/۵۹۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۷۳۹/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۶/۲۹ھ

ماں کے انتقال کے بعد بچہ کی پرورش کا حق کس کو ہے؟

سوال: [۱۰۳۱۴]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری بہن کا انتقال ہوگیا ہے، اور اس نے ایک لڑکا چھ دن کا چھوڑا ہے، تو اس بچے کی پرورش کا حق کس کو ہے، جبکہ اس کا باپ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے، اور بچہ کا جو مال ہے وہ کس کے پاس رہیگا، جبکہ باپ کی نیت صحیح نہیں ہے، اور وہ اس سامان کو ضائع کردے گا، اس کا جواب مرحمت فرمائیں؟

المستفتي: طاہر حسین، محلّہ باڑہ شاہ صفا، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر بچہ کی نانی ہے تو اس کو حق ہے، اور اگر نانی نہیں ہے، تو دادی کو حق پرورش حاصل ہے۔

والحاضنة أما أو غیرها أحق به (إلیٰ قوله) والأم والجدة لأم أو لأب الخ. (الدر المختار، کتاب الطلاق، باب الحضانة، کراچی ۲/۵٦٦، زکریا دیوبند ۵/۲٦۸)

فإن ماتت الأم فأم الأم أولیٰ بحضانة الولد وتعهده. (تاتار خانية، زکریا ۵/۲۷٤، رقم: ۷۸۳۹، مجمع الأنهر، دار الکتب العلمية بیروت ۲/۱٦٦)

مگر سات سال کی عمر کے بعد باپ کو اپنے پاس لانے کا حق حاصل ہوگا، نیز بچہ کا مال

باپ ہی کے پاس رکھنا لازم ہے، باپ سے زیادہ ہمدرد شرعاً دوسرا کوئی نہیں ہے، اور باپ ولی عصبہ ہے جواس کے مال کی حفاظت کا زیادہ حقدار ہے۔

العصبة (إلیٰ قوله) **و أصله الخ** . (سراجی ص:۲۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳۹۵/۲۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲/۴/۱۴۱۴ھ

بھائی کے انتقال کے بعد اسکی بیوی بچہ کا ذمہ دار کون؟

سوال: [۱۰۳۱۵]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید عمر دونوں بھائی تھے بڑے کا نام زید اور چھوٹے کا نام عمر تھا بچپن سے زید نے عمر کی پوری ذمہ داری لے رکھی تھی، اور بالغ ہوگیا تو زید نے عمر کی شادی کردی اس سے ایک لڑکا پیدا ہوا کچھ ہی عرصہ کے بعد عمر کا انتقال ہوگیا عمر کی بیوی بچے کا ذمہ دار کون ہوسکتا ہے، ان کی والدہ یا زید؟

المستفتي: محمد ذکی اللہ رحمانی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: شرعاً والدہ اور زید دونوں میں سے کسی پر بھی ذمہ داری واجب نہیں ہے، البتہ ان میں سے کوئی اگر ذمہ داری لے کر عمر کی بیوی اور بچہ کی ضروریات پوری کرے، تو ایک احسان ہوگا اور چونکہ زید پہلے ہی سے احسان کرتا ہوا آیا ہے، اسلئے زید ہی اس فریضہ کی ذمہ داری لے تو زیادہ بہتر ہے اور عمر کی بیوی بچہ کے لئے سہارا ہوگا۔

ماثبت بزمان يحكم ببقائه مالم يوجد دليل الخ . (قواعد الفقه، اشرفی دیو بند، ص:۱۱٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍جمادی الثانیہ ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲۲۰/۲۹)

علیحدگی کی صورت میں بچہ کی پرورش کا حق

سوال: [۱۰۳۱۶]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سال گذشتہ ہندہ کا نکاح ہوا دو ماہ قبل ولادت ہوئی بعد ولادت آپسی نااتفاقی کی وجہ سے ہندہ اپنے والدین کے گھر پر تقریباً ایک ماہ سے رہ رہی ہے، نااتفاقی اتنی بڑھ چکی ہے کہ طلاق کی نوبت بھی آسکتی ہے، موجودہ بچے کے والد کا اصرار ہے کہ بچہ میرے پاس رہے گا، بچے کی عمر تقریباً دو ماہ ہے، لہٰذا بچے کی پرورش کا حق نااتفاقی یا طلاق ہونے کی صورت میں کسے حاصل ہوگا، نیز اس کی مدت کی تعیین کی کیا صورت ہوگی، (بچہ نرینہ ہے) لہٰذا قرآن وحدیث کی روشنی میں مفصل ومدلل جواب تحریر فرمائیں؟

المستفتي: سہیل ناصر قاسمی، رحمت نگر، گلی نمبر۲، سرسید نگر، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: طلاق کے بعد یا طلاق سے پہلے آپسی نااتفاقی کی بنا پر زوجین کے علاحدہ رہنے کی صورت میں جب تک بچہ اپنی ضروریات کھانے پینے اور استنجاء وغیرہ میں ماں کا محتاج ہو اور بدون ماں کے سہارے کے یہ تمام کام خود نہ کرسکتا ہو اس وقت تک ماں بچے کی پرورش کی زیادہ مستحق ہے، لیکن بچہ جب ذرا بڑا اور سمجھدار ہوجائے، اور مذکورہ ضروریات کے کام بغیر ماں کے سہارے کے کرنے لگے، تو اب پرورش کا حق باپ کو حاصل ہوگا، شریعت نے اس کی مدت سات سال مقرر کی ہے۔

عن عبداللّٰہ بن عمرو أن أمرأة قال: یارسول اللّٰہ إن إبنی ھذا کان بطنی لہ وعاء وثدی لہ سقاء وحجری لہ حواء وإن أباہ طلقنی وأراد أن ینزعہ منی فقال لھا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم أنت أحق بہ مالم تنکحی

. (ابو داؤد، الطلاق، باب من أحق بالولد، النسخة الهندية ۱/ ۳۱۰، دارالسلام برقم: ۲۲۷۶، مسند احمد بیروت ۲/ ۱۸۲، رقم: ۶۷۰۷، مجمع الزوائد، دارالکتب العلمیة

بیروت ٤/٣٢٣، مشکوٰۃ /٢٩٣)

أحق بالولد أمه قبل الفرقة وبعد ها أى فى التربية والإمساك .

(البحرالرائق، كتاب الطلاق ، باب الحضانة ، کوئٹه ١/١٦٧، زكريا ٤/٢٨٢)

والنساء أحق بالحضانة مالم يستغنىٰ الصغير فإن استغنى بأن كان يأكل وحده ويشرب وحده ويلبس وحده وفى رواية ويستنجىٰ وحده فالأب بالغلام أولىٰ . (خانية ، جديد زكريا ١/٢٥٣، و على هامش الهندية زكريا ١/٤٢٣)

قدر مدة الاستغناء أبو بكر الرازى ، بتسع سنين ، والخصاف بسبع سنين ، وعليه الفتوىٰ كما فى أكثر الكتب اعتباراً للغالب الخ. (مجمع الأنهر ، دارالكتب العلمية بيروت ٢/١٦٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ رربیع الثانی ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۹۹۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۴/۷ھ

طلاق کے بعد عدت اور لڑکے کی پرورش کا حکم

سوال: [۱۰۳۱۷]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ رفعت جہاں ۲۰ رسالہ اور محمد اسلم ۲۷ رسال کا نکاح بتاریخ ۲۵ ر اکتوبر ۲۰۰۱ء ہوا تھا، لڑکی رخصت ہو کر اپنی سسرال گئی اور حق زوجیت ادا کیا جس کے سبب اکتوبر ۲۰۰۲ء میں ایک لڑکا پیدا ہوا جو حیات ہے سسرال والوں اور شوہر کا سلوک لڑکی کے ساتھ اچھا نہیں رہا، کیونکہ لڑکا حرام خور ہے، اب لڑکی موقع پا کر خاموشی سے ۱۵ ردن ہوئے بچہ لے کر اپنی ماں کے یہاں آ گئی ،لڑکی کا باپ نہیں ہے، اب لڑکی اپنی سسرال جانے کو تیار نہیں ہے۔

(۱) کیا ایسی حالت میں طلاق مناسب رہے گی ،لڑکے والے دل سے لڑکی کو لے جانا نہیں چاہتے ہیں۔

(۲) دین مہر کی ترتیب کیا رہے گی؟

(۳) ایام عدت کے نان نفقہ کا کیا ہوگا؟

(۴) لڑکا سوا سال کا ہے جو ماں کا دودھ پی رہا ہے، شوہر لڑکا لینا چاہتا ہے، کب لڑکا باپ کو دیا جائے گا، بچے کے خرچہ کا کیا ہوگا؟

المستفتي: مسماۃ قیصر والدہ لڑکی رحمت جمال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) اگر دونوں میں نبھاؤ نہ ہو سکے تو شوہر کو طلاق دے کر نکاح سے الگ کردینے کی اجازت ہے، مگر تین طلاق نہ دی جائے بلکہ صرف ایک طلاق یا دو طلاق دیکر الگ کردے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمۡسَاكٌ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌ بِاِحۡسَانٍ. (الأية سورة بقرة / ۲۲۹)

(۲) شوہر خود طلاق دے گا تو مکمل مہر ادا کرنا شوہر پر واجب ہوگا۔

لأن الطلاق فعل الزوج والمهر ملكها والإنسان لايملك إسقاط حق الغير عن نفسه الخ. (بدائع الصنائع، كتاب النكاح، فصل في بيان مايتأكد به المهر، زكريا ديو بند ۲/ ۵۸۶)

(۳) اگر شوہر کی مرضی کے بغیر میکہ آ گئی ہے، تو ایام عدت کا خرچ بیوی کو نہیں ملے گا۔

نفقة العدة كنفقة النكاح، وتسقط بالنشوز وتعود بالعود الخ. (شامی، كتاب الطلاق، باب النفقة، مطلب في نفقة المطلقة، كراچی ۳/ ۶۰۹، زكريا ۵/ ۳۳۳)

(۴) لڑکے کو سات سال کی عمر تک رکھنے کا حق ماں کو حاصل ہوگا، اور اس درمیان بچہ کا خرچہ باپ پر لازم ہوگا۔

أن الأم أحق بالغلام مالم يبلغ سبع سنين الخ. (تاتار خانية، زكريا ۵/ ۲۷۳، رقم: ۷۸۳۲)

والنفقة علی الأب. (تاتار خانية ، زكريا ٥/٢٧٣ ، رقم : ٧٨٣١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ ذیقعدہ ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۱۹۵/۳۷)

ماں کی دماغی حالت خراب ہونے کی صورت میں پرورش کا حق

سوال: [۱۰۳۱۸]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص کی شادی کے دس سال ہوگئے بیوی کی دماغی حالت ٹھیک نہیں رہتی ہے، اور وہ شخص سسرال میں رہتا ہے، اس نے گھر کے کام کاج بیوی کی تیمار داری اور ساس کے طعنوں سے تنگ آکر طلاق دے دی اس کے چھ بچے ہیں، پانچ لڑکیاں ایک لڑکا سب سے بڑی لڑکی جو آٹھ سال کی ہے، وہ پیدائش سے اب تک دادی کے پاس رہتی رہی ہے، سب سے چھوٹی لڑکی جو تین مہینے کی ہے وہ شہر سے باہر اس لڑکے کے ملنے والے ایک بے اولاد کے گھر میں زیر پرورش ہے، بقیہ چار بچے جن میں تین لڑکیاں اپنے ماں باپ کے پاس رہتی ہیں، اور لڑکا اکثر اپنی خالہ کے پاس رہتا ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے۔

(۱) چاروں بچے صرف ماں کے پاس رہیں گے، یا صرف باپ کے پاس واضح رہے کہ ماں کی دماغی حالت خراب ہے؟

(۲) بیوی کو نان نفقہ کب تک اور کتنا دیا جائے؟

(۳) جو سامان شوہر نے شادی کے بعد جمع کیا ہے، جیسے گھریلو سامان اور گھر کی عمارت زیور کپڑے وغیرہ اس سامان کا کیا حکم ہے؟

المستفتي: تنویر احمد، تمباکو والان، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفيق: مسئولہ صورت میں اگر ماں کی دماغی حالت اس

درجہ خراب ہے کہ بچوں کی صحیح اسلامی تربیت نہیں ہوسکتی ہے، تو پھر پرورش کا حق شرعی طور پر نانی کو حاصل ہے، اور جب لڑکیاں بالغ ہوجائیں اور لڑکا سات سال کا ہوجائے، تو پھر پرورش کا حق باپ کو حاصل ہوجائے گا۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ۹/ ۲۲۶، جدید ڈابھیل ۱۳/ ۵۶۶، فتاویٰ رشیدیہ، قدیم/ ۴۸۰، جدید زکریا/ ۴۵۷، فتاویٰ دارالعلوم ۱۱/ ۸۳)

إذا كان للرجل ولد صغير وقد فارق أمه، فالأم أحق بالولد من الأب. (تاتار خانية، زكريا ٥/ ٢٧٣، رقم: ٧٨٣١، هنديه، كتاب الطلاق، الباب السادس عشر في الحضانة، زكريا قديم ١/ ٥٤١، جديد ١/ ٥٩٢)

فإن لم تكن له أم فأم الأم أولىٰ من أم الأب الخ. (هنديه، اشرفي ديو بند٢/ ٤٣٤)

وقال الرملي ويشترط في الحاضنة أن تكون حرة بالغة عاقلة أمينة قادرة. (شامي، كراچی ٣/ ٥٥٥، زكريا ٥/ ٢٥٣)

(۲) مطلقہ کا نان نفقہ زمانہ عدت یعنی تین ماہواری کے آنے تک دینا واجب ہے، اور یہ نان نفقہ شوہر اپنی حسب حیثیت دے گا۔ (مستفاد: فتاویٰ دارالعلوم ۱۱/ ۱۵۰، ۱۱/ ۱۱۷)

وإذا طلق الرجل امرأته فلها النفقة والسكنىٰ في عدتها رجعيا كان أو بائنا. (هنديه، كتاب الطلاق، باب النفقة، اشرفي ديو بند٢/ ٤٤٣)

تجب النفقة والكسوة والسكنى لمعتدة الطلاق الخ. (البحرالرائق، كتاب الطلاق، باب النفقة، كوئٹه ٤/ ١٩٨، زكريا ٤/ ٣٣٧، شامي، مطلب في نفقة المطلقة، كراچی ٣/ ٦٠٩، زكريا ٥/ ٣٣٣، مجمع الأنهر قديم ١/ ٥٠٣، جديد دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ١٨٩، بدائع الصنائع، كراچی ٤/ ١٦، زكريا ٣/ ٤١٩، تاتار خانية، زكريا ٥/ ٣٩٩، رقم: ٨٣٠٢)

(۳) جو مال شوہر نے شادی کے بعد یا پہلے کما کر جمع کیا ہے، وہ اس کا مالک ہے جس طرح چاہے، اس میں تصرف کرے، مطلقہ بیوی کو مہر کے علاوہ مزید اس مال میں کوئی حق نہیں

ہے۔

والمالک هو المتصرف فی الأعیان المملوکة کیف شاء الخ.

(بیضاوی ، کتب خانہ رشیدیہ ،دھلی ۱/ ۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۲۹۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۵/۱۸ھ

بچوں کی پرورش کا حق دادا دادی کو ہے یا نانا نانی کو

سوال: [۱۰۳۱۹]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نازبینہ کا انتقال ہوا ورثاء میں شوہر احمد حارث ایک لڑکا حسین احمد، ایک لڑکی زینب باپ محمد عرفان ماں تہذیبہ کو چھوڑا، پھر دو ماہ کے بعد احمد حارث کا انتقال ہو گیا ورثاء میں ایک لڑکا حسین احمد ایک لڑکی زینب اور باپ عظیم الدین ماں جہاں آراء شامل ہیں مرحومہ کا ترکہ مذکورہ وارثین کے درمیان کس طرح تقسیم ہوگا، نیز احمد حارث نے جو زیور بیوی کو دیا ہے وہ کس کی ملکیت ہوگی ،شوہر کی یا بیوی کی، احمد حارث کا لڑکا گیارہ سال کا ہے اورلڑکی چھ سال کی ہے، ان کی پرورش کا حق دادا دادی اور چچا کو زیادہ ہے یا نانا نانی کو واضح فرمائیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: برتقدیر صحت سوال وعدم موانع ارث وبعد ادائے حقوق ماتقدم مرحومہ نازبینہ کا ترکہ اسکے ورثاء کے درمیان درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا۔

۲ / ۷
۳۶
۱۲
نازبینہ

شوہر	ماں	باپ	لڑکا	لڑکی
احمد حارث	تہذیبہ	عرفان	حسین احمد	زینب
۳	۲	۲	۱۰	۵
۹	٦	٦	۲۰	۱۰
	۱۲	۱۲		

٢
١٨ـ٩
٦

مرحوم احمد حارث		تداخل	١/٩
ماں	باپ	لڑکا	لڑکی
جہاں آراء	عظیم الدین	حسین احمد	زینب
١	١	٤	
٣	٣	٨	٤

المبلغ: ٢٧

الاحیاء ....

حسین احمد	زینب	عرفان	تہذیبہ	عظیم الدین	جہاں آراء
٢٨	١٤	١٢	١٢	٣	٣

مرحومہ نازبینہ کا ترکہ مذکورہ شرعی ورثاء کے درمیان ٢٧ برابر سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا اتنا ملے گا، جو اس کے نام کے نیچے درج ہے، نیز احمد حارث نے جو زیور بیوی کو دیا تھا، اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر وہ بطور ہبہ تھا تو بیوی کی ملکیت میں شمار ہوکر ترکہ میں شمار ہوگا اگر وہ بطور عاریت تھا تو احمد حارث ہی کی ملک میں شامل ہوگا۔

وإذا بعث الزوج إلىٰ أهل زوجته أشياء عند زفافها فلما زفت إليه أراد أن يسترد من المرأة، ليس له ذلک إذا بعث إليها علی جهة التمليک.

(هنديه، كتاب النكاح، الباب السابع فی المهر، الفصل السادس عشر فی جهاز البنت، زكريا قديم ١/٣٢٧، جديد ١/٣٩٣، فتاویٰ محمودیه جديد ١٢/٢٥٩، ٣٠٩)

لڑکے کی عمر چونکہ گیارہ سال ہے اسلئے اس کی پرورش کا حق نانی کو حاصل نہیں ہوگا، بلکہ اس کی پرورش دادا کے ذمہ ہوگی، اور لڑکی کی عمر چونکہ چھ سال ہے، اس لئے بالغ ہونے سے پہلے لڑکی کی پرورش کا حق نانی کو حاصل رہے گا اور بالغ ہونے کے بعد لڑکی کو دادی کے حوالہ کرنا ضروری ہے، اب اگر نانی بالغ ہونے کے بعد لڑکی کو دادا کے حوالہ کرنے کیلئے تیار ہے تو پرورش کیلئے لے سکتی ہے، اور اگر حوالہ کرنے کیلئے تیار نہیں ہے، تو نانی پرورش کیلئے نہیں

لے سکتی ہے،اور پرورش وغیرہ کا خرچہ ان کے حصۂ میراث سے کیا جائے گا۔

(والأم والجدة أحق بالغلام حتی یستغني وقدر بسبع) لأنه إذا استغنیٰ یحتاج إلیٰ تأدیب والتخلق بأداب الرجال وأخلاقهم، والأب أقدر علی التأدیب والتعنیف ...... (وبها حتی تحیض) أی الأم والجدة أحق بالصغیرة حتی تحیض، لأن بعد الاستغناء تحتاج إلیٰ معرفة آداب النساء والمرأة علی ذلک أقدر وبعد البلوغ تحتاج إلیٰ التحصین والحفظ والأب فیه اقویٰ وأهدیٰ. (البحرالرائق، کتاب الطلاق، باب الحضانة، کوئٹه ٤/١٦٩، ١٧٠، زکریا ٤/٢٨٧، هندیه، زکریا قدیم ١/٥٤٢، جدید ١/٥٩٣، محمودیه جدید ڈابھیل١٣/٥٦٨)

فإن کان الأب قد مات وترک أموالاً وترک أولاداً صغاراً کانت نفقة الأولاد من أنصبائهم الخ. (هندیه، کتاب الطلاق، الباب السابع عشر فی النفقات، الفصل الرابع، زکریا قدیم ١/٥٦٤، جدید ١/٦١٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۸؍جمادی الثانیہ ۱۴۳۰ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۷۵۸/۳۸)	۱۴۳۰/۶/۸ھ

والد مفلس ہوتو بچے کی پرورش کا حق کس کو ہے؟

سوال: [۱۰۳۲۰]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص محمد اسلم ولد رحمت اللہ عرف منن قوم شیخ قریشی محلّہ اصالت پورہ اسلام نگر گلی نمبرا، مرادآباد کا عقد نکاح شرع محمدی کے مطابق ہمراہ ریشما پروین عرف شنو بنت کلو قوم شیخ قریشی محلّہ اصالت پورہ متصل بیگم والی مسجد کے عرصہ قریب چار سال پہلے ہوا تھا، دونوں کی شادی کے ایک سال بعد ریشما پروین عرف شنو کے بطن سے ایک لڑکا ذیشان پیدا ہوا پھر ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام ثناء رکھا گیا، نورچشمی ثناء کی پیدائش کے ۴/۵ گھنٹہ بعد ریشما پروین کا انتقال ہوگیا، اب ریشما پروین کے والدین اوران کے متعلقین کا کہنا ہے،

کہ دونوں بچوں کو بھی ہمیں دیجئے اور شادی کے وقت جو ہم نے سامان دیا تھا، وہ بھی چاہئے، اور محمد اسلم ایک مزدور قسم کا شخص ہے، جو اس وقت تک اپنے والد کے مکان میں رہتا ہے، اب کہیں پر کوئی اپنی رہائش کیلئے مکان خریدنا چاہتا ہے تو اس پر ریشما پروین کے والدین کا کہنا ہے، کہ جو مکان محمد اسلم خریدیں اس میں سے آدھا مکان دونوں بچوں کے نام کریں، کیونکہ دونوں بچے یتیم ہوگئے ہیں، تو

(۱) دونوں بچوں کی پرورش کہاں ہونی چاہئے۔

(۲) شادی کے وقت جو سامان جہیز دیا گیا تھا وہ کیا ریشما پروین کے والدین کو واپس کرنا ضروری ہے؟ مفصل اور واضح بیان فرمائیں؟

(۳) کیا دونوں بچے والدہ کے انتقال کے بعد یتیم ہوگئے ہیں؟

(۴) کیا کوئی مکان محمد اسلم خریدیں تو اس کا آدھا حصہ بچوں کے نام کرنا ضروری ہے؟

(۵) کیا محمد اسلم کو اپنی دوسری شادی اوپر کی تمام باتیں مان کر کرنی چاہئے؟

المستفتي: مجیدالرحمٰن، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) دونوں بچوں کی پرورش کیلئے اگر محمد اسلم کے پاس معقول انتظام ہے اور بچوں کی دادی زندہ ہے، تو دادی کو پرورش کا حق ہے، ریشما پروین کے والدین کیلئے محمد اسلم کو بچوں کو حوالہ کرنے پر مجبور کرنے کا حق نہیں ہے۔

لأن الحضانة كانت حقاً للأم فصح إسقاطها حقها (إلىٰ قوله) لما أسقطت حقها بقي حق الولد فصارت بمنزلة الميتة أو المتزوجة فتكون الجدة أولىٰ. (شامی، کتاب الطلاق، باب الحضانة، زکریا ۵/۲۵۹، کراچی ۳/۵۶۰)

(۲) شادی کے وقت جو سامان ریشما پروین کو دیا گیا تھا، وہ ریشما پروین مرحومہ کا ترکہ ہے اس کے شرعی ورثاء میں تقسیم ہوگا سب ریشما کے والدین کو نہیں ملے گا، اور ریشما کا شوہر بھی ورثاء میں داخل ہے۔

(۳،۴،۵) محمد اسلم کو دوسری شادی کرنے کا ہر وقت حق حاصل ہے، اس میں ریشما مرحومہ کے والدین کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار دیا ہے، کسی انسان کو مداخلت کا حق نہیں ہے، نیز محمد اسلم جو مکان خرید رہا ہے، اس میں کسی کا حق نہیں ہے، اس کی مرضی ہے چاہے اپنی ملکیت میں رکھے یا کسی کو بھی دے دے، مرحومہ کے والدین کو مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے۔

المالک هو المتصرف فی الأعیان المملوکة کیف شاء من الملک.

(بیضاوی، کتاب خانه، رشیدیه، دهلی، ص:۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲؍ ۴۴۵۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۵/۹ھ

نواسی کی پرورش سے متعلق چند سوالات وجوابات

سوال: [۱۰۳۲۱]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری شادی ۱۹۸۷ء میں ہوئی، اور ۱۹۸۹ء میں ایک بچی پیدا ہوئی، لیکن اسکے بعد نبھاؤ کی شکل ممکن نہ رہی چنانچہ میں نے ۱۹۹۰ء میں طلاق دیدیا اس کے بعد میں نے ہر چند کوشش کی کہ میری بچی میری کفالت میں رہے لیکن سسرال والوں نے نہ رہنے دیا، اور انھوں نے خود کفالت کی الغرض ۱۹۹۲ء میں میں نے دوسری شادی کرلی، اور اس بیوی سے میری تین اولاد ہیں، دولڑکے اور ایک لڑکی اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ میری پہلی بیوی والی بچی بڑی ہوچکی ہے، اور شادی کی عمر کو پہونچ چکی ہے، اور سسرال والے بچی کو میرے حوالہ کرنے پر کسی طرح بھی راضی نہیں ہیں، کہ میں اس کا نکاح کردوں اور نہ ہی مجھے لڑکی سے ملنے دیتے ہیں، بلکہ مجھے لڑکی کا کھلا ہوا دشمن سمجھتے ہیں، البتہ سسرال والے دوسروں کے ذریعہ کہلواتے ہیں، کہ تمہیں بچی کی شادی میں پچاس ہزار روپیہ دینا ہوتو دو اور میں ۲۵؍ ہزار روپیہ دینے کے لئے تیار ہوں مگر وہ اسے قبول کرنے

کے لئے تیار نہیں ہیں، اور مجھے والدین کے ترکہ سے پندرہ بیگہ کچا (جس کی قیمت آٹھ لاکھ بنتی ہے) حصے میں ملا ہے، جسکی سالانہ آمدنی بارہ ہزار روپیہ ہے، اور ۲۵/ ہزار روپئے بینک بیلنس ہے، اس کے علاوہ ایک رہائشی مکان ہے جس کی قیمت ڈیڑھ لاکھ روپئے ہے، اور میں ایک مکتب سے جڑا ہوا ہوں، بارہ سو روپیہ ماہانہ پاتا ہوں، اور عذر کی وجہ سے اکثر گھر ہی رہتا ہوں، اور اس کے علاوہ میرے اوپر بیس ہزار روپیہ بجلی کا بل باقی ہے، ایسی صورت حال میں مجھ پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے، جو انھوں نے کفالت کی ہے وہ مجھے خرچہ ادا کرنا ہے اور شادی میں مجھے کتنے روپئے دینے ہیں، اور میری جو جائیداد ہے اس میں سے میری بچی کا کتنا حصہ ہے، کیونکہ سسرال والوں نے بچی کو میرے حوالہ نہیں کیا اور نہ ہی میرا پسند کیا ہوا رشتہ منظور کرتے ہیں۔

المستفتي: مولانا مصلح الدین قاسمی، استاذ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: شرعی طور پر لڑکی بالغ ہو جانے کے بعد باپ کو مل جانی چاہئے تھی، اور شادی میں خرچ کرنے کا کوئی معیار متعین نہیں ہے، بلکہ اپنی حسب حیثیت آسانی اور سہولت سے لڑکی کی شادی میں باپ اپنے اختیار سے خرچ کرے گا، سسرال والوں یا کسی دیگر افراد کو باپ پر دباؤ ڈالنے کا کوئی حق نہیں ہے، نیز باپ اس وقت خرچ کرنے کا مجاز ہے، کہ جب باپ اپنے اختیار سے اپنی لڑکی کی شادی کرے اور جب باپ کے اختیار کے دائرہ میں لڑکی نہ ہو تو باپ کے اوپر کوئی شرعی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے، پھر بھی باپ جو کچھ خرچ کریگا، وہ اس کی مرضی کی بات ہے، نیز بینک بیلنس اور جائیداد میں سے باپ کی زندگی میں لڑکی کا کوئی حق متعلق نہیں ہے، ہاں البتہ باپ کے مرنے کے بعد دوسری بچیوں کا جو حق بنتا ہے، ویسا ہی اس کا بھی حق بنے گا، اور ننہال والوں نے لڑکی کی جو پرورش کی ہے، وہ باپ کے اختیار سے پرورش نہیں

کی گئی ہے، اور اس درمیان باپ جب چاہے لڑکی کو اپنے ساتھ لانے اور لیجانے کے اختیارات باپ کو شرعی طور پر حاصل ہونا چاہئے تھا وہ حاصل نہیں ہوسکے نیز باپ کو لڑکی کا دشمن جیسا ثابت کرنیکی صورت میں گذشتہ زمانہ کا کوئی نان ونفقہ باپ پر لازم نہیں ہوتا، اسلئے پچھلے زمانہ کے نان ونفقہ کے نام سے باپ سے کسی چیز کے مطالبہ کا حق نہیں ہے، باپ کے اوپر خرچ واخراجات اسی وقت لازم ہوتے ہیں، جبکہ اولاد پر باپ کو اختیار حاصل ہو اور یہاں پر باپ کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے، اس اختیار کے نہ ہونے کی صورت میں گذشتہ زمانہ کا خرچہ باپ کے ذمہ لازم نہ ہوگا، اگرچہ قاضی اور حاکم نے نفقہ باندھ دیا ہو تب بھی پچھلے زمانہ کا خرچہ باپ پر واجب نہیں، لھٰذا شادی کیلئے پچاس ہزار کا مطالبہ کرنا یا اس پر دباؤ ڈالنا کسی طرح جائز نہیں ہے، بلکہ ننھال والوں پر شرعی طور پر لازم ہے کہ لڑکی باپ کے حوالہ کردیں اور باپ اپنی مرضی سے شادی کرے۔

ولو قضیٰ القاضی للولد والوالدین وذوی الأرحام بالنفقة فمضت مدة سقطت لأن نفقة هٰؤلاء تجب كفاية للحاجة حتى لاتجب مع يسار وقد حصلت بمضى المدة .(شامی، کتاب الطلاق، باب النفقة، مطلب فی مواضع لا یضمن فیها المنفق، إذا قصد الإصلاح، کراچی ۳/۶۳۳، زکریا ۵/۳۷۰، هدایه، اشرفی دیوبند ۲/۴۴۸،الجوهرة النیره، امدادیه ملتان ۲/۱۷۵،دارالکتاب دیوبند ۲/۱۶۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۰۰۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۹/۵/۱۴۲۷ھ

بالغ لڑکی کی پرورش کا حکم

سوال: [۱۰۳۲۲]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری شادی ۱۹۸۱ء کو محلّہ کسرول میں ہوئی تھی، ۲۸؍جون ۱۹۸۳ء کو بیوی کے میکہ میں ایک لڑکی پیدا

ہوئی جو کہ اس وقت سے اب تک اپنی والدہ کے پاس ہے، اور اس کی والدہ لڑکی کو مجھ سے ملنے تک سے روکے ہوئے ہے، میں ہر طرح کوشش کر چکا ہوں کہ لڑکی مجھے مل جائے، لیکن اسکی والدہ مجھ سے لڑکی کے بہانے خطیر رقم کا مطالبہ بذریعۂ عدالت کر رہی ہے، اور میں لڑکی کو اس کے ننھال میں چھوڑنا نہیں چاہتا ہوں، وہاں کا ماحول اچھا نہیں ہے، اور اس وقت لڑکی کی خالائیں اور ماموں ۴۰/۴۵ سال کے بغیر شادی کے بیٹھے ہوئے ہیں، میری لڑکی کا مستقبل اس کے ننھال میں خراب ہوسکتا ہے، اسلئے میں چاہتا ہوں کہ میری لڑکی مجھے مل جائے، نیز کیا شریعت میں اس کی والدہ کو میری لڑکی کو اپنے پاس روکے رکھنے کا حق حاصل ہے؟

المستفتي: شریف احمد، عیدگاہ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب لڑکی بالغ ہوچکی ہے، تو باپ کو اپنے پاس رکھنے کا حق حاصل ہوچکا ہے، اور اس کی شادی وغیرہ کا انتظام باپ اپنی مرضی سے کرسکتا ہے، ماں کو اس میں کوئی دخل دینے کا حق نہیں ہے، لہٰذا اب شرعاً باپ کو اپنی پرورش میں لینے کا حق ہو چکا ہے۔

والأم والجدة أحق بها، حتى تحيض أي تبلغ الخ. (درمختار، کتاب الطلاق، باب الحضانة کراچی ۳/ ۵٦٦،زکریا۵/ ۲٦۸، البحرالرائق، کوئٹہ ٤/ ۱٦۹، زکریا ٤/ ۲۸۷،ھندیه ، زکریا قدیم ۱/ ٥٤۲، جدید ۱/ ٥۹۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍شوال ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ٦۳۳۴)

بدچلن بیوی کو طلاق دینے کے بعد بچی کی پرورش کا حق

سوال: [۱۰۳۲۳]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری شادی کو لگ بھگ دس سال کا عرصہ ہوگیا، اس درمیان میرے ایک لڑکی بھی ہوئی،

جس کی عمر آٹھ سال ہے، اور میں نے اس درمیان دوسرا نکاح کرلیا اور اپنی پہلی بیوی کو میں نے زیادہ تر اپنے ماں باپ کے پاس رکھا اس درمیان میری پہلی بیوی کے میرے چھوٹے بھائی کے ساتھ ناجائز تعلقات ہوگئے، جس کے سات سال گذر چکے مجھے کچھ کچھ شک تھا، لیکن میں اپنی بیوی اور بھائی پر بہت ہی بھروسہ کرتا تھا، اور پوچھ بھی نہیں سکتا تھا، اس لئے کہ ہر کوئی یہ کہہ دیتا کہ میں الزام لگا رہا ہوں، اور نہ رکھنے کی وجہ سے یہ سب کہہ رہا ہوں، اور اس درمیان وہ سب کچھ ہوا جو ایک میاں بیوی کے درمیان ہوتا ہے، بانہوں میں بھرنا، چومنا، پیار کرنا، جسم چومنا، دودھ منھ میں لینا، ہمبستر ہونا وہ سیکڑوں بار ہمبستر ہوئے کئی بار تو کپڑوں کے اوپر ہی نکل گیا، اور کبھی پیشاب کی جگہ رکھتے ہی نکل گیا، اور کئی بار دونوں میں پورا کام ہوا، اور یہ سلسلہ سات سال تک چلتا رہا، اور رات رات یہ فعل ہوتا تھا، اور میں بھروسہ میں رہا کہ میری بیوی بہت شریف اور نیک ہے، پھر اس نے اپنے ہر گناہ کا اقرار کرلیا اور یہ سب جو میں لکھ دیا ہوں، وہ سب کچھ اسی کا بتایا ہوا ہے، حالانکہ اب وہ معافی مانگ رہی ہے، اور توبہ کررہی ہے، لیکن میری بہت بری حالت ہورہی ہے، کہ وہ اتنے دنوں تک یہ گناہ کرتی رہی اب میں ایک بدچلن اور آوارہ عورت کیساتھ کیسے رہوں جب بھی میں اس کی طرف دیکھتا ہوں تو میرے دل میں اس کے فعل سے نفرت ہوتی ہے، اور مجھے راتوں میں نیند نہیں آتی ہے، اور ایک پل بھی مجھے اس کے ساتھ رہنا مشکل ہورہا ہے، میرا دل گوارہ نہیں کرتا کہ میں اس حالت میں ایک منٹ بھی اس آوارہ اور بدچلن عورت کے ساتھ رہوں، اس حالت میں لڑکی کس کے پاس رہے گی، اور یہ بتائیں کہ اس گناہ کی کیا سزا ملنی چاہئے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرد کو دو شادیاں کرنے کا اختیار شریعت نے دیا ہے۔

فَانْكِحُوْا مَاطَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ. (سورۂ نساء، آیت/ ۳)

لیکن اس کیلئے دونوں بیویوں کے خرچے اور دونوں بیویوں کی رہائش اور رات گذاری

میں برابری اختیار کرنا ضروری ہے، ایک رات ایک بیوی کے ساتھ دوسری رات دوسری بیوی کے ساتھ اور شوہر کے اس طرح کے عمل میں کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہے۔

يجب أن يعدل فيه أى في القسم بالتسوية في البيتوتة وفي الملبوس والمأكول والصحبة . (شامی، کتاب النکاح، باب القسم ، کراچی ۳/ ۲۰۱، ۲۰۲، زکریا ٤ /۳۷۸)

عن أبي هريرة عن النبي ﷺ قال إذاكانت عندالرجل امراتان فلم يعدل بينهما جاء يوم القيامة وشقه ساقط . (ترمذی، ابواب النکاح ،باب ماجاء فی التسوية بين الضرائر ، النسخةالهندية ۱/ ۲۱۷، دارالسلام رقم: ۱۱٤۱)

اوراب جب شوہر کو یہ معلوم ہوا کہ پہلی بیوی نے اپنے دیور کیساتھ منھ کالا کر رکھا ہے، اور یہ سلسلہ بھی کئی سالوں سے جاری کر رکھا ہے، تو ایسی بدکار عورت کو طلاق دینے کا شوہر کو حق ہے، لیکن اپنی بچی کو دیکھ کر طلاق نہ دے تو بہتر ہے۔

لايجب على الزوج تطليق الفاجرة ولاعليها تسريح الفاجر إلا إذا خافا أن لا يقيما حدود الله فلا بأس أن يتفرقا . (شامی، کتاب النکاح ، کراچی ۳/ ۵۰، زکریا ٤/ ١٤٤، البحرالرائق، کوئٹہ ۳/ ۱۰۷، زکریا ۳/ ۱۸۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/۷/ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۷۵۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/۷/ ۱۴۲۳ھ

تین طلاق کے بعد نابالغ اولاد کی پرورش کا حق

سوال: [۱۰۳۲۴]: کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے سالے سے ہوئی کہاسنی میں اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی، جب کہ زید کا اپنی بیوی سے کسی قسم کا کوئی جھگڑا یا ناراضگی نہیں تھی، نکاح کی رسید میں بیوی کا نام احمدالنساء اور دوسرا نام شہنازی ہے، زید نے شہنازی نام لیکر طلاق دی تو اس صورت میں طلاق ہوگئی یا نہیں؟ یا

رجوع کی کوئی صورت بنتی ہے،عورت کے سات بچے تین لڑکیاں نابالغ اور۴؍لڑکے ہیں،ان بچوں کی پرورش کی ذمہ داری کس کے ذمہ ہے؟

المستفتي: محمد آصف، جامع مسجد، وارثی نگر گلی نمبر۲، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: بیوی کا نام لئے بغیر بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے، جب طلاق میں بیوی مراد ہوتی ہے، اور سوالنامہ میں جب شہنازی کا نام لیکر شوہر نے تین بار طلاق دی ہے تو اس سے طلاق مغلظہ واقع ہوکر بیوی شوہر پر حرام ہوچکی ہے، اب بغیر حلالۂ شرعیہ کے دوبارہ آپس میں نکاح بھی درست نہ ہوگا، اگر دونوں دوبارہ ساتھ رہنا چاہیں تو حلالہ کا طریقہ اختیار کرسکتے ہیں، اور حلالہ کی صورت یہ ہے کہ عورت کی عدت گذر جانے کے بعد کسی دوسرے مرد سے نکاح ہوجائے، اور اس کے ساتھ ہمبستری بھی لازم ہے، پھر اس کے بعد وہ دوسرا شوہر طلاق دیدے، اس کے بعد پھر عدت گذر جائے اس کے بعد پہلا شوہر نکاح کرسکتا ہے، نابالغ بچوں کی پرورش کا حق ماں کو ہے، لیکن خرچہ باپ کے اوپر لازم ہے۔

وإن كان الطلاق ثلاثاً في الحرة وثنتين في الأمة لم تحل له حتى تنكح زوجاً غيره نكاحاً صحيحاً، ويدخل بها ثم يطلقها أو يموت عنها. (هدايه ، كتاب الطلاق ، فصل فيما تحل به المطلقة ، اشرفي ديوبند۲/۳۹۹، هنديه، زكريا قديم ۱/۴۷۳، جديد ۱/۵۳۵، مجمع الأنهر ،دارالكتب العلمية بيروت۲/۸۸، تاتار خانية، زكريا ۵/۱۴۷، رقم: ۷۵۰۳)

لوقال لزوجته أنت طالق طالق طالق طلقت ثلاثاً . (الاشباه والنظائر قديم ۱/۲۱۹)

وإذا وقعت الفرقة بين الزوجين فالأم أحق بالولد والنفقة على الأب. (هدايه ، كتاب الطلاق، باب حضانة الولد ، اشرفي ديوبند۲/۴۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍جمادی الثانیہ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰؍۱۰۱۰۳)

٦ باب حق الجوار

مسجدوالوں کا پڑوسی کی چھت توڑ کر مسجد کی دیوار میں جنگلے کھولنا

سوال [۱۰۳۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے والد نے ۲۲؍سال قبل گھر سے لگا ہوا ایک مکان ایک غیر مسلم سے خریدا، اور ہم لوگ اس مکان میں رہنے لگے، اس مکان کے پورب اور دکھن جانب مسجد کی دیوار ہے، اور اسی دیوار سے لگا ہوا پکا رہائشی مکان ہے، جس میں ہماری رہائش ہے، کچھ دن پہلے مسجد کے لوگوں نے ہمارے والد صاحب سے مسجد کی پچھمی دیوار میں گیس پنکھے لگانے کی اجازت مانگی، ہمارے والد صاحب نے انکار کردیا، انکار کے دوسرے دن بڑی تعداد میں مسجد کے لوگ ہمارے گھر میں گھس آئے اور ہماری چھت اور کھمبا توڑ دیا اور دو گیس پنکھے کی جگہ توڑ کر دو جنگلے اور پنکھے لگادیئے، جس سے ہمارے گھر کی بے پردگی ہورہی ہے اور اس سے ہمارا بہت نقصان ہوا ہے، اور اس میں اذیت بھی پہنچی ہے اور پورا پریوار خوف زدہ ہے، ایسی صورت میں مسجد کے لوگوں کا یہ کارنامہ کیسا ہے؟ اور اس مسجد میں نماز سے متعلق کیا حکم ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ میں لکھی ہوئی باتیں واقعہ میں اگر درست ہیں تو مسجد والوں کو سائل کے گھر میں بلا اجازت داخل ہوجانا اور ان کے گھر کی چھت توڑ دینا سراسر ظلم اور نادانی ہے، مسجد والوں پر لازم ہے کہ پڑوسی کی چھت کا جو حصہ توڑ دیا ہے اس کی پوری طرح مرمت کریں یا مرمت میں جو پیسہ خرچ ہوسکتا ہے اس کا معاوضہ ادا کریں، اور رہی دیوار کی بات تو سوالنامہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ دیوار مسجد کی ملکیت ہے، اور مسجد کو اپنی دیوار توڑنے کا حق ہے، لیکن اس دیوار سے پڑوسی کی طرف جنگلہ یا روشن دان نکالنا جس میں پڑوسی کو نقصان پہنچتا ہو جائز نہیں ہے، پڑوسی کو اپنی ذاتی دیوار اٹھا کر ان جنگلوں اور روشن دانوں کو بند کرنے کا حق ہے۔

عن عبد الله بن عمرؓ قال: قال رسول الله ﷺ: المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده. (بخاری شریف، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه و یده، النسخة الهندية ١/٦/ رقم: ١٠)

قال العيني: فيه الحث على ترک أذى المسلمين بكل ما يؤذى. (عمدة القاری، باب المسلم من لسانه و يده زكريا ١/٢٠٦، دار احياء التراث العربی ١/١٣٢)

لايجوز لأحد أن يتصرف فی ملک غيره بلا إذنه أو وكالة منه أو ولاية عليه وإن فعل كان ضامنا. (شرح المجلة رستم اتحاد ١/٦١، رقم المادة: ٩٦)

فإذا أحدث رجل فی داره شباكا أو بناءً جديداً و جعل له شباكا مطلا على المحل الذی هو مقر لنساء جاره ...... فإنه يؤمر برفع الضرر، ويجبر على رفعه بصورة تمنع وقوع النظر. (شرح المجلة رستم اتحاد ١/٦٦٠ رقم: ١٢٠٢)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۶۹۴)

درمیانی چھت گرنے کی صورت میں سفلی وعلوی دونوں مالک تعمیری خرچ میں شریک ہوں گے

سوال [۱۰۳۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ایک مکان ہے جس کے بالائی حصے کے چار مالک ہیں، ان چاروں میں سے ایک حصہ دار بالائی مکان میں رہتا ہے۔

(۲) زیر مکان کے دو مالک ہیں، مکان کی چھت آدھے حصہ گر گئی ہے اس چھت کو نیچے والا نیچے سے استعمال کر رہا ہے اور اوپر والا اوپر سے استعمال کر رہا ہے۔

کیا لینٹر ڈالنے کے خرچہ میں دونوں برابر کے شریک ہیں؟ اس بارے میں شرع اور علماء دین کیا فرماتے ہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جی ہاں لینٹر ڈالنے میں دونوں کو شریک ہونا لازم ہے چونکہ اوپر والے کو چھت کا فائدہ زیادہ پہنچتا ہے اس لیے اس کو کچھ زیادہ ہی خرچ کرنا چاہیے، لیکن اگر نیچے والے برابر خرچ کرنے پر راضی ہوجائیں تو دونوں برابر خرچ میں شریک ہوجائیں۔

إذا انهدم السفل بغير صنع لايجبر صاحبه على البناء ويقال لذى العلو ان شئت فابن السفل من مالك لتصل لنفعك فإذا بناه بإذن القاضى أو أمر شريكه يرجع بما أنفق وإلا فبقيمة البناء وقت البناء وهذا هو الصحيح، المختار للفتوىٰ الخ. (شامى، قبيل كتاب المزارعة زكريا ٩/٣٩٦، كراچى ٦/٢٧٤)

وقوله إن كلالا يصل إلى إحياء حقه إلا بالإنفاق. (شامى، الشركة، مطلب: هم فيما إذا امتنع الشريك من العمارة زكريا ٦/٥١١، كراچى ٤/٣٣٢) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/۱/۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۴۶۱۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/محرم الحرام ۱۴۱۷ھ

پہلی اور دوسری منزل والوں کے حقوق

سوال [۱۰۳۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مکان کے تین حصے ہیں، لال حصے کا مالک بکر ہے اور نیلے حصے کی مالک فاطمہ ہے، درمیان کا ''م'' زدہ حصے کی شکل اس طرح ہے کہ اس کے اوپری حصے کی مالک فاطمہ ہے اور نیچے کے حصہ کا مالک بکر ہے، اوپر نیچے کے معاملہ کی الجھن دور کرنے کے لیے فاطمہ نے حسب ذیل تجویز رکھی ہے:

(۱) اس ''م'' زدہ حصے کو اوپر سے نیچے تک برابر برابر دو حصوں میں تقسیم کرایا جائے، اس طرح دونوں اپنے اپنے حصے کے مالک ہوجائیں گے

(۲) مکان جس حالت میں اب موجود ہے، اسے اسی حالت میں از سر نو بنالیا

جائے، فاطمہ کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی نجی مکان نہیں ہے۔

بکر نے اس سلسلے میں مندرجہ ذیل تجویز رکھی ہے:

(۱) ''م'' زدہ حصے میں اوپر سے نیچے تک ۳/۴ حصہ وہ خود لینا چاہتا ہے، اور ۱/۴ حصہ فاطمہ کو دینا چاہتا ہے۔

(۲) بکر اپنے نیچے حصے کو ۲۰/ فٹ کی اونچائی پر پاٹنے کو کہتا ہے، جس سے فاطمہ کو اتنی اونچائی تک زینہ بنانے میں بہت پریشانی پیش آئے گی۔

(۳) بکر فاطمہ سے کہتا ہے کہ جس شرح سے تم نے خریدا ہے میرے ہاتھ اسی شرح سے فروخت کردو، جبکہ بکر کثیر جائیداد کا مالک ہے اور مکان خرید وفروخت کرنے کا کاروبار بھی کرتا ہے۔

براہ کرم شرع دین متین کی روشنی میں اس مسئلہ کو حل کرکے ہماری رہنمائی فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ میں فاطمہ اور بکر کا مکان جس میں بالائی حصہ فاطمہ کا اور نیچے کا حصہ بکر کا ہے، مکان خستہ اور قابل تعمیر ہو جانے کے بعد فریقین نے اپنی اپنی جو تجویزیں پیش کی ہیں ان تجویزوں کے بارے میں شرعی طور پر نہ مکمل فاطمہ کی ساری بات مانی جائیں گی اور نہ ہی بکر کی سب باتیں تسلیم کی جائیں گی، بلکہ شریعت ایک معتدل اور درمیانی فیصلہ پیش کرتی ہے، چنانچہ اس سلسلے میں شریعت کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر دونوں فریق اپنا اپنا حصہ تعمیر کرنا چاہیں تو پہلے جتنی اونچائی پر دونوں منزلیں تھیں، اتنی اونچائی پر لے جاکر لینٹر ڈالنے کی اجازت ہوگی، لہٰذا نیچے والا اپنے حصے کا لینٹر اتنی اونچائی پر لے جاکر ڈال سکتا ہے، پس بجائے بارہ فٹ کے بیس فٹ پر لے جانے کی اجازت نہیں ہوگی، اسی طرح بالائی منزل پر رہنے والی فاطمہ کے لیے بھی اتنی اونچائی پر لے جاکر لینٹر ڈالنے کی اجازت ہوگی، جتنی اونچائی پر بالائی منزل کی چھت پہلے تھی، لہٰذا نیچے کی منزل کو بکر کے لیے فاطمہ کی اجازت کے بغیر بیس فٹ پر لے جانے کی اجازت نہیں اور فاطمہ کو بکر کی اجازت کے بغیر سابقہ اونچائی سے آگے بڑھانا جائز نہیں ہوگا، اور اگر دونوں فریق زمین سمیت تقسیم کرنا

چاہیں تو سوالنامہ میں پیش کردہ تقسیم کا اعتبار نہ ہوگا، نہ آدھا آدھا تقسیم ہوگا، اور نہ ہی ایک چوتھائی اور تین چوتھائی کا اعتبار ہوگا بلکہ عمارت اور جائیداد کی قیمت لگانے والے ماہرین کے چندافراد بالائی منزل اور نیچے کی منزل کی قیمت لگائیں گے تو نیچے کی منزل کی جو قیمت لگائی جائے گی، اس قیمت کی زمین یا اس قیمت کا حصہ بکر کو ملے گا اور بالائی منزل کی جو قیمت لگائی جائے گی اس قیمت کی زمین یا اس قیمت کا حصہ فاطمہ کو ملے گا یہی شریعت کا فیصلہ ہے:

سفل مجرد مشترک والعلو لأخر وعلو مجرد مشترک والسفل لآخر قوم کل واحد من ذٰلک علی حدة وقسم بالقیمة عند محمد و به یفتی. (الدر المختار مع الشامی، کتاب القسمة، مطلب: فی الرجوع عن القرعة زکریا ۹/۳۸۳، کراچی ۶/۲٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۷۹۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۴/۲۲ھ

درمیانی چھت کی مرمت کا خرچہ کس پر لازم ہے؟

سوال [۱۰۳۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مکان کے دوفریق مالک ہیں، فریق اول مکان کے نیچے کے حصہ کا مالک ہے، فریق دوئم اوپر کے حصہ کا مالک ہے، فریق سوئم ایک تیسرا شخص خالد اوپر کے حصہ میں کرایہ پر رہتا ہے، اور یہی خالد مکان کی مرمت وغیرہ کراتا رہتا ہے، فریق دوئم نے بھی اس کی مرمت وغیرہ نہیں کرائی ہے، اب اس مکان کی فریق اول کے اوپر کی چھت گرگئی ہے، فریق سوئم یعنی خالد کرایہ دار اسے ٹھیک کرانا چاہتا ہے تو سوال یہ ہے کہ اس کے ٹھیک کرانے کی ذمہ داری کس پر ہے، صرف کرایہ دار خالد پر یا فریق اول پر بھی ہے، اگر فریق اول پر بھی ہے تو دونوں پر کتنا کتنا حصہ ٹھیک کرانا پڑے گا، قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: وکیل احمد شمسی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فریق اول یعنی نیچے کی منزل والے کی چھت گر گئی ہے جو اوپر کی منزل والے کے حق میں فرش ہے، جس کو اس نے فریق سوئم یعنی کرایہ دار کو کرایہ پر دے رکھا ہے، اگر سوالنامہ میں یہی چھت مراد ہے جس کی اس وقت مرمت کی ضرورت ہے تو ایسی صورت میں چونکہ اس چھت کا تعلق نیچے والے کے ساتھ چھت کا ہے اور اوپر والے کے ساتھ فرش کا ہے اس لیے اس چھت کی مرمت میں دونوں فریق کو برابری کے ساتھ شریک ہونا لازم ہے، اگر اوپر والے نے مرمت کرالی ہے تو آدھا پیسہ نیچے والے سے وصول کرنا جائز ہے۔

کعلو لرجل و سفل لآخر وسقط السفل فبناه الآخر لایکون متطوعا لأنه لایجبر صاحب السفل علی بنائه فکان في بنائه إیاه مضطرا لیصل إلی حقه وإذا بناه و بنی علیه علوه له منع صاحب السفل من الانتفاع به والسکنی حتی یؤدی قیمته واختلف فی أن القیمة هل تعتبر وقت البناء أو وقت الرجوع والصحیح وقت البناء. (فتح القدیر، کتاب أدب القاضی، مسائل شتی من کتاب القضاء، زکریا ۳۰۲/۷، دار الفکر ۳۲۲/۷، کوئٹہ ۳۰/۶، حاشیه چلپی امدادیه ملتان ۱۹۵/٤، زکریا ۱۲۱/٥، البحر الرائق کوئٹه ۳۰/۷، زکریا ۵۱/۷، شامی زکریا ۵۱٤/٦، کراچی ۳۳٤/٤، جامع الفصولین ۲۰۵/۲-۲۰۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۲۲۴/۷)

فریقین کی زمین کی پیمائش میں غلطی اور اس سے متعلق چند سوالات

سوال [۱۰۳۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمد اشرف اور سیف الرحمٰن کے درمیان زمین کے بارے میں تنازعہ چلتا رہا،

دونوں ایک دوسرے کوالزام دیتے رہے کہ ہماری زمین کاشت کررہے ہو، ہماری زمین ہم کو واپس کرو،محمد اشرف نے تنازعہ کوحل کرنے کے لیےاوراپناحق وصول کرنے کے لیے پٹواری سے پیمائش کرائی تو محمد اشرف کاتھوڑا کھیت محمد خالد کے کھیت میں نکلا جومحمد اشرف کے پڑوسی ہیں، ساتھ ہی دوسری طرف کے پڑوسی وسیع الرحمٰن اورمحمد اشرف کے درمیان پانچ سال قبل چکبندی کے وقت ایک حد متعین ہوئی تھی، اس کے حد کی تعیین کے وقت وسیع الرحمٰن موجودنہیں تھے، دوسرے فریق محمد اشرف موجود تھے،معلوم کرنے پرمحمد اشرف نے جوحدوسیع الرحمٰن کو بتلائی تھی، وسیع الرحمٰن نے مان لی تھی، اب دوسری پیمائش کے بعدچکبندی والی حدختم ہوگئی اوروسیع الرحمٰن کا تھوڑاکھیت محمد اشرف کے کھیت میں نکلا،وسیع الرحمٰن کا کہنا ہے کہ دوبارہ پیمائش کے بعد جتنا کھیت میرا نکلا ہے یہ تم چکبندی کے وقت سے جوت رہے تھے(جس کا زمانہ اب تک پانچ سال ہوتا ہے)لہٰذا میں بھی تمہارااتنا کھیت پانچ سال تک کاشت کروں گا،تا کہ میرا حق وصول ہوجائے۔

غورطلب بات یہ ہے کہ(۱) وسیع الرحمٰن کا یہ مطالبہ بجاہے یانہیں؟ جبکہ پہلی حد بھی پٹواری کی پیمائش پرمتعین ہوئی تھی،اوردوسری حد بھی پٹواری کی پیمائش پرمتعین ہوئی ہے۔

(۲) وسیع الرحمٰن کا حق پہلی پیمائش سے متعلق ہوگا یادوسری پیمائش سے؟

(۳) زمینوں پرحق کس وقت سے ہوتا ہے۔

المستفتی: محمد اخلاق جامعہ قاسمیہ جامع الہدیٰ کھاری بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: پیمائش میں غلطی ہوجانے کی وجہ سےایک کے حصہ پردوسرے کی ملکیت ثابت نہیں ہوگی، بلکہ وہ اسی کا حصہ شمار ہوگا اورجب دوبارہ پیمائش کرائی گئی اوراس میں وسیع الرحمٰن کا کچھ حصہ محمد اشرف کے کھیت میں نکلا اگر یہ پیمائش درست ہےتو یقیناً وہ حصہ وسیع الرحمٰن کی ملک ہوگا،اور پہلی پیمائش کوغلط قراردیا جائے گا،اور چونکہ سابقہ پیمائش کی بناء پرمحمد اشرف نے اس زمین پرکاشت کی ہےاورنفع اٹھایاہےاس لیے حق واضح ہوجانے کے بعد وسیع الرحمٰن کا یہ مطالبہ بجااورحق بجانب ہوگا کہ انہیں بھی اس زمین کے بقدر پانچ سال تک کاشتکاری کا موقع دیا جائے۔

إذا حضر الغائب فله أن ينتفع بكل الأرض مثل تلك المدة. (هنديه، الباب العاشر في زراعة الأرض المغصوبة، زكريا قديم ٥/ ١٤٤، جديد ٥/ ١٦٩، قديم ٥/ ٢٥٥، جديد ٥/ ٢٩٤، مجمع الضمانات ١/ ٢٨٥، شامي كراچی ٤/ ٣٠٤، زكريا ٦/ ٤٧٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍شعبان المعظم ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۵۲۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۸/۵ھ

قانونی چارہ جوئی کے ذریعہ دروازہ کھلا رکھنے کا حق حاصل کرنا

سوال [۱۰۳۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مکان ہے جس کو میں نے اس حال میں خریدا ہے کہ اس کے دو دروازے ہیں، ایک دروازہ عام گذرگاہ کی طرف ہے جبکہ دوسرا دروازہ آس پاس کی پڑی ہوئی زمین کی طرف ہے، یہ دروازہ قانونی اعتبار سے نہیں ہونا چاہیے تھا، مگر مجھ سے قبل مالک مکان نے اس کو بنوایا اور آس پاس کے لوگوں کو روپیہ وغیرہ دے کر دروازہ کھلا رکھا۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ مذکورہ دروازہ میرے لیے کھلا رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ سرکاری قانون یہ بھی ہے کہ جو دروازہ ۱۲؍سال تک کسی طرف سے کھلا رہے اس کو بند نہیں کرایا جاسکتا اور اس دروازہ کو کھلے ہوئے تقریباً چودہ یا پندرہ سال ہوگئے ہیں، اب میں اس دروازہ کو مقدمہ لڑ کر حاصل کرلوں، تو جائز ہوگا یا نہیں؟ مہربانی فرما کر جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: اسرار احمد جگر کالونی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب آپ نے مکان خریدا تو دروازہ کھلا ہوا تھا، نیز دروازہ اس طرف کھلے ہوئے بارہ سال سے زائد ہوگئے جس سے سرکاری قانون کے مطابق اس کو بند کرانے کا حق نہیں رہا، لہٰذا اب اگر آپ کے اوپر رکاوٹ ڈالی جائے تو آپ کو

قانونی چارہ جوئی کرکے دروازہ کھلا رکھنے کا حق ہے۔

رجل ترک الدعویٰ ثلاثا و ثلاثین سنة بلا مانع لا تسمع ثم قال وقد أفتيت بعدم سماع الدعویٰ بعد خمسة عشر سنة لنهي السلطان. (حاشية قواعد الفقه اشرفی ص:۷۷، تحت رقم الأصول: ۱۱۶، تکملة شامی زکریا ۱۱/۶۵۳، کراچی ۷/۴۸۵) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۶۶۸۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۵/۲۶ھ

پڑوسی سے تکلیف کی بناء پر مقدمہ دائر کرنا

سوال [۱۰۳۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: صورت مسئلہ یہ ہے کہ زید کی عمر ۷۰؍سال ہے اور اعصابی کمزوریوں کا مریض ہے، اس کے مکان سے پندرہ میٹر دوری پر بکر نے ایک بڑا کارخانہ لگا رکھا ہے، جس میں دھان سے چاول نکالا جاتا ہے، آٹا پیسا جاتا ہے اور سرسوں وغیرہ کو پیرائی کرکے تیل نکالا جاتا ہے، یہ کارخانہ آبادی کے اندر ہے، تعزیرات ہند کے قانون کے بموجب آبادی کے اندر ایسا کام کرنے کی اجازت نہیں ہے، جس سے ماحولیاتی خرابی پیدا ہوتی ہو اور پڑوسیوں کو تکلیف پہنچتی ہو، لیکن بکر نے ناجائز ذرائع کا استعمال کرکے کارخانہ چلانے کا لائسنس حاصل کرلیا ہے، تقریباً سات سال تک بغیر لائسنس کے کارخانہ چلتا رہا، جب زید نے کہا کہ اگر قرآن و حدیث کی روشنی میں حقوق پڑوسی پر عمل نہیں کروگے تب حکومت کے قانون کے خلاف کام کرنے کا مقدمہ کردیا جائے گا، چار سال قبل بکر نے لائسنس مذکور حاصل کرلیا ہے اور اب وہ اس غرور میں مبتلا ہے کہ اب ہمارے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوسکتی ہے، بکر کی عمر سڑسٹھ سال ہے، فریضۂ حج ادا کرچکا ہے، اور اس کا بیٹا دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فاضل کی سند حاصل کرچکا ہے، اور اب سعودی عربیہ میں ملازمت کرتا ہے، اسی کے مشورہ اور پیسوں کی مدد

سے یہ ناجائز کام ہوتا ہے، دن یا رات میں جس وقت یہ کارخانہ چلایا جاتا ہے اس وقت زید کو نیند، تلاوت، مطالعہ اور تحریری مشاغل میں بہت زیادہ تکلیف ہوتی ہے، مخالف ہوا چلنے پر زید کے کمرے میں گردوغبار اڑ کر آتا ہے، دیگر پڑوسی بھی پریشان ہیں، ایک وکیل صاحب نے زید کو یہ مشورہ دیا ہے کہ مینٹل ٹینشن، اور صحت کو نقصان پہنچنے کی بنیاد پر بکر کے خلاف ہائی کورٹ میں لاکھوں روپیہ حرجانہ وصول کرنے کی رٹ پٹیشن دائر کردی جائے، تب انصاف مل جائے گا، اور لائسنس بھی مسترد ہو جائے گا۔

تو کیا شریعت نے بحالت مجبوری ایسا مقدمہ دائر کرنے کی اجازت دی ہے، اور حرجانہ کے نام سے جو پیسہ زید کو بکر سے حاصل ہوگا وہ جائز ہوگا؟ جواب بالتفصیل عنایت فرمائیں۔

المستفتی: عبدالحمید ساکن بارہ بنکی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سائل کو اس بات کا حق ہے کہ پڑوسی کی طرف سے جو تکلیف اور پریشانیاں پہنچ رہی ہیں ان کے خلاف انصاف کا مقدمہ دائر کرے، حدیث شریف میں وارد ہوا ہے "**لا ضرر و لا ضرار**" لیکن جھوٹا مقدمہ کرنا جائز نہیں ہے، اور جھوٹا مقدمہ دائر کرنا گناہ کبیرہ ہے، اور اس کے ذریعہ سے اگر پیسہ آجاتا ہے تو وہ پیسہ بھی ناجائز ہے۔

عن ابن عباسؓ قال: قال رسول الله ﷺ: لا ضرر ولا ضرار. (ابن ماجه، باب من بنى فى حقه ما يضره بجاره، النسخة الهندية ٢/١٦٩، دار السلام رقم: ٢٣٤١، مسند أحمد بن حنبل ١/٣١٣، رقم: ٢٨٦/٧)

لايجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي. (شامى كتاب الحدود، فصل فى التعزير بأخذ المال، كراچى ٤/٦١، زكريا ٦/١٠٦، البحر الرائق كوئٹه ٥/٤١، زكريا ٥/٦٨، هنديه زكريا قديم ٢/١٦٧، جديد ٢/١٨١) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ رشعبان المعظم ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۷۷۸)

اپنی زمین میں آنے والی غیر کے درخت کی شاخ کاٹنے کا حق ہے

سوال [۱۰۳۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: چک بندی کے وقت زید نے عمرو کے برابر چک لیا، لیکن زید نے اپنے چک میں مینڈھ سے متصل آم کے پودے لگا دیئے، جن کے درخت بن جانے کے بعد عمرو کی دو بیگھے زمین نا قابل کاشت ہوگئی، ۱۹۷۹ء میں عمر کے انتقال کے بعد ان کا بیٹا بکر وارث ہوا، اس نقصان کے ماسوا گذشتہ دو سال سے جہاں تک درختوں کی شاخیں جاتی تھیں، مینڈھ لگا دی بکر نے مجبوراً حکومت سے رجوع کیا، چنانچہ حکومت کے عملے کے ذریعہ مینڈھ تو اپنے مقام پر لگ گئی، لیکن گذشتہ ۲۶/سال سے متأثرہ زمین میں برابر مالی نقصان ہو رہا ہے، اور موجودہ باغات کی آمدنی کے اعتبار سے ۱۰/ہزار ہر سال کا نقصان بدیہی ہے، اس نقصان کے ازالے کے لیے بکر کو کیا کرنا چاہیے؟ شرعی طور پر رہبری درکار ہے؟

المستفتی: بندہ نادر علی خان غفرلہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کے پیڑوں کی وجہ سے اگر عمرو کی زمین کا نقصان ہے تو عمرو کے لیے اس بات کا مطالبہ کرنا جائز ہے کہ زید کے درختوں کی شاخیں عمرو کی زمین کی طرف تجاوز نہ کریں، جو شاخیں عمرو کی زمین کی طرف تجاوز کریں، ان کو کٹوا دیا جائے، اور محض اندرونی جڑوں کی وجہ سے پورے درختوں کو کٹوانے کا مجاز نہیں ہے، بلکہ صرف عمرو کی طرف کی شاخوں کو کٹوانے کا مجاز ہے، اس لیے کہ شاخوں کی وجہ سے جو نقصان ہے وہ واضح نقصان ہے اور جڑوں کی وجہ سے جو نقصان ہے وہ واضح نہیں ہے، اور جو واضح نہیں ہے اس سے زید پر داروگیر نہیں کی جاسکتی۔

ولایمنع الشخص من تصرفه فی ملکه إلا إذا کان الضرر بجاره ضرراً بینا فیمنع من ذٰلک وعلیه الفتویٰ. (در مختار مع الشامی، مطلب: اقتسموا دارا و أراد کل منهم فتح باب لهم، زکریا ۸/۱۵۲، کراچی ۵/۴۴۷، تنقیح الفتاویٰ

الحامدية، دار الكتب العلمية بيروت ۱/ ۳۱۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍شعبان المعظم ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۸۹۲۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۸/۲ھ

دوسرے کی زمین میں غلطی سے لگائے گئے درخت کا مالک کون؟

سوال [۱۰۳۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کی ایسی زمین خالد کے پاس تھی جس کا زید کو علم نہیں تھا، خالد نے اس میں درخت لگائے، اب ناپنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ زمین زید کی ہے، اب شریعت کی رو سے وہ درخت کس کے ہوں گے؟

المستفتی: محمد ابوبکر اررياوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں واقعتاً اگر زمین زید کی ہو اور خالد نے اس پر درخت لگائے ہوں تو شرعی حکم یہ ہے کہ زمین زمین کے مالک کی اور درخت درخت کے مالک کے ہوں گے، لہٰذا درختوں کے مالک خالد پر لازم ہے کہ وہ زید کی زمین خالی کردے یا یہ کہ خالد اپنے درختوں کی قیمت زید سے لے لے، جس سے زمین اور درخت دونوں کا مالک زید ہو جائے گا، یا یہ کہ درختوں کے تیار ہونے تک ایک سال دو سال جتنی مدت کی ضرورت ہو اتنی مدت کے لیے خالد اس زمین کو کرایہ پر لے لے اور مدت کے اندر اندر درخت کاٹ کر کے زمین خالی کردے اور زمین کا کا کرایہ ادا کردے۔ (مستفاد: محمودیہ جدید ڈابھیل ۱۷/ ۱۴۴)

ومن بنى أو غرس في أرض غيره بغير إذنه أمر بالقلع والرد، وللمالك أن يضمن له قيمته بناء أو شجر أمر بقلعه إن نقصت الأرض به. (الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الغصب، زكريا ۹/ ۲۸۳-۲۸۴، كراچى ۶/ ۱۹٤-۱۹۵، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ۸۷، مصرى قديم ۲/ ٤٦۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۹۲۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری
۱۴۳۱/۳/۷ھ

زمین کا کچھ حصہ سڑک میں آنے کی وجہ سے دوسرے خریدار سے مطالبہ کرنا

سوال [۱۰۳۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ تقریباً بتیس سال قبل سلیمان مرحوم نے اپنی جائیداد مکان سمیت اپنے پرانے کھاتہ کے مطابق ۲۱/سال ڈسمل میں سے ساڑھے گیارہ ڈسمل پرتی (خالی) زمین قاری صاحب کے ہاتھ فروخت کردی، اس کے دوسال بعد مؤرخہ ۲۸/۱/۱۹۸۳ء کو مانی پرتی زمین سواچھ ڈسمل مدرسہ امدادیہ عربیہ کے ہاتھ فروخت کردی جس کی چوحدی یہ ہے، اتر: ہائی اسکول، دکھن: قاری صاحب، پورب: پہاڑ، پچھّم: منج (مکان) پھرنو ماہ بعد سوا تین ڈسمل مکان مدرسہ مذکور کے ہاتھ فروخت کردیا، جس کی چوحدی یہ ہے، اتر: ہائی اسکول، دکھن: قاری صاحب، پورب: مدرسہ امدادیہ عربیہ کی پرتی زمین مسلمان سے خریدی ہوئی، پچھّم سڑک...... قاری صاحب کی پرتی زمین میں نشان (آڑ) لگا ہوا تھا، سلیمان مرحوم قاری صاحب کی زمین کی پیداوار قاری صاحب کے ایما پر مدرسہ میں جمع کرتے رہے، مدرسہ نے جب سلیمان مرحوم کی پرتی زمین مکان سے پورب خریدی تو اس کی پیداوار بھی سلیمان مرحوم نے مدرسہ میں جمع کی، اور مدرسہ کی زمین کے نشان (آڑ) کو ختم کردیا اور پیداوار مدرسہ میں جمع کرتا رہا، کبھی قاری صاحب نے بھی پیداوار لی، آج سے دس سال قبل قاری صاحب نے امین کے ذریعہ اپنی زمین کی پیمائش کی امین نے مدرسہ کے خریدے ہوئے مکان کے نصف حصے تک پیمائش کرکے بتایا کہ قاری صاحب کی زمین یہاں تک ہے، مدرسہ کے لوگوں نے سمجھایا کہ آپ کی زمین خریدنے کے بعد چار سال تک سلیمان مرحوم نے اپنے مکان میں بود وباش کی، اور آپ کی نشان شدہ زمین کی پیداوار آپ کے ایما پر مدرسے کو ملتی رہی، سلیمان مرحوم کی کل زمین پچھّم سے جو نئے کھاتے میں سڑک میں چلی گئی ہے، اس کو پیمائش کرنے سے دونوں فریق کی زمین تقریباً پوری ہوتی ہے، قاری صاحب اس کے بعد خاموش ہوگئے۔

اب قاری صاحب اور مدرسہ اپنی اپنی زمین علیحدہ کرنا چاہتے ہیں، دونوں فریق اپنی

اپنی زمین کا داخل خارج بھی کرا چکے ہیں، نقشے کے مطابق پیمائش کرنے پر کل زمین پندرہ ڈسمل ہوتی ہے، زمین مذکور سڑک میں لے لی گئی ہے، زمین مذکور کے پچھّم جانب پختہ سڑک ہے، سڑک کی پرتی زمین ملانے سے تقریباً اکیس ڈسمل زمین پوری ہوتی ہے، قاری صاحب کا کہنا ہے کہ میں نے پہلے رجسٹری کرائی ہے، اس لیے ساڑھے گیارہ ڈسمل میری زمین نکال دیں اس کے بعد آپ کی زمین ہوگی، مدرسہ والوں کا کہنا ہے کہ آپ نے سلیمان مرحوم سے زمین خریدی اس کی حیات میں نشان تک آپ کی زمین میں تھی، اس کی حیات میں آپ نے یونہی چھوڑ دی، کبھی زمین کے متعلق دھیان نہیں دیا، اس نے مدرسہ کو باقی پرتی زمین اور مکان کی رجسٹری کی تھی، اب نئے نقشہ کے مطابق کل پندرہ ڈسمل زمین ہے، اسی میں حساب کیا جائے کیونکہ دونوں فریق کی زمین سڑک میں گئی ہے، پیمائش سے یہ معلوم ہوتا ہے۔

براہ کرم دونوں فریق کے لیے مسئلے کی وضاحت فرما کر عنداللہ ممنون ومشکور ہوں۔

المستفتی: محمد عباس

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ میں ذکر کردہ تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان مرحوم نے اپنی کل جائیداد ۲۱ر ڈسمل میں سے ساڑھے گیارہ ڈسمل زمین قاری صاحب کے ہاتھ فروخت کی ہے، جبکہ ساڑھے ۹ر ڈسمل زمین مدرسہ کو فروخت کی ہے، اور قاری صاحب کی خریدی ہوئی زمین میں حد بندی کے طور پر ایک نشان (آڑ) لگا ہوا تھا، جو کہ دونوں زمینوں کے مابین حد فاصل تھا، نیز سوال میں ذکر کردہ صراحت کے مطابق دونوں نے اپنی خریدی ہوئی زمین کی رجسٹری بھی کرالی تھی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک اپنی اپنی خریدی ہوئی زمین کا مستقل طور پر مالک ہو چکا ہے، اور اب جبکہ دونوں کی زمین میں سے کچھ حصہ سڑک میں چلا گیا ہے، تو ہر ایک کی زمین میں سے جتنا حصہ سڑک میں چلا گیا ہے اس کو اسی کی ملکیت سے خارج مانا جائیگا، بریں بنا قاری صاحب کو مدرسہ والوں سے کسی بھی طرح کے مطالبہ کا حق نہ ہوگا۔

﴿قال الله تعالیٰ: وَلَا تَأْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ. [البقرة: ١٨٨]﴾

لایجوز لأحد من المسلمین أخذ مال أحد بغیر سبب شرعی. (شامی کتاب الحدود، باب فی التعزیر بأخذ المال، کراچی ٤/٦١، زکریا ٦/١٠٦، البحر الرائق کوئٹه ٥/٤١، زکریا ٥/٦٨، هندیه زکریا قدیم ٢/١٦٧، جدید ٢/١٨١، قواعد الفقه اشرفی ص: ١١، رقم المادة: ٢٦٩)

لایجوز لأحد أن یتصرف فی ملک غیره بلا إذنه أو وکالة منه أو ولایة علیه وإن فعل کان ضامنا. (شرح المجلة رستم اتحاد ١/٦١، رقم المادة: ٩٦)

قال الإمام القرطبی: من أخذ مال غیره لا علی وجه إذن الشرع فقد أکله بالباطل. (الجامع لأحکام القرآن للقرطبی، دار الکتب العلمیة بیروت ٢/٢٢٥، تحت رقم الآیة: ١٨٨ من سورة البقرة)

عن أبی هریرة -رضی الله عنه- قال قال رسول الله ﷺ: لایأخذ أحد شبرا من الأرض بغیر حقه إلا طوقه الله إلی سبع أرضین یوم القیامة. (مسلم، باب تحریم الظلم و غصب الأرض وغیرها النسخة الهندیة ٢/٣٢، بیت الأفکار رقم: ١٦١١)

عن سالم عن أبیه قال: قال النبی ﷺ: من أخذ شیئا من الأرض بغیر حقه خسف به یوم القیامة إلی سبع أرضین. (صحیح البخاری، بدء الخلق، باب ما جاء فی سبع أرضین النسخة الهندیة ١/٤٥٣، رقم: ٣٠٩٢، ف: ٣١٩٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۳۹۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۴/۳۰ھ

۷ باب بیع الحقوق

حق تصنیف اور حق طبع کی حیثیت

سوال [۱۰۳۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعض کتب خانے والے ان کتابوں کو جن کے جملہ حقوق بحق ناشر یا مصنف محفوظ ہیں، انہی کے پتہ پر چھاپ کر فروخت کرتے ہیں، اسی طرح دیگر تجار اپنے مال کو کمپنی کا لیبل لگا کر فروخت کرتے ہیں، مثلاً اپنا صابن بنا کر گھڑی صابن کا لیبل لگا کر بازار میں فروخت کرتے ہیں، اسی طرح دیگر اشیاء مثلاً وکس، آئی ڈیکس اور جملہ دوائیاں بنا کر کمپنی کا لیبل چسپاں کر کے فروخت کرتے ہیں تو کیا یہ خرید وفروخت جائز ہے یا حرام یا مکروہ، جس قسم میں یہ خرید وفروخت داخل ہو اس کی تعیین فرما کر جواب سے نوازیں؟

المستفتی: محمد حلیم صدیقی پونہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حق تصنیف اور حق طبع محفوظ رکھنے کے بارے میں خود علماء کا اختلاف ہے، بعض علماء نے جائز کہا ہے اور بعض نے کہا کہ درست نہیں ہے، اس لیے کہ تجارت میں اصل چیز مالیت ہے، اور کتابوں کی تیاری میں جس قدر لاگت صاحب حق کو لگانی پڑتی ہے اسی قدر شائع کرنے والے کو بھی لگانی پڑتی ہے، اس لیے مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے جواہر الفقہ میں حق طبع محفوظ ہونے کے باوجود دوسرے لوگوں کے لیے طبع کرانے کی گنجائش لکھی ہے۔ (مستفاد: جواہر الفقہ قدیم ۲/ ۳۲۹، جدید زکریا دیوبند ۴/ ۴۴۷)

اور ان کے صاحبزادہ حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ نے حق طبع کو مال قرار دے کر دوسروں کے لیے طبع کرانے کو جائز لکھا ہے۔ (مستفاد: فقہی مقالات ۱/ ۲۲۲)

لیکن اگر بلا اجازت کسی نے طبع کرایا ہے تو وہ گنہگار ہوگا، مگر اس کا پیسہ ناجائز نہیں

ہوگا، بلکہ پیسہ حلال ہوگا، اسی طرح دوسری کمپنی کا لیبل لگا کر سامان فروخت کرنا ایک دھوکہ بازی ہے، اس پر دھوکہ دہی کا گناہ ہوگا، مگر تجارت اور مال کا پیسہ حلال ہوگا۔ (مستفاد: فقہی مقالات ۱/۲۲۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۲۲۳)

معاملہ مکمل ہونے کے بعد دوبارہ رقم کا مطالبہ کرنا

سوال [۱۰۳۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بدر الحسن اور قمر النساء نے ریاض الحسن کے نام بخوشی اپنے حصوں کا رجسٹری شدہ بیعنامہ کر دیا ہے، بدر الحسن نے اب سے پانچ سال پہلے ریاض الحسن کے ہاتھ اپنا حصہ بیچا تھا، یہ رجسٹری آٹھ اگست ۱۹۹۲ء کو ہوئی تھی، اور قمر النساء نے ۳۰؍ دسمبر ۱۹۹۶ء کو ریاض الحسن کے ہاتھ اپنا حصہ بیچا تھا اور بدر الحسن وقمر النساء نے بیعنامہ کے وقت اپنا پیسہ وصول کر لیا تھا، کوئی لین دین نہیں رہا، معاملہ بالکل صاف ہو چکا تھا، اب پھر سے دوبارہ مزید پیسہ اتنے سالوں کے بعد مانگ رہے ہیں، کیا ان کا مطالبہ جائز ہو سکتا ہے؟

المستفتی: ریاض الحسن کالا پیادہ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب طے شدہ قیمت مکمل ادا ہو چکی ہے تو پھر سے اتنی مدت کے بعد دوبارہ مزید روپیہ کا مطالبہ کس بات کا ہے؟ شرعی طور پر بدر الحسن اور قمر النساء کا اپنا حق وصول کرنے کے بعد پھر سے مطالبہ کرنا جائز نہیں ہے، ان کو اب کوئی حق نہیں ہے۔

عن أبی حمید الساعدی أن رسول الله ﷺ قال: لایحل لامرئ أن یأخذ مال أخیه بغیر حقه وذٰلک لما حرم الله مال المسلم علی المسلم.

(مسند أحمد بن حنبل ۵/۴۲۵، رقم: ۲۴۰۰۳)

لایجوز لأحد من المسلمین أخذ مال أحد بلا سبب شرعی. (قواعد الفقه اشرفی ص: ۱۱۰، شامی کتاب الحدود، مطلب: فی التعزیر بأخذ المال، کراچی ٤/٦١، زکریا ٦/١٠٦، البحر الرائق کوئٹه ٥/٤١، زکریا ٥/٦٨، هندیه زکریا قدیم ٢/١٦٧، جدید ٢/١٨١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٦/ ذی الحجہ ١٤١٧ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٢/ ٥٠٤٩)

رجسٹری بیع نامہ خریدار کے نام پر ہوگا نہ کہ سوسائٹی کے نام پر

سوال [۱۰۳۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: علی بھائی نے اپنی زمین آدم بھائی کو فروخت کردی تھی، لیکن کاغذات میں داخل خارج نہیں ہوا تھا، پھر آدم بھائی نے اسی زمین کو سوسائٹی والوں کو اسکول وغیرہ بنانے کے لیے فروخت کردیا تھا، سوسائٹی کا راستہ نکالنے سے متعلق آدم بھائی سے اختلاف ہوگیا، مصالحت اس بات پر ہوئی کہ آدم بھائی نے اپنی دوسری زمین اس کے عوض سوسائٹی کو دیدی، اور سوسائٹی نے عوض میں دوسری زمین لے کر تعمیری کام کرلیا، لیکن علی بھائی نے جو زمین آدم بھائی کو فروخت کی تھی اب علی بھائی اس زمین کو آدم بھائی کے نام داخل خارج کرانے سے انکار کررہے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ میں اس زمین کے کاغذات سوسائٹی کے نام کراؤں گا، اس زمین کو سوسائٹی نے خریدا تھا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ علی بھائی کا سوسائٹی سے کوئی تعلق نہیں ہے، سوسائٹی والوں نے علی بھائی سے کوئی معاملہ ہی نہیں کیا، سوسائٹی کا تعلق تو آدم بھائی سے ہے اور سوسائٹی والوں نے اس زمین کے عوض دوسری زمین بھی لے لی ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ علی بھائی کا سوسائٹی کے نام اس زمین کو کرانا اور سوسائٹی والوں کا اپنے نام میں لینا از روئے شرع کیسا ہے؟

المستفتی: عبداللہ بھائی بڑودہ گجرات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: علی بھائی نے جب زمین آدم بھائی کے ہاتھ فروخت کردی ہے تو علی بھائی پر لازم ہے کہ زمین کے کاغذات آدم بھائی کے نام سے ہی داخل خارج کرادے نہ سوسائٹی کو اپنے نام سے کرانے پر اقدام کرنا جائز ہے اور نہ ہی علی بھائی کو سوسائٹی کے نام کرانے کا اختیار ہے، علی بھائی کا تعلق صرف آدم بھائی کے ساتھ ہی رہے گا۔

المسلمون عند شروطهم. (قواعد الفقه اشرفی ص: ۱۲۱، رقم: ۳۱۹، صحيح البخاری، باب أجر السمسرة، النسخة الهندية ۱/۳۰۳)

وإذا دفع المشترى الثمن فإن البائع يجبر على تسليم المبيع. (كتاب الفقه على المذاهب الأربعة دار الفكر ۲/۱۸۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۴۹۱۶)

ڈپوزٹ کا شرعی حکم

سوال [۱۰۳۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اس وقت بمبئی میں مکان کے کرایہ پر لینے کا ایک طریقہ یہ رائج ہے کہ کرایہ دار نے کوئی مکان پانچ سو روپیہ پر لیا، لیکن جو مالک مکان ہے وہ ڈپوزٹ کے نام سے خطیر رقم لیتا ہے، مالک مکان ان روپیوں سے استفادہ بھی کرتا ہے، اور ہر ماہ کا کرایہ بھی وصول کرتا ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا جو ڈپوزٹ والی رقم ہے، ڈپوزٹ والی رقم جب کرایہ دار مکان خالی کرتا ہے تو مالک مکان پوری رقم کرایہ دار کو واپس کردیتا ہے، تو اس سے مالک مکان کا استفادہ کرنا جائز ہے، اس پر رہن کی تعریف صادق آتی ہے یا نہیں؟ اور اس طریقہ سے کرایہ پر مکان لینا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: ابو اسامہ قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ میں درج شدہ مسئلہ کے مطابق جب مالک مکان کرایہ دار سے خطیر رقم حاصل کرتا ہے اور کرایہ داری ختم کرتے وقت وہ واپس کر دیتا ہے تو یہ رقم بطور ضمانت ہے اور ضمانت سے استفادہ جائز ہے۔ (مستفاد: فقہی مقالات ۱/ ۲۱۷، ایضاح النوادر ۱/ ۱۱۰) فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۱۱/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۸۱۱)

کرایہ دار کا حق قرار لینا

سوال [۱۰۳۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک صاحب نے دوسرے صاحب سے ایک دوکان بطور کرایہ پر لی، کرائے پر رہتے ہوئے ایک لمبا عرصہ ہوگیا تقریباً ۳۰/۳۲/ سال، اب مالک دوکان کو اس دوکان کی ضرورت پڑ گئی اور کرایہ دار کو اس نے خالی کرنے کو کہا، کرایہ دار بغیر روپیہ لیے ہوئے خالی نہیں کرنا چاہتا ہے، جیسا کہ آج کل مارکیٹ کا عرف بن چکا ہے، چنانچہ مالک مکان نے ایک تیسرے شخص کو وہ دوکان بیچ دی، اس خریدار نے کرایہ دار سے دوکان خالی کرنے کے لیے پانچ لاکھ روپیہ دیئے۔

کرایہ دار اس دوکان میں کپڑے کا کاروبار کرتا تھا، مگر کچھ عرصہ سے اس کا کاروبار خسارہ میں چل رہا تھا، اور یہ خسارہ بڑھتے بڑھتے دس سے بارہ لاکھ تک ہوگیا، جو بیوپاریوں کا دوکان دار کی جانب باقی ہے، اور ادائیگی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

کرایہ دار دوکان خریدار سے وہ پانچ لاکھ روپیہ لے کر ایک شیئرز کمپنی میں ۵/ لاکھ روپئے کا شیئرز لے اور اس سے جو منافع حاصل ہو اس سے قرض داروں کا قرض ادا کرے، اور پھر چند سال کے بعد اس ۵/ لاکھ روپیہ کے منافع سے قرض کی ادائیگی کے بعد اصل رقم کو

فقراء میں تقسیم کردے، کرایہ دار کے حالات کثرت عیال ودیگر مصائب کی وجہ سے ایسے سنگین ہیں کہ اگر وہ پانچ لاکھ روپیہ کو کمپنی میں بطور شیئرز لگا کر اس سے حاصل شدہ منافع سے اس قرض کی ادائیگی نہ کرے تو قرض کی ادائیگی کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی، اس حالات کے پس منظر میں چند سوال مطلوب ہیں :

(۱) کرایہ دار کا مالک مکان یا خریدار سے خالی کرنے کا معاوضہ لینا شرعاً کیسا ہے؟

(۲) اگر یہ معاوضہ حرام ہے تو اس رقم کو کمپنی میں بطور شیئرز لگا کر اس سے حاصل شدہ منافع سے قرض داروں کے قرض کی ادائیگی کا شرعاً کیا حکم ہے؟

(۳) قرض خواہ اگر غیر مسلم ہو تو کیا ادائیگی کی کچھ گنجائش نکل سکتی ہے؟

جبکہ کرایہ دار اس معاوضہ (۵/لاکھ) کو حرام سمجھتا ہے، لیکن کرایہ دار موجودہ قرض کی ادائیگی کی کوئی صورت نہ نکلنے کی وجہ سے یہ شکل نکال کر قرض کو ادا کرنا چاہتا ہے پھر قرض کی ادائیگی کے بعد وہ اصل رقم ۵/لاکھ روپیہ چند سالوں کے بعد خریدار کو لوٹا دیئے جائیں گے؟

(۴) یہ ۵/لاکھ روپیہ خریدار کو ہی لوٹانے ضروری ہوں گے، یا مسلم فقراء میں تقسیم کردینا کافی ہوگا؟

(۵) ان ۵/لاکھ روپیوں کی آمد سے قرض کی ادائیگی کی صورت میں بدل قرض کا کچھ حصہ جو کہ دوکان میں کپڑے کی صورت میں موجود ہے، ان کپڑوں کو فروخت کر کے اپنے گذر بسر میں استعمال کرنا شرعاً کیسا ہے؟

(۶) اس لی ہوئی ۵/لاکھ رقم میں سے کچھ رقم مثلاً ۲/لاکھ روپئے براہ راست نئی دوکان بنانے میں خرچ کی جاسکتی ہے اس نیت کے ساتھ کہ اتنی رقم چند ماہ کے بعد واپس کردی جائے گی؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) اصل حکم تو یہی ہے کہ کرایہ دار مکان خالی کرتے وقت مالک مکان یا دیگر خریدار سے خالی کرنے کے عوض کوئی رقم نہیں لے سکتا، لیکن جہاں طویل مدتی کرایہ داری پائی جائے، مثلاً پٹہ دوامی ہو یا ملکی قانون اور عرف کے اعتبار سے کرایہ دار کو حق قرار حاصل ہو چکا ہو اور مالک مکان اس کی مرضی کے بغیر اسے خالی کرانے

کا حق نہ رکھتا ہو، تو ایسی صورت میں کرایہ دار کے لیے اپنے حق قرار سے دست برداری کے عوض مالک مکان یا دیگر خریدار سے معاوضہ لینے کی شرعاً گنجائش ہے۔

ومـمن أفتى بلزوم الخلو الذي يكون بمقابلة دراهم يدفعها ...... للمالك العلامة المحقق عبد الرحمن آفندي العمادي وقال: فلا يملك صاحب الحانوت إخراجه ولا إجارتها لغيره مالم يدفع له المبلغ المرقوم فيفتي بجواز ذٰلك للضرورة. (شامي، البيوع، مطلب: في أملاك، زكريا ٧/ ٤٠، كراچي ٤ /٥٢٣)

فإذا أراد صاحبها النزول عنها لغيره بعوض جعلوا ذٰلك بطريق الفراغ كالنزول عن الوظائف وقدمنا عن المفتي أبي السعود أنه أفتى بجوازه.

(شامي، البيوع، مطلب: في بيان مشد المسكة، زكريا ٧/٤٣، كراچي ٤/٥٢٤)

(۲) اگر جواب (۱) میں ذکر کردہ جواز معاوضہ کی شرط کے مطابق آپ نے یہ معاوضہ لیا ہے تو اس معاوضہ کو حلال کاروبار میں لگا کر اس سے نفع اٹھانا بھی جائز ہوگا، لیکن ہندوستان جیسے ملک میں شیئرز کا کاروبار اکثر مشتبہ آمدنی پر مشتمل ہے، اس لیے مسلمانوں کو اس طرح کے کاروبار میں پیسہ نہیں لگانا چاہیے۔

المالك وهو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف يشاء. (بيضاوي شريف رشيديه ١/ ٧)

(۳) اس معاملہ میں مسلم اور غیر مسلم قرض خواہ سے اصل حکم میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور کرایہ دار کا مطلقاً معاوضہ کو حرام سمجھنا صحیح نہیں ہے۔

صـاحب الخـلو إذا نزل عن خلوه لغيره يأخذ الناظر من المنزول له دراهـم تسمى تصديقا فهذه تحسب من الأجرة أيضا. (شامي، البيوع، مطلب: في أملاك، زكريا ٧/ ٤١، كراچي ٤ /٥٢٣)

(۴) اگر یہ پانچ لاکھ روپئے طویل مدتی کرایہ داری میں حق قرار سے دستبرداری کے عوض لیے گئے ہیں تو ان کا کرایہ دار کو لوٹانا ضروری ہے ورنہ فقراء پر صدقہ ضروری ہے۔

عن المفتي أبي السعود أنه أفتى بجواز أخذ العوض في حق القرار والتصرف.

(شامی، کتاب البیوع، مطلب فی العرف الخاص والعام زکریا ۷/۳۷، کراچی ۴/۵۲۰)

(۵) مذکورہ رقم سے جو آمدنی ہوئی ہے یا جو کپڑے خریدے گئے ہیں ان کو اپنے ذاتی استعمال میں لانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

لأن الملک ما من شانه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص. (شامی مطلب: فی تعریف المال زکریا ۷/۱۰، ۲۳۵، کراچی ۵/۵۰، ۵۰۲، الموسوعة الفقهية الكويتية ۱۴/۲۹)

(۶) اس رقم کو نئی دوکان بنانے میں بھی خرچ کرنے کی گنجائش ہے، بشرطیکہ جواز کی شرط پائی جائے۔

كل يتصرف فى ملكه كيف شاء. (شرح المجلة رستم اتحاد ۱/۶۵۴، رقم المادة: ۱۱۹۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ذیقعدہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/۲۴/۱۱۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۱۱/۱۴۳۵ھ

کرایہ دار کا مکان خالی کرنے کے لیے رقم کا مطالبہ کرنا

سوال [۱۰۳۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سائل نے ایک ۱۰۰ ر گز قطعہ آراضی ملحقہ مکان سکنائی بعوض مال سوختہ کرایہ پر دی تھی، اپنی کاروباری ضرورت کے پیش نظر کرایہ دار سے خالی کرنے کو کہا گیا تو وہ انکاری ہو گیا، مجبوراً عدالت کا راستہ اختیار کیا گیا تو اس کی بھول بھلیوں میں ۱۲ ر برس گذر گئے، پھر بھی مستقبل قریب میں کوئی امید اور اس کے ہونے کے آثار دکھائی نہیں پڑتے، اور ہمیں اپنی بے روزگاری اب برداشت سے باہر ہوتی جاتی ہے، مجبوراً کرایہ دار سے تصفیہ کی بات کی تو وہ ایک معقول رقم کا طالب ہے خالی کرنے کے عوض، اپنی مجبوری اور ضرورت کے پیش نظر یہ مطالبہ پورا کر دیا جائے، تو کیا یہ رشوت میں شمار ہوگا؟ جس پر حدیث شریف میں لینے اور دینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے، براہ کرم شرعی حکم سے آگاہ فرمائیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مالک کے لیے کرایہ پر دیئے ہوئے مکان کو کرایہ دار سے خالی کرانے کا کلی اختیار ہے، اور مکان خالی نہ کرنے کی صورت میں مکان خالی کرانے کے لیے جو بھی مناسب ومؤثر تدبیر ہو سکے اختیار کرنے کی شرعاً گنجائش ہے، کیونکہ مالک کو اپنی ملکیت میں ہر طرح کے تصرف کا حق ہے، اور کرایہ دار کا مکان خالی کرنے پر معقول رقم طلب کرنا نا جائز ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ میرٹھ ۲۵/ ۳۰۹)

عن أبي حرة الرقاشي عن عمه أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه. (شعب الإيمان للبيهقي، باب في قبض اليد عن الأموال المحرمة، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ٣٨٧ رقم: ٥٤٩٢، السنن الكبرىٰ للبيهقي دار الفكر بيروت ٨/ ٥٠٦ رقم: ١١٧٤٠، مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٧٢ رقم: ٢٠٩٧١، سنن الدار قطني، دار الكتب العلمية بيروت ٣/ ٢٢ رقم: ٢٨٦٢)

وتصح إجارة أرض للبناء والغرس ...... فإن مضت المدة قلعهما و سلمها فارغة لعدم نهايتهما. (در مختار مع الشامي، كتاب الإجارة، باب ما يجوز من الإجارة، زكريا ٩/ ٤٠-٤١، كراچی ٦/ ٣٠

ليس لأحد أن يأخذ مال غيره بلا سبب شرعي. (هنديه، كتاب الحدود، فصل في التعزير، زكريا قديم ٢/ ١٦٧، جديد ٢/ ١٨١، شرح المجلة رستم اتحاد ١/ ٦٢، رقم المادة: ٩٧، البحرالرائق زكريا ٥/ ٦٨، كوئٹه ٥/ ٤١) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ رشوال المکرّم ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۶۷۱)

پگڑی کا حکم

سوال [۱۰۳۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: ایک بازار میں ایک مسلمان ہے اس نے دوکانیں بنوائی ہیں، اس نے دوکان لینے والوں سے یہ کہا کہ جو دوکان لے گا وہ پانچ ہزار روپیہ دیدے اور دوکان کرایہ پر لے لے، یہ پانچ ہزار روپیہ نہ کرایہ میں مجریٰ ہوں گے اور نہ بعد میں ملیں گا بلکہ مالک دوکان ویسے ہی رکھے گا، تو مالک کا اس طرح سے کرایہ دار سے رقم لینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: اقبال احمد شیر کوٹ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دوکان یا مکان کرایہ پر دینے کا جو طریقہ آپ نے تحریر کیا ہے اس کو ہمارے عرف میں پگڑی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اس طرح پگڑی کے نام سے لی جانے والی رقم حرام وناجائز ہے، البتہ اگر وہ رقم کرایہ میں جوڑ دے تو جائز ہے اور اگر اس کرایہ میں نہ جوڑے اور دوکان خالی کرتے وقت وہی رقم واپس ہو جائے تو اس کی بھی گنجائش ہے۔ (مستفاد: فقہی مقالات ۱/ ۲۱۷، احسن الفتاویٰ ۶/ ۵۲۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۷۳۶)

حقوقِ مجردہ کا عوض لینا

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ أَمَّا بَعْد!

وَالَّذِیْنَ فِی اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَعْلُوْمٌ. وہ لوگ جن کے مال میں متعین حق مقرر ہے۔
(المعارج، الآیة: ٢٤)

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا ☆ عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

زمانہ کی گردش بڑھتی گئی اور نئے نئے مسائل میں اضافہ ہوتا گیا، چنانچہ زمانہ کے بدلنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے لین دین کا عرف اور تعامل بھی بدلتا چلا گیا جس کے نتیجہ میں تجارت کے اقسام وانواع میں اضافہ ہوکر ایسے ایسے نئے مسائل پیدا ہوگئے جن کے بارے میں ائمۂ مجتہدین کے ذہنوں میں وہم وگمان بھی پیدا نہیں ہوا تھا، تو ایسے مسائل ائمۂ مجتہدین اور فقہاء کے اصولی مسائل کو نظیر بنا کر حل کرنے کی ضرورت ہے، اسی کے ضمن میں حقوقِ مجردہ کی بیع یا ایسے حقوق سے دست برداری کا عوض لینے کا مسئلہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے، اسی کے تناظر میں یہ مضمون پیش خدمت ہے۔

حق کسے کہتے ہیں؟

''حق'' کی جمع ''حقوق'' آتی ہے، اس کی تعریف فقہاء نے مختلف انداز سے کی ہے، اس کی چند تعریف ہم ذیل میں نقل کردیتے ہیں:

(۱) حق ایسی چیز کو کہا جاتا ہے جس کے اوپر صاحبِ حق کو تصرف کا اختیار حاصل ہوجاتا ہے، جیسا کہ ''الموسوعۃ الفقہیہ'' کی اس عبارت سے واضح ہوتا ہے:

اَلْمَحَلُّ الَّذِيْ يَجْرِيْ عَلَيْهِ التَّصَرُّفُ يُسَمّٰى حَقًّا. ہر وہ محل جس کے اوپر تصرف کا اختیار جاری ہوجاتا ہے اس کو حق سے موسوم کیا جاتا ہے۔
(الموسوعة الفقهية ٤/ ٢٣٧)

(۲) ''الموسوعۃ الفقہیہ'' کی دوسری جگہ کچھ اور انداز سے حق کی تعریف کی گئی ہے کہ لغت کے اعتبار سے ان امور کو حق کہا جاتا ہے جو ثابت اور موجود ہوں۔ اور فقہاء کی اصطلاح میں آدمی کے مصالح کی وجہ سے مقتضائے شریعت کے مطابق جو چیز اس کے لئے ثابت ہوتی ہے اسے حق کہا جاتا ہے، عبارت ملاحظہ فرمایئے:

الْحُقُوْقُ جَمْعُ حَقٍّ، وَالْحَقُّ لُغَةً الْأَمْرُ الثَّابِتُ الْمَوْجُوْدُ، وَاصْطِلَاحًا يَسْتَعْمِلُهُ الْفُقَهَاءُ فِيْمَا ثَبَتَ لِإِنْسَانٍ بِمُقْتَضَى الشَّرْعِ مِنْ أَجْلِ مَصَالِحِهٖ. (الموسوعة الفقهية ۳/ ۱۰)

حقوق حق کی جمع ہے اور حق کے معنی لغت میں ایسے امور ہیں جو ثابت ہوں موجود ہوں۔ اور فقہاء کی اصطلاح میں ایسی چیز میں حق کا استعمال ہوتا ہے جو چیز انسان کے لئے اس کے مصالح کی وجہ سے شریعت کے مقتضی کے مطابق ثابت ہو۔

(۳) ''ہدایہ'' کے حاشیہ میں بہت جامع انداز سے حق کی تعریف کی گئی ہے کہ ہر وہ چیز انسان کا حق ہوتی ہے جس کے ثابت کرنے اور ساقط کرنے کا آدمی کو اختیار ہوتا ہے۔ عبارت ملاحظہ فرمایئے:

حَقُّ الْإِنْسَانِ مَا يَتَوَلّٰى إِثْبَاتَهٗ وَإِسْقَاطَهٗ. (هامش الهداية ۳/۱٦، بحواله قاموس الفقه ۳/ ۲٦۷)

انسان کا حق وہ چیز ہوتی ہے جس کو ثابت کرنے اور ساقط کرنے کا انسان مالک ہوتا ہے۔

(۴) ''لغۃ الفقہاء'' میں حق کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ انسان کا حق ہر وہ چیز ہوتی ہے جو اس انسان کے لئے دوسرے پر لازم ہو جاتی ہے۔ عبارت ملاحظہ فرمایئے:

حَقُّ الْآدَمِيِّ مَا وَجَبَ لِلْآدَمِيِّ عَلٰى غَيْرِهٖ. (لغة الفقهاء ص: ۱۸۳)

آدمی کا حق وہی ہوتا ہے جو آدمی کے لئے غیر پر لازم ہوتا ہے۔

مال اور حقوقِ مجردہ کی حقیقت

یہاں پر اصولی طور پر دو چیزیں قابل غور ہیں: (۱) مال کسے کہتے ہیں، جس کی بیع جائز

ہو؟ (۲) حقوق مجردہ کی بیع جائز ہے یا نہیں؟

مال کی تعریف

حضراتِ فقہاء نے مال کی تعریف مختلف انداز، کیفیت اور مختلف شرائط کے ساتھ کی ہے اور زمانہ کی تبدیلی کے اعتبار سے بعد کے فقہاء نے مال کی تعریف میں کافی وسعت بھی پیدا کی ہے۔ علامہ حصکفیؒ نے بیع کی تعریف کرتے ہوئے مال ہر اس چیز کو قرار دیا ہے جو مرغوب فیہ ہو اور اس کے ذیل میں علامہ شامیؒ نے یہ تشریح کی ہے کہ ہر اس شئ کو مال کہا جاتا ہے جس کی طرف طبیعت کا میلان ہو۔ ملاحظہ فرمائیے:

مُبَادَلَةُ شَيْءٍ مَرْغُوْبٍ فِيْهِ بِمِثْلِهِ (وتحته في الشامية) أَيْ مَا مِنْ شَأْنِهِ أَنْ تَرْغَبَ إِلَيْهِ النَّفْسُ وَهُوَ الْمَالُ. (شامي كراچی ٥٠٢/٤، زكريا ٧/١١)

عقدِ بیع شئ مرغوب فیہ کو اس کے مثل کے بدلے میں تبادلہ کرنے کا نام ہے (اس کے تحت شامی لکھتے ہیں) کہ ہر وہ چیز جس کی طرف نفس اور طبیعت کا میلان ہو اسی کو مال کہتے ہیں۔

اور ''مجمع الانہر'' میں مال کی تعریف ان الفاظ سے کی گئی ہے:

وَالشَّيْءُ إِنَّمَا يَصِيْرُ مَالًا لِكَوْنِهِ مُنْتَفَعًا بِهِ. (مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية ٨٤/٣)

بے شک کوئی بھی چیز اس وقت مال بن جاتی ہے کہ جب وہ چیز نفع بخش ہو۔

مذکورہ دونوں عبارتوں پر غور کیا جائے تو مال کی تعریف میں کافی وسعت نظر آتی ہے کہ جس چیز کے بارے میں بھی طبیعت کا میلان اور رغبت پیدا ہو جائے اور اس چیز میں کسی نہ کسی درجہ میں نفع کا پہلو موجود ہو اور اس میں بنصِ شرعی حرمت کا پہلو موجود نہ ہو وہ شرعاً مال ہے، جس کو عوض دے کر حاصل کرنے کی گنجائش ہے۔

اور ''بدائع'' کی ایک عبارت سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مال کا عین اور شئ مرئی ہونا لازم نہیں ہے؛ بلکہ کبھی ایسی چیز بھی مال بن جاتی ہے جو غیر مرئی اور غیر مادی شئ ہو اور اس میں منفعت موجود ہو اور انسان کی طبیعت کا میلان اس کو حاصل کرنے کی طرف ہو۔

علامہ شامی اور صاحب بدائع کی تشریح سے نئے پیدا ہونے والے مسائل کا حل بہت

آسانی سے ہوسکتا ہے۔ بدائع کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

وَالْمَالُ قَدْ يَكُوْنُ عَيْنًا، وَقَدْ يَكُوْنُ مَنْفَعَةً، وَيَتَعَلَّقُ بِالْمِلْكِ فِيْ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا أَحْكَامٌ. (بدائع زکریا ۶/۵۰۳)

اور مال کبھی عین اور مادی شئ ہوتا ہے اور کبھی غیر مادی منافع بھی مال ہوتے ہیں اور ملک کے ذریعہ ان دونوں میں سے ہر ایک میں احکام جاری ہوجاتے ہیں۔

حقوقِ مجردہ کی بیع

بادی النظر میں متون کی بعض عبارات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حقوقِ مجردہ کی بیع مطلقاً جائز نہیں ہے؛ حالاں کہ مسئلہ ایسا ہے نہیں؛ بلکہ بہت سے حقوقِ مجردہ کی بیع کو حضراتِ فقہاء نے واضح الفاظ میں جائز لکھا ہے۔ مثال کے طور پر حقِ مرور، حقِ تعلّی، حقِ تسییل، حقِ شرب، حقِ شفعہ، حقِ نوبت زوجہ، دیوار پر کڑی رکھنے کا حق، دروازہ کھولنے کا حق، یہ سب حقوقِ مجردہ میں شامل ہیں۔ ان میں سے بعض حقوق ایسے ہیں جن کا عوض لینا جائز نہیں ہے، مثلاً حقِ شفعہ، حقِ نوبت زوجہ وغیرہ۔ اور بہت سے حقوق ایسے ہیں جن میں سے بعض کا عوض لینا بطریق بیع اور بعض کا بطریق دست برداری جائز ہے، جیسا کہ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

حقِّ مرور کی بیع کا جواز

ان میں سے حقِ مرور کے بارے میں حضراتِ فقہاء نے صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ حقِ مرور کی بیع جائز ہے۔ اور اس کے جواز کے بارے میں وجہ اور علت یہ بیان کی جاتی ہے کہ جس راستے سے گذر ہوتا ہے وہ راستہ متعین ہے اور حقِ شرب اور حقِ تسییل کی بیع کو یہ کہہ کر ناجائز قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ پانی کتنے حصے پر بہے گا وہ حصہ متعین نہیں ہے، اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جہاں حقوقِ مجردہ کی بیع کو جائز کہا گیا ہے وہاں پر جہالت مفضی الی المنازعہ نہ ہونے کی وجہ سے جائز کہا گیا ہے اور جہاں ناجائز کہا گیا ہے وہاں جہالت مفضی الی المنازعہ کو عدمِ جواز کی علت قرار دیا گیا ہے، تو اس سے صاف واضح ہوا کہ

نفسِ حقوقِ مجردہ کی بیع کو حضراتِ فقہاء نے ناجائز نہیں کہا ہے؛ بلکہ جہاں جہالت مفضی الی المنازعہ ہے وہاں ناجائز اور جہاں جہالت مفضی الی المنازعہ نہیں وہاں جائز ہے۔

اس سلسلے میں عبارت ملاحظہ فرمایئے:

وَصَحَّ بَيْعُ حَقِّ الْمُرُوْرِ تَبَعًا لِلْأَرْضِ بِلَا خِلَافٍ وَمَقْصُودًا وَحْدَهُ. فِي رِوَايَةٍ: وَبِهِ أَخَذَ عَامَّةُ الْمَشَايِخِ. (وتحته في الشامية) قَالَ السَّائحَانِي: وَهُوَ الصَّحِيْحُ وَعَلَيْهِ الْفَتْوٰى. (شامي كراچی ٥/ ٨٠، زكريا ٧/ ٢٧٥)

حق مرور کو فروخت کرنا زمین کے تابع بنا کر بالاتفاق جائز ہے اور اس کو زمین سے الگ کر کے تنہا مقصود بالذات بنا کر فروخت کرنا ایک روایت کے مطابق جائز ہے، اسی کو عامۃ المشایخ نے اختیا فرمایا ہے۔ اور اس کے تحت شامی میں ہے کہ سائحانی نے فرمایا کہ یہی صحیح ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

حقِ تسییل کی بیع کا جواز

پرنالے سے پانی بہانے کے حق کو فروخت کرنا، اسی طرح اس کو ہبہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو حضراتِ فقہاء نے جہالت محل کی وجہ سے اس کو ناجائز قرار دیا ہے، یعنی کتنی مقدار پرنالے کے اوپر سے پانی بہتا ہوا جائے گا، اس کا محل مجہول ہے، اس محل کی جہالت کی وجہ سے حقِ تسییل کو فقہاء نے ناجائز قرار دیا ہے، ایسا نہیں ہے کہ نفسِ حقِ تسییل کی بیع جائز نہیں ہے؛ بلکہ نفسِ حقِ تسییل کی بیع جائز ہے اور جہالت محل کی وجہ سے اس کو ناجائز قرار دیا گیا ہے؛ لہٰذا اگر محل متعین ہوجائے اور اس کی جہالت ختم ہوجائے تو بلاشبہ جائز ہوجائے گا۔

فقہاء کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

لَايَصِحُّ بَيْعُ حَقِّ التَّسْيِيْلِ وَهِبَتُهُ سَوَاءٌ كَانَ عَلَى الْأَرْضِ لِجَهَالَةِ مَحَلِّهِ كَمَا مَرَّ أَوْ عَلَى السَّطْحِ (وتحته في الشامية) وَهُوَ أَنْ يَسِيْلَ الْمَاءُ عَنْ أَرْضِهِ

حقِ تسییل کو فروخت کرنا اور اس کا ہبہ کرنا صحیح نہیں ہے، چاہے زمین کے اوپر سے پانی بہایا جائے یا چھت کے اوپر سے محلِ تسییل کی جہالت کی وجہ سے۔ اور شامی میں ہے کہ اور اس کی شکل یہ ہے کہ اس کی زمین سے پانی

كَيْ لَا يُفْسِدَهَا فَيَمُرُّهُ عَلٰى أَرْضٍ لِغَيْرِهِ فَهُوَ مَجْهُوْلٌ لِجَهَالَةِ مَحَلِّهِ الَّذِيْ يَأْخُذُهُ.

(شامي كراچی ٥/ ٨٠ زكريا ٧/ ٢٧٦)

بہایا جائے تاکہ اس کی زمین خراب نہ ہو تو اس کو غیر کی زمین کے اوپر سے گذارا جائے اور وہ مجہول ہے، اس کے اس محل کی جہالت کی وجہ سے جس جگہ سے پانی گذرے گا۔

اس عبارت سے صاف واضح ہوا کہ حقِ تسییل کی بیع اور اس کا ہبہ کرنا فی نفسہ ناجائز نہیں ہے؛ بلکہ فی نفسہ جائز ہے، بس صرف محلِ تسییل کی جہالت کی وجہ سے اس کو ناجائز قرار دیا گیا ہے؛ لہٰذا اگر محلِ تسییل کو متعین کرکے واضح کر دیا جائے جس سے اس کی جہالت ختم ہو جائے تو بلا شبہ حقِ تسییل کو فروخت کرنا اور اس کا ہبہ کرنا حقوقِ مجردہ کے باوجود جائز ہو جائے گا، جیسا کہ مذکورہ عبارت سے واضح ہو چکا ہے۔

تعاملِ ناس کی وجہ سے حقِ شرب کی بیع کا جواز

صاحبِ مبسوط نے بعض مشائخ کا فتویٰ نقل فرمایا ہے کہ حقِ شرب کی بیع جائز ہے اگرچہ زمین کے تابع کرکے اس کو نہ بیچا ہو؛ اس لئے کہ بعض شہروں میں حقِ شرب کا بیچنا معروف اور متعارف ہے؛ لہٰذا جس طرح تعاملِ ناس کی وجہ سے بیع استصناع جائز ہے اسی طرح تعاملِ ناس کی وجہ سے زمین کے تابع کئے بغیر صرف حقِ شرب کو فروخت کرنا بھی جائز ہے۔ مبسوط کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

وَبَعْضُ الْمُتَأَخِّرِيْنَ مِنْ مَشَايِخِنَا رَحِمَهُمُ اللّٰهُ أَفْتٰى أَنْ يَبِيْعَ الشُّرْبَ وَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ أَرْضٌ لِلْعَادَةِ الظَّاهِرَةِ فِيْهِ فِيْ بَعْضِ الْبُلْدَانِ، وَهٰذِهِ عَادَةٌ مَعْرُوْفَةٌ بِنَسَفَ قَالُوْا: إِنَّمَا جُوِّزَ الاسْتِصْنَاعُ لِلتَّعَامُلِ، وَإِنْ كَانَ الْقِيَاسُ يَأْبَاهُ، فَكَذٰلِكَ

ہمارے مشائخ میں سے بعض متاخرین نے حقِ شرب کی بیع کے جواز کا فتویٰ دیا ہے، اگرچہ اس حق کی بیع کے ساتھ زمین کی فروختگی نہ ہو، بعض شہروں میں اس سلسلے میں لوگوں کی عادت متعارف ہونے کی وجہ سے، اور اس کا تعامل بلا دنسف میں معروف ہے۔ ان لوگوں نے فرمایا کہ بے شک تعامل ناس کی وجہ سے معاملۂ استصناع کو جائز قرار دیا گیا ہے اگرچہ

بَيْعُ الشُّرْبِ بِدُوْنِ الْأَرْضِ. (المبسوط ۲۳/ ۱۷۱)

قیاس اس کا انکار کرتا ہو، تو ایسا ہی حقِ شرب کی بیع بھی بغیر زمین کے جائز اور درست ہے۔

اور ''درمختار'' میں ہے کہ حقِ مرور کی طرح حقِ شرب کو فروخت کرنا بھی جائز ہے اور زمین کے تابع بنا کر فروخت کرنا بالاتفاق جائز ہے اور زمین سے الگ کر کے حقوقِ مجردہ کے طور پر فروخت کرنا ظاہر الروایہ کے مطابق بیع فاسد ہے۔ اور مشایخ بلخ کے نزدیک جائز ہے۔ عبارت ملاحظہ فرمایئے:

وَكَذَا بَيْعُ الشُّرْبِ وَظَاهِرُ الرِّوَايَةِ فَسَادُهُ إِلَّا تَبْعًا (وتحته في الشامية) فَإِنَّهُ يَجُوْزُ تَبْعًا بِالإِجْمَاعِ، وَوَحْدَهُ فِيْ رِوَايَةٍ وَهُوَ اخْتِيَارُ مَشَايِخِ بَلْخ؛ لِأَنَّهُ نَصِيْبٌ مِنَ الْمَاءِ. (شامي، كراچی ۵/ ۸۰ زکریا ۷/ ۲۷۶)

اور ایسا ہی (حقِ مرور کی طرح) حقِ شرب کو فروخت کرنا بھی جائز ہے اور ظاہر الروایہ کے مطابق بیع فاسد ہے، الا یہ کہ زمین کے تابع بنا کر فروخت کیا جائے۔ اس کے تحت شامی میں ہے کہ بے شک زمین کے تابع بنا کر فروخت کرنا بالاجماع جائز ہے اور زمین سے الگ تنہا حقِ شرب کو فروخت کرنا ایک روایت کے مطابق جائز ہے اور وہ مشایخ بلخ کا اختیار کردہ قول ہے؛ اس لئے کہ وہ پانی کا ایک حصہ ہے۔

حقِ اسبقیت

''ابوداؤد شریف'' کی ایک روایت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شریعت کے اندر حقِ اسبقیت کا اعتبار ہے کہ جو بھی کسی معاملہ میں سبقت کر کے اپنا حق ثابت کر دے تو اس کا وہ حق ایسا معتبر ہو جاتا ہے کہ اس کی دست برداری کے بغیر اس حق پر دوسرے کا قبضہ جائز نہیں ہے اور حق سے دست برداری کا عوض لینے کو فقہاء نے جائز قرار دیا ہے۔

ابوداؤد شریف کی حدیث ملاحظہ فرمایئے:

عَنْ أَسْمَرَ بْنَ مُضَرِّس قَالَ: أَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَايَعْتُهُ، فَقَالَ: مَنْ سَبَقَ

حضرت اسمر بن مضرسؓ فرماتے ہیں کہ میں نبی اکرم ﷺ کے پاس حاضر ہو کر آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوا، تو حضور ﷺ نے فرمایا: جو شخص

إِلٰى مَا لَمْ يَسْبِقْهُ إِلَيْهِ مُسْلِمٌ فَهُوَ لَهُ، قَالَ: فَخَرَجَ النَّاسُ يَتَعَادَّوْنَ يَتَخَاطُّوْنَ. (أبوداؤد شريف، النسخة الهندية ۱/ ۴۳۷، دار السلام رقم: ۳۰۷۱)

ایسی چیز پر سبقت کر جائے جس پر کسی مسلمان نے سبقت نہ کی ہو تو وہ چیز اس کی ہے، حضرت مضرسؓ فرماتے ہیں: تو لوگ دوڑتے ہوئے اور ایک دوسرے کو پھلانگتے ہوئے نکلے۔

حقوقِ مجردہ کی دو قسموں میں سے کس کا مالی عوض جائز؟

علامہ شامیؒ نے موصی لہ بالخدمۃ کے حق کے لئے یہ ثابت فرمایا ہے کہ آپس کی تراضی سے مالی عوض لے کر اس سے دست بردار ہو جانا صحیح ہوتا ہے، جیسا کہ حق قصاص، حق نکاح اور حق رقیت کا مالی عوض لے کر دست بردار ہو جانا جائز اور صحیح ہے اور یہ تمام حقوق حقوقِ مجردہ میں شامل ہیں؛ لیکن ان کا مالی عوض لے کر ان سے دست بردار ہو جانا جائز ہے۔ شامی کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

أَمَّا حَقُّ الْمُوْصٰى لَهُ بِالْخِدْمَةِ فَلَيْسَ كَذٰلِكَ بَلْ ثَبَتَ لَهُ عَلٰى وَجْهِ الْبِرِّ وَالصِّلَةِ، فَيَكُوْنُ ثَابِتًا لَهُ إِصَالَةً، فَيَصِحُّ الصُّلْحُ عَنْهُ إِذَا نَزَلَ عَنْهُ لِغَيْرِهِ، وَمِثْلُهُ مَا مَرَّ عَنِ الْأَشْبَاهِ مِنْ حَقِّ الْقِصَاصِ وَالنِّكَاحِ وَالرِّقِّ، حَيْثُ صَحَّ الْإِعْتِيَاضُ عَنْهُ؛ لِأَنَّهُ ثَابِتٌ لِصَاحِبِهِ إِصَالَةً لَا عَلٰى وَجْهِ دَفْعِ الضَّرَرِ عَنْ صَاحِبِهِ. (شامي كراچی ۴/ ۵۲۰، زكريا ۷/ ۳۶)

بہر حال اس شخص کا حق جس کی خدمت کے لئے وصیت کی گئی ہے، تو وہ (حق شفعہ، حق قسم، حق خیار وغیرہ کی طرح نہیں ہے) بلکہ اس کے لئے تبرع اور صلہ رحمی کے طور پر حق ثابت ہو چکا ہے؛ لہٰذا اس کا حق اصالۃً ثابت ہے؛ اس لئے اس حق کی طرف سے صلح کرنا درست ہے، جب کہ وہ دوسرے کے لئے اس سے دست بردار ہو جائے اور اسی کی طرح وہ سارے حقوق ہیں جو اشباہ کے حوالہ سے گذر چکے ہیں، جیسا کہ حق قصاص، حق نکاح اور حق رقاب اس طریقہ سے کہ ان حقوق کا عوض لینا جائز اور صحیح ہے؛ اس لئے کہ صاحب حق کے لئے یہ حقوق اصالۃً ثابت ہیں، صاحب حق سے دفع ضرر کے طور پر ثابت نہیں ہیں۔

شامی کی اس عبارت سے واضح ہوا کہ حقوقِ مجردہ دو قسموں پر ہیں:

(۱) وہ حقوق جو ضرر سے بچنے کے لئے ثابت ہوتے ہیں، ان کا مالی عوض لینا جائز نہیں ہے، جیسا کہ شفیع کے لئے حق شفعہ، عورت کے لئے باری کا حق اور مخیّرہ کے لئے اختیار کا حق، یہ سارے حقوق دفع ضرر کے لئے ثابت ہوتے ہیں، اصالۃً ثابت نہیں ہوتے ہیں۔

(۲) وہ حقوق جو صاحبِ حق کے لئے دفع ضرر کے طور پر ثابت نہیں ہوتے ہیں؛ بلکہ اصالۃً براہ راست وہ حقوق ان کے لئے ثابت ہوتے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ ان کو نقصان سے بچانے کے لئے ان حقوق کو ثابت کیا گیا ہو؛ بلکہ براہ راست یہ حقوق ان کے لئے ابتداء سے ثابت ہیں، جیسا کہ موصی لہ بالخدمت کا حق ہے کہ مالی عوض لے کر وہ اس سے دست بردار ہوسکتا ہے، اسی طرح حقِ قصاص ہے کہ دیت لے کر حقِ قصاص سے دست بردار ہوسکتا ہے، اسی طرح حق نکاح ہے کہ مالی عوض لے کر اس سے دست بردار ہوسکتا ہے، جیسا کہ شوہر مالی عوض لے کر خلع بھی کرسکتا ہے اور طلاق علی المال کے طور پر بھی مال لے کر دست بردار ہوسکتا ہے، اسی طرح حقِ رقیت کہ بدلِ کتابت کے طور پر مالی عوض لے کر اس سے دست بردار ہو جائے، ان تمام حقوق کے حقوقِ مجردہ ہونے کے باوجود ان کا عوض لے کر دست بردار ہو جانا جائز ہے۔

نیز حقِ مرور، حقِ شرب، حقِ تسییل یہ سب حقوقِ مجردہ میں سے ہیں، زمین کے تابع ہو کر ان کی فروختگی سب کے نزدیک جائز ہے؛ لیکن زمین اور محل سے الگ کر کے صرف ان حقوق کو فروخت کرنا ظاہر الروایہ کے مطابق ناجائز ہے؛ لیکن تعامل ناس کی وجہ سے اور جہالت کے ختم ہونے کی صورت میں ان تمام حقوق کی بیع جائز اور درست ہے، جیسا کہ درمختار اور شامی کی عبارات سے واضح کیا جا چکا ہے؛ لہٰذا فقہاء کی ان تشریحات پر قیاس کر کے نئے پیدا ہونے والے ایسے تمام حقوق جو اصالۃً ثابت ہوتے ہیں ان کا مالی عوض لینا بھی جائز سمجھ میں آتا ہے؛ البتہ ان کا عوض لینے میں بیع کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے؛ بلکہ دست برداری کا طریقہ اختیار کرنا زیادہ بہتر اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سوال میں ذکر کردہ حقوقِ مجردہ سے دست برداری کا مالی عوض لینا

حقوقِ مجردہ میں ایسے بے شمار حقوق ہیں جن میں دست برداری کا مالی عوض لینا جائز

ہوتا ہے، جیسا کہ شامی کے جزئیہ میں واضح کیا جا چکا ہے کہ موصی لہ بالخدمت کا آپس کی تراضی سے مالی عوض لے کر اپنے حق سے دست بردار ہو جانا جائز ہے، اسی طرح حق قصاص میں بھی دیت کے طور پر مالی عوض لے کر حق قصاص سے دست بردار ہو جانے کا جواز ماقبل میں ذکر کیا جا چکا ہے، اسی طرح سے ایسے تمام حقوق کا مالی عوض لے کر دست بردار ہو جانا جائز اور درست ہے جو حقوق اصالۃً براہ راست ثابت ہوتے ہیں۔

لہٰذا سوال نامہ میں درج کردہ حسب ذیل حقوق کا مالی عوض لے کر دست بردار ہو جانا جائز معلوم ہوتا ہے:

(۱) بیکری کی پھیری لگانے والے لوگ جو اپنی لائن بناتے ہیں ان کے لئے بھی اپنی بنائی ہوئی لائن پر دوسرے سے مالی عوض لے کر دست بردار ہو جانا جائز ہے؛ اس لئے کہ اس میں اس کو حق اسبقیت حاصل ہے۔ اور حق اسبقیت کا مالی عوض لے کر دست بردار ہو جانا جائز ہے، جیسا کہ ’’ابوداؤد شریف‘‘ کی روایت ماقبل میں ذکر کی جا چکی ہے۔

(۲) اسی طرح میڈیکل اسٹوروں پر دوائیاں سپلائی کرنے کی جو لائن بنائی جاتی ہے اس سے بھی دست بردار ہونے کے لئے مالی عوض لینا جائز ہے؛ اس لئے کہ اس نے بھی محنت کر کے اس میں حقِ اسبقیت حاصل کر لیا ہے۔

(۳) اسی طرح اخبار کی لائن بنانے والوں کا بھی اپنی بنائی ہوئی لائن کے حق سے دست بردار ہو جانے کے لئے مالی عوض لینا جائز ہے؛ کیوں کہ اس نے بھی اس میں محنت کر کے حقِ اسبقیت حاصل کر لیا ہے۔ نیز عرف اور تعامل ناس کی وجہ سے بھی ان سے دست برداری کا مالی عوض لینا جائز معلوم ہوتا ہے، اسی طرح حقوق سے دست برداری کے مالی عوض لینے کو حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہ العالی نے بھی ’’اسلام اور جدید معاشی مسائل ۳/ ۶۳ تا ۷۹‘‘ میں تفصیلی وضاحت کے ساتھ جائز لکھا ہے؛ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اجرت دلّال پر قیاس کی ضرورت نہیں، مگر پھر بھی اگر اس پر قیاس کر لیا جائے تو دو طریقے سے جواز کا پہلو نکلے گا۔

اب یہاں سے حق دست برداری سے متعلق چند عبارتیں ملاحظہ فرمایئے:

وَكَذَا أَقُوْلُ عَلٰى اعْتِبَارِ الْعُرْفِ الْخَاصِّ، قَدْ تَعَارَفَ الْفُقَهَاءُ بِالْقَاهِرَةِ النُّزُوْلَ عَنِ الْوَظَائِفِ بِمَالٍ يُعْطٰى لِصَاحِبِهَا، وَتَعَارَفُوا ذٰلِكَ، فَيَنْبَغِي الْجَوَازُ وَأَنَّهُ لَوْ نَزَلَ لَهُ وَقَبَضَ مِنْهُ الْمَبْلَغَ ثُمَّ أَرَادَ الرُّجُوْعَ عَلَيْهِ لَا يَمْلِكُ ذٰلِكَ. (الأشباه زكريا ۲۹۱، ۲۹۲، قديم: ۱٦۲ تا ۱٦٤)

ایسے ہی میں کہتا ہوں کہ عرف خاص کا اعتبار ہے، یقیناً قاہرہ میں فقہاء نے مال لے کر وظائف سے دست بردار ہوجانے کو متعارف قرار دیا ہے جو مال صاحب وظیفہ کو دیا جائے گا۔ اور یہ عمل متعارف ہو چکا ہے؛ لہٰذا اس کے جواز کا مسئلہ بتانا مناسب ہے اور بے شک اگر اس کے لئے دست بردار ہوجاتا ہے اور اس سے طے شدہ رقم قبضہ کر لیتا ہے، پھر اس کے اوپر رجوع کا ارادہ کرے تو رجوع کا حق نہیں ہوگا۔

اس کو حموی میں ان الفاظ سے بیان کیا گیا ہے:

وَذَكَرَ الشَّمْسُ الرَّمْلِي فِيْ شَرْحِ الْمِنْهَاجِ عَنْ وَالِدِهٖ أَنَّهُ أَفْتٰى بِحِلِّ النُّزُوْلِ عَنِ الْوَظَائِفِ بِالْمَالِ؛ لِأَنَّهُ مِنْ أَقْسَامِ الْجَعَالَةِ فَيَسْتَحِقُّهُ النَّازِلُ وَيَسْقُطُ حَقُّهُ. (الحموي تحت الأشباه زكريا ۲۹۲، قديم: ۱٦٥)

امام شمس الدین رملیؒ نے شرح المنہاج میں اپنے والد سے نقل کرتے ہوئے ذکر فرمایا ہے کہ بے شک ان کے والد نے مال کے بدلہ میں وظائف سے دست برداری کے جواز کا فتویٰ دیا ہے؛ اس لئے یہ بھی جعالہ یعنی اجرت کی ایک قسم ہے؛ لہٰذا دست بردار ہونے والا شخص مال کا مستحق ہوگا اور اس کا حق ساقط ہوجائے گا۔

اس کو علامہ شامیؒ نے ان الفاظ سے بھی نقل فرمایا ہے:

وَرَأَيْتُ بِخَطِّ بَعْضِ الْعُلَمَاءِ عَنِ الْمُفْتِي أَبِي السُّعُوْدِ أَنَّهُ أَفْتٰى بِجَوَازِ أَخْذِ الْعِوَضِ فِيْ حَقِّ الْقَرَارِ وَالتَّصَرُّفِ وَعَدَمِ صِحَّةِ الرُّجُوْعِ وَبِالْجُمْلَةِ فَالْمَسْأَلَةُ ظَنِّيَّةٌ وَالنَّظَائِرُ الْمُتَشَابِهَةُ لِلْبَحْثِ فِيْهَا مَجَالٌ، وَإِنْ كَانَ

اور مفتی ابو السعود سے نقل کردہ بعض علماء کی عبارت میں نے دیکھی ہے کہ انہوں نے حق قرار، حق تصرف اور حق عدم رجوع کے عوض لینے کے جواز کا فتویٰ دیا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ ظنی ہے اور اس کے مشابہ بہت سے نظائر ہیں اور اس مسئلہ میں بحث کی گنجائش ہے اگر چہ زیادہ واضح وہی ہے جو ہم نے کہا

الأظهر فيها ما قلنا، فالأولى ما قاله في البحر من أنه ينبغي الإبراء العام بعده. (شامي كراچي ٤/ ٥٢٠، زكريا ٧/ ٣٧)

ہے؛ لیکن زیادہ بہتر بات وہی ہے جو صاحب بحر نے کہی ہے کہ اس کے بعد ابرائے عام زیادہ مناسب ہے (یعنی دوسرے کو تمام لوازمات سے بری کردے)۔

حقوقِ مجردہ کا عوض لینے کا اصولی ضابطہ

سوال ۷ میں پوچھا گیا ہے کہ فقہاء کے ذکر کردہ جزئیات کی روشنی میں کیا کوئی ایسا کلی ضابطہ بنایا جاسکتا ہے جس کے ذریعہ حقوق سے دست بردار ہونے پر معاوضہ لینے کا شرعی حکم معلوم ہوجائے، اس کے بارے میں گزارش یہ ہے کہ ایسے حقوق مجردہ جو دفع ضرر کے لئے ثابت ہوتے ہیں ان کا عوض لینا جائز نہیں ہے، جیسا کہ حق شفعہ، حق قسم اور حق مخیّرہ وغیرہ، اس کے برخلاف ہر وہ حقوق جو دفع ضرر کے طور پر ثابت نہیں ہیں؛ بلکہ اصالۃً ثابت ہوتے ہیں، تو ایسے حقوق کا عوض لے کر دست بردار ہوجانا جائز اور درست ہے، جیسا کہ حق موصی لہ بالخدمت، حقِ قصاص، حقِ نکاح، حقِ رقیت وغیرہ سے دست برداری کا عوض لینا جائز ہے اور اسی اصول کے ذیل میں حقِ تصنیف، حقِ طبع اور حقِ ٹریڈ مارک، حقِ لائسنس وغیرہ سب شامل ہوجاتے ہیں؛ اس لئے کہ یہ سارے حقوق اصالۃً ثابت ہوجاتے ہیں دفع ضرر کے طور پر نہیں۔

اسی طرح بیکری کی لائن اور اخبار کی لائن، دوائیوں کے سپلائی کی لائن بنا کر اس پر جو اس کا حق ثابت ہوتا ہے وہ سبھی اصالۃً ثابت ہوتا ہے؛ اس لئے سارے کے سارے حقوق سے مجردہ ہونے کے باوجود معاوضہ لے کر دست بردار ہوجانا جائز ہے اور اسی کی طرف حضرت تھانویؒ نے امداد الفتاوی میں دوکان کے نام کے عوض لینے کے جواز کے فتوی میں اشارہ فرمایا ہے۔ (ملاحظہ ہو امداد الفتاوی زکریا ۳/ ۱۱۹، ۱۲۰)

حقوقِ مجردہ کی بیع کا مختصر خلاصہ

ماقبل کی عبارات اور تشریح پر غور کرنے کے بعد پانچ چیزیں ایسی ہیں جن پر

خاص توجہ دینا ضروری ہے:

(۱) مال کا مادی شئ ہونا لازم نہیں ہے؛ بلکہ غیر مادی اور غیر مرئی شئ بھی مال بن سکتی ہے جس کی خرید وفروخت جائز ہے، جیسا کہ ماقبل میں بدائع کی عبارت سے واضح ہو چکا ہے۔

(۲) حقوقِ مجردہ کی بیع تعامل ناس اور عرف کی وجہ سے بعض متاخرین کے نزدیک جائز ہے، جیسا کہ مبسوط سرخسی کی عبارت سے واضح ہوتا ہے۔

(۳) حقوقِ مجردہ کی بیع کے عدم جواز کی علت فقہاء نے جہالت محل کو قرار دیا ہے؛ لہٰذا اگر آپس کی تراضی سے جہالت کو ختم کردیا جائے تو حقوقِ مجردہ کی بیع جائز ہو جاتی ہے، جیسا کہ درمختار اور شامی کی عبارت سے واضح ہو چکا۔

(۴) شریعت میں کسی بھی نفع بخش امر کے بارے میں سبقت کر کے اس میں اپنا حق ثابت کرنا جائز ہے، جیسا کہ ابوداؤد شریف کی روایت سے واضح ہوتا ہے۔

(۵) حقوق کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں:

(۱) وہ حقوق جو ضرر سے بچنے کے لئے دفع ضرر کے طور پر ثابت ہوتے ہیں۔

(۲) وہ حقوق جو دفع ضرر کے طور پر ثابت نہیں ہوتے ہیں؛ بلکہ براہ راست اصالۃً ثابت ہوتے ہیں اور ان دونوں قسموں میں سے جو دفع ضرر کے طور پر ثابت ہوتے ہیں ان کا عوض لینا جائز نہیں ہے؛ لیکن وہ سارے حقوق جو اصالۃً براہ راست ثابت ہوتے ہیں ان کا عوض لینا بالاتفاق جائز ہے، جیسا کہ شامی کی عبارت سے واضح ہو چکا ہے۔

مروجہ پگڑی کا مسئلہ

طویل مدتی کرایہ داری یا ایسی کرایہ داری جس میں کوئی مدت ہی متعین نہیں ہے، ہندوستان میں ایسے کرایہ دار کا قبضہ قانونِ ہند رینٹ کنٹرول دفعہ تھری جی کے مطابق اس کا لازمی اور حتمی حق شمار ہوتا ہے اور اس حق سے دست برداری کا عوض لینا ہندوستان کے لوگوں کے درمیان متعارف ہے۔ مذکورہ جزئیات سے عوض لے کر حق کرایہ داری سے دست بردار

ہوجانے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ مولانا مفتی تقی صاحب عثمانی مدظلہ العالی نے چند شرائط وقیودات کے ساتھ علامہ ناصر الدین لاقانیؒ کے حوالہ سے اس طرح کی پگڑی کے جواز کی طرف اشارہ فرمایا ہے، مگر خود لاقانیؒ کی رائے کی طرف اپنا رجحان ظاہر نہیں فرمایا۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۳/ ۷۱) پھر آگے صفحہ ۳۷ رمیں تحریر فرمایا ہے کہ علامہ شامیؒ بھی مروجہ پگڑی کے جواز کی طرف مائل ہیں۔

لیکن ہمارے اکابر میں سے کسی نے اس کے جواز پر فتویٰ دیا ہوا حقر کے علم میں نہیں ہے۔

حقوقِ طبع

کتابوں کی اشاعت کا حق محفوظ کر لیا جاتا ہے، بہت سے اکابر نے حقوقِ طبع کے محفوظ کر لینے کے عدم جواز پر مسئلہ لکھا ہے؛ لیکن بعد کے بہت سے اکابر اہل فتاویٰ نے اس کو جائز لکھا ہے اور ماقبل کی جزئیات اور فقہی عبارات سے اس کے جواز کی بات سمجھ میں آتی ہے؛ لہٰذا اس سے بھی دست برداری کا عوض لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ اور اکابر اہل فتاویٰ میں سے حضرت مفتی کفایت اللہ، مفتی عبد الرحیم لاجپوری، مفتی نظام الدین صاحب مفتی دار العلوم دیوبند رحمہم اللہ وغیرہ نے اس کی اجازت دی ہے۔ (مستفاد: اسلام اور جدید معاشی مسائل ۳/ ۸۶، فتاویٰ رحیمیہ ۹/ ۲۱۹، جدید زکریا ۹/ ۲۱۹-۲۲۰، منتخبات نظام الفتاویٰ ۲/ ۴۵۸)

ٹریڈ مارک اور کمپنی وتجارتی فرم کے نام کی فروختگی

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی تاجر یا تجارتی کمپنی مال تیار کر کے اندرون ملک وبیرون ممالک میں ایکسپورٹ کرتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ تاجر یا تجارتی کمپنی لوگوں کے درمیان نیک نامی سے مشہور ہوجاتی ہے اور اس نام سے جو چیز فروخت ہوتی ہے اس کی مانگ اور سیل زیادہ ہونے لگتی ہے، حتی کہ تاجروں کے درمیان اس نام کی بڑی اہمیت ہوجاتی ہے اور لوگ اس نام کو بھاری قیمت میں خریدنے لگتے ہیں، تو کیا اس طرح شہرت یافتہ ناموں کی خرید وفروخت

جائز ہوسکتی ہے؟ تو حضرت تھانوی قدس سرہ نے مال کے بدلہ میں وظائف اور حق سے دست برداری کے مسئلہ پر قیاس کرتے ہوئے اس طرح نام اور نشان کی خرید وفروخت کرنے کو جائز لکھا ہے۔ (امداد الفتاوی ۳/ ۱۱۹، ۱۲۰)

گویا یہ ایسا ہے کہ اگر کسی کو حکومت یا کمپنی سے وظیفہ ملتا ہے اور وہ اپنا یہ حق کسی کے ہاتھ بعوض مال یا بعوض روپیہ منتقل کر دینا چاہتا ہے تو اس کے لئے یہ جائز اور درست ہے اور اسی پر علماء کا اتفاق ہے۔ علامہ علاء الدین حصکفیؒ نے اس مسئلہ کو ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

فَيُفْتٰى بِجَوَازِ النُّزُوْلِ عَنِ الْوَظَائِفِ بِمَالٍ. (در مختار کراچی ٤/ ٥١٩، زکریا ۷/ ۳٥)

پس فتویٰ دیا گیا ہے مال کے بدلہ میں وظائف اور حق سے دست برداری کے جواز پر۔

اور بعض علماء نے مفتی ابوالسعود کے اس فتویٰ سے بھی استدلال کرکے جائز قرار دیا ہے، جس میں انہوں نے اس بات کا فتویٰ دیا ہے کہ اپنے حقِ قرار اور حقِ تصرف کے بدلہ میں عوض لینا جائز ہے۔

وَرَأَيْتُ بِخَطِّ بَعْضِ الْعُلَمَاءِ عَنِ الْمُفْتِي أَبِي السُّعُوْدِ أَنَّهُ أَفْتٰى بِجَوَازِ أَخْذِ الْعِوَضِ فِيْ حَقِّ الْقَرَارِ وَالتَّصَرُّفِ. (شامي کراچی ٤/ ٥٢٠، زکریا ۷/ ۳۷)

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے مفتی ابوالسعود سے منقول بعض علماء کو یہ بات لکھتے ہوئے دیکھا کہ انہوں نے حقِ تصرف وحقِ قرار کے بدلہ میں عوض لینے کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔

لائسنس کی خرید وفروخت

کاروباری سہولت اور آسانی کے لئے تاجر یا کمپنی سرکار سے لائسنس منظور کرا لیتی ہے اور لائسنس کی وجہ سے مال درآمد اور برآمد کرنے میں سرکاری رکاوٹ سے حفاظت ہوتی ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جس کے لئے ایکسپورٹ یا ایمپورٹ کا لائسنس منظور ہو گیا ہے

وہ دوسرے کے ہاتھ اس لائسنس کو فروخت کر سکتا ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ یہ لائسنس کوئی مادی چیز نہیں ہے؛ بلکہ دوسرے ملک یا شہر یا مارکیٹ میں سامان بیچنے اور منتقل کرنے یا دوسرے ملک یا شہر سے مال خرید کر لانے کے حق کا نام ہے۔ اور یہ ایک ایسا حق ہے جس کے حاصل کرنے میں کافی کوشش اور رقم بھی خرچ کرنی پڑتی ہے؛ اس لئے سرکار کی رضامندی اور قانون کے ماتحت رہ کر لائسنس کی فروختگی بھی جائز اور درست ہے، غالباً اسی اصول سے حضرت تھانوی قدس سرہ نے گورنمنٹ کی رضامندی سے پنشن کی فروختگی کے جواز کا فتویٰ صادر فرمایا ہے۔ (امداد الفتاوی ۴/۵۸۰)

اور لائسنس بھی اپنا ایک اہم ترین حق ہے جس سے بڑا فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اور حضرات فقہاء نے اس قسم کے حقوق سے دست برداری کے بدلہ میں مالی عوض حاصل کرنے کو جائز کہا ہے۔ اور علامہ شامیؒ نے اس مسئلہ کو ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

فَإِنَّهُمْ قَالُوْا: يَجُوْزُ أَخْذُ الْعِوَضِ عَلٰى وَجْهِ الإِسْقَاطِ وَلَا رَيْبَ أَنَّ الْفَارِغَ يَسْتَحِقُّ الْمَنْزُوْلَ بِهٖ. (شامي كراچی ٤/ ٥٢٠، زکریا ٧/ ٣٦)

پس بیشک فقہاء نے کہا ہے کہ اپنے حق کو ساقط کرنے (دست بردار ہونے) پر (مالی) عوض لینا جائز ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ دست بردار ہونے والا اس مال کا مستحق ہو جاتا ہے جس کے عوض میں دست برداری دی ہے۔

حقِ تعلّی کی بیع

حقِ مرور کو فقہاء نے یہ کہہ کر جائز قرار دیا ہے کہ اس کا تعلق زمین اور عین سے ہوتا ہے؛ اس لئے اس کی بیع جائز ہے اور حقِ تعلّی کا تعلق زمین اور عین سے نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ فضاء سے ہوتا ہے؛ اس لئے اس کی بیع جائز نہیں ہے۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ حقِ تعلّی کا ثبوت دفع ضرر کے طور پر ہوتا ہے یا براہ راست ابتداءً حقِ شرعی کے طور پر ہوتا ہے تو صحیح بات یہ ہے کہ حقِ شرب، حقِ مرور اور حقِ تسییل کی طرح حقِ تعلّی کا

ثبوت بھی براہ راست حقِ شرعی کے طور پر اصالۃً ہوتا ہے، حقِ شفعہ کی طرح دفع ضرر کے طور پر نہیں ہوتا، اسی وجہ سے جس شخص کو علو حاصل ہوتا ہے اگر اس کا علو منہدم ہوجائے تو اسے دوبارہ علو (اوپر کی منزل) کی تعمیر کا حق ہوتا ہے؛ لہٰذا جب اوپر کی منزل منہدم ہوجائے اور جس کو حق علو حاصل ہے اس کے پاس اوپر کی منزل کی تعمیر کے لئے مال واسباب فراہم نہیں ہیں، تو ایسی صورت میں اگر اس کے، اس حقِ علو کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے اور اس کے چھوڑنے کے نتیجہ میں اسے کچھ نہ ملے تو اس کا بڑا نقصان ہوجائے گا؛ اس لئے فقہاء کے اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے بطریق بیع تو اس کو بیچنے کی اجازت نہ دی جائے گی؛ لیکن صلح کے طریقہ سے اپنے حق سے دست بردار ہوجانے کا مالی عوض لینا اس کے لئے جائز ہوجائے گا؛ کیوں کہ اس کا حق اس کے لئے ابتداءً اصالۃً ثابت ہے اور دفع ضرر کے طور پر ابتداءً ثابت نہیں ہے۔ اور ایسے حقوق سے دست برداری کے طور پر مالی عوض لینے کو فقہاء نے جائز لکھا ہے۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۳/۵۷)

اس مسئلہ کا جواز ذیل کی عبارت سے واضح ہوتا ہے:

وَرَأَيْتُ بِخَطِّ بَعْضِ الْعُلَمَاءِ عَنِ الْمُفْتِي أَبِي السُّعُوْدِ أَنَّهُ أَفْتٰى بِجَوَازِ أَخْذِ الْعِوَضِ فِيْ حَقِّ الْقَرَارِ وَالتَّصَرُّفِ وَعَدَمِ صِحَّةِ الرُّجُوْعِ وَبِالْجُمْلَةِ فَالْمَسْأَلَةُ ظَنِّيَّةٌ وَالنَّظَائِرُ الْمُتَشَابِهَةُ لِلْبَحْثِ فِيْهَا مَجَالٌ. (شامي زكريا ۷/ ۳۷، كراچی ۵/ ۵۲۰)

اور مفتی ابوالسعود سے نقل کردہ بعض علماء کی عبارت میں نے دیکھی ہے کہ انہوں نے حقِ قرار، حقِ تصرف اور حقِ عدم رجوع کے بدلہ میں عوض لینے کے جواز کا فتویٰ دیا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ ظنی ہے اور اس کے مشابہ بہت سے نظائر ہیں اور اس مسئلہ میں بحث کی گنجائش ہے۔

پنشن کی فروختگی

سرکاری ملازمین کو ملازمت کے ختم ہوجانے کے بعد پنشن ملتی ہے، تو ایسی صورت میں رٹائرڈ ملازم کو بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ اکٹھے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے، تو سرکار اس ملازم

کی ڈاکٹری کرا کر دیکھتی ہے کہ ایسا آدمی عمومی طور پر حادثہ کا شکار نہ ہو، تو کتنے سالوں تک زندہ رہ سکتا ہے، پھر اسی حساب سے اس کی پنشن کا پیسہ بجائے ماہ بماہ دینے کے اتنے سالوں کی نصف پنشن اکٹھا دے کر پورے دس سال کا حق حکومت لے لیتی ہے، تو اس طرح جائز ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلے میں حضرت تھانویؒ نے امداد الفتاویٰ میں یہ جواب لکھا ہے کہ اگرچہ یہ صورۃً بیع ہے؛ لیکن حقیقتاً بیع نہیں ہے؛ بلکہ گورنمنٹ کی طرف سے ایک تبرع ہے؛ اس لئے حکومت کی رضا مندی سے اس طرح کے حق تبرع سے دست برداری کا عوض لینا جائز ہے۔

ملاحظہ فرمایئے (امداد الفتاوی ۴/ ۵۸۰)

یہ معاملہ صرف حکومت کے ساتھ جائز ہے، عوام کے ساتھ جائز نہیں: اس لئے کہ حکومت کی طرف سے پنشن ایک بڑا انعام ہے جو قسط وار دینے کا وعدہ کیا جاتا ہے، اب حکومت اسی کو کم مقدار میں یکمشت لے رہی ہے؛ اس لئے حکومت کے ساتھ یہ معاملہ جائز ہو جاتا ہے۔ (احسن الفتاوی ۶/ ۵۲۱، ۵۲۲، فتاوی محمودیہ میرٹھ ۲۴/ ۲۱۲، جدید ڈابھیل ۱۶/ ۱۱۵)

سوال نامہ کا خلاصہ

سوال نامہ میں بطور نظیر تین چیزوں کو خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے، ان کا حکم خلاصہ کے طور پر ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

(۱) ایک شخص نے میڈیکل اسٹوروں پر دوائیاں سپلائی کرنے کی لائن بنائی ہے اور محنت کر کے کثیر تعداد میں دکانوں سے روابط مربوط کر لیے ہیں اور اس کے بعد دوسرا شخص اس لائن کو حاصل کرنا چاہے تو آپس کی تراضی سے مالی عوض دے کر لے سکتا ہے اور لائن بنانے والے کے لئے حق سے دست برداری کے طور پر رقم حاصل کرنا جائز اور حلال ہے۔ اور حقِ مجرد سے دست برداری کے عوض کے جواز جزئیات گذشتہ صفحات میں گذر چکے ہیں، یا یوں کہا جائے کہ گویا لائن بنانے والا پہلا شخص دلال اور ایجنٹ کے حکم میں ہے، ایجنٹ اور دلال کے لئے اجرت لینا جائز ہے اسی طرح اس شخص کے لئے بھی بنائی ہوئی لائن کی اجرت حاصل کرنا جائز ہے۔

(۲) اسی طرح بیکری کی پھیری لگانے والے لوگ جو اپنی لائن بناتے ہیں ان کے لئے بھی اپنی بنائی ہوئی لائن پر دوسرے سے مالی عوض لے کر انہیں لائنوں پر لگانا جائز اور درست ہے ان کو بھی دلال اور ایجنٹ کے حکم میں قرار دیا جاسکتا ہے؛ اس لئے کہ ایک لائن بنانے کے لئے ایک مدت تک محنت کرنی پڑتی ہے لہٰذا اس کو اپنی اس محنت کی اجرت لینے کا حق ہے، یا حق سے دست برداری کے طور پر مالی عوض لینے کو جائز کہا جائے گا، جیسا کہ ماقبل میں جزئیات گذر چکے ہیں۔

(۳) اسی طرح اخبار کی لائن بنانے والوں کی لائن کو دوسرا شخص لینا چاہے تو حق سے دست برداری کے طور پر عوض لے کر چھوڑ دینا جائز ہوگا، یا یوں کہا جائے کہ ان کا اپنی لائن پر دوسرے کو لگا دینا دلالی اور ایجنٹ کے حکم میں ہے اور دلال اور ایجنٹ کے لئے اجرت لینا جائز ہے، دلالی کی اجرت کے جواز کے بارے میں چند عبارات حسبِ ذیل ہیں:

ولم یر ابن سیرین وعطاء وابراهیم والحسن بأجر السمسار بأساً.

(بخاری شریف، النسخة الهندیة ۱/۳۰۳)

عن الحکم وحماد عن ابراهیم وابن سیرین قالوا لا بأس بأجر السمسار إذا اشتری یدا بید. (المصنف لابن ابی شیبه ۱۱/۳۳۹رقم ۲۲۵۰۰)

اس کو علامہ شامی اور صاحب تاتارخانیہ نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار فقال أرجو أنه لا بأس به وإن کان فی الاصل فاسداً لکثرة التعامل وکثیر من هذا غیر جائز فجوز لحاجة الناس إلیه. (شامی زکریا ۹/۸۷، کراچی ٦/٦۳، تاتارخانیة ۱۵/۱۳۷رقم ۲۲٤٦۲)

اور اس کو صاحب ولوالجیۃ نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

أجرة السمسار .....مما لا تقدیر فیه للوقت ولا مقدار لما استحق بالعقد وللناس فیه حاجة فکانت جائزة وإن کان فی الاصل فاسداً لحاجة الناس إلی ذالک. (الوالوالجیة ۳/۳٤٤)

اس کو علامہ ابن نجیم مصری نے الاشباہ والنظائر میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

إجارة المنادی والسمسار والحمامی ونحوها جائزة للحاجة.

(الاشباہ والنظائر الفن الثانی کراچی ۲/ ۰ ٦)

اور اس کو صاحب مبسوط نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

والسمسار اسم لمن يعمل للغير بالاجر بيعاً وشراءً ومقصوده من إيراد الحديث بيان جواز ذالک. (المبسوط للسرخسی ۱۵/ ۱۵۵)

❁❁❁

۳۹ کتاب الرؤیا

خواب میں سورۂ نوح کی تلاوت

سوال [۱۰۳۴۲]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (الف) خواب دیکھا کہ میں سورۂ نوح پڑھ رہی ہوں، اللہ تعالیٰ کے بارے میں برے برے خیالات آتے ہیں، کچھ پڑھنے کے لیے بتائیں؟

(ب) کیادیکھتی ہوں کہ کلام پاک اٹھارہی ہوں،کلام پاک کے پاس سورۂ نوح پیلے کاغذ پرلکھی ہوئی ہے، پڑھ سکتی ہوں میں، اس کے پڑھنے کے لیے اٹھاتی ہوں کہ آج سے کئی دن پہلے خواب دیکھا تھا کہ میں سورۂ نوح تلاوت کررہی ہوں،اورجس کاغذ پرلکھی ہوئی ہے اس میں دیمک لگ گئی ہے،کاغذ پہلے کالا ہوگیاہے،آنکھ کھل جاتی ہے،اذان فجر کاوقت تھا۔

المستفتیه:سیدہ بیگم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: خواب میں سورۂ نوح کی تلاوت آخرت کی نجات کی طرف اشارہ ہےاورایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسی کوخاص نیک کام کا مشورہ دیں گی، ان شاءاللہ تعالیٰ،انجام بخیر ہوگا۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیراحمد قاسمی عفااللہ عنہ
۱۳؍ذی قعدہ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۶۹۴۳)

خواب میں حج بیت اللہ کا سفرکرنا

سوال [۱۰۳۴۳]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: جواب فوری موصول ہوکر خوشی ہوئی، ایک خواب ہمارے مدرسہ کے منشی جی صاحب کونظر آیا، سحری کے وقت یعنی صبح پانچ بجے، منشی جی تقریباً ڈیڑھ ماہ بہت بیمار رہے، اب طبیعت قدرے بہتر ہے، دوائی ابھی تک جاری ہے، وہ دیکھتے ہیں کہ بندر گاہ پر سمندر میں پلیٹ فارم سے ہی لگا ہوا پانی کا جہاز کھڑا ہے، خیال کرتے ہیں کہ جہاز تو پلیٹ فارم سے کئی کلو میٹر دور کھڑا ہوتا ہے، گہرے پانی میں یہ یہاں کیسے کھڑا ہو گیا، خیر وہ اس میں بیٹھ جاتے ہیں، حج کے لیے تشریف لے جانے کی خوشی میں۔

اس میں تشریف رکھتے ہی ان کو محسوس ہوا کہ یہ تو چچا بھی حج کے لیے جا رہے ہیں (ان کے حقیقی چچا جو بقید حیات ہیں، فی الحال وہ بھی بیمار ہیں) گویا دونوں ساتھ ہیں، جہاز روانہ ہو گیا، جہاز کے چلتے ہوئے جب کچھ ٹائم گذر گیا، تو نہ معلوم کسی شخص نے منشی جی سے کہا کہ دیکھو! سامنے تمہارے دادا اور دادی اور اما بھی ہیں، تو اس شخص کے کہنے پر منشی جی نے سامنے نظر کی تو گویا جہاز کے سامنے آئینہ ہے (جیسا کہ بس وغیرہ میں سامنے آئینہ ہوتا ہے) تو خواب دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ دادا، اور دادی دونوں آئینہ کے باہر ہیں آئینہ میں سے ان کو نظر آئے جہاز بدستور جاری ہے، دادا، دادی صرف نظر آئے اور کچھ نہیں، اور جہاز چلتا رہا کہیں غیر معروف جزیرہ پر جہاز نے اسٹاپ کیا (رکا)، منشی جی بھی جہاز کے نیچے اترے، ایک غیر متعارف باشرع بزرگ صفت شخص ملے، مصافحہ کیا، اور اس آبادی والوں کی کچھ شکایت کی، اپنے انداز میں جو خواب دیکھنے والے کے لیے بھی نصیحت محسوس ہوئی،، یہیں خواب ختم ہو گیا، ان کے کلماتِ شکایت ونصیحت خواب دیکھنے والے کو یعنی منشی جی کو یاد نہیں رہے اور دادا، دادی کو صرف منشی جی نے دیکھا، ان کے چچا جو حج کے لیے ان کے ہمراہ ہیں ان کے بارے میں ان کو معلوم نہیں کہ آیا، انہوں نے بھی دیکھا ہے یا نہیں؟ اپنے والدین کو، چچا عالم باعمل ہیں، منشی جی بھی میرے علم کے مطابق نہایت نیک انسان ہیں، باقی اللہ بہتر جانتا ہے، خاص دھیان کر کے ایک ایک جز کی تعبیر سے مطلع کریں، پہلے کی طرح فوری جواب سے مسرور فرمائیں۔

امید ہے کہ آپ اور گھر میں سب بخیر ہوں گے، آپ کو فرصت کب ہو جائے گی،

اسباق کی کثرت سے مطلع کریں تاکہ سوالات مرتب کرکے روانہ کرسکوں، مولانا مفتی محمد سلمان صاحب و دیگر پرسانِ حال حضرات سے سلام مسنون کہہ دیں، احقر نے بھی گذشتہ ہفتہ ایک دوشنبہ کو اور ایک جمعہ کو صبح صادق کے وقت دو بار اپنے آپ کو حج کے لیے جاتے ہوئے دیکھا ہے کہ جدہ ایئرپورٹ پہنچ گیا ہوں، فقط اتنا ہی۔

المستفتی: خلیل الرحمٰن مدرسہ مرادیہ مظفرنگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس خواب میں دو چیزیں قابل غور ہیں:

(۱) حج کے لیے سفر کرنا۔

(۲) کشتی کی سواری سے صحیح سالم کنارے پر اترنا۔

یہ دونوں اس بات کی طرف مشیر ہیں کہ صاحب خواب اگر بیمار ہے تو ان شاء اللہ تعالیٰ بہت جلد شفا پانے والا ہے، اور اگر قرضدار ہے تو ان شاء اللہ تعالیٰ بہت جلد قرضہ سے سبکدوش ہوگا اور دادا اور دادی کو آئینہ کے ماوراء سے دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ ان سے ملاقات میں ابھی کچھ وقت باقی ہے اور مرحومین کے لیے ایصال ثواب کرتے رہنا چاہیے اور آپ نے جو خواب دیکھا ہے وہ بھی اسی طرف مشیر ہے کہ ان شاء اللہ مرض اور غم سے نجات پاجائیں گے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵ ؍رجب المرجب ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۷۲۵)

خواب میں فرشتوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھنا

سوال [۱۰۳۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے ایک خواب دیکھا ہے جس کی تعبیر معلوم کرنا چاہتی ہوں، خواب کچھ اس طرح ہے کہ ہمارے گھر کے پیچھے ایک بہت بڑا میدان ہے اس میں کچھ حضرات جس میں

عورتیں بھی شامل ہیں، اندازاً پچاس ساٹھ لوگ موجود ہوں گے، نماز ادا کر رہے ہیں، جس میں انہوں نے رکوع سجدہ بھی کیا اور بہت عمدہ لباس پہنے ہوئے ہیں، بہت چمکدار، سفید رنگ کا لباس ہے، اور چہرے ڈھکے ہوئے ہیں، اوران کے لباس کی چمک اتنی تھی کہ آج تک نہیں دیکھی، محلّہ کے لوگ اپنی چھتوں سے اور روڈ پر کھڑے لوگ دیکھ رہے ہیں، نماز پوری کرنے کے بعد وہ لوگ اپنا چہرہ کھولتے ہیں تو سب کے داڑھی اور نورانی چہرہ تھا، میرے پڑوس والوں کے بیٹے بھی کھڑے تھے، میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے اور باقی سب لوگوں نے کہا کہ یہ فرشتے ہیں، نماز کے بعد محلّہ کے لوگ آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ ان کو اب کہاں ٹھہرایا جائے تو سب کی یہ رائے ہوئی کہ ان کو میرے پڑوس والے (جن سے میں نے پوچھا کہ یہ نماز پڑھنے والے کون ہیں) کہ یہاں ٹھہرانا مناسب ہے، کیونکہ ان کا آنگن بڑا ہے اور آرام دہ ہے، کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہے، اوراس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔

المستفتیه: عمرانہ بیگم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جہاں ان فرشتوں کو دیکھا گیا ہے وہاں کے اور اس کے آس پاس کے لوگ غم اور پریشانی سے نجات پائیں گے، اور وہاں کے لوگ دشمنوں سے ان شاء اللہ تعالیٰ حفاظت میں رہیں گے اور جس کے گھر ان کو ٹھہرانے کی بات ہے ان کے یہاں خیر اور بھلائی کی بات ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ ذیقعدہ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۳۶۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱/۱۱/ ۱۴۲۰ھ

خواب میں علماء کی زیارت کرنا

سوال [۱۰۳۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کل رات میں نے خواب میں حضرت مولانا اختر الاسلامؒ اور شیخ الحدیث مولانا

عبدالجبار صاحب کو دیکھا ہے، چہرہ نورانی ہے لیکن دونوں حضرات میں اختلاف ہے، اور اختلافی انداز میں گفتگو کررہے ہیں، تعبیر سے نوازیں؟

المستفتی: محمد صلاح الدین مدرسہ رحمانیہ پیر مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خواب دیکھنے والے کے حق میں بہت خیر و برکت کا باعث ہے، دونوں بزرگ ماشاءاللہ عافیت وعیش میں ہیں، دونوں کا آپسی اختلاف برائے دین ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سبب ہے، اسی وجہ سے دونوں کے چہرے نورانی نظر آرہے ہیں۔

اختلاف أمتي رحمة. (جامع الأحاديث للسيوطي ۲/ ٤٠، رقم: ۷۰٦) **فقط** واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲٦/ ۱۸۲۷)

خواب میں مزار وغیرہ دیکھنا

سوال [۱۰۳۴٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے چاند کی پہلی تاریخ کو خواب دیکھا تھا آپ مجھے اس خواب کی تعبیر دیدیں، میں نے خواب میں دیکھا کہ میری آنکھ کھلی، میں رامپور جارہا ہوں، پتلی پتلی گلیوں کو ہوکر میں نے دیکھا کہ راستے میں بھینس اور بکرے بک رہے ہیں، مطلب ان کی قربانی ہو رہی ہے، راستے میں کپڑا ناپنے کا میٹر بک رہا ہے، میں نے اپنے دل میں سوچا کہ میں بھی ایک میٹر لے لوں، میرے کام میں آئے گا، لیکن میٹر لمبے لمبے تھے، میں نے نہیں لیے، پھر میں آگے گیا تو دیکھا کہ ایک مزار تھا، اس مزار پہ ایک مجاور بیٹھا تھا، فاتحہ دے رہا تھا، میں نے اس سے فاتحہ دلوائی، پھر میں جانے لگا تو اس مجاور نے کہا کہ اے فلاں! تو نے فاتحہ تو دلوائی لیکن گلک میں پیسے نہیں ڈالے، میں نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک روپیہ

گلک میں ڈال دیا، پھر میں وہاں سے واپس آرہا تھا، تو مجھے لگ رہا تھا کہ اس مزار کے گلاب کے پھولوں کی خوشبو میرے پیچھے پیچھے آرہی ہے، میرے دل نے سوچا، پیچھے مڑکر دیکھوں، میں نے دیکھا تو کوئی بھی نہیں تھا، لیکن خوشبو آرہی تھی، میں جب گھر آیا تو مجھے معلوم ہورہا تھا کہ خوشبو میرے گھر آگئی ہو، اور جب میں راستہ سے لوٹ رہا تھا تو وہ قربانی ہورہی تھی۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ماشاء اللہ خواب بہت اچھا ہے، اگر قرض ہے تو ادا ہوجائے گا، اور اگر کوئی تنگی یا کسی وجہ سے خوف ہے تو دور ہوجائے گا، اور اگر حج نہیں کیا ہے تو ان شاء اللہ تعالیٰ حج کا انتظام ہوجائے گا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۴۶۸)

خواب میں غیر نبی کا کلمہ پڑھنا اور اس کی تعبیر

سوال [۱۰۳۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: دوپہر کا وقت تھا کہ نیند نے غلبہ کیا اور سوجانے کا ارادہ کیا، رسالہ حسن العزیز کو ایک طرف رکھ دیا، لیکن جب بندہ نے دوسری طرف کروٹ بدلی تو دل میں خیال آیا کہ کتاب پشت کی جانب ہوگی، اس لیے رسالہ حسن العزیز کو اٹھا کر اپنے سر کی جانب رکھ لیا اور سو گیا، کچھ عرصہ کے بعد خواب دیکھتا ہوں کہ کلمہ شریف لا الہ الا اللہ پڑھتا ہوں لیکن محمد رسول اللہ کی جگہ حضور کا نام لیتا ہوں، اتنے میں دل کے اندر خیال پیدا ہوا کہ تجھ سے غلطی ہوئی، کلمہ شریف کے پڑھنے میں، اس کو صحیح پڑھنا چاہیے، اس خیال سے دوبارہ کلمہ شریف پڑھتا ہوں، دل پر تو یہ ہے کہ صحیح پڑھا جاوے، لیکن زبان سے بے ساختہ بجائے رسول اللہ کے نام کے اشرف علی نکل جاتا ہے، حالانکہ مجھ کو اس بات کا علم ہے کہ اس طرح درست نہیں، لیکن بے اختیار زبان سے یہی کلمہ نکلتا ہے، دو تین بار جب یہی صورت ہوئی تو حضور کو اپنے سامنے دیکھتا ہوں، اور

بھی چند اشخاص حضور کے پاس تھے، لیکن اتنے میں میری یہ حالت ہوگئی کہ میں کھڑا کھڑا بوجہ اس کے کہ رقت طاری ہوگئی، زمین پر گر گیا، اور نہایت زور کے ساتھ ایک چیخ ماری، اور مجھ کو معلوم ہوتا تھا کہ میرے اندر کوئی طاقت باقی نہیں رہی، اتنے میں بندہ خواب سے بیدار ہو گیا لیکن بدن میں بدستور بے حسی تھی، اور وہ اثر ناطاقتی بدستور تھا لیکن حالت خواب اور بیداری میں حضور ہی کا خیال تھا، لیکن حالت بیداری میں کلمہ شریف کی غلطی پر جب خیال آیا تو اس بات کا ارادہ ہوا کہ اس خیال کو دل سے دور کیا جاوے اس واسطے کہ پھر کوئی ایسی غلطی نہ ہو جاوے، بایں خیال بندہ بیٹھ گیا، اور دوسری کروٹ لیٹ کر کلمہ شریف کی غلطی کے تدارک میں رسول اللہ ﷺ پر درود شریف پڑھتا ہوں، لیکن پھر بھی یہ کہتا ہوں ''اللھم صل علی سیدنا ونبینا و مولانا اشرف علی'' حالانکہ اب بیدار ہوں، خواب نہیں، لیکن بے اختیار ہوں، مجبور ہوں، زبان اپنے قابو میں نہیں، اس روز ایسا ہی کچھ خیال رہا تو دوسرے روز بیداری میں رقت رہی، خوب رویا اور بھی بہت سی وجوہات ہیں جو حضور کے ساتھ باعث محبت ہیں، کہاں تک عرض کروں، مذکورہ بالا حادثہ خود مولانا اشرف علیؒ کے مرید کا بیان کردہ ہے، جس پر مولانا نے خاص متبع سنت کا فتویٰ دیا تھا، کیا ایسے کلمات زبان سے نکالنے پر کلمہ کفر ادا کیا یا نہیں؟ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: تلخیص محمد اقبال محلّہ ڈھیر یا مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جواب سے پہلے دو شرعی اصولوں کا سمجھنا ضروری ہے۔

(۱) عاقل بالغ انسان کی دو حالتیں ہیں: (۱) حالت بیداری: اس حالت میں انسان کو احکام شرعیہ کے ہر گوشہ کا مکلّف بنایا گیا، اگر کلمہ کفریہ زبان سے استعمال کرتا ہے یا حضور ﷺ پر کسی کو فوقیت دیتا ہے یا حضور ﷺ کے بعد کسی کو رسول اور نبی تسلیم کر کے اسی کے نام کلمہ پڑھتا ہے تو اس پر کفر کا حکم لگایا جاتا ہے اور اس پر تجدید ایمان اور تجدید نکاح بھی لازم ہوتا ہے۔

(۲) حالت نوم اور بے ہوشی: اس حالت میں انسان پر مستقل کوئی شرعی حکم لاگو نہیں ہوتا، مثلاً اگر کوئی حالت نوم میں کلمہ کفریہ زبان پر جاری کرتا ہے یا کوئی کافر اسلام قبول کرتا ہے یا کوئی اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے تو اسلامی شریعت میں نہ اس پر کفر کا حکم لاگو ہوگا اور نہ اس کا اسلام

معتبر ہوگا اور نہ اس کی بیوی پر طلاق واقع ہوگی، جیسا کہ کتب فقہ کی عبارات سے واضح ہوتا ہے:

(النائم) و تبطل عباراته من الإسلام والردة والطلاق ولم توصف بخير و إنشاء و صدق و كذب كألحان الطيور و مثله في التلويح فهٰذا صريح في أن كلام النائم لايسمى كلامه لغة و لا شرعاً بمنزلة المهمل.

(شامی، کتاب الطلاق، مطلب: فی طلاق المدهوش، زکریا ٤/٤٥٣، کراچی ٣/٢٤٥)

والنائم عديم الاختيار. (هدایه، باب طلاق السنة، اشرفی ٢/٣٥٨)

اصول (٢): علوم شرعیہ دو قسموں پر ہیں: (۱) علم ظاہر جس کا تعلق فن فقہ اور مسائل کے ساتھ ہوتا ہے اور ہر مسلمان کو اس کا مکلّف بنایا گیا ہے۔

(۲) علم باطن جس کا تعلق فن تعبیر اور کشف و مکاشفہ سے ہوتا ہے اس کے اسرار و رموز کا سمجھنا ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں ہے، اس لیے شریعت اسلامی نے کسی کو اس کا مکلّف بھی نہیں بنایا ہے اور خواب میں جو اشیاء نظر آتی ہیں وہ سب علم باطن سے متعلق ہوتی ہیں اور فن تعبیر کا ماہر اور صاحب باطن ہی ان اشیاء کی حقیقت پر غور کر کے صحیح معنی اور مفہوم نکال سکتا ہے جیسا کہ سورۂ یوسف آیت: ۴ میں گیارہ ستاروں سے حقیقی ستارے مراد نہیں ہیں، بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے گیارہ بھائی مراد ہیں، اور شمس وقمر سے حقیقی سورج و چاند مراد نہیں بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے والدین مراد ہیں، اور ان کو سجدہ کرنے سے حقیقی سجدہ مراد نہیں، بلکہ عظمت و شان مراد ہے، آیت ۳۶ رمیں شراب نچوڑنے سے حقیقی شراب نچوڑنا مراد نہیں، بلکہ اس کی تعبیر شاہی دربار کا خادم بننا ہے، اور سر پر روٹیاں اٹھانے سے حقیقی روٹی مراد نہیں بلکہ اس کی تعبیر سولی پر چڑھانا ہے اور آیت: ۴۳ عزیز مصر کے خواب میں سات موٹی گایوں کو سات لاغر گایوں کے کھانے اور سات سبز بالیوں کو سات خشک بالیوں کا لپیٹ کر خشک کر دینے سے اس کا حقیقی معنی مراد نہیں ہے بلکہ اس کی تعبیر سات سال تک عیش و عشرت اور فراوانی کی زندگی اور سات سال تک قحط و خشک سالی اور تنگی کی زندگی ہے۔

نیز حدیث میں حضرت عمرؓ کا لمبا کرتہ پہننے سے ان کا دین مراد ہے، حقیقی کرتہ پہننا مراد نہیں۔ (ترمذی نسخۂ ہندیہ ۲/۵۴ دارالسلام رقم: ۲۲۸۵)

اب اصل سوال کا جواب یوں ہوگا کہ حضور ﷺ تمام بنی نوع انسان کے لیے ہادی و رہنما بن کر تشریف لائے تھے، اس لیے حضور ﷺ کے نام کا کلمہ پڑھنا لازم ہوتا ہے، اب اگر کوئی شخص کسی عالم دین کے نام کا حالت نوم اور خواب میں کلمہ پڑھتا ہے تو اس سے اس کا حقیقی معنی ہرگز مراد نہیں ہے ہوگا بلکہ اس کی تعبیر یہی ہے کہ جس کے نام کلمہ پڑھا ہے وہ متبع سنت اور نائب رسول اور رہنمائے شریعت اور لائق اقتدا ہے، لہٰذا حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے جو تعبیر دی ہے وہ بالکل صحیح ہے، جو شخص فن تعبیر اور علوم باطنہ سے واقفیت رکھتا ہے وہ اس خواب کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، نیز سائل نے ''امداد الفتاویٰ ۳/۳۴-۳۵'' کی عبارت کو اچھی طرح نہیں سمجھا، اس لیے کہ حضرت تھانویؒ نے صاحب خواب کے متبع سنت ہونے کا فتویٰ نہیں دیا بلکہ اپنی ذات کو مذکورہ خواب کی تعبیر سے متبع سنت ہونا بتلایا ہے اور ''امداد الفتاویٰ ۲/ ۳۵'' میں صاحب خواب کا یہ کہنا کہ کلمہ شریف کی غلطی کے تدارک میں رسول اللہ پر درود پڑھتا ہوں لیکن پھر بھی یہ کہتا ہوں ''اللہم صل علی سیدنا ونبینا ومولانا اشرف علی'' حالانکہ اب بیدار ہوں، لیکن بے اختیار ہوں، مجبور ہوں، زبان قابو میں نہیں، یہ باتیں حقیقی بیداری سے متعلق نہیں ہیں بلکہ سلسلہ خواب سے متعلق ہیں، اس لیے کہ خواب دیکھنے والا بسا اوقات زیادہ یادداشت کی وجہ سے یہ محسوس کرتا ہے کہ فلاں بات حالت بیداری میں پیش آئی ہے حالانکہ حقیقت میں بیداری کی نہیں ہوتی، بلکہ نیم نوم اور نیم بیداری کے درمیان کی ہوتی ہے، جیسا کہ باب الأذان میں حضرت عبد اللہ بن زید انصاریؓ جب اپنا خواب بیان فرمارہے تھے اس وقت انہوں نے فرمایا کہ میں نے یہ بات حالت بیداری میں دیکھی اور میں سونے والا نہیں تھا لیکن تہمت کا خطرہ ہے اس لیے دعویٰ نہیں کر رہا ہوں۔

قال عبد الله: لولا إني أتهم نفسي لظننت أني رأيت ذٰلک و أنا يقظان غير نائم. (طحاوی شريف، النسخة الهندية ۱/ ۸۰، دار الكتب العلمية بيروت ۱/ ۱۷٤، رقم: ۷۹٦)

تو اسی طرح ''الامداد الفتاویٰ ۳/ ۳۵'' کی عبارت کا مطلب یہی ہے کہ خواب کی بات زیادہ یاد ہونے کی وجہ سے بیداری کی محسوس کر رہا ہوں، اس قسم کی باتوں کو فن تعبیر کا ماہر

اورصاحب باطن خوب اچھی طرح سمجھ سکتا ہے اور جولوگ فن تعبیر کے رموز پر واقف نہیں ہیں ان کو پریشانی ضرور ہوسکتی ہے۔فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیراحمدقاسمی عفااللہ عنہ
۲؍رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/۴/۲۳۵۴)

خواب میں دودھ کودیکھنا

سوال [۱۰۳۴۸]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرا ایک دوست ہے جس سے مجھے بے انتہا محبت ہے ہم دونوں اکثر اوقات ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور چنددن بھی ایک دوسرے کے بغیر مشکل سے گذارتے ہیں، پچھلے سال دونوں ۴۰؍دن کے سفر میں اللہ کے راستے میں جارہے تھے، عین وقت پر میرے دوست کا جانا رد ہوگیا اور میرے ۴۰؍دن بہت مشکل سے کٹے، میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ میں عشاء کی نماز کے بعد اپنے دوست کو گھر سے بلا کر اپنے ساتھ لے کر کہیں جارہا ہوں اور کچھ دور چل کر وہ مجھ سے بچھڑ جاتا ہے، میں بہت آواز دیتا پھرتا ہوں، بہت دیر بعد وہ مجھے ایک گھر میں ملتا ہے، اس کے بدن پر کرتا نہیں اور پاگلوں کی سی بات کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس گھر والوں نے مجھے دودھ پلایا ہے اس کے بعد گھبرا کر آنکھ کھل جاتی ہے۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: آپ کے خواب کا آخری حصہ اصل ہے اور آخر میں دودھ پینا ثابت ہے اور دودھ کا پینا ہدایت اورصلاح وعلم کی طرف اشارہ ہے۔

عن ابن عمر قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: بينا أنا نائم إذ أتيت بقدح لبن فشربت منه، ثم أعطيت فضلي عمربن الخطاب قالوا: فما أولته يا رسول الله! قال: العلم. (سنن الترمذی، أبواب الرؤيا، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ۲/ ۵٤، دار السلام رقم: ۲۲۸٤)

حدیث میں آیا ہے:

عن أبی هريرة –رضی الله عنه –أحبب حبيبک هونا ما عسى أن يكون بغيضک يوما ما وأبغض بغيضک هونا ما عيسى أن يكون حبيبک يوما ما. (ترمذی، باب ما جاء فی الاقتصاد فی الحب والبغض، النسخة الهندية ۲/ ۲۰، دار السلام رقم: ۱۹۹۷، المعجم الكبير للطبرانی، دار إحياء التراث العربی ۱۳/ ۷۰، رقم: ۱۷۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۸۲۹)

خواب میں مچھلیاں دیکھنا

سوال [۱۰۳۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں ایک ہی خواب کو بار بار دیکھتا ہوں، اور خواب دیکھتے ہوئے تقریباً دس بارہ سال ہو گئے ہیں، میں یہ خواب ہفتہ میں دو ایک بار ضرور دیکھتا ہوں، میں خواب میں مچھلی پکڑتا ہوں، پھر یہ مچھلی ہاتھ سے پکڑتا ہوں تو کبھی کانٹوں سے پکڑتا ہوں، کبھی جال سے پکڑتا ہوں، کبھی ایک دو مچھلی دیکھتا ہو، کبھی بہت ڈھیر ساری مچھلی دیکھتا ہوں، اور کبھی ان میں سے اچھی اور خوبصورت مچھلی کو پسند کرتا ہوں، کبھی ندی کے کنارے مچھلی پڑی ہوئی دیکھی ہے، جو مری ہوئی ہے، چھوٹی بڑی خوبصورت ہر طرح کی دیکھتا ہوں، لیکن دیکھتا مچھلی ہی ہوں، تو اس کی کیا تعبیر ہو سکتی ہے؟

المستفتی: حامد حسین نواب پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب مچھلی زیادہ دیکھتے ہیں اور اپنی ملکیت اور قبضہ میں آ گئی ہیں تو دولت زیادہ مقدار میں حاصل ہونے کی دلیل ہے اور اس میں محنت بھی زیادہ کرنے کی ضرورت نہیں، اور جب مچھلیاں کم مقدار میں حاصل ہوتی ہیں تو اسی طرح کم

مقدار میں دولت حاصل ہونے کی دلیل ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍محرم الحرام ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۲۹۷)

خواب میں کبوترنی دیکھنا

سوال [۱۰۳۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے نواسے کی بیوی میکے میں جاکر رک گئی ہے، بہت کوشش کی گئی لیکن آنے کو تیار نہیں ہے، میرے نواسے نے اسی دوران ایک خواب دیکھا ہے کہ اس کے گھر ایک کبوترنی آئی اس کو اس نے پکڑ لیا، کبوترنی چھوٹنے کی بہت کوشش کرنے لگی مگر اس نے نہیں چھوڑا، پھر گھر سے باہر آیا، کبوترنی چھوٹنا چاہتی تھی وہ کسی طرح چھوٹ کر سامنے ایک کبوتر بیٹھا تھا اس کے پاس چلی گئی، اس کے جاتے ہی کبوتر اڑ کر چلا گیا، تو کبوترنی منھ نیچا کر کے مرگئی، برائے کرم تعبیر بتادیں۔

المستفتی: ماسٹر خلیل احمد محمد پورہ نیوڈیسہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کبوترنی سے مراد نواسے کی بیوی ہے وہ اس سے طلاق لینا چاہتی ہے اور یہ طلاق دینا نہیں چاہ رہا ہے، خواب کے منظر کا حاصل یہ ہے، اور کبوترنی کا اڑ کر دوسرے کبوتر کے پاس پہنچ جانا اور پھر کبوتر کا اڑ کر چلا جانا اور کبوترنی کا نیچے منھ کر کے مرجانا اس بات کی طرف اشارہ ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ لڑکی کسی دوسرے مرد سے نکاح کر کے اس کے پاس رہے گی، اور بعد میں شوہر کا سایہ اس کے اوپر سے اٹھ جائے گا اور بغیر شوہر کے اسی حالت میں اس کی بقیہ زندگی گذر جائے گی۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍ذی قعدہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۸۲۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۱۱/۱۱ھ

خواب میں بندر دیکھنا

سوال [۱۰۳۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ناکارہ نے کچھ عرصہ قبل عجیب طرح کے خواب دیکھے ہیں، جنہیں یادداشت کے لیے تحریر کرلیے تھے، جن کی تعبیر کے لیے طبیعت پریشان رہتی ہے، اس لیے حضرت اقدس کی خدمت میں ناکارہ بڑی عقیدت کے ساتھ خواب تحریر کررہا ہے، ان شاء اللہ تعبیر اور علاج دونوں باتیں حاصل ہوجائیں گے، خواب درج ذیل ہیں:

(۱) ایک روز میں نے سونے کی حالت میں دیکھا کہ ایک بندر مجھ پر حملہ کررہا ہے، اپنے دفاع کے لیے میں تھالی نما برتن سے اس کے منھ پر چوٹ ماررہا ہوں جس کی وجہ سے وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے، اسی حالت میں نیند سے بیدار ہوگیا۔

(۲) ۸ر رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ بروز جمعہ بوقت صبح ۸ر تا ۹ر بجے کے درمیان خواب دیکھا کہ میں گاؤں کے ایک تالاب کے اندر ہوں، وجہ پتہ نہیں کیوں، کمر تک پانی کے اندر، اچانک ایک خنزیر نے حملہ کیا، میں نے اس کا منھ پکڑ کر پانی کے اندر دبایا کہ وہ پانی کے اندر اچانک مرجائے گا، اور تالاب کے باہر کے لوگوں کو پکارا اتنے میں دوسرے خنزیر پر نظر پڑی، اس وقت میرا ہاتھ اس پہلے والے کے منھ کے اندر چلا گیا، پھر وہیں پر کالے رنگ کے دونو جوانوں کی شکل تالاب کے اندر ہی نظر آئی، تب میرے ہاتھ میں عجیب قسم کا ڈنڈا تھا، میں نے دونوں کے ایک یا دو ڈنڈے مارے، اس کے بعد گاؤں کے کسی گھر میں دونوں لڑکے دو چارپائیوں پر بیٹھے ہیں، باقاعدہ سمجھ رہا ہوں کہ خنزیر پالنے والے ہیں، لیکن یہ بات یاد نہیں کہ وہ گالیاں دے رہے ہیں یا میں، جبکہ ایک مدت سے میں گالیوں سے پرہیز رکھتا ہوں، وہ دونوں بگڑ کر کہہ رہے ہیں کوئی واقعہ بتاتے ہوئے جو مجھے یاد نہیں رہا، کہ اس میں بہت تیز بول رہے تھے، اس پر میں نے کہا کہ اس وقت میری داڑھی کتنی بڑی تھی، ایک نے انگلی کے اشارہ سے پوری شرعی داڑھی بتائی، اس پر میں نے بھی انگلی کے اشارے سے کہا کہ اس وقت کافی

چھوٹی تھی، اس پر ایک نے کہا کہ یہ نہیں تھے، دوسرے نے نہیں مانا، اور میں نیند سے بیدار ہو گیا، خواب سے تقریباً دو سال قبل میری داڑھی ایک مشت سے کم تھی۔

(۳) ۸/ذی الحجہ ۱۴۲۰ھ بروز چہارشنبہ مقامی مدرسہ کے ایک مدرس کے ساتھ معلوم نہیں کہاں ہوں، یہ بھی ٹھیک یاد نہیں ہے کہ قریب کون بیٹھا ہے، شاید کوئی شرابی شخص ہے، میرے قریب کوئی بچہ بھی ہے، میں اور مدرس صاحب کوئی رنگین چیز پیالی سے نکال کر پی رہے ہیں، اور میں اس کو شراب سمجھ رہا ہوں اور یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ شراب نہیں ہے، اور اس کا مزہ بھی عجیب عمدہ قسم کا ہے، ساتھ میں ٹافی کی طرح کچھ کاٹ کر کھا بھی رہا ہوں، اسی کے ساتھ بیدار ہو گیا۔

(۴) کچھ مہینہ قبل خواب دیکھا، دن تاریخ بھول گیا، گھر کے برآمدے میں مکّا کے پکے بھٹے کھیتوں سے گھر آ چکے ہیں، بھٹوں کے ساتھ جھلی میں ایک کوا اور ایک شکاری چڑیا بندھی ہوئی ہے، میں نے ان کو دیکھا تو کہہ رہا ہوں کہ کلو (جو کہ ایک کاشتکار ہے) نے باندھ دیا ہے اور یہ پیاس سے مرنے کو قریب ہیں، میں نے کسی سے پانی منگوایا اور ان کو پلا رہا ہوں اور کہہ رہا ہوں کہ کوا بہت کمزور ہو گیا ہے، اور یہ مضبوط ہے اسی کے ساتھ آنکھ کھل گئی۔

(۵) امسال ۱۴۲۳ھ رمضان المبارک میں خواب دیکھا جو کہ پوری طرح یاد بھی نہیں رہا، کہ تحریر کر لیتا کہ گوشت کی دوکان پر گوشت کاٹا جا رہا ہے، اور میرے ہاتھ میں عجیب طرح کا جانور ہے کہ اس کا گوشت کٹے گا یا کٹ رہا ہے، اور سوچ رہا ہوں یہ تو خنزیر ہے۔

المستفتی: محمد اجمل اسہی اعظم پور ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) خواب میں بندر کا دیکھنا، مکار اور فریب دینے والا دشمن ہے جو آپ کو نقصان پہنچانے کے درپے ہے، مگر نقصان نہیں پہنچا سکا، اللہ پاک حفاظت فرمائے، صبح، شام "**بسم اللّٰہ الذی لا یضر مع اسمہ شیئ فی الارض ولا فی السماء وھو السمیع العلیم**" تین تین مرتبہ پڑھ لیا کریں، اور تین تین بار "**اللھم انا نجعلک فی نحورھم و نعوذ بک من شرورھم**" پڑھا کریں، اگر

دشمن معلوم ہے تو اس کی طرف دھیان بھی رکھا کریں۔

(۲) خنزیر سے لڑنا، ظالم اور کمینہ شخص کے ساتھ کچھ لوٹ پھیر ہے، اور پانی میں نصف بدن کا مطلب دین کے اعتبار سے اتنی کمی ہے، نیز اپنی آمدنی کو دیکھ لیں، کہیں سے کوئی مشتبہ مال تو نہیں آرہا ہے، مقابل کے لوگوں کا داڑھی کو زیادہ بتلانا ان کی نگاہ میں عظمت کی دلیل ہے۔

(۳) اگر بیمار ہے تو شفا کی طرف اشارہ ہے۔

(۴) فاسق، بددین اور جھوٹے آدمی کی آپ بہت مدد کرتے ہوں گے۔

(۵) جو خواب صحیح یاد نہ ہو اس کو بیان نہیں کرنا چاہیے، اور بہت پرانا خواب بھی بیان نہیں کرنا چاہیے، اور نیز گائے اور خنزیر کے اشتباہ میں مال مشتبہ کا اندیشہ ہے، خود دیکھ لیں۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۸۶۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۱۲/۲۴ھ

خواب میں شیر دیکھنا

سوال [۱۰۳۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں نے ایک رات کو خواب دیکھا ہے کہ ایک شیر آیا اور وہ میری طرف کو دیکھنے لگا، پھر وہ گھوم کر چلا گیا، یہ واقعہ تو ایک رات کا ہے، دو دن کے بعد پھر میں نے دیکھا کہ میرے مکان کے پیچھے خوب آبادی ہے، وہاں شور مچا اور لوگ چلائے، پھر میں وہاں گیا تو ایک شیر نے بھینس کے اوپر حملہ کر دیا ہے اس نے اس کو پیچھے سے پھاڑ کر کھایا۔

المستفتی: شفیق الرحمٰن اصالت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: آپ کا کوئی دشمن ہے، وہ دشمن باوقار بڑا آدمی ہے، مگر آپ سے دشمنی ہے، جب وہ آپ کے پاس آکر چلا گیا تو دشمن آپ کو کوئی نقصان نہیں

پہنچائے گا اور پھر دوسری مرتبہ جب بھینس کو دیکھا ہے تو اگر وہ بھینس آپ کی ہے تو یہ اشارہ ہے کہ دشمن آپ کے پاس مال میں معمولی نقصان کرے گا اور اگر وہ آپ کی بھینس نہیں ہے تو آپ کے مال و جان میں سے کسی چیز کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۳۹۹۴)

خواب میں شیر اور خود کو امامت کرتے دیکھنا

سوال [۱۰۳۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: پہلا خواب: نوجوان اپنے گھر ہے، شور ہوا کہ شیر (اسد) آ گیا ہے، سب اس جگہ کے باشندہ اپنے اپنے گھروں میں گھس گئے اور اپنے جانور، گائے، بیل، بھینس ان کو بھی اندر کرلیا، پولیس بھی ہے وہ شیر کے مارنے کو اس کی تاک میں ہے، خیر شیر آ کر نہ معلوم اندر بستی میں کہیں چلا گیا، اگلا روز ہوا، پھر اسی طرح شور ہوا، پھر تیسرا روز ہوا، تو یہ نوجوان خواب دیکھنے والا اپنے گھر کے قریب کسی جگہ پاخانہ کر رہا ہے، قضاء حاجت پوری کر رہا تھا کہ ایک دم شور ہوا کہ شیر آ گیا، پاخانہ تھوڑا سا ہوا تھا کہ شور سن کر وہاں سے بھاگا اور گھر میں گھس گیا، بستی کے تمام افراد اسی طرح آج جانور بھی جلدی میں اندر بند نہیں کر سکے، لوگ جو آ گئے، وہ تو مغرب بعد آتے ہیں، یعنی شیر پھر گھر سے باہر نکلا دیکھتا ہے کہ پولیس بہت ہے جو شیروں کو مارنے آئی ہے، شیر ایک کھیت میں چھپے ہیں، تو پولیس رائفل لیے تعاقب میں ہے، یہ نوجوان اور دیگر بستی والے کھڑے ہیں، نوجوان دیکھتا ہے کہ شیر اس کی طرف بڑھ رہا ہے، اور پولیس اس کو گولی نہیں مار رہی ہے، نوجوان پولیس سے بول رہا تھا، کہ مارو بھائی کیوں نہیں مارتے؟ آخر پولیس کی ہمت نہیں ہوئی تو نوجوان نے پولیس والے سے رائفل لے لی اور خود شیر پر چھ سات فائر کیے، فائر کرنے سے شیر کے وہی عالم بن گئے جن کو نوجوان نے پہلے خواب میں نصیحت کی تھی کہ تم گندے ہو، عالم صاحب بولے، بھائی ہم کو مت ماریئے، ہم آئندہ اس بستی میں نہیں آئیں گے۔

دوسرا خواب: نوجوان دیکھتا ہے کہ بستی ہی میں قبرستان کے قریب ایک کھیت ہے، اس میں نوجوان نماز میں امامت کرا رہا ہے، نماز معلوم نہیں کونسی ہے، البتہ جہری نماز ہے، دیکھتا ہے کہ اس کے محسن نماز سے الگ ہو کر وضو کرنے تشریف لے گئے، نوجوان نے دل میں خیال کیا کہ قرأت لمبی کردوں تا کہ استاذ محترم کی رکعت نہ چھوٹ سکے، چنانچہ قرأت لمبی پڑھی اتنے میں محسن صاحب وضو سے فراغت کر کے بالکل اسی جگہ آکر جماعت میں شامل ہو گئے، جس جگہ سے ہٹے تھے، اس جگہ کوئی دوسرا آدمی نہیں آیا تھا، خالی پڑی ہوئی تھی، محسن کی رکعت بھی نہیں نکلی۔

اچھی طرح غور کر کے جلدی روانہ فرمادیں، میرا دماغ دونوں نے خراب کر رکھا ہے، دونوں شاگرد بھی ہیں، اور وہ دونوں محسن اور نوجوان خود بھی استاذ شاگرد ہیں، اور ماتحت وافسر ہیں، مولانا موصوف کو کرایہ وسفر خرچ دے کر روانہ کر رہا ہوں، میری غلطی کو تہ دل سے معاف فرمائیں، نوازش ہوگی، دعامیں یاد رکھیں۔

المستفتی: خلیل الرحمٰن مدرسہ مرادیہ مظفرنگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) شیر کا آنا اور اس کا نوجوان کی طرف رخ کرنا اور اس سے خائف ہونا اس طرف اشارہ ہے کہ نوجوان کا کوئی بڑا آدمی دشمن ہے اور اس دشمن سے نوجوان خائف رہتا ہے، اور پولیس وغیرہ کا نوجوان کی مدد میں شیر کا پیچھا نہ کرنا اور نوجوان کا خود مارنا اس طرف اشارہ ہے کہ اس نوجوان کے کچھ لوگ مددگار ہیں، لیکن مددگار کی مدد کام نہیں آئے گی، بلکہ مددگار جو طریقہ بتلائیں گے، اس طریقہ کو اختیار کر کے نوجوان خود اپنے دشمن کو مغلوب کرے گا اور خود غالب رہے گا۔

(۲) سوالنامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نوجوان نے امامت کی ہے اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ وہ نوجوان کچھ لوگوں پر عزت حاصل کرے گا اور ان لوگوں میں محسن افسر بھی ہوگا نیز محسن کا بے وضو ہونا اور پھر وضو کرنے کو جانا اور پھر اپنی جگہ آکر کھڑا ہونا اور نوجوان کا اس کی رعایت ملحوظ رکھنا اس طرف اشارہ ہے کہ محسن افسر کو کسی نیک کام میں سہو ہو گیا ہے، لیکن

بعد میں اس کی اصلاح کرلیں گے اور پہلے سے اچھی حالت میں ہوں گے، اور اس اصلاح میں نوجوان کی بھی شاید مدد رہے گی۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ رذی قعدہ ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۴۴۹)

خواب میں کتے کو سانپ کھاتے دیکھنا

سوال [۱۰۳۵۴]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کمال کی شادی ہوئی تھی، کمال بیمار ہوا اس کی بیوی نے طلاق لے لی، پھر کمال نے اپنی بیوی کو ناگن سانپ کی شکل میں دیکھا اور بار بار خواب میں سانپ دیکھا کرتا ہے، پرسوں خواب میں دیکھا کہ چھت پر سانپ ہے، مارنے گیا تو اس کو کتے نے کھالیا۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مطلقہ بیوی کو سانپ بنتے دیکھنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ محمد کمال کے حق میں سخت موذی دشمن ہے، اور جس سانپ کو کمال مارنے جا رہا تھا وہ بھی ایک دشمن ہے اور اس سانپ کو کتے نے کھالیا اس بات کا ثبوت ہے کہ دشمن کو دوسرے دشمن نے ختم کردیا ہے اور خود کمال محفوظ رہے گا ان شاء اللہ۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ رصفر المظفر ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۸۷۶)

خواب میں سانپ کو دیکھنا

سوال [۱۰۳۵۵]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج صبح ساڑھے آٹھ بجے ایک سانپ کو دیکھا جو میری برابر میں سے اڑ گیا ہے

اوردوسرا سانپ سامنے دیوار پر چل رہا ہے، دوتین سانپ زمین پر ٹہل رہے ہیں، جن کا رنگ کبرا ہے، اوراڑنے والا سانپ ایک گز کا ہے، اورسانپ سے ڈر میری بھانجی نیچے چلتی ہوئی لکڑیوں میں گررہی تھی، جسے میں نے اپنی گود میں لے لیا۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سانپ کوخواب میں دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ کچھ ایسے دشمن ہیں جن سے خیر کی امید نہیں جوآس پاس میں آتے جاتے ہیں، ہرنماز میں گیارہ گیارہ بار ”**اللھم إنا نجعلک فی نحورھم ونعوذ بک من شرورھم**“ پڑھ کردعا کیا کریں۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۱۱۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/۴/۱۴۲۰ھ

خواب میں کالا اورسفید سانپ دیکھنا

سوال [۱۰۳۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ ایک قبر ہے جس کے اوپر ایک چھید (سوراخ) ہے اوراس کے اندر دوسانپ ہیں، ایک سفید ہے اور ایک کالا ہے، بعد کوان سے ڈر نہیں لگا، نہ میں نے مردے کو دیکھا۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کے دودشمن ہیں جن سے آپ کوڈر نہیں ہے، اورنہ ہی وہ دشمن آپ کونقصان پہنچا سکیں گے، ان شاءاللہ تعالیٰ۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶؍ربیع الثانی ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۱۵۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶/۴/۱۴۱۱ھ

خواب میں دیکھنا کہ گھر میں خنزیر ذبح کیا جانے والا ہے

سوال [۱۰۳۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اب سے قریب چھ ماہ پہلے میں جے پور اپنی پڑھائی کے سلسلے میں گیا ہوا تھا، پڑھائی اور دیگر فکروں کے دوران مجھے گھر سے کوئی تعلق نہ رہا، ایک رات مجھے خواب دکھائی دیا کہ محلّہ کے دوسرے گھروں کی طرح اس دن ہمارے گھر میں سور کاٹا جانے والا تھا، اور گھر کی عورتیں چاول چننے میں لگی ہوئی تھیں، جن کے چہرے پر ایک خوشی تھی، میں نے ان کو اس فعل سے روکا اور قرآن وحدیث کا حوالہ دیا تو انہوں نے مجھے ہی الٹا سمجھا دیا، اور ضد کرنے پر مارنے پیٹنے پر آمادہ ہوگئیں اور گھر سے نکالنے کی دھمکی دینے لگیں اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی، اس کے کچھ دنوں بعد ہی مجھے دوسرا خواب دکھائی دیا کہ میرے گھر کی عورتیں ایک محفل میں سج دھج کر بیٹھی ہیں، جس میں ان کے علاوہ کوئی اور عورت وہاں موجود نہیں تھی، محفل میں شامل سبھی مردان سے گفتگو میں دلچسپی لے رہے تھے، وہ بھی ان کے سوالوں کا جواب خوشی خوشی دے رہی تھیں، میں اس محفل میں لاچاری کی حالت میں تھا، نہ مردوں کو ان کے پاس جانے سے روک سکتا تھا اور نہ ہی ان کو اس محفل سے اٹھا سکتا تھا، گھر لوٹنے پر میں نے یہ دونوں خواب گھر والوں کو سنائے، انہوں نے میرے دماغ کا وہم قرار دیا، میں لکھ دینا چاہتا ہوں کہ میں ان دنوں میں اپنے گھر کی عورتوں کی بے پردگی وبے تکلفی کے خلاف تھا کہ میرے بڑے بھائی نے ایک پرائمری اسکول کھول لیا ہے جس میں اپنی بھابھی اور چھوٹی بہن کو پڑھانے سے نہیں روک سکا ہوں، ویسے بھی میرے گھر میں جدید خیالی غالب ہوتی جارہی ہے تو آپ سے گذارش ہے کہ صحیح تعبیر پیش فرمائیں۔

المستفتی: مبین اصغر انصاری، شاہ چندنی چاندپور بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دونوں کی تعبیر کا خلاصہ یہ ہے کہ گھر میں کہیں سے حرام

مال داخل ہورہا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اخروی حالات کمزور ہورہے ہیں، دنیا کے مقابلے میں آخرت کے حالات تنزلی کی طرف ہیں، اس لیے گھر والوں کو فکر آخرت کرنی چاہیے اور ہر نماز کے بعد گھر کے لوگ یامغیث ۱۱۱/ مرتبہ پڑھ لیا کریں اور توبہ کیا کریں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ شوال المکرّم ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۵۰۰۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/ ۱۰/ ۱۴۱۷ھ

خواب میں بیت الخلاء کی عمارت منہدم ہوجانا

سوال [۱۰۳۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ۲۴/ ذی قعدہ بروز اتوار، دوپہر ۱۲/ بجے کے بعد میں آرام کررہا تھا، تو ہلکی سی نیند لگ گئی اور میں ایک خواب دیکھ رہا ہوں کہ میں جس مدرسہ میں خدمت انجام دے رہا ہوں، اس مدرسہ کے بیت الخلاء کی عمارت منہدم ہوگئی، اور اول مرحلہ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہم نے ابھی بیت الخلاء میں نئی لاڈی ڈلوائی تھی، تو بالکل کسی نے نکالی ہے، اسی طرح دیکھا کہ پورے طور سے عمارت گرگئی ہے، اور میں نیند میں بچوں سے یہ عرض کررہا ہوں کہ کیا اب بیت الخلاء کے لیے ہمیں جنگل جانا پڑے گا اور نیند سے بیدار ہوگیا تو ظہر کی اذان کی تیاری تھی، یہ خواب میں صرف آپ سے عرض کررہا ہوں اس کی تعبیر کیا ہوگی؟

المستفتی: عبدالرشید کوساڑی گجرات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خواب میں بیوی کو بیت الخلاء کی عمارت کی شکل میں بھی دیکھا جاسکتا ہے، کیونکہ جس طرح آدمی بیت الخلاء میں تنہا ہوتا ہے اسی طرح بیوی کے پاس بھی تنہا ہی ہوتا ہے۔ (تعطیر الانام ۲/ ۱۹۴)

لہٰذا بیت الخلاء کی عمارت کی دیوار میں نقصان پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ صاحب خواب اگر شادی شدہ ہے تو بیوی کے مسئلہ میں کچھ پریشانی ہے، اور اگر بغیر شادی شدہ ہے تو جس

لڑکی کے ساتھ رشتہ ہونا ہے اس میں کچھ پریشانی ہے، ہر نماز کے بعد ۱۱۱ ر مرتبہ یالطیف پڑھ کر خیر کی دعا فرماتے رہا کریں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ رذی الحجہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۵۴۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۱۲/۲۱ھ

خواب میں سیب، مور اور آم دیکھنا

سوال [۱۰۳۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) میں نے خواب دیکھا کہ میں دہلی کا سفر کر رہا ہوں میرے ہاتھ میں ایک تھیلا ہے جس میں دو سیب ہیں، اتنے ہی میں ایک سائل آیا اور سوال کیا کہ بیٹا تمہارے پاس کھانے کی کوئی چیز ہے تو مجھے دو، میں بہت بھوکا ہوں، میں نے اس سائل کو جواب دیا کہ میرے پاس تھیلے میں دو سیب ہیں، اگر آپ کو چاہیے تو آپ لے لیجئے، تو اس پر سائل نے کہا کہ بیٹا! یہ دونوں سیب اپنے پاس رکھو، کسی کو مت دینا، یہ کہہ کر سائل روانہ ہو گیا، اور یہ خواب میں نے نصف شب میں دیکھا۔

(۲) ہمارے دونوں ہاتھوں میں لٹو ہے، دائیں ہاتھ کا لٹو باقی رہا، اور بائیں ہاتھ کا لٹو لوٹ گیا، اسی طریقے سے دوسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا، یہ خواب میں نے فجر کی اذان سے تیس منٹ پہلے دیکھا ہے۔

(۳) کیا دیکھتا ہوں کہ عصر کا وقت ہے میں اکیلا تفریح کے لیے جارہا تھا، راستہ میں دو مور دیکھے، اور مور بھی مجھے دیکھ رہے ہیں، دائیں طرف کا مور اور بائیں طرف کا مور دونوں اڑ گئے، میں نے جلدی سے بائیں طرف کا مور پکڑ لیا اور مدرسہ لے کر آیا اس کو میں نے اپنے ساتھی کو دکھایا، لیکن میرے ساتھیوں نے مجھ سے چھین لیا، اور پھر............ ہڈی مجھ کو دیدیں اور کہا کہ ہڈی جنگل میں ڈال دو، چنانچہ میں نے اپنے ساتھیوں کے کہنے کے مطابق ایسا کیا، اور اپنی آنکھوں سے دیکھا، یہ خواب رات کو تین بج کر دس منٹ پر دیکھا۔

(۴) میں نے دیکھا کہ میرے پاس دو عدد آم ہیں، میں نے دونوں کو باندھ دیا پھر دیکھ رہا ہوں کہ بیچ کا آم گر جاتا ہے اور پیر کا نہیں گرتا، پھر آتا ہوں، پھر باندھتا ہوں، پھر گر جاتا ہے، اتنے ہی میں میری آنکھ کھل گئی، یہ خواب میں نے دن میں دو بجے یا ڈھائی بجے دیکھا۔

المستفتی: اصحاب، شاخ دارالعلوم آگرہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) اگر دونوں سیب سبز اور ہرے ہیں تو دو فرزند ہیں، ان کی خوشخبری ہے اور اگر سرخ ہیں تو کسی بڑے سے نفع کی دلیل ہے، اور اگر سفید ہیں تو تجارت میں نفع کی طرف اشارہ ہے۔

(۲) لٹو دونوں ہاتھ میں ہونا ایسا لگتا ہے کہ کچھ وقت ذمہ داری سے آزاد خیالی کی طرف اشارہ ہے، پھر کچھ وقت کے بعد آزاد خیالی کا ایک ساتھی چھوٹ جائے گا۔

(۳) دو مور سے دو عورت مراد ہیں، جو اڑ گیا ہے اس سے جو عورت مراد ہے وہ ہاتھ سے نکل جائے گی اور جو پکڑ میں آ گیا ہے اس سے جو عورت مراد ہے اس سے شادی ہو جائے گی مگر دوسروں کی نظر سے حفاظت کی ضرورت ہوگی۔

(۴) اتفاق سے آم کی بھی وہی تعبیر ہے جو مور کی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۸۳۱)

خواب میں خود کو حاملہ دیکھنا

سوال [۱۰۳۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے رات خواب دیکھا ہے کہ میرے گھر کے پاس چوراہا ہے میں اس چوراہے پے گر گئی، گر کے اٹھنا چاہ رہی ہوں ایک جانور آتا ہے، اس کا سائز بلی کا سا ہے، کافی موٹا، رنگ سفید، وہ میرے پیٹ پر مارنے کی کوشش کرتا ہے، میں اپنا پیٹ بچاتی ہوں، جسم پر

مار رہا ہے، خواب میں مجھے ایسا اندازہ ہے کہ میں حاملہ ہوں، چوتھا یا پانچواں ماہ ہے، میں اپنے پیٹ کو بچانے کی کوشش کرتی ہوں، اب اٹھتی ہوں تو ٹانگوں سے کھڑا نہیں ہوا جاتا، بہت کوشش کرکے وہاں سے بھاگتی ہوں، اپنے دروازے میں گر جاتی ہوں، میں بہت زور سے ”قل اعوذ برب الناس“ پڑھ رہی ہوں، میری آنکھ کھل جاتی ہے، سوا تین بجے تھے، میں حاملہ نہیں ہوں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اپنے آپ کو حاملہ دیکھنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کچھ مال ودولت حاصل ہونے والی ہے، اور جانور مذکور کا حملہ کرنے کی کوشش کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حاصل شدہ مال پر کسی دشمن کی نگاہ ہے، اور اس سے آپ اپنے مال کے بچانے کی کوشش کررہی ہیں، اور کوئی خطرہ اور گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍محرم الحرام ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۰۸۱)

بچہ کا ماں کو ذبح کرنا

سوال [۱۰۳۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: خادمہ نے درج ذیل ایک خواب دیکھا ہے تعبیر سے نوازیں، میں عشاء کی نماز پڑھ کر سوگئی، رات میں یا صبح کا وقت اس کا علم نہیں ہے، دیکھتی ہوں کہ میرا لڑکا محمد طارق جو میرے بچوں میں سب سے چھوٹا ہے، وہ مجھے ذبح کررہا ہے، میں نے اس سے کہا کہ چھری تیز کرلو، اتنا کہنے پر آنکھ کھل گئی، ماشاء اللہ بڑا نیک صالح بچہ ہے، اللہ میرے حق میں بہتر کرے۔

المستفتیه: خادمہ عارفہ بیگم آصف پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ان شاء اللہ تعالیٰ آپ کے بچہ محمد طارق کی طرف سے آپ کو خیر اور بھلائی پہنچنے والی ہے۔

من رأى أحدا يذبحه ذابح فإن المذبوح ينال من الذابح خيرا.

(نابلسی ۱/ ۲۲۷) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۸۳۴)

خواب میں بچے کی پیدائش دیکھنا

سوال [۱۰۳۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خواب میں زید کی بھابھی کے دولڑکے بیک وقت مولود ہوئے اور ایک لڑکا پیدا ہوتے ہی چلنے لگتا ہے اور ہنستا ہے اور آکر زید کو سلام کرتا ہے، زید سلام کا جواب دیتا ہے اور وہ لڑکا پھر شرمگاہ میں چلا جاتا ہے، دوسرا لڑکا صحیح وسالم ہے۔

المستفتی: امام جامع مسجد دھنورہ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شاید معمولی رنج وغم کا سامنا کرنا ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ صفر المظفر ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۳۰۱۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۳/۲/۹ھ

خواب میں اپنے گھر پر غیروں کا قبضہ دیکھنا

سوال [۱۰۳۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: خواب تو بہت لمبا ہے لیکن مختصراً عرض ہے کہ جناتوں نے میرے گھر پر قبضہ کرلیا ہے، اور ہمارے گھر والوں نے باہر سے تالا ڈال دیا ہے۔ تعبیر سے مطلع فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شاید دشمنوں کے تسلط کا خطرہ ہے،لیکن گھروالوں کا دروازہ پر تالا ڈال دینا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ دشمن اپنے مقصد میں زیادہ کامیاب نہیں ہوں گے،اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کی شدید ضرورت ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰/ذیقعدہ ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر:۲۷/۲۴۴۸)

خواب میں کسی لڑکی کے سامنے پیشاب کرنا

سوال [۱۰۳۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے آج سے دو یا ڈھائی سال قبل ایک خواب دیکھا کہ میں ایک مولانا (اور وہ ہمارے مدرسہ کے مہتمم صاحب ہیں) کے گھر میں کھانا پکانے کی جگہ پیشاب کرر ہا ہوں، اور اس وقت ان کی لڑکی میرے سامنے ہے، اور یہ سب مولانا اور ان کی اہلیہ دیکھ رہے ہیں، اور میں بھی ان سب کو دیکھ رہا ہوں اور مولانا اور ان کی اہلیہ اور ان کی لڑکی نے مجھ کو کچھ بھی نہیں کہا، اور اسی وقت میری آنکھ کھل گئی اور یہ خواب میں نے آپ کے سوا کسی سے نہیں بیان کیا اور آج تک یہ خواب بیان کرنے سے ڈرتا رہا ہوں، اور اب میں اس خواب کے بیان کرنے پر مجبور ہوگیا، کیونکہ جب یہ خواب مجھے یاد آتا ہے تو میں پریشان رہتا ہوں اور کبھی مجھے نیند بھی نہیں آتی، اس لیے میں آپ کی طرف رجوع کرر ہا ہوں اور تعبیر کی امید رکھتا ہوں، اور یہ خواب میں نے اپنے طالب علمی کے زمانہ میں دیکھا ہے اور میں ابھی ایک مدرسہ میں خدمت انجام دے رہا ہوں۔

المستفتی: عبدالرشید کوساڑی گجرات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بہت ممکن ہے کہ آپ کا ان کے یہاں یا ان کے خاندان میں مصاہرت کا تعلق پیدا ہو جائے، اور ولادت کا سلسلہ پیدا ہو جائے، اللہ تعالیٰ

سنت پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

من رأى أنه بال فى دار قوم أو محلة قوم أو مسجد قوم أو بلد قرية فإنه يطرح هناك نطفته بمصاهرة منه لهم أو من قومهم أو من غير عشيرتهم فإن كان ذٰلك البول فى المسجد فإنه يرزق ولدا بارا تقيا.

(تعطير الأنام نابلسى ١/ ٤٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ ربیع الاول ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۲۲۰)

۴۰ کتاب الطب والرقیٰ

۱ باب ما یتعلق بالطب وغیرہ

علم طب حاصل کیے بغیر علاج ومعالجہ کرنا

سوال [۱۰۳۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جس شخص نے باقاعدہ کسی ادارے میں یا استاذ کے پاس رہ کر علم طب نہ حاصل کیا ہو اور نہ ڈاکٹری ہی پڑھی ہو، کیا ایسا شخص ڈاکٹر یا حکیم کے مشورے سے چند مخصوص امراض میں کام آنے والی مخصوص دواؤں کے نام وفوائد معلوم کرکے ان مخصوص امراض کے شکار مریضوں کا علاج کرسکتا ہے؟ حوالہ کے ساتھ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: حمد اللہ ناصر، رحمت نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر سائل اپنے بیان میں سچا ہے اور واقعی شخص مذکور علم حاصل کرکے تجربہ کار نہیں بنا ہے، اور نہ ہی کسی ماہر طبیب وحکیم کے پاس رہ کر تجربہ حاصل کیا ہے اور محض عام لوگوں کی طرح کسی ڈاکٹر یا حکیم سے چند دواؤں کے نام یاد کرلیے ہیں اور ان دواؤں کے فوائد اور ان کے مریضوں کی تخصیص بھی عامی کی طرح معلوم کرلی ہے، تو ایسا شخص نسخہ کی تبدیلی وغیرہ کا تجربہ نہیں رکھ سکتا اس لیے ایسے لوگوں کے لیے علاج ومعالجہ کرنا اور طب کا کام کرنا حدیث شریف میں سخت ممانعت آئی ہے، اس لیے جائز نہیں ہے۔

عن عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده أن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم قال: من تطیب ولایعلم منه طب فهو ضامن. (أبو داؤد شریف باب فیمن تطیب بغیر علم فأعنت، النسخة الهندیة ۲/ ۶۳۰، دار السلام رقم: ۴۵۸۶، سنن ابن ماجه، باب من تطیب ولم یعلم منه طب، النسخة الهندیة ۲/۲۵۶، دار السلام رقم: ۳۴۶۶، سنن النسائی، صفة شبه العمد وعلی

من دية الأجنة، النسخة الهندية ۲/ ۲۱٦ دار السلام رقم: ٤٨٣٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۳۱۱۸)

دائی کا کام کرنا کیسا ہے؟

سوال [۱۰۳۶٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک عورت مثلاً زینب ایک دوسری عورت خالدہ کا جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اول الذکر عورت ثانی الذکر عورت کے بچہ کی پوری دیکھ بھال ایک دایہ کا کام انجام دیتی ہے، تو اب دوسری عورتیں ان سے نفرت کرتی ہیں، اور کہتی ہیں کہ ان سے کھانے پینے کا کام کرانا یا ان کے ہاتھ سے پانی پینا وغیرہ برا اور مذموم عمل ہے۔

المستفتی: محمد رئیس نواب نگر رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: دائی کا کام کرنا شرعی طور پر ناجائز یا ممنوع امر نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ایک اہم کارِ ثواب ہے، اس لیے اس سے نفرت کرنا ہرگز ہرگز جائز نہیں، حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا بہت مشہور صحابیہ تھیں، وہ عورتوں کی ختنہ کیا کرتی تھیں۔

عن عطية القرضي قال: كانت بالمدينة خافضة يقال لها أم عطية: فقال لها رسول الله ﷺ: أشمي ولا تحفي فإنه أسرىٰ للوجه، وأحظى عند الزوج. (أسد الغابة، دار الفكر ٦/ ٣٦٧، الإصابة في تمييز الصحابة، دار الكتب العلمية بيروت ٨/ ٤٣٨، تحت رقم الترجمة: ١٢١٧٢)

حضور ﷺ ان سے بہت زیادہ خوش تھے اور جب عورت ولادت کے وقت دائی کا کام کر کے اپنے ہاتھوں کو اچھی طرح دھو لیتی ہے تو اس کا ہاتھ بالکل پاک ہو جاتا ہے، اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا وغیرہ سب پاک ہوتا ہے اس سے پکوانا اور اس کو کھانا سب بلا کراہت جائز

اور درست ہے، لہٰذا کسی کے لیے اس سے نفرت کرنا جائز نہ ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/محرم الحرام ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۴۲۹۳)

دوا کھاتے وقت کیا پڑھا جائے؟

سوال [۱۰۳۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید بسم اللہ پڑھ کر دوا اور کھانا شروع ہی کر رہا تھا کہ زید کی بغل میں بیٹھے ہوئے دوسرے صاحب نے فرمایا کہ دوا کھاتے وقت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بجائے بسم اللہ ہو الشافی ہوالکافی پڑھ کر دوا کھانی چاہیے، اب زید کے لیے کیا پڑھنا بہتر ہوگا؟

المستفتی: امام الدین کولکاتا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دوا کھاتے وقت بسم اللہ ہوالشافی ہوالکافی پڑھنا ثابت نہیں ہے لہٰذا دوسری چیزوں کو کھانے کی طرح دوا کھاتے وقت بھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا اولیٰ ہے، ہاں البتہ دل میں یہ عقیدہ رکھے کہ اصل شفا دینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور دوا محض ایک سبب ہے، زبان سے ہوالشافی، ہوالکافی کہنے کی ضرورت نہیں، اگر ہوالشافی، ہو الکافی کہہ لے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

الاشتغال بالتداوی لابأس به إذا اعتقد أن الشافي هو الله تعالیٰ و أنه جعل الدواء سببا. (هندیه، کتاب الکراهیة، الباب الثامن عشر فی التداوي، زکریا جدید ۴۰۹/۵، قدیم ۳۵٤/۵، الفتاویٰ التاتارخانیة زکریا ۱۹۷/۱۸ رقم: ۲۸۹۳، المحیط البرهانی، المجلس العلمی ۸۱/۸، رقم: ۹٦۳٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/شعبان المعظم ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۸۱۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۸/۱۶ھ

غیر مسلم ڈاکٹر سے ختنہ کروانا

سوال [۱۰۳۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: غیر مسلم ڈاکٹر سے ختنہ کروانا کیسا ہے؟ نیز ختنہ کے متعلق کوئی دعا ہے یا نہیں، ختنہ کرنے والے کا تسمیہ عند الختنہ کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: ہارون رشید کرناٹک

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیر مسلم ڈاکٹر کے ذریعہ بھی ختنہ کرانا جائز ہے، بشرطیکہ وہ ختنہ کے معاملہ میں ماہر، تجربہ کار، اور جانکار ہو، تاہم بہتر یہی ہے کہ کسی مسلم ماہر ڈاکٹر کے ذریعہ ختنہ کرایا جائے تاکہ وہ بسم اللہ بھی پڑھ لے، کیونکہ حدیث میں آیا ہے:

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: كل أمر ذي بال لا يبدأ فيه بالحمد فهو أقطع. (سنن ابن ماجه، باب خطبة النكاح، النسخة الهندية ١/١٣٦، دار السلام رقم: ١٨٩٤، مسند أحمد بن حنبل ٢/٣٥٩، رقم: ٨٦٩٧، مسند البزار، مكتبه العلوم والحكم ١٤/٢٩١، رقم: ٧٨٩٨، المعجم الكبير للطبراني ١٩/٧٢، رقم: ١٤١، صحيح ابن حبان، دار الفكر ١/٧٤ رقم: ١-٢)

وقال النووي: وفي رواية: كل امرئ ذي بال لا يبدأ فيه ببسم الله الرحمن الرحيم فهو أقطع. (الأذكار، دار الكتب العلمية جديد ص: ٩٦-٣٣٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍جمادی الثانیہ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۶۲۱۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۶/۱۷ھ

سرکاری ہسپتال کی دواؤں کو بازار میں فروخت کرنا

سوال [۱۰۳۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ ہندوستان کے اندر حکومت اسپتالوں کو دوائی دیتی ہے، تاکہ غریب مریضوں کو بغیر روپیہ کے دوادی جاسکے، اور اس کے لیے مذہب کی کوئی تشخیص نہیں ہوتی، ہندو، مسلمان، عیسائی، یعنی کوئی بھی ہو، لیکن عمومی بگاڑ کی وجہ سے اسپتال کا عملہ اسکو بازار میں فروخت کردیتا ہے، اس کے کاروبار کے لیے حکومت کی طرف سے سخت پابندی ہے، تو کیا اس کاروبار کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: صہیب احمد خلیل آباد ضلع بستی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہسپتال کا عملہ حکومت کا وکیل ہوتا ہے اور وکیل امین ہوتا ہے، امین کو انتفاعِ امانت بدونِ اذنِ موکل حرام ہے، اس لیے یہ کاروبار و نفع حرام ہوگا۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/ ۳۱۸)

الوكيل إنما يستفيد التصرف من المؤكل وقد أمره بالدفع إلى فلان فلا يملك الدفع إلى غيره. (شامی، کتاب الزکوٰۃ، زکریا ۳/ ۱۸۹، کراچی ۲/ ۲۶۹)

وليس للمودع حق التصرف والاسترباح في الوديعة. (المبسوط للسرخسی، کتاب الودیعة، دار الكتب العلمية بيروت ۱۱/ ۱۲۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ رشوال المکرّم ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۳۰۹)

پولیو کی دوائی پلانا

سوال [۱۰۳۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: پولیو دوا جو ہمارے یہاں بچوں کو پلائی جاتی ہے اس حوالہ سے پہلے ہی سے شک تھا، اب یہ شک یقین کی حد تک بدل گیا ہے، ''ماہنامہ بانگ حراء لکھنؤ، اپریل مئی ۲۰۰۶ء میں بعنوان بیماریوں کی نئی سوغات'' مضمون شائع ہوا ہے جو ہمارے استفتاء کے ساتھ منسلک بھی ہے، آپ حضرات کی خدمت میں یہ مضمون ارسال ہے، تاکہ فیصلہ میں معاون ہو سکے،

پورے مضمون کو پڑھ کر بلاخوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ پولیو کی دوائی پلانا ناجائز ہے کیونکہ اس سے قوت مدافعت، قوت تمیز ماؤف ہوکر رہ جاتی ہے، نیز بے شمار بیماریاں جنم لیتی ہیں، جولا علاج ہیں اور خود اس کے علمبردار کے یہاں (امریکہ) اس پر پابندی ہے، اسرئیل میں یہ دوا اب تک نہیں پلائی گئی ہے، نائیجیریا کے علماء نے اس کے خلاف فتویٰ دیا ہے کہ جبکہ خود ماہرین اس کے خلاف ہیں، امریکی افواج کا دعویٰ ہے کہ ہمارے دشمنوں کے خلاف یہ جراثیمی جنگ ہے، جس میں ہم کامیاب ہیں، دنیا پر حکمرانی کا خواب دیکھ رہے یہودیوں نے مسلمانوں کو اعتقادی روحانی اور اخلاقی اعتبار سے کمزور کرنے اور ان کے اجسام کو فاسد بنانے کے لیے ہی منصوبہ بند طریقے سے مختلف قسم کے ٹیکے، انجکشن اور دوائیاں ایجاد کی ہیں، یہ انہی میں سے ہے، لہٰذا اس سے افزائش نسل پر براہ راست اثر پڑتا ہے، ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھ کر قرآن وحدیث کی روشنی میں ہماری راہنمائی فرمائیں کہ ہم مخالفت کریں یا حمایت؟

المستفتی: محمد سلمان عفا اللہ عنہ مدرسہ تعلیم القرآن جانسٹھ مظفر نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: پولیو کے بارے میں سوالات آتے رہتے ہیں، اس کے بارے میں واضح کیا جاتا ہے کہ اس کے مضر پہلو اور مفید پہلو سے متعلق ہم کو نہ ہی کچھ معلومات ہیں اور نہ ہی کوئی تجربہ ہے، اس لیے ہم پولیو کے بارے میں نہ کوئی حکم شرعی لکھ سکتے ہیں، اور نہ کوئی ذمہ داری قبول کرسکتے ہیں، لہٰذا ہم اتنی بات کہہ سکتے ہیں کہ پولیو کے بارے میں کوئی معلومات نہیں رکھتے۔

عن ابن مسعودؓ قال: يأيها الناس من علم شيئا فليقل به و من لم يعلم فليقل الله أعلم، فإن من العلم أن يقول لما لا يعلم ألله أعلم. (بخاری شریف، باب قوله و ما أنا من المتكلفين، النسخة الهندية ۲/ ۷۱۰ رقم: ۴۶۲۳، ف: ۴۸۰۹، صحيح مسلم، باب الدخان، النسخة الهندية ۲/۳۷۳، بيت الأفكار، رقم: ۲۷۹۸، مشکوٰۃ شریف ۱/ ۳۷) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۸۹۹۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۷/۵/۳ھ

پوسٹ مارٹم

سوال [۱۰۳۷۱]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: پوسٹ مارٹم کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کسی مسلمان ڈاکٹر کے لیے ہندوستانی قانون کے مطابق پوسٹ مارٹم کرنے کی اجازت ہے یانہیں؟

المستفتی: محفوظ الرحمٰن بہرایچی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پوسٹ مارٹم کرنا مردہ انسان کی بے حرمتی ہے چاہے انسان مسلمان ہو یا غیر مسلم، سب کا حکم برابر ہے اور پھر پوسٹ مارٹم کرکے اس کے اعضاء کونکال لینا شریعت اسلامی میں جائز نہیں ہے، ہم ہندوستانی قانون کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ شریعت کے قانون کا احترام کرتے ہیں، اور قانون شریعت کے مطابق کسی بھی ڈاکٹر کے لیے مردہ انسان کے اعضاء کاٹ کرنکالنا جائز نہیں ہے، چاہے ڈاکٹر مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۴/ ۱۸۸، جدید مطول ۱۲/ ۴۵۳، کتاب الفتاویٰ ۳/ ۲۵۱)

﴿**قال الله تعالیٰ: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ.** [الإسراء: ۷۰]﴾

عن عائشة –رضی الله عنها– أن رسول الله ﷺ قال: كسر عظم الميت ككسره حيا. (سنن أبی داؤد، باب فی الحفاء يجد العظم هل يتنكب ذلك المكان، النسخة الهندية ۲/ ۶۵، دار السلام رقم: ۳۲۰۷، مسند أحمد بن حنبل ۶/ ۱۰۵، رقم: ۲۵۲۴۶، سنن ابن ماجه، باب فی النهی عن كسر عظام الميت، النسخة الهندية ۱/ ۱۱۶، دار السلام رقم: ۱۶۱۶)

والآدمی مكرم شرعاً و إن كان كافرا. (شامی، باب بيع الفاسد، مطلب: الآدمی مكرم شرعاً ولو كافرا، زكريا ۷/ ۲۴۵، كراچی ۵/ ۵۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۱۱/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۷ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۰۳۴)	۱۴۲۷/۶/۱۱ھ

انتقال کے بعد سینہ چیر کر مشین نکالنا

سوال [۱۰۳۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: موجودہ دور کے ترقی یافتہ طریقۂ علاج میں ہارٹ کے مریض کے سینہ میں پیس میکر نامی ایک مشین بٹھائی جاتی ہے، جو بہت قیمتی ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسے مریض کے انتقال کے بعد اس کے سینہ کو چیر کر یہ مشین نکالی جاسکتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد مصدق حسین بردوان مغربی بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر وہ مشین قیمتی ہے اور میت کے احترام کا خیال رکھتے ہوئے ضرورت کے مطابق سینہ چاک کر کے مشین نکالی جاسکتی ہے تو نکالنے کی گنجائش ہے، نیز اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ جو چیز نکالی جائے اس کی قیمت دس درہم چاندی سے زیادہ ہو۔

لو بلغ عشرة دراهم ومات يشق، وأفاد البيري عدم الخلاف في الدراهم والدنانير لعدم فسادها. (شامی، کتاب الغصب، زکریا ۹/ ۲۸۱، کراچی ۱۹۳/۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ رجب المرجب ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۴۰۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۸/۱۱ھ

کیا سانپ کے کاٹنے کی وجہ سے آدمی مرتا نہیں ہے؟

سوال [۱۰۳۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: لوگوں کا خیال ہے کہ اگر کسی کے سانپ کاٹ لے تو وہ لوگوں کی نظر میں مر جاتا ہے، حتی کہ ڈاکٹر وغیرہ بھی اس کو مرا ہوا قرار دیتے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ مرتا نہیں، لہٰذا جب لوگ اس کو دفن کر کے چلے آتے ہیں تو سپیرے رات میں اس کو نکال لیتے ہیں، اور اس کو

زندہ کر لیتے ہیں، پھر وہ سپیروں کے جادو کردینے کی وجہ سے گھر والوں سے متنفر ہو جاتا ہے، اوران کے پاس نہیں آتا، اور سپیرے اسے اپنے پاس سے جدا نہیں ہونے دیتے، آیا یہ درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالسمیع نجیب آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سانپ کے کاٹنے کی وجہ سے بالکل نہ مرنے کی بات صحیح نہیں ہے، بلکہ کبھی مرجاتا ہے اور کبھی زندہ بھی رہ جاتا ہے، اگر زندہ رہ کر بے ہوش ہو جاتا ہے تو ماہر طبیب اس کو اچھی طرح اپنے آلات کے ذریعہ سے جان سکتے ہیں، اور دفن کے بعد سپیرے کا قبر سے نکال کر زندہ کرنے کی بات منگھڑت ہے، اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، یہ محض کمانے کا حیلہ ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۷۷۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۱۲/۲۶ھ

عذر کی بنا پر کان میں سوراخ کرانا

سوال [۱۰۳۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: شریعت کی رو سے مرد کے لیے جائز نہیں ہے کہ کان میں سوراخ وغیرہ کھلوا لے، اگر کسی عذر کی بنا پر کان میں سوراخ کھلوائے، مثلاً مشہور ہے کہ اگر کسی کے خصیہ میں پانی اتر آئے اور وہ کھینچ کر لمبا ہو جائے تو کان میں ایک رگ ہوتی ہے اس میں سوراخ کھولنے سے یہ مرض دور ہو جاتا ہے، لہٰذا کان میں سوراخ کھول دیتے ہیں، کچھ دن تک تو اس میں تار پڑا رہتا ہے، اس کے بعد سینک ڈال دیتے ہیں جیسا کہ عورتیں کرتی ہیں تو کیا یہ امر جائز ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر واقعی کان میں سوراخ کرنے سے مذکورہ

مرض دور ہو جاتا ہے اوراس مرض کے لیےکوئی دوسرا علاج بھی کامیاب نہیں ہے تو ایسی صورت میں بدرجہ مجبوری سوراخ کرنے کی گنجائش ہے،مگراس میں عورتوں کی طرح تار یا سینک وغیرہ ڈالنا ہرگز جائزنہ ہوگا۔

ثقب الأذن لتعليق القرط وهو من زينة النساء، فلا يحل للذكور.

(شامی، کتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره زكريا ٩/ ٦٠٢، كراچی ٦/ ٤٢٠)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍صفر المظفر ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر:۳۲/ ۴۳۵۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۲/۲۶ھ

بلڈ پریشر کنٹرول کرنے کے لیے ہاتھ میں چین پہننا

سوال [۱۰۳۷۵]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بلڈ پریشر کنٹرول کرنے کے لیے ہاتھ میں چین کا پہننا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد اقبال شمسی طویلہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بلڈ پریشر کنٹرول کرنے کے لیے یا کسی اور بیماری کے علاج کے لیے سونے چاندی کے علاوہ دیگر دھات کی چین کا استعمال درست ہے۔

(مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۴/ ۴۲۱، ڈابھیل ۱۹/ ۶۳ ۳، رحیمیہ قدیم ۶/ ۲۷۹، جدید زکریا ۱۰/ ۱۵۷)

بقي الكلام في بند الساعة الذي تربط به ويعلقه الرجل بزر ثوبه، والظاهر أنه كبند السبحة الذي تربط به. (شامی، کتاب الحظر الإباحة، باب الاستبراء وغيره زكريا ٩/ ٥١٠، كراچی ٦/ ٣٥٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍ربیع الاول ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر:۳۵/ ۱۲۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۳/۱۸ھ

چہرے پر دانوں کے علاج کے لیے تانبے کا چھلہ پہننا

سوال [۱۰۳۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: چہرے پر دانوں کے علاج کے لیے تانبے کا چھلہ پہننا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: اقبال شمسی ہاؤس طویلہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تانبے کا چھلہ پہننے سے چہرہ پر دانے نہیں ہوتے تو اس کی شرعاً کوئی اصل نہیں ہے، اور اگر واقعی کسی حکیم یا طبیب نے بطور علاج دانوں کے ختم کرنے کے لیے تانبہ کا چھلہ بتایا ہو اور تجربہ سے اس کا فائدہ ظاہر ہو چکا ہو تو ایسی صورت میں بطور علاج تانبہ کا چھلہ پہننے کی گنجائش ہے۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ۱۴/۴۲۱، ڈابھیل ۱۹/۳۶۳، رحیمیہ قدیم ۶/۲۷۹، جدید زکریا ۱۰/۱۵۷)

بقی الکلام فی بند الساعة الذی تربط به ویعلقه الرجل بزر ثوبه، والظاهر أنه کبند السبحة الذی تربط به. (شامی، کتاب الحظر الإباحة، باب الاستبراء وغیره زکریا ۹/۵۱۰، کراچی ۶/۳۵۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ربیع الاول ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۷۱۲۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۳/۱۸ھ

ہاتھی کا دانت، گٹھلی، لکڑی، دھات کے چھلے وغیرہ بطور علاج استعمال کرنا

سوال [۱۰۳۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کسی بیماری کی وجہ سے کوئی کسی چیز کی گٹھلی یا خشک پھل لکڑی یا کسی قسم کا پتھر ہاتھ پیر اور گلے میں ڈال سکتے ہیں، بہت لوگوں کو ہاتھی کا دانت جیسی چیز، پیروں میں باندھے ہوئے دیکھا گیا ہے، اور مختلف قسم کے دھاتوں سے بنی انگوٹھی چھلہ کسی بیماری، بواسیر وغیرہ کے لیے ہاتھوں میں ڈال سکتے ہیں یا نہیں؟ شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ اشیاء کوامراض کی وجہ سے دفع امراض کے لیے استعمال کرنے کا تعلق کسی فقہی مسئلے سے نہیں ہے، بلکہ فن طب اور تجربہ سے اس کا تعلق ہے، اگر تجربہ سے ان اشیاء کا استعمال مفید ثابت ہوتو ضرورتاً جائز اور درست ہے۔(مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۴/ ۴۲۱، ڈابھیل ۱۹/ ۳۶۳)

بقی الکلام فی بند الساعة الذی تربط به ویعلقه الرجل بزر ثوبه، والظاهر أنه کبند السبحة الذی تربط به. (شامی، کتاب الحظر الإباحة، باب الاستبراء وغیره زکریا ۹/ ۵۱۰، کراچی ۶/ ۳۵۴) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱/ ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۳۹۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/ ۴/ ۱۴۱۴ھ

ایک ساتھ کتنے کیلے کھائیں؟

سوال [۱۰۳۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک صاحب آنمحترم کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ مفتی شبیر صاحب نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب کیلے کھائیں تو ایک نہ کھائیں بلکہ دو کھائیں، معلوم یہ کرنا ہے کہ آنجناب کا یہ فرمانا ازروئے طب ہے یا شرعاً کوئی ہدایت ہے؟

المستفتی: عبدالرشید قاسمی، سیڈھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: احقر نے دو کیلے کھانے کی بات اور خود احقر کو یاد بھی ہے کہ کئی جگہ کیلے کھاتے وقت کہا ہے، یہ شریعت کے نقطہ نظر سے نہیں ہے، بلکہ فن طب اور حکیموں کے مشورہ سے کہا ہے کہ ایک کیلا قبض کرتا ہے اور دو کیلے قبض کشا ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ شعبان المعظم ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۳۹۳)

۲ باب أعضاء الإنسان وأجزائه

بلڈڈونیشن کی شرعی حیثیت

سوال [۱۰۳۷۹]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کا خون اپنے جسم میں بطورضرورت کے داخل کراسکتا ہے یانہیں؟ کافی عرصہ سے یہ سلسلہ چل رہا ہے کہ ڈاکٹر صاحبان بیمار مسلمان کے اندرخون کی شدید کمی ہونے کی وجہ سے یا آپریشن کرنے کی وجہ سے کسی دوسرے مسلمان رشتہ دار کا خون بیمار مسلمان کے جسم میں داخل کرتے ہیں، کیا یہ جائز ہے؟ جبکہ مسلمان کا خون اللہ کے نزدیک محترم ومعظم ہے، اور پھر جسم سے شرعی مقدار میں خون نکلنے سے وضوٹوٹ جاتا ہے،اوروہ حرام ہوجاتا ہے، کیادورِصحابہ میں کسی صحابی نے اپنے جسم کاخون یا کوئی دوسرا عضوبطور خدمت خلق کے کسی دوسرے مسلمان کوعطیہ میں پیش کیاہے، میرے دوست کا آپریشن ہونا ہے، اس کوخون کی سخت ضرورت ہے، کیاوہ کسی کافرومشرک کا خون اپنے جسم میں چڑھواسکتا ہے؟

المستفتی: حافظ محمد قاسم مرادآبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: عام حالات میں جب کوئی اضطراری صورت نہ ہوتو آیت قرآنی ''حرمت علیکم المیتۃ والدم'' کے پیش نظرایک انسان کا خون دوسرے کے بدن میں داخل کرنا حرام ہوگا، البتہ جب کسی مریض کی ہلاکت کا خطرہ ہواورخون دینے سے اس کی جان بچنے کاظن غالب ہوتوایسی اضطراری حالت میں بقدرضرورت ''الضرورات تبيح المحظورات'' (قواعد الفقہ اشرفی ص:۸۹، رقم:۷۰) کے پیش نظرخون دینا جائز ہوگا۔

(مستفاد: ایضاح النوادر ص:۱۱۳، رحیمیہ قدیم ۱۰/ ۲۹۶، جدید ۱۰/ ۱۷۴)

يجوز للعليل شرب الدم والبول وأكل الميتة للتداوي إذا أخبره

طبيب مسلم أن شفاءه فيه، ولم يجد من المباح ما يقوم مقامه. (هنديه، كتاب الكراهية، الباب الثامن عشر في التداوي والمعالجات، زكريا قديم ٥/٣٥٥، جديد ٥/٤١٠، شامي زكريا ٧/٤٨٠، ٩/٥٥٨، كراچی ٥/٢٢٨، ٦/٣٨٩)

نیز کافر ومشرک کا خون بھی ضرورت کے تحت مسلمان اپنے بدن میں داخل کراسکتا ہے اس سے اس کا دل اور بدن کافر کا دل اور بدن نہیں ہوگا۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ۱۵/ ۳۴۱، ڈابھیل ۱۸/ ۳۳۱)

والآدمي مكرم شرعاً و إن كان كافرا. (شامي، باب بيع الفاسد، مطلب: الآدمي مكرم شرعاً ولو كافرا، زكريا ٧/٢٤٥، كراچی ٥/٥٨)

اگر چہ دورِ صحابہ میں اعضاء کی پیوند کاری کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا جس کی بنا پر احادیث شریفہ میں اس کی حلت وحرمت موجود نہیں ہے، اور صحابہ میں سے کسی کا اپنا عضو اور خون دینا ثابت نہیں ہے، اور اس دور میں خون چڑھانے کے آلات بھی موجود نہ تھے، اب جبکہ آلات فراہم ہو گئے تو چڑھانے میں کوئی تردد نہیں، لیکن اتنی بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ خون دینا جائز ہے، اعضاء دینا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ خون اور اعضاء دونوں الگ الگ حکم رکھتے ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍صفر المظفر ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۷۲۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۲/۲۰ھ

مسلمان مریض کو خون دینا کیسا ہے؟

سوال [۱۰۳۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص مسلمان بہت زیادہ بیمار ہے، حالت بہت زیادہ نازک ہے، کیا ڈاکٹروں کے مشورہ سے کسی دوسرے مسلمان کے جسم کا خون اس مسلمان مریض کو دے سکتے ہیں، یا نہیں، اب ایسی حالت میں کیا صورت نکل سکتی ہے؟

نوٹ: چند علماء کرام ومفتیان عظام کی یہ رائے ہے کہ یہ جائز نہیں ہے، اب آپ

قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل ومفصل جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: نجیب الرحمٰن بھاگلپوری بروالان مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسی شدید ضرورت کی بنا پر ایک مسلمان کا خون دوسرے مسلمان کو دینا شرعاً جائز اور درست ہے۔ (مستفاد: جواہر الفقہ قدیم ۲/۳۸، جدید زکریا ۷/۴۴)

یجوز للعلیل شرب الدم والبول وأکل المیتة للتداوی إذا أخبره طبیب مسلم أن شفاءه فیه، ولم یجد من المباح ما یقوم مقامه. (هندیه، کتاب الکراهیة، الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات، زکریا قدیم ۵/۳۵۵، جدید ۵/۴۱۰، شامی زکریا ۷/۴۸۰، ۹/۵۵۸، کراچی ۵/۲۲۸، ۶/۳۸۹)

اور اگر مسلمان کا خون کسی طرح حاصل نہ ہو سکے تو ضرورت شدیدہ کی بنا پر غیر مسلم کا خون بھی جائز ہے۔ (مستفاد: جواہر الفقہ قدیم ۲/۴۰، جدید زکریا ۷/۴۹)

والآدمی مکرم شرعاً و إن کان کافرا. (شامی، باب بیع الفاسد، مطلب: الآدمی مکرم شرعاً ولو کافرا، زکریا ۷/۲۴۵، کراچی ۵/۵۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ذیقعدہ ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/۲۹۰۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۲۷/۱۱/۱۴۱۲ھ

بلڈ بینک کا حکم

سوال [۱۰۳۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص مریضوں کی طبی خدمت کرتا ہے، ان متنوع خدمات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ کیمپ لگاتا ہے جس میں ہندو مسلم ہر طرح کے لوگ آکر بخوشی خون دیتے ہیں، پھر شخص مذکور خون کی بوتلیں ''بلڈ بینک'' میں جمع کر دیتا ہے، ان صورتوں میں معاوضہ کا کوئی تصور نہیں ہے، صرف اتنا ہے کہ ''بلڈ بینک'' خادم کو ایک کارڈ دیتی ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ

کسی بھی قسم کے مرض کا حامل شخص جسے خون کی اشد ضرورت پڑتی ہے اسی خادم مذکور سے رابطہ کرلیتا ہے، اور وہ کارڈ دے کر بینک میں بھیج دیتا ہے، بینک والے اس کے خون کی جانچ پڑتال کے بعد مطلوبہ خون اسے چڑھا دیتے ہیں، اس درمیان جو محنتیں انہوں نے کررکھی ہیں، مثلاً خون کی بوتلیں فریج میں رکھنا، بلڈ ٹسٹ کرنا، چڑھانا، بجلی بل، وغیرہ کا خرچہ بینک ان بوتلوں کے گاہکوں سے وصول کرتا ہے، ایک خون کی بوتل کے ۳۵۰؍ روپئے لیتا ہے، جو در حقیقت ان کی اپنی محنتوں اور خرچوں کا بدل ہوتا ہے، خون کا معاوضہ نہیں ہوتا ہے، لہٰذا اب آپ سے چند صورتیں، دریافت طلب ہیں:

(۱) خون کا ذخیرہ کرنے کے لیے کیمپ لگانا درست ہے؟

(۲) بلاتفریق مذہب ہر فرد بشر کا اس امر میں دلچسپی لینا درست ہے؟

(۳) ہمدردی کے عنوان سے گلی گلی اور محلّہ محلّہ لوگوں کو اس امر کی انجام دہی کے لیے اکسانا درست ہے؟

(۴) اگر درست نہیں ہے تو پھر انسانوں کی اس خونی ضرورت کو بروئے کار لانے کے لیے دوسری کون سی شرعی شکل اختیار کی جائے؟

المستفتی: محمد رضوان قاسمی سورت

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خون کی ضرورت کے پیش نظر باقاعدہ کیمپ لگا کر خون کے عطیات جمع کرنا اصولی طور پر جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ ضرورت اس درجہ کی نہیں ہے کہ کسی ناجائز امر کو جائز قرار دیا جائے، لہٰذا مذکورہ ضرورت کو پورا کرنے کے لیے یہ صورت اپنانی چاہیے، کہ جو لوگ کسی بھی ضرورت مند کے لیے خون دینے کی پیشکش کریں، ان کا نام و پتہ اور فون نمبر اپنے دفتر میں نوٹ کر کے رکھیں اور جب کسی مسلمان کو خون کی فوری طور پر سخت ضرورت ہو تو مذکورہ افراد سے رابطہ کر کے ان کو ہسپتال بھیج کر ان سے خون دلوا دیا جائے، تو اس صورت کی گنجائش ہوگی۔ حضرت مفتی نظام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حفظ ما تقدم کے طور پر بلڈ بینک میں رضا کارانہ طور پر خون دینے کی اجازت لکھی ہے، بشرطیکہ بوقت

ضرورت اس کو بلڈ بینک سے اپنے گروپ کا خون مفت میں ملتا ہو۔ (مستفاد: محمودیہ ڈابھیل ۱۶/ ۸۷-۷۹، ایضاح النوادر ص: ۱۳۷، کتاب الفتاویٰ ۶/ ۲۱۳، فقہی مقالات ۴/ ۱۴۴، ۱۴۳)

لم يبح الإرضاع بعد مدته لأنه جزء آدمي والانتفاع به بغير ضرورة حرام. (در مختار مع الشامي، كتاب النكاح، باب الرضاع زكريا ٤/ ٣٩٧، كراچی ٣/ ٢١١)

حرمة الانتفاع بأجزاء الآدمي لكرامته. (هدايه اشرفی ديو بند ١/ ٤١، هنديه زكريا قديم ٥/ ٣٥٤، جديد زكريا ٥/ ٤٠٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۹۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۶/ ۴/ ۱۴۳۵ھ

انسانی اعضاء کا قیمتاً یا ہدیتاً دینا

سوال [۱۰۳۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا کسی انسان کو اپنے اعضاء میں سے کوئی عضو قیمتاً یا ہدیتاً دینے کا حق ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: انسان اپنے اعضاء کا مالک نہیں ہے، اس لیے کسی بھی انسان کو اپنے اعضاء میں سے کوئی عضو قیمتاً یا ہدیتاً دینے کا حق نہیں ہے، نہ زندگی میں نہ موت کے بعد۔ (ایضاح النوادر ص: ۱۱۲، جواہر الفقہ جدید ۷/ ۶۰، کتاب الفتاویٰ ۵/ ۲۶۹، فتاویٰ محمودیہ ڈابھیل ۱۸/ ۳۳۵، میرٹھ ۲۷/ ۳۲۵)

الآدمي محترم بعد موته على ما كان عليه في حياته، فكما لايجوز التداوي بشيئ من الآدمي الحي إكراما، فكذلك لايجوز التداوي بعظم الميت، قال رسول الله ﷺ: كسر عظم الميت ككسر عظم الحي. (شرح سير الكبير ١/ ٨٩)

لايجوز بيع شعور الإنسان ولا الانتفاع به لأن الآدمي مكرم لا مبتذل فلا يجوز أن يكون شيئ من أجزائه مهانا مبتذلا. (هـدايه، باب البيع الفاسد، اشرفی ديو بند ٣/ ٥٥،

البحر الرائق کوئٹه ٦/٨١، زکریا ٦/١٣٣، فتح القدیر کوئٹه ٦/٦٣، زکریا ٦/٣٩٠-٣٩١)

عن عائشةؓ أن رسول الله ﷺ قال: كسر عظم الميت ككسره حيا.

(أبوداؤد، الجنائز، باب فی الحفار، يجد العظم هل ينتكب ذلك المكان، النسخة الهندية ٢/٤٥٨، دار السلام رقم: ٣٢٠٧)

مضطر لم يجد ميتة وخاف الهلاک فقال له رجل: اقطع يدى وكلها أو قال: اقطع منى قطيعة وكلها لا يسعه أن يفعل ذلک، ولا يصح أمره به كما لا يسع للمضطر أن يقطع قطعة من نفسه فيأكل. (هندیه، کتاب الکراهية، الباب الحادی عشر زکریا قديم ٥/٣٣٨، جديد ٥/٣٩١، خانية، جديد زکریا ٣/٢٩٢، وعلی هامش الهندية ٣/٤٠٤، بزازيه جديد زکریا ٣/٢٠٧، وعلی هامش الهندية ٦/٣٦٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۱۴۳۴/۱۲/۲ھ

(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۲۴)

مرنے کے بعد اپنے اعضاء کی عوض یا بلاعوض اسپتال میں دینے کی وصیت

سوال [۱۰۳۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ انسان اپنی زندگی میں اپنی آنکھیں دوسرے کے لیے وقف کرسکتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ اکثر حادثات اور بیماری لاحق ہو جانے کی وجہ سے آنکھوں کی روشنی چلی جاتی ہے، ابھی دنیا میں روشنی واپس لانے والی کوئی دوائی دستیاب نہیں ہوئی ہے، بلکہ دنیا کے اکثر ملکوں بشمول عرب ممالک وہندوستان میں انسان کے مردہ جسم سے آنکھیں حاصل کر لی جاتی ہیں، اور ان آنکھوں میں سے ڈاکٹر پتلی علیحدہ کر کے بذریعہ آپریشن دوسرے زندہ انسان کے جسم میں لگا دیتے ہیں، یہ حکم ربی تو ہے کہ انسان کو روشنی واپس مل جاتی ہے، جیسا کہ میری داہنی آنکھ میں بذریعہ آپریشن پتلی لگائی گئی ہے، اور آہستہ آہستہ الحمد للہ روشنی واپس آرہی ہے، اگر انسان کی بھلائی اور بطور ثواب کے زید، عمر، بکر کوئی بھی اپنی زندگی میں ہی اپنی آنکھوں کو بینک میں جمع

کردے بعد اپنے اعزہ واحباب کو مطلع کردے کہ میں نے مرنے کے بعد اپنی دونوں آنکھیں فلاں آنکھ بینک یا ڈاکٹر کو وقف کردیں ہیں، میری موت کے واقع ہوجانے کے بعد میری موت کی اطلاع متعلقہ ڈاکٹر کو کردینا تا کہ میرے مردہ جسم سے ڈاکٹر آنکھ نکال کر دوسرے انسان کے لگادے، ایسا کرنے کے لیے شرعاً کیا حکم ہے؟

المستفتی: حافظ ظہیر الحق پیرزادہ حیات نگر گلی ۲؍مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حق تعالیٰ شانہ نے انسان کو اپنی قدرت کاملہ کا خاص مظہر بنایا ہے، اوراس کے بدن میں بولنے دیکھنے یا سننے یا سمجھنے وغیرہ کے لیے نازک خود کار مشین لگادی ہیں، گویا انسان ایک چلتی پھرتی فیکٹری ہے، جس میں سینکڑوں نازک خودکار مشین کام کرتی رہتی ہیں، یہ سب مشینیں خالق کائنات نے انسان کو ودیعت وامانت کے طور پر دی ہیں، انسان کو ان چیزوں کا مالک نہیں بنایا ہے، اسی وجہ سے سے جس طرح خودکشی کرنا حرام ہے اورسخت قسم کی خدائی وعید کا مستحق ہوتا ہے، اسی طرح اپنا کوئی عضو کسی دوسرے کو رضا کارانہ طور پر بلا معاوضہ یا بالمعاوضہ لے کر دینا حرام اور مستحق وعید ہے جب انسان خود اپنے اعضاء کا شرعاً مالک نہیں ہوتا تو مالکانہ طور پر اپنے اعضاء کو نہ فروخت کرسکتا ہے نہ وقف کرسکتا ہے، نہ کسی کے لیے وصیت کرسکتا ہے، اس لیے سوالنامہ میں درج شدہ صورت ناجائز اورحرام اور موجب وعید ہے، بظاہر نفع کا معاملہ ہے، مگر اس کا نقصان پوری نوع انسانی پر پہنچ سکتا ہے۔

﴿**قوله تعالیٰ: وَعَسَى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ** . [البقرة: ۲۱۶] ﴾

﴿**وقوله تعالیٰ: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ** . [الإسراء: ۷۰] ﴾

عن عائشةؓ أن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم قال: كسر عظم الميت ككسره حيا.

(أبوداؤد، الجنائز، باب في الحفار، يجد العظم هل ينتكب ذٰلك المكان، النسخة الهندية ۲/۴۵۸، دار السلام رقم: ۳۲۰۷)

لو رأى مضطرا فأراد أن يقطع يده ويعطيه لتناوله لا يحل له ذٰلک. (بزازيه زكريا جديد ۳/۶۶، وعلى هامش الهندية ۶/۱۳۲، جواهر الفقه قديم ۲/۴۳، جديد زكريا ۷/۶۰)

وفـي الهـندية: الانتفاع بأجزاء الآدمي لم يجز. (فتاویٰ عالمگیری، الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات زکریا قدیم ٥/٣٥٤، جدید ٥/٤٠٩، هدایه اشرفی ٤١/١)

وفي الشامي: والآدمي مكرم شرعاً وإن كان كافراً فإيراد العقد عليه وابتذاله به وإلحاقه بالجمادات إذلال له وهو غير جائز. (شامی، باب البیع، مطلب: الآدمی مکرم شرعاً ولو کافراً زکریا ٢٤٥/٧، کراچی ٥/٥٨، کوئٹه ١٤٥/٤)

لہٰذا اوپر مذکورہ دلائل کی بناء پر سوالنامہ میں درج شدہ صورت اور معاملہ ہرگز جائز نہیں ہے۔ (تفصیل: جواہر الفقہ قدیم ص:۴۳، جدید ٦٠/٧) مطالعہ فرمائیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/ جمادی الاول ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۶۷۳/۲۳)

بیمار کو گردہ دینا

سوال [۱۰۳۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اچانک زید کے گردے نوے فیصد خراب ہوگئے، ماہر امراض گردہ ڈاکٹروں نے اس کا علاج یہ بتایا ہے کہ زید کو اپنے کسی عزیز کا گردہ لے کر اپنے جسم میں پیوندکاری کرانی ضروری ہے، بصورت دیگر عدم تصفیہ دم ڈایالیسس کی وجہ سے زید کی زندگی ہمیشہ خطرہ میں رہے گی، اور ڈایالیسس کی وجہ سے ادویات کا ماہانہ خرچ ۸۰/ ہزار روپئے ہے، جو کہ تادم آخر کرانا، بہت گراں ہے تو کیا اپنی زندگی کے تحفظ کے لیے زید پیوندکاری کرا سکتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ نہ کرانے کی صورت میں یا تو ہر ہفتہ اپنی ڈایالیسس کراتا رہے یا پھر رفتہ رفتہ وہ موت کے قریب جا پہنچے گا؟

المستفتی: محمد انور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: دوسرے عزیز کے لیے اپنا گردہ نکلوا کر دینا جائز نہیں ہے، البتہ اضطراری حالت میں ہسپتال میں کسی کا گردہ پہلے سے رکھا ہوا مل جائے تو اس

کو لگانے کی گنجائش ہے۔

﴿قال الله تعالیٰ: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ. [الإسراء: ٧٠]﴾

﴿قال الله تعالیٰ: وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ. [الأنعام: ١١٩]﴾ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ ذیقعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۲۹۲/۴۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۱۱/۱۱ھ

گردوں کی تبدیلی اور ہبہ کا حکم

سوال [۱۰۳۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج کل لوگوں کی ایک بڑی تعداد گردے کے مرض کا شکار ہوتی ہے اور بعضوں کی حالت ایسی ہوجاتی ہے کہ ماہر ڈاکٹروں کا مشورہ ہوتا ہے کہ اگر ان کے گردے نہ بدلے جائیں، تو ہلاکت یقینی ہے، ایسی مجبوری کی حالت میں کیا کیا جائے۔

(۱) گردوں کی تبدیلی حالت اضطراری میں درست ہے یا نہیں؟ ایسے مریضوں کی اعانت کے خاطر دوسرے لوگ اپنا گردہ اپنی رضا سے ہبہ کرسکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: توصیف احمد قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شریعت کے اندر انسان کے کسی عضو سے انتفاع جائز نہیں ہے، لہٰذا ایک انسان کا گردہ دوسرے کے اندر لگانا اصولی طور پر جائز نہیں۔

لیکن میڈیکل سروس کے تجربہ سے پتہ چلا ہے کہ ایک گردہ کے ذریعہ سے انسان صحیح سلامت اور صحت مندی کے ساتھ زندگی گذار سکتا ہے، اس لیے اضطراری حالت میں اگر کوئی شخص اپنے کسی عزیز یا دوست کو اس کی جان بچانے کے لیے ایک گردہ کا عطیہ کرتا ہے تو اضطراری حالت میں اس کی گنجائش ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ص: ۱۱۳، رحیمیہ قدیم ۶/ ۲۸۵، جدید زکریا ۱۰/ ۱۶۹)

الضرورات تبيح المحظورات، الضرورات تتقدر بقدر الضرورة.

الانتفاع بأجزاء الآدمی لم يجز، قيل للنجاسة، وقيل للكرامة هو الصحيح كذا فی جواهر الأخلاطی. (هنديه، كتاب الكراهية، الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات، زكريا قديم ٥/٣٥٤، جديد ٥/٤٠٩)

والآدمی مكرم شرعاً و إن كان كافرا. (شامی، باب بيع الفاسد، مطلب: الآدمی مكرم شرعاً ولو كافرا، زكريا ٧/٢٤٥، كراچی ٥/٥٨)

قوله و إن حرم استعماله أی استعمال جلد و استعمال الآدمی بمعنی أجزائه. (شامی، زكريا ١/٣٥٦، كراچی ١/٢٠٤)

مضطر لم يجد ميتا و خاف الهلاک فقال له رجل اقطع يدی و كلها أو قال اقطع منی قطعة فكلها لايسعه أن يفعل ذلک (إلی قوله) لا يسع للمضطر أن يقطع قطعة من لحم نفسه فيأكل. (فتاویٰ قاضيخان جديد زكريا ٣/٢٩٢، علی هامش الهندية زكريا ٣/٤٠٤)، هنديه زكريا قديم ٥/٣٣٨، جديد ٥/٣٩١، بزازيه جديد زكريا ٣/٢٠٧، وعلی هامش الهندية زكريا ٦/٣٦٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ ر رجب المرجب ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۸۹۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/ ۷/ ۱۴۲۶ھ

اعضاءواجزاءانسانی کا عطیہ

مقالہ خلاصہ

(۱) اضطراری حالات میں کسی انسان کا دوسرے انسان کو خون کا عطیہ دینا بالاتفاق جائز ہے۔

(۲) اگر اضطراری حالت نہ ہو؛ لیکن ضرورت کا دوسرا درجہ ہے، یعنی ضرورت بمعنی حاجت کے درجہ میں ہے، تو ایسی صورت میں خون کا عطیہ دینا تو جائز ہے؛ لیکن ضرورت مند شخص کا متعین اور مشخص ہونا بھی لازم ہے، ایسے شخص کو ایمر جنسی طور پر خون کا عطیہ کرنا جائز ہے۔

(۳) اس تصور کے ساتھ بلڈ بینک قائم کرنا اور اس میں رضا کارانہ طور پر خون کا عطیہ دینا کہ برادرانِ وطن پر اس کے ذریعہ سے اچھا اثر پڑے گا جواز کے دائرہ میں نہیں آتا؛ اس لئے کہ برادران وطن پر اچھا اثر مرتب کرنا ضرورت کے پہلے اور دوسرے درجہ میں داخل نہیں ہے۔

(۴) اگر ایمر جنسی طور پر کسی مریض کو خون کی سخت ضرورت ہو اور اس کا خون ایسے گروپ سے تعلق رکھتا ہو جو بمشکل ملتا ہو اور جس شخص میں اس گروپ کا خون موجود ہو، اس کا اپنا خون دینا اس کے اوپر واجب نہیں ہے اور نہ ہی مستحب ہے؛ بلکہ صرف اباحت اور جواز کے دائرہ میں آسکتا ہے۔

(۵) جگر کا عطیہ دینا انتہائی حساس مسئلہ ہے اور انسانی اعضاء میں جگر اہم ترین اور مرکزی عضو ہے، اس کے بغیر صرف انسانی تصویر ہوسکتی ہے، وہ انسان نہیں ہوسکتا؛ اس لئے مرنے والے شخص کا اپنا جگر دینے کی وصیت کرنا یا مرنے کے بعد وارثین کی اجازت سے جگر کا عطیہ کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

(۶) آنکھوں کا عطیہ کرنا بھی شرعی طور پر جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ کوئی بھی سرمایہ دار اپنی آنکھوں کا عطیہ نہیں کرے گا؛ بلکہ صرف غریب اور نادار انسان روزگار کی مجبوری میں آنکھوں کا عطیہ کرنے کے لئے تیار ہوسکتا ہے، ایسے حالات میں سرمایہ داروں کی دو آنکھیں ہوں گی اور غریبوں کی ایک آنکھ اور شریعت اس کی اجازت نہیں دے سکتی۔

(۷) دودھ بینک اور اس کا عطیہ یہ اس لئے جائز نہیں ہے کہ حرمت رضاعت کا مسئلہ شریعت میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اور دودھ بینک میں دودھ جمع کرنے کی صورت میں قانون شریعت کے ڈھانچہ کی دیوار ہی باقی نہ رہے گی۔ اور حرمت رضاعت کا مسئلہ جڑ سے ختم ہوجائے گا؛ اس لئے کہ رضاعی بھائی، رضائی ماں، رضاعی باپ، رضاعی چچا وغیرہ کی تعیین لازم ہے، تاکہ حرمت رضاعت کی رعایت کی جاسکے۔ اور دودھ بینک کی شکل میں یہ سارے رشتے ختم ہوجائیں گے۔

اعضاءواجزاءانسانی کاعطیہ

سوال [۱۰۳۸۶]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (ا) کیاایک مسلمان دوسرے مسلمان یاغیر مسلم کواس کی ضرورت کی بنا پرخون کاعطیہ دے سکتاہے؟

(۱۰۳۸۷) قدرتی اور غیر معمولی حادثات میں خون کی بہت زیادہ ضرورت پڑتی ہے؛ کیوں کہ ایک ہی وقت میں بہت سارے زخمیوں کی جان بچانے کی کوشش کی جاتی ہے اور پھرایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی مریض کوجس گروپ کا خون مطلوب ہوفوری طور پراس گروپ کا خون مہیانہیں ہوتا؛ چنانچہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ''بلڈ بینک'' قائم ہیں، جہاں لوگ رضا کارانہ طور پرخون کا عطیہ دیتے ہیں اور ایسے بینک بھی عام طور پرخون کی قیمت وصول نہیں کرتے، مفت خون فراہم کرتے ہیں؛ البتہ چاہتے ہیں کہ اس کے بدلے میں متاثر شخص کے متعلقین بھی خون کا عطیہ دیں جو دوسرے مریض کو کام میں آئے، کیا ایسے ''بلڈ بینکوں''میں مسلمان خون کاعطیہ پیش کرسکتے ہیں؟

(۱۰۳۸۸) خدمت خلق کی مختلف تنظیمیں وقتاً فوقتاً ''بلڈ کیمپ'' قائم کرتی ہیں: تاکہ ایمرجنسی حالات کے لئے خون کا عطیہ حاصل کیا جائے اوراسے ''بلڈ بینک'' میں محفوظ کرادیتی ہیں۔آج کل بعض مسلم تنظیمیں بھی ایسے کیمپ قائم کررہی ہیں، خاص طور پر بڑے شہروں میں رسول اللہ ﷺ کی تاریخ ولادت میں ایسے کیمپ لگایا کرتے ہیں اور برادرانِ وطن پراس کا اچھا اثر مرتب ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے پاس صرف لینے والا ہاتھ نہیں ہے، دینے والا ہاتھ بھی ہے، تو کیا مسلمانوں کے لئے ایسے رضا کارانہ بلڈ بینک کا قائم کرنا جائز ہوگا؟

(۱۰۳۸۹) خون کےعطیہ کےسلسلہ میں ایک قابل غور پہلو یہ بھی ہے کہ اگر کسی مریض کو خون کی شدید ضرورت ہو؛ لیکن اس کا خون ایسے نادر گروپ سے تعلق رکھتا ہو، جو بمشکل ہی ملتا ہواور اسی گروپ کےخون کاحامل کوئی شخص موجود ہوتواس کا خون دیناواجب ہوگایامستحب یاصرف جائز؟

المستفتی: اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالات کے جوابات سے قبل تین باتیں بطور تمہید سمجھنا ضروری ہے:

(۱) ''ماکول اللحم حیوانات'' کے اعضاء سے علاج

اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوق میں انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اور انسان جس طرح تمام مخلوق میں سب سے زیادہ اشرف مخلوق ہے، اسی طرح انسان کا ایک ایک عضو بھی انتہائی محترم ہے؛ اس لئے شریعت نے انسانی اعضاء اور اجزاء کی حفاظت کے لئے وسیع ترین انتظام فرمایا ہے۔ اور انسانی اجزاء اور اعضاء کی حفاظت کے لئے دیگر تمام مخلوق کو انسان کے استعمال کے لئے خادم اور آلہ بنایا ہے، یہاں تک کہ سانپ، بچھو کو بھی انسانی اعضاء کی حفاظت کے لئے بطور علاج استعمال کی گنجائش دی گئی ہے، اسی نقطہ نظر سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مقدس میں ارشاد فرمایا ہے: ''هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِيْ الْاَرْضِ جَمِيْعًا'' [سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۹] ''اللہ تعالیٰ وہ پاک ذات ہے جس نے روئے زمین کی ہر چیز کو تمہاری منفعت کے لئے پیدا فرمایا''۔ لہٰذا تمام نباتات اور جمادات کو اعضائے انسانی اور اجزائے انسانی کی افزائش اور صحت کے لئے بطور علاج استعمال میں لانا بلاشبہ جائز ہے۔

اب رہے حیوانات، تو حیوانات میں سے ماکول اللحم اور حلال جانوروں کو انسانی اعضاء کی افزائش کی غرض سے استعمال کرنا بلا تکلف جائز ہے اور جن اشیاء کو انسانی اعضاء کی افزائش کے لئے بطور خوراک استعمال کرنا جائز ہے، ان کو بطور علاج استعمال کرنا بھی بلاتردد جائز ہے۔

اب رہا ان ماکول اللحم جانوروں کے فضلات کا استعمال، تو ان جانوروں کے فضلات میں سے دودھ کا استعمال بھی بالاتفاق جائز ہے؛ لیکن انسانی اعضاء کی منفعت کے لئے بطور علاج پیشاب کا استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلے میں حضراتِ ائمہ ثلاثہ اور امام محمدؒ کے نزدیک چونکہ ماکول اللحم جانوروں کا پیشاب پاک ہے؛ اس لئے بطور علاج ان جانوروں کا پیشاب استعمال کرنا ان کے نزدیک بلاتردد جائز ہے؛ لہٰذا ان

کے قول کے مطابق ''آیورویدک دوائیں'' جن میں گائے کا پیشاب پڑتا ہے، ان کا استعمال کرنا بلا تکلف جائز ہے؛ لیکن اس کے برخلاف حضرات شیخین کے نزدیک ماکول اللحم جانوروں کا پیشاب پاک نہیں ہے؛ بلکہ نجاست خفیفہ ہے، اس لیے شدید ضرورت کے وقت بطور علاج بھی ان کے نزدیک ماکول اللحم جانوروں کا پیشاب استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ اور حضرت امام ابو یوسفؒ کا قول ہے کہ اگر ماہر تجربہ کار ڈاکٹر یا حکیم نے اس میں شفا ہونے کی تائید کی ہو تو ضرورت اور مجبوری کے وقت بطور علاج ماکول اللحم جانوروں کا پیشاب استعمال کرنے کی گنجائش ہے، اسی پر حنفیہ کا فتویٰ ہے۔

(۲) غیر ماکول اللحم حیوانات کے اعضاء سے علاج

غیر ماکول اللحم جانوروں کے اعضاء کو انسانی اعضاء کی افزائش کے لئے بطور خوراک استعمال کرنا باتفاق فقہاء جائز نہیں ہے؛ لیکن ان کے اعضاء کا انسانی اعضاء کی حفظانِ صحت کے لئے بطورِ علاج استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو ''الضَّرُورَاتُ تُبِيحُ المَحظُورَات'' کے اصول کے مطابق بطورِ علاج غیر ماکول اللحم جانوروں کے اعضاء کو استعمال کرنا مجبوری کے تحت جائز اور درست ہے، یہاں تک کہ سانپ کا پتہ اور بچھو کا تیل وغیرہ یہ سب انسانی اعضاء کی حفظانِ صحت کے لئے خارجی استعمال میں لانا بلاشبہ جائز ہے، یعنی اعضاء کے اوپر لیپ اور مالش کرنے کے طور پر استعمال کرنا بلاشبہ جائز ہے، مگر داخلی استعمال علی الاطلاق جائز نہیں ہے؛ بلکہ آیت قرآنی: ''فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ'' [المائدة: ۳] کے پیش نظر انتہائی ضرورت اور مجبوری میں حرام جانوروں کے اعضاء کو بطور علاج داخلی استعمال میں لانے کی بھی گنجائش ہے، یعنی انتہائی مجبوری میں جان بچانے کی غرض سے علاج کے طور پر منہ کے راستہ سے استعمال کرنے کی بھی گنجائش ہے۔

(۳) انسانی اعضاء کا استعمال

انسانی اعضاء کو انسان کی حفظانِ صحت کے پیش نظر استعمال میں لانے کا مسئلہ انتہائی

اہمیت کا حامل ہے اور یہ مسئلہ انتہائی اہم بھی ہے اور بہت زیادہ حساس بھی ہے، اس مسئلہ پر قلم اٹھانے سے پہلے بہت زیادہ غور وخوض کرنے کی ضرورت ہے، پچھلے سیمناروں میں انسانی اعضاء اور اجزاء کے موضوع پر بحث ہوچکی ہے اور اجزاء کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم

انسان کے وہ اجزاء جن میں کمی زیادتی کی وجہ سے انسانی ساخت میں کسی قسم کا فرق نہیں آتا ہے، وہ اجزاء دوسروں کی ضرورت کے لئے کسی طرح کا عوض اور قیمت لئے بغیر دینے کی گنجائش ہے، جیسا کہ خون بغیر عوض لئے کسی متعین شخص کو فوری ضرورت کے تحت دینے کی گنجائش ہے، جس پر علماء نے اتفاق کرلیا ہے، اسی طرح کسی بچہ کی ماں کا دودھ نہیں نکل رہا ہے، تو دوسری عورت اس متعین بچہ کو اپنی پستان سے دودھ پلاسکتی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ جس بچہ کو دودھ پلایا جائے، اس کا اسی طریقہ سے دھیان رکھا جائے جیسا کہ اپنے بچہ کو یاد رکھا جاتا ہے؛ اس لئے کہ دودھ پلانے کی وجہ سے اس بچہ کے ساتھ حرمت مصاہرت کا تعلق ہو چکا ہے۔

دوسری قسم کے اجزاء

انسان کے وہ اجزاء جن میں کمی زیادتی کی وجہ سے انسانی ساخت میں فرق آجاتا ہو جیسا کہ آنکھ، کان، ہاتھ انگلیاں وغیرہ ظاہری اجزاء ہیں، اسی طریقہ سے گردے، دل جگر، معدے، آنت اور پھیپھڑے وغیرہ یہ سب انسان کے وہ اندرونی اعضاء ہیں جن میں سے کسی ایک کے نہ ہونے کی صورت میں اندرونی طور پر قدرتی ساخت میں فرق آجاتا ہے۔

معلوم ہوا کہ انسان کے دو قسم کے اعضاء ہیں: ایک ظاہری اور بیرونی ہیں، دوسرے داخلی اور اندرونی ہیں، تو انسان کی قدرتی ساخت کی بقا کے لئے دونوں قسم کے اعضاء کا اپنی اپنی جگہ پر باقی رہنا لازم اور ضروری ہے۔ اور ان بیرونی اور داخلی اجزاء کی حفظان صحت کے لئے آیت کریمہ: ”**هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا**“ [سورة البقرة، آیت:

۲۹] کے پیشِ نظر نباتات وجمادات کے ساتھ ساتھ دیگر حیوانات کو بھی بطورِ علاج استعمال کرنے کی کسی نہ کسی درجہ میں گنجائش ہے؛ اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک انسانی اعضاء کا بڑا مقام ہے اور ان میں سے ایک ایک عضو کی طاقت وصحت کے لئے اللہ تعالیٰ نے دوسری مخلوق کو پیدا کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ نے انسان اور اس کے اعضاء کو کس قدر اعزاز واحترام کا مقام دیا ہے، اسی لئے قرآن وحدیث میں کہیں بھی انسانی اعضاء کو دوسری مخلوق کے لئے یا خود انسان کے لئے استعمال کی اجازت کی بات نہیں کہی گئی ہے۔

اس تمہیدی گفتگو کے بعد اصل سوالات کے جوابات پیشِ خدمت ہیں۔

انسانی خون کا عطیہ

مذکورہ اصولوں کے پیشِ نظر زیرِ بحث سوالات کے جوابات کو سمجھنا ہے:

(۱) اضطراری حالات میں کسی انسان کا دوسرے انسان کو خون کا عطیہ دینا بالاتفاق جائز ہے، نیز ضرورت بمعنی حاجت جس کو ضرورت کا دوسرا درجہ قرار دیا گیا ہے کہ اگر خون نہ چڑھایا جائے تو سخت مشقت اور دشوارکن حالات سے دوچار ہونا پڑے گا، تو ایسی ضرورت کی وجہ سے بھی اگرچہ کلمہ کفریہ زبان پر جاری کرنا، مردار کھانا جائز نہیں ہے، مگر خون وغیرہ چڑھانا اور خون کا عطیہ لینا اور دینا بھی جائز ہے۔

(۲) سوال نمبر ۲ کا جواب یہ ہے کہ حاجت کے درجہ میں جو ضرورت ہوتی ہے اس ضرورت کی وجہ سے خون کا عطیہ کرنا جائز تو ہے؛ لیکن ضرورت مند شخص کا متعین اور مشخص ہونا بھی لازم ہے، مثلاً کسی متعین شخص کو ایمرجنسی طور پر خون کی سخت ضرورت ہے، تو اس متعین شخص کو خون کا عطیہ کرنا جائز ہے؛ لیکن اگر ضرورت مند شخص متعین نہیں ہے اور نہ ہی فی الحال ضرورت مند شخص کا وجود ہے؛ بلکہ آئندہ کبھی کسی شخص کو ضرورت پیش آسکتی ہے، اس لئے پیش قدمی کرتے ہوئے اس کے لئے پہلے ہی سے خون جمع کر کے رکھنے کی بات ہے، تو یہ ایک امکانی چیز ہے، زیادہ سے زیادہ ظن غالب ہے تو ایسی صورت میں ضرورت بمعنی اضطرار

اورضرورت بمعنی حاجت دونوں میں سے کسی ایک کے بھی دائرہ میں نہیں آتی؛ اس لئے آئندہ ضرورت پیش آنے کے تصور کے ساتھ بلڈ بینک قائم کرنا اوراس میں رضا کارانہ طور پر خون کا عطیہ دینا اصولی طور پر ناجائز ہوگا، ہاں البتہ غیر معمولی حادثات میں بہت زیادہ خون کی ضرورت پڑتی ہے، اورزخمیوں کی جان بچانے کے لیے بروقت کثیر مقدار میں خون کا فراہم ہونا مشکل ہے، تواس ضرورت کے پیش نظر پہلے ہی مختلف گروپ کے خون کوجمع کر کے رکھنے کی گنجائش ہوسکتی ہے جس کو دوسرے الفاظ میں بلڈ بینک سے تعبیر کی جاتی ہے، اور حضرت الاستاذ مفتی نظام الدین صاحبؒ نے جو بلڈ بینک کو جائز لکھا ہے اس کا حاصل بھی یہی ہے، ملاحظہ ہو: نظام الفتاویٰ قدیم ۱/۴۲۲۔

(۳) اس تصور کے ساتھ بلڈ بینک قائم کرنا اوراس میں رضا کارانہ طور پر خون جمع کرنے کے لئے لوگوں کو دعوت دینا اور بلڈ بینک میں خون جمع کرنا اوروہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت میں کیمپ لگوا کر جمع کروانا، تاکہ برادران وطن پراس کا اچھا اثر مرتب ہوجائے شرعی طور پر جواز کے دائرہ میں نہیں آتا؛ اس لئے کہ برادران وطن پر اچھا اثر مرتب کرنے کے بہت سے مراتب ہوسکتے ہیں۔اس شکل میں گنجائش ہے جومفتی نظام الدین صاحبؒ کے فتویٰ کے حوالہ سے لکھا گیا ہے۔

(۴) اگرایمر جنسی طور پر کسی مریض کوخون کی سخت ضرورت ہواوراس کا خون ایسے نادر گروپ سے تعلق رکھتا ہو جو بمشکل ملتا ہو، تواس گروپ کا خون جس شخص میں موجود ہواس کو اپنا خون دینے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، نہ اس پر اپنا خون دینا واجب ہے، نہ لازم ہے، ہاں البتہ اگراس کو اپنی صحت متأثر ہونے کا خطرہ نہ ہوتو اخلاقاً شخص معین کو ایمر جنسی طور پر خون کا عطیہ پیش کردینا اس کے لئے صرف مستحب اور افضل ہے، لازم یا واجب نہیں۔

جگر کی پیوندکاری اوراس کا عطیہ

سوال [۱۰۳۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: انسانی جسم کا ایک اہم ترین عضو جگر ہے، جو غذا کو ہضم کرنے اور انسان کو غذا میں غیر محسوس طور پر آجانے والے مسموم اجزاء سے محفوظ رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے، کچھ عرصہ پہلے تک جگر کی پیوند کاری کو ناممکن سمجھا جاتا تھا؛ لیکن جدید میڈیکل ترقی نے اس کو ممکن بنا دیا ہے اور خود ہندوستان میں اس کے کئی کامیاب آپریشن ہو چکے ہیں، ایک زندہ انسان کا جگر دوسرے انسان کو لگایا جا سکتا ہے؛ کیونکہ میڈیکل تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جس انسان کا جگر کاٹ کر نکالا جاتا ہے اس کا باقی حصہ کچھ دنوں میں بڑھ کر اپنی جگہ جگر کامل کو پہنچ جاتا ہے، نیز جس شخص کا انتقال ہو چکا ہو، انتقال کے فوراً بعد اس کا جگر نکالا جا سکتا ہے؛ کیوں کہ پہلے انسان کے دل و دماغ کی موت ہوتی ہے، اس کے بعد چند گھنٹوں تک اعضاء اور خلیات میں حیات باقی رہتی ہے، اگر اس کے باقی رہتے ہوئے کوئی عضو نکال لیا جائے تو وہ دوسرے کو کام آ سکتا ہے، کیا اس طرح کسی متعین مریض کو اس کی جان بچانے کے لئے یا اس عضو کو محفوظ کرنے والے کسی طبی ادارہ کو عطیہ کے طور پر دیا جا سکتا ہے، تا کہ ایک انسان کی جان بچائی جا سکے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نمبر ۵ میں دو شکلیں لکھی گئی ہیں:

پہلی شکل یہ لکھی گئی کہ زندہ انسان کے جگر کا ایک حصہ دوسرے کو دیدیا جائے تو باقی بچا ہوا حصہ کچھ دنوں میں بڑھ کر جگر کامل تک پورا ہو جاتا ہے، تو ایسی صورت میں انسانی ساخت اپنی جگہ لوٹ آتی ہے اس لیے رضا کارانہ طور پر اپنے کسی عزیز یا دوست کی جان بچانے کے لیے زندہ انسان کا اپنے جگر کا حصہ دینے کی گنجائش ہے، کیونکہ دینے والے کا جگر بعد میں بڑھ کر پورا ہو جائے گا، مگر اس میں شرط یہ ہے کہ مفت میں دیدیا جائے، خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔

دوسری شکل کا جواب یہ ہے کہ مردہ انسان کا جگر انسانی اعضاء میں ایسا اہم ترین اور مرکزی عضو ہے کہ انسان کا دیگر کسی عضو کے بغیر زندہ رہنا ممکن ہے، مگر جگر کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہیں، جب مرنے کے بعد اس اہم ترین اور مرکزی عضو کو نکال کر دوسرے کو دے دیا جائے یا آئندہ ضرورت پڑنے پر دوسرے کو دینے کے لئے نکال کر رکھ لیا جائے تو مرنے والا انسان ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے انسانی ڈھانچہ کی شکل میں باقی ہے اور اس کی نماز

جنازہ پڑھی جائے گی اور اسے دفن کیا جائے گا؛ لیکن حقیقت میں اس انسان کا اصلی عضو اس میں باقی نہیں ہے، تصویر کی شکل میں ظاہری ڈھانچہ ہے، حقیقی عضو اس میں باقی ہی نہیں رہتا؛ اس لئے مرنے کے بعد کسی انسان کے جگر کو نکال لینے کی شریعت اجازت نہیں دیتی، اس میں مسلم اور غیر مسلم سب کا حکم یکساں ہے اور اس میں مرنے سے پہلے مرنے والے کی اجازت یا اس کے وارثین کی اجازت کا بھی اعتبار نہیں ہے؛ کیونکہ یہ درحقیقت پوسٹ مارٹم ہے جس کے عدم جواز پر امت کا اتفاق ہے۔

اور مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اس موضوع پر مدلل مقالہ تحریر فرمایا ہے، جو ہم سب کے لئے حجت شرعی کا درجہ رکھتا ہے۔

دلائل ملاحظہ فرمایئے:

''ابوداؤد شریف'' میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ''اعضائے انسانی کا احترام حالتِ حیات میں جس طرح لازم ہوتا ہے، مرنے کے بعد بھی اسی طرح لازم ہوجاتا ہے''۔ حدیث شریف ملاحظہ فرمایئے:

عن عائشة –رضی الله عنها– أن رسول الله ﷺ قال: كسر عظم الميت ككسره حيا. (سنن أبي داؤد، النسخة الهندية ٢/ ٤٥٨، دار السلام رقم: ٣٢٠٧)

اس کو حضرات فقہاء نے بہت واضح الفاظ سے نقل فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ایک ایک عضو کو محترم بنایا ہے، اسی احترام کا تقاضہ ہے کہ مرنے کے بعد اس کی نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے اور محفوظ طریقہ سے اسے دفن کیا جاتا ہے۔ صاحب بدائع نے اس مسئلہ کو ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

ولو سقط سنه يكره أن يأخذ سن ميت فيشدها مكان الأولى بالإجماع، وكذا يكره أن يعيد تلك السن الساقطة مكانها عند أبي حنيفة ومحمد، ولكن يأخذ سن شاة ذكية، فيشدها مكانها. (بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٣١٦)

اور ''مبسوط'' کے اندر الفاظ کے فرق کے ساتھ مزید وضاحت فرمائی ہے، ملاحظہ فرمایئے:

ألا ترى! أن شعر الآدمي لا ينتفع به إكراماً للآدمي بخلاف سائر

الحيوانات، وإن غائط الآدمي يدفن وما ينفصل من سائر الحيوانات ينتفع به. (المبسوط للسرخسي ١٥/ ١٢٥)

اور''ہندیہ'' میں اسی کو صحیح اور راجح قرار دیا ہے کہ انسانی اجزاء سے انتفاع اس کی کرامت اوراحترام کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔

الإنتفاع بأجزاء الآدمي لم يجز، قيل: لكرامة هو الصحيح، كذا في جواهر الأخلاطي. (هندية زكريا قديم ٥/ ٣٥٤، جديد زكريا ٥/٤٠٩)

مذکورہ تمام دلائل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد انسان کا جگر جو مرکزی عضو ہے اس کو دوسروں کے واسطہ نکالنا جائز نہیں۔

''آئی بینک'' (آنکھوں کا عطیہ)

سوال [۱۰۳۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بینائی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اور اسی لئے قرآن مجید میں بطور احسان کے قوت بصارت کا بار بار ذکر فرمایا گیا ہے، نابینا ہونے کی بعض صورتیں ایسی ہیں کہ ابھی تک کی تحقیق کے مطابق اس کا علاج نہیں ہوسکتا؛ لیکن بعض صورتوں میں اس کا علاج ممکن ہے کہ ایک انسان کے آنکھ کے قرنیہ کی اس نابینا کے حلقہ چشم میں پیوندکاری کردی جائے، اس طرح اس کو بینائی حاصل ہوسکتی ہے، ایک زندہ شخص کی آنکھ سے بھی اسے حاصل کیا جاسکتا ہے اور مرنے کے بعد بھی چند گھنٹے کے اندر مردہ سے قرنیہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ:

الف: اگر کوئی زندہ شخص کسی دوسرے شخص کو اپنی آنکھ کا قرنیہ عطیہ کرے اور سوچے کہ میرا کام تو ایک آنکھ سے چل سکتا ہے، اس سے ہمارے دوسرے بھائی کی آنکھیں بھی روشن ہوجائیں گی، تو کیا ایسا کرنا جائز ہوگا؟

ب: کیا کسی شخص سے قرنیہ اس کی موت کے بعد حاصل کیا جاسکتا ہے؛ تاکہ کسی متعین شخص کو بینائی فراہم کی جاسکے؟

ج: آج کل اس مقصد کے لئے آئی بینک بھی قائم ہیں، جس میں رضا کارانہ طور پر آنکھوں کا عطیہ دیا جاسکتا ہے اور جس کو ضرورت درپیش ہو، آئندہ اس کے حق میں اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، کیا ایسے بینک کو زندہ یا مردہ شخص کی آنکھوں کا عطیہ دیا جاسکتا ہے؟

سوال: (۷) پانچویں اور چھٹے سوال میں یہ بات بھی وضاحت طلب ہے کہ اگر مردہ شخص کے جسم سے جگر یا آنکھ حاصل کرنی جائز ہو تو اس سلسلہ میں کس کی اجازت معتبر ہوگی، خود اس شخص کی، یا اس کے ورثاء کی، یا دونوں کی؟ یعنی مردہ کی وصیت کافی ہوگی، یا صرف ورثاء کی اجازت دینا کافی ہوگا، یا مردہ کی وصیت کے ساتھ ساتھ اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثہ کی طرف سے آمادگی بھی ضروری ہوگی؟

المستفتی: اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نمبر ۶ میں اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ دوسرے کی آنکھ کے ذریعہ سے نابینا کی آنکھ میں روشنی آجاتی ہے؛ اس لئے فوری مرنے والے شخص کی آنکھ فوری طور پر نکالی جائے، تاکہ دوسرے نابینا شخص کے کام آجائے۔ سوال ۷ میں یہ پوچھا گیا ہے کہ جگر یا آنکھ حاصل کرنے کے لئے مرنے والے کی وصیت یا ورثاء کی اجازت ضروری ہوگی اور اس کام کے لئے آئی بینک قائم ہونے کا ذکر آیا ہے، دونوں سوالوں کا جواب یہ ہے کہ: اس سلسلہ میں سب کو معلوم ہے کہ آنکھ انسان کے اعضاء میں سے اہم ترین عضو ہے، ایک آنکھ کے دینے کی وجہ سے انسان کی وہ ساخت باقی نہیں رہتی ہے، جس کو قدرت نے انسان کے وجود کے لئے اور اس کی ضرورت کے لئے بنایا ہے؛ اس لئے ماقبل میں ذکر کردہ اصول کے مطابق مرنے والے آدمی کی آنکھ نکال کر دوسرے کے استعمال کے لئے رکھ لینا آئی بینک میں یا کسی متعین شخص کو فوری طور پر دے دینا شرعاً جائز نہیں ہے، چاہے مرنے والے نے مرنے سے پہلے اپنی آنکھ دوسروں کو دینے کی وصیت کی ہو یا نہ کی ہو، دونوں صورتوں میں جائز نہیں ہے، اسی طرح اس کے وارثین کی اجازت سے بھی جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ انسان کے اعضاء انتہائی محترم ہیں متبذل نہیں۔ (مستفاد: جواہر الفقہ جدید زکریا ۷/۵۷)

اور سوال نامہ میں یہ بات بھی واضح کی گئی ہے کہ کوئی زندہ شخص جس کی دونوں آنکھیں صحیح ہیں، وہ رضا کارانہ طور پر اپنی ایک آنکھ یہ سوچ کر دے دے کہ میرا کام ایک آنکھ سے چل جائے گا، تو ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو شرعاً ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

اس لئے کہ آدمی خود اپنے اعضاء کا مالک نہیں ہے اور کسی بھی عضو میں مالکانہ تصرف بھی جائز نہیں، اس کو نہ یہ حق ہے کہ اپنے کسی عضو کو دوسرے کے ہاتھوں فروخت کردے، یا دوسروں کو تحفہ اور ہدیہ میں دے؛ اس لئے کہ انسان خود اپنے اعضاء کا مالک نہیں ہوتا، جب چاہے اس میں مالکانہ تصرف کر کے اسے فروخت کرے یا ہدیہ میں دے۔

لہٰذا دو آنکھ والا آدمی اپنی دونوں آنکھوں میں سے ایک آنکھ دوسروں کو دے دے قطعاً جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ وہ اپنی آنکھ کا خود مالک نہیں ہے، نیز کوئی بھی سرمایہ دار اپنی دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ دوسروں کو نہیں دے گا؛ لہٰذا یہ مصیبت صرف غریب اور تنگدست لوگوں پر آئے گی کہ غریب انسان اپنی تنگدستی کی وجہ سے دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ دینے کے لئے تیار ہو جائے گا، نتیجہ یہ ہوگا کہ سرمایہ داروں کی دو آنکھیں ہوں گی اور غریبوں کی ایک آنکھ اور غریبوں کی آنکھوں کی دکان لگ جائے گی اور ایک آنکھ والا سرمایہ دار خریدار بن جائے گا اور دو آنکھ والا غریب آدمی بائع بنے گا، ایسا کہیں نہیں ہوگا کہ آنکھوں کے خریدار غریب آدمی بن جائیں یا کسی غریب اور تنگدست آدمی کو کسی سرمایہ دار کی آنکھ مل جائے اس کا امکان ہی نہیں ہے، شریعت کے نزدیک سارے انسان یکساں ہیں؛ اسی لئے زندہ انسان کا اپنی دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ دینا جائز نہیں ہے، اس طرح ناجائز ہونے کے حکم کو حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ نے نظام الفتاویٰ قدیم ۱/۴۲۳، تا ۱/۴۳۲ تک میں مدلل ومفصل تحریر فرمایا ہے، نیز سیمینار میں حیدرآباد کے ماہر ڈاکٹر نے یہ بات بھی واضح فرمائی ہے کہ پیدائشی نابینا کو آنکھ دینے سے عام طور پر بینائی ہونے والے کی آنکھ میں بینائی آئی ہے۔

’’دودھ بینک‘‘ اور اس کا عطیہ

سوال [۱۰۳۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: اللہ تعالیٰ نے ہر نومولود کے لئے اس کی ماں کے سینے میں صحت بخش دودھ کا خزانہ رکھا ہے، قرآن مجید کا بھی ارشاد ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلائیں اور تمام میڈیکل سائنسدانوں کا بھی اتفاق ہے کہ بچہ کے لئے سب سے محفوظ، تقویت بخش اور بہترین غذا ماں کا دودھ ہے، سوائے اس کے کہ ماں کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہو کہ اس کا دودھ بچہ کے لئے مضر ہو جائے؛ لیکن قدیم زمانہ سے یہ رواج چلا آرہا ہے کہ خواتین اپنے بچوں کے علاوہ دوسرے بچوں کو بھی دودھ پلایا کرتی تھیں اور دودھ پلانے والی عورتوں کو اس کی اجرت دی جاتی تھی، اسی پس منظر میں شریعت اسلامی نے رضاعت کو حرمت مؤبدہ کا ایک سبب مانا ہے، موجودہ دور میں خاص طور پر مغربی معاشرہ میں خواتین کی کسب معاش کی جدوجہد میں شامل ہو جانے کی وجہ سے یہ مزاج پروان چڑھا ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلانا نہیں چاہتیں، اس پس منظر میں مغربی ملکوں میں بہت سے دودھ بینک قائم ہو گئے ہیں، جو اپنا دودھ فراہم کرنے والی عورتوں کو معاوضہ ادا کرتے ہیں اور ضرورت مند بچوں کو دودھ مہیا کرکے ان سے معاوضہ وصول کرتے ہیں، گویا یہ انسانی دودھ کی تجارت کی ایک شکل ہے، ہندوستان میں بڑھتے ہوئے معیار زندگی کی وجہ سے خواتین میں ملازمت کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے اور یہاں بھی اس طرح کے بینک قائم کئے جانے کی توقع ہے، تو ایسے بینک کو عوض دے کر یا بلاعوض کسی خاتون کا دودھ مہیا کرنا اور پھر اس دودھ کی ضرورت مند بچوں کے لئے فروختگی کا کیا حکم ہوگا؟ اور اگر یہ صورت جائز ہو تو حرمت رضاعت کے سلسلہ میں کیا احکام ہوں گے؟

(۱۰۳۹۳) موجودہ مغربی تہذیب نے عملاً اور بہت سی جگہ قانوناً اس بات کو تسلیم کرلیا ہے کہ نسبی شناخت کا تحفظ ضروری نہیں ہے اور بچوں کی ماں کی طرف نسبت کافی ہے، دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مردوں اور عورتوں میں خاصی تاخیر کے ساتھ نکاح کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے اور اس کے مختلف محرکات ہیں، جیسے ہر طرح کے معاشی اور سماجی فکر سے آزاد ہو کر اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنا، عورتوں کا ملازمتیں کرنا، ایک عمر تک صنفی لذت اٹھانے کے لئے آزاد زندگی گذارنا، طلاق کا مشکل قانون، جس میں مرد پر ڈھیر ساری ذمہ داریاں عائد کردی جاتی ہیں وغیرہ، اس کی وجہ سے ایک دوسرا نقصان یہ ہے کہ بانجھ پن بڑھتا جارہا ہے اور بہت سے میاں بیوی فطری طور پر اولاد سے بہرہ یاب نہیں ہو پاتے، اس کے لئے مادہ منویہ بینک قائم کئے جاتے ہیں، جن

مردوں کے مادہ منویہ میں تولیدی صلاحیت کے حامل جرثومے نہیں ہوتے ہیں، یہ ان کو کارگر جرثومے فراہم کرتے ہیں اور جن عورتوں میں تولید کے لائق بیضے پیدا نہیں ہو پاتے ہیں، ان کے لئے بیضے فراہم کرتے ہیں، اب اس طرح کے بینک مشرقی ممالک اور مغربی تہذیب کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے خود ہمارے ملک ہندوستان میں بھی قائم کئے جارہے ہیں۔سوال یہ ہے کہ ایسے بینک قائم کرنا، کسی مرد یا خاتون کا بینک کو اور بینک کا کسی ضرورت مند مرد یا خاتون کو مادہ منویہ کا فروخت کرنا یا بغیر قیمت کے ہدیہ کے طور پر دینا کیا جائز ہوگا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نمبر: (۸-۹) کا حاصل یہ ہے کہ شریعت نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ جس بچہ کی ماں کے پستان سے اس کو پیٹ بھر کر دودھ نہیں ملتا ہے اور دوسری عورت کے پستان میں دودھ زیادہ ہے، تو جس کے پستان میں دودھ زیادہ ہے اس کے پستان سے اس بچہ کو دودھ پلانا جائز اور درست ہے، جس کا پیٹ اپنی ماں کے دودھ سے نہیں بھرتا ہے، اسی طرح جس کے پستان میں دودھ زیادہ ہے، وہ اتنا دودھ نکال کر کے دوسرے متعین بچہ کو پلائے؛ لیکن ساتھ ساتھ اس کے اوپر شریعت کی طرف سے یہ حکم بھی لاگو ہو جاتا ہے کہ اس بچہ اور اس عورت کے درمیان حرمت رضاعت ثابت ہو جاتی ہے کہ اس بچہ کے لئے اس عورت کے اصول وفروع حرام ہو جاتے ہیں، اس کے اصول وفروع میں سے کسی سے وہ نکاح نہیں کرسکتا، اسی طرح اس عورت کے لئے اس بچہ کی اولادوں سے نکاح کرنا جائز نہیں، یہ ایک نازک اور حساس ترین مسئلہ ہے کہ جس بچہ کو بھی دودھ پلایا جائے گا تو دودھ پلانے والی عورت اس بچہ کے لئے حقیقی ماں کے درجہ میں ہو جاتی ہے اور آئندہ چل کر اس عورت کے کسی فروع سے اس بچہ کا نکاح ناجائز اور حرام ہوگا؛ اس لئے دودھ پلانے والی عورت اور دودھ پینے والے بچہ کا متعین ہونا لازم ہے، تاکہ آئندہ چل کر کے ناواقفیت اور بے خبری میں رضاعت کی حرمت کے باجود رضاعی بھائی بہن کا نکاح نہ ہو جائے، شریعت میں رضاعی ماں ورضاعی باپ، رضاعی چچا، رضاعی بھائی، رضاعی بھانجہ میں سے کسی کے ساتھ بھی نکاح جائز نہیں ہے۔ اور دودھ بینک میں دودھ جمع

کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ حرمت رضاعت کا مسئلہ ہی نہ رہے گا اور شریعت کے قائم کردہ قانون اور ضابطہ کے ڈھانچہ کی دیوار ہی باقی نہیں رہے گی؛ اس لئے دودھ بینک میں رضا کارانہ طور پر عورتوں کے لئے اپنی پستان کا دودھ پیش کرنا جائز نہیں۔

حرمت رضاعت کے بارے میں قرآن وحدیث میں بے شمار دلائل ہیں، قرآن کی نص قطعی سے اس کی حرمت ثابت ہے، جیسا کہ ''سورۂ نساء'' آیت ۲۳ میں حرمت کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تمہارے لئے وہ مائیں حرام کردی گئیں ہیں، جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہے اور ان بہنوں کو حرام قرار دیا گیا ہے جواز قبیل رضاعت ہیں۔

آیت کریمہ ملاحظہ فرمائیے:

حرمت عليكم (إلى قوله تعالىٰ) وامهاتكم اللاتى ارضعنكم واخواتكم من الرضاعة. (النساء: ۲۳)

حدیث شریف میں بے شمار روایات موجود ہیں۔ ''بخاری شریف'' کی دو روایت ہم یہاں پیش کر دیتے ہیں:

قال النبي ﷺ: في بنت حمزة لا تحل لي يحرم من الرضاعة ما يحرم من النسب، هي بنت أخي من الرضاعة. (بخاري ۱/ ۳۶۰، رقم: ۲۵۷۱، ف: ۲۶۴۵)

اور حضور ﷺ کا ارشاد ہے: **إن الله حرم من الرضاع ما حرم من النسب.**

(سنن ترمذي، باب الرضاعة، النسخة الهندية ۱/ ۲۱۷، دار السلام رقم: ۱۱۵۶)

نیز حضرات فقہاء نے اس کی صراحت کر دی ہے کہ پستان سے دودھ پلانے کے طور پر دوسرے کے بچہ کو دودھ پلانا جائز ہے، مگر کسی عورت کے دودھ کو اس کی پستان سے نکال کر کے الگ سے جانوروں کے دودھ کی طرح فروخت کرنا قطعاً جائز نہیں ہے، یہی حنفیہ کا مسلک ہے۔ عبارات ملاحظہ فرمائیے۔

''مبسوط سرخسی'' میں اس حکم کو ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

لا يجوز بيع لبن بني آدم على وجه من الوجوه عندنا، ولا يضمن متلفه أيضا، وقال الشافعي: يجوز بيعه ويضمن متلفه ...... وحجتنا في ذلك

أن لبن الآدمي ليس بمال متقوم، فلا يجوز بيعه ولا يضمن متلفه، كالبزاق، والمخاط، والعرق. (المبسوط للسرخسي، بيروت ١٥/ ١٢٥)

صاحب بحر نے مزید وضاحت کے ساتھ ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے ملاحظہ فرمائیے:

قوله: لبن امرأة بالجر، أي لم يجز بيع لبن المرأة؛ لأنه جزء الآدمي، وهو بجميع أجزائه مكرم مصون عن الابتذال بالبيع. (البحر الرائق، زكريا ٦/ ١٣٢، كوئٹه ٦/ ٨٠)

سوال (۹) میں یہ پوچھا گیا ہے کہ مرد یا عورت کے مادہ تولید کا بینک قائم کیا جا سکتا ہے؟

نوٹ: بے اولادلوگوں کے لیے مادۂ تولید فراہم کر سکتے ہیں، تو جواب یہ ہے کہ مرد یا عورت کے مادۂ تولید کا بینک قائم کرنا یا کسی مرد اور خاتون کا کسی بینک کو یا کسی ضرورت مند کو مادۂ تولید فروخت کرنا یا بلا قیمت مفت میں دینا اور لینا حرام اور ناجائز ہے، اس مسئلہ پر سیمینار کے تمام شرکاء کا اتفاق ہو چکا ہے۔

❁❁❁

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا ☆ عَلٰى حَبِيْبِکَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

اَللّٰہُ أَكْبَر كَبِيْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا وَسُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَأَصِيْلاً. الحديث

(المعجم الكبير، دار إحياء التراث العربی بيروت ٢/ ١٣٥، برقم: ١٥٧٠)

تجاویز

برائے چوبیسواں فقہی سیمینار

مؤرخہ:۱-۳؍مارچ ۲۰۱۵ء مطابق ۹-۱۱، جمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ

مقام: دارالعلوم الاسلامیہ،اوچیرہ کیرالا

اعضاء واجزاء انسانی کے عطیہ سے متعلق تجاویز

انسانی اعضاء واجزاء کے عطیہ سے متعلق تمام مقالات کے جائزے اور مباحث کے بعد سیمینار یہ محسوس کرتا ہے کہ اس موضوع کا تعلق جہاں شرعی احکام سے ہے وہیں طبی جدید سہولیات اور تحقیقات سے بھی ہے، اس سمت میں آئے دن نئی تحقیقات سامنے آرہی ہیں، اس لیے بتدریج شرعی احکام بھی آتے رہیں گے، اس وقت تک کی جو جدید طبی تحقیقات سامنے آئی ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے درج ذیل تجاویز سیمینار نے طے کی ہیں:

(۱) خون انسانی جسم کا ایک اہم اور بنیادی جزء ہے جس سے حیات انسانی کی بقا مربوط ہے، اگر کسی انسان کو خون کی ضرورت پڑ جائے اور ماہر ڈاکٹر کی تجویز ہو کہ اس کے لیے خون ناگزیر ہے تو انسانی جان بچانے کے لیے ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان یا غیر مسلم کو عطیہ کرنا جائز ہے، اسی طرح کسی مسلمان کے لیے اس سے لینا بھی جائز ہے۔

(۲) ایسے بلڈ بینک جہاں لوگ رضا کارانہ طور پر خون کا عطیہ دیتے ہیں اور وہ بینک ضرورتمندوں کو مفت خون فراہم کرتے ہیں وہاں مسلمان کے لیے خون کا عطیہ کرنا جائز ہے۔

(۳) رضا کارانہ بلڈ کیمپ لگانا اور بلڈ بینک قائم کرنا بھی انسانی ضرورت کے پیش نظر جائز ہے اور یہ انسانی خدمت میں شامل ہے۔

(۴) ایسے نازک موقع پر جہاں خون کا عطیہ نہ کرنے کی صورت میں جان کا خطرہ

ہے، وہاں مطلوبہ گروپ کے حامل موجود شخص کے لیے اپنا خون عطیہ کرنا ایک اہم انسانی فریضہ اور شرعاً پسندیدہ عمل ہے۔

(۵) موجودہ طبی تحقیق کے مطابق زندہ شخص کے جگر کے بعض حصہ کو دوسرے ضرورتمند انسان کو منتقل کرنا ممکن ہو گیا ہے، اور عطیہ کرنے والے کے جگر کے بقیہ بچے ہوئے حصے کا چند مہینوں میں مکمل ہو جانا تجربہ میں آچکا ہے، اس لیے جگر کی منتقل اور پیوندکاری اپنے کسی عزیز یا دوست کے لیے رضاکارانہ طور پر جائز ہے، البتہ خرید وفروخت قطعاً جائز نہیں ہے۔

(۶) زندہ شخص کی آنکھ کا قرنیہ دوسرے ضرورتمندوں کے لیے منتقل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس تجویز کو مزید غور وخوض کے لیے فی الحال مؤخر کرنا بہتر سمجھا گیا۔

(۷) انسانی دودھ کا بینک قائم کرنا جائز نہیں، اگر بینک قائم ہو تو اس میں دودھ جمع کرنا اور اس میں کسی طرح کا تعاون کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

(۸) مرد یا عورت کے مادۂ تولید کا بینک قائم کرنا یا کسی مرد یا خاتون کا کسی بینک کو یا کسی ضرورت مند کو مادۂ تولید فروخت کرنا یا بلا قیمت فراہم کرنا یا لینا حرام ہے۔

۳ باب ما يتعلق بحمل المرأة و موانعه

نسبندی اوراسقاط حمل کی شرعی حیثیت

سوال [۱۰۳۹۴]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) اگرکسی عورت کی جان کا خطرہ ہوتو اس کی نسبندی کرانا جائز ہے یانہیں؟ اگر نہیں تو اس کی زندگی کے سلسلہ میں کیا تدبیر کی جائے؟

(۲) دوسرے یہ کہ شوہر خوداس کی زندگی بچانے کے لیے کسی ماہر ڈاکٹر کے کہنے پر اپنی نسبندی کراسکتا ہے یانہیں؟ تاکہ استقرار حمل کاامکان نہ رہے؟

(۳) یہ کہ ابھی صرف ۲/۳/ ماہ کا حمل ہے اوراس کو ضائع کرادیتا ہے تاکہ بیوی کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑے تو یہ گناہ زیادہ بڑا ہے یانسبندی کرانے والا؟

المستفتی: محمد عزرائیل محبوب پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) شریعت مطہرہ میں نسبندی کرانا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے۔

عن ابن مسعودؓ قال: كنا نغزو مع النبی ﷺ ليس لنا نساء، فقلنا: يا رسول الله! ألا نستخصي فنهانا عن ذٰلک. (صحیح البخاری، باب تزویج المعسر الذی معه القرآن، النسخة الهندیة ۲/ ۷۵۹، رقم: ۴۸۸۰، ف: ۵۰۷۱)

البتہ اگر جان کا قوی خطرہ ہے تو عارضی طور پر مانع حمل تدابیر اختیار کرنے کی گنجائش ہے، آج کل عارضی رکاوٹ پیدا کرنے کے لیے اسباب اختیار کرنے کے بہت سے طریقے ہیں، لیڈیز ڈاکٹرنیوں اور نرسوں سے رابطہ قائم کرلیا جائے، اور جب کمزوری دور ہو جائے تو رکاوٹ ختم کردی جائے۔ (محمودیہ قدیم ۱۱/ ۳۷۷، ڈابھیل ۱۸/ ۲۹۸)

يجوز لها سد فم رحمها كما تفعله النساء مخالفا لما بحثه في البحر من أنه ينبغي أن يكون حراما بغير إذن الزوج قياسا على عزله بغير إذنها، قلت: لكن في البزازية: أن له منع امرأته عن العزل نعم النظر إلى فساد الزمان يفيد الجواز من الجانبين. (شامی، مطلب: فی حکم إسقاط الحمل، زکریا ۳۳٦/٤، کراچی ۱۷٦/۳، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲٦۲/٤۰)

(۲) بیوی کی جان بچانے کے لیے نسبندی کا عارضہ پیش کرنا درست نہیں ہے، بلکہ استقرارِ حمل سے عارضی رکاوٹ پیدا کرنے کے لیے آج کل نرسنگ ہوموں میں اس کے بہت سے اسباب موجود ہیں، وہاں سے رابطہ قائم کرلیں، شوہر کے لیے نسبندی کرانا جائز نہیں ہے۔

عن سعد بن وقاصؓ قال: لقد رد رسول الله ﷺ علیٰ عثمان التبتل ولو أذن له لاختصينا. (نسائی شریف، باب النهی عن التبتل، النسخة الهندية ٦۸/۲، دار السلام رقم: ۳۲۱۲)

أن الاختصاء في الآدمي حرام صغيرا أو كبيراً. (مرقاة، كتاب النكاح، الفصل الاول، امدادیه ملتان ۱۸۷/٦)

(۳) حمل کا ساقط کرادینا اور نسبندی کرانا دونوں گناہ ہیں، لیکن تین ماہ سے پہلے کا حمل گرادینے سے نسبندی کرادینے کا گناہ بہت بڑا ہے۔

لو أرادت الإلقاء قبل مضي زمن ينفخ فيه الروح هل يباح لها ذٰلک أم لا، اختلفوا فيه، وكان الفقيه علي بن موسیٰ يقول: أنه يكره. (شامی، مطلب: فی حکم إسقاط الحمل، زکریا ۳۳٦/٤، کراچی ۱۷٦/۳، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲٦۲/٤۰)

أن الاختصاء في الآدمی حرام صغيرا أو كبيراً. (مرقاة، كتاب النكاح، الفصل الاول، امدادیه ملتان ۱۸۷/٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ رشوال المکرّم ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۱۸۳/۳۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۱۱/۳ھ

دائمی نسبندی

سوال [۱۰۳۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بیوی کمزور ہے، حمل ٹھہر جانے پر پیر وغیرہ سوج جاتے ہیں، بدن میں بھی کافی سوجن آجاتی ہے، سانس بھی کثرت سے پھولنے لگتا ہے، کبھی کبھی ایسی حالت ہوجاتی ہے کہ جان نکل جائے گی، ایسی حالت میں عورت کا آپریشن کرادینا تاکہ حمل نہ ٹھہر سکے، بچہ کی پیدائش نہ ہوتو شریعت کی روشنی میں کیا حکم ہے؟ اگر کوئی صورت ہوتو اس کی بھی صراحت فرمادیں، جو بچہ پیدا ہونے کی تدبیر نہ ہوسکے، ڈاکٹر وحکیم کے دکھائے جانے پر وہ بھی یہی مشورہ دے رہے ہیں کہ آپریشن کرادیا جائے، ڈاکٹر بھی مسلم ہے، نماز وغیرہ کا پابند ہے۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسا عمل کرانا کہ جس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے توالد وتناسل کا سلسلہ منقطع ہوجائے شرعاً جائز نہیں، قرآن وحدیث میں اس پر سخت ترین وعید آئی ہے۔

سعید بن المسیب یقول: سمعت سعد بن أبی وقاص یقول: رد رسول اللّٰہ ﷺ علی عثمان بن مظعون التبتل، ولو أذن له لاختصینا. (صحیح البخاری، باب ما یکره من التبتل والخصاء، النسخة الهندیة ۲/۷۵۹، رقم: ٤٨٨٢، ف: ٥٠٧٣)

سوال میں ذکر کردہ بیماری کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ عموماً عورتوں میں یہ بیماری پائی جاتی ہے، اس کے علاج کی فکر کی جائے، اور جب تک علاج مکمل ہوتو اس وقت تک عارضی طور پر بدرجہ مجبوری موانع حمل دوائیں استعمال کرنے کی گنجائش ہے، اس کے علاوہ آپریشن کراکر سلسلۂ توالد وتناسل کو دائمی طور پر ختم کرنا قطعاً جائز نہیں۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۸/ ۳۴۷، امداد المفتیین ص:۹۷۵، امداد الفتاویٰ ۴/۲۰۳، محمودیہ قدیم ۱۷/ ۳۰۶، ڈابھیل ۱۳/۵۳۲، ۱۱/۳۸۵، ڈابھیل ۱۸/۲۹۱، رحیمیہ قدیم ۲/۲۳۳، جدید زکریا ۱۰/۱۸۲، احیاء العلوم ۱/۴/۲۷، معارف القرآن ۸/۶۸۳)

قالوا یباح لها إن تعالج فی استنزال الدم ما دام الحمل مضغة أو

علقة، ولم يخلق له عضو. (شامی، کتاب الحظر و الإباحة، باب الاستبراء وغيره زكريا ۹/ ٦١٥، كراچی ٦/ ٤٢٩، هنديه زكريا قديم ٥/ ٣٥٦، جديد ٥/ ٤١٢، النهر الفائق، دار الكتب العلمية بيروت ١/ ١٤١)

أنه يجوز لها سد فم رحمها كما تفعله النساء. (شامی، مطلب: فی حکم إسقاط الحمل زكريا ٤/ ٣٣٦، كراچی ٣/ ١٧٦، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٠/ ٢٦٢)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ / جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۲۲۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۵/۲۱ھ

دائمی نسبندی کرانا

سوال [۱۰۳۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کی بیوی کو پہلا لڑکا، پھر لڑکی ہوئی جو پیروں سے اپاہج ہے، پھر دوسرا لڑکا ہوا جو صحیح وسالم ہے، پھر تیسرا لڑکا ہوا وہ بھی اپاہج ہے، ڈاکٹروں سے صلاح ومشورہ پر ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ نسبندی کرائی جائے، ایک دو نہیں کئی سے اس سلسلے میں مشورہ کیا گیا ہے، سب کا یہی کہنا ہے کہ نسبندی کرائی جائے، لیکن ہم شریعت کے خلاف کوئی کام نہیں کرنا چاہتے، اس مسئلہ میں ہماری رہبری فرمائیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں؟

المستفتی: حافظ محمد لیاقت علی فیضی محبوب نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: دائمی نسبندی کرانا جس سے ہمیشہ کے لیے اولاد کا سلسلہ ختم ہو جائے شرعاً ناجائز اور حرام ہے، سوالنامہ میں جس خرابی کا ذکر ہے اگر یہ ڈاکٹروں کی تحقیق کے مطابق رحم مادر کی وجہ سے ہے تو آپ اس کا علاج فرمائیں، لیکن بالکلیہ توالد وتناسل کی صلاحیت کو ختم کرنا قطعاً جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۸/ ۳۴۷، امداد

المفتیین ص: ۹۷۵، امداد الفتاویٰ ۴/۲۰۳، محمودیہ قدیم ۱۷/۳۰۶، ڈابھیل ۱۳/۵۳۲، ۱۱/۳۸۵، ڈابھیل ۱۸/ ۲۹۷، رحیمیہ قدیم ۲/۲۳۳، ۲۳۸، ۲۴۶، ۲۲۱، جدید زکریا ۱۰/ ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۵، معارف القرآن ۸/۶۸۳، احیاء العلوم ۱/۲۶۷، ۲۶۰)

﴿وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ . [انعام: ۱۵۱] ﴾

﴿وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيْرًا. [بنی اسرائیل: ۳۱] ﴾

﴿ وَاِذَا الْمَوْءُ دَةُ سُئِلَتْ، بِاَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ. [التکویر: ۸-۹] ﴾

عن معقل بن یسار ؓ قال قال رسول الله ﷺ: تزوجوا الودود الولود فإنی مکاثر بکم الأمم. (أبوداؤد شریف، باب فی تزویج الأبکار، النسخة الهندية ۱/ ۲۸۰، دار السلام رقم: ۲۰۵۰، مشکوٰة شریف ص: ۲۶۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۶۵۸۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۴/۱۴۲۱ھ

دائمی طور پر قوت تولید ختم کرنا

سوال [۱۰۳۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہندہ گردہ ومثانہ کے مرض میں شدید مبتلا ہے، اور بڑے بڑے ڈاکٹروں کی نگرانی میں علاج ومعالجہ چل رہا ہے، اب واقعہ یہ پیش آیا کہ ڈاکٹروں نے موصوفہ کے شوہر کو یہ مشورہ دیا کہ ہندہ تولد سے ابدالآباد کے لیے محروم رہے گی، اور نہ ہی وقتی طور سے مانع حمل دوائی کھلائی جاسکتی ہے، لہٰذا تحدید الولد کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں ہے، لہٰذا اس بارے میں شرع کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد عالم دمکاوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ضبط تولید کی ایسی کوئی صورت اختیار کرنا جس سے

دائمی طور پر قوت تولید ختم ہو جائے، جائز نہیں، خواہ اس میں کتنے ہی فوائد نظر آئیں، اور اس کے دواعی بظاہر کتنے ہی قوی ہوں، ہاں اگر ہندہ واقعتاً مجبور ہے تو عارضی طور پر ایسی شکل اختیار کرنا جس سے قوت تولید باقی رہے، مگر حمل قرار نہ پائے، اس کی گنجائش ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۸/ ۳۴۷)

عن قيس قال: قال عبد الله: كنا نغزو مع النبي ﷺ ليس لنا شيئ، فقلنا: ألا نستخصي فنهانا عن ذٰلک. (صحيح البخاری، باب ما يكره من التبتل والخصاء، النسخة الهندية ۲/ ۷٥۹، رقم: ٤٨٨٤، ف: ٥٠٧٥)

يجوز لها سد فم رحمها كما تفعله النساء مخالفا لما بحثه في البحرين أنه ينبغي أن يكون حراما بغير إذن الزوج قياسا على عزله بغير إذنها، قلت: لكن في البزازية: أن له منع امرأته عن العزل نعم النظر إلى فساد الزمان يفيد الجواز من الجانبين. (شامی، مطلب: فی حکم إسقاط الحمل، زكريا ٤/ ٣٣٦، كراچی ٣/ ١٧٦، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٠/ ٢٦٢)

أن الاختصاء في الآدمي حرام صغيرا أو كبيراً. (مرقاة، كتاب النكاح، الفصل الاول، امداديه ملتان ٦/ ١٨٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۲۱؍ ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۳۴/ ٦۱۲۳)	۱۴۲۰/۴/۲۱ھ

جان تلف ہونے کے اندیشہ سے بچہ دانی نکلوانا

سوال [۱۰۳۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک عورت کے ہوسپٹل کے اندر بچہ پیدا ہوا اور اس کے تقریباً ایک ماہ کے بعد وہ اپنے گھر کے اندر اوپر والے سلیپ پر سے گر پڑی جس کی وجہ سے بچہ دانی کے جوڑ کھل گئے، علاج کرانے کے بعد ڈاکٹروں نے یہ کہا کہ ان کے بچہ پیدا نہ ہو تو زیادہ بہتر ہے، ورنہ آگے چل کر زیادہ پریشانی کا خطرہ ہے، اس لیے آپ حضور والا سے گذارش ہے کہ جواب عنایت فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسی شکل اختیار کرنا جس سے قوت تولید بالکل ختم ہوجائے اس کی اجازت نہیں ہے، البتہ خطرہ کی وجہ سے ایسی عارضی رکاوٹ پیدا کرنا جائز ہے، جس سے استقرار حمل نہ ہو اور آج کل کے زمانے میں اس طرح کا عارضی اور وقتی علاج ہر شہر اور ہر قصبہ میں پایا جاتا ہے۔

ویجوز لها سد فم رحمها كما تفعله النساء. (شامي، مطلب: في حكم إسقاط الحمل زكريا ٤/٣٣٦، كراچی ٣/١٧٦، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٠/٢٦٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۱۴/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۱۸۶)	۱۴۲۴/۶/۱۴ھ

بیوی کی جان تلف ہونے کے اندیشہ سے نسبندی کرانا

سوال [۱۰۳۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص ماشاء اللہ صحت مند وتوانا ہے، اور مالی اعتبار سے بھی بحمد للہ فراوانی ہے، اس کی بیوی کچھ بیماریوں میں مبتلا ہے، مثلاً ولادت کے وقت آپریشن سے بچہ پیدا ہوتا ہے، ڈاکٹروں نے ہمبستری سے کافی احتیاط کرنے کو کہا ہے، پھر دوسرا حمل قرار پا گیا، بڑا آپریشن کروانا پڑا، تیسری مرتبہ بھی بڑے آپریشن سے لڑکا ہوا، تقریباً ان چھ سالوں میں برابر دوائیں چلتی رہیں، تیسرے آپریشن کے بعد ڈاکٹروں نے کہا کہ ایک یا ڈیڑھ سال کے بعد ہمبستری کرنا، کیونکہ بچہ دانی پر ٹانکا لگا ہے، اور پیٹ میں ناف سے شرمگاہ تک ٹانکے ہیں، اگر ہمبستری ہوئی تو ٹانکا ٹوٹ جائے گا، اور عورت مرسکتی ہے، اس لیے تمہیں بچے کی ولادت بند کروانی ہوگی، تو شرعاً نسبندی کروانے کی اجازت ہے یا نہیں؟

(۲) ایسے حالات میں جبکہ بیوی سے ملنے پر سخت پابندی ہے، اپنے نفس پر بہت

کنٹرول کرتا ہوں، لیکن انسانی طبیعت کب تک برداشت کرے، خواہش بہت ہوتی ہے، راتوں رات نیند نہیں آتی، شیطانی وساوس گناہ پر آمادہ کرتے ہیں، لیکن پھر خدا کا خوف غالب آتا ہے تو گناہ سے رک جاتا ہوں، اب آپ فرمائیں کہ بغیر بیوی کے کیسے رہا جائے، زندگی سے عاجز ہو چکا ہوں، ایسی صورت میں دوسری شادی کرنے کی شرعاً اجازت ہے یا نہیں؟ اگر دوسری شادی کے ارادے پر پہلی بیوی بے انتہا ناراض ہو، زہر کھا لینے، چھوڑ کر چلے جانے، خودکشی کر لینے کی دھمکی دے تو اگر کوئی گناہ ہو جائے تو کیا بیوی پر بھی اس کا وبال ہوگا، جبکہ شوہر ہر طرح کے حقوق ادا کرنے کا وعدہ کرتا ہے، اور کسی قسم کی پریشانی نہ ہونے دینے کا یقین دلاتا ہے، ایسے شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ کیا دوسری شادی کرنی چاہئے یا نہیں؟ شریعت اسلامیہ نے اپنے ماننے والوں کو گناہوں سے بچنے کے لیے چار شادی کا حکم دیا تھا، آج ہندوستان میں کئی شادیوں کے نہ ہونے کی بنا پر اکثریت گناہ میں مبتلا ہے، بہرحال جو بھی حکم ہو واضح فرمائیں۔

المستفتی: ایک بندہ بازی گراں، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) ضبط تولید کی کوئی ایسی صورت اختیار کرنا جس سے دائمی طور پر قوت تولید ختم ہو جائے، جائز نہیں، خواہ اس میں کتنے ہی فوائد نظر آئیں، البتہ اگر واقعتاً مجبوری ہے تو عارضی طور پر ایسی صورت اختیار کرنا جائز ہے کہ جس سے قوت تولید باقی رہے مگر حمل قرار نہ پائے اور زنانہ ہسپتالوں میں عارضی توالد و تناسل بند کرنے کے لیے بہت سے علاج ہیں، ان ہسپتالوں سے رابطہ قائم کیا جائے۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۸/ ۳۴۷)

(۲) بیوی سے ہمبستری سے اگر ڈاکٹروں نے ممانعت کی ہے اور آپ کو بیوی کی ضرورت ہے تو شرعاً آپ کو دوسری شادی کرنے کی اجازت ہے، بشرطیکہ آپ دونوں کے مکمل حقوق ادا کریں، اور کسی طرح کا ظلم کسی پر نہ کریں۔

تعليق الاقتصار على الواحدة أو التبري بخوف الجور يدل على أنه عند القدرة على أداء حقوق الزوجات والعدل بينهن الأفضل، الإكثار في

النكاح. (أحكام القرآن للتهانوی ۲/ ٦٥) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍رجب المرجب ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ٦۲۴۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹؍۷؍۱۴۲۰ھ

عورت کی جان تلف ہونے کے اندیشہ سے بچہ دانی نکلوانا

سوال [۱۰۴۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) سلمٰی جس کی عمر تقریباً ۲۸؍سال ہے، جس کے دو بچے ہیں، جبکہ تیسرے بچے کی امید ہے، لیکن دونوں بچوں کی پیدائش آپریشن کے ذریعہ ہوئی ہے، اور تیسرے کے لیے بھی آپریشن کرانا ناگزیر ہے اور تین کے بعد اب مزید آپریشن نہیں کیا جا سکتا، جبکہ زوجین ابھی نوجوان ہیں اور استقرارِ حمل کی صورت میں عورت کی جان تلف ہونے کا اندیشہ ہے، لہٰذا ایسی صورت میں آپریشن کے ذریعہ بچہ دانی نکلوا دینا کیسا ہے، جبکہ ڈاکٹر کے قول کے مطابق عارضی تدابیر اور دوائیں اتنی کارگر نہیں جن پر کلی طور پر اعتماد کیا جا سکے؟

(۲) عدمِ جواز کی صورت میں اگر کسی نے آپریشن کرالیا تو کیا اس وعید کا مستحق ہوگا جیسا کہ بلا عذر نسبندی کرانے کی شکل میں؟ براہ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل ومفصل جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد داؤد جوگا بائی، جامعہ نگر دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) بچہ دانی نکلوانا ناجائز ہے، کیونکہ یہ دائمی طور پر قطع نسل اور صلاحیت تولید کو ختم کرنا ہے، اور قطعِ نسل وصلاحیت تولید کسی بھی حال میں جائز نہیں ہے۔

أما السبب فهو تفويت المنفعة المقصودة من العضو على الكمال وذلك في الأصل بأحد أمرين: إبانة العضو و إذهاب معنى العضو مع بقاء العضو صورة.

(بدائع الصنائع، فصل في الجناية فيما دون النفس بالسلاح زكريا ٦/ ۳۹۲، كراچی ۷/ ۳۱۱)

بلکہ اس زمانہ میں کامیاب عارضی تدابیر موجود ہیں، لہٰذا عارضی تدابیر کے ذریعہ استقرار حمل کو روکا جائے، صلاحیت تولید ختم کرنے کی اجازت نہیں۔

وقال الشامي: أخذ في النهر من هذا: ولما قدمه الشارح عن الخانية والكمال: أنه يجوز لها سد فم رحمها كما تفعله النساء لما بحثه في البحر من أنه ينبغي أن يكون حراما بغير إذن الزوج قياسا على عزله بغير إذنها. (رد المحتار، مطلب في حكم إسقاط الحمل زكريا ٤/٣٣٦، كراچی ٣/١٧٦، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٠/٢٦٢)

(۲) جو گناہ بلا عذر شرعی نسبندی کرانے کا ہے وہی گناہ بلا عذر شرعی بچہ دانی نکلوانے کا ہے، کیونکہ دونوں میں قطع نسل ہے، اور قطع نسل ناجائز اور حرام ہے۔

سعيد بن المسيب يقول: سمعت سعد بن أبي وقاص يقول: رد رسول الله ﷺ على عثمان بن مظعون التبتل، ولو أذن له لاختصينا. (صحيح البخاري، باب ما يكره من التبتل والخصاء، النسخة الهندية ٢/٧٥٩، رقم: ٤٨٨٢، ف: ٥٠٧٣)

قال العيني: الاختصاء في الآدمي حرام صغيرا أو كبيراً. (مرقاة، كتاب النكاح، الفصل الاول، امداديه ملتان ٦/١٨٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/رجب المرجب ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۶۲۷۸)

کیا جان کے خطرہ کی وجہ سے نسبندی کرا سکتے ہیں؟

سوال [۱۰۴۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: الحمد للہ میری نیت صاف ہے، ہر چیز کا خالق ورازق، نفع ونقصان کا مالک اللہ ہے، الحمد للہ احقر ٦/لڑکوں کا باپ ہے، ایسا بھی نہیں ہے کہ صرف دو پر اکتفا کیا گیا ہو، پریشانی صرف یہ ہے کہ احقر کی اہلیہ بہت کمزور ہے، نیز اس میں ہیموگلوبین یعنی خون کے وہ ذرات جن سے بچہ وماں کی صحت باقی رہے وہ اب چھ فیصد ہیں، اور ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ پانچ

فیصد سے کم پر جان کا خطرہ ہے، میری اہلیہ کی ہیموگلوبین دو بچوں کے بعد آٹھ فیصد سے کم ہوتے جارہے ہیں، جبکہ مستقل ان کے بڑھانے کی دوائیاں چل رہی ہیں، ڈاکٹر ہمیشہ استقرار حمل کو منع کرتے ہیں، اس مرتبہ سختی سے منع کیا ہے، اس لیے دریافت کرنا ہے کہ میرے لیے کہاں تک گنجائش ہے، کیا ایسی حالت میں آپریشن وغیرہ کی اجازت ہے؟ جبکہ عزل ونرودھ اپنا کر دیکھ چکا ہوں، اس مرتبہ جو بچہ پیدا ہوا، نرودھ کے فیل ہونے ہی سے ہوا ہے؟

المستفتی: محمد اسماعیل، راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ماہر اور تجربہ کار ڈاکٹروں نے یہ مشورہ دیا ہو کہ آئندہ ولادت پر بچہ اور اس کی ماں کی صحت اور جان کا خطرہ ہے، تو عارضی طور پر حسب ضرورت ایسے اسباب اختیار کرنے کی گنجائش ہے، جس کی وجہ سے کچھ عرصہ کے لیے ولادت کا سلسلہ موقوف ہو جائے، اور صحت وطاقت آنے کے بعد اس بندش کو ختم کر دیا جائے، لیکن اس طرح آپریشن کرانا کہ آئندہ ولادت کا سلسلہ ہی ختم ہو جائے شرعاً جائز نہیں ہے، بطور مشورہ اور عبرت کے لیے مستفتی سے یہ عرض ہے کہ جس بچہ کے پیدا نہ ہونے کے لیے نرودھ وغیرہ کے ذریعہ ماں باپ نے رکاوٹوں کی حتی الامکان کوشش کی ہے اور اللہ کی قدرت غالب آگئی، بہت ممکن ہے کہ یہی بچہ جس کو ماں باپ نہیں چاہتے تھے اور بچوں کے مقابلے میں ماں باپ کے لیے راحت اور خیر کا باعث بنے۔

ومن الأعذار أن ينقطع لبنها بعد ظهور الحمل وليس لأبي الصبي ما يستاجر به الظئر ويخاف هلاكه. (شامی، مطلب: فی حکم إسقاط الحمل زکریا ٤/٣٣٦، کراچی ٣/١٧٦)

يجوز لها سد فم رحمها كما تفعله النساء. (شامی، مطلب: فی حکم إسقاط الحمل زکریا ٤/٣٣٦، کراچی ٣/١٧٦، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٠/٢٦٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۲۰۲/۳۸)

کیا توالد وتناسل کا سلسلہ ختم کرنے کا کوئی جائز طریقہ ہے؟

سوال [۱۰۴۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مستقبل میں بچوں کا سلسلہ بند کرنے کیلئے شرعاً کوئی طریقہ اپنانے کی اجازت ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یونہی بچوں کا سلسلہ بند کرنے کا راستہ اختیار کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ شریعت میں توالد وتناسل اور کثرت امت مطلوب ہے، اس لیے اس کے خلاف حیلہ جوئی جائز نہیں ہے، بلا وجہ حیلہ جوئی کرنا شرعاً جائز نہیں، کیونکہ وہ انسان کے حکم میں ہوتا ہے، اگر اسلامی حکومت ہوتی تو اس کی دیت ادا کرنی لازم ہوتی۔

قال: إن أسقطت بفعلها وجبت عليها غرة. (الفتاویٰ العالمگیریة، الباب العاشر في الجنين زكريا قديم ٦/٣٦، جديد ٦/٤٤، شامي، زكريا ٩/٥٦١، كراچی ٦/٤٢٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ر محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۸۶۶۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۱/۲۵ھ

احتیاطاً مانع حمل ذرائع کا استعمال

سوال [۱۰۴۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہندہ کو اپنے بچوں کی ولادت میں دو بار بڑے آپریشن کے مرحلہ سے گذرنا پڑا، ڈاکٹروں کے مطابق یہ آپریشن صرف تین بار ہی ہوسکتا ہے، تیسرے آپریشن کے بعد عورت کا حاملہ ہونا اس کی صحت وزندگی کے لیے ضرر رساں ہے۔

(۱) اگر مستقبل میں تیسرے آپریشن کی نوبت آتی ہے تو آپریشن کے بعد ہندہ کے

لیے مستقل مانع حمل (نسبندی وغیرہ) اختیار کرنے کا کوئی شرعی جواز ہے یا نہیں؟

(۲) چونکہ دوسرا آپریشن ابھی حال ہی میں ہوا ہے اور جب تک اندر باہر کی آپریشن کی جگہ اچھی طرح مندمل نہ ہو جائے، ہندہ کے لیے حاملہ ہونا نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے، کیا اس صورت میں بطور احتیاط وقتی و عارضی طور پر مانع حمل ذرائع کا استعمال کیا جاسکتا ہے؟

المستفتی: تنویر الاسلام

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) صورت مسئولہ میں جان بچانے کے لیے مانع حمل دوائیں عارضی طور پر استعمال کرنے کی گنجائش ہے، لیکن دائمی نسبندی کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۸/ ۳۴۷، رحیمیہ ۳/ ۲۳۳)

(۲) بلا عذر شرعی حمل کو روکنے کے لیے مانع حمل دوائیوں کا استعمال ناجائز اور حرام ہے، ہاں البتہ ضرورت شدیدہ کے وقت مثلاً عورت کی جان کا خطرہ ہو یا شیرخوار بچہ کی پرورش میں خلل کا اندیشہ ہو تو مانع حمل دواؤں کے استعمال کی گنجائش ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ احیاء العلوم ۱/ ۴۲۷، فتاویٰ محمودیہ قدیم ۶/ ۳۷۰، ڈابھیل ۱۸/ ۳۱۷، امداد الفتاویٰ ۴/ ۲۰۳)

قالوا: یباح لها أن تعالج في استنزال الدم ما دام الحمل مضغة أو علقة ولم يخلق له عضو. (شامی، کتاب الحظر و الإباحة، باب الاستبراء وغیرہ زکریا ۹/ ٦١٥، کراچی ٦/ ٤٢٩، ھندیه زکریا قدیم ٥/ ٣٥٦، جدید ٥/ ٤١٢، النهر الفائق، دار الکتب العلمیة بیروت ١/ ١٤١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۶ رجمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۶۷۴۶/۳۵)	۱۴۲۱/۶/۶ھ

کن حالتوں میں وقتی طور پر مانع حمل کی گنجائش ہے؟

سوال [۱۰۴۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: (۱) ہمارے ایک رشتہ دار کی بیوی کو بحالت حمل یہ مرض ہونے لگا تھا کہ اس کے پورے پیر کی رگیں پھول جاتی تھیں، ورم آجاتا ہے، اور ولادت تک اسے بے حد تکلیف رہتی تھی، اس مرض کا علاج بھی کوئی نہیں تھا، ہر بچے کے وقت یہی صورت پیش آتی تھی، بالآخر مجبور ہوکر اس نے آپریشن کرالیا تا کہ آئندہ اسے اس پریشانی کا سامنا نہ ہو، ایسا کرنے کی شریعت میں کچھ گنجائش ہے یا نہیں؟

(۲) میرے بیٹے کی بیوی سے چار بچے ہو چکے ہیں، اب پانچواں حمل ہے، دوران حمل وہ بھی پریشان رہتی ہے، اور ولادت کے قریب یا اس کے بعد بہت سخت بیمار ہو جاتی ہے، ایک بار پاگل جیسی کیفیت ہوگئی تھی، اب بھی بحالت حمل اس کو شدید تکلیف ہوئی ہے، اس کا کہنا ہے کہ اپنی جان جانے تک کا اندیشہ کر رہی ہوں، اگر شرعاً مجھے آپریشن کی اجازت مل جائے تو میں اس طرح کی پریشانی سے نجات پاؤں، ایسی حالت میں جان پڑنے سے پہلے حمل کو صاف کرایا جا سکتا ہے؟

المستفتی: عبدالرحیم بڈیڈوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) ہمیشہ کے لیے اولاد کا سلسلہ منقطع کر لینا شرعاً ناجائز اور حرام ہے، سوال میں جو تکلیف مذکور ہے اس سے نجات پانے کے لیے پہلے دوسری عارضی اور وقتی تدابیر اختیار کی جائیں، مثلاً مانع حمل دوا استعمال کی جائے، تا کہ کچھ عرصہ تک استقرار حمل نہ ہو سکے، اسی طرح آج کل لیڈی ڈاکٹرنیوں کے یہاں استقرار حمل نہ ہونے کے لیے ایک خاص تار ڈالنے کا سلسلہ ہے، اس میں اچھے بھی ہوتے ہیں، گھٹیا بھی ہوتے ہیں، طاقت آنے تک کے لیے کوئی اچھا قسم کا تار ڈال دیا جائے جس سے کوئی نقصان نہ پہنچے اور بعد میں جب تندرستی اس قدر ہو جائے کہ استقرار حمل اور ولادت کا تحمل کر سکے تو اس کو نکال دیا جائے اور اس کے نکالنے میں بھی کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوتی ہے، اس لیے قوت حمل ضائع کرنے کے اسباب اختیار کرنا اس زمانہ میں ہرگز جائز نہ ہوگا، البتہ شدید عذر کی وجہ سے اوپر ذکر کردہ عارضی رکاوٹ کا اختیار کرنا جائز ہوگا، اور سوالنامہ میں جو یہ ذکر ہے کہ آپریشن کرالیا ہے، اس کی شرعاً اجازت نہیں تھی، اس گناہ سے توبہ واستغفار کرے اور

آسانی سے آپریشن کھول دینے کی جو شکل ہے اسے اختیار کرلینا چاہیے، اوراس کے سلسلے میں اوپر ذکر کردہ طریقہ اختیار کرلیا جائے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۵/۳۴۳، ۵/۱۱۵، ڈابھیل ۱۸/۳۱۲، ۲۹۰، رحیمیہ قدیم ۲/ ۲۴۶، جدید زکریا ۱۰/ ۱۸۱)

﴿وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ. [انعام: ١٥١]﴾

﴿وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيْرًا. [بنی اسرائيل: ٣١]﴾

﴿وَاِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ، بِاَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ. [التكوير: ٨-٩]﴾

عن معقل بن يسار رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: تزوجوا الودود الولود فإنی مكاثر بكم الأمم. (أبوداؤد شريف، باب فی تزويج الأبكار، النسخة الهندية ١/ ٢٨٠، دار السلام رقم: ٢٠٥٠، مشكوٰة شريف ص:٢٦٧)

(۲) ایسی حالت میں جبکہ عورت کی جان جانے کا خطرہ ہوتو اس صورت میں بچہ میں جان پڑنے سے پہلے مجبوراً صفائی کرانے کی گنجائش ہے، لیکن بجائے اس کے پہلے ہی سے تار وغیرہ کے ذریعہ سے عارضی رکاوٹ کا راستہ اختیار کرلیا جائے، تو صفائی کے مقابلہ میں زیادہ بہتر ہے۔

قالوا: يباح إسقاط الولد قبل أربعة أشهر ولو بلا إذن الزوج، قال فی النهر: بقی هل يباح الإسقاط بعد الحمل نعم يباح مالم يتخلق شيئ ولن يكون ذٰلک إلا بعد مائة و عشرين يوما، قال ابن وهبان: فإباحة الإسقاط محمولة على حالة العذر أو أنها لا تأثم إثم القتل. (شامی، مطلب: فی حكم إسقاط الحمل زكريا ٤/ ٣٣٥-٣٣٦، كراچی ٣/ ١٧٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۱۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹/ ۴/ ۱۴۲۱ھ

بچہ دانی نکلوانا

سوال [۱۰۴۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: ہندہ کے یہاں چار بچے ہیں، جب پہلا بچہ پیدا ہوا تو ڈاکٹروں کی مدد سے اور بہت کچھ پریشانیوں سے دو چار ہونا پڑا، دوسرے اور تیسرے بچے کی پیدائش میں پہلے سے زیادہ تکلیف رہی، اب چوتھا بچہ مردہ پیدا ہوا ہے، اور ہندہ کی حالت اتنی خراب ہے کہ ماہر تجربہ کار عیسائی ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اگر آگے حمل قرار پاتا ہے تو ہندہ کے بچنے کی امید نہیں کی جاسکتی ہے، کیونکہ بچے دانی میں بہت کچھ کمی آچکی ہے، تو کیا ان سب حالات میں بذریعہ آپریشن بچے دانی نکلوائی جاسکتی ہے؟ بحوالہ کتب جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: وکیل احمد قاسمی روڑکی ہریدوار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قطع نسل یعنی ایسی صورت اختیار کرنا جس سے قوت تولید ختم ہوجائے یہ کسی حالت میں جائز نہیں ہے ہاں اگر کسی عورت کو حالت زچگی میں شدید تکلیف یا جان جانے کا خطرہ ہے تو عارضی اور وقتی طور پر حمل روکنے کے اسباب اختیار کرنے کی گنجائش ہے۔

یجوز لها سد فم رحمها کما تفعله النساء مخالفا لما بحثه فی البحر من أنه ینبغی أن یکون حراما بغیر إذن الزوج . (شامی، مطلب: فی حکم إسقاط الحمل، زکریا ٤/٣٣٦، کراچی ٣/١٧٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸ر محرم الحرام ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۵۹۸۲/۳۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/۱/۱۴۲۰ھ

نسبندی کرانا جائز نہیں، چاہے ملازمت گنوانی پڑے

سوال [۱۰۴۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں ریلوے اسٹیشن میں ملازم ہوں، وہاں کے حکام مجھ سے نسبندی کرانے کو کہتے ہیں، لیکن میں نے سختی سے انکار کردیا کہ میں نسبندی ہرگز نہیں کراؤں گا، جس کی وجہ سے حکام نے مجھ کو ڈیوٹی سے بھی روک دیا ہے، اور کہہ رہے ہیں کہ پہلے نسبندی کراؤ، پھر اس کے

بعد ڈیوٹی ملے گی، اورتقریباً پانچ ماہ ہو گئے ہیں، نہایت پریشان ہوں، کیا میرے لیے نسبندی کرانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: مختار حسین محلّہ کرولہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہرگز جائز نہیں، دوسری جگہ ملازمت کی سعی کی جائے۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۲/ ۲۲۵، جدید زکریا ۱۰/۱۸۲، فتاویٰ احیاء العلوم ۱/ ۲۵۷)

رزق جواللہ نے مقدر فرمایا ہے وہ ہر حال میں حاصل ہونا ہے۔

﴿قوله تعالیٰ: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا. [هود: ٦] ﴾

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهُ مَخْرَجًا، وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ. [الطلاق: ٣] ﴾ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵ رشعبان المعظم ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۸۳۸)

نطفہ جاندار ہے یا غیر جاندار؟ اور اس کو ضائع کرنے کا حکم

سوال [۱۰۴۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: نطفہ جاندار ہے کہ غیر جاندار، اگر جاندار ہے تو ان احادیث کا کیا جواب جس میں بیان کیا گیا ہے کہ نطفہ مادر رحم میں جا کر چالیس دن تک نطفہ پھر مضغہ پھر علقہ اور پھر اس میں روح ڈالی جاتی ہے، اور اگر غیر جاندار ہے تو اس کو ضائع کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟ ضائع کرنا ہے، کسی بھی طریقہ سے ہو، مثلاً عزل، آپریشن، نیرودھ وغیرہ کے استعمال کے ذریعہ؟

المستفتی: محمد یوسف قاسمی گجراتی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نطفہ شرعی طور پر غیر جاندار ہے اس میں جاندار

بننے کی صلاحیت ہے، عورت یا شیر خوار بچہ کی شدید کمزوری کی وجہ سے چار ماہ سے قبل ضائع کر دینا جائز ہے، خوفِ رزق کی وجہ سے نہیں۔

قالوا يباح لها أن تعالج فی استنزال الدم ما دام الحمل مضغة أو علقة، ولم يخلق له عضو وقدروا تلك المدة بمائة و عشرين يوما وجاز لأنه ليس بآدمی وفيه صيانة الآدمی. (شامی، کتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره زكريا ۶۱۵/۹، كراچی ۴۲۹/۶، هنديه زكريا قديم ۳۵۶/۵، جديد ۴۱۲/۵، النهر الفائق، دار الكتب العلمية بيروت ۱۴۱/۱)

قالوا: يباح إسقاط الولد قبل أربعة أشهر. (شامی، مطلب: فی حکم إسقاط الحمل زكريا ۳۳۵/۴-۳۳۶، كراچی ۱۷۶/۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۳۳/۲۴)

ضرورت شدیدہ کی وجہ سے اسقاط اور وقفہ کی گنجائش

سوال [۱۰۴۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ایک عورت حاملہ ہے، جب تین چار مہینہ تک حمل پہنچ جاتا ہے تب پیشاب بند ہو جاتا ہے، جب ڈاکٹر کے پاس لے گئے، تو ڈاکٹر نے (آل ٹراچن) کر کے دیکھ کر بتایا کہ اس عورت کے پیشاب کے دروازہ پر گوشت بڑھ گیا ہے، جب بچہ تین چار ماہ کا ہو جاتا ہے تب پیشاب بالکل بند ہو جاتا ہے، اور زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے، اب یہ آدمی کیا کرے؟ کیا حمل کو گرانا یا ثابت نہ ہونے دینا، یا بالکل ولادت کو بند کرا دینا جائز ہے؟

(۳) وقفہ کرنا یعنی پانچ یا دس سال تک کے بچہ پیدا نہ ہونے دینا، پھر اس کے بعد بچہ پیدا ہوگا تو کیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد صادق حسین آسامی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) اسقاط حمل شریعت میں اصلاً ناجائز اور حرام ہے، مگر سوالنامہ میں ذکر کردہ صورت حال کے مطابق اگر واقعی کسی ماہر ڈاکٹر اور حکیم نے عورت کا معائنہ کرکے بتلایا ہے کہ حمل ساقط نہ کیا گیا تو عورت کی جان خطرے میں پڑ جائے گی، تو اس عذر کو سامنے رکھ کر چار ماہ سے پہلے پہلے حمل کو ساقط کرانے کی گنجائش ہے، اور چار ماہ کے بعد تو اس کا اسقاط مطلقاً حرام ہے، کسی بھی عذر سے اس کی گنجائش نہیں ہے، اور نسبندی وغیرہ سے اس کو بالکل ہی بند کرا دینا اس کا بھی شریعت قطعاً ناجائز اور حرام ہونے کا حکم دیتی ہے، ہاں البتہ علاج کرکے صحیح ہونے کے لے عارضی رکاوٹ پیدا کرنے کی گنجائش ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۸/ ۳۴۸، عزیز الفتاویٰ ص: ۷۴۴، فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۶/ ۲۷۵، جدید زکریا ۱۰/۱۸۱)

قال فی النهر: بقی هل یباح الإسقاط بعد الحمل نعم یباح مالم یتخلق شیئ ولن یکون ذٰلک إلا بعد مائة و عشرین یوما. (شامی، مطلب: فی حکم إسقاط الحمل زکریا ٤/٣٣٥-٣٣٦، کراچی ٣/١٧٦، زکریا ٩/٦١٥، کراچی ٦/٤٢٩، هندیه زکریا قدیم ٥/٣٥٦، جدید ٥/٤١٢، النهر الفائق، دار الکتب العلمیة بیروت ١/١٤١)

فإباحة الإسقاط محمولة علی حالة العذر أو أنها لا تأثم إثم القتل. (شامی، مطلب: فی حکم إسقاط الحمل زکریا ٤/٣٣٦، کراچی ٣/١٧٦)

حمل کی وجہ سے موجودہ بچہ کی صحت کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو یا عورت اتنی نحیف و کمزور ہے کہ ولادت کا بار برداشت نہیں کر سکتی ہے تو ایسی صورت میں وقفہ کی گنجائش ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۸/ ۳۴۷، فتاویٰ محمودیہ قدیم ۶/ ۳۰۷، ڈابھیل ۱۸/ ۳۱۷، فتاویٰ احیاء العلوم ص: ۲۷۴)

ومن الأعذار أن ینقطع لبنها بعد ظهور الحمل ولیس لأبی الصبی ما یستاجر به الظئر و یخاف هلاکه. (شامی، مطلب: فی حکم إسقاط الحمل زکریا ٤/٣٣٦، کراچی ٣/١٧٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍رجب المرجب ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۸۰۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲؍۷؍۱۴۲۲ھ

اسقاط حمل کا حکم

سوال [۱۰۴۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید کی عمر تقریباً چالیس سال ہے، اس کے پانچ بچے ہیں، دو بچے، تین بچیاں، زید کی اہلیہ خالدہ جب حاملہ ہوتی ہے تو سخت بیمار پڑ جاتی ہے، یہاں تک کہ تقریباً تین ماہ اس کا کھانا پینا مشکل ہو جاتا ہے، صاحب فراش ہوجاتی ہے، اور ابتداء حمل میں کوئی چیز کھاتی ہے یا پیتی ہے تو فوراً قے ہو جاتی ہے، وہ کافی کمزور ہو جاتی ہے، اس وجہ سے زید کے بچوں کو کھانا ملنا اور مدرسہ اسکول جانا دشوار کن بن جاتا ہے، چونکہ سارے بچے چھوٹے ہیں اور زید اس لائق نہیں کہ خادمہ رکھ سکے، اور اس کے گھر میں دوسری کوئی عورت بھی نہیں ہے تو ایسی صورت میں کیا سلسلۂ تولد کو بذریعہ میکانیکل یا فیزیکل روک سکتا ہے؟ یعنی دوا یا لوپ کے ذریعے؟

(۲) زید کی اہلیہ حاملہ ہوگئی، مدت حمل ابھی تقریباً ایک ماہ دس روز کا ہوا ہے تو دونوں رضامندی سے مذکورہ مجبوریوں کے تحت حمل کو ضائع کر سکتے ہیں؟ اگر کر دیا تو اس پر دیت لازم آئے گی؟، واضح رہے کہ زید اور خالدہ دونوں کو اپنے رب پر یقین ہے کہ وہ ذات خالق و رازق ہے، زید کثیر اولاد کی وجہ سے نہیں بلکہ خالدہ کی طبیعت کی وجہ سے ایسا سوچتا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) ایسا عمل کرالینا جس سے دائمی طور پر سلسلہ اولاد منقطع ہوجائے، ناجائز اور حرام ہے، اور حمل کے زمانہ میں قے کا آنا مرض کے دائرے میں داخل نہیں ہے، البتہ اگر عورت کی جان کا اندیشہ ہو تو صحت یابی تک عارضی طور پر مانع حمل دواؤں کے استعمال کی گنجائش ہے۔

(۲) بلا عذر حمل گرانے کی بھی اجازت نہیں، ہاں اگر عورت کی جان کا خطرہ ہے تو پھر ۱۲۰/ دن کی مدت کے اندر اندر اسقاط حمل کی گنجائش ہے۔

قالوا: يباح إسقاط الولد قبل أربعة أشهر ...... وهو محمولة على حالة العذر.

(شامی، مطلب: فی حکم إسقاط الحمل زکریا ٤ /٣٣٥-٣٣٦، کراچی ٣/١٧٦، هندیه زکریا قدیم ٣٥٦/٥، جدید ٤١٢/٥، النهر الفائق، دار الکتب العلمیة بیروت ١ /١٤١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ربیع الاول ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۰۱۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۳/۱۰ھ

حمل گرانے کا حکم

سوال [۱۰۴۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید جو کہ پیشہ کے اعتبار سے ڈاکٹر ہے، اس کے پاس کچھ خطا کار مسلم خواتین آئیں، کہ ان کی خطا کی نشانی یعنی ناجائز حمل ساقط کردیا جائے، ایسی صورت میں جاننا یہ ہے کہ مسلم عورت کی عزت کا مسئلہ ہے، حمل کے ضیاع کے متعلق حکم کیا ہے؟ زید کا ایسا کرنا کیسا ہے؟ جبکہ ذہن میں یہ بات ہے کہ یہ دوا نہ کرے تو کوئی دیگر ڈاکٹر اس کام کو انجام دے گا، شرعی حکم واضح کریں؟

المستفتی: محمد ملیح مہراج گنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حمل کا گرانا بلا عذر شدید کے جائز نہیں ہے، چاہے حمل حلال نطفہ سے ہو یا بدکاری کے حرام نطفہ کا ہو، دونوں صورتوں میں جائز نہیں ہے، ہاں البتہ اگر عورت کی جان کا خطرہ ہے یا دودھ پیتے بچے کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے تو حمل پر ۱۲۰/دن گذرنے سے پہلے پہلے انتہائی مجبوری کی وجہ سے گرانے کی گنجائش ہے، اور ۱۲۰/دن گذرنے کے بعد شدید مجبوری کے باوجود بھی جائز نہیں ہے، اور ناجائز حمل کا اسقاط کرنے والا ڈاکٹر اور کروانے والے دونوں گنہگار رہوں گے۔

ویکره أن تسقی لإسقاط حملها، وجاز لعذر حیث لا یتصور، قال الشامی: وقدروا تلک المدة بمائة وعشرین یوما وجاز لأنه لیس بآدمی وفیه صیانة الآدمی، خانیة: (حیث لا یتصور) قال الشامی: قید لقوله وجاز لعذو التصور کما

فی القنية: أن يظهر له شعر أو إصبع أو رجل أو نحو ذٰلک. (در مختار مع الشامی، کتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغیرہ، زکریا ۹/۶۱۵، کراچی ۶/۴۲۹)

العلاج لإسقاط الولد إذا استبان خلقه كالشعر والظفر ونحوهما لايجوز، وإن كان غير مستبين الخلق يجوز وخلقه لا يستبين إلا بعد مائة وعشرين يوما. (ھندیہ، الباب الثامن عشر فی التداوی والمعالجات زکریا قدیم ۵/۳۵۶، جدید ۵/۴۱۲)

امرأة عالجت في إسقاط ولدها لا تأثم مالم يستبن شيئ من خلقه. (البحر الرائق، کتاب الکراھیۃ زکریا ۸/۳۷۶، کوئٹہ ۸/۲۰۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ ذی قعدہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۸۱۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۱۱/۱۵ھ

کن حالتوں میں اسقاط حمل جائز ہے؟

سوال [۱۰۴۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہندہ جو پانچ بچوں کی ماں ہے، عمر تقریباً تیس سال ہے، صحت کے اعتبار سے کمزور ہے، ہر حمل کے وقت ماہر لیڈی ڈاکٹرنی کی نگرانی میں رہتے ہوئے بڑی پریشانیاں اور پیچیدگیاں پیدا ہوجاتی ہیں، کبھی بے ہوش ہوجاتی ہے کبھی دردوں کا سلسلہ چلتا رہتا ہے، چپ پڑی رہتی ہے، چلنا پھرنا دوبھر، کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ وہ اس سے جانبر نہ ہوسکے گی، اور یہ زندگی کا آخری مرحلہ ہے، کیا ایسے میں وہ ضبط تولید کا آپریشن کراسکتی ہے؟

المستفتی: محمد یعقوب شمسی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسے شدید اعذار کی صورت میں عارضی طور پر استقرار حمل کو روکنے کا علاج جائز ہے، مگر آپریشن کے ذریعہ تولید کی صلاحیت کو ختم کرنے کی اجازت شرعاً نہیں ہے، اور آج کل استقرار حمل کو روکنے کے لیے مختلف قسم کے طریقے ایجاد

ہو چکے ہیں، ان میں سے جو آپ کو مناسب ہو اختیار کرلیں۔

ویکره أن تسقی لإسقاط حملها، وجاز لعذر حیث لایتصور، وإن أسقطت میتا فهی السقط غرة الخ. (در مختار مع الشامی، کتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغیره، زکریا ۹/ ٦١٥، کراچی ٦/ ٤٢٩، هندیه زکریا قدیم ٦/ ٣٦، جدید ٦/ ٤٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۴۰۱)

حج میں جانے کے لیے حمل ساقط کرانا

سوال [۱۰۴۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید اور اس کی بیوی کی حج کی درخواست منظور ہوچکی ہے اور اب بیوی کو ڈیڑھ ماہ کا حمل ہے، اگر اس کو باقی رکھا جائے تو موسم حج تک وہ تقریباً ۸؍ ماہ کا ہوجائے گا، جس کی وجہ سے حج میں پریشانی ہوگی، کیا ایسی صورت میں اس کو ساقط کرایا جاسکتا ہے؟

المستفتی: اسرار احمد نجیب آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ایسے اعذار سے حمل ساقط کرنا جائز نہیں ہے، نیز وہاں مکہ یا مدینہ کے قیام کے دوران بہت سی عورتوں سے ولادت بھی ہوجاتی ہے، نیز وہاں پر ہسپتالوں میں مفت علاج بھی نہایت عمدہ انداز سے ہوتا ہے، اس لیے حمل ساقط کرنا ہرگز جائز نہ ہوگا۔

الضرورات تقدر بقدرها. (قواعد الفقه اشرفی ص:۸۹، رقم: ۱۷۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍جمادی الاولیٰ ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۷۴۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴/ ۵/ ۱۴۱۹ھ

حمل ساقط کرنے کا حکم

سوال [۱۰۴۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: غیروں کی تقلید کرتے ہوئے مسلمانوں میں اسقاط کا رجحان نہایت تیزی سے فروغ پا رہا ہے، جو کبھی شوہر کی مرضی سے ہوتا ہے، کبھی لاعلم رکھ کر، جواب طلب مسئلہ یہ ہے کہ اگر شوہر کو لاعلم رکھ کر چند ماہ کا حمل ضائع کرا دیا، ان اعذار پر کہ بچہ بہت چھوٹا ہے، یا بچے بڑے ہوگئے ہیں، شرم مانع ہے، مزید یہ کہ ابھی جان نہیں پڑی ہے تو عورت شرعاً کس زمرے میں آتی ہے، یا شوہر کی مرضی سے ہو تو کیا اس کی امامت میں کراہت تو نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر حمل اور وضع حمل میں عورت کی جان کا خطرہ نہیں ہے تو ایسی صورت میں استقرار حمل کے بعد حمل کا ضائع کرنا جائز نہیں ہے، اور اگر عورت کی جان کا خطرہ ہے اور سخت مجبوری ہے، تو چار مہینہ سے پہلے پہلے دواؤں کے ذریعہ سے حمل کو ضائع کرنے کی گنجائش ہے۔ (مستفاد: عزیز الفتاویٰ ۱/۷۴۴)

کما فی الشامیة: وعبارة فی عقد الفوائدة، قالوا: یباح لها أن تعالج فی استنزال الدم مادام الحمل مضغة ولم یخلق له عضو وقدروا تلک المدة بثلاثة وعشرین یوما إنما أباحوا ذٰلک لأنه لیس بآدمی. (شامی، کتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغیرہ زکریا ۹/۶۱۵، کراچی ۶/۴۲۹، ہندیہ زکریا قدیم ۵/۳۵۶، جدید ۵/۴۱۲، النهر الفائق، دار الکتب العلمیة بیروت ۱/۱۴۱) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۲۴ ؍محرم الحرام ۱۴۲۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۸۶۶۷)	۱۴۲۱/۱/۲۴ھ

کیا چار ماہ سے قبل اسقاط حمل مباح ہے؟

سوال [۱۰۴۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: اسقاط حمل مباح ہے جب تک کہ ایک سو بیس دن نہ گذر جائیں، کمافی کتب الفتاویٰ، دریافت طلب امر یہ ہے کہ یہ ایک سو بیس دن کب سے شروع ہوتے ہیں۔

المستفتی: محمد شعیب ساؤتھ افریقہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ایک سو بیس دن سے قبل بھی بلا عذر معقول کے اسقاط حمل جائز نہیں ہے بلکہ ۱۲۰/ دن سے قبل صرف شدید عذر کی وجہ سے جائز ہے اور ۱۲۰/ دن استقرار کے دن سے شمار ہوں گے اور ۱۲۰/دن پر جان پڑ جاتی ہے۔

عن ابن مسعودؓ قال: حدثنا رسول الله ﷺ وهو الصادق المصدوق إن أحدكم يجمع خلقه في بطن أمه في أربعين يوما ثم يكون علقة مثل ذٰلک ثم يكون مضغة مثل ذٰلک ثم يرسل إليه الملک فينفخ فيه الروح.

(صحيح مسلم، باب كيفية خلق الآدمي في بطن أمه، النسخة الهندية ۲/ ۳۳۲، بيت الأفكار رقم: ۲٦٤۳، سنن ابن ماجه، باب في القدر، النسخة الهندية ۱/ ۸، دار السلام رقم: ۷٦)

ويكره أن تسقى لإسقاط حملها، وجاز لعذر حيث لايتصور، وإن أسقطت ميتا ففي السقط غرة. (در مختار مع الشامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ۹/ ٦۱۵، كراچی ٦/ ٤۲۹، هنديه زكريا قديم ٦/ ۳٦، جديد ٦/ ٤٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۲۴/ صفر المظفر ۱۴۱۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۳۴۹)	۱۴۱۶/۲/۲۴ھ

لاغر عورت کی گود میں چار ماہ کا بچہ ہو تو اسقاط حمل جائز ہے یا نہیں؟

سوال [۱۰۴۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کی بیوی جس کی گود میں چار ماہ کا بچہ ہے، اس دوران اس کو حمل قرار پا جاتا

ہے، اس وجہ سے بچے کو پورا دودھ نہیں مل پاتا، نیز ہندہ لاغر بھی ہے، اس صورت میں ہندہ اسقاط حمل کرا سکتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: ایم اے خان، ٹھاکردوارہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اسقاط حمل فی نفسہ ناجائز اور حرام ہے، لیکن مذکورہ اعذار کی صورت میں اگر بچہ یا ماں کا سخت خطرہ ہو تو حمل میں اعضاء اور جان پڑ جانے سے پہلے پہلے ضرورت شدیدہ کی بنا پر اسقاط حمل کی تدبیر جائز ہے، اور اعضاء میں جان پڑ جانے کی صورت میں کسی طرح جائز نہیں ہے، عورت کے کمزور ہونے کی صورت میں استقرار حمل سے قبل ہی ایسا علاج کرلیا جائے جس سے طاقت آنے تک استقرار نہ ہو۔
(مستفاد: فتاویٰ احیاء العلوم ۱/ ۲۴۸، امداد الفتاویٰ ۴/ ۲۰۲)

ویکره أن تسقی لإسقاط حملها، وجاز لعذر حیث لایتصور (الدر المختار) قال الشامي: جاز لعذر کالمرضعة إذا ظهر الحبل وانقطع لبنها ولیس لأبي الصبي ما یستاجر به الظئر ویخاف هلاک الولد قالوا یباح لها أن تعالج فی استنزال الدم مادام الحمل مضغة أو علقة ولم یخلق له عضو وقدروا تلک المدة بمائة وعشرین یوما وجاز لأنه لیس بآدمی وفیه صیانة الآدمی. (در مختار مع الشامی، کتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغیره، زکریا ۹/ ۶۱۵، کراچی ۶/ ۴۲۹، کوئٹه ۵/ ۳۰۴، هندیه زکریا قدیم ۵/ ۳۵۶، جدید ۵/ ۴۱۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ رجب ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۸۱۲)

۵/۶ ماہ کا حمل ساقط کرانا

سوال [۱۰۴۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے شوہر کا انتقال ہوگیا ہے، میرے چھ بچے ہیں اور پانچ مہینہ کا حمل ہے، ہر وقت

پردہ میں رہتی ہوں، ڈاکٹرنی کو بھی دکھایا ہے اس نے کہا کہ بچہ صحیح ہے، عورتیں کہتی ہیں کہ بچہ ایک سال میں پیدا ہوگا، بہت پریشان ہوں، ہسپتال جا کر صفائی ہو جائے تو کیا اس کی اجازت ہے؟

المستفتی: مہتاب النساء اصالت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب آپ کے حمل کو پانچ مہینے ہو گئے اور ڈاکٹرنی نے کہہ دیا کہ بچہ ٹھیک ہے تو اب ہسپتال جا کر صفائی کی اجازت نہیں بلکہ بچہ پیدا ہونے تک عدت میں رہنا ضروری ہوگا۔

قال فی النهر: بقی هل یباح الإسقاط بعد الحمل نعم یباح مالم یتخلق شیئ ولن یکون ذٰلک إلا بعد مائة و عشرین یوما (إلی قوله) وإباحة الإسقاط محمولة علی حالة العذر. (شامی، مطلب: فی حکم إسقاط الحمل زکریا ٤/٣٣٥-٣٣٦، کراچی ٣/١٧٦، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ٢٦٤/٤٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍رجب المرجب ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۴۱۱۸)

چھ ماہ کا حمل ساقط کرانا

سوال [۱۰۴۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص نے زنا کیا اور اس کے نتیجے میں حمل قرار پایا، یہاں تک کہ چھ ماہ ہو گئے، تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس حمل کو ساقط کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ نیز حالت حمل میں اس سے نکاح اس لڑکے کا ہو سکتا ہے یا نہیں؟ حالانکہ زانی، زانیہ سے نکاح کرنے کو تیار نہیں تو جبراً نکاح کرایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر زبردستی کرادیا تو شرعاً عقد نکاح منعقد ہوگا یا نہیں؟ جواب سے آگاہ فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔

المستفتی: سعید الرحمٰن آسامی مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: چھ ماہ کے حمل کو ساقط کرانا ہرگز جائز نہیں ہے، اس میں جان پڑ چکی ہے، اس کو ساقط کرانے والے اور اس میں تعاون کرنے والے سب سخت گنہگار ہوں گے، اور حالت حمل میں زانی کا نکاح زانیہ کے ساتھ صحیح اور درست ہوگا، اور نکاح کے بعد شب باشی بھی جائز ہوگی۔

وإن أسقطت ميتا ففي السقط غرة. (الدر المختار، باب الاستبراء وغيره زكريا ٩/ ٦١٥، كراچی ٦/ ٤٢٩، هنديه زكريا قديم ٦/ ٣٦، جديد ٦/ ٤٤)

وصح نكاح حبلىٰ من زنا (إلى قوله) لو نكحها الزاني حل له وطؤها. (الدر مع الرد، كتاب النكاح، زكريا ٤/ ١٤١-١٤٢، كراچی ٣/ ٤٨-٤٩)

اگر نکاح کیا جاتا ہے اور لڑکا اپنی زبان سے قبول کر لیتا ہے تو نکاح صحیح ہو جائے گا۔

أكره على النكاح جاز العقد. (الجوهرة النيرة، كتاب الإكراه، امداديه ملتان ٢/ ٣٥٥، دار الكتاب ديوبند ٢/ ٣٣٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۲۳؍ ربیع الاول ۱۴۱۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۶۰۰)	۱۴۱۲/۳/۲۳ھ

پیدائش کے وقت موت کے اندیشہ سے وضع حمل

سوال [۱۰۴۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کی بیوی نہایت کمزور ہے جب وضع حمل کا وقت آتا ہے تو شدید تکلیف کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مرنے کے قریب ہے، اس کی کمزوری کا علاج بھی کر لیا گیا ہے، لیکن کمزوری بدستور باقی ہے اور وضع حمل کے وقت موت کا خطرہ رہتا ہے، تو کیا ایسی صورت میں اسقاط حمل کرا سکتے ہیں یا اس کے علاوہ کوئی صورت اور ہو تو رہنمائی فرمائیں؟

المستفتی: محمد راشد بلند شہری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر وضع حمل کے وقت موت کے خطرہ کی شکلیں پیش آچکی ہیں، تو آئندہ کے لیے جب تک عورت تندرست نہ ہو جائے حمل قرار نہ پانے کے اسباب اختیار کرنے کی گنجائش ہے، اور جن اسباب وعلاج کے ذریعہ سے استقرار حمل نہ ہو سکے اس کی بہت سی شکلیں ہیں، جو لیڈیز ڈاکٹرنیوں سے مشورہ کر کے اختیار کی جاسکتی ہیں، اور اگر فی الحال استقرار حمل ہو چکا ہے تو بچہ میں جان پڑنے سے پہلے پہلے عورت کی جان کے خطرہ کی وجہ سے صفائی کرانے کی گنجائش ہے، فقہاء نے اس کی مدت چار مہینے بتائی ہے، لیکن یہ بات بھی یاد رکھیں کہ کیا خبر ہے کہ جس بچہ کو ضائع کیا جارہا ہے وہی ماں باپ کا فرمانبردار اور اللہ کا ولی ہو، اس لیے انتہائی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

وإذا أسقطت الولد بالعلاج قالوا: إن لم يستبن شيء من خلقه لا تأثم. (خانيه، كتاب الكراهية، فصل فى الختان زكريا جديد ۳/۲۹۶-۲۹۷، وعلى هامش الهندية ۳/۴۱۰)

هل يباح الإسقاط بعدالحبل؟ يباح مالم يتعلق شيئ منه ثم فى غير موضع ولا يكون ذٰلك إلا بعد مائة و عشرين يوما. (البحر الرائق، باب نكاح الرقيق كوئٹه ۳/۲۰۰، زكريا ۳/۳۴۹)

قال ابن وهبان: فإباحة الإسقاط محمولة على حالة العذر. (شامى، مطلب: فى حكم إسقاط الحمل زكريا ۴/۳۳۵-۳۳۶، كراچى ۳/۱۷۶)

قالوا: وكذٰلك المرأة يسعها أن تعالج لإسقاط الحبل ما لم يستبن شيء من خلقه وذٰلك ما لم يتم له مائة و عشرون يوما. (هنديه، الباب التاسع فى نكاح الرقيق زكريا جديد ۱/۴۰۱، قديم ۱/۳۳۵، تبيين الحقائق امداديه ملتان ۲/۱۶۶، زكريا ۲/۵۹۷-۵۹۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۰۷۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۵/۲۶ھ

بچہ کی پرورش کی خاطر مانع حمل تدابیر اختیار کرنا

سوال [۱۰۴۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: صورت مسئلہ یہ ہے کہ زید کی بیوی ہر سال حاملہ ہو جاتی ہے، جس سے بچے کی پرورش میں کلفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کے علاوہ بچے کی ماں کو دودھ نہیں ہے، جس سے بچے کی پرورش سہولت سے ہو سکے، کیا زید بچے کی پرورش کی بنا پر (نیرودھ) یا اسقاط حمل کی ادویات یا کوئی ایسی صورت استعمال کرسکتا ہے جس سے زید کی بیوی حاملہ نہ ہو سکے؟ اغلب امید ہے کہ مفتیان کرام قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دینے کی زحمت گوارہ فرمائیں گے۔

المستفتی: ڈاکٹر شمیم عالم پورنیہ بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر زیادہ پریشانی ہے تو دو تین سال کے وقفہ کے لیے ایسا عارضی علاج اور شکل اختیار کرنا جائز اور درست ہے، کہ جس سے دیر میں استقرار حمل ہو بالکل صلاحیت ختم کرنے والی دوا استعمال کرنا جائز نہیں۔

ويكره أن تسقى لإسقاط حملها، وجاز لعذر حيث لايتصور. (در مختار مع الشامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ٩/٦١٥، كراچی ٦/٤٢٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ رصفر المظفر ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/۳۰۰۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۳/۲/۹ھ

مانع حمل دواؤں کا استعمال

سوال [۱۰۴۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج کل موجودہ زمانہ میں ایسی ایسی دواؤں کی آمد ہوئی ہے کہ اگر ان کو ہر مہینہ میں

ایک خوراک استعمال کیا جائے تو استقرار حمل نہیں ہوتا ہے، اسی طرح ایک قسم کی گولیاں ہیں جن کو ہر مہینہ میں ایک ایک کر کے استعمال کیا جائے تو استقرار حمل نہیں ہوتا ہے، کیا ایسی دوائیں اور گولیاں استعمال کرنا جائز ہے، چاہے نیت فیملی کے کم کرنے کے لیے ہو یا خشیۃ املاق کی وجہ سے؟

المستفتی: قاضیم الدین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرد اور عورت کا مادہ بچہ کے تولد کے لیے ایجاب وقبول کی طرح رکن کا درجہ رکھتا ہے اور مذکورہ دوا اور گولی مادہ کے اندر ایک مدت تک کے لیے تولد کی صلاحیت ہی ختم کر دیتی ہے، اور بلا ضرورت شدیدہ تولد کی صلاحیت کا ختم کرنا مطلقاً ناجائز اور ممنوع ہے، اس لیے ایسی دوا اور گولی کا استعمال شرعاً ناجائز اور ممنوع ہوگا، اور مسئلہ عزل میں تولد کی صلاحیت ختم نہیں ہوتی ہے اس لیے اس کے جواز سے مسئلہ مانع حمل گولی وغیرہ کے عدم جواز پر کوئی اشکال نہیں ہوسکتا۔

فماء المرأة ركن في الانعقاد فيجري الماء إلى أن يجري الإيجاب والقبول في الوجود الحكمي في العقود. (احیاء العلوم غزالی ۲/ ۳۰)

نیز فیملی کم کرنا حدیث کے خلاف ہونے کی وجہ سے ممنوع ہے۔

عن معقل بن يسارؓ قال قال رسول الله ﷺ: تزوجوا الودود الولود فإني مكاثر بكم الأمم. (أبوداؤد شريف، باب في تزويج الأبكار، النسخة الهندية ۱/ ۲۸۰، دار السلام رقم: ۲۰۵۰، مشكوٰة شريف ص: ۲۶۷) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۱۶/ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۷۰۸)

مانع حمل ادویہ کا استعمال

سوال [۱۰۴۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: (۱) ایک شخص صرف اس وجہ سے کہ جوان اولاد ہے اگر استقرار ہوگیا تو اولاد کیا کہے گی، نرودھ یا کوئی دوسری دوائی بوقت مجامعت استعمال کرتا ہے، اور عورت بھی اس کے لیے پوری طرح رضامند ہے، تو کیا یہ عمل جائز ہے؟

(۲) منفی صورت میں کس حد کا گناہ ہوگا؟

(۳) استقرار ہونے کے دوڈھائی ماہ بعد عورت کو خوف مذکورہ کی وجہ سے کافی احساس شروع ہوگیا حتی کہ دن بدن کمزوری دل پر ہر وقت صدمہ یہاں تک کہ ایسا محسوس ہونے لگا کہ وضع حمل تک ٹھکانے نہ لگ جائے، ایسی صورت میں صفائی کی کہاں تک اجازت مل سکتی ہے؟

(۴) ان خطرات سے بچنے کے لیے اگر عورت کا آپریشن کرادیا جائے کیا حکم ہے؟

(۵) کسی عالم سے سنا کہ ۹۰/دن سے پہلے پہلے صفائی کرانے کی اجازت ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

المستفتی: ظہیر احمد مدرسہ انوار العلوم جویا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بغیر کسی شرعی عذر کے کوئی ایسی دوا یا تدبیر اختیار کرنا کہ جس سے حمل قرار نہ پائے، کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۲/۳۱۴، جدید ڈابھیل ۱۸/ ۳۰۷، محمودیہ قدیم ۱۴/۳۶۳، جدید ڈابھیل ۱۸/۳۰۳، فتاویٰ احیاء العلوم ص: ۲۴۸)

عن عائشة عن جذامه بنت وهب أخت عكاشه، قالت: حضرت رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ...... ثم سألوه عن العزل فقال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: ذٰلک الوأد الخفي وإذا المؤودة سئلت. (صحيح مسلم، باب جواز الغيلة، وهي وطئ المرضع وكراهة العزل، النسخة الهندية ١/٤٦٦، بيت الأفكار رقم: ١٤٤٢، مسند أحمد بن حنبل ٦/٤٣٤ رقم: ٢٧٩٩٣، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث ٢٤/٢٠٩، رقم: ٥٣٥، مشكوٰة شريف ص:٢٧٦)

قوله وهي: وإذا المؤودة سئلت أى هذه الفعلة الشنيعة التى هى العزل مندرجة تحت هذه الآية ذكرها تاكيداً لبيان شناعته. (حاشية مشكاة شريف ص:٢٧٦)

عن معقل بن يسار رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: تزوجوا الودود الولود فإني مكاثر بكم الأمم. (أبوداؤد شريف، باب في تزويج الأبكار، النسخة الهندية

۱/ ۲۸۰، دار السلام رقم: ۲۰۵۰، مشکوٰۃ شریف ص:۲۶۷)

اسقاط حمل فی نفسہ ناجائز اور حرام ہے، لیکن وقتی اور خاص ضرورت شدیدہ کی بنا پر مثلاً ولادت میں عورت کے زیادہ کمزور ہونے کی وجہ سے جان کا خطرہ ہے، بچہ میں جان پڑنے سے قبل اسقاط کی گنجائش ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ احیاء العلوم ص:۲۴۸، فتاویٰ رحیمیہ جدید زکریا ۱۰/ ۱۹۰-۱۹۱)

يباح إسقاط الولد قبل أربعة أشهر ولو بلا إذن الزوج وتحته في الشامية: فإباحة الإسقاط محمولة على حالة العذر. (شامي، مطلب: في حكم إسقاط الحمل زكريا ٤/ ٣٣٦، كراچی ٣/ ١٧٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ شعبان المعظم ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۴۰۶)

مانع حمل دوائیں یا آپریشن کرانے کا حکم

سوال [۱۰۴۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کی شادی ہوئی، الحمد للہ چار بچے ہیں، الحمد للہ کسی بھی قسم کی پریشانی نہیں ہے، ہندہ کی طبیعت برابر خراب رہتی ہے، اگر ہندہ آپریشن کراتی ہے تو ہندہ کی طبیعت ٹھیک ہو جائے اور زید کہہ رہا ہے کہ تم آپریشن کرالو تاکہ تمہاری جو برابر طبیعت خراب رہتی ہے وہ ٹھیک ہو جائے گی، مگر ہندہ ڈرتی ہے کہ قیامت کے دن میری پکڑ نہ ہو، اس لیے ہندہ گھبراتی ہے کہ کراؤں یا نہیں؟ کیا اس کی کوئی صورت ہے، یا کوئی گنجائش ہے یا نہیں؟ شرعاً جواز کی کوئی صورت ہو تو مفصل تحریر فرمائیں تاکہ میں آپریشن کرالوں، مہربانی ہوگی۔

المستفتی: محمد عطاء اللہ سہرسہ بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر استقرار حمل کی وجہ سے ہندہ مستقل بیمار رہتی ہے تو ہندہ کے لیے شرعی طور پر ایسا علاج وقتی طور پر کرنے کی گنجائش ہے، کہ جس سے مستقل

تندرست اورطاقت ور ہونے تک کے لیے استقرار حمل نہ ہو، اور جب اللہ تعالیٰ دوبارہ تندرستی عطا فرمائے تو پھر علاج کی اجازت نہ ہوگی، اور حمل کو روکنے کی ترکیب کرنا درست نہ ہوگا، لہٰذا اگر آپریشن کی وجہ سے حمل کی صلاحیت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے تو شرعاً اس کی اجازت نہیں ہے، ہاں البتہ اگر کوئی ایسا بھی آپریشن ہو کہ جس سے وقتی طور پر حمل رکتا ہو تو اس کی اجازت ہے۔

ویکره أن تسقی لإسقاط حملها، وجاز لعذر حیث لایتصور. (در مختار مع الشامی، کتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغیره، زکریا ۹/۶۱۵، کراچی ۶/۴۲۹، هندیه زکریا قدیم ۵/۳۵۶، جدید ۵/۴۱۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ رشوال المکرّم ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/۲۴۲۰)

موجودہ دور میں عزل کا حکم

سوال [۱۰۴۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زمانہ موجودہ میں عزل کا طریقہ اختیار کر کے نسل اور توالد کا سلسلہ گھٹانا یا بند کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: داؤد القاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفیق: محض نسل گھٹانے کے لیے شوہر کا اپنی بیوی کی رضامندی سے عزل کرنا مکروہ ہے، ہاں اگر بیوی اتنی کمزور ہے کہ حمل کا تحمل نہیں کرسکتی تو اس کے صحت مند ہونے تک اس کی رضامندی سے عزل کرنا بلا کراہت درست ہے۔

عن عائشة عن جذامة بنت وهب أخت عکاشه، قالت: حضرت رسول الله ﷺ ...... ثم سألوه عن العزل فقال رسول الله ﷺ: ذلک الوأد الخفي-وزاد عبید الله فی حدیثه عن المقرئ وإذا الموؤدة سئلت.

(صحيح مسلم، باب جواز الغيلة، وهى وطئ المرضع و كراهة العزل، النسخة الهندية ١/٤٦٦، بيت الأفكار رقم: ١٤٤٢، مسند أحمد بن حنبل ٦/٤٣٤ رقم: ٢٧٩٩٣، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث ٢٤/٢٠٩، رقم: ٥٣٥، مشكوٰة شريف ص: ٢٧٦)

قال الملاعلى قارى قيل: ذٰلک لا يدل على حرمة العزل بل على كراهته. (مرقاة المصابيح، كتاب النكاح، باب المباشرة، الفصل الأول امداديه ملتان ٦/٢٣٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍رجب المرجب ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۴۹۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵؍۷؍۱۴۲۵ھ

حالت حمل یا ایام رضاعت میں عزل کرنا

سوال [۱۰۴۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ حالت حمل میں جماع سے حمل پر اثر پڑتا ہے، نیز ایام رضاعت میں جماع سے اگر حمل ٹھہر جائے تو دودھ فاسد ہوجاتا ہے اور بچہ بھی کمزور ہوجاتا ہے، تو کیا ان دونوں حالتوں میں مانع حمل دوا یا نرودھ استعمال کرسکتے ہیں، مذکورہ دونوں حالتوں میں عزل کی مطلقاً اجازت ہوگی یا مقیداً؟

المستفتی: محمد زبیر مظاہری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر واقعتاً حالت حمل میں ہم بستری سے جنین میں کمزوری آتی ہے جیسا کہ سوالنامہ میں مذکور ہے، یا ایامِ رضاعت میں ہم بستری سے دودھ میں فساد آتا ہو تو ان اعذار اور اس طرح کے دوسرے اعذار کی بنا پر ہمبستری میں عزل کرنا یا نیرودھ استعمال کرکے عارضی رکاوٹ پیدا کرنے کی بلا کراہت گنجائش ہے۔

ويكره أن تسقى لإسقاط حملها، وجاز لعذر حيث لايتصور. (در

مختار مع الشامی، کتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغیره، زکریا ۹/ ۶۱۵، کراچی ۶/ ۴۲۹، هندیه زکریا قدیم ۵/ ۳۵۶، جدید ۵/ ۴۱۲، النهر الفائق، دار الکتب العلمیة بیروت ۱/ ۱۴۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍صفر المظفر ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۴۶۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۲/۲۳ھ

نیرودھ اور مانع حمل ادویہ کا استعمال

سوال [۱۰۴۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص نیرودھ اور کپر ٹی اور حمل کو روکنے والی گولیاں استعمال کرتا ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو کیوں اور اگر ناجائز ہے تو کیوں؟ اس کے بارے میں قرآن وحدیث کی روشنی سے مفصل تحریر فرمائیں، ساتھ ہی ساتھ عزل کرنا کیسا ہے؟ کیا صحابہ کرام بھی ایسا کرتے تھے؟ جواب مطلوب ہے؟

المستفتی: ڈاکٹر ٹی ایس شان، محمد علی روڈ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بغیر شرعی عذر کے مانع حمل دوا استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ (فتاویٰ احیاء العلوم ۱/ ۲۷۴)

اس لیے یہ حدیث نبوی ”تزوجوا الودود الولود“ کے مقتضاء کے خلاف ہے، اور عذر کی وجہ سے نیرودھ استعمال کرنا اور عزل کرنا شرعاً اس میں کوئی مضائقہ اور ممانعت نہیں ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو عزل کی اجازت دی تھی، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی بتلا دیا تھا کہ جو بچہ مقدر میں پیدا ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا، چنانچہ ایسا ہوا کہ ایک صحابی عزل کرتے رہے لیکن پھر بھی استقرار حمل ہوگیا۔

عن جابر أن رجلا أتی رسول اللّٰه صلی اللہ علیہ وسلم فقال: إن لی جارة، هی خادمنا و سانیتنا، وأنا أطوف علیها وأنا أکره أن تحمل، فقال: اعزل عنها

إن شئت، فإنه سيأتيها ما قدر لها، فلبث الرجل، ثم أتاه، فقال: إن الجارية قد حبلت، فقال: قد أخبرتك أنه سيأتيها ما قدر لها. (صحيح مسلم، باب حكم العزل، النسخة الهندية ۱/۴۶۵، بيت الأفكار رقم: ۱۴۳۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ربیع الاول ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/۲۵۸۵)

بلا عذر مانع حمل طریقہ اختیار کرنا

سوال [۱۰۴۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ایک شخص کے دو بچے ہیں، اب اس کا کہنا ہے کہ میں اور بچہ پیدا کرنا نہیں چاہ رہا ہوں، اب مجھے کوئی بچہ نہیں چاہیے، تو کیا ایسا کر سکتے ہیں؟ یہ صحیح ہے اسلام میں؟ پھر وہی کہتا ہے کہ ایک تو طریقہ ہے، آپریشن کا کہ بالکل جڑ ہی سے رحم نکال کر معاملہ صاف ہو جاتا ہے، اس میں کوئی بچہ ہونے کا امکان ہی نہیں رہتا، یہ تو حرام ہے، وہ شخص خود کہہ رہا ہے یہ تمام باتیں ایک دوسرا طریقہ آج کل چلا ہے وہ یہ ہے ''اپڑی'' یہ ایک ربر ہے جو کہ عورت کی شرمگاہ کے اندر بچہ دانی کے منہ میں ڈاکٹرنی کے ذریعہ فٹ کردی جاتی ہے، اس میں عورت اور مرد کے سب تقاضے پورے ہوتے ہیں، حیض بھی معمول کے مطابق آتا ہے، اب یہ ہم لوگوں کے ہاتھ میں ہے، جب چاہیں ایک سال دو سال، تین سال پانچ سال، دس سال بعد بچہ پیدا کر سکتے ہیں، تو کیا یہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟ اس شخص کا کہنا ہے کہ میرے خیال میں تو یہ جائز ہونا چاہئے، کیونکہ اس میں امید رہتی ہے بچہ ہونے کی، لیکن جب چاہیں؟ تو آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ کیا اس طریقہ کو کر سکتے ہیں؟ کیا یہ اسلام میں جائز ہے، اگر نہیں ہے تو مکمل ومدلل تحریر فرمائیں؟

(۲) اسی طرح ایک مسئلہ عزل کا ہے جس طرح خارج فرج، منی خارج کرنا جائز، ٹھیک اسی طرح نرودھ کنڈوم کا استعمال ہے، اس میں ذکر داخل ہی رہتا ہے اور منی خارج ہو کر اس تھیلی میں جو کہ ذکر کے اوپر چڑھائی جاتی ہے، جس کو کنڈوم یا نرودھ کہتے ہیں، رہتی

ہے، تو نرودھ استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟ کر سکتے ہیں تو کن کن حالتوں میں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۲) آپریشن کے ذریعہ سے توالدو تناسل کی صلاحیت کو بالکل ختم کر دینا سخت ترین گناہ ہے، اس لیے اس کی قطعاً اجازت نہیں ہے، اور دوسرا طریقہ بلا کسی عذر شدید کے محض اس لیے اختیار کیا جائے کہ اب اولاد کی ضرورت نہیں ہے تو یہ بھی مکروہ اور ممنوع ہے، ہاں البتہ اگر عورت اس قدر بیمار اور کمزور ہے کہ حمل کا بار برداشت نہیں کر سکتی، اس کی جان کا خطرہ ہے تو وقتی طور پر دوسرا طریقہ اختیار کرنے کی گنجائش ہے۔

عن عائشة عن جذامة بنت وهب أخت عكاشه، قالت: حضرت رسول الله ﷺ …… ثم سألوه عن العزل فقال رسول الله ﷺ: ذٰلک الوأد الخفي–وزاد عبيد الله فی حديثه عن المقرئ وإذا الموؤدة سئلت.

(صحيح مسلم، باب جواز الغيلة، وهی وطئ المرضع و كراهة العزل، النسخة الهندية ۱/۴٦٦، بيت الأفكار رقم: ۱۴۴۲، مسند أحمد بن حنبل ٦/۴۳۴، رقم: ۲۷۹۹۳، المعجم الكبير للطبرانی، دار إحياء التراث ۲۴/۲۰۹، رقم: ۵۳۵، مشكوٰة شريف ص: ۲۷٦)

قال الملاعلی قاری قيل: ذٰلک لا يدل علی حرمة العزل بل علی كراهته. (مرقاة المصابيح، كتاب النكاح، باب المباشرة، الفصل الأول امداديه ملتان ٦/۲۳۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۱۵؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۳۸۳)	۱۴۲۵/۵/۱٦ھ

بلا عذر شدید کے نرودھ یا گولی استعمال کرنا

سوال [۱۰۴۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا اسلام میں ایک بچے سے دوسرے بچے کے لیے دوسال کے فاصلہ کی اجازت

ہے؟ اور کیا اس کے لیے موجودہ ایجاد نرودھ کے استعمال کی شرعاً اجازت ہے؟ نیز موجودہ ایجاد اور طریقہ گولی وغیرہ میں شرعاً ان تمام کو استعمال کی اجازت ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد اکرام دڑھیال مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دو بچوں کے درمیان دو سال کے فاصلہ کی بات لوگوں کی من گھڑت ہے، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کی پیدائش میں صرف گیارہ ماہ دس دن کا فاصلہ ہے، حضرت حسنؓ کی پیدائش ۱۵؍رمضان المبارک ۳ھ میں ہوئی اور حضرت حسینؓ کی پیدائش ۴ھ میں ہوئی ہے۔ (اکمال فی اسماء الرجال ص: ۵۹۰)

لہٰذا دو بچوں کے درمیان فاصلہ کی کوئی تعیین شریعت میں نہیں ہے اور دو سال کے فاصلہ کے لیے نرودھ یا گولی کا استعمال بلا عذر شدید کے درست نہ ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ ذیقعدہ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۷۲۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۱۱/۲۳ھ

بغیر کسی عذر کے حمل گرانا نیز حمل کو کتنی مدت کے اندر گرانے کی گنجائش ہے؟

سوال [۱۰۴۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) بغیر کسی عذر کے حمل گرانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو دوائی سے یا اوزار کے ذریعہ صفائی کی جائے؟

(۲) حمل کو کتنی مدت کے اندر اندر گرانے کی اجازت ہے؟

المستفتی: محمد مطلوب نیو سیلم پور دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۲) حمل کو بلا عذر شرعی گرانا ناجائز وحرام ہے، البتہ ضرورت شدیدہ کے وقت مثلاً عورت کی جان کا خطرہ ہو یا دودھ پیتے بچے کی پرورش میں خلل پڑنے

کا اندیشہ ہوتو ایک سوبیس دن سے پہلے بدرجہ مجبوری دوائی وغیرہ کے ذریعہ اسقاط حمل کی گنجائش ہے، لیکن اس مدت کے بعد قطعاً اجازت نہیں ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۸/ ۳۴۸، عزیز الفتاویٰ ۱/ ۴۴۷)

قالوا: يباح إسقاط الولد قبل أربعة أشهر ولو بلا إذن الزوج، قال في النهر: بقي هل يباح الإسقاط بعد الحمل نعم يباح مالم يتخلق شيئ ولن يكون ذٰلک إلا بعد مائة و عشرين يوما، قال ابن وهبان: فإباحة الإسقاط محمولة على حالة العذر أو أنها لا تأثم إثم القتل. (شامي، مطلب: في حكم إسقاط الحمل، زكريا ٤/ ٣٣٥-٣٣٦، كراچی ٣/ ١٧٦) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۵۶۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۴/۲ھ

سخت کمزوری میں مانع حمل ادویہ کا استعمال

سوال [۱۰۴۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کی بیوی حالت حمل سے ہے اور کمزوری حد درجہ ہے، نیز ٹی بی کی بھی مریض ہے، ایک ماہر طبیب سے مشورہ کیا، ڈاکٹر صاحب موصوف کا مشورہ ہے کہ آئندہ آپ ان کو مانع حمل دوائی دیدیں، موجودہ صحت کا یہی تقاضہ ہے، اب آپ سے دریافت یہ کرنا ہے کہ مذکورہ شکل میں کسی ایسی دوائی کے استعمال کی شرعاً گنجائش ہے یا نہیں؟

المستفتی: شمیم احمد ٹانڈہ رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسی سخت کمزوری کی حالت میں تندرست ہونے تک کے لیے عارضی طور پر مانع حمل دوا استعمال کرنا جائز ہے تاکہ صحت وتندرستی بحال ہونے تک استقرار نہ ہو سکے، لیکن اگر استقرار ہو چکا ہے اور بچہ میں جان پڑنے کا وقت آچکا ہے تو اس کو ضائع کرنے کے لیے جائز نہیں ہے۔

وجاز لعذر حيث لايتصور و إن أسقطت ميتا ففي السقط غرة.

(شامی، کتاب الحظر و الإباحة، باب الاستبراء وغیره، زکریا ۹/ ۶۱۵، کراچی ۶/ ۴۲۹، هندیه زکریا قدیم ۵/ ۳۳۵، جدید ۵/ ۴۰۱، تبیین الحقائق امدادیه ملتان ۲/ ۱۶۶، جدید ۲/ ۵۹۷-۵۹۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵ ؍جمادی الثانیہ ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۷۳۸)

کمزوری کے خوف سے اسقاط حمل

سوال [۱۰۴۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک عورت نفاس سے پاک ہونے کے بعد ہمبستر ہوئی، اور حمل ٹھہر گیا جبکہ بچہ تین چار ماہ کا ہے، دوسرے بچہ کی ولادت کے وقت پہلا بچہ ایک سال کا ہو جائے گا، اب بیک وقت دو بچوں کی پرورش کرنے میں ماں کو غیر معمولی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا، نیز حمل کی وجہ سے پہلے بچہ کو ماں کا دودھ بھی نہ مل پائے گا، لہٰذا دریافت یہ کرنا ہے کہ اگر کوئی ایسی صورت اختیار کرلی جائے جس سے حمل نہ ٹھہرے اور بچہ کو مکمل دو سال دودھ پینے کا موقع مل جائے اور بچہ چلنے پھرنے لگے، مثلاً کنڈوم استعمال کرنا، اسی طرح کاپر پٹی لگوانا، جس سے بیچ میں تین چار سال کا فاصلہ ہو جائے تاکہ بچے کی صحیح نشو ونما ہو اور عورت کی سابقہ ولادت کی کمزوری ختم ہو جائے یہ دونوں صورتیں کنڈوم، کاپر پٹی جائز ہیں یا نہیں؟ نیز مذکورہ دونوں چیزوں کے لیے کیا بیوی کی اجازت ضروری ہے؟

المستفتی: محمد شفیق چودھری بلندشہر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دو بچوں کے درمیان ایک سال کا فاصلہ ہو جانا پریشانی کا باعث نہیں ہے، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اس صدی تک کروڑہا خواتین

سے اسی طرح ولادت ہوئی ہے کہ دو بچوں کے درمیان صرف ایک سال کا فاصلہ رہا ہے، خود سید الکونین کی صاحبزادی حضرت فاطمہ کی اولاد، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے درمیان صرف گیارہ ماہ کا فاصلہ ہے، اور اس زمانے میں اسباب اور سہولت آج کے زمانے کے مقابلے میں بہت ہی کم تھیں، ہاں البتہ پانچ سات بچوں کی پیدائش کے بعد عورت کمزور ہوگئی ہے اور آگے ولادت کی وجہ سے اس کی صحت اور جان کا خطرہ ہوتو عارضی طور پر ایک دو سال کے لیے مذکورہ اسباب اختیار کرنے کی گنجائش ہے۔

لم يكن بين الحسن والحسين إلا طهرا. (مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ۹/۱۸۵)

ومن الأعذار أن ينقطع لبنها بعد ظهور الحمل وليس لأبي الصبى ما يستاجر به الظئر ويخاف هلاكه. (شامی، مطلب: فی حكم إسقاط الحمل زكريا ٤/٣٣٦، كراچی ١٧٦/٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ رصفر المظفر ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۱۸۶/۳۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۲/۲۷ھ

عدت کی کمزوری کی وجہ سے مانع حمل تدبیر اپنانا

سوال [۱۰۴۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک نوجوان شادی شدہ ہے اس کی بیوی کے سابق شوہر سے تین بچیاں ہیں اور خود زید سے بھی ایک بچہ اور ایک بچی ہے، صورت حال یہ ہے کہ زید کی بیوی صحبت کرنے سے انکار کرتی ہے اور کہتی ہے کہ اب تم مانع حمل تدبیر اختیار کرو، ایک مسلمان دایہ نے جو زید کی بیوی کی حالت سے واقف ہے، اس سے معلوم کرنے پر بتلایا کہ اب بچے ہونے پر جان کا خطرہ تو نہیں ہے، البتہ عورت کمزور ضرور ہے، اور زید کو ہر ہفتہ خواہش جماع ہوتی ہے، ان مذکورہ حالات میں مانع حمل تدبیر کے طور پر نرودھ وغیرہ کا استعمال شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

المستفتی: عبید الرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگرعورت کی جان کا خطرہ نہیں ہے، محض کمزوری کا مسئلہ ہے تو ایسی صورت میں مانع حمل ایسا علاج کرنا جائز نہیں ہے، جس سے ہمیشہ کے لیے حمل کا سلسلہ بند ہو جائے ہاں البتہ وقتی طور پر رکاوٹ پیدا کرنے کی گنجائش ہے اور جب عورت تندرست ہو جائے تو پھر رکاوٹ کا ختم کرنا ضروری ہے، تاکہ حمل کا سلسلہ دوبارہ جاری ہو جائے۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۸/۳۴۷، فتاویٰ رحیمیہ جدید زکریا ۱۰/۱۷۸، قدیم ۲/۲۴۶، فتاویٰ محمودیہ جدید ڈابھیل ۱۸/۳۱۲، قدیم ۵/۳۴۳)

فإباحة الإسقاط محمولة على حالة العذر. (شامي، مطلب: في حكم إسقاط الحمل زكريا ٤/٣٣٦، كراچی ٣/١٧٦)

ثم نقل ما مر عن الخانية من قولهم بإباحة العزل لسوء الزمان وقال وعلى هذا، فيباح لها سده. (منحة الخالق على البحر الرائق، باب نكاح الرقيق، كوئٹه ٣/٢٠٠، زكريا ٣/٣٤٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۶۰۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۴/۱۹ھ

شدید ضرورت میں وقتی طور پر مانع حمل دواؤں کا استعمال

سوال [۱۰۴۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) عورت کی گود میں بچہ ہے، عورت اپنے بچے کی کمزوری کے خوف سے مانع حمل دوائیں استعمال کرسکتی ہے یا نہیں؟

(۲) اگر استقرار حمل کی وجہ سے دونوں میں سے کسی کی جان کا خوف ہو تو کیا صورت ہوگی؟ دلائل کے ساتھ واضح فرمائیں۔

المستفتی: مقصود احمد مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر استقرار حمل کی وجہ سے عورت یا بچہ کی ہلاکت کا خطرہ ہے تو بچہ کے دودھ چھوڑنے اور عورت میں طاقت آنے تک کے لیے وقتی طور پر مانع حمل دوائیوں کا استعمال جائز ہے، جبکہ اس دوائی سے آئندہ تاحیات استقرار حمل کا سلسلہ ختم نہ ہو جائے۔

ویکره أن تسقی لإسقاط حملها، وجاز لعذر حیث لایتصور. (در مختار مع الشامی، کتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغیره، زکریا ۹/۶۱۵، کراچی ۶/۴۲۹، کوئٹہ ۵/۳۰۴)

اور یہ بھی بچہ میں جان پڑنے سے پہلے پہلے ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۴/۱۹۵، فتاویٰ احیاء العلوم ۱/۲۴۸، فتاویٰ محمودیہ جدید ڈابھیل ۱۸/۳۱۲، قدیم ۵/۳۴۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵ر محرم الحرام ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/۴۳۷)

مانع حمل کے لیے نرودھ کا استعمال

سوال [۱۰۴۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مانع حمل نرودھ کا استعمال جائز ہے، کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ بیوی کی اجازت سے جائز ہے؟

المستفتی: عبد الباسط بن قاری امیر احمد نگینہ بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مانع حمل نرودھ کا استعمال کرنا بغیر کسی عذر کے مکروہ اور ممنوع ہے، اس لیے کہ حدیث پاک میں آیا ہے کہ میں قیامت کے دن اپنی امت کی کثرت کے ذریعہ سے دوسروں پر فخر کروں گا، اور بلا کسی عذر مانع حمل نرودھ وغیرہ کا استعمال کرنا اکثر علماء کے نزدیک ممنوع ہے، مگر بعض علماء کے نزدیک جھگڑے سے بچنے کے لیے بغیر اجازت بھی مباح ہے۔

عن معقل بن یسارؓ قال جاء رجل إلى رسول الله ﷺ -إلى- فقال: تزوجوا الودود الولود فإني مكاثر بكم. (سنن النسائي، كراهية تزويج العقيم، النسخة الهندية ۲/۷۰، دار السلام رقم: ۳۲۲۷مسند البزار، مكتبه العلوم والحكم ۹۵/۱۳ رقم: ٦٤٥٦)

عن عمرؓ قال نهى رسول الله ﷺ عن عزل الحرة إلا بإذنها. (السنن الكبرىٰ، باب من قال: يعزل عن الحرة بإذنها...... دار الفكر ۵۳۷/۱۰ رقم: ۱٤٦٦۹)

ويعزل عن الحرة بإذنها، قال الشامي: ذكر في الكتاب: أنه لا يباح بغير إذنها وقالوا: في زماننا يباح بغير إذنها وقالوا في زماننا يباح لسوء الزمان. (شامي، مطلب: في حكم إسقاط الحمل، زكريا ٤/۳۳۵-۳۳٦، كراچی ۱۷٦/۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۱۰۴/۳۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۶/۲۴ھ

بیماری کے اندیشہ سے کنڈوم استعمال کرنا

سوال [۱۰۴۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہماری شادی ہوئے پانچ ماہ ہو چکے ہیں اس درمیان ہماری اہلیہ کے رحم میں بچہ ابتدائی مراحل میں جمنے کے بعد ساقط ہو گیا، ڈاکٹرنی نے بچہ دانی کی صفائی کے بعد یہ کہا کہ تین ماہ تک استقرار حمل نہیں ہونا چاہیے ورنہ آپ کی بیوی کو جسمانی نقصان ہوگا، تو ان حالات میں میرے لیے بوقت جماع کنڈوم کا استعمال جائز ہے جو عزل کی ایک مہذب شکل ہے جس سے منی رحم مرأۃ میں نہیں پہنچتی ہے؟

المستفتی: محمد عبد اللہ مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب ڈاکٹرنی کی صراحت کے مطابق استقرار حمل

بیوی کے حق میں مضر ہے، توشوہر کے لیے بوقت جماع کنڈوم کا استعمال کرنے کی گنجائش ہے۔

إن خاف من الولد السوء فی الحرة یسعه العزل بغیر رضاها لفساد الزمان، فلیعتبر مثله فی الأعذار مسقطا لإذنها. (شامی، مطلب: فی حکم إسقاط الحمل، زکریا ٤/٣٣٦، کراچی ٣/١٧٦)

رجل عزل عن امرأته بغیر إذنها لما یخاف من الولد السوء فی هذا الزمان فظاهر جواب الکتاب أن لا یسعه و ذکر هنا یسعه لسوء هذا الزمان کذا فی الکبریٰ. (هندیه، الباب الثامن فی التداوی والمعالجات، زکریا قدیم ٥/٣٥٦، جدید ٥/٤١١، هدایه اشرفی ٢/٣٤٢، مرقاة المفاتیح امدادیه ملتان ٦/٢٣٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۷۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۳/۱۹ھ

ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا حکم

سوال [۱۰۴۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کسی شخص کے یہاں اولاد پیدا نہ ہوتی ہو تو آج کل سائنسی دور میں اسی شخص کا پانی یا کسی دیگر شخص کا پانی اور اسی شخص کی بیوی کا پانی یا کسی دیگر عورت کا پانی ٹیسٹ ٹیوب میں لے کر اس کو دیکھ لیتے ہیں کہ اگر اس میں ترقی ہو رہی ہو تو وہ ملا ہوا پانی اسی شخص کی بیوی کے مادر رحم میں انجکشن سے ڈال دیتے ہیں اور عورت کے بچہ پیدا ہو جاتا ہے، اس پیدا شدہ بچہ کی کیا نوعیت ہے؟ جائز ہے یا ناجائز؟

المستفتی: وسیم احمد بارہ دری مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: یہ عمل ہر حال میں ناجائز اور حرام ہے، نیز اگر غیر مرد کا پانی مذکورہ شخص کی بیوی کے رحم میں ڈال دیا جائے تو یہ عمل بھی حرام اور جو بچہ ہوگا وہ بھی

حرام کا ہوگا، گو "الولد للفراش" کے اصول سے اس کو مذکورہ شخص کی طرف منسوب کیا جاتا ہو، اس لیے ایسا کرنا ہرگز جائز نہیں ہوگا۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ جدید ڈابھیل ۱۸/ ۳۲۵، قدیم ۵/۱۵۲، فتاویٰ رحیمیہ جدید زکریا ۱۰/ ۱۷۹، قدیم ۶/ ۲۸۰)

نیز مذکورہ شخص کا پانی اجنبی عورت کے پانی میں ملا کر اس کی بیوی کے رحم میں ڈال دیا جائے اور اس سے بچہ پیدا ہو جائے تو ایسی صورت میں عورت و مرد کے پانی کی تلاقی عقد شرعی کے ساتھ حلال طریقہ سے نہیں ہوئی ہے، اس لیے یہ بھی ناجائز اور حرام ہے۔

عن رويفع بن ثابت الأنصاري قال: قام فينا خطيبا قال: أما إني لا أقول لكم إلا ما سمعت رسول الله ﷺ يقول يوم حنين قال: قال لا يحل لامرئ يؤمن بالله واليوم الآخر أن يسقي ماءه زرع غيره. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، باب استبراء من ملك المتعة، دار الفكر ۱۱/ ٤٤١، رقم: ۱٦٠۱۱، سنن أبي داؤد، باب في وطئ السبايا، النسخة الهندية ۱/ ۲۹۳، دار السلام رقم: ۲۱٥٨، مسند أحمد بن حنبل ٤/ ۱٨٠، رقم: ۱۷۱۱٥-۱۷۱۲۲) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴ر رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۵۸۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۹/۴ھ

ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا شرعی حکم

سوال [۱۰۴۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کا نکاح ہوئے ۱۵ر سال کا عرصہ گذر گیا، اس کی ابھی تک کوئی اولاد نہیں ہے، زید نے اپنا اور اپنی بیوی کا میڈیکل چیک اپ کروایا، دونوں صحت مند ہیں، کسی کے مادہ منویہ میں کسی طرح کی کوئی کمی نہیں ہے، زید ٹیسٹ ٹیوب کے ذریعہ تولید کا متمنی ہے، جس کی ایک شکل یہ ہے کہ زید کا مادہ نکلوا کر انجکشن وغیرہ کے ذریعہ اس کی بیوی کے رحم تک پہنچا دیا جائے، اس طرح دونوں کے مادۂ حیات کو خلط ملط کر کے تولید عمل میں آئے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ زید اوراس کی بیوی کے مادے حاصل کر کے ٹیسٹ ٹیوب میں مخصوص مدت تک اس کی پرورش کی جائے، پھر زید کی بیوی ہی کے رحم میں اس کو منتقل کیا جائے اوراس طرح تولید عمل میں آئے، کیا یہ دونوں شکلیں شریعت کی رو سے جائز ہیں، براہ کرم شرعی دلائل سے اس کا جواب مرحمت فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں گے؟

المستفتی: یوسف جوگیشوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ میں ذکر کردہ صورت ایک حیا سوز طریقہ ہے، کیونکہ میاں بیوی کے درمیان اندرونی راز جو نہایت مخفی ہوتا ہے اس میں تیسرے شخص کی مداخلت ہوتی ہے اور یہ مداخلت غیر فطری اور بے حیائی کے ساتھ ساتھ شریعت کے نزدیک دائرۂ جواز میں نہیں آتی، یہ سارا عمل شروع سے لے کر اخیر تک غیر فطری اور ناجائز ہے، اس لیے مسلمانوں کو ایسا طریقہ اختیار کرنے سے گریز کرنا چاہیے، ہاں البتہ اگر میاں بیوی خود ڈاکٹر ہوں اور یہ فن بھی جانتے ہوں اور اس میں کسی تیسرے شخص کی مداخلت بھی نہ ہوتی ہو تو ایسا کرنے میں گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ (مستفاد: آپ کے مسائل اور ان کا حل ۸/ ۵۰۰، فتاویٰ محمودیہ ڈابھیل ۱۸/ ۳۲۴، فتاویٰ حقانیہ ۴/ ۵۹۵-۶۰۴، فتاویٰ رحیمیہ ۱۰/ ۱۷۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ ذی الحجہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۷۹۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۱۲/۲۹ھ

مشین کے ذریعہ استقرارِ حمل کا حکم

سوال [۱۰۴۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: احقر کو ایک مسئلہ میں تشویش ہے جواب تحریر فرمادیں، ایک لڑکی جس کی شادی ہوئے دس سال ہوگئے اور کوئی اولاد نہیں ہے، شوہر ہر اعتبار سے درست ہے، لیکن لڑکی کی ساس یہ کہا کرتی ہے کہ جس کے پاس اولاد نہیں ہے اس کے لیے اس گھر میں کوئی جگہ نہیں

ہے، پھر جب ڈاکٹر کی طرف رخ کیا تو اولاد ہونے کی صرف ایک صورت سامنے آئی، ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اندرونی خرابی کی وجہ سے مشین کے ذریعہ باہر سے منی پہنچا کر پھر سے ہی اس کی پرورش کریں گے، پھر ایسی صورت میں بچہ پیدا ہوسکتا ہے، تو ایسا کرنا کیا جائز ہے؟

المستفتی: محمود بھائی سوپارہ، ایسٹ تھانہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بچہ کی پیدائش اور استقرار کے جائز ہونے میں تین شرطیں نہایت لازم ہیں:

(۱) شرعی نکاح کے ذریعہ شوہر کا مادہ بیوی کے رحم ان میں پہنچے۔

(۲) بیوی ہی کے پیٹ میں نطفہ کی پرورش ہو۔

(۳) شوہر ہی کے عمل سے شوہر کا مادہ بیوی کے رحم میں پہنچ جائے۔

لہٰذا ان تینوں شرطوں میں سے ایک شرط بھی نہ ہو تو جائز نہیں ہے، مثلاً شوہر کا مادہ بیوی کے رحم میں پہنچنے میں شوہر کے علاوہ کسی اور یعنی ڈاکٹر یا نرس وغیرہ کا عمل ہو تو جائز نہیں ہے، اسی طرح شوہر ہی کا مادہ بیوی کے رحم کے بجائے کسی اور مقام میں پرورش کر کے بچہ بنایا جائے تب بھی جائز نہیں ہے، ہاں البتہ اگر شوہر ڈاکٹر ہے اور خود اپنا مادہ نکال کر اپنی ہی بیوی کے رحم میں ڈاکٹری نقطۂ نظر سے پہنچا دیتا ہے اور بیوی کے رحم میں اس کی پرورش ہوتی ہے تو جائز ہے، اس کے علاوہ اور کسی طریقہ سے جائز نہیں ہے۔

﴿فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ. [البقرة: ۲۲۳]﴾

اور دیگر شکلیں اس لیے ناجائز ہیں کہ ان تمام شکلوں میں بے حیائی اور فحاشی پائی جاتی ہیں اور دوسرے کا نطفہ داخل کرنے میں زنا کاری کے مرادف ہوتا ہے، اس لیے یہ بھی نص قطعی سے ناجائز ثابت ہوتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۲۳۲/۳۸)

استقرار حمل کا پتہ لگانے کے لیے ڈاکٹری معائنہ

سوال [۱۰۴۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: استفتاء سابق الف۳۲/ ۴۳۴۹ر کے جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ استقرار حمل کے وقت سے ۱۲۰ر دن شمار ہوں گے، از راہ کرم استقرار کی تشریح مطلوب ہے اور یہ کہ استقرار کا پتہ کس طرح ہوگا اور کب سے شروع ہوگا؟

المستفتی: محمد شعیب افریقہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہمبستری کے وقت استقرار کا یقین ہوجانا اور اس کا پتہ لگ جانا مشکل ترین امر ہے، آج کل کے زمانے میں ڈاکٹری معائنہ سے پتہ لگایا جاسکتا ہے، کہ کس دن استقرار ہوا ہے، حدیث وفقہ میں یہ بات منقول نہیں ہے کہ ہمبستری کے وقت میاں بیوی کو فلاں امر کی وجہ سے استقرار حمل کا پتہ لگ سکتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳ر جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۴۸۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۶/۱۳ھ

انتقال شدہ حاملہ کے بچہ کا حکم

سوال [۱۰۴۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک حاملہ عورت کا انتقال ہوگیا، یہ معلوم نہیں کہ اس عورت کے پیٹ میں بچہ زندہ ہے یا مردہ اس بچے کا کیا حکم ہے؟ آیا اس بچے کا پیٹ چاک کرکے نکالا جائے گا یا وہ عورت کے ساتھ دفن کردیا جائے گا؟

المستفتی: صغیر الدین دیناج پوری مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں ڈاکٹری معائنہ کے ذریعہ پتہ چل سکتا ہے، اگر معائنہ سے پتہ چل جائے کہ بچہ زندہ ہے تو مردہ عورت کا پیٹ چاک کرکے بچہ نکال لیا جائے گا۔

حامل ماتت وولدها حی شق بطنها من الأيسر ويخرج ولدها. (در مختار، کتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، زرکریا ۳/۱۴۵، کراچی ۲/۲۳۸)

الحامل إذا ماتت وفی بطنها جنين حی شق بطنها ويخرج ولدها. (الموسوعة الفقهية الكويتية ۱۶/۲۷۸، البحر الرائق، كتاب الكراهية زكريا ۸/۳۷۶، كوئٹه ۸/۲۰۵)

اوراگر زندہ ومردہ کے متعلق معلومات نہ ہوسکے یا زندہ نہ ہونے کا ظن غالب ہو تو پھر چاک نہیں کیا جائے گا۔ (رحیمیہ جدید زکریا ۱۰/۱۸۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۷۰۱۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱/۸ھ

٤ باب التداوی بالمحرم

آپریشن سے بچنے کے لیے تداوی بالمحرم کا حکم

سوال [۱۰۴۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص بیمار ہے، اگر تداوی بالمحرم اختیار کرلے تو آپریشن سے بچ جائے گا تو آپریشن سے بچنے کے لیے تداوی بالمحرم اختیار کرنا کیسا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو شخص بیمار ہے اس کے لیے کوئی مباح دوا نہ ہو جس سے وہ آپریشن سے بچ سکے، تو ایسی صورت میں آپریشن سے بچنے کے لیے تداوی بالمحرم یعنی حرام اشیاء سے بقدر ضرورت علاج کی گنجائش ہے۔

یجوز للعليل شرب الدم و أكل الميتة للتداوى إذا أخبره طبيب مسلم أن شفاءه فيه ولم يجد من المباح مايقوم مقامه. (هنديه، كتاب الكراهية، الباب الثامن عشر فى التداوى والمعالجات، زكريا قديم ٥/٣٥٥، جديد ٥/٤١٠، الكفاية مع فتح القدير كوئٹه ٨/٥٠١)

الاستشفاء بالمحرم إنما لا تجوز إذا لم يعلم فيه شفاء، أما إذا علم أن فيه شفاء وليس له دواء أخر غيره يجوز الاستشفاء به. (الفتاوىٰ التاتارخانية زكريا ١٨/٢٠٠ رقم: ٢٨٥٠٤، المحيط البرهانى، المجلس العلمى ٨/٨٢، رقم: ٩٦٣٨، عناية مع فتح القدير زكريا ١٠/٨٠، دار الفكر ١٠/٦٧، كوئٹه ٨/٥٠٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۲۶)

بطور دوا شراب کے استعمال کا حکم

سوال [۱۰۴۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جو لوگ نشہ کے عادی و مریض ہوں ان کے علاج کے لیے اگر نشہ آور اشیاء کا استعمال بھی کرنا پڑے اس طور پر کہ بتدریج اس کی عادت کو کم کر کے نفی و مکمل احتراز تک لایا جائے، اس سلسلے میں شریعت اسلامیہ ہماری کیا رہنمائی کرتی ہے؟

جواب قرآن وحدیث اور عبارات فقہاء کے دلائل سے مدلل کریں تو مہربانی اور نوازش ہوگی تاکہ ان مسائل کے سلسلے میں ہمارا خلجان دور ہو؟

المستفتی: سید معیز نواز رانچی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفیق: جب شراب کی حرمت نازل نہیں ہوئی تھی اس وقت تک اکثر لوگ بکثرت شراب پیتے تھے، اور جب شراب کی حرمت نازل ہوئی تو ہمیشہ کے لیے شراب کے عادی لوگوں نے فوراً شراب ترک کر دی، اور اس میں یہ نہیں دیکھا گیا ہے کہ بتدریج، آہستہ آہستہ چھوڑنے کی عادت ڈالی جائے، اس لیے شراب کے بارے میں قطعاً یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ اسے آہستہ آہستہ کم کیا جائے، بلکہ قطعی طور پر چھوڑ دینے کا حکم ہے، اور حدیث میں آتا ہے کہ جب شراب کی حرمت کا اعلان ہوا تو سب لوگوں نے شراب کے گھڑوں کو نالیوں میں بہا دیا اور بارش کے پانی کی طرح مدینہ کی گلیوں میں شراب کی نالیاں بہنے لگیں۔

عن أنس رضی اللہ عنہ کنت ساقی القوم فی منزل أبی طلحة، وکان خمرهم یومئذ الفضیخ، فأمر رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم منادیا ینادی: ألا إن الخمر قد حرمت، قال، فقال أبو طلحة: أخرج فأهرقها، فخرجت فهرقتها، فخرجت فی سکک المدینة. (صحیح البخاری، باب صب الخمر فی الطریق، النسخة الهندية ۱/۳۳۳، رقم: ۲٤۰۰، ف: ۲٤٦٤)

قال عمر: اللهم بین لنا فی الخمر بیانا شفاء فنزلت الآیة "فهل أنتم منتهون"

قال عمر: انتهينا. (سنن أبی داؤد، باب فی تحریم الخمر، النسخة الهندية ۲/۵۱٦، دار السلام رقم: ۳٦۷۰، مسند أحمد بن حنبل ۱/۵۳، رقم: ۳۷۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍شعبان المعظم ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۰۷۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۸/۱۳ھ

الکحل ملائی ہوئی دوا کا حکم

سوال [۱۰۴۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں ہومیوپیتھی معالج ہوں، اس لیے یہ مسئلہ دریافت کرنے کی ضرورت پیش آئی، ہومیوپیتھی میں کچھ دوائیاں سیال ہوتی ہیں جن میں نوے فیصد الکحل ہوتا ہے، اصل دوا کی مقدار صرف دس فیصد ہوتی ہے، ایسی سیال ادویات مریض کو ۲۰/۲۰ ؍قطرے روزانہ ۳ ؍یا ۴ ؍مرتبہ پلائے جاتے ہیں، لیکن اس میں قطعاً نشہ نہیں ہوتا ہے، تو کیا اس طرح کی سیال ادویات استعمال کرنا ازروئے شرع جائز ہے یا ناجائز ہے؟

المستفتی: محمد خالد قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: الکحل انگور اور کھجور کے علاوہ دوسری اشیاء سے بنایا گیا ہے تو حضرات شیخین کے نزدیک اس طرح کا الکحل ادویات اور عطریات میں استعمال کرنے کی گنجائش ہے، اور ہمارے ہندوستان میں شراب اور الکحل انگور اور کھجور کے علاوہ گنا، گاجر، مولی ودیگر اشیاء سے بنایا جاتا ہے اس لیے ہندوستان میں الکحل ملی ہوئی دواؤں کا استعمال جائز ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/ ۱۲٦، کفایت المفتی قدیم ۹/۱۴۲، جدید زکریا مطول ۱۲/ ۲٦۷، احسن الفتاویٰ ۸/۴۸۴)

ولايطلق لفظ الخمر إلا على الأول من الأربعة وأما ما سواها فيتخذ النبيذ من كل شيئ من الحبوب والثمار والألبان وتسمى هذه الأقسام بالأنبذة و حكمها ما ذكروا أن القليل أی القدر غير المسكر حلال إذا كان

بقصد التقوي على العبادة، وحرام بقصد التلهي والكثير أى القدر المسكر منها حرام وهذا مذهب الشيخين للأحناف. (العرف الشذی علی هامش الترمذی، أبواب الأشربة، باب ما جاء فی شارب الخمر ۲/۷-۸، وهكذا فی الهندية رشيديه ۴/ ۴۸۱، اشرفی ۴/۴۹۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ رصفر المظفر ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۲۳۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۲/۵ھ

الکحل ملی ہوئی دوا استعمال کرنے کا حکم

سوال [۱۰۴۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: راقم الحروف عرصہ دراز سے امراض قلب، ووجع المفاصل سے متعلق ایلو پیتھک ادویات استعمال کر رہا ہے اور اس قدر مجبوری ہے کہ اگر دو یوم دوا استعمال نہ کرے تو حالت نا قابل برداشت ہو جاتی ہے، ایلو پیتھک ادویات کے کثیر استعمال کی وجہ سے کچھ دوسری بیماریاں حاوی ہونے لگیں، امراض قلب کی ادویات گردوں پر اثر انداز ہوتی ہیں، درد کی دوائیں فعل جگر کو متأثر کرتی ہیں، متعلقین کی آراء سے ہومیو پیتھک علاج شروع کیا گیا، چار پانچ دن استعمال سے بفضل خدا خاطر خواہ فائدہ معلوم ہوا، لیکن اچانک دوا کی شیشی پر راقم کی نگاہ پڑی تو الکحل لکھا ہوا نظر آیا، الکحل دیکھ کر راقم کو دوا سے کراہیت ہوگئی اور دوا بند کردی (الکحل شراب میں ملایا جاتا ہے یا اس سے شراب بنائی جاتی ہے اس وہم کی وجہ سے راقم سینٹ بھی استعمال نہیں کرتا ہے) معالج مسلم ہیں ان سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ ہومیو پیتھک دوا کوئی بھی الکحل کے بغیر نہیں ہوتی ہم نے ڈاکٹری پڑھنے کے بعد علماء ومفتیان سے مشورہ کیا، استخارہ بھی کیا، معلوم یہ ہوا کہ بیماری سے نجات اور فائدہ کی غرض سے کوئی حرج نہیں ہے، پندرہ بیس یوم دوا بالکل استعمال نہ کرنے کی وجہ سے طبیعت زیادہ خراب ہوگئی، متعلقین نے مصر ہو کر ہومیو پیتھک دوا دوبارہ شروع کرادی، راقم بڑی کراہیت کے ساتھ استعمال کر رہا ہے، اور

پریشان ہے، عرض یہ ہے کہ حکم شرعی کیا ہے؟ دوا استعمال کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: مصباح العابدین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: الکحل عین شراب ہوتا ہے لیکن جو شراب انگور اور کھجور سے بنتی ہے وہ ناپاک اور نجاست غلیظہ ہوتی ہے اور جو انگور و کھجور کے علاوہ اشیاء سے بنتی ہے وہ حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک نجاست غلیظہ اور کلی طور پر حرام نہیں ہوتی، بلکہ اس کی نجاست میں بھی خفت ہے اور مقدار سکر سے کم حرام بھی نہیں ہے، اس لیے اس کے حکم میں تخفیف ہے، لہٰذا عطریات اور ادویات میں اس کے استعمال کی ضرورت کی بنا پر گنجائش ہے، اس لیے ہومیو پیتھک یا ایلو پیتھک کی وہ دوا جس میں الکحل ملا ہوا ہو، مریض کے لیے استعمال کرنا حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جائز ہے، لہٰذا جو دوا آپ پہلے سے استعمال کررہے تھے، وہ اب بھی استعمال کرنے کی گنجائش ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ا/۱۲۶)

ولا يطلق لفظ الخمر إلا على الأول من الأربعة وأما ما سواها فيتخذ النبيذ من كل شيئ من الحبوب والثمار والألبان وتسمى هذه الأقسام بالأنبذة وحكمها ما ذكروا أن القليل أى القدر غير المسكر حلال إذا كان بقصد التقوي على العبادة، وحرام بقصد التلهي والكثير أى القدر المسكر منها حرام وهذا مذهب الشيخين للأحناف. (العرف الشذى على هامش الترمذى، أبواب الأشربة، باب ما جاء فى شارب الخمر ۲/۷-۸، وهكذا فى الهندية رشيديه ٤/ ٤٨١، اشرفى ٤/ ٤٩٧) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۲۳/ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۵۲۹)

ماکول اللحم جانور کے پیشاب سے علاج

سوال [۱۰۴۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ بطور علاج ماکول اللحم جانور کا پیشاب پینا جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ماکول اللحم جانور کا پیشاب بطور علاج پینا جائز ہے جبکہ کسی ماہر ڈاکٹر نے یہ خبر دی ہو کہ اس مریض کا علاج اسی پیشاب میں منحصر ہے۔

یجوز للعليل شرب البول والدم وأكل الميتة للتداوى إذا أخبره طبيب مسلم أن شفاءه فيه ولم يجد من المباح مايقوم مقامه. (هنديه، كتاب الكراهية، الباب الثامن عشر فى التداوى والمعالجات، زكريا قديم ۵/۳۵۵، جديد ۵/۴۱۰، الكفاية مع فتح القدير كوئٹه ۸/۵۰۱، شامى، مطلب: فى التداوي بالمحرم، كراچى ۶/۳۸۹، زكريا ۹/۵۵۸)

الاستشفاء بالمحرم إنما لا تجوز إذا لم يعلم فيه شفاء، أما إذا علم أن فيه شفاء وليس له دواء أخر غيره يجوز الاستشفاء به. (الفتاوىٰ التاتارخانية زكريا ۱۸/۲۰۰ رقم: ۲۸۵۰۴، المحيط البرهانى، المجلس العلمى ۸/۸۲، رقم: ۹۶۳۸، عناية مع فتح القدير زكريا ۱۰/۸۰، دار الفكر ۱۰/۶۷، كوئٹه ۸/۵۰۰)

وجوزه فى النهاية بمحرم إذا أخبره طبيب مسلم أن فيه شفاء ولم يجد مباحا يقوم مقامه. (در مختار مع الشامى، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، كراچى ۶/۳۸۹، زكريا ۹/۵۵۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۲۵)

گائے کا پیشاب اور افیون ملی ہوئی دواؤں کا استعمال وتجارت

سوال [۱۰۴۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ یونانی آیورویدک جس میں مختلف حیوانی اجزاء کا استعمال ہوتا ہے نیز افیون اور

آیورویدک دواؤں میں گائے کا پیشاب استعمال ہوتا ہے، کیا ان دواؤں کو حلال سرٹیفکیٹ دیا جا سکتا ہے؟

المستفتی: نیاز احمد فاروقی حلال ٹرسٹ جمعیۃ علماء ہند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ماکول اللحم جانوروں کا پیشاب امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک نجاست خفیفہ ہے، اور امام محمدؒ کے نزدیک پاک ہے، اور دواؤں کے طور پر ماکول اللحم کے پیشاب کا استعمال امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کے نزدیک بلا کراہت جائز ہے اور تداوی کے طور پر استعمال کرنے میں امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق جواز کو راجح قرار دیا گیا ہے، اس لیے جن آیورویدک دواؤں میں گائے کا پیشاب ملا دیا گیا ہو ان کا استعمال کرنا ضرورتاً بلا کراہت جائز اور درست ہے، نیز حضرت تھانویؒ نے امداد الفتاویٰ ۴/ ۲۰۷، میں ایسی دواؤں کے استعمال کو جائز اور حلال لکھا ہے جن میں افیون ملا ہوا ہو، بس اتنی شرط ہے کہ ان دواؤں کے استعمال کی وجہ سے نشہ نہ آتا ہو، لہٰذا ان دواؤں کا استعمال اور ان کی تجارت جائز اور درست ہے، اور ان دواؤں کے تاجروں کے لیے حلال سرٹیفکیٹ جاری کر دینا بھی بلا شبہ جائز ہوگا، پہلے مسئلہ سے متعلق شامی کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

كره لحم الأتان ولبنها ولبن الجلالة التي تاكل العذرة ولبن الرمكة أي الفرس و بول الإبل، وأجازه أبو يوسف للتداوي (وتحته في الشامية) قالا: لا بأس بأبوال الإبل ولحم الفرس للتداوي (إلى قوله) بقول أبي يوسف أخذ أبو الليث. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، زكريا ۹/ ۴۹۱، کراچی ۶/ ۳۴۰)

(۲) اس سلسلے میں ہدایہ کی عبارت اس طرح ہے:

وقال أبو يوسف و محمد: لا بأس بأبوال الإبل، فتأويل قول أبي يوسف أنها لا بأس للتداوي. (هدايه، كتاب الكراهية، فصل في الأكل والشرب، اشرفی ۴/ ۴۵۲)

(۳) اس سے متعلق ہندیہ کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

وقالا: لابأس بأبوال الإبل و لحم الفرس للتداوي كذا في الجامع الصغير. (هنديه، الباب الثامن عشر في التداوي والمعالجات زكريا قديم ۵/ ۳۵۵، جديد

٥/ ٤١٠) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ ذیقعدہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۶۹۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸/ ۱۱/ ۱۴۳۵ھ

تیل میں گائے کا پیشاب ملاکر بطور دوا استعمال کرنا

سوال [۱۰۴۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) گائے کا پیشاب اگر کسی تیل میں ابالا جائے حتی کہ پیشاب بالکل ختم ہوجائے تو کسی چیز میں ملاکر بطور دوا کھا سکتے ہیں، یا صرف تیل بدن پر لگا سکتے ہیں؟ کیونکہ ایک صاحب کا تجربہ ہے کہ یہ تیل سر میں لگانے سے بال پیدا ہوجاتے ہیں اور ضماد کرنے سے درد ختم ہوجاتا ہے۔

(۲) کیا اس طرح گائے یا اور کسی جانور کے پیشاب کو تیل میں جوش دینے سے اس کی ماہیت بدل جاتی ہے؟

(۳) ایسے تیل کی خرید وفروخت کا کیا حکم ہے؟

نوٹ: جوش دینے کے بعد تیل میں کسی قسم کی ذرا بھی بدبو باقی نہیں رہتی اور تیل کا رنگ بھی بالکل نہیں بدلتا؟ جواب دیں۔

المستفتی: محمد زبیر مظاہری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) تیل میں پیشاب ملاکر جوش دینے سے تیل پاک نہیں ہوگا، بلکہ ناپاک ہی رہے گا، اس کا دوا وغیرہ میں ملاکر استعمال کرنا جائز نہیں ہے، ہاں البتہ بدن پر لیپ کیا جاسکتا ہے، پھر نماز کے لیے اسے دھونا لازم ہے۔ (مستفاد: بہشتی زیور ۹/ ۱۰۰)

وما عجن به فيطعم للكلاب (تحته في الشامية) لأن ما تنجس باختلاط النجاسة به والنجاسة مغلوبة لا يباح أكله و يباح الانتفاع به فيما وراء الأكل كالدهن النجس يستصبح به إذا كان الطاهر غالبا. (شامی، کتاب الطهارة، باب

المیاہ، قبیل مطلب مہم فی تعریف الاستحسان زکریا ۱/۳۷٦، کراچی ۱/۲۱۸)

(۲) گائے یا کسی اور جانور کے پیشاب کو تیل میں ملا کر جوش دینے سے پیشاب کی ماہیت نہیں بدلتی، اس لیے کہ تبدیل ماہیت اور انقلاب حقیقت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی چیز اپنی حقیقت چھوڑ کر دوسری چیز میں تبدیل ہو جائے اور اس کے اوصاف وآثار کلی طور پر زائل ہو جائیں، جیسے شراب سرکہ بن جائے، گدھا نمک کے کان میں گر کر نمک بن جائے اور جانور کے پیشاب کو تیل میں ملا کر جوش دینے سے ہماری معلومات کے مطابق پیشاب تیل میں تبدیل نہیں ہوتا۔

(مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۲/۲۷۷، جدید زکریا مطول ۳/۴۴۰-۴۳۹، فتاویٰ محمودیہ جدید ڈابھیل ۱۸/۱۸۸)

ولو أحرقت العذرة والروث فصار رمادا أو مات الحمار في المملحة فصار ملحا زالت النجاسة وطهر عند محمد خلافا لأبي يوسف و أكثر المشائخ اختاروا قول محمد وعليه الفتوىٰ لأن الشرع رتب وصف النجاسة على تلك الحقيقة و قد زالت بالكلية فإن الملح غير العظم واللحم فإذا صارت الحقيقة ملحا ترتب عليه حكم الملح ونظيره النطفة نجسة و تصير علقة وهي نجاسة و تصير مضغة فتطهر فعلم أن استحالة العين تستتبع زوال الوصف المرتب عليها. (غنية المستملي، الطهارة، فصل في الأسار، الشرط الثاني، اشرفيه ديوبند ص:۱۸۸-۱۸۹، شامي زكريا ۱/۵۳٤، كراچي ۱/۳۲۷)

(۳) دوا کے طور پر ایسے تیل کی خرید وفروخت جائز ہے، کھانے کے لیے بیچنا جائز نہیں، اس لیے کہ بہت سی دوائیں ناپاک اور نجس اشیاء سے بنائی جاتی ہیں، مگر مریض کی ضرورت کی وجہ سے شریعت نے اس کے استعمال کی اجازت دی ہے۔

وكره بيع العذرة رجيع الآدمي خالصة (إلى قوله) وصح بيعها مخلوطة بتراب أو رماد غلب عليها. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ۹/۵۵۳، كراچي ٦/۳۸۵، تبيين الحقائق امداديه ملتان ٦/۲٦، زكريا ۷/۵٦، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/۲۱۱، مصري قديم ۲/۵٤٦، الفتاوىٰ التاتارخانية زكريا ۱۸/۲۳۵، رقم: ۲۸٦۱۵، المحيط البرهاني، المجلس العلمي

۸/۱۰۲، رقم: ۹٦۸۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹٦۰۵/۳۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۵/۱۴۲۹ھ

گائے کے پیشاب میں مخلوط دوا کے استعمال کرنے کا حکم

سوال [۱۰۴۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعض دواؤں میں گائے کا پیشاب ڈالتے ہیں جیسے بعض معجون اس طرح کے آتے ہیں اور ان پر جو اجزاء ترکیبی لکھے ہوتے ہیں ان میں گائے کا پیشاب بھی ہوتا ہے، بعض دوائیوں کی کمپنیاں اپنی ہر دوائی میں گائے کا پیشاب ڈال رہی ہیں جس سے بچنا مشکل نظر آرہا ہے، حکیم لوگ دوائیاں لکھ دیتے ہیں، مریض کو مجبوراً خریدنا پڑتی ہیں، کیا اس طرح کی دوائیاں خریدنا اور استعمال کرنا درست ہے؟

المستفتی: سعید احمد سیڈھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: گائے کے پیشاب سے مخلوط دواؤں کا استعمال عام حالات میں ممنوع ہے، لیکن اگر ماہر فن ڈاکٹر یا حکیم اس سے شفاء یابی کی بات کریں تو ضرورتاً ایسی دواؤں کے استعمال کو حضرات فقہاء نے جائز لکھا ہے۔

يجوز للعليل شرب الدم والبول وأكل الميتة للتداوى إذا أخبره طبيب مسلم إن شفاءه فيه ولم يجد من المباح مايقوم مقامه. (هنديه، كتاب الكراهية، الباب الثامن عشر فى التداوى والمعالجات، زكريا قديم ۳۵۵/۵، جديد ۴۱۰/۵، الكفاية مع فتح القدير كوئٹه ۵۰۱/۸، شامی، مطلب: فى التداوي بالمحرم، كراچی ۳۸۹/٦، زكريا ۵۵۸/۹)

الاستشفاء بالمحرم إنما لا تجوز إذا لم يعلم فيه شفاء، أما إذا علم أن فيه شفاء وليس له دواء أخر غيره يجوز الاستشفاء به. (الفتاویٰ التاتارخانية زكريا

۲۰۰/۱۸ رقم: ۲۸۵۰٤، المحیط البرھانی، المجلس العلمی ۸۲/۸، رقم: ۹٦۳۸، عنایة مع فتح القدیر زکریا ۸۰/۱۰، دار الفکر ٦۷/۱۰، کوئٹہ ۵۰۰/۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍شعبان المعظم ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۴۷۸/۳۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۹/۱۴ھ

ایسی دوا کا استعمال جس میں گائے کا پیشاب ڈالا گیا ہو

سوال [۱۰۴۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کی طبیعت کافی عرصہ سے خراب چل رہی ہے اسی کی وجہ سے لیور خراب ہو گیا ہے جس کی وجہ سے تین مرتبہ آپریشن بھی کرایا جا چکا ہے، اور اس کے ساتھ دوائی بھی کافی مہنگی پڑتی ہے، اور ہر تین مہینے کے بعد تقریباً بارہ ہزار روپیہ کا خرچہ ایک ساتھ آتا ہے، زید کی مالی حالت اتنی نہیں ہے جس کی وجہ سے کافی پریشانی ہے، چند دنوں پہلے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ اس مرض کے لیے ایک دوا ہے، جس میں گائے کا پیشاب ڈالا جاتا ہے تو کیا میں اس دوا کو استعمال کر سکتا ہوں؟

المستفتی: محمد یاسین جھبو کا نالہ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سوالنامہ میں جو مجبوری لکھی گئی ہے ایسی مجبوری کی حالت میں ایسی دوا کا استعمال کرنا جس میں گائے کا پیشاب ڈالا جائے جائز ہے، لہٰذا آپ کے لیے وہ دوا استعمال کرنا شرعاً جائز ہے۔

اختلف فی التداوی بالمحرم وظاهر المذهب المنع کما فی رضاع البحر ولکن نقل المصنف ثمة وهنا عن الحاوی: وقیل: یرخص إذا علم فیه الشفاء ولم یعلم دواء آخر کما رخص الخمر للعطشان وعلیه الفتویٰ (تحته فی الشامیة) وبالبول أیضا إن علم فیه شفاء لا بأس به. (در مختار مع

الشامی، کتاب الطهارة، باب المیاه، مطلب: فی التداوی بالمحرم زکریا ۱/ ۳٦٥-۳٦٦،
کراچی ۱/ ۲۱۰، باب الرضاع زکریا ٤/ ۳۹۷-۳۹۸، کراچی ۳/ ۲۱۱، هندیه زکریا
قدیم ٥/ ۳٥٥، جدید ٥/ ٤۱۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍محرم الحرام ۱۴۳۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۷۳۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۰/۱/۵ھ

شدت ضرورت کی بناء پر گائے کے پیشاب سے علاج کرنا

سوال [۱۰۴۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص کے جسم پر سفید داغ ہیں، جس کو علم طب میں برص نامی بیماری سے تعبیر کیا جاتا ہے، جسم پر سفید داغ کا ہونا، معاشرہ میں انتہائی درجہ معیوب شمار ہوتا ہے، بلکہ بعض لوگ (تقریباً اکثر) اس کو جذام کی ابتداء یا مرض کا ادنیٰ درجہ خیال فرماتے ہیں، دوسری طرف اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ میں ایسے شخص سے بالخصوص ایسی لڑکی سے کوئی بھی شادی کرنے کو تیار نہیں ہوتا، جبکہ مرد وعورت دونوں کے لیے شادی بعض خصوصی حالات میں فرض ہوجاتی ہے، اس فریضہ کی ادائیگی سے غفلت وتاخیر بڑے گناہ کا سبب بن جاتی ہے، آج کسی ڈاکٹر کے پاس اس کا کوئی گارنٹیٹ علاج نہیں۔

ہمارے یہاں ایک نوجوان عالم ہیں، انہوں نے بہت سی جگہ کافی بیش قیمت علاج ومعالجہ کرایا، لیکن فائدہ مکمل ہونا تو درکنار مرض میں تخفیف کی ذرا بھی رمق تک محسوس نہ ہوئی ایسے حالات میں جبکہ اس کا کوئی علاج نہیں اور مرض کو بھی معاشرہ میں معیوب اور قابل اجتناب سمجھا جاتا ہے، ایک شخص کے بارے میں علم ہوا کہ وہ اس کا علاج کرتے ہیں اور انہوں نے جتنے لوگوں کا علاج کیا وہ مکمل شفایاب ہوئے، لیکن مریض ومعالج دونوں مسلمان ہیں اور دونوں ہی کسی مسلمان کو ایسی دوا استعمال کرانا نہیں چاہیے جس میں گارنٹی سے شفا میسر ہوجاتی ہو، اس لیے کہ اس میں بول البقر استعمال کیا جاتا ہے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس ناگزیر صورت حال میں ایسی دوا استعمال کرنا جس میں بول البقر استعمال کیا گیا ہو جائز ہے؟ کیا حدیث عرینہ اس بات کی شاہد عدل بن سکتی ہے؟

المستفتی: حافظ بشیر احمد سہس پور بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ایسے ناگزیر حالات میں حرام اشیاء سے علاج کی گنجائش ہے، حضرت امام یوسفؒ کے نزدیک جائز ہے، اور فتویٰ بھی اسی پر ہے، لہٰذا مذکورہ شخص کے لیے بول البقر کو شدت ضرورت کی وجہ سے علاج میں استعمال کرنا جائز ہوگا۔

وبالبول أيضا إن علم فيه شفاء لا بأس به لكن لم ينقل وهذا لأن الحرمة ساقطة عند الاستشفاء كحل الخمر والميتة للعطشان والجائع.

(شامی، کتاب الطهارة، باب المياه، مطلب: فی التداوی بالمحرم زکریا ۱/۳٦۵، کراچی ۱/۲۱۰، باب الرضاع زکریا ٤/۳۹۷-۳۹۸، کراچی ۳/۲۱۱، هنديه زكريا قديم ۵/۳۵۵، جديد ۵/۴۱۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ربیع الاول ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۴۴۲۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۳/۱۶ھ

شراب کی عادت چھڑانے کے لیے کوّے کا خون پلانا

سوال [۱۰۴۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے محلّہ میں ایک شخص شراب پینے کا عادی ہے، کوشش بسیار کے باوجود وہ اس سے باز نہیں آتا، لیکن ایک ڈاکٹر کہتا ہے کہ میں اس کی شراب چھڑادوں گا، لیکن اس کو کوے کا تازہ خون ویسے یا کسی چیز میں ملا کر پلاؤں گا، تو کیا شراب کی عادت چھڑانے کے لیے کوئے کا خون پینا جائز ہوسکتا ہے؟

المستفتی: قاری ارشاد احمد بریلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شراب پینے کا عادی ہونا یہ کوئی بیماری نہیں ہے، بلکہ عادت ہے، اور کسی چیز کی عادت چھڑانے کے لیے حرام چیز کا استعمال جائز نہیں ہے، اس لیے شراب کی عادت چھڑانے کے لیے کوے کے خون کا استعمال جائز نہیں ہے، البتہ خراب عادت تو یونہی چھوڑ دینی چاہیے، اور اس کے ذریعہ بھی نہ ہوسکے تو کسی حلال چیز کے ذریعہ اس کو ختم کرنا چاہیے۔

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ. [المائدة: ٣]﴾

اتفق الفقهاء على أن الدم حرام نجس لا يؤكل ولا ينتفع به. (الموسوعة الفقهية ٢١/٢٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ / جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۷۱۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۶/۲۴ھ

بکرے کے خصیے بطور علاج کھانا

سوال [۱۰۴۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بکرے کے خصیے کھانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر ڈاکٹر بطور علاج کے کھلائے تو کھا سکتے ہیں یا نہیں؟، ایک صاحب جن کے اولاد نہیں ہوتی تھی، انہوں نے کھائے تو اولاد ہوگئی، انہوں نے ہمیں بتایا ہم بھی بہت علاج کر چکے ہیں تو ہم کھا سکتے ہیں یا نہیں؟ اور ان کو کوٹ کر سفوف بنا کر کھایا جائے گا؟

المستفتی: مولانا عبدالباسط مظاہری بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بکرے کا خصیہ کھانا مکروہ تحریمی ہے البتہ اگر ڈاکٹر بطور علاج کھلائے تو اس کی گنجائش ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۵/ ۸۷، جدید ڈابھیل ۱۸/ ۳۴۸)

الاستشفاء بالمحرم إنما لا تجوز إذا لم يعلم فيه شفاء، أما إذا علم أن فيه شفاء وليس له دواء أخر غيره يجوز الاستشفاء به. (الفتاوىٰ التاتارخانية زكريا

۱۸/ ۲۰۰ رقم: ۲۸۵۰٤، المحیط البرهانی، المجلس العلمی ۸/ ۸۲، رقم: ۹٦۳۸، عنایة مع فتح القدیر، زکریا ۱۰/ ۸۰، دار الفکر ۱۰/ ٦۷، کوئٹه ۸/ ۵۰۰، شامی زکریا ۷/ ٤۸۰، کراچی ۵/ ۲۲۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶ ؍ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۸۲۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۳/۱۶ھ

گدھی کے دودھ سے علاج

سوال [۱۰۴۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مریض کے بارے میں ڈاکٹر کہتا ہے کہ گدھی کا دودھ پلانے سے شفایاب ہوجائے گا تو گدھی کا دودھ شفایابی کے لیے پلانا جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر کوئی مسلم تجربہ کار ڈاکٹر یہ تجویز کرے کہ اس مریض کے لیے گدھی کا دودھ پینے ہی میں شفاء ہے، اور اس کے علاوہ اور کوئی علاج نافع نہیں تو گدھی کا دودھ بطور علاج پینا جائز ہے۔ (مستفاد: محمود یہ میرٹھ ۲۷/ ۲۹۵، ڈابھیل ۱۸/ ۳۶۴)

عن عطاء قال: کان لایریٰ بألبان الأتن بأسا أن یتداوی بها. (المصنف لابن أبی شیبة، کتاب الطب، مؤسسة علوم القرآن ۱۲/ ۱۲٤، رقم: ۲٤۱۱۲)

التداوی بلبن الأتان إذا أشاروا إلیه لا بأس به –إلی– أما إذا علم أن فیه شفاء ولیس له دواء آخر غیره یجوز الاستشفاء به. (المحیط البرهانی، المجلس العلمی ۸/ ۸۲، رقم: ۹٦۳۸)

التداوی بلبن الأتان لابأس به. (بزازیه، کتاب الکراهیة، الفصل الخامس فی الأکل نوع من التداوی زکریا جدید ۳/ ۲۰۸، وعلی هامش الهندیة ٦/ ۳٦۷) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۲۲)

مرغے کے خون کا سفوف دوا کے طور پر استعمال کرنا

سوال [۱۰۴۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: دہلی میں ۶/۵ / اپریل کو ایک سیمینار ہوا، اطباء نے مختلف مضامین پڑھے، اور اپنے تجربات بتائے، ایک طبیب صاحب نے ایک نسخہ بتایا جو ہڈی کے لیے تیر بہدف ہے، وہ درج ذیل ہے:

ایک مرغ کا پورا خون لے کر اس میں پھٹکری ملا کر آگ پر رکھیں، جب بالکل خشک سفوف کی صورت میں ہو جائے تو شیشی میں رکھ لیں، ایک گرام بچوں کو بڑی عمر والوں کو حسب عمر زیادہ کر کے دیں، انہوں نے اپنا تجربہ بتایا کہ تیر بہدف ہے، اب اس سلسلے میں آپ سے عرض ہے کہ شرعی اعتبار سے یہ دوا استعمال کی جا سکتی ہے اور استعمال کرائی جا سکتی ہے، امید ہے کہ شرع سے مطلع کیا جائے گا۔

المستفتی: مولانا حکیم عبدالجلیل کرتپور بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر آگ پر رکھنے کی وجہ سے شدت تغیر سے سفوف بن جاتا ہے تو دواؤں میں اس کا استعمال شرعاً جائز ہے، جیسا کہ ناپاک اور مردار کی چربی سے صابون بنانے کی گنجائش ہوتی ہے۔

وجعل الدهن النجس في صابون يفتى بطهارته لأنه تغير و التغيير يطهر عند محمد و يفتى به. (شامی، کتاب الطهارة، باب الأنجاس زکریا ۱/ ۵۱۹، کراچی ۱/ ۳۱۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳ / محرم الحرام ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۲۹۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/ ۱/ ۱۴۱۶ھ

جان بچانے کے لیے خنزیر کا گوشت کھانا

سوال [۱۰۴۵۴]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی شخص بالکل لب جان ہے اور کسی حکیم یا طبیب نے یہ بتایا کہ تم خنزیر کا گوشت تھوڑا کھالو تو یقیناً تم صحیح ہو جاؤ گے، کیا اس وقت خنزیر کا گوشت کھا سکتے ہیں؟

المستفتی: شمیم احمد مہوت پور بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر واقعی بلب جان ہے اور ماہر حکیم یا ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ اس کا مرض یقینی طور پر خنزیر کے گوشت سے درست ہو جائے گا اور کوئی جائز اور مباح دوا اس مرض کے دفعیہ کے لیے موجود نہیں ہے تو ایسی صورت میں بقدر ضرورت خنزیر کے گوشت کی اجازت ہے۔

﴿**قال الله تعالیٰ: وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ.** [البقرة: ۱۷۳]﴾

﴿**فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ.** [البقرة: ۱۷۳]﴾

ويجوز للعليل ...... أكل الميت للتداوى إذا أخبره طبيب مسلم أن شفاءه فيه. (هندية، الباب الثامن عشر فى التداوى والمعالجات زكريا قديم ٥/٣٥٥، جديد ٥/٤١٠، شامى زكريا ٧/٤٨٠، ٩/٥٥٨، كراچى ٥/٢٢٨، ٦/٣٨٩)

وفى الشامية: لأن الحرمة ساقطة عند الاستشفاء كحل الخمر والميتة للعطشان والجائع. (شامى، كتاب الطهارة، باب المياه، مطلب: فى التداوى بالمحرم زكريا ١/٣٦٥، كراچى ١/٢١٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۹۹۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۵/۴ھ

۵ باب الرقیة (تعویذات)

نظر کی حقیقت

سوال [۱۰۴۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: نظر کی حقیقت اور حیثیت کیا ہے؟ نیز ساٹھ سال کا بوڑھا اور چار پانچ سال کا کالا کلوٹا بچہ جو ہر وقت گندہ رہتا ہے اور نالیوں میں کھیلتا رہتا ہے اس کی ماں کہتی ہے کہ اس کو نظر لگ گئی ہے، کیا ایسے بوڑھے اور بچے کو نظر لگ سکتی ہے؟ اور اس کی کیا شکل ہوسکتی ہے؟

المستفتی: ضیاء الدین مانپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نظر کی حقیقت یہ ہے کہ اس کا لگنا حق ہے، یعنی اس کا اثر ہوتا ہے، حدیث شریف میں فرمایا گیا:

العین حق أی الإصابة بالعین شیئ ثابت موجود. (فتح الباری، کتاب الطب، باب العین حق، دار الفکر ۱۰/۲۰۳، اشرفیه ۱۰/۲۴۹، تحت رقم الحدیث ۵۷۴۰، عمدة القاری زکریا ۱۴/۷۱۹، دار احیاء التراث العربي ۲۱/۲۲۶)

اس کے لگنے کے سلسلے میں بعض محققین کی رائے یہ ہے کہ، عائن کسی پر اعجاب کی نگاہ ڈالتا ہے تو اس کی آنکھوں سے زہریلا مادہ نکل کر منظور الیہ میں پیوست ہوجاتا ہے، جس کی وجہ سے منظور الیہ بیمار ہوجاتا ہے، اور بعض اوقات ہلاکت تک پہنچ جاتا ہے، اور جھاڑ پھونک کے ذریعہ وہ اثر بھی جاتا ہے۔

قال المازری: زعم بعض الطبائعین: إن العائن ینبعث من عینه قحرة سمیة تتصل بالمعین فهلک أو یفسد وهو کإصابة السم من نظر الأفعیٰ. (حاشیة البخاری ۲/۸۵۴، فتح الباری، باب رقیة العین دار الفکر ۱۰/۲۰۰، اشرفیه ۱۰/۲۴۵، تحت رقم

الحديث ٥٧٣٩، عمدة القارى، دار إحياء التراث العربى ٢١/٢٦٤، زكريا ١٤/٧١٧)

رہا معاملہ کالے کلوٹے بچہ اور بوڑھے پر نظر لگنا تو ان کو بھی کوئی نہ کوئی اچھا سمجھتا ہے، اوران پر تعجب کی نگاہ ڈالتا ہے جیسا کہ بچہ چاہے کتنا ہی بدصورت ہو، ماں کی نگاہ میں نہایت حسین وخوبصورت ہوتا ہے، لہٰذا بوڑھے آدمی اور کالے بچہ کو بھی نظر لگ سکتی ہے، اس میں کوئی استحالہ نہیں، نیز نظر غیروں کی ہی نہیں اپنوں کی بھی لگ جاتی ہے، بلکہ اپنوں کی تو زیادہ لگتی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/رجب المرجب ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۶۲۶۲)

کیا تعویذ پہننا حرام ہے؟

سوال [۱۰۴۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مرکزی مکتب اسلامی پبلشرنئی دہلی ۲۵ رکی کتاب فتاویٰ یوسف قرضاوی ترجمہ سید زاہد اصغر فلاحی پسند ہے یا نہیں؟ اسی کے حوالے سے بتا رہا ہوں، میں نے خود اس کتاب میں پڑھا ہے کہ تعویذ پہننا حرام ہے، یعنی نبی علیہ السلام نے منع فرمایا ہے، حضرت والا سے درخواست ہے کہ وضاحت فرمائیں؟

المستفتی: ملک عبدالاحد مہراج گنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جن روایات میں تعویذ گنڈے کی ممانعت ہے ان میں الفاظ صاف ہیں کہ ہر مرض میں تعویذ گنڈے کے پیچھے پڑ جائے اور یہ سمجھے کہ ہر مرض کا علاج تعویذ ہے اور یہی تعویذ مرض کے لیے بذات خود مؤثر ہے، اللہ پر توکل نہ ہو تو ایسے عقیدے کے ساتھ تعویذ کا استعمال منع ہے، اور قرضاوی نے اپنے مطلب کے متعلق ایک پہلو کی حدیث نقل کردی اور دوسرے پہلو کی حدیث کو صرف نظر کردیا ہے۔

عن مغيرة بن شعبة عن أبيه قال قال رسول الله ﷺ: من اكتوى أو استرقى فهو برئ من التوكل. (ترمذی شريف، باب ماجاء في كراهية الرقية، النسخة الهندية ۲/۲۵، دار السلام رقم: ۲۰۵۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۱۰۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۶/۱۴۲۴ھ

کیا تعویذ پہننا بدعت ہے؟

سوال [۱۰۴۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا تعویذ پہننا بدعت ہے؟ اگر حدیث تعویذ کے ثبوت کے لیے ہو تو تحریر فرمائیں؟

المستفتی: عبد الاحد مہراج گنجی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: تعویذ کو ہر مرض کا علاج سمجھنا غلط ہے، کہ جب بھی کوئی مرض لاحق ہو جائے تعویذ پہن لیا جائے، اس کا ثبوت شریعت سے نہیں، اس کو بدعت ہی کہا جا سکتا ہے، ہاں البتہ بعض معنوی امراض کے لیے تعویذ حفاظت کا ذریعہ بن جاتا ہے، لہٰذا حتی الامکان مادی علاج اختیار کرنے کے بعد اگر کسی دین دار متبع شریعت قابل اعتماد شخص سے قرآن یا حدیث کی کوئی دعا لکھوا کر بطور تعویذ پہن لیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

عن أبي خزامة عن أبيه قال: سألت رسول الله ﷺ قلت يا رسول الله! أرأيت رقىً نسترقيها و دواء نتداوى به وتقاة نتقيها هل ترد من قدر الله شيئا قال هي من قدر الله، هذا حديث حسن صحيح. (ترمذی شريف، باب ما جاء لا ترد الرقى ولا الدواء من قدر الله شيئا، النسخة الهندية ۲/۲۷، دار السلام رقم: ۲۱۴۸)

عن أنس أن رسول الله ﷺ رخص في الرقية من الحمة والعين والنملة. (ترمذی شريف، باب ما جاء في الرخصة في ذلك، النسخة الهندية ۲/۲۶، دار

السلام رقم: ۲۰۵٦، صحيح مسلم، باب استحباب الرقية من العين والنملة والحمة والنظرة، النسخة الهندية ۲/۲۲۳، بيت الأفكار رقم: ۲۱۹٦، صحيح البخاری، باب رقية الحية والعقرب، النسخة الهندية ۲/ ٨٥٤ رقم: ٥٥١٧، ف: ٥٧٤١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٦ / صفر المظفر ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۱۰۹/۳۷)

گلے میں تعویذ لٹکانا

سوال [۱۰۴۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعض آدمی کالے دھاگہ پر سورہ فاتحہ، چاروں قل، درود شریف وغیرہ دم کر کے گرہ لگا کر گلے میں ڈال لیتے ہیں، تو سوال یہ ہے کہ اس طرح گلے میں کالا دھاگا ڈالنا جبکہ مجبوری ہو جائز ہے یا نہیں؟ اور بعضے آدمی شوقیہ گلے میں ڈال لیتے ہیں، اس کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ اسی طرح گلے میں مالا ڈالنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: زبیر عالم شاہدرہ دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قرآنی آیات وکلمات ماثورہ پڑھ کر دھاگے پر دم کر کے گلے میں لٹکانا جائز ہے۔

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده، أن رسول الله ﷺ كان يعلمهم من الفزع كلمات، أعوذ بكلمات الله التامة، من غضبه و شر عباده ومن همزات الشياطين و أن يحضرون وكان عبد الله بن عمر يعلمهن من عقل من بنيه ومن لم يعقل كتبه فعلقه عليه. (سنن أبی داؤد، باب كيف الرقى، النسخة الهندية ۲/ ٥٤٣، دار السلام رقم: ۳۸۹۳)

شوقیہ تعویذ گلے میں لٹکانا مشروع نہیں ہے، گلے میں مالا ڈالنا چونکہ ہندوؤں کا شعار

ہےاس لیے جائزنہیں ہے

یکفر ...... و یشد الزنار فی وسطه إلا إذا فعل خدیعة فی الحر ب.

(هندية، کتاب السیر، الباب التاسع فی أحکام المرتدین زکریا قدیم ۲/۲۷۶، جدید ۲/۲۸۷، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۱۲/ ۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۲؍ربیع الاول ۱۴۱۸ھ

(الف فتویٰ نمبر:۳۳/۵۲۰۶)

تعویذ گنڈے کا حکم

سوال [۱۰۴۵۹]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مجھے اب سے ڈھائی سال پہلے ایک کھلا مرض ہو گیا تھا، کافی علاج بھی کیا ہے اور آرام بھی ہوا، پر پوری طرح سے ختم نہیں ہوا، مجھے شک ہے کہ کسی نے مجھے پریشان کرنے کے لیے کچھ ٹوٹکا کیا ہے، کیونکہ میرے پڑوس کے ایک عالم صاحب کا بھی یہی کہنا ہے، اہل حدیث جماعت سے تعلق رکھتا ہوں، اور اس کا مکمل علاج چاہتا ہوں، آپ بتائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، کیا تعویذ وغیرہ صحیح ہے اور بدایوں جانا کوئی گناہ تو نہیں؟ اگر ہے تو کن حالات میں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں لکھیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: احقر تعویذ سے زیادہ واقف نہیں،البتہ شرعاً شریعت کے دائرہ میں رہ کر تعویذ گنڈا کرنے کی گنجائش ہے،حضرت ابوسعید خدری کی روایت سے گنجائش ہے۔

عن أبی سعید قال: کان رسول اللہ ﷺ یتعوذ من الجان وعین الإنسان حتی نزلت المعوذتان فلما نزلتا أخذ بهما وترک ما سواهما. (سنن الترمذی، باب ما جاء فی الرقیة بالمعوذتین، النسخة الهندية ۲/۲۶، دار السلام رقم: ۲۰۵۸)

عن عوف بن مالک الأشجعی قال: کنا نرقي فی الجاهلیة فقلنا: یا

رسول الله! كيف ترىٰ في ذٰلك؟ فقال: اعرضوا علي رقاكم، لابأس بالرقى مالم يكن فيه شرك. (صحيح مسلم، باب جواز أخذ الأجرة على الرقية، النسخة الهندية ۲/ ۲۲٤، بيت الأفكار رقم: ۲۲۰۰)

بدایوں میں کس طرح کام ہوتا ہے، احقر کو معلوم نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍محرم الحرام ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۵۹۳۰/۳۴)

تعویذ گنڈا کرنا

سوال [۱۰۴۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید ایک عالم دین عرصہ بارہ سال سے ایک مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیتا ہے، محلّہ میں کسی قسم کی کوئی بات نہیں ہے، ضرورت پڑنے پر بعض لوگ اپنے بچوں کو دم وغیرہ کے لیے لاتے ہیں، اکابرین امت اور اسلاف کی کتب مثلاً اعمال قرآنی، مجربات وغیرہ کی مدد سے دعا، تعویذ وغیرہ بھی کرتے ہیں، بعض مریضوں کو اگر ضرورت پڑتی ہے تو تعویذ بھی دیتے ہیں اور اس سلسلے میں اگر کوئی سامان مثلاً عطر یا زعفران وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے تو بسا اوقات مریض ہی سے منگوا لیتے ہیں، یا اگر وہ خود پیسے دیدیں تو خود لاکر انہیں لکھ کر دیتے ہیں، اس کے علاوہ پیسہ طلب نہیں کرتے، ہاں اگر کوئی برضا ورغبت خود ہدیہ کے طور پر پیش کردے تو قبول بھی کر لیتے ہیں، اور نہ دینے پر شکوہ نہیں کرتے، اور کہتے ہیں کہ یہی ہمارے بزرگوں کا عمل رہا ہے۔

دو سال قبل ایک عورت ہاجرہ نام کی اپنی پوتی کے علاج کے لیے مذکور امام صاحب کے پاس گئی، امام صاحب نے اس کا علاج کردیا، ہاجرہ بی بی سے کہا، تمہاری لڑکی سلمیٰ کے بارے میں میں سن رہا ہوں، ٹونا ٹوٹکا کرتی ہے، اگر ایسا صحیح ہے تو تم اس کو سمجھا کر اس کی اصلاح کردو، امام صاحب نے یہ چرچا دوسری عورت سے سنا تھا، خود سے ایسا کرتے نہیں دیکھا، لیکن آج دو سال گذرنے کے بعد ہاجرہ بی نے چار آدمیوں کے درمیان یہ بیان دیا کہ

امام صاحب نے مجھ سے چار چھ مہینہ پہلے یہ کہا تھا کہ سلمٰی کو میں نے اپنی آنکھوں سے اس کے گھر کے پیچھے کچھ گاڑتے دیکھا ہے، تحقیق کے لیے امام کو بلوایا گیا، تو امام صاحب نے وہی بات چرچے کی جو دو سال پہلے سنی تھی، وہ نقل کردی، بات ختم ہوگئی، لیکن محلّہ کے کچھ لوگ اس کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں کہ امام صاحب نے یہ بات کیوں کہی ہے، ان کے پیچھے نماز کیسے ہوگی؟ حالانکہ اس عورت کے بارے میں مشہور ہے کہ کئی جھاڑ پھونک کرنے والے اس کے ٹونا کے بارے میں بتلا چکے ہیں، لیکن ان سے کوئی تحقیق نہیں کی گئی اور آج بھی اس کے رشتہ داروں وغیرہ میں شہرت ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

(۱) امام صاحب کا ہاجرہ بی سے اس لڑکی کے بارے میں ایک سنی ہوئی بات اصلاح کی غرض سے نقل کرنا غلط تھا؟

(۲) دو سال کے بعد ہاجرہ بی کو وہی بات عینی شہادت کے طور پر پیش کرنا الزام نہیں ہے؟

(۳) ایسی صورت میں جبکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے پیچھے گہری سازش کام کررہی ہے، امام صاحب کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

جواب باصواب مرحمت فرما کر عنداللہ ماجور ومشکور ہوں۔

المستفتی: حبیب الرحمٰن اسماعیل پورہ ناگپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر سائل اپنے بیان میں سچا ہے تو اس طرح تعویذ گنڈا وغیرہ شرعاً جائز و درست ہے، نیز اگر برائے اصلاح ہاجرہ بی سے سلمٰی کو سمجھانے کے لیے ایسی بات کہی ہے تو شرعاً امام صاحب قصوروار نہیں ہیں، بلکہ امام صاحب کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ثواب ملے گا، اور ہاجرہ بی کا خلاف واقعہ کو واقعہ ثابت کرکے امام صاحب پر الزام قائم کرنا تہمت کے مرادف ہے، اور جب امام صاحب میں کوئی قباحت نہیں ہے تو ان کے پیچھے نماز پڑھنا بلا کراہت درست ہوگا۔

وقد كره قوم من أهل العلم: أن يؤم الرجل قوما وهم له كارهون فإذا كان الإمام غير ظالم فإنما الإثم على من كرهه ...... هذا إذا كره واحد أو

إثنان أو ثلاثة فلا بأس أن يصلى بهم حتى يكرهه أكثر القوم. (سنن الترمذی، باب ما جاء من أم قوما وهم له كارهون، النسخة الهندية ۱/۸۲، دار السلام رقم: ۳۵۸)

وإن كان هو أحق بها منهم ولا فساد فيه ومع هذا يكرهونه لا يكره له التقديم، لأن الجاهل والفاسق يكره العالم والصالح. (حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح قديم ۱/۱٦٤، دار الكتاب ديو بند ۱/۳۰۱) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍رجب المرجب ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/۲۲۸۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷؍۷؍۱۴۱۱ھ

تعویذ گنڈے کو کمائی کا ذریعہ بنانا

سوال [۱۰۴۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) یہ معوض حضرات جو تعویذ گنڈے وغیرہ کرتے ہیں اور خوب پیسہ کماتے ہیں، یعنی زبان سے کہہ کر پیسے لیتے ہیں، یہ جائز ہے یا ناجائز ہے؟

(۲) اور کچھ معوض ایسے ہیں جو نجی اسی کام کو کرتے ہیں، اور ان کا کوئی مشغلہ ہی نہیں اس کام کے علاوہ تو ان کو یہ پیسہ لینا جائز ہے یا ناجائز؟

(۳) اور کچھ معوض ایسے ہیں کہ جو مدرسہ میں مدرس ہیں، اور مسجد میں امام ہیں اور خارج وقت میں وہ تعویذ وغیرہ کرتے ہیں اور ایک گولک اپنے پاس رکھ لیتے ہیں اس میں مریض خود ہی اپنی مرضی سے پیسے ڈالتے جاتے ہیں، جس کا جو دل چاہے وہ گولک میں ڈال دیتا ہے، معوض خود سے نہیں مانگتا، تو یہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟ آخر شریعت مطہرہ میں اس کا کیا جواز ہے؟ لینا جائز ہے یا ناجائز؟ اور معوضین حضرات کے تمام کاروبار، بیاہ، شادی، اور جملہ مشاغل وضروریات اس میں سے چل رہی ہیں، کیا یہ سب درست ہے؟

المستفتی: فصاحت حسین جے پی نگر امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تعویذ دینے والے حضرات کا تعویذ گنڈا کرنا اور

اس سے پیسہ کمانا چاہے زبان سے کہہ کر پیسہ لیتے ہوں یا مریض خود اپنی مرضی سے گولک میں پیسہ ڈال دیتے ہوں دونوں صورتوں میں اجرت لینا جائز ہے، پھر بھی اس کام کو پیشہ کے طور پر اختیار نہ کرنا بہتر ہے، بشرطیکہ تعویذ میں قرآن کریم کی آیت یا حدیث میں وارد کوئی دعا یا صفاتِ الٰہیہ لکھی ہوں، یا کوئی جائز چیز لکھی ہو مگر تعویذ دینے والے حضرات اس فن سے واقف ہوں اور وعدہ ہرگز نہ کریں کہ تیرا کام ہو ہی جائے گا جیسے کہ بیمار سے ڈاکٹر دوا کے پیسے لیتا ہے کہ بیمار کو کو شفا ہو ہی جائے گی، شفاء اللہ تعالیٰ کے قبضہ وقدرت میں ہے، اگر تعویذ دینے والے حضرات اس فن سے واقف نہیں تو دھوکہ دے کر پیسہ لینا ناجائز ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۵/ ۱۶۶، ڈابھیل ۱۷/۱۰۳، کفایت المفتی قدیم ۹/ ۶۰، جدید زکریا مطول ۱۲/ ۴۸۴، احسن الفتاویٰ ۷/ ۲۹۹)

قوله إن أحق ما أخذتم عليه أجرا كتاب الله يعنى إذا رقيتم به. (عمدة القاری، باب ما يعطى فی الرقية على إحياء العرب بفاتحة الكتاب زكريا ٦٢٨/٨، دار إحياء التراث العربى ٩٦/١٢)

عن عوف بن مالك الأشجعي قال: كنا نرقي في الجاهلية فقلنا: يا رسول الله! كيف ترىٰ في ذٰلک؟ فقال: اعرضوا علي رقاكم، لا بأس بالرقى مالم يكن فيه شرك. (صحيح مسلم، باب جواز أخذ الأجرة على الرقية، النسخة الهندية ٢٢٤/٢، بيت الأفكار رقم: ٢٢٠٠)

لا بأس بالمعاوذات إذا كتب فيها القرآن أو أسماء الله تعالىٰ...... قالوا و إنما تكره العوذة إذا كانت لغير لسان العرب ولا يدرى ما هو الخ. (رد المحتار، كتاب الحظر والإباحة، قبيل، فصل فى النظر والمس، زكريا ٥٢٣/٩، كراچی ٣٦٣/٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

كتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۷۸۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۵/۲۹ھ

مؤکلوں کے ذریعہ علاج کرنا

سوال [۱۰۴۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: (۱) زید قرآن کریم کی چند سورتوں کا عامل ہے اور وہ بنیت خدمت خلق تعویذ کا کام کرتا ہے اور طبیبوں کے لاعلاج مریض شفایاب بھی ہوتے ہیں، تو کیا زید منھ مانگا روپیہ یا رقم لے سکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ اس کام سے اس کو اتنا وقت نہیں ملتا کہ ذریعہ معاش کچھ کر سکے، یا بن مانگے کوئی ہدیہ پیش کرے تو لے سکتا ہے یا نہیں؟

(۲) زید مریض کے مرض کو بعلم اعداد فال کھول کر دیکھتا ہے، یا بذریعہ مؤکل دیکھتا ہے، تب جبکہ طبی اصول سے مرض کا پتہ نہ چلے، یا طبی علاج سے عاجز ہو جائے اور زید بذات خود طبیب بھی ہے تو کیا زید کو اس طرح بتانا کہ آپ کو فلاں مرض ہے یا جادو وغیرہ کا اثر ہے، جبکہ بسبب جادو یا اور مرض روحانی متحقق ہے تو زید اسے بتا سکتا ہے؟ اگر ایسا کرے تو علم غیب پر مداخلت تو نہیں؟

(۳) زید مریض سے کوئی سامان جو کہ اس کی ضرورت کا ہو مثلاً مشک وغیرہ منگواتا ہے، مریض کا کام ہونے کے بعد کچھ سامان باقی رہ جاتا ہے تو زید باقی ماندہ سامان کو بطور مزدوری اپنے پاس رکھ لیتا ہے تو کیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو دوسرے مریض کو بازاری بھاؤ میں دے سکتا ہے یا دوسرے مریض پر استعمال کر کے رقم وصول کر سکتا ہے؟

المستفتی: ڈاکٹر سجاد حسین قاسمی دارالشفاء اصالت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) جھاڑ پھونک کرنا نیز تعویذ وغیرہ لکھ کر دینا بشرطیکہ اس میں کوئی مضمون خلاف شرع نہ ہو اور اس پر اجرت لینا جائز وحلال ہے۔

عن عوف بن مالک الأشجعي قال: كنا نرقي في الجاهلية فقلنا: يا رسول الله! كيف ترىٰ في ذٰلک؟ فقال: لابأس بالرقي مالم تكن شركا. (سنن أبي داؤد، باب ما جاء في الرقى، النسخة الهندية ۲/ ۵۴۲، دار السلام رقم: ۳۸۸۶)

وإنما معناه في أخذ الأجرة على الرقية بالفاتحة أو غيرها من القرآن فالإمام لا يمنع هنا. (عمدة القاري، باب الشرط على الرقية بقطيع من الغنم زكريا ۱۴/ ۷۱۷، تحت رقم الحديث ۵۷۳۷، دار إحياء التراث العربي ۲۱/ ۲۶۴)

إن المتقدمين المانعين الاستئجار مطلقا جوزوا الرقية بالأجرة ولو بالقرآن

كما ذكره الطحاوى لأنها ليست عبادة محضة بل من التداوى. (شامی، باب الإجارة الفاسدة، مطلب: تحرير مهم فى عدم جواز الاستيجار زكريا ۹/۷۸، كراچى ٦/٥٧)

(۲) زید کا بذریعہ طب یا مؤکل کے ذریعہ مریض کو دیکھ کر یہ بتانا کہ تمہارے اوپر جادو یا سحر ہے، جائز ہے، بشرطیکہ دھوکہ بازی نہ ہو، یہ غیب میں مداخلت نہیں ہے بلکہ اپنی حکمت عملی سے اس کو بتلاتا ہے، اور غیب کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ

الخفى الذى لا يدركه الحس ولا يقتضيه بداهة العقل. (بيضاوى، مكتبه رشيد ۱/۱۸)

(۳) زید مریض سے جو بھی سامان مریض کے کام کے لیے منگواتا ہو اور بقیہ ماندہ سامان مریض زید کو بخوشی اجرت میں دیدیتا ہو تو زید کے لیے بطور اجرت کے لینا جائز ہے، پھر زید اس سامان کو خود بھی استعمال کرسکتا ہے اور اس کو فروخت بھی کرسکتا ہے، کیونکہ زید اس سامان کا مالک ہوگیا ہے، اس لیے ہر قسم کا تصرف کرسکتا ہے۔

المالك هو المتصرف فى الأعيان المملوكة كيف شاء من الملك. (بيضاوى شريف رشيد ۱/۷)

الملك ما من شانه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص. (شامى مطلب: فى تعريف المال زكريا ۷/۱۰، كراچى ٤/٥٠٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۳۴۴۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹/۴/۱۴۱۴ھ

مجہول العقیدہ والے سے تعویذ گنڈا کرانے کا حکم

سوال [۱۰۴۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ گاؤں میں ایک صاحب کا طریقہ یہ ہے کہ مریض یا ضرورت مند کو سامنے بٹھاتے ہیں پھر ایک تعویذ اس کے ہاتھ میں دیدیتے ہیں، بعدہٗ فرماتے ہیں کہ ایسا ہوا ہے،

اکثر گذری ہوئی باتیں صحیح بتلا دیتے ہیں، بعدہ گنڈے تعویذ سے علاج شروع کرتے ہیں، مسلمان ضرور ہیں مگر عقیدہ معلوم نہیں، لہٰذا طرفین کے لیے شرعاً یہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟

(۲) یہ کہ بندہ اس وقت سخت پریشانی کے عالم میں ہے، مختصر یہ کہ قرضہ اور حقوق تسلی بخش نہ تو ادا ہورہے ہیں اور نہ ہی وصول ہورہے ہیں، بندہ کا معمول ہے جس کی اجازت حضرت پیر مرشد مولانا عبدالجبار صاحب اعظمی سے حاصل ہے کہ رات کو اول وآخر طاق مرتبہ درود شریف درمیان میں ایک سوایک مرتبہ ''یا خبیر اخبرنی'' پڑھ کر سو جاتا ہوں اس خیال سے کہ اللہ رب العالمین کسی جانب سے خواب میں مل جائے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، جس سے میرے سارے بگڑے کام بن جائیں، ان حالات میں میرا مذکورہ بالا شخص کے پاس جانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالعزیز مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: تعویذ وگنڈے وبائی امراض کے ازالہ کے لیے استعمال کرنا شرعاً جائز اور حدیث سے ثابت ہے، اور تجربہ سے ماضی کی کوئی بات صحیح ہونا کوئی برا نہیں ہے جبکہ دونوں کے عقیدے صحیح ہوں، جس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے، جبکہ ظاہری عقیدہ صحیح ہے مگر اندرونی حالت کی تفتیش کے آپ مکلّف نہیں ہیں۔

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده، أن رسول الله ﷺ كان يعلمهم من الفزع كلمات، أعوذ بكلمات الله التامة، من غضبه و شر عباده ومن همزات الشياطين و أن يحضرون وكان عبد الله بن عمر يعلمهن من عقل من بنيه ومن لم يعقل كتبه فعلقه عليه. (سنن أبي داؤد، باب كيف الرقى، النسخة الهندية ۲/۵۴۳، دار السلام رقم: ۳۸۹۳)

(۲) ان حالات میں مذکورہ بالا شخص کے پاس جانے کے لیے اپنے شیخ سے اجازت لینی چاہیے، بغیر اجازت نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ر محرم الحرام ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۵۹/۲۴)

مزاروں سے علاج کرانا

سوال [۱۰۴۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے والد کا کہنا ہے کہ پورے گھر پر جادو کا اثر ہے، اس لیے پورا گھر اور دوکان دیگر کاروبار بند کرکے بدایوں چلیں وہیں سے صحت ملے گی، ابھی فی الوقت انہوں نے مجھے بڑی دھونس اور گھر میں مٹی کا تیل چھڑک کر کے ہاتھ میں ماچس لے کر آگ لگانے کی دھمکی دی، میں مجبوراً چلا گیا، تو وہاں جا کر دو دن بعد میں نے ان سے کہا، میرا بخار نہیں اترا، اور ڈاکٹر کی دوا گھر ہی رہ گئی اور مکان کا معاملہ بھی رہ گیا ہے جو کہ جڑ ہے، اتنا سننے کے بعد انہوں نے بے گنتی گالیاں اور بے دردی سے مارنا شروع کردیا، اللہ اور اس کے رسول کا واسطہ دے کر معافی مانگی، لیکن انہوں نے نہ سنی، اور مارتے ہی چلے گئے، مسجد میں بھی بہت مارا، وہاں کے لوگوں نے بجائے بچانے کے پاگلوں میں بند کروانے کو کہا، عقیدہ یہاں تک ہوگیا ہے اللہ کا دربار یہی ہے، یہیں سے صحت ملے گی، سرکاروں کا کرم ہوتا ہے، یہ مت کہو کہ سب کچھ اللہ کرنے والا ہے، بلکہ ان کو اللہ نے بڑی طاقت بخشی ہے، اب چند سوالات مطلوب ہیں، جواب مرحمت فرمائیں۔

(۱) مزاروں سے علاج کرنے کی کون سی کتاب سے دلیل ملتی ہے یہ درست ہے یا نہیں؟

(۲) اور زبردستی ظلم کر کے لے جانا جائز ہے یا نہیں؟ بلکہ ہمیں وہاں کا علاج ہی نہیں کرانا؟

المستفتی: محمد جاوید محلہ شیدی سرائے مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱-۲) مزاروں سے علاج اور حاجت روائی کی غرض سے وہاں جانا اور مرادیں مانگنا حرام اور موجب شرک ہے، اور کسی کو زبردستی اس کام کے لیے وہاں لے جانے والا سخت گناہ کا مرتکب ہوگا، ایسے افعال شرکیہ سے توبہ کر کے باز آجانا واجب ہے۔

(مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۳/۳، جدید زکریا ۲/ ۲۳۷، محمودیہ قدیم ۱/ ۲۰۹، ۱/ ۲۱۳، ڈابھیل ۱/ ۳۱۷-۲۸۸)

ومنها استدر بها (إلى قوله) والاستعانة بهم و سؤالهم النصر والرزق

والعافية والولد و قضاء الدين، و تفريج الكربات وغير ذلك من الحاجات التي كان عباد الأوثان يسألونها من أوثانهم ليس شيئ منها مشروعا باتفاق أئمة المسلمين. (مجالس ابرار ص: ۱۱۹، مجلس: ۱۷)

كل من ذهب إلى بلدة أجمير أو إلى قبر سالار مسعود أو ما ضاها لأجل حاجة يطلب كأنه أثم إثما أكبر من القتل والزنا. (تنبيهات الهيه ۴/۴۵)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۸۹۹)

وبائی امراض کے ازالہ کے لیے تعویذ دینا

سوال [۱۰۴۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: یہ کہ گاؤں میں ایک صاحب کا طریقہ یہ ہے کہ مریض یا ضرورت مند کو سامنے بٹھاتے ہیں، پھر ایک تعویذ اس کے ہاتھ میں دیدیتے ہیں، بعدہٗ فرماتے ہیں کہ ایسا ہوا ہے، اکثر گذری ہوئی باتیں صحیح بتلا دیتے ہیں، بعدہٗ گنڈے تعویذ سے علاج شروع کرتے ہیں، مسلمان ضرور ہیں عقیدتاً معلوم نہیں، لہٰذا طرفین کے لیے شرعاً یہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالعزیز مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تعویذ وگنڈے، وبائی امراض کے ازالہ کے لیے استعمال کرنا شرعاً جائز اور حدیث سے ثابت ہے، اور تجربہ سے کوئی بات یا چیز صحیح ہونا کوئی برا نہیں ہے جبکہ دونوں کے عقیدے صحیح ہوں، جس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے، جبکہ ظاہری عقیدہ صحیح ہے تو اندرونی حالت میں تفتیش کے آپ مکلّف نہیں ہیں۔

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان

يعلمهم من الفزع كلمات، أعوذ بكلمات الله التامة، من غضبه و شر عباده ومن همزات الشياطين و أن يحضرون و كان عبد الله بن عمر يعلمهن من عقل من بنيه ومن لم يعقل كتبه فعلقه عليه. (سنن أبي داؤد، باب كيف الرقى، النسخة الهندية ۲/۵۴۳، دار السلام رقم: ۳۸۹۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۱۰۵۹)

ناپاکی کی حالت میں تعویذ پہنے رہنا

سوال [۱۰۴۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: یہ کہ تعویذ میں بسم اللہ شریف واسم ذات اللہ تعالیٰ یا آیت قرآن شریف یا کسی نبی یا ولی یا فرشتے کا نام لکھا ہوا ہو، ایسا تعویذ موم جامہ کر کے گردن میں ڈالنا یا بازو میں باندھنا ہر حالت میں پاکی یا ناپاکی میں پیشاب پاخانہ کرنے کی حالت میں یا جماع کرنے کی حالت میں یا ننگے بدن پاکی یا ناپاکی کی حالت میں غسل کرتے وقت ایسے تعویذ کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالعزیز مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر موم جامہ کر کے تعویذ باندھ لیا جائے تو مذکورہ تمام احوال میں باندھے رکھنا جائز اور درست ہے اور اس میں اسماء الٰہی وغیرہ کی بے ادبی لازم نہیں آتی ہے۔

ولا بأس بأن يشد الجنب والحائض التعاويذ على العضد إذا كانت ملفوفة. (شامی، کتاب الحظر والإباحة، قبیل فصل فی النظر والمس، کراچی ۶/۳۶۴، زکریا ۹/۵۲۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۷۴۸)

پانی پر دم کرا کے درو دیوار پر چھڑکنا

سوال [۱۰۴۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سورۃ بقرہ یا اور کوئی سورۃ پڑھ کر یا پڑھوا کر پانی پر دم کرا کر مکانات مسکونہ کے درو دیوار پر چھڑکنا کہ جو برابر زمین پر بھی گرتا ہے اور پیروں تلے آتا ہے، کہاں تک شرعاً جائز ہے؟

المستفتی: شریف الحسن خاں گڑھی سلیم پور کانٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سورہ بقرہ اور کوئی سورت پڑھ کر یا پڑھوا کر پانی پر دم کرا کر مکانات مسکونہ کے درو دیوار پر چھڑکنا اس طرح کا عمل شریعت سے ثابت نہیں ہے، اب درو دیواروں سے گر کر وہ پانی بہتا ہوا پیروں تلے آتا ہے ایسے پانی کا احترام کرنا چاہئے اور ناپاک جگہ پر بھی یہ پانی نہیں پہنچنا چاہئے، جیسا کہ آب زمزم کا مسئلہ ہے کہ آب زمزم سے غسل کرنا جائز ہے، مگر استنجاء کرنا خلاف ادب اور احترام کے خلاف ہے، یہاں بھی ایسا ہی ہے۔

يكره الاستنجاء بماء زمزم لا الاغتسال (در مختار) وفي الشامية: وكذا إزالة النجاسة الحقيقية من ثوبه أو بدنه. (الدر مع الرد، باب الهدي، مطلب في كراهية الاستنجاء بماء زمزم زكريا ٤/ ٥٢، كراچی ٢/ ٦٢٥) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۲۵۳/۳۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۴/۱۴ھ

تعویذ لکھنے میں دھوکہ دینا

سوال [۱۰۴۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید تعویذ گنڈے کرتا ہے اور ایک مخصوص پینسل سے تعویذ لکھتا ہے جس کی روشنائی بالکل زعفران کی طرح ہوتی ہے، عوام اس کی شناخت نہیں کر پاتے، اور وہ یہ کہہ کر

پیسہ لیتا ہے کہ اس نے زعفران سے لکھا ہے تو کیا اس طرح دھوکہ دے کر پیسہ کمانا جائز ہے؟

المستفتی: رئیس احمد شیرکوٹ بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تعویذ گنڈے پر اجرت لینا بقدر ضرورت درست ہے، لیکن دھوکہ اور فریب دے کر روپیہ کمانا درست نہیں ہے۔

ولا بأس بالمعاذات إذا كتب فيها القرآن أو أسماء الله تعالىٰ. (شامی، كتاب الحظر والإباحة، قبيل فصل في النظر والمس زكريا ۵۲۳/۹، كراچی ۳۶۳/۶)

وفي الحديث أعظم دليل على أن يجوز الأجرة على الرقى والطب كما قاله الشافعي ومالك و أبو حنيفة و أحمد. (بذل المجهود، كتاب الطب، باب كيف الرقى، دار البشائر الاسلاميه ۶۲۸/۱۱، تحت رقم الحديث ۳۸۹۹، سهارن پور قديم ۱۱/۵، حاشية أبو داؤد ۵۴۴/۲، عمدة القاری، دار إحياء التراث العربی ۹۶/۱۲، زكريا ۶۲۸/۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍رجب المرجب ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۹۴۲/۳۲)

تعویذ سے متعلق چند سوالات

سوال [۱۰۴۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) تعویذ لینے کے لیے مسجد کے حجرہ میں غیر مسلم عورتوں کا دھوتی بلاؤز پہن کر ستر کھلا ہونے کی حالت میں آنا اور مردوں کے پاس بیٹھنا اور آپس میں ایک دوسرے سے باتیں کرنا شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟

(۲) تعویذ کے ذریعہ علاج کے بہانے عورتوں اور لڑکیوں کے جسم کو جوان لڑکوں کے ہاتھوں ڈورے سے نپوانا شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟

(۳) مرد کا مسجد میں عورتوں اور لڑکیوں کے پورے جسم پر چھری چلانا، اور یہ کہنا کہ بھوت پر یت کٹ رہے ہیں، کیا اس بات کا شرعاً کوئی ثبوت ہے؟

المستفتی: ستار احمد حاجی پورہ فیروز آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۲) مسجد کے حجرہ کو تعویذ گنڈے کے طور پر استعمال کرنا اور بے پردہ عورتوں کا مسجد کے حجرہ میں آنا جانا ناجائز ہے، اور جو شخص اس طرح کی حرکت کرتا ہے وہ شخص شرعاً فاسق ہے، مسجد کے منتظمین کا فرض ہے کہ مسجد کے حجرہ کو ایسے شخص سے خالی کروا کر مذکورہ امور سے پاک کردیں۔

سوال ۲؍ میں تعویذوں سے متعلق جو لکھا گیا ہے یہ بھی ناجائز اور حرام ہے کہ جوان لڑکوں کا عورتوں کے جسم کو ہاتھوں سے اور ڈوروں سے ناپنا یہ سب ناجائز حرکتیں ہیں۔

(۳) مرد کا عورتوں اور لڑکیوں کے جسم پر اس طرح کا عمل کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، اور مسجد کے اندر اور بدتر عمل ہے، یہ سب کا سب فاسقوں کا عمل ہے جو شخص ایسی حرکتیں کرتا ہے وہ فاسق ہے۔

عن عبد اللّٰه عن النبی صلی اللّٰه علیہ وسلم قال: المرأة عورة فإذا خرجت استشرفها الشيطان. (سنن الترمذی، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ۱/ ۲۲۲، دار السلام رقم: ۱۱۷۳، مسند البزار مكتبه العلوم والحكم ۵/ ۴۲۷ رقم: ۲۰۶۱، صحيح ابن خزيمه المكتب الإسلامی ۳/ ۸۱۳ رقم: ۱۶۸۳)

عن أبی هريرة عن النبی صلی اللّٰه علیہ وسلم قال: كتب على ابن آدم نصيبه من الزنا، مدرك ذٰلك لا محالة، فالعينان زناها النظر، والأذنان زناهما الاستماع، واللسان زناه الكلام، واليد زناهما البطش. (صحيح مسلم، باب قدر على ابن آدم حظه من الزنا، النسخة الهندية ۲/ ۳۳۶، بيت الأفكار رقم: ۲۶۵۷)

وفی الأشباه: الخلوة بالأجنبية حرام. (شامی، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره ۹/ ۵۲۹، كراچی ۶/ ۳۶۸، الموسوعة الفقهية الكويتية ۱۹/ ۲۶۷)

وفی الشرنبلالية: معزيا للجوهرة ولايكلم الأجنبية. (شامی، زكريا

۹/ ۵۳۰، کراچی ٦/ ٣٦٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲ر محرم الحرام ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۹۱۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲/۱/ ۱۴۳۴ھ

موذی چیزوں کو بھگانے کے لیے حضرت سلیمان کی قسم دینا

سوال [۱۰۴۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قسم صرف اللہ ہی کے لیے ہے اگر کسی کو جنات وغیرہ پریشان کرتے ہیں تو حضرت سلیمان علیہ السلام کی قسم دیتے ہیں، ڈرانے اور بھگانے کے لیے عہد کراتے ہیں کہ آئے نہیں، تو ایسا عہد کرا سکتے ہیں یا نہیں؟ کتاب شہداء کربلا میں حضرت عباس فرماتے ہیں، پیغمبر اور صلحاء کی قسم ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ قسم نہیں دے سکتے ہیں، وضاحت کے ساتھ بیان فرمائیں مع دلائل کے۔

المستفتی: سجاد حسین پیر غیب مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جنات اور موذی چیزوں کو بھگانے کے لیے قسم دینا تو کسی روایت میں نظر سے نہیں گذرا البتہ حضرت نوح اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے عہد اور وسیلہ سے بھاگ جانے کا سوال کرنا ثابت ہے۔

عن عبد الرحمن بن أبی لیلیٰ قال: قال أبو لیلیٰ: قال رسول اللہ ﷺ: إذا ظهرت الحية فی المسكن فقولوا لها: إنا نسألك بعهد نوح، وبعهد سليمان بن داؤد أن لا تؤذينا فإن عادت فاقتلوها. (سنن الترمذی، باب ما جاء فی قتل الحيات، النسخة الهندية ١/ ٢٧٤، دار السلام رقم: ١٤٨٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱ر ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۸۸۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۳/ ۱۴۱۵ھ

نظر بد سے بچانے کے لیے بچوں کو کالا ٹیکہ لگانا

سوال [۱۰۴۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج کل عورتیں اپنے چھوٹے بچوں کا میک اپ کرنے کے بعد ان کے گال پر یا ٹھوڑی پر کاجل سے ایک کالا نشان لگاتی ہیں اور اس کا مقصد بچوں کی نظر بد سے حفاظت ہوتی ہے، کیا شرعاً اس کا کوئی ثبوت ہے؟ مدلل جواب سے نوازیں۔

المستفتی: محمد رضوان عثمان آباد مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: خوبصورت چھوٹے بچے کو نظر لگنے سے بچانے کی غرض سے چہرے پر کالا نشان لگانا حضرت عثمان غنیؓ کی ایک روایت سے ثابت ہے، روایت درج ذیل ہے۔

وفی حدیث عثمانؓ أنه رأى صبيا مليحا، فقال: دسموا نونته كي لا تصيبه العين روى ثعلب عن ابن الأعرابى: النونة النقبة التى تكون فى ذقن الصبى الصغير ومعنى دسموا سودوا. (تفسير قرطبى، دار الكتب العلمية بيروت ۳۲۹/۱۱، تحت تفسير رقم الآية ۸۷-۸۸ من سورة الأنبياء، مكتبه عباس احمد الباز ۲۱۹/۱۱-۲۲۰، شرح السنة للبغوى بيروت ۱۶۶/۱۲، شرح الطيبى، كتاب الطب والرقى، كراچی ۲۹۳/۸ تحت رقم الحديث: ۴۵۳۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۴۳۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۲/۱۸ھ

کافر عامل سے سحر کا علاج کرانا

سوال [۱۰۴۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید پر کسی نے جادو کیا، سحر کے اثر سے وہ بے حال اور خطرناک بے قابو اور خبیث بن

جاتا ہے،زید کے وطن میں کوئی مسلمان عامل ہے نہیں،جس سے وہ علاج کرا سکے،وہاں کچھ غیر مسلم عامل عملاء موجود ہیں، جو اپنا عمل وتصرف کرکے مسحور آدمی سے سحر دور کرسکتے ہیں،ان کے پاس جانے سے اگر بذات خود زید کسی ناجائز حرام اور کلمہ کفر میں ملوث نہ ہوگا شرعاً جائز ہوگیا یا نہیں؟ کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ تداوی بالحرام کی صورت ہے جو فقدان حلال کے وقت جائز ہوجاتا ہے؟

المستفتی: محمد شعیب ساؤتھ افریقہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مجبوری میں کافر سے تداوی بالمحرم کے اصول کے تحت سحر دور کرانے کی شرعاً گنجائش ہے۔(مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۵/ ۱۵۸،ڈابھیل ۲۰/ ۷۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴رجمادی الثانی ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر:۳۲/۴۵۱۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۶/۲۴ھ

جھاڑ پھونک کے معاملہ پر عورت سے بدگمان ہونا

سوال [۱۰۴۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) جھاڑ پھونک کرنے والے آسیب زدہ پر عمل کرکے اس کا جادوٹونا ابھارتے اور بکواتے ہیں،اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ اس کی آواز ہے جس نے جادوٹونا کیا ہے اس عمل کی کیا حقیقت ہے؟اور اس کے بالکل سچ ہونے کا اعتقاد رکھنا کیسا ہے؟

(۲) محض اس بکنے والے کی آواز پر یقین کرکے وہ جس کا نام لے اس پر جادوٹونا کرنے کی تہمت لگانا اور اس سے ترک تعلق کرنا بلکہ انتہائی قبیح سمجھنا اور اس کا سامنا کرنے سے اعراض کرنا کیسا ہے؟ جبکہ جس عورت پر یہ الزام لگایا گیا ہے وہ صوم وصلاۃ کی پابند،قواعد شرعیہ کی رعایت کرنے والی بلاضرورت گھر سے قدم نہ نکالنے والی شریف عورت ہے۔

(۳) اس گھناؤنے الزام سے برأت ثابت کرنے کا شرعی نقطۂ نظر سے کیا طریقہ ہے؟

المستفتی: امیر الدین مئوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو آدمی آسیب زدہ ہو یا اس پر جنات سوار ہو یا پاگل مجنون ہو، جن کو اپنی کوئی خبر نہیں ہوتی ہے ایسے آدمی کا بڑبڑانا یا بکنا یا کسی جھاڑ پھونک کرنے والے کا اس کو بکوانا اور بکتے وقت اس کی زبان سے جو باتیں نکلتی ہیں، شریعت میں اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اور نہ ہی ایسے لوگوں کی باتوں کا اعتبار ہے اور نہ ہی ان کے اوپر شریعت کا کوئی حکم لاگو ہوتا ہے، لہٰذا اس کی باتوں کو لے کر کے کسی بے قصور عورت یا مرد پر الزام لگانا اور اس کے بارے میں بدگمانی کرنا شریعت میں جائز نہیں ہے۔

عن ابن عباس عن رسول الله ﷺ قال: رفع القلم عن ثلاث عن النائم حتى يستيقظ والمعتوه حتى يفيق والصبي حتى يعقل أو يحتلم.
(المعجم الأوسط، دار الفكر ۲/۳۱٦، رقم: ۳٤۰۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸ر ذی قعدہ ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۵۹۸)

تعویذ کے ذریعہ کسی کو ملزم یا چور ثابت کرنے کی شرعی حیثیت

سوال [۱۰۴۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید تعویذ گنڈے کرتا رہتا ہے، جائز ناجائز ہر طرح کے کاموں میں تعویذ سے مدد لیتا ہے، یہاں تک کہ محبت ودشمنی وغیرہ کے سلسلے میں بھی تعویذ خوب کرتا ہے، چوری میں بھی نام نکالتا ہے، جبکہ وہ شخص جس کا چوری میں نام نکلا ہے وہ ہر طرح قسم کھانے کو بھی تیار ہے، مگر وہ شخص دعویٰ کرتا ہے کہ تمہارا نام نکلا ہے لہٰذا تم نے ہی چوری کی ہے؟

(۱) یہ ہے کہ چوری کے شبہ میں اس طرح نام نکالنا جائز ہے؟

(۲) اگر نام نکالنا ناجائز ہے تو پھر نام نکالنے والے کا کیا حکم ہے؟

(۳) اگر کسی عالم نے کسی کا نام نکالا ہے تو کیا وہ واقعی چور ہے، اس کو بدنام کرنا جائز ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تعویذ گنڈے کے ذریعہ کسی کو چور ثابت کرنا اور کسی کو ملزم قرار دینا شرعی قوانین کے خلاف ہے اور ثبوت شرعی کے بغیر کسی کے اوپر اس طرح کے الزامات عائد کرنا گناہ کبیرہ ہے اس لیے اس سے باز رہنا لازم ہے۔

ومحل التحذير والنهى إنما هو لها تهمة لا سبب لها يوجبها ...... ولم يظهر عليه ما يقتضى ذٰلک. (تفسير قرطبى، دار الكتب العلمية بيروت ۳۳۱/۱۶، تحت تفسير رقم الآية ۱۲، من سورة الحجرات مكتبه عباس احمد الباز ۲۱۷/۱۶)

تكره العوذة إذا كانت بغير لسان العرب ولايدرى ما هو و لعله يدخله سحر أو كفر أو غير ذٰلک. (شامى، كتاب الحظر والإباحة، قبيل فصل فى النظر والمس زكريا ۵۲۳/۹، كراچى ۳۶۳/۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍شعبان المعظم ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۴۷۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۸/۱۳ھ

سامان چوری ہونے پر نام نکلوانا

سوال [۱۰۴۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کچھ لوگوں کا سامان چوری ہو جاتا ہے تو وہ حضرات نام نکلواتے ہیں از روئے شرع ایسا کرنا کیسا ہے اور نام نکلنے کے بعد اس پر گرفت کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد یامین سنبھلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چور کا نام نکالنا کوئی شرعی دلیل نہیں ہے، اور جس کا نام نکلے اس کو چور قرار دے کر زبردستی اس سے مال مسروق وصول کرنا اس کو سزا دینا اور اس پر گرفت کرنا جائز نہیں ہے، جبکہ اس کے پاس شرعی ثبوت نہ ہو اور نہ ہی اس کے پاس کوئی

چوری کا مال ثابت ہو۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ۱۴/۲ ۳۷، جدید ڈابھیل ۲۰/ ۷۷، امداد الفتاویٰ ۴/ ۸۸)

عن أبی هريرة –رضی الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: كل المسلم على المسلم حرام ماله و عرضه و دمه حسب امرئ من الشر أن يحقر أخاه المسلم. (سنن أبی داؤد، باب فی الغيبة، النسخة الهندية ٢/٦٦٩، دار السلام رقم: ٤٨٨٢)

عن أبی حميد الساعدي، أن رسول الله ﷺ قال: لايحل لامرئ أن يأخذ مال أخيه بغير حقه، وذٰلك لما حرم الله مال المسلم على المسلم.

(مسند أحمد بن حنبل ٥/٤٢٥، رقم: ٢٤٠٠٣) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۸۱۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴/۵/۱۴۲۶ھ

٦ باب الأجرة على الرقية (تعویذ پر اجرت)

تعویذ پر اجرت لینا

سوال [۱۰۴۷٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص کسی مدرسہ میں مدرس ہے یا مسجد میں امام ہے، اور وہ تعویذات کے ذریعہ علاج ومعالجہ کرتا ہے اور تعویذات پر اجرت لیتا ہے، تو اس شخص کا تعویذات پر اجرت لینا اور مریضوں کا اجرت دینا کیسا ہے؟

المستفتی: عتیق الرحمٰن قاسمی بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر تعویذات میں کوئی خلاف شرع عمل نہ ہو اور نہ ہی کوئی دھوکہ بازی ہو تو اس کی مناسب اجرت لینا اور دینا جائز ہے۔

جوزوا الرقية بالأجرة ولو بالقرآن كما ذكره الطحاوى لأنها ليست عبادة محضة بل من التداوي. (شامی، باب الإجارة الفاسدة، مطلب: تحرير مهم فى عدم جواز الاستئجار، زكريا ٩/٧٨، كراچی ٦/٥٧)

قوله إن أحق ما أخذتم عليه أجرا كتاب الله يعنى إذا رقيتم به. (عمدة القارى، باب ما يعطى فى الرقية على إحياء العرب بفاتحة الكتاب زكريا ٨/٢٢٨، دار إحياء التراث العربى ١٢/٩٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۵۴۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۱۲/۲۲ھ

تعویذ کے عوض روپیہ لینا

سوال [۱۰۴۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: تعویذ کے عوض روپیہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو کتنی مقدار لے سکتے ہیں؟

المستفتی: وسیم اکرم بدایونی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تعویذ کا عوض روپیہ یا کسی دوسری اشیاء کی شکل میں لینے کی گنجائش ہے، اس کی مقدار متعین نہیں ہے مگر اس کو اپنا روزگار اور پیشہ بنا لینا مناسب نہیں ہے۔

إن المتقدمين المانعين الاستئجار مطلقا جوزوا الرقية بالأجرة ولو بالقرآن. (شامی، باب الإجارة الفاسدة، مطلب: تحرير مهم فی عدم جواز الاستئجار زكريا ۹/۷۸، كراچی ٦/٥٧)

وإنما معناه فی أخذ الأجرة على الرقية بالفاتحة أو غيرها من القرآن فالإمام لا يمنع هذا. (عمدة القاری، باب الشرط على الرقية بقطيع من الغنم زكريا ١٤/٧١٧، تحت رقم الحديث ٥٧٣٧، دار إحياء التراث العربی ٢١/٢٦٤) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۳۹۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۳/۴/۱۴۱۴ھ

تعویذ گنڈے کی اجرت کا حکم

سوال [۱۰۴۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کیا کوئی مسلمان عاقل بالغ شخص جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کو اپنا ذریعہ معاش بنا سکتا ہے؟ بالفاظ دیگر مریضوں کو جن بھوت سے خلاصی دلوانے کا ان سے معاوضہ و اجرت لے کر اپنا اور اپنے اہل وعیال کا نان ونفقہ چلا سکتا ہے؟

المستفتی: ڈاکٹر محمد قمر کاشی پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تعویذ گنڈا کر کے اجرت لینا شرعاً جائز ہے، اور

اس کی اجرت کے پیسے سے بال بچوں کا نان ونفقہ چلانا بھی جائز ہے، لیکن ساتھ میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ تعویذ گنڈے کے پیسہ میں برکت نہیں ہوتی، اس لیے اس کو پیشہ نہ بنانا چاہئے، لیکن اس بات کی اجرت بہرحال جائز ہے۔

جوزوا الرقية بالأجرة ولو بالقرآن كما ذكره الطحاوي لأنها ليست عبادة محضة بل من التداوي. (شامی، باب الإجارة الفاسدة، مطلب: تحرير مهم في عدم جواز الاستيجار زكريا ۹/ ۷۸، كراچی ۶/ ۵۷)

ذهب جمهور الفقهاء إلى جواز أخذ الأجرة على التعاويذ والرقى. (الموسوعة الفقهية الكويتية ۱۳/ ۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۲۸۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/ ۵/ ۱۴۲۸ھ

تعویذ لکھنے اور اس کی اجرت کا حکم

سوال [۱۰۴۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تعویذ لکھنا اور دینا اجرت لینا دینا مطالبہ کرنے کے بعد یا دینے والا خود دے تو جائز ہے یا نہیں؟ اور بغیر مطالبہ کے خوشی سے دے یا مقررہ اجرت لینا شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: محمد لقمان منی پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: تعویذ، گنڈہ کر کے اس کی مناسب اجرت لینا جائز اور درست ہے، لیکن تعویذ گنڈہ کرنے والوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ اس کو اپنی کمائی کا ذریعہ نہ بنائیں، نیز عورتوں کی آمد ورفت سے بے حد احتیاط کی ضرورت ہے۔

قال في البذل: قوله صلى الله عليه وسلم: واضربوا لي معكم بسهم، وفي حديث أعظم دليل على أنه يجوز الأجرة على الرقى والطب كما قال

الشافعی و مالک و احمد و أبو حنیفة رحمهم الله. (بذل المجهود، کتاب الطب، باب کیف الرقی، دار البشائر الاسلامیه ۱۱/۶۲۸، تحت رقم الحدیث: ۳۸۹۹، سهارنپور قدیم ۵/۱۱، حاشیة سنن أبی داؤد ۲/۵۴۴)

وقال الشامی: والثالث أن الرقیة لیست بقربة محضة فجاز أخذ الأجرة علیها. (رسائل ابن عابدین، ثاقب بك ڈپو دیوبند ۱/۱۵۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ربیع الاول ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۵۰۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۳/۴ھ

درس کو منقطع کرکے تعویذ لکھ کر اجرت لینا

سوال [۱۰۴۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اوقات درس وتدریس میں بحالت درس، درس سے منقطع ہوکر تعویذات کے کام کو انجام دینا اور پھر اس پر اجرت لینا اور منھ مانگے روپے لینا اور جواز کی شکل کی کتنی مقدار ہے، جواز، عدم جواز کو قرآن وحدیث کی روشنی میں اطمینان بخش جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: امجد علی بارہ بنکی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: تعویذ کی مناسب اجرت لینے کی گنجائش ہے، لیکن مدرس کے لیے مناسب نہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/۴۰۳)

اور تنخواہ دار مدرس کے لیے بوقت درس، درس کو منقطع کرکے اجرت پر تعویذ لکھنا ہرگز جائز نہیں اور اوقات درس کے تعویذات کی اجرت مدرسہ کو دیدینا لازم ہوگا، یا ان اوقات کی تنخواہ کٹوا دینی چاہئے، البتہ اوقات درس سے خارجی اوقات کی بات اس سے مستثنیٰ ہے، حدیث میں آیا ہے:

عن ابن عباس –رضی الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: لا ضرر ولا

ضرار. (مسند أحمد بن حنبل ۳۱۳/۱، رقم: ۲۸٦۷، سنن ابن ماجه، باب من بنى فى حقه ما يضر بجاره، النسخة الهندية ۱٦۹/۲، دار السلام رقم: ۲۳٤۱، مؤطا إمام مالك، باب القضاء فى المرفق ص: ۳۱۱، المعجم الكبير للطبرانى، دار إحياء التراث العربى ۸٦/۲، رقم: ۱۳۸۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۳۴۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶/۳/۱۴۱۴ھ

قرآنی آیاتِ شفاونقوش لکھ کر مریض کو پلانا اور اس کی اجرت لینا

سوال [۱۰۴۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عامل کے لیے تعویذ دیکر روپیہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور قرآنی آیات شفاء اور نقوش لکھ کر مریض کو گھول کر پلا سکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ادریس ایم پی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جو شخص تعویذ کا عمل جانتا ہے اور اس میں کوئی غلط چیز کا استعمال نہیں کرتا، اور غلط کاموں کے لیے تعویذ نہیں دیتا ہے اس کے لیے روپیہ لینا جائز ہے، البتہ اس کو پیشہ بنالینا مناسب نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ جدید ڈابھیل ۲۰/ ۸۸)

اور قرآنی آیاتِ شفاء اور نقوش کو لکھ کر مریض کو گھول کر پلانا شرعاً درست ہے۔

أن الرقية ليست بقربة محضة فجاز أخذ الأجرة عليها. (تكمله فتح الملهم، مسئلة الأجرة على تعليم القرآن والرقية، اشرفيه ۳۳۰/٤)

جوزوا الرقية بالأجرة ولو بالقرآن كما ذكره الطحاوى لأنها ليست عبادة محضة بل من التداوي. (شامى، باب الإجارة الفاسدة، مطلب: تحرير مهم فى عدم جواز الاستيجار زكريا ۷۸/۹، كراچى ٥۷/٦)

أخبرنا أبو عبد الرحمن السلمي فى ذكر منصور بن عمار و أنه أوتي

الحکمة وقیل: إن سبب ذٰلک أنه وجد رقعة فی الطریق مکتوبا علیها ''بسم الله الرحمن الرحیم'' فأخذها فلم یجد لها موضعا فأکلها، فأري فیما یریٰ النائم کأن قائلا یقول: قد فتح علیک باب الحکمة باحترامک لتلک الرقعة وکان بعد ذٰلک یتکلم بالحکمة. (شعب الإیمان للبیهقی، باب فی تعظیم القرآن، فصل فی تعظیم المصحف، دار الکتب العلمیة بیروت ۲/۵٤٥، رقم: ۲٦٦۲) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍محرم الحرام ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۸۵۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۱/۱۴۳۱ھ

تعویذات کے ذریعہ علاج اور اس کی اجرت کا حکم

سوال [۱۰۴۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تعویذات سے علاج کرنا کیسا ہے؟ اگر جائز ہے تو کس طریقے سے جائز ہے؟ اور اس کام پر روپئے پیسے کتنے لیے جاسکتے ہیں؟ قرآن وحدیث سے جواب دیں۔

المستفتی: حکیم فرہاد الٰہی بلندشہر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قرآن پاک، اللہ کے اسماء وصفات، ادعیۂ ماثورہ وغیرہ کے ذریعہ علاج کرنا یا غیر عربی زبان میں تعویذ کرنا بشرطیکہ اس کے معنی خلاف شرع نہ ہوں، اور نہ اس میں جادوٹونے کی کوئی بات ہو، نیز اس کو مؤثر بالذات نہ سمجھے تو ایسے تعویذات کے ذریعہ علاج کرنا جائز اور درست ہے، جبکہ وہ اچھی طرح علاج کرنا جانتا بھی ہو اور تعویذ کرنے پر اجرت لینا جائز ہے، پیسوں کی مقدار متعین نہیں ہے، جس طرح ڈاکٹروں کی دوائی کی کوئی ایک مقدار متعین نہیں رہتی ہے، ہاں البتہ دھوکہ نہ دیوے، اور غریبوں کا خیال رکھنا اور خیر خواہی کا معاملہ کرنا اصل دینداری ہے۔

ولابأس بالمعاذات إذا کتب فیها القرآن أو أسماء الله تعالیٰ ...... قالوا:

إنما تکره العوذة إذا کانت لغیر لسان العرب ولا یدری ما هو ولعله یدخله سحر أو کفر وغیر ذٰلک و أما ما کان من القرآن أو شيئ من الدعوات فلا بأس به.

(شامی، کتاب الحظر والإباحة، قبیل فصل فی النظر والمس زکریا ۹/۵۲۳، کراچی ۶/۳۶۳)

عن عوف بن مالک الأشجعی قال: کنا نرقي في الجاهلیة فقلنا: یا رسول الله! کیف تریٰ في ذٰلک؟ فقال: اعرضوا علي رقاکم، لابأس بالرقی مالم یکن فیه شرک. (صحیح مسلم، باب جواز أخذ الأجرة علی الرقیة، النسخة الهندیة ۲/۲۲٤، بیت الأفکار رقم: ۲۲۰۰، مشکاة المصابیح، کتاب الطب والرقی قدیم ص:۳۸۸)

أجمع العلماء علی جواز الرقي عند اجتماع ثلاثة شروط: أن یکون بکلام الله تعالیٰ أو بأسمائه و صفاته وباللسان العربي أو بما یعرف معناه من غیره و أن یعتقد أن الرقیة لاتؤثر بذاتها بل بذات الله تعالیٰ. (فتح الباری، کتاب الطب، باب الرقی بالقرآن والمعوذات اشرفیه ۱۰/۲٤۰، دار الفکر ۱۰/۱۹۵، تحت رقم الحدیث: ۵۷۳۵)

استأجره لیکتب له تعویذا لأجل السحر جاز أن بین قدرا لکاغذ و الخط.

(الدر المختار، مطلب: فی أجرة صك القاضی والمفتی زکریا ۹/۱۲۷، کراچی ۶/۹۳)

استأجره لیکتب له تعویذ السحر یصح الخ. (عالمگیری، الباب السادس عشر فی مسائل الشیوع زکریا قدیم ٤/٤٥۰، جدید ٤/٤۸۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم صفر المظفر ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۰۹۵۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۲/۱۴۳۴ھ

مؤکل کے ذریعہ علاج اور اس کی اجرت کا شرعی حکم

سوال [۱۰۴۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک صحیح العقیدہ اور امور دینیہ کا پابند شخص ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے علوم روحانی اور مؤثر معالجہ روحانی کی صفات عطا کیں، وہ اپنے علاج میں کوئی غیر شرعی استعانت بغیر اللہ

کا طریقہ اختیار نہیں کرتا، اور اپنے ان مشاغل کی وجہ سے تجارت وزراعت اور ملازمت سے قاصر ہے، لہٰذا اگر وہ کسی آسیب زدہ یا سحر زدہ مریض کا علاج اپنے مؤکلین کے ذریعہ اپنی رہائش گاہ پر کرنے کے بعد اس کی معین یا غیر معین اجرت لے کر اپنے یا اپنے عیال کی معاشی ضروریات پر صرف کرے یا اس کو ذریعہ معاش بنالے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

(۲) زید معالجہ روحانی کے لیے اگر حالات کے متقاضی ہونے پر اسفار کرتا ہے، جس کی وجہ سے اس کو وقت اور زحمت سفر اور مصارف سفر کا متحمل ہونا پڑتا ہے تو کیا وہ اس کی اجرت لے کر اپنے مصارف میں استعمال کر سکتا ہے؟

(۳) زید اپنے معالجہ روحانی کا کوئی متعینہ مال وزر طلب نہیں کرتا لیکن مریض ازخود اسے تحائف یا نقد رقم دیتا ہے تو کیا وہ اسے قبول کر کے ذاتی مصارف میں لا سکتا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں اگر زید صحیح العقیدہ اور امور دینیہ کا پابند ہے اور علاج میں کوئی ناجائز چیز یا شرکیہ کلمات وغیرہ استعمال نہیں کرتا ہے اور واقعتاً علاج جانتا ہے، دھوکہ دہی کا معاملہ نہیں کرتا ہے تو ایسی صورت میں مناسب معاوضہ لینے کی گنجائش ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۵/ ۳۷۱، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۱۰۳)

ولا بأس بالمعاذات إذا كتب فيها القرآن أو أسماء الله تعالىٰ ...... قالوا: إنما تكره العوذة إذا كانت لغير لسان العرب ولا يدري ما هو ولعله يدخله سحر أو كفر وغير ذٰلک وأما ما كان من القرآن أو شيئ من الدعوات فلا بأس به.

(شامی، کتاب الحظر والإباحة، قبیل فصل فی النظر والمس زکریا ۹/ ۵۲۳، کراچی ۶/ ۳۶۳)

عن عوف بن مالک الأشجعي قال: كنا نرقي في الجاهلية فقلنا: يا رسول الله! كيف ترىٰ في ذٰلک؟ فقال: اعرضوا علي رقاكم، لابأس بالرقى مالم يكن فيه شرک. (صحيح مسلم، باب جواز أخذ الأجرة على الرقية، النسخة الهندية ۲/ ۲۲٤، بيت الأفكار رقم: ۲۲۰۰، مشكاة المصابيح، كتاب الطب والرقى ص:۳۸۸)

أجمع العلماء على جواز الرقي عند اجتماع ثلاثة شروط: أن يكون بكلام

اللـه تعالیٰ أو بأسمائه و صفاته وباللسان العربي أو بما يعرف معناه من غيره و أن يعتقد أن الرقية لاتؤثر بذاتها بل بذات الله تعالیٰ. (فتح الباری، کتاب الطب، باب الرقی بالقرآن والمعوذات اشرفیه ۱۰/ ۴۲۰، دار الفکر ۱۰/ ۱۹۵، تحت رقم الحدیث: ۵۷۳۵)

استأجره ليكتب له تعويذا لأجل السحر جاز أن بين قدر الكاغذ و الخط.

(الدر المختار، مطلب: فی أجرة صك القاضی والمفتی زکریا ۹/ ۱۲۷، کراچی ۶/ ۹۳)

استأجره ليكتب له تعويذ السحر يصح. (عالمگیری، الباب السادس عشر فی مسائل الشیوع زکریا قدیم ۴/ ۴۵۰، جدید ۴/ ۴۸۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۲۹ر جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۲۳۹)

تعویذ پر اجرت لینے والے امام کے پیچھے نماز کا حکم

سوال [۱۰۴۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک آدمی عالم باشرع امامت کرتا ہے اور تعویذات بھی، اب اگر یہ صاحب تعویذات کی اجرت مریض سے لیں تو کیا ان کے پیچھے نماز درست ہے، مثلاً کسی مریض کو تعویذ بنا کر دیا، اس شخص نے معلوم کیا حضرت کتنے پیسے دیدوں، اب حضرت نے کہا زیادہ نہیں بس پچاس روپیہ دیدو، شریعت کی رو سے اس عالم باشرع کے لیے کیا حکم ہے؟

المستفتی: سراج الحق سرجن نگر مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر حدود شرع کا لحاظ رکھتے ہوئے تعویذ، گنڈے دیتے ہیں اور اس پر اجرت لیتے ہیں، اس کی گنجائش ہے، لیکن اس کو ذریعہ معاش اور پیشہ بنا لینا اس دور میں خلاف احتیاط ہے، مگر مذکورہ عالم کی امامت ہر صورت میں بلا کراہت جائز اور درست ہے۔

(مستفاد: فتاویٰ دار العلوم ۳/ ۲۰۸، فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۲/ ۲۲۹، جدید ڈابھیل ۱۷/ ۱۰۳، فتاویٰ احیاء العلوم ۱/ ۲۰۵)

لأن المتقدمين المانعين الاستئجار مطلقا جوزوا الرقية بالأجرة ولو بالقرآن. (شامی، باب الإجارة الفاسدة، مطلب: تحرير مهم في عدم جواز الاستجار زكريا ۹/ ۷۸، کراچی ۶/ ۵۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۳۱۲۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۵؍ ۴؍ ۱۴۱۳ھ

٤١ كتاب الحظر والإباحة

١ باب السلام، والمصافحة والمعانقة

فرد واحد کو السلام علیکم کہنے کا حکم

سوال [۱۰۴۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فقط ایک فرد کو ابتداء سلام کرتے ہوئے السلام علیکم یا جواباً وعلیکم السلام کہنے کی کیا اصل ہے، کیا ایک شخص کو علیک کے بجائے علیکم کہنا بطور جمع لسان نبوت یا تعامل صحابہ سے ثابت ہے، اگر ثابت ہے تو گذارش ہے کہ حوالہ کے ساتھ ضرور درج فرمائیں، اور احقر کی پریشانی دور فرمائیں، اور اگر ثابت نہیں ہے تو بتائیں کہ ایسی صورت میں مخالفت سنت کے جرم کا ارتکاب ہوا یا نہیں؟

المستفتی: محمد اشتیاق قاسمی بھاگلپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: حدیث میں السلام علیکم جمع کے خطاب کے ساتھ بھی الفاظ وارد ہوئے ہیں۔

عن عمران بن حصينؓ قال: جاء رجل إلى النبي ﷺ فقال: السلام عليكم. (سنن أبي داؤد، باب كيف السلام، النسخة الهندية ٢/٧٠٦، دار السلام رقم: ٥١٩٥، سنن الدارمي دار المغني ٣/٧٢٦، رقم: ٢٦٨٢المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ٦/٢٤٦ رقم: ٦١١٤)

أخبرني عمرو بن أبي سفيان –إلى– فقال النبي ﷺ: ارجع، فقل: السلام عليكم أأدخل. (سنن الترمذي، باب ماجاء في التسليم قبل الاستئذان، النسخة

الهندية ۲/ ۱۰۰، دار السلام رقم: ۲۷۱۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍شعبان المعظم ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۱۵۲)

سلام میں مغفرتہ کے اضافہ کا حکم

سوال [۱۰۴۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سلام میں ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ'' پر ومغفرتہ کا اضافہ کرنا کیسا ہے؟ بعض کتب فقہ میں مکروہ لکھا ہے، حالانکہ مشکوٰۃ شریف میں زیادہ کرنے کی حدیث پڑھی ہے، اس مسئلہ میں بہت خلجان ہورہا ہے، لہٰذا اس بارے میں حضرت اپنی تحقیق مع حوالہ کتب تحریر فرماکر ممنون ہوں، چونکہ حدیث کا طالب علم ہوں اور اپنے گاؤں کا دینی رہنما بھی، اس لیے برائے کرم جواب بالتفصیل لکھ کر احسان کریں۔

المستفتی: محمد مشتاق احمد نور پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سلام میں السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کے بعد ومغفرتہ کے اضافہ سے متعلق احادیث شریفہ میں کیا حکم وارد ہوا ہے تو اس سلسلے میں روایات کا جائزہ لے کر دیکھا گیا ہے کہ صحیح سند کی روایات میں صرف وبرکاتہ تک ہے، اور صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم کی روایات سے لفظ ''وبرکاتہ پر اضافہ کو نا پسند کرنے کی بات سمجھ میں آتی ہے جیسا کہ درج ذیل روایات سے بھی یہی واضح ہوتا ہے۔

عن عائشة رضی الله عنها أن رسول الله ﷺ قال لها: يا عائشة! هذا جبرئيل يقرأ عليک السلام، فقلت: و عليه السلام ورحمة الله وبركاته فذهبت تزيد فقال النبی ﷺ: إلى هذا انتهى السلام، فقال: رحمة الله وبركاته عليكم أهل البيت . (المعجم الأوسط للطبرانی، دار الفكر ۱/ ۲۲۹، رقم:

۷۸۲، مجمع الزوائد، دار الکتب العلمية بيروت ۸/۳٤، صحيح البخاری، باب ذكر الملائكة، النسخة الهندية ۱/٤٥۷، رقم: ۳۱۱۳، ف: ۳۲۱۷، صحيح مسلم، باب فضل عائشة رضی الله تعالیٰ عنها، النسخة الهندية ۲/۲۷۸، بيت الأفكار رقم: ۲٤٤۷)

اور بعض روایات کمزور سند کے ساتھ مروی ہیں جن میں ومغفرتہ کا اضافہ ہے، جیسا کہ حسب ذیل روایات سے ظاہر ہوتا ہے۔

عن سهل بن معاذ بن أنس عن أبيه عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم بمعناه، زاد: ثم أتى آخر، فقال: السلام عليكم ورحمة الله وبركاته و مغفرته، فقال: أربعون، قال هٰكذا تكون الفضائل. (سنن أبی داؤد، باب كيفية السلام، النسخة الهندية ۲/۷۰٦، دار السلام رقم: ۵۱۹٦)

عن زيد بن أرقم قال: كان النبی صلی اللہ علیہ وسلم إذا سلم علينا فرددنا عليه السلام قلنا وعليک ورحمة الله وبركاته و مغفرته ...... إن فی إسناده إلى شعبة من لا يحتج به. (شعب الإيمان للبيهقی، فصل فی كيفية السلام و كيفية الرد، دار الكتب العلمية بيروت ٦/٤٥٦، رقم: ۸۸۸۱)

عن أنس -رضی الله عنه- قال: كان رجل يمر والنبی صلی اللہ علیہ وسلم يرعى دواب أصحابه، فيقول: السلام عليک يا رسول الله! فيقول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: وعليک السلام ورحمةا لله وبركاته و مغفرته ورضوانه، فقيل: يا رسول الله! ترد على هذا سلاما ما تسلمه على أحد من أصحابک؟ فقال: و ما يمنعنی من ذٰلک و هو ينصرف بأجر بضعة عشر رجلا. (عمل اليوم والليلة لابن السنی، باب منتهى رد السلام، مؤسسة علوم القرآن ۱/۱۹۷، رقم: ۲۳۵)

اب دونوں طرح کی روایت کو سامنے رکھنے کے بعد یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ سلام میں وبرکاتہ تک کے الفاظ کا استعمال کرنا مسنون ہے، اور اس پر ومغفرتہ کے اضافہ کو مسنون نہیں کہا جا سکتا ہے، اس لیے کہ صحیح سند سے ثابت نہیں ہے، لیکن اس کو مکروہ بھی نہیں کہا جا سکتا، بلکہ کسی درجہ میں جواز کے دائرہ میں شامل ہے، اس لیے اگر کوئی ومغفرتہ کا اضافہ کرتا

ہےتو اس پر نکیر کی ضرورت نہیں، ہاں البتہ مسنون سمجھنے پر نکیر کی جاسکتی ہے۔

فقال ابن عباس، أن السلام انتهى إلى البركة. (مؤطا امام مالك ۱/۳۷۹، اعظمی رقم: ۳۵۲۵)

عن عبد الله بن بأبيه أنه كان مع عبد الله بن عمر فسلم عليه رجل فقال سلام عليک ورحمة الله وبركاته و مغفرته فانتهره ابن عمر وقال: حسبک إذا انتهيت إلى و بركاته. (شعب الإيمان، فصل في كيفية السلام و كيفية الرد، دار الكتب العلمية بيروت ۶/۴۵۶، رقم: ۸۸۸۰)

عن عطاء في قول الله عز وجل "رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهٗ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ قال: كنت عند عبد الله بن عباس إذ جاءه رجل فسلم عليه، فقلت وعليكم السلام ورحمة الله وبركاته ومغفرته، فقال ابن عباس: انته إلى ما انتهت إليه الملائكة. (المستدرك للحاكم، كتاب التفسير، تفسير سورة هود، قديم ۲/۳۴۴، مكتبه نزار مصطفىٰ الباز، جديد ۴/۱۲۴۵، رقم: ۳۳۱۶)

وبهذا نأخذ إذا قال: السلام عليكم ورحمة الله وبركاته فليكفف فإن اتباع السنة أفضل، قال المحشي: وظاهره أن الزيادة على و بركاته خلاف السنة. (مؤطا امام محمد، باب رد السلام ۱/۳۸۵، رقم: ۹۱۴)

والأفضل للمسلم أن يقول: السلام عليكم ورحمة الله وبركاته والمجيب كذلك يرد ...... ولاينبغي أن يزاد على البركات شيئ. (شامی، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره زكريا ۹/۵۹۳، كراچی ۶/۴۱۴، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ۸/۱۷ رقم: ۹۴۹۲، الفتاویٰ التاتارخانية ۱۸/۷۷، رقم: ۲۸۰۸۶، هنديه زكريا قديم ۵/۳۲۵، جديد ۵/۳۷۶)

عن يحى بن سعيد أن رجلا سلم على عبد الله بن عمر رضى الله عنهما فقال: السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، والغاديات والرائحات، فقال له عبد الله بن عمر وعليک ألفا ثم كأنه كره ذلک. (جامع السلام ۱/۳۸۰، رقم اعظمی: ۳۵۳۴، شرح السنة للبغوی، دار الكتب العلمية بيروت ۱۲/۲۵۷،

رقم: ۳۲۹۹، أحسن الفتاویٰ ۸/۱۳۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ذی الحجہ ۱۴۳۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۸۳۲/۳۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۰/۱۲/۱ھ

محفل میں آ کر سلام علیکم کہنا

سوال [۱۰۴۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے محفل میں آ کر کہا "سلام علیکم" ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ سلام علیکم کہنا غلط ہے، السلام علیکم کہنا چاہیے، تیسرے نے کہا، دونوں طرح سے صحیح ہے، جبکہ سام علیکم واقعی غلط اور لائق تعزیر ہے، شرع کی روشنی میں تحریر فرمائیں کہ آیا سلام علیکم غلط ہے یا صحیح ہے؟

المستفتی: مصطفیٰ احمد کسرول مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سلام کا مسنون طریقہ یہی ہے کہ السلام علیکم الف لام کے ساتھ یا سلام علیکم میم کی تنوین کے ساتھ سلام کیا جائے یہی الفاظ صحیح اور درست ہیں، ہاں البتہ علیکم کے بجائے علیک کہنا بھی درست ہے، اور سلام علیکم، السلام پر الف لام بھی نہ ہو اور میم پر تنوین بھی نہ ہو درست نہیں ہے، اور عربی زبان کے اعتبار سے یہ عبارت بھی غلط سمجھی جاتی ہے۔

ولفظ السلام فی المواضع کلها "السلام علیکم أو سلامٌ علیکم" بالتنوین و بدون هذین کما یقول الجهال لایکون سلاما. (شامی، کتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغیره، کراچی ۶/۴۱۶، زکریا ۹/۵۹۶، مطلب: المواضع التی لا یجب فیها رد السلام، زکریا ۲/۳۷۶، کراچی ۱/۶۱۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۳۳۴/۳۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۶/۱۰ھ

غیر محرم مرد و عورت کو سلام کرنا

سوال [۱۰۴۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: غیر محرم عورت مرد کو سلام کرسکتی ہے یا نہیں؟ اسی طرح مرد غیر محرم عورت کو سلام کرسکتا ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جوان عورت جوان مرد کو اور جوان مرد جوان عورت کو سلام نہ کریں اس میں خوف فتنہ ہے، البتہ عورت بوڑھے مرد کو اور مرد بوڑھی عورت کو سلام کرسکتے ہیں، اور جواب بھی دے سکتے ہیں۔

عن یحی بن أبی کثیر قال: بلغنی أنه یکره أن یسلم الرجل علی النساء، والنساء علی الرجل. (شعب الإیمان فصل فی السلام علی النساء، دار الکتب العلمیة بیروت ٦/ ٤٦٠، رقم: ٨٨٩٦)

قال: و أخبرنا معمر، قال: کان قتادة یقول: أما امرأة من القواعد فلا بأس أن یسلم علیها و أما الثانیة فلا. (شعب الإیمان، فصل فی السلام علی النساء، دار الکتب العلمیة بیروت ٦/ ٤٦٠، رقم: ٨٨٩٧)

إذا سلمت المرأة الأجنبیة علی رجل إن کانت عجوزا رد الرجل علیها السلام بلسانه بصوت تسمع وإن کانت شابة رد علیها فی نفسه و کذا الرجل إذا سلم علی امرأة أجنبیة فالجواب فیه علی العکس. (شامی، کتاب الحظر والإباحة، فصل فی النظر والمس، زکریا ٩/ ٥٣٠، کراچی ٦/ ٣٦٩، هندیه زکریا قدیم ٥/ ٣٢٦، جدید ٥/ ٣٧٨، قاضیخان زکریا جدید ٣/ ٣٠٧، وعلی هامش الهندیة ٣/ ٤٢٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ ربیع الثانی ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۹۸۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۴/۲۸ھ

اجنبی کے گھر میں دخول کے لیے سلام اور اجازت دونوں ضروری

سوال [۱۰۴۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کسی شخص نے کسی اجنبی آدمی کے گھر میں جاکر صرف باہر سے السلام علیکم کہا، اندر سے جواب آیا، وعلیکم السلام،تو کیا اس کے بعد وہ اندر داخل ہوسکتا ہے؟ یا پھر الگ سے اجازت طلب کرنا پڑے گی داخل ہونے کے لیے یا وہی سلام کافی ہے داخل ہونے کے لیے؟

المستفتی: منیرالدین بانکوڑی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جی ہاں! السلام علیکم اور الگ سے اجازت دونوں ضروری ہیں،اس کے بعد داخل ہوسکتا ہے۔

﴿ **يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰى اَهْلِهَا.** [النور: ۲۷] ﴾

وفی تفسير الخازن: لا يدخل بيت الغير إلا بعد الاستئذان والسلام (وقوله) وقال الأكثرون: يقدم السلام فيقول: سلام عليكم أأدخل ...... (وقوله) تستأنسوا أی تستأذنوا. (خازن سوره نور ۳/۳۲٤)

عن عمرو بن عبد الله بن صفوان، أخبره أن كلدة بن حنبل: أخبره أن صفوان بن أمية بعثه بلبن ولبأ و ضغابيس إلى النبی صلى الله عليه وسلم، والنبی صلى الله عليه وسلم بأعلى الوادی، قال: فدخلت عليه، ولم استاذن ولم أسلم، فقال النبی صلى الله عليه وسلم ارجع فقل: السلام عليكم أأدخل؟ وذٰلک بعد ما أسلم صفوان. (سنن الترمذی، باب ما جاء فی التسليم قبل الاستئذان، النسخة الهندية ۲/۱۰۰، دار السلام رقم: ۲۷۱۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍شعبان المعظم ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۸۴۲)

کیا مسجد میں داخل ہوتے ہی سلام کرنا مسنون ہے؟

سوال [۱۰۴۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسجد میں داخل ہوتے ہی سلام کرنا مسنون ہے اور ہال میں داخل ہوکر جہاں نمازی سنت وغیرہ پڑھ رہے ہیں کیا سلام کرنا چاہیے؟

المستفتی: محمد یونس علی گڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مسجد میں داخل ہوتے ہوئے سلام کرنا حدیث میں نہیں آیا ہے بلکہ "**أللهم افتح لی أبواب رحمتک** اور **أعوذ بالله العظيم و بوجهه الكريم وسلطانه القديم من الشيطان الرجيم**" کہنا احادیث میں آیا ہے۔

عن أبی أسيد قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا دخل أحدكم المسجد فليقل أللهم افتح لی أبواب رحمتک. (صحيح مسلم، باب ما يقول إذا دخل المسجد، النسخة الهندية ۱/۲۴۸، بيت الأفكار رقم۷۱۳، سنن الدارمی، دار المغنی ۲/۸۷۶، رقم: ۱۴۳۴، ۳/۱۷۶۱، رقم: ۲۷۳۳)

عن عبد الله بن عمرو بن العاص عن النبی صلى الله عليه وسلم: أنه كان إذا دخل المسجد قال: أعوذ بالله العظيم، وبوجهه الكريم وسلطانه القديم من الشيطان الرجيم. (سنن أبی داؤد، باب فيما يقوله الرجل عند دخوله المسجد، النسخة الهندية ۱/۶۷، دار السلام رقم: ۴۶۶)

جہاں لوگ نماز وتلاوت وغیرہ میں مشغول ہوں وہاں پرسلام کرنا مکروہ ہے، ہاں البتہ اگر مسجد یا ہال میں لوگ نماز وذکر وتلاوت میں مشغول نہ ہوں تو ان کو سلام کرنا مشروع ہے۔

يكره السلام على العاجز عن الجواب ...... إلى ...... كالمشغول بالصلاة وقراء ة القرآن. (رد المحتار، مطلب: المواضع التی لا يجب فيها رد السلام زكريا ۲/۳۷۶، كراچی ۱/۶۱۷) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۵۲۴۶/۳۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۴/۱۳ھ

مرض الوفات میں مبتلا لوگوں کوسلام کہلوانا

سوال [۱۰۴۹۱]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مرض الموت میں گذرے ہوئے لوگوں کوسلام کہلوانا درست ہے یانہیں؟

المستفتی: مولانا محمد سالم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جی ہاں یہ ثابت ہے۔

محمد بن المنکدر، قال: دخلت علی جابر بن عبد الله وهو یموت، فقلت: إقرئی رسول الله ﷺ منی السلام. (مسند أحمد بن حنبل ٤/ ٣٠١ رقم: ١٩٧١١)

أخرج البخاری فی تاریخه عن خالدة بنت عبد الله بن أنیس قالت جاء ت أم البنین بنت أبی قتادة بعد موت أبیها بنصف شهر إلی عبد الله بن أنیس وهو مریض فقالت یا عم اقرأ أبی السلام. (شرح الصدر قدیم ٥٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/رجب المرجب ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۲۴/۲۴)

سلام کون کون سے مواقع پرنہیں کرنا چاہیے؟

سوال [۱۰۴۹۲]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کن حالات میں سلام نہ کرنا چاہیے؟

المستفتی: محمد ابرار بہرائچی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حسب ذیل مواقع پر سلام نہیں کرنا چاہیے:

(۱) نماز پڑھنے والے کو (۲) تلاوت کرنے والے کو (۳) ذکر کرنے والے کو

(۴) درس حدیث میں مشغول شخص کو (۵) خطبہ دینے والے کو (۶) خطبہ سننے والے کو (۷) فقہ کے تکرار کرنے والے کو (۸) قاضی کو جبکہ فیصلہ کرنے کے لیے بیٹھ جائے (۹) فقہی مباحثہ کر دینے والے کو (۱۰) مؤذن کو اذان دیتے وقت (۱۱) اقامت کہنے والے کو (۱۲) درس دینے والے کو (۱۳) اجنبی جوان لڑکیوں کو (۱۴) شطرنج اور ہر لہو میں مشغول شخص کو (۱۵) بول و براز کرنے والے کو (۱۶) کھانا کھانے والے کو (۱۷) مغنّی کو (۱۸) زندیق کو۔

مذکورہ مقامات کے علاوہ شامی میں اور بھی مواقع ہیں، جہاں سلام کرنا مکروہ ہے۔

سلامک مکروہ علی من ستسمع ومن بعد ما أبدی یسن و یشرع
مصل و تال ذاکر و محدث خطیب و من یصغی إلیهم و یسمع
مکرر فقه جالس لقضائه ومن بحثوا فی الفقه دعهم لینفعوا
مؤذن أیضا أو مقیم مدرس کذا الأجنبیات الفتیات أمنع
ولعاب شطرنج و شبه بخلقهم ومن هو مع أهل له یتمتع
ودع کافرا أیضا و مکشوف عورة ومن هو فی حال التغوط أشنع
ودع آکلا إلا إذا کنت جائعا وتعلم منه أنه لیس یمنع

(الدر المختار، باب ما یفسد الصلاة و ما یکرہ فیها، مطلب: المواضع التی یکرہ فیها السلام زکریا ۲/۳۷۳-۳۷۵، کراچی ۱/۶۱۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷رمحرم الحرام ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۸۹۶۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/۱/۱۴۲۷ھ

ذکر وتلاوت میں مشغول شخص کو سلام کرنا

سوال [۱۰۴۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسجد میں کوئی ذکر میں ہے کوئی نماز میں ہے، ایسی حالت میں بعض لوگ مسجد میں

آتے اور جاتے وقت میں سلام کرتے ہیں، کیا سلام کرنا جائز ہے اور اس کے سلام کا جواب ذکر کرنے والے پر ذکر کو روک کر دینا ضروری ہے؟

(۲) کوئی شخص علاوہ مسجد کے ذکر یا تلاوت یا مطالعہ کتاب دینی میں مصروف ہے ایسے شخص کو سلام کرنا درست ہے؟ سلام کا جواب دینا اس پر ضروری ہے کہ نہیں؟

المستفتی: عبدالعزیز دوکاندار مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: (۱-۲) ان تمام صورتوں میں سلام کرنا بالاتفاق مکروہ ہے، البتہ اس کے جواب دینے میں فقہاء کا اختلاف ہے، بعض عدم وجوب اور بعض وجوب کے قائل ہیں، لیکن زیادہ پسندیدہ یہی ہے کہ ذکر و تلاوت اور مطالعہ سے رک کر جواب دیدیا کریں۔

إذا سلم رجل على القارئ لاينبغي له أن يسلم على القارئ كي لا يشغله ذٰلک عن القراء ة فإن سلم عليه، قال بعضهم: لا يجب رد السلام على القارئ، وقال بعضهم يجب وهو اختيار الفقيه أبي الليث وإن سلم فى حال التلاوة، فالمختار أنه يجب الرد. (قاضيخان، كتاب الحظر والإباحة، فصل فى التسبيح والتسليم، زكريا جديد ۳۰۶/۳، وعلى هامش الهندية ۴۳۲/۳)

وإن سلم فى حال التلاوة فالمختار أنه يجب الرد. (بزازيه، كتاب الكراهة، نوع فى السلام زكريا جديد ۲۰۰/۳، وعلى هامش الهندية ۳۵۵/۶)

إن سلم فى حالة التلاوة المختار أنه يجب الرد ...... وهو اختيار الصدر الشهيد، وهكذا اختيار الفقيه أبى الليث رحمه الله تعالىٰ. (هنديه، الباب السابع فى السلام و تشميت العاطش زكريا قديم ۳۲۵/۵، جديد ۳۷۷/۵، المحيط البرهانى، المجلس العلمى ۲۰/۸، رقم: ۹۵۰۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ر محرم الحرام ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/۴۶۷)

جنبی، وضوکرنے والے کو سلام

سوال [۱۰۴۹۴]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جنبی کو سلام کرنا یا جنبی کا دوسرے کو سلام کرنا درست ہے یا نہیں؟ اسی طرح وضوکرنے والوں کو سلام کرنا یا وضوکنندہ کا دوسروں کو سلام کرنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد یامین بیگوسرائے بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جنبی کو سلام کرنا اور جنبی کا سلام کرنے والے کو جواب دینا، اسی طرح جنبی کادوسرے کو سلام کرنا، دونوں جائز ہیں، صرف تلاوت قرآن جنبی کے لیے نا جائز ہے۔

ورخصوا للجنب والحائض فی التسبیح والتهلیل. (ترمذی مع عرف الشذی ۳۵/۱)

اورسلام بھی دعا ہی ہے، نیز اگر وضوکرنے والا دعا نہ پڑھ رہا ہوتو سلام کرنا درست ہے ورنہ مکروہ ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۲۳۰/۵، جدید ڈابھیل ۷۶/۱۹)

فیکره السلام علی مشتغل بذکر الله تعالیٰ بأی وجه کان. (شامی، مطلب: المواضع التی یکره فیها السلام زکریا ۳۷۳/۲، کراچی ۶۱۶/۱) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ رمحرم الحرام ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۸۱/۲۳)

کھانے کے دوران سلام کرنا

سوال [۱۰۴۹۵]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص کی ملاقات ایک آدمی سے ایسے وقت میں ہورہی ہے کہ وہ کھانا کھارہا ہے تو کیا ایسی صورت میں آنے والا کھانے والے کو سلام کرسکتا ہے اور وہ جواب بھی دے سکتا ہے؟

المستفتی: کمال احمد منڈی چوک مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مذکورہ میں آنے والے شخص کے لیے کھانے والے کوسلام کرنا مکروہ ہے، ایسی حالت میں سلام نہیں کرنا چاہیے، اور کھانا کھانے والے کوسلام کا جواب دینے میں اختیار ہے، اگر چاہے تو سلام کا جواب دیدے، اس پر سلام کا جواب دیناواجب نہیں ہے۔

یکره السلام علی العاجز عن الجواب حقیقة کالمشغول بالأکل أو الاستفراغ . (شامی، مطلب: المواضع التی یکره فیها السلام زکریا ۲/۳۷۵، کراچی ۱/۶۱۷)

مر علی قوم یأکلون إن محتاجا و عرف أنهم یدعوه إلیه سلم و إلا لا . (بزازیه، کتاب الکراهیة، نوع فی السلام جدید ۳/ ۲۰۰، وعلی هامش الهندیة ۶/ ۳۵۵)

وقال الرافعی: ویردون فی الباقی أی علی سبیل التخییر لا الوجوب. (تقریرات رافعی زکریا ۲/ ۸۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ر صفر المظفر ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۱۹۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۲/۲۷ھ

غیر مسلم کونمستے اور نمشکار کہنا

سوال [۱۰۴۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی مسلم کسی غیر مسلم کو رام رام صاحب، سلامت، بندگی، نمستے یا نمشکار کرے تو کیسا ہے؟ یہ جائز ہے یا ناجائز یا مکروہ یا حرام؟ اور اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کوسلام کرے تو اس کا کیا طریقہ ہے؟

المستفتی: ظریف احمد میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسلمان کے لیے غیر مسلم کو مذکورہ الفاظ سے

سلام کرنا جائز نہیں ہے، نیز ان کو ابتدا بالسلام کرنا بھی ممنوع ہے، بلکہ وہ سلام کرے تو مسلمان صرف وعلیک کہہ دے۔

عن أبی هريرةؓ أن رسول الله ﷺ قال: لا تبدأوا اليهود والنصاریٰ بالسلام، فإذا لقيتم أحدهم فی طريق فاضطروه إلی أضيقه. (سنن الترمذی، باب ما جاء فی التسليم علی أهل الذمة، النسخة الهندية ۲/۹۹، دار السلام رقم: ۲۷۰۰، مسند أحمد بن حنبل ۲/۲٦٦ رقم: ۷٦۰٦، مسند البزار مكتبه العلوم والحكم ١٦/٢٢، رقم: ۹۰۵۲، سنن أبي داؤد، النسخة الهندية ۲/۷۰۷، دار السلام رقم: ۵۲۰۵)

عن عائشةؓ قالت: إن رهطا من اليهود دخلوا علی النبی ﷺ فقالوا: السام عليک، فقال النبی ﷺ: عليكم. (سنن الترمذی، باب ما جاء فی التسليم علی أهل الذمة، النسخة الهندية ۲/۹۹، دار السلام رقم: ۲۷۰۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۹۰۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۳/۱۱ھ

غیر مسلموں کے سوال کا جواب کس طرح دیا جائے؟

سوال [۱۰۴۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر غیر مسلم ہمیں آکر اپنے مذہب کے مطابق سلام عرض کرے جیسے (نمشکار، جے رام جی کی) تو اس وقت ہمیں کیا جواب دینا ہوگا؟

المستفتی: منہاج الدین صدیقی دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسلمان ان کے سلام کے جواب میں صرف وعلیک کہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہے۔

عن أنس أن أصحاب النبی ﷺ قالوا للنبی ﷺ: إن أهل الكتاب

يسلمون علينا، فكيف نرد عليهم؟ قال قولوا: وعليكم. (صحيح مسلم، باب النهى عن ابتداء أهل الكتاب بالسلام و كيف يرد عليهم، النسخة الهندية ۲/۲۱۳، بيت الأفكار رقم: ۲۱٦۳، سنن أبى داؤد، باب فى السلام على أهل الذمة، النسخة الهندية ۲/۷۰۷، دار السلام رقم: ۵۲۰۷، مسند البزار، مكتبه العلوم و الحكم ۱۳/ ۴۱۰، رقم: ۷۱۲۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۳٦۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/۴/۱۴۱۴ھ

غیر مسلم سے سلام ومصافحہ کا حکم

سوال [۱۰۴۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ غیر مسلم سے سلام ومصافحہ کرنا کیسا ہے؟ جبکہ وہ مسلمان کا پڑوسی ہو یا کاروباری تعلق ہو؟

المستفتی: عبید اللہ بھاگلپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیر مسلم کو ابتدا بالسلام کرنا اسی طرح ابتدا بالمصافحہ کرنا ممنوع ہے، بلکہ بعض فقہاء نے مکروہ لکھا ہے، اور یہ کراہت کراہت تنزیہی ہوگی، لیکن اگر کوئی مصلحت پیش نظر ہے تو ابتدا بالسلام اور ابتدا بالمصافحہ میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے، مثلاً غیر مسلم پڑوسی کہیں سفر سے آیا ہوا ہے یا کسی تقریب میں شامل ہوا ہے یا دنیوی مصلحت کے پیش نظر دوستانہ اور کاروباری تعلق ہے، تو ایسی صورت میں ابتدا بالسلام اور ابتدا بالمصافحہ میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے، کیونکہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ دعا، سلام نہ ہونے کی وجہ سے غیر مسلم کو تکلیف ہوتی ہے، جو بعد میں چل کر فتنہ کا باعث بن سکتا ہے، اس لیے سد باب کے طور پر ابتدا بالسلام اور ابتدا بالمصافحہ میں کوئی حرج نہیں، لیکن غیر مسلم کو لفظ سلام کے ساتھ السلام علیکم نہیں کہنا چاہیے بلکہ آداب وغیرہ کے الفاظ کے ساتھ ان سے سلام ومصافحہ کرنا چاہیے۔

ولو يسلم المسلم على أهل الذمة لو له حاجة إليه وإلا كره هو

الصحيح كما كره للمسلم مصافحة الذمي، وتحته في الشامية: أي بلا حاجة لما في القنية لا بأس بمصافحة المسلم جاره النصراني إذا رجع بعد الغيبة ويتأذى يترك المصافحة. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره كراچی ٦/٤١٢، زكريا ٩/٥٩٠)

عن أبي عبد الله العسقلاني قال أخبرني من رأى ابن محيريز يصافح نصرانيا في مسجد دمشق. (مصنف ابن أبي شيبة، في مصافحة المشرك، مؤسسة علوم القرآن ١٣/١٨٦، رقم: ٢٦٢٣٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
١٨/ ذیقعدہ ١٤٣٥ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ٤٠/١١٧٢٥)	١٤٣٥/١١/١٨ھ

ریڈیو اور موبائل میں قرأت کرنے والے قاری کے سلام کا جواب

سوال [١٠٤٩٩]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ریڈیو اور موبائل وغیرہ میں نعت اور تلاوت وغیرہ سے پہلے نعت خواں اور قاری سلام کرتے ہیں تو اس سلام کے جواب کا کیا حکم ہے؟ واجب ہے، مستحب ہے، یا کچھ نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ریڈیو اور موبائل وغیرہ میں نعت خواں اور قاری جو سلام کرتے ہیں اس کا جواب دینا نہ واجب ہے، نہ مستحب، ہاں البتہ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ پروگرام براہ راست ٹیلی کاسٹ کیا جارہا ہے تو تقاضۂ احتیاط ہے کہ سلام کا جواب دیا جائے۔ (مستفاد: محمودیہ ڈابھیل ٧/٤٧٢)

إذا سمعها من طير لا تجب هو المختار ...... و إن سمعها من الصدا لا تجب. (فتح القدير، باب سجود التلاوة دار الفكر ٢/١٦، زكريا ٢/١٦، كوئٹه ١/٤٦٨)

لاتجب إذا سمعها من طير هو المختار. (خلاصة الفتاویٰ اشرفی دیوبند ١/١٨٤)

إذا سمعها من الصداء...... لا تجب عليه السجدة. (تاتارخانية زكريا

۲/ ٤٦٢ رقم: ۳۰۰۳)

لاتجب بسماعه من الصدى (تحته فى الشامية) هو ما يجيبك مثل صوتك فى الجبال والصحارى ونحوهما كما فى الصحاح. (شامی، کتاب الصلاۃ، باب سجود التلاوۃ زکریا ۲/ ۵۸۳، کراچی ۲/ ۱۰۸، حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح دار الکتاب دیوبند ۱/ ٤٨٦) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۵ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۵۷۱)

سلام کا جواب دل دل میں دینا

سوال [۱۰۵۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم نے سنا ہے کہ سلام کا جواب دینا واجب ہے، اب سوال یہ ہے کہ سلام کا جواب سلام کرنے والے کو سنانے کا شرعی حکم کیا ہے؟ اپنے بعض بزرگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ صرف ہونٹ ہلاتے ہیں، کیا سلام کا جواب دل دل میں بھی ہوسکتا ہے؟

المستفتی: محمد مشتاق نور پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سلام کا جواب دینے والے پر جواب کا سنانا واجب ہے، البتہ اگر سلام کرنے والا بہرہ ہو تو جواب دینے والے کا ہونٹ ہلا کر جواب دینا کافی ہے، دل دل میں جواب دینے سے واجب کی ادائیگی نہیں ہوگی، اور حضرت تھانویؒ کی رائے یہ ہے کہ جواب دینا واجب ہے اور جواب کا سنانا مستحب ہے۔

وجوابه أى رده فرض كفاية وإسماع رده واجب، بحيث لو لم يسمعه لا يسقط هذا الفرض عن السامع حتى قيل، لو كان المسلم أصم يجب على الراد أن يحرك شفتيه ويريه بحيث لو لم يكن أصم لسمعه.

(شامی، کتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغیره زکریا ۹/۵۹۳، کراچی ۶/۴۱۳، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۲/۱۷۷)

لايسقط فرض جواب السلام إلا بالإسماع كما لايجب إلا بالإسماع ولو كان المسلم أصم ينبغي أن يريه تحريك شفتيه. (هنديه، الباب السابع فى السلام و تشميت العاطس زكريا جديد ۵/۳۷۸، قديم ۵/۳۲۶)

قال العبد الضعيف: وقد رأيت فى بعض كتب شيخ مشائخنا الإمام محمد أشرف على التهانویؒ: أن رد السلام واجب و إسماعه مستحب، فيه سعة لمن يشكل عليه الإسماع، ولكنى لم أجده فى كتب الفقهاء القدامى.

(تكملة فتح الملهم، باب من حق المسلم للمسلم رد السلام اشرفيه ۴/۲۴۵ تحت رقم الحديث: ۵۶۰۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍صفر المظفر ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۸۷۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۲/۲ھ

سوال بر جواب

سوال [۱۰۵۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اس سے قبل بھی ایک سوال سلام کا جواب سنا کر دینے سے متعلق بندہ نے کیا تھا، اس کے جواب میں حضرت والا نے شامی زکریا ۹/۵۹۳ اور ہندیہ ۵/۳۲۶ کے حوالے سے سلام کا جواب سنا کر دینا واجب لکھا ہے، جبکہ تکملہ فتح الملہم ۴/ ۲۴۵ کی عبارت جو اس جواب کے پرچے میں ہے اس سے استحباب کی صراحت ثابت ہوتی ہے۔

تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ سلام کا جواب سنا کر دینے کا شرعی حکم کیسا ہے؟ دوٹوک فیصلہ فرما کر عنداللہ ماجور رہوں۔

المستفتی: محمد مشتاق احمد متعلم دار العلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سلام کا جواب دینا واجب ہے، اورراجح اور مفتی بہ قول کے مطابق قریب سے سلام کرنے والے کو سنا کر جواب دینا بھی واجب ہے، اور یہی بات زیادہ راجح ہے، حضرت تھانویؒ کی جو رائے پہلے سوال کے جواب میں پیش کی گئی تھی، وہ حضرت تھانویؒ کی اپنی رائے ہے، ممکن ہے کہ دور سے سلام کرنے والے کے جواب کے سلسلے میں ہو، اس لیے دور سے سلام کرنے والے کو جواب کی آواز سنانا لازم نہیں ہے، بلکہ جواب کے ساتھ ایسا عمل کافی ہے جس سے سلام کرنے والے کو معلوم ہو جائے کہ جواب دیا ہے، مثلاً زبان سے جواب دینے کے ساتھ ساتھ ہاتھ سے اشارہ کر دیا جائے جس سے سامنے والے کو سمجھ میں آجائے کہ سلام کا جواب دیا ہے، اس لیے کہ کسی کی آواز اونچی ہوتی ہے کسی کی پست، بعض دفعہ پست آواز والے کی آواز معمولی فاصلے کے لوگوں کو سنائی نہیں دیتی۔

عن ابن عمر قال: إذا سلمت فأسمع وإذا رددت فأسمع. (كنز العمال، مكتبه مكة المكرمة ٩/ ٩٤، رقم: ٢٥٧٢٥)

عن ثابت بن عبيد قال: انتهيت إلى ابن عمر وهو جالس ينتظر الصلاة، فسلمت عليه فاستيقظ فقال: أبا ثابت! قال: قلت: نعم، قال: أسلمت؟ قال: قلت: نعم، قال: إذا سلمت فأسمع وإذا ردوا عليك فليسمعوک، ثم قام فصلى، وكان محتبيا قد نام. (مصنف عبد الرزاق، المجلس العلمي، باب الوضوء من النوم، المجلس العلمي ١/ ١٣٠، رقم: ٤٨٦)

وجوابه أي رده فرض كفاية وإسماع رده واجب، بحيث لو لم يسمعه لا يسقط هذا الفرض عن السامع حتى قيل، لو كان المسلم أصم يجب على الراد أن يحرک شفتيه ويريه بحيث لو لم يكن أصم لسمعه. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره زكريا ٩/ ٥٩٣، كراچی ٦/ ٤١٣، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٢/ ١٧٧)

لايسقط فرض جواب السلام إلا بالإسماع كما لايجب إلا بالإسماع ولو كان المسلم أصم ينبغي أن يريه تحريک شفتيه. (هنديه،

الباب السابع فی السلام و تشمیت العاطس زکریا جدید ۳۷۸/۵، قدیم ۳۲۶/۵)

وینبغی للمجیب إذا رد السلام أن یسمع المسلم حتی لو لم یسمعه لایکون جوابا، ولا یخرج عن العهدة. (المحیط البرهانی، المجلس العلمی ۱۸/۸، رقم: ۹۴۹۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۹۴۸/۳۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۰/۳/۱۴۳۱ھ

بغیر واؤ کے سلام کا جواب

سوال [۱۰۵۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی شخص سلام کا جواب بغیر واؤ یعنی علیکم السلام کہے تو یہ صحیح ہے یا نہیں؟ یا بغیر واؤ کے السلام علیکم ہی کہے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: خورشید انور صاحب مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بلا واؤ کے علیک السلام یا السلام علیکم کہنے سے بھی سلام کا جواب ادا ہوجاتا ہے، البتہ واؤ کے ساتھ افضل ہے۔

والأفضل أن یاتی بالواؤ بأن یقول و علیکم السلام ورحمة اللہ وبرکاته. (البحر الرائق، کتاب الکراهیة، فصل فی البیع کوئٹه ۲۰۷/۸، زکریا ۳۸۰/۸)

ویأتی بواو العطف فی قوله و علیکم السلام وإن حذف واو العطف أجزأه وإن قال المبتدی سلام علیکم أو قال: السلام علیکم فللمجیب أن یقول فی الصورتین سلام علیکم وله أن یقول السلام علیکم. (فتاویٰ عالمگیری، الباب السابع فی السلام و تشمیت العاطس زکریا جدید ۳۷۶/۵، قدیم ۳۲۵/۵، الفتاویٰ التاتارخانیة زکریا ۷۷/۱۸، رقم: ۲۸۰۸۶-۲۸۰۸۷، شامی زکریا

۵۹۳/۹، کراچی ۵۱۵/٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍محرم ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/۱٦۱۴)

سلام کا جواب دینا

سوال [۱۰۵۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے اپنے ساتھی کو السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہہ کر سلام کیا، لیکن ساتھی عدم توجہی یا اور کسی وجہ سے بالکل جواب ہی نہیں دیتا ہے، اب زید کو کیا کرنا ہے؟ ایک عالم دین نے اس حالت کو دیکھتے ہوئے فوراً اس سے کہا تھا کہ جب تمہارے ساتھی نے جواب نہیں دیا تو دل دل میں تم کو ہی جواب دینا چاہیے تھا ان کی بات اگر صحیح ہو تو برائے کرم دلیل سے آگاہ کریں؟

المستفتی: علی حسن بن عبد القدوس دیوبند سہارنپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سلام کرنے والے کے جواب میں اگر سامنے والا اپنی بے توجہی اور غفلت کی وجہ سے جواب نہ دے تو اس کا گناہ اس مخاطب پر ہوگا اور سلام کرنے والا اپنی ذمہ داری سے بری الذمہ ہوجائے گا، اور اس کو سلام اور ابتدا بالسلام دونوں کا پورا پورا ثواب ملے گا، اور بعض روایت میں آیا ہے کہ جب سلام کرنے والے کو مخاطب سامنے والا جواب نہیں دیتا ہے تو سلام کرنے والے کو سلام کا جواب فرشتے دیتے ہیں اور جس نے سلام کا جواب نہیں دیا ہے اس پر لعنت کرتے ہیں۔

وروى الأعمش عن عمرو بن مرة عن عبد الله بن الحارث قال إذا سلم الرجل على القوم كان له فضل درجة فإن لم يردوا عليه ردت عليه الملائكة ولعنتهم. (الجامع لأحكام القرآن للقرطبي، دار الكتب العلمية بيروت ۱۹۵/۵، تحت رقم الآية ۸٦ من سورة النساء، دار الكتب العلمية المصرية قاهرة ۳۰۳/۵)

عن عبد الله قال: قال رسول الله ﷺ: إن السلام إسم من أسماء الله

وضعه فی الأرض فأفشوه فيكم، فإن الرجل إذا سلم على القوم فردوا عليه، كان له عليهم فضل درجة؛ لأنه ذكرهم، فإن لم يردوا عليه رد عليه من هو خير منهم و أطيب. (المعجم الكبير للطبراني دار إحياء التراث العربي ۱۸۲/۱۰، رقم: ۱۰۳۹۱، شعب الإيمان، باب فی مقاربة و موادة أه الدين، دار الكتب العلمية بيروت ۴۳۲/۶، رقم: ۸۷۷۹)

عن أبی أمامة قال: قال رسول الله ﷺ: إن أولى الناس بالله تعالىٰ من بدأهم بالسلام. (سنن أبی داؤد، باب فضل من بدأ السلام، النسخة الهندية ۷۰۶/۲، دار السلام رقم ۵۱۹۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۰۲۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/ ۴/ ۱۴۳۱ھ

کیا مصافحہ سلام کا تکملہ وتتمہ ہے؟

سوال [۱۰۵۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعض علماء فرماتے ہیں کہ مصافحہ سلام کا تکملہ وتتمہ ہے، اس لیے جب جب سلام کرے تو مصافحہ کے ذریعہ اس کی تکمیل کرنی چاہیے، اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ نہیں مصافحہ اور معانقہ تو سفر کی سنت ہے یا کم از کم ملاقات قدرے تاخیر سے ہو تب مصافحہ کرے، غرضیکہ ہر سلام کے کے بعد مصافحہ مسنون نہیں ہے، اس سلسلے میں مفتی بہ قول کیا ہے؟ برائے کرم واضح فرمائیں۔

المستفتی: محمد وسیم مظاہر علوم سہارنپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب دو مسلمان باہم ملاقات کریں تو بعد سلام مصافحہ کرنا مسنون ہے اور حضور ﷺ سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ ۵۳/۵، جدید ۱/ ۱۲۴-۱۲۵ ۳۲۱/۲، فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۲/ جدید ڈابھیل ۱۹/ ۱۱۴، کفایت المفتی ۹/ ۴۹۴، جدید زکریا مطول ۱۲/ ۲۳۴)

لیکن یہ کہنا کہ جب جب سلام کیا جائے تو مصافحہ کے ذریعہ اس کی تکمیل کرنی چاہیے

تو احادیث کثیرہ میں جہاں سلام کی تاکید اور فضیلت بیان کی گئی ہے وہاں مصافحہ کا تذکرہ نہیں ہے اور نہ ہی مصافحہ کا تکملۂ سلام ہونا معلوم ہوتا ہے، اور خود حضور ﷺ کے عمل سے بھی ہر مرتبہ سلام پر مصافحہ کرنے کا ثبوت نہیں ملتا ہے، ہاں البتہ نو وارد شخص کے حق میں مصافحہ تکملۂ سلام ہوسکتا ہے، اور جہاں مصافحہ کو تکملۂ سلام کہا گیا ہے وہاں یہی مراد ہوگا۔

عن أبی هريرة عن النبی ﷺ إذا لقی أحدكم أخاه فليسلم عليه فإن حالت بينهما شجرة أو جدار أو حجر ثم لقيه فليسلم عليه أيضا. (سنن أبی داؤد، باب فی الرجل يفارق الرجل ثم يلقاه أيسلم عليه، النسخة الهندية ۲/۷۰۷، دار السلام رقم: ۵۲۰۰)

عن أبی هريرة أن رسول الله ﷺ: قال: حق المسلم على المسلم ست قيل: ماهن يا رسول الله ﷺ ؟ قال: إذا لقيته فسلم عليه. (مسلم شريف، باب من حق المسلم للمسلم رد السلام، النسخة الهندية ۲/۲۱۳، بيت الأفكار رقم: ۲۱۶۲)

عن أبی هريرة أن رجلا دخل المسجد ورسول الله ﷺ جالس فی ناحية المسجد فصلى ثم جاء فسلم عليه فقال له رسول الله وعليك السلام. (صحيح البخاری، باب من رد فقال عليك السلام، النسخة الهندية ۲/۹۲۴، رقم: ۶۰۱۰، ف: ۶۲۵۱)

عن جابر بن سليم قال: أتيت النبی ﷺ فقلت: عليك السلام، فقال: لا تقل: عليك السلام؛ ولكن قل: السلام عليك. (سنن الترمذی، باب ما جاء فی كراهية أن يقول عليك السلام مبتدئا، النسخة الهندية ۲/۱۰۱، دار السلام رقم: ۲۷۲۲)

جاء رجل إلى النبی ﷺ –إلى– فقال: السلام عليكم ورحمة الله وبركاته فرد عليه فجلس فقال ثلاثون. (سنن أبی داؤد، باب كيف السلام، النسخة الهندية ۲/۷۰۶، دار السلام رقم: ۵۱۹۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍شعبان المعظم ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۴۹۸۱)

سلام،مصافحہ ومعانقہ کا مسنون طریقہ

سوال [۱۰۵۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: معانقہ کرتے وقت پہلے معانقہ کریں، پھر سلام اور مصافحہ کریں یا پہلے سلام پھر مصافحہ پھر معانقہ یا صرف معانقہ پر اکتفا بھی درست ہے،شریعت محمدی کی روشنی میں جو بہتر و افضل ہو تحریر فرمادیں۔

المستفتی: عبدالرشید سیڈھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے ملتے وقت سلام کرے پھر مصافحہ کرے اور اگر کسی سے دیرینہ ملاقات ہو یا دور دراز کے سفر سے آئے ہوئے ہو تو معانقہ بھی مشروع ہے اور مصافحہ کے وقت میں بھی سلام کرنا مسنون ہے، اور ساتھ میں مغفرت کے دعائیہ الفاظ کہنا بھی مسنون ہے، اور معانقہ کے وقت بھی سلام کرنا مسنون ہے، لہٰذا سلام کا معانقہ یا مصافحہ کے ساتھ کوئی تقابل نہیں ہے بلکہ معیت ہے۔

عن جابر بن عبد الله قال قال رسول الله ﷺ: السلام قبل الكلام.

(ترمذی، باب ما جاء فی السلام قبل الكلام، النسخة الهندية ۲/ ۹۹، دار السلام رقم: ۲٦۹۹، مسند أبی يعلى الموصلی، دا الكتب العلمية مصريه ۲/ ۲۹۱، رقم: ۲۰۵۵)

عن البراء بن عازب رضی الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: إذا التقى المسلمان فتصافحا و حمدا لله و استغفراه غفر لهما. (أبو داؤد، باب فی المصافحة، النسخة الهندية ۲/ ۷۰۸، دار السلام رقم: ۵۲۱۱، مسند أبی يعلى الموصلی، دار الكتب العلمية بيروت ۲/ ۱٤٦، رقم: ۱٦٦۹، عمل اليوم والليلة لابن السنی مؤسسة علوم القرآن ۱/ ۱۵۹ رقم: ۱۹۳، مسند أحمد بن حنبل ٤/ ۲۹۳، رقم: ۱۸۷۹۵)

عن عون بن أبی جحيفة عن أبيه قال: لما قدم جعفر من هجرة الحبشة، تلقاه النبی ﷺ فعانقه، وقبل ما بين عينيه، وقال: ما أدرى بأيهما

أنا أسر بفتح خیبر، أو بقدوم جعفر. (المعجم الکبیر للطبرانی دار إحیاء التراث العربی ۲/۱۰۸، رقم: ۱٤۷۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۱۰۰۱۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۴/۶ھ

مصافحہ کا صحیح طریقہ

سوال [۱۰۵۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مصافحہ کرنے کا صحیح طریقہ واضح فرمائیں، کیا دونوں ہاتھ سے کرنا چاہیے یا ایک ہاتھ سے نیز مصافحہ کرتے وقت ہاتھ کی ہتھیلی کہاں ہونی چاہیے؟

المستفتی: محمد یونس مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مصافحہ ایک ہاتھ سے بھی کرنا جائز ہے لیکن دونوں ہاتھوں سے کرنا زیادہ افضل اور باعث فضیلت ہے، اس لیے کہ حدیث میں ہے کہ مصافحہ کرنے سے گناہ جھڑتے ہیں تو جب دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کریں گے تو دونوں ہاتھوں سے گناہ جھڑیں گے۔

عن حذیفة رضـ قال: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: إذا لقی المؤمن المؤمن فقبض أحدهما علی ید صاحبه تناثرت الخطایا منهما کما تناثر أوراق الشجر. (شعب الإیمان فصل فی المصافحة، والمعانقة وغیرهما، دار الکتب العلمیة بیروت ٦/٤٧٤ رقم: ٨٩٥٣)

عن أمامة أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: إذا تصافح المسلمان لم تفرق أکفهما حتی یغفر لهما. (المعجم الکبیر للطبرانی، دار إحیاء التراث العلمی ٨/٢٨٠، رقم: ٨٠٧٦، مجمع الزوائد، دار الکتب العلمیة بیروت ٣٧/٨، رقم: ١٢٧٦٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ رجب المرجب ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۵۱۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۷/۲۹ھ

مصافحہ کا سنت طریقہ

سوال [۱۰۵۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مصافحہ دونوں ہاتھ سے کرنا سنت ہے، یا ایک ہاتھ سے بھی مصافحہ کرلیا جائے تو کافی ہے، چونکہ دونوں طرح کی روایتیں احادیث کی کتابوں میں مذکور ہیں، الأخذ بالید کی روایت:

عن ابن مسعودؓ عن النبی ﷺ قال: من تمام التحیة الأخذ بالید.

(ترمذی ۲/ ۱۰۲، انوار نبوت ۳۰۵)

دونوں ہاتھ سے مصافحہ کرنے والی روایت حضرت امام بخاری نے باب باندھا ہے ''**باب الأخذ بالیدین**'' اس کے بعد یہ روایت نقل کی ہے:

عن بن مسعود یقول: علمنی النبی ﷺ التشھد و کفی بین کفیه.

(بخاری شریف ۲/ ۹۲٦)

المستفتی: مبارک حسین قاسمی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دونوں ہاتھ سے مصافحہ کرنا سنت ہے، اگر کوئی ایک ہاتھ سے مصافحہ کرے تو سنت ادا نہ ہوگی، جیسا کہ سائل کی پیش کردہ حدیث بخاری میں بھی ہے کہ دونوں ہاتھ سے مصافحہ کرنا چاہیے، اور جن بعض روایتوں سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنے سے بھی سنت ادا ہو جائے گی اس کا جواب یہ ہے کہ ید بمعنی ہاتھ کے ہے یہ ایسا ہے جیسے کوئی کہے کہ میں نے ہاتھ سے مصافحہ ملایا تو اس سے ایک ہاتھ متعین نہیں ہوتا ہے بلکہ لفظ ید سے ایک ہاتھ بھی اور دونوں ہاتھ بھی مراد لے سکتے ہیں اور مصافحہ چونکہ دونوں ہاتھ سے مسنون ہے اس لیے جب بھی مصافحہ بولا جائے گا تو اس سے مراد دونوں ہاتھ سے مصافحہ ہوگا۔ مزید تفصیل کے لیے غیر مقلدین کے ۵٦/ اعتراضات کے جواب ص: ۴۸ تا ۵۳ کا مطالعہ فرمائیں۔

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص قال: خرج علینا رسول اللہ ﷺ

وفی یده کتابان، فقال: أتدرون ما هذان الکتابان؟ فقلنا لا یا رسول الله! إلا أن تخبرنا، فقال للذی فی یده الیمنی: هذا کتاب من رب العالمین فیه أسماء أهل الجنة و أسماء آبائهم وقبائلهم، ثم أجمل علی آخرهم فلایزاد فیهم ولاینقص منهم أبدا، ثم قال للذی فی شماله: هذا کتاب من رب العالمین فیه أسماء أهل النار و أسماء آبائهم و قبائلهم ثم أجمل علی آخرهم فلا یزاد فیهم ولاینقص منه أبدا. (ترمذی شریف، باب ما جاء أن الله کتب کتابا لأهل الجنة و أهل النار، النسخة الهندیة ۲/۳۶، دار السلام رقم: ۲۱۴۱، المعجم الکبیر للطبرانی دار إحیاء التراث العربی ۱۳/۱٤۱، رقم: ۱۷، مسند أحمد بن حنبل ۲/۱٦۷، رقم: ٦٥٦۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ محرم الحرام ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸٦٥۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰/۱/۱۴۲۶ھ

دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کی حدیث

سوال [۱۰۵۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا کون سی حدیث سے ثابت ہے؟ مجھے ہر حدیث دلیل کے ساتھ چاہیے کہ کون سی حدیث، حدیث کی کس کتاب کس جلد اور کس صفحہ پر ہے؟ برائے مہربانی حسن درجہ کی حدیث نہ دیں، مجھے ساری حدیث صحیح حدیث دیں۔

المستفتی: محمد الیاس کلکتہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کی روایات حدیث کی کتابوں میں متعدد موجود ہیں، چونکہ غیر مقلدین بخاری کا حوالہ مانگتے ہیں، امام بخاریؒ نے باب المصافحۃ اور باب الأخذ بالیدین کا عنوان قائم کر کے اسی کے ذیل میں دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کی روایت نقل

فرمائی ہے، اسی طرح ترمذی شریف، مسند احمد بن حنبل، المعجم الکبیر للطبرانی میں صحیح حدیث شریف موجود ہے، جس میں لفظ ید دونوں ہاتھوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے ملاحظہ فرمایئے:

(ترمذی شریف، باب ما جاء أن الله كتب كتابا لأهل الجنة و أهل النار، النسخة الهندية ٢/٣٦، دار السلام رقم: ٢١٤١، المعجم الكبير للطبرانى دار إحياء التراث العربى ١٣/١٤، رقم: ١٧، مسند أحمد بن حنبل ٢/١٦٧، رقم: ٦٥٦٣)

عن بن مسعود يقول: علمنى النبى ﷺ التشهد و كفى بين كفيه.

(بخارى شريف، باب الأخذ باليدين، النسخة الهندية ٢/٩٢٦، رقم: ٦٠٢٤، ف: ٦٢٦٥)

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/شعبان المعظم ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۷۸۲)

مصافحہ کے بعد سینہ پر ہاتھ رکھنا

سوال [۱۰۵۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مصافحہ کے بعد ہاتھ کو سینے پر رکھنا کیسا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مصافحہ کے بعد ہاتھوں کو سینے پر پھیرنا نہ تو احادیث سے ثابت ہے اور نہ ہی فقہاء میں سے کسی نے اس کو ذکر کیا ہے بلکہ یہ ایک رواج اور بدعت ہے، لہٰذا اس سے اجتناب لازم ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ دار العلوم ۱۷/۲۱۷)

عن عائشة –رضى الله عنها– قال رسول الله ﷺ: من أحدث فى أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد. (بخارى شريف، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود)

إياكم و محدثات الأمور، فإن كل محدثة بدعة و كل بدعة ضلالة.

(مسند أحمد بن حنبل ٤/١٢٦-١٢٧ رقم: ١٧٢٧٥)

عن جابر بن عبد الله قال: كان رسول الله ﷺ يقول في خطبته: -إلى- و شر الأمور محدثاتها، و كل محدثة بدعة، و كل بدعة ضلالة و كل ضلالة في النار. (صحيح ابن خزيمة، المكتب الإسلامی ٢/ ٨٦٥ رقم: ١٧٨٥)

البدعة ما أحدث على خلاف الحق المتلقى عن رسول الله ﷺ من علم أو عمل أو حال بنوع شبهة و استحسان و جعل دينا قويما و صراطا مستقيما. (شامی، باب الإمامة، مطلب: البدعة خمسة أقسام زكريا ٢/ ٢٩٩، كراچی ١/ ٥٦٠- ٥٦١، النهر الفائق، دار الكتب العلمية بيروت ١/ ٢٤٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۱۱۴۷۲/۴۰)

مصافحہ کر کے سینہ پر ہاتھ رکھنا

سوال [۱۰۵۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مصافحہ کر کے سینہ پر ہاتھ رکھنا کیسا ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں بندہ کو جواب سے سرفراز فرمائیں۔

المستفتی: محمد سرور عالم پورنوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مصافحہ بغیر رسم ورواج کے عام حالات میں مستحب ومسنون ہے لیکن ہر شخص سے جب بھی ملاقات کرے، سینہ پر ہاتھ رکھنا حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

عن عائشة -رضي الله عنها- قال رسول الله ﷺ: من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد. (بخاری شریف، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود)

إياكم و محدثات الأمور، فإن كل محدثة بدعة و كل بدعة ضلالة.

(مسند أحمد بن حنبل ٤/ ١٢٦- ١٢٧ رقم: ١٧٢٧٥)

عن جابر بن عبد الله قال: كان رسول الله ﷺ يقول في خطبته: -إلى- و شر الأمور محدثاتها، و كل محدثة بدعة، و كل بدعة ضلالة و كل ضلالة في النار. (صحيح ابن خزيمة، المكتب الإسلامي ٢/٨٦٥ رقم: ١٧٨٥)

البدعة ما أحدث على خلاف الحق المتلقى عن رسول الله ﷺ من علم أو عمل أو حال بنوع شبهة و استحسان و جعل دينا قويما و صراطا مستقيما. (شامي، باب الإمامة، مطلب: البدعة خمسة أقسام زكريا ٢/٢٩٩، كراچی ١/٥٦٠-٥٦١، النهر الفائق، دار الكتب العلمية بيروت ١/٢٤٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍شوال المکرم ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/۴۳/۲۸)

رخصتی مصافحہ کا ثبوت

سوال [۱۰۵۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: رخصتی مصافحہ کا ثبوت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو باحوالہ جواب تحریر فرمائیے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: رخصتی مصافحہ مسنون اور مشروع ہے، حدیث پاک میں حضور ﷺ سے اس کا ثبوت ہے، مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیے:

عن ابن عمرؓ قال: كان رسول الله ﷺ إذا ودع رجلا أخذ بيده فلا يدعها حتى يكون الرجل هو يدع يد النبي ﷺ ويقول: استودع الله دينك و أمانتك و آخر عملك. (ترمذي شريف، باب ما يقول إذا ودع إنسانا، النسخة الهندية ٢/١٨٢، دار السلام رقم: ٣٤٤٢)

عن ابن مسعود عن النبي ﷺ قال: من تمام التحية الأخذ باليد.

(ترمذي، باب ما جاء في المصافحة، النسخة الهندية ٢/١٠٢، دار السلام رقم: ٢٧٣٠)

عن أبی أمامة قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: تمام تحیتکم المصافحة. (مصنف ابن أبی شیبة مؤسسة علوم القرآن ۱۳/۱۸۶، رقم: ۲۶۲۳۸، سنن الترمذی، باب ماجاء فی المصافحة، النسخة الهندیة ۲/۱۰۲، دار السلام رقم: ۲۷۳۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۴۷۳)

عورت مرد کا آپس میں مصافحہ کرنا

سوال [۱۰۵۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مرد اور عورتیں خواہ ذی رحم محرم ہوں یا نہ ہوں، آپس میں مصافحہ کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اسی طرح آپس میں معانقہ کر سکتے ہیں یا نہیں؟ نیز ایک چار پائی پر بیٹھ سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: محمد ریاض الدین گانوڑی بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مرد وعورت اگر ذو رحم محرم ہیں، ماں بیٹا ہے یا باپ بیٹی ہیں، دادی اور پوتا ہیں، دادا اور پوتی اور نواسی ہیں، حقیقی بھائی بہن ہیں تو ایسے ذو رحم محرم کا آپس میں مصافحہ کرنا بلا تردد جائز اور درست ہے اسی طرح فرط محبت اور دیرینہ ملاقات میں معانقہ اور پیشانی اور ماتھے پر بوسہ دینا بھی اسی طرح جائز ہے جس طرح دو مردوں کے درمیان جائز ہوتا ہے، لیکن غیر محرم مرد کا غیر محرم عورت سے مصافحہ کرنا ناجائز ہے، اور معانقہ کرنا حرام ہے، ہاں البتہ اگر ۶۵/۷۰ سال کی بالکل بوڑھی عورت ہے تو اس سے مصافحہ کرنا اور سر پر ہاتھ پھیروانا جائز اور درست ہے، مگر معانقہ اس سے بھی جائز نہیں ہے، اسی طرح بلا ضرورت ایک چار پائی پر بیٹھنا بھی ممنوع ہے، ہاں البتہ خاص ضرورت ہے تو ایک دوسرے کی طرف توجہ کیے بغیر ایک چار پائی پر بیٹھنے کی گنجائش ہے اور ذو رحم محرم کا ایک چار پائی پر بیٹھنا بلا تردد جائز ہے۔

وما حل نظره مما مر من ذكر أو أنثى حل لمسه إذا أمن الشهوة على

نفسه وعليها لأنه عليه السلام كان يقبل رأس فاطمة وقال عليه الصلاة والسلام من قبل رجل أمه فكأنما قبل عتبة الجنة وإن لم يأمن ذٰلك أو شك فلا يحل له النظر والمس إلا من أجنبية فلا يحل مس وجهها وكفها وإن أمن الشهوة لأنه أغلظ ولذا تثبت به حرمة المصاهرة وهذا في الشابة، أما العجوز التي لا تشتهي فلا بأس بمصافحتها ومس يدها إذا أمن. (الدر المختار مع الشامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره كراچی ٦/٣٦٧، زكريا ٩/٥٢٩، المبسوط للسرخسي دار الكتب العلمية بيروت ١٠/١٤٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۹؍رجب المرجب ۱۴۲۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۴۸۱)	۱۴۲۵/۷/۹ھ

عیدین اور دیگر نمازوں کے بعد مصافحہ یا معانقہ

سوال [۱۰۵۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عید کے دن نماز وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد معانقہ کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد ہارون متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز عید یا دیگر نمازوں کے بعد مصافحہ اور معانقہ کے بارے میں غور طلب بات یہ ہے کہ روافض اور شیعوں میں یہ دستور ہے کہ نماز کے سلام پھیرتے ہی فوراً دائیں بائیں کے لوگوں سے مصافحہ کرنے لگتے ہیں اور بعض شیعہ تو اپنی جگہ سے اٹھ کر دائیں بائیں کے کئی کئی لوگوں سے مصافحہ کرتے ہیں، جیسا کہ حرمین شریفین میں آنے والے روافض سے دیکھنے والوں نے دیکھا ہوگا، حضرات فقہاء نے نمازوں کے بعد اسی مصافحہ کو روافض کا شعار اوران کا طریقہ بتلایا ہے، اوراسی کا التزام روافض کا شعار اور طریقہ ہے، حضرات صحابہ سے اس کا ثبوت نہیں ہے، اس لیے یہ مکروہ تحریمی اور بدعت ہے، اس کا

ترک لازم ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱/ ۳۱۱، جدید ڈابھیل ۳/ ۱۴۲، فتاویٰ رحیمیہ قدیم ۳/ ۱۷، جدید زکریا ۱/ ۱۲۲، فتاویٰ رشیدیہ قدیم ص: ۱۴۸، جدید زکریا ص: ۱۲۳)

وتكره المصافحة بعد أداء الصلاة ...... ولأنها من سنن الروافض ثم نقل عن ابن حجر عن الشافعية أنها بدعة مكروهة لا أصل لها في الشرع، وإنه ينبه فاعلها أولا و يعذر ثانيا. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره زكريا ٩/ ٥٤٧، كراچی ٦/ ٣٨١، كوئٹه ٥/ ٢٧٠، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٧/ ٣٦٣)

اور روافض کے اس طریقے سے ہٹ کر سلام و مصافحہ میں کوئی قباحت نہیں، مگر عید کے دن خاص طور پر معانقہ کا التزام بدعت ہے اس معانقہ کا صحابہ اور سلف سے ثبوت نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۵۳۲)

معانقہ کرنے کا سنت طریقہ

سوال [۱۰۵۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: معانقہ کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ معانقہ میں دائیں طرف کا سینہ ملانا چاہیے یا بائیں طرف کا؟ سنت طریقہ کیا ہے؟

المستفتی: شمیم اختر کرناٹک

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہر اچھا کام دائیں طرف سے کرنا مسنون ہے، لہٰذا معانقہ میں بھی دائیں کندھے سے دایاں کندھا ملانا چاہیے۔

عن عائشة رضي قالت: كان النبي صلى الله عليه وسلم: يحب التيمن ما استطاع في شأنه كله في طهوره و ترجله و تنعله. (بخاري شريف، باب التيمن في دخول المسجد

وغیرہ، النسخة الهندية ١/ ٦١، رقم: ٤٢٢، ف: ٤٢٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۳۲۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۶/۵ھ

معانقہ کا سنت طریقہ

سوال [۱۰۵۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: معانقہ کا سنت طریقہ کیا ہے؟

المستفتی: محمد عثمان سرسید نگر کرولہ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: معانقہ کا طریقہ یہ ہے کہ ایک شخص اپنے ہاتھ کو دوسرے کی گردن پر رکھ کر گردن سے گردن اور سینے سے سینہ ملائے اور دوسری طرف سے بھی اسی طرح ہو۔

المعانقة مفاعلة من عانق الرجل إذا جعل يديه على عنقه و ضمه إلى نفسه. (عمدة القارى، باب المعانقة و قول الرجل كيف أصبحت زكريا ١٥/ ٣٧٩، دار إحياء التراث العربى ٢٢/ ٢٥٤، إرشاد السارى، دار الفكر ٩/ ١٥٥، رقم الحديث: ٦٢٦٦)

اور معانقہ حضور ﷺ اور صحابہ کی سنت ہے، جب حضرات صحابہ آپس میں ملاقات کرتے تو ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے اور جب کسی سفر سے واپس آتے تو آنے والے اور مقامی لوگ آپس میں ایک دوسرے سے معانقہ کرتے تھے۔

وروينا عن الشعبى أنه قال: كان أصحاب محمد ﷺ إذا التقوا صافحوا فإذا قدموا من سفر عانق بعضهم بعضا. (شعب الإيمان للبيهقى، فصل فى المصافحة والمعانقة وغيرهما، دار الكتب العلمية بيروت ٦/ ٤٧٥، رقم: ٨٩٥٨)

عن أنس رضى الله عنه قال: كان أصحاب النبى ﷺ إذا تلاقوا تصافحوا وإذا قدموا عن سفر تعانقوا. (المعجم الأوسط للطبرانى، دار الفكر

۱/ ٤١، رقم: ٩٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ر محرم الحرام ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۶۶۴)

معانقہ کب مسنون ہے؟ اور معانقہ کا سنت طریقہ؟

سوال [۱۰۵۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: معانقہ کا شرعی حکم کیا ہے؟ اس سلسلے میں چند سوالات کے جوابات مطلوب ہیں، امید ہے کہ بطیب خاطر ان سوالات کے جوابات احادیث شریف کی روشنی میں مرحمت فرمائیں گے:

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور سلف صالحین رحمہم اللہ کے دور میں معانقہ کس وقت اور کب کیا جاتا تھا؟

(۲) معانقہ کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ دائیں کندھے سے معانقہ کی ابتدا مسنون ہے یا بائیں کندھے سے؟ بہت سے علماء کو دیکھنے میں آیا ہے کہ بائیں کندھے سے معانقہ کرتے ہیں اس طرح کی کوئی بات ملتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبید اللہ بھاگلپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) شریعت میں معانقہ کا ثبوت عام حالات میں نہیں ملتا، البتہ اگر مقامی آدمی ہے اور وہ کہیں سفر سے آرہا ہے اسی طرح کوئی شخص دوسرے علاقے کا رہنے والا ہے جس کے پاس آپ خود تشریف لے جائیں یا وہ آپ کے یہاں تشریف لائیں تو ایسے مواقع پر مصافحہ کا ثبوت ملتا ہے اور یہ معانقہ دیرینہ ملاقات کی وجہ سے فرط محبت اور شوق ملاقات میں ہوتا ہے، یا دو آدمیوں کے درمیان ذاتی رنجش ہے، اس رنجش کو دور کرنے کے لیے دلوں کی صفائی کے واسطے معانقہ کیا جائے تو یہ بھی شرعاً نہ صرف جائز ومشروع بلکہ افضل وبہتر ہے، اس کے علاوہ باقی کسی اور موقعہ پر معانقہ کا ثبوت نہیں، چنانچہ

حدیث پاک کے اندر اس بات کی صراحت ہے کہ جب حضرت جعفر بن أبی طالب رضی اللہ عنہ حبشہ سے تشریف لائے تو حضور ﷺ نے کھڑے ہوکر آپ سے معانقہ فرمایا اور آپ کی پیشانی کو بوسہ دیا، حدیث شریف ملاحظہ ہو:

عن عون بن أبی جحیفة عن أبیه قال: لما قدم جعفر من هجرة الحبشة، تلقاه النبی ﷺ فعانقه، وقبل ما بین عینیه. (المعجم الکبیر للطبرانی دار إحیاء التراث العربی ۲/۱۰۸، رقم: ۱۴۷۰)

عن جابر رضی اللہ عنہ قال: لما قدم جعفر من أرض الحبشة عانقه النبی ﷺ. (مسند أبی یعلی الموصلی، دار الکتب العلمیة ۲/۲۲۷، رقم: ۱۸۷۱)

عن الشعبی أن النبی ﷺ تلقی جعفر بن أبی طالب فالتزمه وقبل ما بین عینیه. (المصنف لابن أبی شیبة مؤسسة علوم القرآن ۱۳/۱۸۸، رقم: ۲۶۲۳-۳۲۸۷۰ - ۳۴۳۷۰- ۳۷۷۹۸)

وفی حدیث طویل: قال جعفر: فخرجنا حتی أتینا المدینة فتلقانی النبی ﷺ فاعتنقنی. (مسند البزار، مکتبة العلوم والحکم ۴/۱۵۹، رقم: ۱۳۲۸)

اسی طرح جب حضرت زید بن حارثہ مدینہ تشریف لائے اور حضور صلی اللہ علیہ سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے تو حضور ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ سے معانقہ کیا اور بوسہ دیا، حدیث شریف ملاحظہ ہو:

عن عائشة رضی الله عنها قالت: قدم زید بن حارثة المدینة ورسول الله ﷺ فی بیتی فأتاه فقرع الباب، فقام إلیه رسول الله ﷺ عریانا یجر ثوبه، والله ما رأیته عریانا قبله ولا بعده، فاعتنقه وقبله. (سنن الترمذی، کتاب الآداب، باب ما جاء فی المانقة والقبلة، النسخة الهندیة ۲/۱۰۲، دار السلام رقم: ۲۷۳۲)

اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہ معمول تھا کہ جب آپس میں ایک دوسرے سے ملاقات کرتے تو مصافحہ کرتے تھے، اور اگر سفر سے واپسی پر ملاقات کرتے تھے تو معانقہ بھی کرتے تھے، حدیث شریف ملاحظہ ہو:

عن أنس رضی اللہ عنہ قال: کان أصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم إذا تلاقوا تصافحوا، وإذا قدموا من سفر تعانقوا. (المعجم الأوسط للطبرانی، دار الفکر ۱/۴۱، رقم: ۹۷، اسناده صحیح، مجمع الزوائد، دار الکتب العلمیة بیروت ۸/۳۹)

عن الشعبی أن أصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کانوا إذا التقوا تصافحوا وإذا قدموا من سفر تعانقوا. (شرح معانی الآثار، کتاب الکراهة، باب المعانقة، دار الکتب العلمیة بیروت ٤/۹۲، رقم: ٦٧٦٦، ومثله فی شعب الإیمان باب فی مقاربة و موادة أهل الدین، فصل فی المصافحة و المعانقة عند الالتقاء ٦/٤٧٥ رقم: ۸۹۵۸، المصنف لابن أبی شیبة، کتاب الآداب، باب فی المصافحة عند السلام من رخص فیها ۱۳/۱۸۵، رقم: ۲٦۲۳٤، السنن الکبریٰ للبیهقی، کتاب النکاح، باب ما جاء فی معانقة الرجل الرجل إذا لم تکن موذیة إلی تحریك شهوة، دار الفکر ۱۰/۲۸۲ رقم: ۱۳۸۷۱)

المعانقة: وضع کل من الرجلین ذقنه علی کتف الآخر و عنقه علی عنقه، و ضمه إلیه بیدیه. (معجم لغة الفقهاء کراچی ۴۳۸)

وقال أبو یوسف: لا بأس بالتقبیل والمعانقة لما روی أنه علیه الصلاة والسلام عانق جعفرا حین قدم من الحبشة و قبله بین عینیه. (شمی، کتاب الحظر والإباحة کراچی ٦/۳۸۰، زکریا ۹/٥٤٦)

(۲) معانقہ ایک اچھا اور کارِثواب عمل ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر اچھے کام کی ابتدا دائیں جانب سے فرماتے تھے اس لیے معانقہ کی ابتدا بھی دائیں کندھے سے کرنا مسنون اور مستحب ہوگا اور بائیں کندھے سے معانقہ کی ابتدا ہم کو کسی کتاب میں نہیں ملی ہے، حدیث پاک کی روشنی میں بائیں کندھے سے معانقہ کی ابتدا کرنا افضلیت اور اولویت کے خلاف معلوم ہوتا ہے اور جن لوگوں نے بائیں کندھے سے معانقہ کرنے کی صورت میں دل سے دل ملنے کی بات کہی ہے اور اسی کو معمول اور راجح قرار دینے کی کوشش کی ہے وہ بلا دلیل ہے اور جو چیز سنت سے ثابت ہو چکی ہو پھر اس کے خلاف دل سے دل کے ملنے کی دلیل پیش کر کے سنت کے خلاف عمل کو معمول بنا کر راجح قرار دینا ہمارے حلق سے نیچے نہیں اترتا، حدیث شریف

ملاحظہ فرمایئے:

عن عائشةؓ قالت: كان النبي ﷺ: يحب التيامن في كل شيئ.
(صحيح ابن حبان، ذكر استحباب التيامن ...... ٥/ ٢٩٨ رقم: ٥٤٦٥)

عن عائشةؓ ......أن رسول الله كان يحب التيامن ما استطاع. (سنن النسائي، كتاب الزينة، باب التيامن في الترجل ٢/ ٢٣٥ رقم: ٥٢٤٢)

عن عائشةؓ قالت: كان النبي ﷺ: يحب التيمن ما استطاع في شأنه كله في طهوره و ترجله و تنعله. (بخاري شريف، باب التيمن في دخول المسجد وغيره، النسخة الهندية ١/ ٦١، رقم: ٤٢٢، ف: ٤٢٦، صحيح مسلم، كتاب الطهارة، باب التيمن في الطهور وغيره، النسخة الهندية ١/ ١٣٢، بيت الأفكار رقم: ٢٦٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ ذیقعدہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۷۲۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/ ۱۱/ ۱۴۳۵ھ

تین مرتبہ معانقہ کی شرعی حیثیت

سوال [۱۰۵۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ معانقہ کس طرح کیا جائے اور اس کی اجازت کب ہوتی ہے اور اس کا طریقہ کیا ہے؟ ہمارے یہاں ۳/ مرتبہ معانقہ کرتے ہیں تو کیا یہ درست ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

المستفتی: مولانا مہدی حسن ۲۴/ پرگنہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: معانقہ دیرینہ ملاقات پر دور دراز سے آنے والے شخص کے ساتھ کرنا مسنون ہے، حضور ﷺ نے زید بن حارثہ اور حضرت جعفر سے دیرینہ ملاقات پر معانقہ فرمایا ہے، اور ان کی پیشانی پر بوسہ دیا ہے، معانقہ صرف ایک مرتبہ کرنا حدیث سے ثابت ہے، دو بار یا تین بار کرنا کسی حدیث میں ہماری نظر سے نہیں گذرا، معانقہ

سے متعلق روایت ملاحظہ فرمائیے:

عن عائشة رضى الله عنها قالت: قدم زيد بن حارثة المدينة ورسول الله ؛ فى بيتى فأتاه فقرع الباب، فقام إليه رسول الله ﷺ عريانا يجر ثوبه، والله ما رأيته عريانا قبله ولا بعده، فاعتنقه وقبله. (سنن الترمذى، كتاب الآداب، باب ما جاء فى المانقة و القبلة، النسخة الهندية ٢/١٠٢، دار السلام رقم: ٢٧٣٢)

عن جعفر بن أبى طالبؓ فى قصة رجوعه من أرض الحبشة: قال: فخرجنا حتى أتينا المدينة فتلقانى النبى ﷺ فاعتنقنى ثم قال: ما أدرى أنا بفتح خيبر، أفرح أم بقدوم جفعر ووافق ذٰلك فتح خيبر رواه فى شرح السنة. (مشكوٰة المصابيح، كتاب الأدب، باب المصافحة والمعانقة ٢/٤٠٢، شرح السنة، دار الكتب العلمية بيروت ١٢/٢٩١، مسند البزار، مكتبه العلوم والحكم ٤/١٥٩، رقم: ١٣٢٨، المعجم الكبير للطبرانى دار إحياء التراث العربى ٢/١٠٨، ١١٠، رقم: ١٤٦٩- ١٤٧٠- ١٤٧٨) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۹۸۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۴/۱۱ھ

خط میں سلام مسنون لکھنا

سوال [۱۰۵۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خط وغیرہ میں سلام مسنون لکھنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: جمیل اختر عثمانی، مظفر نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: لفظ سلام مسنون کے متعلق کوئی جزئیہ نظر سے نہیں گذرا البتہ یہ الفاظ مسنونہ ”السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ“ کا مخفف ہے جو حکم میں مخفف

عنہ کے ہم معنی ہے، اس لیے اس سے سلام کی سنیت ادا ہو جائے گی، جیسا کہ باب طلاق میں اگر بیوی سے ''انت طالق ثلاثا للسنة'' کہہ دیا جائے تو تینوں فی الحال واقع نہیں ہوتی ہیں بلکہ تین طہر میں تین طلاقیں واقع ہوتی ہیں۔ (ہدایہ جیسور ۲/ ۳۵)

اسی وجہ سے حضرات اکابر کا عمل سلام مسنون لکھنے میں کثرت سے پایا جاتا ہے جو مکاتب رشیدیہ، مکتوبات شیخ، حکایت تصوف وغیرہ میں کثرت سے موجو ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ شعبان المعظم ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۱۹۱۰)

فون پر سلام وجواب کے سلسلے میں تفصیلی مسائل

سوال [۱۰۵۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فون پر عورت کو نامحرم لوگ سلام کرتے ہیں، کیا ان کے سلام کا جواب دے سکتی ہے یا نہیں؟ اس کا کیا مسئلہ ہے؟

المستفتی: مشتاق احمد لالباغ لکھنؤ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اسلام میں آپس میں سلام کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ جانبین سے سلام کے ساتھ ملاقات اور گفتگو کی ابتدا ہو اور ٹیلی فون پر گفتگو بھی ملاقات اور آمنے سامنے گفتگو کے درجہ میں ہے، اس لیے ٹیلی فون اٹھاتے وقت سب سے پہلے سلام ہونا چاہیے، جانبین سے سلام کے بعد آگے کی گفتگو شروع کرنا مسنون ہے، لہٰذا ٹیلیفون اٹھاتے وقت بجائے ہیلو کہنے کے السلام علیکم کہنا مسنون ہوگا اور ہیلو کہنا خلاف سنت ہوگا۔

عن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ: قال: حق المسلم على المسلم ست قيل: ماهن؟ يا رسول الله ﷺ! قال: إذا لقيته فسلم عليه وإذا دعاک فأجبه الخ. (مسلم شريف، باب من حق المسلم للمسلم رد السلام، النسخة الهندية ۲/ ۲۱۳، بيت الأفكار رقم: ۲۱۶۲)

اب سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر ٹیلی فون میں عورت سے گفتگو ہو رہی ہے تو اس کی آٹھ شکلیں ہیں:

(۱) جس عورت سے گفتگو ہو رہی ہے وہ عمر رسیدہ ہے اور اس کا عمر رسیدہ ہونا معلوم ہے تو با قاعدہ سلام اور دعا کے ساتھ اس سے گفتگو کرنے کی اجازت ہے چاہے عورت کی طرف سے ٹیلیفون آئے یا آپ نے عورت کو فون کیا ہو، دونوں طرح سے گنجائش ہے، اور گفتگو ختم ہونے پر ٹیلیفون رکھتے وقت بھی جانبین کا سلام کرنا مسنون ہوگا۔

(۲) عورت جوان اور مشتہاۃ ہے اور عورت نے ٹیلی فون کیا ہے، ظاہر بات ہے کہ جب ٹیلی فون میں گھنٹی آتی ہے کس کا ٹیلیفون ہے معلوم نہیں، تو آپ کا فریضہ السلام علیکم کہنا ہے پس اگر آپ نے بجائے ہیلو کے السلام علیکم کہا ہے تو اس سلام پر آپ کو ثواب ملے گا اس لیے کہ اجنبی جوان عورت کا ٹیلیفون ہے آپ کو اس کا علم نہیں ہے، اگر چہ اس کے ساتھ گفتگو کرنا ضروری نہیں ہے، پھر بھی سلام کی وجہ سے آپ کے اوپر کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ سلام کا ثواب ملے گا، لیکن جب تعارف کے بعد معلوم ہو جائے کہ اجنبی جوان مشتہاۃ عورت کا ٹیلی فون ہے تو جلدی سے ٹیلیفون رکھ دینے کی کوشش کی جائے، اور فون رکھتے وقت نفرت کے انداز سے سلام کر کے فون رکھ دیا جائے، یا بغیر سلام فوراً رکھ دیا جائے۔

(۳) اجنبی جوان عورت کا ٹیلی فون ہے، کسی شرعی مسئلہ سے متعلق یہ ٹیلیفون ہے یا نہایت ضروری اور اہم گفتگو کا انتظار پہلے سے ہے تو یہاں بھی سلام دعاء کے ساتھ گفتگو جائز ہے اور سلام کا انداز تعلق والا نہ ہونا چاہیے، یہ ایسا ہے جیسا کہ قاضی کی عدالت میں ضرورت کی وجہ سے جوان عورت کا شہادت دینا، اور اس سے گفتگو کرنا جائز ہے۔

(۴) عورت خاندان اور کنبہ سے متعلق ہے اور جان پہچان ہے مگر محرم نہیں ہے، غیر محرم ہے اور ٹیلیفون پر نفرت کا انداز اختیار کرنے میں خاندان میں اختلاف کا اندیشہ ہے تو یہاں بھی سلام کے ساتھ ٹیلیفون میں بقدر ضرورت گفتگو کی اجازت ہے، زیادہ گفتگو جائز نہیں ہے، اور جلدی سے سلام کے ساتھ ٹیلیفون رکھ دے۔

(۵) وہ عورت ذو رحم محرم ہے اور بہت قریبی رشتہ دار ہے یہاں بھی بلا تکلف ٹیلیفون میں دعا سلام، خیر خیریت معلوم کرنا جائز اور درست ہے۔

(۶) عورت جوان اور مشتہاۃ ہے اور کوئی ضروری گفتگو بھی نہیں ہے اور نہ دینی، شرعی مسئلہ درپیش ہے، محض تعلقات بڑھانے کے لیے ٹیلیفون میں گفتگو کا سلسلہ ہے تو ایسی صورت میں اگر عورت کی طرف سے ٹیلیفون آئے اور آپ بے خبری میں ٹیلیفون اٹھالیں تو السلام علیکم کہنا جائز ہے، لیکن فوراً بغیر سلام کے ٹیلیفون رکھ دینا ضروری ہے، مزید اس سے گفتگو کرنا جائز نہیں ہے۔

(۷) مرد خود کرتا ہے تو اگر مشتہاۃ عورت سے بات کرنے کے لیے کرتا ہے تو دعا و سلام گفتگو سب ناجائز ہے۔

(۸) اگر سخت ضرورت میں ٹیلیفون کرتا ہے تو دعا سلام جائز ہے۔

ان آٹھ شکلوں میں احتیاط لازم ہے، (۶) میں بے خبری میں سلام ہوا تو بعد میں معلوم ہونے پر گفتگو کرنا ہرگز جائز نہیں اور (۷) میں بالقصد گفتگو کرنے کے لیے ٹیلیفون کریں تو سلام کرنا، گفتگو کرنا قطعاً جائز نہیں ہے، بقیہ چھ شکلوں میں ٹیلی فون پر سلام کرنے کی گنجائش ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍صفر المظفر ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۹۳۳/۳۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۲/۱۹ھ

ٹیلیفون پر ہیلو کے بجائے السلام علیکم کہنے سے متعلق مفصل فتویٰ

سوال [۱۰۵۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سوال کے جواب میں یہ جملہ ''ٹیلیفون اٹھاتے وقت بجائے ہیلو کہنے کے السلام علیکم کہنا مسنون ہوگا اور ہیلو کہنا خلاف سنت ہوگا''، محل نظر ہے جس کی دو وجہیں درج کی جاتی ہیں:

(۱) ٹیلیفون اٹھانے والے کو معلوم نہیں کہ کس نے فون ملایا ہے بہت ممکن ہے کہ

فون ملانے والا کوئی غیر مسلم یا نامحرم ہو جس سے سلام کرنا احتیاط کے خلاف ہے اسے سنت کیسے کہا جا سکتا ہے؟

(حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری کی رائے یہی ہے)

(۲) احادیث طیبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ اور حضرات صحابہؓ دروازہ پر دستک دینے والے کو سلام نہیں کرتے تھے بلکہ پہلے اس کا تعارف حاصل کرتے تھے پھر سلام و جواب اور گفتگو کا سلسلہ شروع فرماتے تھے، اس سلسلے کی احادیث بخاری و مسلم اور مسند احمد بن حنبل وغیرہ میں موجود ہیں، نمونہ کے طور پر ایک حدیث پیش خدمت ہے:

عن جابر رضی الله عنه أنه ذهب إلى النبی ﷺ فی دین أبیه فدققت الباب فقال من هذا؟ فقلت أنا، قال: أنا أنا كأنه كرهه. (أبو داؤد، باب الرجل یستأذن بالدق، النسخة الهندیة ۲/۷۰۵، دار السلام رقم: ۵۱۸۷)

ظاہر ہے کہ فون ملانے والا دستک دینے والے کے درجہ میں ہے اور فون اٹھانے والا اس شخص کے درجہ میں ہے جس کے یہاں دستک دی گئی ہے، لہٰذا حدیث پاک کے بموجب فون اٹھانے والے کے لیے سنت یہ ہونا چاہیے کہ پہلے تعارف حاصل کرلے نہ کہ سلام؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ٹیلیفون اٹھاتے وقت ''ہیلو'' کے بجائے ''السلام علیکم'' کہنا مسنون ہے، سائل نے اس مسئلہ کو محل نظر کہا ہے اور عدم مسنونیت پر دو وجہیں بیان کی ہیں:

وجہ (۱): یہ بیان فرمائی کہ معلوم نہیں کس نے فون ملایا ہے؟ ممکن ہے کہ فون ملانے والا غیر مسلم یا نامحرم ہو اسے سنت کیسے کہا جا سکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ سلام شعائر اسلام میں سے ایک اہم ترین شعار ہے اس کو عام کرنے اور اس کو رواج دینے کے بارے میں اس قدر کثرت کے ساتھ حضرت سید الکونین علیہ الصلاۃ والسلام کا ارشاد وارد ہوا ہے، کہ دوسرے اور کسی حکم کے بارے میں اس کثرت کے ساتھ ارشاد رسول بہت کم وارد ہوا ہے، اسی وجہ سے آقائے نامدار علیہ السلام نے یہ حکم فرمایا ہے کہ جس کو تم پہچانتے ہو اسے بھی سلام کرو

اور جس کو تم نہیں پہچانتے ہو اسے بھی سلام کرو، لہٰذا اگر بے خبری میں غیر مسلم یا نامحرم عورت کو ناآشنائی اور انجانے میں سلام کیا جائے تو کوئی گناہ نہیں اور نہ ہی کوئی مضائقہ اور حرج ہے، اور بے خبری میں سلام کرنے والے کو بہرحال اپنے سلام کا ثواب ملے گا، اس لیے کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اہم ترین سنت بھی ہے اور آپ کا حکم بھی ہے، اس نے سلام کے ذریعہ سے آقا کی سنت کو عام کیا ہے، حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

عن عبد الله بن عمرو أن رجلا سأل النبی صلی اللہ علیہ وسلم أی الإسلام خیر قال: تطعم الطعام و تقرأ السلام علی من عرفت ومن لم تعرف. (بخاری شریف، باب إطعام الطعام من الاسلام، النسخة الهندية ۱/۶، رقم: ۱۲، ۲/۹۲۱ رقم: ۵۹۹۵، ف: ۶۲۳۶)

اس حدیث شریف سے مسلمان سمجھ کر ہر کسی انسان کو سلام کرنے کا جواز ثابت ہے، اور کسی غیر مسلم انسان کو بے خبری اور لاعلمی میں مسلمان سمجھ کر سلام کرنا احتیاط کے خلاف نہیں ہے، اور سلام کرنے والے کو اپنے سلام کا ثواب بھی مل جائے گا، اور سنت سمجھ کر سلام کرنے کی وجہ سے سنت کا حق بھی ادا ہو جائے گا اور آقا نے فرمایا کہ ایسا آدمی مسلمانوں میں سب سے بہتر اور افضل ترین مسلمان ہے جو ہر شخص کو سلام کرتا ہے اور بعد میں جب غیر مسلم ہونا معلوم ہو جائے تو ٹیلیفون رکھتے وقت رخصتی سلام نہ کیا جائے بلکہ بغیر سلام کے ٹیلیفون رکھ دیا جائے، نیز بے خبری اور لاعلمی میں نامحرم عورت کو سلام کرنے میں مضائقہ نہیں اور نہ ہی احتیاط کے خلاف ہے، بلکہ ٹیلیفون اٹھاتے وقت ابتدا بالسلام کرنے والے کو ادائے سنت کا ثواب بہرحال مل جائے گا، نیز اگر فتنہ اور ہیجان کا خطرہ نہ ہو تو غیر محرم عورتوں کو بالقصد سلام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، اور بے خبری اور لاعلمی میں نامحرم کو سلام کرنے میں کوئی ہیجان اور فتنہ نہیں ہے، چنانچہ حضرت سید الکونین علیہ السلام نے بالقصد غیر محرم عورتوں کو سلام فرمایا ہے، اس لیے کہ وہاں ہیجان اور فتنہ کا شبہ نہیں تھا، حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

عن أسماء بنت یزید مر علینا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی نسوة فسلم علینا. (سنن أبی داؤد، باب السلام علی النساء، النسخة الهندية ۲/۷۰۷، دار السلام رقم: ۵۲۰۴)

ان روایات سے یہ بات صاف واضح ہوجاتی ہے کہ ٹیلیفون اٹھاتے وقت سلام کرنا مسنون ہوگا اور جس نے ٹیلیفون ملایا ہے اس کا غیر مسلم یا نامحرم ہونا سنت طریقہ سے گفتگو شروع کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا، اس لیے کہ غیر مسلم اور نامحرم کو جو سلام کیا گیا ہے وہ غیر مسلم کے غیر مسلم ہونے کی وجہ سے اور نامحرم کے نامحرم ہونے کی وجہ سے نہیں کیا گیا ہے بلکہ ناآشنائی اور بے خبری میں کیا گیا ہے، اور ناآشنا آدمی کو سلام کرنا بھی مسنون ہے، چاہے بعد میں اس کا غیر مسلم ہونا ثابت ہوجائے، اسی طرح نامحرم ہونا ثابت ہوجائے جیسا کہ بخاری کی مذکورہ حدیث شریف سے صاف واضح ہے، شاید اس تفصیل سے سائل کا شبہ دور ہوجائے۔

اور حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری دامت برکاتہ کی جو رائے پیش کی گئی ہے اس میں یہ ممکن ہے کہ حضرت والا کا ذہن اس طرف نہ گیا ہو۔

دوسری وجہ: سائل نے یہ پیش کی ہے کہ حضورﷺ اور صحابہ کرامؓ دروازہ پر دستک دینے والے کو سلام نہیں کرتے تھے، بلکہ پہلے اس کا تعارف حاصل کرتے تھے، پھر سلام و جواب اور گفتگو کا سلسلہ شروع فرماتے تھے اور مزید سائل نے یہ تحریر فرمایا کہ بخاری و مسلم اور مسند امام احمد بن حنبل میں احادیث شریفہ موجود ہیں، سائل کی اس تحریر کو اہمیت دے کر ذخیرۂ احادیث کی حتی الوسعت چھان بین کی گئی مگر تلاش بسیار کے باوجود ایسی کوئی حدیث شریف دستیاب نہیں ہوسکی جس میں اس کی صراحت موجود ہو کہ حضورﷺ اور صحابہ کرام کا یہ معمول رہا ہو کہ پہلے تعارف حاصل کرتے تھے پھر سلام و جواب، پھر گفتگو کا سلسلہ شروع فرماتے تھے، بخاری و مسلم اور مسند امام احمد بن حنبل وغیرہ کی چھان بین کے ساتھ صحاح اور غیر صحاح دوسری کتابوں کی بھی چھان بین کی جاچکی ہے، مگر کہیں بھی ایسی کوئی روایت نہیں مل سکی جس میں سائل کی تحریر کے مطابق پہلے تعارف حاصل کیا جائے پھر سلام و جواب اور گفتگو کا سلسلہ شروع ہو، بلکہ ذخیرہ حدیث میں اس کے خلاف پہلے سلام و جواب اس کے بعد گفتگو اور تعارف اور موانست سے متعلق بے شمار احادیث شریفہ موجود ہیں، اگر اس موضوع پر حدیثیں جمع کی جائیں تو مستقل ایک کتاب بن جائے گی، سائل نے حضرت جابرؓ کی جو حدیث پیش کی

ہے اس کے بارے میں بعد میں عرض کریں گے، اس سے پہلے نمونہ کے طور پر بارہ احادیث شریفہ اس بات کے ثبوت میں پیش کی جارہی ہیں جن میں سے ہر ایک سے یہ بات صراحت اور وضاحت کے ساتھ ثابت ہو جاتی ہے کہ گفتگو اور تعارف سے پہلے سلام کا حکم ہے اس کے بعد گفتگو کا سلسلہ شروع کرنا مسنون ہے۔

حدیث نمبر ا:

عن عمرو بن عبد الله بن صفوان، أخبره أن كلدة بن حنبل، أخبره أن صفوان بن أمية بعثه بلبن ولبأ و ضغابيس إلى النبى ﷺ، والنبى ﷺ بأعلى الوادى، قال: فدخلت عليه ولم أسلم ولم استأذن، فقال النبى ﷺ ارجع فقل: السلام عليكم أأدخل؟ وذلك بعد ما أسلم صفوان. (سنن الترمذی، باب ما جاء فی التسلیم قبل الاستئذان، النسخة الهندیة ۲/ ۱۰۰، دار السلام رقم: ۲۷۱۰)

حضرت کلدۃ بن حنبل فرماتے ہیں کہ فتح مکہ کے بعد حضرت صفوان بن امیہ نے اسلام قبول فرمایا اور ابھی آقائے نامدار علیہ السلام کا قیام وادی مکہ کے عوالی میں تھا، حضرت صفوان بن امیہ نے کلدہ بن حنبل کے ہاتھ آقائے نامدار علیہ الصلاۃ والسلام کی خدمت بارگاہ میں دودھ اور کھیس اور چھوٹے چھوٹے کھیرے وغیرہ بطور تحفہ روانہ فرمائے، حضرت فرماتے ہیں کہ میں بغیر اجازت اور بغیر سلام کے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پہنچ گیا، آپ نے مجھ سے فرمایا واپس لوٹ جاؤ پہلے یہ کہو "**السلام عليكم أأدخل**" اس حدیث شریف میں صاف واضح ہے کہ اجازتِ دخول سے پہلے سلام کا حکم کیا گیا ہے، اس کے بعد داخل ہونے کی اجازت حاصل کرنے کا حکم ہے، اور بغیر سلام کے آنے کی وجہ سے آقا نے ان کو واپس فرما دیا۔

حدیث ۲: حضرت جابرؓ سے حضرت سید الکونین علیہ الصلاۃ والسلام کا ارشاد صراحت کے ساتھ مروی ہے کہ سلام سے پہلے کسی قسم کا کلام اور گفتگو نہ کی جائے بلکہ پہلے سلام اس کے بعد کلام کی اجازت ہے، حدیث شریف ملاحظہ ہو:

عن جابر بن عبد الله قال قال رسول الله ﷺ: السلام قبل الكلام.

(ترمذی، باب ما جاء فی السلام قبل الکلام، النسخة الهندیة ۲/ ۹۹، دار السلام رقم:

٢٦٩٩، مسند أبی یعلی الموصلی، دا الکتب العلمیة مصریه ٢/٢٩١، رقم: ٢٠٥٥)

حدیث نمبر۳: حضرت ابوامامہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ جب دو آدمی آپس میں ملاقات کریں تو اللہ کے نزدیک دونوں میں سب سے افضل اور بہتر کون ہوگا تو آقائے نامدار نے فرمایا وہی بہتر ہوگا جو سلام میں ابتدا کرے گا۔

عن أبی أمامة قال: قیل: یا رسول الله! الرجلان یلتقیان أیهما یبدأ بالسلام فقال أولاهما بالله. (ترمذی، باب ما جاء فی فضل الذی یبدأ بالسلام، النسخة الهندیة ٢/٩٩، دار السلام رقم: ٢٦٩٤)

حدیث نمبر۴: حضرت ابوامامہ کی روایت ابو داؤد شریف میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ موجود ہے کہ لوگوں میں اللہ کے نزدیک سب سے بہتر وہ شخص ہے جو سلام سے ابتداء کرتا ہے حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

عن أبی أمامة قال: قال رسول الله ﷺ: إن أولیٰ الناس بالله تعالیٰ من بدأهم بالسلام. (ابو داؤد، باب فضل من بدأ السلام، النسخة الهندیة ٢/٧٠٦، دار السلام رقم: ٥١٩٧)

حدیث نمبر۵: حضرت ابوہریرہؓ سے اسی طرح کی حدیث شریف ابوداؤد میں موجود ہے کہ تم میں سے کوئی اپنے بھائی سے ملاقات کرے تو پہلے اس کو سلام کرے پھر سلام کے بعد اگر تھوڑی دیر کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو جائے چاہے کسی درخت یا دیوار یا پتھر کی آڑ میں کیوں نہ ہو پھر ملاقات ہو جائے تو دوبارہ سلام کرے، لہٰذا ٹیلیفون میں ایک دفعہ گفتگو ہو جانے کے بعد دو چار منٹ دوبارہ ٹیلیفون میں گفتگو ہو تو پھر سلام سے ابتدا کرنا مسنون ہوگا، غرضیکہ جب بھی ٹیلیفون میں گفتگو شروع ہو تو ہر مرتبہ اولا سلام کرنا مسنون ہوگا، جیسا کہ آمنے سامنے ملاقات کے وقت ہر مرتبہ سلام سے ابتداء کرنا مسنون ہے، حدیث شریف کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

عن أبی هریرة عن النبی ﷺ إذا لقی أحدکم أخاه فلیسلم علیه فإن حالت بینهما شجرة أو جدار أو حجر ثم لقیه فلیسلم علیه أیضا. (سنن أبی داؤد، باب فی الرجل یفارق الرجل ثم یلقاه أیسلم علیه، النسخة الهندیة ٢/٧٠٧، دار السلام رقم: ٥٢٠٠)

حدیث نمبر۶: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے

ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص تمہارے پاس کچھ مانگنے کے لیے آئے اور وہ پہلے سلام کرنے کے بجائے سوال کا سلسلہ شروع کردے تو اس کے سوال اور اس کی مانگ کا جواب بھی نہ دو، اس حدیث شریف میں بھی گفتگو اور تعارف سے پہلے سلام کا تاکیدی حکم ہے، حدیث شریف ملاحظہ فرمایئے:

عن ابن عمر قال: قال رسول الله من بدأ بالسؤال قبل السلام فلا تجيبوه. (المعجم الاوسط، دار الفكر ۱۳۵/۱، رقم: ۴۲۹، عمل اليوم والليلة لابن السنى، مؤسسة علوم القرآن ۱۷۶/۱، رقم: ۲۱۴)

حدیث نمبر ۷: حضرت جبرئیل امین جب آقائے نامدار علیہ الصلاۃ والسلام کی بارگاہ میں حاضر ہوتے تو اولاً سلام کرتے تھے، اور آقائے نامدار علیہ السلام اس کا جواب دیتے تھے پھر اس کے بعد گفتگو کا سلسلہ شروع ہوتا تھا، حدیث شریف ملاحظہ فرمایئے:

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده قال: نزل جبرئيل عليه السلام إلى النبي ﷺ في أحسن صورة لم ينزل في مثلها قط ضاحكا مستبشرا فقال: السلام عليكم يا محمد! قال و عليك السلام يا جبرئيل قال: إن الله بعثني إليك بهدية. (مستدرك، كتاب الدعاء والتكبير قديم ۷۲۹/۱، مكتبه نزار مصطفى الباز جديد ۷۶۰/۲، رقم: ۱۹۹۸)

یہ سات روایتیں ایسی ہیں جن میں سے ہر ایک میں ملاقات کے وقت گفتگو شروع کرنے سے پہلے سلام کا حکم ہے، اسی طرح جس طرح بالمشافہہ ملاقات کے وقت گفتگو سے پہلے سلام کرنا مسنون ہیں، اسی طرح ٹیلیفون میں بھی گفتگو سے پہلے سلام کرنا مسنون ہوگا، اور آج کل کے زمانہ میں ٹیلیفون انسان کے لیے اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ہر وقت کی ایک مستقل زبان بن گئی ہے اور آمنے سامنے کی گفتگو اور ملاقات کا بدل بن گیا ہے، لہٰذا آمنے سامنے ملاقات اور دعا وسلام کا جو مسنون طریقہ ہے وہ ٹیلیفون میں بھی مسنون ہوگا۔

حدیث نمبر ۸: حضرت ابوموسیٰ اشعری حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضری کے لیے تشریف لے گئے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کے طریقہ کے مطابق اولاً سلام فرمایا اس کے بعد اپنا تعارف کرایا چنانچہ فرمایا ''السلام علیکم ہٰذا عبد اللہ بن قیس''، کسی کے گھر میں داخل ہونے

کے لیے اجازت کا یہی مسنون طریقہ ہے کہ سلام کے ساتھ آواز دی جائے، اور پھر اپنے نام وغیرہ کے ذریعہ تعارف کرایا جائے جیسا کہ مسلم شریف میں اس کی صراحت موجود ہے، حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

عن أبی موسی الأشعریؓ قال: جاء أبو موسیٰ إلی عمر بن الخطاب فقال: السلام علیکم هذا عبد الله بن قیس فلم یأذن له فقال: السلام علیکم هذا أبو موسیٰ، السلام علیکم، هذا الأشعری ثم انصرف فقال ردوا عليَّ ردوا عليَّ فجاء فقال یا أبا موسیٰ ما ردک؟ کنا فی شغل قال سمعت رسول الله ﷺ یقول: الاستئذان ثلاث فإن أذن لک وإلا فارجع قال لتأتینی علی هذا ببینة وإلا فعلت وفعلت فذهب أبو موسیٰ قال عمر إن وجد بینة تجدوه عند المنبر عشیة و إن لم یجد بینة فلم تجدوه فلما أن جاء بالعشی وجدوه قال یا أبا موسیٰ ما تقول أقد وجدت؟ قال نعم أبی بن کعب قال: عدل، قال یا أبا الطفیل ما یقول هذا؟ قال سمعت رسول الله ﷺ یقول: ذٰلک یا ابن الخطاب فلا تکونن عذابا علی أصحاب رسول الله ﷺ قال: سبحان الله، إنما سمعت شیئا فأحببت أن أتثبت. (مسلم شریف، باب الاستیذان، النسخة الهندیة ۲/ ۲۱۱، بیت الأفکار رقم: ۲۱۵٤)

حدیث نمبر ۹: حضرت ابوسعید خدری فرماتے ہیں کہ ابوموسیٰ اشعری، حضرت عمر کے پاس حاضری کے لیے تشریف لے گئے، اس میں اجازت کے الفاظ یہ ہیں: "**السلام علیکم أأدخل**" پہلے سلام کیا گیا پھر اجازت مانگی گئی، یہ حدیث شریف ترمذی ۲/ ۹۸ پر موجود ہے، ان روایات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کسی کے گھر میں داخل ہونے کے لیے اجازت طلب کرنے سے پہلے سلام کرنے کا حکم ہے، اور ایسا کہیں نہیں ہے کہ پہلے تعارف کرایا جائے اس کے بعد سلام و جواب کا نمبر آئے، ان تمام روایات کو سمجھ لینے کے بعد دوسری طرف دیکھئے کہ جب کسی کے گھر سے اجازت طلب کی جاتی ہے تو اندر سے جواب دینے والا کون ہوتا ہے؟ مرد ہوگا یا اس کے گھر کی عورت ہوگی، اور تجربہ سے سب کو یہ معلوم ہے کہ اکثر و بیشتر اندر سے

جواب دینے والی عورت ہوتی ہے اور وہ عورت اجازت طلب کرنے والے کی نامحرم ہوتی ہے جبکہ حضرت سید الکونین علیہ الصلاۃ والسلام نے گھر والوں سے اجازت لینے سے پہلے سلام کا حکم فرمایا اور اس میں محرم یا غیر محرم مرد یا عورت کا کوئی امتیاز نہیں ہے، بلکہ اجازت لینے والے کو یہی حکم ہے کہ پہلے سلام کرے پھر اجازت مانگے ،تو ٹیلیفون میں جس طرح نامحرم عورت کے ٹیلیفون کرنے کا شبہ ہوتا ہے اسی طرح گھر کے اندر سے جواب دینے والے کے لیے بھی نامحرم عورت ہونے کا شبہ ہے، لیکن نامحرم عورت کے شبہ ہونے کی وجہ سے سلام کی سنت ادا کرنے میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہے،حدیث شریف کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے:

عن أبی سعید قال: استأذن أبو موسیٰ علی عمر فقال السلام علیکم أأدخل، فقال عمر: واحدة ثم سکت ساعة ثم قال: السلام علیکم أأدخل، فقال عمر ثنتان ثم سکت ساعة فقال: السلام علکم أأدخل، فقال عمر ثلاث ثم رجع فقال عمر للبواب ما صنع قال رجع قال علي به فلما جاءه قال ما هذا الذی صنعت قال السنة، قال: السنة والله لتأتینی علی هذا ببرهان و بینة أو لأفعلن بک قال فأتانا و نحن رفقة من الأنصار فقال: یا معشر الأنصار ألستم أعلم الناس بحدیث رسول الله صلی الله علیه وسلم، ألم یقل رسول الله صلی الله علیه وسلم الاستئذان ثلاث فإن أذن لک وإلا فارجع فجعل القوم یمازحونه قال أبو سعید ثم رفعت رأسی إلیه فقلت ما أصابک فی هذا من العقوبة فأنا شریکک قال: فأتی عمر فأخبره بذلک فقال عمر ما کنت علمت بهذا.

(ترمذی، باب ما جاء في الاستیذان ثلاثة، النسخة الهندیة ۲/۹۸، دار السلام رقم: ۲۶۹۰)

حدیث نمبر ۱۰: المعجم الأوسط میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ اجازت طلب کرنے والے کو اس وقت تک اجازت نہ دی جائے جب تک سلام سے ابتدا نہ کرے،حدیث شریف ملاحظہ ہو:

عن أبی هریرة قال: لایؤذن للمستأذن حتی یبدأ بالسلام. (المعجم الأوسط، دار الفکر ۶/۲۲۹، رقم: ۸۶۰۳)

حدیث نمبر۱۱: حضرت اسامہ بن زید فرماتے ہیں کہ عمرۃ القضاء کے موقع پر حضور ﷺ نے حضرت حمزہ کی بیٹی قبیصہ کو اپنی کفالت میں لینے کے لیے ان کے دروازہ پر تشریف لے جا کر فرمایا ''السلام علیکم أ ثم أبو عمارة؟'' پہلے سلام فرمایا اس کے بعد حضرت حمزہ کی کنیت کے ساتھ فرمایا کہ یہاں ابوعمارہ ہیں؟ مقصد حضرت حمزہ کی بیٹی کو حاصل کرنا تھا، توریہ کے طور پر حضرت حمزہ کا نام لیا تھا، اس لیے کہ حضرت حمزہ احد میں شہید ہو چکے تھے، اس حدیث شریف میں بھی دروازہ پر پہلے سلام کرنا ثابت ہے نہ کہ تعارف کرانا، حدیث شریف ملاحظہ ہو:

عن أسامة بن زید قال: خرج رسول الله ﷺ یرید بنت حمزة قبیصة حتی وقف علی الباب فقال: السلام علیکم أ ثم أبو عمارة قال: فقالت لا.
(المستدرك، کتاب معرفة الصحابة، قدیم ۲۱۶، مکتبه نزار مطصفی الباز جدید ۵/ ۱۸۳۰، ۱۸۳۱، رقم: ٤٨٨٦)

حدیث نمبر۱۲: المعجم الکبیر اور مسند امام احمد بن حنبل میں ایک روایت متعدد مقامات میں مفصل اور مختلف الفاظ کے ساتھ حضور ﷺ کے حضرت سعد بن عبادہؓ کے یہاں تشریف لے جانے سے متعلق ہے، آپ نے تعارف اور موانست سے پہلے مسلسل تین مرتبہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ فرمایا ہے، اندر کا جواب سنائی نہ دینے کی وجہ سے واپس تشریف لے جانے لگے، تو حضرت سعدؓ نے دوڑ کر جا کر آپ کو روک لیا اور فرمایا کہ یا رسول اللہ! میں نے آپ کے سلام کا جواب دے دیا ہے لیکن اس مقصد سے آہستہ جواب دیا تاکہ آپ کی زبان مبارک سے سلام ہمارے گھر پر بار بار ہوتا رہے حدیث شریف ملاحظہ ہو:

عن سعد بن عبادة قال: زارنا رسول الله ﷺ فی منزلنا فقال: السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته قال فرد سعد ردا خفیا ثم قال: السلام علیکم ورحمة الله فرد سعد ردا خفیا ثم قال السلام علیکم ورحمة الله فرد سعد ردا خفیا فرجع رسول الله ﷺ فأتبعه سعد فقال یا رسول الله! إنی کنت أسمع تسلیمک و أرد علیک ردا خفیا لتکثر علینا من السلام. (المعجم الکبیر للطبرانی، دار إحیاء التراث العربی ۱/ ۳۵۳، رقم: ۹۰۲، مسند أحمد بن حنبل ۳/ ٤۲۱، رقم: ۱۵۵۵۵)

ان تمام روایات میں کسی کے گھر اور کسی کی رہائش گاہ پر جا کر گفتگو اور تعارف حاصل کرنے سے پہلے سلام کے ساتھ دستک دینے کا حکم ہے، اس کے بعد گفتگو اور تعارف کا نمبر آتا ہے، یہی طریقۂ مسنونہ ہے کہ پہلے سلام کیا جائے، اس کے بعد تعارف اور موانست اور دیگر گفتگو کی جائے اس لیے ٹیلیفون میں بھی ریسیور اٹھانے کے ساتھ ساتھ ''ہیلو'' کے بجائے السلام علیکم کہنا مسنون ہوگا۔

اب سنئے کہ قرآن کریم میں سورۂ نور آیت :۲۷ میں ''حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا'' جو فرمایا گیا ہے اس سے مراد موانست اور تعارف کے بعد سلام نہیں ہے بلکہ سلام کے بعد موانست اور تعارف ہے، اس آیت کریمہ میں سلام اور موانست میں ترتیب کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے اور ایسا قرآن کریم میں بکثرت واقع ہے جیسا کہ سورۂ نساء آیت :۱۲ میں ''من بعد وصية يوصين بها أو دين'' میں وصیت مقدم اور دین مؤخر ہے مگر حکم شرعی اس کے برعکس ہے کہ نفاذ وصیت سے پہلے قرضہ ادا کرنا واجب ہے، اور تفسیر عثمانی میں سورۂ نور آیت :۲۷ کے تحت اس قسم کی تفسیر موجود ہے کہ کسی غیر کے گھر میں سلام کے ساتھ آواز دے کر اجازت حاصل کرنی چاہیے، اور حضرت تھانویؒ نے بیان القرآن میں ''تستانسوا'' سے اجازت مراد لی ہے، اور سلام سے سلام مراد لیا ہے، لیکن ترتیب اس کے برعکس مراد لی ہے، اس لیے کہ احادیث شریفہ کا پورا ذخیرہ اول سلام اور بعدہ اجازت کی ہدایت کرتا ہے، بیان القرآن کی عبارت ملاحظہ فرمایئے: ''دوسروں کے گھروں میں جن میں دوسرے لوگ رہتے ہیں خواہ وہ ان کی ملک ہوں یا کسی سے عاریتاً رہنے کو لے لیے ہوں یا کرایہ پر لیے ہوں، داخل مت ہو جب تک اجازت حاصل نہ کرلو اور اجازت لینے سے پہلے ان کے رہنے والوں کو سلام نہ کرلو، یعنی اول باہر سے سلام کر کے پھر ان سے پوچھو کہ کیا ہمیں اندر آنے کی اجازت ہے، اور بغیر اجازت لیے ویسے ہی مت گھس جاؤ'' (معارف القرآن ۶/ ۳۸۵)

اور تفسیر عثمانی کی عبارت ہے کہ ''اور تقیید فرمایا سلام کا آپس کی ملاقات میں کیونکہ اس سے بہتر دعا نہیں جو لوگ اس کو چھوڑ کر اور الفاظ گھڑ لیتے ہیں اللہ کی تجویز سے ان کی تجویز بہتر نہیں ہوسکتی'' (فوائد عثمانی تحت سورۂ نور آیت :۶۱ ص:۴۷۹)

اب سنئے حضرت جابرؓ کی روایت کے بارے میں، حضرت جابر کی روایت ملاحظہ ہو:

عن جابر رضی الله عنه أنه ذهب إلى النبی صلى الله عليه وسلم فی دين أبيه فدققت الباب فقال من هذا؟ فقلت أنا، قال: أنا أنا كأنه كرهه. (أبو داؤد، باب الرجل يستأذن بالدق، النسخة الهندية ۲/ ۷۰۵، دار السلام رقم: ۵۱۸۷)

اس روایت میں شروع سے اخیر تک غور فرمائیے کہ کہیں بھی ایسی بات ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ پہلے تعارف حاصل کرتے تھے، اس کے بعد سلام وجواب اور گفتگو کا سلسلہ شروع فرماتے تھے؟ بلکہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو یہ بات ثابت ہوگی کہ شروع سے اخیر تک حضرت سید الکونین علیہ الصلاۃ والسلام کی طرف سے حضرت جابرؓ کے عمل پر تردید ہے، اور رسول اللہ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جس عمل پر تردید کی جاچکی ہو وہ طریقۂ مسنونہ کیسے ہوسکتا ہے؟ سائل نے حضرت جابرؓ کی اس روایت کو ابوداؤد سے نقل فرمایا ہے اور جہاں ابوداؤد میں یہ روایت مذکور ہے وہیں خود ابوداؤد کے حاشیہ میں اور بذل المجہود میں حضرت جابرؓ پر تردید کی دو وجہ بیان فرمائی ہے، ایک وجہ بیان فرمائی ہے کہ لفظ انا کے ساتھ نام یا کنیت یا لقب کا استعمال کرنا ضروری تھا، اس کے بغیر صرف ''انا، انا'' کہنے پر آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے تردید فرمائی ہے، پھر اس گفتگو کے بعد آپس میں سلام اور اس کے جواب کا کہیں بھی حدیث شریف میں ثبوت نہیں ہے، اور دوسری وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ حضرت جابرؓ نے دستک دینے کے ساتھ ساتھ اجازت بالسلام پر عمل نہیں کیا تھا، اس لیے تردید فرمائی ہے، ملاحظہ فرمائیے۔ (حاشیۂ ابوداؤد ۲/ ۷۰۵، بذل المجہود ہندی ۵/ ۳۲۰، مصری ۲۰/ ۱۲۵، دار البشائر الاسلامیہ ۱۳/ ۵۷۳، تحت رقم الحدیث ۷/ ۵۸)

دوسری وجہ کو قیل سے بیان کر کے کمزور کر دیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت جابرؓ نے بغیر سلام کے دستک نہیں دی تھی، ورنہ خود حضرت جابرؓ کی ماقبل میں روایت نقل ہوچکی ہے، ''**السلام قبل الکلام**'' حضرت جابرؓ کو معلوم ہے کہ کلام سے پہلے سلام لازم ہے، تو بغیر سلام کے حضرت جابرؓ دستک نہیں دے سکتے تھے، اور اس کی دلیل واضح ہے کہ حضرت جابرؓ کے والد حضرت عبد اللہ بن حرامؓ غزوۂ احد میں شہید ہوگئے تھے، ان پر جو قرض تھا اس کی ادائیگی سے متعلق حضور کی خدمت میں تشریف لے گئے اور یہ قصہ ۳ھ کا ہے اور ابتداءً بالسلام کی آیت سورہ نور میں ہے، اور سورہ نور بلا اختلاف قصۂ افک کے موقع پر نازل ہوئی، اور قصہ افک کا

واقعہ بہرحال غزوۂ احد کے بعد کا ہے، ظاہر بات ہے کہ حضرت جابر قرض سے متعلق جنگ احد کے بعد قصہ افک سے قبل آنحضرت ﷺ کی خدمت میں تشریف لے گئے تھے، جس میں ابتدا بالسلام نہیں فرمایا تھا، چنانچہ محدثین نے بھی واضح الفاظ میں یہ لکھا ہے کہ حضرت جابرؓ کا یہ واقعہ استئذان بالسلام کی آیت کے نازل ہونے سے پہلے کا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

قال الداؤدی هذا كان قبل نزول آية الاستئذان. (فتح الباری، باب إذا قال: من ذا؟ فقال: أنا، دار الفكر ۱۱/۳۵، اشرفيه ديوبند ۱۱/۴۲، تحت رقم الحديث ۶۲۵۰، عمدة القاری زكريا ۱۵/۳۶۶، دار احياء التراث العربی ۲۲/۲۴۵)

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ حضرت جابرؓ کی روایت سائل کے مدعا سے متعلق نہیں ہے، اور مذکورہ تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ٹیلیفون اٹھاتے وقت ''ہیلو'' کے بجائے السلام علیکم'' کہنا مسنون ہوگا، اور ٹیلیفون ملانے والا کون ہے، مسلمان ہے یا غیر مسلم ہے، عورت ہے، محرم ہے یا غیر محرم ہے، اس کا معلوم ہونا سلام کی سنیت کے ثبوت کے لیے لازم نہیں ہے۔

ایک شبہ

پھر کوئی یہ سوال کرسکتا ہے کہ ٹیلیفون میں جس کی طرف سے گھنٹی آتی ہے یہ گھنٹی دستک دے کر اجازت طلب کرنے کے درجہ میں ہے تو جس طرح دستک دینے والے پر ابتدا بالسلام کا حکم ہے اسی طرح ٹیلیفون ملانے والے پر بھی ابتداء بالسلام کا حکم ہونا چاہیے؟

شبہ کا ازالہ

تو اس شبہ کا ازالہ یہ ہے کہ جس کی طرف سے ٹیلیفون کی گھنٹی آتی ہے وہ اس وقت تک نفس کلام پر قادر نہیں ہوتا ہے جب تک دوسری جانب سے ٹیلیفون نہ اٹھایا جائے، یا موبائل کا بٹن نہ دبایا جائے، لہٰذا ٹیلیفون میں ابتدا بالکلام کا اختیار درحقیقت ٹیلیفون اٹھانے اور موبائل کا بٹن دبانے والے کو حاصل ہے، اس لیے عام طور پر کلام کی ابتدا ٹیلیفون اٹھانے والے کی طرف سے ہوتی ہے، اسی لیے سلام کی ابتدا بھی ٹیلیفون اٹھانے والے کو کرنی چاہیے، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

کہ ٹیلیفون اٹھانے والا دیر میں گفتگو شروع کرتا ہے اور گفتگو میں ٹیلیفون کرنے والے کی طرف سے پہل ہوجاتی ہے تو ایسی صورت میں ابتدا بالسلام کا حکم بھی پہل کرنے والے پر ہوگا۔

حاصل یہ نکلا کہ کلام کی ابتدا جس کی طرف سے ہوگی پہلے سلام کا ذمہ دار بھی وہی ہوگا، چاہے ٹیلیفون ملانے والا ہو یا ٹیلیفون اٹھانے والا، دونوں صورتوں میں سلام کی ابتدائی ذمہ داری اسی شخص پر ہے جس کی طرف سے کلام کرنے میں پہل ہوگی، اور ابتدا بالسلام کا ثواب بھی اسی کو حاصل ہوگا۔

ایک دوسرا شبہ

ایک شبہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر کہیں پہلے گفتگو اور تعارف ہوجائے اور اس کے بعد سلام وجواب ہو تو کیا یہ خلاف سنت ہے؟

شبہ کا ازالہ

تو اس شبہ کا ازالہ یوں ہے کہ سلام میں دو سنت الگ الگ ہیں:

(۱) ''**السلام قبل الکلام**'' کہ کلام کرنے سے پہلے سلام کرنے کی سنت۔

(۲) نفس سلام کی سنت، تو جو لوگ پہلے گفتگو اور تعارف کے بعد سلام کرتے ہیں ان کو نفس سلام کا ثواب تو مل جائے گا لیکن سنت طریقہ سے کلام سے پہلے سلام کرنے کا ثواب اور ''**أولی الناس باللہ من یبدأ بالسلام**'' کی رو سے ابتدا بالسلام کا ثواب نہیں ملے گا۔

پہلے والے فتویٰ میں یہ عبارت بھی تھی کہ فون اٹھاتے وقت بجائے ہیلو کہنے کے السلام علیکم کہنا مسنون ہوگا، یہاں تک بات بنص حدیث صحیح اور درست ہے، اور اس کے بعد ایک جملہ یہ بھی لکھا گیا تھا (ہیلو کہنا خلاف سنت ہوگا) یہ جملہ زائد ہے، اس کی وجہ سے مسئلہ میں شدت آگئی ہے، اس لیے اس جملہ سے رجوع کرتا ہوں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۷۰۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸؍۶؍۱۴۲۴ھ

(۲) باب الصلة والمقاطعة

قاتل کے اہل خانہ کا مقتول کے ورثاء کے ساتھ صلہ رحمی کرنے کی شکل

سوال [۱۰۵۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید اور بکر دونوں ایک ہی خانوادہ کے افراد ہیں، آج سے بیس سال قبل خاندانی روایات کے تحت ہر ایک کا دوسرے کے یہاں آنا جانا رہتا تھا، اسی دوران زید کے بکر کی اہلیہ سے ناجائز تعلقات کافی بڑھ گئے، جو بکر کے کئی بچوں کی ماں تھی، بکر کو ان کا علم ہونے پر کوئی سخت ردعمل سامنے آئے اور معاشرہ میں رسوائی ہو، اس اندیشہ سے زید جس کے تعلقات بکر سے کافی اچھے تھے، بکر کو کسی نامعلوم مقام پر لے گیا، پہلے اس سے اپنی اہلیہ کے نام کچھ خطوط اور طلاق نامہ لکھوایا اور وہیں پر اسے قتل کردیا، ذی وجاہت اور سرمایا دار ہونے کی وجہ سے قانونی کارروائی رکوا کر نعش ضائع کرادی، مقتول کے اہل خانہ فکرمند ہوئے، اس سے پہلے بذریعہ ڈاک بکر سے لکھوائے ہوئے خطوط آنے لگے اور آخر میں طلاق نامہ آگیا، جس کی وجہ سے ایک مدت تک وہ اسے حیات سمجھتے رہے؛ لیکن ایک مدت کے بعد موت کا یقین کرلیا گیا، قاتل کے اہل خانہ سب اس کرتوت بد سے واقف تھے؛ لیکن معاملہ دبادیا اور زید پر کوئی سماجی یا اخلاقی دباؤ نہیں ڈالا، کچھ وقت کے بعد جب قاتل کے لواحقین میں آپس میں اختلافات ہوئے، تو انہوں نے اس پورے معاملے سے پردہ اٹھادیا، تب سے قاتل ومقتول کے لواحقین میں کبیدگی ہوگئی، سارے مراسم ٹوٹ گئے، بعد میں چل کر کاروبار متحد ہونے کی وجہ سے مقتول کے بعض لواحقین نے زید کی سرمایا داری اور وجاہت سے مرعوب ہوکر سمجھوتہ کرلیا؛ لیکن قریبی رشتہ داروں میں آج بھی رنجش اور غم وغصہ باقی ہے،

زید قاتل اپنے کئے پر نہ تائب ہے، نہ نادم اگر چہ حج کر چکا ہے، ایسی صورت حال میں زید کے والدین اور برادران صلہ رحمی کے جذبہ سے بکر مقتول کے لواحقین سے تعلقات استوار کرنا چاہتے ہیں؛ جبکہ وہ زید پر کوئی دباؤ ڈالنے کے لئے تیار نہیں ہیں، ایسی صورت میں زید اوراس کے معاونین کے لئے دنیوی واخروی عواقب شریعت کی روشنی میں کیا ہوں گے، اسلامی ہدایات کیا ہوں گی؟ اوراس کے اہل خانہ کو صلہ رحمی کے جذبہ کے تحت کیا کرنا چاہئے، زید کے والدین زید کی ذات کو چھوڑ کر مابقیہ افراد خاندان سے مراسم استوار کرانا چاہتے ہیں، کیا یہ درست ہوگا، جو بھی شرعی حل ہو جس سے خاندان متحد ہو سکے،اس سے مطلع فرمائیں زید کے بعض بزرگ چراغ سحری ہیں؛ اس لئے جواب جلد مطلوب ہے۔

المستفتی: محمد نعیم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر قاتل کے ورثاء یہ چاہتے ہیں کہ مقتول کے ورثاء کے ساتھ رشتہ داری اور قرابت داری کا جو پرانا تعلق تھا، اس کو زندہ کریں، تو ان کے لئے ضروری ہے، کہ قاتل کو مقتول کے ورثاء کے سامنے عاجزی وانکساری کے ساتھ اپنی غلطی پر ندامت کا اظہار کرائیں، جس سے مقتول کے ورثاء کے دل نرم ہو جائیں، پھر جانبین میں تعلق کا سلسلہ شروع ہو جائے اور تعلق جوڑنے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ قاتل اپنی غلطی پر نادم نہ ہو اور اپنی جگہ ڈٹا رہے اور بقیہ خاندان کے لوگ تعلق جوڑنے کی کوشش کریں؛ اس لئے پہلے قاتل کو نرم کیا جائے اور پھر تعلقات کا سلسلہ شروع کیا جائے۔

عن عبد الله بن مسعودؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: التائب من الذنب كمن لا ذنب له. (سنن ابن ماجه، باب ذكر التوبة،النسخة الهندية ٢/٣١٣، دار السلام رقم: ٤٢٥٠، المعجم الكبير للطبراني، دار أحياء التراث العربي ١٠/١٥٠، رقم: ١٠٢٨١)

عن أبي هريرةؓ، عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ما نقصت

صدقة من مال، وما زاد الله عبداً بعفوٍ إلا عزا، وما تواضع أحد لله إلا رفعه الله.

(مسلم شريف، باب استحباب العفو والتواضع،النسخة الهندية ۲/۳۲۱، بيت الأفكار رقم:۲۵۸۸، سنن الدارمي، دار المغني ۲/۱۰۴۲، رقم:۱۷۱۸، مسند أحمد بن حنبل۲/۳۸٦، رقم: ۸۹۹٦، صحيح ابن خزيمة المكتب الإسلامي۲/۱۱٦۸، رقم:۲٤۳٦)

إتفق الفقهاء على أن حكم القصاص الوجوب على ولي الأمر إذا رفع إليه من مستحقه، ومباح طلبه من قبل مستحقه إذا استو في شروطه، فله أن يطالب به، وله أن يصالح عليه، وله أن يعفو عنه والعفو أفضل ثم الصلح.

(الموسوعة الفقهية۳۳/ ۲٦۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ / صفر المظفر ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳٦/ ۷۵۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۲/۲۹ھ

معافی طلب کرنے والے کو معاف کردینا چاہئے

سوال [۱۰۵۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کسی سے جانے یا انجانے میں کوئی غلطی ہوجائے اور وہ پھر اس غلطی پر شرمندہ ہو، تو اسے معاف کردینا چاہئے یا نہیں؟ یا اسے پھر بھی گنہگار کی نظر سے دیکھا جائے؟

المستفتی: محمد ناصر الدین، کرولہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر غلطی کرنے والا اپنی غلطی پر شرمندگی وندامت کے ساتھ صاحب معاملہ سے معافی طلب کرتا ہے، تو انسانی اخلاق اور ہمدردی کے پیش نظر اسے معاف کردینا چاہئے، اور اگر وہ اسے معاف نہیں کرتا ہے، تو اسے گنہگار کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے، یہ انسانی شرافت کے خلاف ہے اور معافی طلب کرنے کے باوجود معاف نہ کرنے والا شریعت کی نظر میں مجرم ثابت ہوتا ہے۔

عن عبد الله بن الزبيرؓ، قال: أمر الله نبيه صلى الله عليه وسلم أن يأخذ العفو من أخلاق الناس. (صحيح البخاري، باب خذ العفو وأمر بالعرف، النسخة الهندية ٢/٦٦٩، رقم: ٤٤٥٧، ف:٤٦٤٣)

عن عبد الله بن زبيرؓ في قوله تعالىٰ: خذ العفو قال أمر النبي صلى الله عليه وسلم: أن يأخذ العفو من أخلاق الناس. (أبوداؤ شريف، باب في التجاوز في الأمر، النسخة الهندية ٢/ ٦٦٠، دارالسلام رقم:٤٧٨٧، مسند أحمد البزار، مكتبه العلوم والحكم ٦/ ١٤٠، رقم:٢١٨١، المعجم الكبير للطبراني، دار أحياء التراث العربي١٣/ ١٠٧، رقم: ٢٥٧، المعجم الأوسط، دار الفكر ١/ ٣٣٥، رقم:١٢١٦)

عن عقبة بن عامر قال: لقيت رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال لي: يا عقبة بن عامر! صل من قطعک، وأعط من حرمک واعف عمن ظلمک. (مسند إمام بن حنبل ٤/ ١٥٨، رقم:١٧٨٩، شعب الإيمان للبيهقي، فصل في التجاوز والعفو وترك المكافاة، دار الكتب العلمية بيروت ٦/ ٢٦١، رقم: ٨٠٨١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۶۰۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۲۳/۴/۱۴ھ

غلطی پر نادم ہو کر معافی مانگنے والے سے قطع تعلق کرنا

سوال [۱۰۵۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بدرالدین عرف ببلو ساکن جسپور، جمعہ کی نماز پڑھنے مسجد گیا، اپنے ساتھ اپنے چھ سال کے بھتیجے کو بھی لے گیا، بدرالدین سعودیہ میں کام کرتا ہے، وہاں لوگ اپنے بچوں کو اپنے ساتھ ہی کھڑا کر لیتے ہیں اور نماز پڑھ لیتے ہیں، اسی طرح بدرالدین نے یہاں بھی اپنے بھتیجے کو اپنے ہمراہ بڑوں کی صف میں کھڑا کر لیا، تو ایک صاحب نے کہا آپ

اس بچے کو پیچھے کردیں، اس پر بدرالدین نے کہا کہ ایسا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بہر حال پھر نماز میں مشغول ہوگئے، اور نماز کے بعد امام صاحب سے معاملہ بیان کیا، تو امام صاحب نے ایک کتاب دکھائی، جس میں لکھا تھا کہ اگر بچہ پاگل یا گندہ ہو، تو اسے پیچھے کردیں۔ بہر حال بدرالدین نے کہا کہ ہم یہ مسئلہ نہیں مانتے ہم یہ مسئلہ لکھ کر سعودیہ سے منگوائیں گے اور اگر اس طرح مسئلہ نہ ہوا، تو آپ کا جینا حرام کردیں گے، بدرالدین کے اس طرح بات کرنے پر امام صاحب سے بات چیت میں مار پیٹ کی نوبت آگئی، بیچ بچاؤ کردیا گیا، اور بالآخر معاملہ تھانہ پہونچ گیا، وہاں امام شہر اور دیگر معززین کی موجودگی میں معافی تلافی ہوگئی اور امام صاحب نے معاف کردیا؛ لیکن اہل محلّہ کے درمیان نزاع ختم نہ ہوا، اور دو فریق ہوگئے، ایک فریق نے بدرالدین اور اس کے متعلقین کا حقہ پانی بھی بند کردیا ہے، تو معافی تلافی کے بعد ایسا کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے، کیا بدرالدین امام صاحب سے دوبارہ معافی مانگ لے شریعت کا کیا حکم ہے، بدرالدین کو امام صاحب کی گستاخی کا احساس ہے اور نادم ہوکر ہاتھ جوڑ کر معافی تھانہ میں مانگ چکا ہے؛ لیکن امام صاحب کی طرف کے لوگ مزید انتشار پیدا کررہے ہیں۔ شریعت کی تعلیم ایسے موقع پر کیا ہے؟

المستفتی: اہل محلّہ بھوب سنگھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب شخص مذکور نے اپنی غلطی پر نادم ہوکر معافی مانگ لی ہے، تو ضرور معاف کردینا چاہئے اور معافی کے بعد اس کو سماج میں پہلے کی طرح رکھنا چاہئے۔

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا. [النساء:۱۷]

حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص گناہ اور غلطی کرکے معافی مانگتا ہے، اور توبہ کرتا ہے، تو اس کا حال اللہ کے نزدیک ایسا ہوجاتا ہے جیسے کہ اس نے گناہ اور غلطی کی ہی نہیں۔

عن عبد الله بن مسعودؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: التائب من الذنب كمن لا ذنب له. (سنن ابن ماجه، باب ذكر التوبة، النسخة الهندية ٢/٣١٣، دار السلام رقم: ٤٢٥٠، المعجم الكبير للطبراني، دار أحياء التراث العربي ١٠/١٥٠، رقم: ١٠٢٨١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/ذی قعدہ ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۸۴۵)

والد کی مرضی کے مطابق بیٹے کا رشتہ نہ کرنے کی وجہ سے والد کی اس سے ناراضگی

سوال [۱۰۵۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید ایک عالم شخص ہے، اس کے نکاح کے لئے ایک پیغام آیا، اس کے والد صاحب نے قبول کرنے کا ارادہ کرلیا، مگر زید نے صراحتاً منع کردیا کہ آپ شادی طے نہ کریں میں وہاں نکاح نہیں کروں گا، والد صاحب نے کہا کہ میں شادی وہیں طے کروں گا چاہے تم نکاح کرنا یا نہ کرنا گویا کہ زبردستی طے کرلیا اور اس رشتہ پر والد اور ایک بھائی کے علاوہ گھر کا کوئی فرد اور کوئی رشتہ دار راضی نہ تھے، خیر والد صاحب نے بات پکی کرلی، زید نے بادل ناخواستہ چند دنوں کے بعد کہا، اگر آپ لوگ زبردستی نکاح کرنا ہی چاہتے ہیں، تو میں کرلوں گا؛ لیکن چار مہینے کے بعد زید نے بالمشاہدہ خفیہ طور پر لڑکی اور لڑکی کے گھر اور اس کے گھر والوں کا جائزہ لیا، تو معلوم ہوا کہ اس گھر میں دینداری اور نماز وغیرہ کا کوئی بھی خیال نہیں ہے۔

اب زید نے اپنی عالمانہ اور دینی غیرت کی بناء پر اس نکاح سے دوبارہ انکار کردیا حتی کہ طے شدہ رشتہ اب بالکلیہ ختم ہو چکا ہے، اس میں دراصل انکار کی وجہ دینداری کا لڑکی والوں میں فقدان اور لڑکی کے حالات کا علم ہے، اس انکار کے نتیجہ میں اب تک زید کے والد

زید سے ناراض ہیں، بات چیت بھی نہیں کرتے زید باہر رہتا ہے، برابر تقریباً چار ماہ سے اپنی اس انکار کی غلطی پر معافی نامہ لکھ کر بھیجتا رہا، مگر والد صاحب کوئی جواب نہیں دیتے۔

اب دریافت طلب امور یہ ہیں۔

الف: مذکورہ نوعیت کے رشتہ سے زید کا انکار کرنا درست ہے یا نہیں؟

ب: اس انکار سے والد کی نافرمانی تو نہیں لازم آرہی ہے کہ جس کی بناء پر زید گنہگار ہو۔

ج: اس انکار پر والد کا ناراض ہونا اور بات چیت نہ کرنا شرعاً کیسا ہے؟

د: زید کا ایک نظریہ ہے کہ جہاں بھی رشتہ طے کیا جائے، پہلے لڑکی کے بارے میں تفتیش کرلی جائے کہ پڑھی لکھی ہے یا نہیں اور اس کے حالات کیسے ہیں اور اس کے گھر میں دینی ماحول کیسا ہے، اس کے بعد بات پکی کی جائے، تاکہ بعد میں چھوڑ چھڑاؤ کا کوئی معاملہ پیدا نہ ہو، جس پر دوسرے لوگوں کو ہنسنے کا موقع ملے، زید کا یہ نظریہ عین شریعت کے مطابق ہے یا نہیں؟ باحوالہ تشفی بخش جواب عنایت فرمائیں عین کرام ہوگا۔

المستفتی: عبداللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: الف: سوال میں درج شدہ باتیں صحیح ہوں، تو زید کا مذکورہ نوعیت کے رشتہ سے انکار کرنا شرعاً درست ہے، والد کو زبردستی نہیں کرنی چاہئے۔

ولا تجبر البالغة البكر على النكاح لانقطاع الولاية (در مختار)

وفي الشامية: ولا الحر البالغ. (شامي، كتاب النكاح، باب الولي، زكريا ٤/١٥٩، كراچي ٣/٥٨، فتاوى رحيميه قديم ٨/٣٣٤، جديد زكريا ٨/٢٢٥-٢٢٦، أحسن الفتاوى ٥/٩٣)

ب: چونکہ زید کے والد ایسے گھر میں نکاح کرانا چاہتے ہیں، جہاں دینداری اور نماز وغیرہ کا اہتمام نہیں ہے؛ لہٰذا ایسے نکاح سے زید کا انکار کرنا والد کی نافرمانی نہیں ہے کہ جس کی بناء پر زید گنہگار ہو۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۱/۱۵۷، جدید میرٹھ ۱۷/۱۳۳)

لا طاعة في معصية الله، إنما الطاعة في المعروف. (مسلم شريف، باب وجوب طاعة الأمراء في غير معصية، وتحريمها في المعصية،النسخة الهندية ۲/۱۲۵، بيت الأفكار رقم: ۱۸٤۰، صحيح البخاري، باب ماجاء في إجازة خبر الواحد الصدوق،النسخة الهندية ۲/۱۰۷۷، رقم: ٦۹٦۷، ف:۷۲۵۷)

ج: جب زید متعدد مرتبہ اس انکار کی غلطی پر معافی نامہ لکھ رہا ہے، تو والد کو چاہئے کہ زید کو معاف کرکے ناراضگی ختم کرلیں محض اس انکار کی بنا پر ناراض رہنا اور بات چیت نہ کرنا شرعاً مناسب نہیں ہے۔

د: رشتہ کی تحقیق کے سلسلہ میں زید کا نظریہ درست ہے۔ حدیث شریف میں ہے۔

عن أبي هريرة رضـ، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: تنكح المراة لأربع: لمالها، ولحسبها، ولجمالها، ولدينها، فاظفر بذات الدين تربت يداك. (صحيح البخاري، باب الأكفاء في الدين، النسخة الهندية ۲/۷٦۲، رقم: ٤۸۹۹، ف: ۵۰۹۰، صحيح مسلم، باب استحباب نكاح ذات الدين، النسخة الهندية ۱/٤۷۳، بيت الأفكار رقم: ۱٤٦٦)

وفي حاشية المشكوة: قوله أن لا تفعلوا أي إن لم تزوّجوا من هذه صفته ورغبتم في مجرد الحسب والمال تكن فتنة في الأرض وفساد؛ لأن المال والحسب يوجبان الطغيان والفساد. (مشكوة ۲٦۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸ ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/۶۵۷۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۴/۸ھ

قطع تعلق کرنا

سوال [۱۰۵۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص نے اپنے داماد کی شرکت میں کام شروع کیا تھا، کام میں نقصان ہو گیا

مار پیٹ کی نوبت آگئی اس وقت سے اب تک کئی سال ہوگئے، سسر اپنے داماد اور بیٹی سے رشتہ منقطع کئے ہوئے ہے، سسر اور داماد کا گھر تقریباً دس قدم کے فاصلہ پر ہے، اور سسر قطع تعلق کئے ہوئے ہے، ویسے تو سسر پانچ وقت کا نمازی ہے اور حدیث بھی سنتا ہیے، ایسے شخص کے بارے میں اللہ اور رسول ﷺ کے کیا احکامات ہیں؟

المستفتی: ببن خاں، پیتل نگری، مکان نمبر ۳۸ ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: معمولی سی بات پر رشتہ داری کو منقطع کرنا اور برابر ناراض رہنا شرعاً جائز نہیں ہے، ایک عام مسلمان سے بھی تین دن سے زیادہ بول چال بند کرنے سے منع کیا گیا ہے، تو قریبی رشتہ دار سے بول چال بند کرنا کیسے جائز ہوسکتا ہے؛ لہٰذا سوال میں مذکور شخص پر لازم ہے کہ جلد از جلد اپنی ناراضگی ختم کرے اور داماد اور بیٹی سے رشتہ بحال کرے۔ نیز داماد اور بیٹی پر بھی لازم ہے کہ سسر صاحب کی بڑائی کا خیال رکھتے ہوئے، ان سے معافی کی درخواست کریں اور اپنے عمل سے ان کو راضی کرنے کی کوشش کریں، ورنہ وہ بھی گنہگار ہوں گے۔

عن أبي هريرة رضـ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يحل لمسلم أن يهجر أخاه فوق ثلاث، فمن هجر فوق ثلاث فمات دخل النار.

(سنن أبي داؤد، باب في هجرة الرجل أخاه، النسخة الهندية ٢/ ٦٧٣، دار السلام رقم: ٤٩١٤، مشكوة المصابيح ٢/ ٤٢٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶ ؍شعبان المعظم ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶ ؍۷۸۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۸/۱۷ھ

قطع تعلق کی شکل اختیار کرنا

سوال [۱۰۵۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نسیم اور ببلو دونوں میں دوستی ہے، ببلو نے نسیم کو راستے میں کسی بات پر ناراض

ہوکر سلام کرنے سے منع کیا تھا، کچھ دنوں کے بعد نسیم کی ملاقات ببلو سے ہوئی، تو نسیم نے ببلو سے سلام نہیں کیا، تو ببلو نے نسیم کو سلام کیا اور کہا تم سلام نہیں کرتے ہو، تم مسلمان نہیں ہو اور تم باشرع آدمی ہو، پھر بھی سلام نہیں کرتے ہو اور ببلو اپنے باپ کی شان میں برا بھلا بھی کہتا ہے اور ماں کے ساتھ بدگوئی کرتا ہے، تو بتائیں یہ شخص کیسا ہے؟

المستفتی: نسیم احمد، پیرغیب، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس طرح سے بات طے کرنا کہ کوئی کسی سے سلام نہیں کرے گا اور پھر عمل کرتے ہوئے ملاقات کے وقت ایک دوسرے کو سلام نہ کرنا حضور ﷺ کے فرمان ”أفشوا السلام“ کے منافی ہونے کی وجہ سے شرعاً مذموم ہے، ایسا شخص گناہ کبیرہ کا مرتکب ہے، اسی طرح والدین کو بھی برا بھلا کہنا بھی گناہ کبیرہ ہے، ایسے شخص کو فوراً اپنے عمل سے باز آکر توبہ واستغفار کرنا چاہئے۔

عن أبي هريرةؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لاتدخلون الجنة حتى تؤمنوا، ولاتؤمنوا حتى تحابوا أولا أدلكم على شيئ إذا فعلتموه تحاببتم؟ أفشوا السلام بينكم. (مسلم شريف، باب بيان أنه لا يدخل الجنة إلا المؤمنون......النسخة الهندية ١/٥٤، بيت الأفكار رقم: ٥٤، سنن الترمذي، باب ماجاء في إفشاء السلام، النسخة الهندية ٢/٥٨، دارالسلام رقم: ٢٦٨٨، مشكوة المصابيح٢/٣٩٧)

عن عبد الله بن عمرؓ، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: الكبائر: الإشراك بالله، وعقوق الوالدين، وقتل النفس، واليمين الغموس. (صحيح البخاري، باب اليمين الغموس، النسخة الهندية ٢/٩٨٧، رقم: ٦٤١٩، ف: ٦٦٧٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱/ربیع الاولیٰ ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/۷۰۸۴)

مقاطعہ ختم کرنے کے لئے شرطیں لگانا

سوال [۱۰۵۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید اور بکر میں چند سالوں سے آپسی معاملات کی وجہ سے بول چال یہاں تک کہ کھانا پینا اور زید بکر کے گھر جانے سے اور بکر زید کے گھر جانے سے اپنے اپنے دلوں میں کدورت رکھتے ہیں۔ اب زید چاہتا ہے کہ خوف الٰہی کی بنا پر میل ملاپ ہو جائے اور تمام گذشتہ غلطیوں پر ندامت کرتے ہوئے، بکر کو خبر بھیجی کہ خوف الٰہی کی بنا پر میل ملاپ کرنا چاہتا ہوں، بکر نے اس کا جواب دیا کہ میل ملاپ چند بار ہو چکا ہے؛ لہٰذا اب ملنا جلنا ہے، تو بغیر قرآن شریف پکڑ کر ملاپ نہیں کروں گا، تب معاملات درست ہو سکتے ہیں، ورنہ نہیں اور یہ بھی شرط لگائی کہ جب تک تمام بھائی اور بہن اور بہنوئی شرکت نہیں فرمائیں گے، تب تک میں نہیں مل سکتا؛ کیونکہ یہاں کا رواج ہے اور دونوں بہنوئی میں نا اتفاقی چند مہینوں سے چل رہی ہے اور تمام کا شریک ہونا ناممکن ہے؛ لہٰذا اس صورت میں زید کیا کرے گا اور بکر کے لئے کیا حکم ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب سے نوازیں ممنون ومشکور ہوں گا۔

المستفتی: محمد معصوم، متعلم جامع الہدیٰ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسی صورت میں بکر کو بھی بول چال اور میل ملاپ کے لئے تیار ہو جانا چاہئے اور اگر بکر تیار نہ ہو، تو زید بکر کو سلام کیا کرے اور اپنا دل صاف رکھے انشاء اللہ تعالیٰ عذاب الٰہی سے محفوظ رہے گا، ورنہ گنہگار ہوگا اور جو بول چال کے لئے تیار نہ ہوگا وہی گنہگار رہے گا۔

عن أبي أيوب الأنصاريؓ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا يحل لمسلم أن يهجر أخاه فوق ثلاث ليال، يلتقيان فيعرض هذا ويعرض

هذا، وخيرهما، الذي يبدأ بالسلام. (صحيح مسلم، باب تحريم الهجر فوق ثلاث ليالٍ بلا عذر شرعي، النسخة الهندية ۳۱٦/۲، بيت الأفكار رقم: ۲٥٦۰، صحيح البخاري، باب الهجرة، النسخة الهندية ۸۹۷/۲، رقم: ٥۸٤۰، ف: ٦۰۷۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱۶۸/۲۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹/۴/۱۴۱۳ھ

گناہ کی بنا پر والدہ سے قطع تعلق کرنا

سوال [۱۰۵۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید اپنی والدہ سے گفتگو نہیں کرتا زید کی والدہ رانڈ بیوہ ہے ہر وقت جدید فیشن میں منہمک رہتی ہے اور پردہ کا اہتمام نہیں کرتی ہے، زید شرع کا پابند ہے، یہ بات زید پر بہت ناگوار اور شاق گذرتی ہے کہ اپنی اس والدہ سے گفتگو کرے، اس صورت حال میں زید کو شریعت کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: رئیس احمد، شیر کوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کسی بھی صورت میں والدہ سے گفتگو بند کرنا ہرگز جائز نہیں؛ بلکہ ہر حال میں والدہ کا احترام اور ان کی خدمت اور ان کو خوش رکھنا لازم اور ضروری ہے، والدہ اگر کوئی گناہ کا کام کریں تو ادب واحترام کے ساتھ نرمی سے سمجھاتے رہنا چاہئے اور قبر وآخرت کے عذاب کی باتیں وقتاً فوقتاً سناتے رہنا چاہئے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور فائدہ ہوگا۔

ادْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ. [النحل: ۱۲۵]

فقد ختم الله جل ثنائه ألآية الكريمة بوجوب صحبتهما بالمعروف والإحسان إليهما في الدنيا حتى لو كانا مشركين؛ لأن حقهما على ولدهما عظيم. (روائع البيان ۲/ ۲۳۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ ررجب المرجب ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲ /۴۹۴۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹ /۷ /۱۴۱۷ھ

اسلام کا مذاق اڑانے اور ماڈرن طریقہ کو پسند کرنے والے سے قطع تعلق کرنا

سوال [۱۰۵۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) زید کی خالہ شوہر کی نافرمان رکشہ والے کے دوا لگاتے پاؤں دباتے گھر والوں نے دیکھا جوان کا نوکر تھا، ہر اولاد کے بارے میں محلّہ خاندان میں یہی بات مشہور ہے کہ یہ فلاں شخص کی ہے، اپنے بڑے بھائی کو گھر سے کئی دفعہ نکال چکی ہیں کہ نکل نہیں تو تیری پول کھول دوں گی لڑکیوں سے بیوی جیسے برتاؤ کرتا ہے۔

(۲) زید کا بڑا اماموں پچیس پاروں کا حافظ تھا، مگر بری صحبتوں میں پڑ کر بھول گیا، شراب کے نسے میں بیوی اور بیٹیوں کے فرق کو مٹا بیٹھا سوائے چھوٹی بیٹی کے کہ جب اس نے شکایت کی گھر والوں سے تو اس کو ممبئی بھیج دیا گیا۔ اب تو ان کی نواسیاں جوان ہو رہی ہیں، مگر اسلام کی طرف رجحان نہیں، بیسوں برس سے گھر والے جانتے ہیں ان باتوں کو مگر ماڈرن طریقہ پسند کیا جا رہا ہے۔

تفصیل طلب مسئلہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں سے رشتہ توڑنا اسلام کے خلاف تو نہیں ہے اور اگر یہ لوگ سچے دل سے توبہ کر کے علماء کرام سے وابستہ ہوں، تو ان کی توبہ قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عمر، پوسٹ بکس ٦٦٢٦، دوبئ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر اصلاح کا طریقہ اختیار کیا جائے، تو زیادہ

بہتر ہے؛ اس لئے اگر توبہ کر کے راہ راست پر آنے کی امید ہے، تو ان سے قطع تعلق اختیار نہ کریں اور اللہ تعالیٰ شرک کے علاوہ باقی تمام گناہوں کو توبہ کرنے سے معاف کر دیتا ہے؛ اس لئے یہ لوگ اگر سچی توبہ کر کے باز آجائیں گے، تو انشاء اللہ اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرما دیگا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ . [النساء:۱۱٦]

عن عبد الله بن مسعودؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: التائب من الذنب كمن لا ذنب له. (سنن ابن ماجه، باب ذكر التوبة، النسخة الهندية۲/۳۱۳، دار السلام رقم: ٤٢٥٠، المعجم الكبير للطبراني، دار أحياء التراث العربي ۱۰/۱۵۰، رقم: ۱۰۲۸۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹؍۳۲۲۱)

بیٹے کی زبان درازی پر اس سے اور بیوی سے قطع تعلق کرنا

سوال [۱۰۵۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرا نام محمد عاقل ہے، میں ایک سرکاری نوکری کرتا ہوں، ایک دن غصہ میں میں نے اپنے بڑے لڑکے کو ''لوفر'' کہہ دیا جس پر اس نے مجھ سے زبان درازی کی جس پر اس کی والدہ نے اس سے کچھ نہیں کہا؛ حالانکہ شوہر کے حق واحترام کو ملحوظ رکھنے کی وجہ سے اسے بیٹے کو سرزنش کرنی چاہئے تھی؛ لہٰذا میں نے ماں بیٹے دونوں سے تقریباً ۳؍مہینہ سے قطع تعلق کر رکھا ہے، بیٹے سے زبان درازی کے سبب اور بیوی سے اس کے بیٹے کو سرزنش نہ کرنے کے سبب۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ میرا یہ عمل اور قطع تعلق قرآن وحدیث کی روشنی میں کیسا ہے؟ آیا بیٹے یا بیوی کی غلطی واقعی اس لائق ہے کہ ان سے ترک کلام اور قطع تعلق

کیا جائے، بعض احباب کے کہنے پر مجھے یہ خیال پیدا ہوا؛ حالانکہ میں اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہوں، اگر میرا عمل شریعت کے خلاف ہو، تو مطلع فرمائیں؟

المستفتی: محمد عاقل احمد، علی گڑھ (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بیٹے کے اوپر باپ کی فرماں برداری اور باپ کے سامنے عاجزی اور انکساری اختیار کرنا لازم اور واجب ہے، اس نے باپ کے ساتھ تیز کلامی اور زبان درازی کر کے گناہ عظیم کا ارتکاب کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنی عبادت کے ساتھ ماں باپ کے ساتھ فرماں برداری اور رواداری کا اسی درجہ کا حکم دیا ہے، جس درجہ میں اپنی عبادت کا حکم دیا ہے، اور ماں باپ کے سامنے اُف کہنے سے بھی منع فرمایا ہے اور انتہائی عاجزی وانکساری اور مسکنت سے پیش آنے کا حکم فرمایا ہے۔

سوال نامہ میں ذکر کردہ واقعہ میں بیٹے نے باپ کے ساتھ دو عظیم غلطی کی ہیں۔

(۱) باپ کے ساتھ زبان درازی۔

(۲) ماں اور باپ کے درمیان اختلاف اور دوری پیدا کردی؛ اس لئے بیٹے کے اوپر لازم ہے کہ باپ کے پیر پکڑ کر معافی مانگے اور باپ کو خوش کر کے اپنے گھر لائے اور ماں باپ دونوں کے درمیان جوڑ پیدا کرے۔

وَقَضَى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا اُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ○ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا. [بني اسرائيل: ۲۳-۲٤]

عن عبد الله بن عمرو ؓ، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: رضا الرب في رضا الوالد، وسخط الرب في سخط الوالد. (ترمذي شريف، باب ماجاء من

الفضل في رضا الوالدين، النسخة الهندية ۲/ ۱۲، دارالسلام رقم:۱۸۹۹، مسند البزار، مكتبه العلوم والحكم ۳۷٦/٦، رقم: ۳۳۹٤، مستدرك كتاب البر والصلة قديم ۱٦۸/٤، مكتبة نزار مصطفیٰ الباز ۲۵۸۹/۷، رقم:۷۲٤۹)

سائل نے جو اپنی بیوی سے قطع تعلق کرلیا ہے، یہ مناسب نہیں ہے؛ اس لئے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ عورتوں کی کمزوری کو برداشت کرلیا جائے اور یہ عورت کی طرف سے ایک زنانہ کمزوری ہے؛ اس لئے اسے درگذر کرنا چاہئے۔

عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من كان يؤمن بالله واليوم الآخر، فلا يؤذي جاره، واستوصوا بالنساء خيرًا، فإنهن خلقن من ضلع، وإن أعوج شيئ في الضلع أعلاه فإن ذهبت تقيمه، كسرته. (بخاري شريف، باب الوصاة، بالنساء، النسخة الهندية ۷۷۹/۲، رقم: ٤۹۹۱، ف: ۵۱۸۵، صحيح مسلم، باب الوصية بالنساء، النسخة الهندية ٤۷۵/۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰۰۲۰/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/۴/۱۴۳۱ھ

بالغ نامحرم کو متبنی بنا کر رکھنے والی عورت سے قطع تعلق کرنا

سوال [۱۰۵۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک صاحب بسلسلہ ملازمت سعودیہ گئے ہوئے تھے، ان کے پیچھے ان کی بیوی نے تقریباً ۲۲/۲۳/سال کے نوجوان لڑکے کو جو غیر قوم سے ہے، اپنا بیٹا بنالیا اور رات ودن دونوں کا ایک ساتھ رہنا ہوگیا، اس کی وجہ سے خاندان کے کچھ لوگوں نے اس تعلق سے عورت کو روکا، جس کی وجہ سے خاندان میں اختلاف ہوگیا، آٹھ دس سال کے بعد اس لڑکے کی شادی بھی ہوگئی، رات دن کا رہنا تو ختم ہوگیا؛ لیکن گاہ بگاہ آتا ہے، عورت بھی کسی صورت میں اس لڑکے سے تعلق ختم کرنے کے لئے تیار نہیں، ان وجوہات کی بنا پر خاندان کے کچھ

لوگوں نے اس عورت سے تعلق ختم کرلیا ہے، اور جس تقریب میں وہ عورت شرکت کرتی ہے وہ شریک نہیں ہوتے ،تو ایسی عورت سے تعلق ختم کر لینے میں اور جس تقریب میں وہ عورت شرکت کرتی ہے،اس تقریب میں شرکت کرنے میں کیا کوئی حرج ہے یا نہیں؟ جبکہ شرکت نہ کرنے میں خاندان میں نا اتفاقی بڑھ رہی ہے۔

المستفتی: محمد ابراہیم،رامپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیرمحرم مرد کو ساتھ رکھنا حرام اور عذاب الٰہی کا سخت خطرہ ہے، علاقہ کے با اثر لوگوں پر ضروری ہے کہ ان پر سخت پابندی لگائیں، اگر اس عورت سے بائیکاٹ کرنے میں ہدایت کی امید ہے،تو بائیکاٹ کرلیا جائے ؛لیکن اگر بائیکاٹ کرنے میں فواحش اور برائیاں زیادہ ہونے کا خطرہ ہے،تو بائیکاٹ نہ کیا جائے، بلکہ ایسی حکمت عملی اختیار کرلی جائے،جس سے برائیوں سے حفاظت ہو۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ. [النحل: ۱۲۵]

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷رمحرم الحرام ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳ /۵۱۲۰)

دوستی ودشمنی میں مبالغہ کرنا

سوال [۱۰۵۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ احقر کے ایک دوست اور احقر کے درمیان کچھ غلط فہمیاں ہوگئیں، جس سے تعلقات کشیدہ ہوگئے، دوریاں بڑھ گئیں کچھ بڑے صلح کرانے آئے،ہم دونوں بیٹھے دوران گفتگو انہوں نے فرمایا: آپ کی قسم کا کوئی اعتبار نہیں آپ جھوٹے ہیں۔نیز یہ کہ آپ

کی طبیعت میں فساد ہے اور عادت بدلتی نہیں ہے وغیرہ، اس طرح کے جملہ بہت چھپے بعد میں صلح صفائی کرادی گئی۔ اب بول چال ہے، مگر پہلے جیسے تعلقات نہیں ہیں، پہلے میں اپنی نجی وذاتی ہر بات بتادیا کرتا تھا، اب نہیں بتاتا ہوں۔ نیز بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں، مگر یہ سمجھ کر کہ ان کو میری بات اور قسم کا یقین نہیں ہوگا نہیں کہتا ہوں، نیز ضرورت سے زیادہ گفتگو بھی نہیں کرتا ہوں، وہ صاحب بھی بلاضرورت احقر سے گفتگو نہیں کرتے، اس بناء پر وہ صاحب مجھے بغضیلا اور بغض والا کہتے ہے، اور واقعی ان کی مذکورہ باتوں کا میرے دل پر آج بھی اثر ہے، میرے دل سے اس کا اثر ختم نہیں ہوا ہے، میں بات کرتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ وہ میری بات کا نہ جانے کیا مطلب نکالیں کیا واقعی یہ غلط حرکت ہے؟ یہ بغض ہے مجھے لگتا ہے کہ یہ غلط نہیں ہے؛ کیونکہ حضرت تھانویؒ کا ایک ملفوظ ہے جب آپ سے کسی نے معافی مانگی، تو فرمایا آخرت کے لئے معاف کردیا، دنیا میں معاف نہیں کیا؛ بلکہ ہمیشہ تم سے ہوشیار رہوں گا۔

المستفتی: محمد ابراہیم، سیو ہورہ، ٹانڈا، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حدیث میں آیا ہے کہ دوستی میں بھی مبالغہ مت کرو اور دشمنی میں بھی مبالغہ مت کرو؛ اس لئے درمیانی درجہ اختیار کرنا چاہئے، نہ اپنا راز بتانا چاہئے اور نہ دوسرے کا راز دار بننا چاہئے؛ اس لئے آپ دونوں کے درمیان دعا سلام رہے، اور بہت زیادہ تعلقات مضر ہیں، نہ اس کی ضرورت ہے کہ وہ آپ کی باتوں کو غلط مان رہا ہو اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے کہ آپ پچھلی باتوں کو یاد کر کے اپنے اندر وہ بات پیدا کریں۔ بس دعا سلام اور ضرورت کے بقدر گفتگو کی جائے، اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔

عن أبي هريرةؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أحبب حبيبك هونا ما، عسى أن يكون بغيضك يوما ما، وأبغض بغيضك هونا ما عسى أن يكون حبيبك يوما ما. (ترمذي شريف، باب ماجاء في الإقتصار في الحب والبغض، النسخة الهندية ۲/ ۲۰، دار السلام رقم: ۱۹۹۷، مسندالبزار مكتبه العلوم والحكم۱۷/ ۲۲۰، رقم:۹۸۸۲، المعجم الكبير للطبراني، دار أحياء التراث العربي

۱۳/ ۷۰، رقم:۱۷۲، الأدب المفرد، باب أحبب حبيبك هونا ما، دار الكتب العلمية بيروت ۳۸۲، رقم: ۱۳۲۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ جمادی الثانی ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۰۹۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۶/۱۳ھ

بغض وکینہ کے بغیر قطع تعلق کا حکم

سوال [۱۰۵۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عابد اور ثاقب دو طالب علم ہیں، یہ باہم کلام نہیں کرتے؛ لیکن دل میں دونوں کے حسد وکینہ وغیرہ نہ ہو تو کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد ناظر بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دو مسلمانوں کا آپس میں باہم کلام نہ کرنا غصہ اور ذاتی عناد پر مبنی نہ ہو اور اس سے کسی کی حق تلفی نہ ہوتی ہو اور ایک کے سلام کرنے پر دوسرا جواب بھی دے دیتا ہو، تو اس صورت میں ہجران ممنوع میں داخل نہ ہوں گے۔

والشارع إنما حرم المهاجرة المقيدة لا المطلقة مع أن في إطلاقها حرجا عظيما حيث يلزم منه، أن مطلق الغضب المؤدي إلى مطلق الهجر أن يكون حراما –إلى– فيفيد أنه إذا لم يحصل التلاقي والإعراض فلا بأس بالهجران المطلق –إلى– قال الأكمل وفيه حث على إزالة الهجران، وأنه يزول بمجرد السلام. (مرقاة، باب ماينهي عنه من التهاجر والتقاطع وإتباع العورات، الفصل الأول، امدادية ملتان ۹/ ۲۶۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۱۰۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۵/۱۵ھ

لڑکی کے جرم کی وجہ سے والد کا بائیکاٹ کرنا

سوال [۱۰۵۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں نے اپنی لڑکی کا نکاح ایک شخص سے کردیا تھا، اس کا شوہر ایک سال بیوی کے ساتھ رہا، اس کے بعد پاکستان چلا گیا، پھر وہاں سے واپس نہیں آیا، اس کے بعد لڑکی دوسرے مرد کے ساتھ چلی گئی اور اب تک دوسرے مرد کے ساتھ ہی رہ رہی ہے، تو اب گاؤں اور پنچایت کے لوگ کہتے ہیں کہ تم بھی اسی کے ساتھ چلے جاؤ، یعنی بائیکاٹ کررہے ہیں؛ جبکہ میں نے لڑکی کے جانے کے بعد ہی سے لڑکی سے تعلقات ختم کرلیئے اور جانے کے بعد سے اب تک میں نے اس سے کوئی ملاقات بھی نہیں کی اور آئندہ بھی ایسی لڑکی سے ملنا نہیں چاہتا، تو کیا شرعاً ہم بائیکاٹ کئے جانے کے مستحق ہیں؟ جبکہ ہم نے لڑکی کی شادی بھی کردی تھی، شرعی حکم تحریر فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر لڑکی آپ کے قابو سے باہر ہوگئی ہے اور لڑکی کو وہاں سے چھڑانے پر بھی قدرت نہیں رکھتے ہیں اور لڑکی کے اس فعل شنیع سے راضی بھی نہیں ہیں، تو ایسی صورت میں برادری والوں کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ آپ سے بائیکاٹ کرلیں اور برادری کے بااثر لوگوں پر لازم ہے کہ لڑکی کو فوراً اس فعل شنیع سے الگ کرلیں اور توبہ کرالیں ورنہ لڑکی مستقل زنا کاری میں مبتلا رہے گی۔

عن ابن عباسؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا ضرر ولا ضرار.

(سنن ابن ماجه، باب من بني في حقه ما يضر بجاره، النسخة الهندية ۲/ ۱٦۹، دار السلام رقم: ۲۳٤۱، مسند أحمد بن حنبل ۱/ ۳۱۳، رقم: ۲۸٦۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ ذی قعدہ ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۳٦۹۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/ ۱۱/ ۱۴۱۴ھ

ناراضگی میں فون پر بات نہ کرنا

سوال[۱۰۵۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حدیث میں مسلمان بھائی کے ساتھ تین دن سے زائد قطع تعلق سے منع کیا گیا ہے، تو کیا اگر کسی سے روزانہ فون پر بات ہوتی ہو، پھر کسی وجہ سے ناراض ہوکر فون میں بات کرنا بند کردیا، تو ایسا آدمی بھی اس حدیث کا مصداق ہوگا؟

المستفتی: مشتاق احمد، متعلم دارالعلوم دیو بند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر ضرورت کی گفتگو ہوتی ہے، تو جائز اور درست ہے، پھر کسی بات پر ناراض ہوکر ضرورت کے باوجود گفتگو نہ کرنا اور دوسری طرف سے فون آنے کے باوجود نمبر دیکھ کر فون کاٹ دینا بند کردینا تاکہ اس سے گفتگو نہ کرنی پڑے؛ حالانکہ گفتگو کرنے میں کوئی دینی یا دنیوی نقصان نہیں ہے، صرف ناراضگی کی بنا پر فون کاٹ دیا جاتا ہے، تو اس طرح مسلسل تین دن سے زائد کرنے سے اس حدیث شریف کے دائرہ میں شامل ہوجائے گا، جس میں قطع تعلق سے منع کیا گیا، اور اگر دینی یا دنیوی یا ذاتی کسی قسم کے نقصان یا فتنہ کا خطرہ ہے، تو ایسی صورت میں گفتگو نہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ اس لئے کہ جس طرح قطع تعلق سے منع کیا گیا ہے، اسی طرح اپنے آپ کو فتنہ سے دور رکھنے کا بھی حکم دیا گیا ہے۔

عن أبي سعيد الخدري رضـ، أنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: يوشک أن يكون خير مال المسلم غنم يتبع بها شعف الجبال، ومواقع القطر يفر بدينه من الفتن. (بخاري شريف، باب من الدين الفرار من الفتن، النسخة الهندية ۱/۷، رقم: ۱۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ر محرم الحرام ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸ر ۹۸۷۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۷/۱/۱۴۳۱ھ

محض میٹنگ میں شرکت کرنے کی وجہ سے مقاطعہ

سوال [۱۰۵۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک برادری شیخ منصوری نے اپنی برادری کے قوانین مرتب کرنے اورفلاح و بہبود کے لئے ایک میٹنگ منعقد کی تھی، اس میں برادری کے چند آدمیوں نے شرکت نہیں کی میٹنگ کی تاریخ اور مقام دوسرے پرچہ پر مندرج ہے، اب مذکورہ برادری نے ان شرکت نہ کرنے والوں کا مقاطعہ از برادری جس کو اپنی اصطلاح میں حقہ پانی بند کردیا ہے، وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ان میں شرکت نہ کرنے والوں نے چار برادروں کی بات نہیں مانی؛ اس لئے یہ برادری کی توہین ہے، اس توہین کے پیش نظر شرکت نہ کرنے والوں کا حقہ پانی بند کردیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ میٹنگ میں شرکت نہ کرنے سے ان کا حقہ پانی بند کردینا جائز ہوگا یانہیں؟ برادری نے یہ کام اچھا کیا ہے یا برا کیا ہے؟ ضرورت استفتاء اس لئے درپیش ہوئی کہ یہ کام اچھا کیا ہے، تو اپنی جگہ اٹل ورنہ پھر دوسرا رخ اختیار کیا جائے، حقہ پانی بند کرنے کی تفصیل کی ضرورت نہیں، برادری کی طرف سے جو نوٹس حقہ پانی بند کرنے کا شرکت نہ کرنے والوں کو دیا گیا ہے وہ بھی ہمرشتہ سوال ہے۔

المستفتی: برادری منصوری، شیرکوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: محض میٹنگ میں شرکت نہ کرنے کی وجہ سے مقاطعہ (حقہ پانی بند) کردینا شرعی طور پر اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے؛ بلکہ ان کے ساتھ ہمدردی اور حسن سلوک اور تعلقات باقی رکھنے چاہئے۔

عن أنس قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تقاطعوا، ولاتدابروا، ولاتباغضوا، ولاتحاسدوا، وكونو عباد الله إخوانا ولا يحل للمسلم أن يهجر أخاه فوق ثلاث. (سنن الترمذي، باب ما جاء في الحسد، النسخة الهندية ۲/۱۵، دار السلام رقم:۱۹۳۵، صحيح البخاري، باب الهجرة، النسخة الهندية ۲/۸۹۷، رقم:۵۸۳۹، ف:۶۰۷۶، صحيح مسلم، باب النهي عن التحاسد والتباغض والتدابر، النسخة الهندية ۲/۳۱۶، بيت الأفكار رقم:۲۵۵۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/رجب المرجب ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۹۶۰/۳۲)

آپسی رنجش کی وجہ سے ترک کلام

سوال [۱۰۵۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہم دونوں بھائیوں میں کسی وجہ سے آپس میں رنجش ہوگئی حتی کہ دونوں نے ایک دوسرے سے بولنا چھوڑ دیا، کچھ عرصہ بعد میں نے صلح کرنی چاہی اور لوگوں کو اس سلسلہ میں متوجہ کیا کہ آپ ہمارے درمیان بات کرادیں؛ جب ان لوگوں نے میرے چھوٹے بھائی سے بات کی تو انہوں نے ان کو جواب دیا کہ ہمارے درمیان کوئی لڑائی نہیں، پھر صلح کس بات کی سوء اتفاق کچھ دنوں بعد چھوٹے بھائی کے دشمنوں نے ان کو قتل کر ڈالا، مجھے ہر وقت یہی فکر رہتی ہے کہ بخشش کی کیا شکل ہے، جبکہ حدیث شریف میں فرمایا گیا، کہ تین دن سے زیادہ ترک کلام کرنا حرام ہے اور اگر اس حالت میں کوئی مرجائے، تو وہ جہنمی ہے، تو آپ سے معلوم یہ کرنا ہے کہ اس گناہ کی تلافی کس طرح ممکن ہے کہ جس سے میرا گناہ اور میرے مرحوم بھائی کے گناہ دور ہوجائیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں

میری پریشانی کوحل فرمائیں۔

المستفتی: محمد حنیف بھاگووالا، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر ذاتی اور دنیوی امور کی وجہ سے آپس میں کلام ترک کردیا جائے، جس میں کوئی دینی فائدہ مقصود نہ ہو، بلکہ محض غیظ نفسانی ہو، تو یہ واقعۃً شرعاً مذموم ہے اور حدیث شریف میں اسی سے منع کیا گیا ہے اور یہ گناہ کبیرہ ہے۔

سوال نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تعلقات کو استوار کرنے کی کوشش تو کی ہے؛ لیکن اقدام نہیں کیا اس لئے جرم تو بہر حال برابر رہا، اب اس کے تدارک کی صورت یہ ہے کہ آپ انتہائی ندامت کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں توبہ واستغفار کریں۔

نیز ان کے بیوی بچوں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرنے کے ساتھ ساتھ خود ان کے لئے بھی ایصال ثواب کریں، اس طریقہ پر امید ہے کہ انشاء اللہ آپ اور آپ کے بھائی اس جرم سے بری ہوجائیں گے۔

وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَعْفُوْ عَنِ السَّیِّئَاتِ. [الشوریٰ: ۲۵]

عن عبد الله بن مسعودؓ، قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: التائب من الذنب کمن لا ذنب له. (سنن ابن ماجه، باب ذکر التوبة،النسخة الهندیة ۲/۳۱۳، دار السلام رقم: ٤٢٥٠، المعجم الکبیر للطبراني، دار أحیاء التراث العربی ۱۰/۱۵۰، رقم: ۱۰۲۸۱)

وفي المرقات: تحته إعلم أن التوبة إذ وجدت بشروطها المعتبرة فلا شک في قبولها وترتب المغفرة علیها، لقوله تعالیٰ: وهو الذي یقبل التوبة عن عباده. (مرقاة المفاتیح، قبیل باب رحمة الله، مکتبه امدایة ملتان ٥/١٥١)

یغفر مادون ذلک لمن یشاء من الصغائر والکبائر مع التوبة. (شرح عقائد۱۱۲)

وأيضا المسئلة مستفاد من هذا الحديث عن أنس بن مالكؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن العبد ليموت والداه أو أحدهما، وإنه لهما لعاق فلا يزال يدعو لهما، ويستغفر لهما حتى يكتبه الله بارًّا.

(شعب الإيمان، فصل في حفظ حق الوالدين بعد موتهما، دار الكتب العلمية بيروت ٦/ ٢٠٢، رقم: ٧٩٠٢، مشكوة شريف ٤٢١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍رجب المرجب ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۶۸۵۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲؍۷؍۱۴۲۱ھ

تین دن سے زائد قطع تعلق کر لینا جائز ہے؟

سوال [۱۰۵۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک آدمی بہت شریر ہے، لوگوں پر تہمت لگانا جھوٹ بولنا اور جھگڑا کرنا اورلوگوں کے اندر تفریق ڈالنا اس کی عادت ہے، تو آپ ہی سمجھئے وہ کیسا آدمی ہے؟ اس لئے ایک آدمی نے بہت دنوں سے اس سے بات کرنی چھوڑ دی ہے، اس آدمی پر بھی کئی مرتبہ مذکورہ شخص نے تہمت لگائی ہے، تو اس سے بات کرنا چھوڑ دینا جائز ہوگا یا نہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو آدمی کسی مسلمان سے تین دن تک بات کرنا چھوڑ دے اور مر جائے، تو وہ جنت میں نہیں جائے گا؟ اس حدیث کی وعید میں یہ شخص آئے گا یا نہیں؟

المستفتی: محمد حیدر علی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: حدیث میں جو مروی ہے کہ تین دن سے زیادہ قطع تعلق نہ کرے، یہ مطلق نہیں اگر فساق سے بوجہ فسق احتراز کرے تو کوئی حرج نہیں۔

کلمة الحق ۱۲۷/۸، بحواله فتاوی رحیمیه قدیم ۹/ ۶۳۷، جدید زکریا ۳/ ۲۴۱)

رخص للمسلم أن يغضب على أخيه ثلاث ليال لقتله ولايجوز فوقها إلا إذا كان الهجران في حق من حقوق الله تعالىٰ، فيجوز فوق ذالک– إلى –فإن هجرة أهل الأهواء والبدع واجبة على مر الأوقات مالم يظهر منه التوبة والرجوع إلى الحق. (مرقاة المفاتيح، باب ما ينهى عنه من التهاجر و التقاطع وإتباع العورات الفصل الأول، امدادية ملتان ۹/ ۲۶۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍شوال المکرّم ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۱۰۵)

بے نمازی سے ترک تعلق کرنا

سوال [۱۰۵۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بے نمازی کس کو کہا جاتا ہے، اس کے ساتھ کھانا پینا اور اس سے میل جول رکھنے کے متعلق احکامات بیان کریں؟

المستفتی: محمد ظہیر الحق، افضل گڑھ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بے نمازی وہ شخص ہے، جو جان بوجھ کر نماز ترک کردیتا ہو ایسا آدمی عام طور پر جاہل ہوتا ہے، اس کے ساتھ ترک تعلق کا اگر معاملہ کیا جائے گا، تو اور بھی گمراہ ہوجائے گا؛ بلکہ محبت سے اس کو قریب کرنے کی کوشش ہونی چاہئے انشاء اللہ کسی وقت توبہ کرلے گا اور فوت شدہ نمازوں کو بھی قضاء عمری کے طور پر پڑھتا رہے گا؛ لہٰذا قطع تعلق نہ کیا جائے، نرمی اور محبت کا معاملہ کیا جائے۔

ادْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ. [النحل:۱۲۵]

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍شوال المکرّم ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۴۷۰/۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۱۰/۲۳ھ

مسلمانوں کی آبروریزی کرنے والے سے قطع تعلق کرنا

سوال [۱۰۵۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے موضع میں ایک پرانا دینی مدرسہ ہے، جو سرکار سے منظور ہے، درجہ پانچ تک دینیات، ہندی، اردو، ناظرۂ قرآن پاک اور تجوید کے ساتھ قرآن پاک حفظ کی تعلیم باقاعدہ ہوتی ہے، مدرسہ کی کمیٹی ہے، مدرسہ رجسٹرڈ ہے، مدرسہ کمیٹی کے صدر بابو سلیم صاحب ہیں، جن سے گاؤں ہی کے ایک شخص زید کا اپنے بھی معاملات میں جھگڑا ہوگیا، زید نہ مدرسہ کا ممبر ہے، نہ دین سے کوئی تعلق ہے، بابو سلیم اور زید کا جھگڑا بہت بڑھا زید بابو سلیم کو ہر طرح زیر کرنے کی کوشش کرنے لگا یہاں تک زید کا کوئی بس نہیں چلا تو بابو سلیم کو مدرسہ کی صدرات سے الگ کرنے کی کوشش کرنے لگا مدرسہ پر بابو سلیم کے احسانات ہیں، مدرسہ کی بقا وترقی اور مدسہ کی مفاد کے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں، بابو سلیم دیندار ذی علم ہیں اور ان کی سرکاری اچھی سروس ہے، زید بابو سلیم کو صدارت سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہوا، تو مدرسہ کو ہر طرح نقصان پہچانے کی دھمکی دینے لگا۔

۲۹؍جنوری آئی تو ایک درخواست لکھا کر چند لوگوں سے دستخط کرا کے تھانہ انچارج کو دیدی کہ ۲۶؍جنوری کو آزادی والا جھنڈا مدرسہ میں نہیں لہرایا گیا، مدرسہ کے صدر ممبران کمیٹی واساتذہ ملک کے غدار ہیں، تھانہ والوں کو کوئی وجہ چاہئے۔ بہر حال مدرسہ میں پولیس آئی

اور مدرسہ کے صدر مدرس کو جو عالم حافظ ہیں، تھانہ لے گئی، مدرسہ کے ذمہ دار بہت پریشان ہوئے، کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑی مدرسہ کے بجٹ میں روپیہ بھی نہیں تھے، قرض لے کر کسی طرح معاملہ کو رفع دفع کرایا گیا، معاملہ رفع دفع ہو جانے کے بعد زید نے دو مرتبہ اخبار میں بھی یہ معاملہ لکھوایا کہ تھانہ والوں نے لین دین کر کے معاملہ کو رفع دفع کر دیا، زید کا کوئی شریف آدمی ساتھی نہیں ہے، بس دو ایک بے نمازی، بے دین، راز دارانہ مشورہ کار ہیں، معلوم یہ کرنا ہے کہ زید نے جو یہ حرکت کی جس میں مدرسہ کے ذمہ دار انتہائی پریشان کئے گئے، مدرسہ کے صدر مدرس مولانا صاحب چھ گھنٹہ تھانہ میں بند رہے، مدرسہ میں پیسہ نہیں تھے، مدرسہ کی حفاظت کے لئے قرض لے کر کسی طرح معاملہ دفع کیا گیا؟ زید کی اس نازیبا حرکت پر بستی کے مسلمانوں کو زید کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے؟ کہ دوسروں کو عبرت ہو اور ایسی نازیبا حرکت پھر دوبارہ مدرسہ کے ساتھ کوئی نہ کر سکے۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسلمان کی آبروریزی اور اس کی ہتک حرمت نیز دینی ادارہ کو نقصان پہونچانا یہ تمام باتیں شرعاً گناہ کبیرہ ہیں، جن کی وجہ سے عبرت اور جرم کا احساس دلانے کی خاطر گو کہ شرعاً تعلقات کا انقطاع کی گنجائش ہے؛ لیکن اس دور میں تعلقات کا انقطاع مفید نہیں ہے؛ بلکہ اس طرح اور کشیدگی بڑھ جاتی ہے؛ اس لئے ایسے شخص سے کسی طرح درمیان میں بااثر لوگوں کو ڈال کر میل جول کر کے معاملات کی صلح وصفائی کر لینی چاہئے تاکہ اس طرح آپس کے نجی معاملات کی وجہ سے دینی ادارے زد میں نہ آئیں۔

وَالصُّلۡحُ خَيۡرٌ . [النساء:۱۲۸]

عن أبي الدرداءؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ”ألا أخبركم بأفضل من درجة الصيام، والصلاة، والصدقة“ قالوا: بلى! يارسول الله! قال: إصلاح ذات البين، وفساد ذات البين الحالقة

(أي المزيلة للخيرات) (سنن أبي داؤد، باب في اصلاح ذات البين، النسخة الهندية ٢/٦٧٣، دار السلام رقم: ٤٩١٩، الأدب المفرد، دار الكتب العلمية بيروت ١٢٣، رقم:٣٩١، مسند أحمد بن حنبل٦/٤٤-٤٤٥، رقم:٢٨٠٥٨، مسند البزار، مكتبه العلوم والحكم ١٠/٤٦، رقم:٤١٠٩)

ثم إن الهجران الممنوع إنما هو كان لسبب دنيوي، أما إذا كان بسبب فسق المرأ وعصيانه، فأكثر العلماء على جوازه. (تكملة فتح الملهم، باب تحريم الهجر فوق ثلاث بلاعذر شرعي، اشرفية ديوبند ٥/٣٥٥-٣٥٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
ا رصفر المظفر ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۷۰۶۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۲/ ۱۴۲۳ھ

راستہ تنگ کرنے کی وجہ سے ترک کلام

سوال [۱۰۵۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے اپنے چھوٹے بھائی کا راستہ تنگ کر دیا ہے اور آگے چل کر عام راستہ تھا، اس کو بھی تنگ کر دیا ہے، جس کی وجہ سے دونوں بھائیوں میں گفتگو بند ہے، تو ایسی صورت میں گفتگو کا بند رہنا جائز ہوگا یا نہیں؟ مدلل ومفصل جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد صدیق انصاری، قصبہ کوری روانہ، مرادآباد (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تین روز سے زیادہ گفتگو اور میل جول بند رہنا ناجائز ہے، ضرور گفتگو اور میل جول شروع کر دینا چاہئے، ابتدا سلام سے کریں، جو ابتداءً سلام کرے گا، اس کو زیادہ ثواب ملے گا، دوسرا سلام کا جواب دیگا تو وہ بھی ثواب میں شریک ہوگا اور اگر جواب نہ دے گا تو گنہگار ہوگا، آئندہ سلام کرنے والا گنہگار نہیں کہلائیگا۔

عن أبي هريرةؓ، أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لا يحل لمؤمن أن يهجر مؤمنا فوق ثلاث، فإن مرت به ثلاث، فليلقه فليسلم عليه، فإن رد عليه السلام فقد اشتركا في الأجر، وإن لم يرد عليه فقد باء بالإثم، زاد أحمد، وخرج المسلم من الهجرة. (سنن أبي داؤد، باب في هجرة الرجل أخاه المسلم، النسخة الهندية ۲/۶۷۳، دار السلام رقم: ۴۹۱۲، الأدب المفرد، باب إن السلام يجزي من الصوم، دار الكتب العلمية بيروت ۱۲۹، رقم: ۴۱۴، مشكوة المصابيح ۲/۴۲۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍رجب المرجب ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/۸۴۹)

سود پر قرض دینے والوں سے قطع تعلق کرنا

سوال [۱۰۵۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کے متعلقین میں سے کچھ لوگ روپیہ سود پر قرض دیتے ہیں، تو ان سے معاملات کرنا، ان کے گھر کھانا پینا، ان کو اپنے یہاں کھلانا کیسا ہے؟ ان سے قطع تعلق کرنے سے شریعت کی نظر میں کوئی خرابی تو نہیں ہے؟

المستفتی: محمد معراج، بہرائچ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سوال نامہ میں جن کے بارے میں لکھا گیا ہے، اگر ان کے یہاں صرف یہی سودی کاروبار ہے، تو ان کے یہاں کھانا نہ کھایا جائے، مگر وہ آپ کے یہاں کھانا کھا سکتے ہیں؛ اس لئے کہ آپ کے یہاں حلال کمائی ہے اور ان کے ساتھ قطع تعلق نہ کیا جائے؛ بلکہ تعلق برقرار رکھ کر ان کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی جائے۔

عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم، آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: وهم سواء. (مسلم شريف، باب لعن أكل الربا ومؤكله، النسخة الهندية٢/٢٧، بيت الأفكار رقم:١٥٩٨)

أكل الربوا وكاسب الحرام أهدىٰ إليه، أو أضافه وغالب ماله حرام لا يقبل ولايأكل مالم يخبره أن ذلك المال أصله حلال ورثه، أو استقرضه. (هندية، الباب الثانى عشر في الهدايا والضيافات، زكريا قديم ٥/٣٤٣، جديد ٥/٣٩٧، المحيط البرهاني، المجلس العلمي بيروت ٨/٧٣، رقم:٩٦١٧، البناية اشرفيه ١٢/٢٠٩، مجمع الأنهر، مصري قديم ٢/٥٢٩، دار الكتب العلمية بيروت ٤/١٨٦-١٨٧)

ادْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ. [النحل:١٢٥] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ / ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۹۶۸)

منکرات والی شادی میں عدم شرکت اور داعی کا بائیکاٹ

سوال [۱۰۵۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے اپنے بہنوئی عمرو کو اپنی لڑکی کی تقریب میں مدعو کیا، بدعوتِ زید عمرو ان کے گھر گئے، دیکھا کہ ان کے مکان پر لاؤڈ اسپیکر سے گانے ہو رہے تھے، جب لاؤڈ اسپیکر سے گانے سنے، تو وہاں سے عمر چلدیئے، عمر کے جانے پر زید نے اور بھی برا بھلا کہا۔ خیر عمر وہاں سے چلے گئے اور اب زید کے گھر آنا جانا اور بات چیت سب بند کر رکھی ہے، تو عمر کا معمول یہ ہے کہ جہاں جس تقریب میں باجا یا ناچ وغیرہ ہوتا ہے، اس میں شریک نہیں

ہوتے اورنہ اس تقریب کی دعوت کھاتے ہیں، زید اس بات کو جانتا تھا؛ لیکن باوجود اس کے اس نے ایسی حرکت کی، تو پوچھنا یہ ہے کہ عمر کا بات چیت بند کرنا از راہ شرع کیسا ہے؟ اور کب تک ترک تکلم اور ترک آمد ورفت جائز ہے؟ جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: محمد رفیق، لکھیم پورکھیری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر عمر کی حیثیت علاقہ میں مقتدی کی سی ہے اور ان کا اثر لوگوں کے قلوب میں بیٹھ گیا ہے، تو اس طرح منکرات سے خود روکا کریں، اگر نہ مانے تو وہاں سے واپس لوٹ آنا چاہئے۔ اور اگر عمر کی حیثیت علاقہ میں مقتدی کی سی نہیں ہے، تو دل سے ان باتوں کا انکار کریں اور صبر کر کے کھانا کھا کر، واپس آجائیں اور آئندہ ایسی دعوت میں حاضر ہی نہ ہوا کریں۔

عن عمران بن حصين قال: نهي رسول الله صلى الله عليه وسلم: عن إجابة طعام الفاسقين. (المعجم الكبير للطبراني، دار أحياء التراث العربي ١٨ /١٦٨، رقم: ٣٧٦)

من دعىٰ إلى وليمة فوجد ثمة لعباً، أو غناءً، فلابأس أن يقعد و يأكل، فإن قدر على المنع يمنعهم، وإن لم يقدر يصبر وهذا إذا لم يكن مقتدي به أما إذا كان ولم يقدر على منعهم، فإنه يخرج ولايقعد. (عالمگيري، الباب الثاني عشر في الهدايا والضيافات، زكريا قديم ٥/٣٤٣، جديد ٥/٣٩٧، هداية اشرفي ٤/٤٥٥، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٨/٢١٦)

عمرو کا بات چیت بند رکھنے کے بجائے نرمی سے سمجھاتے رہنا بہتر ہے، اس سے ہدایت کی امید ہے۔

قوله تعالىٰ: ادْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّکَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ. [النحل:۱۲۵] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍شوال المکرّم ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/۹۰۶)

لاعلمی میں خنزیر کا گوشت کھانے والے سے قطع تعلق

سوال [۱۰۵۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عبدالسلام پہلی مرتبہ دہلی کام کرنے کے لئے گئے، وہاں انہوں نے ایک بھنگی کی دوکان پر خنزیر کا گوشت خرید کر کھالیا، ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ بھنگی کی دوکان ہے، یا خنزیر کا گوشت ہے، پھر دوبارہ انہوں نے گوشت خرید کرلیا اور ساتھیوں سے معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ یہ گوشت خنزیر کا ہے، تو عبدالسلام نے اس گوشت کو پھینک دیا اور ساتھیوں کو بتایا کہ اس سے قبل ایک مرتبہ اور اس گوشت کو کھا چکا ہوں؛ لہٰذا اس کے ساتھ رہنے والے ساتھیوں نے اسے اپنے ساتھ کھانے پینے سے الگ کر دیا اور ساتھیوں نے یہ بات اس کے گاؤں میں پھیلا دی اور لوگ اسے برا بھلا کہتے ہیں، اب اس کی کیا صورت نکلے گی؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: عبدالسلام، لکھیم پور، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں عبدالسلام کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ واستغفار کرے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَحِيْمًا. [النساء:۶۴]

اور یہ واقعہ چونکہ عدم علم کی وجہ سے پیش آیا ہے، اس لئے اس کے ساتھ مقاطعت نہ کی

جائے؛ بلکہ پہلے کی طرح میل ملاپ باقی رکھا جائے توبہ کرنے کے بعد شرعًا اس کا حکم خنزیر کا گوشت نہ کھانے والے کے حکم میں ہوجائے گا، اس کے بعد اس کو برا بھلا کہنے والے گنہگار ہوں گے، اور توبہ کرنے والے کے گناہ کو اللہ تعالیٰ معاف فرمادے گا۔

عن ابن عمرؓ، قال: صعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: المنبر...... لاتؤذوا المسلمین ولاتعیروهم، ولاتتبعوا عوراتهم، فإنه من تتبع عورة أخيه المسلم تتبع الله عورته ومن تتبع الله عورته يفضحه ولو في جوف رحله. الحديث (الترمذي شريف، باب ماجاء في تعظيم المؤمن، النسخة الهندية ٢/٢٣، دار السلام رقم: ٢٠٣٢)

عن عبد الله بن مسعودؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: التائب من الذنب كمن لا ذنب له. (سنن ابن ماجه، باب ذكر التوبة، النسخة الهندية ٢/٣١٣، دار السلام رقم: ٤٢٥٠، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ١٠/١٥٠، رقم: ١٠٢٨١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ جمادی الثانی ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳؍۵۳۲۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۶/۶ھ

خنزیر کے بالوں کا برش بنانیوالے سے قطع تعلق کرنا

سوال [۱۰۵۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ یہاں پر سور کے بالوں کا برش بنتا ہے، لہٰذا مجھے ان کے یہاں پر آنے جانے یعنی تعلقات کیسے رکھنا چاہئے؟ اگر ان کے یہاں پر نہ جائیں تو ان سے تعلقات ختم ہوتے ہیں قرآن وحدیث کی روشنی میں میرے لئے کیا حکم ہے؟ تعلقات میں میرا کھانا پینا بھی شامل ہے۔

المستفتی: محمد رئیس احمد، محلہ اسلام نگر سیوہارہ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خنزیر کے بال نجس العین ہیں، جب اس کے علاوہ دوسری اشیاء سے برش بنانے کا کام چل سکتا ہے، تو کسی مسلمان کے لئے خنزیر کے بالوں کا برش وغیرہ بنانا اوراس کا کاروبار ہرگز جائز نہ ہوگا۔

ولا یجوز بیع شعر الخنزیر؛ لأنه نجس العین فلا یجوز بیعه إهانة له.

(هداية، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد اشرفي ۳/۵۵)

لہٰذا جب تک اپنے فعل سے توبہ کرکے باز نہ آجاوے اعزاء واقرباء کے لئے بائیکاٹ کرنے کی گنجائش ہے۔

وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ. [هود: ۱۱۳] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/شوال المکرم ۱۴۰۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/۳۱۲)

بدکار بہن سے قطع تعلق اور وراثت سے محروم کرنا

سوال [۱۰۵۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کی بہن اور بہنوئی میں جھگڑا ہوا اور بہنوئی نے ایک ہی مجلس میں تقریباً دس لوگوں کے سامنے تین طلاقیں دیدیں زید کی بہن میکہ میں تھی، سب نے کہا طلاق ہوگئی؛ چنانچہ اس سے عدت گذارنے کے لئے کہا گیا؛ لیکن وہ عدت میں نہ بیٹھی اور باہر نکلتی رہی اور تقریباً دو مہینے کے بعد اپنے گھر خود چلی گئی اور دونوں میاں بیوی میں بول چال ہوگئی یعنی روٹی وغیرہ پکا کر دینے لگی اور اب بھی دے رہی ہے، زید نے خود بھی سمجھایا اور دوسروں سے بھی سمجھوایا؛ لیکن وہ نہ مانی زید ایک دین دار شخص ہے۔

(۱) سوال یہ ہے کہ زید کا اپنی بہن سے بول چال تعلق رکھنا جائز ہے یا نہیں؟

جب سے یہ واقعہ ہوا ہے، زید نے بہن سے تعلق ختم کردیا ہے۔

(۲) جب وراثت تقسیم ہوتو ایسی بہن کو حصہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: انوارعلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں زید کی بہن پر طلاق مغلظہ واقع ہوچکی ہے اور طلاق مغلظہ کے وقوع کے بعد عورت کا شوہر کے ساتھ میاں بیوی کی طرح رہنا حرام کاری اور بدکاری ہے اور زید پر لازم ہے کہ بہن کو فوری طور پر بہنوئی سے الگ کرائے عدم تعمیل کی صورت میں اسے ایسی بدکار بہن سے تعلقات منقطع کرنے کی اجازت ہے۔

إن قال لزوجته: أنت طالق طالق طالق، طلقت ثلاثاً. (الأشباه والنظائر قديم۲۱۹، جديد زكريا ۳۷۶)

إن الهجران إذا كان بسبب فسق المرأ وعصيانه، فأكثر العلماء على جوازه. (تكملة فتح الملهم، باب تحريم الهجر فوق ثلاث بلا عذر شرعي، اشرفيه ديوبند ۵/۳۵۵-۳۵۶)

(۲) البتہ اس گناہ کے سبب بہن وراثت سے محروم نہ ہوگی۔

الإرث جبري لا يسقط بالإسقاط. (تكملة شامي، مطلب في حادثة الفتوى، زكريا ۱۱/۶۷۸، كراچي ۷/۵۰۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ ذی قعدہ ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۲۱۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۱۱/۱۴۳۱ھ

بھانجی سے ناجائز تعلق قائم کرنے والے سے قطع تعلق

سوال [۱۰۵۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: کہ زید کا لڑکا عاقل وبالغ شادی شدہ ہے، دو بچے ہیں بیوی گھر پر ہے، بکر کی حقیقی بھانجی بکر کے گھر پر مہمانداری کے لئے آئی، بھانجی عاقل وبالغ بغیر شادی شدہ ہے، بھانجی رات کو بکر کے لحاف میں جاتی تھی، زید کو اور زید کی بیوی کو اس بات کا علم تھا، زید اور زید کی بیوی نے کسی شخص سے بھی ظاہر نہیں کیا، کچھ عرصہ کے بعد وہ لڑکی اپنے باپ کے یہاں چلی گئی، اس لڑکی کا ماحول وہاں بھی گندہ تھا، کچھ دنوں کے بعد بکر اپنی بھانجی کے گھر گیا اور وہاں سے دونوں غائب ہوگئے، کچھ دنوں کے بعد گھر واپس آئے بھانجی کے باپ اور چچا نے بکر اور بھانجی کو مار کر اور ۵۰/روپیہ دے کر واپس کر دیا، پھر وہ دونوں وہاں سے چلے گئے، کچھ عرصہ کے بعد بھانجی کا باپ تلاش میں نکلا، بکر کو گرفتار کرا دیا اور اپنی لڑکی لے کر چلا آیا آکر اس نے لڑکی کا نکاح دوسری جگہ کر دیا، بکر کے خاندان والوں کو ان سب باتوں کا علم ہوا بکر اپنے گھر آیا آکر اپنے کام میں لگ گیا، بکر کے خاندان والوں نے زید اور بکر سے قطع تعلق کیا، زید اپنے ایک خاندان سے تعلق رکھتا ہے، جس خاندان سے تعلق رکھتا ہے، وہاں بکر کے چھوٹے بھائی کی شادی ہوئی ہے، تو اب جس خاندان سے بکر کا تعلق ہے بقیہ خاندانی اس سے تعلق رکھیں یا نہ رکھیں؟

(۲) زید کے خاندان والوں کے جو رشتہ دار ہیں، زید تعلق رکھتا ہے، خاندانی اپنے رشتہ داروں سے تعلق رکھیں یا نہیں؟

(۳) زید اور بکر کی پٹائی کرنے میں خاندان اور بستی کے معزز حضرات تھے، زید اور بکر اپنی غلطی کی معافی چاہتے ہیں، اپنے خاندان والوں سے تعلق رکھنا چاہتے ہیں، خاندان والے تعلق رکھیں یا نہیں؟ ان مسائل کا قانون شریعت کی روشنی میں جواب مفصل ومدلل عنایت فرمائیں۔

المستفتی: جمشید احمد، دوکاندار، شریف نگر، ٹھاکردوارہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سائل اگر اپنے بیان میں سچا ہے، تو مذکورہ حالات

میں زید وبکر جب تک خالص توبہ نہ کریں، اس وقت تک ان سے برادرانہ تعلق رکھنا جائز نہیں ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ. [هود: ۱۱۳]

البتہ اگر زید وبکر نے واقعی اپنے افعال سے توبہ کرلی ہے، تو قطع تعلق جاری رکھنا جائز نہ ہوگا؛ بلکہ ان کے ساتھ برادرانہ تعلق شروع کردینا چاہئے۔ (مستفاد: فتاوی احیاء العلوم ۱/۱۳۱، کفایت المفتی قدیم ۱/۲۷۲، جدید زکریا مطول ۱۲/۵۸۸، ۱۳/۱۱۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ جمادی الثانی ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/ ۷۳۳۳)

مطلقہ بیوی کو ساتھ رکھنے والے سے قطع تعلق کرنا

سوال [۱۰۵۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہم ایک اہم شبہ میں مبتلا ہیں ہمارے علاقہ میں ایک آدمی اپنی بیوی کو تین طلاق دینے کے بعد اسی کے ساتھ زندگی بسر کررہا ہے، اور تین طلاق دینے پر گواہ بھی موجود ہیں، ہم نے اس کو بارہا سمجھایا کہ حلالہ کے بغیر تمہارے لئے حلال نہیں ہے؛ لیکن وہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہے، تو اب ہم اس کے ساتھ معاملہ اور لین دین کے بارے میں کیا کریں۔

المستفتی: محمد ریاض الدین، گاؤں مریگاؤں (آسام)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: تین طلاق سے طلاق مغلظہ ہوجاتی ہے، جس سے بیوی قطعاً حرام ہوجاتی ہے، اس کے بعد بغیر حلالہ کے نکاح کرنا بھی جائز نہیں ہوتا ہے، پھر ایسی عورت کو اس حالت میں رکھ کر کے ساتھ زندگی گذارنا حرام کاری اور زنا کاری کی زندگی ہے، ایسے گھر سے خیر وبرکت سب اٹھ جاتی ہے، خدا کا عذاب آنے کا خطرہ ہے

اوراس کے گھر میں نحوست اورنیستی پیدا ہوتی ہے؛اس لئے علاقہ کےلوگوں پرضروری ہے کہ دونوں کے درمیان علاحدگی پیدا کردیں اور حلالہ شرعی کے ساتھ رکھنے کا طریقہ بتلادیں، اگرنہ مانےتوپورےعلاقہ کےلوگ اس کا بائیکاٹ کر کےحقہ پانی بندکردیں شاید بازآجائے۔

فإن طلقها بعد الثنتين، فلا تحل له من بعد أي من بعد ذالك التطليق حتى تنكح زوجًا غيره أي تتزوج زوجًا غيره ويجامعها. (روح المعاني، زكريا ۲/۲۱۲، تحت تفسير رقم الآية ۲۳۰، من سورة البقرة)

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَان.

[مائده:۲] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفااللہ عنہ
۲۰؍ربیع الاول ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۹۸۹)

مطلقہ ثلثہ کوساتھ رکھنے والے سے قطع تعلق کرنا

سوال [۱۰۵۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص کی دس لڑکیاں ہیں، جن میں سے چھ لڑکیوں کی شادی ہوگئی،ان کی ایک سب سے بڑی لڑکی کو دومرتبہ طلاق مل چکی ہے بالکل صاف طریقے سے وہ پھردوبارہ بغیرکسی حلالہ کےاوربغیرکسی نکاح اوربغیرعدت گذارے اپنے شوہرکےساتھ رہنےلگی،اس بات کوتقریباً چھ سال گذرگئے،لڑکی کے والدین بھی اس بات کے بارے میں کسی طرح کی کوئی روک ٹوک نہیں کرتے اورخوب آنا جانا، کھانا پینا ہےاورکسی طرح کی کوئی ناراضگی بھی نہیں ہے،ایسی جگہ اپنی لڑکی کا رشتہ طے کرنے میں کوئی کراہت تونہیں ہے؟

المستفتی: حفیظ الرحمٰن، محلّہ بندوقچیاں، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر دومرتبہ طلاق سے مراد تین تین طلاقیں، دو مرتبہ دی گئی ہیں، تو دونوں کا بلاحلالہ ساتھ رہنا حرام کاری اور زنا کاری ہے، وہاں کے بااثر لوگوں پر لازم ہے کہ فوراً دونوں کے درمیان علیحدگیکرادیں اور باقاعدہ شرعی حلالہ کے بعد دونوں کے درمیان دوبارہ نکاح کروادیں۔

وإن کان الطلاق ثلثاً في الحرة وثنتین في الأمة لم تحل له حتی تنکح زوجًا غیره نکاحًا صحیحًا ویدخل بها، ثم یطلقها أو یموت عنها .

(هندیة، کتاب الطلاق، الباب السادس، زکریاجدید ۱/ ۵۳۵، قدیم ۱/ ۴۷۳)

اگر ماں باپ کی کمزوری ولاپرواہی سے طلاق شدہ لڑکی شوہر کے پاس رہ رہی ہے، تو ان کے ساتھ شادی بیاہ حقہ پانی کا سلسلہ بند کردیا جائے تو باز آجانے کی امید ہے، اور وہاں رشتہ نہ کرنا بہتر ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ .

[الهود: ۱۱۳] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹/ ۳۳۷۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۳/۲۶ھ

طلاق ثلاثہ کے بعد حلالہ کے بغیر ساتھ رہنے والے سے قطع تعلق کرنا

سوال [۱۰۵۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے لڑکے کی شادی ایسی لڑکی سے ہوئی ہے، جس کی بڑی بہن کو دومرتبہ تین تین طلاق تھوڑے تھوڑے دنوں کے وقفے کے بعد ہوئیں؛ لیکن وہ لڑکی بغیر عدت گذارے اپنے شوہر کے گھر چلی جاتی ہے نہ کوئی نکاح ہوتا ہے اور نہ کوئی حلالہ ہوتا ہے

اوراس کے ماں باپ بھی اس بات پرکوئی روک ٹوک نہیں کرتے اورخوب آپس میں آنا جانا رہتا ہےاور ہم بھی اپنی بہوکومنع کرتے ہیں کہ اپنی بہن کے گھر مت جایا کر؛ لیکن وہ نہیں مانتی، ایسی صورت میں بتایئے کہ ہمیں بھی اس لڑکی اوراس کے گھر والوں سےرشتہ توڑ دینا چاہئے یا نہیں اور ہم اپنی بہوکو کیسے سمجھائیں اوراگر ہماری بہو نہ مانے ،تواس کوکیا کرنا چاہئے، اس کو چھوڑ دیا جائے یانہیں؟

المستفتی: انیس الرحمٰن، مطیع الرحمٰن، مسجد منہاروں والی، چاہ شری، بجنور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کے بیٹے کوشرعی طور پر پوراحق ہے کہ اس کو وہاں جانے سے قطعاً منع کردے اوراگرشوہر کی بات نہ مان کر چلی جاتی ہے،تواس کواولاً طلاق وغیرہ کی دھمکی دی جائے، پھرنہ مانے تو صرف ایک طلاق دے،تین طلاق نہ دے۔ نیزاس کو مار پیٹ کربھی سمجھانے کاحق ہے۔

وَاللّٰاتِیُ تَخَافُوُنَ نُشُوُزَهُنَّ فَعِظُوُهُنَّ وَاهُجُرُوُهُنَّ فِیُ الْمَضَاجِعِ وَاضُرِبُوُهُنَّ فَاِنُ اَطَعُنَكُمُ فَلَا تَبْغُوُا عَلَيُهِنَّ سَبِيُلًا . [النساء: ٣٤]

وطلاق البدعة أن يطلقها ثلاثاً بكلمة واحدة أو ثلثاً في طهر واحد.

(هداية، كتاب الطلاق، باب طلاق السنة اشرفي ٢/ ٣٥٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفااللہ عنہ
۳ ر جمادی الاول ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹/ ۳۴۵۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۵/۳ھ

(۳) باب اللباس

اسلام میں ٹوپی پہننا کیسا ہے

سوال[۱۰۵۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اسلام میں ٹوپی پہننا کیسا ہے؟ نیز کیا کھانا کھاتے وقت بھی ٹوپی پہننا ضروری ہے؟

المستفتی: محمد طاہر، جامعہ شاہ ولی اللہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ٹوپی پہننا مسنون ہے، حضرات صحابہ کرام کے سروں پر چپٹی ہوئی ٹوپیاں ہوتی تھیں۔

عن أبي سعيد وهو عبد الله بن بسرؓ، قال: سمعت أبا كبشة الأنماري، يقول: كانت كمام أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم بطحا. (سنن الترمذي، باب بلاترجمة، النسخة الهندية ۱/ ۳۰۸، دار السلام رقم:۱۷۸۲، مشكوة المصابيح ۲/ ۳۷٤)

اور کھانا کھاتے وقت ٹوپی پہننا ضروری اور لازم نہیں، بغیر ٹوپی کھانے میں کوئی حرج نہیں۔

ولا بأس بالأكل متكئًا، أومكشف الرأس في المختار. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، زكريا ۹/ ٤۹۰، كراچي۶/ ۳۰٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ محرم الحرام ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۲۰۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/ ۱/ ۱۴۲۵ھ

ٹوپی پہننے کا ثبوت حدیث شریف سے

سوال [۱۰۵۵۳-۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ٹوپی اوڑھنا سنت ہے یا مستحب یا واجب؟ اگر سنت ہے تو کونسی؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

المستفتی: حافظ ایوب مسجد ہاتھی خانہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سر پر ٹوپی اوڑھنا سنت ہے اور معتبر حدیث سے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ٹوپی اوڑھنا ثابت ہے۔ حدیث کے الفاظ میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ یا حضرت عمرؓ نے آسمان کی طرف اس طرح سر اٹھایا کہ ٹوپی سر سے نیچے گر گئی اور اس حدیث شریف کو محدثین نے حسن کہا ہے۔ حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

عن أبي يزيد الخولاني، قال: سمعت فضالة بن عبيد يقول: سمعت عمر بن الخطاب يقول: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: الشهداء أربعة: رجل مؤمن جيد الإيمان لقي العدو فصدق الله فقتل، فذلک الذي ينظر الناس إليه هكذا ورفع رأسه حتى سقطت قلنسوة رسول الله صلى الله عليه وسلم أو قلنسوة عمر. والثاني: رجل مؤمن لقي العدو فكأنما يضرب ظهره بشوک الطلح، جاءه سهم غرب فقتله، فذلک في الدرجة الثانية. والثالث: رجل مؤمن خلط عملاً صالحاً و آخر سيئًا لقي العدو فصدق الله عزوجل حتى قتل فذلک في الدرجة الثالثة. الحديث. وقال المحشي اسناده حسن. (مسند أحمد بن حنبل، دار الحديث قاهرة ۱/ ۳۳۰-۳۳۱، رقم: ۱۵۰)

ورواه الترمذي وقال حديث حسن غريب. (ترمذي شريف، باب ما جاء في فضل الشهداء عند الله، النسخة الهندية ۱/ ۲۹٤، دار السلام رقم: ۱٦٤٤، مسند أبي داؤد الطيالسي، دار الكتب العلمية بيروت ۱/ ٤۰، رقم: ٤٥، مسند أبي يعلىٰ

الموصلي، دارالکتب العلمية بيروت ۱/۱۲۷-۱۲۸، رقم:۲۴۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ربیع الاول ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر:الف ۷۵۴۰/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۳/۴ھ

کیا حضور ﷺ کی ٹوپی گول تھی؟

سوال [۱۰۵۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے سوال کیا کہ کلاہ مدور یعنی گول ٹوپی رسول اللہ ﷺ نے استعمال نہیں کی، تو پھر حضور ﷺ نے کون سی ٹوپی استعمال کی؟

المستفتی: محمد عمیر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سنن الترمذی میں ایک حدیث شریف ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ گول ٹوپی استعمال فرمایا کرتے تھے۔

عن أبي سعيد وهو عبد الله بن بسرؓ، قال: سمعت أبا كبشة الأنماري، يقول: كانت كمام أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم بطحا. (سنن لترمذي، باب بلاترجمة، النسخة الهندية ۱/۳۰۸، دار السلام رقم: ۱۷۸۲، مشكوة المصابيح ۲/۳۷۴)

اس جگہ کمام بمعنی ٹوپی کے ہے، بطحاء بمعنی چپکی ہوئی ہونے کے ہیں، جب صحابہ کرامؓ کی ٹوپی کی صراحت اس طرح ہے، تو لامحالہ حضور ﷺ کے اس طرح ٹوپی استعمال کرنے کی وجہ سے صحابہ بھی استعمال کرتے رہے ہوں گے، اور سر سے چپکی ہوئی جب ہی ہوسکتی ہے کہ جب گول ہو۔ نیز حضور ﷺ کے پاس ایک ٹوپی سفر کی الگ بھی تھی، جس کو سترہ بنا کر نماز بھی پڑھ لیتے تھے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۴/۱۷۰، جدید ڈابھیل ۱۸/۲۹۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ذی قعدہ ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر:الف ۳۶۸۸/۳۱)

اسلامی ٹوپی کیسی ہو اور حضور ﷺ کی ٹوپی کیسی تھی؟

سوال [۱۰۵۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اسلامی ٹوپی کونسی ٹوپی کو کہا جائے گا، حضرت نبی کریم ﷺ کی ٹوپی کس نمونہ کی تھی سر سے اوپر اٹھی ہوئی یا سر سے لگی ہوئی گول یا لمبی؟

المستفتی: مہربان علی، بڑوتوی، مدرسہ عربیہ امداد الاسلام، ہرسولی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضور اقدس ﷺ کی ٹوپی سر سے چپٹی ہوئی تھی اوپر کو اٹھی ہوئی نہیں تھی؛ البتہ حضور ﷺ کی سفر کی ٹوپی بال دار تھی اور حضرات صحابہ کرام کی ٹوپیاں سر سے چپٹی ہوئی تھیں، اوپر کو اٹھی ہوئی نہیں تھیں۔ (مستفاد: نبوی لیل ونہار معہ خصائل نبوی ۳۴۰، فتاوی محمودیہ قدیم ۵/ ۱۰۹، جدید ڈابھیل ۱۹/ ۲۹۶)

بطحا جمع بطحاء أي مبسوطة على رؤسهم ولازقة على رؤسهم غير مرتفعة عنها. (حاشية مشكوة ۲/ ۳۷٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ جمادی الثانیہ ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/ ۱۲۸۹)

اکابر دار العلوم دیوبند کی ٹوپیاں کیسی تھیں؟

سوال [۱۰۵۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ، مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ، حکیم الأمت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ، مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن

صاحب دیوبندی اور دیگرا کابرین کی ٹوپی کس نمونہ کی ہوتی تھیں؟

المستفتی: مہربان علی، بڑوتوی، مدرسہ عربیہ امداد الاسلام، ہرسولی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی ٹوپی کے بارے میں تحقیق نہ ہوسکی، حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ کی ٹوپی معلوم کرنے کے لئے احقر نے بذات خود حضرت مولانا اسلم صاحب سے ملاقات کی ہے، ان کے یہاں حضرت نانوتویؒ کی ایک ٹوپی تھی، جو گول تھی البتہ بالکل بیچ میں ذراسی نوک نما تھی، جو فی الحال مولانا حامد الانصاری غازی کی اہلیہ کے پاس موجود ہے، حضرت تھانویؒ کی ٹوپی گول تھی، جو اس وقت حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب مدظلہ کے متعلقین خاص طریقے سے استعمال کرتے ہیں، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کی ٹوپی کے متعلق معلومات زیادہ محقق طریقے سے حضرت اقدس مفتی محمود حسن صاحب مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند سے ہوسکتی ہے؛ لیکن فی الحال وہ افریقہ تشریف لے گئے ہیں، تاہم دوسرے اکابر سے معلوم ہوا کہ وہی ٹوپی استعمال کرتے تھے، جو حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب قدس سرہ استعمال کیا کرتے تھے اور حضرت شیخ الحدیث صاحب کی ٹوپی احقر نے اپنی آنکھ سے دیکھی ہے کہ گول ٹوپی پہنتے تھے، کسی زمانے میں جالی دار ٹوپی بھی استعمال کرتے تھے؛ کیونکہ سر میں زیادہ گرمی رہتی تھی، حضرت مولانا الیاس صاحب کی ٹوپی کے بارے میں ان کے صحبت یافتہ جناب فریدی صاحب مرادآبادی مدظلہ سے معلوم کیا گیا، انہوں نے بتلایا کہ کبھی گول ٹوپی استعمال کرتے تھے اور کبھی کبھی دو پلی ٹوپی استعمال کرتے تھے، جو اس وقت عام اکابر علماء استعمال کرتے ہیں، حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کی ٹوپی کھدّر کی معتدل انداز میں دو پلی تھی، شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی کی ٹوپی کے سلسلہ میں ان کے خاندان ودیگر اکابر علماء سے معلوم کیا گیا ہے کہ حضرت کی ٹوپی گول تھی؛ لیکن بیچ میں چندیا ہوتی تھی

اور دیگر اکابر علماء کی ٹوپی جو احقر نے دیکھی ہے گول یا دوپلی ہوتی تھی اس کے علاوہ کوئی دوسری ڈیزائن کی ٹوپی اکابر نہیں استعمال کرتے تھے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ جمادی الثانیہ ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴؍ ۱۲۸۹)

دیوبندی ٹوپی سے متعلق چند سوال وجواب

سوال [۱۰۵۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جس چنٹ والی اور چونچ دار ٹوپی کو آج کل دیوبندی ٹوپی کہا جاتا ہے، اس کی اصل کیا ہے اور اس کا موجد کون ہے؟ اس کے متعلق زیادہ روشنی کی ضرورت ہے۔

الف: کیا یہ ٹوپی سنت کے مطابق ہے؟

ب: کیا ہمارے اسلاف اور موجود اکابر نے اس کو اختیار اور پسند فرمایا ہے؟

ج: اگر اکابر نے اس کو اختیار نہیں فرمایا، تو آخر کیوں؟ اس کی وجہ کیا ہے؟

د: کیا اس ٹوپی کو قاسمی ٹوپی کہنا صحیح ہے؟

ہ: بعض لوگ اس کو فیشنی ٹوپی کہتے ہیں، ایسے لوگوں کا یہ خیال کیسا ہے؟

امید ہے کہ آنجناب سوال کے ہر ہر جزء کو منقح فرما کر ہدایت اور رہنمائی فرمائیں گے۔

المستفتی: مہربان علی، بڑوتوی، مدرسہ عربیہ امداد الاسلام، ہرسولی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: چونچ دار ٹوپی جو اس زمانے میں دیوبندی ٹوپی سے موسوم ہے، اس کا استعمال کرنا اگرچہ حرام یا مکروہ نہیں ہے؛ لیکن یہ اکابر علماء دیوبند کی ٹوپی نہیں ہے، اس کے اصل موجد اور بانی کے بارے میں احقر کو علم نہیں ہے؛ البتہ دیوبند کی طرف منسوب ہونے کی علت احقر کو پوری طرح معلوم ہے کہ ہندوستان کے مختلف خطوں

سے طلبہ داخلہ لینے کے لئے دیوبند آتے تھے، جیسا کہ اب بھی آتے ہیں، ان میں بعض طلبہ اپنے علاقے سے چونچ دار ٹوپی پہن کر آتے تھے، دیکھا دیکھی دوسرے طلبہ نے بھی شوقیہ استعمال کرنا شروع کردی تھی، اور اپنے ساتھیوں کے ذریعہ سے منگوایا کرتے تھے، آخر میں طلبہ کے درمیان اس کا رواج چل پڑا، پھر راقم الحروف کے طالب علمی کے زمانہ میں ایک صاحب بنام ہدایت اللہ صاحب نے کہیں سے یہ ٹوپی دارالعلوم دیوبند کے صدر گیٹ کے سامنے فروخت کرنا شروع کردی، رفتہ رفتہ انہوں نے اپنے گھر بھی بنانا شروع کردی اور ضلع سہارنپور، میرٹھ، مظفر نگر، وغیرہ قرب وجوار کے علاقہ میں کہیں بھی یہ ٹوپی دستیاب نہیں ہوتی تھی اور قرب و جوار کے طلبہ جناب ہدایت اللہ صاحب سے چونچ دار ٹوپی لے کر گھر جاتے تھے، دیکھا دیکھی اطراف کے لوگوں نے بھی اپنے لئے دیوبند سے یہ ٹوپی منگوانا شروع کردی، رفتہ رفتہ عام لوگ اس ٹوپی کو دیوبند سے دیوبندی ٹوپی کے نام سے منگوانے لگے، جب یہ ٹوپی اس طرح چالو ہوگئی تو دوکاندار قاری عبدالرحیم صاحب وغیرہ نے بھی اس کا سلسلہ جاری کردیا، اس طرح دیوبند میں ملنے کی وجہ سے دیوبندی ٹوپی سے موسوم ہوگئی ہے، ورنہ اکابر واساتذہ دارالعلوم سے اس ٹوپی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

الف: اگرچہ یہ حضور ﷺ وصحابہؓ کی ٹوپی نہیں ہے؛ لیکن کفار کے شعار نہ ہونے کی وجہ سے ناجائز بھی نہیں ہے۔

ب/ ج: اکابر نے اسلئے اختیار نہیں فرمایا کہ یہ ٹوپی حضرت گنگوہیؒ، وحضرت نانوتویؒ کے زمانہ میں نہیں تھی اور بعد کے اکابر انہیں کے پیروکار تھے، نیز اخیر کے اکابر اپنے متعلقین و طلبہ کو اس ٹوپی کے استعمال کرنے سے اس لئے منع کرتے ہیں کہ یہ اکابر اسلاف کی ٹوپی نہیں ہے اور یہ ممانعت ناجائز ہونے کی وجہ سے نہیں ہے؛ بلکہ از قبیلِ تربیت واکابر کے لباس کے عادی بنانے کے لئے ہے۔

ج: اس کو قاسمی ٹوپی کہنا غلط ہے، حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ کی ٹوپی اب بھی

حامدالانصاری غازی کے یہاں موجود ہے، جس کو تحقیق کرنا ہوا خود جا کر دیکھ لے۔

۵: اس کو فیشنی ٹوپی اس لئے کہتے ہیں کہ اکابر نے اس کو اپنایا نہیں ہے۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفااللہ عنہ
۲۳؍ جمادی الثانیہ ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۲۸۹/۲۴)

گول ٹوپی اور لمبی ٹوپی کا ثبوت

سوال [۱۰۵۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ گول ٹوپی اور لمبی ٹوپی کے بارے میں ہمارے یہاں شدید تنازع ہے، بعض کہتے ہے کہ نبی علیہ السلام سے صرف گول ٹوپی پہننا ثابت ہے، لمبی ٹوپی یہ دیوبندی ایجاد شدہ ہے شرعًا اس کا ثبوت نہیں ہے، مخالفین حضرات کہتے ہے کہ اس کا ثبوت اگر چہ صراحۃً حضور علیہ السلام سے نہیں ہے، مگر دلالۃً ثابت ہے۔

نیز تعامل اسلاف دونوں ہے؛ اس لئے اس کی گنجائش ہے؛ لیکن گول ٹوپی پہننا افضل ہے، تو کیا یہ فریقین کا نظریہ درست ہے؟

نیز لمبی ٹوپی کے بارے میں کوئی روایت موجود ہو تو حوالہ دے کر ہم دیوبندیوں کو مطمئن کریں؟

المستفتی: محمد عبدالرحمٰن، ۲۴؍ پرگنوی، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چپکی ہوئی گول ٹوپی پہننا حضور ﷺ اور بعض صحابہ کرام سے ثابت ہے، نیز اکابر صلحاء واسلاف کا بھی معمول یہی رہا ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۳۰۳/۱۷، جدید ڈابھیل ۲۹۸/۱۹، لیل ونہار خصائل نبوی ۳۴۰)

عن أبي سعيد وهو عبد الله بن بسر رضي الله عنه**، قال: سمعت أباكبشة الأنماري،**

یقول: کانت کمام أصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم بطحا. (سنن الترمذي، باب بلاترجمة، النسخة الهندیة ۱/۳۰۸، دار السلام رقم:۱۷۸۲، مشکوۃ المصابیح ۲/۳۷٤)

کمام أصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم، هي جمع کمة القلنسوة المدورة سمیت بها؛ لأنها تغطي الرأس، وبطحاء، معناه أنها کانت مبسوطة لازقة برؤوسهم غیر مرتفعة عنها. (شرح الطیبي، کتاب اللباس، الفصل الثاني، کراچي ۸/۲۱۵، تحت رقم الحدیث:٤٣٣٣)

بطحا جمع بطحاء وهي القلنسوة المدورة؛ أي کانت مبسوطه علی رؤسهم لازقة غیر مرتفعة عنها. (مرقات، کتاب اللباس، الفصل الثاني، امدادیة ملتان ۸/۲٤٦)

لمبی دو پلی ٹوپی بھی بعض اکابر اسلاف سے ثابت ہے؛ لیکن حضور ﷺ یا صحابہ کرامؓ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا اور لمبی نوک والی ٹوپیاں جو دیوبندی اور گاندھی کی ٹوپی سے مشہور ہے، یہ نہ تو حضور ﷺ سے ثابت ہے اور نہ ہی اسلاف اکابر دیوبند کی ٹوپی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۰؍ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/۶۵۵۸)	۱۴۲۱/۳/۲۰ھ

کن کن اوقات میں ٹوپی پہننا مسنون ہے؟

سوال [۱۰۵۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کھانا کھاتے وقت ٹوپی پہننا سنت ہے یا نہیں؟ یا پھر ہر وقت ٹوپی پہننا سنت ہے یا بعض اوقات میں نہ پہننے کی گنجائش ہے، جیسے پیشاب پاخانہ وغیرہ کے وقت۔

المستفتی: محمد اطہر جاوید

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عام حالات میں سر پر ٹوپی رکھنا مستحب ہے اور عمومیت میں کھانا بھی شامل ہے، اور بلا ٹوپی کھانا کھانا بلا کراہت جائز ہے، لہٰذا سر پر ٹوپی

رکھنا صرف آداب طعام میں سے ہوسکتا ہے، اور ٹوپی سر پر نہ رکھ کر کھانا خلاف سنت یا مکروہ نہ ہوگا، البتہ بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت سر پر ٹوپی رکھنا فقہاء نے مستحب لکھا ہے۔

وإذا أراد دخول الخلاء يستحب له أن يدخل بثوب (إلى قوله) ويدخل مستور الرأس. (هنديه، كتاب الطهارة، الباب السابع، الاستنجاء علىٰ خمسة أوجه، زكريا قديم، ١/ ٥٠، جديد، ١/ ١٠٦، حاشيه الطحطاوى على مراقى الفلاح، دارالكتاب ديوبند ١/ ٥١)

ولا بأس بالأكل مكشوف الرأس وهو المختار. (عالمگيرى: كتاب الكراهيه الباب الحادى عشر فى الكراهة فى الاكل وما يتصل به، زكريا قديم، ٥/ ٣٣٧، جديد: ٥/ ٣٩١، شامى زكريا: ٩/ ٤٩٠، كراچى: ٦/ ٣٤٠)

اور کبھی ضرورت کی وجہ سے ٹوپی سر پر نہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں، مگر مجمع یا بازاروں اور سڑکوں پر ننگے سر پھرنا خلاف سنت ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۷ رصفر المظفر ۱۴۱۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۴۳۵۸)	۱۴۱٦/۲/۲۹ھ

عام حالات ومجالس میں ٹوپی پہننے کا حکم

سوال [۱۰۵٦۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عام مجلس اور عام حالات میں ٹوپی پہننا کیا حکم رکھتا ہے، کیا بغیر ٹوپی کے بازاروں میں گھومنا شرعاً منع اور گناہ ہے؟ یا ننگے سر رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں؟

المستفتی: مہربان علی، بڑوتوں، مدرسہ عربیہ امداد الاسلام ہرسولی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عام حالات اور عام مجلس میں ٹوپی پہنے رہنا مسنون ہے، ننگے سر بازار میں گھومنا فساق کا طریقہ ہونے کی وجہ سے علماء نے مکروہ لکھا ہے:

البتہ کسی عذر یا بے خیالی کی وجہ سے سر پر ٹوپی نہ رہے، تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۴۲/۵، جدید ڈابھیل ۳۰۶/۱۹)

ویکرہ کشف الرأس بین الناس. (غنیة الطالبین مترجم ۴۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ جمادی الثانیہ ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۲۸۹/۲۴)

بلا عذر عام حالات میں ننگے سر رہنا

سوال [۱۰۵۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک فاضل دار العلوم جو مانگ نکال کر بغیر ٹوپی پہنے ہوئے گھومتا پھرتا ہے، ان سے یہ کہنے پر کہ سنت نبوی سے کیوں بھاگتے ہو؟ جواب دیتے ہیں کہ ابھی جوان ہوں، شرعاً یہ عالم کس امر کے مرتکب ہوئے؟ مفصل تحریر فرمائیں۔ ننگے سر پھرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالرحمٰن، دربھنگہ، متعلم مدرسہ شاہی مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عام حالات میں بلا عذر ننگے سر گھومنا فساق کا طریقہ ہے؛ اس لئے علماء نے ننگے سر گھومنے کو مکروہ لکھا ہے اور خاص طور پر فاضل دار العلوم کے لئے تو یہ حرکت ہرگز درست نہیں ہوسکتی، جوانوں کو اللہ تعالی نے مرفوع القلم قرار نہیں دیا ہے؛ ہاں جو جوان مجنون اور پاگل ہے، وہ مستثنیٰ ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۴۲/۵ اجدید ڈابھیل ۳۰۶/۱۹، فتاوی رحیمیہ قدیم ۲۵۱/۶، جدید زکریا ۱۵۵/۱۱-۱۵۶)

ویکرہ کشف الرأس بین الناس. (غنیة الطالبین مترجم ۴۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۵۷۸/۲۵)

گنبد خضریٰ یا غلاف کعبہ کے رنگ کی ٹوپی پہننا

سوال [۱۰۵۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ گنبد خضریٰ کی نسبت سے یا غلاف کعبہ کی نسبت سے اپنی ٹوپی کو اس کے رنگ کے مطابق پسند کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالحفیظ، کرولہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گنبد خضریٰ کی نسبت سے یا غلاف کعبہ کی نسبت سے اپنی ٹوپی کو اس کے رنگ کے مشابہ کوئی شخص پسند کرتا ہے، وہ اس شخص کی اپنی ذاتی عقیدت کی بات ہے، اس کو اختیار ہے کہ اس رنگ کی ٹوپی استعمال کرے، مگر یہ ایسی شرعی بات نہیں، جو عامۃ المسلمین کے لئے لائحہ عمل ہو، عامۃ المسلمین کے لئے قابل عمل وہی ہے، جس کو حضرت سید الکونین علیہ السلام نے پسند فرما کر ترغیب دی اور وہ سفید لباس ہے، آپ ﷺ نے سفید لباس کو پسند فرمایا اور اس کی ترغیب دی ہے؛ اس لئے لباس کے اعتبار سے اس شخص کا عمل زیادہ بہتر ہے، جس نے حضرت سید الکونین علیہ السلام کے پسند کے مطابق سفید لباس اختیار کر رکھا ہو کرتا بھی سفید ہو پائجامہ بھی سفید ہو اور ٹوپی بھی سفید ہو۔ حدیث شریف ملاحظہ ہو۔

عن ابن عباسؓ، قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: بالبياض من الثياب ليلبسها أحياكم و كفنوا فيهاموتاكم، فإنها من خيار ثيابكم، وعن سمرة جندبؓ، قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه علية وسلم: البسوا البياض، فإنها أطهر وأطيب، وكفنوا فيهاموتاكم. (شمائل ترمذي٥)

عن ابن عمرؓ، أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: كان يلبس قلنسوة

بيضاء. (شعب الإيمان للبيهقي، فصل في العمائم، دار الكتب العلمية بيروت ٥/١٧٥، رقم: ٦٢٥٩، مجمع الزوائد، دار الكتب العلمية بيروت ٥/١٢١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ ذی قعدہ ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹؍ ۱۰۸۱۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۵؍ ۱۱؍ ۱۴۳۳ھ

کسی قوم سے مشابہت کا مطلب

سوال [۱۰۵۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حدیث **من تشبه بقوم فهو منهم** کا کیا مطلب ہے؟ نیز اسلامی معاشرہ کی حقیقت اور اہمیت کیا ہے؟ اس کے تحفظ کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: عبد الحق، نورتھ، ۲۴؍ پرگھنہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مذکورہ حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شرفاء کی خصوصیات اور طور وطریق اور حلیہ لباس وغیرہ کو اختیار کرکے شرفاء کے مشابہ بنتا ہے، تو وہ عند اللہ شرفاء کے زمرہ میں شامل ہوگا اور اگر کوئی فساق یا کفار کی خصوصیات اور طور وطریق حلیہ لباس وغیرہ اختیار کرتا ہے اور انہیں سے مشابہت اختیار کرتا ہے، تو عند اللہ وہ فساق یا کفار کے زمرہ میں شامل ہوگا۔

عن ابن عمرؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من تشبه بقوم فهو منهم. (سنن أبي داؤد، كتاب اللباس، باب في لبس الشهرة ٢/٥٥٩، دارالسلام رقم: ٤٠٣١، منسد البزار، مكتبه العلوم و الحكم ٧/٣٦٨، رقم: ٢٩٦٦)

من شبه نفسه بالكفار، مثلاً في اللباس وغيره، أو بالفساق، أوالفجار، أو بأهل التصوف، والصلحاء الأبرار فهو منهم أي في الإثم والخير. (مرقاة

المفاتيح، كتاب اللباس،الفصل الثاني، مكتبه امدادياملتان ٨ /٢٥٥، شرح الطيبي، كراجي ٢١٩/٨، تحت رقم الحديث ٤٣٤٧،عون المعبود، دار الكتاب العربي بيروت ٤ /٧٨)

اسلامی معاشرہ کی اہمیت اور اس کا تحفظ حکماً فرض کفایہ ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵؍۱۴۵۴)

مسنون لباس

سوال [۱۰۵۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اسلام میں لباس کی کوئی تعیین ہے یا نہیں؟ شرعی لباس کونسا ہے؟ اور مسنون لباس کونسا ہے۔ نیز لباس شریعت اور لباس سنت ایک ہیں یا ان میں کچھ فرق ہے،؟ نیز پینٹ شرٹ پہننا کیسا ہے؟ کیا اس میں غیروں کے ساتھ تشبہ لازم آتا ہے یا نہیں؟ جبکہ اس میں ابتلائے عام ہے؟ کیا ابتلائے عام کی وجہ سے تشبہ ختم ہوجاتا ہے؟ اگر ہوجاتا ہے تو پھر دوسری چیزوں میں بھی تشبہ نہ رہنا چاہئے، جیسے کی ڈاڑھی کٹوانا وغیرہ۔ نیز یہ بھی بتلائیں کہ تشبہ کس وقت لازم آتا ہے، اور کس وقت نہیں یعنی تشبہ کی مقدار اور اس کی حد کیا ہے، ان تمام سوالات کے جوابات عنایت فرماکر شکریہ کا موقع دیں۔

المستفتی: ڈاکٹر محمد زبیر، بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جولباس مسنون لباس ہے، یعنی حضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہ کا لباس وہ یقینی طور پر شرعی لباس ہے، اسے مسنون لباس بھی کہا جاسکتا ہے۔ اور شرعی لباس بھی کہا جاسکتا ہے، اور ہر ملک کے جو صلحاء کا لباس ہے اور وہ فساق وفجار اور غیروں کے لباس کے مشابہ نہیں ہے، اسے اگرچہ مسنون لباس نہ کہا جائے، مگر وہ بھی شرعی

لباس کے دائرے میں داخل ہے؛ لہٰذا ہندوستان کے علماء وصلحاء کے لباس شرعی لباس کے دائرے میں داخل ہیں، پینٹ شرٹ صلحاء کا لباس نہیں ہے، اگر چہ غیروں کی مشابہت نہ کہا جائے، تب بھی یہ شرعی لباس کے دائرے میں داخل نہیں ہے، نیز آج کل کے زمانے میں پینٹ، شرٹ کی شکل میں ''جینس'' کے نام سے جو زیادہ چل رہی ہے، وہ قطعی طور پر فساق کا لباس ہے، جو مسلمانون کے گھر گھر عام ہو چکا ہے، مردوں کے لئے اس لباس کا پہننا مکروہ تحریمی ہے، اور عورتوں کے لئے اس کا پہننا حرام ہے؛ اسلئے کہ اس سے ان کے بدن کی بناوٹ مکمل نظر آتی ہے، یہ لباس انگریزوں سے شروع ہوکر پوری دنیا میں عام ہو چکا ہے، اگر چہ آج کے زمانے میں اس کو کسی قوم کا لباس نہ کہا جائے، پھر بھی جب عورتیں اور لڑکیاں پہنتی ہیں، وہ مردوں کے مشابہ بن جاتی ہیں، اور عورتوں کے لئے ایسا لباس پہننا جس میں مردوں کی مشابہت آتی ہو حرام ہے۔ (مستفاد: محمود یہ ڈابھیل ۱۹/ ۲۵۵، فتاوی رحیمیہ زکریا ۱۰/ ۱۵۶)

عن أبي بردة رضي الله عنه، قال: أخرجت إلينا عائشة رضي الله عنها، كساءً ملبدًا، وإزارا غليظاً، فقالت: قبض روح رسول الله صلى الله عليه وسلم: في هذين. (شمائل ترمذي۸)

عن أم سلمة قالت: كان أحب الثياب إلي رسول الله صلى الله عليه وسلم يلبسه القميص. (شمائل ترمذر٥)

قال القاري أي من شبه نفسه بالكفار مثلا في اللباس وغيره، أو بالفساق، أو الفجار، أوبأهل التصوف، والصلحاء الأبرار، فهو منهم أي في الإثم، والخير عند الله تعالى. (مرقاة المفاتيح، كتاب اللباس، الفصل الثاني، امدادية ملتان ٨/ ٢٥٥)

عن أبي هريرة رضي الله عنه، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: صنفان من أهل النار لم أرهما، قوم معهم سياط كأذناب البقر يضربون بها الناس، ونساء كاسيات عاريات مميلات مائلات رؤسهن كأسنمة البخت المائلة لا يدخلن الجنة، ولا يجدن ريحها، وإن ريحها ليوجد من مسيرة

کذا و کذا. (مسلم شریف، باب النساء الکاسیات العاریات المائلات المميلات،النسخة الهندية ۲/ ۲۰۵، بيت الأفكار رقم:۲۱۲۸)

نیز داڑھی کٹوانے کو ابتلاء عام کہہ کر جواز کے دائرہ میں لانے کی فکر کرنا غلط ہے، داڑھی اسلام کا اہم ترین شعار ہے؛ اس لئے اس کا منڈوانا اور ایک مشت سے کم کرکے کٹوانا دونوں حرام ہیں، اس کا تشبہ سے کوئی تعلق نہیں ہے؛ کیونکہ اگر سکھ داڑھی رکھتے ہیں، تو مسلمانوں کے داڑھی رکھنے کو سکھوں کے ساتھ مشابہ قرار نہیں دیا جائے گا؛ بلکہ داڑھی رکھنا اسلام کا ایک مستقل شعار ہے۔

عن ابن عمرؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: خالفوا المشركين أحفوا الشوارب وأوفوا اللحي. (مسلم شريف، باب خصال الفطرة، النسخة الهندية ۱/ ۱۲۹، بيت الأفكار رقم: ۲۵۹)

عن عائشةؓ، قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: عشر من الفطرة قص الشارب، وإعفاء اللحية. (مسلم شريف، باب خصال الفطرة،النسخةالهندية ۱/ ۱۲۹، بيت الأفكار رقم: ۲۶۱)

ويحرم على الرجل قطع لحيته. (الدر المختار مع الشامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ۹/ ۵۸۳، كراچي ۶/ ۴۰۷)

وأما الأخذ منها أي من اللحية وهي دون ذلك كما يفعله بعض المغاربة ومخنثة الرجال، فلم يبحه أحد وأخذ كلها فعل يهود الهند ومجوس الأعاجم. (الدر المختار مع الشامي، مطلب في الأخذ من اللحية زكريا ۳/ ۳۹۸، كراچي ۲/ ۴۱۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱ر صفر المظفر ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۸۷۰/۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۲/۴ھ

ٹائی باندھنا

سوال[۱۰۵۶۵]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل عام طور پر مسلمانوں کو گلے میں ٹائی باندھے ہوئے دیکھا جاتا ہے، خاص طور پر شادی کے موقعہ پر دولہا کے بھی کوٹ پینٹ کے ساتھ گلے میں ٹائی باندھی جاتی ہے، چاہے دولہا ان پڑھ ہی کیوں نہ ہو، کچھ دن پہلے مجھ کو ایک مولوی صاحب نے بتایا تھا کہ ٹائی نہ باندھا کروں؛ کیونکہ مسلمانوں کو ٹائی باندھنا حرام ہے؛ لہٰذا آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا ایک مسلمان کو ٹائی باندھنا حرام ہے؟ ٹائی کے سلسلہ میں شرعی حکم کیا ہے اور یہ بھی بتائیں کہ ٹائی باندھ کر دولہا کا نکاح کرنا درست ہے یا نہیں؟

ہم لوگ اس کا کاروبار کرتے ہیں، تو کیا ایسی حالت میں کاروبار سے ہوئی آمدنی حرام نہیں ہوگی؟

المستفتی: سیدنوشادعلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفیق: ٹائی باندھنا اغیار کا شعار ہونے کی وجہ سے ناجائز اور ممنوع ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۴۲۹/۳، فتاوی محمودیہ قدیم ۴۰۸/۱۲، جدید ڈابھیل ۲۸۹/۱۹)

اور ٹائی کے استعمال کی قباحت الگ چیز ہے، اور نکاح کا حکم اس سے الگ دوسری چیز ہے؛ اس لئے ٹائی باندھنے کی وجہ سے عقد نکاح کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

نیز کاروبار سے ہونے والی آمدنی بالکل پاک صاف اور حلال ہے، اس میں خرابی کی کوئی علت موجود نہیں ہے، بشرطیکہ کاروبار میں سودی لین دین نہ ہو۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍شعبان المعظم ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵۷۶/۳۱)

ٹائی باندھنا

سوال [۱۰۵٦٦]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل اسکولوں میں جو پہناوا چل رہا ہے، اور گلے میں جو ٹائی لگائی جاتی ہے، تو کیا یہ صحیح ہے؟ اس کے بغیر بچہ کو اسکول میں داخل نہیں کرتے ہیں، میری ایک بچی آدم جو اسکول میں پڑھتی ہے اور اس اسکول میں عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی ہے، ہم نے اپنی بچی کے گلے میں ٹائی نہ لگا کر اسکول بھیجا تو انہوں نے پڑھانے سے انکار کردیا، تو کیا ایسی صورت میں ٹائی لگا کر بھیج سکتے ہیں؟ دلائل اور وضاحت کے ساتھ جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: عتیق الرحمٰن، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ٹائی یہ نصاریٰ اور غیروں کا طریقہ اور شعار ہے؛ لیکن چونکہ آج کل اسکولوں میں ٹائی باندھنے کو لازمی قرار دیا گیا ہے؛ اس لئے صرف ضرورت کی بنیاد پر ٹائی باندھنے کی اجازت ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۲/۴۰۸، جدید ڈابھیل ۱۹/۲۸۹)

الأمور بمقاصدها يعني أن الحكم الذي يترتب على أمر يكون على مقتضى ماهو المقصود من ذلك الأمر. (قواعد الفقه، اشرفي ٦٢، رقم القاعدة ٥١)

الضرورات تتقدر بقدرها. (قواعد الفقه، اشرفي ٨٩، رقم: القاعدة ١٧١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ ذی قعدہ ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ٦۹۴۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۱۱/۱۲ھ

کلی دار کرتا

سوال [۱۰۵۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کلی دار کرتا اور بغیر کلی دار کرتے کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟ طلباء اور علماء کو کس طرح کا کرتا پہننا چاہئے؟

المستفتی: محمد ریاض الدین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کلی دار کرتا اور غیر کلی دار دونوں طرح کا کرتا پہننا شرعاً جائز ہے؛ لیکن ہمارے اکابر نے کلی دار کرتے کو اپنایا ہے اور بغیر کلی دار کرتا اکابر نہیں پہنتے تھے۔ نیز پنجابی سوٹ اکابر کا لباس نہیں ہے؛ اس لئے طلباء علماء کے لئے کلی دار کرتا پہننا بہتر اور مستحسن ہے اور بغیر کلی دار کرتا مشائخ علماء کے علاوہ عام لوگ استعمال کرتے ہیں؛ اس لئے وہ عوام کا لباس شمار ہوتا ہے اور کلی دار کرتا علماء اور صلحاء کا لباس سمجھا جاتا ہے۔

الناس يعرف باللباس. (مفيد الطالبين ٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ رمحرم الحرام ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۶۷۱)

نصف ساق یا ٹخنوں تک کرتا پہننے کا حکم

سوال [۱۰۵۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نصف ساق تک کرتا پہننا سنت ہے یا افضل ہے؟

ب: پائجامہ نصف ساق تک سنت ہے یا ٹخنوں تک سنت ہے؟ اگر ٹخنوں تک سنت ہے، تو نصف ساق تک کو کیا کہا جائے گا؟

المستفتی: حاجی سردار خاں سنگمیر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: نصف ساق تک کرتا پہننا سنن عادیہ میں داخل ہے اور مستحب وافضل ہے بنیت اتباع اختیار کرنے میں ثواب ملے گا، ترک کرنے میں ثواب سے محرومی ہوگی اور ٹخنوں تک کرتا پہننا بھی بلا کراہت جائز ہے۔

عن العلاء بن عبدالرحمن عن أبيه أنه قال: سألت: أبا سعيد الخدري، عن الإزار؟ فقال: أنا أخبرك بعلم من رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إزارة المؤمن إلى أنصاف ساقيه، لا جناح عليه فيما بينه، وبين الكعبين، وما أسفل من ذلك ففي النار، لا ينظر الله يوم القيامة إلي من جر إزاره بطراً.

(مؤطا امام مالك، ماجاء في اسبال الرجل٣٦٧، اعظمي رقم: ٣٣٩٠، سنن ابن ماجه، باب موضع الإزار أين هو،النسخة الهندية ٢/٢٥٥، دار السلام رقم: ٣٥٧٣، مسند أحمد بن حنبل ٣/٥/ رقم: ١١٠٢٣،مسندأبي يعلي الموصلي، دار الكتب اللعلمية بيروت ١/٤٢٤-٤٢٥، رقم:٩٧٦)

قال صاحب البذل: المستحب إلي نصف الساقين والجائز بلاكراهة إلي الكعبين (إلى قوله) ما قال: رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى نصف الساق، أو الكعبين في الإزار من الرخصة، وما قال في أسفل منهما من النهي فهو في القميص وغيره من الثياب. (بذل المجهود، كتاب اللباس، باب في قدر موضع الإزار، دار البشائر الإسلامية ١٢/١٢٥تا١٢٧، سهارن پور قديم ٥/٥٧، تحت رقم الحديث ٤٠٩٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/۷۹۶۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/۳/۱۴۲۴ھ

ٹخنوں سے نیچے کپڑا پہننے کا حکم

سوال [۱۰۵۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کوئی شخص ٹخنہ کے نیچے تک کپڑا پہنتا ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ کیا میں کوئی فیشن میں پہنتا ہوں؟ فیشن سے ہو یا ایسے ہی ہو کیا یہ صحیح ہے؟

المستفتی: محمد بدرالدین، مسجد میدان والی، محلّہ رفعت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: دونوں صورت میں ناجائز ہے، صورت اولیٰ میں حرام صورت ثانیہ میں مکروہ تحریمی ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱۲۲/۴)

عن أبي هريرة رضـ**، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا ينظر الله يوم القيام إلى من جر إزاره بطراً.** (صحيح البخاري، باب جر ثوبه من الخيلاء، النسخة الهندية ۲/ ۸٦١، رقم: ٥٥٦٠ ف:٥٧٨٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۴۵/۲۳)

ٹخنے کے نیچے لنگی یا پائے جامہ پہننا

سوال [۱۰۵۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک مسجد میں چارٹ نظر سے گذرا جس میں نماز کے علاوہ بھی ٹخنے (پیروں) ڈھکنا منع لکھا تھا، اگر یہ ممانعت درجہ کراہت تک ہے، تو بھی مستقل مکروہ فعل باعث قباحت ہے اور اگر خلاف سنت ہے، تو اور بھی زیادہ قابل ترک ہے، اور اگر خلاف واجب وفرض ہے تو عین حرام ہوگا؛ کیونکہ بندہ ناکارہ پتلون وغیرہ پہنتا ہے اور تقریباً

۱۴ سے ۱۶ رگھنٹے اسی حال میں گذر تے ہیں؛ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں مسئلہ شرعی معلوم کر کے ضروری اقدام کیا جاوے؛ کیونکہ حرام لباس حرام کمائی غرض ہر حرام عبادات کو غیر مقبول اور دعا کو بھی غیر مقبول بنا دیتے ہیں؛ جبکہ دعا مؤمن کا ہتھیار اور عبادت کا مغز ہے اور عبادت دعا کو مقبول بنانے کے واسطے ہی کی جاتی ہے، تو جناب والا سے بصد احترام درخواست ہے کہ اس سلسلے میں ٹخنوں کو ڈھکنے کے درجہ وحکم کی وضاحت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں عین عنایت ہوگی حکم الٰہی کی تلاش میں ہے ایک بندہ۔

المستفتی: اقتدار انیس صدیقی، محلّہ سرائے جگر روڈ، لال باغ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ٹخنے کے نیچے لنگی یا پائے جامہ، پتلون وغیرہ پہننا گناہ کبیرہ اور حرام ہے، چارٹ میں ممانعت سے مراد حرام ہے، صحیح حدیث شریف میں اس کی سخت وعید وارد ہوئی ہے۔

عن أبي ذرؓ، عن النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم، قال: ثلاثة لا یکلمهم اللّٰہ یوم القیامة: ؛ ولاینظر إلیهم، ولایزکیهم ولهم عذاب ألیم، قال فقرأها رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: ثلاث مراراً، قال أبو ذر: خابوا وخسروا، من هم یا رسول اللّٰہ! قال: المسبل والمنان، والمنفق سلعته بالحلف الکاذب. (مسلم شریف، باب بیان غلظ تحریم اسبال الإزار......النسخة الهندیة ۱/ ۷۱، بیت الأفکار رقم:۱۰۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۷ر ربیع الاول ۱۴۱۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۱۵۴)	۱۴۱۱/۳/۶ھ

کیا موزے ٹخنوں کے نیچے کپڑے پہننے کی وعید میں شامل نہیں؟

سوال [۱۰۵۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ ٹخنوں کے نیچے کپڑا پہننا مرد کے لئے مکروہ تحریمی ہے، مگر موزے پہننے سے ٹخنے چھپ جاتے ہیں اور بعض آدمی جبہ ٹخنوں سے نیچے پہنتے ہیں، اس میں سے کون سی صورت جائز ہے؟

المستفتی: عبدالصمد، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عربی زبان میں اسبال کے معنی لٹکانے کے ہیں اور موزے پہننے میں لٹکانے کا کوئی مفہوم ثابت نہیں ہوتا ہے۔

نیز حدیث شریف میں حضور ﷺ کا موزے پہن کر مسح کرنا ثابت ہے؛ اس لئے موزے کے ذریعہ سے ٹخنوں کا چھپانا جائز اور درست ہے اور پاجامہ، لنگی کرتا، جبہ وغیرہ کے ذریعہ سے ٹخنوں کو چھپایا جائے، تو اسبال کا معنی پورے طریقہ سے پایا جاتا ہے؛ اس لئے ناجائز اور حرام اور گناہ کبیرہ ہوگا۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تین قسم کے افراد کی طرف رحمت کی نگاہ نہیں اٹھائیں گے اور نہ ہی ان کو گناہ سے پاک کریں گے اور ان کو سخت ترین عذاب میں مبتلا کریں گے، ان میں سے ایک ٹخنوں سے نیچے کپڑے لٹکانے والا بھی ہے۔

عن أبي ذرؓ، عن النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم، قال: ثلاثة لا یکلمهم اللّٰہ یوم القیامة: ولاینظر إلیهم، ولایزکیهم ولهم عذاب ألیم...... المسبل والمنان، والمنفق سلعته بالحلف الکاذب. (مسلم شریف، باب بیان غلظ تحریم إسبال الإزار......النسخة الهندیة ۱/۷۱، بیت الأفکار رقم: ۱۰۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/۳۵۷۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۹/۲ھ

نیچے چاک والا کرتا پہننا کیا خلاف سنت ہے؟

سوال [۱۰۵۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: کہ ہماری ایک مشکل کا مناسب حل فرمایئے: وہ یہ ہے کہ ہمارے مدرسہ میں کچھ اختلاف ہورہا ہے، کہ مسنون کرتا کیا ہے؟

فریق اول: کا نظریہ یہ ہے کہ کرتا نیچے چاک والا ہونا چاہئے، جس طرح اکثر ہندوستانی اور پاکستانی کرتا پہنتے ہیں، ان کی دلیل یہ ہیکہ ہمارے اکابر اور بزرگوں کے کرتے اکثر چاک والے رہتے تھے، اور یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ ایسا کرتا تجویز فرمائیں، جوسو فیصد سنت کے مطابق نہ ہو۔

فریق ثانی: ان کو یہ جواب دیتا ہے کہ یہ بات تو لازم نہیں کہ ہمارے اکابر اور صلحاء نے اس کرتے کو اس وجہ سے تجویز کیا کہ وہ اقرب الی السنۃ ہے؛ بلکہ اس وجہ سے کہ وہ زیادہ آسانی پیدا کرتا ہے، چلنے پھرنے کے لئے، جیسا کہ مولانا عبدالحیؒ نے عمدۃ الرعایہ میں چاک کرتے کی تعریف اس طرح کی ہے۔

الشق الذي يفعل في قميص الحئ يتسع فيه للمشي. (۲۰۲/۱)

اور فریق ثانی کے دوسرے دلائل یہ ہیں کہ یہ بات تو ضرور ہے کہ آپ ﷺ کا کرتا مبارک چاک والا نہیں تھا، مصنف عبدالرزاق اور البیہقی وغیرہ کی روایت ہے، حضرت جابرؓ سے کہ میں نے آپ ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا؛ اس حال میں کہ آپ ﷺ پر صرف ایک کرتا تھا، کیا یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ اپنا ستر ظاہر فرماتے ہوں خصوصاً نماز کے وقت؛ کیونکہ آج کے چاک والے کرتے میں یہ ممکن نہیں ہے کہ نماز پڑھی جائے انکشاف ستر کے بغیر اگر پائجامہ یا لنگی پہنے ہوئے نہیں ہے، اسی طرح کتب حدیث میں متعدد روایات ہیں صحابہ سے کہ انہوں نے نماز پڑھ لی بقمیص واحد بخاری شریف کی مشہور روایت میں ہے کہ جب عبد اللہ ابن ابی مر گیا، تو اس کا کفن آپ کا کرتۂ مبارک تھا، اگر یہ چاک والا کرتا ہوتا، تو انکشاف ستر ہوتا، اس طرح کتب لغۃ میں قمیص (کرتا) کی تعریف یہ ہے کہ وہ ایسا کپڑا ہے، جو بدن اور ستر کو چھپاتا ہے، اور یہ عبارت آتی ہے۔ **القميص ما يتقمن البدن** اور خصائل نبوی

میں حضرت شیخ زکریا نے لکھا ہے کہ آپ ﷺ کرتا پسند فرماتے تھے؛ کیونکہ وہ بدن کو چھپاتا ہے اور ستر کا چھپانا چاک والے کرتے میں نہیں ہو پاتا ہے؛ لہٰذا آپ سے درخواست ہے اس سلسلہ میں تحقیقی جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد توحید

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہر وہ لباس جو فساق کے ماحول کا نہیں ہوتا؛ بلکہ صلحاء کے ماحول کا ہوتا ہے، تو شرعاً وہ پسندیدہ لباس ہوتا ہے، اور ہر ملک کا رہن سہن اور لباس کچھ الگ الگ بھی ہوتا ہے؛ اس لئے کسی بھی ملک کے صلحاء وعلماء جس لباس کو اپنے ماحول میں پسند کرتے ہیں، وہ لباس اپنی جگہ مستحب و پسندیدہ لباس ہے، ہندوستان میں ہمارے اکابر وعلماء کے کرتے اکثر وہ ہوتے ہیں، جس میں چاک ہوتا ہے؛ اس لئے یہ لباس خلاف سنت نہیں بلکہ یہ بھی شرعاً پسندیدہ اور اپنی جگہ درست لباس ہے۔

اور آج بھی عربوں کے کرتے اسی طرح بے چاک کے ہوتے ہیں، جس طرح پہلے ہوتے تھے؛ لہٰذا عین مسنون کرتا تو وہی ہے، جو حضور ﷺ اور صحابہؓ استعمال کرتے تھے، مگر کوئی وہی کرتا پہننا چاہے جو حضور ﷺ اور صحابہؓ استعمال فرماتے تھے، تو وہ بغیر شگاف اور بے چاک کا کرتا ہے، جیسے ہمارے ہندوستان میں بعض علماء واکابر استعمال کرتے ہیں، اس اعتبار سے فریق ثانی کا یہ کہنا کہ عین مسنون کرتا وہ ہے، جو بے شگاف و بے چاک کے ہوتا ہے درست ہے؛ لیکن چونکہ حضور ﷺ اور صحابہ کا یہ کرتا از قبیل سنن ہدیٰ نہیں تھا؛ بلکہ سنن عادیہ اور عرب کے لباس کے اعتبار سے تھا، اس لئے ہر مسلمان پر اس کی پابندی لازم اور ضروری نہیں اور چاک والا کرتا، اگرچہ وہ کرتا نہیں ہے، جو حضور ﷺ اور صحابہؓ استعمال فرمایا کرتے تھے؛ لیکن اس ملک کے صلحاء وعلماء کا پسندیدہ کرتا ہے؛ اس لئے اس کو خلاف سنت ہرگز نہیں کہا جاسکتا ہے؛ بلکہ یہ بھی شرعاً پسندیدہ لباس ہے۔

(مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۲/۳۱۲، ڈابھیل ۱۹/۲۵۵، احسن الفتاوی ۸/۶۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ر محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/۷۰۲۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۱/۱۴۲۲ھ

گریبان کے بٹن کھلے رکھنا

سوال [۱۰۵۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہماری بستی میں ایک بزرگ وارد ہوتے ہیں، وہ گریبان کے سب بٹن اوپر سے نیچے تک ہروقت نماز اور غیر نماز میں کھول کر رکھتے ہیں، ان کے پیروکار بھی ایسے ہی سارا گریبان کھول کر ہروقت رہتے ہیں اور وہ اس کو اسلاف اور بزرگوں کا شعار بتاتے ہیں، تو کیا سارا گریبان ہروقت کھول کر رکھنا سنت مستحب یا عادت بزرگاں ہے؟ یا یہ بزرگ جھوٹ کہتے ہیں کسی بزرگ کو ہم نے مستقل طور پر گریبان کھولے ہوئے نہیں دیکھا اس کی تشریح مطلوب ہے۔

المستفتی: حافظ شرافت اللہ صاحب، محلّہ نائک سرائے، شیرکوٹ، بجنور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گریبان کی گھنڈیوں کو کھلا رکھنا سنت، مستحب یا بزرگوں کا شعار نہیں ہے، حضور ﷺ سے صرف ایک مرتبہ گریبان کی گھنڈیوں کو کھلا رکھنا ثابت ہے؛ لیکن یہ آپ ﷺ کی دائمی عادت نہیں تھی؛ بلکہ ایک مرتبہ جو آپ کے گریبان کی گھنڈیاں کھلی ہوئی تھیں، وہ بھی کسی عارض کی وجہ سے کھلی ہوئی تھیں۔

نیز جملہ صحابہ کرامؓ میں سے بھی صرف حضرت معاویہؓ اور ان کے بیٹے سے اپنے گریبان کی گھنڈیوں کو کھلا رکھنا ثابت ہے، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حضور ﷺ کا گریبان جس دن کھلا رہ گیا تھا، معاویہ بن قرہ نے اتفاق سے اسی دن اسلام قبول کیا تھا؛ اس لئے ان کو وہ پسند

آیا جس کی بنا پر وہ اپنا گریبان کھلا رکھتے تھے، آپ ﷺ کا یہ دائمی عمل نہیں ہے؛ اس لئے پوری زندگی میں آپ ﷺ سے صرف ایک مرتبہ گھنڈیوں کو کھلا رکھنے کے ثبوت سے اور صحابہ کے جم غفیر میں سے صرف دو صحابہ کے عمل کی وجہ سے گھنڈیوں کے کھلا رکھنے کو سنت یا مستحب کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ نیز مذکورہ صاحب کے اس فعل کو بزرگوں کا شعار کہنا بھی درست نہیں ہے؛ اس لئے کہ کسی بھی بزرگ کو ہمہ وقت اپنے گریبان کو کھلا رکھے ہوئے نہیں دیکھا گیا، یہ بات تو عام احوال کی ہے اور نماز میں اس طرح تمام گھنڈیوں کو کھلی رکھ کر نماز پڑھنا خلاف اولیٰ ہے، معاویہ بن قرہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں۔

قال: أتيت رسول الله صلى الله عليه وسلم في رهط من مزينة فبايعناه وإن قميصه لمطلق الأزرار أي مفتوحها يعني كان جيب قميصه غير مشدود ...... قال عروة: فما رأيت معاوية ولا إبنه إلا مطلقي أزرارهما قط في شتاء ولا حر ولا يزرر ان أزرارهما أبدًا كتب مولانا محمد يحي المرحوم من تقرير شيخه قوله (فما رأيت معاوية) وهذا وإن كان اختياراً لما هو خلاف الأولىٰ خصوصاً في الصلوة؛ لكنهما أحبا أن يكونا على ما رأيا النبي صلى الله عليه وسلم، وإن كان إطلاقه أزراره إذ ذاک لمعارض ولم يكن هذا من عامة أحواله صلى الله عليه وسلم، وذلک لما فيه من قلة المبالاة بأمر الصلوة، إلا ان الكراهة لعلها لا تبقي في حق معاوية ؓ، وإبنه لكون الباعث لهما حب النبي صلى الله عليه وسلم وإتباعه فيما رأياه من الكيفية.

(بذل المجهود، كتاب اللباس، باب في حل الأزرار، دار البشائر الإسلامية ١٢/١٠٨-١٠٩، تحت رقم الحديث ٤٠٨٢، سهارنپور قديم ٥/٥٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍صفر المظفر ۱۴۴۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۰۱۹/۳۴)

مردوں کے لئے پھول بوٹے والے کپڑے استعمال کرنے کا حکم

سوال [۱۰۵۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ چند دنوں سے کچھ مسلمان جن میں امام اور حافظ لوگ پیش پیش ہیں، ان لوگوں نے چکن کے کپڑے اور پھول پنکھڑی والے سفید سے لے کر تمام رنگوں کے کپڑے کرتے وغیرہ پہننے شروع کردیئے ہیں، یہ وہ کپڑے ہیں جن کو ہمیشہ سے عورتیں پہنتی ہیں اور آج بھی پہن رہی ہیں، اگر یہ کپڑے مرد کے لئے جائز ہیں، تو کیا پورا سوٹ مع رومال اور ٹوپی کے استعمال کرسکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: ماسٹر راحت علی، این پی آرسی، بلاک سیدنگر، رام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ کے مطابق عورتوں سے مشابہت کی وجہ سے مردوں کے لئے اس طرح کے کپڑے پہننا ممنوع ہے، جو عورتوں کے ساتھ خاص ہیں؛ لہٰذا بیل بوٹے والے کپڑے جو عورتوں کے ساتھ خاص ہیں، مردوں کے لئے پہننا ممنوع ہیں اور رنگوں میں گہرے سرخ رنگ اور گہرے پیلے رنگ کے کپڑے پہننا بھی مردوں کے لئے ممنوع ہیں۔

عن ابن عباس رضی قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: المتشبهات بالرجال من النساء، والمتشبهين بالنساء من الرجال. (ترمذي شريف، باب ماجاء في المتشبهات بالرجال من النساء، النسخة الهندية ۱۰٦/۲، دار السلام رقم: ۲۷۸٤، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ۱۷/ ٤٠، رقم: ۹۵۵۷، سنن أبي داؤد، باب في لباس النساء، النسخة الهندية۲/ ٥٦٦، دار السلام، رقم: ٤٠۹۷، سنن ابن ماجه، باب في المخنثين، النسخة الهندية ۱۳۷/۱، دار السلام رقم:۱۹۰٤)

عن البراء بن عازب قال: نهانا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم

عن سبع عن خاتم الذهب أو حلقة الذهب، وآنية الفضة، ولبس الحرير والديباج والإستبرق والقسي. (ترمذي شريف، باب ماجاء في كراهية لبس المعصفر للرجال والقسی، النسخة الهندية ۱۰۸/۲، دار السلام رقم:۲۸۰۹، صحيح البخاري، باب خواتيم الذهب، النسخة الهندية ۸۷۱/۲، رقم: ۵۶۳۴، ف:۵۸۶۳)

ويكره للرجل أن يلبس الثوب المصبوغ بالعصفر، والزعفران، والورس. (فتاوى عالمگيري، كتاب الكراهية، الباب التاسع في اللبس ما يكره من ذلك وما لا يكره، زكريا قديم ۳۳۲/۵، جديد ۳۸۵/۵، قاضيخان، زكرياجديد ۲۹۹/۳، وعلى هامش الهندية ۴۱۲/۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱؍صفر المظفر ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۸۷۵/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۲/۱ھ

پینٹ پتلون پہننا کیسا ہے؟ اسکو چھڑانے کا طریقہ اور شرعی لباس

سوال [۱۰۵۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) پینٹ اور پتلون پہننا کیسا ہے جائز ہے یا ناجائز؟ اور یہ کس کا شعار ہے اہل ہنود کا یا مسلمانوں کا اور جہاں پر کسی خاص فرقہ کا شعار نہیں سمجھا جاتا؛ بلکہ مسلم غیر مسلم دونوں ہی پہنتے ہیں، تو وہاں پر مسلمان مرد کا پتلون پہننا کیسا ہے؟ خاص کر عالموں کے لئے کیا حکم ہے؟

(۲) اگر کوئی شخص پہلے سے پتلون پہنتا تھا، تو اب چھوڑنے کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ اگر وہ چھوڑ دے، تو ان متروکہ پتلون کو کیا کرے؟ کسی غریب کو دیدے یا جلا کر ضائع کردے؟

(۳) شرعی لباس کس طرح کا ہونا چاہئے؟ اگر کوئی شخص بغیر کلی والی قمیص اور پتلون

نما ازار پہنے تو اس کا کیا حکم ہے؟ کیا ایسا شخص قابل ملامت ہے یا نہیں؟ اور مرد کے لئے کلی دار لباس ضروری ہے یا غیر ضروری؟

المستفتی: عبدالکریم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) پینٹ اور پتلون کا اس زمانہ میں اتنا عام رواج ہوگیا ہے، کہ کسی خاص فرقہ یا قوم کا شعار نہیں رہا ہے، اس وجہ سے تشبہ بالکفار تو نہیں؛ لیکن تشبہ بالفساق میں کوئی شبہ نہیں ہے؛ لہٰذا مسلمان مرد کے لئے پتلون پہننے سے احتراز لازم ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۸/۶۴)

اور پینٹ پتلون چونکہ صلحاء کا لباس نہیں ہے؛ اس لئے علماء کے لئے لباس پہننا مکروہ تحریمی ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ جدید ڈابھیل ۱۹/۲۸۰، قدیم ۱۷/۳۴۸)

حسنات الأبرار سيئات المقربين. (روح المعاني، زكريا ١/٣٧٤، تحت تفسير رقم الآية: ٣٥، من سورة البقرة)

(۲) ان کو خود نہ پہنے بلکہ چھوٹے بچوں کے کپڑے بنوادے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو ایک ریشمی جوڑا دیا، حضرت علیؓ اسے پہن کر مجلس میں تشریف لائے، تو حضور ﷺ نے ناگواری کا اظہار فرمایا تو حضرت علیؓ نے اسے لے جا کر عورتوں میں تقسیم کر دیا، تو یہاں بھی یہی کیا جا سکتا ہے، کہ پتلون پینٹ کو کھول کر چھوٹے بچوں کے کپڑے بنوا دیئے جائیں۔

عن علي قال: اهديت لرسول الله صلى الله عليه وسلم خلة سيراء، فبعث بها إلي فلبستها، فعرفت الغضب في وجهه، فقال إني لم أبعث بها إليک لتلبسها، إنما بعثت بها إليک لتشققها خمرًا بين النساء.

(صحيح مسلم، باب تحريم استعمال إناء الذهب......النسخة الهندية ٢/١٩٢، بيت الأفكار رقم: ٢٠٧١، مشكوة شريف ٢/٣٧٤)

(۳) جولباس سنت سے ثابت ہو، وہ یقیناً شرعی لباس ہے اسی طرح اگر کسی لباس کا سنت رسول میں ذکر نہ ہو، اور اس کو اکابر صلحاء نے اختیار کیا ہو اور کفار وفساق کا شعار بھی نہ ہو، تو وہ بھی شرعی لباس ہے، جیسے ہمارے ہندوستان میں اکابر علماء کے لباس جوکلی دار کرتے اور مغلیہ پاجامے ہوتے ہیں، عین سنت کے مطابق حضور ﷺ اور صحابہ کرام کا کرتا جو کہ بے شگاف نصف ساق تک پہونچتا ہے اور قرآن کریم اور احادیث شریفہ میں اسی کو قمیص کے لفظ سے ذکر کیا گیا ہے اور اہل عرب آج کل اس کو توپ بھی کہتے ہیں۔

عن أم سلمة قالت: كان أحب الثياب إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم القميص. (أبوداؤد، باب ماجاء في القميص، النسخة الهندية ۲/ ۵۵۸، دارالسلام رقم: ۴۰۲۵، سنن الترمذي، باب ما جاء في القميص، النسخة الهندية ۱/ ۳۰۶، دار السلام رقم: ۱۷۶۲)

اگر یہ نہ ہو سکے تو اپنے اکابر وصلحاء کا پسندیدہ کلی دار کرتا پہننا چاہئے اور اگر کرتا بغیر کلی کا ہے، تو وہ بھی جائز ہے، مگر اکابر وصلحاء کا لباس نہیں ہے اور پتلون نما پاجامہ نہ ہی سنت رسول سے ثابت ہے، نہ اکابر صلحاء نے اختیار کیا ہے؛ بلکہ یہ تشبہ بالفساق ہے جو کہ حضور ﷺ کے ارشاد: **من تشبه بقوم فهو منهم** کے تحت داخل ہو کر قابل ملامت ہے۔

(مستفاد: احسن الفتاوی ۸/ ۶۴)

عن ابن عمر رضـ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من تشبه بقوم فهو منهم. (سنن أبي داؤد، كتاب اللباس، باب في لبس الشهرة، النسخة الهندية ۲/ ۵۵۹، دار السلام رقم: ۴۰۳۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ رجمادی الثانی ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۶۷۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۶/۵ھ

مردوں کے لئے چست لباس پہننے سے متعلق چند سوالات کے جوابات

سوال [۱۰۵۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل مردوں میں چست لباس یعنی پینٹ پتلون پہننے کا عام رواج ہوگیا ہے، مرد کے لئے گھٹنوں سے ناف تک کا حصہ ستر ہے، کیا ستر کے صرف یہ معنی ہیں کہ بدن کا رنگ نظر نہ آئے، یا اس کے ساتھ بدن کی ساخت کا نظر نہ آنا یہ بھی مطلوب شرعی ہے؟ کیا اس طرح کے کپڑوں کو پہن کر ایک مسلمان گھر سے باہر جاسکتا ہے؟ رانیں اور کولہے اوراگلا حصہ، بسا اوقات اس کا عضو مخفی کا حجم بھی نظر بچانے کے باوجود نظر آجاتا ہے؟ اگرچہ کپڑے کے اوپر سے ہی صحیح ایسے پتلون کے استعمال کا کیا حکم ہے؟ ان کو پہن کر نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ ان کی رانوں کو دیکھنا اوران کو دکھانے کا کیا حکم ہے؟ ان کی نماز واجب الاعادہ ہے یا نہیں؟ جواب شافی کافی مدلل عنایت فرمائیں۔ اس سلسلہ میں احسن الفتاوی میں ایک فتوی لکھا ہوا ہے اس کو بعینہ نقل کیا جاتا ہے۔

جواب: ایسا چست لباس پہننا جس سے اعضاء مخفیہ کی شکل نظر آئے حرام ہے، اس طور پر اعضاء مخفیہ دکھانا بھی حرام اور دیکھنا بھی حرام، اگرچہ بلاشہوت ہو، ایسا لباس اگر اتنا موٹا ہو کہ اس میں سے بدن کا رنگ نظر نہ آتا ہو، تو اس میں اگرچہ نماز کا فرض ادا ہوجائے گا، مگر حرام لباس میں نماز مکروہ اور واجب الاعادہ ہوگی، عورتوں کے لباس کی بنسبت مردوں کے چست پتلون زیادہ خطرناک ہے؛ اس لئے کہ عورت نے چست کرتے کو چادر یا دوپٹہ سے چھپا کر نماز پڑھی تو اس میں کراہت نہیں۔

قال ابن عابدینؒ: ولا یضر التصاقه أي بالألیة مثلاً وقول وتشکله من عطف المسبب علی السبب، وعبارة شرح المنیة: أما لو کان غلیظا لا یریٰ منه لون البشرة، إلا أنه التصق بالعضو، وتشکل بشکاله فصار شکل العضو

مرئيا، فينبغي أن لا يمنع جواز الصلاة لحصول الستر، قال: وانظر هل يحرم النظر إلى ذلک المتشکل مطلقاً، أو حيث وجدت الشهوة، قلت: سنتکلم علی ذلک في کتاب الحظر، والذي يظهر من کلامهم هناک هو الأول.

(رد المحتار، کراچي ۱/ ۴۱۰، أحسن الفتاوی ۳/ ۴۰۳)

المستفتی: ابوالکلام، مدرسہ مظاہرالعلوم سیلم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شریعت میں لباس کے لئے کوئی خاص شکل متعین نہیں ہے؛ بلکہ اس کے لئے کچھ شرائط وضوابط مقرر ہیں، ان کوملحوظ رکھتے ہوئے ہر طرح کا لباس پہننا شریعت میں جائز ہےاوروہ شرائط درج ذیل ہیں اول یہ کہ لباس ساتر ہو۔ دوم یہ کہ فساق وفجار کا شعار نہ ہو، سوم یہ کہ وہ عورتوں کے لباس کے مشابہ نہ ہو، اسی طرح اس قدر چست نہ ہو کہ اس سے اعضاء مخفیہ کی ساخت ظاہر ہوتی ہو؛ لہٰذا ایسا لباس پہننا جس سے بدن کی ساخت ظاہر ہو جائز نہ ہوگا اور ایسا کپڑا پہن کر نماز پڑھنے میں ستر عورت پائے جانے کی وجہ سے نماز تو ادا ہو جائے گی، البتہ خلاف شریعت لباس پہننے کی وجہ نماز مکروہ ہوگی ایسےاور چست لباس پہنے شخص کے اعضاء مستورہ کی طرف قصداً دیکھنا بھی شرعاً جائز نہیں ہے۔

فإن الإسلام لم يقصره علی نوع دون نوع، ولم يقرر للإنسان نوعًا خاصًا، أو هيئة خاصة من اللباس......وإنما وضع مجموعة من المبادي والقواعد الأساسية يجب علی المسلم أن يحتفظ بهذه المبادي......فمن مقدمة هذه المبادي، أن اللباس يجب أن يکون ساترًا لعورة الإنسان ......وکذالک اللباس الرقيق، أو اللاصق بالجسم الذي يحکي للناظر شکل حصة من الجسم الذي يجب ستره فهو في حکم ماسبق في الحرمة وعدم الجواز......والمبدأ الثالث: أن اللباس الذي يتشبه به الإنسان بأقوام

كفرة، لايجوز لبسه لمسلم. (تكملة فتح الملهم، كتاب اللباس والزينة، باب تحريم استعمال أواني الذهب، اشرفية ديوبند ٤/٨٧٠٨٨)

عن أبي هريرةؓ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم: لعن الرجل يلبس لبسة المرأة. (مسند أحمد ٢/٣٢٥، رقم: ٨٢٩٢، سنن أبي داؤد، باب في لباس النساء، النسخة الهندية ٢/٥٦٦، دارالسلام رقم: ٤٠٩٨، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم٦/٤٩، رقم: ٩٠٨٨)

لو كان غليظاً لا يرىٰ منه لون البشرة إلا أنه التصق بالعضو وتشكل بشكله فصار شكل العضو مرئيًا، فينبغي أن لا يمنع جواز الصلاة لحصول الستر. (شامي، كتاب الصلاة، باب شروط الصلاة، زكريا ٢/٨٤، كراچي١/٤١٠)

أن روية الثوب بحيث يصف حجم العضو ممنوعة ولو كثيفًا لا ترى البشرة منه. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، زكريا ٩/٥٢٦)

لايحل النظر إلى عورة غيره فوق ثوب ملتزق بها يصفه حجمها. (شامي، زكريا٩/٥٢٦، كراچي ٦/٣٦٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۳۴۱/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۴/۶ھ

مردوں کے لئے کالا لباس پہننا

سوال [۱۰۵۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کالا لباس مرد کے لئے پہننا جائز ہے یا نہیں؟ کیا یہ کالا لباس دوزخی لباس ہے؟

المستفتی: حافظ محمد طیب اندرا چوک، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: کالا لباس پہننا مرد کے لئے جائز اور مباح ہے؛

چنانچہ امہات المؤمنین حضرت عائشہؓ نے نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام کی چادر کو کالے رنگ میں رنگا، تو آپ ﷺ نے اسے زیب تن فرمایا؛ لہٰذا کالا لباس پہننا جائز ہے، ہاں البتہ آج کل کے دور میں کالا لباس شیعوں کا شعار ہو چکا ہے؛ اس لئے سنیوں کے لئے بہتر ہے کہ کالے لباس سے جہاں تک ہو سکے احتیاط رکھیں تا کہ شیعوں کی مشابہت سے بچ جائیں۔

عن عائشةؓ، قالت: صبغت للنبي صلى الله عليه وسلم بردة سوداء فلبسها. (أبو داؤد شريف، باب في السواد، النسخة الهندية ٢/٥٩٣، دار السلام رقم: ٤٠٧٤، مسند أحمد بن حنبل ٦/١٣٢، رقم: ٢٥٥١٧-١٤٤٦، رقم: ٢٥٦٣٠، ٦/٢١٩، رقم: ٢٦٣٦٤، ٦/٢٤٩، رقم: ٢٦٦٤٦، مسند أبي داؤد الطيالسي، دار الكتب العلمية بيروت٣/١٤٠، رقم:١٦٦٣)

وفي الحديث جواز لبس السواد وهو متفق عليه. (بذل المجهود، باب في السواد، دار البشائر الإسلامية ١٢/١٠١، تحت رقم الحديث ٤٠٧٤، سهارنپور قديم ٥/٥١)

اور کسی معتبر کتاب میں سند صحیح کے ساتھ کالے لباس کو دوزخیوں کا لباس کہا گیا ہو ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸ر محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۳۸۹/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۱/۱۸ھ

سرخ کپڑا پہننے اور حدیث کو نہ ماننے کا حکم

سوال [۱۰۵۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سرخ کپڑا مرد کے لئے پہننا جائز نہیں؛ لیکن زید کہتا ہے کہ یہ غلط ہے، نہ میں حدیث کو مانتا ہو نہ مسئلہ کو، اس بارے میں کیا حکم شرعی ہے؟ جواب دے کر مستفیض فرمائیں۔

المستفتی: محمد زکی اللہ، متعلم مدرسہ حیات العلوم، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کسم اورزعفران سے رنگا ہوا کپڑا مردوں کے لئے حرام ہے اور مطلقاً سرخ رنگ کے کپڑے کے بارے میں اختلاف ہے، بعض کے نزدیک حرام ہے، بعض کے نزدیک مباح، بعض کے نزدیک مستحب اور بعض کے نزدیک مکروہ تنزیہی اور مکروہ تنزیہی والا قول مفتی بہ قول ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی، زکریا ۱۲۰/۴، فتاوی رشیدیہ قدیم ۵۸۳-۵۸۲، جدید زکریا ۵۷۴تا ۵۷۶، فتاوی عبدالحئ ۱۰۱/۲، فتاوی عزیزی ۱۲۲/۱)

وكره لبس المعصفر، والمزعفر الأحمر، والأصفر للرجال مفاده أنه لا يكره للنساء ولا بأس بسائر الألوان وفي المجتبى والقهستاني،وشرح النقاية لأبي المكارم: لا بأس بلبس الثوب الأحمر، ومفاده أن الكراهة تنزيهية؛ لكن صرح في التحفة بالحرمة، فأفاد أنها تحريمية، وهي المحمل عند الإطلاق، قال المصنف قلت: ولشرنبلالي فيه رسالة نقل فيها ثمانية أقوال منها: أنه مستحب (تحته في الشامية) ولكن جل الكتب على الكراهة كالسراج، والمحيط والاختيار والمنتقي، والذخيرة وغيرها وبه أفتى العلامة قاسم. (الدر مع الرد، كتاب الحظر و الإباحة، فصل في اللبس، زكريا ٩/٥١٥-٥١٦، كراچي ٦/٣٥٨، هندية، زكريا جديد ٥/٣٨٥، قديم ٥/٣٣٢)

اورزید کا یہ کہنا کہ نہ میں حدیث کو مانتا ہوں اور نہ مسئلہ کو یہ کفریہ جملہ ہے، اس پر ضروری ہے کہ تجدید ایمان اور تجدید نکاح کر کے توبہ واستغفار کے ذریعہ اپنے اس قول سے رجوع کرلے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳۹۱/۵)

مايكون كفرًا إتفاقاً يبطل العمل والنكاح وما فيه خلاف يؤمر بالإستغفار، والتوبة وتجديد النكاح. (شامي، باب المرتد، قبيل مطلب في حكم من شتم دين مسلم، زكريا ٦/٣٦٧، كراچي ٤/٢٣٠)

رجل عرض عليه خصمه فتوى الأئمة فردها، وقال: (جه بار نامه

فتوی أورد)ہ قیل یکفر؛ لأنہ رد حکم الشرع. (هندية، الباب التاسع في أحكام المرتدين، زكريا قديم ٢/ ٢٧٢، جديد ٢/ ٢٨٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍محرم الحرام ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴؍۱۰۸۳)

پنجابی سوٹ پہننے کا حکم

سوال [۱۰۵۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ پنجابی سوٹ جس کو پٹھانی سوٹ کہتے ہیں، اس کو پہننا جائز ہے یا نہیں؟ یا کسی قسم کی کراہت ہے، جس میں ڈبل کالر ہوتا ہے، اور کف ہوتے ہیں، آستین اور دامن کے کنارے گول ہوتے ہیں؟

المستفتی: ابوالخیر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: پنجابی سوٹ جسے کہتے ہیں، وہ سوٹ اسم بامسمیٰ ہے، ہمارے ہندوستان کے پنجابی سکھوں کا یہ خاص لباس ہے؛ اس لئے اس کا نام پنجابی سوٹ ہے، اور پنجاب سے آگے کشمیر اور اس سے آگے پاکستان میں بھی یہ لباس ہے، ہمارے ہندوستان میں غور طلب بات یہ ہے کہ پنجابی سوٹ غیر مسلم سکھوں کا خصوصی لباس ہے، کوئی عام مسلمان اس لباس کو پہنتا ہے، تو اس کو ہم بالکل ناجائز بھی نہیں کہتے؛ اس لئے کہ مسلمانوں کا بھی ایک بڑا طبقہ یہ لباس پہننے لگا ہے، جیسا کہ کوٹ پتلون درحقیقت انگریزوں کا خاص لباس ہے، پھر مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ بھی پہننے لگا؛ اس لئے اگر کوئی کوٹ پتلون پہنتا ہے تو اس کو بھی بالکل ناجائز نہیں کہتے؛ لیکن یہ دونوں لباس علماء وصلحاء اور حدیث وفقہ کے طلبہ کے لباس نہیں ہیں، اگر علماء صلحاء اور حدیث وفقہ کے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ یہ لباس پہنتے ہیں، تو حسنات

الابرار سیئات المقربین کے اصول سے کراہت کے دائرہ میں ہوگا؛ اس لئے کہ اگر حدیث پڑھانے والا کوئی استاد کوٹ پتلون یا پنجابی سوٹ پہن کر مسند حدیث پر بیٹھ کر حدیث پڑھانے لگے یا مفتی صاحب مسند افتاء پر بیٹھ کر فتوی لکھنے لگیں، تو حاضرین قطعاً اچھی نگاہ سے نہیں دیکھیں گے، اور ان کا اچھی نگاہ سے نہ دیکھنا بجا ہے؛ اس لئے کہ مذکورہ اصول کے مطابق ایسے علماء صلحاء اور مقتدا لوگوں کے لئے یہ لباس مکروہ ہے۔

حسنات الأبرار سيئات المقربين. (روح المعاني، ١/٣٧٤، تفسير رقم الآية ٣٥، من سورة البقرة، تفسير خازن ٤/١٤٥، تفسير جمل ٧/٢٠٨، حاشية الصاوي ٤/٩٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۸/ جمادی الاول ۱۴۲۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۴۳/۳۶)	۱۴۲۳/۵/۹ھ

عورتوں کے لئے شوہر وباپ، بھائی کا چست لباس لا کر دینا

سوال [۱۰۵۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عورتوں کے چست وتنگ لباس کے متعلق کیا حکم ہے؟ اور ان کے اس لباس پر جو خرچ باپ، بھائی، شوہر اور بیٹا سب کر رہے ہیں، اس کے متعلق کیا حکم ہے؟

المستفتی: مسعود احمد خان، کاسگنج (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ایسا چست وتنگ لباس جس میں بدن کی ہیئت اور ساخت ظاہر ہوتی ہے، اس کا پہننا عورتوں کے لئے ناجائز ہے اور ایسے لباس کے بارے میں حدیث شریف میں سخت وعید آئی ہے، اور باپ، بھائی وغیرہ کا عام طور پر مستورات کے لباس بنانے میں کوئی دخل نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ ایسا لباس بنانے میں ماں کا دخل ہوتا ہے؛ البتہ

باپ، بھائی وغیرہ ایسے لباس پر خوش ہیں، تو تعاون علی المعصیۃ کی وجہ سے ان پر بھی گناہ ہوگا۔

عن أبي هريرةؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: صنفان من أهل النار: لم أرهما: قوم معهم سياط (إلى قوله) ونساء كاسيات عاريات مميلات مائلات رؤسهن كأسنمة البخت المائلة لا يدخلن الجنة، ولا يجدن ريحها، وإن ريحها ليوجد من مسيرة كذا و كذا.

(مسلم شريف، باب النساء الكاسيات العاريات المائلات المميلات،النسخة الهندية ٢/ ٢٠٥، بيت الأفكار رقم:٢١٢٨، مسند أحمد بن حنبل ٢/ ٣٥٥-٣٥٦، رقم: ٨٦٥٠، ٢/ ٤٤٠، رقم: ٩٦٧٨)

وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة:٢] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ رجمادی الثانیہ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۱۶۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۶/۲۶ھ

عورتوں کا کالا برقعہ اور کالا کپڑا پہننا

سوال [۱۰۵۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) ندائے شاہی میں لکھا ہے کہ امیر المؤمنین حضرت علی نے اپنے ساتھیوں کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کالا لباس مت پہنا کرو؛ کیونکہ یہ فرعون کا لباس ہے اور پیغمبر علیہ السلام کو بھی کالا رنگ ناپسند تھا، سوائے تین چیزوں میں، عمامہ، موزہ، چادر۔

من لا يحضره الفقيه ٨١، باب في لباس المصلي مطبع جعفرية نخاس لكهنؤ١٣٠٧.

امام جعفر صادق سے پوچھا گیا کہ کالی ٹوپی پہن کر نماز پڑھنا کیسا ہے؟ تو آپ نے

جواب دیا کہ کالی ٹوپی پہن کر نماز مت پڑھو کیوں کہ یہ جہنمیوں کا لباس ہے۔ (بحوالہ ندائے شاہی، نومبر ۲۰۱۲ء)

تو ہم عورتیں کالا لباس، برقعہ، سویٹر، چوڑی، ٹوپی پہن سکتی ہیں یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ نے ندائے شاہی کے جس مضمون کا حوالہ دیا ہے، اس میں شیعہ مذہب کی کتابوں سے کالے لباس پہننے کی کراہت ثابت کی گئی ہے، اس کی عربی عبارت بھی اس مضمون میں درج ہے اور اس حوالہ کو دینے کا مقصد یہ تھا کہ شیعہ لوگ جو محرم میں سوگ کے طور پر کالا لباس پہنتے ہیں یہ بے اصل اور ممنوع ہے اور کالی ٹوپی کے بارے میں جو حضرت جعفر صادقؒ کا قول نقل کیا گیا، اس کی علت یہ ہے کہ یہودیوں کی خاص علامت کالی ٹوپی ہے، آج بھی وہ لوگ ایک خاص انداز کی کالی ٹوپی اوڑھتے ہیں، تو تشبہ کی وجہ سے ایسی کالی ٹوپی پہننا ممنوع ہوگا، اور جہاں کوئی تشبہ نہ ہو یا سوگ کا اظہار مقصود نہ ہو، تو کالا لباس پہننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

عن ابن عمرؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من تشبه بقوم فهو منهم. (سنن أبي داؤد، كتاب اللباس، باب في لبس الشهرة ۲/ ۵۵۹، دار السلام رقم: ۴۰۳۱)

قال القاري: أي من شبه نفسه بالكفار مثلا في اللباس وغيره، أو بالفساق، أو الفجار، أو بأهل التصوف والصلحاء الأبرار فهو منهم، أي في الإثم والخير. (مرقاة، كتاب اللباس، الفصل الثاني، مكتبه امدادية ملتان ۸/ ۲۵۵)

عن عائشةؓ، قالت: خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم ذات غداة وعليه مرط من شعر أسود. (شمائل ترمذي۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ ر رجب المرجب ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۴۱ر)

مزین برقعوں کے استعمال کی شرعی حیثیت

سوال [۱۰۵۸۳]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ برقعوں میں نگ، بیل بوٹے، لگائے جاسکتے ہیں اورگریبان پر کالرلگاسکتے ہیں یانہیں؟ کیاکوٹ ٹائپ برقعہ سلا سکتے ہیں، کیابرقعے کے ساتھ ہاتھ پاؤں کے دستانے پہننے ضروری ہیں؟ برقعے کارنگ کیساہونا چاہئے؟

المستفتی: عرفان اللہ قاسمی، مالیگاؤں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: صحابیہ عورتیں کالے رنگ کےجلباب پہنا کرتی تھیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برقعہ کا رنگ کالا ہونا زیادہ بہتر ہےاوراس کےاوپر بیل بوٹے وغیرہ نہ ہوں، تو زیادہ مناسب ہے اور ہاتھوں میں دستانہ اور پیروں میں موزہ پہننا اگر فتنے کا خطرہ نہیں ہےتو لازم نہیں ہے؛ اس لئے کہ ہتھیلی اورقدمین ستر میں داخل نہیں؛ لیکن اگرفتنہ کاخطرہ ہےتو دستانہ اورموزہ پہننا بہتر ہے۔

وأخرج جماعة و عبد الرزاق عن أم سلمة قالت: لما نزلت هذه الآية يدنين عليهن من جلابيبهن: خرج نساء الأنصار، كان على رؤسهن الغربان من السكينة وعليهن أكسية سود يلبسنها. (روح المعاني ۲۲/۱۲۸)

والمرط من أكسية سود. (مسند أحمد بن حنبل،٦/ ١٩٩، رقم:٢٤٨٨٦، مصنف عبد الرزاق، المجلس العلمي ٢/ ٣٢، رقم: ٢٣٧٧)

وأما النظر إلى الأجنبيات فنقول يجوز النظر إلى مواضع الزينة الظاهرة منهن وذلك الوجه، والكف في الظاهر الرواية، كذا في الذخيرة، إن غلب على ظنه أن يشتهي فهو حرام. (هندية، الباب الثامن، فيما يحل للرجل

النظر إلیه……زکریا قدیم ۵/ ۳۲، جدید ۵/ ۳۸۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ / جمادی الثانیہ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰ / ۱۱۱۵۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴ / ۶ / ۱۴۳۴ھ

ڈیزائن والے برقعے پہننے اوران کی خرید وفروخت کرنے کا حکم

سوال [ ]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خواتین کا برقعہ جسم کے خدوخال اور زیب وزینت کو چھپانے کے لئے ہوتا تھا، آج کل برقعہ دیدہ زیب اور انتہائی چمکدار پھول کا رواج پا گیا ہے، اس کا پہننا اور ایسے پھول والے برقعہ کا (جس کو برقعہ صرف عرف عام میں کہہ سکتے ہیں اصلاً نہیں) کاروبار جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: راشد علی، پیپل سانہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: برقعہ کا مقصد سر سے پیر تک پورے بدن کو ڈھانکنا ہوتا ہے تاکہ بدن کے کسی حصہ پر اجنبی مردوں کی نگاہ نہ پڑے اور وہ مقصد ہر طرح کے برقعہ سے حاصل ہوجاتا ہے؛ لیکن افضل اور بہتر یہ ہے کہ برقعہ زیادہ بھڑک دار نہ ہوتا کہ اجنبی مردوں کی نگاہ بھڑک دار برقعہ پر پڑ کر ہیجانی کیفیت پیدا نہ کرے، اب رہی برقعہ کی تجارت تو برقعہ کی تجارت ہر حال میں جائز ہے اور اس کا پیسہ حلال ہے اور جو عورت برقعہ کو پردہ کے بجائے فیشن کے طور پر استعمال کرے، جس کی وجہ سے اجنبی مردوں کی نگاہ غلط انداز سے اس کے اوپر پڑسکتی ہے، تو اس کا گناہ اسی عورت پر ہوگا نہ کہ تجارت کرنیوالے پر۔

إن عائشةؓ، قالت: لقد کان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یصلي الفجر، فتشهد معه نساء من المؤمنات متلفعات في مروطهن، ثم یرجعن إلي بیوتهن ما یعرفهن أحد. (بخاري شریف، باب في کم تصلي المرأة

في الثياب، النسخة الهندية ۱/ ٥٤، رقم:۳۷۲)

أن النساء أيضاً مأمورات بغض البصر عن الرجال الأجانب كما أن الرجال مأمورون بغض البصر من النساء الأجنبيات. (أحكام القرآن للتهانوي ٤٣/۳، بحواله محموديه ميرٹھ۲۸/ ۹٥)

وإنما تحصل المعصية بفعل فاعل مختار. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ۹/ ٥٦۲، كراچي ٦/ ۳۹۲)

وإن قامت المعصية بعينه يكره بيعه تحريماً وإلا فتنزيهًا. (الدر المختار، زكريا ۹/ ٥٦۱، كراچي ٦/ ۳۹۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ذی قعدہ ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۵۴۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۷/۱۱/ ۱۴۳۲ھ

بحالت حیض ونفاس مہندی وسنگار کرنا، نیز شادی شدہ کے لئے سفید کپڑے پہننے کا حکم

سوال [۱۰۵۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک عورت حالت حیض و نفاس میں مہندی اور دیگر سنگار کرتی ہے، کیا اس کے لئے یہ سب کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور ایک دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ شادی شدہ عورت کے لئے سفید کپڑے پہننا کیسا ہے؟ ان دونوں مسئلوں کا جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: محمد نوشاد، لکھیم پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حالت حیض ونفاس زینت کے منافی نہیں ہے؛ لہٰذا جو عورت حالت حیض ونفاس میں زینت کرتی ہے، اس پر کوئی گناہ نہیں ہے؛ البتہ حالت

عدت میں متوفی عنہا زوجہا جس کے شوہر گذر چکے ہوں اور مطلقہ ثلاثہ کے لئے زینت کرنا جائز نہیں ہے، اور شادی شدہ اور غیر شادی شدہ عورتوں کے لئے ہر قسم کے رنگے ہوئے کپڑے پہننا جائز ہے، اسی طرح سفید رنگ کا کپڑا پہننا بھی جائز ہے۔ (مستفاد: آپ کے مسائل اور ان کا حل ۲/۷۰)

وتجتنب المعتدة كل زينة نحو: الكحل، والحناء، والخضاب، والدهن، والتحلي، والتطيب، ولبس المطيب، والمصبوغ بالمعصفر والزعفران. (قاضيخان، باب العدة، فصل فيما يحرم على المعتدة، زكريا جديد ۱/۳۵۱، وعلى هامش الهندية ۱/۵۵٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ شعبان المعظم ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳٦/۷۸۰٦)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۸/۱۴۲۳ھ

قیمتی کپڑے کو بطور زینت پاپوش کے لئے استعمال کرنا

سوال [۱۰۵۸٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل بڑے بڑے ہوٹلوں میں انتہائی اعلی اور قیمتی کپڑے بطور پاپوش استعمال کئے جاتے ہیں اور ہاتھ پوچھنے کے واسطے دیئے جاتے ہیں، تو اس کا استعمال شرعًا کیسا ہے؟ کیا نعمت خداوندی کی بے ادبی اور ناقدری تو نہیں؟

المستفتی: محمد سجاد حسین، قاسمی کانپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عمدہ اور قیمتی کپڑوں کو بطور پاپوش اور ہاتھ پوچھنے کے لئے استعمال کرنا متکبرین کا شیوہ ہے؛ اس لئے کہ عمومًا قیمتی کپڑوں سے جوتے اور ہاتھ صاف نہیں کئے جاتے ہیں؛ بلکہ ان کے لئے الگ قسم کی دستیاں اور تولیاں آتی ہیں، ان کے

استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے خواہ وہ عمدہ قسم ہی کی کیوں نہ ہوں؛ لہٰذا اعلیٰ اور عمدہ کپڑوں کو بطور پاپوش استعمال کرنا مکروہ اور غیر مناسب ہے۔

وتكره الخرقة التي تحمل ويمسح بها العرق إلا إذا كان شيئًا لاقيمة له، وكذا للتكبر. (البحرالرائق، كتاب الكراهية، فصل في الأكل والشرب، كوئٹه ٨/١٨٣، زكريا ٨/٣٣٦، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ٨/١٢٧-١٢٨، رقم: ٩٧٥٢، هداية، اشرفي ٤/٤٥٨، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٨/٢٨٣، رقم:٢٨٨١٥)

سئل مسح اليد على ثيابه، فقال: لايجوز وسئل عن مسح اليد بدستار ورق، فقال: لايجوز. (البحر الرائق، كوئٹه ٨/١٨٣، زكريا ٨/٣٣٦)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ ربیع الاول ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳ / ۵۲۵۷)

درزی کا مختلف نوع کے لباس سینا

سوال [۱۰۵۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید ٹیلر ہے کرتا پائجامہ، پینٹ، شرٹ، لیڈیز سوٹ وغیرہ سب تیار کرلیتا ہے، کرتا پائجامہ کا کام کم ملنے کی وجہ سے وہ پینٹ، شرٹ، لیڈیز سوٹ وغیرہ کا کام ازروئے شرع کرسکتا ہے؟

المستفتی: رفیع الدین، زاہد نگر سرسید نگر کرولہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: زید کے لئے کرتا پائجامہ کے علاوہ پینٹ، شرٹ اور لیڈیز سوٹ سل کر پیسہ حاصل کرنا جائز اور درست ہے؛ البتہ فساق اور غیروں کا لباس جیسا

کہ آج کل کے زمانہ میں جوان لڑکے اورلڑکیاں یوروپ، وامریکہ کے طرز پر چست پینٹ اور ماڈرن بنیان پہنتی ہیں، یہ فاسقوں اور کافروں کا لباس ہے؛ اس لئے ایسے لباس کا سلنا مکروہ ہے، اسی طرح بلاؤز جوعورتیں ساڑی کے ساتھ پہنتی ہیں، جس سے صرف پستان اور پیٹ کا کچھ حصہ ڈھکا رہتا ہے، بقیہ پیٹ اور پیٹھ کھلی رہتی ہے، تو اس کا بھی سلنا مکروہ ہے۔

أمره إنسان أن يتخذله خفا على زي المجوس، أو الفسقة، أو خياطا أمره أن يتخذله ثوبًا على زي الفساق، يكره له أن يفعل؛ لأن سبب التشبه بالمجوس، والفسقة. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ٩/٥٦٢، كراچي٦/٣٩٢، فتاوى محمودية قديم ١٢/٣٢٥و ٣٦٨/١٤، جديد ڈابھیل١٩/٢٨٣-٢٨٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۷۷۹/۳۷)

مور کی تصویر بنے ہوئے کپڑے کو کیا کریں؟

سوال [۱۱۳۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں نے ایک سوٹ خرید کر سلوالیا، اوراس کو پہن کر اپنی بہن کے یہاں گئی، تو میری بہن نے دھیان دلایا کہ اس کپڑے پر مور کی تصویر بنی ہوئی ہے، اس کا مجھے بہت افسوس ہے، یہ کپڑا سوتی ہے؛ لیکن قیمتی ہے، مہربانی کرکے آپ جواب تحریر فرمائیں کہ میں اس کپڑے کو کس طرح استعمال کرسکتی ہوں؟

المستفتی: اہلیہ محمد ناصر الدین، بھٹی محلّہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر مور کی تصویر اتنی چھوٹی ہے کہ کپڑے کو زمین

بر رکھدیا جائے اور کھڑے ہوکر دیکھا جائے تو تصویر نظر نہ آئے، تو اس کا استعمال جائز ہے اور اگر کھڑے ہوکر نظر آجاتی ہے، تو اس کا استعمال جائز نہیں ہے، ہاں البتہ ایسا کیا جاسکتا ہے کہ اس کپڑے کا فرش اور بستر وغیرہ بنالیا جائے۔

ولایکره لو کانت تحت قدمیه (إلی قوله) **أو کانت صغیرة لاتتبین تفاصیل أعضائها للناظر قائمًا، وهي علی الأرض.** (در مختار، باب ما یفسد الصلاة، وما یکره فیها، زکریا ۲/۱۷ ٤-۱۸ ٤، کراچي ۱/٦٤۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ ربیع الثانی ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۳۹۵۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/۴/ ۱۴۱۵ھ

(٤) باب الزينة

عطر لگانے کا مسنون طریقہ

سوال [۱۰۵۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عطر لگانے کا سنت طریقہ کیا ہے؟

المستفتی: مفتی عتیق الرحمٰن، مدرسہ اسلامیہ، ناگپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عطر لگانا سنت ہے اور اس کو آنحضرت ﷺ نے بہت پسند فرمایا ہے؛ لیکن اس کے لگانے کا سنت طریقہ کیا ہے؟ اس کے بارے میں کوئی روایت نظر سے نہیں گذری؛ البتہ روایت ذیل:

عن عائشة رضـ، قالت: كان النبي صلى الله عليه وسلم: يعجبه التيمن في تنعله وترجله وطهوره وفي شانه كله. (رواه البخاري، كتاب الوضوء، باب التيمن في الوضوء، والغسل ١/٢٩، رقم:١٦٨)

کے سیاق وسباق سے جانب یمن سے عطر لگانے کی ابتداء کرنا افضل معلوم ہوتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ جمادی الثانی ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱؍۴۰۶۴)

پرفیوم کا استعمال

سوال [۱۰۵۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: کہ مردوں کے لئے پرفیوم (فوارے والاعطر) استعمال کرنا کیسا ہے؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مردوں کے لئے حرام ہے، سوال یہ ہے کہ یہ عطر تو ایک طرح کی خوشبو ہے، پھر حرام کیوں؟

المستفتی: ضیاء الرحمٰن قاسمی، مسجد حکیمان، وارڈ ریڑیاں خانپور، بلندشہر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے حکم یکساں ہے، اگر اس میں کوئی ناپاک مادہ نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ خوشبو ہی ہے، تو اس کے استعمال میں مردوں اور عورتوں میں سے کسی کے لئے کوئی قباحت نہیں۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۳۹۹/۱۵، جدید ڈابھیل ۱۹۳/۱۸)

وبهذا يتبين حكم الكحول المسكرة التي عمت بها البلوىٰ اليوم، فإنها تستعمل في كثير من الأدوية، والعطور، والمركبات الأخرىٰ......وإن اتخذت من غيرهما، فالأمر فيها سهل على مذهب أبي حنيفة ولايحرم استعمالها للتداوي، أو لأغراض مباحة أخرىٰ......وإن معظم الكحول التي تستعمل اليوم في الأدوية، والعطور وغيرها لاتتخذ من العنب، أو التمر، إنما تتخذ من الحبوب، أو القشور، أو البترول وغيره الخ. (تكملة فتح الملهم، كتاب الأشربة، حكم كحول المسكرة، اشرفية ديوبند ٦٠٨/٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰ ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۰۲۴/۳۶)

سینٹ کا استعمال کیسا؟

سوال [۱۰۵۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ سینٹ (پرفیوم) میں الکحل ملا ہوا ہوتا ہے، اور الکحل فسٹ نمبر کی شراب ہے، تو یہ سینٹ پاک ہے یا نہیں؟ نیز اس کو لگا کر نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اور ادویات میں الکحل کا استعمال کر سکتے ہے یا نہیں؟ تشفی بخش جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: محمد جاوید

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو الکحل انگور یا کھجور سے بنا ہوا ہو، وہ تو بالاتفاق حرام اور ناپاک ہے؛ لیکن جو ان دونوں کے علاوہ دیگر اشیاء مثلاً آلو، گاجر وغیرہ سے بنایا گیا ہو، تو وہ حضرات شیخینؒ کے قول کے مطابق پاک ہے، عموماً یہی الکحل عطریات اور ادویہ میں استعمال ہوتا ہے؛ لہٰذا ضرورت شدیدہ اور عموم بلویٰ اور ابتلائے عام کی وجہ سے عطریات اور ادویات کے حق میں حضرات شیخینؒ کے قول کے مطابق جواز کا فتوی ہے، اور پینے کے حق میں حضرت امام محمدؒ کے قول کے مطابق حرام اور ناجائز ہونے پر فتوی ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱۲۵، احسن الفتاوی ۸/۴۸۸، دینی مسائل ۲۹۳)

وأما غير الأشربة الأربعة فليست نجسة عند الإمام أبي حنيفةؒ، وبهذا يتبين حكم الكحول المسكرة التي عمت بها البلوىٰ اليوم، فإنها تستعمل في كثير من الأدوية، والعطور، والمركبات الأخرى، فإنها إن اتخذت من العنب، أو التمر، فلا سبيل إلى حلتها أو طهارتها، وإن اتخذت من غيرهما فالأمر فيها سهل على مذهب أبي حنيفةؒ ولا يحرم استعمالها للتداوي، أو لأغراض مباحة أخرى، ما لم تبلغ حد الإسكار؛ لأنها إنما تستعمل مركبة مع المواد الأخرىٰ ولا يحكم بنجاستها أخذاً بقول أبي حنيفةؒ، وإن معظم الكحول التي تستعمل اليوم في الأدوية، والعطور وغيرها لا تتخذ من العنب، أو التمر، إنما تتخذ من الحبوب، أو القشور، أو البترول وغيره...... وحيئذ هناك فسحة في الأخذ بقول أبي حنيفةؒ عند عموم البلوىٰ. (تكملة فتح الملهم، كتاب الأشربة، اشرفية ديوبند ۳/ ۶۰۸)

وأما ماسواها فيتخذ النبيذ من كل شيئ من الحبوب والثمار، والألبان وتسمي هذه الأقسام بالأنبذة وحكمها ماذكروا أن القليل أي القدر غير المسكر منها حلال إذا كان بقصد التقوى على العبادة وحرام بقصد التلهي والكثير أي القدر المسكر منها حرام وهذا مذهب الشيخين.

(العرف الشذي على هامش الترمذي، أبواب الأشربة، باب ماجاء في شارب الخمر ۲/۸)

أما الأشربة المتخذة من الشعير، أو الذرة، أو التفاح، أو العسل إذا اشتد وهو مطبوخ،أو غير مطبوخ، فإنه يجوز شربه مادون السكر عند أبي حنيفةؒ، وأبي يوسفؒ، وعند محمدؒ حرام شربه قال: الفقيه وبه نأخذ. (هندية، كتاب الأشربة، الباب الثاني في المتفرقات، زكريا قديم ٥/٤١٤، جديد ٥/٤٧١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍جمادی الاول ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰؍۱۱۵۲۴)

مرد کا ہاتھوں اور بالوں میں مہندی لگانا

سوال [۱۰۵۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مرد کا مہندی لگانا کیسا ہے؟ بالوں اور ہاتھوں دونوں کے بارے میں بتائیں؟

المستفتی: محمد ناصر انصاری، محلّہ ملکیان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرد کا بالوں میں مہندی لگانا شرعاً درست ہے؛ البتہ ہاتھ پیر میں مرد کو مہندی لگانا شرعاً درست نہیں ہے اور اگر گرمی دور کرنے کیلئے ایسا کرے، تو صرف تلوؤں میں لگانے کی گنجائش ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۳۸۶/۱۴، جدید ڈابھیل ۴۵۶/۱۹)

عن أبي ذر قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن أحسن ماغيرتم به الشيب الحناء، والكتم. (سنن النسائي، الزينة، النسخة الهندية ٢/٢٣٦، دار السلام رقم:٥٠٨٨)

وعن الإمام أن الخضاب حسن؛ لكن بالحناء. (هندية، كتاب الكراهية، الباب العشرون في الزينة، زكريا قديم ٥/٣٥٩، جديد ٥/٤١٤)

يستحب للرجل خضاب شعره، ولحيته لا يديه، ورجليه، فإنه مكروه للتشبه بالنساء. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي٦/٢٢٤،زكريا ٩/٦٠٤)

وأما خضب اليدين، والرجلين، فيستحب في حق النساء، ويحرم في حق الرجال إلا للتداوي. (مرقاة، شرح المشكوة، كتاب اللباس، باب الترجل، الفصل الثاني، امدادية ملتان ٨/٣٠٤، تحت رقم الحديث٤٤٥٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۶/ذی قعدہ ۱۴۲۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۹۳۲/۳۵)	۱۴۲۱/۱۱/۸ھ

سر، داڑھی، ہاتھ، پیر میں مہندی لگانے کا حکم

سوال [۱۰۵۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مہندی لگانا سر یا داڑھی کے بالوں میں اور ہاتھ پیر میں جائز ہے یا نہیں؟

(۲) یہ کہ عورت کو بالوں میں مہندی لگانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالعزیز، بزازی، شاہی مسجد مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) مردوں کو سر یا داڑھی کے بالوں میں مہندی لگانا جائز ہے۔

عن ابن سيرين قال: سئل أنس هل خضب رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ قال: إنه لم يكن رأي من الشيب إلا قال ابن إدريس كا ن يقلله وقد خضب أبوبكر، وعمر بالحناء، والكتم. (صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب شيبة صلى الله عليه وسلم، النسخة الهندية ۲/۲۵۸، بيت الأفكار رقم: ۲۳۴۱)

وورد أن أبا بكرؓ خضب بالحناء، والكتم. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كوئٹه ۵/۲۹۹، كراچي ۶/۴۲۲، زكريا ۹/۶۰۵، كفايت المفتى ۹/۱۷۲، جديد زكريا مطول ۱۲/۳۴۴)

مردوں کو ہاتھ اور پیر میں مہندی لگانا مکروہ ہے؛ کیونکہ اس میں عورتوں کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے۔

لايديه ورجليه،فإنه مكروه للتشبه بالنساء. (شامي، مطبوعة، كوئٹه ۵/۲۲۹، كراچي ۶/۲۲۴، زكريا ۹/۶۰۴، أوجز المسالك، باب ماجاء في صبغ الشعر، قديم ۶/۳۳۴، فتاوى احياء العلوم ۱/۲۷۰، فتاوى محمودية ۱/۱۵۵، جديد ڈابهيل ۱۱/۲۱۴، فتاوى رشيدية قديم ۵۸۸، جديد زكريا ۵۷۹)

(۲) اگر شوہر کو یہی پسند ہے تو جائز ہے۔

استحباب خضاب الشيب للرجل، والمرأة بصفرة، أوحمرة. (أوجز المسالك قديم ۶/۳۳۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/۵۹۹)

ٹیٹو کا شرعی حکم

سوال [۱۰۵۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ٹائے ٹوس (جو ایک طرح کا جسم پر نقش و نگار ہوتا ہے، اس میں

گدوانا نہیں ہوتا صرف ایک کاغذ کو جس پر نقش ونگار ہوتا ہے جسم پر چسپاں کرتے ہیں، پھر کچھ دیر بعد اس کاغذ کو جسم سے الگ کر دیتے ہیں، جس کی وجہ سے اس کاغذ کا نقش جسم پر ظاہر ہوجاتا ہے) تو کیا اس طرح جسم کے کسی بھی حصہ پر نقش ونگار کی اجازت ہے؟ کیا یہ تغییر خلق میں داخل ہے؟ مفصل تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد رضوان، حیدرآباج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: حدیث شریف میں گدوانے کی مذمت آئی ہے اوراس کو شیطان کی کتابت سے تعبیر کیا ہے، اور ٹائے ٹوس کا نقش گدوائے بغیر اگرچہ جسم پر چسپاں ہوجاتا ہے؛ لیکن جسم پر چسپاں ہوجانے کے بعد گدوانے کے مشابہ ہوجاتا ہے، اس لئے یہ بھی جائز نہیں ہوگا۔

عن أبي هريرة رضـ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: العين حق ونهى عن الوشم. (بخاري شريف، كتاب اللباس، باب الواشمة ۸۷۹/۲، رقم: ۵۷۱۱، ف:۵۹۴۴)

وقد يكون في اليد وغيرها من الجسد وقد يفعل ذلک نقشًا وقد يجعل دوائر، وقد يكتب اسم المحبوب، وتعاطيه حرام بدلالة اللعن. (فتح الباري، كتاب اللباس، باب المتفلجات للحسن، دار الريان للتراث العربي بيروت ۳۸۵/۱۰، اشرفية ديوبند ۴۵۵/۱۰، دار الفكر بيروت ۳۷۲/۱۰، تحت رقم الحديث ۵۹۳۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/محرم الحرام ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۵۸۱/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۱/۱۴۳۳ھ

کیا زندگی میں سوا کلو یا سوا سیر سرمہ لگانا سنت ہے؟

سوال [۱۰۵۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: کہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ سرمہ لگانا سنت ہے؛ لیکن سوا کلو یا سوا سیر اگر کسی نے اپنی زندگی میں استعمال نہ کیا تو مرنے کے بعد اس کو قبر میں فرشتے ٹھوسیں گے یہ بات کہاں تک صحیح ہے؟

المستفتی: محمد مختار، سکٹھونگلہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کسی آیت کریمہ اور صحیح حدیث سے سوا کیلو یا سوا سیر والی بات ثابت نہیں ہے، بس حدیث میں صرف سرمہ لگانے کی سنیت ثابت ہے، مذکورہ مقدار کا ثبوت نہیں ہے، ہاں البتہ تین تین مرتبہ ایک آنکھ میں لگانا مسنون ہے۔

أن النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم، کانت لہ مکحلة منها عند النوم ثلاثاً في کل عین. (شمائل ترمذي ٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵ ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/ ۳۱۲۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۳/۴/۵ھ

عورتوں کا فیشن کرنا

سوال [۱۰۵۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ معلمات وطالبات بلکہ اکثر مسلم عورتیں ہتھیلی پر مہندی لگانے کے ساتھ پشت پر بھی کہنیوں تک پھول، بیل بوٹے بناتی ہیں، لمبے آئرن کانوں میں لٹکاتی ہیں، جو بلاشبہ دور حاضر کی فیشن ایبل لڑکیوں اور غیر مسلم عورتوں کی نقل ہے، تو اس قسم کی زیب وزینت کی معلمات وطالبات اور مسلم عورتوں کو کہاں تک اجازت ہے؟

المستفتی: عرفان اللہ قاسمی، مالیگاؤں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورتوں کے لئے پھول، بوٹے کے ساتھ

مہندی لگانا اور کانوں میں بوندے پہننا حدیث سے ثابت ہے، مگر اس طرح مہندی لگا کر ہاتھوں کو کھول کر کے مردوں کے مجمع میں یا سڑکوں پر پھرنا قطعاً جائز نہیں؛ ہاں البتہ مہندی لگا کر گھروں میں اور پردہ میں رہتی ہیں اور اجنبیوں کے سامنے نہیں آتی ہیں، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

عن ابن مسعودؓ، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: المرأة عورة، فإذا خرجت استشرفها الشيطان. (سنن الترمذي، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ۱/۲۲۲، دار السلام رقم:۱۱۷۳، مشكوة المصابيح ۱/۲۶۹)

عن عائشةؓ قالت: أومأت امرأة من وراء ستر بيدها كتاب إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقبض رسول الله صلى الله عليه وسلم يده، فقال: ما أدري أيد رجل أم يد امرأة، قالت: بل امرأة؟ قال: لو كنت امرأة لغيرت أظفارك يعني بالحناء. (أبوداؤد، باب في الخضاب للنساء، النسخة الهندية ۲/۵۷۴، دار السلام رقم:۴۱۶۶، مشكوة ۳۸۳)

أن النبي صلى الله عليه وسلم خرج ومعه بلال فظن أنه ليسمع النساء فوعظهن وأمرهن بالصدقة، فجعلت المرأة تلقي القرط والخاتم وبلال يأخذ في طرف ثوبه. (صحيح البخاري، باب عظة الإمام النساء وتعليمهن، النسخة الهندية ۱/۲۰، رقم:۹۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ جمادی الثانیہ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/۱۱۱۵۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۶/۲۴ھ

عورتوں کی فیشن ایبل جوتیوں کا حکم

سوال [۱۰۵۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: کہ موجودہ دور کی لیڈیز جوتیاں مسلم عورتیں پہن سکتی ہیں؟

المستفتی: جامعۃ الطیبات مالیگاؤں (ناسک)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جوتیاں عورتوں ہی کے لئے وضع کی جاتی ہیں؛ اس لئے مسلم عورتوں کے لئے لیڈیز جوتیاں پہننے میں کوئی قباحت نہیں ہے، سائل کے سوال سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ عورتیں لیڈیز جوتیاں نہ پہن کر کے مردانہ پہنیں۔ **لاحول ولاقوۃ إلا باللّٰہ۔**

یباح للنساء......وما یلبسه علی وجوههن وفي أعناقهن، وأیدیهن، وأرجلهن، وأذانهن وغیره. (إعلاء السنن، باب حرمة الذهب علی الرجال وحله للنساء، دار الكتب العلمية بیروت ۳۱۸/۱۷، كراچي ۲۹٤/۱۷، المغني لابن قدامة، دارالكتب العلمية بیروت ۳٤۲/۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ / جمادی الثانیہ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۱۵۹/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۶/۲۴ھ

سینٹ اور چمکدار ہونٹ پالش کا حکم

سوال [۱۰۵۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سینٹ اور چمکدار ہونٹ پالش کی تیاری میں خنزیر یا ناپاک اجزاء کی ملاوٹ ہوتی ہے، تو کیا ان کی باتوں پر یقین کرتے ہوئے مذکورہ دونوں چیزوں کا استعمال کرنا ناجائز ہوگا؟ اگر ہونٹ پالش میں چمک نہ ہو صرف لال رنگ ہو، تو عورت اپنے شوہر کے سامنے لگا سکتی ہے کہ نہیں؟

المستفتی: محمد اعجاز، نگینہ بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہندوستان میں جو سینٹ بنتا ہے، اس میں انگوری شراب سے بنا ہوا الکحل استعمال نہیں ہوتا؛ بلکہ دوسری اشیاء سے بنایا ہوا الکحل استعمال ہوتا ہے؛ لہٰذا ایسے سینٹ کا استعمال درست ہے اور عورتوں کے لئے ہونٹ پالش کا استعمال کرنا جائز ہے، بشرطیکہ اس میں کوئی ناپاکی ملی ہوئی نہ ہو۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۱۲۵، محمودیہ قدیم ۱۵/۳۵۸، جدید ڈابھیل ۱۹/۳۳۱)

وبهذا يتبين حكم الكحول المسكرة التي عمت بها البلوىٰ اليوم، فإنها تستعمل في كثير من الأدوية، والعطور، والمركبات الأخرىٰ......وإن اتخذت من غيرهما، فالأمر فيها سهل على مذهب أبي حنيفةؒ ولايحرم استعمالها للتداوي، أو لأغراض مباحة أخرىٰ......وإن معظم الكحول التي تستعمل اليوم في الأدوية، والعطور وغيرها لاتتخذ من العنب، أو التمر، إنما تتخذ من الحبوب، أو القشور، أو البترول وغيره الخ. (تكملة فتح الملهم، كتاب الأشربة، حكم كحول المسكرة، اشرفية ديوبند ۳/۶۰۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍رجب المرجب ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۵۸۶۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۷/۱۴۱۹ھ

عورتوں کا لبوں پر سرخی لگانا

سوال [۳۵۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عورتیں جو لبوں پر سرخی لگاتی ہیں؛ حالانکہ اس سرخی سے غالباً پپڑی بھی نہیں بنتی ہے، جیسا کہ عورتوں کا کہنا بھی ہے کہ اس کو دھونے سے سب صاف ہو جاتی ہے، علاوہ ازیں کہ ناخن کی جو پالش ہوتی ہے، اس کو بغیر کھرچے صاف نہیں کیا جا سکتا ہے، اس معنی کر اس پر وضو کرنے میں پانی بھی جذب نہیں ہوتا ہے، اس کا استعمال غالباً ٹھیک نہیں ہے، بعض علماء

سے معلوم کیا، تو بتلایا کہ لبوں پر سرخی کا لگانا درست نہیں ہے؛ کیوں کہ وضوء میں پانی جذب نہیں ہو پاتا، بعض لوگوں نے بتلایا درست ہے، اس سے پپڑی لبوں پر نہیں بنتی ہے نیز بعض علماء نے پیروں کے زیور چٹکی یا بچھیا کو غیر مسلم عورتوں سے مشابہ قرار دے کر منع کر دیا کہ یہ غیر مسلم عورتوں کا شعار ہے، تو ان کا استعمال کیسا ہے؟

المستفتی: جلیس احمد، مدرسہ جامعہ عربیہ شہر سیتا پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: لبوں پر سرخی نہ لگانا چاہیئے اس لئے کہ لوگوں کے بتانے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اس میں خنزیر کی چربی شامل ہوتی ہے اور اگر اس بات کی تحقیق ہو کر یقین ہوجائے، تو پھر سرخی لگانا حرام ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۲/۳۵۹، جدید ڈابھیل ۱۹/۳۳۲)

قال اللّٰہ تعالیٰ: اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ. [البقرة: ۱۷۳] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/شعبان المعظم ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/۳۵۵۹)

عورتوں کا لپ اسٹک لگا کر باہر نکلنا

سوال [۱۰۶۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عورتوں کو لپسٹک استعمال کرنا کیسا ہے؟ اگر جائز نہیں ہے، تو اس کی وجوہات کیا ہیں؟

المستفتی: شریف احمد، لکھیم پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شوہر کو خوش کرنے کے لئے گھر کے اندر پردہ میں رہ کر ایسی لپ اسٹک لگانا جائز ہے، جس میں کوئی نجس شئ شامل نہیں ہو؛ لیکن باہر گھومنے کے

لئے یہ بھی جائز نہیں ہے؛ کیونکہ یہ زینت کے لئے استعمال ہوتی ہے، اور زینت کے ساتھ غیر محرموں کے سامنے جانا جائز نہیں ہے۔

وطيب النساء لون لا ريح له كالزعفران، والخلوق. (مرقاة، كتاب اللباس، امداديه ملتان ٨/٢٥٨)

وأما التحمير ونحوه فيجوز بإذن الزوج وفي داخل البيت، ويحرم بغير إذن الزوج وخارج المنزل. (الفقه الإسلامي، وأدلته، كتاب الحظر والإباحة، تاسعا الترجل والتخنث، مكتبه هدىٰ انٹرنیشنل دیو بند ٣/ ٥٨٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ ؍محرم الحرام ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳ ؍ ۵۶۰۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸ ؍۱ ؍۱۴۱۹ھ

عورتوں کے لئے لپ اسٹک کے استعمال کا حکم

سوال [۱۰۶۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ لپ اسٹک جو عورتیں ہونٹوں میں استعمال کرتی ہیں، بعض اخبارات سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ خنزیر کی چربی سے تیار ہوتی ہے، اس کی کیا تحقیق ہے یہ جائز ہے یا ناجائز ہے؟

المستفتی: محمد صابر، مدرس مدرسہ تعلیم القرآن، مظفر نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: لپ اسٹک میں خنزیر کی چربی کی موجودگی کا علم یقینی ہو، تو اس کا استعمال ناجائز ہے اور ہونٹوں کی ناپاکی کا بھی حکم ہوگا؛ لیکن اگر خنزیر کی چربی کا یقین نہیں ہے یا اس کی حقیقت بدلنے کے بعد لپ اسٹک میں شامل کی جاتی ہے، تو اس کے استعمال میں گنجائش ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۲/ ۳۵۹، جدید ڈابھیل ۱۹/ ۳۲۲، کفایت المفتی قدیم ۲/ ۲۸۲، جدید زکریا مطول) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍شعبان المعظم ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۹۸۶/۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۷/۸/۱۶ھ

عورتوں کا لبوں پر سرخی لگانا جائز ہے یا نا جائز؟

سوال [۱۰۶۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عورتیں جو اپنے لبوں پر سرخی لگاتی ہیں، اس کا لگانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں جائز ہے تو حالات کے اعتبار سے اس دور کے آدمی یا مولوی یا مفتی کا رنگ برنگی دنیا کو دیکھتے ہوئے نفس پر کنٹرول کرنا نہایت مشکل ہے؛ حالانکہ ایک مرتبہ اللہ کے رسول اپنے گھر سے باہر نکلے اچانک ایک عورت پر نظر پڑی حضور ﷺ فوراً اپنے گھر واپس ہوئے اور کسی بیوی سے حاجت پوری کی پھر فرمایا: تم میں سے کوئی بھی سفر یا حضر میں نکلے اور کوئی عورت اس کو بھا جائے، تو وہ فوراً اپنے گھر واپس ہو، جو اس کے پاس ہے وہی اس کے پاس ہے؛ لیکن اس دور میں تو سرخی کا عام رواج ہو گیا، اگر کوئی شخص کسی کو دیکھے اور گھر واپس آئے، تو ویسی حالت نہ پائے، وہ کیا کرے؟ حالانکہ مفتی صاحب آپ نے اپنی کتاب ایضاح المسائل میں روزہ کے بیان میں لکھا ہے کہ سرخی روزہ کی حالت میں لگائے، تو روزہ میں کوئی فرق نہیں پڑے گا، تو وہ کون سی لالی یا سرخی ہے؟ جس کا لگانا ٹھیک ہے جائز ہے، اس دور کی دیگر عورتوں کو دیکھو تو نفس پر عجیب نقش بن جاتا ہے کہ مٹائے ہی نہیں مٹتا، اگر گھر پر عورت کے لبوں پر سرخی لالی وغیرہ لگوا کر صحبت کی جائے، تو کوئی گناہ کی بات تو نہیں اگر ہے، تو اس کو بھی واضح فرمائیں۔

المستفتی: محمد ذکوان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورتوں کا لبوں میں سرخی یعنی لپ اسٹک لگانا جائز اور درست ہے؛ البتہ اگر لپ اسٹک تہہ دار ہے اور ہونٹوں تک پانی پہونچنے سے مانع ہے،

تو اس کو صاف کئے بغیر وضوء اور غسل درست نہیں عورتوں کو لپ اسٹک لگا کر اور بن سنور کر گھر سے باہر نکلنا کہ جس سے اجنبی مردوں کے دل مائل ہوتے ہوں درست نہیں ہے؛ لیکن اگر اپنے شوہر کو خوش کرنے کے لئے اور اسی طرح صحبت کے وقت لالی اور سرخی لگائی جائے تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۳۸۵/۱۵، جدید ڈابھیل ۳۲۲/۱۹، دینی مسائل اور ان کا حل ۳۱۷)

ولا يمنع الطهارة ونيم وحناء ودرن......وكذا دهن ودسومة وتراب في ظفر مطلقاً وما على ظفر صباغ، وقيل إن صلبا منع وهو الأصح (در مختار) أي إن كان ممضوغاً مضغاماتأ كدًا، بحيث تداخلت أجزاؤه وصار لزوجة وعلاكة كالعجين لا متناع نفوذ الماء مع عدم الضرورة والحرج. (شامي، كتاب الطهارة، مطلب في أبحاث الغسل، كراچي ١/١٥٤، زكريا ١/٢٨٨-٢٨٩)

وأما التحمير ونحوه فيجوز بإذن الزوج وفي داخل البيت، ويحرم بغير إذن الزوج وخارج المنزل. (الفقه الإسلامي، وأدلته، كتاب الحظر والإباحة، تاسعا: الترجل والتخنث، مكتبه هدىٰ انٹرنیشنل دیو بند ٣/ ٥٨٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۵۵۱/۳۷)

شوہر کو خوش کرنے کے لئے کالا خضاب لگانا

سوال [۱۰۶۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مردوں کے لئے کالا خضاب لگانا مکروہ ہے؟ کیا یہ حکم عورتوں کے لئے بھی ہے؟ اگر عورتوں کے لئے بھی یہی حکم ہے، تو کیا شوہر کی خوشنودی کے لئے بالوں کو کالا کرنا اس کے لئے جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد شفیع

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مردوں کی طرح عورتوں کے لئے بھی سیاہ خضاب استعمال کرنا مکروہ ہے؛ البتہ شوہر کی خوشنودی کے لئے اس کے کہنے پر سیاہ خضاب استعمال کرنے کی گنجائش ہے، یہی حضرت امام ابویوسفؒ کا قول ہے، اور ایسے حالات میں حضرت امام یوسفؒ کی رائے کو ترجیح دینا بہتر ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۹/۴۵۵، میرٹھ ۲۷/۵۱۰)

ومذهبنا استحباب خضاب الشيب للرجل، والمرأة بصفرة، أوحمرة ويحرم خضابه بالسواد على الأصح. (نووي على هامش المسلم، كتاب اللباس والزينة، باب استحباب خضاب الشيب بصفرة أوحمرة ۲/۱۹۹)

أما الخضاب بالسواد للغزو ليكون أهيب في عين العدو، فهو محمود بالاتفاق، وإن ليزين نفسه للنساء، فمكروه وعليه عامة المشائخ، وبعضهم جوزه بلا كراهة روي عن أبي يوسفؒ أنه قال: كما يعجبني أن تتزين لي يعجبها أن أتزين لها. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٦/٤٢٢، زكريا ٩/٦٠٥، هندية، زكريا قديم ٥/٣٥٩، جديد ٥/٤١٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ١/٣٥٠، تاتارخانية، زكريا ١٨/٢١٤، رقم: ٢٨٥٥٥)

اختضب لأجل التزين للنساء، والجواري جاز في الأصح، ويكره بالسواد، وقيل: لا، وتحته في الشامي ومذهبنا استحباب خضاب الشيب للرجل والمرأة أو حمرة وتحريم خضابه بالسواد على الأصح ......قال الحموي: وهذا في حق غير الغزاة، ولا يحرم في حقهم للإرهاب. (شامي، كراچي ٦/٧٥٦، زكريا ١٠/٤٨٨-٤٨٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۵۶۲)

لڑکیوں کے لئے مردانہ جوتے پہننے کا حکم

سوال [۱۰۶۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ لڑکیوں کو کپڑے کا جوتا پہنانا اور اس کا پابند کرنا شرعًا کیسا ہے؟ جبکہ جوتا دیکھنے میں مردانہ معلوم ہوتا ہے۔

المستفتی: مشتاق احمد، برولان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: لڑکیوں کو مردانہ جوتا پہنانا ناجائز اور حرام ہے، اگر لڑکیاں بالغ ہیں، تو اس کا گناہ خود ان پر ہوگا اور اگر نابالغ ہیں، تو اس کا گناہ والدین پر ہوگا۔

مرد را تشبہ بزنان وزن را تشبہ بمرداں ومسلم را تشبہ بکفار وفساق حرام است۔

(مالابدمنہ، مطبوعہ نامی لکھنؤ ۱۲۶، مستفاد: فتاوی رشیدیہ قدیم ۵۹۴، جدید زکریا ۵۸۶، امداد الفتاوی ۱۲۵/۴)

حدیث شریف میں پیغمبر کا حکم یہی آیا ہے کہ والدین اپنی اولاد کو سات سال کی عمر سے احکام شرعیہ اور آداب شرعیہ کا عادی بنائیں۔

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: مروا أولادكم بالصلوة وهم أبناء سبع سنين واضربوهم عليها وهم ابناء عشر، وفرقوا بينهم في المضاجع. (أبوداؤد شريف، كتاب الصلوة، باب متى يؤمر الغلام بالصلاة، النسخة الهندية ۷۱/۱، دارالسلام رقم:٤٩٥)

ولاشک أن المراد بالتأديب هنا تعليم الأداب الشرعية. (مرقاة، شرح مشكوة، باب البر والصلة، الإقتصاد في العلم والعمل، امدادية ملتان ۲۳۱/۹)

عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: أكرموا أولادكم وأحسنوا آدبهم. الحديث (ابن ماجه شريف، كتاب الأدب، باب بر الوالد والإحسان إلى البنات،

النسخة الهندية ۲/ ۲٦۱، دار السلام رقم: ۳٦۷۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ جمادی الاول ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/ ۶۹۴)

بیوی کا شوہر کے لئے زینت کرنے کا حکم

سوال [۱۳٦٦۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر عورتیں صرف اپنے شوہروں کے لئے ایسی زینت اختیار کریں، جو آج کل غیروں کی عورتیں کرتی ہیں، یعنی میک اپ کریں قسم قسم کے لباس وغیرہ پہنیں اور یہ صرف اس لئے کریں کہ ان کے شوہروں کی نگاہ دوسری عورتوں پر نہ پڑے تو کیا یہ زینت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد زبیر بن نور محمد جگنو (گجرات)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہر قسم کی زینت اختیار کرنا جائز ہے، اور لباس بھی پہننا جائز ہے، بشرطیکہ شوہر اس قسم کے لباس کی اجازت دیتا ہو ورنہ نہیں۔

فإن لم يكن لها زوج، ولا سيد فهو حرام أيضًا، وإن كان فثلاثة أوجه...... وأصحها عندهم إن فعلته بإذن الزوج أو السيد جاز . (شرح المسلم، للنووي، كتاب اللباس والزينة، باب تحريم فعل الواصلة والمستوصلة ۲/ ۲۰٤، عمدة القاري، شرح صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب وما أتاكم الرسول فخذوه، داراحياء التراث العربي بيروت ۹/ ۲۲٦، زكريا ديوبند ۱۳/ ۳۹۰، تحت رقم الحديث ٤۸۸۷)

ولعله محمول على ما إذا فعلته لتتزين الأجانب. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، قبيل باب الإستبراء، زكريا ۹/ ۵۳٦، كراچي ۹/ ۳۷۳)

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ . [النور: ۳۱]

قال أبو بكر: ظاهره يقتضي إباحة إبداء الزينة للزوج (إلى قوله) إن المراد مواضع الزينة: وهو الوجه، واليد، والذراع؛ لأن فيها السوار والقلب، والعضد وهو موضع الدملج والنحر والصدر موضع القلادة، والساق موضع الخلخال. (أحكام القرآن للجصاص، سورة النور، باب الإستئذان، سهيل اكيڈمي لاهور ۳/ ۳۱۷، زكريا ديوبند ۳/ ۴۰۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ رشعبان المعظم ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/ ۱۳۶۵)

مسلمان عورتوں کا سندور لگانا

سوال [۱۰۶۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کافر عورت جو کہ سندور لگاتی ہے، کیا مسلم عورت کے لئے یہ جائز ہے؟

المستفتی: محمد بدرالدین، مسجد میدان والی، رفعت پورہ، مرادآبا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مسلمانوں عورتوں کے لئے سندور لگانا ناجائز اور حرام ہے؛ کیونکہ اس میں کافروں کے اطوار وشعائر ومشابہت کو اپنانا ہوتا ہے، جس کی حدیث میں وعید آئی ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۴/ ۲۵۲-۴/ ۲۵۴، فتاوی محمودیہ قدیم ۱/ ۱۵۵، جدید ڈابھیل ۱۱/ ۲۱۴، فتاوی رشیدیہ قدیم ۴۶۳)

عن ابن عمرؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من تشبه بقوم فهو منهم. (سنن أبي داؤد، كتاب اللباس، باب في لبس الشهرة ۲/ ۵۵۹، دار السلام رقم: ۴۰۳۱، سنن سعيد بن منصور، دار الكتاب العلمية بيروت ۲/ ۱۴۳، رقم: ۲۳۷۰، مسند أحمد بن حنبل ۲/ ۵۱، رقم: ۵۱۱۴، المصنف لإبن أبي شيبه، مؤسسه علوم القرآن بيروت ۱۰/ ۲۷۲، رقم: ۱۹۷۴۷، مشكوة شريف ۲/ ۳۷۵)

ولو شبه نفسه باليهود، أو النصارىٰ: أي صورة أو سيرة على طريق المزاح، والهزل، ولو على هذا المنوال كفر الخ. (شرح فقه اكبر، جديد اشرفي ديو بند ۲۲۸، قديم ۲۲۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ / ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/ ۶۴۸)

عورتوں کے لئے مہندی لگانا

سوال [۱۰۶۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کالی مہندی کا استعمال کیسا ہے؟ کیا مطلق جائز ہے یا اس میں کوئی کراہت ہے؟ اگر کراہت ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟ (یہاں استعمال سے مراد عورت کا اپنے ہاتھ پر لگانا ہے)

المستفتی: محمد عمر، گڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: عورت کے لئے کالی یا سرخ مہندی لگانا مطلقاً جائز ہے۔

اتفق الفقهاء على أن تغير الشيب بالحناء، أو نحو مستحب للمرأة للأخبار الصحيحة في ذلك ويجوزلها، بإذن زوجها، وسيدها تحمير الوجنة وتطريف الأصابع بالحناء مع السواد. (الموسوعة الفقهية الكويتية ۲/ ۳۸۱)

ولا ينبغي أن يخضب يدى الصبي الذكر ورجله إلا عند الحاجة، ويجوز ذالك للنساء. (هندية، كتاب الكراهية، الباب العشرون، زكريا قديم ۵/ ۳۵۹، جديد ۵/ ۴۱۵، تاتارخانية، زكريا ۱۸/ ۲۱۵، رقم: ۲۸۵۵۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ / ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۶۱۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۴/۲۷ھ

مرد وعورت کومہندی لگانے کاحکم

سوال [۱۰۶۰۹]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مرد یاعورت کے لئے مہندی لگانا کیسا ہے؟

المستفتی: عبدالمتین، قصبہ بھنگار شراوستی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: عورتوں کومہندی لگانا درست ہےاورمردوں کو عورتوں کی مشابہت کیوجہ سے درست نہیں چاہے بطورعلاج ہی کیوں نہ لگائے؛ البتہ پھوڑے اورپھنسی پر رکھنے کی اجازت ہے۔(مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱/۱۵۵، جدید ڈابھیل ۱۳/۲۱۴، فتاوی رشیدیہ قدیم ۵۸۸، جدید زکریا ۵۷۹)

لعن الله المتشبهين من الرجال بالنساء. (المعجم الكبير للطبراني، داراحياء التراث العربي بيرت ۱۱/۲۵۲، رقم:۱۱۶٤۷، مشكوة ۲/۳۸۰)

عن ابن عباسؓ، قال: لعن النبي صلى الله عليه وسلم: المتشبهين من الرجال بالنساء. الحديث (صحيح البخاري، كتاب اللباس، باب المتشبهين بالنساء۲/۸۷٤، رقم: ٥٦٥٦، ف:٥٨٨٥)

ويجوز لها بإذن زوجها، وسيدها تحمير الوجنة وتطريف الأصابع بالحناء مع السواد. (الموسوعة الفقهية ۲/۲۸۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفااللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۷/ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/۶۶۱۸)	۱۴۲۱/۴/۲۷ھ

پیشانی پر بندی لگانا، چوڑی اورلونگ پہننا کیسا ہے؟

سوال [۱۰۶۱۰]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ میں ایک مسلم بندی ایک بات جاننا چاہتی ہوں امید کہ صحیح جواب دینے کی زحمت گوارہ فرمائیں گے، اللہ کا شکر ہے پہلے بھی مختلف فتویٰ منگا چکی ہوں، جس پر عمل کر کے کافی فائدہ ہوا ہے، اللہ آپ حضرات کا سایہ دیر تک قائم رکھے تاکہ امت دین سے متصف ہو کر کامیاب ہو جائے، کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ چوڑی، بندی اور ناک میں لونگ پہننا سنت ہے، کہیں ایسا تو نہیں سماج میں اس کا چلن ہونے کی وجہ سے سنت سمجھ بیٹھے ہوں، اس کی اصل کیا ہے؟ اس کی تہہ تک پہونچا کر علم سے روشناش فرمائیں تاکہ ہماری زندگی صحابیت سے میل کھا جائے، اور ہم ازواج مطہرات کے نقش قدم پر چلیں۔

المستفتی: محمد فیصل، کرولہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پیشانی پر ٹیکہ لگانا جس کو سوال نامہ میں بندی سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ اغیار کی عورتوں کا شعار ہے؛ لہٰذا ناجائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۷/۲۹۴، جدید ڈابھیل ۱۹/۵۵۷)

عن ابن عمرؓ، قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: من تشبه بقوم فهو منهم. (سنن أبي داؤد، كتاب اللباس، باب في لبس الشهرة ۲/۵۵۹، دار السلام رقم: ۴۰۳۱، المعجم الأوسط للطبراني، مكتبه نزار مصطفىٰ للباز بيروت ۶/۱۵۱، رقم: ۸۳۲۷، المعجم الكبير للطبراني، دار أحياء التراث العربي بيروت ۱۳/۳۱۷، رقم: ۱۴۱۰۹)

اور اگر بندی سے جھومر مراد ہے، جو چھوٹے سائز کا سونے کا ہوتا ہے، جو باضابطہ زیور کی قبیل سے ہوتا ہے، جو بالوں میں باندھنے کے بعد لٹک کر پیشانی تک پہونچتا ہے، یہ مسلم عورتوں کے لئے بلا کراہت جائز ہے؛ اس لئے کہ یہ زینت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور چوڑی اور ناک میں لونگ پہننا شریعت سے ثابت ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۴/۱۳۵)

ويكره للولي إلباس الخلخال، أو السوار لصبي (در مختار) وفي الشامية: قوله "لصبي" أي الذكر؛ لأنه من زينة النساء. (شامي،

كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع كراچي ٦/ ٤٢٠، زكريا ٩/ ٦٠٢)

قلت: وهل يجوز الخزام في الأنف، لم أره (در مختار) وفي الشامي: قوله ''ولم أره'' قلت: إن كان مما يتزين النساء به كما هو في بعض البلاد فهو فيها كثقب القرط. (شامي، كراچي ٦/ ٤٢٠، زكريا ٩/ ٦٠٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ جمادی الاول ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴؍ ۶۱۴۴)

عورت کا کلائیوں اور پنڈلیوں کے بال صاف کرنا

سوال [۱۰۶۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عورتیں اپنے بدن مثلاً ہاتھ کی کلائیوں یا پنڈلیوں پر سے بال صاف کرسکتی ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو پھر اگر کوئی عورت بال صاف کرلے، تو پھر اس کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد عمران، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر یہ بال دیکھنے میں برے لگتے ہوں اور ان کی وجہ سے شوہر کی ناگواری کا اندیشہ ہو، تو عورت شوہر کی خوشنودی کے لئے یہ بال صاف کراسکتی ہے، محض غیروں کو دکھلانے یا مروجہ فیشن پرستی کے طور پر اس کی اجازت نہیں ہے۔

قال الشامي: تحت قول النامصة لعله محمول على ما إذا فعلته لتزين للأجانب وإلا فلو كان في وجهها شعر ينفر زوجها عنها بسببه ففي تحريم إزالته بعد. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، قبيل باب الاستبراء، زكريا ٩/ ٥٣٦، كراچي ٦/ ٣٧٣، الموسوعة الفقهية الكويتية ١١/ ٢٧٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ صفر المظفر ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴؍ ۶۰۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۲/۱۹ھ

ناپاکی کی حالت میں بال یا ناخن کاٹنے کا حکم

سوال [۱۰۶۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ناپاکی کی حالت میں جبکہ غسل فرض ہو بال کٹوانا، ناخن کٹوانا کیسا ہے؟ ناجائز ہے یا جائز؟

المستفتی: محمد نسیم انصاری، محلّہ ملکیان، پوسٹ: گڑھی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حالت جنابت میں غسل سے قبل بال کٹوانا اور ناخن کاٹنا مکروہ ہے۔

حلق الشعر حالة الجنابة مكروه، و كذا قص الأظافير. (هندية، كتاب الكراهية، قبيل الباب العشرين، زكريا قديم ۳۵۸/۵، جديد ۴۱۴/۵) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۲۱/ ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۳۸۸/۳۴)

(۵) باب الحجاب

شرعی پردہ اور محرم شرعی کی تفصیل

سوال [۱۰۶۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شرعی پردہ اور محرم شرعی کی قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

المستفتی: محمد اعظم اعظمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: شرعی پردہ کی تین قسمیں ہیں:

(۱) بالکل اجنبی مردوں سے پورے بدن کا پردہ لازم ہے، جس میں ہتھیلی چہرہ اور قدمین بھی شامل ہیں۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: المرأة عورة. (ترمذي، أبواب الرضاع، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ۱/۲۲، دار السلام رقم: ۱۱۷۳)

وتمنع المرأة الشابة من كشف الوجه بين الرجال لا لأنه عورة؛ بل لخوف الفتنة، وتحته في الشامية: والمعنىٰ تمنع من الكشف لخوف أن يرىٰ الرجال وجهها فتقع الفتنة. (شامي، كتاب الصلوة، باب شروط الصلوة، كراچي ۱/۴۰۶، زكريا ۲/۷۹)

(۲) اعزاء واقرباء اور خاندان کے وہ لوگ جن سے نکاح کرنا جائز ہے، ان سے اگر فتنہ کا خطرہ نہ ہو، تو چہرہ ہتھیلی اور قدمین کا پردہ لازم نہیں ہے اور گھریلو ضروریات رہن سہن کے اعتبار سے چہرہ کھول کر ان کے سامنے آنا اور ضرورت کی باتیں کرنا جائز ہے۔

ینظر من الأجنبية–إلى وجهها، وكفيها فقط للضرورة، قيل: والقدم. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في النظر والمس، كراچي ٦/٣٦٩، زكريا ٩/٥٣١)

فحل النظر مقيد بعدم الشهوة. (شامي، زكريا ٩/٥٣٢، كراچي ٦/٣٧٠)

يجوز الكلام المباح مع إمرأة أجنبية. (شامي، كراچي ٦/٣٦٩، زكريا ٥٣٠)

ایسے اعزاء جن سے نکاح کرنا کبھی بھی جائز نہ ہوان سے سر بازو، پنڈلی وغیرہ کا پردہ بھی لازم نہیں ہے۔

ینظر من محرمه هي من لا يحل له نكاحها أبدًا إلى الرأس، والوجه، والصدر، والساق، والعضد. (شامي، كراچي ٦/٣٦٧، زكريا ٩/٥٢٨)

شرعی محرم ایسے شخص کو کہا جاتا ہے، جن سے نکاح کرنا کبھی بھی جائز نہ ہو۔

محرمه هي من لا يحل له نكاحها أبداً بنسب أو سبب. (شامي، كراچي ٦/٣٦٧، زكريا٩/٥٢٧)

والمحرم من لا يجوز له مناكحتها على التابيد بقرابة، أورضاع، أوصهرية. (شامي، كتاب الحج، مطلب في قولهم يقوم حق العبد على الشرع، كراچي ٢/٤٦٤، زكريا ٣/٤٦٤)

باپ، دادا، بھائی کی اولادیں اپنے لڑکے پوتے نواسے، اپنا داماد اپنی اولاد کے داماد وغیرہ یہ سب عورت کے لئے شرعی محرم ہیں۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِىْ اٰبَآئِهِنَّ وَلَا اَبْنَآئِهِنَّ وَلَا اِخْوَانِهِنَّ وَلَا اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَلَا اَبْنَآءِ اَخَوَاتِهِنَّ. [الاحزاب:٥٥] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۵؍ربیع الاول ۱۴۳۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۳۰۷)	۱۴۳۲/۳/۵ھ

پردہ کا شرعی حکم اور اس میں سختی برتنا

سوال [۱۰۶۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے گھر میں لڑکے لڑکیاں جوان ہیں، جب میرے بھانجے، یا بھتیجے میرے گھر آتے ہیں، تو دروازہ پر دستک دیتے ہیں، میں گھر میں ان کی بہنوں یعنی اپنی لڑکیوں کو پردہ میں کرتا ہوں، پھران کو گھر میں لاتا ہوں، ان کے سامنے قطعاً نہیں آنے دیتا؛ جبکہ بچپن میں وہ ایک ساتھ کھیلتے پھرتے تھے، اوراپنی بیوی کا بھی ان سے پردہ کراتا ہوں، یعنی ان کی حقیقی چچی اور ممانی ہوتی ہیں؛ جبکہ بچپن میں وہ ان کی گود میں کھیلتے تھے، جب وہ بالغ ہوئے، تو ان سے پردہ کرایا گیا؛ جبکہ گھر میں ان کی عمر کے میرے لڑکے اور میں خود بھی موجود ہوتا ہوں، کوئی تنہائی کا موقع بھی نہیں ہوتا ہے، میرا یہ طریقہ کیسا ہے؟ رہنمائی چاہتا ہوں۔

(۲) میری ایک لڑکی شادی شدہ ہے، جب میرے داماد میرے گھر آتے ہیں، تو میں گھر میں پردہ کا نظم کر کے ان کو گھر میں داخل کرتا ہوں، اپنی بچیوں کو حکم کرتا ہوں کہ وہ بالکل پردہ سے رہیں، اگر داماد گھر میں اندر ہے، تو دروازہ پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے، تاکہ ان کے کپڑوں تک کی جھلک ان کو نظر نہ آئے، جب داماد کو باہر آنے کی پیشاب یا پاخانہ جانے کی ضرورت ہوتی ہے، تو وہ کسی بچہ کو آواز دے کر کہہ دیتے ہیں، یہاں میں بچیوں کو دوسرے کمرہ میں بھیج دیتا ہوں، جب تک وہ باہر یعنی برآمدہ وغیرہ میں رہیں، تب تک لڑکیاں اندر کمرہ میں رہیں گی، میں یہاں تک کوشش کرتا ہوں کہ جب داماد گھر آتے ہیں، تو سالیاں ان کی خیریت تو درکنار اپنی بہن کی خیریت بھی معلوم نہیں کرسکتیں نہ وہ سالیوں کی خیریت معلوم کر سکتے، نہ وہ ان کی بہن کا سلام بلا واسطہ کہہ سکتے ہیں، کیا یہ میرا رویہ سنت نبوی کے مطابق ہے یا نہیں؟ جواب تحریر فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں نوازش ہوگی۔

المستفتی: محمد عبداللہ، رام جی والا، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) چچا زاد، ماموں زاد بھائی اوراس طرح کے رشتہ دار جن کی گھر میں باربار آمد ورفت ہو اور بظاہر فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، تو بلا زیب وزینت صرف چہرہ اور ہتھیلی کھلے رہنے کی حالت میں ان کے سامنے آنے جانے اورضروت کی باتیں کرنیکی اجازت ہے، ہاں البتہ ان کے ساتھ بالکل تنہائی میں ہونا اورتنہا سفر کرنا، بے تکلفی اور بے حیائی کرنا جو باعث فتنہ ہے جائز نہیں ہے، اسی طرح بھابھی کے ساتھ تنہائی کی حالت میں گھر میں یا باہر رہائش کی گنجائش نہیں، اسی طرح بھابھی کو تنہا کہیں لے جانے لانے کی گنجائش نہیں ، ہاں البتہ کئی مرد یا کئی عورت ساتھ ہوں تو کوئی حرج نہیں ہے اور حدیث شریف میں الحمو موت جو کہا گیا ہے، اس کا مطلب یہی ہے کہ بھابھی کے ساتھ رہائش اختیار کرنے میں فتنہ میں مبتلا ہونے کا سخت خطرہ ہے، پھر اگر دونوں شادی شدہ ہوں، تو خدانخواستہ منہ کالا ہونے کی صورت میں سنگ ساری کی وجہ سے موت کی باری آسکتی ہے۔

حدیث شریف کا یہی مطلب ہے، ایسا ہرگز نہیں کہ دیور بھابھی کے درمیان اجنبیوں کی طرح پردہ لازم ہے؛ بلکہ گھریلو رشتہ داروں کے درجہ میں ہے، اور جہاں فتنہ کا اندیشہ ہونیکی صورت میں ممانعت آئی ہے، اس کا مصداق یہی تفصیل ہے اورسوال نامہ میں جوسختی اور پابندی کی باتیں لکھی ہیں، اس قدر سختی اور پابندی شریعت کا حکم نہیں ہے۔

نیز سوالنامہ میں بھانجے اور بھتیجے وغیرہ کو چچی اور ممانی سے پردہ کرنے کی جوسختیاں بیان کی گئی ہیں، یہ بھی شریعت کا حکم نہیں ہے، اگر بھانجے یا بھتیجے اور ممانی اور چچی کے درمیان فتنہ کا خطرہ نہیں ہے، تو اس طرح کے پردہ کی سختی شریعت کا حکم نہیں بلکہ بھانجے اپنی ممانی کے سامنے اور بھتیجے اپنی چچی کے سامنے آجاسکتے ہیں۔

(۲) جب آپ نے بیٹی کی شادی کسی لڑکے کے ساتھ کردی ہے، تو وہ لڑکا آپ کا بیٹا بن گیا ہے، آپ کی بیوی اس کے لئے ایسی محرم بن گئی ہے، جیسا کہ اس کی ماں اور آپ کی

بیٹیاں اس کے لئے اس مدت تک کے واسطہ بہنیں بن گئی ہے، جس مدت تک آپ کی بیٹی اس کے نکاح میں رہے گی؛ لیکن اگر فتنہ کا خطرہ ہو، تو پھر ان میں پابندی عائد کرنی ضروری ہوگی۔

نیز بالغ لڑکی کو داماد کے گھر کئی روز کے لئے بھیجنا بھی مناسب نہیں اور اسی طرح بالغ لڑکی کو داماد کے ساتھ تنہا سفر میں بھیجنا بھی ممنوع ہے، اور بہنوئی اور سالی کا گھر میں تنہا رات گزارنا بھی ممنوع ہے۔ حدیث شریف میں الحمو موت جو کہا گیا ہے، اس کے ذریعہ سے اس طرح کی تنہائی سے ممانعت کی گئی ہے اور جب گھر میں اور دوسرے لوگ بھی موجود ہوں اور فتنہ کا خطرہ بھی نہ ہو، تو سالی کا بہنوئی سے ضرورت کی باتیں کرنے میں اور ضرورت کی چیز بالمشافہہ لینے دینے میں اور ضروت میں آمنے سامنے جانے آنے میں کوئی گناہ اور کوئی مضائقہ نہیں ہے، یہی فقہاء کرام کی اس طرح کی عبارات کا مطلب ہے۔

وأما النظر إلى الأجنبيات فنقول: يجوز النظر إلى مواضع الزينة الظاهرة منهن، وذلک الوجه، والكف. في ظاهر الرواية: كذا في الذخيرة، وإن غلب على ظنه أنه يشتهي فهو حرام إلى قوله أنه يجوز النظر إلى ذراعيها أيضًا عند الغسل والطبخ، قيل وكذلک يباح النظر إلى ثناياها، وذلک كله إذا لم يكن النظر عن شهوة كذا في المحيط. (الهندية، كتاب الكراهية، الباب الثامن فيما يحل للرجل النظر إليه وما لا يحل له،زكريا قديم ٥/٣٢٩، جديد ٥/٣٨١، تاتارخانية، زريا ١٨/٩٥، رقم: ٢٨١٤٥، المحيط البرهاني،المجلس العلمي بيروت ٨/٢٩، رقم: ٩٥١٦-٩٥١٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ رجب المرجب ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۴۷۴/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۷/۱۴۲۵ھ

پردہ کے چاروں اقسام کے احکام

سوال [۱۰۶۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ بہو کے لئے خسر سے پردہ کرنا کیسا ہے؟ پردہ کرسکتی ہے یا نہیں؟ اس طرح جیٹھ سے بھی پردہ کرنا کیسا ہے؟ درست ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو ان دونوں مردوں سے کتنا پردہ کرسکتی ہے؟ اس کی صحیح حد متعین کردیجئے۔

المستفتی: محمد زبیر، ہاپوڑ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بہو کا خسر سے پردہ نہیں ہے؛ کیونکہ وہ اس کے باپ کے درجہ میں ہے اور وہ حرمت ابدی کے طور پر باپ کے حق میں محرم ہو چکی ہے۔

ثالثاً آباء الأزواج لقوله تعالیٰ: أو آباء بعولتهن. (روح البيان تفسير آيات الأحكام ۲/ ۱٦۰)

البتہ فتنہ کا خوف ہو، تو احتیاط ضروری ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۸/ ۳٦)

پردے کی چار قسمیں ہیں: جن کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) مرد کا اپنی بیوی سے پردہ تو مرد کے لئے اپنی بیوی سے کوئی پردہ نہیں ہے، سر سے پیر تک دیکھ سکتا ہے؛ البتہ ستر عورت کا نہ دیکھنا اولیٰ ہے۔

عن بهز بن حكيم عن أبيه عن جده قال: قلت يانبي الله! عوراتنا مانأتي منها ومانذر؟ قال: إحفظ عورتک إلا من زوجتک، أو ماملكت يمينک. الحديث (سنن الترمذي، كتاب الأدب، باب ماجاء في حفظ العورة، النسخة الهندية ۲/ ۱۰۷، دار السلام رقم: ۲۷۹٤)

أما النظر إلى زوجته فهو حلال من قرنها إلى أقدامها عن شهوة وغير شهوة، هذا ظاهر إلا أن الأولىٰ ان لا ينظر كل واحد منهما إلى عورة صاحبه. (عالمگيري، كتاب الكراهية، الباب الثامن، زكريا قديم ٥/ ۳۲۷، جديد ٥/ ۳۷۹، تاتارخانية، زكريا ۱۸/ ۹۱، رقم: ۲۸۱۳۳، المحيط البرهاني، المجلس العلمي بيروت ۸/ ۲٦، رقم: ۹۵۰۹)

(۲) عورت کا محارم سے پردہ تو محارم عورت کی زینت کی جگہ کو دیکھ سکتے ہیں، وہ چاہے زینت کی ظاہری جگہیں ہوں یا باطنی جگہیں ہوں اور وہ زینت کی جگہیں سر، بال، گردن، سینہ، کان، بازو، کلائی، ہتھیلی، پیر، پنڈلی اور چہرہ ہیں، ان کی طرف محارم دیکھ سکتے ہیں۔

(۳) تیسری قسم پردے کی یہ ہے کہ اجنبی مرد کسی اجنبیہ سے پردہ کرے، تو چہرہ اور ہتھیلی اور قدمین کے علاوہ اجنبیہ کے سارے بدن کا پردہ ہے، اگر فتنہ کا اندیشہ نہ ہو تو دیکھنے کی گنجائش ہے۔ قرآن کریم میں بھی اسی کا ذکر ہے، اور ایک گھر کے اندر چچی، بھابھی، چچازاد بہن تایازاد بہن یہ سب رہتی ہیں اور اسی گھر میں آپ کو بھی رہنا ہے، جیسا کہ آج کل کے زمانہ میں شہر کے تنگ مکانات میں گذارا ہوتا ہے؛ حالانکہ یہ سب عورتیں آپ کے حق میں شرعی طور پر غیرمحرم ہیں؛ لیکن ان عورتوں کا آپ سے پردہ کرنا نہایت مشکل ہے؛ اس لئے اگر ان عورتوں کو آپ سے کوئی فتنہ اور معصیت کا خطرہ نہ ہو اور کوئی بے شرمی اور بے تکلفی کی بات چیت آپس میں نہ ہوتی ہو، تو یہ عورتیں آپ کے سامنے چہرہ، ہتھیلی اور قدمین کھول کر آسکتی ہیں۔

قرآن کریم میں جو پردہ کا حکم بیان کیا گیا ہے، اس میں یہی شکل مراد ہے۔

وأما نظره إلى ذوات محارمه، فنقول: يباح له أن ينظر منها إلى موضع زينتها الظاهرة، والباطنة وهي الرأس، والشعر، والعنق، والصدر، والأذن، والعضد، والساعد، والكف، والساق، والرجل، والوجه......وأما النظر إلى الاجنبيات، فنقول يجوز النظر إلى مواضع الزينة الظاهرة منهن وذلك الوجه. والكف في ظاهر الرواية. (عالمگيري، زكريا قديم ٥/٣٢٨-٣٢٩، جديد ٥/ ٣٨٠-٣٨١، تاتارخانية، زكريا ١٨/٩٢-٩٥، رقم: ٢٨١٣٤-٢٨١٤٥)

وقوله تعالىٰ: وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا. [سورة النور: ٣١]

(۴) اور اگر آپ سے ان عورتوں کو فتنہ اور معصیت کا خطرہ ہو یا آپ کو ان سے فتنہ اور معصیت کا خطرہ ہو یا آپس میں بے حجابی اور بے شرمی کی باتیں بے تکلف کرتے ہوں،

تو پھر چہرہ اور ہتھیلی کا پردہ بھی آپ سے لازم ہوگا، جیسا کہ آج کل چہرہ موضع زینت ہونے کی وجہ سے دوسرے اجنبی مردوں سے چھپانا لازم اور ضروری ہے۔

وإن غلب علی ظنه أنه يشتهي فهو حرام. (عالمگيري، زكريا قديم ٥/ ٣٢٩، جديد ٥/ ٣٨١، تاتارخانية، زكريا ١٨ ٩٥، رقم: ٤٦ ٢٨١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍ محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۴۶۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶/۱/۱۴۲۱ھ

پردہ کے کتنے درجات ہیں؟

سوال [۱۰۶۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ پردے کے کتنے درجات ہیں؟ دیور، چچازاد، ماموں زاد بھائی یعنی جو ذورحم تو ہیں، پر محرم نہیں ہیں، اسی طرح دیگر ذورحم غیر محرم سے کس درجہ کا پردہ ہے؟

المستفتی: محمد زید غازی آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: پردے کے کل چار درجات ہیں:

(۱) عورت کا اپنے شوہر سے کوئی پردہ نہیں ہے، بدن کے پورے حصہ کا دیکھنا شوہر کے لئے جائز ہے۔

(۲) محارم سے پردہ، محرم رشتہ دار سے پردہ، ہاتھ، بازو، سینہ، پنڈلی، کا پردہ نہیں ہے، جیسا کہ باپ، بھائی، بھتیجے، بھانجے وغیرہ۔

(۳) غیر محرم رشتہ دار سے پردہ، اگر شہوت اور فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، تو ذورحم غیر محرم کے سامنے چہرہ اور ہتھیلی کھولنے کی گنجائش ہے؛ لہٰذا چچازاد ماموں زاد، بھائیوں کے سامنے چہرہ اور ہتھیلی کھولنے کی گنجائش ہے، بشرطیکہ فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔

(۴) اجانب سے پورے جسم کا پردہ ہے؛ لیکن بوقت ضرورت چہرہ اور ہتھیلی کھولنے کی گنجائش ہے، جیسا کہ ہر وقت گھر میں آنے جانے والے لوگ مثلاً دیور، جیٹھ اور ان کی نرینہ اولاد وغیرہ، اسی طرح کنبہ کے لوگ جبکہ ان سے فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔ (مستفاد: قاموس الفقہ ۳/۱۸۳، رحمۃ اللہ الواسعہ ۵/۵۱)

أما النظر إلى زوجته فهو حلال من قرنها إلى أقدامها عن شهوة وغير شهوة، هذا ظاهر إلا أن الأولىٰ أن لا ينظر كل واحد منهما إلى عورة صاحبه. (تاتارخانية، زكريا ١٨/٩١، رقم: ٢٨١٣٣)

والحكم بالفرق بين الأجنبي، وذي الرحم، إذا كان النظر لا عن شهوة، فأما بالشهوة فلا يحل لأحد النظر. (بزازيه على الهندية، كتاب الإستحسان، جديد زكريا ٣/٢١٣، وعلى هامش الهندية، زكريا ٦/٣٧٣)

وأما نظره إلى ذوات محارمه، فنقول: يباح له أن ينظر منها إلى موضع زينتها الظاهرة، والباطنة وهي الرأس، والشعر، والعنق، والصدر، والأذن، والعضد، والساعد، والكف، والساق، والرجل، والوجه. (هندية، زكريا قديم ٥/٣٢٨، جديد ٥/٣٨٠، تاتارخانية، زكريا ١٨/٩٢، رقم: ٢٨١٣٤)

وأما النظر إلى الأجنبيات فنقول: يجوز النظر إلى مواضع الزينة الظاهرة منهن، وذلك الوجه، والكف-وإن غلب على ظنه أنه يشتهي فهو حرام. (هندية، زكريا قديم ٥/٣٢٩، جديد ٥/٣٨١، تاتارخانية، زكريا ١٨/٩٥، رقم: ٢٨١٤٥، بدائع الصنائع، زكريا ٤/٢٩٣، حجة البالغة ٢/٣٩٢)

عن عائشةؓ، أن أسماء بنت أبي بكرؓ دخلت على رسول الله صلى الله عليه وسلم، وعليها ثياب رقاق، فأعرض عنها رسول الله صلى الله عليه وسلم وقال: ياأسماء! إن المرأة إذا بلغت المحيض لم يصلح لها أن يرىٰ منها إلا هذا وهذا، وأشار إلى وجهه وكفيه. (سنن أبي داؤد، كتاب اللباس، النسخة

الهندية ٢/ ٥٦٧، دار السلام رقم: ٤١٠٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ جمادی الاول ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۵۶۸/۴۰)

عورت کے ستر کی حد اور محارم سے پردہ کا حکم

سوال [۱۰۶۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کس حد تک ستر چھپائیں اور ستر کا عورت کے لئے از روئے شرع کیا حکم ہے؟ اور اپنا سگا لڑکا بھتیجہ، بھانجہ، بھائی، باپ کے سامنے مکمل طور پر پردہ کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد حامد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورت کا تمام بدن ہی ستر ہے، مگر حسب ضرورت غیر محرم کے سامنے صرف چہرہ، ہتھیلی اور پیر کھولنے کی اجازت ہے اور محرم کے سامنے کچھ اور وسعت ہے کہ ان مذکورہ اعضاء کے ساتھ سر، پنڈلی، سینہ، بازو کھل جانے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اعضاء محرم کے لئے داخل ستر نہیں، یہ مطلب نہیں کہ بلا ضرورت ان کے سامنے پھرے؛ بلکہ بضرورت ان کے سامنے آنا اور باہر نکلنا درست ہے اور بلاضرورت اور خوف فتنہ کے وقت چہرہ چھپانا بھی واجب ہے، چاہے وہ محرم ہی کیوں نہ ہو۔

عن عائشةؓ، أن أسماء بنت أبي بكر، دخلت على رسول الله صلى الله عليه وسلم وعليها ثياب رقاق، فأعرض عنها رسول الله صلى الله عليه وسلم وقال: يا أسماء! إن المرأة إذا بلغت المحيض لم يصلح لها أن يرىٰ منها إلا هذا وهذا، وأشار إلى وجهه وكفيه. (سنن أبي داؤد، كتاب اللباس، النسخة الهندية ٢/ ٥٦٧، دار السلام رقم: ٤١٠٤)

أمـا الـنـظـر إلـى الأجـنبيـات فـنقول: يجوز النظر إلى مواضع الزينة الـظاهرة مـنهـن، وذلك الـوجه، والكف......وإن غلب على ظنه أنه يشتهي فهـو حرام. (الهـنـدية، كتـاب الـكـراهية، البـاب الثـامـن، زكـريـا قديم ٥/ ٣٢٩، جديد ٥/ ٣٨١، تاتارخانية، زريا ١٨/ ٩٥، رقم: ٢٨١٤٥)

أمـا نـظـره إلـى ذوات مـحـارمه، فنقول: يباح له أن ينظر منها إلى موضع زينتها الظاهرة، والباطنة وهي الرأس، والشعر، والعنق، والصدر، والأذن، والـعـضـد، والسـاعـد، والـكف، والسـاق، والرجل، والوجـه. (هـنـدية، زكـريـا قـديـم ٥/٣٢٨، جـديـد ٥/ ٣٨٠، تـاتـارخـانية، زكـريـا ١٨/ ٩٢، رقم: ٢٨١٣٤)

تـمنع الشابة من كشف الوجه بين الرجال لا لأنه عورة؛ بل لخوف الفتنة. (شامي، كتاب الصلاة، باب شروط الصلوة زكريا٢/ ٧٩، كراچي ١/ ٤٠٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸؍ ۸۹۶۷)

عورت پر کن کن سے پردہ لازم ہے؟

سوال [۱۰۶۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) عورت کو اپنے حقیقی ماموں زاد، خالہ زاد، پھوپھی زاد بھائی سے پردہ کرنا چاہئے یا نہیں؟ جبکہ وہ بالغ ہیں وہ نامحرم ہیں یا محرم؟

(۲) عورت کو اپنے بھائی کی سسرال والوں یعنی بھابھی کے باپ اور بھائی سے جو کہ بالغ ہیں پردہ کرنا چاہئے یا نہیں؟

(۳) عورت کو اپنے بہنوئی سے جو کہ بالغ ہے پردہ کرنا چاہئے یا نہیں؟

(۴) نندوئی سے پردہ کرنا چاہئے یانہیں؟ آج کل عورتیں صرف جواپنے شوہر کا بڑا بہنوئی ہے، اس سے پردہ کرتی ہیں اور جونندوئی اپنے شوہر سے چھوٹا ہے؛ حالانکہ وہ بھی بالغ ہے پردہ نہیں کرتیں، کیا یہ طریقہ شرعاً صحیح ہے؟

(۵) دیور جوکہ بالغ ہے پردہ کریں یانہیں؟

(۶) کسی دور کے رشتہ دار سے ماموں، خالو، پھوپھا، چچا، تایا وغیرہ سے پردہ کریں یا نہ کریں؟ شرعی حکم کیا ہے؛ جبکہ وہ بالغ ہیں۔

(۷) اپنی دیورانی، جٹھانی کے گھر والوں سے ان کے باپ اور بھائی سے یا کسی رشتہ دار سے پردہ کرنا چاہئے یانہیں؟ جوکہ بالغ ہیں، کہتی ہیں کہ ان کا بھائی ہمارا بھائی ہے کیا یہ صحیح ہے؟

(۸) عورت کو اپنے میکہ میں مسلم وغیر مسلم سبھی سے پردہ کرنا چاہئے، پورے گاؤں کے لوگ محرم ہیں یا نامحرم؟

(۹) جیٹھ اور سسر سے پردہ ہے یانہیں؟

المستفتی: ظریف احمد صدیقی، مخمول پور، کاندھلہ، مظفرنگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) ماموں زاد، خالہ زاد، پھوپھی زاد بھائی نامحرم ہیں، ان سے پردہ لازم ہے، ان کے ساتھ تنہا سفر کرنا بھی مشروع نہیں ہے۔ (مستفاد: معارف القرآن ۶/ ۴۰۳)

(۲) یہ سب غیر محرم ہیں ان سے پردہ لازم ہے۔

(۳) بہنوئی غیر محرم ہے اس سے بھی پردہ لازم ہے؛ البتہ بوقت ضرورت جبکہ فتنہ نہ ہو، تو چہرہ کھولنے کی گنجائش ہے۔ (مستفاد: معارف القرآن ۶/ ۴۰۲)

(۴) تمام نندوئی سے پردہ لازم ہے۔

(۵) بالغ دیور سے پردہ کرنا ضروری ہے، مگر جب ایک گھر میں پردہ کرنا دشوار

ہو، تو ضرورت کی وجہ سے چہرہ کا پردہ معاف ہے، بشرطیکہ فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔ (مستفاد: معارف القرآن ۶/۴۰۲)

حدیث میں ہے: **الحمو الموت الحديث.** (صحيح البخاري، كتاب النكاح، باب لا يخلون رجل بإمرأة ۲/۷۸۷، رقم: ۵۰۳۶، ف:۵۲۳۲)

(۶) ان سے پردہ شرعاً لازم ہے۔

(۷) یہ سب غیر محرم ہیں، ان سے پردہ لازم ہے۔

(۸) نامحرم مسلم اور تمام غیر مسلموں سے پردہ واجب ہے، اسی کو **وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلَى** .[الاحزاب: ۳۳] میں فرمایا گیا ہے۔

(۹) سسر حقیقی محرم ہے، باپ کے درجہ میں ہے، اس سے پردہ نہیں ہے؛ البتہ جیٹھ غیر محرم ہے، مگر ایک گھر میں دشواری کی وجہ سے چہرہ کا پردہ معاف ہے، بشرطیکہ فتنہ کا خطرہ نہ ہو۔ (مستفاد: معارف القرآن ۶/۴۰۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍صفر المظفر ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/۴۳۳۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۲/۱۱ھ

شریعت میں کن کن لوگوں سے پردہ کا حکم ہے؟

سوال [۱۰۶۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل کے ماحول میں جبکہ ہر جگہ بے پردگی عام ہے، کوئی لڑکی اگر پردہ کے حکم پر عمل کرنا چاہے تو لوگ طعنہ دیتے ہیں، اسی طرح کوئی شوہر اگر پردہ کروانا چاہے، تو اس لڑکے کے رشتہ دار وغیرہ طعنہ دیتے ہیں۔ تو دریافت یہ کرنا ہے کہ شریعت اسلامیہ مین کن کن لوگوں سے پردہ کرنے کا حکم ہے؟ تفصیل سے لکھدیں اور اگر رشتہ داروں میں جایا کریں،

تو وہاں ایک فیملی میں محرم غیر محرم ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں، کس طرح پردہ کریں، اپنے بہنوئی، دیور، جیٹھ وغیرہ سے پردہ کا کیا حکم ہے، کیا ان لوگوں کے سامنے آسکتے ہیں؟ شریعت میں ان لوگوں کے بارے میں کچھ نرمی ہے یا نہیں؟

(۲) غیر محرم جس سے نکاح جائز ہے، شریعت میں اس سے پردہ کا حکم ہے تو بہنوئی سے سالی کا نکاح اس وقت تک جائز نہیں؛ جب تک سالی کی بہن نکاح میں ہے، تو بہنوئی سے پردہ بھی نہیں ہو چاہئے؟ شرعی حکم کیا ہے تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد فیصل، کرولہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) اجنبی مرد سے پردہ فرض ہے، اور یہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ حضور ﷺ نے امہات المؤمنین سے پردہ کروایا ہے، پردہ کرنے پر اگر کوئی طعنہ دے، تو وہ شخص گنہگار رہوگا اور اس کی بات ہرگز نہ مانیں۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت جائز نہیں اور شریعت اسلامیہ میں اپنے شوہر، باپ، دادا، ساس، سسر، بیٹا، پوتا، نواسا حقیقی بھائی بھتیجہ اور بھانجہ وغیرہ کے علاوہ سب سے پردہ فرض اور ضروری ہے اور بہنوئی دیور، جیٹھ سے بھی پردہ اسی طرح فرض ہے، جس طرح اجنبی مردوں سے فرض ہے؛ لیکن اگر فتنہ کا خطرہ نہ ہو، تو ان لوگوں سے بقدر ضرورت بات کر لینے کی گنجائش ہے۔

(۲) اور یہ کہنا کہ غیر محرم جس سے نکاح جائز ہے، شریعت میں اس سے پردہ کا حکم ہے، تو بہنوئی سے نکاح اس وقت تک جائز نہیں جب تک سالی کی بہن نکاح میں ہے، تو بہنوئی سے پردہ نہ ہونا چاہئے صحیح نہیں ہے، بہنوئی سے پردہ فرض ہے، جو عورتیں ہمیشہ کے لئے حرام ہوتی ہیں، صرف ان کے لئے پردہ نہیں ہے، سالی ہمیشہ کے لئے حرام نہیں؛ بلکہ اس کی حرمت ایک عارض کی بناء پر ہے، اگر بیوی کا انتقال ہو جائے یا طلاق ہو جائے، تو عدت گذارنے کے بعد بہنوئی سے نکاح درست ہے؛ لہٰذا اس عارضی حرمت کی وجہ سے بہنوئی سے پردہ ساقط نہ ہوگا۔

وقوله تعالیٰ: وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْ اَخَوَاتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التَّابِعِيْنَ غَيْرِ اُوْلِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرَاتِ النِّسَآءِ .

[سورة النور: ۳۰]

وقال الله تعالیٰ: وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى.

[الأحزاب: ۳۲]

عن عقبة بن عامر قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إياكم والدخول على النساء، فقال: رجل يا رسول الله أفرأيت الحمو؟ قال: الحمو الموت. (صحيح البخاري، كتاب النكاح، باب لا يخلون رجل بالمرأة لاذو محرم۲/۷۸۷، رقم:۵۰۳٦، ف:۵۲۳۲، صحيح مسلم، كتاب السلام، باب تحريم الخلوة بالأجنبية والدخول عليها، النسخة الهندية ۲/۲۱٦، بيت الأفكار رقم:۲۱۷۲، مشكوة ۲٦۸) *فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم*

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍محرم الحرام ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴؍ ۵۹۷۰)

کتنے سال کی عمر سے پردہ کرنا ضروری ہے؟

سوال [۱۰٦۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ لڑکیوں کے لئے غیر محرم سے پردہ کرنا کتنے سال کی عمر سے ضروری ہو جاتا ہے؟

المستفتی: رئیس الدین، محلّہ لوہاران، گڈھی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب لڑکی حد شہوت کو پہونچ جائے، تو اس کے لئے غیر محرم سے پردہ کرنا ضروری ہے، حد شہوت کو پہونچنے کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں، آب وہوا اور صحت وتوانائی پر موقوف ہے، بعض لڑکی ۹ رسال ہی کی عمر میں صحت منداور آب وہوا کے مناسب ہونے کی وجہ سے حد شہوت کو پہونچ جاتی ہے اور بعض ۱۲/۱۳ رسال کی عمر کے باوجود قابل شہوت نہیں ہوتی۔

والتي بلغت حد الشهوة فهي كالبالغة (إلى قوله) فإن كانت صغيرة لا يشتهي مثلها، فلابأس بالنظر إليها ومن مسها؛ لأنه ليس ببدنها حكم العورة. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الثامن، زكريا قديم۵/ ۳۲۰، جديد ۵/ ۳۸۱، تاتارخانية، زكريا ۱۸/ ۹۶، رقم: ۲۸۱۵۱، المحيط البرهاني، المجلس العلمي بيروت ۸/ ۳۱، رقم: ۹۵۱۷)

فحل النظر مقيد بعدم الشهوة. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في النظر والمس، كراچي ۶/ ۳۷۰، زكريا ۹/ ۵۳۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ر جمادی الاول ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱ر ۴۰۳۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۵/۲۷ھ

ستر عورت سے متعلق حدیث

سوال [۱۰۶۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مرد اور عورت کے ستر سے متعلق یہ تفصیل کہ مرد کا ستر ناف سے لے کر گھٹنوں تک ہے اور عورت کا ستر پورا جسم سوائے چہرے اور ہاتھ کی ہتھیلی اور قدم کے اس کے لئے حدیث شریف کا حوالہ مطلوب ہے۔

المستفتی: شمس الحق قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) مرد وعورت کے ستر سے متعلق حدیث شریف ملاحظہ فرمایئے:

(١) عن أبي أيوبؓ، قال: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: ما فوق الركبتين من العورة، وما أسفل من السرة من العورة. (دار قطني، دار الكتب العلمية بيروت ١/٢٣٧، رقم الحديث: ٨٧٩، السنن الكبرىٰ للبيهقي، دار الفكر بيروت ٣/٨٧، رقم: ٣٣٢٠)

(٢) عن عائشةؓ، أن أسماء بنت أبي بكرؓ دخلت على رسول الله صلى الله عليه وسلم، وعليها ثياب رقاق، فأعرض عنها رسول الله صلى الله عليه وسلم وقال: ياأسماء! إن المرأة إذا بلغت المحيض لم يصلح لها أن يرىٰ منها إلا هذا وهذا، وأشار إلى وجهه وكفيه. (سنن أبي داؤد، كتاب اللباس، النسخة الهندية ٢/٥٦٧، دار السلام رقم: ٤١٠٤، السنن الكبرىٰ، دار الفكر بيروت ٣/ ٨١، رقم: ٣٣٠٢)

(٣) قال أخبرنا عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: مروا صبيانكم بالصلاة لسبع وأضربوهم عليها لعشر وفرقوا بينهم في المضاجع، وإذا زوج أحدكم عبد أمته وأجيره، فلا ينظر إلى مادون السرة، وفوق الركبة، فإن ما تحت السرة إلى الركبة من العورة. (دار قطني، دار الكتب العلمية بيروت ١/٢٣٧، رقم الحديث: ٨٧٦)

(٤) عن ابن عباسؓ قال: ولايبدين زينتهن إلا ما ظهر منها، قال: ما في الكف، والوجه. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، دار الفكر بيروت ٢/ ٨٠، رقم: ٣٢٩٨)

(٥) قال حدثني داؤد بن سوار المزني باسناده ومعناه وزاد: وإذا زوج أحدكم خادمه عبده، أوأجيره، فلاينظر إلى مادون السرة، وفوق الركبة. (أبو داؤد شريف، كتاب الصلاة، باب متى يؤ مر الغلام بالصلاة، النسخة الهندية

۱/ ۷۱، دار السلام رقم: ٤١١٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ رجب المرجب ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۴۵۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/ ۷/ ۱۴۲۵ھ

الحمو الموت کی تشریح

سوال [۱۰۶۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ دیور بھابھی اسی طرح سالی اور بہنوئی دو گھرانے ایک ہی مکان میں اپنے اپنے کمروں میں رہتے ہیں؛ لیکن مخلوط رہائش کی وجہ سے بھابھی کی نظر دیور پر، دیور کی نظر بھابھی پر پڑتی رہتی ہے، اسی طرح سالی کی نظر بہنوئی پر، بہنوئی کی نظر سالی پر پڑتی رہتی ہے، تو کیا یہ لوگ گنہگار ہوتے رہیں گے، یا اللہ تعالیٰ مجبوری کی وجہ سے معاف فرما دیں گے، کوئی صریح جزئیہ اس سلسلہ میں نظر سے گذرا ہو، تو ضرور تحریر فرما دیں نوازش ہوگی۔ حدیث شریف ''الحمو الموت'' جب سے سنی ہے، بہت ڈر لگتا ہے، کیا اس مسئلہ میں کچھ تخفیف ہو سکتی ہے؟ شرعی حکم تحریر فرما دیں۔

المستفتی: محمد یحییٰ علی گڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفیق: عورت کے پردہ کی تین شکلیں ہیں:

(۱) اجنبی نامحرموں سے پردہ کہ جن سے کسی طرح کی رشتہ داری نہیں ہے، ایسے لوگوں سے سر سے لے کر پیر تک حتی کہ قدمین، ہتھیلی اور چہرہ تک کا پردہ لازم ہے۔

وأما النظر إلى الأجنبيات فنقول: يجوز النظر إلى مواضع الزينة الظاهرة ......وإن غلب على ظنه أنه يشتهي فهو حرام. (الهندية، زكريا قديم ٥/ ٣٢٩، جديد ٥/ ٣٨١، بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٢٩٣)

وتمنع المرأة الشابة من كشف الوجه بين الرجال لا لأنه عورة؛ بل لخوف الفتنة (تحته في الشامية) **والمعنىٰ يمنع من الكشف لخوف أن يرىٰ الرجال وجهها فتقع الفتنة.** (شامي، كراچي ١/٤٠٦، زكريا ٢/٧٩)

(۲) ایسے مرد جن سے دور یا قریب کی رشتہ داری ہے، مگر نامحرم ہیں اور کنبہ کے اندر ساتھ میں رہنا ہوتا ہے، یا قریبی رشتہ داری ہے، جیسا کہ چچازاد، ماموں زاد، خالہ زاد، پھوپھی زاد بھائی اسی طرح دیور، جیٹھ وغیرہ جن کا کثرت کے ساتھ گھر میں آنا جانا ہوتا ہے، ان سے پردہ کرنے کی صورت میں سخت دشواری اور تکلیف مالا یطاق لازم آئے گی، ایسے لوگوں سے اگر فتنہ کا خطرہ ہے، تو پردہ لازم ہے اور اگر فتنہ کا خطرہ نہیں ہے، تو ایسے لوگوں سے پردہ لازم نہیں ہے اور پردہ نہ کرنے کا گناہ نہ ہوگا۔

ينظر من الأجنبية......وجهها، وكفيها فقط للضرورة قيل: والقدم.
(شامي، كراچي ٦/٣٦٩، زكريا ٩/٣١)

الضرورات تتقدر بقدرها. (قواعد الفقة، اشرفي ديوبند ٨٩، رقم:١٧١)

(۳) اپنے شرعی محرم (باپ، بیٹے، بھائی، چچا، ماموں وغیرہ) جن سے نکاح کرنا کبھی بھی جائز نہیں ہوتا ہے، ان کے سامنے بازو، پنڈلی، سر وغیرہ کھل جانا گناہ نہیں ہے۔ اب رہی حدیث شریف ''الحمو الموت'' دیور کو موت کا سبب بتلایا ہے۔ یہ دوسری قسم کے نامحرموں میں شامل ہے، اور ''الحمو الموت'' کا مطلب یہ ہے کہ دیور ہر وقت گھر میں آتا رہتا ہے اور اس سے فتنہ اور معصیت میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہے، تو ایسی صورت میں اگر گھر میں دیور کے ساتھ بالکل تنہائی اختیار کرلی جائے، تو فتنہ اور حقیقی معصیت میں مبتلا ہوکر شرعی حد یا رجم کا مستحق ہونے کا خطرہ ہے، اس کو الحمو الموت کہا گیا ہے؛ لیکن اگر دیور اور بھابھی کے درمیان فتنہ ومعصیت کا کوئی خطرہ نہیں ہے، تو گھر میں کسی وقت تنہا ہونے کی صورت میں بھی بھابھی پر پردہ لازم نہیں ہے اور گھر کے سب لوگوں کی موجودگی میں بھابھی کے سامنے آنے جانے

میں تو کسی طرح کے فتنہ کا خطرہ ہے ہی نہیں؛ لہٰذا فتنہ ومعصیت میں مبتلا ہونے کا خطرہ نہ ہو، تو ایک دوسرے پر نظر پڑنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور گھریلو اور ذاتی ضرورت سے متعلق گفتگو کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

ثم لاشک أنه يباح النظر إلى ثيابها، ولا يعتبر خوف الفتنة في ذلک فکذلک إلى وجهها، وكفها. وروي الحسن بن زياد عن أبي حنيفةؒ أنه يباح النظر إلى قدمها أيضًا، وهكذا ذكر الطحاوي؛ لأنها كما تبتلي بإبداء وجهها في المعاملة مع الرجال، وبإبداء كفها في الأخذ والإعطاء تبتلي بإبداء قدميها إذا مشت حافية......وذكر في جامع البرامكة عن أبي يوسفؒ أنه يباح النظر إلي ذراعيها أيضًا؛ لأنها في الخبز وغسل الثياب تبتلى بإبداء ذراعيها أيضًا. (مبسوط السرخسي، دار الكتب العلمية بيروت ١٠/١٥٣)

وفي عمدة القاري: ”الحمو الموت“ إلى قوله وقال القرطبي: معناه أنه يفضي إلى موت الدين بطلاقها عند غيرة الزوج، أوبرجمها إن زنت معه .

(عمدة القاري، كتاب النكاح، باب لا يخلون رجل المرأة إلا ذو رحم، دار احياء التراث العربي بيروت ٢٠/٢١٣-٢١٤، زكريا ديوبند ١٤/٢٠٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۸؍صفر المظفر ۱۴۳۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۹۷۲/۴۰)	۱۴۳۴/۲/۱۸ھ

گھر کے اندر پردے سے متعلق تفصیلی مسئلہ

سوال [۱۰۶۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک مکان میں دو بھائی رہتے ہیں، دونوں کے اہل وعیال بھی اس مکان میں مقیم ہیں، ایسی صورت میں ایک بھائی کے لئے دوسرے بھائی کی بیوی کا چہرہ، قدمین اور اس کی ہتھیلیوں کا دیکھنا جائز ہے یا نہیں؟

اسی طرح ایک بھائی کی اولاد (بالغ لڑکے،لڑکیاں) کے لئے دوسرے بھائی کی بالغ اولاد کی صورت،قدمین اور ہتھیلیوں کا دیکھنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ مکان چھوٹا ہے اور بار بار کی آمدورفت کی وجہ سے ان اعضاء کا پردہ باعث حرج اور بہت دشوار ہے۔

المستفتی: مولانا خورشید انور، مدرس مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پردہ کی دو قسمیں ہے:

(۱) عورت کا اپنے محارم سے پردہ! اس سلسلہ میں شرعی حکم یہ ہے کہ محارم سے زینت کی جگہوں کا پردہ نہیں ہے، وہ زینت کی جگہوں کو دیکھ سکتے ہیں، خواہ زینت ظاہری ہو یا باطنی، جیسے سر، بال، کان، بازو، کلائی، ہتھیلی، پیر، پنڈلی، چہرہ وغیرہ۔

(۲) اجنبی مرد سے پردہ! اس سلسلہ میں شرعی حکم یہ ہے کہ اجنبی مرد سے عورت کے کل بدن کا پردہ ہے، حتی کہ چہرہ، ہتھیلی اور قدمین کا بھی؛ لیکن اگر چہرہ، ہتھیلی وغیرہ کا پردہ کرنے میں مشکل کا سامنا ہو اور تکلیف مالا یطاق لازم آئے، جیسا کہ آج کل مکانات کے تنگ ہونے کی وجہ سے ایک گھر میں چچا، چچی، بھائی، بھابھی، تائے زاد چچا، بھائی بہن وغیرہ رہتے ہیں، تو ایسی صورت میں اگر کسی معصیت اور فتنہ کا اندیشہ نہ ہو اور آپس میں بے شرمی بے حجابی اور غیر شرعی بے تکلفانہ بات چیت نہ ہوتی ہو، تو ان غیر محرم دیور، جیٹھ، تائے زاد، چچازاد، بھائیوں سے چہرہ ہتھیلی قدمین وغیرہ کا پردہ لازم نہیں ہے، عورت کو چہرہ کھول کر ان کے سامنے آنے جانے کی بھی گنجائش ہے۔ قرآن کریم میں جو پردہ کا حکم بیان کیا گیا ہے۔

ولا یبدین زینتھن إلا ما ظھر منھا میں زینت ظاہری سے یہی مراد ہے۔

(مستفاد: انوار ہدایت ۴۵۵، معارف القرآن، سورۂ نور ۳۱)

أما نظره إلى ذوات محارمه، فنقول: يباح له أن ينظر منها إلى موضع زينتها الظاهرة، والباطنة وهي الرأس، والشعر، والعنق، والصدر، والأذن،

والعضد،والساعد، والكف، والساق، والرجل، والوجه......وأما النظر إلى الأجنبيات، فنقول: يجوز النظر إلى مواضع الزينة الظاهرة منهن وذلك الوجه. والكف وفي ظاهر الرواية، إن غلب على ظنه أنه يشتهي فهو حرام.
(هندية، كتاب الكراهية،الباب الثامن، زكريا قديم ٥/٣٢٩، جديد ٥/٣٨١، شامي، كراچي ٦/٣٦٧، زكريا ٩/٥٢٨، تاتارخانية، زكريا ١٨/٩٢، رقم: ٢٨١٣٤-٢٨١٤٥، أحكام القرآن، جديد زكريا ٣/٤٠٥، سهيل اكيڈمي لاهور ٣/٣١٣)

والعلة في ذلک هي الضرورة الداعية المداخلة، والمعاشرة حيث يكثر الدخول عليهن. (روائع البيان ٢/١٦٠)

لاتعارض بين جواز كشف الوجه،والنظر ووجوب الإحتجاب؛ لأن جواز كشف الوجوه، والنظر مبنى على الضرورة، ودفع الحرج، وحكم الإحتجاب مبنى على خوف الفتنة، وسدبا بها ولاتعارض بين الحكمين عند أختلاف الجهتين فافهم. (إعلاء السنن، كراچي ١٧/٣٧٨، دار الكتب العلمية بيروت١٧/٤٠٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍رجب المرجب ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۳۱۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۷/۱۴۲۲ھ

محرم وغیر محرم رشتہ دار سے پردہ کا حکم

سوال [۱۰۶۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اسلام کا پردہ کے بارے میں کیا حکم ہے؟ شرعی مجبوری کے علاوہ سماجی مجبوری سے کیا عورتیں غیر محرم مردوں کے ساتھ میل جول، بات چیت کرسکتی ہیں؟ مریم ایک مشترکہ فیملی میں رہتی ہے، اللہ اور رسول کے حکم کے مطابق پردے کے ساتھ زندگی گذارنا چاہتی

ہے، اپنے بہنوئی، سسر، چچا سسر، دیور، جیٹھ، بہنوئی کے بھائیوں سے نند کے شوہر سے چچرے، خالہ زاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد بھائی سے جوان یا بالغ بیٹے کے دوست ملاقاتی سے پردہ کس طرح کریں؟

المستفتی: محمد جنید دوتائی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اسلام میں پردہ واجب ہے، نامحرموں سے مکمل طور پر پردہ کرنا چاہئے اگر نامحرموں کے ساتھ ایک ہی گھر میں مجبوراً رہنا پڑ رہا ہو، جس کی وجہ سے گہرا پردہ کرنا مشکل ہو، تو ان نامحرموں کے سامنے ایسے اعضاء ظاہر کرنے کی گنجائش ہے، جو اعضاء کام کاج نقل وحرکت کے وقت عادۃً کھل ہی جاتے ہیں یعنی چہرہ دونوں ہاتھ گٹے تک اور دونوں پیر ٹخنے کے نیچے تک کھولنا جائز ہے۔

سوال میں مذکورہ لوگوں میں سسر کے علاوہ باقی تمام لوگوں سے سارے بدن کا چھپانا ضروری ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وقولہ تعالیٰ: وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِن. [سورة النور: ۳۱]

لیکن سسر نامحرم نہیں ہے؛ بلکہ حقیقی باپ کے درجہ میں ہے اور جس طرح باپ سے پردہ نہیں ہے، اسی طرح سسر سے پردہ کرنے کی ضرورت نہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے پردہ کے حکم سے محرموں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے سسر کا بھی ذکر فرمایا ہے:

اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ. [النور: ۳۱]

یعنی اپنے سسر کے سامنے نامحرموں کی طرح زینت کے اعضاء کو چھپانا ضروری نہیں ہے۔ نیز سسر محرم ہونے کی وجہ سے اس کے سامنے بہو کا پورا چہرہ، سر، سینہ، پنڈلیاں، بازو بھی شرعی پردہ میں داخل نہیں، بقیہ اعضاء داخل ہیں۔

وبدن الحرة عورة إلا وجهها، وكفيها، وقدميها. (فتاوى عالمگيري، كتاب الصلوة، الباب الثالث في شروط الصلوة، زكريا قديم ١/٥٨، جديد ١/١١٥)

وينظر الرجل من ذوات محارمه إلى الوجه، والرأس، والصدر، والساقين، والعضدين، ولا ينظرإلى ظهرها، وبطنها، وفخذها. (هداية، اشرفي ديو بند ٤/٤٦١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰رمحرم الحرام ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۹۶۶/۳۸)

سوتیلی ماں اوراس کے رشتہ داروں سے پردہ ہے یانہیں؟

سوال [۱۰۶۲۵]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خالد کی دوسری بیوی طاہرہ موجود ہے، پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے، پہلی بیوی سے بچے ہیں، تو پہلی بیوی کے بچے اور بڑی لڑکی کا شوہر یعنی داماد دوسری بیوی طاہرہ کا محرم ہے یانہیں؟

(۲) اسی طرح دوسری بیوی طاہرہ کے والد بھائی وغیرہ محرم لوگ اگر آئیں تو ان کا پہلی بیوی کی لڑکی سے پردہ ہوگا یانہیں؟ شرعی حکم سے آگاہ فرمادیں کرم ہوگا۔

المستفتی: محمد عمیر، محلّہ بھٹی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) خالد کی پہلی بیوی کی اولاد کے لئے دوسری بیوی طاہرہ غیرمحرم نہیں ہے؛ بلکہ محرم ہے، حقیقی ماں کی طرح اس کے ساتھ پردہ لازم نہیں ہے، جیسے حقیقی ماں کے لئے پردہ لازم نہیں ہوتا ہے، اسی طرح سوتیلی ماں کے لئے بھی پردہ لازم نہیں ہے؛ جبکہ فتنہ کا خطرہ نہ ہو، ہاں البتہ پہلی بیوی سے پیدا شدہ لڑکی کا شوہر طاہرہ کے لئے محرم نہیں

ہے؛ کیونکہ اس میں محرم ہونے کی کوئی علت نہیں پائی جارہی ہے، ہاں البتہ گھر اور کنبہ کے لوگوں میں فتنہ کا خطرہ نہ ہو، تو چہرہ اور ہاتھ وغیرہ کا پردہ لازم نہیں ہے اور فتنہ کے خطرہ نہ ہونے کی صورت میں منہ درمنہ گفتگو کرنے کی بھی گنجائش ہے۔ (مستفا: فتاوی دار العلوم دیوبند ۱۶/۱۹۳-۱۹۶)

لايجب عليها الاستتار من أولاد زوجها......ولعل وجهه خشية الفتنة حيث كانوا رجالا معها في بيت واحدٍ، وإن كانوا محارم لها بكونهم أولاد زوجها كما قالوا بكراهية الخلوة بالصهرة الشابة، وفي البحر عن المعراج، وكذالک حکم الستره إذا مات زوجها وله أولاد كبار أجانب. (شامي، كتاب الطلاق، باب العدة، مطلب: الحق ان على المفتى ان ينظر في خصوص الوقائع، زكريا ٥/٢٢٦، كراچي ٣/٥٣٧)

(۲) اگر فتنہ کا خطرہ نہیں ہے، تو پردہ لازم نہیں ہے اور اگر فتنہ کا خطرہ ہے، تو پردہ کرنا لازم ہے اور فتنے کا خطرہ نہ ہونے کی صورت میں ایسے قریبی لوگوں کے ساتھ پردہ میں شدت اختیار کرنا مناسب نہیں ہے۔

وكذا تنظر المرأة من الرجل كنظر الرجل للرجل إن أمنت شهوتها، فلو لم تأمن، أوخافت، أوشكت حرم إستحساناً. (الدر المختار مع الشامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في النظر والمس، زكريا ٩/٥٣٣، كراچي ٦/٣١١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/۱۳۰۱۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۶/۲۳ھ

مرد کا مرد کے سامنے ستر عورت کھولنے کا حکم

سوال [۱۰۶۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ زید کہتا ہے کہ مرد کا ستر عورت صرف عورت کے سامنے ہے، مرد مرد کے سامنے کھول سکتا ہے، کیا ایسا کرنا حرام نہیں؟ آج کل کسرت کرنے میں پاؤڈر، انجکشن وغیرہ کا استعمال کیا جاتا ہے، جس کو ڈاکٹر حضرات منع کرتے ہیں اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس پاؤڈر میں یا انجکشن مین ناجائز اشیاء شامل کی جاتی ہیں، جس سے فائدہ کے بجائے نقصان ہوتا ہے، کبھی کبھی ان کو استعمال کرنے سے نامردی بھی ہوجاتی ہے۔ جِم وغیرہ میں یہ کسرت ماہانہ اجرت پر ہوتی ہے، اس کسرت میں عریانیت جسم کی نمائش کرنا خاص طور پر جو فلمی ہیرو کرتے ہیں، کیا یہ جائز ہے؟ آج کل معاشرہ میں عام طور پر دیکھا جاسکتا ہے، بعض حضرات اس کو جائز قرار دیتے ہیں، وہ خود بھی کسرت کرتے ہیں، کیا کسرت کرنا جائز ہے؟ کسرت ہال میں فوٹو بھی لگے رہتے ہیں اور گانا خوب بجتا ہے۔ مدلل جواب تحریر فرمادیں۔

المستفتی: مظفر حسین، مغل پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرد کا ستر عورت ناف سے لے کر گھٹنوں تک ہے، اتنے حصہ میں سے کوئی بھی جز کھولنا اور کھول کر کسی مرد یا عورت کے سامنے آنا ناجائز اور حرام ہے اور جس نے یہ کہا ہے کہ مرد اپنا ستر دوسرے مرد کے سامنے کھول سکتا ہے صحیح نہیں ہے۔ بغیر ضرورت شدیدہ کے اس حصہ میں سے کھولنا مرد کے لئے گناہ کبیرہ ہے اور عورت کا ستر اجنبی مردوں کے سامنے سر سے لے کر پیر تک ہے اور گھر کے خاندان کے لوگوں کے سامنے اگر فتنہ کا خطرہ نہ ہو، تو چہرہ، ہاتھ اور پیروں کے کھولنے میں حرج نہیں ہے اور حقیقی محرم جن کے ساتھ کبھی نکاح جائز نہیں ہے، ان کے سامنے چہرہ، سر، بازو، پنڈلی تک ضرورۃ کھل جائے تو گناہ نہیں ہے، اس کے علاوہ بدن کے دیگر اعضاء کا کھولنا حقیقی محرم کے سامنے بھی عورت کے لئے جائز نہیں ہے۔ نیز اجنبی عورت کے سامنے بھی دیگر اعضاء کا کھولنا بغیر ضرورۃ شدیدہ کے جائز نہیں ہے۔

عن أبي أيوبؓ، قال: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: ما فوق

الركبتين من العورة، وما أسفل من السرة من العورة. (سنن دار قطني، دار الكتب العلمية بيروت ۱/۲۳۷، رقم الحديث: ۸۷۹)

عن ابن عباسؓ قال: ولايبدين زينتهن إلا ما ظهر منها، قال: ما في الكف، والوجه. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، دار الفكر بيروت ۲/۸۰، رقم:۳۲۹۸)

ينظر الرجل من الرجل سوى ما بين سرته إلى ما تحت ركبتيه، فالركبة عورة لا السرة (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في النظر والمس، كراچي ۶/۳۶٤ تا ۳۶۶، زكريا ۹/۵۲۶)

وينظر المرأة من المرأة إلى ما يجوز للرجل أن ينظر إليه من الرجل، وينظر الرجل من ذوات محارمه إلى الوجه، والرأس، والصدر، والساقين، والعضدين، ولاينظر إلى ظهرها، وبطنها وفخذها. (هداية، اشرفي ديوبند ٤/٤٦١)

(۲) کسرت اور ورزش کرنا فی نفسہ جائز ہے، بشرطیکہ عریانیت اور منکرات اس میں نہ ہوں اگر ستر کھولا جاتا ہے، تو جائز نہیں ہے، اسی طرح ستر کھول کر اس کی فلم لینا بھی جائز نہیں ہے۔ اب رہا طاقت کا انجکشن لینا اگر یہ نقصان دہ نہیں ہے، تو کوئی حرج نہیں ہے اور پاؤڈر کے بارے میں جو بات کہی جاتی ہے ہمیں اس کا علم نہیں ہے کہ اس میں ناپاک ناجائز اشیاء ہوتی ہیں یا نہیں؟ اگر واقعی ناجائز اور حرام چیز ہوتی ہے، تو اس سے احتراز کرنا لازم ہے، اور جہاں تک اس سے نقصان کی بات ہے، وہ حکیم اور ڈاکٹر بتائیں گے، وہ ہمارے بتانے کی چیز نہیں ہے۔

عن أبي هريرةؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا سبق إلا في خف أو حافر أو نصل. (سنن أبي داؤد، الجهاد، باب في السبق، النسخة الهندية ۱/۳٤۸، دار السلام رقم:۲۵۷٤)

تجوز المسابقة بالسهام، والخيل، والحمير...... لقوله عليه السلام لا سبق إلا في خف، أو نصل، أو حافر. وفي الحديث سابق

رسول الله صلى الله عليه وسلم، وأبو بكرؓ، وعمرؓ، فسبق رسول الله صلى الله عليه وسلم؛ ولأنه يحتاج إليه في الجهاد، وللكر، والفر وكل ماهو من أسباب الجهاد فتعلمه مندوب إليه سعياً في إقامة هذه الفريضة.

(مجمع الأنهر، شرح ملتقي الأبحر، كتاب الكراهية ٤/ ٢١٦، مكتبه فقيه الأمة ديوبند، أيضاً دار الكتب العلمية بيروت) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ ذی قعدہ ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۸۱۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۱۱/۴ھ

کیا برقعہ ہی سے پردہ ہوتا ہے؟

سوال [۱۰۶۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شرعًا برقعہ ہی سے پردہ ہوتا ہے، یا چادر سے بھی ہوسکتا ہے؟ زید کہتا ہے کہ برقعہ ہی سے پردہ ہوتا ہے، بغیر برقعہ کے پردہ ہوتا ہی نہیں، اس کے برعکس بکر کہتا ہے کہ شریعت میں برقعہ ضروری نہیں ہے، ہاں پردہ ضروری ہے، خواہ کسی بھی طریقہ سے ہو۔ قرآن کریم میں ہے:

قال الله تبارک وتعالیٰ: يُدۡنِيۡنَ عَلَيۡهِنَّ مِنۡ جَلَابِيۡبِهِنَّ. [الأحزاب: ٥٩]

اس آیت کریمہ میں بھی برقعہ کا ذکر نہیں آیا، خیر القرون میں برقعہ کا ذکر ملتا ہے یا نہیں؟ پردہ کے لئے برقعہ ضروری ہے یا بغیر برقعہ کے بھی پردہ ہوسکتا ہے؟

المستفتی: ظریف احمد، میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شرعًا برقعہ مقصود نہیں ہے؛ بلکہ پردہ ہی مقصود ہے؛ لہٰذا چادر سے بھی ہوسکتا ہے۔ (معارف القرآن، سورۂ احزاب تفسیر الآیہ ۵۹/ اشرفی دیوبند ۷/ ۲۳۵)

قال اللّٰہ تعالیٰ: یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِاَزْوَاجِکَ وَبَنَاتِکَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ. [سورۃ الأحزاب: ۵۹] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱؍۳۹۰۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱؍۳؍۱۴۱۵ھ

برقعہ میں ہاتھ اور آنکھوں کو کھلا رکھنا

سوال [۱۰۶۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کوئی صاحبہ برقعہ تو نہیں، مگر آنکھیں اور ماتھا کھولے رکھیں؛ جبکہ پردہ نگاہ کا ہوتا ہے، تو یہ پردہ جائز ہے؟ جبکہ اسی حالت میں وہ صاحبہ بازار یا سفر میں رہیں؟

المستفتی: سید اظہر علی رضوی، علی گڈھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایک آنکھ کھولنے کی اجازت ہے، ماتھا کھولے رکھنا مردوں کی نگاہ بد کے خطرہ کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: معارف القرآن، اشرفی دیوبند ۷؍۲۱۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍محرم الحرام ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱؍۳۸۴۰)

سر پر دوپٹہ اوڑھنا

سوال [۱۰۶۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سر پر دوپٹہ اوڑھنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد حنیف

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سر پر دوپٹہ اوڑھنا اجنبی کے سامنے واجب ہے؛ اس لئے کہ اجنبی کے سامنے شدت ضرورت میں صرف چہرہ کھولنے کی اجازت ہے، اور بلاضرورت چہرہ کھولنا بھی جائز نہیں ہے، اور گھر کے اندر بھی اپنے محارم کے سامنے سر چھپانا مستحب ہے۔

لایجوز أن ینظر الرجل إلی الأجنبیة إلا إلي وجهها وکفیها. لقوله تعالیٰ ولایبدین زینتهن إلا ما ظهر منها. (هدایة، کتاب الکراهیة، فصل في النظر والمس و الوطئ، اشرفي دیوبند ٤/٤٥٨)

وینظر من الأجنبیة......إلی وجهها وکفیها فقط للضرورة. (در مختار، کتاب الحظر والإباحة، فصل في النظر والمس، کراچي٦/٣٦٩، زکریا ٩/٥٣١)

اور اگر شہوت اور ہیجان کا خطرہ ہے، تو اجنبی کے سامنے چہرہ کھولنا بھی حرام ہے۔

امتنع نظره إلی وجهها فحل النظر مقید بعدم الشهوة وإلا فحرام. (در مختار، زکریا ٩/٥٣٢، کراچي ٦/٣٧٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/۳۹۵۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۳/۲۸ھ

لڑکیوں کا ننگے سر رہنے اور دوپٹہ کندھے پر رکھنے کا حکم

سوال [۱۰۶۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ لڑکیوں کا ننگے سر رہنا اور دوپٹہ کندھے پر رکھنا یا انہیں اس کا پابند کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: مشتاق احمد، بروالان مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر لڑکیاں بالغ ہوگئی ہیں، تو ننگے سر رہنا حرام

ہے،اس کا گناہ خودلڑکیوں اور پابند کرنے والےسب پر برابر ہوگا۔

شعر المرأة ما على رأسها عورة. (هندية، كتاب الصلوة، الباب الثالث في شروط الصلوة، زكريا قديم ١/ ٥٨، جديد ١/ ١١٥، هداية، اشرفى ديوبند ١/ ٩٤، حلبي كبير قديم ٢١٠، جديد اشرفيه ديوبند ٢١٢، مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي قديم ١٣١، جديد دار الكتاب ديوبند ١/ ٢٤١)

اور اگرلڑکیاں نابالغ باشعور ہیں،توماں باپ پر واجب ہے کہ ان کوسر ڈھکنے کا عادی بنائیں،ورنہ عادت بگڑنے کا گناہ ماں باپ پر ہوگا۔

يطلب من المسلم أن يعود لبناته من سن العاشرة على إرتداء الحجاب الشرعي حتى لا يصعب عليهن بعد إرتداء ه. (روائع البيان ٢/ ٣٨١)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر:الف ۲۴/ ۶۹۴)

دوران سفرعورتوں کا ہتھیلیوں اور قدمین کوکھلا رکھنا

سوال [۱۰۶۳۱]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عورتیں جب سفر میں جائیں یا قریبی عزیز داری میں چندکیلومیٹر پر جائیں تو کیا موزے اور دستانے پہن کر جائیں؟ اگر نہ پہنیں تو کیا گنہگار ہوں گی؟

المستفتی: عبدالرشید قاسمی ،سیڑھا،بجنور(یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: عورتوں کے لئے دونوں ہتھیلیوں اور قدمین کو کھلے رکھنے کی اجازت ہے؛ لیکن شرط یہ ہے کہ اگر ہاتھ پیر کے کھلے رکھنے کی وجہ سے دیکھنے

والے مردوں میں ہیجان پیدا ہو جانے کا خطرہ اور فتنہ کا اندیشہ ہے، تو دونوں ہتھیلی اور قدمین کا چھپانا ضروری ہے اور اگر یہ خطرہ نہیں ہے، تو کھلے رکھنے کی گنجائش ہے۔

وفي روح المعاني: "إلا ما ظهر" أي إلا ما جرت العادة، والجبلة على ظهوره، والأصل فيه الظهور كالخاتم والكحل، والخضاب، فلا مواخذة في إبدائه للأجانب، وإنما المؤاخذة في إبداء ما خفي من الزينة. (روح المعاني، سورة النور، تحت تفسير الآية: ۳۱، زكريا ديوبند ۱۰/۲۰۶)

وتمنع المرأة الشابة من كشف الوجه بين الرجال لا لأنه عورة؛ بل لخوف الفتنة. (شامي، كتاب الصلوة، باب شروط الصلوة، كراچي ۱/۴۰۶، زكريا ۲/۷۹)

وأما النظر إلى الأجنبيات فنقول: يجوز النظر إلى مواضع الزينة الظاهرة منهن، وذلك الوجه، والكف......وإن غلب على ظنه أنه يشتهي فهو حرام. (هندية، زكريا قديم ۵/۳۲۹، جديد ۵/۳۸۱، تاتارخانية، زكريا ۱۸/۹۵، رقم: ۲۸۱۴۵، بدائع الصنائع، زكريا ۴/۲۹۳) *فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم*

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍شعبان المعظم ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۳۹۳/۳۸)

ساس کا داماد سے پردہ نہیں

سوال [۱۰۶۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک عورت کے شوہر کا انتقال ہوگیا ہے، وہ عورت فی الحال عدت میں ہے، تو کیا عورت حالت عدت میں اپنے دامادوں کے سامنے آسکتی ہے یا نہیں؟ برائے کرم جواب لکھ کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں عین کرام ہوگا۔

المستفتی: عبد القدیر، اصالت پورہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: داماد شرعی محرم ہوتا ہے، عورت کو کسی حال میں بھی اپنے داماد سے پردہ کرنا لازم نہیں ہے؛ لہٰذا عدت کی حالت میں داماد کے سامنے آسکتی ہے۔

والمحرم من لا يجوز له مناكحتها على التابيد بقرابة، أورضاع، أو صهرية. (شامي، كتاب الحج، مطلب في قولهم يقوم حق العبد على حق الشرع، كراچي ٢/٤٦٤، زكريا ٣/٤٦٤، هندية، زكريا قديم ١/٢١٩، جديد ١/٢٨٢، المحيط البرهاني، المجلس العلمي بيروت٣/٣٩٤، تاتارخانية، زكريا ٣/٤٧٥، رقم: ٤٨٨٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴ رشوال المکرّم ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۹۸٦/۲٦)

کیا ساس کو داماد سے پردہ کا حکم ہے؟

سوال [۱۰٦۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں شادی شدہ ہوں میری ساس میرے سامنے آجاتی ہے، میرے ساتھ کھلے طور سے بات چیت بھی کرتی ہے، کھانا بھی بیٹھ کر ساتھ کھاتی ہے، ان سب میں میں جاننا چاہتا ہوں کہ ساس اور داماد کے بیچ پردہ ضروری ہے یا نہیں؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ داماد بھی بیٹے جیسا ہوتا ہے ہے اس کے ساتھ ساس کا پردہ کیسا ہے؟ شریعت کیا کہتی ہے مطلع فرمائیں۔

المستفتی: محمد عبد الحنیف

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: داماد شریعت کی رو سے ساس کے حق میں بیٹے کی

طرح محرم ہے اور ساس داماد کے حق میں ماں کی طرح محرم ہے، شریعت میں ساس و داماد کے درمیان کوئی پردہ کا حکم نہیں ہے؛ لہٰذا پردہ ضروری نہیں ہے۔

والمحرم من لا يجوز له مناكحتها على التابيد بقرابة، أورضاع، أوصهرية. (شامي، كتاب الحج، مطلب في قولهم يقوم حق العبد على حق الشرع، كراچي ٢/٤٦٤، زكريا ٣/٤٦٤، البحر الرائق، كوئٹه ٢/٣١٥، زكريا ٢/٥٥١، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ٢/٦، زكريا ٢/٢٤٣، هندية، زكريا قديم ١/٢١٩، جديد ١/٢٨٢، فتاوى قاضي خان، جديد زكريا ١/١٧٣، وعلى هامش الهندية، زكريا ١/٢٨٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/۱۵۸۷)

چچی سے پردہ ہے یا نہیں؟

سوال [۱۰۶۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کی چچی زید کے لئے زید کے چچا کے نکاح میں رہ کر محرم یا غیر محرم ہے، اگر زید کی چچی زید کے لئے غیر محرم ہے، تو ان سے احتراز لازم آتا ہے یا نہیں؟ حالانکہ ہر شخص بلا تکلف کلام کرتا ہے۔

المستفتی: محمد رضوان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ایسی صورت میں بھی چچی غیر محرم اور اجنبیہ ہے؛ لیکن جب خوف فتنہ نہیں ہے، تو چچی کا چہرہ ہتھیلیاں وغیرہ دیکھنا اور کلام کرنا جائز ہے۔

(مستفاد: امداد الفتاویٰ ۴/۱۷۸)

وأما النظر إلى الأجنبيات فنقول: يجوز النظر إلى مواضع الزينة الظاهرة منهن، وذلک الوجه، والكف. في ظاهر الرواية: كذا في الذخيرة، وإن غلب على ظنه أنه يشتهي فهو حرام– إلى قوله– أنه يجوز النظر إلى ذراعيها أيضًا عند الغسل والطبخ، قيل وكذلک يباح النظر إلى ثناياها، وذلک كله إذا لم يكن النظر عن شهوة كذا في المحيط. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الثامن فيما يحل للرجل النظر إليه ما لا يحل له،زكريا قديم ۳۲۹/۵، جديد ۳۸۱/۵، تاتارخانية، زكريا ۹۵/۱۸، رقم: ۲۸۱٤۵، المحيط البرهاني،المجلس العلمي بيروت ۲۹/۸، رقم: ۹۵۱٦-۹۵۱۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۳۷۴۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۱۲/۷ھ

بھابھی دیور کا پردہ ہے یا نہیں؟

سوال [۱۰۶۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بھابھی محترمہ دیور کے حق میں کیسی ہے؟ بھابھی بھی غیر محرم ہے، اور غیر محرم کو دیکھنا اور بات کرنا حرام ہے؟ کیا دیور کو بھابھی سے بات چیت کرتے یا دیکھنے میں کچھ قباحت ہے؟

المستفتی: منظور احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس طرح بھابھی دیور کے حق میں غیر محرم ہے، اسی طرح دیور بھی بھابھی کے حق میں غیر محرم ہے؛ لیکن گھر میں ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے اختلاط رہتا ہے، اگر فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، تو ایسی صورت میں دیور بھابھی کی ہتھیلی، چہرہ اور قدمین دیکھ سکتا ہے اور افراد خانہ کی موجودگی میں بھابھی سے بات کرسکتا ہے؛ لیکن تنہائی میں بات

کرنے کی اجازت نہیں ہے اور نہ مذاق اور بے حیائی کی بات کی اجازت ہے، اس میں سخت فتنہ کا اندیشہ ہے۔حدیث شریف میں ہے۔

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم: إياكم والدخول على النساء، فقال: رجل من الأنصار يا رسول الله افرأيت الحمو؟ قال: الحمو الموت. الحديث (بخاري شريف، كتاب النكاح، باب لا يخلون رجل بإمرأة إلا ذو محرم ۲/۷۸۷، رقم: ۵۰۳۶، ف: ۵۲۳۲، صحيح مسلم، كتاب السلام، باب تحريم الخلوة بالأجنبية والدخول عليها، النسخة الهندية ۲/۲۱۶، بيت الأفكار رقم: ۲۱۷۲)

قال النووي في شرح: "الحمو الموت" فمعناه أن الخوف منه أكثر من غيره، والشر يتوقع منه، والفتنة أكثر لتمكنه من الوصول إلى المرأة، والخلوة من غير أن ينكر عليه بخلاف الأجنبي. (حاشية مسلم شريف ۲/۲۱۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۳ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۵۲۰)	۱۴۲۱/۳/۳ھ

خسر اور بہو کا نمائشوں و بازاروں میں ایک ساتھ گھومنا

سوال [۱۰۶۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید لڑکا ہے باقر حسین کا، باقر حسین نے اپنے لڑکے زید کا عقد مسماۃ خاتون جہاں کے ساتھ کر دیا تھا، کچھ دنوں کے بعد خاتون جہاں اپنے خسر باقر حسین کے بارے میں کہتی ہے، کہ انہوں نے میرے ساتھ زنا کیا ہے، اور اسی بات پر خاتون جہاں نے طلاق لے لی، ایک عرصہ دراز کے بعد باقر حسین نے اپنے لڑکے زید کا دوسرا عقد مسماۃ ریحانہ بیگم کے ساتھ کر دیا۔ یہ دوسری زید کی بیوی ریحانہ بیگم اپنے خسر کے متعلق کچھ نہیں کہتی ہے، لیکن کچھ ایسے شواہدات ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ باقر حسین کی عادت ٹھیک نہیں ہے۔ یہ غلط رویہ اپنے لڑکے زید کی بیوی کے ساتھ کرتا ہے، شواہدات یہ ہیں۔

(۱) ریحانہ بیگم کی بڑی بہن حفصہ بیگم یہ کہتی ہے کہ میری بہن کی عادت خود خراب ہے، جس کی وجہ سے راز فاش نہیں ہوتا ہے، پہلی بیوی خاتون جہاں کی عادت ٹھیک تھی وہ پاکدامن تھی، جس کی بنا پر اس کو برداشت نہیں ہوا اور سرعام اپنے خسر باقر حسین کا معاملہ اپنے ساتھ ہونے کو ظاہر کر دیا۔

(۲) دوسری علامت یہ ہے کہ باقر حسین ریحانہ بیگم کو اپنے ساتھ ایک رکشہ پر بٹھا کر بازاروں اور نمائشوں میں سیر کرتا ہے، کریم پاؤڈر، اور دوسری چیزیں خرید خرید کر باقر حسین ریحانہ بیگم کو دیتا ہے۔

(۳) تیسری علامت یہ ہے کہ گھر کے اندر جب باقر حسین اور زید ہوتے ہیں، تو ریحانہ بیگم اپنے خسر کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہے، کھانا پانی کے دینے میں اپنے خسر کی طرف زیادہ توجہ دیتی ہے، اپنے شوہر زید کی طرف نظر گھما کر بھی دیکھنا نہیں چاہتی ہے، یہ سب علامات ہیں، جن سے ہر ایک شخص کا گمان یہ ہے کہ باقر حسین کی عادت اور ریحانہ بیگم کی عادت خراب ہے۔

اب پوچھنا یہ ہے کہ ریحانہ بیگم اپنے شوہر کے پاس رہنے کے قابل ہے یا نہیں؟ دوسری بات یہ معلوم کرنی ہے کہ باقر حسین پر کونسا حکم لگایا جائے گا؟ تیسری بات یہ معلوم کرنی ہے کہ اگر برادری والے باقر حسین کا حقہ پانی بند کر دیں اور اپنی تقریبات میں شریک نہ کریں، تو کوئی حرج تو نہیں ہے؟ ان سب باتوں کو قرآن وحدیث کی روشنی میں مفصل تحریر فرمائیں، جس سے لوگوں کو سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔

المستفتی: عبداللہ لکھیم پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: محض اس قسم کی علامات کی وجہ سے نہ باقر حسین اور نہ بہو پر غلط کاری کا شرعی حکم لگ سکتا ہے، اور نہ ہی زید پر بیوی حرام ہوسکتی ہے، جب تک شہوت کے ساتھ دواعی جماع دو عادل کی شہادت سے ثابت نہ ہوں۔

وفي المس لا تحرم ما لم تعلم الشهوة. (الدر المختار مع الشامي، كتاب النكاح، فصل في المحرمات، كراچي ٣/٣٦، زكريا ٤/١١٣)

وما سوى ذالک من الحقوق يقبل فيها شهادة رجلين، أو رجل، وإمرأتين وسواء كان الحق مالا أو غير مال مثل النكاح، والطلاق، والوكالة، والوصية، ونحو ذالک. (هداية، كتاب الشهادة، اشرفي ديوبند ٣/١٥٤-١٥٥)

اورایک رکشہ میں لے کر نمائشوں میں اور بازاروں میں سیر وتفریح کرانا وغیرہ موجب فسق ہے، باقرحسین کا ایسی حرکات سے توبہ واستغفار کرکے باز رہنا ضروری ہے، اور اگر لوگوں کے سمجھانے کے باوجود اپنے فعل سے باز نہ آوے تو برادری والوں کو توبہ واستغفار کرکے باز آنے تک باقرحسین سے بائیکاٹ کرلینا چاہئے۔

قال الله تعالیٰ: وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارَ. [هود:١١٣]

اور توبہ کے بعد حقہ پانی پھر جاری رکھنا لازم ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ذی قعدہ ۱۴۰۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/۷۳۳)

نامحرم لڑکیوں کے ساتھ کاروبار کرنے کا حکم

سوال [۱۰۶۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں ایک ضعیف آدمی میری عمر ۶۷/سال ہے، اکاؤنٹ (کھاتہ نویس ہوں) آج کل علالت کی وجہ سے زیادہ کام کرنے کے قابل نہیں ہوں، میں نے اپنی مدد کے لئے لڑکوں کو بہت تلاش کیا؛ لیکن کوئی لڑکا کام کرنے پر آمادہ نہیں ہوا، اب میں نے مجبوراً دو لڑکیوں کو کام سکھا کر اپنے ہمراہ لگا لیا ہے، اور معاہدہ کے مطابق ان کو معاوضہ ادا کردیتا ہوں،

غیرلڑکیاں ہیں، میرا ان سے کوئی رشتہ نہیں ہے، تو میرا ان نامحرم لڑکیوں کے سامنے آنا جانا جائز ہے یا نہیں؟ اس طرح کمایا ہوا روپیہ حلال ہوگا یا حرام؟

المستفتی: محمد احمد، فیض گنج، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کا نامحرم لڑکیوں سے کام لینا اور ان نامحرم بالغہ لڑکیوں کے ساتھ اختلاط شرعی طور پر جائز نہیں ہے، اس سے آپ سخت گنہگار ہوں گے، فوراً یہ سلسلہ ختم کرنا آپ پر لازم ہے، محنت کی کمائی کا حکم الگ ہے اور غیر محرم کے ساتھ اختلاط کا گناہ الگ ہے؛ لہٰذا کمائی حرام نہیں، مگر اختلاط حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔

واما المجبوب الذي جف ماءه (إلى قوله) اختلاطه بالنساء والأصح أنه لا يرخص ويمنع. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الثامن، زكريا قديم ٥/ ٣٣٠، جديد ٥/ ٣٨٢، البحر الرائق، كوئٹه ٨/ ١٩٥، زكريا ٨/ ٣٥٨، تاتارخانية، زكريا ١٨/ ١٠١، رقم: ٢٨١٧٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍محرم الحرام ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶؍۷۸۸۳)

دفاتر میں کام کرنے والی عورتوں پر نظر پڑ جانا کیسا؟

سوال [۱۰۶۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ دفاتر میں عورتیں کام کرتی ہیں، اور بے پردہ رہتی ہیں، بعض دفعہ متقی پرہیزگار مرد علماء دین کو بھی ایسے دفتروں سے کام پڑتا ہے، تو ان سے علماء کا اپنی کام کی غرض سے بات چیت کرنا اور ملاقات کرنا جائز ہے یا نہیں؟ یہ ان کے تقویٰ کے خلاف تو نہیں؟

المستفتی: محمد عمیر غازی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آج کل عموماً دفاتر وغیرہ میں بے پردہ عورتیں کام کرتی ہے اور ہر شخص کو ان مراحل سے گذرنا پڑتا ہے، اوران سے بات چیت ناگزیر ہے؛ لہٰذا ان سے ضروری بات چیت کرنا جائز ہے اور یہ تقوی کے خلاف نہیں ہے، ایسی عورتوں کو شریعت نے باندی اور حربیہ عورت کے حکم میں قرار دیا ہے۔

الخلوة بالأجنبية حرام إلا لملازمة مديونة هربت ودخلت خربة.

وفي الشامية: يجوز الكلام المباح مع إمرأة أجنبية. (شامي، فصل في النظر والمس، زكريا ٩/٥٢٩-٥٣٠، كراچي ٦/٣٦٨-٣٦٩)

عن عبد الكريم قال: حدثني نصر بن عاصم، أن عمر بن الخطاب، سمع نواحه بالمدينة ليلا، فأتىٰ عليها، فدخل ففرق النساء فأدرك النائحة، فجعل يضربها بالدرة، فوقع خمارها، فقالوا: شعرها يا أمير المؤمنين، فقال: أجل فلا حرمة لها. (مصنف عبد الرزاق، المجلس العلمي بيروت ٣/٥٥٧، رقم:٦٦٨٢)

ان عمرؓ هجم على نائحة فضربها بالدرة حتى سقط خمارها، فقيل له يا أمير المؤمنين قد سقط خمارها، فقال: إنها لا حرمة لها، ومن هنا قال الفقية أبوبكر البلخي حين مربنساء على شط نهر كاشفات الرؤوس، والذراع، فقيل له كيف تمر، فقال: لا حرمة لهن غنما الشك في إيمانهن كأنهن حربيات. (در مختار على الشامي، زكريا كتاب النكاح، باب نكاح الكافر ٤/٣٦٩، كراچي٣/١٩٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۴۶٦۰)

عورتوں کا بغیر محرم کے اجتماعات، قرآن خوانی ونشرح کی مجلس میں جانا

سوال [۱۰٦۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شہر میں یا شہر سے باہر مستورات کے وہ اجتماعات جو نہ تو تبلیغی مرکز سے طے ہوتے ہیں، اور نہ کسی معتبر مدرسہ سے ان اجتماعات میں مستورات کا بغیر کسی محرم کے جانا کیسا ہے؟

(۲) کسی کے گھر مستورات میں میلاد پڑھنے جانا ختم قرآن پاک میں جانا کیسا ہے؟ نشرح میں لڑکیوں کا جانا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد ارشد، بارہ دری، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) مستورات کے لئے بلا محرم شہر سے باہر جانا ممنوع ہے؛ کیونکہ یہ فتنہ کا زمانہ ہے؛ اس لئے ان کو گھر سے باہر مسجد میں جا کر باجماعت نماز پڑھنے سے منع کر دیا گیا ہے؛ ہاں البتہ محرم کے ساتھ جائے، تو اس کی گنجائش ہے، چاہے تبلیغی مرکز کی طرف سے طے شدہ پروگرام ہو یا آپس کے مشورہ سے طے ہوا ہو، بس شرط یہ ہے کہ معتبر دینی پروگرام ہو اور محرم کے بغیر جانا جائز نہیں ہے۔ نیز خالص دینی پروگرام کے علاوہ دوسرے پروگرام مثلاً قوالی، عرس، نمائش وغیرہ میں جانا جائز نہیں ہے۔

عن أبي هريرة رضـ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يحل لإمرأة تؤمن بالله واليوم الآخر أن تسافر مسيرة يوم وليلة ليس معها حرمة. (صحيح البخاري، كتاب تقصير الصلوة، باب في كم يقصر الصلوة ١/١٤٧، رقم: ١٠٧٧، ف: ١٠٨٨)

وروي عن أبي حنيفة رحـ، وأبي يوسف كراهة خروجها وحدها مسيرة واحدة وينبغي أن يكون الفتوىٰ عليه لفساد الزمان. (شامي، كتاب الحج، مطلب في قولهم يقدم حق العبدعلى حق الشرع، كراچي ٢/٤٦٥، زكريا ٣/٤٦٥)

والفتوی الیوم علی الکراهة في الصلوة کلها؛ لظهور الفساد ومتی کره حضور المسجد للصلوة فلأن یکره حضور مجالس الوعظ خصوصًا عند هولاء الجهال الذین تحلوا بحلیة العلماء أولیٰ. (البحر الرائق، کتاب الصلوة، باب الإمامة، زکریا ۱/۶۲۸، کوئٹه ۱/۳۵۸)

میلاد پڑھنے کا موجودہ طریقہ شریعت سے ثابت نہیں، اس کا ترک لازم ہے، نہ اس میں مرد کا جانا جائز ہے اور نہ ہی عورت کا نشرح خوانی کی رسم بھی شریعت سے ثابت نہیں، وہاں بھی نہیں جانا چاہئے، قرآن خوانی کی فضیلت ہے، اگر فتنہ کا خطرہ نہ ہو، تو پردوں کے اہتمام کے ساتھ مردوں کے اختلاط سے دور رہ کر محلّہ کے اندر کسی کے گھر میں قرآن خوانی میں شرکت میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، مگر اس غرض سے عورت کے لئے شہر سے باہر جانے کی اجازت نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍رجب المرجب ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/۵۳۸۶)

عورتوں کا بازار جانا

سوال [۱۰۶۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عورتوں کے لئے بازار جانا کیسا ہے،

المستفتیه: شبینہ ثمرین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورتوں کا ضرورت کی وجہ سے بازار جانا شرعی پردہ کے ساتھ مباح ہے؛ لیکن شرط یہ ہے کہ چہرہ، ہاتھ وغیرہ سب چھپے ہوئے ہوں؛ کیونکہ یہ فتنہ کا زمانہ ہے؛ اس لئے ضرورت شدیدہ کے لئے جانا ہو، تو بدن کا ایک ایک

بال چھپا کر ہی جا سکتی ہے؛ لہٰذا نہ بے ضرورت بازار جانا جائز ہے اور نہ ہی چہرہ کھول کر کسی حال میں جانا جائز ہے؟

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: المرأة عورة. (سنن الترمذي، أبواب الرضاع، باب بلاترجمة، النسخة الهندية ۱/۲۲۲، دار السلام رقم: ۱۱۷۳)

فحل النظر مقيد بعدم الشهوة، وإلا فحرام. (در مختار كتاب الحظر والإباحة، فصل في النظر والمس، زكريا۹/ ۵۳۲، كراچي ۶/ ۳۷۰)

وتمنع المرأة الشابة من كشف الوجه بين الرجال لا لأنه عورة؛ بل لخوف الفتنة (وتحته في الشامية) والمعنىٰ يمنع من الكشف لخوف أن يرىٰ الرجال وجهها فتقع الفتنة. (شامي، كتاب الصلوة، باب شروط الصلوة، كراچي ۱/ ۴۰۶، زكريا ۲/ ۷۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ ر ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۳۹۵۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۳/۲۸ھ

بلا محرم عورت کے لئے جہاز کا سفر

سوال [۱۰۶۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید انگلینڈ میں رہتا ہے، اس کا ارادہ وہاں سکونت اختیار کرنے کا ہے، گرین کارڈ ملنے سے پہلے وہاں کی نیشنلٹی ممکن نہیں، چار سال کے بعد گرین کارڈ ملے گا، اس درمیان میں اگر اپنے وطن سفر کرے گا، تو گرین کارڈ نہیں ملے گا، زید کی بیوی ہندوستان میں رہتی ہے اور بیوی کا اتنی مدت تک تنہا رہنا ممکن نہیں ہے، اس وجہ سے اگر عورت محرم کے ساتھ ایر پورٹ پر آجائے اور وہاں سے جہاز سے انگلینڈ چلی جائے اور شوہر انگلینڈ ایر پورٹ پر آکر اس کو لے لے، تو عورت بلا محرم سفر کرنیکی وجہ سے گنہگار ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: محمد طیب

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں جب عورت کے پاس محرم کو ساتھ لے جانے کا خرچہ نہ ہو اور محرم عورت کو ایرپورٹ پر چھوڑ جاتا ہے اور جہاں جانا ہے، وہاں بھی شوہر یا محرم آکر اس کو ساتھ لے لے، تو اس طرح سفر کرنا امام مالکؒ، امام شافعیؒ کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے جائز ہے، عورت پر بلا محرم سفر کرنے کا گناہ بھی نہیں ہوگا۔ (مستفاد: انور رحمت ص: ۸۴)

وقال حماد لا بأس للمرأة أن تسافر بغير محرم مع الصالحين. (هندية، كتاب الكراهية، الباب السادس والعشرون، زكريا قديم ٥/٣٦٦، جديد ٥/٤٢٣، بنايه اشرفية ديوبند ٤/١٤٩)

قال مالكؒ تخرج مع جماعة النساء، وقال الشافعي: تخرج مع ثقة حرة مسلمة وقال ابن سيرين: تخرج مع رجل من المسلمين، وقال الأوزاعي: تخرج مع قوم عدول. (إعلاء السنن، كراچي ١٠/١٤، دار الكتب العلمية بيروت ١٠/١٧)

إن المحرم ليس بشرط في الحج والواجب، قال: الأثرم سمعت أحمد يسأل؛ هل يكون الرجل محرما لأم إمرأته يخرجها إلى الحج، فقال: أما في حجة الفريضة فأرجو لأنها تخرج إليها مع النساء ومع كل من أمنته وأما في غير فلا. (أوجز المسالك، دار القلم بيروت ٨/٦٤٨)

وأما الأسيرة إذا تخلصت من أيدي الكفار، فإن سفرها سفر ضرورة للناس لا يقاس عليه حالة الاختيار، ولذالک تخرج فيه وحدها؛ ولأنها تدفع ضرراً تيقنًا يتحمل الصدر المتوهم، فلا يلزم تحمل ذلک من غير

ضرر. (المغني، دار الفكر ٣/ ٩٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ر صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۵۴/۴۰)

نامحرم کے ساتھ غیر شرعی سفر کرنا

سوال [۱۰۶۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کوئی عورت تنہا یا نامحرم کے ساتھ غیر شرعی سفر (پانچ، دس، بیس کلومیٹر) کر سکتی ہے یا نہیں؟

نـــــوٹ: سوال کا تعلق ایسے سفر سے ہے، جو مشترکہ سواری ریل، بس وغیرہ سے ہوتا ہے، جس میں بہت سے لوگوں کے ساتھ سفر ہوتا ہے، خلوت نہیں ہوتی ہے۔

المستفتی: مولانا خورشید انور (صاحب) (استاذ) مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: تنہا یا غیر محرم کے ساتھ دس بیس کلومیٹر کا سفر بھی فسادِ زمانہ کی وجہ سے کراہت سے خالی نہیں؛ اس لئے حتی الامکان احتیاط لازم ہے۔

لايحل لإمرأة تؤمن بالله واليوم الآخر أن تسافر مسيرة يوم وليلة ليس معها حرمه. (بخاري شريف، كتاب التقصير الصلوة، باب في كم يقصر الصلوة ١/ ١٤٨، رقم: ١٠٧٧، ف: ١٠٨٨، صحيح مسلم، كتاب الحج، باب سفر المرأة مع محرم، النسخة الهندية ١/ ٤٣٣، بيت الأفكار رقم: ١٣٣٩)

وروي عن أبي حنيفةؒ، وأبي يوسف كراهة خروجها وحدها مسيرة واحدة، وينبغي أن يكون الفتوىٰ عليه لفساد الزمان. (رد المختار، كتاب الحج، مطلب في قولهم يقدم حق العبد على حق الشرع، كراچي ٢/ ٤٦٥، زكريا ٣/ ٤٦٥، تبين

الحقائق، امدادية ملتان ۲/ ٦، زكريا ۲/ ۲٤۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ رجب المرجب ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۳۱۶)

بے پردہ پھرنے والی عورتوں کو دیکھنا

سوال [۱۰۶۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جو مسلم، یا غیر مسلم عورتیں بازار میں پھرتی ہیں، ان کو دیکھنا کیسا ہے؟

نیز مرد دوکاندار کی دوکان پر سامان خریدنے اگر عورت آتی ہے، جو بلا نقاب کے ہے، تو کس طرح معاملہ کرے کہ شریعت کی نگاہ میں گنہگار نہ ہو، کیا عورت کے چہرہ کا پردہ نہیں ہے؟ یعنی اس کو چھپانا ضروری نہیں ہے؟

المستفتی: سرور احمد، ریاض سعودیہ عربیہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بے پردہ پھرنے والی مسلم اور غیر مسلم دونوں قسم کی عورتوں کو نگاہ جما کر دیکھنا ناجائز ہے اور دوکاندار کے سامنے نہ عورتوں کو بے نقاب ہونا جائز ہے اور نہ دوکاندار مرد کو ان کی طرف دیکھنا۔ نیز چہرہ کا پردہ عورتوں پر واجب ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: يدنين عليهن من جلابيبهن. دلالة على أن المرأة الشابة مأمورة بستر وجهها عن الأجنبين، واظهار التسر، والعفاف عند الخروج لئلا يطمع فيهن أهل الرب. (روائع البيان ۲/ ۳۸۳- ۲/ ۳۸۰- ۲/ ۱٥۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍ شوال المکرّم ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/ ۹۴۴)

عورتوں کی ملازمت کا شرعی حکم

سوال [۱۰۶۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عورتوں کا سرکاری یا غیر سرکاری اداروں، دفاتر یا کمپنیوں میں نوکری کرنا کیسا ہے؟ اسی طرح وہ ازخود ذاتی تجارت کریں، تو اس کا کیا حکم ہے، عورتوں کی کسی بھی طرح کی نوکری کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ کیا کسی مجبوری یا عذر کی بنا پر جائز ہوسکتی ہے؟ اگر ہاں تو کن شرطوں کے ساتھ اور اگر کسی بھی صورت میں جائز نہیں، تو اس کے دلائل بھی تحریر فرمادیں۔

المستفتی: سید زوار احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورتوں کا روزگار کمائی کا راستہ اختیار کرنا فی نفسہ کوئی برا نہیں، مثلاً اپنے گھر میں رہ کر سلائی، کڑھائی کے ذریعہ سے کمائی کرتی ہے، تو کوئی برا نہیں ہے جائز اور درست ہے، ایسا ہی سرکاری اور غیر سرکاری نوکری اور ملازمت کے ذریعہ سے روزی حاصل کرنا بھی فی نفسہ جائز ہے؛ لیکن دو قسم کی برائیوں کی وجہ سے یہ نوکری جائز نہیں۔ (۱) بے پردگی (۲) خوف وفتنہ، اگر یہ دونوں چیزیں نہیں ہے تو جائز ہے، مثلاً ایسا اسکول ہے، جس میں پڑھنے والی سب لڑکیاں اور پڑھانے والی بھی سب عورتیں ہوں، تو آمد ورفت میں پردے کے اہتمام کے ساتھ ایسے اسکولوں میں نوکری کرنا عورتوں کے لئے جائز اور درست ہے چاہے اسکول سرکاری ہو یا غیر سرکاری دونوں صورتوں میں جائز ہے، اسی طرح اگر کوئی سرکاری یا غیر سرکاری ایسا دفتر ہے، جس میں اوپر سے نیچے تک ساری عورتیں ہی ہوں اور مردوں کا وہاں کوئی تعلق نہ ہو تو اس میں نوکری کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے؛ لیکن جہاں مردوں کے اختلاط کے ساتھ نوکری اور ملازمت ہوتی ہے، وہاں مردوں کے ساتھ نوکری کرنے میں دو برائیاں ہیں:

(۱) پردے کے حکم کی خلاف ورزی جس کو اللہ نے قرآن میں منع فرمایا ہے۔

(۲) مردوں کے ساتھ خوف فتنہ، ان دونوں برائیوں کی وجہ سے اختلاط کے ساتھ عورتوں کی نوکری جائز نہیں ہے، اور اگر وہ برقعہ میں رہ کر کے اپنی ذمہ داری ادا کرتی ہیں، تب بھی مردوں کے اختلاط کی وجہ سے خوف فتنہ پھر بھی باقی ہے؛ اس لئے شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی ہے۔

قال تعالیٰ: وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلَىٰ. [الاحزاب: ۳۳]

روي عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: لايخلون رجل بامرأة إلا كان ثالثهما الشيطان. (ترمذي، أبواب الرضاع، باب ماجاء في كراهية الدخول على الغيبات، النسخة الهندية ۱/ ۲۲۱، دار السلام رقم: ۱۱۷۱، مسند البزار، مكتبه العلوم والحكم بيروت ۹/ ۲۷۱، رقم: ۳۸۱۷، المستدرك للحاكم، مكتبه نزار مصطفیٰ الباز بيروت ۱/ ۱۱٤، رقم: ۳۸۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍محرم الحرام ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰؍۱۰۹۴۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳؍۱؍۱۴۳۴ھ

عورتوں کا گاڑی چلانا

سوال [۱۰۶۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کوئی سی گاڑی عورتیں پردہ کی حالت میں چلاسکتی ہیں یا نہیں؟ اگر پردہ کی حالت میں گاڑی چلانا جائز ہے، تو قرآن وحدیث سے دلیل تحریر فرمائیں۔

المستفتی: تسلیم احمد قاسمی، عسکری پور، چاند پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چہرے کا پردہ بھی اجنبیوں سے لازم اور ضروری ہے اور چہرے کے پردہ کے ساتھ تو گاڑیاں چلانا بہت مشکل بات ہے،

نیز جب کوئی عورت اورنو جوان لڑکی کسی قسم کی گاڑی چلاتی ہے،تو حیرت کی وجہ سے یااس کی ادا پسند آنے کی وجہ سے مردوں کی نگاہیں اس کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہیں؛ اس لئے عورتوں کے لئے گاڑی چلانا جائز نہ ہوگا؛ کیونکہ اس سے آیت کریمہ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلٰى. [الاحزاب: ۳۳] کی مخالفت لازم آتی ہے۔
(مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۴۲۵/۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۳۹۱۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۳/۹ھ

ملازم سے پردہ واجب ہے یا نہیں؟

سوال [۱۰۶۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے خسر کی ہمراہ مشین پر ایک لڑکا شیعہ مذہب سے تعلق رکھنے والا کام کرتا تھا، بچہ ہونے کی وجہ سے آمد ورفت کا تعلق گھر کے اندر بھی تھا؛ لیکن اب وہ بچہ جوان ہوگیا ہے، اوراس کی شادی بھی ہوگئی ہے، اس کے یہاں بچہ کی پیدائش پر میری خوشدامن میری بیوی کواس کے گھر لے گئیں، جب مجھے علم ہوا، تو میں نے ایکشن لیا اور کہا کہ شرعاً پردہ فرض ہے، اگرچہ وہ بچپن میں گھر کے اندر آتا جاتا تھا؛ اس لئے آپ کو بالکل لے جانے کا حق نہیں ہے، میری ساس نے غلطی کا اقرار کیا؛ لیکن میرے خسر نے مسئلہ پردہ بتانے پر برجستہ یہ کہا کہ یہ مولوی لوگ لوجھڑ (لایعنی باتیں) بتایا کرتے ہیں، تو حل طلب مسئلہ یہ ہے:

(۱) کیا اس شیعہ سے پردہ واجب ہے یا نہیں؟

(۲) میرے خسر نے مسئلہ بتانے پر جو کلمات اپنی زبان سے ادا کئے یہ کفریہ ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو کیا تجدید نکاح ضروری ہوگا؟

المستفتی: محمد حذیفہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) شیعہ مذہب کے اس اجنبی مرد کے سامنے سنی عورتوں کا بغیر کسی پردہ کے آنا جانا قطعاً جائز نہیں ہے، اس سے پردہ کرنا واجب ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱۷۹/۴)

منع النظر من الشابة في زماننا ولولا بشهوة. (روح المعاني، سورة الأحزاب: تحت تفسير الآية ٥٩، جزء ٢٢، مكتبه زكريا ١٢٨/١٢، در مختار، كتاب الحظر والإباحة، فصل في النظر والمس، كراچي ٣٧٠/٦، زكريا ٥٣٢/٩)

(۲) شرعی مسئلہ بتانے پر خسر کا ایسا جملہ استعمال کرنا نہایت خطرناک ہے، موجب کفر بھی بن سکتا ہے توبہ کر کے تجدید نکاح کر لینا چاہئے۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۳۵/۱، جدید زکریا مطول ۳۷۳/۱)

وما فيه خلاف يؤمر بالاستغفار والتوبة، وتجديد النكاح. (در مختار ٢٤٧/٤)

وإذا كان الفقيه يذكر شيئًا من العلم أويروي حديثًا صحيحًا، فقال: آخر أين هيج نيست درده فهذا كفر. (عالمگيري، كتاب السير، الباب التاسع في أحكام المرتدين، زكريا قديم ٢٧١/٢، جديد ٢٨٢/٢، تاتارخانية، زكريا ٣٣٤/٧، رقم: ١٠٦٢٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۷۹۹/۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۷/۴/۲۶ھ

غیر محرم عورتوں کو چوڑی پہنانا

سوال [۱۰۶۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: کہ چوڑی فروش کا کام کرنا اور غیر عورتوں کی کلائی پکڑ کر چوڑی پہنانا کیسا ہے؟ جائز ہے یا ناجائز؟

المستفتی: عنایت اللہ، گودھرا (گجرات)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیر محرم عورتوں کی کلائی پکڑ کر چوڑیاں پہنانا حرام ہے، اگر پکڑتے وقت شہوت ابھر جائے، تو اس عورت کی نسل میں کسی لڑکی کے ساتھ نکاح ہمیشہ کے لئے ناجائز ہو جائے گا۔

فلا يحل مس وجهها، وكفها، وإن أمن الشهوة؛ لأنه أغلظ ولذا تثبت به حرمة المصاهرة. (الدر المختار، كتاب الحظر والإباحة، فصل في النظر والمس، كراچي ٦/٣٦٧، زكريا ٩/٥٢٨)

ولايحل له أن يمس وجهها، ولا كفها، وإن كان يأمن الشهوة. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الثامن، زكريا قديم ٥/٣٢٩، جديد ٥/٣٨١، تاتارخانية، زكريا١٨/٩٥، رقم:٢٨١٤٧، المحيط البرهاني، المجلس العلمي بيروت ٨/٣٠، رقم:٩٥١٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ذی قعدہ ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/۱۵۶۰)

(٦) باب مایتعلق بالشعر (بالوں سے متعلق)

بال رکھنے کا مسنون طریقہ

سوال [۱۰۶۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سر کے بال منڈانا سنت ہے یا مستحب یا پٹھے بال رکھنا سنت ہے یا مستحب؟ اور پٹھے بال رکھنے کی کیا حد ہے؟ اور کتنے طریقے ہیں؛ اس لئے کہ بعض لوگوں کو گردن کے اخیر تک پٹے رکھے ہوئے دیکھا ہے، اور بعضوں کو نصف گردن تک اور بعضوں کو سر کے آخری حصہ تک ۔ مفصل طریقہ تحریر فرمائیں کہ پٹھے رکھنے کی صورت میں مذکورہ تینوں صورتوں میں کیا کیا حکم ہے؟

المستفتی: سعید احمد سیوانی، مدرسہ مظاہر علوم، سہارن پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضور ﷺ عام طور پر جو بال رکھتے تھے، وہ کانوں کی لو تک ہوتے تھے، جس کو وفرہ کہا جاتا ہے اور کبھی لمبے ہو کر نصف گردن تک ہوتے تھے، جس کو لمہ کہا جاتا ہے اور کبھی کاٹنے میں تاخیر ہو جاتی، تو مونڈھوں کے قریب تک ہو جاتے تھے، جس کو جمہ کہا جاتا ہے، پھر کبھی کاٹ کر لو کے برابر کرتے تھے اور کبھی لو سے نیچے کاٹ دیتے تھے، مگر گردن تک چھوڑنے کا معمول نہیں تھا؛ بلکہ کاٹنے میں جب تاخیر ہو جاتی، تو وہاں تک پہونچ جاتے تھے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۴/ ۲۲۴)

لیکن طالبان علم دین کے لئے طالب علمی کے زمانہ میں مذکورہ تینوں قسموں میں سے کسی بھی ایک قسم کو اختیار کرنا مناسب نہیں ہے؛ بلکہ مونڈ وادے؛ کیونکہ منڈانا بھی سنت ہے یا برابر کر کے کٹا دے۔

وفي رواية: كان يضرب شعره منكبيه، وفي رواية إلى أنصاف أذنيه، وفي رواية: بين أذنيه وعاتقه، قال أهل اللغة: الجمة الشعر الذي نزل إلى المنكبين، والوفرة: ما نزل إلى شحمة الأذنين، واللمة: التي لمت بالمنكبين– إلى– وذالک لإختلاف الأوقات. (نووي على هامش مسلم، باب صفة شعره صلى الله عليه وسلم، وصفاته، وحليته، النسخة الهندية ۲/۲۵۸، تحت رقم الحديث: ۲۳۳۷، عمدة القاري، دار أحياء التراث العربي ۲۲/۵۳، زكريا ۱۵/۹۹–۱۰۰، ارشاد الساري، دار الفكر ۸/٤٦٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍رجب المرجب ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲؍۴۹۴۴)

کیا بیچ سر میں مانگ نکالنا مرد وعورت دونوں کے لئے سنت ہے

سوال [۱۰۶۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سر کے بالوں میں مانگ نکالنا سنت ہے، تو کیا یہ سنت مرد وعورت سب کے لئے عام ہے، یا مردوں کے ساتھ خاص ہے؟ نیز مشہور ہے کہ مرد سر کے بیچ میں مانگ نکالے اور عورت سر کے بائیں جانب کنارے پر مانگ نکالے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ آپ اولاً سنت عمومی یا خصوصی کی وضاحت فرمادیں بعدہ مانگ کا محل متعین فرما کر مرد وعورت دونوں کے متعلق ممکن حد تک عربی عبارت کا صریح جزئیہ یا کوئی حدیث شریف اس نوعیت کی ہو، تو اسے بھی نقل فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

المستفتی: محمد شمیم قاسمی (مہاراشٹر)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سر کے بالوں میں مانگ نکالنا سنت ہے۔

عن عائشةؓ قالت: كنت إذا فرقت لرسول الله صلى الله عليه وسلم رأسه صدعت فرقة عن يافوخه، وأرسلت ناصيته بين عينيه. (مسند أحمد بن حنبل ٢٧٥/٦، رقم: ٢٦٨٨٧، ٩٠/٦، رقم: ٢٥١٠١، سنن أبي داؤد، باب ماجاء في الفرق، النسخة الهندية ٥٧٦/٢، دار السلام رقم: ٤١٨٩، مشكوة شريف ٣٨١)

اور یہ سنت سنت عمومی ہے؛ کیونکہ جب مردوں کے لئے مانگ نکالنا سنت ہے، تو عورتوں کے لئے بدرجہ اولیٰ ہے؛ اس لئے کہ عورت زیب وزیبائش کی زیادہ حقدار ہے۔ (مستفاد: مظاہر حق جدید۵/۵۱۶)

نیز بیچ میں مانگ نکالنا مرد وعورت دونوں کے لئے سنت ہے، جیسا کہ لفظ حدیث عن یافوخہ سے پتہ چلتا ہے، ٹیڑھی مانگ نکالنا یہ متغربین کا طریقہ ہے۔ (فتاوی محمودیہ قدیم ۱۰۳/۵، جدید ڈابھیل ۴۳۳/۱۹)

اور عورتوں کے لئے ٹیڑھی مانگ نکالنے کی جو بات کہی گئی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/۶۴۴۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۱/۱۴۲۱ھ

زیب وزینت کے لئے باربار مانگ نکالنا اور مانگ نکالنے کا سنت طریقہ

سوال [۱۰۶۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) حدیث شریف میں جو روزانہ کنگھا کرنے کی ممانعت آئی ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا حضور ﷺ ہر وضو کے بعد کنگھا کیا کرتے تھے، ایک شخص ہر وضو کے بعد کنگھا کرتا ہے، کیا ازروئے شرع یہ ناجائز ہے؟

(۲) کیا مانگ نکالنا سنت ہے، اگر ہوتو وضاحت فرمائیں مانگ بیچ سر میں نکالنا سنت ہے، یا دائیں بائیں جانب عورت ومرد میں کوئی فرق ہو، تو وضاحت فرمائیں ایک صاحب کا کہنا کہ مرد کے لئے بیچ سر میں مانگ نکالنا سنت ہے، اگر درست ہے تو تصویب فرمائی جائے؟

وسط رأس اور دائیں بائیں جانب دونوں طرف مانگ نکالنا جائز ہے، تو بہتر کس طرف نکالنا ہے؟ بیچ سر میں یا دائیں بائیں جانب ہر جز کا جواب مدلل دیں۔

المستفتی: ضیاء الرحمٰن، چوہان بانگر، دہلی-۵۳

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: زیب وزینت کے لئے بار بار کنگھا کرنے کی ممانعت حدیث میں اس لئے آئی ہے کہ اس کی وجہ سے آدمی اپنی ذمہ داری سے آزاد ہوکر خود پسندی میں لگ جائے گا، ہاں البتہ بکھرے ہوئے بالوں اور ڈاڑھیوں کو کسی بھی وقت کنگھے سے درست کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

المستفاد والمراد بالنهي عن المواظبة عليه والاهتمام به، فإنه مبالغة في التزئين وتهالک في التحسين. (حاشية مشكوة ٣٨٢)

عن أبي هريرةؓ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من كان له شعر فليكرمه. (سنن أبي داؤد، باب في اصلاح الشعر، النسخة الهندية ٢/ ٥٧٣، دار السلام رقم:٤١٦٣، المعجم الأوسط، دار الفكر٦/ ١٩٥، رقم:٨٤٨٥، مشكوة المصابيح ٢/ ٣٨٢)

(۲) مرد کے لئے بیچ سر میں مانگ نکالنا سنت ہے۔

عن عائشةؓ قالت: كنت إذا فرقت لرسول الله صلى الله عليه وسلم رأسه صدعت فرقة عن يافوخه، وأرسلت ناصيته بين عينيه. (مسند أحمد بن حنبل ٦/ ٢٧٥، رقم: ٢٦٨٨٧، شمائل ترمذي ٣، سنن ابن ماجه، النسخة الهندية ٢/ ٢٥٩،

دارالسلام رقم:٣٦٣٣، مسند أبي يعلي الموصلي، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ٤٦، ٢٤٣، رقم: ٤٣٩٦، ٤٧٩٨)

قوله أرسل ناصيته معناه أنها ترسل نصف الناصية في يمين ذلك الفرق والنصف الآخر في يساره عن بين عينيه، بأن يكون الفرق محاذ يا لما بين عينيه. (حاشية أبو داؤد٢/ ٥٧٦)

والفرق سنة في الشعر (إلى قوله) أي وسط رأسه. (بذل المجهود، باب ماجاء في الفرق، دار البشائر الإسلامية ١٢/ ٢١٤، ٢١٥، سهارنپور قديم٥/ ٧٦)

عورت دائیں یابائیں جس طرف چاہے مانگ نکال سکتی ہے؛ جبکہ فساق کی مشابہت کے قصد سے خالی ہواورمحض زینت کے لئے ہو۔ (مستفاد: فتاوی احیاء العلوم ۳۰۵)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیراحمدقاسمی عفااللہ عنہ
۲۷/جمادی الثانی ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر:الف۳۳/۵۳۵۷)

عورت مانگ کس طرح نکالے؟

سوال[۱۰۶۵۲]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مردوں کے لئے سر کے بیچ میں مانگ نکالنا سنت ہے،عورتوں کے لئے مانگ نکالنے کا کونسا طریقہ مسنون ہے؟

المستفتی: محمدابراہیم،رام پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جس طرح مردوں کے لئے بیچ میں مانگ نکالنا مسنون ہے،اسی طرح عورتوں کے لئے بھی بیچ میں مانگ نکالنا مسنون ہے؛ کیونکہ حدیث میں مطلق رأس کاحکم ہے،جس میں مردوں اورعورتوں کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

والفرق سنة؛ لأنه الذي رجع إليه صلى الله عليه وسلم والظاهر إنه إنما رجع إليه بوحي. لقوله إنه كان يجب موافقة أهل الكتاب فيما لم يؤمر فيه-إلى-والحاصل أن الصحيح المختار جواز السدل. (مرقات، باب الترجل، امداديه ملتان ۸/۲۹۳، شرح الطيبي، كراچي ۸/۲۴۹، تحت رقم الحديث: ۴۴۲۵، شرح النووي على مسلم، النسخة الهندية ۲/۲۵۸، تحت رقم الحديث: ۲۳۳۶)

الفرق أي فرق شعر الرأس هو قسمته في المفرق، وهو وسط الرأس وأصله، من الفرق بين الشيئين والفرق مكان انقسام الشعر من الجبين إلى دارة وسط الرأس. (فتح الباري، باب الفرق، اشرفية ۱۰/۴۴۲، دار الفكر ۱۰/۳۶۱، تحت رقم الحديث: ۵۹۱۷، عمدة القاري، دار احياء التراث العربي ۲۲/۵۵، زكريا ۱۵/۱۰۳-۱۰۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۸؍صفر المظفر ۱۴۲۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۹۳۰/۳۶)	۱۴۲۴/۲/۱۹ھ

لڑکیوں کے بال کس عمر تک مونڈنے کی اجازت ہے؟

سوال [۱۰۶۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ لڑکیوں کے سر کے بال کٹانے مونڈنے کا کیا حکم ہے؟ کتنے سال کی عمر تک سر کے بال کاٹے یا مونڈے جاسکتے ہیں؟

المستفتی: رئیس الدین، محلّہ ڈھاران، گڑھی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مطلقاً لڑکیوں کے بال کسی عذر مثلاً سر کے درد وغیرہ کی وجہ سے منڈوانے کٹوانے کی اجازت ہے اور بغیر کسی عذر کے کٹوانا منڈوانا مکروہ وناجائز ہے۔

ولو حلقت المرأة رأسها، فإن فعلت بوجع أصابها لا بأس به، وإن فعلت ذلک شبهًا بالرجل فهو مکروه. (هندية، الباب التاسع عشر، في الختان، زکريا قديم ۵/ ۳۵۸، جديد ۵/ ۴۱۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ ر جمادی الثانی ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱ / ۴۰۳۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۵/۲۷ھ

سفید بال مؤمن کا نور

سوال [۱۰۶۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سفید بالوں کے بارے میں جو آیا ہے کہ یہ مؤمن کا نور ہے، مفتی صاب سے گذارش ہے کہ یہ روایت کن کتب احادیث میں ہے؟ بحوالہ نقل فرمادیں کرم ہوگا۔

المستفتی: محمد ناظر، بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس روایت میں سفید بالوں کو مؤمن کا نور کہا گیا ہے، وہ مختلف کتب احادیث میں موجود ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده، أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن نتف الشيب، وقال: إنه نور المسلم. (ترمذي شريف، باب ماجاء في النهي عن نتف الشيب، النسخة الهندية ۲/ ۱۰۹، درا السلام رقم: ۲۸۲۱)

عن عمرو بن شعيب عن جده أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا تنتفوا الشيب، فإنه نور المسلم، من شاب شيبة في الإسلام كتب الله له بها حسنة وكفر عنه بها خطيئة ورفعه بها درجةً. (مسند أحمد ۲/ ۲۱۰، رقم: ۶۹۶۲، ۲/ ۱۷۹، رقم: ۶۶۷۲)

عن فضالة بن عبيد أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من شاب شيبة في الإسلام كانت له نوراً يوم القيامة، فقال رجل: إن رجالاً ينتفون الشيب، فقال: رسول الله صلى الله عليه وسلم: من شاء نتف شيبه، أو قال: نوره وفي رواية ابن لهيعة: من شاء فلينتف نوره. (شعب الإيمان للبهيقي، فصل في كراهية نتف الشيب، دار الكتب العلمية بيروت٥/ ٢١٠، رقم:٦٣٨٨)

عن عمرو بن عبسة السلمي سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من شاب شيبةً في الإسلام، أو قال في سبيل الله كانت له نورًا يوم القيامة ما لم يخضبها، أو ينتفها. (شعب الإيمان للبيهقي، فصل في كراهية نتف الشيب، دار الكتب العلمية بيروت ٥/ ٢١٠، رقم:٦٣٨٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ رربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۵۰۶)

سفید بال والے اور تین قسم کے لوگوں کے اعزاز واکرام کا لزوم

سوال [۱۰۶۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ تین قسم کے لوگوں کا اعزاز و اکرام کرنا درحقیقت اللہ تعالیٰ کی عظمت دل میں پیدا کرتا ہے۔(۱) سفید بال والے (۲) عادل بادشاہ، (۳) عالم دین۔ مفتی صاحب سے گذارش ہے کہ از راہ کرام یہ حدیث کتب احادیث کے حوالوں سے نقل فرما دیں۔

المستفتی: محمد عادل، بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ روایت جس میں یہ مضمون وارد ہوا ہے کہ

تین قسم کے لوگوں کا اعزاز واکرام کرنا درحقیقت اللہ تعالیٰ کی عظمت دل میں پیدا کرنا ہے۔ درج ذیل کتب احادیث میں موجود ہے۔

عن أبي هريرةؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن من تعظيم جلال الله عزو جل إكرام ذي الشيبة في الإسلام، وإن من تعظيم جلال الله إكرام الإمام المقسط. (شعب الإيمان للبيهقي، باب في رحم الصغير وتوقير الكبير، دار الكتب العلمية بيروت ٧/ ٤٦٠، رقم: ١٠٩٨٨)

عن أبي موسىٰ الأشعريؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن من إجلال الله إكرام ذي الشيبة المسلم، وحامل القرآن غير الغالي فيه، والجا في عنه وإكرام ذي السلطان المقسط. (أبو داؤد، باب في تنزيل الناس منازلهم، النسخة الهندية ٢/ ٦٦٥، دار السلام رقم: ٤٨٤٣، كذا في مصنف ابن أبي شيبة، مؤسسه علوم القرآن جديد ١٧/ ٣٨٠، رقم: ٣٣٢٨)

عن أبي أمامةؓ عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ثلاثة لا يستخف بحقهم إلا منافق ذو الشيبة في الإسلام وذو العلم، وإمام مقسط.
(المعجم الكبير، دار أحياء التراث العربي ٨/ ٢٠٢، رقم: ٧٨١٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰ /۱۱۵۰۷)

غیر مجاہدین کے لئے مونچھیں بڑھانا

سوال [١٠٦٥٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بعض آدمی مونچھیں اوپر چڑھاتے ہیں، اس طرح اوپر چڑھانا غیر مجاہدین کے لئے جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: زبیر عالم، شاہدرہ-دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شریعت میں اصل حکم تو داڑھی بڑھانے اور مونچھیں کتروانے کا ہے، مگر مجاہدین کے لئے مونچھیں بڑھانے کی گنجائش ہے تاکہ دشمن دیکھ کر مرعوب وخائف ہو، غیر مجاہدین کے لئے زیادہ مونچھیں بڑھانا جائز نہیں ہے۔

عن عامر بن عبد اللّٰہ بن الزبیر أن عمر بن الخطابؓ کا ن إذا غضب فتل شاربه ونفخ. (المعجم الکبیر للطبراني، دار أحیاء التراث العربي ١/٦٦، رقم:٥٤)

قالوا لابد عن طول الشارب للغزاة؛ لیکون أهیب في أعین العدو، کذا في الغیاثیة. (الهندیة، الباب التاسع عشر في الختان، و الخصاء...... زکریا قدیم ٥/٣٥٨، جدید ٥/٤١٤، المحیط البرهاني، المجلس العلمي ٨/٧٨، رقم: ٩٦٥٥)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲ ربیع الاول ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/ ۵۲۰۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۳/۲ھ

سر پر دو چوٹیاں باندھنا

سوال [۱۰۶۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عورت کے سر کے اگلے حصہ کے بال چھوٹے ہوں اور ایک چوٹی میں اچھی طرح پکڑے نہ جانے کی وجہ سے بار بار بکھر کر دوپٹہ سے باہر آجاتے ہوں، تو بالوں کی حفاظت اور انہیں نامحرم کے سامنے کھلنے سے بچانے کے لئے اگر وہ دو چوٹیاں ڈالا کرے، تو شرعًا کوئی قباحت تو نہیں ہے؟

المستفتی: مفتی ابرارالحق، لاتور، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دو چوٹیاں باندھنے یا سنگار کرنے میں بالوں کی حفاظت اور نامحرم کی نگاہ سے بچانے کے علاوہ کافر یا فاسق لوگوں کی اتباع یا فیشن کی کوئی نیت نہیں ہے، تو شرعًا اس کی اجازت ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۴۲/۵، جدید ڈابھیل ۴۳۹/۱۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ محرم الحرام ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۳۸۵/۳۲)

مجیب کا جواب صحیح ہے

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نیز صحابیہ عورتیں بھی اپنے اپنے سروں پر دو یا اس سے زیادہ چوٹیاں باندھنے میں کسی قسم کی قباحت نہیں سمجھتی تھیں۔ حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میرے سر پر کئی کئی چوٹیاں ہونے کی وجہ سے بار بار غسل جنابت کے لئے سب کو کھولنا دشوار ہو گیا تھا۔

عن أم سلمةؓ، قال: قلت یا رسول اللّٰہ! إني امرأة أشد ضفر رأسي فأنقضه لغسل الجنابة الحدیث (صحیح مسلم، باب حکم ضفائر المغتسلة، النسخة الهندیة ۱۴۹/۱، بیت الأفکار رقم: ۳۳۰، سنن الترمذي، باب هل تنقض المرأة شعرها عند الغسل، النسخة الهندیة ۱۶/۱، دار السلام رقم: ۱۰۵، سنن أبي داؤد، باب المرأة هل تنقض شعرها عند الغسل، النسخة الهندیة ۳۳/۱، دار السلام رقم: ۲۵۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ ربیع الاول ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۳۸۵/۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۳/۹ھ

عورتوں کا دو چوٹیاں باندھنا

سوال[۱۰۶۵۸]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کیاعورتیں دو چوٹیاں باندھ سکتی ہے، جیسے ہندولڑکیاں دوچوٹیاں باندھتی ہیں؟ اگرنہیں تو عورت کے مرنے کے بعداس کے سر کے بالوں کے دو حصے کرنے کے بعد دائیں بائیں سینہ پراس کے بال کیوں ڈال دیئے جاتے ہیں،مثبت یامنفی جواب تحریرفرماتے وقت دلیل ضرورتحریرفرمائیں۔

المستفتی: عبدالوحید،امروہی، مکان۱۴/۱امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دویازائد چوٹیاں باندھنے کا جوازحدیث سے ثابت ہے،اورصحابیہ عورتوں کا کئی چوٹیاں باندھنااورحضور ﷺ کانکیرنہ فرمانا ثابت ہے، ہندوعورتیں دو چوٹیاں باندھتی ہیں، تو اس سے مسلم عورتوں کاہندوعورتوں کے ساتھ مشابہت اختیارکرنالازم نہیں آتا؛ کیونکہ یہ مسلم عورتوں کا پرانا طریقہ زینت ہے،جیسا کہ اگریہودی اورسکھ ڈاڑھی رکھتے ہیں،تومسلمانوں پرڈاڑھی کی ممانعت نہیں ہے؛اس لئے کوئی اشکال نہیں ہوناچاہئے۔

عن أم سلمة أن امرأة جاءت إلى أم سلمةؓ بهذا الحديث قالت: فسألت لها النبي صلى الله عليه وسلم بمعناه، قال فيه: واغمزي قرونک عند كل حفنة. (سنن أبي داؤد، باب في المرأة هل تنقض شعرها عند الغسل، النسخة الهندية ۱/۳۳، دار السلام رقم: ۲۵۲)

سبحان من زين الرجال باللحي والنساء بالذوائب. (كشف الخفاء، دار الكتب العلمية بيروت ۱/۳۹۳، رقم: ۱۴۴۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/۲۲۳۲)

مسلم عورتوں کا مانگ میں افسا لگانا

سوال [۱۰۶۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہندوؤں کی عورتیں اپنی مانگ میں سیندور لگاتی ہے، تو کیا مسلمان عورتیں سیندور کی جگہ اپنی مانگوں پر کوئی اور چیز مثلاً افسا (ایک سنہری چیز ہوتی ہے) اسے استعمال کرسکتی ہیں یا نہیں؟

المستفتی: محمد کلیم الدین، پرتا بگڈھی، متعلم: دورۂ حدیث مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بہتر اور افضل یہی ہے کہ مسلمان عورتیں اپنی مانگ پر کسی قسم کا رنگ نہ لگائیں، اس سے غیروں کی مشابہت آجاتی ہے؛ البتہ شوہر کو خوش کرنے کے لئے جس طرح بھی چاہے مانگ نکال کر زیب وزینت کرسکتی ہیں اور پیشانی کے اوپر مانگ کے بیچ میں کسی طرح کا رنگ لگانا غیر مسلم عورتوں کا شعار اور علامت ہے؛ اس لئے کسی بھی طرح کا رنگ مانگ میں لگانا مسلم عورتوں کے لئے مناسب نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱/۲۹۳، جدید ڈابھیل ۱۹/۵۵۷)

عن ابن عمرؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من تشبه بقوم فهو منهم. (سنن أبي داؤد، باب في لبس الشهرة، النسخة الهندية ۲/۵۵۹، دار السلام رقم: ۴۰۳۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/صفر المظفر ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/۸۷۲۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲/۲/۱۴۲۶ھ

بچیوں کے سروں پر پھول باندھنے اور دو چوٹیوں کا حکم

سوال [۱۰۶۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ بچیوں کے سروں پر جو پھول باندھ دیتے ہیں جو کہ عام رواج ہو گیا ہے، دوسرے چوٹی باندھنا اس کا جواز ہے یا حرام ہے؟

المستفتی: نور العابدین، بارو دگران، نولگڑھ (راجستھان)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پھول زینت کی چیز ہے، اس کو لڑکیوں کی چوٹیوں میں لگانے میں کوئی حرج نہیں اور دو یا زیادہ چوٹیاں باندھنا صحابیہ عورتوں سے ثابت ہے۔

عن أم سلمةؓ، قالت: قلت يا رسول الله! إني امرأة أشد ضفر رأسي فأنقضه لغسل الجنابة الحديث (صحيح مسلم، باب حكم ضفائر المغتسلة، النسخة الهندية ١/١٤٩، بيت الأفكار رقم: ٣٣٠، مسند الدارمي، دار المغني ١/٧٤٣، رقم: ١١٩٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸؍۲۹۱۳)

گدی یا گردن کے بال استرے سے صاف کرنا کیسا؟

سوال [۱۰۶۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ گدی اور گردن کے بال استرے سے صاف کرانا کیا حکم شرعی رکھتا ہے؟

المستفتی: محمد ابرہیم، رام پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گدی الگ عضو ہے اور اس سے ہٹ کر گردن دوسرا الگ عضو ہے اور گدی سر کے پیچھے کا حصہ ہے، اور گردن کان کی لو کے بعد سے شروع ہوتی ہے؛ لہٰذا گدی کے بال استرے سے صاف کردیا جائے اور سر کا بقیہ حصہ صاف نہ

کرے، تو یہ قزعہ میں داخل ہوکر نا جائز اور ممنوع ہے اور صرف گردن کے بال استرے سے صاف کرلیا جائے، تو بلا کراہت جائز اور درست ہے؛ اس لئے کہ یہ قزعہ میں داخل نہیں ہے۔

(مستفاد: امداد الفتاوی، زکریا ۴/۲۲۴، فتاوی رشیدیہ جدید ۲/۷۶/۳، ص: ۱۹/۷، رشید قدیم ۵۹۰، جدید زکریا ۵۸۷، احسن الفتاوی ۸/۷۶)

عن ابن عمر أن النبي صلى الله عليه وسلم نهي عن القزع، وهو أن يحلق رأس الصبي فتترك له ذؤابة. (سنن أبي داؤد، باب في الذوائبة، النسخة الهندية ۲/ ۵۷۷، دار السلام رقم: ٤١٩٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ رجب المرجب ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۲۰۰۳/۴۱)

سینہ کے بال صاف کرنا کیسا؟

سوال [۱۰۶۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بعض لوگوں کے سینہ پر زیادہ بال ہوتے ہیں، اس کو صاف کرنا کیسا ہے؟ اور اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: محمد عادل، سیوہاروی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سینہ کے بال صاف کرنا جائز اور درست ہے، تاہم یہ خلاف ادب ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۴/ ۲۲۴، محمودیہ میرٹھ ۲۷/ ۴۲۷، فتاوی دار العلوم ۱۶/ ۲۳۴، محمودیہ ڈابھیل ۱۹/ ۴۴۴، کتاب الفتاوی ۶/ ۱۴۳)

وفي حلق شعر الصدر والظهر ترك الأدب. (هندية، الباب التاسع عشر، زكريا قديم ٥/ ٣٥٨، جديد ٥/ ٤١٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ١٨/ ١٠٠)

وفي اليتيمة: سألت أبا الفضل عمن حلق شعر صدره، أوظهره هل له ذلک؟ فقال: هو تارک الأدب. (تاتارخانية، زكريا ۱۸/ ۲۱۱، رقم: ۲۸۵۴۱)

وفي حلق شعر الصدر والظهر ترک الأدب، كذا في القنية.

(شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ۹/ ۵۸۳، كراچي ۶/ ۴۰۷)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۵۰۹)

عورت کا شوہر کو خوش کرنے کے لئے بدن کے بال صاف کروانا

سوال [۱۰۶۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بیوٹی پارلر میں عورتیں اپنے بدن کے بالوں کو صاف کروانے جاتی ہیں، بعض عورتوں کے ہاتھ، پیر میں بال زیادہ ہوتے ہیں، جس کو شوہر پسند نہیں کرتا ہے، اسی طرح اس کے چہرہ اور بھوں میں بال شوہر پسند نہیں کرتا ہے، تو کیا شوہر کو خوش کرنے کے لئے عورتیں ایسا کرسکتی ہیں یا نہیں؟

المستفتی: محمد ابراہیم، رام پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: عورت شوہر کی خوشنودی ورضاء کی خاطر ہاتھ پیروں کے بال اور چہرہ سے رواں وغیرہ صاف کرسکتی ہے، فقہاء کرام نے اس کی اجازت دی ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۹/ ۴۴، میرٹھ ۲۷/ ۴۷، دینی مسائل اوران کا حل ۳۱۹، آپ کے مسائل اوران کا حل ۸/ ۳۲۳)

ولابأس أن تعرّي المرأة عن الشعر. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في النظر واللمس، زكريا ۹/ ۵۳۶، كراچي ۶/ ۳۷۳)

عن أم سلمةؓ، أن النبي صلى الله عليه وسلم كان إذا أطلي بدأ بعورته، فطلاها بالنورة، وسائر جسده أهله. (سنن ابن ماجه، باب الاطلاء بالنورة، النسخة الهنديد ۲/۲٦٦، دار السلام رقم: ۳۷۵۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۵۲۲/۴۰)

بیوی کو خوش کرنے کے لئے سینہ کے بال صاف کرنا

سوال [۱۰۶٦۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بعض لوگوں کے بدن میں بہت زیادہ بال ہوتے ہیں، جیسے چہرہ، سینہ، پیر، ہاتھ وغیرہ تو اپنے بدن کے بالوں کو صاف کر کے ٹھیک کر سکتا ہے یا نہیں؟ بسا اوقات بیوی اس کو قطعاً پسند نہیں کرتی، تو اس کے لئے کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد ابراہیم، رام پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جن لوگوں کے بدن پر بہت زیادہ بال ہوتے ہوں، تو ان کے لئے بدن کے بالوں کو صاف کرنے کی اجازت ہے اور بیوی کو خوش کرنے کے لئے بھی بلا کراہت جائز ہے اور بلا ضرورت خلاف ادب ہے اور ضرورۃً جائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم ۱۶/۲۳۴، کتاب الفتاوی ۱۴۳/۶، محمودیہ ڈابھیل ۱۹/۴۴۴، میرٹھ ۲/۲۷۴، امداد الفتاوی ۴/۲۲۴)

لا بأس بأخذ الحاجبين، وشعر وجهه ما لم يشبه بالمخنث. وفي حلق شعر الصدر، والظهر ترك الأدب. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ۹/۵۸۳، كراچي ٦/۴۰۷، هندية، زكريا قديم ۵/۳۵۸، جديد ۵/۴۱۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۱۸/۱۰۰)

وفي اليتيمة: سألت أبا الفضل عمن حلق شعر صدره، أو ظهره

هل له ذلک؟ فقال: هو تارک الأدب. (تاتارخانية، زكريا ۱۸/ ۲۱۱، رقم: ۲۸۵٤۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱؍ جمادی الثانیہ ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰؍ ۱۱۵۵۱)

بال کٹوانے کے بعد سر پر استرہ پھیرنا

سوال [۱۰۶۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سر کی کٹنگ یا مشین پھرانے کے بعد استرہ سے گدی پر گردہ سا بنانے کا رواج ہے کیا یہ درست ہے؟

المستفتی: محمد یونس احمد، گڑھ (پنجاب)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سر کے بال قینچی سے صاف کرنے کے بعد گردن یا کان پر استرہ پھیرنے کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۴؍ ۲۲۳، فتاوی رشیدیہ قدیم ۵۹۱، جدید زکریا ۵۸۲)

عن أبي حنيفةؒ يكره أن يحلق قفاه إلا عند الحجامة، كذا في الينا بيع. (عالمگيري، الباب التاسع عشر، زكريا قديم ۵/ ۳۵۷، جديد ۵/ ٤۱۳، حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، دار الكتاب ديوبند ۵۲٦، الموسوعة الفقهية الكويتية ۱۸/ ۹٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍ ربیع الاول ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲؍ ۴۷۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶؍ ۳؍ ۱۴۱۷ھ

سر منڈانا کیسا ہے؟

سوال [۱۰٦٦٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بندہ نے غنیۃ الطالبین ۸۰؍ پر پڑھا ہے، جس میں لکھا ہے، حج اور عمرہ اور ضرورت کے سوا امام احمدؒ کے نزدیک سر منڈانا برا ہے اور ایک روایت حضور ﷺ سے منقول ہے کہ جس نے سر منڈایا وہ مجھ سے نہیں۔ دار قطنی نے جابر بن عبداللہ سے روایت کی ہے کہ آقا نے فرمایا کہ حج وعمرہ کے سوا بال نہ منڈوایا جائے، سر کے بال منڈوانے والے میں خارجیوں کی علامت پائی جاتی ہے، حضرت ابن عباس روایت کرتے ہیں، اگر کسی کا سر منڈا ہوا دیکھ لو، تو سمجھو اس میں شیطان کی خاصیت ہے؛ کیونکہ سر منڈانے والا اپنے آپ کو عجم کی ہم صورت بناتا ہے اور آقا کا فرمان ہے کہ جو شخص اپنی صورت کو دوسری قوم کے مشابہ بنائے وہ اسی قوم سے ہے، جو روایت بیان کی گئی ہیں، اس سے سر منڈانے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے، آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔

المستفتی: نور الزماں، لالباغ، مدرسہ ہذا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سائل نے غنیۃ الطالبین کے حوالے سے سر منڈانے کی کراہت اور ممنوعیت سے متعلق جو روایتیں نقل فرمائی ہیں، وہ اپنی اپنی جگہ صحیح طور پر موجود ہیں۔ اور ان تمام روایات سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ حج وعمرہ کے علاوہ سر منڈانا نہ مسنون ہے، نہ مستحب ہے، نہ بہتر سمجھا گیا ہے اور سر منڈانے سے متعلق حضور اکرم ﷺ سے اور صحابہ سے سنن عادیہ کے طور پر بھی باوجود جستجو اور تلاش کے کوئی روایت دستیاب نہیں ہوسکی، صرف حضرت علیؓ کا وہ عمل جو غسل جنابت سے متعلق مروی ہے وہ دستیاب ہوا کہ غسل جنابت میں اگر بال برابر بھی جگہ باقی رہ جائے، تو غسل درست نہیں ہوتا، اس پر

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ جب سے میں نے یہ ارشاد سنا، اس وقت سے میں نے اپنے سر سے عداوت کرلی ہے، حضرت علیؓ کی اس روایت کا کیا مطلب ہے؟ محدثین نے اس سلسلے میں دوطرح کی تشریح فرمائی ہے:

(۱) اس سے مراد یہی ہے کہ حضرت علیؓ اس دن کے بعد سے سر منڈالیا کرتے تھے۔

(۲) بعض محدثین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اس دن کے بعد سے حضرت علیؓ سر کے بالوں کو جڑ سے کاٹ دیا کرتے تھے منڈاتے نہیں تھے۔ نیز غنیۃ الطالبین میں جہاں سوالنامہ میں نقل کردہ روایات کا ذکر ہے، وہاں پر اس سے متصل سر منڈانے کی اباحت سے متعلق بھی دو روایتیں نقل کی گئی ہیں اور ایک روایت ابوداؤد شریف میں ہے، وہ بھی اس بارے میں واضح نہیں ہے۔

(۱) وہ روایت ہے جس میں حضرت جعفرؓ کے غزوۂ موتہ میں شہید ہونے کے موقع پر ان کے بچے اور گھر والے منع کرنے کے باوجود رو رہے تھے، آخر حضور ﷺ نے ان کو بلا کر سزا کے طور پر سب کے سر منڈاوئے۔

(۲) دوسری روایت ابوداؤد شریف کی ہے، جس میں اس بات کا ذکر ہے کہ کسی نے اپنے بچے کے سر کے بال کو انگریزوں کی طرح آدھا سر کٹوادیا اور آدھا سر باقی چھوڑ دیا، تو حضور ﷺ نے فرمایا تو پورا منڈادو یا پورا چھوڑ دو ایک روایت غنیۃ الطالبین میں وہ بھی نقل کی ہے، جس میں حضور ﷺ کا آخری عمر میں سر منڈانے کا ذکر ہے اور آخر عمر میں سر منڈانے سے مراد حجۃ الوداع کے موقع پر سر منڈانا اور حج سے واپسی کے دو مہینہ بعد آپ ﷺ کی وفات ہوگئی ہے۔

اب دونوں قسم کی روایات کو سامنے رکھنے کے بعد یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ سر منڈانا نہ مسنون ہے، نہ مستحب ہے اور نہ ہی امر مستحسن ہے، ہاں البتہ حضرت علیؓ کے عمل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے غسل کی آسانی کے لئے سر منڈادیا جائے، تو کوئی قباحت نہیں ہے، مباح اور جائز ہے؛ لہٰذا سر منڈانے کو مسنون نہ سمجھتے ہوئے، اگر کوئی شخص سر منڈاتا ہے،

تو اس کے اوپر کوئی نکیر بھی نہ ہونی چاہئے، مگر افضل یہی ہے کہ سر نہ منڈایا جائے۔ اب دونوں طرح کی روایات ذیل میں درج ہیں ملاحظہ ہو:

(۱) عن جابرؓ عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لا توضع النواصي إلا في حج، أو عمرة. (المعجم الأوسط للطبراني، دار الفكر ٦/ ٤٨٠، رقم: ٩٧٥، غنية الطالبين ٣٧، حاشية بذل المجهود حجازي ١٧/ ٧٨)

(٢) عن ابن عباسؓ أنه قال: الذي يحلق في المصر خليق بالشيطان. (غنية الطالبين ٣٧)

(٣) قال ابن عباسؓ الذي يحلق رأسه في المصر شيطان. (حاشية بذل المجهود حجازي ١٧/ ٧٨)

(٤) وقال عمر لصبغ لو وجدتک محلوقًا لضربت الذي فيه عيناک بالسيف. (حاشية بذل المجهود حجازي ١٧/ ٧٨، غنيةالطالبين ٣٧، لكن لم يذكر بالسيف)

(٥) عن أبي سعيدن الخدري عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: يخرج ناس من قبل المشرق ويقرؤن القرآن لا يجاوز تراقيهم يمرقون من الدين كما يمرق السهم من الرمية، ثم لا يعودون فيه حتى يعود السهم إلى فوقه، قيل: ما سيما هم؟ قال: سيما هم التحليق، او قال التسبيد. (بخاري شريف، باب قراءة الفاجر والمنافق......النسخة الهندية ٢/ ١١٢٨، رقم: ٧٢٦١، ف: ٧٥٦٢)

(٦) روي في حديث أبي موسىٰ، وعبيد بن عميرؓ عنهما عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: ليس منا من حلق. (غنية الطالبين ٣٧)

اباحت کی روایات ملاحظہ ہو جو کسی نہ کسی علت کے ساتھ معلول ہیں۔

(١) عن عليؓ قال: ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من ترک موضع شعرة من جنابة لم يغسلها فعل بها كذا وكذا من النار،

قال عليؓ: فمن ثم عاديت رأسي، فمن ثم عاديت رأسي، فمن ثم عاديت رأسي، وكان يجز شعره رضي الله عنه. (أبو داؤد شريف، باب في الغسل من الجنابة، النسخة الهندية ١/٣٣، دار السلام رقم: ٢٤٩، سنن الدارمي، دار المغني ١/٥٨٠، رقم: ٧٨، مسند أحمد بن حنبل ١/١٠١، رقم:٧٩٤)

(٢) عن عبد الله بن جعفر أن النبي صلى الله عليه وسلم أمهل آل جعفر ثلاثًا، أن يأتيهم، ثم أتاهم، فقال: لاتبكوا على أخي بعد اليوم، ثم قال ادعو إلى بني أخي، فجئ بنا كأنا أفرخ، فقال: أدعوالي الحلاق، فأمره فحلق رؤوسنا. (أبو داؤدشريف، باب في حلق الراس، النسخة الهندية ٢/٥٧٧، دارالسلام رقم: ٤١٩٢، المعجم الكبير للطبراني،دار أحياء التراث العربي ٢/١٠٥، رقم: ١٤٦١، ١٣/٧٩، رقم: ١٩٤، مشكوة شريف ٢/٣٨٢، غنية الطالبين ٣٨)

(٣) عن ابن عمر أن النبي صلى الله عليه وسلم رأي صبيًا قد حلق بعض رأسه وترک بعضه، فنهاهم عن ذالک، فقال: احلقوه كله، أواتركوه كله. (أبو داؤد، باب في الذوائبة، النسخة الهندية ٢/٥٧٧، دار السلام رقم: ٤١٩٥،مشكوة ٢/٢٨٠)

(٤) روي أن النبي صلى الله عليه وسلم حلق رأسه في آخر عمر بعد أن كان شعره يضرب منكبيه. (غنية الطالبين ٣٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍محرم الحرام ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷؍۸۶۶۵)

سفید بالوں پر پیلا خضاب لگانا زیادہ بہتر ہے یا سفید حالت میں چھوڑ دینا؟

سوال [۱۰۶۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ بڑھاپے میں سفید بالوں پر خضاب لگانا بہتر ہے یا ان کو بغیر خضاب کے یوں ہی چھوڑے رکھنا زیادہ بہتر ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دے کر کرم فرمائیں۔

المستفتی: محمد عادل، سیوہاروی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: متعدد روایات میں سفید بالوں کی فضیلت وارد ہوئی ہے، مثلاً آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ اگر انسان نے اپنے سفید بالوں پر خضاب نہ لگایا ہو، تو یہ بال بروز قیامت اس کے لئے نور ہوں گے اور آپ علیہ السلام سے سفید بالوں پر حضاب لگانے سے متعلق روایات مختلف ہیں؛ لہٰذا سفید بالوں پر خضاب لگانا اور نہ لگانا دونوں جائز ہے؛ لیکن افضل یہی ہے کہ ان پر حضاب نہ لگایا جائے؛ بلکہ ان کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے؛ کیونکہ حضور ﷺ نے اپنے سفید بالوں پر کبھی کبھی پیلا حضاب لگایا ہے، مگر زیادہ تر حالات اور اکثر اوقات میں پیلا خضاب نہ لگا کر سفید حالت میں چھوڑے رکھا ہے۔

والمختار أنه رسول الله صلى الله عليه وسلم صبغ في وقت، وتركه في معظم الأوقات. (شرح النووي على المسلم ۲/ ۲۵۹)

ويحمل حديث من أثبت الخضاب على أنه عليه السلام فعل ذالک أحيانا ولم يواظب عليه. (تکملة فتح الملهم ٤/ ٥٥٩)

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده أن النبي صلى الله عليه وسلم نهي عن نتف الشيب، وقال: إنه نور المسلم. (ترمذي شريف، باب ما جاء في النهي عن نتف الشيب، النسخة الهندية ۲/ ۱۰۹، دار السلام رقم: ۲۸۲۱، مسند أحمد بن حنبل ۲/ ۲۱۰، رقم: ٦٩٦٢)

عن عمرو بن عنبسة السلميؓ سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من شاب شيبة في الإسلام، أو قال: في سبيل الله كانت له نورًا يوم القيامة مالم يخضبها، أوينتفها. (شعب الإيمان، فصل في كراهية نتف الشيب، دارالكتب العلمية بيروت ٥/ ۲۱۰، رقم: ٦٣٨٩)

عن ثابت عن أنسؓ أنه سئل عن خضاب النبي صلى الله عليه وسلم، فذكر أنه لم يخضب؛ ولكن قد خضب أبو بكرؓ، وعمرؓ. (أبو داؤد شريف، باب في الخضاب،النسخة الهندية ٢/٥٧٨، دار السلام رقم: ٤٢٠٩)

عن عثمان بن عبد الله بن موهبؓ، قال: دخلت على أم سلمةؓ، فأخرجت إلينا شعرًا من شعر النبي صلى الله عليه وسلم مخضوباً. (بخاري شريف، باب ما يذكر في الشيب ٢/٨٧٥، رقم: ٥٨٩٧، ف:٥٦٦٨)

عن بن عمرؓ، أن النبي صلى الله عليه وسلم كان يلبس النعال السبتية ويصفر لحيته بالورس، والزعفران. (أبوداؤد شريف، باب ما جاء في خضاب الصفرة، النسخة الهندية ٢/٥٧٨، دار السلام رقم: ٤٢١٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ر صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۴۹/۴۰)

سیاہ خضاب کی شرعی حیثیت

سوال [۱۰۶۶۸]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سیاہ خضاب لگانا حرام ہے یا مکروہ تحریمی یا مکروہ تنزیہی؟ بعض روایات سے کالا خضاب لگانا بلا کراہت جائز معلوم ہوتا ہے اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کالا خضاب لگانا جائز نہیں ہے۔ حضرت تھانویؒ اور حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبان کے بعض فتاوی سے مکروہ تنزیہی اور خلاف اولیٰ معلوم ہوتا ہے اور ان دونوں بزرگوں کے بعض فتاوی سے حرام یا مکروہ تحریمی اور موجب فسق معلوم ہوتا ہے، تو گذارش یہ ہے کہ کالا خضاب لگانے والے کی امامت کا کیا حکم ہے؟ اور اس کے پیچھے نماز بلا کراہت جائز ہے یا مکروہ ہے، مفتی صاحب سے گذارش ہے کہ اس مسئلہ پر خاص توجہ فرما کر جو بھی شرعی حکم ہو واضح فرمادیں نوازش ہوگی۔

المستفتی: عبید اللہ دریاپور، بھاگلپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سرخ اور پیلا خضاب لگانا بالاتفاق جائز ہے، اختلاف سیاہ خضاب کے متعلق ہے، جہاد میں سیاہ خضاب لگانا بالاتفاق جائز ہے اور جہاد کے علاوہ دیگر حالات میں عامۃ المشائخ کے نزدیک مکروہ ہے اور حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک بیوی کو خوش کرنے کی خاطر بلا کراہت جائز ہے، حضرت تھانویؒ نے امداد الفتاوی ۲۱۳/۴ پر اس موضوع سے متعلق سب سے پہلا فتوی جو لکھا ہے، اس کا حاصل یہی ہے، آگے چل کر کہیں مکروہ تحریمی اور کہیں حرام کے الفاظ استعمال کئے ہیں، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ نے بھی فتاوی دار العلوم میں اس موضوع پر چار جوابات دیئے ہیں، فتاوی دار العلوم ۲۴۰/۱۶-۲۴۱ میں چار جوابات کے شروع میں تین جوابات جو دیئے ہیں، ان کا حاصل بھی یہی ہے کہ سیاہ خضاب اکثر مشائخ کے نزدیک مکروہ ہے اور بعض مشائخ عدم کراہت کے بھی قائل ہیں۔ بہر حال اجتناب بہتر ہے اور مبسوط سرخسی ۱۹۹/۱۰ میں یہ جزئیہ موجود ہے۔

وأما من اختضب لأجل التزئين للنساء، والجواري، فقد منع من ذالک، بعض العلماء رحمهم الله تعالىٰ والأصح، أنه لا بأس به، وهو مروي عن أبي يوسفؒ قال: كما يعجبني أن تتزين لي يعجبها أن أتزين لها. (المبسوط للسرخيي، دار الكتب العلمية بيروت ١٩٩/١٠)

اور چوتھا جواب جو لکھا ہے اسمیں کراہت تحریمی ثابت فرمائی ہے اور مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے کفایت المفتی قدیم ۱۷۱/۹-۱۷۲، جدید زکریا مطول ۳۴۲/۱۲ میں سیاہ خضاب لگانے کو صرف مکروہ لکھا ہے، مکروہ تحریمی کہیں بھی نہیں لکھا ہے، حضرت گنگوہیؒ نے باقیات فتاوی رشیدیہ ۳۷۸/ میں منع لکھا ہے اور فتاوی رشیدیہ قدیم ۵۸۹، جدید زکریا ۵۸۰/ میں اتنا لکھا ہے کہ سوائے سیاہ خضاب کے سب قسم کے خضاب درست ہیں، حضرت گنگوہیؒ نے صاف الفاظ میں مکروہ بھی نہیں لکھا ہے۔

اب ہم کو احادیث شریفہ کے نصوص پر غور کرنا ہے کہ جہاد کے علاوہ یا بیوی کو خوش رکھنے کے مسئلہ کے علاوہ زینت کے لئے سیاہ خضاب لگانا تمام نصوص کے پیش نظر کیا حکم رکھتا ہے، تو اس سلسلہ میں ہم نے احادیث شریفہ کے نصوص کو احاطہ کر کے دیکھا ہے کہ دو قسم کی روایات ہمارے سامنے ہیں، بعض روایات تو وہ ہیں جن سے مطلقاً جواز ثابت ہوتا ہے اور بعض روایات وہ ہیں جن سے عدم جواز ثابت ہوتا ہے؛ اس لئے دونوں قسم کی روایات کو جمع کرنے کے بعد ہم کو غور کرنا ہے کہ سیاہ خضاب لگانا حرام، مکروہ تحریمی اور موجب فسق ہے، جس کی وجہ سے سیاہ خضاب لگانے والے کے پیچھے نماز بھی مکروہ ہوجائے گی یا مکروہ تنزیہی ہے، جس کی وجہ سے سیاہ خضاب لگانے والے پر فسق کا حکم نہیں لگ سکتا اور اس کے پیچھے نماز بلا کراہت درست ہوجائے گی۔

پہلی قسم کی روایات امام طبرانیؒ نے المعجم الکبیر میں حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ اور حضرت جریر بن عبداللہ بجلیؓ کا عمل نقل فرمایا ہے کہ یہ دونوں حضرات سیاہ خضاب لگایا کرتے تھے، مصنف ابن ابی شیبہ میں صحیح اور عالی سند کے ساتھ روایت نقل کی گئی ہے کہ حضرت عقبہ بن عامرؓ سیاہ خضاب لگایا کرتے تھے، اور اس کی ترغیب بھی دیا کرتے تھے۔ نیز حضرت حسنؓ وحضرت حسینؓ کا عمل بھی صحیح سند کے ساتھ نقل فرمایا ہے کہ وہ سیاہ خضاب لگایا کرتے تھے اور امام محمد ابن الحنفیہ سے سیاہ خضاب لگانے کے بارے میں سوال کیا گیا، تو انہوں نے جواب دیا ”**لا أعلم به بأسًا**“ (اس میں کوئی حرج نہیں) اور اس موضوع سے متعلق روایات کی تعداد بہت زیادہ ہے؛ اس لئے ساری روایات کو نقل نہ کرتے ہوئے چند روایات نقل کردیتے ہیں، جو حسب ذیل ہیں ملاحظہ فرمائیے:

(۱) عن أبي عشانة المعافري قال: رأیت عقبة بن عامرؓ یخضب بالسواد، ویقول نسود أعلاها وتأبي أصولها. (مصنف ابن أبي شیبة، مؤسسه علوم القرآن ۱۲/۵۵۵، رقم: ۲۵۵۶۹)

(٢) **عن الحسن أنه كان لا يرى باسًا بالخضاب بالسواد.** (مصنف ابن أبي شيبة ١٢/ ٥٥٤، رقم: ٢٥٥٢٣)

(٣) **عن قيس مولى خباب قال: دخلت على الحسنؓ، والحسينؓ وهما يخضبان بالسواد.** (مصنف ابن أبي شيبة ١٢/ ٥٥٤، رقم: ٢٥٥٢٠، المعجم الكبير ٣/ ٩٩، رقم: ٢٧٨٧/ ٢٧٩١/ ٢٧٩١)

(٤) **عن أبي عون قال: كانوا يسألون محمداً عن الخضاب بالسواد، فيقول: لا أعلم به باسًا.** (مصنف ابن أبي شيبة ١٢/ ٥٥٤، رقم: ٢٥٥٢٤)

(٥) **عن سعيد بن المسيب أن سعد ابن أبي وقاصؓ كان يخضب بالسواد.** (المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التراث العربي ١/ ١٣٨، رقم:٢٩٥)

(٦) **عن عامر بن سعدؓ أن سعداً كان يخضب بالسواد.** (المعجم الكبير للطبراني ١/ ١٣٨/ ٢٩٦، مجمع الزوائد، دار الكتب العلمية بيروت ٥/ ١٥٨)

اس موضوع سے متعلق بہت ساری روایات نقل کی گئی ہیں۔ دوسری قسم کی روایات جن میں سیاہ خضاب کی ممانعت ہے، ان کی بھی تعداد اچھی خاصی ہے، ان میں سے دو روایتیں ایسی ہیں، جن سے بادی النظر میں کراہت تحریمی کا حکم لگانا ممکن ہے۔

(۱) حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت ہے، جن میں حضرت صدیقؓ کے والد حضرت ابو قحافہ کے بال کو خضاب لگا کر تغیر کرنے کا حکم کیا گیا ہے، اور ان الفاظ سے حضور ﷺ نے حکم فرمایا:

غيروا هذا بشيئ واجتنبوا السواد. (مسلم شريف، باب في صبغ الشعر وتغيير الشيب، النسخة الهندية ٢/ ١٩٩، بيت الأفكار رقم: ٢١٠٢، نسائي شريف، النهي عن الخضاب بالسواد، النسخة الهندية ٢/ ٢٣٦، دار السلام رقم: ٥٠٧٦)

دوسری روایت عبداللہ ابن عباسؓ کی ہے، جس میں وعید کے الفاظ بھی موجود ہیں، اس میں الفاظ یہ ہیں:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يكون قوم يخضبون في آخر

الزمان بالسواد كحواصل الحمام لايريحون رائحة الجنة. (أبوداؤد شريف، باب ماجاء في خضاب السواد،النسخة الهندية ٢/٥٧٨، دار السلام رقم:٤٢١٢، سنن النسائي، النهي عن الخضاب بالسواد، النسخة الهندية ٢/٢٣٦، دار السلام رقم: ٥٠٧٥)

اب ان دونوں روایتوں پر غور کرنا ہے، پہلی روایت میں امر کا صیغہ ہے اور امر کا صیغہ وجوب کے لئے ہوتا ہے، اور اس میں حضور ﷺ نے دو جملے امر کے صیغہ کے ساتھ استعمال فرمائے ہیں:

پہلے جملے میں حضرت ابو قحافہؓ کے بالوں کو خضاب لگا کر تغیر کرنے کا حکم فرمایا، دوسرے جملے میں سیاہ خضاب سے اجتناب کا حکم فرمایا۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ اگر سیاہ خضاب سے اجتناب واجب ہے، تو اس کا لگانا حرام یا مکروہ تحریمی ہے، تو پہلا جملہ جس میں سفید بالوں کو خضاب کے ذریعہ تغیر کرنے کا حکم ہے، وہ بھی وجوب پر محمول ہو جائے، تو ایسی صورت میں سفید سفید ڈاڑھی والوں پر خضاب لگانا واجب ہو جائے گا؛ حالانکہ سفید بال سفید داڑھی والوں پر خضاب لگا کر بال کو تغیر کرنے کے وجوب کا قائل کوئی بھی نہیں ہے؛ اس لئے امر کے دونوں صیغے ترغیب پر محمول ہوں گے، وجوب یا تحریم پر نہیں ہو سکتے۔

دوسری حدیث شریف میں ایسی قوم کے بارے میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: جن کو جنت کی بو بھی حاصل نہ ہوگی، اس قوم کی حضور ﷺ نے پہچان بیان فرمائی ہیں:

(۱) وہ قوم سیاہ خضاب لگائے گی۔

(۲) اس قوم کی جسمانی کیفیت کبوتروں کے پوٹے کی طرح ہوگی، سیاہ خضاب لگانے کو حضور ﷺ نے اس قوم کی پہچان قرار دی ہے، وعید کی علت قرار نہیں دی ہے، اور جن بزرگوں نے اس کو وعید کی علت قرار دی ہے، ان کو اس حدیث شریف پر دوبارہ نظر ثانی کرنی چاہئے، ورنہ حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ، حضرت جریر ابن عبد اللہ بجلیؓ، حضرت عقبہ ابن عامرؓ اور حضرت حسن و حضرت حسین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پر العیاذ باللہ مکروہ تحریمی کا ارتکاب اور فسق کا الزام عائد ہو سکتا ہے، جو قطعاً درست نہیں ہے۔

نیز حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ اور حضرت جابر بن عبد اللہؓ کی روایت بالاتفاق ظنی الثبوت ہے اور جواز کی روایات کی وجہ سے ان دونوں روایتوں کی دلالت بھی بالاتفاق ظنی ہے اور جو روایتیں ظنی الثبوت اور ظنی الدلالت ہوتی ہیں، ان سے کراہت تحریمی اور حرمت کا ثبوت نہیں ہوتا؛ بلکہ کراہت تنزیہی کا ثبوت ہوتا ہے؛ اس لئے حضرت گنگوہیؒ اور حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے بہت محطاط انداز سے حکم لگایا ہے، اور حضرت تھانویؒ اور حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کے اول الذکر فتاوی کا محمل بھی یہی ہے؛ اس لئے سیاہ خضاب لگانا مکروہ تنزیہی ہوسکتا ہے، اور اس کی امامت بھی بلاکراہت درست ہوجائے گی۔ نیز حضرت امام نوویؒ نے اس بات پر اجماع نقل فرمایا ہے کہ ان روایات میں صیغۂ امر سے بالاجماع وجوب کا حکم ثابت نہیں ہے، اور صیغۂ نہی سے بالاجماع مکروہ تحریمی یا حرمت کا ثبوت نہیں ہے؛ لہٰذا صرف مکروہ تنزیہی کا حکم ثابت ہوسکتا ہے اور مکروہ تنزیہی کے ارتکاب سے آدمی فاسق نہیں ہوتا ہے، اور اس کی امامت بلاکراہت درست ہوجاتی ہے، علامہ نوویؒ کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

واختلاف السلف في فعل الأمرين بحسب اختلاف أحوالهم في ذالک مع أن الأمر والنهي في ذالک ليس للوجوب بالإجماع؛ ولهذا لم ينكر بعضهم على بعض خلافه في ذالک قال: ولايجوز أن يقال فيهما ناسخ ومنسوخ. (شرح نووي على المسلم ٢/ ١٩٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢٩ ؍شوال المکرّم ١٤٣٥ھ
(فتویٰ نمبر: الف ١١٦٨٣/٤١)

بیوی کوخوش کرنے کے لئے امام صاحب کا خضاب لگانا

سوال [١٠٦٦٩]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں : کہ زید کی عمر ۳۵؍سال ہے، جوشادی شدہ ہے اوراس کا ایک بچہ بھی ہے، وہ کسی مسجد میں امامت کرتا ہے، ایک مرتبہ سخت بیماری میں مبتلا ہونے پر اس نے اپنی بیماری کا علاج کرایا، جس کی وجہ سے اس کے سارے بال داڑھی سمیت مکمل سفید ہو گئے، اس کی بیوی کو یہ پسند نہیں ہے؛ چنانچہ بیوی کا کہنا یہ ہے کہ اگر وہ سیاہ خضاب استعمال نہ کرے، تو میں اس سے الگ ہوجاؤں گی، ادھر مصلیوں کا کہنا ہے کہ اگر وہ سیاہ خضاب استعمال کرے گا، تو ہم اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھیں گے، ایسی صورت میں زید کونسی راہ اختیار کرے؟

المستفتی: محمد مصدق حسین، مغربی بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بیوی کوخوش کرنے اور گھر کو اجڑ جانے سے حفاظت کے واسطے داڑھی پر سیاہ خضاب لگانا حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جائز ہے؛ لہٰذا ایسے واقعہ میں امام ابو یوسفؒ کے مسلک کے مطابق عمل کرنے کی گنجائش ہے۔

وبعضهم جوز ذالک من غير كراهة، وروي عن أبي يوسفؒ أنه قال: كما يعجبني أن تتزين لي يعجبها أن أتزين لها. (هندية، الباب العشرون، في الزينة ......زكريا قديم ٣٥٩/٥، جديد ٤١٤/٥، المحيط البرهاني، المجلس العلمي٨٨/٨، رقم: ٩٦٥٧، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ٤١٨/٢١، رقم:٢٨٥٥٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍شعبان المعظم ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸؍۹۴۰۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۸/۱۴ھ

داڑھی پر سیاہ خضاب لگانے کا حکم

سوال [۱۰۶۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ داڑھی پر سیاہ خضاب لگانا جائز ہے یا نہیں؟ خضاب لگا کر سفیدی چھپانا کیسا ہے؟

المستفتی: حاجی، عمر دراز، طویلہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سیاہ خضاب کسی شرعی مصلحت کی بناپر لگانا جائز ہے، مثلاً جہاد میں شرکت مقصود ہو یا میاں بیوی دونوں جواں ہوں یا شوہر بوڑھا ہو؛ لیکن بیوی جوان ہو، تو ان دونوں صورتوں میں بیوی کی خوشنودی کے لئے کالا خضاب لگانے کی گنجائش ہے اور اگر اس طرح شرعی ضرورت نہ ہو، تو خالص سیاہ خضاب لگانا جس سے بالوں کی سفیدی اصل سیاہی معلوم ہو مکروہ ہے۔

أما الخضاب بالسواد للغزو؛ ليكون أهيب في عين العدو فهو محمود بالاتفاق، وإن ليزين نفسه للنساء، فمكروه وعليه عامة المشائخ، وبعضهم جوزه بلاكراهة روي عن أبي يوسفؒ أنه قال: كما يعجبني أن تتزين لي يعجبها ان أتزين لها. (شامي، زكريا ٩/٦٠٥، كراچي ٦/٤٢٢، هندية، الباب العشرون في الزينة.....زكريا قديم ٥/٣٥٩، جديد ٥/٤١٤، الموسوعة الفقهية الكوتية ١١/ ٢٧٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢١ر جمادی الاولیٰ ١٤٢١ھ
(فتویٰ نمبر: الف ٦٧١٢/٣٥)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٤٢١/٥/٢١ھ

بیوی کی خوشنودی کے لئے کالا خضاب لگانا

سوال [١٠٦٧١]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید ایک نوجوان آدمی ہے، حتی کہ ابھی شادی بھی نہیں کی ہے؛ لیکن اس کے سر کے بال ایسے سفید ہو رہے ہیں، جیسا کہ ٥٠/٦٠ر سال کے آدمی کے بال سفید ہوتے ہیں، تو کیا اس صورت میں زید کو کالا خضاب لگانے کی گنجائش ہے؟

المستفتی: اسرار الحق، مظاہری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سیاہ خضاب لگانا جس سے بالوں کی سفیدی اصل سیاہی معلوم ہومکروہ ہے، البتہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک بیوی کے سامنے تزئین کے لئے کالا خضاب لگانے کی گنجائش ہے، اور جب آپ کی شادی بھی نہیں ہوئی ہے، تو امام ابو یوسف کے قول کے مطابق آپ کو کالا خضاب لگانے کی گنجائش ہے۔

وأما من اختضب لأجل التزئين للنساء، والجواري، فقد منع من ذالک بعض العلماء رحمهم الله تعالیٰ والأصح، أنه لا بأس به، وهو مروي عن أبي يوسفؒ قال: كما يعجبني أن تتزين لي يعجبها أن أتزين لها. (المبسوط للسرخيي، دار الكتب العلمية بيروت ۱۰/۱۹۹)

وإن ليزين نفسه للنساء، فمكروه وعليه عامة المشائخ، وبعضهم جوزه بلا كراهة، روي عن أبي يوسفؒ أنه قال: كما يعجبني أن تتزين لي يعجبها ان أتزين لها. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ۹/۶۰۵، كراچي ۶/۴۲۲، الموسوعة الفقهية الكوتية ۱۱/۲۷۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ / جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۶۷۲۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۵/۲۸ھ

شوہر کو خوش کرنے کے لئے بیوی کا خضاب لگانا

سوال [۱۰۶۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سیاہ خضاب کی فقہاء نے مجاہد اور امام ابو یوسفؒ نے شوہر کو بیوی کے سامنے تزئین کے لئے بھی گنجائش دی ہے، کیا عورت کے لئے اس طرح کی تزئین کی گنجائش اپنے شوہر کے لئے ہوسکتی ہے؟

المستفتی: عبدالرحمٰن، ٹانڈہ رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورت کے لئے شوہر کو خوش کرنے کے واسطہ خضاب بالوں پر لگانا جائز ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی جدید زکریا مطول ۳۴۲/۱۲، قدیم ۱۷۱/۹)

إن الکراهة خاصة بالرجال دون النساء، فیجوز ذلک للمرأة لأجل زوجها. (فتح الباري، باب ما ذکر عن بني اسرائیل، دار الفکر ٦/٤٤٩، اشرفیه دیوبند ٦/٦١٨، تحت رقم الحدیث ٣٤٦٢، عمدة القاري، دار أحیاء التراث العربي ١٦/٤٦، زکریا ١١/٢١٢، تحت رقم الحدیث ٣٤٦٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۰۷۴/۳۳)

سخت کھجلی کی بناء پر سر میں کالا خضاب لگانا

سوال [۱۰۶۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص نیک سیرت اور شریف ہے اور امامت کے فرائض کو بخوبی انجام دیتے ہیں، مگر اپنے سر کے سفید بالوں کو کوئی چیز لگا کر سیاہ کرتے ہیں، صرف سر کے بالوں کو سیاہ کرتے ہیں، داڑھی کو نہیں وہ کہتے ہیں کہ میری مجبوری ہے کہ سر میں سخت کھجلی ہوتی ہے، اس مجبوری میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: مولوی محمد کامل، نور پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بلا کسی عذر کے کالا خضاب لگانا مکروہ ہے؛ لیکن سوال نامہ میں اس بات کا ذکر ہے کہ خارش کے عذر کی وجہ سے کالا خضاب لگایا جارہا ہے، اوراس کی وجہ سے خارش کا فائدہ بھی ہے، تو ایسی صورت میں عذر کی وجہ سے علاج کے طور پر

کالا خضاب لگانا ناجائز اور مکروہ نہیں ہے؛ بلکہ اس کی گنجائش ہے، جیسے کہ بیوی کو خوش رکھنے کے لئے اور میدان جنگ میں دشمنوں پر رعب ڈالنے کی ضرورت کی وجہ سے جائز ہوتا ہے؛ لیکن بہتر اور افضل یہ ہے کہ خارش کے لئے کوئی متبادل دوسرا علاج ممکن ہو، تو وہی علاج اختیار کیا جائے تاکہ دیکھنے والوں کو بلا عذر کالا خضاب لگانے کا شبہ نہ ہو۔

أن التداوي بالمحرم لا يجوز في ظاهر المذهب. وفي الدر المختار عدم جواز عند أبي حنيفةؒ وفي رد المحتار جواز عند أبي يوسفؒ، وفي النهاية عن الذخيرة يجوز إن علم فيه شفاء ولم يعلم دواء آخر. (معارف السنن، باب ماجاء في بول مايؤكل لحمه، مسألة التداوي بالمحرم، اشرفية ديوبند ۲۷۷/۱، شامي، زكريا ۳۶۵/۱-۳۶۶، كراچي ۲۱۰/۱، باب الرضاع ۳۹۷/٤-۳۹۸، كراچي ۲۱۱/۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍رجب المرجب ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۷۶۸/۳۶)

کیا غیر شادی شدہ نوجوان کالا خضاب لگا سکتا ہے؟

سوال [۱۰۶۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) ایک نوجوان جو غیر شادی شدہ ہے، اس کے بال سفید ہونے لگے ہیں، ایسی صورت میں وہ اپنے بال کو کالے خضاب (مہندی) کے ذریعہ کالا کرنا چاہتا ہے، تو آیا اس کے لئے کالا خضاب لگانا جائز ہے یا نہیں شرعًا کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد الطاف، متعلم مدرسہ ہٰذا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سیاہ خضاب لگانا کسی شرعی مصلحت سے جائز ہے؛

لہٰذا جس شخص کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے؛ اس کے لئے سیاہ خضاب لگانا جائز ہے۔
(مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۹/۱۷۱، جدید زکریا مطول ۱۲/۳۴۲)

أما الخضاب بالسواد فمن فعل ذالک من الغزاة؛ ليكون أهيب في عين العدو فهو محمود منه اتفق عليه المشائخ، ومن فعل ذالک ليزّين نفسه للنساء، وليحبب نفسه إليهن فذالک مكروه وعليه عامة المشائخ، وبعضهم جوز ذلک من غير كراهة. (عالمگيري، الباب العشرون في الزينة......زكريا قديم ۵/۳۵۹، جديد ۵/۴۱۴، شامي، زكريا ۹/۶۰۵، كراچي ۶/۴۲۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/رجب المرجب ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/۸۱۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۷/۷/۱۴۲۴ھ

رشتہ کی غرض سے داڑھی اور بالوں میں کالا خضاب لگانا

سوال [۱۰۶۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں ایک لڑکا جس کی عمر بیس سال ہے، بیماری کی وجہ سے سر کے اور داڑھی کے بال سب سفید ہوگئے، کہیں سے رشتہ کا پیغام اسی وجہ سے نہیں آرہا ہے، کیا شادی کے لئے اپنے سر اور داڑھی کے بالوں میں سیاہ خضاب کرنے کی گنجائش ہوگی؟

المستفتی: عبد الرشید قاسمی، سیڑھا، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مسئولہ صورت میں بیس سال کا لڑکا جس کے سر کے بال بیماری کی وجہ سے سفید ہوگئے اور رشتہ نہیں آرہا ہے، تو اس کے لئے حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول پر عمل کر کے کالا خضاب کرنا جائز ہے۔

روي عن أبي يوسفؒ أنه قال: كما يعجبني أن تتزين لي يعجبها أن أتزين لها. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ٩/ ٦٠٥، كراچي ٦/ ٤٢٢، هندية، زكرياقديم ٥/ ٣٥٨، جديد ٥/ ٤١٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۱۰۰/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۵/۱۳ھ

کن چیزوں سے موئے زیر ناف کو صاف کیا جاسکتا ہے؟

سوال [۱۰٦٧٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ موئے زیر ناف عورتیں بھی بذریعہ مشین صاف کرسکتی ہیں یا نہیں؟ یا مرد بھی کسی اور چیز کے استعمال سے صاف کرسکتے ہیں یا نہیں؟ یعنی انگریزی دوا وغیرہ سے مثلا تیل، صابن، پوڈر وغیرہ؟

المستفتی: شمیم احمد، کوری روانہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مشین، استرہ، بلیڈ وغیرہ آلات سے موئے زیر ناف کا صاف کرنا عورت ومرد دونوں کے لئے جائز اور درست ہے۔ نیز مسالہ اور دوا وغیرہ سے صفائی کرنا بھی درست ہے۔ حدیث شریف میں ہے۔

عن جابر بن عبدالله، قال: قفلنا مع النبي صلى الله عليه وسلم من غزوة –إلى– وتستحد المغيبة. (صحيح البخاري، باب تزويج الثيبات، النسخة الهندية ٢/ ٧٦٠، رقم:٤٨٨٨، ف:٥٠٧٩، صحيح مسلم، باب كراهة الطروق، النسخة الهندية ١٠/ ١٤٤، بيت الأفكار رقم: ٧١٥)

ولو عالج بالنورة في العانة يجوز. (هندية، الباب التاسع عشر، زكريا قديم ٥/ ٣٥٨، جديد ٥/ ٤١٣)

ویستحب إزالة شعر عانة الرجل بالحلق، أو بالنورة، أما عانة المرأة فتسن إزالتها بالنتف. (کتاب الفقه علی المذاهب الأربعة، دار الفکر ۲/ ٤٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶؍ جمادی الثانی ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/ ۲۷۴۰)

مرد کے لئے بال صفا اشیاء استعمال کرنے کا حکم

سوال [۱۰۶۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مرد کو ناپا کی کے بال بال صفا صابون سے صاف کرنا سنت ہے یا جائز ہے؟

المستفتی: شفیق احمد تھانہ، ناگ پھنی دولت باغ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسنون ومستحب حلق کرنے میں ہے اور بال صفا صابون اور کریم وغیرہ کے ذریعہ بھی جائز ہے۔ نیز صفائی بالکل ناف سے لے کر آخر تک کرنا چاہئے۔

ویبتدئ في حلق العانة من تحت السرة ولو عالج بالنورة في العانة یجوز. (فتاوی عالمگیري، الباب التاسع عشر، زکریا قدیم ٥/ ٣٥٨، جدید ٥/ ٤١٣، شامي، کراچي ٦/ ٤٠٦، زکریا ٩/ ٥٨٣، کتاب الفقه علی المذاهب الأربعة، دار الفکر ٢/ ٤٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ ذی قعدہ ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/ ۹۷۹)

مردوں کے لئے زیر ناف بال صاف کرنے کے لئے کیمیکل استعمال کرنے کا حکم

سوال [۱۰۶۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کے دور میں بالوں کو صاف کرنے والی نئی نئی چیزیں یعنی خواتین کے لئے زیر ناف بالوں کو صاف کرنے کے لئے کریم لوشن، پاؤڈر، وکیمیکل وغیرہ ایجاد کئے گئے ہیں، کیا ان چیزوں کو مرد بھی استعمال کر سکتے ہیں؟ کیا ایسے مرد بھی جو نابینا ہوں یا ہاتھ پیر سے معذور ہوں یا زیادہ موٹا پیٹ ہونے کی وجہ سے ہاتھ زیر ناف تک استرا چلانے میں ناکام ہو، تو درج بالا چیزیں بالوں کو صاف کرنے میں استعمال کر سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد اعظم لال مسجد، سرائے ترین، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زیر ناف بالوں کے صاف کرنے میں مردوں کے لئے مستحب طریقہ، تو استرہ کا استعمال کرنا ہے؛ لیکن اگر کوئی شخص کریم، پاؤڈر یا دیگر کیمیکل کو اس کام کے لئے استعمال کرتا ہے تو یہ بھی جائز ہے خاص طور پر سوال نامہ میں جن معذورین کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے لئے کریم پاؤڈر کا استعمال زیادہ بہتر ہے؛ اس لئے کہ استرہ بلیڈ کے ذریعہ سے جگہ جگہ کٹ جانے کی وجہ سے لہولہان ہوجانے کا خطرہ ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۸/۷۸)

ویستحب حلق عانة قال الشامي: قال في الهندية: ولو عالج بالنورة یجوز کذا في الغرائب. (شامي، کتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغیره، زکریا ۹/۵۸۳، کراچي ۶/۴۰۶، هندیة، زکریا قدیم ۵/۳۵۸، جدید ۵/۴۱۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۵/ جمادی الثانی ۱۴۲۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۸۰۲۵)	۱۴۲۴/۵/۵ھ

عورت موئے زیرناف کیسے صاف کرے؟

سوال[۱۰۶۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عورت زیرناف کے بال کن کن آلات کے ذریعہ سے صاف کرسکتی ہے؟ اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ کتابوں کے حوالہ سے مسئلہ کی وضاحت فرمادیں۔ خاص کر علماء احناف کیا فرماتے ہیں؟ کتاب کا نام ضروری ہے۔

المستفتی: محمد یاسین، محمود پور، معافی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: عورتوں کے لئے زیادہ بہتر اور افضل اکھاڑنا ہے۔

والسنة في عانة المرأة النتف. (بذل المجهود، باب السواك من الفطرة، دار البشائر الإسلامية ۱/ ۳۳۹، سهارنپور قديم ۱/ ۳٤، تحت رقم الحديث ۵۲)

أما عانة المرأة فتسن إزالتها بالنتف. (كتاب الفقه على المذاهب الأربعة، دار الفكر ۲/ ٤۵)

اور اگر پاؤڈر وغیرہ جدید اشیاء کے ذریعہ سے صاف کرتی ہے، تو اس کی بھی گنجائش ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۴/ ۲۰۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ ذی قعدہ ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۷/ ۲۴۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴/ ۱۱/ ۱۴۱۱ھ

زیرناف وبغل کے بال ندی نالے میں پھینکنا

سوال[۱۰۶۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بغل کے بال اور زیرناف بال کیا ندی نالے میں پھینک سکتے ہیں؟

المستفتی: شیخ قاسم، شیخ فرید (مہاراشٹر)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بغل اورزیر ناف کے بال ندی نالے میں پھینکنے میں کوئی قباحت نہیں ہے؛ البتہ کسی محفوظ جگہ پر دفن کر دینا زیادہ بہتر ہے۔

وفي الخانية: ينبغي أن يدفن قلامة ظفره ومحلوق شعره، وإن رماه فلابأس به. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح،دار الكتاب ديوبند ١/ ٥٢٧)

يدفن أربعة: الظفر، والشعر، وخرقة الحيض والدم. (هندية، الباب التاسع عشر، زكريا ٥/ ٣٥٨، جديد ٥/ ٤١٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۶/ رجمادی الثانی ۱۴۲۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۱۱۰)	۱۴۲۴/۶/۲۶ھ

بچہ کے سر پر جو بال ماں کے پیٹ سے آتے ہیں ان کو کیا کیا جائے؟

سوال [۱۰۶۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے اور جو بال ماں کے پیٹ سے آتے ہیں، ان بالوں کو کیا کرنا چاہئے؟ منڈوانے کے بعد دفن کرنا چاہئے یا دریا میں بہانا چاہئے۔ بعض کہتے ہیں کہ دریا میں بہانا چاہئے، اس کی اصلیت کیا ہے؟ دفن کرنا بہتر ہے یا دریا میں بہانا بہتر ہے؟ خلاصہ جواب تحریر فرمادیں، مہربانی ہوگی۔

المستفتی: عبدالستار، مسجد کنڈا والی، بچھرایوں، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سر منڈھانے کے بعد بالوں کے برابر چاندی صدقہ کرنا اور بالوں کو کہیں دفن کر دینا مستحب ہے، دریا میں بہا دینا احقر کی نظر سے کہیں نہیں گذرا۔

(مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۲/ ۹۲، جدید زکریا ۱۰/ ۶۰، فتاوی محمودیہ قدیم ۵/ ۲۳۱، جدید ڈابھیل ۱۹/ ۴۵۲)

ينبغي أن يدفن قلامة ظفره ومحلوق شعره، وإن رماه فلابأس به.

(حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح،دار الكتاب ديوبند ١/ ٥٢٧، هندية، زكريا قديم ٥/ ٣٥٨، جديد ٥/ ٤١٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶ر محرم الحرام ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/ ۱۶۱۰)

عورتوں کے بال خرید کر چوٹی بنا کر بیچنا

سوال [۱۰۶۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عورتیں جب کنگھی کرتی ہے، تو ان کے بال جھڑ جاتے ہیں، ایک شخص ان بالوں کو جمع کر لیتا ہے یا خرید لیتا ہے، اور پھر ان بالوں سے چوٹی بنا کر بیچتا ہے، جن عورتوں کے بال چھوٹے ہوتے ہیں، وہ اس چوٹی کو خرید کر اپنے بالوں میں لگاتی ہیں، تو کیا اس شخص کا بال خرید کر اور پھر چوٹی بنا کر بیچنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ شرعی حکم تحریر فرمادیں۔

المستفتی: محمد مصطفیٰ بیر بھومی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفیق: بال انسان کے بدن کا ایک جزء ہوتا ہے، اور انسانی اجزاء کا بیچنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ نیز ایک انسان کے بدن کا جزء دوسرے انسان کے لئے زینت کے طور پر استعمال کرنا بھی جائز نہیں ہے؛ اس لئے انسانی بالوں کی چوٹی بنا کر بیچنا، پھر اس کا خریدنا پھر اس کا استعمال کرنا سب ناجائز ہے اور اس کاروبار سے جو آمدنی ہوگی وہ بھی حلال نہیں ہے۔

عن جابر بن عبد الله أنه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: عام الفتح، وهو بمكة أن الله ورسوله حرم بيع الخمر، والميتة، والخنزير

واستدل بهذا الحديث أيضاً على أنه لايجوز بيع ميتة الآدمي مطلقاً سواء فيه المسلم، والكافر، أما المسلم فلشرفه وفضله حتى أنه لا يجوز الانتفاع بشيئ من شعره، وجلده، وجميع أجزاءه، وأما الكافر فلأن نوفل بن عبد الله بن المغيرة، لما اقتحم الخندق، وقتل غلب المسلمون على جسده، فأراد المشركون أن يشتروه منهم، فقال صلى الله عليه وسلم: لاحاجة لنا بجسده، ولا بثمنه، فخلى بينهم وبينه. (تكملة فتح الملهم، باب تحريم بيع الخمر، حكم أعضاء الميته، والخنزير، اشرفية ديوبند ۱/ ۵۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۵؍صفر المظفر ۱۴۲۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۵۲۴/۳۰)	۱۴۲۳/۲/۲۵ھ

وگ لگانے کا شرعی حکم

سوال [۱۰۶۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جانوروں کو وگ لگانا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ایسا وگ جس کا لگانا آسان ہے، اور کوئی پریشانی نہیں ہے۔

(۲) ایسا وگ جسے سر میں آپریشن کر کے فٹ کر دیا جاتا ہے، پھر وہ اتارا نہیں جا سکتا۔

(۳) انسانوں کے علاوہ دیگر حیوانات یا مصنوعی بالوں کی وگ لگانا کیسا ہے؟ اس کے سر پر ہوتے ہوئے وضو میں مسح کا کیا حکم ہے؟ کیا اس کے ہوتے ہوئے وضو ہو سکتا ہے؟

(۴) اس کے سر پر ہوتے ہوئے نماز درست ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: محمد صفوان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: (۱) انسانی بالوں سے بنی ہوئی وگ لگانا

بہرصورت ناجائز ہے خواہ وگ ایسا ہو، جسے بآسانی اتارا جاسکتا ہو یا بذریعۂ آپریشن سر میں فٹ کردیا گیا ہو۔

عن عائشةؓ أن جارية من الأنصار تزوجت وإنها مرضت فتمعط شعرها، فأرادوا أن يصلوها، فسألوا النبي صلى الله عليه وسلم فقال: لعن الله الواصلة والمستوصلة. (بخاري شريف، باب الوصل في الشعر، النسخة الهندية ٢/٨٧٨، رقم: ٥٧٠١، ف: ٥٩٣٤، صحيح مسلم، باب تحريم فصل الواصلة والمستوصلة، النسخة الهندية ٢/٢٠٤، بيت الأفكار رقم: ٢١٢٢)

ومن يكون شعرها قصيرًا، أو حقيرًا، فتطوله وتعززه بشعر غيرها فكل ذالک داخل في النهي، وهو من تغيير خلق الله تعالىٰ، والرجل في هذا الأخير كالمرأة. (فتح الباري، باب المتنمصات، اشرفية ١٠/٤٦٢، درا الفكر ١٠/٣٧٧، تحت رقم الحديث٥٩٣٩)

وصل الشعر بشعر الآدمي حرام. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، قبيل باب الاستبراء، زكريا ٩/٥٣٥، كراچي ٦/٣٧٢، هندية، زكريا قديم٥/٣٥٨، جديد ٥/٤١٤)

عن كثير من الفقهاء أن الممتنع من ذلک وصل الشعر بالشعر. (فتح الباري، دار الفكر ١٠/٣٧٥، اشرفية ١٠/٤٥٩)

(٢) انسانوں کے علاوہ دیگر حیوانات یا مصنوعی بالوں سے بنی ہوئی وگ لگانا شرعًا جائز ہے۔

لا بأس للمرأة أن تجعل في قرونها وذوائبها شيئًا من الوبر. (هندية، زكريا قديم ٥/٣٥٨، جديد ٥/٤١٤)

الرخصة في غير شعر بني آدم تتخذه المرأة لتزيد في قرونها وهو مروي عن أبي يوسف. (شامي، زكريا ٩/٥٣٦، كراچي ٦/٣٧٣، المحيط البرهاني،المجلس العلمي٨/٨٧، رقم: ٩٦٥٥، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٨/٢١٣، رقم:٢٨٥٤٩)

إذا وصلت شعرها بغير الشعرمن خرقة ونحوها فلا يدخل في النهي. (فتح الباري، دار الفكر ۱۰/ ۳۷۵، اشرفية ديوبند ۱۰/ ۴۵۹)

لابأس عليها في وصلها شعرها بما وصلت به من صوف، وخرقة وغير ذلك. (تكملة فتح الملهم اشرفية ديوبند ۴/ ۱۹۱)

(۳) وہ وگ جو آپریشن وغیرہ کے ذریعہ سر پر اس طرح فٹ کر دی جائے کہ وہ سر سے جدا نہ ہو سکے، اس کی حیثیت جسم کے مستقل عضو کی ہے، وضو کرتے وقت اس پر مسح کر لینا کافی ہے اور وگ کی دوسری قسم جسے با آسانی لگایا اور اتارا جاسکتا ہو، وہ ٹوپی کے حکم میں ہے، وضو میں اس کو اتار کر سر کا مسح کرنا ضروری ہے۔

والصرام، والصباغ ما في ظفرهما يمنع تمام الغسل، وقيل: كل ذالک يجزئهم للحرج، والضرورة ومواضع الضرورة مستثناة عن قواعد الشرع. (هندية، كتاب الطهارة، الباب الثاني في الغسل، زكريا قديم ۱/ ۱۳، جديد ۱/ ۶۴)

عن عرفجة بن أسعد قال: أصيب أنفي يوم الكلاب في الجاهلية، فاتخذت أنفًا من ورق فأنتن علي، فأمرني رسول الله صلى الله عليه وسلم، أن اتخذ أنفًا من ذهب. (ترمذي شريف، باب ماجاء في شد الأسنان بالذهب، النسخة الهندية ۱/ ۳۰۶، دارالسلام رقم: ۱۷۷۰)

عن جابر بن عبدالله، أنه سئل عن العمامة، فقال: لا، حتى يمس الشعر الماء، قال محمدؒ: وبهذا نأخذ وهو قول أبي حنيفة. (مؤطأ امام محمدؒ ۷۰)

ولايجوز المسح على القلنسوة، والعمامة. (هندية، كتاب الطهارة، زكريا قديم ۱/ ۶، جديد ۱/ ۵۶)

ولايجوز المسح على العمامة ولا القلنسوة؛ لأنها يمنعان وصول

الـماء الشعر. (بـدائـع الـصـنـائـع، زكـريا ١/ ٧١، كـراچـي ١/ ٥، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ١/ ١٠١)

(۴) انسانوں کے بال سے بنی ہوئی وگ لگانا بہر حال ناجائز ہے، جیسا کہ اوپر گذرا؛ لیکن اگر اس کے ساتھ نماز پڑھی جائے، تو نماز بلاشبہ درست ہوجائے گی۔

في جواز صلوة المرأة مع شعر غيرها الموصول اختلاف بينهم، والمختار أنه يجوز. (هـنـدية، قبيـل الباب العشرين في الزينة......زكريا قديم٥/ ٣٥٨، جديد ٥/ ٤١٤)

الوصل بشعر الآدمي حرام. (تكملة، اشرفية ديو بند ٤/ ١٩١)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ر صفر المظفر ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۹۱۸/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۲/۲۶ھ

(۷) باب ما يتعلق باللحية (داڑھی سے متعلق)

داڑھی کی شرعی حیثیت اور اس کی حد

سوال [۱۰۶۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ داڑھی کی شرعی حد کیا ہے؟ کیا ایک مشت کے سنت مؤکدہ ہونے پر جملہ اہل سنت والجماعت کا متفقہ فتوی ہے۔ جواب کو فقہ کے ساتھ صحاح ستہ کی کتب سے بھی مدلل کریں۔

دوسرا پہلو یہ کہ عرض میں داڑھی کی شرعی حد کیا ہے، یعنی تحریر کتنی پتلی کم از کم بنوائی جاسکتی ہے؟ ہم نے بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ سائڈوں سے باریک سی قطار رکھتے ہیں، لمبائی تو ایک مشت ہی ہوتی ہے، مگر اوپر نیچے کی کھال استرے سے صاف کرادیتے ہیں، اس میں کہاں تک گنجائش ہے، وضاحت فرما کر ذہنی الجھن کو دور فرمائیں۔

المستفتی: محمد رئیس محمود پور، ڈلاری، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: داڑھی کی حد کان کے سوراخ کے محاذ پر سر سے ملتی ہوئی جو ہڈی آرہی ہے، وہاں سے شروع ہوتی ہے، وہاں سے شروع ہو کر کے رخساروں کی ہڈی سے ملتی ہوئی ہونٹ کے برابر تک پہو نچ گئی ہے اور ہونٹوں کے نیچے جو بال ہیں وہ بھی تقریباً داڑھی میں شامل ہیں؛ اس لئے اس کے کاٹنے کو فقہاء نے مکروہ وبدعت لکھا ہے۔

ونتف الفنيكين بدعة وهما جانبا العنفقة، وهي شعر الشفة السفلىٰ، كذا في الغرائب. (فتاوى هندية، كتاب الكراهية، الباب التاسع عشر، زكريا قديم ۵/۳۵۸، جديد ۵/۴۱۴، شامي، كراچي ۶/۴۰۸، زكريا ۹/۵۸۳، حاشية الطحطاوي على المراقي، دار الكتاب ديوبند ۵۲۶)

اب کان کے سوراخ کے برابر کان کی پٹی سے لے کر نیچے تک چوڑائی میں کیا حد ہے؟ اس کو حضرات فقہاء نے العذار سے تعبیر کیا ہے، عذار نام ہے کنپٹی کی ہڈی سے لے کر چہرے کی سائیڈ کے نیچے تک کے حصہ کا اور اس کی چوڑائی چہرے کی جانب سے رخسار کی ہڈی کے ختم تک اوپر نیچے دونوں جبڑے کے اوپر جو کھال ہے، اس کھال سے متصل جو سخت حصہ شروع ہورہا ہے، یہ پورا داڑھی کا حصہ ہے، رخسار میں ہڈی سے خارج وہ نرم چمڑی منھ کے کھولنے کی صورت میں دونوں جبڑوں کے بیچ میں آجاتی ہے، صرف وہ حصہ داڑھی کی حدود سے خارج ہے؛ لہٰذا چہرہ کی گولائی کے وقت میں اس حصہ میں جو بال زیادہ بڑھ جائیں، ان کو صاف کرنے کی گنجائش ہے تاکہ چہرہ ایک مناسب انداز سے خوبصورت معلوم ہو اور یہ سمجھنا غلط ہے کہ کان کے سوراخ کے محاذ سے ایک باریک سی دھاری نیچے تک لے جائی جائے، تو داڑھی کا فریضہ مکمل ہوجائے گا، یہی داڑھی کے لئے کافی ہے؛ بلکہ اس کی چوڑائی اچھی خاصی ہے، جو داڑھ کے پیچھے کے حصہ سے رخسار کے سامنے کی ہڈی تک کسی کے دو انگل چوڑی کسی کے ڈھائی تین انگل چوڑی ہوتی ہے اور دیکھنے والوں کو خود ہی محسوس ہوجاتا ہے کہ داڑھی کی گولائی مناسب انداز کی ہے، اس حد کے متعین کرنے میں فقہاء نے اچھی خاصی بحث کی ہے، مختصر سی عبارت حسب ذیل ہے۔

العذاران كما في لسان العرب جانبًا اللحية وكان الفقهاء أكثر تحديداً للعذار (إلى قوله) بأنه الشعر النابت على العظم الناتئ المحاذي لصماخ الأذن يتصل من الأعلىٰ بالصدغ ومن الأسفل بالعارض إلى قوله بأن العذار جزء من اللحية وعليه فتنطبق عليه أحكامها .

(الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۵/ ۲۲۲)

ایک مشت داڑھی رکھنا اہل سنت والجماعت کا متفقہ فتویٰ ہے، جن کتابوں میں ایک مشت داڑھی رکھنا سنت کہا گیا ہے، وہ اس لئے کہا گیا ہے کہ حدیث سے ثابت ہے، ورنہ

ایک مشت داڑھی رکھنا واجب ہے اور ایک مشت سے کم کرنا حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔ حدیث پاک میں حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے امر کے صیغہ کے ساتھ مونچھ کو کاٹنے اور داڑھی کو بڑھانے کا حکم فرمایا ہے اور صیغۂ امر سے وجوب کا ثبوت ہوتا ہے۔

وکذا یحرم علی الرجل قطع لحیته، فعلم من ذلک أن ما یفعله بعض من لاخلاق له في الدین من المسلمین في الهند، والأتراک حرام. (بذل المجهود، کتاب الطهارة، باب السوال من الفطرة قدیم ١/٣٣، جدید دارالبشائر الإسلامیة بیروت ١/٣٣٦)

عن ابن عمر عن النبي صلی الله علیه وسلم أنه أمر بإحفاء الشوارب، وإعفاء اللحیة. (مسلم شریف، کتاب الطهارة، باب خصال الفطرة، النسخة الهندیة ١/١٢٩، بیت الأفکار رقم: ٢٥٩، سنن الترمذي، أبواب الأداب، با ماجاء في إعفاء اللحیة، النسخة الهندیة٢/١٠٥، دار السلام رقم: ٢٧٦٣، سنن النسائي، باب إحفاء الشارب، واعفاء اللحیٰ، النسخة الهندیة ١/٤، دار السلام رقم: ١٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ر صفر المظفر ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/۷۹۱۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۲/۹ھ

داڑھی کی شرعًا کیا حیثیت ہے؟

سوال [۱۰۶۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) داڑھی کی شرعًا کیا حیثیت ہے؟

(۲) آیا ہر مسلمان کے لئے داڑھی رکھنا سنت ہے یا واجب ہے؟

(۳) اگر کوئی داڑھی منڈوائے، تو اس کا یہ فعل حرام ہے یا ناجائز یا اور کچھ؟

(۴) اگر کسی کو سرکاری سروس میں مثلاً پولیس، فوج وغیرہ میں داڑھی رکھنے سے روکا

جائے،تو کیا یہ مداخلت فی الدین نہیں ہے؟ تمام مذکورہ سوالات کے باحوالہ جوابات مرحمت فرما کرعنداللہ ماجوروعندالناس مشکورہوں۔

المستفتی: معزالدین احمد،مباحث فقہیہ جمعیۃ علماء ہند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱)داڑھی اسلام کا خاص شعاراور یونیفارم کی حیثیت رکھتی ہے۔(مستفاد: فتاوی شیخ الاسلام ۱۱۱، کفایت المفتی ۹/ ۱۶۲، جدید زکریا مطول ۱۲/ ۳۲۰-۳۱۹)

(۲)داڑھی رکھنا ہر مسلمان پرواجب ہے۔(مستفاد: کفایت المفتی ۹/ ۱۶۷، جدید زکریا ۱۳/ ۳۱۸)

عن ابن عمر عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه أمر بإحفاء الشوارب، وإعفاء اللحية. (صحيح مسلم، كتاب الطهارة، باب خصال الفطرة، النسخة الهندية ١/ ١٢٩، بيت الأفكار رقم: ٢٥٩، سنن الترمذي، كتاب الأداب، باب ماجاء في اعفاء اللحية، النسخة الهندية ٢/ ١٠٥، دار السلام رقم: ٢٧٦٤)

وقد قام الدليل على وجوب إعفاء اللحية، وقص الشارب. (أحكام القرآن، تهانويؒ ١/ ٤٦)

اورداڑھی ایک قبضہ سے کم کرانا حرام ہے۔(مستفاد: امدادالفتاوی ۴/ ۲۲۳)

وأما الأخذ منها وهي دون ذلك كما يفعله بعض المغاربة، ومخنثة الرجال، فلم يبحه أحد، وأخذ كلها فعل يهود الهند، ومجوس الأعاجم . (در مختار مع الشامي، كتاب الصوم، باب ما يفسد الصوم وما لا يفسده، مطلب في الأخذ من اللحية، كراچي ٢/ ٤١٨، زكريا ٣/ ٣٩٨)

(۳) داڑھی منڈوانا اور قبضہ سے کم کروانا دونوں حرام ہیں، ہاں البتہ دونوں میں معمولی فرق یہ ہے کہ قبضہ سے کم کرانے میں ایک ہی حرمت ہے اور منڈوانے میں دوحرمت ہیں، ایک منڈوانے کی حرمت، دوسری عورتوں کی مشابہت کی حرمت؛ اس لئے کترانے سے منڈوانے کا گناہ زیادہ ہوگا۔

عن ابن عباسؓ، قال: لعن النبي صلى الله عليه وسلم: المتشبهين من الرجال بالنساء الحديث (صحيح البخاري، كتاب اللباس، باب المتشبهين بالنساء٢/٤ ٨٧، رقم:٥٦٥٦، ف:٥٨٨٥)

(۴) پولیس، فوج یا دیگر، سرکاری سروس میں داڑھی رکھنے سے مسلمان پر روک لگانا سراسر مذہب اسلام میں مداخلت ہے اور اسلامی شعار کے ساتھ ٹکراؤ اور تصادم ہے۔
(مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۴/ ۳۱۳، جدید زکریا مطول ۶/ ۴۲۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰/ محرم الحرام ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۲۱۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۱/۳۰ھ

ایک مشت داڑھی رکھنا واجب ہے یا سنت؟

سوال [١٠٦٨٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک مشت داڑھی رکھنا واجب ہے یا سنت، خواہ واجب ہو یا سنت؟ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی روشنی میں مسلک امام ابوحنیفہؒ کی وضاحت فرمائیں۔ نیز اگر ایک مشت داڑھی کے متعلق کوئی حدیث ہو؟ تو اس کو ضرور تحریر فرمائیں۔

المستفتی: آفتاب عالم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: صحیح احادیث میں مطلقاً داڑھی بڑھانے اور نہ کٹوانے کا حکم وارد ہے، مگر راوی حدیث حضرت ابن عمرؓ کا معمول ایک مشت سے بڑھ جانے پر کٹا دینے کا تھا؛ اس لئے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ایک مشت داڑھی رکھنا واجب ہے اور اس سے پہلے کٹانا ناجائز اور حرام ہے اور اس کے بعد ایک مشت سے زائد کے کاٹنے کی گنجائش ہے۔

عن ابن عمرؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أنهكوا

الشوارب، وأعفوا اللحىٰ. (بخاری شریف، کتاب اللباس، باب اعفاء اللحية ۲/۸۷۵، رقم: ٥٦٦٤، ف:٥٨٩٣)

اعفاء کے معنی خوب بڑھانے کے ہیں اور ایک مشت داڑھی کے وجوب کی بات قرآن کی آیت سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے واقعہ میں ہے۔

لا تأخذ بلحيتي. [سورة طه: ٩٤]

اور داڑھی کو پکڑ کر کھینچے کے لئے کم از کم ایک مشت یا زائد ہونا ضروری ہے؛ لہٰذا ایک مشت داڑھی رکھنا واجب اور اس سے کم کرانا حرام ہے۔

عن أبي هريرةؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: جزوا الشواب وأرخوا اللحىٰ خالفوا المجوس. (مسلم شريف، كتاب الطهارة، باب خصال الفطرة، النسخة الهندية ١/١٢٩، بيت الأفكار رقم: ٢٦٠)

عن ابن عمرؓ أنه كان يقبض على لحيته، ثم يفض ماتحت القبضة قال محمد: وبه نأخذ وهو قول أبي حنيفةؒ. (كتاب الآثار ١/١٩٨)

وأما الأخذ منها وهي دون ذلک كما يفعله بعض المغاربة ومخنثة الرجال فلم يبحه أحد. (شامي، كتاب الصوم، مطلب الأخذ من اللحية، كراچي ٢/٤١٨، زكريا ٣/٣٩٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۵۹۲/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۵/۲ھ

داڑھی کی واجب مقدار

سوال [۱۰۶۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: کہ داڑھی کم سے کم کتنی ہونی چاہئے اور زیادہ سے زیادہ کتنی ہونی چاہئے؟

المستفتی: محمد افضال شمسی، طویلہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: داڑھی رکھنا واجب ہے اور اس کی مقدار شرعی ایک مشت ہے، اس سے کم جائز نہیں ہے اور یہ تمام انبیاء کی سنت ہے، اسلامی اور قومی شعار ہے، شرافت و بزرگی کی علامت ہے، چھوٹے بڑے میں امتیاز کرنے والی ہے، اس سے مردانہ شکل کی تکمیل ہوتی ہے اور صورت نورانی ہوتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی عمل ہے، آپ نے اسے فطرت سے تعبیر فرمایا ہے اور امت کو تاکیدی حکم دیا ہے؛ لہٰذا داڑھی رکھنا واجب اور ضروری ہے، منڈانا یا کتروانا گناہ کبیرہ اور حرام ہے، اس پر امت کا اجماع ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ جدید ڈابھیل ۱۹/۴۰۷، قدیم ۱/۲۶۵)

اب احادیث ملاحظہ فرمائیے:

عن عائشة رضـ قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: عشر من الفطرة قص الشارب، وإعفاء اللحية إلى آخره. (ابوداؤد شريف، كتاب الطهارة، باب السواك من الفطرة، النسخة الهندية ١/٨، دار السلام رقم: ٥٣، صحيح مسلم، كتاب الطهارة، باب خصال الفطرة، النسخة الهندية ١/١٢٩، بيت الأفكار رقم: ٢٦١، سنن ابن ماجه، كتاب الطهارة، باب الفطرة، النسخة الهندية ١/٢٥، دار السلام رقم:٢٩٣)

خالفوا المشركين أوفروا اللحىٰ وأحفوا الشوارب. (مشكوة شريف ٣٨٠)

عن ابن عمر رضـ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: خالفوا المشركين، وفروا اللحىٰ. (بخاري شريف، كتاب اللباس، باب تقليم الأظفار ٢/٨٧٥، رقم: ٥٦٦٣، ف:٥٨٩٢)

دوسری روایت میں ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم انهكوا الشوارب واعفوا اللحىٰ.

(بخاري شريف ٢/٨٧٥، رقم:٥٦٦٤، ف:٥٨٩٣)

والـلحية هي الفارقة بين الصغير والكبير،وهي جمال الفحول، وتمام هيأتهم،فلا بد من إعفائها، وقصها سنة المجوس، وفيه تغيير خلق الله. (حجة الله البالغه، خصال الفطرة إعفاء اللحية، مكتبة حجاز ديوبند ۱/ ۵۰۷، ۵۰۸)

داڑھی بڑھانے کے بارے میں ہے کہ آپ ﷺ کی داڑھی اتنی گنجان تھی، جس نے سینہ مبارک کو گھیر لیا تھا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍صفر المظفر ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۵۰۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۲/۲۳ھ

کیا داڑھی رکھنا دلیل قطعی سے ثابت ہے؟

سوال [۱۰۶۵۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ داڑھی ایک مشت رکھنا کسی دلیل قطعی سے ثابت اور لازم ہے؛ اس سلسلہ میں اصولی طور پر دلیل قطعی مطلوب ہے کہ اس کی مخالفت کرنے والے کو فاسق کہا جاتا ہو اور کیا کفایت المفتی مطبوعہ کراچی میں یہ لکھا ہے کہ جس کی داڑھی ایک مشت سے ذرا سی کم ہو، اس کو فاسق کہنے میں احتیاط رکھنی چاہئے؛ کیونکہ ایک مشت کا ثبوت دلیل قطعی سے نہیں ہے۔

المستفتی: شمس الحق قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دلیل قطعی کا انکار کرنے والا کافر ہوجاتا ہے، اور دلیل ظنی کے خلاف کرنے والا فاسق ہوتا ہے، اور ایک مشت داڑھی کا وجوب حدیث رسول سے ثابت ہے، جو کہ دلیل ظنی ہے، دلیل قطعی نہیں ہے، اس کے خلاف کرنے والے کو کافر کوئی نہیں کہتا ہے؛ بلکہ صرف فاسق کہا جاتا ہے، تو فاسق کہنے کی وجہ سے آپ نے دلیل قطعی کس بنا پر طلب کی ہے؛ اس لئے کہ ایک مشت داڑھی کے خلاف یا انکار

کرنے والے کو کافر کوئی نہیں کہتا؛ بلکہ صرف فاسق کہتے ہیں۔ نیز کھل کر فاسق اس کو کہا جاتا ہے، جس نے بالکل داڑھی منڈالی ہو یا نمایاں طور پر کترا والی ہو، اور مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے صرف اس شخص کے بارے میں احتیاط کی بات کہی ہے، جس کی داڑھی سے دیکھنے میں شرعی داڑھی ہونے یا نہ ہونے میں تمیز نہ ہو سکے اور بات بھی یہی ہے کہ جتنا گناہ اس شخص کا ہوگا، جس نے داڑھی منڈائی ہو یا نمایاں طور پر کتروائی ہو، اتنا بڑا گناہ اس شخص کا نہ ہوگا، جس نے معمولی کتروائی ہے اور دور سے دیکھنے میں قطعی طور پر یہ نہ کہا جاسکتا ہو کہ اس کی داڑھی واقعی ایک مشت سے کم ہے؛ اس لئے جس نے نمایاں طور پر داڑھی منڈائی یا کتروائی ہے، وہ فاسق ہے، اس کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہے اور جس کی داڑھی ایک مشت سے قدرے کم ہونے کا شبہ ہو، اس کو قطعی فاسق نہیں کہا جاسکتا، اس کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی نہ ہوگی؛ بلکہ مکروہ تنزیہی ہوگی۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۹؍صفر المظفر ۱۴۲۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/۶۴۹۹)	۱۴۲۱/۲/۱۹ھ

داڑھی کے وجوب کی دلیل کیا ہے؟

سوال [۱۰۶۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ داڑھی رکھنا واجب ہے؛ اس کے وجوب کی دلیل کیا ہے اور کاٹنا حرام ہے، اس کی حرمت کی دلیل کیا ہے؟ مدلل جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد صابر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: داڑھی رکھنے کے وجوب کی دلیل آپ ﷺ کا داڑھی بڑھانے کا حکم دینا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے، اور داڑھی کے

کٹوانے کی حرمت کی دلیل حدیث شریف میں وارد حکم کی مخالفت کرنا ہے کسی چیز کے وجوب کا امر اس کے مخالف حرمت کو ثابت کرتا ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۹/۳۹۴، میرٹھ ۲۷/۴۸۰)

عن ابن عمرؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أنهكوا الشوارب، وأعفوا اللحىٰ. (بخاری شریف، کتاب اللباس،باب إعفاء اللحية ٢/ ٨٧٥، رقم: ٥٦٦٤، ف:٥٨٩٣، صحيح مسلم، كتاب الطهارة، باب خصال الفطرة، النسخة الهندية ١/ ١٢٩، بيت الأفكار رقم:٢٥٩، سنن الترمذي، كتاب الأدب، باب ماجاء في إعفاء اللحية، النسخة الهندية ٢/ ١٠٥، دار السلام رقم: ٢٧٦٣)

يكره حلقها وقصها وتحريقها، وأما الأخذ من طولها، وعرضها، فحسن و يكره الشهرة في تعظيمها كما تكره في قصها. (النووي على مسلم ١/ ١٢٩)

لاطاعة لمخلوق في معصية الخالق ولذا يحرم على الرجل قطع لحيته. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، زكريا ٩/ ٥٨٣، كراچي ٦/ ٤٠٧)

ذهب عامة العلماء الذين قالوا: بأن موجب الأمر الوجوب من أصحابنا، وأصحاب الشافعي، وأصحاب الحديث إلى أن الامر بالشيئ نهي عن ضده، إن كان له ضد واحد كالأمر بالإيمان نهي عن الكفر، وإن كان له أضداد كالأمر بالقيام، فإن له أضداد من القعود، والسجود، والاضطجاع ونحوها يكون الأمر نهيا عن الأضداد كلها. (باب حكم الأمر والنهي، كشف الاسرار، على أصول فخر الإسلام، كراچي ٢/ ٣٢٨- ٣٢٩)

وجوب الشيئ يتضمن حرمة ضده يعني إذا وجب الشيئ يفهم في ضمن وجوبه أن ضد هذا الشيئ حرام. (كشف المبهم ١١١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۴۶۴)

داڑھی کی حد بندی کا حدیث سے ثبوت

سوال [١٠٦٩٠]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کہتا ہے داڑھی رکھنا ضروری تو ہے، مگر کیف ما اتفق جتنی چاہے انسان رکھ سکتا ہے، ایک مشت داڑھی رکھنا ضروری یا سنت نہیں ہے، وہ کسی بھی آیت قرآن وحدیث سے ثابت نہیں ہے؛ بلکہ اس کا کہنا یہ ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک جو سو قدم سے داڑھی نظر آجائے، وہ بھی داڑھی ہے۔

الغرض اس کا کہنا یہی ہے کہ شریعت یا کتاب وسنت میں ایک مشت یا اس سے زیادہ کی کوئی حد بندی نہیں ہے؛ بلکہ جتنی چاہے آدمی رکھ سکتا ہے؛ لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایک مشت داڑھی کا ثبوت یا کسی طرح کی حد بندی کا ثبوت کسی حدیث یا سنت سے ثابت ہے یا نہیں؟

المستفتی: وفاء الدین، دڑھیال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ایک مشت داڑھی رکھنا ضروری یا سنت نہیں ہے اور کسی بھی آیت قرآن وحدیث سے ثابت نہیں ہے؛ بلکہ قرآن سے بھی ایک مشت داڑھی کا ثبوت ملتا ہے کہ کسی کی داڑھی پکڑ کر صحیح طور پر اس وقت کھینچا جا سکتا ہے؛ جبکہ داڑھی ایک مشت ہو یا اس سے لمبی ہو۔ قرآن کی آیت ملاحظہ فرمایئے:

قَالَ يَا ابْنَ أُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي . [سوره طه:٩٤]

حدیث میں ہے کہ حضرات صحابہ ایک مشت داڑھی مکمل ہوجانے کے بعد اس سے زائد مقدار کو کاٹ دیا کرتے تھے۔ حدیث شریف ملاحظہ فرمایئے:

وكان ابن عمر إذا حج، أو اعتمر قبض على لحيته فما فضل أخذه.

(بخاري شريف، كتاب اللباس، باب تقليم الاظفار ٨٧٥/٢، رقم: ٥٦٦٣، ف:٥٨٩٢، منصف ابن ابي شيبة، مؤسسه علوم القرآن بيروت ١١٣/١٣)

عن أبي ذرعة كان أبو هريرة رضی اللہ عنہ يقبض على لحيته، ثم يأخذ ما فضل عن القبضة. (مصنف ابن أبي شيبة۱۳/۱۱۲، رقم:۲۵۹۹۲)

عن الحسن قال كانوا يرخصون فيما زاد على القبضة من اللحية أن يؤخذ منها. (مصنف ابن أبي شيبة، مؤسسه علوم القرآن بيروت ۱۳/۱۱۲، رقم:۲۵۹۹۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر:الف۳۸؍۹۹۸۱)

کیا حدیث شریف میں داڑھی کی مقدار کی کوئی حد بندی نہیں ہے؟

سوال [۱۰۶۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عبدالکریم کا کہنا ہے کہ حدیث میں داڑھی کے بڑھانے کے تعلق سے کوئی حد بندی نہیں ہے، جتنی چاہیں چھوٹی رکھ لیں، یا بڑی رکھ لیں اس کی کوئی پابندی نہیں؛ چونکہ حدیث میں کوئی تحدید معلوم نہیں ہوتی ہے؛ لہٰذا اس بارے میں شدت اختیار کرنا سراسر غلط ہے۔

المستفتی: شمیم اختر نیوروئل کرناٹک

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: احادیث مبارکہ میں مبالغہ کے ساتھ داڑھی بڑھانے کی تاکید آئی ہے، اور مبالغہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ جب ایک مشت سے بھی کافی لمبی ہو۔

نیز قرآن کریم کے اندر حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کے واقعہ میں **لأتأخذ بلحيتي** میں ایک مشت سے زیادہ کی بات ثابت ہوتی ہے؛ اس لئے کہ وہ ایک مشت سے زائد کو پکڑ کر کاٹتے تھے، ایک مشت سے کم کو نہیں؛ اس لئے ایک مشت سے کم ہونے کی صورت میں احادیث مبارکہ کا مفہوم کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا ہے۔

اورحدیث شریف میں اعفاء کالفظ آیا ہےاور ایک مشت سےکم کی صورت میں اعفاء کا معنی ثابت نہیں ہوسکتا ہے، جولوگ عربی محاورہ سے واقف ہیں وہی اس کو سمجھ سکتے ہیں اورجوعربی محاورہ سے واقف نہیں ہیں، وہ تاویل کی کوشش کریں گے۔

وکان ابن عمر إذا حج، أو اعتمر قبض علی لحیتهٖ فما فضل أخذه. (بخاري شریف، کتاب اللباس، باب تقلیم الاظفار ۲/ ۸۷۵، رقم: ۵۶۶۳، ف: ۵۸۹۲، منصف ابن ابي شیبة، مؤسسه علوم القرآن بیروت ۱۳/ ۱۱۳)

عن ابن عمرؓ قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: خالفوا المشرکین، وفروا اللحیٰ، وأحفوا الشوارب. (بخاري شریف، ۲/ ۸۷۵، رقم: ۵۶۶۳، ف: ۵۸۹۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ / جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۰۱۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴/ ۵/ ۱۴۲۷ھ

شرعی داڑھی کی تحقیق

سوال [۱۰۶۹۲]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ داڑھی رکھنا سنت ہے یا واجب؟ اگر سنت ہے، تو ہمارا اعتراض یہ ہے کہ جس طرح سے باقی سنتوں کے چھوڑنے سے انسان کو فاسق قرار نہیں دیا جاتا ہے مثلاً کرتا عمامہ، تہبند وغیرہ۔ اب اگر کوئی داڑھی کی سنت کو ادا نہ کرے، تو اسے فاسق کیوں قرار دیا جاتا ہے ورنہ تو سنت مؤکدہ غیر مؤکدہ دونوں کے چھوڑنے والے کو فاسق قرار دیا جانا چاہئے۔

(۲) اگر واجب ہے تو صحابہ کرام کی زندگی پر اعتراض ہوتا ہے، جیسے عبد اللہ بن عمرؓ وابن عباسؓ کہ انہوں نے حج کے موقعہ پر داڑھی کٹائی ہے، اگر واجب ہی ہے، تو صحابہ بھی ترک وجوب کے مرتکب ہوئے۔ (نعوذ باللہ من ذلک)

(۳) اگر آپ صحابہ کی زندگی سے ایک مشت داڑھی ثابت کرنا چاہیں تو مد مخالف کاٹنے کا ثبوت پیش کرتا ہے اور یہ اصول ہے، جب ایک لفظ کا دو معنی ہو، تو اس کو دلیل میں پیش کرنا درست نہیں ہے، جیسے لفظ قروء۔

(۴) ایضاح المسالک میں مسئلہ عموم بلویٰ کے حکم کے تحت لکھا ہے کہ فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر کوئی عمل حرام لوگوں میں رائج ہوجائے، تو کراہت تنزیہی کے حکم میں آجاتا ہے، تو اس اصول کے تحت بھی داڑھی کا کٹانا کراہت تنزیہی کے تحت آجاتا ہے۔

(۵) ایک مشت داڑھی کے متعلق کوئی صریح روایت پیش فرمائیں کہ داڑھی کا اطلاق کہاں سے کہاں تک ہے۔

المستفتی: عبدالحمید، پیرزادہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) داڑھی رکھنا واجب ہے۔

عن ابن عمرؓ، عن النبي صلی اللہ علیه وسلم، أنه أمر بإحفاء الشوارب، وإعفاء اللحية. (مسلم شريف، كتاب الطهارة، باب خصال الفطرة،النسخة الهندية ١/١٢٩، بيت الأفكار رقم: ٢٥٩، سنن الترمذي الأدب، باب ماجاء في إعفاء اللحية، النسخة الهندية ٢/١٠٥، دار السلام رقم: ٢٧٦٤)

يحرم على الرجل قطع لحيته. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، زكريا ٩/٥٨٣، كراچي ٦/٤٠٧)

وأما الأخذ منها وهي دون ذلك كما يفعله بعض المغاربة، ومخنثة الرجال، فلم يبحه أحد. (شامي، كتاب الصوم، باب ما يفسد الصوم وما لا يفسده، مطلب في الأخذ من اللحية، كراچي ٢/٤١٨، زكريا٣/٣٩٨)

اور اگر داڑھی رکھنا سنت قرار دیا جائے، تو یہ سنت مؤکدہ ہے، جس کے ترک پر شرعاً فسق کا حکم لگتا ہے؛ کیونکہ سنت مؤکدہ کا ترک مکروہ تحریمی ہے۔

أن ترک السنة المؤکدة مکروه تحریمًا لجعله قریبًا من الحرام.
(شامي، کتاب الحظر والإباحة، کراچي ٦/٣٣٨، زکریا ٩/٤٨٧)

یأثم بترک الواجب ومثله السنة المؤکدة. (در مختار علی الشامي، کراچي ٦/٣٣٧، زکریا ٩/٤٨٧)

اوراس کے برخلاف عمامہ باندھنا، کرتا پہننا سنن زوائد میں سے ہے؛ اس لئے اس کے ترک پر ملامت نہیں ہے؛ لہٰذا اس کے تارک پر فسق کا حکم نہ لگے گا۔

(۲) رہا حضرات صحابہؓ سے داڑھی کٹانے کی حدیث مروی ہے اوران کے عمل سے داڑھی کٹانا ثابت ہے، تو جو ایک مشت سے زائد داڑھی ہوتی تھی، اس کوانہوں نے کٹائی ہے۔فلا اشکال۔

وکان ابن عمر إذا حج، أو اعتمر قبض علی لحیته فما فضل أخذه.
(بخاري شریف، کتاب اللباس، باب تقلیم الاظفار ٢/٨٧٥، رقم: ٥٦٦٣، ف:٥٨٩٢)

إن ابن عمر یأخذ من لحیته بعد الفراغ عن الحج؛ أي ما یزید علی القبضة. (العرف الشذي علی هامش الترمذي، باب إعفاء اللحیة ٢/١٠٥)

عن عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده، أن رسول الله صلی الله علیه کان یأخذ من لحیته من طولها وعرضها. (سنن الترمذي، کتاب الأدب، باب ماجاء في الأخذ اللحیة، النسخة الهندیة ٢/١٠٥، دار السلام رقم: ٢٧٦٢)

(۳) اعفاء لحیہ کے متعلق جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں، ان کو محتمل المعنی گردانا اور فروع پر قیاس کرنا بالکل درست نہیں۔

(۴) اور آپ کے ''ایضاح المسالک'' میں ذکر کردہ عموم بلویٰ کا مطلب یہ ہے کہ جس میں عام لوگ مبتلا ہو گئے ہوں، اوراس سے بچنا دشوار ہو اور داڑھی کے کٹانے سے بچنا دشوار نہیں ہے؛ بلکہ داڑھی کاٹنا بالکل غیر ضروری کام ہے، جس کو گناہ بےلذت کہا جا سکتا ہے۔

(۵) حضور ﷺ نے داڑھی کو خوب بڑھانے کا حکم فرمایا ہے:

عن ابن عمرؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أحفوا الشوارب، وأعفوا اللحىٰ. (ترمذي شريف، كتاب الأدب، باب ماجاء في إعفاء اللحية، النسخة الهندية ۲/ ۱۰۵، دار السلام رقم: ۲۷۶۳)

ہاں البتہ جو اِدھراُدھر منتشر ہو، اس کو سنبھالنے میں پریشانی کی صورت میں ایک مشت سے زائد کو کاٹنے کی اجازت بھی دی ہے۔

حدثنا مروان يعني ابن سالم المفقع، قال: رأيت ابن عمر يقبض على لحيته، فيقطع مازادت على الكف، وقال كان النبي صلى الله عليه وسلم إذا أفطر. قال: ذهب الظمأ وابتلت العروق وثبت الأجر إن شاء الله. (أبو داؤد شريف، كتاب الصيام، باب القول عند الإفطار، النسخة الهندية ۱/ ۳۲۱، دار السلام رقم: ۲۳۵۷، كتاب الآثار مع شرح اردو ۳۳۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ ربیع الثانی ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳؍ ۵۷۰۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۴/۴/۱۴۱۹ھ

داڑھی کی شرعی مقدار اور اس میں خضاب کا مسئلہ

سوال [۱۰۶۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ داڑھی کی شرعی مقدار کیا ہے، ہونٹ کے نیچے آنے والے بالوں کو تراشا جاسکتا ہے یا داڑھی میں شمار ہوں گے؟

(۲) داڑھی میں کون سے رنگ کا خضاب لگانا جائز ہے؟ اور کس عمر میں لگانا بہتر ہے؟ کیا سیاہ بالوں میں خضاب لگانا جائز ہے۔

المستفتی: محمد سالم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ائمہ اربعہ کے نزدیک ایک مٹھی کے برابر داڑھی رکھنا واجب ہے، اس سے پہلے کاٹنا یا منڈانا حرام ہے۔ (مستفاد: جواہر الفقہ، جدید زکریا ۱۵۹/۷، قدیم ۱۴۱/۲، امداد الفتاوی ۲۲۳/۴)

وأما الأخذ منها وهي دون ذلک کما یفعله بعض المغاربة، ومخنثة الرجال، فلم یبحه أحد، وأخذ کلها فعل یهود الهند، ومجوس الأعاجم. (در مختار مع الشامي، کتاب الصوم، باب ما یفسد الصوم وما لا یفسده، مطلب في الأخذ من اللحیة، کراچي ۴۱۸/۲، زکریا۳۹۸/۳)

ہونٹ کے نیچے آنے والے بال بھی داڑھی میں شامل ہیں، اوران کا کاٹنا بھی ممنوع ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ۳۸۷/۶، جدید ڈابھیل ۴۰۷/۱۹، احیاء العلوم ۳۲۱/۴)

ونتف الفنیکین بدعة وهما جانبا العنفقة، وهي شعر الشفة السفلیٰ. (فتاوی هندیة، کتاب الکراهیة، الباب التاسع عشر، زکریا قدیم ۳۵۸/۵، جدید ۴۱۴/۵، شامي، کراچي ۴۰۸/۶، زکریا ۵۸۳/۹، حاشیة الطحطاوي علی المراقي، دار الکتاب دیوبند ۵۲۶)

سیاہ رنگ کے سوا دوسرے رنگوں کا خضاب لگانا جائز ہے اور میدان جنگ کے علاوہ کسی صورت میں سیاہ خضاب لگانا جائز نہیں، ہاں امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جوان بیوی کو خوش رکھنے کے لئے بھی سیاہ خضاب لگانا جائز ہے۔ (مستفاد: جواہر الفقہ ۱۴۷/۲)

وقد سبق عن الإمام محمدؒ أنه قال في موطئه: لانریٰ بالخضاب بالوسمة، والحناء، والصفرة بأسًا. (مرقاة المفاتیح، کتاب اللباس، أحکام اللحیٰ، امدادیة ملتان ۲۹۲/۸، ممبئی ۴۵۸/۴، مؤطا إمام محمد، کتاب السیر، باب الخضاب، اشرفي دیوبند ۳۹۲/۱، وهکذا في الهندیة، کتاب الکراهیة، الباب العشرون، زکریا قدیم ۳۵۹/۵، جدید ۴۱۴/۵)

أما الخضاب بالسواد للغزو؛ لیکون أهیب في عین العدو فهو محمود بالاتفاق، وإن لیزین نفسه للنساء، فمکروه وعلیه عامة المشائخ،

روي عن أبي يوسفؒ أنه قال: كما يعجبني أن تتزين لي يعجبهاأن أتزين لها. (شامي، كتاب الحظر و الإباحة، فصل في البيع، زكريا ۹/۶۰۵، كراچي ۶/۴۲۲، هندية، زكرياقديم ۵/۳۵۹، جديد ۵/۴۱۴، تاتارخانية، زكريا۱۸/۲۱۴، رقم: ۲۸۵۵۵)

کس عمر میں خضاب لگانا بہتر ہے؟ اس کی کوئی تحدید نہیں ہے؛ بلکہ اس کا مدار داڑھی کے سفید ہونے پر ہے، اوراس زمانہ میں خضاب لگانے کو بہتر کہا گیا ہے، جس زمانہ میں کالی داڑھی میں سفید داڑھی کا اختلاط ہوتا ہے، سیاہ بالوں پر خضاب لگانا مشروع نہیں ہے؛ بلکہ سفید بالوں پر لگایا جاتا ہے، ہاں البتہ سفید بالوں کے ساتھ سیاہ بالوں میں خضاب لگ جائے، تو یہ غیر اختیاری چیز ہے، اس پر کوئی دار و گیر نہیں ہے۔

عن أبي ذر رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم غيروا الشيب ولاتشبهوا باليهود، وفي المرقاة: قال بعض العلماء: يحتمل أن يكون النهي اختص بالحالة التي يختلط الشعر الأبيض فيها بالأسود لما في اختلاف اللونين من قبح التضاد، ومشابهة الموافقة بأهل النفاق، فأما إذا ابيض كله وصار اللون واحدًا فلا يغير. (مرقاة، كتاب اللباس، باب الترجل، الخضاب، امدادية ملتان ۸/۳۰۶، ممبئي ۴/۴۶۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۶۱۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۵/۳ھ

صرف ہڈی پر داڑھی رکھنے کا حکم

سوال [۱۰۶۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص داڑھی صرف ہڈی پر ہی رکھتا ہے، ہڈی سے نیچے کے تمام بال ترشوادیتا ہے اوراوپر سے بھی تمام بال صاف رکھتا ہے، تو کیا ایسا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ داڑھی کی شرعی حیثیت بیان کریں۔ میری نظر میں اس کا مقصد یہ ہوگا کہ ایسا کرنے سے داڑھی کم

معلوم ہوگی، جس سے عمر بھی کم لگے گی، خیر یہ نظریہ ہو یا نہ ہو، اگر کوئی آدمی ایسا کرتا ہے، تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد شاہد قاسم پور گڑھی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ہڈی کے اوپر رخساروں کے بال صاف کرنا، اسی طرح ہڈی کے نیچے کے بال صاف کرنا جائز ہے، مگر خلاف اولیٰ اور مکروہ تنزیہی ہے۔ (مستفاد: فتاوی رشیدیہ جدید زکریا ۵۸۴، قدیم ۵۹۲)

ولا يحلق شعر حلقه، وعن أبي يوسفؒ لابأس بذلك، ولا بأس بأخذ الحاجبين، وشعر وجهه ما لم يتشبه بالمخنث. (هندية، كتاب الكراهية، الباب التاسع، زكريا قديم ٥/٣٥٨، جديد ٥/٤١٤، شامي، كراچي ٦/٤٠٧، زكريا ٩/٥٨٣، حاشية الطحطاوي على المراقي، دار الكتاب ديوبند ٥٢٦)

اور لب کے نیچے کے بال منڈوانے اسی طرح حلق پر جو بال ہوتے ہیں، ان کو منڈوانے کو فقہاء نے بدعت بھی کہا ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ۶/ ۳۸۵)

ونتف الفنيكين بدعة وهما جانبا العنفقة، وهي شعر الشفة السفلى. (فتاوى هندية، كتاب الكراهية، الباب التاسع عشر، زكريا قديم ٥/٣٥٨، جديد ٥/٤١٤، شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٦/٤٠٨، زكريا ٩/٥٨٣، حاشية الطحطاوي على المراقي، دار الكتاب ديوبند ٥٢٦)

بہر حال ایسا نہ کرنا افضل اور بہتر ہے اور کرنے والے کے پیچھے نماز بلا کراہت جائز اور درست ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ محرم الحرام ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۴۲۹۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۱/۱۴۱۶ھ

داڑھی بچہ کے کاٹنے کا حکم

سوال [۱۰۶۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ داڑھی بچہ کا رکھنا کیا حکم رکھتا ہے؟ اور اس کا کاٹنا کیسا ہے؟ مدلل جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: محمد جابر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: داڑھی بچہ داڑھی کے حکم میں ہے؛ لہٰذا اس کا رکھنا واجب اور بچہ کا کاٹنا مکروہ تحریمی ہے، پس اس کے کاٹنے سے بچنا انتہائی ضروری ہے۔ (مستفاد: محمود الفتاوی ۴/۲۴۷، فتاوی دار العلوم جدید ۱۶/۲۵۶، بہشتی زیور حصہ ۱۱، ص: ۱۷۷، اشاعت)

ونتف الفنيكين بدعة وهما جانبا العنفقة، وهي شعر الشفة السفلى. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٦/٤٠٨، زكريا ٩/٥٨٣، فتاوى هندية، زكريا قديم ٥/٣٥٨، جديد ٥/٤١٤، حاشية الطحطاوي على المراقي، دار الكتاب ديوبند ٥٢٦)

وقد ذكر العلماء في اللحية أثنتي عشرة خصلة مكروهة......السابعة الزيادة فيها والنقص منها بالزيادة في شعر العذار من الصدغين، أو أخذ بعض العذار في حلق الرأس، ونتف جانبي العنفقة وغير ذلك. (النووي على مسلم، كتاب الطهارة، باب خصال الفطرة، ١/١٢٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۴۶۵)

داڑھی بھر کر آئے اس نیت سے کترنا کیسا ہے؟

سوال [۱۰۶۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں اپنی داڑھی میں چھدری ہونے کی وجہ سے کترتا ہوں اور ارادہ یہ ہے کہ جب خط بھر کر آجائے گی، تو کترنا چھوڑ دوں گا، یعنی سنت کو مٹانا مقصد نہیں ہے؛ بلکہ تحریر کا بھرنا مقصد ہے، کیا میں اپنے جیسے داڑھی کتروں یا داڑھی منڈوں کی امامت (تراویح کے واسطے بوجہ قرآن سنانے کے) کرسکتا ہوں؟ اگر جواز کی کوئی صورت ہو، تو برائے مہربانی لکھد یجئے۔

المستفتی: محمد ذاکر، سرائے ترین،

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں درج شدہ مقصد کے لئے بھی داڑھی کترا کر شرعی حد سے کم کرنا حرام وناجائز ہے، ایسا کرنے والا شرعاً فاسق ہے، اس کے پیچھے نماز تراویح مکروہ تحریمی ہوگی۔

والسنة فيهاالقبضة (إلى قوله) ولذا يحرم على الرجل قطع لحيته.

(الدر المختار، کتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، کراچي ۶/۴۰۷، زکریا ۹/۵۸۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/۱۳۸۸)

داڑھی کے بال اگانے کے لئے استرا پھروانا

سوال[۱۰۶۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں : کہ زید کی عمر تقریباً ۲۵؍سال سے زائد ہوگئی ہے؛ لیکن اس کو ابھی داڑھی نہیں نکلی بعض ڈاکٹر حکیم لوگوں نے مشورہ دیا کہ تم داڑھی پر خالی استرا پھروالو اس سے تمہاری داڑھی آجائے گی، تو کیا شریعت کی روشنی میں ایسا کیا جا سکتا ہے؟

المستفتی: محمد عابد، متعلم مدرسہ ہٰذا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بالوں کا اگنا نہ اگنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، یہ کسی کے اختیار میں نہیں ہے، اگر کسی کے چہرہ پر بال نہیں نکلے تو اس سلسلہ میں اس سے کوئی باز پرس نہ ہوگی، اور نہ وہ گنہگار ہوگا؛ لہٰذا اس طرح چہرہ پر استرا پھیرنے کی ضرورت نہیں ہے، تاہم اگر بطور علاج ایسا کیا جائے اور حکیم ڈاکٹروں کی یہ بات مجرب ہو، تو پھر استرا پھیرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے؛ اس لئے کہ یہ داڑھی پر استرا پھیرنا نہیں ہے۔ (مستفاد: محمودیہ جدید ڈابھیل ۱۹/۴۱۸، قدیم ۱۷/۳۰۷، فتاوی رحیمیہ جدید زکریا ۱۰/۱۱۶-۱۱۷، قدیم ۶/۲۶۹، احسن الفتاوی ۸/۷۷)

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا. [البقرہ: ۲۸۶] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍شعبان المعظم ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/۷۳۶۷)

عورتوں کو داڑھی یا مونچھ نکل آئے تو کاٹنا کیسا ہے؟

سوال [۱۰۶۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ تخلیقی طور سے بعض مرد یا بعض عورتوں کے جسم کے بعض حصوں پر جیسے داڑھی مونچھ، بھویں، کان، کمر پر بال اگ جاتے ہیں، جو بدنما محسوس ہوتے ہیں، ان بالوں کو صاف کرنا مرد وعورت کے لئے جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد غفران صدرس، مدرسہ تعلیم القرآن شیرکوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرد کے جن اعضا پر عموماً بال نکلتے ہیں، مثلاً داڑھی مونچھ، بھوں، ابرو، ان کے علاوہ کسی حصہ پر مثلاً کان، کمر یا کسی اور حصہ پر بال نکل آئیں، تو ان کا صاف کرنا جائز ہے، اسی طرح عورت کے چہرے وغیرہ پر بال نکل آئیں، تو ان کا صاف کرنا جائز ہے۔

إزالة الشعر من الوجه حرام إلا إذا نبت للمرأة لحية، أوشوارب، فلا تحرم إزالته؛ بل تستحب ولابأس بأخذ الحاجبين وشعر وجهه ما لم يشبه المخنث. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، قبيل الإستبراء، كراچي ٦/ ٣٧٣، زكريا ٩/ ٥٣٦، الموسوعة الفقهية الكويتية ١١/ ٢٧٣، الفقه الإسلامي وادلته، مكتبه هدىٰ انٹرنيشنل ديوبند ١/ ٤٠٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ شعبان المعظم ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۷۰۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۸/۱۶ھ

داڑھی ایک مشت سے زائد کاٹنا اور گولائی میں کرنا

سوال [۱۰۶۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ داڑھی کی کم سے کم لمبائی کتنی ہونی چاہئے اور اس کو کاٹ کر گولائی میں کرنے کا حکم کس حدیث سے ثابت ہے، بعض غیر مقلدین داڑھی کو ناف سے نیچے چھوڑ دیتے ہیں، کیا یہ عمل صحیح ہے؟ یا حدیث کے خلاف ہے؟ مدلل جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: محمد ذاکر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: داڑھی ایک مشت رکھنا واجب ہے اور ایک

مشت سے بہت زائد لمبی داڑھی رکھنا جیسا کہ بعض غیر مقلدین رکھتے ہیں، یہ احادیث اور سنت کے خلاف ہے ایک مشت سے زائد داڑھی کو کاٹ کر گولائی میں کرنا ابن عمرؓ اور ابو ہریرۃؓ کی روایت سے ثابت ہے، جو درج ذیل ہے۔

عن ابن عمرؓ عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: خالفوا المشركين، وفروا اللحیٰ، واحفوا الشوارب، وكان ابن عمر إذا حج، أو عمر قبض على لحيته فما فضل أخذه. (بخاري شريف، كتاب اللباس، باب تقليم الأظفار ٢/٨٧٥، رقم: ٥٦٦٣، ف:٥٨٩٢)

وقد روي عن أبي هريرةؓ أيضاً أنه كان يقبض على لحيته فيأخذ مافضل عن القبضة. (هامش الترمذي ٢/١٠٥)

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده، أن رسول الله صلى الله عليه كان يأخذ من لحيته من طولها وعرضها. (سنن الترمذي، كتاب الأدب، باب ماجاء في الأخذ اللحية، النسخة الهندية ٢/١٠٥، دار السلام رقم: ٢٧٦٢)

عن الحسن قال: كانوا يرخصون فيمازاد على القبضة من اللحية: أن يؤخذ منها. (مصنف ابن أبي شيبة، مؤسسة علوم القرآن بيروت١٣/١١٢، رقم:٢٥٩٩٥)

عن أبي هريرةؓ: أنه كان يأخذ من لحيته ماجاز القبضة. (مصنف ابن أبي شيبة ١٣/١١٣، رقم:٢٥٩٩٩)

أنه ورد في السنة إصلاح اللحية بما يزيد على القبضة.
(اوجز المسالك، دار القلم بيروت٨/١٣٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/۱۱۴۶۶)

داڑھی کے بال توڑ کر پھینکنے کی حکمت

سوال [١٠٧٠٠]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں ایک رواج ہے کہ اگر داڑھی کا کوئی بال ٹوٹتا ہے، یا گرتا ہے تو اس کو توڑ کر پھینکتے ہیں، معلوم یہ کرنا ہے کہ داڑھی کے بال کا توڑ کر ایک طرف ڈالنا یہ شرعاً کوئی بات ہے یا ویسے ہی عوامی رواج ہے؟

المستفتی: سعید احمد سیڈھا، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بخاری شریف میں ایک روایت کئی جگہ موجود ہے حضور ﷺ کو جو جادو کیا گیا تھا، وہ بالوں میں گرہ لگا کر کیا گیا تھا اور داڑھی کے بال چونکہ لمبے ہوتے ہیں، ان میں گرہ لگانا آسان ہوتا ہے؛ اس لئے جو لوگ داڑھی کے بال گرنے کے بعد اسے توڑ کر چھوڑ دیتے ہیں، شاید اسی وجہ سے کرتے ہوں گے کہ کسی دشمن کے ہاتھ نہ لگ سکے، اور اگر داڑھی کے بال توڑ کر ایک طرف ڈالنے والوں کا مقصد کوئی دوسرا ہے، تو وہی بتائیں گے، ہم کو معلوم نہیں کہ ان کا کیا مقصد ہے؟

عن عائشة رضـ كان رسول الله صلى الله عليه وسلم سحر حتى كان يرىٰ أنه يأتي النساء، ولا يأتيهن......وقال من طبه قال لبيد بن الأعصم رجل من بني زريق حليف ليهود، كان منافقًا، قال: وفيم ، قال في مشط ومشاقة قال فأين؟ قال: في جف طلعة ذكر تحت رعوفة في بئر ذى أروان. (بخاري شريف، كتاب الطب، باب هل يستخرج السحر ٢/٨٥٨، رقم: ٥٥٤٠، ف: ٥٧٦٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٤/ جمادی الثانیہ ١٤٢٩ھ
(فتویٰ نمبر: الف ٩٦٣٤/٣٨)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٤٢٩/٦/١٤ھ

رخسار اور حلق کے بال منڈانا

سوال [۱۰۷۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ رخسار کے بال اور ٹھوڑی کے نیچے حلق کے بال کی کیا حیثیت ہے؟ کیا یہ ازروئے شرع داڑھی کے اندر داخل ہے یا خارج؟ زید رخسار اور داڑھی کے نیچے ٹھوڑی کے نیچے کے بال منڈاتا ہے، شریعت کی نظر میں اس کا یہ عمل کیسا ہے؟

المستفتی: عبدالکریم، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: رخسار اور حلق کے بال داڑھی میں داخل نہیں؛ لہٰذا زید کے رخسار اور حلق کے بالوں کو منڈانے کی گنجائش ہے اور رخسار کے بالوں کو گولائی میں منڈانے کی بھی گنجائش ہے؛ لیکن نہ منڈانا بہتر ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ، جدید ڈابھیل ۴۴۲/۱۹، ۴۲۰/۱۹-۴۲۱، قدیم ۲۸۲/۸-۲۹۴/۸)

ولا يحلق شعر حلقه، وعن أبي يوسفؒ لابأس بذلك، ولا بأس بأخذ الحاجبين، وشعر وجهه ما لم يتشبه بالمخنث، كذا في الينابيع. (هندية، كتاب الكراهية، الباب التاسع، زكريا قديم ٣٥٨/٥، جديد ٤١٤/٥، حاشية الطحطاوي على المراقي، دار الكتاب ديوبند ٥٢٦، شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچي ٤٠٧/٦، زكريا ٥٨٣/٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ جمادی الاول ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/۶۶۸۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۵/۲۷ھ

داڑھی مونڈنا کیسا ہے؟

سوال [۱۰۷۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: کہ جو حضرات شروع سے داڑھی مونڈتے ہیں، ان کے بارے میں علماء دین کیا فرماتے ہیں؟ اسی طرح جو حضرات داڑھی رکھ کر پھر اس کو صاف کردیں، ان کے بارے میں کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد سمیع اللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ایک مشت سے کم داڑھی کاٹنے کو فقہاء نے حرام قرار دیا ہے، شروع سے مونڈ دے، تو بھی حرام اور رکھ کر مونڈ دے تب بھی حرام ہے۔

عن ابن عمرؓ، عن النبي صلى الله عليه وسلم، أنه أمر بإحفاء الشوارب، وإعفاء اللحية. (مسلم شريف، كتاب الطهارة، باب خصال الفطرة، النسخة الهندية ١٢٩/١، بيت الأفكار رقم: ٢٥٩، سنن الترمذي، كتاب الأدب، باب ماجاء في إعفاء اللحية، النسخة الهندية ١٠٥/٢، دار السلام رقم: ٢٧٦٤)

إذا كانت بقدر المسنون وهو القبضة –إلى قوله– وهي دون ذلك كما يفعله بعض المغاربة، ومخنثة الرجال، فلم يبحه أحد، وأخذ كلها فعل يهود الهند، ومجوس الأعاجم. (در مختار مع الشامي، كتاب الصوم، باب ما يفسد الصوم وما لا يفسده، مطلب في الأخذ من اللحية، مصري ١٥٥/٢، كراچي ٤١٨/٢، زكريا ٣٩٨/٣)

يحرم على الرجل قطع لحيته. (در مختار مع الشامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، مصري ٣٥٩/٥، كراچي ٤٠٧/٦، زكريا ٥٨٣/٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲؍صفر المظفر ۱۴۲۰ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۰۱۵/۳۴)	۱۴۲۰/۲/۲ھ

داڑھی ہوتے ہوئے کوئی غلط کام ہوجانے کے خوف سے داڑھی نہ رکھنا

سوال [۱۰۷۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: کہ بعض حضرات اس لئے داڑھی نہیں رکھتے کہ اگر ہم داڑھی رکھ کرکوئی غلط کام کریں گے، تو اس سے داڑھی والوں کی بدنامی اور داڑھی کی بے حرمتی ہوگی، ایسے حضرات کے بارے میں کیا حکم ہے؟

المستفتی: جوادالحق، نئی بستی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: داڑھی رکھنا واجب ہےاور کتر انے میں ایک گناہ کبیرہ ہے، جوموجب فسق ہے، اورداڑھی منڈانے میں دو گناہ کبیرہ ہیں، ایک گناہ کبیرہ جو موجب فسق ہے۔ دوسرا گناہ کبیرہ عورتوں کے ساتھ مشابہت ہے پس داڑھی کی سب سے بڑی بےحرمتی یہی ہے کہ منڈادیا جائے یا کترادیا جائے اورداڑھی منڈا کر کے داڑھی کو بے حرمتی سے بچانے کی بات کرنا کتنی بڑی الٹی کھوپڑی کی بات ہےخوداپنے ہاتھ سے داڑھی کو بدنام بھی کردیا۔ نیز دنیاوالوں کے سامنے دکھایا، پھر کہتے ہیں کہ داڑھی کو بدنامی سے بچائیں، یہ کونسی سمجھ کی بات ہے؟ اگر غلط کام کرتے ہیں، تو غلط کام کا گناہ الگ سے ہوگا اورداڑھی منڈانے کا گناہ الگ سے؛ اس لئے داڑھی نہ رکھنے والوں کی یہ دلیل درست نہیں ہے۔ (مستفاد: امدادالفتاوی ۴/۲۲۳، احسن الفتاوی ۸/۷۳)

عن ابن عمرؓ، عن النبي صلى الله عليه وسلم، أنه أمر بإحفاء الشوارب، وإعفاء اللحيه. (مسلم شريف، كتاب الطهارة، باب خصال الفطرة، النسخة الهندية ١/١٢٩، بيت الأفكار رقم: ٢٥٩، سنن الترمذي، كتاب الأدب، باب ماجاء في إعفاء اللحية، النسخة الهندية ٢/١٠٥، دار السلام رقم: ٢٧٦٤)

عن ابن عباسؓ، قال: لعن النبي صلى الله عليه وسلم: المتشبهين من الرجال بالنساء الحديث (صحيح البخاري، كتاب اللباس، باب المتشبهين بالنساء ٢/٨٧٤، رقم: ٥٦٥٦، ف: ٥٨٨٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ربیع الاول ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/۷۶۰۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۲۳/۴/۲۲ھ

جس کمپنی میں داڑھی کی اجازت نہ ہو، اس میں ملازمت

سوال[۱۰۷۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں قطر پٹرولیم کمپنی میں کام کرتا ہوں، ہماری کمپنی میں داڑھی رکھنے پر سخت پابندی ہے اگر کبھی تھوڑی بہت داڑھی بڑھ بھی جاتی ہے، تو ہماری کمپنی کا منیجر داڑھی کٹانے کا حکم دیتا ہے، اور بغیر کٹائے کام کرنے کی اجازت نہیں ہوتی، مجھے داڑھی کاٹنے پر بہت شرمندگی ہوتی ہے اور میں دوسری کمپنی تلاش بھی کرر ہا ہوں، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ جب تک دوسری کمپنی میں سروس نہ ملے، اس کمپنی میں کام کرنا کیسا ہے، اور ایسی مجبوری کی حالت میں داڑھی کٹانے کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد حسن، دوحہ، قطر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: داڑھی رکھنا اور اس کو بڑھانا شرعاً واجب ہے، حدیث شریف میں اس کا حکم آیا ہے، ایک مشت پہونچنے سے پہلے کٹانا اور ایک مشت سے کم کرالینا جائز نہیں۔ لہٰذا کمپنی کے منیجر کے کہنے سے شرعی حکم کی مخالفت جائز نہیں، آپ اللہ پر بھروسہ کرکے ایسی کمپنی سے نوکری چھوڑ دیں، اللہ تعالیٰ انشاء اللہ اس سے اچھا انتظام فرمادیں گے۔
(مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۹/۴۱۴)

عن ابن عمرؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: خالفوا المشركين، وفروا اللحىٰ، وأحفوا الشوارب، وكان ابن عمر إذا حج، أو اعتمر قبض على لحيته فما فضل أخذه. (بخاري شريف، كتاب اللباس، باب تقليم الأظفار ۲/۸۷۵، رقم: ۵٦٦۳، ف:۵۸۹۲)

عن عليؓ قال: قال رسول الله عليه وسلم لا طاعة في معصية إنما الطاعة في المعروف. (صحيح البخاري، كتاب أخبار الأحاد، باب ماجاء في إجازة

خبر الواحد ٢/١٠٨٧، رقم:٦٩٦٧، ف:٧٢٥٧، مشكوة شريف ٩ ٣١)

يحرم على الرجل قطع لحيته. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، زكريا ٩/٥٨٣، كراچي ٦/٤٠٧)

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إنك لا تدع شيئًا اتقاء الله إلا أعطاك الله خيرًا منه. (شعب الإيمان، دار الكتب العلمية بيروت ٥/٥٣، رقم: ٥٧٤٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/رجب المرجب ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۵۵۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/۷/۱۴۳۲ھ

داڑھی رکھنے کی وجہ سے نوکری سے نکالنے لگے تو کیا حکم ہے؟

سوال [۱۰۷۰۵]: (الف) کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید گورنمنٹ ملازم ہیں یعنی ملیٹری میں نوکری کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ملیٹری میں رہنے کے باوجود داڑھی رکھیں، مگر ان کے جو جنرل کرنل ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر تم داڑھی رکھو گے تو تمہیں نوکری سے نکال دیا جائے گا اور اگر زید نوکری چھوڑ دیں، تو ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے، جس سے اپنے بیوی بچوں کا خرچہ چلاسکیں، اس وجہ سے زید کافی مجبور ہیں۔ واضح رہے کہ زید کے تمام آفیسر کافر ہیں۔

المستفتی: فوجی محمد الیاس، جموں کشمیر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: داڑھی تمام انبیاء کی سنت اور شعائر اسلام میں سے ہے؛ اس لئے ایک مشت داڑھی رکھنا واجب اور لازم ہے، ایک مشت سے کم کرانا یا ترشوانا قطعاً جائز نہیں ہے۔ اب رہی ملازمت کی بات کہ داڑھی رکھنے سے نوکری سے نکال

دیا جائے گا، تو یہ ہندوستانی قانون کے خلاف ہے؛ کیونکہ ہندوستانی قانون میں ہر آدمی اپنے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد ہے، جیسا کہ سکھوں کو داڑھی رکھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں اور جو مسلمانوں کو دھمکی دی جارہی ہے، وہ خود مسلمانوں کی ذاتی کمزوری اور غفلت کی وجہ سے ہے؛ اس لئے کہ مسلمان خود اپنے یونی فارم کی پابندی نہیں کرتے ہیں۔

عن عائشة رضؓ قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: عشر من الفطرة قص الشارب، وإعفاء اللحية إلى آخره. (سنن أبو داؤد شريف، كتاب الطهارة، باب السواك من الفطرة، النسخة الهندية ١/٨، دار السلام رقم: ٥٣، صحيح مسلم، كتاب الطهارة، باب خصال الفطرة، النسخة الهندية ١/٢٩، بيت الأفكار رقم: ٢٦١، سنن ابن ماجه، كتاب الطهارة، باب الفطرة، النسخة الهندية ١/٢٥، دار السلام رقم:٢٩٣)

وقص اللحية كان من صنع الأعاجم، وهو اليوم شعار كثيرمن المشركين كالأفرنج والهنود، ومن لا خلاق له في الدين من الطائفة القلندرية. (مرقاة شرح مشكوة شريف، باب السواك، مكتبة امداية ملتان اشرفى ٢/٤، شامي، زكريا ٣/٣٩٨، كراچي ٢/٤١٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸ر ربیع الاول ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/۸۷۶۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۳/۹ھ

سرحد پار کرنے کے لئے داڑھی منڈوانے کی گنجائش

سوال [۱۰۷۰۵/ب]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص ہندوستان کا رہنے والا ہے؛ لیکن کاروبار کے لئے بنگلہ دیش آنا جانا ہوتا رہتا ہے تو اس درمیان کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی؛ لیکن اس مرتبہ رکاوٹ پیش آرہی ہے، وجہ یہ ہے کہ پہلے داڑھی نہیں رکھتا تھا اور اب داڑھی رکھنے لگا ہے، جس کی وجہ

سے پاسپورٹ فوٹو سے چہرہ نہ ملنے کیوجہ سے باڈر پر روک لیا جاتا ہے، تو کیا اس مجبوری کیوجہ سے داڑھی کو کٹوایا جاسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد جوہر علی، بیگوسرائے

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر داڑھی منڈوائے بغیر سرحد پار کرنا ممکن نہیں نہیں، تو بدرجۂ مجبوری داڑھی منڈوا کر کے سرحد پار کرنے کی گنجائش ہے؛ کیونکہ مجبوری اورضرورت کی وجہ سے بقدرضرورت امرممنوع کے ارتکاب کی شرعاً اجازت ہوجاتی ہے۔

ما أبيح للضرورة يتقدر بقدرها الخ. (الأشباه والنظائر ١٤٠)

عن أنس أن الزبير، وعبد الرحمن بن عوف شكوا إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم القمل فرخص لهما في قميص الحرير في غزاة لهما. الحديث. (قديم ٦٥)

إنما يكره اللبس إذا لم تقع الجاجة في لبس الخ. (البحر الرائق ١٩٠/٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ذی الحجہ ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ؍)

داڑھی مونڈنے والے نائی کی اجرت کا جواز

سوال [۱۰۷۰۵؍ ج]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آپ نے لکھا ہے کہ سرحد پار کرنے کے لئے داڑھی کی وجہ سے رکاوٹ پیش آنے کی صورت میں داڑھی منڈوا کر سرحد پار کرنے کی گنجائش ہے اور اس طرح بہت سے اعذار ایسے ہیں، جن کی وجہ سے داڑھی منڈوانے کی گنجائش ہوسکتی ہے؛ اسی طرح تصویر کشی کرنا فی نفسہ ناجائز ہے؛ لیکن بہت سے امور میں تصویر کی ضرورت پیش آئی؛ اسی لئے

بہت سے فقہاء نے تصویر کشی کی اجرت کو جائز اور حلال لکھا ہے، تو کیا داڑھی مونڈنے والے نائی کی اجرت بھی جائز ہوگی یا نہیں اور ایسا نائی جو داڑھی مونڈنے کی اجرت حاصل کرتا ہے، اس کو قربانی کے سات شرکاء میں سے ایک شریک قرار دینے میں دیگر شرکاء کی قربانی میں خرابی آئے گی یا نہیں؟ بعض علاقہ میں اس مسئلے کو لے کر لوگوں میں اختلاف اور جھگڑا ہو رہا ہے کہ نائی کی شرکت کی وجہ سے دوسروں کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگ ناجائز کہتے ہیں، بعض لوگ جائز کہہ رہے ہیں، آپ اس مسئلے کا حل شریعت کی روشنی میں فرمادیں۔

المستفتی: عبدالہادی بستوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: داڑھی مونڈنے والے نائی کی اجرت حلال ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں باقاعدہ طور پر کوئی صریح جزئیہ دستیاب نہ ہوسکا اور داڑھی مونڈنے کے مسئلہ کا سلسلہ خیر القرون اور ائمہ مجتہدین کے زمانہ سے چلا آرہا ہے، یہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے، مگر ائمۂ مجتہدین میں متقدمین اور متأخرین میں سے کسی نے بھی اس مسئلہ کو اہمیت دی ہو یا اس مسئلے پر صاف الفاظ کے ساتھ کسی حکم شرعی کی وضاحت فرمائی ہو۔

احقر کے علم میں نہیں ہے تاہم ایسے نائی کی اجرت جو داڑھی مونڈ کر حاصل ہوتی ہو، اس کی حلت وحرمت کے متعلق نظائر پر غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تعاون علی المعصیت کی وجہ سے داڑھی مونڈنے کا عمل باعث گناہ ہے، مگر اس کی اجرت جائز اور حلال ہوگی، حاصل طور پر جب استرا اور بلیڈ نائی کا ہو تو قربانی میں دیگر شرکاء کے ساتھ اس کی قربانی بھی درست ہوجائے گی اور دیگر شرکاء کی قربانی بھی بلا کراہت درست ہوجائے گی اور یہ ایسا ہے کہ جیسا کہ تصویر کشی کرنا معصیت اور گناہ کبیرہ ہے لیکن تصویر کشی کی اجرت حضرت امام محمدؒ کے نزدیک جائز اور حلال ہے، اسی طرح ڈھول، تاشے اور آلات لہو ولہب کا تیار کرنا تعاون علی المعصیت کی وجہ سے گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہے؛ لیکن اس کی اجرت جائز اور حلال ہے اور یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ بعض حالات میں تصویر کشی کی ضرورت ہوتی ہے اور آلات لہو ولہب کی بھی بعض دفعہ

ضرورت پڑ جاتی ہے،اس طرح داڑھی منڈوانے کی بھی بعض دفعہ ضرورت پڑ جاتی ہے مثلاً کسی بیماری کی وجہ سے منڈوانے کی ضرورت پڑ جاتی ہے یا پاسپورٹ کے اوپر بغیر داڑھی کا فوٹو ہے اور غیر ملک میں جانے کے ایک دو سال کے بعد چہرے پر پوری داڑھی آ چکی ہو اور پاسپورٹ کا فوٹو چہرہ سے میل نہ کھاتا ہو اور اس حالت میں سرحد پار کرنے میں دشواری ہو،تو داڑھی منڈوا کر کے سرحد پار کرنے کی اجازت ہو جاتی ہے،تو معلوم ہوا کہ بعض دفعہ بعض اعذار کی وجہ سے ایسے ہی داڑھی منڈوانے کی گنجائش ہو جاتی ہے،جیسا کہ تصویر کشی کی گنجائش ہوتی ہے؛اس لئے ہم داڑھی مونڈنے والے نائی کی اجرت کو اسی طرح جائز اور حلال سمجھتے ہیں،جس طرح تصویر کشی کرنے والے کی اجرت کو بعض فقہاء نے جائز اور حلال کہا ہے۔

جزئیات ملاحظہ فرمائیے:

وفي نوادر هشام عن محمدؒ رجل استأجر رجلاً ليصور له صوراً أو تماثيل الرجال في بيت أو فسطاط فاني أكره ذالك وأجعل له الأجرة. قال هشام: تاويله إذا كان الإصباغ من قبل الأجير ......وإن استاجره لينحت له طنبوراً أو بربطا ففعل طاب له الأجر إلا أنه ياثم به. (هندية، زكريا ٤/ ٤٥٠، اتحاد ٤/ ٤٨٦)

وفي فتاوى اهل سمر قندؒ إذا استأجر رجلا ينحت له طنبورًا أو بربطا ففعل يطيب له الأجر إلا أنه ياثم في الإعانة على المعصية وإنماا وجب له الأجر في هذه المسائل. (المحيط البرهاني ١١/ ٣٤٦، رقم: ١٣٧٩٣، البحر الرائق، زكريا ٨/ ٣٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ذی الحجہ ١٤٣٦ھ
(فتویٰ نمبر: الف ١٢٢٩٨/٤١)

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ

فتاویٰ قاسمیہ

منتخب فتاویٰ

حضرت مولانا مفتی شبیر احمد القاسمی

خادم الافتاء و الحدیث جامعہ قاسمیہ

مدرسہ شاہی مرادآباد، الہند

(جلد ۲۴)

المجلد الرابع و العشرون

بقية الحضر و الاباحة باب الاكل و الشرب الانتفاع بالحيوانات الخمر، الدخان، الهدايا، الموالة مع الكفار، المال الحرام، الادب، اللهو، استعمال الذهب والفضة، كسب الحلال، الغناء، التصاوير

۱۰۷۰۶ ——— ۱۱۲۰۵

ناشر

مکتبہ اشرفیہ، دیوبند، الہند

01336-223082

فتاویٰ قاسمیہ

صاحب فتاویٰ

حضرت مولانا مفتی شبیر احمد القاسمی

پہلا ایڈیشن محرم الحرام ۱۴۳۷ھ

ناشر

مکتبہ اشرفیہ، دیوبند، ضلع سہارنپور، الہند

01336-223082

ASHRAFI BOOK DEPOT

DEOBAND, SAHARANPUR, INDIA

Phone: 01336-223082

Mob. : 09358001571،08810383186

مکمل اجمالی فہرست ایک نظر میں

❖❖ ❍❖❍

فہرست مضامین

۴۱/ بقیۃ کتاب الحظر والإباحۃ

۸/ باب: کھانے کی سنتوں اور آداب وغیرہ کا بیان

مسئلہ نمبر .... صفحہ نمبر

۹/باب: حلال وحرام اشیاء کا بیان

١٠/ باب: حلال وحرام جانور

۱۱/ باب الإنتفاع بالحیوانات

۱۲/ باب ما یحل قتله وما لا یحل

۱۳/ باب الخمر والدخان

۱۴/ باب في الهدايا والضيافات

۱۵/ باب الموالات مع الکفار

اہل کتاب اور ان سے متعلق احکام کا تحقیقی جائزہ

۱۶/ باب المال الحرام ومصرفه

۱۷/باب الأدب

معذوروں اور بوڑھوں کے حقوق کا تحقیقی جائزہ

۱۸/باب اللھو واللعب

۱۹/ باب استعمال الذهب والفضة وغيرها

۲۰/باب کسب الحلال والحرام

۲۱/باب المعاصي والتوبة

۲۲/باب ما یتعلق بالسحر

۲۳/ باب الشعر والغناء

۲۴/ باب جھوٹ،غیبت،چوری وغیرہ کا بیان

۲۵/ باب التصاویر

۲۶/ باب ٹیلی ویژن اور میڈیا

۲۷/ باب الأسماء و الکنی

۲۸/ باب الجوالة والانترنیت

۲۹/باب المتفرقات

۴۱/ بقية كتاب الحظر والإباحة

(۸) باب: کھانے کی سنتوں اور آداب وغیرہ کا بیان

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا ☆ عَلٰى حَبِيبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

کھانا کھانے کے لئے بیٹھنے کا سنت طریقہ

سوال [۱۰۷۰٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کھانا کھانے کے لئے بیٹھنے کے سنت طریقے کتنے ہیں؟

المستفتی: محمد قاسم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کھانا کھانے کے مختلف طریقے حضور ﷺ سے ثابت ہیں؛ البتہ جس ہیئت پر بیٹھ کر کھانے میں تکبر وغرور سے احتراز، عبودیت کا اظہار اور بیٹھنے والے کو سہولت وآسانی ہو، اسی طریقے پر بیٹھ کر کھانا مسنون ہے۔

عن یحيٰ بن أبي كثير أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: آكل كما يأكل العبد، وأجلس كما يجلس العبد، فإنما أنا عبد. (شعب الإيمان، الأكل متكئًا، دارالكتب العلمية ٥/ ١٠٧، رقم: ٥٩٧٥، الزهد لابن المبارك، دارالكتب العلمية بيروت ٤٧٥، رقم: ١٩٣، مسند أبي يعلى الموصلي، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٢٧٩، رقم: ٤٨٩٩)

فـآكـل كـمـا يـأكل العبد، وكان يأكل وهو مقع ويذكر عنه، أنه كان يـجـلـس لـلأكل متوركاً على ركبتيه ويضع بطن قدمه اليسرىٰ على ظهر قدمه اليـمنىٰ تواضعاً لربه عزوجل وأدبابين يديه واحترامًا للطعام وللمؤاكل.

(زاد المعاد، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٢٢١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۱۰۸)	۱۵/۵/۱۴۳۴ھ

کھانا کھانے کا مسنون طریقہ

سوال [۱۰۷۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کھانا کھانا کون کون سے طریقہ سے ہے؟ بیٹھ کر کھانا حضور ﷺ سے ثابت ہے؟ اور ان طریقوں میں کون سا طریقہ زیادہ سنت اور افضل ہے؟ نیز اکڑوں بیٹھنا کیسا ہے؟

المستفتی: عبداللہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حضور اکرم ﷺ سے کسی خاص طریقہ پر بیٹھ کر کھانا کھانا کسی حدیث سے وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے نہیں اور اس سلسلہ میں کوئی صریح حدث شریف ہمیں نہیں مل سکی، ہاں البتہ ایک دفعہ اکڑوں بیٹھ کر کھجور تناول فرمانا ثابت ہے، اور حضرات محدثین نے حدیث کے حوالہ کے بغیر کھانا کھانے کے لئے کچھ مستحب طریقے نقل فرمائے ہیں، ان میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے گھٹنوں اور قدمین کے ظاہری حصہ کو زمین پر رکھ کر دوزانو بیٹھ کر کھانا کھائے، یہ ایسے لوگوں کے لئے ہے، جو اس طریقہ سے آسانی کے ساتھ بیٹھ سکتے ہوں۔

دوسرا طریقہ یہ نقل فرمایا ہے کہ دائیں پیر کو کھڑا رکھا جائے اور بائیں پیر پر بیٹھ کر کھایا جائے،

یہ بھی ایسے لوگوں کے لئے ہے، جو اس طریقہ سے سہولت کے ساتھ دیر تک بیٹھنے پر قادر ہوں؛ لیکن جن لوگوں کے بدن بھاری ہوں، وہ نہ اکڑوں بیٹھ سکتے ہیں، نہ دوزانوں بیٹھ سکتے ہیں اور نہ ہی ایک ٹانگ کھڑی کر کے بیٹھ سکتے ہیں، تو ایسے لوگوں کے لئے وہی طریقہ بہتر ہے، جس میں وہ آسانی اور سہولت کے ساتھ کھانا کھا سکتے ہوں۔

عن مصعب بن سليمؒ، قال: سمعت أنس بن مالك يقول أتي رسول الله صلى الله عليه وسلم بتمر، فرأيته يأكل، وهو مقع من الجوع. (شمائل ترمذي۹، ومسلم شريف، باب استحباب تواضع الأكل وصفة قعوده، النسخة الهندية ۲/ ۱۸۰، بيت الأفكار رقم:٤ ٠ ٢ ٠٤، مسند الدارمي دار المغني ۲/ ۱۳۱۰، رقم:٦ ٠ ۲۱)

فالمستحب في صفة الجلوس للآكل أن يكون جاثياً على ركبتيه وظهور قدميه، أوينصب الرجل اليمنىٰ، ويجلس على اليسرىٰ. (فتح الباري، باب الأكل متكئًا، دارالفكر۹/ ٥٤٢، اشرفية ديوبند ۹/ ٦٧٦، تحت رقم الحديث: ٥٣۹۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

كتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ رجمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۵۹۶/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۵/۶ھ

کیا اکڑوں بیٹھ کر کھانا حضور ﷺ سے ثابت ہے؟

سوال [۱۰۷۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حضور ﷺ سے اکڑوں بیٹھ کر کھانا تناول فرمانا ثابت ہے؟ اگر آپ علیہ الصلاۃ والسلام سے کسی خاص ہیئت پر بیٹھ کر کھانا تناول فرمانا ثابت ہو، تو اس کو واضح فرمادیں، آپ کی عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: محمد سمیع الدین قاسمی دیوان بازار مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: حضور ﷺ کا اکڑوں بیٹھ کر کھانا تناول فرمانا کسی حدیث شریف سے ثابت نہیں؛ البتہ آپ علیہ السلام کا اکڑوں بیٹھ کر کھجور تناول فرمانا صحیح حدیث شریف سے ثابت ہے، حدیث شریف ذیل میں نقل کی جارہی ہے اور بعض فقہاء ومحدثین نے حضور ﷺ کا عورتوں کے التحیات میں بیٹھنے کی طرح تورک کر کے کھانے کے لئے بیٹھنے کا ذکر فرمایا ہے یعنی بائیں قدم کو دائیں قدم کی پشت پر رکھ کر تواضع کی ہیئت اختیار کر کے کھانے کے لئے بیٹھنا جو ذیل کی عبارتوں سے واضح ہوتا ہے، مگر کسی نے بھی اس بارے میں کوئی حدیث شریف نقل نہیں فرمائی ہے، اوراحقر کو بھی اس بارے میں کوئی حدیث شریف دستیاب نہ ہوسکی۔

یہاں یہ بات بھی یادرکھنے کی ہے کہ حضور ﷺ سے صراحت کے ساتھ کسی ایک ہیئت پر کھانا تناول نہ فرمانا امت کی سہولت کے لئے ہے؛ لہٰذا جو آدمی جس ہیئت پر آسانی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاسکتا ہے،اس کے لئے اسی طریقے سے کھانے کے لئے بیٹھنا بہتر ہے۔

عن أنس بن مالکؓ قال: رأيت النبي صلى الله عليه وسلم مقعيًا يأكل تمرًا. (مسلم شريف، باب استحباب تواضع الأكل وصفة قعوده، النسخة الهندية ۲/ ۱۸۰، بيت الأفكار، رقم: ۲۰٤٤)

والإقعاء أن يجلس علي أليتيه ناصبًا ساقيه. (زاد المعاد ٤/ ۲۲۱، المجم الأوسط ۷٥۰)

فالمستحب في صفة الجلوس للآكل أن يكون جاثيًا على ركبتيه وظهور قدميه، أوينصب الرجل اليمنىٰ ويجلس على اليسرىٰ. (فتح الباري، باب الأكل متكئًا، دار الفكر ۹/ ٥٤۲، اشرفية ۹/ ٦۷٦، تحت رقم الحديث: ٥۳۹۹)

قال ابن القيمؒ: ويذكر عنه صلى الله عليه وسلم: أنه كان يجلس للأكل متكأ على ركبتيه، ويضع بطن قدمه اليسرىٰ تواضعًا لله بين يديه،

قال: هذه الهيئة أنفع هيئات الأكل وأفضلها؛ لأن الأعضاء كلها تكون على وضعها الطبيعي خلقها الله عليه. (مرقاة المفاتيح، كتاب الأطعمة، مكتبه امدادية ملتان ٨/ ١٦٤، زاد المعاد ٤/ ٢٢١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۴۵۶)

حضور ﷺ کھانے میں پانی کس وقت پیتے تھے؟

سوال [۱۰۷۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ پیارے رسول اللہ ﷺ کھانا کھانے میں پانی کس وقت پیتے تھے؟ آپ سے کھانے سے پہلے کھانے کے درمیان اور کھانے کے بعد پانی پینا ثابت ہے یا نہیں؟ اگر ثابت ہے تو اسے سنت کہیں گے یا کھانے کے آداب میں سے کہا جائے گا؟

المستفتی: حاجی سردار خاں، سنگیر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اس سلسلہ میں احقر کو اپنی کوتاہ نظری اور کم فہمی کے ساتھ احادیث شریفہ کے ذخیرہ کی چھان بین کے بعد جو کچھ حاصل ہوا ہے، وہ پیش خدمت ہے۔

مسلم شریف میں حضرت ابوالہیثم ابن تیہان کے واقعہ میں یوں لکھا ہے کہ حضور ﷺ کی خدمت میں کھجور اور بکرے کا کھانا پیش کیا گیا، ساتھ میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت ابوہریرہ رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی موجود تھے، سب نے کھجور بھی تناول فرمائی اور کھانا بھی تناول فرمایا اور پانی بھی پیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخیر میں پانی پیا۔

حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے۔

عن أبي هريرةؓ، قال: خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم: ذات يوم، أو ليلة، فإذا هو بأبي بكرؓ، وعمرؓ: فقال: ما أخرجكما من بيوتكما هذه الساعة؟

قالا: الجوع یا رسول الله! قال: وأنا والذي نفسي بیده لأخرجني الذي أخرجکما، قوموا، فقاموا معه، فأتیٰ رجلا من الأنصار، فإذا هو لیس في بیته، فلما رأته المرأة، قالت: مرحبا وأهلا، فقال لها رسول الله صلی الله علیه وسلم: أین فلان؟ قالت: ذهب یستعذب لنا من الماء، إذا جاء الأنصاري، فنظر إلی رسول الله صلی الله علیه وصاحبیه، ثم قال: الحمد لله ما أحد الیوم أکرم أضیافًا مني، قال: فأنطلق، فجاء بعذق فیه بسر وتمر ورطب، فقال: کلوا من هذه وأخذ المدیة، فقال له رسول الله صلی الله علیه وسلم: إیاک والحلوب، فذبح لهم، فأکلوا من الشاة ومن ذلک العذق وشربوا، فلما أن شبعوا وروُوا، قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لأبي بکرؓ، وعمرؓ: والذي نفسي بیده؛ لتسألن عن هذا النعیم یوم القیٰمة، أخرجکم من بیوتکم الجوع، ثم لم ترجعوا حتی أصابکم هذا النعیم. (مسلم شریف، باب جواز استتباعه غیره إلي دارمن یثق، النسخة الهندیة ۲/ ۱۷۷، بیت الأفکار رقم:۲۰۳۸)

اور ترمذی شریف میں اسی واقعہ کے تحت یہ تفصیل ہے کہ حضرت ابوالہیثمؓ نے پہلے کھجور پیش فرمائی: ان سب حضرات نے کھجور تناول فرمانے کے بعد کھانا تناول فرمانے سے پہلے پانی پیا ہے۔

حدیث شریف کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے:

عن أبي هریرةؓ، قال: خرج النبي صلی الله علیه وسلم في ساعة لایخرج فیها ولا یلقاه فیها أحد، فأتاه، أبوبکر، فقال: ماجاء بک یا أبا بکر؟ فقال: خرجت ألقي رسول الله صلی الله علیه وسلم وأنظر في وجهه والتسلیم علیه، فلم یلبث أن جاء عمر، فقال: ماجاء بک یا عمر؟ قال: الجوع یارسول الله صلی الله علیه وسلم! قال: وأنا قد وجدت بعض ذلک، فانطلقوا إلي منزل أبي الهیثم بن التیهان الأنصاري، وکان رجلاً کثیر النخل والشاء

ولـم يـكـن لـه خـدم، فـلـم يجدوه، فقالوا لامرأته: أين صاحبک، فقالت: انـطـلـق يستـعـذب لـنـا الـمـاء، فلم يلبثوا أن جاء أبو الهيثم بقربة يزعبها فـوضـعـهـا، ثم جاء يلتزم النبي صلى الله عليه وسلم ويفديه بأبيه، وأمه، ثم انـطـلق بهم إلى حديقته فبسط لهم بساطاً، ثم انطلق إلى نخلة، فجاء بقنو فـوضعه، فقال: النبي صلى الله عليه وسلم: أفلا تنقيت لنا من رطبه؟ فقال: يـارسـول الله! إنـي أردت أن تـخـتـاروا أو قـال تخيروا : من رطبه وبسره، فـأكـلـوا وشـربوا من ذلک الماء، فقال: رسول الله صلى الله عليه وسلم: هذا والذي نفسي بيده من النعيم الذي تسئلون عنه يوم القيمة، ظل بارد، ورطـب طـيـب، ومـاء بـارد، فـانطلق أبو الهيثم ليصنع لهم طعاماً، فقال النبي صلى ا لله عـلـيـه وسـلـم: لا تـذبـحـن ذات در، فذبح لهم، عناقًا، أوجديًا، فـأتاهم بها، فأكلوا الحديث . (ترمذي، باب ماجاء في معيشة أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم، النسخة الهندية ۲/ ٦٢، دارالسلا رقم: ٢٣٦٩)

ان دونوں روایتوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کھانے کے بعد یا کھانے سے پہلے کبھی اتفاقاً پانی پیا ہے؛ لیکن دونوں روایتوں میں تاویل کی گنجائش ہے، پہلی روایت کو دوسری روایت کے ساتھ منطبق کر کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ نفوس قدسیہ کی اس جماعت کو ابوالہیثم کے پاس پہونچتے ہی کھجور کا خوشہ پیش کیا گیا، اس کے بعد بکری کو ذبح فرمایا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ بکری ذبح کرنے کے بعد پکا کر تیار کرنے میں کچھ وقت لگا ہے، تو کھجور تناول فرما کر پانی ضرور پیا ہے، کافی وقفہ کے بعد کھانا تناول فرمایا اور کھانے کے بعد پینے کا ذکر نہیں ہے۔ اور مسلم شریف میں دونوں چیزوں کو ایک ساتھ ملا کر بیان کیا گیا ہے، اسی لئے مسلم کی روایت کو ترمذی کی روایت کے موافق کر کے مطلب نکالا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ مزید تفصیلی اور واضح روایت ہم کو نہیں ملی ؛ لیکن علامہ ابن قیم جوزی نے زاد المعاد میں یہ لکھا ہے کہ حضور ﷺ کی سنت یہ نہیں تھی کہ آپ کھانے کے بعد پانی تناول فرماتے : اس لئے کہ کھانے

کے اوپر پانی پینے سے غذا میں بگاڑ پیدا ہوکر پیٹ خراب ہوسکتا ہے، ابن قیمؒ نے فرمایا کہ کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد پانی پینا مکروہ ہے، اسی طرح تھکاوٹ کے بعد، جماع کے بعد ریاضت کے بعد، پھل کھانے کے بعد پانی پینے کو مکروہ لکھا ہے؛ لیکن کراہت پر کوئی دلیل نہیں نقل فرمائی، شاید طبی نقطۂ نظر سے نقصان دہ ہونے کی وجہ سے ابن قیمؒ نے مکروہ لکھا ہے، طبی دلیل ان کے پاس ہے شرعی دلیل نہیں ہے۔ زاد المعاد کی عبارت ملاحظہ فرمایئے۔

ولم يكن من هديه أن يشرب على طعامه، فيفسده ولاسيما إذا كان الماء حارًا، أوبارداً قوله ويكره شرب الماء عقيب الرياضة والتعب وعقيب الجماع وعقيب الطعام وقبله وعقيب أكل الفاكهة وإن كان الشرب عقيب بعضها أسهل من بعض وعقيب الحمام وعند الانتباه من النوم، فهذا كله مناف لحفظ الصحة. (زاد المعاد ٤/ ٢٢٤)

ان تمام چیزوں کے پیش نظر احقر اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے کراہت اور عدم کراہت کی کوئی دلیل نہیں ہے، کھانے سے پہلے، یا کھانے کے بیچ میں، یا کھانے کے بعد کوئی پانی پی لیتا ہے، تو اس میں کسی قسم کی شرعی کراہت کا حکم نہیں لگے گا؛ البتہ طبی نقطۂ نظر سے کھانے سے پہلے یا بعد میں پانی پینا نقصان دہ ہے؛ اس لئے طبی کراہت اس میں لازم آتی ہے، اور کھانے کے بیچ میں چونکہ طبی کراہت نہیں ہے؛ اس لئے بیچ میں پینے میں نہ شرعی کراہت ہے، نہ طبی کراہت ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۹۶۹)

میز و کرسی پر کھانا، کھانا

سوال [۱۰۷۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ شادی میں میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھا سکتے ہیں یانہیں؟

المستفتی: فاروق دستگیر، ستارا، مہا راشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آج کے زمانہ میں شادی وغیرہ میں میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھانا کسی خاص قوم کا شعار نہیں رہا ہے اور نہ ہی غرور وتکبر ہوتا ہے؛ اس لئے میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کی گنجائش ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۸/۱۲۱، دینی مسائل اور ان کا حل ۲۹۱-۲۹۲)

والحاصل أن الأكل عليه أي الخوان بحسب نفس ذاته لا يربو على ترك الأولوية-إلى قوله-لكنه جائز إن خلا عن قصد التكبر. (الكوكب الدرى مع الحاشية ۲/۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/رجب المرجب ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۶۰۳/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/۷/۱۴۳۵ھ

کھڑے ہو کر کھانا پینا

سوال [۱۰۷۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل جو دعوتوں اور پارٹیوں میں کھڑے کھڑے کھانے پینے کا رواج ہے، یہ کہاں تک درست ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بغیر عذر شدید کے کھڑے ہو کر کھانا پینا ممنوع اور ناجائز ہے؛ کیونکہ اولاً تو اس میں سنت کی خلاف ورزی ہے۔ نیز کھڑے ہو کر اور چلتے پھرتے کھانا پینا جانوروں کا طریقہ ہے، انسان کی فطرت اور امتیازی شان اس کے خلاف ہے؛ اس لئے مکروہ تحریمی ہے۔ (مستفاد: انوار نبوت ۶۴۱)

عن أنس أن النبي صلی اللّٰہ علیه وسلم نهیٰ أن يشرب الرجل قائماً ، فقيل : الأكل، قال : ذلک أشد. (ترمذي شريف، باب ما جاء في النهی عن الشرب قائماً، النسخة الهندية ۲/ ۱۰، دارالسلام رقم: ۱۸۷۹، مسند أبي داؤد الطيالسي ، دارالكتب العلمية بيروت ۲/ ۴۸۲، رقم: ۲۱۲۹ ، مسند أحمد بن حنبل ۳/ ۱۳۱، رقم: ۱۲۳۶۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۵۰۸)

کھڑے ہوکر کھانا پینا کیسا ہے؟

سوال [۱۰۷۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اس وقت جس مسئلہ پر میں کچھ لکھ رہا ہوں، وہ اگر چہ اتنا زیادہ اہم نہیں ہے، جس پر کسی بحث کی ضرورت ہو تاہم بعض صورتوں میں یہ اہم بھی ہوجاتا ہے، دراصل معاشرہ افراط وتفریط کا شکار ہے، کہیں تو دین کے بنیادی احکام کو بھی قابل اعتبار نہیں سمجھا جاتا اور کہیں غیر ضروری امور کو فرض وواجب سمجھ کر ان کے ترک کرنے والوں پر لعن طعن کی بوچھار کردی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ دونوں صورتیں اسلام کے لئے مضر ہیں، اب یہی کھڑے ہوکر کھانے پینے کا مسئلہ ہے، جو عام ہوگیا ہے، شادی بیاہ کے موقع پر بڑے شہروں میں عام طور پر کھڑے ہوکر کھانا مروج ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ مغرب کی تقلید ہے، اگر یہ وجہ ہے تو باعث افسوس ہے اور ظاہر ہے کہ ہر وہ کام جو دشمنان اسلام کی تقلید کی نیت سے ہو وہ مسلمانوں کے احساس کمتری اور ان کی شکست خوردہ ذہنیت کا ثبوت ہے؛ لیکن اگر اس کی وجہ جگہ کی قلت ہے یا کھانے میں آسانی ہوتی ہے، تو یہ مسئلہ قابل غور ہے، میرے بعض دوستوں نے مجھے بتایا کہ وہ کئی دعوتوں سے اس لئے واک

آؤٹ کر گئے کہ وہاں کھڑے ہوکر کھانے کا انتظام تھا، بعض جگہ کھانے کی میز پر بیٹھ کر انہوں نے مسنون طریقہ سے کھانا تناول فرمایا ایک مسجد کے امام صاحب کی امامت خطرہ میں ہے، اسی قسم کی اور بھی بہت سی غیر ضروری مشکلات لوگوں کو لاحق ہیں۔

میں یہاں اپنی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ کھانے کا ادب یہ ہے کہ بایاں پاؤں بچھا دے اور داہنا کھڑا رکھے یا بیٹھ کر دونوں گھٹنے کھڑے رکھے (بہار شریعت) اس کے علاوہ نظام آداب اپنی جگہ درست ہیں جو کتب فقہ میں مذکورہ ہیں، مگر یہاں صرف اتنی بحث ہے کہ اگر کسی نے کھڑے ہوکر کھالیا، تو شریعت میں اس کی کیا سزا مقرر کی گئی ہے؟ کیا اس پر لعن طعن جائز ہے؟ کیا اس پر لڑنا جھگڑنا درست ہے؟ مجھے اس سلسلہ میں یہی معلوم ہوسکا ہے کہ ان باتوں میں سے کوئی بھی صحیح نہیں، کھڑے ہوکر پانی پی لینا، چلتے پھرتے کھالینا جائز ہے اور ان افعال پر لوگوں کو لعن طعن کرنا درست نہیں اور کھانے کے آداب کے سلسلے میں جو احادیث وارد ہیں، اگر ان میں سے بعض صحیح بھی ہوں، تو ان کا تعلق کھانے کی مصلحتوں سے ہے، وہ شرعی اور تعبدی احکام نہیں ہیں۔ اب اس مسئلہ میں چند حوالہ جات ملاحظہ ہوں۔

(۱) سیدنا ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں چلتے پھرتے ہوئے کھایا کرتے تھے اور کھڑے ہوکر پیا کرتے تھے۔ (ترمذی شریف، باب الاکل قائما، نسخہ ہندیہ ۲/۱۰، دارالسلام رقم: ۱۸۸۰، تحفۃ الأحوذی ۳/۱۱۱)

(۲) ابن ماجہ اور ترمذی میں کبشہ انصاری سے روایت ہے کہ حضور ﷺ ان کے گھر تشریف لائے، گھر میں ایک مشکیزہ معلق تھا، آپ ﷺ نے منھ لگا کر کھڑے کھڑے اس مشکیزہ سے پانی پیا۔ (شامی ۱/۹۵، شمائل ترمذی ۱۵، ابن ماجہ ترمذی، بہار شریعت)

حالانکہ صحیح بخاری ومسلم کی حدیثوں میں آپ نے مشکیزہ کے دہانے سے پانی پینے کی ممانعت کی، ان دونوں احادیث میں تطبیق اس طرح دی گئی ہے کہ ممانعت اس لئے ہے کہ کہیں کوئی کیڑا وغیرہ منھ میں نہ چلا جائے اور اگر یہ نہ ہو تو جائز ہے، امام طحاویؒ

جو جلیل القدر حنفی امام ہیں، اسی کو راجح قرار دیتے ہیں کہ کھڑے ہوکر کھانے پینے میں مضائقہ نہیں اور ممانعت محض اس لئے ہے کہ ایسی حالت میں پھندا وغیرہ لگنے کا خطرہ ہوتا ہے، امام شعبیؒ نے بھی یہی فرمایا کہ کھڑے ہوکر پینا تکلیف کے خطرہ کی وجہ سے مکروہ ہے۔ (شامی ۱۲۹/۳، طحاوی شریف ۳۵۸/۲)

فقہاء نے مسافر کے لئے چلتے پھرتے پینے کو بھی جائز قرار دیا۔ (ص:۹۶)

اب روایات میں تو ٹیک لگا کر کھانے کی ممانعت ہے، مگر ہم نے بہت سے بزرگوں کو کرسی پر ٹیک لگائے ہوئے کھاتے دیکھا، کھاتے وقت جوتا اتارنا چاہئے، مگر جوتے سمیت کھاتے ہیں اور پان کون نہیں کھاتا، سب سڑکوں پر چلتے پھرتے کھاتے ہیں، آپ اس کو مشروب کہیں یا کیا جو کچھ بھی کہیں کھڑے کھڑے اور چلتے پھرتے اور نہ معلوم کس کس حال میں اس کو تناول فرمایا جاتا ہے۔ اب اگر کوئی گنڈ یریاں یا ریوڑیاں چلتے پھرتے کھائے، تو اس کی شہادت وثقاہت کیوں مجروح ہوتی ہے، یہ تمام سطور لکھنے کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ کھڑے ہوکر کھانے کو افضل و اعلیٰ بتایا جائے؛ بلکہ مقصود یہ ہے کہ اگر بوقت ضرورت ایسا ہو جائے، یا کوئی کھڑے ہوکر کھا پی لے، تو وہ شریعت کی نگاہ میں مجرم نہیں اور اس پر طعن ضروری نہیں۔ پس راہ اعتدال کو نہ چھوڑنا چاہیے اور اسلام نے لوگوں کو جو سہولتیں دی ہیں، وہ ان کو ملنی چاہیے۔ (ماخوذ ماہنامہ شمشی آواز مئی ۱۹۹۲ء)

کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیان دین مسئلہ ذیل میں کہ رسالہ شمشی آواز کی مذکورہ عبارت میں کھڑے ہوکر کھانے کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلہ میں حدیث وفقہ کی کتابوں سے حوالہ پیش کیا ہے۔

نیز پان، سیگریٹ وغیرہ چلتے پھرتے کھانے کے استعمال کرنے سے بھی استدلال کیا ہے، تو یہ کہاں تک درست ہے؟ جو بھی صحیح صورت ہو، اس کو تحریر فرمائیے۔

المستفتی: ریاض الحسن، عرف منے، جوتا والے، گول گھر منڈی چوک، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کھڑے ہوکر کھانا کھانا مغربی تہذیب اور اغیار کے ساتھ مشابہت کی بناء پر ممنوع اور ناجائز ہے، اس سے احتراز ہر مسلمان پر لازم ہے، اور حدیث شریف میں اس کی صراحت آئی ہے کہ جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے، اس کا حشر اسی قوم کے ساتھ ہوگا اور کھڑے ہوکر کھانے کا فیشن مغربی یہود ونصاریٰ سے آیا ہے اور یہ انہیں کی تہذیب ہے؛ اس لئے اس کا ترک ہر مسلمان پر لازم ہے۔ حدیث میں ہے۔

عن ابن عمرؓ، قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: من تشبہ بقوم فهو منهم. (سنن أبي داؤد، باب في لبس الشهرة، النسخة الهندية ۲/۵۵۹، دارالسلام رقم: ۴۰۳۱)

اور رسالہ شمشی آواز میں جو حوالے پیش کئے گئے ہیں، وہ سب خاص خاص عذر کے ساتھ خاص خاص مواقع کے ساتھ مخصوص ہیں، ان حوالوں سے استدلال کر کے جواز ثابت نہیں کیا جاسکتا اور خود ان حوالوں کے خلاف صحیح حدیثیں ممانعت کی بھی موجود ہیں۔

عن أنسؓ أن النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم، نهی أن يشرب الرجل قائماً، فقيل الأكل قال ذاک أشد. (ترمذي شريف، باب ماجاء في النهی عن الشرب قائماً، النسخة الهندية۲/۱۰، دار السلام رقم: ۱۸۷۹، مسند أبي داؤد الطيالسي، دارالكتب العلمية بيروت ۲/۴۸۲، رقم: ۲۱۲۹، مسند أحمد بن حنبل ۳/۱۳۱، رقم:۱۲۳۶۳)

اور پان وغیرہ کے ساتھ قیاس کر کے کھڑے ہوکر کھانے کو جائز قرار دینا؛ اس لئے درست نہیں ہے کہ پان وغیرہ کے مسئلہ میں اغیار کی مشابہت نہیں ہے اور نہ ہی عرف میں معیوب ہے اور کھڑے ہوکر کھانے کی اصل ممانعت اغیار کی مشابہت ہے؛ اس لئے قیاس صحیح نہیں ہے اور جگہ کی تنگی کا عذر بھی مشاہدہ کے خلاف ہے؛ اس لئے کہ عام طور پر کھڑے ہوکر کھانے کا انتظام وہاں کیا جاتا ہے، جہاں جگہ کی تنگی نہیں ہوتی، جو لوگ ہر طرح کا انتظام کر سکتے ہیں، وہی اس طرح کا انتظام کرتے ہیں؛ اس لئے یہ عذر بھی فضول ہے؛ لہٰذا

کھڑے ہوکر کھانا کھلانے کا جو فیشن اس زمانہ میں جنم لے رہا ہے، وہ ہرگز جائز نہیں ہے، اس کا ترک ہر مسلمان پر لازم ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/ ۲۹۲۱)

تین انگلیوں سے کھانا کب مسنون ہے؟

سوال [۱۰۷۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مشہور ہے کہ تین انگلیوں سے کھانا مسنون ہے، تو کیا اس سے زائد انگلیوں سے کھانا خلاف سنت ہے، تین انگلیوں سے روٹی کا کھانا تو سمجھ میں آتا ہے؛ لیکن چاول جیسی چیز کس طرح کھائی جائے گی؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: عام حالات میں جس چیز کو تین انگلیوں سے کھانا آسان ہو، اس کو تین انگلیوں سے کھانا مسنون ہے؛ لیکن چاول وغیرہ یا ایسی چیز جس کا تین انگلیوں سے کھانا مشکل ہو، اس میں چوتھی اور پانچوی انگلی شامل کرنا خلاف سنت نہیں؛ اس لئے کہ آپ ﷺ سے پانچ انگلیوں سے کھانا بھی ثابت ہے۔

الأكل بالثلاث سنة فلا يضم إليها الرابعة، والخامسة إلا لضرورة وفي حديث مرسل أنه صلى الله عليه وسلم كان إذا أكل أكل بخمس؛ ولعله محمول على المائع، أو على القليل النادر ...... فإن عادته في أكثر الأوقات هو الأكل بثلاث أصابع. (مرقاة المفاتيح، كتاب الأكل، مكتبه امداديه ملتان ۸/ ۱۶۲-۱۶۳، تكملة فتح الملهم، اشرفيه ديوبند ٤/ ۲۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۴۸۷)

کیا کھانے کی ابتداء وانتہاء نمک پر کرنا مسنون ہے؟

سوال [۱۰۷۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کھانا شروع کرنے سے پہلے نمک چاٹنا یا نمک سے کھانے کی ابتداء کرنا اورنمک پر ہی کھانے کو ختم کرنا، کیا ایسا کرنا نبی ﷺ یا صحابہ رضی اللہ عنہم سے کسی روایت سے ثابت ہے؟ بعض فقہی کتب میں جو سنت یا مستحب لکھا ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟ بعض علماء بھی محض فقہی کتابوں کو دیکھ کر اس عمل کو مستحب قرار دے رہے ہیں؛ جبکہ شمائل کی کسی کتاب میں نہیں مل رہا ہے۔ دارالافتاء سے اس سلسلہ میں وضاحت مطلوب ہے۔

المستفتی: عبدالرشید قاسمی، سیڑھا، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: کھانے کو نمک سے شروع کر کے نمک پر ختم کرنے سے متعلق فقہاء نے مستحب یا مسنون لکھا ہے، اس سلسلہ میں احادیث شریفہ مرفوع متصل تو دستیاب نہ ہوسکیں؛ البتہ ضعیف حدیث وآثار صحابہؓ اس سلسلہ میں موجود ہیں۔

حدیث شریف ملاحظہ فرمایئے:

عن علي أنه قال: من ابتدأ غذاءه بالملح أذهب عنه سبعين نوعاً من البلاء. (شعب الإيمان، باب في المطاعم والمشارب، دارالكتب العلمية بيروت ۱۰۳/۵، رقم: ۵۹۵۲)

ونقل السيوطي عن الأصبهاني عن علقمة بن سعد بن معاذ حدثني أبي عن أبيه عن جده مرفوعاً استعينوا طعامكم بالملح فوالذي نفسي بيده أنه ليرد ثلاثاً وسبعين نوعاً من البلاء. (اللآلي المصنوعة في الأحاديث الموضوعة للسيوطي ۱۷۹/۲، تذكرة الموضوعات للفتنی ۱٤۱/۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۶۹۶/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۵/۱۱ھ

نمک سے کھانا شروع کرنے اور نمک پر ختم کرنے کا حکم

سوال[۱۰۷۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ **من السنة أن يبدأ بالملح و يختم بالملح** کیا یہ حدیث ہے؟ عالمگیری وغیرہ میں لکھا ہے کہ کھانے کی ابتداء نمک سے کرے اور ختم بھی نمک سے کرے اور غالباً زادالمعاد میں لکھا ہے کہ ایسا کرنے پر ۷۵/ بیماریوں سے شفا ہے۔

معلوم یہ کرنا ہے کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا ہم لوگ اپنے دستر خوان پر نمک رکھا کریں تاکہ پہلے تھوڑا سا نمک چکھ لیں، پھر کھانا شروع کریں اور کھانے کے بعد بھی نمک کھالیں۔اسی بات کو مفتی کمال الدین صاحب احمد راشدی استاذ دارالعلوم کراچی، پاکستان نے اپنی کتاب (کھانے پینے کی حلال حرام چیزیں) کے ۱۰۹ پر لکھا ہے، کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد تھوڑا نمک چکھنے کو فقہاء کرام نے مستحب لکھا ہے۔اس سلسلہ میں ہم تمام دعوت وتبلیغ کے ساتھی آپ سے وضاحت چاہتے ہیں، کیا نمک سے ابتداء مسنون ہے یا کسی بھی نمکین کھانے سے ابتداء کرنے میں اس استحباب پر عمل ہوجائے گا۔

المستفتی: جملہ احباب حلقہ نہٹور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: نمک یا نمکین سے کھانا شروع کرنا اور ختم کرنا فقہاء نے مسنون لکھا ہے؛ لیکن کسی صحیح اور صریح حدیث میں اس کا ثبوت نہیں ملتا؛ البتہ بعض نہایت کمزور اور موضوع قسم کی روایت میں اس کا ذکر موجود ہے؛ اس لئے اس کو باضابطہ سنت یا مستحب نہیں کہا جاسکتا، ہاں البتہ اتنی بات ہے کہ اس زمانہ میں نمکین یا نمک سے شروع کر کے کھانا کھانے کے بعد پھر نمک چکھنے کی عادت رہی ہے، تو اس کو سنن عادیہ کہا جاسکتا ہے، تو حضرات فقہاء نے سنن عادیہ کی قبیل سے لکھا ہے، سنن ہدیٰ کی قبیل سے نہیں اور اس کا مدار عادت اور رغبت پر ہے شریعت پر نہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱۱۲/۴)

عن عليؓ أنه قال: من ابتدأ غذاءه بالملح اذهب عنه سبعين نوعاً من البلاء. (شعب الإيمان، باب في المطاعم والمشارب، دارالكتب العلمية بيروت ٥/١٠٣، رقم: ٥٩٥٢)

ونقل السيوطي عن الأصبهاني عن علقمة بن سعد بن معاذ حدثني أبي عن أبيه عن جده مرفوعاً استعينوا طعامكم بالملح فوالذي نفسي بيده أنه يرد ثلاثاً وسبعين نوعاً من البلاء. (اللآلي المصنوعة في الأحاديث الموضوعة للسيوطي ٢/١٧٩، تذكرة الموضوعات للفتني ١/١٤١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ رجب المرجب ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۳۶۷/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۷/۲۴ھ

سر ڈھانک کر کھانا کھانا کیسا ہے؟

سوال [۱۰۷۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کیا کھانا کھاتے وقت یا پانی پیتے وقت کھانے پینے کے آداب میں سر ڈھانک کر کھانا پینا، یا اس کا تذکرہ ملتا ہے، جیسے بیت الخلاء جاتے وقت سر ڈھانک کر جانے کا ذکر ملتا ہے؟

المستفتی: عبدالرشید قاسمی، سیڈھا، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ٹوپی اوڑھ کر کھانا کھانے کی بات صراحت کے ساتھ ثابت نہیں ہے اور فقہاء نے لکھا ہے کہ ننگے سر کھانا کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ لیکن مہذب مجلسوں اور تقریبوں میں ننگے سر پہونچنا خلاف ادب ہے؛ اس لئے ایسے مواقع میں ٹوپی پہن کر پہونچنا اور ٹوپی پہن کر کھانا کھانا ادب کے دائرہ میں داخل ہوگا۔

ولا بأس بالأكل متكئًا، أو مشكوف الرأس في المختار. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، زكريا ٩/٤٩٠، كراچي ٦/٣٤٠)

ولا بـأس بـالأكل مكشوف الرأس كذا في الخلاصة. (هندية، الباب الحادي عشر في الكراهة في الأكل و ما يتصل به، زكريا قديم ٥/٣٣٧، جديد ٥/٣٩١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۰۹۹/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۵/۱۳ھ

کھاتے وقت سر ڈھانکنا کیسا ہے؟

سوال [۱۰۷۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کھانا کھاتے وقت اور پانی پیتے وقت سر ڈھانکنے کا کیا حکم ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کھانا کھاتے وقت اسی طرح پانی پیتے وقت سر ڈھانکنا نہ لازم ہے اور نہ ہی سنت ہے؛ جبکہ کبر وتکبر نہ ہو؛ بلکہ کھلے سر کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (مستفاد: محمود یہ میرٹھ ۴۵/۲۷)

لا بـأس بـالأكـل متـكـئًا إذا لم يكن على وجه التكبر و هو المختار.

(خلاصة الفتاوى ٣٥٩/٤)

لا بـأس بـالأكـل متـكـئـا إذا لـم يـكـن عـلى وجـه التكبر وهو الـمـخـتـار، وكـذا مكشوف الرأس. (التاتارخانية، زكريا ١٨/١٤٣، رقم: ٢٨٣٠٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ رجب المرجب ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۶۰۳/۴۱)

ٹوپی پہن کر کھانا کھانا

سوال[۱۰۷۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں نے اکثر لوگوں سے سنا ہے کہ ٹوپی اوڑھ کر کھانا کھانا اور پانی پینا سنت ہے؛ جبکہ ایک مولوی صاحب کا کہنا ہے کہ ٹوپی اوڑھ کر کھانا کھانا اور پانی پینا سنت نہیں ہے، یہ سنت ہے یا مستحب؟

المستفتی: محمد یونس، نیو سیلم پور- دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سر ڈھانک کر کھانے پینے کا سنت یا مستحب ہونا کسی حدیث یا فقہ کے جزئیہ سے ثابت نہیں؛ بلکہ فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ ننگے سر کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں۔

ولا بأس بالأكل مشكوف الرأس وهو المختار. (عالمگيري، الباب الحادي عشر في الكراهة في الأكل وما يتصل به، زكريا قديم٥/٣٣٧، جديد ٥/٣٩١)

والأكل مشكوف الرأس ......فيه روايتان والمختار أنه لا يكره. (البحر الرائق، كتاب الكراهية، فصل في الأكل والشرب، زكريا ٨/٣٣٨، كوئٹه ٨/١٨٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰ رمحرم الحرام ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/۶۰۰۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۱/۳۰ھ

خورد ونوش کے وقت سر ڈھانکنا

سوال[۱۰۷۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خورد ونوش کے وقت تغطۂ رأس کیا سنت ہے؟ اگر سنت ہے تو حدیث نبوی کی

نشاندہی مطلوب ہے۔ نیز تغطۂ رأس عند دخول الخلاء کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: روح الامین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کھانے پینے کے وقت خاص طور پر سر ڈھانکنا کسی حدیث سے ثابت نہیں۔

ولا بأس بالأكل متكئا أو مكشوف الرأس في المختار . (شامي، كتاب الحظر والإباحة، زكريا٩/ ٤٩٠، كراچي ٦/ ٣٤٠)

ہاں البتہ بیت الخلاء میں سر ڈھانک کے داخل ہونا مستحب ہے۔

ويدخل مستور الرأس. (هندية، الباب السابع، زكريا قديم ١/ ٥٠، جديد ١/ ١٠٦، حاشية الطحطاوي، دارالكتاب ديوبند ١/ ٥١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍صفر المظفر ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳؍ ۵۶۱۹)

کھانا کھانے اور پانی پینے کے وقت سر ڈھانکنا

سوال [۱۰۷۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جس طرح بیت الخلاء جانے کے آداب میں لکھا ہے کہ سر ڈھانپ کر بیت الخلاء جانا مسنون ہے، کیا کھانا کھاتے وقت یا پانی پیتے وقت بھی سر ڈھانکنا مسنون ہے، ہمارے یہاں اہل علم حضرات یہاں تک اہتمام کرتے ہیں کہ پانی پیتے وقت اگر ٹوپی نہ ہو، تو ایک ہاتھ سر پر رکھ لیتے ہیں یا پنکھا وغیرہ ہو، وہ سر پر رکھ لیتے ہیں، جس سے ہم لوگ سمجھتے ہیں کہ کھانا کھاتے یا پانی پیتے وقت سر ڈھانکنا مسنون ہے؛ لیکن کسی کتاب میں ہم کو نہیں ملا کہ کھانا کھاتے یا پانی پیتے وقت سر ڈھانکنا مسنون ہے؛ اس لئے دارالافتاء سے

رجوع کرر ہے ہیں مع حوالہ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: جملہ احباب، نہٹور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: کھانا کھاتے وقت یا پانی پیتے وقت سر ڈھانکنا کسی حدیث اور فقہ کے جزئیہ سے اس کا مسنون ہونا ثابت نہیں ہے؛ بلکہ حضرات فقہاء نے ننگے سر کھانے پینے کو مباح لکھا ہے؛ اس لئے سر ڈھانک کر کھانا اور ننگے سر کھانا دونوں بلا کراہت جائز ہیں؛ لہٰذا کھاتے اور پیتے وقت سر ڈھانکنے کا اتنا اہتمام کرنا کہ ٹوپی نہ ہونے کی صورت میں سر کے اوپر ہاتھ یا پنکھا رکھ دیا جائے یہ بے جا تکلف ہے، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

ولا بأس بالأكل مكشوف الرأس وهو المختار. (عالمگيري، الباب الحادي عشر في الكراهة في الأكل وما يتصل به، زكريا قديم٥/٣٣٧، جديد ٥/٣٩١، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٨/١٤٣، رقم:٢٨٣٠٣، البحر الرائق، زكريا٨/٣٣٨، كوئٹه ٨/١٨٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ ررجب المرجب ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۳۶۷/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۷/۲۴ھ

پانچوں انگلیوں سے کھانا کھانے کی صورت میں چاٹنے کی ترتیب

سوال [۱۰۷۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شمائل کی کتب میں اتنا تو مل رہا ہے کہ اگر کھانا تین انگلیوں سے کھایا ہے، تو فراغت پر انگلیوں کے چاٹنے کی ترتیب پہلے بڑی انگلی، پھر شہادت کی انگلی، پھر انگوٹھا، اگر پانچوں انگلیوں سے کھانا کھایا ہے، تو فراغت پر چاٹنے کی کیا ترتیب ہے؟

المستفتی: عبد الرشید قاسمی، سیڈھا، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر پانچوں انگلی سے کھانا کھایا جائے، تو مذکورہ تینوں انگلیوں کو اسی ترتیب سے چاٹا جائے جو روایت میں منقول ہے، اور مذکورہ تینوں کے علاوہ بقیہ کو ان کے بعد چاٹا جائے۔

عن كعب بن عجرة قال: رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يأكل بأصابعه الثلاث: بالإبهام، والتي تليها، والوسطىٰ، ثم رأيته يلعق أصابعه الثلاث قبل أن يمسحها، ويلعق الوسطىٰ، ثم التي تليها، ثم الإبهام .

(المعجم الأوسط، دار الفكر ١/٤٤٨، رقم: ١٦٤٩، مجمع الزوائد، دارالكتب العلمية بيروت ٥/٢٨، رقم: ٧٩٣٩)

عن أنسؓ قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم إذا أكل طعاماً لعق أصابعه الثلاث . (شمائل ترمذی ۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/۱۱۰۹۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۵/۱۳ھ

کھانے کے بعد دانتوں کو صاف کر کے اس پانی کو نگلنا

سوال [۱۰۷۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے کھانا کھانے کے بعد منھ کے اندر پانی لیا اور منھ میں پانی رہتے ہوئے اس نے اپنی انگلی سے دانتوں کو صاف کیا؛ لہٰذا اب اس کے لئے اس پانی کا پینا کیسا ہے؟ جو پانی منھ کے اندر ہے، جائز ہے یا ناجائز یا مکروہ؟ اس کا جواب مرحمت فرما کر ثواب دارین حاصل کریں۔

المستفتی: حفظ الرحمٰن، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر منھ میں کھانے کے اجزاء موجود ہیں اور زید یہ چاہتا ہے کہ یہ اجزاء ضائع نہ ہوں، اس نیت سے وہ منھ میں پانی لے کر انگلی سے صاف کر کے پانی کو پی لیتا ہے، تو اس میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں۔ نیز یہ لوگوں کی اپنی طبیعتوں پر موقوف ہے۔
(مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۷/۳۳۴، ڈابھیل ۱۸/۱۷)

کما استفید من هذه العبارة: والتحقيق أن المفتي في الوقائع لابدله من ضرب اجتهاد ومعرفة بأحوال الناس ......فينظر في صاحب الواقعة إن كان ممن يعاف طبعه ذلك أخذ بقول أبي يوسفؒ، وإن كان ممالا أثر لذلك عنده أخذ بقول زفر. (حاشية چلپي، الصوم، باب مايفسد الصوم وما لا يفسده، زكريا ۲/۱۷۳، مكتبه امدادية ملتان ۱/۳۲۵، شامي، كراچي ۳۹۸، زكريا ۳/ ۳۷۰، ۳۷۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۲۶۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۶/۸ھ

کھانے کے بعد پلیٹ میں کھانا چھوڑنا

سوال [۱۰۷۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کھانے کے بعد کھانا پلیٹ میں چھوڑنا کیا سنت ہے یا پلیٹ کو اچھی طرح انگلی سے صاف کرنا سنت ہے؟

المستفتی: عبدالجلیل، بردوانی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کھانے کے بعد پلیٹ کو اچھی طرح صاف

کرنے کی تاکید حدیث شریف میں آئی ہے کہ کھانے کے بعد ادھر اُدھر سے پلیٹ کو خوب اچھی طرح صاف کر دیا جائے، اس عمل سے گناہ معاف ہوتے ہیں اور برتن کھانے والے کے لئے دعاء کرتا ہے؛ لہٰذا پلیٹ کو اچھی طرح صاف کرنا سنت ہے۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ۳۸۹/۱۵، ڈابھیل ۷۳/۱۸)

عن نبيشة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من أكل في قصعة ثم لحسها استغفرت له القصعة. (ترمذي، باب ماجاء في اللقمة تسقط، النسخة الهندية ٢/٢، دارالسلام رقم ١٨٠٤، سنن ابن ماجه، باب تنقية الصحفة، النسخة الهندية ٢/٢٤٣، دارالسلام رقم: ٣٢٧١، سنن الدارمي دارالمغني ٢/١٢٩٠، رقم: ٢٠٧٠، مسند أحمد بن حنبل٥/٧٦، رقم: ٢١٠٠١، مشكوة ٣٦٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۱۶۳/۳۵)

کھائے ہوئے برتن میں ہاتھ دھونے کا حکم

سوال [۱۰۷۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کھانے کے بعد جس میں کھانا کھایا، اس میں ہاتھ دھونا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ بعض لوگ اس عمل کو برا سمجھتے ہیں؛ جبکہ بعض جگہ عرف اور عادت یہی ہے کہ کھانے کے بعد اسی برتن میں بلا تردد ہاتھ دھوتے ہیں، شرعی نقطۂ نظر کیا ہے، ہم نے امام غزالیؒ کی کتاب کیمیائے سعادت میں دیکھا کہ کھانے کے بعد اسی برتن میں ہاتھ دھوکر وہ پانی پینے سے ایسا ثواب ہوگا کہ گویا ایک غلام کو آزاد کیا۔

نیز علامہ مناویؒ نے شمائل کی شرح جمع الوسائل کے حاشیہ میں لکھا ہے۔

في الإحياء: يقال من لعق القصعة وشرب مائها كان له كعتق رقبةٍ.

ان سے ہاتھ دھونے کا ثبوت ملتا ہے؛ جبکہ شمائل کبریٰ میں اتحاف کے حوالے سے منقول ہے کہ جس برتن میں کھانا کھایا ہو، اس میں ہاتھ دھونا بے ادبی ہے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس سلسلہ میں قطعی فیصلہ کیا ہے؟ اور مذکورہ منقولات کا جواب کیا ہے؟ تفصیل سے روشنی ڈالیں عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: محمد مشتاق احمد، درجۂ ہفتم دارالعلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: امام غزالیؒ نے کیمائے سعادت میں کھانا کھانے کے بعد اسی برتن میں ہاتھ دھوکر اس پانی کو پی لینے کا ثواب ایک غلام آزاد کرنے کے برابر لکھا ہے، یہ بات ہم نے کہیں نہیں دیکھی ہے، ہاں البتہ کیمائے سعادت میں اتنا ضرور لکھا ہے کہ جس برتن میں کھانا کھایا ہو، اس برتن کو دھوکر پانی پی لیا جائے، تو وہ ثواب ملے گا، جو سوال نامہ میں درج ہے، شاید سائل کو یہ دھوکہ ہو رہا ہے کہ برتن دھونے کی بات کو اس نے ہاتھ دھونا سمجھا ہو؛ حالانکہ وہاں برتن میں ہاتھ دھونے کا تذکرہ نہیں ہے اور احیاء العلوم کی عبارت یوں ہے۔

من لعق القصعة وغسلها وشرب ماءها كان له كعتق رقبة .

(احیاء العلوم علی هامش الإتحاف ۵/ ۲۲۵)

اس میں برتن دھونے کا تو ذکر ہے، مگر ہاتھ دھونے کا ذکر نہیں ہے، شمائل کبریٰ کا حوالہ دیکھ لیا گیا، انہوں نے اتحاف السعادۃ ۵/۲۲۵ کا حوالہ دیا ہے، وہ بھی دیکھ لیا اور اتحاف کے اندر ایسی کوئی عبارت موجود نہیں ہے، جس میں اس بات کی وضاحت ہو کہ جس برتن میں کھانا کھایا ہو، اس میں ہاتھ دھونا بے ادبی ہے۔

الخامس: أن غسل اليد في الطست لا بأس به، وله أن يتنخم فيه، إن كان أكل وحده، وإن أكل مع غيره، فلا ينبغي أن يفعل ذلك.

احیاء العلوم کی عبارت کے ذیل میں شرح کرتے ہوئے اتحاف کی عبارت یوں لکھی گئی ہے۔

وله أن يتنخم فيه عند غسل يده وفمه، والنخامة من كان من الحلق

إن أكل وحده، وإن أكل مع غيره، فلاينبغي أن يفعل ذلک، فربما يستقذره أخوه وهو مخالف للأدب. (الاتحاف ٥/٢٢٩)

اب احیاء العلوم اور اتحاف دونوں کی عبارتوں پر نظر ڈالیں، تو ان میں کہیں بھی یہ بات نہیں ہے کہ جس برتن میں کھانا کھایا ہو، اس میں ہاتھ دھونا بے ادبی ہے؛ بلکہ اتحاف کی عبارت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر تنہائی میں کسی برتن میں ہاتھ دھویا جائے اور اسی میں کلی بھی کر لی جائے اور کلی کے ساتھ بلغم وغیرہ بھی نکال دیا جائے، تو کوئی حرج نہیں؛ البتہ اگر دوسروں کے ساتھ کھانا کھایا جائے، تو لوگ کسی ایک برتن میں ہاتھ دھوئیں تو اس میں ہاتھ اور منھ دھونے کے ساتھ ساتھ کلی اور غرغرہ کر کے بلغم نکال کر ڈالنا خلاف ادب ہے؛ اس لئے کہ اس سے دوسروں کو نفرت اور تکلیف ہوتی ہے؛ لہٰذا کھانا کھا کر اسی برتن میں ہاتھ دھونے کے بارے میں نہ کوئی ممانعت ثابت ہے اور نہ ہی کوئی فضیلت ثابت ہے؛ لہٰذا اس کے بارے میں جس طرح بھی سہولت ہو، اس پر عمل کرنے کی گنجائش ہوگی، مدارس کے طلبہ کے پاس صرف ایک برتن ہوتا ہے، اسی میں کھانا لیتے ہیں، اسی میں کھاتے ہیں، اسی میں ہاتھ دھوتے ہیں اور اس کو دھو کر رکھ لیتے ہیں، اس میں کسی قسم کی قباحت نہیں اور جس علاقہ کے لوگوں میں برتن میں ہاتھ دھونے کا معمول نہیں ہے، وہ برتن میں ہاتھ نہ دھوئیں، تو ان پر کوئی اعتراض نہیں اور جن علاقوں میں اسی برتن میں ہاتھ دھونے کا معمول ہے، اس میں کوئی اشکال نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۱۰۰۰۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/۴/۱۴۳۱ھ

کھانے کے بعد پانی پینا کیسا ہے؟

سوال [۱۰۷۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ کسی حدیث شریف سے یہ ثابت ہے کہ کھانا کھانے کے بعد پانی پینا ممنوع ہے اور کیا کسی حدیث شریف سے کھانا کھانے کے درمیان میں پانی پینے کا ثبوت ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کھانا کھانے کے بعد پانی پینے کی ممانعت اور کھانا کھانے کے دوران پانی پینے کی ترغیب کسی حدیث شریف سے ثابت نہیں؛ بلکہ یہ طبی اور حکیمانہ بات ہے، جیسا کہ شیخ الرئیس بوعلی سینا نے فرمایا کہ پانی پینے کا بہتر وقت وہ ہے کہ جب کھانا ہضم پر آوے اور ہضم کے بعد پیوے تو بہت بہتر ہے اور بعض اطباء نے لکھا ہے کہ کھانے سے پہلے پانی پینا معدے کی حرارت کو بجھاتا ہے، اور ہضم کے بعد گرمی پیدا کرتا ہے اور بدن کو موٹا کرتا ہے اور بقراط نے کہا ہے کہ کھانے پر پانی پینا برا ہے۔ تجربہ سے ثابت ہے کہ کھانے کے بعد پانی پینے میں عام طور پر کھانا خراب ہوجاتا ہے اور تیزابیت پیدا ہوجاتی ہے۔ (طب نبوی ۴۳، بیروت ۱۷۴)

ويكره شرب الماء عقيب الرياضة والتعب وعقيب الجماع وعقيب الطعام وقبله وعقيب أكل الفاكهة، فهذا كله مناف لحفظ الصحة.

(زاد المعاد، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٢٢٤)

إن البطن إذا امتلأ من الطعام ضاق عن الشرب، فإذا ورد عليه الشراب ضاق عن النفس وعرض له الكرب والتعب، وصار محله بمنزلة الحامل الثقيل، هذا إلى ما يلزم ذلک من فساد القلب وكسل الجوارح عن الطاعات وتحولها في الشهوات التي يستلزمها الشبع.

(زاد المعاد، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ر صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۵۲/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۲/۲۸ھ

کھانا کھانے کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا

سوال [۱۰۷۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کھانا کھانے کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعاء کرنا کیسا ہے؟، چند عالم کہتے ہیں کہ کھانا کھانے سے پہلے یا بعد میں دعوت کرنے والوں کی طرف سے دعاء کی درخواست ہو، تو ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے؟ اور یہ کہاں تک صحیح ہے، اور کہاں تک غلط؟

المستفتی: محمد عمرو

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کھانا کھانے کے بعد دعاء پڑھنے کا ثبوت حدیث سے ہے اسی طرح کسی کے یہاں دعوت کھانے کے بعد بھی دعاء کرنا حدیث سے ثابت ہے؛ لیکن یہ دعاء ہاتھ اٹھا کر کرنا ثابت نہیں۔

عن أبي سعيد الخدريؓ قال: كان النبى صلى الله عليه وسلم: إذا أكل، أو شرب قال: الحمد لله الذي أطعمنا وسقانا وجعلنا مسلمين. (ترمذي شريف، باب ما يقول إذا فرغ من الطعام، النسخة الهندية ٢/١٨٤، دارالسلام رقم: ٣٤٥٧)

عن عبد الله بن زبير قال: أفطر رسول الله صلى الله عليه وسلم عند سعد فقال: أفطر عندكم الصائمون وصلت عليكم الملائكة، وأكل طعامكم الأبرار. (صحيح ابن حبان، دارالفكر ٥/٢٥٨، رقم: ٤/٥٣٠٤، مسند الدارمي دارالمغني ٢/١١١١، رقم:١٨١٣ سنن ابن ماجه، باب في ثواب من فطر صائما، النسخة الهندية ١/١٢٥، دارالسلام رقم:١٧٤٧، سنن أبي داؤد، باب ماجاء في الدعاء لرب الطعام إذا أكل عنده، النسخة الهندية ٢/٥٣٨، دارالسلام رقم: ٣٨٥٤)

عن عبد الله بن يسر السلمى قال: جاء رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى أبي فنزل عليه، فأتاه بطعام وحيس وسويق، وتمر، ثم أتاه

بشراب، فناول من عن يمينه قال: و كان يأكل التمر و يضع النوىٰ على ظهر إصبعيه السبابة، والوسطىٰ، ثم يرمى به، ثم دعالهم فقال: اللّٰهم بارك لهم فيما رزقتهم و اغفر لهم وارحمهم. (صحيح بن حبان، دارالفكر ۲۰۹/۵، رقم: ۵۳۰۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ذی الحجہ ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۵۵۴/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۱۲/۳ھ

سب سے افضل ترین پانی کونسا ہے؟

سوال [۱۰۷۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سب سے افضل ترین پانی کونسا پانی ہے؟ آب زم زم سے بھی کوئی پانی افضل ہے؟ حدیث کے حوالہ سے جواب عنایت فرمائیے۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سب سے افضل پانی وہ پانی ہے، جو آپ ﷺ کی انگشت مبارک سے نکلا تھا، اور دنیا کے موجود پانیوں میں سب سے افضل پانی آب زم زم ہے اور سرور کائنات ﷺ کی انگلیوں کے پوروں سے جو پانی نکلتا تھا، وہ آب زم زم سے بھی افضل ہے۔

عن جابر بن عبد الله، هذا الحديث قال: لقد رأيتني مع النبي صلى الله عليه وسلم وقد حضرت العصر، وليس معنا ماء غير فضلة، فجعل في إناء فأتي النبي صلى الله صلى الله عليه وسلم به، فأدخل يده فيه و فرج أصابعه......فتوضأ الناس..... فعلت أنه بركة، قلت لجابر: كم كنتم يومئذ؟ قال: ألفا وأربع مأئة. (بخاري شريف، باب شرب البركة، والماء المبارك، النسخة الهندية ۸۴۲/۲، رقم: ۵۴۲۲، ف: ۵۶۳۹)

أفضل المياه ما قد نبع بين أصابع النبي المتبع
فماء زمزم فماء الكوثر فنيل المصر ثم باقي الأنهر

(الحموی علی الأشباه کامل الفنّ الرابع کتاب الطهارة مکتبه ادارة القرآن کراچی ٢٧٣/٢)

عن ابن عباسؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه: خير ماء على وجه الأرض ماء زمزم فيه طعام من الطعم وشفاء من السقم. (المعجم الكبير للطبراني، احياء التراث العربي ٨١/١١، رقم:١١١٦٧، الترغيب والترهيب ١٧٥٣/١٦٦/٢)

أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: خير ماء على وجه الأرض زمزم. (الموسوعة الفقهية ٩٠/١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٢رصفر المظفر ١٤٣٥ھ
(فتویٰ نمبر: الف ١١٤٣٣/٤٠)

بوتل سے منھ لگا کر پانی پینا

سوال [١٠٧٢٨]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بوتل سے منھ لگا کر پانی پینا کیسا ہے؟

المستفتی: مقتدیان جامع مسجد منڈی دھنورہ، جے پی نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: بہتر صورت تو یہ ہے کہ گلاس وغیرہ میں لے کر پانی پیئے، بوتل سے منھ نہ لگائے؛ کیونکہ اس طرح پانی پینے سے دوسروں کو ناگواری ہوگی۔

عن أبي هريرةؓ، نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الشرب من فم القربة، أوالسقاء. (صحيح البخاری باب الشرب من فم السقاء، النسخة الهندية ٨٤١/٢، رقم: ٥٤١٠، ف:٥٦٢٧، صحيح مسلم، باب آداب الطعام والشراب، النسخة الهندية ١٧٣/٢، بيت الأفكار رقم:٢٠٢٣)

عن أبي سعيد الخدري رضـ، قال: نهىٰ رسول الله صلى الله عليه وسلم: عن اختناث الأسقية. (صحيح البخاري، باب اختناث الأسقية، النسخة الهندية ٢/ ٨٤١، رقم:٥٤٠٩، ف:٥٦٢٥، صحيح مسلم، باب آداب الطعام والشرب، النسخة الهندية ٢/ ١٧٣، بيت الأفكار رقم:٢٠٢٣)

وربما فسد الوعاء ويتقذره غيره لما يخالط الماء من ريق الشارب فيؤل إلى إضاعة الماء. (قسطلاني، باب الشرب من فم السقاء، دارالفكر ١٢/ ٤٢١، تحت رقم الحديث:٥٦٢٧، نووي على هامش مسلم٢/ ١٧٣)

اورگلاس موجود نہ ہو، تو بوتل میں منھ لگا کر پانی پینے کی گنجائش ہے، آقائے نامدار ﷺ سے بوقت ضرورت مشکیزے میں منھ لگا کر پانی پینا ثابت ہے۔

عن عيسىٰ بن عبد الله بن أنيس عن أبيه قال: رأيت النبي صلى الله عليه وسلم قام إلي قربة معلقة فخنثها، ثم شرب من فيها. (ترمذي شريف، باب ما جاء في الرخصة ذلك، النسخة الهندية ٢/ ١١، دارالسلام رقم:١٨٩١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۲؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵؍ ۶۷۴۷)	۱۲/ ۶/ ۱۴۲۱ھ

دایاں ہاتھ شوربے میں ملوث ہونے کی وجہ سے بائیں ہاتھ سے کھانا نکالنا

سوال [۱۰۷۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کھانا کھاتے وقت اگر داہنا ہاتھ شوربے سے ملوث ہو، تو بائیں ہاتھ سے چمچہ کے ذریعہ شوربا وغیرہ لینے میں کوئی کراہت تو نہیں؟

المستفتی: محمد ابوالکلام، گڈا (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر دایاں ہاتھ طعام کے ساتھ ملوث ہوجائے، تو بائیں ہاتھ سے سالن وغیرہ پلیٹ میں منتقل کرنا جائز ہے۔

يجعل يمينه لطعامه وشرابه وشماله لما سوىٰ ذلک فإن احتيج إلي الاستعانة بالشمال فبحکم التبعية. (عمدة القاري، باب التسمية على الطعام والأكل باليمين، زكريا ١٤/٣٨٧، دار احياء التراث العربي ٢١/٢٩، تحت رقم الحديث:٥٣٧٥)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۳۹۱۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/ ۳/ ۱۴۱۵ھ

پھل وغیرہ کو چاقو سے کاٹ کر کھانا

سوال [۱۰۷۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ پھل وغیرہ اشیاء کو چاقو وغیرہ سے کاٹ کر کھانے سنت ہے، یا منھ لگاکر، آیا گوشت کی طرح ان اشیاء میں استعمال سکین کی ممانعت تو نہیں؟

المستفتی: روح الامین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پھل فروٹ میں سے جس کو کاٹ کر کھانے کی ضرورت ہوتی ہے، اس کو کاٹ کر کھانا مسنون ہے، مثلاً تربوز، خربوزہ وغیرہ۔ جس کو بغیر کاٹے آسانی سے کھایا جاسکتا ہے، اس کو بغیر کاٹے کھانا مسنون ہے، مثلاً کھجور وغیرہ، اور گوشت کو بھی حضور ﷺ حسب ضرورت چاقو سے کاٹ کر کھایا کرتے تھے۔

عمرو بن أمية أخبره أنه رأي النبي صلى الله عليه وسلم يحتز من كتف شاة في يده، فدعي إلي الصلوة، فألقاها والسكين التى يحتز بها،

ثم قام فصلیّ، ولم یتوضأ. (بخاري شریف، باب قطع اللحم بالسکین، النسخة الهندیة ۸١٤/٢، رقم: ٥١٩٧، ف: ٥٤٠٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷ر صفر المظفر ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۶۱۹/۳۳)

بائیں ہاتھ سے کھانا

سوال [۱۰۷۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کوئی شخص بائیں ہتھا ہے یعنی ہر کام بائیں ہاتھ سے کرتا ہے، کھانا بھی بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے، لکھنا بھی بائیں ہاتھ سے کرتا ہے، تو اس کو بائیں ہاتھ سے کھانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد احمد، فیض گنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بائیں ہاتھ سے کھانا پینا مکروہ ہے، حدیث شریف میں ممانعت کے ساتھ ساتھ اس کو شیطانی عمل قرار دیا گیا ہے۔

عن عبد اللہ بن عمرؓ، أن النبي صلی اللہ علیہ وسلم، قال: لا یأکل أحدکم بشماله، ولایشرب بشماله، فإن الشیطان یأکل بشماله، ویشرب بشماله. (ترمذي، باب ماجاء في النهي عن الأکل والشرب بالشمال، النسخة الهندیة ٢/٢، دارالسلام رقم: ١٧٩٩، صحیح مسلم، باب آداب الطعام والشراب، النسخة الهندیة ١٧٣/٢، بیت الأفکار رقم: ٢٠٢٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵ر شعبان المعظم ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۸۸۹/۳۵)

(۹) باب حلال وحرام اشیاء کا بیان

کونسا سرکہ کھانا سنت ہے؟

سوال [۱۰۷۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سرکہ کھانا سنت لکھا ہے اور بڑے فضائل لکھے ہیں، اس سرکہ سے کیا وہ شربت مراد ہے جو گنے کے رس سے بنایا جاتا ہے، بغیر پکائے ہوئے یا وہ سرکہ مراد ہے، جس میں آم ڈال کر مرچ نمک مصالحہ ڈال کر مربہ یا چٹنی کے طرز پر بنایا جاتا ہے، اس سلسلہ میں نبی ﷺ کی سنت کی ادائے گی کون سے سرکہ سے کھانے میں ہوگی؟

المستفتی: جملہ احباب نہٹور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سرکہ چاہے گنے کے رس سے بنا ہوا ہو یا انگور کے شیرہ سے بنا ہوا ہو، یا جامن اور دیگر اشیاء سے بنا ہوا ہو، سب کا حکم یکساں ہے اور سرکہ کو حضور ﷺ نے پسند فرمایا ہے، روٹی کھانے کے لئے سالن نہ ہوتا، تو آپ ﷺ سالن کی جگہ سرکہ استعمال کرلیا کرتے اور آم، مرچ، مسالہ وغیرہ ڈال کر جو مربہ کی شکل ہوتی ہے، وہ سرکہ نہیں ہوتا، وہ یا تو مربہ ہے، یا اچار کہلاتا ہے، وہ بعینہ سرکہ نہیں ہوتا، بعینہ سرکہ وہ ہوتا ہے، جو پتلا ہوتا ہے، اس میں کوئی چیز ڈالی ہوئی نہیں ہوتی، جس کو دنیا کا ہر انسان جانتا ہے اور سرکہ کی تعریف کی حدیث شریف درج ذیل ہے۔

عن جابرؓ عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: نعم الإدام الخل.

(ترمذي، باب ما جاء في الخل، النسخة الهندية ۲/ ۵، دارالسلام رقم: ۱۸۳۹، صحيح مسلم، باب فضيلة الخل والتأدم به، النسخة الهندية ۲/ ۱۸۳، بيت الأفكار

رقم: ۲۰۵۱، مسند الدارمي دار المغني ۲/۱۳۰۲، رقم:۲۰۹۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ رجب المرجب ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸؍۷؍۹۳۶۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴؍۷؍۱۴۲۸ھ

ڈالڈا گھی کا استعمال

سوال [۱۰۷۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ڈالڈا گھی کا استعمال کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد عبد اللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ڈالڈا گھی کا استعمال کرنا درست ہے محض شک کی بنا پر نا جائز ہونے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ ۶؍۲۹۰)

من شک في إنائه، أو ثوبه، أو بدنه أصابته نجاسة أولا فهو طاهر مالم يستيقن (إلى قوله) وكذا مايتخذه أهل الشرك، أو الجهلة من المسلمين كالسمن، والخبز، والأطعمة، والثياب. (شامي، كتاب الطهارة، قبيل مطلب في أبحاث الغسل، زكريا ۱/ ۲۸۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ ربیع الاول ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲؍ ۴۷۲۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳؍۳؍۱۴۱۷ھ

کولگیٹ کا استعمال کرنا

سوال [۱۰۷۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کولگیٹ ٹیوب کا منہ کے اندر استعمال کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد عبد الرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کول گیٹ وغیرہ سے دانت صاف کرنا درست ہے، محض شک کی وجہ سے اس پر ناجائز ہونے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔

شک في وجود النجس، فالأصل بقاء الطهارة. (الأشباه والنظائر قديم ۱۰۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍ربیع الاول ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲؍۴۷۲۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۰؍۳؍۱۴۱۷ھ

پارلے جی بسکٹ کا کھانا

سوال [۱۰۷۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ پارلے جی بسکٹ میں سور کی چربی ملائی جاتی ہے تو کیا اس کا کھانا ناجائز ہے؟ معتبر ذرائع سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بسکٹ میں خنزیر کی چربی ملائی جاتی ہے، وہ اس طرح کہ مہاراشٹر میں اکولہ شہر میں تبلیغی اجتماع تھا، اور اس اجتماع میں بنگلہ والی مسجد حضرت نظام الدین دہلی کے ذمہ دار حضرات اکابرین بھی آئے ہوئے تھے، شہر امراوتی کے ذمہ داروں نے ان اکابرین کے ناشتہ کے لئے چائے اور پارلے جی بسکٹ کے پیکٹ پیش کئے، تو ان اکابرین نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اس میں سور کی چربی ملی رہتی ہے، دوسرا لے آیئے؛ چنانچہ پھر دوسرا بسکٹ لایا گیا، تو معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا واقعی اس میں سور کی چربی ملی رہتی ہے؟ اور کیا اس کا کھانا ناجائز ہے؟

المستفتی: شیخ قاسم، شیخ فرید، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پارلے جی بسکٹ کے بارے میں جب تک

یقین اور تحقیق کے ساتھ معلوم نہ ہو کہ اس میں سور کی چربی ملی ہوئی ہے، تو محض کسی کے کہہ دینے سے یا شک کی بنا پر اس کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا ہے۔(مستفاد: ایضاح المسائل ۱۴۶)

من شک في إنائه، أو ثوبه، أو بدنه أصابته نجاسة أولا فهو طاهر مالم یستیقن، وکذا مایتخذه أهل الشرک، أو الجهلة من المسلمین کالسمن، والخبز، والأطعمة، والثیاب. (شامي، کتاب الطهارة، قبیل مطلب في أبحاث الغسل، زکریا ۱/ ۲۸۳-۲۸۴، کراچي ۱/ ۱۵۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ / جمادی الثانیہ ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۱۱۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۶/۲۶ھ

اجمیر کی مٹھائی کا حکم

سوال [۱۰۷۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک عورت اپنے محرم کے ہمراہ اجمیر شریف گئی، وہاں سے مٹھائیاں اور چوڑیاں خرید کر لائی، اپنے رشتہ داروں میں وہ سب اس نے اجمیر کی نیاز ہے کہہ کر تقسیم کردی، اب یہاں دو امر دریافت طلب ہیں۔

(۱) اگر سچ مچ وہ مٹھائیاں اور چوڑیاں چڑھاوے اور نذر و نیاز کی ہوں، تو اس کا کھانا ناجائز ہے؟

(۲) اگر حقیقت میں نذر و نیاز کی نہیں ہیں، لیکن یہ عورت نیاز کہہ کر تقسیم کر رہی ہے، تو کیا اب بھی یہ مٹھائیاں ناجائز ہوں گی؟ براہ کرم درست جواب پانچ کتابوں کے حوالہ سے تحریر فرمادیجئے۔

المستفتی: محمد رضوان قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر عورت مٹھائیوں کو اجمیر کے بازار سے خرید کر

لائی ہے اور یہاں لاکر تبرک بتا کر بانٹ رہی ہے، تو یہ اگر چہ اس کی گمراہی اور جہالت ہے، مگر مٹھائی اپنی جگہ حلال اور درست ہے؛ کیونکہ بازار کی خریدی ہوئی چیز چڑھاوا نہیں ہوتی ہے۔

عن ابن عباسؓ، قال كان أهل الجاهلية يأكلون أشياء ويتركون أشياء تعذراً، فبعث الله نبيه وأنزل كتابه وأحل حلاله وحرم حرامه، فما أحل فهو حلال وما حرم فهو حرام، وماسكت عنه فهو عفو منه وتلا هذه الآية: قل لا أجد فيما أوحي إلي محرماً على طاعم. (الانعام:١٤٥، المستدرك، مكتبه نزار مصطفىٰ الباز٧/٢٥٤١، رقم: ٧١١٣)

عن أبي ثعلبة الخشنيؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الله حد حدودًا–إلى قوله–وترك أشياء من غير نسيان من ربكم؛ ولكن رحمة من ربكم فاقبلوها ولا تبحثوا فيها. (المستدرك، مكتبه نزار مصطفىٰ الباز ٧/٢٥٤٢، رقم:٧١١٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ر محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۰۶/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۱/۲۲ھ

دودھ پھاڑ کر گلاب جامن بنانا

سوال [۱۰۷۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اچھے دودھ کو کسی چیز سے پھاڑ کر سفید گلاب جامن بنانا؛ جبکہ اچھی چیز کو خراب کر کے خراب چیز سے مٹھائی بنائی جاتی ہے، اور دودھ پھٹ جانے کے بعد اس کا پانی پھینک دیا جاتا ہے، اور باقی مواد کا گلاب جامن بنایا جاتا ہے، تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ اور اس کے اس طریقہ کو اپنا کر گلاب جامن بنانا کیسا ہے؟

المستفتی: عباد الرحمٰن، حلوائی، لالباغ مرادآباد (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دودھ پھاڑ کر گلاب جامن بنانا جائز ہے، اس میں کسی قسم کی کراہت نہیں ہے، جس طرح سے انگور وغیرہ سے سرکہ بنانا جائز ہے۔

وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَرِزْقًا حَسَنًا.

وفسر الرزق الحسن بالخل. (روح المعاني، زكريا ۸/ ۲٦٦، تحت تفسير رقم الآية: ٦٧، من سورة النحل)

والأشربة بالتغير لا تحرم. (عالمگيري، الباب الحادي عشر في الكراهة، زكريا قديم ٥/ ٣٣٩، جديد ٥/ ٣٩٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹/ ۳۴۷۲)

اللہ لکھے ہوئے آلو کا کیا کریں؟

سوال [۱۰۷۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کچھ دن پہلے کی بات ہے کہ میں اپنا کھانا بنانے کے لئے آلو کاٹ رہا تھا، اچانک ایک آلو کو کاٹتے ہی اس کے اندر کے حصے میں ''اللہ'' کا لفظ صاف نظر آنے لگا، اس طرح کبھی گوشت کے ٹکڑے میں لفظ ''اللہ'' لکھا ہوا ملتا ہے، تو سوال یہ ہے کہ جن ماکولات میں اس قسم کے الفاظ ملیں ان کے کھانے کا کیا حکم ہے؟

(۲) دوسرا سوال یہ ہے کہ میں نے تعظیم کی نیت سے آلو کے ٹکڑے کو حفاظت کے ساتھ ایک پاک جگہ میں رکھ دیا تھا، اب وہ ہوا لگنے کی وجہ سے سوکھتا جا رہا ہے، تو اب اس آلو کا کیا کیا جائے؟ کیا مٹی میں دفن کر دوں یا کچھ اور کروں؟

المستفتی: محمد مشتاق احمد، نور پوری، متعلم درجہ ہفتم دار العلوم دیو بند سہارن پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگرآلو کاٹنے کے بعداس میں لفظ ''اللہ'' لکھا ہوا نظرآرہاہے،اس کوسالن میں پکا کرکھانے میں کسی طرح کی کوئی قباحت نہیں ہے؛ بلکہ اس کو تبرک سمجھ کرشوق سے کھانا چاہیے اور جوآلوسوکھ چکا ہے،اگرسوکھنے کی وجہ سے مضراثرات اس میں نہ آئے ہوں،تواس کوبھی سالن میں پکا کرکھانا بلا تکلف جائز ہے۔

عن أبي عبد الرحمن السلمي في ذكر منصور بن عمار وأنه أوتى الحكمة، وقيل أن سبب ذلک أنه قد وجد رقعة في الطريق مكتوباً عليها بسم الله الرحمن الرحيم، فأخذها فلم يجدلها موضعها، فأكلها فأرى فيما يرى النائم كأن قائلا يقول: قد فتح عليک باب الحكمة باحترامک لتلک الرقعة، وكان بعد ذلک يتكلم بالحكمة. (شعب الإيمان للبيهقي، فصل في تعظيم المصحف، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٥٤٥، رقم:٢٦٦٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ذی الحجہ ۱۴۳۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۸۳۰/۳۸)

گھر کا بچاہوا کھانا خاکروبہ کو دینا

سوال [۱۰۷۳۹]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ روٹی چاول وغیرہ جو کھانے سے بچ جاتے ہیں، وہ خاکروبہ لیجاتی ہے،اوروہ اس روٹی چاول وغیرہ کواپنے خنزیروں کوکھلاتے ہیں۔

دریافت یہ کرنا ہے کہ ہمیں اپنے روٹی چاول وغیرہ خاکروبہ کودینے میں کوئی حرج تونہیں؟ ازروئے شرع جواب سے نوازیں۔

المستفتی: عبدالواجد، محلّہ قاضی پورہ، ٹانڈہ، رام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گھر میں بچا ہوا کھانا خاکروبہ کو دینے کی اجازت ہے،اس کے بعد وہ جہاں چاہے استعمال کرسکتی ہے، اس میں شرعی حکم کا کوئی تعلق نہیں،خواہ وہ خود کھائے یا اپنے جانوروں کو کھلائے۔

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء. (بیضاوي شریف، مکتبہ رشیدے)

كل يتصرف في ملكه كيف شاء. (شرح المجلة، رستم اتحاد ١/٦٥٤، رقم المادة: ١١٩٢، البناية اشرفية ٨/٢١٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۴۳/۳۵ ۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۴/۴ھ

کھانے میں کیڑے یا مینگنی کا نکلنا

سوال [۱۰۷۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ پکاتے ہوئے کھانے کی چیز میں کیڑا یا چوہے کی مینگنی ملے،تو اس کھانے کو کھانا جائز ہے یا نہیں؟ جیسا کہ مدرسہ کے سالن میں اکثر وقت ملتا ہے۔غریب ومدرسہ کے طالب علم یا مالدار کا اس کھانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

المستفتی: سراج الاسلام، بردوانی، مدرسہ مظاہر العلوم، جدید کمرہ: ۳۶

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مینگنی اور کیڑے کو نکال کر پھینک دیا جائے اور کھانا کھالیا جائے تو جائز ہے۔

خبز وجد في خلاله خرء فأرة، فإن كان الخرء صلبا رمي به، وأكل

الخبز. (الدر مع الرد، کتاب الخنثیٰ، مسائل شتی، زکریا ۱۰/۴۵۳، کراچي ۶/۷۳۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳ رجب المرجب ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۹۷/۲۳)

کھانے کی چیز میں جائفل اور دیگر نشہ آور چیز ڈالنا

سوال [۱۰۷۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ فتاوی محمودیہ ۳۳۶/۱۲، باب الحظر والا باحہ پر اس طرح لکھا ہوا ہے کہ سوال ۳۸۳/۳ ایک دیگ میں تقریباً سو آدمیوں کے لئے گوشت پکتا ہے، اس میں دو تین جائفل جس کا وزن ایک تولہ سے کم ہوتا ہے، بطور مصالحہ ڈال دیا جاتا ہے، جس سے قطعاً کوئی نشہ نہیں ہوتا، ایسی حالت میں وہ کھانا کیسا ہے؟ کیونکہ یہاں پر علماء دیوبند میں دو گروہ ہو گئے ہیں بعض کا کہنا ہے کہ حرام ہے اور کچھ کا کہنا ہے کہ صرف دواءً استعمال ہوتا ہے۔

الجواب: ایسی صورت میں وہ کھانا حرام نہیں؛ اس لئے کھانے میں مضرت نہیں اور نشہ بھی نہیں ہوتا؛ اگر چہ خود جائفل کھانا ممنوع ہے۔

اس میں دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ جائفل کا استعمال بکثرت قورمہ میں اور دواء میں ہو رہا ہے، اس کی ممانعت کی وجہ کیا ہے؛ جبکہ اس میں نشہ بھی نہیں ہے اور مضرت بھی نہیں ہے ادویہ کے خواص میں جب اسے دیکھا گیا، تو اطباء نے اس کو دوسرے درجہ میں گرم خشک لکھا ہے، یہ ایک درخت کا پھل ہوتا ہے، اطباء نے اس کو نشہ آور نہیں لکھا ہے، جائفل کی ممانعت کا ماخذ ضرور نقل کیا جائے۔

المستفتی: جمیل احمد قاسمی، بازار پہاڑی دروازہ، نگینہ بجنور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جائفل، عنبر، زعفران، ان سب کے اندر سکر اور نشہ ہوتا ہے، اسی وجہ سے ان چیزوں کو مخدرات میں شامل کیا گیا ہے؛ لہٰذا یہ چیزیں مقدار سکر تک استعمال کرنا جائز نہیں ہے اور مقدار سکر سے کم جو نشہ کو نہ پہونچے اس کے استعمال کی گنجائش ہے، جیسا کہ حکیمی دواؤں میں زعفران، عنبر اور جائفل بھی شامل ہوتا ہے، وہ بلاکراہت جائز ہے، اسی طرح جائفل کی وہ مقدار جو حد سکر کو نہیں پہونچتی، اس کا قورمہ وغیرہ میں استعمال جائز ہے۔ (مستفاد: بہشتی زیور ۱۱/۱۱۹)

وكذا تحرم جوزة الطيب، وكذا العنبر، والزعفران (إلى قوله) فهذا كله ونظائره يحرم استعمال القدر المسكر منه دون القليل. (شامي، كتاب الأشربة، زكريا ١٠/ ٤١، كراچي ٦/٤٥٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۶۵۷۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۴/۱۴۲۱ھ

مضطر نے اگر اکل حرام کے ذریعہ جان نہیں بچائی، تو کیا وہ گنہگار ہے؟

سوال [۱۰۷۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مضطر کے لئے اکل خنزیر و اکل میتہ وغیرہ کی اجازت ہے، یہ صرف اجازت ہی ہے یا کھانے کا حکم بھی ہے؟ کہ بقدر اضطرار کھانا ضروری اور واجب شرعی ہے؟ خنزیر یا میتہ موجود ہو اور دوسری چیز نہ ہو؛ لیکن مضطر نے یہ خنزیر وغیرہ نہ کھایا اور بھوکا مر گیا، تو وہ حرام موت مرا؟ یا شراب نہ پیا اور پیاسا مر گیا، تو حرام موت مرا گنہگار رہا یا کسی صورت میں کھانے نہ کھانے کا اختیار رہے؟ خصوصاً جبکہ اس وقت صرف خنزیر ہو؟

المستفتی: محمد اشتیاق نور قاسمی، پیر پینتی بازار، بھاگل پور، بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: صورت مسئولہ میں جبکہ مضطر کے پاس خنزیر اورمیتہ کے گوشت کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہ ہواوراس کے کھائے بغیر نہ بچ سکے، تو جان بچانے کے لئے اتنی مقدار کھانے کی گنجائش ہے، جس سے جان بچ جائے اور یہ اجازت قرآن سے ثابت ہے؛ لہٰذا اگرکوئی شخص ایسی حالت میں خنزیر یا میتہ کا گوشت کھائے بغیر بھوکا مرجائے گا، تو وہ گنہگار ہوگا۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۳۶۶/۱۲، جدید ڈابھیل ۲۵۵/۱۸)

قال اللہ تبارک و تعالیٰ: فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَحِيْمٌ. [سورة المائدہ:۳]

ومن امتنع عن أكل الميتة حالة المخمصة، أوصام، ولم يأكل حتى مات يأثم. (هندية، الباب الحادي عشر في الكراهة في الأكل، زكريا قديم ۳۳۸/۵، جديد ۳۹۱/۵)

من اضطر إلى ميتة أو لحم خنزير، أودم ولم يأكل ولم يشرب، فمات دخل النار. (شامي، كتاب الإكراه، زكريا ۱۸٤/۹، كراچي ۱۳۳/٦، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ۱۵۱/۲٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۶۵۵/۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۵/۷ھ

ہوائی جہاز کی چیزوں کا کھانا کیسا ہے؟

سوال [۱۰۷۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہوائی جہاز میں مرغ کے گوشت کی بریانی وغیرہ کھاسکتے ہیں یانہیں؟ کیونکہ حلال نہ ہونے کا شبہ رہتا ہے؟

المستفتی: محمد جاوید قریشی باندرہ، ممبئی ویسٹ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسلم ممالک کے مسلم کمپنی کے ہوائی جہاز میں گوشت کی بریانی اور گوشت کا سالن کھانا جائز ہے اور غیر مسلم ممالک یا غیر مسلم کمپنی کے ہوائی جہاز میں گوشت کھانے کے بارے میں احتیاط بہتر ہے، اگر ہوائی جہاز کا عملہ اس بات کو واضح کردے کہ حلال گوشت ہے، اوردل مطمئن ہے، تو کھا سکتے ہیں۔

عن أبي الحوراء السعدي قال: قلت للحسن بن علي: ما حفظت من رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ قال: حفظت منه: دع ما يريبک إلى ما لا يريبک. (سنن النسائي، الحث على ترك الشبهات، النسخة الهندية ۲/ ۲۸۵، دارالسلام رقم: ۵۷۱۱، سنن الترمذي، باب بلا ترجمة، النسخة الهنية ۲/ ۷۸، دارالسلام رقم: ۲۵۱۸، مسند أحمد بن حنبل ۱/ ۲۰۰، رقم: ۱۷۲۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ ذی قعدہ ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹؍ ۱۰۸۱۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۴؍ ۱۱؍ ۱۴۳۳ھ

ہوائی جہاز کی طرف سے ملنے والے ہوٹلوں کے کھانے کا حکم

سوال [۱۰۷۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہم لوگ بیرون ملک سفر کرتے ہیں دوران سفر ہوائی جہازوں اور ہوٹلوں میں کمپنی جو کھانا دیتی ہے، وہ کوشر کھانا کہلاتا ہے، جس کے معنی ہیں حلال کھانا، ایسے کھانوں کا کھانا دوران سفر جبکہ کوئی دوسرا نظم نہ ہو کیسا ہے؟

المستفتی: عبد اللہ محلّہ بھٹی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مسلم ممالک کے جہاز نہیں ہیں، غیر مسلم

ممالک کے جہاز ہیں، تو ان کا گوشت نہ کھایا جائے؛ اگرچہ کوشر کھانا لکھا ہوا کیوں نہ ہو؛ البتہ سبزی وغیرہ کھانے کی گنجائش ہے؛ جبکہ خاص طور پر کوشر کھانا لکھا ہوا ہو، تو بلاتردد کھانا جائز ہے۔

نیز حاجیوں کے مخصوص جہاز کے کھانے کا بھی یہی حکم ہے اور ہوٹلوں کا بھی یہی حکم ہے، اگر غیر مسلموں کا ہوٹل ہے، تو اس میں گوشت کھانا ممنوع ہے، سبزی وغیرہ کی گنجائش ہے، اور اگر مسلم کمپنی کا ہوٹل ہے، اور کام کرنے والے بھی مسلمان ہیں تو وہاں سے گوشت اور سبزی دونوں کھا سکتے ہیں۔

عن أبي ثعلبة قال: سئل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن قدور المجوس، قال: أنقوها غسلاً واطبخوا فيها—وعنه أنه قال: يارسول الله صلى الله عليه وسلم؟(إلىٰ قوله) إن لم تجدوا غيرها فارحضوها بالماء . (ترمذي شريف، باب ما جاء في الأكل في آنية الكفار، النسخة الهندية ۲/۲، دارالسلام رقم: ۱۷۹۶-۱۷۹۷)

لاتحل ذبيحة غير كتابي من وثني ومجوسي ومرتد. (الدر المختار، كتاب الذبائح، زكريا ۹/۴۳۱، كراچي ۶/۲۹۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ربیع الاول ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/۷۵۴۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۳/۷ھ

غیر ممالک کے پیکٹ کا گوشت

سوال [۱۰۷۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ غیر ممالک سے گوشت اور مرغی کے جو پیکٹ آتے ہیں اور خود بحرین میں جو جانور اور مرغیاں ذبح ہوتی ہیں، ان پر لکھا ہوتا ہے، ذبح طریقۂ اسلامی؛ لیکن ان پر گمان صحت ہے نہ کہ علم یقین ان کا کھانا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد شفیع احمد الاعظمی، الرفاع، بحرین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ جو پیکٹوں پر ذبح طریقۂ اسلامی لکھا ہوتا ہے، وہ مسلمانوں کا ذبیحہ ہونے کی علامت ہوتی ہے؛ اس لئے اس کا کھانا شرعاً جائز ہوگا؛ البتہ جن ذبیحوں کے بارے میں معتبر ذرائع سے معلوم ہوجائے کہ اسلامی طریقہ پر ذبح نہیں کیا گیا ہے یا مسلمانوں کا ذبیحہ نہیں ہے، یا ان یہود ونصاریٰ کا ذبیحہ نہیں ہے، جو آسمانی کتاب اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو نبی مانتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ذبح کرتے ہیں، تو ان کا کھانا جائز نہیں ہوگا۔

نیز ذبیحہ اور گوشت کو حلال سمجھنے اور کھانے کے لئے گمان صحت کافی ہوتا ہے، جیسا کہ فقہاء کی تصریحات سے مستفاد ہوتا ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/، کفایت المفتی ۸/۲۶۷-۸/۲۶۹)

ومن أرسل أجيراً له مجوسيًا، أو خادمًا، فاشترى لحما، فقال اشتريته من يهوديّ، أو نصراني، أو مسلم وسعه أكله؛ لأن قول الكافر مقبول في المعاملات؛ لأنه خبر صحيح لصدوره عن عقل ودين يعتقد فيه حرمة الكذب، ولحاجة ماسة إلى قبوله لكثرة وقوع المعاملات. (هداية، كتاب الكراهية، اشرفي ديوبند ٤/٤٥٣، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٨/١١٨، رقم: ٢٧٨٩٣، هندية، زكريا جديد ٥/٣٥٨، قديم ٥/٣١٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/صفر المظفر ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۶۴۳/۲۵)

تمباکو استعمال کرنے والی عورت کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا حلال ہے؟

سوال [۱۰۷۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: کہ گھر کی عورتیں تمبا کو استعمال کرتی ہیں، ان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کیسا ہے؟ مدلل جواب سے سرفراز فرمائیں۔ بینوا توجروا.

المستفتی: ایچ کے نعمانی، نیوڈ یلکس واچ سروس

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ایسی عورتوں کے ہاتھوں کا کھانا بلا کراہت حلال ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍رجب المرجب ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴؍۱۳۱۰)

مدارس اسلامیہ میں آنے والے گوشت کا کھانا

سوال [۱۰۷۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل مدارس اسلامیہ میں بکرے کا گوشت کئی طرح کے آتے ہیں، مثلاً کبھی عقیقہ کا گوشت آتا ہے، اور کبھی ہدیہ کا تو کبھی صدقہ کا اور کبھی جھٹکے کا بھی گوشت صدقہ ہی کہہ کر دیا جاتا ہے، ایسی صورت میں مدرسے کے طلبہ کے لئے اس طرح کا گوشت کھانا اور طلبہ کا اساتذہ کے لئے ہدیہ کرنا کیسا ہوگا؟

المستفتی: عبدالکریم، جامع مسجد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جو حضرات مدارس اسلامیہ میں گوشت دیتے ہیں، ان سے گوشت لیتے وقت تحقیق ضروری ہے اور جب تحقیق ہوجائے اور اس کے حلال ہونے کا یقین ہوجائے، تو اس کو قبول کیا جائے؛ لیکن اگر معلوم ہوجائے کہ یہ جھٹکے یا غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہے، تو اسے ہرگز قبول نہ کیا جائے؛ اس لئے کہ اس کا کھانا

حرام ہے اور عقیقہ کا گوشت بلا شبہ جائز اور حلال ہے، باقی گوشت کے بارے میں ضرور تحقیق کر لی جائے، ہمارے یہاں مدرسہ شاہی میں اس طرح کا گوشت شروع شروع میں آیا کرتا تھا، آج تقریباً ۲۶/۲۷ سال سے بلا تحقیق کوئی گوشت نہیں لیا جاتا ہے، جب سے گوشت کی واپسی کا سلسلہ شروع ہوا، تو آج الحمد للہ اس طرح الٹا سیدھا گوشت مدرسہ شاہی میں آنے کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ۱۳۸-۱۳۹، امداد الفتاوی ۳/۵۷۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۴۱۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۲/۱۴۳۵ھ

یتیم خانے کا کھانا خرید کر کھانا

سوال [۱۰۷۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ یتیم خانہ کا کھانا قیمت سے کسی مزدور کے لئے کھانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: غیاث الدین، پورنوی، ڈگروا، پورنیہ (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر قیمت دیکر یتیم خانہ کا کھانا کوئی مزدور یا کوئی مالدار کھاتا ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، قرآن کریم کی درج ذیل آیت سے جواز نکلتا ہے۔

قال اللّٰہ تبارک وتعالیٰ: وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ. [البقرۃ: ۲۲۰]

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/ ۳۱۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۶/۴/۱۴۱۳ھ

غیر مسلم کے یہاں میت کا کھانا کھانا کیسا ہے؟

سوال [۱۰۷۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ غیر مسلم کے یہاں مسلمانوں کے لئے میت کی دعوت کھانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: جلال الدین، کٹیہاری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیر مسلم کے یہاں میت کا کھانا کھانے میں جہاں تک ممکن ہو شریک نہ ہونا چاہئے اور بلاضرورت ان کے یہاں دعوت قبول کرنا ممنوع ہے۔

(مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۹/۳۶۹، ڈابھیل ۱۸/۱۱۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/ رجب المرجب ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹/۳۲۵۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴/۷/۱۴۱۳ھ

غیر مسلم کا پکایا ہوا گوشت کھانا

سوال [۱۰۷۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک جانور کو اہل ایمان نے ذبح کیا، مگر اس کو بنانے والا اور پکانے والا غیر مسلم ہے، اس کو کھانا شرعا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد فیض خاں، مفتاحی، دہلوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مسلمان نے ذبح کیا ہے، اور غیر مسلم نے بنایا اور پکایا ہے، تو اس کا کھانا مسلمان کے لئے بلا کراہت جائز اور درست ہے؛ جبکہ اس غیر مسلم کا ہاتھ نجاست سے ملوث نہ ہو۔

المسلم إذا ذبح فأمر المجوسي السكين بعد الذبح لم يحرم.

(الفتاوى التاتارخانية، زكريا ۱۷/۳۹۱، رقم: ۲۷۶۰۱، هندية، زكريا قديم ۵/۲۸۷، جديد ۵/۳۳۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲ ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/۳۱۱۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲/۴/۱۴۱۳ھ

غیر مسلم قصاب سے مسلمانوں کا گوشت خرید کر کھانا کیسا ہے؟

سوال [۱۰۷۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں ہفتہ میں دو روز جمعرات واتوار کو بازار لگتا ہے، جس میں دیگر اشیاء کے علاوہ بکرے کا گوشت بھی فروخت ہوتا ہے، جس کو ایک غیر مسلم قصاب گڈریا فروخت کرتا ہے، جب اس نے کسی مسلمان کے ہاتھ سے ذبح کرایا ہے، تو کیا اس کے قول کا اعتبار کر کے مسلمانوں کو اس سے گوشت خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر خرید لیا تو کھا سکتے ہیں یا نہیں؟ مفصل مدلل جواب تحریر فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

المستفتی: (مولانا) منصب علی قاسمی، صدر مدرس مرکز اشرف المدارس دونکپوری ٹانڈہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیر مسلم قصاب سے مسلمانوں کا گوشت خرید کر کھانا جائز نہیں ہے، اگر چہ وہ غیر مسلم یہ کہتا ہو کہ مسلم سے ذبح کروایا ہے؛ اس لئے کہ حرام وحلال میں غیر مسلم کا قول معتبر نہیں ہے، ہاں البتہ اگر خود مسلمان کو معلوم ہے کہ مسلمان ہی نے ذبح کیا ہے۔ یا دیکھنے والے مسلمان نے شہادت دی ہے کہ مسلمان نے ذبح کیا ہے، تب جائز ہوسکتا ہے، ورنہ نہیں اور اگر خرید لیا ہے، تو واپس کر دینا چاہئے اگر واپس بھی نہیں ہوسکتا ہے، تو کراہت تحریمی کے ساتھ کھا سکتا ہے۔

(مستفاد: فتاوی رشیدیہ مبوب مطبوعہ دیوبند ۵۵۲، امداد الفتاوی ۳/۵۴۳)

ومفاده أن مجرد كون البائع مجوسياً يثبت الحرمة، فإنه بعد إخباره بالحل بقوله ذبحه مسلم كره أكله فكيف بدونه. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، زكريا ٩/ ٤٩٧، كراچي ٦/ ٣٤٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/ ۳۱۰۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۳/۳/۲۷ھ

ہندو کی دوکان سے مٹھائی خریدنا

سوال [۱۰۷۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بعض حضرات یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ بعضے ہندو شیرینی فروش گائے کا پیشاب مٹھائی پر چھڑکتے ہیں، ایسی صورت میں ہندو دوکان سے مٹھائی خریدنے اور کھانے کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا.

المستفتی: محمد رضوان حیدر آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس مٹھائی فروش کے بارے میں یقین کے ساتھ معتبر ذرائع سے معلوم ہوجائے کہ یہ شخص اپنی مٹھائی پر گائے کا پیشاب چھڑکتا ہے، تو ایسی دوکان سے مٹھائی خریدنا اور کھانا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۸/ ۴۰، کتاب الفتاوی ۱/ ۳۰۳، معارف القرآن دیوبند ۳/ ۴۹-۵۰)

وبول ما يؤكل لحمه والفرس......مخفف، وخفة النجاسة تظهر في الثوب دون الماء، البول المنتضح قدر رؤوس الإبر معفو للضرورة، وإن امتلأ الثوب أما إذا انتضح في الماء، فإنه ينجسه ولا يعفي عنه؛ لأن طهارة الماء آكد من طهارة الأبدان، والثياب، والمكان. (هندية، الباب السابع، الفصل الثاني في الأعيان، النسخة الهندية، زكريا قديم ١/ ٤٦، جديد ١/ ١٠١)

ونجاسة بول مايؤكل لحمه على قول من يقول بنجاسة خفيفةالخ وإذا وقع قطرة في الماء أفسده؛ لأن القليل في الماء يصير كثيراً .
(الفتاوى االتاتارخانية، زكريا ۱/ ٤٤١، رقم: ١١٢٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ محرم الحرام ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۵۸۱/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۱/۱۴۳۳ھ

غیر مسلم کے ہوٹل میں گوشت کھانا

سوال [۱۰۷۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ غیر مسلم کے ہوٹلوں میں گوشت کھانا کیسا ہے؟ جبکہ ان ہوٹلوں کا عملہ بھی غیر مسلم ہو اور ہمارے ہندوستان کے غیر مسلم اہل کتاب بھی نہیں ہیں؟

المستفتی: محمد جاوید

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیر مسلموں کے ہوٹل میں گوشت کھانا جائز نہیں، اگر ہوٹل کا مالک یا عملہ گوشت کے حلال ہونے کا دعوی کرے، تب بھی اس کا دعوی نا قابل قبول ہے؛ کیونکہ یہ حلت وحرمت کے قبیل سے ہے، حلت وحرمت میں غیر مسلم کا قول معتبر نہیں۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۸/۳۸، میرٹھ ۲۷/۶۶)

ولا يقبل قول الكافر في الديانات. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الأول، زكريا قديم ٥/٣٠٨، التاتارخانية، زكريا ١٨/ ٢٤، رقم:٢٧٩١٧)

ويقبل قول الكافرين في الحل، والحرمة–قال الزيلعي هذا سهو لأن الحل و الحرمة من الديانات ولايقبل قول الكافر فى الديانات وإنما يقبل قوله في المعاملات خاصة للضرورة. (تبيين الحقائق، كتاب الكراهية، فصل في الأكل، زكريا ٧/٢٧، امدادیه ملتان ٦/١٢)

ولا يأكلون من أطعمة الكفار ثلثة أشياء اللحم،والشحم، والمرق، ولايطبخون في قدورهم حتى يغسلوها. (النتف في الفتاوى، كتاب الجهاد، باب مالايؤكل من اطعمة الكفار ٤٣٥، بحواله محموديه ڈابهيل١٨/ ٣٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ جمادی الثانی ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۵۵۲/۴۰)

غیر مسلم ہوٹل کے مسلم کا رندے حلال گوشت کی خبر دیں تو؟

سوال [۱۰۷۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر ہوٹل کا مالک غیر مسلم ہے، مگر اس ہوٹل کے کارندے اور اس کا سب عملہ مسلمان ہیں، ایسے ہوٹل میں گوشت وغیرہ کھانا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد زید

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جب ہوٹل میں سب کارندے اور عملہ مسلمان ہیں اور مسلم کارندہ گوشت کی حلت کی خبر دے، تو اس کی بات معتبر مان کر اس ہوٹل میں گوشت کھانا جائز ہے؛ اس لئے کہ حلت وحرمت میں مسلمان عادل کی خبر معتبر ہوتی ہے۔

خبر الواحد يقبل في الديانات كالحل، والحرمة، والطهارة، والنجاسة إذا كان مسلما عدلا. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الاول، زكريا قديم٥/ ٣٠٨، جديد ٥/ ٣٥٦)

اتفق الفقهاء على أنه إذا أخبر الثقة بنجاسة ماءٍ، أوثوب، أو طعام، أوغيره وبين سبب النجاسة وكان ذلك السبب يقتضي النجاسة حكم بنجاسة؛ لأن خبر الواحد العدل في مثل هذه الأشياء مقبول وليس هذا من

باب الشهادة، وإنما هو من باب الخبر، وكذا لو أخبر عن دخول وقت الصلوة وعن حرمة الصلوة وعن حرمة الطعام أو حله ولا فرق في هذا بين الرجل والمرأة ولا بين الأعمي والبصير بخلاف الكافر والفاسق، فلا يقبل خبرهما في النجاسة والطهارة. (الموسوعة الفقهية ۱۹/ ۱۵۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳ ر جمادی الثانیہ ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۵۵۳)

غیر مسلم کے جس ہوٹل میں مسلم وغیر مسلم دونوں کارندے ہوں وہاں گوشت کھانا؟

سوال [۱۰۷۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ غیر مسلم کے ایسے ہوٹل میں گوشت وغیرہ کھانا کیسا ہے، جس میں ہوٹل کے کارندے مخلوط ہوں، یعنی اس ہوٹل میں مسلمان بھی کام کرتے ہیں اور غیر مسلم بھی جواب مرحمت فرما کر ممنون ومشکور ہوں؟

المستفتی: محمد ذاکر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیر مسلم کے وہ ہوٹل جس ہوٹل کا عملہ مخلوط ہے، تو وہاں پر گوشت کی حلت وحرمت میں اشتباہ ہوگیا اور جس کی حلت وحرمت مشتبہ ہوجائے، تو وہاں پر ترک واجب ہوتا ہے؛ اس لئے مذکورہ ہوٹلوں میں گوشت کھانا جائز نہیں احتراز لازم ہے۔

عن النعمان بن بشير قال: سمعت رسول الله يقول: الحلال بين والحرام بين، وبين ذلک أمور مشتبهات، لايدري كثير من الناس أمن الحلال هي أم من الحرام، فمن تركها استبرأ لدينه وعرضه فقد سلم، و من واقع شيئًا منها، يوشک أن يواقع الحرام. (ترمذي شريف، باب ماجاء في ترك الشبهات،

النسخة الهندية، ۱/۲۲۹، دارالسلام رقم: ۱۲۰۵، صحيح البخاري، باب فضل من استبرأ لدينه، النسخة الهندية ۱/۱۳، رقم: ۵۲، صحيح مسلم، باب أخذ الحلال وترك الشبهات، النسخة الهندية ۲/۲۸، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۹)

قال قائل أن المشتبهات المباحات، فإنه إذا أصرّ على المباح يقع في المكروه وإذا أصرّ على المكروه صار حرامًا، ونقلوا أن المتورع من تجنب من المباحات أيضا. (العرف الشذي على الترمذي ۱/۲۳۱)

قوله: وقع في الشبهات وقع في الحرام يريد إذا اعتادواستمر عليها أوقعه إلى الوقوع في الحرام بأن يتجاسر عليه، فيواقعه بقول فليتق الشبهة يسلم من الوقوع في الحرام. (بذل المجهود، باب في اجتناب الشبهات، دارالبشائر الإسلامية ۱۱/۱٤، سهارنپور ٤/۲۳۷)

إذا تعارض دليلان أحدهما يقتضي التحريم، والآخر الإباحة قدم التحريم، القاعدة الثانية إذا اجتمع الحلال والحرام غلب الحرام. (الأشباه والنظائر ۱/۳۰۲، مكتبه زكريا) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۵۵۱)

غیر مسلم ہوٹلوں میں گوشت کے علاوہ دیگر اشیاء سبزی وغیرہ کھانا

سوال [۱۰۷۵٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ غیر مسلموں کے ہوٹلوں میں گوشت کے علاوہ دیگر اشیاء کا کھانا کیسا ہے، مثلاً سبزی، انڈا، مچھلی وغیرہ اگر یہ کھانا، جائز ہے، تو اس حدیث شریف کا کیا مطلب ہے؟ جس میں یہ حکم فرمایا گیا کہ غیر مسلموں کے برتنوں کو استعمال نہیں کرنا

چاہئے، اگر سخت ضرورت ہو، تو خوب کھنگال کر استعمال کریں؛ اس لئے خوب اچھی طرح مدلل جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: محمد خالد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیر مسلم کے ہوٹل میں گوشت کے علاوہ سبزی وغیرہ کھانا جائز ہے، حدیث شریف میں غیر مسلموں کے برتنوں کو استعمال کرنے سے جو منع کیا گیا ہے، وہ اس صورت میں ہے جبکہ وہ برتن ناپاک چیز میں مستعمل ہوں، اگر کفار کے برتنوں کا پاک ہونا یقینی ہو، تو انکا استعمال بلا کراہت درست ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمود یہ ڈابھیل ۴۶/۱۸-۴۸، میرٹھ ۶۶/۲۷-۶۸)

عن جابرؓ قال: كنا نغزوا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فنصيب من انية المشركين وأسقيتهم فتستمتع بها، فلا يعيب ذلك عليهم. (أبوداؤد، باب الأكل في آنية أهل الكتاب، النسخة الهندية ٢/٤٢٨، دارالسلام رقم: ٣٨٣٨، مسند أحمد بن حنبل ٣/٣٧٩، رقم: ١٥١١٩)

قال الخطابي: الرخص الغسل، هذا إذا كان معلوما والأصل من حال المشركين أنهم يطبخون في قدورهم الخنزير، ويشربون في آنيتهم الخمر فإنه لايجوز استعمالها إلا بعد الغسل والتنظيف. (بذل المجهود، باب في استعمال آنية أهل الكتاب، دارالبشائر الإسلامية ١١/٥٦٣، سهارنپور ٤/٣٦٦)

قال: أنقوها غسلا لأنهم يطبخون فيها الخنزير ويشربون فيها الخمر . (العرف الشذي هامس الترمذي ٢/٢)

عن أبي ثعلبة الخشنيؓ قال: سئل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن قدور المجوس، فقال: أنقوها غسلا واطبخوا فيها. (ترمذي شريف باب ما جاء في الإنتفاع بآنية المشركين، النسخة الهندية ١/٢٨٤، دارالسلام رقم: ١٥٦٠)

لا بأس بطعام المجوس إلاذبيحتهم و في الأكل معهم.
(خلاصة التفاوى اشرفيه ديوبند ٤/٣٤٦)

قال محمدؒ: ويكره الأكل والشرب فى أواني المشركين قبل الغسل و مع هذا لوأكل، أو شرب قبل الغسل جاز ولايكون آكلاً ولاشارباً حراماً، وهذا إذا لم يعلم بنجاسة الأواني، فأما إذا علم فإنه لايجوز أن يشرب و يأكل منها قبل الغسل ولو شرب، أو أكل كان شارباً، وآكلا حراما. (هندية، الباب الرابع عشر في أهل الذمة، زكريا جديد ٥/٤٠٠، قديم ٥/٣٤٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ جمادی الثانیہ ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۵۵۴)

کھانے پینے کی اشیاء میں سور کی چربی ملی ہونے کے نوٹس کا حکم

سوال [۱۰۶۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے علاقہ میں حال میں ایک نوٹس کے ذریعہ معلوم ہوا کہ مندرجہ ذیل اشیاء میں خنزیر کی چربی، خنزیر کا خون وغیرہ شامل کیا گیا، جس سے یہ چیزیں حرام ہوجاتی ہیں، لکس صابن، کیمی صابن، کولگیٹ، پالمولیو کے دانت کے پیسٹ، پیپسی کولا، کوکا کولا میں شراب ملائی گئی ہے۔

(۱) بذریعۂ نوٹس: کوکا کولہ میں حرام چیز شامل رہنے سے کوکا کولہ حرام ہے یہ دارالعلوم دیوبند کا فتوی ہے۔

(۲) کوکا کولہ میں شراب ہے، اس بات کو تیار کرنے والے نے خود تسلیم کرلیا ہے، اور خنزیر کی چربی بھی؟

(۳) غیر مسلم کے ہوٹلوں میں جو چیزیں تیار ہوتی ہیں، اس میں گائے کا پیشاب ملایا جاتا ہے اور یہ دیکھا گیا ہے۔کیا یہ بات صحیح ہے اور ہے تو مسئلہ بتائیں؟

المستفتی: محمد شاکر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال میں مذکورہ جتنی چیزوں کے بارے میں بذریعۂ نوٹس معلومات حاصل ہوئی ہیں کہ ان میں ناپاک چیزیں ملائی جاتی ہیں، جب تک ان کے بارے میں اس جز کی پوری تحقیق نہ ہوجائے حرمت کا حکم لگانا درست نہیں۔

نیز یہ بھی ضروری نہیں کہ مذکورہ چیزیں اسی طریقہ سے بنائی جائیں؛ بلکہ دیگر طریقوں سے بھی ان کی ترکیب ممکن ہے، زیادہ تجسس اور کھود کرید کرنا اور احتمالات واوہام کی بناء پر احتراز کرنا دین میں تعمق وغلو ہونے کی وجہ سے ممنوع ہے، اور بلا دلیل شرعی حرمت کا حکم لگانا دین میں زیادتی اور تحریف ہے، اور دارالعلوم دیوبند کے فتوی کے بارے میں ہم اس وقت تک کچھ نہیں کہہ سکتے، جب تک وہ ہمارے سامنے نہ ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہم ان کے فتاوی سے اس وقت تک اتفاق کرلیں، جب تک ان کے فتوی میں دلیل شرعی مضبوط طور پر موجود نہ ہو۔

نیز دارالعلوم دیوبند کے مایہ ناز مفتی فقیہ النفس حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ کے متعدد فتوے اس مسئلہ کی تائید میں امور مذکورہ کے متعلق آپ کو ملیں گے۔ ملاحظہ فرمائیں فتاوی محمودیہ قدیم ۳۱۸/۱۷ و۳۷۴/۱۵ و۳۰۸/۱۷ و۱۵۹/۵، جدید ڈابھیل ۱۸۰/۲۴، ۲۰۵/۱۸، ۲۰۶.

نیز مذکورہ مسائل سے متعلق حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، مفتی اعظم ہند اور حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند کا مفصل وطویل فتوی جو کفایت المفتی میں ۲۷۹/۲ پر موجود ہے اس کا مطالعہ کرنا بہت مفید ثابت ہوگا اور ایضاح المسائل اضافہ شدہ ۱۴۶/ و ایضاح المسالک ۱۴۲/ پر اس سلسلہ میں مختصر مسئلہ موجود ہے، ان فتاوی و

جزئیات کو دیکھ کر خود بھی مطمئن ہوں اور مسلمانوں کو بھی مطمئن کریں تاکہ مسلمان طہارت وعدم طہارت کے متعلق شکوک وشبہات میں مبتلا نہ ہوں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۲۰۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۶/۱۶ھ

E کوڈ کی شرعی حیثیت

سوال [۱۰۷۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (IFANCA) اسلامک فوڈس اینڈ ٹراشن کونسل آف امریکا نامی تنظیم نے اپنے ویب سائٹ میں حلال وحرام اشیاء خورد ونوش کی ایک لمبی فہرست شائع کی ہے، جس میں انہوں نے حرام وحلال اشیائے خورد ونوش کی شناخت کے لئے کچھ متعین کوڈ نمبر بتایا ہے، مثلاً E120,E 140,E171,472,471 وغیرہ یہ کوڈ نمبر جس کھانے کے سامان کے پیکٹ وغیرہ میں لکھا ہوا ہوگا وہ حرام ہے؛ کیونکہ اس میں Emulsifier ملا ہوا ہے، اور یہ حیوانات اور نباتات کی چربی سے بنتا ہے، جیسے BritaniaTop بسکیٹ میں E471 جو کہ حرام کوڈ نمبر ہے لکھا ہے، واضح ہو کہ ویب سائٹ نے یہ اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ (Emulsifier) اگر چہ مختلف جانوروں کی چربی سے تیار ہوتا ہے؛ لیکن یہ قوی اندیشہ ہے کہ یہ سور کی چربی سے تیار ہوا ہو؛ لہٰذا مسلمانوں کو Emulsifier ملی ہوئی چیزوں کے استعمال سے اجتناب کرنا چاہئے، ہم لوگوں نے یہاں اپنے محدود ذرائع سے اس کی تحقیق کرنے کی کوشش کی؛ لیکن کوئی تشفی بخش جواب حاصل نہ ہوسکا، اس بارے میں آپ حضرات کی تحقیقات کیا ہیں؛ چونکہ آپ حضرات کے پاس معلومات وتحقیقات کے ذرائع بہت زیادہ ہیں؛ اس لئے آپ حضرات سے مؤدبانہ گذارش ہے کہ اس بارے میں پوری تحقیق کر کے تشفی بخش جواب مرحمت فرمائیں تاکہ عوام کو اس کے بارے میں روشناس کرایا جاسکے۔

نــــوٹ: Emulsifier کا معنی زیادہ تر لغت میں دودھ جیسی شئ کو بتایا گیا ہے؛ البتہ دوایک لغت میں اس کا ترجمہ چربی سے کیا گیا ہے۔

المستفتی: محمد عزیز الحق قاسمی، مدنا پور مغربی بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: اشیاء خوردنی میں اصل حکم اباحت اور حلت کا ہے؛ لہٰذا جب تک کسی چیز کی حرمت قطعی اور یقینی طور پر پایۂ ثبوت کو نہ پہونچے تو محض شبہ کی وجہ سے اس پر حرمت کا حکم نہیں لگایا جا سکتا ہے اور کمپنی نے جو کچھ متعین کوڈ بتلائے ہیں، وہ حرمت کے یقین کو نہیں پہنچتے ہیں بالخصوص جبکہ ویب سائٹ نے حرام اشیاء کے ملے ہونے کا اندیشہ ظاہر کیا ہے اور خود ویب سائٹ والوں کو بھی اس میں حرام اشیاء کی ملاوٹ کا یقین نہیں ہے؛ بلکہ تردد ہے؛ اس لئے اس پر حرمت کا حکم نہیں لگایا جا سکتا ہے، البتہ اگر کوئی شخص ان چیزوں کے استعمال سے گریز کرتا ہے، تو وہ اس کی طرف سے ایک احتیاط اور بہتر بات ہے۔

الأصل في الأشياء الإباحة. (قواعد الفقه اشرفي ٥٩)

من شك في إنائه، أوثوبه، أو بدنه أصابته نجاسة أو لا، فهو طاهر مالم يستيقن، وكذا الآبار، والحياض، والحباب الموضوعة في الطرقات، ويستقي منها الصغار، والكبار، والمسلمون، والكفار، وكذا مايتخذه أهل الشرك، أوالجهلة من المسلمين كالسمن، والخبز، والأطعمة، والثياب. (شامي، كتاب الطهارة، قبيل مطلب في أبحاث الغسل، زكريا ٢٨٣/١-٢٨٤، كراچي ١٥١/١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢١ ربیع الثانی ١٤٣٤ھ
(فتویٰ نمبر: الف ١١٠٦٤/٤٠)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
٢١/٣/١٤٣٤ھ

E کوڈ کا شرعی حکم

سوال [۱۰۷۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہم اپنے ایک بزرگ کے احسان مند ہیں کہ انہوں نے آج ہمیں ایک مسلم ڈائجسٹ مارچ ۲۰۰۵ء میں شائع ڈاکٹر محمد امجد خاں کا ایک مضمون لاکر دیا جسے پڑھ کر ہمارے ہوش اڑ گئے، انہوں نے اپنے ایک دوست کے حوالے سے جو فرانس کے سرکاری محکمۂ غذا میں کام کرتے ہیں جہاں کھانے میں استعمال ہونے والی تمام اشیاء اور دواؤں وغیرہ کا رجسٹریشن ہوتا ہے، لکھا ہے کہ یورپ اور امریکہ وغیرہ کی تمام ملٹی نیشنل کمپنیاں دھڑلے سے مسلمانوں کو سور (خنزیر) کی چربی کھلا رہی ہیں۔

بسکٹ اور کیک سمیت بیشتر بیکری items ٹوتھ پیسٹ، شیونگ کریم، چیونگ گم، چاکلیٹ، ٹافی، کارن فلیک، ڈبہ بند غذائی اشیاء، ڈبہ بند پھل اور پھلوں کے رس کے علاوہ وٹامن گولیوں سمیت کچھ ایلو پیتھک ٹانکوں میں دیگر اجزاء کے علاوہ لازماً جو چیز شامل ہوتی ہے، وہ خنزیر کی چربی ہے؛ چونکہ اب بین الاقوامی قانون کے تحت تمام غذائی اشیاء کے پیکٹ یا ڈبے پر یہ لکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس کے اندر کون کون سے اجزاء شامل ہیں، اور اس کی تغذیاتی قوت (NutritionValue) کیا ہے۔ لہٰذا براہ راست Pig Fat (خنزیر کی چربی) یا Animal Fat (حیوانی چربی) لکھنے کے بجائے ایک مخصوص ای کوڈ (E-Code) کا استعمال ہوتا ہے۔ ڈاکٹر امجد خان کا کہنا ہے کہ E-100 سے لے کر E-904 تک جتنے کوڈ غذائی اشیاء کے پیکٹ، ریپر یا ڈبے وغیرہ پر درج ہوتے ہیں، ان سے مراد سور کی چربی ہوتی ہے، مثال کے طور پر برطانیہ کمپنی کے نیوٹری چوائس، کریم کریکر، بسکٹ کے ریپر پر اس میں شامل اجزاء (Ingredients) کے تحت جہاں گیہوں کے آٹے، نباتاتی تیل، شکر وغیرہ کا حوالہ ہے وہیں اس فہرست میں Mulsifier (E-481) بھی درج ہوتا ہے۔

ڈاکٹر خان کی E-Code فہرست کے مطابق یہ E-481 کوڈ بھی خنزیر کی چربی کے لئے استعمال ہوتا ہے، ڈاکٹر خاں کے مطابق ان کے دوست فرانس کے مقام پیگل پر واقع محکمۂ غذا کی کوالٹی کنٹرول لیباریٹری میں Department of Food's Quality Controle Laboratories میں کام کرتے ہیں۔ یہ اطلاعات انہیں وہیں سے حاصل ہوئی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ صرف فرانس میں بیالیس ہزار Pig Farms ہیں اور خنزیر کے بدن میں چربی بہت زیادہ ہوتی ہے، ساٹھ سال پہلے تک فرانسیسی کمپنیاں اس چربی کو جلا کر ضائع کر دیتی تھیں؛ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد صابن میں اس کا استعمال شروع ہوا اور پھر شیونگ کریم، خواتین کے افزائش حسن کی متعدد اشیاء اور ٹوتھ پیسٹ میں اس کا استعمال کیا جانے لگا، پھر بیکری میں تیار ہونے والی اشیاء بسکٹ وغیرہ اور چاکلیٹ میں استعمال ہونے لگا، شروع میں ڈبے یا ریپر کے اوپر Pig Fat لکھا جاتا تھا؛ لیکن جب کچھ لوگوں نے ان کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اسی سور اور گائے کی چربی کے استعمال کے خلاف بغاوت سے شروع ہوئی تھی (جسے سامراج نے غدر اور بغاوت کا نام دیا تھا) تو انہوں نے پگ فیٹ کے بجائے Animal Fat لکھنا شروع کر دیا؛ لیکن جب تیل کی دولت آنے کے بعد مغربی ممالک نے بڑے پیمانے پر عرب اور مسلم ممالک سے کاروبار شروع کیا تو مسلم حکومتوں نے ان سے پوچھا کہ آپ کس حیوان کی چربی استعمال کرتے ہیں؟ تو انہوں نے گائے اور بھیڑ کی چربی کا نام لیا؛ لیکن جب مسلم ممالک نے اس پر بھی یہ اعتراض کیا کہ چونکہ اسلام نے ہر اس حلال جانور کو بھی حرام کر دیا ہے جسے حلال طریقے سے ذبح نہ کیا گیا ہو؛ لہٰذا ہم ان کا استعمال نہیں کر سکتے، تو مغربی ممالک اور ملٹی نیشنل کمپنیوں نے E-Code استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس وقت سے تمام ڈبہ بند اشیاء پر اسی ای کوڈ کا استعمال ہو رہا ہے؛ لیکن ڈاکٹر خان کے مطابق اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ مختلف اشیاء کے Ingredients میں

جوشئ E.Nos کے ساتھ درج ہوتی ہے، وہ خنزیر کی چربی ہوتی ہے؛ لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ اب وہ بازار سے کوئی بھی چیز خریدتے وقت اس کے Ingredients کو ضرور دیکھ لیں، اگر اس میں E-100 سے E-904 تک کوئی بھی کوڈ درج ہے، تو اس سے بہر قیمت پرہیز کریں۔ ہم نے اس کا تذکرہ صرف اس لئے کیا کہ مسلم اہل علم کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی تحقیق کریں؛ کیونکہ اس سے پہلے ہمارے علم میں یہ بات بھی لائی جا چکی ہے کہ چائنیز کھانوں میں Taste Maker کے طور پر جو خاص جز استعمال ہوتا ہے، وہ بھی خنزیر کی چربی سے بنایا جاتا ہے۔ اللہ ہماری مدد کرے اور ہمیں ہر طرح کی حرام غذا سے محفوظ رکھے۔

ای-کوڈ (E-Code) میں پوشیدہ ہیں کئی گہرے راز

ای-کوڈ (E-Code) والے بسکٹ، چیونگم، چاکلیٹ، ٹافی اور ڈبہ بند خوراک استعمال کرنے والے ہوشیار ہو جائیں

ملٹی نیشنل کمپنیز کی مذکورہ مصنوعات میں سور کی چربی ہونے کا الزام لگاتے ہوئے وی ایچ پی (وشو ہندو پریشد) کے سابق ریاستی ترجمان اور تاجر لیڈر وبھوتی بھوشن گپتا کی قیادت میں گذشتہ ہفتہ کارکنوں نے ملٹی نیشنل کمپنیوں کا پتلا نذر آتش کیا اور عوام کو ایسی مصنوعات کے استعمال سے پرہیز کرنے کی اپیل کی، پتلا نذر آتش کرنے والوں کا الزام تھا کہ ان اشیائے خوردنی میں ای کوڈ کے نام سے استعمال ہونے والی شے میں گائے سور اور بھیڑ کی چربی ہوسکتی ہے۔

اس معاملے میں جمعیۃ العلماء گورکھپور کے صدر مولانا جنید عالم ندوی کہتے ہیں کہ ای کوڈ ہندو اور مسلمانوں کے مذہب کے ساتھ کھلواڑ ہے، مولانا ندوی کہتے ہیں کہ (E-Code) ۱۰۰ سے ۹۰۴ تک ای کوڈ جتنے بھی کوڈ اشیائے خوردنی کے پیکٹ پر درج ہوتے ہیں، ان کا مطلب سور کی چربی ہے۔

حقیقت میں ای کوڈ کیا ہے؟ اس معاملے میں کئی ویب سائٹس کو کھول کر دیکھا گیا ہے، برطانیہ کی ویب سائٹ http:/www.bryngolliefreeserve.co.uk پر ای کوڈ کے زیادہ تر مصنوعات میں جانوروں کے باقیات یا چربی (Animal Origin, Animal fars or Animal Product) ہونے کا خدشہ ظاہر کیا گیا ہے، ملٹی نیشنل کمپنیوں کے کئی قسم کے بسکٹوں میں E471/E422 استعمال کیا گیا ہے، ویب سائٹ پر سبزی خوروں کو ان مصنوعات سے پرہیز کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

آج کل اکثر چیزیں جو غیر ملکی کمپنیوں کی بنی ہوئی آرہی ہیں، بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ خنزیر کی چربی سے تیار کی جاتی ہیں اور ہر چیز کے پیکٹ پر ایک کوڈ بنا دیا گیا ہے، جس میں کمپنی والوں نے خود یہ بتلا دیا ہے کہ اس میں کیا کیا چیزیں ہیں؟ خنزیر کی چربی کے لئے بھی ایک کوڈ مقرر کیا گیا ہے، اس کوڈ کے ذریعہ خنزیر کی چربی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے، جس کی تفصیل کے لئے اور پوری صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے ای کوڈ کی ایک کاپی اس تحریر کے ساتھ ارسال کی جاتی ہے، جس کی رو سے ۹۰ ر فیصد چیزیں اس چربی سے خالی نہیں ہیں؛ جبکہ وہ روزمرہ کھانے کی چیزیں ہیں اور تقریباً ہر آدمی ان کو استعمال میں لا رہا ہے؛ لہٰذا آپ شریعت کی روشنی میں مدلل حکم شرعی سے آگاہ فرمائیں کہ یہ چیزیں حلال ہیں یا حرام؟

المستفتی: زبیر احمد قاسمی، امام مسجد چھتہ آغا جان، دریا گنج دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سوال نامہ میں جن اشیاء میں ناپاک اجزاء کی ملاوٹ کا ذکر ہے، وہ چیزیں آج کل کثرت سے لوگوں کے استعمال میں ہیں اور بلا شبہ کروڑوں مسلمان بھی روزمرہ کی زندگی میں ان چیزوں کے عادی ہو چکے ہیں؛ اس لئے ان چیزوں کی حرمت کے بارے میں فتوی دیتے وقت نہایت احتیاط کی ضرورت ہے، اور ایک دو ڈاکٹر کے تحقیقی مضمون یا اخبارات میں چھپنے والے مضامین سے حتمی طور پر یہ

بات معلوم نہیں ہوسکتی کہ جو تحقیق ان مضامین میں پیش کی گئی ہے، وہ واقع کے عین مطابق ہے؛ بلکہ ایسے مضامین خود ہی قابل تحقیق ہیں اور اگر بالفرض اس طرح کے مضامین کو درست بھی مان لیا جائے، تو یہ امر قابل تحقیق رہ جاتا ہے کہ آیا وہ ناپاک اجزاء ان اشیاء میں مل کر اپنی اصلی شکل میں موجود ہیں یا کیمیکلوں کے ذریعہ ان کی ماہیت تبدیل کردی گئی ہے، اگر یہ ثابت ہوجائے کہ ان کی ماہیت بدل چکی ہے، تو ایسی اشیاء کے استعمال میں شرعاً کوئی حرج نہ ہوگا جیسا کہ شراب کا شیرہ اگر سرکہ میں تبدیل ہوجائے، تو سرکہ کا استعمال درست ہوتا ہے، اسی طرح فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر ناپاک تیل سے صابون بنایا جائے، تو اس صابون کا استعمال درست ہے؛ کیونکہ ماہیت بدل جاتی ہے؛ اس لئے جب تک مذکورہ اشیاء میں ماہیت کی تبدیلی یا عدم تبدیلی کے متعلق مکمل تحقیق سامنے نہ آجائے، اس وقت تک مذکورہ اشیاء کو حلال ہی کہا جائے گا، ان کی حرمت کا فتویٰ نہیں دیا جاسکتا۔
(مستفاد: کفایت المفتی ۲/ ۲۷ تا ۲۸۴، ایضاح المسالک ۱۴۲)

إن النجاسة لما استحالت وتبدلت أوصافها، ومعانيها خرجت عن كونها نجاسة؛ لأنها اسم لذات موصوفة فتنعدم بانعدام الوصف وصارت كالخمر إذا تخللت. (بدائع الصنائع، كتاب الطهارة، الدباغة، زكريا ١/ ٢٤٣، كراچي ١/ ٨٥)

ثم اعلم أن العلة عند محمدؒ هي التغير وانقلاب الحقيقة، وإنه يفتىٰ به للبلوىٰ كما علم مما مرَّ، ومقتضاه عدم اختصاص ذلك الحكم بالصابون فيدخل فيه كل ما كان فيه تغير وانقلاب حقيقة، وكان فيه بلوىٰ عامة. (شامي، كتاب الطهارة، باب الأنجاس، زكريا ١/ ٥١٩، كراچي ١/ ٣١٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۳۱۲/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۵/۲۳ھ

مردار بکری یا مرغی غیر مسلم کو کھانے کے لئے دینے کا حکم

سوال [۱۰۷۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کوئی چیز مسلمان کے لئے کھانا ناجائز ہے، مثلاً گھر میں بکری یا مرغی مرگئی تو مردار مرغی، بکری وغیرہ کا کسی غیر مسلم کو کھانے کے لئے دینا کیا حکم رکھتا ہے؟

المستفتی: محمد عمران دیناج پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فتاوی دار العلوم میں مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کے فتاوی میں اس بات کی وضاحت موجود ہے کہ میتۃ اور جو میتۃ کے حکم میں ہے، وہ غیر مسلم کو دینے کی گنجائش ہے اور دیتے وقت دینے والے کی یہ نیت ہونی چاہئے کہ مردہ چیز کو ہم یہاں سے نکال پھینک رہے ہیں، جو غیر مسلموں کے ہاتھ میں پہونچ رہی ہے اور شریعت نے غیر مسلموں کو اپنے مذہب پر چھوڑ دینے کا حکم فرمایا ہے اور ایسے ناپاک اور گندی چیزوں کو ان کے ہاتھوں میں دینے کی گنجائش دی ہے۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم ۱۵/۴۳۲)

جزئیات ملاحظہ فرمائیے:

وأهل الذمة في البياعات كالمسلمين إلا في الخمر، والخنزير خاصة، فإن عقدهم على الخمر كعقد المسلم على العصير وعقدهم على الخنزير كعقد المسلم على الشاة لأنها أموال في اعتقادهم ونحن أمرنا بأن نتركهم وما يعتقدون دل عليه قول عمر ولوهم بيعهما الخ.

(كتاب البيوع، مسائل منثورة، الهداية ۳/ ۱۰۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ رجب المرجب ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/ ۱۲۱۳۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۳/۷/۱۴۳۶ھ

(۱۰) باب حلال وحرام جانور

حلال جانوروں کو کھانے کا حکم کب نازل ہوا؟

سوال[۱۰۷۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حلال جانوروں کا گوشت، جیسے گائے بھینس بکرے دنبہ، مچھلی، پرندوں وغیرہ کیکھانے کا حکم کب سے ہوا ہے، حضور والا سے مؤدبانہ التماس ہے کہ حدیث وقرآن کی روشنی میں مدلل جواب مرحمت فرمائیں ممنون ومشکور ہوں گا۔

المستفتی: رمضان علی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قولہ تعالیٰ: **قُلْ لَا اَجِدُ فِيْ مَا اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهُ اِلَّا اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ.** [الانعام: ١٤٥]

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ تمام حلال جانوروں کے کھانے کی اجازت وحکم اسلامی شریعت سے پہلے سے تھا نیز حلال جانوروں کے علاوہ خنزیر، دم مسفوح اور میتہ کو چھوڑ کر اور بھی بہت سے جانور حلال تھے، غزوۂ خیبر کے موقع پر ان جانوروں کی حرمت نازل ہوگئی ہے، یعنی گدھا، خچر، درندے اور پنجوں سے شکار کرنے والے پرندے کو خیبر میں حرام کردیا گیا تھا، باقی کی حلت دائمی رہی ہے۔

عن جابرؓ قال: حرم رسول الله صلى الله عليه وسلم: يعني يوم خيبر، الحمر الإنسية، ولحوم البغال، وكل ذي ناب من السباع، وذي مخلب

من الطیر. (السنن الترمذي، باب ما جاء في كراهية كل ذي ناب و ذي مخلب، النسخة الهندية ۱/ ۲۷۳، دارالسلام رقم:۱۴۷۸)

نیز مچھلی کی حلت بھی شریعت اسلامی سے پہلے سے تھی، جو قوم یہود کو ہفتہ کے دن مچھلی کے شکار کی ممانعت کی آیت سے واضح ہوتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍محرم الحرام ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴؍۱۰۷۸)

حلال جانور پر ’’جلالہ‘‘ کا حکم کب لگتا ہے؟

سوال [۱۰۷۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ’’جلالہ‘‘ کس حلال جانور کو کہا جاتا ہے، جو چوپائے جانور یا مرغ وغیرہ پاک چارہ کھانے کے ساتھ ساتھ نجاست کھالیں وہ جلالہ ہوں گے؟ یا اس کو جلالہ کہا جاتا ہے جس کی مستقل غذا نجاست ہوتی ہے؟

المستفتی: شکیل احمد، مدرسہ قاسم العلوم، سیتا پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: کسی بھی حلال جانور کے جلالہ ہونے کے لئے دو شرطیں لازم ہیں، ان دونوں شرطوں کے بغیر جانور کو جلالہ نہیں کہا جاسکتا ہے۔

شرط نمبر ۱: اس حلال جانور کی غذا صرف نجاست اور گندگی ہو، نجاست اور گندگی کے علاوہ کوئی پاک چارہ نہ کھاتا ہو۔

شرط نمبر ۲: نجاست اور گندگی کھانے کی وجہ سے اس کے گوشت سے بد بو نمایاں طور پر ظاہر ہوتی ہو، حتی کہ اس کے پسینے سے بھی بد بو ظاہر ہوتی ہو، تو ایسے جانور کو جلالہ کہا جاتا ہے، جس میں یہ دونوں شرطیں ایک ساتھ پائی جائیں؛ لہٰذا اگر مستقل

نجاست کھانے کے باوجود اس جانور کے گوشت میں نجاست کی بدبو اور اثرات نمایاں نہ ہوں، تو وہ جلالہ میں شامل نہیں ہوتا ہے اور اس حلال جانور کو کھانا بلا کراہت جائز ہے، اس کو صاحب بدائع نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے۔

روي ابن رستم عن محمد في الناقة الجلالة، أو الشاة، والبقر الجلال أنها إنما تكون جلالة إذا تفتتت وتغيرت ووجد منها ريح منتنة، فهي الجلالة حينئذ لايشرب لبنها و لايؤكل لحمها، وبيعها وهبتها جائز، هذا إذا كانت لا تخلط و لا تأكل إلا العذرة غالباًوإن خلطت فليست جلالة. (بدائع الصنائع، كتاب الذبائح، فصل بيان ما يكره من الحيوانات، زكريا ٤/١٥٤، كراچي٥/٤٠)

اور مبسوط سرخسی میں اس کو ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے ملاحظہ فرمائیے۔

والذي روي أنه كان يحبس الدجاج ثلاثة أيام،ثم يذبحها، فذلك على سبيل التنزه من غير أن يكون ذلك شرطاً في الدجاجة وغيرها مما يخلط وإنما يشترط ذلك في الجلالة التي لاتأكل إلا الجيف.

(مبسوط سرخسي، دارالكتب العلمية بيروت، كتاب الصيد١١/٢٥٦)

اور شامی میں اس کو ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے ملاحظہ فرمائیے:

الجلالة التي إذا قربت وجد منها رائحة، فلا تؤكل و لايشرب لبنها و لا يعمل عليها. (شامي، كتاب الذبائح، زكريا ٩/٤٤٥، كراچي ٦/٣٤٠)

اور امام زیلعی نے اس کو ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے۔

والجلالة هي التي تعتاد أكل الجيف، والنجاسات و لا تخلط، فيتغير لحمها، فيكون منتنًا ولو حبست حتى يزول النتن حلت ولم يقدر لذلك مدة في الأصل. (تبيين الحقائق، كتاب الكراهية، زكريا ٧/٢٤، امدادية ملتان ٦/١٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ربیع الاول ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱؍۱۱۹۵۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵؍۳؍۱۴۳۶ھ

جلالہ جانور کو بند رکھ کر پاک غذا کھلانے کا حکم وجوبی ہے یا استحبابی؟

سوال [۱۰۷٦۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جو حلال جانور نجاست کھانے کے عادی ہیں، نجاست اور غلاظت ان کے لئے مرغوب ترین غذا بن گئی ہے، اور پاک چارہ کھانے کے عادی نہیں ہیں، اگر کھائیں تو بہت ہی کم جس کی وجہ سے وہ جانور جلالہ بن گئے ہیں، تو ایسے حلال جانوروں کو ذبح کرنے سے پہلے کتنے دنوں تک بند رکھنے کا حکم ہے؟ اور بند رکھنے کا حکم وجوبی ہے یا استحبابی ہے؟

اس سلسلے میں شریعت کا جو بھی حکم ہو دلائل کی روشنی میں واضح فرمادیں اور یہ بھی فرمادیں کہ اگر مرغ ہو، تو اسے کتنے دنوں تک بند رکھ کر پاک غذا دی جائے؟ اسی طرح بکری ہو تو اسے کتنے دن بند رکھ کر پاک غذا دی جائے اور گائے، بھینس اور اونٹ کو کتنے دنوں تک بند رکھ کر پاک غذا دی جائے؟

المستفتی: محمد فراز، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جلالہ جانور کو ناپاک غذا سے محفوظ رکھ کر پاک غذا کھلانے کا مسئلہ وجوبی نہیں ہے؛ بلکہ استحبابی اور افضلیت کا ہے؛ تاکہ کراہت تنزیہی سے بھی پاک ہو جائے اور اس کی مقدار کے بارے میں چار اقوال ہمارے سامنے ہیں:

(۱) امام زیلعیؒ نے نوادر کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے کہ اونٹ کو ایک ماہ تک ناپاک غذا سے محفوظ رکھ کر پاک غذا کے دائرہ میں بند رکھا جائے اور گائے، بیل، بھینس کو بیس دن تک بند رکھا جائے اور بکرے کو دس دن تک اور مرغ کو تین دن تک۔

(۲) اونٹ کو پاک غذا کے ساتھ چالیس دن تک بند رکھا جائے، اس کو زیلعیؒ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے ملاحظہ فرمائیے:

وقدره في النوادر بشهر وقيل بأربعين يوماً في الإبل، وبعشرين يوما في البقر، وبعشرة أيام في الشاة، وثلاثة أيام في الدجاجة. (تبيين الحقائق، كتاب الكراهية، مطبع، زكريا٧/٢٤، امدادية ملتان٦/١٠)

اوراسی کو بزازیہ اورشامی کتاب الحظر والاباحۃ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا گیا ہے۔

إن ذلك شرط في التي لا تأكل إلا الجيف؛ ولكنه جعل التقدير في الإبل بشهر وفي البقر بعشرين. وفي الشاة بعشرة. (شامي مع الدر، زكريا٩/٤٩١، كراچي٦/٣٤١، فتاوى بزازيه، زكريا جديد ٣/١٦٤، وعلى هامش الهندية٦/٣٠٢)

(۳) شامی کتاب الذبائح میں تجنیس کے حوالہ سے نقل فرمایا گیا ہے کہ مرغ کو تین دن، بکرے کو چار دن اور اونٹ، گائے، بیل کو دس دن تک ناپاک غذا اور چارہ سے محفوظ رکھ کر پاک غذا کھلانا چاہئے، اسی کو قول مختار کہا ہے جیسا کہ درج ذیل عبارت سے واضح ہوتا ہے ملاحظہ فرمائیے:

وفي التجنيس: إذا كان علفها نجاسة تحبس الدجاجة ثلاثة أيام، والشاة أربعة، والإبل، والبقرة عشرة، وهو المختار على الظاهر. (شامي مع الدر، كتاب الذبائح، زكريا ٩/٤٤٤، كراچي ٦/٣٠٦)

(۴) ایام اور مدت کی تعیین کے جو اقوال ماقبل میں مذکور ہیں، وہ سارے کے سارے اقوال مرجوحہ ہیں اور قول راجح اور صحیح ترین قول یہی ہے کہ تبدیل غذا کے لئے ایام اور مدت کی کوئی تعیین نہیں ہے؛ بلکہ جتنے وقت میں جانور کے بدن سے نجاست کھانے کی بدبو ختم ہوجائے اتنے وقت تک بندر کھنے کا حکم ہے اور اس وقت کی کوئی تعیین نہیں اور بندرکھنے کے بعد جب بھی اس کے بدن سے بدبو ختم ہوجائے مستحب طریقہ سے ذبح کرنا ثابت ہو جائے گا اور جانور پالنے والے کو خود اس کا اندازہ ہوجائے گا، اس کو امام شمس الائمہ سرخسیؒ نے مبسوط سرخسی میں زیادہ صحیح اور راجح قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

وإنما يشترط ذلك في الجلالة التي لا تأكل إلا الجيف، وفي الكتاب:

قـال تـحبس أياماً على علف طاهر قيل ثلاثة أيام، وقيل عشرة أيام، والأصح أنها تـحبس إلى أن تزول الرائحة المنتنة عنها؛ لأن الحرمة لذلك وهو شيئ مـحسـوس و لايتـقـدر بـالـزمان لاختلاف الحيوانات في ذلك فيصار فيه إلى اعتبار زوال الـمـضـر، فإذا زال بـالـعلف الطاهر حل تناوله والعمل عليه بعد ذلك. (المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت، كتاب الصيد)

اسی طرح کی عبارت (شامی کتاب الذبائح مطبع زکریا دیوبند ۱۱/۲۵۶، ۹/۴۴۴-۴۴۵، کراچی ۶/۳۰۶، بزازیہ، زکریا جدید ۳/۱۶۴، وعلی ہامش الہندیۃ ۶/۳۰۲) میں ہے۔

اس کوصاحب بدائع نے اس طرح کے الفاظ کے ساتھ نقل فرمایاہے ملاحظہ فرمایئے:

والأفـضـل أن تحبس الدجاجة حتى يذهب ما في بطنها من النجاسة، وقـولـه لأن الـنـهـي ليـس لمعنىً يرجع إلي ذاتها؛ بل لعارض، جاورها فكان الانتـفـا ع بها حلالاً في ذاته إلا أنه يمنع عنه لغيره ثم ليس لحبسها تقدير في ظـاهـر الـرواية، هـكذا روى عن محمدؒ أنه قال: كان أبو حنيفةؒ لا يوقت فى حبسـهـا، وقـال: تـحبس حتى تطيب وهو قولهما أيضاً. (بدائع الصنائع، كتاب الذبائح، والصيود، زكريا ٤/١٥٤، كراچي ٥/٤٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ربیع الاول ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/۱۱۹۵۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۳/۱۴۳۶ھ

طوطا، مینا حلال ہیں اوران کا کھانا جائز ہے

سوال [۱۰۷۶۴]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ پرندوں میں سے طوطا یا مینا کا کھانا جائز ہے یانہیں؟ اگر جائز ہوتو معلوم یہ کرنا ہے کہ فقہ کی کتاب میں جوعلت قرار دیا ہے بعض پرندوں کی حرمت کے بارے میں

کہ ہر وہ پرندہ جو پنجوں سے پکڑتا ہے؛ لہٰذا اگر طوطے کو اس حکم سے مستثنیٰ کیا گیا ہو، تو مہربانی فرما کر وہ عبارت تحریر فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

اور دوسر بات یہ ہے کہ اس کو مستثنیٰ کرنے کی وجہ کیا ہے؟

المستفتی: محمد زین العابدین، بردوانی بنگالی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: طوطا اور مینا حلال ہیں اور طوطا وغیرہ پنجوں سے شکار نہیں کرتے ہیں؛ بلکہ کسی چیز کے کھاتے وقت پنجوں سے دبا کر چونچ سے کھاتے ہیں اور جن پرندوں کی حرمت حدیث میں وارد ہوئی ہے، وہ ایسے پرندے ہیں جو ہوا میں اڑتے ہوئے اپنے پنجوں سے شکار کر لیتے ہیں، جیسا کہ باز، چیل اور شاہین وغیرہ ہیں اور طوطا وغیرہ ہوا میں اڑتے ہوئے شکار نہیں کرتے ہیں۔

ویحل من الطیر أکل العصافیر، بأنواعها، والسمان، والقنبر، والزرزور، والقطأ والکروان والبلبل، والببغاء، والنعامة، والطاؤس الخ

(کتاب الفقة علی المذاهب الأربعة، کتاب الحظر والإباحة، دارالفکر بیروت ۲/۲)

عن ابن عباسؓ قال: نهی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: عن أکل کل ذي ناب من السبع، وعن کل ذي مخلب من الطیر. وتحته في البذل والمراد بذي مخلب من الطیر الذي یصید بمخالبه مع الطیران في الهواء.

(أبوداؤد، کتاب الأطعمة، با ماجاء في أکل السبع، النسخة الهندیة ۲/۵۳۳، دارالسلام رقم: ۳۸۰۳، بذل المجهود، مصري ۱۶/۱۳، هندي، ۴/۳۵۹، دارالبشائر الإسلامیة بیروت ۱۱/۵۳۰، فتاوی احیاء العلوم ۱/۲۴۱، بهشتي زیور۳/۶۰) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۱۲؍ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/۱۷۵۸)

امریکن گائے

سوال [۱۰۷۶۵]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ امریکن گائے، جس کے بارے میں عام طور پر لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ اس کی پیدائش خنزیر کے نطفے سے (بذریعہ آلات جدیدہ) یا براہ راست اختلاط سے ہوتی ہے، ایسی گائے کا شرعاً پالنا اور اس سے انتفاع کرنا کیسا ہے؟ وضاحت کے ساتھ جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: فرید احمد، خادم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: امریکن گائے کا پالنا اس کا دودھ استعمال کرنا اور اس کا گوشت کھانا جائز ہے؛ اس لئے کہ حلت اور حرمت میں ماں کا اعتبار ہوتا ہے۔

ولهذا يحل أكل جذع تغذي بلبن الخنزير؛ لأن لحمه لا يتغير وماتغذي به يصير مستهلكاً لا يبقي له أثر. (البحر الرائق، كتاب الكراهية، فصل في الأكل والشرب، كوئٹه ۸/۱۸۲، زكريا ۸/۳۳۵، در مختار، كراچي ۶/۳۴۱، زكريا ۹/۴۹۱، بدائع الصنائع، كراچي ۵/۴۰، زكريا ۴/۱۵۴، هندية، زكريا قديم ۵/۲۹۰، جديد ۵/۳۳۴، الجوهرة النيرة، امدادية ملتان ۲/۲۸۱، دار الكتاب ديوبند ۲/۲۶۷، فتاوى قاضي خان، جديد زكريا ۳/۲۵۴، وعلى هامش الهندية، زكريا ۳/۳۵۹)

المولود بين أهلي والوحشي يتبع الأم؛ لأنها هي الأصل في التبعية حتى إذا نزا الذئب على الشاة يضحي بالولد. (هداية، كتاب الأضحية، اشرفي ديوبند ۴/۴۴۹، در مختار كراچي ۶/۳۲۲، زكريا ۹/۴۶۶، تاتارخانية، زكريا ۱۷/۴۳۳، رقم: ۲۷۷۳۹، هندية، زكريا قديم ۵/۲۹۷، جديد ۵/۳۴۳)

وكان مراده الأضحية فقط دون الحل في الأكل، فإن الأكل يجوز مطلقاً. (حاشية اشباه ص: ٧٧٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍صفر المظفر ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۱۴۳/۲۶)

سمک طافی

سوال [۱۰۷٦٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سمک طافی کسے کہتے ہیں؟ اس کی حقیقت کو واضح فرمادیں۔ حضرات فقہاء نے سمک طافی کی حرمت کی علت کیا بیان فرمائی ہے؟ وہ حرام اور ناجائز کیوں ہے؛ جبکہ حدیث شریف میں مردہ مچھلی کھانے کی روایت وارد ہوئی ہے سمک طافی بھی مچھلی ہی ہے، آخر اس کی حرمت کی علت کیا ہے؟

المستفتی: توحید احمد، ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سمک طافی اس مچھلی کو کہا جاتا ہے، جو کسی سبب ظاہری کے بغیر اپنی موت مرگئی ہو یعنی وہ اپنی اندرونی بیماری اور خرابی کی وجہ سے خود بخود مرگئی ہو، اس کے مرنے میں کوئی ظاہری اور خارجی سبب کا کوئی تعلق نہ ہو، اس طرح مچلی خود بخود مرنے کے بعد اس کی دو حالتیں ہوتی ہیں:

(۱) وہ مچھلی مرنے کے بعد پانی کے نیچے ڈوب کر چلی جائے۔

(۲) پانی کے نیچے اس کی تہہ میں پہونچنے کے بعد وہ پھول جائے اور پھول کر پیٹ اوپر کی طرف ہوکر، الٹی حالت میں بہتے پانی کی سطح پر آجائے، تو بعض فقہاء نے اوپر آنے کے بعد مچھلی کے طافی ہونے کا حکم لگایا ہے، جس کا کھانا جائز نہیں ہے اور بعض فقہاء نے

پھول کراوپر آنے سے پہلے بھی اس کے اوپر طافی ہونے کا حکم لگایا ہے اور ان کے نزدیک طافی ہونے کے لئے اتنا کافی ہے کہ مچھلی اپنی موت مرجائے اور مرکر پانی کی تہہ کی طرف چلی جائے یا پھولنے کے بعد اوپر کو آجائے، دونوں صورتوں میں طافی ہونے کو تسلیم کیا ہے اور اس کے اوپر عدم جواز کا حکم لگایا ہے اور دونوں صورتوں کی تائید میں فقہی عبارتیں ملتی ہیں۔

صاحب بدائع نے دونوں شکلیں نقل کرنے کے بعد دوسری شکل کو راجح اور صحیح قرار دیا ہے اور ساتھ میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ سمک طافی کو اس لئے طافی کہا جاتا ہے کہ وہ پھول کر عادۃً پانی کے اوپر آجاتی ہے اور اس کے عدم جواز اور حرمت کی علت فقہاء نے یہی بیان فرمائی ہے کہ وہ مچھلی سڑ،گل کر پھول جاتی ہے اور سڑنے گلنے کی وجہ سے اس میں بدبو اور تعفن بھی پیدا ہوجاتی ہے، انسان کے کھانے کے لائق نہیں رہتی ہے، اس کے کھانے میں مضر اثرات پیدا ہوسکتے ہیں، اس وجہ سے اس کو ناجائز کہا گیا ہے۔

عن جابر بن عبد اللّٰہ قال: قال: رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما ألقي البحر، أو جزر عنه، فكلوه ومامات فيه وطفا فلا تأكلوه(أبوداؤد شريف، باب في أكل الطافي من السمك، النسخة الهندية٢/ ٥٣٤، دارالسلام رقم:٣٨١٥، سنن ابن ماجه، باب الطافي من صيد البحر، النسخة الهندية ٢/ ٢٣٤، دارالسلام رقم:٣٢٤٧)

إنما الطافي اسم لما مات في الماء من غير آفة، وسبب حادث وهذا مات بسبب حادث وهو قذف البحر، فلا يكون طافياً والمراد من الحديثين غير الطافي لما ذكرنا، ثم السمک الطافي لا يحل أكله عندنا، هو الذي يموت في الماء حتف أنفه بغير سبب حادث منه سواء علا على وجه الماء، أو لم يعل بعد أن مات في الماء حتف أنفه من غير سبب حادث. وقال بعض مشائخنا: هو الذي يموت في الماء بسبب حادث ويعلو على وجه الماء، فإن لم يعل يحل والصحيح هو الحد الأول وتسميته طافياً لعلوه على وجه الماء عادة. (بدائع الصنائع، كتاب الذبائح و الصيد، زكريا ٤/ ١٤٥-١٤٦)

وما مات من حرارة الماء، أو برودته، أوكدورته، ففيه روايتان روي عن أبي حنيفةؒ، وأبي يوسفؒ لا يؤكل؛ لأن السمک لا يموت بسبب برودة الماء، وحرارته غالباً، فيكون ميتاً بغير آفة ظاهراً، فلا يحل كالطافي. وري عن محمدؒ أنه يؤكل؛ لأنه مات بآفة؛ لأنه قد يموت بسبب برودة الماء، وكدورته، فيحال بالموت عليه، وهذا أرفق بالناس، كذا في المحيط السرخسي وعليه الفتوى كذا في جواهر الأخلاطي،وعن محمدؒ لا يؤكل الطافي لا لأنه حرام؛ لكن لأنه يتغير فينفر الطبع عنه فصار من الخبائث.

(هندية، الباب السادس في صيد السمك،زكريا قديم ٥/٤٢٩، جديد ٥/٤٨٥، و مثله في التاتارخانية ١٨/ ٤٩٠، رقم:٢٩٧٠١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍ربیع الاول ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر:الف ۴۱؍۱۱۹۴۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹؍۳؍۱۴۳۶ھ

خنزیر کے اجزاء کھا کر پرورش پانے والی مچھلیوں کا حکم

سوال [۱۰۷۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک تالاب میں مچھلی پالن ہوتا ہے اور مچھلیوں کو خنزیر کی چربی وغیرہ سے غذا دی جاتی ہے، اسی طرح خنزیر کے پائخانہ کو مچھلی کی غذا کے طور پر تالاب میں ڈالا جاتا ہے،تو جو مچھلی خنزیر کے اجزاء کھا کر پرورش پا رہی ہے،اس کا کھانا حلال ہے یا نہیں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو مچھلی خنزیر کے اجزاء سے پرورش پاتی ہے، اس کا کھانا حلال ہے؛ کیونکہ مچھلی ناپاک اور حرام اشیاء کھانے سے جلالہ نہیں ہوتی ہے، اور مچھلی کی حلت پر نص وارد ہوئی ہے اور یہ نجاست وغیرہ کھانا، اس کی حلت سے مانع نہیں ہے۔

عن عبد الله بن عمرؓ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: أحلت لنا ميتتان: الحوت، والجراد. (سنن ابن ماجه، الصيد، باب صيد الحيتان والجراد، النسخة الهندية ٢/٢٣٢، دارالسلام رقم: ٣٢١٨)

أرسلت السمكة في الماء النجس فكبرت فيه لا بأس بأكلها في الحال.

(بزازية، كتاب الصيد، جديد زكريا ٣/١٦٤، وعلى هامش الهندية، زكريا ٦/٣٠١)

ولا يحل حيوان مائي إلا السمک الذي مات بآفة ولو متولداً في ماءٍ نجس، فلا بأس بأكلها للحال لحله بالنص، وكونه يتغذي بالنجاسة لا يمنع حله. (شامي، زكريا ٩/٤٤٤، شامي، كراچي ٦/٣٠٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۰۱/۴۰)

ناپاک غذا کھانے والی مچھلی کا حکم

سوال [۱۰۷۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خشکی کے جو جانور ناپاک غذا کھاتے ہیں، ان کو جلالہ کہا جاتا ہے، جو مچھلی ناپاک غذا یا پانی میں پرورش پائے، تو کیا اسے جلالہ کہا جاسکتا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو مچھلی ناپاک غذا سے پرورش پاتی ہے، اس کا کھانا درست ہے، اس کو جلالہ نہیں کہا جائے گا، اس لئے کہ جلالہ کی تعریف میں لفظ ''دابۃ'' کی قید ہے اور مچھلی دابۃ سے خارج ہے۔ نیز جلالہ خشکی کے جانوروں کے لئے بولا جاتا ہے؛ اس لئے مچھلی جلالہ کی تعریف میں شامل نہ ہوگی۔

سئل علي بن أحمدؒ ويوسف بن محمدؒ عن السمكة إذا أخذت

وأرسلت في الماء النجس فكبرت فيه، فقال: لا بأس بأكلها للحال.

(التاتارخانية، زكريا ۱۸/۴۹۲، رقم: ۲۹۷۱۰)

أرسلت السمكة في الماء النجس فكبرت فيه لا بأس بأكلها للحال.

(بزازيه، كتاب الصيد، جديد زكريا ۳/۱٦٤، وعلى هامش الهندية، زكريا قديم ٦/۳۰۱)

الجلالة: الدابة التي يكون طعامها العذرة ونحوها من الجلة والبعر.

(لغة الفقهاء ص:۱٦٤)

الجلالة: الدابة التى تتبع النجاسات وتأكل الجلة وهي البعرة والعذرة. (الموسوعة الفقهية ۱۵/۲٦۰)

مسئلة الجلالة فيها تفصيل عند الفقهاء، والمحدثين أنه متي يكون الحيوان الجلالة، فقالوا: إذا يعتلف الحيوان نجاسةً، فيكون الحيوان جلالة، والصحيح الذي عليه الجمهور أنه لا اعتبار أن يكون أكثر أكلها النجاسة، وإنما الاعتبار بالرائحة، والنتن، فإن وجد في عرقها وغيره ريح النجاسة فجلالة وإلا فلا. (التاتارخانية، زكريا ۱۸/۱٤۰، رقم: ۲۸۲۹۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/۱۱۴۰۳)

گندگی سے پرورش پانیوالی مچھلیوں کا کھانا

سوال [۱۰۷٦۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بعض لوگ مچھلیوں کا پالن کرتے ہیں، مگر بعض مچھلیاں ایسی ہوتی ہیں، جو گندگی بھی کھالیتی ہیں، جیسے مرغوں اور مچھلیوں کے کاٹنے کے بعد بچی ہوئی آلائش اور گندگی – دہلی وغیرہ کے اندر مرغے ومچھلی مارکیٹ سے پالن کرنے والے ان آلائشوں کو لے جا کر تالاب

میں ڈال دیتے ہیں اور مچھلیاں اسے بہت شوق سے کھاتی ہیں اور جلد فربہ ہو جاتی ہیں، تو معلوم یہ کرنا ہے کہ اس طرح کی مچھلی جس کی بڑھوتری گندگی سے ہوتی ہو، کھانا کیسا ہے؟

نیز ان لوگوں کا یہ فعل کہ گندگی کھلاتے ہیں شرعاً درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد تعظیم نا ہکہ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو مچھلیاں مرغ اور مچھلیوں کی آلائش سے پرورش پاتی ہیں، ان کا کھانا جائز اور حلال ہے، ہاں البتہ یہ عمل مکروہ ہے، مچھلی پالن کرنے والے اپنی مچھلیوں کی گندی غذا سے پرورش نہ کریں۔

في الدر المختار: ولا يحل حيوان مائي إلا السمک الذي مات بآفة ولو متولداً في ماءٍ نجس. وتحته في الشامية: فلا بأس بأكلها للحال لحله بالنص، وكونه يتغذي بالنجاسة لا يمنع حله. (شامي، كتاب الذبائح، زكريا ٩/٤٤٤، شامي، كراچي ٦/٣٠٦، تاتارخانية، زكريا ١٨/٤٩٢، رقم: ٢٩٧١٠، بزازيه جديد، زكريا ٣/١٦٤، وعلى هامش الهندية، زكريا قديم ٦/٣٠١) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ صفر المظفر ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۴۴۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۳/۸ھ

کیا حرام غذا سے پرورش شدہ مچھلیوں کا کھانا حلال ہے؟

سوال [۱۰۷۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک تالاب میں مچھلیوں کے بچوں کی پرورش کی جاتی ہے، بطور کاروبار کے اور تالاب کے اوپر جال لگا دیا گیا ہے، یہ جال لوہے کا ہے، اس جال کے اوپر خنزیر کے بچے پالے جاتے ہیں، خنزیر کے بچوں کا پاخانہ نیچے پلنے والی مچھلیاں کھاتی ہیں، گویا کہ یہ ان

کی غذا ہے، ان مچھلیوں کو اس کے علاوہ بھی غذا دی جاتی ہے، یہ مچھلیاں اس غذا سے بڑی ہوکر بازار میں فروخت ہوتی ہیں، ان کا کھانا شرعاً حلال ہے یا نہیں؟

تالاب میں پلنے والی مچھلیوں کو خنزیر کا خون بطور غذا دیا جاتا ہے، ان مچھلیوں کا کھانا شرعاً حلال ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ایوب، کیلاش نگر، دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خشکی کے جانور اور پانی کے جانور مچھلی کے درمیان کچھ فرق ہے، اگر خشکی کے جانور کی غذا ناپاک اور نجس ہو، تو اسے جلالہ کہا جاتا ہے، اس کے بارے میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ مرغ ہو، تو اسے تین دن تک پاک غذا کھلائی جائے، اس کے بعد اس کو ذبح کر کے کھانا بلا کراہت حلال ہے، اور گائے، بیل، بھینس، اونٹ کے بارے میں راجح قول کے مطابق دس دن تک پاک غذا کھلانے کے بعد ذبح کیا جائے، تو بلا کراہت حلال ہے اور خشکی کے وہ جانور جن کی غذا ناپاک رہی ہو، ان کو اس طرح تبدیلیٔ غذا سے پہلے ذبح کر کے کھانا مکروہ ہے، اس کے برخلاف پانی کے جانور یعنی مچھلی کا حکم اس سے بالکل الگ تھلگ ہے کہ مچھلی اگر ناپاک پانی میں ناپاک غذا کے ساتھ پرورش پائے، تب بھی وہ بغیر تبدیلیٔ غذا کے جائز اور حلال ہے؛ لیکن سوالنامہ میں جو شکل نقل کی گئی ہے، اس کی وجہ سے طبعی نفرت ضرور پیدا ہوگئی، مگر شرعی طور پر حلال ہے۔

الجلالة: بوزن حمالة الدابة التي يكون طعامها العذرة ونحوها من الجلة والبعرة. (لغة الفقهاء ص:٦٥، الموسوعة الفقهية ١٥/٢٦٠)

وفي التجنيس: إذا كان علفها نجاسة تحبس الدجاجة ثلاثة أيام، والشاة أربعة، والإبل، والبقرة عشرة، وهو المختار على الظاهر. (شامي، كتاب الذبائح، زكريا ٩/٤٤٤، كراچي ٦/٣٠٦)

ولا يحل حيوان مائي إلا السمک الذي مات بآفة ولو متولداً

في ماءٍ نجس. وتحته في الشامية: فلا بأس بأكلها للحال لحله بالنص، وكونه يتغذي بالنجاسة لا يمنع حله–إلى قوله–وينظر الفرق بين السمكة وبين الجلالة بأن تحمل السمكة على ما إذا لم تنتن ويراد بالجلالة المنتنة.

(شامي، كتاب الذبائح، زكريا٩/٤٤٤، كراچي٦/٣٠٦)

سئل علي بن أحمدؒ ويوسف بن محمدؒ عن السمكة إذا أخذت وأرسلت في الماء النجس فكبرت فيه، فقال: لا بأس بأكلها للحال.

(التاتارخانية، زكريا ١٨/٤٩٢، رقم: ٢٩٧١٠، وكذا في البزازية، جديد زكريا٣/١٦٤، وعلى هامش الهندية، زكريا ٦/٣٠١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر:الف ۱۱۴۱۰/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۱/۲۵ھ

لا وارث جانور کا حکم

سوال [۱۰۷۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ لا وارث جانوروں کا کیا حکم ہے؟ یہاں راجستھان میں لوگ بالقصد اپنی گائے، بچھڑے چھوڑ دیتے ہیں، ان سے فصلوں کو نقصان بھی ہوتا ہے، تو کیا ان کو پکڑ کر گھر لا کر پالنا یا کسی قسم کا فائدہ اٹھانا ذبح کرکے کھانا نیز قربانی کرنا جائز ہے؟

المستفتی: انوار الحق، امام بڑی مسجد، ہنومان گڈھ (راجستھان)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جو گائے، بچھڑے غیر مسلم چھوڑ دیتے ہیں، وہ ان کی ملکیت سے خارج نہیں ہوتے، مالک کی اجازت کے بغیر ان کو قبضہ میں لینا اور ذبح کرکے کھانا جائز نہیں ہے، اور یہ سائبہ اور بحیرہ کے حکم میں ہیں، جو مالک کی ملکیت سے خارج نہیں ہوتے۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَلَا سَآئِبَةٍ وَلَا وَصِيْلَةٍ وَلَا حَامٍ وَلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ. [مآئدة:۱۰۳]

عن أبي حميد الساعديؓ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لايحل لمسلم أن يأخذ مال أخيه بغير حق. (مجمع الزوائد، دارالكتب العلمية بيروت٤/١٧١، السنن الكبرىٰ للبيهقي، دارالفكر بيروت١٢/٣٥٢، رقم: ١٧٢٢٤)

لا يجوز التصرف في مال غيره بلا إذنه ولا ولايته. (در مختار مع الشامي، كتاب الغصب، مطلب فيما يجوز من التصرف بمال الغير، زكريا٩/٢٩١، كراچي٦/٢٠٠، الأشباه، كتاب الغصب، كراچي ٢/٩٨، قواعد الفقة، اشرفي ديوبند ص: ١١٠، الموسوعة الفقهية الكويتية٢٨/٢٩٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱؍ذی قعدہ ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷؍۸۵۸۷)

کونسا کوا کھانا حلال ہے؟

سوال [۱۰۷۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کونسا کوا حلال ہے؟ کیا یہ کوّا جو بچوں کے ہاتھ سے روٹی لے کر بھاگتا ہے یہ درست ہے؟ یا کوئی اور دوسرا کوا حلال ہے؛ لیکن علامہ رشید احمد گنگوہیؒ نے فتاوی رشیدیہ میں زاغ معروف کو حلال بتلایا ہے، زاغ معروف سے کونسا کوا مراد ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو کوا دانا کھاتا ہے، یا دانا کھاتا ہے لیکن کبھی کبھی گندگی بھی کھاتا ہے وہ حلال ہے، اور جو کوا صرف گندگی ہی کھاتا ہے، وہ بالاجماع حرام ہے، اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے فتاوی رشیدیہ میں زاغ معروف لکھا ہے، اس سے دانا کھانے والا کوا مراد ہے؛ کیونکہ یہ امام اعظمؒ کے نزدیک مکروہ نہیں ہے۔

والغراب الأبقع الذي يأكل الجيف؛ لأنه ملحق بالخبائث وفي الشامية: قال في العناية :اما الغراب الأ بقع والأسود فهو أنواع ثلثة نوع يلتقط الحب، ولايأكل الجيف وليس بمكروه ونوع لا يأكل إلا الجيف، وهو الذي سماه المصنف الأبقع،و إنه مكروه ونوع يخلط يأكل الحب مرة والجيف أخرىٰ، وهو غير مكروه عنده مكروه عند أبي يوسف والأخير هو العقعق. (شامي، كتاب الذبائح، زكريا ٩/٤٤٣، كراچي ٦/٣٠٥،، البحرالرائق، كوئٹه ٨/١٧٢، زكريا ٨/٣١٣، عالمگيري، زكريا قديم٥/٢٨٩، جديد ٥/٣٣٤، حاشية هداية، اشرفي ديوبند ٤/٤٤١، فتح القدير، زكريا٩/٥١٢، كوئٹه ٨/٤١٩، دارالفكر بيروت ٩/٥٠٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹؍۳۴۸۴)

مسلک شافعی میں کچھوا کھانے کا حکم

سوال [۱۰۷۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسلک شافعی میں کچھوا کھانے کا کیا حکم ہے؟ خواہ بری ہو یا بحری ہو؟ مسلک شافعی کی کوئی مختصر جامع اردو یا عربی کی کتاب سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی: محمد صدیق، بہنن پوروہ، لکھیم پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: مسلک شافعی میں بحری کچھوا حلال ہے، بری کے بارے میں علم نہیں۔

وقال: مالکؒ وجماعة من أهل العلم بإطلاق جميع ما في البحر واستثنىٰ بعضهم الخنزير، والكلب،والإنسان وعن الشافعيؒ أنه أطلق

ذلک کله. (هداية، كتاب الذبائح، اشرفي ديوبند ٤/٤٢٦، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ٥/٢٩٦، زكريا ٦/٤٦٩)

اور مسلک شافعی کی مشہور کتاب امام شافعیؒ کی کتاب الام فقہ میں تحفہ ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱/ذی قعدہ ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۳۹۴/۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۱۱/۱۴۱۸ھ

جھینگا اور کیکڑا حلال ہے یا نہیں؟

سوال [۱۰۷۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جھینگا مچھلی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو اس کا کھانا کیا جائز ہوگا؟ نیز کیکڑے کے متعلق بھی حکم شرعی تفصیل سے تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد اسلم مظاہری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: دریائی جھینگا اقسام مچھلی میں داخل ہے؛ اس لئے اس کا کھانا حلال اور درست ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۴/۱۰۳، تاج العروس ۱۰/۱۴۳، القاموس المحیط ۴/۳۳۲، منتہی الارب ص: ۱۲۰، ایضاح المسائل ص: ۱۳۶)

اور کیکڑا چونکہ اقسام سمک میں داخل نہیں ہے؛ اس لئے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک حلال نہیں ہے اور ائمہ ثلثہ کے نزدیک حلال ہے۔

ولا يأكل من حيوان الماء إلا السمك، وقال: مالكؒ و جماعة من أهل العلم بإطلاق جميع ما في البحر الخ (هداية، كتاب الذبائح، اشرفي ديوبند ٤/٤٤٢، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ٥/٢٩٦، زكريا ٦/٤٦٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/رجب المرجب ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵۱۳/۳۱)

مار ماہی

سوال [۱۰۷۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک مچھلی ہے، سانپ کی طرح لمبی ہوتی ہے، اس کا رنگ لال ہوتا ہے، اس کو اردو زبان میں مچھین کہتے ہیں اور فارسی میں مار ماہی، اس کو مچھلی والے تو مچھلی ہی کہہ کر بازار میں بیچتے ہیں، یہ مچھلی پانی میں سوراخ کے اندر رہتی ہے، اس کو کھانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد علاء الدین، منی پوری، متعلم مدرسہ عبداللہ بن مسعود، ٹانڈہ بادلی، رامپور۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مار ماہی جس کا ذکر سوالنامہ میں ہے، جس کو مچھلی والے مچھلی کہتے ہیں، شریعت بھی اس کو مچھلی ہی کہتی ہے، شرعاً وہ مچھلی ہے اور حلال ہے۔

لا بأس بأكل المار ماهي. (هداية، قبيل كتاب الأضحية، اشرفي ديوبند ٤/٤٤٢، حاشية چلپي على التبيين امدادية ملتان ٥/٢٩٦، زكريا ٦/٤٧٠، بدائع الصنائع، زكريا ٤/١٤٦، قديم ٥/٣٦، فتاوى قاضي خان، جديد زكريا ٣/٢٥٣، وعلى هامش الهندية، زكريا قديم ٣/٣٥٧)

والمارماهي سمک في صورة الحية. (الدر مختار مع الشامي، كتاب الذبائح، كراچي ٦/٣٠٧، زكريا ٩/٤٤٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲ر جمادی الثانیہ ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۰۲۱/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۷/۶/۲ھ

’’جھینگا مچھلی نہیں‘‘ ائمۂ اربعہ اور اکابر دیوبند کا کیا موقف ہے؟

سوال [۱۰۷۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: کہ (۱) جھینگا مچھلی ہے یا دریائی کیڑا ہے؟

(۲) جھینگے کی حلت وحرمت کے متعلق وضاحت فرمائیں آخراس کے بارے میں شکوک کیوں ہیں؟

(۳) ائمہ احناف و ائمہ ثلثہؒ کے فرمودات جھینگے کے متعلق کیا ہیں؟ حوالہ جات اور تفصیلات درکار ہیں تاکہ ہر قسم کے شکوک رفع ہو جائیں وضاحت فرما کر ممنون ومشکور فرمائیں۔

(۴) اپنے اکابر دیوبندؒ کے اقوال وآراء بھی قلمبند ہو جائیں تو نوازش ہوگی۔

المستفتی: محمد محسن بارہ دری، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) جھینگا کو ماہر حیوانات علامہ دمیریؒ نے حیاۃ الحیوان میں مچھلی میں شمار فرمایا ہے؛ اس لئے مچھلی ہونے میں کوئی شبہ نہ ہونا چاہئے۔

الروبيان هو سمک صغير جداً أحمر. (حياة الحيوان ۱/۳۷۱)

(۲) مچھلی کے اقسام میں داخل ہونے کی وجہ سے حلال ہے۔

ولا بأس الجريث والمارماهي وأنواع السمک. (هداية، قبيل كتاب الأضحية، اشرفي يوبند ٤/٤٤٢، حاشية چلپي على تبيين الحقائق، امدادية ملتان ٥/٢٩٦، زكريا ٦/٤٧٠)

(۳) حضرات ائمہ احناف سے خاص طور پر جھینگا کے متعلق کوئی حکم نہیں ملتا، عام مچھلی کے لئے حکم ملتا ہے اور عام مچھلی میں جھینگا بھی داخل ہے اور ائمہ ثلثہ کے نزدیک جھینگا حلال ہے۔ نیز دریائی کیڑے بھی ان کے یہاں حلال ہیں۔

وقال مالکؒ وجماعة من أهل العلم: بإطلاق جميع ما في البحر واستثنیٰ بعضهم الخنزير، والكلب، والإنسان وعن الشافعيؒ أنه أطلق ذلک كله. (هداية، كتاب الذبائح، اشرفي ديوبنمد ٤/٤٢٦، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ٥/٢٩٦، زكريا ٦/٤٦٩)

(۴) اپنے اکابر دیوبند میں حضرت تھانویؒ حلال لکھتے ہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۴/۱۰۲، ۱۰۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ربیع الثانی ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/۲۱۹۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۱/۴/۲۶ھ

جھینگا مچھلی کی حلت وحرمت سے متعلق علماء احناف کا راجح قول

سوال [۱۰۷۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جھینگا مچھلی کی حلت وحرمت کے بارے میں کیا علماء احناف کا اختلاف ہے؟ نیز راجح قول کی وضاحت فرمادیں۔

المستفتی: عبد الحفیظ قاسمی، لکھیم پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اہل فتاوی میں سے بعض حضرات کو جھینگا کے مچھلی کی قسم میں سے ہونے پر شبہ ہونے کی وجہ سے ان حضرات نے اس سے منع فرمایا ہے، مگر تحقیق کے بعد یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جھینگا مچھلی کی ایک قسم ہے اور اس کا کھانا بلاتردد جائز اور درست ہے؛ اس لئے کہ حنفیہ کے نزدیک **سمک بجمیع أنواعه** حلال ہے۔

(مستفاد: ایضاح المسائل ص: ۱۳۸، امداد الفتاوی قدیم ۴/۱۰۴، فتاوی عبد الحیؒ قدیم ۱/۵۶، عین الهدایة ۴/۱۷۳، جواہر الفتاوی ۲/۵۹۷)

الروبيان بالكسر سمك كالدود. (القاموس المحيط ٤/١٣٢)

اربیان نوع از ماہی است کہ آں را بہندی جھینگہ گویند۔ (منتہی الأرب في لغة العرب ربع دوم ۲۱۰)

روبیان بفتح الف وباء تازي ملخ آب وآن نوع از ماہی خورد است بہندی جھینگہ گویند۔

(مستفاد: شمس اللغات ص: ۴۰)

الرو بیان هو السمک. (حياة الحيوان ١/٤٦٠)

جھینگہ ایک قسم کی چھوٹی مچھلی ہے۔ (فیروز اللغات ۳۹۷، منجد اردو ص:۵۲، منجد عربی ص:۳۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۳۷۵/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۱/۸ھ

جھینگا مچھلی کا حکم

سوال [۱۰۷۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جھینگا کھانا جائز ہے یا نہیں اور وہ مچھلی میں داخل ہے یا نہیں؟ اس میں امام ابو حنیفہؒ کا قول کیا ہے؟

المستفتی: محمد شعیب بجنوری، متعلم مدرسہ شاہی مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جھینگا ایک دریائی جانور ہے، اور دریائی جانوروں میں سے مچھلی بجمیع انواعہ حنفیہ کے نزدیک بالاتفاق حلال ہے، رہی یہ بات کہ جھینگا مچھلی کے اقسام میں داخل ہے یا نہیں اور کسی مچھلی کے مچھلی ہونے کے لئے اس کے خواص اور صفات لازمہ کی تعیین کے بارے میں شریعت اسلامی میں کوئی منصوص دلیل نہیں ہے؛ اس لئے لا محالہ علماء مبصرین وماہرین حیوانات یا پھر اہل لغات کے اقوال پر اس کی معرفت کا مدار ہوگا اور احقر کی تحقیق کے مطابق تمام ماہرین مبصرین اور اہل لغات نے جھینگا کو اقسام سمک میں داخل کیا ہے؛ لہٰذا جھینگا مچھلی ہے اور اس کا کھانا حلال ہے۔ اس کے متعلق مدرسہ شاہی اور دارالعلوم دیوبند کا متفقہ فتوی رسالہ ندائے شاہی شمارہ جنوری ۱۹۹۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔

(مستفاد: امداد الفتاوی ۱۰۴/۴)

ویستوي في حل الأکل جمیع أنواع السمک من الجریث، والمارماهي وغیرهما. (بدائع الصنائع، کتاب الذبائح والصیود جدید، زکریا ۱٤٦/٤، قدیم ۳٦/٥، ومثله في الخانیة، جدید زکریا ۲٥۳/۳، وعلی هامش الهندیة، زکریا ۳٥۷/۳)

اور امام اعظم ابوحنیفہؒ نے سمندر کی تمام مچھلیوں کو حلال کہا ہے، اور مچھلی کے اقسام میں سے کسی خاص قسم کے بارے میں کوئی بات نہیں کہی، اگر جھینگا مچھلی کے اقسام میں داخل ہے، تو امام صاحب کا قول جھینگا کے بارے میں حلت کا ہے اور اوپر کی تفصیلات سے جھینگا کا مچھلی ہونا ثابت ہو چکا ہے؛ لہٰذا امام صاحبؒ کا قول جھینگا کے بارے میں یہی ہے کہ وہ حلال ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵؍ ۶۷۲۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۶/۵ھ

دریائی جھینگا کا حکم

سوال [۱۰۷۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آپ کے مسائل کے اندر لکھا ہے کہ دریائی جھینگا امام اعظمؒ کے نزدیک کھانا جائز نہیں ہوگا اور کھانا مکروہ تحریمی ہے اور لکھا ہے کہ جدید تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ دریائی جھینگا مچھلی نہیں ہے۔ آپ کے مسائل جلد۴؍ ۲۴۹-۲۵۰ پر ہے، آپ نے خود اپنی کتاب میں لکھا ہے، ایضاح المسائل کے اندر اور حوالہ دیا ہے کہ دریائی جھینگا کھانا حلال اور درست ہے۔ (تاج العروس ۱۰؍ ۱۴۳، فتاوی رحیمیہ ۶؍ ۲۵۷، القاموس المحیط ۴؍ ۳۳۲، فتاوی امدادیہ ۴؍ ۱۰۳، منتہی الارب ص: ۱۲۰، ایضاح المسائل ص: ۱۳۶)

آپ مہربانی کر کے ٹھیک جواب دے کر اس مسئلہ کو حل کریں۔

المستفتی: مزمل الحق

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سمندری جانوروں میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مچھلی کے علاوہ دیگر جانور حلال نہیں ہیں اور جو بھی جانور مچھلی کی تعریف میں شامل ہے، وہ امام صاحبؒ کے نزدیک حلال ہے اور مچھلی کی تعریف میں داخل ہونے اور نہ ہونے کا مدار ماہرین حیوانات اور مبصرین کی آراء پر موقوف ہے اور ماہرین حیوانات اور مبصرین کی تحقیق اور رائے یہی ہے کہ دریائی جھینگہ مچھلی ہی ہے؛ اس لئے ہم بھی حلال کہنے پر مجبور ہیں اور اس مسئلہ پر ایک زمانہ سے بعض لوگوں کو اشکال ہوتا رہا۔

حضرت مفتی مہدی حسن صاحب اور حضرت تھانویؒ اور ہر زمانہ میں دارالعلوم دیوبند کے مفتیان کرام تحقیقات کی روشنی میں اس کو مچھلی لکھتے آئے ہیں اور جو اس کو مچھلی تسلیم نہیں کرتے ہیں، ان کے پاس ایسی مضبوط دلیل نہیں ہے، جو تسلیم کی جائے اسی موضوع پر فروری ۱۹۹۲ء کے ماہنامہ ندائے شاہی میں دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ شاہی کے تمام مفتیان کرام کی اتفاق رائے سے سولہ کتابوں کے حوالہ کے ساتھ اس کے مچھلی ہونے پر ایک فتوی لکھا گیا تھا، موقع ہو تو اسے بھی معائنہ فرمائیں۔

نیز اسی شمارے میں دارالعلوم دیوبند کا بھی ایک مفصل فتوی اس کے مچھلی ہونے پر جاری ہوا ہے؛ اس لئے ہم اس کو مچھلی سمجھ کر حلال کہتے ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ نہیں کھاتے تھے، مگر ان کا نہ کھانا ناامت کے لئے عدم حلت کی دلیل نہیں ہے۔ جب ان سے اس کے بارے میں سوال کیا گیا، تو ان کا یہ جواب تھا کہ میں نہ حلال کہتا ہوں اور نہ حرام کہتا ہوں، مکروہ کہنا صحیح نہیں، میں خود نہیں کھاتا اس سے بات صاف ہو جاتی ہے کہ حلت وحرمت کے سلسلہ میں ان کی رائے کسی ایک جانب مضبوط نہیں ہے؛ اسلئے ان کے نہ کھانے کو حجت شرعی قرار نہیں دیا جاسکتا اور آپ کے مسائل اور ان کا حل نامی کتاب میں علماء کے اختلاف کو ظاہر کر کے جانب کراہت کو ترجیح دینے کی کوشش کی ہے اور اس پر جو دلیل پیش کی ہے، وہ ناتمام ہے،

جو ماہرین حیوانات اور مبصرین کی تحقیق کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور جو عربی عبارت لکھی ہے، اس سے دریائی جھینگا کے بارے میں کوئی حکم صاف نہیں ان کی عبارت ہے۔

السمک الصغار کلها مکروهة التحریم.

ترجمہ: چھوٹی مچھلیاں سب مکروہ تحریمی ہیں۔

خود مچھلی کہہ رہے ہیں، پھر کراہت کا حکم بھی، مچھلی ہو تو کراہت ہی نہیں ہوئی۔

بہرحال وہ عبارت دریائی جھینگا کی کراہت یا حرمت پر مستدل نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍صفر المظفر ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۲۶۶/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۲/۲۰ھ

جھینگہ کے متعلق ایک تحقیقی فتویٰ

سوال [۱۰۷۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ گذشتہ شمارہ ندائے شاہی میں آپ کے دینی مسائل کے عنوان کے تحت ایک مسئلہ جھینگا مچھلی کے حلت کے سلسلہ میں نظر نواز ہوا میں اس سلسلہ میں کچھ تحقیقات کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، مگر فرصت نہ ہوسکی امروزوفردا پر دوسرا شمارہ بھی آپہنچا۔ بہرحال میرے خیال سے جھینگا کے سلسلہ میں اگر کراہت وغیرہ بھی نہ ہو، تو جس مسئلہ میں حلت وحرمت میں اختلاف ہو، تو **دع ما یریبک إلی مالا یریبک** کے قاعدہ کے تحت اس سے اجتناب و احتراز ہی بہتر ہے؛ لہٰذا جواب اگر اس انداز کا ہوتا، تو بہتر تھا؛ اس لئے کہ فتاوی دارالعلوم کتاب الطہارۃ میں ایک جگہ مفتی صاحب نے کسی مسائل کے سوال و جواب میں ارشاد فرمایا ہے، جو امام جھینگے کھاتا ہے، بشرطیکہ وہ جھینگا مچھلی کی جنس کا نہ ہو، تو مکروہ ہے اب یہ جھینگا جو مسئول بہا ہے، یہ بہت سی چیزوں میں مچھلی کی جنس سے مختلف اور متضاد ہے۔

(۱) اس کی ٹانگیں ہوتی ہیں، جن سے خشکی میں عام کیڑوں کی طرح چلتا پھرتا ہے، مچھلی کبھی چلتی نہیں کودتی ہے پھدکتی ہے۔

(۲) یہ خشکی میں ایک مدت تک زندہ رہ سکتا ہے، مچھلی چند ساعت کے بعد مرجاتی ہے۔

(۳) یہ کھانے میں قطعی طور پر مچھلی جیسا نہیں ہوتا ہے، اس کے اوپر گوشت قطعی نہیں ہوتا؛ بلکہ پکنے کے بعد اس کو توڑ کر کھاتے ہیں، صرف خول ہوتا ہے؛ جبکہ مچھلی کو **لحماً طريًا** فرمایا گیا ہے، مچھلی کی بہت اقسام مثلاً مار ماہی جو کہ سانپ جیسی ہوتی ہے، گنیڈ مچھلی مذکورہ چیزوں میں مچھلی سے متباین نہیں۔

(۴) ماہی گیر لوگ بتلاتے ہیں کہ مچھلی کے پیٹ میں انڈے ہوتے ہیں، اس کے انڈے باہر پروں کے اندر جھیل کے اندر رہوتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ مچھلی کے انڈے نکالنے کے وقت مچھلی مرے گی؛ کیونکہ پیٹ توڑنا پڑے گا اور جھینگے کے انڈے نکالنے کے لئے پیٹ توڑنے کی ضرورت نہیں ہے، انڈے نکال کر بھی وہ زندہ رہے گا۔

(۵) اجنبی آدمی اسی جھینگا کو دیکھ کر کبھی اس کو مچھلی نہیں کہے گا؛ بلکہ اس کو کیڑا کہے گا، اس کے علاوہ پانی میں کوئی جھینگا ایسا نہیں جو مچھلی کے جنس کا ہو، حضرت مولانا فخر الدینؒ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم نے درس بخاری میں فرمایا تھا کہ جس جھینگا کو علامہ دمیریؒ نے حیاۃ الحیوان میں انواع سمک میں شمار کیا ہے، یہ وہ جھینگا نہیں اس جھینگا کو میری آنکھوں نے دیکھا ہے، خاص طور سے اس کو دیکھ کر اور اس کو کھا کر بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ غالباً انواع سمک میں سے نہیں، ممکن ہے وہ دمیری کا جھینگا کوئی اور ہو جیسا کہ شیخ نے فرمایا تھا کہ یہ وہ جھینگا نہیں، اس کے علاوہ بعض کتب میں تو اختلاف کی تصریح موجود ہے، جیسا کہ غالباً مجموعۃ الفتاوی مولانا عبدالحیؒ ۲/۱۰۱ر پر دونوں قول نقل کئے ہیں۔

الدود الذي يقال له جهينگه حرام عند بعض العلماء؛ لأنه لا يشبه السمک، فإنما يباح عندنا من صيد البحر أنواع السمک، وهذا لا يكون كذلک، وقال بعضهم: حلال لأنه يسمىٰ باسم السمک. (۳/۱۰٤ و ۲/۱۰۷)

پر بھی دونوں قول نقل کیا ہے، اور تذکرۃ الخیل ۲۰۰ر پر تو عدم جواز کا فتوی ہے، صاحب حیاۃ الحیوان نے اریب کو جھینگا فرمایا ہے؛ جبکہ بعض لغات میں اس کا ترجمہ مار ماہی جو متفق علیہ مچھلی ہے لکھا ہے۔ (مصباح اللغات)

بہر حال جس میں بعض علماء حرمت کے قائل ہیں جیسا کہ تذکرۃ الخلیل اور مجموعۃ الفتاوی مولانا عبدالحئ میں اول قول تو اگر ایسی چیز سے مذکورہ حدیث **دع ما یریبک الخ** کے تحت اجتناب واحتراز کا فتوی ہو تو کیا خوب ہے

جھینگا اگر حلال ہوا اور نہ کھایا تو خدا تعالیٰ گرفت نہیں کریں گے کہ جھینگا کو میں نے حلال کیا، تو کیوں نہ کھایا، اگر حرام ہوا اور کھالیا جیسا کہ فتوی دیا جا رہا ہے پھر تو خیر نہیں۔

المستفتی: محمد اکبر قاسمی، امام علی سید شیرکوٹ ضلع بجنور یوپی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جھینگہ دریائی جانور ہے، اور دریائی جانوروں میں سے مچھلی بجمیع انواعہ حنفیہ کے نزدیک بالاتفاق حلال ہے۔ اب غور طلب مسئلہ صرف اتنا ہے جھینگا اقسام سمک میں داخل ہے یا نہیں اور کسی مچھلی کے مچھلی ہونے کے لئے اس کے خواص اور صفات لازمہ کے تعین کے بارے میں شریعت اسلامی میں کوئی منصوص دلیل نہیں ہے؛ اس لئے اس کی معرفت کا مدار مبصرین و ماہر حیوانات اور اہل لغت کی تحقیق پر ہوگا اور اگر ان میں اختلاف ہے، تو اس کے حکم میں بھی اختلاف ہوگا اور اگر ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے، تو حکم میں بھی اختلاف نہ ہوگا اور تحقیق و تفتیش کے باوجود کسی مبصر اور ماہر اور اہل لغات کا اختلاف اس ناکارہ کی نظر سے نہیں گذرا اور نہ ہی اہل لغات نے جھینگہ کو اقسام سمک سے خارج کیا ہے اور تذکرۃ الخلیل کی اصل عبارت دیکھ لی گئی ہے کہ حضرت قدس سرہ کو عام سمک کی طرح اس میں گلپھڑے نہ ہونے کی وجہ سے جھینگا کے اقسام سمک میں شامل ہونے میں تردد ہو گیا تھا اور تردد کی بناء پر حلت کا فتوی نہ دینا حضرت قدس سرہ کا تقویٰ تھا اور اس سے عدم جواز پر فتوی دینا لازم نہیں آتا اور اقسام سمک میں داخل ہونے کے لئے تین صفتوں میں سے صرف ایک کا پایا جانا کافی ہے۔

(۱) خشکی میں آ کر تڑپنا اور پھدکنا۔

(۲) گلپھڑے کا ہونا اور اسی سے سانس لینا۔

(۳) کانٹے دار اور لائن دار پر یا دم کا ہونا اور بعض سمک میں تینوں صفتیں جمع ہو جاتی ہیں، جیسا کہ بام مچھلی میں ہے اور بعض میں صرف ایک یا دو صفتیں ہوتی ہیں، جیسے کہ مار ماہی کہ اس میں کانٹے دار پر نہیں ہوتے۔ نیز خشکی میں آ کر کودتی بھی نہیں؛ بلکہ سانپ کی طرح رینگتی ہے؛ البتہ اس کے صرف گلپھڑے ہوتے ہیں اور جھینگہ میں کانٹے دار دم ہوتی ہے اور خشکی میں آ کر پھدکتا اور کودتا ہے؛ البتہ اس کے گلپھڑے نہیں ہوتے اور گلپھڑے ہر ایک سمک کے لئے جزء لاینفک بھی نہیں ہے۔ نیز خشکی میں آ کر زیادہ دیر زندہ بھی نہیں رہتا ہے اور سوال نامہ میں اس کی زندگی کے بارے میں جو کہا گیا ہے، وہ مسلم نہیں؛ اس لئے کہ تجربہ کر کے دیکھا گیا ہے کہ بعض سمک جھینگہ سے زیادہ دیر تک زندہ رہتی ہے اور سمک کے صفات کے بارے میں فتاوی عبدالحیؒ میں منقول ہے۔

إحديها إسقاط وثانيها انفتاح لحييه، وثالثها جناح ذو شواک بينهن ستور، وكذا الذنب، وبعض أنواع السمک العلامات كلها ولبعضها بعضها كما شاهدنا. (فتاوى عبد الحئ قديم ۲/۱۹۲)

اور آنجناب نے حضرت مولانا عبدالحیؒ لکھنویؒ کا فتوی نقل نہیں فرمایا ہے؛ بلکہ صرف وہ عربی عبارت نقل کر دی ہے کہ جس سے منکرین جواز کا قول بھی ثابت ہوتا ہے اور حضرت علامہ موصوف کا اصل فتوی جھینگہ کی حلت پر ہے اور ساتھ ساتھ حلت کے منکرین پر تردید بھی فرمائی ہے۔ علامہ موصوف کا اصل فتوی جو فارسی میں ہے بلفظہ نقل کیا جاتا ہے۔

''وجھینگہ کہ آں را ار بیان بکسر ہمزہ میگویند چنانچہ از صحاح وغیرہ مفہوم میشود حلال است چہ آں نوعیت از انواع سمک والسمک بجمیع انواعہ حلال بالاتفاق'' یہی علامہ موصوف کے فتوی کی عبارت ہے، جس کو انہوں نے جھینگہ کی حلت میں تحریر فرمایا ہے، پھر اس کے بعد

ناجائز کہنے والوں پر ان الفاظ کے ساتھ تردید فرمائی ہے کہ ”وآنکہ قائل حرمتش شدہ اند منشاء آں فہمیدن جھینگہ را خارج از اقسام سمک است ولیس کذا لک“ پھر اس کے بعد حمادیہ کی وہ عبارت نقل فرمائی ہے، جو آنجناب نے سوال نامہ میں نقل فرمائی ہے اور حمادیہ کی عبارت صرف منکرین حلت کی تردید کر کے ان کی دلیل کے ضعف کو ظاہر کرنے کے لئے لائے ہیں، یہ پوری تفصیل فتاوی قدیم ۱/۶۵ میں موجود ہے۔

اب یہ ناکارہ اپنی طرف سے کچھ لکھے بغیر مبصرین حیوانات اور اہل لغات اور اہل فتاوی کی سولہ کتابوں کے حوالے حلت جھینگہ مچھلی کے متعلق آنجناب کی خدمت میں پیش کرنا مناسب سمجھتا ہے تا کہ ان پر غور کر کے شبہات کا ازالہ کیا جائے۔

(۱) القاموس المحیط جو لغت کی مشہور اور مستند کتاب ہے، اس میں لکھتے ہیں۔ **الاربیان بالکسر سمک کالدود** ۳۳۲/٤ کہ جھینگہ کیڑے کی شکل میں ایک مچھلی ہے۔

(۲) منتہی الارب فی لغت العرب فارسی کی مشہور لغت ہے، اس میں لکھتے ہیں ”اربیان نوعی از ماہی است کہ آں را بہندی جھینگہ گویند ۱۲۰/۲“ کہ جھینگہ اقسام سمک میں سے ایک ہے، جس کو ہندوستان میں جھینگہ کہا جاتا ہے۔

(۳) شمس اللغات ایک مستند کتاب ہے، اس میں لکھتے ہیں ”اربیان بفتح الف و باء تازی ملخ آب وآں نوعی از ماہی خود است بہندی جھینگہ گویند ۴۰“ کہ اربیان ایک مچھلی ہے، جس کو ہندوستان میں جھینگہ کہتے ہیں۔

(۴) صراح لغت کی ایک مشہور کتاب ہے، اس میں ہے کہ اربیان نوعے از ماہی ۵۶۰ رکہ جھینگہ از قسم مچھلی ہے۔

(۵) عرب وعجم کی مشہور کتاب تاج العروس میں ہے، **والاربیان بالکسر سمک کالدود** ۱۴۳/۱۰ کہ جھینگہ کیڑے کی طرح ایک مچھلی ہے۔

(۶) المنجد اردو میں ہے کہ الاربیان جھینگہ مچھلی ہے ص:۵۲۔

(۷)المنجدعربی میں ہے **بر غوث البحر نوع من صغر السمک تشبه هيئته البر غوث ص: ۳۲** کہ جھینگہ پسو کے مشابہ ایک چھوٹی مچھلی کی قسم ہے اوراس کی دم میں مچھلی کی طرح کانٹے دارلائن دار پر ہے۔

۸، فیروزاللغات میں ہے کہ جھینگہ ایک قسم کی چھوٹی مچھلی ہے ص:۳۹۷۔

(۹) علامہ دمیریؒ منجملہ ماہرین حیوانات میں سے ہیں وہ اپنی کتاب حیاۃ الحیوان میں نقل فرماتے ہیں کہ **الروبیان هو السمک** ۱/۴۶۰ رکہ جھینگہ مچھلی ہی ہے۔

(۱۰) مخزن المفردات طب کی مشہور کتاب ہے،اس میں یہ عبارت ہے کہ مچھلی جھینگہ ماہی روبیان حلال مچھلی ہے،اس کی مونچھیں لمبی ہوتی ہیں، رنگ سفید ذائقہ شیریں بساندہ۔ (مخزن المفردات)

(۱۱) تذکرہ داؤ دالطائی میں ہے، **روبيان اسم مضرب من السمک** کہ جھینگہ مچھلی کی ایک قسم کا نام ہے۔

(۱۲) مشہور محقق علامہ امیر علیؒ نے عین الہدایہ ۴/۱۷۳ رمیں جھینگہ کو اقسام سمک میں شمار فرما کر مباح قرار دیا ہے۔

(۱۳) حضرت مولانا مفتی عبدالسلام صاحب جواہر الفتاوی میں لکھتے ہیں کہ علماء مصرو علماء عرب نے جھینگہ کے بارے میں لکھا ہے کہ دنیا میں اقسام سمک میں سب سے زیادہ ذائقہ دار جھینگہ مچھلی ہے۔

ألذالأ سماک في الدنيا و أغلاها فيها الخ. (جواهر الفتاوی۲/ ۵۹۷)

(۱۴) حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری دامت برکاتہم نے فتاوی رحیمیہ قدیم ۶/۲۹۷، جدید زکریا۱۰/۷۷ر میں بہت مفصل اورمدلل فتاوی جھینگہ کے اقسام سمک میں سے ہونے اورحلال ہونے پرتحریرفرمایا ہے۔

(۱۵) حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ نے امداد الفتاوی ۴/۱۰۴ر میں،

علامہ دمیریؒ کا حوالہ دے کر بہت انشراح کے ساتھ جھینگہ کے دریائی مچھلی اور حلال ہونے پر اطمنان کا اظہار کرتے ہوئے تفصیلی فتوی صادر فرمایا ہے، جس کا ندائے شاہی میں شائع شدہ فتویٰ میں حوالہ دیا گیا ہے۔

(۱۶) حضرت علامہ ابوالحسنات، مولانا عبدالحئ لکھنوی نے اپنے فتوی میں جھینکہ کو مچھلی ثابت فرما کر حلال لکھا ہے، اور ساتھ میں ان لوگوں کی تردید فرمائی ہے، جو ایسے صفات کی بناء پر جھینکہ کو دائرہ حلت سے خارج کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جو صفات آنجناب نے سوال نامہ میں پیش فرمائی ہیں، جو کہ مچھلی کے صفات لازمہ میں سے نہ ہونا مبصرین کی کتابوں سے ثابت ہو چکا ہے اور اس ناکارہ کی معلومات کے مطابق اپنے کابر میں سے کسی نے بھی جھینکہ کے بالانشراح بالکل کھول کرنا جائز یا حرام ہونے پر فتوی نہیں دیا ہے اور جن اکابر نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے وضاحت کے ساتھ لکھا ہے، انہوں نے صاف حلال ہونے کا فتوی دیا ہے، جیسا کہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ قدس سرہ حضرت مولانا عبدالحئ لکھنوی، حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری مدظلہم اور صاحب عین الہدایہ وغیرہم ہیں۔

مذکورہ تمام دلائل وشواہد کی بناء پر اس ناکارہ کو بھی حلت پر فتوی لکھنے میں بالکل اطمینان ہے اور آنجناب نے سوال نامہ کے آخر میں لکھا ہے کہ اگر حرام ہوا اور کھالیا، جیسا کہ فتوی دیا جارہا ہے، پھر تو خیر نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ الحمد اللہ ہم مذکورہ اکابر کے فتاوی کو شرعی دلیل اور حجت سمجھتے ہیں اور ہم شرعی دلیل وحجت کے مطابق فتوی لکھنے میں کار ثواب اور حق تعالیٰ شانہ سے خیر ہی کی امید رکھتے ہیں اور ایسے اکابر کے فتاوی کو نقل کر کے مسئلہ بتلانے میں خدائے پاک سے یہ امید ہے کہ آخرت میں ان حاملین شریعت کے زمرہ میں شامل فرمائیں گے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۷/ ۲۶۶۹)

خنزیر کے دودھ سے پرورش شدہ بکری کے بچہ کا حکم

سوال [۱۰۷۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک بکری کے بچہ نے خنزیر یا کتیا کے دودھ سے پرورش پائی، تو سوال یہ ہے کہ بکری کے اس بچہ کا گوشت کھانا حلال ہے یا نہیں؟ اس کی عمر پوری ہونے پر اس کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عمر، فتح پوری، سیتا پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سوال نامہ میں جس مسئلہ کو اٹھایا گیا ہے، وہ مسئلہ انتہائی حساس اور نازک ہے، اس کے بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ بکری کا بچہ فی حد ذاتہ پاک اور حلال ہے؛ البتہ اتنی بات قابل غور ہے کہ ناپاک غذا سے پرورش پانے کے وجہ سے پاک ہونے یا حلال ہونے میں فرق آیا ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں سبھی فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ بکری کے اس بچہ کے گوشت میں ناپاک غذا کا اثر نمایاں طور پر ظاہر نہ ہو، تو وہ بچہ بلاشبہ حلال ہے اس کا گوشت پاک ہے لہٰذا اسکی قربانی بھی جائز ہے اور اگر اس کے گوشت میں ناپاکی کے آثار نمایاں ہوجائیں اور اس کے بدن سے بدبو آنے لگے، تو وہ جلالہ کے حکم میں ہوجاتا ہے، اس کو اتنے دنوں تک پاک غذا کھلائی جائے کہ ناپاکی کا اثر ختم ہوجائے اور اس کے بدن سے بدبو ختم ہوجائے، اس کے بعد اس کا گوشت کھانا بلا کراہت جائز اور درست ہے اور اس کی قربانی بھی جائز ہے۔ فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمائیے:

صاحب بدائع نے اس کو ان الفاظ سے واضح فرمایا ہے۔

والحكم متعلق بالنتن؛ ولهذاقال أصحابنا في جدي ارتضع بلبن خنزير حتى كبر أنه لا يكره أكله؛ لأن لحمه لا يتغير ولاينتن ؛ فهذا يدل على أن الكراهة في الجلالة؛ لمكان التغير والنتن، لا لتناول

النجاسة. (بدائع الصنائع، زكريا ديوبند، كتاب الذبائح ٤/ ١٥٤، كراچي ٥/ ٤٠، الموسوعة الفقهية الكويتية ٥/ ١٤٩)

اوراس کو ’’تبیین الحقائق، شامی اورطحطاوی علی الدر‘‘ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا گیا ہے۔

يحل أكل لحم جدي غذي بلبن خنزير؛ لأن لحمه لا يتغير وما غذي به يصير مستهلكا لا يبقي له أثر. (تبيين الحقائق، كتاب الكراهية،زكريا ديوبند جديد ٧/ ٢٤، امدادية ملتان٦/ ١٠، شامي، كراچي ٦/ ٣٤١، زكريا ٩/ ٤٩١، طحطاوي على الدر، كوئٹه ٤/ ١٧٢)

اس کو مبسوط سرخسی میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔

ولو أن جدياً غذى بلبن خنزير، فلابأس بأكله؛ لأنه لم يتغير لحمه، وماغذى به صار مستهلكا، ولم يبق له أثر وعلى هذا نقول: لابأس بأكل الدجاجة، وإن كانت تقع على الجيف. (مبسوط سرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ١١/ ٢٥٥)

اورفتاوی تاتارخانیہ میں اس طرح کے الفاظ سے منقول ہے۔

إذا أربي الجدي بلبن الخنزير لا بأس به، قال معناه إذا اعتلف أياما بعد ذلک كالجلالة. (تاتارخانية، زكريا ١٨/ ١٤٠، رقم:٢٨٢٩٣)

اورمبسوط میں یہ عبارت بھی مذکور ہے۔

والأصح أنها تحبس إلى أن تزول الرائحة المنتنة عنها؛ لأن الحرمة؛ لذلک وهو شي محسوس ولا يتقدر بالزمان لاختلاف الحيوانات في ذلک فيصار ذلک إلى اعتبار زوال المضر، فإذا زال بالعلف الطاهر حل تناوله. (مبسوط سرخسي، دارالكتب العلمية بيروت١١/ ٢٥٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ربیع الاول ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۹۵۲/۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۳/۱۵ھ

ناپاک اور پاک چارا دونوں کھانے والے جانور کا حکم

سوال [۱۰۷۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جو حلال جانور پاک اور ناپاک دونوں طرح کی غذا کھاتا ہو، مثلاً مرغ ہے، وہ پاک چارا کھاتا ہو اور انسان کی غلاظت بھی کھاتا ہو، خاص طور پر دیہاتوں میں جو آزاد پھرتا ہے، وہ انسان کی گندگی کھاتا ہے، کیا ایسے آزاد مرغ جو انسان کی گندگی بھی کھاتا ہو، اس کو بندر کھے بغیر فوری طور پر ذبح کر کے کھانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ریحان، لکھنؤ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسا مرغ یا چوپایا جس کی غذا کا مدار صرف نجاست کھانے پر نہیں ہے؛ بلکہ پاک اور صاف ستھرا چارا بھی کھاتا ہے اور انسان کی گندگی بھی کھاتا ہے اور گندگی کھانے کی وجہ سے اس کے جسم اور گوشت سے بدبو ظاہر نہیں ہوتی ہے، تو اس کو بند رکھے بغیر ذبح کر کے کھانا بلا کراہت جائز اور درست ہے؛ اس لئے کہ وہ جلالہ کے حکم کے دائرہ میں داخل نہیں ہے، اس کو امام زیلعیؒ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے ملاحظہ فرمایئے:

أما التي تخلط بأن تتناول النجاسة والجيف، وتتناول غيرها على وجه لا يظهر أثر ذلک في لحمها، فلا بأس به ولهذا يحل أكل لحم جدي غذي بلبن الخنزير؛ لأن لحمه لا يتغير و ماغذى به يصير مستهلكا لا يبقي له أثر وعلى هذا قالوا: لا بأس بأكل الدجاج؛ لأنه يخلط و لا يتغير لحمه. (تبيين الحقائق، كتاب الكراهية، زكريا۷/۲٤، امدادية ملتان٦/ ١٠)

اس کو مبسوط سرخسی میں مزید واضح الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

ولو أن جدياً غذى بلبن خنزير، فلابأس بأكله؛ لأنه لم يتغير لحمه، وماغذي به صار مستهلكا، ولم يبق له أثر وعلى هذا نقول: لابأس بأكل

الـدجـاجة، وإن كـانـت تـقـع عـلى الجيف؛ لأنها تخلط و لايتغير لحمها و لاينتن. (مبسوط سرخسي، دارالكتب العلمية بيروت، كتاب الصيد ۱۱/۲۵۵)

اورشامی میں اس کو ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔

لا تـكره الدجاجة المخلاة وإن أكلت النجاسة يعنى إذا لم تنتن بها لما تقدم؛ لأنها تخلط و لايتغير لحمها. (شامي، كتاب الذبائح، زكريا ۹/۴٤۵، كراچي ٦/٣٠٦)

اورصاحب بدائع نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے ملاحظہ فرمایئے:

لايـكره أكـل الـدجـاجة الـمخـلي، وإن كان يتناول النجاسة؛ لأنه لايغلب عليه أكل النجاسة؛ بل يخلطها بغيرها، وهو الحب ذا و ذا. وقوله: ولهـذا إذا خـلـطت لا يكره و إن وجد تناول النجاسة؛ لأنها لا تنتن فدل أن العبرة لـلـنتن لا لتناول النجاسة. (بـدائع الـصـنـائع، كتـاب الـذبائح والصيود، زكريا٤/١٥٤، كراچي٥/٤٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۵/ربیع الاول ۱۴۳۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/۴/۱۱۹۵۴)	۱۵/۳/۱۴۳۶ھ

بکری اور کتا، اسی طرح سور اور بکری کے اختلاط سے پیدا شدہ بچے کا حکم

سوال [۱۰۷۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بکری اور کتا اور سور اور بکری سے مل کر جو بچہ پیدا ہوتا ہے، اس بچہ کا گوشت کھانا جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جس بچہ کی ماں حلال ہے، اس کا بچہ بھی حلال ہے؛ لہٰذا کتا اور بکری سے پیدا ہونے والا اور خنزیر اور بکری سے پیدا ہونے والا بچہ حلال ہوگا،

اس کا گوشت کھانا اور دودھ پینا درست ہے۔

لأن المعتبر في الحل والحرمة الأم فيما تولد من مأكول وغير مأكول. (شامي، كتاب الذبائح، كراچي ٦/٣٠٥، زكريا٩/٤٤٢، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ٥/٢٩٥، زكريا ٦/٤٦٨، مجمع الأنهر قديم ٢/٥١٣، جديد دار الكتب العلمية بيروت ٤/١٦١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ ربیع الاول ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۴۷۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶/۳/۱۴۱۷ھ

دانہ سے پرورش شدہ مرغیوں کا کھانا

سوال [۱۰۷۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ چوزوں (مرغی کے بچوں) کے لئے میلوں میں جو مرغی کے لئے دانہ تیار ہوتا ہے، اس کے اجزاء میں چاول، پالش، مچھلی کی آنت او جھڑی اور خنزیر کی چربی شامل ہوتی ہے، یہ دانہ اگر چوزوں کو کھلایا جائے، تو بہت تیز پرورش ہوتی ہے اور بچہ چالیس دن میں ڈیڑھ کلو کا ہو جاتا ہے؛ لہٰذا معلوم یہ کرنا ہے کہ جو چوزے اس مرغی دانہ سے پرورش پاتے ہیں، ان کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) دوسری بات یہ معلوم کرنا ہے کہ خود اس دانہ کا چوزوں کو کھلانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: حاجی محمد خلیل ٹانڈہ بادلی، رام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ان چوزوں کا جن کی پرورش مذکورہ دانہ سے ہوئی ہے، کھانا حلال ہے؛ البتہ ذبح سے پہلے چند روز حلال چارہ کھلایا جائے، تو بہتر ہے۔

(مستفاد: امداد الفتاوی ۴/ ۱۰۵، احسن الفتاوی ۸/ ۱۲۶- ۷/ ۴۰۸)

لو علفها علفا حراما لم يحرم لبنها و لحمها، وإن كان الورع الترك. (الأشباه والنظائر ص:١٥٧)

والجدي إذا كان يربي بلبن الأتان والخنزير، إن اعتلف أياما فلابأس لأنه بمنزلة الجلالة–والجلالة إذ احتسبت أياما فعلفت لا بأس بها. (هندية، كتاب الذبائح، الباب الثاني، جديد زكريا ٥/ ٣٣٤، وعلى هامش الهندية، زكريا قديم ٥/ ٢٩٠، شامي، زكريا٩/ ٤٩٢، كراچي ٦/ ٣٤١)

(۲) یہ دیکھا جائے کہ اس دانہ میں حلال اشیاء غالب ہیں یا حرام؟ اگر حلال غالب ہیں، تو پھر یہ دانہ چوزوں کو کھلانا جائز ہے، اور اگر حرام غالب ہوں، تو پھر چوزوں کو یہ دانہ کھلانا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: عزیز الفتاوی ۱/ ۷۶۱)

إنما حرام عليكم الميتة، والدم، ولحم الخنزير. [بقره: ١٧٣]

بخلاف الودک أي دهن الميتة؛ لأنه جزئها فلا يكون مالاً.....وكذا الانتفاع به. (شامي، زكريا ٧/ ٢٦٦، كراچي ٥/ ٧٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸ ؍ ربیع الاول ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۷۱۲۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۳/۱۸ھ

انسان کے براز کھانے والے مرغ کا حکم

سوال [۱۰۷۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ دیہاتوں میں جو مرغیاں صبح صبح انسان کا براز کھایا کرتی ہیں، ایسی مرغیوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: دیہاتوں میں جو مرغیاں صبح صبح انسان کا براز کھاتی ہیں، ان کو ذبح کر کے کھانا اس وقت تک جائز ہے، جب تک ان کے گوشت کے اندر

نجاست کا اثر بدبو وغیرہ ظاہر نہ ہوجائے اور اگر گوشت میں بدبو ظاہر ہونے لگے، تو جلالہ کے حکم میں ہوجائیں گی اور انہیں ۳؍دن تک پاک غذا کھلانے کے بعد ان سے کراہت ختم ہوسکتی ہے۔

لایکره أکل الدجاجة المخلي، وإن کان یتناول النجاسة؛ لأنه لایغلب علیه أکل النجاسة؛ بل یخلطها بغیرها. (هندیة، کتاب الذبائح، الباب الثاني في بیان مایؤکل لحمه وما لا یؤکل جدید زکریا ۵/۳۳٤،وعلی هامش الهندیة، زکریا قدیم ۵/۲۹۰)

أما الدجاجة المخلاة، فلابأس بأکلها؛ لأنها تخلط بین العذرة وغیرها. (الولوالجیة، مکتبه دار الإیمان سهارنپور ۳/۵٦)

لابأس بأکل الدجاج؛ لأنها تخلط ولایتغیر لحمه. (البحر الرائق، زکریا۸/۳۳۵، کراچي۸/۱۸۳)

لابأس بأکل الدجاج؛ لأنها یخلط ولایتغیر لحمه. (شامي، کراچي ٦/۳٤۱، زکریا ۹/٤۹۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۴۰۹/۴۰)

ابھی ابھی انسان کا براز جس مرغ نے کھایا اس کا حکم؟

سوال [۱۰۷۸٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مرغ اگر مخلوط غذا کھائے، تو وہ بلا کراہت حلال ہے، تو سوال یہ ہے کہ مرغ کی غذا ناپاک تو نہیں؟ لیکن اس نے ابھی ابھی انسان کا براز کھایا ہے، اب اس کے بارے میں حکم شرعی کیا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرغ نے ابھی ابھی انسان کا براز کھایا ہے،

تو نجاست اس کے بدن میں سرایت کرنے سے پہلے یعنی ایک گھنٹے میں ذبح کر کے کھانے میں کوئی کراہت نہیں۔ اور اگر یہ اندازہ ہو کہ نجاست اس کے گوشت میں سرایت کرگئی ہے، تو اس صورت میں اس کا کھانا مکروہ ہے، بلا کراہت کھانے کی صورت یہ ہے کہ ۳/ دن تک اس کو صاف غذا کھلائی جائے۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم ۱۵/۴۵۲)

ولو سقیٰ ما یؤکل لحمه خمراً، فذبح من ساعته حل أکله، ویُکره.

(شامي، کتاب الحظر الإباحة، کراچي ۶/ ۳۴۱، شامي، زکریا ۹/ ۴۹۲)

والشاة، والإبل، إذا سقیٰ خمراً، فذُبحت من ساعتها حل أکلها.

(خانية جدید زکریا ۳/ ۲۵۴، وعلی هامش الهندیة، زکریا ۳/ ۳۵۹)

عن محمدؒ في الناقة، والشاة، والبقرة الجلالات أنها إنما تکون جلالة إذا أنتنت وتغیرت ووجد منها ریح منتنة، والحکم متعلق بالنتن وهذا یدل علی أن العبرة للنتن لا لتناول النجاسة. (الموسوعة الفقهية الکویتية ۵/ ۱۴۹، بدائع الصنائع، زکریا ۶/ ۱۵۴)

و في التجنیس: إذا کان علیها نجاسة تحبس الدجاجة ثلاثة أیام.

(شامي، کراچي ۶/ ۳۰۶، زکریا ۹/ ۴۴۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۴۰۲)

عام غذا دانہ وغیرہ ہوں اور ساتھ میں خنزیر کے اجزاء بھی کھلائے تو کیا حکم؟

سوال [۱۰۷۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مرغی پالن میں جو غذا کھلائی جاتی ہے، ان غذاؤں میں خنزیر کے اجزاء بھی ہوتے ہیں، تو اس صورت میں اس سے پرورش شدہ مرغیوں کے بارے میں حکم شرعی کیا ہے؟ وہ حلال ہیں یا حرام؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگرخنزیر کےاجزاء بعینہٖ باقی ہوں اوروہی مرغیوں کوکھلایا جاتا ہے،تو اگر دیگر پاک غذا زیادہ مقدار میں ہوں اور یہ ناپاک غذا کم ہو تو جلالہ کےحکم میں نہ ہوں گے اور مرغی پالن میں جن مرغیوں کی عام غذا دانہ وغیرہ ہوں اوران کے ساتھ میں خنزیر کے اجزاء بھی بطور غذا دیتے ہوں،تو ایسے مرغوں اورمرغیوں کا کھانا بلاکراہت حلال اوردرست ہے؛اس لئے کہ عام غذا پاک ہے۔

إذا خلط بين أكل العذرة وغيرها ليست بجلالة يحل أكله. أما الدجاجة المخلاة فلا بأس بأكلها؛ لأنها تخلط بين العذرة وغيرها. (الولوالجية، دارالإيمان سهارن پور ۳/ ٥٦)

لا بأس بأكل الدجاجة؛ لأنها تخلط ولا يتغير لحمه. (البحر الرائق، كتاب الكراهية، فصل في الأكل والشرب، زكريا ٨/ ٣٣٥، كوئٹه ٨/ ١٨٣)

لايكره أكل الدجاجة المخلي، وإن كان يتناول النجاسة؛ لأنه لايغلب عليه أكل النجاسة؛ بل يخلطها بغيرها، وهو الحب (بدائع الصنائع، كتاب الذبائح والصيود، زكريا٤/ ١٥٤، كراچي٥/ ٤٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰؍۱۱۳۸۴)

(۱۱) باب الانتفاع بالحیوانات

گائے کا گوشت کھانا جائز ہے یا نہیں؟

سوال [۱۰۷۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ گائے کا گوشت کھانا جائز ہے یا نہیں؟ ان جگہوں پر جہاں حکومت کی طرف سے پابندی ہو، جیسا کہ چند دن پہلے دار العلوم دیوبند سے عدم جواز کا فتوی جاری ہوا تھا۔

المستفتی: محمد آفتاب عالم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہندوستان میں گائے، بیل شریعت اسلامیہ کی رو سے بلاتردد جائز اور حلال ہیں؛ البتہ جن علاقوں میں گائے ذبح کرنا قانوناً جرم ہے، ان علاقوں کے مسلمانوں کو گائے ذبح کرکے اپنی جان ومال کو خطرہ میں ڈالنے سے احتراز کرنا چاہئے؛ اس لئے کہ شریعت کا یہ بھی حکم ہے کہ تم اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور دار العلوم دیوبند سے عدم جواز کے فتوی کے متعلق جو بات لکھی گئی ہے، وہ صرف اخبار ومیڈیا کی بات ہے، دار العلوم دیوبند کا فتوی براہ راست دیکھ لینا چاہئے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُكَة . [البقرہ: ۱۹۵]

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹؍۱۰۲۳۵)

ولادت کے فوراًبعد گائے کے دودھ کا حکم

سوال[۱۰۷۸۹]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ گائے، بھینس جب بچہ جنتی ہے، تو اس کے بعد دوسرے دن یا تیسرے دن اس گائے کا گاڑھا دودھ دوہ کر کھیس پکاتے ہیں، کیا اس کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بھینس یا گائے کے بچہ دینے کے بعد جو موٹا دودھ ہوتا ہے، اس کا استعمال کرنا شرعاً جائز اور درست ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

(مستفاد: فتویٰ رحیمیہ قدیم ۳/۳۰۴، جدید زکریا ۱۰/۱۳۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/۷۶۸۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۶/۸ھ

انجکشن کے ذریعہ جانوروں سے دودھ حاصل کرنا

سوال [۱۰۷۹۰]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک گائے کئی سال کی ہوگئی، مگر حاملہ نہیں ہوتی ہے، ایک ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ میں دوائیوں اور انجکشنوں کے ذریعہ بغیر بچہ دیئے دودھ دیتی کردوں گا، دس کیلو دودھ دیا کریگی، تو کیا اس طریقہ سے جانور سے دودھ لیا جا سکتا ہے؟

المستفتی: محمد یونس احمد، گڈھ پنجاب

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: انجکشن کے ذریعہ دودھ حاصل کرنے میں کوئی کراہت نہیں ہے؛ کیونکہ آج کل اکثر جانور انجکشن کے بعد ہی دودھ دیتے ہیں؛ لہٰذا شرعاً جائز ہوگا۔

(مستفاد: امداد الفتاوی ۴/۶۲۲، محمودیہ قدیم ۱۷/۳۱۴، ڈابھیل ۱۸/۲۴۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۷۴۰/۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۷/۴/۲۶ھ

انجکشن کے ذریعہ بھینس کا دودھ نکالنا

سوال [۱۰۷۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ انجکشن کے ذریعہ بھینس کا دودھ نکالنا کیسا ہے؟ جبکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ فعل بھینس کے ساتھ ظلم ہے، شریعت کی رو سے اس کا جواب مرحمت فرمادیجئے۔

المستفتی: حافظ رئیس احمد، شیر کوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: انجکشن کے ذریعہ بھینس کا دودھ نکالنا جائز ہے اور اس انجکشن سے بھینس کو ایسی تکلیف نہیں ہوتی، جس کو ظلم کہا جائے؛ بلکہ اس کے اعضاء کو ڈھیلے کرنے کے لئے یہ انجکشن لگایا جاتا ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۲۱۸/۵، ڈابھیل ۱۸/۲۴۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/جمادی الثانیہ ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۹۲۸/۳۲)

جرسی گائے کا دودھ اور گوشت کھانا

سوال [۱۰۷۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جرسی گائے کا دودھ اور گوشت کھانا کیسا ہے؟ جرسی گائے کی نسل کی ابتداء کہاں سے ہوئی؟

المستفتی: محمد شمس الحق، مدھے پور، بھاگل پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جرسی گائے کا دودھ اور گوشت کھانا درست ہے۔

(مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۷/۲۹، ڈابھیل ۱۸/۲۴۸)

واعلم أن الأصل في الأشياء كلها سوى الفروج الإباحة......إنما تثبت الحرمة بعارض نص مطلق، أو خبر مروي، فما لم يوجد شيئ من الدلائل المحرمة، فهي على الإباحة. (مجمع الأنهر، كتاب الأشربه، دارالكتب العلمية بيروت ٤/٢٤٤، مصري قديم ٢/٥٦٨)

اوراس کی نسل کی ابتداء کے بارے میں ہمیں معلومات نہیں ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍محرم الحرام ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/۴۶۱۲)

امریکن گائے کے دودھ کا حکم

سوال [۱۰۷۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ امریکن گائے کے مادہ کے بارے میں سنا ہے کہ خنزیر سے لیا گیا ہے۔ نیز آواز اور شکل سے مشابہت بھی رکھتی ہے، تو اس کے دودھ گوشت کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: عبدالقادر، قاسمی، خادم مدرسہ ضیاء العلوم، کرتپور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: امریکن گائے کا دودھ اور اس کا گوشت استعمال کرنا بلا شبہ حلال وجائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۷/۲۹، ڈابھیل ۱۸/۲۴۸)

والمتولد بين الأهلي والوحشي يتبع الأم (در مختار) تحته في الشامية: تبعاً للهداية وغيرها، قال في البدائع: فلو نزا ثور وحشي على بقرة أهلية، فولدت ولداً يضحىٰ به دون العكس؛ لأنه ينفصل عن الأم وهو

حیوان متقوم تتعلق به الأحکام. (شامي، کتاب الأضحیة، زکریا ۹/۴٦٦، کراچي ٦/٦٤٦، هدایة، اشرفي دیوبند ٤/٤٤٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۶۶۷۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/۵/۱۴۲۱ھ

امریکن گائے کا دودھ اور گوشت حلال ہے؟

سوال [۱۰۷۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ امریکن گائے کا دودھ پینا حرام ہے یا حلال ہے؟ میرے گاؤں میں یہ بات مشہور ہے کہ امریکن گائے کو انجکشن کے ذریعہ حمل ٹھہرایا جاتا ہے، پھر اس سے اولاد پیدا ہوتی ہے، اسی طرح سلسلہ چلتا رہتا ہے، تو ایسی گائے کا دودھ پینا صحیح ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد قاسم گوجر، بھوانی پور، ادھم سنگھ نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: امریکن گائے کا دودھ اور گوشت حلال ہے۔

والمتولد بین الأهلي والوحشي یتبع الأم (در مختار) قال في البدائع: فلو نزا ثور وحشي علی بقرة أهلیة، فولدت ولداً یضحیٰ به دون العکس؛ لأنه ینفصل عن الأم وهو حیوان متقوم تتعلق به الأحکام ومن الأب ماء مهین ولذا یتبع الأم في الرق والحرمة.

(شامي، کتاب الأضحیة، زکریا ۹/۴٦٦، کراچي ٦/٦٤٦، هدایة، اشرفي دیوبند ٤/٤٤٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۶۶۹۶)

مری ہوئی مرغی کا انڈا

سوال[۱۰۷۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کوئی مرغی یا بطخ مرجائے، تو اس کے اندر کے انڈے کو نکال کر استعمال کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد عبدالجلیل، بردوانی، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مری ہوئی مرغی یا بطخ کے پیٹ سے نکالے ہوئے صحیح وسالم انڈے کا استعمال درست ہے۔ (مستفا: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۵۶/۵، ڈابھیل ۲۳۶/۱۸)

البيضة إذا خرجت من دجاجة ميتة أكلت. (فتاوى عالمگيري، الباب الحادي عشر في الكراهية في الأكل، زكريا جديد ۳۹۲/۵، قديم ۳۳۹/۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷/۳۵/ ۷۲۴۷)

جس مرغی کا مرغے کے ساتھ اختلاط نہ ہوا ہو اس کا انڈا

سوال [۱۱۰۷۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایسی مرغی جس کا مرغے کے ساتھ اختلاط نہ ہوا ہو، اس کا انڈا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس مرغی کا مرغے کے ساتھ اختلاط نہ ہوا ہو، اس کا انڈا کھانا بلا کراہت جائز ہے عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

واعلم أن الأصل في الأشياء كلها سوى الفروج الإباحة......إنما

تثبت الحرمة بعارض نص مطلق، أو خبر مروي، فما لم يوجد شيئ من الدلائل المحرمة، فهي على الإباحة. (مجمع الأنهر، كتاب الأشربه، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٢٤٤، مصري قديم ٢/ ٥٦٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍رجب المرجب ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۴۰۹۷)

کتیا کا دودھ پینے والے گائے کے بچے کے گوشت کا حکم

سوال [۱۰۷۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے یہاں پر ایک گائے کا بچہ پل رہا ہے، جو کہ لگ بھگ ڈیڑھ سال کا ہے، ابھی کوئی چار مہینے پہلے میرے لڑکوں نے اس گائے کے بچہ کو کسی کتیا کا دودھ پیتے ہوئے دیکھا ہے؛ لیکن میں نے آج تک نہیں دیکھا؛ جبکہ میں خود ہی اس کو کھولتا باندھتا ہوں۔

اب آپ مسئلہ کو بغور پڑھ کر شرع کی رو سے یہ بتانے کی زحمت گوارہ فرمائیں کہ اس گائے کے بچے کو میں کاٹ کر یعنی ذبح کر کے اپنے کھانے کے صرف میں لاسکتا ہوں یا نہیں؟ مدلل ومفصل جواب سے نوازکر شکریہ کا موقع عطا فرمائیں مہربانی ہوگی۔

المستفتی: محمد یعقوب قریشی، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سوال نامہ میں درج شدہ گائے کے بچہ کو ذبح کر کے اس کا گوشت کھانا بلا کراہت حلال رہے گا۔

ولهذا يحل أكل لحم جدي تغذي بلبن الخنزير؛ لأن لحمه لا يتغير وما غذي به صار مستهلكاً لا يبقي له أثر. (تبيين الحقائق، كتاب الكراهية، فصل في الأكل والشرب، زكريا ٧/ ٢٤، امدادية ملتان ٦/ ١٠، البحر الرائق، كتاب الكراهية،

فصل في الأكل والشرب، كوئٹه ۸/۱۸۲، زكريا ۸/۳۳۵، بزازية، زكريا جديد ۳/۱٦٤، وعلى هامش الهندية، زكريا ۳/۳۵۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ جمادی الثانیہ ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴؍۷۲۲)

جس گائے سے زنا کیا گیا، تو اس کو کیا کیا جائے

سوال [۱۰۷۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ براہین و دلائل شرعیہ فقہ حنفی کے مطابق تحریر فرما کر مشکور وممنون فرمائیں عین کرم ہوگا۔

زید نے بکر کی گائے کیساتھ زنا کیا، بکر نے محلّہ والوں سے کہا، محلّہ والوں نے ایک مولانا کے پاس مسئلہ معلوم کرنے کو بھیج دیا، مولانا نے مسئلہ یہ دیا کہ زانی سے گائے کی قیمت اوراوپر سے جرمانہ لیا جائے، اور گائے کو ذبح کر کے دفن اسی زانی سے کرایا جائے، چنانچہ اسی طریقہ سے محلّہ والوں نے قیمت اوراوپر سے جرمانہ لیا اور مولانا کے کہنے پر عمل کیا، آیا یہ صحیح ہے یا نہیں؟ اس گائے کو ذبح کر کے دفن کیوں کیا گیا؟ اس کا گوشت کیوں نہیں کھایا گیا؟ اوراگر اس کا گوشت کھانا حرام اور بیچنا بھی حرام، تو زانی سے قیمت لینا جرمانہ لینا یہ بھی تو بیچنا ہوا یا نہیں؟ اور گائے کی قیمت نہیں ملے گی، تو گائے والے کو نقصان ہو رہا ہے اب کیا کرنا ہے؟

المستفتی: عبدالصمد، محلّہ بلاسپور گیٹ، رام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: صرف گائے کی قیمت وصول کرنا درست ہے اوراوپر سے جرمانہ مالی لینا جائز نہیں ہے۔

عن أبي حميد الساعديؓ، أن رسول الله صلى الله علية وسلم قال: لا يحل

لامري أن يأخذ مال أخيه بغير حقه و ذلک لما حرم الله مال المسلم على المسلم.

(مسند أحمد بن حنبل٥/ ٤٢٥، رقم:٣٤٠٠٣)

اور جو جرمانہ لیا گیا ہے، اس کا واپس کرنا ضروری ہے اور گائے کے جلانے کا جو حکم ہے، وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ اس کا گوشت کھاتے وقت واقعہ یاد آنے کی وجہ سے طبیعت میں سخت قسم کی کراہت پیدا ہو سکتی ہے، ورنہ فی نفسہ گائے مذکور کا گوشت شرعاً حرام نہیں ہے۔ نیز اس کو ایسی جگہ لیجا کر فروخت کر دینا بھی جائز ہے کہ جہاں کے لوگوں کو اس واقعہ کی اطلاع نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ۳۵۴/۶، ڈابھیل ۳۸۲/۱۷)

وتذبح ثم تحرق أي لقطع امتداد التحدث به كلما رؤيت وليس بواجب (وقوله) يطالب لصاحبها أن يدفعها إليه بالقيمة......والظاهر لا يجبر على دفعها. (شامي، الحلود، مطب في وطء الدابة، زكريا ٦/ ٣٦، كراچي ٤/ ٢٦، الموسوعة الفقهية الكويتية٢/ ١٢٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶۴۷/۲۷)

بکری کا وہ بچہ جس کا سر کتے اور بقیہ دھڑ بکری کی طرح ہو اس کا کھانا

سوال [۱۰۷۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بکری نے بچہ جنا جس کا سر کتے اور دھڑ بکری کا ہے، تو کیا اس کا کھانا، قربانی دینا جائز ہے؟

المتولد من الحيوان تعتبر إلا في الحرمة والحل کے مطابق جائز ہونا چاہئے؛ جبکہ اس کا رئیس الاعضاء حرام جانور کا ہے، مفصل ومدلل تشفی بخش جواب درج فرمائیں؛ کیونکہ یہاں فالف گروپ کے علماء نے مثلاً رضا خانی، غیر مقلد نے جواب دینے

سے عجز کا اظہار کردیا ہے، بالآخر وہ لوگ میرے پاس آئے؛ لیکن کسی بھی فتاوی کے کتب میں مجھے تسلی بخش جواب نہ مل سکا؛ لہٰذا ان باتوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر جواب ثبت فرمائیں۔

المستفتی: اسرارالحق، قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: بکری کا وہ بچہ جس کا سر کتے اور بقیہ دھڑ بکری کی طرح ہے، اس کے سلسلے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر وہ بچہ گوشت کھاتا ہے یا زبان سے پانی پیتا ہے، یا کتے کی طرح آواز کرتا ہے، تو اس کا کھانا حلال نہیں ہے۔ اور اگر گھاس کھاتا ہے، یا پانی منہ سے پیتا ہے، یا بکری کی طرح آواز کرتا ہے، تو پھر کھانا حلال ہے اور اگر بچے میں دونوں طرح کی صفت ہے، تو اس کے سامنے پانی رکھا جائے گا، تو اگر بکری کی طرح پیتا ہے، تو اس کا کھانا اور قربانی کرنا دونوں حلال ہے اور اگر کتے کی طرح زبان سے پانی پیتا ہے، تو اس کا کھانا اور قربانی دونوں ناجائز ہے۔

فجاء ها نتاج له رأس ككلب فينظر، فإن أكلت لحماً، فكلب جميعها، وإن أكلت تبناً فذا الرأس يبتر و يؤكل باقيها وإن أكلت لذا، و ذا فاضر بنها والصياح يخبر، وإن أشكلت بأن نبح كالكب وثغاً كالعنز أي فإن نبح لا يؤكل وإن ثغا يرى رأسه ويؤكل الباقي، وظاهر كلامه أن اعتبار هذه الأمور على هذا الترتيب فبعد وضوحٍ علامة الأكل لا يعتبر الصياح مطلقاً وبعد وضوح علامة الصياح لا يعتبر ما في الجوف مطلقاً وعليه فإذا أكل لحماً وثغاً، أو ظهر له كرش لا يؤكل وإذا أكل تبناونبح، أوظهر له أمعاء يؤكل. (الدر مع الرد، كتاب الذبائح، زكريا ٩/٤٥١، كراچي ٦/٣١١)

شاة ولدت ولداً بصورة الكلب فأشكل أمره، فإن صاح مثل الكلب لا يؤكل وإن صاح مثل الشاة يؤكل وإن صاح مثلهما يوضع الماء بين يديه إن شرب باللسان لا يؤكل؛ لأنه كلب و إن شرب بالفم يؤكل؛ لأنه شاة،

وإن شرب بهما يوضع التبن واللحم قبله إن أكل التبن يؤكل؛ لأنه شاة، وإن أكـل اللحم لا يؤكل وإن أكلهما جميعًا بذبح ان خرج الأمعاء لايؤكل وان خرج الكرش يؤكل. (عـالمگيري، الباب الثالث في المتفرقات، زكريا قديم ٥/ ٢٩٠، جديد ٥/٣٣٥، المسوعة الفقهية الكويتية ٤٥/ ٢١٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ رمحرم الحرام ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴ ر ۵۹۴۳)

حلال جانوروں کے خصیتین کا کھانا

سوال [۱۰۸۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خصیتین میں بڑی طاقت ہوتی ہے، تو طاقت کے ارادے سے ان کا کھانا بلا کراہت حلال ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: خصیتین کا کھانا احناف کے یہاں مکروہ تنزیہی ہے، حنفیہ کے یہاں حلال جانوروں کے سات اعضاء کا کھانا ممنوع ہے:

۱. دم مسفوح ۲. ذکر ۳. خصیتین ۴. قبل ۵. غدود ۶. مثانہ ۷. پِتّہ۔

ان سات میں سے دم مسفوح حرام ہے، جس کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے اور مثانہ، غدود، پتہ، بچہ دانی، کا کھانا مکروہ تحریمی اور خصیتین کا کھانا مکروہ تنزیہی ہے اور ذَکر میں کراہت تحریمی اور تنزیہی دونوں کا احتمال ہے۔ عرب کے لوگ خصیتین بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔

عـن مجاهد أن النبي صلى الله عليه وسلم كره من الشاة سبعًا: الدم الـمسـفـوح، والـذكـر، والأنثيـيـن، والـقبل، والغدة، والمثانة، والمرارة.

(مراسیل أبو داؤد ص:۱۹، مصنف عبد الرزاق، المجلس العلمي ٤/٥٣٥، رقم: ٨٧٧١، اعلاء السنن ١٧/١٣٠)

وأما بيان ما يحرم أكله من أجزاء الحيوان، سبعةٌ: الدم المسفوح، والذكر، والأنثيان، والقبل، والغدة، والمثانة، والمرارة. (هندية، كتاب الذبائح، الباب الثالث في المتفرقات، زكريا قديم ٥/٢٩٠، جديد ٥/٣٣٥)

ويكره من الشاة الحيا، والخصية، والمثانة، والذكر، والغدة، والمرارة، والدم المسفوح للأثر الوارد في كراهة ذلك. (مجمع الأنهر، كتاب الخنثیٰ، دارالكتب العلمية بيروت ٤/٤٨٩، مصري قديم ٢/٧٤٣)

إذا ما ذكيت شاة فكلها — سوى سبع ففيهن الوبال
فحاء، ثم خاء، ثم غين — ودال، ثم ميمان و ذال

(در مختار، كتاب الخنثیٰ، كراچي ٦/٧٥٠ زكريا ١٠/٤٧٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۳۱۷)

بکرے کے خصیوں کو دوا کے طور پر استعمال کرنا

سوال [۱۰۸۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بکرے کے خصیوں کا کیا حکم ہے؟ اس کو دوا کے طور پر استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ دوسری دوا کم اثر اور فائدہ رکھنے والی موجود ہو، ہومیو پیتھ کی دوائیوں میں شراب کا محلول ملایا جاتا ہے، اور یہ طریقۂ علاج جائز ہے؟

المستفتی: ابوالخیر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: بکرے کا خصیہ اسی طرح دیگر حلال جانوروں کا خصیہ

حنفیہ کے نزدیک حلال نہیں ہے؛ بلکہ مکروہ ہے۔(مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۴/۳۵۷، ڈابھیل ۲۹۸/۷)

اور شئ مکروہ کو علاج کے طور پر استعمال کرنا حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق جائز ہے اور اسی پر حنفیہ کا فتوی ہے۔

وفي النوازل رجل أدخل المرارة في أصابعه للتداوي. قال أبو حنيفةؒ يكره، وقال أبويوسفؒ يجوز والفقيه أبو الليث اختار قول أبي يوسفؒ.

(البحرالرائق، كتاب الكراهية، فصل في البيع، زكريا ٣٧٦/٨، كوئٹه ٢٠٥/٨، هندية، زكريا قديم ٣٥٦/٥، جديد ٤١١/٥)

ہومیو پیتھک کی دواؤں میں شراب کا محلول جس کو الکحل کہا جاتا ہے ملایا جاتا ہے، ضرورت کی بنا پر ان کا استعمال جائز ہے۔(مستفاد: ایضاح النوادر ۱۲۵، بہشتی زیور ۱۰۲/۹)

وقال محمدؒ ما أسكر كثيره، فقليله حرام، أقول أن هذا خاص بالأشربة المائعة دون الجامد، فلا يحرم قليلها؛ بل كثيرها المسكر.

(شامي، كتاب الأشربة، زكريا ٣٨/١٠، كراچي ٤٥٥/٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۶۴۳/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۵/۹ھ

چھوٹی مچھلی کو آلائش سمیت بھون کر کھانا

سوال [۱۰۸۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ چھوٹی مچھلی جو کہ ایک بالشت سے کم ہو پیٹ چاک کئے بغیر صرف دھوکر یا پکا کر بھون کر کھایا جاسکتا ہے یا نہیں؟ یا اس چھوٹی مچھلی کو بغیر آلائش نکالے بھون کر یا پکا کر استعمال کرنا درست ہے یا نہیں یا چھوٹی بڑی مچھلی کے درمیان فرق ہے؟، برائے مہربانی وضاحت کے ساتھ مطلع فرمائیں۔

المستفتی: محمد جابر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مچھلی کو آلائش سمیت بھون لیا گیا یا پکا لیا گیا، تو ایسی صورت میں مچھلی ناپاک نہ ہوگی؛ اس لئے کہ مچھلی اور دیگر حیوان مائی کا کوئی جز ناپاک نہیں ہے؛ لیکن آلائش کے بعض اجزاء مضر ہوتے ہیں؛ اس لئے بھنی ہوئی مچھلیسے آلائش نکال کر کھانا جائز ہے؛ لیکن آلائش کے ساتھ کھانا حرام ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۷ ۹،۴/۱۰۴، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۲/۷ ۳۹، جدید ڈابھیل ۱۸/۲۰۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹/ ۳۴۵۸)

مرغ یا بطخ کی کھال کھانا

سوال [۱۰۸۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مرغ یا بطخ کے چرم کا کھانا باعتبار شرع کیسا ہے؟

المستفتی: بشیر احمد قاسمی، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرغ یا بطخ کی کھال کھانا جائز ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۷/۵۲۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ ربیع الاول ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۴۷۲۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۳/۱۴۱۷ھ

مرغ یا بطخ ذبح کرنے کے بعد بال ختم کرنے کے لئے گرم پانی میں ڈالنا

سوال [۱۰۸۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ مرغ یا بطخ کو ذبح کرنے کے بعد اس کے بال ختم کرنے کے لئے گرم پانی میں ڈالنا کیسا ہے؟

المستفتی: بشیر احمد قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرغ یا بطخ کو ذبح کرنے کے بعد اگر اس کے بال و پر صاف کرنے کی غرض سے کھولتے ہوئے پانی میں ایک یا ڈیڑھ منٹ تک چھوڑ دیا جائے، تو اس کا کھانا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ اتنی دیر میں اندرونی نجاست کا اثر گوشت میں آجاتا ہے، اور اگر گرم پانی میں ڈالتے ہی فوراً نکال لیا جائے کہ گرمی کا اثر اندر تک نہ پہونچ سکے تو حلال ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۵۹/۵، ڈابھیل ۸۴/۱۸، ایضاح المسائل ۱۸)

ولایترک فیہ إلا مقدار ماتصل الحرارۃ إلی ظاھر الجلد؛ لتنحل مسام الصوف. (شامي، باب الأنجاس، مطلب في تطہیر الدھن والعسل، زکریا ۱/ ۵٤٤، کراچي ۱/ ۳۳٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ ربیع الاول ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۷۲۳/۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۷/۳/۱۳ھ

مرغی ذبح کر کے گرم پانی میں ڈالنا

سوال [۱۰۸۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مرغی کو گرم پانی میں ڈال کر پَر اتار کر کھانا کیسا ہے؟

المستفتی: مزمل الحق

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرغی کو ذبح کر کے کھولتے ہوئے پانی میں اگر ایک ڈیڑھ منٹ تک چھوڑ دیا گیا، اسی طرح اگر پروں کو جلا دیا گیا، اور اتنی دیر جلایا گیا کہ آگ

کا اثر غلاظت میں پہونچ کر پھر غلاظت گھل کر اس کا اثر گوشت میں گھلگیا، تو اس کا کھانا جائز نہیں؛ لیکن اگر اتنی دیر جلایا نہیں گیا کہ جس سے غلاظت گھل کر اس کے اثرات گوشت میں منتقل ہوسکیں تو اس کا کھانا جائز ہے؛ لہٰذا مذکورہ کھانے میں مرغ کا جو گوشت کھایا گیا ہے، اگر وہ ایسا مرغ ہے، جس کو اتنی دیر جلایا نہیں گیا کہ اس کی غلاظت بھی گھل کر اس کے اثرات گوشت میں منتقل ہوسکیں تو اس کو کھانا جائز ہے اور جنہوں نے کھایا ہے، ان پر کوئی ملامت نہیں؛ اس لئے گوشت تیار کرنے والوں سے اس کی تفصیل معلوم کرلی جائے، تاکہ آئندہ جواز اور عدم جواز دونوں پہلو سامنے آجائیں۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ۱۸)

وفي الشامية: وكذا دجاجة قال في الفتح: انها لا تطهر أبداً(الی قوله تشربها النجاسة بواسطة الغليان و لايترک فيه إلا مقدار ما تصل الحرارة إلي ظاهر الجلد. (شامي، باب الأنجاس، مطلب في تطهير الدهن، والعسل، زكريا ۱/ ٥٤٤، كراچي ۱/ ۳۳٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷ر محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴ر ۶۴۳۷)

جس مرغی کو ذبح کر کے گرم پانی میں ڈالدیا جائے اس کا کھانا

سوال [۱۰۸۰٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک مسلم تاجر جو مرغی کا گوشت فروخت کرتا ہے، مرغی کو ذبح کرتے ہی فوراً کھولتے ہوئے پانی میں ڈبو دیتا ہے تاکہ بال و پر آسانی سے نکل جائیں، ایسی مرغی کا کھانا کیسا ہے؟ عوام کیا خواص بھی اس سے نابلد و ناآشنا ہیں، ہر طرف یہی طریقہ چل رہا ہے، عوام وخواص کہتے ہیں کہ اس کے حرام و ناجائز ہونے کی کیا وجہ ہے؟

المستفتی: سید عبدالغفور، پربھنی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگراتنی دیرگرم پانی میں ڈال کرچھوڑ دیا جائے کہ جتنی دیرمیں اندرکی نجاست کےاثرات گوشت میں منتقل ہوسکتے ہیں،تواس کا کھاناجائزنہیں ہے اوراگرنجاست کےاثرات گوشت میں منتقل ہونے سےقبل نکال لیاجائے،تواس کا کھاناجائزہے۔ (مستفاد:ایضاح المسائل ۱۸)

لكن العلة المذكورة لا تثبت مالم يمكث اللحم بعد الغليان زمانا يقع في مثله التشرب والدخول في باطن اللحم. (شامي، باب الأنجاس، مطلب في تطهير الدهن و العسل، زكريا ۱/ ۵٤٤، كراچي ۱/ ۳۳٤)

تجربہ کار لوگوں سے معلوم ہوا کہ اتنی جلدی نکال لیا جاتا ہے، کہ اتنی دیرمیں نجاست کے اثرات گوشت میں نہیں پہونچ پاتے ہیں، اگر واقعہ ایسا ہےتو ایسے مرغ کا کھانا بلاشبہ حلال ہے۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیراحمد قاسمی عفااللہ عنہ
۱۲؍شوال المکرّم ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر:الف ۳۱؍۴۱۷۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۱۰/۱۲ھ

جس کھانے میں خنزیر کے بال نکل آئیں وہ حلال ہے یا حرام؟

سوال[۱۰۸۰۷]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اکثر تقریبات میں دیگ وغیرہ میں خنزیر کے بال نکل آتے ہیں ایسی صورت میں جس کے سامنے یہ بال آجائیں، اس کو کھانا کھانا چاہئے یا نہیں؟ اور دوسرے لوگوں کو بھی کھانا کھانے سے روک دے کہ نہیں؟ کیاوہ کھاناناپاک ہوجاتاہے،جس میں خنزیر کے بال نکل آئیں؟

المستفتی: احسان علی صدیقی اصغرمنزل شیرکوٹ بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کھاناناپاک اورحرام ہے۔

لو وقع في ماء قليل نجسه. (شامي، كتاب الطهارة، باب المياه، زكريا ١/٣٥٩، كراچي ١/٢٠٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۲۹/۲۴)

حرام مغز کا حکم

سوال [۱۰۸۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حرام مغز کا کیا حکم ہے؟ حلال ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حرام مغز میں کوئی علت حرمت نہیں ہے، بریں بناء طبیعت کے گھن کرنے کی وجہ سے اس کو زیادہ سے زیادہ مکروہ تنزیہی اور خلاف اولیٰ کہا جائے گا؛ لہٰذا اگر کسی شخص کی طبیعت اس سے گھن نہ کرتی ہو، تو وہ اس کو کھا سکتا ہے۔ حضرت مفتی کفایت اللہؒ نے لکھا ہے کہ حرام مغز نہ حرام ہے اور نہ ہی مکروہ بیچارہ یونہی بدنام ہو گیا۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۹/۱۲۳)

وكره من الشاة الحياء، والخصية، والغدة، والمعدة، والمثانة، والمرارة، والدم المفسوح، ونخاع الصلب. (كنزل الدقائق ٤٩٦)

یہ عبارت صاحب کنز کی ہے؛ لیکن اس پر محشی رقم طراز ہیں کہ یہ جملہ کنز کے دیگر متون میں نہیں ہے۔ نیز ہندیہ زکریا ۵/۲۹۰ میں کنز کے حوالہ سے اسکو مکروہ لکھا گیا ہے اور رہے اردو کے فتاوی تو اولاً حضرت گنگوہی نے فتاوی رشیدیہ ۵۵۲/ پر اس کو ممنوع لکھا تھا اس لئے تمام ناقلین فتاوی نے اس کو مکروہ لکھا ہے اور دلیل میں اکثر فقہاء اس عبارت کو نقل کر دیتے ہیں۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم ۱۵/۴۶۸، امداد المفتیین ۹۷۰، محمودیہ ڈابھیل ۱۷/۲۹۸، محمودیہ میرٹھ ۲۶/۲۱۵، رشیدیہ ۵۵۲)

وأما بيان ما يحرم أكله من أجزاء الحيوان، سبعةٌ: الدم المسفوح، والذكر، والأنثيان، والقبل، والغدّة، والمثانة، والمرارة. (هندية، كتاب الذبائح، الباب الثالث في المتفرقات، زكريا قديم ٥/ ٢٩٠، جديد ٥/ ٣٣٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۳۱۸/۴۰)

ماکول اللحم کی اوجھڑی کا حکم

سوال [۱۰۸۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کہتا ہے کہ ماکول اللحم جانوروں کی اوجھڑی کھانا جائز ہے؛ جبکہ بکر اوجھڑی کی حرمت کا قائل ہے، دونوں میں سے کس کی بات از روئے شرع درست ہے؟ مفصل جواب سے نوازیں۔

المستفتی: نور جمال، بیر بھومی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ماکول اللحم جانوروں کی اوجھڑی کھانا حلال اور جائز ہے بکر کا اوجھڑی کی حرمت کا قائل ہونا ناواقفیت پر محمول ہے۔ (مستفاد: فتاوی رشیدیہ قدیم ۵۵۳، جدید زکریا ۵۳۴، امداد الفتاوی ۱۰۲/۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ محرم الحرام ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۸۸۶/۳۶)

حلال جانور کی انتڑی حلال

سوال [۱۰۸۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ حلال جانوروں کی انتڑی حلال ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ناصر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حلال جانوروں کی انتڑی کھانا شرعاً جائز اور حلال ہے؛ کیوں کہ اس میں کوئی علت حرمت نہیں ہے، اسی وجہ سے فقہاء کرام نے اس کو اعضاء محرمہ میں شمار نہیں فرمایا ہے۔ (مستفاد: فتاوی رشیدیہ ۵۵۲، باقیات فتاوی رشیدیہ قدیم ۴۵۰، جدید زکریا ۵۴۳، محمودیہ ڈابھیل ۱۷/ ۲۹۴)

وفي الاختيار وغيره: الكرش، الكبد، والرقة، والفؤاد، والرأس، والأقارع، والأمعاء، والطحال لحم؛ لأنها تباع مع اللحم. (مجمع الأنهر، باب اليمين في الأكل والشرب واللبس والكلام، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٢٩٢، مصري قديم ١/ ٥٥٩، الاختيار لتعليل المختار ٤/ ٦٧)

وإن أكل لحم خنزير، أو لحم إنسان يحنث؛ لأنه لحم حقيقي إلا أنه حرام......وكذا إذا أكل كبداً، أو كرشا؛ لأنه لحم حقيقة......ويستعمل استعمال اللحم. (هداية، باب اليمن في الأكل والشرب اشرفي ٢/ ٤٨٨)

كره تحريما وقيل: تنزيهاً، والأول أوجه، من الشاة، سبع: الحياء، والخصية، والغدّة، والمثانة، والمرارة، والدم المفسوح، والذكر للأثر الوارد في كراهية ذلك. (در مختار مع الشامي، كتاب الخنثیٰ، كراچي ٦/ ٧٤٩، زكريا ١٠/ ٤٧٨)

ويكره من الشاة الحياء، والخصية، والمثانة، والذكر، والغدة، والمرارة، والدم المسفوح للأثر الوارد في كراهة ذلك. (مجمع الأنهر، كتاب الخنثیٰ، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٤٨٩، مصري قديم ٢/ ٧٤٣)

وأما بيان ما يحرم أكله من أجزاء الحيوان المأكول، فالذي يحرم أكله

منه سبعةٌ: الدم المسفوح، والذكر، والأنثيان، والقبل، والغدة، والمثانة، والمرارة، وهذه الأشياء السبعة مما تستخبثه الطباع السليمة فكانت محرمة. (بدائع الصنائع، زكريا ٤/١٩٠، كراچي ٥/٦١، هندية، كتاب الذبائح، الباب الثالث في المتفرقات، زكريا قديم ٥/٢٩٠، جديده/٣٣٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢ رشوال المکرّم ١٤١٣ھ
(فتویٰ نمبر: الف ٣١٧/٤٠/١١٣١)

حلال جانور کے حرام اجزاء اور حرام مغز کا حکم

سوال [١٠٨١١]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حلال جانوروں میں کتنے اجزاء حرام ہیں؟ نیز حرام مغز کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: مولانا معاذ الاسلام، مدرس مدرسہ امدادیہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حلال جانوروں میں سات اجزاء کا کھانا ناجائز اور مکروہ تحریمی ہے: دم مسفوح، ذکر، خصیتین، قُبل، غدود، مثانہ اور مرارہ یعنی پِتّہ، ان میں سے دم مسفوح قطعی طور حرام ہے۔

ما يحرم أكله من أجزاء الحيوان المأكول، فالذي يحرم أكله منه سبعةٌ: الدم المسفوح، والذكر، والأنثيان، والقبل، والغدة، والمثانة، والمرارة. (شامي، قبيل كتاب الأضحية، كوئٹه ٥/٢١٩، كراچي ٦/٣١١، زكريا ٩/٤٥١، بدائع الصنائع، زكريا ٤/١٩٠، كراچي ٥/٦١، هندية، زكريا قديم ٥/٢٩٠، جديده/٣٣٥)

امداد الفتاوی ٤/١١٨، فتاوی احیاء العلوم ١/٢٣٣، اور طحطاوی علی الدر کے اندر حرام مغز کو بھی مکروہ لکھا ہے۔

وزید نخاع الصلب. (طحطاوي علی الدر، کوئٹه ٤/ ٣٦٠، قبل کتاب الفرائض)

لیکن حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے یوں فرمایا کہ حرام مغزنہ حرام ہےاور نہ مکروہ بیچارہ یوں ہی بدنام ہوگیا کفایت المفتی قدیم ۸/۲۸۷، جدید زکریا مطول ۱۱/۱۷۱ اور فتاوی رحیمیہ ۲/۲۲۳، جدید زکریا ۱۰/۸۰، فتاوی رشیدیہ قدیم ۵۵۲، جدید ۵۳۴، فتاوی احیاء العلوم کی عبارت مضطرب ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ رجب المرجب ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/ ۸۲۵)

مرغ کے اندر کیا کیا چیزیں حرام یا مکروہ ہیں

سوال [۱۰۸۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مرغ کے اندر کیا کیا چیزیں مکروہ ہیں اوران کے نکالے بغیر گوشت جائز نہیں ہوگا، جو ایضاح المسائل میں ممنوع لکھا ہے۔

المستفتی: عبدالصمد، بلاسپور گیٹ، رام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس کے پیٹ میں جو آلائش اور گندگیاں موجود ہوتی ہیں۔

نیز گرم پانی میں ڈالدینے سے اس کے اثرات گوشت میں منتقل ہوجاتے ہیں؛ اس لئے ایضاح المسائل میں ممنوع لکھا گیا ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ۱۸، احسن الفتاوی ۲/۹٦)

وکذا دجاجة ملقاة حالة غلي الماء للنتف قبل شقها (تحته في الشامية) إنها لا تطهر أبداً...... تشربها النجاسة بواسطة الغليان. (شامي، باب الأنجاس،

قبیل فصل في الإستنجاء، زکریا ١/ ٥٤٤، کراچي ١/ ٣٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۳ر ربیع الثانیہ ۱۴۱۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹/ ۳۴۰۰)	۱۴۱۴/۴/۳ھ

حرام مغز اور پیٹھ کی ہڈی حلال ہے یا حرام

سوال [۱۰۸۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شریعت مطہرہ کا حرام مغز اور پیٹھ کی ہڈی (ریڑھ کی ہڈی) کے متعلق کیا حکم ہے؟ کیا ان کا کھانا ناجائز ہے براہ کرم تشفی بخش جواب سے نوازیں۔

المستفتی: اعجاز احمد، مدرسہ چلہ امروہہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حلال جانوروں میں سے سات اجزاء کا کھانا ناجائز اور مکروہ تحریمی ہے۔ ۱. دم مسفوح، ۲. ذکر، ۳. خصیتین، ۴. قبل، ۵. غدود، ٦. مثانہ، ۷. مرارہ یعنی پِتّہ اور ان میں سے دم مسفوح قطعی طور پر حرام ہے۔ (شامی، کوئٹہ ۵/ ۲۱۹، زکریا ۹/ ۴۵۱، کراچی ٦/ ۳۱۱، بدائع الصنائع، زکریا ۴/ ۱۹۰، کراچی ۵/ ٦۱، ہندیہ، زکریا قدیم ۵/ ۲۹۰، جدید ۵/ ۳۳۵)

ان اشیاء کو ذکر کرنے کے بعد **وزید نخاع الصلب** کی عبارت نقل کرتے ہیں۔ (طحطاوی علی الدر، کوئٹہ ۴/ ۳٦۰)

اور حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ مغز نہ حرام ہے اور نہ ہی مکروہ بیچارہ یوں ہی بدنام ہوگیا ہے، کفایت المفتی ۸/ ۲۸۷، اور پیٹھ کی ہڈی کسی کے نزدیک مکروہ نہیں ہے، سب کے نزدیک حلال ہے اور علامہ طحطاویؒ نے طحطاوی علی الدر میں کلیجی گردہ کو بھی مکروہ لکھا ہے اور فقہاء میں صرف علامہ طحطاوی تنہا ایک فرد ہیں جو کلیجی گردہ حرام مغز کو مکروہ لکھتے ہیں، بقیہ کوئی بھی فقیہ ان اشیاء کو مکروہ نہیں لکھتے ہیں صاحب اعلاء السنن نے

۱۷/۲۷۱ رمیں تفصیلی بحث کی ہے۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰ رجمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹/ ۳۲۱۸)

حرام مغز اور غدود دونوں ایک ہیں یا الگ الگ؟

سوال [۱۰۸۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حلال جانور کے جن سات اعضاء کا کھانا مکروہ تحریمی ہے، ان میں سے ایک جزءکو عربی میں لفظ ''غُدود'' سے تعبیر کیا گیا ہے، جس کا ترجمہ اردو فتاوی میں ''غدود'' سے کیا گیا ہے، پھر غدود کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے یعنی حرام مغز جو پشت کے مہرے میں ہوتا ہے۔
(مستفاد: فتاوی رشیدیہ قدیم ۵۵۲، جدید ۵۳۴، فتاوی رحیمیہ قدیم ۳۳۲/۹-۲۲۳/۹، جدید زکریا ۸۰/۱۰)

بندہ ناچیز کو غدود کی تفسیر حرام مغز سے کرنے میں کچھ خلجان ہے؛ اس لئے کہ ڈاکٹروں کے استفسار سے اور لغات کے تتبع سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ غدود اور حرام مغز دونوں الگ الگ ہیں۔

غــــدود: جسم کے اندر کی گانٹھ کو کہتے ہیں جو جسم کے کسی بھی حصہ میں ہوسکتی ہے۔
(فیروز اللغات)

حرام مغز: وہ گودا ہے جو پشت کے مہرے میں ہوتا ہے۔(فرہنگ آصفیہ ۸۲۱/۱)

پس غدود کی تفسیر حرام مغز سے کیسے ہوسکتی ہے؟ اب سوال یہ ہے کہ عربی میں جو لفظ غدہ ہے (خواہ حدیث میں ہو جیسے السنن الکبریٰ للبیہقی ۴۰۱/۱۴، یا فقہ کی عبارت ہو جیسے: بدائع الصنائع ۱۹۰/۴، الدر المختار مع الشامی زکریا ۴۷۷/۱۰)

اردو میں اس کو کس طرح تعبیر کیا جائے گا؟ جس طرح فتاوی رشیدیہ ورحیمیہ میں ہے اگر وہ بالکل درست ہے تو بندہ کو اس میں جو خلجان ہے اس کو دور کرنے کی کوشش فرمائیں

اوراگراس میں کچھ کلام کی گنجائش ہوتو اپنی تحقیق رقیق سے مطلع فرمائیں۔

بندۂ ناچیز کی ایک ناقص رائے یہ ہے کہ علامہ شامیؒ نے ''غدۃ'' کی تفسیر قاموس کے حوالہ سے ان الفاظ میں فرمائی ہے۔

كل عقدة في الجسد أطاف بها شحم، وكل قطعة صلبة بين العصب ولاتكون في البطن، كما في القاموس. (شامي، زكريا ١٠/٤٧٨)

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غدۃ کا ترجمہ اس طرح کرنا زیادہ صحیح ہے ''غدۃ'' یعنی غدود اور حرام مغز جو پشت کے مہرے میں ہوتا ہے ''یعنی غدہ کا مصداق غدود اور حرام مغز دونوں کرقرار دیا جائے، اگرچہ غدود اور حرام مغز دونوں الگ الگ ہیں، اگر علامہ شامیؒ کی عبارت کا مطلب یہی ہے اور ایسا سمجھنا اور اس طرح ترجمہ کرنا درست ہے، تو تقویت فرمائیں ورنہ جو کچھ محقق بات ہو، مدلل اور با حوالہ تحریر فرما کر بندے کے خلجان کو دور کرنے کا سامان فراہم فرمائیں۔

المستفتی: فیاض احمد قاسمی، بھیونڈی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غدود کا ترجمہ حرام مغز سے کرنا درست نہیں ہے، اگر کسی نے شامی کی عبارت سے غدود کا ترجمہ حرام مغز سمجھا ہے، تو وہ نظر ثانی کرلیں کہ غدود کا ترجمہ حرام مغز نہیں ہے۔ سائل نے شامی کی جو عبارت سوال نامہ میں درج فرمائی ہے اس کے کسی لفظ کا ترجمہ مغز نہیں ہے۔

نیز فتاوی رشیدیہ میں بھی غدود کا ترجمہ حرام مغز سے نہیں کیا گیا ہے؛ بلکہ حرام مغز کو الگ سے ایک مستقل چیز قرار دیا ہے، جو ان الفاظ سے منقول ہے کہ حرام مغز جو پشت کے مہرے میں ہوتا ہے؛ لہٰذا فتاوی رشیدیہ کی عبارت میں غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس میں کل نو چیزوں کا ذکر ہے، شروع کی سات چیزوں کے بارے میں فرمایا کہ ''سات چیزیں حلال جانور کی کھانی منع ہیں، اس کے بعد مسلسل سات چیزوں کو گنایا۔

ذکر، فرج مادہ، مثانہ، غدود، حرام مغز جو پشت کے مہرے میں ہوتا ہے، خصیہ، پتہ، مرارہ جو کلیجی میں تلخ پانی کا ظرف ہے، اس کے بعد دم سائل کو قطعی حرام کہا ہے، پھر بعض روایات کے مطابق گردے کی کراہت تنزیہی بیان فرمائی ہے۔ (مستفاد: فتاوی رشیدیہ قدیم ۵۵۲، جدید زکریا ۵۳۴/۷)

ہاں البتہ فتاوی رحیمیہ میں فتاوی رشیدیہ کی عبارت نقل کرنے میں دو جگہ مسامحت ہوئی۔

(۱) غدود کے بعد اپنی طرف سے لفظ یعنی بڑھا کر حرام مغز سے غدود کی تشریح کی گئی، جو تشریح فتاوی رشیدیہ میں نہیں ہے۔

(۲) فتاوی رشیدیہ کی عبارت مگر بعض روایات میں گردے کی کراہت لکھتے ہیں اور کراہت تنزیہی پر حمل کرتے ہیں اس میں گردے کی جگہ فتاوی رحیمیہ میں کڑوے پتہ کی کراہت کے الفاظ ہیں، جس میں نقل میں بھی غلطی ہوئی اور تعبیر میں بھی غلطی ہوئی ''گردے'' کے بجائے ''کڑوے'' لکھ دیا اور ساتھ ساتھ لفظ ''پتہ'' کا اضافہ بھی کر دیا، یہ دونوں فتاوی رشیدیہ میں نہیں ہیں؛ لہٰذا فتاوی رحیمیہ کے اس فتوے پر اعتماد نہیں کیا سکتا ہے۔

اب کوئی یہ سوال کر سکتا ہے کہ شامی اور در مختار کی عبارت میں حرام مغز کا تو ذکر نہیں ہے، تو فتاوی رشیدیہ میں حرام مغز کا ذکر کہاں سے آیا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ فتاوی رشیدیہ میں حضرت گنگوہیؒ کا جو فتوی ہے، اس کا مدار شامی و در مختار کی عبارت پر نہیں ہے؛ بلکہ حضرت گنگوہیؒ کی جامع معلومات پر ہے، اور جن نو چیزوں کا ذکر حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا ہے، وہ ایک جگہ نہیں ہیں؛ بلکہ مختلف مقامات پر ہیں، جیسا کہ شامی کی مذکورہ عبارت میں گردے کی ممانعت کا ذکر کہیں بھی نہیں ہے، مگر حضرت گنگوہی نے بعض روایات کے حوالہ سے مکروہ تنزیہی لکھا ہے، اور گردے اور کلیجہ کی کراہت تنزیہی کی عبارت طحطاوی علی الدر کتاب الذبائح، کوئٹہ ۱۵۷/۴ میں موجود ہے ملاحظہ فرمائیے:

”والكبد والطحال دون الدم المسفوح؛ وهل الكراهة تحريمة، أوتنزيهة قولان“

اورحرام مغز کوعربی میں نخاع الصلب کہا جاتا ہے، غدونہیں کہا جاتا ،طحطاوی علی الدر مسائل شتی ۴/ ۳۶۰ / میں حلال جانور کے اشیاءمکروہہ کے ذیل میں بعض علماء کا قول ”وزید نخاع الصلب“ کے الفاظ سے نقل کیا گیا ہے، یہیں سے حضرت گنگوہیؒ نے حرام مغز کوممنوعہ اشیاء میں سے ذکر فرمایا ہے، صاحب فتاوی رحیمیہ کے لئے بہتر یہ تھا کہ حضرت گنگوہیؒ کے فتوے کونقل کرتے وقت اس کے ایک ایک جزء پرغور فرمالیتے اورمراجع کوبھی دیکھ لیتے۔

اب اس تفصیل کے بعدسائل کااشکال دور ہوگیا ہوگا؛ لیکن ساتھ میں اس بات کی بھی وضاحت کردینامناسب معلوم ہوتا ہے کہ حرام مغز کاحکم ایسا ہی ہے، جیسا کہ گردہ کلیجی اوجھڑی اوربٹ وغیرہ کا ہے کہ ان چیزوں پرفقہاء نے کراہت تنزیہی کاحکم لگایا ہے؛ لیکن یہ کراہت تنزیہی صرف طبعی کراہت ہے شرعی کراہت نہیں ہے؛ اس لئے حضرت نے کفایت المفتی ۸/ ۲۸۷، جدید مطول ۱۱/ ۱۷۱/۶ / میں حرام مغز کے بارے میں فرمایا ہے کہ ”حرام مغز نہ حرام ہے اور نہ ہی مکروہ ہے، بیچارہ یونہی بدنام ہوگیا ہے“ احقر بھی ان اشیاء کے بارے میں یہی لکھا کرتا ہے کہ یہ چیزیں نہ حرام ہیں اور نہ مکروہ ہیں؛ بلکہ حلال ہیں، اس موضوع کاتفصیلی فتوی ۱۸/ رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ میں بھی لکھا گیا تھا، جس کانمبر ۲۵/ ۱۴۱۵/ ہے اورایک فتوی ۲۵/ رجب المرجب ۱۴۰۸ھ میں بھی لکھا گیا تھا، جس کانمبر ۲۴/ ۸۲۵ ہے۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیراحمدقاسمی عفااللہ عنہ
۱/ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر:الف ۳۸/ ۹۵۶۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۲۹/۴/۵ھ

حلال جانوروں میں کیا کیا حرام ہیں؟

سوال [۱۰۸۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حلال جانوروں کے اندر سات چیزیں حرام ہیں، کیا یہی چیزیں حلال پرندوں اور مرغی کے اندر بھی حرام ہیں؟

المستفتی: محمد شاکر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: حلال جانوروں میں جو سات چیزیں حرام ہیں وہی حلال پرندوں میں بھی حرام ہیں خواہ مرغی ہو یا کوئی اور پرندہ۔

عن مجاهدؒ، قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم، يكره من الشاة سبعًا: الدم، والحياء، والأنثيين، والغدة، والذكر، والمثانة، والمرارة، وكان يستحب من الشاة مقدمها. (مصنف عبد الرزاق، باب ما يكره من الشاة، المجلس العلمي ٤/٥٣٥، رقم: ٨٧٧١، المعجم الأوسط، دارالفكر ٦/٤٨١، رقم: ٩٤٨٠، المراسيل لأبي داؤد ٩١، رقم: ٤٦٥)

وأما بيان ما يحرم أكله من أجزاء الحيوان سبعةٌ: الدم المسفوح، والذكر، والأنثيان، والقبل، والغدة، والمثانة، والمرارة. (هندية، كتاب الذبائح، الباب الثالث في المتفرقات، زكريا قديم ٥/٢٩٠، زكريا جديد٥/٣٣٥، بدائع الصنائع، زكريا ٤/١٩٠، كراچي٥/٦١، الموسوعة الفقهية الكويتية ٥/١٥٢)

وكره تحريمًا من الشاة سبع: ذكر الشاة اتفاقي؛ لأن الحكم لايختلف في غيرها من المأكولات. (شامي، كتاب الخنثىٰ،

زکریا ۱۰/۴۷۸، کراچي ٦/۷٤۹، مجمع الأنهر، دار الکتب العلمیة بیروت ٤/۹ ٤۸۹، مصري قدیم ۲/۷٤۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶؍۷۹۳۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۲/۱۹ھ

حلال جانوروں کے سات اعضاء کا حکم

سوال [۱۰۸۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حلال جانوروں کے کتنے اعضاء کا کھانا حلال نہیں ہے؟

المستفتی: محمد رضوان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حلال جانوروں کے سات اعضاء کا کھانا حلال نہیں ہے۔

(۱)دم سائل (۲)ذکر (۳)خصیتین (۴)فرج مادہ (۵)غدود (۶)مثانہ (۷)پتہ۔

(فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۷؍۲۹، میرٹھ ۲۶؍۲۱۷، آپ کے مسائل اور ان کا حل جدید زکریا ۵؍۵۱۰)

وأما بیان ما یحرم أکله من أجزاء الحیوان سبعةٌ: الدم المسفوح، والذکر، والأنثیان، والقبل، والغدة، والمثانة، والمرارة. (هندیة، اتحاد ٥/٣٣٥، زکریا قدیم ٥/٢٩٠، جدید ٥/٣٣٥)

عن مجاهدؒ، أن النبي صلی اللّٰه علیه وسلم کره من الشاة سبعًا: الدم المسفوح، والذکر، والأنثیین، والقبل، والغدة، والمثانة، والمرارة. (مراسیل أبوداؤد، ١٩، اعلاء السنن، کراچي ١٧/١٣٠، عباس احمد الباز، مکة المکرمه ١٧/١٤٤، مصنف عبد الرزاق ٤/٥٣٥، رقم: ٨٧٧١)

یاد رکھیں کہ مذکورہ اعضاء میں سے دم مسفوح حرام ہے،مثانہ،غدود، پتہ، بچہ دانی کا کھانا مکروہ تحریمی ہے، اور خصیتین کا کھانا مکروہ تنزیہی ہے اور ذکر کراہت تحریمی اور تنزیہی دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۲۸۲)

کرش وامعاء کی حلت وحرمت کا حکم ہے

سوال [۱۰۸۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کرش وامعاء کی حلت وحرمت کے بارے میں زید اور عمر کے درمیان اختلاف ہے، زید اپنے دلائل کی روشنی میں ان کی حلت کا مثبت ہے اور عمر اپنے استدلالات کے پیش نظر ان کی حرمت کا قائل ہے۔

زید کے دلائل حسب ذیل ہیں:

أخرج الطبراني في الأوسط عن عبد الله بن عمر رضي الله عنه ۱۰/ ۲۱۷، حديث: ۹٤۷٦)

والبيهقي عن ابن عباس رضي الله عنه**، كان رسول الله صلى الله عليه وسلم: يكره من الشاة سبعًا: المرارة، والمثانة، والحياء، والذكر، والأنثيين، والغدة، والدم، وكان أحب الشاة إليه مقدمها.** (السنن الكبرى ۱۰/ ۷)

وقال أيضًا عن مجاهد رضي الله عنه**، قال: كره رسول الله صلى الله عليه وسلم من الشاة سبعًا: الذكر، والأنثيين، والقبل، والغدة، والمرارة، والمثانة، والدم** - مذکورہ بالا دونوں روایتوں میں ماکول اللحم جانور کی سات چیزوں کی حرمت کا تذکرہ ہے، اس میں کہیں بھی حرمت کرش وامعاء مذکورہ نہیں، اگر واقعتاً حرمت کا حکم کرش

وامعاء سے متعلق ہوتا، تو انہیں سات چیزوں کے ساتھ اس کا ذکر ہوتا؛ حالانکہ ایسا نہیں ہے، اسی طرح کتب فقہ متداولہ میں اشیاء محرمہ کو سات ہی بیان کیا گیا ہے؛ چنانچہ عالمگیری، مصری جلد پنجم، کتاب الذبائح میں بدائع کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے۔

وأما بيان ما يحرم أكله من أجزاء الحيوان سبعةٌ: الدم المسفوح، والذكر، والأنثيان، والغدة، والمثانة، والمرارة، والقبل. (عالمگيري٥/ ٢٩٠)

اورشامی زکریا جلدنہم کتاب الذبائح ۴۵۱، پر بعینہ یہی عبارت موجود ہے۔

وفي الطحطاوي، قال أبوحنيفة: أما الدم فحرام بالنص وأكره الباقية، المرارة، والمثانة، والحياء، والذكر، والأنثيين، والغدة. (طحطاوي كوئٹه ٤/ ٣٦٠)

بہرحال مذکورہ بالا روایات اور فقہاء کی ان عبارات میں انہیں اشیاء کی حرمت صریح ہے، ان میں کہیں بھی حرمت کرش وامعاء موجود نہیں ہے اور یہ ان کی حلت کی طرف مشیر ہے۔

عمرو کہتا ہے کہ زید کی پیش کردہ روایات وعبارات فقہیہ کی صحت ونقل میں کوئی کلام نہیں ہے؛ لیکن انہیں سات چیزوں میں اشیاء محرمہ کا انحصار سمجھنا اور اس کو مدار استدلال قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ اشیاء مباحہ ومحرمہ کی جملہ تفصیل اس کی تمام جزئیات کے ساتھ قرآن وحدیث پاک میں موجود نہیں ہوتی، مثلاً شریعت نے ربو کی حرمت کو ''وحرم الربو'' سے بیان فرمایا، حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے حدیث پاک میں اس کی تشریح فرمائی؛ لیکن اس تشریح میں بھی اس کی تمام جزئیات کا انحصار نہیں فرمایا؛ بلکہ اس کی چند جزئیات کو ذکر فرما کر اس کی علت کی طرف اشارہ فرما دیا۔

اب اگر زید کے نزدیک احکام شرعیہ کے اثبات سے متعلق عبارت النص ہی سب کچھ ہے اشارۃ النص، دلالۃ النص کوئی چیز نہیں، تو پھر اس کو چاہئے کہ انہیں اشیاء ثمانیہ میں ربو کی حرمت کو تسلیم کرے، جو حدیث میں شمار کی گئی ہیں، اسی طرح حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے اشیاء محرمہ کی چند جزئیات کو مذکورہ بالا دونوں روایتوں میں بیان فرمایا اور قرآن کریم نے

’’ویحرم علیهم الخبائث‘‘ سے ان جزئیات محرمہ کی علت حرمت کو مخصوص فرمایا- معلول ہوا کہ حکم شرعی قرآن وحدیث میں اپنی جملہ جزئیات کی تفصیل کے ساتھ نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ وہ معلول بالعلۃ ہوتا ہے کہ جس کی وجہ سے اس کی جزئیات کا علم ہوجاتا ہے، خواہ وہ علت منصوصہ ہو یا علت مستنبطہ یا اور کوئی علت اور اس علت کا انکشاف ہمارے فقہاء کرام فرماتے ہیں: چنانچہ اشیاء مذکورہ محرمہ سبعہ کی حرمت معلول بعلۃ منصوصہ ہے اور وہ علت حرمت خباثت ہے، جیسا کہ اس حدیث کے ذیل میں (جس میں اشیاء محرمہ سبعہ کا بیان ہے)

علامہ شامی فرماتے ہیں:

قال أبو حنيفة: فالدم حرام وأكره الستة وذلك لقوله عزوجل: حرمت عليكم الميتة والدم الآية، فلما تناوله النص قطع بتحريمه وكره ماسواه؛ لأنها تستخبثه الأ نفس وتكرهه، وهذا معنى سبب الكراهة، لقوله تعالىٰ: ويحرم عليهم الخبائث. (زيلعي، شامي، زكريا ۱۰/ ٤٧٧)

معلوم ہوا کہ ان اشیاء ستہ کی کراہت کی علت خباثت یعنی گندگی اور گھناؤنی ہونا ہے۔ اب اگر اشیاء ستہ کی کراہت خباثت کی بناء پر ہے، تو پھر کرش وامعاء کی کراہت بدرجۂ اولیٰ ثابت ہوگی؛ کیونکہ اگر ان سے خباثت میں زائد نہیں تو کسی طرح کم بھی نہیں، مثلاً مثانہ اگر معدن بول ہے، تو کرش وامعاء مخزن فرث ہے، اب چاہے دلالۃ النص سمجھئے یا اجزائے علت منصوصہ! کرش وامعاء کی حلت کسی طرح ثابت نہیں۔

رہ گئی زید کی یہ بات کہ فقہ کی کتب متداولہ میں اشیاء سبعہ کی حرمت مصرح ہے، تو وہ محض باتباع نظم حدیث ہے، اس میں انحصار فی سبع بالکل مستفاد نہیں؛ چنانچہ علت منصوصہ مذکورہ کی بنیاد پر دیگر کتب فقہ میں زیادتی بھی منقول ہے، علامہ قاضی بدیع خوارزمی صاحب منیۃ الفقہاء اور علامہ شمس الدین محمد قہستانی شارح نقایہ اور علامہ سیدی احمد مصری محشی درمختار وغیرہم علماء نے دو چیزیں اور زیادہ ذکر فرمائیں، ایک ’’نخاع الصلب‘‘ یعنی حرام مغز

دوسرے گردن کے دونوں پٹھے، جوشانوں تک ممتد ہوتے ہیں، اسی طرح خون جگرخون طحال اوراس خون گوشت کی کراہت مزید منقول ہے، جودم مسفوح کے نکل جانے کے بعد گوشت میں رہ جاتاہے، ذبائح الطحطاوی میں یہ عبارت مذکورہ ہے۔

الذكر، والأنثيان، والمثانة، والعصبان اللذان في العنق، والمرارة تحل مع الكراهة، وكذ الدم الذي يخرج عن اللحم، والكبد، والطحال دون الدم المسفوح، وهل الكراهة تحريمة أوتنزيهة قولان الخ.

بہر کیف فقہاء کی ان زیادات سے زید کا فہم انحصار باطل اور فقہاء کی بیان کردہ کراہت کی علت منصوصہ یعنی خبائث حرمت کرش وامعاء کے لئے مثبت کامل یہ ہے کرش وامعاء کی حلت وحرمت کے بارے میں زید وعمر کا اختلاف محترم مفتی صاحب سے گذارش ہے کہ ان دونوں کے خیالات پر نظر انصاف سے غورفرمائیں، اب اگر زید کا قول اقرب الی الصواب ہے، تو عمر کے اصولی استدلال کا وہ اصولی جواب مرحمت فرمائیں کہ جس سے اس کے استدلال کا ایک ایک تار عنکبوت بن کر بکھر جائے۔ **بينوا بيانـاً شافيا توجروا أجرا وافياً.**

المستفتی: عبدالحلیم قاسمی، مدرسہ فضل رحمانیہ نگ پور، ضلع: فیض آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: علامہ طحطاوی وغیرہ نے جن اجزاء پر کراہت کا حکم لگایاہے، وہ چار قسموں پر ہیں:

(۱) وہ اجزاء جن کو قرآن کریم میں صاف طور پر حرام کہا گیاہے، جیسا کہ دم مسفوح۔

(۲) وہ اجزاء جن کی کراہت حدیث شاۃ میں مذکور ہے، جیسا کہ دم مسفوح کے علاوہ باقی چھ اجزاء۔

(۳) وہ اجزاء جن کی حلت وکراہت کے سلسلہ میں نص میں کوئی صراحت موجود نہیں ہے، جیسا کہ کرش وامعاء، نخاع الصلب اور گردن کے دونوں پٹھے اوردم مسفوح وغیرہ۔

(۴) وہ اجزاء جن کی حلت حدیث شریف سے ثابت ہے۔

عن ابن عمر قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أحلت لنا ميتتان، ودمان، الميتتان الحوت، والجراد، والدمان الكبد، والطحال.

(سنن ابن ماجه، باب الكبد والطحال، النسخة الهندية ۲۳۸/۲، دارالسلام رقم: ۳۳۱۴، مسند أحمد بن حنبل ۹۸/۲، رقم:۵۷۲۳، سنن الدار قطني كتاب الأشربة وغيرها، دارالكتب العلمية بيروت ۱۸۴/۴، رقم:٤٦٨٧، مشكاة المصابيح ۳۶۱/۲)

قیاس کے لئے شرط یہ ہے کہ جن چیزوں پر قیاس کے ذریعہ سے حکم لگایا جارہا ہے، اس کا حکم نص میں موجود نہ ہو، کبد اور طحال وغیرہ کے حلال ہونے کا حکم نص میں مذکور ہے، پھر قیاس کے ذریعہ سے اس پر کراہت یا عدم کراہت کا حکم لگانا نص کو باطل کرنا ہے، جس کی اجازت اصولاً نہیں ہے، اور اصول میں مذکور ہے کہ تعلیل فی مقابلۃ النص باطل وناجائز ہے، اور قرآن وحدیث میں جن حیوانات کے کھانے کا جواز ثابت ہے، ان کو بجمیع اجزاء کھانا درست ہے، سوائے ان اجزاء کے کہ جن کو قرآن وحدیث میں مشخص طور پر مستثنیٰ کردیا گیا ہے، اور کرش وامعاء وغیرہ مستثنیات میں سے نہیں ہیں۔

اور علامہ طحطاوی وغیرہ نے مذکورہ چاروں قسم کے اجزاء پر کراہت کا حکم لگایا ہے، جیسا کہ سوالنامہ کے اندر عمرو نے سب پر حرمت کا حکم لگایا ہے؛ حالانکہ بعض کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے، بعض کی کراہت نص حدیث سے ثابت ہے، بعض کی حلت نص حدیث سے ثابت ہے اور بعض کی حلت وکراہت نص میں مذکور نہیں ہے؛ اس لئے سب پر علی الاطلاق کراہت کا حکم لگانا ہرگز درست نہیں ہوگا، ہاں اس حدتک درست ہوسکتا ہے کہ دم مسفوح کے علاوہ حدیث شاۃ میں جن اشیاء پر کراہت کا حکم لگایا ہے، ان میں شرعی کراہت مراد ہے اور وہ اشیاء جن کے بارے میں نص حدیث حلت کی ناطق ہے، ان میں اور اشیاء مسکوت عنہا میں شرعی کراہت مراد نہ ہو؛ بلکہ ان میں طبعی تنفر کی وجہ سے کراہت طبعیہ مراد ہو، جو شرعی حلت کے

منافی نہیں ہے، اور فقہاء کی تصریحات کا واضح مطلب بھی یہی ہے۔

اب اس اصل سوال کا جواب یوں ہوگا کہ زید کا کرش وامعاء کو حلال کہنا اس اعتبار سے ہے کہ اگر کرش و امعاء کو جوار خبث حاصل ہے، تو کبد وطحال کو خون و گھناؤنیت کی عینیت حاصل ہے؛ کیونکہ وہ خون بستہ ہیں اور بحکم حدیث کبد وطحال حلال ہیں، تو کرش وامعاء بھی بلاتردد حلال ہوں گے، اور اگر شرعی علت کے ساتھ طبعی تنفر کیوجہ سے کراہت طبعیہ کا حکم لگایا جائے ،تو جس قدر کراہت طبعیہ کا حکم کبد وطحال پر لگایا جاسکتا ہے، اسی قدر کرش وامعاء ونخاع الصلب وغیرہ پر بھی لگایا جائے ، تو کوئی اشکال نہیں اور اس طرح کراہت طبعیہ حلت شرعیہ کی منافی نہیں ہوگی خلاصہ یہ نکلا کہ حدیث شاۃ میں ذکر کردہ اشیاء میں شرعی کراہت مراد ہے، اسی طرف بعض محققین کی تصریحات مشیر ہیں۔

الحديث نص في كراهة هذه الأشياء السبع وهو مذهب الحنفية، فإن قلت: لا يجوز أن تكون الكراهة طبعية لا شرعية، قلنا لو كان كذلك لكانت الأمعاء أولي بالكراهة، فدل ذلك على أنها ليست بطبعية؛ بل شرعية. (اعلاء السنن، كراچي ١٧/ ١٣٠، دار الكتب العلمية بيروت١٧/ ١٤٤)

اسی وجہ سے حضرت تھانوی قدس سرہ نے امداد الفتاوی ۴/ ۱۰۴ میں اور حضرت گنگوہی قدس سرہ نے فتاوی رشیدیہ ص: ۵۵۱ میں اوجھڑی کو حلال لکھا ہے۔

اب رہا عمرو کے اصولی استدلال کا اصولی جواب تو اس کا مدار اس بات پر ہے کہ اولاً عمرو دلائل نقلیہ کے ذریعہ سے مقیس علیہ کی حرمت ثابت کردے اور اگر حرمت سے کراہت کی طرف رجوع کرتا ہے، تو حلت کے ساتھ ساتھ کراہت بھی ثابت کی جاچکی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/ ۱۴۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/ ۹/ ۱۴۰۹ھ

حلال جانور کی کھال گوشت کے ساتھ استعمال کرنا

سوال [۱۰۸۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مشرقی بعض علاقوں میں حلال جانوروں کی کھال بھی گوشت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، کیا اس طرح کھال کو کھانا جائز ہے؟

المستفتی: ابوالخیر۲۴؍ پرگنوی، متعلم مدرسہ شاہی مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: حلال جانوروں کی کھال پاک اور حلال ہے؛ لہٰذا اگر کوئی کھانا گوارہ کرتا ہے، تو جائز ہے۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ۳۳۳/۴، جدید ڈابھیل ۲۹۲/۱۷)

ما يحرم أكله من أجزاء الحيوان المأكول سبعةٌ: الدم المسفوح، والذكر، والأنثيان، والقبل، والغدة، والمثانة، والمرارة. (شامي، قبيل، كتاب الأضحية، كراچي ٣١١/٦، زكريا ٤٥١/٩، هندية، زكريا قديم ٢٩٠/٥، جديده ٣٣٥/٥، بدائع الصنائع، زكريا ١٩٠/٤، كراچي ٦١/٥، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤٨٩/٤، مصري قديم ٧٤٣/٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰۷۸/۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۶/۱۸ھ

مردار جانور کی ہڈی اور کھال فروخت کرنا

سوال [۱۰۸۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مردار کی ہڈی اور مردار کی کھال فروخت کرنا جائز ہے یا ناجائز، جیسے ہمارے یہاں ایک بھینس تھی وہ مرگئی، اس کی کھال کو ہم نے بیچ لیا یہ پیسہ خرچ کرنا ہمارے لئے جائز ہے یا ناجائز ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مردار کی ہڈی جس میں سے آلائش کوصاف کرلیا گیا ہو، اسی طرح مردار کے سینگ پاک ہوتے ہیں؛ اس لئے کہ ہڈی اور سینگ میں زندگی نہیں ہوتی ہے، ؛ اس لئے مردار کی ہڈی اور سینگ کا فروخت کرنا درست ہے، ہاں البتہ مردار کی کھال کا مسئلہ بالکل الگ ہے، اگر مردار کی کھال کو دباغت دے کر صاف کرلیا ہو،تو وہ پاک ہوجاتی ہے،اوراس کا فروخت کرنا صحیح ہے اور دباغت سے پہلے پہلے مردار کی کھال بیچنا جائز نہیں ۔

ولابأس ببيع عظام الميتة، وعصبها، وصوفها، وشعرها، وقرنها، ودبرها والانتفاع بذلك كله. (هداية، باب البيع الفاسد اشرفی ديوبند ٣/ ٥٥، البناية اشرفية ديوبند ٨/ ٤٢٧، الجامع الصغير و شرحه النافع الكبير، دارالكتب العلمية بيروت ١/ ٣٢٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍صفر المظفر ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷؍ ۸۶۹۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۲/۴ھ

حرام جانوروں کے اجزاء سے مرغی کی غذا تیار کرنا

سوال [۱۰۸۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جانوروں کے کھانے کے لئے مخصوص غذا تیار کی جاتی ہے، جس میں گوشت کے مختلف اجزاء پسی ہوئی ہڈی، چربی اورخون شامل ہوتا ہے، کیا ایسی غذا جانوروں کوکھلانا اورانہیں تیار کر کے ان کی تجارت کرنا شرعاً جائز ہے؟ بعض لوگوں کوخون شامل کرنے کی وجہ سے شک ہے؟

المستفتی: نیاز احمد فاروقی، حلال ٹرسٹ جمعیۃ علماء ہند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر ذبح شدہ حلال جانور کے گوشت کے اجزاء ہیں اور حلال مذبوحہ کی چربی ہے، اسی طرح اس کی ہڈی ہے، تو ان تمام چیزوں کے جائز اور پاک ہونے میں کسی کو شک وشبہ نہیں ہے اور ان کے ذریعہ سے جانوروں کو کھلانے کے لئے جو غذا تیار کی جاتی ہے، ان غذاؤں کے استعمال اور ان کی تجارت بھی بلا شبہ جائز اور حلال ہے اور اگر حرام جانوروں کے اجزاء ہیں یا غیر مذبوح جانوروں کے گوشت کے اجزاء مثلاً مردار وغیرہ کے گوشت چربی وغیرہ ہیں، تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر بعینہ اجزاء اپنی اصلی حالت پر باقی ہیں، تو انہیں جانوروں کے غذا کے طور پر استعمال کرنا جائز نہ ہوگا اور نہ ہی ان کی تجارت جائز ہوگی اور اگر ان اجزاء کو تبدیل ماہیت کے ذریعہ ان کی حقیقت بدل دی جائے، جس سے ان اشیاء کا رنگ، بو، مزہ اور نمایاں اثرات ختم ہوکر دوسری چیز بن جائے، تو اس کو جانوروں کی غذا کے طور پر استعمال کرنا وغیرہ سب کچھ جائز ہوجاتا ہے، جیسا کہ فقہاء نے مردار کی چربی اور مردار کے ناپاک تیل سے بنائے گئے صابن کو تبدیل ماہیت کی وجہ سے پاک اور جائز قرار دیا ہے، اور اس کا استعمال اور اس کی تجارت سب کچھ جائز ہے، اسی طرح مذکورہ تمام اشیاء بھی تبدیل ماہیت کی وجہ سے پاک ہوجائیں گی اور جانوروں کے غذا کے طور پر استعمال کرنا اور ان کی تجارت بھی بلاشبہ جائز ہوجائے گی۔

سوال نامہ میں خون کے شامل ہونے کی وجہ سے شک وشبہ کا اظہار کیا گیا ہے، اس کے بارے میں تفصیل یہ ہے کہ دم مسفوح یعنی بہتا ہوا خون چاہے، حلال جانور کا ہو یا حرام جانور کا جوشہ رگ سے بہتا ہوا نکلتا ہے، وہ ناپاک اور حرام ہے؛ لہٰذا اس کو بعینہ اصلی حالت میں رہتے ہوئے مذکورہ غذاؤں میں شامل کیا جائے، تو وہ غذا ناپاک ہوگی، اگر اسی حالت میں حلال جانوروں کو کھلایا جائے، تو جانور جلالہ کے حکم میں ہوگا اور اگر تبدیل ماہیت کے ذریعہ خون کی اصلی حالت ختم ہوجائے، مثلاً اس کی سیلانیت اور تراوٹ ختم ہوجائے اور اس کا رنگ وبو،

اوراس کامزہ بھی ختم ہوجائے،اس کی اصلی حالت باقی نہ رہے؛ بلکہ کوئی دوسری چیز بن جائے، تو تبدیل ماہیت کی وجہ سے وہ پاک ہوجائے گا اور جانوروں کےغذاء کےطور پر استعمال کرنا اوراس کی تجارت کرنا سب کچھ جائز ہوجائے گا۔(مستفاد:منتخبات نظام الفتاوی۲/۵۲۶)

عبارة المجتبیٰ: جعل الدهن النجس في صابون یفتیٰ بطهارته؛ لأنه تغیر، والتغیر یطهر عند محمدؒ، ویفتی به للبلویٰ، وظاهره أن دهن المیتة کذلک لتعبیره بالنجس دون المتنجس، إلا أن یقال: هو خاص بالنجس؛ لأن العادة في الصابون وضع الزیت دون بقیة الأدهان، ثم رأیت في شرح المنیة ما یؤید الأول حیث قال: وعلیه یتفرع مالو وقع إنسان، أو کلب في قدر الصابون، فصار صابونا یکونا طاهرًا؛ لتبدل الحقیقة، ثم إعلم أن العلة عند محمدؒ هي التغیر وانقلاب الحقیقة، وأنه یفتی به للبلوی کما علم مما مر، ومقتضاه عدم اختصاص ذلک الحکم بالصابون، فیدخل فیه کل ما کان فیه تغیر وانقلاب حقیقة، وکان فیه بلوی عامة. (شامي، کتاب الطهارة، باب الأنجاس، کراچي ۱/۳۱٦، زکریا ۱/۵۱۹، حاشیة تاتارخانیة، زکریا۱ /۴۳۷، غنیة المستملي، اشرفیة دیوبند ۱۸۹، کذا في البحر، کوئٹه ۱/۲۲۸، زکریا ۱/۳۹۵، هندیة، زکریا قدیم ۱/۴۵، جدید ۱/۱۰۰)

علامہ شامیؒ نے دوسری جگہ محیط کے حوالہ سے حضرت امام محمدؒ کے ساتھ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا قول بھی یہی نقل فرمایا ہے۔ملاحظہ فرمایئے:

فصار حمأة لانقلاب العین (وفي الشامیة) لانقلاب العین علة للکل، وهذا قول محمدؒ، وذکر معه في الذخیرة والمحیط أبا حنفیةؒ قال في الفتح: وکثیر من المشایخ اختاروه وهو المختار؛ لأن الشرع رتب وصف النجاسة علی تلک الحقیقة وتنتفی الحقیقة بانتفاء بعض أجزاء مفهومها فکیف بالکل؟ فإن الملح غیر العظم واللحم، فإذا صار ملحا

ترتب حکم الملح. (شامي، باب الأنجاس، مطلب في العفو عن طين الشارع، زكريا ١/٥٣٤، كراچي ١/٣٢٧)

محیط برہانی اورتاتارخانیہ میں الفاظ کے کچھ فرق کے ساتھ اس طرح نقل فرمایا ہے ملاحظہ فرمایئے:

وقد وقع عند بعض الناس أن الصابون نجس؛ لأنه يتخذ من دهن الكتان، ودهن الكتان نجس؛ لأن أوعيته تكون مفتوحة الرأس عادةً والفأرة تقصد شربها، وتقع فيها غالباً، ولكنا لا نفتي بنجاسة الصابون؛ لأن الأصل إنما هو الطهارة،والنجاسة بعارض أمر نادر، ومع أنالو نفتي بنجاسة الدهن لانفتي بنجاسة الصابون؛ لأن الدهن قد تغير وصار شيئًاآخر، وقد ذكرنا أن من مذهب محمدؒ: أن النجس يصير طاهراً بالتغير؛ فيفتى فيه بقول محمدؒ: لمكان عموم البلوى. (المحيط البرهاني، المجس العلمى ١/٣٦٩، رقم المسألة٧٤٦، تاتارخانية، زكريا ١/٤٣٧، رقم: ١١٠١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ذی قعدہ ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/۱۱۷۰۰)

مذبوحہ جانوروں کے خون سے کھادا ور مچھلیوں کی غذا بنانا

سوال [۱۰۸۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ احقر اپنا ایک نجی مذبح خانہ چلاتا ہے،اس میں وہ جانور جن کا گوشت شریعت محمدی میں کھانے کی اجازت ہے، ان جانوروں کو اللہ رب العزت کے نام مبارک سے ذبح کیا جاتا ہے، ذبیحہ جانور کے نکلے ہوئے خون کو محفوظ کر کے جدید ترین مشنریز کے ذریعہ سے خشک کر کے اور پھر کسی ٹیکنالوجی سے اس کو کھادا ور غذا بنا دیا جاتا ہے، جس کو پھل پھول اناج

اور مچھلیوں کی پیداوار میں اضافہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، ایسی حالت میں کاروبار کر کے منافع کمانا یا نفع ونقصان کرنا ناجائز یا حرام ہے، یا پھر جائز ہے، اور اگر ناجائز اور حرام ہے، تو پھر اس خون کے کاروبار سے کمائی ہوئی دولت کو کہاں خرچ کیا جائے، یہاں پر یہ بات بھی بتادینا ضروری ہے، مذکورہ بالا مذبح خانہ بنانے کی اجازت ومنظوری انہیں بنیادی شرائط پر سرکار نے دی ہے، اگر سرکاری شرائط کا لحاظ نہیں رکھا گیا، تو سرکار کی جانب سے لائیسنس منسوخ کئے جانے کا خطرہ ہے، جس کی وجہ سے احقر کو کافی نقصان اٹھانا پڑے گا۔ قرآن حکیم اور احادیث نبویہ کی روشنی میں جلدی جواب عنایت فرمائیں عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: احتشام الحق، ساکن محلہ اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دم مسفوح کو محفوظ کر کے جدید مشینری کے ذریعہ سے دیگر اشیاء کے اختلاط کے ساتھ خون کی ماہیت تبدیل کر لی جائے، اور وہ دوسری چیز بن جائے، مثلاً کھاد اور مرغ مچھلی کا چارہ یا دیگر اشیاء کی شکل بن جائے، تو دم مسفوح پاک ہوجاتا ہے؛ کیونکہ انقلاب ماہیت کی وجہ سے ناپاک چیزیں پاک ہوجاتی ہیں، جیسا کہ شراب نجس اور حرام ہوتی ہے، مگر اسی شراب کو سرکہ بنالیا جائے، تو وہ پاک اور حلال ہوجاتا ہے، اسی طریقہ سے ناپاک تیل اور مردار کی چربی سے صابون بنالیا جائے، تو انقلاب ماہیت کی وجہ سے وہ پاک ہوجاتا ہے؛ لہٰذا سوال نامہ میں درج کردہ صورت میں جدید مشینری کے ذریعہ سے خون کی ماہیت تبدیل کر کے دوسری اشیاء بنادی جائیں، تو اس سے خون کا حکم ختم ہوجاتا ہے اور وہ چیزیں استعمال کرنا اور ان کی تجارت کرنا اور اس تجارت کا پیسہ سب حلال وجائز ہے اور اس بارے میں کتب فقہ میں جزئیات کا بڑا ذخیرہ موجود ہے، چند جزئیات حسب ذیل ہیں۔

وعندهما يصير خمرًا بظهور دليل الخمرية ويصير خلا بظهور

دليل الخلية فيه،هذا إذا تخللت بنفسها، فأما إذا خللها صاحبها بعلاج من خل، أو ملح أو غيرهما فالتخليل جائز والخل حلال عندنا......لنا ماروى عن النبي عليه الصلوة والسلام أنه قال: أيما إهاب دبغ فقد طهر كالخمر إذا تخلل فيحل. (بدائع الصنائع، كتاب الأشربة، زكريا ٤/٢٧٩، كراچي ٥/١١٣-١١٤)

يطهر زيت تنجس بجعله صابونا به يفتى للبلوى (تحته في الشامية) ثم هذه المسئلة قد فرعوها على قول محمد بالطهارة بانقلاب العين الذي عليه الفتوىٰ واختاره أكثر المشايخ......وعبارة المجتبىٰ: جعل الدهن النجس في صابون يفتى بطهارته؛ لأنه تغير والتغير يطهر عند محمد ويفتى به للبلوى......ثم اعلم أن العلة عند محمدؒ هي التغير وانقلاب الحقيقة، وأنه يفتى به للبلوىٰ كما علم ممامرو مقتضاه عدم اختصاص ذلک الحكم بالصابون، فيدخل فيه كل ماكان فيه تغير وانقلاب حقيقة وكان فيه بلوىٰ عامة. (شامي، كتاب الطهارة، باب الأنجاس، زكريا ١/٥١٩، كراچي ١/٣١٥، الموسوعة الفقهية الكويتية٢٦/٣٠١، ٢٩/١٠٨)

وخل الخمر حلال ولو خللت (بعلاج) بالقاء ملح أوخل عندنا لقوله عليه السلام خير خلكم خل خمركم. (مجمع الأنهر، كتاب الأشربة، دار الكتب العلمية بيروت ٤/٢٥١، مصري قديم ٢/٥٧٣)

والأعيان النجسة تطهر بالاستحالة عندنا وذلک مثل الميتة إذا وقعت في المملحة، فاستحالت حتى صارت ملحاً والعذرة إذا صارت تراباً، أو حرقت بالنار وصارت رماداً، فهي نظير الخمر إذا تخللت، أوجلد الميتة إذا دبغت، فإنه يحكم بطهارتها للاستحالة وذكر في الفتاوى

أن رأس الشاة لو أحرق حتى زال الدم يحكم بطهارته وكذا البلة النجسة في التنور تزول بالإحراق. (تبيين الحقائق، كتاب الطهارة، باب الأنجاس، امدادية ملتان ١/٧٦، زكريا ١/٢٠٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۰۲۱/۴۰)

خنزیر کے بالوں سے تیار شدہ برش کا استعمال

سوال [۱۰۸۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں ایک موٹر مکینک ہوں اور گاڑی وغیرہ کی صفائی کے لئے برش کی ضرورت پڑتی ہے، اور عام طور پر برش خنزیر کے بالوں کا ہوا کرتا ہے؛ لیکن ہمیں پتہ نہیں چلتا کہ یہ خنزیر کے بالوں کے ہیں یا عام جانوروں کے بال کے۔ اور ہم دوکاندار سے کہتے ہیں کہ خنزیر کے علاوہ کے بالوں کا برش دینا؛ لیکن وہ دھوکہ دے کر بعض مرتبہ خنزیر کے بالوں کا برش دیتا ہے اور مجھے پتہ نہیں چلتا، تو اب میرے لئے اس برش کا استعمال کرنا کیسا ہے؟

(۲) پھر اس برش کو ہم استعمال کر لیتے ہیں اور بعض اوقات ہاتھ دھوئے بغیر کوئی چیز کھاپی لیتے ہیں، تو اس طریقہ سے میرا کھانا پینا جائز ہے یا ناجائز وضاحت فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) خنزیر کا بال نجس العین ہے، اس سے تیار شدہ برش بھی ناپاک ہے؛ اس لئے اس کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے اور یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ جو لوگ برش کا استعمال کرتے ہیں، ان کو پہچان نہ ہو، اگر دھوکہ دے کر خنزیر کے بال والا برش دیدیا ہے، تو ضرور پہچانا جاسکتا ہے۔

نیز ہمارے ہندوستان میں خنزیر کے بالوں کے علاوہ کسی اور جانوروں کے بالوں سے برش بنانے کا دستور نہیں ہے، اگر کہیں خال خال ہے بھی تو وہ بالکل کالعدم ہے؛ اس لئے دوکاندار سے صاف کہد یا جائے کہ خنزیر کے بالوں کا برش نہ ہو؛ بلکہ نائیلون کا برش چاہئے اور نائیلون کے تاروں کا ایسا برش آرہا ہے جس کی وجہ سے جانوروں کے بال کے برش استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۲) کسی مسلمان کے لئے یہ نہایت خطرناک بات ہے کہ خنزیر جیسے نجس العین جانور کے بال اپنے ہاتھ سے استعمال کرے، پھر بغیر دھوئے کوئی چیز کھائے۔ نیز ایک مسلمان کی غیرت ایمانی کے خلاف ہے کہ خنزیر کے بال پر ہاتھ لگائے۔

قال ابن عابدینؒ، قوله على المذهب أي على قول أبي يوسفؒ الذي هو ظاهر الرواية أن شعره نجس وصححه في البدائع ورجحه في الاختيار إلى قوله قال العلامة المقدسي. وفي زماننا استغنوا عنه أي فلا يجوز استعماله؛ لزوال الضرورة الباعثة للحكم بالطهارة. (شامي، كتاب الطهارة، باب المياه، زكريا ۱/ ۳۵۹- ۳۶۰، كراچي ۱/ ۲۰۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۶۰۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/ ۴/ ۱۴۲۳ھ

خنزیر کی رقم سے اپنی ضروریات پوری کرنا

سوال [۱۰۸۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں، جو کھیتی کی حفاظت اور شکار کے لئے جانے میں خنزیر یعنی سور کو پکڑ لیتے ہیں اور پھر اس کو بیچ کر کے اس کی رقم اپنے کھانے پینے میں اور دیگر ضروریات میں صرف کرتے ہیں۔ کیا جبکہ سور کا کھانا کسی بھی مسلمان کے لئے ناجائز

اورحرام ہے، تو کیا اس کو فروخت کر کے اس کی رقم اپنی ضروریات میں خرچ کر سکتے ہیں یانہیں؟ مسئلہ دلیل کے ساتھ قلم بندفرمائیں۔

المستفتی: محمد ہاشم قاسمی، جیرولی کھم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خنزیراوراس کی قیمت دونوں مسلمانوں کے لئے حرام اورناجائز ہے، نہ اس کوفروخت کرنا جائز ہے، اورنہ ہی اس کی قیمت ضروریات میں خرچ کرنا جائز ہے۔

وأما بيع الخمر، والخنزير إن كان قوبل بالدين كالدراهم والدنانير، فالبيع باطل لا يفيد ملك الخمر ولا مايقابلها. (الموسوعة الفقهية الكويتية اشرفي ديوبند ٣٨/٣٤٤، هداية اشرفي ديوبند ٣/٤٩) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمدقاسمی عفااللہ عنہ
۲۶ ربیع الاول ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/۴۳۹۵)

(۱۲) باب ما یحل قتله وما لا یحل

کن جانوروں کو مارنے کی اجازت ہے؟

سوال [۱۰۸۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جن موذی جانوروں کو مارنا مستحب ہے؟ وہ کون کون سے ہیں؟

(۲) جنگلی جانور جن سے جانی خطرہ ہے ان کے مارنے کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: اقبال شمشی ہاؤس، طویلہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱/۲) جن موذی جانوروں کا مارنا ثواب ہے، ان میں سے سانپ، بچھو، گرگٹ، چھپکلی۔ نیز زمین پر رہنے والی مکڑی وغیرہ ہیں، جو رات کے وقت نکلتی ہے اور موذی ہوتی ہے؛ لیکن جو مکڑی عام طور پر گھروں میں پائی جاتی ہے بلاضروت اور بغیر پریشانی وضرر کے اس کو نہیں مارنا چاہئے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۸/۱۸۵، فتاوی محمودیہ جدید ڈابھیل ۸/۶ ۲۷، ۲۷۸، ۲۸۰، قدیم ۱۲/ ۶ ۳۷، ۵/ ۳۴، ۱۷/۱/ ۳۸۹)

عن أبي هريرةؓ، قال: أمر رسول الله صلى الله عليه وسلم أن نقتل الأسودين في الصلوة العقرب والحية. (مسند أحمد ٦/١٥٧، رقم: ٧٨٠٤، سنن الترمذي، أبواب الصلوة، باب ماجاء في قتل الاسودين في الصلاة، النسخة الهندية ١/٨٩، دارالسلام، رقم: ٣٩٠٤، مسند دارمي، دار المغني بيروت ٣/٩٤٥، رقم: ١٥٤٥)

عن عائشةؓ أنها قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اقتلوا الحيات كلهن. (مسند أحمد ٦/١٥٧، رقم: ٢٥٧٥٥، سنن الترمذي، أبواب الصيد، باب في قتل الحيات، النسخة الهندية ١/٢٧٣، دارالسلام رقم: ١٤٨٣)

عن أم شريكؓ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أمر بقتل الوزغ. (بخاري شريف، كتاب الأنبياء، باب قول الله عزوجل واتخذ الله إبراهيم خليلاً، ١/ ٤٧٤، رقم: ٣٢٤٨، ف: ٣٣٥٩، في كتاب بدء الخلق، باب خير مال المسلم غنم ١/ ٤٦٦، رقم: ٣١٩٩، ف: ٣٣٠١)

من قتل وزغا في أول ضربة كتبت له مأة حسنة وفي الثانية دون ذلك وفي الثالثة دون ذلك. (مسلم شريف، كتاب قتل الحيات، باب استحباب قتل الوزغ، النسخة الهندية ٢/ ٢٣٦، بيت الأفكار رقم: ٢٢٤٠، سنن الترمذي، أبواب الصيد، باب في قتل الوزع، النسخة الهندية ٢/ ٢٧٣، دارالسلام رقم: ١٤٨٢، سنن ابن ماجه أبواب الصيد، باب قتل الوزغ،النسخة الهندية٢/ ٢٣٢، دار السلام رقم: ٣٢٢٨)

النوع الآخر يحضر بيته في الأرض، ويخرج في الليل كسائر الهوام وهي على ما ذكره غير واحد من ذوات السموم، فليسن قتلها لذلک. (روح المعاني، سورة العنكبوت، تحت تفسير الآية: ٤١، جزء ٢٠، مكتبه، زكريا ديوبند ١١/ ٢٤١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۷۲۱۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۵/۱۰ھ

ٹوکری میں بند کرنے کی وجہ سے بلی مرگئی

سوال [۱۰۸۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج سے تقریباً بیس سال قبل بندہ ایک بلی کو ٹوکری میں بند کر کے دفتر چلا گیا تھا، پھر جب شام میں واپسی ہوئی اور ٹوکری کو کھول کر دیکھا تو بلی کو مردہ پایا، اس واقعہ کے بعد سے بندہ اپنے اس فعل قبیح پر کافی نادم وپشیمان ہے؛ لہٰذا اگر اس کی تلافی کی کوئی صورت ہو تو عرض فرما دیں؟

المستفتی: سرتاج حسین، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بلا وجہ کسی بھی جاندار کو اذیت پہونچانا گناہ ہے؛ لہٰذا آپ کے فعل کی وجہ سے جو بلی مرگئی ہے، وہ قابل مذمت اور سخت گناہ کی بات ہے، حدیث شریف میں آیا ہے، کہ ایک عورت نے بلی کو باندھ رکھا تھا، نہ اس کو کھانا دیتی تھی اور نہ اس کو چھوڑتی تھی کہ وہ اپنے طور پر کوئی چیز کھا کر پیٹ بھر لیتی اور اسی بندھے ہوئے ہونے کی حالت میں بلی مرگئی، اسی وجہ سے اس کا نام جہنمیوں کی فہرست میں آگیا؛ اس لئے احتیاط کی ضرورت ہے، اب اس کی تلافی کی صورت یہی ہے کہ آپ سچے دل سے پکی سچی توبہ کرلیں اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے؛ البتہ اگر آپ نے بلی کو اس لئے بند کر رکھا تھا کہ آپ کے پیچھے بلی گھر کی چیزوں کو نقصان پہونچاتی تھی، ٹوکری میں بند کر کے اس کی جان مارنا مقصد نہیں تھا، اور اس کی ضرورت کا کھانا بھی آپ نے دیدیا تھا، تو ایسی صورت میں گناہ سے بچنے کی امید ہے؛ لیکن پھر بھی اللہ سے نادم ہو کر توبہ کر لینی چاہئے۔

عن نافع عن عبد اللّٰہ ؓ ان رسول اللّٰہ صلی علیه وسلم قال: عذبت امرأة في هرة حبستها حتى ماتت جوعا، فدخلت فيها النار قال: فقال واللّٰه أعلم لا أنت أطعمتها ولاسقيتها حين حبستيها ولاأنت أرسلتها، فأكلت من خشاش الأرض. (بخاري شريف، كتاب المساقاة، باب فصل سقي الماء ١/٣١٨، رقم: ٢٣٠٤ ف٢٣٦٥)

عن عبيدة بن عبد اللّٰه عن أبيه ؓ، قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: التائب من الذنب كمن لا ذنب له. (ابن ماجه شريف، أبواب الزهد، باب ذكر التوبة، النسخة الهندية ٢/٣١٣، دارالسلام رقم: ٤٢٥٠، مشكوة شريف ٢٠٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹؍ ۱۰۴۱۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۵/۲۹ھ

بلا قصد جھاڑو سے چیونٹیاں مرجائیں تو کیا حکم ہے؟

سوال [۱۰۸۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بندہ مدرسہ چلہ امروہہ میں ملازم ہے، جھاڑو دینے کا کام بھی بندہ کے ذمہ ہے۔

دریافت طلب بات یہ ہے کہ جھاڑو دینے میں بہت سی چیونٹیاں جھاڑو کی زد میں آجاتی ہیں، جس سے بہت سی مر بھی جاتی ہیں، اگر آہستہ آہستہ جھاڑو لگاتا ہوں، تو بہت تاخیر ہوتی ہے، بندہ پر ان چونٹیوں کے مرنے میں کوئی گرفت تو نہیں ہے یا پھر کیا شکل اختیار کرنی چاہئے۔

المستفتی: نسیم احمد، چلہ امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جھاڑو دیتے وقت اگر آپ کی نیت چونٹیوں کو مارنا نہیں ہے؛ بلکہ صرف مسجد کی صفائی ہے اور بلا اختیار ایک آدھ چیونٹی مرجائے، تو انشاء اللہ تعالیٰ مواخذہ نہ ہوگا اور چیونٹیوں کا مسجد میں جمع ہوجانا ایذاء مصلی سے خالی نہ ہوگا؛ اس لئے جھاڑو کی زد میں مرجائیں، تو مؤاخذہ انشاء اللہ نہ ہوگا۔

قتل النملة تكلموا فيه، والمختار أنه إذا ابتدأت بالأذىٰ لا بأس بقتلها. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الحادي والعشرون، زكريا قديم ٥/ ٣٦١، جديد ٥/ ٤١٧، تاتارخانية، زكريا ١٨/ ٢٢٦، رقم: ٢٨٥٩٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ صفر المظفر ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹/ ۳۳۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/ ۲/ ۱۴۱۴ھ

گاندھلی کو آگ سے جلانا

سوال [۱۰۸۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ مسجدوں میں بہت سی جگہ گاندھلی بیٹھتی ہیں، وہ بہت زہریلی ہوتی ہیں، کیا ان کو آگ سے جلا سکتے ہیں؟

المستفتی: محمود محمدی، شاہی مسجد، جلگاؤں، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر جلائے بغیر کسی اور طریقہ سے دفع کیا جا سکتا ہے، تو جلانا جائز نہیں ہے اور اگر بغیر جلائے وہاں سے ہٹانے کی کوئی اور صورت نہ ہو، تو مجبوراً آگ لگانا جائز ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۴/۲۵۲-۴/۲۶۵)

نهیٰ رسول الله صلی الله علیه وسلم عن قتل کل ذي روح إلا أن یؤذي.

(المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التراث العربي بيروت ۱۲/۹۱، رقم: ۱۲۶۳۹)

والظاهر أن المراد حرق ذاتهم بالمجانيق، وإذا جازت محاربتهم بحرقهم فما لهم أولیٰ بالمجانيق أي برمي النار بها عليهم؛ لکن جواز التحريق والتغريق مقيد بما إذا لم يتمكنوا من الظفر بهم بدون ذلک بلا مشقة عظيمة، فإن تمكنوا بدونها فلا يجوز. (شامي، كتاب الجهاد، مطلب في أن الكفار مخاطبون ندباً، كراچي ۴/۱۲۹، زكريا ۶/۲۰۹-۲۱۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/رجب المرجب ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/۲۷۶۸)

مکڑی مارنے کا حکم

سوال [۱۰۸۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مکڑی کے مارنے کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: اقبال شمسی ہاؤس، طویلہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جنگلی جانور جن سے جان وغیرہ کا اندیشہ ہو، جیسے شیر چیتا بھیڑیا اسی طرح دیگر موذی جانوروں کو مارنا جائز ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۱۸۵/۸، محمودیہ جدید ڈابھیل ۲۷۹/۱۸، قدیم ۳۷۷/۱۲)

نھیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن قتل کل ذي روح إلا أن یؤذي .

(المعجم الکبیر للطبراني، دار احیاء التراث العربی بیروت ۹۱/۱۲، رقم:۱۲۶۳۹)

وجاز قتل ما یضر منھا ککلب عقور وھرة تضر . (شامي، کتاب الحج، باب الجنایات، زکریا ۶۰۸/۳، کراچي ۵۷۰/۲، وفي تاب الحظر والإباحة، فصل في البیع، زکریا۵۵۸/۹، کراچي ۷۵۲/٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۱/۳۵۷)	۱۴۲۲/۵/۱۰ھ

مچھروں کو الیکٹرونک بیٹ سے مارنا کیسا ہے؟

سوال [۱۰۸۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کرنٹ والے بیٹ سے مچھر مارنا جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: الیکٹرانک بیٹ کے ذریعہ مچھروں کو جلا کر مارنا جائز نہیں ؛ بلکہ مکروہ تحریمی ہے؛ اس لئے کہ اس میں جاندار کو آگ سے جلانا لازم آتا ہے، جس کی حدیث میں ممانعت وارد ہوئی ہے، ہاں البتہ کرنٹ والی مشین کسی جگہ رکھی ہوئی ہو اور مچھر خود وہاں جا کر جل کر مر جاتے ہوں، تو اس میں کوئی حرج نہیں ؛ کیونکہ اس میں جلانا نہیں پایا جارہا ہے؛ بلکہ مچھر خود ہی آ کر جل رہے ہیں، یہ ایسا ہے کہ جیسے پتنگے بلبوں اور چراغ میں خود جا کر مرتے ہیں۔

عن عبد الرحمن بن عبد الله عن أبيه رضي قال: كنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم: في سفر فانطلق لحاجته......ورأى قرية نمل قد حرقناها، فقال: من حرق هذه؟ قلنا نحن، قال: إنه لا ينبغي أن يعذب بالنار إلا رب النار. (أبوداؤد شريف، كتاب الجهاد، باب في كراهية حرق العدو في النار، النسخة الهندية۲/ ۳٦۲-۳٦۳، دارالسلام رقم:۲٦۷۵)

عن أبي هريرة رضي، أنه قال: بعثنا رسول الله صلى الله عليه وسلم في بعث فقال: إن وجدتم فلاناً و فلانًا فأحرقوهما بالنار، ثم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم حين أردنا الخروج إني أمرتكم أن تحرقوا فلانًا وفلانًا وأن النار لا يعذب بها إلا الله، فإن وجدتموهما فاقتلوهما. (بخاري شريف، كتاب الجهاد، باب لا يعذب بعذاب الله۱/ ٤۲۳، رقم:۲۹۲۳، ف:۳۰۱٦)

وإحراق القمل، العقرب بالنار مكروه. (هندية، زكريا قديم ٥/ ۳٦۱، جديد ٥/ ٤۱۷، تاتارخانية ۱۸/ ۲۲۷، رقم:۲۸٥۹۸)

ويكره إحراق جراد، وقمل، وعقرب، وتحته في الشامية: يكره تحريما ومثل القمل البرغوث ومثل العقرب الحية. (شامي، زكريا ۱۰/ ٤۸۲، كراچي ۷٥۲) *فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم*

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر الف ۴۱/ ۱۱۰۷۷)

(۱۳) باب الخمر و الدخان

شراب پینا کیسا ہے؟

سوال [۱۰۸۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شراب پینا کیسا ہے؟

المستفتی: جمعہ شاہ پی ٹی سی فرسٹ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: شراب پیشاب وخون کی طرح نجس ہے، اوراس کا پینا حرام ہے۔

قال الله تعالىٰ: يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْن. (المائدہ: ۹۰)

وأما الخمر فلها أحكام ستة: أحدها: أنه يحرم شرب قليلها وكثيرها، ويحرم الانتفاع بها للتداوي وغيره...... والخامس: هى نجسة غليظة كالبول والدم. (هنديه، كتاب الأشربة الباب الاول زكريا جديد ٥/٤٦٨ قديم ٥/٤١٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹/ ۳۴۷۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۵/۲۳ھ

ما اسكر كثيره فقليله حرام کا مطلب اور بیڑی وغیرہ کا کیا حکم ہے؟

سوال [۱۰۸۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: کہ حدیث پاک **ما اسکر کثیره فقلیله حرام** کو پیش نظر رکھ کر واضح فرمائیے کہ جس کا کثیر نشہ آور ہو، تو اس کا قلیل بھی حرام ہے، تو تمباکو، بیڑی، سگریٹ، اس کا کثیر نشہ آور ہوسکتا ہے؛ لیکن کوئی اسے حرام نہیں کہتا بہت زیادہ تو مکروہ کہتے ہیں؟ اس کا تشفی بخش جواب عنایت فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حدیث شریف **ما اسکر کثیره فقلیله حرام** سے مراد اشیاء سیالہ غیر جامدہ ہیں، جن میں شراب کی تمام قسمیں شامل ہیں، بیڑی، سگریٹ، تمباکو، میں جو چیز ملائی جاتی ہے، وہ جامد ہے سیال نہیں ہے، اگرچہ اس کا کثیر نشہ آور ہوسکتا ہے، تاہم اس کے قلیل کو دوا کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت ہے، بریں بناء اس کے قلیل پر حرمت کا حکم نہیں دیا جائیگا جیسا کہ زعفران، کہ اس کا کثیر نشہ آور ہوسکتا ہے؛ لیکن قلیل کے استعمال پر کسی نے حرمت کا حکم نہیں دیا؛ بلکہ اسے جائز قرار دیا گیا ہے، اسلئے بیڑی، سگریٹ، تمباکو، وغیرہ میں بدبو نہ ہوتو پینا جائز ہے، اور بدبو ہوتو مکروہ تنزیہی ہے، اور نشہ ہوتو حرام ہے۔ (محمودیہ ڈھابیل ۱۸/۳۸۰، میرٹھ ۲۷/۲۳۰، امداد الفتاوی ۴/۱۱۶)

اور حضرت گنگوہیؒ نے یہ توجیہ بیان فرمائی ہے کہ قلیل کی دو قسمیں ہیں:

(۱) قلیل مُسکر (۲) قلیل غیر مُسکر قلیل مُسکر حرام ہے، اور قلیل غیر مُسکر حرام نہیں، بیڑی، سگریٹ، تمباکو، وغیرہ قلیل غیر مُسکر ہونے کی وجہ سے جائز ہیں۔ (الکوکب الدری اشرفی ۲/۱۲-۱۳)

قال محمد: ما أسكر كثيره فقليه حرام وهو نجس أيضًا (تحته) أقول الظاهر إن هذا خاص بالأشربة المائعة دون الجامد كالبنج والأفيون فلا يحرم قليلها بل كثيرها المسكر ولم نر أحدا قال بنجاستها ولا بنجاسة زعفران مع أن كثيره مسكر ولم يحرموا أكل قليله أيضا–أما

الـجـامدات فلا يحرم منها إلا الكثير المسكر. (شـامـي، كتاب الاشربه، زكريا، ٣٧/١، كراچي، ٤٥٥/٦)

من أكل مايتأذى به أي بر ا ئحته كثوم وبصل ويؤ خذ منه، أنه لو تأ ذى مـن رائحة الدخان المشهو د له منعها من شربه. (شامي كراچي، ٣/٢٠٨، زكريا، ٢٨٨/٤، شـرح نـوى عـلـى الـمسـلـم، كتاب المساجد، باب نهى من اكل ثوماً أو بصلاً أو كراثاً الخ ٢٠٩/١)

فيـفـهـم مـنـه حـكم النبات وهو الإباحة على المختار أو التوقف وفيه إشـارة إلـى عـدم تسـليـم إسكاره، وتفتيره، أو ضراره (شـامـي، كتاب الاشربة كراچي، ٤٦٠/٦، زكريا، ٤٤/١٠)

أكل قليل السقمو نيا، والبنج مباح للتداوي وما زاد على ذلک إذاكان يقتل أويذهب العقل حرام. (شامي زكريا، كتاب الاشربة، ٤٠/١٠، كراچي، ٤٥٧/٦)

ويـمكن أن يقال في الرواية الأولى وهو ما أسكر كثيره ان الكثير و الـقـليـل كـلاهـمـا مسـكـران إلا أن الـكثير أكثر إسكارا من القليل فالقليل حينئذ قسمان: قليل مسكر و قليل غيرمسكر والموضوع في الـحـديـث هـو الـقـليـل الأول دون الـثـانـى فـكـان المعنى أن ا لقليل الـمسـكـر حرام، وإن قل إسكاره فبقى القليل الغير المسكر على حله.
(الكوكب الدرى ١٢/٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ جمادی الاخری ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۵۹۷/۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۶/۱۸ھ

غیر مسکر شراب کے استعمال کا حکم

سـوال [۱۰۸۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ(۱) شراب پینا تو حرام ہے، نشہ اور سکر کی وجہ سے؛ لیکن اگر کوئی ایسی شراب ہو جس میں نشہ اور سکر نہ ہو تو اس کا پینا کیا جائز ہے؟ جیسا کہ آج کل ایسی بہت شراب ملتی ہیں،

(۲) اگر کوئی آدمی اس حد تک شراب پئے کہ جسکے پینے سے بدن میں چستی پیدا ہوتی ہے، سستی دور ہوتی ہے، اور کوئی نشہ بھی نہیں ہوتا، تو اس حد تک پینا کیا جائز ہے؟ تشفی بخش جواب دیکر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں، نوازش ہوگی

المستفتی: طیب احمد آسامی متعلم دارالعلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفیق: (۱) ایسی شرابیں جن کے پینے سے نشہ آتا ہو تو ایسی صورت میں ان کا پینا ناجائز اور حرام ہے، اور سائل نے سوالنامہ میں یہ جو لکھا ہے کہ ایسی شراب جس میں نشہ اور سکر کا مادہ نہ ہو اُسے شراب کیسے کہا جائے، وہ شراب ہی نہیں ہوئی، جب وہ شراب ہی نہیں ہے تو اس کے پینے میں کوئی قباحت بھی نہیں، سائل کے لئے مناسب یہ تھا کہ جس کو سائل ایسی شراب کہہ رہا ہے جس میں نشہ اور سکر نہیں ہوتا ہے، اس سلسلے میں ایک دو چیز متعین کر کے واضح کر دیتا تو بہتر ہوتا جیسا کہ انگور یا کھجور سے شراب بنتی ہے؛ لیکن پانچ یا سات گھنٹے انگور یا کھجور کو پانی میں بھگو دیا جائے تو اسکی مٹھاس پانی میں اچھی طرح منتقل ہوجاتی ہے مگر اس میں نشہ اور سکر نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ اس کو نبیذ کہتے ہیں، اسی طرح جَو کا پانی ہوتا ہے جس میں نشہ اور سکر نہیں ہوتا ہے، اس کو آج کل کے زمانے میں ''بیئر'' کہتے ہیں اس کا پینا بھی بلا تردد جائز اور درست ہے، سعودی عرب کے بازاروں میں اس طرح کی ''بیئر'' خوب ملتی ہے، تو سائل کس کے بارے میں پوچھ رہا ہے وہ ہمارے لیے خود متعین کرنا دشوار ہو رہا ہے، جو چیزیں اندازہ سے بیان کی گئی ہیں اگر انھیں میں سے کوئی ہے تو حکم بیان کیا جاچکا ہے، ورنہ سائل اوپر کے حکم سے خود ہی حکم شرعی سمجھ لے۔

عن جابر بن عبداللّٰہ ؓ، أنه قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم:

ماأسكر كثيره فقليله حرام. (ترمذي شريف باب ماجاء مااسكر كثيره فقليله حرام النسخة الهندية ۲/۸،دارالسلام، رقم ۱۸٦٥، سنن ابن ماجه باب مااسكر كثيره فقليله حرام النسخة الهندية ۲/۲٤۳، دارالسلام، رقم۳۳۹۲)

عن عائشة رضى الله عنها قالت: كنا ننبذ لرسول الله صلى الله عليه وسلم فى سقاء، يوكأ فى أعلاه، له عذلاء ننبذه غدوة ويشربه عشاء، وننبذه عشاء ويشربه غدوة(ترمذي،باب ماجاء فى الانتباذ فى السقاء النسخة الهندية، ۲/۹، دارالسلام رقم: ۱۸۷۱، المعجم الأوسط دارالفكر ۲/۱۲٥، رقم:۲۷٤٥، صحيح مسلم، باب إباحة النبيذ النسخة الهندية ۲/۱٦۸، بيت الافكار رقم:۲۰۰٥)

(۲) سستی دور کرنے اور چستی لانے کے لیے نشہ آور شراب کا ایک قطرہ اور دو قطرے پینا بھی ناجائز اور حرام ہے، چاہے پینے والے کو اس کے پینے سے نشہ نہ آتا ہو،

عن ابن عمر رضى الله عنهما أنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما أسكر كثيره فقليله حرام. (ابن ماجه شريف، باب ما أسكر كثيره فقليله حرام النسخة الهندية،۲/۲٤۳،سنن أبى داؤد، باب النهى عن المسكر النسخة الهندية ۲/٥۱۸، دارالسلام رقم،۳٦۸۱، مسند أحمد بن حنبل ۲/۹۱،رقم: ٥٦٤۸، مسند البزارمكتبة العلوم والحكم ۱۲/۱۹۳، رقم۵۸۵۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم جمادی الثانیہ ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۰۲۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۷/۶/۱ھ

بیئر بنانے، فروخت کرنے اور پینے کا حکم

سوال [۱۰۸۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جَو کا پانی جس کو ایک معینہ عرصہ تک خمیر کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس میں

نشہ آور مادہ (الکحل) پیدا ہو جاتا ہے تب اس مادہ کو (الکحل) مشینوں کے ذریعہ بالکل پاک وصاف کر دیا جاتا ہے، جس سے وہ ایک سادہ بغیر نشہ آور مشروب بن جاتا ہے، رنگ وہیئت کے اعتبار سے وہ انگریزی ''بیئر'' کے مشابہ ہوتا ہے لیکن تاثیر کے اعتبار سے بالکل الگ، نہ اس میں نشہ ہوتا ہے اور نہ (الکحل) بلکہ طبی نکتہ نظر سے وہ ایک صحت بخش شراب بن جاتا ہے، شرعاً مشروب بنانا اور پینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد اقبال محلّہ طویلہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں ذکر کردہ ''بیئر'' جس میں نشہ بالکل نہیں ہوتا ہے، حنفی مسلک میں اس کا بنانا، اسکو پینا، اور خرید وفروخت کرنا، اور اس کا پیسہ سب جائز اور بلاتردد پاک اور حلال ہے، بعض علماء جنہوں نے مدینہ منورہ وغیرہ میں اس کو پیا ہے بتلایا کہ وہ ایک پاک صاف طاقتور مشروب ہوتا ہے، اس میں کسی قسم کا نشہ نہیں ہوتا ہے، ایسا مشروب بنانا پینا اور بیچنا سب جائز ہے،

واذا تخللت الخمر حلت سواء صارت خلاً بنفسها أو بشيء يطرح فيها ولايكره تخليلها الخ. (هداية، كتاب الأشربة اشرفي ٤/ ٤٩٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ رصفر ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۴۳۴۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲/ ۲/ ۱۴۱۶ھ

فروٹ بیئر کے استعمال کا حکم

سوال [۱۰۸۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ فروٹ بیئر میں نشہ نہیں ہے؛ لیکن اگر کوئی شخص اس کو پی لے تو اس کا

پینا حرام ہے یا حلال ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فروٹ بیئر جس میں بالکل نشہ نہ ہو اس کا استعمال جائز ہے ۔ (مستفاد فتوی محمودیہ قدیم ۱۷/۳۸۳، جدید ڈابھیل ۱۸/۱۸۴)

ما يتخذ من الحنطة والشعير والعسل والذرة حلال عند أبي حنيفةؒ.

(هداية، كتاب الأشربة، اشرفي ديوبند ٤/٤٩٦، شامي كراچي ٦/٤٥٣، زكريا ١٠/١٣٣)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ / جمادی الاولیٰ ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳ / ۵۳۱۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۵/۲۲ھ

حلال اشیاء سے بنی ہوئی اسپرٹ کا حکم

سوال [۱۰۸۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اسپرٹ چونکہ شراب کے حکم میں ہے، انجکشن کے بعد بدن یا کپڑے کو دھوکر پاک کرنا ضروری ہے یا اڑ جانے کی وجہ سے بدن یا کپڑا پاک ہو جاویگا حجام لوگ بھی استرہ چلانے کے بعد اسپرٹ والی چیز پھوڑے پھنسی کی احتیاط کی وجہ سے چہرہ پر مل دیتے ہیں اس کو ملوانا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد یونس، احمد گڑھ، پنجاب

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: انگور کے کچے رس سے بنی ہوئی اسپرٹ تو حرام اور ناپاک ہے، اس کا استعمال کسی چیز میں بھی جائز نہیں، اور اس کے علاوہ دوسری اشیاء مثلاً گنّا، جامُن، آلو، گاجر، مولی، گیہوں، اور چاول، وغیرہ سے بنی ہوئی اسپرٹ کا

حکم یہ ہے کہ دواؤں وغیرہ میں استعمال کی گنجائش ہے، اور کپڑے میں لگ جائے تو چوتھائی کپڑے سے کم معاف ہے؛ لہٰذا ایسی اسپرٹ سے بنی ہوئی دوا چہرہ پر لگواسکتے ہیں۔
(مستفاد: ایضاح النوادر، ۱/۱۲۵)

وأما سواها فيتخذ النبيذ من كل شي من الحبوب، والثمار، والألبان، وحكمها ماذكروا أن القليل أي القدر غير المسكر منها حلال (إلى قوله) وحرام بقصد التلهى والكثير أي القدر المسكر منها حرام. (العرف الشذى، حاشيه ترمذي، ۲/۷، تكمله فتح الملهم اشرفيه ديو بند، ۳/۶۰۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶ / جمادی الاولیٰ ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲ / ۴۸۲۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۶/۵/۱۴۱۷ھ

تاڑی کی حرمت کا ثبوت

سوال [۱۰۸۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شراب پینا مسلمانوں کیلئے حرام ہے اور اسکی حرمت قرآن سے ثابت ہے؛ تو کیا اسی طرح سندھی (تاڑی) کی حرمت وممانعت بھی قرآن وحدیث سے ثابت ہے، اگر مکروہ ہے تو کون سی کراہت ہے؟

المستفتی: محمد ہاشم امام مسجد تپّن پلّی منڈل چندر گونڈا، وایا شجاعت نگر، ضلع کھمم اے پی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تاڑی اگر حد سکر کو پہونچ جائے تو اسکی حرمت حدیث سے ثابت ہے، اور جس تاڑی میں نشہ آگیا اس کا پینا بھی حرام ہے۔

عن عائشة رضی الله عنها عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: كل

شراب أسکر فهو حرام. (صحیح البخاری، باب لایجوز الوضوء بالنبیذ ولاالمسکر النسخة الهندیة ۱/۳۸، رقم۲۴۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍محرم الحرام ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۰۱۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/۱/۱۴۲۰ھ

مسلمان کا اپنے ڈھابہ میں شراب پینے کی اجازت دینے کا حکم

سوال [۱۰۸۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک کھانے کا ہوٹل جس کو آج کل ڈھابہ کہتے ہیں، مسلمان کی ملکیت ہے، یعنی اصل مالک اور چلانے والا مسلمان ہے؛ لیکن پورا عملہ ہوٹل کا غیر مسلم لوگوں کا رکھتا ہے، شراب بھی نہیں رکھتا البتہ بعض لوگ خود شراب لاکر ہوٹل میں پی لیتے ہیں؛ تو ایسا ہو جانے سے مسلمان گنہگار تو نہیں ہوگا؟

المستفتی: حافظ محمد طاہر نگینہ بجنور، یوپی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مذکورہ ہوٹل اور اسکی آمدنی اپنی جگہ جائز ہے، مگر وہاں بیٹھ کر شراب پینے کی اجازت دینا جائز نہیں، اگر اس پر سختی سے روک تھام نہیں ہے تو ہوٹل والے اس گناہ کبیرہ میں پوری طرح شامل ہونگے۔

وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّار. [ھود:۱۱۳] **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ذیقعدہ ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۳۶۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/۱۱/۱۴۲۰ھ

الکحل اور سینٹ کا حکم

سوال [۱۰۸۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سینٹ میں الکحل ملا ہوا ہوتا ہے، اور الکحل فرسٹ نمبر کی شراب ہے تو یہ سینٹ پاک ہے یا نہیں نیز اس کو لگا کر نماز پڑھنا کیسا ہے اور ادویات میں الکحل کا استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جو الکحل انگور کی کچی شراب اور انگور کی پکی شراب اور منقی اور کھجور سے بنایا جائے تو وہ بالاتفاق حرام اور ناپاک ہے، شرعی طور پر اس کا استعمال اور تجارت سب ممنوع ہے، اور اگر کپڑے میں گلٹ کے ایک روپیہ سے زائد لگ جائے تو نماز نہ ہوگی، اور اگر اس سے کم ہو تو کراہت کے ساتھ نماز درست ہے، انگور، کھجور کے علاوہ دیگر اشیاء، مثلاً آلو، لوکی، گاجر، ٹماٹر، مولی، جامُن، وغیرہ سے بنے ہوئے الکحل کے بارے میں اختلاف ہے، امام محمدؒ کے نزدیک حرام ہے، اور حضرات شیخینؒ کے نزدیک نجاست خفیفہ ہے، عموماً یہی الکحل عطریات اور ادویہ میں استعمال ہوتا ہے، لہٰذا ضرورت شدیدہ اور عموم بلویٰ اور ابتلاء عام کی وجہ سے عطریات اور ادویات کے حق میں حضرات شیخینؒ کے قول کے مطابق جواز کا فتویٰ ہے، اور پینے کے حق میں حضرت امام محمدؒ کے قول کے مطابق حرام اور ناجائز ہونے پر فتویٰ ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱۲۵)

وأما غير الأشربة الأربعه فليست نجسة عند الإمام أبي حنيفةؒ وبهذا تبين حكم الكحول المسكرة التي عمت بها البلوى اليوم فإنها تستعمل في كثير من الأدوية، والعطور، والمركبات الأخرىٰ فإنها إن تخنت من العنب أو التمر فلا سبيل إلى حلتها أو طهارتها، وإن اتخذت من غيرها فالأمر فيها

سهل على مذهب أبي حنيفةؒ ولا يحرم استعمالها للتدأوي أو لأغراض مباحة أخرى مالم تبلغ حد الإسكار لأنها إنما تستعمل مركبة مع المواد الأخرى ولا يحكم بنجاستها أخذا بقول أبى حنيفةؒ وأن معظم الكحول التى تستعمل اليوم فى الأدويه والعطور وغيرها لاتتخذ من العنب، أوالتمر، وانما تتخذ من الحبوب أو القشور أوالبترول وغيره –فحينئذ هناک منحة فى الأخذ بقول أبى حنيفةؒ عند عموم البلوى. (تكمله فتح الملهم، حكم الكحول المسكرة اشرفي ۳/۶۰۸)

وأما ما سواها فيتخذ النبيذ من كل شي من الحبوب والثمار وتسمى الأقسام بالأنبذة وحكمها ماذكروا أن القليل أى القدرغير المسكر منها حلال إذكان بقصد التقوى على العبادة وحرام بقصد التلهى والكثير أى القدر المسكر منها حرام وهذا مذهب الشيخين.(العرف الشذى على الترمذي،۲/۸)

أماالأشربة المتخذ من الشعير، أوالذرة، أوالتفاح، أوالعسل، اذا اشتد وهو مطبوخ أوغير مطبوخ فإنه يجوز شربه مادون السكر عند أبي حنيفةؒ وأبي يوسفؒ، وعند محمدؒ حرام شربه قال الفقيه وبه نأخذ.(هندية، كتاب الأشربة، الباب الثانى، زكريا قديم ۵/۴۱۴، جديده ۵/۴۷۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف خاص ۴۰/۱۱۵۱۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۵/۲ھ

کیا شراب، پیشاب، سود، اور لحم خنزیر کی حرمت برابر ہے؟

سوال [۱۰۸۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کا کہنا ہے کہ شراب پیشاب اور سود اور لحم خنزیر کی حرمت برابر ہے، جواب با

صواب سے مطلع فرمائیں؟

المستفتی: محمد امیر حسین خادم مدرسہ حبیبیہ اصالت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شراب، سود، خنزیر، سب کی حرمت قرآن کریم سے ثابت ہے، خنزیر کو سورۂ بقرہ آیت ١٧٣ر میں حرام کہا ہے، اور شراب کو سورۂ مائدہ آیت ٩٠ر میں حرام قرار دیا گیا ہے؛ اس لئے سب کی حرمت برابر درجہ کی ہوگی اور پیشاب کا نجاست غلیظہ ہونا تو سب کو معلوم ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ. (سورۃ البقرۃ:١٧٣)

قال اللّٰہ تعالیٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. (المائدہ: ٩٠)

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. (البقرہ:٢٧٥) فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٦ر ذی قعدہ ١٤١٢ھ
(فتویٰ نمبر: الف ٢٨/ ٢٨٨٣)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٦/١١/١٤١٢ھ

شراب پینا یا خنزیر کا گوشت کھانا

سوال [١٠٨٤٠]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص بھنگی کے یہاں گیا اور اس سے خنزیر کا گوشت طلب کیا تو اس بھنگی نے اسے منع بھی کیا کہ آپ تو مسلمان ہیں؛ لیکن وہ نہیں مانا اس نے زبردستی گوشت کھالیا اور وہ شخص شرابی بھی ہے تو اس کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے، قرآن وسنت کی روشنی میں اس کا شرعی حکم تحریر فرمائیں؟

المستفتی: محمد حامد حسین بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خنزیر کا گوشت کھالینا حرام اور گناہ کبیرہ ہے اس پر توبہ کرنا لازم ہے اسی طرح شراب پینا بھی حرام اور گناہ کبیرہ ہے، توبہ کرکے باز آجانا واجب ہے، قرآن میں سخت حرمت نازل ہوئی ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ . (سورۃ البقرۃ: ۱۷۳)

قال اللّٰہ تعالیٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ . (المائدہ: ۹۰)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۵ ؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸ / ۳۲۰۶)	۲۵/۵/۱۴۱۳ھ

شراب کی بوتل بیچنے والے کی آمدنی کا حکم

سوال [۱۰۸۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شراب اور بیئر کی خالی بوتلوں کی خرید وفروخت اسی طرح انکی ڈاٹوں کی خرید وفروخت جبکہ دونوں چیزیں کمپنی میں جاکر پھر سے ان میں مشروب بھرے جاتے ہیں، اور اس پر وہ ڈاٹ لگتی ہے نیز پیپسی، کوکا کولا، تھمسپ، ودیگر مشروبات کی ڈاٹیں جو کبھی کمپنی کو فروخت کی جاتی ہیں، اور کبھی دوسرے کاروباریوں کو جوان ڈاٹوں کو اپنے تیار کردہ لوکل مشروب میں جس پر کسی کمپنی کا لیبل چسپا نہیں کرتے، اور بعض ایسے لوگوں کو بھی فروخت کرتے ہیں جو اپنے لوکل مشروب میں کمپنی کا لیبل لگا کر بیچتے ہیں؛ تو کیا ان ڈاٹوں کا فروخت کرنا مطلقاً ناجائز ہے یا اس میں تفصیل ہے؟ وضاحت سے بیان فرما کر ممنون مرمائیں؟

المستفتی: محمد حلیم صدیقی پونہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شراب اورنشہ آور بیئر کی خالی بوتلوں اوران کی ڈاٹوں کودھوکر پاک کرکے استعمال کرنا جائز ہے، اوران کودوسروں کے ہاتھ فروخت کرنا بھی بلاشبہ جائز ہے، اورخریداروں میں سے جوان کوناجائزامورمیں استعمال کرےگاوہ خودگنہگارہوگا، بیچنے والے پرکوئی گناہ نہیں۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۳۲۴/۱۷، جدید ڈابھیل ۱۶/ ۱۳۳)

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرَى. [سورة الانعام: ١٦٤]

وإنما تحصل المعصية بفعل فاعل مختار الخ. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا، ٩/ ٥٦٢، كراچی، ٦/ ٣٩٢، تبيين الحقائق امداديه ملتان، ٦/ ٢٩، زكريا، ٧/ ٦٥) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍صفر ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۲۲۳/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۲/۳ھ

تمباکو وسگریٹ نوشی کا حکم

سوال [۱۰۸۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ تمباکو اور سگریٹ کی وبا اب عام ہوگئی ہے، بہت کم علماء اسکی تردید کرتے ہیں، بعض علماء تو اسکی حرمت اور بعض نے کراہت ثابت کی ہے، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ حضرت والا اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ آیا یہ کلیۃً حرام ہے یا اس میں کراہت ہے؟ براہ کرم اپنے تأثرات عالیہ تحریر فرماکر ارسال فرمادیں شکرگزار ہونگا؟ جواب کا انتظار رہے گا

المستفتی: محمد عبدالرحمٰن، سرینگر کشمیر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تمباکو اور سگریٹ وغیرہ سے اگر نشہ اور سکر کی

بوآتی ہےتو سکر ونشہ کی مقدار استعمال حرام اور ناجائز ہے، اور اگر سکر اور نشہ نہیں آتا ہے؛ بلکہ صرف بد بو منھ سے ظاہر ہوتی ہےتو مکروہ تنزیہی ہے، تو جو علماء حرام قرار دیتے ہیں وہ مسکر پر محمول ہے، اور جو علماء مکروہ قرار دیتے ہیں وہ مسکر ونشہ نہ ہونے کی صورت میں بد بو کی وجہ سے قرار دیتے ہیں، فقیر کی رائے بھی عام تمبا کو جس سے نشہ نہیں آتا ہے اس کے بارے میں مکروہ ہونے پر ہے۔

ومثله زهر القطن فانه قوي التفريح يبلغ الإسكار (إلى قوله) **يحرم استعمال القدر المسكر منه دون القليل الخ.** (شامي، كتاب الأشربة زكريا ١٠/ ٤١، كراچي ٦/ ٤٥٨)

فيفهم منه حكم النبات الذى شاع فى زمانناالمسمى با لتتن وقد كرهه العمادى فى هديته إلحاقاله بالثوم والبصل با لأولىٰ الخ. (الدرالمختار، كتاب الاشربه، زكريا، ١٠/ ٤٤، كراچي، ٦/ ٤٦٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ رجمادی الثانیہ ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۱۸۱۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۲/۶/۹ھ

گٹکا کھانا

سوال [۱۰۸۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ گٹکا جسکو کھانے کا آج کل بہت رواج ہے اسکو کھانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد احمد فیض گنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گٹکے کے بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ اگر اس کے کھانے میں نشہ نہ آئے تو بد بو کی وجہ سے مکروہ ہے، اور اگر نشہ آجائے تو پھر یہ حرام ہے۔

عن عائشة رضی الله عنها عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: کل شراب أسکر فهو حرام. (صحیح البخاری، باب لایجوز الوضوء من النبیذ ولاالمسکر، النسخة الهندیة، ۱/۳۸، رقم ۲۴۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵ رشعبان ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۶۸۸۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۸/۱۴۲۱ھ

گل منجن کرنا

سوال [۱۰۸۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ گل منجن کرنا کیسا ہے، مکروہ ہے یا مکروہ تحریمی گل کرنے سے سر میں چکر آتا ہے؟

المستفتی: محمد مزمل الحق

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گل مسکر ومفتر نہیں کیونکہ اس سے دماغ میں فتور نہیں آتا بلکہ اس میں حدت ہے لیکن نشہ آور نہیں ضرورت کے وقت گل کرنے کی اجازت ہے، لہٰذا بلاضرورت نہیں کرنا چاہئے؛ البتہ جب گل کرنے میں نقصان ہو تو جائز نہیں۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۸/ ۱۱۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳ ربیع الاول ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۰۷۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/۳/۱۴۲۰ھ

پیپسی، تھمس اپ، وغیرہ کولڈ رنگ کا استعمال کیسا ہے؟

سوال [۱۰۸۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہم نے موبائل میں ایک پروگرام دیکھا جس میں ٹیبل پر خنزیر کو کاٹا

جارہا ہے اور ایک بتانے والا بتا رہا ہے کہ اس کا پوڈر تیار کیا جاتا ہے، اور کولڈرنگ، پیپسی، لمکا، تھمس اپ، سیون اپ وغیرہ میں ڈالا جاتا ہے، لہٰذا حضرت والا سے درخواست ہے کہ ایسی صورت میں پیپسی وغیرہ کا استعمال جائز ہے یا ناجائز، قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں؟

المستفتی: محمد شمیم احمد قریشی و جملہ مقتدی جامع مسجد قریشیان، ٹھاکردوارہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: موبائل میں پروگرام دیکھ کر یہ یقین ہوجانا مشکل ہے کہ تمام مشروبات میں خنزیر کا پاؤڈر بنا کر ڈالا جاتا ہے، اس لئے بغیر شرعی ثبوت کے ان مشروبات پر یکسر حرمت کا حکم لگانا درست نہیں ہوگا، ہاں البتہ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو ان چیزوں کے استعمال سے دور رکھے تو اس کے لئے تقویٰ اور احتیاط کی بات ہے۔

الأصل في الأشياء الإباحة. (قواعد الفقه :ص۵۹)

اليقين لايزول بالشک. (الاشباه جديد، ۲۲۰)

من شک في إنائه، أوثوبه، أوبدنه، أصابته نجاسة أو لا فهو طاهر مالم يستيقن أنه نجاسة. (شامي، کتاب الطهارة، قبيل مطلب في ابحاث الغسل، زکريا ۱/ ۲۸۳، کراچي ۱/ ۱۵۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ر جمادی الثانیہ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۱۴۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۶/۲۲ھ

موجودہ دور میں پیپسی، کوکا کولا وغیرہ مشروبات کا استعمال

سوال [۱۰۸۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ موجودہ دور میں مشروبات میں پیپسی اور اسی کی طرح دیگر اقسام مثلاً کوکا کولا،

تھمس اپ وغیرہ بہت عام ہیں، لہٰذا ان کا استعمال شرع کی رو سے جائز ہے یا نہیں یا بعض کا جواز ہے، اور بعض کا عدم جواز، اگر عدم جواز ہے تو اسکی وجوہات بھی تحریر فرمائیں؟

المستفتی: محمد عثمان سنبھل بڑی مسجد سرسید نگر مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پیپسی، کوکا کولا، اور تھمس اپ ان مشروبات کا استعمال جائز ہے، ان چیزوں کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے، ہاں البتہ حالات زمانہ کے اعتبار سے امریکہ کے مظالم کی وجہ سے امریکی کمپنی سے بائیکاٹ کے لئے جب علماء کی قیادت میں مسلمان متحد ہو جائیں تو ان کی کمپنی سے یہ چیزیں نہ خریدی جائیں تا کہ ان کو نفع نہ پہونچے۔

(مستفاد: احسن الفتاوی ۴۸۹/۸)

وأما ما هو حلال عند عامة العلماء فهو الطلاء وهو المثلث ونبيذ التمر، والزبيب، فهو حلال شربه مادون السكر لاستمراء الطعام والتداوي وللتقوي على طاعة الله تعالى لاللتلهي والمسكر منه حرام وهو قدر الذي يسكر وهو قول العامة. (عالمگيري، كتاب الاشربه الباب الاول، زكريا قديم ۴۱۲/۵، جديد ۴۷۰/۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۳۲۷/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۴/۲۰ھ

(۱۴) باب في الهدايا و الضيافات

کھانے کے دوران آنے والے فقیر کی ضیافت

سوال [۱۰۸۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جب کھانے بیٹھیں اور درمیان میں فقیر آجائے، تو کیا اس کو کھانا کھلا سکتے ہیں ایسا کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد امیر حسن مدرسہ حبیبیہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: کھانا کھانے کے درمیان کوئی ضرورت مند فقیر آجائے تو اسکو بھی بقدر وسعت کھانا کھلا دینا بہت زیادہ ثواب کی بات ہے حدیث شریف میں ہے کہ جس نے کسی بھوکے شخص کو کھانا کھلایا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کا پھل کھلائے گا، اور دوسری جگہ ارشاد ہے کہ جس نے صدق دل سے اخلاص کے ساتھ اللہ کی راہ میں اپنی حلال کمائی سے ایک کھجور کا کسی فقیر وغیرہ پر صدقہ کیا تو اللہ تعالیٰ اسکو انتہائی قدردانی کے ساتھ قبول فرماتا ہے، اور اس کا اجر اتنا بڑھاتا ہے کہ پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔

عن أبي سعيدؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم أيما مسلم أطعم مسلماً على جوع أطعمه الله من ثمار الجنة. الحديث (سنن أبي داؤد، الزكاة، باب في فضل سقي الماء، النسخة الهندية ١/ ٢٣٦، دار السلام رقم: ١٦٨٢، مشكوة شريف ١٦٩)

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من تصدق بعدل تمرة من كسب طيب فإن الله يتقبلها بيمينه، ثم يربيها لصاحبه كما يربي أحدكم فلوه حتى

تکون مثل الجبل (بخاری شریف، کتاب الزکاة، باب الصدقة من کسب طیب الخ ١/١٨٩، رقم الحدیث:١٣٩٢، ف ١٤١٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١١ر ربیع الثانی ١٤٢٢ھ
(فتویٰ نمبر: الف ٣٥/ ٧١٦٣)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١١/٤/١٤٢٢ھ

شادی کی تقریب میں شرکت

سوال [١٠٨٤٨]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک صاحب سے ہمارے بہت ہی قریبی تعلقات ہیں ان کے یہاں ایک تقریب ہونے والی ہے، جس کے سلسلے میں کافی کام ہم نے انجام دئے؛ لیکن آخری لمحات تک انہوں نے کھانے پر ہمیں مدعو نہیں ایسی صورت میں کیا ان کی تقریب میں جانا چاہئے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں، جن صاحب سے قریبی تعلقات ہیں وہ آخری لمحات میں بلانے آئے تھے۔

المستفتی: محمد عشرت میاں حیات نگر اول پیرزادہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر کھانا کھلا کر فارغ ہونے سے قبل آپ کو بلایا جارہا ہے اور اس میں آپ کی اہانت بھی مقصود نہیں ہے اور وہاں کوئی معصیت بھی نہیں ہے؛ تو تقریب اور دعوت میں شرکت کر لینی چاہئے۔

لو دعی إلیٰ دعوة قالوا أحب أن یجیبه إلی ذلک ما لم یکن هناک معصیة ولا بدعة، وإن لم یجبه کان ورعا، والا متناع أسلم فی زماننا الا اذا علم یقینا أن هناک لیس بدعة ولا معصیة.

(الفتاوی التاتارخانیة زکریا ١٨/ ٧٥، رقم:٢٨٤٠٦)

واختلف في إجابة الدعوة قال بعضهم واجبة لايسع تركها (وقوله) والأفضل أن يجيب إذا كانت وليمة (وقوله) إنما يجب عليه أن يجيبه إذا لم يكن هناك معصية الخ. (فتاوى عالمگيرى، باب الضيافة، زكرياقديم ٥/٣٤٣، جديد ٥/٣٩٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴ رشوال المکرّم ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/ ۹۰۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۰۸/۱۰/۴ھ

شرابیوں کو اپنے ہوٹل میں کھانا کھلانا

سوال [۱۰۸۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کچھ لوگ اپنے ہوٹلوں میں شرابیوں کو کھانا کھانے کی اجازت دیتے ہیں جو پہلے ہوٹل سے خرید کر کھانا کھاتے ہیں، اور پھر اپنے ساتھ لائی ہوئی شراب وہیں بیٹھ کر پیتے ہیں؟

المستفتی: محمد ساجد قاسمی بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تعاون علی المعصیۃ ہونے کی وجہ سے ہوٹل والے مسلمان گنہگار ہونگے ان کو ایسے لوگوں کو اپنے ہوٹل میں آنے سے منع کر دینا چاہئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے۔

وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة:۲] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷ رمحرم الحرام ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/ ۵۱۰۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۱/۷ھ

جھاڑو دینے والے کا جھوٹا کھانا

سوال [۱۰۸۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کوئی مسلمان کسی ایسے آدمی یا عورت جو صفائی (جھاڑو میلا، نالی) کا کام کرتا ہے مگر جنگلی نہیں کھاتا، اگر کوئی مسلمان ایسے آدمی یا عورت کا جھوٹا کھالیتا ہے تو کیا اس سے اس کے ایمان میں فرق آتا ہے؟

المستفتی: محمد اطہر علی سونی کلر لیب گوئیاں باغ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر اس آدمی یا عورت کے منہ میں نجاست حقیقیہ مثلاً شراب وغیرہ کا اثر نہ ہو تو ان کا جھوٹا شرعاً پاک اور حلال ہے اور ان کے جھوٹے کے کھانے والے کے ایمان پر کوئی فرق نہیں آئے گا۔

أما الطاهر فسؤر الأدمي ومايؤكل لحمه ويدخل فيه الجنب والحائض والنفساء والكافر إلا سؤر شارب الخمر. (الجوهرة، كتاب الطهارة، امداديه ملتان ۱/ ۲۱، دارالكتاب ديوبند،۱/ ۲۲، حلبی كبير، فصل فی الآسار، اشرفية ديوبند ۱۶٦، هداية، اشرفی ديوبند ۱/ ٤٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰ ؍رجب المرجب ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/ ۱۳۵۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۳۰/ ۷/ ۱۴۰۹ھ

حجّام کی دعوت اور قربانی میں شرکت کا حکم

سوال [۱۰۸۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید ہمارے گاؤں میں حجّام کی دوکان کرتا ہے، زید لوگوں کی داڑھیاں بھی

مونڈتا ہے، اور سر کے بال بھی تراشتا ہے اور مدرسہ کے اساتذہ اور طلبہ کے بال بھی کاٹتا ہے معلوم یہ کرنا ہے کہ زید کا اس دوکان کے علاوہ کوئی کاروبار نہیں ہے کیا زید کے گھر کا کھانا اور زید کے ساتھ قربانی میں حصہ لینا جائز ہے؟

المستفتی: عبدالرشید قاسمی سیڈھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نائی کی کمائی فی الجملہ پاک اور حلال ہے، سوال نامہ سے واضح ہوجاتا ہے کہ لوگوں کے سر کے بال اور مدرسہ کے طلبہ واساتذہ کے بال بھی کاٹا کرتا ہے، اور اس کی اجرت بلاشبہ پاک اور حلال ہے، اور دوکان میں آنے والے بعض لوگ اس کے ذریعہ سے داڑھی بھی منڈواتے ہیں، جو لوگ اس نائی کے ذریعہ سے اپنی داڑھیاں منڈواتے ہیں، وہ خود شرعی طور پر فاسق ہیں، اور داڑھی منڈوانا گناہ کبیرہ ہے اور نائی جو داڑھی مونڈتا ہے، وہ منڈوانے والے کے حکم سے مونڈتا ہے، وہ اپنی اجرت لینے کے لئے اس معصیت پر تعاون کرتا ہے، اس لئے اسکا یہ عمل مکروہ ہے؛ لیکن اس عمل کی اجرت ایک حق المحنت ہے، اس لئے یہ اجرت اس کے لئے حلال ہے؛ لیکن یہ ایک غیر مناسب اجرت ہے جو خلاف اولی اور کراہت تنزیہی کے درجے میں ہوتی ہے، لیکن اس اجرت کو حرام اور ناجائز نہیں کہا جاسکتا، اسلئے کہ یہ ایسا ہی ہے، جیسا کہ درزی سے فسّاق کا لباس بنانے کے لیے کہہ دیا اور اس نے فاسقوں کا لباس بنا کردے دیا تو اس طرح لباس بنانا تو مکروہ ہے مگر حق المحنت حلال ہے، اسی طرح گھر میں تصویر یا مجسمہ بنانے کے لیے کسی اجیر کو لایا تو اجیر کے لئے یہ عمل مکروہ ہے لیکن حق المحنت اور اجرت اس کے لیے حلال ہوگی، اور جب اسکا پیسہ حلال ہے تو اسکے گھر کھانا کھانا، اور قربانی میں اسکے ساتھ شریک ہونا، سب جائز ہے۔

عن محمدؒ : رجل استأجر رجلاً لیصوّر له صوراً أو تماثیل الرجال في بیت أو فسطاط فإني أکره ذلک وأجعل له الأجر وقوله وإن استأجره

لينحت له طنبوراً أو بربطاً ففعل، طاب له الأجر إلا أنه يأثم به (هنديه، الباب السادس عشر في مسائل السيوع في التجارة، زكريا قديم ٤/ ٤٥٠، جديد ٤/٤٨٦، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٥/ ١٣٠، رقم:٢٢٤٣١)

لو آجره دابة لينقل عليها الخمر، أو آجر نفسه ليرعى له الخنازير يطيب له الأجر عنده (الى قوله) وإن كان اسكافاً أمره إنسان أن يتخذله خفّا على زيّ المجوس أو الفسقة أو خياطاً أمره أن يتخذله ثوبًا على زيّ الفساق يكره له أن يفعل لأنه سبب التشبه بالمجوس والفسقة. (شامي، كتاب الخطر والاباحة، باب الاستبداء وغيره، زكريا ٩/ ٥٦٢، كراچی ٦/ ٣٩٢، هداية، اشرفي ديوبند ٤/ ٤٧٣، البحرالرائق، كوئٹه ٨/ ٢٠٣، زكريا ٨/ ٣٧٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ رصفر ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۴۸۵/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۲/۲۳ھ

نائی کی کمائی سے دعوت قبول کرنا

سوال [۱۰۸۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نائی کی کمائی سے جو دعوت ہوتی ہے اس میں شرکت کرنا اور اس کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نائی کی کمائی صاحبینؒ کے اصول کے مطابق تعاون علی المعصیت کی وجہ سے مکروہ تنزیہی ہے، اور حضرت امام ابو حنیفہؒ کے اصول کے مطابق بلا کراہت جائز ہے؛ لہٰذا نائی کی کمائی سے جو دعوت کی جاتی ہے اس میں شرکت کرنا اور اس کا کھانا بلا کراہت جائز اور درست ہے۔

لو آجره دابة لينقل عليها الخمر، أو آجر نفسه؛ ليرعى له الخنازير يطيب له الأجر عنده، وعندهما يكره. (شامي، كتاب الخطر والإباحة، فصل فی البيع، زكريا ۹/۵٦۲، كراچي ٦/۳۹۲)

وجاز إجارة بيت بسواد الكوفة؛ ليتّخذ بيت نار، أو كنيسة، أوبيعة، أويباع فيه الخمر. وقالا: لاينبغي ذلک؛ لأنه إعانة على المعصية. وتحته في الشّامية: وجاز إجارة بيتٍ الخ. هذا عنده أيضاً؛ لأنّ الإجارة على منفعة البيت؛ ولهذا يجب الأجر بمجرّد التّسليم ولامعصية فيه وإنما المعصية بفعل المستأجر وهو مختارٌ فينقطع نسبته عنه. (شامي، زكريا ۹/٥٦۲، كراچي ٦/۳۹۲، الموسوعة الفقهية ۹/۲۱۳، هداية، اشرفي ديوبند ٤/٤٧۲)

رجل استأجر رجلاً ليكتب له غناء با لفارسية، أو بالعربيّة يجوز ويطيب له الأجر كما إذا استأجر ليبنى للهود، أو للنّصارى بيعة، أو كنسية جاز ويطيب له الأجر كذاهذا (الولو الجيه، ۳/۳۲۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰؍۱۱۴۴۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۲/۲۲ھ

خریداروں کو مدعو کر کے بطور ضیافت مٹھائی اور کلنڈر دینا

سوال [۱۰۸۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری ایک دوکان کپڑے کی ہے، کپڑا قرض لے کر میں بھی خرید وفروخت کرتا ہوں کیونکہ بغیر قرض کے تجارت کرنا مشکل ہے، کیونکہ ہر دوکاندار قرض سے خرید وفروخت کرتے ہیں۔

اب میرا سوال یہ ہے کہ میری دوکان میں ۲۰۰ آدمی کپڑا خریدتے ہیں اور قرض کے طور پر بھی لوگ لیتے ہیں اب میں لوگوں سے ۱۰ ہزار روپیہ پانے والا ہوں اسلئے کہ روپیہ وصول کرنے لئے ہر سال ایک متعینہ تاریخ میں لوگوں کو خط کے ذریعہ خبر کردیتا ہوں کہ فلاں تاریخ میں میری دوکان پر آپ لوگ مہربانی کرکے تشریف لے آنا یعنی روپیہ جمع کرنے کا دن ہے؛ تو یہ سب لوگ میری دوکان میں آجاتے ہیں، میں ان سب لوگوں کو ایک کلنڈر اور تھوڑی مٹھائی دیتا ہوں ہدیہ کے طور پر اپنی مرضی سے؛ تو اس مٹھائی کو کھانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد مزل الحق

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: صورت مسئولہ میں خریداروں کو کلنڈر اور مٹھائی دینا مصالح تجارت کے پیش نظر اور ضیافت کے طور پر ہے، لہٰذا اس مٹھائی کا کھانا جائز اور حلال ہے، اس میں کسی قسم کی قباحت نہیں۔

ولايهب بعوض ولا بغير عوض وكذا لايتصدق إلاأن يهدى اليسير من الطعام، أويضيف من يطعمه لأنه من ضرورات التجارة استجلابا لقلوب المجاهزين. (هداية، كتاب الماذون، اشرفي ديوبند ٣/ ٣٦٤)

ويهدى طعامًا يسيراً ويضيف من يطعمه لأن التجار يحتاجون إليه لاستجلاب قلوب المجاهزين. (البحر الرائق، زكريا ٨/ ١٦٩، كوئٹه ٨/ ٩٣)

ويجوز تبرعه بالطعام اليسير إذا وهب أو أطعم استحسانًا الخ- ولأن هذا من ضرورات التجارة عادةً. (بدائع الصنائع، زكريا، ديوبند ٦/ ٢١٧، شامي زكريا ٩/ ٢٣٨، كراچي ٦/ ١٦٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ رجب ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۳۲۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/ ۷/ ۱۴۲۲ھ

بقایارقم کی وصولی کے لئے خریداروں کی دعوت کرنا

سوال [۱۰۸۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بعض علاقوں میں دوکانداروں کا یہ معمول ہے، وہ لوگ سال بھرا پنے خریداروں سے نقد وادھار دونوں طرح کے معاملات کرتے ہیں، اور سال بھر خرید وفروخت کرنے کے بعد جو رقم وصول نہیں ہوتی ان خریداروں کی اپنی دوکان پر دعوت کرتے ہیں اور مختلف قسم کی مٹھائی وغیرہ کھلانے کا نظم کرتے ہیں اور خریدار آ کر اس میں شرکت کرتے ہیں، اور کھانے کے بعد معاملہ صاف کر کے جاتے ہیں، اس کے بعد دوبارہ ازسرنو معاملہ شروع ہوتا ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طرح دعوت کرنا اور خریداروں کے لئے دعوت قبول کرنا اس طرح معاملہ کرنا ازروئے شرع جائز ہے یا نہیں؟ اگر فتوی عدم جواز پر ہو تو جواز کی کیا شکل ہوسکتی ہے؟

المستفتی: حبیب اللہ متعلم شعبہ افتاء شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں دوکانداروں کا مخصوص ایام میں اپنے خریداروں کا سال کے اخیر میں دعوت کرنا جبکہ خلوص اور حلال مال سے ہو اسی طرح خریداروں کا دعوت قبول کر کے کھانا اور سوال میں ذکر کردہ طریقہ سے نقد ادھار کا معاملہ کرنا شرعًا جائز اور درست ہے، اگرچہ اس میں بقایہ کی وصولی بھی مقصود ہو، نیز دعوت قبول کرنا سنت ہے نبی کریم ﷺ خود دعوت کرتے تھے، اور دوسروں کی دعوت قبول بھی فرماتے تھے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۴/۴۲۲ تا ۴۲۳، جدید ڈابھیل ۱۸/۹۵)

عن ابن عمر رضـ، قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: إذا دعا أحدكم أخاه فليجب عرسا كان أونحوه، (سنن أبي داؤد، الاطعمة، باب ماجاء فى اجابة الدعوة، النسخة الهندية ۲/ ۵۲۵، دارالسلام ورقم: ۳۷۳۸)

ولاینبغی التخلف عن اجابة الدعوة العامة كدعوة العرس والختان ونحوهما الخ. (هندية، كتاب الكرهية، الباب الثاني عشرفى الهدايا والضيافات زكريا قديم ٥/٣٤٣، جديده/٣٩٧، تاتارخانيه، زكريا١٨/١٧٦،رقم:٢٨٤١٢)

وقال عليه السلام من لم يجب الدعوة، فقدعصى الله ورسوله الخ. (صحيح البخاري، كتاب النكاح، باب من ترك الدعوة، فقدعصى الله ورسوله ٢/٧٧٨، رقم:٤٩٨٣، ف:٥١٧٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍رجب ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/۴۱۰۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲/۷/۱۴۱۵ھ

دودھ میں پانی ملاکر فروخت کرنے والے کے یہاں کھانا کھانا

سوال [۱۰۸۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید علی الاعلان دودھ میں پانی ملاکر خالص دودھ کہہ کر فروخت کرتا ہے، قدیمی ذریعۂ معاش اس کا یہی ہے، ایسے میں زید کی دعوت قبول کرنی چاہئے یا نہیں؟ یا اسکے کھانے سے گریز کریں؟

المستفتی: محمد اسلام امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حدیث میں آتا ہے کہ تم اونٹ اور بکری وغیرہ کو اس طور پر نہ فروخت کرو کہ دوتین دن اس کا دودھ دھونا چھوڑ دو تاکہ وہ دودھ جمع ہوجائے پھر مشتری زیادہ دیکھ کر زیادہ قیمت میں لے لے صاحب مرقاۃ نے اس نہی کی علت دھوکہ دہی بیان فرمائی ہے۔

لاتصروا الإبل، والغنم. (مشكوة المصابيح ٢٤٧)

و فی شرحه المرقاة، و النهی للخداع. (مرقاة مکتبة ملتان ٦/٧٥)

اورصورت مذکورہ میں بھی دھوکہ دہی اور جھوٹ پایا جاتا ہے؛ اسلئے ایسا کرنا درست نہیں اور جوکمائی اس طریقے سے حاصل ہو وہ حلال بھی نہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/۱۳۶)

اب اگر زید کا دودھ فروخت کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا حلال ذریعۂ معاش نہیں تو اس کی دعوت قبول کرنے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر اتنا پانی ملا کر فروخت کرتا ہے کہ پانی غالب اور دودھ مغلوب ہے تو اسکی دعوت قبول کرنا درست نہیں؛ لیکن اگر ایسا نہیں بلکہ دودھ غالب اور پانی مغلوب ہے تو پھر اسکی دعوت قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، البتہ اگر کوئی ورع وتقوی کے پیش نظر نہ قبول کرے تو اسکی بھی گنجائش ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ، قدیم ۱۷/۳۵۵، جدید ڈابھیل ۱۸/۱۳۲)

عن ابن مسعودؓ قال: جاء إليه رجل فقال: إن لی جارًا يأكل الربا، وإنه لايزال يدعونی، فقال: مهنأه لک وإثمه عليه، قال: سفيان فإن عرفته بعينه فلا تصبه. (مصنف عبدالرزاق، المجلس العلمی بیروت ٨/١٥٠، رقم: ١٤٦٧٥)

آكل الربا وكاسب الحرام أهدى اليه أو أضافه وغالب ماله حرام لايقبل ولا يأكل مالم يخبره أن ذلک المال أصله حلال ورثه أو استقرضه وإن كان غالب ماله حلالا لا بأس بقبول هديته والأكل منها. (الهندية، كتاب الكراهية، الباب الثانی عشرفي الهدايا والضيافات زكريا قديم ٥/٣٤٣، جديد ٥/٣٩٧، تاتارخانيه زكريا ١٨/١٧٥، رقم: ٢٨٤٠٥، بزازيه، جديد زكريا ٣/٢٠٣، وعلى هامش الهندية، زكريا ٦/٣٦٠، مجمع الأنهر، دارالكتب العلميه بيروت ٤/١٨٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۱۸۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۶/۳ھ

بینک میں فکس ڈپوزٹ کرنے والوں کی دعوت قبول کرنا

سوال [۱۰۸۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کیا ان لوگوں کی دعوت قبول کرنا اوران پروگراموں میں شرکت کرنا کھانا کھانا جائز ہے؟ جو خاص مواقع کے لئے بینک میں فکس ڈپوزٹ کر دیتے ہیں اگر جائز ہے تو کن صورتوں میں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فکس ڈپوزٹ سودی معاملہ ہے اس میں جمع شدہ پر زائد رقم ملتی ہے وہ حلال نہیں ہے، اور جو ایسا کرتا ہے اور اس کے یہاں دوسری حلال آمدنی بھی ہے اور ڈپوزٹ کا رأس المال بھی حلال ہے؛ تو شرعاً جس کے یہاں حرام وحلال دونوں طرح کی آمدنی ہے اس کے یہاں دعوت کھانا جائز ہے۔ (مستفاد: عزیز الفتاوی ۱/۷۴۶)

عن ابن مسعودؓ، قال: جاء اليه رجل فقال: إن لی جارًا يأكل الربا، وإنه لايزال يدعونی فقال مهنأه لک وإثمه عليه. (مصنف عبدالرزاق، المجلس العلمي بيروت۸/۱۵۰، رقم:۱٤٦۷٥)

أحب إلى أن لا يأكل منه ويسعه حكما أن ياكله إن كان ذلك الطعام لم يكن عين الغصب، أو الرشوة الخ. (شامي، كتاب الزكاة، مطلب في التصدق من المال الحرام، كراچي، ۲/۲۹۲، زكريا۳/۳۱۹، هنديه زكريا قديم۵/۳۵۰، جديد۵/٤۰٤، المحيط البرهاني المجلس العلمي بيروت، ۸/٦٤، رقم:۹٥۹٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ رشوال المکرم ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/۶۳۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۱۰/۲۲ھ

جس کی اکثر کمائی حلال ہو اسکے یہاں کھانا کھانا

سوال [۱۰۸۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید اصلاح حال کے لئے شیخ طریقت کے زیر تربیت ہے، اور اتفاق سے بحکم خداوندی حالات کا شکار بھی، یعنی بے روزگاری قرض رہائشی خستہ حالی گھریلو نا اتفاقی وغیرہ مندرجہ بالا حالات کی ابتدا، اور تمام اہل خانہ ومتعلقین کے احکام خداوندی وسنت پر مکمل عمل نہ کرنے کی بنا پر یہ حالات پیدا ہوئے، اور احقر نے ان سب سے تنگ آ کر اللہ کی توفیق سے تمام معاشرہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی زندگی کو احکام خداوندی اور سنت نبوی کے سانچے میں ڈھالنے کی سوچی، اور اس کے لئے تبلیغی جماعت سے کئی سال پہلے اپنے کو منسلک کیا اور اب اللہ کے وعدوں وبزرگوں کی ترغیب پر اللہ کے راستے میں چار مہینے کے لئے جانے کا عزم مصمم کیا جس کے لئے بڑوں سے مشورہ بھی کیا جا چکا ہے، اور جانے کی ممانعت نہیں ہوئی ہے۔ بہر حال چوں کے اہلیہ کی تربیت دینی ماحول میں نہیں ہوئی ہے اور حالات ابتلاء وغیرہ میں جمنا مشکل امر بھی ہے، پھر بھی بیچاری بہت زیادہ ساتھ دیتی ہے اب چونکہ زید بھی اللہ کے راستے کے لئے عازم ہے، اور اہلیہ کی ایک بھابھی کے یہاں اول ولادت کا موقع ہے، اس موقع پر اہلیہ کے حقیقی بھائی ان کو بمبئی اپنے پاس بلانا چاہتے ہیں؛ لیکن بھائی بھابھی دین سے دور یہاں تک کہ حرام حلال سے بے پرواہ اور صوم وصلوۃ کے بھی پابند نہیں ہیں، اور ان کے والد سے معلوم ہوا کہ وہ جہاں پر نوکر ہیں وہاں مالک کی نظر بچا کر کچھ اوپر کی آمدنی بھی کرتے ہیں ایسی حالت میں اہلیہ کو وہاں بھیجنا مناسب ہے یا نہیں؟ جبکہ اعمال حسنہ وعقائد کے اعتبار سے وہ بھی پہلے ہی سے کمزور ہے، برائے کرم ایسی حالت میں شریعت کا کیا حکم ہے، مطلع فرمائیں۔

المستفتی: حبیب الرحمٰن انصاری بیضہ مرچنٹ علی مسجد مارکٹ شیر کوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کا نسبتی بھائی نوکری کرتا ہے اور ساتھ ساتھ بے احتیاطی کرتا ہے؛ لیکن پھر بھی اکثر مال حلال ہوگا اسلئے ان کے یہاں جانا وہاں کھانا کھانا سب شرعًا جائز ہے۔

عن سلمان الفارسيؓ قال: إذا كان لک صديق عامل أو جار عامل أو ذو قرابة عامل فأهدیٰ لک هدية، أو دعاک إلى طعام فاقبله، فان منهأه لک و إثمه عليه.(مصنف عبدالرزاق، المجلس العلمى بيروت۸/ ۱۵۰، رقم:۱٤٦٧٧)

أهدى إلى رجل شيئاً أو أضافه إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس الخ. (هنديه، كتاب الكراهية، الباب الثانى عشرفى الهدايا والضيافات زكريا قديم۵/ ۳٤۲، جديد۵/ ۳۹٦، تاتارخانيه، زكريا۱۸/ ۱۷۵، رقم:۲۸٤۰۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸؍۲۹۱۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۲/۱۲/۲ھ

مخنث سے تعلق قائم کرنے، اور ان کی دعوت قبول کرنے کا حکم

سوال [۱۰۸۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مخنث حضرات ماہ رمضان میں افطار یا دیگر مواقع پر نذر ونیاز وغیرہ کا اہتمام کرتے ہیں، اور یہ لوگ غیر مخنث حضرات سے تعلقات رکھنے کی بناپر ان کو بھی کھانے پر مدعو کرتے ہیں، آیا ان لوگوں سے تعلقات قائم کرنا، یا ان کے یہاں کھانا اور ان کو کھلانا درست ہے کہ نہیں؟

المستفتی: محمد حسیب محمد حسین نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر ان مخنث لوگوں کی ساری کمائی یا اکثر کمائی ناچ گانے کی ہے، تو ان کے یہاں دعوت قبول نہ کی جائے اور اگر حرام کمائی زیادہ نہیں ہے؛ بلکہ حلال کمائی ہی زیادہ ہے تو دعوت قبول کرنے کی گنجائش تو ہے مگر بہتر نہیں؛ البتہ اگر مخنثوں کی دعوت میں شرکت کے نتیجہ میں ان کی ہدایت کا ذریعہ بن سکتا ہو تو قبول کر لینی چاہئے ورنہ نہیں۔

عن عمران بن حصینؓ قال: نهٰی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن إجابة طعام الفاسقین. (المعجم الکبیر للطبرانی، داراحیاء التراث العربی بیروت ۱۸/ ۱۶۸، رقم: ۳۷۶)

آکل الربا وکاسب الحرام أهدی إلیه أو أضافه وغالب ماله حرام لایقبل ولایأکل مالم یخبره أن ذلک المال أصله حلال ورثه، أواستقرضه وإن کان غالب ماله حلالا، لابأس بقبول هدیته والأکل منها. (هندیة، کتاب الکراهیة، الباب الثاني عشرفي الهدایا، والضیافات، زکریا قدیم ۵/ ۳۴۳، زکریا جدید ۵/ ۳۹۷، الفتاوی التاتارخانیة زکریا ۱۸/ ۱۷۵، رقم: ۲۸۴۰۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ ربیع الاول ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۴۷۲۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/ ۳/ ۱۴۱۷ھ

جس کی کمائی حرام ہو اس کے یہاں دعوت کھانا

سوال [۱۰۸۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے ایک قریبی رشتہ دار کا حرام کا کاروبار ہے، ان کے یہاں دعوت ہوتی

ہے، نہ جائے تو رشتہ ٹوٹ جاتا ہے، ایسے وقت کیا کریں؟ ہمارے یہاں ایک مولانا کہتے ہیں کہ دعوت کھاؤ، اوراسکی مقدار کا پیسہ صدقہ کرڈالو، کیا اس طرح کر سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد فاروق دستگیر ستارا، مہاراسٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال میں ذکر کردہ رشتہ دار کی کمائی اگر سب کی سب حرام ہے، یا اکثر حرام ہے یا حرام وحلال برابر ہے تو اس کے یہاں ہرگز دعوت قبول نہ کی جائے، رشتہ ٹوٹ جانے کا خطرہ ہو تب بھی اس کے یہاں کھانا جائز نہیں ہے، اور کسی مولانا صاحب کا یہ کہنا کہ دعوت قبول کرلو، اوراس کی مقدار پیسہ اسی کی نیت سے صدقہ کردو تو اس کی مثال ایسی ہے کہ مردہ بکرا خود کھالیا اور ذبح شدہ حلال بکرا کسی کو دیدیا، ہاں البتہ اگر اس کے یہاں حرام پیسے کے ساتھ ساتھ حلال کمائی حرام پر غالب رہتی ہے تو پھر دعوت قبول کرنے کی گنجائش ہے، اور یہ سوچنا چاہئے کہ اس نے ہم کو حلال میں سے کھلایا ہے۔

غالب مال المهدی إن حلالا لا بأس بقبول هديته وأكل ماله مالم يتعين أنه من حرام وإن غالب ماله الحرام لايقبلهاولا يأكل إلا إذاقال: أنه حلال ورثته أواستقرضته. (بزازية، كتاب الكراهية، الفصل الرابع فى الهدية والميراث، جديد زكريا٣/٢٠٣، وعلى هامش الهندية، زكريا٦/٣٦٠)

أهدى إلى رجل شيئًا أو أضافه إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن يعلم بأنه حرام فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لايقبل الهدية ولايأكل الطعام. (هندية، زكريا قديم٥/٣٤٢، جديد٥/٣٩٦، مجمع الانهر، دارالكتاب العلمية بيروت ٤/١٨٦، تاتار خانية، زكريا١٨/١٧٥، رقم: ٢٨٤٠٥) **فقط واللّٰہ** سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍رجب المرجب ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/ ۱۱۵۹۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۷/۱۴۳۵ھ

مردار کی کھال وہڈی فروخت کرنے والے کی دعوت وامامت کا حکم

سوال [۱۰۸۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) اگر کوئی مسلمان مردار جانوروں کی کھال اور ہڈیاں ازخود نکال کر جمع کر کے فروخت کرتا ہے، یا کسی مسلم یا غیر مسلم سے یہ کام اجرت دیکر کرواتا ہے، پھر فروخت کر کے پیسے کماتا ہے تو یہ آمدنی شرعی اعتبار سے کیسی ہے؟ ایسے مسلمان کے یہاں دعوت قبول کرنا نیز شادی بیاہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) مسئولہ مذکورہ شخص کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

المستفتی: مولانا زاہد قاسمی پوروہ داسہ پور سیتاپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: (۱-۲) دباغت سے پہلے کھالوں کو فروخت کرنا اور اس سے آمدنی حاصل کرنا قطعاً حرام ہے، اس شخص پر لازم ہے کہ وہ حرام کاروبار چھوڑ کر حلال ذرائع اختیار کرے، اگر وہ باز نہ آئے تو اس کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہوگا، اور ہڈیوں کا حکم یہ ہے کہ اگر آلائش الگ کر کے انھیں فروخت کیا جائے یا کھال کو دباغت دینے کے بعد بیچا جائے تو اس کی آمدنی حلال ہوگی۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۶/ ۴۹۷، امداد المفتیین ۲/ ۸۳۳)

قال الإمام قاضيخان: وبيع جلود الميتات باطل إذالم تكن مذبوحة، أو مدبوغه، ويجوز بيع عظامها، وعصبها. (خانية، كتاب البيع، فصل في البيع الباطل جديد زكريا۳/ ۸۱-۸۲، وعلى هامش الهندية، زكريا۲/ ۱۳۳)

ولابيع جلودالميتة قبل أن تدبغ لأنه غير منتفع به ولابأس ببيعها والانتفاع بها بعد الدباغ لأنها طهرت بالدباغ ولابأس بيع عظام الميتة وعصبها. (هداية، اشرفي ديوبند۳/ ۵۵، تاتارخانيه، زكريا۸/ ۳٤۱، رقم:۱۲۹۳۲)

ويكره تقديم الفاسق كراهة تحريم. (صغيري، مطيع مجتبائی

دهلی ۲٦٤ کبیری اشرفیه دیوبند ص: ۵۱۲ هدایه اشرفی دیوبند ۱/۱۲۲)

اور دعوت کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اگر غالب آمدنی حرام کی ہے تو دعوت قبول کرنا جائز نہیں، اور اگر غالب آمدنی حلال ہے تو اس صورت میں دعوت قبول کرنا جائز ہے۔

وكذا دعوة من كان غالب ماله من حرام مالم يخبر أنه حلال، وإن كان غالب ماله حلالا، لا بأس بقبول هديته والأكل منها. (هندية، كتاب الكراهية الباب الثاني عشر في الهدايا والضيافات، زكريا قديم، ٥/٣٤٣، جديد، ٥/٣٩٧، الفتاوى التاتار خانيه زكريا، ١٨/١٧٥، رقم، ٢٨٤٠٥)

اور شادی سے پہلے بھی آمدنی کی تحقیق کر لی جائے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۷/۲۹۳، جدید ڈابھیل ۱۸/۲٦۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ جمادی الاولی ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ٦۱٦۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۵/۲۳ھ

متقی شخص کے لئے حرام آمدنی والے کی دعوت قبول کرنا

سوال [۱۰۸٦۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جس کے یہاں زیادہ تر آمدنی حلال ہو اور حرام آمدنی کم ہو تو اس کی دعوت قبول کرنا اسی طرح ہدایا تحائف قبول کرنا جائز ہے، اب سوال یہ ہے کہ کسی کے یہاں بزرگ اور متقی آدمی پہونچا، اور اسکی ساری آمدنی حرام ہے تو پانچ روپیہ اپنا ملا کر اور دس روپیہ حلال کمائی سے ملا کر اس بزرگ کے لئے کھانا تیار کیا گیا تو کیا یہ کھانا اس بزرگ اور متقی کے لئے جائز ہوگا؟

المستفتی: محمد شبیر، نئی دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ایسا شخص جس کا کل مال حرام کمائی کا ہو اس

کے یہاں بزرگوں کا دعوت قبول کرنا درست نہیں؛ البتہ داعی صراحت کیساتھ کہدے کہ میں حلال کمائی سے کھلا رہا ہوں تو درست ہے۔

عن عمران بن حصینؓ قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن إجابة طعام الفاسقين. (المعجم الكبير للطبراني دارإحياء التراث العربي، بيروت، ۱۸/ ۱۶۸، رقم ۳۷۶)

لايجب دعوة الفاسق ...... وكذامن كان غالب ماله من حرام مالم يخبر أنه حلال الخ. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الثاني عشرفي الهدايا والضيافات، زكريا قديم ۵/ ۳۴۳، جديد ۵/ ۳۹۷، تاتار خانيه زكريا ۱۸/ ۱۷۵، رقم: ۲۸۴۰۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۵؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱؍ ۴۰۳۷)	۱۴۱۵/۵/۲۵ھ

حرام کمائی کرنے والے کا حلال رقم سے مہمان نوازی کرنا

سوال [۱۰۸۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خالد کو معلوم ہے کہ بکر کے یہاں خالص حرام کمائی سے پورے خاندان کا گذارہ ہوتا ہے، حسن اتفاق خالد ایک دن بکر کے گھر مہمان ہوا بکر کے پاس چونکہ پوری کمائی ناجائز اور حرام تھی اسلئے اس نے حلال کمائی کمانے والے سے قرض لیکر ضیافت کردی اور مہمان کے رخصت ہوجانے کے بعد یا ان کی موجودگی میں اپنی خالص حرام کمائی سے قرض کی ادائیگی کرتا ہے تو کیا صورت مذکورہ میں حرام کمائی سے قرض ادا کرسکتے ہیں؟

نیز خالد کا بکر کے یہاں مہمان ہونا اور دوسرے سے قرض لیکر ضیافت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالحکیم متعلم شعبہ افتاء مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسا شخص جسکی تمام کمائی حرام ہواگر یہ شخص کسی حلال کمائی والے سے قرض لیکر کسی کی دعوت کردے تو اس دعوت کا قبول کر لینا درست ہے، اوراس کااس طرح قرض لیکر دعوت کرنا بھی جائز ہے؛ لیکن اس قرض کی ادائیگی میں مال حرام دینا ناجائز اورنامناسب ہے؛ بلکہ مال حرام سے قرض ادا کرنے والا سخت گنہگار ہوگا اسی طرح لینے والے کو اگر یہ معلوم ہے کہ یہ مال حرام ہے تو اس کا اپنے قرضہ میں لینا بھی مکروہ اور باعث گناہ ہے۔ (مستفاد: فتاوی رشیدیہ قدیم ص:۵۶۹، جدید زکریا ص:۵۵۵، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۶۰/۵، جدید ڈابھیل ۴۵۰/۱۸)

آكل الربو وكاسب الحرام أهدياإليه،أوأضافه وغالب ماله حرام لايقبل ولا يأكل مالم يخبره أن ذلك المال أصله حلال ورثه أواستقرضه، وإن كان غالب ماله حلالا، لابأس بقبول هديته والأكل منها كذا فى الملتقط. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الثانى عشرفي الهدايا والضيافات، زكريا قديم٥/٣٤٣، جديده/٣٩٧، تاتارخانيه زكريا١٨/١٧٥، رقم:٢٨٤٠٥، بزازية، جديد زكريا٣/٢٠٣، وعلى هامش الهندية زكريا٦/٣٦٠، مجمع الانهر، دارالكتب العلمية بيروت٤/١٨٦)

لوكان الدين لمسلم على مسلم فباع المسلم خمراً وأخذ ثمنها وقضاه صاحب الدين كره له أن يقبض ذلك من دينه كذافى السراج الوهاج. (عالمگيري، الباب السابع والعشرون فى القرض والدين زكريا قديم٣٦٧، جديد زكريا٥/٤٢٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم رجب ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰۹۸/۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۷/۱۴۱۵ھ

سود کھانے والے کی دعوت قبول کرنے کا حکم

سوال [۱۰۸۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص نے اپنی جائیداد فروخت کرکے اسکی جملہ رقم کو بینک میں ڈالدیا ہے، اور وہ اس کے سود سے اپنا جملہ خرچ چلاتا ہے، اس کا کوئی دوسرا کاروبار نظر نہیں آتا اس صورت حال میں اگر وہ دعوت کرے تو اس کے یہاں کھانا کیسا ہے؟

المستفتی: شمیم احمد مدرسہ تجوید القرآن، روڑکی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر یہ قطعی طور پر معلوم ہے کہ اس کا سارا خرچہ سود کا ہوتا ہے تو ایسے شخص کے یہاں دعوت قبول نہ کی جائے ، ہاں البتہ اگر وہ یہ بتلادے کہ دعوت کا پیسہ سود کا نہیں ہے؛ بلکہ ادھار لیا ہے، یا کسی نے ہبہ کیا ہے، یا وراثت میں ملا ہے، تو دعوت قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

آکل الربو وکاسب الحرام أهدیٰ الیه،أوأضافه وغالب ماله حرام لایقبل ولا یأکل مالم یخبره ان ذلک المال أصله حلال ورثه أواستقرضه.

(فتاوی عالمگیري، کتاب الکراهیة، الباب الثانی عشرفي الهدایا و الضیافات، زکریا قدیم ۵/۳۴۳، جدید ۵/۳۹۷، تاتار خانیه زکریا۱۸/ ۱۷۵، رقم:۲۸۴۰۵، بزازیه جدید زکریا۳/۲۰۳، وعلی هامش الهندیة زکریا ۶/۳۶۰، مجمع الانهر، دارالکتاب العلمیه بیروت ۴/ ۱۸۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۷/۲۶۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴/۴/۱۴۱۲ھ

خنزیر کے بالوں کا برش بنانے والے کی دعوت قبول کرنے کا حکم

سوال [۱۰۸۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک غیر مسلم کی کمائی حرام ہے، مثلاً خنزیر کے بالوں کے برش کا کام ہے تو اس کے یہاں دعوت کھانا کیسا ہے؟

المستفتی: حافظ علاء الدین، شیر کوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیر مسلم کے عقیدہ میں شراب اور خنزیر کی تجارت اور اس کا پیسہ جائز ہے، اسلئے وہ اپنی کمائی سے جو پیسہ کسی مسلمان کو دیگا یا کھلائے گا وہ مسلمان کے لئے جائز ہو جاتا ہے۔

إن بلا لاقال لعمر بن الخطاب رضی الله عنه ان عمالک يأخذون الخمر و الخنازير فی الخراج فقال لا تأخذ وها منهم، ولكن ولوهم ببيعها وخذ وا أنتم من الثمن فهذا عمرؓ قد أجاز لأهل الذمة بيع الخمر والخنازير وأجاز للمسلمين أخذ أثمانهما فی الجزية والخراج وذلک بمحضر من الصحابة ولم ينكر عليه منكر. (اعلاء السنن، ابواب البيوع الفاسدة، باب حرمة بيع الخمر، كراچی ١٤/ ١١٢، دار الكتاب العلميه بيروت ١٤/ ١٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ ر جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۵۱۶/۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۶/۲۴ھ

کیا مسلمان کیلئے غیر مسلم کی دعوت قبول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

سوال[۱۰۸۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ(۱) کسی غیر مسلم کی دعوت کھانا کیسا ہے؟

(۲) اگر ایک آدمی کسی غیر مسلم دوست کے گھر گوشت بھیج کر پکواتا ہے، پھر اس کی دعوت (دلجوئی کیلئے) قبول کر کے وہی گوشت کھاتا ہے تو ایسے غیر مسلم کے یہاں پکا ہوا گوشت کھانا کیسا ہے؟ جبکہ کسی غلط چیز کے ملانے یا ناجائز چیزوں کو اس میں ڈال کرنہ پکانے کا کامل یقین ہے؟

المستفتی: مولانا سلمان ندوی، ہلدوانی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیر مسلم کی ایسی دعوت جس میں کسی حرام چیز کی ملاوٹ کا شبہ نہ ہو قبول کرنا جائز ہے۔

عن أنس بن مالک رضـ أن یهودیة أتت النبی صلی الله علبه وسلم بشاة مسمومة فأ کل منهافجیئ بها فقیل ألانقتلها، قال: لا،: فمازلت أعرفها فی لهوات رسول الله صلی الله علیه وسلم. (صحیح البخاري، الهبة، باب قبول الهدیة من المشرکین ۱/۳۵٦، رقم:۲٥٤۳، ف:۲٦۱۷)

ولا بأس بالذهاب إلی ضیفة أهل الذمه. (الفتاوی التاتارخانیة، زکریا ۱۸/۱٦۷، رقم:۲۸۳۷۷)

(۲) مسئولہ صورت میں اگر مذکورہ گوشت کے درست ہونے کا یقین ہو تو غیر مسلم کے یہاں ایسا گوشت کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ویقبل قول کافر ولو مجوسیا قال: اشتریت اللحم من کتابي فیحل أوقال من مجوسيفیحرم، ولایرده بقول الواحد أصلهأنه خبر الکافر مقبول

بالإجماع فی المعاملات، لافی الدیانات. (تنویر الابصار مع الشامي، کتاب الحظر والإباحة، زکریا ۹/۴۹۷، کراچي، ۶/۳۴۴، تبیین الحائق، زکریا۷/۲۷، امدادیه ملتان ۶/۱۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍شعبان ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹؍۱۰۴۷۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵؍۸؍۱۴۳۲ھ

کیا ہولی اور دیوالی کی مٹھائی مسلمان کھا سکتے ہیں؟

سوال [۱۸٦٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ غیر مسلم دیوالی اور ہولی کے موقع پر مسلمانوں کو مٹھائی دیتے ہیں کیا مسلمانوں کو دیوالی وہولی کے نام کی مٹھائی کھانا جائز ہے؟ ذرا قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت سے بیان فرمائیں۔

المستفتی: عباد الرحمان بجنوری، مدرسہ شاہی مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہولی اور دیوالی کے موقع پر غیر مسلم بطور تحفہ وہدیہ مسلمانوں کو مٹھائی وغیرہ جو پیش کرتے ہیں مسلمانوں کے لئے اس کا نہ قبول کرنا بہتر ہے؛ لیکن اگر صرف وطنی تعلقات کو باقی رکھنے کے لئے قبول کریں تو اس کا کھالینا حرام اور ناجائز بھی نہیں ہے، کھانے کی گنجائش ہے بشرطیکہ مندر وغیرہ میں نہ چڑھایا گیا ہو بلکہ بازار سے خرید کر بلا ان کے مذھبی لوازمات کے پیش کیا جاتا ہو۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۵؍۲۲۷، جدید ڈابھیل ۱۸؍۳۴، امداد الفتاوی ۳؍۴۸۱)

عن انس بن مالک أن یهودیة أتت النبی صلی اللہ علبه وسلم بشاة مسمومة فأ کل منها فجيئ بها فقیل ألا نقتلها، قال: لا، :فمازلت أعرفها فی

لهوات رسول الله صلى الله عليه وسلم. (صحيح البخاري، الهبة، باب قبول الهدية من المشركين ١/٣٥٦، رقم:٢٥٤٣، ف:٢٦١٧)

ولا بأس بطعام المجوس كله إلا الذبيحة. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الرابع عشرفی أهل الذمة، زكريا قديم٥/٣٤٧، جديد٥/٤٠١)

والأولى للمسلمين أن لايوافقهم على مثل هذه الأحوال لإظهار الفرح والسرور. (شامي، كراچي ٦/٧٥٥، زكريا ١٠/٤٨٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲ / جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸ / ۳۱۷۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۳/۵/۲ھ

دیوالی میں غیر مسلم کا تحفہ مٹھائی وغیرہ قبول کرنا

سوال [۱۰۸۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ دیوالی کے موقع پر غیر مسلم مسلمانوں کو تحفہ میں خوشی کے طور پر مٹھائی کا ڈبہ دیتے ہیں، وہ مسلمانوں کے لئے کھانا جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: دیوالی کے موقع پر غیر مسلم، مسلمانوں کو تحفہ میں مٹھائی کا ڈبہ دیتے ہیں اس کا نہ لینا بہتر ہے؛ لیکن اگر ظاہر داری اور مصلحت سے لے لیا تو شرعاً اس کا کھانا بلا کراہت جائز ہے؛ اسلئے کہ بنفسہ وہ چیز حلال ہوتی ہے۔

لابأس بطعام المجوس كله إلا الذبيحة. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الرابع عشر، زكريا قديم٥/٣٤٧، جديد٥/٤٠١، البحرالرائق، كوئٹه ٨/١٨٤، زكريا٨/٣٣٧، محيط برهاني كوئٹه قديم ٦/١٠٣، جديد، مجلس علمی٨/٦٩، رقم:٩٦٠٣)

ولابأس بالذهاب إلى ضيافة أهل الذمة. (هندية، زكريا قديم٥/٣٤٧، زكريا جديد٥/٤٠١)

لو اتخذ مجوسى دعوة لحلق رأس ولده فحضر مسلم دعوته فأهدى إليه شيأ لا يكفر …… إن إجابة دعوة أهل الذمة مطلقا فى الشرع …… والأولى للمسلمين أن لايوافقهم على مثل هذه الأحوال لإظهار الفرح والسرور. (شامي، زكريا ١٠/٤٨٦، كراچی٦/٧٥٥)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف خاص ۴۰/۱۱۳۵۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۱/۳ھ

کیا بھنگی کے گھر کھانا کھانا دھوبی کے گھر کھانا کھانے سے بہتر ہے؟

سوال [۱۰۸۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسلمان دھوبی کے یہاں کا پکا ہوا کھانا مسلم بھنگی کے کھانے سے گھٹیا ہے یا اعلی؟ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے کہیں پڑھا ہے کہ بھنگی کے یہاں کا پکا ہوا کھانا دھوبی کے گھر کے پکے ہوئے کھانے سے اطیب ہے، بحوالہ تحریر فرمائیں؟

المستفتی: محمد شفیع مدرسہ شمس العلوم، کاشی پور نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: احقر کی نظر سے ایسی کوئی کتاب نہیں گذری کہ جسمیں مذکورہ بالا مسئلہ موجود ہے؛ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ کسی زمانہ میں دھوبی لوگوں کی چیزیں بلا اجازت اٹھا لے جایا کرتا تھا یا دھوبی کپڑا کم ہونے کا دعوی کرکے

فروخت کر دیا کرتا تھا جواب بھی ہے اور ملک غیر کی وجہ سے دھوبی کے گھر کے کھانا سے احتیاط کی ترغیب دی ہو۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/۵ ۲۲۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/ ۶/ ۱۴۱۱ھ

بطور ہدیہ موبائل میں ریچارج کرانا

سوال [۱۰۸۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے جن بزرگوں سے ہماری عقیدت ومحبت ہے ان کو ہدیہ تحفہ دینے کو دل چاہتا ہے؛ لیکن ان کے رعب یا قبول نہ کرنے کے ڈر سے ہوتا نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ان کے موبائل نمبر میں ریچارج کرا کے ان تک ہدیہ کی رقم پہونچانا شرعاً کیسا ہے؟ کوئی قباحت تو نہیں؟ اگر بعد میں فون کر کے ان کو اطلاع کرادے تو کیا حکم ہے؟ اور اگر بالکل ہی اطلاع نہ کریں تو کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد مشتاق متعلم دارالعلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: موبائل میں بطور ہدیہ ریچارج کرانا درست ہے، جبکہ ان کو اس کی اطلاع بھی دیدی جائے؛ لیکن اگر بالکل ہی اطلاع نہ دی جائے تو یہ عمل حدیث میں بیان کئے گئے ہدیہ کے لین دین کے مقصد کے خلاف ہوگا، نیز وہ اس تردد میں پڑ سکتا ہے کہ کسی کے موبائل میں ریچارج کرایا گیا ہوگا، اور لائن کی خرابی سے میرے موبائل میں آگیا؛ تو ایسی صورت میں جس کو ہدیہ کیا جارہا ہے، وہ مزید پریشان ہوجائے گا؛ اس لئے اطلاع ضرور کردینی چاہئے۔

عـن أبي هريرةؓ عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: تها دواتحابوا .

(السـنـن الكبری للبهقي قديـم ١٦٩/٦، جديد دارالفكر بيروت ١٥٤/٩، رقم:١٢١٦٩)

عـن أبي هريرةؓ، عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: تهادوا فان الهدية تـذهـب وحـرالـصـدر، ولاتـحـقـرن جارة لجارها ولو شق فر سن شاة.

(تـرمذي شريف، أبواب الولاء والهبة، باب ما جاء فی حث النبی صلی اللّٰہ عـليـه وسـلم علی الهدية النسخة الهندية،٣٤/٢، دارالسلام رقم،٢١٣٠)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍صفر المظفر ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۸۷۸/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۲/۲ھ

(۱۵) باب الموالات مع الکفار

کفار کے یہاں کون سی چیز حلال یا حرام ہے اس کی تحقیق کا حکم

سوال [۱۰۸۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کتب مذہب حنفیہ ہدایہ وغیرہ میں مصرح ہے کہ جو چیزیں غیر مسلموں کے اپنے مذہب میں حلال ہیں ان چیزوں سے غیر مسلموں کو حاصل شدہ منافع مسلمانوں کے لئے جائز ہیں چنانچہ شاۃ اور کلب خمر اور شربت کی مثال موجود ہے، اس سلسلہ میں چند امور قابل دریافت ہیں؟

الف: غیر مسلموں کے مذہب میں حلال ہونے کا فیصلہ کس بنیاد پر کیا جائیگا؟ ان کی مذہبی تعلیمات واحکامات جوان کی کتابوں میں موجود ہیں یا عرف ورواج کی بنیاد پر، یا اس بارے میں ہماری شریعت کی طرف سے کچھ مقررہ حدود ہیں جن پر ان غیر مسلموں کے مذہب کو پرکھا اور ناپا تولا جائیگا؟

ب: بالخصوص سود کا کیا حکم ہے؟ عرف حلت پر ہے جبکہ تصریحات قرآنی مثلاً **واکلھم الربوا وقدنھو عنہ** وغیرہ حرمت پر دلالت کرتی ہیں، ان کے بالمقابل خانیہ کا ایک جزئیہ بندہ کی نگاہ سے گذرا جس سے پتہ چلتا ہے کہ سود اصل میں حلال تھا چنانچہ مسئلہ لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص تمنا کرے کہ کاش اللہ تعالیٰ نے شراب، سود، محارم سے نکاح حرام نہ کیا ہوتا؛ تو وہ کافر نہ ہوگا؛ کیونکہ اصل میں یہ چیزیں حلال تھیں الخ۔ (خانیہ علی ہامش الہندیہ ۳/۵۷۴ زکریا دیوبند)

المستفتی: عبدالرشید عفی عنہ، اندھیری بمبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیر مسلموں کے مذہب کے اعتبار سے حلت وحرمت کو سمجھنے کے لئے ہم صرف اتنے کے مکلّف ہیں کہ جن چیزوں کے بارے میں ان کے یہاں حلال ہونے کی شہرت ہے، وہ ان کے لئے جائز اور حلال ہیں، اور جن چیزوں کے بارے میں ان کے یہاں حرام ہونے کی شہرت ہے وہی چیزیں ان کے لئے ناجائز اور حرام ہیں، مثلاً زنا ہے، وہ ہر قوم ومذہب میں ناجائز ہے؛ لیکن خنزیر، شراب، اور سود، وغیرہ ان کے یہاں ناجائز نہیں، اور نہ اس کی تجارت ان کے یہاں ناجائز ہے؛ ان اصولوں کے ذریعہ جہاں تک ان کے مذہب کو پرکھا اور ناپا تولا جاسکتا ہے وہ کیا جاسکتا ہے، اس سے زیادہ مسلمانوں کو ان کے مذہب کے متعلق کھود کرید کا مکلّف نہیں بنایا گیا ہے، جو حسب ذیل عبارت سے سمجھ میں آتا ہے۔

ففيه أنا لانجيز لهم بيع الخمر والخنزير علا نية ظاهراً في بلاد المسلمين وإنما لهم ذلک سراً، هذا حكم أهل الذمة، وأما أهل الصلح الذين صالحنا هم على قدرمعلوم من المال، ولم نجعلهم ذمة لنا فنتركهم ومايدينون الخ. (اعلاء السنن، ابواب البيوع الفاسدة، باب حرمة بيع الخمر، الرد على ابن حزم في تشنيعه على أبي حنيفةؒ، دارالكتب العلميه بيروت ١٤/ ١٣٥، كراچي ١٤/ ١١٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۷؍ربیع الاول ۱۴۲۸ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۲۳۶/۳۸)	۱۴۲۸/۳/۲۷ھ

ہندو ومسلم کا ایک دوسرے کو تہواروں پر ہدیہ دینا

سوال [۱۰۸۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کے محلّہ والے کافروں کو عید وبقرعید میں مٹھائیاں اور دیگر اشیاء بطور ہدیہ

دیتے ہیں اسی طرح کفار بھی اپنے ہولی اور دیگر تہوار میں مٹھائیاں اور دیگر اشیاء بطور ہدیہ دیتے ہیں تو یہ اقدام کیسا ہے کیا درست ہے؟ اور اولیٰ کیا ہے؟

المستفتی: محمد محسن تکمیل ادب مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: محلّہ داری اور پڑوس کی بناء پر کافروں کے ساتھ میل جول رکھنا، اور آپس میں ایک دوسرے کو مٹھائی وغیرہ لینا دینا جائز ہے؛ لیکن نہ لینا اولیٰ ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۲۲۷/۵، جدید ڈابھیل ۳۳/۱۸، کفایت المفتی قدیم ۳۳۱/۹، جدید زکریا مطول ۱۳۹/۱۳، فتاوی رشیدیہ قدیم ص: ۵۷۵، جدید زکریا ۵۶۳)

ولا بأس بضيافة الذمي وإن لم يكن بينهما إلا معرفة كذا في الملتقط وفي التفاريق لابأس بأن يضيف كافرًا لقرابة، أولحاجة كذا في التمر تاشي. (عالمگیري، كتاب الكراهية، الباب الرابع عشر زكريا قديم ۳٤۷/٥، جديد ٥/ ٤٠١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

كتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍ رجب المرجب ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۴۰۹۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/۷/۱۴۱۵ھ

غیر مسلموں کے مذہبی تہواروں کے موقع پر ان سے مٹھائیاں لینا

سوال [۱۰۸۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ غیر مسلموں کے مذہبی تہواروں مثلاً دسہرا، ہولی، دیوالی، وغیرہ میں ان کی طرف سے دی ہوئی مٹھائیاں کھانا اسی طرح اگر وہ اپنی شادی ودیگر تقریبات میں دعوت کریں تو ان کے یہاں جا کر کھانا شرعاً کیسا ہے؟

المستفتی: محمد سجاد قاسمی کانپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیر مسلموں کے مذہبی تہواروں کے موقع پر جومٹھائیاں تقسیم ہوتی ہیں ان کا نہ لینا بہتر ہے؛ البتہ اگر کسی مصلحت کے پیش نظر ان کی طرف سے دی ہوئی مٹھائیاں لے لی جائیں تو پھر ان کے کھانے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ وہ مٹھائیاں دیوی دیوتاؤں کے نام سے نہ ہوں۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۵/۲۲۷، جدید ڈابھیل ۱۸/۳۳، فتاوی رشیدیہ قدیم ص:۵۷۵، جدید زکریا ص:۵۶۳، مجموعۃ الفتاوی ۱/۲۰۷)

نیز اگر ہندو اپنی تقریبات میں دعوت کریں تو ان کی ضیافت قبول کرنا اور ان کے یہاں کھانا پینا درست ہے بشرطیکہ وہ ضیافت حلال چیزوں کی ہو، اگر یہ معلوم ہو جائے کہ ضیافت شیٔ حرام سے ہے تو پھر اس کا کھانا حرام ہے۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ۱۴/۳۸۲، ۹/۳۶۹، ۵/۱۱۷، جدید ڈابھیل ۱۸/۱۱۳، ۱۱۵، ۵۱، امداد الفتاوی ۴/۱۴۹)

عن أبي وائل وإبراهيم قالا: لما قدم المسلمون أصابوا من أطعمة المجوس من جبنهم وخبزهم، فأكلوا ولم يسألوا عن شئ من ذلک.
(مصنف ابن أبی شیبه، مؤ سه علوم القرآن بیروت ۱۷/۱٦ ٤، رقم: ٣٣٣٤٤)

ولابأس بالذهاب إلى ضيافة أهل الذمة هكذاذكر محمد رحمةالله عليه و في أضحية النوازل المجوس، أو النصراني إذا دعا رجلاً إلى طعامه تكره الإجابة وانه قال اشتريت اللحم من السوق فإن كان نصرانيا لابأس به.
(الهندية، كتاب الكراهية، الباب الرابع عشر، زكريا قديم٥/٣٤٧، جديد ٥/٤٠١)

ولابأس بأن يضيف كافراً لقرابة أولحاجة. (هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٧، جديد٥/٤٠١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ربیع الاول ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/۵۲۵۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۳/۲۲ھ

غیر مسلم سے انکے تہوار پر مٹھائی وغیرہ لینا

سوال [۱۰۸۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ غیر مسلموں سے کاروباری تعلقات ہیں تعلقات کی بنیاد پر وہ دیوالی کے موقع پر خوشی میں شیرنی دیتے ہیں آیا اس میٹھے کا کھانا صحیح ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد جلیس احمد ٹانڈہ، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دیوالی وغیرہ تہوار کے موقع پر غیر مسلم سے مٹھائی لینے میں اگر اس بات کا اندیشہ ہے کہ وہ کافر مسلمان کو اپنی نظر میں ہلکا سمجھے گا یا احسان جتائیگا تو لینا درست نہیں ہے، اور اگر اس طرح کی کسی دینی یا دنیوی مضرت کا اندیشہ نہیں ہے تو درست ہے۔

(مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۲۲۵/۵، و۱۸۸، جدید ڈابھیل ۱۸/۴۷۱، ۱۷۵)

وقبل من شخص علم أنه لا يقل صلابته وعزته في حقه ولايلين بسبب قبول الهدية. (عالمگيري، كتاب الكراهية، االباب الرابع عشر زكريا قديم ۳۴۸/۵، جديد، ۴۰۲/۵، تاتار خانيه زكريا، ۱۶۹/۱۸، رقم ۲۸۳۸۵، محيط برهاني، المجلس العلمي بيروت ۷۱/۸، رقم: ۹۶۱۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/رجب المرجب ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/۴۱۱۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۷/۴ھ

مسلم مزدور کا ہندو مالک سے اس کے تہوار پر ہدیہ قبول کرنا

سوال [۱۰۸۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک مسلمان کسی غیر مسلم کے یہاں ورکر ہو اور مزدوری کی اجرت روزمرہ

دے دیتا ہو، پھر کبھی غیر مسلم اپنے تہوار کے موقع سے ہمیں کچھ تحفہ وغیرہ پیش کرے تو ہمارے لئے جائز ہے یا نہیں؟ حدیث قرآن کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔

نوٹ: تہوار غیر مسلموں کا جیسے ہولی، یا دیوالی، تہواروں کے لئے کیا حکم ہے؟ تفصیل سے جواب مرحمت فرمائیں نوازش ہوگی۔

المستفتی: داؤد عالم امیر جماعت مسجد گووند پوری، دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر غیر مسلم اپنا احسان سمجھ کر دیتے ہیں یا یہ سمجھ کر دیتے ہیں کہ مسلمان ہمارے اس تہوار میں شریک ہوگئے تو لینا ناجائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۸۸/۵، جدید ڈابھیل ۱۷۵/۱۸)

اور اگر ایسا نہیں ہے؛ بلکہ محض خوشی میں بطور تحفہ پیش کردیتے ہیں تو گنجائش ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ۱۸۸/۵)

عن علي رضـ عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم إن کسریٰ أهدی له فقبل، وإن الملوک أهدوا إلیه فقبل منهم. (سنن الترمذي، السیر، باب ماجاء فی قبول هدایا المشرکین، النسخة الهندیه ۱/ ۲۸۶، دارالسلام رقم: ۱۶۲۴)

ومن المشائخ من وفق من وجه آخر، فقال: لم یقبل من شخص علم أنه لوقبل منه لایقل صلابته وعزته فی حقه ویلین له بسبب قبول الهدیة. (الفتاوی التاتارخانیة، زکریا ۱۸/ ۱۶۹، رقم: ۲۸۳۸۵، المحیط البرهانی، المجلس العلمي بیروت ۸/ ۷۱، رقم: ۹۶۱۰، هندیة، زکریا قدیم ۵/ ۳۴۸، جدید ۵/ ۴۰۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۲۳/۲۴)

دیوالی کے موقع پر غیر مسلم لڑکی کا مسلم لڑکے کو ٹیکہ لگانا

سوال [۱۰۸۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کسی مسلمان لڑکے نے غیر مسلم لڑکی کو بہن بنایا اب وہ لڑکی مسلمان لڑکے کے پاس آکر اپنے تہوار کی تمام رسومات ادا کرتی ہے مثلاً دیوالی کے موقع پر اس کے ماتھے پر ٹیکہ لگاتی ہے، اور اس کے ہاتھ میں راکھی وغیرہ باندھتی ہے، اور وہ لڑکا اسکی دلداری کے لئے ان تمام رسومات میں شریک ہوتا ہے، اور بخوشی اس کو اجازت دیتا ہے؛ تو کیا ایسا کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

المستفتی: محمد شکیل صدیقی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسا کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، نیز اس میں غیر مسلم لڑکی کو اسلام کی طرف لانے کی کوشش نہیں ہے؛ بلکہ مسلم لڑکا خود ان کے مذہب کے امور اختیار کر رہا ہے، اس سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں سختی سے منع فرمایا ہے۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِي شَيْءٍ. [آل عمران:۲۸] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ر شوال ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/ ۵۴۸۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹/ ۱۰/ ۱۴۱۸ھ

ہندوؤں کے مذہبی تہواروں میں شرکت کرنا

سوال [۱۰۸۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کے علاقہ میں دسہرے یعنی کالی پوجا میں مسلم لوگ میلا دیکھنے

جاتے ہیں اور بچوں کو دیوتا وغیرہ دکھاتے ہیں، اور مٹھائی خریدتے ہیں، اس موقع پر اپنے داماد بیٹی کو کپڑے اور روپئے مٹھائی وغیرہ دینا ضروری سمجھتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد علیم الدین، کشن گنج، بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہندوؤں کے مذہبی تہواروں میں جانا اور شریک ہونا، اور وہاں جاکر بچوں کو دیوتا وغیرہ دکھانا ایسے کام ہیں جن سے مسلمانوں کا عقیدہ خراب ہو سکتا ہے، ہندوؤں کی مشابہت کی بنا پر جائز نہیں ہے، اس کا ترک کرنا مسلمانوں پر لازم ہے۔

عن ابن عمرؓ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: من تشبه بقوم فهو منهم الحديث. (ابو داؤد شريف، اللباس، باب في لبس الشهرة، النسخة الهندية ۵۵۹/۲، دارالسلام رقم: ۴۰۳۱، سنن سعيد بن منصور، دارالكتب العلمية بيروت ۱۴۳/۲، رقم: ۲۳۷۰، مسند أحمد بن حنبل ۵۰/۲، رقم: ۵۱۱۴، مصنف ابن أبي شيبه، مؤسسه علوم القرآن بيروت ۲۷۲/۱۰، رقم: ۱۹۴۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۲/ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۲۵۶/۳۸)	۱۴۲۸/۳/۱۳ھ

غیر مسلموں کے تہوار میں شرکت اور مبارکباد کا حکم

سوال [۱۰۸۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کیا ہم غیر مسلم کے تہوار میں شریک ہو سکتے ہیں اور مبارکباد دے سکتے ہیں؟

المستفتی: منہاج الدین صدیقی، نئی دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسلمانوں کیلئے غیر مسلموں کے تہوار میں شریک ہو

کر مبارکباد دینا حرام اور کفر کے قریب پہونچا دیتا ہے، اس سے دور رہنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔

(مستفاد: امداد الفتاویٰ ۴/۲۵۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۷/۲۳۶۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۱/۹/۴ھ

انگریزوں کی طرح مکان کے افتتاح میں عالم کی شرکت

سوال [۱۰۸۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کسی جدید دوکان کا انگریزوں کے طریقہ پر افتتاح کرنا یعنی اس مکان یا دوکان کے دروازے پر ربن لگایا جاتا ہے، ہر ایک آدمی اس ربن کو کاٹتا ہے کسی امام یا مولوی کو کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نائب مہتمم مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کسی مسلمان کو کفار کے اطوار کو اپنانا یا ان کی مشابہت اختیار کرنا ہرگز جائز نہیں۔

لو شبه نفسه باليهود والنصریٰ أي صورة أوسيرة على طريق المزاح والهزل أي ولو على هذا المنوال الخ. (شرح فقه اكبر قديم ٢٢٦، جديد، اشرفي ديوبند ٢٢٨)

من تشبه بقوم فهو منهم الحديث. (ابو داؤد شريف، اللباس، باب في لبس الشرة، النسخة الهندية ٢/٥٥٩، دارالسلام رقم: ٤٠٣١، المعجم الاوسط للطبراني، دارالفكر بيروت ٦/١٥١، رقم: ٨٣٢٧، المعجم الكبير للطبراني، داراحياء التراث العربى بيروت ١٣/٣١٧، رقم: ١٤١٠٩)

خاص کر کسی امام مولوی کو وہاں جانا، شرکت کرنا، بیٹھنا، ممنوع اور سخت گناہ اور معصیت کا راستہ پیدا کرنا ہے۔

فان قدر على المنع منعهم (الى قوله) ولم يقدر على منعهم يخرج ولايقعد، لأن فى ذلک شين الدين وفتح باب المعصية على المسلين الخ.

(هداية، كتاب الكراهية، قبيل فصل فى اللبس، رشيدية ٤ /٤٣٩، اشرفي ديوبند ٤ /٤٥٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ ر ذیقعدہ ۱۴۰۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/ ۳۷۵)

غیروں کی مشابہت اختیار کرنا

سوال [۱۰۸۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) حدیث **من تشبہ بقوم فھو منھم** کا کیا مطلب ہے؟ نیز اسلامی معاشرہ کی حقیقت اور اہمیت کیا ہے؟ اور اس کے تحفظ کا کیا حکم ہے؟

(۲) مسلمانوں کے بچوں اور خاص طور پر مسلمان بچیوں کا غیر اسلامی ہندو اور عامی وضع قطع کے لباس پہننا اور پہنانا جائز ہے یا نہیں؟

(۳) علماء کرام اور علمی اداروں کے ذمہ دار اور اساتذہ اگر اپنی بچی تک کو انگریزی لباس وضع قطع میں اسکول بھیجیں تو ان کے حق میں کیا حکم ہے؟

(۴) مسلمان بچیوں کو حتی کہ چھوٹی چھوٹی بچیوں کو اسکول میں انگریزی اسکول انکی تربیت اور ماحول میں بھیجنا اور انکو وضع قطع پہنانا کہاں تک جائز ہے؟

(۵) کیا ایسی حالت میں انہیں یہ حق پہنچتا ہے کہ دوسرے کے بچوں کو اور بچیوں کو دینی تعلیم کی ترغیب دیں، مدرسہ میں داخل کریں اسلامی وضع قطع کے لئے سختی کریں؟

(۶) جو استاذ اپنی بچیوں کو غیر اسلامی وضع قطع کے ساتھ غیر اسلامی ماحول کے اسکول میں بھیجتا ہے، روکنے یا سمجھانے سے باز نہیں آتا، اگر مہتمم مدرسہ اس کی بنا پر ایسے استاذ کو مدرسہ کی ملازمت سے برطرف کردے تو شرعاً اس کا کیا حکم ہوگا؟

(۷) اگر کوئی عالم دین باپ اپنی بیٹی کا اسکول میں داخلہ کرائے اور عالم دین بیٹے کا باپ جو خود عالم دین ہیں پوتی کو غیر اسلامی وضع قطع سے پرہیز کرکے رکھے، سمجھائیں، خوشامد سماجت، ہاتھ جوڑ کر اس سے باز رہنے کو کہے؛ مگر اس کے باوجود بیٹا اپنی بیٹی کو انگریزی وضع قطع میں رکھے، اور اسکول داخلہ پر بضد اور مصر رہے، اور باپ بیٹے کے اس اقدام غیر شرعی اور اسلامی معاشرہ کے تباہ کن سمجھ کر اسلامی معاشرت کی حفاظت کے لئے کم سے کم اپنے ماحول میں اس زہر کے سرایت کرنے سے بچے کا باپ بیٹے کو عاق کردے گھر سے نکال دے تو ایسے باپ اور ایسے بیٹے کے حق میں شریعت کا فیصلہ کیا ہے؟ براہ کرم فوری اور تشفی بخش جواب سے ممنون فرمائیں، برادران وطن کو مسلمانوں سے شکایت ہے کہ مومی دھاری میں نہیں بستے اور بنیاد پرست ہیں براہ کرم اگر اس پر بھی مختصر روشنی ڈالیں تو بہت ہی کرم ہوگا؟

المستفتی: عبدالحق گاؤں پوسٹ نورتھ قاضی پاڑہ باراسات، ۲۴ پرگنہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ حدیث شریف کا مطلب یہی ہے کہ اگر کوئی شرفاء کی خصوصیات اور طور طریق اور حلیہ، لباس، وغیرہ کو اختیار کرکے مشابہ بنتا ہے تو وہ عنداللہ شرفاء کے زمرہ میں شامل ہوگا، اور اگر کوئی فساق یا کفار کی خصوصیات اور طور طریق وغیرہ کا حلیہ لباس اختیار کرتا ہے، اور انہیں سے مشابہت اختیار کرتا ہے؛ تو عنداللہ وہ فساق یا کفار کے زمرہ میں شامل ہوگا۔

عن ابن عمرؓ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من تشبہ بقوم فھو منھم. (أبوداؤد شریف، کتاب اللباس، باب في لبس الشھرة، النسخة الھندیة ۲/۵۵۹، دارالسلام رقم: ۴۰۳۱)

من تشبه نفسه بالكفار مثلا فى اللباس وغيره أو با لفساق، أوبالفجار، أوباهل التصوف والعلماء، والابرار فهو منهم اى فى الاثم والخيرالخ. (مرقات، باب اللباس، امدادیه ملتان، ۸/۲۵۵، بذل المجهود، جديد دارالبشائر الاسلاميه بيروت ۱۲/۵۹، قديم هندي، ۵/۴۱، مصری ۱۶/۳۵٦، عون المعبود، فی شرح أبي داؤد، دارالكتاب العلمية بيروت ۴/۷۸، فتاوی شامي، باب مايفسد الصلوة ومايكره فيها، مطلب فی التشبه بأهل الكتاب، کراچي ۱/٦۲۴، زكريا ۲/۳۸۴)

اسلامی معاشرہ کی اہمیت اور اس کا تحفظ فرض کفایہ ہے۔

(۲) غیر اسلامی وضع قطع اور لباس وغیرہ حرام ہے جیسا کہ مذکورہ حدیث شریف سے ثابت ہے۔

(۳) چھوٹی بچیوں کو مذکورہ ضرورت انگریزی زبان کی تعلیم دینا جائز ہے؛ لیکن ان کو اغیار کے اسکول میں رہ کر ان کے اسلامی اخلاق وکردار کو، اور لباس کو بگاڑنا حرام ہے، اورنا جائز ہے۔

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جدهؓ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ليس منا من تشبه بغيرنا الحديث. (سنن الترمذي، ابواب الاستئذان، باب ماجاء فی كراهية اشارة اليد فی السلام، النسخة الهندية ۲/۹۹، دارالسلام رقم، ۲٦۹۵، عون المعبود، دارالكتب العلميه بيروت ۴/۷۸)

(۴) علماء پر زیادہ ذمہ داری ہونے کی وجہ سے اس اقدام پر علماء زیادہ گنہگار ہونگے۔

(۵) دوسرے کو صحیح راہ بتلانا علماء پر لازم ہے، خود عمل نہ کرنے کی سزا علیحدہ ملیگی۔

(٦) اگر استاذ اپنی بالغہ لڑکی کو مذکورہ وضع قطع پر اسکول بھیجتا ہے تو وہ فاسق ہے، مہتمم مدرسہ پر لازم ہے کہ غیر متبع شریعت استاذ کو مفرور کریں وہ فاسق استاذ کی معزولی کی راہ اختیار کرسکتا ہے۔

(۷) ایسی صورت میں بیٹا سخت گنہگار ہوگا؛ لیکن شریعت اسلام میں عاق کرنا جائز نہیں ہے، اگر باپ عاق کر کے انتقال کر جائے تو بیٹا وراثت سے محروم نہ ہوگا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳۱۸/۴، فتاوی محمودیہ قدیم ۲۳/۵، جدید ڈابھیل ۴۸۷/۲۰)

الإرث جبري لايسقط بالإسقاط. (تكمله ردالمحتار، مطلب فی حادثه الفتاوی كراچي، ۵۰۵/۷، زكريا، ۶۷۸/۱۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۴۵۴/۲۵)

کافر کے جھوٹے کا حکم

سوال [۱۰۸۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ غیر مسلم کا جھوٹا کھانا مسلمان کے لئے پاک ہے یا ناپاک؟

المستفتی: شفیق احمد تھانہ ناگ پھنی دولت باغ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کافر کا جھوٹا شرعاً پاک ہے

وسؤر الآدمی طاهر ويدخل فی هذا الجنب والحائض والنفساء والكافر .

(فتاوی عالمگيري، كتاب الطهارة، الفصل الثانی فيما لايجوز به التوضؤ، زكريا قديم ۲۳/۱، جديد، ۷۶/۱، درمختار كراچي ۲۲۲/۱، زكريا ۳۸۱/۱، طحطاوی علی المراقي قديم/۱۷، جديد دارالكتاب ديوبند، ۲۹/۱، مبسوط سرخسي، دارالكتاب العلميه بيروت ۷۴/۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ذیقعدہ ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۷۹/۲۴)

قادیانی بھائی سے میل جول رکھیں یا نہیں؟

سوال [۱۰۸۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کہتا ہے کہ میرا بھائی قادیانی ہے، وہ زمین جائیداد باغ وتالاب ہر چیز میں شریک ہے حتی کہ گھر بھی ایک ساتھ ہے، زمین وگھر پیسہ کا تقسیم کرنا آسان ہے؛ لیکن تالاب کا تقسیم کرنا بہت مشکل ہے ہاں اگر تالاب بڑا ہوتا تو بہت زحمت کے بعد ممکن ہوتا ورنہ بہت مشکل ہے؟ یا تالاب میں بہت سارے شریک ہیں؟ ان میں سے ایک قادیانی ہے یا ایک قادیانی ایک ہندو، اور باقی مسلمان ہیں؟ تو ان وجوہ میں ان سے میل رکھنا باتیں کرنا کیسا ہے؟ ادھر لوگ کہتے ہیں کہ جب غیر مسلمانوں سے میل جول، بات کرنا جائز ہے؛ تو ان سے باتیں کرنا کیوں نہیں جائز ہوگا؟

المستفتی: محمد شہید اللہ الحسینی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسے حالات میں تکلم ناگزیر ہو تو بوقت ضرورت بات کر سکتے ہیں؛ لیکن ان کے ساتھ بلاضرورت شدیدہ میل جول بود وباش کا معاملہ نہ رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے؛ کیونکہ اندیشہ ہے کہ وہ بھی اسی رنگ میں رنگ جائے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۳۰۸/۵، جدید، ڈابھیل ۱۲۹/۲، معارف القرآن، اشرفي ۳۶۷/۳)

قال اللّٰہ تعالیٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَآءَ. [سورة الممتحنة: ۱] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۱۹/۲۴)

شیعوں کے ساتھ کھانا کھانا کیوں ممنوع ہے؟

سوال[۱۰۸۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مؤمنوں کو شیعہ کے یہاں کھانا کیسا ہے؟ اگر ممنوع ہے تو کیوں ہے؟ احادیث اور قرآن کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں نوازش ہوگی؟

المستفتی: محمد سلیم وارثی دولت باغ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شیعوں سے میل جول اوران کے یہاں کھانا پینا اورانکی شادی بیاہ وغیرہ میں شرکت کرنا پکے سچے مسلمان کے لئے جائزنہیں ہے، نیز غیر مسلم ہندو کے ساتھ کھانے پینے میں کوئی ظاہری دھوکہ نہیں ہے،اس لئے اس غیر مسلم کا کفر تمام مسلمانوں پر ظاہر ہے اسکے ساتھ کھانے پینے سے دوسرے مسلمان اس غیر مسلم کے مذہب کو صحیح نہیں سمجھیں گےاور شیعوں کے ساتھ میل جول میں یہ دھوکہ ہے کہ انجان لاعلم مسلمان اس کو دیکھ کر شیعہ کے عقائد صحیح سمجھ سکتے ہیں کیونکہ شیعہ اپنے کو سچا مسلمان ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے لہٰذا تمام مسلمانوں پر ضروری ہے کہ شیعوں کے ساتھ میل جول نہ رکھیں۔(مستفاد: فتاوی احیاء العلوم ۱۵۲/۱)

قولہ تعالیٰ: وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّا . [ھود:۱۱۳]

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴ ؍ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۸۶/۲۴)

حنفیوں کا شیعوں کے ساتھ کھانا پینا

سوال[۱۰۸۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: کہ شیعہ مذہب حنفیہ مذہب کے ساتھ مل کر کھانا پینا شادی بیاہ مفردانی اورکام کاج وغیرہ ایک ساتھ کریں تو جائز ہے یا نہیں؟ اور یہی شیعہ لوگ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مانتے ہیں، اورابو بکرؓ، عثمان غنیؓ، اورحضرت عمر فاروقؓ کو نہیں مانتے ہیں، یعنی یہی لوگ تین خلیفہ کو نہیں مانتے؛ بلکہ کہتے ہیں کہ صرف خلافت کے حقدار حضرت علیؓ ہیں، یعنی خلافت ان تینوں کو نہیں ملی، صرف حضرت علی کو ملی اس کے بارے میں علماء کرام کیا کہتے ہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جائز نہیں ہے۔

قوله تعالى: وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّار. (هود:۱۱۳)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵ رشوال المکرّم ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/۱۴۳۶)

غیر مسلم کو مستقل باورچی بنانے اور اپنے ساتھ کھلانے کا حکم

سوال [۱۰۸۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ غیر مسلموں کو مستقل طور پر باورچی بنانا اور ایک ہی دسترخوان پر کھلانا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: شفیع احمد الاعظمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کتب فقہ میں اسکی صراحت موجود ہے کہ غیر مسلم کے ساتھ مستقل طور پر کھانا پینا مکروہ ہے، تو اس سے غیر مسلم کو مستقل باورچی بنانے کی کراہت اورممانعت ثابت ہوجاتی ہے۔

والأكل مع الكفار لو ابتلى به المسلم لابأس لومرة أو مرتين

أما الدوام عليه يكره الخ. (فتاوى بزازية، كتاب الكراهية، الفصل الثالث فيما يتعلق بالمناهي، جديد زكريا ۳/۲۰۳، وعلى هامس الهندية زكريا۶/۳۵۹، هندية زكريا قديم ۵/۳۴۷، جديد ۵/۴۰۱، الفتاوى التاتار خانية زكريا ۱۸/۱۶۶، رقم:۲۸۳۷۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/۱۷۸۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۰/۵/۱۶ھ

غیر مسلم کیلئے خنزیر وشراب کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۱۰۸۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شراب اور خنزیر کی فروختگی اسی طرح سود کا پیسہ غیر مسلموں کے حق میں حلال ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: چونکہ غیر مسلم اپنے دھرم میں اس پیسہ کو جائز سمجھتے ہیں اس لئے یہ پیسہ انکے حق میں حلال ہے۔ (مستفاد: انوار رحمت ۱۵۶)

ولاينعقد بيع الخنزير من المسلم؛ لأنه ليس بمال فی حق المسلمين، فأما أهل الذمة فلا يمنعون في بيع الخمر والخنزير...... فلأنه مباح الانتفاع به شرعًا لهم كالخلّ وكالشّاة لنا فكان مالاً فی حقهم فيجوز بيعه. (بدائع الصنائع، زكريا۴/۳۳۴)

ان بلالاً رضی اللہ عنہ قال لعمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ: إنّ عمالک يأخذون الخمر والخنازير فی الخراج، فقال: لاتأخذونها منهم ولكن ولو هم ببيعها وخذوا أنتم من الثمن ......فهذا عمر رضی اللہ عنہ قد أجاز لأهل الذمه بيع الخمر والخنزير وأجاز

للمسلمين أخذ أثمانهما في الجزية والخراج وذلک بمحضر من الصحابة ولم ينكر عليهم منكر. (اعلاء السنن کراچي ۱۴/ ۱۱۱،۱۱۲، دارالکتاب العلميه بيروت ۱۴/ ۱۳۴، البناية، نعيميه ديوبند۸/ ۳۸۳) **فقط واللہ** سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف خاص ۱۱۵۰۹/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۴/۲۹ھ

ہندؤں کے رہنماؤں کی شان میں کہے گئے اشعار کا حکم

سوال [۱۰۸۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید جو کہ مسلمان ہے اور شاعر بھی ہے وہ اپنے دیوان میں مندرجہ ذیل اشعار لکھتا ہے؟ اس شاعر اور کاتب پر اور ناشر پر از روئے شرع کوئی گناہ تو نہیں ہے ''رام'' کے سلسلے میں رقم طراز ہیں؟

وہ کہ دشرتھ کا دلارا وہ صداقت کا امیں ۔۔۔ وہ کہ جو آیا تھا بن کر حامل عزم ویقین
وہ کہ تھا انس ومحبت کا جہاں میں دیوتا ۔۔۔ وہ کہ تھا جو درحقیقت پیکر صدق وصفا کا
وہ کہ جس نے توڑ ڈالی ہر تکبر کی کمان ۔۔۔ وہ جسکی زندگی تھی حق پرستی کا بیان
وہ مخفی قوتوں کا حقیقی راز تھا ۔۔۔ وہ صحیح معنوں میں جو فطرت کے ایک غماز تھا
وہ کہ جس نے ڈھادئے باطل کے طاقت کے تول ۔۔۔ وہ کہ جس نے کردئے راون کے ہر چشم سرنگو
وہ کہ ٹوٹی کشتیوں کا جو کہ تھا ایک نا خدا ۔۔۔ وہ کہ جو بھٹکی ہوئی دنیا کا خضر ورہنما

اور ''ایکتا'' کے تحت لکھتے ہیں؟

ہیں تو ناقوس واذاں دونوں کی ہے آواز ایک
شیخ ہو یا ہریجن دونوں کی پرواز ایک

دیر ہو یا ہو حرم دونوں کا ہے اعجاز ایک
ایک انداز نظر ہے ایک شان انجمن
ایک میرا گلستاں ایک بہر چمن

اور بھی اسی انداز کے کافی اشعار ہیں؟ شریعت مطہرہ کی روشنی میں جواب فرمائیں؟

المستفتی: مفتی احمد میاں کوح قاضی، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ان اشعار کے اندر ہندو مذہب کے رہنما اور پیشوا کے لئے پیغمبرانہ صفات ثابت کی گئی ہیں جو ان کے پرسنل لا اور مذہب کی سخت تعظیم وتوقیر ہے، جس سے مسلمانوں پر سخت غلط اثر پڑ سکتا ہے، اور مسلمان موحد، کاتب، قاری سے ان کے مذہب کی عقیدت کا مظاہرہ بھی ہوتا ہے؛ اسلئے زید خود اور کاتب وقاری سب حرام اور گناہ کبیرہ کے مرتکب ہونگے۔

لقوله تعالى: وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّار. [هود:۱۱۳]

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكَافِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ. (آل عمران:۲۸)

وفی تفسیره و كذا اذ دخلوا فی المو الات المنهی عنها السلام والتعظيم والدعاء بالكنية والتوقير بالمجالس الخ. (احكام القرآن للتهانوي ۲/۸)

وقوله تعالى: الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكَافِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا. (النساء: ۱۳۹)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴ رمحرم الحرام ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۴۹/۲۴)

غیر مسلموں سے تعلق کی حد

سوال [۱۰۸۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ گاؤں میں ہندوؤں کی خاصی آبادی ہے جن کے یہاں سے شادی بیاہ میں نیوتہ (تعاون) چلتا ہے، اور وقت ضرورت پر دوسری چیزوں کا بھی لین دین ہوتا ہے، شادی کے موقع پر، اسی طرح شادی کے بعد دولہن کے دوبارہ آنے کے بعد ہندو مسلم دونوں کے یہاں خوشی میں مٹھائیاں تقسیم کرنے کا رواج ہے، شادی کی یہ مٹھائیاں لی دی جاتی ہیں، بعض مسلمان شادیوں کے موقع پر اپنے ہندو متعلقین کو مدعو کرتے ہیں، اور ہندو بھی اپنے مسلم متعلقین کو مدعو کرتے ہیں، اور کھلاتے ہیں، واضح رہے کہ شادی کی دعوت میں غیر کو مدعو کرنے اور غیر کی شادی میں شرکت کرنے کا معاملہ عمومی نہیں ہوتا، عموماً چند متعلقین ہی ہوتے ہیں، بقیہ ہندوؤں کی مذہبی تقریبات میں شرکت، ان کے پرشاد اور نذر و نیاز کو لینے سے مکمل احتیاط برتی جاتی ہے، ایک عالم صاحب کا کہنا ہے کہ کفار کی اس طرح کی غیر مذہبی دعوتوں میں شرکت کرنا موالات مع الکفار میں داخل ہے، سوال یہ ہے کہ یہ باتیں موالات میں داخل ہیں؟ موالات کے حدود کیا ہیں؟ کفار سے کس قسم کا تعلق اور تعاون جائز ہے؟

المستفتی: محمد اجمل قاسمی، مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دو چیزیں بالکل الگ الگ ہیں:

(۱) **موالات**: دلی محبت ومودت کے ساتھ تعلق اور ہمدردی قائم رکھنا یہ صرف مسلمانوں کے ساتھ جائز ہے غیر مسلموں کے ساتھ جائز نہیں ہے قرآن مقدس کے اندر اللہ تعالیٰ نے غیروں کے ساتھ اسی موالات کی ممانعت فرمائی ہے۔

(۲) **مواسات**: نفع رسانی اور ہمدردی کا اظہار کرنا جس میں دلی محبت ومودت کا ہونا

لازم نہیں ہے؛ بلکہ دلی محبت ومودت کے بغیر بھی نفع رسانی اور ظاہری ہمدردی اور ظاہری تسلی دینا ممکن ہوتا ہے، اور مواسات مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کے ساتھ بھی جائز اور درست ہے۔

(مستفاد: معارف القرآن ۲/۵۰، سورہ آل عمران: ۲۸)

جیسا کہ حدیث پاک کے اندر یہودی پڑوسی کے ساتھ ہمدردی اور رواداری کرنے کی بات آئی ہے۔

عن عبداللہ بن عمرؓ أنه ذبحت له شاة فجعل يقول لغلامه أهديت لجارنا اليهودي، أهديت لجارنا اليهودي؟ سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: مازال جبريل يوصيني بالجار حتى ظننت أنه سيورثه .

(الأدب المفرد /٤٤، رقم:١٠٥، ابوداؤد، الأدب، باب في حق الجوار، النسخة الهندية ٢/٧٠١، دارالسلام رقم:٥١٥٢، ترمذي، ابواب البر والصلة، باب ماجاء في حق الجوار، النسخة الهندية ٢/١٦، دارالسلام رقم: ١٩٤٣، مسند احمد، ٢/١٦٠، رقم:٦٤٩٦)

لہٰذا غیر مسلموں کی شادی بیاہ میں خوشی کا اظہار کرنا اور خوشی میں ان کو کوئی تحفہ پیش کرنا یا ان کا تحفہ قبول کرنا یہ از قبیل مواسات و مدارات ہے، از قبیل موالات نہیں، اس لئے اتنی بات کی گنجائش ہے؛ لیکن بطور نیوتہ ان کو کچھ دینا یا ان سے کچھ لینا یہ جس طرح مسلمانوں کے ساتھ جائز نہیں، غیر مسلموں کے ساتھ بھی ناجائز ہے۔

الا أن تتقوا منهم تقاة فحينئذ تجوز الموالاة ظاهرا . (روح المعاني سورة آل عمران تحت رقم الأية:٣٧، زكريا ديوبند ٣/٢٢٨، ومثله في احكام القرآن للجصاص مطلب في بيان معنى التقية وحكمها، سهيل اكيڈمی لاهور ٢/٩، جديد، زكريا ٢/١٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶؍رجب المرجب ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/ ۱۱۵۸۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶/۷/۱۴۳۵ھ

کافر کے گھر پر کھانا کھانا کیسا ہے؟

سوال [۱۰۸۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کافر کے گھر کھانا کیسا ہے جواب مرحمت فرمائیں؟

المستفتی: محمد دانش دولت باغ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بہتر یہ ہے کہ غیر مسلموں کے گھر کھانا نہ کھایا جایائے؛ لیکن اگر شدید ضرورت پیش آجائے یا فتنہ کا خطرہ ہوتو گوشت کے علاوہ سبزی دال وغیرہ معمولی انداز سے کھالیا جائے جس سے ضرورت پوری ہوجائے، یا فتنہ سے حفاظت ہوجائے اسلئے کہ حدیث شریف میں ان کے برتنوں کے استعال کی بھی ممانعت آئی ہے۔

عن أبی ثعلبة رضی اللہ عنه قال: سئل رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم عن قدور المجوس قال انقوها غسلا واطبخوا فیها.

عن أبي ثعلبة الخشنی رضی اللہ عنه انه قال یا رسول اللہ إنا بأرض اهل کتاب نطبخ فی قدور هم ونشرب فی آنیتهم فقال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم إن لم تجدوا غیرها فارحضوها بالماء. (ترمذي شریف، ابواب الاطعمة، باب ما جاء فی الاکل فی آنیة الکفار، النسخة الهندیة، ۲/۲، دارالسلام رقم، ۱۷۹٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ربیع الاول ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳٦؍۷۲۹۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۳/۱۴ھ

ادھیوگ ویاپار پریشد منڈل سے تعلق رکھنے کا حکم

سوال [۱۰۸۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ ایک تنظیم جو اترپردیش کے کاروباریوں کی ''ادھیوگ ویاپار پریشد منڈل'' کے نام سے جانی جاتی ہے، جو خود کو غیر سیاسی اور بلا لحاظ مذہب وملت کاروبار کرنے والے سودا گروں کا ہمدرد ہونے کا دعویٰ کرتی ہے، اس بار اس نے آگرہ میں الیکشن اور میٹنگ کا پروگرام رکھا، جس کے ایجنڈے میں دوسری تمام باتوں کے علاوہ مندرجہ ذیل نکات بھی شامل تھے، جو بمطابق پروگرام ہوئے بھی۔

الف: لکشمن کی تصویر کو مالا ڈالنا اور دیپ جلانا۔

ب: وندے ماترم (اے بھارت ماں تیری پوجا کرتے ہیں) گانا۔

ت: سنکھ بجانا اور ویدوں کا پڑھنا اور پاٹھ کرنا۔

(۱) تو کیا کسی مسلمان کا اس طرح کی میٹنگ میں جانا درست ہے؟

(۲) اس تنظیم سے مسلمان منسلک رہ سکتے ہیں؟

(۳) اس تنظیم سے جو مسلمان منسلک ہیں، ان کو اب کیا رخ اختیار کرنا چاہئے؟

(۴) اس تنظیم سے منسلک رہ کر کیا دائرہ اسلام میں رہ سکتا ہے؟

(۵) اب تک منسلک رہے لوگوں کے واسطے کیا حکم شرعی ہے؟

(٦) کیا مسلمان کاروباریوں کو اپنے مفادات کی خاطر اتحاد ملت کے واسطے ایک تنظیم بنا لینی چاہئے تا کہ ان باطل معاملات سے نجات مل سکے؟

(۷) کیا کسی اور سیکولر تنظیم جو ان تمام باتوں سے دور رہ کر سب کو ساتھ لے کر چلنے کا وعدہ کرے، تو اس سے ناطہ کیا جاسکتا ہے؟ جو مسلمان کاروباریوں کا بھرپور خیال رکھے۔

المستفتی: حافظ طاہر حسین، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱/۲/۳) ایسی تنظیم میں جب کہ اس کے ایجنڈے میں الیکشن اور میٹنگ کے پروگرام کے موقع پر شرکیہ اعمال بھی ہوتے ہیں، ایسی

میٹنگ میں شریک ہونا یہ ان کے مذہب کو تقویت پہونچانا ہے اور ان کے شرکیہ اعمال پر عملاً رضامندی کا اظہار ہے؛ لہٰذا کسی مسلمان کے لئے ایسی میٹنگ میں شریک ہونا ہرگز جائز نہیں ہوگا، اور ایسی حالت میں اس تنظیم سے منسلک رہنا بھی درست نہیں ہوگا۔ نیز جو مسلمان اس میں منسلک ہیں، ان کے لئے ضروری ہے کہ جلد از جلد اس سے علیحدگی اختیار کرلیں۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ. [هود:۱۱۳]

(۴) اگر وہ مسلمان ان کے شرکیہ اعمال میں شریک نہیں ہوتے، محض مجلس میں شریک ہوتے ہیں، تو وہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوں گے؛ لیکن اس میں شرکت کر کے عملاً ان کے مذہب کو تقویت پہونچانا ہے؛ اس لئے شرکت بھی جائز نہیں اور اگر وہ ان اعمال میں بھی شریک ہوتے ہیں، تو دائرہ اسلام سے خارج ہوجائیں گے۔

ولانزاع في أن من المعاصي ماجعله الشارع امارة للتكذيب وعلم كونه كذٰلک بالأدلة الشرعية كسجود الصنم، وإلقاء المصحف في القاذروات والتلفظ بكلمات الكفر، ونحو ذٰلک مما ثبت بالأدلة أنه كفر. (شرح عقائد:۱۰۸)

(۵) ایسے لوگوں پر توبہ کرنا لازم ہے اور توبہ کے بعد پھر ایسے پروگرام میں شرکت نہ کریں۔

عن أبي عبيدة بن عبد الله عن أبيهؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: التائب من الذنب كمن لا ذنب له. (ابن ماجه، أبواب الذهد، باب ماجاء في ذكر التوبة، النسخة الهندية ۲/۳۱۳، دارالسلام رقم: ۴۲۵۰)

(۶) مسلمان کاروباریوں کو اپنے مفادات کے واسطے ایسی تنظیم بنانے کی شرعاً اجازت ہے۔

(۷) اگر وہ واقعتاً اپنے دعویٰ کے مطابق تنظیم چلاتے ہیں، تو ایسی تنظیم سے ناطہ وتعلق رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ اس میں غیر مسلموں کے مذہبی وہ امور نہ ہوں، جو ماقبل میں مذکور ہوئے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۱/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۱۰۸)	۱۴۲۴/۶/۲۱ھ

فساق وفجار کے ساتھ رہن سہن کا حکم

سوال [۱۰۸۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حامد کی آمدنی حلال ہے؛ لیکن ہمیشہ فساق وفجار کے ساتھ رہتا ہے، دین اسلام سے اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے، نہ نماز، نہ روزہ، نہ حج اور نہ زکاۃ اور نہ ہی والدین کے حقوق کی ادائیگی اور اپنے ان کاموں پر کوئی ندامت بھی نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ان لوگوں کے یہاں دعوت میں شرکت کرنا، ان کا ہدیہ، تحفہ قبول کرنا، ان کے ساتھ مل کر مشترکہ قربانی کرنا شریعت کے اعتبار سے کیا حکم رکھتا ہے، اور ان کے ماتحت لوگوں کو ان کی کمائی سے نان ونفقہ لینا کیسا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل ومفصل جواب عنایت فرما کر شکریہ کا موقع مرحمت فرمادیں۔

نوٹ: واضح رہے کہ ان لوگوں کا مذکورہ ذریعہ آمدنی کے علاوہ اور کوئی کمائی کا ذریعہ نہیں ہے؛ لہٰذا مذکورہ کاموں اور ان سے آمد شدہ روپیہ کا کیا حکم ہوگا۔

المستفتی: محمد زکریا، دارالعلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فساق وفجار کے ساتھ رہنے، فرائض وواجبات کی ادائیگی نہ کرنے اور والدین کی نافرمانی کے سبب ایسا کرنے والے شخص کا کھانا پینا شرعاً حرام نہیں ہوگا؛ البتہ فاسق فاجر کے ساتھ رہنے اور مذکورہ کاموں کا گناہ اس کے سر ہوگا اور وہ اس کے سبب عنداللہ مؤاخذہ دار ہوگا۔

ويجيب دعوة الفاسق. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الثاني عشر في الهدايا والضيافات، زكريا قديم ٥/٣٤٣، جديد ٥/٣٩٧، تاتارخانية، زكريا١٨/١٧٥، رقم: ٢٨٠٧)

وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ

عَذَابٌ مُّهِيْنٌ. [النساء: ١٤] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍رجب المرجب ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۴۶۴/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۷/۱۴۳۲ھ

غیر مسلم کی چھینک کا جواب کس وقت دیا جائے گا؟

سوال [۱۰۸۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حدیث وفقہ میں جو آتا ہے کہ غیر مسلم کی چھینک کا جواب **یهديكم الله** سے دینا چاہئے کیا اگر غیر مسلم چھینک کے بعد **الحمد لله** کہے تب یہ جواب ہے جیسا کہ مسلمان چھینک کے بعد **الحمد الله** کہے، تب **يرحمك الله** کہے، ورنہ نہیں تو کیا غیر مسلم کے لئے بھی یہی ہے کہ وہ چھینک کر **الحمد الله** کہے، تو **يهديكم الله** کہے، ورنہ کچھ نہ کہے شرعاً کیا حکم ہے؟

المستفتی: عبد الرشید قاسمی، سیڑھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: غیر مسلم اگر **الحمدلله** کہے تب اس کے جواب میں **يهديكم الله ويصلح بالكم** کہنا مشروع ہے اور اگر وہ **الحمد لله** نہ کہے، تو اس کے جواب میں کچھ نہیں کہا جائے گا۔

عن أبي موسىٰ رضي الله عنه قال: كان اليهود يتعاطسون عند النبي صلى الله عليه وسلم يرجون أن يقول لهم يرحمكم الله فيقول يهديكم الله ويصلح بالكم.

(ترمذي شريف، الادب، باب ماجاء كيف يشمت العاطس، النسخة الهندية ١٠٣/٢، دارالسلام رقم: ٢٧٣٩، أبو داؤد، الادب، باب كيف يشمت الذمي، النسخة الهندية٢/٦٨٧، دارالسلام رقم:٥٠٣٨، مسند أحمد ٤/٤٠٠، رقم:١٩٨١٥)

عن أبي بردةؓ، قال: دخلت على أبي موسیٰؓ، وهو في بيت بنت الفضل بن عباس –إلى– سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إذا عطس أحدكم فحمد الله فشمتوه، فإن لم يحمد الله فلا تشمتوه. (مسلم شريف، الذهد، باب تشميت العاطس، النسخة الهندية ۲/ ٤١٣، بيت الأفكار رقم: ٢٩٩٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ / جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۵۵۰)

گرجا گھر اور مندر کی امداد کرنے کا حکم

سوال [۱۰۸۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے مندر، گرجا گھر یا اور کوئی معبد میں مسلمان کو امداد کرنا کیسا ہے؟ اور اسی طرح غیر مسلموں کی حکومت میں کیا حکم ہے؟

المستفتی: فرید الرحمٰن، لاجپت نگر مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیر مسلموں کی عبادت گاہ اور مندر گرجا گھر کی امداد کرنا مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے، اس سے مسلمان سخت گنہگار ہوگا۔ نیز غیر مسلم حکومت میں بھی یہی حکم ہے۔

عن الإمام القرا في أنه أفتىٰ بأنه لا يعاد ما انهدم من الكنائس، وأن من ساعد على ذلك، فهو راض بالكفر والرضا بالكفر كفر. (شامي، فصل في الجزية، مطلب في أحكام الكناس والبيع، زكريا ٦/ ٣٣٠، كراچي ٤/ ٢٠٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۷/ محرم الحرام ۱۴۲۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۲۰۸)	۱۴۲۵/۱/۱۸ھ

ہندؤں کو چندہ دینا

سوال [۱۰۸۹۳]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہندؤں کو چندہ دینا جائز ہے؛ حالانکہ وہ مسلمان کے خلاف سازشیں کرتے ہیں اور بت وغیرہ میں صرف کرتے ہیں، جس کی وجہ سے مشرکوں کو شرک میں امداد ملتی ہے؟

المستفتی: محمد جلال الدین، ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں جن صورتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان میں غیر مسلموں کی امداد اور ان کو چندہ دینا شرعاً جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ۱۴/۸۷-۱۷/۱/۵۰۱، جدید ڈابھیل ۱۹/۷۷۵)

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [سورۃ المائدۃ: ۲] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/۷۰۰۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱/۷ھ

کیا غیر مسلم مالدار غریب مسلمان کی امداد کرسکتا ہے؟

سوال [۱۰۸۹۴]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک غیر مسلم اپنے پاس سے کسی مسلمان ضرورت مند کے لئے مثلاً سردی میں لحاف کمبل وغیرہ یا اور کوئی ضرورت کی چیز امداد کے طور پر دینا چاہتا ہے، تو کیا مسلمان ضرورت مند کے لئے لینا اور اس کا استعمال کرنا درست ہے یا نہیں؟ لہٰذا برائے مہربانی قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد نذیر الدین، انجیر والی مسجد بھٹی اسٹریٹ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر غیر مسلم مالدار بخوشی مسلمان فقیر غریب کی امداد کرتا ہے، تو مسلم محتاج کے لئے اسے قبول کر کے تصرف میں لانا جائز اور درست ہے۔

كما استفاده من الشامي: ان شرط وقف الذمي أن يكون قربة عندنا وعندهم كالوقف على الفقراء، أو مسجد القدس. (شامي، كتاب الوقف، مطلب قد يثبت الوقف بالضرورة، زكريا ٦/ ٥٢٤، كراچي ٤/ ٣٤١، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٤/ ١٤٠، البحرالرائق، كوئٹه ٥/ ١٨٩، زكريا ٥/ ٣١٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ جمادی الأولیٰ ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۷/ ۲۶۷۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۷/ ۵/ ۱۴۱۲ھ

مسلمان کا پرشاد کے چندہ میں شرکت کرنا

سوال [۱۰۸۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک مسلمان ایک ہندو کی کمپنی میں ملازم ہے، جہاں معدودے چند مسلمان ہیں اور باقی اکثریت ہندو صاحبان کی ہے، یہ لوگ ہر منگل کو پرشاد بانٹتے ہیں اور پرشاد بانٹنے کے لئے سب سے چندہ وصول کرتے ہیں، جس میں مسلمان بھی شامل ہیں، جن کو مجبوراً یا ظاہری طور پر نباہ کرنے کی غرض سے چندہ دینا پڑتا ہے، اس کے بعد چندہ کئے ہوئے روپیہ سے مٹھائی بطور پرشاد خریدی جاتی ہے، اور وہ مٹھائی کسی مورتی کے آگے غالباً ہنومان کی مورتی کے آگے رکھ کر اور کچھ اسلوک وغیرہ پڑھ کر سب میں تقسیم کردی جاتی ہے، جن میں مسلمان بھی شامل ہیں۔ امر واضح طلب یہ ہے کہ آیا ایسے پرشاد کے لئے مسلمان کو چندہ دینا یا مٹھائی بطور پرشاد کھانا ٹھیک ہے؟ اس کے لئے فتویٰ درکار ہے۔

المستفتی: عبد القیوم، معرفت کمل آرٹس، ایمپوریم، چوک گلشہید، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پرشاد کے چندہ میں مسلمانوں کوشرکت کرنا جائز نہیں۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَان. [سورة المائدة:٢]

حتی الامکان اس سے بچنے کی کوشش کی جائے؛ البتہ مجبوری کی حالت میں دفع مضرت کی نیت سے اگر کچھ دیدیں، تو گنجائش ہے، مگر نیت صرف دفع مضرت کی ہو، نہ کی چندہ میں شرکت کی۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۴/۱۸۳، جدید ڈابھیل ۱۹/۵۸۷)

أما إذا أعطى...... ليدفع به عن نفسه ظلمًا فلا بأس به. (مرقاة المفاتيح الامارة والقضاء، باب رزق الولاة وهداياهم، امدادية ملتان ٧/٢٤٨)

اسی طرح اس چڑھے ہوئے پرشاد کولینا شرعاً جائز نہیں اوراگر لےلیں تو کھانے سے احتراز کریں۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۵/۲۲۷، جدیدڈابھیل ۱۸/۳۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/۶۱۲۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۲۵/۴/۱۴۲۰ھ

پوجا کے لئے چندہ دینا

سوال [۱۰۸۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہندولوگ مسلمان سے جبراً پوجا کے لئے چندہ وصول کرتے ہیں، مسلمان فتنہ سے بچنے کے لئے مجبوراً چندہ دیتے ہیں۔ کیا اس حالت میں چندہ دینے سے مسلمان گنہگار ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: مولانا مسیح الزماں، کلکتہ (بنگال)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حتی الامکان پوجا کے چندے سے بچا جائے۔

قال الله تعالیٰ: وَتَعَاوَنُوْا عَلٰی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلٰی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَان. [المائدة:۲]

البتہ مجبوری کی حالت میں دفع مضرت کی نیت سے اگر کچھ دیدے تو گنجائش ہے، مگر نیت صرف دفع مضرت کی ہو نہ کہ چندہ میں شرکت کی۔

أما إذا أعطی......لیدفع به عن نفسه ظلمًا فلا بأس به. (مرقاة المفاتیح، الامارة والقضاء، باب رزق الولاة وهدایاهم، امدادیة ملتان ۲۴۸/۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍صفر المظفر ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/۳؍ ۶۰۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۲/۲۸ھ

غیر مسلم تنظیم کا مسلم لڑکی کی شادی بیاہ میں امداد کرنا

سوال [۱۰۸۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ادھر کئی جگہ غیر مسلم تنظیم نے ایسے خیراتی ادارے قائم کئے ہیں، جن میں کسی بھی مذہب کی لڑکی کی شادی لڑکی والوں کے پسند کردہ لڑکے سے کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

نیز نکاح کی رسم اپنے مذہب کے مطابق ادا کرائی جاتی ہے، اور اس میں جہیز دان کی صورت میں برتن کپڑے وغیرہ ضروری سامان طے شدہ پروگرام کے مطابق یہ خیراتی ادارہ ہی لڑکی کو دیتا ہے، اس سے وہ غریب خاندان فائدہ اٹھا رہے ہیں، جو غربت کا شکار ہیں اور جہیز دان دینے سے مجبور ہیں اور اس خرچہ سے بچنے کے لالچ میں اس پروگرام سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کیا شریعت اسلامیہ غریب مسلمانوں کو ایسی تنظیم اور خیراتی ادارہ سے فائدہ اٹھانے کی جازت دے گی؟ اور اس سے مسلمانوں کی غیرت اور اسلام کے وقار کو کوئی نقصان تو نہیں؟

المستفتی: محمد یونس جامع مسجد، احمد گڈھ (پنجاب)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر غیر مسلموں کی طرف سے ان مسلمانوں پر احسان جتانے کا اندیشہ نہ ہو، اور نہ ہی ان غریب مسلمانوں کے مذہبی امور میں دخل اندازی کا اندیشہ ہو، تو ایسی صورت میں غیر مسلموں کے خیراتی ادارے کے تعاون سے مسلم لڑکی کی شادی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے؛ لیکن اگر غریب مسلموں کے مذہبی امور میں اس کی وجہ سے دخل اندازی کا خطرہ ہو، تو ان کا تعاون نہ حاصل کیا جائے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۵۱۳/۱، جدید ڈابھیل ۱۳۹/۱۵، فتاوی احیاء العلوم ۱۱۴/۱)

وأما الإسلام فليس من شرطه، فيصح وقف الذمي بشرط كونه قربة عندنا وعندهم. (البحر الرائق، كتاب الوقف، كوئٹه ۱۸۹/۵، زكريا ۳۱۶/۵، حاشية چلپي على تبيين الحقائق، امدادية ملتان ۳۲۴/۳، زكريا ۲۵۹/٤) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲ ررجب المرجب ۱۴۱۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۴۱۰۳)	۲/۷/۱۴۱۵ھ

مندر کے لئے چندہ دینا

سوال [۱۰۸۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید ملازم ہے، ایک ہندو کے یہاں اور وہ مندر کے لئے چندہ کر رہا ہے، زید اگر روپیہ نہیں دیتا، تو نقصان کا اندیشہ ہے، ایسی صورت میں چندہ دینے پر مجرم ہوگا یا نہیں؟ اور اگر دیدیا ہے، تو اس کی توبہ کا کیا طریقہ ہے؟

المستفتی: انعام احمد قاسمی، امام جامع مسجد کاسگنج، ایٹہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مندر کے لئے چندہ دینا جائز نہیں۔ (مستفاد: احیاء العلوم ۶۳/۱)

اگر دیدیا ہے، تواللہ سے توبہ واستغفار کرلے، اللہ کے حضور میں نادم ہوکر اللہ سے مانگے۔

قال اللہ تعالیٰ: اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ . [سورة النساء:۱۷]

وقال في موضع آخر: وَهُوَ الَّذِىْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ. [شوریٰ: ۲۵] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ربیع الاول ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/۵۶۷۹)

نمائش میں شرکت کا حکم

سوال [۱۰۸۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل کمپنی باغ میں نمائش لگ رہی ہے، اس نمائش میں عورت مرد سبھی شامل ہوتے ہیں، اس میں شرکت کا کیا حکم ہے؟ ازروئے شرع جواب سے نوازیں۔

المستفتی: حافظ مقیم الدین، قاضی ٹولہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نمائش میں عورتوں اور مردوں کی عریانیت، تماشائی اور رنگیلی کا بازار لگتا ہے، تو ایسی جگہ بغیر ضرورت شدیدہ کے جانا اپنے آپ کو معصیت میں مبتلا کرنا ہے؛ اس لئے بغیر ضروت شدیدہ نمائش میں جانا ممنوع ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۲۰۸/۵، جدید ڈابھیل ۵۷۰/۱۹)

عن علي بن الحسين رضـ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: **إن من حسن إسلام المرأ تركه ما لا يعنيه.** (ترمذي شريف، الزهد، باب بلاترجمة، النسخة الهندية ۵۸/۲، دار السلام رقم: ۲۳۱۷)

عن أبي هريرةؓ عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: كتب على ابن آدم نصيبه من الزنا مدرك ذٰلک لا محالة فالعينان زنا هما النظر والأذنان زناهما الاستماع واللسان زناه الكلام، واليد زنا ها البطش، والرجل زناها الخطي، والقلب يهوى يتمنىٰ ويصدق ذٰلک الفرج ويكذبه. (مسلم شريف، كتاب القدر، باب قدر على ابن آدم وخطه من الزنا وغيره، النسخة الهندية ۲/۳۳۶، بيت الأفكار رقم: ۲۶۵۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۳۴۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۴/۲۸ھ

ہندو و مسلم تہواروں کے موقعوں پر لگے میلے میں دوکان لگانا

سوال [۱۰۹۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عرس، دسہرا، ہولی، عید یا اس جیسے بہت سے ہندو و مسلم تیوہاروں کے موقعوں پر میلے لگتے ہیں، اس میں جا کر کسی جائز چیز کی دوکان لگانا، جھلانا چلانا نشانے کی دوکان لگانا وغیرہ کیسا ہے جائز یا ناجائز؟

المستفتی: عبد الباسط، جوٹھیا، رام پور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ہندوؤں کے مخصوص قومی اور مذہبی میلے میں جا کر، ان کی رونق کو بڑھانا ناجائز ہے، مسلمانوں کو ان سے اجتناب ضروری ہے؛ لہٰذا تجارت یا دوکان وغیرہ لگانے کی غرض سے جانا بھی منع ہے اور اہل علم کو جانا ہرگز زیبا نہیں ہے؛ البتہ عید وغیرہ میں دوکان لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۲۰۸/۵، جدید ڈابھیل ۵۶۹/۱۹)

من كثر سواد قوم، فهو منهم. (كشف الخفاء، دارالكتب العلمية بيروت ٢/٢٤٤، رقم:٢٥٨٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ ذیقعدہ ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۵۹۰/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۱۱/۵ھ

غیر مسلم کے مذہبی سامان کی خرید وفروخت کرنا

سوال [۱۰۹۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ دیوتاؤں کی تصویریں، پٹاخے، اسی طرح وہ سامان جن کو صرف غیر مسلم استعمال کرتے ہیں، مثلاً بندی راکھی اور کتب باطلہ وغیرہ کی خرید وفروخت کرنا ازروئے شرع کیا حکم رکھتا ہے؟ جبکہ امداد الفتاوی ۲۵۶/۴؍ کی عبارت سے تو پتہ چلتا ہے کہ پٹاخے کی خرید وفروخت جائز ہے؟

المستفتی: محمد جاوید

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دیوتاؤں کی تصویروں کی خرید وفروخت کرنا درست نہیں ہے۔ حدیث شریف میں جاندار کی تصویر سے متعلق سخت وعیدیں آئی ہیں۔

سمعت عبد الله بن مسعودؓ، قال: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم: يقول: إن أشد الناس عذابًا عند الله المصورون. (بخاري شريف ٢/٨٨٠، رقم: ٥٧١٧، ف: ٥٩٥٠)

اسی طرح پٹاخے اور آتش بازی میں اپنے مال کو ضائع کرنا فضول خرچی ہے، جس کے متعلق قرآن کریم میں وعید آئی ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُوْرًا. [سورة الاسراء:٢٧]

لہٰذا آتش بازی گناہ کا کام ہے، اس کی تجارت کرنا گویا گناہ کے کام میں مدد کرنا ہے، جو آیت قرآنیہ کی رو سے ممنوع ہے، اسی طرح بندی، راکھی اور کتب باطلہ کی خرید و فروخت کرنے میں کافروں کی مذہبی رسم اور ان کے شعار میں تعاون کرنا ہے جو معصیت ہے اور تعاون علی المعصیت کی بنا پر ان تمام چیزوں کی خرید وفروخت کرنا جائز نہیں ہے، یہی قول راجح ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے اور امداد الفتاویٰ میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے قول کو نقل فرمایا ہے؛ لیکن فتوی امام صاحب کے قول پر نہیں ہے؛ بلکہ صاحبین کے قول پر عدم جواز کا فتویٰ ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۶/۵۴۱، رشیدیہ قدیم ص:۵۱۶، جدید زکریا ص:۴۹۴)

قال اللہ تعالیٰ: وَتَعَاوَنُوْا عَلٰی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلٰی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة:۲]

ويجوز بيع البربط، والطبل، والمزمار، والدف، والنرد وأشباه ذلک في قول أبي حنيفةؒ، وعندهما لايجوز بيع هذه الأشياء (إلى قوله) والفتوى على قولهما. (هندية، كتاب البيوع، الفصل الخامس في بيع المحرمات زكريا قديم ۳/۱۱۶، جديد ۳/۱۱۷)

ومن كسر لمسلم بربطًا، أو مزمارًا، أو دفًا، أو أراق له سكرًا، أو منصفًا ضمن قيمته لغير لهو ويصح بيع هذه الأشياء عند الإمام، وقالا: لايضمن، ولايجوز بيعها؛ لأن هذه الأشياء أعدت للمعصية، فيبطل تقومها، وبقولهما قالت الأئمة الثلاثة: وعليه الفتوىٰ لفساد الزمان فيما بين الناس.

(مجمع الأنهر ـ دار الكتب العلمية بيروت ۴/۹۷-۹۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۸۶۶/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۶/۲۲ھ

ہندو ملازم کا دوکان میں پوجا کرنا

سوال [۱۰۹۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کی دوکان ہے، ملازم ہندو ہے، وہ ملازم اپنے عقیدے کے مطابق مورتی یا تصاویر لٹکاتا ہے اور اس کی پوجا وہیں دوکان پر کرتا ہے، منع کرنے پر نقصان کا اندیشہ ہے، ایسی صورت میں زید پر کوئی جرم ہے یا نہیں؟ اور برکت کی دوری کے لئے جو تصاویر ہیں، اس میں یہ دوکان شامل ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: انعام احمد قاسمی، امام جامع مسجد، کاسگنج، ایٹہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مورتی اور اس پوجا سے روکنے کی صورت میں تو نقصان کا خطرہ ہوسکتا ہے؛ لیکن اس ملازم کو الگ کرنے میں کوئی خطرہ نہیں ہے؛ اس لئے ایسے ملازم کو برطرف کر کے دوکان کی پوجا پاٹ سے حفاظت کرنا مالک کا فرض ہے۔ نیز یہ دوکان برکت سے دور ہوگی۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة: ۲] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶؍ ربیع الاول ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۶۷۹/۳۳)

مسلم کا غیر مسلم کی رسومات میں شرکت کرنا

سوال [۱۰۹۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کافر کے مرنے کے بعد تیرہویں ہوتی ہے، تو کیا مسلمان اس میں کھانے

وغیرہ میں شرکت کرسکتا ہے کہ نہیں؟

المستفتی: عبدالحمید، راعینی، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسلمان کو غیر مسلموں کی ایسی رسومات میں شرکت نہیں کرنی چاہئے۔

ولا یأکل معه حال مایظهر الشرک والکفر. (هندية، کتاب الکراهية، الباب الرابع عشر، زکریاقدیم ۵/ ۳۴۷، جدید ۵/ ۴۰۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ر رجب المرجب ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۲۴۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/ ۷/ ۱۴۲۰ھ

غیر مسلموں کی شادی بیاہ یا ان کے جنازہ میں شریک ہونا

سوال [۱۰۹۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ غیر مسلموں کے ساتھ رہنا سہنا یا ان کے شادی بیاہ میں شریک ہونا اور اگر وہ مرجائیں، تو مٹی میں جانا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد ابرار، بہرائچی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیر مسلموں کے ایسے عقائد واعمال جو اسلام سے کسی طرح میل نہیں کھاتے، ان میں کسی بھی صورت میں شرکت کی اجازت نہیں؛ لہٰذا مردے کے ساتھ شمشان جانا اور اس کو جلانے میں شریک ہونا جائز نہیں؛ البتہ جب تمام مشرکانہ رسوم پوری ہوجائیں، تو تعزیت کے لئے ان کے گھر جائے، تو کوئی حرج نہیں، اسی طرح ان کے شادی بیاہ میں حسب ضرورت شرکت کی بھی گنجائش ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكَافِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ. [آل عمران: ۲۸]

ولا بأس بضيافة الذمي، وإن لم يكن بينهما إلا معرفة كذا في الملتقط وفي التفاريق لا بأس بأن يضيف كافراً لقرابة، أو لحاجة كذا في التمرتاشي. (عالمگیری، کتاب الكراهية، الباب الرابع عشر، زکریا قدیم ۵/۳۴۷، جدید ۵/۴۰۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍محرم الحرام ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۹۶۳/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۱/۱۴۲۷ھ

غیر مسلم کی شادی وغم میں شرکت کرنا

سوال [۱۰۹۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک لڑکا عاقل و بالغ مسلمان ۲۲؍سالہ ہے، جو کہ علم دین کو بھی جانتا ہے، اور دنیاوی علوم میں پی ایچ ڈی اسکول میں انگلش کا ماسٹر ہے، تمام عقلی وعملی صلاحیت سے لیس ہے؛ لیکن اس نے کچھ ایسی باتیں اپنا رکھی ہیں اور ایسی حرکتیں کرتا ہے کہ جس سے ہم بہت نیچے دکھتے ہیں اور اسلام کے خلاف ساری حرکتیں ہیں، مثلاً وہ اب تک جنم دن کافی دھوم دھام سے مناتا ہے، خوب دعوتیں کرتا ہے اور کیک کاٹا جاتا ہے، کھانے وناچ گانے کا پورا انتظام ہوتا ہے۔

(۲) ہولی میں ہندوؤں کے یہاں جاکر ان کے ساتھ کھاپی کر اپنے آپ کو رنگوا کر رنگ و ہولی ان کے ساتھ کھیلتا ہے۔

(۳) اگر اس کے بنائے دوست یا بھائی ہندو مرجاتا ہے، تو وہ شمشان گھاٹ جاکر اس کی چِتا کو آگ بھی لگا دیتا ہے۔

(۴) وہ اپنے ماتھے پر تلک (ٹیکہ) بھی لگوالیتا ہے اور ہولی (پوجا) میں بھی شامل ہوجاتا ہے۔

(۵) ہندوؤں کا تہوار رکھشا بندھن بھی وہ خوب مناتا ہے، اس کی کلائی پر کئی کئی راکھی بندھی ہوتی ہیں۔

(۶) دیوالی میں بڑی دھوم دھام سے ان کے ساتھ رہ کر مناتا ہے، غرض کہ ہندوانہ کام ورسم کو بلاکسی جھجھک کے اپناتا ہے، اس بارے میں اس کے ماں باپ سے کہا جاتا ہے، تو وہ لوگ ایک ساتھ جواب دیتے ہیں کہ میاں یہ تو اونچے ماحول میں رہتا ہے اور اسٹنڈرکا نام دیتے ہیں اوران حرکتوں میں ان کا ساتھ دیتے ہیں، یعنی کوئی نکیر نہیں کرتے ہیں؛ لہٰذا اس مسلمان کے بارے میں شرعاً کیا حکم ہے اور یہ کس زمرے میں آئے گا اور ایسا کرنا کیسا ہے؟ اس شخص سے دوستی ورشتہ داری رکھنی چاہئے کہ نہیں؟ ان سارے مسائل کے جوابات قرآن وحدیث کی روشنی میں مرحمت فرمائیں نوازش ہوگی۔

المستفتی: محمد فرید ولد حاجی محمد شریف، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال میں جتنے امور کا ذکر کیا گیا ہے، سب کا جواب ایک ہی ہے۔ غیر مسلم کے تہواروں میں شرکت اوران کے ساتھ ہولی کھیلنا اور غیر مسلم کی طرح دھوم دھام سے جنم دن منانا ممنوع اور ناجائز ہے۔ اور ان کی میت میں شمشان گھاٹ جاکر ان کی طرح عمل کرنا اور ان کی پوجا پاٹ میں شرکت کر کے ماتھے پر ٹیکہ لگوانا اور ان کے تہوار کو ان ہی کی طرح دھوم دھام سے منانا یہ سارے امور ناجائز اور حرام ہیں، ان سے توبہ کرنا لازم اور ضروری ہے۔ آئندہ کے لئے ایسے امور سے دور رہنے کے عہد کے ساتھ توبہ لازم ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۹/۳۳۶)

قال اللّٰہ تعالیٰ: **لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِي شَيْءٍ .** [آل عمران:۲۸]

اگر یہ ان چیزوں سے توبہ کر کے باز نہ آئے، تو مسلمان کو ایسے شخص سے حقہ پانی بند کر کے بائیکاٹ کر دینا چاہئے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ . [هود: ۱۱۳] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ر صفر المظفر ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۲۳۵/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۲/۹ھ

غیر مسلم میت کو جلانے کے لئے جانا

سوال [۱۰۹۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جیسا کہ ایک مسلمان کے غیر مسلموں سے تعلقات ہوتے ہیں اور غیر مسلم کے یہاں کوئی موت ہو جائے، تو کیا وہ مسلمان اس غیر مسلم کے مردے کے ساتھ اس کو آگ میں جلانے کے لئے جا سکتا ہے یا نہیں؟ یا صرف غیر مسلم کے گھر تک جائے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیر مسلم دوست کے یہاں موت کے موقع پر صرف گھر جا کر تعزیت کرنے کی گنجائش ہے، جلانے کے لئے ساتھ جانا جائز نہیں؛ کیونکہ اس میں جلانے کے عمل کا اعزاز ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۲۷۶/۱۶، جدید ڈابھیل ۴۱/۹)

لا ينبغي لقريبه المسلم أن يتبع الجنازة حتى لاتكون مكثر سواد الكفرة ......وفي الطحاوي: ولابأس بأن يعود إذا مرض. (تاتارخانية، زكريا ۷۷/۳، رقم: ۳۷۵۳، المحيط البرهاني، الملجس العلمي بيروت ۹۵/۳، رقم: ۲٤۹۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹ر محرم الحرام ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۱۴۵/۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۱/۱۹ھ

مسلم وغیر مسلم کا ایک دوسرے کی میت میں شریک ہونا

سوال [۱۰۹۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ یہاں ایک رواج بن رہا ہے کہ مسلم غیر مسلم پڑوسی یا دوست کی میت میں اور اس کی رسم میں شریک ہوتے ہیں، اسی طرح غیر مسلم بھی اپنے مسلم دوست یا پڑوسی کے جنازہ میں شریک ہوتے ہیں، شریعت مطہرہ کا اس بارے میں کیا حکم ہے؟

المستفتی: ابوالحسن، سیتامڑھی، مسجد سفۂ ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مسلم کا غیر مسلم کی میت میں اور اس کی رسم میں شریک ہونا جائز نہیں ہے؛ البتہ اس کی تعزیت کر سکتے ہیں اور اگر کوئی غیر مسلم مسلمانوں کے جنازہ میں آجاتا ہے، تو اسمیں مسلمانوں کا دخل نہیں۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۲۳۳/۴، فتاوی محمودیہ قدیم ۲۹۲/۱۴، جدید ڈابھیل ۳۹/۹، کفایت المفتی قدیم ۱۹۰/۴، جدید زکریا مطول ۴۴/۵)

لا ينبغي لقريبه المسلم أن يتبع الجنازة حتى لاتكون مكثر سواد الكفرة ......وفي الطحاوي: ولابأس بأن يعود إذا مرض. (تاتارخانية، زكريا ۷۷/۳، رقم: ۳۷۵۳، المحيط البرهاني، المجلس العلمي بيروت ۹۵/۳، رقم: ۲٤۹۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/صفر المظفر ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۴۹۸/۳۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۲/۱۷ھ

عذر شدید کی بناء پر غیر مسلم کی لاش شمشان لے جانا اور اس کے گھر کھانا بھیجنا

سوال [۱۰۹۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ قصبہ کے ایک محلّہ میں ۱۵-۱۶؍سال کی ایک غیر مسلم لڑکی جو بہت دنوں سے بیمار چل رہی تھی، لڑکی کے پتا کیلاش نے اپنی لڑکی کا کافی علاج کرایا؛ لیکن وہ ٹھیک نہیں ہوسکی، مرنے سے کچھ دن پہلے اس کو کسی ملاجی کو دکھایا، تو اس ملاجی نے لڑکی پر کچھ اثرات بتائے، جس سے پورے محلّہ میں یہ بات پھیل گئی کہ کیلاش کی لڑکی کو زبردست اثر ہے اور جو بھی شخص اس لڑکی کو ہاتھ لگائے گا، اس کو بھی خطرہ ہوسکتا ہے، آخر کار لڑکی کی موت ہوگئی، محلّہ میں بہت سے غیر مسلم رہتے تھے؛ لیکن کسی غیر مسلم پڑوسی نے نہ تو اس لڑکی کو نہلایا اور نہ ہی اس کو اپنے کندھوں پر رکھ کر شمشان لیجانے کو تیار ہوئے؛ حالانکہ کیلاش کا محلّہ میں کسی سے کوئی لڑائی جھگڑا بھی نہیں ہے، ایسی مجبوری میں کیلاش کے گھر والوں نے صبح خود ہی اسے نہلایا اور کفن وغیرہ دے کر تیار کیا۔ اب لڑکی کا والد کیلاش لڑکی کو شمشان گھاٹ لیجانے کے لئے آدمیوں کا انتظار کرتا رہا؛ لیکن پڑوس کا کوئی غیر مسلم لڑکی کو کندھا لگا کر لیجانے کو تیار نہیں ہوا، کیلاش اور کیلاش کا بھائی اور دو مسلمان یہ چاروں اپنے کندھوں پر رکھ کر اس میت کو شمشان گھاٹ تک لے گئے اور دونوں مسلم بھائی میت کو شمشان گھاٹ تک پہونچا کر فوراً اپنے گھر چلے گئے، اس کے جلانے یا کسی بھی اور رسم میں یہ دونوں مسلم بھائی شریک نہیں ہوئے، اس کے بعد محلّہ والوں نے اس کے گھر کھانا پہونچانا بھی مناسب نہیں سمجھا، تو ایک وقت کا کھانا بھی ان دونوں مسلم بھائیوں نے پہونچایا، تو کیا انسانیت اور پڑوس کے ناطے ان دونوں مسلم بھائیوں نے جو کام کیا ہے، اس میں اسلامی شریعت کے تحت ان دونوں بھائیوں کے ایمان میں کوئی کمی ہوئی اسی طرح ان کے پیچھے نماز وغیرہ ہوسکتی ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیر مسلم پڑوسی کے یہاں کھانا بھیجنا سوال نامہ میں درج کردہ پریشانی کے بغیر بھی جائز ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے یہاں جب گوشت یا عمدہ کھانے کا نظم ہوتا، تو وہ گھر والوں سے سوال کرتے کہ ہمارے یہودی پڑوسی کے یہاں

بھیجا ہے کہ نہیں، ہاں البتہ غیر مسلموں کے غمی وخوشی کے رسم ورواج میں شریک ہونا ممنوع ہے؛ لیکن سوال نامہ میں جوعذر اور پریشانی پیش کی گئی ہے، ایسے سخت عذر اور پریشانی میں جب کندھا لگانے کے لئے کوئی غیر مسلم تیار نہیں ہے، تو ان کے رسم ورواج میں شرکت کئے بغیر صرف شمشان گھاٹ تک ان کی میت کو پہونچا کر فوراً واپس آجائے اور غسل کرلیا جائے، تو ان مسلمانوں کے ایمان میں فرق نہیں آئے گا، اوران کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں ہے، جیسے حضرت علیؓ کے والد ابو طالب کی موت پر حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ جاؤ ابو طالب کو کسی گڈھے میں دفن کر کے آجاؤ۔

عن مجاهد أن عبد الله بن عمرؓ ذبحت له شاة في أهله فلما جاء قال: أهديتم لجارنا اليهودي؟ أهديتم لجارنا اليهودي. (ترمذي شريف، باب ماجاء في حق الجوار، النسخة الهندية، ۲/۱٦، دار السلام رقم:۱۹٤۳)

عن أبي اسحاق سمعت ناجية بن كعب يقول: سمعت علياؓ يقول: لما توفي أبي أتيت رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقلت: إن عمك قدتوفي فقال: إذهب فواره، فقلت: أنه مات مشركا فقال اذهب فواره لاتحدثن شيئًا حتى تأتي ففعلت فأتيته فأمرني أن أغتسل. (البداية والنهاية ۳/۱۲۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۷ر شوال المکرّم ۱۴۳۰ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۷۹۵/۳۸)	۱۴۳۰/۱۰/۱۷ھ

غیر مسلم کے چڑھاوے کا حکم

سوال [۱۹۰۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید راستہ میں جارہا تھا، وہیں ایک جگہ ہندوؤں کے ایک چمنڈا (ان کے

عقیدے کے مطابق ان کے بزرگ کی قبر پر کھانے کا بھنڈارا چل رہا تھا، جہاں بہت بھیڑ لگی ہوئی تھی، اسی بھیڑ میں ایک ہندو زید کو جاننے والا بھی تھا، اس نے زید سے کھانے کے لئے کہا زید اس کے بلانے پر گیا، اور اس نے بھی بھنڈارے کے کھانے میں سے کھالیا۔

اب سوال یہ ہے کہ غیر مسلموں کے یہاں ان کے دیوی دیوتاؤں کے نام سے کھلائے جانے والے کھانے کو کھانے کی وجہ سے اس کا ایمان باقی ہے یا نہیں؟ اسی طرح تجدید نکاح کی کوئی ضرورت تو نہیں ہے؟ واضح رہے کہ زید بالکل جاہل وان پڑھ ہے، اسے اس طرح کا کوئی مسئلہ معلوم نہیں ہے؟

المستفتی: محمد فہیم بروالان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایک مسلمان کے لئے غیر مسلم کے اجتماعات و تہواروں میں شرکت جائز نہیں ہے، اسی طرح ان کے دیوی دیوتاؤں کے چڑھاوے کا کھانا بھی جائز نہیں ہے، تاہم اگر زید نے ناواقفیت کی بنا پر بھنڈارے کا کھانا کھالیا ہے، اور اس کے دل میں اس تقریب اور تہوار کی کوئی عظمت یا ہندوؤں کے ساتھ ان کے تہواروں میں باقاعدہ ان کا ساتھ دینے کا ارادہ نہیں تھا، تو اس عمل کی وجہ سے زید کافر نہیں ہوا۔ اور نہ ہی اسے تجدید نکاح کی ضرورت ہے؛ البتہ اس کو چاہئے کہ جو کچھ سرزد ہو چکا ہے، اللہ سے نادم ہوکر توبہ کرے اور آئندہ کے لئے ایسی تقریبوں میں شرکت سے اپنے آپ کو مضبوطی سے باز رکھے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔

ومایأتي به المجوس في نیروزهم من الأطعمة إلی الأکابر والسادات من کانت بینهم وبینهم معرفة ذهاب ومجي فقد قیل إن أخذ ذلک علی وجه الموافقة لفرحهم یضر ذلک لدینه، وإن أخذه لا علی ذلک الوجه لابأس به والاحتراز عنه أولیٰ. (الفتاوی التاتارخانیة، زکریا ۳۴۸/۷، رقم:۱۰۶۵۷،

محیط برهاني ۷/ ٤٢٩، رقم: ٩٢٨٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۰۳۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۴/۲۱ھ

میاں بیوی کا غیر مسلم دوستوں کے ساتھ مندر جانا

سوال [۱۰۹۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سائل اپنی بیوی اور اپنے کچھ غیر مسلم دوستوں عورتوں اور مردوں کے ساتھ مندر میں گیا تھا، سائل کی بیوی بھی ہمراہ تھی مندر کے اندر پہونچنے کے بعد وہاں کے پجاری نے جس طرح سے ہندو عورتوں کو پوجا کے طریقہ سے تلک لگایا اور گنگا جل دونوں ہاتھوں میں دے کر کچھ پی لینے اور باقی جل اپنے سر پر لگا کر سر کے بالوں میں لگایا، اسی طرح کا رسمی طریقہ میری بیوی سے بھی کرایا اور سوکھے چنے کھانے کے لئے دیئے، جسے میری بیوی نے لے کر اپنے بچے کو کھلا دیئے، یہ ایک غیر اسلامی عمل تھا جو کہ نادانستگی میں میری بیوی سے ہوگیا۔ برائے مہربانی اس بارے میں اصلاح فرما کر فتوی ارسال فرمائیں۔

المستفتی: فیصل حسین، جگر کالونی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں آپ کا اور آپ کی بیوی کا یہ عمل نہایت ہی سخت گناہ ہے؛ اس لئے ندامت کے ساتھ دونوں میاں بیوی کو توبہ واستغفار کرنا لازم اور ضروری ہے۔ نیز آئندہ پوری احتیاط واجتناب لازم ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۲/ ۴۲۳، جدید ڈابھیل ۱/ ٣٦٧)

قال اللّٰہ تعالیٰ: إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَأُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا. [سورة النساء: ١٧]

هو كبيرة من الكبائر وهل يكفر؟ قال بعضهم.........: إن أرادبه العبادة يكفر، وإن أرادبه التحية لم يكفر ويحرم عليه ذلك. (فتاوی عالمگیري، كتاب السير، الباب التاسع في آحكام المرتدين، زكريا قديم ٢/ ٢٨١، جديد زكريا ٢/ ٢٩٢)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍شعبان المعظم ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۳۴۸)

گرودوارے وغیرہ پر تیار کیا ہوا حلوہ کھانا کیسا ہے؟

سوال [۱۰۹۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ گرودوارے یا کھنڈ پاتھ پر تیار کیا ہوا، اور کرپان بیچ سے نکال کر متبرک بنایا ہوا حلوہ چاول (پرشاد) لینا اور کھانا کیسا ہے؟ نیز دیوالی کے موقعہ پر دوستوں سے مٹھائی لینا، کھانا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد یونس، جامع مسجد، احمد گڈھ (پنجاب)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گرودوارے یا کھنڈ پاتھ پر تیار کیا ہوا اور کرپان نکال کر متبرک بنایا ہوا حلوہ چاول لینا اور کھانا سب ناجائز ہے اور دیوالی کے موقعہ سے ہندوؤں سے مٹھائی وغیرہ لینے میں تفصیل ہے، وہ یہ ہے کہ اگر ہندو اپنا احسان سمجھ کر دیتے ہیں، یا یہ سمجھ کر دیتے ہیں کہ مسلمان ہمارے اس تہوار میں شریک ہوگئے، تب تو نہیں لینا چاہئے اور اگر محض دوستانہ تعلق یا پڑوسیت کی وجہ سے دیتا ہے، تو لے لینے میں کوئی حرج نہیں۔

(مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۵/ ۱۸۸، جدید ڈابھیل ۱۸/ ۱۷۵-۳۳)

ومن المشائخ من وجه آخر، فقال: لم يقبل من شخص علم أنه لو قبل

منه لاتقل صلابته وعزته في حقه ويلين له بسبب قبول الهدية، قبل من شخص علم أنه لا تقل صلابته وعزته في حقه ولا يلين له بسبب قبول الهدية.

(تاتارخانية، زكريا ۱۸/۱٦۹، رقم: ۲۸۳۸۵، المحيط البرهاني، المجلس العلمي بيروت ۸/۷۱، رقم: ۹٦۱۰، هندية، زكريا قديم ۵/۳٤۸، جديد ۵/٤۰۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ رجب المرجب ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۴۱۰۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲/ ۷/ ۱۴۱۵ھ

غیر مسلموں کے میلوں میں مسلمان کا دوکان لگانا

سوال [۱۰۹۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ غیر مسلموں کے تیوہاروں اور میلوں میں مسلمان دوکانداروں کو خورد ونوش کا سامان، نیز پھل کھلونے وغیرہ فروخت کرنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد اقبال، شیر کوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیر مسلموں کا میلہ اگر ان کے دھرم سے متعلق ہے، تو اس میں بغرض تجارت بھی شرکت جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی رشیدیہ ۵۵٦)

اور اگر ان کے دھرم سے متعلق نہیں ہے؛ بلکہ تجارتی نمائش ہی ہے، تو اس میں بغرض تجارت شرکت جائز ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۴/ ۲٦۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲٦/ ذی قعدہ ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/ ۵۰۳۳)

ب:۱۰۹۱۲ اہل کتاب اوران سے متعلق احکام کا تحقیقی جائزہ

اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) اوران سے متعلق کچھ احکام ایسے ہیں جن میں ان کے ساتھ مسلمانوں جیسا معاملہ کیا جاسکتا ہے، خاص طور پر دو مسئلے ایسے ہیں جن میں قرآن وحدیث میں ان کا معاملہ مسلمانوں جیسا قرار دیا گیا ہے:

(۱) ان کی عورتوں سے نکاح کا جواز۔

(۲) ان کے ذبیحہ کا حلال اور جائز ہونا۔

ان ہی دونوں مسئلوں پر سوال نامہ میں پوچھے گئے مسائل کا مدار ہے، اس سلسلے میں ۸/سوالات کے ذریعہ سے مسائل پوچھے گئے ہیں، جو علی الترتیب سرخیوں کے ساتھ پیش کئے جارہے ہیں، ملاحظہ فرمائیے:

اہل کتاب کسے کہتے ہیں؟

سوال [۱]: اہل کتاب کسے کہتے ہیں؟ ان سے کون سی قوم مراد ہے؟

المستفتی: اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اہل کتاب اس قوم کو کہا جاتا ہے جو دین سماوی کا اعتقاد رکھتی ہو اور آسمانی کتاب پر بھی ایمان رکھتی ہو اور اس قوم کی کوئی ایسی کتاب بھی ہو جس کا اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہونا قطعی طور پر ثابت ہو۔ اور یہ بات الگ ہے کہ اس قوم نے اپنی کتاب کو تحریف کر کے بگاڑ دیا ہو؛ لیکن فی الجملہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہو، جیسا کہ درج ذیل جزئیات سے واضح ہوتا ہے:

اس کو ''تبیین الحقائق'' میں ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

وكل يعتقد دينا سماويا وله كتاب منزل كصحف إبراهيم عليه السلام وشيث، وزبور داؤد عليه السلام فهو من أهل الكتاب، فتجوز مناكحتهم وأكل ذبائحهم. (تبيين الحقائق، زكريا ۲/ ۵۷۷-۵۷۸، هندية قديم ۱/ ۲۸۱، جديد ۱/ ۳۴۷)

اس کو ''**الفقه الإسلامي وأدلته**'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

الكتابية: هي التي تؤمن بدين سماوي كاليهودية والنصرانية، وأهل الكتاب: هم أهل التوراة والإنجيل لقوله تعالىٰ: ﴿اَنْ تَقُوْلُوْا اِنَّمَا اُنْزِلَ الْكِتَابُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا﴾ [الأنعام: ۶/ ۱۵۶] (الفقه الإسلامي وأدلته ۷/ ۱۵۸)

اس کو ''الموسوعۃ الفقہیۃ'' میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

إن أهل الكتاب: هم كل من يؤمن بنبي ويقر بكتاب، ويشمل اليهود والنصارى، ومن آمن بزبور داؤد وصحف إبراهيم وشيث، وذلك لأنهم يعتقدون دينا سماويا منزلا بكتاب. (الموسوعة الفقهية ۷/ ۱۴۰)

صابئین سے کون سی قوم مراد ہے؟

سوال [۲]: قرآن مجید میں اہل کتاب کی حیثیت سے یہود ونصاریٰ اور صابئین کا ذکر آیا ہے، ان میں سے یہود ونصاریٰ تو معروف ہیں؛ لیکن صابئین سے کون لوگ مراد ہیں اور کیا اب یہ گروہ پایا جاتا ہے؟ اس بات کی وضاحت فرمائیں۔

المستفتي: اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: آج کے دور میں جب بھی اہل کتاب بولا جاتا ہے، تو اس سے یہود ونصاریٰ مراد ہوتے ہیں اور یہودی تورات کو مانتے ہیں اور نصاریٰ انجیل کو مانتے ہیں، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صابئین کون سی قوم ہے؟ تو ان

کے بارے میں علمائے محققین نے لکھا ہے کہ صابئین یہود ونصاریٰ میں سے ایک جماعت کا نام ہے، جو ان سے الگ ہوکر کے ایک فرقہ کی شکل اختیار کرلی تھی، جیسا کہ سامری اور سامری کے ساتھیوں کو صابئین سے تعبیر کیا جاتا ہے، گویا کہ یہود ونصاریٰ میں سے وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان سے الگ ہوکر کے الگ طائفہ زائغہ کی شکل اختیار کرلی ہے۔

اور بعض علماء نے صابئین کے بارے میں لکھا ہے کہ یہود ونصاریٰ کے درمیان ایک بین بین قوم ہے، من وجہ یہودی ہیں اور من وجہ نصاری ہیں اور ملائکہ کی عبادت کرتے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا فتویٰ ان کے بارے میں یہی ہے کہ ان کا ذبیحہ حلال نہیں ہے اور ان کے ساتھ مناکحت بھی جائز نہیں ہے، مگر امام قرطبیؒ نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ ان کے ساتھ یہود ونصاریٰ کا معاملہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کا ذبیحہ حلال ہے اور ان کی عورتوں کے ساتھ مناکحت بھی مباح ہے؛ لیکن حضرت امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ان کی عورتوں کے ساتھ مناکحت جائز نہیں ہے اور یہی صاحبین کا قول زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کی تائید میں ہے، جیسا کہ ذیل کی عبارات سے واضح ہوتا ہے۔

اس کو امام قرطبیؒ نے ان الفاظ میں نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

فقال السدی: هم فرقة من أهل الكتاب، وقاله إسحاق بن راهوية: قال ابن المنذر، وقال إسحاق: لا بأس بذبائح الصابئين؛ لأنهم طائفة من أهل الكتاب، وقال أبو حنيفة: لا بأس بذبائحهم ومناكحة نسائهم، وقال الخليل: هم قوم يشبه دينهم دين النصارى إلا أن قبلتهم نحو مهب الجنوب، يزعمون أنهم على دين نوح عليه السلام، وقال مجاهد والحسن

وابن أبي نجيح: هم قوم تركب دينهم بين اليهودية والمجوسية لا تؤكل ذبائحهم، ابن عباس: ولا تنكح نسائهم ...... والذي تحصل من مذهبهم فيما ذكره بعض علمائنا أنهم موحدون معتقدون تأثير النجوم، وأنها فعالة، ولهذا أفتى أبو سعيد الإصطخري القادر بالله بكفرهم حين سأله عنهم.

(الجامع لأحكام القرآن للقرطبي ۱/ ۴۳۴-۴۳۵)

اس کو ''تبیین الحقائق'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

قال رحمه الله: (والصابئة) أي حل تزوج الصابئة، وقال أبو يوسف ومحمد: لا يجوز نكاحها، وهذا الخلاف بناء على أنهم عبدة الأوثان أم لا، فعندهما عبدة الأوثان فإنهم يعبدون النجوم، وعند أبي حنيفة ليسوا بعبدة الأوثان، وإنما يعظمون النجوم كتعظيم المسلم الكعبة. (تبيين الحقائق، زكريا ۲/ ۴۷۸، هكذا في البناية ۵/ ۴۷)

اس کو ''الموسوعة الفقهية'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

اختلف الفقهاء في الصابئة، فذهب أبو حنيفة إلى أنهم من أهل الكتاب من اليهود أو النصارى. (الموسوعة الفقهية ۷/ ۱۴۰)

اس کو ''تفسیر مظہری'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

قال عمر وابن عباس: هم قوم من أهل الكتاب، فقال عمر: يحل ذبائحهم، وقال ابن عباس: لا يحل ذبائحهم ولا مناكحتهم، وقال مجاهد: هم قوم نحو الشام بين اليهود والمجورس من أهل الكتاب، وقال الكلبي: هم بين اليهود والنصارى، وقال قتادة: هم قوم يقرؤون الزبور ويعبدون الملائكة ويصلون إلى الكعبة أخذوا من كل دين شيئا. (تفسير مظهري ۱/ ۸۸)

اس کو ''البنایہ'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

وقال عبدالعزيز بن يحيىٰ: قد درجوا وانقرضوا فلا عين ولا أثر. (البناية ۵/ ۴۷)

موجودہ دور کے یہود ونصاریٰ کا ذبیحہ اوران کی عورتوں سے مناکحت

سوال [۳]: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو یہود ونصاریٰ تھے وہ بھی بہت سی گمراہیوں کے باوجود ایک خدا کے قائل تھے، اگرچہ عیسائی تین کے مجموعہ کوایک مانتے تھے، اسی طرح وہ وحی، نبوت، ملائکہ اور آخرت میں جزا وسزا کو بھی تسلیم کرتے تھے؛ البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی نہیں مانتے تھے؛ لیکن موجودہ دور میں یہ صورت حال نہیں ہے، خاص کر مغربی ملکوں میں جو لوگ اپنے آپ کو یہودی یا عیسائی کہتے ہیں، ان میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو خدا کے وجود ہی کے قائل نہیں ہیں، اگر خدا کو مانتے ہیں تو وحی ورسالت اور آخرت کو نہیں مانتے، کیا ایسے لوگوں کا شمار بھی یہود ونصاریٰ میں ہوگا؟ اور نکاح وذبیحہ کے معاملہ میں ان کے ساتھ اہل کتاب کا معاملہ کیا جائے گا؟

المستفتی: اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: موجودہ دور میں یہود ونصاریٰ کی دو قسمیں ہیں:

(۱) پہلی قسم کے وہ یہود ونصاریٰ ہیں جو خدا کے وجود ہی کو نہیں مانتے ہیں اور جب وہ لوگ خدا کے وجود ہی کے قائل نہیں ہیں، تو اللہ کی طرف سے مبعوث کردہ نبی اور نازل کردہ کتاب کے بھی وہ لوگ قائل نہیں ہوں گے، تو ایسے یہود ونصاریٰ کی عورتوں کے ساتھ اُسی طرح نکاح جائز نہیں ہوگا جس طرح ایک مشرکہ عورت کے ساتھ نکاح کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اس طرح کی یہودیہ ونصرانیہ عورت خالص مشرکہ عورتوں کے حکم میں ہوگی۔

(۲) دوسری قسم وہ یہود ونصاریٰ ہیں جو مشرکانہ حرکتوں کے ساتھ خدا کے وجود

کے قائل ہیں اور نبی مرسل کو بھی مانتے ہیں اور آسمانی کتاب کے بھی قائل ہیں، یہ وہ یہود ونصاریٰ ہیں جو سید الکونین علیہ الصلاۃ والسلام اور نزول قرآن کے زمانہ میں تھے؛ لہٰذا ایسے یہودیوں کا ذبیحہ حلال اور جائز ہے، جو اللہ کے نام سے ذبح کرتے ہیں اور ایسی یہودیہ عورت کے ساتھ مناکحت کا حکم بھی وہی ہے جو خیر القرون کے زمانے میں تھا۔

اب رہا نصاریٰ اور عیسائیوں کا مسئلہ تو عیسائی عام طور پر خدا کا نام لے کر ذبح نہیں کرتے؛ اس لئے ان کا ذبیحہ حلال نہیں ہوگا اور جو عیسائی عیسائیت کی تبلیغ کرتے ہیں، ان کا حال وہی ہے جو سید الکونین علیہ الصلاۃ والسلام کے زمانے میں تھا؛ اس لئے ایسی عیسائی عورتوں کے ساتھ مناکحت کا وہی حکم ہوگا جو حضرت سید الکونین علیہ الصلاۃ والسلام کے زمانے میں اور خیر القرون میں تھا؛ لیکن یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ قرآنی حکم کی وجہ سے عیسائی عورتوں کے ساتھ مناکحت کو حرام تو نہیں کہہ سکتے ہیں، مگر بہت سی وجوہات ایسی ہیں جن کی وجہ سے علی الاطلاق بلا کراہت ان کی عورتوں سے نکاح کو جائز اور حلال بھی نہیں کہا جا سکتا؛ اس لئے کہ اولاد ماں سے متأثر ہوا کرتی ہے، تو اگر ان کی عورتوں سے نکاح کیا جائے تو مسلمانوں کی اولاد کا معاشرہ اور عقیدہ انہیں جیسا ہونے لگے گا، اسی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو خط میں لکھا تھا کہ آپ نے جس یہودیہ عورت سے نکاح کیا ہے میرے خط کے پہنچتے ہی آپ فوراً اسے اپنے نکاح سے الگ کر دیں، تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھا تھا کہ کیا وہ میرے لئے حرام ہے؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں تحریر فرمایا تھا کہ میں اللہ کی حلال کردہ چیز کو حرام نہیں کرتا؛ لیکن جب آپ جیسے لوگ ان کی عورتوں سے نکاح کریں گے تو پھر ان سے نکاح کرنا عام ہو جائے گا، اور مسلمانوں کا معاشرہ خراب ہوتا جائے گا اور آئندہ ان سے پیدا ہونے والی نسلیں ان کی عورتوں کی طرح اسلام سے بیزار ہونے لگیں گی، نیز ان کی عورتیں عام طور پر بدکار ہوتی ہیں اور تم ان کی اطاعت کرنے لگو گے؛ لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس گہری دور بینی کے نقطہ نظر سے ایسے

یہود ونصاریٰ کی عورتوں سے نکاح کرنا بھی کراہت سے خالی نہیں ہوگا، جونزول قرآن کے زمانہ کے یہود ونصاری کی طرح ہیں۔

ہم اس سلسلے میں پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خط کو نقل کرتے ہیں، اس کے بعد علماء امت کی تحریرات پیش کرتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خط سنن کبریٰ کے حوالے سے ملاحظہ فرمائیے:

سمعت أبا وائل يقول: تزوج حذيفة –رضي الله عنه– يهودية، فكتب عمر –رضي الله عنه– أن يفارقها، فقال: إني أخشى أن تدعوا المسلمات وتنكحوا المومسات، وهذا من عمر رضي الله عنه على طريق التنزيه والكراهة، ففي رواية أخرى: أن حذيفة كتب إليه أ حرام هي؟ قال: لا، ولكنى أخاف أن تعاطوا المومسات منهن. (السنن الكبرى للبيهقي، دار الفكر بيروت ١٠/ ٤٢٥، رقم: ١٤٣١، ودار الحديث القاهرة ٧/ ١٩٨، رقم: ١٣٩٨٤)

مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خط ملاحظہ فرمائیے:

عن شقيق قال: تزوج حذيفة يهودية، فكتب إليه عمر: أن خل سبيلها، فكتب إليه: إن كانت حراما خليت سبيلها، فكتب إليه: إني لا أزعم أنها حرام، ولكني أخاف أن تعاطوا المومسات منهن. (المصنف لابن أبي شيبة ٩/ ٨٥، رقم: ١٦٤١٧)

اب علمائے امت کی تحریرات پیش کی جارہی ہیں، ملاحظہ فرمائیے۔ تفسیر مظہری میں ہے:

قال ابن الجوزي: روى أصحابنا حديث ابن عباس أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن ذبائح نصارى العرب، وروى ابن الجوزي بسنده عن علي رضى الله عنه قال: لا تأكلوا من ذبائح نصارى بني تغلب، فإنهم لم يتمسكوا من النصرانية بشيء إلا شربهم الخمر ...... فكذا حكم نصارى

العجم إن كان عادتهم الذبح على غير اسم الله تعالى غالبا لا يؤكل ذبيحتهم، ولا شك أن النصارى في هذا الزمان لا يذبحون بل يقتلون بالوقذ غالبا، فلا يحل طعامهم. (تفسير مظهري، زكريا ٣/ ٧٠-٧١)

اس کو ''الفقه الإسلامي وأدلته'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

لا يحل للمسلم الزواج بالمرأة المشركة أو الوثنية، وهي التي تعبد مع الله إلٰها غيره كالأصنام أو الكواكب أو النار أو الحيوان، ومثلها المرأة الملحدة أو المادية، وهي التي تؤمن بالمادة إلها، وتنكر وجود الله ولا تعترف بالأديان السماوية مثل الشيوعية والوجودية والبهائية والقاديانية والبوذية. (الفقه الإسلامي وأدلته ٧/ ١٥٧)

اس سلسلے میں بنایہ کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

ويروى عن ابن عمر أنه كان لا يجوز نكاح الكتابية، وقالت الإمامية: لا يجوز نكاح الكتابية إلا عند عدم المسلمة لاختلاف العلماء في كونهم مشركين، قال الله تعالىٰ: ﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّى يُؤْمِنَّ﴾ أي حتى يسلمن من أهل الكتاب. (البناية ٥/ ٤٣)

اس سلسلے میں بنایہ کی دوسری عبارت بھی ملاحظہ فرمایئے:

وقال الكافي: الأولىٰ أن لا يتزوج الكتابية، ولا تؤكل ذبيحتهم إلا للضرورة لما روى أن عمر رضى الله عنه غضب على حذيفة وكعب وطلحة غضبا شديدا. (البناية ٥/ ٤٤)

دین محمدی کے نزول کے بعد پیدا ہونے والی قوم کا حکم

سوال [۴]: بعض ایسے باطل ادیان بھی ہیں، جو شریعت محمدی کے نازل

ہونے کے بعد ایجاد کیئے گئے ہیں، جیسے بہائی، بابی، سکھ اور قادیانی، ان میں سے بعض گروہ قرآن کو بھی اللہ کی کتاب تسلیم کرتے ہیں یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول مانتے ہیں؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کے بعد کسی اور الہامی کتاب کے اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی اور شخص کے نبی ہونے کے دعویدار ہیں، کیا ان کا شمار بھی اہل کتاب میں ہوگا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شریعت محمدی اور دین محمدی کے نزول کے بعد جو نئی قومیں پیدا ہوئی ہیں اور انہوں نے اپنا الگ دین بنالیا ہے، تو وہ دو قسم کی ہوسکتی ہیں:

(۱) ان کے وجود میں آنے سے پہلے ان کے باپ دادا مشرک تھے، جیسا کہ سکھ وغیرہ ہیں، ان کا حکم وہی ہوگا جو پہلے سے تھا، یعنی ان کے باپ دادا بھی مشرک تھے اور نئی قوم بننے کے بعد بھی وہ مشرک ہی ہوں گے؛ لہٰذا سکھ وغیرہ کو اہل کتاب تسلیم نہیں کیا جاسکتا؛ بلکہ وہ مشرک ہی ہیں۔

(۲) وہ قوم ہیں جن کے باپ دادا پہلے مسلمان تھے، پھر انہیں میں سے نئے دین ومذہب کے ساتھ نئی قوم وجود میں آئی ہے، جیسا کہ قادیانی وغیرہ، یہ اگرچہ قرآن کو اللہ کی کتاب تسلیم کرتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول بھی مانتے ہیں؛ لیکن قرآن کے علاوہ کسی الہامی کتاب کے قائل اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین تسلیم نہیں کرتے؛ بلکہ کسی اور کے نبی ہونے کے دعویدار بھی ہیں؛ اس لئے یہ زندیق کے حکم میں ہیں؛ لہٰذا نہ تو ان کا ذبیحہ حلال ہے اور نہ ہی ان کی عورتوں کے ساتھ مناکحت جائز ہے اور یہ لوگ اسلام سے خارج ہیں، مسلمان نہیں ہیں، جیسا کہ ذیل کی عبارات سے واضح ہوتا ہے۔

اس کو ''ہندیہ'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

إذا لم يعرف الرجل أن محمدا صلى الله عليه وسلم آخر الأنبياء عليهم وعلى نبينا السلام فليس بمسلم. (هندية قديم ۲/ ۲٦۳، جديد ۲/ ۲۷٥)

اور ''مجمع الانہر'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:

وأما الإيمان بسيدنا عليه الصلاة والسلام فيجب بأنه رسولنا في الحال، وخاتم الأنبياء والرسل، فإذا آمن بأنه رسول ولم يؤمن بأنه خاتم الأنبياء لا يكون مؤمنا. (مجمع الأنهر ۲/ ٥۰٦)

اوراس کو ''مرقاۃ شرح مشکوۃ'' میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے:

وإنكار وجوب المجمع عليه إذا كان معلوما من الدين بالضرورة كفر اتفاقا، بل قال جماعة: إن إنكار المجمع عليه كفر وإن لم يكن معلوما. (مرقاة المفاتيح، أشرفيه ديوبند ٤/ ١٣٦)

اورصاحب بزازیہ نے ان الفاظ میں نقل فرمایا ہے:

يجب الإيمان بالأنبياء عليهم السلام بعد معرفة معنى النبي (وقوله) وأما الإيمان بسيدنا عليه الصلاة والسلام، فيجب بأنه رسولنا في الحال وخاتم الأنبياء والرسل، فإذا آمن بأنه رسول ولم يؤمن بأنه خاتم الرسل لا ينسخ دينه إلى يوم القيامة لا يكون مؤمنا. (بزازية على الهندية ٦/ ۳۲۷)

اور ''بنایہ شرح ہدایہ'' میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے:

ويدخل في الوثنيات عبدة الشمس وعبدة النجوم والصور التي أنحتوها، والمعطلة، والزنادقة، والباطنية، والإباحية، وفي شرح الوجيز: وكذا كل مذهب يكفر معتقده؛ لأن اسم الشرك يتناولهم جميعا. (البناية ٥/ ٤٦)

نسلی قادیانی بھی زندیق

سوال [۵]: قادیانی دوطرح کے ہیں: ایک وہ جوخود مرتد ہوتے ہیں،

دوسرے وہ جن کے آباء واجداد مرتد ہوئے اور وہ نسلی طور پر قادیانی ہیں، اگر قادیانی اہل کتاب میں سے نہیں ہیں، تو کیا قادیانیوں میں سے دوسرے گروہ یعنی نسلی قادیانیوں کو اہل کتاب میں شمار کیا جا سکتا ہے؟

المستفتی: اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قادیانی کی دو قسمیں ہیں: (۱) وہ لوگ جو بذات خود قادیانی بنے ہیں، ان کے مرتد اور زندیق ہونے میں سب کا اتفاق ہے۔

(۲) وہ قادیانی ہیں جو باپ دادا سے نسلی طور پر قادیانی کہلائے جاتے ہیں، ایسے قادیانی کو جن علماء نے اہل کتاب کے درجے میں قرار دیا ہے وہ ان کی اپنی ذاتی رائے ہے اور اس رائے پر کوئی دلیل نہیں، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے بھی کفایت المفتی قدیم ۱/ ۳۶۵، اور جدید ۱/ ۴۶۸ رمیں اپنا رجحان اسی طرف ظاہر فرمایا ہے؛ لیکن یہ صرف حضرت کی اپنی ذاتی رائے ہے، اس پر کوئی دلیل نہیں ہے، حضرت نے شامی کی کسی عبارت سے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے، مگر حضرت کی اس رائے سے دوسرے بڑوں نے اتفاق نہیں کیا ہے؛ لہٰذا نسلی قادیانی بھی مرتد ہیں اور ان قادیانیوں کی اولاد اہل کتاب کے حکم میں نہیں ہے؛ بلکہ خالص زندیق ہیں۔

(حاشیہ کفایت المفتی جدید ۱/ ۴۶۸، فتاوی رحیمیہ زکریا ۱/ ۱۹۶، فتاوی حقانیہ زکریا ۴/ ۳۴۲، آپ کے مسائل اور ان کا حل زکریا ۲/ ۱۱۷، احسن الفتاوی ۶/ ۳۵۹)

اس سلسلے میں ''بزازیہ'' کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

یجب الإیمان بالأنبیاء علیهم السلام بعد معرفة معنی النبي (وقوله) وأما الإیمان بسیدنا علیه الصلاة والسلام، فیجب بأنه رسولنا في الحال وخاتم الأنبیاء والرسل، فإذا آمن بأنه رسول ولم یؤمن بأنه خاتم الرسل لاینسخ دینه إلی یوم القیامة لا یکون مؤمنا. (بزازیة علی الهندیة ٦/ ٣٢٧)

اوراس کو ''مجمع الانہر'' میں ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

وأما الإيمان بسيدنا عليه الصلاة والسلام فيجب بأنه رسولنا في الحال، وخاتم الأنبياء والرسل، فإذا آمن بأنه رسول ولم يؤمن بأنه خاتم الأنبياء لا يكون مؤمنا. (مجمع الأنهر ٢/ ٥٠٦)

کتابیہ عورت سے مناکحت میں دارالاسلام ودارالحرب کا فرق

سوال [٦]: **(الف)** بعض فقہاء نے اہل کتاب سے نکاح کے مسئلے میں دارالاسلام اور دارالکفر کے درمیان فرق کیا ہے، دارالاسلام میں مباح قرار دیا ہے اور دارالکفر میں مکروہ؛ لیکن آج کل مسلم ممالک میں اگر کوئی مسلمان لڑکا یہودی یا عیسائی لڑکی سے نکاح کرلے تو مغرب کے فکری تسلط کی وجہ سے بیوی کے شوہر پر اثر انداز ہونے کا پورا خطرہ رہتا ہے، خاص کر عرب ملکوں میں مسلمان حکمرانوں، فوجی کمانڈروں، اور اعلیٰ سرکاری عہدہ داروں کے یہودی اور عیسائی عورتوں سے نکاح کرنے سے عالم اسلام کو غیر معمولی فوجی سیاسی اور معاشی نقصان پہنچا ہے، ان حالات میں دارالاسلام میں اہل کتاب خواتین سے نکاح کرنے کا کیا حکم ہوگا؟

المستفتی: اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بعض فقہاء نے کتابیہ عورتوں سے مناکحت کے بارے میں دارالاسلام اوردارالکفر کے درمیان فرق کیا ہے، چنانچہ دارالاسلام میں مباح قرار دیا ہے اور دارالکفر میں مکروہ؛ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خط سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان عورتوں سے نکاح کے بعد زندگی میں مرتب ہونے والی خرابی اور پیدا ہونے والی اولادوں کی تربیت اوران کے عقائد کے بگاڑ کے خطرے کی

وجہ سے دارالاسلام میں بھی ان کی عورتوں سے نکاح کرنا درجۂ کراہت سے خالی نہیں ہے؛ اس لئے جو لوگ دارالاسلام میں مباح قرار دیتے ہیں وہ صرف اس نظریہ کے پیش نظر مباح قرار دیتے ہیں کہ اولاد اپنی نشو ونما میں اسلامی عقائد اور اسلامی طور وطریق اور احکام اسلام کو اپنی زندگی میں داخل کرے گی؛ لیکن تجربہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اولاد باپ کے مقابلے میں ماں سے زیادہ متأثر ہوتی ہے؛ اس لئے اولاد کے عقیدہ کے بگڑنے کا زیادہ خطرہ ہے۔

لہٰذا دارالاسلام میں بھی ان کی عورتوں سے نکاح کرنا مکروہ تحریمی ہوگا، جیسا کہ ذیل کی احادیث اور فقہی جزئیات سے واضح ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں ''مصنف ابن ابی شیبہ'' کی روایت ملاحظہ فرمایئے:

عن ابن عمر: أنه كان يكره نساء أهل الكتاب ولا يرى بطعامهن بأسا. (المصنف لابن أبي شيبة ٩/ ٨٦، رقم: ١٦٤١٩)

اور ''**المصنف لابن أبي شيبة**'' کی دوسری روایت ملاحظہ فرمایئے:

عن ابن عمر: أنه كره نكاح نساء أهل الكتاب، وقرأ: ﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّى يُؤْمِنَّ﴾ (المصنف لابن أبي شيبة ٩/ ٨٦، رقم: ١٦٤٢٠)

اور ''مصنف ابن ابی شیبہ'' کی تیسری روایت ملاحظہ فرمایئے:

عن شقيق قال: تزوج حذيفة يهودية، فكتب إليه عمر: أن خل سبيلها، فكتب إليه: إن كانت حراما خليت سبيلها، فكتب إليه: إني لا أزعم أنها حرام، ولكني أخاف أن تعاطوا المومسات منهن. (المصنف لابن أبي شيبة ٩/ ٨٥، رقم: ١٦٤١٨)

اس سلسلے میں ''سنن کبریٰ بیہقی'' کی روایت ملاحظہ فرمایئے:

سمعت أبا وائل يقول: تزوج حذيفة -رضي الله عنه- يهودية، فكتب عمر -رضي الله عنه- أن يفارقها، فقال: إني أخشى أن تدعوا

المسلمات وتنكحوا المومسات، وهذا من عمر رضي الله عنه على طريق التنزيه والكراهة، ففي رواية أخرى: أن حذيفة كتب إليه أ حرام هي؟ قال: لا، ولكنى أخاف أن تعاطوا المومسات منهن. (السنن الكبرى للبيهقي، دارالفكر بيروت ١٠/ ٤٢٥، رقم: ١٤٣١، ودارالحديث القاهرة ١٩٨/٧، رقم: ١٣٩٨٤)

اور''مصنف عبدالرزاق'' کی روایت ملاحظہ فرمایئے:

عن قتادة: أن حذيفة نكح يهودية في زمن عمر، فقال عمر: طلقها، فإنها جمرة، قال: أ حرام هي؟ قال: لا فلم يطلقها حذيفة لقوله: حتى إذا كان بعد ذلك طلقها. (المصنف لعبد الرزاق ٦/ ٧٨، رقم: ١٠٠٥٧)

اوراس کو''بحرالرائق'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائے:

وفي المحيط: يكره تزوج الكتابية الحربية؛ لأن الإنسان لا يأمن أن يكون بينهما ولد فينشأ على طبائع أهل الحرب، ويتخلق بأخلاقهم فلا يستطيع المسلم قلعه عن تلك العادة. (البحرالرائق، زكريا ٣/ ١٨٣، كوئٹه ٣/ ١٠٣)

اوراس کو''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

والواقع في الزواج بالكتابيات وبالأولىٰ الحربيات مضار اجتماعية ووطنية ودينية، فقد ينقلن لبلادهن أخبار المسلمين، وقد يرغبن الأولاد في عقائد وعادات غير المسلمين، وقد يؤدى الزواج بهن إلى إلحاق ضرر للمسلمات بالإعراض عنهن، وقد تكون الكتابية منحرفة السلوك. (الفقه الإسلامي وأدلته ٧/ ١٦٠)

دعوتی نقطۂ نظر سے کتابیہ عورت سے نکاح کرنا

سوال [٦]: **(ب)** مغربی ممالک میں مسلمان مختلف محرکات جیسے مزاجی ہم آہنگی، ویزا کی سہولت وغیرہ کے تحت یہودی وعیسائی کی عورتوں سے نکاح کرتے ہیں، بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے یہ نکاح دعوتی نقطۂ نظر سے کیا ہے اور یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ اکثر وبیشتر مسلمان مردوں کے نکاح میں آنے والی عورتیں دامن اسلام میں آجاتی ہیں اور پھر وہ ایمان کی روشنی اپنے خاندان وسماج تک بھی پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں، تو کیا اس صورت حال میں بھی ان لوگوں کے قول پر اہل کتاب سے نکاح کرنے کی کراہت باقی رہے گی جو دارالکفر میں اہل کتاب سے نکاح کومکروہ قرار دیتے ہیں۔

المستفتی: اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگرکوئی مسلمان کتابیہ عورت سے دعوتی نقطۂ نظر سے نکاح کرتا ہے اور واقعی وہ عورت دامن اسلام میں داخل ہو جاتی ہے، تو دارالاسلام اور دارالکفر دونوں میں اس کے ساتھ نکاح کرنا مباح ہوگا۔ اور یہ بات یادرکھنا لازم ہے کہ عورت مسلمان مرد سے متأثر ہو جائے اور مسلمان مرد عورت سے متأثر ہوکر اس کے معاشرہ کوقبول نہ کرے؛ لیکن اگر شوہر منکوحہ کتابیہ سے اور ان کے معاشرہ سے متأثر ہو جاتا ہے اور بچوں کی طبیعتوں کے ان ہی کی فطرت کوقبول کرنے کا خطرہ ہوتو ان کے ساتھ نکاح کرنا مکروہ تحریمی ہوگا، جیسا کہ درج ذیل عبارات سے واضح ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں مصنف ابن ابی شبیہ کی روایت ملاحظہ فرمایئے:

عن ابن عباس -رضي الله عنه- قال: لا يحل نكاح نساء أهل الكتاب إذا كانوا حربا. (المصنف لابن أبي شيبة ٩/ ٨٨، رقم: ١٦٤٣١)

اوراس کے متعلق مصنف ابن ابی شیبہ کی دوسری روایت ملاحظہ فرمایئے:

عن أبي عياض، قال: نساء أهل الكتاب لنا حلال إلا أهل الحرب، فإن نسائهم وذبائحهم عليكم حرام. (المصنف لابن أبي شيبة ۹/ ۸۸، رقم: ۱٦٤۳۲)

اس کو علامہ ابن نجیم نے ''البحر الرائق'' میں ان الفاظ کے ساتھ تحریر فرمایا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

يكره تزوج الكتابية الحربية؛ لأن الإنسان لا يأمن من أن يكون بينهما ولد فينشأ على طبائع أهل الحرب، ويتخلق بأخلاقهم، فلا يستطيع المسلم قلعه عن تلك العادة. (البحرالرائق، زکریا ۳/ ۱۸۳، کوئٹہ ۲/ ۱۰۳)

اس کو علامہ شامیؒ نے ان الفاظ میں تحریر فرمایا ہے:

وتكره الكتابية الحربية إجماعا؛ لافتتاح باب الفتنة من إمكان التعلق المستدعى للمقام معها في دار الحرب، وتعريض الولد على التخلق بأخلاق أهل الكفر. (شامي، زكريا ٤/ ١٣٤، کراچی ۳/ ٤٥، وتبيين الحقائق، زكريا ٢/ ٤٧٧)

اس کو ''البنایہ'' میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

وقال الكاكي: الأولى: أن لا يتزوج الكتابية، ولا تؤكل ذبيحتهم إلا للضرورة لما روى أن عمر رضى الله عنه غضب على حذيفة و كعب وطلحة غضبا شديدا. (البناية ٥/ ٤٤، كذا في تبييق الحقائق ٢/ ٤٧٧)

اس کو ''ہندیہ'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

وإذا تزوج المسلم كتابية حربية فى دارالحرب جاز ويكره. (هندية، قديم ١/ ٢٨١، جديد ١/ ٣٤٧)

کیا ہندؤں کے اوتار نبی تھے؟ اور ویدیں آسمانی کتابیں ہیں؟

سوال [۷]: قرآن مجید میں یہ بات فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں اپنے پیغمبر بھیجے ہیں اور ہر زبان میں اپنی کتاب نازل فرمائی، لیکن جن انبیاء

اورآسمانی کتابوں کاقرآن مجید نے ذکر کیا ہے ان کے علاوہ دوسری شخصیتوں اور کتابوں کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ کیا وہ اپنے عہد کے پیغمبر تھے؟ اور کیا ان کے ماننے والوں کے پاس جو مذہبی کتاب موجود ہے اور وہ ان کو خدائی تعلیمات کا مجموعہ قرار دیتے ہیں، کیا وہ آسمانی کتابیں ہیں جن میں تورات وانجیل کی طرح ان کے ماننے والوں نے آمیزشیں کردی ہیں؟ اسی سے یہ سوال ابھرتا ہے کہ ہندو مذہب کی کتابوں خاص کر ویدوں میں توحید کی واضح تعلیمات موجود ہیں، آخرت کا تصور بھی ہے، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی خوشخبری بھی ہے اوراس میں قریب قریب صراحت کے ساتھ آپ کے اسمائے مبارکہ احمد اور محمد کا لفظ استعمال ہوا ہے،تو کیا برادران وطن جن شخصیتوں کو خدا کا اوتار مانتے ہیں، کیا یقین کیا جاسکتا ہے کہ یہ اپنے عہد میں اللہ کے پیغمبر رہے ہوں؟ اور جیسے عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملے میں مبالغہ سے کام لیا، ان کے ماننے والوں نے ان کے بارے میں مبالغہ سے کام لیا ہوگا اور کیا ان کی کتابوں کو قرآن مجید کی بیشتر اعتقادی اور اخلاقی تعلیمات میں موافقت کی بنیاد پر الہامی کتاب تسلیم کیا جاسکتا ہے؟

المستفتی: اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں ارشادفرمایا ہے:

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ. [الرعد: ۷]

اس کا مقتضی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہندوستان میں بھی یہاں کی قوم پر ہدایت لے کر کسی نبی یا رسول کو بھیجا ہو؛ لیکن ان کے اوتاروں میں سے کسی کا متعین طور پر اللہ کی طرف سے مبعوث کردہ نبی ہونا ہمارے سامنے ثابت نہیں ہے اور جب تک ہمارے سامنے متعین طور پر ثابت نہیں ہوگا، تب تک ہم کسی اوتار کو نبی مرسل تسلیم نہیں کرسکتے،

اسی طرح ان کے ویدوں میں اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی پیشین گوئیاں بھی موجود ہیں؛ لیکن جب تک دلیل شرعی سے ان کی کسی کتاب کا آسمانی کتاب ہونا ثابت نہ ہوجائے، اس وقت تک ہم انہیں آسمانی کتاب نہیں کہہ سکتے۔

نیز اسی طرح ہم انہیں آسمانی کتاب ہونے کا نہ انکار کریں گے اور نہ ہی ثابت کریں گے اور یہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہیں۔

حدیث پاک میں وارد ہوا ہے کہ تورات وانجیل میں یہود ونصاری نے تحریف کر رکھا ہے؛ اس لئے ان کے بارے میں مثبت یا منفی پہلو سے متعلق امت محمدیہ کوئی بات ثابت نہیں کرے گی۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۱/ ۱۴۸، جدید ۴/ ۲۷۷-۲۷۸)

اس سلسلے میں بخاری شریف کی روایت ملاحظہ فرمائیے:

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: كان أهل الكتاب يقرؤون التوراة بالعبرانية ويفسرونها بالعربية لأهل الإسلام، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تصدقوا أهل الكتاب ولا تكذبوهم، وقولوا: آمنا بالله ما أنزل.

(صحيح البخاري ٢/ ١١٢٥، رقم: ٧٢٤١، ف: ٧٥٤٢)

عیسائی اسکولوں میں تعلیم

سوال [۸]: (الف) اہل کتاب سے سماجی تعلقات کے سلسلہ میں دو باتیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں: عیسائی مشنریز تعلیم پر خصوصی توجہ دیتی رہی ہیں اور پورے ملک میں ان کے اسکولوں کا جال بچھا ہوا ہے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان اسکولوں سے پڑھ کر نکلنے والے طلبہ وطالبات کی ایک اچھی خاصی تعداد الحاد ودہریت کا شکار ہوجاتی ہے اور ان کے ذہن میں شکوک وشبہات کے کانٹے جڑ پکڑ لیتے ہیں، ان حالات میں مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کا ایسے اداروں میں داخلہ لینے

کا کیا حکم ہے؟ کیا مسلمانوں کو اپنے علاقہ میں ایسے اسکولوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے ؛ تاکہ ان کے بچے عصری تعلیم سے آراستہ ہوسکیں اور ان کو روزگار کے مواقع حاصل ہوسکیں یا اس سے اجتناب کرنا چاہئے اور متبادل معیاری تعلیمی درسگاہوں کے قیام پر توجہ دینی چاہئے؟

المستفتی: اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عیسائی اسکولوں میں اگر عیسائی مشنریز تعلیم پر خصوصی توجہ دے رہی ہیں اور ان اسکولوں میں پڑھنے والے طلبہ وطالبات کو عیسائی مشنریز کے مطابق عیسائیت کا عقیدہ ان کے دلوں میں راسخ کیا جاتا ہے، جس سے طلبہ وطالبات کے عقائد کے بگڑنے کا سخت خطرہ ہوتا ہے، تو ایسے اداروں میں مسلمانوں کو اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے داخل نہیں کرنا چاہئے ؛ اس لئے کہ ایسے اسکولوں میں تعلیم کے لئے طلبہ کو داخل کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ دین وایمان کو خطرے میں ڈالنا ہے اور مسلمانوں کو چاہئے کہ اچھی معیاری عصری تعلیم کے لئے اپنا متبادل اسکول قائم کریں، تاکہ ان اسکولوں میں پڑھنے کے بعد مسلمان بچوں کا عقیدہ اپنی جگہ برقرار رہے۔ اور اگر کہیں عیسائی اسکول میں داخلہ کی ضرورت پڑ جائے تو اس کے ساتھ ساتھ ان بچوں کی اسلامی تعلیم کا نظم بھی چالو رہنا چاہئے کہ دیگر اوقات میں بچے دینی اسلامی تعلیم بھی ساتھ ساتھ حاصل کرتے رہیں، تاکہ ان کے عقائد نہ بگڑیں اور وہ اپنے عقائد پر مضبوطی سے قائم رہیں، ورنہ ماں باپ اپنے بچوں کو ایسے اسکول میں داخل کرکے ان کی آخرت برباد کرنے کے شکار بن جائیں گے، جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی ہے اور یہود ونصاریٰ کی فکر یہی ہوتی ہے کہ وہ اسلام کی مخالفت کریں اور مسلمان اور دیگر اقوام انہیں کے دین کی اتباع کریں، اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

وَلَنْ تَرْضَى عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ إِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدَى وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآئَهُمْ بَعْدَ الَّذِىْ جَآئَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيْرٍ. [البقرة: ۲۰]

اس آیت شریفہ کے مقتضی سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنے بچوں کو ان کے اسکولوں میں تعلیم کے لئے داخل نہیں کرنا چاہئے۔ اور بچے اپنی فطرت کے اعتبار سے اسلام سے قریب ہوتے ہیں، مگر ماں باپ یہودی ماحول یہودی بنادیتے ہیں اور عیسائی ماحول عیسائی بنا دیتے ہیں اور مجوسی ماحول مجوس بنا دیتے ہیں اور ہندو ماحول ہندو بنا دیتے ہیں۔ حدیث شریف ملاحظہ فرمایئے:

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: كل مولود يولد على الفطرة، فأبواه يهودانه أو ينصرانه أو يمجسانه. **الحديث** (صحيح البخاري ۱/ ۱۸۵، رقم: ۱۳۶۹، ف: ۱۳۸۵)

اجتماعی کفالت کے لئے زکوۃ جمع کرنا

سوال [۹]: (ب) اگر اہل کتاب خاتون سے نکاح کیا جائے تو اس کے کیا حقوق ہوں گے؟ کیا اس کے وہی حقوق ہوں گے جو مسلمان بیویوں کے ہیں؟ کیا نکاح کرنے کے بعد ان کے حقوق سے راہ فرار اختیار کرنے اور ان کو چھوڑ کر بھاگ آنے یا محض غیر مسلم ہونے کی بنا پر طلاق دے دینے کی اجازت ہوگی؟ جو اہل کتاب خواتین مسلمان مردوں کے نکاح میں ہوں وہ اپنے شوہر کے گھر میں مذہبی مراسم انجام دے سکتیں ہیں یا نہیں؟

المستفتی: اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر کوئی مسلمان کسی کتابیہ عورت سے

نکاح کرلے، تو مسلمان شوہر پر وہ تمام حقوق لازم ہوجاتے ہیں جو ایک مسلمان عورت سے شادی کرنے کے بعد لازم ہوتے ہیں؛ لہٰذا جس طرح ایک مسلم خاتون کے ساتھ نکاح کرنے کے بعد حقوق ادا کرنا لازم ہوتا ہے، اسی طرح تمام حقوق اس پر لازم ہوجائیں گے، نیز اگر دو بیویاں ہیں، ایک مسلمان دوسری کتابیہ، تو دونوں کے ساتھ برابری کا معاملہ کرنا بھی شوہر پر لازم ہوجاتا ہے، جو ذیل کی روایات سے واضح ہوتا ہے، ملاحظہ فرمائیے۔

''مصنف ابن ابی شیبہ'' میں اس بارے میں کئی روایات ہیں، ملاحظہ فرمائیے:

عن قتادة عن ابن المسيب والحسن في من يتزوج اليهودية والنصرانية على المسلمة قالا: يقسم بينهما سواء. (المصنف لابن أبي شيبة ۹/ ۷٤، رقم: ۱٦۳٥۲)

عن الزهري قال: قسمتهما سواء. (المصنف لابن أبي شيبة ۹/ ۷٤، رقم: ۱٦۳٥۳)

عن إبراهيم قال: يقسم لها كما يقسم للحرة. (المصنف لابن أبي شيبة ۹/ ۷٤، رقم: ۱٦۳٥٤)

عن الشعبي في الرجل يتزوج المسلمة واليهودية والنصرانية، قال: يسوى بينهما في القسمة من ماله ونفسه. (المصنف لابن أبي شيبة ۹/ ۷٤، رقم: ۱٦۳٥٥)

اس کو ''قاضی خان'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

النفقة تتعلق بأشياء منها الزوجية والاحتباس، فتجب على الرجل نفقة امرأته المسلمة والذمية. (خانية على الهندية ۱/ ٤۲٤، جديد ۱/ ۲٥٤)

اس کو خانیہ میں مختصر الفاظ میں نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

والمسلمة والكتابية في القسم سواء. (خانية على الهندية ۱/ ٤۳۹، جديد ۱/ ۲٥۹)

اس کو ’’ہندیہ‘‘ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

ویجوز نکاح الکتابیة علی المسلمة، والمسلمة علی الکتابیة، وهما في القسم سواء لاستوائهما في محلیة النکاح. (هندیة قدیم ۱/ ۲۸۲، جدید ۱/ ۳٤۷)

اس کو ’’البحر الرائق‘‘ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

تجب النفقة للزوجة علی زوجها. (کنز الدقائق) وفي البحر: أطلق في الزوجة فشمل المسلمة والکافرة. (البحر الرائق، زکریا ٤/ ۲۹۳-۲۹٤)

نیز جب کتابیہ عورت مسلمان کے نکاح میں آجائے تو اس مسلمان کے ماتحت اور اس کے گھر میں رہتے ہوئے اپنے مذہبی رسوم ادا کرنا جائز نہیں ہے؛ لہٰذا شوہر کو حق ہے کہ وہ کنیسہ میں جانے سے روکے، اسی طرح گھر میں رہ کر کے اپنے مذہبی رسومات ادا کرنے سے روکے، جیسا کہ درج ذیل جزئیات سے واضح ہوتا ہے۔

اس کو کو ہندیہ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:

إذا تزوج المسلم الکتابیة فله منعها من الخروج إلی البیعة والکنیسة ومن اتخاذ الخمر في منزله، کذا فی النهر الفائق. (الهندیة قدیم ۱/ ۲۸۱، جدید ۱/ ۳٤۷)

وقال القدوري في النصرانیة تحت مسلم لا تنصب في بیته صلیبا وتصلی في بیته حیث شاء ت، کذا في المحیط. (هندیة قدیم ٥/ ۳٤٦، جدید ٥/ ٤۰۱)

عیسائی مشنریز اداروں میں ملازمت

سوال [۹]: (ج) عیسائی مشنریز کثرت سے ہاسپٹل اور قرض مہیا کرنے والے ادارے بھی قائم کرتی ہیں، یہ ادارے خدمت خلق کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کی تبلیغ اور کم سے کم دوسروں کو ان کے مذہب سے دور کردینے میں اہم

کردار ادا کررہے ہیں، ایسے اداروں میں خدمت کرنے اوران کی خدمت سے استفادہ کرنے میں مسلمانوں کا کیا رویہ ہونا چاہئے؟

المستفتی: اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عیسائی مشنریز کے ادارے جس میں ہسپتال اورقرض مہیا کرنے کے ادارہ وغیرہ ہوں، اوران اداروں میں خدمت خلق کے ساتھ ساتھ عیسائی مذہب کی تبلیغ ہوتی ہے، اور دوسروں کوان کے مذہب سے دورکرکے اپنے عیسائی مذہب سے قریب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور مسلمانوں کوان کے اپنے مذہب سے دور کرنے کا کردار ادا کیا جاتا ہے، تو ایسے اداروں میں کسی مسلمان کے لئے ان کی جماعت میں کردار ادا کرنے کے لئے ملازمت کرنا جائز نہیں ہوگا؛ ہاں البتہ اگر کوئی مسلمان عالم دین اسلام کی تبلیغ کی خاطر ایسے اداروں میں رہ کر اسلام کی تبلیغ کرتا ہے، تو اس کی گنجائش ہوسکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس کے اندر معصیت پر تعاون سے ممانعت فرمائی ہے، ملاحظہ فرمائیے:

وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة: ٢]

اور ”حجۃ اللہ البالغہ“ میں اس کوان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

أقول: يحرم طلب العلم الديني لأجل الدنيا، ويحرم تعليم من يرى فيه الغرض الفاسد لوجوه، منها: أن مثله لا يخلو غالبا من تحريف الدين لأغراض الدنيا بتأويل ضعيف، فوجب سد الذريعة. (رحمة الله الواسعة شرح حجة الله البالغة، مكتبه حجاز ديوبند ٣/ ١٣٣)

فصديق الإنسان من يسعى في عمارة آخرته وإن كان فيه ضررا

لـدنيـاه، وعدوه من يسعى في غارة آخرته وإن كان فيه نفع لدنياه، وقد قال الله تـعالىٰ: ﴿وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلٰى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة: ۲]﴾ (مـجالس الأبرار، ص: ۵۳۱، المجلس الخامس وثمانون، بحواله فتاوی محمودیه میرٹھ ۶/ ۴۶)

❁❁❁

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا ☆ عَلٰى حَبِيْبِکَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

اَللّٰهُ أَكْبَر كَبِيْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا وَسُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَأَصِيْلاً. الحديث

(المعجم الكبير ۲/ ۱۳۵، برقم: ۱۵۷۰)

(مفتی) شبیر احمد قاسمی

خادم الحدیث والافتاء جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد (یو-پی)

بروز سنیچر ۷/ربیع الاول ۱۴۳۷ھ

(۱۶) باب المال الحرام ومصرفه

مال حرام کا ایک لقمہ کھانے سے نماز کی قبولیت کا حکم

سوال [۱۰۹۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مال حرام کا ایک لقمہ اگر کھالے، تو اس سے اس شخص کا چالیس دن کا کوئی عمل قبول نہیں ہوگا، اس عمل سے فرض نماز مراد ہے یا تمام اعمال فرائض ونوافل سب مراد ہیں؟

المستفتی: راغب حسین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: لقمہ حرام کی وجہ سے چالیس روز کا عمل قبول نہ ہونے کی روایت ذیل میں درج ہے۔

عن ابن عباسؓ، قال: تليت هذه الآية عند رسول الله صلى عليه وسلم: يا ايهاالناس كلوا مما في الأرض حلالا طيباً، فقام سعد بن أبي وقاصؓ فقال: يا رسول الله صلى الله عليه وسلم أدع الله أن يجعلنى مستجاب الدعوة، فقال له النبي صلى الله عليه وسلم: يا سعد! أطب مطعمك تكن مستجاب الدعوة، والذي نفس محمد بيده، إن العبد ليقذف اللقمة الحرام في جوفه ما يتقبل منه عمل أربعين يوماً، وأيما عبد نبت لحمه من السحت، والربا فالنار أولىٰ به. (المعجم الأوسط، دارلفكر ٥/ ٣٤، رقم: ٦٤٩٥)

اوراس حدیث میں چالیس روز تک عمل قبول نہ ہونے میں فرائض ونوافل سب شامل ہیں اورقبول نہ ہونے سے مراد ذمہ سے ساقط ہونے کے بعد اللہ کے یہاں سے قبولیت کا جواجر وثواب ملتا ہے، وہ نہیں ملے گا، مگر ذمہ سے ساقط ہوجائے گا، فرائض ونوافل سب شامل

کی حدیث بخاری لا یقبل الله صرفا و لا عدلا کے تحت فتح الباری میں ہے۔

واختلف تفسيرها، فعند الجمهور الصرف الفريضة والعدل النافلة.

(فتح الباري، باب حرم المدينة، دارالفكر ٤/٨٦، اشرفيه ديوبند ٤/١٠٦، تحت رقم الحديث: ١٨٧٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ذی قعدہ ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۸۴۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۱۱/۱۴۲۳ھ

طالب علم کا اپنے ساتھی کی چیز بلا اجازت استعمال کرنا

سوال [۱۰۹۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید ایک مدرسہ کا متعلم تھا، دوران تعلیم جیسا کہ بعض طلبہ کی عادت ہوتی ہے کہ مذاق میں اس نے اپنے بعض ساتھیوں کی کھانے پینے کی معمولی اشیاء بنا ان کی اجازت کے کھالی اور اس بات کو ایک عرصہ گذر گیا ہے۔ اب زید کو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ ساتھی کہاں ہیں؟ وہ چاہتا ہے، ان اشیاء کی قیمت ادا کرے اس کے تدارک کی کیا شکل ہوگی؟

المستفتی: عبدالقادر بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: وہ ساتھی کہاں ہے، معلوم نہیں ہے، تو اس کی نیت کر کے تخمینہ سے کچھ زائد رقم صدقہ کر دیں۔

من اكتسب مالا بغير حق، فأما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة، أو الاستئجار على المعاصي، أو السرقة......ففي جميع الأحوال، المال الحاصل له حرام عليه......ويجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك، وإن لم يجد المالك ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه......فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، باب فرض الوضوء،

سهارنپور ۱/ ۳۷، دار البشائر الإسلامية ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، البحرالرائق، زکریا۸/ ۳٦۹، کوئٹه۸/ ۲۰۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍صفر المظفر ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳؍ ۵٦۲۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۲/۱۲ھ

مال حرام میں تعدی پائی جاتی ہے یا نہیں؟

سوال [۱۰۹۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بکر کی بالکلیہ کمائی اور رقم حرام طریقے کی ہے، اس نے وہی حرام رقم اپنے داماد زید کو دی، زید نے اسی رقم کے ذریعہ ایک جائز دھندہ کیا۔ مذکورہ زید کے لڑکے کیساتھ میں اپنی لڑکی کا رشتہ کرنا چاہتا ہوں، اس سلسلے میں شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟ یہ رشتہ میرے لئے ازروئے شرع مناسب ہے یا نہیں؟ جو بھی حکم ہو واضح طور پر باحوالہ کتب معتبرہ سے نوازیں۔

المستفتی: وصی احمد بستوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حرام مال کے منتقل ہونے کے بارے میں حکم یہ ہے کہ بعینہ وہی حرام مال دوسرے کی ملکیت میں پہونچنے کے بعد بھی حرام رہتا ہے؛ لہٰذا اس مال کو دوسرا شخص بھی جان بوجھ کر استعمال کرے گا، تو حلال نہ ہوگا؛ لیکن اگر دوسرا آدمی اس مال کو فروخت کر کے اس کے عوض میں دوسری چیز حاصل کرتا ہے، تو حاصل شدہ چیز حرام نہیں ہوئی؛ بلکہ صرف مکروہ ہوتی ہے؛ کیونکہ استہلاک کے بعد حکم میں تبدیلی آجاتی ہے؛ لہٰذا داماد نے سسرال سے آئے ہوئے پیسہ کا استہلاک کر دیا ہے اور جائز تجارت میں لگا کر عین مال حرام ہلاک کر کے اس کے عوض میں دوسرے منافع حاصل کئے ہیں؛ اس لئے دوسرے منافع اس کے حق میں حرام نہیں ہیں؛ بلکہ وہ حلال ہیں صرف کراہت کے درجہ میں ہیں، جیسا کہ نائی

کی کمائی ہے؛ لہٰذا آپ اپنی لڑکی کی شادی زید کے لڑکے کے ساتھ کر سکتے ہیں۔

إذا غصب حنطة فزرعها، أو نواة فغرسها غير أن عند أبي يوسفؒ يباح الإنتفاع فيهما قبل أداء الضمان لوجود الاستهلاک من کل وجه.

(هداية، كتاب الغصب، فصل فيما يتغير بفعل الغاصب اشرفي ديوبند ٤/ ٣٧٧)

إمرأة زوجها في أرض الجور إذا أكلت من طعامه ولم يكن عينه غصباً، أو اشترىٰ طعاماً، أو كسوة من مال أصله ليس بطيب فهي فى سعة من ذلک والإثم على الزوج. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، زكريا ٩/ ٥٥٣- ٥٥٤، كراچي ٦/ ٣٨٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/ ۵۵۶۷)

مالک معلوم نہ ہونے کی صورت میں چوری کے مال کا مصرف

سوال [۱۰۹۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے اپنی کم عقلی کی وجہ سے اگر کسی کا مال چوری کرلیا یا پیسے چوری کر لیئے اور اس رقم کو اپنے کسی ذاتی کام میں استعمال کرلیا اور مال کو بھی خرچ کرلیا اور بعد میں وہ شرمندہ ہوکر یہ چاہتا ہے کہ اس کا بدلہ دنیا ہی کے اندر ادا کر دے تا کہ آخرت کی رسوائی سے بچ جائے اور جس کا مال چوری کیا ہے، اس کو زید کا پتہ بھی نہ نکلے تو کیا ایسا کوئی راستہ شریعت کے اندر ہے؟

المستفتی: عبدالرحمٰن، غازی آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چوری کا مال یا روپیہ وغیرہ جو چیز بھی ہو، اگر مالک کا پتہ نہ ہو، تو وہ مال یا اتنی مقدار روپیہ بلانیت ثواب فقراء ومساکین پر اپنے ذمہ

سے گناہ ساقط ہونے کی نیت سے صدقہ کرسکتا ہے۔

کما في البذل: صرح الفقهاء: بأن من اکتسب مالا بغیر حق، فإما أن یکون کسبه بعقد فاسد–أو بغیر عقد کالسرقة، والغصب، والخیانة، والغلول، ففي جمیع الأحوال، المال الحاصل له حرام علیه؛ ولکن إن أخذه من غیر عقد لم یملکه و یجب علیه، أن یرده علی مالکه إن وجد المالک وإلا ففي جمیع الصور یجب علیه أن یتصدق بمثل تلک الأموال علی الفقراء. (بذل المجهود، کتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/۳۷، دارالبشائر الإسلامیة، ۱/۳۵۹، تحت رقم الحدیث: ۵۹، شامي، زکریا ۹/۵۵۳، کراچي ۶/۳۸۵)

وفي العرف الشذي: وأما رجاء الثواب من نفس المال فحرام بل ینبغی لمتصدق الحرام...... تخلیص رقبة ولا یرجوا الثواب منه؛ بل یرجوه من ایتماره أمر الشارع. (العرف الشذي، علی هامش الترمذي، النسخة الهندیة ۱/۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍صفر المظفر ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۶۷۶/۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۷/۲/۲۲ھ

زائد تول کے ذریعہ جمع شدہ رقم حلال نہیں

سوال [۱۰۹۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے عمر کے ساتھ گنے کی تجارت کی تھی، عمر جب گنے کے کاشتکاروں سے خریدتا تھا، تو زائد وزن تول لیتا تھا، اس میں کاشتکار کا نقصان بھی ہوتا ہے اور قیمت وزن کے برابر ہی ادا کرتا تھا، اس طرح پر زید کے حصہ میں آئی ہوئی رقم ایک ہزار کے قریب ہوگی اوران کا شتکاروں کا پتہ لگانا بھی دشوار کن مسئلہ ہے، شریعت کی نظر میں یہ عمل کیسا ہے؟ اوراس

عمل قبیح سے کسی طرح دست برداری ہوسکتی ہے؟ جس وقت یہ تجارت کی گئی تھی، اس وقت زید کو اتنا علم بھی نہ تھا، شریعت کا حکم کیا ہے؟ مہربانی فرما کر مذکورہ تینوں سوالوں کے جوابات صاف واضح انداز میں دینے کی زحمت فرما کر احسان عظیم فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

المستفتی: اجمل علی، ساکن زادت پور، کانٹ، شاہجہاں پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید نے زائد تول کے ذریعہ جو رقم اکٹھا کی ہے، وہ اس کے لئے حلال نہیں اس رقم کو اصل مالک تک پہنچانا ضروری ہے، اگر اصل مالک تک رسائی ممکن نہیں ہے، تو بلا نیت ثواب اتنی رقم فقیروں اور غریبوں پر خرچ کردے۔

من اکتسب مالا بغیر عقد کالسرقة، والغصب، والخیانة، والغلول، ففي جمیع الأحوال المال الحاصل له حرام علیه؛ ولکن إن أخذه من غیر عقد لم یملک ویجب علیه أن یرده علی مالکه إن وجد المالک، وإلا ففي جمیع الصور یجب علیه أن یتصدق بمثل تلک الأموال علی الفقراء. (بذل المجهود، کتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/۳۷، دار البشائر الإسلامیة، ۱/۳۵۹، تحت رقم الحدیث: ۵۹، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ٣٤/٢٤٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/۸۰۶۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۵/۲۸ھ

اسکول میں پروگرام کے حیلہ سے ڈرائیوروں سے جبراً روپیہ وصول کرنا

سوال [۱۰۹۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے طالب علمی کے زمانہ میں کذب بیانی کرکے بیریل پر گاڑی

روک کر ڈرائیوروں سے اسکول میں پروگرام کے حیلہ سے جبراروپئے وصولے؛ حالانکہ اسکول میں کسی طرح کا کوئی پروگرام نہیں ہوتا تھا،اس وقت زید کی عمر تقریباً پندرہ سال تھی، بنظر شرع یہ عمل کیسا ہے؟ اوراس کی تلافی کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ اور یہ رقم تقریباً ہزار آٹھ سوروپیہ کے قریب ہوگی۔

المستفتی: اجمل علی، ساکن زادت پور، کانٹ، شاہجہاں پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: زید نے زمانۂ طالب علمی میں دھوکہ دے کر جتنے پیسے حاصل کئے، وہ اس کے لئے جائز نہیں، وہ پیسے ان لوگوں تک پہنچانا ضروری ہے، جن سے وصول کیا تھا، اگر اصل مالک نہ ملے،تو بلانیت ثواب اتنا پیسہ فقیروں اور مسکینوں پر صرف کردے، یہی تلافی کی صورت ہے۔

إن أخذه من غير عقد لم يملك ويجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ١/٣٧، دارالبشائر الإسلامية، ١/٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩، تبيين الحقائق، امدادية ملتان ٦/٢٧، زكريا ٧/٦٠، هندية، زكريا قديم ٥/٣٤٩، جديد ٥/٤٠٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

كتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/۸۰۶۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۵/۲۸ھ

(۱۷) باب الأدب

کتے کو بسم اللہ پڑھ کر روٹی دینا

سوال [۱۰۹۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کتے کو روٹی دیتے وقت بسم اللہ پڑھتے ہیں، تب روٹی دیتے ہیں، بہت سے حضرات بسم اللہ کہہ کر روٹی دیتے ہیں، یہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟ اس کا جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: امین الدین، نرائن پور، پوسٹ: موہن پور، نجیب آباد بجنور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کتا منجملہ درندوں میں سے ایک درندہ ہے اور شوقیہ طور پر اس کا پالنا بھی جائز نہیں ہے اور جب اس کا پالنا امر مذموم اور ممنوع ہے، تو کھلا پلا کر اس کو مانوس کرنا عمدہ اور بہتر کام نہیں ہے اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو کام عمدہ اور بہتر ہوتا ہے، اس میں بسم اللہ پڑھنا مسنون ہے، جیسا کہ کھانا کھانا، مسجد میں داخل ہونا، قرآن کریم کی تلاوت کرنا وغیرہ اس کے برخلاف قضاء حاجت کے لئے بیت الخلاء میں داخل ہونا عمدہ اور افضل کام نہیں ہے؛ اس لئے اس وقت بسم اللہ پڑھنا بھی مسنون نہیں ہے، تو ایسے ہی کتے کو روٹی ڈالتے وقت بسم اللہ پڑھنا بھی مسنون نہیں ہوگا۔ حدیث شریف ملاحظہ فرمائیں۔

قال رسول الله صلى الله عليه كل أمر ذي بال لا يبدأ فيه بذكر الله وببسم الله الرحمن الرحيم فهو أقطع. (عمدة القاري كتاب بداء الوحي، زكريا ۱/۳۳، دار احياء التراث العربي ۱/۱۱، مرقاة المفاتيح، مكتبه امداديه ملتان ۱/۳،

کتاب الأذکار للنووي ٩٦، رقم: ٣٣٥، دارالکتب العلمیة) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍صفر المظفر ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶؍۷۱۹۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۲/۹ھ

امرد سے خدمت لینا

سوال [۱۰۹۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ امرد سے خدمت لینا اس زمانہ کے لحاظ سے کیسا ہے؟

المستفتی: طاہر حسین فاضل پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: امرد سے جسمانی خدمت لینا فتنہ سے خالی نہیں ہے؛ اس لئے علماء نے اس سے ممانعت فرمائی ہے۔

وفتنة الأمرد ظاهرة لا يحتاج إلى خبر، وقد أفتى الشيخ محي الدين النووي بمنع النظر إليه سواء كان بشهوة، أو بغير شهوة......قلت الأولىٰ في هذا الزمان أن يفتي بقول الشيخ محي الدين لظهور الفسق، والشناعة بين الناس. (البنايه، كتاب الكراهية، فصل في الوطء والنظر واللمس اشرفيه ديوبند ١٢/ ١٣٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ذی قعدہ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱؍۴۲۱۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۱۱/۲۰ھ

اچھے کاموں میں دائیں ہاتھ کا استعمال کرنا

سوال [۱۰۹۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ خورد ونوش کے علاوہ دیگر اشیاء کے اخذ وتناول میں آیا استعمال یمین مسنون ہے؟

المستفتی: روح الامین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہر اچھا کام دائیں ہاتھ سے کرنا مسنون ہے، اسی طرح دائیں ہاتھ سے پکڑنا مسنون ہے۔

عن عائشة رضـ قالت: كان النبي صلى الله عليه وسلم: يحب التيمن ما استطاع في طهوره وتنعله، وترجله. (صحيح البخاري، باب التيمن في الأكل وغيره، النسخة الهندية ٢/ ٨١٠، رقم: ٥١٧١، ف: ٥٣٨٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍صفر المظفر ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳؍۵۶۱۹)

رات میں ناخن تراشنے کا حکم

سوال [۱۰۹۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ رات میں ناخن تراشنا خلاف مسنون اور باعث کراہت ہے؟

المستفتی: روح الامین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: رات میں ناخن تراشنا مکروہ نہیں ہے۔

سأل أبا يوسفؒ عن قص الأظافير في الليل، فقال: ينبغي، فقال: ما الدليل على ذلک؟ فقال قوله عليه السلام: الخير لا يؤخر. (هندية، الباب التاسع عشر، زكريا قديم ٥/ ٣٥٨، جديد ٥/ ٤١٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍صفر المظفر ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳؍۵۶۱۹)

کیا مجمع عام میں چھینکنے والے کا جواب دینا لازم ہے؟

سوال[۱۰۹۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بعض لوگ مجمع عام میں چھینکنے کے بعد زوردار آواز سے الحمد للہ پڑھتے ہیں، ایسا کرنا کیا درست ہے؟ اور مجمع عام کے ہر ایک پر چھینک کا جواب دینا لازم ہے، اگر لازم ہے، تو چھینکنے والے کو سنا کر یا دل میں؟

المستفتی: محمد مشتاق، نور پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مجمع عام میں چھینک آنے پر بآواز بلند الحمد للہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور تمام سامعین پر چھینک کا جواب دینا ضروری نہیں ہے؛ بلکہ ایک شخص جواب دیدے تو سب کی طرف سے کافی ہوجائے گا؛ البتہ افضل یہ ہے کہ تمام سامعین جواب دیں تاکہ ظاہر حدیث پر عمل ہوجائے۔ نیز چھینک کا جواب سنانا ضروری ہے، محض دل میں جواب دینا کافی نہیں ہے۔

عن أبي هريرة رضـ، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إن الله يحب العطاس ويكره التثاؤب، فإذا عطس فحمد الله، فحق على كل مسلم سمعه أن يشمته. (بخاري، باب ما يستحب من العطاس، ومايكره من التثاؤب، النسخة الهندية ٢/٩١٩، رقم: ٥٩٨٢، ف: ٦٢٢٣)

وينبغي للعاطس أن يرفع صوته بالتحميد حتى يسمع من عنده فيشمته، ولوشمته بعض الحاضرين أجزأ عنهم والأفضل أن يقول كل واحد منهم بظاهر الحديث. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا٩/٥٩٤، كراچي ٦/٤١٤)

لا يسقط فرض جواب السلام إلا بالإسماع كما لايجب

إلابالإسماع، ولوكان المسلم أصم ينبغي أن يريه تحريك شفتيه، وكذلك جواب العطيسة. (هندية، الباب السابع في السلام وتشميت العاطس، زكريا قديم ٥/٣٦٦، جديد ٥/٣٧٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍صفر المظفر ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۸۷۸/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۲/۲ھ

کیا داہنی کروٹ پر ہی اٹھنا سنت ہے؟

سوال [۱۰۹۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نیند سے جاگ کر بستر سے کیا داہنی کروٹ پر اٹھنا سنت ہے، جیسا کہ داہنی کروٹ پر سونا سنت ہے؟

المستفتی: ہارون رشید کرناٹکی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حدیث پاک سے داہنی کروٹ پر سونا تو ثابت ہے، مگر داہنی کروٹ ہی پر اٹھنا ثابت نہیں ہے۔

عن البراء بن عازب ؓ، قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا آوىٰ إلى فراشه نام على شقه الأيمن، ثم قال اللهم أسلمت نفسي إليك الخ. (صحيح البخاري، باب النوم على الفسق الأيمن،النسخة الهندية ٢/٩٣٤، رقم: ٦٠٧٠، ف: ٦٩١٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍جمادی الثانیہ ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۲۰۵/۳۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۶/۱۵ھ

قبلہ کی طرف پشت کرکے بیٹھنا

سوال [۱۰۹۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کوئی آدمی مسجد کے اندر قبلہ رخ کرنے کے بجائے ہمیشہ یا اکثر پورب کی طرف منھ کرکے بیٹھے اور تسبیح پڑھے یا خاموش بیٹھے تو کیا یہ ناجائز یا مکروہ ہے؟ وضاحت سے جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: عابد حسین، محلّہ نیو بستی انصار کلاں، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مسئلہ مسائل یا تقریر وغیرہ کے لئے قبلہ کی طرف پشت کرکے پورب کرتا ہے، تو صرف خلاف اولیٰ ہے قابل ملامت نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۴/ ۵۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ صفر المظفر ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۳۰۱۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۳/۲/۱۱ھ

غصہ کا علاج

سوال [۱۰۹۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے ایک عزیز ہیں جن کا نام شیخ احمد ہے جن کی عمر ۶۴/ سال ہے اور تندرستی ٹھیک ہے، تعلیم اردو عربی سے ماہر ہیں اور احمد نگر ضلع کے اردو بورڈ کے صدر کی جگہ پر فائز ہیں، ان کی تندرستی دن بدن گرتی جارہی ہے۔

(۲) طبیعت میں چڑ چڑا پن ہوگیا ہے، بھوک بہت لگتی ہے، مگر کھانے کو بیٹھنے پر پیٹ بھرا معلوم ہوتا ہے، کھانا دو چار لقمہ کے بعد ہی بند کردیتے ہیں، پانچ وقت کی نماز پابندی سے

پڑھتے ہیں، تلاوت کا سلسلہ ہمیشہ رہتا ہے، مگر اب دن بدن کوئی بھی بات بہت جلد بھول جاتے ہیں اور بات بات پر غصہ بہت بڑھ جاتا ہے، پوری زندگی صبر اور سکون میں گذری ہے، مگر آج کل یہ حالت ہے اللہ جانے یہ کیوں ہو رہا ہے، آپ کوئی راستہ ضرور بتائیں۔

المستفتی: ملا محمد قاسم، احمد نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہم تعویذ گنڈے کا کام نہیں کرتے ہیں؛ البتہ غصہ ختم کرنے کے لئے حدیث شریف میں ایک علاج بتلایا گیا ہے کہ جب غصہ آئے تو کسی ترکیب سے ان کو لٹا دیا کریں۔

عن أبي سعيدؓ قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: اتقوا الغضب، فإنها جمرة توقد في قلب ابن آدم، ألم تر إلى انتفاخ أوداجه وحمرة عينيه، فمن أحسن من ذلک شيئاً، فليلزق بالأرض.

(المصنف لابن أبي شيبة، واذكر في الغضب......مؤسسه علوم القرآن ۶۵/۱۳، رقم: ۲۵۸۹۳، مسند أحمد بن حنبل ۶۱/۳، رقم: ۱۱۶۰۸، سنن الترمذي، باب ما أخبر النبي صلى الله عليه وسلم أصحابه بما هو كائن إلى يوم القيامة، النسخة الهندية ۴۳/۲، دارالسلام رقم: ۲۱۹۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۸۲۱/۳۲)

دوسروں سے جسمانی خدمت لینے کے احکام

سوال [۱۰۹۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) جسمانی خدمت لینا ہاتھ پاؤں وغیرہ دوسروں سے دبوانا کیا نبی کریم صلی

اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے؟ اگر ثابت ہے تو مدلل و باحوالہ تحریر فرمائیں اور اگر ثابت نہ ہو، تو اس کا شرعی حکم رقم فرمائیں۔

(۲) بصورت جواز وثبوت جسمانی خدمت لینے کا مسنون طریقہ اور یہ کہ کن کن لوگوں سے یہ خدمت لی جاسکتی ہے؟

(۳) اور جسم کے وہ اعضاء جن کا دوسروں کے سامنے کھولنا جائز نہیں ہے، ان کے دبوانے کا کیا حکم ہے؟ مدلل تحریر فرمائیں۔

المستفتی: خورشید انور القاسمی، مدرس مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) ہاتھ پاؤں وغیرہ دوسروں سے دبوانا حضور ﷺ سے کسی حدیث میں خاکسار کی نظر سے نہیں گذرا ہے؛ البتہ عمل صحابہ اور عبارات فقہاء سے خوف فتنہ سے حفاظت کی شرط کے ساتھ ثابت ہے؛ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن الزبیرؓ ایک بوڑھی عورت سے اپنا پیر دبوایا کرتے تھے۔

وعبد الله بن زبيرؓ، استأجر عجوزا،لتمرضه وكانت تغمز رجله.

(هداية، كتاب الكراهية، فصل في الوطء والنظر والمس، اشرفي ٤/٤٥٩)

(۲) اگر اپنی اولاد ہو، تو علی الاطلاق ہر ایک سے دبوانا جائز ہے، چاہے باریش ہو یا بے ریش؛ اس لئے کہ اس میں کوئی فتنہ نہیں ہے۔

يغمز الرجل رجل والديه. (عالمگيري، الباب الثامن، زكريا قديم ٥/٣٢٨، جديد ٥/٣٨٠، المحيط البرهاني،المجلس العلمي٨/١٢٣، رقم:٩٧٣٤)

اور اگر اولاد نہیں ہیں، تو باریش مرد کامل سے دبوانا جائز ہے اور بے ریش امرد سے سے دبوانا جائز نہیں ہے۔

وفتنة الأمرد ظاهرة ولايحتاج إلى خبر وقد أفتى الشيخ محى الدين النووي يمنع النظر إليه سواء كان بشهوة، أو بغير شهوة (إلى قوله) الأولىٰ

فـي هـذا الزمان أن يفتي بقول الشيخ محي الدين بظهو ر الفسق، والتنازعة بين الناس. (بنايه، فصل في الوطء والنظر والمس، اشرفية ١٣٤/١٢، قديم ٢٦٦/٤)

(۳) صرف پنڈلی کھول کر دبوانے کی گنجائش ہے، اور ران کھولنا ناجائز اور حرام ہے اور اگر ران دبوانے کی ضرورت ہو اور فتنہ کا بھی کوئی خطرہ نہ ہو، تو کپڑے کے اوپر سے دبوانے کی گنجائش ہے۔

لابـأس بأن يغمز الرجل الرجل إلى الساق (وقوله) يبيح أن يغمز الفخذ ويمسها وراء الثوب وغيرها. (عالمگيري، الباب الثامن، زكريا جديد ٣٨٠/٥، قديم ٣٢٨/٥، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ١٢٣/٨، رقم: ٩٧٣٤)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ربیع الاول ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۷؍۲۵۹۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۲/۳/۱۵ھ

معذوروں اور بوڑھوں کے حقوق کا تحقیقی جائزہ

معذوروں اور بوڑھوں کے حقوق سے متعلق فقہ اکیڈمی کی طرف سے۹؍سوالات پر مشتمل سوال نامہ آیا ہوا ہے، ہر ایک سوال وجواب کو الگ الگ عنوانات کے ساتھ درج کرکے جوابات پیش کئے گئے ہیں، جو ترتیب وار ذیلی سرخیوں میں آرہے ہیں، ملاحظہ فرمایئے:

والدین کسی قدر کسب معاش پر قادر رہوں تو ان کا نفقہ اولاد پر لازم ہے یا نہیں؟

سوال [۱]: اگر کوئی شخص بڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا؛ لیکن اتنا کمزور نہیں ہے کہ کسب معاش نہ کرسکے، کسی قدر مشقت کے ساتھ ہی سہی وہ کما کر خود اپنی ضرورت پوری کرسکتا ہے، تو کیا ایسے شخص کو اس کی اولاد یا اعزہ واقارب جن کے ذمہ اس کا نفقہ واجب ہے کسب معاش پر مجبور کرسکتے ہیں؟

المستفتی: فقہ اکیڈمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر والدین اور عمر رسیدہ کمزور شخص کسب معاش پر قادر نہ ہوں اور وہ ضرورت مند ہوں، تو ان کے چھوٹوں پر ان کا نفقہ لازم اور واجب ہوتا ہے، اگر حقیقی اولادیں ہیں تو ان پر واجب ہوتا ہے۔ اور اگر حقیقی اولادیں نہیں ہیں، تو قریبی اعزہ پر ان کا نفقہ لازم ہوتا ہے، جیسا کہ بھائی بھتیجے وغیرہ۔

اور اگر عمر رسیدہ کمزور شخص کسی قدر کسب معاش پر قادر ہو اور ضرورت مند ہو اور اس کی اولاد خوش حال ہو اور کمانے پر اچھی طرح قادر ہو، تو ایسی حالت میں امام شمس الائمہ سرخسی اور امام شمس الائمہ حلوائیؒ کے درمیان اختلاف ہے، امام شمس الائمہ سرخسیؒ فرماتے ہیں کہ باپ

کے کسب معاش پر قادر ہونے کے باوجود بیٹے کو باپ کا خرچہ دینے پر مجبور کیا جائے گا اور بیٹے پر لازم ہے کہ باپ کو آرام کا موقع دے اور اس کا سارا خرچ بیٹا ادا کرے اور اس کے برخلاف شمس الائمہ حلوائیؒ فرماتے ہیں کہ باپ اگر کسب معاش پر قادر ہو تو بیٹے کو باپ کا نفقہ ادا کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا؛ بلکہ بیٹے کو اختیار دیا جائے گا کہ چاہے تو باپ کو آرام کا موقع دے دے اور سارا خرچ بیٹا اپنے ذمہ لے لے اور چاہے تو خرچ ادا نہ کرے اور باپ اپنی کمائی کی محنت سے گذارا کرے۔ اور شمس الائمہ حلوائیؒ کی رائے کے مطابق یہ بات سامنے آتی ہے کہ بیٹا باپ کو کسب معاش پر مجبور کرسکتا ہے؛ لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ باپ اگر کسی قدر کسب معاش پر قادر ہو تو باپ کو کسب معاش پر مجبور نہیں کیا جائے گا؛ بلکہ اولاد اپنی کمائی کے ذریعہ سے باپ کا خرچ ادا کرے اور باپ کو آرام کا موقع دے، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شمس الائمہ سرخسیؒ کی بات زیادہ راجح ہے اور وہی مفتی بہ قول معلوم ہوتا ہے اور یہی ظاہر الروایت بھی ہے۔

اس سلسلے میں پہلے حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

عن عائشة –رضي الله عنها– قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن أولادكم هبة الله لكم ﴿يَهَبُ لِمَنْ يَشَآءُ اِنَاثًا وَيَهَبُ لِمَنْ يَشَآءُ الذُّكُوْرَ﴾ [الشورى: ٤٩] **فهم وأموالهم لكم إذا احتجتم إليها.** (السنن الكبرى للبيهقي، دارالحديث القاهرة ٨/ ١١٥، رقم: ١٥٧٤٥)

عن عائشة –رضي الله عنها– قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن أطيب ما أكلتم من كسبكم، وإن أولادكم من كسبكم. (ترمذي شريف ١/ ٢٥٢، رقم: ١٣٥٨)

عن عائشة –رضي الله عنها– قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن أطيب ما أكل الرجل من كسبه، وإن ولده من كسبه. (نسائي شريف ٢/ ١٨٦، رقم: ٤٤٥٧)

اس کو ''تاتارخانیہ'' میں اس طرح کے الفاظ میں نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

ثم يفرض على الابن نفقة الأب إذا كان الأب محتاجا والابن موسرا، سواء كان الأب قادرا على الكسب أو لم يكن، وذكر شمس الأئمة السرخسي في شرح أدب القاضي للخصاف: أن الأب إذا كان كسوبا والابن أيضا كسوب يجبر الابن على الكسب فى نفقة الأب، وذكر شمس الأئمة الحلواني في شرح أدب القاضي للخصاف: أنه لا يجبر الابن على نفقة الأب إذا كان الأب قادرا على الكسب، واعتبره بذي الرحم المحرم، فإنه لا يستحق النفقة في كسب قريبه ولا على قريبه الموسر إذا كان هو كسوبا، وفي الفتاوى الخلاصة: وفي الأصل إذا كان الأب والابن معسرين لا تجب على أحدهما نفقة الآخر. (الفتاوى التاتارخانية ٥/ ٤٢٥-٤٢٦، رقم: ٨٣٦٧)

اس کو ''مجمع الانہر'' میں ان الفاظ سے نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

تجب على الموسر نفقة أبويه وأجداده وجداته ...... سواء كانوا قادرين على الكسب أو لا، قيل: هو ظاهر الرواية، وقال الحلواني: الابن الكاسب لا يجبر على نفقة الأب الكاسب؛ لأنه كان غنيا باعتبار الكسب فلا ضرورة في إيجاب النفقة على الغير، وفي الفتح: يجبر الموسر على نفقة أحد من قرابته إذا كان رجلا صحيحا وإن كان لا يقدر على الكسب إلا في الوالد خاصة. (مجمع الأنهر ٢/ ١٩٥-١٩٦)

اس کو ''بنایہ شرح ہدایہ'' میں کافی واضح الفاظ سے نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

واستدل شمس الأئمة السرخسي في شرح الكافي بقوله تعالى: ''فلا تقل لهما اف'' [الإسراء: ٢٣] **وقال: نهى عن التأفيف يعني الأذى، ومنع الأذى فى منع النفقة على حاجتها أكثر، ولهذا يلزمه نفقتهما وإن كانا قادرين على الكسب؛ لأن معنى الأذى في الكد والتعب أكثر منه في**

التأفيف، وقال عليه السلام: إن أطيب ما أكل الرجل من كسبه، وإن ولده من كسبه، فكلوا من كسب أولادكم. (البناية ٥/ ٧٠٠)

عمر رسیدہ لوگوں کا نفقہ وعلاج دوسروں پر کب واجب ہوگا؟

سوال [۲]: عمر رسیدہ کمزور اور ضعیف لوگوں کا نان ونفقہ اور علاج ان کی اولاد پر ان کے قریبی اعزہ پر کن صورتوں میں واجب اور لازم ہوتا ہے؟

المستفتی: فقہ اکیڈمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کمزوروں کا خرچ ان کی اولاد پر یا ان کے چھوٹوں پر یا ان کے قریبی اعزہ پر دو صورتوں میں واجب ہوتا ہے:

(۱) عمر رسیدہ ہو کر کسب معاش پر قادر نہ ہوں اور ضرورت مند ہوں۔

(۲) عمر رسیدہ ہونے کی کوئی قید نہیں ہے، مگر معذور ہوں، مثلاً لنگڑے ہوں، اپاہج ہوں یا کسی اور طریقے سے ایسی بیماری کا شکار ہوں جس کی وجہ سے کسب معاش پر قادر نہ ہوں، تو ایسی صورت میں عزیز وا قارب پر ان کا خرچ اور ان کا علاج واجب اور لازم ہوتا ہے، اگر ان کا علاج ومعالجہ اور خرچ واخراجات عزیز وا قاب ادا نہیں کریں گے، تو گنہگار رہوں گے۔

اس کو ''بنایہ شرح ہدایہ'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

وعلى الرجل أن ينفق على أبويه وأجداده وجداته إذا كانوا فقراء، وإن خالفوه في دينه. (هداية) **وتحته في البناية: وفي المبسوط: على الرجل الموسر نفقة أبيه وأمه وأب الأب وإن علا، وأم الأب وإن علت، وأم الأم وإن علت، وشرط الشافعي في ذلك أن يكون الأب زمنا ولم يوافقه أحد، وفي التنبيه: ويجب على الأولاد ذكورهم وإناثهم نفقة الوالدين، وإن علوا**

بشرط الفقر والزمانة. (البناية، أشرفيه ٥/ ٦٩٩)

اس کو شامی میں بہت مختصر الفاظ میں نقل کیا گیا ہے؛ لیکن مفہوم واضح ہے، ملاحظہ فرمایئے:

فالمعتبر في إيجاب نفقة الوالدين مجرد الفقر قيل: وهو ظاهر الرواية. (شامي، زكريا ٥/ ٣٥٥، كراچی ٣/ ٤٢٣)

صاحب ثروت والدین کا خرچہ اولاد پر نہیں

سوال [۳]: بوڑھے والدین یا خاندان کے وہ بڑے جن کا نفقہ ان کے چھوٹوں پر محتاجی کی صورت میں واجب ہے، اگر وہ محتاج نہ ہوں، خود صاحب ثروت ہوں، تب بھی وہ اپنی اولاد سے یا ان لوگوں سے جن پر بحالت حاجت نفقہ واجب ہوتا ہے زیادہ سہولت کے لئے یا دوسرے لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے یا کچھ رقم محفوظ کرنے کے لئے زائد رقم کا مطالبہ کر سکتے ہیں؟

المستفتی: فقہ اکیڈمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بوڑھے والدین یا خاندان کے وہ بڑے لوگ جن کا نفقہ چھوٹوں پر ضرورت اور محتاجی کی حالت میں واجب ہوتا ہے، اگر وہ لوگ محتاج اور ضرورت مند نہ ہوں؛ بلکہ خود صاحب ثروت اور سرمایہ دار ہوں، تو وہ لوگ دوسروں پر خرچ کرنے کے لئے یا کچھ رقم پس انداز کر کے محفوظ کرنے کے لئے اپنی اولاد یا چھوٹوں سے زائد رقم کے مطالبہ کے مجاز نہ ہوں گے؛ اس لئے کہ یہ مطالبہ ان کی ضرورت سے خارج ہے اور بے ضرورت مطالبہ ہے، ہاں البتہ اولاد اپنے والدین کو خوش کرنے کے لئے ضرورت نہ ہونے کے باوجود اپنے طور پر والدین کو ماہانہ یا سالانہ کچھ دیتی رہے اور والدین اس رقم کو کہیں بھی اپنے اختیار سے خرچ کریں، تو یہ اولاد کی

خوش نصیبی ہے، مگر اولاد کو اس پر مجبور نہیں کیا جائے گا اور یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ عمر رسیدہ لوگ صاحب ثروت نہ ہوں، مگر کسب معاش پر قادر ہوں تو ظاہر روایت کے مطابق اولاد پر ان کا خرچ لازم ہوتا ہے، مگر صاحب ثروت ہونے کی صورت میں لازم نہیں ہوتا، جیسا کہ ذیل کی جزئیات سے واضح ہوتا ہے:

اس کو "فتاوی قاضی خان" میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

وملک الدار لا يمنع النفقة إلا أن يكون فيها فضل مال بأن كان يكفيه أن يسكن في ناحية ويبيع الناحية الأخرى، وكذا الخادم والدابة إذا كانت نفيسة يمكنه أن يبيعها ويشتري بثمنها خسيسة، وينفق الفضل على نفسه، فحينئذ لا تجب له النفقة. (خانية على الهندية ١/ ٤٤٨، فتاوى قاضي خان جديد ١/ ٢٦٨)

اس کو "البحر الرائق" میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

ولأبويه وأجداده وجداته لو فقراء. (كنز الدقائق) ...... وشرط الفقر لأنه لو كان ذا مال فإيجاب النفقة في ماله أولى من إيجابها في مال غيره.
(البحرالرائق، كوئٹه ٤/ ٢٠٥، زكريا ٤/ ٣٤٨)

اور اس کو صاحب "تاتارخانیہ، محیط برہانی اور ہندیہ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

فإن كان للأب مسكن أو دابة فالمذهب عندنا أنه يفرض النفقة على الابن إلا أن يكون في المسكن فضل نحو أن يكفيه أن يسكن في ناحية منه، فحينئذ يؤمر الأب ببيع الفضل والإنفاق على نفسه، فإذا آل الأمر إلى الناحية التي يسكنها الأب يفرض نفقته حيئنذ على الأب، وكذلك إذا كانت للأب دابة نفيسة يؤمر أن يبيع ويشتري الأوكس وينفق الفضل على نفسه، فإذا آل الأمر إلى الأوكس يفرض النفقة على الابن ويستوي في هذا

الوالدون والمولودون وسائر المحارم وهو الصحيح من المذهب. (الفتاوى التاتارخانية ٥/ ٤٢٩، ٤٣٠، رقم: ٨٣٧٨، والمحيط البرهاني ٤/ ٣٥٤، رقم: ٤٥٥٧، هندية قديم ١/ ٥٦٧، جديد ٣١٢)

کسب معاش کے لئے بوڑھے والدین کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جانا

سوال [۴]: ایک اہم مسئلہ والدین اور بزرگوں کی جسمانی خدمت، خاص کر جب انسان چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے اور کسری ضرورت کو پوری کرنے میں سہارے کا محتاج ہوجائے، ایسی صورت حال میں اگر بیٹا زیادہ پیسہ کمانے کی غرض سے دوسرے شہر، دوسری ریاست یا دوسرے ملک میں چلا جائے تو بوڑھوں کی دشواریاں بہت بڑھ جاتی ہیں، ان حالات میں کیا زیادہ آمدنی کے لئے لڑکوں کا اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا جائز ہے؟

المستفتی: فقہ اکیڈمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ضعیف، کمزور والدین جو جسمانی خدمت کے محتاج ہوں، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے اور کسی ضرورت کو پوری کرنے میں دوسروں کے سہارے کے محتاج ہوجائیں، تو ایسی صورت میں بیٹوں کا ایسے ضعیف والدین کو بے یارو مددگار چھوڑ کر ان کی اجازت کے بغیر دور دراز علاقوں میں کمانے کے لئے چلا جانا جائز نہیں ہے، ہاں البتہ اگر ماں باپ نے بخوشی اجازت دے دی ہے یا ماں باپ کی خدمت کے لئے خادم کا انتظام کردیا ہو، جس کی وجہ سے ماں باپ کو جسمانی خدمت حاصل کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی تو دوسری جگہ جا کر کسب معاش کی گنجائش ہے؛ لیکن اگر خادم کا باضابطہ انتظام نہیں کیا ہے اور ماں باپ کی طرف سے ان کو چھوڑ کر جانے کی اجازت نہیں ہے، تو سفر حج، سفر عمرہ اور سفر تبلیغ کے لئے چلا جانا اولاد کے لئے جائز نہیں ہے؛ بلکہ ماں باپ کی خدمت ان سب پر مقدم ہے، جیسا کہ ذیل کی جزئیات سے واضح ہوتا ہے۔

اس کو ''ہندیہ'' میں بہت واضح الفاظ میں نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

وقال محمد –رحمه الله تعالى– في السير الكبير: إذا أراد الرجل أن يسافر إلى غير الجهاد لتجارة أو حج أو عمرة وكره ذلك أبواه، فإن كان يخاف الضيعة عليهما بأن كانا معسرين ونفقتهما عليه، وماله لا يفى بالزاد والراحلة ونفقتهما، فإنه لا يخرج بغير إذنهما، سواء كان سفرا يخاف على الولد الهلاك فيه ...... أولا يخاف على الولد الهلاك فيه، وكذا الجواب فيما إذا خرج للنفقة إلى بلدة أخرى إن كان لا يخاف عليه الهلاك بسبب هذا الخروج كان بمنزلة السفر للتجارة، وإن كان يخاف عليه الهلاك كان بمنزلة الجهاد. (هندية قديم ٥/ ٣٦٥، جديد ٥/ ٤٢٢)

اس کو ''تاتارخانیہ'' اور ''محیط برہانی'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

وكل سفر أراد الرجل أن يسافر غير الجهاد لتجارة أو لحج أو لعمرة فكره ذلك أبواه، هل له أن يخرج بغير إذنهما؟ فهذا على وجهين: إما إن كان لا يخاف عليهما الضيعة بأن كانا موسرين ولم تكن نفقتهما عليه، أو كان يخاف عليهما الضيعة بأن كانا معسرين وكانت نفقتهما عليه، وفي الذخيرة: وماله لا يفى بالزاد والراحلة ونفقتهما ...... فإن كان يخاف الضيعة عليهما، فإنه لا يخرج بغير إذنهما سواء كان السفر سفرا يخاف على الولد الهلاك فيه أو لا يخاف. (الفتاوى التاتارخانية ١٨/ ٢٤٢، رقم: ٢٨٦٧، المحيط البرهاني ٨/ ١١٠، رقم: ٩٧٠٧)

اس کو ''شامی'' میں کچھ مختصر الفاظ سے نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

لا يحل سفر فيه خطر إلا بإذنهما، وما لا خطر فيه يحل بلا إذن (درمختار) وفي الشامية: كالسفر للتجارة والحج والعمرة يحل بلا إذن إلا إن خيف عليهما الضيعة. (شامي زكريا ٦/ ٢٠٣، كراچى ٤/ ١٢٥)

کیا عورت پر ساس، خسر کی خدمت لازم ہے؟

سوال [۵]: اگر بہو ساس کے ساتھ رہنا نہ چاہتی ہو یا اس کی ساس کو خدمت کی ضرورت ہو؛ لیکن کوئی خدمت گار موجود نہ ہو اور بیٹیوں کو ان کے شوہروں کی طرف سے میکے میں رہنے کی اجازت نہ ہو، تو اس صورت میں بہو کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور کیا اسے اس کے ساس سسر کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے؟

المستفتی: فقہ اکیڈمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورت پر اپنے ساس، خسر کی خدمت شرعی طور پر لازم نہیں ہے، اگر شوہر کے ماں باپ خدمت کے محتاج ہوں تو شوہر کی ذمہ داری ہے کہ اپنے ماں باپ کی خدمت کے لئے خادم کا انتظام کرے، اس کی بیوی اس کام کے لئے نہیں ہے، ہاں البتہ بیوی کا اخلاقی فریضہ ہے کہ ساس خسر کی غیر جسمانی خدمت کرے، مثلاً پکوان وغیرہ پکا کر کے کھلائے؛ لیکن اگر بیوی یہ نہیں چاہتی ہے تو اس پر کسی قسم کا جبر ودباؤ جائز نہیں ہے، نیز اگر بیوی ساس خسر کے ساتھ مشترکہ فیملی میں ایک ساتھ نہ رہنا چاہے تو شوہر کی ذمہ داری ہے کہ بیوی کے لئے الگ رہائش کا انتظام کرے، اسی طرح ساس بہو کے درمیان عدم موافقت کی صورت میں شوہر کے لئے حکمت عملی یہی ہے کہ ان کے درمیان کشیدگی کا سلسلہ طول نہ پکڑنے پائے، اس لئے الگ انتظام کر لے۔

اس کو علامہ شامیؒ نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

ولو أراد أن يسكنها مع ضرتها أو مع أحمائها كأمه وأخته وبنته فأبت فعليه أن يسكنها في منزل منفرد؛ لأن إباءها دليل الأذى والضرر، ولأنه محتاج إلى جماعها ومعاشرتها في أي وقت يتفق لا يمكن ذلك مع ثالث

(وقوله) ذكر الخصاف أن لها أن تقول: لا أسكن مع والديک وأقربائک في الدار فأفرد لي دارا. (شامي، زكريا ٥/ ٣٢١-٣٢٢، كراچی ٣/ ٦٠١)

اس کو "الموسوعة الفقهية" میں ان الفاظ سے نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

فالجمع بين الأبوين والزوجة في مسكن واحد لا يجوز (وكذا غيرهما من الأقارب) ولذلک يكون للزوجة الامتناع عن السكنى مع واحد منهما؛ لأن الانفراد يمسكن تأمن فيه على نفسها ومالها وحقها، وليس لأحد جبرها على ذلک، وهذا مذهب جمهور الفقهاء من الحنفية والشافعية والحنابلة. (الموسوعة الفقهية ٢٥/ ١٠٩)

اس کو "البحر الرائق" میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

والسكنى في بيت خال عن أهله وأهلها ...... أي تجب السكنى في بيت أي الإسكان للزوجة على زوجها؛ لأن السكنى من كفايتها فتجب لها كالنفقة ...... وإذا وجبت حقا لها ليس له أن يشرک غيرها فيه؛ لأنها تتضرر به فإنها لا تأمن على متاعها ويمنعها ذلک من المعاشرة مع زوجها، ومن الاستمتاع إلا أن تختار؛ لأنها رضيت بانتقاص حقها. (البحرالرائق کوئٹہ ٤/ ١٩٣-١٩٤، زكريا ٤/ ٣٢٨)

کیا ماں باپ کی خدمت بیٹوں کی طرح بیٹیوں پر بھی واجب ہے؟

سوال [٦]: (ج) ماں باپ کی خدمت صرف بیٹوں پر واجب ہے یا بیٹیوں پر بھی؟ بعض اوقات بیٹیاں اپنے والدین کی مجبوری اور بے بسی کو دیکھتے ہوئے اپنے والدین کی خدمت کرنا چاہتی ہیں؛ لیکن ان کے شوہران کو اس کی اجازت نہیں دیتے، کیا ان کے شوہر کو اس کا حق حاصل ہے؟

المستفتی: فقہ اکیڈمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ماں باپ کی خدمت دوطرح کی ہیں:

(۱) ان کے نان ونفقہ کی خدمت: یہ صرف بیٹوں پر واجب ہے، بیٹیوں پر نہیں؛اس لئے کہ بیٹیاں کمانے پر قادر نہیں ہوتی ہیں؛ لہٰذا بیٹوں پر ہی محتاج ماں باپ کا نان ونفقہ لازم ہوگا۔

(۲) جسمانی خدمت: ماں باپ جب جسمانی خدمت کے محتاج ہوجائیں، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے میں دوسروں کے سہارے کے محتاج بن جائیں تو ایسے ماں باپ کی جسمانی خدمت بیٹے اور بیٹیوں پر برابر طریقے سے لازم ہوجاتی ہے؛ البتہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ بیٹے کے لئے ماں باپ کی خدمت کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں، جب کہ بیٹیاں اگر شادی شدہ ہیں،تو ان کے لئے ماں باپ کی جسمانی خدمت کرنے کے لئے ماں باپ کے یہاں قیام کرنا مشکل پڑجاتا ہے؛اس لئے کہ اگر دور دراز علاقے میں لڑکی کی شادی ہوگئی ہے تو شوہر اور اس کے بچوں کو چھوڑ کر ماں باپ کے یہاں آکر ان کی خدمت کرنا اس کے لئے دشوار ہے، ہاں البتہ اگر شوہر نے اپنی مرضی سے بیوی کو ماں باپ کے یہاں ان کی خدمت کے لئے چھوڑ دیا ہے تو بیٹی پر والدین کی خدمت کرنا لازم ہے۔ اور اگر شوہر نے ماں باپ کے یہاں نہیں چھوڑا ہے اور بیٹی ماں باپ کی خدمت کے لئے ماں باپ کے یہاں رہنا چاہے اور شوہر نہ چاہے تو ایسی صورت میں شریعت بیٹی کو اس بات پر مجبور نہیں کرتی کہ اپنا گھر بگاڑیں۔ اور اگر بیٹی کی شادی اسی مقام پر ہوئی ہے جہاں ماں باپ رہتے ہوں،تو موقع لے لے کر ماں باپ کی خدمت کرنا اور دیکھ بھال کرنا اس پر لازم ہے، نیز ماں باپ کی خدمت کے لئے اگر غیر شادی شدہ لڑکیاں موجود ہیں یا لڑکے موجود ہیں تو شادی شدہ لڑکیوں پر ماں باپ کی خدمت کسی طرح لازم اور واجب نہیں ہے۔ اور جن فقہی عبارات میں اس بات کا ذکر ہے کہ شوہر کو یہ حق نہیں ہے کہ کمزور اور معذور والدین کے یہاں جانے سے بیوی کو روکے تو ان سے مراد یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً ماں باپ کی عیادت کے لئے جانے سے شوہر کو روکنے کا حق نہیں ؛لیکن ماں باپ کے یہاں مستقل رہ کر کے خدمت کے لئے جانے سے شوہر کو روکنے کا حق ہے، جیسا کہ حسب ذیل جزئیات سے واضح ہوتا ہے۔ اس کو صاحب خلاصۃ الفتاوی نے

ان الفاظ میں نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

امرأة لها أب زمن وليس له من يقوم عليه غير البنت ويمنعها الزوج من تعاهده جاز لها أن تعصى زوجها وتطيع أباها، سواء كان الأب مسلما أو كافرا. (خلاصة الفتاوی ۲/ ۵۳)

اوراس کوعلامہ شامیؒ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

ولا يمنعها من الخروج إلى الوالدين في كل جمعة إن لم يقدرا على إتيانها على ما اختاره في الاختيار ولو أبوها زمنا مثلا فاحتاجها فعليها تعاهده ولو كافرا وإن أبى الزوج (الدرالمختار) وفي الشامية: فعليها تعاهده: أي بقدر احتياجه إليها، وهذا إذا لم يكن له من يقوم عليه. (شامي، زكريا ٥/ ٣٢٤، كراچی ٣/ ٦٠٢-٦٠٣)

اوراس کو "فتاویٰ قاضی خان" میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

امرأة لها أب زمن ليس له من يقوم عليه، وزوجها يمنعها عن الخروج إليه وتعاهده كان لها أن تعصى زوجها وتطيع الوالد مؤمنا كان الوالد أو كافرا؛ لأن القيام بتعاهد الوالد فرض عليها، فيقدم على حق الزوج. (خانية على الهندية ١/ ٤٤٣، خانية جديد ١/ ٢٦٤)

اوراس کو "الموسوعۃ الفقہیۃ" میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

فقال الحنفية: ليس له منعها من عيادة والد زمن ليس له من يقوم عليه، ولا يجب عليها طاعة زوجها إن منعها من ذلک، سواء كان الوالد مسلما أو كافرا؛ لأن القيام بخدمته فرض عليها في مثل هذه الحالة، فيقدم على حق الزوج. (الموسوعة الفقهية ٢٤/ ٥٨)

نکاح ثانی کرنے پر اولاد کو رکاوٹ بننے کا حق نہیں

سوال [۷]: انسان کو جس طرح جوانی میں بیوی کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح وہ بڑھاپے میں بھی بیوی کا محتاج ہوتا ہے، تاکہ اس عمر کے سرد وگرم کو سہنا اس کے لئے آسان ہوجائے، ہندوستان کے معاشرہ میں عام طور پر بیٹے اور بیٹیاں اپنی والدہ کے فوت ہونے کے بعد والد کے دوسرے نکاح میں رکاوٹ بنتے ہیں، کیا ان کا یہ رکاوٹ بننا درست ہے؟ اور اگر خود والد میں اپنی بیوی کی کفالت کی استطاعت نہ ہو تو اس سلسلے میں کیا اولاد پر بھی اس نسبت سے کچھ ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟

المستفتی: فقہ اکیڈمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر بڑھاپے کی حالت میں بیوی کا انتقال ہوجائے تو آدمی بے سہارا جیسا ہوجاتا ہے اور اس کو ایسا لگتا ہے کہ وہ بے یار و مددگار ہے، ایسے حالات میں جب وہ نکاح ثانی کرنا چاہے تو لڑکے اور لڑکیاں ساری اولادیں اور خاندان کے دوسرے لوگ بھی ہندوستان کے غیر شرعی معاشرہ کی وجہ سے رکاوٹ بن جاتے ہیں جو شریعت کے مطلوبہ مقصد کے خلاف ہے؛ لہٰذا جب باپ دوسری شادی کرنا چاہے تو اولاد میں سے کسی کے لئے بھی رکاوٹ بننا جائز نہیں ہے؛ بلکہ باپ اگر نکاح ثانی کرنا چاہے تو شریعت کا مطلوبہ مقصد یہ ہے کہ اولاد خود باپ کے نکاح ثانی کا انتظام کرے۔ اور اگر باپ نے نکاح ثانی کرلیا ہے اور خرچ واخراجات پر قادر نہیں ہے، تو اولاد پر لازم ہے کہ باپ کے خرچ کے ساتھ ساتھ باپ کی زوجۂ ثانیہ کا نان ونفقہ بھی ادا کرے، جیسا کہ ذیل کی جزئیات سے واضح ہوتا ہے۔

اس کو ''ہندیہ'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

إلا أن يكون بالأب علة لا يقدر على خدمة نفسه ويحتاج إلى خادم يقوم بشأنه ويخدمه، فحينئذ يجبر الابن على نفقة خادم الأب منكوحة كانت أو أمة (وقوله) وإن احتاج الأب إلى زوجة والابن موسر وجب عليه أن يزوجه أو يشترى له جارية. (هندية قديم ١/ ٥٦٥، جديد ١/ ٦١١، والفتاوى التاتارخانية ٥/ ٤٢٧، رقم: ٨٣٧١)

اس کو ''فقہ اسلامی'' میں اور واضح الفاظ میں نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

يرى جمهور الفقهاء وفي رواية عند الحنفية: أن الوالد يلزمه تزويج أو إعفاف أبيه المعسر ولو كان كافرا معصوما ...... فالزواج معا تدعو الحاجة إليه ويتضرر الأب بفقده، فلزم ابنه تزويجه كالنفقة، والرواية الراجحة عند الحنفية عدم وجوب إعفاف الأب؛ لأنه من الكماليات. (الفقه الإسلامي وأدلته ٧/ ٧٣٣)

اس کو شامی میں اس طرح کے الفاظ میں نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

وعليه نفقة زوجة أبيه وأم ولده، بل وتزويجه أو تسريه (الدرالمختار) وفي الشامية: أي في رواية وفي أخرى: إن كان الأب مريضا أو به زماناة يحتاج للخدمة ...... قال في البحر: وظاهر الذخيرة أن المذهب عدم وجوب نفقة امرأة الأب أو جاريته أو أم ولده حيث لم يكن بالأب علة، وأن الوجوب مطلقا عن رواية أبي يوسف، وفي حاشية الرملي: والذي تحرر من المذهب أنه لا فرق بين الأب والابن في نفقة الخادم وأنه إذا احتاج أحدهما لخادم وجبت نفقته كما وجبت نفقة المخدوم، فكان من جملة نفقته، وإذا لم يحتج إليه فلا تجب. (شامي، زكريا ٥/ ٣٤٤، كراچی ٣/ ٦١٦)

اور اس کو صاحب خانیہ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

يجب عليه نفقة خادم الأب امرأة كانت الخادم أو جارية إذا كان الأب محتاجا إلى من يخدمه. (خانية على الهندية ١/ ٤٤٨، خانية جديد ١/ ٢٦٨)

کیا اولاد کو باپ کی زندگی میں اپنے حق کے مطالبہ کا حق ہے؟

سوال [۸]: بعض اوقات اولاد والد کی زندگی میں ہی جائیداد کا مطالبہ شروع کر دیتی ہے اور اسے اپنا حق سمجھتی ہے، کیا اولاد کے لئے ایسے مطالبہ کی گنجائش ہے؟ خاص کر ایسی صورت میں جب کہ والدین کی معاشی حالت بہتر اور اولاد محتاج ہو؟

المستفتی: فقہ اکیڈمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر اولاد باپ کی عیال اور باپ کی فیملی میں رہتی ہے تو والدین کی معاشی حالت بہتر ہونے کی صورت میں اولاد کے محتاج اور فقیر ہونے کی بات ثابت نہیں ہوتی؛ اس لئے کہ اولاد کی ساری ضروریات باپ کی عیال اور فیملی میں رہ کر پوری ہو جاتی ہیں، ہاں البتہ اگر اولاد باپ کی فیملی سے الگ رہتی ہو، تو معاشی کمزوری اور محتاج ہونے کی بات ثابت ہوتی ہے، ایسے حالات میں جب اولاد محتاج ہو اور والدین کی معاشی حالت بہتر ہو تو اولاد کے لئے ماں باپ سے ان کی زندگی ہی میں جائیداد کا مطالبہ کرنا اور ماں باپ پر دباؤ ڈالنا جائز نہیں ہے، ہاں البتہ ماں باپ کے سامنے اولاد اپنی ضرورت رکھ سکتی ہے اور پھر ماں باپ اپنے طور پر اپنے اختیار سے کچھ دے دیں تو وہ ان کے رحم وکرم پر موقوف ہے، مگر ان پر دباؤ ڈال کر کے یا جبر وتشدد کے ساتھ ان سے مطالبہ کرنے کا اولاد کو کوئی حق نہیں ہے، اسی طرح دادالٰہی اور موروثی جائیداد میں سے اولاد کا اپنے والدین سے حق کا مطالبہ کرنا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ جب تک ماں باپ زندہ ہیں وہی شرعی طور پر مالک ہیں، ان کی زندگی میں اولاد کا کوئی حق ان کی جائیداد سے متعلق نہیں ہوتا ہے، جیسا کہ درج ذیل جزئیات سے واضح ہوتا ہے۔ اس کو ’’البحر الرائق‘‘ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

وأما بيان الوقت الذي يجرى فيه الإرث فنقول هذا فصل اختلف المشايخ فيه، قال مشايخ العراق: الإرث يثبت في آخر جزء من أجزاء حياة المورث، وقال مشايخ بلخ: الإرث يثبت بعد موت المورث. (البحرالرائق كوئٹه ٨/ ٤٨٨، زكريا ٩/ ٣٦٤)

اس کوصاحب تاتارخانیہ نے ان الفاظ میں نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

الفصل الرابع في بيان الوقت الذي يجرى فيه الإرث، هذا فصل اختلف المشايخ رحمهم الله، قال مشايخ العراق: الإرث يجرى في آخر جزء من أجزاء حياة المورث، وقال مشايخ بلخ: الإرث يجرى بعد موت المورث. (الفتاوى التاتارخانية ٢٠/ ٢١٥، رقم: ٣٣٠٧٨)

اس سلسلے میں ''شعب الایمان'' کی حدیث شریف ملاحظہ ہو:

عن أبي حرة الرقاشي عن عمه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه. (شعب الإيمان للبيهقي ٤/ ٣٨٧، رقم الحديث: ٥٤٩٢)

عمر رسیدہ لوگوں کو ہاسپٹل میں داخل کردینا

سوال [۹]: مغربی ملکوں میں عمر دراز لوگوں کے لئے ہاسپٹل بنادیئے گئے ہیں، اب ہندوستان میں بھی جگہ جگہ ایسے ہاسپٹل بن رہے ہیں جن میں نوجوان اپنے بزرگوں کو داخل کردیتے ہیں، اس میں ایک پہلو یہ ہے کہ ان عمر دراز حضرات کو ایک جگہ اپنی ضرورت کی چیزیں مہیا ہوجاتی ہیں اور اپنے ہم عمر لوگ مل جاتے ہیں، دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کی محبت سے محروم ہوجاتے ہیں، عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ انسان چاہتا ہے کہ اس کے بال بچے اس کے قریب رہیں، اولاد اور اولاد کی اولاد کو دیکھ کر اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں، ایسے ہاسپٹلوں میں اس کی یہ خواہش ایک حسرت بن

جاتی ہے، تو ایسے ہاسپٹلوں کے بارے میں شرعی نقطہ نظر کیا ہے؟ کیا کوئی شخص اپنے بزرگوں کو ایسے ہاسپٹلوں میں قیام پر مجبور کرسکتا ہے؟

المستفتی: فقہ اکیڈمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب انسان عمر رسیدہ ہوکر کمزور ہوجاتا ہے، تو وہ اپنے چھوٹوں کی خدمت کا زیادہ محتاج ہوجاتا ہے اور اپنی اولاد اور قریبی اعزہ کی ہمدردی اور صلہ رحمی کا زیادہ مستحق بھی ہوجاتا ہے، ایسے حالات میں ان کو قریبی رشتہ داروں اور اعزہ سے الگ کر کے ہاسپٹلوں میں داخل کر دینا ان کے حق میں جیل خانہ میں داخل کر دینے کے مرادف ہے، اور شرعاً صلہ رحمی کے خلاف قطع رحمی کا ایک دروازہ کھول دینا ہے؛ لہٰذا شریعت صلہ رحمی، غم خواری اور رواداری سے محروم کرکے ایسے ہاسپٹلوں میں داخلہ کی ہرگز اجازت نہیں دیتی، قرآن وحدیث کی رو سے یہ عمل جواز کے دائرے میں داخل نہیں ہوسکتا، ذیل کی عبارات میں شریعت کا حکم ملاحظہ فرمائیے:

قوله تعالیٰ: ﴿اما يبلغن عندک الكبر احدهما او كلاهما﴾ خص حالة الكبر؛ لأنها الحالة التي يحتاجان فيها إلى بره لتغير الحال عليهما بالضعف والكبر، فألزم في هذه الحالة من مراعاة أحوالهما أكثر مما ألزمه من قبل لأنهما في هذه الحالة قد صارا كلا عليه فيحتاجان أن يلي منهما في الكبر ما كان يحتاج في صغره أن يليا منه، فلذلک خص هذه الحالة بالذكر. (الجامع لأحكام القرآن للقرطبي ١٠/ ١٥٨)

اور ''ترمذی شریف'' کی روایت ملاحظہ فرمائیے:

فقال عبد الرحمن: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: قال الله تبارک وتعالى: أنا الله وأنا الرحمن خلقت الرحم وشققت لها من اسمي، فمن وصلها وصلته ومن قطعها بتته. (جامع الترمذي ٢/ ١٢/ رقم: ١٩٠٧)

اور بخاری شریف کی روایت ملاحظہ فرمائیے:

عن أبي هريرة - رضي الله عنه - عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: الرحم شجنة من الرحمن، فقال الله من وصلك وصلته، ومن قطعك قطعته. (صحيح البخاري ٢/ ٨٨٥-٨٨٦، رقم: ٥٧٥٤-٥٧٥٥)

اور ترمذی شریف کی دوسری روایت ملاحظہ فرمایئے:

عن جبير بن مطعم - رضي الله عنه - قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يدخل الجنة قاطع، قال ابن أبي عمر قال سفيان: يعني قاطع رحم. (جامع الترمذي ٢/ ١٣، رقم: ١٩٠٩)

اور بدائع الصنائع کی عبارت ملاحظہ ہو:

وترك الإنفاق من ذي الرحم المحرم مع قدرته وحاجة المنفق عليه تقضي إلى قطع الرحم، فيحرم الترك وإذا حرم الترك وجب الفعل ضرورة. (بدائع الصنائع، زكريا ديو بند ٣/ ٤٤٢)

اجتماعی کفالت کے لئے زکوۃ جمع کرنا

سوال [۱۰]: بڑھاپے کی عمر میں اگر انسان کا ہاتھ خالی ہو، تو اس کی بے سہارگی اور بڑھ جاتی ہے۔ اور اگر اس کی اولاد یا قریبی رشتہ دار موجود نہ ہوں تب تو انسان اپنے آپ کو اس دنیا میں تنہا محسوس کرنے لگتا ہے، کیا ایسے لوگوں کی اجتماعی کفالت کے لئے خصوصی طور پر زکوۃ کی رقم استعمال کی جاسکتی ہے؟

المستفتی: فقہ اکیڈمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ضعیف کمزور لوگوں اور بوڑھے لوگوں کو ایک جگہ ایک ہاسٹل میں جمع کر کے پھر ان کی اجتماعی کفالت کے لئے زکوۃ اکٹھا کرنے کی بات سوال نامہ میں ذکر کی گئی ہے، تو اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ شریعت اس کی

اجازت ہی نہیں دیتی ہے کہ ان کو قریب یا دور کے رشتہ داروں سے الگ کر کے کسی ہاسٹل میں داخل کر دیا جائے، اگر قریبی رشتہ دار موجود نہیں ہیں تو دور کے رشتہ داروں کی ذمہ داری ہے کہ ان کی ضرورت پوری کریں، نیز اس میں یہ بات بھی ہے کہ دور کے رشتہ دار اپنی زکوۃ کی رقم سے بھی ان کی ضرورت پوری کر سکتے ہیں؛ لہٰذا اجتماعی کفالت کے واسطے زکوۃ اکٹھا کرنے کی ضرورت نہیں؛ بلکہ زکوۃ کا پیسہ ان کمزوروں کے ہاتھ میں دے کر کے براہ راست مالک بنا دیا جائے وہ اپنے حساب سے اپنی ضرورت پوری کرلیا کریں گے، جیسا کہ حسب ذیل جزئیات سے واضح ہوتا ہے۔

اس کو ''الاختیار لتعلیل المختار'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

واعلم أن التمليك شرط، قال تعالى: وآتو الزكوة، والإيتاء: الإعطاء، والإعطاء التمليك، فلابد فيها من قبض الفقير أو نائبه؛ لأن التمليك لا يتم بدون القبض. (الاختيار التعليل المختار ۱/ ۱۲۱، الشاملة بحواله كتاب النوازل ۷/ ۴۰)

اس کو ''بدائع الصنائع'' میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

أما ركن الزكاة، فركن الزكاة: هو إخراج جزء من النصاب إلى الله تعالى، وتسليم ذلك إليه يقطع المالك يده عنه بتمليكه من الفقير وتسليمه إليه أو إلى يد من هو نائب عنه، وهو المصدق، والملك للفقير يثبت من الله تعالى، وصاحب المال نائب عن الله تعالى في التمليك والتسليم إلى الفقير. (بدائع الصنائع، زكريا ديوبند ۲/ ۱۴۲)

عمر رسیدہ لوگوں کے لئے سرکاری مراعات سے فائدہ اٹھانا

سوال [۱۰]: عمر دراز لوگوں کے لئے حکومتوں نے مختلف چیزوں میں بعض خصوصی رعایتیں رکھی ہیں، جیسے ٹرین وغیرہ میں کرایہ میں تخفیف، حکومت کی طرف سے

امدادی وظیفہ، ٹیکس میں رعایت وغیرہ، جولوگ ان رعایتوں کے لئے مطلوب مقررہ حد عمر کو نہ پہنچے ہوں، کیاان کے لئے ایسی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا؟

المستفتی: فقہ اکیڈمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حکومت کی طرف سے عمر رسیدہ لوگوں کے لئے جو سہولیات اور خصوصی رعایتیں رکھی گئی ہیں، ان رعایتوں سے فائدہ اٹھانا ان ہی لوگوں کے لئے جائز ہے جن کی عمر مطلوبہ حد کو پہنچ گئی ہو، اب مطلوبہ حد کے بارے میں سرکاری قانون میں علی الاطلاق اس کی تحدید ہے، شمسی یا قمری کی کوئی قید نہیں ہے؛ لیکن غیر اسلامی سرکاری قانون میں شمسی اور انگریزی سن ہی مراد لیتے ہیں اور اسلامی قوانین میں قمری سن مراد ہوتا ہے، جیسے سعودی عرب وغیرہ میں ہے: اس لئے اگر کوئی مسلمان قمری حساب سے ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ گیا ہے اور شمسی حساب سے کچھ کم ہے اور وہ اس رعایت سے فائدہ اٹھاتا ہے، تو اسلامی نقطۂ نظر سے اسے خائن اور دھوکہ باز نہیں کہا جائے گا؛ اس لئے کہ اس کی عمر اسلامی سن کے اعتبار سے ساٹھ سال پوری ہوگئی ہے، ہاں البتہ احتیاطاً شمسی سال کے حساب سے ساٹھ سال پورے ہونے کے بعد ان رعایتوں سے فائدہ اٹھائے تو زیادہ بہتر ہے، نیز جن امور میں رعایت حاصل کرنے کا مدار آئی ڈی دیکھنے پر ہے، ان امور میں آئی ڈی میں درج کردہ تاریخوں کے اعتبار سے رعایت حاصل کرنا ضروری ہے، اور آج سے دس پندرہ سال پہلے تک لوگوں کے پاس آئی ڈی نہیں تھی اور نہ ہی آئی ڈی مانگی جاتی تھی، جس نے اپنی عمر اندازے سے ساٹھ سال سمجھا ہے اور لکھ دیا ہے اور وہ ان رعایتوں سے فائدہ اٹھا تا رہا ہے اور دس پندرہ سال کے بعد سے جو آئی ڈی بنتی چلی آئی ہے ان میں عمر رسیدہ لوگوں کی عمر میں عام طور پر اندازے سے لکھی گئی ہیں، قطعی اور حتمی نہیں ہیں؛ لہٰذا آج کے زمانے میں جتنے لوگ ساٹھ سال تک پہنچ چکے ہیں، ان میں سے ساٹھ ستر فیصد افراد وہ ہیں جن کی تاریخ پیدائش متعین طور پر درج کردہ نہیں ہے؛ اس لئے ایسے لوگ اندازے سے اپنی عمریں ساٹھ سال بتا

کران رعایتوں سے فائدہ حاصل کریں یا قمری حساب سے فائدہ حاصل کریں، تو جائز اور درست ہوگا؛ اس لئے کہ ان کا مقصد حکومت کو دھوکہ دینا نہیں ہے؛ بلکہ عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے ان رعایتوں سے فائدہ اٹھانا مقصد ہے۔

تمام اسلامی اور دینی ممالک میں سارا نظام اسلامی سال اور اسلامی مہینوں سے چلتا ہے، اور مسلمان اپنی تاریخیں اسلامی سال کے حساب سے محفوظ رکھتے ہیں، اس سلسلے میں فتح الباری مطبع دارالریان ۷/ ۳۱۵، مطبع اشرفیہ ۷/ ۳۴۱، عمدۃ القاری نسخہ قدیم ۱۷/ ٦٦، الروض الانف ۴/ ۲۵٦، میں پوری تفصیل موجود ہے۔

نیز قرآن مقدس کے اندر اسلامی تاریخ اور اسلامی مہینے ہی کو معتبر قرار دیا گیا ہے، آیت شریفہ ملاحظہ فرمایئے:

يَسْاَلُوْنَکَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ. [البقرة: ١٨٩]

اور ''روح المعانی'' میں بہت واضح الفاظ میں اسلامی تاریخ کے اعتبار کرنے کو واضح فرمایا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

وهي أن يكون معالم للناس يوقتون بها أمورهم الدنيوية، ويعملون أوقات زروعهم ومتاجرهم ومعالم للعبادات المؤقتة يعرف بها أوقتها كالصيام والإفطار، وخصوصا الحج، فإن الوقت مراعى فيه أداء وقضاء.

(روح المعاني، المكتبة التجارية مصطفى أحمد الباز ٢/ ١٠٧)

اور جامع احکام القرآن للقرطبی میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:

قوله تعالىٰ: ﴿قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ تبيين لوجه الحكمة في زيادة القمر ونقصانه، وهو زوال الإشكال في الآجال، والمعاملات، والأيمان، والحج، والعدد، والصوم، والفطر، ومدة الحمل، والإجارات والأكرية إلى ذلك من مصالح العباد. (الجامع لأحكام القرآن للقرطبي ٢/ ٢٢٨، بيروت لبنان ٢/ ٢٢٨)

ان جزئیات سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان اسلامی سال اور اسلامی مہینہ ہی کا زیادہ پابند ہوتا ہے؛ اس لئے اگر کسی مسلمان نے اسلامی سال کے پیش نظر سرکاری مراعات سے فائدہ اٹھالیا ہے، تو اس کے لئے جائز اور درست ہو جائے گا، اس کو ناجائز نہیں کہا جا سکتا؛ اس لئے کہ ملک بھر میں رہنے والے مسلمانوں کے سر براہان اور ذمہ داران قمری سال ہی کا اعتبار کرتے ہیں۔

❁❁❁

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا ☆ عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِمِ

اَللّٰہ أَکْبَر کَبِیْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْرًا وَسُبْحَانَ اللّٰہِ بُکْرَۃً وَأَصِیْلاً. الحدیث

(المعجم الکبیر ۲/ ۱۳۵، برقم: ۱۵۷۰)

(مفتی) شبیر احمد قاسمی

خادم الحدیث والافتاء جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد (یو-پی)

بروز جمعرات ۵/ ربیع الاول ۱۴۳۷ھ

(۱۸) باب اللهو واللعب

چھٹی کس دن منائیں اور کھیل کود کا حکم

سوال [۱۰۹۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) چھٹیاں جمعہ کو ہوں یا اتوار کو؟

(۲) کھیل کود کو تعلیم کا جز لاینفک قرار دینا کہاں تک درست ہے؟

(۳) بچوں اور بچیوں کے لئے یکساں حکم ہے یا دونوں میں فرق ہے؟

ہندوستان میں دو قسم کے ادارے عموماً رواج پذیر ہیں، دینی درسگاہیں اور جامعات دنیوی اسکول اور یونیورسٹیاں کچھ عرصہ سے لوگوں میں ایک خوش آئند رجحان یہ ابھرا ہے کہ بین بین تعلیمی ادارے بھی ہونے چاہئے، اس رجحان کے نتیجہ میں غیروں کی تو خبر نہیں، مگر مسلمانوں میں جا بجا اس طرح کے ادارے وجود میں آرہے ہیں جس کا عنوان یہ ہوتا ہے کہ بچے "خالص اسلامی ماحول میں دین سے واقفیت کے ساتھ عصری علوم کی مکمل تعلیم حاصل کرسکیں۔

بہر صورت ماحول تہذیب وافکار دینی ہی رکھنے کا اعلان واخبار واشتہار کیا جاتا ہے؛ اس لئے ان اداروں کی بڑی پذیرائی ہوتی ہے اور اپنی مہنگائی کے باوجود بہت جلد مقبول ہوجاتے ہیں اور پھر ایک ڈیڑھ ہزار سے لے کر پانچ پانچ ہزار تک فیس بھی مقرر کی جاتی ہے، ہمیں اس سے بحث نہیں؛ لیکن مذکورہ بالا عنوان واشتہار کی وجہ سے یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ چھٹیاں تہذیب واخلاق اسلامی کا حصہ ہیں یا نہیں؟ ہر ملک وقوم کے لوگ اپنے اپنے قومی مذہبی دنوں میں چھٹیاں کرتے ہیں، چھٹیوں کا خصوصاً بچوں کو شدت سے انتظار ہوتا ہے، بچوں کے ماں باپ ان دنوں کھانے وغیرہ کا اہتمام بھی کرتے ہیں اور اب تو ممبئ جیسے شہروں

میں خصوصی پکوان بعض مسلمانوں کے یہاں بھی سنیچر واتوار کو ہونے لگا ہے، ان ایام میں ٹیلی ویژن پر خصوصی فکر کے حامل نشریات بھی پیش کئے جاتے ہیں، سیر وتفریح جم کر کی جاتی ہے، تفریح گاہوں میں جگہ نہیں ہوتی، ان امور سے ان دنوں کی اہمیت کا دل میں اترنا قرین قیاس معلوم ہوتا ہے؛ اس لئے یہ سوال ذہنوں میں آیا کہ سنیچر اور اتوار کی چھٹیاں دینا اور ان اداروں کے اشتہار واعلان اسلامی تہذیب واخلاق سازی کے خلاف تو نہیں ہیں؟

اس سوال کو تقویت اس لئے بھی ملتی ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے سنیچر واتوار کو روزہ رکھا اور اس کی وجہ مشرکین کی مخالفت قرار دیا؛ کیونکہ وہ ان کے محترم اور عید کے دن ہیں؛ اس لئے وہ کھانے پینے کا اہتمام کرتے ہیں اور آپ ﷺ نے روزہ رکھوا کر عدم اکل بصورت صوم کی سنت جاری فرما کر ان کی مخالفت فرمائی۔

و في المشكوة: عن أم سلمة رضـ، قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم: يصوم يوم السبت ، ويوم الأحد أكثر مايصوم الأيام، ويقول انهما يوما عيد للمشركين ، فأنا أحب ان اخالفهم . (رواه أحمد ١٨٠، باب صيام التطوع)

وفي المرقاة تحت هذه الرواية والمستحب صومهما جميعاً متوالين تحقيقًا لمخالفة للفريقين. (١٤/٣٠٤-٣٠٥)

اس روایت کے خط کشیدہ جملے اہم اور مسئلہ کے حل کے لئے قابل غور ہیں، اس روایت اور ذکر کردہ مفاسد واحوال اور اسکول کے مقاصد کے پیش نظر سنیچر اور اتوار کی چھٹیوں کی گنجائش ہے یا نہیں؟

بعض لوگوں نے جمعہ کی اہمیت وفضیلت کے پیش نظر انتظامیہ کو جمعہ کی چھٹی کے لئے توجہ دلائی، تو یہ اعذار پیش کئے گئے کہ سنیچر واتوار کو ہم سب کا توافق ہو جاتا ہے، کاروبار وبازار بند رہتے ہیں۔ دوسرے ایک دو بچے اور بھی ہوتے ہیں، جن کی چھٹیاں انہیں ایام میں ہوتی ہیں؛ اس لئے سب مل کر وقت ساتھ گذار لیتے ہیں اور یہ کہ یہ عام ماحول ہے، اس میں سب کو

سہولت ہے، شادی بیاہ کی تقریبات بھی انہیں دنوں میں منعقد ہوتی ہیں، تو کیا یہ اعذار سنیچر واتوار کی رخصت کے لئے قابل ترجیح ہیں؟ یا تہذیب اسلامی سے ربط نہ ہونے کی وجہ سے مرجوح ومتروک ہونے کے قابل ہیں۔

سوال نمبر۲ رکی مزید وضاحت: کھیل کود جس کو اسلامی تعلیمات میں لہو ولعب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ومن الناس من يشتري لهو الحديث، إنما الحيوة الدنيا لهو ولعب، كل لهو حرام إلا ثلثة وغيره.

اس کو تعلیم کا لازمی جزء قرار دینا مذکورۃ الصدر اداروں کے لئے کہاں تک روا ہے، ان میں جو کھیل ہوتے ہیں، وہ عموماً دوڑ بھاگ کے مقابلے، فٹبال، کرکٹ، ٹینس، رسیوں سے کودنا اور بعض دوسرے جدید کھیل ہوتے ہیں، جس سے مستقبل میں دوسرے اداروں کے بچوں سے مقابلہ کرایا جاسکے وغیرہ غالباً مقاصد ہیں۔ بہرصورت جزء لاینفک قرار دینا کیسا ہے؟

آپ ارباب علم وفضل پر مخفی نہیں کہ عالمی سطح پر جتنی توجہ کھیل تماشہ پر دی جارہی ہے۔ بعض دوسری چیزوں پر نہیں؛ اس لئے نہ صرف یہ کہ کھیل کود اپنے مفہوم یعنی برائے تفریح طبع پر باقی نہ رہے؛ بلکہ ایک پیشہ وارانہ ہنر اور فن بھی بن گیا ہے، اور بچوں میں بڑی رغبت کے ساتھ یہ رجحانات مستحکم ہوتے ہیں کہ کھیل تو بڑی اہم اور قدر کی چیز ہے؛ کیونکہ اس سے ناموری اور بہت جلد سستی شہرت کے ساتھ ساتھ دنیا بھی بہت بہتر بن جاتی ہے؛ اس لئے ضمن میں بطور خاص یہ وضاحتیں مطلوب ہیں۔

(۱) کون کون سے کھیل (اپنے مقاصد کے ساتھ) جائز ہیں، اگر موجودہ ماحول میں ان کے مقاصد کا رخ بدلا جاسکتا ہے، تو اس کی مناسب صورت کیا ہے؟

(۲) اگر لازم قرار نہ دیا جائے، تو اس کے لئے یوم یا کم وزیادہ کتنا وقت مناسب ہے؟ خصوصاً بچیوں کو اس دوڑ میں شریک کرنا کہاں تک اور کس عمر تک درست وجائز ہے؟

امید کہ سوالوں کے جوابات مدلل اور حسب گنجائش مفصل لکھنے کی زحمت فرمائیں گے۔ واجرکم علی اللہ۔

المستفتی: سعید الرحمٰن فاروقی القاسمی، دارالعلوم امدادیہ، ممبئی-۳

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) ہفتہ واری تعطیل جمعہ کے دن رکھنی چاہئے؛ اس لئے کہ تمام مسلمان نماز جمعہ کے مکلّف ہیں اور شریعت نے صبح سے تیاری کا حکم دیا ہے، اس وجہ سے مدارس دینیہ میں ہفتہ واری تعطیل جمعہ ہی کے دن کرنی ضروری ہے اور ہفتہ میں مذہب اسلام کی رو سے جمعہ کا دن بڑا دن ہے اور اتوار کو دین وشریعت کے نقطۂ نظر سے کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہے؛ بلکہ ہفتہ کا دن یہودیوں کا بڑا دن ہے، اور اتوار کا دن نصاریٰ کا بڑا دن ہے، تو دینی مدارس میں ہفتہ اور اتوار کو تعطیل کرنے کی صورت میں یہود ونصاریٰ کے مذہب کی رعایت ہوتی ہے اور مذہب اسلام کی مخالفت ہوتی ہے۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ۱۶/۹۹، ڈابھیل ۸/۳۶۳، امداد الفتاوی ۴/۲۶۶)

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ. [آل عمران:۸۵]

(۲) کھیل کود کا تعلیم سے کوئی جوڑ نہیں ہے؛ لہٰذا کھیل کود کو تعلیم کا جزء قرار دینا درست نہیں ہے، ہاں البتہ تندرستی کے لئے بطور ورزش کھیلنا جائز ہے اور کھیلوں میں سب سے بہتر کھیل مسابقت یعنی دوڑ میں ایک دوسرے سے سبقت کرنا، اسی طرح جنگی آلات کے ذریعہ مشق کرنا سب سے بہتر کھیل ہے۔ حدیث شریف میں تین قسم کے کھیل کی ترغیب دی گئی ہے:

(۱) گھوڑ دوڑ میں سبقت کرنا۔

(۲) تیراندازی میں نشانہ بازی کرنا۔

(۳) بیوی کو خوش کرنے کے لئے اس کے ساتھ کھیلنا۔

لہٰذا دوڑ میں سبقت کا کھیل موجودہ کھیلوں میں سب سے بہتر ہے اور سوال نامہ میں

کرکٹ، فٹبال اور رسیوں وغیرہ سے جن کھیلوں کا ذکر کیا گیا ہے، اگر ورزش اور تندرستی کی نسبت سے سترعورت کی حفاظت کے ساتھ کھیلا جائے، تو اس کی گنجائش ہے، مگر بین الاقوامی دنیا میں فساق کے جو کھیل ہیں، ان میں نہ تو ورزش کی نیت ہوتی ہے اور نہ ہی سترعورت کی حفاظت کا لحاظ ہوتا ہے؛ اس لئے ایسا کھیل مدارس میں جاری نہ کرنا بہتر ہے۔ (مستفاد: امداد المفتیین ۱۰۰۰، کفایت المفتی قدیم ۹/۲۷، جدید زکریا مطول ۱۳/۱۰۳، عزیز الفتاوی ۷۵۰)

أما إذا قصد التلهي، أو الفخر، أو ترى شجاعته فالظاهر الكراهية، وفي الدر المختار أما بدونه فيباح في كل الملاعب (إلى قوله) وأما السباق بلا جعل فيجوز في كل شئ. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا۹/۵۷۷- ۵۷۹، كراچي٦/٤٠٢-٤٠٤)

(۳) بچوں کے لئے مردانہ کھیل اور بچیوں کے لئے زنانہ کھیل مناسب ہے، ہر علاقہ میں جو کھیل زنانہ شمار کیا جاتا ہے، وہی کھیل بچیوں کے لئے مقرر کرنا چاہئے اور جو کھیل مسابقت وغیرہ سے متعلق حدیث میں منقول ہے، وہی بچوں کے لئے مناسب ہے۔

عن عبد الله بن عبد الرحمن بن أبي حسين أن رسول الله صلى الله عليه وسلم -إلى- كل ما يلهو به الرجل المسلم باطل، إلا رميه بقوسه، وتاديبه فرسه، وملاعبته أهله، فإنهن من الحق. (سنن الترمذي، باب ماجاء في فضل الرمي في سبيل الله، النسخة الهندية ١/١٩٣، دارالسلام رقم:١٦٣٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ شعبان المعظم ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۵۵۳)

کبوتر بازی کا حکم

سوال [۱۰۹۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ کبوتر بازی کرنا کیسا ہے؟ دیکھنے میں ایسا آیا ہے کہ جو کبوتر پالتے ہیں ان کے گھروں میں بدحالی آئی ہے تو یہ عمل کیسا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: کبوتر بازی کرنا حرام ہے؛ کیونکہ اس میں بہت سارے امور خلاف شرع اور مفاسد پیش آتے ہیں، پڑوسیوں کی بے پردگی، تالیاں بجانا، سیٹیاں بجانا وغیرہ وغیرہ اور یہ ساری چیزیں ناجائز اور حرام ہیں۔ (مستفاد: کفایت المفتی جدید ۹/۱۸۷، قدیم ۹/۱۸۰، جدید زکریا مطول ۱۳/۹۷)

عن أبي هريرةؓ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم رأى رجلا يتبع حمامة، فقال: شيطان يتبع شيطانة. (سنن أبي داؤد، باب في اللعب بالحمام، النسخة الهندية ۲/ ٦٧٥، دارالسلام رقم: ٤٩٤٠)

عن عثمان أن رسول الله صلى الله عليه وسلم رأىٰ رجلا وراء حمام، فقال: شيطان يتبع شيطانة. (كنز العمال ١٥/ ٩٨)

فأما سائر ما يتلهى به البطالون من أنواع اللهو كالنرد، والشطرنج، والمزاجلة بالحمام، وسائر ضروب اللعب مما لايستعان به في حق، ولايستجم به لدرك واجب فمحظور كله. (الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٥/ ٣٣٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ رصفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف خاص ۱۱۴۴۲/۴۰)

پرندہ پالنا کیسا ہے؟

سوال [۱۰۹۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ کبوتر پالنا کیسا ہے؟ اسی طرح کسی قسم کا پرندہ پالنا جائز ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کبوتر یا دیگر پرندوں کا پالنا درست ہے، یہ آپ ﷺ کی تقریر سے ثابت ہے کہ حضرت انسؓ کے گھر میں ان کے چھوٹے بھائی نے پرندہ پال رکھا تھا۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم جدید ۱۶/۲۸۵)

عن أنس بن مالکؓ قال: کان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: یدخل علینا ولي أخ صغیر یکنی أباعمیر، وکان له نغریلعب به، فمات، فدخل علیه النبي صلی اللّٰه علیه وسلم ذات یوم فرآه حزیناً، فقال: ماشأنه؟ قالوا: مات نغره، فقال: أباعمیر ما فعل النغیر. (سنن أبي داؤد، باب ماجاء في الرجل یتکنی ولیس له ولد، النسخة الهندیة ۲/۶۷۵، دارالسلام رقم: ٤٩٦٩)

إتخاذ الحمام للبیض والأنس ونحو ذلک جائز غیر مکروه.

(حاشیة أبی داؤد ۲/۶۷۵)

لابأس بحبس الطیور والدجاج في بیته؛ ولکن یعلفها وهو خیر من إرسالها في السکک. (شامي، کتاب الحظر والإباحة، با الإستبراء وغیره، زکریا ۹/۵۷۵، کراچي ۶/٤۰۱) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۲۴ رصفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف خاص ۴۰/۱۱۴۴۹)

تعلیمی تاش کھیلنا جائز ہے یا نہیں؟

سوال [۱۰۹۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ چند آدمی تعلیمی تاش بلاشرط تعلیمی معلومات کے لئے کھیلتے ہیں، اس پر

کسی ایک شخص نے اعتراض کیا کہ اس کا کھیلنا درست نہیں، آپ شرع کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد ارشد، بس اسٹینڈ، شریف نگر، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر ہار جیت پر شرط نہیں ہے، اور اس کی وجہ سے نماز وغیرہ میں غفلت بھی نہیں ہوتی ہے تو جائز ہے، ورنہ نہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۴/ ۲۴۰، فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۹/ ۵۳۵)

وعلى هذا الأصل: فالألعاب التي يقصد بها رياضة الأبدان، أو الأذهان جائزة في نفسها، مالم تشتمل على معصية أخرىٰ، وما لم يؤد الانهماك فيها إلى الإخلال بواجب الإنسان في دينه ودنياه، والله سبحانه أعلم.
(تكملة فتح الملهم حكم الألعاب في الشريعة، اشرفية ديوبند ٤/ ٤٣٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ صفر المظفر ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/ ۱۱۱۲)

تفریحاً تاش کھیلنا

سوال [۱۰۹۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص نماز کا پابند ہے، جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہے اور شریعت کے مطابق داڑھی بھی رکھتا ہے؛ لیکن رات کو تفریحاً تاش کھیلتا ہے، تو ایسا کرنا درست ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تاش کھیلنا ذہنی عیاشی ہے، مگر اس میں جوا ہوگا

توحرام ہوجاتا ہے اور اگر جوا نہیں ہے، تو حرام تو نہیں، مگر مکروہ ہے؛ البتہ اس کی وجہ سے آدمی فاسق نہیں ہوتا۔

ويكره اللعب الشطرنج، والنرد......ثم إن قامر به تسقط عدالته، وإن لم يقامر لا تسقط. (هداية، كتاب الكراهية، مسائل متفرقه اشرفي ٤ /٤٧٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ ذی قعدہ ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۵۰۲۵)

بغرض تفریح لوڈو کھیلنا

سوال [۱۰۹۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہم سات آدمی ہیں اور سبھی نماز پڑھتے ہیں، ہفتہ میں ایک دن ساتوں آدمی دو تین گھنٹہ لوڈو کھیلتے ہیں، جس میں کسی طرح کی کوئی شرط نہیں ہوتی، جب اذان ہوتی ہے، تو نماز پڑھنے چلے جاتے ہیں، تو ہمارا مذہب کیا حکم کرتا ہے؟ ہم لوڈو کھیلیں یا نہیں؟ ہفتہ میں صرف ایک دن دل بہلانے کے لئے بلا کسی شرط کے کھیلتے ہیں۔

المستفتی: محمد شریف

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جسمانی یا دماغی تفریح کے لئے چار شرطوں کے ساتھ کھیل جائز ہوجاتا ہے۔

(۱) جو کھیل کھیلا جائے وہ کھیل کفار یا فساق کا نہ ہو۔

(۲) کھیل میں ہار جیت کی شرط نہ ہو۔

(۳) اس میں مشغول ہونے کی وجہ سے نماز، روزہ جیسی عبادات یا معاشی مشغولیت میں نقصان دہ نہ ہو۔

(۴) کھیل میں کوئی خلاف شرع امر نہ ہو اور سوال نامہ میں درج کردہ صورت میں اگرچہ آخری تینوں شرطوں کی پابندی ہے، مگر پہلی شرط کی پابندی نہیں ہوئی؛ اس لئے کہ لوڈو فساق کا کھیل سمجھا جاتا ہے؛ اس لئے اس سے احتیاط ہی بہتر ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۳۶۴/۱۵، جدید ڈابھیل ۵۳۸/۱۹-۵۳۹)

وعلى هذا الأصل: فالألعاب التي يقصد بها رياضة الأبدان، أو الأذهان جائزة في نفسها، مالم تشتمل على معصية أخرىٰ، وما لم يؤد الانهماك فيها إلى الإخلال بواجب الإنسان في دينه ودنياه، والله سبحانه أعلم. (تكملة فتح الملهم حكم الألعاب في الشريعة، اشرفية ديوبند ٤/ ٤٣٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ محرم الحرام ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸۳۴/۳۱)

لوڈو اور کیرم بورڈ کھیلنا

سوال [۱۰۹۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) لوڈو کھیلنا کیسا ہے اور خاص کر طالب علم کے لئے؟

(۲) کیرم بورڈ کھیلنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد اکرم بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱/۲) لوڈو اور کیرم بورڈ کھیلنے میں کوئی فائدہ نہیں ہے، محض تضیعِ اوقات ہے اور احکام شرعیہ سے غفلت ہوتی ہے؛ اس لئے ایسے کھیل نہیں کھیلنا چاہئے اور طالب علموں کو بدرجہ اولیٰ ان سب کھیلوں سے اجتناب ضروری ہے۔

إن الملاهي كلها حرام. (درمختار، كتاب الحظر والإباحة، زكريا ٩/ ٥٠٢، كراچي ٦/ ٣٤٨)

وکره تحريما اللعب بالنرد، وكذا الشطرنج وكره كل لهو، لقوله عليه الصلاة والسلام كل لهو المسلم حرام إلا ثلاثة ملاعبته أهله، وتأديبه لفرسه، ومناضلته بقوسه. (در مختار، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ٩/ ٥٦٥-٥٦٦، كراچي٦/ ٣٩٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/شعبان المعظم ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۹۸۳/۳۲)

کیرم کھیلنا

سوال [۱۰۹۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کیرم کھیلنا شرعا کیسا ہے؟ کیا کیرم بورڈ کھیلنے میں دماغ کی ورزش ہوتی ہے یا دماغ کوتھکانا ہے، عام طور پر لوگ اپنے وقت کو پاس کرنے کے لئے کھیلتے ہیں؟ کیا کسی آدمی کی اس کھیل سے دماغی ورزش کی نیت ہو، تو کیا کھیل سکتا ہے؟

المستفتی: محمد قاسم، گجراتی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر یہ کھیل فساق یا کفار کا کھیل نہیں ہے، اسی طرح اس کی وجہ سے نماز روزہ جیسی عبادات یا معاشی مشغولیت میں کسی قسم کا نقصان نہیں ہے، تو کبھی کبھار کھیلنے کی گنجائش ہوسکتی ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۲۰۰/۹، جدید زکریا مطول ۱۰۲/۱۲)

مگر میرے خیال میں یہ فساق کا کھیل ہے، اس سے احتراز ہی بہتر ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۳۶۴/۱۵، جدید ڈابھیل ۵۳۶/۱۹)

وعلى هذا الأصل: فالألعاب التي يقصد بها رياضة الأبدان، أو الأذهان

جائزة في نفسها، مالم تشتمل على معصية أخرىٰ، وما لم يؤد الانهماك فيها إلى الإخلال بواجب الإنسان في دينه ودنياه، والله سبحانه أعلم.
(تكملة فتح الملهم حكم الألعاب في الشريعة، اشرفية ديوبند ٤/ ٤٣٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍محرم الحرام ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱؍ ۳۸۳۵)

پتنگ بازی جائز ہے یا نہیں؟

سوال [۱۰۹۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ پتنگ بازی جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: مولانا حفظ الرحمٰن، مدیر ندائے شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: پتنگ بازی کے اندر وہ تمام مفاسد موجود ہیں، جو کبوتر بازی میں ہوتے ہیں، مثلاً چھتوں پر چڑھنے کے وجہ سے عورتوں کی بے پردگی، ہار جیت، تضییع اوقات، ہلاکت کا خطرہ وغیرہ وغیرہ، اطلاع ملی ہے کہ سال گذشتہ جے پور میں ۱۴؍جنوری کو پتنگ لوٹنے میں ۱۵-۱۶؍افراد چھتوں پر سے گر کر ہلاک ہوگئے ہیں۔

نیز آنحضور ﷺ نے اس طرح بازی لڑ کر لوٹنے والوں کو شیطان مردود سے تشبیہ دی ہے؛ اس لئے مذکورہ مفاسد اور آنحضور ﷺ کی ممانعت کی بنا پر پتنگ بازی وکبوتر بازی ناجائز اور حرام ہے، مسلمانوں پر ضروری ہے کہ ایسے مفاسد میں مبتلا ہونے سے لوگوں کو سختی یا حکمت سے روک تھام کیا کریں۔ (مستفاد: اصلاح الرسوم ۱۴، بہشتی زیور ۶/۶، مالابد منہ ۱۶۳)

فإن كان يطيرها فوق السطح مطلعاً على عورات المسلمين (إلى قوله) عزر ومنع أشد المنع، فإن لم يمتنع بذلك ذبحها. (الدر المختار،

كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ٩/ ٥٧٥، كراچي ٦/ ٤٠١)

عن أبي هريرة رضـ**، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم رأى رجلا يتبع حمامة، فقال: شيطان يتبع شيطانة.** (سنن أبي داؤد، باب في اللعب بالحمام، النسخة الهندية ٢/ ٢٧٥، دارالسلام رقم: ٤٩٤٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۸۳/۲۴)

پتنگ کٹنے کے بعد اس میں لگے روپیہ کا مالک کون؟

سوال [۱۰۹۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ضلع رام پور میں یہ ہوتا ہے کہ پتنگ کیساتھ سو کا پچاس کا بیس کا نوٹ باندھ کراڑایا جاتا ہے، اب پتنگ کٹنے کے بعد ان روپیوں کا مالک کون ہوگا؟ آیا لوٹنے والا کیوں کہ عرفاً وہ نوٹ لوٹنے والے ہی کا سمجھا جاتا ہے، تو کیا لوٹنے والا شرعاً اس کا مالک بن جائے گا یا نہیں؟ مدلل ومفصل بحوالہ کتب جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: (حضرت حفظ الرحمٰن صاحب) مدیر ندائے شاہی ونائب مہتمم مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پتنگ اور نوٹ دونوں لقطہ کے حکم میں ہوں گے، مالک کو واپس کردینا واجب ہوگا، مالک نہ ملنے کی صورت میں نوٹ کا صدقہ کردینا اور پتنگ کا پھاڑ دینا لازم ہوگا۔

لأن الغني لا يحل له الانتفاع بها. (شامي، كتاب اللقطه، زكريا ٦/ ٤٣٨، كراچي ٤/ ٢٧٩)

اور اگر فتنہ کا خطرہ نہ ہو، تو پتنگ حاصل کرکے پھاڑ دینا بھی جائز ہے جیسا کہ درمختار کی عبارت سے مستفاد ہورہا ہے۔

فإن كان يطيرها فوق السطح مطلعاً على عورات المسلمين، ويكسر زجاجات الناس يرميه تلك الحمامات عزر ومنع أشد المنع، فإن لم يمتنع بذلك ذبحها. (الدر المختار، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ۹/ ۵۷۵، كراچي ٦/ ٤٠١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۸۳/۲۴)

پتنگ کٹ جانے کے بعد اس کا مالک کون ہے؟

سوال [۱۰۹۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ پتنگ کٹ جانے پر دوسرے لوگوں کا قبضہ کر لینا اور مالک کو واپس نہ کرنا جائز ہے یا نہیں؛ جبکہ عرف میں چل رہا ہے کہ جو پہلے پکڑ لیتا ہے، وہ اس کا عرفاً مالک بن جاتا ہے۔

المستفتی: مولانا حفظ الرحمٰن، مدیر ندائے شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شریعت اسلامی میں ایسا عرف معتبر نہیں ہے، جو حکم شرع کے خلاف ہو؛ لہٰذا شرعاً لوٹنے والا اس کا مالک نہیں ہوگا؛ بلکہ وہ پتنگ اصل مالک کی ملکیت میں ہی رہے گی، مالک مل جائے تو واپس کر دینا واجب ہوگا۔

والعمل بالعرف مالم يخالف الشريعة (عقود رسم المفتي قديم ۹۸)

إن قال من أخذها فهي له ولا تخرج عن مالكه باعتاقه. وفي الشامية: ولو قال من تناول من مالي فهو حلال له، فتناول رجل شيئاً لايحل. (الدر المختار، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ۹/ ۵۷۵، كراچي ٦/ ٤٠١)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۸۳/۲۴)

مال کی ہار جیت کے بغیر شطرنج اور چوسر کھیلنا

سوال[۱۰۹۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مارچ ۲۰۰۰ء کے رسالہ میں ندائے شاہی کے مضمون ’’جوا اور سٹہ بازی‘‘ کے تحت قرآن پاک کی آیت کریمہ **یا ایھا الذین اٰمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعکم تفلحون.** کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا کلیم اللہ صاحب قاسمی نے صفحہ نمبر۲۸ ر پر لکھا ہے کہ شطرنج اور چوسر کو احادیث صحیحہ میں حرام قرار دیا گیا ہے؛ کیونکہ ان کھیلوں میں مال کی ہار جیت پائی جاتی ہے، جس سے واضح طور پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر ان کھیلوں میں مال کی ہار جیت نہ پائی جائے ،تو یہ کھیل حرام نہیں ہوں گے، جیسا کہ آج کل لوگ دوسرے کھیلوں کی طرح شطرنج بھی بغیر شرط کے کھیلتے ہیں؛ لہٰذا مجھے آپ سے یہی دریافت کرنا ہے کہ آیا ان کھیلوں کا بغیر مال کی ہار جیت کے کھیلنا کسی درجہ میں جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو برائے مہربانی اس کی تشریح سے نوازیں کرم ہوگا۔

المستفتی: محمد ذاکر خاں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مولانا کلیم اللہ صاحب کا مضمون اپنی جگہ درست ہے؛ اس لئے کہ یہ کھیل مال کی ہار جیت کے ساتھ تو ناجائز ہیں ہی اور آگے بڑھ کر مال کی ہار جیت کے بغیر بھی ناجائز ہیں؛ کیونکہ یہ کھیل آدمی کو اپنی ذمہ داریوں سے غافل کردیتے ہیں اور آخرت کو بھلا کر دنیا کی رغبت میں مبتلا کردیتے ہیں اور ان کھیلوں کے اندر شیطان کی اعانت بھی پائی جاتی ہے؛ اس لئے یہ کھیل ہار جیت کے بغیر بھی ناجائز ہیں۔

وكـره تحريما اللعب بالنرد، وكذا الشطرنج (در مختار) وتحته في الشامية: وإنـما كره لأن من اشتغل به ذهب عناؤه الدنيوي، وجاءه العناؤ الأخروي، فهو حرام، وكبيرة عندنا وفي إباحته اعانة الشيطان على الإسلام والـمسلمين. (در مـختـارمع الشـامـي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ۹/ ٥٦٥-٥٦٦، كراچي٦/ ٣٩٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ٦٦۰۲)

کرکٹ، ہاکی، لوڈو، تاش وغیرہ کھیلنا

سوال [۱۰۹۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کسی بھی کھیل مثلاً کرکٹ، ہاکی، شطرنج، لوڈو، بیٹ منٹن، تاش وغیرہ کھیلنا جائز ہے یا نہیں؟ یا اسلام میں اس کی ممانعت ہے؟ خلاصہ کیجئے یا جس کھیل کی ممانعتہو، اس کے بارے میں خلاصہ کیجئے۔

المستفتی: سعد انور ابن عبد الحفیظ، لاجپت نگر، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کھیل خواہ گیند کا ہو یا کوئی دوسرا، اگر اس سے محض کھیل اور لہو ولعب مقصود ہے، تو مکروہ ہے اور اگر تفریح طبع یا رفع کسل، یا تحصیل قوت مقصود ہو تو جائز ہے بشرطیکہ کسی ممنوعات شرعیہ پر مشتمل نہ ہو؛ البتہ تاش شطرنج اور لوڈو کا کھیلنا کسی صورت میں مستحسن نہیں ہے۔

وقال الشامیؒ: أما إذا قصد التلهي، أو الفخر، أو لترىٰ شجاعته، فالظاهر الكراهة أما بدونه فيباح في كل الملاعب. (شامي، كتاب الحظر

والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ٩/٥٧٧، كراچي ٦/٤٠٢، امداد المفتيين ١٠٠٠، عزيز الفتاوى ص: ٧٥٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ / جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴ / ۵۸۲۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۶/۲۳ھ

کرکٹ کھیل کا حکم

سوال [۱۰۹۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کرکٹ کا کھیل جائز ہے یا حرام؟ کچھ دنوں قبل گجرات کے مفتیان کرام نے بیک زبان حرام قرار دیدیا ہے؛ حالانکہ محمد میاں صاحب نے دینی تعلیم کے رسالہ میں جہاں جائز کھیلوں کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ کھیلا کرو، اس میں کرکٹ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

المستفتی: ارشد خاں شاہد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حدیث اور روایات فقہیہ سے واضح ہے کہ لہو ولعب شرعاً دراصل ممنوع ہے؛ لیکن اگر کوئی غرض اس سے متعلق ہے جیسے تفریح طبع اور ورزش وغیرہ، تو پھر جائز ہوگا، اس اعتبار سے کرکٹ کھیلنا جائز ہے؛ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ کھیل اس طرح ہو کہ ان میں کوئی امر خلاف شرع نہ ہو اور نہ تشبہ بالکفار ہو، نہ لباس وطرز وضع میں انگریزیت ہو، اور نہ ہی گھٹنے کھلے ہوئے ہوں، نہ اپنے نہ دوسروں کے اور نہ اس طرح اشتغال ہو کہ ضروریات اسلام نماز وغیرہ میں خلل آئے، کوئی شخص ان شرائط کے ساتھ کرکٹ کھیل سکتا ہے، تو جائز ہے ورنہ نہیں۔ آج کل چونکہ ان شرائطوں کا لحاظ نہیں کیا جاتا؛ اس لئے ناجائز کہا جاتا ہے۔ (مستفاد: عزیز الفتاویٰ ۱/۷۵۰، امداد المفتیین ص: ۱۰۰۱-۱۰۰۲)

وقال الشاميؒ: أما إذا قصد التلهي، أو الفخر، أو لترىٰ شجاعته،

فالظاهر الكراهة. وفي الدر المختار: أما بدونه فيباح في كل الملاعب.

(شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ۹/۵۷۷، كراچي ٦/٤٠٢، امداد المفتيين ص: ۱۰۰۰/ عزيز الفتاوى ص: ۷۵۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۱۸۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۶/۴ھ

علماء وطلباء کا کرکٹ وغیرہ کھیلنا

سوال [۱۰۹۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کرکٹ، فٹ بال، ٹینس، کھیلنا کیسا ہے؟ اگر کرکٹ کے عدم جواز کی علت انہماک اور امور دین سے غفلت ہے، تو کیا طلبۂ مدارس میں تفریح طبع کے لئے حدود شرع کی رعایت کے ساتھ اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اسی طرح اگر علماء بھی کھیلیں تو کوئی حرج تو نہیں؟ قرآن وحدیث وکتب سے مدلل تحریر فرمائیں۔

المستفتی: مفتی حسام الدین، مقیم امراوتی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جسم کی ورزش اور بدن کی تندرستی بڑھانے کے لئے بطور ورزش کوئی بھی ایسا کھیل جائز ہے، جو شریعت کو پامال نہ کرتا ہو اور اس کھیل کو کھیلنے والوں کیلئے ستر پوشی اور حدود کی رعایت رکھ کر تندرستی اور ورزش کی غرض سے کرکٹ، فٹ بال، وٹینس بھی کھیلنے کی گنجائش ہے، بشرطیکہ اس کھیل میں لوگوں کی تماشائی اور ہار جیت میں معاوضہ وغیرہ نہ ہو، اور نماز باجماعت سے اور اپنی دینی ودنیاوی ومعاشی ذمہ داریوں سے غفلت نہ ہو۔ (مستفاد: جواہر الفقہ قدیم ۲/۳۵۱، جدید زکریا ۴/۵۷۳، امداد المفتیین ۱۰۰۱)

وعلى هذا الأصل: فالألعاب التي يقصد بها رياضة الأبدان، أو الأذهان

جائزة في نفسها، مالم تشتمل على معصية أخرىٰ، وما لم يؤد الانهماك فيها إلى الإخلال بواجب الإنسان في دينه ودنياه، والله سبحانه أعلم.
(تكملة فتح الملهم حكم الألعاب في الشريعة، اشرفية ديوبند ٤/ ٤٣٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍صفر المظفر ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸؍ ۹۴۸۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۲/۲۴ھ

کرکٹ سے متعلق چند سوالات کے جوابات

سوال [۱۰۹۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اس زمانہ کے اکثر لوگ بے فائدہ اور نقصان دہ کھیلوں میں مدہوش اور منہمک ہیں، خصوصاً کرکٹ میں اور رات دن اسی کے نشہ میں رہتے ہیں کبھی تو کھیلتے ہیں اور کبھی تو دیکھتے ہیں اور کبھی سنتے ہیں اور اسی میں پوری زندگی کو جو کہ بہت قیمتی ہے ضائع کررہے ہیں۔

اور جو کرکٹ کھیل دو دو ملکوں کے درمیان ہوتا ہے، مثلاً ہندوستان، پاکستان وغیرہ وغیرہ میں، تو افسوس صد ہا افسوس کہ نماز ذکر تلاوت تسبیح چھوڑ کر کمینٹری سننے دیکھنے میں مدہوش ہوجاتے ہیں، خصوصًا مدارس اسلامیہ کے طلبہ اس میں زیادہ مشغول ہیں اور بعض اساتذہ بھی اس میں شامل ہیں، بڑے بڑے اساتذہ دورے میں پڑھانے والے اسی کے نشہ میں پڑ گئے ہیں۔ گذشتہ سال کا واقعہ ہے کہ ضلع سہارنپور میں بہت بڑے مدرسہ کے استاذ آخری سال میں دورۂ حدیث کے آخری سبق اور آخری دعا میں حاضر ہونے سے قاصر رہے؛ کیونکہ اس دن ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کھیل ہورہا تھا۔

بہرحال مدارس کے طلبہ کا حال یہ ہے کہ وہ تو اس وقت کھانا، پینا، سونا، نماز جماعت تلاوت، تسبیح، سبق، درس چھوڑ کر کمینٹری سنتے رہتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ ہر ایک کے پاس ایک ایک ٹی وی (.T.V) یا ریڈیو ضرور ہوتا ہے اور کم از کم ایک ایک کمرے میں تو

ایک ٹیوی یا ریڈیو ضرور ہوتا ہے اور یہ ٹی وی چھوٹا چھوٹا ہوتا ہے؛ لہٰذا اینٹینے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے، بعض طلبہ تو مدرسہ کے باہر کمرہ کرایہ پر رکھ کر اس میں بڑا ٹی وی رکھ کر اس میں کھیل دیکھتے اور سنتے ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کھیل سننے اور دیکھنے کے جتنے طریقے ہیں، وہ سب طریقے اختیار کرتے ہیں۔

میں نے اپنی آنکھ سے دورۂ حدیث، تکمیلات کے طلبہ کو اس کمینٹری کو سنتے ہوئے نماز قضا کرتے ہوئے دیکھا کہ ادھر جماعت ہو رہی ہے اور وہ مسجد کے کمرے میں بیٹھ کر کمینٹری سن رہا ہے، ادھر کان میں جماعت کی آواز آرہی ہے؛ لیکن وہ غافل کھیل سن رہا ہے، اسی طرح اذان کے وقت تلاوت کے وقت سنتے ہیں اور مسجد کے اندر بیٹھ کر بھی سنتے ہیں، درسگاہ میں بیٹھ کر بھی سنتے ہیں۔

کھیل جب ہوتا ہے، تو کھیل سنتے رہتے ہیں اور جب کھیل نہیں ہوتا، تو وہ لوگ یا تو کھیلتے ہیں یا اس کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں اور ہر جملہ میں کم از کم ایک مرتبہ اس کا تذکرہ کرتے ہیں، ایک دوسرے کو کھلاڑیوں کے نام سے پکارتے ہیں، مثلاً ایک دوسرے کو سچن، شعیب اختر، کیف وغیرہ سے پکارتے ہیں، یہ سب کھلاڑیوں کے نام ہیں۔

مذکورہ حالت تو کرکٹ سننے والوں کی ہے، اور بعض طلبہ ورلڈ کپ فٹبال میں بالکل ایسے ہی مشغول ہیں جیسے کرکٹ سننے والوں کا حال ہے اور یہ اکثر برمہ کے رہنے والے طلبہ کا حال ہے، وہ کھیل تو چار سال میں ایک مرتبہ ہوتا ہے اور تقریباً دو ماہ تک رہتا ہے، اور ایسے دلچسپی رکھنے والے اس کو خوب دیکھتے اور سنتے ہیں اور اس فٹبال کھیلنے میں بھی خوب دلچسپی ہے، اور اکثر اس کو کھیلتے ہیں۔

بہر حال تقریباً تمام مدارس اسلامیہ کے طلبہ اس میں مشغول ہیں اِلا ماشاء اللہ دو ایک مدارس مثلاً اس میں مدرسہ شاہی مرادآباد وغیرہ یہاں تک کہ دارالعلوم دیوبند کے طلبہ بھی اس عالمی وبا (کرکٹ) میں مدہوش ہیں اور آج کل تو کم از کم ساٹھ فی فیصد طلبہ اس کے نشہ میں

پڑ کر بالکل برباد ہورہے ہیں چھوٹے چھوٹے لڑکوں کی زبان میں کھیل کا تذکرہ سنا جاتا ہے۔

ہم نے ان کو ایسے منہمک ہونے سے منع کیا تھا اور امداد الفتاوی ۲۵۳/۴ (غنا ومزامیر اورلہولعب وتصاویر کے احکام) اور فتاوی رحیمیہ جس میں تفصیلی بحث ہے ۲۷۵/۷ (باب الامامۃ) کا حوالہ بھی دیا؛ لیکن وہ طلبہ نہیں مانتے اور فتاوی دارالعلوم کے مفتی شفیع صاحب کے قول سے جواز پر استدلال کرتے ہیں اور ان کھیلوں کو جائز بلکہ اولیٰ بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب یہ زمانہ صوفیانہ نہیں ہیں؛ بلکہ دنیا کے ساتھ چلنا چاہئے۔

لہٰذا بندہ مجبور ہو کر حضرت والا کے پاس ایک استفتاء بھیج رہا ہے، امید ہے کہ بالتفصیل مع دلائل کثیرہ جواب سے نوازیں۔

(۱) بغیر کسی غرض کے کرکٹ کھیلنے کا حکم کیا ہے، اور جسمانی ورزش کے لئے کھیلنے کا کیا حکم ہے اور ان دونوں صورتوں میں میدان میں بیٹھ کر دیکھنے کا کیا حکم ہے؟

(۲) عام طور پر جو دوملکوں کے درمیان کرکٹ ہوتا ہے، بغیر کسی اہتمام کے کبھی کبھی اخبار میں اس کے نتیجہ کو پڑھنے کا کیا حکم ہے اور اہتمام سے یعنی دائمی پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

(۳) کرکٹ کی کمینٹری (Commentry) کو ریڈیو میں کبھی کبھی بغیر انہماک کے سننے کا کیا حکم ہے اور انہماک سے سننے کا کیا حکم ہے؟

(۴) کرکٹ کی کمینٹری کو ٹی وی (T.V.) میں بغیر اہتمام کے سننے کا دیکھنے کا کیا حکم ہے اور ہمیشہ اس کمینٹری کو دیکھنے کا کیا حکم ہے؟

(۵) فٹ بال (Foot Ball) بغیر کسی غرض کے کھیلنے کا کیا حکم ہے اور جسمانی ورزش کے لئے کھیلنے کا کیا حکم ہے اور ان دونوں صورتوں میں میدان کے اندر بیٹھ کر دیکھنے کا کیا حکم ہے؟

(۶) ورلڈ کپ فٹ بال (World Cup Foot Ball) کبھی کبھی اخبار میں پڑھنے کا کیا حکم ہے اور اہتمام سے پڑھنے کا حکم کیا ہے؟

(۷) ورلڈ کپ فٹ بال کی کمینٹری کو عدم اہتمام کے ساتھ ریڈیو میں سننے کا حکم کیا ہے

اور بلا اہتمام سننے کا کیا حکم ہے؟

(۸) ورلڈ کپ فٹ بال کی کمینٹری کو عدم انہماک سے ٹی وی میں دیکھنے کا کیا حکم ہے اور مع انہماک دیکھنے کا کیا حکم ہے؟

(۹) کتنے کھیل جائز اور کتنے کھیل ناجائز؟ جتنے کھیل جائز ہیں کیا وہ مطلقاً جائز ہیں یا کسی شرط کے ساتھ مشروط ہیں؟

(۱۰) کھیل سنتے وقت کسی موقع پر سبحان اللہ یا الحمد للہ یا انا للہ پڑھنا کیسا ہے، مثلا کسی کھلاڑی نے چار رن بنائے یا کوئی آؤٹ (Out) ہو گیا، تو اس وقت مذکورہ اذکار پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ **بينوا بالدلائل العقلية والنقلية مع التفصيل ليشفي العليل وتوجروا بالأحر الجزيل.**

المستفتی: محمد نیاز الدین الجلیلی، کریم گنج (آسام)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) بغیر کسی غرض کے کرکٹ کھیلنا جب کہ اس میں دینی یا دنیاوی فائدہ نہ ہو درست نہیں ہے؛ کیونکہ اس میں اضاعت وقت ہے اور اگر جسمانی طاقت ورزش مقصود ہو اور اس میں خلاف شرع کوئی کام نہ ہو اور با قاعدہ ستر پوشی کا انتظام ہو اور فرائض اسلام نماز وغیرہ میں خلل نہ ہو، تو جائز ہے؛ لیکن آج کل چونکہ عموماً یہ شرائط کرکٹ کھیلنے میں مقصود ہیں؛ اس لئے ناجائز کہا جائے گا۔

نیز کرکٹ میچ کو میدان میں دیکھنا جبکہ وہاں نوجوان لڑکیاں اور عورتیں موجود ہوں اور اسکے علاوہ دیگر خلاف شرع امور ہوں تو ناجائز اور سخت گناہ کا باعث ہے۔

وكره كل لهو أي كل لعب وعبث إلى قوله قد جاء الأثر في رخصة المسارعة لتحصيل القدرة على المقاتلة دون التلهي، فإنه مكروه. (، فتاوی رحيمية ۲۷۷/۷، امداد المفتيين ص: ۱۰۰۲، شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ۵٦٦/۹، كراچي ۳۹٤/٦)

(۲) احکام شرعیہ مثلاً نماز وغیرہ سے غفلت نہ ہو، تو اہتمام کے ساتھ اور بغیر اہتمام کے خبریں پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ ۷/۲۷۷)

(۳) اہتمام کے ساتھ یا بغیر اہتمام کے کرکٹ کمینٹری کو ریڈیو پر سننے میں محض وقت کا ضیاع ہے: حالاں کہ وقت اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، ساتھ ہی ساتھ اس میں آخرت کا بھی فائدہ نہیں ہے؛ بلکہ خسارہ ہی خسارہ ہے۔ حدیث شریف میں لایعنی باتوں میں مصروف ہونے سے منع فرمایا گیا ہے۔

عن عليؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من حسن إسلام المرء تركه مالايعنيه. (مسند أحمد بن حنبل ۱/ ۲۰۱، رقم: ۱۷۳۷، سنن الترمذي، باب بلا ترجمة، النسخة الهندية ۲/ ۵۸، دارالسلام رقم: ۲۳۱۷-۲۳۱۸)

(۴) ٹی وی پر اہتمام یا غیر اہتمام کے ساتھ کمینٹری دیکھنے میں بہت سارے مفاسد ہیں اولاً تماشائی نیم عریاں لڑکیوں کی تصاویر سامنے آنا۔ ثانیاً ہر چھ بال کے بعد ایڈوٹائز آتا ہے، جو فلم دیکھنے کے مشابہ ہے، نیز نمازوں کا ضیاع، وقت کا ضیاع وغیرہ مفاسد کو شامل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، اس سے احتراز کرنا اور بچنا نہایت ہی لازم اور ضروری ہے۔

وكره كل لهو أي كل لعب وعبث إلى قوله والإطلاق شامل لنفس الفعل واستماعه. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ۹/ ٥٦٦، كراچي ٦/ ٣٩٤، فتاوى رحيمية ٧/ ٢٧٨)

(۵) فٹ بال کا حکم بھی کرکٹ ہی کے مانند ہے؛ لہٰذا اس کا جواب نمبر ا میں آگیا۔ (مستفاد: امداد المفتیین ص: ۱۰۰۲)

(۶) اس کا جواب نمبر۲ میں آگیا۔

(۷) اس کا جواب نمبر۳ میں آگیا۔

(۸) اس کا جواب نمبر۴ میں آگیا۔

(۹) کھیلوں کے سلسلے میں یہ بات ذہن نشین ہو کہ اسلام نے اس معاملہ میں نہ

کھلی آزادی دی ہے اور نہ ہی تنگ نظری سے کام لیا ہے؛ بلکہ کچھ شرطوں کے ساتھ کھیلوں کی اجازت ہے۔

(۱) کھیل میں ستر کے حدود کی رعایت کی جائے۔

(۲) کھیل میں ایسا مصروف نہ ہو کہ دینی فرائض سے بھی غفلت ہو جائے۔

(۳) ایسی دوطرفہ شرطیں نہ ہوں کہ جس سے قمار کی صورت پیدا ہو جائے۔

(۴) پھر ان میں وہ کھیل جس سے جسمانی ورزش وچستی پیدا ہو، تو زیادہ پسندیدہ ہے، جس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے گھوڑ سواری دوڑ اور تیر اندازی کو پسند فرمایا، جو جسم میں چستی وتوانائی کا باعث بنتے ہیں؛ لیکن آج کل عمومًا یہ شرائط موجودہ کھیلوں کرکٹ، فٹ بال اور ٹینس میں موجود نہیں ہیں؛ اس لئے ناجائز کہا جاتا ہے۔ (امداد المفتیین ص:۱۰۰۲، جدید فقہی مسائل ۱/۲۵۴)

(۱۰) کھلاڑی کی عمدہ کارکردگی یا اس کے آؤٹ ہو جانے کی بنا پر ذکر یا تسبیح پڑھنا جائز نہیں ہے؛ بلکہ پڑھنے والا سخت گنہگار ہوگا۔

وإن سبح على أن الفاسق يعمل الفسق كان آثمًا. (الأشباه والنظائر قديم ص: ٥٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/شعبان المعظم ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۱۱۳/۳۸)

انڈیا ٹیم کی جیت کے لئے دعا کرنا

سوال [۱۰۹۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ انڈیا پاکستان کا جو میچ ہوتا ہے، انڈیا میں صرف ٹیم کا مالک مسلمان ہے اور انڈیا تو اپنا دیش ہے اور پاکستان ٹیم میں سب کے سب مسلمان ہیں، تو انڈیا کی طرف سے دعا کرنی

چاہئے یانہیں؟ یہاں مدرسہ میں کچھ لڑکے انڈیا کی تعریف کرتے ہیں اور انڈیا کے جیتنے کی دعا کرتے ہیں۔ دوسرے کہتے ہیں کہ ہندوؤں کے لئے دعا کرتے ہو، جس میں صرف ایک ہی مسلمان ہے، تو اس کے بارے میں حضرات مفتیان کرام کیا فرماتے ہیں؟ اور انڈیا والے کہتے ہیں کہ جس دیش میں رہتے ہو، اس کی برائی کرتے ہو۔

المستفتی: محمد لقمان، کانپوری، مدرسہ اشرف المدارس، ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس طرح میچ کھیلنا دیکھنا جائز نہیں، اسی طرح اس میں کسی ٹیم کے لئے دعا کرنا بھی جائز نہیں چاہے ہندوستان کی ٹیم ہو، یا پاکستان کی؛ کیونکہ یہ اعانۃ علی المعصیۃ ہے، جو شرعاً ممنوع ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدہ:۲]

درمختار میں ہے۔

وكره كل لهو لقوله عليه السلام كل لهو المسلم حرام.

اور شامی میں ہے۔

والإطلاق شامل لنفس الفعل واستماعه كالرقص، والسخرية، والتصفيق (إلى قوله) وكلها مكروهة؛ لأنهازي الكفار. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ۹/۵٦٦، كراچي ٦/۳۹٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ربیع الاول ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴؍۶۰۵۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۳/۴ھ

(۱۹) باب استعمال الذهب والفضة وغيرها

مردوں کے لئے کن چیزوں میں چاندی کا استعمال جائز؟

سوال [۱۰۹۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مردوں کے لئے مقدار مقررہ سے زائد چاندی اور سونا یا دیگر اشیاء نمائش کا استعمال کرنا کیسا ہے؟ اور اس کے ساتھ نماز ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: محمد ادریس، جامعہ ملیہ دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مردوں کے لئے صرف چاندی کی انگوٹھی کی اجازت ہے، اس کے علاوہ سونا، اسٹیل، تانبا وغیرہ کسی اور دھات کی کوئی انگوٹھی مردوں کے لئے جائز نہیں ہے، اور انگوٹھی کے علاوہ گھڑی کی چین وغیرہ گھڑی کی حفاظت کے لئے استعمال کرنا جائز ہے اور کپڑے میں بٹن کا استعمال کرنا بھی جائز ہے، ان کے علاوہ کسی اور طریقہ سے کسی قسم کی دھات کا استعمال مردوں کے لئے جائز نہیں ہے۔

عن عبد الله رضي الله عنه، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم إتخذ خاتما من ذهب، وجعل خاتما من ذهب، وجعل فضة مما يلي كفه، واتخذه الناس، فرمي به، واتخذ خاتما من ورق، أو فضة. (صحيح البخاري، باب خواتيم الذهب، النسخة الهندية ۲/ ۸۷۱، رقم:۵۶۳۶، ف:۵۸۶۵)

عن ابن بريدة، عن أبيه، قال: جاء رجل إلى النبي صلى الله عليه وسلم خاتم من حديد، فقال: مالي أرى عليك حلية أهل النار؟ ثم جاءه

وعليه خاتم من صفر، فقال: مالي أجد منك ريح الأصنام؟ ثم أتاه وعليه خاتم من ذهب، فقال: إرم عنك حلية أهل الجنة؟ قال: من أي شيئ أتخذه؟ قال: من ورق ولاتتمه مثقالا. (سنن الترمذي، باب ماجاء في الخاتم الحديد، النسخة الهندية ۱/ ۳۰۸، دارالسلام رقم:۱۷۸۵)

ولا يتحلي الرجل بذهب و فضة مطلقًا إلا بخاتم-ولا يتختم إلابالفضة لحصول الاستغناء بها فيحرم بغيرها كحجر-فعلم أن التختم بالذهب، والحديد، والصفر حرام- ولايكره في المنطقة حلقة حديد. وفي الشامية: وانتطق الرجل شد وسطه بمنطقة كتنطق -وهذا أنسب هنا. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في اللبس، زكريا ۹/٦ ۱ ٥، كراچي ۹/ ۳٥۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۷؍محرم الحرام ۱۴۲۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر:الف ۳۶/ ۷۶۴۷)	۲۷/۱/۱۴۲۳ھ

مرد کے لئے چاندی کی انگوٹھی کے نگینہ پر سونا استعمال کرنا

سوال [۱۰۹۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ چاندی کی انگوٹھی کے نگینہ پر تھوڑا سا سونا استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: مجیب الرحمٰن، ندیادی متعلم مدرسہ امدادیہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چاندی کی انگوٹھی کے نگینہ پر تھوڑا سا سونا استعمال کرنا جائز ہے۔

وحل مسمار الذهب في حجر الفص. (الدر المختار، كتاب الحظر

والإباحة، فصل في اللبس، زكريا ۵۱۹/۹، كراچي ۳۶۰/۶، کوئٹه ۲۵۴/۵، الموسوعة الفقهية الكويتية۸ ۱۱۱/۱، هدايه اشرفي ۴۵۷/۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۳۰/۲۳)

سونے کا نگ لگی ہوئی انگوٹھی کے استعمال کا حکم

سوال [۱۰۹۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ وہ چاندی کی انگوٹھی جس میں سونے کا نگ لگا ہو، اس کو استعمال کرنا کیسا ہے؟ مدلل تحریر فرمائیں۔

المستفتی: مجیب الرحمٰن، مدرسہ افضل العلوم، تاج گنج، آگرہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: چونکہ نگینہ حلقہ کے تابع ہوتا ہے؛ اس لئے اگر وہ سونے کا ہو، پھر بھی جواز معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ سونے کے وہ بٹن جو کپڑے سے متصل ہوتے ہیں، کپڑے کے تابع ہوکر، اس کا استعمال درست ہوگا۔

وأما الفص فلا يبالي به من أي نوع منها، وليحرر الجواز بنص.

(**طحطاوي**، كتاب الحظر والإباحة، فصل في اللبس، کوئٹه ۱۸۱/۴)

ثم الحلقة في الخاتم هي المعتبرة؛ لأن قوام الخاتم بها ولا معتبر بالفص حتى أنه يجوز أن يكون حجراً وغيره. كذا في السراج الوهاج.

(هندية، الباب العاشر في استعمال الذهب والفضة، زكريا قديم۵ /۳۳۵، جديد ۳۸۹/۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۷۳۹/۳۳)

چاندی کے علاوہ دیگر دھاتوں کی انگوٹھی پہننا

سوال [۱۰۹۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مردوں کے واسطے چاندی کی انگوٹھی کے علاوہ کیا لوہے، پیتل، اوراسی طرح پتھروں کی انگوٹھیاں پہننا جائز ہے یانہیں؟

المستفتی: محمد دانش، محلّہ کسرول، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مردوں کے لئے چاندی کی ایک انگوٹھی کے علاوہ کسی اوردھات لوہے، پیتل، تانباوغیرہ کی انگوٹھی پہننا جائز نہیں اورعورتوں کے لئے چاندی اورسونے کی انگوٹھی جائز ہےاوران کے علاوہ کسی اوردھات کی انگوٹھی عورتوں کے لئے بھی ممنوع ہے۔(مستفاد: بہشتی زیور۳/۶۲)

اسی طرح پتھر کی بھی جائز نہیں۔

عن عبد الله بن بريدةؓ، عن أبيه، قال: إن رجلاً جاء إلى النبي صلى الله عليه وسلم وعليه خاتم من حديد، فقال: مالي أرى عليك حلية أهل النار، فطرحه، ثم جاءه وعليه خاتم من شبه، فقال: مالي أجد منك ريح الأصنام، فطرحه، قال: يا رسول الله! من أي شيئٍ أتخذه؟ قال: من ورق ولاتتمه مثقالا. (سنن النسائي، مقدار ما يجعل في الخاتم من الفضة، النسخة الهندية۲/۲۴۵، دارالسلام رقم: ۵۱۹۵، سنن أبي داؤد، باب ماجاء في خاتم حديد، النسخة الهندية۲/۵۸۰، دارالسلام رقم:۴۲۲۳)

عن أم عمرو بنت عمرو، قالت: كانت عائشةؓ تنهانا أن نتحلي الذهب، أو نضبب الآنية، أونحلقها بالفضة، فما برحنا حتى رخصت لنا، وأذنت لنا أن نتحلى الذهب، وما أذنت لنا ولا رخصت لنا أن نحلق الآنية،

أو نضببها بالفضة. (المصنف لإبن أبي شيبة، من كره الشرب في الإناء المفض، موسسه علوم القرآن ۱۲/ ۲۹۱، رقم: ۲٤٦۳۷)

ولايتختم إلا بالفضة لحصول الاستغناء بها فيحرم بغيرها كحجر، وتحته في الشامية: فعلم أن التختم بالذهب والحديد، والصفر حرام (إلى قوله) والتختم بالحديد، والصفر، والنحاس، والرصاص مكروه للرجال، والنساء. (شامي، كتاب الكراهية، فصل في اللبس، زكريا ۹/ ۵۱۷، كراچي ۶/ ۳۵۹-۳۶۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰ رمحرم الحرام ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۲۱۹/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۱/۳۰ھ

مرد کے لئے مختلف دھاتوں کی انگوٹھی پہننا

سوال [۱۰۹۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے گھر سے ایک خط آیا ہے، جس میں لکھا ہے کہ سونے سے لے کر لوہے تک جو بھی دھاتیں ہیں، خواہ وہ پیتل ہو، خواہ وہ چاندی ہو، خواہ وہ کوئی بھی دھات ہو، اس کا استعمال کرنا انگوٹھی کی شکل میں ہو چاہے وہ چشمہ کی شکل میں ہو یا وہ بٹن کی شکل میں ہو، خواہ وہ کسی بھی شکل میں اس کا استعمال کرنا عوام کے لئے کیسا ہے؟ اور خواص کے لئے کیسا ہے؟ حضرت والا سے گذارش ہے کہ جلد از جلد جواب سے نوازیں۔

المستفتی: محمد عالم، سیتاپوری، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مردوں کے لئے چاندی کے علاوہ باقی کسی بھی دھات کی انگوٹھی جائز نہیں اور مردوں کے لئے سونے چاندی کی چین اور چشمہ کا فریم بھی جائز

نہیں ہے؛ البتہ اگر بٹن کو باقاعدہ کپڑے کے ساتھ سل کر ضم کر دیا جائے، تو گنجائش ہے اور اگر دھلنے اور پریس کرنے کے وقت علاحدہ کیا جاسکتا ہے، تو جائز نہیں۔

نیز سونا، چاندی کے علاوہ ہر قسم کی دھات کا مردوں کے لئے گھڑی کی چین، بٹن، چشمہ کے فریم میں استعمال کرنا جائز ہے، انگوٹھی میں ناجائز ہے اور عورتوں کے لئے انگوٹھی میں صرف سونا، چاندی کا استعمال جائز ہے، دوسری دھاتوں کا استعمال انگوٹھی میں عورتوں کے لئے بھی ناجائز ہے۔

عن ابن بريدة، عن أبيه، قال: جاء رجل إلى النبي صلى الله عليه وسلم وعليه خاتم من حديد، فقال: مالي أرى عليه حلية أهل النار؟ ثم جاءه وعليه خاتم من صفر، فقال: مالي أجد منك ريح الأصنام؟ ثم أتاه وعليه خاتم من ذهب، فقال: إرم عنك حلية أهل الجنة؟ قال: من أي شيئ أتخذه؟ قال: من ورق ولا تتمه مثقالا. (سنن الترمذي، باب ماجاء في الخاتم الحديد، النسخة الهندية ١/ ٣٠٨، دارالسلام رقم: ١٧٨٥، مسند أحمد البزار مكتبه العلوم والحكم ١٠/ ٣٠٩، رقم: ٤٤٣٠)

أن التختم بالفضة حلال للرجال بالحديث، وبالذهب، والحديد، والصفر، حرام عليهم بالحديث. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في اللبس، زكريا ٩/ ٥١٧، كراچي ٦/ ٣٦٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ ؍ رجب المرجب ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲ ؍ ۴۵۲۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶ ؍ ۷ ؍ ۱۴۱۶ھ

مرد کے لئے سونے چاندی کے بٹن کا استعمال

سوال [۱۰۹۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: کہ ایک شخص نے سونے کے چار بٹن اپنی قمیص میں استعمال کرنے کے لئے اس سبب سے بنوائے کہ سفر میں وقت ضرورت فروخت کر کے اپنی پریشانی کو دور کر لے اور کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرے۔ براہ کرم مفصل جواب سے مطلع فرمائیں کہ یہ عمل جائز ہے اور نماز میں کوئی فرق تو نہیں آتا؟

المستفتی: محمد اکرام، تحصیل اسکول، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فتاوی رشیدیہ وغیرہ میں شامی کی عبارت سے استدلال کر کے سونے کا بٹن استعمال کرنا مردوں کے لئے مطلقاً جائز لکھا ہے اور امداد الفتاوی، فتاوی احیاء العلوم، فتاوی رحیمیہ محمودیہ وغیرہ میں شامی کی عبارت کا مطلب کاما بتولی کی گھنڈی نکال کرنا جائز قرار دیا ہے؛ لیکن مذکورہ ضرورت کی بناء پر بلاکسی اختلاف کے سب کے نزدیک جائز ہوگا۔

ولاتشد الأسنان بالذهب، وتشد بالفضة–إلى قوله– ان الأصل فيه التحريم والإباحة للضرورة. (هداية، كتاب الكراهية، فصل في اللبس، اشرفي ٤/٤٥٧)

قال الخطابي فيه استباحة استعمال اليسير من الذهب للرجال عند الضرورة كربط الأسنان، وما جرى مجراه مما لا يجري غيره فيه مجراه.

(عون المعبود، باب ماجاء في ربط الاسنان بالذهب، دارالكتاب العربي ٤/١٤٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢١/ ٢٨٠– ٢٨١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱/ ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۴۶۸/۲۵)

ایضاح المسائل کے ایک مسئلہ پر اعتراض کا جواب

سوال [۱۰۹۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ احقر دار العلوم دیوبند میں تدریب الإفتاء کا طالب علم ہے اور حضرت مولانا محمد احتشام الحسن صاحب کاندھلوی قدس سرہ میرے حقیقی دادا ہیں، پچھلے ماہ دار العلوم کے مہمان خانہ میں جناب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا، مگر قلت وقت کے باعث کوئی علمی استفادہ نہیں کر سکا، جناب کی فقہ سے متعلق تصانیف سے خوب مستفید ہوتا ہوں، خصوصاً ایضاح المسالک سے استفادہ کیا ہے، اس کو الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ **فجزاکم الله جزیل الجزاء علی هذه الخدمة المبارکة.**

فی الحال یہ چند سطور محض آپ کے دریائے علم سے استفادہ کی خاطر سپرد قرطاس کرر ہا ہوں، چند روز قبل آپ کی تصنیف ''ایضاح المسائل'' کا مطالعہ کر رہا تھا، دوران مطالعہ دو جگہ اشکال ہوا، اسی کے دفعیہ کے لئے جناب کو تکلیف دے رہا ہوں--- کتاب کے ص: ۱۳۸ پر جناب نے مردوں کے لئے سونے اور چاندی کے بٹنوں کو ناجائز قرار دیا ہے، اور حوالہ فتاوی رشیدیہ ۵۸۷ر کا دیا ہے؛ حالانکہ فتاوی رشیدیہ میں کئی جگہ صراحتاً جواز نقل کیا گیا ہے، اور کہیں بھی عدم جواز کی رائے منقول نہیں ہے، آپ کے بیان کردہ مسئلہ پر اشکال مقصود نہیں ہے؛ کیونکہ فقہاء کرام نے جو ''ازرار الذہب'' کے جواز کا فتوی دیا ہے، یقیناً اس سے مراد وہ گھنڈیاں جو کلابتوں کے ذریعہ کپڑے میں بن دی جاتی تھیں اور وہ ثوب کے تابع ہونیکی وجہ سے جائز تھیں اور موجودہ دور میں زنجیری بٹنوں کو ثوب کے تابع نہیں قرار دیا جاسکتا ہے؛ چنانچہ اسی طرح عدم جواز کا فتوی امداد الفتاوی نظام الفتاوی اور فتاوی رحیمیہ میں مرقوم ہے، مقصد صرف فتاوی رشیدیہ کے حوالہ پر اشکال ہے۔

المستفتی: محمد ارتضاء الحسن رضی کاندھلوی عفی عنہ، متعلم تدریب علی الافتاء دار العلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضرت مولانا مفتی ارتضاء الحسن صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے!

آنجناب نے خاکسار کے تحریر کردہ مذکورہ دونوں مسئلوں پر جس زور و طاقت سے اشکال فرمایا ہے، اس وقت آخری سال میں اسباق کی سخت مشغولیت کی وجہ سے اسی انداز کا جواب لکھنے اور دلائل فراہم کرنے کا موقع نہیں اور نہ ہی خاکسار میں اس کی صلاحیت ہے، تاہم آپ کے علمی ذوق وفراست اور اخلاق سے خاکسار کو بڑی خوشی ہوئی؛ اس لئے مختصر جواب پیش خدمت ہے۔

شاید اس سے شبہ کا ازالہ ہو جائے، ایضاح المسائل ۱۳۸/ میں سونا، چاندی کے بٹنوں سے متعلق ہے؛ اس مسئلہ کو آنجناب دوبارہ پڑھ کر دیکھ لیں۔ اس میں دو چیزیں الگ الگ ہیں۔

(۱) سونے کا بٹن کپڑے سے الگ نہیں ہوتا ہے، یعنی کپڑے میں سی دیا گیا ہے، تو اس کا استعمال جائز ہے، یہی مفہوم فتاوی رشیدیہ میں ہے، جس کا آنجناب نے سوال نامہ میں فتاوی رشیدیہ میں موجود ہونے کا زور سے انکار کیا ہے؛ حالانکہ اس میں ہے۔

(۲) اور اگر کپڑے سے الگ ہو جاتا ہے، یعنی کپڑے میں سلا نہیں ہے، تو اس کا استعمال جائز نہیں ہے، یہی چاندی کا بھی حکم ہے۔ اور عدم جواز کا یہ مفہوم فتاوی رحیمیہ میں امداد الفتاوی وغیرہ کے حوالہ کے ساتھ موجود ہے؛ چونکہ یہ کتاب عوام ہی کے لئے لکھی گئی ہے؛ اس لئے دونوں جزؤں کا حوالہ الگ الگ دینے کے بجائے بغرض اختصار آخر میں ایک ساتھ دیدیا ہے؛ لہٰذا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ فتاوی رشیدیہ میں یہ مسئلہ نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ جمادی الثانیہ ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۲۲۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸ جمادی الثانیہ ۱۴۲۰ھ

ایضاح المسائل کے ’’سونے چاندی کے بٹن لگانے‘‘ والے مسئلہ پر اعتراض

سوال [۱۰۹۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بندہ نے جناب والا کی تالیف کردہ کتاب ایضاح المسائل کا مطالعہ کیا بہت پسند آئی روزمرہ پیش آنے والے اکثر مسائل کا حل پیش کیا ہے؛ لیکن احقر کی کوتاہ نظر سے ایک مسئلہ ایسا گذرا جس سے دل مطمئن نہ ہوسکا، حضور والا کے اس رسالہ میں چاندی کے بٹن لگانا منع لکھا ہے، چاہے وہ جدا ہوجاتے ہوں اور بغیر جدا ہونے والے کو جائز لکھا ہے اور حوالہ فتاوی رحیمیہ، فتاوی رشیدیہ/ ۵۸۷ کا دیا ہے حالانکہ احقر نے فتاویٰ رشیدیہ کی طرف رجوع کیا، تو اس میں مذکورہ بالا صفحہ پر ہی دونوں طرح کی بات درست لکھی ہے چاہے سونے کے ہوں یا چاندی کے ہوں الگ ہوتے ہوں یا الگ نہ ہوتے ہوں، دونوں طرح ٹھیک ہے آیا اصل مسئلہ کیا ہے آگاہ فرمائیں۔

المستفتی: محمد عارف، مظفرنگری،

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: احقر کو خود بھی حیرت ہوئی کہ اس میں فتاوی رشیدیہ کا حوالہ کیسے آگیا، احقر کے ذہن میں بھی یہی ہمیشہ امداد الفتاوی کا فتوی رہا ہے اور فتاوی رحیمیہ والوں نے بھی امداد الفتاوی کو بنیاد بنایا ہے اور احقر بھی ہمیشہ اسی کو دیکھ کر مسئلہ لکھتا رہا ہے۔

الحمد للہ نفس مسئلہ اور فتاوی رحیمیہ کا حوالہ دونوں صحیح ہیں۔ رشیدیہ کا حوالہ غلطی سے آگیا۔ دراصل امداد الفتاوی ہی کا حوالہ اس میں آنا چاہئے تھا، امداد الفتاوی مطبع کراچی ۴/۱۲۵، مطبع دیوبند ۴/۱۳۱/ کا ملاحظہ فرمائیں۔ انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں بجائے رشیدیہ کے امداد الفتاوی کا حوالہ لکھ دیا جائے گا، توجہ دلانے کا بہت بہت شکریہ۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ محرم الحرام ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۵۹۲۹)

جس کرتے میں سونے چاندی کے تار ہوں اس کا استعمال

سوال [۱۰۹۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سونے کے بٹن کرتے میں لگانا جائز ہے یا نہیں؟ سنا ہے کہ اگر کپڑے میں سلے ہوں، تو جائز ورنہ نہیں، تو اگر سلے ہونے کی صورت میں جائز ہے، تو اگر تانے یا بانے کی شکل میں کرتے میں سونے کے کہیں کہیں تار ہوں تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ذاکر، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سونے، چاندی کے بٹن کا استعمال مردوں کے لئے جائز نہیں ہے؛ البتہ جو بٹن کپڑے کے ساتھ سلے ہوں، جیسے گھنڈی وغیرہ، تو ان کا استعمال درست ہے؛ کیونکہ وہ کرتے کے تابع ہوتے ہیں۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ۱۳۸، احسن الفتاویٰ ۸/۷۰، محمودیہ قدیم ۱۴/۳۰۶۰، ڈابھیل ۱۹/۳۵۲)

لابأس بأزرار الديباج والذهب. (شامي، كتاب الحظروالإباحة زكريا ٩/ ٥١١، كراچی ٦/ ٣٥٥)

اگر کرتے کے اندر کہیں کہیں سونے چاندی کے تار ہوں تو اس کا استعمال جائز ہے، بشرطیکہ پورا کپڑا یا کپڑے کا اکثر حصہ دور سے دیکھنے میں سونے چاندی کے تار سے بنا ہوا معلوم نہ ہو۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۸/۶۵)

يحرم لبس الحرير ولو بحائل بينه وبين بدنه على المذهب الصحيح يحل في الحرب على الرجل لا المرأة إلا قدر أربع اصابع كأعلام الثوب مضمومة (در مختار) وتحته في الشامية: ومقتضاه حل الثوب المنقوش بالحرير تطريزًا، و نسجًا إذا لم تبلغ كل واحدة من نقوشه الربع أصابع، وإن زادت بالجمع مالم ير كله حريراً تأمل

(شامي) وفي الدر المختار: وكذا المنسوج بذهب يحل إذا كان هذاالمقدار أربع أصابع وإلا لا. (درمختار، كتاب الحظر والإباحة، فصل في اللبس، زكريا ۹/۵۰۶-۵۰۷، كراچي ۶/۳۵۱-۳۵۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍رجب المرجب ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۸۰۹/۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۷/۳ھ

مرد کے لئے سونے کی انگوٹھی پہننا

سوال [۱۰۹۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سونے کی انگوٹھی مردوں کے لئے پہننا شریعت کے اندر جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالرب، کاشی پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مرد کے لئے سونے کی انگوٹھی پہننا جائز نہیں حرام ہے۔

عن أبي هريرةؓ، عن النبي صلى الله عليه وسلم، أنه نهىٰ عن خاتم الذهب. (صحيح مسلم، باب تحريم خاتم الذهب، النسخة الهندية ۲/۱۹۵، بيت الأفكار رقم: ۲۰۸۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍صفر المظفر ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۴۴/۲۳)

مرد کے لئے سونے کی چیز استعمال کرنے کا حکم

سوال [۱۰۹۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا مرد کے لئے کسی بھی وقت میں سونے کی کوئی چیز استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور

جائز ہے تو کون سی حالت میں اور بادشاہ کے لئے سونا استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: حبیب الرحمٰن، متعلم مدرسہ امدادیہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بوقت ضرورت شدیدہ جائز ہے، مثلاً اگر چاندی کے دانت سے ضرورت پوری نہ ہو، تو سونے کا دانت مباح ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۹/۱۵۰-۱۵۵، جدید زکریا مطول ۱۲/۳۶۰-۳۶۱، فتاویٰ محمودیہ قدیم ۵/۱۴۵، ڈابھیل ۱۹/۳۵۲)

عن عبد الله بن عمر رضي الله عنه، أن أباه سقطت ثنيته، فأمره النبي صلى الله عليه وسلم أن يشدها بذهب. (المعجم الأوسط، دارالفكر ٦/١٤٥، رقم: ٨٣٠٥)

اسی طرح میدان جنگ میں سونے کی زرہ اور خود وغیرہ کا استعمال جائز ہے۔

ولابأس بالجوشن والبيضة من الذهب، والفضة في الحرب. (عالمگيري، الباب العاشر في استعمال الذهب والفضة، زكريا قديم ٥/٣٣٥، جديد ٥/٣٨٨، شامي، كراچي ٦/٣٤٢، كوئٹه ٥/٢٤١، زكريا ٩/٤٩٤)

بلاعذر عام حالتوں میں سونے کا استعمال مردوں کے لئے ناجائز اور حرام ہے، چاہے عام لوگ ہوں اور چاہے بادشاہ سب اس میں برابر ہیں۔ (مستفاد: فتویٰ احیاء العلوم ۱/۲۴۷)

ولايجوز للرجال التحلي بالذهب، والفضة-إلى قوله-والتختم بالذهب على الرجال حرام. (هداية، كتاب الكراهية، فصل في اللبس اشرفي ٤/٤٥٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/۶۳۹)

عورتوں کا ناک میں زیور پہننا ثابت ہے یا نہیں؟

سوال [۱۰۹۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ عورت کا ناک میں زیور پہننا دورِ نبوت سے ثابت ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورت کا ناک میں زیور پہننا دورِ نبوت سے ثابت نہیں ہے؛ البتہ فقہاء نے کان کے زیور پر قیاس کرتے ہوئے اسے جائز قرار دیا ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ میرٹھ ۲۸/۳۴، ڈابھیل ۱۹/۱۷۲، فتاوی رشیدیہ جدید ۲/۳۴۱، فتاوی دارالعلوم ۱۶/۱۷۷، کتاب الفتاوی ۶/۸۳)

لابأس بثقب أذن البنت والطفل –قلت: وهل يجوز الخزام في الأنف؟ لم أره، قلت: إن كان مما يتزين النساء به كماهو في بعض البلاد فهو فيها لثقب القرط. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، كراچي ٦/ ٤٢٠، زكريا ٩/ ٦٠٢، هندية، زكريا قديم ٥/ ٣٥٧، جديد ٥/ ٤١٢)

هل يجوز ثقب أنف النساء؟ إن كان للتزيين يجوز كما في ثقب الأذن. (نفع المفتي والسائل من مجموعة رسائل لكهنوى ٤/ ١٩٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف خاص: ۴۰/۱۱۴۴۵)

عورت کے لئے پیر اور کان میں زیور پہننے کا جواز

سوال [۱۰۹۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عورت کے لئے کان میں زیور پہننا اور پیر میں زیور پہننا حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورت کے لئے کان اور پیر میں زیور پہننا

حدیث سے ثابت ہے،مگر احادیث میں بجنے والا زیور پہننے سے منع کیا گیا ہے۔(مستفاد: کفایت المفتی،زکریا۹/۱۸۱، قدیم۹/۱۷۴)

عن ابن عباسؓ، قال: خرج النبي صلی اللہ علیه وسلم: یوم عید، فصلی رکعتین، لم یصل قبل ولا بعد، ثم أتی النساء، فأمرهن بالصدقة، فجعلت المرأة تصدق بخرصها وسخابها. (بخاري شریف، باب القلائد والسخاب للنساء، النسخة الهندیة ۲/۸۷۳، رقم: ۵۶۵۲، ف: ۵۸۸۱)

بخرصها أي حلقة الذهب، والفضة تکون في الأذن. (عمدة القاری، باب القلائد والسخاب للنساء، دار احیاء التراث العربي ۲۲/۴۰، زکریا۱۵/۸۱، تحت رقم الحدیث: ۵۸۸۱)

یباح للنساء من حلي الذهب، والفضة–ومایلبسه في أعناقهن وأرجلهن وأذنهن. (إعلاء السنن، کراچي ۱۷/۲۹۴، دارالکتب العلمیة بیروت ۱۷/۳۱۸)

قال علي بن سهل بن زبیر: أخبره أن مولاة لهم ذهبت بابنة الزبیر إلي عمر بن الخطابؓ وفي رجلها أجراس، فقطعها عمرؓ، ثم قال: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یقول: إن مع کل جرس شیطاناً. (أبو داؤد، باب ماجاء في الجلاجل، النسخة الهندیة ۲/۵۸۱، دارالسلام رقم: ۴۲۳۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف خاص: ۴۰/۱۱۴۶۲)

عورتوں کے لئے کالے وسنہرے موتیوں کے ہار کے استعمال کا حکم

سوال[۱۰۹۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ ہار کی شکل کا ایک زیور ہے، جس کو کالے اور سنہرے موتیوں سے بنایا جاتا ہے، اس زیور کو منگل ستر کہتے ہیں، اس زیور کی حیثیت غیر مسلموں میں یہ ہے کہ جس روز عورت مرد کا عقد ہوتا ہے، تو شوہر اپنی زوجہ کے گلے میں یہ زیور پہناتا ہے، اور شوہر کی تاحیات بیوی اس زیور کو اپنے گلے سے نہیں نکال سکتی، یعنی شادی شدہ عورت کا یہ زیور مخصوص علامت ہے، غیر شادی شدہ عورت یہ زیور نہیں پہن سکتی، غیر مسلموں کی دیکھا دیکھی بہت سے مسلم علاقوں میں بھی اس زیور یعنی منگل ستر کو لازمی قرار دیا جاتا ہے۔

لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مسلم عورتوں کو منگل ستر کا پہننا جائز ہے؟ یا اس میں غیر مسلموں کی مشابہت پائے جانے کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہے؟

المستفتی: محمد خالد قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کالے اور سنہرے موتیوں کا ہار استعمال کرنا عورتوں کے لئے فی نفسہ مباح ہے؛ لیکن سوال نامہ میں ہندوؤں کا جو عقیدہ اس بارے میں لکھا گیا ہے، اگر اس عقیدہ اور رسم کی پابندی میں استعمال کیا جائے، تو ان کی مشابہت کی بنا پر جائز نہیں۔

عن ابن عمرؓ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: من تشبہ بقوم فهو منهم. (أبوداؤد شریف، باب في لبس الشهرة، النسخة الهندية ۲/۵۵۹، دارالسلام رقم: ۴۰۳۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ رصفر المظفر ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۲۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۲/۶ھ

چٹکی اور بچھیا (زیور) پہننا

سوال [۱۰۹۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ اس وقت عام مسلم عورتوں میں پیر کا ایک زیور جسے چٹکی یا شاید بچھیا بھی کہتے ہیں، اس وقت مسلم عورتوں میں اس چیز کے پہننے کا عام رواج ہے، خاص طور پر دیہات کی عورتوں میں یہ رسم زیادہ پائی جاتی ہے، شریعت کی رو سے جواز ہے یا نہیں؟

المستفتی: جلیس احمد مدرسہ جامعہ عربیہ شہر سیتا پور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر چٹکی اور بچھیا غیر مسلم عورتوں کا قومی ومذہبی شعار نہ ہو اور یہ چیزیں بجنے والی نہ ہوں اور مسلم وغیر مسلم عورتیں محض زینت کی غرض سے پہنتی ہوں جیسا کہ آپ کے سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ چیزیں زینت ہی کی غرض سے مسلم عورتیں استعمال کرتی ہیں، تو مسلمان عورتوں کے لئے دیگر زیورات کی طرح یہ چیزیں بھی پہننا جائز ومباح ہے اور ان کے پہننے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۹/۱۷۳، جدید زکریا مطول ۱۲/۳۶۰، بہشتی زیور ۳/۶۲)

قل من حرم زينة الله التي أخرج لعباده. والقول الثاني: ذكره الإمام فخر الرازيؒ أنه يتناول جميع أنواع الزينة، فيدخل تحته جميع أنواع الملبوس، والحليٰ. (تفسير خازن قديم۲/ ۸٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/شعبان المعظم ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵۵۹/۳۱)

سونے وچاندی کے علاوہ دیگر دھات کی انگوٹھی کا حکم

سوال [۱۰۹۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عورت کے لئے سونے چاندی کے علاوہ دیگر دھات کی آرٹیفیشل انگوٹھی پہننا جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورت کے لئے سونے چاندی کے علاوہ دیگر دھات کی آرٹیفیشل انگوٹھی پہننا جائز نہیں ہے؛ لیکن اگر دھات پر سونے چاندی کی پالش کی گئی ہو، تو جب تک پالش باقی رہے، اس کے پہننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (مستفاد: دینی مسائل ۳۲۲، احسن الفتاوی ۸/۷۰، ایضاح المسائل ۱۳۷)

أما التختم بما سوی الذهب، والفضة من الحديد، والنحاس، والصفر، فمكروه للرجال، والنساء جميعًا. (بدائع الصنائع، كتاب الإستحسان، حكم التختم والأواني ، زكريا ٤/٣١٧، كراچي ٥/١٣٣ ، هندية، زكريا قديم ٥/٣٣٥، جديد ٥/٣٨٨، شامي، زكريا ٩/٥١٩، كراچي ٦/٣٦٠)

حدثني إياس بن حارث بن المعيقيب، وجده من قبل أمه أبو ذباب عن جده، قال: كان خاتم النبي صلى الله عليه وسلم من حديد ملوى عليه فضة. (أبو داؤد باب ما جاء فی خاتم الحديد ،النسخةالهندية ٢/٥٨٠، المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التثراث العربي ٢٠/٣٥٢، رقم:٨٣١)

لابأس بأن يتخذ خاتم حديد قد لوي عليه فضة وألبس بفضة حتى لايرى. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في اللبس، زكريا٩/٥١٩، كراچي ٦/٣٦٠، تاتارخانية، زكريا١٨/١٢٧، رقم:٢٨٢٥٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ر صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف خاص: ۴۰/ ۱۱۴۵۲)

لوہے کی انگوٹھی اور چین کا استعمال

سوال [۱۰۹۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ لوہے کی انگوٹھی پہننا حدیث شریف میں ممنوع ہے، اسی حدیث کی بناپر بریلوی

حضرات لوہے، پیتل، تانبے کی چین لگانا گھڑی میں مکروہ بتاتے ہیں اور نماز کے اندر مذکورہ چین لگانا مکروہ بتاتے ہیں اصل مسئلہ کیا ہے؟

المستفتی: محمد اشتیاق نور، بھاگل پوری،

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سونا، چاندی کے علاوہ کسی دوسرے دھات کی انگوٹھی عورتوں کے لئے جائز نہیں ہے۔

والتختم بالحديد، والصفر، والنحاس، والرصاص مكروه للرجال، والنساء. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في اللبس، كراچي ٣٦٠/٦، زكريا ٥١٨/٩، بدائع الصنائع، زكريا ٣١٧/٤، كراچي ١٣٣/٥، هندية، زكريا قديم ٣٣٥/٥، جديد ٣٨٨/٥)

البتہ لوہے، پیتل، تانبے کی چین استعمال کرنا جائز ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱۳۳/۴)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۰۶۶/۳۲)

سونے، چاندی کے علاوہ دیگر دھات کی انگوٹھی اور چین کا مسئلہ

سوال [۱۰۹۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مرد کو کسی بھی دھات کی انگوٹھی یا چین پہننا درست ہے یا نہیں؟ انگوٹھی یا چین کی تعداد اور وزن کتنا ہونا چاہئے؟

المستفتی: اقبال شمسی ہاؤس، طویلہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مرد کے لئے چاندی کے علاوہ کسی بھی دھات کی

انگوٹھی استعمال کرنا جائز نہیں ہے اور چاندی کی انگوٹھی کی مقدار بھی ایک مثقال سے زائد نہ ہو اور ایک مثقال کا وزن موجود گرام کے حساب سے ۴؍گرام ۳۷۴؍ملی گرام ہے۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ۴۲۱/۱۴، ڈابھیل ۳۶۲/۱۹-۳۶۳، احسن الفتاوی ۶۸/۸، ایضاح المسائل ۱۳۰)

ویکره للرجال التختم بما سوى الفضة، كذا في الينابيع. (هندية، الباب العاشر في استعمال الذهب والفضة، زكريا قديم٥/٣٣٥، جديد ٥/٣٨٨، شامي، زكريا ٩/٥١٦، كراچي٦/٣٥٩)

اور عورتوں کے لئے صرف چاندی اور سونے کے علاوہ کسی اور دھات کی انگوٹھی استعمال کرنا جائز نہیں ہے اور عورت کی سونے، چاندی کی انگوٹھی کی کوئی مقدار اور وزن متعین نہیں ہے، جتنے وزن کی چاہیں استعمال کرسکتی ہیں۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۷۰/۸، محمودیہ قدیم ۴۲۱/۱۴، ڈابھیل ۳۶۲/۱۹-۳۶۳، احیاء العلوم ۳۲۲/۱)

والتختم بالحديد، والصفر، والنحاس، والرصاص يكره للرجال، والنساء. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في اللبس، كراچي ٦/٣٦٠، زكريا ٩/٥١٨، هندية، زكريا قديم ٥/٣٣٥، زكريا جديد ٥/٣٨٨، بدائع الصنائع، زكريا ٤/٣١٧، كراچي٥/١٣٣)

چین اگر گھڑی کے ساتھ ہے، تو مرد کو سونے، چاندی کے علاوہ دیگر دھات کی چین گھڑی میں استعمال کرنا درست ہے اور اگر گھڑی کے علاوہ ہے، جیسا کہ آج عام طور پر نوجوانوں کے گلے اور ہاتھ میں چین ڈالنے کا رواج ہے، تو اس کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۴۲۱/۱۴، ڈابھیل ۳۶۲/۱۹-۳۶۳، امداد الفتاوی ۱۳۳/۴، احسن الفتاوی ۲۱۳/۸)

وتكره ....الكيس الذي يعلق، تحته فى الشامية والمراد بالكيس المعلق نحو كيس التمائم المسماة بالحمائل، فإنه يعلق بالعنق.

(شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في اللبس، زكريا ٩/ ٥١٠، كراچي ٦/ ٣٥٤)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ربیع الاول ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵؍ ۷۱۲۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۳/۱۸ھ

سونے، چاندی کے علاوہ دیگر دھاتوں کی بنی انگوٹھی کے استعمال کا حکم

سوال [۱۰۹۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سونا، چاندی کے علاوہ لوہا، پیتل وغیرہ دھاتوں کی انگوٹھی پہننا مرد اور عورت دونوں کے لئے مکروہ تنزیہی ہے، اور شامی وغیرہ کتب فقہ میں حرام لکھا ہے؛ اس لئے تردد پیدا ہوا کہ اس مسئلہ کا اصل حکم کیا ہے؟

اسی طرح سونا چاندی میں اگر کھوٹ مغلوب ہو، اور سونا وچاندی غالب ہو، تو اسے سونا چاندی کے حکم میں تسلیم کر کے اسی کا حکم لگایا جاتا ہے؛ لیکن شامی وغیرہ کتب فقہ میں صراحت ہے کہ اگر لوہا و پیتل وغیرہ دیگر دھاتوں کی انگوٹھی پر چاندی کا پانی پھیر دیا جائے، تو اس کا پہننا بلا کراہت جائز ہے۔ نیز اگر چاندی کی طرح سفید رنگ کی دوسری دھات ملائی جائے، جس میں چاندی مغلوب ہو اور دوسری سفید دھات غالب ہو یا دوسری دھات کے اوپر چاندی کا پانی پھیر دیا جائے، تو اس کا حکم کیا ہے؟ نیز اس کا پہننا کیسا ہے؟ اس مسئلے کو بھی تحقیق کر کے واضح فرمادیں۔

المستفتی: (مولانا) محمد سفیان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: لوہا، پیتل، تانبا، اسٹیل وغیرہ کی انگوٹھی پہننا مرد و عورت دونوں کے لئے جائز نہیں ہے، بعض کتب فقہ میں حرام کے الفاظ آئے ہیں اور بعض

میں مکروہ کے الفاظ آئے ہیں، جن کتب فقہ میں حرام کے الفاظ آئے ہیں، وہاں حرام سے مکروہ تحریمی مراد ہے؛ اس لئے کہ ثبوت حرمت کے لئے نص قطعی لازم ہے اور نص قطعی سے اس کی حرمت ثابت نہیں ہے اور حضرت گنگوہیؒ کو کراہت تحریمی سے بھی اتفاق نہیں؛ کیونکہ جن نصوص سے عدم جواز کا ثبوت ہوتا ہے، وہ نصوص قطعی الثبوت نہیں اور ان کی دلالت بھی قطعی نہیں اور کراہت تحریمی کے ثبوت کے لئے ظنی الثبوت، قطعی الدلالۃ یا قطعی الثبوت، ظنی الدلالۃ ہونا لازم ہے اور وہ نصوص اس درجہ کے نہیں ہیں؛ بلکہ ظنی الثبوت، ظنی الدلالۃ ہیں؛ اس لئے حضرت گنگوہیؒ نے کراہت تنزیہی کا حکم لگایا ہے، جو فتاوی رشیدیہ ۵۹۹؍ سے واضح ہوتا ہے، حرام کے الفاظ کے ساتھ کتب فقہ کی عبارت حسب ذیل ہے۔

فعلم أن التختم بالذهب، والحديد، والصفر حرام. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في اللبس، زكريا ۹/۵۱۷، كراچي ۶/۳۵۹، هداية، اشرفي ديو بند ۴/۴۵۷، الجامع الصغير ۱/۴۷۷)

وأما التختم بالحديد، والرصاص، والصفر فهو حرام على الرجال، والنساء جميعًا. (الفتاوى التاتارخانية، زكريا ۱۸/ ۱۲۵، رقم: ۲۸۲۴۷، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ۸/۴۹، رقم: ۹۵۶۰)

اور مکروہ کے الفاظ کے ساتھ درج ذیل عبارت ہے۔

وأما التختم بما سوى الذهب، والفضة من الحديد، والرصاص، والنحاس، والصفر فمكروه للرجال، والنساء جميعًا؛ لأنه زي أهل النار. (بدائع الصنائع، كتاب الإستحسان، حكم التختم والأواني المموهة، زكريا ۴/۳۱۷، كراچي ۵/۱۳۳، هندية، زكريا قديم ۵/۳۳۵، جديد ۵/۳۸۸، شامي، كراچي ۶/۳۶۰، زكريا ۹/۵۱۸)

اب یہاں دو مسئلے بظاہر متعارض ہیں۔

(۱) سونا، چاندی کے برتنوں کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے؛ لیکن اگر سونے چاندی

کے علاوہ دیگر کسی بھی دھات کے برتن کے اوپر چاندی یا سونے کا پانی پھیر دیا جائے ،تو ان کا استعمال بالاتفاق جائز ہے؛ اس لئے کہ پانی پھیر دینے کے بعد ان برتنوں میں سونا چاندی وغیرہ کا حکم ثابت نہیں ہوتا اور اعتبار غالب کا ہوتا ہے۔

وأما الأواني المموهة بماء الذهب، والفضة الذي لا يخلص منه شيئ،فلا بأس بالانتفاع بها في الأكل والشرب وغير ذلک بالإجماع.

(بدائع الصنائع، كتاب الإستحسان، حكم التختم والأواني المموهة، زكريا ٤/٣١٧، كراچي ٥/١٣٣، هكذا في الفتاوى التاتارخانية ١٨/١٢١، رقم: ٢٨٢٣٢)

اسی طرح غالب اور مغلوب کے مسئلہ کا تعلق اداء زکوۃ اور معاملۂ بیع صرف سے ہے کہ اگر سونا چاندی غالب ہے، تو اس کی زکوۃ ادا کرنا لازم ہے اور اگر سونا چاندی غالب نہیں ہے؛ بلکہ مغلوب ہے، تو وہ عروض اور سامان کے درجہ میں ہو جاتے ہیں اور اس سونا چاندی پر زکوۃ واجب نہیں ہوتی ،اسی طرح معاملۂ بیع صرف میں ربا اور سود کا حکم چاندی اور سونے کے غالب ہونے پر ہوتا ہے اور مغلوب ہونے کی صورت میں ربا کا حکم نہیں لگتا، جیسا کہ ہدایہ ۱/۱۷۵-۳/۹۳ وغیرہ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

(۲) دوسرا مسئلہ اوپر والے مسئلہ کے برعکس ہے، وہ یہ ہے کہ چاندی، سونے کے علاوہ دیگر دھاتوں کی انگوٹھی کا استعمال مرد وعورت دونوں کے لئے ناجائز ہے، جس کے بارے میں بعض کتب فقہ میں حرام لکھا ہے، اور بعض میں مکروہ لکھا ہے اور ظنی الثبوت، ظنی الدلالۃ سے ثابت ہونے کی وجہ سے حضرت گنگوہیؒ نے مکروہ تنزیہی کہا ہے، تو ان دھاتوں کی انگوٹھی پر اگر چاندی کا پانی چڑھا دیا جائے ،تو یہ کراہت بھی ختم ہو جاتی ہے، اس کی علت یہ بیان کے جاتی ہے کہ انگوٹھی کے استعمال میں اصل مقصد حصول زینت ہے اور جب ان دھاتوں کے اوپر چاندی کا پانی پھیر دیا جائے، تو حصول زینت چاندی ہی کے ذریعہ ہوتی ہے نہ کہ دوسری دھاتوں سے چاہے، وہ دوسری دھات لوہا،

پیتل، تانبا، اسٹیل ہو یا زرد رنگ کا ہو یا سفید رنگ کا ہو، کسی بھی طرح کے رنگ کی دھات ہو اس کے اوپر چاندی کا پانی پھیرد یا جائے، تو زینت چاندی ہی کے ذریعہ ہوتی ہے نہ کہ دوسری دھاتوں سے ؛ اس لئے اس کا استعمال مرد وعورت دونوں کے لئے بلا کراہت جائز ہے۔

اس تفصیل سے دونوں مسئلوں کا فرق واضح ہو گیا، فقہاء کی عبارت ملاحظہ فرمائیے :

المحيط البرهاني میں علت کے ساتھ اس مسئلہ کا حکم بیان کیا گیا ہے۔

لابأس بأن يتخذ خاتم حديد، قد سوى عليه فضة وألبس بفضة حتى لا يرى؛ لأن التزيين يقع بالفضة دون الحديد؛ لأن الحديد ليس بظاهر.

(المحيط البرهاني، المجلس العلمي٨/ ٥٠، رقم: ٩٥٦٢)

ولابأس بأن يتخذ خاتم حديد قد لوي عليه فضة وألبس بفضة حتى لا يرى. (الفتاوى التاتارخانية، زكريا١٨/ ١٢٧، رقم:٢٨٢٥٣، هندية، زكريا قديم ٥/ ٣٣٥، جديد ٥/ ٣٨٩، شامي، زكريا ٩/ ٥١٩، كراچي ٦/ ٣٦٠)

اس سلسلہ میں حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

عن معيقيب رضی اللہ عنہ، قال: كان خاتم النبي صلى الله عليه وسلم: من حديد ملوي عليه فضة. (سنن أبي داؤد، باب ماجاء في خاتم الحديد، النسخة الهندية ٢/ ٥٨٠، دارالسلام رقم: ٤٢٢٤، سنن النسائي، لبس خاتم حديد ملوي عليه بفضة، النسخة الهندية٢/ ٢٤٦، دارالسلام رقم: ٥٢٠٨، المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التراث العربي ٢٠/ ٣٥٢، رقم: ٨٣١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ شوال المکرّم ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۲۵۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴/ ۱۰/ ۱۴۳۴ھ

عورت کے لئے سونے، چاندی کے علاوہ دیگر دھات کا زیور استعمال کرنا

سوال[۱۰۹۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عورتیں چوڑیاں پازیب کڑے، انگوٹھی وغیرہ زیور کو استعمال کرسکتی ہیں؟ اور مرد کی چاندی کی انگوٹھی کی مقدار کیا ہے؟ کتنے وزن تک پہننے کی اجازت ہے؟

المستفتی: ناچیز کلیم اللہ، سیتا پوری ،مقام: فتح پور، کملا پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سونے اور چاندی کے میسر نہ ہونے کی صورت میں انگوٹھی کے علاوہ باقی ہر طرح کے زیورات پیتل، گلٹ، المونیم وغیرہ کا استعمال کرنا عورتوں کے لئے جائز ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۴/ ۱۲۸، فتاویٰ احیاء العلوم ۱/ ۳۲۲، فتاوی محمودیہ قدیم ۶/ ۳۴۷، جدید میرٹھ ۱۴/ ۸۱)

ولابأس للنساء بتعليق الخرز في شعورهن من صفر، أو نحاس، أوشبه، أو حديد، ونحوها للزينة، والسوار منها. (هندية، الباب العشرون في الزينة واتخاذ الخادم للخدمة، زكريا قديم ٥/ ٣٥٩، جديد ٥/ ٤١٥)

ولا يتختم إلا بالفضة فيحرم بغيرها كذهب، وحديد، وصفر، ورصاص، وزجاج وغيرها. في الشامية: والتختم بالحديد، والصفر، والنحاس، والرصاص مكروه للرجال، والنساء. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في اللبس، كراچي ٦/ ٣٦٠، زكريا ٩/ ٥١٨، هندية، زكريا قديم ٥/ ٣٣٥، جديد ٥/ ٣٨٨، بدائع الصنائع، كتاب الإستحسان، حكم التختم والأواني المموهة، زكريا ٤/ ٣١٧، كراچي ٥/ ١٣٣)

مرد کو ایک مثقال سے زائد وزن کی انگوٹھی نہیں پہننا چاہئے۔

عن عبد الله بن بريدة، عن أبيه، قال: إن رجلاً جاء إلى النبي صلى الله

علیه وسلم -إلی قوله- فقال: یا رسول الله! من أي شيءٍ أتخذه؟ قال: من ورق ولاتتمه مثقالا. (سنن أبي داؤد، باب ماجاء في خاتم حدید، النسخة الهندیة۲/ ۵۸۰، دارالسلام رقم:۴۲۲۳، سنن الترمذي، باب ماجاء في الخاتم الحدید، النسخة الهندیة ۱/ ۳۰۸، دارالسلام رقم:۱۷۸۵، مسند البزار، مکتبة العلوم والحکم ۱۰/ ۳۰۹، رقم: ۴۴۳۰، سنن النسائي، مقدار ما یجعل في الخاتم من الفضة، النسخة الهندیة۲/ ۲۴۵، دارالسلام رقم: ۵۱۹۵)

وینبغي أن تکون فضة الخاتم المثقال ولا یزاد علیه. (فتاوی عالمگیري، الباب العاشر في استعمال الذهب والفضة، زکریا قدیم ۵/۳۳۵، جدید ۵/۳۸۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍ جمادی الثانیہ ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۲۶۱/۲۴)

آرٹی فیشل زیورات کے استعمال کا حکم

سوال [۱۰۹۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل آرٹی فیشل زیورات چل رہے ہیں، جو پیتل یا کسی اور ہلکی دھات کے بنے ہوئے ہیں، جو دیکھنے میں اور چمک دمک میں سونے کی طرح لگتے ہیں، یہ دھات لوہا نہیں ہے، ان زیورات میں عورتیں ہاتھ کے کڑے ہر وقت پہنے رہتی ہیں اور باقی گلے کا ہار، کان کے بندے، ہاتھ کی انگوٹھی وغیرہ کبھی کبھی کسی شادی وغیرہ کے موقع پر کہیں آنے جانے کے وقت پہنتی ہیں، بس ہاتھ میں یہ کڑے اور دیگر زیورات پہننا درست ہے یانہیں؟ اور ان کو پہن کر نماز درست ہوگی یانہیں،؟ خاص طور پر ہاتھ کے کڑے پہن کر نماز ہوگی یانہیں؟

المستفتیہ: ساجدہ خاتون، لالباغ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورتوں کے لئے سونے چاندی کے زیورات جس طرح استعمال کرنا جائز ہے، اسی طرح زیورات کی شکل میں تانبا، پیتل، لوہا، اسٹیل کانچ ہر چیز کا زیور استعمال کرنا جائز ہے، ہاں البتہ انگوٹھی صرف سونے اور چاندی کی جائز ہے، سونے اور چاندی کے علاوہ دیگر دھاتوں کی انگوٹھی عورتوں کے لئے بھی بطور زیور کے جائز نہیں۔

(مستفاد: امداد الفتاوی ۴/۱۳۵-۱۳۶، ایضاح المسائل ۱۳۸)

والتختم بالحديد، والصفر، والنحاس، والرصاص مكروه للرجال، والنساء. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في اللبس، زكريا ٩/٥١٨، كراچي ٦/٣٦٠، هندية، زكريا قديم ٥/٣٣٥، جديد ٥/٣٨٨، بدائع الصنائع، كتاب الإستحسان، حكم التختم والأواني المموهة، زكريا ٤/٣١٧، كراچي ٥/١٣٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ / ربیع الاول ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸ / ۹۲۲۷)

معاشرہ میں رائج مختلف دھاتوں کے زیورات کا حکم

سوال [۱۰۹۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عورتوں کے پہننے کے وہ زیورات جو سونا چاندی کے علاوہ ہوں، مثلاً پیتل، تانبا، رانگ وغیرہ کے بندے (لونگ) اور سلور کے کڑے وغیرہ کی جو آج کل چیزیں پہنی جارہی ہیں جائز ہیں یا نہیں؟ اگر جائز نہیں، تو پھر ان کا فروخت کرنا بھی جائز نہیں ہوگا؟ ایک مولانا نے فرمایا کہ چوڑی کی تو اجازت ہے، دیگر چیزوں کی اجازت نہیں ان کی بات کس حد تک صحیح ہے؟

المستفتی: حافظ فرحت، استاذ مدرسہ تجوید القرآن، سیانہ بلند شہر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سونے چاندی کے علاوہ دوسری دھاتوں مثلاً پیتل، تانبے، رانگ وغیرہ کے بنے ہوئے بندے لونگ سلور کے کڑے اور دیگر زیورات کانچ کی چوڑیاں یہ سب عورتوں کے لئے مباح ہیں، ان کے لئے ان سب کا پہننا اور استعمال کرنا جائز ہے۔

سوال میں مذکور مولانا کی بات درست نہیں ہے۔

ويباح للنساء من حلي الذهب، والفضة، والجواهر كل ماجرت عادتهن يلبسه مثل السوار والخلخال، والقرط، والخاتم وما يلبسه على وجوههن. وفي اعناقهن، وأيديهن، وأرجلهن، وآذانهن وغيره. (مغني لابن قدامة، دارالكتب العلمية بيروت٢/ ٣٢٤، اعلاء السنن، كراچي ١٧/ ٢٩٤، دارالكتب العلمية بيروت١٧/ ٣١٨)

البتہ صرف سونے اور چاندی کے علاوہ کسی اور دھات کی انگوٹھی عورت کے لئے بھی جائز نہیں ہے۔

والتختم بالحديد، والصفر، والنحاس، والرصاص مكروه للرجال، والنساء. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في اللبس، زكريا ٩/ ٥١٨، كراچي ٦/ ٣٦٠، هندية، زكريا قديم ٥/ ٣٣٥، جديد ٥/ ٣٨٨، بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٣١٧، كراچي ٥/ ١٣٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۶۶۵۹)

عورتوں کے لئے دیگر دھاتوں کے زیورات پہننا

سوال [۱۰۹۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ عورتوں کے لئے سونے چاندی والے زیورات کے علاوہ کسی اور دھات کے زیورات استعمال کرنا کیسا ہے، نیز ان زیورات کو پہن کرنماز پڑھنا عورتوں کے لئے کیا حکم رکھتا ہے؟

المستفتی: شوکت حسین، رام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سونے اور چاندی کے زیورات کے علاوہ دیگر ہرقسم کی دھات کا زیور پہننا بھی عورتوں کے لئے جائز ہے، بس صرف اتنا ہے کہ سونے اور چاندی کے علاوہ دیگر دھاتوں کی انگوٹھی پہننا جائز نہیں، اور وہ زیورات جن کو آرٹیفشل کے زیورات کہا جاتا ہے، ان کو پہن کرنماز پڑھنا عورتوں کے لئے بلاکراہت جائز ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ۱۳۸)

ويباح للنساء من حلي الذهب، والفضة، والجواهر كل ما جرت عادتهن يلبسه مثل السوار والخلخال، والقرط، والخاتم وما يلبسه على وجوههن. وفي اعناقهن، وأيديهن، وأرجلهن، وآذانهن وغيره. (اعلاء السنن، كتاب الحظر والإباحة، باب حرمة الذهب على الرجال وحله للنساء، دارالكتب العلمية بيروت ۱۷/۳۱۸، كراچي ۱۷/ ۲۹٤، المغني لابن قدامة، دارالكتب العلمية بيروت ۲/ ۳۲٤)

والتختم بالحديد، والصفر، والنحاس، والرصاص مكروه للرجال، والنساء. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في اللبس، زكريا ۹/ ۵۱۸، كراچي ۶/ ۳۶۰، هندية، زكريا قديم ۵/ ۳۳۵، جديد ۵/ ۳۸۸، بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ۳۱۷، كراچي ۵/ ۱۳۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۶۶۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۳۳/۴/۲۶ھ

عورت کے لئے چوڑی ومہندی کا استعمال

سوال [۱۰۹٦٨]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عورت اپنے ہاتھ میں کتنی چوڑی پہن سکتی ہے؟ کیا عورت کو ہاتھ میں منہدی لگانا ضروری ہے اور اگر ہاتھ میں چوڑی نہ ہوں، تو اس کے ہاتھ سے کوئی چیز کھانا کیسا ہے؟ مفصل تحریر فرمائیں۔

المستفتی: نسیم اختر جامع مسجد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورت کے لئے چوڑی پہننا جائز ہے، اور جتنی چوڑیاں چاہے پہن سکتی ہے، اور عورت کے لئے مہندی لگانا جائز ہے، ضروری اور لازم نہیں ہے۔

ویکره للإنسان أن یخضب یدیه ورجلیه بالحناء، وکذلک الصبي ولابأس به للنساء. (کتاب الحظر والإباحة، امدادیه ملتان ۲/ ۳۸۳، دارالکتاب دیوبند ۲/ ۳٦٤)

یجوز للنساء لبس أنواع الحلي کلها من الذهب، والفضة، والخاتم، والحلقة، والسوار، والخلخال، والطوق، والتعاویذ، والقلائد وغیره. (اعلاء السنن، کتاب الحظر والإباحة، باب حرمة الذهب علی الرجال وحله للنساء، دارالکتب العلمیة بیروت ۱۷/ ۳۱۸، کراچي ۱۷/ ۲۹۳)

اور اگر عورت کے ہاتھ میں چوڑی نہ ہوں، تو اس کے ہاتھ سے کوئی چیز کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱٦/ ذی قعدہ ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/ ۲۸۸۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۲/۱۱/۱٦ھ

کیا بجنے والی چوڑی زیور ہے؟

سوال [۱۰۹۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عورت کی چوڑی زیور میں داخل ہے یا نہیں؟ اگر زیور ہے، تو چوڑی بجتی ہے اور بجنے والے زیور کو پہننے سے منع فرمایا ہے، اور اگر زیور نہیں ہے، تو پھر زیور کے علاوہ کسی چیز کو زیب وزینت کے لئے پہننا درست نہیں ہے؟

المستفتی: شمیم الرحمٰن قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فقہاء نے جس بجنے والے زیور سے منع فرمایا ہے، اس سے پازیب وغیرہ مراد ہے، جس میں گھنگرو لگے ہوئے ہوں اور چلتے پھرتے نقل وحرکت کے وقت وہ خوب بجتے ہوں؛ لہٰذا ایسے زیور جس میں گھنگرو لگے ہوئے ہوں، وہ ممنوع ہیں اور اگر گھنگرو لگے ہوئے نہیں ہیں اور متعدد چوڑیاں ہاتھ میں پہن لی جائیں اور ایک چوڑی دوسری چوڑی میں لگنے کی وجہ سے جو معمولی آواز پیدا ہوتی ہے تو اس طرح غیر اختیاری آواز ممنوع اور ناجائز نہیں ہے۔ اور سونے چاندی کی چوڑیاں زیورات میں تو شامل نہیں ہیں؛ لیکن ان کا پہننا زیب وزینت کے طور پر عورتوں کے لئے جائز ہے اور یہ بات بھی واضح ہو کہ ہر زینت کی چیز کا زیور ہونا لازم نہیں ہے؛ لہٰذا سونے چاندی کے علاوہ دیگر چوڑیاں زینت کی چیز تو ہوسکتی ہیں؛ لیکن زیورات میں شامل نہیں۔ (مستفاد: فتاوی امدادیہ ۴/۱۳۰، عزیز الفتاوی ۷۷۱، ایضاح المسائل ۱۳۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/۷۴۳۶)

سونے کا پانی چڑھی ہوئی گھڑی پہننا

سوال [۱۰۹۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہاتھ میں یا جیب کی گھڑی جس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا ہوتا ہے، اور چین پر بھی سونے کا ملمع ہوتا ہے، جو کہ استعمال ہونے سے اتر جاتا ہے اور اصلی دھات دکھائی دینے لگتی ہے۔ برائے کرم مفصل دلیل وجواب سے مطلع فرمائیں کہ اس کا پہننا یا استعمال جائز ہے؟ اور اس سے نماز میں کوئی فرق تو نہیں آتا۔

المستفتی: اکرام باری، باری سنس تحصیل اسکول، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سونے کا پانی چڑھی ہوئی گھڑی یا چین کا استعمال کرنا اور اس کے ساتھ نماز پڑھنا جائز ہے؛ البتہ ایسی چیزوں کا استعمال نہ کرنا زیادہ احتیاط کی بات ہے،

أما التمويه التي لا يخلص فلا بأس به بالإجماع؛ لأنه مستهلك، فلا عبرة ببقائه لونا. (شامي، كتاب الحظرو الإباحة، زكريا ٩/٤٩٧، كراچي ٦/٣٤٤، قاضيخان، زكريا جديد ٣/٢٩٩، وعلى هامش الهندية ٣/٤١٣، هندية، زكريا قديم٥/٣٣٤، جديد ٥/٣٨٧، كتاب الفقه على المذاهب الأربعة، دارالفكر ٢/١٦، هداية اشرفي ٤/٤٥٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۴۶۲/۲۵)

سونے، چاندی کے پالش شدہ برتن کا استعمال

سوال [۱۰۹۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: کہ جس برتن پر چاندی کی پالش ہو، جیسے چائے دانی، سرمہ دانی، چمچہ وغیرہ کیا ان کا استعمال کرنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ضیاء الحق ولد محمد عتیق الحق، نجیب آباد، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سونے، چاندی کی پالش شدہ چائے دانی، وسرمہ دانی وغیرہ کا استعمال جائز ہے؛ لیکن استعمال نہ کرنا بہتر ہے۔

أما التمويه التي لا يخلص فلا بأس به بالإجماع؛ لأنه مستهلك، فلاعبرة ببقائه لونا. (شامي، كتاب الحظر الإباحة، زكريا ٩/٤٩٧، كراچي ٦/٣٤٤، قاضيخان، زكريا جديد ٣/٢٩٩، وعلى هامش الهندية ٣/٤١٣، هندية، زكريا قديم ٥/٣٣٤، جديد ٥/٣٨٧، كتاب الفقه على المذاهب الأربعة، دارالفكر ٢/١٦، هداية اشرفي ٤/٤٥٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱؍ ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۵۲۹/۲۵)

(۲۰) باب کسب الحلال والحرام

اللہ کے حکم کو توڑ کر روزی کمانا

سوال[۱۰۹۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) روزی کمانا کیسا ہے؟

(۲) اللہ کے حکم کو توڑ کر روزی کمانا کیسا ہے؟

المستفتی: رفیق احمد، کرولہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱/۲) یہ دنیا دار الاسباب ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ تمام ضروریات کی تکمیل اسباب کے دائرہ میں فرماتے ہیں؛ لہٰذا زندگی گذارنے کے لئے کسب معاش ضروری ہے، تاکہ ہر شخص اپنی زندگی حلال غذا کھا کر گذار سکے؛ چنانچہ ارشاد باری ہے:

فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ. [سورۃالجمعة:۲۸]

اور حدیث شریف میں ہے۔

عن عبد اللّٰہ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: طلب کسب الحلال فریضة بعد الفریضة. (شعب الإیمان، باب في حقوق الأولاد والأهلین، دارالکتب العلمیة بیروت ٦/ ٤٢٠، رقم: ٨٧٤١، السنن الکبریٰ للبیهقي، دارالفکر ٩/ ٥٦، رقم: ١١٩٠٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍صفر المظفر ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۵۰۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۲/۲۷ھ

وکالت کی اجرت حلال ہے یا حرام؟

سوال [۱۰۹۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ وکیل کی کمائی حلال ہے یانہیں؟ اورسب کومعلوم ہے کہ وکیل اپنی وکالت میں کیا کیا ہتکنڈے استعمال کرتا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جووکیل صرف جائز مقدمات کی پیروی کرتا ہے، اورکذب بیانی بھی نہیں کرتا،تواس کی آمدنی حلال ہے،اورجووکیل ناجائز مقدمات کی پیروی کرتا ہے اورکذب بیانی سے کام لیتا ہے،اس کی آمدنی حرام ہے۔ (امداد الفتاوی ۳۲۰/۳، محمودیہ ڈابھیل ۴۵۲/۱۶، محمودیہ میرٹھ ۶۸/۲۵)

إذا أخذ الوكيل الأجرة لإقامة الوكالة، فإنه غير ممنوع شرعاً، إذا الوكالة عقد جائز. (نتائج الأفكار ۳/۸)

أخذ الوكيل الأجرة لإقامة الوكالة، فإنه غير ممنوع شرعاً، إذا الوكالة عقد جائز، لايجب على الوكيل إقامتها، فيجوز أخذ الأجرة فيها. (فتح القدير، كتاب الوكالة، زكريا ۳/۸، كوئٹه ۲/۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ رصفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف خاص: ۱۱۴۲۲/۴۰)

ملکی قانون کی خلاف ورزی کے ساتھ تجارت

سوال [۱۰۹۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہندوستان میں کوئی بھی باہر سے، ایک کیلوسونا لا سکتا ہے؛ لیکن زید

بجائے ایک کیلو کے ۲ر کیلو سونا لے آیا، بارڈر پر کوئی رکاوٹ نہیں رہی، اب یہ سونا اس کے لئے حلال ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اپنے ملک کے قانون کی خلاف ورزی سے بچنا سب پر لازم ہے؛ کیونکہ اپنے آپ کو بے عزتی اور خطرہ میں ڈالنے کی شریعت نے اجازت نہیں دی، مگر جو شخص کسی ملک میں اس ملک کے قانون کی خلاف ورزی کر کے کوئی چیز خرید کر لاتا ہے، تو اس کے لئے وہ مال پوری طرح حلال ہے؛ لہٰذا زید کے لئے یہ سونا حلال ہے؛ لیکن حکومت کی قانون کی خلاف ورزی اور نقض عہد کا گناہ ہوگا۔ (مستفاد: فتاوی عثمانی ۳؍۹۰)

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ . [البقرہ:۱۹۵]

كل يتصرف في ملكه كيف شاء. (شرح المجله، رستم اتحاد ۱/٦٥٤-١١٩٢)

لايمنع أحد من التصرف في ملكه أبداً إلا إذا أضر بغيره ضررا فاحشا.

(شرح المجلة رستم اتحاد ١/٦٥٧- رقم الماده:١١٩٧)

إن المسلم يجب عليه أن يطيع أميره في الأمور المباحة، فإن أمر الأمير بفعل مباح وجبت مباشرته، وإن نهىٰ عن أمر مباح حرام إرتكابه، ومن هنا صرح الفقهاء بأن طاعة الإمام فيما ليس بمعصية واجبة. (تكملة فتح الملهم، باب وجوب طاعة الأمراء، اشرفية ديو بند ٣/٣٢٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف خاص: ۴۰؍۱۱۴۲۴)

قانون کے خلاف ٹرک میں کیروسین ڈلوانا

سوال [۱۰۹۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: کہ میری اپنی گاڑی (ٹرک) ہے، جو کرایہ پر چلاتا ہوں، یہ ٹرک میری روزی روٹی کا ذریعہ ہے، اصل تو قانون سرکاری کی رو سے ڈیزل ڈلوانا ہوتا ہے، میرے شہر گودھرا میں مسلمانوں کے پاس تقریباً ایک ہزار گاڑیاں ہیں، جو کسب کا ذریعہ ہیں، جس میں سے ۹۵۰/ گاڑیوں کے مالک حضرات اس میں ڈیژل کے بجائے کیروسین (مٹی کا تیل) ڈلواتے ہیں جو سستا ہے اور گھاٹا بھی کم رہتا ہے سرکاری قانون کے اعتبار سے کیروسین ڈلوا کر گاڑی چلانا سرکاری گناہ بنتا ہے اور یہ کیروسین بلیک مارکیٹ میں ملتا ہے، اس کو فروخت کرتے وقت پولیس اور سرکاری افسران کی دہشت بھی رہتی ہے، تو کیا مسلمانوں کے لئے ٹرک میں اس طرح قانون کے خلاف کیروسین ڈالوانا جائز ہے؟ اور اس طرح کی کمائی کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: نثار احمد، گودھروی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ڈیلر حکومت کی جانب سے اس بات کا وکیل ہوتا ہے کہ حکومت نے جن لوگوں کو تیل فروخت کرنے کے لئے نامزد کیا ہے، انہیں کو متعینہ قیمت پر تیل فروخت کیا جائے اور یہ ڈیلر وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ تاجر بھی ہوتے ہیں؛ کیونکہ یہ حکومت سے خرید کر متعین کردہ گراہکوں کے ہاتھ تیل فروخت کرتے ہیں؛ لہٰذا حکومت کی جانب سے وکیل ہونے کی حیثیت سے متعین کردہ گراہکوں کے علاوہ دوسروں کے ہاتھ فروخت کرنے کی صورت میں ایک قسم کی خیانت اور دھوکہ دھڑی ہے؛ لہٰذا اس کا گناہ اسی کے سر ہوگا اور شریعت اس طرح کی دھوکہ دھڑی کی اجازت نہیں دیتی اور دوسری خرابی اس میں یہ ہے کہ دوسروں کے ہاتھ فروخت کرنے کا پتہ اگر حکومت کو چل جائے، تو یہ شخص اس کی گرفت میں آجائے گا۔ قرآن کریم میں اس طرح سے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالنے سے منع کیا گیا ہے، ارشاد باری ہے:

وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَةِ. [البقرہ: ۱۹۵]

لہٰذا شرعاً اور قانوناً دونوں طرح کے حکم کی خلاف ورزی کا ذمہ دار ڈیلر ہی ہوگا اور ڈیلر سے خرید کر گاڑی میں ڈالنے والے شرعاً گنہگار نہ ہوں گے، ہاں البتہ ان کو بھی اس بات سے احتراز کرنا ضروری ہے کہ وہ سرکاری قانون کی زد میں آ کر اپنا نقصان نہ کرلیں؛ البتہ اگر گاڑی کے مالکان بلیک مارکیٹ سے تیل خرید کر قانونی گرفت سے بچ جائیں، تو وہ شرعاً گنہگار نہ ہوں گے۔

الوكيل إنما يستفيد التصرف من الموكل، وقد أمره بالدفع إلى فلان فلا يملك الدفع إلى غيره. (شامي، كتاب الزكاة، زكريا ٣/١٨٩، كراچي ٢/٢٦٩)

عن أبي هريرةؓ رضي الله عنه، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم مر برجل –إلى– فقال: رسول الله صلى الله عليه وسلم: ليس منا من غش. (سنن أبي داؤد، باب النهي عن الغش، النسخة الهندية ٢/٨٩، دارالسلام رقم: ٣٤٥٢، مسند أحمد بن حنبل ٢/٢٤٢، رقم: ٧٢٩٠)

المالك للشيء هو الذي يتصرف فيه باختياره ومشيئته. (بدائع الصنائع، فصل في بيان ما يبطل به الخيار، زكريا ٢/٦٣٨، كراچي ٢/٢٧٢)

كل يتصرف في ملكه كيف شاء. (شرح المجلة، رستم اتحاد ١/٦٥٤، رقم: المادة: ١١٩٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ صفر المظفر ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۲۷۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۲/۱۲ھ

گیس سلنڈر کو بلیک میں فروخت کرنا

سوال [۱۰۹۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص دو وایڈریس پر دو گیس سلینڈر خریدتا ہے، اس کے لئے ایک گیس کافی

ہے، اوردوسرا گیس سلینڈر زیادہ قیمت میں بلیک میں فروخت کرتا ہے، تو اس کے لئے بلیک میں یہ سلینڈر رفروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟؛ جبکہ یہ قانونی جرم ہے؟ اوراس سے حاصل شدہ رقم اس کے لئے حلال ہوگی یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دوایڈریس پر دوسلینڈر رلیتا ہے، اوران میں سے ایک سلینڈر رزیادہ قیمت میں بلیک میں فروخت کرتا ہے، تو اس کا یہ بیچنا جائز ہے اوراس سے حاصل شدہ رقم حلال ہے؛ کیونکہ اپنے پیسے سے خریدی ہوئی چیز ہی فروخت کی ہے؛ البتہ بلیک میں سلینڈر رفروخت کرنا حکومت کے قانون کی خلاف ورزی کی وجہ سے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالنا ہے؛ اس لئے شریعت ایسے کام کی اجازت نہیں دیتی ۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ میرٹھ ۲۴/۱٦۰، ڈابھیل ۱٦/۱۴۹، فتاوی عثمانی ۳/ ۹۰)

كل يتصرف في ملكه كيف شاء. (شرح المجله، رستم اتحاد ١/٦٥٤-١١٩٢)

أن من تصرف في خالص ملكه لا يمنع منه ولو أضر بغيره. (شامي، مطلب اقتسموا أدارًا و أراد كل منهم فتح باب لهم ذلك، زكريا ٨/ ١٥٣، كراچي ٥/ ٤٤٨)

ومن هنا صرح الفقهاء: بأن طاعة الإمام فيما ليس بمعصية واجبة......هذه الطاعة كما أنها مشروطة بكون أمر الحاكم غير معصية، فإنها مشروطة أيضا، بكون الأمر صادرا عن مصلحة لا عن هوى، أو ظلم لأن الحاكم لايطاع لذاته وإنما يطاع من حيث أنه متول لمصالح العامة. (تكملة فتح الملهم، باب واجب طاعة الأمراء، اشرفية ديوبند ٣/ ٣٢٣- ٣٢٤) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف خاص: ۴۰/ ۱۱۴۲۹)

دھوکہ کی تجارت کا حکم

سوال [۱۰۹۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک آدمی ڈیلر ہے؛ لیکن اس میں شرعاً یہ پریشانی ہے کہ چینی یا تیل تقسیم کرنے کا حکومت کی طرف سے کوئی معاوضہ نہیں ملتا؛ بلکہ اس میں سے کچھ بچا کر بیچتا ہے اور اپنی مزدوری لانے کا کرایہ اور مکان کرایہ نکالتا ہے، یہ عام رواج ہے۔ کیا اس طرح کا یہ معاملہ شرعاً درست ہے؟

المستفتی: مبارک حسین، مدرسہ بدر العلوم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اسلامی شریعت میں دھوکہ اور فریب کا راستہ اختیار کرنا جائز نہیں ہے اور راشن کے مال سے کچھ بچا کر الگ سے بلیک میں فروخت کر کے اپنی مزدوری اور لانے کا کرایہ اور مکان کا کرایہ نکالنا یہ سب دھوکہ اور فریب ہے، جو شرعاً جائز نہیں ہے؛ اس لئے اس سے احتراز کرنا ضروری ہے، اگر ڈیلر کو حکومت کی طرف سے راشن تقسیم کرنے کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا ہے، تو اس کو یہ کام چھوڑ کر جائز تجارت کا کوئی راستہ اختیار کر لینا چاہئے، جس سے جائز طریقہ سے نفع حاصل ہوجایا کرے گا۔

عن أبي بكر الصديقؓ عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: لا يدخل الجنة خب، و لا بخيل، و لا منان.

وعن أبي هريرةؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: المؤمن غر كريم، والفاجر خب لئيم. (ترمذي، باب ما جاء في البخيل، النسخة الهندية ۲/ ۱۷، دارالسلام رقم:۱۹۶۳ – ۱۹۶٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ ربیع الاول ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۷۷۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۳/۱۳ھ

سعودیہ عمرہ کی نیت سے جا کر ملازمت کرنے والے کی آمدنی کا حکم

سوال [۱۰۹۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک صاحب عمرہ کے ویزا سے یہ نیت لے کر سعودی عرب جاتے ہیں کہ وہاں جا کر چھپ جاؤں گا، عمرہ کے ویزا کی مدت ختم کرنے کے بعد اور یہی ہوا وہ وہاں چھپے رہے اور چوری چھپے روپیہ کما کر کئی سال بعد آ گئے، تو برائے کرم وضاحت فرمائیں کہ کیا ایسی کمائی جائز ہے؟

المستفتی: سید اظہر علی رضوی، علی گڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: عمرہ کے لئے سفر میں ضمنی آمدنی اختیار کرنا جائز ہے اور جب عمرہ سے فارغ ہو گیا ہے، تو وہاں رہ کر کمائی کا طریقہ اختیار کرنا اور کمائی کا مال لانا سب جائز ہے؛ البتہ بلا ویزا وہاں رہنا خلاف قانون ہونے کی وجہ سے اپنی عزت کا خطرہ ہے اور اس خطرہ کی وجہ سے ایسا طریقہ اختیار کرنے سے شریعت منع کرتی ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ . [البقرہ: ۱۹۵]

مگر جب بحفاظت واپس آ گیا ہے، تو اب اس کے مال اور ذات میں کسی قسم کی قباحت باقی نہیں رہی جیسا کہ خلاف قانون دوسرے ممالک سے بحفاظت مال لانے میں ہوتا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ر محرم الحرام ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱ / ۳۸۴۰)

عورت کی نوکری کا پیسہ شوہر کے لئے استعمال کرنا

سوال [۱۰۹۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ اگر کوئی عورت کسی کالج میں نوکری کرتی ہواور اس کی آمدنی سے اپنا گھر چلاتی ہو، ساتھ ہی ساتھ اس کا شوہر بھی کسی نوکری کے ذریعہ گھر چلانے میں مدد کرتا ہو، تو کیا اس عورت کی کمائی جائز ہے یانہیں؟ اگر وہ کمائی اس کا شوہر کھائے تو کیا اس کے لئے جائز ہے یانہیں؟ وہ ان پیسوں میں سے کچھ پیسے اپنے بھائی کو اس کی کسی خوشی میں یا بغیر کسی موقع خرچ کے لئے دے، تو کیا یہ کمائی اس کے بھائی کے لئے جائز ہے یانہیں؟ جبکہ اس کا بھائی بالغ ہو، مگر ابھی پڑھائی کررہا ہو۔

المستفتی: سعد انور ابن عبدالحفیظ، لاجپت نگر، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورت کے لئے بے پردہ سرکاری ملازمت کرنا بہت برا ہے، غیرت انسانی کے خلاف ہے، تاہم کوئی عورت ملازمت کرتی ہے، اس کے عوض ملنے والی تنخواہ اس کی ذاتی ملکیت ہے، اس کو جس طرح چاہے خرچ کرسکتی ہے، چاہے اپنے اوپر خرچ کرے یا شوہر پر خرچ کرے یا اس کے مشورہ سے دوسرے رشتہ داروں پر خرچ کرے، تو اس کی اجازت ہے؛ لیکن شوہر کے لئے اپنی عورت کی کمائی استعمال کرنا مردانگی کیخلاف ہے؛ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ عورت کا روپیہ استعمال نہ کرے۔

ثم ذكر خلافًا للمرأة مع زوجها إذا اجتمع بعملها أموال كثيرة، فقيل هي للزوج، وتكون المرأة معينة له إلا إذا كان كسب علاحدة، فهو لها، وقيل: بينهما نصفان. (شامي، مطلب اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ولا يعلم التفاوت، زكريا ٦/٢ ٥٠، كراچي ٤/ ٣٢٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۵۸۲۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۶/۲۳ھ

معاشی تنگی کی وجہ سے عورتوں کا کام کرنا

سوال [۱۰۹۸۰]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ گھریلو حالات کمزور ہونے کی بنا پرلڑکیوں کا بال کٹنگ کی دوکان پرنوکری کرنا تقریبات میں دلہن بنانا، بناؤ سنگھار کرنا اور ڈیزائن دار مہندی لگانے کے لئے جانا اور اس کے روپئے لینا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد ارشد، بارہ دری، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: بازار میں بال کٹنگ کی دوکان کرنا عورتوں کے لئے جائز نہیں۔ نیز عورت کو پورا بال چھوڑے رکھنے کا حکم ہے، مردوں کی طرح چھوٹا کرنا جائز نہیں۔

ولو حلقت المرأة رأسها، فإن فعلت لوجع أصابها لا بأس به، وإن فعلت ذلك تشبيها بالرجل فهو مكروه. (هندية، الباب التاسع عشر في الختان......زكريا قديم ٥/ ٣٥٨، جديد ٥/ ٤١٤)

عورتوں کا عورتوں کو مہندی لگانے اور عورتوں کا سنگھار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور اس کی اجرت لینے میں بھی کوئی قباحت نہیں، بشرطیکہ وہاں غیر مردوں کا اختلاط نہ ہو۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍رجب المرجب ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/ ۵۳۸۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸؍۷؍۱۴۱۸ھ

جوان لڑکی کا لڑکے لڑکیوں کو ایک ساتھ پڑھانا

سوال [۱۰۹۸۱]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: عرض یہ ہے کہ میں ۲۵ رسالہ کنواری لڑکی ہوں، گھر میں دو بہنیں، دو بھائی اوروالد ہیں، والد ضعیف اور بیمار ہیں، ان کی آمدنی اتنی ہے کہ اپنی دوا اور دیگر ضروریات کو پورا کرلیں، بھائی کی آمدنی اتنی نہیں ہے کہ وہ کھانے کے علاوہ ہماری اور ضروریات کو پورا کرسکیں، ان کے کاروبار پر بھی مجھے شک ہے کہ ناجائز اور جھوٹ وفریب پر مبنی ہے، اپنی اور بہنوں کی دوا، پڑھائی، جوتے، کپڑے و دیگر ضروریات کو پورا کرنے کے لئے میں پچھلے کئی سال سے ایک اسکول میں لڑکیوں کو پڑھاتی ہوں؛ لیکن اس سال سے اسکول میں ایسا سینٹر قائم ہوگیا ہے، جس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں پڑھتے ہیں، میں اس سینٹر کی ذمہ دار مقرر کی گئی ہوں، ایسے میں لڑکوں کو پڑھاتی بھی ہوں اور دفتر میں نامحرم مردوں کے ساتھ کام بھی کرتی ہوں، میرے سارے طالب علم بالغ اور شرعی نامحرم ہیں۔

(۱) ایسی صورت حال میں کیا میرا اس ادارے میں کام کرنا جائز ہے؟ کیا یہ کمائی حلال ہوگی؟ اگر میں اسی ادارے میں کام کروں تو کیا صرف نامحرم کے سامنے آنے کا گناہ پڑے گا یا کمائی بھی حرام ہوجائے گی؟

(۲) اگر میں کسی ایسے ادارے میں کام کروں جہاں صرف لڑکیاں اور عورتیں ہوں، تو وہ کمائی حلال ہوگی یا حرام؟ جبکہ کوئی ادارہ ایسا نہیں جہاں مرد نہ ہوں؟

(۳) اگر میں کہیں سروس نہ کروں، تو کیا بھائی کے بنائے ہوئے کپڑوں میں میری نماز ہوجائے گی؟ جبکہ حرام پیسوں کے کپڑوں میں نماز نہیں ہوتی؟

المستفتیہ: راعنا احمد، شیدھی سرائے، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ایسے اسکول میں ملازمت کرنا جس میں غیرمحرم مردوں کے ساتھ اختلاط ہو، اوران کے سامنے بے پردگی سے پیش آنا پڑتا ہونا جائز اور حرام ہے؛ اس لئے ایسی ملازمت عورتوں کے لئے قطعاً جائز نہیں؛ لہٰذا مذکورہ اسکول میں تعلیمی

خدمت انجام دینے کے لئے ملازمت کرنا قطعاً جائز نہیں۔ اللہ نے آپ کا رزق صرف اسی حرام ملازمت میں نہیں رکھا ہے، اور نہ ہی آپ کے اوپر شریعت کی طرف سے بھائی، بہنوں کا خرچہ ادا کرنا لازم ہے؛ بلکہ اس وقت پردہ نشین بن کر رہنا آپ کے لئے ضروری ہے، اور جلد کہیں شادی کر کے شوہر کی ماتحتی اختیار کرنا ضروری ہے، وہی شوہر آپ کی ضروریات پوری کرے گا اور آپ کے چھوٹے بھائی بہنوں کے خرچہ کا ذمہ دار آپ کا بھائی ہے، وہ اگر بہنوں کے علم کے بغیر کوئی ناجائز کمائی کھلائے، تو قیامت کے دن وہی اس کا ذمہ دار ہوگا۔ (مستفاد: امداد المفتیین ۱۰۳۰، احسن الفتاوی ۳۲/۸)

قال اللہ تعالیٰ: وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا. [النور: ۳۱]

اليقين لا يزول بالشک، من شک في القليل والكثير حمل على القليل، فلا يبرأ إلا باليقين. (الأشباه والنظائر قديم ۱۰۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۵۲/۳۵ ۷)

پاندان بنانا

سوال [۱۰۹۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں پاندان بنانے کا کارخانہ کھولنا چاہتا ہوں اور پاندان وہی لوگ خریدتے ہیں، جو تمباکو کھانے کے عادی ہوتے ہیں، پاندان میں خاص طور پر ایک خانہ تمباکو کا بنایا جاتا ہے۔ مہربانی فرما کر از روئے شرع محمدی تحریر فرمائیں کہ پاندان بنانا جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ایسا پاندان بنانا جس میں ایک خانہ تمباکو کے لئے

بنایا جاتا ہے، وہ از روئے شرع محمدی علیہ الصلاۃ والسلام بلا کراہت جائز ہے؛ کیونکہ نفس تمباکو کا بیچنا ہی جائز ہے، تو اس کو رکھنے کے لئے جو آلہ ہے، وہ بدرجۂ اولیٰ جائز ہوگا۔ (مستفاد: عزیز الفتاوی ۷۴۸)

اور عموماً اس قسم کی تجارتوں میں مالیت مقصود ہوتی ہے اور شکل صورت مالیت کے تابع ہوتی ہے۔

لأنها لو كانت من خشب، أو صفر جاز اتفاقاً في ما يظهر؛ لإمكان الانتفاع بها. (شامي، باب المتفرقات من أبوابها، زكريا ۴۷۸/۷، كراچي ۲۲۶/۵، الموسوعة الفقهية الكويتية ۱۲۹/۱۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ربیع الثانی ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۷۰۲/۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۴/۳ھ

داڑھی مونڈنے والے نائی کی اجرت

سوال [۱۰۹۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جو نائی لوگ داڑھی مونڈتے ہیں، ان کی کمائی کیسی ہے حلال حرام یا مکروہ؟ مفتی صاحب سے گذارش ہے کہ حکم شرعی سے آگاہ فرمادیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چونکہ داڑھی کاٹنا اور مونڈنا حرام ہے، اس لئے جو لوگ داڑھی مونڈتے ہیں، ان کی کمائی تعاون علی المعصیت کی وجہ سے مکروہ تنزیہی ہے۔ (محمودیہ ڈابھیل ۱۲۳/۱۷، میرٹھ ۲۷۲/۲۵)

رجل استأجر رجلاً ليصور له صوراً، أو تماثيل الرجال في بيت، أو فسطاط، فإني أكره ذلك وأجعل له الأجر قال هشام: تأويله إذا كان الإصباغ من قبل الأجير. (تاتارخانية، زكريا ۱۳۰/۱۵، رقم: ۲۲۴۳۱)

وجاز إجارة بيت بسواد الكوفة ليتخذ بيت نار، أو كنيسة، أو بيعة، أو يباع فيه الخمر، وقالا: لا ينبغي ذالک؛ لأنه إعانة على المعصية. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ٩/ ٥٦٢، كراچي٦/ ٣٩٢)

إذا أستاجر رجلا ليحمل له خمراً فله الأجر في قول أبي حنيفةؒ. (هندية، الباب السادس عشر، زكريا قديم ٤/ ٤٤٩، جديد ٤/ ٤٨٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف خاص ۴۰؍ ۱۱۴۴۷)

نائی کی کمائی کارِ خیر میں خرچ کرنے کا حکم

سوال [۱۰۹۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جو مسلمان حجام (نائی) کا کام کرتے ہیں جن کے ذمہ مسلم وغیر مسلم کی داڑھی مونڈنا ایک مٹھی سے کم داڑھی کاٹنا اور انگریزی طرز کے بال کاٹنا ہے جو ان کی آمدنی کا اکثر حصہ ہے اور سر کے بال مونڈ کر اور سر کے یکسانی بال کتر کر اور چہرہ کا خط بنا کر مونچھ مونڈ کر اور مونچھ کتر کر اور بغل کے بال مونڈ کر جو آمدنی ہوتی ہے وہ مقدار کے اعتبار سے بہت کم ہوتی ہے، تو ان تمام صورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے بال کو مسجد، مدرسہ یا کسی اور نیک کام میں خرچ کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ نیز ان کے مال کی دعوت کھانا صحیح ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل جواب تحریر فرمائیں عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: محمد اکرم، نل والے، محلّہ پہاڑی دروازہ، بجنور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: داڑھی مونڈنا جس کی داڑھی ہے اس کے لئے حرام ہے اور نائی چونکہ اس کے حکم کی تعمیل کرتا ہے اس لئے داڑھی مونڈنا اس کے لئے مکروہ

تحریمی ہے؛ لیکن اس عمل کی اجرت اس کے لئے کراہت کے ساتھ جائز ہے اور انگریزی بال بنوانا خود صاحب بال کے لئے مکروہ ہے اور نائی کے لئے تعاون علی الکراہیہ کی وجہ سے مکروہ تنزیہی ہے اور عمل کی اجرت نائی کے لئے حلال ہے اور جب نائی کے پاس جائز پیسہ آ گیا ہے تو وہ مسجد یا مدرسہ میں دے سکتا ہے، اس کے یہاں دعوت کھانا بھی جائز ہے اور قربانی کے جانور میں ایک شریک بن کر قربانی کرنا بھی جائز ہے جیسا کہ مندر بنانا اور بت خانہ تعمیر کرنا نا جائز ہے؛ لیکن اس کی تعمیر میں مزدوری کرنے والے کے لئے اجرت حلال ہے؛ البتہ امام اعظمؒ کے نزدیک بلا کراہت جائز ہے اور صاحبینؒ کے نزدیک تعاون علی المعصیت کی وجہ سے مکروہ تنزیہی ہے۔ بہرحال اجرت حرام نہیں اور نہ ہی مکروہ تحریمی ہے اور صاحبین کا قول احتیاط پر مبنی ہے اور جب مسلمان کے ہاتھ میں اس کی اجرت آجائے تو کسی بھی کار خیر میں وہ خرچ کرسکتا ہے۔

إن استأجره لينحت له طنبورًا أو بربطا ففعل طاب له الأجر إلا أنه يأثم به. (هندية ٤/ ٤٥٠، جديد زكريا ٤/ ٤٨٦)

عن محمدؒ: رجل استأجر رجلا ليصور له صورًا أوتماثيل الرجال في بيت أو فسطاط فإني أكره ذلک وأجعل له الأجرة. (هندية ٤/ ٤٥٠، جديد زكريا ٤/ ٤٨٦)

ولو آجر نفسه ليعمل في الكنيسة ويعمرها لا بأس به لأنه لا معصية في عين العمل وهذا عنه، وقالا: هو مكروه. (شامي، زكريا ٩/ ٥٦٢، كراچي ٦/ ٣٩٢)

أو آجر نفسه ليرعى له الخنازير يطيب له الأجر عنده وعندهما يكره. (رد المحتار زكريا ٩/ ٥٦٢، كراچي ٦/ ٣٩٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ رجب المرجب ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/ ۱۲۱۲۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۷/۳ھ

شرعی لباس کے ساتھ غیر شرعی لباس کی تجارت

سوال[۱۰۹۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بندہ کا کپڑوں کی خرید وفروخت کا کاروبار ہے، جس میں پینٹ، شرٹ غیر اسلامی لباس بھی ہوتا ہے، تو کیا غیر شرعی لباس کی خرید وفروخت میں کسی قسم کی قباحت تو نہیں ہے؟ اگر ہے تو کس درجہ کی؟

المستفتی: مطیع الرحمٰن، ٹانڈہ، بادلی، رام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: کپڑوں کی تجارت میں شرعی لباس کے ساتھ ساتھ غیر شرعی فساق کے لباس کی جو خرید وفروخت ہوتی ہے، اس میں آپ کا مقصد صرف اپنی تجارت اور کمائی ہے، فساق کا تعاون مقصود نہیں ہے، تو ایسی صورت میں آپ گنہگار نہ ہوں گے؛ ہاں البتہ تبعاً ایک قسم کا تعاون آپ کی طرف سے پایا جاتا ہے؛ اس لئے عمل تجارت فساق کے لباس کی حد تک مکروہ تنزیہی ہے اور اس تجارت کا پیسہ بلا شبہ حلال ہے؛ اس لئے کہ آپ اپنی مالیت کا پیسہ حاصل کرتے ہیں اور مال کی مالیت کا پیسہ حلال ہے، اور جو فساق فاسقانہ لباس استعمال کریں گے، وہ خود گناہ گار ہوں گے، اور آپ کے دل میں اس طرح کے لباس کی نفرت رہنی چاہئے۔

ان بيع العصير ممن يتخذه خمراً إن قصد به التجارة، فلا يحرم وإن قصد به لأجل التخمير حرم. (الأشباه والنظائر قديم ۵۳)

عن نافع عن عبد الله أن عمر رأى حلة سيراء تباع فقال: يا رسول الله! لوا بتعتها تلبسها للوفدإ ذا أتوک والجمعة؟ قال: إنما يلبس هذه من لاخلاق له، وأن النبي صلى الله عليه وسلم بعث بعد ذلک إلى عمر حلة سيراء حريرا، کساها إياه، فقال عمر: کسو تنيها، وقد سمعتک تقول فيها

ما قلت؟ فقال: إنما بعثت إليک لتبيعها، أو تکسوها. (بخاري شريف، باب الحرير للنساء، النسخة الهندية ۲/۸٦۸، رقم: ٥٦١٢، ف: ٥٨٤١، مسند أحمد بن حنبل ۲/۲۰ رقم: ٤٧١٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/۷٦/۱۰۰۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۵/۲۵ھ

درزی کے لئے فساق کا لباس سینا اور اس کی اجرت

سوال [۱۰۹۸٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک درزی فساق کا لباس سیتا ہے، تو اس کا یہ عمل شرعاً کیا حکم رکھتا ہے، اور اس کی اجرت کا کیا حکم ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فساق کا لباس مثلاً ایسا لباس سینا، جس میں اعضاء کی بناوٹ اور جسم نظر آتا ہو مکروہ ہے اور اس کے ذریعہ حاصل ہونے والی آمدنی حلال ہے۔
(مستفاد: محمودیہ ڈابھیل ۱۹/۲۸۲، احسن الفتاوی ۸/۵۲)

فإذا ثبت كراهة لبسها للتختم ثبت كراهة بيعها وصيغها لما فيه من الإعانة على ما لا يجوز وكل ما أدىٰ إلى ما لا يجوز لا يجوز. (الدر مع الرد، كتاب الحظر والإباحة، فصل في المس، زكريا ۹/٥١٨، كراچي ٦/٣٦٠)

وإن كان إسكافًا أمره إنسان أن يتخذ له خفًا على زي المجوس، أوالفسقة، أو خياطاً أمره أن يتخذ له ثوباً على زي الفسوق يكره له أن يفعل؛ لأنه سبب التشبه بالمجوس......والفسقة. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع ۹/٥٦٢، كراچي٦/٣٩٢)

إذا استأجر رجلاً لينحت له طنبوراً، أو بربطاً ففعل يطيب له الأجر إلا أنه يأثم في الإعانة على المعصية. (الفتاوی التاتارخانية، زكريا ١٥/ ١٣١، رقم: ٢٢٤٣٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۴۴۶)

ڈگری حاصل کئے بغیر ڈاکٹری کا پیشہ کرنا

سوال [۱۰۹۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرا دوست ڈاکٹر نہیں ہے، اس کے پاس ڈاکٹری کی ڈگری نہیں ہے، صرف ایک مقامی ڈاکٹر کے پاس چند سال تک پریکٹس کرنے کے بعد وہ اپنا ذاتی دواخانہ شروع کرنا چاہتا ہے، یہاں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے علاقہ میں بھی کئی ڈاکٹر بغیر ڈگری کے ہیں اور مریض ان کے پاس جاتے ہیں اور بحمد اللہ شفایاب بھی ہوتے ہیں، تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا میرا دوست ایسا دواخانہ شروع کرسکتا ہے کہ نہیں؟ اگر ہاں تو کیا اس کی آمدنی حلال شمار ہوگی؟

نیز اگر وہ شخص کسی اور کے دواخانہ میں نوکری کرے اور پورے دواخانہ کو سنبھالے اور مریضوں وغیرہ کو دیکھے اور اس کے عوض میں تنخواہ پائے تو ایسا کرنا شرعاً درست ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ڈاکٹری پیشہ کا تعلق معلومات سے زیادہ تجربات سے ہے؛ اس لئے اگر مذکورہ شخص کو ڈاکٹری پیشہ میں کامل تجربہ حاصل ہوگیا ہو اور اس کے علاج سے لوگوں کو فائدہ ہو، تو اس کا علاج کرنا اور دوسرے کے دواخانہ میں نوکری کرنا سب جائز اور درست ہے اور اس سے ملنے والی تنخواہ بھی جائز اور حلال ہوگی، مگر یہ خیال رکھنا بہت

ضروری ہوگا کہ الٹے سیدھے مریضوں کو دوا نہ دیا کرے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۴۱۸/۱۷، ڈابھیل ۳۷۶/۱۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ رصفر المظفر ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۷۳۵/۳۷)

ٹی وی کی مرمت کی اجرت حلال ہے یا حرام

سوال [۱۰۹۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (T.V) ٹی وی کی مرمت کی آمدنی کا کیا حکم ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: .T.V ٹی وی سازی اوراس کی اصلاح ومرمت کی آمدنی حلال ہے؛ کیونکہ ٹی وی اصل کے لحاظ سے آلۂ لہو ولعب نہیں ہے، اس کو اصلاحی، تعلیمی، تربیتی اور سائنسی مقاصد کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے اور جو چیز فی نفسہ برائی کے لئے نہ ہو، مگر انسان برائی کے لئے اس کا استعمال کرے فقہاء نے اس کی اصلاح اور خرید وفروخت کو جائز قرار دیا ہے، تاہم چونکہ اس کا استعمال اکثر برائی ہی میں ہوتا ہے؛ اس لئے اس کی مرمت کی اجرت کراہت سے خالی نہیں۔ (مستفاد: جدید فقہی مسائل ۳۹۹/۱)

وعلم من هذا أنه لا يكره بيع مالم تقم المعصية به كبيع الجارية المغنية، والكبش النطوح، والحمامة الطيارة، والعصير، والخشب ممن يتخذ منه المعازف. وتحته في الشامية: لأن الإجارة على منفعة البيت؛ ولهذا يجب الأجر بمجرد التسليم، ولا معصية فيه وإنما المعصية بفعل المستأجر وهو مختار فينقطع نسبته عنه. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ٥٦٢/٩، كراچي ٣٩١/٦)

لابأس بأن يؤاجر المسلم دارًا من الذمي ليسكنها فإن شرب فيها الخمر، أو عبد فيها الصليب أو أدخل فيها الخنازير لم يلحق المسلم إثم في شيءٍ من ذلك؛ لأنه لم يؤاجر لذلك والمعصية في فعل المستأجر، وفعله دون قصد رب الدار فلا إثم على رب الدار في ذلك. (مبسوط سرخيي، دارالكتب العلمية بيروت ۳۹/۱٦)

وإذا استأجر الذمي من المسلم دارًا يسكنها، فلا بأس بذلك وإن شرب فيها الخمر، أو عبد فيها الصليب، أو أدخل فيها الخنازير، ولم يلحق المسلم في ذلك بأس؛ لأن المسلم لا يؤاجرها لذلك إنما آجرها للسكنىٰ كذا في المحيط. (هندية، الباب السادس عشر، زكريا قديم ٤/ ٤٥٠، جديد ٤/٤٨٦)

عن محمدؒ رجل إستأجر رجلا ليصور له صوراً، أو تماثيل الرجال في بيت، أو فسطاط، فإني أكره ذلك، وأجعل له الأجر. (هندية، الباب السادس عشر، زكريا قديم ٤/ ٤٥٠، جديد ٤/٤٨٦، الفتاوى التاتارخانية، زكرياه ١/ ١٣٠، رقم:٢٢٤٣٧)

وفي فتاویٰ أهل سمرقند: اذا استأجر رجلا لينحت له طنبوراً، أو بربطاً ففعل يطيب له الأجر إلا أنه يأثم في الإعانة على المعصية.
(الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٥/ ١٣١، رقم: ٢٢٤٣٧) *فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم*

كتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف خاص: ۱۱۴۴۸/۴۰)

ٹیلیویژن کی تجارت کی آمدنی حلال یا حرام؟

سوال [۱۰۹۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ T.V. (ٹی وی) کی تجارت میں آمدنی کا کیا حکم ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: .T.V (ٹی وی) فی نفسہ آلۂ لہوولعب نہیں ہے، اس کو اصلاحی، تعلیمی، تربیتی اور سائنسی مقاصد کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے، اور فقہاء نے ہر ایسی چیز کی خرید وفروخت کو جائز قرار دیا ہے، جس میں فی نفسہ کوئی برائی نہ ہو؛ لہٰذا ٹی وی کی تجارت کی آمدنی حلال ہے، تاہم اب تک چونکہ اس کا استعمال اکثر برائی ومنکرات کے لئے ہوتا رہا ہے؛ اس لئے اس کی تجارت کی آمدنی کراہت کے ساتھ جائز ہے۔ (مستفاد: جدید فقہی مسائل ۱/۳۹۹)

وعلم من هذا أنه لا يكره بيع مالم تقم المعصية به كبيع الجارية المغنية، والكبش النطوح، والحمامة الطيارة، والعصير، والخشب ممن يتخذ منه المعازف. وتحته في الشامية: لأن الإجارة على منفعة البيت؛ ولهذا يجب الأجر بمجرد التسليم، ولا معصية فيه وإنما المعصية بفعل المستأجر وهو مختار فينقطع نسبته عنه. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ٩/٥٦٢، كراچي ٦/٣٩١)

ومن كسر لمسلم بربطًا، أو طبلا، أو مزمارًا، أو دفاً، أو أراق له سكراً، أو منصفاً، فهو ضامن، وبيع هذه الأشياء جائز، وهذا عند أبي حنيفة......ولأبي حنيفة أنها أموال لصلاحيتها لما يحل من وجوه الانتفاع، وإن صلحت لما لا يحل فصار كالأمة المغنية، وهذا لأن الفساد بفعل فاعل مختار، فلا يوجب سقوط التقوم وجواز البيع والتضمين مرتبان على المالية والتقوم، والأمر بالمعروف باليد إلى الأمراء لقدرتهم، وباللسان إلى غيرهم. (هداية، اشرفي ديو بند ٣/٣٨٧)

وفي فتاویٰ أهل سمرقند: إذا استأجر رجلا لينحت له طنبوراً، أوبربطاً ففعل يطيب له الأجر إلا أنه يأثم في الإعانة على المعصية. (تاتارخانية، زكريا ١٥/١٣١، رقم: ٢٢٤٣٧)

عن محمدؒ رجل استأجر رجلا ليصور له صوراً، أو تماثيل الرجال في بيت، أو فسطاط، فإني أكره ذلك، وأجعل له الأجر. (هندية، الباب السادس عشر، زكريا قديم ٤/ ٤٥٠، جديد ٤/ ٤٨٦، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٥/ ١٣٠، رقم: ٢٢٤٣١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ ؍ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰ ؍ ۶۲ ؍ ۱۱۴۱۴)

ٹی وی، ریڈیو، موبائل وغیرہ کے سامان کا کاروبار کرنا

سوال [۱۰۹۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بکر ٹی وی، ریڈیوں، موبائل، کے ساتھ ساتھ مختلف لہوولعب کے سامان کا کاروبار کرتا ہے مفتی صاحب سے گزارش ہے کہ بکر کی آمدنی حلال ہے یا حرام دلائل کے ساتھ جواب تحریر کریں۔

المستفتی: محمد زکریا، دارالعلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ٹی وی، ریڈیو، صرف فحش پروگراموں اور ناجائز نشریات کے لئے خاص نہیں؛ بلکہ ان پر جائز پروگرام بھی نشر کئے جاتے ہیں، مثلاً وہ ٹی وی جو کاروباری لوگ اپنی فیکٹری میں لگاتے ہیں، جس سے مختلف کمروں میں کام کرنے والوں کی نگرانی کی جاتی ہے؛ اس لئے ان کی مرمت کا پیشہ بنانا جائز اور آمدنی حلال ہے، اس کا حکم بھی فوٹو گرافی کی اجرت کی طرح ہے، اور ان چیزوں کا استعمال فحش پروگراموں کو نشر کرنے اور بے حیائی کی ترویج کے لئے زیادہ ہوتا ہے اور اس کی مرمت میں ایک گونہ تعاون علی الاثم ہے؛ اس لئے یہ پیشہ اختیار کرنا مکروہ ہوگا۔ اور موبائل کا حکم ان چیزوں سے الگ ہے، موبائل کی ایجاد اصلاً آپسی رابطہ اور مواصلاتی نظام کی ترقی کے لئے ہوئی ہے؛ اس لئے اس کی

مرمت کا پیشہ اختیار کرنا جائز اور آمدنی بلاشبہ حلال ہے، جو موبائل کو ناجائز کاموں میں استعمال کرے گا وہی گناہ گار ہوگا، مرمت کرنے والے پر اس کا کوئی گناہ نہ ہوگا۔ اورلہو ولعب کے سامان کی مرمت کرنے اور ان کی تجارت کرنے میں فی نفسہ گناہ نہیں ہے؛ بلکہ ان چیزوں کو ناجائز کھیلوں میں استعمال کرنے والا گنہگار ہوگا اور جائز کھیلوں میں استعمال کرنے والا گنہگار نہیں ہوگا؛ لہٰذا لہو ولعب کی مرمت وتجارت کرنے والے شخص کی آمدنی حلال ہے۔ اوراس کے ساتھ ہر طرح کا معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے۔

الأمور بمقاصدها. (الأشباه والنظائر ۵۳)

قال الله تعالیٰ: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرَی. [الأنعام:۱٦٤]

يجب الأجر بمجرد التسليم، ولا معصية فيه وإنما المعصية بفعل المستأجر وهو مختار فينقطع نسبته عنه. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ٥٦٢/٩، كراچي ٣٩١/٦)

إذا استأجر رجلا لينحت له طنبوراً، أو بربطاً ففعل يطيب له الأجر إلاأنه يأثم في الإعانة على المعصية. (هندية، الباب السادس عشر، زكريا قديم ٤٥٠/٤، جديد ٤٨٦/٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۵؍رجب المرجب ۱۴۳۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۴۶۴/۳۹)	۱۴۳۲/۷/۱۵ھ

جعلی سرٹیفیکٹ سے حاصل شدہ نوکری کا پیشہ حلال یا حرام؟

سوال [۱۰۹۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جعلی سرٹیفیکٹ کے ذریعہ سے جو نوکری حاصل کی جاتی ہے، وہ جائز ہے یا نہیں؟ اوراس کے بعد اس نوکری سے جو تنخواہ ملے گی وہ حلال ہوگی یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جعلی سرٹیفکیٹ کے ذریعہ سے جونوکری حاصل کی جاتی ہے وہ ناجائز ہے؛ اس لئے کہ یہ جھوٹ اوردھوکہ ہے تاہم جوکام اس کے ذمہ ہے، اگر وہ اس کوبحسن وخوبی انجام دیتا ہے، تو اس کے لئے اجرت لینا جائز اور حلال ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۱۹۸/۸، کتاب الفتاوی ۳۹۵/۵، آپ کے مسائل اوران کاحل جدید زکریا ۲۹۸/۷، فقہی مسائل ۴۱۳/۱)

فيطيب له وإن كان السبب حراماً. (البحر الرائق، باب الإجارة الفاسدة، زكريا ۳۳/۸، كوئٹه ۱۹/۸)

واعترض رجل من غير المقلدين، وقال إن أبا حنيفةؒ يجعل أجرة البغي طيبة، وهذا خلاف نص الحديث، وإجماع الأمة، وأجاب مولانا المرحوم الگنگوهي أن صورة المسئلة أن يستأجر رجل المرأة لعمل ما من الطحن، أو الخبز، واشترط معها، أنه يزنى بها، فإن أجرة عملها طيبة. (العرف الشذي على هامش الترمذي، مكتبه البدر ۲۱٦/۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف خاص: ۱۱۴۵۸/۴۰)

تصویر کشی کی اجرت حلال ہے یا نہیں؟

سوال [۱۰۹۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید ایک فوٹو گرافر ہے، اس کے یہاں ہر طرح کے فوٹو کھینچے جاتے ہیں، پاسپورٹ اور ایجنسی کارڈ فوٹو کے ساتھ آدمی کا پورا فوٹو اور نوجوان لڑکے لڑکیوں کے شوقیہ فوٹو بھی کھینچے جاتے ہیں، تو اس طرح کے فوٹو تیار کر کے اس کی اجرت حلال ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جوفوٹوگرافر جائزونا جائز دونوں طرح کے فوٹو تیارکرتا ہے، تواس کا پیشہ تو سخت گناہ کا کام ہے؛ لیکن اس کی اجرت مع الکراہت حلال ہے؛ اس لئے کہ وہ اپنے سامان کی اجرت لیتا ہے، جو وہ فوٹو کی تیاری میں خرچ کرتا ہے۔

(مستفاد: جواہرالفقہ ،مکتبہ تفسیرالقرآن، دہلی -۳/۷ ۳۳)

رجل استأجر رجلا ليصور له صوراً، أو تماثيل الرجال في بيت، أوفسطاط، فإني أكره ذلک، وأجعل له الأجر. قال هشام: تأويله إذا كان الإصباغ من قبل الأجير. (الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٥/ ١٣٠، رقم: ٢٢٤٣١، هندية، زكريا قديم ٤/ ٤٥٠، زكريا جديد ٤/ ٤٨٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف خاص: ۱۱۴۴۹/۴۰)

بیڑی، سگریٹ کی تجارت اوراس کا پیشہ

سوال [۱۰۹۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کی بیڑی، سگریٹ کی ایجنسی ہے، تھوک میں لوگ لے جاتے ہیں، تو یہ کاروبار کرنا کیسا ہے؟ اوراس کی آمدنی کا کیا حکم ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بیڑی، سگریٹ کا کاروبار بلا کراہت جائز ہے اوراس سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی بلاکراہت حلال ہے؛ البتہ پینے والوں کے لئے پینا مکروہ ہے۔

وصح بيع الخمر مما مر ومفاده: صحة بيع الحشيشة، والأفيون –ولا شک في ذلک لأنهما دون الخمر وليسا فوق الأشربة

المحرمة فصحة بيعها يفيد صحة بيعهما. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، كراچي٦/٤٥٤، زكريا ٣٥/١٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف خاص: ۱۱۴۷۶/۴۰)

جانوروں کو ادھیا پر دینا

سوال [۱۰۹۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جانوروں کو ادھیا پر دینا کیسا ہے؟ یعنی مالک چرواہے کو جانور اس شرط پر دے کہ وہ اس کی پرورش کرے، تو دودھ اور بچہ دونوں میں آدھا آدھا ہوگا، اگر یہ ناجائز ہے، تو اس کے جواز کی کیا شکل ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جانوروں کو ادھیا پر دینا جائز نہیں ہے؛ البتہ اس کے جواز کی شکل یہ ہے کہ مالک جانور کی ایک مناسب قیمت لگا کر نصف حصہ دیکھ ریکھ کرنے والے کے ہاتھ فروخت کر دے، پھر اس کی قیمت معاف کر دے، تو ایسی صورت میں جانور دونوں کے درمیان مشترک ہو جائے گا اور اس کی نسل اور آمدنی بھی دونوں کے درمیان نصف نصف ہو جائے گی اور دیکھ ریکھ کرنے والا اپنی دیکھ ریکھ کی اجرت نہ لے، اسے معاف کر دے، تو اس صورت میں جانور کی نسل اور دودھ دونوں کے درمیان آدھا آدھا تقسیم ہو جائے گا۔

(مستفاد: انوار رحمت ۲۲۴، محمودیہ ڈابھیل ۵۹۴/۱۶، میرٹھ ۱۹۴/۲۵)

دفع بقرة إلى رجل على أن يعلفها، وما يكون من اللبن، والسمن بينهماأنصافًا، فالإجارة فاسدة وعلى صاحب البقرة للرجل أجر قيامه وقيمة علفه إن علفها من علف هو ملكه–والحيلة في جوازه أن يبيع نصف البقرة

منه بثمن ويبرئه عنه، ثم يأمر باتخاذ اللبن والمصل، فيكون بينهما. (هندية، الباب الخامس عشربثمن الفصل الثالث، زكريا قديم ٤/ ٤٤٥،جديد ٤/ ٤٨١، بزازيه، زكريا جديد ٢/ ٢٠، وعلى هامش الهندية ٥/ ٣٧، قاضيخان، زكريا جديد ٢/ ٢١٠، وعلى هامش الهندية٢/ ٣٣٠)

رجل دفع بقرة إلى رجل بالعجل مناصفة، وهي التي يسمى بالفارسية كاونم، بأن دفع على أن ما يحصل من اللبن، والسمن بينهما نصفان؛ فهذا فاسدة، والحادث كله لصاحب البقرة والإجارة فاسدة -والحيلة في تجويز هذا التصرف أن يبيع نصف البقرة من المدفوع إليه بثمن معلوم، ويسلم البقرة إليه ويبرئه من الثمن، ثم يأمره، بأن يتخذ من لبنها المصل والسمن وغير ذلک فيكون ذلک بينهما.

(خلاصة الفتاوى، الفصل الثاني، اشرفية٣/ ١١٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱/ربیع الاول۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف خاص: ۱۱۴۵۵/۴۰)

جانوروں کو حاملہ کرانے کے لئے انجکشن لگوانا اوراس کی اجرت لینا

سوال [۱۰۹۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جانوروں کو حاملہ کرانے کے لئے انجکشن لگوانا اوراس کی اجرت دینا ولینا کیسا ہے؟ جوبھی شرعی حکم ہو تحریر فرمائیں نوازش ہوگی۔

المستفتی: حسین احمد، متعلم مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جانوروں کو حاملہ کرانے کے لئے انجکشن لگوانا دوقسموں پر ہوسکتا ہے:

(۱) جانور کے فطری راستہ سے ہٹ کر جسم کے کسی دوسرے حصہ پر لگوایا جائے، تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جانور اپنی طبعی کمزوری کی وجہ سے حاملہ نہیں ہو رہی ہے اور بطور علاج انجکشن کے نر سے ملنے پر حاملہ ہو جاتی ہے، تو اس طرح انجکشن لگوانا اور اس کی اجرت لینا دینا بھی شرعاً جائز ہے۔

(۲) جانور کے رحم دان میں فطری راستہ سے انجکشن کے ذریعہ نرینہ جانور کا مادہ منویہ پہونچایا جائے، تو مادہ اور انجکشن کی اجرت وقیمت دینا اور لینا ناجائز اور حرام ہے۔

أحاديث الباب تدل على أن بيع ماء الفحل وإجارته حرام؛ لأنه غير متقوم به، وإليه ذهب الجمهور. (حاشية بذل المجهود، تحت باب في عسب الفحل، دارالبشائر الإسلامية ۱۱/۱۳۳، دار الكتب العلمية بيروت ۱۵/۹۶، نيل الأوطار، دارالكتب العلمية بيروت ۵/۱۷۴)

اور اس طرح انجکشن لگوائی کی اجرت کے سلسلہ میں فقیر کی نظر سے کوئی صریح جزئیہ نہیں گذرا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۴ ربیع الثانی ۱۴۱۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/۲۱۸۵)	۴/۴/۱۴۱۱ھ

غیر مسلم کی پوجا کی تصویریں فروخت کرنا

سوال [۱۰۹۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں اہل ہنود کی پوجا کی تصویریں فریم کر کے بیچتا ہوں، کیا یہ روزی میرے لئے از روئے شریعت جائز ہے یا ناجائز؟ آگاہی فرما دیں عند اللہ ماجور ہوں گے۔

المستفتی: محمد طاہر حسن، مانپور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کا یہ کام اعانت علی المعصیت کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہے؛ البتہ اجرت کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بلاکراہت حلال و جائز ہے اور امام ابو یوسفؒ ومحمدؒ کے نزدیک مع الکراہت جائز ہے؛ اس لئے مسلمانوں کو اس طرح روزی اختیار کرنے سے احتراز کرنا جائز ہے۔

لو آجره دابة لينقل عليها الخمر، أو آجره نفسه ليرعي له الخنازير يطيب له الأجر عنده و عندهما يكره. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ٩/ ٥٦٢، كراچي ٦/ ٣٩٢، البحرالرائق، زكريا ٨/ ٣٧٢، كوئٹه ٨/ ٢٠٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/ ۱۷۴۹)

لہو ولعب کی اشیاء بنا کر کرایہ پر دینا

سوال [۱۰۹۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ وہ تمام اشیاء لہو ولعب کی جو شادی بیاہ میں مشرکین، ہنود، یا غیر مسلمین عیسائی، یہودی اور مسلمان استعمال کرتے ہیں، ان کا بنانا اور کرایہ وغیرہ پر دینا کیسا ہے؟

المستفتی: جمیل احمد قاسمی، بستوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تعاون علی المعصیۃ کی وجہ سے صاحبین کے نزدیک ناجائز ہے، اسی پر فتوی دیا جاتا ہے؛ اس لئے ان چیزوں کا بنانا اور کرایہ پر دینا سب ممنوع اور مکروہ ہے۔

وعندهما يكره له ذلك لوجود الإعانة على المعصية، وقد صح أن النبي صلى الله عليه وسلم لعن في الخمر عشراً وعد منها حاملها والمحمول إليه. (مجمع الأنهر، كتاب الكراهية، فصل في الكسب، دارالكتب العلمية، بيروت ٤/١٨٨، مصري قديم ٢/٥٣٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/محرم الحرام ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/۲۰۹۴)

کم تنخواہ دیکر زیادہ پر دستخط کرانا

سوال [۱۰۹۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ گورمنٹ کے مدرسہ میں مدرس کی جو تنخواہ متعین ہوتی ہے، اس کا نصف حصہ گورنمنٹ دیتی ہے اور نصف حصہ مدرسہ کے ذمہ واجب الاداء ہوتا ہے، اگر دینی مدارس کو اس نصف کی ادائے گی میں بھی دشواری پیش آئے اور مدرسین رضاء وخوشی کے ساتھ اس سے کم پر بھی آمادہ ہوجائیں اور دستخط پورے نصف پر کریں، تو کیا ایسا کرنا جائز نہیں ہے؟ بینوا بالتفصیل تو جروا عنداالجلیل۔

المستفتی: ظہیر الحق نعمانی، وصیۃ العلوم، کوپا گنج، اعظم گڈھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر کم لے کر زیادہ پر دستخط کرانے کا مقصد قوم کو زیادہ حساب دکھلا کران سے زیادہ رقم حاصل کرنی ہے، تو یہ دھوکہ ہے، یہ ناجائز اور واجب الاحتراز ہے، اگر اس طرح زیادہ پر دستخط کا کوئی دوسرا مقصد ہے، تو اس کی صراحت کردی جائے، اس کے بعد حکم لکھا جاسکتا ہے۔

عن أبي هريرة رضي الله عنه، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم

مـربـرجـل –إلـى –فقال: رسول الله صلى الله عليه وسلم: ليس منامن غش.
(سنن أبي داؤد، باب النهي عن الغش، النسخة الهندية۲/ ۸۹، دارالسلام رقم: ۳۴۵۲، مسند أحمد بن حنبل ۲/ ۲۴۲، رقم: ۷۲۹۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/ ۱۲۱۴)

فسادات میں لوٹے ہوئے مال کی خرید وفروخت

سوال [۱۰۹۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ موجودہ زمانہ میں فسادات میں لوٹے ہوئے مال کی بیع وشراء کا کیا حکم ہے؟ مع دلائل جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: اخلاق احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ہندوستان جیسے (دارالجمہوریہ) میں لوٹ مار کرنا ناجائز اور حرام ہے اور لوٹ مار میں جو مال حاصل ہوجائے، اس کو خود استعمال کرنا ناجائز ہے، اصل مالک یا اس کے ورثاء کو پہونچا دینا لازم ہے اور اگر یہ ممکن نہ ہو، تو فقراء کو بلا نیت ثواب دیدینا لازم ہے۔

صرح الفقهاء: بأن من اكتسب مالا بغير حق، فأما أن يكون كسبه بعقد فاسد (إلى قوله) **أوبغير عقد كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه، يجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك وإلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء.** (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹)

فإن عرفوا أربابها ردوها على أربابها؛ لأنه لا يخلوا عن نوع خبيث، وإن لم يعرفوا أربابها تصدقوا بها. (قاضيخان، كتاب الحظر و الإباحة، زكريا جديد ٣/ ٢٩٠، وعلى هامش الهندية ٣/ ٤٠١)

لو أجريت أحكام المسلمين، وأحكام أهل الشرك لاتكون دار حرب. (شامي، مطلب فيما تصير به دارالإسلام، دار حرب، زكريا ٦/ ٢٨٨، كراچي ٤/ ١٧٥، الموسوعة الفقهية الكويتية ١٠/ ٢٩٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ ؍ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/ ۱۷۸۳)

غیر مسلم، مسلمان کو شراب وخنزیر کا پیسہ تحفہ میں دے تو کیا حکم؟

سوال [۱۱۰۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شراب اور خنزیر کا ثمن مسلمانوں کے لئے حرام ہے، غیر مسلموں کے حق میں کیا حکم رکھتا ہے؟ شراب اور خنزیر کا پیسہ اگر ان کے حق میں جائز ہے، تو وہ مسلمانوں کو شراب اور خنزیر کا پیسہ تحفہ میں دیں، تو مسلمانوں کے لئے وہ پیسہ جائز ہوگا یا ناجائز ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شراب اور خنزیر کا پیسہ غیر مسلموں کے لئے ان کے عقیدے کے مطابق جائز ہے؛ لہٰذا اگر غیر مسلم مسلمان کو شراب یا خنزیر کا پیسہ بطور تحفہ دے، تو مسلمان کے لئے وہ پیسہ حلال اور جائز ہوجائے گا۔

إن بلالاً قال: لعمر بن الخطابؓ إن عمالك ياخذون الخمر، والخنازير في الخراج، فقال: لا تأخذوها منهم؛ ولكن ولوهم ببيعها وخذوا أنتم من الثمن -فهذا عمرؓ قد أجاز لأهل الذمة بيع الخنازير، والخمر، وأجاز للمسلمين أخذ أثمانهما في الجزية، والخراج وذلك بمحضر من

الصحابةؓ ولم ينكر عليه منكرٌ. (إعلاء السنن، باب حرمة بيع الخمر، والميتة، والخمر، والخنزير، والأصنام، دارالكتب العلمية بيروت ١٤/١٣٤، ١٣٥، كراچي ١٤/١١١، بدائع الصنائع، زكريا٤/٣٣٤، كراچي ٥/١٤٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵ر صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف خاص: ۴۰ر ۱۱۴۴۲)

نشہ آور چیز کا کاروبار و بلیک مارکٹنگ کا حکم

سوال [۱۱۰۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خالد نشہ آور چیز کی آمدنی وکارور بار کے ساتھ کالا بازار کا کاروبار کرتا ہے اس بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد زکریا، دارالعلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: شراب کی تجارت اورآمدنی حرام ہے، اگر شراب کا کاروبار کرنے والے کی غالب آمدنی یہ ہے،توان سے ہدیہ یادعوت قبول کرنا یاان کو اپنے ساتھ قربانی میں شریک کرنا جائز نہ ہوگا اور بیوی اور بچوں کے لئے ان کے مال سے اپنا نفقہ لینے کی گنجائش ہے اورشراب کے علاوہ جونشہ آور چیزیں ہیں، جیسے گانجا، بھنگ، افیون یادیگر منشیات ان کی تجارت اور آمدنی مکروہ ہے، اوریہی حکم ان کے ہدایا اور دعوت کا ہے اور بلیک مارکٹنگ کا کاروبار فی نفسہ جائز ہے۔

قال الله تعالىٰ: ﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾. [البقرة:١٩٥]

الأشربة المحرمة أربعة. (هداية، كتاب الأشربة، اشرفي ديوبند ٤/٤٩٢)

ولايجوز بيعها لحديث مسلم” الذي حرم شربها حرم بيعها. (شامي، كتاب الأشربة، زكريا ١٠/٢٩، كراچي ٦/٤٤٩)

وصح بيع غير الخمر……ثم إن البيع وإن صح لكنه يكره.

(شامي، كتاب الأشربة، زكريا ١٠/٣٥، كراچي٦/٤٥٤)

لا يجيب دعوة الفاسق……وكذا من كان غالب ماله حرامًا.

(هندية، الباب الثاني عشر في الهدايا والضيافات، زكريا قديم٥/٣٤٣، جديد ٥/٣٩٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍رجب المرجب۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر:الف۳۹؍۱۰۴۶۴)

ٹیکسی سے شرابیوں کو شراب خانے لے جانا اوران کو کمرے کرایہ پر دینا

سوال [۱۱۰۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ یہاں نیوزی لینڈ میں مختلف ممالک کے مسلمان بغرض تجارت وروزگار مقیم ہیں، ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں، جو اچھی کمائی کے لئے حرام وحلال سے قطع نظر کچھ کاروبار کرتے ہیں۔

(۱) کچھ لوگ پوری رات اپنی ٹیکسی سے شراب خانوں سے شرابیوں اور اسی طرح جوئے خانوں رقص گاہوں اور قہوہ خانوں سے فساق وفجار کو منتقل کرتے ہیں اور پھر دن بھر سوتے ہیں اور یہ محض اچھی آمدنی کے خاطر کرتے ہیں۔

(۲) کچھ لوگ مکانات خریدتے ہیں اور پھر انہیں ایسے لوگوں کو کرایہ پر دیتے ہیں، جو ان میں شراب پیتے ہیں، خنزیر کا گوشت کھاتے ہیں اور اپنی دوست لڑکیاں لاتے ہیں، ان کا مقصد بھی اچھی آمدنی ہے۔

المستفتی: مفتی ساجد، بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) ٹیکسی چلانے والے کی اجرت حلال ہے،

معصیت کا کام کرنا فساق وفجار کا اپنا ذاتی فعل ہے، وہ معصیت کے فاعل مختار ہیں؛ البتہ تعاون علی المعصیت کی وجہ سے حضرات صاحبینؒ کے نزدیک مکروہ ہے۔

وإن تحصل المعصية بفعل فاعل مختار، وليس الشراب من ضرورات الحمل؛ لأن حملها قد يكون للإراقة، أو للتخليل (إلى قوله) وعلى هذا الخلاف لو آجره دابة لينقل عليها الخمر، أو آجره نفسه ليرعي له الخنازير يطيب له الأجر عنده، وعندهما يكره. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، كراچی ۶/۳۹۲، زكريا ۹/۵۶۲، البحرالرائق، كوئٹه ۸/۲۰۳، زكريا ۸/۳۷۲)

(۲) ایسا کام کرنا تعاون علی المعصیت کی وجہ سے مکروہ ہے اور اجرت حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بلاکراہت حلال ہے اور حضرات صاحبین کے نزدیک مکروہ ہے۔

يطيب له الأجر عنده، و عندهما يكره. (شامي، كراچي ۶/۳۹۲، زكريا ۹/۵۶۲)

وهو صريح في جواز بيع الغلام من اللوطي. (شامي، كراچي ۶/۳۹۲، زكريا ۹/۵۶۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ر محرم الحرام ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/۵۱۰۷)

مسلم مزدور کا سرکاری دفتر میں پھینکی ہوئی خالی شراب کی بوتل کو دھل کر استعمال کرنا

سوال [۱۱۰۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سرکاری دفتر میں غیر مسلم شراب پی کر خالی بوتل پھینک دیتے ہیں، وہاں مسلم

مزدور کام کرتے ہیں، وہ خالی بوتلیں اٹھالاتے ہیں، ان کوفروخت کردیتے ہیں یا صاف کر کےاپنے استعمال میں لاتے ہیں۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ شراب کی خالی بوتلیں وہاں سے اٹھانا یا فروخت کر کے پیسے اپنے صرفہ میں لانا یا بوتل صاف کر کےاپنے استعمال میں لانا مسلمان کے لئے جائز ہے یانہیں؟ بحوالہ جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: منشی انیس احمد، نئی بستی، رام نگر، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: صورت مسئولہ میں ان بوتلوں کو پاک وصاف کر کے شرعاً اپنے استعمال میں لانا اورفروخت کر کے قیمت حاصل کرنا جائز ہے۔ نیز پانی سے اچھی طرح پاک کرلیا جائے۔

ويجوز تطهير النجاسة بالماء وبكل مائع طاهر. (مختصر القدوری، كتاب الطهارة، باب الأنجاس۱۸)

فإن كانت شيئًا يعلم أن صاحبها لا يطلبها كالنواة، وقشر الرمان يكون إلقاؤه إباحة حتى جاز الانتفاع به بلا تعريف. (شامي، كتاب اللقطة،زكريا ٦/٤٣٦، كراچي ٤/٢٧٨، كوئٹه ٣/٣٥٠)

والبطيخ في مواضع متفرقة له أن يأخذ وينتفع بها. (بزازيه، كتاب اللقطة، زكريا جديد ٣/١١١، وعلى هامش الهندية ٦/٢١٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ر جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴ر ۷۰۳)

مقدمہ کا خرچ اپنے فریق سے وصول کرنا

سوال [۱۱۰۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں: کہ میں نے ایک شخص زید کو کچھ مال دیا، اس شخص نے اس مال کی قیمت واپس نہیں کی اور نہ ہی مال واپس کیا، تقریباً دس سال گذر گئے، پھر میں نے عدالت میں نالش کی تو ڈگری میرے نام آگئی، اس درمیان عدالت میں میرا تقریباً پانچ ہزار چار سو روپیہ خرچہ ہوا، اس کے بعد اس شخص نے اس مال کی قیمت ادا کردی اور اس پر جو سود ہوتا ہے، وہ میں نے نہیں لیا۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ عدالت میں جو روپیہ میرا خرچہ ہوگیا، وہ خرچ شدہ روپیہ زید سے وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟ زید کہتا ہے کہ معاف کردو؛ جبکہ وہ صاحب حیثیت آدمی ہے، شرعی حکم کیا ہے؟ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد یونس، محلّہ: سرائے ترین، سنبھل، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسی حالت میں خرچۂ مقدمہ وصول کرنا بعض فقہاء جائز کہتے ہیں اور بعض ناجائز کہتے ہیں؛ اس لئے اگر معاف کردیں گے، تو زیادہ بہتر ہوگا اور اگر وصول کریں گے، تو جن فقہاء نے اجازت دی ہے، ان کے قول کے مطابق آپ کے لئے خرچۂ مقدمہ وصول کرکے استعمال کرنا حلال ہوگا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۴/۱۵۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/محرم الحرام ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/۲۹۶۶)

بکرے کے خصیتین کی فروختگی اور اس سے حاصل شدہ آمدنی کا حکم

سوال [۱۱۰۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) ایک صاحب ہیں، ان کا گوشت کا کاروبار ہے، اور کثیر تعداد میں بکرا ذبح کرکے گوشت فروخت کرتے ہیں، بکرے کے خصیتین ''فوطا'' جس کو یہاں کی

زبان میں کبورا کہتے ہیں، یہاں کے غیر مسلم اسے خرید کر بڑے شوق سے کھاتے ہیں، کیا اس کا فروخت کرنا جائز ہے؟

(۲) کچھ جان کار لوگ کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ کے یہاں بکرے کا خصیہ یعنی فوطا کھانا جائز ہے اور فروخت کرنا بھی جائز ہے۔ کیا یہ حقیقت میں جائز ہے؟ اگر شافعی مسلک میں جائز ہے، تو مجبوری کے درجہ میں مسلک شافعی پر عمل کرکے فروخت کیا جائے، تو جائز ہوگا؟

(۳) اگر بالفرض خصیتین کی بیع شریعت مطہرہ میں بالکل ہی ناجائز ہے، تو کیا شریعت میں ایسی کوئی شکل ہے کہ خصیتین یعنی فوطا بیچ کر اس رقم سے غریبوں کی مدد کی جاسکے، جیسا کہ بینک میں جمع شدہ رقم سے جو سود ملتا ہے، اس کو غریبوں میں تقسیم کرنے کو حضرات فقہاء جائز قرار دیتے ہیں۔

المستفتی: عزیز احمد رحمانی، کچھی کومپلکس، بدھوار نیپٹھ (مہاراشٹر)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حلال جانوروں کے خصیتین حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مکروہ ہیں اور ائمہ ثلاثہؒ اور جمہورؒ کے نزدیک بلا کراہت حلال اور جائز ہیں اور حنفیہ کے یہاں اگرچہ کھانا مکرہ ہے؛ لیکن اس کو فروخت کرنا بلا کراہت جائز اور درست ہے اور اس کا پیسہ بھی حلال ہے؛ اس لئے کہ جس مسلک کے نزدیک حلال ہے، ان کے ہاتھ فروخت کرنے کے جواز میں کوئی شبہ نہیں۔ نیز خصیتین دواؤں میں بھی کام آتے ہیں۔ نیز حنفی مسلک میں اگرچہ مکروہ ہے؛ لیکن اگر کوئی دوا اور علاج کے طور پر استعمال کرے گا، تو بلا کراہت جائز ہے؛ اس لئے بیع کے جواز میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے اور اس کے لئے شافعی مسلک اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

فجاز بیعه ولحوم السباع وشحومها وجلودها......والانتفاع بها غير الأكل. (تبيين الحقائق، زكريا ديوبند ٤/ ٣٧٨، امداديه ملتان ٤/ ٥١)

يجوز بيع الحيات إذا كان ينتفع بها للأدوية. (شامي، مطلب في بيع دودة القرمز، زكريا۷/ ۲٦٠ ، کراچی ٥ /٦٨)

عن مجاهد قال: كره رسول الله صلى الله عليه وسلم: من الشاة سبعاً المرارة –إلى قوله– والأنثيين (الحديث) قلت الحديث نص في كراهة هذه الأشياء السبع وهو مذهب الحنفية. (إعلاء السنن، کراچي ١٧/ ١٣٠، دار الكتب العلمية بيروت١٧ / ١٤٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍رجب المرجب ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۱۲۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱؍۷؍۱۴۳۱ھ

حرام کمائی سے زندگی بسر کرنے کا حکم

سوال [۱۱۰۰٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے چھوٹے بھائی کی کمائی جائز نہیں ہے، کئی سال میں اس کے ساتھ رہا، کھانا پینا بھی اسی کے ساتھ تھا، پھر میری شادی ہوگئی، تو میں الگ رہنا چاہتا تھا؛ لیکن وہ مجھے جانے نہیں دیتا تھا۔ ۱۰؍سال اپنے بھائی کے ساتھ رہا وہاں کھایا پیا اور اس کے گھر میں رہا جس میں لائٹ بھی دو نمبر کی تھی، میں نے ٹھنڈا گرم پانی بھی استعمال کیا۔ اب میں ان سب چیزوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں، مجھے بتائیں کہ اس کا کفارہ ادا کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

المستفتی: اقبال احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دس سال تک بھائی کے ساتھ جو رہنا ہوا ہے، اس میں خود آپ کی کمائی بھی تھی؛ اس لئے آپ کے کھانے پینے میں کوئی ناجائز چیز نہیں رہی، آپ کی کمائی حلال تھی، مگر بھائی کی کمائی کے ساتھ مخلوط ہونے کی وجہ سے صرف شبہ اور اشتباہ رہا ہے، اس کی وجہ سے وسوسہ میں مبتلا نہ ہوئیے۔ اللہ تعالیٰ سے سچی توبہ کر لینا ضروری

ہے اس کا کوئی کفارہ شریعت سے ثابت نہیں، آپ کے بھائی کی ہدایت کے لئے دعا کر رہے ہیں۔ اللہ پاک حلال روزی کی توفیق دے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: اِنَّمَا التَّوْبَۃُ عَلَی اللّٰہِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ فَاُولٰٓئِکَ یَتُوْبُ اللّٰہُ عَلَیْهِمْ وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا.

[النساء:۱۷] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ذی قعدہ ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/۳۶۹۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶/۱۱/۱۴۱۴ھ

چوری کے مال سے خریدی گئی حلال چیز کا دوسروں کے لئے استعمال کرنے کا حکم

سوال [۱۱۰۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک چور نے چوری کے مال سے کوئی حلال چیز خریدی تو وہ حلال چیز دوسرے لوگوں کے لئے استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: ابوالخیر، ۲۴/پرگنوی، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چوری کا مال اور چوری کے مال سے خریدی ہوئی چیز استعمال کرنا کسی کے لئے جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۸/۱۰۴)

اشتریٰ بالثوب المغصوب جارية يحرم عليه وطؤها حتى يدفع قيمة الثوب إلى صاحبه. ان الصحيح لا يحل له الأكل ولا الوطء؛ لأن في السبب نوع خبث. (شامي، كتاب الغصب، مطلب شرى دارا أو سكنها...... زكريا ۹/۲۷۸، كراچي ۶/۱۹۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/شعبان المعظم ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/۷۷۹۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۵/۸/۱۴۲۳ھ

جوے کے پیسے سے خریدی گئی زمین کی پیداوار کا حکم

سوال [۱۱۰۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص جوا کھیلتا ہے، اس سے حاصل شدہ رقم کے ذریعہ ایک زمین خریدتا ہے اور اس میں کاشتکاری کر رہا ہے، تو اس سے حاصل ہونے والی پیداوار حلال ہے یا حرام؟ نیز اس کے ذریعہ سے قربانی کر سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: ابوالخیر، ۲۴ پرگنوی، متعلم تکمیل ادب، مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جوے کے پیسے سے جو زمین خریدی گئی ہے، اس زمین کی پیداوار اس وقت تک مشتبہ رہے گی، جب تک یہ شخص ان لوگوں کو اتنی مقدار میں پیسہ واپس نہ کر دے، جس مقدار کا پیسہ جوے میں ہارنے والوں سے وصول کیا ہے، ہارنے والوں ہی کو وہ پیسہ واپس کر دینا ضروری ہے، اس کے بعد زمین کی پیداوار بلا شک وشبہ حلال ہوگی، اور اس پیسہ سے قربانی حلال نہیں ہے؛ ہاں البتہ جوے میں ہارنے والوں کو اتنی مقدار میں پیسہ واپس کر دینے کے بعد قربانی حلال ہو سکتی ہے۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ۳۵۲/۱۳، ڈابھیل ۴۱۵/۱۸، احسن الفتاوی ۱۰۴/۸)

صرح الفقهاء: بأن من اكتسب مالا بغير حق، أوبغير عقد كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية بيروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵ر شعبان المعظم ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۷۹۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۸/۵ھ

بینڈ باجہ فروخت کرکے اس کی رقم سے دوسرا کاروبار کرنا

سوال [۱۱۰۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عادل کہتا ہے کہ میرے باپ، دادا سے بینڈ باجے کا کام چلا آرہا ہے، اور میں بھی کررہا ہوں۔ اب اس کام کو ترک کرنے جارہا ہوں، تو کیا جو کچھ سامان ہے بینڈ باجے کا اس کو بیچ کر یا اس کی کمائی کا جو روپیہ ہے، اس سے کوئی دوسرا کاروبار کرسکتا ہوں یا نہیں؟ اور میرے پاس روپیہ نہیں ہے۔ حل صورت بتلائیں اور یہ پیشہ بینڈ باجہ کا صحیح ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد اسلم فیضی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینڈ باجہ کی تجارت تعاون علی المعصیت ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہے، مگر ان کی قیمت حرام نہیں ہے، بلکہ کراہت کے ساتھ حلال ہے۔

وجاز بيع عصير عنب ممن يعلم أنه يتخذ خمراً؛ لأن المعصية لاتقوم بعينه؛ بل بعد تغيره وقيل يكره لإعانة على المعصية. (در مختار مع الشامي كتاب الحظرو الإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ۹/ ۵٦۰-۵٦۱، كراچي ٦/ ۳۹۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍رجب المرجب ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۳٦۹/۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۵/۷/۱۴۱۸ھ

غیر مسلم کے ہاتھوں فریم کی فروختگی کا حکم

سوال [۱۱۰۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص شیشے کے فریم بنانے کا کاروبار کرتا ہے اور وہ فریم بنا کر مسلم وغیر مسلم

دونوں کوفروخت کرتا ہے؛ لیکن غیر مسلم فریم خرید کر کے اس کے اندر مورتی رکھ کر پوجا کرتے ہیں اور یہ بات اس شخص کو معلوم بھی ہے،تو اب سوال یہ ہے کہ کیا اس شخص کا غیر مسلم کو فروخت کرنا جائز ہے؟ جبکہ اس کے روپیہ سے غیر مسلم بت پرستی کا کام انجام دے رہے ہیں؟

المستفتی: محمد عبدالعظیم،جگر کالونی،مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شیشہ وغیرہ کے فریم بنانے کا کاروبار کرنا جائز اور درست ہے،خریدار چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم اور فریم کے خریدنے والے غیر مسلم، اگر ان فریموں میں مورتی وغیرہ رکھ کر پوجا وغیرہ کرتے ہیں،تو اس کا گناہ فریم بنانے والے پرنہیں ہوگا؛ کیونکہ فریم بنانے والے اور بنا کر کاروبار کرنے والے کا اصل مقصد اس کی تجارت ہے، پیسہ حاصل کرنا ہے، اورخریدنے والے جائز چیز میں استعمال کریں گے،تو ان کے لئے جائز ہے اور ناجائز چیز میں استعمال کریں گے،تو ان کے لئے ناجائز ہے اور انہی کا گناہ انہی کے سر پر ہوگا،فریم بنانے والے اور بیچنے والے کے سر پرنہیں ہوگا۔

عن عطاء في الرجل يبيع العصير ممن يجعله خمرًا. قال: أحب إلي أن يبيعه من غير من يجعله خمرًا، وإن باعه فلا بأس. (مصنف لابن أبي شيبه، كتاب البيوع و الأقضية في بيع العصير، مؤسسة علوم القرآن ١١/٣٦٢، رقم: ٢٢٧٠)

وفي الفتاوى العتابية: ولا بأس بيع العصير ممن يتخذه خمرًا، ولايبيع الأرض ممن يتخذها كنيسة. (الفتاوى التاتارخانية، زكريا ٨/٣٤٤، رقم: ١٢١٣٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ربیع الاول ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/۱۱۹۶۱)

پھولوں کے کاروبار کا شرعی حکم

سوال [۱۱۰۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرا پھولوں کا کاروبار ہے، جس میں موگرا، جھنڈو، کاکڑا، شیونتی، گلاب، چمبیلی وغیرہ شامل ہیں ان پھولوں کا استعمال درگاہ، مندروں میں مورتیوں پر چڑھاوے، شادیوں، گلدستوں، تصویروں اور مختلف شرکیہ افعال میں بھی ہوتا ہے۔ نیز میتوں پر اور قبروں پر ڈالنے کے لئے بھی کثرت سے استعمال ہوتا ہے؛ لہٰذا اس کا کاروبار کرنا شرعاً کیسا ہے؟ جلد سے جلد رہنمائی فرمادیں عین نوازش ہوگی، اللہ تعالی سے دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر میں برکت نصیب فرمائیں اور درازی عمر نصیب فرمائے۔ آمین۔ دعا کی درخواست ہے۔

المستفتی: محمد صادق منیار، کیشو نگر، شولا پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کا مقصد پھولوں کا کاروبار کرنے میں پھولوں کو بیچ کر اپنا کاروباری نفع حاصل کرنا ہے اور خریدار کہاں استعمال کریں گے، اس سے آپ کو کوئی مطلب نہیں ہے؛ اس لئے پھولوں کا کاروبار اور تجارت بلا شبہ جائز ہے اور اس کا پیسہ بھی حلال ہے اور خریدار معصیت کی جگہ استعمال کرے گا، تو اس کا گناہ خریدار کے سر ہوگا اور اچھی جگہ استعمال کرے گا، تو اس پر کوئی گناہ نہ ہوگا، فاعل مختار کے فعل کا اعتبار ہے۔

رجل آجر بيتًا ليتخذ فيه نارًا، أو بيعة، أو كنيسة، أو يباع فيه الخمر، فلا بأس به، وكذا كل موضع تعلقت المعصية بفعل فاعل مختار. (خلاصة الفتاوى، كتاب الكراهية، الفصل التاسع في المتفرقات، المكتبة الأشرفية ٤/ ٣٧)

لابأس بأن يؤاجر المسلم دارًا من الذمي ليسكنها، فإن شرب فيها الخمر، أو عبد فيها الصليب، أو أدخل فيها الخنازير لم يلحق المسلم إثم في شيءٍ من

ذلک؛ لأنہ لم یؤاجر لذلک والمعصیة في فعل المستأجر، وفعله دون قصد رب الدار فلا إثم علی رب الدار في ذلک. (مبسوط سرخسي، کتاب البیوع، باب الإجارۃ، الفاسدۃ، دارالکتب العلمیة بیروت ۱۶/۳۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/۱۱۹۹۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۴/۱۴۳۶ھ

کسی شخص کا ضامن بننے پر اجرت لینا

سوال [۱۱۰۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید سرکاری اور غیر سرکاری نوکریاں پیسہ روپیہ لے کر لگواتا ہے، گویا زید کا یہ پیشہ ہے، حاصل شدہ رقم کا اکثر حصہ افسروں کو دیتا ہے، اور کچھ رقم ایک تیسرے شخص بکر کو دیتا ہے، جو ضامن ہے، اس بات کا کہ اگر نوکری لگ گئی، تو پوری رقم زید کو دلوائے گا، جو نوکری لگواتا ہے اور اگر کسی وجہ سے نوکری نہیں لگ پائی، تو جو رقم پیشگی زید کے پاس یعنی نوکری لگوانے والے کے پاس پہونچ چکی ہے، وہ واپس کروائیگا۔ تو سوال خاص طور پر بکر ضمانتی کے بارے میں یہ ہے کہ بکر کو جو رقم مل رہی ہے، محض ضمانت کی کہ اگر نوکری لگ گئی، تو مابقیہ رقم دلائے گا اور اگر نہیں لگی تو پیشگی رقم واپس کرائے گا، اس بکر کے لئے یہ رقم لینا جائز ہے یا نہیں؟ یہ رشوت کے حکم میں داخل ہے یا نہیں؟

المستفتی: انور حسین، کاسگنج، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں بکر کا اپنے ضامن بننے پر اجرت لینا شرعاً جائز ہے؛ اس کے لئے یہ پیسہ رشوت کے حکم میں داخل نہ ہوگا۔

الکفالة والرهن شرعًا للتولیة، والتولیة ملائم للأجر. (بدائع الصنائع، کتاب الإجارۃ، باب حکم الإجارۃ، زکریا ۴/۶۱، کراچي ۴/۲۰۲)

إن شرط الكفيل تقديم مقابل، أو أجر على كفالة، وتعذر على المكفول عنه تحقيق مصلحة......جاز دفع الأجر للضرورة. (الفقه الإسلامي وأدلة، مكتبه هدیٰ انٹر نیشنل دیوبند ۵/ ۱٦۱، دارالفکر ٦/ ٤١٧٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ر ربیع الاول ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۳۳۲)

فرضی کارڈوں سے راشن وصول کرنا

سوال [۱۱۰۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے سرکاری لائسنس کے ذریعہ سرکار سے اپنے حلقہ میں راشن تقسیم کرنے کی ذمہ داری لے رکھی ہے اور اس میں زید کو کچھ نہیں بچتا ہے اور جو کمیشن ملتا ہے، وہ بمشکل پانچ سو یا سات سو روپے ہوتے ہیں، جس سے کوئی ضرورت پوری نہیں ہوتی؛ اس لئے زید نے فرضی ناموں کی اتنی تعداد میں کارڈ بنا رکھے ہیں، جس تعداد کے راشن سرکار سے لے کر بلیک میں بیچنے میں زید کو معتد بہ نفع ہوسکتا ہے، تو کیا زید کے لئے فرضی ناموں کے کارڈ کے ذریعہ سے سرکار سے راشن وصولی کرنا اور پھر اس راشن کو بلیک میں فروخت کر کے نفع حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس طرح ہر راشن ایجنسی میں راشن تقسیم کرنے والوں کی طرف سے ہوتا ہے، اور حکومت اس پر خاص گرفت بھی نہیں کرتی ہے؟

المستفتی: محمد جاوید خاں، محلّہ مزار ٹاٹ شاہ، رام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اسلامی شریعت میں دھوکہ اور فریب کا راستہ اختیار کرنا جائز نہیں ہے اور فرضی کارڈوں کے ذریعہ سے راشن وصول کرنا یہ دھوکہ اور فریب ہے، جو شرعاً جائز نہیں ہے؛ اس لئے اس سے احتراز کرنا ضروری ہے، اگر زید کو اس میں نفع

اورفائدہ نہیں ہے،تو اس کو یہ کام چھوڑ کر جائز تجارت کا کوئی راستہ اختیار کرلینا چاہئے،جس سے جائز طریقہ سے نفع حاصل ہوجایا کرے گا۔

عن أبي بكر الصديقؓ، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: لا يدخل الجنة خب، ولا بخيل، ولامنان.

وعن أبي هريرةؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: المؤمن غر كريم، والفاجر خب لئيم. (ترمذي شريف، باب ماجاء في البخيل،النسخة الهندية ۱۷/۲، دارالسلام رقم:۱۹٦۳-۱۹٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍محرم الحرام ۱۴۲٦ھ
(فتویٰ نمبر:الف۳۷؍۸٦۵۲)

(۲۱) باب المعاصي والتوبة

بار بار گناہ بار بار توبہ

سوال [۱۱۰۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص حافظ قرآن ہے، دین سے محبت ہے نام زید ہے؛ لیکن اس سے ایک بہت بڑا گناہ ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ اس نے ایک مرتبہ زنا کیا تو بہ کرلی، پھر زنا کیا، پھر توبہ کرلی، اسی طرح تیسری چوتھی مرتبہ حتی کہ گیارہ بارہ مرتبہ زنا کیا ہے۔ اب یہ دل سے یقین کے ساتھ توبہ کرنا چاہتا ہے، اس حال میں توبہ قبول ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: مشتاق احمد محلّہ تھانہ امروہہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: زید آخر میں بھی اپنے فعل پر نادم وپشیماں ہوکر اورآئندہ نہ کرنے کا عزم مصمم کرکے اللہ تعالیٰ کے دربار میں خلوص وللّٰہیت کے ساتھ توبہ کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کوضرور قبول کرے گا اور اس کے گناہ معاف ہوجائیں گے۔

قال الله تعالیٰ: وَهُوَ الَّذِىْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْ عَنِ السَّيِّئَاتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْن. [الشوریٰ:۲۵]

عن أبي عبيدة بن عبد الله، عن أبيه، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: التائب من الذنب كمن لا ذنب له. (سنن ابن ماجه، باب ذكر التوبة، النسخة الهندية ۲/۳۱۳، دارالسلام رقم: ۴۲۵۰، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ۱۰/۱۵۰، رقم: ۱۰۲۸۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍ جمادالثانیہ ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۴۴۸۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۰/۶/ ۱۴۱۶ھ

توبہ کے بعد سماج کا گناہ کی عار دلا کر نیچی نگاہ سے دیکھنا

سوال [۱۱۰۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کوئی گناہ کرلے نادانی میں اور پھر وہ اس پر شرمسار ہو، تو کیا وہ گنہگار ہی رہے گا؛ جبکہ وہ اللہ سے معافی کا طلب گار ہے، تو کیا اسے سماج معاف نہیں کرسکتا، کیا اسے گنہگار ہی سمجھا جائے گا، مثال کے طور پر ایک بازاری عورت اگر یہ چاہے کہ میں بھی اس گناہ کی بستی سے نکل کر ایک سچی مسلمان عورت بن جاؤں، تو کیا مذہب اسلام نے اتنا رتبہ نہیں دیا کہ وہ ایک پاک صاف زندگی بسر کرسکے، اگر یہ رتبہ ہمارے دین نے دیا ہے، تو یہ سماج کے لوگ ایک بار کسی نہ کسی کو سدھرنے کا موقع کیوں نہیں دیتے، اسے برا بھلا کہتے ہیں۔ کیا برے انسان کو اپنایا نہیں جاتا؛ جبکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کافروں کو بھی معاف کردیا ہے، تو پھر یہ سماج کیوں معاف نہیں کرسکتا؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیجئے۔

المستفتی: عبدالرشید، میاں کالونی روڈ، آزادنگر، نزد جمالی مسجد، سرسیدنگر کرولہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب آدمی گناہوں سے شرمندہ ہوکر خالص دل سے توبہ کرتا ہے، پھر آئندہ گناہ میں مبتلا نہ ہونے کا قصد کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اسے معاف کردیتا ہے، اور جب اللہ تعالیٰ معاف کردیتا ہے، تو سماج کے لئے جائز نہیں ہے کہ گذشتہ گناہ کی عار دلا کر نیچی نگاہ سے دیکھے، پھر بھی سماج اگر اسے نفرت کی نظر سے دیکھے، تو اس کا وبال سماج پر آئیگا۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَحِیْمٌ. [سورۃ النور: ۵]

عن معاذ رضؓ، قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: من عیر أخاہ بذنب لم یمت حتی یعملہ یعنی من ذنب قد تاب منہ. (سنن الترمذي ،

باب بلاترجمة، النسخة الهندية ۲/۷۷، دارالسلام رقم: ۲۵۰۵، المعجم الأوسط، دارالفكر ۲۰۵۵/۵، رقم: ۷۲٤٤، مشكاة المصابيح ٤١٤/۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍رجب المرجب ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۷۸۱/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۷/۲۷ھ

اسراف اور ضرورت کی حد

سوال [۱۱۰۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اسراف اور ضرورت کی حد کیا ہے؟ کہ کہاں تک ہونے سے یہ چیز ضرورت مانی جائیگی؟ اور کہاں تک ہونے سے اسراف مانی جائے گی؟

بسا اوقات ایک چیز ایک شخص کے لئے ضرورت ہوتی ہے اور دوسرے کے لئے وہ ضرورت نہیں ہوتی؛ لہٰذا اس کے لئے وہ اسراف ہے، جیسا کہ شادی وغیرہ میں کہ ایک شخص اس میں خوب دھوم دھام کرنے کو ضرورت سمجھ کر کر رہا ہے کہ یہ میرے لئے ضرورت ہے؛ اس لئے یہ میرے لئے باعث گناہ نہیں اور دوسرے کے لئے وہ زائد از ضرورت ہے؛ اس لئے اس کے لئے وہ اسراف ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

اب اگر ان دونوں کی کوئی حد معلوم ہو جائے تو دونوں کو سمجھایا جاسکتا ہے۔

المستفتی: طیب احمد آسامی، متعلم دارالعلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قرآن کریم میں دو قسم کے الفاظ آئے ہیں:

(۱) اسراف۔ (۲) تبذیر۔

تبذیر کہتے ہیں: کہ مال کو گناہ کے کام میں خرچ کرنا۔

اسراف کہتے ہیں: کہ جائز مواقع میں ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اس

لئے تبذیر اسراف کے مقابلہ میں اشد ہے، اور قرآن کریم میں مبذرین کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا ہے اور اسراف کے بارے میں قرآن کریم میں ’’کلوا واشربوا ولاتسرفوا‘‘ آیا کہ مناسب انداز سے کھاؤ پیو اور زائد خرچ مت کرو۔ اور اسراف کی کوئی حد شریعت کی طرف سے ایسی مقدار کے اعتبار سے متعین کرنا مشکل ہے، جو مقدار تمام مسلمانوں پر برابری کے ساتھ جاری ہوجائے؛ بلکہ بعض جگہ اور بعض لوگوں سے متعلق خرچ کی ایک مقدار کو اسراف شمار کیا جاتا ہے اور وہی مقدار دوسرے کے حق میں اسراف نہیں سمجھی جاتی ہے، مثلاً ایک شخص محنت ومزدوری کر کے گذارہ کرتا ہے، تو اس کے لئے شادی میں اس انداز سے خرچ کرنا جو ایک سرمایہ دار خرچ کرتا ہے، قطعی طور پر اسراف ہے اور اتنا ہی خرچ کوئی دوسرا سرمایہ دار کرتا ہے اور اس خرچ کی وجہ سے اس کے سرمایہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے، تو وہ اس کے لئے اسراف نہیں ہے؛ اس لئے کوئی خاص مقدار اور حد تمام مسلمانوں کے لئے یکساں طور پر متعین کرنا دشوار ہے؛ اس لئے ہر مبتلیٰ بہ خود ہی سمجھے کہ کہاں تک اس کے لئے مناسب خرچ ہے اور کہاں تک مناسب خرچ سے زائد ہے؛ لہٰذا وہی خود سمجھے۔

والتحقيق أن بينهما فرقًا، وهو أن الإسراف صرف الشئ فيما ينبغي زائدا على ما ينبغي، والتبذير صرفه فيما لا ينبغي. (شامي، كتاب الفرائض، زكريا ١٠/ ٤٩٤، كراچي ٦/ ٧٥٩، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤/ ١٧٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۰۲۵)

اپنے پاس کسی کی برائی کرنے والے کو منع نہ کرنے والے کا حکم

سوال [۱۱۰۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید بکر کے پاس بیٹھ کر عمرو، خالد کی برائی کرتا ہے اور بکر سنتا ہے، منع نہیں کرتا،

بکر کو حدیث پاک کے اعتبار سے کیا کرنا چاہئے؟ اگر وہ اس پر عمل نہ کرے، تو کیا بکر بھی حق العباد کے گناہ عظیم کا مرتکب ہوگا؟

المستفتی: عبدالرحمٰن، کتھولی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر بکر اپنی زبان سے روکنے پر قدرت رکھتا ہے، تو اس پر لازم ہے، کہ زبان سے منع کردے اور اگر زبان سے روکنے پر قدرت نہیں ہے، تو دل سے انکار کرنا اور ہاں میں ہاں نہ ملانا لازم ہے، ورنہ بکر بھی غیبت کے گناہ میں شریک ہوگا۔

(شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ۹/۵۸۸، كراچي ۶/۴۱۰)

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: المستمع أحد المغتابين، الحديث: ان المستمع لا يخرج من إثم الغيبة إلا بأن ينكر بلسانه، فإن خاف فبقلبه. (إحياء العلوم ۳/۷۸)

عن ابن عمرؓ، قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الغيبة، وعن الاستماع إلى الغيبة. (مجمع الزوائد، باب ماجاء في الغيبة والنميمة، دارالكتب العلمية بيروت ۸/۹۱، رقم: ۱۳۱۲۲، المعجم الكبير للطراني ۱۳/۳۳۱، رقم: ۱۴۱۳۶)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۲۶۹)

شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار

سوال [۱۱۰۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شیطان بنی آدم کو گمراہ کرنے کے لئے مختلف ہتھکنڈوں کا استعمال کرتا ہے، کبھی

جھوٹ، چغلی، غیبت، قتل وزناکاری، شراب نوشی وغیرہ؛ لیکن قرآن واحادیث کی روشنی میں یہ وضاحت فرمائیں کہ شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار کیا ہے؟

المستفتی: محبوب عالم، نزد گلاب براس، نئی بستی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: انسان کو گمراہ کرنے کے لئے شیطان کے ہتھیار اور ہتھکنڈوں میں سب سے بڑا ہتھیار جھوٹ اور شراب ہے، جھوٹ کے ذریعہ سے ہر گناہ کے عیب چھپانے کی کوشش کرتا ہے، اس کے برخلاف جب سچ بولے گا، تو جو بھی گناہ کرے گا، تو اس کا اقرار کرنا پڑے گا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی گناہ نہ کرنے پائے گا۔ اور شراب کا حال ایسا ہے کہ شراب پینے کے بعد دنیا بھر کا کوئی بھی گناہ کرے، اس کو کوئی پرواہ نہیں، شراب کی مستی میں ماں کے ساتھ منھ کالا کرے، بہن کے ساتھ، پھوپھی کے ساتھ، خالہ کے ساتھ، اسے کوئی پرواہ نہیں؛ اس لئے شراب کو ام الکبائر، ام الفواحش اور ام الخبائث کہا گیا ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ. [المطففين: ١٠]

الأصل في الكذب أنه حرام بالكتاب، والسنة، وإجماع الأمة، وهو من أقبح الذنوب، وفواحش العيوب. (الموسوعة ٣٤/ ٢٠٥)

عن ابن عباسؓ، قال: سمعت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يقول: الخمر أم الفواحش، واكبر الكبائر من شربها وقع على أمه وخالته، وعمته.

(المعجم الكبير، دار احياء التراث العربي ١٦/ ١٣٢، رقم: ١١٣٧٢)

عن عبد اللّٰه بن عمرو بن العاصؓ، قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: الخمر أم الخبائث، فمن شربها لم تقبل منه صلاته أربعين يومًا، فإن مات وهي في بطنه مات ميتة جاهلية. (المعجم الأوسط، مكتبة المعارف الرياض ٤/ ٤٠٢، رقم: ٣٦٨٠، دارالفكر ٢/ ٤٠٦، رقم: ٣٦٦٧) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۱۱؍ شعبان المعظم ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۵۳۸)

جان بوجھ کر نماز ترک کرنا

سوال [۱۱۰۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسجد میں اذان ہوگئی محلّہ والے ذی شعور اور پڑھے لکھے لوگ ہیں، جماعت کا وقت گذر رہا ہے، مگر گپ شپ میں وقت گذار دیتے ہیں؛ لیکن جماعت سے نماز کے لئے نہیں آتے اور نہ ہی نماز سے دلچسپی رکھتے ہیں، جب ان سے نماز کے لئے کہا جاتا ہے، تو یہ جواب دیتے ہیں کہ مجھے نہیں معلوم کہ پڑھنی چاہئے یا نہیں؛ لیکن پھر بھی نماز کے لئے نہیں آتے اور اپنے گھروں میں ہی اپنے کام کاج اور دیگر لہو ولعب میں مشغول رہتے ہیں، ایسے مسلمانوں کے لئے قرآن واحادیث میں کیا حکم ہے؟

المستفتی: انتظامیہ کمیٹی، جالندھر شہر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اذان سن کر جان بوجھ کر نماز میں شرکت نہ کرنے والا جو اپنی قیام گاہ میں نماز نہیں پڑھتا ہے، تو ایسے تارک صلوۃ شرعاً فاسق ہوجاتے ہیں، ان کو اپنی اس کمزوری سے نادم ہوکر توبہ کرنا لازم ہے۔

عن عبد اللّٰہ رضی اللہ عنہ **قال: من سره أن يلقي الله عزوجل غدا مسلماً فليحافظ على هؤلاء الصلوات المكتوبات، حيث ينادى بهن، فإنهن من سنن الهدى، وإن الله عزوجل شرع لنبيكم سنن الهدىٰ، ومامنكم إلا وله مسجد في بيته ولو صليتم في بيوتكم كما يصلى هذا المتخلف في بيته لتركتم سنة نبيكم، ولو تركتم سنة نبيكم لضللتم.** (مسند الإمام أحمد ۱/ ۳۷۲، رقم:۳۶۲۳)

وتاركها عمداً، مجانة أي تكاسلاً فاسق. (در مختار، كتاب الصلاة، زكريا ۲/ ۵، كراچي ۱/ ۳۵۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۱/ ۴۴۵۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۵/۹ھ

نکاح نہ کرنے کی وجہ سے معصیت میں مبتلا اولاد کے گناہ میں والدین شریک ہیں یا نہیں؟

سوال [۱۱۰۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ وہ نوجوان لڑکے لڑکیاں جو نکاح کے قابل اور ان کی قوت شہوانی شباب پر ہے، اور وہ برائی سے بچنے کی وجہ سے نکاح کرنا چاہتے ہیں؛ لیکن ان کے والدین ان کی شادی نہیں کررہے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی زندگیاں برباد ہورہی ہیں اور طرح طرح کی بیماریوں کے شکار ہورہے ہیں۔ اور زنا جیسے سخت عظیم گناہ کے مرتکب ہورہے ہیں، کیا ان کے گناہوں کا وبال ان کے والدین پر بھی ہوگا یا نہیں؟ جو اپنے جوان لڑکے، لڑکیوں کی شادیوں میں تاخیر کررہے ہیں۔ جواب سے مطلع فرمائیں عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: محمد قاسم غفرلہ، محلّہ کسرول، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو ماں باپ اپنے جوان لڑکے اور لڑکیوں کی شادیوں میں تاخیر کررہے ہیں اور اولاد گناہ اور معصیت میں مبتلا ہورہی ہے، ان پر اولاد کی معصیت وگناہ کا وبال پڑے گا اور ماں باپ سخت گنہگار رہوں گے۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ۷/۴۲)

عن أبي سعيد، وابن عباسؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من ولد له ولد فليحسن اسمه وأدبه، فإذا بلغ فليزوجه فإن بلغ ولم يزوجه فأصاب إثماً، فإنما إثمه على أبيه. (شعب الإيمان، باب في حقوق الأولاد والأهلين، دارالكتب العلمية بيروت٦/ ٤٠١، رقم:٨٦٦٦، مشكوة شريف ٢/ ٢٧١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۲۶۱)

خودکشی

سوال [۱۱۰۲۱]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص نے زہریلی شئ کھالی اوراس نے بعد میں کچھ ایسی گولیاں کھالیں، جس سے اس کو نیندآ گئی، پھراس کا چند گھنٹوں میں انتقال ہوگیا۔اب مزید خودکشی کے حکم سے مطلع فرمائیں شریعت مطہرہ میں اس کی مغفرت کے بارے میں کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد جنیدانا وی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: زہریلی اشیاء کھانا خودکشی کرنے کے مترادف ہے، اورخودکشی کرنا گناہ کبیرہ ہے، اس کی مغفرت اورعدم مغفرت کا فیصلہ اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے تاہم روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ مؤمنین اہل ایمان کواولاً ارتکاب گناہ کی بناء پرعذاب ہوگا، پھرایمان کی وجہ سے خلاصی ہوجائے گی۔

عن أبي هريرةؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من قتل نفسه بحديدة، فحديدته في يده يتوجأبها في بطنه في نار جهنم خالداً مخلداً فيها أبدًا، ومن شرب سما فقتل نفسه فهو يتحساه في نار جهنم خالداًمخلدًا فيها أبداً. (مسلم شريف، باب غلظ تحريم قتل الإنسان نفسه......النسخة الهندية ١/٧٢، بيت الأفكار رقم:١٠٩، مسند الدارمي، دار المغني للنشر والتوزيع٣/١٥٢٦، رقم:٢٤٠٨٧، صحيح البخاري، باب شرب السم والدوابه......النسخة الهندية٢/٨٦٠، رقم:٥٥٥٠، ف:٥٧٧٨)

إن الروايات قد صحت أن أهل التوحيد يعذبون، ثم يخرجون منها ولايخلدون. (فتح الملهم، اشرفيه ديوبند ١/٢٢٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیراحمد قاسمی عفااللہ عنہ
۴/ذی الحجہ ۱۴۳۰ھ
(فتویٰ نمبر:الف ۹۸۳۴/۳۸)

خودکشی اکبرالکبائر میں سے ہے

سوال [۱۱۰۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کسی شخص نے خودکشی کی، تو اس کی جو موت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اس کی موت کا جو وقت اس کے مقدر میں لکھ دیا تھا، اس وقت پر ہوئی یا اس وقت سے پہلے ہوئی؟

المستفتی: حاجی عبدالرب، جگر کالونی، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

قال الله تعالىٰ: وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتَابًا مُؤَجَّلًا.

[آل عمران: ١٤٥]

کسی کے لئے خود مرنے کا حق نہیں ہے؛ اس لئے خودکشی اکبرالکبائر میں سے ہے، ہر ایک کو موت کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ وقت کا انتظار کرنا لازم ہے، جو خودکشی کرتا ہے، وہ اس وقت کا انتظار نہیں کرتا ہے؛ اس لئے اس کے اوپر خودکشی کا سخت عذاب ہوگا اور کسی کا یہ کہنا کہ خودکشی کرنے والا اپنے مقدر سے مقررہ وقت پر مرا ہے۔ قرآن کریم کی اس آیت کے مقتضاء کے خلاف ہے اور کسی کو اپنے اختیار سے مرنے کا حق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ وقت اور اس کا انتظار لازم ہے، اسی لئے خودکشی کی وعید انتہائی سخت انداز میں وارد ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

عن أبي هريرة رضـ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من قتل نفسه بحديدة، فحديدته في يده يتوجأبها في بطنه في نار جهنم خالداً مخلداً فيها أبدًا. (مسلم شريف، باب غلظ تحريم قتل الإنسان نفسه......النسخة الهندية ١/ ٧٢، بيت الأفكار رقم:١٠٩)

وقال العلامة الآلوسي: وما كان لنفس ان تموت إلا بإذن الله كتابًا

مؤجلا أي مؤقتاً بوقت معلوم لا يتقدم ولا يتأخر، وقيل حكمًا لازمًا، مبرمًا.
(روح المعاني، زكريا ۱۱۹/۳)

وقال صاحب المظهري وماكان لنفس ان تموت إلا بإذن الله أي إلا بمشيئة الله، وقضائه، أو بإذنه لملك الموت في قبض روحه كتابًا مؤجلا لا يتقدم ولا يتأخر. (تفسير مظهري، زكريا جديد ۱۵۲/۲، قديم ۱۵۱/۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/۱۰۰۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱/۴/۱۴۳۱ھ

خودکشی کرنے کا گناہ خود اسی پر ہوگا

سوال [۱۱۰۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک لڑکی ایک شخص سے شادی کرنا چاہتی ہے، اور شادی کی کوئی بھی صورت نہیں ہے؛ اس لئے کہ وہ شخص شادی شدہ ہے، تو اگر وہ منع کردے اور اس کے منع کردینے کی وجہ سے وہ لڑکی کسی گناہ میں مبتلا ہوجائے یا خودکشی کرلے، تو اس لڑکی کے خودکشی کرنے کا گناہ اس شخص پر ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: فخر الدین، خضر آباد، دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: صورت مسئولہ میں لڑکی کی خودکشی کا گناہ مذکورہ شخص پر نہ ہوگا۔ قرآن شریف میں ہے۔

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرَىٰ. [النجم: ۳۷]

خودکشی کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جس نے اپنے آپ کو خودکشی

کرنے کے لئے پہاڑ سے نیچے گرا یا وہ ہمیشہ جہنم میں اسی عذاب میں مبتلا رہے گا اور جس نے اپنے کو زہر کھا کر قتل کیا، تو وہ ہمیشہ جہنم میں زہر کھا کر مرتا رہے گا اور جو اپنے کو لوہے کے ذریعہ قتل کرے، تو اس کے ہاتھ میں لوہا دیا جائے گا اور وہ اپنے پیٹ کو بار بار اس سے چیرتا رہے گا۔

عن أبي هريرةؓ عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من تردىٰ من جبل، فقتل نفسه، فهو في نار جهنم، يتردىٰ فيها خالداً مخلداً فيها أبدًا، ومن تحسي سمًا فقتل نفسه، فسمه في يده يتحساه في نار جهنم خالداًمخلدًا فيها أبداً، ومن قتل نفسه بحديدة، فحديدته في يده يتوجأبها في بطنه في نار جهنم خالداً مخلداً فيها أبدًا. (صحيح البخاري، باب شرب السم والدواء به وبما يخاف منه والخبيث، النسخة الهندية ۲/ ۸٦٠، رقم: ٥٥٥٠، ف: ٥٧٧٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍محرم الحرام ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۶۰۵/۳۲)

داڑھی منڈانے اور زنا کرنے میں کونسا بڑا گناہ ہے؟

سوال [۱۱۰۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ داڑھی مونڈوانا یا زنا ان دونوں میں سے کون سا گناہ زیادہ بڑا ہے۔ نیز داڑھی مونڈوانے والے سے تعلقات رکھنا کیسا ہے؟ آپ برائے کرم وضاحت کے ساتھ جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: زبیر عالم، دڑھیال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: داڑھی مونڈنے کی حرمت حدیث سے ثابت ہے، اور زنا کی حرمت حدیث اور قرآن کریم دونوں سے ثابت ہے؛ اس لئے زنا کی حرمت اور اس کا گناہ زیادہ بڑا ہے، اور حدیث میں زنا اکبر کبائر میں شمار فرمایا ہے۔

قال عبد اللّٰہؓ: قال رجل: یا رسول اللّٰہ! اي الذنب أکبر عند اللّٰہ؟ –إلی– أن تزاني حلیلة جار الحدیث. (صحیح البخاري، باب قول اللّٰہ تعالیٰ یاأیها الرسول بلغ ما أنزل إلیك من ربك، النسخة الهندیة۲/ ۱۱۲۴، رقم:۷۲۳۱، ف:۷۵۳۲، صحیح مسلم، باب کون الشرك أقبح الذنوب، و بیان أعظمها بعده، النسخة الهندیة۱/ ۶۳، بیت الأفکار رقم:۸۶) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸؍ ۳۰۷۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰؍ ۳؍ ۱۴۱۳ھ

ثبوت شرعی کے بغیر محض الزام لگانے سے جرم ثابت نہیں ہوگا

سوال [۱۱۰۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید ایک مسجد میں تقریباً دس سال سے امامت کرتا ہے، اور چند سے سال مسجد مذکورہ میں مدرسہ بھی چلا رہے ہیں، جس میں مقامی وبیرونی طلباء زیر تعلیم ہیں۔

عید الفطر ۱۹۹۴ء سے پہلے کی بات ہے، بکر نے جو مدرسہ کا طالب علم تھا، اپنے استاذ زید پر یہ الزام لگایا کہ مجھے اور ایک دوسرے طالب علم کو اپنے کمرے میں رات بھر سلایا اور میرے ساتھ زید نے اغلام بازی کی بکر کے متعلقین نے اس بات کی لوگوں میں خوب تشہیر کی بکر کی باتوں میں آنے والے حضرات سے جو پنج وقتہ نمازی اس مسجد کے نہیں ہیں؛ بلکہ جو عیدین وغیرہ کے نمازی ہیں اور دوسرے محلّہ کے رہنے والے ہیں، بکر کے متعلقین نے کہا بکر صحیح بول رہا ہے، نابالغ بچہ کی بات غلط نہیں ہوسکتی۔

اب اگر زید مسجد میں آتا ہے، تو خون خرابہ ہوگا، گولی بھی چل سکتی ہے، زید کو کسی بھی صورت میں مسجد میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا، اس وقت زید اپنے آبائی وطن میں تھا، زید کو الزام کی خبر نہیں تھی، جب معلوم ہوا تو جمعہ کی نماز پڑھائی اور جمعہ میں کہا جو الزام بکر

نے مجھ پر لگایا ہے، بے بنیاد، جھوٹ غلط ہے، بکر جو کہتا ہے کہ میں زید کے کمرہ میں لیٹا تھا، اور ساتھ میں دوسرا لڑکا بھی تھا، قطعی غلط تھا، کوئی بھی میرے کمرہ میں نہیں سویا ہے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ صرف الزام ہی سے زید کا مجرم ہونا ثابت ہوجاتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو جو لوگ بکر کی بات سے زید کی بدنامی کررہے ہیں۔ شریعت میں ان کے بارے میں کیا حکم ہے؟ زید قابل امامت ہے؟

المستفتی: جمیل احمد، مسجد سید صالحہ، لین کلکتہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بکر کی حمایت میں جو لوگ ثبوت شرعی کے بغیر زید پر الزام لگا رہے ہیں، اور اس کا افشاء کررہے ہیں، وہ سب شرعاً گنہگار ہوں گے، ان سب پر لازم ہے کہ مذکورہ امام صاحب سے معافی مانگ لیں، ورنہ ایسے لوگ قیامت کے دن بالکل بے سہارا اور مفلسی کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش کئے جائیں گے، ان کی نماز، روزہ، وغیرہ سب برباد ہوجائیں گے۔

عن أبي هريرة رضـ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: أتدرون؟ ما المفلس؟ قالوا: المفلس فينا من لادرهم له ولامتاع، فقال: إن المفلس من أمتي يأتي يوم القيامة بصلاة، وصيام، وزكاة، ويأتي قد شتم هذا، وقذف هذا، وأكل مال هذا، وسفک دم هذا، وضرب هذا، فيعطي هذا من حسناته، وهذا من حسناته، فإن فنيت حسناته قبل أن يقضي ما عليه أخذ من خطاياهم فطرحت عليه، ثم طرح في النار. (صحيح مسلم، باب تحريم الظلم، النسخة الهندية ۲/ ۳۲۰، بيت الأفكار رقم: ۲۵۸۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۴۰۳۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۷/ ۵/ ۱۴۱۵ھ

مشترک لوگوں کے پیسوں کو اپنی ضروریات میں صرف کرنا

سوال [۱۱۰۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بکر ایک طالب علم ہے، اور وہ غریب گھرانے کا ہے، وہ مدرسہ ضیاء العلوم میں پڑھتا ہے، بکر کو زید نے پچاس روپیہ دیئے اور کہا کہ ان روپیوں کی مٹھائی لے کر اپنے ساتھیوں کو کھلا دینا اور میرے لئے دعا کرا دینا، تو اگر بکر نے ان روپیوں کو خود خرچ کیا اور ساتھیوں کو مٹھائی نہیں کھلائی؛ لیکن دعا کرادی، تو جو زید کا مقصد تھا وہ ہو گیا، تو کیا یہ روپئے بکر کے لئے جائز ہوں گے یا نہیں؟

دوسری بات یہ ہے کہ اگر بکر کے لئے یہ روپئے جائز نہیں، تو کیا مدرسہ ضیاء العلوم ہی کے طلباء کو کھلائے گا یا دوسرے مدرسہ کے طلباء کو اگر کھلا دے گا، تو حق ادا ہو جائے گا یا نہیں؟

المستفتی: وکیل احمد، سیتاپوری، متعلم مدرسہ شاہی مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اس روپیہ کو بکر خود خرچ کر لیتا ہے اور ساتھیوں کو نہیں کھلاتا ہے، تو بکر کی طرف سے سخت خیانت ہے، بکر گنہگار ہوگا اور خائن کی دعا کہاں سے قبول ہو سکتی ہے اور ساتھیوں کو کھلانے کی قید سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ضیاء العلوم کے طلبہ مراد ہیں؛ ہاں البتہ کھلاتے وقت دوسرے مدرسہ کے بھی ایک آدھ شریک ہو جائیں، تو مضائقہ نہیں۔ بہر حال صاحب خیر نے جو شرط لگائی ہے، اس کے مخالف نہ کرنا چاہئے، خاص طور پر طالب علم کے لئے اس طرح خیانت کا سلسلہ زہر قاتل ہے۔

المسلمون عند شروطهم. (قواعد الفقة، اشرفي ۱۲۱، رقم: ۳۱۹، صحيح البخاري، باب أجر السمسرة ۱/ ۳۰۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ / صفر المظفر ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳ / ۵۱۸۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۲/۲۳ھ

کیا دور حاضر کے مانگنے والوں کو دینا اعانت علی الحرام ہے

سوال [۱۱۰۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک مسئلہ یہ ہے کہ بہت سے مفتیان کرام اور خاص طور پر امام جامع مسجد امروہہ حضرت مفتی محمد عزت اللہ صاحب دور حاضر کے مانگنے والوں کی مدد کرنے کو حرام بتلاتے ہیں اور یہ فرماتے ہیں کہ مانگنے والوں کو دینا اعانت علی الحرام ہے، اور بہت سے صحابیوں اور بزرگان دین کے بارے میں آتا ہے کہ کھانا کھارہے تھے کہ دروازہ پر فقیر آگیا، تو وہ کھانا اس فقیر کو دیدیا اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضرت مولانا عزت اللہ صاحب نے ایسے لوگوں کے مانگنے کی حرمت بیان کی ہے، جو بلاضرورت مانگنے کے عادی بن گئے ہیں۔ حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے، جولوگ مانگنے کے عادی ہیں ان کو ہمیشہ فقرو فاقہ اور محتاجی کی مصیبت کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

أبو كبشة الأنماري، أنه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ثلاثة أقسم عليهن، وأحدثكم حديثا فاحفظوه، قال: ......ولا فتح عبد باب مسألة إلا فتح الله عليه باب فقر. (سنن الترمذي، باب ماجاء مثل الدنيا اربعة نفر، النسخة الهندية ۲/ ۵۸، دارالسلام رقم: ۲۳۲۵، المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التراث العربي ۲۲/ ۳۴۱، رقم: ۸۵۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ ذی قعدہ ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۸۹۵۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲/ ۱۱/ ۱۴۲۶ھ

خوشحال کے لئے دست سوال دراز کرنا

سوال [۱۱۰۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کوئی طالب علم اچھے خوش حال گھر سے تعلق رکھتا ہو، گھر سے روپیہ نہیں منگاتا ہو اور وہ جس چیز کا کسی سے سوال کرتا ہو، وہ اس کے پاس موجود ہو، تو اس کے لئے یہ لینا اور سوال کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: قمرالدین، سہرسہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: صورت مذکورہ میں سوال کرنا طلبہ اور غیر طلبہ کسی کے لئے جائز نہیں حرام ہے، ایسے طلبہ کو گھر سے منگوانا لازم ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایسے حالات میں سوال کرنے والا جہنم کے کنکر اپنے لئے جمع کرتا ہے، اگر دینے والے کو حالت معلوم ہے، تو اس پر بھی دینا حرام ہے۔

عن سهل بن الحنظلية رضـ، قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من سأل الناس عن ظهره غنى، فإنما يستكثر من جمر جهنم، قلت: يا رسول الله! وما ظهر غنى؟ قال: أن يعلم أن عند أهله ما يغديهم وما يعشيهم. (شرح معاني الآثار للطحاوي الزيادات، باب المقدار الذي يحرم الصدقة على مالكه، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٢٠٢، رقم:٧٢١٥، المعجم الكبير للطبراني، دارإحياء التراث العربي ٦/ ٩٦، رقم: ٥٦٢٠)

لايحل سؤال قوت يومه لمن له قوت يومه لحديث الطحاوي من سأل الناس عن ظهر غنى فإنه يستكثر من جمر جهنم (وقوله) وينبغي أن يلحق به طالب العلم لاشتغاله عن الكسب بالعلم؛ ولهٰذا قالوا إن نفقته على أبيه وإن كان صحيحًا مكتسبًا (وقوله) وإذا حرم السؤال عليه إذا ملك

قوت يومه فهل يحرم الإعطاء له إذا علم حاله (إلى قوله) فحكمه في القياس أن يأثم بذلك ؛ لأنه إعانة على الحرام. (البحر الرائق، كتاب الزكاة، باب المصرف، كوئٹه ۲/ ۲۵۰، زكريا۲/ ۴۳۷، معارف السنن، اشرفي بكڈپو ديوبند ۵/ ۲۵۷-۵/ ۲۵۹، تحت حديث الترمذي من سأل الناس و له ما يغنيه الحديث باب أن الصدقة توخذ من الأغنياء، و ترد على الفقراء ۱/ ۸۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/ ۶۷۹)

نوکرانی کو باندی کا درجہ دیکر حلال سمجھنا

سوال [۱۱۰۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ پہلے زمانہ میں جو باندیاں تھیں، کیا وہ جائز تھیں؟ بغیر نکاح کرے، کیا آج کے دور میں باندیاں ہیں یا نہیں؟ اگر کوئی شخص نوکرانی کو باندی بنائے، تو ایسے شخص کے بارے میں کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد حنیف لال مسجد، سرائے ترین، سنبھل مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پہلے زمانہ میں جو باندیاں تھیں، وہ اس زمانہ کے جانوروں کے حکم میں تھیں، ان کو جانوروں کی طرح خرید کرلایا جاتا تھا، پھر ان کو اپنی خدمت کے لئے رکھا جاتا تھا اور تمام خدمات کے اندر خریدنے والے آقا کے لئے اس کے ساتھ ہمبستری کرنا بھی داخل تھا اور اس زمانہ میں غلام یا باندی کا وجود پوری روئے زمین میں نہیں ہے؛ بلکہ اس زمانہ میں تمام انسان آزاد ہیں اور جو کسی کے یہاں عورتیں نوکرانی بن کر کام کر رہی ہیں، وہ بھی فی نفسہ آزاد ہیں۔ مالک کے لئے ان کو چھونا بھی جائز نہیں اور ان سے

جسمانی خدمت لینا قطعی طور پر حرام ہے اوران کے ساتھ جماع کرنا قطعی طور پر زنا ہے۔

(مستفاد:عزیز الفتاوی ۱/۴۰۷)

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُم.

[سورة النساء:٢٤]

(وحرم نكاح المولىٰ أمته) لأن ملك المتعة ثابت للمولىٰ قبل النكاح، فيلزم إثبات الثابت. (طحطاوي على الدر، كتاب النكاح، فصل في المحرمات، كوئٹه ٢/٢١)

قال اللّٰہ تعالیٰ: فَمَنِ ابْتَغَى وَرَاءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ.

[مؤمنون:٧]

ويدخل فيما وراء ذلك الزنا، واللواط، ومواقعة البهائم، وهذا مما لا خلاف فيه. (روح المعاني، زكريا ١٠/١١، تحت رقم الآية:٧، من سورة المؤمنون)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/۶۵۷۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۴/۹ھ

بچوں کی سال گرہ منانا

سوال [۱۱۰۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بچوں کی سال گرہ منانا کیسا ہے؟

المستفتی: سید اسحاق، جیلانی دواخانہ رفعت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بچوں کی سال گرہ منانا شرعی تقریب نہیں ہے؛ البتہ اگر منکرات اور مروجہ بدعات سے پاک صاف ہو اور محض خوشی میں بلا التزام دوست واحباب کو

کھانا کھلانا ہے، تو اس کی گنجائش ہے۔ (مستفاد: فتاوی رشیدیہ جدید زکریا ۵۵۴، قدیم ۵۶۸، فتاوی رحیمیہ جدید زکریا ۱۰/۲۲۶، کفایت المفتی جدید زکریا مطول ۲/۱۱۲، قدیم ۹/۶۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ / ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۷۸۰/۲۵)

مختلف احکام شرعیہ کی خلاف ورزی کرنے والی عورت کا حکم

سوال [۱۱۰۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) مسلمانوں کی جدوجہد سے ایک اسکول کا آغاز ہوا، جس میں لڑکے لڑکیاں تعلیم پاتے ہیں، اس کی صدر مدرس (پرنسپل Princial) ایک مسلم خاتون ہیں، جن کے طور طریقے اور رہن سہن انگریزی مغربی تہذیب کے ہیں مثلاً سر کے بال کٹوائے ہوئے، بے پردہ اسکوٹر چلاتی ہوئی اسکول آتی جاتی ہیں۔

(۲) یہ خاتون پانچ سال اور اس سے اوپر کی عمر والے نابالغ لڑکے لڑکیوں پر ظہر اور عصر کی نماز بغیر طہارت کا لحاظ کئے ہوئے جبراً ادا کرنے کا حکم دیتی ہیں اور نہ پڑھنے پر سزا ان بچوں کو دیتی ہیں۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟

(۳) یہ خاتون خود کھلا سر رکھتی ہوئی لڑکیوں کو سر پر اوڑھنی یا دوپٹہ پہننا لازم قرار دے کر اگر کوئی لڑکی نہ پہن کر آئے تو بطور سزا اسکول سے گھر کو واپس بھیج دی جاتی ہے۔ کیا ایسی خاتون بچوں پر شرعی قانون نافذ کرسکتی ہے؛ جبکہ خود عمل نہ کرے؟

(۴) ایسی خاتون پر جو خود شرعی احکام کی خلاف ورزی کرے شریعت کا کیا حکم ہے؟

(۵) ایسی خاتون کو صدر مدرس بنا کر مجلس انتظامیہ نے شرعی ذمہ داری کو کیسے ادا کیا ہے؟

(۶) یہ خاتون حال ہی میں شوہر سے طلاق لے چکی ہے، مگر عدت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مدرسہ میں حاضری دیتی رہی ہے، عدت نہ پوری کرنے والی مسلمان عورت پر شریعت کا کیا حکم ہے؟

مندرجہ بالا سوال کے بارے میں اسلامی شریعت کی رو سے علماء دین شرع متین کیا فرماتے ہیں؟ جواب سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی: محمد غوث، مارا کوئر لائبریری اسٹریٹ، جی ٹی، مدراس

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) سر کے بال کٹوانا عورتوں پر حرام ہے اور ناجائز ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۲۲۸/۴)

اور بے پردہ پھرنا بھی عورتوں پر حرام ہے؛ اس لئے مذکورہ خاتون اپنے اس فعل کی وجہ سے سخت گنہگار ہوگی۔

لقوله تعالیٰ: يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِن. [سورة الاحزاب: ۵۹]

(۲) کسی کا ذاتی طور پر کسی گناہ میں مبتلا ہونا الگ چیز ہے اور اس گناہ سے دوسروں کو باز رہنے کی تلقین ایک الگ چیز ہے۔ نیز نیک عمل خود کرنا ایک مستقل نیکی ہے اور دوسروں کو نیک عمل کی ترغیب دینا دوسری الگ نیکی ہے؛ لہٰذا عورت کا خود گناہ میں مبتلا اور نیک عمل نہ کرنا ایک مستقل چیز ہے، اس گناہ کا وبال مذکورہ خاتون پر الگ سے ہوگا اور اس کا دوسروں کو اس گناہ سے باز رکھنا اور نیک کام پر پابندی کرانا الگ سے دوسری چیز ہے، اس کا الگ سے ثواب مل سکتا ہے؛ اس لئے چھوٹی بچیوں کو نماز کی تربیت دینا اس کے لئے ممنوع نہ ہوگا، ہاں البتہ ساتھ ساتھ وضو کا طریقہ اور اس کی تربیت دینا بہتر ہے۔

عن عمرو بن شعيب عن أبيه، عن جدهؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: مروا أولادكم بالصلاة وهم أبناء سبع سنين، واضربوهم عليها، وهم ابناء عشر، وفرقوا بينهم في المضاجع. (سنن أبي داؤد، باب متى يؤمر الغلام بالصبي، النسخة الهندية ۱/ ۷۰، دار السلام رقم: ٤٩٥)

(۳) عادی بنانے کے لئے پابندی کرانا باعث ثواب ہے، اور خود عمل نہ کرنے کا گناہ اس پر الگ سے ہوتا رہے گا۔

(۴) بہت بڑا گناہ ہے اس کا وبال اس پر ہوگا۔

(۵) معلّمہ اوراستانی باشرع ہونی چاہئے، مجلس انتظامیہ پر ضروری ہے کہ ایسی خاتون کو ایسے گناہ سے باز آنے کی پابندی کرائے اور اگر باز نہ آئے، تو دوسری اچھی باشرع خاتون کا انتظام کرے تاکہ زیر تعلیم بچیوں پر فاسقہ عورت کا اثر مرتب نہ ہو۔

(۶) مطلقہ عورت پر عدت کے ایام میں گھر سے باہر نکلنا ناجائز ہے اور دوران عدت باہر نکلنے کا الگ سے گناہ ہوگا۔

قال الله تعالیٰ: لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْن. [الطلاق:۱]

ولا يجوز للمطلقة الرجعية، والمبتوتة الخروج من بيتها ليلاً ولانهاراً. (هداية، باب العدة، فصل في الحداد، اشرفي ۲/ ٤۲۸، مختصر القدوري ۱۸۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ رجب المرجب ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/ ۲۷۶۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/ ۷/ ۱۴۱۲ھ

مسلم شخص کا ہندو کے ساتھ مندر جانا اور جے شری رام کہنا

سوال [۱۱۰۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ علی رضوان عرف منے جو پنجوقتہ نمازی ہیں، داڑھی اور مونچھ سے گریز کرتے ہیں۔ دفتر نگر پنچایت ملیح آباد لکھنؤ میں نوکر ہیں، ساتھ میں سات مسلم ہیں اور آٹھ غیر مسلم ہیں، ایک غیر مسلم کیساتھ اجودھیا مندر گئے، مندر پہونچ کر رامائن پڑھی، واپس آکر دفتر نگر پنچایت آئے، تو غیر مسلم ساتھیوں نے کہا کہ آپ مندر گئے تھے، اس وجہ سے آپ کا آج سے

علی رضوان نام نہیں؛ بلکہ منئے مشرا جی ہے، اس نام کو سن کر علی رضوان کو کوئی اعتراض نہیں ہوا؛ بلکہ اس پر حامی بھرتے رہے، حد تو یہ کردی کہ علی رضوان صاحب نے خود کھڑے ہوکر ہاتھ جوڑ کر غیر مسلم کو جے شری رام کہا، اس پر مسلم بھائی نے جو ساتھ میں ملازمت کرتے ہیں اعتراض کیا تو علی رضوان بولے کہ کیا ہوا؟ ہم نے کہہ دیا پھر مسلم بھائی بولے کہ اس جملہ کو کہتے ہوئے آپ کو کیسا لگا؟ تو علی رضوان نے کہا یہ جملہ ہم مسجد میں بھی کہہ سکتے ہیں؛ بلکہ یہ جملہ ٹیلے والی مسجد لکھنؤ میں بھی بول سکتے ہیں، اس کے بعد علی رضوان نے کہا کہ تم کس مسجد میں ملو گے، تو مسلم بھائی بولے کہ ہم فلاں مسجد میں نماز جمعہ ادا کرتے ہیں، نماز جمعہ ہونے کے بعد علی رضوان مسلم بھائی سے بولے کہ ہم نے تین مسجدوں میں آپ کو تلاش کیا، اگر آپ ملتے تو وہاں پر بھی یہ جملہ بول کے سناتے۔

مندر جانے کے بعد اس طرح کے جملہ علی رضوان کے بولنے پر ساتھ میں ملازمت کرنے والے ہندو بھائیوں کو شبہ ہو رہا ہے کہ کیسا پنجوقتہ نمازی ہے؟ جب اس کا چرچا دفتر نگر پنچایت میں ہوا، تو علی رضوان بولے کہ یہ تو ہمارا مذاق تھا؛ لہٰذا بتائیں علی رضوان قرآن وحدیث کی روشنی میں کافر یا مرتد یا فاسق ہیں؟

المستفتی: طارق شمیم، دفتر نگر پنچایت، ملیح آباد، لکھنؤ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں مذکورہ شخص علی رضوان کے تمام ذکر کردہ افعال ہندوانہ شعار اور گناہ کبیرہ ہیں۔ اور ان کا ارتکاب کرنے والا شخص گناہ گار اور فاسق معلن ہے۔ اور از راہ مذاق واستخفاف ایسے بڑے گناہوں کا ارتکاب اور بھی بڑی جسارت مندی کی بات ہے؛ لہٰذا ان پر لازم ہے کہ دل کی ندامت وپشیمانی کے ساتھ اپنی ان حرکات پر توبہ واستغفار کریں اور آئندہ اس قسم کے گناہوں سے مکمل اجتناب کریں۔

قال عمرؓ: لاتعلموا رطانة الأعاجم، ولاتدخلوا علی المشرکین في

كنائسهم يوم عيدهم، فإن السخطة تنزل عليهم. (السنن الكبرىٰ للبيهقي ١١٣/١٤، رقم ١٩٣٧٤)

إنما يمنعون أن يدخلوا عليهم، وبيعهم، وكنائسهم. (الموسوعة الفقهية ٩/١٢)

اتفقوا أن التوبة من جميع المعصية واجبة سواء كانت المعصية صغيرة، أو كبيرة. (شرح النووي ٢/٢٥٤)

واتفقت الأمة على أن التوبة فرض على المؤمنين؛ لقوله تعالىٰ: وتوبوا إلى الله جميعًا أيها المؤمنون. (تفسير القرطبي، دار الكتب المصرية القاهرة ٥/٩٠، دار الكتب العلمية بيروت ٥/٦٠، تحت رقم الأية: ١٧، من سورة النساء) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍محرم الحرام ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹؍۱۰۲۴۶)

ماتھے پر ٹیکہ لگانا

سوال [۱۱۰۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ماتھے پر ٹیکہ لگانا غیر مسلم کے قومی شعار، یا مذہبی امور میں سے ہے، تو اگر کسی علاقہ یا صوبہ میں مسلم بھی اسے اپنالے، تو عموم کی وجہ سے یہ من تشبہ بقوم فهو منهم سے خارج ہوسکتا ہے؟ اور جواز کی حد میں داخل ہوسکتا ہے یا نہیں؟

نیز اس بات سے بھی مطلع کریں کہ قومی شعار یا امور مذہبی غیر مسلم میں عموم موجب تخفیف ہے یا نہیں؟ یا صرف اول میں موجب تخفیف ہے اور ثانی میں نہیں؟

المستفتی: عتیق الرحمٰن ناگوری، مدرس دار العلوم حسینیہ اکولہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ماتھے پر ٹیکہ لگانا اگر غیر مسلموں کا قومی شعار ہے،

تو اس کو اختیار کرنے والا مسلمان **من تشبه بقوم فهو منهم** کی وعید میں داخل ہوکر فعل حرام کا مرتکب ہوگا؛ لیکن صرف فسق کی حد تک ہوگا موجب کفر نہ ہوگا اور اگر ٹیکہ لگانا غیر مسلموں کی عبادت میں شامل ہے اور مسلمان اس کو جنگی حیلہ وغیرہ کے لئے استعمال نہیں کرتا ہے؛ بلکہ بلاضرورت شدیدہ استعمال کرتا ہے، تو فعل حرام کے ارتکاب کے ساتھ ساتھ ایمان کے چلے جانے کا بھی خطرہ ہے۔

کما استفید من عبارة الهندية يكفر بوضع قلنسوة المجوس على رأسه على الصحيح إلا لضرورة دفع الحر والبرد......خديعة في الحرب وطليعة للمسلمين. (هندية، الباب التاسع، فصل في أحكام المرتدين، زكريا قديم ٢/٢٧٦، جديد ٢/٢٨٧، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٢/٥١٣، مصري قديم ١/٦٩٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/۳۱۶۲)

(۲۲) باب ما یتعلق بالسحر

جادو پر اعتماد کرنا

سوال [۱۱۰۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جادو جو دور حاضر میں لوگ کرتے ہیں، اس پر اعتماد کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز کسی انسان کو کیا یہ اختیار رہے کہ وہ کسی بھی انسان کو اپنے جادو کے ذریعہ سے مار سکے؟

المستفتی: ضیاء الدین، مانپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جادو پر اس اعتبار سے اعتماد کرنا کہ اس کا اثر ہوتا ہے جائز ہے۔ قرآن کریم میں بھی جادو کا ذکر آیا ہے؛ چنانچہ فرمایا گیا:

وما كفر سليمان؛ ولكن الشياطين كفروا يعلمون الناس السحر. [البقرة:١٠٣]

اور خود حضور ﷺ پر بھی جادو کیا گیا تھا، اور اس کا اثر بھی ہوا۔

عن عائشة رضـ قالت: سحر رسول الله صلى الله عليه وسلم: حتى أنه يخيل إليه أنه فعل الشئ ومافعله. (بخاري شريف، الطب، باب السحر، النسخة الهندية ٢/٨٥٨، رقم: ٥٥٤١، ف:٥٧٦٦)

جادو کرنا اور اس کے ذریعہ لوگوں کو تکلیف پہونچانا اور ہلاک کرنا حرام ہے، رہا یہ مسئلہ کہ جادو کے ذریعہ کسی کو مار سکتا ہے اور اس کا اختیار بندے کو ہے، تو جاننا چاہئے کہ اسباب کے درجہ میں دیگر اسباب ظاہریہ مثلاً زہر وغیرہ کی طرح اس کا استعمال بھی کبھی ہلاکت تک پہونچا دیتا ہے، جیسا کہ زہر کا استعمال ہلاکت تک پہونچا دیتا ہے؛ لیکن مؤثر حقیقی ہر چیز میں اللہ تعالیٰ ہے۔

والفاعل للآثار في الحقيقة هو الله عز سلطانه بالإجماع؛ لكن جرت عادته تعالىٰ على خلقها بالأسباب من غير توقف عقلي عليها. (روح المعاني، زكريا ٨/ ٢٦، تحت رقم الآية٦٧، من سورة يوسف) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍رجب المرجب ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۲۶۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۶/۷/ ۱۴۲۰ھ

جادوگر ہونے کا الزام لگانا

سوال [۱۱۰۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری شادی ہوئی، ایک بچہ پیدا ہوا ایک سال تین ماہ کے بعد طلاق بھی ہوگئی، میری طلاق دی ہوئی عورت کے چندرشتہ دار دنیا سے گذر گئے، اٹھارہ سال کی مدت میں درگاہ قاضی پیٹھ کے امام خاں صاحب فرماتے ہیں کہ میں جادوگر ہوں، چور ہوں...... اوران کا کہنا یہ ہے کہ میری طرف سے ہی ان کی مطلقہ عورت کے چندرشتہ دار گذر گئے ہیں، اٹھارہ سال کی مدت میں اب مجھ کو درگاہ قاضی پیٹھ کے گاؤں والے سب مل کر مارڈالنا چاہتے ہیں۔

(۲) میری دوسری شادی بھی ہوگئی ہے، اور سات بچے بھی پیدا ہوئے، ۶؍زندہ بچے ہیں، میری دوسری بیوی کے غیر شخص سے تعلقات تھے، اس غیر شخص نے خودکشی کرلی؛ جبکہ دوسری بیوی نے بھی قرآن شریف پکڑ کر قسم کھالی ہے کہ میں جادوگر نہیں ہوں، میں چور نہیں ہوتو بھی ان کو بھروسہ نہیں ہے۔

آپ سب علماء دین ان مسئلوں میں کیا فرماتے ہیں اور ہوسکے تو قطب ابدال ولی کے ذریعہ فیصلہ فرمائیے اوران کا نام بھی لکھد یجئے۔

مجھ کو امام خاں صاحب اور گاؤں والے مل کر مارڈالنے کا ارادہ کررہے ہیں، اگر میں

جادوگر ہوتا، تو پہلی عورت کو اور دوسری بیوی کو ختم کرتا، دونوں زندہ ہیں، میری پہلی عورت کا ایک بچہ اور دوسری بیوی کے چھ بچے ہیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو جادوگر نہیں، اس پر جادوگری کا الزام لگانا بہت بڑا گناہ ہے، قطب ابدال جو یقینی ہو، ان کے ساتھ میرا تعارف نہیں؛ اس لئے ان سے فیصلہ لے کر بتلانا دشوار ہے؛ البتہ ہم پیغمبر کے امتی ہیں، ان کے احکام کے تابع ہیں کسی مسئلہ میں پیغمبر ہی کا فیصلہ پیش کر سکتے ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ شوال المکرّم ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۵۰۰۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸؍ ۱۰؍ ۱۴۱۷ھ

جادو کرنا یا کرانا

سوال [۱۱۰۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل عام طور پر جادو کا کرنا یا کرانا جیسے کسی سے مخالفت ہوجاتی ہے، تو وہ لوگ سامنے والوں کو جادو کرا کر ختم کرا دیتے ہیں یا برباد کرا دیتے ہیں، ایسے کرنے والے کے حق میں شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟

مذکورہ بالا سوال کا مدلل ومفصل جواب سے مطلع فرمائیں۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہونگے۔

المستفتی: عبدالواحد، خادم مدرسہ اسلامیہ فیض العلوم، شیرکوٹ بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس طرح جادو کرنا اور کرانا حرام ہے اور گناہ کبیرہ ہے اور بسا اوقات کفر وشرک تک پہونچ جاتا ہے۔ (مستفاد: معارف القرآن ۱/ ۲۲۳)

قال الله تعالیٰ: وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ. [سورۃ بقرہ:۱۰۲] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۲۶۰/۳۲)

سفلی عمل کرنا یا کروانا

سوال [۱۱۰۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کسی مسلم خاتون کو اپنے شوہر کے بارے میں تحقیقی طور پر یہ معلوم ہوجائے کہ وہ سفلی علم کے ذریعہ سے روحانی علاج کرتا ہے اور کسی بھی انسان پر سحر بھی کر دیتا ہے اور دوسرے سے کروا بھی دیتا ہے، تو کیا اس عورت کو اپنے اس شوہر کی زوجیت میں رہنا چاہئے؟ یا اپنی عصمت وعفت اور ایمان واسلام کے تحفظ کے لئے اس سے طلاق کا مطالبہ کرنا چاہئے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

المستفتی: حاجی محمد عمر، معرفت ڈاکٹر محمد قمر، کٹورا تال، کاشی پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سفلیعمل کرنا گناہ کبیرہ ہے، اس کی وجہ سے آدمی فاسق بن جاتا ہے۔ قرآن کریم میں بھی سحر وجادو کی سخت مذمت آئی ہے؛ اس لئے اگر کسی نے ایسی حرکت کر رکھی ہے، تو آئندہ کے لئے سچی توبہ کرنا لازم ہے، اگر توبہ نہیں کرے گا، تو وہ فاسق شمار ہوگا اور اس کے فسق وفجور کا گناہ بیوی پر نہیں ہوگا؛ بلکہ اس گناہ کا وبال اسی شخص کے سر ہوگا اور اس کی بیوی کا نکاح اس کے ساتھ بدستور باقی رہے گا، بیوی پر یہ لازم نہیں کہ اس سے طلاق کا مطالبہ کر کے علیحدگی حاصل کرلے؛ بلکہ کوشش کر کے ان حرکتوں سے اسے باز رکھنے کے اسباب فراہم کئے جائیں؛ ہاں البتہ ان حالات میں اگر دونوں کے درمیان نبھاؤ

ممکن نہیں ہے اور وہ شخص جادو اور سفلی عمل کے کام سے باز نہ آئے تو مجبوری کے تحت بیوی کو شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرنے کی گنجائش ہے۔

ولا يجب على الزوج تطليق الفاجرة (در مختار) ولا عليها تسريح الفاجر إلا إذا خافا أن لا يقيما حدود الله فلا بأس أن يتفرقا. (شامي، كتاب الحظر والأباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ٩/ ٦١١، كراچي ٦/ ٤٢٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۲۸۶/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۵/۱۴۲۵ھ

جادو کروا کر دوسروں کو تکلیف پہونچانا

سوال [۱۱۰۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل عام طور پر جادو کرنا یا کرانا، جیسے کسی سے مخالفت ہو جاتی ہے، تو وہ لوگ سامنے والوں کو جادو کرا کے ختم کرا دیتے ہیں یعنی کسی سفلی عامل کو روپیہ دے کر جادو کرا کے سامنے والے کو ختم کرا دیتے ہیں یا برباد کرا دیتے ہیں۔ ایسے کرنے والے کے حق میں شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: عبد الواحد بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اس طرح جادو کرنا کرانا حرام اور گناہ کبیرہ ہے، اور بسا اوقات کفر وشرک تک پہونچ جاتا ہے۔ (مستفاد: معارف القرآن ۱/۲۲۳)

قال الله تعالىٰ: وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ. [سورة بقره: ١٠٣] **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۲۵۷/۳۱)

سحر کو ساحر پر لوٹانا

سوال [۱۱۰۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نامی ایک شخص ایک طویل عرصہ سے سحر میں گرفتار ہے، جو بظاہر کسی بدخواہ کی طرف سے کرایا گیا ہے، جیسا کہ اس لائن کے ماہرین نے لمبے لمبے عرصہ علاج کرنے کے بعد بتایا ہے اور مریض مذکورہ اس وقت بھی ایک ماہر فن کے زیر علاج ہے، مگر اب اس کے معالج خاص کا کہنا ہے کہ اس سحر کے ختم ہونے کی بظاہر صرف ایک ہی شکل ہے کہ اس سحر کو اسی کی طرف واپس کردیا جائے، جس نے یہ کرایا ہے، اگر ایسا کیا جاتا ہے، تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا زید کسی گناہ یا بدعملی کا مرتکب خیال تو نہیں کیا جائے گا؟ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات تشفی بخش جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد زید، ساکن ڈیرسرائے، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کے کلام سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر مسحور کی شفا صرف سحر کو ساحر پر لوٹا دینے میں ہے، تو اس سلسلہ میں جاننا چاہئے کہ سحر کرنا حرام ہے۔

السحر حرام بلاخلاف بين أهل العلم، وإعتقاد إباحته كفر. (شامي، باب المرتد، مطلب في الساحر والزنديق، زكريا ٦/ ٣٨١- ٣٨٢، كراچي ٤/ ٢٤٠)

لیکن اگر جان جانے کا خطرہ ہو، تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر کسی شخص معین کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ فلاں معین شخص نے سحر کیا ہے، اس کی طرف لوٹایا جارہا ہے، تو اس شخص معین کے ساحر ہونے پر دو شرعی گواہوں سے ثبوت لازم ہے، اس کے بعد اولاً اس سے رابطہ قائم کیا جائے کہ معین شخص نہیں؛ بلکہ عمومی انداز سے لاعلی التعیین جس نے کیا ہوگا اس پر واپس کیا جارہا ہے، تو دفع مضرت کے لئے اس کی گنجائش ہے۔

وفي أحكام القرآن، قلت مقتضى الإطلاق تحريمه، لو تعلم لدفع الضرر عن المسلمين. وقيل بجوازه لدفع الضرر عنهم وفي موضع آخر وقد أجاز بعض العلماء تعلم السحر لأحد الأمرين، أما التميز ما فيه كفر من غير، وأما لإزالته عمن وقع فيه. (أحكام القرآن للتهانوي ١/ ٣٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ ربیع الاول ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۳/ ۶۰۷)

سحر کرنے کرانے اور سحر سے پیدا ہوئی بیہوشی کی حالت میں دی گئی طلاق کا حکم

سوال [۱۱۰۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) کسی شخص نے اپنے دوست پر سحر جادو کرایا، جس کے اثر سے مسحور سحر زدہ کافی زمانہ تک ایک سخت تکلیف بیہوشی کی حالت میں رہا اور اسی بیہوشی کی حالت میں مسحور نے اپنی بیوی کو طلاق بھی دیدی، پھر اس مسحور شخص کی مطلقہ بیوی اپنے گھر سے چلی گئی؛ جبکہ یہ عورت اس کے نکاح میں اکیاون سالوں سے رہ رہی ہے۔

(۲) ایک دوست اپنے دوست پر سحر جادو کراتا ہے، جس کی وجہ سے مسحور (سحر زدہ) کافی پریشانیاں اور تکلیفیں اٹھاتا ہے، اور یہ دوست آئندہ بھی سحر (جادو) کرانے کا عزم رکھتا ہے۔

(۳) ایک شخص اپنی بیوی کو مجبور کرتا ہے کہ میرے دوست کے ساتھ غلط کام کرائے، نہ کرانے کی صورت میں جان سے مارڈالنے اور قتل کرڈالنے کی دھمکیاں دیتا ہے، مجبوراً یہ عورت اپنے شوہر کے دوست سے غلط کام کرالیتی ہے۔ نیز یہ شخص اپنے دوست کے ساتھ خود بھی بدفعلی (لواطت) میں مبتلا رہتا ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ نمبر ایک صورت میں مسحور (سحر زدہ) شخص کی بیہوشی کی طلاق واقع ہوجائے گی یا نہیں؟ نمبر دو صورت میں ایسے شوہر کے لئے کیا حکم شرعی ہے

اور بیوی جو کہ مجبوری کی حالت میں اس عمل بد کو کرا رہی ہے، اس کے لئے شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟ نمبر تین صورت میں سحر کرانے اور کرنے والے کے لئے کیا حکم شرعی ہے؟ آیا ایسا شخص اسلام سے خارج تو نہیں؟ نیز ایسے شخص کو کوئی سزا دی جا سکتی ہے یا نہیں؟ مفصل مدلل مع حوالہ کتب وائمہ اربعہ کا مفتی بہ موقف تحریر فرمائیں۔

المستفتی: منور علی، تندوالہ، پاکستان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: (۱) اگر واقعی ایسی بے ہوشی ہے کہ ہوش آنے کے بعد یاد نہیں ہے کہ بے ہوشی کی حالت میں کیا کہا تھا، تو ایسی بے ہوشی کی حالت میں دی گئی طلاق واقع نہیں ہوئی، نکاح بدستور باقی رہتا ہے اور اگر بیہوشی کی حالت میں دی گئی طلاق یاد ہے، تو ایسی طلاق معتبر ہوا کرتی ہے۔ اب سائل خود فیصلہ کرے کہ کونسی شکل پیش آئی تھی، اس کے مطابق عمل کرے۔

والذي يظهر لي أن كلا من المدهوش، والغضبان لا يلزم فيه، أن يكون بحيث لا يعلم ما يقول (وقوله) بأن الدهش من أقسام الجنون فلا يقع. (شامي، كتاب الطلاق، مطلب في طلاق المدهوش، زكريا ٤/٤٥٢، كراچي ٣/٢٤٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٩/١٨)

(۲) جو شخص اپنی بیوی کو بدکاری پر زبردستی کرتا ہے، وہ گناہ عظیم کا مرتکب ہے اور ایسے شخص کو حدیث میں بدترین قسم کا دیوث کہا گیا، اس کو جنت نصیب نہیں ہوگی۔

عن عمار بن ياسر، عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ثلاثة لا يدخلون الجنة أبدًا: الديوث من الرجال، والرجلة من النساء، ومدمن الخمر، فقالوا: يا رسول الله! أما مدمن الخمر؟ فقد عرفناه، فما الديوث من الرجال؟ قال: الذي لايبالي من دخل على أهله. (شعب الإيمان، باب في الغيره واعذاء، دار الكتب العلمية بيروت ٧/٤١٢، رقم: ١٠٨٠٠)

رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی بن سلول اپنی دو باندیوں کو بدکاری پر مجبور کرتا تھا، حضرت معاذہ اور حضرت امیمہ ان دونوں نے حضرت سید الکونین علیہ السلام سے شکایت فرمائی تو اللہ تعالی نے آیت کریمہ

وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ إِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا. [سورة نور:۳۳] نازل فرمائی

لیکن بیوی کو چاہئے کہ ایسے شوہر سے طلاق حاصل کرکے الگ ہو جائے اور اگر طلاق نہ دے، تو قاضی شرعی یا شرعی پنچایت کے ذریعہ طلاق حاصل کرلے، اگر بیوی علیحدگی کی کوشش نہ کرے، تو خود وہ بھی گناہ میں شامل ہو جائے گی۔ نیز مسلمانوں کو چاہئے کہ اس کو اس حرکت سے باز رکھیں، ورنہ اس سے بائیکاٹ کرلیں۔

قال الله تعالىٰ: وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ. [هود:۱۱۳]

(۳) سحر کرنے اور کرانے والے دونوں گناہ عظیم کے مرتکب ہیں، ایسا شخص اسلامی حکومت میں واجب القتل ہے، اگر جائز سمجھتا ہے، تو کفر کا خطرہ ہے، تجدید ایمان لازم ہو جائے گا۔

السحر حرام بلاخلاف بين أهل العلم واعتقاد إباحته كفر وعن أصحابنا ومالك وأحمد يكفر الساحر بتعلمه وفعله سواء اعتقد الحرمة، أولا ويقتل. (شامي، باب المرتد، مطلب في الساحر والزنديق، زكريا ٦/ ٣٨١-٣٨٢، كراچي ٤/ ٢٤٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ر محرم الحرام ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۲۰۹/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۱/۲۲ھ

(۲۳) باب الشعر والغناء

شعروشاعری کا حکم

سوال[۱۱۰۴۱]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کیاشعروشاعری مطلقاً حرام ہے یاجائز؟ اور **وما علمناه الشعر و ماينبغي له** کا شان نزول واضح فرمادیں۔

المستفتی: محمد رضوان راجہ غالب پور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اشعاردوطرح کے ہوتے ہیں:

(۱) وہ اشعارجن میں دینی اوراصلاحی مضامین ہوتے ہیں، ان کے ساتھ شیطان کا تعلق نہیں ہے، اس طرح کے اشعار کہنا جائز اور درست ہے۔

(۲) وہ اشعار جن میں دنیاوی مضامین یعنی کسی کے خلاف ہواورکسی کی تعریف میں مبالغہ آرائی کر کے آسمانوں تک پہونچادینایامردوعورت کے درمیان عشق ومحبت پیداکرنے والے مضامین کے اشعار کہنا ایسے تمام اشعار شیاطین کے کلام میں شامل ہیں؛ اس لئے ایسے اشعار کہنا ناجائز ہے اوراس طرح کے اشعار پڑھنا گمراہی کا سبب ہے اوراسی قسم کے اشعار سے شوق رکھنے والے شعراء کے بارے میں قرآن میں مذمت کی گئی ہے۔

قال الله تعالىٰ: وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُوْنَ. (شعراء:٢٢٤، انوار نبوت٥١٥، المعجم الكبير، دار إحياء التراث العربي٨/٢٠٧، رقم:٧٨٣٦)

کفارودشمنان اسلام نے قرآن کریم کے بارے میں یہ افواہیں اڑانی شروع کردی

تھیں کہ قرآن کریم محض ایک شعروشاعری ہے اور پچھلے پرانے لوگوں کی کہانیاں ہیں، تو اللہ تبارک وتعالی نے سورہ یٰسین کی اس آیت کریمہ

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنبَغِي لَهُ. [يس: ٦٩]

کے ذریعہ سے صاف واضح فرمادیا کہ ہم نے محمد ﷺ کو شعروشاعری نہیں سکھلائی اور نہ ہی قرآن کریم میں کوئی بات شاعرانہ ہے؛ بلکہ خالق کائنات کا کلام ہے، یہی اس آیت کریمہ کا شان نزول ہے اور اس بارے میں کتابوں میں تفصیل دیکھ لیں۔ (مستفاد: معارف القرآن ۷/۴۰۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/شوال ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/۸۵۸۳)

قوالی کا شرعی حکم

سوال [۱۱۰۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مزارات پر ہونے والی قوالیوں کو بہت سے علماء جائز قرار دیتے ہیں باوجود کہ ان کے ساتھ سنگیت بھی ہوتا ہے اور بہت سے علماء اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں، اس کی حقیقت کیا ہے؟ اور یہ کہاں تک صحیح ہے؟ نیز فلمی گانے اور ڈھول دھما کہ کے ساتھ ہونے والی قوالیاں دونوں کا حکم ایک ہی ہے؟ یا ایسی قوالیوں کا کوئی استثناء ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مزارات پر ہونے والی قوالیاں ناجائز وگناہ کا عمل ہیں، ان کو جائز کہنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے، فلمی گانے اور مروجہ قوالی دونوں کا حکم یکساں ہے، دونوں ناجائز اور معصیت ہیں۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۷/۴۵، جدید ڈابھیل ۳/۲۴۸)

السماع والقول والرقص الذي يفعله المتصوفة في زماننا حرام لايجوز القصد إليه والجلوس عليه، وهو والغناء، والمزامير سواء. (هندية، الباب السابع عشر في الغناء……زكريا قديم ۵/۳۵۲، جديد ۵/۴۰۶، شامي، كراچي ۶/۳۴۹، زكريا ۹/۵۰۳)

سئل الحلواني عمن سموا أنفسهم بالصوفية، فاختصوا بنوع لبسة، واشتغلوا باللهو، والرقص، وادعوا لأنفسهم منزلة، فقال: افتروا على الله كذبًا. (الفتاوى التاتارخانية، زكريا ۱۸/۱۸۷، رقم:۲۸۴۵۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍رجب المرجب ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲؍۴۹۴۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳؍۷؍۱۴۱۷ھ

حضرت خواجہ اجمیریؒ کی جانب قوالی کی نسبت

سوال [۱۱۰۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عوام میں مشہور ہے کہ حضرت خواجہ اجمیریؒ نے اور ان کے سلسلہ کے بہت سے بزرگوں نے قوالی سنی ہے، یہ کہاں تک درست ہے؟ حضرت تھانویؒ نے بھی ایک واقعہ نقل فرمایا ہے، جس سے ثابت ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدینؒ نے بھی قوالی سنی ہے، ان واقعات کے سلسلے میں ہمارے اکابرین کی کیا رائے ہے؟

المستفتی: عبدالعزیز، برتن بازار، شاہی مسجد مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حضرت خواجہ اجمیریؒ کی طرف اس کی نسبت صحیح سند کے ساتھ ثابت نہیں ہے، اگر فی الواقع صحیح بھی ہے، تو وہ امام غزالیؒ کی شرطوں کے ساتھ ہوگا۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے تفہیمات الٰہیہ میں، علامہ شامی نے تنقیح الفتاوی

الحامدیہ ۲/۳۵۵، میں اور علامہ علاء الدین حصکفیؒ نے سکب الانہر میں ممنوع لکھا ہے۔

عبارت حصکفی ملاحظہ فرمائیے:

لا أصل له في الدين زاد في الجوهرة، وما يفعله متصوفة زماننا حرام لايجوز القصد والجلوس إليه ومن قبلهم لم يفعل كذلك. (شامي، كتاب الحظرو الإباحة، قبيل فصل في اللبس، زكريا ٩/٥٠٣، كراچي٦/٣٤٩، هكذا في الهندية، زكريا قديم ٥/٣٥٢، جديد٥/٤٠٦)

یعنی قوالی کی دین میں کوئی اصل نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ۱/۱۴۰)

اگر خواجہ نظام الدینؒ کی طرف اس کی نسبت صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے، تو وہ امام غزالیؒ کی شرط کے مطابق ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ربیع الاول ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۰۸/۲۳)

مروجہ قوالی اور کیمیائے سعادت کی شرائط

سوال [۱۱۰۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حضرت امام غزالیؒ نے کیمیائے سعادت میں شرطیں تحریر فرمائی ہیں کہ ان شرطوں کے ساتھ قوالی سننا جائز ہے۔ یہ کہاں تک درست ہے؛ جبکہ حدیث شریف میں گانے کی ممانعت ہے۔

المستفتی: عبدالعزیز، بزار شاہی مسجد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کیمیائے سعادت میں جو شرطیں ہیں، وہ مروجہ قوالی میں کسی حد تک نہیں ہوتی ہیں۔ خود کیمیائے سعادت میں یہی منقول ہے کہ

سن کر اگر وجد اور دنیا و مافیہا سے منحرف ہو کر سیر فی اللہ میں استغراق کی کیفیت نہیں ہوتی ہے، تو سننا زہر قاتل ہے۔

وہر کرا در دل دوستی باطل بود سماع زہر قاتل او بود وبر وے حرام باشد (وقولہ) نزدیک وے در دل جز عشق مخلوق صورت نہ بندد واگر عشق خالق صورت بندد وبنا بر خیال تشبیہ باطل بود بایں سبب گوید کہ سماع یا بازے بود یا از عشق مخلوقے وایں ہر دو در دین مذموم است۔

کیمیائے سعادت ۲۱۸/ اور اہل اللہ کے علاوہ کسی کو سیر فی اللہ کا درجہ حاصل نہیں ہے اور حدیث شریف کا مصداق بھی یہی ہے؛ اس لئے ناجائز ہی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/ ۶۰۶)

سماع کا جواز اور ''سیرت فخر العارفین'' نامی کتاب کا حکم

سوال [۱۱۰۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مولانا عبد الحیؒ چاٹ گامی کی کتاب سیرت فخر العارفین ۱۷۵/ پر آپ نے مندرجہ ذیل عبارت نقل کر کے جواز سماع کا عنوان قائم کیا ہے۔

وهذا يفيد آلة اللهو ليست محرمة لعينها؛ بل لقصد اللهو منها، إما من سامعها، أو من المشتغل بها وبه تشعر الإضافة ألا ترىٰ أن ضرب تلك الآلة بعينها حل تارة وحرم أخرى باختلاف النية بسماعها والأمور بمقاصدها وفيه دليل لساداتنا الصوفية الذين يقصدون أمورًا هم أعلم بها فلا يبادرا لمعترض بالإنكار كي لا يحرم بركتهم، فإنهم السادة الأخيار أمدنا الله تعالى بامداداتهم وأعاد علينا من صالح دعواتهم وبركاتهم. (در المختار ٥/٣٤٣)

الف: سیرت فخر العارفین اور صاحب کتاب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ب: اگر یہ عبارت شامی کی ہے، تو واضح اور مفصل مطلب کیا ہوگا؟

المستفتی: محمد عباس لکھیم پوری، مدرسہ صراط مستقیم کھیری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: فخر العارفین نامی کتاب تلاش بسیار کے باوجود دستیاب نہیں ہوئی؛ اس لئے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا؛ البتہ جو عربی عبارت آپ نے نقل کی ہے، وہ شامی، کتاب الحظر والاباحۃ، قبیل فصل في اللبس، کراچی، ۳۵۰/۶، زکریا ۵۰۵/۹ میں موجود ہے۔

علامہ شامی کی بات حدیث نبوی ﷺ۔

استماع صوت الملاهي معصية والجلوس عليها فسق. الحديث

(در مختار، كتاب الحظر والإباحة، زكريا ٩/٥٠٤، كراچي ٦/٣٤٩، الفتاوى التارتارخانية، زكريا ١٨/١٨٩، رقم:٢٨٤٦٦)

کے مخالف ہونے کی وجہ سے مردود ہوگی، اس کو حجت شرعی قرار دینا جائز نہ ہوگا۔

نیست حجت قول وفعل ہیچ پیر
قول حق را فعل احمد را بگیر

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹۰۲/۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۳/۱۱ھ

غزل ونعت کو گانے کی آواز میں پڑھنا

سوال [۱۱۰۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ غزل یا نعت کو گانے کی آواز میں پڑھنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد ابوصدیق، ۲۴/ پرگنہ بنگال، متعلم مدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اشعارِ نعت وغیرہ گانے کی آواز میں پڑھنا غیر مناسب چیز ہے، اس سے بچنا چاہئے۔

عن أبي سعيد الخدري رضـ، قال: بينا نحن نسير مع رسول الله صلى الله عليه وسلم بالعرج إذ عرض شاعرينشد، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: خذوا الشيطان، أو امسكوا الشيطان؛ لأن يمتلئ جوف رجل قيحًا خيرله من أن يمتلي شعرًا. (صحيح مسلم، الشعر، النسخة الهندية ٢/ ٢٤٠، بيت الأفكار، رقم: ٢٢٥٩)

وما نقل أنه عليه السلام سمع الشعر لم يدل على إباحة الغناء.

(شامي، كتاب الحظر و الإباحة، قبيل فصل في اللبس، زكريا ٩/ ٥٠٣، كراچي ٦/ ٣٤٩)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵؍۷۰۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲؍۱؍۱۴۲۲ھ

قوالی یا گانا سننا

سوال [۱۱۰۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ قوالی سننا یا گانا جائز ہے یا نہیں؟ سننے میں ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ، یا زبانی سب کا ایک حکم ہے یا الگ الگ؟

المستفتی: عبد العزیز، بازار شاہی مسجد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قوالی سننا اور گانا دونوں ناجائز ہیں، اسی طرح ٹیپ ریکارڈ اور زبانی سب کا حکم برابر ہے، جو چیز زبانی سننا ناجائز ہے، وہ ٹیپ ریکارڈ وغیرہ میں بھی ناجائز ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۹؍۱۸۳، جدید زکریا مطول ۱۳؍۶۲)

عن جابر بن عبد اللّٰہؓ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: الغناء ینبت النفاق في القلب کما ینبت الماء الزرع. (شعب الإیمان، باب حفظ اللسان، دار الکتب العلمیة بیروت ٤/٢٧٩، رقم: ٥١٠٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ربیع الاول ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳؍۶۰۶)

قوالی کروانے کا حکم

سوال [۱۱۰۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اس عالم کے اندر ثواب کی نیت سے قوالی کرنا یا قوالی کروانا یا سننا کسی حدتک جائز ہے یا نہیں؟ جو ہر جگہ عام طور پر رائج ہورہی ہے یا بے کار کمائی کا روپیہ اس میں لگانا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد معصوم قاسمی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قوالی کرنا کروانا اور سننا جیسا کہ آج کل رائج ہے، قطعاً جائز نہیں ہے اور شریعت میں اس کی کوئی اصل موجود نہیں ہے؛ لہٰذا ایسے ناجائز کام سے ثواب کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔

لا أصل له في الدین زاد في الجوهرة، وما یفعله متصوفة زماننا حرام لایجوز القصد والجلوس إلیه ومن قبلهم لم یفعل کذلک. (سکب الأنهر علی مجمع الأنهر، کتاب الکراهیة، فصل في المتفرقات، دارالکتب العلمیه بیروت ٤/٢١٩-٢٢٠، مصری قدیم ٢/٥١١، هندیة، زکریا قدیم ٥/٣٥٢، جدید ٥/٤٠٦، شامي، زکریا ٩/٥٠٣، کراچي ٦/٣٤٩)

واستماع ضرب الدف، والمزمار وغير ذلک حرام. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ۹/ ٥٦٦، كراچي ٦/ ٣٩٥)

نیز قوالی میں روپیہ لگانا بھی تعاون علی المعصیت کی بنا پر جائز نہیں ہے۔

قال الله تعالیٰ: وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ . [مائده: ٢]

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۶/ شعبان المعظم ۱۴۲۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۶۸۹۰)	۱۴۲۱/۸/۱۶ھ

مزاروں پر عورتوں کا جانا، قوالیاں اور فحش باجے گانے کروانا

سوال [۱۱۰۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مزاروں پر عورتوں کا جانا، چادر چڑھانا، قوالیاں اور فحش باجے گانے کروانا کیسا ہے؟ کیا کہیں سے ثابت ہے؟

المستفتی: جسیر احمد، سرس موں گڈ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مزاروں پر صرف قرآن کریم کی تلاوت وغیرہ سے ایصال ثواب اور اہل قبور کو دیکھ کر عبرت حاصل کرنے کے لئے جانے کی اجازت ہے اور عورتوں کا اس کام کے لئے بھی نہ جانا بہتر ہے، اور سوال نامہ میں درج شدہ خرافات واہیات سب ناجائز اور حرام ہیں۔

ان الملاهي كلها حرام، ويدخل عليهم بلا إذنهم لإنكار المنكر، قال ابن مسعودؓ: صوت اللهو والغناء ينبت النفاق في القلب كما ينبت الماء النبات وفي البزازية: استماع صوت الملاهي كضرب قصب ونحوه

حرام؛ لقوله عليه الصلاة والسلام: استماع الملاهي معصية والجلوس عليها فسق، والتلذذ بها كفر. (در مختار، كتاب الحظر والإباحة، قبيل فصل في اللبس، زكريا ۹/۵۰۲، كراچي ۶/۳۴۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ ذی قعدہ ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴؍ ۵۹۱۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۱۱/۱۴۱۹ھ

ناچنا گانا، ڈھول بجانا

سوال [۱۱۰۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شادی کی ہر رات میں ناچنا وگانا اور ڈھول وغیرہ پیٹنا کہاں تک صحیح ہے؟ ان سب باتوں کو شامل کر کے لڑکے ولڑکی کے نکاح میں کوئی خرابی تو نہیں آتی؟ برائے کرم اس کا جواب فتویٰ کی شکل میں عنایت فرما دیں۔ شکریہ

المستفتی: محمد نوشہ ڈبہ والے، اسلام نگر گلی-۳؍ اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: لڑکے اور لڑکی کے نکاح میں کوئی خرابی نہیں آتی ہے؛ البتہ یہ سب افعال ناجائز اور حرام ہیں؛ اس لئے ان افعال کے ارتکاب کرنے والے اور ان میں شرکت کرنے والے اور لطف اندوز ہونے والے سب کے سب سخت گنہگار ہوں گے۔

استماع صوت الملاهي كضرب قصب ونحوه حرام؛ لقوله عليه الصلاة والسلام: استماع الملاهي معصية والجلوس عليها فسق، والتلذذ بها كفر. (در مختار، كتاب الحظر والإباحة، قبيل فصل في اللبس، زكريا ۹/۵۰۴، كراچي ۶/۳۴۹، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ۱۸/۱۸۹، رقم: ۲۸۴۶۶،

هندية، زكريا قديم ٥/٣٥٢، جديد ٥/٤٠٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ربیع الثانی ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۱۸۴/۲۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۱/۴/۳ھ

ریڈیو پر گانا سننا

سوال [۱۱۰۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جموں ریڈیو اسٹیشن پر جو عورتیں پانچ بجے شام گیت گاتی ہیں اور وہ سب عورتیں مسلمان ہیں، اس بارے میں قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: عبد المجید، کشمیری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذہب اسلام میں گانا، بجانا اور گیت گانا اور ریڈیو سے گانے وغیرہ سننا بھی ناجائز اور ممنوع ہے۔ نیز ان چیزوں کا ارتکاب اگر عورت کرنے لگے، یا عورتوں کے گیتوں کو ریڈیو وغیرہ سے مرد سننے لگیں، تو اور بھی بے حیائی کی بات ہے، ان سب سے احتراز لازمی ہے۔

عن جابر بن عبد الله رضی قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الغناء ينبت النفاق في القلب كما ينبت الماء الزرع. (شعب الإيمان، باب حفظ اللسان، دار الكتب العلمية بيروت ٤/٢٧٩، رقم: ٥١٠٠)

عن ابن مسعود رضی: الغناء ينبت النفاق في القلب كما ينبت الماء البقل.

(كنز العمال ١٥/٩٥، رقم: ٤٠٦٥١)

قال: إن الملاهي كلها حرام. قال ابن مسعود رضی، صوت اللهو والغناء ينبت النفاق في القلب كما ينبت الماء النبات......وفي البزازية استماع

صوت الملاهي كضرب قصب ونحوه حرام؛ لقوله عليه الصلاة والسلام: استماع الملاهي معصية، والجلوس عليها فسق، والتلذذ بها كفر.

(درمختار، كتاب الحظر والإباحة، قبيل فصل في اللبس، زكريا ٩/٥٠٤، كراچي٦/٣٤٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍شعبان المعظم ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۹۸۷/۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۷/۸/۱۶ھ

(۲۴) باب جھوٹ، غیبت، چوری وغیرہ کا بیان

جھوٹ بولنا

سوال [۱۱۰۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں ایک دوکان پر کام کرتا تھا، وہاں پر مجھ سے ایک چوری ہوگئی اور وہ چوری پکڑی گئی اور میں مالک دوکان سے یہ کہہ بیٹھا میں باوضو کلام پاک اٹھا کر کہہ سکتا ہوں کہ یہ چوری میں نے نہیں کی ہے، یہ مجھ سے بہت بڑا گناہ ہوگیا ہے، اور میں بہت پریشان چل رہا ہوں۔

المستفتی: مسرت حسین، جامع مسجد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جھوٹ اور چوری سے خالص دل سے توبہ کرلیں اور چوری کا سامان مالک کو واپس کردیں اور مالک سے معذرت خواہی کرلیں۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِکَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا. [سورۃ النساء:۱۷]

إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه، إن وجد المالک. (بذل المجهود، باب فرض الوضوء، جديد دار البشائر الإسلامية بيروت ۱/ ۳۵۹، قديم هندي ۱/ ۳۷، ايضاح النوادر ۱/ ۱۰۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ر ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۴۲۷۲)

جھوٹے کی پہچان کیا ہے؟

سوال [۱۱۰۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جھوٹے کی پہچان حدیث پاک کی روشنی میں کیا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: جھوٹے کی پہچان حدیث پاک میں یوں بیان فرمائی ہے کہ ہر سنی سنائی باتوں کو بیان کیا کرے اور تحقیق کا اہتمام نہ کرے۔

عن حفص بن عاصمؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: كفىٰ بالمرء كذبًا أن يحدث بكل ما سمعه. الحديث (مسلم شريف، مقدمه ۱/۸، دارالسلام رقم: ۵، سنن أبي داؤد، الادب، باب التشديد في الكذب، النسخة الهندية ۲/۶۸۱، دارالسلام رقم: ۴۹۹۲، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم بيروت ۱۵/۲۰، رقم: ۸۲۰۱، مشكوة شريف ۱/۲۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶۶۹/۲۷)

دوسرے کی بیوی سے زنا کرنا اور اس کے شوہر کے سامنے جھوٹی قسم کھانا

سوال [۱۱۰۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ فرمان اور نسیم دونوں دوست ہیں، ایک دن فرمان نسیم کی بیوی کے پاس تنہائی میں گیا اور اس سے زنا بھی کرلیا، اسی کے کچھ دیر بعد نسیم اپنی بیوی کے پاس آگیا، اس نے فرمان کو اپنی بیوی کے پاس پاکر زنا کا شک کیا، تو فرمان نے جھوٹ بولتے ہوئے منع کیا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا ہے، پھر نسیم نے زور دے کر فرمان سے قسم کھانے کو کہا اور یہ الفاظ

کہلوائے کہ اگر میں نے کوئی غلط کام کیا ہو، تو ایمان سے خارج ہو جاؤنگا، فرمان نے وضو کیا اور قرآن ہاتھ میں لے کر یہ الفاظ ادا کیے، فرمان اگر یہ قسم نہ کھاتا تو لڑکی کو طلاق ہو جاتی؛ اس لئے مجبوراً ایسی قسم کھالی۔

اب دریافت یہ کرنا ہے کہ اس طرح قسم کھالینے سے کیا ایمان باقی بچا، یا نہیں؟ اب کیا کرنا چاہئے جس سے یہ گناہ معاف ہو جائے؟ شرعی حکم تحریر فرمادیں۔

(۲) قسم کا کوئی کفارہ ادا کرنا پڑے گا یا نہیں؟

المستفتی: فرمان اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فرمان سے بڑے بڑے دو گناہ صادر ہوئے:

(۱) اس نے نسیم کی بیوی کے ساتھ اپنا منھ کالا کر کے عظیم ترین گناہ کا ارتکاب کیا، اگر اسلامی حکومت ہوتی، تو اس کے اوپر حد زنا جاری ہوتی اور ہندوستان؛ چونکہ اسلامی حکومت نہیں ہے؛ اس لئے اس پر سچی توبہ کرنا لازم ہے اور نسیم کی بیوی پر بھی سچی توبہ لازم ہے۔

(۲) اس نے دوسرا عظیم گناہ یہ کیا ہے کہ اس نے جھوٹی قسم کھائی اور جھوٹی قسم کا کفارہ نہیں ہوتا، اس کو یمین غموس کہتے ہیں اور زمانہ ماضی کی جھوٹی قسم کی وجہ سے سچی توبہ لازم ہے۔

عن عبد اللّٰہ بن عمروؓ، عن النبي صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: الکبائر الاشراک باللّٰہ، وعقوق الوالدین، وقتل النفس، والیمین الغموس. (صحیح البخاري، کتاب الأیمان والنذور، باب الیمین الغموس ۲/۹۸۷، رقم: ۶۴۱۹، ف: ۶۶۷۵، سنن الترمذي، أبواب التفسیر، من سورة النساء، النسخة الهندیة ۲/۱۳۱، دارالسلام رقم: ۳۰۲۰، إعلاء السنن، دار الکتب العلمیة بیروت ۱۱/۳۶۵، کراچي ۱۱/۳۴۲)

ثم لایخفي أن الحلف بالقرآن الآن متعارف، فیکون یمینًا.

(البحرالرائق، کتاب الأیمان، کوئٹه ۴/۲۸۶، زکریا ۴/۴۸۲)

وهي ثلاث غموس وهي حلفه علی أمر ماض، أو حال کذباً عمدًا

وحكمها الإثم ولا كفارة فيها إلا التوبة. (ملتقي الأبحر، دارالکتب العلمیة بیروت ۲/ ۲۰۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵ر شوال المکرّم ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۷۹۲/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۱۰/ ۱۴۳۳ھ

بیماری کی جھوٹی سند دکھا کر رخصت لینے اور تنخواہ کا حکم

سوال [۱۱۰۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بندۂ ناچیز کو صورت مسئولہ میں مندرجہ ذیل کچھ خلجان ہے، دفع فرمائیں کہ ایک دعوت وتبلیغ میں لگا ہوا آدمی کسی سرکاری دفتر میں ملازم ہے، مثلاً اس کے پاس کل ۲۰ر یوم کی رخصت اتفاقیہ تھی، جس میں اب ۱۰ر یوم کی رخصت اتفاقیہ باقی رہ گئی ہے اور اس کے پاس دو ماہ کی رخصت بیماری کی ہے۔

اب وہ ایک چلہ جماعت میں جائے، اس طرح کہ دس دن تو رخصت اتفاقیہ کی درخواست پیش کردے اور باقی ایک ماہ کی جبکہ وہ خود اچھا ہے، بیماری کا ڈاکٹری سرٹیفکٹ جھوٹا ادارہ میں پیش کردے، ظاہر ہے کہ ادارہ میں ابھی اسکی رخصت بیماری موجود ہے، اور اس نے جھوٹی ڈاکٹری سند پیش کی؛ اس لئے ادارہ والے اس سند کی وجہ سے تنخواہ نہیں کاٹتے اور اس کی ایک ماہ کی تنخواہ بھی جاری رہتی ہے، تو اس جھوٹی ڈاکٹری سند کی وجہ سے ایک ماہ کی تنخواہ ملنی ہے، وہ ایک ماہ کی تنخواہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے بیماری سے مراد قلبی وروحانی بیماری کو مراد لیا تھا؟ کیا یہ فلسفہ تنخواہ کے جواز کی دلیل بن سکتا ہے؟

ہمارے مدرسہ میں ۱۵ر شعبان سے تعطیل عام ہے، معلوم کرنا ہے کہ آپ مراد آباد میں کن تاریخوں تک رہیں گے؟

المستفتی: عتیق الرحمٰن، مدرسہ اسلامیہ دارالعلوم پیلی حویلی، کامٹی، ناگپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دفتر کے ملازم کو تنخواہ لینا اسی وقت جائز ہے؛ جبکہ وہ دفتر کی شرائط کے مطابق حاضر رہے؛ لہٰذا ڈاکٹری جھوٹی سند دکھا کر رخصت لینا اوران ایام کی رخصت کی تنخواہ لینا اس کے لئے جائز نہ ہوگا اور جو رخصت علالت ضابطہ اور قانون میں مقرر ہے، اس سے روحانی علالت مراد نہیں ہے؛ بلکہ جسمانی اور مادی علالت مراد ہے؛ اس لئے یہ سرٹیفکٹ تاویل کرکے جواز کے دائرہ میں نہیں آسکتا۔

عن أبي هريرةؓ، أن رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم قال: من حمل علينا السلاح، فليس منا ومن غشنا فليس منا. (مسلم شريف، كتاب الايمان، باب قول النبيؐ من غشنا فليس منا، النسخة الهندية ١/ ٧٠، بيت الأفكار رقم:١٠١)

والأجير الخاص هو الذي يستحق الأجر بتسليم نفسه في المدة. (مجمع الأنهر، كتاب الإجارة، دار الكتب العلمية بيروت ٣/ ٥٤٤، هداية اشرفي ديوبند ٣/ ٣١٠، هندية، زكريا قديم ٤/ ٥٠٠، زكريا جديد ٤/ ٥٤٣، الموسوعة الفقهية الكويتية ١/ ٢٨٨)

يجوز الكذب في ثلثة مواضع في الإصلاح بين الناس وفي الحرب ومع امرأته، قال في الذخيرة: أرادبها المعارض لا الكذب. (حاشية حموي على الأشباه قديم ٥/ ١٤٩) فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۸؍رجب المرجب ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۷۵۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸؍۷؍۱۴۲۳ھ

غیبت کس کو کہتے ہیں؟

سوال [۱۱۰۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ غیبت کس کو کہتے ہیں؟

المستفتی: عبدالرحمٰن، کھتولی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حدیث پاک میں غیبت کی تعریف یوں فرمائی گئی ہے کہ آدمی اپنے دینی بھائی کی ایسی بات دوسروں کے سامنے نقل کردے کہ جس کی بات بیان کی جارہی ہے، اس کو سن کر ایذا وتکلیف ہوتی ہو۔

عن أبي هريرةؓ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: اتدرون ما الغيبة؟ قالوا الله ورسوله أعلم. قال ذكرك أخاك بما يكره.

(مسلم شريف، كتاب البر والصلة، باب تحريم الغيبة، النسخة الهندية ٢/٣٢٢، بيت الأفكار رقم: ٢٥٨٩، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في الغيبة، النسخة الهندية ٢/٦٦٨، دارالسلام رقم: ٤٨٧٤، سنن الترمذي، أبواب البر والصلة، باب ما جاء في الغيبة، النسخة الهندية ٢/١٥، دارالسلام رقم: ١٩٣٤)

اعلم أن حد الغيبة أن تذكر أخاك بمايكرهه لو بلغه سواء ذكرته بنقص في بدنه، أو في نسبه، أو في خلقه، أو في فعله، أو في قوله، أو في دينه، أو في دنياه حتى في ثوبه وداره ودابته. (إحياء العلوم، امام غزاليؒ ٣/٧٧، مرقات شرح مشكوة، امداديه ٩/١٤٣، قديم ٤/٦٢٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ / جمادی الثانیہ ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۲۶۹/۲۶)

چغلخوری کرنا

سوال [۱۱۰۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جو شخص بے قابو زبان چلاتا ہے، خواہ مخواہ اس کی بات برائی کے ساتھ نقل کرنا ایسا شخص اقوال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں کیا کہلاتا ہے؟

المستفتی: عبدالرحمٰن، کھتولی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسے شخص کو حدیث پاک میں نمام اور قتات سے موسوم کیا گیا ہے، اور نمام اور قتات جنت اور نعمت ہائے جنت سے محروم ہوگا۔

قال حذيفة: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: لا يدخل الجنة نمام وقوله عليه السلام لا يدخل الجنة قتات. الحديث (مسلم شريف، كتاب الأيمان، باب بيان غلظ تحريم النميمة، النسخة الهندية ١/ ٧٠، بيت الأفكار رقم: ١٠٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۲۶۹)

غیبت کرنے اور سننے والا دونوں گنہگار ہیں

سوال [۱۱۰۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ غیبت کو حدیث پاک میں زنا سے بھی بدترین گناہ بتلایا گیا ہے، کیا یہ گناہ صرف غیبت کرنے والے کو ہی ہوگا یا سننے والے کو بھی جو بغور سنتا ہو؟

المستفتی: عبد الرحمٰن، کھتولی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیبت کو دلچسپی سے سننے والے کو بھی غیبت کا گناہ ہوگا۔

ان المستمع لا يخرج من إثم الغيبة إلا أن ينكر بلسانه، فإن خاف فبقلبه. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، زكريا ٩/ ٥٨٨، كراچي ٦/ ٤١٠، إحياء العلوم إمام غزاليؒ ٣/ ٧٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۲۶۹)

انسداد فتنہ کے لئے کافر کی غیبت کرنا

سوال [۱۱۰۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کیا کافر کا عیب بیان کرسکتے ہیں؟ جولوگوں کو دھوکہ میں ڈال رہا ہو، اگر ہم اس کے بارے میں کسی کو خبر نہ دیں، تو فتنہ ہوسکتا ہے۔

المستفتی: محمد فاروق اسماعیل، محلّہ: جعفر ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر کافر سے فتنہ کا خطرہ ہے، تو اس کے دھوکہ وفریب سے مسلمانوں کو باخبر کرنا اس غیبت میں شامل نہیں ہے، جس کی ممانعت آئی ہے؛ بلکہ حقیقت کا واضح کرنا ضروری ہے۔

بأن تذموهم وتسبوهم إذا لم يؤد ذلك إلى سب الله سبحانه.

(حاشية مشكوة ٢/٣٣٢)

جاهدو هم بهابأن تذموهم، وتعيبوهم، وتسبوا أصنامهم، ودينهم الباطل وبأن تخوّفو هم بالقتل والأخذ وماأشبه ذلك الخ.

(مرقات، كتاب الجهاد، ملتاني ٧/٢٨٨، بذل المجهود، كتاب الجهاد، باب كراهية ترك الغزو، جديد دارالبشائر الإسلامية بيروت ٩/٥٣، رقم الحديث: ٢٥٠٤، قديم هندي ٣/٤١١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/ ۱۷۱۳)

غیبت کی وجہ سے بدظن ہونا

سوال [۱۱۰۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ بکر نے خالد سے زید کے متعلق غلط بیانی کی، زید کے کریکٹر پر الزام لگایا؛ جبکہ زید عوام میں اور علماء کے طبقہ میں بھی معتمد علیہ ہے، اور خود عالم ہے اور بکر بھی عالم ہے؛ لیکن بکر کا علم علماء اور عوام دونوں میں غیر معتبر ہے اور بکر نے جو الزام لگایا، یا اس کی دلیل کا ثبوت بھی جو کہ شریعت میں مطلوب ہے، بکر کے پاس نہیں ہے، تو آیا خالد کو بکر کی بات کا اعتبار کرنا چاہئے یا نہیں؟ اگر خالد بکر کی بات سن کر زید کی طرف سے بدظن ہوتا ہے، تو خالد کے لئے کیا حکم ہے؟ اور بکر کے لئے کیا حکم ہے مطلع فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کسی باعزت شخص پر چاہے عالم ہو یا ان پڑھ بلا کسی ثبوت کے غلط گمان والزام قائم کرنا اور عیوب کا تجسس کرنا ناجائز اور حرام اور عنداللہ سخت عذاب کا مستحق ہوگا۔ قرآن کریم میں اسکی سخت ممانعت آئی ہے۔

نیز حدیث شریف میں عذاب ونجات کا مدار زبان کو قرار دیا ہے۔

قوله تعالیٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا. [الحجرات:١٢]

وقول عليه السلام عن عقبة بن عامرؓ قال: قلت يا رسول الله صلى الله! ما النجاة؟ قال املك عليك لسانک الحديث. (ترمذي شريف، أبواب الزهد، باب ما جاء في حفظ اللسان، النسخة الهندية ٢/٦٦، دارالسلام رقم: ٢٤٠٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ر شعبان المعظم ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۹۰۸/۲۶)

علامات نفاق کیا کیا ہیں؟

سوال[۱۱۰۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ منافق کی علامت حدیث میں کیا ہیں؟

المستفتی: عبدالرحمٰن، کھتولی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: حدیث شریف میں منافق کی علامات یوں بتلائی گئی ہیں کہ جب بات کرے، تو جھوٹ بولے اور جب وعدہ کرے، تو خلاف ورزی کرے اور جب امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔

عن أبي هريرةؓ، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: آية المنافق ثلث إذ حدث كذب، وإذا وعدا خلف، وإذا أؤتمن خان. (بخاري شريف، كتاب الايمان، باب علامة المنافق ۱/۱۰، رقم:۳۳، مسلم شريف، كتاب الايمان، باب خصال المنافق، النسخة الهندية ۱/۵٦، بيت الافكار، رقم: ۵۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ رجمادی الثانیہ ۱۴۱۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۲٦۹/۲٦)

دارالحرب میں بجلی چوری کرنا

سوال[۱۱۰٦۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر زید اس دارالحرب (ہندوستان) میں رہتے ہوئے، سرکار سے بجلی وغیرہ کی چوری کرلے تو کیا جائز ہے؟

المستفتی: محمد فیروز بدایوں، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہندوستان کے بارے میں تحقیقی بات یہی ہے کہ اب دارالحرب نہیں، جہاں کے غیر مسلموں کے مال مسلمانوں کے لئے حلال ہوں؛ بلکہ ہندوستان دارالأمان ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۹۰)

لو أجريت أحكام المسلمين، وأحكام أهل الشرك لا تكون دار حرب. (شامي، مطلب فيما تصير به دار الإسلام دار حرب، كراچي ٤/١٧٥، زكريا ٦/٢٨٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ١٠/٢٩٤)

اور اگر دارالحرب فرض بھی کرلیا جائے تب بھی غدر حرام اور ناجائز ہونے کی وجہ سے بجلی کی چوری ناجائز ہے۔

عن أبي هريرةؓ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من حمل علينا السلاح، فليس منا ومن غشنا فليس منا. (مسلم شريف، كتاب الايمان، باب قول النبيؐ من غشنا فليس منا، النسخة الهندية ١/٧٠، بيت الأفكار رقم: ١٠١، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في النهي عن الغش، النسخة الهندية ٢/٤٨٩، دار السلام رقم: ٣٤٥٢)

وإنما يحرم على المسلم إذا كان بطريق الغدر. (فتح القدير، باب الربا، دار الفكر بيروت ٧/٣٩، كوئٹہ ٦/١٧٨، زكريا ٧/٣٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ ذی قعدہ ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۳۷۲۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۱۱/۲۷ھ

بہو کا خسر کے زیورات چرانا

سوال [۱۱۰۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ مذکورہ تحریر جوایک مضمون کی شکل میں ہے، میں نے اپنے صاحبزادہ مولوی محمد انعام کو عالم دین بنایا، زمانہ تعلیم میں ان کی کڑی نگرانی رکھی اوران کی شادی کردی، پھر ملازمت دلائی، جب ساری ذمہ داریاں میری ختم ہوگئیں اور مجھ کو کچھ ناخلف اولاد نے میرے ساتھ بجائے حسن سلوک کے بدسلوکی کا ثبوت دیا ہے، جوحسب ذیل ہے۔

مولوی انعام صاحب ملازم تھے، اہلیہ کو وہاں رکھا تھا، مولوی انعام نے اطلاع کی، وہاں قیام کے دوران حالات نامناسب دیکھے، میں نے مولوی انعام سے کہا کہ بچوں کو روانہ کردو، مجھے انکارکردیا گیا، ایک شب گزرنے کے بعد مجھے تیارکردیا، اس نے لانے سے انکار کردیا، جوحالات دیکھ چکا تھا، اس کا صدمہ قلب پراثرانداز تھا، وہ یہ کہ دلہن پردہ کیا کرتی تھی، وہ گم کردیا، اس طرح ایک سال کا عرصہ ہوگیا، بعدایک سال مولوی انعام الحق صاحب باغوں والی تشریف لے آئے، گاؤں میں امامت شروع کردی، باغوں والی میں ایک شادی تھی، مولوی انعام کی اہلیہ نے کہا کہ اس شادی میں دوشب میں رہوں گی، میں نے اپنے خسر سے منع کردیا کہ آپ جانا، شام کو واپس آجانا، منع کرنے کی وجہ یہ تھی کہ جس جگہ شادی تھی، وہ جگہ اخلاقی اعتبار سے مشکوک تھی۔

جس کے کرنے کا ردعمل یہ ہوا کہ بہو نے کان کے بندے چوری ہوجانے کا شوشہ چھوڑ دیا، جس کی قیمت لگ بھگ تین چار ہزار روپیہ ہوگی، شام کومولوی انعام سے اس کا تذکرہ کیا گیا، انہوں نے فیصلہ کیا کہ ان کوان کے وطن بھیج دیا جائے، دونوں بچوں کی بیوی کا کچھ زیورمیرے پاس تھا، میں نے صندوق کھول کر بعد نماز عشاء ان دونوں میاں بیوی کے سامنے اپنے زیور کا جائزلیا، تو وہ صندوق میں موجودتھا، صبح کوان کی بیوی آٹھ بجے اپنے وطن روانہ ہوگئی۔ اورمیں نے دس بجے صندوق کھول کر پھر دیکھا، تواس میں وہ زیورنہیں تھا، اس کا تفصیلی فیصلہ محمد انعام کے پرچے سے معلوم ہوسکتا ہے۔

بہرحال بات بڑھ گئی، محمد انعام نے اپنی اہلیہ کو معاف کرنا چاہا؛ لیکن بات بڑھتی ہی گئی اور میں ان کو اور اس کے سسرال والوں کو گالی گلوج بکتا رہا، انعام کی طرف سے مجھے بتانے والوں نے بتایا کہ میرے والد میرے ساتھ نعمانی کو اغوا کرنا چاہتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ ناکارہ جیل میں قیدیوں کو اچھی بات بتلانے اور تبلیغ کرنے پر حکومت کی طرف سے مامور ہے، مجھے جیسے ہی یہ خبر ملی، تو میں نے حضرت مولانا محمد ایوب صاحب مدرس دارالعلوم میرٹھ کو اطلاع دی، انہوں نے محمد انعام کو اپنے مکان پر بلوا کر میرے آمنے سامنے فیصلہ دیا، جو ان کی تحریر میں حاضر خدمت ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

کچھ دن بعد میرے چچازاد بھائی کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا، ہم نے محمد انعام کی سسرال میں کوئی خبر نہیں کی۔ اور نہ ہی وہ اس سے قبل کبھی ہماری کسی موت میں شریک ہوئے، مگر شام کو دیکھا کہ محمد انعام مع اپنی اہلیہ کے اور خسر اور ساس کے حاضر ہے، مجھے وہ راستہ میں ملے، دعا سلام ومصافحہ کے بعد وہ چچا کے یہاں چلے گئے، شام کو دفن کے بعد وہ اپنے وطن واپس ہوگئے، رات کو میرے والد صاحب نے مجھ سے معلوم کیا کہ اسلام تم نے کیوں ان کو نہیں ٹھہرایا، میں نے گالی وغیرہ دے کر کہا کہ ابا جان جب وہ میرے مکان پر نہیں آئے اور نہ ہی مجھ سے بول چال کی، تو مجھے ان کو اپنے یہاں روکنے کا کیا حق ہے۔

بہرحال والد صاحب تو خاموش رہے لیکن یہ بات کسی صاحب نے محمد انعام سے بتلائی کہ تمہارے سسرال والوں کو خوب گالی دی جارہی ہیں، محمد انعام اگلے روز اپنے چچا کے یہاں آیا اور مجھے معلوم نہ ہوسکا کہ انہوں نے کیا کیا مجھ سے کہا، میں از خود اپنے چچا کے مکان سے مہمان اور ان کی دلجوئی کر کے واپس جارہا تھا، تو مجھے اپنے بھائی کے دروازہ سے یہ آواز سنائی دی کہ چچی میں اس کو گولی ماردوں گا اور مزید وہ الفاظ بھی سنے کہ جس کو میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ بہرحال مجھے پدری جوش آیا اور میں نے کہا کہ یہ کس کو کہہ رہا ہے، بس اتنے الفاظ کہنے تھے کہ اس نے فوراً میرا گریبان تھام لیا۔ اور میری

داڑھی پکڑ کر کھینچنی شروع کی، انہوں نے اتنی طاقت سے کام لیا کہ اگر خدا کا کرم نہ ہوتا، تو خدا شاہد ہے کہ محمد انعام نے یہ دل سے چاہا تھا کہ میری داڑھی کا ایک بال بھی باقی نہ رہے، کافی جھگڑنے کے بعد شور وشغب سن کر میرے چچازاد بھائی آئے اور انہوں نے میری جان بچائی، پھر میرے بھائی صاحب آئے اور وہ بال جو گر گئے تھے، اکٹھا کئے، جو ایک تولہ کے برابر ہوں گے۔ محمد انعام نے اپنی مسجد میں رات بھر پہرہ دیا اور اگلے روز صبح کو وہ مع سامان کے اپنی سسرال پھولاس اکبرپور چلے گئے۔

اب میرا یہ کہنا ہے کہ وہ محمد انعام اپنی اہلیہ کو طلاق دیں، اور چلے آئیں یا وہ سونا واپس کریں، تب معاف کیا جاسکتا ہے کہ ایسی زانی عورت کا ہمارے خاندان میں رہنا کسی طرح اچھا نہیں ہے۔ حضرت مفتی صاحب اس عورت پر کیا بھروسہ کیا جاسکتا ہے کہ جس نے تقریباً بیس ہزار روپئے کے زیورات کی چوری کی ہو۔ اور شرعاً قبیح اور برے کاموں میں کھلم کھلا مبتلا ہو، اگر اس کو معاف کرکے لایا بھی گیا، تو اس نے ہم کو زہر دیدیا، تو اس کی ذمہ داری کس پر ہوگی؟

حضرت مولانا موسیٰ صاحب امیر جماعت تبلیغ ضلع مظفرنگر کے پاس محمد انعام گیا اور معافی کے لئے کہا، میں نے انکار کردیا، تو حضرت مولانا موسیٰ صاحب نے ازروئے شریعت ایک فتوی پر اس کام کو مؤخر رکھا ہے کہ جو شارع علیہ السلام کا فیصلہ ہوگا، وہ ہم دونوں تسلیم کریں گے۔ ان شاءاللہ تعالیٰ۔

اب اس واقعہ کے اندر سوال طلب امر مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) جبکہ انعام کی بیوی نے میرے گھر کے تمام زیورات چوری کرکے بیس ہزار کا نقصان کیا ہے اور محمد انعام نے میری بےعزتی کی ہے، تو میرا انعام سے مطالبہ یہ ہے کہ یا تو تم اپنی بیوی کو طلاق دو، اور یا اس سے زیورات واپس لاؤ، تب تم کو معاف کیا جاسکتا ہے، اور صلح ہوسکتی ہے، آیا میرا اس سے یہ مطالبہ کرنا اور صلح کے لئے یہ شرائط قرار دینا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: حافظ محمد اسلام، باغوں والی

منجانب: دار العلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مذکورہ میں بیٹے نے باپ کے ساتھ جوگستاخیاں اور بدسلوکی کی ہے، یہ بہت ہی بڑا گناہ ہے، اورانتہائی بے باکی و بدنصیبی کی بات ہے۔ باپ کا مقام شریعت اسلام نے بہت ہی بلند کیا ہے، اب اگر واقعی وہ بہت شرمندہ ہے، اور معافی مانگ رہا ہے، تو معاملات کی صفائی اور حقوق کی ادائیگی ضروری ہے، اگر بیٹے کی بیوی نے زیورات چوری کئے ہیں، تو ان کی واپسی کو معافی سے پہلے شرط لگانا والد صاحب کا یہ فعل صحیح ہے، لڑکے کو اور اس کی بیوی کو چاہئے کہ وہ بیس ہزار روپئے کی نقصان کی تلافی کریں اور اس کے بعد دونوں سچے دل سے نادم ہوکر والد صاحب سے معافی مانگ لیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن، خیرآبادی
مفتی دار العلوم دیوبند
۱۸؍شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ

منجانب: مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: لڑکے پر واجب ہے کہ بلاکسی تاخیر کے باپ کے پیروں پر پڑ جاوے اور اپنی بدکرداری سے نادم ہوکر معافی مانگتا رہے؛ کیونکہ باپ کی بد دعا موٴخر نہیں ہوا کرتی۔ (مستفاد: معارف القرآن ۵/۴۶۴)

عن أبي هريرة رضـ، أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ثلاث دعوات مستجابات لا شك فيهن، دعوة الوالد، ودعوة المسافر،

ودعوة المظلوم. (سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب الدعاء بظهر الغيب، النسخة الهندية ١/ ٢١٤، دار السلام رقم: ١٥٣٦)

نیز باپ کا مذکورہ مطالبہ بھی صحیح ہے اور درست ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۴۵۲/۲۵)

جواب ثانی استفتاء نمبر الف ۱۴۵۲/۲۵ کا ہے

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر بیوی کا چوری کرنا شرعی شہادتوں سے ثابت ہوجائے، تو مسروقہ رقم کا مطالبہ کرنا درست ہے ورنہ نہیں۔ نیز اگر بیوی کو طلاق دینے سے گناہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ نہیں ہے، تو باپ کے حکم سے طلاق دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اگر گناہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہے، تو طلاق نہ دے چاہے باپ ناراض ہوجائے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۳۸/۵، ڈابھیل ۳۲/۱۹، امداد الفتاوی ۴۶۴/۴)

زنا کا الزام سخت خطرناک ہے، اگر چار چشم دید شرعی گواہوں سے ثابت نہ کرسکے، تو خسر کو اگر اسلامی حکومت ہوتی، تو ۸۰؍ کوڑے لگائے جاتے؛ چونکہ اسلامی حکومت نہیں ہے؛ اس لئے اپنے اس الزام سے نادم ہوکر توبہ کرلینا اور بہو سے معافی مانگنا خسر کے لئے لازم ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: والذين يرمون المحصنات، ثم لم ياتوا باربعة شهداء فاجلدوهم ثمانين جلدة ولاتقبلوا لهم شهادة أبدًا. [النور: ٤]

اور صرف شکوک وشبہات کی بناء پر تجسس کرنے کی قرآن میں وعید سخت آئی ہے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا. [سورة الحجرات: ١٢]

نیز گالی، بدگوئی، غیبت سخت حرام ہے۔

قال: رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يدخل الجنة نمام وقوله عليه السلام لا يدخل الجنة قتات. الحديث (مسلم شريف، كتاب الأيمان، باب بيان غلظ تحريم النميمة، النسخة الهندية ١/٧٠، بيت الأفكار رقم: ١٠٥)

اورلڑکے نے جو باپ کی داڑھی پکڑی ہے، یہ سخت گناہ ہےاور بدنصیبی کی بات ہے، اس پرلازم ہے کہ باپ کے پیروں پرگرکر معافی مانگے اور باپ پرلازم ہے کہ جب ندامت کے ساتھ معافی مانگے تو بلاکسی شرط کے معاف کردے، اللہ تعالیٰ کے یہاں معافی کے لئے کوئی شرط نہیں ہے۔

عن أبي عبيدة بن عبد الله، عن أبيهؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: التائب من الذنب كمن لا ذنب له. (سنن ابن ماجه، أبواب الزهد، باب ذكر التوبة، النسخة الهندية ٢/٣١٣، دارالسلام رقم: ٤٢٥٠، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ١٠/١٥٠، رقم: ١٠٢٨١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ رشوال المکرّم ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/ ۱۴۵۲)

بلاثبوت چوری کا الزام لگانا

سوال [۱۱۰۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ دو سگے بھائی اور والدہ ہیں تقسیم جائداد کے وقت لوگوں کے سامنے جب والدہ نے زیور تقسیم کے لئے دیا، تو مسلم نے بڑے بھائی زید سے پوچھا کہ بھائی زید جس وقت باہر گیا تھا، تبھی آپ کی والدہ نے کل زیور دکھا دیا تھا، کیا اس وقت کا یہ زیور اتنا ہی ہے جتنا پہلے تھا، زید نے کہا یہ کم ہے، لوگوں نے پوچھا کتنا کم ہے، کچھ ناپ تول یا اندازہ ہی بتائیے، تو زید

نے کہا کہ میں وزن وغیرہ نہیں بتاؤں گا، یہاں باقی زیورات والدہ کے پاس موجود ہیں، پوچھنے پر والدہ انکار کر دیتی ہیں، جس سے مسلم و والدہ دس سال سے آج تک لڑتے رہے، زید ہمیشہ اس طرح کہہ کر اور نفرت پیدا کر کے الگ ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں زید کا یہ فعل والدہ پر چوری کا الزام لگانا مسلم سے نفرت وغیرہ پیدا کرنا کیسا ہے؟ زید ایسے شخص کی امامت کیسی ہے؟

(۲) لوگوں نے فیصلہ دیا کہ زید و مسلم پہلے اپنے ماموں کو بلالائیں، اس کا بٹوارہ کل کر دیا جائے گا، مسلم کے جانے کے بعد زید نے محلے میں شور کر دیا کہ مسلم تالا توڑ کر زیور چرا لے گئے؛ جبکہ چراتے ہوئے زید نے نہیں دیکھا اور نہ ہی چشم دید گواہ ہی ملے، پھر زید نے شک کرتے ہوئے مسلم کے خلاف نام زد رپورٹ تھانہ پر کر دی، لوگوں کو جب معلوم ہوا، تو دیکھا کہ تالا نہیں؛ بلکہ کنڈا توڑا گیا ہے، اس پر لوگوں نے کہا سبھی لوگ قسم کھائیں کہ میں نے چوری نہیں کی ہے، اس پر مسلم نے کہا کہ ٹھیک ہے؛ لیکن قسم یہ کھائی جائے کہ نہ میں نے کنڈا توڑا ہے اور نہ کسی سے توڑوایا ہے، اور نہ توڑنے والوں کے بارے میں مجھے کسی قسم کا علم ہے، سبھی لوگوں نے کہا کہ ٹھیک ہے؛ لیکن زید نے قسم کھانے سے انکار کر دیا، کہا کہ میں قسم خود نہیں کھاؤں گا اور نہ میرے بچے ایسی صورت میں زید کی یہ حرکت چوری کا الزام لگا کر رپورٹ کرانا اور قسم بھی نہ کھانا اور چھوٹے بھائی کا حصہ نہ دینا کیسا ہے؟

(۳) علماء کرام کے فتوے پر عمل نہ کرنے والے کے لئے کیا حکم ہے؟ ایسے لوگوں کی امامت وغیرہ کیسی ہے؟

المستفتی: رشید احمد، بھنگا رشید بک ڈپو، چوک بازار، بھنگا، ضلع: بہرائچ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) نہ زید کے لئے بغیر ثبوت کے والدہ پر چوری کا الزام لگانا جائز ہے اور نہ مسلم کے لئے زید کی بے ثبوت بات کو اہمیت دے کر والدہ کے بارے میں بدگمانی اور نفرت قائم کرنا جائز ہے، دونوں پر توبہ کرنا لازم ہے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا. [سورة الحجرات: ۱۲]

(۲) اگر دونوں کوقسم کھانے پر فیصلہ دیا گیا ہے، اور زید قسم سے انکار کررہا ہے، تو شرعاً زید مجرم قرار پائے گا اور چوری کا حکم زید پر لگے گا؛ کیونکہ قسم سے انکار شرعاً اشیاء خود لینے پر اقرار ہوتا ہے۔

أن النكول دل على كونه باذلاً، أو مقرًا، إذلو لا ذلك لأقدم على اليمين إقامة للواجب ودفعًا للضرر عن نفسه فيترجح هذا الجانب.

(هداية، كتاب الدعوىٰ، باب اليمين اشرفي ديوبند۳/ ۲۰۳)

نیز چھوٹے بھائی کا حصہ نہ دینے والا غاصب اور فاسق ہے، اس کی امامت مکروہ ہے، اس پر واجب ہے کہ چھوٹے بھائی کا حصہ دیدے۔

عن عبدالله بن السائب بن يزيد عن أبيه عن جده، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لايأخذ أحدكم عصا أخيه لاعباأو جادًا، فمن أخذ عصا أخيه فليردها. (سنن الترمذي، كتاب الفتن، باب ماجاء لا يحل لمسلم أن يروع مسلماً، النسخة الهندية ۲/ ۳۹، دار السلام، رقم: ۲۱۶۰، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب مايأخذ الشيئ على المزاح، النسخة الهندية ۲/ ۶۸۳، دارالسلام رقم: ۵۰۰۳)

وعلى الغاصب رد العين المغصوبة، وقوله عليه السلام لا يحل لأحد أن ياخذ متاع أخيه لاعبًا ولاجادًا، فإن أخذه فليرده عليه. (هداية، كتاب الغصب، اشرفي ديوبند ۳/ ۳۷۳)

(۳) اگر علماء کے صحیح فتاوی پر عمل نہ کرتے ہوئے چھوٹے بھائی کا حصہ دبالیا ہے، تو وہ غاصب وفاسق ہے، اس کی امامت مکروہ تحریمی ہے۔

ولذا كره إمامة الفاسق ......ومفاده كون الكراهة في الفاسق

تحريمية. (طحطاوي على المراقي، فصل في بيان الأحق بالإمامة قديم١٦٥، جديد دارالكتاب ديوبند٣٠٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍ رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۹۶۵/۲۶)

خود پسندی اور تکبر کا حکم

سوال [۱۱۰۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جس مسلمان میں خود پسندی ہے وہ کیا ہے؟ کیا حکم لگ سکتا ہے، اس آدمی کے لئے بالتفصیل جواب سے نوازیں گے۔

المستفتی: عبدالحسیب، موضع: کاچی موہا، پوسٹ: ہری گرام، دیناجپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خود پسندی اور تکبر دونوں ہم مصداق ہیں۔

الكبر هو أن يرىٰ نفسه فوق غيره في صفة الكمال اعجابًا من نفسه. (قواعد الفقة، اشرفي ٤٣٩)

خود پسند اور متکبر شخص کا ٹھکانہ جہنم ہے، توبہ اور استغفار کرکے ایسے افعال شنیعہ سے باز آجانا لازم ہے۔

عن معاويةؓ، قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من أحب أن يمثل له الرجال قيامًا فليتبوّأ مقعده من النار. الحديث. (أبو داؤد شريف، كتاب الأدب، باب الرجل يقوم للرجال يعظمه بذالك، النسخة الهندية ٢/ ٧١٠، دارالسلام رقم: ٥٢٢٩، سنن الترمذي، كتاب الأدب، باب ماجاء في كراهية قيام الرجل للرجل، النسخة الهندية٢/ ١٠٤، دار السلام رقم: ٢٧٥٥، مسند أبي داؤد الطيالسي، دارالكتب العلمية بيروت١/ ٥٤٢، رقم: ١٠٥٣)

المرتبة الثانية أي من الإثم أن يتكبر بكبره (إلى قوله) فإذا مات إنعطف جميع همه منافرة له وموذية إياه وأحاطت به خطيئته من حيث لم يجد للخروج منه سبيلاً. (حجة الله البالغة ۱/ ۷۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ / جمادی الاولی ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/ ۷۰۶)

کسی کے متعلق بدگمانی رکھنا

سوال [۱۱۰٦٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کسی بھی سچ وحق بات کو جھوٹ بنانا یا جھوٹ سمجھنا فعل مردود ہے یا نہیں؟ برائے کرم قرآن پاک یا حدیث مبارک کا حوالہ تحریر کیجئے۔

المستفتی: شوکت علی، مقبرہ دوم، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: بلا کسی قوی دلیل کے مسلمان کی کسی بات کو جھوٹ بتانا یا سمجھنا جائز نہیں ہے، یہ اس کے ساتھ بدگمانی ہے، جس کی قرآن وحدیث میں سخت ممانعت آئی ہے۔ قرآن میں اس کو گناہ فرمایا گیا ہے اور حدیث شریف میں بدترین جھوٹ کہا ہے۔

قوله تعالیٰ: يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا. [الحجرات: ۱۲]

اس کے تحت احکام القرآن میں ہے۔

وكذلك سوء الظن بالمسلمين الذين ظاهرهم العدالة محظور عنه وهو من الظن المحظور المنهي عنه...... عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إياكم والظن فإن الظن أكذب الحديث فهذا من الظن

المحظور هو ظنه بالمسلم سوئكم من غير سبب يوجبه. (أحكام القرآن للجصاص، مطلب الظن على أربعة أضرب، سهيل اكيڈمي لاهور، ۳/۴۰۶، زكريا ديوبند ۳/۵۳۹)

عن الاعرج قال: قال أبو هريرة رضؓ: ياثر عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إياكم والظن، فإن الظن أكذب الحديث. (صحيح البخاري، كتاب النكاح، باب لا يخطب على خطبة أخيه ۲/۷۷۲، رقم: ۴۹۵۰، ف: ۵۱۴۳، صحيح مسلم، كتاب البر والصلة، باب تحريم الظن والتجسس، النسخة الهندية ۲/۳۱۶، بيت الأفكار رقم:۲۵۶۳، مسند أبي داؤد الطيالسي، دار الكتب العلمية بيروت ۳/۲۰، رقم:۲۶۵۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶؍رجب المرجب ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/۶۲۴۵)

کسی شخص کو اس کی بیوی کے متعلق بدگمانی میں ڈالنا

سوال [۱۱۰۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ احقر کی بیوی کے بارے میں چار پانچ اشخاص کا یہ کہنا ہے کہ تمہاری بیوی شادی سے قبل بدچلن تھی، جب سے میں نے یہ بات سنی ہے، اس کی طرف سے بدگمانی میں مبتلا ہوں، بہت پریشان ہوں، معلوم یہ کرنا ہے کہ ان کہنے والوں کا شریعت میں کیسا حکم ہے؟ اور بدگمانی کا علاج تحریر فرمادیں۔

المستفتی: ابصار احمد، حسن پور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جو لوگ آپ کی بیوی کو بدچلن کہتے ہیں، تو اگر اس کے اندر یہ صفت ہے، تو یہ لوگ اس کی غیبت کرتے ہیں اور اگر یہ صفت نہیں ہے، تو اس پر بہتان لگاتے ہیں، غیبت اور بہتان دونوں ہی حرام ہیں۔

عن أبي هريرةؓ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: أتدرون ما الغيبة؟ قالوا: الله ورسوله أعلم، قال: ذكرك أخاك بما يكره، قيل: أفرأيت إن كان في أخي ما أقول؟ قال: إن كان فيه ما تقول فقد اغتبته، وإن لم يكن فيه فقد بهته. (صحيح مسلم، كتاب البر والصلة، باب تحريم الغيبة، النسخة الهندية٢/ ٣٢٢، بيت الأفكار رقم:٢٥٨٩، سنن أبي داؤد، باب في الغيبة، النسخة الهندية ٢/٦٦٨، دارالسلام رقم:٤٨٧٤، سنن الترمذي، باب ماجاء في الغيبة، النسخة الهندية ٢/١٥، دارالسلام رقم:١٩٣٤)

کسی سے بدگمانی نہیں کرنی چاہئے، بدگمانی کرنا گناہ ہے، ہوسکتا ہے آپ کی بیوی نے اب توبہ کرلی ہو،قرآن کریم میں ہے۔

اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْم. [الحجرات: ١٢] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍محرم الحرام ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲؍ ۴۶۱۴)

حلف لینے کے بعد بھی بدگمانی کرنا

سوال [۱۱۰۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص جو کہ مسلم ہے اور اس نے اپنی اہلیہ سے اس کی پاکیزگی کردار کی یقین دہانی کے لئے قرآن کریم کی قسم کھلوائی اور کہا کہ قرآن کریم کی قسم کھاؤ کہ میں پاک ہوں، اس کی اہلیہ نے اس طرح قرآن کریم کی قسم کھا کر یقین دہانی کرائی؛ لیکن وہ شخص اس قسم کے بعد بھی اپنی اہلیہ پر شک کرتا ہے، اور خود وہ اپنے والد محترم سے اہلیہ کے کردار پر مختلف قسم کے طعنہ وجملہ کسی کرتا رہتا ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں مفتیان کرام وعلماء عظام شرعی طور پر کیا فرماتے ہیں؟ واضح رہے کہ اہلیہ اس وقت قرآن کی تلاوت کر

رہی تھی اوراس پر ہاتھ رکھوا کرقسم لی گئی تھی۔

المستفتی: محمد حنیف، ساکن: قاضی ٹولہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب بیوی نے حلفیہ بیان دیا ہےاور پھر بھی شوہر اپنی بیوی کے بارے میں شک کرر ہا ہے،تواس حرکت اور خیال کی وجہ سے شوہر گنہگار ہوگا۔ قرآن کریم میں اس کی سخت ممانعت آئی ہے؛ بلکہ بیوی کی دل جوئی کرنا شوہر پر لازم ہے۔

اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْم. [الحجرات:۱۲] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ رشوال المکرّم ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/۳۴ ۵۹۰۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۱۰/۲۶ھ

بدعہدی کرنا گناہ کبیرہ ہے

سوال [۱۱۰۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی سے تقریباً پچاس ہزار روپیہ بطور قرض طلب کئے کہ میں اپنے لڑکے کا مکان فروخت ہونے پر لوٹا دوں گا، چھوٹے بھائی نے رقم کا انتظام ہونے پر بڑے بھائی کو رقم دیدی، اپنے لڑکے کے لئے مکان خرید نے کی بات کہہ کر رقم جو قرض لی تھی چھوٹے بھائی نے ارادہ کیا کہ آپ مکان مجھے فروخت کردو، جو رقم دوسرا دے رہا ہے، وہ مجھ سے لے لو، چھوٹے بھائی نے انتظام ہونے پر رقم یہ کہہ کر دی کہ موجودہ مکان آپ کے بیٹے کا میں خرید لوں، تو کیا ٹھیک ہے، بڑے بھائی راضی ہوگئے۔

اب یہ رقم بطور قرض نہ ہوتے ہوئے پیشگی تسلیم کر لی گئی، چند روز بعد انہوں نے مکان فروخت کرنے سے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ مجھ کو دوسرا شخص مکان کی رقم زیادہ دے رہا ہے،

کیا یہ عہد شکنی نہیں ہے؟ چھوٹے بھائی نے کہا کہ جو رقم دوسرا دے رہا ہے، دس ہزار روپیہ زائد میں دیتا ہوں، بڑے بھائی راضی ہوگئے؛ لہٰذا وقت کا تعین کر دیا گیا، رقم کی ادائے گی کا اس درمیان مکان کی بجلی کا بل حتی کہ مکان کا کرایہ بھی چھوٹا بھائی کرتا رہا ہے۔ اب اچانک پھر عہد شکنی کرتے ہوئے مکان بیچنے سے انکار کر دیا ور کہا کہ مجھے مکان نہیں فروخت کرنا ہے، میں تم کو رقم واپس کر دوں گا، اتفاقاً چھوٹے بھائی کی دختر سخت علیل ہوگئی، چھوٹے بھائی کے مطالبہ کے بغیر بڑے بھائی نے ہمدردی جتاتے ہوئے پچیس ہزرا روپئے علاج معالجہ کے لئے دیے اور کہا کہ حساب پھر ہو جائے گا۔

اللہ کو منظور یہی تھا چند روز بعد چھوٹے بھائی کی جوان دختر اللہ کو پیاری ہوگئی، اسی روز اخراجات کے پیش نظر از راہ ہمدردی بڑے بھائی نے بنا مطالبہ کے چھوٹے بھائی کو پچیس ہزار روپیہ پھر دیدیئے اور کہا کہ حساب پھر ہو جائے گا، چھوٹا بھائی یہی سمجھتا رہا کہ بڑے بھائی ہمدردی کر رہے ہیں، چند روز بعد غم ہلکا ہونے پر چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی سے بات کرنی چاہی کہ مکان کی بقیہ رقم لیلواور اپنی رقم بھی لیلو، تو بھائی نے بات کرنے سے انکار کر دیا کیا یہ عہد شکنی نہیں ہے؟ اگر ہے تو عہد شکنی کی پامالی پر شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: قاری حسین، ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں جو لکھا گیا ہے، اگر وہ واقعہ کے مطابق صحیح ہے، تو بڑے بھائی کی طرف سے بار بار کی بدعہدی ہوئی ہے اور بدعہدی کا بہت سخت گناہ ہے، بڑے بھائی کے اوپر لازم ہے کہ اللہ سے سچی توبہ کرے اور چھوٹے بھائی سے بھی معذرت خواہی کرے حدیث شریف میں بدعہدی کرنے والے کو بددین کہا گیا ہے۔

حدیث شریف ملاحظہ فرمائیں:

عن عبد اللہؓ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: لا أیمان لمن

لأمانة له، ولادين لمن لا عهدله، والذي نفسي بيده، لا يستقيم دين عبد حتى يستقيم لسانه، ولايستقيم لسانه حتى يستقيم قلبه، ولا يدخل الجنة من لايأمن جاره بوائقه. (المعجم الكبير، للطبراني، داراحياء التراث العربي بيروت ۱۰/۲۲۷، رقم: ۱۰۵۵۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/صفر المظفر ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۸۸۴/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۲/۷ھ

وعدہ خلافی کرنا گناہ کبیرہ ہے؟

سوال [۱۱۰۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حبیب اللہ خاں، سعد اللہ خاں، انیس خاں، جاوید خاں نے مل کر ایک شخص کے ساتھ کاروبار کیا، پھر جس کے ساتھ کاروبار کیا تھا، وہ شخص ساری رقم لے کر بھاگ گیا، تو ان لوگوں نے اس کے گھر جا کر اس سے ملاقات کی سمجھایا، تو اس نے وعدہ کیا کہ ہم روپیہ دیدیں گے؛ لیکن پھر وعدہ خلافی کردی، کئی بار وعدہ کر کے توڑ دیا، تو عرض یہ ہے کہ ایسے شخص کے بارے میں شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا شرعاً اس شخص کو ادا کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اور اگر نہ ادا کرے تو آخرت میں کیا سزا ہوگی؟

المستفتی: حبیب اللہ، محلّہ گھیر سخی، رام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: وعدہ خلافی کرنا بہت بری چیز ہے، آپ ﷺ نے علامات منافقین میں سے ایک علامت یہ بیان فرمائی ہے کہ جب وعدہ کرے، تو وعدہ خلافی کرے۔

أربع من كن فيه كان منافقًا خالصًا، ومن كانت فيه خصلة منهن

کـانت فيه خصلة من النفاق حتى يدعها إذا اؤتمن خان، وإذا حدث كذب، وإذا عـاهد غدر وإذا خاصم فجر. (صـحيـح البخاري، كتاب الإيمان، با ب علامة الـمـنـافـق ١/ ١٠، رقـم:٣٤، صـحيـح مسلم، كتاب الإيمان، باب خصال المنافق، النسخة الهندية١ /٥٦، بيت الأفكار رقم:٥٨، مشكوة شريف١٧)

اور اگر ایک شریک دوسرے شریک کے مال کو یا کوئی حق زبردستی لے لیتا ہے، تو اس کے بارے میں حدیث شریف میں سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں؛ چنانچہ ایک روایت میں مروی ہے کہ ایک برائی کے بدلہ میں قیامت کے دن اس کی مقبول نیکیاں لے لی جائیں گی، اگر نیکیاں نہیں ہیں، تو اس کے گناہ سر ڈال دیئے جائیں گے، یہاں تک کہ وہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا اور یہ حقوق العباد کے قبیل کی چیز ہے، اس میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے؛ لہٰذا اس بھائی کو چاہئے کہ اپنے شریک کے حصہ کو وعدہ کے مطابق دیدے اور اپنے آپ کو آخرت کے وبال سے بچالے۔

عن أبي هـريرةؓ، أن رسـول الله صـلـى الله عـليـه وسلم قال: أتدرون مـاالـمـفلس قالوا: المفلس فينا من لا درهم له، ولامتاع، فقال: إن المفلس مـن أمتـي مـن يـأتـي يوم القيامة بصلوة، وصيام، وزكوة، ويأتي قد شتم هذا وقـذف هـذا وأكـل ما ل هذا الحديث. (مسـلـم شـريف، كتاب البر والصلة، باب تحريم الظلم، النسخة الهندية٢ /٣٢٠، بيت الأفكار رقم:٢٥٨١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ ؍ جمادی الاولی ۱۴۱۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳ ؍ ۵۷۵۷)

مدرسہ کے نام پر کم قیمت پر زمین خرید کر اپنے نام پر زیادہ قیمت میں بیچنا

سـوال [۱۱۰۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ ہمارے شہر میں ایک دینی ادارہ ہے، جس کے قریب ہماری کاشت کی زمین تھی، اس ادارہ کے مہتمم اور ذمہ دار حضرات نے ہم سے ملت کی لڑکیوں کی دینی تعلیم وتربیت کی اشد ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے، ایک لڑکیوں کا مدرسہ قائم کرنے کے عزم کا اظہار کیا اور اس نیک مقصد کے لئے ہماری زمین رعایتی قیمت پر ادارہ کو دینے کے لئے زور دیا ہم نے اسے کار خیر اور ثواب جاریہ مان کر، ان حضرات کے بیان پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی زمین برائے نام قیمت لے کر ذمہ دار حضرات کے حوالہ کردی ادھر گذشتہ چند برسوں میں اسی علاقہ میں رہائشی کالونیاں بننے کی وجہ سے زمین کی قیمتوں میں بے انتہا اضافہ ہوگیا، جس سے ان حضرات کی نیت خراب ہوگئی اور انہوں نے وہ زمین جو خالص مدرسہ (لڑکیوں کے لئے) ہم سے برائے نام قیمت پر خریدی تھی، اسے اونچی قیمت پر پلاٹ کاٹ کر فروخت کردی۔

دریافت طلب امور یہ ہیں کہ:

(۱) ذمہ دار حضرات کا یہ فعل شرعی حیثیت سے کیسا ہے؟

(۲) یہ بدعہدی اور دھوکہ دہی ہے یا نہیں؟

(۳) اس طرح کمایا گیا منافع حلال ہے یا حرام؟

(۴) اس منافع کو نیک کام میں خرچ کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

(۵) اس صورت میں ہمیں ثواب ملے گا یا نہیں؟

(۶) اس قسم کے لوگوں کو جو دینی ادارہ چلا رہے ہیں، اس کا تعاون کرنا چاہئے یا نہیں کیونکہ اس ادارہ کا حساب وکتاب بھی پابندی سے شائع نہیں کیا جاتا؟

المستفتی: اصغر پٹیل، نور پٹیل

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب دینی ادارہ ہی قائم کرنے کے نام سے زمین خریدی گئی ہے، تو اس زمین پر دینی ادارہ ہی قائم کرنا لازم تھا، اس میں دوسرا کام

کرنا یااس کوفروخت کر کے نفع حاصل کرنا دھوکہ دہی اور خیانت ہے، ہاں البتہ اگرگراں قیمت میں اس کوفروخت کر کے اسی رقم سے دوسری مناسب زمین خرید کر دینی ادارہ قائم کرتا ہےتا کہ ادارہ کا زیادہ فائدہ ہو،تو اس کی گنجائش ہے۔اورآپ کے ثواب میں کمی نہ ہوگی ؛ کیونکہ آپ ہی کی زمین کے بل بوتے پر دوسری زمین لی گئی ہے؛ لیکن اگر ایسا پروگرام نہیں ہے؛ بلکہ صرف ذاتی منافع کے لئے فروخت کردیا ہے،تو وہ لوگ گنہگار ہوں گے، اب اس میں کون سی صورت پیش آئی ہے،آپ خود دیکھ لیں اور زمین جس کے نام سے خریدی ہے،اس کے لئے منافع تو حلال ہےاوراس کی رقم دینی کام میں بھی لگانا جائز ہے، مگر دھوکہ دہی اور بدعہدی کی وجہ سے وہ لوگ گنہگار ہوں گےاور اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں دینی ادارہ کا تعاون نہ کرنا ہی بہتر ہے، پتہ نہیں اس پیسہ کا کیا کریں گے؟ مسلمانوں پرشرائط کی پابندی لازم ہوتی ہے۔

قال رسول الله عليه وسلم: المسلمون عند شروطهم. الحديث

(ترمذي شريف، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن النبي صلى الله عليه وسلم في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دار السلام رقم:۱۳۵۲)

اس سےتمام سوالات کےجوابات واضح ہوگئے۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیراحمدقاسمی عفااللہ عنہ
۲۳رشوال المکرّم ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر:الف ۳۳/۵۴۷۱)

الجواب صحیح:
احقرمحمدسلمان منصورپوری غفرلہ
۲۳/۱۰/۱۴۱۸ھ

فراڈ کر کےاسکول کے نام پرحکومت سے رقم لینا

سوال[۱۱۰۷۲]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) ایک شخص ایک مذہبی اسکول کے نام پر ہر ماہ حکومت سے ایڈ لے کر، اسکول چلاتا ہے؛لیکن اسکول میں موجودطلبہ اورٹیچرس کم ہیں اورانہیں حکومت کے ریکارڈ میں

زیادہ دکھایا گیا ہے اور اسی حساب سے اسے حکومت سے رقم ملتی ہے؛ بلکہ ٹیچر تو دوسرے اسکول میں ۲۴ر گھنٹہ کے ملازم ہیں، ان کے نام پر بھی وہ شخص ہر ماہ حکومت سے تنخواہ وصول کرتا ہے، تو کیا حکومت سے اس طرح فراڈ کر کے رقم لینا اور اس کو اسکول اور خاص کر اپنے ذاتی خرچ میں لانا شرعاً جائز ہے۔

(۲) اور اگر جائز نہیں ہے، تو پھر علماء کو اس شخص کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہئے، اس سے دوستی رکھنا کیا مداہنت فی الدین نہیں ہے۔

(۳) نیز ایسے شخص کو کسی شرعی کمیٹی کا رکن یا ممبر بنانا شرعاً جائز ہے؟ ایسے ہی جس ملازم کے نام پر وہ شخص رقم لیتا ہے اور وہ اسکول میں کچھ کرتا بھی نہیں، تو کیا شرعاً اس ملازم کی کچھ پکڑ ہے یا اس پر کوئی گناہ نہیں؛ جبکہ اسے اس کی خبر ہے۔

المستفتی: خان مشینری اسٹور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اس طرح جھوٹ اور فریب دے کر حکومت سے اسکول کے نام پر رقم حاصل کرنا نا جائز ہے، اس خیانت میں دستخط کرنے والے ملازم بھی شامل ہو جائیں گے اور گناہ کا وبال ان پر بھی ہوسکتا ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۴/۶ ۱۵، جدید ڈابھیل ۱۵/ ۵۹۱)

عن أبي هريرةؓ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من حمل علينا السلاح فليس منا، ومن غشنا فليس منا. (صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب قول النبيؐ من غشنا فليس منا، النسخة الهندية ١/ ٧٠، بيت الأفكار رقم: ١٠١)

ولا يولي إلا أمين قادر بنفسه، أو بنائبه؛ لأن الولاية مقيدة بشرط النظر، وليس من النظر تولية الخائن؛ لأنه يخل بالمقصود. (الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٤/ ٢٠٧، شامي، كراچي ٤/ ٣٨٠، زكريا ٦/ ٥٧٨)

علماء کرام حسب استطاعت اس کو اس امر منکر سے باز آجانے کی تلقین کر سکتے ہیں اور ایسے خائن شخص کو شرعی کمیٹی کا رکن بنانا جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱؍۳۹۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲؍۳؍۱۴۱۵ھ

فرضی کاغذات رکھوا کر پیسہ لینا اور دھوکہ دینا

سوال [۱۱۰۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں ایک سرکاری ملازم ہوں، ہماری مقامی حکومت مہاراشٹر درشن کے لئے خرچ دیتی ہے، جس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ آپ پہلے مہاراشٹر کے کسی بھی ہندو مقام پر جا کر آئے، اس کے بعد اس سفر میں ہوئے خرچ کو حکومت کو پورے ثبوت کے ساتھ پیش کریں حکومت اس کو منظوری دے کر اتنی ہی رقم تنخواہ کے علاوہ دیتی ہے۔ ہر تین سال میں ایک بار کر سکتے ہیں؛ لیکن ہمارے یہاں ۱۵؍فیصد کمیشن پر محکمہ والے فرضی کاغذات پیش کر کے اس طرح کے بل ہم کو ڈالنے پر لگاتے ہیں، جس کے لئے ہم کو کوئی کاغذی ثبوت پیش نہیں کرنا پڑتا ہے، محکمہ والے خود فرضی کاغذات پیش کر دیتے ہیں، جس کے لئے وہ ۱۵؍فی صد رقم پورے بل کی وہ لے تے ہیں؛ جبکہ ہم کسی بھی مقام پر جا کر نہیں آئیں ہوتے ہیں، تو ایسا کرنا کیسا ہے؟ کیا اس طرح کی رقم کو ہم اپنی ذات پر خرچ کر سکتے ہیں؟ رہنمائی فرمائیں۔

المستفتی: مبین شیخ، شیر پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ آپ ان مقامات پر نہیں گئے، جہاں جانے کی وجہ سے وہ رقم ملتی ہے اور جب آپ ان مقامات پر نہیں گئے، تو محض فرضی طور پر اپنا سفر کاغذ پر دکھا کر سرکار سے اس کے بدلہ روپیہ لینا جائز نہیں ہے

اور یہ حکومت کے ساتھ دھوکہ دھڑی ہے، اس طرح حاصل کی ہوئی رقم کا اپنی ذات پر خرچ کرنا بھی جائز نہیں ہے؛ بلکہ اس رقم کو بلانیت ثواب فقراء پر تقسیم کرنا لازم ہے، اسی طرح انکم ٹیکس، سیل ٹیکس، رجسٹری فیس وغیرہ میں بھی اس نیت سے دے سکتے ہیں کہ جو پیسہ ہم واپس کررہے ہیں، یہ پیسہ ہمارے پاس سرکار کی طرف سے ناجائز طریقہ پر آیا ہے، پھر آئندہ اس طریقہ سے کوئی رقم حاصل نہ کی جائے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ليس منا غش. (أبوداؤد، كتاب البيوع، باب في النهي عن الغش، النسخة الهندية ٢/٤٨٩، دار السلام رقم:٣٤٥٢)

الأجرة إنما تكون فى مقابلة العمل. (شامي، كتاب النكاح، باب المهر، كراچي ٣/١٥٦، زكريا ٤/٣٠٧)

لايجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحدٍ بغير سبب شرعيٍ. (شامي، كتاب الحدود، مطلب في التعزير بأخذ المال، كراچي ٤/٦١، زكريا ٦/١٠٦)

من كان عنده مالٌ خبيث ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، جديد دار البشائر الإسلامية بيروت ١/٣٥٩، قديم هندى ١/٣٧)

من اكتسب مالا بغير حق......ففي جميع الأحوال، المال الحاصل له حرام عليه؛ ولكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه، ويجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك. (بذل المجهود، هندى ١/٣٧، جديد دار البشائر الإسلامية بيروت ١/٣٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۳۹۵/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۴/۳ھ

بیماری کا فرضی سرٹیفکٹ پیش کرنا

سوال [۱۱۰۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں ایک ذاتی ادارے کے سرکاری اسکول میں صدر مدرس ہوں ادارہ بہت بڑا ہونے کی وجہ سے ہماری نگرانی کے لئے ایک افسر مقرر کیا ہے، جو ہماری نگرانی کے ساتھ ساتھ ہماری چھٹی کی درخواست بھی منظور کرتا ہے۔

گذشتہ سال مجھے میرے حضرت مولانا شیر محمد صاحب مکرانی کے ساتھ مدینہ منورہ کا حضور ﷺ کی قبر کی زیارت کے لئے سفر کرنا تھا، اس سفر کے لئے ۱۳/ دن لگنے والے تھے، اس کے لئے میں نے جب درخواست دی، تو اس افسر نے یہ کہہ کر نامنظور کردی کہ آپ صدر مدرس ہیں؛ اس لئے آپ کو چھٹی لمبی نہیں دی جاسکتی ہے۔ جس ادارہ میں میں کام کرتا ہوں اسے ایک غیر مسلم ٹرسٹ چلاتا ہے اور افسر بھی غیر مسلم ہے، اس کے بعد میں نے جھوٹا عریضہ دیا کہ میرے ہاتھ میں تکلیف ہے، اس کے علاج کے لئے مجھے ۱۵/ روز کی چھٹی چاہئے، اس کے لئے بھی انہوں نے صرف پانچ دن چھٹی منظور کی، میں اس چھٹی کی منظوری کے ساتھ سفر میں روانا ہوگیا، اور پہلے گھر میں ایک عریضہ دیا کہ وہ پانچ دن کے بعد اسے پوسٹ سے اس افسر کو روانہ کردے، میں سفر سے واپس آیا، تو معلوم ہوا کہ افسر نے بعد والے عریضہ کو منظور نہیں کیا، میں اس سے ملنے گیا، تو اس وقت ساری بات سچ سچ بتادی، اس نے کہا کہ ٹھیک ہے میں پورے ۱۵/ دن کی چھٹی منظور کرتا ہوں، دوسرا عریضہ دے دو؛ لیکن آئندہ اس طرح کی غلطی مت کرنا۔

اس سال مجھے میرے حضرت والا کے ساتھ رمضان کا پہلا عشرہ گزارنا تھا، اس کے لئے میں نے ۱۲/ دن کی چھٹی کا عریضہ دیا، تو انہوں نے صرف پانچ دن کی چھٹی منظور کی اس طرح مجھے زیادہ دن کی چھٹی نہیں مل پائی، اگر میں ان جیسے کاموں کے لئے بیماری کا بہانہ کر

کے چھٹی لوں اور بعد میں فرضی سرٹیفکٹ دے دوں، تو کیسا ہوگا؟ کیا ایسا کرنا جائز رہے گا؟ رہنمائی فرمائیں۔

المستفتی: مبین الدین، شیر پور، دھولیہ (مہاراشٹر)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آنجناب کا مذکورہ کاموں کے لئے بیماری کا بہانہ کر کے چھٹی لینا اور بعدہ فرضی سرٹیفکٹ پیش کرنا یہ جھوٹ اور دھوکہ پر مشتمل ہے اور یہ دونوں چیزیں اسلام میں حرام ہیں، بریں بناء اس کی شریعت میں گنجائش نہیں ہے، جو کچھ ہو چکا ہے، اس سے سچے دل سے توبہ کریں۔

عن ابن عمرؓ عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إذا كذب العبد تباعد عنه الملك ميلا من نتن ما جاء به. (سنن الترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الصدق والكذب، النسخة الهندية ۲/۱۸، دارالسلام رقم، ۱۹۷۲)

عن أبي هريرةؓ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من حمل علينا السلاح فليس منا، ومن غشنا فليس منا. (مسلم شريف، كتاب الأيمان، باب قول النبيؐ من غشنا فليس منا ۱/۷۰، بيت الأفكار، رقم: ۱۰۱، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في النهى عن الغش، النسخة الهندية ۲/۴۸۹، دارالسلام رقم: ۳۴۵۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ ذیقعدہ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۲۸۴/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۱۱/۳ھ

ماموں کا وعدہ خلافی کرنا اور بھانجہ کو اس کی دوکان نہ دینا

سوال [۱۱۰۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ احمد کی دوکان جو کہ اس کے والد نے چالیس سال قبل کرایہ پر حاصل کی تھی، ۱۵؍سال کرنے کے بعد اس کے والد کا انتقال ہوگیا، پھر احمد کی والدہ نے اپنے حقیقی بھائی کو وہ دوکان اس معاہدہ پر دیدی کہ جب میرا لڑکا احمد دوکان کرنے کے لائق ہوگا، تو انہیں دوکان واپس کرنی ہوگی؛ لیکن نامعلوم وجہ کی بنا پر احمد کے بڑے ماموں دوکان نہ کرسکے اور چابی دوکان کی پانچ سال کرنے کے بعد احمد کی والدہ کو دیدی۔

پھر تمام لوگوں کے بیچ یہ طے پایا کہ احمد کے چھوٹے ماموں دوکان اس وقت تک کریں جب تک احمد دوکان کرنے کے لائق نہیں ہوتا ہے اور جب احمد دوکان کرنے کے لائق ہوگا، تو انہیں احمد کو دوکان واپس کرنی ہوگی، اس جز کی وضاحت احمد کی والدہ نے کر رشتہ داروں واعزاء کے سامنے بھی کی تھی، اسی آپسی معاہدۂ زبانی پر یقین وخلوص کی بنا پر احمد کی دوکان کی چابی احمد کی والدہ نے اپنے چھوٹے بھائی کو دیدی۔ اب احمد اپنی اور اپنی بہنوں کی کفالت تقریباً چار سال سے خود کررہا ہے اور اس کے پاس کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے۔

اب اسے دوکان کی اشد ضرورت ہے، والدہ کا بھی انتقال ہوچکا ہے، احمد نے اپنے ماموں صاحب سے دوکان کا مطالبہ کیا، اب احمد کے ماموں صاحب دوکان دینے میں ٹال مٹول کررہے ہیں اور مصنوعی کلمات جوڑ کر احمد کو گمراہ کررہے ہیں، اب احمد کے سامنے روزی روٹی کا مسئلہ درپیش ہے اور احمد بے حد پریشان ہے، آپ احمد کے لئے راستہ شرعی اختیار کرنے کے لئے رہنمائی فرمائیں۔

المستفتی: احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب احمد کی والدہ نے احمد کے ماموں کو اس معاہدہ پر دوکان کو دیا تھا کہ جب تک احمد دوکان کرنے کے لائق نہ ہوجائے، اس وقت تک تم دوکان کرو، اور جب احمد دوکان کرنے کے لائق ہوجائے، تو احمد کو دوکان واپس کرنی ہوگی، تو حسب معاہدہ اب جبکہ احمد دوکان کرنے کے لائق ہوگیا، تو احمد کو دوکان واپس کرنی لازم

ہےاور احمد کے ماموں کا ٹال مٹول اور وعدہ خلافی کرنے والوں پر سخت وعید آئی ہے؛ اس لئے حسب وعدہ احمد کو دوکان واپس کرنی شرعًا ضروری اورلازمی ہے۔

واوفوا بالعهد أي ماعاهدتم عليه غيركم من العباد، ويدخل في ذلک العقود (إلی قوله) وقد جاء عن علي كرم الله وجهه أنه عد من الكبائر نكث الصفقة أي الغدر بالمعاهد. (روح المعاني، سورة الإسراء، تحت رقم الآية:٣٤، مكتبه زكريا ديوبند ١٠٢/٩)

قال: رسول الله صلى الله عليه وسلم: ملعون من ضار مؤمنًا أو مكربه. (ترمذي، أبواب البر والصلة، باب ماجاء في الخيانة والغش، النسخة الهندية ١٥/٢، دارالسلام رقم: ١٩٤١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۳ ؍صفر المظفر ۱۴۲۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۷۳۰/۳۷)	۱۴۲۶/۲/۲۵ھ

وعدہ پورا نہ کرنے والا خدا کے یہاں مؤاخذہ دار ہوگا

سوال [۱۱۰۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خادم ایک دوکان پر نوکری کرتا تھا، کافی عرصہ سے اچانک کافی بیمار ہوگیا اور دوکان نہیں جاسکا، میری غیر حاضری میں مالک نے دوسرا نوکر رکھ لیا، صحت یاب ہوکر میں کام پر گیا، مالک نے منع کردیا کہ میں نے آدمی کا انتظام کرلیا ہے، میں نے بہت کہا انہوں نے نہیں رکھا، وہ آدمی ساڑھے تین مہینہ رہ کر چلا گیا، مالک نے پھر مجھے بلایا اور کہا کام پر آجاؤ، میں نے کہا کہ کام پر تو آجاؤں گا؛ لیکن پہلے جتنے ٹائم خالی پھرا ہوں وہ پیسے دوگے تب آؤں گا ورنہ نہیں آؤں گا، مالک نے وعدہ کرلیا کہ کام کرو ہوجائے گا، وعدہ کے مطابق میں نے کام کرنا شروع کردیا، اس بات کے گواہ مالک کے ایک بہنوئی بھی ہیں، مالک کے میری

طرف باقی کے ۲۷۰۰۰/ روپیہ نکل رہے ہیں، وعدہ کے مطابق میرے مالک کی طرف ساڑھے تین مہینے کے ۴۷۲۵/روپیہ نکل رہے ہیں، مالک اپنے روپیہ کو کہتے ہیں کہ اللہ کے گھر دوگے؛ لیکن میں دنیا ہی میں دینے کو تیار ہوں؛ لیکن مالک نے جو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ دیدوں گا، وہ وعدہ سے مکر رہے ہیں، اللہ کے گھر اس وعدہ کی پکڑ ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: لیاقت علی، محلّہ: گلاب کی رائے کا باغ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس سلسلہ میں کوئی صریح جزئیہ تو نہیں ملا؛ لیکن اصولوں سے یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ جب مالک نے یہ کہہ دیا کہ سب ہوجائے گا، تم کام کرو تو گویا کہ اس نے دینے کا وعدہ کرلیا؛ لہٰذا مالک پر ان تین ماہ کی تنخواہ دینا ضروری ہوگا، اگر نہیں دے گا تو یقیناً خدا کے یہاں اس کی پکڑ ہوگی۔

الحدیث: قال رسول اللّٰه عليه وسلم: المسلمون عند شروطهم. (ترمذي شريف، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دار السلام رقم: ۱۳۵۲)

المرأ مؤاخذ بإقراره، المرأ يعامل في حق نفسه كما أقربه، ولايصدق على إبطال حق الغير ولا بالزام الغير حقاً، المسلمون عند شروطهم. (قواعد الفقه، اشرفي ديوبند ۱۲۰ و ۱۲۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹/ ۳۴۷۰)

اپنا امتحان دوسرے سے دلوانا

سوال [۱۱۰۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ابوبکر جو عالم دین ہے اور زید جو حافظ قرآن ہے، اور زید چاہتا ہے کہ وہ بھی

عالم کی ڈگری حاصل کرے؛ لہٰذا وہ ڈگری لینے کے لئے سرکاری بورڈ والے امتحان کا فارم بھر دیتا ہے، اور عالم کا امتحان دینے ابوبکر عالم دین کو بٹھا دیتا ہے اور امتحان لینے والے کی طرف سے بھی کوئی سختی نہیں ہے۔ کیا ابوبکر کا امتحان دینا عالم کا اس کے بدلہ جو کہ صرف حافظ ہے اور اس کو عالم کے بارے میں کچھ بھی جانکاری نہیں ہے صحیح ہے یا نہیں؟

اور اس امتحان دینے کی وجہ سے ابوبکر کے پیچھے نماز درست ہوگی یا نہیں؟

اور جبکہ ابوبکر نے توبہ کرلی ہو، قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب سے سرفراز فرمائیں۔

المستفتی: عبدالقادر، خادم مدرسہ دینیہ مسلم یتیم خانہ، شاہی عیدگاہ، جون پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسی دھوکہ بازی اور جھوٹ کی وجہ سے دونوں گنہگار ہوں گے، دونوں پر توبہ واستغفار کرنا لازم ہے اور اس جھوٹی ڈگری سے زید عالم نہ ہوگا، عالم بننا جھوٹی دوکانداری نہیں ہے؛ بلکہ اس کی بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے؛ البتہ ابوبکر نے جب توبہ کرلی ہے، تو وہ گناہ سے بری ہوگیا ہے۔ حدیث میں آیا ہے۔

عن أبي عبيدة بن عبد الله، عن أبيه، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: التائب من الذنب كمن لا ذنب له. (سنن ابن ماجه، أبواب الزهد، باب ذكر التوبة، النسخة الهندية ۲/ ۳۱۳، دارالسلام رقم: ۴۲۵۰، المعجم الكبير للطبراني، دارإحياء التراث العربي ۱۰/ ۱۵۰، رقم: ۱۰۲۸۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۲؍ ذی قعدہ ۱۴۱۸ھ

(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/ ۵۴۹۸)

جوئے کے پیسے سے خریدی ہوئی اشیاء کا حکم

سوال [۱۱۰۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ زید جوا کھیلتا تھا اور زید نے جوا میں بہت روپیہ کمایا اور اسی جوے کے روپیہ سے زید نے اپنی شادی کی اور اپنا گھر بنایا اور کپڑے سلائی مشین بھی خریدی۔ اب زید نے جوا کا کام چھوڑ دیا اور دین سے منسلک ہوگیا، اب زید اسی سلائی مشین سے گذر بسر کرتا ہے اور دوسرا اس کے پاس کوئی ذریعہ بھی نہیں ہے گذر بسر کا، تو کیا زید کے لئے یہ سلائی مشین اور دوسری چیزیں جو زید نے خریدی ہیں، جوے کے پیسہ سے وہ زید کے لئے استعمال کرنا درست ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد اختر، بڑا احاطہ، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جوے کے پیسے سے جو اشیاء خریدی گئی ہیں ان کی قیمت صدقہ کرنے کے بعد ان کی جائز آمدنی حلال ہوگی۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ جدید ڈابھیل ۱۸/۴۱۶، قدیم ۱۳/۳۵۲)

في القنية: لو كان الخبيث نصابًا لا يلزمه الزكوة؛ لأن الكل واجب التصدق عليه. (شامي، كراچی ۲/۲۹۱، زکریا دیوبند ۳/۲۱۸، منحة الخالق، کوئٹه ۲/۲۰۵، زکریا ۲/۳۵۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍شعبان المعظم ۱۴۱۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳/۵۴۱۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۸/۹ھ

چوری سے جوتے، چپل بیچنا

سوال [۱۱۰۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید اور عمر دونوں ایک چپل، جوتے کی دوکان میں ملازمت کرتے ہیں، ان دونوں کی تنخواہ تقریباً سولہ سترہ سو روپیہ ہے، ان دونوں کا مالک کام زیادہ لیتا ہے اور تنخواہ بھی

نہیں بڑھاتا، یہ دونوں اپنے مالک سے جوتا، چپل چرا کر بیچتے ہیں، پھران دونوں نے کسی عالم سے مسئلہ پوچھا کہ ہم لوگوں کا مالک کام زیادہ لیتا ہے اور ہم لوگوں کی تنخواہ نہیں بڑھاتا ہے اور ہم لوگ چپل، جوتا چرا کر بیچ دیتے ہیں،تو یہ عمل کیسا ہے؟، اس عالم نے جواب دیا کہ کوئی حرج نہیں ہے، یہ جواب درست ہے یا نہیں؟ ان دونوں نے اپنے صحیح روپیہ اور چوری کے روپیہ سے گھر بنایا اور اپنے بال بچوں پر خرچ کیا،تو صرف یہی شخص گنہگار ہوگا یا اس کے گھر والے بھی؟ اگر گناہ ہوا تو کیا اپنے مالک سے معافی مانگیں یا اللہ سے توبہ کریں؟ اگر مالک سے معافی مانگے تو ڈر ہے کہ ملازمت سے الگ کردے۔

المستفتی: نعیم الدین، دربھنگوی (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ صورت میں مالک کی اجازت اور رضا مندی کے بغیر جوتے چرا کر فروخت کرنا اور اس روپیہ کا خود پر اور گھر والوں پر استعمال کرنا قطعاً ناجائز اور حرام ہے، گھر والوں کے گناہوں کا وبال بھی چرانے والوں پر ہوگا۔ آپ کو چاہئے کہ فوراً اس فعل سے باز آ کر سچی توبہ کریں اور جتنی رقم چرائی ہے،اس کا اندازہ کر کے کسی بھی طریقہ سے مالک کو لوٹا دیں۔

عن عبداللّٰه بن السائب بن يزيد عن أبيه عن جده، قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: لايأخذ أحدكم عصا أخيه لاعباأوجادًا، فمن أخذ عصا أخيه فليردها إليه. (سنن الترمذي، كتاب الفتن، باب ماجاء لا يحل لمسلم أن يروع مسلماً، النسخة الهندية۲/۳۹، دار السلام، رقم:۲۱۶۰، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب ما يأخذ الشيئ على المزاح، النسخة الهندية۲/۶۸۳، دارالسلام رقم:۵۰۰۳)

ويجب رد عين المغصوب مالم يتغير تغيرًا فاحشًا ويبرأ بردها، ولو بغير علم المالك، أو يجب مثله إن هلك وتجب القيمة في القيمي يوم غصبه إجماعاً. (الدر المختار مع الشامي، كتاب الغصب، مطلب في

رد المغصوب، کراچي ٦/ ١٨٢، زکریا٩/ ٢٦٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ شعبان المعظم ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۸۲۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۸/۱۷ھ

سرکاری لکڑی کا استعمال کرنا

سوال [۱۱۰۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سرکاری لکڑی یا پٹہ کاٹ کر جانوروں کو کھلانا اور سرکاری لکڑی کاٹ کر یا توڑ کر جلانا کیسا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سرکاری پیڑ کے پتے اور لکڑیاں جو جلائی جاتی ہیں، اگر وہ پتے اور لکڑیاں سرکار کے قیمتی ہیں، تو پتے کھلانے اور لکڑیاں جلانے کے وجہ سے مالک گنہگار ہوگا اور جتنا چرایا اور جلایا ہے، اتنی مقدار کا اس پر ضمان لازم آئے گا اور اگر ان پتوں اور لکڑیوں کی سرکار کے یہاں کوئی قیمت نہیں، تو اس سے مالک گنہگار بھی نہیں ہوگا۔

ولو أن بقارًا رعي بقرًا، في أجمة مملوكة لإنسان فليس له ذلك وهو ضامن لمارعي. (بدائع، كتاب الأراضي، أرض الموات، زكريا٥/ ٢٨٣، كراچی ٦/ ١٩٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ محرم الحرام ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۶۷۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۱/۲۸ھ

اپنے مدرسہ کے علاوہ دوسری جگہ کا کنشیشن استعمال کرنا

سوال [۱۱۰۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ کسی مدرسہ میں عیدین کے علاوہ دوسرے اوقات میں کنشیشن نہیں ملتا ہے، کیا اس طالب علم کو دوسرے مدرسہ کا کنشیشن لے کر عیدین، یا اس کے علاوہ دوسرے اوقات میں کسی ضرورت کی وجہ سے یا بغیر ضرورت کے استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جواز کی کوئی صورت ہے؟

المستفتی: سراج الاسلام، بردوانی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تجربہ کار حضرات سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ارباب مدرسہ کو منجانب حکومت اس کا پابند بنایا جاتا ہے کہ وہ اپنے مدرسہ میں داخل شدہ طلبہ کے علاوہ کسی غیر کو کنشیشن نہ دیں اور ارباب مدرسہ اس باب میں حکومت کے وکیل ہوتے ہیں اور وکیل مالک کا امین ہوتا ہے اور امین کا امانت میں بغیر اذن مالک تصرف حرام ہے، اس لئے دوسرے مدرسہ سے کنشیشن لینے والا اور دینے والا دونوں کے لئے یہ فعل ناجائز رہے گا۔

الوكيل إنما يستفيد التصرف من الموكل وقد أمره بالدفع إلي فلان فلا يملك الدفع إلى غيره. (شامي، كتاب الزكاة، زكريا ٣/١٨٩، كراچي ٢/٢٦٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳؍۱۹۷)

مالک کا پتہ معلوم نہ ہونے کی صورت میں روپیہ واپس کرنے کا طریقہ

سوال [۱۱۰۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں پڑھنے کے زمانہ میں اپنے ساتھی سے دو چار روپئے کا جوڑ الیا کرتا تھا، اور حساب بھی ان کے پاس لکھا ہوا ہے، اب وہ ادا کرنا چاہتا ہوں، مگر ساتھی کا پتہ معلوم

نہیں ہے، ان کے پیسے کو کیا کروں، اس کا گناہ معاف ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: مشتاق احمد محلّہ تھانہ، امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ نے اپنے ساتھی سے جتنے روپے کا چوڑا لیا ہے وہ سب روپیہ اس تک یا اس کے ورثاء تک پہونچانا ضروری ہے اور اگر اس کا پتہ معلوم نہ ہو، تو جس مدرسہ میں پڑھتے تھے، اس مدرسہ کے دفتر سے پتہ حاصل کر لیجئے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۷/ ۳۸۵، جدید ڈابھیل ۱۸/ ۴۲۶)

ویجب علیه أن یرده علی مالکه، إن وجد المالک، وإلا ففي جیمع الصور یجب علیه أن یتصدق بمثل تلک الأموال علی الفقراء. (بذل المجهود، باب فرض الوضوء، سهارن پور ۱/ ۳۷، دار البشائر الإسلامیة بیروت ۱/ ۳۵۹)

یردوا المال إلي أربابه، فإن لم یعرفوا أربابه؛ تصدّقوا به لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبه. (الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۳۴/ ۲۴٦، شامي، زکریا ۹/ ۵۵۳، کراچي ٦/ ۳۸۵) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۴۴۸۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۰/ ۶/ ۱۴۱۶ھ

(۲۵) باب التصاویر

محض آنکھ بنانے سے تصویر کا گناہ ہوگا یا نہیں؟

سوال [۱۱۰۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اعلی حضرت امام احمد خاں فاضل بریلوی کا ایک تاریخی کلنڈر بریلوی شریف کا شائع ہوا ہے، جس میں مسجد یا مزار کا نقشہ ہے، اس نقش (تصویر) کے ایک جانب ایک آنکھ کی تصویر بھی ہے۔ نیز اس میں آنکھ سے آنسو کے ساتھ قطرے بھی گرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ جواب طلب امر یہ ہے کہ کیا اس طرح کسی بزرگ کے جسم کے کسی ایک حصہ کی تصویر بنانا، پھر آنکھ سے اشک بہتے ہوئے تصویر بنانا شریعت محمدیہ میں جائز ہے؟ قرآن وحدیث وتمثیل صحابہ واولیاء کرام کے جوابات تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد نصیر، گلشیر، چھتیس گڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر تصویر میں آنکھ کے ساتھ ساتھ چہرے کا بھی کچھ حصہ شامل ہے، جس میں آنکھ لگی ہوئی ہو، اور اس میں آنسوں بہہ رہے ہوں، تو شرعاً جائز نہیں ہے اور اگر چہرے کا کوئی حصہ شامل نہیں ہے صرف آنکھ ہے، تو وہ تصویر کے حکم میں شامل نہیں ہے اور محض آنکھ بنانے سے تصویر کا گناہ نہ ہوگا اور اسطرح فرضی آنکھ کی تصویر بنا کر اس سے آنسوں کا دیکھنا محض دھوکہ ہے؛ اس لئے اس سے گریز کرنا چاہئے۔ (مستفاد جواہر الفقہ، قدیم ۳/ ۲۲۷، جدید، زکریا ۷/ ۲۵۰)

عن عكرمة عن ابن عباسؓ قال: الصورة الرأس فإذا قطع الرأس

فليس بصورة. (السنن الكبرى للبيهقي، باب الرخصة فيما يوطأ من الصور، دارالفكر ۱۱/۸۳، رقم: ۱٤۹٤٥)

عن أبي هريرة رضـ**، قال: الصورة الرأس، فكل شئ ليس له رأس فليس بصورة.** (شرح معاني الآثار، كتاب الكراهة، باب الصور تكون في الثياب، دار الكتب العلمية بيروت ٤/۱۰۰، رقم: ٦۸۰٦)

إن كانت الصورة باقية الهيئة قائمة الشكل حرام، وإن قطعت الرأس، أو تفرقت الأجزاء جاز. قال: وهذا هو الأصح. (فتح الباري، باب من كره القعود على الصور، دار الفكر ۱۰/۳۹۱، اشرفية ديوبند ۱۰/٤۷۹، تحت رقم الحديث: ٥۹٥۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶؍ شعبان المعظم ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸؍۹۱۱۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۷/۸/۸ھ

جانوروں کی عکاسی بھی تصویر کے حکم میں ہے

سوال [۱۱۰۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کسی جاندار کی تصویر تو اس طرح ہوتی ہے، جس میں اس کے نقوش اور اعضاء پوری طرح ظاہر ہوتے ہیں، اگر صرف جاندار چیز کی کٹنگ اس طرح ہو، جس سے صرف یہ معلوم پڑتا ہے کہ یہ مچھلی یا طوطا یا بکری، بھینس یا بچہ، بچی ہے آدمی ہے یا جانور تو کیا ایسی عکاسی بھی تصویر کے حکم میں ہے، چاقو کا دستہ تصویر کے حکم میں ہے یا مستثنیٰ ہے؟

المستفتی: محمد یونس احمد، گڑھ، پنجاب

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: کسی بھی چیز کی اس طرح کٹنگ ہو کہ اس سے مچھلی، طوطا وغیرہ کسی بھی جاندار کی معرفت اور پہچان ہوتی ہو، اس میں سر اور چہرہ موجود ہو،

تو وہ تصویر کے حکم میں ہے، چاہے یہ تصویریں چاقو کے دستہ میں ہوں یا کواڑوں کے دستہ اور بیڈوغیرہ میں ہوں، سب ناجائز اور حرام ہیں، ہاں اگر سر کٹا ہوا ہو تو جائز ہے۔

عن أبي هريرةؓ، قال: الصورة الرأس، فكل شئ ليس له رأس فليس بصورة. (شرح معاني الآثار، كتاب الكراهة، باب الصور تكون في الثياب، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ١٠٠، رقم:٦٨٠٦)

التصوير، والصورة، والمثال، والتمثال كلها بمعنى واحد، والمراد ما يقع به المعرفة، وهو الوجه والرأس ففعل الصورة هو رسم الوجه والرأس ويتعلق به حكم المنع والتحريم. (كفاية المفتي قديم ٩/ ٢٣٦، جديد زكريا مطول ١٣/ ٥٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ ر ربیع الاول ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۷۴۰/۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۰/۴/۱۴۱۷ھ

سرکٹی تصویر کے ذریعہ نماز کا مسنون طریقہ سکھانے کا حکم

سوال [۱۱۰۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ منسلک ارکان نماز (جس میں نماز کے مسنون طریقے خاکوں کے ذریعہ سمجھائے گئے ہیں) کیا یہ خاکے تصویر کے حکم میں آتے ہیں؟

(۲) ارکان نماز کے مسنون طریقے جس سے عام نمازیوں کی ناواقف کثیر تعداد بآسانی مستفیض اور مستفید ہو سکے، اس سے متعلق اپنی قیمتی آرا سے آگاہ فرمائیں نوازش ہوگی۔

المستفتی: ولی الرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مستفتی نے سوال نامہ کے ساتھ جو نقشہ

منسلک کیا ہے، اس میں انسانی ڈھانچہ کے ساتھ سر بالکل نہیں ہے اور شریعت میں جس تصویر کی ممانعت ہے، اس کا حکم جاندار کے سر پر لگتا ہے اور جب سر ہی نہیں ہے، تو وہ تصویر ہی نہیں ہے؛ اس لئے مذکورہ نقشہ میں جو بغیر سر کے انسانی ڈھانچے ہیں، ان کے ٹانگنے میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔

عن أبي هريرةؓ، قال: استأذن جبرئيل عليه السلام على النبي صلى الله عليه وسلم، فقال: أدخل فقال: كيف أدخل؟ وفي بيتك ستر فيه تصاوير، فإما أن تقطع رؤسها، أو تجعل بساطاً يؤطأ، فإنا معشر الملائكة لاتدخل بيتا فيه تصاوير.

(نسائي شريف، ذكر اشد الناس عذابا، النسخة الهندية ٢/١ ٣٠، دارالسلام، رقم٥٣٦٥)

عن عكرمة قال: إنما الصورة الرأس، فإذا قطع الرأس فلا بأس.

(المصنف لإبن أبي شيبة، مؤسسه علوم القرآن ١٢/٦٣٧، رقم: ٢٥٨٠٨)

أو مقطوع الرأس أي سواء كان من الأصل، أو كان لها رأس محي (وقوله) وإنما لم يكره؛ لأنها لا تعبد بدون الرأس عادةً. (البحرالرائق، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها زكريا ٢/٥٠، كوئٹه ٢/٢٨)

(۲) مستفتی نے دوسرے سوال میں رائے اور مشورہ طلب فرمایا ہے، تو اس سلسلے میں ہماری رائے وہی ہے، جو چودہ سو سال سے صحابہ، مجتہدین، اکابر ومشائخ اور بزرگوں کی ہے، ان کی رائے انسانی ڈھانچے کے ذریعہ نماز سکھانے سے متعلق ثابت نہیں ہے، ہاں البتہ عملی مشق کے ذریعہ سے نماز سکھانا ان سے ثابت ہے، جیسا کہ حضرت محی السنۃ شاہ ابرار الحقؒ نے اپنی زندگی کے پچاس سال تک عملی مشق کے ذریعہ متعلقین کو نماز سکھائی ہے؛ اس لئے ہماری رائے وہی ہے، جو حضرت محی السنۃ شاہ ابرار الحق صاحب نوراللہ مرقدہ کی ہے، ہاں البتہ مستفتی نے جو نقشہ پیش کیا ہے، اس سے بھی کچھ مدد مل سکتی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/۸۱۷۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۴/۲۳ھ

اخبارات کی تصاویر کا حکم

سوال[۱۱۰۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) اخبار کا کوئی پنا بھی جاندار تصویروں سے خالی نہیں ہوتا ہے، ہر پنّے پر جاندار زیادہ تر انسانوں کی اور کم جانوروں کی تصویر ہوتی ہیں، ایسے اخبار کو دسترخوان کی جگہ استعمال کرنا اور اس پر روٹی سالن رکھ کر کھانا کیسا ہے؟

(۲) گھروں میں جو طاق ہوتے ہیں، ان میں ان اخباروں کا بچھانا اور پھر بچے ہوئے اخباروں پر گھر کی دیگر ضروریات کا سامان رکھنا کیسا ہے؟

(۳) گھر میں روزانہ آنے والے اخبار جب تک گھروں میں ہیں، تو ان کی تصویروں پر شرعی قانون کا اطلاق ہوگا یا نہیں؟ جہاں جاندار کی تصویریں ہوتی ہیں، وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے ہیں، اس سے متعلق علماء کرام کا کیا فیصلہ ہے؟

المستفتی: محمد اسحٰق، جے پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) ایسے اخبار کا دسترخوان کی جگہ پر استعمال کرنا، جس میں تصویریں ہوں اور اس پر روٹی سالن رکھ کر کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ لیکن بہتر یہ ہے کہ ایسے اخبار جس میں تصویریں ہوں، دسترخوان کی جگہ استعمال نہ کریں؛ اس لئے کہ عموماً اخباروں میں فحش اور بے حیائی کی تصویریں ہوتی ہیں، جن پر نظر پڑنا اچھی بات نہیں؛ اس لئے اجتناب ہی بہتر ہے، اور اس کی اہانت مقصود ہو تو حرج بھی نہیں ہے۔

(۲) اسی طرح گھروں کے طاق میں ان اخباروں کو بچھا کر گھر کی ضروریات کا سامان رکھنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

ولو كانت الصورة على وسادة ملقاة، أو على بساط مفروش

لایکره؛ لأنها تداس وتؤطا. (شامي، باب ما یفسد الصلاۃ، ومایکره فیها، زکریا۲/۴۱۷، کراچي ۱/۶۴۸)

(۳) گھروں میں روزانہ آنے والے ایسے اخبار، جن میں تصویریں ہوتی ہیں، یہ تصاویر دخول ملائکۂ رحمت کیلئے مانع نہیں؛ اس لئے کہ ان تصاویر کو تعظیماً رکھنا مقصود نہیں؛ بلکہ اصل مقصود ان اخباروں سے خبروں کی معلومات حاصل کرنا ہے؛ البتہ اولی اور افضل یہ ہے کہ تصویروں کو ڈھک کر یا دبا کر رکھد یا جائے کہ نظر نہ آئیں؛ لیکن فحش تصویروں کو رکھنا جائز نہیں؛ اس لئے اس میں اخلاق پر زبردست اثر پڑتا ہے؛ لہٰذا ان کو فوراً اپھاڑ دیا جائے، مٹا دیا جائے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۹/۲۳۹، جدید زکریا مطول ۱۳/۴۰، جواہر الفقہ قدیم ۳/۲۳۷، جدید زکریا ۷/۲۶۲)

لأن الصورة إذا كانت على بساط مفروش تكون مهانة لا تمنع من الدخول. (شامي، باب ما یفسد الصلاۃ، وما یکره فیها، زکریا ۲/۴۱۹، کراچي ۱/۶۴۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۴۷۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۱/۲۸ھ

فوٹو اسٹیٹ میں آنے والی تصویر کی شرعی حیثیت

سوال [۱۱۰۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ فوٹو کاپی مشین پر ہر چیز کی فوٹو کاپی اتر جاتی ہے، اکثر کاغذات پر تصویر لگی ہوتی ہے، تو کیا اس کو اتارنا فوٹو کے حکم میں ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد رئیس، ۱۰۰/۸۸، پریم نگر، کانپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جی ہاں یہ بھی فوٹو کی حکم میں ہوگا۔

عن ابن عباسؓ، قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: كل مصور في النار يجعل له بكل صورة صورها نفسًا فتعذبه في جهنم الحديث. (صحيح مسلم، باب لا تدخل الملائكة بيتًا فيه كلب ولاصورة، النسخة الهندية ۲/ ۲۰۲، بيت الأفكار رقم: ۲۱۱۰، مسند أحمد بن حنبل ۱/ ۳۰۸، رقم: ۲۸۱۱)

المصور هو الذي يصور أشكال الحيوان فيحكيها بتخطيط لها، وتشكيل. (مرقاة المفاتيح، باب التصاوير، مكتبه امدادية ملتان ۸/ ۳۳۰)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶/ ۲۰۵۹)

فوٹو کھنچوانا کب جائز ہے؟

سوال [۱۱۰۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید شافعی المسلک ہے، زید اپنا فوٹو کھنچوانا چاہتا ہے، اس کے بارے میں شریعت شافعی المسلک کیا کہتی ہے؟ واضح کریں۔

المستفتی: عبد الباسط، شری رام پور، احمد نگر (مہاراشٹر)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: پاسپورٹ اور ایڈنٹی کارڈ وغیرہ کے لئے ضرورت شدیدہ میں فوٹو کھنچوانا سب کے نزدیک جائز ہے اور بغیر ضرورت شدیدہ جس طرح مسلک حنفی میں ناجائز ہے، اسی طرح مسلک شافعی میں بھی ناجائز اور حرام ہے۔

امام نوویؒ مسلک شافعی کے جلیل القدر علماء میں سے ہیں، ان کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

قال أصحابنا وغيرهم من العلماء: تصوير صورة الحيوان حرام شديد التحريم، وهو من الكبائر؛ لأنه متوعد عليه بهذا الوعيد

الشديد المذكور في الأحاديث سواء صنعه بما يمتهن، أو بغيره فصنعته حرام بكل حال؛ لأن فيه مضاهاة لخلق الله تعالىٰ. (نووی علی هامش المسلم ۲/ ۱۹۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۱۴۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۵/۹ھ

آئندہ ضرورت کی وجہ سے تصویر سازی کا حکم

سوال [۱۱۰۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ تصویر نکالنا بے ضرورت تو حرام ہے؛ لیکن ضرورت کے وقت اجازت دی ہے، مثلاً آئی کارڈ کے لئے تو پوچھنا یہ ہے کہ فی الحال تو ایک کی ضرورت ہوتی ہے؛ لیکن آئندہ ضرورت پیش آئے گی، یہ سوچ کر ایک سے زائد بنانا کیسا ہے؛ اس لئے کہ ایک ساتھ آٹھ یا بارہ نکلتے ہیں۔

المستفتی: عمران بہاری، انکلیشور (گجرات)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شناختی کارڈ، آئی کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ کے لئے فوٹو کھنچوانا جائز اور درست ہے اور فوٹو ایک بار کھینچ کر بارہ یا چوبیس بنتے ہیں، آئندہ ضرورت کے پیش نظر ایک ساتھ بارہ یا چوبیس بنوانے میں کوئی حرج نہیں۔ (مستفاد: ایضاح المسائل ۱۱۳)

الضرورات تبيح المحظورات. (الأشباه والنظائر قديم ۱٤٠)

أما إتخاذ الصورة الشمسية للضرورة، أو الحاجة كحاجتها في جواز السفر، وفي التاشيرة، وفي البطاقات الشخصية، أو في مواضع يحتاج فيها إلى معرفة هوية المرء، فينبغي أن يكون مرخصًا فيه.

(تکملة فتح الملهم، باب تحريم تصوير صورة الحيوان، الصورة عند الحاجة، اشرفية ديو بند ٤/ ١٦٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ذی الحجہ ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۵۶۲/۳۹)

جلسہ میں علماء کرام کی تصویر کھنچوانے کی شرعی حیثیت

سوال [۱۱۰۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ علماء دین و قائدین ملت دینی امور مثلاً تقریر وتحریر و بیان وغیرہ کی پوری کارروائی یا اس کا خلاصہ اخبارات ورسائل میں اپنی تصویر کے ساتھ شائع کراتے ہیں، کچھ حضرات تو برضاء ورغبت تصویریں شوق سے کھنچواتے ہیں اور بعض حضرات اس سلسلہ میں خاموشی اختیار کئے رہتے ہیں اور اخبار والے تصاویر وغیرہ کھینچ کر لے جاتے ہیں اور جن کی تصویر کھینچی جاتی ہے، وہ چپ رہتے ہیں منع نہیں کرتے، تو اس سلسلہ میں معلوم یہ کرنا ہے کہ مسلم علماء وذمہ داران ملت خصوصاً اور عوام الناس کا عموماً اس طرح دینی امور کی انجام دہی کے بعد اس طرح کی کارروائی مع تصویر شائع کرانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: حامد حسین قاسمی، امرتسر (پنجاب)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: تصویر اور فوٹو کھنچوانے کی دو حیثیتیں ہیں:

(۱) بے ضرورت محض نمائش کے طور پر شوقیہ تصویر کھنچوائی جائے، جس کی حدیث شریف میں بہت سخت وعید آئی ہے۔

عن عبد الله بن مسعودؓ، قال: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: إن أشد الناس عذابًا عند الله يوم القيامة المصورون. (صحيح البخاري،

باب عذاب المصورين يوم القيامة، النسخة الهندية ۲/ ۸۸۰، رقم:۷ ۵۷۱، ف: ۵۹۵۰،
صحيح مسلم، باب لا تدخل الملائكة بيتًا فيه كلب و لاصورة، النسخة الهندية ۲/ ۲۰۱،
بيت الأفكار رقم: ۲۱۰۹

(۲) ضرورت کی وجہ سے تصویر کھنچوائی جائے تو فی نفسہ ممنوع ہونے کے باوجود ضرورت کی وجہ سے تصویر کھنچوانے کی گنجائش ہے

الضرورات تبيح المحظورات (الأشباه قديم ص ۱۴۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ صفر المظفر ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۲۹۹/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۲/۲۸ھ

تقریبات اور جلسہ جلوس کی تصاویر کا حکم

سوال [۱۱۰۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں کرناٹک بنگلور میں دینی مدرسہ ہے، اس علاقہ میں کافی مشہور ہے، اس ادارہ کی پالیسی صلح کل کی ہے، کہتے ہیں کہ فتنہ فساد بری چیز ہے؛ اس لئے جہاں فاتحہ کا تقاضہ ہو جاری رکھتے ہیں اور جہاں تکرار ہو حسب موقعہ فتوی فراہم کرتے ہیں کوئی ایک موقف واضح نہیں ہے، تصویر کے بارے میں بھی کوئی واضح نظریہ نہیں ہے، بظاہر اکابرین دارالعلوم دیوبند اور تبلیغی جماعت سے تعلقات بتاتے ہیں مسلک دارالعلوم دیوبند سے صد فیصد متفق نہیں ہیں، رمضان المبارک کی طاق راتوں کے سلسلہ میں عیدین کے بعد مصافحہ و معانقہ تراویح کے درمیان مروجہ تسبیحات نیز مروجہ فاتحہ خوانی وغیرہ کے بارے میں اپنا الگ موقف ہے تبلیغی جماعت بھی اس مدرسہ کو اپنانے کے لئے تیار نہیں ہے۔

تقریباً یقین ہو چکا ہے کہ بریلویت، دیوبندیت کے درمیان ایک تیسرا ملا جلا مسلک صلح کل والا بن چکا ہے۔

اس مدرسہ کی اپنی اتنی مضبوط پہچان ہے کہ یہاں دار القضاء، دارالافتاء اور امارت شرعیہ ہے،عوام الناس رجوع ہوتی ہے، اسی غرض وغایت کے لئے کہ وہاں کا فیصلہ قبول ہے، اس میں تیسری راہ کی ہرگز کوئی حاجت نہیں ہے؛ لیکن اس کے باوجود خواہ مخواہ مداہنت سے کام لیا جاتا ہے، اب اس سلسلہ میں استفاء یہ ہے کہ

(۱) ہم اہل سنت والجماعت مسلک دار العلوم دیوبند کے حامیوں کیلئے اپنی اولاد کو اس مدرسہ میں داخل کرنا کیسا ہے؟

(۲) اس مدرسہ کا تعاون مالی اور جسمانی اعتبار سے کرنا کیسا ہے؟

(۳) زکوۃ اور چرم قربانی کا کیا یہ مدرسہ مصرف بن سکتا ہے؟ **ولاتعاونوا علی الإثم والعدوان** میں تو نہیں آئے گا؟

(۴) چونکہ صلح کل کی پالیسی ہے؛ اس لئے امراء اور سیاست داں اس ادارہ سے بہت خوش ہیں، بہت سے چھوٹے مدارس جو مکمل دار العلوم کے نہج پر چل رہے ہیں، حلال وحرام کے بیان میں واضح نظریہ رکھتے ہیں، ان دونوں صنفوں میں کس ادارہ کو چندہ دیا جائے؟

(۵) بوقت ضرورت ایسے مدارس کے دارالافتاء سے فتوی طلب کیا جاسکتا ہے یانہیں؟ جبکہ اور شہر میں دارالافتاء ہیں جو کہ **لایخافون لومة لائم** کا نمونہ ہیں۔

(۶) اس ادارہ کے دار القضاء میں اپنے قضیات لیجائے جاسکتے ہیں یانہیں؟

(۷) چونکہ اس ادارہ کا ظاہر کچھ اور ہے باطن کچھ اور، تو کیا جن احباب کو اس کی اندرونی حقیقت معلوم ہو آنے والی نسل کو اس سے آگاہ کرنا کیسا ہے؟

حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم العالیہ ہم اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر حلفیہ بیان دیتے ہیں کہ اس ادارہ سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے، یہ مدرسہ مالی اور سیاسی قوت کے اعتبار سے اتنا آگے نکل چکا ہے کہ ان فتاوی کا اس پر اگر چہ کوئی اثر نہیں؛ لیکن ہم جیسے جاہلوں کے لئے آپ کے فتاوی باعث شرح صدر ہیں۔ امید کہ مدلل جواب مرحمت فرما کر مستحق ثواب دارین ہوں گے۔

شادی بیاہ اور دیگر گھریلو تقریبات میں تصویر لینا کیسا ہے؟

جب ہم منع کرتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ بڑے بڑے علماء سیرت پاک کے جلسوں میں مساجد، مدارس اور اداروں کے افتتاح کے مواقع پر ان کی تصاویر لی جاتی ہیں، اخبارات میں شائع کی جاتی ہیں اور علماء معذرت بھی طلب نہیں کرتے، کیا ان علماء کرام کے اس عمل کی وجہ سے تصویر کشی کے احکامات میں موجودہ زمانہ کی وجہ سے کچھ تخفیف ہوسکتی ہے؟ اس سلسلہ میں شریعت مطہرہ کا واضح نظریہ پیش فرمائیں مہربانی ہوگی۔ جزاک اللہ خیرا۔

المستفتی: محمد شفیق مفتاحی، امام جامع مسجد ٹمکور، بنگلور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہم اتنی دور رہ کر وہاں کے مدارس کے بارے میں کوئی فیصلہ کن بات لکھ نہیں سکتے؛ اس سلسلہ میں وہاں کے مقتداء علماء اور معتبر مفتیان کرام سے رابطہ قائم کریں، حضرت مولانا مفتی شعیب اللہ صاحب بنگلور، حضرت مولانا مفتی اشرف علی صاحب مدرسہ سبیل الرشاد، مفتی زین العابدین صاحب مدرسہ شاہ ولی اللہ، مفتی افتخار صاحب وغیرہ، ان حضرات سے مشورہ کر کے جو صحیح بات مناسب ہو، اسی پر عمل کیا کریں۔

گھریلو تقریبات اور بیاہ شادی میں تصویر کشی بے ضرورت ہے؛ اس لئے تصویر کشی کا گناہ جو حدیث شریف میں وارد ہے، اس کا ارتکاب لازم آئے گا۔

عن عائشة رضـ قالت: دخل عليّ رسول الله صلى الله عليه وسلم: وأنا متسترة بقرام فيه صورة، فتلون وجهه، ثم تناول الستر فهتكه، ثم قال: إن من أشد الناس عذابًا يوم القيامة، الذين يشبهون بخلق الله.

(صحيح مسلم، باب لا تدخل الملائكة بيتًا فيه كلب ولا صورة، النسخة الهندية ۲/ ۲۰۰، بيت الأفكار رقم:۲۱۰۷)

ہاں البتہ ملکی اور سماجی پروگرام میں تصویر کشی اور ویڈیو، ٹیلی کاسٹ کرنے کا حکم ضرورت کی وجہ سے الگ حیثیت رکھتا ہے، جس کے بارے میں بنگلور کے سمینار کی تجاویز

کا ملاحظہ بہتر ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۱۰۰۱۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۴/۷ھ

نیک کاموں کی تصاویر اخبار میں شائع کرانا

سوال [۱۱۰۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بعض مخیّر حضرات یا بعض مدارس کے ناظمین و مہتممین یا دینی وفلاحی تنظیموں کے ذمہ داران مالی اعتبار سے ادارہ یا طلبہ یا غریب عوام کی امداد مختلف انداز میں کرتے ہیں، پھر اس پوری کارروائی کو مع تصویر اخبارات ورسائل میں شائع کراتے ہیں، معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا اسطرح کے نیک کاموں کو اخبارات ورسائل وغیرہ میں مع تصویر شائع کرانے کی اسلام میں اجازت ہے؟

المستفتی: حامد حسین قاسمی، خیرالدین ہال بازار، امرتسر (پنجاب)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ضرورت کی وجہ سے تصویر کھنچوائی جائے تو فی نفسہ تصویر کھنچوانا ممنوع ہونے کے باوجود ضرورت کی وجہ سے تصویر کھنچوانے کی گنجائش ہے، جیسا کہ پاسپورٹ، ایڈنٹی کارڈ، اسکولوں اور مدارس کے داخلہ فارم میں یا سرکاری کام کے فارم کے لئے تصویر کھنچوانے کی گنجائش ہے۔

الضرورات تبیح المحظورات. (الأشباہ والنظائر قدیم ۱٤۰)

اسی طرح قومی اور اجتماعی ضرورت کے لئے بھی تصویر کھینچوانے کی گنجائش ہے؛ لہٰذا اگر مسلمان اور اسلام کے خلاف غیروں کی طرف سے سازش ہورہی ہو اور اس سازش کے خلاف مسلمان اجتماعی طور پر احتجاج کرتے ہیں اور احتجاج کی تشہیر کے بغیر مسلم دشمن طاقتوں

پر کوئی اثر نہیں پڑسکتا ہے، تو ایسے حالات میں اس احتجاج کی تشہیر، پاسپورٹ، ایڈنٹی کارڈ وغیرہ کی انفرادی ضرورت کے مقابلہ میں زیادہ ضرورت کی چیز ہے؛ اس لئے ایسے پروگراموں کے خطیبوں کی تصویر اور تقریری مجمع کی تصویر اجتماعی ضرورت کے لئے معاون ثابت ہوتی ہے؛ لہٰذا مسلمانوں کے سماجی وسیاسی پروگراموں میں تصویر اور تشہیر کی ضرورت پاسپورٹ اور ایڈنٹی کارڈ اور اسکولوں میں داخلہ فارم کے لئے تصویر کی ضرورت سے کم درجہ کی ضرورت نہیں؛ کیونکہ یہاں پر اصل مقصد تصویر نہیں؛ بلکہ مسلمانوں کی باتوں کو باوزن بنانا ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسالک ۱۳۴)

لیکن اس کا بہت لحاظ رکھا جائے کہ ایسا احتجاجی پروگرام جس کی تشہیر کی ضرورت ہے مساجد میں نہ کیا جائے اور دینی اصلاحی پروگرام میں تصویر کشی، ویڈیو فلم وغیرہ کو ہم جائز نہیں سمجھتے ہیں۔ نیز دینی اصلاحی پروگرام اور وعظ وتقریر کی تشہیر کی ایسی ضرورت نہیں ہے، جس کے ذریعہ سے باطل طاقتوں کو مؤثر کیا جائے۔ اب اس تفصیل کے بعد سوال نامہ کے دونوں سوالوں کے پیش نظر تصویر شائع کرانے والے سے معلوم کیا جائے کہ ان کی ضرورت کس خانہ میں داخل ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍صفر المظفر ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/۱۰۲۹۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۲/۲۸ھ

داخلہ فارم کے لئے فوٹو بنوانا

سوال [۱۱۰۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بعض مدارس اسلامیہ کی منتظمہ نے یہ اصول ضوابط میں داخل کیا ہے کہ طلبہ تصویر کشی کراکے فارم داخلہ پر چسپاں کر کے دفتر میں جمع کریں، تو کیا طلباء کو تصویر کشی کی اجازت شریعت کی جانب سے ہے؟

المستفتی: جمیل احمد بستوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر طلباء کے فوٹو کے بغیر بد نظمی ہوتی ہے، تو ضرورۃً فوٹو بنوالینا مباح ہے، جیسا کہ پاسپورٹ وغیرہ کی ضرورت سے فوٹو بنوالینا جائز ہے۔

(مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۲۳۱، جدید زکریا مطول ۱۳/ ۴۷-۴۴)

أما إتخاذ الصورة الشمسية للضرورة، أو الحاجة كحاجتها في جواز السفر، وفي التاشيرة، وفي البطاقات الشخصية، أو في مواضع يحتاج فيها إلى معرفة هوية المرء، فينبغي أن يكون مرخصًا فيه. (تكملة فتح الملهم، باب تحريم تصوير صورة الحيوان، الصورة عند الحاجة، اشرفية ديوبند ٤/ ١٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ ر رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/ ۱۴۲۲)

شناختی کارڈ بنوانے کے لئے فوٹو کھنچوانا

سوال [۱۱۰۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حکومت ہندوستان نے قانون بنایا دیا ہے کہ ہر ہندوستانی باشندے کے لیے شناختی کارڈ بنانا اور رکھنا ضروری ہے، جس کے پاس شناختی کارڈ نہیں ہوگا، اس کی شہریت مشکوک اور حق رائے دہی سے محروم کیا جا سکتا ہے؟ تو کیا اس مجبوری کے تحت مسلمان عورتوں کو شناختی کارڈ بنوانے کے لئے فوٹو کھنچوانا جائز ہے؟ شریعت کے حکم سے مطلع فرمایا جائے۔

المستفتی: نسیم ساغر شمسی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب ایک ملک میں شہری بن کر رہنا ہے اور اس سے کسی کو مفر نہیں ہے، تو اس ملک کے قانون پر عمل کرنا ہر شخص پر لازم ہوتا ہے، اور قانون کی

خلاف ورزی ایک مستقل جرم ہے، جس کی سزا نا قابل برداشت بھی ہوسکتی ہے۔ اب جب ہمارے ہندوستان میں ہر شخص کا اپنا حق شہریت ثابت کرنے کے لئے شناختی کارڈ بنوانے کا قانون بن چکا ہے اور شناختی کارڈ فوٹو کے بغیر بن نہیں سکتا، تو ایسے ناگزیر حالات میں تمام مسلمان مردوں اور عورتوں پر شرعی طور پر بھی لازم ہے کہ وہ اپنے شناختی کارڈ بنوانے کے لئے فوٹو کھنچوائیں کوئی مسلمان اس معاملہ میں قطعًا غفلت نہ برتے، کہ جس کا خمیازہ بھگتنا پڑ جائے؛ اس لئے تمام مسلمان اس معاملہ میں خبردار رہیں۔ (مستفاد: ایضاح المسالک ۱۱۲-۱۳۴، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۷/۳۶۶، جدید ڈابھیل ۱۹/۴۹۶-۴۹۷، جواہر الفقہ قدیم ۳/۲۳۳، جدید زکریا ۷/۲۵۷)

أما إتخاذ الصورة الشمسية للضرورة، أو الحاجة كحاجتها في جواز السفر، وفي التاشيرة، وفي البطاقات الشخصية، أو في مواضع يحتاج فيها إلى معرفة هوية المرء، فينبغي أن يكون مرخصًا فيه. (تكملة فتح الملهم، باب تحريم تصوير صورة الحيوان، الصورة عند الحاجة، اشرفية ديوبند ٤/١٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍رجب المرجب ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/۷۳۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲/۷/۱۴۲۲ھ

پاسپورٹ وداخلہ فارم وغیرہ کے لئے فوٹو کھنچوانا

سوال [۱۱۰۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ فوٹو کے مسئلے پر وضاحت فرمائیں: فی زمانہ فوٹو کی ضرورت پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے؟ ملازمت کے لئے سرکاری محکموں میں فوٹو کی ضرورت، پاسپورٹ کے لئے فوٹو کی ضرورت، شناختی کارڈ کے لئے فوٹو کی ضرورت، اسکولوں، کالجوں اور انسٹیوٹ میں داخلے کے لئے فوٹو کی ضرورت، بینک کے کھاتے کے لئے فوٹو کی ضرورت، ڈرائیونگ لائسنس کے فوٹو اب ایک ناگریز ضرورت بن گئی ہے، اس ضرورت کو ہم کہاں

لے جائیں؟ اس سے مفر نہیں۔ ایک مسلمان فوٹوگرافی کی دوکان کھول کر عوام الناس کی اس اہم ضرورت کو پورا کر رہا ہے، کیا اس کو شریعت اس ذریعۂ معاش کی اجازت دے سکتی ہے؟ جبکہ دیگر فنون کی طرح فوٹوگرافی بھی ایک فن ہے۔ بینوا توجروا۔

نوٹ: اگر ندائے شاہی میں گنجائش ہو، تو اس کے ذریعہ جواب عنایت فرمائیں تاکہ دیگر احباب کو بھی فائدہ پہنچے، جوابی لفافہ بھی ارسال خدمت ہے۔

المستفتی: شفیق احمد غازی آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پاسپورٹ اور ایڈنٹی کارڈ کے لئے اپنا فوٹو کھنچوانا ضرورت کی وجہ سے علماء نے جائز لکھا ہے، اسی طرح اسکولوں، کالجوں، یونیورسیٹوں میں داخلہ کے لئے اور بینک میں کھاتہ کھولنے کے لئے اسی طرح لائسنس وغیرہ کے لئے، جائداد کی خرید وفروخت میں فوٹو لگانے کے لئے، مدارس میں داخلہ کے لئے اور فارم پر فوٹو لگانے کے لئے فوٹو کھنچوانا ضرورۃً جائز ہے؛ لہٰذا ان کاموں کے لئے فوٹو کھینچنا بھی جائز ہے اور ان کاموں کے لئے فوٹو کھینچ کر اجرت لینا بھی جائز ہے؛ لیکن ایک مسلمان کے لئے محض فوٹو گرافی کو ذریعۂ معاش بنالینا غیر مناسب ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسالک ۱۱۲-۱۳۴)

أما إتخاذ الصورة الشمسية للضرورة، أو الحاجة كحاجتها في جواز السفر، وفي التاشيرة، وفي البطاقات الشخصية، أو في مواضع يحتاج فيها إلى معرفة هوية المرء، فينبغي أن يكون مرخصًا فيه.

(تكملة فتح الملهم، باب تحريم تصوير صورة الحيوان، الصورة عند الحاجة، اشرفية ديوبند ٤/ ١٦٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۸۰۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۴/۲۳ھ

داخلۂ امتحان کیلئے لڑکے ولڑکیوں کا فوٹو کھنچوانا

سوال [۱۱۰۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ لڑکوں اورلڑکیوں کو قانونی اعتبار سے تصویر کھنچانا ضروری ہے، اسکول اور کالج وغیرہ کے لئے اور داخلہ کے امتحان کے لئے شرعی حکم کیا ہے؟ لڑکے اورلڑکیوں کے احکام مفصل قرآن وحدیث کی روشنی میں تحریر فرمائیں۔

المستفتی: سعید احمد سیوانی، مدرسہ مظاہر العلوم، سہارن پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تصویر کھنچانا مطلقاً حرام ہے، ہاں سخت مجبوری اورضرورت کی بنا پر پاسپورٹ اور شناختی کارڈ وغیرہ کے لئے کھنچانا مباح ہے، لڑکے اورلڑکیوں کے لئے مباح اورحرام ہونے میں حکم یکساں ہے؛ لہٰذا محض شوق کے لئے تصویر کھنچانا جائزنہیں۔ (مستفاد: ایضاح المسالک ۱۱۳، کفایت المفتی قدیم ۹/۲۴۳، جدید مطول ۱۳/۴۴، جواہر الفقہ قدیم ۳/۲۳۲، جدید زکریا ۷/۲۵۶، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۴/۴۲۴، جدید ڈابھیل ۱۹/۴۶۹)

وإن تحققت الحاجة إلى استعمال السلاح الذي فيه تماثل، فلا بأس باستعماله؛ لأن موضع الضرورة مستثناة من المحرمة كما في تناول المحرمة.

(شرح سير كبير بحواله جواهر الفقه، قديم٢/٢٣٢، جديد زكريا٧/٢٥٦=٢٥٧)

أما إتخاذ الصورة الشمسية للضرورة، أو الحاجة كحاجتها في جواز السفر، وفي التاشيرة، وفي البطاقات الشخصية، أو في مواضع يحتاج فيها إلى معرفة هوية المرء، فينبغي أن يكون مرخصًا فيه. (تكملة فتح الملهم، باب تحريم تصوير صورة الحيوان، الصورة عند الحاجة، اشرفية ديوبند ٤/ ١٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍رجب المرجب ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۴۹۴۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/۷/۱۴۱۷ھ

پاسپورٹ اور شناختی کارڈ کے لئے تصویر کشی

سوال [۱۱۰۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جوائنٹ چیریٹی کمشنر ناگپور نے بڑی مسجد ٹرسٹ کے دیرینہ تنازعات کو فیصل فرماتے ہوئے سات نفری ایک عارضی ٹرسٹی کمیٹی بنا کر اسے حکم دیا ہے کہ بائی لاز کے مطابق عام ممبر سازی کر کے ایک منتخب شدہ ٹرسٹی کمیٹی کا انتخاب کرا کے ٹرسٹ کا چارج اسے سونپ دے؛ لہٰذا جج موصوف کے حکم کے مطابق مقامی اخبار میں عام اعلان چھپوا کر ممبر شپ کے لئے درخواستیں طلب کی گئیں، ٹرسٹی کمیٹی نے اپنی معلومات کی روشنی میں اور ایک ذیلی کمیٹی کی مدد سے موصول شدہ درخواستوں کی فرداً فرداً تصدیق کی اور ۵۹۲؍ممبران بنالیے۔ ممبر سازی چونکہ شخصی تصدیق پر مبنی تھی؛ اس لئے عرضداروں سے ان کے فوٹو طلب نہیں کئے؛ کیونکہ اسوقت اس کی ضرورت نہ تھی۔

اب جج موصوف کا دوسرا حکم یہ ہے کہ ایک قابل اور مذہب کے لائق شخص کو الیکشن آفیسر مقرر کر کے، اس کے ماتحت اور زیر نگرانی الیکشن کرادیا جائے، الیکشن آفیسر ایک ایسا شخص ہونا چاہئے، جس کا ٹرسٹ کے معاملات سے دور نزدیک کا کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے، ٹرسٹی کمیٹی نے ایک ایسے ہی شخص کو الیکشن آفیسر مقرر کردیا ہے۔

اب مسئلہ یہ پیدا ہوا ہے کہ الیکشن آفیسر چونکہ ممبران سے واقف نہیں ہے؛ اس لئے ووٹنگ کے وقت صرف نام اور پتے کی بنیاد پر ممبران کی قطعی شناخت کس طرح کریں گے۔ ٹرسٹی کمیٹی کے ممبران الیکشن کے دوران الیکشن کی جگہ اور اس کے اطراف میں قانوناً موجود نہیں رہ سکیں گے؛ اس لئے ممبران کی شناخت میں ان کی مدد نہیں لی جاسکتی؛ لہٰذا ٹرسٹی کمیٹی نے طے کیا ہے کہ ممبران کے شناختی کارڈ تیار کروالئے جائیں اور ایک فوٹو الیکشن فہرست پر ممبر کے نام کے آگے چسپاں کر کے الیکشن آفیسر کے سپرد کردی جائے، اس کی اطلاع تمام ممبران کو ایک مراسلہ مؤرخہ ۱۵؍مئی ۲۰۰۴ء کے ذریعہ دیدی گئی ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ الیکشن آفیسر کے فرائض منصبی کی ادائے گی میں مدد کرنے کے لئے اور ممبران کی صحیح شناخت کی قانونی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اور ہر قسم کی بدانتظامی اور جعلی (بوگس) ووٹنگ کے سدباب کے لئے اور صاف ستھرا منصفانہ الیکشن کرانے کے لئے ممبران سے ان کے شناختی کارڈ تیار کرنے کے لئے ان سے فوٹو مانگنا شرعاً کیسا ہے؟

المستفتی: نذیر انصاری، سکریٹری، ایڈ ہاک، ٹرسٹی کمیٹی، مومن پورہ، ناگ پور-۱۸

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پاسپورٹ اور شناختی کارڈ کے لئے فوٹو کھنچوانا جائز اور درست ہے؛ اس لئے مذکورہ صورت میں شناختی کارڈ طلب کرنے کی گنجائش ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسالک ۱۳۵)

أما إتخاذ الصورة الشمسية للضرورة، أو الحاجة كحاجتها في جواز السفر، وفي التاشيرة، وفي البطاقات الشخصية، أو في مواضع يحتاج فيها إلى معرفة هوية المرء، فينبغي أن يكون مرخصًا فيه.

(تكملة فتح الملهم، باب تحريم تصوير صورة الحيوان، الصورة عند الحاجة، اشرفية ديوبند ٤/١٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۳۷۶/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۵/۱۵ھ

کارٹون بنانے کا حکم

سوال [۱۱۰۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل شخصیتوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کارٹون بنائے جاتے ہیں، جس میں انسانی خدوخال ظاہر نہیں ہوتا؛ لیکن اس شخصیت کی طرف اشارہ ہوجاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا کارٹون بنانا جائز ہے؟ یا یہ بھی تصویر سازی میں شمار ہوگا؟ اس کو بنانا اوراس سے ذریعہ آمدنی اختیار کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ مدلل جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد قربان علی، ہری دوار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جن کارٹونوں کے سر موجود ہوں اگر چہ ان کے چہرے کے خدوخال ظاہر نہ ہوں وہ شرعاً تصویر کے دائرہ میں داخل ہیں، ان کا بنانا اوران کے ذریعہ کاروبار وغیرہ کرنا جائز نہیں ہے، عام تصویر سازی کے مقابلہ میں اس میں اورزیادہ برائی یہ ہے کہ اس میں ایک آدمی کی صورت بگاڑ کر اس کی توہین وتذلیل کی جاتی ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسَى اَنْ يَكُوْنُوْا خَيْرًا مِنْهُم. [الحجرات:۱۱]

قال القرطبي: والسخرية الاستهزاء. (تفسير قرطبي،دارالكتب المصرية القاهرة ۳۲٤/۱٦، دار الكتب العلمية بيروت ۲۱۳/۱٦)

وقيد بالرأس؛ لأنه لا اعتبار بإزالة الحاجبين، أو العينين. (شامي، باب مايفسد الصلاة ومايكره فيها، زكريا ٤۱۸/۲، كراچي ٦٤۸/۱)

ولو قطع يداها، أو رجلاها لا ترفع الكراهة، وكذا لو أزيل الحاجبان، أو العينان. (مجمع الأنهر، باب مايفسد الصلاة ومايكره فيها، دار الكتب العلمية بيروت ۱۸۹/۱، مصرى قديم ۱۲٦/۱)

عن عبد الله بن مسعودؓ يقول: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم: إن أشد الناس عذابًا عند الله يوم القيامة المصورون. (مسند أحمد بن حنبل ۳۷۵/۱، رقم:۳۵۵۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ربیع الاول ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۳۲۲/۳۹)

عورت کے نام رجسٹری کرانے میں تصویری اسٹامپ لگوانے کا حکم

سوال [۱۱۰۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسئلہ یہ ہے کہ گورنمنٹ نے قانون بنایا ہے کہ اگر رجسٹری عورت کے نام کرائی جائے، تو اسٹامپ کچھ کم لگتا ہے؛ جبکہ عورت کا فوٹو اسٹامپ پر بھی لگتا ہے، اسی طرح سرکاری رجسٹر پر بھی لگتا ہے۔ نیز ایک فوٹو رجسٹری آفس میں بھی کھینچا جاتا ہے؛ جبکہ دفتر میں بہت سے لوگ ہوتے ہیں، ان کے سامنے چہرہ کھولنا پڑتا ہے۔

غورطلب امر یہ ہے کہ کیا خرچ کچھ کم کرنے پر عورت کو غیروں کے سامنے بے پردہ کرنا درست ہے؟

المستفتی: محمد عثمان امروہوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر عورت کے نام رجسٹری کرانے میں واقعتاً پیسوں کی بچت ہوتی ہے تو اپنے پیسوں کی بچت کے لئے عورت کا فوٹو رجسٹری کے لئے لگانے کی گنجائش ہے، جیسا کہ شرعی شہادت دینے کے لئے غیر محرم قاضی کے یہاں چہرہ کھولنے کی اجازت ہوتی ہے۔

أما إتخاذ الصورة الشمسية للضرورة، أو الحاجة كحاجتها في جواز السفر، وفي التاشيرة، وفي البطاقات الشخصية، أو في مواضع يحتاج فيها إلى معرفة هوية المرء، فينبغي أن يكون مرخصًا فيه. (تكملة فتح الملهم، باب تحريم تصوير صورة الحيوان، الصورة عند الحاجة، اشرفية ديوبند ٤/ ١٦٤)

فإنا أجمعنا على أنه يجوز النظر إلى وجهها لتحمل الشهادة.

(هنـدية، كتـاب الشهادة، الباب الثاني، زكريا قديم ۳/ ۴۵۲، جديد ۳/ ۳۸۹)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۶۷۰/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۵/۹ھ

فوٹوگرافی کی اجرت کا حکم

سوال [۱۱۱۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید فوٹوگرافر ہے اور فوٹوگرافی ہی اس کا ذریعہ معاش ہے، فوٹوگرافری کی آمدنی سے اپنے ہر قسم کے اخراجات پورے کرتا ہے، اس بارے میں مطلع فرمائیں کہ:

(۱) فوٹو کھینچنا۔

(۲) فوٹو کھنچوانا۔

(۳) فوٹوگرافری کا پیشہ کرنا۔

(۴) اس کی آمدنی سے اپنے اخراجات پورے کرنا یہ سب کیسا ہے؟ اگر اس کی آمدنی حرام ہے، تو اس پیسے سے خریدے ہوئے لباس کا استعمال اور اس سے خریدی ہوئی خورد ونوش کی اشیاء کا کھانا، پینا کیسا ہے؟

(۵) کیا ایسے شخص کی نماز صحیح ہوجاتی ہے؟

(۶) ایسے شخص کے یہاں دعوت طعام پر کھانا کھانا اور اس سے اپنی لڑکی کی شادی بیاہ کرنا کیسا ہے؟

(۷) کیا اس کی کمائی ہوئی آمدنی کے جائز ہونے کی کوئی صورت ہوسکتی ہے یا نہیں؟

(۸) نیز مطلع فرمائیں کہ فوٹو کھنچوانا کس کس صورت میں جائز ہے؟

اس مسئلہ کے تمام گوشوں کا جواب باصواب بے تکلف ہوکر قدرے تفصیل کے ساتھ مرحمت فرمائیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔

المستفتی: محمد عباس، ہلدوانی، نینی تال (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱/۲) بغیرضرورت شدیدہ فوٹو کھینچنا، کھنچوانا ناجائز اور حرام اور گناہ کبیرہ ہے اور سخت ترین عذاب الٰہی کا خطرہ ہے۔

عن عبد الله بن مسعودؓ، قال: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: إن أشد الناس عذابًا عند الله يوم القيامة المصورون. (صحيح البخاري، باب عذاب المصورين يوم القيامة، النسخة الهندية ٢/ ٨٨٠، رقم: ٥٧١٧، ف: ٥٩٥٠)

تصوير صورة الحيوان حرام أشد التحريم، وهو من الكبائر. (عمدة القاري، باب عذاب المصورين يوم القيامة، زكريا ١٥/ ١٢٤، دار إحياء التراث العربي ٢٢/ ٧٠، تحت رقم الحديث: ٥٩٠١)

(۳) اس کا پیشہ اختیار کرنا ناجائز اور حرام ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۹/ ۲۴۵، جدید زکریا مطول ۱۳/ ۵۷، امداد الفتاوی ۴/ ۱۳۲)

ولو استأجر مصوراً فلا أجر له؛ لأن عمله معصية. (شامي، قبيل مطلب الكلام على إتخاذ المسبحة، زكريا ٢/ ٤٢٠، كراچي ١/ ٦٥٠، حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، دار الكتاب ديوبند ١/ ٣٦٣، النهر الفائق، دار الكتب العلمية بيروت ١/ ٢٨٥)

(۴) اس کی آمدنی امام ابوحنیفہؒ اور امام کرخی کے نزدیک حلال ہے اور صاحبین کے نزدیک مکروہ ہے اور امام کرخی کے قول پر ہی فتوی ہے۔

لو آجره دابة لينقل عليها الخمر، أو آجره نفسه ليرعى له الخنازير يطيب له الأجر عنده وعندهما يكره. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ٩/ ٥٦٢، كراچي ٦/ ٣٩٢)

رجل اکتسب مالا من حرام، ثم اشتری، فهذا علی خمسة أوجه: أما إن دفع تلک الدراهم إلی البائع أولاً ثم اشتری منه بها، أو اشتری قبل الدفع بها ودفعها، أو اشتری قبل الدفع بها ودفع غیرها، أو اشتریٰ مطلقاً ودفع تلک الدراهم، أو اشتریٰ بدراهم آخر ودفع تلک الدراهم (إلی قوله) وقال الکرخي: في الوجه الأول، والثاني لا یطیب، وفي الثلاث الأخیرة یطیب، وقال أبوبکر یطیب في الکل؛ لکن الفتوی الآن علی قول الکرخي دفعاً للحرج عن الناس. (شامي،، مطلب: إذا اکتسب حراما ثم اشتری علی خمسة أوجه، کراچي ۵/۲۳۵، زکریا۷/۴۹۰)

(۵) اس کی نماز صحیح ہوجاتی ہے۔

(۶) اس کی دعوت قبول نہ کرنا بہتر ہے۔

(۷) ضرورت پوری کرلیا کرے، پھر آمدنی کو قرض کی ادائے گی میں کردے۔

(مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۳۶۲/۶، ڈابھیل ۶۱/۱۸)

(۸) ضرورت شدیدہ مثلاً پاسپورٹ وغیرہ بنوانے کے لئے جائز ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۲۴۵/۹، جدید زکریا مطول ۴۴/۱۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/محرم الحرام ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۶۰۷/۲۵)

گڈے گڑیا کی شرعی حیثیت

سوال [۱۱۱۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بچوں کے کھلونوں میں گڑیا گڈے کی تصویریں بنی ہوئی ہوتی ہیں، تو کیا ایسے کھلونوں کو خریدنا اپنے گھر میں رکھنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد فراست علی، سرائے ترین، سنبھل (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گڈے گڑیا ایک قسم کے مجسمے ہوتے ہیں اور حدیث شریف میں حضرت عائشہؓ کی گڑیا سے متعلق جو واقعہ مشہور ہے، یہ اس زمانہ کا ہے، جس زمانہ میں مجسمہ اور تصویر کشی وغیرہ کی ممانعت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، اور یہ سب غزوہ خندق اور غزوہ خیبر سے پہلے کی چیزیں ہیں، غزوہ خندق وخیبر کے بعد یہ ساری چیزیں ممنوع ہوچکیں، جیسا کہ شادی کے موقع پر دف بجانا بھی جائز تھا، وہ دف بجانا بھی منسوخ ہوچکا، شراب بھی جائز تھی وہ بھی منسوخ ہوچکی۔ (مستفاد: محمودیہ ڈابھیل ۱۹/۵۰۳، جواہر الفقہ جدید زکریا ۷/۲۵۰-۲۶۰)

قال أصحابنا وغيرهم من العلماء: تصوير صورة الحيوان حرام شديد التحريم، وهو من الكبائر؛ لأنه متوعد عليه بهذا الوعيد الشديد المذكور في الأحاديث سواء صنعه في ثوب، أوبساط، أو درهم، أودينار، أو غير ذلک، وأما تصوير الشجر، والرجل، والجبل وغير ذلک فليس بحرام، هذا حکم نفس التصوير، وأما إتخاذ المصور بحيوان، فإن کان معلقاً على حائط سواء کان له ظل أم لا، أو ثوبًا ملبوسًا، أو عمامة، أونحو ذلک فهو حرام. (مرقاة المفاتيح، مکتبه امدادية ملتان ۸/۳۲۶، شرح النووي للمسلم ۲/۱۹۹)

ويحمل أن يكون قضية عائشةؓ هذه في أول الهجرة قبل تحريم الصورة. (مرقاة المفاتيح، مکتبه امدادية ملتان ۶/۲۰۶)

وادعي بعضهم أن إباحة اللعب بهن للبنات منسوخ بهذه الأحاديث. (مرقاة المفاتيح، مکتبه امدادية ملتان ۸/۳۲۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/ ذی قعدہ ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/ ۱۱۷۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۱۱/۲۴ھ

چہرے والے آرڈر بنانا

سوال[۱۱۱۰۲]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے پاس چہرے کا آرڈر رہے، میں اس مال کو بنا سکتا ہوں یا نہیں؟

المستفتی: ابوالکلام آزاد، کسرول مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حدیث شریف میں جاندار کی تصویر اور شکل بنانے پر سخت وعید آئی ہے؛ اس لئے مذکورہ آرڈر لے کر اس کی تصویر اور مجسمہ کی شکل بنانا قطعاً جائز نہیں۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۸۰)

عن عبد الله بن مسعودؓ، قال: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: إن أشد الناس عذابًا عند الله يوم القيامة المصورون. (صحيح البخاري، باب عذاب المصورين يوم القيامة، النسخة الهندية ۲/ ۸۸۰، رقم: ۵۷۱۷، ف: ۵۹۵۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/رجب المرجب ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/۹۰۶۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴/۷/۱۴۲۷ھ

لوہا، پیتل ودیگر دھات کی مورتیاں بنانے کا حکم

سوال[۱۱۱۰۳]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ پیتل، المونیم، لوہا یا دیگر دھات کی مورتیاں انسان یا جانداروں کی شکل میں یا فحش ننگی ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی مورتیاں بنانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد یعقوب عرف چھوٹے بھائی، تکیہ شاہ علاء الدین، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پیتل، المونیم، لوہا وغیرہ دھات کے مجسمے

انسان یا جانداروں کی شکل میں بنانا ناجائز اور حرام ہے اور بنانے والے پر سخت ترین عذاب الٰہی کا خطرہ ہے۔

حدیث پاک میں آیا ہے کہ قیامت کے دن جاندار کا مجسمہ بنانے والے پر سخت ترین عذاب ہوگا۔ مزید جاندار کا مجسمہ بنانے کے ساتھ ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی حالت میں بنانے میں اس سے بھی زیادہ عذاب الٰہی کا خطرہ ہے؛ اس لئے مسلمانوں کو ایسے مجسمے اور مورتیاں بنانے سے اپنے آپ کو دور رکھنے کی ضرورت ہے، روزگار کا مالک اللہ تبارک وتعالیٰ ہے اور اللہ پر بھروسہ کر کے ایسے کام کا آرڈر مسلمان ہرگز نہ لیا کریں اور اسے ٹھکرا کر کسی اور کام کا آرڈر لیا کریں، اللہ پاک غیبی مدد فرمائیں گے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۸۰، فتاویٰ محمودیہ ڈابھیل ۱۹/۴۷۲)

قال اللہ تعالیٰ: وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِى الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزۡقُهَا. [هود:٦]

عن عبد الله بن مسعودؓ، قال: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: إن أشد الناس عذابًا عند الله يوم القيامة المصورون. (صحيح البخاري، باب عذاب المصورين يوم القيامة، النسخة الهندية ٢/ ٨٨٠، رقم: ٥٧١٧، ف: ٥٩٥٠، صحيح مسلم، باب لا تدخل الملائكة بيتًا فيه كلب ولا صورة، النسخة الهندية ٢/ ٢٠١، بيت الأفكار رقم: ٢١٠٩)

فظاهر كلام النووي في شرح مسلم: الإجماع على تحريم تصوير الحيوان. وقال وسواء صنعه لما يمتهن، أو بغيره، فصنعه حرام بكل حال؛ لأن فيه مضاهاة لخلق الله تعالىٰ سواء كان في ثوب، أو بساط، أو درهم أو دينار وحائط وغيرها. (شامي، باب ما يفسد الصلاة ما يكره فيها، زكريا ٢/ ٤١٦، كراچي ١/ ٦٤٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸ر محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۳۸۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/۱/۱۴۳۵ھ

آرڈر باقی رکھنے کے لئے ایک آئٹم مجسم بنانا

سوال [۱۱۱۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بحالت مجبوری پیتل کے مجسمہ کا ایکسپورٹ کرنا مثلاً سات آئٹم غیر جاندار کے مجسمہ ہیں اور ایک مجسمہ جاندار کا ہے، جیسے ہاتھی کا مجسمہ اب اس ایک مجسمہ کی وجہ سے آرڈر کو کینسل کر دیتے ہیں، اس حالت میں ایکسپورٹ کرنا آیا جائز ہے یا ناجائز؟

المستفتی: محمد قاسم، امروہہ گیٹ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بقیہ اشیاء کے آرڈر کو باقی رکھنا شرعی طور پر ایسا عذر نہیں ہے، جس کی وجہ سے مجسمہ جیسی حرام اشیاء کی تیاری کی گنجائش ہو سکے؛ اس لئے جائز نہیں ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔

عن عبد اللّٰه بن مسعودؓ يقول: قال سمعت النبي صلى اللّٰه عليه وسلم: إن أشد الناس عذابًا يوم القيامة المصورون. (صحيح مسلم، باب لا تدخل الملائكة بيتًا فيه كلب ولا صورة، النسخة الهندية ۲/ ۲۰۱، بيت الأفكار رقم: ۲۱۰۹)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ ذی قعدہ ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/ ۳۷۱۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۱۱/۱۶ھ

پیتل کے جانور مورتی وغیرہ بنانے اور ان کی تجارت کا حکم

سوال [۱۱۱۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) پیتل کے جانور، مورتی، مندر بنانا کیسا ہے؟

(۲) ان کوخرید کر بیچنا کیسا ہے؟ ایسی تجارت کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

المستفتی: علی محمد، مقبرہ اول، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) پیتل، تانبا وغیرہ کسی بھی دھات سے جانور بنانا ناجائز اور حرام ہے۔ حدیث شریف میں اس کی سخت وعید آئی ہے اور مورتی بنانا اور مندر کے اندر کی چیزیں بنانا اور بھی زیادہ شدید گناہ اور عذاب الٰہی کا باعث ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۸۰-۸۱، فتاوی محمودیہ قدیم ۲۵۸/۷، جدید ڈابھیل ۴۷۰/۱۹، جواہر الفقہ قدیم ۴۰/۴، جدید زکریا ۲۴۶/۷)

عن عبد اللّٰه بن مسعودؓ، قال: سمعت النبي صلى اللّٰه عليه وسلم يقول: إن أشد الناس عذابًا عند اللّٰه المصورون. (صحيح البخاري، باب عذاب المصورين يوم القيامة، النسخة الهندية ۲/۸۸۰، رقم: ۵۷۱۷، ف: ۵۹۵۰، صحيح مسلم، باب لا تدخل الملائكة بيتًا فيه كلب ولا صورة، النسخة الهندية ۲/۲۰۱، بيت الأفكار رقم: ۲۱۰۹)

(۲) پیتل وغیرہ کے جانوروں کی تجارت اور اس کی خرید وفروخت کرنا بھی ناجائز اور ممنوع ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۸۳/۱)

إن ماقامت المعصية بعينه يكره بيعه تحريمًا. (در مختار، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ۹/۵۶۱، كراچي ۶/۳۹۱، الموسوعة الفقهية الكويتية ۹/۲۱۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ رجب المرجب ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۷۷۹/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۷/۲۸ھ

(۲۶) باب ٹیلی ویژن اور میڈیا

دور حاضر میں ٹیلی ویژن کا حکم

سوال [۱۱۱۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نظام الفتاوی میں ٹی وی شریعت کی نظر میں: ٹی وی کے پروگرام کے متعلق ایک ضابطہ درج ہے، وہ یہ ہے کہ وہ پروگرام جن کو بغیر کسی آلہ کے دیکھنا درست ہے، اس کو بذریعۂ آلہ بھی دیکھنا درست ہے اور جن کو بغیر کسی آلہ کے دیکھنا درست نہیں، ان کو بذریعۂ آلہ دیکھنا درست نہیں ہے، یہ ضابطہ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر فٹ بال کھیل دکھایا جارہا ہو اور کھیلنے والے مردوں کا لباس بھی مکمل ہو یا کرکٹ کھیل ہورہا ہو اور نماز وغیرہ کے اوقات کی رعایت کرتے ہوئے دیکھا جائے، تو یہ شرعًا درست ہوگا یا نہیں؟ آیا اس سابق ضابطہ کے تحت ان پروگراموں کے دیکھنے کو جائز قرار دیا جائے یا پھر چونکہ تصویر ذی روح کو دیکھنا درست نہیں؛ اس لئے ان پروگراموں سے دیکھنے پر عدم جواز کا فتوی دیا جائے یا سدًّا للباب ان کے دیکھنے سے روکا جائے۔

المستفتی: مفتی عتیق الرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ ضابطہ دور حاضر کے لئے مناسب نہیں ہے، دور حاضر میں عمومی طور پر ناجائز پروگرام ہوتے ہیں۔ نیز کرکٹ فی نفسہ ممنوع کھیل ہے، اس لئے ٹی وی کے پروگراموں کے علاوہ صرف ٹی وی گھر میں رکھنا بھی ممنوع اور ناجائز ہوگا،

علت کچھ بھی ہواس زمانہ میں یہ چیزیں ام الفواحش ہیں؛ اس لئے ان چیزوں کا رکھنا مطلقاً سداًللباب ناجائز ہوگا۔ نیز درمختار کی عبارت کا تقاضہ بھی عدم جواز ہی کا ہے۔

استماع صوت الملاهي معصية، والجلوس عليها فسق، والتلذذبها كفر بالنعمة. (در مختار، كتاب الحظر والإباحة، فصل في اللبس، كراچي٦/٣٤٩، زكريا ٩/٥٠٤، تاتارخانية، زكريا١٨/١٨٩، رقم: ٢٨٤٦٦، هندية، زكريا قديم ٥/٣٥٢، جديد ٥/٤٠٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ ذی قعدہ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۲۱۶/۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۱۱/۲۳ھ

ٹیلی ویژن کا پروگرام عکس ہے یا تصویر؟

سوال [۱۱۱۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ٹیلی ویژن میں جو پروگرام آتے ہیں اوراس میں جو تصویریں نظر آتی ہیں، وہ فوٹو ہیں یا عکس؟ ازراہ کرم حکم شرعی سے آگاہ فرمادیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ٹیلی ویژن میں جو پروگرام آتے ہیں اوران میں جو تصویریں نظر آتی ہیں وہ فوٹو نہیں ہیں؛ بلکہ عکس ہیں اس لئے کہ ان کو دوام اوراستقرار نہیں ہوتا؛ کیونکہ درحقیقت وہ بجلی کے ذرات ہوتے ہیں، جو کیمرے سے اسکرین کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں اور پھر اسی اصلی ترتیب سے اسکرین پر ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور پھر زائل اور فناء ہوجاتے ہیں؛ لہٰذا ان پر ثابت اور مستقر تصویر کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ (مستفاد: فقہی مقالات ۱۳۲/۴، درس ترمذی ۳۵۱/۲)

أما الصورة التي ليس لها ثبات واستقرار وليست منقوشة على شيئ

بصفة دائمة، فإنها بالظل أشبه. (تكلمه فتح الملهم، كتاب اللباس والزينة، التلفزيون، اشرفيه ديوبند ٤/ ١٦٤)

لا تحرم المنظور إلي فرجها الداخل إذا رآه من مرآة، أو ماء؛ لأن المرئي مثاله بالانعكاس لاهو. وتحته في الشامية: يشير إلى ما في الفتح الماء من الفرق بين الرؤية من الزجاج، والمرآة وبين الرؤية في الماء، ومن الماء حيث قال: كأن العلة والله سبحانه وتعالىٰ أعلم أن المرئي في المرآة مثاله لا هو. (شامي، زكريا ٤/ ١١٠، كراچي ٣/ ٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف خاص ۴۰/ ۱۱۴۵۶)

بچوں کو ٹیلی ویژن اور ویڈیو سے منع کرنا

سوال [۱۱۱۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں امام ہوں بچوں کو پڑھاتا ہوں اور جو بچہ .T.V اور ویڈیو دیکھنے کا شوق رکھتا ہے؛ اس پر تنبیہ کرتا ہوں تو اس کے ماں باپ مجھ سے بحث کرنے کے لئے آتے ہیں؛ اس لئے آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟ اور آپ کیا منظوری دیں گے؟ آپ حق و باطل کو دیکھتے ہوئے اس کا جواب دیں کہ ان کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرنا چاہئے؟ ان کو پڑھایا جائے کہ نہیں؟

المستفتی: قاری محمد عرفان، مکان نمبر ۵۸، گلی نمبر ۳۰، اندرا چوک، دہلی-۵۳

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: آپ بچوں کو اور ماں باپ کو نرمی و پیار اور محبت و حکمت سے سمجھائیں۔ انشاء اللہ بحث ومباحثہ کی نوبت نہیں آئے گی۔

کما قال اللہ تعالیٰ: ادْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ. [سورۃ النحل: ١٢٥] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍شوال المکرّم ۱۴۰۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳؍۳۱۳)

گھر میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن رکھنا

سوال [۱۱۱۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو کا شرعاً کیا حکم ہے؟ جبکہ ہندوستان میں ہمارے برادران وطن اس کو اپنے مذہب کی اشاعت کے لئے استعمال کرتے ہیں، جس کا اثر نونہال ملت پر پڑتا ہے۔ از راہ کرام بالتفصیل وبا حوالہ جواب عنایت فرمائیں نوازش ہوگی۔

المستفتی: عبید الرحمٰن، پیرزادہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جس ٹیلی ویژن .T.V ریڈیوں میں ناچ گانا کھیل تماشا اور مرد وعورت کی تصویریں آتی ہوں، اس کا خریدنا گھر میں چالو کرنا عزیز واقارب کے مرد وعورتوں کو بیٹھ کر دیکھنا اور لذت حاصل کرنا سب حرام اور گناہ کبیرہ اور خدائی وعید وعذاب کا سخت خطرہ ہے، جس طرح شراب کو ام الخبائث کہا گیا ہے، اسی طرح ٹیلی ویژن، ام الفواحش اور بے حیائیوں کی جڑ ہے۔ (مستفاد: جدید فقہی مسائل ۱/۲۰۱)

التغني واستماعها كل ذلك حرام (وقوله) وضرب الدف، وجميع أنواع الملاهي حرام. (فتاوى عزيزى ١/ ٦٦)

ودلت المسئلة أن الملاهي كلها حرام؛ لقوله عليه الصلوة والسلام: استماع الملاهي معصية، والجلوس عليها فسق، والتلذذ بها

کفر أي بالنعمة. (الدر المختار، کتاب الحظر والإباحة، قبیل فصل في اللبس، مطبوعة کوئٹه ٥/٢٤٦، کراچي ٦/٣٤٩، زکریا ٩/٥٠٤، الفتاوی التاتارخانیة، زکریا ١٨/١٨٩، رقم: ٢٨٤٦٦، هندیة، زکریا قدیم ٥/٣٥٢، جدید ٥/٤٠٦، فتاوی عزیزی ١/٦٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/ ۱۳/ ۷)

قومی وملی ضرورت کے لئے ٹیلی ویژن میں پروگرام

سوال [۱۱۱۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ قومی وملی ضرورت کے لئے قومی وملی پروگرام ٹیلی ویژن میں دینا کیسا ہے، جس سے قوم اور حکومت کو معلوم ہوجائے کہ قومی وملی کیا پروگرام ہورہا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قومی وملی ضرورت کے پیش نظر ٹیلی ویژن میں قومی وملی پروگرام دینا جائز ہے تاکہ قوم اور حکومت کو معلوم ہوجائے کہ قومی وملی پروگرام کیوں کیا جارہا ہے؟

الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة. (الأشباه والنظائر، زکریا ١/٢٦٧)

الضرورات تبيح المحظورات. (الأشباه والنظائر، زکریا ١/٢٥١)
فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف خاص ۴۰/ ۱۱۴۴۰)

دینی پروگرام کے لئے ٹیلی ویژن کا حکم

سوال [۱۱۱۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ٹیلی ویژن میں خالص دینی پروگرام کا دیکھنا شرعًا کیسا ہے؟ جب کہ اس میں نامحرم کی تصویر اور کوئی فحش پروگرام نہ ہو؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ٹیلی ویژن میں خالص دینی پروگرام کا دیکھنا جب کہ اس میں کسی نامحرم کی تصویر اور کوئی فحش پروگرام نہ ہو جائز اور مباح ہے، جیسا کہ فیکٹری وغیرہ میں مالک نے ملازمین کی نگرانی اور چور وغیرہ پر نگاہ رکھنے کے لئے کیمرہ لگالیا ہو تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ (مستفاد: فقہی مقالات ۱۳۳/۴، درس ترمذی ۳۵۱/۵، آپ کے مسائل اور ان کا حل جدید زکریا ۴۳۵/۸)

الأمور بمقاصدها. (الأشباه والنظائر، زكريا ص: ١٠٢)

إذا كان التلفزيون، أو الفيديو خاليًا من هذه المنكرات بأسرها؛ هل يحرم بالنظر إلى كونه تصويرًا؟ فإن لهذا العبد الضعيف –عفا الله عنه– فيه وقفة، وذلك لأن الصّورة المحرمة ما كانت منقوشة، أو منحوتةً بحيث يصبح لها صفة الاستقراء على شيئ، وهي الصور التي كان الكفار يستعملونها للعبادة، أما الصورة التى ليس لها ثبات واستقرار، وليست منقوشة على شيئ بصفةٍ دائمةٍ، فإنها بالظل أشبه منها بالصورة. (تكملة فتح الملهم، كتاب اللباس والزينة، التلفزيون، اشرفية ديوبند ١٦٤/٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰ر صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف خاص ۱۱۴۳۹/۴۰)

ٹی وی میں اسلامی وغیر اسلامی پروگرام دیکھنا

سوال [۱۱۱۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) ٹی وی میں مطلقاً پروگرام دیکھنا کیسا ہے؟

(۲) ٹی وی میں اسلامی پروگرام دیکھنا کیسا ہے؟ اگر جائز ہے تو اور ناجائز ہے تو دہلی میں جمعیۃ علماء ہند کے پروگرام میں جو پردہ لگایا گیا تھا، اس کی حیثیت کیا ہے؟

المستفتی: ریاض الدین، کولکاتہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) ٹی وی میں زیادہ تر فحاشی اور عریانیت اور مخرب اخلاق پروگراموں کا غلبہ ہوتا ہے، اور ٹی وی سے زیادہ تر معاشرہ جن شرمناک حرکتوں میں ملوث ہے، وہ ناقابل بیان ہیں؛ اس لئے ٹی وی کا گھر میں رکھنا اور اس کے پروگراموں کا دیکھنا شرعاً ناجائز ہے۔ (مستفاد: تجاویز فقہی اجتماع، ادارۃ المباحث الفقہیہ، بنگلور)

(۲) ٹی وی میں اسلامی اور جائز پروگراموں کا دیکھنا شرعاً اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی؛ اس لئے کہ جہاں اسلامی اور جائز پروگراموں کو دیکھا جاتا ہے، وہاں ناجائز پروگراموں سے بچنا ناممکن ہے؛ اس لئے اسلامی اور جائز پروگراموں کی بھی مطلقاً اجازت کا اعلان درست نہیں ہے۔

اور جمعیۃ علماء ہند کے پروگرام میں جو پردہ لگایا گیا تھا، اس کی حیثیت کیا ہے، وہاں کے ذمہ داروں سے معلوم فرمائیے۔ احقر بھی اس پروگرام میں شریک ہوا تھا، اور دور دور کالے پردے نظر تو آئے تھے؛ لیکن وہ پردہ کیوں لگایا تھا؟ ہمیں معلوم نہیں تھا بعد میں لوگوں نے بتایا کہ اس میں پروگرام نظر آرہا تھا اور اس پروگرام کے اندر چند مطالبے ایسے تھے، جو مسلمانوں اور شریعت کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، مثلاً قرآن کریم کی بے حرمتی کی مخالفت کا اعلان اور بے حرمتی کرنے والوں کو سزا دینے کا مطالبہ، اسی طرح پوٹا قانون کے

تحت بی جی پی حکومت نے جن مظلوم و بے قصور مسلمانوں کو گرفتار کررکھا تھا، ان کے چھڑانے کا مطالبہ اور حکومت کو اس کی طرف توجہ دلانے کا مطالبہ، اسی طرح حکومت ہند سے مسلمانوں کو ریزویشن دینے کے مطالبے ایسے ضروری اور اہم چیزیں ہیں، جن کا پورے ملک میں چرچا ہونا اور حکومت کے ذمہ داروں تک پہونچانا نہایت ضروری تھا، پھر بھی اصل حیثیت کا صحیح جواب وہاں کے ذمہ داران دے سکتے ہیں؛ اس لئے سائل اگر ضرورت محسوس کرے تو وہاں کے ذمہ داروں سے رابطہ قائم کرے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/ ۸۸۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۶/۲ھ

ٹی وی پر حج کا پروگرام دیکھنا

سوال [۱۱۱۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ٹی وی پر حج کے پروگرام دیکھنا، نیز ٹی وی سے حج سیکھنا کیسا ہے؟

المستفتی: زوار احمد، مال پوری جے پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ٹی وی سے حج کا سیکھنا کسی طرح بھی ممکن نہیں؛ اس لئے کہ حج کے مسائل نہایت اہم ہیں پڑھے لکھے افراد سے چار چار، پانچ پانچ مرتبہ حج کرنے کے باوجود امور حج میں غلطیاں واقع ہوجاتی ہیں اور حج کے موضوع پر چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں لکھی جاچکی ہیں، ان کتابوں سے جو معلومات فراہم ہوسکتی ہیں، وہ ٹی وی دیکھ کر معلوم نہیں ہوسکتیں؛ اس لئے یہ بیجا دلیل ہے؛ لہٰذا اس بہانہ سے ٹی وی دیکھنے کی گنجائش نہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ نے عبادت اور دین کو آلۂ لہو ولعب سے اختلاط کرنے سے منع فرمایا ہے۔

(مستفاد: فتاوی محمودیہ جدید ڈابھیل ۱۹/ ۵۰۸-۵۱۸، قدیم ۹/ ۴۱۷-۳۸۲/۱۴، امداد الفتاوی ۴/ ۲۵۷)

قال اللّٰہ تعالیٰ: یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَكُمْ هُزُوًا وَلَعِبًا مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوْا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِیَآءَ وَاتَّقُوْا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِیْنَ. [سورة مائده: ۵۷]

الملاهي كلها حرام حتى الغني بضرب القضيب. (هداية، كتاب الكراهية، اشرفي ديوبند ٤/٤٥٥، رشيدية٤/٤٣٩، الدر المختار على هامش رد المختار، زكريا٩/٥٠٢، كراچي٦/٣٤٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

كتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۶۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۵/۹ھ

ٹیلی ویژن میں حج کی فلم دیکھنا

سوال [۱۱۱۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مواقع حج کی کیسٹوں کو ٹیلی ویژن یا ویڈیو وغیرہ پر دیکھا جاسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: نیاز احمد، دیوریا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ٹیلی ویژن، وی سی آر، لہو ولعب اور گانے بجانے کا آلہ ہے، اس کے اندر تصویروں کی بھرمار ہوتی ہے، مردوں کی نظر عورتوں پر اور عورتوں کی نظر مردوں پر پڑتی ہے، جو بنص قطعی حرام ہے اور حج کی فلم میں اگرچہ ناچ گانا نہیں ہوتا ہے، مگر مرد وعورتوں کی تصویریں مخلوط ہوتی ہیں؛ لہٰذا حج کی فلم کو ٹیلی ویژن، وی سی آر پر دیکھنا جائز نہیں ہے اور یہ فلم جس ٹیلی ویژن یا وی سی آر میں دیکھی جارہی ہے، کیا وہ ٹیلی ویژن ایسا ہے کہ جس میں کبھی کوئی ناجائز پروگرام نہ آتا ہو؛ اس لئے بھی حج کی فلم کو ٹیلی ویژن وغیرہ میں دیکھنے کی اجازت نہ ہوگی۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۴/ ۳۸۶)

استماع الملاهي معصية، والجلوس عليها فسق، والتلذذ بها كفر .

(الدر المختار، كتاب الحظر والإباحة، قبيل فصل في اللبس، كراچي ٦/٣٤٩، زكريا ٩/٥٠٤، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٨/١٨٩، رقم:٢٨٤٦٦، هندية، زكريا قديم ٥/٣٥٢، جديد ٥/٤٠٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۸۲۵/۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۷/۵/۱۶ھ

کیو ٹی وی پر دینی پروگرام دیکھنا

سوال [۱۱۱۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کیو ٹی وی کا دیکھنا سننا اور اس پر بیان کئے گئے مسائل پر عمل کرنا کیسا ہے؟

نیز اس پر جو علماء کرام بیان کرتے ہیں، وہ کس مسلک سے متعلق ہیں؟ مزید تفصیل بیان فرما کر ممنون ہوں۔

المستفتی: محمد نعیم رام نگری، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: کیو ٹی وی احقر نے کبھی نہیں دیکھا؛ اس لئے اس کی حقیقت سے واقف نہیں ہے، ہاں البتہ دیکھنے والوں سے وہاں کے بعض بیانات سننے میں آئے، جو نہایت بے ثبوت اور غیر ذمہ دارانہ مسائل پر مشتمل ہوتے ہیں؛ اس لئے اس کے دیکھنے اور سننے میں کوئی دینی فائدہ نہیں ہے۔ نیز جس ٹیلی ویژن میں فحش اور حیا سوز پروگرام آتا ہے، اسی میں یہ پروگرام بھی آتا ہے؛ اسلئے ان کا دیکھنا اور سننا جواز کے دائرہ میں ہونا احقر کی سمجھ میں نہیں آتا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ ربیع الاول ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۷۵۷/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۳/۷ھ

خبریں سننے کے لئے ٹی وی رکھنا

سوال [۱۱۱۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید صوم وصلوۃ کا پابند ہے، دینی مزاج رکھتا ہے، زید چاہتا ہے کہ عالمی خبریں معلوم کرنے کے لئے ایک ٹی وی اپنے گھر میں لگائے، فلمی پروگرام ناٹک اور دیگر برے کاموں کے لئے استعمال نہیں کرے گا، زید خود ان چیزوں سے بہت زیادہ متنفر رہتا ہے، تو کیا عالمی حالات کو معلوم کرنے کے لئے اپنے گھر ٹی وی رکھی جا سکتی ہے اور عالمی احوال پر خبر رکھنا فرض ہے یا واجب یا مستحب ہے یا مکروہ ہے؟

المستفتی: ضمیر احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عالمی احوال کی خبر رکھنا آپ ﷺ کی اس سنت کے تحت داخل ہوسکتا ہے، جو آپ ﷺ سے اپنے صحابہ کرام کے واقعات اور حالات پر مطلع ہونے کے سلسلہ میں مروی ہے، جیسا کہ شمائل ترمذی شریف کی حدیث ہے۔

ويتفقد أصحابه ويسئل الناس عما في الناس، ويحسن الحسن، ويقويه ويقبح القبح ويوهيه. (شمائل ترمذي۲۳، جواهر الفقة، زكريا جديد ٥٠٦/٦، زكريا قديم ٤٦١/٢)

لیکن شرط یہ ہے کہ ان خبروں کے لئے کسی خلاف شرع کام کا ارتکاب کرنا نہ پڑے اور آج کل ٹی وی میں جو خبریں نشر کی جاتی ہیں، اس میں کئی وجوہات سے ممانعت شرع موجود ہونے کی وجہ سے ناجائز اور حرام میں داخل ہوگا۔

(۱) ٹی وی میں خبریں نشر کرنے والی عموماً عورتیں ہوتی ہیں، جن کو دیکھنا حرام ہے اور اس پر حدیث شریف میں سخت وعید وارد ہوئی ہے۔

عن الحسن قال: بلغني أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لعن الله الناظر والمنظور إليه. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، دارالفكر

بيـروت ١٠/ ٢٨٠، رقم: ١٣٨٦٢، شعـب الإيمـان للبيهقي، دارالكتب العلمية بيروت ١٦٢/٦، رقم: ٧٧٨٨، مشكوة شريف ٢٧٠)

نیز وہ عورتیں ایسی پرکشش اور باریک لباس زیب تن کئے ہوئے ہوتی ہیں کہ ان کے بدن کا اکثر حصہ برہنہ ہوتا ہے یا ایسے باریک کپڑے پہنتی ہیں، جن سے ان کے بدن کی کیفیت اور نشیب وفراز ظاہر ہوتا ہے، جس کو دیکھنا قطعاً حرام ہے۔

قال الشامي أقول: مفاده أن رؤية الثوب بحيث يصف حجم العضو ممنوعة، ولو كثيفًا لا ترى البشرة منه. (شامي، كتاب الحظر الإباحة، فصل في المس، كراچي ٣٦٦/٦، زكريا ٥٢٦/٩)

(۲) ٹی وی آلۂ لہوولعب ہے، جس کو گھر میں رکھنا بھی مکروہ تحریمی اور ناجائز ہے؛ اگرچہ اس کو استعمال نہ کریں۔

ولو أمسك في بيته شيئا من المعازف، والملاهي كره و يأثم، وإن كان لا يستعملها؛ لأن إمساك هذه الأشياء يكون للهو عادة. (خلاصة الفتاوى ٣٣٨/١، بحواله رحيمية ٢٩٨/٦)

اور عالمی خبریں معلوم کرنے کے لئے ریڈیو کافی ہے اور خبریں سننے کے لئے ریڈیو کا استعمال بھی جائز اور درست ہے؛ لہٰذا ٹی وی رکھنے کی ضرورت نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ رصفر المظفر ۱۴۲۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۷۹۳۹/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۲/۲۷ھ

ٹیلی ویژن پر خبریں سننا

سوال [۱۱۱۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک امام صاحب ٹیلی ویژن پر خبریں سنتے ہیں، مابقیہ منکرات نہیں دیکھتے، تو ایسے امام کی اقتداء میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ٹیلی ویژن پر خبریں سننا جائز اور درست ہے، جبکہ اس میں کسی نامحرم کی تصویر اور کوئی فحش پروگرام نہ آتا ہو؛ لہٰذا جو امام صاحب ٹیلی ویژن پر صرف خبریں سنتے ہیں ما بقیہ منکرات نہیں دیکھتے، تو ایسے امام کی اقتداء میں نماز پڑھنا بلا کراہت جائز اور درست ہے؛ لیکن اگر اس میں نامحرم کی تصویریں آتی ہوں، تو اس کا دیکھنا جائز نہیں ہے۔

(مستفاد: فقہی مقالات ۱۳۳/۳، درس ترمذی ۳۵۱/۵، آپ کے مسائل اوران کا حل ۴۳۵/۸)

الأمور بمقاصدها. (الأشباه والنظائر، زكريا ١٠٢)

إذا كان التلفزيون، أو الفيديو خاليًا من هذه المنكرات بأسرها؛ هل يحرم بالنظر إلى كونه تصويرًا؟ فإن لهذا العبد الضعيف –عفا الله عنه –فيه وقفة، وذلك لأن الصّورة المحرمة ما كانت منقوشة، أومنحوتةً بحيث يصبح لها صفة الاستقراء على شيئ، وهي الصور التي كان الكفار يستعملونها للعبادة ،أماالصورة التى ليس لها ثبات واستقرار وليست منقوشة على شيئ بصفةٍ دائمةٍ، فإنها بالظل أشبه منها بالصورة. (تكملة فتح الملهم، باب تحريم تصوير صورة الحيوان، التلفزيون، اشرفية ديوبند ٤/ ١٦٤) فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف خاص ۴۰/ ۱۱۴۳۸)

محض ڈسکوری کے لئے ٹی وی رکھنا

سوال [۱۱۱۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ محض حصول معلومات (ڈسکوری) کے لئے ٹی وی رکھنا اور استعمال کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

المستفتی: ریاض احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: ٹی وی عریانیت، فحاشیت اور دیگر بہت سی اخلاقی وایمانی برائیوں کی جڑ ہے، اور گھروں کے اندر ٹی وی رکھی جائے اور کسی قسم کا ناجائز پروگرام کبھی بھی اس میں نہ آسکے یہ ناممکن بات ہے؛ اس لئے عمومی طور پر ٹی وی گھروں میں رکھنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳۰۶/۸)

قال اللّٰه تعالیٰ: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ. [لقمان: ٦]

درء المفاسد أولیٰ من جلب المنافع، وعلى هامشه فإذا تعارضت مفسدة مصلحة قدم دفع مفسدة غالبًا؛ لأن اعتناء الشرع بالمنهيات أشد من اعتنائه بالمأمورات. (قواعد الفقه، اشرفی دیوبند ۱۸، رقم: ۱۳۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ربیع الاول ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۲۱۲/۳۸)

خبر یا دینی پروگرام کے لئے ٹی وی رکھنا

سوال [۱۱۱۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ صرف خبر سننے کے لئے یا کوئی دینی پروگرام کے لئے اپنے گھر میں ٹی وی رکھنا کسی حد تک جائز ہے یا نہیں؟ جیسے آج کل ماحول ہے کہ ہندو مسلم فساد زیادہ ہوتے ہیں یا دیش بدیش کی خبروں کی معلومات ہونی ضروری ہے؟

المستفتی: محمد عثمان، محمد غفران (راجستھان)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: خبر اور دینی پروگرام سننے اور دیکھنے کے لئے گھر میں ٹی وی رکھنا جائز نہیں ہے۔ قرآن کریم میں دین کو لہو ولعب کی چیزوں میں

استعمال کرنے کو کفار کا علم بتا کر مسلمانوں کو ان سے بیزار ہونے کی تاکید فرمائی ہے۔
(مستفاد: احسن الفتاوی ۸/۲۹۹، امداد المفتیین ۱۰۰۶)

قال اللہ تعالیٰ: يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَلَعِبًا مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوْا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ وَاتَّقُوْا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْن. [مائده: ۵۷، پ:٦]

دنیا کی خبریں حاصل کرنے کے لئے ٹیلی ویژن کی ضرورت نہیں ہے، ریڈیو اوراخبارات کے ذریعہ سے بھی یہ مقصد حاصل ہوجاتا ہے؛ اس لئے خبروں کے واسطے ٹی وی کے بجائے ریڈیو رکھنا چاہئے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/صفر المظفر ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳٦/۷۵۳۲)

ٹیلی ویژن میں کرکٹ، فٹ بال وغیرہ دیکھنا

سوال [۱۱۱۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ٹیلی ویژن کے اندر کوئی کھیل جیسے کرکٹ اور فٹ بال وغیرہ یا خبریں سننا یا نعتیہ شعر یا کوئی جائز پروگرام دیکھنا یا سننا کیسا ہے؟ اور کرکٹ وغیرہ کھیلوں میں ستر بھی نہیں کھلتا ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب تحریر فرمائیں نوازش ہوگی۔

المستفتی: محمد نعیم بجنوری، مقام بھنیچرہ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ٹیلی ویژن میں آنے والے کسی بھی کھیل کا دیکھنا شرعاً جائز نہیں ہے چاہے ستر کھل جاتا ہو یا نہ کھلے اس لئے کہ شرعی طور پر صرف تین قسم کے کھیل جائز ہیں، ان کے علاوہ کسی قسم کا کھیل دیکھنا جائز نہیں ہے۔

(۱) تیراندازی اور جنگی مشق۔

(۲) گھوڑے اور سواری وغیرہ سے سبقت کرنا۔

(۳) اپنی بیوی کی دل جوئی کے لئے اس کے ساتھ کھیلنا۔ اور ٹیلی ویژن میں یہ کھیل نہیں آتے ہیں۔

عن عبد الله بن عبد الرحمٰن بن أبي حسين أن رسول الله صلى الله عليه وسلم -إلى- كل ما يلهوبه الرجل المسلم باطل إلا رميه بقوسه، وتأديبه فرسه، وملاعبته أهله، فإنهن من الحق. (سنن الترمذي،باب ماجاء في فضل الرمي في سبيل الله، النسخة الهندية ۱/۲۹۳، دارالسلام رقم:۱۶۳۷)

ان الملاهي كلها حرام، وتحته في الشامية: اللهو حرام بالنص قال عليه السلام، لهو المؤمن باطل إلا في ثلاث تأديبه فرسه، ورميه عن قوسه، وملاعبته مع أهله. (الدر المختار مع الشامي، كتاب الحظر والإباحة، زكريا ديوبند۹/۵۰۲، كراچي ۶/۳۴۸)

نیز ٹیلی ویژن چونکہ آلۂ لہو ولعب ہے، اور اس میں نامحرم عورتوں کی تصویریں بھی آتی ہیں؛ اس لئے اگر ریڈیو سے خبریں سنی جاسکتی ہیں، تو پھر ٹیلی ویژن سے سننے کا مقصد صرف تلذذ ہی ہوگا؛ اس لئے ٹیلی ویژن سے خبریں سننے سے احتراز کرنا چاہئے۔ نیز ٹیلی ویژن رکھنے کا مقصد خبریں سننا نہیں ہوتا، جیسا کہ تجربہ سے ثابت ہے؛ بلکہ اس کا اصل مقصد ناجائز پروگرام ہوتا ہے؛ لہٰذا خبریں سننے کے بہانے سے بھی ٹیلی ویژن رکھنا جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۷ ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۷/۲۶۵۸)	۱۴۱۲/۴/۲۸ھ

کرایے دار ٹی وی چلائیں تو کیا اس کا گناہ مالک مکان پر بھی ہوگا

سوال [۱۱۱۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کے پاس ایک مکان ہے، جو چند کمروں پر مشتمل ہے اور زید نے اپنی رہائشی ضروریات کے علاوہ ایک کمرہ کرایہ پر دے رکھا ہے، جو اس کے معاشی ضروریات کے لئے معاون ثابت ہوتا ہے؛ لیکن وہ کرایہ پر رہنے والا شخص اپنے کمرہ پر ٹی وی چلاتا ہے، جس سے مکان مالک نالاں ہے اور منع کرتا ہے، مگر وہ کرایہ والا شخص یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ ٹی وی چلانا جائز ہے؛ چونکہ وہ یہ کہتا ہے کہ میں نے مختلف فرقوں کے علماء سے اس کے جواز کے بارے میں سنا ہے؛ لہٰذا حضور والا سے درخواست ہے کہ جواب عنایت فرمائیں، کیا نص وغیرہ سے جائز نہ ہونے کے باوجود کوئی وجہ جواز نکل سکتی ہے؟

المستفتی: عبدالحمید، برولان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ٹی وی وغیرہ جو اس زمانہ میں دوکان وغیرہ میں چلایا جاتا ہے، وہ امر ممنوع اور ناجائز ہے؛ لیکن اس کا گناہ چلانے والے پر ہوگا عنداللہ آپ ماخوذ نہ ہوں گے، آپ کا بس اس پر نہیں چلتا ہے؛ اس لئے خدا کے یہاں بازپرس اس سے ہوگا۔

إنما تحصل المعصية بفعل فاعل مختار. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، زكريا ۹/ ۵٦۲، كراچي ٦/ ۳۹۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ رمحرم الحرام ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲٦/ ۱۹۵٦)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری
۹/ ۱/ ۱۴۱۳ھ

مدارس ومساجد کے پروگرام کی سی ڈی تیار کرنا

سوال [۱۱۱۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ مدارس ومساجد یا عام جگہوں پر ہونے والے دینی واصلاحی اجلاس وپروگراموں کی ویڈیوگرافی کرنا سی ڈیز تیار کرنا تعلیم وتربیت مالی امداد فراہمی کے لئے یا شہرت ونا موری کے لئے شرعًا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: ممتاز احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دوقسم کے اجلاس ہوتے ہیں:

(۱) خالص دینی پروگرام جس کا حکومت وسیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے، ایسے پروگرام کی ویڈیوگرافی اور میڈیا کے لوگوں کے ذریعہ سے تصویروں کے ساتھ تشہیر کرنا جائز نہیں ہے؛ اس لئے اگر ان اصلاحی پروگراموں کو دوسروں تک پہونچا کر دینی فائدہ مقصود ہو، تو کیسٹوں اور سیڈیوں کے ذریعہ سے یہ کام ہوسکتا ہے، جس میں تصویروں کے لانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

(۲) قومی اور سیاسی پروگرام جن کا اصل مقصد مسلمانوں کے مطالبات کو حکومت تک پہونچانا ہے اور اس مطالبہ میں مسلمانوں کے اتحاد کو ثابت کرنا ہوتا ہے اور یہ کام میڈیا کے بغیر نہیں ہوتا؛ اس لئے ایسے اجلاس میں میڈیا کو بلا کر پروگرام کا نشر کرنا جائز ہے، جو قومی مفاد کے لئے حکومت تک پہونچانا مقصود ہو، جیسا کہ جمعیۃ علماء ہند کے پروگرام ہوتے ہیں، ان کو میڈیا کے ذریعہ نشر کرنا شرعًا جائز اور درست ہے۔

الضرورات تبيح المحظورات. (الأشباه قديم ١٤٠، زكريا جديد ٢٥١)

ما أبيح للضرورة يتقدر بقدرها. (الأشباه قديم ٥/ ١٤٠، جديد زكريا ٢٥١، شامي، زكريا ٩/ ٥٣٣، كراچي ٦/ ٣٧٠) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ شعبان المعظم ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۷۸۹)

مستورات کو بچوں کا پروگرام اسکرین پر دکھانا

سوال [۱۱۱۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہماری مسجد میں مدرسہ فرقانیہ تعلیم القرآن کے نام سے ایک مکتب چلتا ہے، جس میں تقریباً ایک ہزار طلبہ وطالبات تعلیم حاصل کررہے ہیں، سال کے آخر میں مکتب کے طلبہ وطالبات کا سالانہ جلسہ منعقد ہوتا ہے، جو مسجد کے گراؤنڈ فلور پر ہوتا ہے اور مسجد کے پہلے منزلہ پر مستورات کو پروگرام میں شرکت کرنے کی اجازت ہوتی ہے، مگر اس میں ہمارے لئے ایک مشکل یہ درپیش ہوتی ہے کہ پروگرام مسجد کے نیچے کے حصہ میں ہونے کی وجہ سے مستورات کو صرف آواز سنائی دیتی ہے؛ لہٰذا مستورات کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو پروگرام پیش کرتا ہوا دیکھ سکیں، تو کیا مسجد کے اوپر کے حصہ میں یا مسجد کے پڑوس کے شادی ہال میں کیمرہ کے ذریعہ مستورات کو LCD یا اسکرین پر اس پروگرام کو دکھایا جا سکتا ہے؟

واضح رہے کہ اس پروگرام کو ریکارڈ یا محفوظ نہیں کیا جائے گا، صرف (Live Teli Cast) کیو ٹیلی کاسٹ کیا جائے گا۔ امید کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں مسئلہ کا حل تجویز فرما کر عنداللہ ماجور ہوں گے۔

المستفتی: خادمین مدرسہ فرقانیہ تعلیم القرآن، مکہ مسجد مؤمن پورہ، پونہ (مہاراشٹر)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مسئولہ صورت میں اسکرین وغیرہ نصب کر کے بچوں کے پروگرام کو کیو ٹیلی کاسٹ کرنا جائز نہیں ہے؛ کیونکہ اس میں دینی اور قومی ضرورت نہیں ہے، عورتوں کے لئے اصلاحی تقریروں کی آواز سننا ہی کافی ہے؛ لہٰذا اس کام کے لئے کیمرہ وغیرہ نصب کرنا قطعاً جائز نہیں ہے۔

قال اللہ تبارک وتعالیٰ: مَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا. [سورة الحشر رقم الآیة: ۷]

عن عبد الله بن مسعودؓ، قال: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: إن أشد الناس عذابًا يوم القيامة المصورون.

(صحيح البخاري، كتاب اللباس، باب عذاب المصورين يوم القيامة، النسخة الهندية ۲/ ۸۸۰، رقم:۵۷۱۷، ف:۵۹۵۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۳۴۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۴/۸ھ

بیٹی کے جہیز میں ٹی وی دینا

سوال [۱۱۱۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص نے اپنی لڑکی کے جہیز میں اس خیال سے ٹی وی دیا کہ میری بیٹی کے گھر والے حدیث اور دیگر دینی معلومات سے ناواقف ہیں، وہ ٹی وی کے ذریعہ دینی باتوں کو معلوم کر کے اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں گے، اب اگر لڑکی کے گھر والے دینی معلومات حاصل کرنے کے بجائے فحش پروگرام دیکھتے ہیں، تو کیا اس صورت میں جہیز میں ٹی وی دینے کی وجہ سے دینے والے پر شرعًا کوئی مواخذہ ہوگا، اگر مواخذہ ہو تو جہیز میں ٹی وی دینے والے کے گناہ سے بچنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے، آیا واپس لے لی جائے یا کوئی اور صورت ہوسکتی ہے، دور حاضر میں ٹی وی رکھنا شرعًا کیسا ہے؟ کیونکہ گھر میں ہر مزاج کے آدمی ہوتے ہیں اور اس میں ہر طرح کے پروگرام دیکھے جاتے ہیں۔

المستفتی: حاجی محمد زاہد، پی اے سی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: اس نیت سے بیٹی کو ٹی وی دینا کہ بیٹی کے سسرال والے ٹی وی کے ذریعہ دینی معلومات حاصل کریں گے غلط اور فاسد خیال ہے؛ اس لئے کہ کوئی ایسی ٹی وی نہیں ہوتی ہے، جس میں صرف دینی معلومات ہوتی ہوں اور کسی قسم کے

منکرات نہ ہوتے ہوں، بغیر منکرات کے کوئی بھی ٹی وی نہیں ہوتی؛ بلکہ ٹی وی دے کر کے بیٹی کے گھر والوں کو منکرات فاحشات کا نظارہ دیکھنے کے لئے مزید قوت پہونچانا ہے، جہیز میں ٹی وی دینے والے کے گناہ سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ جہیز میں ٹی وی ہی نہ دی جائے۔ دور حاضر میں ٹی وی رکھنا بیوی، بچے اور گھر والوں کو بے حیا بنانا اور ان کے اخلاق بگاڑ کر ان کو دین سے دور کرنے کے مترادف ہے۔

قال الله وتعالیٰ: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَاهُزُوًا اُولٰٓئِکَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ. [لقمان:٦]

وكره كل لهو، وتحته في الشامية: واستماعه كالرقص، والسخرية، والتصفيق، وضرب الأوتار من الطنبور، والبربط، والرباب، والقانون، والزمار، والصنج، والبوق، فإنها كلها مكروهة؛ لأنها زيّ الكفار، واستماع ضرب الدف، والمزمار وغير ذلک حرام. (شامي، كتاب الحظر الإباحة، فصل في البيع، كراچي ٦/٣٩٥، زكريا٩/٥٦٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ رذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۳۱۹/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۱۱/۲۵ھ

تصویر سے متعلق مختلف مسائل کا حل

سوال [۱۱۱۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) تقریبات میں فوٹو ویڈیو کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

(۲) فوٹو ویڈیو استعمال کرنے والا اٹھانے والا مصورین کی وعید میں شامل ہے یا نہیں؟

(۳) فوٹو ویڈیو میں جو اجنبی مرد عورتیں ہیں، ان کو دیکھنا جائز ہے یا نہیں؟

(۴) جن مجالس میں فوٹو ویڈیو کا استعمال ہو، تو وہاں شریعت کو قائم کرنے کے لئے ہمیں کیا کرنا ہے؟

(۵) مجبوراً فوٹو ویڈیو جائز ہونے کی مقدار کیا ہے؟

المستفتی: مولوی مختار اللہ، جماعۃ العلماء کرور، تمل ناڈو

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تصویر سازی اورویڈیوگرافی کی شرعاً دو حیثیتیں ہیں:

اول: یہ کہ بلاضرورت صرف نمائش کے لئے فوٹوگرافی وتصویر سازی کی جائے، یہ جائزنہیں ہے،اورایسا کرنے والا حدیث پاک ’’ **إن أشد الناس عذابًا یوم القیامة المصورون** ‘‘. (صحیح البخاري، باب عذاب المصورین یوم القیامة، النسخة الهندیة ۲/ ۸۸۰، رقم:۵۷۱۷، ف:۵۹۵۰) کی وعید میں داخل ہے۔

دوم: یہ کہ ضروت کی وجہ سے ویڈیوگرافی یا تصویر سازی کرائی جائے،تو ایسی صورت میں فی نفسہ تصویر سازی وغیرہ ناجائز ہونے کے باوجود اس کی اجازت ہوگی، جیسے پاسپورٹ، ایڈنٹی کارڈ اور داخلہ فارم میں لگانے کے لئے فوٹو کھینچوانا جائز ہے،اسی طرح اگر اسلام اور مسلمانوں کیخلاف غیروں کی طرف سے کوئی سازش ہورہی ہواور مسلمان اس کے خلاف اجتماعی طور پر احتجاجی پروگرام کر رہے ہوں اور احتجاج کی تشہیر کے بغیر مسلم دشمن طاقتوں پر وہ زیادہ مؤثر نہ ہوسکتا ہو،تو ایسے حالات میں اس احتجاجی پروگرام کی تشہیر کے لئے ویڈیوگرافی کی اجازت ہوگی؛ کیونکہ اس میں ضرورت ہے۔(مستفاد: ایضاح المسالک ۱۳۴)

اور یہاں مقصد فوٹوگرافی نہیں؛ بلکہ مسلمانوں کی باتوں کو باوزن بنانا ہے اور دینی اصلاحی پروگراموں میں تصویر سازی ویڈیو رکارڈنگ اور لائیو ٹیلی کاسٹ وغیرہ کو ہم جائزنہیں سمجھتے؛ لہٰذا ایسے پروگرام میں ان چیزوں سے باز رہنا چاہئے اور ضرورت کی غرض سے بنائی گئی ویڈیو اور تصویر کو دیکھنا صنف مخالف کے لئےشہوت کا خوف نہ ہونے کے وقت اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ تصاویر میں ستر پوشی کا اہتمام ہو۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۳۴۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۴/۸ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله الذي حرم الفواحش ماظهر منها وما بطن، والصلاة والسلام على شمس الهداية محمد وآله وصحبه وسلم تسليما أما بعد!

ٹی وی اور ٹیلی ویژن کے گمراہ کن آثار

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے کہ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہوں گے، جو کھیل تماشا اور فحش وعریانیت کی چیزیں خرید کر ہزاروں کو گمراہی کا شکار بنادیں گے، اور ٹی وی اور ٹیلی ویژن، کھیل تماشا، عریانیت وبے حیائی اور حیا سوز پروگراموں کا سنگم ہوتا ہے، اس کے ذریعہ سے دنیا میں ہزاروں انسان فحاشی وآوارگی کا شکار بنتے جارہے ہیں، ایسوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے دردناک اور ذلت آمیز عذاب کی وعید کا اعلان فرمایا ہے، سورۂ لقمان کی آیت ملاحظہ فرمائیے:

قال اللہ تعالیٰ: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِىْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ. [لقمان: ٦]

اور بعض لوگ وہ ہیں جو کھیل تماشا کی چیزوں کو خریدتے ہیں تاکہ بے سمجھے اللہ کی راہ سے لوگوں کو گمراہ کردیں اور ان چیزوں کو لوگوں کے لئے ہنسی مذاق کا سامان ٹھہرائیں، ایسے لوگوں کے لئے ذلت کا عذاب ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ سورۂ نور میں ارشاد فرمایا ہے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوں گے، جو مسلمانوں اور ایمان والوں میں فاحشات اور برائیاں پھیلائیں گے؛ چنانچہ آج گھر گھر ٹی وی اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ سے فحاشی پھیلائی جارہی ہے۔ آیت کریمہ ملاحظہ فرمائیے!

قال اللہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ. [النور: ١٩]

بے شک ایسے لوگ جو یہ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں میں بدکاریاں پھیلتی جائیں، ان کے لئے دنیا وآخرت میں دردناک عذاب ہے۔

اور ایک جگہ سورۂ اعراف میں اللہ کا ارشاد ہے کہ اللہ پاک نے اندرونی اور بیرونی تمام فاحش اور حیا سوز کاموں کو حرام کر دیا ہے اور معصیت اور بدکاری کے کاموں کی حرمت کا اعلان فرمادیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ .

[الاعراف:۳۳]

اے نبی آپ کہہ دیجئے کہ میرے رب نے ظاہری و باطنی ہر قسم کے فواحش اور گناہ کبیرہ اور زنا کو حرام کر دیا ہے۔

اور ایک جگہ سورۂ انعام میں فرمایا: اندرونی اور بیرونی ہر طرح کے فحش اور حیا سوز کاموں سے دور رہا کرو، ایسے کاموں کے قریب تک مت ہو، اور ٹی وی اور ٹیلی ویژن انسان کے ظاہر کو بھی برباد کر دیتے ہیں اور اندرونی اخلاق کو بھی ناس کر دیتے ہیں۔

آیت کریمہ ملاحظہ فرمائیے:

وَلَا تَقْرَبُوْا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ . [انعام:۱۵۱]

اور تم ظاہری و باطنی ہر قسم کی برائی اور فحش پروگراموں کے قریب تک مت جاؤ۔

عکس اور سایہ: عکس اور سایہ کی حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کا عکس نظر آتا ہے، وہ اتنی دیر کے لئے نظر آئے گا، جب تک اصل شئ عکس کے سامنے موجود ہو یا عکس کے ساتھ اصل شئ کا کنکشن اور رابطہ باقی ہو، اسی طرح کسی شئ کا سایہ اس کو کہا جاتا ہے کہ جس شئ کا سایہ ہوتا ہے، وہ شئ جب تک قائم ہو، اس وقت تک سایہ باقی رہتا ہے اور جب اصل شئ اپنی جگہ سے ہٹ جائے، تو سایہ بھی ساتھ ساتھ ہٹ جاتا ہے؛ لہٰذا سایہ اور عکس یہ ایک الگ شئ ہے، اور تصویر اس سے جداگانہ ایک دوسری شئ ہے؛ اس لئے تصویر اور عکس اور سایہ

کو ایک ہی حقیقت میں گردانناان امور کی حقیقت پر ناواقفیت کی دلیل ہے، جو لوگ ان چیزوں کو ایک ہی حقیقت شمار کرتے ہیں، وہ ان چیزوں کے متعلق غور کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کرسکیں گے، خلط مبحث کے شکار بن جائیں گے، اس بات کو مزید واضح کرنے کے لئے امور خارجیہ کے ذریعہ سے اس طرح غور کیا جاسکتا ہے کہ فوٹو اور تصویر کسی دیوار پر یا کسی لکڑی پر یا کسی کاغذ پر یا اسی طرح کسی اور شئ پر متصل ہوتی ہے اور اس شئ کے ساتھ علیٰ صفۃ الدوام باقی رہتی ہے اور جب تک کسی عمل کے ذریعہ سے یا اس کے زائل کرنے والے اشیاء کے ذریعہ سے مٹائی نہ جائے گی، اس وقت تک مٹتی نہیں، وہ اپنی جگہ موصوف کے ساتھ متصف ہوکر قائم رہتی ہے اور عکس کا حال یہ ہے مثلاً آپ شیشہ کے سامنے کھڑے ہوجایئے تو آپ کا عکس شیشے میں نظر آئے گا صرف اس وقت تک نظر آئے گا جب تک آپ شیشے کے سامنے رہیں گے اور جب آپ شیشے کے سامنے سے ہٹ جائیں گے ساتھ ساتھ عکس بھی ختم ہوجائے گا؛ لہٰذا شیشے میں جو شئ آپ کی صورت وشکل کے ساتھ نظر آرہی ہے، وہ آپ کی تصویر نہیں ہے؛ بلکہ آپ کا عکس ہے، اسی طرح جب صاف شفاف پانی کے حوض یا تالاب کے کنارے پر آپ کھڑے ہوجاتے ہیں، تو آپ کی پوری شکل وصورت اس پانی میں نظر آتی ہے، مگر اس وقت تک کے لئے نظر آتی ہے، جب تک آپ حوض یا تالاب کے کنارے پر کھڑے رہیں گے یا بلب وغیرہ کسی اور شئ کی روشنی میں کھڑے ہوتے ہیں، تو روشنی کی مخالف جانب میں آپ کا سایہ ہوتا ہے، یہ سایہ آپ کی تصویر نہیں ہے؛ بلکہ غیر مستقر سایہ ہے، جو آپ کی نقل وحرکت کے ساتھ ساتھ اپنی جگہ چھوڑ دیتا ہے، جیسا کہ اس کی وضاحت آگے درمختار اور شامی کی عبارت سے بخوبی ہوسکتی ہے اور درمختار اور شامی میں شیشہ اور پانی میں عکس دیکھنے سے متعلق مستقل بحث کی گئی ہے۔

اصل شئ اور عکس کا شرعی فرق : حضرات فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر شیشہ میں دیکھا جائے، اسی طرح پانی میں دیکھا جائے تو شرعی طور پر حلت وحرمت کا حکم لگ جاتا ہے،

مثلاً کوئی عورت شیشہ کی ایک طرف ہو اور آپ شیشہ کی دوسری جانب میں ہوں یعنی آپ اور عورت کے بیچ میں شیشہ حائل ہو، اور آپ دوسری جانب سے عورت کی شرمگاہ کو شہوت کے ساتھ دیکھ لیں، تو حرمت مصاہرت کا ثبوت ہو جائے گا، اسی طرح عورت اگر پانی کے اندر ننگی بیٹھی ہوئی ہے اور کسی اجنبی مرد نے پانی کے باہر سے اس کی شرمگاہ کو شہوت سے دیکھ لیا ہے، تو حرمت مصاہرت کا ثبوت ہو جائے گا، تو اس مسئلے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر کسی عورت کی شرمگاہ کو شیشہ کے چشمہ سے دیکھا جائے یا شیش محل کے اندر عورت ننگی بیٹھی ہوئی ہے اور باہر سے مرد نے اس کی شرمگاہ کو شہوت سے دیکھ لیا ہے، تو حرمت مصاہرت ثابت ہو جائے گی، اسی طرح تالاب یا حوض میں ننگی نہا رہی ہے اور باہر سے کسی مرد نے اس کی شرمگاہ کو شہوت سے دیکھ لیا ہے، تو حرمت مصاہرت ثابت ہو جائے گی۔ حضرات فقہاء نے اس مسئلہ کو اس قسم کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے۔

وعلی هذا فالتحريم به من وراء الزجاج بناء على نفوذ البصر منه فيرى نفس المرئي بخلاف المرآة ومن الماء. (شامي، زكريا ديوبند ٤/ ١١٠، كراچي ٣/ ٣٤)

اور اسی اصول پر شیشے کے پیچھے سے دیکھنے کی حرمت کا مسئلہ ہے، اس بنیاد پر کہ شیشے کے پیچھے سے دیکھنے سے نگاہ کا نفوذ اور نظر براہ راست ہوتی ہے؛ لہٰذا اس سے عین شیٔ کا دیکھنا ثابت ہو جاتا ہے، برخلاف آئینہ اور پانی میں عکس دیکھنے کے۔

شیشہ اور پانی میں عکس دیکھنا: اگر عورت کا عکس شیشہ میں نظر آجائے، اسی طرح عورت پانی سے باہر ہو اور وہ حوض یا تالاب کے کنارے پر کھڑی ہو اور حوض یا تالاب کے پانی میں اس کی شرمگاہ کا عکس نظر آجائے، تو اس کو شہوت سے دیکھنے کی وجہ سے حرمت مصاہرت کا حکم ثابت نہ ہوگا؛ اس لئے کہ اس میں عین عورت کو نہیں دیکھا گیا؛ بلکہ اس کا عکس دیکھا گیا اور عکس کا حکم شرعی طور پر وہ نہیں ہوتا، جو عین شیٔ کا ہوتا ہے جیسا کہ اس مسئلہ سے واضح ہو رہا ہے، مگر اس سے یہ ہرگز نہ سمجھا جائے کہ عین عورت کو دیکھنا جائز نہیں

اوراس کے عکس کو دیکھنا جائز ہے؛ بلکہ عکس کو دیکھ کر تلذذ حاصل کرنے سے آنکھ اور نگاہ کا زنا اوراس کا گناہ بھی ضرور ہوگا اور ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ میں جو باضابطہ طور پر ایسی گفتگو ہوتی ہے، جیسے آمنے سامنے کھڑے ہوکر گفتگو کی جاتی ہے۔

تو سوال یہ ہے کہ ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کے اندر جونظر آرہا ہے، وہ عین شئ ہے یا اس کا عکس ہے، تو ظاہر بات ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ عین شئ ہے اور عین انسان ہے؛ بلکہ انسان کا عکس نظر آرہا ہے، جیسا کہ شیشہ کے پاس کھڑے ہونے سے انسان کا عکس نظر آتا ہے اور صاف شفاف حوض اور تالاب کے کنارے پر کھڑے ہونے سے اس کے پانی میں انسان کا پورا عکس اور شکل وصورت نظر آتی ہے، مگر شیشہ کے اندر یا پانی کے اندر حقیقی انسان نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ انسان کا ایسا عکس ہوتا ہے کہ جب تک انسان شیشہ یا پانی کے سامنے کھڑا رہے گا، اس وقت تک نظر آئے گا اور جب شیشہ یا پانی کے سامنے سے ہٹ جائے گا، تو عکس بھی ساتھ ساتھ ہٹ جائے گا اور عکس کی شکل میں شکل وصورت کا دیکھنا اور بغیر عکس کے انسان کی اصل شکل وصورت کا دیکھنا دونوں میں بہت بڑا فرق ہے اور دونوں کا شرعی حکم بھی الگ الگ ہے اوراسی پر حرمت مصاہرت کے مسئلہ کا مدار بھی ہے۔ عمدۃ الفقہاء حضرت علامہ علاؤ الدین حصکفیؒ نے اس مسئلہ کواس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے۔

لاتحرم المنظور إلى فرجها الداخل إذا رآه من مرآة أوماء؛ لأن المرئي مثاله بالانعكاس لا هو. (در مختار مع الشامي، كراچي ۳/ ۳٤، زكريا ٤/ ۱۰۹)

عورت کے فرج داخل کو جب آئینہ کے عکس میں دیکھا جائے یا صاف شفاف پانی میں فرج داخل کا عکس دیکھا جائے، تو حرمت مصاہرت کا ثبوت نہیں ہوگا؛ اس لئے کہ شیشہ اور پانی میں جو مثالی چیز دیکھی جارہی ہے، وہ عورت کے فرج داخل کا عکس ہے عین فرج داخل نہیں ہے۔

عکس اور تصویر کا ایک اور شرعی فرق

عکس اور تصویر کے درمیان ایک شرعی فرق یہ بھی ہے کہ تصویر کشی کرنا حدیث تصویر کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہے؛ لیکن کسی شئ کا عکس نظر آ جانا اور عکس کے وجود میں آنے کا انتظام کرنا اور عکس کے وجود میں آنے کا سبب بننا ناجائز اور حرام نہیں ہے، اس گناہ میں دونوں کا حکم برابر ہے؛ لیکن اگر کسی مرد کا عکس لیا جائے، تو ناجائز نہیں ہے، مثلاً بالقصد کسی مرد کو کسی جگہ شیشہ کے سامنے کھڑا کر دیا جائے، تو اس کا عکس صاف طور پر شیشہ میں نظر آئے گا اس کی نقل وحرکت سب کچھ نظر آئے گی اور اس کو یوں بھی سمجھو کہ نائی کی دوکان پر چاروں طرف شیشہ لگا ہوا ہے، جب تم نائی کی دوکان میں داخل ہو جاؤ گے، تو تمہاری چار طرف سے چار صورتیں نظر آئیں گی، یہ سب تمہاری ذات کا عکس ہے تصویر نہیں ہے اور نہ ہی دنیا اس کو تصویر کہتی ہے اور نہ ہی ان شیشوں کے اندر تمہارا عکس آنے کی بناء پر وہ نائی گناہ گار ہوگا، جس نے شیشہ لگایا ہے؛ لیکن اس کے برخلاف کوئی شخص تمہاری بلا ضرورت کیمرے سے تصویر لیتا ہے، تو یہ ناجائز ہوگا، اسی طرح ویڈیو کیمرے میں پہلے سے وہ سارا انتظام موجود ہے اور اس کا بٹن پہلے سے دبا ہوا ہے، اب اس کے بعد اس کیمرے کے سامنے کوئی بھی پہونچ جائے، تو اس کی نقل وحرکت کا عکس اس کیمرے میں پہونچ جائے گا؛ حالانکہ وہ تصویر کشی نہیں کر رہا ہے، تو اس طرح کیمرے میں تمہارے عکس کا پہونچ جانا حرمت کا باعث نہ ہوگا، یہ نفس تصویر اور نفس عکس کے درمیا فرق کی ایک شکل پیش کی جارہی ہے۔ اس کے مدمقابل عورت کی تصویر اور عورت کے عکس کا مسئلہ ہے کہ جس طرح مرد کی تصویر کشی کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح عورت کی تصویر کشی بھی جائز نہیں ہے؛ لیکن مرد کے عکس کا منظر عام پر آجانا جائز ہے اور عورت کی شکل وصورت کا منظر عام پر آنا جائز نہیں ہے، حتی کہ نائی کی دوکان میں عورت کے لئے چہرہ اور مرکز زینت کو کھول کر داخل ہونا اور اس میں بیٹھ جانا مردوں کی موجودگی میں جائز نہ ہوگا،

جس کے ہر چہار جانب اس کی صورت وشکل کا عکس نظر آ رہا ہوگا؛ کیونکہ اجنبی مرد چاروں طرف کے شیشے میں اس کی صورت وشکل کا عکس دیکھ کر قطعی طور پر تلذذ حاصل کرے گا، تو حاصل یہ نکلا کہ درمختار اور شامی کی عبارت کے پیش نظر عورت کے اعضاء کے اصل دیکھنے اور پانی اور شیشہ میں عکس دیکھنے میں حرمت مصاہرت کے باب میں فرق ہے کہ اصل دیکھنے سے حرمت کا ثبوت ہوجاتا ہے اور عکس دیکھنے سے حرمت کا ثبوت نہ ہوگا، تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اصل دیکھنا ناجائز ہو اور عکس کا دیکھنا جائز ہو؛ بلکہ اگر عکس دیکھنے سے تلذذ حاصل ہوتا ہو، تو اس کا دیکھنا بھی ناجائز اور حرام ہوگا؛ اگرچہ اس کے دیکھنے سے حرمت مصاہرت کا ثبوت نہ ہوتا ہو، اور بنص حدیث عکس دیکھ کر تلذذ حاصل ہونے سے نگاہ کا زنا اور بدکاری شمار ہوگی، تو اسی طرح ٹیلی ویژن میں عورتوں کی شکل وصورت نقل وحرکت جو نظر آتی ہے، اگرچہ وہ تصویر نہیں ہے، اور تصویر کشی کا حکم ثابت نہیں ہوتا ہے؛ لیکن اس میں نظر آنے والی عورتوں کی شکل وصورت کا عکس دیکھنا بھی ناجائز اور حرام ہوگا اور مزید مرد وعورت کے اختلاط اور حیا سوز اور فحش عکس کا دیکھنا دیکھنے والوں میں زبردست ہیجان پیدا ہونے کا سبب بنتا ہے؛ اسلئے ٹیلی ویژن میں اس طرح تمام حیا سوز پروگراموں کا دیکھنا قطعی طور پر ناجائز اور حرام ہے حتی کہ مردوں کے بغیر صرف عورتوں کی شکل وصورت کا عکس دیکھنا بھی ناجائز اور حرام ہوگا اور بخاری ومسلم کی روایت میں آنکھوں اور نگاہوں کا زنا بھی ثابت کیا گیا ہے، اور آنکھوں اور نگاہوں کا زنا کیسا ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ بغیر تلذذ کے نگاہوں کے زنا کا ثبوت نہیں ہوسکتا اور جب عکس دیکھ کر تلذذ حاصل ہوتا ہے، تو عکس کا دیکھنا بھی نگاہوں کا زنا ہوگا؛ لہٰذا ٹی وی اور ٹیلی ویژن میں بھی عورتوں کا عکس دیکھنا جائز نہ ہوگا۔

عکس کی بھی تصویر لی جاسکتی ہے: یہاں ساتھ میں یہ بات بھی ثابت کرتے چلیں کہ درمختار کی عبارت سے اصل اور عکس کے درمیان فرق بیان کیا گیا تھا اور ابھی اوپر یہ بیان کیا گیا کہ اصل کی تصویر لینا جائز نہیں اور عکس لینا جائز ہے؛ لیکن ساتھ

ساتھ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ جس طرح اصل کی تصویر کشی ہوسکتی ہے، اسی طرح عکس کی بھی تصویر کشی ہوسکتی ہے، مثال کے طور پر نائی کی دوکان میں چاروں طرف شیشہ لگا ہوا ہے اور چاروں طرف عکس نظر آرہا ہے۔اب اگر کوئی فوٹو گرافر آپ کی اصل سے نہیں؛ بلکہ عکس سے تصویر کھینچنا چاہے،تو لے سکتا ہے،تو اس طرح بھی بلاضرورت تصویر کشی حدیث تصویر کے دائرے میں داخل ہوکر ناجائز اور حرام ہوگی؛ کیونکہ کیمرے کی تصویر جس طرح اصل سے لی جاسکتی ہے،اسی طرح عکس سے بھی لی جاسکتی ہے،اور دونوں کا حکم یکساں ہوگا۔

تصویر اور عکس کا ایک دوسرا فرق

تصویر اور عکس کی حقیقت ماقبل کی سرخیوں اور عنوانات کے ذریعہ سے آپ کے سامنے آگئی اور اس کا فرق بھی آپ کے سامنے آگیا ہے؛لیکن تصویر اور عکس کے درمیان ایک باریک اور کیمیائی فرق بھی ہے، وہ یہ کہ تصویر کے اپنے وجود میں آنے میں کسی انسان کے عمل کا دخل لازم ہے،اگر انسان بالقصد تصویر کے وجود میں آنے کے لئے کوئی عمل نہیں کرتا ہے، تو وہ تصویر اپنے وجود میں نہیں آسکتی ہے،مگر عکس اور سایہ کے اپنے وجود میں آنے میں بالقصد اور بالارادہ کسی انسان کے عمل کا دخل نہیں ہوتا ہے،جیسا کہ سایہ اور عکس انسان کے علاوہ دیگر حیوانات، جمادات اور نباتات کے بھی ہوتے ہیں کہ شیشہ اور پانی میں انسانی عمل کے بغیر درخت اور جانوروں کا عکس نظر آجاتا ہے اور ان عکسوں کے نظر آنے میں خود ان اشیاء کا دخل نہیں ہوتا ہے، درخت کے سایہ اور عکس کے وجود میں آنے میں نہ انسان کے عمل کا دخل ہے اور نہ خود درخت کے دخل ہے، مگر اس کے برخلاف تصویروں اور مجسموں کے وجود میں آنے میں بالقصد انسان کے عمل کا دخل لازم ہے، عمل انسان کے بغیر تصویر اپنے وجود میں نہیں آسکتی تو معلوم ہوا کہ تصویر کا وجود اختیاری ہوتا ہے کہ بالفعل انسانی عمل سے اس کا وجود ہوتا ہے اور عکس اور سایہ کا وجود اضطراری ہوتا ہے کہ

ان کے وجود میں آنے میں بالقصد انسان کے عمل کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

ٹیلی ویژن کے ڈبہ میں نظر آنے والی چیزیں تصویر ہیں یا عکس؟

اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوگیا کہ تصویر اور عکس کے درمیان ٹکنالوجی فرق ہے، دونوں بالکل الگ الگ جداگانہ دوشئ ہیں۔اب سوال پیدا یہ ہوتا ہے کہ ٹیلی ویژن اور ٹی وی کے ڈبے میں جوشئ نقل وحرکت کرتی ہوئی نظر آتی ہے،وہ تصویر ہے یا عکس......؟ ظاہر بات ہے کہ تصویر اور عکس کی حقیقت پر واقف کار لوگ یہی کہیں گے کہ ٹیلی ویژن اور ٹی وی کے ڈبہ میں نظر آنے والی اشیاء چاہے وہ از قبیلۂ انسان مرد وعورت کی شکلیں ہوں یا جانوروں اور جمادات کی شکلوں میں ہوں،وہ اصل شئ کی تصویر نہیں ہوتی ہیں؛ بلکہ اصل شئ کا عکس اور سایہ ہوتا ہے؛ اس لئے ان ڈبوں میں علیٰ سبیل الدوام اور استقرار وہ شکلیں نظر نہیں آتی ہیں،اگر تصویر ہوتیں تو علی سبیل الدوام اور استقرار ان ڈبوں میں موجود رہتیں؛ لہٰذا ان کو تصویر کہنا درست نہیں ہوگا؛ بلکہ اصل شئ کا عکس کہنا لازم ہوگا۔

حضرات علماء نے اسکو اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے۔

أما الصورة التي ليس لها ثبات واستقرار وليست منقوشة على شئ بصفة دائمة، فإنها بالظل أشبه منها بالصورة ويبدو أن صورة التلفزيون والفيديو لا تستقر على شئ في مرحلة من المراحل إلا إذا كان في صورة ’’فيلم‘‘ فإن كانت صور الإنسان حية بحيث تبدو على الشاشة في نفس الوقت الذي يظهر فيه الإنسان أمام الكيمرا، فإن الصورة لا تستقر على الكيمرا ولا على الشاشة وإنما هي أجزاء كهربائية تنتقل من الكيمرا إلى الشاشة وتظهر عليها بترتيبها الأصلي ثم تفنى وتزول. (تكملة فتح الملهم، باب تحريم تصوير صورة الحيوان،التلفزيون،اشرفية ديوبند ٤/ ١٦٤)

بہرحال وہ تصویر جس کے لئے دوام اور استقرار نہ ہو اور کسی شئ کے اوپر دوام کی صفت کے ساتھ متصف اور منقوش نہ ہو، تو بیشک وہ صورتیں تصویر کے مقابلہ میں عکس اور سایہ کے زیادہ مشابہ ہیں اور اس طور پر ظاہر ہوتی ہیں کہ ٹیلی ویژن اور ویڈیو میں وہ تصویریں کسی شئ کے اوپر کسی بھی درجہ میں مستقر اور ثبات کیساتھ متصف ہوکر ظاہر نہیں ہوتی ہیں الا یہ کہ ننگے ٹوو ریل والے فلم کی شکل میں مستقر ہوتی ہوں، پس بیشک زندہ انسان کی صورتیں ٹیلی ویژن کے ڈبے کے شیشے پر صرف اس وقت ظاہر ہوتی ہیں کہ جس وقت کیمرے کے سامنے انسان ظہور پذیر ہوتا ہے؛ کیونکہ بیشک وہ تصویریں کیمرے پر ثابت اور مستقر نہیں ہوتی ہیں اور نہ ہی ٹیلی ویژن کے شیشہ کے اوپر قائم رہتی ہیں اور یقیناً وہ ایسے برقی اجزاء ہوتے ہیں جو کیمرے سے منتقل ہوکر ٹیلی ویژن کے شیشے پر پہونچتے ہیں اور اسی پر اپنے اصلی ترتیب کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں، پھر اس کے بعد ظاہر ہوتے ہوتے فنا ہوتے رہتے ہیں اور زائل ہوتے رہتے ہیں۔

ٹی وی اسٹیشن پر تقریر: اوپر کی تفصیلات سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ ٹی وی اور ٹیلی ویژن میں انسان اور دیگر اشیاء کی جو شکلیں اور نقل وحرکت نظر آتی ہیں، وہ تصویر نہیں ہیں؛ بلکہ عین شئ کا عکس ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ٹی وی اسٹیشن پر تقریر کر رہا ہے یا جہاں ویڈیو کیمرا لگا ہوا ہے، اس میں بیٹھ کر پورے مجمع میں تقریر کر رہا ہے یا قاری قرآن پڑھ رہا ہے، اور ویڈیو کیمرا سامنے لگا ہوا ہے اور براہ راست خطیب کی تقریر اور قاری کی قرأت اور اس کی تصویر ٹی وی اسکرین پر دکھائی جارہی ہے اور درمیان میں فلم اور ریکارڈنگ کا کوئی واسطہ نہیں ہے، براہ راست دکھائی دے رہی ہے، تو ایسی صورت میں دکھائی دینے والی شکل وصورت کو تصویر کہا جائے گا یا نہیں ......؟ تو اوپر کے دلائل اور تفصیلات سے واضح ہوچکا ہے کہ براہ راست دکھائی دینے والی شکلیں تصویر نہیں ہیں؛ بلکہ اصل شئ اپنی جگہ موجود ہے، اس کا عکس ویڈیو کیمرے کے ذریعہ سے براہ راست ٹی وی اور ٹیلی ویژن کے ڈبے میں نظر آرہا ہے، اور جب تک خطیب تقریر کرتا رہے گا، یا قاری قرأت کرتا رہے گا نظر

آ تا رہے گا اور جب وہاں سے ہٹ جائے گا ساتھ ساتھ عکس بھی ختم ہو جائے گا اور جو عکس ٹی وی اور ٹیلی ویژن کے ڈبہ میں نظر آرہا ہے، وہ وہاں سے ختم ہو جائے گا دوبارہ قطعاً نظر نہیں آئے گا؛ اس لئے جو لوگ ٹی وی اسٹیشن میں پروگرام کے وقت ٹیلی ویژن میں دکھائی دینے والی شکلوں کو تصویر کہتے ہیں، ان کو اس بارے میں نظر ثانی کرنیکی ضرورت ہے؛ اس لئے کہ وہ تصویر ہی نہیں ہیں اور تصویر کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی؛ بلکہ عکس اور سایہ کی تعریف اس پر صادق آتی ہے، جیسا کہ ماقبل کی تفصیلات سے واضح ہو چکا ہے۔

خطیب کی تقریر کی ویڈیو کیسٹ

اگر ویڈیو اسٹیشن میں خطیب تقریر کر رہا ہے یا کوئی دوسرا پروگرام چل رہا ہے، اس کو ویڈیو کیسٹ میں محفوظ کر لیا جائے، پھر اس کے بعد جب پروگرام ختم ہو جائے، تو اسی جگہ یا دوسری جگہ ویڈیو کیسٹ میں محفوظ شدہ پروگرام بعد میں دکھایا جائے، تو اس کا کیا حکم ہے؟ جبکہ پورے پروگرام کی فلم اور ریکارڈنگ بن چکی ہے، جب چاہے وہ پروگرام دوبارہ دکھایا جا سکتا ہے، تو ایسی صورت میں ویڈیو کیسٹ میں محفوظ کیا ہوا پروگرام جو بظاہر علی صفۃ الدوام اور استقرار ہے، ان کو تصویر کے دائرے میں تسلیم کیا جائے یا نہیں؟ تو غور طلب بات یہ ہے کہ ویڈیو کیسٹ میں پروگرام کے وقت ریلوں کے ذریعہ سے جو ذرات اسی ترتیب کیساتھ چھوڑ دیئے گئے ہیں، جس ترتیب سے ویڈیو اسٹیشن میں پروگرام ہوا تھا، پھر جب چاہے اسی کا ایک منظر اور وہاں کی تصویریں اور شکلیں ٹی وی کے ذریعہ سے دیکھی جا سکتی ہیں، تو اب یہاں اس کی ٹکنالوجی پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ تصویر کو علی سبیل الدوام اور استقرار کے ساتھ ساتھ انسان دیکھ سکتا ہو، جب چاہے تصویر کے آلات کے ذریعہ سے اس کا فوٹو لیا جا سکتا ہو، اسے تصویر کہا جاتا ہے؛ لیکن یہاں ایسا ہرگز نہیں ہے کہ ویڈیو کیسٹ کے ذریعہ سے پروگرام کے جو ذرات محفوظ کر لئے گئے ہیں، ان کو خوردبین سے بھی دیکھا نہیں جا سکتا چہ جائے کہ

فوٹوگرافر مشین کے ذریعہ سے ان کا نگیٹیو لیا جائے، یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ویڈیو کیسٹ کے ذرات میں جو صورت اور شکلیں محفوظ ہیں، وہ دوسری چیز میں منتقل ہو جائیں نہ ان کا فوٹو کے لئے نگیٹیو لیا جاسکتا ہے اور نہ ہی ان ذرات کو خوردبین کے ذریعہ سے دیکھا جاسکتا ہے؛ لہٰذا ویڈیو کیسٹ میں محفوظ کردہ ذرات اور شعاعوں کو بھی تصویر کہنا نہایت مشکل ہے، ویڈیو کیمرے اور ٹیلی ویژن کے ٹکنالوجی سے واقفیت رکھنے والے لوگوں سے معلوم ہوا کہ ویڈیو کیسٹ میں ریلوں کے ذریعہ سے جو ذرات محفوظ ہو جاتے ہیں، ان کا نگیٹیو نہیں لیا جاسکتا اور نہ ہی ان کو آنکھ سے دیکھا جاسکتا ہے، حتی کہ خوردبین سے بھی نظر نہیں آسکتے، جب صورت حال یہی ہے، تو ان کو بھی تصویر نہیں کہا جاسکتا؛ اس لئے ٹی وی اسٹیشن پر کوئی جائز اور صحیح پروگرام پیش کیا جائے اور پھر دوسری جگہوں میں ٹی وی چینلوں کے ذریعہ سے ٹیلی ویژن اور ٹی وی کے ڈبے میں وہ پروگرام دیکھا جائے، تو فی نفسہ جائز ہوگا، گہرائی میں پہونچنے کے بعد ان کے عدم جواز کی بات سمجھ میں نہیں آتی؛ بلکہ مجبوراً ان کو جائز ہی کہنا پڑے گا؛ اس لئے فی نفسہ جائز پروگرام جو ٹیلی ویژن میں آئے اسے جائز کہا جائے گا اور جو ناجائز پروگرام آئے اسے ناجائز کہا جائے گا۔

دوسری طرف یہ بات بھی ہم سب کے سامنے ہے کہ جن ٹی وی اور ٹیلی ویژن کے ڈبوں میں جائز پروگرام آسکتا ہے، ان میں اکثر وبیشتر دنیا بھر کے فاحشات اور برائیوں کا پروگرام آتا رہتا ہے، تو یہ بہت ممکن ہے کہ جائز پروگرام دیکھتے دیکھتے ناجائز پروگرام بھی دیکھنے لگیں؛ اس لئے سد ذرائع کے طور پر عام ٹیلی ویژنوں میں جائز پروگرام کو بھی ممنوع قرار دیا جانا چاہئے۔

ویڈیو سی ڈی: ویڈیو کیسٹ میں ریل ہوتی ہے اور سی ڈی میں ریل بھی نہیں ہوتی، وہ تو ایک عجیب وغریب انداز کی چیز ہے کہ دیکھنے میں کچھ نہیں ہے کہ جب سی ڈی میں ویڈیو پروگرام یا کوئی اور پروگرام کمپیوٹر وغیرہ کے ذریعہ سے یا انٹرنیٹ کے ذریعہ سے بھر لیا جائے،

تو اس میں کچھ بھی پتہ نہیں چلتا ہے، جب سی ڈی کی پلیٹ کو کمپیوٹر کی سی ڈی کی جگہ پر رکھ دیا جائے یا ٹیلی ویژن کی سی ڈی کی جگہ پر رکھ دیا جائے، تو اس میں بھرے ہوئے تمام پروگرام اسی ترتیب سے نظر آتے ہیں، جس ترتیب سے اس میں بھرے گئے تھے، دنیا بھر کا تماشا بھی نظر آتا ہے، جو اس میں بھرلیا گیا تھا، اور قرآن شریف کی قرأت، قاری کی تصویر کے ساتھ دیکھی جاسکتی ہے؛ جبکہ اس میں بھرلیا گیا ہو، آج کل ائمہ حرمین کی قرأتوں کی کیسٹ جس طرح مل رہی ہے، اسی طرح کثرت کے ساتھ ان کی تصویروں کے ساتھ عمدہ قرأت کی سی ڈی بھی مل رہی ہے۔

نیز حدیث کی بڑی بڑی کتابوں کی سیڈیاں بھی مل رہی ہیں، جن کو کمپیوٹر وغیرہ میں سی ڈی کی جگہ رکھنے کے بعد تمام چیزیں آنکھوں سے دیکھی جاسکتی ہیں، صحاح ستہ اور حدیث وسیرت کی مختلف کتابوں کے ساتھ تقریباً چوبیس پچیس کتابوں کا مجموعہ سی ڈی میں آرہا ہے، اسی طرح سی ڈی میں خطیب کی تقریر قاری کی قرأت مع ان کی صورت وشکلوں کے سی ڈی میں بھری جارہی ہیں اور ٹیلی ویژن اور کمپیوٹر کے ڈبے میں ان پروگراموں کو باآسانی دیکھا جاسکتا ہے اور سی ڈی کی پلیٹ میں برقی شعاعوں کے ذریعہ سے جو پروگرام بھرلیا گیا ہے، نہ ان کا نگیٹیو بن سکتا ہے اور نہ ہی خوردبین کے ذریعہ سے ان ذرات کو دیکھا جاسکتا ہے؛ اس لئے ٹیلی ویژن اور کمپیوٹر کے ڈبے میں سی ڈی میں بھری ہوئی چیزیں تصویروں کی شکل میں نظر آجائیں، تو ان کو حقیقی معنی میں تصویر نہیں کہا جاسکتا؛ بلکہ ان کو ماقبل کی تفصیل کے مطابق اصل شئ کا عکس کہا جاسکتا ہے یا عکس کا عکس کہا جاسکتا ہے، جن میں تصویروں کی طرح دوام اور استقرار نہیں ہوتا؛ اس لئے سی ڈی میں بھی جائز پروگرام کا دیکھنا جائز ہوسکتا ہے اور ناجائز پروگرام کا دیکھنا ناجائز ہوگا۔

ویڈیو کیمرے کی کیسٹ

ویڈیو کیمرے کی دو قسمیں ہے:

نمبر ۱: وہ ویڈیو کیمرے جن کا کام صرف منظر کشی کرنا ہے، محفوظ کرنا اس کا کام نہیں ہے

اوراس کے منظرکشی کرتے وقت جس ٹی وی اور ٹیلی ویژن سے اس کا کنکشن ہے، اسی وقت ان ٹی وی اور ٹیلی ویژنوں میں منظر دکھائی دیگا، جیسا کہ حرمین شریفین میں مسجد حرام اور مسجد نبوی میں لگے ہوئے ویڈیو کیمروں کا حال ہے، ان کا کام صرف منظروں کا کیچ کرنا ہے، محفوظ نہیں کرتے، محفوظ کرنے کے لئے دوسری جگہ کنٹرول روم ہے، یا جن ٹیلی ویژنوں سے دیکھا جائے گا، ان ہی میں کیسٹ لگا کر محفوظ ہوسکتا ہے۔

نمبر۲ : وہ ویڈیو کیمرے جن کے ساتھ ویڈیو کیسٹ کی ریل بھی ہوتی ہیں جیسا کہ سرکاری اور غیر سرکاری پروگراموں کے موقع پر پریس والے اور ویڈیو فلم والے آتے ہیں، وہ لوگ جو کیمرے لے کر آتے ہیں، ان کیمروں میں ویڈیو کیسٹ کی ریل بھی ہوتی ہیں، ان ریلوں میں ویڈیو فلم لینے کے ساتھ ساتھ محفوظ بھی ہوجایا کرتا ہے، پھر اس کے بعد ان ویڈیو کیمروں کے کیسٹوں میں بھرے ہوئے پروگراموں کو ویڈیو چینل کے ذریعہ سے دنیا کو دکھایا جاتا ہے، اور یہی سلسلہ پوری دنیا میں کثرت کے ساتھ رائج ہے، عمومی طور پر ہر جگہ اسی طریقے سے ویڈیو فلم کے کیسٹوں میں پروگراموں کو بھرلیا جاتا ہے، پھر ویڈیو چینلوں کے ذریعہ سے دنیا والوں کو ٹیلی ویژنوں میں دکھایا جاتا ہے۔

ویڈیو کیمرا

ویڈیو کیمرا اسکو کہا جاتا ہے، جو خارج کی چیزوں کو اخذ کر کے اپنے اندر کیچ کرتا ہے، پھر جہاں ٹی وی رکھی ہوئی ہے، اس میں ویڈیو کیمرے کی کیچ کی ہوئی چیز جوں کی توں سپلائی ہوتی ہے، مثلاً جہاں میٹنگ ہورہی ہے، جلسہ ہورہا ہے یا اجتماع ہورہا ہے یا اور طریقے سے انسان اور دیگر جانور اور ہر چیز کی نقل وحرکت، صورت وشکل، رفتار وگفتار سب کچھ بعینہ ویڈیو کیمرا اخذ کرتا رہتا ہے اور جہاں ٹی وی یا ٹیلی ویژن کا ڈبہ رکھا ہوا ہے، وہاں سے اس کے شیشے میں بعینہ نظر آتا ہے۔

فرموں اور فیکٹریوں میں کیمرا

بڑی بڑی فیکٹریوں اور کارخانوں میں مالک ایک کمرے میں بیٹھا رہتا ہے اور اس کے ملازمین سیکڑوں کی تعداد میں پورے فرم میں کام کرتے ہیں اور سب لوگوں کا مالک کے سامنے ہونا نہایت دشوار ہے، کسی کا کام کسی کاؤنٹر میں، کسی کا کام کسی شعبہ سے، کس کا کام کسی ہال میں اور کسی کا کام کسی دوسرے ہال میں، کوئی نیچے کی منزل میں اور کوئی اوپر کی منزل میں کام کررہا ہے، کوئی پیکنگ کررہا اور کوئی تیاری کررہا ہے، مختلف ملازمین کی مختلف ذمہ داریاں ہیں ان سب کی نگرانی مالک ایک کمرے میں بیٹھ کر کرتا ہے اور جن ہالوں میں اور جن منزلوں میں ملازمین کام کرتے ہیں، ان میں ویڈیو کیمرا لگادیا جاتا ہے، اور تمام کیمروں کا کنکشن مالک کے کمرے میں ٹی وی کے ایک ڈبے سے ہوتا ہے اور اس ڈبے کے شیشے میں ہر منزل اور ہر ہال کے ہر قسم کے ملازمین نظر آتے ہیں۔ کون کیا کررہا ہے؟ کون کام کررہا ہے، کون نہیں کررہا ہے اور کون کام چھوڑ کر باتوں میں لگا ہوا ہے، سب کچھ مالک ایک جگہ بیٹھ کر اپنی آنکھوں سے دیکھ کر نگرانی کرلیتا ہے، اس طرح کی فیکٹریوں میں کاروباری نگرانی اور ضرورت کے لئے ویڈیو کیمرا اور ٹی وی رکھا جاتا ہے، اس میں پوری فیکٹری کی روزانہ کی کارکردگی کی فلم بنتی جاتی ہے، مگر اس فلم کو ہر خاص وعام جائز سمجھتے ہیں، اس کو ناجائز کوئی نہیں کہتا ہے، اسی طرح بڑی بڑی فیکٹریوں اور کارخانوں میں گیٹ پر بھی ویڈیو کیمرا رکھا جاتا ہے اور ذمہ دار کے کمرے میں اس کا ٹی وی رکھا جاتا ہے، اس ٹی وی میں کون آرہا ہے؟ کون جارہا ہے؟ سب کچھ نظر آتا ہے ذمہ دار کو جسے آنے کی اجازت دینی ہوتی ہے، گیٹ مین سے بتادیتا ہے کہ اسے آنے دو اور جسے نہیں آنے دینا ہوتا ہے، اس کے بارے میں منع کردیا جاتا ہے، اس طرح کی فیکٹریوں اور کارخانوں میں نگرانی کے لئے جو ویڈیو کیمرے اور ٹی وی چلتا ہے، اس کی حقیقت کو دیکھ کر سخت مزاج اور سخت گیر مفتی بھی ناجائز نہیں کہتا ہے، ہر خاص وعام اس کو جائز کہتے ہیں۔

حرمین شریفین کے ویڈیو کیمرے

حرم مکی اور حرم نبوی میں ہر جگہ ویڈیو کیمرا لگا ہوا ہے، مکہ مکرمہ اور مسجد حرام میں ہزاروں کی تعداد میں ویڈیو کیمرے لگے ہوئے ہیں اور مسجد نبوی میں امام صاحب کے سر کے اوپر بھی محراب میں کیمرا لگا ہوا ہے۔غرضیکہ مسجد حرام اور مسجد نبوی کے تمام نمازیوں کی ان کیمروں کے ذریعہ فلم لی جاتی ہے، اور یہ تمام کیمرے کیچ کرتے ہیں، گویا کہ یہ تمام کیمرے آنکھ ہیں، وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر کے کیچ کر لیتے ہیں اور پھر بعینہ پوری دنیا کے ٹی وی اور ٹیلی ویژنوں کے ڈبے میں کیمرے نے جو دیکھا تھا، وہی نظر آنے لگتا ہے اور منی میں جمرات کے دونوں جانب کیمرا لگا ہوا ہے اور منیٰ چونکہ دوطرفہ پہاڑوں کے درمیان میں واقع ہے، دونوں طرف کے پہاڑوں کے دامنوں میں اونچائی پر بھی کیمرے لگے ہوئے ہیں، ان سب کیمروں میں لاکھوں کی تعداد میں رمی کرنے والوں کا منظر پوری دنیا کو دکھایا جاتا ہے۔

اب یہاں ساتھ ہی یہ سوال اٹھتا ہے کہ فیکٹریوں میں جو کیمرے لگے ہوئے ہیں، ان میں اور حرمین شریفین میں لگے ہوئے کیمروں کے درمیان کوئی فرق ہے یا حقیقت میں یکساں ہیں، تو ظاہر بات ہے کہ جو شخص ویڈیو کیمرا اور اس کی فلم اور پھر وہ ٹی وی کے ڈبوں میں نظر آنے کی حقیقت جانتا ہو، وہ یہی کہے گا کہ دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، یہاں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ویڈیو کیمرا اور ویڈیو کیسٹ دونوں الگ الگ چیز ہیں، یہاں صرف ویڈیو کیمرے کی بات ہورہی ہے، ویڈیو کیسٹ کی بات نہیں ہورہی ہے اور ویڈیو کیسٹ کے بارے میں گفتگو مستقل طور پر آگے آرہی ہے۔

فیکٹریوں میں ویڈیو کیمرا ہے، اس میں بھی لوگ بروقت نظر آتے ہیں، انہیں کیسٹ میں نہیں کیا جاتا ہے اور حرمین شریفین کے پروگراموں کو بھی یہاں بروقت دیکھنے کی بات چل رہی ہے، ریلوں کے ذریعہ سے کیسٹ والی بات یہاں نہیں چل رہی ہے، بروقت پروگرام

وجود میں آنے میں دونوں کا حال یکساں ہے، تو فیکٹریوں میں جو چلتا ہے، اس کو جائز کہتے ہیں اور حرمین کے پروگرام کو علماء اب تک ناجائز کہتے ہیں آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

حرمین کے ویڈیو پروگرام کو ناجائز کہنے کی وجہ؟

حرمین شریفین کے پروگرام، رمضان المبارک میں تراویح کا پروگرام، نمازیوں کو اور امام حرم کو دیکھنے کی حالت میں امام حرم کے قرآن سننے، وہاں کے نمازیوں کو دیکھنے اور حج کا پروگرام، منیٰ کا پروگرام، صفا مروہ میں دوڑنے کا پروگرام طواف کا پروگرام وغیرہ وغیرہ، یہ سب پروگرام دنیا کے لوگ اسی ٹی وی میں اور اسی ٹیلی ویژن میں دیکھتے ہیں، جس میں فحش اور ناجائز اور حیا سوز پروگرام بھی دیکھا جاتا ہے اور ٹی وی، ٹیلی ویژن رکھنے والے عام طور پر اتنے محتاط نہیں ہوتے ہیں کہ ان کے ٹی وی اور ٹیلی ویژن میں حرمین شریفین کے پروگرام اور دیگر جائز پروگرام کے علاوہ کوئی ناجائز پروگرام قطعی طور پر نہ آسکتا ہو؛ لہٰذا اگر ان کو ان پروگراموں کو دیکھنے کی اجازت دی جائے اور وہ انہیں پروگراموں کو دیکھنے کے ارادے سے ٹیلی ویژن رکھیں، تو وہ ناجائز پروگرام سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے۔

حدیث پاک میں آیا ہے کہ ہر بادشاہ کے ملک کی ایک سرحد ہوتی اور اللہ سب سے بڑے بادشاہ ہیں، اس کے احکام کی سرحد مشتبہ امور ہیں؛ لہٰذا جو شخص ایسے متردد فیہ اور مشتبہ پروگراموں کو دیکھنے میں مبتلا ہوجاتا ہے، وہ اچانک حرام اور ناجائز پروگرام میں بھی مبتلا ہوجائے گا اور اسے اس کا احساس بھی نہ ہوسکے گا؛ اس لئے حضرات علماء نے سد باب کے طور پر حرمین کے پروگراموں کو بھی ٹیلی ویژن میں دیکھنا ناجائز کہا ہے۔

حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

عن النعمان بن بشیرؓ، قال: سمعته یقول سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: وأهوی النعمان بإصبعه إلی أذنیه أن الحلال بین والحرام

بين وبينهما مشتبهات لا يعلمهن كثير من الناس ، فمن اتقى الشبهات استبرأ لدينه وعرضه ومن وقع في الشبهات وقع في الحرام كالراعي يرعي حول الحمي يوشک أن يرتع فيه ألا وإن لكل ملک حمى ألا وإن حمي الله محارمه ألا وإن في الجسد مضغة إذا صلحت صلح الجسد كله، وإذا فسدت فسد الجسد كله ألا وهي القلب. (صحيح مسلم، كتاب المساقاة، باب أخذ الحلال وترك الشبهات، النسخة الهندية ۲/ ۲۸، بيت الأفكار رقم:۱۵۹۹، صحيح البخاري، كتاب الإيمان، با ب فضل من استبرأ لدينه ۱/ ۱۳، رقم:۵۲)

حضرت نعمان بن بشیرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے فرماتے ہوئے سنا ہے، بیشک اللہ نے حلال چیزوں کو واضح کر کے بیان فرمادیا اوراسی طرح حرام کوبھی واضح کردیاہے، اوران دونوں کے مابین کچھ مشتبہ چیزیں ہیں، جن کا حکم بہت سے لوگ نہیں جانتے ہیں؛ لہٰذا جوشخص ان مشتبہ چیزوں سے بچے گا وہ اپنے دین اورعزت کومحفوظ کرلے گا اور جوشخص مشتبہ چیزوں میں مبتلا ہوجائے گا، وہ حرام میں مبتلا ہوجائے گا، جیسا کہ چرواہا چراگاہ کے کنارے پر چراتا ہے،تو بہت ممکن ہے کہ چرانے لگے حدود کے باہر بھی، اورآگاہ ہوجاؤ بیشک ہر بادشاہ کی حکومت کے لئے حدوداوردائرے ہیں،خبردار ہوجاؤ بیشک اللہ کے احکام کے حدود اوردائرے کی سرحدمحارم ہیں،آگاہ ہوجاؤ بیشک جسم کے اندر ایک گوشت کا لوتھڑا ہے، جب وہ صحیح سالم رہے،تو پورا جسم صحیح سالم رہتا ہے، اور جب اس میں فساداور بگاڑ آجائے تو پورے جسم میں فساد آجاتاہے، بیشک وہ قلب ہے۔

تو معلوم ہوا کہ شریعت میں بہت سی چیزوں کو برائیوں کا دروازہ بند کرنے کے لئے ناجائز قرار دیا جاتا ہے،جن جن راستوں سے برائیوں کا دروازہ کھل سکتا ہے،ان تمام دروازوں کو پہلے ہی سے بند کردیا جاتا ہے،اورفیکٹریوں اورکارخانوں میں جو ویڈیو کیمرا اور ٹی وی چلتا ہے،ان کا دائرہ اور حدود صرف فیکٹریوں تک محدود ہوتے ہیں، ان میں ان

فیکٹریوں کے علاوہ کوئی دوسرا پروگرام آ ہی نہیں سکتا؛ کیوں کہ ان میں فرم اور فیکٹریوں کی ضروریات کے علاوہ دیگر ناجائز اور فحش پروگرام کے آنے کا امکان نہیں ہوتا ہے؛ اس لئے علماء نے فیکٹریوں اور کارخانوں کے ویڈیو کیمرے کو جائز قرار دیا ہے اور حرمین کے پروگراموں کو سد باب کی وجہ سے ناجائز کہا ہے۔

ویڈیو کیمرے اور ویڈیو کیسٹ کا فرق

ویڈیو کیمرا کا کام صرف کیچ کرنا ہوتا ہے، اور جس حالت میں کیمرا کیچ کر رہا ہوگا، اسی حالت میں اسی مجلس اور اسی اجتماع اور اسی پروگرام کو اس کیمرے سے متعلق چینلوں کے ذریعہ سے ٹیلی ویژنوں میں دیکھا جاسکتا ہے اور اگر ان ٹیلی ویژنوں میں ویڈیو کے ساتھ ساتھ کیسٹ بھی لگی ہوئی ہے، اور اس کیسٹ کے ذریعہ محفوظ کر لینا چاہے، تو محفوظ کرلیا جاسکتا ہے اور اگر ویڈیو کے ساتھ اس کی ریلوں کی کیسٹ کا بٹن نہیں دبایا گیا ہے، تو پروگرام محفوظ نہیں ہو سکے گا؛ بلکہ جس وقت ویڈیو کیمرا اسکو کیچ کر رہا ہوگا، اسی وقت اس کیمرے سے تعلق رکھنے والے ٹیلی ویژن میں پروگرام دیکھا جاسکتا ہے اور جب پروگرام ختم ہو جائے گا، تو ٹیلی ویژن میں نظر نہیں آئے گا اور نہ ہی بعد میں ان پروگراموں کو دیکھا جاسکتا ہے، تو معلوم ہوا کہ ویڈیو کیسٹ کا تعلق ٹیلی ویژن دیکھنے والوں سے ہے، وہ چاہیں تو محفوظ کرلیں اور چاہیں تو غیر محفوظ چھوڑ دیں اور ویڈیو کیمرے کا کام صرف کیچ کرنا ہوتا ہے اور وہی کیچ شدہ چیز ٹیلی ویژن کے ڈبہ میں نظر آتی ہے، اور کیسٹ کرنے کا کام علیحدہ سے ہوتا ہے، جیسا کہ ٹیپ ریکارڈ میں دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک ریڈیو ہوتا اور ایک ریکارڈنگ ہوتی ہے، ریڈیو کے ذریعہ سے باہر کی خبریں سنی جاتی ہیں اگر انہیں ریکارڈ نہ کیا جائے تو وہ خبریں صرف اسی وقت سنی جاسکتی ہیں، بعد میں نہیں سنی جاسکتیں؛ لیکن اگر کیسٹوں میں ریکارڈنگ کرلی جائیں تو وہ خبریں دوبارہ بھی سنی جاسکتی ہیں۔

بغیر پائیلٹ کے ہوائی جہاز

اس وقت دنیا میں سائنس نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ بغیر پائیلٹ کے ہوائی جہاز چلنے لگا، امریکہ نے افغانستان پر حملہ کرنے سے پہلے بغیر پائلٹ کے ہوائی جہاز کے ذریعہ سے افغانستان کے فوجی مقامات کا پتہ لگالیا، اسی طرح عراق پر حملہ کرنے سے پہلے بغیر پائیلٹ والے ہوائی جہاز کے ذریعہ سے عراق کے فوجی مورچوں اور فوجی مقامات اور اہم نشانات کا پتہ لگالیا جیسا کہ اس زمانہ کی نشریات کے ذریعہ سے دنیا کی خبروں میں اس کا چرچا ہوا ہے، تو ظاہر بات ہے کہ جن ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے دوسرے ملکوں کے باریک اور خفیہ مقامات کا پتہ لگالیا جاتا ہے، ان جہازوں میں نہایت ہائی پاور ویڈیو کیمرے اور انٹرنیٹ کیمرے لگے ہوں گے، اور ان کیمروں کے ذریعہ سے جہاں کے ٹی وی سے ان کیمروں کا تعلق ہے یا جس کنٹرول روم سے ان ہوائی جہازوں کے کیمرے کا تعلق ہے، اس میں مکمل طور پر ان کیمروں سے کیچ کی ہوئی ہر چیز نظر آتی ہے، اگر کوئی فوٹو گرافر اپنے عمدہ ترین فوٹو کیمرے کے ذیعہ سے فوٹو لے لے، اس میں جو صاف ستھری ہر چیز کی فوٹو آجاتی ہے، اس سے کہیں زیادہ عمدہ اور صاف ستھرے انداز سے ان ہوائی جہازوں کے کیمرے کے ذریعہ سے ہر چیز کی تصویر اور نقل وحرکت ذرہ ذرہ کنٹرول روم کے ٹی وی میں نظر آتی ہے۔

اب ان تمام تقریروں سے ہمیں ایک بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیمروں کے ذریعہ سے جو فوٹو کھینچا جارہا ہے، اور ہر چیز کی نقل وحرکت کیچ کی جارہی ہے، وہ ٹیلی ویژن میں بعینہ نظر آتی ہے، تو سوال یہ ہے کہ ویڈیو کیمرا جس چیز کو دیکھ کر کیچ کرتا ہے، اس چیز کی تصویریں صورتیں اور نقل وحرکت ٹیلی ویژن میں جس وقت نظر آتی ہے، اس وقت ٹیلی ویژن اس کی تصویر کھینچتا ہے یا ویڈیو کیمرا اس کی تصویر کھینچتا ہے، ان دونوں میں فوٹو گرافر کون ہے؟ تصویر کشی کون کررہا ہے، اس سلسلے میں ویڈیو کیمرا اور ٹیلی ویژن کی ٹکنالوجی سے تعلق رکھنے

والوں سے معلوم ہوا کہ فوٹو گرافر ویڈیو کیمرا ہے، ٹیلی ویژن نہیں ہے، ٹیلی ویژن میں صرف ویڈیو کیمرے نے جس کو کیچ کرلیا ہے، اسے برقی تاروں کے ذریعہ سے یا سرچ لائٹ کے ذریعہ سے ٹیلی ویژن اپنے پاس اس کی شعاعیں کھینچ لیتا ہے، جو عکس کے طور پر ٹی وی اور ٹیلی ویژن کے ڈبے میں نظر آتی ہے۔

تصویر کی حقیقت اور ٹیلی ویژن میں تصویروں کا عکس

سب سے پہلے یہ حقیقت جاننے کی ضرورت ہے کہ تصویر کی حقیقت کیا ہے؟ تصویر کسے کہا جاتا ہے، اور شریعت میں اس کی حرمت کیوں بیان کی گئی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ کفار ومشرکین اپنے بڑوں کی تصویر اور مجسمہ بنا کر ان کو محفوظ کر لیتے تھے، پھر ان کا احترام عبادت کی حد تک کرنے لگتے تھے، پھر خدا کو بھول کر انہی کو معبود بنالیا کرتے تھے اور ظاہر بات ہے کہ شریعت میں جس تصویر اور مجسمہ کی ممانعت کی گئی ہے، وہ تصویر اور مجسمہ اپنی حقیقت پر اس وقت ثابت ہوسکتا ہے، جب کہ دیوار یا لکڑی، پلاسٹک یا کاغذ وغیرہ کسی شئ پر علی صفۃ الدوام والاستقرار منقش ہو اور جو صورت اور تصویر علی صفۃ الدوام والاستقرار کسی شئ پر قائم اور منقش نہ ہو؛ بلکہ ظاہر ہو کر فنا ہوتی رہتی ہو، وہ اس تصویر کی حقیقت کے دائرہ میں داخل نہیں ہوسکتی، جس کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے، اس لئے کہ جو چیز علی صفۃ الدوام والاستقرار نہ ہو، اور اپنی شکل پر قائم نہ رہے، اس کی عبادت کیسے کس طرح کی جاسکتی ہے، کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ اس کی عبادت کی جائے؛ اس لئے تصویر کے تصویر ہونے کے لئے قائم اور ثابت رہنا لازم ہے اور اس طرح تصویر کی حقیقت ماہر علماء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایاہے:

(١) لأن الصورة المحرمة ما كانت منقوشة، أو منحوتة بحيث يصبح لها صفة الاستقرار على شئ وهي الصورة التي كان الكفار

يستعملونها للعبادة. (تكملة فتح الملهم، باب تحريم تصوير صورة الحيوان، التلفزيون، اشرفيه ديوبند ٤/ ١٦٤)

اس لئے کہ وہ تصویر جس کی حرمت بیان کی گئی ہے، ایسی ہوتی ہے جو کسی شئ پر منقش ہو یا ممثل ہو، اس طریقے سے کہ وہ نقشہ اس شئ کے اوپر دوام اور استقرار کے ساتھ متصف ہو اور یہی وہ تصویر ہے، جس کو کفار و مشرکین عبادت کے لئے بنایا کرتے تھے۔

(۲) اور ملا علی قاریؒ نے مشکوۃ کی شرح مرقات میں صاف الفاظ میں نقل فرمایا ہے کہ تصویر اس کو کہا جاتا ہے، جو کسی دیوار یا چادر یا پردہ وغیرہ پر کسی ذی روح اور صورت حیوان کے ساتھ متصف اور متصل ہو، تو ظاہر بات ہے کہ دیوار اور چادر وغیرہ پر جو تصویر ہوتی ہے، اس میں ثبات اور استقرار رہوا کرتا ہے۔ ملا علی قاریؒ کی عبارت ملاحظہ ہو۔

التصاوير جمع التصوير وهو فعل الصورة، والمراد به هنا ما يتصور مشبها بخلق الله من ذوات الروح مما يكون على حائط، أو ستر كذا ذكره ابن الملك. (مرقاة المفاتيح، مطبوعه اشرفيه ديوبند ٨/٣٢٥)

تصاویر: تصویر کی جمع ہے، اور وہ تصویر کا بنانا ہے اور یہاں اس سے مراد اللہ کی پیدا کی ہوئی کسی جاندار مخلوق کی خلقت کے مشابہ ایسی تصویر ہے، جو کسی دیوار یا پردہ پر قائم ہو۔

تصویر کی حقیقت کے بارے میں امام نوویؒ نے مسلم شریف کی شرح میں تھوڑی سی اور وضاحت فرمائی ہے، کہ تصویر کی دو قسمیں ہیں:

(۱) وہ تصویر جس کے لئے سایہ ہو یعنی مجسمہ اور تمثال کہ باضابطہ طور پر سایہ میں بھی اس جاندار کی ہیئت نظر آتی ہو، جیسا کہ ابھی حال ہی میں ہمارے مرادآباد میں دہلی روڈ پر چرن سنگھ کی مورتی رکھی گئی ہے اور نئ دہلی میں گاندھی جی کے ساتھ آزادی کا مطالبہ کرنے والوں کی جو آزادی لینے کے لئے جاتے ہوئے شکل دکھائی گئی ہے، اس میں گاندھی جی کی قیادت میں ہندو، مسلم، سیکھ وغیرہ مختلف مذاہب کے لوگوں کی مورتیاں بنی ہوئی ہیں، اسی

طرح مایاوتی نے جگہ جگہ ڈاکٹر امبیڈکر کا مجسمہ کھڑا کردیا ہے، یہ ہے سایہ دار تصویر۔

(۲) وہ تصویر جو کسی شئ کے ساتھ ایسے متصلا ور متصف ہوجائے کہ دیکھنے والے کو تو اچھی طرح نظر آجائے، مگراس تصویر کا اپنی ہیئت کے ساتھ سایہ نہیں بنتا ہے، جیسا کہ دیوار پر تصویر کپڑے پر تصویر، چادراور پردے پر تصویر وغیرہ وغیرہ چاہے ہاتھ سے بنائی گئی ہو یا کیمرے سے، تو پہلی قسم کی تصویر کی حرمت پر سب کا اتفاق ہے اور دوسری قسم کی تصویر کی حرمت میں بعض لوگوں نے اختلاف کیا ہے، جس کو جمہور نے قول باطل کہہ کر کے ٹھکرا دیا ہے، اسی سے بعض علماء عرب نے کیمرے کی تصویر کو حدیث تصویر سے خارج کیا ہے، اس وجہ سے کیمرے کی تصویر کے معاملے میں حدیث شریف کی دلالت ظنی ہوگئی، اس کی قطعیت باقی نہیں رہی۔ بہر حال اس سے واضح ہوا کہ تصویر چاہے مجسمہ کی شکل میں ہو یا دیوار یا کاغذ وغیرہ پر ہاتھ سے منقش کر کے بنائی گئی ہو یا کیمرے کے ذریعہ سے نگیٹیو تیار کر کے تصویر بنائیگئیہو، ہر صورت میں تصویر موجودات خارجیہ میں سے کسی شئ کی ایسی صفت ہونا لازم ہے، جواس شئ کے ساتھ متصف اور مستقر ہو۔ امام نوویؒ کی عبارت کا مختصر ٹکڑا ملاحظہ فرمایئے:

(۳) وقال بعض السلف: إنما ينهى عما كان له ظل، ولا بأس بالصورة التي ليس لها ظل، و هذا مذهب باطل، فإن الستر الذي أنكر النبي صلى الله عليه وسلم: الصورة فيه لا يشك أحد أنه مذموم وليس لصورته ظل. (شرح المسلم للنووي ۱۹۹/۲)

اور بعض سلف نے کہا کہ حدیث تصویر میں ان مجسموں کی ممانعت ہے، جن کے لئے اپنی ہیئت کے ساتھ سایہ کا وجود ہو اور ایسی تصویر میں کوئی حرج نہیں ہے، جو کسی شئ کے ساتھ متصل ہونے کی وجہ سے ان کے لئے سایہ نہ ہو اور یہ مذہب اور قول باطل ہے؛ اس لئے کہ وہ پردہ جس پر تصویر دیکھنے کی وجہ سے حضور ﷺ نے انکار فرمایا تھا، اس کے بارے میں کسی کو اس بات میں کوئی شک نہیں پیدا ہوسکتا کہ بیشک وہ مذموم اور بری شئ ہے؛ حالانکہ اس پردے کی تصویر کا سایہ نہیں تھا۔

(۴) اس کو صاحب روح المعانی علامہ آلوسیؒ نے اس سے بھی واضح انداز سے نقل فرمایا ہے کہ ہمارے نزدیک تصویر کے لئے اس بات میں کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ تصویر، مجسمہ اور مورتی کی شکل میں سایہ دار ہو یا سایہ دار نہ ہو، جیسا کہ مثال کے طور پر منقش گھوڑے کی تصویر کسی کاغذ یا دیوار کے اوپر نظر آ جائے، صاحب روح المعانی کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

لا فرق عند نا بين أن تكون الصورة ذات ظل وأن لا تكون كذلك كصورة الفرس المنقوشة على كاغذ أو جدار مثلاً. (روح المعاني، سورة السبا، مطبوعه، زكريا ديوبند ١٢/ ١٧٣)

ہمارے نزدیک اس بات میں کوئی فرق نہیں ہے کہ تصویر، مجسمہ اور مورتی کی شکل میں سایہ دار ہو یا ایسا سایہ دار نہ ہو، جیسا کہ کسی کاغذ یا دیوار کے اوپر گھوڑے کی منقش تصویر۔

صاحب روح المعانی کی عبارت سے بھی واضح ہوا کہ تصویر کے تصویر ہونے کے لئے چاہے سایہ دار نہ ہو، مگر کسی جامد چیز کے ساتھ متصف اور مستقر ہونا لازم ہے۔

(۵) الموسوعۃ الفقہیہ میں شریعت کے ممنوع اور حرام تصویر کے بارے میں چند شرطیں لکھی ہیں، ان میں سے پہلی شرط تصویر محرمہ کی حقیقت سے متعلق ہے، اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان یا حیوان کی ایسی تصویر ہو کہ مجسمہ اور مورتی کی شکل میں اس کا سایہ بھی ہو؛ لہٰذا اگر مجسمہ کی شکل میں سایہ نہ ہو، تو اس کا بنانا حرام نہیں ہے، جیسا کہ دیوار یا کاغذ یا کسی نقش و نگار پر منقش تصویر ہوتی ہیں، ہاں البتہ اسے مکروہ تو کہا جا سکتا ہے؛ لیکن اس کے بنانے کو حرام نہیں کہا جا سکتا، تو اس سے بھی واضح ہوا کہ جس تصویر کا سایہ نہ ہو، جس کو ہم تصویر اور فوٹو سے تعبیر کرتے ہیں، اس کا کسی جامد چیز کے ساتھ متصل اور مستقر ہونا لازم ہے، مثلاً دیوار یا کاغذ یا کسی نقش و نگار کی شئ پر متصف ہو۔ عبارت ملاحظہ فرمائیے:

والشرط الأول: أن تكون صورة الإنسان، أو الحيوان مما له ظل أي تكون تمثالا مجسداً، فإن كانت مسطحة لم يحرم عملها

وذلک کالمنقوش في جدار، أو ورق أوقماش؛ بل یکون مکروهاً.
(الموسوعة الفقهیة ۱۲/ ۱۰۱)

اور پہلی شرط یہ ہے کہ انسان یا حیوان کی ایسی صورت کا مجسمہ ہو، جس کے لئے سایہ ہوتا ہو، یعنی جسم والے حیوان کی شکل میں مجسمہ ہو؛ لہٰذا اگر کسی شئ پر مسطح ہو، تو اس کا بنانا حرام نہیں ہے، جیسا کہ کسی دیوار یا ورق یا نقش ونگار کی شئ پر منقش تصویر ہوتی ہے، ہاں البتہ اس کا بنانا مکروہ ہوگا۔

(۶) اور اس کو علامہ بدرالدین عینیؒ نے عمدۃ القاری شرح بخاری میں اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے۔

والصورة ما کان رقمًا، أو تزویقا في ثوب، أو حائط. (عمدة القاری دارإحیاء التراث العربی بیروت ۲۲/ ۷۰، زکریا ۱۵/ ۱۲٤)

اورصورت وتصویر اسکو کہا جاتا ہے، جو لائن اور لکیردار ہو، یا کسی کپڑے یا دیوار پر نقش ونگار کی شکل میں ہو، اسکو صاحب عنایہ نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے۔

ومنهم من قال التمثال ماتصوره علی الجدار والصورة ماتصور علی الثوب ولیس بواضح. (عنایه مع الفتح زکریا دیوبند ۱/ ٤۲۹، کوئٹه ۱/ ۳٦٤)

کہ تمثال وہ ہے کہ جو کسی دیوار پر ہوتا ہے اور تصویر اسے کہا جاتا ہے، جو کپڑے وغیرہ پر ہو اور ایسا واضح نہ ہو، جس کے لئے سایہ ہوتا ہو۔

حضرات محدثین اور فقہاء اور مفسرین کے مذکورہ تصریحات کے ذریعہ سے معلوم ہوگیا ہے کہ تصویر اسے کہا جاتا ہے، جو کسی جامد شئ کے اوپر مستقر ہو، چاہے ہاتھ سے بنائی گئی ہو یا کیمرے سے نگیٹیو کے ذریعہ سے تیار کی گئی ہو، ایسی نہ ہو کہ عکس اور سایہ کی طرح اپنی جگہ برقرار نہ ہوکر ظاہر ہوتی رہے، پھر زائل ہوتی رہے؛ اس لئے کہ جو چیز اصل شئ کے ساتھ ساتھ ظاہر ہوتی رہے اور پھر زائل ہوتی رہے، اس کو تصویر نہیں کہتے ہیں؛ بلکہ اس کو عکس یا سایہ کہا جاتا ہے۔

انٹرنیٹ اور کمپیوٹر

یہاں یہ بات بھی واضح ہوجانا ضروری ہے کہ انٹرنیٹ پر جوخبریں آتی ہیں، اس پر عام طور پرخبر دینے والے کی تصویر بھی نظر آتی ہے، یہ بھی درحقیقت تصویرنہیں ہے؛ بلکہ خبر دینے والے کا اسی طرح کا عکس ہے، جو ٹیلی ویژن پر آتا ہے، اور انٹرنیٹ کے ذریعہ سے دنیا کے مواصلات نہایت آسان ہو چکے ہیں، مگر انٹرنیٹ میں بھی ان ہی تمام شرائط وقیودات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، جو ٹی وی اور ٹیلی ویژن میں کہا گیا ہے کہ جس طرح ٹی وی اور ٹیلی ویژن میں عورت کی مشکل صورت کا عکس دیکھنا ناجائز ہے، اسی طرح انٹرنیٹ پر بھی اس کو دیکھنا جائز نہیں ہے۔

نیز سی ڈی کے ذریعہ سے اگر کمپیوٹر میں پروگرام بھرلیا ہے، تو اس میں بھی عورتوں کا پروگرام ناجائز اور حرام ہوگا اور مردوں کے جائز پروگرام کے ساتھ ان کی تصویروں کا دیکھنا جائز اور درست ہوگا، مگر نامحرم عورتیں جن میں مردوں کی صورت دیکھ کر ہیجان وتلذذ پیدا ہوسکتا ہے، ان کے لئے دیکھنا جائز نہیں ہے اور چونکہ انٹرنیٹ حیاسوز اور فحش پروگراموں کے لئے نہیں بنایا گیا؛ بلکہ مواصلات اور خبروں کے لئے بنایا گیا ہے؛ اس لئے کمپیوٹر کی طرح انٹرنیٹ کا استعمال جائز اور درست ہے، ہاں البتہ اس میں کوئی غلط پروگرام شامل کرلیا جائے تو ناجائز ہوگا، اسی طرح کیمرے والے موبائل میں عورتوں کے لئے نامحرم مردوں کی تصویر کیمرے میں رکھنا اور مردوں کے لئے نامحرم عورتوں کی عکسی تصویر اپنے موبائل میں شامل کرنا ناجائز اور حرام ہوگا؛ اس لئے کہ ان میں ایک دوسرے کو دیکھ کر تلذذ حاصل کیا جائے گا، جس سے نگاہوں کا گناہ اور معصیت میں مبتلا ہونے کا شکار ہوسکتا ہے، جو نصِ حدیث ناجائز اور حرام ہے۔

نصوص سے استدلال کیسے کریں؟

شریعت کے صریح نصوص سے براہ راست حاصل کرنا مشکل ہے، ہاں البتہ ان سے قریب ترین نصوص شرعیہ کو نظیر بنانے کی ضرورت ہے کہ اس کی حقیقت ان نظائر میں شامل ہے یا نہیں اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ ٹیلی ویژن اور ویڈیو کیمرے کی حقیقت کو نصوص تصویر سے زیادہ مشابہت حاصل ہے؛ اس لئے ٹیلی ویژن کی حقیقت کی شناسائی کے سلسلے میں حدیث تصویر کو موضوع بحث بنانا پڑے گا، ہاں البتہ ٹیلی ویژن میں جو فاحش پروگرام آتے ہیں، ان کے حکم کے متعلق نصوص شرعیہ میں صریح حکم موجود ہے؛ لہٰذا ویڈیو کیمرے اور ٹیلی ویژن کے چینل سے متعلق حقیقت پر غور کرنے کے لئے حدیث تصویر کو موضوع بحث بنانے کے لئے اولاً نصوص شرعیہ کی اقسام پر ایک نظر ڈالتے جائیں، اس کے بعد حدیث تصویر کو سامنے رکھ کر مسئلہ ویڈیو کیمرا اور ٹی وی چینل پر بحث کریں گے۔

نصوص شرعیہ کی چار قسمیں

قرآن کریم اور احادیث شریفہ کی نصوص کل چار قسموں پر ہیں:

(۱) قطعی الثبوت قطعی الدلالۃ (۲) قطعی الثبوت ظنی الدلالۃ (۳) ظنی الثبوت قطعی الدلالۃ (۴) ظنی الثبوت ظنی الدلالۃ اور اس کو فقہاء نے ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے۔

بيان ذلک أن الأدلة السمعية أربعة. الأول: قطعي الثبوت والدلالة كنصوص القرآن المفسرة، أو المحكمة والسنة المتواترة التي مفهومها قطعي. والثاني: قطعي الثبوت ظني الدلالة كالآيات المؤولة، الثالث: عكسه كأخبار الآحاد التي مفهومها قطعي الرابع ظنيهما كأخبار الآحاد التي مفهومها ظني، فبالأول يثبت الفرض والحرام، وبالثاني، والثالث الواجب وكراهة التحريم، وبالرابع: السنة، أو المستحب. (شامي، كراچي ۱/۹۵و۶/۳۳۷، زكريا جديد ۱/۲۰۷و۹/۴۸۷، هكذافي العرف الشذي ۱/۶، طحطاوي على المراقي قديم ۳۱، جديد دارالكتاب ديوبند ۵۷، حاشية شرح نقايه، مكتبه اعزازية ديوبند ۱/۴)

اس کی وضاحت یوں ہے کہ ادلہ سمعیہ چار ہیں:

(۱) قطعی الثبوت قطعی الدلالۃ، جیسا کہ قرآن کریم کی نصوص مفسرہ اور نصوص محکمہ اور وہ احادیث متواترہ جن کا مفہوم قطعی ہو۔

(۲) قطعی الثبوت ظنی الدلالۃ ،جیسا کہ وہ آیات قرآنیہ جن میں تاویل کی گنجائش ہوتی ہے۔

(۳) اس کے برعکس ہے وہ اخبار آحاد جن کی دلالت قطعی ہونے کی وجہ سے تاویل کی گنجائش نہ ہو۔

(۴) ظنی الثبوت ظنی الدلالۃ، جیسا کہ وہ اخبار آحاد جن کا مفہوم ظنی ہونے کی وجہ سے تاویل کی گنجائش ہو، اول سے فرضیت اور حرمت ثابت ہوتی ہے، ثانی اور ثالث سے واجب اور کراہت تحریمی ثابت ہوتی ہے اور رابع سے سنت یا مستحب ثابت ہوتا ہے۔

اب نصوص کی چاروں قسموں میں سے ہرایک کی اجمالی تفصیل ذیل میں درج کی جارہی ہے۔

(۱) قطعی الثبوت قطعی الدلالۃ: اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن وحدیث کی وہ نصوص جن کا ثبوت قطعی ہو اور دلالت بھی قطعی ہو اور قطعی الثبوت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن یا احادیث متواترہ سے ثابت ہو اور قطعی الدلالۃ کا مطلب یہ ہے کہ اس نص سے جو حکم ثابت ہورہا ہے، اس میں کسی قسم کی تاویل کی گنجائش نہ ہو اور اس نص کے ذریعہ سے کسی شئ کے کرنے کا حکم کیا جائے، تو اس کا کرنا فرض ہوگا اور اگر ترک کرنے کا حکم کیا جائے اور اس کے اختیار سے منع کیا جائے، تو اس نص سے اس شئ کی حرمت ثابت ہوتی ہے اور ایسے نصوص کا منکر کافر ہوجاتا ہے، جیسا کہ آیت کریمہ:

من شهد منكم الشهر فليصمه. [البقرہ: ۸۵]

جس شخص کی زندگی میں رمضان کا مہینہ آجائے، وہ رمضان کا روزہ ضرور رکھ لے۔

یہ آیت قرآن سے ثابت ہونے کی وجہ سے قطعی الثبوت اور فلیصمہ سے فرضیت صوم میں تاویل کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے قطعی الدلالۃ ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ . [المائدہ:۳]

تم پر مردار خون اور خنزیر کا گوشت حرام کردیا گیا ہے۔

یہ آیت قرآن سے ثابت ہونے کی وجہ سے قطعی الثبوت ہے اور مذکورہ اشیاء کی حرمت میں تاویل کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے قطعی الدلالۃ ہے اور اسی طرح بہت سی احادیث شریفہ بھی قطعی الثبوت قطعی الدلالۃ ہیں، جیسا کہ پانچ نمازوں کا ثبوت اور نماز کے اوقات خمسہ کا ثبوت یہ احادیث متواترہ سے ثابت ہیں؛ اس لئے قطعی الثبوت ہیں اور پانچ وقت نماز کے فرض ہونے میں تاویل کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے قطعی الدلالۃ ہیں اور اس موضوع کی روایات کتب احادیث میں طویل بھی آئی ہیں اور مختصر بھی اور ہم یہاں مختصر سی ایک حدیث امامت جبرئیل سے متعلق اور ایک حدیث پانچ نمازوں کی فرضیت سے متعلق اور ایک حدیث کذب علی النبی ﷺ سے متعلق نقل کرتے ہیں۔

(۱) نزل جبرئيل فأمني فصليت معه، ثم صليت معه، ثم صليت معه، ثم صليت معه، ثم صليت معه يحسب بأصابعه خمس صلوات. (صحيح مسلم ۱/ ۲۲۱، رقم: ۶۱۰، صحيح البخاري ۱/۷۵، رقم: ۵۱۵، ف: ۵۲۱)

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ حضرت جبرئیل امین نے تشریف لاکر میری امامت فرمائی تو میں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی اس کے بعد پھر دوسری نماز پڑھی، پھر تیسری نماز پڑھی، پھر چوتھی نماز پڑھی، پھر پانچویں نماز پڑھی اور حضور ﷺ نے اپنی انگلیوں سے پانچ نمازیں شمار فرمائی ہیں۔

(۲) قال يا محمد إنهن خمس صلوات كل يوم وليلة. الحديث

(صحيح مسلم ۱/ ۹۱، رقم:۱۶۲، صحيح البخاري ۱/ ۵۱ذ، رقم: ۳۴۷، ف: ۳۴۹)

(لیلۃ الاسرا میں آخری مرتبہ میں) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے محمد یہ نمازیں دن ورات میں پانچ ہی ہوں گی۔

وفی البخاری لايبدل القول لدي. الحديث

اور بخاری شریف میں اس کا اضافہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہمارے یہاں قول میں تبدیلی نہیں ہوتی۔

(۳) **من كذب علي متعمداً فليتبوأ مقعده من النار. الحديث** (صحيح مسلم ۱/۷، رقم: ۳، نزهة النظر ۱۱)

جو شخص مجھ پر جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

(۲) قطعی الثبوت ظنی الدلالۃ: یہ ایسی نص ہے، جس کا ثبوت قرآن سے ہو، مگر اس میں تاویل اور مختلف معنی مرادی نکالنے کا احتمال ہو، تو اس کا ثبوت؛ چونکہ قرآن سے ہے؛ اس لئے قطعی الثبوت ہے اور اس کے معنی مرادی میں مختلف جہتوں کا احتمال ہوتا ہے؛ اس لئے اس کی دلالت قطعی نہیں ہے؛ بلکہ ظنی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

المطلقت يتربصن بأنفسهن ثلثة قروء. [البقرہ:۲۲۸]

مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین قروء تک روکے رکھیں۔

اس آیت کریمہ میں لفظ قروء دو احتمال رکھتا ہے:

(۱) قروء سے حیض مراد ہو، جیسا کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ نے یہی مراد لیا ہے۔ نیز حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا راجح قول بھی یہی ہے، مگر حضرت امام شافعیؒ اور امام مالکؒ نے قروء سے حیض مراد نہیں لیا؛ بلکہ اس سے طہر مراد لیا ہے۔ (عمدة القاری، دار احیاء التراث العربی بیروت ۳۰۶/۲۰، زکریا دیوبند ۳۳۷/۱۴، حاشیہ بخاری شریف ۸۰۲/۲)

لہٰذا آیت کے اس لفظ میں تاویل کی گنجائش ہونے کی وجہ سے ائمہ مجتہدین کے درمیان معنیٰ مرادی کے متعین کرنے میں اختلاف واقع ہو گیا ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا . [المائدہ:۶]

یہ آیت کریمہ نص قرآنی ہونے کی وجہ سے قطعی الثبوت ہے؛ لیکن اس کے معنی مرادی

میں تاویل کی گنجائش ہونے کی وجہ سے ائمہ میں اختلاف ہوگیا ہے؛ چنانچہ حضرات حنفیہؒ لمستم سے جماع مراد لیتے ہیں اور حضرات ائمہ ثلاثہ امام کسائی اور حمزہ کی قراءت أو لمستم النساء کے مطابق لمس بالید مراد لیتے ہیں اور امام شافعیؒ کا مفتی بہ قول یہی ہے کہ لمستم سے لمس بالید مراد ہے؛ اس لئے ان حضرات کے نزدیک مس مرأة ناقض وضو ہے اور حنفیہؒ کے نزدیک چونکہ جماع مراد ہے؛ اس لئے مس مرأة ناقض وضو نہیں ہے؛ لہٰذا معنی مرادی میں تاویل کی گنجائش ہونے کی وجہ سے ظنی الدلالۃ ہے، اسی طرح مسح علی الخفین کی روایت بے شمار صحابہ سے تواتر کے ساتھ مروی ہے؛ لہٰذا تواتر اسانید کی وجہ سے حدیث شریف قطعی الثبوت ہے، مگر اس کے معنی مرادی میں تاویل کی گنجائش ہے؛ اس لئے کہ شیعہ امامیہ اور خوارج نے یہ کہا کہ مسح علی الخفین مطلقاً جائز نہیں ہے اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کا موزوں پر مسح کرنا سورۂ مائدہ کے نزول سے پہلے کا واقعہ ہے اور ابن رشد مالکیؒ نے بدایۃ المجتہد ۱/۱۸ر میں امام مالک کا قول نقل کیا ہے کہ مسح علی الخفین صرف مسافر کے لئے جائز ہے، مقیم کے لئے جائز نہیں ہے، مگر حضرت امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور جمہور فقہاء کے نزدیک مسح علی الخفین مسافر اور مقیم دونوں کے لئے جائز ہے۔ (ایضاح الطحاوی ۱/۲۴۱، ترمذی مع العرف الشذی، امام ترمذیؒ نے مسح علی الخفین کی روایت کو انیس صحابہ سے نقل فرمایا ہے ۱/۲۷، حاشیہ نخبۃ الفکر ۱۲)

اور صاحب بدائع نے امام حسن بصری کے حوالے سے نقل فرمایا ہے کہ ستر بدری صحابہ سے مسح علی الخفین کی روایت مروی ہے۔ (بدائع الصنائع قدیم ۱/۷، جدید زکریا ۱/۷۷)

لہٰذا یہ حدیث شریف تواتر سے ثابت ہونے کی وجہ سے قطعی الثبوت ہے، مگر تاویل کی گنجائش ہونے کی وجہ سے ظنی الدلالۃ ہے۔

(۳) ظنی الثبوت قطعی الدلالۃ: یہ ایسی نص ہے جو خبر واحد یا خبر مشہور سے ثابت ہو اور اس کے معنی مرادی میں تاویل کی گنجائش نہ ہو اور تمام امت نے متفق ہوکر اس کے ایک

معنی مراد لئے ہوں، جیسا کہ حدیث پاک میں حضور پاک ﷺ کا ارشاد ہے:

ألا لایحج بعدهذا العام مشرک، ولا یطوف بالبیت عریان.

(سنن النسائی، النسخة الهندیة ۲/ ۳۱، دارالسلام رقم: ۲۹۶۰)

آ گاہ ہو جاؤ کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کر سکتا اور نہ ہی بیت اللہ شریف کا ننگے ہو کر طواف کیا جا سکتا ہے۔

یہ حدیث شریف تواتر اسانید سے مروی نہ ہونے کی وجہ سے ظنی الثبوت ہے، مگر اسکے معنی مرادی میں تاویل کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے قطعی الدلالۃ ہے؛ لہٰذا ۹ ھ میں حضرت صدیق اکبرؓ کی امارت کے تحت حج کے موقع پر اس اعلان کے بعد مشرک کے لئے حج کرنا اور ننگے ہو کر بیت اللہ کا طواف کرنا ہمیشہ کے لئے حرام ہو گیا ہے، اور اس کی حرمت میں امت میں سے کسی کا اختلاف نہیں ہے اور اسی طرح صدقۂ فطر کی روایت ہے۔

عن ابن عمر قال: فرض رسول الله صلی الله علیه وسلم: صدقة الفطر علی الذکر والأنثیٰ، والحر، والمملوک. الحدیث (سنن الترمذي، النسخة الهندیة ۱/ ۱۴۶، دارالسلام رقم: ۶۷۵)

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ہر مرد اور عورت اور ہر آزاد و غلام پر صدقۂ فطر فرض فرمایا ہے:

اور یہاں فرض سے واجب مراد ہے اور یہ حدیث شریف میں خبر متواتر نہ ہونے کی وجہ سے ظنی الثبوت ہے اور صدقۂ فطر کے وجوب پر تاویل کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے قطعی الدلالۃ ہے۔

(۴) ظنی الثبوت ظنی الدلالۃ: یہ ایسی نص ہے جو خبر واحد سے ثابت ہوا ور اسکے معنی مرادی میں تاویل کی بھی گنجائش ہو، جیسا کہ جمعہ سے پہلے چار رکعت سنت کی روایت ہے، حضرات حنفیہؒ اس کو سنت مؤکدہ کہتے ہیں اور یہ روایت حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے اثر سے ثابت ہے۔

عن عبد اللّٰہ بن مسعودؓ، أنه كان يصلي قبل الجمعة أربعًا وبعدها أربعًا.
(سنن الترمذي، النسخة الهندية ١/١١٧-١١٨، دار السلام رقم: ٥٢٣)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ وہ چار رکعت جمعہ سے پہلے پڑھتے تھے، اور چار رکعت جمعہ کے بعد پڑھتے تھے۔

یہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا اثر ہے اور سنن ابن ماجہ، نسخہ ہندیہ ۱/۷۹، جدید دار البشائر الاسلامیہ رقم: ۱۱۲۹/ میں یہ حدیث شریف حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعاً مروی ہے؛ لیکن سند کمزور ہے، اور یہ حدیث شریف ظنی الثبوت ہے، اور تاویل کی گنجائش ہونے کی وجہ سے ظنی الدلالۃ ہے؛ لہٰذا حضرت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھنا سنت ہے اور امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک چار رکعت پڑھنا سنت نہیں ہے۔ (بذل المجہود قدیم مطبع سہارنپور ۲/۱۹۸، جدید دار البشائر الاسلامیہ بیروت ۵/۱۹۳، ایضاح الطحاوی ۲/۳۲۸)

اسی طرح حضرت ابوہریرۃؓ کی روایت ہے۔

إذا أقيمت الصلوة فلا صلوة إلا المكتوبة. الحديث (سنن الترمذي، النسخة الهندية ١/٩٦، دار السلام رقم: ٤٢١)

یہ حدیث شریف خبر واحد ہونے کی وجہ سے ظنی الثبوت ہے اور تاویل کی گنجائش ہونے کی وجہ سے اس کی دلالت بھی ظنی ہے؛ لہٰذا جماعت شروع ہوجانے کے بعد سنتیں پڑھنا مکروہ تحریمی یا حرام نہ ہوگا؛ بلکہ صرف مکروہ تنزیہی ہوسکتا ہے اور جماعت کھڑی ہوجانے کے بعد فجر کی سنت تو حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک بلا کراہت جائز ہے۔

حدیث تصویر پر ایک نظر

حدیث تصویر " **إنّ أشد الناس عذابًا يوم القيٰمة المصورون". الحديث**

(صحیح مسلم، النسخة الهندية ۲/ ۲۰۱، بیت الأفكار رقم: ۲۱۰۹، مشکوة ۲/ ۸۸۰، جواهر الفقه قديم ۳/ ۱۷۵، جديد زكريا ۷/ ۱۸۹)

اس کے بارے میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ نے یہ ثابت فرمایا کہ یہ حدیث شریف تواتر اسانید سے ثابت ہے اور انہوں نے تصویر سے متعلق اکتیس روایات نقل فرمائی ہیں، جن میں سے بیس روایات تصویر کشی کی حرمت سے متعلق ہیں؛ لہٰذا اگر اس حدیث شریف کے متواتر ہونیکی بات ثابت ہوجاتی ہے، تو یہ حدیث شریف قطعی الثبوت ہوگی۔

اب اس کی دلالت سے متعلق غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کی دلالت قطعی ہے یا ظنی؟ نیز کس قسم کی تصویر میں قطعی اور کس قسم میں ظنی ہے، تو حضرت مفتی صاحب موصوف قدس سرہ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی دلالت اور مفہوم بھی قطعی ہے، تو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تصویر کشی مطلقاً حرام ہوگی؛ لہٰذا اس کی اباحت کے لئے اضطراری ضرورت کا ثبوت بھی لازم ہوگا، اس کے بغیر محض حاجت کی وجہ سے تصویر بنانا یا بنوانا ہرگز جائز نہیں ہوگا اور حضرت مفتی صاحب موصوف نے جواہر الفقہ میں اسی کو ثابت فرمایا ہے۔ (جواہر الفقہ قدیم ۳/ ۱۷۵، جدید زکریا ۷/ ۱۸۹)

اب اس حدیث شریف کے مضمون کے بارے میں کچھ تفصیل کی ضرورت ہے کہ حدیث تصویر کے اندر جانوروں کا وہ مجسمہ جو ہاتھ سے یا اوزار سے بنایا جاتا ہے، اس کے مراد ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے؛ بلکہ تمام امت کا اتفاق اس بات پر ہے کہ حدیث تصویر میں مجسموں کی حرمت متعین ہے؛ لہٰذا جانوروں کے مجسموں کے متعلق حدیث شریف قطعی الدلالۃ اور قطعی الثبوت ہوگی؛ اس لئے مجسمہ بنانا یا بنوانا سب قطعی حرام ہوگا اور حضرت مفتی صاحب نے جو قطعی الدلالۃ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے، اس سے اگر یہی مجسمہ کی تصویر مراد ہے، تو اس کی حرمت کے قطعی ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہوگا؛ لیکن بعض علماءِ عرب کیمرے کی تصویر کی حرمت کو حدیث شریف کے قطعیت کے مفہوم سے

مستثنیٰ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قطعیت میں صرف مجسمہ اور تماثیل داخل ہیں، کیمرے کی تصویر داخل نہیں ہے؛ اس لئے کہ نزول قرآن کے زمانہ میں کیمرے کی تصویر کا وجود نہیں تھا؛ لہٰذا اس میں تأویل کی گنجائش نکل سکتی ہے، اور ایسی صورت میں حدیث شریف اگر چہ قطعی الثبوت ہے، مگر کیمرے کی تصویر کے حق میں اس کی دلالت ظنی ہونے کی وجہ سے اس سے حرمت قطعیہ کا ثبوت نہیں ہوتا؛ بلکہ حرام کے قریب کراہت تحریمی کا ثبوت ہوسکتا ہے جو کہ ضرورت بمعنی حاجت کی وجہ سے مباح ہوجاتی ہے؛ لہٰذا ایسی صورت میں اسکولوں، کالجوں، کمپنیوں، فرموں، سرکاری محکموں اور مدارس کے افراد کے لئے شناختی کارڈ وغیرہ کے لئے بھی تصویر کھنچوانا جائز اور مباح ہوجائیگا۔ نیز آج کل جو ملکی سطح پر وطنی تصدیق نامہ کے طور پر شناختی کارڈ بنانے کا سلسلہ جاری ہوا ہے، اس کے لئے بھی کیمرے کی تصویر بنانا بلاتردد جائز ہوگا اور یہی توجیہ زیادہ صحیح اور راجح ہے۔

کیمرے کی تصویروں کے بارے میں جو اوپر اختلاف نقل کیا گیا ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اگر کیمرے کی تصویروں کو مذکورہ حدیث شریف کے حکم کے دائرہ میں داخل کیا جائے، تو حدیث شریف کے قطعی الثبوت اور ظنی الدلالت ہونے کی وجہ سے کیمرے کی تصویر کی حرمت میں تخفیف آئی ہے اور بعض علماءعرب کے قول کے مطابق کیمرے کی تصویر مذکورہ حدیث کی حرمت کے دائرے میں داخل نہیں ہے۔ (علماءعرب کے اختلاف کی تفصیل تکملۃ فتح الملہم اشرفیہ دیوبند ۴/۱۶۲ تا ۴/۱۶۴ رمیں موجود ہے)

لیکن سوال یہ ہے کہ ویڈیو کیمرے کے ذریعہ سے ٹیلی ویژن اور ٹی وی کے شیشے کے ڈبہ میں جو تصویریں نظر آتی ہیں، وہ کونسی تصویریں ہیں، تو اس کی تفصیل ”ٹیلی ویژن کے ڈبے میں نظر آنیوالی تصویروں کی حقیقت“ کے عنوان اور ”عکس اور سایہ“ کے عنوان اور ”تصویر اور عکس کا فرق“ کے عنوان کے ذیل میں واضح کردیا ہے کہ ٹیلی ویژن میں نظر آنے والی تصویریں اور شکلیں حقیقی معنی میں تصویر نہیں ہوتی ہیں؛ بلکہ عکس ہوا کرتی ہیں، ظاہر بات ہے کہ تصویروں

کے مقابلہ میں عکس کا حکم ہلکا ہوا کرتا ہے؛ اس لئے جس طرح ضرورت کی وجہ سے کیمرے کی اصل تصویر ایڈنٹی کارڈ پاسپورٹ وغیرہ کے لئے کھینچنا اوران کو رکھنا جائز ہے، اسی طرح کسی خاص شرعی ضرورت اور خاص موقع پر خطیب کی تقریر مع تصویر کے ویڈیو کیمرے میں پیش کیا جانا بھی اوران کا ٹیلی ویژنوں میں دیکھنا فی نفسہ جائز ہوگا، مگر سد باب کے لئے یہ بھی جائز نہیں۔

ہر فی نفسہ جائز امر کو بروئے کار لانا جائز نہیں

یہاں ساتھ ہی دوسری طرف بھی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ہر وہ شئ جو فی نفسہ جائز ہو، اس کو بروئے کار اور بروئے عمل لانا بھی جائز ہے یا نہیں؟

یہ بات نہایت غورطلب ہے کہ بروئے عمل لانا اس وقت جائز ہوسکتا ہے کہ اس عمل کی وجہ سے کسی امر مفسد اور امر قبیح کا دروازہ نہ کھلتا ہو اور اگر امر مفسد اور برائی کا دروازہ کھلنے کا سبب بن جاتا ہو، تو پھر وہ جائز امر بھی ناجائز ہوجائے گا اور ٹیلی ویژن میں اگر خطیب کی تقریر اور قاری کی قراءت سننے اور دیکھنے کی اجازت دی جائے، تو اسی ٹیلی ویژن میں فاحش اور ننگی فلمیں بھی دیکھنے لگیں گے، پھر ناجائز اور حرام پروگرام سے روک تھام نہایت مشکل ہوجائے گی اور عام لوگوں کے دلوں سے اس کی حرمت کی اہمیت بھی کم ہو جائے گی؛ اس لئے سد باب کے طور پر خطیب کی تقریر اور مفسر کی تفسیر اور قاری کی قراءت کا پروگرام دیکھنے کو بھی جائز قرار نہیں دیا جاسکتا، اس کی مکمل تفصیل دلائل شرعیہ کے ساتھ آگے ''سد باب'' کے عنوان کے تحت مستقل طور پر آرہی ہے۔

نگاہوں کا زنا اور گناہ کبیرہ

یہ بات آپ کے سامنے پیش کی جاچکی ہے کہ ٹیلی ویژنوں میں جو صورتیں و شکلیں نظر آتی ہیں، وہ سب اصل شئ کا عکس ہوتی ہیں، تصویر نہیں ہوتی ہیں؛ لہٰذا ٹیلی ویژن کے ڈبے

میں بغیر کسی ہیجان اور تلذذ کے کسی مرد کو دیکھا جائے تو جائز ہوگا؛ لیکن اگر مرد ناچ گانا اور فلمی شکل میں دکھائی دیتا ہے تو ناجائز اور حرام ہوگا اور اگر عورتوں کو دیکھا جاتا ہے تو چاہے ناچ گانا نہ ہو، کسی بھی طرح سے عورتوں کی صورتوں کا عکس نظر آجائے اور ان عورتوں کو دیکھ کر کے دیکھنے والوں میں ہیجان اور تلذذ پیدا ہوتا ہو، تو ناجائز اور حرام ہے اور اگر بے پردہ عورتیں نظر آجائیں اور فلمی اداکارہ نظر آجائیں، چہرہ، سر، بازو وغیرہ برہنہ حالت میں نظر آجائیں یا رقص کرتی ہوئی نظر آجائیں، تو ان تمام صورتوں کے اندر ان کا ویڈیو فلم لینا اور پھر ان کو ٹی وی چینلوں کے ذریعہ سے ٹیلی ویژنوں میں دکھانا، پھر ان کو ٹیلی ویژن میں دیکھنا سب آنکھوں کا زنا اور سراسر گناہ کبیرہ اور حرام ہے۔ ان حیا سوز فلموں کی وجہ سے دنیا بھر کے اندر فاحشات اور برائیاں پھیل رہی ہیں اور مسلمانوں میں اس طرح کے فلم اور فاحش پروگرام دکھانے والے ٹیلی ویژنوں کا رکھنا بھی گناہ کبیرہ ہے۔

حدیث پاک میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کے سامنے آنکھوں کا زنا بھی رکھا ہے، ہاتھوں کا زنا بھی رکھا ہے، پیروں کا زنا بھی رکھا ہے، کانوں کا زنا بھی رکھا ہے، زبان کا زنا بھی رکھا ہے، انسان اپنے ان اعضاء میں سے جس عضو سے بھی چاہے زنا میں مبتلا ہو جائے۔

حدیث میں آیا ہے کہ آنکھوں کا زنا دیکھ کر تلذذ حاصل کرنا ہے اور کانوں کا زنا سن کر تلذذ حاصل کرنا ہے اور زبان کا زنا گفتگو کے ذریعہ سے تلذذ حاصل کرنا ہے اور دلوں کا زنا بدکاری کے لئے مکمل طور پر مائل ہو جانا ہے، پھر آخری درجہ میں حقیقی بدکاری کا نمبر آتا ہے۔ ٹیلی ویژنوں میں جن عورتوں کو تلذذ کے ساتھ دیکھا جاتا ہے اگر چہ انکے ساتھ حقیقی بدکاری نہیں ہوسکتی مگر ٹیلی ویژنوں میں دیکھائی دینے والی عکسی صورتوں سے نگاہوں کا زنا اور کان کا زنا اور زبان کا زنا خوب ہوتا رہتا ہے۔

قیامت کے دن اللہ کے دربار میں آنکھوں کے زنا کا سوال ہوگا اور کانوں کے زنا کا بھی سوال ہوگا، زبان کے زنا کا بھی سوال ہوگا اور ٹیلی ویژنوں پر دکھائی دینے والی

صورتیں اگر چہ اصل تصویر نہیں ہیں، مگر اصل شئ کا عکس ہیں، جن کو دیکھ کر جن کی باتوں کو سن کر ہیجان اور تلذذ پیدا ہوتا ہے، تو ان سے اس طرح گناہ ہوگا، جس طرح حقیقی عورت کو دیکھ کر تلذذ حاصل کرنے کا گناہ ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کی حفاظت فرمائے، اس موضوع سے متعلق بے شمار احادیث شریفہ ہیں، ہم یہاں پر بخاری ومسلم سے صرف دو حدیثیں نقل کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

قال أبو هريرةؓ: عن النبي صلى الله عليه وسلم قال إن الله كتب على ابن آدم حظه من الزنا، أدرك ذلك لا محالة فزنا العين النظر، وزنااللسان النطق، والنفس تمنى وتشتهي، والفرج يصدق ذلك ويكذبه. (صحيح البخاري، ۲/ ۲۲-۹۷۸، رقم:۶۰۰۲، ف:۶۲۴۳/ ۶۳۵۹، ف:۶۶۱۲)

حضرت ابو ہریرہؓ سے حضرت سید الکونین علیہ الصلاۃ والسلام کا ارشاد مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ بیشک اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنی آدم پر زنا کا ایک حصہ رکھا ہے، جس کی لذت وہ لازمی طور پر حاصل کرتا ہے؛ لہٰذا آنکھ کا زنا دیکھنا اور زبان کا زنا برائی کی بات کرنا ہے، اور دل کا زنا برائی کی مکمل آرزو اور خواہش میں مبتلا ہو جانا ہے اور شرمگاہ اس کو اصل شکل تک پہونچانے کا کام کرتی ہے یا تو برائی کے ثبوت تک پہونچ جاتی ہے یا اسے جھٹلا کر انکار کر جاتی ہے۔

قال أبو هريرةؓ: أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إن الله كتب على ابن آدم حظه من الزنا أدرك ذلك لامحالة، فزنا العينين النظر، وزنا اللسان النطق، والنفس تمنى وتشتهي، والفرج يصدق ذلك أو يكذبه.

(صحيح مسلم، النسخة الهندية ۲/ ۳۳۶، بيت الأفكار رقم:۲۶۵۷)

حضرت ابو ہریرہؓ سے نبی کریم ﷺ کا ارشاد مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ نے بنی آدم پر زنا کا ایک حصہ لکھ دیا ہے، لازمی طور پر اس کی لذت وہ حاصل کر لیتا ہے؛ لہٰذا دونوں آنکھوں کا زنا ان دونوں سے دیکھنا ہے اور دونوں کانوں کا زنا ان دونوں سے برائی کی باتیں

سننا ہے اور زبان کا زنا برائی کی بات زبان پر لانا ہے اور ہاتھ کا زنا نامحرم کو ہاتھ سے پکڑنا ہے اور پیر کا زنا برائی کے ارادہ سے چلنا ہے اور دل کا زنا برائی کا پکا ارادہ کر کے برائی کی طرف پوری طرح مائل ہوجانا ہے، پھر شرم گاہ اس کو سچا کر کے دکھا دے یا اسے جھٹلا دے۔

أهو البليتين وأخف المفسدتين

جب دو حکم نص قطعی سے ثابت ہوجائیں تو دونوں کی فرضیت مسلم ہے اور دونوں میں سے کسی کو بھی ترک کردینا امر مفسد ہے اور اصول یہ ہے کہ جب اس طرح دو امر مفسد جمع ہوجائیں تو غلبۂ مصلحت کی رعایت میں اخف مفسدہ کو برداشت کر کے اشد مفسدہ کو ترک کردینے کا حکم ہے، اسی کو علامہ مصری نے الاشباہ والنظائر میں ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

إذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضررا بارتكاب أخفهما. (الأشباه والنظائر قديم ١٤٥)

جب دو امر مفسد آپس میں متعارض ہوجائیں تو ایسی صورت میں ان دونوں میں سے اخف مفسد کا ارتکاب کر کے اعظم مفسد کو ترک کرنے کی رعایت کی جائے گی۔

اور اس اصول کے تحت حضرات فقہاء نے بیشمار جزئیات کا استخراج فرمایا ہے، اس کے متعلق دو جزئیے بطور نظیر ہم یہاں پیش کررہے ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے اندر جھوٹ سے دور رہنے کا حکم فرمایا ہے، جیسا کہ سورۂ حج کی اس آیت کریمہ سے واضح ہوتا ہے۔

واجتنبوا قول الزور. [الحج: ٣٠] جھوٹی باتوں سے بچتے رہو

اس آیت کریمہ سے جھوٹ کا قطعی حرام ہونا واضح ہوگیا؛ لہٰذا جھوٹ بولنا بہت بڑا مفسدہ ہوگا اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے اندر قطعی طور پر اس حکم کی بھی تاکید فرمائی ہے کہ جب مسلمانوں کے دو فریق میں لڑائی جھگڑا اور فتنہ کا اندیشہ ہو تو ان کے درمیان

صلح کرادیا کریں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا. [الحجرات:۹]

اور اگر دو فریق مسلمانوں کے آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں ملاپ کرادو

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ . [الحجرات: ۱۰]

مسلمان تو سب بھائی ہیں؛ اس لئے اپنے دو بھائیوں میں اصلاح کردیا کرو

تیسری جگہ ارشاد فرمایا:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ . [الانفال: ۱]

اللہ سے ڈرو اور اپنے باہمی تعلقات کی اصلاح کرو

ان تینوں آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے دو فریق کے درمیان صلح کرنے کا حکم فرمایا ہے اور آیت زور میں جھوٹ سے دور رہنے کا حکم فرمایا؛ لہٰذا جھوٹ بولنا بھی مفسدہ ہوگا اور دو فریق کے درمیان صلح کرنے کی قدرت ہوتے ہوئے صلح نہ کرنا بھی مفسدہ ہے؛ لیکن صلح نہ کرنے کا مفسدہ جھوٹ کے مسفدہ سے بڑھا ہوا ہے اس لئے دوفریق کے درمیان صلح کی مصلحت کی رعایت کے پیش نظر اگر جھوٹ کی ضرورت پیش آجائے تو جھوٹ بولنا جائز ہوجائے گا،اسی کو حضرات فقہاء نے ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

الكذب مفسدة محرمة وهي متى تضمن جلب مصلحة تربو عليه جاز كالكذب للإصلاح بين الناس وعلى الزوجة لإصلاحها وهذا النوع راجع إلى ارتكاب أخف المفسدتين في الحقيقة عامة كانت أو خاصة.

(الأشباه والنظائر قديم ۱۴۹)

جھوٹ مفسدہ محرمہ ہے اور جب وہ ایسی مصلحت پر شامل ہو جائے جو جھوٹ سے بڑھا ہوا ہو تو ایسی صورت میں وہ جائز ہوجاتا ہے، مثلاً لوگوں کے مابین اصلاح کرنے کی غرض سے اسی طرح بیوی کی اصلاح کی وجہ سے (تو جائز ہے) اور یہ قسم درحقیقت دو مفسدوں میں سے اخف کے ارتکاب کی طرف راجع ہے خواہ عام ہو یا خاص۔

(۲) نماز کے اندر ستر عورت شرط ہے اور اس کا حکم قرآن سے ثابت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا بَنِيٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ. [الاعراف: ۳۱]

اے اولاد آدم تم مسجد کی ہر حاضری کے وقت (نماز کیلئے ہو یا طواف کیلئے) اپنا لباس پہن لیا کرو

اوراسی طرح نماز کے لئے استقبال قبلہ شرط ہے، اس کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ. [البقرة: ١٤٤]

اب سے اپنا چہرہ نماز میں مسجد حرام کی طرف کیا کیجئے۔

اوراسی طرح نماز کے لئے طہارت ثیاب بھی شرط ہے، اس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ. [سورة المدثر: ٤]

اپنے کپڑے کو پاک رکھئے۔

اسی طرح نماز کے لئے وضو بھی شرط ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے آیت وضو میں ارشاد فرمایا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلاةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ. [المآئدة: ٦]

اے ایمان والو! جب تم نماز کو اٹھنے لگو تو اپنے چہروں کو دھوؤ۔

اور دوسری طرف نماز کو اپنے وقت میں پابندی کے ساتھ پڑھنے کا حکم فرمایا ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ ”وأقيموا الصلوة“ کے الفاظ سے ارشاد فرمایا ہے؛ لہٰذا ستر عورت، استقبال قبلہ اور طہارت کے بغیر نماز پڑھنا ایک مفسدہ ہے اور نماز کو اپنے وقت میں نہ پڑھنا دوسرا مفسدہ ہے اور ترک صلاۃ کا مفسدہ ترک شرائط کے مفسدہ سے بڑھا ہوا ہے؛ اس لئے

ترک صلوۃ کے مفسدہ کی رعایت کرتے ہوئے ترک شرائط کے مفسدہ کو برداشت کرلیا جائے گا اور مذکورہ شرائط میں سے کسی شرط کے فوت ہوجانے کی حالت میں بھی نماز پڑھنے کا حکم ہوگا ،اس کو حضرات فقہاء نے ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

وقد ترعي المصلحة لغلبتها على المفسدة فمن ذلك الصلوة مع اختلال شرط من شروطها من الطهارة، والستر والاستقبال فإن في كل ذلك مفسدة لما فيه من الإخلال بجلال الله تعالىٰ في أن لايناجى إلا على أكمل الأحوال ومتى تعذر عليه شيئ من ذلک جازت الصلوة بدونه تقديما لمصلحة الصلوة على هذه المفسدة. (الأشباه والنظائر قديم ١٤٨)

اور کبھی مفسدہ کے مقابلہ میں غلبہ مصلحت کی رعایت کی جاتی ہے؛ چنانچہ اسی قبیل سے وہ نماز ہے، جو اپنی شرائط مثلا طہارت، ستر عورت، استقبال قبلہ میں سے کسی شرط کے مختل (مفقود) ہونے کے ساتھ پڑھی جائے تو اس میں عظمت خداوندی میں کوتاہی پیدا ہوجانے کی وجہ سے مفسدہ موجود ہے؛ کیونکہ اللہ سے سرگوشی اور مناجات حالت کمال میں کی جاتی ہے،مگر جب ان شرائط میں سے کسی شرط کی ادائے گی متعذر ہوجائے تو اس شرط کے بغیر نماز جائز ہوجاتی ہے، اس شرط کے فوت ہوجانے کے مفسدہ پر مصلحت صلوۃ کو ترجیح دینے اور مقدم رکھنے کے لئے۔

ان تمام نظائر اور دلائل کا نتیجہ خطیب کی تقریر اور غیروں کے مفسدہ کے معارضہ کے عنوان کے تحت مرتب کیا جائے گا۔

جائز پروگرام بھی سد باب کے لئے ناجائز ہے

شریعت کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اہم ترین اصول یہ بھی ہے کہ جو امر فی نفسہ

جائز اور حلال ہوتا ہے اور اس کا کرنا بھی شرعاً جائز اور حلال ہے، مگر وہ امر جائز اور حلال ہونے کے باوجود اگر کسی امر حرام کا سبب یا ذریعہ بنے تو وہ امر حلال بھی شرعاً حرام ہو جاتا ہے اور شریعت میں اس کی بے شمار مثالیں اور نظائر موجود ہیں اور اس کا بنیادی اصول حضرت سید الکونین علیہ الصلاۃ والسلام نے ایک مختصر جملے میں مثال سے سمجھا دیا ہے، آقاء نے مثال یوں پیش فرمائی ہے کہ جانور چرانے والے چرواہے کے لئے ایک متعین چراگاہ ہوتی ہے وہ اپنے ہی چراگاہ کے حدود میں چرانے کا مجاز ہے اور اس کے لئے چراگاہ کے بالکل کنارے اور بارڈر پر بھی چرانا فی نفسہ جائز ہے؛ لیکن سرحد پر جانور چرتے چرتے بہت ممکن ہے کہ حدود کے باہر بھی منہ مار دے اس لئے سرحد پر چرانے سے منع کیا جاتا ہے اس لئے یہ امر حلال امر حرام کا سبب بن سکتا ہے، اسی طرح ہر بادشاہ کے لئے اس کی سلطنت اور ملک کی ایک سرحد ہوتی ہے ایسے ہی اللہ کے احکامات کی بھی سرحد ہوتی ہے اور حلال وحرام کے درمیان جو سرحد ہے اس پر عمل کرنا بھی فی نفسہ جائز ہے؛ لیکن اس پر عمل کرتے کرتے حلت کی سرحد اور دائرہ سے ہٹ کر اس کے باہر حرام میں بھی مبتلا ہونے کا قوی اندیشہ ہوتا ہے؛ اس لئے حرام اور حلال کے درمیان سرحد کو امر مشتبہ سے تعبیر کیا گیا ہے، شریعت نے اس سے بچنے اور دور رہنے کا تاکید سے حکم فرمایا ہے اور ایسا ہی زیر بحث موضوع کا بھی معاملہ ہے کہ زیر بحث موضوع میں ٹیلی ویژن میں آنے والی صورتوں وشکلوں کا دلائل کے ذریعہ سے اصل شئ کا عکس ہونا ثابت ہو چکا ہے اور کسی امر جائز کا عکس لینا حرام اور ناجائز نہیں ہے؛ البتہ تصویر لینا اور تصویر کھینچنا ناجائز ہے اور ٹی وی اور ٹیلی ویژن میں اگر ایسے جائز پروگرام ہوں جو دائرۂ شریعت تک محدود ہوں اور کسی قسم کی کوئی عورت اس پروگرام میں نہ ہو تو کیمرے میں اس پروگرام کو لینا عکس ہونے کی وجہ سے فی نفسہ جائز ہے؛ لیکن اس پروگرام کا عکس جن ٹیلی ویژنوں میں دیکھا جائے گا ان ہی ٹیلی ویژنوں میں ناجائز اور حرام پروگرام بھی دیکھا جاتا ہے۔

اب اگر عوام کو عام ٹیلی ویژنوں میں جائز پروگرام دیکھنے کی اجازت دی جائے مثلاً حرمین شریفین کی نماز، تراویح، حج وعمرہ مختلف پروگرام اسی طرح دنیا کے کسی بھی علاقے میں کوئی

جائز پروگرام یا خطیب کی تقریر یا مفسر کی تفسیر یا قاری کی قرأت مع ان کی شکل وصورت کے ٹیلی ویژنوں میں دیکھنے کی اجازت دیجائے اور لوگ ان پروگراموں کو ان ٹیلی ویژنوں میں جائز سمجھ کر بلاتکلف دیکھنے لگیں تو ان ہی پروگراموں کو دیکھتے دیکھتے حرام اور حیا سوز پروگرام بھی دیکھنے لگیں گے؛ اس لئے ٹی وی اور ٹیلی ویژنوں میں ان جائز پروگراموں کے جائز ہونے کے باوجود ناجائز پروگراموں کے دیکھنے کا سبب بننے کی وجہ سے ناجائز ہی کہا جائے گا۔

اب اس موضوع سے متعلق احادیث شریفہ اور فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمایئے:

حدیث شریف ملاحظہ ہو:

عن النعمان بن بشير قال: سمعته يقول سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: وأهوى النعمان بإصبعه إلى أذنيه ان الحلال بين والحرام بين وبينهما مشتبهات لا يعلمهن كثير من الناس فمن اتقى الشبهات استبرأ لدينه وعرضه ومن وقع في الشبهات وقع في الحرام كالراعي يرعى حول الحمى يوشك أن يرتع فيه ألا وإن لكل ملك حمى ألا وأن حمى الله محارمه. (صحيح مسلم، النسخة الهندية ۲۸/۲، بيت الأفكار رقم: ۱۵۹۹، صحيح البخاري ۱۳/۱، رقم: ۵۲)

حضرت نعمان بن بشیرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے فرماتے ہوئے سنا ہے بیشک اللہ نے حلال چیزوں کو واضح کر کے بیان فرمادیا ہے اور اسی طرح حرام کو بھی واضح کردیا ہے اور ان دونوں کے مابین کچھ مشتبہ چیزیں ہیں جن کا حکم بہت سے لوگ نہیں جانتے ہیں؛ لہٰذا جو شخص ان مشتبہ چیزوں سے بچے گا وہ اپنے دین اور عزت کو محفوظ کرلے گا اور جو شخص مشتبہ چیزوں میں مبتلا ہوجائے گا وہ حرام میں مبتلا ہوجائے گا جیسا کہ چرواہا چراگاہ کے کنارے پر چراتا ہے، تو بہت ممکن ہے کہ چرانے لگے حدود کے باہر بھی اور آگاہ ہوجاؤ بیشک ہر بادشاہ کی حکومت کے لئے حدود اور دائرے ہیں بیشک اللہ کے حدود اور دائرہ کی سرحد محارم ہیں۔

حضرات فقہاء کی تصریحات ملاحظہ فرمائیے:

صاحب بدائع الصنائع علامہ کاسانیؒ عورتوں کی جماعت میں شرکت کی ممانعت کا حکم لکھتے ہوئے نقل فرماتے ہیں کہ جوان عورتوں کے لئے مساجد میں جا کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا ممنوع ہے اور حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں سبب فتنہ سے بچنے کے لئے سدًا للذرائع عورتوں کو جماعت میں شرکت کرنے سے منع فرما دیا تھا؛ حالانکہ فی نفسہ جماعت میں عورتوں کا شریک ہونا جائز اور درست ہے جیسا کہ حضرت سید الکونین علیہ الصلوۃ والسلام کے زمانے میں درست تھا؛ لیکن عورتوں کا جماعت کے لئے گھر سے نکلنا فتنہ کا سبب بن سکتا ہے؛ اس لئے ممانعت کر دی گئی ہے۔ اثر صحابہ اور فقہاء کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

ولا يباح للشواب منهن الخروج إلى الجماعات بدليل ما روى عن عمر رضي الله عنه أنه نهى الشواب عن الخروج ولأن خروجهن إلى الجماعة سبب الفتنة والفتنة حرام وما أدى إلى الحرام فهو حرام. (بدائع الصنائع كراچي ۱/۱۵۷، زكريا ۱/۳۸۸)

اور جوان عورتون کے لئے جماعت کی شرکت کے لئے گھر سے نکلنا جائز اور مباح نہیں ہے؛ اس دلیل کی وجہ سے جو حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ یقیناً انہوں نے عورتوں کو جماعت میں شرکت سے ممانعت فرمائی ہے؛ اس لئے کہ ان کا جماعت میں شریک ہونا باعث فتنہ ہے اور فتنہ حرام ہے اور جو چیز حرام تک متعدی ہوتی ہے وہ بھی حرام ہے۔

(۲) اور صاحب معارف السنن نے اس کو ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

وأما الشابة وذات الجمال ومن تشتهي فيكره لهن الحضور لما ذلك من خوف الفتنة عليهن وبهن (وقوله) وعلم منه أن أصل مذهبنا كما قاله شيخنا جواز الخروج للنساء للعيدين غير أنه منعه المشايخ، وأرباب الفتوى لفساد الزمان. (معارف السنن اشرفية ديوبند ٤/٤٤٦-٤٤٧)

جوان اور خوبصورت اور مشتہاۃ عورتوں کا جماعت میں حاضر ہونا ناجائز اور مکروہ ہے؛ اس لئے کہ یہ امر عورتوں کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا سبب ہے (اور مصنف کا قول) اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ ہمارا اصل مسلک عورتوں کا نماز عید کے لئے نکلنا جائز ہے، مگر مشائخ اور ارباب فتویٰ نے فساد زمانہ کی وجہ سے منع کر دیا ہے۔

(۳) اور علامہ بدر الدین عینیؒ نے بخاری کی شرح عمدۃ القاری میں حائضہ عورت سے مباشرت اور استمتاع کے مسئلہ کے ذیل میں بحث کرتے ہوئے اس مسئلہ کو بہت واضح الفاظ میں نقل فرمایا ہے کہ استمتاع اور مباشرت فی نفسہ جائز اور درست ہے، مگر ان لوگوں کے لئے جائز ہے، جو اپنے نفس پر قابو یافتہ ہیں اور جو لوگ اپنے نفس پر قابو یافتہ نہیں ہیں، ان کے لئے حائضہ عورت سے استمتاع جائز نہیں ہے: اس لئے کہ بہت ممکن ہے کہ اصل مقام سے ہٹ کر استمتاع کرتے کرتے اصل مقام میں مبتلا ہو جائے؛ اس لئے سدًا لذرائع کے طور پر ایسے لوگوں کو حائضہ سے استمتاع کرنے سے بھی منع کر دیا گیا ہے۔

عمدۃ القاری کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

منها جواز مباشرة الحائض فيما فوق الإزار (وقوله) أن هذه المباشرة إنما تجوز له إذا كان يضبط نفسه ويمنعها من الوقوع في الجماع وإن كان لا يملك ذلك فلا يجوز له ذلك لأن من رعى حول الحمى يوشك أن يقع فيه. (عمدة القاري، دارإحياء التراث العربي بيروت ۳/۲٦۸، زكريا ديوبند ۳/۱۱۳)

حائضہ عورت سے مافوق الإزار مباشرت اور استمتاع جائز ہے (اور مصنف کا قول) بیشک یہ مباشرت شوہر کے لئے اس وقت جائز ہے، جب وہ اپنے نفس پر قابو یافتہ ہو اور اپنے نفس کو جماع سے روکنے پر قادر ہو اور اگر اپنے نفس پر قابو یافتہ نہیں ہے، تو اس کے لئے مافوق الإزار بھی استمتاع جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ جو شخص چراگاہ کے سرحد میں چراتا ہے ممکن ہے کہ سرحد سے باہر بھی چرائے ایسا ہی ممکن ہے کہ یہ شخص بھی جماع میں واقع ہو جائے۔

(۴) اور اس مسئلہ کو صاحب بدائع الصنائع نے مسجد میں جماعت ثانیہ کی ممانعت کے تحت لکھتے ہوئے فرمایا ہے کہ جماعت ثانیہ اس وقت ممنوع اور مکروہ ہے جب اصل جماعت متاثر

ہو ورنہ فی نفسہ جماعت ثانیہ جائز اور درست ہے مگر محلّہ کے لوگوں کو اگر جماعت ثانیہ کی اجازت دی جائے تو یہی جماعت ثانیہ مسجد کے اصل جماعت میں قلت کا سبب بنے گی؛ اس لئے شریعت نے محلّہ کے لوگوں کی جماعت ثانیہ کی ممانعت فرمائی ہے۔

بدائع الصنائع کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

وری عن أنس بن مالک رضی اللہ عنہ أن أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم كانوا إذا فاتتهم الجماعة صلوا في المسجد فرادىٰ ولأن التكرار يؤدي إلى تقليل الجماعة؛ لأن الناس إذا علموا أنهم تفوتهم الجماعة فيستعجلون فتكثر الجماعت وإذا علموا أنها لا تفوتهم يتأخرون فتقل الجماعة وتقليل الجماعة مكروه (وقوله) بخلاف ما إذا صلى فيه غير أهله لأنه لا يؤدى إلى تقليل الجماعة.

(بدائع الصنائع كراچي ۱/۱۵۳، بيروت ۱/۶۵۵، زكريا ديوبند ۱/۳۷۹-۳۸۰)

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ کے اصحاب جب ان کی جماعت فوت ہو جاتی تو مسجد میں تنہا تنہا نماز پڑھتے تھے اور اس لئے کہ تکرار جماعت اصل جماعت میں قلت افراد کا سبب ہے؛ کیوں کہ جب لوگوں کو یہ بات معلوم ہوجائے کہ ان کی جماعت فوت ہو جائے گی، پھر اس کی تلافی نہ ہو سکے گی تو شرکت جماعت میں جلدی کریں گے اور اصل جماعت میں افراد کی کثرت رہے گی اور جب یہ معلوم ہوجائے کہ ان کی جماعت فوت نہیں ہوگی تو آنے میں تاخیر کریں گے، پھر اصل جماعت کے افراد میں کمی آجائے گی اور اصل جماعت میں کمی کا سبب مکروہ ہے؛ لیکن جب محلّہ والوں کے علاوہ دوسرے لوگ جماعت ثانیہ کریں تو یہ جائز ہے؛ اس لئے کہ ان لوگوں کی جماعت ثانیہ اصل جماعت میں قلت کا سبب نہیں ہے۔

(۵) اور مسئلہ شرعی یہ ہے کہ حالت صوم میں شوہر کے لئے بیوی سے بوس وکنار کرنا

فی نفسہ جائز ہے؛ لیکن یہی امر جائز جب جماع کا سبب بن جائے تو ممنوع اور ناجائز ہوجاتا ہے؛ اس لئے کہ جوان آدمی کے لئے یہی بوس وکنار غالباً جماع کا سبب بن جاتا ہے اور جو چیز کسی شئ کے لئے غالباً سبب بن جاتی ہے، اس کو حقیقی سبب کے درجہ میں قرار دیا جاتا ہے۔

فقہاء کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

لأنها قلما تخلو عن الفتنة قلنا الكلام فيما إذا كان بحال يأمن فإن خاف قلنا بالكراهة؛ لأنها إذا كانت سببًا غالبًا تنزل سببًا. (فتح القدير، كوئٹه ۲/ ۲۵۸، زكريا ۲/ ۳۳۷)

اس لئے کہ اسی بوس وکنار میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ فتنہ سے خالی ہو، ہماری گفتگو اس صورت میں ہے کہ جب ایسی حالت میں بوس وکنار کیا جائے، جس میں جماع سے امن ہو؛ لہٰذا اگر جماع کا خوف ہوتو ہم کراہت کا حکم لگائیں گے اور زیادہ راجح کراہت ہی ہے؛ اس لئے کہ جب یہ وقوع جماع کا غالباً سبب ہے، تو اس کو اصل سبب کے درجہ میں اتار دیا جائے گا۔

مذکورہ تمام تفصیلات اور احادیث شریفہ اور فقہاء کے جزئیات سے واضح ہو چکا کہ جو امر جائز امر ممنوع کا سبب بنتا ہے، تو وہ خود بھی ناجائز اور ممنوع ہوجاتا ہے اور ویڈیو کیمرے اور ٹیلی ویژن کے چینلوں کے ذریعہ سے ٹی وی اور ٹیلی ویژن کے ڈبوں میں جو اصل جائز پروگرام کا عکس نظر آتا ہے وہ فی نفسہ جائز ہونے کے باوجود ناجائز اور حیا سوز پروگرام دیکھنے کا سبب بن سکتا ہے؛ اس لئے کہ ان ٹیلی ویژنوں میں جائز پروگراموں کو دیکھنے کی بھی شرعاً اجازت نہ ہوگی۔

خطیب کی تقریر اور غیروں کے مفسدہ کا معارضہ

اب آخر میں پوری بحث اور تفصیلات کا حاصل پیش کیا جارہا ہے کہ آج کل کے زمانے میں دوسرے مسلک کے لوگوں کی طرف سے ٹی وی چینل کے ذریعہ سے غیر ذمہ

دارانہ بیانات پوری دنیامیں عام ہوتے جارہے ہیں،حتی کہ یہاں تک کا پروگرام آنے لگا کہ تم انٹرنیٹ میں اپنی حاجت اورضرورت پیش کردو، اور وہاں سے شریعت کا کوئی نام نہاد ذمہ دارآپ کواستخارہ کے ذریعہ سے مسئلہ کا حل پیش کردے آپ کی پریشانی دورکردے، عجیب عجیب خرافات ٹیلی ویژن میں آرہی ہیں ،اس سلسلے میں عوام الناس خود پریشان ہیں یہ ایک اہم مفسدہ ،اور مصیبت امت کے سامنے ہے،اور دوسری طرف اہل حق کی جانب سے، باضابطہ ٹیلی ویژن کا پروگرام دیاجائے،اور عامۃ الناس ٹیلی ویژنوں میں اہل حق کا پروگرام دیکھتے جائیں ؛تواوپر کی تفصیل کے مطابق اہل حق کا پروگرام اس بات کا سبب بن جائیگا کہ عوام الناس ان ہی ٹیلی ویژنوں میں حیاسوز،اورفحش پروگرام بھی دیکھنےلگیں گے،تو معلوم ہوا کہ اہم ترین، دومفسدہ کے درمیان معارضہ،اور مقابلہ ہے،تواب فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے کہ اخف المفسد تین کون ہے،تواس پرغور کرنے کی ضرورت ہے کہ حیاسوزاورفحش پروگرام میں عوام کے مبتلا ہونے کا سبب بننا زیادہ شدید مفسدہ ہے،غیروں کے مفسدہ کے مقابلےمیں،اس لئے اخف مفسدہ کو دورکرنے کے لئے اشدّ مفسدہ کا اختیارکرنا درست نہیں ہوگا،اس لئے کہ حیاسوز پروگرام عوام الناس کے زنا،اور بدکاری میں مبتلا ہونے کا سبب ہے، جواس وقت قابو سے باہر ہوتا جارہا ہے، پھر اس کو عام کرنے کا ہم خودسبب بن جائیں تونہایت خطرناک بات ہوگی، اورفرق باطلہ کی طرف سے جو غیر ذمہ دار نہ بیانات ، اور پروگرام ٹیلی ویژنوں میں آرہے ہیں، وہ ہمارے بیانات کی وجہ سے بندنہیں ہوں گے، وہ اپنی جگہ بحالہ باقی رہیں گے، ہاں البتہ عوام الناس سے ان کی باتوں کے مقابلے میں ہماری باتوں کوقبول کرنے کی زیادہ امید ہے؛لیکن اس امید کی بناء پرہم خودمفسدہ کا سبب بن جائیں تو میرے خیال میں یہ ہم سب کے لئے غیرمناسب بات ہوگی۔

ہم نے ماقبل میں اخف المفسد تین کا باضابطہ عنوان قائم کرکے متعدد مثالیں ، اورنظیریں قرآن وحدیث اورفقہ کی عبارات کے ذریعہ سے پیش کردی تھیں اس اصول کو ذھن

میں رکھنا نہایت اہمیت کا حامل ہے اس اصول کی روشنی میں خطیب کی تقریر، حرمین کے پروگرام، قاری کی قراءت کے جوفوائد مرتب ہو سکتے ہیں، ان سے کہیں زیادہ مفسدہ بڑھ سکتا ہے، اس لئے خطیب کی تقریر، اور مفسر کی تفسیر کا ٹیلی ویژنوں میں نشر کرنا جائز قرار دینے میں نہایت احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

ٹی وی اور ٹیلی ویژن کے جسمانی نقصانات

آج دنیا کے ہر خاص وعام، بچے، بوڑھے، مردوعورت نے اس بات کا بخوبی تجربہ حاصل کرلیا ہے کہ ٹی وی اور ٹیلی ویژن سے شرعی نقصانات کے ساتھ ساتھ اس نے انسانی معاشرہ، اور انسانی زندگی کو حیاسوز بنادیا ہے اور پھر اسی کے ساتھ ساتھ دنیا کے بڑے بڑے تجربہ کاروں نے انسانی دنیا کے سامنے اپنا تجربہ، اور رپورٹ پیش کی ہے، کہ ٹی وی اور ٹیلی ویژن سے ہر سال ہزاروں بچے، بوڑھے، مرد وعورت اپنی آنکھوں کی روشنی سے محروم ہو چکے ہیں، برطانیہ، اور امریکہ کے تجربہ کار ڈاکٹروں نے ٹیلی ویژن کے نقصانات کا اہم تجزیہ قوم کے سامنے پیش کیا ہے کہ آج کی دنیا میں، نگاہوں کی کمزوری کا ایک اہم سبب ٹیلی ویژن ہے، نیز اس کے حیاسوز پروگراموں کی وجہ سے ہزاروں نوجوان لڑکے، اور لڑکیاں بدکاری میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جس کے نتیجے میں ایک خطرناک مرض، ایڈز، کے شکار ہو جاتے ہیں، ابھی ۲۵ / مارچ بروز جمعہ ۲۰۰۵ء کو اخبار ''راشٹریہ سہارا'' میں مرض ٹی وی کا ایک تجزیہ آیا ہے، اس میں لکھا ہے کہ ایڈز، اور ٹی وی کے مرض میں ایک خاص تعلق، اور جوڑ ہے اور ہر سال ٹی وی کے مرض کی وجہ سے پوری دنیا میں تقریباً بیس لاکھ افراد موت کا شکار ہو جاتے ہیں، اور یہ ٹی وی اور ایڈز کی بیماری بھی ٹی وی اور ٹیلی ویژن سے پیدا ہو رہی ہے، اس لئے جس طرح ٹی وی اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ سے دنیا کی خبریں معلوم ہو جاتی ہیں، اس سے کہیں زیادہ ٹی وی اور ٹیلی ویژن سے شرعی، طبعی، اور انسانی صحت کے نقصانات کا

شکار بن جانا پڑتا ہے۔اللہ پاک ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

حیا سوز حرکتوں سے آسمانی آفات

حدیث پاک میں آیا ہے کہ جب انسانوں میں بے حیائی عام ہو جائیگی، اور عورتوں، اور مردوں کا اختلاط زیادہ ہو جائیگا پھر ان کے درمیان بدکاری عام ہو جائیگی تو آسمانی عذاب کا انتظار کرو! اور جس علاقہ میں زنا کاری، بدکاری اور بے حیائی عام ہو جائیگی ان علاقوں میں آسمانی زلزلہ بھی آسکتا ہے، اور وبا کی امراض بھی عام ہو جاتی ہیں، ترمذی شریف میں بڑی اہمیت کے ساتھ آقائے نامدار ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب برائیاں عام ہو جائیں گی تو آسمان سے پتھر برسے گا، اور خطرناک ولا علاج بیماری پیدا ہو جائے گی، اور علاقہ میں زلزلہ آکر پورا علاقہ برباد ہو سکتا ہے، چنانچہ یورپ، اور مغربی وشمالی ایشیاء میں بے حیائی وبے پردگی کافی عرصہ سے عام ہو چکی تھی، اس کا نتیجہ چند سالوں سے معلوم ہو گیا ہے کہ وہاں کے باشندگان کس قدر ہلاکت وبربادی کے شکار بن کر برباد ہو گئے پھر انڈونیشیا اور ساحلی علاقے جہاں سیر وتفریح، اور بے حیائی عام ہے، پانچ، چھ مہینہ سے ان علاقوں میں کس قدر قیامت خیز زلزلہ آرہا ہے، اور بار بار آرہا ہے، بہت ممکن ہے کہ یہ سب حضرت سید الکونین علیہ الصلاۃ والسلام کی صداقت کا ظہور ہے، اللہ پاک ہم سب کی آسمانی وزمینی آفات سے حفاظت فرمائے۔

چند احادیث ملاحظہ فرمایئے:

حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اللہ کی قسم میں جھوٹ نہیں کہتا میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا آپ ﷺ نے فرمایا:

ليكونن من أمتي أقوام يستحلون الحر والحرير والخمر والمعازف. (صحيح البخاري ۸۳۷/۲، رقم: ۵۳۷۳، ف ۵۵۹۰)

میری امت میں سے کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو زنا ریشم شراب، اور گانے باجوں کو اپنے لئے حلال کرلیں گے

مذکورہ حدیث کے آخری حصہ میں انہیں باغیان دین کا تذکرہ ہے کہ ان کو زمین میں

دھنسا دیا جائے گا، اوران کو بندروں، اورسوروں کی صورت میں مسخ کر دیا جائیگا۔

عن عمران بن حصين أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: في هذه الأمة خسف ومسخ وقذف فقال رجل من المسلمين يارسول الله ومتى ذلك قال إذا ظهرت القيان والمعازف وشربت الخمور، الحديث. (سنن الترمذي، النسخة الهندية ٢/ ٤٥، دارالسلام رقم: ٢٢١٢)

حضرت عمران بن حصینؓ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ اس امت پر زمین کو دھنسا دینے، اورصورتوں کو بگاڑ دینے، اورآسمانوں سے اولے، اور پتھر برسانے کے ذریعہ سے آسمانی عذاب نازل کیا جائیگا تو مسلمانوں میں سے ایک صحابیؓ نے درخواست کی کہ یارسول اللہ ﷺ یہ عذاب کس وقت اورکب نازل ہوگا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب رنڈیاں، اور گانے بجانے کی چیزیں کثرت کے ساتھ ظہورمیں آنے لگیں گی، اورکثرت کے ساتھ لوگ شراب پینے لگیں گے۔

تجاویز: آٹھواں فقہی اجتماع ادارۃ المباحث الفقہیہ، جمعیۃ علماء ہند

ادارۃ المباحث الفقہیہ، جمعیۃ علماء ہند کے آٹھویں فقہی اجتماع منعقدہ ۱۷/۱۸/۱۹ ربیع الاول ۱۴۲۶ء 27/ 28/ 29/ اپریل 2005ء بمقام: مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ ہال، عیدگاہ جدید، ٹیانری روڈ، بنگلور میں ”ٹیلی ویژن اورانٹرنیٹ کا دینی مقاصد کے لئے استعمال“ پرغوروخوض کے بعددرج ذیل امور طے کئے گئے۔

(۱) آج ٹیلی ویژن پر زیادہ تر فحاشی، عریانیت، اورمخربِ اخلاق پروگراموں کا غلبہ ہے، ۲۴/ گھنٹے اس کے مختلف چینلوں پررقص وسرود، اورحد درجہ شرمناک مناظر دکھائے جاتے ہیں، پھر ڈش اینٹینا اور پرائیوٹ کیبل چینلوں نے تو تمام اخلاقی اور انسانی حدودکو پار کردیا ہے، اورآج ٹی وی زدہ معاشرہ جن شرمناک حرکتوں میں ملوث ہے، وہ ناقابل بیان ہیں، اورجس

گھر میں ٹیلی ویژن ہو وہاں کے لوگوں کا اس کے مخرب اخلاق پروگراموں سے بچنا تقریباً محال ہے، لہٰذا ٹیلی ویژن گھر میں رکھنا، اور اس کے پروگراموں کو دیکھنا شرعاً ناجائز ہے، جس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

(۲) اسلام میں بلاضرورت شرعی تصویر کھچوانا ناجائز ہے، لیکن اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ٹیلی ویژن، اور دیگر ذرائع ابلاغ پر اعداء اسلام یا شر پسند فرقہ پرست طاقتوں کی طرف سے کوئی ایسی چیز سامنے آئے جس سے اسلامی عقائد، اور اقدار پر زد پڑتی ہو، اور اس کا مناسب جواب نہ دینے سے اسلام کی شبیہ بگڑنے یا مسلمانوں کے حقوق کے ناقابلِ تلافی نقصان کا اندیشہ ہو، تو اس کے دفاع کے لئے ٹیلی ویژن کے کسی پروگرام پر آنے کی ضرورۃً گنجائش ہے۔

(۳) اسلامی ٹی وی چینل قائم کرنے کو اگرچہ موجودہ دور کی ضرورت کہا جاتا ہے لیکن مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد یہ فقہی اجتماع اس نتیجہ پر پہنچا کہ اولاً علیحدہ اسلامی ٹی وی چینل قائم کرنا عملاً مشکل ترین امر ہے، اور اگر ایسا چینل وجود میں آ بھی جائے تو اس کے ذریعہ سے فوائد کے مقابلہ میں نقصانات کہیں زیادہ ہیں، کیونکہ اس طرح کے چینلوں کو بہانہ بنا کر لوگ ٹیلی ویژن کے فحش پروگراموں تک بآسانی رسائی حاصل کرلیں گے، اور دیگر باطل فرقوں کے چینلوں سے اس کا امتیاز بھی دشوار ہوگا، نیز عام لوگوں کی دلچسپی کی چیزیں شامل کئے بغیر خالص اسلامی چینل کے ناظرین کی تعداد غیر معمولی حد تک کم ہوگی، اور متوقع فوائد حاصل نہ ہوسکیں گے، ان وجوہ سے اسلامی چینل قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۴) انٹرنیٹ اس دور میں ایسا معلوماتی ذریعہ ہے جس میں ہر طرح کے اچھے اور برے پروگرام پائے جاتے ہیں، گوکہ آج زیادہ تر اس ذریعہ کو ناجائز اور حرام چیزوں میں استعمال کیا جارہا ہے، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کو اگر شرعی حدود میں رہ کر استعمال کیا جائے تو منکرات وفواحش سے بچتے ہوئے اس سے عظیم تعلیمی، تجارتی اور انتظامی وغیرہ

فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں، اس لئے یہ فقہی اجتماع انٹرنیٹ کے جائز حدود میں استعمال کو جائز قرار دیتا ہے اور اس کے ناجائز استعمال کو ناجائز اور حرام قرار دیتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

نوٹ: تمام شرکاء نے اس تجویز سے مکمل اتفاق کیا، البتہ مولانا مفتی اشفاق صاحب (سرائے میر) نے شق نمبر۲/ سے جزوی اختلاف کرتے ہوئے یہ نوٹ تحریر کیا ''ٹیلی ویژن پر آنے کی اجازت ہے'' سے مجھے اتفاق نہیں ہے، تجویز نمبر۳/ سے تضاد محسوس ہوتا ہے، اور ٹیلی ویژن کے جواز کا دروازہ کھلتا ہے۔

❁❁❁

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَداً ☆ عَلٰى حَبِيْبِکَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

اَللّٰهُ أَكْبَر كَبِيْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا وَسُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَأَصِيْلاً. الحديث

(المعجم الكبير ۲/ ۱۳۵، برقم: ۱۵۷۰)

(مفتی) شبیر احمد قاسمی

خادم الحدیث والافتاء جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد (یو-پی)

(۲۷) باب الأسماء والکنی

پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کا نام لے کر پکارنا

سوال [۱۱۱۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کلمہ طیبہ مکمل یعنی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں چلتے پھرتے خوب پڑھتا ہوں؛ لیکن ایک تقریر میں سنا کہ حضور ﷺ کو اسم گرامی محمد لے کر پکارنا ادب کے خلاف ہے۔ قرآن پاک میں بھی اس کا خیال کیا گیا ہے، اکثر نبی کہہ پکارا گیا ہے، تو کیا میرا اس طرح کثرت سے پڑھنا باعث بے ادبی ہے؟ اگر ہاں تو اس کلمہ کو کس طرح پڑھیں؛ کیونکہ کلمہ اور درود دونوں ملا کر کثرت سے پڑھتا ہوں، یعنی یہ کہ کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ اور درود یعنی صلی اللہ علیہ وسلم تا کہ دونوں کا ہر وقت ورد رہے؛ بلکہ اسی میں اکثر استغفر اللہ بھی جوڑتا ہوں اجازت دی جائے کہ اس طرح کرتا رہوں یا نہیں؟ وضاحت فرمادیں۔

المستفتی: محمد فیاض الدین، بہار شریف، ٹانڈہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کا نام لے کر پکارنے کی جو ممانعت آئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے ہم عام بول چال میں جس طرح ایک دوسرے کا نام لے کر پکارتے ہیں، مثلاً یا زید یا عمرو اسی طرح پیغمبر علیہ السلام کو یا محمد کہہ کر پکارنا منع ہے۔

(مستفاد: معارف القرآن ۶/ ۴۵۵)

اور کلمہ طیبہ **لا إلہ إلا اللہ محمد رسول اللہ** یہ عام لوگوں کے پکارنے کے انداز کا پکارنا نہیں ہے؛ بلکہ یہ کلمہ طیبہ کا ورد اور ذکر خداوندی ہے جیسے **اشھد أن محمدا رسول اللہ** میں ہے۔

لاتجعلوا دعاء الرسول بينكم كدعاء بعضكم بعضًا. قال سعيد بن زبير ومجاهد المعنى قولوا يا رسول الله! في رفق ولين ولاتقولوا يا محمد بتجهم. (تفسير قرطبي، سوره نور تحت رقم الآية:٦٣، دارالكتب العلمية بيروت ٢١٢/١٢، تفسير رازي٢٤/ ٤٠، روح المعاني١٨/ ٢٢٥، جديد زكريا ديوبند ١٠/ ٣٣٠، سوره نور تحت رقم: ٦٣)

أخرج ابن أبي حاتم وأبو نعيم في الدلائل عن ابن عباسؓ، قال كانوا يقولون يا محمد يا أبا قاسم فنهاهم الله عن ذلك بقوله سبحانه: لاتجعلوا الآية إعظاما لنبيه صلى الله عليه وسلم، فقالوا يا نبي الله يارسول الله.

(روح المعاني قديم ١٨/ ٢٢٥، زكريا ديوبند ١٠/ ٣٣٠، سوره نور رقم الآية: ٦٣)

اور **لا إله** کے ذکر کا طریقہ حضرت تھانویؒ نے یہ فرمایا ہے کہ ہر دس مرتبہ میں ایک بار محمد رسول اللہ کہے (شریعت وطریقت ۲۹۴) اور کلمہ طیبہ کے ساتھ درود شریف کو ملانا اکابر کے معمول سے ثابت ہے اور ساتھ میں **استغفر الله ربی من کل ذنب وأتوب إليه** پڑھنا کہیں ثابت نہیں نہ حدیث سے ثابت ہے نہ ہی اکابر کے معمول سے ثابت ہے بلکہ **استغفر اللہ ربی من کل ذنب وأتوب الیہ** یا الگ سے وظیفہ کے طور پر پڑھا جائے۔

ولوكان ذلك علي عمومه للزم المؤذن إذا أذن وللزم للقاري إذا مر ذكره في القرآن، وللزم الداخل في الإسلام إذا تلفظ بالشهادتين، ولكان ذلك من المشقة والحرج. (القول البديع في الصلوة على الحبيب الشفيع، دارالكتب العلمية بيروت ٢٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ / جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۶/ ۷۶۶۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۷/ ۵/ ۱۴۲۳ھ

مرحوم کے نام پر اولاد کا نام رکھنا

سوال [۱۱۱۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مجھ سائل کا نام ہمایوں فر ہے، اور میری اہلیہ کا نام شائشہ ہے، میں اپنی بیوی کے ساتھ اپنی خالہ محترمہ کے مکان پر ان کے ساتھ رہتا ہوں، میری خالہ کا اکلوتہ بیٹا جس کا نام محمد بلال ہے، میری شادی سے قبل ۲۷/ سال کی عمر میں انتقال کر گیا، ہم دونوں خالہ زاد بھائیوں میں بے حد اتفاق ومحبت تھی، بلال کی شادی ہوچکی تھی، مگر کوئی اولاد نہ تھی، اب مجھ سائل کو اللہ تعالیٰ نے پہلی اولاد سے بیٹے کی شکل میں نوازا ہے۔ سوال یہ ہے کہ میں اپنی اولاد لڑکے کا نام محمد بلال رکھ سکتا ہوں یا نہیں؟ اگر نہیں تو کوئی دوسرا نام تجویز فرمادیں۔

المستفتی: ہمایوں فر، محلّہ بھٹی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اپنے مرحوم بھائی ''بلال'' کے ہم نام اپنی اولاد کا نام رکھنا بلاشبہ جائز ہے، صحابہؓ سے اس کا ثبوت ہے، صحابہ کرامؓ نے بھی اپنے مرحوموں اور شہیدوں کے نام سے اپنی اولاد کا نام رکھا ہے، حضرت زبیرؓ نے بئر معونہ میں شہید ہونے والوں کے ہم نام سے اپنی اولاد کا نام رکھا ہے، حضرت عروہ بن اسماء بن صلت بئر معونہ میں شہید ہوگئے تھے، حضرت زبیرؓ نے اپنے بیٹے عروہ بن زبیر کا نام ان کے ہم نام رکھا ہے، اسی طرح حضرت منذر بن عمرؓ بھی بئر معونہ میں شہید ہوگئے تھے، حضرت زبیر نے اپنے بیٹے منذر بن زبیر کا نام انہیں کے نام پر رکھا؛ لہٰذا مرحوم بلال کے ہم نام اپنی اولاد کا نام رکھنا بلاشبہ جائز ہے، اس میں کوئی تردد نہیں ہونا چاہئے۔

وأصيب يومئذ فيهم عروة بن اسماء بن الصلت، فسمي عروة، به ومنذر بن عمر، سمي به منذرًا. الحديث (بخاري شريف، باب غزوة الرجيع،

ورعل......النسخة الهندية ٢/ ٥٨٧، رقم: ٣٩٤٦، ف: ٤٠٩٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٥ر صفر المظفر ١٤٢٩ھ
(فتویٰ نمبر: الف ٣٨ر ٩٤٣٧)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
٥/٢/١٤١٩ھ

بچہ کا نام عبد اللہ، عبد الرحمٰن رکھنا

سوال [١١١٤٨]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ظہیر احمد کے لڑکے کی پیدائش ١٢ر ربیع الاول کی رات بارہ بجے ہوئی ہے، مفتیان کرام صاحب قرآن اور حدیث کی روشنی میں کیا نام رکھنا چاہئے؟ جواب عنایت کریں۔

المستفتی: ظہیر احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حدیث پاک میں آیا ہے کہ اللہ تعالی کے نزدیک سب سے عمدہ اور محبوب ترین نام عبد اللہ اور عبد الرحمٰن ہے؛ لہٰذا آپ مذکورہ نومولود بچہ کا نام ان دونوں میں سے کوئی ایک رکھ لیجئے۔

عن ابن عمرؓ عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: أحب الأسماء إلى الله عبد الله، وعبد الرحمن. (ترمذي شريف، باب ماجاء ما يستحب من الأسماء، النسخة الهندية ٢/ ١١٠، دارالسلام رقم: ٢٨٣٣، مسند أحمد بن حنبل ٢/ ١٢٨، رقم ٦١٢٢ الدارمي دار المغني ٣/ ١٧٦٦، رقم: ٢٧٣٧، سنن أبي داؤد، باب في تغيير الأسماء، النسخة الهندية ٢/ ٦٧٦، دارالسلام رقم: ٤٩٤٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢٦ر ربیع الثانی ١٤٢١ھ
(فتویٰ نمبر: الف ٣٥ر ٦٦١٢)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
٢٦/٤/١٤٢١ھ

عبدالسبحان، یا محمد سبحان نام رکھنا

سوال [۱۱۱۴۹ (الف)]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عبدالسبحان نام رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور سبحان اسماء حسنہ میں سے ہیں یا نہیں؟

نیز عبد کی اضافت سبحان کی طرف صحیح ہے یا نہیں؟ نیز محمد سبحان نام رکھنا کیسا ہے؟ اگر دونوں نام صحیح نہ ہوں، تو براہ کرام کوئی نام تجویز فرمادیں۔

المستفتی: عبدالسبحان، متعلم جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سبحان نہ اللہ کا نام ہے اور نہ ہی اللہ کی صفت اصلی؛ بلکہ صفت زائدہ ہے؛ اس لئے عبدالسبحان نام رکھنا بعض بزرگوں نے ممنوع لکھا ہے۔

نیز بلا اضافت سبحان کا لفظ استعمال نہیں ہوتا ہے؛ اس لئے محمد سبحان نام رکھنا بلا اضافت درست نہیں ہے؛؛ کیونکہ سبحان کے معنی ہر قسم کے نقائص سے پاک ہونے کے ہیں اور ایسا کوئی انسان نہیں جو ہر نقص سے پاک ہو: لہٰذا اپنا نام بجائے محمد سبحان کے عبد الرحمٰن یا عبدالغفور وغیرہ رکھ لیں۔

تسمية العوام أطفالهم بعبد السبحان مما لا معنى لها، ويجب نهيهم عنها، فإن العبودية لا تضاف إلا إلى إسم من أسماء الله تعالىٰ والسبحان ليس علما له ولا وصفًا له؛ بل هو مصدر. (السعاية: ۲/ ۱۶٤)

وسبحان مصدر كغفران ولا يكاد يستعمل إلا مضافًا منصوبًا. (تفسير بيضاوي ۱/ ٦۲، البقره: ۳۲)

عن ابن عمرؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أحب الأسماء إلى الله عزوجل عبد الله،و عبد الرحمن. (أبوداؤد شريف، باب في تغيير الأسماء، النسخة الهندية ۲/ ٦٧٦، دارالسلام رقم: ٤٩٤٩، سنن ابن ماجه، باب ما يستحب

من الأسماء، النسخة الهندية ۲/۲٦٥، دار السلام رقم: ۳۷۲۸، صحيح مسلم، باب النهي عن التكنى بأبي القاسم……النسخة الهندية ۲/۲۰٦، بيت الأفكار رقم: ۲۱۳۲)

يلتحق بهذين الإسمين ماكان مثلهما كعبد الرحيم. (حاشية أبي داؤد ۸، فتاوی محموديه جديد ڈابهيل ۱٦/۳۸۷)

اورعبدالسبحان مختلف فیہ نام ہے؛ کیونکہ اس کاایک معنی ہے پاکی بیان کرنے والا بندہ اوردوسرا معنی ہے کہ اس ذات کا بندہ جو ہرقسم کے نقائص سے مبرّ ہ اورپاک ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفت خاصہ ہے،تواس معنی کے اعتبار سے عبدالسبحان نام رکھنے کی گنجائش ہے جیسا کہ روح المعانی وغیرہ کی عبارت سے واضح ہوتا ہے۔

ثم العدول عن المصدر إلى الإسم الموضوع له خاصة لا سيما وهو علم يشير إلى الحقيقة الحاضرة في الذهن ومافيه من قيامه مقام المصدر مع الفعل فإن انتصابه بفعل متروك الاظهار ولهذا لم يجز استعماله إلا فيه تعالىٰ اسماؤه وعظم كبرياؤه وكأنه قيل ما أبعد الذي له هذه القدرة عن جميع النقائص فلايكون اصطفاؤه لعبده التخصيص به إلا حكمة وصوابًاالخ. (تفسير روح المعاني بيروت ۹/۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ذی قعدہ ۱۴۳۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۸۱۹/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/۱۱/۱۴۳۰ھ

عبدالسبحان نام رکھنا

سوال [ب: ۱۱۱۴۹]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) عبدالسبحان نام رکھنا کیسا ہے؟ اگر جائز نہیں تو عدم جواز کس درجہ کا ہے؟ نیز نام رکھنے والا مسلسل گنہگار رہوگا یا ایک مرتبہ یہ گناہ نام رکھنے والے کے ساتھ خاص ہے

یا مسمیٰ کو بھی لاحق ہوگا ؟

(۲) ناجائز ہونے کی صورت میں یہ بھی بتلا دیجئے کہ عدم جواز معنی کی خرابی کی وجہ سے ہے یا اس کے بے معنی ہونے کی وجہ سے؟

درصورت اول: سبحان کے ایسے کیا معنی ہیں جس سے ابہام شرک یا کوئی اور خرابی لازم آتی ہے؟

درصورت ثانی: کیا بے معنی نام رکھنا صحیح نہیں؟ نیز اگر عبدالسبحان کی کوئی صحیح تاویل ہو تو واضح فرمادیں۔

(۳) اگر مسمّٰی کی عمر کافی ہوچکی ہے اور اسی نام سے لوگوں کے درمیان مشہور ہے۔ نیز سرکاری اور غیر سرکاری کاغذات میں یہی نام درج ہے اور اس نام کی تبدیلی میں خاصی مشکل اور کئی پیچیدہ مراحل ہیں تو کیا اس کی کوئی اور صورت نکل سکتی ہے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرما کر عنداللہ ماجور رہوں۔

المستفتی: عبدالسبحان، سندیلہ، ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عبدالسبحان نام رکھنا کیسا ہے؟ اس سلسلے میں کافی جستجو اور تحقیق کے بعد دو رائے ہمارے سامنے آئی ہیں:

پہلی رائے یہ ہے کہ ’’عبدالسبحان‘‘ نام نہیں رکھنا چاہئے، جو حضرات عبدالسبحان نام رکھنے کو منع کرتے ہیں وہ اس کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ سبحان تسبیح کے ہم معنی مصدر ہے، جس کے معنی پاکی بیان کرنے کے آتے ہیں اور لفظ تسبیح کا علم ہے اور علم کی دو قسمیں ہیں:

علم جنسی اور علم شخصی، یہاں علم شخصی مراد نہ ہونا متفق علیہ ہے؛ البتہ علم جنسی ہے جسے نکرہ بنا کر اضافت کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے اور معنی مصدری اپنی جگہ باقی رہتا ہے اور معنی مصدری اپنی جگہ باقی رہنے کی صورت میں عبدالسبحان کا معنی ہوگا ’’پاکی بیان کرنے کا بندہ‘‘

اس معنی کے پیش نظر عبد السبحان نام رکھنے کے متعلق حضرت مولانا عبدالحیؒ لکھنویؒ نے سعایہ میں تحریر فرمایا ہے کہ عوام کو اس نام کے رکھنے سے منع کرنا لازم ہے اور فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ نے عبد السبحان نام رکھنے کے متعلق جواز اور عدم جواز کے بارے میں واضح حکم نہیں لگایا ہے؛ لیکن حضرت کا رجحان عدم جواز کی طرف ہے اور اس رجحان پر سعایہ کی عبارت بھی نقل کر دی ہے۔ ملاحظہ ہو فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۹/ ۳۸۶، میرٹھ ۲۹/ ۲۲۳۔

اب سعایہ کی عبارت ملاحظہ ہو:

ومن ههنا وضح ذلک أن تسمية العوام أطفالهم بعبد السبحان مما لا معنى لها ويجب نهيهم عنها فان العبودية لا تضاف إلا إلى أسماء الله تعالىٰ، والسبحان ليس علماً له ولا وصفًا له؛ بل هو مصدر فاحفظه! فإنه من الفوائد النفيسة. (السعاية، اشرفية ديوبند ۲/ ۱٦٤)

قوله سبحان مصدر لازم النصب باضمار الفعل وهو علم للتسبيح والعلم على نوعين: علم جنسي وعلم شخصي ثم أنه تارة يكون للعين والأخرىٰ للمعنىٰ فهذا من العلم الجنسي الذى للمعنى فان قلت لفظ سبحان واجب الإضافة فكيف الجمع بين الإضافة والعلمية؟ قلت: ينكر ثم يضاف، فان قلت: ما معنى التسبيح؟ قلت: التنزيه يعنى انزه الله تنزيها مما لا يليق به تعالى. (هامش صحيح البخاري ۲/ ۱۱۲۹، رقم:۷۲٦۲، ف:۷٥٦۳)

دوسری رائے یہ ہے کہ عبد السبحان نام رکھنا جائز اور درست ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ ''سبحان'' مصدر ہے اور علم جنسی ہے اور مصدر کو علم کے طور پر استعمال کرنا بھی جائز ہے اور لفظ سبحان کے معنی ہر قسم کے نقائص اور خامیوں سے مبرہ اور پاک ہونے کے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی پاک ذات کی خاص صفت ہے اور کسی مخلوق کے لئے یہ صفت منسوب نہیں ہو سکتی؛ بلکہ یہ صفت ذات باری تعالیٰ ہی کے ساتھ خاص ہے، تو ایسی صورت میں عبد السبحان کا مطلب یہ ہوگا کہ اس ذات کا بندہ جو ہر قسم کے نقائص سے پاک ہے اور عبد السبحان اور عبد

السبوح ایک ہی معنی میں ہوں گے، تو اس لحاظ سے عبدالسبحان نام رکھنے میں کوئی حرج نہ ہوگا اور ہماری رائے بھی تحقیق کے بعد اسی رائے کے موافق ہے؛ لہٰذا اگر کسی کا عبدالسبحان نام رکھا گیا تو اس کو بدلنے کی ضرورت نہیں ہے۔

مفسرین کی ذیل کی عبارات اس کی تائید میں سمجھ میں آتی ہیں، ملاحظہ فرمائیے:

ذكر انه يدل على التنزيه البليغ وذلک من حيث الاشتقاق من السبح وهو الذهاب والا بعاد في الأرض، ثم العدول عن المصدر إلى الاسم الموضوع له خاصة لا سيما وهو علم يشير إلى الحقيقة الحاضرة في الذهن وما فيه من قيامه مقام المصدر مع الفعل فإن انتصابه بفعل متروک الاظهار ولهذا لم يجز استعماله إلا فيه تعالیٰ أسماء ه وعظم كبرياؤه، وكأنه قيل: ما أبعد الذى له هذه القدرة عن جميع النقائص فلايكون اصطفاؤه لعبده التخصيص به الا حكمة وصوابا (إلى قوله) وقال الطيبي في قول الزمخشري: أنه دل على التنزيه البليغ عن جميع القبائح التي يضيفها إليه اعداء الله تعالیٰ. (روح المعاني، زكريا ٩/٥-٦، وبيروت ٩-٥)

ومعناه التنزيه والبراء ة لله عزوجل من كل نقص فهو ذكر عظيم لله تعالیٰ لا يصح لغيره. (الجامع لاحكام القرآن ٩/ ٢٠٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲ رصفر المظفر ۱۴۳۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۲۳۸۳/۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴/۲/۲ھ

''اصلاح الرحمٰن'' وزارۃ اللہ دونوں ناموں کا تحقیقی جائزہ

سوال [۱۱۱۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص کا نام اصلاح الرحمٰن اور دوسرے کا وزارۃ اللہ ہے، یہ دونوں نام کیسے

ہیں آیا صحیح ہیں یا غلط؟ آپ اس کا تسلی بخش جواب دیکر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد یوسف، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اصلاح کے معنی درست کرنے کے ہیں اور جب مصدر کی اضافت ہوتی ہے، تو کبھی مصدر اپنے مضاف الیہ کو مفعول بناتا ہے اور کبھی فاعل اور یہاں قرینہ یہی ہے کہ مضاف الیہ فاعل ہی بن سکتا ہے، تو اصلاح الرحمٰن کا مطلب یہ ہوگا کہ رحمٰن کا درست کیا ہوا، تو اس معنی کر یہ نام درست ہے اور وزارت کے معنی نیابت کے ہیں اور وزارت اللہ کا مطلب ہوگا، اللہ کا نائب اور قرآن وحدیث میں وارد ہوا ہے کہ انسان روئے زمین میں اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے، تو اس معنی کر یہ نام جائز اور درست ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: اِنَّا جَعَلْنَاکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ. [سورہ صٓ:۲۶]

لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ. [النور:۵۵]

عن أبي سعيد الخدري رضـ، قال: صلى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم -إلى- و إن الله مستخلفكم فيها فناظر كيف تعملون. الحديث (سنن الترمذي، باب ما جاء ما أخبر النبي صلى الله عليه وسلم أصحابه بما هو كائن إلى يوم القيامة، النسخة الهندية ۲/٤٦، دارالسلام رقم: ۲۱۹۱، صحيح مسلم، باب أكثر أهل الجفة ......النسخة الهندية ۲/۳٥۳، بيت الأفكار رقم: ۲۷٤۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۵؍ ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴؍ ۶۳۷۴۳)	۱۵؍۱۱؍۱۴۲۰ھ

کیا راشد اللہ اور ارشد اللہ معناً صحیح ہیں؟

سوال [۱۱۱۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ راشد اللہ اور ارشد اللہ دونوں نام معنی کے لحاظ سے صحیح ہیں؟

المستفتی: محمد اعلم قاسمی، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: راشد اللہ اور ارشد اللہ میں اگر لفظ من محفوظ مان لیا جائے، راشد من اللہ اور ارشد من اللہ تو جائز ہوسکتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۳۷۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۱۱/۱۳ھ

احمد نبی اور محمد نبی اور طالب نبی نام رکھنا

سوال [۱۱۱۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ احمد نبی، محمد نبی، طالب نبی نام رکھنا کیسا ہے؟ ایسے نام رکھنا شرع کے خلاف تو نہیں ہیں؟

المستفتی: احمد نبی، سبدیش پور، چندوسی، علی گڈھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: احمد نبی، محمد نبی طالب نبی نام رکھنے میں حدیث کے خلاف نہ ہونے کی وجہ سے کوئی قباحت نہیں ہے؛ بلکہ یہ از قبیل مرکب منع صرف ہے کہ دونوں کلموں کے درمیان کوئی نسبت اضافی نہیں ہے۔

المركبات كل اسم من كلمتين ليس بينها نسبة (وتحته في الرضي) ليس قبل العلمية بينهما نسبة، قال: إنما قلت يفرج المضاف والمضاف إليه. (رضي شرح كافيه ٢/ ٨٤)

ومنع التسمية بعبد النبى (إلى قوله) والأكثر على المنع خشية اعتقاد حقيقة العبودية كما لايجوز عبد الدار. (شامي، كتاب الحظر

والإباحة، باب الإستبراء وغيره زكريا ۹/۵۹۹، كراچي ۶/۴۱۸، الموسوعة الفقهية الكويتية ۱۱/۳۳۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ جمادی الثانیہ ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۴/ ۱۲۹۹)

احمد نبی، محمد نبی نام رکھنا کیسا ہے؟

سوال [۱۱۱۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ احمد نبی نام میں کچھ کراہت ہے، میں نے ایک کتاب میں احمد نبی محمد نبی وغیرہ ناموں کے بارے میں پڑھا تھا، کہ حرام ہے، احمد نبی کی جگہ احمد علی کیسا ہے؟ دعاؤں کی پر خلوص درخواست ہے۔

المستفتی: طالب دعاء: احمد نبی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: محمد نبی واحمد نبی جیسے ناموں کے اندر نسبت اضافی نہ ہونے کی وجہ سے حدیث مسلم کی رو سے ممنوع ہے؛ بلکہ یہ نام بعلبک اور معدیکرب، حضر موت، محمد احمد کی طرح مرکب منع صرف ہیں، جس کا جواب آپ کو ۲۸/ جمادی الثانیہ ۱۴۰۹ھ کو فتوی ۲۴/ ۱۲۹۹/ میں دیا جا چکا ہے، البتہ اگر حدیث

عن أنس بن مالك رضي، قال: -إلى- فقال: النبي صلى الله عليه وسلم: سموا باسمي ولا تكنوا بكنيتي. (صحيح البخاري، باب ما ذكر في الأسواق ۱/۲۸۵، رقم: ۲۰۷۳، ف: ۲۱۲۰، صحيح مسلم، باب النهى عن التكني بأبي القاسم......النسخة الهندية ۲/۲۰۶، بيت الأفكار رقم: ۲۱۳۳)

کی طرح اشتباہ کی علت تسلیم کی جائے، تو ان کے ناموں میں علماء محققین کا اختلاف ہے، حضرت ملا علی قاریؒ نے مرقات میں پانچ توجیہات اور امام نوویؒ نے شرح

مسلم میں ۶ رتوجیہات نقل فرمائی ہیں، ان میں سے توجیہ۲ر علامہ حصکفیؒ نے درمختار میں اورعلامہ شامی نے ردالمحتار میں جائز نقل فرمائی ہے؛ اس لئے کہ ممانعت کی علت حضور ﷺ کے زمانہ کے ساتھ معلوم ہوتی ہے اور حضور کے بعد اشتباہ باقی نہ رہنے کی وجہ سے ممانعت کا حکم بھی باقی نہیں رہا ہے۔ (مستفاد: نووی علی ہامش مسلم۲/۲۰۶، الدر مع الرد، کراچی ۶/۴۱۷، زکریا۹/۵۹۸، حاشیہ مشکاۃ ۲/۴۰۷)

بل ینبغي أن یقال ینتفي الحکم بانتفاء العلة في ذلک الاشتباہ وھو متعین في حال الحیوان. (مرقات، باب الأسامي، مکتبہ امدادیہ ملتان ۹/۱۰۵)

اور علامہ بدرالدین عینی نے عمدۃ القاری، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم سموا باسمی...... داراحیاء التراث العربی ۲۲/۲۰۶، زکریا ۱۵/۳۱۴ کے اندر کراہت کو ترجیح دی ہے اور تحریمہ کی نفی کی ہے اور شیخ عبدالحق محدث دہلی نے اشعۃ اللمعات میں حرمت کو ترجیح دی ہے؛ لہٰذا ایسا مشتبہ نام نہ رکھنے میں احتیاط ہے اور اگر رکھ بھی لیا جائے، تو قول اول کی بنا پر حرام بھی نہیں کہیں گے۔ اب آپ کو اختیار ہے چاہے اپنا نام بدل دیں یا باقی رکھیں، اگر احتیاط ہی چاہتے ہیں تو بدل دیجئے ورنہ واجب نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳ ر رجب المرجب ۱۴۰۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۵/۱۳۲۰)

ثقلین اور حسنین نام رکھنا کیسا ہے؟

سوال [۱۱۱۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ثقلین اور حسنین نام کے دو بچے ہیں، ان کا یہ نام شرعی طور پر درست ہے یا نہیں؟ ہر دو صورت میں توجیہ بھی مطلوب ہے۔

المستفتی: عبدالرؤف، گلی نمبر۶، کانکی نارہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حسنین نام رکھنا بہر حال جائز ہے اور ثقلین نام رکھنا فی نفسہ جائز ہے؛ لیکن اس سے بہتر وہ نام ہے، جس میں عبدیت کا اظہار ہو یا صالحین میں سے کسی کا نام ہو اور ثقلین نہ کسی صحابی کا نام ہے، نہ کسی ولی کا؛ بلکہ اس کے معنی جن وانس کے ہیں اور جنات میں اچھے برے دونوں طرح کے ہوتے ہیں، اسی طرح انسانوں میں بھی دونوں طرح کے ہوتے ہیں اور حدیث میں آتا ہے، کہ اپنے اچھے نام تجویز کیا کرو؛ اس لئے کہ قیامت کے میدان میں تم کو تمہارے اور تمہارے آباء کے نام کے ساتھ پکارا جائے گا۔

عن أبي الدرداءؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إنكم تدعون يوم القيامة بأسمائكم، وأسماء آبائكم، فأحسنوا أسمائكم.

(سنن أبي داؤد، باب في تغيير الأسماء، النسخة الهندية ٢/٦٧٦، دارالسلام رقم: ٤٩٤٨، مسند الدارمي، دار المغني ٣/١٧٦٦، رقم: ٢٧٣٦، مسند أحمد بن حنبل ٥/١٩٤، رقم: ٢٢٠٣٥، صحيح ابن حبان، دار الفكر ٥/٣٩١، ٥٨٢٧)

لہٰذا قیامت کے میدان میں جب اس نام کے ساتھ پکارا جائے گا، تو دونوں گروہوں کو شامل ہوگا۔ الحاصل ثقلین نام اگرچہ جائز ہے، مگر بہتر نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۸؍ربیع الاول ۱۴۲۰ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۰۸۵/۳۴)	۱۴۲۰/۳/۲۰ھ

’’محمد بشیر الدین احمد‘‘ نام رکھنا

سوال [۱۱۱۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے ایک بھائی کا نام محمد بشیر الدین احمد رکھا، تو وہیں مولانا صاحب نے فرمایا کہ نام کے اول اور آخر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام رکھنا جائز نہیں، اس طرح محمد بشیر

الدین احمد صرف محمد بشیر الدین یا بشیر الدین احمد جائز ہے۔

المستفتی: مزمل الحق

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: محمد بشیر الدین احمد نام رکھنا شرعًا جائز ہے؛ اس لئے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: سموا باسمی یعنی میرے نام کی طرح نام رکھو، اس میں کوئی تفصیل نہیں ہے کہ ایک طرف حضور ﷺ کا نام آنا چاہئے یا دونوں طرف اسی طرح فرمایا: تسموا باسماء الأنبیاء کہ انبیاء کے ناموں کے مطابق نام رکھو، اس میں بھی کوئی تفصیل نہیں؛ لہٰذا محمد بشیر الدین احمد نام رکھنا درست ہے۔

عن جابر بن عبد الله الا نصاري، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: سموا بإسمي. الحديث (صحيح البخاري، باب من سمي بأسماء الأنبياء، النسخة الهندية ٢/٩١٥، رقم: ٥٩٥٥، ف: ٦١٩٦، صحيح مسلم، باب النهى عن التكنى بأبي القاسم......النسخة الهندية ٢/٢٠٦، بيت الأفكار رقم: ٢١٣٣)

عن أبي وهب وكانت له صحبة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: تسموا بأسماء الأنبياء. الحديث (سنن النسائي، ما يستحب من شية الخيل، النسخة الهندية ٢/١٠٥، دار السلام رقم: ٣٥٦٥، سنن أبي داؤد، باب في تغيير الأسماء، النسخة الهندية ٢/٦٧٦، دار السلام رقم: ٤٩٥٠، مسند أحمد بن حنبل ٤/٣٤٥، رقم: ١٩٢٤١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍محرم الحرام ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۵۹۴۴/۳۴)

شبیر احمد کے معنی

سوال [١١١٥٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ میرے بھتیجے کا نام شبیر احمد ہے، اس نام کے کیا معنی ہے؟

المستفتی: مولانا مہدی حسن، ٢٤/پرگنہ، مغربی بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: شبیر کے معنی نیک اور خوبصورت کے ہیں اور یہ نام حضرت حسینؓ کا ہے، حضور ﷺ نے اپنے نواسوں کا نام حضرت ہارون کے بیٹوں کے ہم نام رکھا تھا، حضرت حسنؓ کا نام شبّر اور حضرت حسین کا نام شبیر اور محسن کا نام مشبّر تھا، حضرت محسن بچپن ہی میں گذر گئے تھے ملاحظہ فرمایئے:

قال علي بن أبي طالبؓ: لما ولد الحسن جاء رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: اروني إبني، ما سميتموه؟ قلت: سميت حربًا، فقال: بل هو حسن، فلما ولد الحسين سميناه حربًا، فجاء النبي صلى الله عليه وسلم فقال: أروني ابني، ماسميتموه؟ قلت حربًا، قال: بل هو حسين ، فلما ولد الثالث جاء النبي صلى الله عليه وسلم فقال: أروني ابني، ماسميتموه؟ قلت سميته حربًا ، قال: بل هو محسن، ثم قال: سميتهم بأسماء ولد هارون "شبر، وشبير، ومشبر . (اسد الغابة في معرفة الصحابة، دارالفكر بيروت ١/ ٤٨٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١١/ربیع الثانی ١٤٣٦ھ
(فتویٰ نمبر: الف ١١٩٨٤/٤١)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٤٣٦/٤/١١ھ

نبیہ سرور نام کے تبدیل کرنے کا حکم

سوال [١١١٥٧]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرا نام نبیہ سرور ہے، اور میں اس کو تبدیل کر کے حفظ الرحمٰن رکھ لینا چاہتا ہوں، شریعت کی رو سے یہ نام بہتر رہے گا یا نہیں؟

المستفتی: نبیہ سرور، امبید کرنگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نبیہ سرور نام کو تبدیل کر کے حفظ الرحمٰن رکھ لینا جائز اور درست ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں ہے؛ بلکہ حفظ الرحمٰن نام نبیہ سرور کے مقابلہ میں اچھا ہے، حضور ﷺ پرانے ناموں کو اچھے ناموں کے ساتھ تبدیل کر دیا کرتے تھے، مثلاً حضرت ام المؤمنین زینب بنت جحشؓ کا نام برہ تھا، تو رسول اللہ ﷺ نے اس کو بدل کر ان کا نام زینب رکھا ہے، اسی طرح حضرت ام المؤمنین ام سلمہؓ کی بیٹی حضرت زینب بنت سلمہ کا نام بھی برہ تھا، تو حضور ﷺ نے ان کا بھی نام بدل کر زینب رکھا، اسی طرح حضرت ام المؤمنین جویریہؓ کا نام بھی برہ بنت حارث تھا، حضور ﷺ نے ان کا نام بدل کر جویریہ رکھا، اسی طرح ام المؤمنین حضرت میمونہ بنت حارثؓ کا نام بھی برہ تھا، حضور ﷺ نے ان کا نام میمونہ رکھا، اسی طرح حضرت عبداللہ بن حارث زبیدیؓ کا نام عاص تھا، حضور ﷺ نے ان کا نام بدل کر عبد اللہ بن حارث رکھا، اسی طرح حضرت عبد اللہ بن عمر بن العاصؓ کا نام عاص تھا، حضور ﷺ نے ان کا نام بدل کر عبداللہ بن عمرابن العاص رکھا؛ لہٰذا نبیہ سرور کا نام بدل کر حفظ الرحمٰن نام رکھنا جائز اور درست ہے۔ (مستفاد: انوار رسالت ۵۹۴ تا ۶۰۰)

عن أبي هريرة أن زينب كان اسمها برة فقيل: تزكى نفسها فسماها رسول الله صلى الله عليه وسلم زينب. (صحيح البخاري، باب تحويل الإسم إلى إسم أحسن منه، النسخة الهندية ٢/ ٩١٤، رقم: ٥٩٥١، ف: ٦١٩٢)

حدثتني زينب بنت أم سلمةؓ، قالت: كان اسمي برة، فسماني رسول الله صلى الله عليه وسلم زينب قال: ودخلت عليه زينب بنت جحش واسمها برّة فسماها زينب. (مسلم شريف، باب بيان تغيير الإسم القبح إلى حسن ــ النسخة الهندية ٢/ ٢٠٨، بيت الأفكار رقم: ٢١٤٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱؍ ۱۲۰۵۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۵/۲۶ھ

عبدالمطلب نام رکھنا

سوال [۱۱۱۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرا نام عبدالمطلب ہے، یہ نام شریعت کی رو سے جائز ہے یا نہیں؟ یہ نام رکھنا درست نہ ہو، تو کیا رکھیں؟

المستفتی: عبدالمطلب، سیتاپوری، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عبدالمطلب نام رکھنا درست نہیں؛ اس لئے کہ عبد کی اضافت اللہ تعالیٰ کے اسماء کے علاوہ کی طرف جائز نہیں اور مطلب اللہ کے اسماء حسنیٰ میں سے نہیں ہے۔

أقول: ویؤخذ من قوله ولا عبد فلان منع التسمية بعبد النبي و نقل المناوي عن الدميرى أنه قيل بالجواز بقصد التشريف النسبة والأكثر على المنع خشية اعتقاد العبودية كما لايجوز عبد الدار. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الإستبراء وغيره، زكريا ۵۹۹/۹، كراچي ۴۱۸/۶، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۳۶/۱۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ربیع الاول ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۰۶۹/۳۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۳/۱۲ھ

لفظ فوزان کی تحقیق

سوال [۱۱۱۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ فوزان کے معنی کیا ہیں اور فوزان کون سی زبان عربی، فارسی یا کس زبان کا لفظ ہے، اور محمد فوزان نام رکھنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد خالد قاسمی، شبانہ منزل پاٹلی پاڑہ، ٹرامبے ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فوزان فوز مادہ سے صفت کا صیغہ ہے، اس کے معنی کامیاب ہونے کے ہیں اور محمد فوزان نام رکھنا اچھا ہے۔ (فیروز اللغات جامع ۷۰۷)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍صفر المظفر ۱۴۲۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۷/۸۲۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۲/۵ھ

عظیم الشان نام رکھنا کیسا ہے؟

سوال [۱۱۱۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ احقر کا نام عظیم الشان ہے، جو احقر کے گھر والوں نے رکھا، تو اس نام کا رکھنا شرعاً کیسا ہے جائز ہے یا ناجائز یا مکروہ؟ اگر کراہت ہے، تو کس درجہ کی؟ جواب سے نوازیں۔

المستفتی: عظیم الشان لکھیم پوری، متعلم مدرسہ شاہی مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسے نام رکھنا جن سے اپنی بڑائی اور برتری کا اظہار ہوتا ہو، مکروہ ہے اور چونکہ عظیم الشان کے معنی میں بڑائی پائی جاتی ہے؛ لہٰذا یہ نام رکھنا مکروہ ہوگا اور عظیم الشان اللہ تبارک وتعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں کو لفظ عبد کے ساتھ رکھنا چاہئے۔

عن أبي هريرة رضـ، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: أغيظ رجل على الله يوم القيامة، وأخبثه و أغيظه عليه، برجل كان يسمىٰ ملك الأملاك، لاملك إلا الله. (مسلم شريف، باب تحريم التسمى بملك الاملاك، وبملك الملوك، النسخة الهندية ۲/۲۰۸، بيت الأفكار رقم: ۲۱۴۳)

أي أقبحها وأفحشها؛ لأنه يدل على غاية التكبر، وهذا الإسم يليق بالله سبحانه تعالىٰ. (بذل المجهود، باب في تفسير الإسم القبيح، دار البشائر الإسلامية، ۱۳/ ۳٦۰، سهارن پوره/ ۲٦۹)

عزيز: لأنه من أسماء الله تعالىٰ، فينبغي أن يقال عبد العزيز؛ لأن العبد موصوف بالذل، والخضوع، والعزة لله تعالىٰ: وكذا لا ينبغي أن يسمىٰ بحميد، فإنه من أسمائه وصفاته على وجه المسابقة، فلا يقال إلاعبدالحميد، وكذلک الكريم وأمثاله. (مرقا ة، باب الأسماء،الفصل الثانی امدادية ملتان ۹/ ۱۱٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۵/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/ ۱۰۷۱۷)	۱۴۳۳/۶/۱۵ھ

صرف الدین، شرف الدین نام رکھنا

سوال [۱۱۱٦۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص نے اپنے بیٹے کا نام شرف الدین رکھا ہے، شین سے لکھتا ہے، اوردوسرے شخص نے بھی اپنے بیٹے کا نام صرف الدین رکھا ہے، صاد سے لکھتا ہے، دونوں آدمیوں کے بیچ نزاع ہے، تو کیا دونوں کے نام صحیح ہیں؟

المستفتی: محمد نعیم الدین، جھگڑو، دربھنگہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ان دونوں ناموں میں شرف الدین نام رکھنا زیادہ صحیح اور عمدہ ہے؛ کیونکہ شرف الدین کے معنی دین میں عزت اور بلند مرتبہ والا ہونا اورصرف الدین نام رکھنا معنی کے اعتبار سے بہتر نہیں ہے؛ کیونکہ صرف الدین کے معنی دین کے اندر تصرف کرنے اورالٹ پھیر کرنے کے ہیں ظاہر ہے یہ معنی صحیح نہیں ہیں۔

(مستفاد: مصباح اللغات ۴۲۸-۴٦۷)

عن أبي الدرداءؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إنكم تدعون يوم القيامة بأسمائكم، وأسماء آبائكم فأحسنوا أسمائكم.
(سنن أبي داؤد، باب في تغير الإسم، النسخة الهندية ٢/٦٧٦، دار السلام رقم: ٤٩٤٨)
فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ رجمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/۴۵۰۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۶/۲۰ھ

پرویز نام رکھنا کیسا ہے؟

سوال [۱۱۱۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ پرویز کے کیا معنی ہیں؟ کیا مندرجہ ذیل نام رکھنا درست ہیں؟ پرویز خاں، محمد پرویز، پرویز احمد، پرویز الدین، پرویز اختر؟

المستفتی: محمد اقبال شمسی ہاؤس، طویلہ اسٹریٹ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: پرویز فارس کے اس بادشاہ کا نام ہے، جس نے حضور کے نامۂ مبارک کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا تھا؛ اس لئے پرویز کا معنی چاہے کچھ بھی ہو، مگر دشمن رسول کا نام ہے؛ لہٰذا اس نام کے ساتھ مسلمان بچوں کا نام رکھنا نہایت غیر مناسب ہے۔

عبيد الله بن عبد الله، أن ابن عباس أخبره، أن سول الله صلى عليه وسلم، بعث بكتابه إلى كسرىٰ–فأمره أن يدفعه إلى عظيم البحرين فدفعه عظيم البحرين إلى كسرىٰ، فلما قرأه، مزقه فدعا عليهم رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يمزقوا كل ممزق. (بخاري شريف، باب كتاب النبي صلى الله عليه وسلم إلى كسرىٰ وقيصر، النسخة الهندية ١/٦٣٧، رقم: ٤٢٤٦، ف: ٤٤٣٤)

وإسمه پرويز بن هزمز بن نوشيروان وكسرىٰ. (حاشية بخاري ٢/ ٦٣٧)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/ ۷۰۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/۱/۱۴۲۲ھ

یزدان نام رکھنا

سوال [۱۱۱۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرا نام یزدان ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ نام صحیح نہیں ہے، کوئی نام تجویز فرمادیں اور اگر اس نام میں کوئی قباحت نہ ہو، تو اسے باقی رکھا جائے؛ اس لئے کہ اسکول کی اسناد اور بینک وغیرہ کے کاغذات میں تبدیلی کرانی پڑے گی یا اسکول اور بینک میں اسے چلاتے رہیں اور الگ سے ایک اور نام رکھ لیں، شریعت کا کیا حکم ہے؟ تحریر فرمادیں۔

المستفتی: یزدان علی نئی سڑک، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: یزدان کے معنی خدا اور خیر کے خالق کے ہیں۔

(مستفاد: فیروز اللغات ۱۴۶۷)

اس لئے یہ نام بدل کر کوئی اچھا سا اسلامی نام رکھ لیا جائے اور سرکاری کاغذات اور اسکولی اسناد میں جس حد تک ممکن ہو تبدیلی کرالی جائے؛ کیونکہ آنحضرت ﷺ بھی صحابہؓ کے نامناسب ناموں کو اچھے ناموں سے بدل دیا کرتے تھے۔

عن أبي الدرداءؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إنكم تدعون يوم القيامة بأسمائكم، وأسماء آبائكم، فأحسنوا أسمائكم. (سنن أبي داؤد، باب في تغيير الإسم، النسخة الهندية ٢/ ٦٧٦، دار السلام رقم: ٤٩٤٨)

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يغير الإسم القبيح إلى الحسن.
(شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ٥٩٩/٩، کراچی ٤١٨/٦)

عن ابن عمرؓ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم غير اسم عاصية، وقال أنت جميلة. (مسلم شريف، باب تغيير استحباب تغيير الأسم...... النسخة الهندية ٢٠٨/٢، بيت الأفكار رقم: ٢١٣٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۰۲۴۵/۳۹)

اِرم نام رکھنا کیسا ہے؟

سوال [۱۱۱۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری بیٹی کا نام اِرم ہے، اس کے کیا معنی ہیں، اس کا عقیقہ بھی کر دیا ہے، کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ نام ٹھیک نہیں ہے؛ لہٰذا اس کا نام اگر صحیح نہیں ہے، تو مجھے نام بدلنا ہوگا، تو کیا دوسرا عقیقہ بھی کرنا ہوگا؟ کیونکہ اگر عقیقہ کرنا ہوگا تو لمبا کرنے کا ارادہ ہے۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: قرآن کریم میں جو لفظ اِرم آیا ہے، اس سے ایک بادشاہ یا شاہی خاندان کا نام مراد ہے۔ (تفسیر شیخ الہند ۷۹۰، معارف القرآن ۷۳۶/۸)

اور لغت میں اِرم کے معنی رہنمائی کے لئے نصب کیا ہوا پتھر کے ہیں۔ (مصباح اللغات ۳۲)

اب اگر اس نام کو باقی رکھنا چاہتے ہیں، تو آپ کو اختیار ہے، اور اس سے بھی عمدہ نام رکھنا چاہتے ہیں، تو بدلنے میں بھی اختیار ہے، مگر نام بدلنے کی وجہ سے دوبارہ عقیقہ لازم نہیں، مسنون عقیقہ شرعاً ادا ہو چکا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۶۳۸۲/۳۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۱۱/۱۶ھ

آسیہ نام رکھنا کیسا ہے؟

سوال [۱۱۱۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آسیہ نام رکھنا کیسا ہے؟ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آسیہ نام رکھنے سے حضرت آسیہ کی طرح پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور بعض آسیہ نام والیوں کو دیکھا گیا ہے، کہ وہ اکثر بیمار یا آسیب زدہ سی رہتی ہیں اوران کے والدین وغیرہ کی خواہش ہے کہ اس نام کے بجائے دوسرا نام رکھ لیا جائے، کیا ایسا کرنا درست ہے؟

المستفتی: عبدالرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آسیہ دنیا کی ایک نیک اور مقبول ترین خاتون کا نام ہے، جن کی گود میں حضرت موسیٰؑ کی پرورش ہوئی ہے، اگرچہ وہ فرعون کی بیوی تھیں؛ لیکن اللہ کے نزدیک نہایت پارسا اور خداترس نیک خاتون تھیں اور جنت میں آپ ﷺ کی زوجہ بنیں گی، ان کے نام پر لڑکیوں کا نام رکھنا باعث سعادت ہے؛ اس لئے کہ حضور ﷺ پچھلے انبیاء یا نیک لوگوں کے ہم نام نام رکھنا پسند فرماتے تھے، اور جن لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اس نام کی بچیاں اکثر بیمار یا آسیب زدہ رہتی ہیں یہ عقیدہ کا فساد ہے، ایسا عقیدہ درست نہیں، آسیہ کے معنی تسلی حاصل کئے جانے اور مضبوطی کے ہیں؛ اس لئے اس کے معنی میں بھی کوئی خرابی نہیں؛ البتہ والدین کو اختیار ہے کہ جو چاہیں نام رکھیں۔

عن سعد بن جنادة رضـ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الله زوجني في الجنة مريم بنت عمران، وإمرأة فرعون، وأخت موسىٰ عليه السلام. (المعجم الكبير للطبراني، دارإحياء التراث العربي ٦/ ٥٢، رقم: ٥٤٨٥)

عن عبد الرحمن بن أبي ليلى قال: قال رسول الله صلى الله عليه

وسلم: فاطمة سيدة نساء العالمين، بعد مريم ابنة عمران، وآسية امرأة فرعون، وخديجة ابنة خويلد. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب الفضائل، مؤسسه علوم القرآن ۱۷/۴۱۲، رقم:۳۲۹۳۹)

عن عائشةؓ قالت: دخل علي رسول الله عليه وسلم مسرورًا، فقال: ياعائشة! إن الله عزوجل زوجني مريم بنت عمران، وآسية بنت مزاحم في الجنة. (عمل اليوم والليلة لإبن السني، باب الرخصة في ذلك،موسسه علوم القرآن ۱/۵۵۶، رقم:۶۰۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍جمادی الثانیہ ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸؍۹۶۱۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/۵/۱۴۲۹ھ

’’خورشیدہ‘‘ نام رکھنا

سوال [۱۱۱۶۶]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری بہن کا نام خورشیدہ ہے، تو ایک مولانا صاحب نے فرمایا کہ خورشیدہ نام رکھنا ناجائز ہے، خورشیدہ کا کیا معنی ہے جائز ہے یانہیں؟

المستفتی: مزمل الحق

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خورشیدہ لفظ خورشید کی مؤنث ہے، اور خورشید کے معنی سورج اور آفتاب کے ہیں، خورشیدہ نام رکھنا جائز ہے؛ اس لئے کہ اس کے معنی میں کوئی خرابی نہیں؛ بلکہ اچھا ہے اور حضور ﷺ نے اچھا نام رکھنے کی تاکید کی ہے۔

عن أبي الدرداءؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إنكم تدعون يوم القيامة بأسمائكم، وأسماء آبائكم، فأحسنوا أسمائكم.

(سنن أبي داؤد، باب في تغيير الإسم، النسخة الهندية ۲/۶۷۶، دارالسلام

رقم:٤٩٤٨، مسند احمد بن حنبل ١٩٤/٥، رقم ٢٢٠٣٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ ر محرم الحرام ۱۴۲۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴ر ۵۹۴۴)

کیا پروین نام اچھا نہیں ہے؟

سوال [١١١٦٧]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کی بیوی کا نام پروین جہاں ہے، کسی نے زید سے کہا کہ یہ نام اچھا نہیں، اس نام میں تبدیلی کردو، کیا کہنے والے کی یہ بات صحیح ہے؟

المستفتی: محمد حامد، کرلا ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پروین نام رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اوراس کے معنی ستاروں کے جھرمٹ کے ہیں۔ نیز نام میں تغیر وتبدیلی کی وجہ سے دوبارہ نکاح کی ضرورت نہیں ہے۔

عن ابن عباسؓ، قال: كانت جويرية اسمها برّة، فحول رسول الله صلى الله عليه وسلم إسمها جويرية. (صحيح مسلم، باب استحباب تغيير الإسم القبيح ......النسخة الهندية ٢٠٨/٢، بيت الأفكار رقم:٢١٤٠، صحيح ابن خزيمة المكتب الإسلامي ٣٧٠/١، رقم: ٧٥٣، مسند أحمد بن حنبل ٣١٦/١، رقم:٢٩٠٢)

اس روایت سے تبدیل نام کے بعد تجدید نکاح نہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴ر جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱ر ۴۰۴۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۴ر۶ر۱۴۱۵ھ

حافظ صاحب کو امیر حمزہ کے لقب سے پکارنا

سوال [۱۱۱۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص حافظ قرآن ہے، لوگ اس کو امیر حمزہ کہہ کر پکارتے ہیں، تو کیا امیر حمزہ کہہ کر پکارنا درست ہے؟ اور امیر حمزہ کا مقام یہی ہے؟

المستفتی: عبدالصمد قاسمی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مذکورہ حافظ صاحب کا نام امیر حمزہ ہے، تو اس نام کے ساتھ اس کو پکارنا بلا شبہ جائز ہے، اور اگر امیر حمزہ نہیں ہے، مگر لوگ اس نام کے ساتھ پکارتے ہیں، تو وہ اس کے لئے لقب ہے اور امیر حمزہ کسی کا لقب پڑ جائے، تو اس کو اس لقب کے ساتھ پکارنے کی ممانعت نہ حدیث میں ہے اور نہ ہی فقہ میں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ / صفر المظفر ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱ / ۳۸۸۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۲/۲۵ھ

احمد رضا کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ لکھنا

سوال[۱۱۱۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں صاحب کے عرس کا ایک اشتہار چھپا ہے، جس میں امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ لکھا ہے۔

جواب طلب امر یہ ہے کہ برائے مہربانی رحمۃ اللہ علیہ اور رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں فرق مراتب تحریر فرمائیں۔ نیز یہ مژدہ سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اطہر سے اللہ کی جانب سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سنایا گیا تھا، تو عمومی طور پر صحابہ کے ساتھ تابعین واولیاء کرام سب

کے لئے تھا یا یہ کہ صحابہ کرام کی قربانیوں کی وجہ سے صحابہ کو اللہ نے اپنی رضا کا پروانہ عطا فرمایا تھا؟ مکمل مدلل قرآن وحدیث آثار صحابہ سے تحریر فرمائیں۔

المستفتی: گلشیر، محمد نصیر، چھتیس گڈھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہنا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے مستحب ہے اور یہی معمول دور صحابہ اور سلف صالحین سے چلا آرہا ہے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد کے علماء اور صلحاء اور اولیاء اللہ کے لئے رحمۃ اللہ علیہ کہنا مستحب ہے، یہی معمول سلف صالحین سے سلسلہ وار چلا آرہا ہے؛ اس لئے اسی کے مطابق عمل کرنا چاہئے۔

ویستحب الترضي للصحابة، والترحم للتابعين، ومن بعدهم من العلماء، والعباد والسائر الأخيار. (الدر مع الشامي، كتاب الخنثىٰ، زكريا ١٠/٤٨٥، كراچي ٦/٧٥٤، مجمع الأنهر مصري قديم ٢/٧٤٥، دارالكتب العلمية بيروت ٤/٤٩١، الموسوعة الفقهية الكويتية ١١/١٨٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٦ / شعبان المعظم ١٤٢٧ھ
(فتویٰ نمبر: الف ٣٤/ ٩١١٦)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٤٢٧/٨/٨ھ

نام کے ساتھ قاسمی، مظاہری وغیرہ لکھنا

سوال [١١١٧٠]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نام کے ساتھ قاسمی، مظاہری، وغیرہ لکھنا کیسا ہے؟ مجھے یاد ہے، میرے یہاں مولانا عبدالحق صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند مئو تشریف لائے تھے سختی سے منع کرتے تھے۔

المستفتی: شفیع احمد، الاعظمی الرفاع

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کا سابق فتویٰ جس کا جواب ۵/ ذی الحجہ کو

یہاں سے روانہ کیا جا چکا ہے، اس میں لکھا جا چکا ہے، حضرت الاستاذ مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ سے احقر نے براہ راست دیوبند جا کر ملاقات کر کے معلوم کیا ہے، تو انہوں نے جواب دیا مطلقاً منع نہیں کیا؛ بلکہ غلط انتساب کو منع کیا ہے، کہ اگر کوئی عثمانی فاروقی نہیں ہے اور اپنے آپ کو عثمانی فاروقی وغیرہ کی طرف منسوب کرے، اسی طرح کوئی قاسمی یا مظاہری نہیں ہے اور اپنے آپ کو ان الفاظ سے منسوب کرے، تو ناجائز اور ممنوع ہے۔

عن سعد -رضي الله عنه- قال: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم: يقول: من ادعىٰ إلى غير أبيه، وهو يعلم أنه غير أبيه، فالجنة عليه حرام.

(صحيح البخاري، باب من ادعى إلى غير أبيه، النسخة الهندية ١٠٠١/٢، رقم: ٦٥٠٩، ف: ٦٧٦٦، صحيح مسلم، باب بيان حال إيمان من رغب عن أبيه وهو يعلم، النسخة الهندية ٥٧/١، بيت الأفكار رقم: ٦٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ رجب المرجب ۱۴۱۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹/۳۲۵۳)

نام کے ساتھ عثمانی، فاروقی، علوی وغیرہ لکھنا

سوال [۱۱۱۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نام کے ساتھ لوگ عثمانی، فاروقی، علوی، اعظمی وغیرہ لکھتے ہیں، اس کا لکھنا کیسا ہے؟ مجھے یاد ہے کہ ایک بار میرے گاؤں میں سابق شیخ الحدیث دارالعلوم مئو حضرت مولانا عبدالحق صاحب تشریف لائے تھے، ایک صاحب سے بات کے دوران سختی سے منع فرمایا تھا۔

المستفتی: احمد اعظمی، بحرین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر کوئی حضرت عثمان غنیؓ کی نسل میں سے ہے،

تو اس کا اپنے آپ کو عثمانی لکھنا اور جو لوگ حضرت صدیق اکبرؓ کی نسل سے ہیں، ان کا اپنے آپ کو صدیقی لکھنا اور جو لوگ حضرت علیؓ کی نسل سے ہیں، ان کا اپنے آپ کو علوی لکھنا اور کوئی صاحب اعظم گڈھ کے ہیں، ان کا اپنے آپ کو اعظمی وغیرہ لکھنا شرعاً جائز اور درست ہے، ہاں البتہ اگر کوئی عثمانی نہیں ہے، اور وہ اپنے آپ کو عثمانی لکھے، تو یہ جائز نہیں ہے، اسی طرح نسبت کا مسئلہ ہے اور حضرت الاستاذ مولانا عبد الحق صاحب دامت برکاتہم سے دارالعلوم دیوبند حاضر ہو کر اس سلسلہ میں معلوم کیا گیا، تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے یہی کہا ہے کہ جو لوگ غلط منسوب کرتے ہیں، ان کے لئے جائز نہیں اور ممانعت کی گئی ہے۔

عن أبي ذرؓ، أنه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ليس من رجل ادعى لغير أبيه، وهو يعلمه إلا كفر. الحديث (صحيح مسلم، باب بيان حال ايمان من رغب عن أبيه، وهو يعلم، النسخة الهندية ١/٥٧، بيت الأفكار رقم: ٦١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/ ۲۹۱۶)

مولانا احمد رضا اور مولانا مودودی کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ لکھنا

سوال [۱۱۱۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مولانا احمد رضا بریلوی اور مولانا مودودی کو رحمۃ اللہ علیہ لکھنا یا کہنا درست ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے ان میں سے ہر ایک کو ماننے والے موجود ہیں، اگر ہم ان کا نام بے ادبی سے لیں گے، تو وہ ہمارے اکابر کا نام بے ادبی سے لیں گے، کیا ایسی صورت میں کم سے کم ان کے ماننے والوں کے سامنے آداب والقاب کے ساتھ اور رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ پکارا جا سکتا ہے؟ اگر رحمۃ اللہ علیہ نہ کہا جائے، تو لعنت اللہ علیہ کہنا چاہئے کہ نہیں؟

المستفتی: عرفان احمد قاسمی، گونڈوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مولانا احمد رضا خاں صاحب اور مولانا مودودی صاحب دونوں اپنے اپنے عقیدہ اور کردار کی وجہ سے بدعتی اور فاسق ہیں؛ چونکہ ان کے بھی ماننے والے ہیں؛ اس لئے ان کے لئے لعنت کے الفاظ استعمال نہ کئے جائیں اور نہ ہی رحمت وترحم کے الفاظ استعمال کئے جائیں؛ کیونکہ ترحم کے الفاظ نیک صالح مؤمنین اور تابعین کے لئے بولنا مستحب ہے؛ اس لئے ان کو صرف مولانا احمد رضا خانصاحب اور مولانا مودودی صاحب کے الفاظ سے یاد کیا جائے، اس میں ان کے لئے گستاخانہ الفاظ بھی نہیں ہیں جس سے ردعمل کی بات لازم آسکے اور جن لوگوں کیلئے ترحم کے الفاظ استعمال کرنے کی ترغیب آئی ہے، ان میں یہ لوگ شامل نہیں ہیں۔

ويستحب الترضي للصحابة، والترحم للتابعين، ومن بعدهم من العلماء، والعباد والسائر الأخيار. (در مختار مع الشامي، كتاب الخنثىٰ، زكريا ۱۰/ ۴۸۵، كراچي ۶/ ۷۵۴، مجمع الأنهر مصري قديم ۲/ ۷۴۵، دارالكتب العلمية بيروت ۴/ ۴۹۱، الموسوعة الفقهية الكويتية ۱۱/ ۱۸۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱؍صفر المظفر ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۳۰۱/۲۹)

کسی کو پاک یا مقدس کا لقب دینا

سوال [۱۱۱۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کیا حضرت مخدوم علاء الدین صابر کلیریؒ کو صابر پاک کا لقب وخطاب دینا جائز ہے؟ شریعت یا طریقت کی روشنی میں اور کس حد تک؟

المستفتی: محمد کیس، چندوسی مسجد، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کسی کو بھی پاک یا مقدس وغیرہ کا لقب دینا شرعاً درست نہیں۔ حدیث شریف میں اس سے ممانعت فرمائی گئی ہے، ہاں البتہ بزرگوں کے لئے رحمۃ اللہ علیہ کے لفظ کا استعمال کرنے کی تلقین ہے۔

عن محمد بن عمرو بن عطاءؓ، قال: سمیت إبنتي برّة، فقالت لي زینب بنت أبي سلمة: ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نهی عن هذا الإسم وسمیت برة، فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لاتزکوا أنفسکم اللّٰہ أعلم بأهل البر منکم. الحدیث (مسلم شریف، باب استحبات تغییر الإسم القبیح، النسخة الهندیة ۲/ ۲۰۸، بیت الأفکار رقم: ۲۱۴۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ر محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۶۴۴۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۱/۲۱ھ

بچوں کو پیار میں لالہ، منی پیارے وغیرہ کہنا

سوال [۱۱۱۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ چھوٹی عمر کے بچوں کو محبت میں لالہ، پیارے، منی، چوزہ کے لفظ سے پکارتے ہیں؛ جبکہ بچے اس کو برا بھی نہیں سمجھتے، تو کیا یہ آیت قرآنی ''**ولاتنابزوا بالألقاب**'' کے خلاف تو نہیں ہے؟

المستفتی: محمد عامر، بلیاوی، متعلم دورۂ حدیث مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چھوٹے بچوں کو اصل نام چھوڑ کر کے لالہ اور پیارے اور منے وغیرہ کے الفاظ سے کبھی کبھی پیار میں بولنے میں کوئی حرج نہیں؛ لیکن مستقل طور پر اصل نام کو چھوڑ کر اسی طرح کے الفاظ سے پکارنا درست نہیں، اس سے

بڑے ہونے تک انہی بگڑے ہوئے ناموں کے ساتھ مشہور ہوجاتے ہیں، تو ایسی صورت میں یہ آیت قرآنی ''ولاتنابزوا بالالقاب'' (الحجرات: ۱۱) کی ممانعت کے دائرہ میں داخل ہوجاتا ہے، اس لئے احتیاط اس میں ہے کہ چھوٹے بچوں کو کبھی بھی اصل نام چھوڑ کر بگڑے ناموں سے نہ پکارا جائے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ ذیقعدہ ۱۴۳۳ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۰۸۲۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۱۱/۹ھ

کمہار کا آباء واجداد کی طرف نسبت کر کے رشیدی، حمیدی لکھنا

سوال [۱۱۱۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص کے قرابت والوں کا پیشہ مٹی کے برتن بنانے کا ہے، اور وہ لوگ خود کو کمہار کہتے ہیں، ایک گھرانہ اس کا اس پیشہ کو نہیں کرتا اور نہ ہی یہ کرتا ہے نہ ہی اس کے بھائی باپ وغیرہ کرتے ہیں اور نہ دادا نے اس کام کو کیا ہے، اس گھرانے کے لوگ اپنے آپ کو باپ کی طرف نسبت کرتے ہوئے کمہار کہنے کے بجائے رشیدی، حمیدی، رحمانی، کہلاتے ہیں اس طرح کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں جو حکم شرعی ہو بتلایئے۔

المستفتی: راشد، محلّہ بھٹی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس طرح اپنے آباء واجداد کی طرف یا پیشہ کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنا شرعاً درست ہے۔ (مستفاد: فتوی محمودیہ قدیم ۱۳۳/۵، جدید ڈابھیل ۳۹۱/۱۹ فتاوی احیاء العلوم ۴۵۱/۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/ ۲۵۱)

گوشت کے پیشہ کی وجہ سے خود کو قریشی کہنا

سوال [۱۱۱۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک قبیلہ قریش ہندوستان آیا انہوں نے گوشت کا کاروبار کیا، مگر کچھ اور مسلمان دوسری برادری کے گوشت کا کاروبار کرنے لگے، کیا ان کو قریش قبیلے میں شامل کر لیا جائے یا وہ خود اپنی مرضی سے شامل ہو جائیں، اس کے لئے آپ کی کیا رائے ہے؟

المستفتی: ارشاد عظیم قریشی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: محض پیشہ گوشت فروشی کی وجہ سے غیر قریشی کا اپنے کو قریشی کہنا تلبیس ہے؛ اس لئے ناجائز ہے، ان کو قریشی میں شامل نہیں سمجھا جا سکتا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۴/۲۴۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۳/ ۵۸۹)

دو مسلمان کا آپس میں ایک دوسرے کو فرعون اور ابوجہل کہنا

سوال [۱۱۱۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ دو شخص آپس میں مذاق سے ایک دوسرے کو فرعون اور ابوجہل کہتے ہیں، ایسے لوگوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا ایسا کہہ کر پکارنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد سلیم، ڈرائیور، مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپس میں ایک دوسرے کو فرعون وابوجہل کہنا سخت گناہ اور حرام ہے۔

ولاتنابزوا بالألقاب. تحته اتفق العلماء على تحريم تلقيب الإنسان بما يكره وموضع آخر: أن الدعاء بالقبيح المكروه منها حرام.
(روح المعاني، زكريا ١٤/ ٢٣٢- ٢٣٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴۸۸/۲۹)

ازراہ تفہیم کسی کو لنگڑا کانا کہنا

سوال [۱۱۱۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید ایک انتہائی عام نام ہے، ایک صاحب نے زید ذکر کیا، مخاطب نے ازراہ تفہیم پوچھا کیا لنگڑا زید؟ یہی زید کا معروف نام ہے، تو کیا ازراہ تفہیم بھی کسی کو لنگڑا یا کانا کہنا منع ہے؟

المستفتی: محمد شمیم اعظمی، انور ہاؤس، طبا قیان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: کسی لنگڑے کو اس کے سامنے اس طرح لنگڑا کہنا کہ اس کو معلوم ہو جائے گالی اور گناہ کبیرہ ہے، ازراہ تفہیم بھی لنگڑا کہنا اور اسی سے مشہور کرنا درست نہیں؛ بلکہ تفہیم کے لئے باپ، دادا کے نام سے منسوب کرنا چاہئے۔
(مستفاد: انوار ہدایت ۳۶۱)

عن أبي موسىؓ، قال:......فقال عمر حين رأى أسماء، من هذه؟ قالت: اسماء بنت عميس، قال عمر: الحبشيه هذه؟ البحرية هذه؟قالت اسماء نعم.... فغضبت وقالت: كلا والله.....وأيم الله لا أطعم طعاماً ولا أشرب شراباً حتى أذكر ما قلت لرسول الله صلى الله عليه وسلم. (بخاري شريف، باب عزوة

خیبر، النسخة الهندية ٢/٦٠٧، رقم:٤٠٧٥، ف:٤٢٣٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍محرم الحرام۱۴۲۲ھ
(فتویٰ نمبر:الف۳۵؍۳۵-۷۰۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲؍۱؍۱۴۲۲ھ

لکڑی کا صندوق جس میں نام وغیرہ لکھے ہوں اس پر بیٹھنا

سوال [۱۱۱۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہم نے ایک لکڑی کا صندوق بنوایا ہے، جس کے اندر چار دروازے ہیں اوران دروازوں میں کتابیں ہیں اور ان میں نام وغیرہ بھی لکھے ہیں، جیسے افتخار احمد، محمد نعیم وغیرہ کیا ہم اس صندوق پر بیٹھ سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: افتخار احمد، محلّہ بھٹی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس صندوق اور دروازوں میں حساب کتاب کے رجسٹر رکھے ہوئے ہیں، جس میں لوگوں کے نام بھی ہوں، جیسا کہ افتخار احمد، نعیم احمد وغیرہ ایسے صندوق اور دروازوں پر بیٹھنا بلا تکلف جائز ہے؛ اس لئے کہ حساب وکتاب کا رجسٹر دنیوی معاملات سے متعلق ہے، دینی کتاب نہیں ہے، اور افتخار احمد، نعیم احمد، ان ناموں کے ساتھ محمد یا احمد لگا ہوا ہے، ان ناموں کا جزء ہے؛ اس لئے بے ادبی نہیں ہے۔

وإذا كتب اسم الله تعالىٰ على كاغذ، ووضع تحت طنفسة يجلسون عليها، فقد قيل: يكره، وقد قيل:؛ لايكره، قال: ألا ترىٰ، أنه لووضع في البيت لا بأس بالنوم على سطحه. (المحيط البرهاني، المجلس العلمي ٨/١٠، رقم: ٩٤٨١، الفتاوى التارتار خانية، زكريا ١٨/٧٠، رقم: ٢٨٠٧١، هندية، زكريا قديم ٥/٣٢٢، جديد ٥/٣٧٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ
(فتویٰ نمبر:الف ۳۸؍۶۳-۶۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹؍۴؍۱۴۲۸ھ

مدینہ منورکو یثرب کہنا

سوال [۱۱۱۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مدینہ منورہ کو یثرب کہنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ادریس، مراد پور، شاہجہاں پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدینہ منورہ کو یثرب کہنا ممنوع ہے۔

عن البراءؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من سمى المدينة يثرب، فليستغفر الله عزوجل هي طابة، هي طابة. (مسند أحمد بن حنبل ٤/٢٨٥، رقم:١٨٧١٨، مجمع الزوائد، دار الكتب العلمية بيروت ٣/٣٠٠، رقم: ٥٧٨٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱/۳۹۱۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۳/۱۴۱۵ھ

مزارات وشہر وغیرہ کے ساتھ شریف لگانا

سوال [۱۱۱۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کسی بزرگ یا ولی کے مزار کے ساتھ یا اس کی بنسبت اس شہر کے ساتھ لفظ ''شریف'' لگانا اوراس کو باعث تکریم سمجھنا کیسا ہے، مثلاً دیوہ شریف، اجمیر شریف وغیرہ ،مگرعرض یہ ہے کہ مکہ، مدینہ، بیت اللہ اور بیت المقدس کے ساتھ لفظ شریف لگانے کی کیا اصل ہے؟

المستفتی: محمد سرتاج ، بارہ بنکی،

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، بیت اللہ شریف اور بیت المقدس کے ساتھ شریف کا لفظ اس لئے لگایا جاتا ہے، کہ ان مقامات کا تقدس اور شرافت دنیا کے تمام مقامات سے بلند وبرتر ہے، اور ان کا تقدس اور شرافت قرآن وحدیث سے ثابت ہے؛ اس لئے ان کو شریف کہا جاتا ہے، ان کے علاوہ دیگر مقامات کا تقدس قرآن وحدیث سے ثابت نہیں ہے؛ لہٰذا اگر کسی مقام یا شہر میں کسی اللہ والے کی شہریت کی بنا پر اس مقام کے ساتھ شریف کا لفظ لگایا جائے اور مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور بیت المقدس کے تقدس کے برابر نہ سمجھا جائے، اور نہ بولنے والے کے ذہن میں اس طرح کی کوئی بات ہو اور نہ ہی ماحول میں شریف کا لفظ لگانے کی وجہ سے مقامات مقدسہ کی عظمت میں فرق آتا ہے، تو شریف کا لفظ دیگر مقامات کے ساتھ لگانے کی گنجائش حضرت گنگوہیؒ نے فتاوی رشیدیہ ۵۶۳ر میں لکھی ہے؛ لیکن احقر کو مکہ معظّمہ، مدینہ منورہ اور بیت المقدس کے علاوہ دیگر مقامات کے لئے شریف کا لفظ بولنے میں تشویش سی ہوتی ہے، اسی طرح حضرت سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر کے علاوہ امت میں کسی کی بھی قبر کے ساتھ روضہ کا لفظ بولنے میں تشویش پیدا ہوتی ہے، یہ احقر کی اپنی بات ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۰ رصفر المظفر ۱۴۲۹ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۴۶۱/۳۸)	۱۴۲۹/۲/۲۰ھ

کسی قوم وبرادری کو حقیر سمجھنا

سوال [۱۱۱۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کسی قوم کو حقیر سمجھنا کیسا ہے، بہت سے لوگوں کو دیکھا گیا، قوموں کا نام لے کر

حقارت سے پکارتے ہیں، کیا بڑی بڑی کتابوں میں قوموں کے بارے میں کچھ آیا ہے؟

المستفتی: محمد طارق، مدرس مدرسہ تعلیم القرآن، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: کسی قوم اور برادری کو حقیر سمجھنا گناہ کبیرہ ہے؛ اس لئے کہ یہ کبر اور فخر ومباہات ہے، جس کے متعلق سخت وعید آئی ہے، اور اللہ تعالی نے قرآن کریم میں فرمایا کہ انسان کو الگ الگ قبیلے اور خاندان میں اس لئے پیدا فرمایا ہے کہ اعزہ او راقرباء کی پہچان اور تعارف رہے، پھر ان کے ساتھ صلہ رحمی کا معاملہ کیا جاسکے، تفاوت مراتب کی بناء پر ہرگز نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلند مرتبہ والے اور معزز صرف وہی لوگ ہیں، جو متقی اور پرہیز گار ہیں؛ اس لئے کسی قوم کو حقیر سمجھنا ہرگز جائز نہیں، تمام مسلمان عظمت و احترام میں یکساں اور برابر ہیں، کسی بھی برادری کو دوسرے پر عنداللہ کوئی فوقیت نہیں ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ. [الحجرات:۱۳]

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسَى أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِنْهُم. [الحجرات: ۱۱] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴ / جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۱ / ۴۰۵۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۴ / ۶ / ۱۴۱۵ھ

مولانا واچ سروس کا بورڈ لگانا

سوال [۱۱۱۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ زید کی دوکان گھڑی مرمت کرنے کی ہے، نئ گھڑیاں بھی فروخت کی جاتی ہیں، زید نے اپنی دوکان پر مولانا واچ سروس کا پورا بورڈ لگوا رکھا ہے۔ از راہ شرع کیا اس قسم کے نام کے بورڈ دوکان پر لگانے کی ممانعت ہے؟

المستفتی: مہدی حسن، مین مارکیٹ جسپور، اودھم سنگھ نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دوکان کو اپنے نام کے ساتھ منسوب کرنا چاہئے، لفظ مولانا کے ساتھ منسوب کرنا بہتر نہیں ہے، اس سے لفظ مولانا کی حیثیت گھٹ جاتی ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۵/۳۶۰، جدید ڈابھیل ۱۹/۳۸۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ شعبان المعظم ۱۴۲۱ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۵/۶۸۸۶)

دنیاوی مراعات کی وجہ سے قومیت بدلنا

سوال [۱۱۱۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خالد حسین قوم کے اعتبار سے انصاری یا ترک یا مغل یا سید ہے، کیا دنیوی مراعات کے تحت اپنی قومیت کو تبدیل کر سکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد اظہار، سنبھلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس طرح قومیت اور نسبت بدلنا سخت منع ہے، حدیث شریف میں اس کی سخت وعید آئی ہے کہ ایسا کرنے والے پر جنت کو حرام کہا گیا ہے۔

عن سعد بن أبي وقاصؓ، يقول: سمع أذناي من رسول الله صلى الله عليه وسلم، وهو يقول: من ادعىٰ أبًا في الإسلام غير أبيه يعلم أنه غير أبيه، فالجنة عليه حرام. (صحيح مسلم، باب بيان حال إيمان من رغب

عن أبيه وهو يعلم، النسخة الهندية ۱/ ۵۷، بيت الأفكار رقم:۶۳، صحيح البخاري، باب من أدعى إلى غير أبيه، النسخة الهندية ۲/ ۱۰۰۱، رقم:۶۵۰۹، ف: ۶۷۶۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۲/ ۴۸۳۴)

قانونی مجبوری کی بناء پر خود کو دوسرے خاندان کی طرف منسوب کرنا

سوال [۱۱۱۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سرکاری ملازمت میں بعض قانونی مجبوریوں کی بنا پر اعلیٰ خاندان نہ بتا کر ادنیٰ خاندان بتا کر ملازمت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں کسی دوسرے مسلمان کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ برائے مہربانی جواب سے نوازیں۔

المستفتی: منصار الحق، سہسپور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اس طرح اپنے آپ کو دوسرے خاندان کی طرف منسوب کرنے کی حدیث شریف میں ممانعت آئی ہے؛ اس لئے جائز نہیں ہوگا۔

عن أبي ذرؓ، أنه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ليس من رجل ادعى لغير أبيه، وهو يعلمه إلا كفر. الحديث (صحيح مسلم، باب بيان حال ايمان من رغب عن أبيه، وهو يعلم، النسخة الهندية ۱/ ۵۷، بيت الأفكار رقم:۶۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ رجب المرجب ۱۴۱۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۴/ ۴۹۵۰)

لے پالک لڑکی کی ولدیت میں اپنا نام لکھانا

سوال [۱۱۱۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں نے ایک لڑکی صرف ایک دن کی لے کرمثل اپنی لڑکی کے پالی ہے، اب اس کی شادی کا موقع ہے، میں اس لڑکی کی شادی کے کارڈ میں اپنی ولدیت لکھا سکتا ہوں یا نہیں؟ اور نکاح نامہ میں اپنی ولدیت لکھا سکتا ہوں یا نہیں؟ شرع کی رو سے جواب دینے کی زحمت کریں عین نوازش ہوگی، لڑکی کے باپ کا نام عابد حسین ہے، اور یہ مرحوم ہیں۔

المستفتی: اسلام الدین، محلّہ دولت باغ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: شادی کارڈ اور نکاح نامہ میں باپ کو چھوڑ کر آپ کا اپنی ولدیت لکھنا ناجائز اور سخت گناہ کی بات ہوگی۔ حدیث شریف میں غیر باپ کی طرف منسوب کرنے کی سخت مذمت اور وعید آئی ہے؛ اس لئے عابد حسین جو لڑکی کا باپ ہے، اس کی ولدیت لکھنا ضروری ہے۔

عن أبي ذرؓ، أنه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ليس من رجل ادعى لغير أبيه، وهو يعلمه إلا كفر، ومن ادعى ماليس له، فليس منا وليتبوأ مقعده من النار. (صحيح مسلم، باب بيان حال ايمان من رغب عن أبيه، وهو يعلم ، النسخة الهندية ۵۷/۱، بيت الأفكار رقم: ۶۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۷/۶۲۶۳)

یتیم بچی کی پرورش کرنے والے کا باپ کی جگہ اپنا نام لکھنا

سوال [۱۱۱۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں نے ایک یتیم بچی حصول ثواب کی نیت سے اپنی پرورش میں لی ہے، اب جو دنیاوی امور کے لحاظ سے کاغذات اور ڈاکومینٹ بنتے ہیں، ان میں اس لڑکی کے والد کے نام کا مسئلہ ہے کہ آیا اس بچی کے حقیقی والد کا نام لکھا جائے یا میں اس کالم میں اپنا نام لکھوں؟

ایک مولانا صاحب یوں کہتے ہیں کہ آپ اپنا نام بھی لکھ سکتے ہیں؛ جبکہ ایک دوسرے مفتی صاحب کا کہنا ہے کہ تمام کاغذات میں اس بچی کے حقیقی باپ کا ہی نام لکھا جائے گا، آپ کے لئے اپنا نام لکھنا جائز نہیں ہے، اب میرا دماغ پریشان ہے کہ ان میں سے کس کے بیان کردہ مسئلہ پر عمل کروں؛ اس لئے آپ سے عاجزانہ ومخلصانہ درخواست ہے کہ اس سلسلہ میں میری شرعی رہنمائی فرمائیں۔

المستفتی: فیاض الدین، انصاری، ملک جہانگیر آباد، دھامپور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفیق: یتیم بچی کے ڈاکومینٹ وغیرہ میں اس کے والد حقیقی کا نام لکھا جائے گا اور وہ بچی اپنے حقیقی والد ہی کی طرف منسوب ہوگی کفالت کرنے والے کے لئے اس کے والد کی جگہ اپنا نام لکھنا اور اس کو اپنی طرف منسوب کرنا درست نہیں ہوگا؛ البتہ بطور کنیت وتخلص کے پرورش کرنے والے کا نام حقیقی باپ کے نام کے ساتھ اضافہ کرنے کی گنجائش ہے۔

قال الله تعالیٰ: أدعوهم لأبائهم، هو أقسط عند الله، فإن لم تعلموا آباؤهم فاخوانكم في الدين (الاحزاب) وارشد بقوله إلى أن الأولیٰ والأعدل أن ينسب الرجل إلى أبيه نسبًا. (تفسير قرطبي ١٤/ ١١٩)

عن أبي عثمان، عن سعد-رضى الله عنهم-قال: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم: يقول: من ادعىٰ إلى غير أبيه، وهويعلم أنه غير أبيه، فالجنة عليه حرام. (صحيح البخاري، باب من ادعى إلى غير أبيه، النسخة الهندية ٢/ ١٠٠١، رقم: ٦٥٠٩، ف:٦٧٦٦)

ولو كنى إبنه الصغير بأ بي بكرا وغيره الصحيح أنه لا بأس به، فإن الناس يريدون التفاؤل أنه يصير أبا في ثاني الحال لا التحقيق في الحال. (هندية، الباب الثاني والعشرون في شمية الأولاد، زكريا قديم ٥/٣٦٢، جديده/١٨/٤١٨، المحيط البرهاني،المجلس العلمي بيروت ٨/٩٦، رقم:٩٦٧٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٥/١٧١، الفتاوى التارتارخانية، زكريا ١٨/٢٢٩، رقم:٢٨٦٠٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٠/ربیع الثانی ١٤٣٥ھ
(فتویٰ نمبر:الف ١١٤٨١/٤٠)

(۲۸) باب الجوالة والانترنیت

ٹی وی، موبائل، کمپیوٹر وغیرہ کے احکام

سوال [۱۱۱۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ٹی وی، موبائل، کمپیوٹر وغیرہ کی بیع وشراء نیز گھر میں رکھنا اور ان کی مرمت کرنے کے بارے میں شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے، ان آلات نیز ویڈیو، انٹرنیٹ کا استعمال کرنا ساتھ ہی ان کے استعمال کرنے کا طریقہ سیکھنا اور سکھانا جائز ہے یا نہیں؟ عام طور پر جن چیزوں کا محض آنکھ سے دیکھنا جائز ہے، کیا ان وسائل (اسکرین) پر بھی ان کا دیکھنا جائز ہوگا یا نہیں؟ حالانکہ ٹی وی اور انٹرنیٹ آج کل انتہائی ضروری سمجھا جارہا ہے؛ کیونکہ ان میں جہاں بے شمار منکرات مثلاً بے حیائی فحاشی نیم برہنہ عورتوں کا سامنے آنا اس کے علاوہ بے شمار اچھے پروگرام بھی دکھائے جاتے ہیں، مثلاً تلاوت قرآن مجید، اذان، بیانات، اسلامی پیغامات، جدید ترقیاتی آلات، قرآن وحدیث سے ریسرچ کردہ امور وایجادات اللہ کی دوسری ان گنت نعمتیں، اگر مسلمانوں کے خلاف کچھ پروپیگنڈہ ہورہا ہو، تو اس کو دیکھ کر مسلمان تیار ہوسکتے ہیں، اس طرح مسلمان کے مفاد پر بے شمار پروگرام دکھائے جاتے ہیں، جن کو بغیر جانے مسلمانوں کا بسا اوقات نقصان عظیم کا خوف ہوتا ہے۔ ازروئے شرع ان کو دیکھا جاسکتا ہے یا نہیں؟

نیز علماء سیاست داں قوم ومرکزی حکومت کے مابین تعلقات قائم کرنے والے سیاستداں علماء جو عوام کے حقوق کے تحفظ کے لئے انتھک سعی کرتے ہیں، ایسے خواص کے لئے کیا حکم لاحق ہوگا۔ مزید ان وسائل کے اسکرین پر نظر آنے والی تصویروں کا کیا حکم ہے؟ جبکہ اس

میں جماد نہیں ہے، ان تصویرات کی تحقیق اور تصویرات کے جائز اور ناجائز ہونے کا مدار کیا ہے؟

المستفتی: مسیح الرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: موبائل اور کمپیوٹر کا گھر میں رکھنا ان کی بیع وشراء اور ان کی مرمت کا پیشہ اختیار کرنا بلاشبہ جائز ہے؛ کیونکہ ان دونوں کی وضع گناہ کے کاموں کے لئے نہیں ہوئی ہے؛ بلکہ موبائل ذرائع ابلاغ ومواصلاتی نظام کی ترقی کے لئے اور کمپیوٹر مختلف تعلیمی ودفتری سرگرمیوں کی انجام دہی کے لئے ایجاد کیا گیا ہے؛ البتہ جو شخص ان پر ناجائز چیزیں دیکھے گا، اس کا گناہ اسی کے سر ہوگا؛ لیکن ٹی وی ہمارے زمانہ میں مجمع الفواحش ہے، اس پر زیادہ تر فحش پروگرام نشر کئے اور دیکھے جاتے ہیں اور تجربہ سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ جن گھرانوں میں ٹی وی موجود ہے، اس گھر کے لوگ اس کے فحش پروگراموں سے بالکل محفوظ نہیں رہتے؛ اس لئے سداً للباب ٹی وی گھر میں رکھنے کو ناجائز قرار دیا جائے گا؛ البتہ اس پر جائز پروگرام کی نشریات بھی ہوتی ہیں؛ اس لئے اس پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے ٹی وی کی مرمت کا پیشہ اور اس کا کاروبار جائز ہوگا، تاہم ایک گونہ تعاون علی الاثم کی وجہ سے اس کی مرمت وکاروبار مکروہ ہوگا اور تصویر سازی، ویڈیو گرافی کے سلسلہ میں تفصیل یہ ہے کہ اگر اسے محض تفریح طبع کے لئے یا دنیاوی پروگراموں میں کیا جائے، تو یہ ناجائز ہے۔

عن عبد اللّٰہ بن مسعودؓ، قال: سمعت النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول: إن أشد الناس عذابًا عند اللّٰہ یوم القیامة المصورون. (صحیح البخاري، باب عذاب المصورین یوم القیامة، النسخة الهندیة ۲/ ۸۸۰، رقم: ۵۷۱۷، ف: ۵۹۵۰)

لیکن مسلمانوں کی ملی واجتماعی ضرورت کی خاطر مثلاً باطل قوتوں کے ذریعہ مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی سازشیں اور پروپیگنڈوں کے خلاف آواز بلند کرنے اور اسے مضبوط بنانے کی غرض سے جو ویڈیو گرافی، تصویر سازی کی جائے یا پاسپورٹ، ایڈنٹی کارڈ

وغیرہ کے موقع پر جو فوٹو کھینچوائے جائیں تو تصویر سازی کے اصلاً ناجائز ہونے کے باوجود بھی **الضرورات تبیح المحظورات** کے ضابطہ سے علماء نے اس کی گنجائش رکھی ہے۔

الأمور بمقاصدها. (الأشباه قديم ٥٣، قواعد الفقه اشرفي ٦٢، رقم: ٥١)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶ر شعبان المعظم ۱۴۳۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۹/۱۰۴۸۶)

دین کی نشر واشاعت کے لئے ٹی وی یا انٹرنیٹ استعمال کرنا کیسا ہے؟

سوال [۱۱۱۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل ٹی وی چینلس اور انٹرنیٹ کے ذریعے جدت پسند اور مغربی تہذیب سے متأثر لوگ جیسے ڈاکٹر ذاکر نائک وغیرہ دین کی باتوں کا عنوان لگا کر مسلمانوں کو اپنے علماء سے دور کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، تو اس کے دفاع کے لئے اور امت کی صحیح رہنمائی کے لئے کچھ علماء نے ٹی وی چینلس اور انٹرنیٹ پر ویڈیو کلپس کے ذریعہ اپنے دینی پروگرامس شروع کئے ہیں، تو کیا یہ پروگرامس دیکھنا جائز ہے؟ جبکہ اسلامک چینلس میں وقفہ ہوتا ہے، جس میں ناجائز تصویریں بھی آتی ہیں (مثلاً عورتوں کی تصویر) تو کیا اس طرح کے پروگراموں کو دیکھنا جائز ہے؟

المستفتی: عبید اللہ بھاگل پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: خوش عقیدہ لوگوں کے لئے فرق باطلہ کی تردید کے واسطے ٹی وی، چینل کے بجائے لیپ ٹاپ اور انٹرنیٹ کے ذریعہ سے اپنے تردیدی بیان اور اپنے مدعیٰ کا نشر کرنا زیادہ بہتر ہے، اور ٹی وی چینل کی صورت میں نامحرم عورتوں کی عریاں

تصویر بھی آتی ہے؛ اس لئے اس کے بجائے ویب سائٹ اور انٹرنیٹ کا استعمال بہتر ہے۔

الأمور بمقاصدها. (الأشباه، قديم تحت القاعد الثانية ۵۳)

ما أبيح للضرورة يتقدر بقدرها. (الأشباه قديم تحت القاعدة الخامسة ص ۱٤۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍صفر المظفر ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۹۰۰/۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۲/۱۳ھ

انٹرنیٹ سے کتابیں لوڈ کرنے کا حکم

سوال [۱۱۱۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک طالب علم جو ڈاکٹری تعلیم حاصل کرتا ہے، اور ڈاکٹری درجہ کی کتابیں انتہائی مہنگی ہوا کرتی ہیں اور وہ اسے خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا اور وہ طالب علم کمپنی کے نمبروں کو خفیہ طور پر نیٹ سے حاصل کر کے اس سے فائدہ اٹھاتا ہے، اور کمیٹی کی طرف سے اس طرح فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں ہوتی ہے، تو اس نے ان کتابوں کو حاصل کر کے نیٹ پر عام کر دیا کہ جس سے ہر ڈاکٹری درجہ میں پڑھنے والا اس سے فائدہ اٹھا سکے، اب اس کے ذیل میں دو باتیں مطلوب ہیں:

(۱) کیا اس طریقہ سے کمپنی کی اجازت کے بغیر حاصل کر کے فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟

(۲) اب جو نیٹ پر کتاب رکھ دی گئی ہے، اس سے دوسرا طالب علم فائدہ اٹھا سکتا ہے یا نہیں؟ حالانکہ دوسرے طالب علم کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا ہے۔

المستفتی: محمد سلمان سورتی، گجرات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مسئولہ صورت میں کمپنی کی اجازت کے بغیر خفیہ

طور پر نیٹ کے ذریعہ مذکورہ کتابیں حاصل کرنا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ عرفی اور قانونی اعتبار سے ان کتابوں کی اشاعت کا حق کمپنی کے نام محفوظ ہے اور اس میں بلا اجازت تصرف کرنا یقیناً حق تلفی اور گناہ ہے، لیکن جب یہ کتابیں کسی طرح حاصل کر کے کسی مفت ویب سائٹ پر ڈالدی جائیں اور وہاں سے کوئی شخص فائدہ اٹھائے ،تو وہ حق تلفی کرنے والوں میں شامل نہ ہوگا؛ کیونکہ اس کے اس عمل کی وجہ سے کمپنی کا کوئی نقصان نہیں ہورہا ہے؛ بلکہ ساری ذمہ داری ناحق طور پر ویب سائٹ پر ڈالنے والے پر ہی رہے گی۔

لایجوز لأحد أن یتصرف في ملک غیرہ بلا إذنه. (شرح المجلة، اتحاد بکڈپو دیوبند ۱/ ۶۱، رقم المادہ: ۹۶)

المباشر ضامن وإن لم یتعمد، المباشر هو الذي یلي الأمر بنفسه، فإنه یضمن الضرر الذي یتولد عن فعله سواء کان عن قصد منه، أو لم یکن. (شرح المجلة، اتحاد بکڈپو دیوبند ۱/ ۶۰، رقم المادة: ۹۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۱۱۹۹۶/۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۴/۱۴ھ

انٹرنیٹ پر کئے گئے نکاح کا حکم

سوال [۱۱۱۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک لڑکا عرفان الدین ولد محمد ابراہیم محلّہ شیدی سرائے مرادآباد انٹرنیٹ کے ذریعہ کمپیوٹر کے اسکرین پر نظر آرہا تھا اور لڑکی اپنے گھر پر کمرہ میں تھی اور قاری نعیم صاحب جو قاضی بن کر نکاح پڑھا رہے تھے، ان کے پاس لڑکی موجود تھی اور قاری نعیم صاحب نے یہ سمجھا کہ لڑکا جو انٹرنیٹ پر نظر آرہا ہے، وہ مجلس نکاح میں ہے؛ چنانچہ قاری صاحب نے انٹرنیٹ پر نکاح پڑھا دیا اور خارج میں دو گواہ موجود تھے، تو یہ نکاح منعقد ہوا

یانہیں؟ اور لڑکا آج تک دبئی سے نہیں آیا ہے؛ جبکہ نکاح کا یہ واقعہ تین سال پہلے کا ہے۔

المستفتی: شفاعت علی خان، محلّہ لاکڑی والان، کوئل والی مسجد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سوالنامہ کے مطابق قاری نعیم صاحب مرحوم نے قاضی بن کر کے انٹرنیٹ پر جو نکاح پڑھایا ہے، وہ نکاح شرعی طور پر درست نہیں ہوا ہے؛ اس لئے کہ انٹرنیٹ پر جو نظر آرہا تھا، وہ لڑکے کا عکس ہے، بنفس نفیس لڑکا نہیں ہے اور مجلس نکاح میں لڑکے کا بنفس نفیس یا اس کے وکیل کا براہ راست حقیقی طور پر موجود ہونا لازم ہوتا ہے اور یہاں ایسا نہیں ہوا؛ اس لئے یہ نکاح منعقد نہیں ہوا۔

ومن شرائط الإيجاب والقبول اتحادالمجلس لو حاضرين، وإن طال وتحته في الشامية: قال في البحر: فلو اختلف المجلس لم ينعقد، فلو أوجب أحدهما، فقام الآخر، أو اشتغل بعمل آخر بطل الإيجاب؛ لأن شرط الارتباط اتحاد الزمان، فجعل المجلس جامعًا تيسرًا، وأما الفور فليس من شرطه، ولو عقدا وهما يمشيان ويسيران على الدابة لايجوز. (شامي، كتاب النكاح، مطلب التزوج بإرسال كتاب،زكريا ٤/٧٦، كراچي ٣/١٤)

وشرط حضور شاهدين حرين، أو حر و حرتين مكلفين سامعين قولهما معًا على الأصح. (الدر المختار مع الشامي، زكريا ٤/٨٧تا٩٢، كراچي ٣/٢١تا٢٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/ ۱۲۰۷۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۶/۹ھ

موبائل فون سے متعلق چند سوالات کے جوابات

سوال [۱۱۱۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ (۱) موبائل مسجد میں لانا درست ہے یا نہیں؟

(۲) بھول یا غلطی سے کوئی شخص نہ بند کرے، تو اس سے توہین ہے، اور مسجد میں تکرار یا سخت رویہ اپنانا کیسا ہے؟

(۳) بسا اوقات حرم مسجد میں لوگ موبائل سے گفتگو کرتے ہیں کوئی تجارت کی ضروری بات کرتا ہے، کوئی اپنے بچوں کی خیریت لیتا ہے، کوئی ڈاکٹر مریضوں کو رہنمائی کرتا ہے، اس قسم کی بات مسجد میں موبائل فون پر جائز ہے؟ جب کہ یہ بات کرنے والے نمازیوں کا احترام بھی ملحوظ رکھتے ہوں، اس قسم کی گفتگو جائز ہے یا نہیں؟ اس کی بھی وضاحت فرمادیں کہ اس حکم میں معتکف وغیر معتکف یکساں ہیں یا فرق ہے؟ حرم سے باہر وضوخانہ میں گفتگو کی اجازت ہے؟

(۴) نماز کی حالت میں موبائل بند کرنے کی گنجائش ہے یا نہیں؟

المستفتی: سعید الرحمٰن، ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) موبائل ساتھ لے کر مسجد میں آنا شرعًا جائز ہے؛ البتہ موبائل کھلا رکھ کر مسجد میں آنا احترام مسجد کے خلاف ہے؛ کیونکہ اگر اچانک موبائل کی گھنٹی بجنی شروع ہو جائے، تو مسجد میں شور وغل ہوگا؛ جو کہ ممنوع ہے؛ اس لئے مسجد میں آنے سے پہلے موبائل بند کر لینا چاہئے۔

ودل تعليلهم أن المبيع لو لم يشغل البقعة لا يكره إحضاره كدراهم يسيرة، أو كتاب ونحوه. (شامي، كتاب الصوم، باب الإعتكاف، زكريا ۳/ ٤٤٠، كراچي ۲/ ۳۲۷)

السادس أن لا يرفع فيه الصوت من غير ذكر الله تعالىٰ. (هندية، الباب الخامس في آداب المسجد، زكريا قديم ۵/ ۳۲۱، جديد ۵/ ۳۷۲)

(۲) بھولے سے موبائل بند نہ کرنے کی بناء پر مسجد میں گھنٹی بجنے لگے، تو اس کی وجہ

سے جھگڑا کرنا درست نہیں؛ بلکہ اس کو نرمی سے سمجھا دینا چاہئے اور مسئلہ شرعی سے آگاہ کر دینا چاہئے؛ اس لئے کہ بھول ونسیان سے کوئی انسان پاک نہیں۔

عن أبي ذر الغفاري، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الله قد تجاوز عن أمتي الخطأ، والنسيان، وما استكرهوا عليه. (ابن ماجه شريف، باب طلاق المكره والناسي، النسخة الهندية ١/ ١٤٧، دارالسلام رقم: ٢٠٤٣)

السادس: أن لا يرفع فيه الصوت من غير ذكر الله تعالىٰ. (هندية، زكريا قديم٥/ ٣٢١، جديد ٥/ ٣٧٢)

(۳) تجارت سے متعلق کوئی ضروری بات ہو یا گھر والوں کی خیریت لینی ضروری ہو یا اسی طرح کسی مریض کی رہنمائی ضروری ہو، تو آداب مسجد کا لحاظ رکھتے ہوئے حدود مسجد کے اندر نہایت مختصر انداز میں بات کر کے موبائل بند کر دینا چاہئے جس سے کسی بھی نمازی کو کسی طرح کا خلل نہ ہو، بات کرنے والا معتکف ہو یا غیر معتکف سب کیلئے یہی حکم ہے؛ البتہ غیر معتکف کے لئے بہتر یہ ہے کہ حدود مسجد سے باہر وضوخانہ وغیرہ میں گفتگو کرلے۔

لابأس بالحديث في المسجد إذاكان قليلاً. (شامي، كتاب الصوم، باب الإعتكاف، زكريا٣/ ٤٤٢، كراچی٢/ ٤٥٠)

الكلام المباح من حديث الدنيا يجوز في المساجد، وإن كان الأولىٰ أن يشتغل بذكر الله تعالىٰ.....أقول ويؤخذ من هذا أن الأمر الممنوع منه إذا وجد بعد الدخول بقصد العبادة لا يتناوله. (شامي، مطلب في الغرس في المسجد، زكريا ٢/ ٤٣٦، كراچي ١/ ٦٦٢، الموسوعة الفقهية الكويتية٣٧/ ٢٠٧)

(۴) آدمی کو اس بات کا اہتمام والتزام کرنا چاہئے کہ نماز شروع کرنے سے پہلے موبائل کی گھنٹی بند کر دے؛ لیکن اگر اتفاقاً کبھی گھنٹی بند کرنا بھول گیا اور دوران نماز گھنٹی بجنے لگی، تو جیب میں رکھے رکھے ایک ہاتھ سے موبائل بند کرنے کی گنجائش ہے، اس سے نماز میں کوئی خرابی نہیں آئے گی۔ (مستفاد: انوار رحمت ۱۲۲)

ولو رفع العمامة ووضعها على الأرض، أو رفعها من الأرض ووضعها على الرأس لا تفسد؛ لأنه يتم بيد واحدة من غير تكرار......ولو لبس قلنسوة، أو بيضة، أو نزعها لا تفسد. (قاضيخان، فصل فيما يفسد الصلاة، زكريا ١/ ٨١، وعلى هامش الهندية ١/ ١٢٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸/ ۹۶۲۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱/۶/ ۱۴۲۹ھ

ویڈیو کالنگ کا شرعی حکم

سوال [۱۱۱۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایسے موبائل سے بات کرنا جس پر مخاطب کی تصویر آتی ہو کیسا ہے؟

المستفتی: عبد الرشید قاسمی، سیڈھا بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آج کل ایسے موبائل چل پڑے ہیں، جن میں مخاطب کی صورت نظر آتی ہے اور جب تک بات کی جاتی ہے، تب تک نظر آتی ہے، اور بات ختم ہونے کے بعد ختم ہو جاتی ہے، یہ تصویر نہیں ہوتی ہے؛ بلکہ انسان کا عکس ہوتا ہے، جیسا کہ شیشے میں نظر آتا ہے، یہ اگر چہ عکس ہے؛ لیکن کسی نامحرم عورت کا عکس آتا ہو، تو بلا ضرورت قطعاً جائز نہیں ہے؛ البتہ نامحرم عورت کا عکس نہیں ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے؛ بلکہ بعض دفعہ تجارتی اور معاملاتی امور میں بہتر ہی ثابت ہوتا ہے۔

أما الصورة التي ليس لها ثبات واستقرار وليست منقوشة على شيئ بصفة دائمة، فإنها بالظلأشبه (تكملة فتح الملهم، باب تحريم صورة الحيوان، اشرفيه ديو بند ٤/ ١٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۴۶۳)

موبائل میں گھنٹی کی جگہ قرأت وغیرہ لگانا

سوال [۱۱۱۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) موبائل فون کی گھنٹی کی جگہ السلام علیکم یا لا الہ الا اللہ جیسے فٹ کرنا کیسا ہے؟

(۲) موبائل فون کی گھنٹی دو طرح کی ہوتی ہے، ایک گھنٹی تو وہ ہوتی ہے، جو فون آنے پر آگاہ کرتی ہے، دوسری گھنٹی وہ ہوتی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ آپ کا فون مطلوبہ جگہ جا رہا ہے، کیا دونوں گھنٹیوں کا مسئلۂ بالا کے بارے میں ایک ہی حکم ہے؟

(۳) ان مذکورہ گھنٹیوں کی جگہ کسی قاری کی قرأت حدراً یا ترتیلاً فٹ کرنا کیسا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱/۳) موبائل کی گھنٹی کی جگہ السلام علیکم یا لا الہ الا اللہ وغیرہ کلمات یا کسی قاری صاحب کی قرأت فٹ کرنا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ اولاً تو ان کلمات کا بے محل استعمال کرنا لازم آتا ہے۔ نیز ان کلمات کی توہین بھی ہوتی ہے؛ کیونکہ بسا اوقات آدمی استنجاء یا بیت الخلاء میں ہوتا ہے اور وہیں فون آنے لگتا ہے اور ان کلمات یا قرأت کی آواز آنی شروع ہو جاتی ہے؛ اس لئے ان کلمات کا یا کسی قاری صاحب کی قرأت کا موبائل کی گھنٹی میں فٹ کرنا جائز نہیں ہے۔

وكذا قولهم بكفره إذا قرأ القرآن في معرض كلام الناس كما إذا اجتمعوا فقرأ فجمعناهم جمعاً وله نظائر كثيرة كلها ترجع إلى قصد الاستخفاف به قال قاضيخان: الفقاعي إذا قال عند فتح الفقاع صل على محمد قالوا يكون آثمًا، وكذا الحارس إذا قال في الحراسة لا إله إلا الله يعني لأجل الإعلام بأنه مستيقظ. (الاشباه والنظائر قديم ۵۳)

یکره أن یقرأ في الحمام؛ لأنه موضع النجاسات ولا یقرأ في بیت الخلاء. (هندیة، الباب الرابع، زکریا قدیم ٥/٣١٦، جدید٥/٣٦٥، قاضیخان، زکریا جدید ٣/٣٠٦، وعلی هامش الهندیة٣/٤٢٢)

(۲) السلام علیکم کے علاوہ کوئی اور چیز کلمہ لا إلہ الا اللہ یا آذان یا آیت قرآنی وغیرہ فٹ کرنا جائز نہیں اور السلام علیکم بھی صرف اسلئے جائز ہے کہ موبائل میں فون کرنے والا بیت الخلاء میں رہ کر کے نہیں کرے گا؛ لہٰذا اس کے پاس سلام کی آواز آنے میں کوئی قباحت نہیں۔

وکذا قولهم بکفره إذا قرأ القرآن في معرض کلام الناس کما إذا اجتمعوا فقرأ فجمعناهم جمعًا. (الأشباه والنظائر قدیم ٥٣)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۵۷۹/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۴/۵ھ

موبائل کی گھنٹی میں کلمۂ طیبہ سیٹ کرنا

سوال [۱۱۱۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ موبائل وغیرہ کی گھنٹی آتے وقت یا ہمارے فون کی گھنٹی دوسرے کے پاس جاتے وقت میں کلمہ لا الہ الا اللہ یا کوئی دعا وغیرہ کا سیٹ کرنا کیسا ہے؟ اس سے سننے والے کو بھی فائدہ ہوگا، جائز بلا کراہت ہے یا ناجائز؟ وضاحت فرمادیں۔

المستفتی: محمد یعقوب رشیدی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: موبائل کی گھنٹی میں لا الہ الا اللہ وغیرہ بھرنا ان کلمات کی بے ادبی کے مرادف ہے، بعض دفعہ بیت الخلاء میں بھی گھنٹی آجائے، تو کلمہ کی سخت

بے حرمتی ہے؛ اس لئے لا الہ الا اللہ وغیرہ موبائل میں بھرنا جائز نہیں۔ الاشباہ والنظائر میں لکھا ہے کہ چوکیدار اگر بلند آواز سے کلمہ لا الہ الا اللہ اس لئے پڑھتا ہے تاکہ لوگوں کو اس کی بیداری کا علم ہوجائے، تو گنہگار رہوگا۔

وكذا الحارس إذا قال في الحراسة: لاإله إلا الله يعنى لأجل الإعلام بأنه مستيقظ (أي يكون آثما) (الاشباه والنظائر قديم ٥٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍صفر المظفر ۱۴۲۹ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۹۴۵۲/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۲/۱۱ھ

موبائل فون پر گھنٹی کے بجائے گانا بجنا

سوال [۱۱۱۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہم کسی کو فون کرتے ہیں دوسری طرف سے رینگ ٹون کی جگہ گانا لگا ہوتا ہے، بات کرنا بھی ضروری ہوتا ہے، اگر کان سے فون ہٹاتے ہیں، تو دوسری طرف سے کال وصول کرنے کا پتہ نہیں چل پاتا، ان حالات میں گانا بجنے کے باوجود فون کو کان پر لگائے رکھنا جائز ہے یا ناجائز؟

المستفتی: محمد ایوب، کیلاش نگر، دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب آپ کے فون میں گانا اور میوزک وغیرہ کی آوازیں نہیں ہیں اور ضرورت پر آپ نے دوسرے کو فون کیا ہے، اور اس کے فون سے فون کی گھنٹی کی آواز آنے کے بجائے گانے کی آواز آرہی ہے، اگر آپ کا ارادہ اس کا سننا نہیں ہے؛ بلکہ صاحب موبائل سے رابطہ قائم کرنا ہے، تو یہ ایسا ہے جیسا کہ سڑک پر سے جلوس نکلتے وقت گانا اور میوزک بینڈ باجہ کی آواز آپ کو سنائی دیتی ہے، اسی طرح اس فون میں سنائی دینے

والے باجے اور میوزک کی آواز کا حکم ہے کہ جس طرح بینڈ باجے کی آواز آپ کے کان میں پڑنے سے آپ گنہگار نہیں ہیں، اسی طرح یہاں بھی گناہ گار نہیں ہوں گے؛ اس لئے کہ آپ اس کے سننے کا ارادہ نہیں رکھتے ہیں، غیر اختیاری طور پر آپ کے کان میں آواز آرہی ہے؛ جبکہ آپ کے دل میں اس کی نفرت ہے۔

الأمور بمقاصدها. (الأشباه والنظائر، زکریا ۱۹۲، قدیم ۵۳)

وإن سمع بغتةیکون معذوراً ویجب أن یجتهد أن لا یسمع. (شامي، کتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغیره، زکریا ۹/۵۶۶، کراچي ۶/۳۹۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/۱۱۳۹۶)

اسکرین پر کلمہ لگا ہونے کی حالت میں موبائل بیت الخلاء میں لے جانا

سوال [۱۱۱۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ موبائل کی اسکرین پر کلمہ حروف مقطعات وغیرہ کا لگانا اور اس کو بیت الخلاء وغیرہ میں لیجانا کیسا ہے؟ جبکہ موبائل پر وہ چیز خوب صاف ہمہ وقت نظر آتی ہے؛ لیکن شیشہ کے اندر رہتی ہے۔

المستفتی: محمد اویس کاسگنج، ایٹہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: موبائل اسکرین پر حروف مقطعات یا کلمہ وغیرہ کے لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ البتہ بیت الخلاء جاتے وقت موبائل بجائے اپنے ہاتھ میں رکھنے کے اپنی جیب یا بیت الخلاء سے باہر رکھنے کا اہتمام کریں۔

فلو نقش اسمه تعالیٰ واسم نبیه صلی اللہ علیه وسلم استحب أن یجعل الفص في کمه إذا دخل الخلاء. (شامي، کتاب الحظر والإباحة، فصل في النظر، زکریا ۵۱۹/۹، کراچي ۳۶۱/۶، الموسوعة الفقهية الکویتية ۲۱/۳٤ - ۲۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍صفر المظفر ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۷۳۸/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۲/۲۹ھ

عورتوں کا ٹیلیفون پر سلام وکلام کا حکم

سوال [۱۱۱۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عورت ٹیلیفون اور موبائل کی گھنٹی بجنے پر جواباً غیر محرم مرد سے کس طرح بات کرے گی؟ غیر محرم نے سلام کیا تو عورتیں کس طرح جواب دیں گی؟

المستفتی: محمد حامد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر ٹیلیفون وغیرہ پر بات کرنے کا اتفاق ہوجائے اور ضرورت پڑ جائے، تو بات کرنے کی گنجائش ہے، مگر اجنبی مرد سے بات کرنے میں نرم لہجہ اختیار نہ کرے؛ بلکہ ایسا انداز اختیار کرے، جس سے الفت پیدا نہ ہو۔

قال اللہ تعالیٰ: فَلا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوْفًا. (الاحزاب: ۳۲)

(۲) فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر فتنہ کا اندیشہ ہو، تو اجنبیہ سے سلام نہ کیا جائے اور اس کے سلام کا زبان سے جواب نہ دیا جائے؛ بلکہ دل سے جواب دیدے اور اگر فتنہ کا اندیشہ نہیں ہے، مثلاً عورت بوڑھی ہے، تو سلام کرنے کی گنجائش ہے، فون پر

سلام کرنے میں بھی یہی تفصیل ہے۔

ولا يكلم الأجنبية إلا عجوزًا عطست، أو سلمت، وكذا الرجل مع المرأة إذا التقيا يسلم الرجل أولاً، وإذا سلمت المرأة الأجنبية على رجل إن كانت عجوزًا رد الرجل عليها السلام بلسانه بصوت تسمع، وإن كانت شابة رد عليها في نفسه، وكذا الرجل إذا سلم عليامرأة أجنبية، فالجواب فيه على العكس. (شامي، كتاب الحظر و الإباحة، فصل في النظر، زكريا ٩/ ٥٣٠، كراچي ٦/٣٦٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۸۹۶۷/۳۸)

(۲۹) باب المتفرقات

حساب

سوال [۱۱۱۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک گھڑی ساز کی دوکان پر گیا، تو گھڑی ساز کا نوکر تھا، اس نے ایک گھڑی کی قیمت پچاس روپیہ بتائی ہم نے اور ہمارے ساتھی نے مل کر ساجھے میں ۲۵-۲۵/ روپیہ دے کر خرید لی، پھر دوکاندار اپنی دوکان پر گیا، اس نے نوکر سے معلوم کیا کچھ فروختگی ہوئی ہے؟ تو نوکر نے بتایا ایک گھڑی پچاس روپیہ کی فروخت ہوئی ہے، تو مالک دوکاندار نے کہا کہ وہ گھڑی ۴۵/ روپیہ کی ہے جاؤ، ان لوگوں کو ۵/ روپیہ واپس کرو، اس نوکر کے دل میں بے ایمانی آ گئی، اس نے ۵/ روپیہ کے بجائے ۳/ روپیہ واپس کئے یعنی ہم دونوں کو ڈیڑھ ڈیڑھ روپیہ واپس کیا اور دو روپئے اپنے پاس رکھ لیے، اب گویا کہ گھڑی کی قیمت ہر ایک کے حصہ میں تیئیس روپئے پچاس پیسے آئے دونوں کی رقم ملا کر ۴۷/ روپئے ہوئے، اس کے بعد نوکر کو کچھ خیال ہوا کہ ان لوگوں کو دھوکا دینا صحیح نہیں ہے، اس نے ہمارے دو روپیہ بھی واپس کردیئے۔ اب ہم نے ۴۷/ روپیہ میں دو روپیہ اور ملا کر حساب لگایا تو ۴۹/ روپیہ ہوئے ایک روپیہ کہاں غائب ہوگیا۔

المستفتی: حافظ ضیاء الاسلام، مدرس مدرسہ بدر العلوم گنگوار حسنپور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس طرح تین روپیہ واپس کرنے پر آپ نے پچاس میں سے تین روپیہ گھٹا کر ۴۷/ روپیہ سمجھا ہے، اسی طرح آپ پر لازم ہے کہ جب بقیہ دو روپیہ واپس کردئے ہیں، تو ۴۷/ میں سے دو روپیہ کو گھٹا کر دیکھتے تو بجائے ۴۹/

کے ۴۵ نظر آجاتے، جب بعد میں دو مزید بھی واپس مل گئے ہیں، تو اس کو گھٹا یا جائے گا یا جوڑا جائے گا، آپ حساب کے اصول سیکھیں اور اس کی مشق کیا کریں، بعد میں ایسی پریشانیوں کا سابقہ نہیں پڑے گا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵ر صفر المظفر ۱۴۱۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۹ر ۳۳۱۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۲/۱۵ھ

چیل کو گوشت کھلانا صدقہ ہے؟

سوال [۱۱۲۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کارِ ثواب سمجھ کر چیلوں کو گوشت کھلانا کیسا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: کارِ ثواب سمجھ کر چیلوں کو گوشت کھلانا اور اس پر خوب پیسہ خرچ کرنا یہ سراسر اسراف اور فضول خرچی ہے، اور عقیدہ کی خرابی کی وجہ سے ناجائز ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳٦٧)

اس لئے ضروری ہے کہ صدقہ کے لئے جائز طریقہ استعمال کیا جائے تاہم کوئی قصاب اپنے پاس بچے ہوئے ناقابل استعمال گوشت کے چھیچھڑے بلی اور چیل کو کھلا دے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

ولا تبذر أي تسرف في الإنفاق في غير حق. قال الشافعي رضی الله عنه: والتبذير إنفاق المال في غير حقه، ولا تبذير في عمل الخير وهذا قول الجمهور، وقال أشهب عن مالك التبذير هو أخذ المال من حقه ووضعه في غير حقه وهو الإسراف وهو حرام لقوله تعالىٰ: إن المبذرين كانوا إخوان الشيطين. (أحكام القرآن للقرطبي، دار الكتب العلمية بيروت ١٠/ ١٦١،

دارالفکر ۱۰/۲٤۷، تحت تفسیر رقم الآیة ۲٦، من سورة الإسراء) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(فتویٰ نمبر: الف خاص ۴۰؍۱۱۴۳۱)

وسیع پنجرہ میں کبوتر پالنا

سوال [۱۱۲۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک کمرہ بشکل پنجرہ دس فٹ لمبا اور دس فٹ چوڑا ہے، اس میں کبوتر پال رکھے ہیں، ان کے دانہ اور پانی کا معقول انتظام ہے۔ آپ تحریر فرمائیں شرعی اعتبار سے اس کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد انور ابن حاجی عبد القیوم، ڈپٹی گنج، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر اتنا بڑا کمرہ ہے، جس کی پیمائش اوپر درج ہے، تو اس میں بندر کھنا اور اسی میں چارہ وغیرہ دیتے رہنا شرعاً جائز ہے۔

لابأس بحبس الطیور والدجاج في بیته؛ ولکن یعلفها وهو خیر من إرسالها في السکک. (فتاوی شامي، کتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغیره، زکریا ۹/۵۷۵، کراچي ٦/٤۰۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۶؍۲۰۶۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۰/۱۲/۲۷ھ

اللہ اور رسول کے واسطے مسجد میں مانگنے والے کو ملا ہوا مال کس کی ملک؟

سوال [۱۱۲۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جیسا کہ اکثر سائلین مسجد میں آکر اپنے لئے سوال کرتے ہیں اور اپنے سوال

میں یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے واسطے، اللہ کے رسول کے واسطے میری نقد کپڑے سے مدد کرو، میں معذور و مجبور ہوں، اس سوال پر لوگ اس کی مدد کرتے ہیں، اس پر زید یہ کہتا ہے کہ اس سائل کے سوال میں آئی ہوئی اجناس سائل کی ملکیت نہیں ہوں گی؛ کیونکہ اس نے اللہ کے اور اللہ کے رسول کے واسطے کہہ کر مانگا ہے، اگر صرف یہ کہتا کہ میری مدد کرو، تو اس کی ملکیت ہوتی، جب اللہ کے واسطے کہہ کر مانگا ہے، تو یہ مانگا ہوا مال مسجد وغیرہ کے لئے صرف کرنا ہوگا، تو اس طرح سوال کرنے پر زید کا قول صحیح ہے کہ وہ سائل کی ملکیت نہیں؛ بلکہ مسجد کا مال ہوگا یا سائل کا ہی رہے گا؟ قول فیصل سے مطلع فرما کر ممنون ومشکور فرمائیں۔

المستفتی: قاری عبدالرحمٰن، غداپور،

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: اللہ کے واسطے اور رسول کے واسطے مدد کرو کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ غریبوں پر مدد کرنے سے اللہ تعالیٰ آخرت کی مشکل آسان فرما دیتے ہیں؛ لہٰذا میری مدد کرو اللہ تعالی تمہاری مدد کریں گے اور رسول کے واسطے کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ دین اسلام لے کر تشریف لانے والے ہیں، دونوں حضور ﷺ کے دین میں دینی بھائی ہونے کی وجہ سے حضور ﷺ کے توسل سے مدد کرو، یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول کی ملکیت کیلئے وہ مانگ رہا ہے، لہذا ایسی صورت میں مانگنے والا خود ہی اس چیز کا مالک ہوگا، مسجد وغیرہ میں صرف کرنا لازم نہ ہوگا۔

إن التوسل بالنبي صلى الله عليه وسلم جائز في كل حال قبل خلقه وبعد خلقه في مدة حياته الدنيا، وبعد موته في مدة البرزخ، وبعد البعث في عرصات القيامة والجنة. (شفاء السقام ۱۲۰، بحواله تسكين الصدور ۴۰۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰/شوال المکرّم ۱۴۱۲ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۲۸/۲۸۶۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۱۱/۱۴۱۲ھ

کیا ناپاک پانی کی اطلاع دینا ضروری ہے؟

سوال [۱۱۲۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص کو معلوم ہے کہ اس بالٹی میں جو پانی رکھا ہوا ہے، وہ ناپاک ہے، اب اگر کوئی شخص جس کو اس کے ناپاک ہونے کی خبر نہیں ہے، وہ اس سے وضو کرے یا غسل کرے، تو کیا جس کو اس کے ناپاک ہونے کا علم ہے، اس کو وضو یا غسل کرنے والے کو اطلاع دینی ضروری ہے؟

المستفتی: عبدالباسط اعظمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ناپاک پانی سے بےخبری میں غسل یاوضو کرنے والے کو پانی کی ناپاکی کی اطلاع کرنا ایسے لوگوں پر ضروری ہے، جن کو پہلے سے پانی کے ناپاک ہونے کا علم ہے، یہ ایک مسلمان کا دینی فریضہ ہے۔

عن زيد بن خالد الجهني، أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ألاأخبركم بخير الشهداء الذي يأتي بشهادته قبل أن يسألها. (صحيح مسلم، الأقضية، باب بيان خير الشهود، النسخةالهندية ٢/٧٧،بيت الأفكار، رقم: ١٧١٩)

ويجب الأداة بلا طلب لو الشهادة في حقوق الله تعالىٰ. (در مختار مع الشامي، كتاب الشهادت، زكريا ٨/١٧٥، كراچي ٥/٤٦٣، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٦/٢٣٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍رجب المرجب ۱۴۲۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۳۸؍۸۸۹۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۰؍۷؍۱۴۲۶ھ

آپسی مسائل کو صلح وصفائی سے حل کرنا

سوال [۱۱۲۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ احقر سیوانی کا رہنے والا ہے، احقر اور سیوانی گاؤں کے دیگر علماء کرام نے مل کر سوچا کہ ہم سب مل کر خصوصًا اپنے گاؤں کی اور عمومًا پوری امت کی فکر کریں اور امر بالمعروف نہی عن المنکر جو علماء کرام کی اہم ذمہ داری ہے، اس کی فکر کریں اور یہ کام سب سے پہلے اپنی ذات اپنے گھر اور اپنے رشتہ داروں سے شروع کریں اور پھر پورے گاؤں اور پوری امت کی فکر کریں، اس کام کے لئے گاؤں کے تمام علماء کرام جمع ہوئے اور مشورہ سے طے ہوا کہ یہ کام ہم علماء کرام کا بہت اہم ہے، اور ہمیں ضرور کرنا چاہئے؛ لہٰذا علماء کرام نے حسب مشورہ کام شروع کیا اور گاہے گاہے مثلاً ماہانہ یا سہ ماہی پر تمام علماء کرام جمع ہوتے ہیں اور آئندہ مشورہ تک کون سے امور پر کام کرنا ہے، وہ طے ہوتے ہیں اور ان پر حتی المقدور کوشش کی جاتی ہے، جن میں سے چند امور بطور تمثیل کے یہ ہیں۔

(۱) مسلم معاشرہ میں فیشن اور بے پردگی کے بڑھتے سیلاب کو روکنا۔

(۲) قبل النکاح فون پر جانبین سے اپنے منگیتر سے ہونے والی گفتگو کو روکنا۔

(۳) جو چیزیں عند الشرع منکر وممنوع ہیں، انہیں حکمت سے ختم کرنا۔

(۴) جانبین میں کشیدگیاں اور جھگڑے ختم کرواکر فریقین میں صلح کروانا۔

(۵) ایام قربانی میں گاؤں والوں کی رضا مندی سے شریعت کی روشنی میں قربانی کا انتظام اور اطراف کے غیر مانوس علاقوں میں گوشت پہونچانے کی ترتیب۔

(۶) نوجوان موبائل کا غلط استعمال نہ کریں اس کی فکر کرنا۔

علماء کرام نے یہ جماعت سازی اور طریقۂ کار طے کرنے کے بعد کام شروع کرنے سے قبل گاؤں میں پہلے سے موجود کمیٹی کے احباب سے بھی ملاقاتیں کیں اور ان سے اپنی جماعت سازی اور طریقہ کار کا تذکرہ کیا تاکہ سب باہم اتفاق سے کام کریں، تو ان تمام احباب نے کہا کہ یہ کام بہت اچھا ہے اور کرنا ہی چاہئے۔

نیز انہوں نے بہت فرحت ومسرت کا اظہار بھی کیا اور ہماری ہمت افزائی بھی

فرمائی، کچھ وقت گذرنے کے بعد گاؤں کے چند چودھریوں نے لوگوں کو جمع کیا اور انہیں علماء کرام کی اس منظّم جماعت اور ان کے طریقہ کار سے متنفر کرنے کی بھرپور کوشش کرکے، ان تمام لوگوں کو اپنے ہاتھ پر لے لیا اور علماء کرام اور ان کے طریقۂ کار کے بارے میں نازیبا جملے بھی کہے، مثلاً گاؤں میں ایک نئی جماعت قائم کی گئی ہے، جو اپنے ذاتی فتوے ظاہر کرتی ہے، اپنے گاؤں میں پہلے سے اصلاحی جماعت قائم ہے۔ اب کوئی دوسری جماعت قائم نہیں ہوسکتی ہے حتی کہ بعض نے تو یہ بھی کہا کہ ’’جس گاؤں میں علماء کرام کی جماعت بنی ہے، وہاں انہوں نے جھگڑے ہی کروائے ہیں وغیرہ؛ چنانچہ ان چودھریوں نے اس طرح کی باتیں کرکے یہ فیصلہ کیا کہ علماء کرام کی یہ جماعت ختم کرو؛ جبکہ علماء کرام کی یہ جماعت گاؤں میں موجود کمیٹی کے کاموں میں کوئی دخل اندازی نہیں کرتی ہے؛ بلکہ اس جماعت کا مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل کے بعد ہم آپ حضرات مفتیان کرام سے چند سوالات کے جوابات کے منتظر ہیں۔

(۱) کیا گاؤں والوں کی اس طرح نقد و جرح کرنے کی وجہ سے علماء کرام اپنی جماعت ختم کردیں؟

(۲) کیا علماء کرام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چھوڑ دیں؟

(۳) علماء کرام کی جماعت اور ان کے طریقۂ کار پر جملے کسنے والے کیا کار خیر میں رکاوٹ ڈالنے والے شمار ہوں گے یا نہیں؟

(۵) نیز ہم فریقین کے لئے شریعت کی نگاہ میں کیا رہنمائی ہے؟

المستفتی: محمد حسن سیوانی، مقام و پوسٹ: ناہی، بناس کانٹھا (گجرات)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سوال نامہ سے واضح ہوتا ہے کہ علماء کی تنظیم بننے سے پہلے بھی کوئی تنظیم گاؤں میں موجود تھی، اب علماء کی تنظیم بن جانے کے بعد پہلی تنظیم کے

ساتھ کیا ٹکراؤ ہے، ہم سمجھنے سے قاصر ہیں؛ اس لئے آپس کے صلح وتصفیہ کے ذریعہ سے اس مسئلہ کو حل کرنا چاہئے، یا وہاں سے قریب کے بااثر علماء جو وہاں کی نزاکت کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں، ان کے ذریعہ سے مسئلہ کا تصفیہ کرانا چاہئے۔

وَالصُّلْحُ خَيْرٌ. [النساء:۱۲۸]

عبد الله بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين، إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حرامًا. (سنن الترمذي، كتاب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دار السلام رقم: ۱۳۵۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴ ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۰/ ۱۱۰۸۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۵/۴ھ

نماز اور خارج نماز ٹخنوں سے نیچے پائجامہ وغیرہ لٹکانے کا شرعی حکم

سوال [۱۱۲۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نماز کی حالت میں شلوار، پائجامہ یا پینٹ نیچے سے موڑنا یا اوپر کمر کے پاس سے موڑنا اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر کسی نے بغیر موڑے نماز ادا کرلی اور ٹخنے ڈھکے ہوئے ہوں تو نماز کا کیا حکم ہے؟ مدلل تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد شکیل قادری رائس مل رچھا، بریلی (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ٹخنوں سے نیچے پائجامہ یا لنگی لٹکانا نماز اور خارج نماز دونوں حالتوں میں ناجائز اور مکروہ تحریمی ہے، اس حالت میں نماز پڑھی

جائے تو نماز مکروہ تحریمی ہوگی؛ لہٰذا نماز اور خارج نماز دونوں حالتوں میں ٹخنوں سے نیچے پائجامہ وغیرہ لٹکانے سے بچنا ضروری ہے، اگر کسی کا پائجامہ ٹخنوں سے نیچے ہے اور اسی حالت میں وہ نماز پڑھ رہا ہے، تو اس کی نماز ناقص اور مکروہ تحریمی ہوگی، اس سے بچنے کی شکل یہی ہے کہ پائچہ موڑ کر ٹخنوں سے اوپر کردے، پھر کراہت ختم ہوجائے گی اور نماز کے بعد بھی موڑے رکھنا چاہئے۔

حدیث شریف ملاحظہ فرمائیں:

عن أبي ذرؓ عن النبي صلى الله عليه قال: ثلاثة لا يكلمهم الله يوم القيامة ولا ينظر إليهم ولا يزكيهم ولهم عذاب أليم (إلى قوله) المسبل إزاره والمنان الخ. (مسلم شريف ١/ ٧١، رقم:٢٩٣)

عن أبي هريرةؓ قال: بينما رجل يصلي مسبلا إزاره فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: اذهب فتوضأ، فقال له رجل: يارسول الله مالك أمرته أن يتوضأ ثم سكت عنه؟ قال: إنه كان يصلي وهو مسبل إزاره، وإن الله لا يقبل أى قبولا كاملا. (بذل المجهود ٣/ ٥٧١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ
(فتویٰ نمبر: الف ۴۱/ ۱۲۱۸۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۸/۱۱ھ

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِيْ الدِّيْنِ

فتاویٰ قاسمیہ

منتخب فتاویٰ

حضرت مولانا مفتی شبیر احمد القاسمی

خادم الافتاء و الحدیث جامعہ قاسمیہ

مدرسہ شاہی مرادآباد، الہند

(جلد ۲۵)

المجلد الخامس و العشرون

الوصیة، الفرائض

بتمام ابوابها

۱۱۲۰۶ ——— ۱۱۶۰۰

ناشر

مکتبہ اشرفیہ، دیوبند، الہند

01336-223082

مکمل اجمالی فہرست ایک نظر میں

	رقم المسأله		عنوانات
المجلد الأول	١	١٧٢	مقدمة التحقيق، الإيمان و العقائد إلى باب ما يتعلق بالارواح.
المجلد الثاني	١٧٣	٥٥٧	بقية الإيمان و العقائد من باب الحشر إلى باب ما يتعلق بأهل الكتاب، التاريخ و السير، البدعات و الرسوم.
المجلد الثالث	٥٥٨	١٠٠٥	بقية البدعات و الرسوم من باب رسومات جنائز إلى رسومات نكاح، كتاب العلم إلي باب ما يتعلق بالكتابة.
المجلد الرابع	١٠٠٦	١٤١٥	بقية كتاب العلم من كتابة القرآن إلي باب الوعظ و النصيحة، الدعوة و التبليغ، السلوك و الاحسان، الأدعية و الأذكار.
المجلد الخامس	١٤١٦	١٩٣٥	الطهارة بتمام أبوابها، الصلوة من أوقات الصلوة إلى صفة الصلوة.
المجلد السادس	١٩٣٦	٢٤٥٧	الجماعة، المساجد، الإمامة.
المجلد السابع	٢٤٥٨	٢٩٦٤	بقية الصلوة من تسوية الصفوف إلي سجود التلاوة.
المجلد الثامن	٢٩٦٥	٣٤٢٣	بقية الصلوة من الذكر و الدعاء بعد الصلوة، الوتر، ادراک الفريضة، السنن والنوافل، التراويح، صلوة المسافر.

فہرست عناوین

۴۳ کتاب الفرائض

	(۴) باب الوصیة قبل الموت	۲۵۲

(۵) باب موانع الإرث ۲۸۷

(۶) باب ذوی الفروض ۳۰۰

٤٢ كتاب الوصية

١ باب ما يتعلق بنفس الوصية

وصیت کرنا کب واجب ہے؟ اور کب مستحب؟

سوال [۱۱۲۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: وصیت کرنا فی نفسہ مباح ہے اور قیود لگی ہوں، مثلاً اس پر کسی کا قرض ہوتو وصیت کرنا واجب اور مستحب ہے، کیا یہ عبارت درست ہے کیونکہ ایک مولانا صاحب کہہ رہے ہیں کہ وصیت کرنا فی نفسہ مستحب ہے اور قیود کے ساتھ واجب ومباح وغیرہ ہے، دونوں میں سے کون سی بات درست ہے؟

المستفتی: مجیب الرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: وصیت کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ایسی چیز کی وصیت کرنا جس کی ادائیگی اس کے اوپر لازم ہے، مثلاً کسی سے قرض لے رکھا ہے یا کسی اور طریقہ سے کسی کا حق اس پر لازم ہے تو اس کے ترکہ میں اس حق کی ادائیگی لازم اور واجب ہے، اسی طرح اس کے ذمہ نماز یا روزہ یا حج کا فریضہ باقی ہے تو اس سلسلے میں وصیت کرنا لازم اور واجب ہے، ورنہ اللہ کے یہاں مؤاخذہ دار ہوگا۔

(۲) ایسی چیز کی وصیت جو اس کے اوپر لازم نہیں مثلاً: سرمایہ والا آدمی یہ چاہتا ہے کہ کسی غیر رشتہ دار کو اپنے تمام سرمایہ میں سے کچھ دے کر مالک بنادے، یا اپنے سرمایہ میں سے کچھ مدرسہ یا مسجد وغیرہ میں دینے کا ارادہ ہے تو اس کی وصیت کرنا مستحب ہے واجب نہیں۔

عن سعد بن أبی وقاص رضی اللہ عنہ **قال: مرضت عام الفتح مرضا أشفيت منه على الموت فأتاني رسول الله** صلی اللہ علیہ وسلم **يعودني، فقلت: يا رسول الله! إن لي مالا كثيرا،**

ولیس یرثنی إلا ابنتی فأوصي بمالی کله؟ قال: لا، قلت: فثلثی مالی، قال: لا، قلت: فالشطر؟ قال: لا، قلت: فالثلث؟ قال: الثلث والثلث کثیر، إنک إن تذر ورثتک أغنیاء خیر من أن تذرهم عالة یتکففون الناس. (سنن الترمذی، باب ما جاء فی الوصية بالثلث، النسخة الهندية ۲/۳۳ دار السلام رقم: ۲۱۱٦، صحیح البخاری، باب رثاء النبی ﷺ سعدابن خوله، النسخة الهندية ۱/۱۷۳ رقم: ۱۲۸۱، ف: ۱۲۹۵، صحیح مسلم، کتاب الوصية، النسخة الهندية ۲/۳۹ بیت الأفکار رقم: ۱٦۲۸)

الوصية بما عليه من الفرائض والواجبات كالحج والزكاة والكفارات واجبة وفی المواهب تجب علی مدیون بما علیه لله تعالیٰ أو للعباد. (شامی، کتاب الوصایا، زکریا ۱۰/۳۳٦، کراچی ٦/٦٤۸، بدائع الصنائع زکریا ٦/٤۲٤، کراچی ۷/۳۳۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱٦/شعبان ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۱۳/۹۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۸/۱٦ھ

عام حالات میں وصیت کرنے کی حیثیت

سوال [۱۱۲۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر مرنے والے کے ذمہ دین ہوتو وصیت کرنا واحب ہے اسی طرح دوسری قیودات کے ساتھ سنت وغیرہ ہے، مگر عام حالات میں وصیت کرنے کی کیا حیثیت ہے، بعض کتب مثلاً قدوری وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مستحب ہے اور بعض سے محض جواز معلوم ہوتا ہے، دلیل کے ساتھ تحریر فرمائیں کہ عام حالات میں وصیت کرنے کی کیا حیثیت ہے؟

المستفتی: مجیب الرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: وصیت کی دو قسمیں ہیں:

(۱) وصیت واجبہ: اس کی شکل یہ ہے کہ اگر دوسروں کا حق مریض کے اوپر لازم ہے یا مریض کا حق دوسروں پر لازم ہے یا کوئی اور حقوق دوسروں کے اس کے اوپر لازم ہیں تو ان صورتوں میں وصیت کرنا مریض پر واجب ہے، اور اس طریقے سے صراحت کے ساتھ وصیت لکھ دے کہ فلاں کا اتنا مال یا اتنا پیسہ میرے اوپر لازم ہے، یا فلاں کے اوپر میرا اتنا پیسہ یا دیگر مال لازم ہے تا کہ مرنے کے بعد ورثاء میت کی وصیت کے مطابق میت کا قرضہ ادا کردیں، یا میت کا قرضہ وصول کرلیں، اور میت کے قرض کی ادائیگی میں ثلث مال وغیرہ کی قید نہیں، بلکہ جمیع مال سے میت کا قرضہ ادا کیا جائے گا، اس کو حدیث شریف میں ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

عن ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنه قال: قال النبی ﷺ: ما حق امرئ مسلم يبيت ليلتين وله ما يوصي فيه إلا ووصيته مكتوبة عنده. (سنن الترمذی، باب ماجاء فی الحث علی الوصية، النسخة الهندية ۲/ ۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۱۸، صحيح البخاری، كتاب الوصايا، النسخة الهندية ۱/ ۳۸۲، رقم: ۲۶۵۷، ف: ۲۷۳۸، صحيح مسلم كتاب الوصية، النسخة الهندية ۲/ ۳۸-۳۹ بيت الأفكار رقم: ۱۶۲۷)

(۲) وصیت اختیاری واستحبابی: اس کی شکل یہ ہے کہ مریض کے اوپر کسی کا حق لازم نہیں اور نہ ہی دوسروں پر مریض کا حق ہے، بلکہ مریض یہ چاہتا ہے کہ اپنے سرمایہ میں سے کچھ غیر وارث کو مل جائے، یا کارِ خیر میں دیدے، تو اس بات کی اپنی مرضی سے وصیت کرنا ایک امر مستحب ہے، اور میت کے ثلث مال سے اس وصیت کو نافذ کیا جائے گا، جن کتابوں میں وصیت کرنا مستحب لکھا ہے وہاں پر وہی وصیت مراد ہے جو نمبر ۲ / میں درج ہے۔

عن سعد بن أبی وقاص رضؓ قال: مرضت عام الفتح مرضا أشفيت منه على الموت فأتانی رسول الله ﷺ يعودنی، فقلت: يا رسول الله! إن لی مالا كثيرا، وليس يرثنی إلا ابنتی فأوصي بمالی كله؟ قال: لا، قلت: فثلثی مالی، قال: لا، قلت: فالشطر؟ قال: لا، قلت: فالثلث؟ قال: الثلث والثلث

کثیر، إنک إن تذر ورثتک أغنیاء خیر من أن تذرهم عالة یتکففون الناس. (سنن الترمذی، باب ما جاء فی الوصیة بالثلث، النسخة الهندیة ۲/ ۳۳ دار السلام رقم: ۲۱۱٦، صحیح البخاری، باب رثاء النبی ﷺ سعدابن خوله، النسخة الهندیة ۱/ ۱۷۳رقم: ۱۲۸۱، ف: ۱۲۹۵، صحیح مسلم، کتاب الوصیة، النسخة الهندیة ۲/ ۳۹ بیت الأفکار رقم: ۱٦۲۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍رجب المرجب ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۰۵۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸؍۷؍۱۴۲۷ھ

عام حالت میں وصیت کرنے کا حکم

سوال [۱۱۲۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: وصیت کے متعلق یہ نہ بتایا جائے کہ کن حالات میں واجب اور کن حالات میں مستحب ہے؟ بلکہ صرف یہ بتلایا جائے کہ عام حالات میں وصیت کرنے کی کیا حیثیت ہے؟ آیا فی نفسہٖ مباح ہے یا مستحب ہے؟

المستفتی: مجیب الرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: عام حالات میں وصیت کرنا فی نفسہٖ جائز ہے، لیکن بعض نے استحباب کی بات بھی کہی ہے۔

فالوصیة غیر واجبة بل جائزة وبه أخذ أبو اللیث. (بدائع کتاب الوصیة زکریا ٦/ ٤٢٤، کراچی ۷/ ۳۳۱)

فالقیاس یأبی جواز الوصیة إلا أنهم استحسنوا جوازها بالکتاب العزیز. (بدائع، کتاب الوصیة زکریا ٦/٤٢٢، کراچی ۷/ ۳۳۰)

الوصیة غیر واجبة وهی مستحبة، قال ابن الهمام: أقول الحکم

بالاستحباب على الوصية مطلقا لايناسب. (فتح القدير، باب في صفة الوصية، كوئٹه ۳/٩ ٤ ٤، زكريا ۱۰/ ٤٤٣، دارالفكر ۱۰/ ٤١٣، البحر الرائق كوئٹه ٤٠٤/٨ زكريا ٢١٣/٩)

وقد أجمع على الأمر بها لكن مذهب الأربعة أنها مندوبة لا واجبة. (إرشاد الساري، باب الوصايا، دار الفكر ۲٤٦/٦ تحت رقم الحديث: ۲۷۳۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍صفر المظفر ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۸۹۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۲/۱۴ھ

وصیت کے ثبوت کی شرط

سوال [۱۱۲۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک مکان حافظ نور الحسن عرف منن کا تھا، ان کی ایک لڑکی ہے جس کی عمر ساڑھے ۱۹؍سال ہے، نور الحسن کا انتقال ہوگیا ہے، لڑکی کے ایک چچا ہیں، ریاض الحسن وہ کہتے ہیں کہ تمہارے والد یہ مکان ہمارے نام سے وصیت کر گئے ہیں، جبکہ وہ نابالغہ تھی، اب ساڑھے ۱۹؍سال عمر ہے، انتقال سے قبل زمین کی تقسیم ہوگئی تھی، دونوں بھائی کے حق میں برابر برابر، اب چچا کہتے ہیں کہ ہم کو وصیت کر گئے ہیں، تمہارے والد، دریافت طلب امر یہ ہے کہ یہ زمین کس کو ملے گی، کون اس کا حقدار ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں؟

المستفتی: رئیس احمد برولان مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ریاض الحسن کے محض دعویٰ سے وصیت کرنا ثابت نہ ہوگا، بلکہ دو عادل باشرع مرد یا ایسا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت یا سرکاری رجسٹری کاغذ کا ہونا لازم ہوگا، جس میں نور الحسن اور گواہوں کے دستخط ہوں، اس کے بغیر وصیت کا دعویٰ صحیح نہ ہوگا، اور شرعی وارث کو محروم نہیں کیا جائے گا، نیز ریاض الحسن بھی نور الحسن کا شرعی وارث ہے اور وارث کے حق میں وصیت صحیح نہیں ہوتی ہے، لہٰذا مذکورہ وصیت اگر

معتبر اور ثابت ہو جائے گی تب بھی وارث کے حق میں ہونے کی وجہ سے باطل ہو جائے گی، کیونکہ دوسرے ورثاء اس پر راضی نہیں ہیں۔

عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ: لاتجوز الوصية لوارث، إلا إن شاء الورثة. (السنن الکبریٰ للبیہقی، باب نسخ الوصية للوالدين والأقربين الوارثين، دار الفكر ۹/۳۵٦، رقم: ۱۲۷۹۷ – ۱۲۷۹۸، سنن الدارقطنی، دار الكتب العلمية بيروت ٤/٨٦، رقم: ٤٢٥١)

عن أبي أمامة الباهلي –رضي الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول في خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارك وتعالىٰ قد أعطىٰ كل ذي حق حقه فلا وصية لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصية لوارث، النسخة الهندية ٢/ ٣٢ دار السلام رقم: ٢١٢٠)

ولاتجوز لوارث لقوله عليه السلام إن الله تعالىٰ أعطىٰ كل ذي حق حقه ...... **لاوصية للوارث.** (هدايه كتاب الوصايا رشيديه ٤/ ٦٤١، اشرفی ديوبند ٤/ ٦٥٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم جمادی الثانیہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۵۳۱۲/۳۳)

ضمناً وصیت سے رجوع کرنا

سوال [۱۱۲۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میری والدہ صاحبہ نے میرے پاس تین سو روپیہ جمع کیے اور جمع کرتے وقت یہ وصیت کی کہ جب میرا انتقال ہو جائے اور میرے بھائی کفن دفن نہ کریں تو ان پیسوں سے کفن دفن کر دینا، اور اگر بھائیوں نے کفن دفن کر دیا تو یہ پیسے اپنی بہن کی لڑکی کی شادی میں لگا دینا، پھر ایسا ہوا کہ میرے یہاں تنگی آ گئی، تو والدہ صاحبہ نے کہا کہ ان پیسوں سے تم اپنی مجبوری رفع کرلو، میں نے کرلی، کچھ عرصہ بعد والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا، ان کا کفن دفن ان کے

بھائیوں نے کردیا، پھر میری ہمشیرہ نے اپنی لڑکی کی شادی کی ان کو بھی بھات میرے بھائی صاحب نے اچھا دیدیا تھا اور وہ پیسہ میرے ہی پاس رہا، اب سوال یہ ہے کہ جب والدہ صاحبہ نے یہ کہا تھا کہ تم خرچ کرلوتو یہ نہیں کہا تھا کہ ہمیشہ کے لیے رکھ لو، اور نہ یہ کہا تھا کہ میری وصیت کے مطابق عمل کرنا۔

اب دریافت طلب بات یہ ہے کہ وہ تین سو روپیہ والدہ صاحبہ کے کیا کروں آیا بہن کو دیدوں یا نہ دوں، یا قرآن کریم لے کر مسجد و مدرسہ میں برائے ایصالِ ثواب والدہ صاحبہ دیدوں، کیا کروں؟ شریعت سے جو حکم ہو تحریر فرمادیں جس سے مجھ پر کوئی وبال نہ رہے۔

المستفتی: خورشید فاطمہ عمرہ بجنوریوپی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں جب تنگدستی کے وقت والدہ صاحبہ نے وصیت کی ہوئی رقم خرچ کرنے کی اجازت دیدی تو اس اجازت دینے میں ضمناً وصیت سے رجوع پایا جارہا ہے، لہٰذا یہ رقم آپ کے لیے عطیہ ہوگئی ہے،، اب آپ پر کوئی چیز لازم نہیں ہے، نہ وہ رقم بہنوں کو دینا ضروری ہے اور نہ ہی قرآن کریم وغیرہ لے کر مسجد و مدرسہ میں دینا ضروری ہے، بلکہ آپ کو اختیار ہے پھر بھی اگر قرآن کریم وغیرہ خرید کر مسجد یا مدرسہ میں وقف کردیا جائے تو آپ کے اور آپ کی والدہ صاحبہ کے حق میں صدقۂ جاریہ ہونے کی وجہ سے بہتر ہوگا

قال: وإذا صرح بالرجوع أو فعل ما يدل على الرجوع كان رجوعا أما الصريح فظاهر وكذا الدلالة لأنها تعمل عمل الصريح فقام مقام قوله قد أبطلت. (هدايه، كتاب الوصايا، باب فى صفة الوصية اشرفى ٤/ ٦٦٠، مختصر القدورى ص: ٢٨٥، هنديه زكريا قديم ٦/ ٩٢، جديد ٦/ ١٠٩) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۴۰۴۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۵/۲۹ھ

رضامندی کا اعتبار کس وقت ہے؟

سوال [۱۱۲۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کے ۵/لڑکے ہیں ایک لڑکا زید کی زندگی میں انتقال کرجاتا ہے، اس کے دو لڑکے ہیں زید نے اپنے بڑے لڑکے کو کچھ دے کر راضی کرلیا، پھر وصیت نامہ لکھا کہ میں نے ایک لڑکے کو تو جو کچھ دینا تھا وہ دیدیا، اور بقیہ میرے تین لڑکے کی اولاد میں برابر برابر تقسیم کردیں، اوراسی وصیت نامہ پر بڑے لڑکے کی دستخط بھی ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ وراثت کس طرح تقسیم ہوگی؟ بڑے لڑکے کو بھی حصہ ملےگا یا نہیں؟

المستفتی: حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالجبار صاحب مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بڑے لڑکے کی رضامندی کا اعتبار زید کے مرنے کے بعد ہے، زندگی میں راضی ہونے کا اعتبار نہیں۔

عن ابراهيم قال: إذا أوصى الرجل بوصية لوارث فأجاز الورثة قبل أن يموت ثم رجع الورثة بعد موته فهم على رأس أمرهم. (المصنف لابن أبي شيبة، مؤسسة علوم القرآن ١٦/١٤٢، رقم: ٣١٣٦٥)

ولاتعتبر إجازة الورثة في حال حياة الموصي حتى كان لهم أن يرجعوا بعد موت الموصي. (مجمع الأنهر، كتاب الوصايا، دار الكتب العلمية بيروت ٤/٤١٩، مصري قديم ٢/٦٩٢، هدايه اشرفي ٤/٦٥٥، بدائع الصنائع زكريا ٦/٤٨٣، كراچی ٧/٣٧٠)

إن إجازتهم في حال حياة المورث ساقطة؛ لأن إجازتهم في ذٰلك الوقت غير معتبرة أصلا. (فتح القدير زكريا ١٠/٤٤٨، دار الفكر ١٠/٤١٧، كوئٹه ٩/٣٤٧)

صلبی لڑکوں کی موجودگی میں پوتے وصیت کے باوجود شرعی وارث نہیں ہوسکتے، البتہ اگر پوتوں کے حق میں اجنبی کی طرح وصیت کرجائے تو ایک ثلث یا اس سے کم میں وصیت نافذ ہوسکتی ہے۔

عن عامر بن سعد، عن أبيه رضي الله عنه قال: مرضت، فعادني النبي

صلى الله عليه وسلم -إلي- قلت: أريد أن أوصي بالنصف؟ قال: النصف كثير، قلت: فالثلث؟ قال: الثلث كثير أو كبير، قال: فأوصى الناس بالثلث، فجاز ذٰلك لهم. (صحيح البخاري، باب الوصية بلثلث، النسخة الهندية ١/٣٨٣، رقم: ٢٦٦٣، ف: ٢٧٤٤)

وتصح الوصية بالثلث للأجنبي وإن لم يجيزوا. (مجمع الأنهر، كتاب الوصايا، دار الكتب العلمية بيروت ٤/٤١٩، مصري قديم ٢/٦٩٢) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ ذی قعدہ ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۳۶۲)

وصیت نامہ رجسٹری نہ ہوا ہو تو کیا حکم ہے؟

سوال [۱۱۲۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: حاجی امام بخش ولد خیر اللہ قوم قصاب محلّہ اصالت پورہ مرادآباد کے تین لڑکے تھے: مولیٰ بخش، علی بخش، ولی محمد، اور امام بخش کی موجودگی میں ولی محمد کا انتقال ہوگیا اور ولی محمد کا ایک لڑکا نیاز محمد موجود تھا تو حاجی امام بخش نے اپنے بیٹے مولیٰ بخش کو ذمہ دار بنایا کہ اپنے پوتے نیاز محمد کے حق میں کل دولت میں سے ایک ہزار روپیہ کی وصیت کردیں، یہ ۱۸۹۷ء کی بات ہے اور حاجی امام بخش اس وقت اپنے ضعف اور بیماری کی وجہ سے سرکاری کاغذات کچہری جا کر نہیں بنا سکتے تھے، اس لیے اپنے بیٹے مولیٰ بخش کو اختیار دیا کہ ایک ہزار روپیہ کی مالیت نیاز محمد کے لیے وصیت میں رجسٹری کردیں اور اپنے بیٹے علی بخش کے ذریعہ سرکاری اسٹام خرید کر وصیت نامہ سرکاری کاغذ پر لکھ دیا، مگر اس کی رجسٹری نہیں ہو پائی، وصیت نامہ سوالنامہ کے ساتھ منسلک ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ حاجی امام بخش نے اپنے پوتے نیاز محمد کے لیے جو وصیت کی ہے یہ شرعی نقطۂ نظر سے صحیح ہے یا نہیں؟ اور آج سے ۹۷ سال پہلے کی ایک ہزار روپیہ کی مالیت پر وصیت جاری ہو چکی ہے یا نہیں؟ جو بھی شرعی حکم ہو دلائل کے ساتھ تحریر فرمائیں۔

نوٹ: اس سے پہلے مدرسہ شاہی مرادآباد سے مولیٰ بخش اور علی بخش کے وارثین نے وصیت نامہ کو ظاہر نہ کر کے صرف ولی محمد کو باپ کی موجودگی میں مرجانا دکھا کر فتویٰ حاصل کیا ہے جس میں مفتی صاحب نے سوال کے مطابق ولی محمد کے لڑکے نیاز محمد کو محروم قرار دیا ہے، اب یہ سوال وضاحت کے ساتھ لکھا جارہا ہے۔

المستفتی: صغیر احمد ظہیر احمد اصالتپورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ۲۳؍محرم الحرام ۱۴۱۵ھ کو اسی واقعہ سے متعلق ایک سوال آیا تھا جس میں ولی محمد کے لڑکے نیاز محمد کے حق میں وصیت کا کوئی تذکرہ نہیں تھا، اس لیے اس میں سوال کے مطابق نیاز محمد کو محروم قرار دیا گیا تھا، اور اب وصیت نامہ کے ثبوت کے ساتھ سوال آیا ہے، اس لیے اس کا جواب دوسرا ہوگا کہ سرکاری اسٹامپ پر تحریر شدہ مذکورہ وصیت نامہ اگرچہ رجسٹری نہیں ہوا ہے مگر شرعی اعتبار سے یہ وصیت نامہ معتبر ہوگا اس لیے ولی محمد کے لڑکے نیاز محمد کے حق میں اس کے دادا نے جو وصیت کی ہے وہ شرعی طور پر صحیح ہے، لہٰذا اگر ایک ہزار کی مالیت تہائی مال سے کم ہے تو ایک ہزار کی مالیت پر وصیت جاری ہو کر نیاز محمد کو پورے ایک ہزار مل جائیں گے، اور اگر ایک ہزار کی مالیت تہائی مال سے زائد ہے تو صرف ایک تہائی مالیت پر وصیت جاری ہوگی، اور نیاز محمد اسی ایک تہائی کا حقدار ہوجائے گا۔

عن عامر بن سعد، عن أبيه رضي الله عنه قال: مرضت، فعادني النبي ﷺ –إلى– قلت: أريد أن أوصي بالنصف؟ قال: النصف كثير، قلت: فالثلث؟ قال: الثلث كثير أو كبير، قال: فأوصى الناس بالثلث، فجاز ذلك لهم. (صحيح البخاري، باب الوصية بالثلث، النسخة الهندية ۱/۳۸۳، رقم: ۲٦٦۳، ف: ۲۷٤٤)

ولاتجوز بما زاد على الثلث. (هدايه، كتاب الوصايا اشرفى ٤/٦٥٤) **فقط** واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍صفر المظفر ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۳۸٦۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۲/۱۸ھ

زبانی وصیت کی ایک جائز شکل

سوال [۱۱۲۱۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ساجدہ کا انتقال ہوا، ساجدہ نے دو کمرے اوران کمروں کے برابر ایک دوکان آبادی میں اور دو دوکانیں بازار میں چھوڑیں، ساجدہ کا یہ کہنا تھا کہ آبادی والے کمروں اور دوکان میں میراجح اور درسگاہ بنے گی، اولاد سے ساجدہ نے کہا اپنے انتقال سے دو ماہ قبل، لیکن یہ بات ایک وارث کے سامنے کہی اور دیگر وارث موجود نہیں تھے، ویسے ساجدہ کہتی یہی تھی کہ آبادی والے کمرے اور دوکان میں میراجح اور درسگاہ بنے گی اور بازار کی دوکانوں کے لیے کہتی تھی کہ تم آپس میں سب وارث تقسیم کرلینا۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ یہ وصیت ساجدہ کی صرف دو کمروں اور ایک دوکان آبادی والی میں چلے گی یا بازار والی میں بھی چلے گی، اور دونوں جگہوں کی جائیداد ملا کر تہائی مال لگایا جائے گا یا صرف آبادی والی جائیداد میں تہائی مال میں یہ وصیت چلے گی، اور تہائی مال میں حج اور درسگاہ بنوائی جائے گی، یا کل روپیہ آبادی والے کمروں کا حج اور درسگاہوں میں صرف ہوگا اور دوکانیں بازار والی الگ رہ جائیں گی، کیا صورت ہوگی؟

ساجدہ کے وارث یہ ہیں: شوہر، ۶ رلڑکے، ایک لڑکی،

المستفتی: سعید احمد غفرلہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زبانی وصیت کا بھی اعتبار ہوتا ہے، بشرطیکہ تمام وارثین اس کی تصدیق کرتے ہوں، لہٰذا سوالنامہ میں جس وصیت کا ذکر ہے اس کو نافذ کرنے میں تمام وارثین متفق ہوں، تو اس کے نافذ کرنے کی صورت یہ ہے کہ اگر حج اور درسگاہ آبادی والے کمرے اور دوکان کے پیسہ سے بنائی جاسکتی ہے اور وہ کل ترکہ کی تہائی کے اندر ہے تو صرف اسی سے حج بھی کرایا جائے اور درسگاہ بھی بنائی جائے اور اگر آبادی والے کمرے اور دوکان کی قیمت کل ترکہ کی ایک تہائی سے بہت زیادہ ہے تو یہ کمرے اور دوکان کل کے کل

وصیت میں داخل نہ ہوں گے، بلکہ کل ترکہ کی ایک تہائی کی مقدار وصیت میں داخل ہوسکتی ہے اور اگر یہ کمرے اور دو کان کل ترکہ کی ایک تہائی سے بہت ہی کم ہے، اور حج اور درسگاہ ان کی قیمت سے پوری نہیں ہوتی ہے تو ایک تہائی مقدار کے اندر رہ کر بازار والی دو کانوں سے بھی اس کام کے لے لینے کی اجازت ہے۔

عن عامر بن سعد، عن أبيه رضى الله عنه قال: مرضت، فعادني النبي ﷺ -إلى- قلت: أريد أن أوصى بالنصف؟ قال: النصف كثير، قلت: فالثلث؟ قال: الثلث كثير أو كبير، قال: فأوصى الناس بالثلث، فجاز ذلك لهم. (صحيح البخاري، باب الوصية بالثلث، النسخة الهندية ۱/۳۸۳، رقم: ۲٦٦۳، ف: ۲۷٤٤)

عن إبراهيم النخعي قال: إذا أوصىٰ بحج أو زكاة فهى من الثلث حج أو لم يحج. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، باب الوصية بالحج، دار الفكر ۹/۳۷۹، رقم: ۱۲۸٦۸، المصنف لابن أبي شيبة، مؤسسة علوم القرآن بيروت ۱٦/۱٦۳، رقم: ۳۱٤٦۸)

ولاتجوز بما زاد على الثلث لقول النبي ﷺ في حديث سعد بن أبي وقاص رضـ: الثلث كثير (وقوله) إلا أن يجيزها الورثة بعد موته. (هدايه، كتاب الوصية، باب في صفة الوصية، اشرفي ٤/٦٥٤-٦٥٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍محرم الحرام ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۵۷۶)

جعلی وصیت نامہ کو گرفت کرنے کی ایک شکل

سوال [۱۱۲۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جلال الدین کا انتقال ہوگیا، ان کے ورثاء میں دولڑکے جمال الدین، کمال الدین، چھ لڑکیاں: صاحبزادی بیگم، شمشادی بیگم، دلشادی بیگم، سکندر بیگم، منی بیگم، روبانہ بیگم ہی۔

۲۴؍ستمبر ۱۹۸۱ء میں والد کا انتقال ہوگیا تھا، پھر ۱؍۱اکتوبر ۱۹۸۱ء کو ایک کاغذ اسٹامپ

پر یہ تحریر لکھی گئی، کہ میرے والد جلال الدین نے مرنے سے قبل یہ وصیت کی تھی کہ میرے مرنے کے بعد میرا مسکونہ مکان میرے دونوں لڑکوں کو ملے گا، ان کے مرنے کے بعد وصیت کے مطابق ہم مقرات بحالت صحت نفس وثبات عقل خوب سوچ سمجھ کر بذریعہ تحریر ہذا اقرار کرتی ہیں کہ وصیت مذکورہ صحیح ہے، اس کے نفاذ میں ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے، بموجب وصیت مذکورہ ہمارے ہر دو برادران جمال الدین وکمال الدین مالکان ہیں ہم یا ہمارا کوئی وارث اب یا آئندہ وصیت مذکورہ کے خلاف معترض نہیں ہوگا۔

دریافت یہ کرنا ہے کہ شرعاً یہ وصیت صحیح تھی یا نہیں، اور جب بہنوں نے تحریر لکھدیا اور اپنے سہام سے دستبردار ہوگئیں اور کاغذ پر دستخط کردیئے صرف ایک بہن سکندر پروین کے دستخط کسی وجہ سے نہیں ہوسکے تھے تو یہ مکان بھائیوں کا ہوگیا، یا سب بھائی بہنوں کو شریعت کے مطابق اب حصہ ملے گا، اب بہنیں اتنے عرصہ کے بعد اپنا اپنا حصہ طلب کررہی ہیں، شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: جمال الدین تمبا کو والان مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: وصیت نامہ خود بتلا رہا ہے کہ یہ جعلی وصیت نامہ ہے اس لیے کہ مالک اپنی زندگی میں بحالت ہوش وحواس اپنی ملکیت کے بارے میں خود لکھتا ہے اور یہاں مالک کے مرنے کے بعد لڑکوں نے باپ کی طرف سے خود اپنے حق میں لکھا ہے، ایسا وصیت نامہ شرعاً معتبر نہیں ہے، اگر باپ نے اپنی زندگی میں اپنی مرضی سے لکھا ہوتا اور تمام بیٹیاں اپنی رضامندی سے باپ کے وصیت نامہ پر دستخط کردیتیں تب اس کا اعتبار کیا جاسکتا تھا، اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ وارثین کے حق میں وصیت درست نہیں ہے، لیکن دوسرے ورثاء کی رضامندی سے درست ہے، اور یہاں جو وصیت نامہ لکھا گیا ہے وہ خود مورث کی طرف سے نہیں ہے اس لیے وصیت نامہ کا اعتبار نہیں ہے۔

عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ: لاتجوز الوصیة لوارث، إلا إن شاء الورثة. (السنن الکبریٰ للبیهقی، باب نسخ الوصیة للوالدین والأقربین الوارثین،

دار الفکر ۹/۳۵٦، رقم: ۱۲۷۹۷ – ۱۲۷۹۸، سنن الدار قطني، دار الکتب العلمیة بیروت ٤/٨٦، رقم: ٤٢٥١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۱۴۱/٦٧)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/٦/۷ھ

زندگی میں وصیت کا تبصرہ نہ کرنے کا حکم

سوال [۱۱۲۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) میری بہن کا نام رشیدہ طلعت ہے اس کی تاریخ وصال ۷/ اکتوبر ۲۰۰۹ء ہے، میری بہن بہنوئی کے کوئی اولاد نہیں ہے، میری بہن کا ایک بھائی حیات ہے، اور شوہر عقیل احمد ہے۔

(۲) پھر میرے بہنوئی عقیل احمد کا انتقال ۱۵/ جنوری ۲۰۱۳ء کو ہو گیا میرے بہنوئی کا ایک بھائی ہے، شکیل احمد اور چار بہنیں ہیں، مبین فاطمہ، رئیس فاطمہ، ممتاز فاطمہ، ریاض فاطمہ، بہنوئی کی اپنی ذاتی خریدی ہوئی یا ان کے والد محترم کی طرف سے دی ہوئی کوئی ملکیت نہیں ہے، بہن رشیدہ طلعت کو والد مرحوم کے ذاتی مکان کا ایک تہائی سے زیادہ حصہ بذریعۂ عدالت دیدیا گیا تھا، بہن کے مکان کا رقبہ ۵۷۵ مربع فٹ ہے، بہن نے اپنی حیات میں اپنے مکان کا نہ کسی کو وارث بنایا اور نہ کسی کے نام لکھا، بہن کافی زمانہ سے بیمار چل رہی تھی، بہن بہنوئی نے ایک بالغہ لڑکی جس کا نام روشنی بنت ممتاز فاطمہ (بہنوئی کی بہن) کو اپنی خدمت کے لیے رکھ لیا تھا، بہنوئی کے انتقال کے بعد وہ لڑکی جو کچھ عرصہ سے خدمت کرتی تھی یہ کہتی ہے کہ یہ مکان آپ کے بہنوئی صاحب نے میرے نام بذریعۂ وصیت نامہ ۸/ جولائی ۲۰۰۴ء کو کردیا تھا، وصیت نامہ کی ایک کاپی (یہ وصیت نامہ فرضی ہے) منسلک ہے، ہبہ زبانی یادداشت کے نام سے بہن کی طرف سے بہنوئی کو جواب بہنوئی کے انتقال کے بعد دکھایا ہے وہ بھی فرضی ہے، اس کی ایک کاپی منسلک ہے۔

المستفتی: انجینئر غلام حسین شوکت باغ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب بہن بہنوئی کی زندگی میں وصیت کا کوئی تبصرہ نہیں ہوا ہے اوران کی وفات کے بعد وصیت کی بات پیش کی جارہی ہے تو اس پر ثبوت شرعی لازم ہے، آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ ان کی زندگی میں وصیت کا تذکرہ کیوں نہیں آیا، اس لیے منسلک وصیت نامہ فرضی معلوم ہوتا ہے لہٰذا اس پر حکم شرعی نہیں لگایا جاسکتا اور رشیدہ طلعت کا زبانی ہبہ کرنے کا جو تذکرہ ہے اس میں صرف یہ لکھا ہے کہ گواہان اور عزیزوں کی موجودگی میں ہبہ کیا ہے، لیکن اس ہبہ نامہ میں نہ کسی گواہ کا نام موجود ہے اور نہ ہی عزیزوں میں سے کسی کا نام ہے، اور نہ کسی گواہ کے دستخط موجود ہیں، اور ہبہ نامہ لکھنے کا جو ضابطہ اور اصول ہے یہ تحریر اس سے بالکل ہٹی ہوئی ہے، اس لیے یہ ہبہ نامہ بے ثبوت ہوگا، اور شرعی ثبوت کے بغیر کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا، لہٰذا مذکورہ جائیداد رشیدہ طلعت کے وارثین کے درمیان شرعی طور پر تقسیم ہوگی، اور سوالنامہ کے مطابق وارثین میں شوہر اور ایک حقیقی بھائی ہے اس لیے پوری جائیداد دو حصوں میں تقسیم ہوکر نصف حصہ شوہر کو ملے گا، اور نصف حصہ حقیقی بھائی غلام حسین کو ملے گا اور اس کے بعد شوہر عقیل احمد کا انتقال ہوا تو اس کا آدھا حصہ اس کے حقیقی وارثین کے درمیان تقسیم ہو جائے گا، اور اس کے حقیقی وارثین میں ایک بھائی اور چار بہنیں ہیں، لہٰذا اس کا نصف حصہ چھ میں تقسیم ہوکر بھائی کو دو ملیں گے، اور چاروں بہنوں کو ایک ایک مل جائے گا، لہٰذا مذکورہ جائیداد درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگی۔

۱۲/۲

رشیدہ طلعت میتہ

شوہر عقیل احمد — بھائی غلام حسین

۱ — ۱/۶

۶ — تداخل

عقیل احمد میت

بھائی	بہن	بہن	بہن	بہن
شکیل احمد	مبین فاطمہ	رئیس فاطمہ	ممتاز فاطمہ	ریاض فاطمہ
۲	۱	۱	۱	۱

المبلغ ۱۲
الأحیاء

سہام	غلام حسین	شکیل احمد	مبین فاطمہ	رئیس فاطمہ	ممتاز فاطمہ	ریاض فاطمہ
	۶	۲	۱	۱	۱	۱

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۰۸۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۵/۳ھ

تعلیق بالشرط سے وصیت کا عدم بطلان

سوال [۱۱۲۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ محمد صدیق مرحوم نے یہ وصیت کی ہے کہ میرے مرنے کے بعد میری ساری جائیداد کی مالک میری بیوی ہوگی، بیوی کی موت کے بعد میرا بھانجہ اقبال حسین مالک ہوگا، جبکہ محمد صدیق کی بوقت وفات دو بہنیں بھی موجود تھیں، تو کیا اقبال حسین کے حق میں وصیت درست ہوگی؟ جو بیوی کی موت پر معلق رکھا ہے، یا اس تعلیق کی وجہ سے وصیت اقبال حسین کے حق میں باطل ہے؟

المستفتی: افضل حسین تحصیل اسکول بڑھیا والی مسجد مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: وصیت معلق کرنے سے باطل نہیں ہوئی، لیکن چونکہ بیوی شرعاً وارث ہے اور شریعت میں دوسرے وارثین کی موجودگی میں وارث کے حق

میں وصیت نافذ نہیں ہوتی،اس لیے بیوی کو ساری جائیداد نہیں مل سکتی، اور اقبال حسین چونکہ شرعاً وارث نہیں ہے اس لیے اس کے حق میں وصیت درست ہے، مگر ساری جائیداد میں وصیت درست نہ ہوگی، بلکہ کل جائیداد کو تین حصوں میں تقسیم کرکے ایک حصہ وصیت کی بنا پر اقبال حسین کو بیوی کے مرنے کے بعد ملے گا، اور بیوی کے مرنے تک وہ حصہ بیوی کے قبضہ میں رہے گا، بعد وفات اقبال حسین کو ملے گا، اب کل جائیداد میں سے ایک ثلث اقبال حسین کے لیے الگ کر لینے کے بعد باقی دو ثلث ۸؍سہام میں تقسیم ہوکر بیوی کو ۲؍سہام اور دونوں بہنوں کو تین تین سہام ملیں گے، اور اگر بیوی کا کوئی شرعی وارث نہیں ہے اور اس نے اپنا حصہ اقبال حسین کو دینے کے لیے کہا ہے تو بیوی کے دو سہام بھی اقبال حسین کو ملیں گے، اور بہنوں کے سہام میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۴/۲۸۳)

والوصية تارة تكون منجزة و تارة معلقة بشرط فيجب أن يعلم بأن تعلق الوصية بالشرط جائز . (البحر الرائق، كتاب الوصايا كوئٹه ۸/۴۰۵، زكريا ۹/۲۱۴ وهكذا في المغني لابن قدامه ۶/۹۰، رقم: ۴۶۶۳)

وقال أبو حنيفةؒ إذا قال أوصيت أن يخدم عبدى فلانا سنة ثم هو لفلان فقال فلان لا أقبل الوصية قال يخدم الورثة سنة (إلى قوله) فإن مات فلان خدم تمام السنة للورثة ثم يدفع إلى الوصى له بعد تمام السنة. (البحر الرائق، كتاب الوصايا زكريا ۹/۲۱۵، كوئٹه ۸/۴۰۵)

ولأن الشرط الفاسد في معنى الربا وهو يعمل في المعاوضات دون التبرعات . (هدايه، كتاب الهبة، باب مايصح رجوعه و مالايصح، اشرفى ۳/۲۹۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍محرم الحرام ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/۱۵۹۵)

موصی کی زندگی میں موصیٰ لہ کی موت

سوال [۱۱۲۱۷]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ چند لوگوں نے مل کر کچھ خاص خاص مقدار پیسہ جمع کر کے ایک شرکت کی سوسائٹی قائم کی اور اس میں جو نفع ہوتا ہے وہ اپنے اپنے حصوں کے تناسب سے سب کو مل جاتا ہے، اور اگر گھاٹا ہو جائے تو اس میں سب شریک ہو جاتے ہیں، تو ایسی سوسائٹی میں جناب عزیز احمد مرحوم بھی شریک تھے، اتفاق سے انہوں نے اپنی بیوی کو زندگی میں طلاق دیدی اور اولاد بھی پیدا نہ ہوئی، تو عزیز احمد نے بحالت صحت اپنی شرکت اپنے بڑے بھائی عبداللطیف کے نام کردی، کہ میرے مرنے کے بعد اس سوسائٹی میں عبداللطیف شریک رہے گا، لیکن اتفاق سے ایسا ہوا کہ پہلے عبداللطیف کا انتقال ہو گیا، پھر اس کے بعد عزیز احمد کا انتقال ہوا، اب سوال طلب امر یہ ہے کہ عزیز احمد کا ایک اور بھائی ہے بنام علی احمد، یہ چاہتا ہے کہ عزیز احمد کی شرکت مجھے مل جائے اور عبداللطیف کی بیوی یہ چاہتی ہے کہ چونکہ میرے شوہر کے نام کردیا ہے، اس لیے مجھے ملنا چاہیے؟ اب شریعت کا جو حکم ہو وہ تحریر فرمادیں۔

المستفتی: سکینہ بیگم پیرزادہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عزیز احمد کا اس طرح نام کردینا کہ میرے مرنے کے بعد عبداللطیف اس سوسائٹی میں شریک رہے گا یہ وصیت شرعاً دو وجہوں سے باطل ہے۔

(۱) عبداللطیف عزیز احمد کا شرعی وارث ہے، اور وارث کے لیے وصیت شرعاً درست نہیں ہے۔

عن أبی أمامة الباهلی –رضی الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصية لوارث، النسخة الهندية ۲/ ۳۲، دار السلام رقم: ۲۱۲۰)

(۲) موصی کے انتقال سے پہلے موصیٰ لہ کا انتقال ہو چکا ہے،تو شئ موصیٰ بہ مالک کی ملکیت کی طرف لوٹ گئی ہے، اس لیے مذکورہ وصیت شرعاً درست نہیں ہے، اور سارا حق عزیز کا شرعی وارث علی احمد کو مل جائے گا۔

وقبول الوصية بعد الموت (وقوله) فإن قبلها موصىٰ له فی حال الحياة أو ردها فذٰلک باطل. (الجوهرة النيرة، كتاب الوصايا، امداديه ملتان ۲/ ۳۹۱، دار الكتاب ديوبند ۲/ ۳۷۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ محرم الحرام ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۱۰۰)

شئ موصیٰ بہ کو اپنی ملکیت سے خارج کرنے کا حکم

سوال [۱۱۲۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسماۃ شکوراً بیوی محمد حسین جسپور نے وصیت کی کہ میرے مکان کا نصف حصہ میرے مرنے کے بعد مسجد کو دیدیا جائے، کچھ عرصہ کے بعد اپنے لڑکے سے ناراضی ختم ہوگئی، اور مسماۃ مذکورہ نے مکان کی رجسٹری لڑکے کے نام کرادی، اور یہ کہہ دیا کہ اس کی قیمت مسجد کو دیدینا، مسماۃ مذکورہ کا انتقال ہوگیا۔

سوال یہ ہے کہ لڑکے پر رقم مسجد کو دینا لازم ہے یا نہیں؟ یا رقم دینا استحسانا ہے، نیز اس مسجد کے علاوہ اس بستی میں ایک دوسری مسجد اور تعمیر ہوئی ہے جس پر کافی قرض ہوگیا ہے حتی کہ تعمیری قرض ابھی تک ادا نہیں ہوا ہے، اور لڑکا اس دوسری مسجد مقروض کی زیادہ ضرورت دیکھ کر چاہتا ہے کہ اس کے ذریعہ مسجد کا قرض ادا ہو جائے اور پہلی مسجد کا معاملہ ایسا نہیں ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں مسجد مقروض کو نصف یا اس سے کم وزیادہ دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

جواب باصواب سے مطلع فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

المستفتی: محمد شفیع غفرلہ محلّہ علی خاں کاشی پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: وصیت کے بعد اگر موصی کسی بھی طریقے سے عین اور شیٔ موصیٰ بہ کو اپنی ملکیت سے نکال دے تو وصیت ختم ہوجاتی ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں جب مسماۃ مذکورہ نے اپنے بیٹے سے راضی ہوکر مکان مذکور بیٹے کے نام رجسٹری کر کے مالک بنا دیا تو مذکورہ مسجد کے حق میں وصیت باطل ہوچکی ہے، اب بیٹے کا مسجد کو دینا احسان اور تبرع ہوگا، اور جس کو چاہے دے سکتا ہے۔

ولو أوصیٰ بعبده لفلان ثم كاتبه أو دبره أو أخرجه عن ملكه بوجه من الوجوه كان رجوعا حتى لو عاد إلى ملكه لايكون وصية. (عالمگیری، كتاب الوصايا الباب الأول زكريا قديم ٦/ ٩٣، جديد ٦/ ١١٠)

ولو باع العين الموصىٰ بها ثم اشتراها أو وهبها ثم رجع فيها بطلت الوصية. (هنديه جديد زكريا ٦/ ١٠٩، قديم ٦/ ٩٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

كتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۱۵۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/ ۳/ ۱۴۱۱ھ

قریب المرگ وصیت کرنا

سوال [۱۱۲۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص اپنی زندگی میں وراثت کو غیر شرعی طریقے سے اپنے وارثین میں وصیت کے نام سے تقسیم کردیتا ہے کہ یہ تو لے لینا۔

اسی میں جواب طلب بات یہ ہے کہ آیا قریب المرگ انسان کے لیے اپنی وراثت کی وصیت یا وقف اپنے وارثین کے لیے جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ وہ اس میں انصاف بھی نہیں کرپاتا کسی کو زیادہ دیتا ہے تو کسی کو کم دیتا ہے، اگر یہ جائز نہیں ہے تو کیا شکل ہوگی کہ اس کی خواہش بھی پوری ہوجائے کہ زندگی ہی میں ہر وارث کو اس کا حق وراثت بتا دیا جائے، اس میں یہ بھی واضح کریں کہ

زندگی میں تقسیم وراثت کرتے وقت لڑکے اورلڑکی کو برابر رکھا جائے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص ناجائز طریقے سے اپنی زندگی میں شرعی مسائل کا خیال نہ کرکے اس کے خلاف وصیت نامہ لکھ دے کہ میرا فلاں لڑکا اس کا مالک ہے اور فلاں لڑکا اس کا مالک ہے، اور فلاں لڑکی اس کی مالک ہے، تو اس کے مرنے کے بعد اس وصیت نامہ کا اعتبار ہوگا یا نہیں؟ اگر نہیں ہوگا تو اس کے وارثین پر اس وقت موت کے بعد کیا واجب ہوتا ہے؟ آیا اسلامی فتویٰ کے مطابق دوبارہ تقسیم کریں یا نہیں؟ اگر دوبارہ تقسیم واجب ہوتی ہے اور جن کو زیادہ مال وصیت نامہ میں ملا ہے وہ اس دوبارہ تقسیم کو نہ مانے اور کہہ دے کہ جو ہمارے باپ کہہ کر مرے ہیں وہ صحیح ہے، اور کے فتویٰ کو ہم نہیں مانتے تو اس شکل میں گناہ مرنے والے پر ہوگا یا اس دوبارہ تقسیم کرنے کو نہ ماننے والوں پر ہوگا؟

المستفتی: عطاء اللہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: وارثین کے لیے وصیت جائز نہیں ہے، اگر زندگی میں میراث تقسیم کرنا ہے تو لڑکیوں کو لڑکوں کے برابر دینا لازم ہے، ورنہ باپ گنہگار ہو جائے گا۔

عن أبی أمامة الباهلی -رضی الله عنه- قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک و تعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصية لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصية لوارث، النسخة الهندية ۲/ ۳۲ دار السلام، رقم: ۲۱۲۰)

فسویٰ بينهم يعطی البنت کالابن عند الثانی وعليه الفتویٰ، ولو وهب فی صحته کل المال للولد جاز و أثم. (در مختار، کتاب الهبة زکريا ۸/ ۵۰۱، کراچی ۵/ ۶۹۶، قاضیخان زکريا جديد ۳/ ۱۹۴، وعلی هامش الهندية ۳/ ۲۹۷، هنديه زکريا قديم ۴/ ۳۹۱، جديد ۴/ ۴۱۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍رمضان المبارک
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۵۹۷)

۲ باب ما یجوز من الوصایا و مالایجوز

اپنا کل مال فلاحی کاموں میں لگانا

سوال [۱۱۲۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص جولا ولد ہے، اور گودلیا ہوا ایک بچہ رکھتا ہے، اور وہ اپنی ساری جائیداد اس گود لیے ہوئے بچہ کو دینا چاہتا ہے، یا اس کا کچھ حصہ یا کل فلاحی کاموں میں لگا دینا چاہتا ہے، کیا اس کو ایسا کرنے کا حق ہے، جبکہ اس کے جائز ورثاء موجود ہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مذکورہ شخص بحالت صحت وبحالت ہوش و حواس اپنا مال لے پالک کو دینا چاہتا ہے یا کل مال فلاحی کاموں میں خرچ کر دینا چاہتا ہے تو اس کے لیے جائز اور درست ہے، ہاں مرض الموت میں جائز نہیں ہے، البتہ مرض الموت میں صرف ایک ثلث میں ایسا کرنا جائز ہوتا ہے۔

المالک هو المتصرف فی الأعیان المملوکة کیف شاء من الملک. (بیضاوی شریف رشید ۱/۷)

الملک ما من شانه أن یتصرف فیه بوصف الاختصاص. (شامی مطلب: فی تعریف المال زکریا ۷/۵ ۲۳، کراچی ۵/ ۵۰۰) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱ر ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴۱۲/۲۹)

وصی کا اپنی جائیداد اللہ کی راہ میں دینا

سوال [۱۱۲۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: مرنے والے کی وصیت تھی کہ میرے مرنے کے بعد میرا کفن دفن یعنی میت کا جملہ خرچ میرے ہی پیسہ سے کیا جائے اور باقی جو روپیہ پیسہ بچے وہ اللہ کی راہ میں دیدیا جائے ،لہٰذا متوفیٰ کے پڑوس میں ایک مسجد و مدرسہ بھی ہے، جس میں فرش ، پلاسٹر وغیرہ کے لیے پیسہ کی ضرورت ہے،اب جناب والا سے معلوم یہ کرنا ہے کہ کفن دفن وغیرہ کے بعد جو روپیہ بچے اس میں پڑوس کی مسجد اور مدرسہ کا کیا حق بنتا ہے،کیا باقی مساجد و مدرسہ کو بھی دینا ضروری ہے؟ اگر ضروری ہے تو کتنا؟ واضح رہے کہ وارثین بھی لینا نہیں چاہتے ہیں بلکہ نفاذ وصیت پر تیار ہیں۔

المستفتی: محمد نسیم قریشی اصالت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر واقعی وارثین وصیت کے نفاذ پر تیار اور خوش ہیں اور کوئی چھوٹے نابالغ وارث موجود نہیں ہیں تو مرحوم کے مابقیہ کل مال کو محلّہ کی مسجد و مدرسہ میں خرچ کرنے کی اجازت ہے،دیگر مساجد اور مدارس میں دینا کوئی ضروری نہیں، کیونکہ اپنے پڑوس کا زیادہ حق ہوتا ہے اور اگر مرحوم کا کوئی وارث نابالغ ہے تو اس کا حصہ محفوظ رکھنا لازم ہے۔

وتجوز بالثلث للأجنبي ...... لاالزيادة عليه إلا أن تجيز ورثته بعد موته وهم كبار. (تنوير الأبصار، كتاب الوصايا، زكريا ١٠/٣٣٩، كراچی ٦/٦٥٠)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

كتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ ؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۰۲۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴/ ۵/ ۱۴۱۵ھ

جائیداد وقف کرنے کی صورت میں وصیت کا حکم

سوال [۱۱۲۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کے تین بھائی اور چار بہنیں تھیں، زید کے دو بھائیوں کی شادی باپ کی سرپرستی میں ہوگئی تھی، کچھ دنوں کے بعد باپ اللہ کو پیارے ہوگئے، والدہ کچھ دن حیات

رہیں، پھر وہ بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں، اور چاروں بہنیں شادی شدہ تھیں، بعدہ دونوں بھائی چھوٹے بھائی سے الگ ہوگئے، چھوٹا ادھرادھر اپنی محنت ومشقت اور مزدوری کرتا رہا، پھر اللہ نے اس کی روزی میں برکت عطا کی اور اپنی گاڑھی کمائی سے اپنا مکان بنوایا، پھر اس کے بعد اپنی شادی کرلی، اب مذکورہ شخص کے دونوں بھائی اور زید اور تینوں بہنیں اللہ کو پیاری ہوچکی ہیں، اب ہم تینوں بیوہ ہیں اور تینوں بیواؤں کے پاس اپنے اپنے شوہر کا مکان اور جائیداد الگ الگ موجود ہے، میرے شوہر حیات تھے تو میرے اور ان میں معاہدہ ہوا تھا کہ اگر میرا پہلے انتقال ہوجائے تو میرا مکان اور جائیداد مسجد میں وقف کردینا، میں نے اپنے شوہر کے فرمان کے مطابق ایسا ہی کیا ہے کیا ان بیواؤں کا حق میرے مکان اور جائیداد میں ہوتا ہے یا نہیں؟ یا جو میں نے ایسا کیا ہے یہ ٹھیک ہے یا نہیں؟ جواب سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی: زیتون بیوہ، گودھنا، سیتاپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر آپ کا سوال صحیح اور درست ہے، تو آپ کا ایسا کرنا کل مکان وجائیداد میں سے ایک تہائی میں درست ہے، باقی دوتہائی آپ کے جو شرعی ورثاء ہیں ان کے درمیان ان کے حقوق کے مطابق تقسیم ہوگی، کیونکہ وصیت صرف ایک ثلث میں نافذ ہوتی ہے۔

عن عامر بن سعد، عن أبيه رضي الله عنه قال: مرضت، فعادني النبي ﷺ –إلى– قلت: أريد أن أوصي بالنصف؟ قال: النصف كثير، قلت: فالثلث؟ قال: الثلث كثير أو كبير، قال: فأوصى الناس بالثلث، فجاز ذلك لهم . (صحيح البخاري، باب الوصية بالثلث، النسخة الهندية ١/٣٨٣، رقم: ٢٦٦٣، ف: ٢٧٤٤)

اگر آپ اپنے شوہر کے وارثین اور تعداد لکھ دیتیں تو حصہ بھی بنادیا جاتا، آپ کے شوہر کی جائیداد میں سے مذکورہ بیواؤں کو بطور وراثت کوئی حق نہیں مل سکتا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۷۱۱)

متوفیہ کی نماز، روزہ کے فدیہ اور حج بدل کی وصیت کا حکم

سوال [۱۱۲۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: متوفیہ کے ذمہ دو سال کے روزے اور تین سال کی زکوٰۃ واجب ہے، آیا تقسیم سے پہلے ادا کیے جاسکتے ہیں یا نہیں؟ ان کی ادائیگی کے بارے میں متوفیہ کی وصیت بھی ہے، متوفیہ نے زبانی بھی وصیت کی کہ میرے مال سے جو منقولہ یا غیر منقولہ ہے اس سے پہلے حج بدل ادا کرادیں، روزے، زکوٰۃ کا بدل دیں، اس کے بعد جو بچے وہ وقف للہ کردیں، آیا اس طرح وصیت کرنا شرع محمدی میں درست ہے؟ کل یا کچھ حصہ کے بارے میں وصیت کرسکتے ہیں؟ تحریر کریں، مہربانی فرما کر درج بالا مسائل پر از روئے شرع فتویٰ دیں۔

المستفتی: احسان الحق محلّہ بھٹی مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر متوفیہ نے زکوٰۃ کی ادائیگی، روزہ ونماز کا فدیہ اور حج بدل کی وصیت کی ہے تو متوفیہ کے کل ترکہ میں سے تہائی حصہ نکال کر اس میں سے اولاً زکوٰۃ، روزہ، نماز اور حج بدل وغیرہ میں وصیت کے مطابق صرف کردیئے جائیں، اور ان سب کی ادائیگی کے بعد بھی تہائی حصہ میں سے بچ جائے تو وقف للہ کو نافذ کردیں ورنہ نہیں، اور کل ترکہ کا دوتہائی مذکورہ ورثاء کا حق ہوگا، اور ورثاء کو دوتہائی میں سے مذکورہ چیزوں میں خرچ کرنے پر شرعاً مجبور نہیں کیا جائے گا۔

إذا مات من علیه زکاة، أو فطرة، أو کفارة، أو نذر لم تؤخذ من ترکته عندنا إلا أن یتبرع ورثته وهم من أهل التبرع ولم یجبروا علیه و إن أوصیٰ تنفذ من الثلث. (شامی، باب صدقة الفطر، کراچی ۲/ ۳۵۹، کوئٹه ۲/ ۷۸، زکریا ۳/ ۳۱۱، هندیه زکریا قدیم ۱/ ۱۹۳، جدید ۱/ ۲۵۵، الجوهرة النیرة، امدادیه ملتان ۱/ ۱۶۵، دار الکتاب دیوبند ۱/ ۱۶۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ شعبان المعظم ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۲۴۱)

حج کے لیے بطور وصیت دیئے گئے روپیہ سے حج کرنا واجب ہے یا نہیں؟

سوال [۱۱۲۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: معلوم ہو کہ میرے خسر نے انتقال سے پہلے مجھے حج بدل کرنے کی وصیت کی اور ساتھ ہی رقم بھی ادا کردی، تقریباً ڈھائی ماہ ہو چکے ہیں، مرحوم نے اپنے متعلقین کے لیے گھر، کھیت وغیرہ کافی جائیداد چھوڑی ہے، میرا خود کا معاملہ یہ ہے کہ میرے پاس کھیت ہے، نقد رقم اتنی نہیں کہ خود کا فرض ادا کرسکوں، میرے بڑے بھائی ان کی بھی حیثیت ہے، مگر ابھی تک حج کے لیے نہیں گئے، والدہ وہ بھی نہ جاسکیں، والد کا انتقال ہو چکا ہے، یہاں میں نے اپنی حالت بیان کردی ہے تاکہ آپ نیک مشورہ سے نوازیں۔

المستفتی: محمد رفیق، نزد درگاہ مسجد قاضی پورہ، امراوتی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب آپ کے خسر نے آپ کو حج بدل کرنے کے لیے رقم دے کر وصیت کردی تو آپ پر واجب ہے کہ ان رقموں سے حج بدل خود کریں اور بصورت عذر دوسرے کے ذریعہ حج بدل کروادیں، ورنہ آپ سخت گنہگار ہوں گے، البتہ اگر آپ نے اپنا حج ابھی تک نہیں کیا ہے اور آپ پر حج فرض بھی نہیں ہے، تو آپ کا حج بدل کرنا مکروہ تنزیہی اور غیر مستحسن ہے، اگر آپ پر حج فرض ہو چکا ہے تو مکروہ تحریمی ہے، آپ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ پر حج فرض نہیں ہے، بہر صورت اگر آپ حج بدل کریں گے تو حج ادا ہو جائے گا۔ (مستفاد: جواہر الفقہ قدیم ۱/ ۵۰۷، جدید زکریا ۴/ ۲۱۵، فتاویٰ دار العلوم ۶/ ۵۷۶)

اور اگر آپ حج بدل کر کے اس کی اجرت لینا چاہتے ہیں تو جائز نہیں ہے۔

ولایجوز الاستئجار علی الطاعات. (رسم المفتی قدیم ص: ۳۷، جواهر الفقه قديم ۱/ ۵۰۱، جدید زکریا ۴/ ۲۰۸)

عن إبراهيم النخعي أنه قال: إذا أوصیٰ بحج أو زكاة فهي من الثلث حج أو لم يحج. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، باب الوصية بالحج، دار الفكر ۹/ ۳۷۹، رقم: ۱۲۸۶۸،

المنصف لابن أبی شیبة مؤسسة علوم القرآن ١٦/ ١٦٣ رقم: ٣١٤٦٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ صفر المظفر ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۰۴۴)

وارث مسجد کے حق میں وصیت کا منکر ہو اور گاؤں والے مدعی ہوں

سوال [۱۱۲۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ گاؤں والوں کا کہنا ہے کہ بڑے بھائی نے مرتے وقت یہ وصیت کی تھی کہ سو گز مکان میں سے ساٹھ گز مسجد میں وقف ہوگا، اور چالیس گز چھوٹے بھائی کو دیدیا جائے گا، تو کیا یہ وصیت جاری ہوگی یا نہیں؟ جبکہ چھوٹے بھائی کا کہنا ہے کہ میرے بھائی نے کوئی وصیت نہیں کی، بلکہ گاؤں والے مجھ کو مکان سے محروم کر دینے کا پروپیگنڈہ کر رہے ہیں؟

المستفتی: نصیر احمد محلّہ زاہد نگر مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ساٹھ گز میں وصیت کسی بھی طرح نافذ نہیں ہوگی، نیز اگر دو عادل آدمی کی شہادت سے وصیت کا ثبوت نہ ہو تو کل سو گز ورثاء کے درمیان تقسیم ہو جائے گا اور اگر وصیت کے لیے دو عادل باریش یا پابند صوم وصلاۃ آدمی شہادت دیدیں تو بڑے بھائی کے سو گز میں سے صرف ایک تہائی مسجد کو مل سکتا ہے، بقیہ نصیر احمد اور نور جہاں کے درمیان حصص شرعی کے طور پر تقسیم ہوگا۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۸/ ۴۱۵، جدید زکریا مطول ۱۳/ ۳۳۶)

ثم تنفذ وصایا من ثلث ما بقی بعد الدین. (شریفیه ص: ۷)

وإذا شهد شاهدان أن المیت أوصی إلی هذا الرجل (إلی قوله) أجزت شهادتهما. (عالمگیری، کتاب الوصایا، الباب العاشر فی الشهادة علی الوصیة، زکریا جدید ٦/ ١٨٢، زکریا قدیم ٦/ ١٥٩) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ صفر المظفر ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۶۵۵)

مسجد کے لیے وصیت کردہ رقم کو مدرسہ میں لگانا

سوال [۱۱۲۲٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص نے اپنی وفات سے قبل ہزار روپیہ دے کر یہ وصیت کی کہ ان کو مسجد وغیرہ میں لگا دینا، پھر اس کا انتقال ہوگیا، اب آیا ان کو مدرسہ میں لگا دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ادریس رامپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مذکورہ ہزار روپیہ مرحوم کی شرط کے مطابق مسجد میں صرف کرنا واجب ہوگا، مدرسہ میں لگانا جائز نہ ہوگا۔

أما الوصية لمسجد كذا أو قنطرة كذا، صرف إلى عمارته و إصلاحه. (بزازيه كتاب الوصايا زكريا جديد ٢٦٢/٣، وعلى هامش الهندية ٤٣٨/٦)

شرط الواقف كنص الشارع، مالم يكن مخالفا للشرع. (الموسوعة الفقهية الكويتية ١٠٠/٣٦)

صرحوا بأن مراعاة غرض الواقفين واجبة. (شامي، مطلب: مراعاة غرض الواقفين واجبة كراچي ٤٤٥/٤، زكريا ٦٦٥/٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲٦ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۲۰۹/۲۴)

مسجد کے لیے کل مال کی وصیت کرنا

سوال [۱۱۲۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حبیب احمد نے اپنی زندگی میں اپنی تمام جائیداد، صحرائی وسکنائی، محلّہ کی مسجد و مدرسہ کو وصیت کردی تھی، اس کے بعد حبیب احمد کا انتقال ہوگیا ہے، حبیب احمد نے حسب

ذیل ورثاء کو چھوڑا، بیوی خدیجہ، بھائی مولوی مختار احمد صاحب، دونوں وارثوں نے مورث کی وصیت کو قائم رکھا، اور اس سے راضی رہے، مرحوم کے بھائی مولوی مختار احمد صاحب نے نماز جنازہ پڑھا کر تمام نمازیوں کے سامنے یہ اعلان کر دیا تھا کہ بھائی کے ترکہ میں سے جو حصہ میرا ہوتا ہے وہ میں مرحوم کی وصیت کے مطابق مسجد و مدرسہ ہی کو دیتا ہوں، اور اب مولوی مختار احمد کے انتقال کے بعد ان کے وارثوں نے بھی مسجد و مدرسہ کے حق میں ہی چھوڑ دیا، مسجد و مدرسہ نے حبیب احمد کے انتقال کے بعد قانونی کارروائی کی تا کہ وصیت شدہ جائیداد مسجد و مدرسہ کی ملکیت میں آجائے، اور ان دونوں وارثوں یعنی مرحوم کے بھائی اور مرحوم کی بیوی نے مسجد و مدرسہ کے نام داخل و خارج ہونے میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دونوں وارثوں نے یہ جائیداد وصیت شدہ اپنی ملکیت سے نکال کر بخوشی مسجد و مدرسہ کی ملکیت میں دیدی، اب بھائی اور بیوہ کا اس جائیداد سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں رہتا، لیکن مورث کی زبانی وصیت کے مطابق کہ وصیت شدہ آراضی کی پیداوار سے بیوہ اپنا گذارہ کرتی رہے گی، کیونکہ اس کے گذارے کے لیے کوئی دوسرا ذریعہ نہیں، لہٰذا بیوہ تا حیات اس جائیداد کی پیداوار سے گذارا کرتی رہی، اب بیوہ کا انتقال ہوگیا ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ: (۱) اس صورت میں بیوہ کے وارثوں کا کوئی حق و حصہ نکلتا ہے کہ نہیں؟

(۲) حبیب احمد کے دونوں وارثوں کے حصص قائم کر دیئے جائیں؟

(۳) وصیت شدہ کی پیداوار جو بیوہ کے انتقال کے وقت کھیت میں کھڑی ہوئی تھی اس میں بیوہ کے وارثوں کا کوئی حصہ ہوتا ہے کہ نہیں؟

المستفتی: حاجی نور احمد قصبہ منڈاوٗ ضلع بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: انفاق اور صرف کرنے کی قید لگائے بغیر مسجد کے لیے وصیت نافذ ہونے میں اختلاف ہے، امام ابو حنیفہؒ و امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وصیت باطل ہوجاتی ہے، اور امام محمدؒ کے نزدیک جائز و درست ہوجاتی ہے۔

لو قال أوصيت بثلث مالی للمسجد جاز عند محمدؒ وقال أبو يوسف لايجوز إلا أن يقول ينفق على المسجد، فی الخانية: ولو أوصیٰ بثلث ماله للمسجد وعين المسجد أو لم يعين فهی باطلة فی قول أبی يوسف جائزة فی قول محمد ولو أوصیٰ بأن ينفق ثلثه علی المسجد جاز فی قولهم. (البحر الرائق، كتاب الوصايا، باب الوصية بثلث المال، كوئٹه ۸/۴۱۳، زكريا ۹/۲۲۹-۲۳۰، الدر مع الرد زكريا ۱۰/۳۵۹، كراچی ۶/۶۶۴، زكريا ۱۰/۴۰۳، كراچی ۶/۶۹۶، بزازيه زكريا جديد ۳/۲۶۱ وعلی هامش الهندية ۶/۴۳۷، قاضيخان زكريا جديد ۳/۳۶۸ وعلی هامش الهندية ۳/۴۹۷)

نیز شرعی ورثاء کے ہوتے ہوئے کل جائیداد ترکہ کی وصیت شرعاً نافذ نہیں ہوتی بلکہ کل جائیداد کی وصیت کی صورت میں ایک تہائی میں وصیت نافذ ہوتی ہے باقی دو تہائی جائیداد وارثین کے درمیان تقسیم ہو جائے گی۔

لايجوز بما زاد علی الثلث. (الجوهرة النيرة، كتاب الوصايا، امداديه ملتان ۲/۳۸۹، دار الكتاب ديوبند ۲/۳۷۰، مختصر القدوری ص: ۲۸۱، هدايه اشرفی ۴/۶۵۴، البحر الرائق كوئٹه ۸/۴۰۲، زكريا ۹/۲۱۴)

ہاں البتہ جو وارث اپنا حصہ بخوشی چھوڑ دے گا اس کے حصہ میں بھی وصیت نافذ ہو جائے گی۔

وإن أجاز أحدهما دون الآخر يجعل فی حق الذی جاز. (الجوهرة النيرة، كتاب الوصايا، امداديه ملتان ۲/۳۸۹، دار الكتاب ديوبند ۲/۳۷۰، شامی زكريا ۱۰/۳۴۰، كراچی ۶/۶۵۱، فتح القدير زكريا ۱۰/۴۴۸، دار الفكر ۱۰/۴۱۷، كوئٹه ۹/۳۴۷)

امام محمدؒ کے قول کے مطابق اگر مذکورہ وصیت کو صحیح اور نافذ قرار دیا جائے تو مولانا مختار احمد صاحب مرحوم کے حصہ میں بھی وصیت نافذ ہو کر مسجد کو مل جائے گا، اسی طرح اگر بیوہ نے بھی صراحت کے ساتھ اپنا حصہ مسجد کو دینے کے لیے کہہ دیا تھا تو وہ بھی مسجد کو مل جائے گا، اور بیوہ کے ورثاء نہ جائیداد ملے گی اور نہ اس کی پیداوار میں سے کچھ مل سکتا ہے اور اگر بیوہ نے اپنا حصہ مسجد کو دینے کے لیے صراحت کے ساتھ رضامندی کا اظہار نہیں کیا ہے تو بیوہ کے حصے

میں وصیت نافذ نہیں ہوگی؟ لہٰذا کل جائیداد کے دو ثلث میں بیوہ کا جو حصہ شرعاً نکل سکتا ہے وہ تمام فقہاء کے قول کے مطابق مسجد کو نہیں ملے گا، بلکہ بیوہ کے شرعی ورثاء کو جائیداد و پیداوار سب مل جائے گی، ہاں البتہ وہ لوگ اپنی رضامندی سے مسجد کو دینا چاہتے ہیں تو جائز ہوسکتا ہے ورنہ نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم جمادی الثانیہ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۱۲۱۳)

مسجد کے لیے کی گئی وصیت کا حکم

سوال [۱۱۲۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حاجی خلیل کی ایک بیوی اور دو لڑکوں نے حاجی صاحب کو خرچہ وغیرہ کچھ نہیں دیا اور بہت تنگ کیا، اس لیے حاجی صاحب نے تقریباً دس سال سے مسجد میں قیام کرلیا، اور حاجی صاحب نے دوکان اور ۹ر بیگہ زمین کا بیع نامہ بیوی اور لڑکوں کے نام کردیا اور بقیہ چھ بیگہ زمین مسجد کے نام اس شرط پر رجسٹری کردی کہ زندگی میں میری اور بعد مرنے کے مسجد کی، ۹۳ء میں حاجی صاحب کا انتقال ہوگیا پاکستان جاکر اور زمین چھ بیگہ پر دونوں لڑکے ظفیر اور ظہیر نے قبضہ کرلیا، اور مسجد کو بالکل دینا نہیں چاہتے، جبکہ مسجد کے منتظمین کل زمین چھ بیگہ مسجد کے لیے لینے پر بضد ہیں، اس صورت میں منتظمینِ مسجد کو کیا کرنا چاہئے؟ مرحوم کی دو لڑکیاں بھی ہیں۔

المستفتی: منتظمین مسجد شاہ آباد رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حاجی خلیل احمد صاحب نے اپنی زندگی میں چھ بیگہ زمین مسجد کے نام اس شرط پر رجسٹری کی ہے کہ زندگی میں میری اور میرے مرنے کے بعد مسجد کی، یہ وصیت کی ہے، اور وصیت کا نفاذ میت کے ثلث مال میں ہوتا ہے، لہٰذا چھ بیگہ زمین اگر کل جائیداد کا ثلث ہے تو وہ مسجد کی ہے اور اگر ثلث سے زیادہ ہے تو زیادہ ورثاء کی ہے، اور

بقدر ثلث مسجد کی ہوگی۔

عن عامر بن سعد، عن أبيه رضي الله عنه قال: مرضت، فعادني النبي ﷺ -إلى- قلت: أريد أن أوصي بالنصف؟ قال: النصف كثير، قلت: فالثلث؟ قال: الثلث كثير أو كبير، قال: فأوصى الناس بالثلث، فجاز ذلك لهم. (صحيح البخاري، باب الوصية بالثلث، النسخة الهندية ۱/۳۸۳، رقم: ۲٦٦۳، ف: ۲۷٤٤)

ولاتجوز بما زاد على الثلث لقوله عليه السلام في حديث سعد بن أبي وقاص (الثلث والثلث كثير) بعد ما نفى وصيته بالكل والنصف. (هدايه، كتاب الوصايا باب في صفة الوصية اشرفي ٤/٦٥٤-٦٥٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم شعبان المعظم ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۶۱/۴۵۶۱)

مسجد کے لیے ثلث مال سے زائد کی گئی وصیت کا حکم

سوال [۱۱۲۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمد گل شیر مرحوم ولد محمد اسماعیل مرحوم ساکن شہزاد پور ضلع بجنور نے اپنی اولاد سے چھپا کر جو کہ پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں، اپنی آراضی کاشت کی جو کہ کل ۷۵ گز ہے، اور اخیر میں بعض لوگوں کے کہنے اور بہکانے میں چالیس بیگہ زمین جس میں باغ کھڑا ہے، جامع مسجد شیر کوٹ کو وصیت کر دی تھی، جو کہ ان کی وفات کے بعد ہم وارثین کو معلوم ہوا، اس باغ کی آمدنی جامع مسجد شیر کوٹ والے لینے لگے، اور باغ میں جو کاشت ہوتی تھی ان کے وارثین یعنی اولاد استعمال کرتی رہی، اب جامع مسجد شیر کوٹ کی کمیٹی نے اس باغ پر مکمل قبضہ کرلیا ہے، اور وارثین کو کاشت کرنے سے روک دیا ہے، اور باغ کا کٹان کرا رہے ہیں، سوال یہ ہے کہ یہ وصیت جو کہ چالیس بیگہ زمین کی ہے، صحیح اور درست اور نافذ العمل ہے یا نہیں؟ جبکہ ان کی ملکیت میں صرف پچھہتر بیگہ آراضی ہی تھی، بعض علماء سے معلوم کیا تو انہوں

نے بتایا کہ ان کو صرف ۲۵/ بیگہ ہی وصیت کرنے کا حق تھا، زیادہ کا نہیں تھا، اگر وصیت صحیح نہیں ہے تو کیا کمیٹی جامع مسجد شیر کوٹ کو کٹان کا حق ہے؟ اور چالیس بیگہ آراضی پر قبضہ کرنے کا حق ہے؟ جواب باصواب سے نوازیں۔

المستفتی: دلدار احمد ولد گل شیر احمد شہزاد پور بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جن علماء نے یہ مسئلہ بتایا ہے کہ کل آراضی کی ایک تہائی میں وصیت نافذ ہوگی، جبکہ اس کے علاوہ کوئی اور جائیداد اس کے پاس نہ ہو، صحیح اور درست ہے، لہٰذا اگر واقعۃ مرحوم نے مسجد کے لیے وصیت کی ہے تو چالیس بیگہ میں وصیت نافذ نہیں ہوگی بلکہ پچیس صرف بیگہ میں وصیت نافذ ہوسکتی ہے، اور مسجد کے ذمہ داران کے لیے پچیس بیگہ سے زائد پر قبضہ کرنا جائز نہیں ہے، اور پچیس بیگہ سے زائد کی آمدنی اور پیداوار مسجد کے لیے حلال نہیں ہوگی۔

ثم تصح الوصية للأجنبي بالثلث من غير إجازة الوارث …… وإن ردوا الزيادة بطلت. (تبيين الحقائق، كتاب الوصايا زكريا ٧/٥٧٣-٧٣٦، امداديه ملتان ١٨٢/٦، البحر الرائق كوئٹه ٨/٤٠٤، زكريا ٩/٢١٣)

وتكون الزيادة عن الثلث موقوفة على الإجازة فإن أجاز الورثة الزائد عن الثلث للأجنبي نفذت الوصية، وإن ردوا الزيادة بطلت. (الفقه الإسلامي هدى انٹر نيشنل ٨/٥٧)

عن سعد بن أبي وقاصؓ قال: كان النبي ﷺ يعودني و إنما أنا مريض بمكة فقلت لي مال أوصي بمالي كله قال: لا، قلت: فالشطر قال: لا، قلت: فالثلث؟ قال: الثلث والثلث كثير، أن تدع ورثتك أغنياء خير من أن تدعهم عالة يتكففون الناس في أيديهم (الحديث). (صحيح البخاري باب فضل النفقة على الأهل، النسخة الهندية ٢/٨٠٦، رقم: ٥١٤٥، ف: ٥٣٥٤)

عن سالم عن أبيه قال قال النبي ﷺ: من أخذ من الأرض شيئا بغير

حقه خسف به يوم القيامة إلى سبع أرضين. (بخاری، إثم من ظلم شيئا من الأرض، النسخة الهندية ١/ ٣٣٢، رقم: ٢٣٩٠، ف: ٢٤٥٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۳۰)

مسجد کے لیے مکان کی وصیت کرنے کا حکم

سوال [۱۱۲۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک بیوہ عورت جس کے دو بچے ہیں، دونوں کی شادی کردی ہے، لڑکے کا انتقال ہو چکا ہے، لڑکے کی بیوی نے دوسرا نکاح کرلیا ہے بچے ماں کے ساتھ ہیں، لڑکے کے انتقال کے بعد ماں نے لڑکی داماد کو اپنے گھر بلا کر ان کو مالک بنادیا ہے، ماں دماغ سے کچھ کمزور ہے، محلّہ میں مسجد ہے، ماں کو چڑھا کر لوگوں نے مکان مسجد کے نام وصیت کروا دیا ہے، لڑکا لڑکی داماد کی غیر موجودگی میں، لڑکی داماد کو بلائے ہوئے سترہ سال ہو چکے ہیں، لڑکی کو سسرال سے بلا کر وہاں کی مالیت سے بے دخل کروادیا ہے، چھ لڑکیاں ہیں، جن میں تین لڑکیاں جوان ہیں اس وقت لڑکی بے سہارا ہے، داماد نے جو کچھ کمایا وہ بچوں کی پرورش اور ساس کے اخراجات میں خرچ کردیا، ان حالات میں اپنی جوان لڑکیوں کو لے کر کہاں جائے، مسجد والے تنبیہ کررہے ہیں کہ مکان خالی کرو، کیا ان حالات میں وصیت جائز ہے، مسجد والوں کو ان حالات میں مسجد کے لیے مکان لینا جائز ہے یا نہیں؟ ماں دماغی حالات میں ہوتی ہے تو کہتی ہے کہ مکان تیرا ہے، تجھے کوئی نہیں نکال سکتا اور جب دماغ میں کمی ہوتی ہے تو کہتی ہے کہ نکل، گھر سے نکل جا، لڑکی بہت پریشان ہے، لڑکی نہ سسرال کی رہی اور نہ میکے کی، اور داماد بہت پریشان ہے، لڑکی ماں کی خدمت کرنے کو تیار ہے، لڑکی کہتی ہے کہ ماں تمہاری پوری زندگی خدمت کروں گی، ہر اعتبار سے خدمت انجام دوں گی، کبھی شکایت کا موقع نہیں آنے دوں گی، ماں تم میرے اوپر مہربانی کرو، مسجد والوں سے لڑکی داماد نے بات کی تو جواب دیا کہ

مسجد کو ایسا مال لینا جائز ہے؟ کیا مسجد والوں کا کہنا صحیح ہے؟

المستفتی: اعظم کاشی پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مذکورہ عورت نے ہوش وحواس کی درستگی کی حالت میں مسجد کے نام سے مکان کی وصیت کی ہے، اور اس عورت کے پاس اس مکان کے علاوہ کوئی دوسری جائیداد نہیں ہے تو اس عورت کی موت کے بعد مذکورہ مکان کی صرف ایک تہائی میں وصیت نافذ ہوگی، باقی دو تہائی، اس عورت کی اولاد کے درمیان شرعی حساب سے تقسیم ہوگا، سوالنامہ میں درج ہے کہ اس عورت کے لڑکے کا انتقال عورت کی زندگی میں ہو چکا ہے اور اس لڑکے کی بیوی اور اس کی اولا دیں موجود ہیں، اور اس عورت کی ایک لڑکی بھی موجود ہے جو اس گھر میں رہ رہی ہے تو عورت کی لڑکی اور اس کے پوتے پوتی اس کے شرعی وارث ہوں گے، مکان کے دو تہائی کے حقدار وہی لوگ ہوں گے اور لڑکے کی بیوی چونکہ مذکورہ عورت کی وارث نہیں ہے، اس لیے لڑکے کی بیوی کو اس میں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا، اور یہ بات بھی یاد رکھیں کہ یہ وصیت عورت کے مرنے کے بعد نافذ ہوگی، اس کی زندگی میں مسجد والے مسجد کے لیے ایک ثلث حصہ لینے کا مطالبہ نہیں کر سکتے، اور جب تک وہ عورت زندہ رہے گی اس وقت تک پورے مکان کی وہی مالک رہے گی، لہٰذا مسجد والوں کو عورت کی زندگی میں مکان کا کوئی حصہ لینے کا حق نہیں ہے، اور اگر عورت وصیت پر بدستور قائم رہے اور اس کو باطل نہ کرے، پھر اسی حالت میں مر جائے تو مر جانے کے بعد مسجد والوں کو ایک ثلث کے مطالبہ کا حق ہوسکتا ہے، اور باقی دو ثلث اس کے شرعی وارثین کے درمیان تقسیم ہو جائے گا، اور عورت اپنی زندگی میں اس وصیت کو باطل کرنے کا حق بھی رکھتی ہے۔

ولاتجوز بما زاد على الثلث وقوله: ويجوز للموصى الرجوع عن الوصية لأنه تبرع لم يتم فجاز الرجوع عنه. (هدايه، كتاب الوصايا، باب فى صفة الوصية، اشرفى ٤/ ٦٥٤ – ٦٦٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ شوال المکرّم ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۱۸۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/ ۱۰/ ۱۴۳۱ھ

عمرہ کرانے کی وصیت کا شرعی حکم

سوال [۱۱۲۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمد عامر مرحوم کینسر کے مریض تھے، مرحوم اپنے والد اور خسر کو عمرہ کرانے کا ارادہ رکھتے تھے، مرحوم نے حج کو جاتے وقت کاروباری نائب اپنے بہنوئی سے کہا کہ آپ اگلے سال والد اور ہمارے خسر صاحب کو عمرہ کرا دینا، اگر میں اس سفر سے واپس نہ بھی آؤں تو آپ یہ کام کرا دیں، اور خسر صاحب سے یہ کہا (کسی دوسرے موقع پر) کہ آپ کو (ہمارے والد) پاپا کو لے کر اگلے سال جانا ہے، نائب سے کہا کہ یومیہ کچھ (۲۰۰) رقم علاحدہ جمع کرنا شروع کر دینا، مرحوم سفرِ حج سے واپس آئے، تقریباً چار ماہ بعد انتقال فرما گئے، اس وقت تک (انتقال تک) مبلغ تینتیس ہزار روپیہ جمع ہو چکے تھے، مرحوم کے ورثاء میں ایک بچی جس کی عمر انتقال کے وقت سوا ماہ زوجہ، والد اور والدہ ہیں تو کیا مرحوم کے مال متروکہ سے اس ارادہ کی تکمیل کرائیں؟ یا وراثت تقسیم کرا دیں، جواب سے نوازیں؟

المستفتی: محمد آصف رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرحوم محمد عامر نے اپنے خسر اور اپنے باپ دونوں کے لیے ایک ساتھ عمرہ کے خرچہ کی وصیت کی ہے، اب مرحوم کی موت کے بعد جمع کردہ ۳۳؍ ہزار روپیہ اور مرحوم کا دیگر سرمایہ جمع کرنے کے بعد اولاً تین حصہ کیے جائیں گے، اور تین حصہ کرنے کے بعد ثلث مال یعنی تہائی حصہ میں وصیت نافذ ہونے کی بات تھی، لیکن خسر کے ساتھ اپنے باپ کے عمرہ کی وصیت کو بھی جوڑ دیا تھا، اس لیے اس ایک تہائی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا، ایک حصہ باپ کا جس میں باپ کے وارث ہونے کی وجہ سے وصیت نافذ نہ ہوگی، اور ایک حصہ خسر کا جس میں خسر کے وارث نہ ہونے کی وجہ سے وصیت نافذ ہوگی اس لیے کل سرمایہ ٦؍ حصوں میں تقسیم کرنے کے بعد سدس یعنی چھٹا حصہ اتنا ہے کہ عمرہ کا خرچہ پورا ہو جاتا ہے تو خسر کے حق میں وصیت نافذ ہو جائے گی اور باپ کے حق میں

وصیت نافذ نہ ہوگی بلکہ باپ کووراثت کا شرعی حصہ ملے گا۔

ومن أوصیٰ لأجنبي ولوارثه فللأجنبي نصف الوصية وتبطل وصية الوارث لأنه أوصیٰ بما يملك الإيصاء به و بمالا يملك فصح في الأول وبطل في الثاني. (هدايه، كتاب الوصايا، باب الوصية بثلث المال اشرفی ٤/٦٦٧-٦٦٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍محرم الحرام ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۶۴۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۱/۲۰ھ

کنواں بنوانے کی وصیت

سوال [۱۱۲۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حسین کے نانا محسن نے اپنی زندگی میں حسین کو کچھ رقم دی کہ اسے تجارت میں لگا لو، بعد میرے مرنے کے اپنی نانی کی کفالت اسی پیسے سے کرنا اور اپنی نانی کے فوت ہونے پر نفع کے پیسے کا ایک کنواں بنوادینا تا کہ اس کے پانی سے سیراب ہونے والوں کی دعائیں میرے ساتھ رہیں، لیکن آج نانا نانی کی وفات کے بعد کنواں کا رسم ورواج ختم ہوگیا، نل وٹنکی کا استعمال ہے، اب کیا کنواں ہی کی بناء ضروری ہے یا ٹنکی مسجد میں بنوادی جائے اور ایک ٹوٹی مسجد کے باہر کردی جائے جس سے راہگیر وغیرہ استفادہ کریں، واضح رہے کہ نانا کی زندگی میں حسین نے ایک بار ذکر کرتے ہوئے محسن سے دریافت کیا تھا کہ اب تو کنواں کا استعمال وبناء مفقود ہوگیا، کیا میں ٹنکی نہ بنوادوں گا تو نانا محسن کنواں ہی بنانے پر مصر رہے، اب حسین اس وقت کیا کرے؟ اگر کنواں کے علاوہ دیگر کوئی امر کرنے پر نانا کی وصیت پوری ہوتی ہے تو احسان فرما کر مطلع فرمائیں، نوازش ہوگی۔

المستفتی: احمد علی پرتاپگڈھی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: جب نانا محسن کا اصرار کنواں بنانے پر رہا ہے تو

وصیت پوری ہونے کے لیے کنواں ہی بنانا لازم ہوگا۔

شرط الواقف كنص الشارع. (الأشباه قديم ص: ۱۷۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۷۴۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱/۶/۱۴۱۲ھ

اپنے باغیچہ میں تدفین کی وصیت

سوال [۱۱۲۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے والد بزرگوار نے اپنی قبر اپنی حیات میں باغیچہ میں کھدوائی ہے اور اپنی اہلیہ کو بھی اپنے ہی بغل میں دفن کرنے کی وصیت کی ہے، میرے تایا زاد بھائیوں کا اس پر کچھ اعتراض ہے، چونکہ خاندان کے سبھی لوگ اور پردادا بھی جس کا یہ باغیچہ ہے، قبرستان میں دفن ہیں، قبرستان گھر سے قریب ہی ہے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان کی وفات کے بعد ان کو قبرستان میں دفن کریں یا جہاں انہوں نے اپنی قبر کھدوائی ہے وہاں دفنایا جائے، قبرستان میں دفن ہونے سے ان کو اس لیے کراہت ہے کہ وہاں خنزیروں کی آمدورفت سے گندگی رہتی ہے، باغیچہ تقسیم ہو چکا ہے؟

المستفتی: محمد نسیم المورڑہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کے والدین کی وصیت شرعاً معتبر نہیں ہے، ان کو باغیچہ میں دفنانے کے بجائے عام مسلمانوں کے قبرستان میں دفنانا مسنون ہوگا۔

(مستفاد: احسن الفتاویٰ ۴/ ۳۰۵)

ولو أوصىٰ بأن يدفن في داره فوصيته باطلة إلا أن يوصي أن يجعل داره مقبرة للمسلمين. (هنديه، كتاب الوصايا، الباب الثاني، زكريا قديم ٦/ ٩٥، جديد ٦/ ١١٢، كتاب الفقه على المذاهب الأربعة، دار الفكر ٣/ ٣٣٠، البحر الرائق زكريا

۳۰۱/۹، کوئٹه ۴۵۳/۸)

بل ينقل إلى مقابر المسلمين. (شامی، باب صلاة الجنازة، مطلب: فی دفن الميت زکريا ۱۴۰/۳، کراچی ۲۳۵/۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍رجب المرجب ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۸۴۷/۲۶)

قبر پر سورۂ بقرہ پڑھنے کی وصیت

سوال [۱۱۲۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعض حضرات اپنے متعلقین کو وصیت کر دیتے ہیں کہ ہمارے دفن کے بعد ہماری قبر پر سورۂ بقرہ مکمل پڑھنا، لہٰذا چند حضرات مل کر سورۂ بقرہ پڑھ دیتے ہیں۔

دریافت یہ کرنا ہے کہ اس طرح کی وصیت کرنا بعدہٗ اجتماعی شکل میں پڑھنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: جلیل احمد ٹانڈہ رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس کی وصیت کرنا اور اس کے مطابق قرآن شریف پڑھنا درست ہے، مگر لازم نہیں۔

ويستحب إذا دفن الميت أن يجلسوا ساعة عند القبر بعد الفراغ بقدر ما ينحر جزور و يقسم لحمها يتلون القرآن ويدعون للميت كذا فى الجوهرة النيرة. (هنديه، كتاب الصلاة، الباب الحادى عشر فى الجنائز، الفصل السادس فى القبر والدفن، زكريا قديم ۱۶۶/۱، جديد ۲۲۷/۱، الجوهرة النيرة امداديه ملتان ۱۳۳/۱، دار الكتاب ديوبند ۱۳۲/۱، طحطاوى على المراقى قديم ۳۳۸، جديد دار الكتاب ديوبند ۶۱۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍رجب المرجب ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱۱۴/۳۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۷/۳ھ

قطع تعلق کی وصیت کا شرعی حکم

سوال [۱۱۲۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میری والدہ کو والد مرحوم کی وصیت ہے کہ مرحوم کے بیٹے کی دوسری اہلیہ سے نہ ملیں، اگر دوسری اہلیہ سے تعلق رکھا جائے گا تو میں راضی نہیں ہوں، شرع کی رو سے جواب دیں؟

المستفتی: حاجی محمد اکرم طویلہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بلاکسی جرم اور شرعی قصور کے کسی سے قطع تعلق کر لینا ممنوع ہے اور اسی طرح قطع تعلق کی وصیت بھی شرعی طور پر صحیح نہیں ہوتی ایسی وصیت کو پورا کرنا بھی بیوی اور دوسرے متعلقین پر لازم نہیں ہے، لہٰذا بیٹے کی دوسری اہلیہ سے تعلق قائم کرنا آپس میں مل جل کر رہنا باعث گناہ نہیں ہوگا، بلکہ ثواب ملے گا، اس لیے کہ قطع تعلق کرنے سے حدیث میں ممانعت آئی ہے۔

عن أبی أیوب عن النبی ﷺ: لا یحل لمسلم أن یهجر أخاه فوق ثلاث. (صحیح البخاری، کتاب الاستیذان، باب السلام للمعرفة وغیر المعرفة، ۲/ ۹۲۱، رقم: ۵۹۹۶، ف: ۶۲۳۷)

عن عبد اللّٰه عن النبی ﷺ قال: (إلی قوله) فإذا أمر بمعصیة فلا سمع ولا طاعة. (صحیح البخاری، کتاب الأحکام، باب السمع والطاعة للإمام مالم تکن معصیة ۲/ ۱۰۵۷، رقم: ۶۸۶۱، ف: ۷۱۴۴) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۱۴؍ رجب المرجب ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۱۲۱)

والد کا بیٹے کو قطع تعلق کی وصیت کرنا

سوال [۱۱۲۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: بڑے بیٹے کو والد مرحوم کی وصیت ہے کہ چھوٹے بیٹے کی دوسری اہلیہ سے نہ ملیں، جوکوئی اس سے تعلق رکھے تو میں راضی نہیں، اس بات کو دس سال کا عرصہ گذر چکا ہے لیکن والدہ کا کہنا ہے کہ اس سے تعلق رکھ لیں، شرع کی رو سے کیا حکم ہے، جواب دیجئے ؟

المستفتی: حاجی محمد اکرم شمسی طویلہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگرچھوٹے بیٹے کی دوسری اہلیہ نے اپنے خسر صاحب کے ساتھ ازخود کسی قسم کی بے ادبی نہیں کی ہے بلکہ اس لیے خسر صاحب ناراض ہیں کہ بیٹے نے اس عورت سے والد کی اجازت کے بغیر نکاح کیا ہے، تو ایسی صورت میں یہ عورت (دوسری اہلیہ) شرعاً کسی قسم کی قصوروار یا مجرم نہیں ہے، اور کسی مسلمان سے بلا کسی شرعی جرم کے قطع تعلق کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے اب اس ناراضگی کو ختم کرکے دل صاف کرلینا چاہیے، اور آپس کی رشتہ داری اور تعلقات کو بحال کرنے سے والد مرحوم کی نافرمانی نہ ہوگی، اور والد مرحوم کے لیے سب لوگ دعا کریں اور جس بہو سے ناراض تھے وہ بھی اپنے خسر صاحب مرحوم کے لیے ہمیشہ دعائے مغفرت کرتی رہے، حدیث شریف میں اس طرح قطع تعلق کرنے کی ممانعت آئی ہے۔

عن أنسؓ قال قال رسول الله ﷺ: لاتقاطعوا و لاتدابروا و لا تباغضوا ولا تحاسدوا وكونوا عباد الله إخوانا، ولا يحل لمسلم أن يهجر أخاه فوق ثلاث. (ترمذی، أبواب البر و الصلة، باب ماجاء فی الحسد، النسخة الهندية ٢/ ١٥ دار السلام رقم: ١٩٣٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ رجب المرجب ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۱۲۰)

٣ باب الوصية بالثلث

ثلث مال میں وصیت کا نفاذ

سوال [۱۱۲۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے دو ماموں تھے،عبد الرشید،عبد الواحد، دونوں کی مشترکہ زمین سو بیگہ تھی، بڑے ماموں عبد الرشید لاولد تھے، انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی عبد الواحد کو یہ وصیت کی تھی کہ پچاس بیگہ زمین جو ہمارے حصہ کی ہے زید کو دیدینا،لیکن عبد الواحد نے نہ دی، اور مجھ سے کہا کہ اگر تم اپنی فلاں زمین جو مارکیٹ میں ہے، اپنے خالو کو دیدو تو میں تم کو تیس بیگہ زمین دیدوں گا، چنانچہ زید نے وہ زمین اپنے خالو کو دیدی،اس کے بعد بھی ماموں نے حسب وعدہ ۳۰ ربیگہ زمین نہ دی اور اپنے لڑکوں کو وصیت کر گئے کہ تیس بیگہ زمین زید کو دیدینا، پھر چھوٹے ماموں کا بھی انتقال ہو گیا، پھر بھی ان کے لڑکوں نے زید کو زمین نہ دی۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید اس تیس بیگہ زمین کا حقدار شریعت کی رو سے ہے یا نہیں؟

نوٹ: جو زمین میں نے اپنے خالو کو دی تھی وہ زمین آج بھی پڑی ہوئی ہے،جس کی مالیت اس زمانہ میں تقریباً بیس لاکھ روپیہ ہیں اس کا کون حقدار ہے،آیا زید یا زید کا خالو؟

المستفتی: محمد اسلام ٹھاکردوارہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عبدالرشید نے اپنے حصہ پچاس بیگہ زمین کی جو وصیت اپنے بھانجہ زید کو کی ہے اس کے ایک ثلث یعنی پونے سترہ بیگہ زمین میں وصیت نافذ ہوگی اور از روئے شرع پونے سترہ بیگہ زمین زید کی ملک ہوگی ،اور دو ثلث یعنی سواتیس بیگہ بقیہ ورثاء کا حق ہے، اس میں وصیت نافذ نہ ہوگی۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۳۱۲/۱۵،۱۱/۴۴۸، جدید ڈابھیل

٢٠/٢١٦،٢١٤، کفایت المفتی قدیم ٨/ ٤٣٩ ،جدید زکریا مطول١٣/٣٢٢-٣٢٣، امداد المفتیین ٢/ ١٠٤١)

عن عامر بن سعد، عن أبيه رضى الله عنه قال: مرضت، فعادنى النبى صلى الله عليه وسلم -إلى- قلت: أريد أن أوصى بالنصف؟ قال: النصف كثير، قلت: فالثلث؟ قال: الثلث كثير أو كبير، قال: فأوصى الناس بالثلث، فجاز ذٰلک لهم. (صحيح البخارى باب الوصية بالثلث، النسخة الهندية ١/٣٨٣ رقم: ٢٦٦٣، ف: ٢٧٤٤)

لأن الوصية بأكثر من الثلث إذا لم تجز تقع باطلة، وفى الشامية: وإنما المراد بطلان الزائد. (شامى كتاب الوصايا، باب الوصية بثلث المال، كراچى ٦/٦٦٧، زكريا ١٠/٣٦٣)

نیز عبدالواحد کے کہنے پر زید نے جو زمین اپنے خالو کو دی ہے وہ تیس بیگہ زمین کے عوض پر دی ہے، اگر زید کو مذکورہ تیس بیگہ مل جائے تو مارکیٹ کی زمین زید کے خالو کی ملک ہوگی، اور جب تک تیس بیگہ زمین زید کو نہیں ملتی ہے اس وقت تک مارکیٹ کی زمین زید کی ملکیت میں رہے گی، زید کے خالو مارکیٹ کی زمین کے حقدار اس وقت تک نہیں ہوں گے جب تک زید کو تیس بیگہ زمین نہ دی جائے۔

إذا باع دارا من إنسان ببلدة أخرىٰ ولم يسلمها إليه إلا باللفظ ثم امتنع المشترى عن تسليم الثمن كان له ذٰلک، كذا فى المحيط. (هنديه، كتاب البيوع، الباب الرابع، الفصل الثانى، زكريا قديم ٣/١٧، جديد ٣/١٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١١رشعبان المعظم ١٤٢٥ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٧/ ٨٥٣١)

وصیت صرف ثلث مال میں واجب العمل ہے

سوال [١١٢٣٨]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عبدالکریم صاحب کا انتقال ہوا، تین آدمی کہ جن کے پاس ایک بینک کی کاپی تھی، ١٨٤٣٥ روپئے درج تھے، اس کتاب کو اپنے چچازاد بھائی عبدالحکیم کو دیدینے کو کہا ہے،

اورانہیں تین آدمی کے پاس جن کے پاس بینک کی کاپی تھی،۸۶۰۰ روپئے تھے،اور پچیس ہزار ایک سوروپئے کی چینی تھی،اب ان تینوں آدمیوں کا کہنا ہے کہ عبدالکریم نے اپنے کل روپئے کواور چینی کے روپئے کومسجد میں دیدینے کوکہاہے، نیز یہ بھی کہا کہ اگرنہیں دوگے تو روزحشر میں دامن گیرہوں گا، جب کہ ان ۴ورثاء میں ایک لڑکی، ایک چچازاد بھائی عبدالحکیم،دونواسی، دونواسے موجود ہیں، یہ مذکورہ ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا، آیامذکورہ وصیت کے بعد ورثاءکوحصہ ملےگایانہیں؟ وضاحت کےساتھ تحریرفرمائیں،عین کرم ہوگا۔

المستفتی: جمیل احمد حسن پور مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جس مالیت کومسجد میں دینے کی وصیت کی ہے اگروہ مرحوم کی کل ملکیت کاایک ثلث یااس سے کم ہےتو وصیت کے مطابق اس مالیت کومسجد میں دیناضروری ہوگااوراگرکل ملکیت کےایک ثلث سے زیادہ ہے،تو صرف ایک تہائی مسجد میں دیدےاورباقی دوتہائی ورثاء کے درمیان تقسیم کردینالازم ہوگا۔

عن عامر بن سعد، عن أبيه رضي الله عنه قال: مرضت، فعادني النبي ﷺ -إلي- قلت: أريد أن أوصي بالنصف؟ قال: النصف كثير، قلت: فالثلث؟ قال: الثلث كثير أو كبير، قال: فأوصى الناس بالثلث، فجاز ذٰلك لهم. (صحيح البخاري، باب الوصية بالثلث، النسخة الهندية ١/٣٨٣، رقم: ٢٦٦٣، ف: ٢٧٤٤)

ولاتجوز بما زاد على الثلث. (هدايه، كتاب الوصايا، رشيديه ٤/٦٣٨ اشرفي ديوبند ٤/٦٥٤، تبيين الحقائق امداديه ملتان ٦/١٨٢، زكريا ٦/٣٧٥، هنديه زكريا قديم ٦/٩٠، جديد ٦/١٠٦، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/٤١٨، البحر الرائق كوئٹه ٨/٤٠٣، زكريا ٩/٢١٢، تاتارخانية زكريا ١٩/٣٨١، رقم: ٣١٨٥٩)

اورباقی دوثلث میں ایک ثلث لڑکی کو ملےگااورایک ثلث چچازاد بھائی عبدالحکیم کو ملے گا،نواسیاں محروم ہوں گی۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیراحمد قاسمی عفااللہ عنہ
۸؍صفرالمظفر ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر:۳۲/ ۴۳۱۷)

غیر وارث کے لیے ثلث مال میں وصیت کا نفاذ

سوال [١١٢٣٩]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسماۃ شاہدہ خانم بیوہ نسیم الدین جس کا عقد ثانی مسمیٰ رونق امیر الدین کے ہمراہ ہوگیا،عقد ثانی کے وقت بیوہ کے پاس نسیم الدین سے ایک لڑکی ارم خانم تھی جو کہ رونق امیر الدین کی سوتیلی لڑکی اور سگی بھتیجی ہوئی، پھر شاہدہ خانم کا انتقال ہوگیا، تو رونق امیر الدین نے سوتیلی لڑکی اور سگی بھتیجی ہے ارم خانم کے بارے میں ایک وصیت نامہ لکھا کہ میرے مرنے کے بعد میری جائیداد ونقد روپیہ کی میری سوتیلی لڑکی ارم خانم مالک ہوگی، پھر رونق امیر الدین کا انتقال ہوگیا، تو یہ وصیت کتنے میں نافذ ہوگی؟ اور ورثاء میں والد نصیر الدین، والدہ محمودہ، دو بھائی: نعیم الدین، عظیم الدین اور چار بہنیں موجود ہیں، انہیں بھی ملے گا یا نہیں؟

المستفتی: لڈن خاں، مفتی ٹولہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ارم خانم چونکہ امیر الدین کی شرعی وارث نہیں ہے اس لیے اس کے حق میں وصیت تو نافذ ہوگی مگر کل ترکہ میں سے صرف ایک ثلث میں نافذ ہوگی باقی دو ثلث اس کے شرعی ورثاء کے درمیان تقسیم ہو جائیں گے۔

عن عامر بن سعد، عن أبيه رضي الله عنه قال: مرضت، فعادني النبي ﷺ –إلی– قلت: أريد أن أوصي بالنصف؟ قال: النصف كثير، قلت: فالثلث؟ قال: الثلث كثير أو كبير، قال: فأوصى الناس بالثلث، فجاز ذٰلک لهم . (صحيح البخاري، باب الوصية بالثلث، النسخة الهندية ٣٨٣/١، رقم: ٢٦٦٣، ف: ٢٧٤٤)

ولايجوز بما زاد على الثلث. (هدايه كتاب الوصايا اشرفی ديو بند ٦٥٤/٤، رشيديه ٦٣٨/٤)

لہٰذا کل ترکہ میں سے ایک تہائی ارم خانم کو دینے کے بعد بقیہ دو تہائی ترکہ مذکورہ ورثاء کے درمیان حسب ذیل طریقے سے تقسیم ہوگا۔

۳
امیرالدین میـــــــــــــــــــــــــت

بہن	بھائی	والدہ	والد
محروم	محروم	۱	۲

بقیہ دوتہائی تین سہام میں تقسیم ہوکر والدکو۲/سہام اور والدہ کوایک سہام ملے گا، اور سب بھائی بہن محروم ہوجائیں گے۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیراحمد قاسمی عفااللہ عنہ
یکم محرم الحرام ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر:۳۱/۳۷۸۹)

کل جائیداد کی وصیت اپنی زوجہ کے نام

سوال [۱۱۲۴۰]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حمید احمد خاں ولدعزیز احمد خاں نے اپنے انتقال پرحسب ذیل وارثان چھوڑے اورمرنے سے قبل مرحوم نے سال ۱۹۸۰ء میں اپنی تمام جائیداد کی ایک وصیت بحق اپنی زوجہ مسماۃ کوثر اختر لکھ دی تھی کہ میرے مرنے کے بعدمیری کل جائیداد کی میری زوجہ مسماۃ کوثر اختر تنہا مالک ہوگی، اورمسماۃ سرفراز بیگم ہمشیرہ حمید احمد خاں اورضمیراحمد خاں برادر حقیقی حمید احمد خاں نے اپنے اپنے بیان حلفی میں وصیت مذکورہ کی تائید وتوثیق کردی کہ وصیت مذکورہ صحیح ہے، اور ہماری جائیداد کاحمید احمد خاں سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ بیان حلفی مقدمہ عدالت ججی مرادآباد ۱۹۸۲/۱۳۱ء مسماۃ صدیق فاطمہ بنام مسماۃ کوثر اختر وغیرہ میں داخل ہیں۔

نام وارثان: حمید احمد خاں، ایک بیوہ مسماۃ کوثر اختر، برادر حقیقی ضمیر احمد، ہمشیرہ حقیقی مسماۃ سرفراز بیگم، برادرتایازادرفیق الرحمٰن، خان ولدعبدالغفورخان۔

نوٹ: حمید احمد خاں کے انتقال کے بعدان کے حقیقی برادرضمیراحمداور حقیقی ہمشیرہ سرفراز بیگم نے بیان حلفی کے ذریعہ وصیت مذکورہ کی تائید وتوثیق کردی اور وصیت نامہ کا اقرارکرتے

ہوئے کہا کہ جائیداد کا حمید احمد خان سے ہمارا کوئی تعلق نہیں تو اب حمید احمد کے تایازاد بھائی رفیق الرحمٰن کی اولاد کا یہ دعویٰ کرنا کہ اس میں ہمارا حق ہے، کیسا ہے؟ کیا شرعاً حمید احمد کے تایازاد بھائی رفیق الرحمٰن کی اولاد کو مل سکتا ہے یا نہیں؟ جو بھی شرعی حکم ہو مفصل تحریر فرمائیں۔

المستفتی: ہاشم اختر کھیر سید خاں مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر حمید احمد خاں کے انتقال کے وقت اس کے حقیقی بھائی ضمیر احمد اور حقیقی بہن، سرفراز بیگم باحیات تھے، تو رفیق الرحمٰن تایازاد بھائی اور اس کی اولاد شرعاً حمید احمد خاں کے ورثاء میں شامل نہیں ہیں، اور جب حمید احمد خاں کے انتقال کے بعد اس کے حقیقی بھائی اور بہن نے مذکورہ وصیت پر رضامندی کا اظہار کرلیا ہے، تو شرعاً کوثر اختر کے حق میں پوری جائیداد کی وصیت درست اور صحیح ہوچکی ہے، اور پوری جائیداد کی مالک شرعی طور پر کوثر اختر ہوگی، اور اس میں رفیق الرحمٰن کی اولاد کا دعویٰ شرعاً ناجائز اور باطل ہوگا۔

عن ابن عباس قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ: لاتجوز الوصية لوارث، إلا إن شاء الورثة. (السنن الكبرىٰ للبيهقى، باب نسخ الوصية للوالدين والأقربين، دار الفكر ٩/٣٥٦، رقم: ١٢٧٩٧ – ١٢٧٩٨، سنن الدار قطنى، دار الكتب العلمية بيروت ٤/٨٦، رقم: ٤٢٥١)

لاتجوز لوارثه إلا أن يجيزها الورثة. (هدايه كتاب الوصايا، باب فى صفة الوصية رشيديه ٤/٦٤١، اشرفى ديوبند ٤/٦٥٧، مجمع الأنهر دار الكتب العلمية بيروت ٤/٤١٨، البحر الرائق كوئٹه ٨/٤٠٣، زكريا ٩/٢١٢) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰؍ربیع الاول ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/۲۶۱۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۲/۳/۳۰ھ

زندگی میں نواسے کے نام کل مال کی وصیت کرنا

سوال [۱۱۲۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: ولی داد خاں کا انتقال ہوگیا، وارثین میں ۳/ بیٹے علی محمد خاں، ولی محمد خاں، وزیر محمد خاں تھے، علی محمد، ولی محمد باپ کی زندگی ہی میں وفات پا چکے تھے، علی محمد نے صرف ایک بیٹا چھوڑ کر انتقال کیا تھا، جس کا نام فقیر محمد خاں ہے جبکہ ولی محمد کے کوئی اولا نہیں تھی، باقی ولی داد خاں کے انتقال کے وقت صرف وزیر محمد خاں حیات تھے، پھر وزیر محمد کے انتقال کے وقت صرف وزیر کی دو بیٹیاں عقیلہ، جمیلہ زندہ تھی، جبکہ وزیر محمد خاں کا بیٹا ان کی زندگی میں ہی فوت ہو چکا تھا، انتقال کے وقت صرف ایک بیٹی تھی، جو آج بھی حیات ہے، یعنی وزیر کی پوتی، وزیر محمد خاں نے اپنی زندگی میں اپنی بیٹی جمیلہ کے دو بیٹوں کے نام کل مال کی وصیت کردی تھی، اس وصیت کا شرعاً اعتبار ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کتنے میں وصیت نافذ ہوگی، اور اس وقت وزیر محمد کے وارثین میں صرف ایک بھتیجہ فقیر محمد خاں اور ایک پوتی قمری بیگم موجود ہے، ان کو شرعاً حصہ ملے گا یا نہیں؟ اگر ملے گا تو کتنا کتنا؟ شرعی حکم تحریر فرمائیں؟

المستفتی: نسیم احمد غازی پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت سوال و بعد ادائے حقوق وزیر محمد خاں کا اپنے دونوں نواسوں کے نام کی ہوئی وصیت کل مال کے صرف تہائی حصے میں نافذ ہوگی، باقی ترکہ وزیر محمد خاں کی پوتی اور بھتیجہ کے درمیان درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا۔

وزیر محمد فاروق	میت ۲	
	پوتی	بھتیجہ
	۱	۱

وزیر محمد خاں کے ترکہ میں سے تہائی حصہ میں وصیت نافذ ہوگی، اور بقیہ مال دو سہام میں تقسیم ہو کر ایک حصہ پوتی قمری بیگم اور بقیہ ایک حصہ بھتیجہ محمد رفیق کو ملے گا۔

ولاتجوز بما زاد علی الثلث. (هدایه، کتاب الوصایا رشیدیه ٦٣٨/٤ اشرفی دیوبند ٦٥٤/٤، تبیین الحقائق امدادیه ملتان ١٨٢/٦، زکریا ٣٧٥/٦، هندیه زکریا قدیم ٩٠/٦، جدید ١٠٦/٦، مجمع الأنهر، دار الکتب العلمیة بیروت ٤١٨/٤،

البحر الرائق کوئٹہ ۸/۳ ۰ ٤، زکریا ۹/ ۲ ۱ ۲، تاتارخانیة زکریا ۱۹/ ۱ ۸ ۳، رقم: ۳۱۸۵۹)

ثم تنفذ وصاياه من ثلث ما بقيي ...... ثم يقسم الباقي بين الورثة على سهام الميراث. (فتاویٰ عالمگیری، کتاب الفرائض، الباب الأول زکریا قدیم ٦/٤٤٧، جدید ٦/٤٤٠، سراجی ص: ٤-٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۲۳۰)

پوتوں کے لیے وصیت ثلث مال میں نافذ ہوگی

سوال [۱۱۲۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حاجی رمضان احمد کے پانچ لڑکے تھے، عبد اللطیف، حبیب احمد، عبد الحمید، نثار حسین، اسحاق حسین، پانچوں لڑکوں میں سے ایک لڑکے عبد الحمید کا انتقال حاجی رمضان کی موجودگی میں ہوگیا تھا، حاجی رمضان نے مرنے سے پہلے ایک وصیت چند حضرات کے سامنے تحریر کرادی تھی، اور اس وصیت نامہ پر موجودہ اولاد کے دستخط کرادیئے، حاجی رمضان ایک لڑکے سے ناراض ہوگئے تھے، ناراضگی کی وجہ یہ ہوئی کہ عبد اللطیف نے غیر قوم میں والد کی مرضی کے خلاف شادی کرلی تھی، اس جرم میں حاجی رمضان نے عبد اللطیف کو ایک چھوٹا سا مکان دے کر بقیہ جائیداد سے محروم کردیا تھا، وصیت نامہ کا مضمون یہ ہے کہ: عبد اللطیف کو صرف فلاں مکان دے رہا ہوں، عبد اللطیف کو بقیہ جائیداد سے مطلب نہیں، اور عبد الحمید جن کا انتقال باپ کی موجودگی میں ہوگیا تھا، ان کے نام وصیت فرمائی کہ عبد الحمید کو وراثت میں جو حصہ ملتا میں اس حصہ کی عبد الحمید کے بچوں کے لیے وصیت کرتا ہوں، ضروری بات یہ معلوم کرنی ہے کہ کیا وصیت نامہ صحیح ہے یا غلط؟ کیا عبد الحمید کے بچوں کو وراثت میں حصہ ملے گا یا نہیں؟

المستفتی: مکرم الحق

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: عبد الحمید کی اولاد وارثین سے خارج ہونے کی

وجہ سے ان کے حق میں ایک ثلث یا اس سے کم وصیت نافذ ہوگی، زیادہ ہونے کی صورت میں حاجی رمضان کی موت کے بعد موجودہ ورثاء کی اجازت پر موقوف ہوگی۔

وتجوز بالثلث للأجنبی عند عدم المانع وإن لم یجز الوارث ذلک لا الزیادة علیه إلا أن تجیز ورثته بعد موته. (در مختار، کتاب الوصایا، کراچی ٦/ ٦٥٠، زکریا ١٠/ ٣٣٩، مصری ٥/ ٥٧١، هدایه رشیدیه ٤/ ٦٣٨، اشرفی دیو بند ٤/ ٦٥٥، هندیه زکریا قدیم ٦/ ٩٩، جدید ٦/ ١١٦، الجوهرة النیرة، امدادیه ملتان ٢/ ٣٨٩، دار الکتاب دیوبند ٢/ ٣٦٩، البحر الرائق کوئٹه ٨/ ٤٠٤، زکریا ٩/ ٢١٤)

وفی الدر المختار: وأما الجد و ولد الولد فیدخل فی ظاهر الروایة وقیل لا واختاره فی الاختیار، وفی الشامیة ثم قال لکن فی شرح الحموی بخطه أن الدخول هو الأصح. (در مختار مع الشامی، باب العتق فی المرض، کراچی ٦/ ٦٨٦، زکریا ١٠/ ٣٩٠، مصری ٥/ ٤٨٦)

ولا تعتبر إجازة الورثة فی حال حیاة الموصی حتی کان لهم أن یرجعوا بعد موت الموصی و تصح الوصیة بالثلث للأجنبی وإن لم یجیزوا. (مجمع الأنهر في شرح ملتقی الأبحر، دار الکتب العلمیة بیروت ٤/ ٤١٩) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ ذی قعدہ ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۳۶۱)

زندگی میں کسی ایک وارث کے نام کل ترکہ کی وصیت کرکے قبضہ دیدینے کا حکم

سوال [۱۱۲۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مکان جس کے دو شخص مالک تھے، شہزادہ مرحوم اور ان کی والدہ شہزادہ نے ایک وصیت کے ذریعہ اپنی زندگی میں اور بیوی کے انتقال کے بعد اپنی جائیداد بیٹی کے نام کردی، اور دادی نے بھی ایک وصیت کے ذریعہ شہزادہ مرحوم (بیٹے) کی زندگی میں ان کی

بیٹی کے نام جائیداد کردی، یہ وصیت تحریری موجود ہے، اور زبانی بھی لڑکے کے چچا شہزادہ کے بھائی و پھوپھی وغیرہ کی موجودگی میں ایسا کیا، ان کی گواہی موجود ہے، شہزادہ مرحوم نے دو شادیاں کیں، پہلی بیوی سے لڑکی ہے، جس کا اوپر بھی ذکر ہے، اور جس کے نام دادی اور باپ نے وصیت کی ہے اور دوسری بیوی کو شہزادہ نے شادی کے سال دو سال کے بعد طلاق دیدی، اس سے ایک لڑکا ہے، وصیت میں شہزادہ نے اپنے لڑکے کا کوئی ذکر نہیں کیا، اور نہ دادی نے لہٰذا چند سوال نیچے تحریر ہیں، ان کے جواب سے ان لوگوں کے مسائل حل ہو جائیں گے، برائے کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں جو جواب ہوتا ہو، عنایت فرمائیں:

(۱) کیا دادی وصیت کے ذریعہ تنہا اپنی پوتی کو جائیداد دے سکتی ہے جبکہ چچا اور پھوپھی اس کے لیے راضی ہیں؟

(۲) کیا شہزادہ مرحوم وصیت کے ذریعہ لڑکی کو کل جائیداد کی وصیت کر کے قبضہ دے سکتے ہیں، موجودہ حالت میں تنہا لڑکی مکان پر قابض ہے، قبضہ والد نے اپنی زندگی میں اور دادی نے بھی اپنی زندگی میں لڑکی کو کرا یا دیا تھا۔

(۳) لڑکا اپنے حصے کا مطالبہ اوپر کے حالات کے باوجود کر رہا ہے، کیا اس کا مطالبہ درست ہے؟ اگر درست ہے تو شرعاً اس کا کتنا حق ہوتا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت سوال اگر واقعی معاملہ وصیت کا ہی ہوا ہے تو وصیت موت کے بعد نافذ ہوتی ہے، اور زندگی میں جو قبضہ ہوا ہے شرعاً وہ قبضہ عاریت ہوگا، اور شریعت اسلامی میں وارثین کے حق میں وصیت نافذ نہیں ہوتی ہے اس لیے مذکورہ صورت میں لڑکی پورے ترکہ کی مالک نہ ہوگی، بلکہ اس لڑکے کا بھی شرعی حق ہوگا، لہٰذا کل ترکہ تین سہام میں تقسیم ہو کر دو لڑکے کو اور ایک لڑکی کو ملے گا۔

عن أبی أمامة –رضی اللہ عنه– قال: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: إن اللہ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث. (سنن أبی داؤد، الوصایا،

باب ما جاء فی الوصیة للوارث، النسخة الهندیة ۲/ ۳۹٦، دار السلام رقم: ۲۸۷۰)

ولاتجوز لوارثه لقوله علیه السلام إن الله قد أعطیٰ کل ذی حق حقه ألا لا وصیة للوارث. (هدایه کتاب الوصایا رشیدیه ٤/ ٦٤١، اشرفی دیو بند ٤/ ٦٥٧، شامی کراچی ٦/ ٦٥٥، زکریا ١٠/ ٣٤٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۷۰۸)

٤ باب الوصية للأقرباء وغيرهم

شرعی حصص کے مطابق جائیداد تقسیم کرنے کی وصیت

سوال [۱۱۲۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں اپنی جائیداد سے متعلق یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد کس طرح تقسیم ہوگی؟ میرے ورثاء میں ایک بیوی چار لڑکے، دولڑکیاں ہیں، کیا یہ وصیت کرسکتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد میرے ورثاء شرعی حصص کے مطابق تقسیم کریں، اور کیا وصیت نامہ میں ان کے حصے متعین ونامزد کرسکتا ہوں؟ تاکہ ان کے درمیان آئندہ جھگڑے نہ ہوں، ترکہ میں ۱۹۲ گز ہیں۔

المستفتی: جمیل احمد نئی بستی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے مرنے کے بعد آپ کے مذکورہ ورثاء کے درمیان آپ کی جائیداد کس طرح تقسیم ہوگی، اور آپ کی وفات کے بعد ہر ایک کو جو شرعی حق ملنا ہے اس کے متعلق نامزد کر کے حصہ متعین کر کے ایک وصیت نامہ اس طرح لکھنا چاہتے ہیں کہ ہر ایک حقدار کو اپنا شرعی حق مل جائے، اور آپس میں کوئی اختلاف اور لڑائی پیدا نہ ہو، تو آپ کے لیے ایسا کرنا جائز اور درست ہے، تاکہ آپ کے وارثین کے درمیان جھگڑا پیدا نہ ہو۔

وأما إذا أراد الرجل أن يقسم أملاكه فيمابين أولاده في حياته لئلا يقع بينهم نزاع بعد موته، فإنه وإن كان هبة في الاصطلاح الفقهي، ولكنه في الحقيقة والمقصود استعجال لما يكون بعد الموت وحينئذ ينبغي أن يكون سبيله سبيل الميراث. (تکملہ فتح الملهم، كتاب الهبات، مذهب الجمهور التسوية بين الذكر والأنثىٰ اشرفيه ديو بند ۲/ ۷۵)

لہٰذا آپ کی مذکورہ جائیداد درج ذیل نقشہ کے مطابق مذکورہ وارثین کے درمیان آپ کی وفات کے بعد تقسیم ہوگی۔

توافق/۱۶

میــــــــــــــــــــــــــــت

	بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی
سہام	۱	۱۴	۱۴	۱۴	۱۴	۷	۷
ترکہ	۱۰ / ۲۴رگز	۳ / ۵	۳ / ۵	۳ / ۵	۳ / ۵	۴ / ۵	۴ / ۵
		۳۳رگز	۳۳رگز	۳۳رگز	۳۳رگز	۱۶رگز	۱۶رگز

مذکورہ جائیداد ۸۰رسہام میں تقسیم ہوکر اسی کے تناسب سے ۱۹۲ گز متروکہ جائیداد میں سے ہرایک کو اتنا ملے گا جو اس کے نام کے نیچے ترکہ کے سامنے درج ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷رصفر المظفر ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۴۶۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۲/۲۷ھ

جھگڑے سے بچانے کے لیے وراثت سے متعلق وصیت

سوال [۱۱۲۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے نام ۸۰رگز مکان ہے اور میں بیوہ ہوں، میرا کوئی ذریعۂ معاش بھی نہیں، میرے چار بیٹے، تین بیٹیاں ہیں، جن میں سے ایک بیٹا دماغی طور پر معذور ہے، ایک بیٹا نافرمان اور مجھے پریشان کرنے والا ہے، میں اپنی زندگی میں چاہتی ہوں کہ اپنے بچوں کے متعلق وصیت کردوں تو کتنے کتنے گز کی وصیت کروں، شریعت کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: اکبری بیگم زوجہ محمد حفیظ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: وارثین کے حق میں وصیت درست نہیں ہوتی

ہے، اگر موت کے بعد وصیت پر ایک آدھ وارث راضی نہ ہو تو وہ وصیت منسوخ ہو جاتی ہے اور متروکہ جائیداد شرعی حصوں کے حساب سے سب کے درمیان تقسیم ہو جاتی ہے، اگر آپ کا مقصد یہ ہے کہ آپ کے فوت ہو جانے کے بعد بچوں کے درمیان اختلاف اور جھگڑا پیدا نہ ہو تو ایسی صورت میں شرعی حصوں کے حساب سے وصیت کی جاسکتی ہے کہ کل جائیداد گیارہ حصوں میں تقسیم ہو کر چاروں لڑکوں کو دو دو حصہ اور تینوں لڑکیوں کو ایک ایک حصہ ملے گا۔

عن أبی أمامة الباهلی –رضی الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک و تعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصیة لوارث، النسخة الهندیة ۲/ ۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، کتاب الوصایا، باب ما جاء فی الوصیة للوارث، النسخة الهندیة ۲/ ۳۹۶، دار السلام رقم: ۲۸۷۰)

ولا لوارثه إلا بإجازة ورثته لقوله علیه السلام: لا وصیة لوارث.
(شامی، کتاب الوصایا، کراچی ۶/ ۶۵۵-۶۵۶، زکریا ۱۰/ ۳۴۶)

وأما إذا أراد الرجل أن یقسم أملاکه فیما بین أولاده فی حیاته لئلا یقع بینهم نزاع بعد موته، فإنه وإن کان هبة فی الاصطلاح الفقهی، ولکنه فی الحقیقة والمقصود استعجال لما یکون بعد الموت وحینئذ ینبغی أن یکون سبیله سبیل المیراث. (تکمله فتح الملهم، کتاب الهبات، مذهب الجمهور التسویة بین الذکر والأنثیٰ، اشرفیه دیوبند ۲/ ۷۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۱۴/ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۵۰)	۱۴۳۴/۴/۱۴ھ

مورث کی وفات کے بعد حصص شرعیہ کے مطابق کی گئی وصیت کا حکم

سوال [۱۱۲۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلۂ ذیل کے

بارے میں: کہ عالی جناب محمد قمرالدین صاحب مرحوم کی دو بیویاں ہیں، پہلی بیوی کے بطن سے چھ لڑکے، دو لڑکیاں ہیں، سب کی شادی مرحوم کی زندگی میں ہوئی، دوسری بیوی سے دو لڑکے اور دو لڑکیاں شادی شدہ اور دو لڑکے زیر تعلیم ہیں، تو مرحوم نے اپنی زندگی میں ساری جائیداد کی اپنی اولاد کو مدنظر رکھتے ہوئے نعیم کے اور چند گواہوں کے سامنے وصیت کی تاکہ کل کے دن یعنی میری زندگی کے بعد کسی بچے کی حق تلفی نہ ہو، اور جائیداد کے تعلق سے کسی قسم کا ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا نہ ہو، ان ساری باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے، اور آئندہ کا خیال کرتے ہوئے مرحوم نے اپنی زندگی میں جائیداد تقسیم کر دی، اور اب آخری ایک وصیت نامہ لکھا تاکہ میرے مرنے کے بعد ہی اس پر عمل ہو، تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس وصیت نامہ پر عمل کیا جائے یا نہ کیا جائے، کیونکہ ان کی زندگی میں عمل کیا گیا تو کیا ضروری ہے کہ ان کے گذر جانے کے بعد بھی اس پر عمل کیا جائے، اس بارے میں شریعت کے لحاظ سے علماء دین کیا فرماتے ہیں؟

المستفتی: محمد عظیم الدین مشیرآباد، حیدرآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر وصیت نامہ اس طرح تحریر میں آیا ہے کہ فخر الدین کے مرنے کے بعد دونوں بیویوں کو آٹھواں حصہ اور لڑکیوں کو لڑکوں کے اعتبار سے آدھا ملے گا، اور فخر الدین کی موت کے بعد ہی مالک ہوں گے، تو یہ درحقیقت فخر الدین کی موت کے بعد حکم شرعی پر عمل کرنے کے لیے ان کی طرف سے وصیت ہے نہ کہ جائیداد کی وصیت، اس لیے اس طرح وصیت نامہ پر عمل درست ہے اور ہر ایک کو اپنے اپنے حقوق کے مطابق حصہ ملے گا، اور اگر تقسیم شرعی سے قطع نظر کر کے حصہ متعین کر کے وصیت کی ہے، تو وہ وصیت نافذ نہ ہوگی، بلکہ حصۂ شرعی کے اعتبار سے تقسیم کرنا لازم ہوگا، کیونکہ شرعاً وارثین کے لیے وصیت درست نہیں ہے۔

عن أبی أمامة الباهلی -رضی الله عنه- قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث. (سنن الترمذی باب ما جاء لا وصیة لوارث

النسخة الهندية ۲/ ۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، کتاب الوصایا، باب ما جاء فی الوصیة للوارث، النسخة الهندية ۲/ ۳۹٦، دار السلام رقم: ۲۸۷۰)

ولا لوارثه إلا بإجازة ورثته لقوله عليه السلام: لا وصية لوارث. (شامی، کتاب الوصایا، کراچی ٦/ ٦٥٥-٦٥٦، زکریا ۱۰/ ۳٤٦، کوئٹه ٥/ ٤٥٩، الجوهرة النيرة، امدادیه ملتان ۲/ ۳۸۹، دار الکتاب دیوبند ۲/ ۳٦۹)

ومنها كون الموصىٰ له أجنبيا حتى لا تجوز الوصية لوارث. (مجمع الأنهر، قدیم ۲/ ٦۹۱، جدید دار الکتب العلمية بيروت ٤/ ٤۱۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍رجب المرجب ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۲۲/۲۴)

وارث کے حق میں وصیت نافذ نہیں ہوتی

سوال [۱۱۲۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے والد صاحب نے ایک مکان اپنے ذاتی سرمایہ سے خریدا تھا، ہمارے والد صاحب کے دو بھائی اور ایک بہن ہیں، اس مکان کے لیے ہمارے والد بزرگوار نے وصیت کردی تھی اور زبانی ہبہ بھی کردیا تھا، دو یا تین عزیزوں کے سامنے اپنی وفات سے پہلے کہ بعد میرے مرنے کے میری دونوں لڑکیاں آدھے آدھے مساوی طور پر مالک مکان ہوں گی، اس کے باوجود ہمارے چچا صاحب جن کا نومبر ۱۹۹۰ء کو انتقال ہوگیا ہے، ہم پر دعویٰ تقسیم کا ۱۹۸۵ء میں عدالت میں کردیا کہ ہم بھی مالک ہیں، جبکہ ہمارے مرحوم والد صاحب نے وصیت نامہ لکھ دیا اور ہبہ بھی کردیا تو کیا اب بھی شرعاً ہمارے چھوٹے چچا اور ان کی بیوہ اور ان کی لڑکی کو اس مکان میں حصہ پہنچ سکتا ہے کہ نہیں؟

المستفتی: دختران قمر جہاں وچندا بی محلّہ فیل خانہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اسلامی شریعت میں وارث کے حق میں وصیت

نافذ نہیں ہوتی ہے، اور مالک جائیداد کی دونوں لڑکیاں شرعی وارث ہیں اور مالک جائیداد کے بھائی بہن بھی شرعی وارث ہیں بشرطیکہ مالک جائیداد کا کوئی لڑکا موجود نہ ہو۔

عن أبی أمامة الباهلی -رضی الله عنه- قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک و تعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصیة لوارث، النسخة الهندیة ۲/ ۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، کتاب الوصایا، باب ما جاء فی الوصیة للوارث، النسخة الهندیة ۲/ ۳۹٦، دار السلام رقم: ۲۸۷۰)

لاتجوز الوصیة للوارث. (الجوهرة النیرة، کتاب الوصایا، ملتانی ۲/ ۳۸۹، دار الکتاب دیوبند ۲/ ۳٦۹، مجمع الأنهر، دار الکتب العلمیة بیروت ٤/ ٤۱۸، هدایه، رشیدیه ٤/ ٦٤۱، اشرفی دیوبند ٤/ ٦٥۷، شامی کراچی ٦/ ٦٥٥، زکریا ۱۰/ ۳٤٦)

لہٰذا کل ترکہ تین حصوں میں تقسیم ہو کر دونوں لڑکیوں کو برابر برابر دو حصے اور بھائی بہن کو ایک حصہ دیا جاسکتا ہے، اور بھتیجی اور بھائی کی بیوہ وغیرہ کو نہیں ملتا ہے، جبکہ بھتیجی کا باپ اور بیوی کا شوہر مالک جائیداد سے پہلے مرگیا ہو اور اگر زندہ تھا اور بعد میں انتقال کیا ہے تو اس کے حصہ میں اس کی بیوہ اور لڑکی وارث ہوسکتی ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٦ ربیع الاول ۱٤۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۵۷۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱٤۱۲/۳/۴ھ

وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں

سوال [۱۱۲۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید، عمر، بکر تین حقیقی بھائی ہیں، دادالٰہی مکان پورا سب سے بڑے بھائی زید کے نام ہے، زید نے اس مکان میں سے آدھا حصہ اپنے تایازاد بھائی خالد کو بذریعۂ رجسٹری ہبہ کردیا، اور زید کی بیوی مریم اور ایک لڑکی بھی حیات تھی، اس کے بعد بقیہ آدھا مکان سب سے

چھوٹے بھائی بکر نے اپنے نام کرالیا، پھر زید کا انتقال ہوا، اس کے بعد عمر کا انتقال ہوا، اور زوجۂ زید مریم کا بھی انتقال ہو گیا، تایازاد بھائی خالد کی کوئی اولاد نہیں تھی، وہ آخر تک چچازاد بھائی بکر کے پاس رہے، بکر ہی نے ان کی خدمت کی، اب خالد کا انتقال ہوا، انہوں نے ایک چچازاد بھائی بکر اور دوسرے چچازاد بھائی زید کی ایک لڑکی کل دو وارث چھوڑے، پھر بکر کا بھی انتقال ہو گیا، اور خالد کے مکان میں بکر کے بچے قابض ہیں، اب زید کی لڑکی ان سے اپنے باپ کا حق مانگتی ہے، تو کیا اس کا کوئی اس مکان میں حق ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کس طرح تقسیم کیا جائے گا؟ اور بکر نے بھی اپنے پانچ وارث: تین لڑکے اور ایک لڑکی اور بیوہ بیوی چھوڑے ہیں، زید کی لڑکی کا اگر اس میں حصہ ہے تو اس کے چچازاد بھائیوں یعنی بکر کے بچوں نے اب تک جو اس کی امداد کی ہے اس کو واپس لے سکتے ہیں یا نہیں؟ اس کی صراحت فرما دیں؟

ایک جواب طلب امر یہ ہے کہ ان تینوں بھائیوں (زید، عمر، بکر) میں سے عمر نے ایک مکان اپنے ذاتی پیسہ سے خریدا تھا، اور عمر کی حیات ہی میں اس کے والدین اور ایک بڑے بھائی زید کا انتقال ہو گیا، عمر نے اپنے انتقال کے وقت صرف ایک اپنا حقیقی بھائی اور دوسرے بڑے بھائی زید کی ایک لڑکی، کل یہ دو وارث چھوڑے تو زید کی لڑکی اپنے چچا کے مکان میں حقدار ہو گی یا نہیں؟ اگر ہو گی تو وہ مکان جو عمر نے میراث میں چھوڑا ہے کس طرح ان دونوں کے درمیان تقسیم ہو گا؟

المستفتی: محمد آصف ہلدوانی نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مذکورہ مکان دادالٰہی ہے اور اس کے حقدار صرف زید، عمر، بکر تھے اور زید نے عمر و بکر کے حصہ کی قیمت ادا نہیں کی ہے اور صرف بڑے ہونے کی وجہ سے پورا مکان اپنے نام کرالیا ہے، تو اس صورت میں زید شرعاً پورے مکان کا مالک نہیں ہوا ہے، بلکہ تینوں کا برابر حق اس مکان میں شامل ہے، لہٰذا نصف حصہ تایازاد بھائی خالد کے ہاتھ رجسٹری ہبہ بھی شرعاً صحیح نہیں ہوا، اور بقیہ نصف حصہ بکر کا اپنے نام کرالینا بھی درست نہ ہو گا، اس لیے اولاً پورا مکان تین حصوں میں تقسیم ہو کر زید، عمر، بکر کے

درمیان برابر برابر تقسیم ہوگا، اور اس کے بعد ان کے واسطے سے ان کے ورثاء کو حسب حکم شرع حصہ ملتا جائے گا، لہٰذا زید، عمر، بکر کے حصوں کا مسئلہ حل ہونے سے پہلے ان کی اولاد کے حقوق بیان نہیں کیے جا سکتے۔

عن أبی أمامة الباهلی –رضی الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ كل ذی حق حقه فلا وصية لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصية لوارث، النسخة الهندية ۲/۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، كتاب الوصايا، باب ما جاء فی الوصية للوارث، النسخة الهندية ۲/۳۹۶، دار السلام رقم: ۲۸۷۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍ربیع الاول ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/۲۵۸۲)

وارث کے لیے کی گئی وصیت کا حکم

سوال [۱۱۲۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے شوہر جعفر احمد ولد شبیر احمد ساکن تلی تال، نینی تال نے اپنے مملوکہ و مسکونہ مکان نمبر ۳۱۶/۳۳۶، واقع بڑا بازار نے اپنے مکان مذکور کی بابت ایک وصیت بتاریخ ۱۸؍اکتوبر ۱۹۹۷ء میرے حق میں تحریر و تکمیل کرا کر رجسٹری کرادی اور وصیت مذکور کے ذریعہ میرے شوہر نے مجھ کو مکان مذکور کا کلیۃً مالک وقابض قرار دیدیا، میرے شوہر مذکور کا انتقال ہوئے عرصہ قریب سوا سال ہو چکا ہے، میرے شوہر لاولد فوت ہوئے، ان کے کوئی اولاد اناث یا ذکور پیدا نہیں ہوئی، میرے شوہر کے کئی بھائی تھے اور ایک بہن تھی، ان کے کئی بھائیوں کا انتقال ان کی زندگی ہی میں ہو چکا تھا، ان کے انتقال کے بعد صرف ایک بھائی اور بہنیں زندہ ہیں، میرے شوہر کے انتقال کے بعد ان کے بھائی کا بھی انتقال ہوگیا، میرے شوہر کے انتقال کے بعد میرے شوہر کے بھائی کے وارثان اور بہنیں اپنا اپنا حق ہونا ظاہر

کرتے ہیں، اور مجھ سے دس قسم کا مطالبہ کررہے ہیں، آپ یہ بتائیے کہ وصیت مذکور کے ہوتے ہوئے اشخاص مذکورہ بالا کا کوئی حصہ مکان مذکور میں ہوتا ہے، اور اگر ہوتا ہے تو کتنا کتنا ہوتا ہے، میں اپنے شوہر کی منکوحہ ہوں، میرا مکان مذکور میں از روئے شریعت کتنا حصہ ہوتا ہے، تفصیل سے بتانے کی زحمت گوارہ فرمائیں؟

المستفتی: مسماۃ انتخاب بیگم ساکنہ بڑا بازار تلی تال، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ اور وصیت نامہ دونوں پر بخوبی غور کیا گیا ہے، شریعت اسلامی میں وارث کے حق میں وصیت نافذ نہیں ہوتی، جبکہ دوسرے وارثین اس وصیت کے نفاذ پر متفق نہ ہوں، اس لیے انتخاب بیگم کے حق میں اس کے شوہر جعفر احمد نے جو وصیت کی ہے، وہ شرعاً کالعدم ہے، کیونکہ انتخاب بیگم خود جعفر احمد کی شرعی وارث ہے، لہٰذا شریعت کے ضابطہ کے مطابق انتخاب بیگم کو کل جائیداد میں سے ایک چوتھائی ملے گا، اور تین چوتھائی شوہر کے بھائی اور بہن کو حصص شرعیہ کے اعتبار سے ملے گا۔

عن أبی أمامة الباهلی –رضی الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک و تعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصیة لوارث، النسخة الهندیة ۲/ ۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، الوصایا، باب ماجاء فی الوصیة للوارث، النسخة الهندیة ۲/ ۳۹۶، دار السلام رقم: ۲۸۷۰)

ولا لوارثه إلا بإجازة ورثته لقوله علیه السلام: لاوصیة لوارث. (شامی، کتاب الوصایا، کراچی ۶/ ۶۵۵-۶۵۶، زکریا ۱۰/ ۳۴۶، کوئٹه ۵/ ۴۵۹، الجوهرة النیرة، امدادیه ملتان ۲/ ۳۸۹، دار الکتاب دیوبند ۲/ ۳۶۹) **فقط واللّٰہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللّٰہ عنہ
۲۶؍ ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۱۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۴/۲۶ھ

وارث کے حق میں کی گئی وصیت کا شرعی حکم

سوال [۱۱۲۵۰]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری بہن شفیقہ خاتون کے کوئی اولا دنہیں ہے، اس کے شوہر کا انتقال ہوگیا ہے، شوہر کا بھی کوئی وارث نہیں ہے، میری بہن نے میرے ایک لڑکے اور ایک لڑکی کو لے کر پالا، پوسا، اور جوان ہونے کے بعدان دونوں کی شادی بھی کردی۔

اب دریافت یہ کرنا ہے کہ میری بہن کے کل ترکہ کے مالک اس کے مرنے کے بعد اس کے شرعی ورثاء (تین حقیقی بھائی: محمد تصور، محمد افسر، محمد انور، ایک بہن: رفیقہ) ہوں گے، یا لے پالک لڑکا اور لڑکی بھی، اور اگر میری بہن اپنی حیات میں اپنی جائیدادا پنے کسی وارث کو دیدے تو وہ مالک ہوجائے گا یانہیں؟ یا وصیت کرنا چاہے تو کتنے حصے کی وصیت کرسکتی ہے؟

المستفتی: محمد انور گلاب باڑی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بہن کی زندگی میں اس کے مال میں اس کے بھائی بہنوں کا کوئی حق نہیں ہے، اور جب بہن کا انتقال ہو جائے گا تو تینوں بھائی اور بہن اپنے حصۂ شرعی کے مطابق اس کے ترکہ کے حقدار رہوں گے، اور لے پالک لڑکے اور لڑکی کا آپ کی بہن کے مال میں شرعاً کوئی حق نہیں ہے، اور آپ کی بہن اپنی زندگی میں اپنے مال و جائیداد کی ہر طرح کی مالک ہے جس طرح چاہے تصرف کرے، اگر وہ کسی وارث یا غیر وارث کو دینا چاہے تو دے سکتی ہے، اور کسی وارث کے حق میں وصیت کرنے کا اعتبار نہیں ہے، اگر وصیت کرے گی تو دیگر وارثین کی اجازت کے بغیر وہ نافذ نہیں ہوگی۔

قال اللہ تعالیٰ: ﴿وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآئَكُمْ اَبْنَآئَكُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ. [الأحزاب: ٤]﴾

عن أبی أمامة الباهلی -رضی الله عنه- قال: سمعت رسول الله

ﷺ **یقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث.** (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصیة لوارث، النسخة الهندیة ۲/۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، الوصایا، باب ماجاء فی الوصیة للوارث، النسخة الهندیة ۲/۳۹۶، دار السلام رقم: ۲۸۷۰)

وشروطه ثلاثة: موت مورث حقیقة أو حکماً کمفقود. (شامی، کتاب الفرائض کراچی ۶/۷۵۸، زکریا ۱۰/۴۹۱)

ولأن الترکة فی الاصطلاح ما ترکه المیت من الأموال صافیا عن تعلق حق الغیر بعین من الأموال کما فی شروح السراجیة. (شامی، کراچی ۶/۷۵۹، زکریا ۱۰/۴۹۳،ونحو ذٰلك فی حاشیة السراجی ص: ۳)

کل یتصرف فی ملکه کیف شاء. (شرح المجلة رستم اتحاد ۱/۶۵۴ رقم المادة: ۱۱۹۲)

ولا لوارثه إلا بإجازة ورثته لقوله علیه السلام: لاوصیة لوارث إلا أن یجیزها الورثة. (شامی، کتاب الوصایا، کراچی ۶/۶۵۵ زکریا ۱۰/۳۴۶، کوئٹه ۵/۴۵۹، الجوهرة النیرة، امدادیه ملتان ۲/۳۸۹، دار الکتاب دیوبند ۲/۳۶۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰؍رجب المرجب ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۲۱۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۳۰؍۷؍۱۴۳۴ھ

اولاد کے حق میں والد کی وصیت

سوال [۱۱۲۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے والد محترم محمد ظہور مرحوم کے کل چار مکان تھے، انہوں نے انتقال سے تقریباً ایک ماہ قبل یہ وصیت کی تھی کہ ۱۵۰؍گز آراضی والا مکان جو کسرول میں ہے، وہ دونوں بڑے لڑکوں: واحد نور، زاہد حسین کے نام کرا دینا، اور تقریباً ۵۵؍گز آراضی والا مکان جو نئی

بستی میں ہے جس میں طالب حسین رہتا ہے وہ طالب حسین کے نام کرادینا، اور جس میں میں (ظہوراحمد) رہتاہوں وہ واجد حسین کے حق میں کرا دینا، اور چوتھامکان بیچ کر واجد حسین کی شادی کرادینا، اور یہ بھی وصیت کی کہ شادی کے بعد جو رقم بچے وہ آپس میں تقسیم کر لینا۔

تو دریافت یہ کرنا ہے کہ والد محترم کی وصیت جو ہم لوگوں کے حق میں کی ہے وہ نافذ ہوگی یا نہیں؟ اگر وصیت نافذ نہیں ہوگی تو ان مکانوں کی تقسیم کس طرح ہوگی؟ اور جو مکان بیچ کر بڑے بھائیوں نے واجد حسین کی شادی کی ہے اس میں جو روپیہ بچا ہے وہ شرعاً سب ورثاء کو ملے گا یا نہیں؟

کل ورثاء درج ذیل ہیں: چار لڑکے: واحد نور، زاہد حسین، طالب حسین، واجد حسین، ایک لڑکی مہر جہاں۔

المستفتی: طالب حسین، نئی بستی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: وارث کے حق میں وصیت اس وقت درست ہوتی ہے کہ جب دوسرے ورثاء راضی ہوجائیں، اور جب دوسرے ورثاء نے بخوشی چوتھا مکان فروخت کرکے وصیت کے مطابق واجد حسین کی شادی کردی ہے، تو اس مکان میں وصیت درست ہوگئی، اور جو رقم بچ گئی ہے وہ تمام ورثاء کے درمیان حقوق کے مطابق تقسیم کرنا لازم ہوگا اور اس کے علاوہ رہائشی مکانات کے بارے میں جو وصیت کی گئی ہے اس میں چونکہ سب ورثاء متفقہ طور پر راضی نہیں ہیں، اس لیے اس میں وصیت نافذ نہ ہوگی، بلکہ تمام مکانات کی قیمت لگا کر ۹؍ سہام بنا کر ۲/۲؍ سہام لڑکوں کو اور ایک سہام لڑکی کو ملے گا۔

عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ: لاتجوز الوصية لوارث، إلا إن شاء الورثة. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، باب نسخ الوصية للوالدين والأقربين الوارثين، دار الفكر ۹/ ۳۵٦، رقم: ۱۲۷۹۷ – ۱۲۷۹۸، سنن الدار قطني، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ۸٦، رقم: ٤۲٥۱)

إن الله أعطىٰ كل ذي حق حقه ألا لا وصية للوارث (إلى قوله) إلا أن

یجیزها الورثة …… **(قوله) و لأن الامتناع لحقهم فتجوز بإجازتهم.** (هدایه، کتاب الوصایا، رشیدیه ٤/ ٦٤١، اشرفی دیو بند ٤/ ٦٥٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ر صفر المظفر ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۵۱۸۴/۳۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۲/۲۲ھ

والدہ کا اپنا مکان کسی ایک اولاد کے نام وصیت کرنا

سوال [۱۱۲۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زینب کی چار بیٹیاں، ایک بیٹا ہے، تین بیٹیوں اور ایک بیٹے کی شادی ہو چکی ہے، موجودہ حالات میں جس مکان میں زینب کی رہائش ہے اس کے تمام مالکانہ حقوق زینب کو حاصل ہیں، کیا زینب اپنا مکان کسی ایک اولاد کے نام کر سکتی ہے، اور ایسا کرنے میں کوئی شرعی عذر تو نہیں؟ اور اس کا طریقہ کیا ہوگا؟ کیا وصیت کے ذریعہ اس کام کو کیا جا سکتا ہے؟ جبکہ کہتے ہیں کہ وصیت ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہو سکتی؟ برائے مہربانی جواب تحریر فرمادیں۔

المستفتی: اکبری بیگم زوجہ محمد حفیظ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: زینب کا اپنی اولاد میں سے کسی ایک کے نام پر اپنے پورے مکان کو کر دینا، دیگر اولاد پر ظلم ہے، جس کی شریعت میں اجازت نہیں ہے، اس لیے زینب کے لیے یہ درست نہیں ہے کہ وہ اپنا پورا مکان کسی ایک کے نام پر کر دے اور اگر وہ اپنا مکان اپنی زندگی میں اولاد میں تقسیم کرنا چاہتی ہے تو اسے ہر ایک کو برابر حصہ دینا چاہیے، اور اولاد سب کی سب وارث ہوتی ہیں اور ان میں کسی ایک کے نام پر شرعی طور پر وصیت نافذ نہیں ہوگی، جب تک کہ دوسرے ورثاء بخوشی اس کی اجازت نہ دیں۔

عن عمرو بن خارجة قال: قال رسول الله ﷺ: لا وصية لوارث إلا أن يجيز الورثة. (سنن کبریٰ للبیهقی، دار الفکر بیروت ٩/ ٣٥٨، رقم: ١٢٨٠٣، سنن

الدار قطنی، دار الکتب العلمیة بیروت ٤/٨٦، رقم: ٤٥٢)

وإن قصد به الإضرار سوی بینهم، یعطی الابنة مثل ما یعطی للإبن وعلیه الفتویٰ. (فتاویٰ عالمگیری، کتاب الهبة، الباب السادس، زکریا قدیم ٤/٣٩١، جدید ٤/٤١٦، فتاویٰ قاضیخان جدید زکریا ٣/١٩٤، وعلی هامش الهندیة زکریا ٣/٢٧٩)

ولاتجوز الوصیة للوارث عندنا إلا أن یجیزها الورثة. (عالمگیری، کتاب الوصایا، الباب الأول، زکریا قدیم ٦/٩٠، جدید ٦/١٠٦، در مختار مع الشامی، کراچی ٦/٦٥٥، زکریا ١٠/٣٤٦، هدایه رشیدیه ٤/٦٤١، اشرفی دیوبند ٤/٦٥٧، مجمع الأنهر، دار الکتب العلمیة بیروت ٤/٤١٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍شعبان المعظم ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۰۷۹)

وارث بھتیجے کے حق میں وصیت کا حکم

سوال [۱۱۲۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: حاجی بابو کا انتقال ہوگیا، انہوں نے اپنے مرنے کے بعد دو لڑکیاں اور دو بھتیجے ایک بیوی کو چھوڑا، شریعت مطہرہ کی روشنی میں بتلائیں کہ کس کا کتنا حق بنتا ہے؟ جبکہ ایک بھتیجہ نعیم احمد کہتا ہے کہ میرے چچا حاجی بابو نے پورے مکان کی میرے لیے وصیت کردی ہے، تو یہ وصیت نافذ ہوگی یا نہیں؟ ورثاء میں زوجہ، زیب النساء بنت آمنہ بنت امینہ، ابن الاخ نعیم، ابن الاخ حنیف۔

المستفتی: خلیل احمد، اظہر علی لالباغ حسن پور ضلع امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بھتیجہ نعیم وارث ہے اور وارث کے حق میں وصیت نافذ نہیں ہوتی ہے، لہٰذا وہ بھی دیگر بھتیجوں کی طرح ایک وارث ہی کے درجہ میں ہوگا،

چنانچہ کل ترکہ ۴۸/ سہاموں میں تقسیم ہوکر بیوی کو ٦، اور دونوں لڑکیوں کو ۱٦/ ۱٦/ اور دونوں بھتیجوں کو پانچ پانچ ملیں گے۔

عن أبي أمامة الباهلي -رضي الله عنه- قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول في خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارك وتعالىٰ قد أعطىٰ كل ذي حق حقه فلا وصية لوارث. (سنن الترمذي، باب ما جاء لا وصية لوارث، النسخة الهندية ۲/ ۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبي داؤد، الوصايا، باب ماجاء في الوصية للوارث، النسخة الهندية ۲/ ۳۹٦، دار السلام رقم: ۲۸۷۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱٦/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۹۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱٦/ ۱۱/ ۱۴۳۴ھ

صحرائی یا سکنائی جائیداد کو کسی ایک وارث کے لیے وصیت کرنا

سوال [۱۱۲۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کیا کسی وارث کے حق میں وصیت کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟ مثلاً باپ بیٹے کے نام کچھ جائیداد وصیت کرسکتا ہے یا نہیں؟

(۲) کیا صحرائی جائیداد میں وصیت کسی وارث کے حق میں کرنے کی گنجائش ہے، یا سکنائی میں؟ اگر کرسکتے ہیں تو کتنے حصوں کی کرسکتے ہیں؟

المستفتی: سراج الحق کانٹھ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صحرائی یا سکنائی کسی قسم کی جائیداد میں بیٹے یا کسی دوسرے وارث کے حق میں وصیت نافذ نہیں ہوتی، جس کے حق میں وصیت کی جائے گی وہ صرف حق میراث پاسکتا ہے، وصیت کی بنا پر نہیں پائے گا۔

عن أبي أمامة الباهلي -رضي الله عنه- قال: سمعت رسول الله

ﷺ **یقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث.** (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصیة لوارث، النسخة الهندیة ۲/۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، الوصایا، باب ماجاء فی الوصیة للوارث، النسخة الهندیة ۲/۳۹۶، دار السلام رقم: ۲۸۷۰)

ولا تجوز لوارثه لقوله علیه السلام إن الله قد أعطی کل ذی حق حقه ألا لاوصیة للوارث. (هدایه، کتاب الوصایا، رشیدیه ٤/٦٤١، اشرفی دیوبند ٤/٦٥٧، شامی کراچی ٦/٦٥٥-٦٥٦، زکریا ١٠/٣٤٦، الجوهرة النیرة امدادیه ملتان ٢/٣٨٩، دار الکتاب دیوبند ٢/٣٦٩، مجمع الأنهر، دار الکتب العلمیة بیروت ٤/٤١٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۰۷۵)

جب دوسرے ورثاء وصیت پر راضی نہ ہوں تو......؟

سوال [۱۱۲۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے والد کی سات اولادیں ہیں، میں دوسرے نمبر کا لڑکا ہوں، جس میں چار لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں، میرے والد صاحب نے میرے کہنے پر ایک وصیت کی تھی، جس کا مضمون اس طرح ہے کہ میری سات اولادیں ہیں جس میں بڑی لڑکی کا انتقال ہوگیا اور دو لڑکے اور دو لڑکیوں کی شادی بیاہ ہوگیا، صرف دو چھوٹے لڑکے رہ گئے ہیں، ان کی شادی نہیں ہوئی ہے، میری یہ خوشی ہے کہ جو میرا مکان ہے وہ میں ان دونوں کو دیدوں، اس لیے وصیت کررہا ہوں تاکہ ان کی شادی بیاہ میں پریشانی نہ ہو، اس وصیت کے بعد والد صاحب کی زندگی میں دونوں چھوٹے بھائیوں کی شادی بھی ہوگئی، اور والد صاحب کا بعد میں انتقال ہوگیا، جبکہ اور بھائی بہن کا کہنا ہے کہ والد صاحب نے وصیت غلط کی، ہم سب بھی مکان کے مالک ہیں، علماء دین بتائیں کہ وصیت غلط ہے یا ٹھیک؟

المستفتی: محمد ہاشم علی محلّہ جگر کالونی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب دوسرے ورثاء وصیت پر راضی نہیں ہیں تو شرعی طور پر باپ کی وصیت لڑکوں کے بارے میں نافذ نہ ہوگی، تمام ترکہ تمام ورثاء کے درمیان شرعی حصص کے اعتبار سے تقسیم ہوگا۔

عن عمرو بن خارجة قال: قال رسول الله ﷺ: لا وصية لوارث إلا أن يجيز الورثة. (سنن کبریٰ للبیهقی، دار الفکر بیروت ۹/۳۵۸، رقم: ۱۲۸۰۳، سنن الدار قطنی، دار الکتب العلمیة بیروت ٤/٨٦، رقم: ٢٤٥٢)

ولاتجوز لوارثه ......إلا أن يجيزها الورثة . (هدایه، کتاب الوصایا، رشیدیه ٤/٦٤١، اشرفی دیوبند ٤/٦٥٧، شامی کراچی ٦/٦٥٥، زکریا ١٠/٣٤٦، الجوهرة النيرة، امدادیه ملتان ٢/٣٨٩، دار الكتاب دیوبند ٢/٣٦٩، مجمع الأنهر، دار الکتب العلمیة بیروت ٤/٤١٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍شوال المکرّم ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۴۵۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۱۰/۲۱ھ

وارث کے حق میں وصیت برضا دیگر وارثین

سوال [۱۱۲۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے اپنی وفات سے قبل اپنے فرزندوں کے لیے اپنی ساری زمین کی وصیت کردی تھی، اور یہ واضح رہے کہ زید کے کل تین فرزند ہیں، بعد وفات وہ دونوں وصیت کے مطابق کل زمین پر قبضہ کرنے کی کوشش کررہے ہیں، اور تیسرا لڑکا بقیہ کل مال پر قابض ہے، اب آپ شریعت کی روشنی میں اس بات کی مکمل ومدلل وضاحت فرمائیں، کہ یہ وصیت کرنا اور قبضہ کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد منیر لکھیم پوری مدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کی اس وصیت سے اگر تیسرا لڑکا اور دیگر وارثین راضی نہیں ہیں تو یہ وصیت جائز نہ ہوگی، ایسی صورت میں کل زمین اور بقیہ مال کو تمام وارثین کے درمیان ان کے حصوں کے بقدر تقسیم کیا جائے، بغیر تقسیم کیے قبضہ کرنا جائز نہیں؟

عن عمرو بن خارجة قال: قال رسول الله ﷺ: لا وصية لوارث إلا أن يجيز الورثة. (سنن کبریٰ للبیهقی، دار الفکر بیروت ۹/۳۵۸، رقم: ۱۲۸۰۳، سنن الدار قطنی، دار الکتب العلمیة بیروت ٤/٨٦، رقم: ٢٤٥٢)

ولا لوارثه إلا بإجازة ورثته لقوله عليه السلام: لا وصية لوارث إلا أن يجيزها الورثة يعني عند وجود وارث آخر كما يفيده. (در مختار مع الشامی، کتاب الوصایا، کراچی ٦/٦٥٥-٦٥٦، زکریا ١٠/٣٤٦، کوئٹه ٥/٤٥٩، الجوهرة النيرة، امدادیه ملتان ٢/٣٨٩، دار الکتاب دیوبند ٢/٣٦٩، هدایه رشیدیه ٤/٦٤١، اشرفی دیوبند ٤/٦٥٧، مجمع الأنهر، دار الکتب العلمیة بیروت ٤/٤١٨) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۶۱۱۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/۴/۱۴۲۰ھ

بیوی کو قرضہ اور ادائیگی دین مہر کے لیے مکان کی وصیت

سوال [۱۱۲۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) عبد الغفور کی تین اولادیں تھیں، دولڑکے عبد اللہ وعبد الستار اور ایک لڑکی جس کا ان کی زندگی میں ہی انتقال ہوگیا تھا، عبد الغفور نے اپنی ملکیت میں دو قطعہ مکانات چھوڑے اور دونوں کا نمبر ۸۳۹ تھا، اور عبد الغفور کا انتقال ہوا، تو ان دونوں مکانوں میں سے ایک ایک عبد اللہ وعبد الستار کو وارثت میں ملا۔

(۲) عبد اللہ کے ذمہ مبلغ ۵۰۰۰؍روپیہ قرضہ تھا، اس نے اپنی بیوی کو تحریری وصیت کی

کہ یہ مکان مہراورقرض کی ادائیگی کے عوض تمہارا ہے، بیوی کا مہر ایک ہزار تھا،اورقرض پانچ ہزار، اورعبداللہ کے مرنے کے بعد وصیت کے مطابق اس کا مکان اس کی بیوی مٹھّیا کے نام اندراج ہوگیا لیکن بیوہ مذکورہ نے قرضہ ادانہیں کیا ہے،تو شرعی طور پر بیوہ مذکورمکان کی مالک ہوئی یانہیں، مٹھّیا نے اپنے مرنے سے قبل اپنی چارلڑکیوں کووصیت کی کہ یہ مکان مجھے تمہارے باپ سے مہر وقرض کی ادائیگی کے عوض ملا ہے،تم باپ کا قرضہ ادا کردینا یہ مکان تمہاری ملکیت ہے،اس طرح لڑکیوں نے مکان کواپنے چچا عبدالستار کے لڑکے کے مشورہ سے فروخت کردیا۔

المستفتیه: رمضانی محلّہ قاضی پورہ ٹانڈہ رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۲) جب مٹھّیا نے قرضہ ادانہیں کیا ہے تو مذکورہ مکان کا چھٹا حصہ اپنے ایک ہزار دین مہر کے عوض اس کی ملکیت میں آ گیا ہے، اور باقی حصے پانچ ہزار کے عوض قرض خواہوں کے حق میں معلق ہے اگر اس کی وصیت کے مطابق لڑکیوں نے قرضہ ادا کردیا ہے تو چھٹا حصہ ماں کی وراثت سے اور بقیہ پانچ حصے ادائے قرض کے عوض لڑکیوں کی ملکیت میں آ گئے ،اور پورے مکان میں عبدالستار کے لڑکے محمد اسماعیل کا کوئی حق شرعاً باقی نہیں رہا ہے، کیونکہ قرضہ کی ادائیگی وراثت پر مقدم ہوا کرتی ہے۔

ثم تقضی دیونه من جمیع ما بقی من ماله. (شریفیه ص: ٦، تاتارخانیة زکریا ۲۰/۲۱۸، رقم: ۳۳۰۸٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/۲۳۸۷)

بیٹیوں کوچھوڑ کر صرف بیٹوں کے لیے وصیت کرنا

سوال [۱۱۲۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگرکسی کے چار بیٹے اور چار بیٹیاں ہوں تو کیا وہ شخص اپنی ساری جائیداد کی

وصیت صرف بیٹوں کے نام کرکے اپنی بیٹیوں کو بے دخل کردے، اور وصیت نامہ کی رجسٹری کرادے، تو کیا یہ وصیت شرعی طور پر صحیح ہے؟

المستفتی: مبشر حسین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صرف بیٹوں کے نام وصیت کرکے بیٹیوں کو حق وراثت سے محروم کرنا ناجائز ہے اور اس پر احادیث مبارکہ میں سخت ترین وعیدوارد ہوئی ہیں، نیز شرعی طور پر وارث کے حق میں وصیت درست نہیں ہوتی اور بیٹے چونکہ وارث ہیں وہ شریعت کی طرف سے متعین حصہ کے حقدار ہیں، اس سے زائد جس کی وصیت کی گئی ہے وہ جائز نہیں ہے، وہ نافذ نہ ہوگی، اور لڑکیوں کا جو حق بیٹھتا ہے وہ لڑکیوں کے لیے متعین رہے گا، اور لڑکیوں کا حصہ لڑکوں کو دینے سے سخت ترین عذاب کے مستحق ہوں گے۔

عن أنس بن مالک رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: من فر من میراث وارثه قطع الله میراثه من الجنة یوم القیامة. (ابن ماجه، أبواب الوصایا، باب الحیف فی الوصیة،، النسخة الهندیة ٢/١٩٤، دار السلام رقم: ٢٧٠٣)

عن أنس بن مالک رضی اللہ عنہ قال: إن لتحت ناقة رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم یسیل عليّ لعابها فسمعته یقول: إن الله عز وجل قد أعطی کل ذی حق حقه، فلا وصیة لوارث. (دار قطنی سهارنپور ٤/٣٨، رقم: ٤٠٢١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢٤؍محرم الحرام ١٤٣٣ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٩/١٠٦٠٨)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
٢٤/١/١٤٣٣ھ

بیٹی کے حق میں وصیت کا حکم

سوال [١١٢٥٩]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہندہ کے پاس دوتولہ سونا تھا اس نے اس کے بارے میں یہ وصیت کی کہ یہ سونا ایک تولہ میرے دونوں بیٹوں کا ہے، لیکن قبل اسکے کہ یہ سونا دونوں میں تقسیم ہوتا، چھوٹے بھائی

کی شادی کا مسئلہ درپیش آ گیا، اور وہ سونا چھوٹے بیٹے کی شادی میں دیدیا گیا، دینے والوں میں بڑا بھائی اوراس کی والدہ دونوں کی مرضی شامل تھی، کچھ عرصہ کے بعد چھوٹے بھائی نے کسی ضرورت کے تحت وہ سونا فروخت کر کے اس کی رقم اپنے مصرف میں لے لی، اب سالہا سال گذر جانے کے بعد بڑا بھائی اپنے اس ایک تولہ سونا کے لینے کا خواہش مند ہے تو کیا اس کا یہ مطالبہ درست ہے، اور اگر درست ہے تو ادائیگی کے لیے کس بھاؤ کا اعتبار ہوگا اس وقت کے بھاؤ کا جب وہ بکا تھا یا موجودہ وقت کے بھاؤ کے حساب سے قیمت تقسیم کرنی ہوگی؟

المستفتی: محمد انور کلرس اینڈ کیمیکل مرچینٹ کاشی پور نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: والدہ نے دو تولہ سونے کے بارے میں جو وصیت کی تھی کہ یہ سونا میرے دونوں بیٹوں کا ہے، یہ وصیت ہی درست نہیں ہوئی، اس لیے کہ وارث کے حق میں وصیت درست نہیں ہے، پھر بعد میں والدہ نے بڑے لڑکے کی مرضی کے ساتھ چھوٹے لڑکے کی شادی میں دیدیا ہے تو اس کا دینا درست ہوگیا، اور چھوٹا لڑکا اس کا مالک ہوگیا، لہٰذا بڑے لڑکے کا اس سونے کی قیمت کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہے۔

عن أبی أمامة الباهلی –رضی الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصیة لوارث، النسخة الهندیة ۳۲/۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، الوصایا، باب ماجاء فی الوصیة للوارث، النسخة الهندیة ۳۹۶/۲، دار السلام رقم: ۲۸۷۰)

وتتم الهبة بالقض الکامل. (شامی، کتاب الهبة زکریا ۴۹۳/۸، کراچی ۲۹۰/۵)

وتتم بالقبض الکامل لقوله علیه الصلاة والسلام لاتجوز الهبة إلا مقبوضة. (مجمع الأنهر، دار الکتب العلمیة بیروت ۴۹۱/۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۲۷۴/۴۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۱۱/۳ھ

دیگر ورثاء کی موجودگی میں محض بیٹی کے نام کل جائیداد کی وصیت

سوال [۱۱۲۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کہ حاجی محمد احمد نے انتقال سے قبل اپنی اکلوتی لڑکی عشرت النساء کے نام اپنی تمام منقولہ وغیر منقولہ جائیداد کی وصیت کی تھی، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ دیگر ورثاء کے ہوتے ہوئے یہ وصیت صرف بیٹی کے نام معتبر ہوگی یا نہیں؟

(۲) حاجی محمد احمد ساکن دیوی استھان قصبہ محمدی لکھیم پور کا مؤرخہ ۲۳/اگست ۲۰۰۰ء کو انتقال ہوگیا، ورثاء میں ایک بیوی صغریٰ بیگم ایک بیٹی عشرت النساء، دو چھوٹے بھائی سید احمد، محمد حسین اور ایک بہن سکینہ کو چھوڑا، تو ہر وارث کو کتنے کتنے حصے ملیں گے؟ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد حسین قاسمی، محلہ دیوی استھان محمدی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) دوسرے ورثاء کی مرضی اور اجازت کے بغیر صرف ایک وارث کے حق میں شریعت اسلامی میں وصیت نافذ نہیں ہوتی، اور ایسی صورت میں وصیت کو کالعدم قرار دے کر تمام ترکہ منقول وغیر منقول کو تمام شرعی ورثاء کے درمیان حصص شرعی کے اعتبار سے تقسیم کر دینا لازم ہوتا ہے، لہٰذا مذکورہ واقعہ میں عشرت النساء تمام منقولہ وغیر منقولہ جائیداد کی مالک نہیں ہے، بلکہ اس میں سب کا حق متعلق ہے۔

عن أبی أمامة الباهلی –رضی الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصیة لوارث، النسخة الهندیة ۲/۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، الوصایا، باب ماجاء فی الوصیة للوارث، النسخة الهندیة ۲/۳۹۶، دار السلام رقم: ۲۸۷۰)

ولاتجوز لوارثه لقوله علیه السلام إن الله قد أعطی کل ذی حق حقه ألا لا وصیة للوارث (إلی قوله) إلا أن یجیزها الورثة. (هدایه، کتاب الوصایا، رشیدیه ۴/۶۴۱،

اشرفی دیوبند ٤/٦٥٧، شامی کراچی ٦/٦٥٥، زکریا ١٠/٣٤٦، الجوهرة النيرة امدادیه ملتان ٢/٣٨٩، دار الكتاب ديوبند ٢/٣٦٩، مجمع الأنهر دار الكتب العلمية بيروت ٤/٤١٨)

(۲) بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ماتقدم وعدم موانع ارث حاجی محمد احمد کا کل ترکہ مذکورہ ورثاء کے درمیان درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا۔

حاجی محمد احمد میت $\frac{۴۰}{۸}$

بیوی	بیٹی	بھائی	بھائی	بہن
صغریٰ بیگم	عشرت النساء	سید احمد	محمد حسین	سکینہ
$\frac{۱}{۵}$	$\frac{۴}{۲۰}$	۶	۶	۳

کل ترکہ چالیس سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا اتنا ملے گا جو اس کے نام کے نیچے درج ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/شوال المکرّم ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۸۳۶)

ماں کی وصیت کی بناء پر لڑکے کو محروم کرنے کا حکم

سوال [۱۱۲۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک ماں نے اپنے بڑے لڑکے کے بارے میں یہ وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد میرے لڑکے رفیق احمد کو کچھ نہ ملے تو شرعاً کیا وہ لڑکا وراثت سے محروم ہوجائے گا یا نہیں؟

المستفتی: نسیم احمد کسرول مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ماں کے وصیت کرنے سے کہ میرے مرنے کے بعد میرے لڑکے کو کچھ نہ ملے اس وصیت سے بیٹا ماں کی وصیت سے محروم نہ ہوگا، کیونکہ وراثت

ملک غیر اختیاری ہے، لہٰذا ماں کو یہ حق نہیں ہے کہ اپنے مرنے کے بعد ورثاء میں سے کسی کو محروم کردے، شریعت نے جو حصہ جس وارث کا متعین کردیا ہے وہ اس کو ضرور پہنچے گا، چاہے لڑکا ماں کی ہمیشہ نافرمانی ہی کرتا رہا ہو، اس کو اس کا شرعی حق مل کر رہے گا، نیز بلا کسی وجہ کے وارث کو محروم کرنا سخت گناہ ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۵/۶۳، جدید ڈابھیل ۲۰/ ۴۸۸، امداد المفتیین ۲/ ۱۰۴۹)

عن أنس بن مالکؓ قال: قال رسول الله ﷺ: من فر من میراث وارثه قطع الله میراثه من الجنة یوم القیامة. (ابن ماجه، أبواب الوصایا، باب الحیف فی الوصیة،، النسخة الهندیة ۲/ ۱۹٤، دار السلام رقم: ۲۷۰۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍رجب المرجب ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۱۱۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۳؍۷؍۱۴۲۴ھ

ماں کے کسی وارث کو حصہ نہ دینے کی وصیت کا شرعی حکم

سوال [۱۱۲۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زرینہ بیگم کی آٹھ اولادیں ہیں، چھ لڑکے: ان شاء اللہ، سبحان اللہ، الحمد للہ، رضوان اللہ، سلیم، اسلام، اور دو لڑکیاں: پروین، حنا، زرینہ اور اس کے شوہر ماشاء اللہ کی مشترکہ جائیداد ہے، ماشاء اللہ کا انتقال پہلے ہوا، اس کے بعد زرینہ نے یہ کہا کہ ان شاء اللہ کو کچھ نہیں دینا ہے، اور اس کی شہادت زرینہ کا بیٹا اسلام دیتا ہے، اور یہ قسم کھا کر کہتا ہے کہ ماں نے یہ کہہ دیا ہے کہ ان شاء اللہ کو کچھ نہیں دینا ہے، اس کے بعد ان شاء اللہ نے اسلام سے کہا کہ اگر تم یہ بات مسجد میں جا کر قسم کھا کر کہو تو میں اپنا حصہ چھوڑ دوں گا، چنانچہ اسلام نے مسجد میں جا کر بھی قسم کھالی اور جب بقیہ ۲؍ بھائیوں اور تیسرے بھائی کی بیوی کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ اسلام نے جھوٹی قسم کھائی ہے بلکہ ماں نے ہم سے کہا تھا کہ ان شاء اللہ کا بھی حصہ ہے، اس کے بعد زرینہ کا انتقال ہوگیا، اب سوال یہ ہے کہ ان شاء اللہ وارث ہوگا یا نہیں؟ حکم شرعی واضح فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

المستفتی: ان شاء اللہ محمد شیخ علاؤ الدین پیرزادہ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: میراث میں وارثین کو جومتروکہ مال حصہ میں ملتا ہے وہ منجانب اللہ ملتا ہے، مرنے والے مورث کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا ہے اور اسلام کا یہ کہنا ہے کہ والدہ نے ان شاء اللہ کو کچھ نہ دینے کی وصیت کی ہے، اگر یہ بات اپنی جگہ صحیح بھی ہے تب بھی اس وصیت کا کوئی اعتبار نہیں، اسلام قسم کھائے یا نہ کھائے، اس معاملہ پر گواہ پیش کرے یا نہ کرے؟ ہر حال میں ان شاء اللہ کو بھی اتنا ہی ملے گا جتنا اس کے بھائیوں کو ملے گا، اسی طرح اگر زندگی میں ماں باپ نے کسی بچہ کو عاق کردیا ہے تو اس کا بھی اعتبار نہیں ہوتا ہے، اور عاق کرنے کے بعد بھی وارث ہوجاتا ہے، لہٰذا مذکورہ سوال میں ان شاء اللہ کو محروم کرنے کے لیے اسلام کی کوشش خوامخواہ کی ہے اس کی کوشش کا ان شاء اللہ کے اپنے ماں باپ کا وارث بننے میں کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۴/۳۶۴)

﴿قال الله تعالیٰ: **يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ.** [النساء: ١١]﴾

الإرث جبري لايسقط بالإسقاط. (تکملہ شامی، مطلب: واقعة الفتاویٰ کراچی ٧/٥٠٥، زکریا ١١/٦٧٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۲۴/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۳۰۰۸)	۱۴۳۶/۶/۲۴ھ

بعض ورثاء کو بے دخل کر کے بعض کے حق میں وصیت کرنے کا حکم

سوال [۱۱۲۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جمیلہ خاتون کے پاس دو مکان تھے، ایک مکان شوہر سے دین مہر میں ملا تھا، دوسرا بھی شوہر نے دیا تھا، اور سارے اختیارات بھی دیدئے تھے، پھر جمیلہ نے اپنی تمام جائیداد منقولہ وغیر منقولہ اپنی زندگی میں اپنے دو لڑکوں ریاست حسین اور امیر حسین اور ایک لڑکی حبیبہ

خاتون کے نام وصیت کردی، جس میں یہ لکھا تھا کہ میرے مرنے کے بعد میری جائیداد کے مالک یہ دولڑکے اور ایک لڑکی ہوگی، اور میری طرح سارے اختیارات انہیں رہیں گے، اس وصیت نامہ میں دولڑکوں لیاقت اور شوکت کے نام کوئی وصیت نہیں کی تو کیا لیاقت اور شوکت کو بھی اس مکان میں سے کچھ ملے گا یا نہیں؟ واضح رہے کہ جس مکان کے بارے میں وصیت کی تھی اس میں سے ایک کرایہ داروں کے پاس تھا، وہ خالی نہیں کررہے تھے، تو مقدمہ چلا اور پھر کرایہ داروں سے خالی کرالیا گیا، پھر والدہ جمیلہ خاتون نے ایک دخل نامہ میرے نام لکھوایا جس دخل نامہ میں لیاقت وشوکت کے دستخط بھی ہیں تو اس دخل نامہ لکھوانے سے ہماری ملکیت میں وہ مکان آگیا یا نہیں؟

وارثوں کے حق میں دخل نامہ اور وصیت نامہ لکھنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس کا اعتبار ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر اعتبار نہیں تو جمیلہ کا ترکہ شرعاً کس طرح تقسیم ہوگا۔

المستفتی: ریاست حسین محلّہ گوئیاں باغ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دخل نامہ لکھوانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ فریق مخالف کے ہاتھ سے نکال لیا جائے، یہ مقصد نہیں ہوتا کہ ملکیت میں ہو جائے، نیز ورثاء کو محروم کرکے بعض دوسرے ورثاء کے حق میں وصیت شرعاً صحیح نہیں ہوتی، اس لیے مذکورہ وصیت نامہ کالعدم شمار ہوگا، اور تمام شرعی ورثاء میں ہر ایک کو اپنا اپنا حق شرعی مل جائے گا، لہٰذا جمیلہ کی وفات کے وقت جتنے ورثاء زندہ تھے ان سب کو جمیلہ کے ترکہ سے اور وصیت شدہ جائیداد میں سے شرعی حق ملے گا۔

عن أبی أمامة الباهلی –رضی الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ كل ذی حق حقه فلا وصية لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصية لوارث، النسخة الهندية ۳۲/۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، الوصايا، باب ماجاء فی الوصية للوارث، النسخة الهندية ۳۹۶/۲، دار السلام رقم: ۲۸۷۰)

قوله عليه السلام إن الله تعالىٰ أعطى كل ذى حق حقه ألا لا وصية للوارث ولأنه يتاذى البعض بإيثار البعض. (هدايه، كتاب الوصايا، رشيديه ٤/٦٤١، اشرفی ديوبند ٤/٦٥٧، شامی كراچی ٦/٦٥٥، زكريا ١٠/٣٤٦، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/٤١٨، الجوهرة النيرة، امداديه ملتان ٢/٣٨٩، دار الكتاب ديو بند ٢/٣٦٩) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۴۴۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۵/۷

کل جائیداد ایک بیوی کی اولاد کے نام کر کے دوسرے کی اولاد کو محروم کرنے کا حکم

سوال [۱۱۲۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حاجی محمد معروف بن محمد معشوق صاحب کا انتقال ۲۰۰۶ء میں ہوگیا ہے، انہوں نے اپنی حیات میں دو بیویاں کی تھیں اور دونوں سے اولاد بھی ہیں، حاجی محمد معروف صاحب نے اپنے انتقال سے پہلے اپنی پراپرٹی وغیرہ اپنی پہلی بیوی کے بچوں کے نام کردی، جو کہ لکھت روپ میں ہے، اور دوسری بیوی اور ان کے بچوں کو کسی بھی اعتبار سے اپنے ترکہ میں شریک نہیں کیا، حضرت والا سے درخواست ہے کہ جواب مرحمت فرمادیں کہ حاجی محمد معروف نے جو اپنی آدھی اولاد کے نام اپنا کل ترکہ کیا اور کچھ کو بالکل بھی نہ دیا، کیا ایسا کرنا درست ہے؟ اور شرعی اعتبار سے اس لکھی ہوئی تحریر کی کیا حیثیت ہے جو حاجی محمد معروف نے لکھوائی ہے؟ جواب دے کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں؟

المستفتی: فیض الرحمٰن مصطفیٰ آباد، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ میں پہلی بیوی کی اولاد کو دینے سے متعلق جو تحریر منسلک ہے وہ تحریر وصیت کی ہے زندگی میں بحالت صحت ہبہ کر کے مالک بنانے

کی نہیں ہے، اور کچھ ورثاء کو نہ دے کر کچھ ورثاء کو دینے کی وصیت کرنا شرعاً معتبر نہیں ہے، لہٰذا اگر دوسری بیوی کی اولادیں بھی محمد معروف ہی سے پیدا ہوئی ہیں تو وہ اولادیں محمد معروف کی وارث ہیں، اور دوسری بیوی سے اگر ایسی اولادیں بھی ہیں جو محمد معروف سے پیدا نہیں ہوئی ہیں، بلکہ کسی دوسرے شوہر سے پیدا شدہ ہیں تو وہ اولادیں محمد معروف کی وارث نہیں ہوں گی، اس تفصیل کے بعد شرعی حکم یہ ہے کہ محمد معروف نے جو تحریر لکھوائی ہے وہ وصیت نامہ ہے، اور وصیت دوسرے ورثاء کی مرضی کے بغیر نافذ نہیں ہوگی، بلکہ ساری جائیداد مملوکہ متروکہ سب کی سب میراث شمار ہوں گی، اور ہر ایک شرعی وارث اس میراث میں شرعی حصہ کا حقدار ہوگا، اور دونوں بیوی اگر زندہ ہوں تو وہ دونوں بھی وارث ہوں گی۔

عن أبی أمامة الباهلی -رضی الله عنه- قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصية لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصية لوارث، النسخة الهندية ٢/ ٣٢ دار السلام رقم: ٢١٢٠، سنن أبی داؤد، الوصايا، باب ماجاء فی الوصية للوارث، النسخة الهندية ٢/ ٣٩٦، دار السلام رقم: ٢٨٧٠)

ولا لوارثه إلا بإجازة ورثته لقوله عليه السلام: لاوصية لوارث إلا أن يجيزها الورثة. (شامی، کتاب الوصايا، کراچی ٦/ ٦٥٥-٦٥٦، زکريا ١٠/ ٣٤٦)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵ر محرم الحرام ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۹۲۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۵/۱/۱۴۳۴ھ

وارث کے حق میں وصیت کا مسئلہ اور بہن وراثت کی مستحق

سوال [۱۱۲۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جناب عبدالشکور صاحب کا انتقال ہوا، انہوں نے ترکہ میں دس لاکھ روپئے اور

اٹھاسی گز زمین مع مکان جس کی قیمت تقریباً ۲؍لاکھ روپیہ ہے، چھوڑا، وارثین میں بیوی شکوراؔ اور تین لڑکے: عبدالرحیم، عبدالکریم، عبدالعلیم اور چار لڑکیاں: سروری بیگم، نرگس بیگم، انیسہ، حلیمہ چھوڑیں، والد صاحب نے چھوٹے بھائی کے نام یہ وصیت کی تھی کہ دس لاکھ میں سے میرے بیٹے عبدالعلیم کو پانچ لاکھ پہنچے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا والد صاحب کی اس طرح وصیت درست ہے؟ نیز بہنوں کی شادی کے موقع پر ہم تینوں بھائیوں نے باپ کے ساتھ بڑھ چڑھ کر خرچ کیا اور وسعت سے زیادہ جہیز دیا، کیا وہ اب بھی وراثت کی حقدار ہیں؟ نیز اگر وہ وراثت کی حقدار ہیں تو خرچ کیا ہوا روپیہ وغیرہ ان کے حصہ سے نکالا جا سکتا ہے، یا نہیں؟ شرع کی رو سے والد صاحب کا ترکہ کس کو کتنا پہنچتا ہے؟

المستفتی: عبدالکریم مسجد بنجاران، کانٹھ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: وارث کے حق میں وصیت درست نہیں ہے، لہٰذا آپ کے والد صاحب نے جو عبدالعلیم کے نام وصیت کی ہے، اس کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں ہے، بلکہ باپ کے ترکہ میں تمام ورثاء حصص شرعیہ کے مطابق حق دار ہوں گے۔

عن أبی أمامة الباهلی –رضی الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصیة لوارث، النسخة الهندیة ۲/ ۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، الوصایا، باب ماجاء فی الوصیة للوارث، النسخة الهندیة ۲/ ۳۹۶، دار السلام رقم: ۲۸۷۰)

شریعت اسلامیہ نے والدین کے ترکہ میں تمام ورثاء کا حق بیان کیا ہے خواہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں، شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ، لہٰذا بہنیں بھی حصۂ شرعیہ کی حقدار ہیں۔

﴿لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِمَّا تَرَکَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِمَّا تَرَکَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ کَثُرَ نَصِیْبًا مَفْرُوْضًا. [النساء: ۷] **﴾**

نیز بھائیوں نے بہنوں کی شادی کے موقع پر جو کچھ باپ کے ساتھ حسن سلوک اور تعاون کیا ہے اس کو بہنوں سے وصول کرنے کا حق نہیں ہے۔

ولایجوز لأحدهما أن یتصرف في نصیب الآخر إلا بأمره وکل واحد منهما کالأجنبي في نصیب صاحبه. (هندیه کتاب الشرکة، الباب الأول زکریا قدیم ۲/ ۳۰۱، جدید ۲/ ۳۱۱)

أما إذا کان بغیر أمره فلأنه تبرع بإسقاط الحق عنه فلایملک أن یجعل ذلک مضمونا علیه. (بدائع کتاب الهبة زکریا ۵/ ۱۸۹)

لہٰذا بشرط صحت سوال مرحوم عبدالشکور کا ترکہ تمام ورثاء کے درمیان درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا۔

تداخل

میت

	بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی
	شکوراً	عبدالکریم	عبدالرحیم	عبدالعلیم	سروری بیگم	نرگس بیگم	انیسہ	رحیمہ	
سہام	۱/۱۰	۱۴	۱۴	۱۴	۷	۷	۷	۷	۷
ترکہ	۳۴۳۷ ۴۰/۸۰	۴۸۱۲ ۴۰/۸۰	۴۸۱۲ ۴۰/۸۰	۴۸۱۲ ۴۰/۸۰	۲۴۰۶ ۲۰/۸۰	۲۴۰۶ ۲۰/۸۰	۲۴۰۶ ۲۰/۸۰	۲۴۰۶ ۲۰/۸۰	

مرحوم کا کل ترکہ ۸۰؍ سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنے روپیہ ملیں گے جو اس کے نام کے نیچے درج ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۷۰۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/۵/۱۴۲۱ھ

تعلیق بالوصیۃ، نیز بیوی اور بھانجے کے لیے وصیت

سوال [۱۱۲۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ محمد صدیق مرحوم نے یہ وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد میری ساری جائیداد کی مالک میری بیوی ہوگی، بیوی کی موت کے بعد میرا بھانجا اقبال حسین مالک ہوگا، تو کیا اقبال حسین کے حق میں وصیت درست ہوگی؟ جو بیوی کی موت پر معلق رکھی ہے، یا اس تعلیق کی وجہ سے اقبال حسین کے حق میں وصیت باطل ہے؟

المستفتی: افضل حسین، تحصیل اسکول مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: وصیت معلق کرنے سے باطل نہیں ہوتی، بلکہ معلق کرنا درست ہے، شرط کے وجود کے بعد وصیت نافذ ہوجاتی ہے، لہٰذا بیوی کی موت کے بعد اقبال حسین کو محمد صدیق مرحوم کے کل ترکہ کا تہائی حصہ مل جائے گا اور بقیہ ورثاء کا حق ہے، وہ بقدر حصص شرعیہ ورثاء کو مل جائے گا، نیز بیوی کے حق میں ورثاء کی موجودگی میں وصیت نافذ نہیں ہوتی، بلکہ مابقیہ کا چوتھائی حصہ اور اقبال حسین کو ملنے والا کل ترکہ کا تہائی حصہ اپنی نگرانی میں قبضہ میں رکھنے کا حق ہے، موت کے بعد اقبال حسین کو تہائی حصہ وصیت کی بناء پر مل جائے گا، اور اگر بیوی نے بھی ورثاء کی عدم موجودگی میں اپنا حصہ اقبال حسین کو دینے پر رضامندی کا اظہار کیا ہے تو بیوی کا چوتھائی حصہ بھی اقبال حسین کو حاصل ہوگا۔

والوصية تارة تكون منجزة و تارة معلقة بشرط فيجب أن يعلم بأن تعلق الوصية بالشرط جائز. (البحر الرائق، کتاب الوصایا، زکریا ۹/ ۲۱٤، کوئٹہ ۸/ ٤٠٤)

ولأن الوصية يتسامح فيها ولهذا صح تعليقها على الخطر والغرر وصحت للحمل وبه، وبما لايقدر على تسليمه وبالمعدوم والمجهول فجاز أن يتسامح فيها بقبول الخط. (إعلاء السنن کراچی ۱۸/ ۳۱۹، دار الكتب العلمية بيروت ۱۸/ ۳٥٤، أوجز المسالك، كتاب الأقضية، الأمر بالوصية قديم ٥/ ٣٦٣/ ٤/ ٢٩٤، جديد دار القلم بيروت ٥/ ٣٦٣، وهكذا المغني لابن قدامه ٦/ ٩٠، رقم: ٤٦٦٣)

وقال أبو حنيفة رحمه الله إذا قال أوصيت أن يخدم عبدى فلانا سنة ثم هو لفلان فقال فلان لا أقبل الوصية قال يخدم الورثة سنة ثم الموصى له

ولاتبطل وصيته للثاني بإباء الأول الخدمة...... أى الموصىٰ له بعد تمام السنة. (البحر الرائق زكريا ۹/ ۲۱۵، كوئٹه ۸/ ۸۰۵)

لأن الشرط الفاسد في معنى الربوا وهو يعمل في المعاوضات دون التبرعات. (هدايه، كتاب الهبة اشرفى ديوبند ۳/ ۲۹۲، رشيديه ۳/ ۲۷٦، الدر المختار كراچى باب المتفرقات بعد باب السلم ٥/ ٢٤٩، زكريا ٧/ ٥٠٩، امداد الفتاوىٰ ٤/ ٢٨٣)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۵۸۲/۲۵)

بہو، لڑکے کو ہبہ اور وصیت کرنا

سوال [۱۱۲۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ساس اپنی بہو یا اپنے لڑکے یا اپنی مطلقہ بہو کو شوہر کی وراثت یا اپنے مال میں ہبہ یا وصیت کرسکتی ہے؟

(۲) وصیت کا حق کہاں تک ہے؟

(۳) کیا وراثت کی تقسیم وصیت کی تعمیل کے بعد ہوگی؟

(۴) وصیت کی رو سے ایک شخص کو اختیار ہے کہ جس طرح چاہے اپنے مال کو اپنے ورثاء میں تقسیم کردے یا ان کو محروم کردے؟

(۵) وصیت کے لیے ضروری شرائط کیا ہیں؟ مدلل بیان کریں۔

(۶) وصیت کس قسم کی ہو، کسی خاص حصہ یا کل کے متعلق ہونی چاہیے؟

(۷) ہبہ وصیت کے لفظی معانی وتفریق وشرعی مسائل مدلل بیان فرمائیں؟

المستفتی: حکیم محمد حسیب قادری دواخانہ، پتھنہ سبور، بھاگلپور بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) لڑکے کو بحالت صحت ہبہ کرکے قبضہ دیدینا

تو جائز ہے لیکن لڑکے کے وارث ہونے کی وجہ سے اس کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے۔

عن أبی أمامة الباهلی –رضی الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ كل ذی حق حقه فلا وصية لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصية لوارث، النسخة الهندية ۲/ ۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، الوصايا، باب ماجاء فی الوصية للوارث، النسخة الهندية ۲/ ۳۹٦، دار السلام رقم: ۲۸۷۰)

لاتجوز الوصية للوارث. (الجوهرة النيرة، كتاب الوصايا، ملتانی ۲/ ۳۸۹، دار الكتاب ديوبند ۲/ ۳٦۹، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ٤١٨، هدايه رشيديه ٤/ ٦٤١، اشرفی ديوبند ٤/ ٦٥٧، شامی كراچی ٦/ ٦٥٥، زكريا ١٠/ ٣٤٦)

ولاتجوز لوارثه. (هدايه، كتاب الوصايا، رشيديه ٤/ ٦٤١، اشرفی ديوبند ٤/ ٦٥٧، شامی كراچی ٦/ ٦٥٥، زكريا ١٠/ ٣٤٦، الجوهرة النيرة، امداديه ملتان ٢/ ٣٨٩، دار الكتاب ديوبند ٢/ ٣٦٩، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ٤١٨)

ہاں البتہ لڑکے کی بیوی چاہے مطلقہ ہو یا نکاح میں موجود ہو اس کے حق میں وصیت درست ہے، اس لیے کہ وہ ورثاء میں شامل نہیں ہے، چاہے اپنے ذاتی مال میں وصیت کرے یا اپنے شوہر سے وراثت میں ملے ہوئے مال میں دونوں میں جائز ہے۔

(۲) وصیت صرف ایک تہائی مال میں جائز ہے۔

عن عامر بن سعد، عن أبيه رضی الله عنه قال: مرضت، فعادنی النبی ﷺ –إلی– قلت: أريد أن أوصی بالنصف؟ قال: النصف كثير، قلت: فالثلث؟ قال: الثلث كثير أو كبير، قال: فأوصی الناس بالثلث، فجاز ذٰلک لهم. (صحيح البخاری، باب الوصية بالثلث، النسخة الهندية ١/ ٣٨٣، رقم: ٢٦٦٣، ف: ٢٧٤٤)

ولاتجوز بما زاد علی الثلث. (هدايه، اشرفی ديوبند ٤/ ٦٥٤، رشيديه ٤/ ٦٤٨)

(۳) جی ہاں، وراثت کی تقسیم تنفیذ وصیت کے بعد ہی ہوتی ہے۔

ثم تنفذ وصاياه من ثلث ما بقی من الدين. (سراجی ص: ٤)

(۴) جی نہیں، کیونکہ وصیت صرف تہائی میں نافذ ہوتی ہے اس لیے وصیت کے ذریعہ سے ورثاء کو محروم کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ (هدايه اشرفی ديوبند ٤/ ٦٥٤، رشيديه ٤/ ٦٤٨)

(۵) وصیت کے لیے کیا کیا شرائط ہیں؟ اور کتنی شرطیں ہیں، کتاب الوصایا کا مطالعہ کیجیے، فتویٰ کے جواب میں کتاب نہیں لکھی جاتی، بلکہ جتنا آپ معلوم کریں گے، اتنے کا جواب دیا جاتا ہے۔

(۶) سوال کو واضح کیجیے، معمہ حل کرنے کا موقع نہیں۔

(۷) ہبہ اور وصیت کے لفظی معانی وتفریق شرعی سب ہدایہ کتاب الہبۃ اور کتاب الوصایا میں دس دس بیس بیس صفحات میں موجود ہیں، وہاں مطالعہ فرمایئے، یہاں آپ جو جزئیہ معلوم کریں گے صرف اسی کا جواب دیا جاتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۶ / ذیقعدہ ۱۴۲۰ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۳۶۱)	۱۴۲۰/۱۱/۶ھ

پوتوں کے حق میں کی گئی وصیت کا حکم

سوال [۱۱۲۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے والد صابر حسین نے اپنی زندگی میں ایک وصیت نامہ تحریر کیا ہے جس میں اپنے ایک بیٹے اعجاز حسین اور دس پوتے: محمد شعیب، محمد سفیان، محمد سہیل، محمد سالم (پسران شمشاد حسین مرحوم)، محمد سلمان، محمد فیضان، محمد جنید (پسران قمر الزماں مرحوم)، محمد نوشاد، محمد حماد (پسران دلشاد حسین)، محمد زبیر (پسر بدر الزماں) کے نام وصیت کی اور یہ لکھا کہ میرے مرنے کے بعد میری کل جائیداد کے میرے پسر ومیرے پوتے مذکوران بحصۂ مساوی حقدار ہوں گے۔

واضح رہے کہ صابر حسین کے انتقال کے وقت ان کے شرعی ورثاء میں تین لڑکے: اعجاز حسین، دلشاد حسین، بدر الزماں ایک لڑکی افروز جہاں حیات ہیں۔

دریافت یہ کرنا ہے کہ وصیت کل مال میں نافذ ہوگی یا ثلث مال میں، اور شرعی ورثاء کو

کتنے کتنے حصے ملیں گے، شرعی تقسیم فرمادیں؟

المستفتی: اعجاز حسین پیرزادہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دوسرے ورثاء کی اجازت کے بغیر کسی ایک وارث کے حق میں وصیت نافذ نہیں ہوتی، لہٰذا صابر حسین کا اپنے بیٹے اعجاز حسین کے لیے وصیت کرنا اس وقت درست ہوسکتا ہے جبکہ دوسرے بالغ ورثاء اس وصیت کی اجازت دیدیں، البتہ پوتے چونکہ اولاد کی موجودگی میں شرعی وارث نہیں ہوتے تو ان کے حق میں مورث کے کل مال میں سے صرف ایک تہائی حصہ میں وصیت نافذ ہوگی، اس سے زائد میں نافذ نہ ہوگی، اور یہ ایک تہائی حصہ پوتوں کے درمیان برابر برابر تقسیم ہوگا، اور مابقیہ دوتہائی جائیداد صابر حسین کے زندہ ورثا کے درمیان مندرجہ ذیل نقشہ کے اعتبار سے تقسیم ہوگی۔

میـــت ۷

لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی
اعجاز حسین	دلشاد حسین	بدرالزماں	افروز جہاں
۲	۲	۲	۱

ایک تہائی پوتوں کو دینے کے بعد مابقیہ دوتہائی جائیداد سات سہام میں تقسیم ہوکر ہر ایک وارث کے اتنے سہام ہوں گے، جو اس کے نام کے نیچے درج ہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۴/ ۴۸۷)

عن أبی أمامة الباهلی -رضی الله عنه- قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ كل ذی حق حقه فلا وصية لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصية لوارث، النسخة الهندية ۲/ ۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، الوصايا، باب ماجاء فی الوصية للوارث، النسخة الهندية ۲/ ۳۹۶، دار السلام رقم: ۲۸۷۰)

وتجوز بالثلث للأجنبی عند عدم المانع وإن لم يجز الوارث ذٰلک لا الزيادة عليه. (شامی، كتاب الوصايا كراچی ۶/ ۶۵۰، زكريا ۱۰/ ۳۳۹)

ولاتصح الوصية بما زاد على الثلث. (مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بیروت ٤/٤١٨)

من شرائطها: أن يكون الموصى به مقدار الثلث لا زائدا عليه وهو ليس بسديد على إطلاقه فإن الموصى إذا ترك ورثه فإنما لا تصح وصيته بما زاد على الثلث. (البحر الرائق کوئٹہ ٨/٤٠٣، زکریا ٩/٢١٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ جمادی الثانیہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۷۲۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۶/۱۵ھ

پوتوں کے حق میں دادا کی وصیت

سوال [۱۱۲۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے والدین نے ۱۹۸۲/۱۰/۱ء کو اپنی تمام جائیداد اور املاک کو بمطابق مرضیٔ خود اپنے تمام وارثین کو تقسیم کر دیا، لیکن آج تک اتنے سال گذرنے کے بعد بھی وصیت پر عمل نہیں ہوا، اور یہی وارثین قانون وضابطہ کے مطابق ان املاک کے مالک بنے ہیں، حالت یہ ہے کہ وارثین کے درمیان تلواریں کھینچی ہوئی ہیں، یہ وصیت لکھنے کے بعد والدین نے اپنے تمام وارثین سے مع چند گواہان کے دستخط لے لیے تھے، چند سالوں کے بعد یعنی ۱۹/۴/ ۱۹۹۰ء کو پھر ایک وارث کے خط کے جواب میں والد صاحب نے لکھا کہ وہ خود مختار ہیں، لہٰذا وہ پھر ایک جائیداد کو جو دوسرے وارث کے حصے میں آئی تھی، بصورت دیگر وارث تبدیل کر رہے ہیں، اس پر صرف والد صاحب اور والدہ صاحبہ کے دستخط ہیں، دیگر وارثین یا گواہان کے نہیں ہیں، والدین کی وفات کو کئی سال گذر جانے کے باوجود حالات جوں کے توں ہیں، اب اگر بٹوارہ کیا جائے تو کیا یہ وصیت قابل عمل ہے؟ اور اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ یہ وصیت پوتوں کے حق میں ہے۔

مسئلہ: ایک شخص عبدالوہاب کے چار بیٹے اور ایک بیٹی تھی، اس کی زندگی میں ہی دو بیٹے وفات پاگئے، زندہ بیٹے عبدالتواب، عبدالمعبود لیکن بیٹی سائرہ کا انتقال اس شخص کی وفات کے بعد ہوا ایسی صورت میں بعد وفات اس شخص کے تمام املاک اور اثاثہ کی تقسیم کس طرح ہوگی، کیا پوتے پوتیاں بھی حقدار ہوتی ہیں، ان تینوں حالات میں تقسیم کی کیا شکل ہوگی؟

مسئلہ: حدود شرعیہ میں اس مسئلہ کا کیا حل ہے کہ بکر کے چار بیٹے ہیں اور ایک بیٹی اور بکر کی جائیداد ایک بیٹے کے ساتھ شراکت میں تھی، اور بکر نے اپنی زندگی میں ہی اپنے اس بیٹے کی وفات کے بعد پورے حصہ کی قیمت ادا کر کے پوری جائیداد کے تنہا مالک بن گئے، بعد میں مزید تعمیر ومرمت کرا کر اسی جائیداد کو اس مرحوم بیٹے کے ورثاء کو کرایہ پر دیدی، اور تاحیات وہ ان سے کرایہ وصول کرتے رہے، بعد وفات بکر کے آج تک انہوں نے کوئی کرایہ ادا نہیں کیا، کیا ان کو کرایہ ادا کرنا واجب ہے یا نہیں؟ اور اس کرایہ کو وصول کرنے کا حق کس کو ہے؟

بکر کے ورثاء ضرورت مند ہیں، کیا وہ جائیداد کو بیچ سکتے ہیں، ورثاء میں تقسیم کا طریقۂ کار کیا ہوگا؟ جبکہ ورثاء میں چار بیٹوں میں سے دو کی موت ان کی زندگی میں ہو چکی تھی، اور بیٹی سائرہ کی موت خود ان کی موت کے بعد ہوئی تھی، ان کی بیوی بتول بیگم کی بھی موت ان کی موت کے بعد ہوئی تھی۔

والد کا نام: حاجی عبدالوہاب صاحب، والدہ کا نام: محترمہ بتول بیگم، بڑے بیٹے کا نام: عبدالودود صاحب، منجھلے بیٹے کا نام: عبدالقدوس (یہ دونوں والد صاحب سے پہلے انتقال کر گئے) تیسرے بیٹے کا نام: عبدالتواب، چھوٹے بیٹے عبدالمعبود (الحمد للہ حیات ہیں) دختر کا نام: سائرہ بی، (والدین کی وفات کے بعد انتقال کر گئیں)۔

والد صاحب کی وفات کی تاریخ ۲۸؍فروری ۱۹۹۳ء، والدہ کی وفات: ۶؍دسمبر ۱۹۹۳ء، منجھلے بھائی کی وفات: ۳۰؍جون ۱۹۷۱ء، بڑے بھائی کی وفات ۱۸؍فروری ۱۹۷۳ء، ہمشیرہ کی وفات: ۹؍جون ۱۹۹۶ء، تاریخ وصیت یکم اکتوبر ۱۹۸۲ء، تاریخ ترمیم وصیت: ۱۹؍اپریل ۱۹۹۰ء۔

المستفتی: محمد اقبال شمسی طویلہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال میں تین چیزیں معلوم کی گئی ہیں:

(۱) وصیت کے متعلق (۲) وارثین کے درمیان جائیداد کس طرح تقسیم ہو (۳) بیٹے کی وفات کے بعد بیٹے کی شراکت کی پوری قیمت ادا کر کے پوری جائیداد کے تنہا مالک بن گئے، اور مرحوم بیٹے کے ورثاء کو کرایہ پر دیدیا، اور تاحیات اس سے کرایہ وصول کرتے رہے، ان تینوں سوالوں میں سے کوئی بھی سوال بالکل واضح اور صاف نہیں ہے، اس لیے سائل سے بار بار ٹیلیفون میں زبانی معلوم کیا گیا ہے۔

(۱) پہلے سوال کے بارے میں جس وصیت کا ذکر ہے اس میں سوال نامہ میں وضاحت نہیں ہے، کہ بیٹوں کے لیے وصیت کی تھی، یا مرحوم بیٹا کی اولاد جو کہ پوتے ہیں، ان کے حق میں وصیت کی تھی، لیکن ٹیلیفون میں زبانی معلوم ہوا کہ وصیت پوتوں کے حق میں کی ہے، تو شرعی حکم یہ ہے کہ بیٹے باپ کے وارث ہونے کی وجہ سے ان کے حق میں وصیت نافذ نہیں ہوتی ہے وہ شرعاً کالعدم سمجھی جاتی ہے، لیکن بیٹوں کی موجودگی میں چونکہ پوتے وارث نہیں ہوتے ہیں اس لیے شرعاً پوتوں کے حق میں وصیت معتبر ہو جاتی ہے، لہٰذا سوالنامہ میں جس وصیت کا ذکر ہے وہ شرعی طور پر پوتوں کے حق میں معتبر بھی ہے اور قابل عمل بھی ہے۔

ثم تصح الوصية للأجنبي بالثلث من غير إجازة الوارث. (تبيين الحقائق، كتاب الوصايا، زكريا ۷/ ۳۷۵- ۳۷٦، امداديه ملتان ٦/ ۱۸۲، البحر الرائق كوئٹه ۸/ ٤٠٤، زكريا ۹/ ۲۱۳)

سوال (۲) کا حاصل یہ ہے کہ شخص مذکور کے چار بیٹوں میں باپ کی زندگی میں دو کی وفات ہوگئی اور ایک بیٹی اور دو بیٹے زندہ تھے، لہٰذا وصیت نافذ ہو جانے کے بعد وصیت میں جو پوتوں کے نام وصیت کی گئی ہے وہ پوتوں کو دینے کے بعد بقیہ جائیداد چالیس سہام میں تقسیم ہو کر بیوی کو پانچ اور دونوں لڑکوں کو چودہ، چودہ اور لڑکی کو سات سہام ملیں گے، جو درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگی، لیکن مسئلہ چونکہ مناسخہ ہے اس لیے نتیجہ میں زندہ ورثاء کو وہ ملے گا

جونقشہ کے نیچے الاحیاء کے ذیل میں لکھا گیا ہے:

عبد الوہاب میت

بیوی	بیٹے	بیٹے	بیٹی
بتول	عبدالتواب	عبدالمعبود	سائرہ
۱/۵	۱۴/۵۶	۱۴/۵۶	۷

تماثل

بتول میت

۵		۵
لڑکا	لڑکا	لڑکی
عبدالتواب	عبدالمعبود	سائرہ
۲/۸	۲/۸	۱

تداخل ۱/۸

سائرہ میت

شوہر	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی
۱/۸	۶	۳	۳	۳ ۳	۳	۳	۳

المبلغ ۱۶۰

الأحیاء

عبد التواب	عبد المعبود	شوہر سائرہ	ابن سائرہ	بنت سائرہ	بنت سائرہ	بنت سائرہ	بنت سائرہ	بنت سائرہ	بنت سائرہ
۶۴	۶۴	۸	۶	۳	۳	۳	۳	۳	۳

عبدالوہاب کی وصیت کے بعد بقیہ ترکہ ۱۶۰ر سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا ملے گا جو اس کے نیچے درج ہے۔

(۳) اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر کسی جائیداد کے متعلق پوتوں کے حق میں وصیت

کی تھی کہ جیتے جی خود مالک رہے گا اور پوتے دادا کی زندگی میں کرایہ ادا کرتے رہیں گے، اور خود کی وفات کے بعد پوتے اس جائیداد کے مالک ہو جائیں گے، تو ایسی صورت میں مرحوم عبد الوہاب کے انتقال کے بعد پوتے وصیت کی وجہ سے اس جائیداد کے مالک ہو جائیں گے، لہٰذا پوتوں پر اب اس کا کرایہ ادا کرنا لازم نہ ہوگا؟ لیکن اگر وصیت اس جائیداد کے علاوہ کسی اور جائیداد کے بارے میں کر رکھی ہے، جو پوتوں کی کرایہ داری پر نہیں تھی، تو وصیت شدہ جائیداد کے پوتے مالک ہو جائیں گے، اور اس جائیداد کا کرایہ ادا کرنا ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍ربیع الاول ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۶۵۲۲/۳۵)

نانا کی وصیت نواسے کے نام ہوئی یا نہیں؟

سوال [۱۱۲۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے نانا جان حیات تھے ان کو مجھ سے بہت زیادہ محبت تھی، انہوں نے ہی میری کفالت (پرورش) کی میرے ساتھ بہت ہی مشفقانہ برتاؤ رکھتے تھے، محبت ہونے کی وجہ سے مرحوم نے آخری وقت اپنے تینوں لڑکوں سے (یعنی ماموؤں سے) ایک دوکان اور نو بیگہ زمین کے بارے میں وصیت کی، وصیت کردہ جائیداد میں ان کے تینوں لڑکے دوکان نہیں دیتے، اس سلسلے میں شرعاً کیا حکم ہے، آیا ان کی وصیت کے مطابق وہ دوکان میری ملکیت ہوئی یا نہیں؟ اس دوکان کو شرعاً لینے کا میں حقدار رہوں یا نہیں؟ دلائل کے ساتھ شرعاً وضاحت فرمائیں۔

محترم نانا مرحوم صاحب کو جاں بحق ہوئے تقریباً گیارہ سال ہو چکے ہیں، اپنی زندگی میں انہوں نے کافی زمین چھوڑی ان کے تینوں لڑکوں کو گو مجھ سے محبت ہے، اور مجھ پر ان کو مکمل اعتماد ہے، ان کی چھوڑی ہوئی جائیداد میں سے ہم چاروں نے زمین ٹھیکہ لے کر اور بٹائی پر دے کر ترقی کی، ہم چاروں نے اپنی محنت سے ایک ٹریکٹر خریدا، اور بیس بیگہ زمین خریدی اور ایک چکی لگائی، اب میرے تینوں ماموں اپنا اپنا حصہ لے کر علاحدہ ہوئے ہیں، جو

ہم چاروں نے مل کرمحنت سے چکی لگائی ،ٹریکٹرخریدا، اوربیس بیگہ زمین خریدی،اس میں سے شرعاً میرا کیاحق ہوتا ہے، آیا جتنا حصہ ان تینوں ماموں کا ہوتا ہے، اتنا میرا بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ یا کچھ کم ہوتا ہے،شرعاً وضاحت فرمائیں کہ شریعت کیاحکم نافذ کرتی ہے۔

نوٹ: میرے تینوں ماموں اپنا اپنا حصہ الگ تقسیم کررہے ہیں، مجھے اس محنت میں سے اوراس مذکورہ جائیداد میں سے کچھ نہیں دیتے، اب میری آرزوئیں ختم ہورہی ہیں کہ تیس سال میں نے اتنی تکلیف اور مشقت اٹھائی، کیا اس مشقت کا کوئی بھی حق نہ ہوگا، شریعت مطہرہ نے ہماری اس مشقت کا جوعلاج کیا ہے؟ آپ دلائل کے ساتھ وضاحت فرمائیں۔

المستفتی: مظاہرالحق قاسمی نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مذکورہ دوکان ونو بیگہ زمین کی مالیت آپ کے نانا مرحوم کی کل جائیداد وکل ترکہ کا تہائی یا اس سے کم ہے،تو مذکورہ وصیت شرعاً صحیح ودرست ہے،اورمذکورہ اشیاء کے حقدار آپ ہوں گے۔

عن أبی أمامة الباهلی –رضی الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصیة لوارث، النسخة الهندیة ۲/۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، الوصایا، باب ماجاء فی الوصیة للوارث، النسخة الهندیة ۲/۳۹۶، دار السلام رقم: ۲۸۷۰)

لاتجوز بما زاد علی الثلث إلا أن یجیزها الورثة. (الجوهرة النیرة، کتاب الوصایا، امدادیه ملتان ۲/۳۸۹، دار الکتب العلمیة دیوبند ۲/۳۷۰، مجمع الأنهر، دارالکتب العلمیة بیروت ٤/٤١٩، تاتارخانیة زکریا ۱۹/۳۸۱ رقم: ۳۱۸۵۹)

(۲) آپ کا سرمایہ جتنا لگا اس کے بقدر ٹریکٹر، بیس بیگہ زمین اور دیگر مشترکہ کمائی کے آپ شرعاً حقدار ہوں گے۔

کما استفاده من الشامی : في زوج امرأة وابنها اجتمعا فی دار واحدة و

أخذ كل منهما يكتسب على حدة ويجمعان كسبهما ولايعلم التفاوت ولاالتساوي ولا التمييز فأجاب بأنه بينهما سوية وكذا لو اجتمع إخوة يعملون في تركة أبيهم ونماالمال فهو بينهم سوية و لو اختلفوا في العمل والرائ. (الشامي، فصل في الشركة الفاسدة، كراچی ٣٢٥/٤، زكريا ٥٠٢/٦) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ر شوال المکرم ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۰۰۶/۲۶)

نواسے کے نام وصیت

سوال [۱۱۲۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید اور ساجد دونوں دوست ہیں، رشتہ داری یا کنبہ یا برادری کا کوئی تعلق نہیں، زید نے ساجد کو ایک چیز خرید کر دیدی اور کہہ دیا کہ یہ میرے نواسے کو دیدیجیو تو ساجد یہ خریدی ہوئی چیز نواسوں کو دے گا یا نہیں؟

(۲) چاند خاں اور مقبول احمد دونوں دوست تھے، رشتہ داری، برادری کا کوئی تعلق نہ تھا، چاند خاں کی بھابھی نے اپنے نام کے مکان کا حصہ چاند خاں کے دوست مقبول احمد کے نام کر دیا، یعنی قطعی بیع کر دیا، اس میں چاند خاں کا کوئی حوالہ نہیں، اب مقبول احمد کے وارثان بیوہ لڑکے لڑکی سب یہ کہتے ہیں کہ ہم سے نواسوں کو دینے کے لیے کہہ دیا تھا کہ یہ میرے نواسوں کو دیدیجیو، اس وقت نواسے کم سن چھوٹے چھوٹے بچے تھے، اب نواسوں کو دینا چاہیے یا نہیں؟ اور بیوہ مقبول احمد کی یہ بھی کہتی ہے کہ اسی کو انہوں نے اپنے لڑکے سے بچا کر ہمارے شوہر کے نام کر دیا تھا۔

(۳) یعنی قطعی بیع مقبول احمد کے نام ہے، اس میں چاند خاں کے کسی بھی وارث کا کوئی حوالہ نہیں ہے، اور ہم سے مکان سلطان احمد چاند خاں کے لڑکے خالی کرانا چاہتے ہیں، کیا ان کو ہم سے مکان خالی کرانے کا حق حاصل ہوتا ہے؟

(۴) کیا شریعت میں زبانی ہبہ جائز ہے یا نہیں؟ اور ہبہ کے کیا معنی ہیں؟

(۵) ایک شخص نے مکان کا نصف حصہ اپنے نواسے کو ہبہ کردیا، اور مالک بھی بنا دیا اور قبضہ بھی دیدیا، وہ آج بھی قابض ہے، کیا یہ جائز نہیں؟ جب یہ ہبہ کیا تھا اس وقت مکان کے اندر ایک بوسیدہ دیوار تھی، جب بڑے نواسے کی شادی ہوئی تو اسی شخص کے لڑکے اور لڑکی کی بہنوں نے نواسے کے پیسے سے رضامندی اور خوشی سے نئی دیوار تعمیر کرادی تھی، اور جب لڑکی والوں کے گھر لڑکی والوں نے یہ سوال رکھا کہ لڑکی کے نام آدھا مکان لکھو، اس شخص نے یعنی لڑکے نے وہاں کے لوگوں میں یہ کہا کہ لکھنے کے لیے ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں، آدھا گھر ان کا ہے اور آدھا گھر ہمارا ہے، وہ اپنے آدھے میں اوپر بنائے اور نیچے بنائے، نکالنے کا کوئی نہیں ہے، گویا یہ بھی ہبہ پر راضی تھے۔

المستفتی: نسیم الدین مسجد لوہاران امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) صورت مذکورہ میں ساجد، زید کا وصی ہے اور وصی پر شرعی طور پر شئ موصی بہ کا موصیٰ لہ کو ادا کردینا واجب ہوتا ہے، لہٰذا ساجد پر واجب ہے کہ ذکر کردہ اشیاء زید کے نواسوں کو دیدے، ورنہ سخت گنہگار ہوگا۔

ومن أوصیٰ إلی رجل فقبل الوصی فی وجه الموصی وردها فی غیر وجهه فلیس برد، لأن المیت مضی لسبیله معتمدا علیه. (هدایه، کتاب الوصایا، باب الوصی وما یملکه، اشرفی دیوبند ٤/٦٩١، رشیدیه ٤/٦٧٥)

(۲) اگر واقعہ صحیح ہے تو چاندخاں کی بھابھی نے مقبول احمد کے نام جو کردیا ہے وہ شرعاً بیع التلجئۃ ہے۔

بیع التلجئة ویأتی متنافی الإقرار وهو أن یظهر عقدا وهما لایریدانه یلجأ إلیه لخوف عدو وهو لیس ببیع فی الحقیقة بل کالهزل. (الدر المختار، مطلب: فی بیع التلجیة زکریا ٧/٥٤٢، کراچی ٥/٢٧٣)

اور مذکورہ مکان میں سے نواسوں کے لیے نافذ وصیت کی وجہ سے ایک ثلث ملے گا،

اور بقیہ دوثلث بھابھی کے ورثاء شرعی کے درمیان تقسیم ہوگا اس لیے کہ شرعاً وارث کی موجودگی میں ایک تہائی سے زائد پر وصیت نافذ نہیں ہوتی۔

عن سعد بن أبي وقاصؓ حديثا طويلا، وطرفه: قال: النصف كثير، قلت: فالثلث، قال: الثلث كثير أو كبير، قال: فأوصى الناس بالثلث، فجاز ذٰلک لهم. (صحيح البخارى، الوصايا، باب الوصية بالثلث ١/٣٨٣، رقم: ٢٦٦٣، ف: ٢٧٤٤)

لاتجوز بما زاد على الثلث الخ. (الجوهرة النيرة، كتاب الوصايا، امداديه ملتان ٢/٣٨٩، دار الكتاب ديوبند ٢/ ٢٧٠، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/٤١٩، تاتارخانية زكريا ١٩/٣٨١، رقم: ٣١٨٥٩)

(٣) سوال نمبر۲؍ سے واضح ہوتا ہے کہ اس بیع کا مقصد مقبول احمد کو مالک بنانا نہیں ہے، بلکہ اس طریقے سے نواسوں کو پہنچ جائے، اور نواسوں کو بطور وصیت ایک تہائی مل سکتا ہے، اور دو تہائی شرعی ورثاء کو ملے گا، اس لیے اگر چاند خاں کے لڑکے شرعی وارث ہیں تو دو تہائی سے خالی کرا سکتے ہیں۔

لاتجوز بما زاد على الثلث إلا أن يجيزها الورثة. (الجوهرة النيرة، كتاب الوصايا، امداديه ملتان ٢/٣٨٩، دار الكتاب ديوبند ٢/ ٣٧٠، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/٤١٩، تاتارخانية زكريا ١٩/٣٨١، رقم: ٣١٨٥٩)

(۴) جی ہاں زبانی ہبہ جائز ہے، لیکن جو صورت سوالنامہ میں درج ہے وہ ہبہ کی نہیں ہے بلکہ بیع التلجئۃ کی صورت ہے۔

(۵) جب زندگی میں نصف مکان ہبہ کر کے مالک بنادیا ہے اور قبضہ بھی دیدیا ہے تو شرعاً یہ صورت ہبہ کی ہے، اور ہبہ مکمل ہو چکا ہے، اس میں وارثین کا کوئی حق باقی نہیں رہا۔

الهبة تصح بالإيجاب والقبول ...... وتتم بالقبض. (الجوهرة النيرة، كتاب الهبة امداديه ملتان ٢/٩، دار الكتاب ديوبند ٢/ ١٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/۲۳۹۴)

مرحوم اولاد کے لیے وصیت کرنے کا حکم

سوال [١١٢٧٢]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ فیاض حسین ولد اختیار حسین کے آٹھ اولادیں تھیں، ۴ر لڑکے اور ۴ر لڑکیاں، ایک لڑکے کا انتقال ۱۵ر سال کی عمر میں ہی ہوگیا تھا، اور دوسرے لڑکے کا انتقال ۳۲ر سال کی عمر میں ہوا، اس نے اپنے پیچھے ایک بیوہ اور ۲ر لڑکیاں چھوڑیں۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ میرے انتقال کے بعد میری کل جائیداد میرے وارثین کے درمیان کس طرح تقسیم ہوگی، اور مرحوم لڑکے کی دولڑکیوں کے نام بھی میں کچھ وصیت کرنا چاہتا ہوں، تو کیا ان کو بھی شرعی اعتبار سے میرے مال میں سے حصہ ملے گا، شریعت کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: فیاض حسین ٹھیکری گودھی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر آپ کا مقصد زندگی میں تقسیم کرنے سے یہ ہے کہ ہر ایک وارث کو زندگی میں اس کے متعینہ مال کو دے کر اس کو مالک وقابض بنادیا جائے تو ایسی صورت میں لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر دینا مستحب اور اولیٰ ہے، اور اگر مقصود یہ ہے کہ میری وفات کے بعد وارثین کے درمیان کوئی نزاع اور جھگڑا نہ ہو اور ہر وارث کو اس کا پورا حق صحیح طور پر مل جائے تو کل مال آٹھ حصوں میں تقسیم کرکے لڑکوں کے نام ۲/۲ر حصے اور لڑکیوں کے نام ایک ایک حصہ کردیا جائے، اور یہ وصیت نامہ لکھ دیا جائے کہ میری وفات کے بعد ہر وارث حسب تحریر وصیت اپنا اپنا حق وصول کرلے۔

قال العبد الضعیف عفا الله عنه: قد ثبت بما ذكرنا أن مذهب الجمهور في التسوية بين الذكر والأنثیٰ في حالة الحياة أقویٰ و أرجح من حيث الدليل ولكن ربما يخطر بالبال أن هذا فيما قصد فيه الأب العطية

والصلة، وأما إذا أراد الرجل أن يقسم أملاكه فيما بين أولاده في حياته لئلا يقع بينهم نزاع بعد موته فإنه وإن كان هبة في الاصطلاح الفقهي ولكنه في الحقيقة والمقصود استعجال بما يكون بعد الموت وحينئذ ينبغي أن يكون سبيله سبيل الميراث. (تكمله فتح الملهم كتاب الهبات، مذهب الجمهور التسوية بين الذكر والأنثىٰ اشرفيه ديو بند ۲/ ۷۵)

اور مرحوم لڑکے کی جن دولڑکیوں کا سوالنامہ میں ذکر ہے وہ شرعی اعتبار سے اس وصیت کے دائرے میں داخل نہیں ہیں، البتہ مرحوم بیٹے کی دونوں بیٹیوں کو الگ سے مخصوص جائیداد ہبہ کر کے مالک بنادیں، یا کل جائیداد میں سے ایک ثلث سے کم جائیدا دان کے لیے وصیت میں لکھ دیں، تو ایسی صورت میں ان کو ہبہ شدہ یا وصیت والی جائیداد مل جائے گی، اور اگر ان کے نام ہبہ یا وصیت نہیں کی تو ان کو آپ کی جائیداد میں سے کچھ نہ ملے گا۔

ثم تقدم وصيته من ثلث ما بقي بعد تجهيزه و ديونه . (تنوير الأبصار مع الدر، كتاب الفرائض زكريا ۱۰/ ۴۹۵- ۴۹۶، کراچی ۶/ ۷۶۰، سراجی /۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۳۰۱۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲/ ۶/ ۱۴۳۶ھ

پوتی اور نواسی کے حق میں وصیت کا حکم

سوال [۱۱۲۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: نفیسہ خاتون کا انتقال ہوا، ان کا ایک مکان تقریباً دوسو گز کا ہے اس کی قیمت آٹھ لاکھ روپیہ سے کم نہیں، ان کی اولادوں میں تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں موجود ہیں، انہوں نے اپنی زندگی میں اپنی ملکیت کے مکان کے بارے میں مذکورہ وارثین کے واسطے ایک وصیت نامہ لکھا ہے کہ جیتے جی میں مالک، میرے مرنے کے بعد میرے لڑکے لڑکیوں کے درمیان ہر ایک کو شرعی حصہ کے مطابق ملے گا، اور ملکیت کے مکان کے علاوہ کچھ زیورات اور کچھ کپڑے ان کے

پاس موجود تھے، ان زیورات اور کپڑوں کے بارے میں اپنی ایک پوتی اور ایک نواسی کے بارے میں وصیت کی ہے کہ میرے مرنے کے بعدان زیورات میں سے فلاں فلاں زیور پوتی کو دینا ہے، اورفلاں فلاں کپڑ انواسی کو دینا ہے اوران کے ایک جوڑی بندے مرحومہ کی بیٹی نے اپنی ماں کو بنا کر دیئے تھے تو ماں نے مرنے سے پہلے اپنی بیٹی کو بندے یہ کہہ کر واپس کر دئے کہ یہ تم نے مجھے بنوا کر دیئے تھے یہ تمہارے ہیں تم لے لو، اور جن زیورات اور کپڑوں کے بارے میں وصیت کی تھی ان کی قیمت بیس ہزارروپیہ سے اوپر نہیں ہے، یعنی ان کی کل ملکیت کا بیسواں حصہ بھی مشکل سے ہے، اور مرحومہ کی وفات کے بعدان کے لڑکے اورلڑکیوں نے اپنا اپنا حصۂ شرعی مکان میں سے حاصل کرلیا ہے، اب پوچھنا یہ ہے کہ پوتی اورنواسی کے بارے میں جو وصیت کی ہے، وہ شرعی طور پرنافذ ہوگی یا نہیں؟ اورلڑکی کو جو بندے دیئے ہیں وہ اس کی حقدار ہے یا نہیں؟ مرحومہ کے کچھ پیسے بھی تھے، ان پیسوں کو تجہیز وتکفین کے لیےان کے بیٹے کو دیدیا گیا؟

المستفتی: محمدوصی پیرغیب مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ پرغور کیا گیا ہےاس کے مطابق یہ بات ثابت ہوئی کہ جن زیورات کے بارے میں وصیت کی گئی ہے وہ ثلث مال سے بھی بہت ہی کم ہے، اور پوتی نواسی شرعی طور پر وارث نہیں ہوتیں، البتہ ان کےحق میں وصیت نافذ ہوتی ہے، لہٰذا جن زیورات کے بارے میں پوتی اورنواسی کو دینے کے لیے وصیت کی گئی ہے توان میں سے جس کو جوزیوردینے کےواسطے وصیت کی گئی ہے، اس کووہ زیوروصیت کے مطابق دیدینا لازم اورضروری ہے۔

الوصية غير واجبة وهى مستحبة وقوله ولاتجوز الوصية بما زاد على الثلث وقوله: ولاتجوز لورثته لقوله عليه السلام: إن الله تعالىٰ أعطىٰ كل ذى حق حقه ألا لا وصية للوارث. (هدايه، كتاب الوصايا، اشرفى ديوبند ٤/ ٦٥٤- ٦٥٧)

اور بیٹی نے جو بندے بنا کر ماں کو دیئے تھے اور ماں نے اپنی زندگی میں وہ زیور بیٹی کو جو یہ کہہ کر دے دیئے ہیں کہ تم نے بنا کر دیئے تھے یہ زیور میں تم ہی کو دیتی ہوں، تو یہ دینا

بھی صحیح ہو گیا ہے، وہ بندے اسی بیٹی کو ملیں گے اور تجہیز و تکفین کے لیے جو پیسے بیٹے کے ہاتھ میں دیئے گئے، اس میں سے تجہیز و تکفین کے بعد اگر کچھ بچ گیا ہے تو اس میں سارے وارثین کا حق متعلق ہوگا۔

الأول يبدأ بتكفينه و تجهيزه من غير تبذير ولا تقتير. (سراجی ص: ۳)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰؍صفر المظفر ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۴۸۹)

پوتی اور نواسی کے حق میں کی گئی وصیت کا شرعی حکم

سوال [۱۱۲۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میری والدہ اپنے انتقال سے پہلے مجھ سے یہ کہہ گئی تھیں کہ میری دو تولہ کی چوڑیاں ہیں وہ میری پوتی کو اور میری نواسی کو آدھا آدھا تولہ اس میں سے دیدینا، اور جو ایک تولہ اور بچے گا اس میں سے تم دونوں بہن بھائی آدھا آدھا تولہ کر لینا، کیا میں ایسا کروں یا نہیں؟ کیونکہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس طرح وصیت نہیں مانی جاتی ہے، لڑکوں کا زیادہ اور لڑکیوں کا کم ہوتا ہے، یہ بات میری والدہ نے انتقال سے قریب دو تین سال پہلے کہی تھی۔

نوٹ: انتقال سے تقریباً دو مہینہ پہلے جب انہوں نے اپنی طبیعت زیادہ خراب دیکھی تو کہنے لگیں، میری چوڑیاں بیچ کر میرا علاج کرو، تو ان کے منجھلے بیٹے نے جیسے بھی ہوسکا، علاج کیا لیکن وہ پھر بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں، مگر ہم لوگوں نے ان سے چوڑیوں کے بارے میں کوئی تذکرہ نہیں کیا، اور نہ ہی وہ چوڑیاں بکیں، علاج تو ان کے لڑکے یعنی میرے بھائی نے کیا، میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میں جیسے انہوں نے کہا تھا، آدھا آدھا تولہ دینے کو ایسا ہی کروں یا کوئی اور طریقہ ہے، آپ میرے اس مسئلے پر مجھے صحیح جواب دیں؟

المستفتی: محمد فاہم محلّہ سیدھی سرائے مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کی والدہ نے انتقال سے پہلے جو وصیت کی تھی وہ صرف پوتی اور نواسی کے حق میں ایک تہائی چوڑی یا اس کی ایک تہائی قیمت میں نافذ ہوگئی،لہٰذا چوڑی یا چوڑی کی قیمت چھ حصوں میں تقسیم کرکے ایک حصہ پوتی کو اور ایک حصہ نواسی کو وصیت کے مطابق دیدیا جائے گا،ان دونوں کا دوحصہ چوڑیوں کی تہائی ہے،جس میں شرعاً وصیت نافذ ہوتی ہے،بقیہ چار حصے جو چوڑیوں کی دو تہائی ہیں، وہ شرعی وارثین کے درمیان تقسیم ہو جائیں گے،اور ماں باپ نے جو بعد میں بیماری کے وقت کہا ہے کہ میری چوڑیاں بیچ کر علاج کراؤ تو اس میں وصیت کا حصہ شامل نہیں ہوگا، بلکہ دو تہائی جو وصیت کا حصہ نہیں ہے، وہی مراد ہے،مگر بیٹے نے چوڑیاں بیچ کر علاج کرانے کے بجائے اپنے پیسوں سے جو علاج کرایا ہے وہ اس کی طرف سے ماں کی خدمت اور تبرع ہے۔

وتجوز بالثلث للأجنبی عند عدم المانع. (شامی، کتاب الوصایا، کراچی ٦/ ٦٥٠، زکریا ١٠/ ٣٣٩)

وتصح الوصية بالثلث للأجنبی وإن لم يجيزوا. (مجمع الأنهر، کتاب الوصايا، دار الکتب العلمية بيروت ٤/ ٤١٩، تبيين الحقائق، امداديه ملتان ٦/ ١٨٢، زکريا ٧/ ٣٧٥، البحر الرائق کوئٹه ٨/ ٤٠٤، زکريا ٩/ ٢١٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۲۸؍رجب المرجب ۱۴۲۸ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر:۹۳۸۴/۳۸)	۲۸؍۷؍ ۱۴۲۸ھ

مکان کے ایک تہائی حصہ کی وصیت بھائی کے نام

سوال [۱۱۲۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اگر کسی شخص نے اپنے ذاتی ملکیتی مکان کے ایک تہائی حصہ کا وصیت نامہ اپنے چھوٹے بھائی کے نام کردیا اور باقی جائیداد چھوڑ کر وہ انتقال کرگیا اور اپنے وارثین کی حیثیت سے ایک بیوی اور پانچ لڑکے اور پانچ لڑکیاں چھوڑی ہوں تو ان وارثین کا حق کتنے

سہام ہوں گے؟ اور مرحوم کی بیوی کا کتنا حصہ ہوگا؟ اور کیا ساری جائیداد کی مالک تنہا مرحوم کی بیوی ہوسکتی ہے؟ اور وصیت نامہ کی کیا حیثیت رہے گی؟

المستفتی: امیر قریشی کاشی پور نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر ایک تہائی میراث میں وصیت کی ہے تو شرعاً وصیت صحیح ہو جائے گی اور ایک تہائی چھوٹے بھائی کو دینے کے بعد بقیہ ترکہ وارثین کے درمیان تقسیم ہو سکے گا اور وصیت شرعاً معتبر ہوگی، اور مرحوم کی بیوی کو اس میں رکاوٹ پیدا کرنے کا حق نہیں ہوگا، اور نہ ہی وہ ساری جائیداد کی تنہا مالک بن سکتی ہے۔

وتصح الوصية بالثلث للأجنبي وإن لم يجيزوا. (مجمع الأنهر، كتاب الوصايا، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ٤١٩، تبيين الحقائق، امداديه ملتان ٦/ ١٨٢، زكريا ٧/ ٣٧٥، البحر الرائق كوئٹه ٨/ ٤٠٤، زكريا ٩/ ٢١٣)

ثم تنفذ وصاياه من ثلث ما بقي بعد الدين ثم يقسم الباقي بين ورثته بالكتاب والسنة. (سراجی ص: ٤)

اور ایک تہائی چھوٹے بھائی کو بطور وصیت دینے کے بعد بقیہ ترکہ ورثاء کے درمیان حسب ذیل طریقے سے تقسیم ہوگا۔

۱۲۰ / ۸

مرحوم میت

زوجہ	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی
۱					۷						
۱۵	۱۴	۱۴	۱۴	۱۴	۱۴	۷	۷	۷	۷	۷	

وصیت کا ایک ثلث نکالنے کے بعد باقی دو ثلث مذکورہ بالا طریقے سے تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا ملے گا جو اس کے نیچے درج ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰ / ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۵۰۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۳۰/ ۱۲/ ۱۴۱۱ھ

بھائی کے لیے کی گئی وصیت کا حکم

سوال [۱۱۲۷۶]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے بڑے بھائی کا نام امیر الدین ہے، میں ان کا چھوٹا بھائی عظیم الدین ہوں، میرے لیے میرے بڑے بھائی یہ وصیت کرکے دنیا سے انتقال کر گئے، کہ میرے مرنے کے بعد صرف عظیم الدین میرے مال وجائیداد کا حق دار بنے گا اور والدین دو بھائی چار بہن موجود ہیں، اور نہ ان کی بیوی ہے نہ بچہ، ان کی بیوی کا بہت پہلے انتقال ہو چکا۔

گواہان: محمودہ بیگم، شاہانہ بیگم، عبدالقادر، نعیم الدین۔

المستفتی: عظیم الدین محلّہ گوئیاں باغ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر سائل اپنے بیان میں سچا ہے اور واقعتاً امیر الدین نے اپنے سارے مال وجائیداد کو عظیم الدین کی ملکیت میں دینے کی وصیت کی ہے اور اس کی باقاعدہ شہادت شرعی بھی موجود ہے، تو صرف ایک تہائی میں وصیت نافذ ہوسکتی ہے اور یہ بھی عظیم الدین کے باپ کی وجہ سے اور ورثاء کے دائرہ سے خارج ہونے کی وجہ سے ہے اور بقیہ دو تہائی ماں باپ کو حسب ذیل طریقے سے ملیں گے۔

امیر الدین میـــــــــــــــــــــــــــــــــت ۶

ماں	باپ
۱	۵

ایک تہائی عظیم کو دینے کے بعد دوثلث کو چھ حصوں میں تقسیم کرکے ایک ماں کو اور پانچ باپ کو ملیں گے۔

وتصح الوصیت بالثلث للأجنبی وإن لم یجیزوا. (مجمع الأنہر، کتاب الوصایا، دار الکتب العلمیۃ بیروت ۴/ ۴۱۹، تبیین الحقائق، امدادیہ ملتان ۶/ ۱۸۲، زکریا

۳۷۵/۷، البحر الرائق کوئٹہ ۴۰۴/۸، زکریا ۲۱۳/۹)

لا تجوز بما زاد على الثلث إلا أن يجيزها الورثة. (الجوهرة النيرة، امدادیہ ملتان ۳۸۹/۲، دار الكتاب ديوبند ۳۷۰/۲، تاتارخانية زكريا ۳۸۱/۱۹، رقم: ۳۱۸۵۹)

ثم تنفذ وصاياه من ثلث ما بقي بعد الدين ثم يقسم الباقي بين الورثة على سهام الميراث. (هنديه، كتاب الفرائض، الباب الأول زكريا قديم ۴۴۷/۶، جديد ۴۴۰/۶، سراجی ص: ۴-۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱۱۴/۲۸)

پرورش کرنے والی عورت کا حق دیور کے مال میں ہے یا نہیں؟

سوال [۱۱۲۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک عورت نے اپنے دیور کو بچپن ہی سے پالا تھا، اب اس عورت کے اس دیور نے اپنی جملہ زمین مسجد کے نام کردی، اب وہ عورت اور اس کے بچے یہ چاہتے ہیں کہ ہم نے انہیں بچپن ہی سے پالا تھا، اور ہمیں جوان سے خونی محبت ہے ہمیں اس کا صلہ ضرور ملنا چاہیے، تو کیا یہ درست ہے؟ اور کچھ لوگ اس پر زور بھی دے رہے ہیں کہ وہ شخص اپنی مسجد کے نام وصیت کردہ زمین میں سے کم از کم آدھی زمین کی وصیت کو ختم کر کے اپنی بھابھی اور اس کے بچوں کو دیدے تو کیا جو لوگ اس بات پر زور دے رہے ہیں وہ گنہگار رہوں گے یا نہیں؟

المستفتی: قاری عزیز الرحمٰن لکرالہ ضلع بدایوں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: آدمی اپنی ملکیت میں جس طرح چاہے تصرف کا حق رکھتا ہے، اس لیے دیور کا اپنی تمام ملکیت کو مسجد کے نام وصیت کرنا صحیح ہے۔

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء من

الملک. (بیضاوی شریف رشیدیه ۱/ ۷)

اورشریعت میں صلہ رحمی کی بھی بہت بڑی اہمیت ہے، اس لیے دیورکواپنے اختیار کے ساتھ ساتھ اعزاء کے ساتھ ہمدردی کا خیال رکھنا بھی ایک نیکی کی بات تھی، اس لیے جولوگ زوردے رہے ہیں وہ گنہگارنہیں ہوں گے۔

عن جرير بن عبد الله قال: قال رسول الله ﷺ: من لا يرحم الناس لا يرحمه الله. (سنن الترمذی، أبواب البر والصلة، باب ما جاء في رحمة الناس، النسخة الهندية ۲/ ۱٤، دار السلام رقم: ۱۹۲۲) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍صفر المظفر ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۵۴۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۲/۲/۱۲ھ

وصیت کی ایک شکل کا حکم

سوال [۱۱۲۷۸]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کہ زیب النساء کے دوحقیقی بھائی تھے، محمد خالد، محمد عارف، اور تین علاتی بھائی تھے، محمد عابد، محمد زاہد، بدرالدین، اور پانچ علاتی بہنیں تھیں: حلیمہ، تسلیمہ، نعیمہ، محمودہ، سارہ بی۔

(۲) زیب النساء کی زندگی میں حقیقی بھائی محمد خالد کا انتقال ہوگیا تھا اس کے بعد انہوں نے ایک وصیت نامہ لکھا، جس میں محمد خالد کی اولاد کے نام اورحقیقی بھائی محمد عارف کے نام وصیت کی، اس کے بعد اتفاق سے محمد عارف کا بھی انتقال زیب النساء کی زندگی میں ہوگیا، پھر دوبارہ زیب النساء نے کوئی وصیت نہیں کی اور زیب النساء کا انتقال ہوگیا، بوقت انتقال مذکورہ علاتی بھائی وبہنیں سب موجود تھے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ زیب النساء کی جائیداد متروکہ میں سے علاتی بہنوں کی موجودگی میں محمد عارف کی اولاد کوحق پہنچتا ہے یانہیں؟

(۳) نیز ایک فتویٰ مدرسہ شاہی مرادآباد سے لیا گیا جس میں وصیت کا کوئی ذکرنہیں

اورعلاتی بہنوں کو بیان کیا گیا اورعلاتی بھائیوں کوصرف بھائی ذکرکیا گیا، علاتی یا حقیقی بھائی کی تفصیل نہیں کی،اس کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: حسین احمد محلّہ رفعت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت سوال وبعدادائے حقوق ماتقدم وعدم موانع ارث زیب النساء کا ترکہ ورثاء اورموصیٰ لہم کے درمیان درج ذیل طریقہ سے تقسیم ہوگا۔

زیب النساء میت　$\frac{۳۳}{۳}$

موصیٰ لہم	اولاد خالد	ورثاء بھائی علاتی	عابد	زاہد	بدرالدین	علاتی بہنیں	حلیمہ	تسلیمہ	نعیمہ	محمودہ	سارہ بی
	۱/۱۱		۴	۴	۲/۴		۲	۲	۲	۲	۲

کل ترکہ کا ایک تہائی بطور وصیت خالد کی اولاد کو ملے گا، اور باقی دوتہائی ترکہ علاتی بھائی بہنوں کو مذکورہ طریقہ سے ملے گا، اورمحمد عارف کی اولاد کودووجہوں سے نہیں ملے گا:

(۱) محمد عارف، زیب النساء کا وارث تھااورشرعاً وارث کے حق میں وصیت درست نہیں ہوتی۔

عن أبی أمامة الباهلی –رضی الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصیة لوارث، النسخة الهندیة ۲/۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، الوصایا، باب ماجاء فی الوصیة للوارث، النسخة الهندیة ۲/۳۹۶، دار السلام رقم: ۲۸۷۰)

لاوصیة للوارث. (هدایه، کتاب الوصایا، رشیدیه ۴/۶۴۱، اشرفی دیوبند ۴/۶۵۷)

(۲) موصیٰ لہ کی موت اگرموصی سے پہلے واقع ہوجاتی ہےتو وصیت موصیٰ لہ کے ورثاء کی طرف منتقل نہیں ہوتی ہے، بلکہ باطل ہوتی ہے۔

ولو مات الموصیٰ له فی حیاة الوصی بطلت. (هدایه، اشرفی دیوبند ٤/٦٨٤، رشیدیه ٤/٦٦٨)

اور محمد خالد کی اولاد چونکہ وارث نہیں تھی، اس لیے ان کے حق میں وصیت جاری ہوگی، اور مدرسہ شاہی سے محمد زاہد صاحب نے ۱۵؍ ذی قعدہ کو فتویٰ نکلوایا ہے، اس پر عمل نہ کیا جائے، اس لیے کہ اس میں سوال ناقص تھا تو جواب بھی ناقص گیا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ ذی قعدہ ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۴۵۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/۱۱/۱۴۱۱ھ

مرض الموت میں وارث کے لیے وصیت کرنا

سوال [۱۱۲۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میری امی جان انتقال سے تین مہینہ پہلے کہہ رہی تھیں، اسٹامپ لاؤ، اس میں اپنی ساری جائیداد تمہارے نام لکھ دوں، میں نے اس کہنے پر غور نہیں کیا، پھر انتقال سے ۲۵؍ دن پہلے لیٹی تھیں، ہم آ کر بیٹھ گئے، امی اٹھ کر بیٹھ گئیں، اور زیور والے صندوق کی چابی نکال کر دینے لگیں، تو ہم چیخ مار کر رونے لگے تو چابی اپنے پاس رکھ لیں پھر میری خود کی ڈائری میں یہ لکھ دیا کہ میں نے اپنی ساری چیز، زیور اور برتن اپنے لڑکے حافظ خورشید کو دیدیا ہے، اپنی زندگی میں کسی کا حق نہیں اور بہنوں سے کہہ دیا کہ جب میں اس دنیا میں نہ رہوں تو چابی نکال کر حافظ خورشید کو دیدینا، اگر اس طریقہ پر قبضہ صحیح ہے تو فبہا ورنہ تقسیم کر کے بتا دیجئے، ان کے درمیان ماں شوہر ایک لڑکا تین لڑکیاں ترتیب وار اپنی تینوں لڑکیوں کو ایک ایک انگوٹھی دے کر یہ سب کیا یا لکھا ہے؟

المستفتی: حافظ خورشید احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ما تقدم وعدم

موانع ارث آپ اپنی والدہ کے وارث ہیں اور شریعت میں وارث کے لیے وصیت درست نہیں ہے، اور مرض الموت میں جس چیز کو کسی کی ملکیت میں دی جاتی ہے وہ وصیت کے دائرہ میں داخل ہو جاتی ہے۔

عن أبی أمامة الباهلی –رضی الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک و تعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصیة لوارث، النسخة الهندیة ۲/ ۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، الوصایا، باب ماجاء فی الوصیة للوارث، النسخة الهندیة ۲/ ۳۹٦، دار السلام رقم: ۲۸۷۰)

لاتجوز الوصیة للوارث. (هدایه، کتاب الوصایا رشیدیه ٤/ ٦٤١، اشرفی دیوبند ٤/ ٦٥٧)

لہٰذا آپ کی والدہ کی تمام ملکیت تمام ورثاء کے درمیان اس طرح تقسیم ہو جائے گی۔

مرحومه میت ۶۰/۱۲

شوہر	ماں	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی
۳	۲				
۱۵	۱۰	۱۴	۷	۷	۷

کل ترکہ ۶۰ر سہام میں تقسیم ہو کر شوہر کو ۱۵ر، ماں کو ۱۰ر، لڑکے کو ۱۴ر اور لڑکیوں کو ۷ر۷ر سہام ملیں گے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ر ربیع الثانی ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۹۸۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۴/۲۶ھ

مرض الوفات میں کی گئی وصیت کا شرعی حکم

سوال [۱۱۲۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: ایک صاحب نے اپنے مرض الوفات میں یہ وصیت کردی کہ اگر میرے یہاں اولادنرینہ کا سلسلہ باقی رہا تو میرے کل مال کا مالک ہوگا، اگر سلسلہ ختم ہوگیا تو کل مال کی مسجد مالک ہوگی، حالانکہ ان کی لڑکی موجود تھی، کیا یہ وصیت شرعی طور پر درست ہے؟

المستفتی: مولانا عبدالباسط مظاہری بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: یہ وصیت صرف ایک تہائی مال میں نافذ ہوگی، لہٰذا مسجد ایک تہائی مال کی مالک ہوجائے گی، بقیہ ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

عن سعد بن أبي وقاصحديثا طويلا وطرفه: فقلت: أوصي بالنصف، قال: النصف كثير، قلت: فالثلث، قال: الثلث، والثلث كثير أو كبير، قال: فأوصى الناس بالثلث فجاز ذلك لهم. (صحيح البخاري، الوصايا، باب الوصية بالثلث ١/٣٨٣، رقم: ٢٦٦٣، ف: ٢٧٤٤)

لا تجوز بما زاد على الثلث. (هدايه، كتاب الوصايا، رشيديه ٤/٦٣٨، اشرفى ديوبند ٤/٦٥٤، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/٤١٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶ ؍ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۸۲۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۶/۳/ ۱۴۱۵ھ

مرض الموت میں وقف کرنا وصیت کے درجے میں ہے

سوال [۱۱۲۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کہ میرے والد مرحوم تقریباً چھ ماہ کے عرصہ سے کینسر جیسے مہلک مرض کے عارضہ میں مبتلا تھے، علاج ومعالجہ کے باوجود وبصحت نہیں ہو پا رہے تھے، زندگی سے مایوس ہو چکے تھے، لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ پندرہ روز قبل والد مرحوم اس دار فانی سے رخصت ہوکر عالم بقا کی طرف روانہ ہوگئے، لیکن والد مرحوم کے انتقال سے دو یوم قبل میں نے

والد مرحوم سے عرض کیا کہ آپ کی کچھ زمین ہے جو رہائشی ہے، آپ اس زمین کو وقف کردیجیے، میں اس پر مدرسہ بنوادوں گا، والد مرحوم حالانکہ برابر بول بھی نہیں پاتے تھے مگر ان سے کچھ پوچھو تو تتلاتی ہوئی زبان سے جواب دیتے تھے، والد مرحوم نے کہا کہ میری طرف سے وقف ہے، تم اس جگہ پر مدرسہ بنوالینا، میں نے کہا کہ میں ایک کاغذ پر لکھوالیتا ہوں، آپ اس پر اپنا انگوٹھا لگادیجیے، والد مرحوم نے کہا کہ تم لکھوا کر لے آؤ میں انگوٹھا لگادوں گا۔

اس کے بعد اس بات کا تذکرہ میں نے اپنے چھوٹے بھائی سے کیا، چھوٹے بھائی نے اپنی نامرضی کا اظہار کیا اور کہا کہ ہمارے رہنے کے واسطے جگہ کم رہ جائے گی، اس لیے وقف نہیں کروانا، میں نے والد مرحوم سے چھوٹے بھائی کی بات نقل کی اور کہا کہ آپ چھوٹے بھائی کو بلا کر اس سے بات کیجیے، وہ وقف کروانے سے منع کررہا ہے، یہ سن کر والد مرحوم خاموش ہوگئے، اور چھوٹے بھائی سے اس بارے میں کوئی بات ہی نہیں کی، میں نے بھی بار بار اصرار نہیں کیا، کہ میں والد مرحوم کو تکلیف دوں، اس واقعہ کے دو روز کے بعد والد مرحوم کا انتقال ہوا اور آخری وقت تک ہوش وحواس درست تھے، ہاں اتنا ضرور تھا کہ وہ کہتے تھے کہ اب میں بچوں گا نہیں، میرا آخری وقت آچکا ہے، لہٰذا قلمبند فرمائیں کہ مذکورہ زمین وقف مانی جائے گی یا نہیں؟ تسلی بخش جواب تحریر فرمائیں؟ نوازش ہوگی۔

(۲) دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ والد مرحوم نے زید کو کچھ زمین فروخت کی، لیکن ابھی بیعنامہ نہیں کیا تھا، کیونکہ زید پر ابھی بارہ ہزار روپیے باقی تھے، زید کے پاس ابھی پیسے کا انتظام نہیں تھا، والد مرحوم نے کہا کہ زید پر ہمارے بارہ ہزار روپئے باقی ہیں، جب وہ پیسے دیدے تو فلاں زمین کا اس کے نام بیعنامہ کردینا، لیکن ساتھ ساتھ والد مرحوم نے ایک بات اور کہی کہ اس بارہ ہزار میں سے دو ہزار اسی کو چھوڑ دینا اور صرف دس ہزار روپئے لے لینا تو کیا ہم زید سے پورے بارہ ہزار روپئے لے کر بیع نامہ کریں یا دو ہزار روپئے والد مرحوم کی وصیت کے مطابق زید کو چھوڑ دیں، کیا مرض الوفات کی وصیت نافذ ہوتی ہے؟ شریعت مطہرہ کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں، مندرجہ بالا وصیت بھی والد مرحوم نے انتقال سے دو روز پہلے ہی کی، اس وصیت کا زید کو علم نہیں ہے، وہ تو ہم کو بارہ ہزار روپئے ہی دے گا۔

المستفتی: محمد خالد قاسمی، شکتی نگر ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) والدصاحب کا مرض الموت میں یہ کہنا کہ یہ زمین میری طرف سے وقف ہے، وصیت کے درجے میں ہے، لہٰذا اگر سب ورثاء اس پورے مکان کو وقف کرنے پر راضی ہوں تو پورا مکان وقف قرار دیا جائے گا، اور اگر ورثاء راضی نہ ہوں تو یہ وصیت صرف ایک تہائی مکان میں نافذ ہوگی، اس سے زیادہ میں نہیں۔

إعتاقه و محاباته و هبته و وقفه وضمانه كل ذٰلك حكمه كحكم وصية فيعتبر من الثلث. (الدر المختار مع الشامی، کتاب الوصایا، باب العتق فی المرض، کراچی، ٦/٦٧٩- ٦٨٠، زکریا دیوبند ١٠/٣٨٠)

(۲) میت نے مرض الوفات میں زید کو دو ہزار روپے کی قیمت میں تخفیف کا جو ارادہ ظاہر کیا ہے یہ بھی وصیت کے درجے میں ہے، اگر سب ورثاء راضی ہوں تو پورے دو ہزار روپے کی تخفیف کی جائے گی، اور اگر راضی نہ ہوں تو دو ہزار روپے کے صرف ایک تہائی کے بقدر تخفیف ہوگی۔

إعتاقه و محاباته و هبته و وقفه وضمانه كل ذٰلك حكمه كحكم وصية فيعتبر من الثلث. (الدر المختار مع الشامی، کتاب الوصایا، باب العتق فی المرض، کراچی، ٦/٦٧٩- ٦٨٠، زکریا دیوبند ١٠/٣٨٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ رجمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۳۱۳/۳۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۵/۲۳ھ

مرحوم کی وصیت صرف ثلث میں نافذ ہوگی بقیہ ترکہ شمار ہوگا

سوال [۱۱۲۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) میں ایک بیوہ عورت ہوں، میری عمر تقریباً ۷۵ر سال ہے، میرے شوہر کا آج سے تقریباً ۱۳ر سال قبل انتقال ہو چکا ہے، الحمد للہ میرے چار لڑکے اور پانچ لڑکیاں

ہیں، سب الحمد للہ حیات ہیں۔

(۲) آج سے تقریباً ۴۰؍سال قبل میرے شوہر نے ایکسپورٹ کا کاروبار شروع کیا، کچھ وقت انہوں نے باہر کے لوگوں سے شراکت کی، ان میں سے ایک نے تقریباً ۳۱؍سال قبل اور دوسرے نے تقریباً ۲۸؍سال قبل میرے شوہر سے الگ ہوکر اپنا اپنا کاروبار شروع کردیا، اور جوں جوں میرے لڑکے بڑے ہوتے چلے گئے ان سب کو میرے شوہر اپنے کاروبار میں شامل کرتے رہے۔

(۳) سال ۷۰ء تا ۸۴ء میرے شوہر اور میرے لڑکے مل کر ایک ہی کاروبار میں شریک رہے، سال ۸۴ء میں میرے شوہر نے حالات کے مدنظر چار لڑکوں میں سے ایک لڑکے کو الگ کردیا، اور کہا کہ اب تم اپنا کاروبار الگ سنبھالو اور جو لڑکا الگ ہوا اس کا حساب و کتاب بنا کر اس کے حوالے کردیا گیا، جس وقت یہ حساب بنایا گیا، میری معلومات کے مطابق اس کا مندرجہ ذیل طریقۂ کار اپنایا گیا:

الف: میرے شوہر نے اپنے تمام اثاثہ کو ایک جگہ اکٹھا کیا، اس میں چند جائیداد الگ کیں، اور ان جائیداد کو راہِ خدا میں صرف کرنے کی وصیت کی، اور اس کے علاوہ ایک باغ بھی الگ کیا، اور ایک رقم میرے لیے محفوظ کردی، اور باقی لڑکوں کو یہ حکم دیا کہ اس بچے ہوئے اثاثہ کو برابر پانچ حصہ بنا کر چار حصہ چار بھائی آپس میں بانٹ لو اور ایک حصہ جو ان کا اپنا تھا اس میں باغ شامل کرکے کہا کہ یہ میرا حصہ مانا جائے اور بعد میں اپنی زندگی میں اس کو شریعت کے مطابق وارثان میں تقسیم کردیا۔

ب: اتفاق ایسا ہوا کہ اس وصیت کو بنانے کے بعد چند ہی ماہ میں میرے شوہر کا انتقال ہوگیا، اپنے شوہر کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد مجھ کو علم ہوا کہ مزید کچھ رقم میرے شوہر نے کچھ الگ سے ایک اثاثہ کی شکل میں چھوڑی ہے، جو میرے سب سے بڑے لڑکے کے پاس محفوظ ہے، اس رقم کا خلاصہ اس طرح دیتی ہوں:

ت: اندازاً جو ترکہ میرے شوہر نے تقسیم کیا تھا وہ صرف ۲۵؍فیصدی تھا اور مزید

۷۵/ فیصدی میرے بڑے لڑکے کے پاس الگ سے محفوظ تھا، مثلاً میرے شوہر کا کل ترکہ تقریباً ایک روپیہ تھا، اس میں سے ۲۵/ پیسے تو میرے شوہر کی وفات کے بعد وارثان میں تقسیم ہوگئے، باقی ۷۵/ پیسے میرے بڑے لڑکے کے پاس محفوظ تھے۔

ث: مجھ کو اپنی بڑی لڑکی کے ذریعہ معلوم ہوا کہ یہ رقم میرے شوہر نے اس کے پاس بطور امانت رکھی ہے، اور یہ ہدایت دی ہے کہ اس کا استعمال راہِ خدا میں کیا جائے، مجھ کو احساس ہوتا ہے کہ باوجود ۱۳/ سال گذر جانے کے اس رقم کا کچھ حصہ ہی صرف ہوا ہے اور باقی آج بھی میرے بڑے لڑکے کے پاس محفوظ ہے (یہ رقم جس اثاثہ کی شکل میں محفوظ تھی آج کے بھاؤ سے وہ تقریباً ۳/ تا ۵/ گنا بڑھ گئی ہے)۔

میرے دوسرے بچے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اس رقم کا ذکر میرے شوہر نے ان سے بھی کیا، مگر کبھی راہِ خدا کے نام وقف کرنے کا کوئی ذکر نہیں کیا، اس بات کا میں اعتراف کرتی ہوں، حالانکہ میں ان کی بیوی تھی، انہوں نے کبھی مجھ سے راہ خدا میں وقف کرنے کا تذکرہ نہیں کیا۔

البتہ اگر کبھی بھی میں نے ان سے ان کے مکمل اثاثہ کے بارے میں معلوم بھی کیا تو انہوں نے یہی کہا کہ مجھ کو خود اندازہ نہیں، ہاں البتہ میرے بعد تم کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ میرے بڑے لڑکے کا دبدبہ زیادہ ہونے کی وجہ سے میرے شوہر کچھ باتوں میں کھل کر بولنے کی ہمت نہیں کرتے تھے، مجھ کو یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ میرے شوہر نے جو جائیداد وغیرہ بھی راہ خدا میں صرف کرنے کی وصیت کی تھی، وہ ۱۳/ سال گذر جانے کے باوجود جوں کی توں پڑی ہوئی ہے، میں اس کا ذمہ دار اپنے چاروں لڑکوں کو برابر مانتی ہوں کہ وہ جس طرح پوری دلجمعی سے اپنے کاروبار کے مسائل کو حل کرتے ہیں، ان تمام جائیداد کے مسائل حل کرنے میں اپنا وقت صرف کیوں نہیں کرتے ہیں؟ میں آپ سے گذارش کرتی ہوں کہ میرے اس مسلہ کا حل حدیث اور قرآن کی روشنی میں مندرجہ ذیل حقائق کو سامنے رکھ کر بیان کردیں۔

(۱) یہ رقم ترکہ کے تقسیم سے پہلے میرے شوہر نے میرے بڑے لڑکے کے حوالہ کی تھی؟

(۲) یہ رقم میرے شوہر کی زندگی میں بالکل خرچ نہیں ہوئی، جس وقت میرے شوہر کا

انتقال ہوا یہ رقم پوری کی پوری محفوظ تھی؟

(۳) میرے بڑے لڑکے کا یہ کہنا ہے کہ چونکہ یہ اثاثہ اس کے والد نے اس کے ذمہ کیا ہے، لہٰذا اس کو خرچ کرنے کا وہ مکمل اختیار رکھتا ہے، اور یہ اس کی مرضی ہے کہ وہ چاہے تو دوسروں سے مشورہ لے سکتا ہے، چاہے نہیں، اور وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ وہ جو کر رہا ہے بالکل صحیح کر رہا ہے، اور اپنے اس عمل کا خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں خود ذمہ دار ہوگا؟

(۴) میرے باقی بچے جن میں پانچ لڑکیاں اور تین لڑکے شامل ہیں وہ اس بات کی دلیل پیش کرتے ہیں کہ شریعت کی رو سے کسی بھی انسان کو مکمل اثاثہ کا ایک تہائی سے زیادہ راہِ خدا میں وقف کرنے کا اختیار نہیں ہے، لہٰذا اس کا ایک تہائی نکال کر باقی حصہ وارثین میں شریعت کی رو سے تقسیم ہونا چاہیے اور ایک تہائی حصہ کو راہِ خدا میں خرچ کرنے کو ان کے ہر مشورہ اور خواہش کا احترام کیا جائے، لہٰذا میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ اس مسئلہ میں میری رہنمائی فرمائیں تاکہ میری کسی بھی اولاد کے ساتھ حق تلفی نہ ہو اور ساتھ ہی میرا سب سے بڑا لڑکا جس سے میں سب سے بڑا ہونے کے ناطہ سب سے زیادہ محبت کرتی ہوں کسی لاعلمی کی وجہ سے گناہ کا مرتکب نہ ہو جائے؟

المستفتیہ: توحیدہ خاتون سنبھل مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ میں میت کے دو طرح کے اموال کے بارے میں شرعی حکم معلوم کیا گیا ہے ہر ایک کے متعلق تفصیل درج ہے:

(۱) آپ کے شوہر نے اپنی زندگی میں جن جائیدادوں کے بارے میں باقاعدہ راہِ خدا میں صرف کرنے کی وصیت کی ہے جس کے گواہ موجود ہیں ان میں تو بہرحال وصیت کے احکامات نافذ ہوں گے، یعنی میت کے کل ترکہ کے صرف تہائی حصہ کو راہِ خدا میں صرف کیا جائے گا، اور بقیہ دو تہائی حصہ وارثین میں تقسیم ہوگا۔

عن سعد بن أبی وقاص حدیثا طویلا وطرفه: فقلت: أوصی بالنصف، قال: النصف کثیر، قلت: فالثلث، قال: الثلث، والثلث کثیر أو کبیر، قال:

فأوصى الناس بالثلث فجاز ذٰلك لهم. (صحيح البخارى، الوصايا، باب الوصية بالثلث ۱/۳۸۳، رقم: ۲٦٦٣، ف: ۲۷٤٤)

لا تجوز بما زاد على الثلث. (هدايه، كتاب الوصايا، رشيديه ٤/٦٣٨، اشرفى ديوبند ٤/٦٥٤، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/٤١٩)

(۲) اور جو رقم بڑے لڑکے کے پاس رکھی ہوئی ہے اس کے بارے میں چونکہ دیگر وارثین وصیت کے متعلق لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں، اس لیے اس وصیت کا حکم صرف اسی وقت جاری ہوسکتا ہے جبکہ:

الف: میت کے اس رقم کو راہِ خدا میں صرف کرنے کے متعلق دو شرعی گواہ یا پختہ تحریری ثبوت موجود ہو۔

وإن أنكر سأل المدعى البينة. (هدايه، كتاب الدعوىٰ، اشرفى ديوبند ۳/۲۰۲، رشيديه ۳/۱۸٦)

إذا قال اشهدوا أنى أوصيت لفلان بألف درهم و أوصيت أن لفلان فى مالى ألف درهم فالأولىٰ وصية. (شامى، كتاب الوصايا، كراچى ٦/٦٥٠، زكريا ۱۰/۳۳۸)

اگر ایسا شرعی ثبوت موجود نہ ہو تو اس رقم پر وصیت کا حکم نافذ نہیں ہوسکتا بلکہ وہ مکمل رقم خواہ اس میں کتنا ہی اضافہ ہوگیا ہو میت کے سبھی وارثین میں حسب حصص شرعیہ تقسیم کرنی ضروری ہوگی اگر آپ کے بڑے لڑکے نے ایسا نہ کیا تو وہ خائن شمار ہوگا اور عنداللہ سخت ترین عذاب الٰہی کا مستحق ہوگا۔

قال رسول الله ﷺ: ألا لا تظلموا، ألا لايحل مال امرئ إلا بطيب نفس منه. (مسند أحمد ٥/٧٢، رقم: ۲۰۹۷۱، سنن الدار قطنى، دار الكتب العلمية بيروت ۳/۲۲، رقم: ۲۸٦٣، مشكوٰة ۱/۲٥٥)

لايجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعى. (شامى، كتاب الوصايا، مطلب: فى التعزير زكريا ٦/۱۰٦، كراچى ٤/٦١)

واضح رہے کہ جو رقم ہبہ، صدقہ یا وقف کے لیے الگ نکال کر رکھ دی جاتی ہے وہ جب تک اپنے مصرف میں خرچ نہ ہو جائے اس وقت تک مالک کی ملکیت سے خارج نہیں ہوتی، اور مرنے کے بعد اس کے ترکہ میں شمار ہوتی ہے، لہٰذا حسب تحریر سوال جبکہ میت کی زندگی میں مذکورہ رقم جوں کی توں موجود رہی اور صدقہ کی نیت کے باوجود انتقال کے وقت تک صدقہ کے محل تک نہیں پہنچی تو محض نیت کر لینے سے وہ آپ کے شوہر کی ملکیت سے خارج نہیں ہوئی، بلکہ انتقال ہوتے ہی اس رقم سے میت کے سبھی وارثین کا حق متعلق ہو چکا ہے۔

وإذا قال عبدی هذا لفلان و داری هذه لفلان ولم يقل وصية و لا كان في ذكر وصية ولا قال بعد موتي كان هبة قياسا و استحسانا فإن قبضها في حال حياته صح وإن لم يقبضها حتى مات فهو باطل. (عالمگیری، کتاب الوصایا، الباب الثانی زکریا قدیم ٦/ ٩٤، جدید ٦/ ١١١)

ب: اور اگر آپ کا بڑا لڑکا اس پوری رقم کے راہِ خدا میں صرف کرنے کی ہدایت پر دو شرعی گواہ یا پختہ ثبوت پیش کر دے پھر بھی اس کا نفاذ صرف ایک تہائی رقم میں ہو سکتا ہے، باقی دو تہائی رقم بہر حال وارثین میں تقسیم کرنی لازم ہے، آپ کے بڑے لڑکے پر فرض ہے کہ وہ جلد از جلد اس رقم کو مستحقین تک پہنچا کر اپنا ذمہ فارغ کرے، ورنہ وہ مرتکب خیانت ہو کر وصی اور وکیل ہونے کی ذمہ داری سے معزولی کا مستحق ہوگا۔

لاينبغي له أن يعزله حتى يبدو له منه خيانة فإن علم منه خيانة عزله. (عالمگیری، الباب التاسع فی الوصی و مایملکه، زکریا قدیم ٦/ ١٣٩، جدید ٦/ ١٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ربیع الثانی ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۳۴/ ۵۷۲۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۴/۲۵ھ

مرض الموت میں ہبہ کرنے کا حکم

سوال [۱۱۲۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ محمد اکبر کے دولڑکے، صابرحسین اور عابدحسین اور ایک لڑکی للّو ہیں، عابدحسین کا انتقال اکبر کی زندگی ہی میں ۱۹۹۰ء میں ہوگیا۔

عابد کے تین لڑکے محمد عالم، محمد مرسلین، محمد آصف اور تین لڑکیاں: رقیہ خاتون، رضیہ خاتون، اوماخاتون ہیں، اس کے بعد اکبر کا ماہ ستمبر ۲۰۰۱ء میں انتقال ہوا، انتقال سے کچھ وقت پہلے جب ان کے ہوش درست تھے تو عزیز رشتہ داران کے پاس جمع تھے، انہوں نے ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا، تو موجودہ لوگوں نے معلوم کیا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں، اور آپ نے چھوٹے بیٹے عابد کی اولاد کے لیے کیا کیا ہے؟ تو انہوں نے مکان کے بارے میں انگلی سے آدھے آدھے کا اشارہ کیا، کہ آدھا مکان صابر کا اور آدھا عابد کے بچوں کا اور زبان سے بھی کہا، اس پر ان کی بیٹی للّو اور عابد کی بہو خیرالنساء اور اکبر کا بڑا بیٹا صابر اور صابر کے لڑکے اور دیگر رشتہ دار، لڈن چکی والے، مقصود بھائی وغیرہ گواہ موجود ہیں جو اس وقت ان کے پاس موجود تھے، معلوم یہ کرنا ہے کہ شریعت کی روشنی میں یہ ہبہ درست ہے یا نہیں؟ واضح رہے کہ اپنے ہاتھ سے اشارہ کرتے وقت زبان سے بھی انہوں نے آدھے آدھے کا لفظ کہا تھا؟ شریعت کی روشنی میں جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

المستفتی: محمد حنیف محلّہ نئی بستی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرض الوفات میں ہبہ اور عطیہ وصیت کے حکم میں ہوتا ہے، اس لیے واقعتاً سوال میں ذکر کردہ لوگوں کی موجودگی میں عابد کی اولاد کے لیے آدھے مکان کی جو وصیت کی گئی تھی اور ان گواہوں نے وصیت کی بات اچھی طرح سمجھی ہے، اور یہ سب لوگ اس کی گواہی دے رہے ہیں، تو مرحوم اکبر کے کل ترکہ و مکان کے کل ۹ر حصے ہوں گے، اس میں سے ایک تہائی حصہ جس میں ۳ر حصے آتے ہیں، وہ عابد کی اولاد کو ملیں گے، باقی دو تہائی جس میں چھ حصے آتے ہیں، اس میں دو حصے بیٹی للّو اور چار حصے صابر کو ملیں گے، لیکن اگر بیٹا صابر اور بیٹی للّو باپ کی اس وصیت کا احترام کرتے ہوئے مرحوم عابد کی اولاد کو آدھا مکان بخوشی دینا چاہتے ہیں تو یہ جائز اور درست ہے، اور اگر بخوشی دینا نہ چاہیں تو

۹/ حصوں میں سے ۳/ حصے دینے ہوں گے۔

والهبة من المريض للوارث في هذا نظير الوصية لأنها وصية حكما حتى تنفذ من الثلث. (هدايه، كتاب الوصايا، رشيديه ٤/ ٦٤١، اشرفی ديوبند ٤/ ٦٥٧)

ولاتجوز بما زاد على الثلث ......إلا أن يجيزها الورثة بعد موته وهم كبار . (هدايه، اشرفی ديوبند ٤/ ٦٥٥، رشيديه ٤/ ٦٣٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ شعبان المعظم ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۳۷۲)

وصیت سے متعلق چند سوالات کے جوابات

سوال [۱۱۲۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) نھو نامی ایک شخص کا دعویٰ ہے کہ ظہوراً نے جس کا میں وارث ہوں، میرے نام کل مال کی وصیت کردی تھی، تو کیا وارث کے حق میں وصیت کرنا جائز ہے؟

(۲) ایک عورت نے جبکہ اس کے وارثین بھی موجود ہیں ایک شخص کو کل مال کی وصیت کردی تھی، کیا یہ شرعاً جائز ہے، وصیت کرنے والی مرچکی ہے؟

(۳) ایک شخص نے عدالت میں دعویٰ کیا ہے کہ فلاں نے مجھے کل مال کی وصیت کردی تھی، اور وصیت کنندہ کے وارث بھی موجود ہیں، انہوں نے اس دعویٰ کے خلاف عذر داری دائر کردی ہے، اور مدعی کے اس ناجائز دعویٰ کی وجہ سے عذر دار فریق کی اتنی رقم صرف ہوگئی ہے کہ مدعی کا وصیت سچی ہونے کی شکل میں جو تہائی حصہ کی قیمت ہوگی وہ رقم اس سے زیادہ ہے، یعنی مدعی کی تہائی حصہ جتنی قیمت کا ہوتا ہے اس سے زیادہ رقم مدعی نے کل زمین کی وصیت کا غلط دعویٰ پیش کرکے عذر دار فریق کی خرچ کرادی اب اگر اس شکل میں عذر دار فریق پوری زمین کا مقدمہ جیت لے اور مدعی کو اس کی وجہ سے تہائی حصہ زمین نہ دے کہ اس نے اس سے زیادہ ہماری رقم خرچ کرادی، جوکہ اس کے غلط دعویٰ کے نتیجے میں خرچ کرنی پڑی تو شرعاً

کوئی حرج تو نہیں ہے، اس رقم کا ذمہ دار مدعی کو ہی سمجھا جائے گا؟ اس کی وضاحت فرمائیں۔

المستفتی: شمس الحق قاسمی غفرلہ، موسیٰ پور سنبھل مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) وارث کے لیے وصیت کرنا جائز نہیں اگر کوئی وارث کے لیے وصیت کرے تو وہ باطل ہے۔

قال ومنها أن لايكون وارث الموصى وقت موت الموصى فإن كان لا تصح. (بدائع الصنائع، كتاب الوصايا، زكريا ٦/ ٤٣٣)

(۲) وارثین کی موجودگی میں کسی اور کے لیے کل مال کی وصیت کرنا جائز نہیں۔

قال: يعني أن الباطل هو أحد الشيئين الذين قصدهما الموصى وهو استحقاق الزائد على الثلث فإنه بطل لحق الورثة. (شامی، كتاب الوصايا، باب الوصية بثلث المال كراچی ٦/ ٦٦٧، زكريا ١٠/ ٣٦٣)

(۳) بر تقدیر صحت سوال مسئولہ صورت میں موصیٰ لہ کا ایک تہائی حق دیدینا لازم ہے اس پر بغیر اس کی اجازت کے قبضہ کرنے کی گنجائش نہیں ہے، البتہ اس مقدمہ میں جو رقم آپ کی خرچ ہوئی ہے اس کا مطالبہ بذریعہ عدالت آپ کرسکتے ہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۴/ ۱۴۱) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ صفر المظفر ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۰۱۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۲/۲ھ

٤٣ كتاب الفرائض

١ باب ما يتعلق بنفس الفرائض

شرعی تقسیم کا طریقۂ کار

سوال [۱۱۲۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) میرے چھوٹے بھائی ہیڈ ماسٹر عبدالشہو دخاں مرحوم نے اپنے فنڈ وتنخواہ میں کچھ روپیہ چھوڑا، مرحوم کی تجہیز وتکفین مرحوم ہی کے پیسے سے کرنا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) مرحوم نے مبلغ دو ہزار روپیہ اپنی چھوٹی بہن سے قرض لیا تھا، اور مرحوم نے اپنی درست صحت میں اس قرض کی ادائیگی کی وصیت زبانی، رو برو گواہان کی تھی، یہ قرض مرحوم ہی کے پیسے سے ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

(۳) مرحوم کی تجہیز وتکفین وقرض مرحوم کے فنڈ وتنخواہ سے کاٹ کر بقیہ روپیہ ان کے وارثین میں تقسیم ہونا چاہیے یا نہیں؟

(۴) اس سلسلے میں جبکہ جامعہ قاسمیہ میں ان کے فنڈ وتنخواہ کا روپیہ موجود ہے، جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی کے محترم جناب مہتمم صاحب کو تصدیق کر کے سب وارثین کو تقسیم کرنا چاہیے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) شریعت کا یہی حکم ہے کہ سب سے پہلے میت کے ترکہ میں سے متوسط درجہ کی تجہیز وتکفین کا خرچ نکال لیا جائے۔

ويبدأ بتكفينه و تجهيزه بلا تبذير و لا تقتير. (شريفيه ص: ۳)

(۲) یہ قرض تجہیز وتکفین کے بعد مرحوم کے ترکہ میں سے ہی ادا کرنا واجب ہے۔

ثم يبدأ بقضاء دينه من جميع ماله الباقي بعد التجهيز و التكفين. (شريفيه ص:٥)

(۳) اگر مرض الموت میں کسی غیر مورث کے لیے وصیت نہیں کی ہے تو بقیہ سارا مال وارثین کے درمیان ان کے حقوق کے بقدر تقسیم کرنا لازم ہے۔

ثم يقسم الباقي هذا رابع الأربعة وهو أن يقسم ما بقي من ماله بعد التفكين والدين والوصية بين ورثته أي الذين ثبت إرثهم بالكتاب. (شريفيه ص:٧)

(۴) اس زمانۂ فتن میں یہی بہتر ہے کہ مذکورہ صورت میں مہتمم صاحب ہی ہر وارث کا حصہ اسی کے ہاتھ میں دیدیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ ؍ ربیع الاول ۱۴۰۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۵۹۷)

تقسیم وراثت میں امیر بنانے کا حکم

سوال [۱۱۲۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید نے اپنے انتقال کے وقت اپنے پیچھے بارہ اولاد چھوڑی، جس میں نو لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں، ان تمام لڑکوں اور لڑکیوں نے مل کر اپنے میں سے ایک کو امیر منتخب کیا ہے، سوائے دو لڑکوں کے کہ انہوں نے کسی کو اپنا امیر نہیں بنایا ہے، اور یہ بھی معلوم ہے کہ کل جائیداد منقولہ وغیر منقولہ اکیس حصے کے اعتبار سے تقسیم ہوگی، اور یہ بھی ملحوظ رہے کہ سارے وارثین کی عمر ۴۵ ؍ سال سے متجاوز ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا امیر وراثت کی تقسیم ان دونوں کی رضامندی واطلاع کے بغیر کرسکتا ہے؟

(۲) اسی طرح دیگر وارثین کی خوشنودی کے بغیر اپنی اطاعت کی تاکید کرتے ہوئے کیا امیر وراثت کی تقسیم اپنے اعتبار سے کرنے کا حق رکھتا ہے؟

(۳) اسی طرح بعض وارثین نے ایک عمارت کا جو وارثین کے درمیان مشترک تھی،

دوسرے وارثین کومطلع کیے بغیر سودا کرلیا ہے،اس سودے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا اس طرح کا سودا کرنا شرعی اعتبار سے درست ہے؟ شریعت کی روشنی میں جواب دیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تقسیم وراثت میں امیر بنانے اوراس کی اطاعت کوسارے ورثاء پر لازم کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ آپس میں سب مل کر جائیداد منقولہ وغیر منقولہ کو۲۱/حصوں میں تقسیم کرکے بانٹ لیں، اور جس کو امیر بنایا ہے اس کا وراثت کواپنے اعتبار سے تقسیم کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ شرعی تقسیم لازم ہے، نیز بعض وارثین کا دیگر بعض وارثین کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا اوراس کو بیچنا درست نہیں ہے۔

﴿يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيْ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ. [النساء: ۱۱]﴾

ثم يقسم الباقي هذا رابع الأربعة وهو أن يقسم ما بقي من ماله بعد التفكين والدين والوصية بين ورثته أي الذين ثبت إرثهم بالكتاب. (شريفيه ص: ۷)

لايجوز لأحد أن يتصرف في ملك غيره بلا إذنه أو وكالة منه أو ولاية عليه وإن فعل كان ضامنا. (شرح المجلة ۱/۶۱ رقم: ۹۶) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۵۲۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۱/۵/۱۴۳۵ھ

تقسیم شرعی معتبر ہے نہ کہ والد صاحب کی ہدایتِ تقسیم

سوال [۱۱۲۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: والد صاحب جس طرح سے تقسیم کرنے کے لیے زندگی میں کہہ گئے ہیں، اگر اس طرح سب کو اتفاق ہو تو اس طرح تقسیم کرنا درست ہے، اور اگر کچھ وارثین تو راضی ہوں لیکن کچھ جن کے پاس زیادہ مال قبضہ میں ہے راضی نہ ہوں، تو پھر کس طرح تقسیم کی جائے؟

المستفتی: ممتاز حسن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر والد کی ہدایت کے مطابق تقسیم کرنے پر سب ورثاء راضی نہیں ہیں، تو ان کی ہدایت کے مطابق تقسیم کرنا جائز نہیں ہوگا، بلکہ قانون شرعی کے مطابق تقسیم کرنا لازم ہوگا، اس لیے کہ وراثت کی ملکیت اختیاری نہیں ہوتی بلکہ اضطراری طور پر قانونِ الٰہی کے تحت یہ ملکیت حاصل ہوتی ہے۔

إن سبب الملک نوعان: إختیاری کالشراء وقبول الهبة و إضطراری کالإرث. (حاشیہ سراجی ص:۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍شعبان المعظم ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۳۲۷)

غیر شرعی طریقہ پر تقسیم کی گئی جائیداد کا شرعی حکم

سوال [۱۱۲۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید اور خدیجہ دونوں بھائی بہن ہیں، دونوں نے والدین کے انتقال کے بعد تقریباً پندرہ سال پہلے آپسی رضامندی سے جائیداد کو تقسیم کرلیا تھا، لیکن یہ شرعی تقسیم نہیں ہوئی تھی، جس کی بناء پر بہن کو اپنا حق صحیح طور پر نہیں ملا تھا، اور اب پندرہ سال بعد جائیداد کی قیمت بڑھ گئی ہے، اور بہن اپنے شرعی حق کا مطالبہ کررہی ہے، تو مفتی صاحب سے گذارش ہے کہ مندرجہ بالا مسئلہ میں پہلی تقسیم ہی کا اعتبار کیا جائے یا از سرنو جائیداد تقسیم کی جائے گی، جو بھی شرعی حکم ہو براہِ کرم مع دلائل جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: محمد عارف گجراتی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پندرہ سال پہلے بھائی بہن نے رضامندی سے جو جائیداد تقسیم کی ہے وہ اگر شریعت کے خلاف ہے، اور مسئلہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے اس

طرح تقسیم ہوئی ہے، اور بعد میں مسئلہ معلوم ہونے کے بعد پتہ چلا ہے کہ شریعت کی رو سے غلط تقسیم ہوئی ہے، تو ایسی صورت میں اس تقسیم کو کالعدم قرار دے کر دوبارہ شریعت کے مطابق تقسیم کر سکتے ہیں، اور جب بعد میں دوبارہ شریعت کے مطابق ازسرِنو تقسیم کی جائے گی تو اس دوسری بار تقسیم کا اعتبار ہوگا اور پہلی تقسیم کالعدم ہوجائے گی۔

إذا حدثت القسمة ثم تبين فيها غبن فاحش وهو الذى لايدخل تحت تقويم المقومين كأن قوم المال بألف وهو لايساوى خمس مأة فسخت قسمة التقاضى بإتفاق الحنفية لأن تصرف القاضى مقيد بالعدل ولم يوجد والغبن حصل بغير رضا المالك، فصار كبيع الأب والوصى ينقض بالغبن الفاحش وتفسخ أيضا قسمة التراضى فى الأصح لأن شرط جوازها المعادلة ولم توجد فوجب نقضها وهذا هو الصحيح المعتمد المفتىٰ به عند الحنفية كما ذكر ابن عابدين أى أن قسمة التراضى تفسخ بالغبن الفاحش كقسمة التقاضى. (الفقه الإسلامى و أدلته، هدى انٹرنیشنل دیوبند ٥/٥٥٣-٥٥٤، المحيط البرهانى، المجلس العلمى ١١/١٨٨، رقم: ١٣٥٦١، شامى زكريا ٩/٣٨٧، كراچى ٦/٢٦٧، البنايه اشرفيه ديوبند ١١/٤٥٠، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣١/١٥٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۲۰۰۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۴/۱۴۳۶ھ

خلاف شرع تقسیم کا حکم

سوال [۱۱۲۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہندہ نے اپنے شوہر کے انتقال کے بعد اپنے شوہر کا مکان فروخت کر کے وہ رقم بطور امانت واسطے حج بیت اللہ کے اپنے حقیقی بھائی کے پاس رکھ دی تھی، کوئی محرم نہ ملنے کی وجہ سے حج بیت اللہ نہ جا سکی، اور پچھلے دنوں ہندہ کا انتقال ہوگیا، مرحومہ ہندہ کی بطور امانت والی رقم

کو کیا کیا جائے؟ یا وارثین میں کس طرح تقسیم کی جائے، ہندہ بے اولاد تھی، تو کیا مرحومہ ہندہ کی اس رقم سے ہندہ کا حج بدل کرایا جا سکتا ہے، ہندہ نے اپنی زندگی میں وصیت کی تھی کہ اگر میں نہ رہوں تو میرا یہ پیسہ میری فلاں حقیقی بہن کو دیدینا، اتفاق سے ہندہ کی زندگی میں ہی اس بہن کا انتقال ہوگیا، جس بہن کے حق میں وصیت کی تھی، جس وقت بہن کے حق میں وصیت کی تھی، اس کا شوہر، دو نابالغ لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں، ہندہ کے شوہر کی پانچ بہنیں تھیں، دو بہنوں کا انتقال ہوگیا، ہندہ کے شوہر کی تین بہنیں حیات ہیں، کیا ہندہ کے مرحوم شوہر کی مرحوم بہنوں کی اولاد کا حق بنتا ہے، ان میں لڑکی لڑکوں کو کتنا کتنا ملے گا، مرحومہ ہندہ کے والد محترم حیات ہیں، مرحومہ ہندہ کے چار بھائی ہیں، مرحومہ ہندہ کی چار بہنیں حیات ہیں، ان سب کا علیحدہ علیحدہ حق بتا دیں، اور کیا مرحومہ ہندہ کی امانت رکھنے والا بھائی ہندہ کی اس رقم کو اپنے طور سے کسی مسجد یا مدارس میں یا غریب وغرباء میں بطور امداد ہندہ کے نام سے دے سکتا ہے؟

المستفتی: عبدالرؤف ہلدوانی، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہندہ کے لیے پورا مکان فروخت کرنا جائز نہیں تھا، اس مکان میں ہندہ صرف چوتھائی حصہ کی حقدار تھی، شوہر کی بہنوں کو دوثلث ملیں گے، کل ۱۲؍سہام میں تقسیم ہوکر ہندہ کو ۳؍اور بہنوں کو ۸؍اور باقی دو شوہر کے قریبی حقیقی چچا یا تایا یا ان کی مذکور اولاد کو ملے گا، لہٰذا امانت کی رقم کو اسی حساب سے تقسیم کرکے حقداروں کو دیدینا لازم ہے، اور شوہر کی موت کے وقت جو بہنیں زندہ تھیں سب وارث ہوجائیں گی، نیز ہندہ کی وصیت اس کی رقم میں سے ایک تہائی میں نافذ ہوسکتی تھی، مگر موصیٰ لہا کے پہلے مرنے کی وجہ سے وصیت بھی ختم ہوگئی ہے۔

ویشترط فی الوصیة القبول صریحا أو دلالة ...... قبول الوصیة إنما یکون بعد الموت. (هندیه، کتاب الوصایا، الباب الأول زکریا جدید ۶/ ۱۰۶، قدیم ۶/ ۹۰)

اب اس کے حصہ کی رقم سے حج بدل بھی جائز نہیں ہے، بلکہ اس کے وارثین کو ملے گی یہ مسئلہ مناسخہ کا ہے، تمام وارثین اور مرنے والوں کو نام بنام علی الترتیب ذکر کیے بغیر مسئلہ کا جواب مکمل طور پر ممکن نہیں، شوہر اور بیوی کے خاندان کے لوگوں کو مرنے والوں کی ترتیب

کے ساتھ نامزد لکھیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍محرم الحرام ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۱۵۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۱/۲۶ھ

غلط تقسیم غیر معتبر ہے

سوال [۱۱۲۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید نے ایک عورت سے شادی کی اس سے تین بچے پیدا ہوئے، دو لڑکے اور ایک لڑکی: عبد الرحیم، سلیم احمد، لڑکی آمنہ، بعدہٗ زید کی بیوی کا انتقال ہوگیا، اس کے بعد زید نے دوسری شادی کرلی، اس سے بھی تین ہی بچے پیدا ہوئے، محمد ایوب، عبد القیوم، آمنہ، اب زید کا انتقال ہوگیا، بوقت انتقال زید نے دونوں بیویوں کی اولاد اور دوسری بیوی کو چھوڑا اور تین مکانات چھوڑے۔

(۲) زید کی پہلی بیوی سے پیدا شدہ لڑکے سلیم احمد کا انتقال ہوگیا؟

(۳) اور کچھ ہی دنوں کے بعد پہلی بیوی کی ہی لڑکی آمنہ کا بھی انتقال ہوگیا، یہ دونوں غیر شادی شدہ تھے، ان دونوں نے بوقت انتقال ایک حقیقی بھائی عبد الرحیم اور دو علاتی بھائی محمد ایوب، عبد القیوم ایک علاتی بہن آمنہ کو چھوڑا؟

(۴) اس کے بعد زید کی دوسری بیوی کا انتقال ہوگیا، اس نے اپنے تینوں بچوں کے علاوہ زید کی پہلی بیوی سے پیدا شدہ لڑکے عبد الرحیم کو بھی چھوڑا، بعدہٗ زید کی دوسری بیوی سے پیدا شدہ لڑکی آمنہ کا بھی انتقال ہوگیا، اس نے اپنی اولاد میں پانچ لڑکوں کو چھوڑا، محمد غفران، محمد عثمان، محمد اسلم، عبد السلام، محمد اسلام، شوہر کا پہلے ہی انتقال ہوگیا ہے، زید کے انتقال کے بعد مال کی تقسیم کے ساتھ ساتھ مکانات کی تقسیم بھی باہمی رضامندی سے اس طرح کرلی گئی ہے کہ ایک مکان پہلی بیوی سے پیدا شدہ لڑکے عبد الرحیم کو دیدیا، اور دوسرا مکان دوسری بیوی سے پیدا شدہ الڑکوں کو دیدیا، اور دونوں ہی اس فیصلہ پر بخوشی رہتے سہتے چلے آرہے ہیں، زید کی دوسری

بیوی سے پیدا شدہ لڑکوں نے دوسری بیوی کی موجودگی میں فروخت بھی کر دیا اب جبکہ زید کے انتقال کو قریب پچاس سال اور زید کی دوسری بیوی کے انتقال کو پچیس سال گذر گئے، زید کی دوسری بیوی سے پیدا لڑکوں نے دوبارہ تقسیم جائیداد کا دعویٰ پیش کر دیا پہلی بیوی سے پید شدہ الڑکے سلیم احمد مرحوم اور لڑکی آمنہ مرحومہ کے حصہ کا حقدار کون ہوگا؟ بالتفصیل جواب عنایت فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ میں درج شدہ صورت سے جو تقسیم ہوئی ہے وہ شرعی طور پر صحیح نہیں ہوئی، اس لیے کہ اس میں بعض ورثاء کو حق سے محروم کر دیا گیا ہے، جیسا کہ دوسری بیوی کی لڑکی آمنہ اور اس کے ورثاء کو کوئی حق نہیں دیا ہے، لہٰذا دوبارہ شرعی طریقہ سے تقسیم ہونا لازم ہے، اور کسی بھی وارث کو محروم نہ کیا جائے، نیز دوسری بیوی کے لڑکوں نے جو کچھ فروخت کر دیا ہے اس کا حساب بھی تقسیم میں شامل کرنا ہوگا، لہٰذا ان کے حصہ میں سے فروخت شدہ کو بھی مجریٰ کرنا ہوگا۔

ولو ظهر غبن فاحش فی القسمة تفسخ. (البحر الرائق، کتاب القسمة زکریا ۸/۲۸۳، کوئٹہ ۸/۱۵۶، تبیین الحقائق امدادیه ملتان ۵/۲۷۳، زکریا ۶/۴۱۹)

ولو استحق بعض شائع فی الکل تفسخ بالاتفاق لأن باستحقاق جزء شائع ینعدم معنی القسمة وهو الإفراز لأنه یوجب الرجوع بحصته فی نصیب الآخر. (هدایه، کتاب القسمة اشرفی دیوبند ۴/۴۲۰-۴۲۱) **فقط واللّٰہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۲۵۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/۴/۱۴۱۸ھ

کیا والد صاحب کی زندگی میں اپنی لڑکیوں کو وراثت دے سکتے ہیں؟

سوال [۱۱۲۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کوئی صاحب جائیداد اپنی حیات میں اپنی لڑکیوں کو ترکہ دے سکتا ہے یا نہیں؟

(۲) میرے والد محترم نے اپنی وفات سے دو تین سال قبل اپنی لڑکیوں کو ان کا ترکہ ادا کر کے ہم بھائیوں کے حق میں ایک یادداشت تقسیم نامہ مرتب کیا تھا، ابھی ہماری والدہ ماجدہ بقید حیات ہیں، اس یادداشت تقسیم نامہ کے گواہان بھی باحیات ہیں، اس یادداشت میں لڑکیوں کو ترکہ دینے کا تذکرہ نہیں کیا، ایسی صورت میں ہم بھائیوں کو اپنی بہنوں کو ہمارے والد محترم کی جائیداد میں سے ترکہ دینا ہوگا یا نہیں؟

(۳) ہماری موروثی آراضی پر ہم تمام بھائیوں نے باہمی مشورہ سے ایک بھائی کو نگراں مقرر کیا تھا، اس بھائی نے اس آراضی کی کاشت فصل نہ دے کر تمام آراضی پر قبضہ کرلیا، ہم دیگر بھائیوں کو حصہ دینے سے انکار کر دیا، چنانچہ میں نے عدالت عالیہ سے رجوع کیا، جس میں جملہ بھائی بہنوں کو مدعیٰ علیہ بنانا پڑا، عدالت عالیہ نے بھائیوں، بہنوں کے درمیان آراضی تقسیم کرنے کا فیصلہ صادر فرمایا، بربنائے تصفیہ عدالت عالیہ بہنیں بھی آراضی میں حصہ تقسیم چاہتی ہیں، جس میں ہر بہن کی متضاد رائے ہے، بڑی بہن یہ کہتی ہے کہ والد محترم نے اپنی حیات میں دے دیا ہے، اب میں نہیں لوں گی، دوسری بہن یہ کہتی ہے کہ عدالت عالیہ کے حکم کی روشنی میں ہم کو ہمارا حق دیں، تیسری بہن یہ کہتی ہے کہ والد محترم نے ہمارا حصہ برابر نہیں دیا ہے، اس لیے ہم کو آپ جواب دیں، کہ ہمارا کیا عمل ہونا چاہیے؟

(۴) بڑے برادران یہ کہتے ہیں کہ تمہاری وجہ سے ہم کو دوبارہ ترکہ بہنوں کو دینا پڑ رہا ہے، جس کی وجہ سے میرے برادران مجھ سے ناراض ہیں تو کیا میرا عدالت میں اپنے حصہ کے لیے رجوع کرنا غلط تھا؟

المستفتی: محمد اصغر کیراف حاجی ظہیر الدین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنی جائیداد میں سے لڑکیوں کو کچھ حصہ دینا چاہے تو لڑکوں کے حق کی رعایت کرتے ہوئے تمام لڑکیوں کو برابر برابر حصہ دینا شرعاً درست اور جائز ہے، لیکن اس کا اس طرح دینا ترکہ نہیں بلکہ ہبہ کہلاتا ہے۔

یعطی الإبنة مثل ما یعطی الإبن وعلیه الفتویٰ. (هندیه، الباب السادس فی الهبة للصغیر، زکریا قدیم ۴/۳۹۱، جدید ۴/۴۱۶، شامی زکریا ۸/۵۰۲، کراچی

٦٩٦/٥، قاضيخان زكريا جديد ١٩٤/٣، وعلى هامش الهندية زكريا ٢٧٩/٣)

(۲) آپ کے والد صاحب نے اپنی حیات میں اپنی لڑکیوں کو جو حصۂ جائیداد دے کر قابض بنادیا شرعاً وہ ہبہ تھا، اب والد صاحب کے انتقال کے بعد ترکہ کی تقسیم میں وہ لڑکیاں بھی شریک رہیں گی، اگرچہ والد صاحب کے یادداشت نامہ میں ان کا تذکرہ نہ ہو۔

عن النضر بن أنس قال: نحلني أنس نصف داره قال: فقال أبو بردة: إن سرک يجوز ذٰلک فاقبضه فإن عمر بن الخطاب قضى في الإنحال: أن ما قبضه منه فهو جائز، ومالم يقبض فهو ميراث قال فدعوت يزيد الرشک فقسمها. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، باب ما جاء في هبة المشاع دار الفكر ١٥٨/٩، رقم: ١٢١٨٦، المصنف لابن أبي شيبة، مؤسسة علوم القرآن ٥٢١/١٠، رقم: ٢٠٥٠٢)

(۳) تقسیم ترکہ سے پہلے آپ کے بھائی نے جوزمین پر ناجائز قبضہ کرلیا تھا، جس سے تمام وارثین کا حق تلف ہورہا تھا، ایسا کرنا سخت گناہ ہے، ایسی صورت میں آپ کا عدالت سے رجوع ہونا اور عدالت کا سب بھائی بہنوں کے حق میں فیصلہ کرنا بالکل درست اور بجا ہے، شرعی رو سے بھی تمام بہنوں کو ترکہ میں سے اپنا حصہ ملے گا، البتہ کوئی بہن باپ کی زندگی میں حصہ مل جانے کی وجہ سے میراث میں سے اپنا حق اپنے بھائیوں کو دیدے تو یہ اس کی مرضی ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ رشیدیہ قدیم ص: ٦٠٧، جدید زکریا ص: ٦٠١، فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۴/ ۴۳۷، جدید ڈابھیل ۲۰/ ۲۸۵)

عن سليمان بن موسىٰ قال: قال رسول الله ﷺ: من قطع ميراثا فرضه الله، قطع الله ميراثه من الجنة. (سنن سعيد بن منصور، باب من قطع ميراثا فرضه الله،، دار الكتب العلمية بيروت ٩٦/١، رقم: ٢٨٥-٢٨٦)

عن أنس بن مالك -رضي الله عنه- قال: قال رسول الله ﷺ: من فر من ميراث وارثه، قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة. (سنن ابن ماجه، باب الحيف في الوصية، النسخة الهندية ١٩٤/٢، دار السلام رقم: ٢٧٠٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۸۸۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/ ۶/ ۱۴۱۷ھ

جھگڑے اور نقصان سے بچنے کے لیے زندگی میں تقسیم کرنا

سوال [۱۱۲۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج کے دور میں میراث کے معاملہ میں حق تلفی ہی نظر آتی ہے، بھائی بھائی تو میراث کو باہمی طور پر یا عدالتی طور پر آسانی سے تقسیم کر لیتے ہیں، مگر بہنوں کو حصۂ میراث سے اکثر وبیشتر محروم ہی دیکھا جارہا ہے، اگر کوئی لڑکی ہمت کر کے اپنا حصہ طلب کر لیتی ہے یا عدالت کے سہارے سے اپنے حصہ کا مطالبہ کر لیتی ہے تو قطع تعلقی کا شکار ہو جاتی ہے، اور ہمیشہ کے لیے بہن بھائیوں کی محبت عداوت میں بدل جاتی ہے، شریعت مطہرہ چونکہ رسم ورواج کے تابع نہیں اس لیے مسلمانوں کو تو شریعت کے مطابق ہی عمل کرنے میں اصل کامیابی ہے۔

(۱) میراث کی تقسیم کاشتکاری کی زمین یا فیکٹری، کارخانہ جات کی جائیداد میں ہے یا رہائشی مکانات میں بھی ہے، زیور اور کپڑوں میں بھی ہے یا نہیں؟

(۲) موجودہ روش کے مدنظر اگر کوئی باپ اپنی اولاد کو اس قضیہ سے بچانے کے لیے اور لڑکی کا حق اپنی موجودگی میں کسی شکل میں پہنچانے کی غرض سے بصورت ہبہ یا عطیہ کی شکل میں میراث تقسیم کر دے تو کیسا ہے؟ تاکہ حق والے کو حق بھی مل جاوے اور بہن بھائیوں میں رنجش بھی نہ ہو، مثال دے کر سمجھانے کی زحمت فرمائیں، مال کے علاوہ اگر جائیداد رہائشی کا اندازہ تین لاکھ روپیہ ہیں اور ایک لڑکی تین لڑکے ہوں تو ہر ایک کو کتنا ملے گا، اگر چار لڑکے دو لڑکیاں ہوں تو ہر ایک کو کتنا ملے گا؟

(۳) اس سلسلے میں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ ہر ایک اس حق تلفی میں مبتلا ہے، لڑکی کے حق رسانی کے خودساختہ رسم بھانجے یا بھانجی کی شادی پر کچھ خرچہ کر دینا لڑکی کا حق ادا کر دینا مانا گیا ہے، اس کی کیا وضاحت ہے؟

المستفتی: محمد یونس مظاہری احمد گڑھ، سنگرور پنجاب

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) شریعت میں میراث کے حقدار لڑکوں کی طرح لڑکیاں بھی ہوتی ہیں، اور بھائیوں کی طرح بہنیں بھی ہوتی ہیں، ہاں البتہ لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکیوں کو نصف ملتا ہے، مثلاً ایک لڑکی اور تین لڑکے ہیں تو کل سرمایہ جائیداد وغیرہ تمام متروکہ اشیاء سات حصوں میں تقسیم ہوکر ایک لڑکی کو اور دو- دو لڑکوں کو ملے گا، اور میراث میں کاشتکاری کی زمین فیکٹری کارخانہ جات کی جائیداد، رہائشی مکان، دوکان، زیور، کپڑے، روپیہ، پیسے سب شامل ہیں، ہر چیز اسی حساب سے تقسیم ہوگی جو یہاں پیش کی گئی ہے۔

(۲) اگر یہی شکل ہے کہ بیٹیوں اور بہنوں کو میراث میں سے بالکل نہیں دیا جاتا ہے، اگر کوئی بہن یا بیٹی اپنے حق میراث کا مطالبہ کرے تو عداوت اور دشمنی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، اس سے بچنے کے لیے اگر باپ اپنی زندگی میں یہ طریقہ اختیار کرتا ہے کہ لڑکیوں کو اس کے مرنے کے بعد جو شرعی حصہ مل سکتا ہے اسی کے حساب سے صحرائی یا سکنائی جائیداد اس کے نام منتقل کر دیتا ہے یا روپیہ پیسہ بینک بیلینس کے طور پر لڑکی کے کھاتہ میں منتقل کر دیتا ہے تو یہ نہایت مناسب شکل ہے، تاکہ باپ کی موت کے بعد اس کے حصہ کا جھگڑا پیدا نہ ہو، اور ساتھ ہی ہر ماحول کے ہر علاقہ کے علماء اور اہل حل وعقد پر ضروری ہے کہ مسلمانوں کو اس بارے میں ترغیب دیں کہ بہن بیٹیوں کو میراث سے محروم نہ کریں، ورنہ اس کے حق کی وجہ سے جہنم کا ایندھن بننا پڑے گا۔

میت ۷ — تباین — ترکہ ۳۰۰۰۰۰

	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی
سہام	۲	۲	۲	۱
ترکہ	۸۵۷۱۴ ۲/۷	۸۵۷۱۴ ۲/۷	۸۵۷۱۴ ۲/۷	۴۲۸۵۷ ۱/۷

میت ۱۰ — تداخل — ترکہ ۳۰۰۰۰۰

	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی
سہام	۲	۲	۲	۲	۱	۱
ترکہ	۶۰۰۰۰	۶۰۰۰۰	۶۰۰۰۰	۶۰۰۰۰	۳۰۰۰۰	۳۰۰۰۰

میـــت ۷ — تباین — ترکہ ۲۰۰۰۰۰

	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی
سہام	۲	۲	۲	۱
ترکہ	۵۷۱۴۲ ٦/۷	۵۷۱۴۲ ٦/۷	۵۷۱۴۲ ٦/۷	۲۸۵۷۱ ۳/۷

(۳) تعلیم یافتہ غیر تعلیم یافتہ ہر طبقہ کے لوگ واقعی اس معصیت میں مبتلا ہیں کہ بہن اورلڑکیوں کو میراث سے محروم کر دیتے ہیں، اور پھر بھانجہ بھانجی کی شادی پر خرچ کر دینا ہرگز حق میراث کی تلافی نہیں ہوسکتی، حق میراث بدستور اپنی جگہ باقی رہے گا۔

عن أنس بن مالك –رضى الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: من فر من ميراث وارثه، قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة. (سنن ابن ماجه، باب الحيف في الوصية، النسخة الهندية ۲/۱۹٤، دار السلام رقم: ۲۷۰۳، سنن سعيد بن منصور، باب من قطع ميراثا فرضه الله، دار الكتب العلمية بيروت ۱/٩٦، رقم: ۲۸۵-۲۸٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۲۵۰/۳۸)

زندگی میں وارثین کے درمیان میراث تقسیم کرنا

سوال [۱۱۲۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید جن کے تین لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں، زید کے پاس ۶۷۸۵؍ گز آبادی کی زمین اور ۳۰۷؍ بیگہ کھیت کی زمین ہے، زید اپنی زندگی ہی میں اپنی جائیداد کو اپنے ان بچوں کے درمیان تقسیم کرنا چاہتے ہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں بتائیں کہ زید کی جائیداد کس طریقہ سے تقسیم ہوگی؟

المستفتی: عتیق الرحمٰن سنبھلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کے اس سوال کے پیچھے دو باتیں سمجھ میں آتی

ہیں: (۱) زید زندگی میں یہ چاہتا ہے کہ تمام اولاد کو جائیداد کا باضابطہ مالک بنا کر خود خالی ہاتھ ہوجائے، اگر یہی مقصد ہے تو لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر دینا چاہیے، لہٰذا کل جائیداد سات حصوں میں تقسیم ہوکر ہر ایک کو ایک ایک حصہ دیدیا جائے۔

(۲) زید کا یہ مقصد نہیں ہے کہ اولاد کو مالک بنا کر خود خالی ہاتھ ہوجائے بلکہ یہی مقصد ہے کہ زید کی موت کے بعد اولاد میں ہر ایک کو اپنا اپنا شرعی حق مل جائے، تو ایسی صورت میں تقسیم میراث کی طرح لڑکیوں کو لڑکوں کے مقابلے میں آدھا آدھا دیا جائے، اور اس طرح تقسیم نامہ لکھوا کر رجسٹری کروالیا جائے کہ مرنے کے بعد ہر ایک وارث کو اتنا اتنا حصہ ملے گا اور اس کو متعین کردیا جائے کہ فلاں جائیداد فلاں کو ملے، فلاں جائیداد فلاں کو ملے، لہٰذا سکنائی وصحرائی دونوں طرح کی جائیداد کو دس حصوں میں تقسیم کرکے لڑکوں کو دو- دو اور لڑکیوں کو ایک ایک حصہ کے حساب سے ہر ایک کے نام سے جائیداد کو متعین کردیا جائے تاکہ مرنے کے بعد بلاکسی اختلاف اور انتشار کے ہر ایک اپنے اپنے حصہ پر قابض ہوجائے، اس طرح زندگی میں ہر ایک کا حصہ متعین کردیا جائے تو بہتر اور مناسب اقدام ہے۔

يعطى الإبنة مثل ما يعطى الإبن وعليه الفتوىٰ. (هنديه، الباب السادس فى الهبة للصغير، زكريا قديم ٤/٣٩١، جديد ٤/٤١٦، شامى زكريا ٨/٥٠٢، كراچى ٥/٦٩٦، قاضيخان زكريا جديد ٣/١٩٤، وعلى هامش الهندية زكريا ٣/٢٧٩)

المختار: التسوية بين الذكر والأنثىٰ فى الهبة. (البحر الرائق، كتاب الهبة، زكريا ٧/٤٩٠، كوئٹه ٧/٢٨٨)

وأما إذا أراد الرجل أن يقسم أملاكه فيما بين أولاده فى حياته لئلا يقع بينهم نزاع بعد موته، فإنه وإن كان هبة فى الاصطلاح الفقهى ولكنه فى الحقيقة، والمقصود استعجال لما يكون بعد الموت وحينئذ ينبغى أن يكون سبيله سبيل الميراث. (تكملة فتح الملهم، كتاب الهبات، مذهب الجمهور، التسوية بين الذكر والأنثىٰ، اشرفيه ديوبند ٢/٧٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۵۸۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/ ۶/ ۱۴۳۵ھ

والد صاحب کے انتقال کے بعد پہلے لڑکے کی شادی کریں یا ترکہ تقسیم کریں؟

سوال [۱۱۲۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جناب فدا حسین کا انتقال ہو گیا، انہوں نے اپنی وفات کے بعد تین پسران ایک دختر اور بیوہ بقید حیات چھوڑے، ایک دختر کا انتقال ان کی حیات میں ہو گیا، والد صاحب کی جائیداد سے جو آمدنی ہے اس میں ایک پسر کی شادی نہیں ہوئی ہے، تحریر فرمائیں کہ آمدنی والد صاحب کی پہلے تقسیم ہوگی یا پہلے پسر کی شادی ہوگی؟ شرعاً تحریر فرمائیں۔

المستفتی: سجاد حسین عرف بابو ولد فدا حسین فیل خانہ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فدا حسین مرحوم کی متروکہ جائیداد ومکان کی آمدنی تمام شرعی وارثین کے درمیان پہلے تقسیم کرنا لازم اور واجب ہے، جس کی شادی ہونی ہے وہ اپنے حصہ میں سے خرچ کرے گا، البتہ اگر دوسرے ورثاء بلا جبر ودباؤ کے اپنی مرضی اور خوشی سے شادی میں اپنے اپنے حصے میں سے خرچ کرنا چاہتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

عن ابن عباس –رضی الله عنه– عن النبی ﷺ قال: ألحقوا الفرائض بأهلها. (صحیح البخاری، باب میراث الولد من أبیه و أمه، النسخة الهندیة ۲/۹۹۷، رقم: ٦٤٧٥، ف: ٦٧٣٢، صحیح مسلم، باب ألحقوا الفرائض بأهلها، النسخة الهندیة ۲/۳٤، بیت الأفکار، رقم: ١٦١٥)

الملک ما من شانه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص. (الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۱٤/۲۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ ؍ رجب المرجب ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۷۹۱)

تقسیم میں ملکیت کا اعتبار ہے نہ کہ قیمت کا

سوال [۱۱۲۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کا انتقال ہوا، اس نے تین لڑکے چھوڑے، بکر، خالد، عمر، یہ تینوں لڑکے باپ زید کے رہائشی مکان میں رہتے ہیں، جو اس طرح پر بنا ہوا ہے کہ مکان کا ایک حصہ بالکل الگ بنا ہوا ہے، جس کا دروازہ راستہ سب الگ ہے، جس کو مشن رائے سے بکر نے لے لیا، اور سرکاری کاغذات میں اس حصہ کو اپنے نام کرالیا، خالد اور عمر نے مکان کا وہ حصہ اپنے نام کرالیا جو دومنزل بنا ہوا تھا، اوپر کی منزل خالد نے اور نیچے کی منزل عمر نے لے لی، اور ہر ایک نے سرکاری کاغذات میں ایک ایک منزل مکان اپنے اپنے نام کرالیا، جتنا حصہ نیچے بنا ہوا ہے اتنا ہی حصہ اوپر بنا ہوا ہے، کوئی کمی زیادتی نہیں ہے، اوپر کی منزل خالد کے نام ہے اور نیچے کی منزل عمر کے نام ہے، ان دونوں خالد اور عمر کا انتقال ہوگیا ہے، ان دونوں نے اپنے اپنے وارثین میں سے مندرجہ ذیل حضرات کو چھوڑا ہے، خالد ایک زوجہ ایک لڑکا، ایک لڑکی، عمر ایک زوجہ، ۲؍لڑکے، ایک لڑکی، ان تمام وارثین نے مشن رائے کو وہ دومنزل مکان دولاکھ اسی ہزار روپیہ میں فروخت کردیا، اب نیچے کے مکان والے عمر کے وارثین یہ کہتے ہیں کہ رقم میں ہمارا حصہ زیادہ ہے، کیونکہ نیچے کے مکان کی حیثیت زیادہ ہوتی ہے، اس لیے ہمیں زیادہ حصہ چاہیے تو اس رقم کو آدھا آدھا تقسیم کیا جائے گا، یا کمی زیادتی کے ساتھ اور پھر کتنی کمی زیادتی کے ساتھ اور ایسے ہی ہر ایک مورث کے وارث کو کتنا کتنا حصہ ملے گا، قرآن وحدیث کی روشنی میں موجودہ رقم میں ہر ایک وارث کا کتنا حصہ ہوگا، متعین فرمادیں؟

المستفتی: محمد محی الدین مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب تعمیری حیثیت سے اوپر اور نیچے دونوں حصے برابر ہیں اور دوسرے لوگوں کے نزدیک دونوں کی حیثیت یکساں ہے تو دونوں کی قیمت برابر لگے گی، بعضے پہلو سے دیکھا جائے تو اوپر کے حصہ کی حیثیت نیچے سے بڑھی ہوئی مانی جاتی ہے، کہ اوپر کے حصہ میں ضرورت کے لیے تعمیر کی جاسکتی ہے، سردیوں میں اوپر کی چھت دھوپ کے لیے استعمال

ہوسکتی ہے، اوپر کا حصہ نیچے کے مقابلے میں ہوا دار ہوتا ہے، اگر ایسی شکل ہے تو دونوں کی قیمت میں کوئی خاص فرق نہ ہوگا، اور چونکہ مذکورہ مکان دونوں بھائیوں کو وراثت میں ملا ہے اور تقسیم وراثت کے موقع پر دونوں کی قیمت برابر برابر سمجھی گئی تھی، اس لیے آج بھی دونوں کی قیمت برابر سمجھی جائے گی، لہٰذا جب دونوں کا حصہ ایک ساتھ ایک ہی شخص کے ہاتھ فروخت کردیا تو دونوں بھائیوں کو اس قیمت کا نصف نصف ملے گا، لہٰذا کسی ایک کو زیادہ حق کا مطالبہ کرنا درست نہ ہوگا، اس لیے کہ اس مکان میں دونوں بھائیوں کا برابر برابر حق ہے، تو قیمت میں بھی دونوں برابر برابر ہوں گے، لہٰذا ہر ایک کو دو لاکھ اسی ہزار کے اعتبار سے ملے گا، اس کے بعد ہر ایک کے وارثین کے درمیان مذکورہ ایک لاکھ چالیس ہزار درج ذیل نقشہ کے حساب سے تقسیم ہوں گے۔

وقال محمد رحمه الله تعالىٰ: يقسم بالقيمة فإن كانت قيمتها سواء كان ذراع بذراع. (عناية على فتح القدير، كتاب القسمة، فصل فى كيفية القسمة، زكريا ٩/٤٥٢، دار الفكر ٩/٤٤٣، كوئٹه ٨/٣٦٦)

بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ما تقدم وعدم موانع ارث مرحوم خالد کا ترکہ اس کے ورثاء میں درج ذیل طریقہ پر تقسیم ہوگا۔

خالد میت ۸ ۳/۲۴ — توافق/۸ — ۱۷۵۰۰/۱۴۰۰۰۰

بیوی	لڑکا	لڑکی
۱	۱۴	۷
۱۷۵۰۰	۸۱۶۶۶ ۲/۳	۴۰۸۳۳ ۱/۳

مرحوم خالد کا کل ترکہ ۱۴۰۰۰۰ میں سے ہر ایک کو اتنا اتنا ملے گا جو اس کے نام کے نیچے درج ہے۔ بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ما تقدم وعدم موانع ارث مرحوم عمر کا ترکہ اس کے ورثاء میں درج ذیل طریقہ پر تقسیم ہوگا۔

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ شعبان المعظم ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۰۹۱)

ترکہ کی تقسیم کس وقت کے اعتبار سے ہوگی؟

سوال [۱۱۲۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کا انتقال ہوگیا، اس نے اپنے بعد چھ لڑکے: سلیم، کلیم، بکر، حامد، خالد، شاہد، اور دو لڑکیاں: زینب، فاطمہ اور زوجہ فہمیدہ کو چھوڑا۔

انتقال کے بعد بھائیوں نے ترکہ میں سے اپنی بہنوں کا پورا حصہ حساب لگا کر بے باق کردیا، اس طرح کہ سو روپیہ حصہ بنا تو پچاس روپیہ ان کو دیئے گئے، اور پچاس روپیہ انہوں نے معاف کردیئے، گویا کہ آدھا حصہ دیا اور آدھا حصہ معاف کرالیا، بھائیوں نے اپنا حصہ نہیں لیا، اور والدہ کا حصہ بھی نہیں دیا، بلکہ چھ بھائی اور والدہ کا حصہ ملا کر کاروبار کیا گیا، والد کے انتقال کے بعد والدہ کے نام کی زمین جائیداد سب بھائیوں نے اپنے نام کرالیا، اب تمام بھائی بٹوارہ کرنا چاہتے ہیں، اور والدہ بھی اپنا حصہ لینا چاہتی ہیں، تو تقسیم ترکہ کی کیا صورت ہوگی؟ نیز والدہ کا حصہ آج کے حساب سے نکلے گا یا پہلے کے حساب سے، یاد رہے کہ زید کے انتقال کو دس سال سے زیادہ ہوچکے ہیں۔

المستفتی: محمد خالد کلکتہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مستفتی سے زبانی فون پر معلوم ہوا کہ بہنوں کے حصوں میں سے جو کچھ بھائیوں نے روک لیا ہے، اگر بہنوں کی طرف سے مطالبہ ہوتو آج بھی ان کے حصوں کا حساب لگا کر ان کو دینے کے لیے تیار ہیں، تو اگر بہنوں کو دیا جائے تو وہ کس حساب سے دیا جائے، تو اس کے بارے میں حکم شرعی یہ ہے کہ چونکہ بھائیوں نے ضرورت اور مجبوری کی وجہ سے بہنوں سے لیا تھا، اس لیے بہنوں کی طرف سے قرضہ کے درجہ میں مانا جائے گا، اور قرضہ کی ادائیگی کا حکم شرعی یہ ہے کہ جس وقت ان سے لیا تھا یا استعمال کی اجازت لی تھی، اس وقت کی قیمت اور معیار کا اعتبار رہوگا، مثلاً: اگر اس وقت ایک ہزار روپیہ لیا تھا تو آج بھی

ایک ہزار روپیہ ہی واپس ہوگا، اس پر نفع جو ہوا ہے اس نفع میں حصہ دار نہیں ہوں گے۔

عن فضالة بن عبيد صاحب النبی ﷺ أنه قال: كل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربا. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، البيوع، باب كل قرض جر منفعة فهو ربا، دار الفكر ٢٨٦/٨، رقم: ١١٠٩٢)

عن علي -رضي الله عنه- قال: كل قرض جر منفعة فهو ربا. (كنز العمال، الدين والسلم، دار الكتب العلمية بيروت ٩٩/٦، رقم: ١٥٥١٢)

دوسری بات یہ ہے کہ جائیداد جو اپنے نام کرالی ہے اس کے بارے میں مستفتی سے زبانی معلوم ہوا کہ بہنوں کا جو حساب بیٹھتا ہے ان کا حساب پورا کرنے کے بعد نام کرائی گئی ہے، تو ایسا کرنا شرعاً درست ہے، سوال میں تیسری بات یہ ہے کہ ماں کا حصہ بھی بھائیوں کے حصہ کے ساتھ آپس کی رضامندی سے شامل کرکے کاروبار چلایا گیا ہے، تو گویا کہ ماں بھی بھائیوں کے ساتھ کاروبار میں شریک ہے، لہٰذا جس تناسب کے ساتھ بھائیوں کے ساتھ ماں کا حصہ شامل کیا گیا ہے اسی تناسب سے ماں نفع میں بھی حصہ دار ہوگی۔

والحاصل أن المفهوم من كلامهم أن الأصل في الربح أن يكون على قدر المال. (شامي، كتاب المضاربة، زكريا ٤٣١/٨، كراچی ٦٤٦/٥)

ولو دفع إليه ألف درهم مضاربة على أنهما شريكان في الربح، ولم يبين مقدار ذٰلك فالمضاربة جائزة، لأن مطلق الشركة يقتضي المساواة. (هنديه، كتاب المضاربة، الباب الثاني، زكريا قديم ٢٨٨/٤، جديد ٢٩٦/٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶؍ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۹۴۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۳/۶ھ

میراث کی ادائیگی میں کس دن کی قیمت کا اعتبار ہے؟

سوال [۱۱۲۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: (۱) ہم نے پہلے زمین باپ کے انتقال کے بعد فروخت کی، اس کے روپیہ مجھ کو بیس ہزار ملے، اور اس وقت بہنوں کو حصہ دینا مجھے معلوم نہ تھا، اب میں بہنوں کو (جو حصہ شریعت نے مقرر کیا ہے) دینا چاہتا ہوں، اب میں ایک بھائی اور دو بہنیں میری اس بیس ہزار روپیہ میں شامل ہیں تو ان کو کتنا حصہ دیا جائے گا؟

نیز اس وقت کے حساب سے زمین کا ریٹ آٹھ ہزار روپیہ تھا اور اب ریٹ دو لاکھ روپیہ ہے، تو کس حساب سے حصہ دیا جائے گا، جب کہ زمین آٹھ ہزار روپیہ کے حساب سے پہلے بک چکی ہے، اب زمین بالکل نہیں ہے۔

(۲) والدہ کے مرنے کے بعد ماں کی زمین بھی ہم نے فروخت کردی، وہ پینتیس ہزار روپیہ میں فروخت ہوئی، جب والدہ کی زمین بکی تو ۳۵۰۰۰/ ہزار روپیہ کو تھی، اب اس کی بھی موجودہ قیمت دو لاکھ روپیہ ہے، اب زمین بالکل نہیں ہے۔

غور طلب مسئلہ دونوں شقوں میں یہ ہے کہ زمین تو ہم پہلے ہی فروخت کر چکے ہیں اور حصہ اب دینا چاہتے ہیں جب کہ اب قیمت دو لاکھ روپیہ کے حساب سے ہے، آپ برائے مہربانی یہ تحریر فرمادیں کہ کونسی قیمت کے حساب سے بہنوں کا حصہ دینا ہوگا؟

نوٹ: باپ اور ماں کے انتقال کے بعد جب زمین فروخت ہوئی، تو اس وقت بہنیں زندہ تھیں، اور اب دونوں بہنوں کا انتقال ہو چکا ہے۔

المستفتی: عبدالملک

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آٹھ ہزار اور دو لاکھ میں ۲۲/ گنا کا فرق ہوتا ہے، اور حضرات فقہاء کے درمیان اس مسئلہ میں کچھ اختلاف ہے، حضرت امام ابو یوسفؒ نے یوم البیع کی قیمت کا اعتبار کیا ہے اور حضرت امام محمدؒ نے یوم الاداء کی قیمت کا اعتبار کیا ہے۔

وعندهما لا يبطل البيع لأن المتعذر التسليم بعد الكساد وذٰلک لايوجب الفساد لاحتمال الزوال بالرواج لكن عند أبي يوسف تجب قيمة يوم البيع، وعند محمدؒ يوم الكساد وهو آخر ما تعامل الناس بها و في

الذخيرة: الفتوىٰ على قول أبي يوسف، وفي المحيط: والتتمة والحقائق وبقول محمد يفتي رفقا بالناس. (شامي، كتاب البيوع، مطلب مهم: في أحكام النقود إذا كسدت...... زكريا ٧/٥٥، كراچی ٤/٥٣٣، تبيين الحقائق امداديه ملتان ٤/١٤٢، زكريا ٤/٥٦٥، البحر الرائق كوئٹه ٦/٢٠١، زكريا ٦/٣٣٦-٣٣٧)

امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق اگر یوم البیع کا اعتبار کیا جائے تو صرف آٹھ ہزار روپئے بنتے ہیں، جس میں صاحب حق کا بڑا نقصان ہے، اور اگر امام محمدؒ کے قول کے مطابق یوم الاداء کی قیمت کا اعتبار کیا جائے تو دو لاکھ روپئے بیگہ کے اعتبار سے صاحب حق کو ملے گا تو ایسی صورت میں بیچنے والے کا بڑا نقصان ہے، تو ایسے معاملہ میں علامہ ابن عابدینؒ شامی نے صلح کے طور پر ایک اصول نقل کیا ہے جس میں درمیان کا راستہ اختیار کیا گیا، فریقین درمیان درمیان کی کسی خاص مقدار پر صلح کر کے راضی ہوجائیں تو ایسی صورت میں مسئلہ کا حل آسان ہے، اور حدیث پاک میں ہے:

عن ابن عباس -رضي الله عنهما- قال قال رسول الله ﷺ: لا ضرر ولا ضرار. (سنن ابن ماجه، باب من بنى في حقه مايضر بجاره، النسخة الهندية ٢/١٦٩، دار السلام رقم: ٢٣٤١، مسند أحمد ابن حنبل ١/٣١٣، رقم: ٢٨٦٧، المعجم الكبير للطبراني، دار احياء التراث العربي ٢/٨٦، رقم: ١٣٨٧)

اسی کی روشنی میں علامہ شامیؒ نے اپنی کتاب ''تنبیہ الرقود علی مسائل العقود'' میں ایسے مسائل میں درمیان کا راستہ جانبین کی تراضی کے ساتھ اختیار کرنے کو بہتر لکھا ہے، لہٰذا دونوں جانب کے لوگ آپس میں بیٹھ کر دس ہزار اور دو لاکھ کے درمیان میں کسی خاص مقدار پر صلح کر کے راضی ہوجائیں اور بہنوں کو اسی کی ادائیگی کر دیں۔

وإنما الشبهة فيما تعارفه الناس من الشراء بالقروش و دفع غيرها بالقيمة فليس هنا شيئ معين حتى تلزمه به سواء غلا أو رخص ووجهه ما أفتى به بعض المفتيين كما قدمنا آنفا وقوله فإذا باع شخص سلعة بمأة قرش مثلا ودفع له المشتري بعد الرخص ما صارت قيمته تسعين قرشا من

الريال أو الذهب مثلاً ليحصل للبائع ذٰلک المقدار الذی قدره و رضی به ثمنا لسلعته لكن قد يقال لما كان راضيا وقت العقد بأخذ غير القروش بالقيمة من أى نوع كان صار كأن العقد وقع على الأنواع كلها فإذا رخصت كان عليه أن يأخذ بذٰلک العيار الذی كان راضيا به وإنما اخترنا الصلح لتفاوت رخصها وقصد الإضرار كما قلنا، وفی الحديث: لا ضرر ولا ضرار فی قوله أما إذا صار ما كان قيمته مأة من نوع يساوی تسعين ومن نوع آخر خمسة و تسعين ومن آخر ثمانية و تسعين، فإن ألزمنا البائع بأخذ ما يساوی التسعين بمأة فقد اختص الضرر به وإن ألزمنا المشتری بدفعه بتسعين اختص الضرر به فينبغی وقوع الصلح على الأوسط. (تنبيه الرقود على مسائل النقود، رسائل ابن عابدين، ثاقب بکڈپو دیوبند ٢/٦٧) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۱۴؍محرم الحرام ۱۴۳۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۸۳۰)	۱۴۳۶/۱/۱۴ھ

قرعہ اندازی کے ذریعہ مشترکہ موروثہ حصہ کی تعیین

سوال [۱۱۲۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عبدالصمد مرحوم کے چار بیٹے ہیں: رفیق احمد، عبدالعزیز، عبدالغنی، عبدالحق، ان سب کا ایک ہی مکان ہے، یہ مکان ۲۰۰؍گز آراضی میں بنا ہوا ہے، سب سے بڑے بیٹے رفیق احمد مرحوم ہیں، ان کے بچے مکان کے اگلے حصہ میں رہتے ہیں، اور ہمیشہ سے اسی میں رہتے آئے ہیں، رفیق احمد کے برابر میں عبدالعزیز رہتے ہیں، اوپر کے اگلے حصہ میں عبدالغنی رہتے ہیں، اور اوپر کے پچھلے حصے میں عبدالحق رہتے ہیں، اور یہ سب ہمیشہ سے ایسے ہی رہتے آئے ہیں، اب یہ آپس میں گھر تقسیم کرنا چاہتے ہیں، مکان کی تقسیم زمین سے ہی ہونی ہے، لہٰذا آپ یہ بتائیے کہ اگلا حصہ رفیق احمد کا ہے یا ان کے اوپر عبدالغنی جو رہتے ہیں ان کا ہے، رفیق احمد ہمیشہ

اگلے حصہ میں رہتے ہیں، برائے کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں مفصل جواب تحریر کریں۔

المستفتی: محمد شریف پیرزادہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جوآدمی جس حصہ میں رہ رہا ہے اس کو اس حصہ میں دوسرے شرکاء کی رضا مندی سے رہنے اور ملکیت میں لینے کا حق ہوسکتا ہے، اگر آپس میں رضا مندی نہیں ہے تو پورے مکان کو چار حصوں میں برابر تقسیم کیا جائے اس کے بعد رضا مندی اور خوشی سے ہر ایک حصہ دار ایک ایک حصہ لے لے اور اگر رضا مندی نہیں تو قرعہ ڈالا جائے اور جس کے نام جو حصہ نکلتا رہے وہ وہ حصہ لیتا جائے۔

عن عامر يقول: سمعت النعمان بن بشير عن النبي ﷺ قال: مثل القائم على حدود الله عز و جل والواقع فيها كمثل قوم استهموا على سفينة فأصاب بعضهم أعلاها و بعضهم أسفلها. (صحيح البخاري، الشركة، باب هل يقرع في القسمة والاستهام فيه، النسخة الهندية ١/٣٣٩، رقم: ٢٤٢٩، ف: ٢٤٩٣)

ويفرز كل نصيب عن الباقي بطريقه وشربه ...... ثم يلقب نصيبا بالأول والذي يليه بالثاني والثالث على هذا ثم يخرج القرعة فمن خرج اسمه أولا فله السهم الأول ومن خرج ثانيا فله السهم الثاني. (هدايه، كتاب القسمة، فصل في كيفية القسمة، اشرفي ديو بند ٤/٤١٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۴۴۷۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۶/۱۰ھ

میت کا قرض کون ادا کرے، نیز تقسیم جائیداد کے لیے قرعہ اندازی

سوال [۱۱۲۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے والد حاجی اشتیاق حسین ولد مشتاق حسین ساکن محلّہ شیدی سرائے

مرادآباد کا انتقال ہو چکا ہے، میرے والد صاحب کی دو بیویاں ہیں، پہلی بیوی حسن جہاں، ان کے تین لڑکے: محمد اقبال، محمد اسلام، محمد اکرام، تین لڑکیاں: ثمر جہاں، فردوس جہاں، کوثر جہاں، دوسری بیوی عشرت جہاں، ان کے چار لڑکے: شہزادانور، تاج انور، نور رانور، نفیس انور ہیں، میرے والد صاحب کے تین قطعہ مکان ہیں، مکان کی آراضی ایک مکان ۳۰۰ ؍ورگ میٹر کا ہے، دوسرا مکان ۲۵۰ ؍ ورگ میٹر کا ہے، تیسرا مکان ۲۰۰ ؍ورگ میٹر کا ہے، تینوں مکانوں کا کل رقبہ ۷۵۰ ورگ میٹر ہے۔

برائے مہربانی اس کا شرعاً فیصلہ دیں کہ ہم سب وارثوں کے حصہ میں کتنی کتنی ورگ میٹرز مین آئے گی، اوراس جائیداد کا بٹوارہ آپسی مصالحت سے کریں یا قرعہ سے کریں، شرعاً اورحدیث کے ذریعہ سے بتائیں اوراس کا فیصلہ دیں، اوراگر میرے والد صاحب پر کسی بھی طرح کا قرضہ ہوتو کون ادا کرے گا؟

المستفتی: حاجی محمد اسلام ولد حاجی اشتیاق، شیدی سرائے مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ما تقدم وعدم موانع ارث اشتیاق احمد کا ترکہ حسب ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا۔

۱۳٦ / ۲۷۲ / ۸ ۔۔۔۔ ۳۷۵ / ۷۵۰

حاجی اشتیاق میت

زوجہ حسن جہاں	زوجہ عشرت جہاں	ابن اقبال	ابن اسلام	ابن اکرام	ابن شہزادانور	ابن تاج انور	ابن نورانور	ابن نفیس انور	بنت ثمر جہاں	بنت فردوس	بنت کوثر
	۱				۷						
۱۷	۱۷	۲۸	۲۸	۲۸	۲۸	۲۸	۲۸	۲۸	۱۴	۱۴	۱۴
۴٦ ۱۱۹/۱۳٦	۴٦ ۱۱۹/۱۳٦	۷۷ ۲۸/۱۳٦	۷۷ ۲۸/۱۳٦	۷۷ ۲۸/۱۳٦	۷۷ ۲۸/۱۳٦	۷۷ ۲۸/۱۳٦	۷۷ ۲۸/۱۳٦	۷۷ ۲۸/۱۳٦	۳۸ ۸۲/۱۳٦	۳۸ ۸۲/۱۳٦	۳۸ ۸۲/۱۳٦

حاجی اشتیاق احمد کا کل ترکہ ۲۷۲ سہام میں تقسیم ہوکر اسی کے تناسب سے ترکہ میں سے ہر فرد کو اتنا ملے گا جتنا اس کے نام کے نیچے درج ہے، اور والد مرحوم کا قرضہ ان کے مابقیہ

جمیع مال سے ادا کیا جائے گا۔

ثم تقضیٰ دیونه من جمیع ما بقی من ماله. (سراجی / ٤)

جائیداد کو شرعی اعتبار سے برابر تقسیم کیا جائے، البتہ کون سا جانب کس کو ملے گا؟ اس کے لیے قرعہ اندازی کی اجازت ہے، تاکہ کسی طرح کا اعتراض نہ رہے۔

عن عامر یقول: سمعت النعمان بن بشیر عن النبی ﷺ قال: مثل القائم علی حدود الله عز و جل والواقع فیها کمثل قوم استهموا علی سفینة فأصاب بعضهم أعلاها و بعضهم أسفلها. (صحیح البخاری، الشرکة، باب هل یقرع فی القسمة والاستهام فیه، النسخة الهندیة ۱/۳۳۹، رقم: ۲۴۲۹، ف: ۲۴۹۳)

ویعدله علی سهام القسمة ......والقرعة لتطییب القلوب و إزاحة تهمة المیل حتی لو عین لکل منهم نصیبا من غیر اقتراع جاز. (هدایه کتاب القسمة فصل فی کیفیة القسمة، اشرفی ٤/٤١٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۲۶ر جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۴/۶۱۷)	۱۴۲۰/۵/۲۶ھ

موروثی مکان کو چھڑانے میں صرف شدہ رقم کا حکم

سوال [۱۱۳۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سائل واحد نور نے اپنے مکان محلّہ کسرول والے کا ایک کمرہ کرایہ دار سے خالی کرایا، جس میں ۲۶ر ہزار روپیہ خرچ ہوئے اس کا بار کس وارث کو کتنا اٹھانا ہوگا، حاجی محمد ظہور کے ورثاء میں ۴ر لڑکے ایک لڑکی ہے، اسی طرح اس مکان میں ایک کرایہ دار رہ رہا ہے، اور وہ بھی روپیہ لے کر خالی کرے گا تو وہ کون ادا کرے گا؟ سب برابر کے شریک رہیں گے یا نہیں؟

المستفتی: واحد نور نئی بستی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مکان کے خالی کرنے میں جو رقم خرچ ہوئی ہے

اس میں تمام ورثاء اپنے اپنے حصہ کے بقدر خرچ کے ذمہ دار ہوں گے، اوراسی طرح آئندہ جو مکان خالی کرانا ہےاس میں بھی تمام ورثاء اپنے اپنے حصہ کے بقدر خرچ کے ذمہ دار ہوں گے۔

ولو قضیٰ الدین بعض الورثة فله الرجوع علی الباقین شرط أو لم يشترط. (هندیه، الباب الثامن فی قسمة الترکة و علی المیت أو له دین، زکریا قدیم ٥/٢٢٢، جدید ٥/٢٥٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷ر ربیع الاول ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۱۳۱۷/۴)

ایک وارث کے حصہ میں کم قیمت کی جائیداد آئے تو کیا حکم ہے؟

سوال [۱۱۳۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم چھ بھائی اور چار بہنیں ہیں، والد کا ترکہ آپس میں آپ کے فتویٰ ''الف ۳۳/ ۵۴۲۰'' کے مطابق تقسیم کرلیا ہے، لیکن اب پوچھنا یہ ہے کہ کچھ بھائیوں کا حصہ سڑک کی طرف ہے، جو قیمتی ہے، اور کچھ لوگوں کا سڑک سے ہٹ کر اندر ہے، تو جن لوگوں کا حصہ سڑک کی طرف ہے، کیا ان کو حصہ قیمتی ہونے کی وجہ سے دیگر بھائیوں، بہنوں کو کچھ رقم یا زمین زیادہ دینا چاہیے یا نہیں؟ شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: ریاض الحسن، کالا پیادہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب تقسیم جائیداد میں کسی وارث کے حصہ میں کم قیمت کی جائیداد آئے اور دوسرے کے حصہ میں زیادہ قیمتی حصہ پہنچ جائے تو ایسی صورت میں شرعی حکم یہ ہے کہ جتنی زائد قیمت قیمتی حصہ کو پہنچتی ہے، اس کا حساب لگا کر دوسرے وارث کو اتنی قیمت دیدے جس سے دونوں وارثوں کی جائیداد کی قیمت برابر ہوجائے، مثال کے طور پر ایک کی جائیداد کی قیمت دس ہزار ہے، اور دوسرے کی جائیداد کی قیمت بارہ ہزار ہے، تو بارہ ہزار والا ایک ہزار

روپیہ دس ہزار والے کوادا کردے تو دونوں کے حصے گیارہ گیارہ ہزار کے بن جائیں گے۔

ثم يرد من وقع البناء فی نصيبه دراهم من الآخر بقدر فضل البناء لأنه أكثر قيمة من العرصة غالبا (أو من كان نصيبه أجود) أی أو يرد من كان نصيبه أجود سواء كان الذی هو أصابه البناء لو أصابه العرصة دراهم على الآخر حتى يساويه فتدخل الدراهم فی القسمة لأجل ضرورة المعادلة.

(البناية فی شرح الهداية، اشرفيه ديوبند ۱۱/ ۴۳۴-۴۳۵)

وعلى هٰذا: الأصل يخرج ما إذا اقتسما دارا و فضلا بعضها على بعض بالدراهم أو الدنانير لفضل قيمة البناء، والموضع أن القسمة جائزة؛ لأنها وقعت عادلة من حيث المعنى؛ لأن الدار قد يفضل بعضها على بعض بالبناء والموضع فكان ذٰلک تفضيلا من حيث الصورة تعديلا من حيث المعنى ولو لم يسميا قيمة فضل البناء وقت القسمة جازت القسمة استحسانا وتجب قيمة فضل البناء وإن لم يسمياها فی القسمة. (بدائع الصنائع، كتاب القسمة، فصل فی صفات القسمة، زكريا ۵/ ۴۷۷، كراچی ۷/ ۲۷-۲۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۵۹۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۴/۱۳ھ

دو بھائیوں کے درمیان فرنٹ کے حصہ کی زمین کی تقسیم

سوال [۱۱۳۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ فضل حسن ونور الحسن دونوں حقیقی بھائی ہیں، ان کے والد کی کافی جائیداد تھی، دونوں بھائیوں کے حصے میں جو جائیداد تقسیم کی رو سے آئی ہے اس کی شکل یوں ہے کہ ایک قطعہ زمین ۶۸۰/ میٹر ہے، یہ زمین پیچھے کی جانب ہے اور ایک زمین ۶۶۵/ میٹر ہے، یہ مین سڑک سے ملی ہے، اب دونوں بھائیوں میں تقسیم اس طریقہ سے ہوئی کہ پیچھے کی جانب کی

٦٨٠ / میٹر مکمل فضل حسن کے حصہ میں آئی اور ٣٧ / میٹر مین سڑک والی زمین میں سے آئی تو ٥٣٧ / میٹر فضل حسن کے حصہ میں آئی اور سڑک کے حصہ میں سے ٣٧ / میٹر فضل حسن کو دینے کے بعد باقی ٥٩١ / میٹر رہ جاتے ہیں، یہ نور الحسن کے حصہ میں آئی، اتنی بات میں کوئی اختلاف نہیں، اب دونوں بھائیوں میں یہ اختلاف ہوا کہ سڑک کی جانب سے فرنٹ میں سے نور الحسن کو کتنا ملنا چاہیے اور فضل حسن کو کتنا ملنا چاہیے، نور الحسن کا کہنا ہے کہ زمین کی مقدار کے حساب سے فرنٹ کا حصہ تقسیم ہوگا، فضل حسن کہتا ہے کہ فرنٹ کا حصہ دونوں میں برابر تقسیم ہوگا، اس پر نور الحسن کہتا ہے، اگر فرنٹ میں سے فضل حسن کو برابر ملتا ہے تو مجھے ١٦٢ / میٹر کم لینے کا کیا شوق ہے؟ مجھے جو ١٦٢ / میٹر کم مل رہا ہے وہ صرف فرنٹ کی جانب کم ہونے کی وجہ سے یہ کمی برداشت کرنی پڑ رہی ہے، اگر فرنٹ دونوں کو برابر ملتا ہے تو مجھے اس کمی کا کیا شوق ہے؟ اس کمی کی وجہ صرف یہی ہے کہ فرنٹ کا حصہ زیادہ مل رہا ہے، اب مفتی صاحب شرعی حکم بتلادیں کہ فرنٹ کے حصہ کا پلاٹ کس طرح تقسیم ہوگا، جس کی لمبائی ٢١ / میٹر اور گہرائی ٣١ / میٹر ہے، سوال یہ ہے کہ ٦٦٥ / میٹر میں سے ٣٧ / میٹر کس طریقے سے نکال کر فضل حسن کو دیا جائے جو بھی شرعی حکم ہو، واضح فرمائیں؟

المستفتی: حافظ نور الحسن ولد حافظ محمد حسن محمد ڈیریا، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سوالنامہ کے ساتھ ساتھ سائل نے جائیداد کے محل وقوع کا نقشہ بھی پیش کیا ہے، جائیداد کے محل وقوع اور سوالنامہ دونوں پر شرعی طور پر غور کیا گیا، ٦٦٥ / میٹر میں سے جب فضل حسن کے حصہ میں ٣٧ / میٹر آیا ہے اور فرنٹ کا حصہ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ٢١ / میٹر ہے تو شرعی طور پر ٣٧ / میٹر کے تناسب سے پوری زمین میں نسبت دیکھی جائے گی تو پوری زمین ٣٧ / میٹر کے تناسب سے کل ٩ / حصے بن جاتے ہیں، تو گویا کہ ٣٧ / میٹر آرہا ہے، لہٰذا نو سہاموں میں سے ہر سہام کی چوڑائی فرنٹ کی طرف سے ٧ / فٹ ٧ / انچ رہے گی اور اسی چوڑائی کے ساتھ ہر ایک کی گہرائی ٣١ / میٹر رہے گی، لہٰذا فضل حسن کو شرعی طور پر فرنٹ کی طرف سے ٧ / فٹ ٧ / انچ چوڑائی ملے گی، یہی اس کا

شرعی حق ہوگا، اس سے زیادہ مطالبہ کا حق نہیں ہے۔

والأصل: أن ینظر فی ذٰلک إلی أقل الأنصباء حتی إذا کان الأقل ثلاثا جعلها أثلاثا وإن کان سدسا جعلها أسداسا لیمکن القسمة. (هدایه، کتاب القسمة، فصل فی کیفیة القسمة، اشرفی دیوبند ٤/ ٤١٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۸۰۰۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/ ۴/ ۱۴۲۴ھ

بھائیوں کی آپسی تقسیم کے بعد بھتیجے کا چچا کی ملکیت میں دعویٰ کرنا

سوال [۱۱۳۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: چار باغ ہیں اور چار ہی بھائی ہیں، اور چاروں باغوں میں چاروں کے نام ہیں، ۱۹۷۷ء میں چاروں بھائیوں کو ایک ایک باغ مل جاتا ہے، اور یہ بٹوارہ چاروں بھائیوں نے خود ہی کیا تھا اور سرکاری اسٹامپ پر گواہوں کی موجودگی میں سب کے دستخط کروالیے گئے جو کہ سب کے پاس موجود ہیں، اور آج تک اپنی اپنی جگہوں پر قابض ہیں، لیکن آج تک چاروں باغوں میں چاروں بھائیوں کے نام چلے آرہے ہیں، بعد میں دو بھائیوں کا انتقال ہوجاتا ہے، اور ان کی اولاد مالک ہوجاتی ہے، ان میں سے ایک لڑکا کہتا ہے کہ میں ان اسٹامپوں کے فیصلہ کو نہیں مانتا، میرا چچا کے مال میں چوتھائی کا حصہ نکلتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ کے نقطۂ نظر سے چچا کے مال میں بھتیجہ کا حصہ نکلتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: امتیاز علی عرف بٹو، حسن پور جے پی نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب چاروں بھائیوں نے آپسی رضامندی سے باضابطہ طور پر چاروں باغات تقسیم کرلیے ہیں اور ہر ایک نے ایک ایک باغ پر قبضہ بھی کرلیا ہے تو ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے باغ کے شرعی طور پر مالک ہوچکے ہیں، اور اس

تقسیم کے بعد کسی کا حق دوسرے کے حصہ میں باقی نہیں رہتا، لہٰذا ان بھائیوں کے کسی لڑکے کا اپنے چچا کے باغ میں سے کسی حق کا مطالبہ کرنا جائز نہیں۔

رجل مات و ترک دارا و ابنین فاقتسما الدار و أخذ کل واحد منهما النصف، واشهد علی القسمة والقبض والوفاء ثم ادعی أحدهما بیتا فی ید صاحبه لم یصدق علی ذٰلک. (هندیه، الباب الحادی عشر فی دعویٰ الغلط فی القسمة ط زکریا جدید ٥/٢٦٣-٢٦٤، قدیم ٥/٢٢٨)

وأما حکم القسمة فتعیین نصیب کل واحد منهم من نصیب صاحبه بحیث لا یبقی لکل واحد منهم تعلق بنصیب صاحبه. (هندیه، القسمة، الباب الأول، زکریا جدید ٥/٢٣٧، قدیم ٥/٢٠٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۵۵۹/۳۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۴/۸ھ

تین سو گز میں بنے دو منزلہ مکان کی دو لڑکوں کے درمیان تقسیم

سوال [۱۱۳۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ محمد لئیق صاحب کا انتقال ہوا، دو لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں، تقسیم ترکہ میں شرعی طور پر جو بھی حصہ لڑکیوں کا بن سکتا تھا، وہ لڑکیوں کو دیدیا گیا، اور لڑکیوں کے حصہ میں دو مکان آئے جس میں سے ایک مکان ۸۰؍گز میں بنا ہوا ہے، اور دوسرا دو سو بیس گز میں بنا ہوا ہے، اور دونوں مکان دو منزلہ بنے ہوئے ہیں، اب ان دونوں بھائیوں کے درمیان کل تین سو گز کس طریقے پر تقسیم ہوگا، اگر ڈیڑھ ڈیڑھ سو ڈیڑھ سو گز تقسیم کرتے ہیں تو کسی کے عملہ میں عمارتی حصہ زائد پہنچتا ہے، تو ایسی صورت میں شرعی تقسیم کس طرح سے ہوگی؟ وضاحت فرمادیں، جس میں زمین دونوں بھائیوں میں برابر برابر پہنچے، اور عملہ بھی برابر برابر پہنچے۔

المستفتی: محمد اسجد تمبا کو والان مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر تین سوگز زمین کی کیفیت اس طریقہ سے ہے کہ ۸۰؍گز الگ سے ہے وہ بھی دومنزلہ بنا ہوا ہے، اور دوسوبیس گز الگ سے ہے، وہ بھی دومنزلہ بنا ہوا ہے، اوراس میں چالیس گز کا آنگن بھی ہے، تو شرعی طور پر دوبھائیوں کے درمیان تقسیم ہونے کی صورت یہ ہوگی، کہ دونوں کے پاس ڈیڑھ سو، ڈیڑھ سوگز زمین پہنچ جائے، تو ۸۰؍گز عمارت مکمل ایک شخص کے پاس آجائے، اور دوسوبیس گز والی عمارت میں سے ستر گز زمین مع عملہ کے اس کودی جائے، تو اس طریقہ سے اس کے پاس ایک سو پچاس گز پہنچ جائے گی اور باقی ڈیڑھ سو گز مع عملہ کے دوسرے بھائی ......کو پہنچے گی، اس کے بعد دونوں کے عملہ کا حساب لگادیا جائے، جس کے پاس عملہ زیادہ پہنچ رہا ہے تو وہ حساب لگا کر دوسرے فریق کو زیادہ کی قیمت ادا کردے، تاکہ دونوں طرف برابر کا حساب ہوجائے، اس طریقہ سے شرعی تقسیم ہوسکتی ہے۔

وإذا كان أرض و بناء فعن أبي يوسف أنه يقسم كل ذٰلك على اعتبار القيمة لأنه لايمكن اعتبار المعادلة إلا بالتقويم، وعن أبي حنيفةؒ أنه يقسم الأرض بالمساحة لأنه هو الأصل في الممسوحات ثم يرد من وقع البناء في نصيبه أو من كان نصيبه أجود دراهم على الآخر، حتى يساويه فتدخل الدراهم في القسمة ضرورة. (هدايه، كتاب القسمة، فصل في كيفية القسمة، اشرفي ديوبند ٤/ ٤١٦) **فقط واللّٰہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۶۵۰/۳۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۵/۱۹ھ

تقسیم کے بعد دوسرے بھائی کی ملکیت میں حصہ داری کا دعویٰ

سوال [۱۱۳۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تین بھائیوں کے مکانات مشترک تھے، جن میں دو کمرے مع برآمدے کے اور

ایک بیٹھک تھی، ابھی باقاعدہ تقسیم نہیں ہوئی تھی، بڑا بھائی بیٹھک میں اور بچلا بیچ والے گھر میں، چھوٹا طرف والے کمرے میں رہتا تھا، چھوٹے بھائی نے اپنا حصہ بڑے بھائی کو رہنے کے لیے دیدیا، اور بیٹھک میں بڑے بھائی کو بطور ہمدردی دوکان کرادی اس کے بعد چھوٹے بھائی نے اپنا حصہ بچلے بھائی کو بیچ دیا، اب بچلے بھائی نے بیٹھک کی طرف والے حصے کو جو زیادہ قیمت کا تھا اپنے حصے میں شامل کرلیا، اور طرف والا مکان بڑے بھائی کو دیدیا، اس کے بہت دنوں کے بعد بچلے بھائی نے سڑک کی طرف والے حصہ میں دوکانیں تعمیر کروالیں، اس وقت بھی بڑا بھائی خاموش رہا، دوکانیں بن جانے کے بعد بڑے بھائی نے کہا کہ میرا حصہ سڑک کی طرف والا ہے، چار آدمیوں میں یہ فیصلہ ہوگیا کہ بچلا بھائی بڑے بھائی کا برآمدہ صحیح کرکے بنوادیگا، جس سے اس زائد قیمت کی تلافی ہوجائے گی، اس پر فریقین رضامند ہوگئے، بعدہٗ بڑے بھائی کا انتقال ہوگیا، اور بچلے بھائی نے حسب وعدہ برآمدہ بنوادیا، لیکن اب بڑے بھائی کے اہل وعیال یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں ایک دوکان دینی پڑے گی، اس لیے کہ تم نے زیادہ قیمت والا حصہ لیا ہے، شرعی فیصلہ سے آگاہ فرمائیں، کرم ہوگا۔

المستفتی: اسرار احمد نجیب آباد، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب آپس کی تراضی سے بٹوارہ ہوا ہے اور بعد میں بڑے بھائی کے برآمدہ صحیح کرکے بنوادینے پر فریقین راضی ہوگئے تھے، اور صحیح کرکے بنوا بھی دیا، پھر اس کے بعد دوکانیں بن جانے کے بعد اس میں سے بھی لینے کے لیے دعویٰ کرنا شرعاً معتبر نہ ہوگا، دعویٰ باطل ہوگا۔

ثم ادعیٰ صاحب الأوكس غلطا في التقويم لم تقبل بينته في ذٰلك لأن القسمة منهم إقرار بالتساوي فإذا ادعى التفاوت وقد أنكر ما أقر به فلا يسمع ولم يفصل بينهما إذا كانت القسمة بالقضاء أو بالتراضي. (بنايه، كتاب القسمة، باب دعوىٰ الغلط في القسمة اشرفيه ديوبند ۱۱/ ۴۵۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۲۶۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۱۸/۴/۲۹ھ

الاشباہ کی مشکل عبارت کا حل اور دو عورتوں کی میراث کا معمہ

سوال [۱۱۳۰۶]: رجل قيل لـه أوص .... فقـال بمـا أوصـى .... إنما ترثني عمتاك و خالتاك و أختاك و جدتاك و زوجتاك فقل .... تزوج بجدتي رجل مريض أم أمه و أم أبيه والمريض متزوج بجدتي الصحيح كذلك فولدت كل من جدتى الصحيح من المريض بنتين فالبنتان من جدتى الصحيح أم أمه خالتاه واللتان من أم أبيه عمتاه وقد كان المريض متزوجا أم الصحيح فولدت بنتين فهما أختاه الصحيح لأمه والمريض لأبيه فإذا مات المريض ولامرأته الثمن وهما جدتا الصحيح ولبناته الثلثان وهن عمتا الصحيح و خالتاه و لجدتيه السدس وهما امرأتا الصحيح ولأختيه لأبيه ما بقى وهما أختا الصحيح لأمه والمسئلة تصح من ثمانية و أربعين.

مذکورہ عبارت کواچھی طرح حل فرمائیں، اور ہر ایک کے رشتے کی وضاحت فرمائیں:

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایک شخص مرض الوفات میں مبتلا ہے اس سے کسی نے کہا کہ آخری وقت ہے میرے لیے بھی کچھ وصیت کر کے جاؤ، تو اس کے جواب میں اس بیمار شخص نے کہا کہ میں کس کے لیے وصیت کروں، میری میراث کی مستحق تو تیری دونوں پھوپھیاں، تیری دونوں خالائیں، تیری دونوں دادیاں، اور نانی، تیری دونوں بہنیں اور تیری دونوں بیویاں ہی بن رہی ہیں لہٰذا میرا ترکہ سب لوٹ کر تیرے ہی پاس جائے گا، لہٰذا وصیت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اب رہی یہ بات کہ مریض شخص کا قول کہ تیری پھوپھیاں، خالائیں، دادیاں، بہنیں، اور بیویاں وارث بن رہی ہیں، اس کی شکل کیا ہوگی، اور ایک کا دوسرے سے کیا رشتہ بنے گا۔

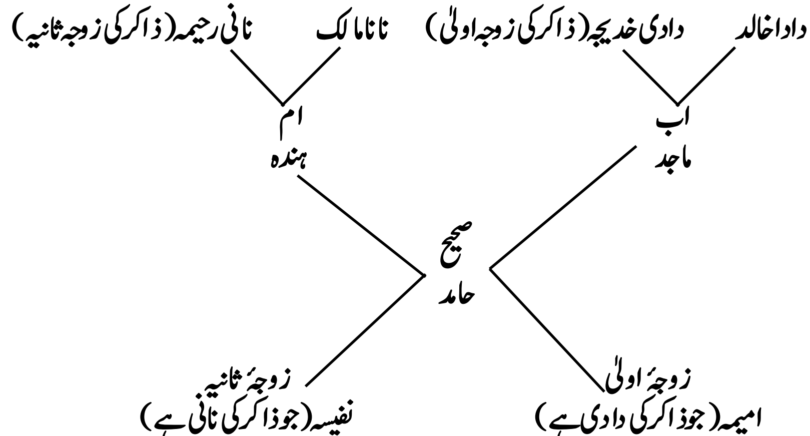
تو یہ بات غور طلب اور وضاحت طلب ہے جس کو مصنفؒ نے اپنے قول ”فقل

تزوج'' سے بیان کیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک صحیح اور تندرست شخص نے قریب الموت شخص کی دادی اور نانی سے شادی کر رکھی ہے، یعنی قریب المرگ شخص کی دادیاں صحیح اور تندرست شخص کی بیویاں ہیں، اسی اعتبار سے قریب المرگ شخص کہہ رہا ہے کہ تیری دونوں بیویاں میرے ترکہ کی مستحق اور وارث ہوں گی، کیونکہ یہ دونوں اس کے رشتہ کی دادیاں ہیں اور دادیوں کو ثمن ملتا ہے، اولاد کی موجودگی میں، اسی طرح قریب المرگ شخص صحیح شخص کی دادی اور نانی سے شادی کر چکا ہے اور ان میں سے ہر ایک سے دو دو لڑکیاں ہوئی ہیں۔

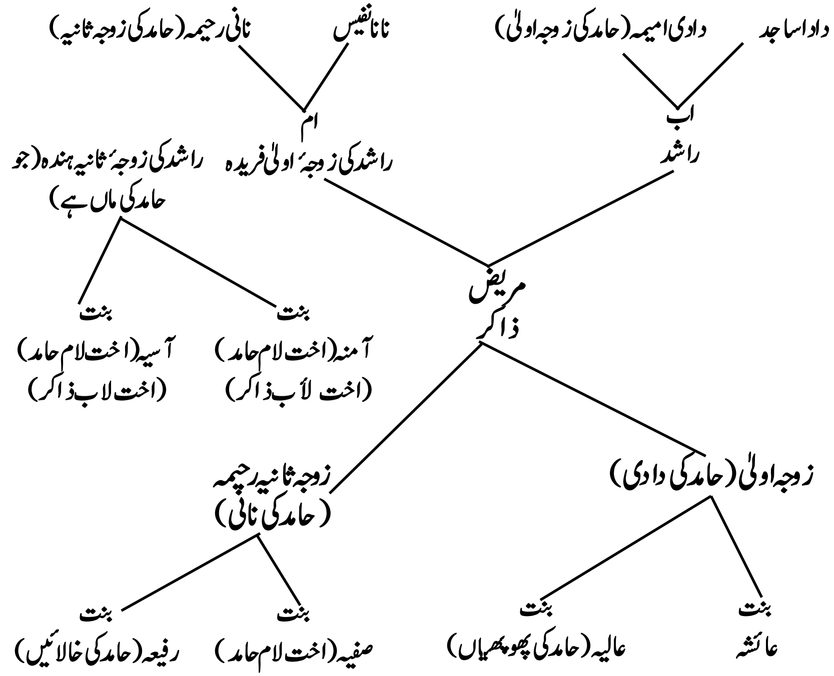
اب اس قریب المرگ شخص کا یہ کہنا کہ میرے انتقال کے بعد میری دونوں بیویوں کو میراث ملنے والی ہے جو تمہاری دادیاں ہیں بالکل صحیح ہے، کیونکہ قریب المرگ شخص کی دونوں بیویاں صحیح کی دادی اور نانی ہیں اسی طرح اس کا قول کہ تیری دونوں پھوپھیوں کو میری میراث سے ملنے والا ہے، صحیح ہے، کیونکہ قریب الموت شخص کی وہ دو لڑکیاں جو صحیح کی دادی سے پیدا ہوئی ہیں وہ صحیح کی پھوپھیاں اور قریب المرگ کی لڑکیاں بنتی ہیں، اسی طرح مریض کا قول کہ تیری دونوں خالائیں وارث بنیں گی، صحیح ہے کیونکہ مریض کی وہ دو لڑکیاں جو صحیح کی نانی سے پیدا ہوئی ہیں وہ صحیح شخص کے لیے خالہ اور قریب المرگ کی لڑکیاں ہوتی ہیں، پس مریض کی دونوں بیویوں یعنی صحیح کی دادی اور نانی کو ثمن ملے گا، اور مریض کی چاروں لڑکیوں کو یعنی صحیح کی دونوں خالاؤں اور پھوپھیوں کو ثلثان ملے گا، نیز مریض شخص کے باپ نے صحیح کی ماں سے شادی کر رکھی ہے اور اس سے دو لڑکیاں ہیں، یہ دونوں لڑکیاں قریب المرگ شخص کی باپ شریک بہنیں بنتی ہیں، جبکہ صحیح شخص کی ماں شریک بہنیں بنتی ہیں، لہٰذا قریب المرگ شخص کا قول کہ تیری دونوں بہنیں بھی وارث بن رہی ہیں، بالکل صحیح ہے کیونکہ اس کی باپ شریک بہنیں صحیح کی ماں شریک بہنیں بن رہی ہیں، اب صورت مسئولہ میں ثمن، ثلثان، سدس پانے والے جمع ہوگئے۔

لہٰذا مسئلہ بنا ۲۴ر سے، پھر عدد رؤس اور سہام کے درمیان نسبت دیکھی تو کسر واقع ہو رہا ہے، پھر عدد رؤس اور عدد رؤس کے درمیان نسبت دیکھی تو تماثل کی نسبت ہے، لہٰذا کسی ایک عدد کو لے کر اصل مسئلہ میں ضرب دیا تو مسئلہ کی تصحیح ۴۸ر سے ہوئی، جیسا کہ حسب ذیل نقشہ سے واضح ہے:

صحیح شخص کی تفصیل



مریض شخص کی تفصیل



ذاکر میت $\frac{۴۸}{۲۴}$

زوجۂ اولیٰ	زوجۂ ثانیہ	دادی	نانی	بنت	بنت	بنت	بنت	اخت لاب	اخت لاب
خدیجہ	رحیمہ	امیمہ	نفیسہ	عائشہ	عالیہ	صفیہ	رفیعہ	آمنہ	آسیہ
$\frac{۳}{۶}$		$\frac{۴}{۸}$			$\frac{۱۶}{۳۲}$			$\frac{۱}{۲}$	
۳	۳	۴	۴	۸	۸	۸	۸	۱	۱

مسئلہ کی تصحیح ۴۸؍ سے ہوکر ہر وارث کو اتنا ملے گا جو اس کے نیچے درج ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۹۹۸)

۲ باب میت کے قرض کا بیان

قرض کی ادائیگی کیلئے مکان کوفروخت کرنے سے اولاد کوروکنے کا حق نہیں

سوال [۱۱۳۰۷]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) بندہ جس مکان میں رہائش پذیر ہے وہ سائل واہلیہ کی ملکیت ہے، دونوں حیات ہیں، اور کسی مرض الموت میں بھی مبتلانہیں ہیں، ایسی صورت میں سائل کا سوال یہ ہے کہ اس مکان میں اولاد کا حق ہے یانہیں؟

(۲) یہ کہ سائل مقروض ہے بظاہر ادائیگی کی کوئی صورت نہیں کہ سائل اس کوفروخت کرکے قرضہ ادا کردے، کیاایسی صورت میں میری کسی اولاد کے لیے یہ جائز ہے کہ مکان بکنے میں ایسی رکاوٹیں ڈالے جونا قابل قبول ہوں، اورقرضہ ادا کرنے کی وہ ترکیب بتلائیں جونا قابل قبول ہواورخود اپنے پاس سے ادا کرے؟

المستفتی: عبدالعزیز دوکاندارنزدمدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱-۲) آپ کواپنامکان فروخت کرکےقرضہ ادا کرنے کا ہروقت شرعی طور پرحق حاصل ہے، اولادکواس میں رکاوٹ ڈالنےکاشرعاً کوئی حق نہیں ہے۔

المالک هو المتصرف فی الأعیان المملوکة کیف شاء من الملک. (بیضاوی شریف رشیدیه ۱/ ۷)

المالک للشیئ هو الذی یتصرف فیه باختیاره ومشیئته. (بدائع الصنائع، النکاح، فصل فی بیان مایبطل به الخیار زکریا ۲/۶۳۸، کراچی ۲/ ۳۲۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفااللہ عنہ

۱۶/ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۷۶۷)

قرض کی ادائیگی تقسیم میراث پر مقدم ہے

سوال [۱۱۳۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے والد سریع الاسلام صاحب نے کچھ روپیہ بینک سے اپنے کاروبار کے واسطے قرض لیا، میرے والد صاحب نے حصۂ مکان کے کاغذ قرض کے عوض میں دیدیئے، کافی عرصہ گذر جانے کے بعد انہوں نے بینک کی ادائیگی نہیں کی، اس طرح ان پر بینک کا بیاج کافی زیادہ ہوگیا اور اسی قرضہ میں ان کا انتقال ہوگیا، بینک والے برابر اطلاع دیتے رہے، بوقت انتقال میرے والد صاحب پہلی بیوی سے: رفیع الاسلام، سمیع الاسلام، سید اسلام، معراج الدین اور پھول جمال بیگم اور دوسری بیوی سے میری والدہ عائشہ پروین، نورالاسلم، محمد شعیب، محمد شفف، یاسمین جہاں، شہناز پروین وارثان چھوڑے ہیں، مجبوراً ہم تین بھائیوں نے رفیع الاسلام، سمیع الاسلام، معراج الدین نے بینک کی نیلامی میں اس حصۂ مکان کو خرید لیا، بینک نے کاغذی رو سے بھی مکان کا حصہ ہمارے نام کردیا ہے، سوال یہ اٹھتا ہے کہ حصۂ مکان کس کا ہوگا؟

المستفتی: سمیع الاسلام

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: آپ کے والد سریع الاسلام صاحب کے ذمہ چونکہ بینک کا قرض تھا، اس لیے وارثین پر ضروری تھا کہ وہ تجہیز وتکفین کے بعد ہونے والے ترکہ سے قرض ادا کرتے، اس کے بعد ہی بچے ہوئے ترکہ میں وراثت جاری ہوتی، اس لیے آپ تینوں بھائیوں نے باپ کے حصے کا جو نیلامی مکان بینک سے خریدا ہے اتنی قیمت کو ترکہ میں سے الگ کیا جائیگا، گویا جتنے پیسوں سے مکان خریدا ہے اتنے پیسوں کو ادائے قرض کے درجے میں مان لیا جائے گا، لہٰذا وہ مکان اور دیگر ترکہ میں سے نیلامی مکان خریدنے والوں کا پیسہ مجریٰ کر کے ان کو ادا کردیا جائیگا، اس کے بعد مکان اور دیگر ترکہ میں سے جو بچے گا اس کو تمام ورثاء کے درمیان شریعت کے مطابق تقسیم کیا جائے گا، اور اس میں خریدنے والے بھی برابر کے شرعی حصہ کے حقدار ہوں گے۔

ثـم يـقسـم البـاقـي بـعد ذلك بين ورثته الذى ثبت إرثهم بالكتاب أو السنة. (در مختار مع الشامي، كتاب الفرائض، زكريا ١٠/٤٩٧، كراچی ٦/٧٦٢، سراجی/٤، الفتاویٰ التاتارخانية زكريا ٢٠/٢١٨، رقم: ٣٣٠٨٦، مجمع الأنهر مصرى قديم ٢/٧٤٧ دار الكتب العلمية بيروت ٤/٤٩٥، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣/٢١) **فقط واللہ** سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲ر شعبان المعظم ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۲۳۰۶)

اولاً قرض کی ادائیگی کی جائے اس کے بعد ترکہ تقسیم ہو

سوال [۱۱۳۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمد اسلام صاحب مرحوم نے اپنے بیٹے محمد اکرم سے بطور قرض اکرم کی بیوی کا زیور طلب کیا، چند یوم کے وعدہ پر اپنے کاروبار کے واسطے، اس درمیان میں محمد اسلام صاحب کا انتقال ہوگیا، مذکورہ مرحوم نے جس کے پاس وہ امانت رکھی تھی، مرحوم کی بیوی نے بالا بالا خفیہ طور پر وہ امانت حاصل کر کے اپنے تصرف میں لے لیا، جس کی وہ چیز ہے وہ برابر تقاضہ کرر ہا ہے، شریعت کی رو سے اس کا دین دار کون ہے؟ وہ قرضہ کس کے ذمہ عائد ہوتا ہے، اور اس کی ادائیگی کس طرح ہوگی؟ اور کون ادا کرے گا؟ مذکورہ مرحوم کے پاس تین چار لاکھ کا ایک پختہ مکان تین منزلہ ہے جس مکان میں کارخانہ ساز وسامان مشینری ومال وغیرہ رکھا ہوا ہے، جس کی قیمت تقریباً ایک لاکھ سے اوپر ہوتی ہے، مذکور مرحوم نے اپنی ایک بیوی پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں چھوڑی ہیں، ہنوز کوئی تقسیم نہیں ہوئی ہے؟

المستفتی: محمد اکرم محلہ ٹھٹیرہ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفيق: جب مرحوم نے ہی لے کر رہن رکھا ہے تو اولاً

مرحوم کے ورثاء وہی زیور حاصل کر کے محمد اکرم کی بیوی کو ادا کرنے کی کوشش کریں اور اگر جس کے پاس ہے، اس سے حاصل نہ کر سکیں تو مرحوم کے ترکہ میں سے اتنی مقدار زیور خرید کر دیدیں، یا اس کی قیمت مرحوم کے ترکہ سے لے کر ادا کرنا لازم ہے۔

فإنها تصير مضمونة في يد المرتهن، وللمعير أن يرجع على المستعير بقيمته. (شامی، کتاب العارية زکریا ۴۸۱/۸، کراچی ۶۸۲/۵، البحر الرائق کوئٹه ۲۸۳/۷، زکریا ۴۸۱/۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸ ؍ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۱۶۸/۲۶)

شوہر کے انتقال کے بعد مہر وجہیز کا حکم

سوال [۱۱۳۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی تھی، پھر تین مہینے کے بعد اس شخص کا انتقال ہو گیا اور اس نے ابھی تک اپنی بیوی کا مہر بھی ادا نہیں کیا تھا اور اس کی شادی میں اس کو جہیز بھی ملا تھا تو یہاں دو باتیں دریافت طلب ہیں:

(۱) جو جہیز اس کو شادی میں ملا تھا وہ کس کی ملکیت شمار ہوگا؟ اور چونکہ اس نے ابھی تک مہر بھی ادا نہیں کیا تھا تو کیا اس کے ذمہ مہر واجب الأ دا رہا یا نہیں؟

اب شوہر تو انتقال کر چکا ہے لہٰذا اب اس کا مہر کون ادا کرے گا؟

المستفتی: محمد واصف امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جہیز کا سارا سامان جو لڑکی کے ماں باپ لڑکی کو دیتے ہیں وہ لڑکی کی حقیقی ملکیت ہوتا ہے، اس میں شوہر کا کوئی حصہ نہیں ہوتا ہے، اور لڑکی کو اس سامان میں پورا پورا حق ہے کہ جسے چاہے استعمال کی اجازت دے اور جسے چاہے نہ دے

اورلڑکی کا مہر شوہر کے انتقال کے بعد اس کے ترکہ میں سے سب سے پہلے ادا کیا جائے گا۔

کل أحد يعلم أن الجهاز ملك المرأة و أنه إذا طلقها تأخذه كله و إذا ماتت يورث عنها. (شامی، باب المهر، مطلب: في دعوىٰ الأب أن الجهاز عارية، زكريا ٤/ ٣١١، كراچی ٣/ ٥٨٥)

وإذا مات الزوج وقد سمى لها مهر فلورثتها أن يأخذوا ذٰلک من تركة الزوج. (تاتارخانية زكريا ٤/ ٢٠٣، رقم: ٥٩٦٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۲۴ / ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۷۷)	۱۴۳۴/۴/۲۴ھ

دین مہر میں دیئے گئے مکان کی تقسیم

سوال [۱۱۳۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے والد صاحب نے ایک مکان کھپریل (۵۶/ گز) والدہ کے دین مہر میں لکھ دیا تھا، پھر جب ماں کا انتقال ہوگیا تو سات سال کے بعد والد صاحب نے وہ مکان اپنے لڑکے فہیم الدین کے نام پکا بیع نامہ کرادیا، پھر بیع نامہ کے پانچ سال بعد والد صاحب کا بھی انتقال ہوگیا، اب والدہ کے دیگر وارثین ماں کے حصہ دین مہر میں اپنا حصہ مانگ رہے ہیں، اورخریدار فہیم الدین بھی بخوشی حصہ دینے کے لیے تیار ہے تو ماں کے حصہ میں سے ہر ایک وارث کو کتنے کتنے حصے ملیں گے، وارثین میں والدہ کے انتقال کے وقت والد صاحب حیات تھے، (اب انتقال ہوگیا، اوراپنا حصہ بیچ دیا تھا) چار لڑکے: محمود حسن، ریاض الحسن، فہیم الدین، فیاض الدین، چار لڑکیاں: دینی بیگم، بدرالنساء، عابدہ بیگم، پروین جہاں کو چھوڑا؟

المستفتی: فہیم الدین پیرزادہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ماں کے مرنے کے بعد ماں کے ترکہ میں سے

باپ صرف چوتھائی حصہ کا حقدار تھا، باقی لڑکے اور لڑکیوں کے حقوق تھے، اور باپ کے لیے یہ جائز نہیں تھا کہ ماں کا پورا مکان صرف ایک لڑکا فہیم الدین کے نام کردیں، یہ باپ کی طرف سے دوسرے وارثین کے حقوق کا غصب ہے، اس کی واپسی فہیم الدین پر پہلے ہی سے لازم تھی، اور اب جب فہیم الدین بخوشی دینے کے لیے تیار ہے تو معاملہ آسان ہوگیا، لہٰذا وہ مکان تمام وارثین کے درمیان ان کے حقوق کے مطابق شرعاً تقسیم ہونا چاہیے، جس میں خود فہیم الدین کا بھی ایک حصہ ہے۔ (مستفاد: امداد المفتیین ص: ۱۰۴۵)

وأصل هذا أن الدين المشترک بين اثنين إذا قبض أحدهما شيئا منه فلصاحبه أن يشاركه في المقبوض. (هدايه، باب الصلح فى الدين، فصل فى الدين المشترك، اشرفى ديوبند ۳/۲۵۳)

مرحوم کا ترکہ بارہ سہام میں تقسیم ہوکر دو دو حصہ لڑکوں کو اور ایک ایک حصہ لڑکیوں کو ملے گا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۱۳؍ربیع الاول ۱۴۲۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۱۱۲۷)	۱۴۲۲/۳/۱۴ھ

دین مہر بیوی کی ملک ہے اس میں وراثت جاری نہیں ہوگی

سوال [۱۱۳۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسمیٰ نور الدین نے مسماۃ حلیمہ سے قبل ۱۹۴۷ء شادی کی، اس سے تین لڑکیاں اور ایک لڑکا پیدا ہوا، بعدہٗ حلیمہ اپنا شیر خوار لڑکا گود میں لے کر پاکستان بوقت ۱۹۴۹ء محلّہ کے ایک آدمی کے ساتھ فرار ہوگئی (جس کا نام محمد اسماعیل ہے) چند سال کے بعد مسمی نور الدین نے مسماۃ حلیمہ کی بہن خدیجہ سے نکاح کیا، ان دونوں گواہوں کی موجودگی میں (۱) کا کا نمبر دار (۲) راحم عرف مور محلّہ دار، اور اس سے کوئی بچہ تولد نہیں ہوا، تاحیات زوجیت میں رہی، نور الدین کے والد نے بوقت نکاح کل املاک ۴۱ ربیگہ زمین بعوض مہر خدیجہ کے نام کردیا،

نورالدین کے انتقال کے بعد خدیجہ نے اپنی زندگی ہی میں ان ۴۱ بیگہ زمینوں میں سے ۲۵/ بیگہ سابقہ تین لڑکیوں جو حلیمہ سے تھیں مالک بنادی اور تین بیگہ اپنے اخراجات کے لیے فروخت کردی، اور ۱۳/ بیگہ مسجد اور مدرسہ کے نام وقف کردیا، نیز مرتے وقت خدیجہ نے اپنے تمام زیورات کو یہ کہہ کر دو آدمی کے حوالہ کیا کہ یہ اللہ کے نام خیرات کردینا اور مرگئی، زیورات اب تک ان دونوں آدمیوں کے پاس ہیں۔

اب دریافت طلب مسئلہ ہے کہ نورالدین کا شیرخوار لڑکا مسمیٰ گلزار جاوید جو اپنے آپ کو اس کا لڑکا بتاتا ہے جس کو لے کر حلیمہ فرار ہوئی تھی، اب وہ پاکستان سے آکر اپنے باپ نور الدین کی جائیداد (جو بعوض مہر خدیجہ کے نام تھی، جس کو خدیجہ نے مسجد اور مدرسہ کے نام وقف کی تھی) کا اور مذکورہ زیورات کا ۵۴/ سال کے بعد دعویدار بتاتا ہے، تو کیا حق دعویٰ اور حق وراثت کا مستحق ہے، یا نہیں؟

نوٹ: یہ بھی یاد رہے کہ مسمیٰ گلزار جاوید نے خدیجہ کی زندگی ہی میں ڈیڑھ لاکھ روپئے اور پانچ تولے سونا لے چکا تھا۔

المستفتی: محمد نذیر، جماپورہ مالیرکوٹلہ پنجاب

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو اکتالیس بیگہ زمین خدیجہ کو دین مہر کے عوض میں ملی ہے وہ اس کی حقیقی ملکیت ہے، اس میں کسی دوسرے کا کوئی حق متعلق نہیں ہے، وہ اپنی زندگی میں جس طرح چاہے استعمال کرسکتی تھی، لہٰذا جب اس نے بخوشی ۲۵/ بیگہ زمین مذکورہ تینوں لڑکیوں کو ہبہ کردی تو وہ ان لڑکیوں کی ملکیت ہوگئی ہے، اور جو تیرہ بیگہ زمین مسجد اور مدرسہ کے نام وقف کردی ہے وہ وقف بھی درست ہوگیا، اور اپنی ملکیت کے زیورات کے متعلق جو وصیت کرگئی ہے وہ وصیت بھی درست ہوگئی، بشرطیکہ خدیجہ کا کوئی ایک حقیقی وارث موجود نہ ہو اور اگر اس کا کوئی وارث موجود تھا، اور وہ اس وصیت پر رضامند رہا ہے تو تمام زیورات کو کار خیر میں وصیت کے مطابق خرچ کردینا لازم ہے اور نورالدین کا لڑکا مسمیٰ گلزار جاوید خدیجہ کا حقیقی وارث نہیں، اس لیے کسی بھی چیز میں حق کا دعویٰ کرنا اس کے لیے درست نہیں۔

المالک هو المتصرف فی الأعیان المملوکة کیف شاء من الملک. (بیضاوی شریف رشیدیه ۱/ ۷)

لایجوز لأحد أن یأخذ مال أحد بلا سبب شرعی. (قواعد الفقه اشرفی ص: ۱۱۰، رقم: ۲۶۹) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ربیع الاول ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۲۷۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۳/۱۴۲۵ھ

دین مہر میں ایک حصہ دینے کے بعد بقیہ حصوں میں وراثت کا مطالبہ کرنا

سوال [۱۱۳۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے والد نے بڑے بھائی کی شادی کے موقعہ پر اس کی بیوی کو اپنے حصۂ مکان کے تین حصے کرکے (اس لیے کہ تین لڑکے تھے) ایک حصہ اپنے بڑے لڑکے کی بیوی کو بیع نامہ کردیا تھا۔

اب دریافت یہ کرنا ہے کہ بقیہ دو حصوں کے صرف دو لڑکے ہی مالک ہوں گے، یا ان دو حصوں میں تینوں لڑکے اور ۵/ لڑکیاں حصہ دار ہوں گی؟

المستفتی: مسعود احمد طویلہ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: بڑے لڑکے کا وراثت میں اپنے حصہ کا مطالبہ کرنا شرعاً جائز اور درست ہے، اس لیے کہ بڑے لڑکے کی بیوی کو مکان کا جو حصہ مہر میں دیا گیا ہے وہ باپ کی طرف سے دین مہر کی ادائیگی ہے اور اس میں وارثین کا کوئی حق نہیں ہوتا ہے، بلکہ وہ دین مہر اسی عورت کی تنہا ملکیت ہے، نیز مکان کے بقیہ دو حصے تینوں لڑکے اور پانچوں لڑکیوں میں حسب حصص شرعیہ تقسیم ہوں گے، لہٰذا بقیہ جائیداد کو گیارہ حصوں میں تقسیم کرکے لڑکوں کو دو- دو حصہ اور لڑکیوں کو ایک ایک حصہ ملے گا۔

﴿يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيۡ اَوۡلَادِكُمۡ لِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ. [النساء: ۱۱]﴾

ومع الإبن للذكر مثل حظ الأنثيين. (سراجی ص: ۱۲)

وصح ضمان الولی مهرها أی سواء كان ولی الزوج أو الزوجة صغيرين كانا أو كبيرين ولو المرأة صغيرة ولو عاقدا لأنه سفير لكن بشرط صحته فلو فی مرض موته وهو وارثه لم يصح وإلا صح من الثلث أی وارث الولی كان يكون الولی أبا الزوج أو أبا الزوجة. (در مختار مع الشامی، باب المهر، مطلب: فی ضمان الولی المهر زكريا ديوبند ٤/ ٢٨٦ -٢٨٧، كراچی ٣/ ١٤٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۶۵۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/۴/ ۱۴۳۳ھ

ادائے مہر کے بعد ہبہ کرنے کی اجازت ہے

سوال [۱۱۳۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرا نام عبد الغفار ہے، میرے دو لڑکے، اور دو لڑکیاں ہیں، ان میں سے دو کی شادی ہو چکی ہے، اور دو غیر شادی شدہ ہیں، اور میری بیوی بھی حیات ہے، والدین نہیں ہیں، میری تین ایکڑ زمین ہے، جس میں سنترے کا باغ ہے، فی الحال اس کی قیمت دس لاکھ روپئے ہوتی ہے، رہنے کا مکان نصف کچا اور نصف پکا، جو پکا ہے وہ شادی والے لڑکے کی کمائی سے تعمیر ہوا ہے، اس کی قیمت دو لاکھ ہوتی ہے۔

نفس مسئلہ یہ ہے کہ قبل از حج بیت اللہ ایسی وصیت کرنے کا ارادہ ہے کہ شرعی اعتبار سے کسی وارث کی حق تلفی نہ ہو اور وارثین کو ان کا حق مل جائے، اور میرا یہ بھی ارادہ ہے کہ جو تین ایکڑ زمین ہے اس کو دونوں لڑکوں کے نام کر دوں، اور لڑکیوں کو نقد رقم دیدوں، کیونکہ زمین کو اگر اتنے حصوں میں تقسیم کیا جائے گا تو اس کی حیثیت کم ہو جائے گی، اور لڑکیاں نقد لینے پر راضی بھی ہیں، اور بیوی کا مہر پانچ ہزار روپیہ ہے، وہ بھی ادا کرنا ہے تو اس صورت میں لڑکیوں کے نام کتنی کتنی رقم آئے گی؟ اور بیوی کے حصہ میں مہر کے علاوہ کتنی آئے گی؟ اسی

طرح رہنے کا جو مکان ہے اس کو بھی لڑکوں کے نام پر کرنے کا ارادہ ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس میں لڑکیوں کا کتنا حصہ نکلے گا؟ اگر نکلے گا تو لڑکیوں کے حصے پر کتنی کتنی رقم آئے گی؟ لڑکیاں اس میں نقد کی شکل میں لینے پر راضی ہیں، نقد رقم ادا کرنے کے لیے ضامن میرے لڑکے ہوں گے۔

المستفتی: محمد عبدالغفار، ضلع امراوتی مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سب سے پہلے بیوی کا مہر ادا کرنا واجب ہے اور بیوی کا مہر ادا کرنے کے بعد بقیہ مال میں سے حسب منشاء بیوی کو جتنا چاہیں دیدیں، اس کے بعد ما بقیہ مال لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان برابر برابر تقسیم کردیں۔

وإن قصده يسوى بينهم، يعطى البنت كالإبن عند الثاني، وعليه الفتوىٰ أى قول أبى يوسف من أن التنصيف بين الذكر والأنثىٰ أفضل من التثليث الذى هو قول محمد. (در مختار مع الشامی، کتاب الهبة، زکریا ۸/۵۰۱- ۵۰۲، کراچی ۵/۶۹۶)

یہ زندگی میں جائیداد کے ہبہ کرنے کی صورت ہے، لیکن اگر زندگی میں نہیں دیتے تو آپ کے مرنے کے بعد بیوی کو مہر کے علاوہ آٹھواں حصہ ملے گا اس کے بعد ما بقیہ مال میں سے لڑکیوں کو لڑکوں کے نصف کے حساب سے ملے گا، یعنی کل ترکہ ۴۸؍ سہام میں تقسیم ہو کر بیوی کو چھ، دونوں لڑکوں کو چودہ چودہ اور دونوں لڑکیوں کو سات سات ملیں گے، اب آپ کی مرضی ہے، اپنی جائیداد کے بارے میں جو طریقہ چاہیں اختیار کرلیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ رجب المرجب ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۷۴۶)

مہر میں طے شدہ تین سو گز زمین میں شوہر کے بھائی بہنوں کا حصہ

سوال [۱۱۳۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: احمد نبی خاں مرحوم کے چار بیٹے اور پانچ لڑکیاں ہیں: محمد علی عرف بابو جی مرحوم، احمد علی خاں، چندہ خاں، سلیم خاں، احمد نبی خاں نے اپنے لڑکے محمد علی کی زوجہ کے مہروں میں اپنی جائیداد کا کچھ حصہ لکھا تھا، وہ اپنی جائیداد کے خود مالک تھے، محمد علی کی زوجہ کا بھی انتقال ہو گیا، ان کی اولادوں میں آٹھ لڑکے اور تین لڑکیاں موجود ہیں، لہٰذا معلوم یہ کرنا ہے کہ محمد علی کی زوجہ کے مہروں میں جو جائیداد ہے اس میں ان کی اولاد کے علاوہ ان کے شوہر کے بھائیوں اور بہنوں کا بھی حصہ ہوگا یا نہیں؟ زوجہ محمد علی کے مہروں میں صرف ۳۰۰ رگز آراضی ہے۔

المستفتی: محمد علیم خاں مغل پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: احمد نبی خاں نے اپنی جائیداد میں سے جو حصہ اپنے بیٹے محمد علی خاں عرف بابو جی کی زوجہ کے مہروں میں لکھ کر کے دیدیا ہے، اس حصہ کی مالک محمد علی خاں کی زوجہ ہی ہوگی، اس میں کسی کا حق نہیں ہے، البتہ اس حصہ کو چھوڑ کر بقیہ جو حصے احمد نبی خاں کی ملکیت میں باقی ہیں، ان میں احمد نبی کے تمام ورثاء کا حق متعلق ہے، اور محمد علی کی زوجہ کے مہروں کے حصہ میں جو جائیداد ہے اس میں صرف اس کی اولاد کا حق متعلق ہوگا، لہٰذا زوجہ کے حصہ کو ۱۹ رحصہ کر کے ہر لڑکے کو دو دو حصہ اور ہر لڑکی کو ایک ایک حصہ ملے گا۔

إذا مات الزوجان وقد سمی لها مهرا ثبت ذٰلک بالبنية أو بتصادق الورثة فلورثتها أن يأخذوا ذٰلک من ميراث الزوج. (عالمگیری، الباب السابع فی المهر، الفصل الثانی عشر فی اختلاف الزوجين فی المهر، زکریا جدید ۱/ ۳۸۸، قدیم ۱/ ۳۲۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ رجمادی الثانیہ ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۴۱۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۶/۲۱ھ

تقسیم ترکہ سے قبل زکوٰۃ نکالنا

سوال [۱۱۳۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک بیوہ عورت ہے اس کے ایک لڑکا اور دو لڑکیاں ہیں، عورت کے شوہر کا انتقال ہوئے تقریباً بیس برس ہوگئے، وہ اپنے لڑکے کے ساتھ رہتی تھی، عورت کے پاس اپنا زیور اور نقدی شوہر کے میراث سے جو ملا تھا یہ سب اس لڑکے کے پاس تھا جو اس کی دیکھ بھال کرتا تھا، وہ بہت سیدھی عورت تھیں، حساب وکتاب کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھیں، لہٰذا اب تینوں کی والدہ کا انتقال ہوگیا، لڑکا مال کو وارثان میں تقسیم کرنا چاہتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ اس مال پر زکوٰۃ نہیں دی گئی ہے، زکوٰۃ تقریباً تیس چالیس ہزار روپیہ ہوتی ہے، عورت کی وفات کے بعد یہ مال وارثان کا ہوگیا، اس مال پر زکوٰۃ کے بارے میں صرف لڑکے کو ہی معلوم ہے، کسی بھی ٹائم انہوں نے اپنی لڑکیوں سے ذکر نہیں کیا، لڑکے کے علاوہ کوئی بھی گواہ نہیں ہے، تو کیا وارثوں کو زکوٰۃ کا روپیہ نکال کر تقسیم کیا جائے گا؟

المستفتی: محمد نسیم تمباکو اسٹریٹ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) مذکورہ عورت نے اگر واقعتاً زکوٰۃ نہ نکالی ہو اور نہ ہی انتقال کے وقت گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ نکالنے کی وصیت کی ہو تو ترکہ تقسیم کرنے سے قبل اس کے وارثین پر زکوٰۃ نکالنا ضروری نہیں، بلکہ بغیر زکوٰۃ نکالے بھی وہ آپس میں ترکہ تقسیم کر سکتے ہیں، مگر گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا نہ ہونے کی وجہ سے مذکورہ عورت اللہ کے یہاں مؤاخذ دار ہوگی، اس لیے وارثین کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے۔

ثم تقدم ديونه التي لها مطالب من جهة العباد و أما دين الله تعالىٰ فإن أوصىٰ به وجب تنفيذه من ثلث الباقي وإلا لا، وفي الشامي: قوله: وأما دين الله تعالىٰ: محترز قوله من جهة العباد وذٰلك كالزكاة والكفارات و نحوها فإنها تسقط بالموت فلا يلزم الورثة أدائها إلا إذا أوصىٰ بها أو تبرعوا بها هم من عندهم. (شامي، كتاب الفرائض، زكريا ١٠/ ٤٩٥، كراچی ٦/ ٧٦٠)

وافتراضها عمري أي على التراضي وتحته في الشامية: وإذا لم يؤد

إلى آخر عمره يتضيق عليه الوجوب حتى لو لم يؤد حتى مات يأثم. (شامی، کتاب الزکاۃ زکریا ۳/۱۹۱، کراچی ۲/۲۷۱، الموسوعة الفقهية الكويتية ۹/۱۰، ۲۳/۲۹۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰/ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۵۳۶/۳۸)

میت کے متروکہ مال سے ان کی زکوٰۃ ادا کرنا

سوال [۱۱۳۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) میری والدہ مرحومہ کے ورثاء میں دولڑکے محمد نعیم، محمد شکیل اور دولڑکیاں ہیں، مرحومہ کا ترکہ ان کے مابین کس طرح تقسیم ہوگا؟

(۲) سات سال سے زکوٰۃ بھی نہیں دی گئی وہ کس طرح ادا ہوگی؟

المستفتی: محمد نعیم تمباکو والان مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ماتقدم وعدم موانع ارث مرحومہ کا ترکہ درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا۔

میــت ۶

لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی
محمد شکیل	محمد نعیم	شاہنہ خاتون	شاہانہ خاتون
۲	۲	۱	۱

آپ کی والدہ مرحومہ کا ترکہ ۶/ سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا ملے گا جو اس کے نام کے نیچے درج ہے۔

(۲) آپ کی والدہ کی وفات سے قبل جو زکوٰۃ ان پر لازم تھی، وہ انہوں نے ادا نہیں

کی تو ان کی وفات کے بعد ورثاء کے ذمہ اس کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب اور ضروری نہیں ہے، البتہ اگر وصیت کی ہو تو اس کی زکوٰۃ مرحومہ کے تہائی مال سے ادا کر دی جائے، اور اگر بلا وصیت اس کی زکوٰۃ ورثاء نے ادا کر دی تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ سے زکوٰۃ کا ذمہ ساقط کر دے گا۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۵/ ۴۵، جدید ڈابھیل ۲۰/ ۳۴۲)

و أما دين الله تعالىٰ فإن أوصىٰ به وجب تنفيذه من ثلث الباقي وإلا لا، (در مختار) وفي الشامية: تحته قال الزيلعي: فإنها تسقط بالموت فلا يلزم الورثة أدائها إلا إذا أوصىٰ بها أو تبرعوا بها هم من عندهم. (در مختار مع الشامي، كتاب الفرائض، زكريا ١٠/ ٤٩٥، كراچی ٦/ ٧٦٠)

اور سات سال کی زکوٰۃ ادا کرنے کی شکل یہ ہوگی کہ سات سال پہلے ان کے زیورات کی قیمت کیا رہی ہے اس کو معلوم کر کے اس کا چالیسواں حصہ نکال لیں، اس کے بعد اگلے سال مابقیہ کا چالیسواں حصہ نکال لیں، پھر اس کے بعد والا سال جو بچا ہے اس کا چالیسواں نکال لیں، اس ترتیب سے سات سال کی زکوٰۃ نکالی جا سکتی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۴۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۵/۵ھ

حصص کی تقسیم صرف ترکہ میں ہوگی

سوال [۱۱۳۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کا آج سے تقریباً ڈیڑھ سال قبل انتقال ہوا، بوقت انتقال وارثین میں پہلی بیوی جس کو وہ طلاق دے چکے تھے سے دو لڑکے اور ایک دوسری بیوی سے ایک لڑکی چھوڑی، اور ترکہ میں ۳/ چھوٹے مکان اور ایک خالی دوکان چھوڑی، اور کچھ زیورات بھی تھے، جو زید کی بیٹی اور دوسری بیوی کے ہیں، بیوی اپنے زیور کو میکہ سے لائی تھی، ان دونوں کے زیورات زید ہی کے پاس رکھے ہوئے رہتے تھے، اب پہلی بیوی کے دونوں بیٹے اس میں حصہ مانگ

رہے ہیں، شرعاً کس کو کتنا حصہ ملے گا؟

واضح رہے کہ زید اپنی زندگی ہی میں دونوں لڑکوں کو قانونی طور پر محروم کر چکا تھا، اور دوسری بیوی سے کہتا تھا کہ یہ مکان تمہارا ہے اور دوکان میری بیٹی کی ہے، اور زیورات کے بارے میں دوسری بیوی سے کہتا تھا کہ تم اس کو امانت کے طور پر پہنتی رہو، یہ میری بیٹی کا ہے، زندگی میں میں اس کا مالک ہوں اور مرنے کے بعد میری بیٹی اس کی مالک ہے، اور تمہارا (یعنی بیوی کا) اس میں کوئی حق نہیں ہے، لیکن ان مذکورہ باتوں کے سلسلے میں کوئی تحریری ثبوت نہیں ہے البتہ بیماری کی حالت میں زید نے اسپتال میں اپنی بیٹی سے کاتب بلانے کو کہا تھا لیکن کاتب نہیں آسکا، اس وقت دوسری بیوی کے دو بھائی تنزیل الرحمٰن اور مطیع الرحمٰن وہاں موجود تھے، اور ایک دن رات کو زید کی دیورانی ان سے ملاقات کرنے گئی تھی تو اس سے بھی کہا تھا، اور انتقال سے پندرہ روز پہلے زید کی بیوی اور بیٹی دونوں کے زیورات کو الگ الگ کر رکھا تھا، جس کو ان کے بھائی نے بھی دیکھا ہے، اب بتلائیں کہ زید کے لڑکے کا ان زیورات میں شرعاً کوئی حق بنتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: ایک خاتون مرادآبادیوپی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: زید کا قانونی طور پر اپنے لڑکوں کو میراث سے محروم اور ناحق کرنا اور بیویوں سے یہ کہنا کہ یہ مکان تمہارا ہے اور دوکان بیٹی کی ہے، اسی طرح زیورات کے بارے میں یہ کہنا کہ تم اس کو بطور امانت پہنتی رہو، میرے مرنے کے بعد میری بیٹی اس کی مالک ہے، شرعاً ان باتوں کا کوئی اعتبار نہیں، اس کی وجہ سے زید کے انتقال کے بعد اس کی بیوی اور بیٹی مذکورہ مکان و دوکان اور زیورات کے مالک نہیں ہوں گی، بلکہ حسب حصص شرعیہ لڑکے بھی اس میں حقدار ہوں گے، البتہ وہ زیور جو دوسری بیوی میکہ سے لائی ہے وہ اسی کی ملک ہے، اس میں لڑکے کا شرعاً کوئی حق نہیں، لہٰذا بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ما تقدم و عدم موانع ارث مرحومہ زید کا کل ترکہ بیوی کے زیورات کے علاوہ بوقت

انتقال موجود تمام وارثین کے درمیان درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا۔

میـــــــــــــــــــت ۴۰

بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکی
۱/۵		۷	
۵	۱۴	۱۴	۷

مرحوم زید کا کل ترکہ ۴۰؍سہاموں میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا حصہ ملے گا جو اس کے نیچے درج ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۷۱۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۶/۲۸ھ

ترکہ سے متعلق چند سوالات کے جوابات

سوال [۱۱۳۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) عبد الرحمٰن نے بوقت وفات یہ وارث چھوڑے تو اس کی ملکیت ان وارثوں پر کس حساب سے تقسیم ہوگی؟ بیوی: مریم، بھائی: رجب، بھائی: کھجولا، بہن: سائرہ، بہن: ڈنگری، یہ کل پانچ وارث ہیں۔

(۲) عبد الرحمٰن نے زمین اپنے پیسے سے خریدی، اس میں بیوی مریم کا نام لکھوایا لیکن اپنے خرچ سے عمارت بنوائی اور اپنے قبضے میں رکھا تو کیا یہ زمین وعمارت عبد الرحمٰن کی ملکیت شمار ہوگی یا بیوی مریم کی؟

(۳) عبد الرحمٰن کی بیوی مریم نے عبد الرحمٰن کے انتقال کے بعد تقسیم وراثت کیے بغیر جائیداد کا کسی کو ہبہ یا بیع نامہ کر دیا تو یہ ہبہ یا بیع نامہ پورے طور پر صحیح ہوگا، یا صرف اتنے حصے کا جس کی حقدار مریم وراثت کے اعتبار سے ہوتی ہے؟

(۴) عبد الرحمٰن کو ایک دوکان میونسپل بورڈ کی طرف سے کرایہ پر ملی، ان کی وفات

کے بعدان کی بیوی مریم اس دوکان پر قابض رہیں، اور میونسپل بورڈ کو کرایہ ادا کرتی رہیں، یہ دوکان کس کی ملکیت مانی جائے گی؟

نوٹ: واضح رہے کہ میونسپل بورڈ سے اجازت لے کر ایسی دوکان کو بیچنے کا حق بھی کرایہ دار کو ہوتا ہے، اور کرایہ دار کی موت کے بعد ایسی دوکان پر اس کے وارثوں کا حق ہو جاتا ہے۔

المستفتی: مولانا عبدالہادی صاحب مدرسہ نورالعلوم ہر ہر پور پرتا بگڈھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ماتقدم وعدم موانع ارث عبدالرحمٰن کا ترکہ حسب ذیل طریقہ سے تقسیم ہوگا۔

عبدالرحمٰن میت $\frac{۸}{۴}$

بیوی	بھائی	بھائی	بہن	بہن
مریم	رجب	کھجولا	سائرہ	ڈنگری
$\frac{۱}{۲}$	۲	$\frac{۳}{۲}$	۱	۱

کل ترکہ ۸ر سہام میں تقسیم ہو کر ہر ایک کو اتنا ملے گا جو اس کے نیچے درج ہے۔

(۲-۳) اگر دین مہر کے عوض میں بیوی کا نام لکھوایا ہے تو وہ زمین بیوی کی ملکیت ہوگی، اور اگر دین مہر کے عوض میں نہیں ہے، بلکہ صرف بیوی کو خوش کرنے کے لیے یا کسی خاص مصلحت کی بناء پر لکھوایا ہے تو اس سے زمین بیوی کی ملکیت نہ ہوگی بلکہ شوہر کی ملکیت ہوگی، اور بعد میں اس میں شوہر کا مالکانہ تصرف بھی اس بات پر دال ہے کہ محض نام کرنا مقصود ہے، مالک بنانا مقصود نہیں ہے، اس لیے وہ زمین عبدالرحمٰن کی ملکیت ہے، اور اس کی موت کے بعد اس میں اس کے تمام ورثاء کا حق متعلق ہوگا، لہٰذا عبدالرحمٰن کی موت کے بعد تقسیم سے قبل دوسرے ورثاء کی شرعی اجازت کے بغیر بیوی کا ہبہ یا بیع کا تصرف جائز نہیں ہوگا، ہاں البتہ اس کا جو شرعی حق بنتا ہے اس میں اس کا تصرف جائز ہوسکتا ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/ ۳۸)

وبيع التلجئة ...... وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه

لخوف عدو و تحته فی الشامية: فالهزل أعم من التلجئة لأنه يجوز أن لايكون مضطرا إليه و أن يكون سابقا و مقارنا. (در مختار مع الشامی، باب الصرف، مطلب: فی بیع التلجئة زكريا ٧/٢ ٥٤، كراچی ٥/٢٧٣، هنديه زكريا قديم ٢٠٧/٣، جديد ١٩٦/٣، بدائع الصنائع زكريا ٣٨٩/٤، كراچی ١٧٦/٥، المبسوط للسرخسی دار الكتب العلمية بيروت ١٢٢/٢٤)

(۴) ہندوستان میں جو جائیداد کرایہ دار کے پاس ہوتی ہے اس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) وہ جائیداد جس کو قانوناً مالک اپنے اختیار سے خالی کرا سکتا ہے، اور جب چاہے کرایہ میں اضافہ کرا سکتا ہے جیسے اوقاف کی جائیداد۔

(۲) وہ جائیداد جس کو مالک قانوناً اپنے اختیار سے جب چاہے خالی نہیں کرا سکتا اور نہ ہی جتنا چاہے کرایہ میں اضافہ کرا سکتا ہے، انہیں میں سے وہ جائیداد بھی ہے جو سوالنامہ میں میونسپل بورڈ کی ہے، تو ایسی جائیداد کرایہ دار کے ہاتھ میں نیم ملکیت ہوتی ہے...... جیسے قانوناً کرایہ دار کے ورثاء کا حق متعلق ہو جاتا ہے، شرعاً بھی اس میں کرایہ دار کے ورثاء کا حق متعلق ہو جائے گا، لہٰذا اس دوکان کو فروخت کرنے اور خریدنے میں کرایہ دار کے تمام ورثاء کا حق متعلق ہوگا۔

الثابت بالعرف كالثابت بالنص. (قواعد الفقه اشرفی ص: ٧٤، رقم: ١٠١، المبسوط للسرخسی، دار الكتب العلمية بيروت ١٩/١٤١، ٣٠/٢٢٠، البناية اشرفيه ديو بند ٢٣٨/٩، الموسوعة الفقهية الكويتية ١٦/٢٦١) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍ ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۶۳۶۷/۳۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۱۱/۱۰ھ

۳ باب ترکہ اور تقسیم

متروکہ مال باپ کی ملکیت کہلائے گا یا بیٹے کی

سوال [۱۱۳۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے شوہر ابرار احمد نے اپنا حصۂ مکان ایک قریشی کے لیے فروخت کیا، وہ رقم میں نے اپنے ماموں کے پاس امانت رکھی، محمد عامر بچہ تھا، اکرام بھائی نے جنرل مرچینٹ والوں کی دوکان پر یونہی بلا مشاہرہ کاروباری مشق کی کچھ عرصہ بعد ندیم بھائی کے یہاں ملازم ہو گئے، غالباً چار سو روپئے ماہانہ، اس کے بعد قاری اختر علی صاحب کے ساتھ شرکت میں کاروبار کیا، میں نے محمد عامر کے والد کی وہ رقم جو کہ مکان کے حصہ کی تھی لاکر دی، اور کاروبار میں شرکت اسی رقم سے باقاعدہ ہو گئی، کاروبار میں کافی ترقی ہوئی اور اس کے بعد نواب بھائی سے دوکان کرایہ پر لی جو کہ بغیر پگڑی کے دیدی، اب کاروبار اور دوکان محمد عامر ہی چلانے لگا، انہوں نے جو کچھ ابرار صاحب ان کے والد مرادآباد سے مال لاکر رام پور کے دوکانداروں کو دیتے تھے، بند کرادیا، اور کہا کہ آپ صرف دوکان پر بیٹھیں، کوئی علیحدگی کا تصور بھی نہیں تھا، کاروبار میں اللہ نے اتنی برکت دی کہ بچیوں کی شادی کیں اور محمد عامر کی شادی کی، اور محمد عامر نے حج بھی کیا۔

یہ کاروباری نوعیت تھی، یہ مال محمد عامر کی ملکیت قرار دیا جائے گا یا محمد عامر کے والد محمد ابرار صاحب کا، ابرار صاحب کا صرف ایک ہی بیٹا تھا اور باقی لڑکیاں تھی، جب محمد عامر کی بیوی گھر آئی تو ساتھ میں رہی، ایک ہی چولہا تھا، اور جب تک دلہن بیوگی کی حالت میں رہی سابقہ طریق پر رہی، صرف معلوم یہ کرنا ہے کہ یہ مال کس کی ملک قرار دیا جائے گا، شرعی فیصلہ سے آگاہ فرمایا جائے؟

المستفتی: زوجہ ابرار احمد رام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سوال میں اصل چیز جس پر حکم شرعی کا مدار ہے وہ واضح

نہیں ہوئی، وہ یہ ہے کہ محمد عامر جب تنہا دوکان چلا رہا تھا تو اس زمانہ میں محمد عامر کے والد محمد ابرار زندہ تھے یا نہیں؟ اگر محمد عامر کے والد زندہ تھے اور ابرار کی نگرانی میں عامر دوکان چلا رہا تھا، پھر اسی دوکان کی آمدنی سے عامر اوران کی بہنوں کی شادی ہوئی تھی تو ایسی صورت میں سارا سرمایہ محمد عامر کے والد محمد ابرار ہی کی ملکیت ہوگا، لہٰذا وہ دوکان اس کا سامان محمد عامر کا نہیں ہوگا اور ابرار کے انتقال کے بعد دوکان کا سارا سرمایہ محمد ابرار کے وارثین کے درمیان شرعی طور پر تقسیم ہوگا اور سب وارثین اپنے اپنے شرعی حصہ کے حقدار ہوں گے، کس کو کتنا ملے گا، تمام وارثین کی تفصیل کے بعد لکھا جاسکتا ہے اور اگر یہ معاملہ ایسا ہوا ہے کہ محمد ابرار زندہ ہے اور عامر کا انتقال ہوگیا ہے جیسا کہ سوالنامہ میں عامر کی بیوی کے بیوہ ہونے کا ذکر ہے، اگر واقعہ ایسا ہے تو پوری دوکان کا مالک عامر کا والد ابرار ہوگا اب ابرار کو اختیار ہوگا کہ عامر کی اولاد اور اس کی بیوی کو اس میں سے کچھ دیدیا کرے۔

الأب و ابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيئ فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله لكونه معينا له ألا ترىٰ لو غرس شجرة تكون للأب ثم ذكر خلافا في المرأة مع زوجها إذا اجتمع بعملهما أموال كثيرة فقيل هي للزوج وتكون المرأة معينة له. (شامي، الشركة، مطلب: اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ...... زكريا ٥٠٢/٦، كراچى ٣٢٥/٤، هنديه زكريا جديد ٣٣٢/٢، قديم ٣٢٩/٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍صفر المظفر ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۷۱۵/۳۷)

والد اور لڑکے کی قیمت سے خریدے گئے مکان میں لڑکی کا حصہ

سوال [۱۱۳۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے والد کی دو اولادیں ہیں ایک لڑکا جس کا نام عزیز النبی، دوسری لڑکی جس کا نام نجمہ بی بی ہے، میرے والد نے ایک مکان فروخت کیا، چھ ہزار روپئے میں، پھر میرے

بھائی عزیز النبی نے بطور قرض یا جس طرح بھی ہو دس ہزار روپئے کا انتظام کرکے والد صاحب کو دیا، پھر ایک دوسرا مکان تقریباً ۲۶۰۰۰/ ہزار روپے میں خریدا۔

یہاں یہ خیال رہے کہ اس مکان میں سولہ ہزار روپئے والد کے مکان کا اور دس ہزار روپئے بھائی کے ذریعہ انتظام ہوا، والد کے انتقال کے کافی دنوں بعد تک میرے بھائی اس ملکیت میں میرا حق بتاتے تھے، اور دینے کا وعدہ بھی کرتے تھے، فی الحال مکان کی قیمت تقریباً ۵/۵۰ ۵/ لاکھ روپئے ہے، جبکہ میرے بڑے بھائی بہت خوشگوار اور پرسکون زندگی بسر کررہے ہیں، اس کے مقابلے میں میں ایک چھوٹے سے مکان میں غریبی کی زندگی گذار رہی ہوں، ابھی کچھ دنوں پہلے سے بھائی میرا حق وحصہ بھی دینے سے انکار کرتے ہیں، میں نے سنا ہے کہ میرے بھائی نے میری سادگی کا فائدہ اٹھا کر والد کی موجودگی میں ہبہ نامہ یا وصیت نامہ بنوالیا تھا، اس وقت سارے کاغذات میرے بھائی کے نام ہیں، صرف لائٹ بل والد صاحب کے نام سے آتا ہے، کیا شریعت کی رو سے اس مکان میں جو مشترکہ جائیداد ہے، میرا حق ہوتا ہے، ہوتا ہے تو کتنا؟ کیا ازروئے شریعت ہمارا حق کا مطالبہ کرنا حق بجانب ہے کہ نہیں؟

لہٰذا آپ سے گذارش ہے کہ شریعت کی روشنی میں ہماری اس جائیداد میں ہمارا جو حصہ ہوتا ہے اس کی وضاحت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں؟

المستفتی: نجمہ بی بی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں اس بات کی وضاحت ہے کہ عزیز النبی نے دس ہزار روپیہ دوسروں سے قرض وغیرہ لے کر کے مکان کی خریداری میں دیا ہے، اور باپ نے وہ دس ہزار روپیہ واپس نہیں کیا، اس لیے دس ہزار روپیہ کی ملکیت میں عزیز النبی مکان میں شریک ہے، لہٰذا چھبیس ہزار میں سے دس ہزار کی ملکیت کو مجریٰ کرنے کے بعد باقی سولہ ہزار کی ملکیت تین حصوں میں تقسیم ہوکر دو حصہ عزیز النبی کو اور ایک حصہ بہن نجمہ بی بی کو ملے گا۔

﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ. [النساء: ١٢]﴾ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۱۴۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۶/۱۸ھ

باپ کی ماتحتی میں رہ کر کمائے ہوئے سرمایہ کی اولاد مالک نہیں

سوال [۱۱۳۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک باپ کے سات بیٹے ہیں، باپ نے حسب ضرورت ایک بیٹے کو بقدر کفایت سامانِ زندگی دے کر الگ کر دیا، اور چھ بیٹے باپ کے ساتھ زندگی گذار رہے تھے، پھر بعد میں چھ بھائیوں میں سے زید باپ کی زندگی میں ہی ہر طرح کی ذمہ داریوں کا سرپرست بن گیا، اور زید کی نگرانی میں پانچوں بھائی آٹے کی مشین ''چکی'' اور تقریباً نو ہینڈلوم کے ذریعہ کام کرتے رہے، یہاں تک کہ حالات خوشحال زندگی میں تبدیل ہوگئے، چنانچہ زید نے اچانک پانچوں بھائیوں میں سے ایک بھائی یعنی خالد کو بغیر کچھ دیئے ہوئے الگ کر دیا، الگ کرنے کے بعد ابھی کچھ ہی مدت گذری تھی کہ زید نے زمین خریدی اور اس کو اپنے نام اور بقیہ چار بھائیوں کے نام لکھوا دیا، اور ایک لمبی مدت گذرنے کے بعد والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔

الف: زید نے خالد کو بغیر کچھ دیئے ہوئے الگ کر دیا تو خالد کا زید پر کیا حق بنتا ہے؟

ب: اور اگر حق بنتا ہے تو اس کا ذمہ دار صرف زید ہے یا بقیہ چار بھائی بھی ہیں؟

ج: کیا خریدی گئی زمین میں بھی خالد کا حصہ بنتا ہے کہ نہیں؟ اگر بنتا ہے تو کیوں اور کیسے؟

نوٹ: تشفی بخش دلائل کے ساتھ تفصیلی جوابات مطلوب ہیں۔

المستفتی: محمد عبد اللہ حاجی لنگی مئو

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: باپ کی زندگی میں باپ کی ماتحتی میں کاروبار کرتے ہوئے جو سرمایہ جمع ہوا ہے وہ باپ کی ملکیت ہے، لہٰذا باپ نے ایک بیٹے کو جو مناسب سامان وجائیداد وغیرہ دے کر الگ کیا ہے وہ باپ کی جانب سے ہبہ ہے، جس کا وہ بیٹا مالک ہوگیا، لیکن باپ کی زندگی میں کسی ایک بیٹے کا اپنے کسی بھائی کو فیملی اور کاروبار سے

الگ کرنے کا حق نہیں ہے، کیونکہ تمام کاروبار کا مالک اپنی زندگی میں باپ ہے، اس لیے مسئولہ صورت میں حکم شرعی یہ ہے کہ زید نے والد کی حیات میں جو زمین اپنے اور خالد کے علاوہ دیگر بھائیوں کے نام سے خریدی ہے، خالد کا بھی اس میں سب بھائیوں کے برابر حق بنتا ہے، اور پورے کاروبار میں بھی خالد سب کے برابر کا حصہ دار ہے، کیونکہ اسے کاروبار سے بے دخل کرنے کا باپ کے علاوہ کسی کو اختیار نہیں تھا، اسی طرح باپ کی وفات کے بعد اس کے چھوڑے ہوئے ترکہ میں خالد اور اس لڑکے کو بھی سب بیٹوں کے برابر حق وراثت حاصل ہے، جسے باپ نے اپنی زندگی میں کمائی اور کاروبار سے الگ کردیا تھا۔

الأب و ابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيئ فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله لكونه معينا له. (شامی، الشركة، مطلب: اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ...... زكريا ٦/٥٠٢، كراچی ٤/٣٢٥، هنديه زكريا جديد ٢/٣٣٢، قديم ٢/٣٢٩)

لو اجتمع إخوة يعملون في تركة أبيهم و نما المال فهو بينهم سوية وإن اختلفوا في العمل والرأى. (شامی كراچی ٤/٣٢٥، زكريا ٦/٥٠٢)

الإرث جبرى لايسقط بالإسقاط. (تكملة رد المحتار، مطلب: في حادثة الفتوىٰ، زكريا ١١/٦٧٨، كراچی ٧/٥٠٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ جمادی الثانیہ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۰۸۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۶/۵ھ

مال مشترک کی تقسیم

سوال [۱۱۳۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: خورشید علی نے اپنی ذاتی ملکیت سے ایک دوکان خریدی اور اس دوکان پر اپنے چھوٹے بھائی مجاہد علی کو بٹھا دیا، اور دونوں بھائی مشترکہ طور پر برابر دوکان چلاتے رہے، اور اسی کی آمدنی سے بفضل ایزدی ایک دوسری دوکان خریدی گئی اور دونوں دوکان کی آمدنی سے

مجاہد علی کی شادی بھی کردی گئی، اب اس کا ایک لڑکا پیدا ہوا اور پھر اس کا انتقال ہوگیا، اب اس کے ورثاء میں اس کی ایک بیوی اور ایک لڑکا موجود ہے جس کی عمر ڈھائی ماہ ہے تو ایسی صورت میں دونوں دوکان کس طرح تقسیم ہوں گی، اور اس کے علاوہ چھ بھائی ہیں تو کیا ان چھ بھائیوں کو بھی اس میں سے کچھ ملے گا یا نہیں؟ نیز ان کے بال بچوں کا متولی بننے کا زیادہ حقدار کون ہے؟

المستفتی: شہزاد پکا باغ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب دونوں بھائیوں نے مشترکہ طور پر کاروبار کیا ہے تو پورے کاروبار اور دونوں دوکانوں میں دونوں بھائی برابر کے شریک ہوگئے ہیں، اس لیے دونوں دوکانوں کی قیمت لگا کر نصف قیمت کی دوکان خورشید علی کو ملے گی اور بقیہ نصف قیمت کی دوکان آٹھ سہام میں تقسیم ہوکر ایک سہام مجاہد علی کی بیوی کو ملے گا، اور سات سہام مجاہد کے ڈھائی ماہ کے بچہ کو ملے گا، اور ان کے دیگر چھ بھائیوں کو مذکورہ کاروبار اور دوکانوں میں شرعاً کوئی حق نہیں پہنچتا ہے، نیز بال بچوں کا متولی وہی ہوسکتا ہے جو ان کے حقوق کی زیادہ حفاظت کرسکتا ہے، اور مرحوم کی دیگر ملکیت کا مالک بھی مذکورہ طریقہ پر مرحوم کی بیوی اور لڑکا ہے۔

كما استفيد من عبارة الشامي: في زوج امرأة و ابنها اجتمعا في دار واحدة وآخذ كل منهما يكتسب على حدة و يجمعان كسبهما ولايعلم التفاوت و لا التساوی ولا التمييز فأجاب بأنه بينهما سوية. (شامی، الشركة، مطلب: اجتمعافی دارواحدة واكتسبا ...... زكريا ٦/ ٥٠٢، كراچی ٤/ ٣٢٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۲۱۱)

مشترک کاروبار میں کسی شریک کے الگ سے کمائے ہوئے مال میں وراثت

سوال [۱۱۳۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: علی نے کپڑوں کی تجارت شروع کی اور جس دوکان میں یہ تجارت کررہے ہیں وہ ان کے والد اور چچاؤں کے نام ہے، اوران کا کاروبار بھی کپڑوں کا ہی ہے، لیکن علی نے اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر جو کاروبار شروع کیا اس کے لیے اس نے اپنے بڑوں کے کاروبار سے جو مشترکہ ہے، کچھ بھی مدد نہیں لی، اور اپنے بل بوتے پراور ادھار مال لاکر کاروبار کو آگے بڑھایا اور اب بھی کسی سے کوئی مدد یا رقم لیے بغیر کاروبار کررہے ہیں، لیکن اب مشترکہ تجارت اور جائیداد میں تقسیم درپیش ہے تو کیا تقسیم کے وقت دوکان کے ساتھ اس میں موجود مال کو بھی شامل کیا جائے گا، جبکہ اس مال کے لیے مشترکہ تجارت سے کچھ بھی رقم نہیں لی گئی، اور خود اپنے بل بوتے پر مال بنایا ہے، برائے کرم وراثت تقسیم کرکے اس معاملہ میں شریعت کی روشنی میں مدلل حوالوں کے ساتھ جلد سے جلد جواب دیں؟

المستفتی: ایم، اے، ایچ، اطہر، وقف بورڈ گلبرگہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) صورت مسئولہ میں جب علی نے بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے والد اور چچا کے نام کی مشترکہ دوکان میں اپنے بل بوتے اور سرمایہ کے ساتھ کاروبار کر رکھا ہے، تو والد اور چچاؤں کی جائیداد کی تقسیم کے وقت اس میں موجود مال کو ان کی وراثت میں شامل نہیں کیا جائے گا، البتہ اگر دوکان کے ذریعہ سے کاروبار کیا گیا ہے تو اس کا مناسب کرایہ علی کو ادا کرنا پڑے گا۔

إذا أخذ أحد الورثة مبلغا من نقود التركة قبل القسمة بدون إذن الآخرين و عمل فيه وخسر كانت الخسارة عليه كما أنه إذا ربح لايسوغ لبقية الورثة أن يقاسموا الربح. (شرح المجلة رستم اتحاد ۱/ ۶۱۰، رقم: ۱۰۹۰)

لو تصرف أحد الورثة فى التركة المشتركة وربح فالربح للمتصرف وحده. (هنديه، الشركة، الباب السادس فى المتفرقات زكريا قديم ۲/ ۳۴۶، جديد ۲/ ۳۴۳) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍ ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۴۳)

والد اور اولاد کے مشترکہ مال کی والد کے انتقال کے بعد تقسیم

سوال [۱۱۳۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ریاض الدین نے اپنے بڑے لڑکے محمد اکرام کو دہلی میں سلائی کا ایک کارخانہ کچھ دے کر کروایا تھا، محمد اکرام نے کچھ دنوں تک اس کارخانے میں محنت کی، پھر اس نے اس کارخانے میں سے اپنا حصہ لے لیا، اور الگ ہوگیا، اس کا اس کارخانے سے کوئی تعلق نہ رہا، اس کے بعد ریاض الدین نے اپنے لڑکے محمد عمران کو اس کارخانے میں لگادیا، اور اس نے اسے سنبھالا اور اپنے چھوٹے بھائی محمد عرفان محمد ریحان کو لگایا، یہ سب کارخانہ میں کام کرتے رہے، پھر اسی کارخانہ کی آمدنی سے عمران کی شادی ہوئی اور اس نے ایک مکان خریدا، چار لاکھ پانچ ہزار روپیہ کا، اب عمران اسی مکان پر قابض ہے اور کارخانے والے مکان کی مشین وغیرہ بھی یہیں اسی نئے مکان میں منتقل کرلی ہے، اور پرانے کارخانے والے مکان کو کرایہ پر اٹھادیا، کرایہ خود وصول کرتا ہے۔

تو دریافت یہ کرنا ہے کہ نئے مکان اور کارخانہ والا مکان دونوں میں دو چھوٹے بھائی محمد عرفان اور محمد ریحان کا حق ہوتا ہے یا نہیں؟ یہ تمام کاروبار باپ کے ساتھ ہوتا تھا، شرعی حکم کیا ہے؟ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: ریاض الدین محلّہ نئی بستی، سنبھل مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب باپ کے ساتھ رہ کر ہی یہ تمام کاروبار رہوا ہے تو سب کی آمدنی شرعاً باپ کی ہی ملکیت ہے، لہٰذا باپ کے بعد سب کے اندر تمام ہی ورثاء کا حق حصص شرعی کے اعتبار سے متعلق ہوگا۔

الأب و ابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيئ فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله لكونه معينا له. (شامی، الشرکة، مطلب:

اجتمعا فی دار واحدۃ واکتسبا ...... زکریا ۶/۵۰۲، کراچی ۴/۳۲۵، هندیه زکریا جدید ۲/۳۳۲، قدیم ۲/۳۲۹) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ شوال المکرّم ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۵۹۱۰)

شرکت میں ملنے والا منافع مرحوم کے تمام شرعی ورثاء کا حصہ ہے

سوال [۱۱۳۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کی شرکت تین بیکریوں میں ہے اس کا پروفٹ آتا ہے، وہ کن لوگوں کے مابین تقسیم ہوگا، لڑکوں کے یا لڑکیاں بھی حقدار رہوں گی؟

المستفتی: اہلیہ شعیب رشید اصالت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: زید کی شرکت والی تین بیکریوں سے جو پروفٹ آتا ہے اس میں اس کے تمام وارثین اپنے اپنے حصۂ شرعی کے بقدر مالک ہیں، بیوی کو آٹھواں حصہ اور ’’لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ‘‘ کے مطابق ہر لڑکے کو دوہرا اور لڑکی کو اکہرا حصہ ملے گا۔

﴿فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ. [النساء:۱۲]﴾

﴿قال الله تعالیٰ: يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ. [النساء:۱۱]﴾

لاشک أن أعیان الأموال یجری فیها الإرث. (تاتارخانیة زکریا ۲۰/۲۱۳، رقم: ۳۳۰۷۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ شعبان المعظم ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۲۲۸)

فروخت شدہ مکان میں وراثت جاری نہیں ہوگی

سوال [۱۱۳۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں مسماۃ طاہرہ نے اپنے ایک رشتہ دار کو جو زمینوں اور مکانات کی خرید وفروخت کا کاروبار کرتے تھے، ایک خطیر رقم دی کہ مجھے وہ ایک رہائشی مکان دلائیں، چنانچہ انہوں نے مجھے ایک مکان میں ٹھہرایا لیکن اس کو میرے نام پر نہیں کیا، اور کچھ عرصہ بعد مجھے اس مکان سے نکال دیا، کیونکہ وہ مکان خود ان کے نام پر مکمل نہیں ہوا تھا، بعد میں انہوں نے مجھے ایک دوسرے مکان میں ٹھہرایا لیکن میں اس مکان سے خوش نہ تھی، میری دانست میں میں نے جو رقم ان کو دی تھی وہ مکان اس سے کم لاگت کا تھا، پھر انہوں نے اس مکان کا (جی، پی، اے) میرے نام لکھ دیا، جس کی ظاہری حیثیت مختار نامہ کی ہوتی ہے، مگر وہ ملکیت سپرد کرنے کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے، اہل شعبہ اس کی تحقیق آپ کو دے سکتے ہیں۔

اس رشتہ دار کے معاملات صاف اور واضح نہیں تھے، اس لیے میں نے فوراً اس مکان کی رجسٹری اپنے شوہر کے نام پر کر دی، اس خیال سے کہ کہیں اس مکان کو بھی مجھ سے واپس نہ لے لیں، اس کے باوجود میں اس رشتہ دار سے برابر کہتی رہی کہ وہ مکان مجھے پسند نہیں ہے، مجھے دوسرا مکان دلاؤ۔

ایک دن اس رشتہ دار نے مجھے اپنے گھر بلوایا، اور مجھ سے کہنے لگے کہ طاہرہ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میرا آخری وقت ہے، مجھے اب اپنی زندگی زیادہ باقی معلوم نہیں ہوتی، میں نے تم کو اس سے اچھا مکان دلوانے کا وعدہ کیا تھا، لیکن اب یہ ممکن نہیں ہوتا، لہٰذا تم اسی مکان میں رہو، اور جو زیادتی میری طرف سے تم پر ہوئی ہے اس کو معاف کر دو، وہ رشتہ دار اصلاً میری بہن کے شوہر تھے، مجھے ان کا زندگی سے مایوس ہو کر اس طرح بات کرنے سے ترس آیا اور میں نے انہیں اسی وقت معاف کر دیا، اور ان کے اس مطالبہ کو کہ اس مکان پر خوش رہو، قبول بھی کر لیا، طیب قلب سے، اور مطمئن ہوگئی، اور ان سے کہہ دیا کہ مجھے کسی دوسرے مکان کی

ضرورت نہیں ہے، پھران کا انتقال ہو گیا، آج اس مکان میں رہتے ہوئے مجھے قریب بارہ سال کا عرصہ گذر چکا ہے، اوراس رشتہ دار کا انتقال ہوئے قریب دس سال بعد اس کے رشتہ دار مجھ سے کہتے ہیں کہ وہ مکان شرعی طور پر فروخت نہیں ہوا تھا، اس لیے وہ اب بھی مرحوم کی ملکیت میں ہے، اور چونکہ وہ اب رہے نہیں، اس لیے ان کے ورثاء کا حصہ ہے۔

رہی بات میری رقم کی جو میں نے مرحوم کو دی تھی وہ قرض شمار ہوگی، وہ مرحوم کے مال سے واجب الأ داء ہوگی، مگر چونکہ تم مرحوم کے مکان میں ۱۲/ سال سے رہ رہی ہو اس لیے تمہاری رقم سے بارہ سال کا کرایہ منہا کر کے ادا کیا جائیگا، اور کہہ رہے ہیں کہ میں اس مکان کی رجسٹری ان کے ورثاء کے نام کردوں، جو مرحوم کی زندگی ہی میں میں نے اپنے شوہر کے نام کردیا تھا، مجھے پوچھنا یہ ہے کہ کیا واقعی وہ مکان میری ملکیت نہیں ہے، اور کیا میں شرعی طور پر اس کو چھوڑ دینے کی پابند ہوں، جبکہ میں نے اس کی لاگت سے زیادہ رقم مرحوم کو دی تھی، یہ صحیح ہے کہ میں ابتدا میں اس مکان سے مطمئن نہیں تھی لیکن مرحوم کے انتقال سے قبل کی گفتگو میں میں نے اس مکان کو قبول کرلیا تھا، اوراس وقت بغیر کسی تکدر کے اس پر مطمئن ہوگئی تھی، اور مرحوم پر کسی قسم کا پھر مطالبہ نہیں کیا، اور مرحوم کی زندگی ہی میں وہ مکان پہلے ہی اپنے شوہر کے نام کردیا تھا، اور آج بھی وہ میرے شوہر کے نام رجسٹرڈ ہے، مہربانی فرما کر شرعی حکم بیان فرمائیں۔

المستفتی: طاہرہ بیگم زوجہ نصیرالدین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: مسئولہ صورت میں جب ایک خطیر رقم کے عوض طاہرہ کو یہ مکان دیا گیا ہے اور اخیر میں جانبین سے اس پر رضامندی بھی ہوگئی تو ایسی صورت میں بہنوئی کا اس خطیر رقم کے عوض دیا گیا مکان شرعاً طاہرہ کی ملک بن گیا ہے، اب اس میں مالک مکان یعنی طاہرہ کے بہنوئی کے کسی وارث کا حق نہ ہوگا۔

إذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع. (هدايه، كتاب البيوع، اشرفى ۳/ ۲۰، شامی زكريا ۷/ ۴۷، كراچى ۴/ ۵۲۸، مختصر القدورى ص: ۷۱)

وحاصله: أن التخلية قبض -إلى- ولو قال البائع للمشترى بعد البيع خذ

لایکون قبضا، ولو قال خذه یکون تخلیة إذا کان یصل إلی أخذه. (شامی، مطلب: فی شروط التخلیة، زکریا دیوبند ۷/۹۶-۹۷، کراچی ٤/٦٢ ٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۷۲۴۹)

کیا فروخت شدہ جائیداد ترکہ ہے؟

سوال [۱۱۳۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص مسمیٰ عظمت اللہ نے اپنے مکان کو اپنی زندگی ہی میں اپنے بھائی عبداللہ مرحوم کے لڑکوں (یعنی اپنے بھتیجوں) کے ہاتھ ۳۰؍ ہزار میں فروخت کر دیا تھا، عظمت اللہ اپنے اس مکان کا بلا شرکت غیرے خود اکیلا مالک تھا، بھتیجوں نے وہ پورا تیس ہزار روپیہ عظمت اللہ کو ادا کر دیا تھا، عظمت اللہ کا چونکہ کوئی لڑکا نہیں تھا، اور اس کی بیوی کا بھی کافی عرصہ ہوا انتقال ہو چکا تھا، صرف ایک لڑکی تھی جس کی شادی ہوگئی تھی، اس لیے بھتیجے ہی اس کی بیماری میں اور کمزوری ومعذوری میں اس کی خدمت اور دیکھ بھال کرتے تھے، جب عظمت اللہ کی نواسی کی شادی ہوئی تو شادی میں بھی بھتیجوں نے کافی خرچ کیا، تقریباً ۱۸؍ ہزار روپیہ عظمت اللہ کی خدمت اور اس کی نواسی کی شادی میں بھتیجوں کا خرچ ہوا اور یہ ۱۸؍ ہزار روپیہ اس ۳۰؍ ہزار سے الگ ہیں، جو مکان کی قیمت میں بھتیجوں نے ادا کر دیا تھا۔

تو اس طرح ۴۸؍ ہزار روپیہ عظمت اللہ کی طرف بھتیجوں کا پہنچ گیا، بھتیجوں نے اس خریدے ہوئے مکان میں اپنا کچھ سامان بھی رکھ دیا تھا، اور عظمت اللہ کو بھی اس مکان میں رہنے کے لیے جگہ دیدی تھی، تاکہ رہائش کے لیے ان کو پریشانی نہ ہو، عظمت اللہ کا چھوٹا بھائی تھا رحمت اللہ، اس نے عظمت اللہ کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی اس کو اپنے گھر کھلانا پلانا، شروع کر دیا، اور اپنے لڑکوں کو دیکھ بھال کے لیے لگا دیا، عظمت اللہ کے دوسرے بھتیجوں (یعنی عبداللہ مرحوم کے لڑکوں) کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوا، کیونکہ رحمت اللہ بھی بھائی ہے، بھائی بھائی کی خدمت

کرے تو کیا حرج ہے؟ لیکن جب عظمت اللہ نے اس مکان سے اپنے بھتیجوں کا رکھا ہوا سامان نکلوا کر دوسری جگہ رکھوا دیا تب یہ بات سمجھی گئی کہ یہ سب کچھ رحمت اللہ ہی عظمت اللہ سے کرا رہا ہے، اور خدمت کا مقصد صرف اس مکان کا حاصل کرنا ہے، جبکہ رحمت اللہ کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ مکان عبد اللہ بھائی مرحوم کے لڑکوں نے خرید لیا ہے اور اس کی پوری قیمت بھی عظمت اللہ مالک مکان کو ادا کر دی ہے، یہ بات اور دوسرے رشتہ داروں کو محلّہ والوں کو اور پڑوس والوں کو بھی اچھی طرح معلوم ہے، عبد اللہ کے لڑکوں کو جب اس بات کا علم ہوا کہ ان کا سامان اس مکان سے اٹھوا کر کسی اور جگہ رکھوا دیا گیا ہے تو انہوں نے عظمت اللہ سے کھل کر بات کی کہ تمہارا اس مکان میں اب کوئی حق یا دخل نہیں رہا، یہ مکان تو ہمارا ہو چکا ہے، ہم نے تو اپنا بڑا سمجھ کر پریشانی سے بچانے کے لیے تم کو اس مکان میں جگہ دیدی تھی، اگر یہ حرکت کرو گے تو تمہاری چارپائی نکال کر باہر ڈال دیں گے، تب عظمت اللہ نے وہ سامان اس مکان میں دوبارہ رکھوایا، اس کے بعد عظمت اللہ نے اپنے بھتیجوں میں سے بڑے بھتیجے محمد طفیل کے نام وصیت نامہ لکھوایا، تا کہ کل کو کوئی اس مکان میں کسی طرح کا جھگڑا نہ کرے، تو اب عظمت اللہ کا انتقال ہو چکا ہے اس نے اپنے انتقال کے بعد اپنا ایک حقیقی بھائی رحمت اللہ ایک حقیقی بہن نور جہاں، تین بھتیجے یعنی عبد اللہ مرحوم کے لڑکے ایک نواسی، یہ چھ وارث چھوڑے ہیں، اور وہ مکان چھوڑا جس کو عبد اللہ مرحوم کے لڑکوں کے ہاتھ بیچ کر اس مکان کا ان کو مالک بنا دیا ہے۔

تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس مذکورہ مکان میں جس کو مالک نے اپنی زندگی میں فروخت کر کے بھتیجوں کو مالک بنا دیا ہے، بھتیجوں کے علاوہ دوسرے ورثاء کا اس مکان میں اب کوئی حق باقی ہے یا نہیں؟ اور بحق وراثت اس مکان میں اپنے حق کا مطالبہ کرنا صحیح ہے یا سراسر غلط ہے، جبکہ سب ورثاء کو یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ عظمت اللہ نے یہ مکان اپنی زندگی ہی میں بھتیجوں کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے، بالفرض اگر ورثاء کا مطالبہ صحیح ہے تو یہ بھی فرمائیں کہ ان چھ ورثاء میں سے کس کو ملے گا اور کس کو نہیں ملے گا اور جس کو ملے گا تو کتنا ملے گا؟

المستفتی: محمد طفیل و محمد شفیق ہلدوانی، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر عظمت اللہ نے مذکورہ بھتیجوں کے ہاتھ فروخت کردیا تھا جیسا کہ سوالنامہ میں مذکور ہے تو وہ مکان صرف ان بھتیجوں کی ملکیت ہے جن کے نام فروخت کردیا تھا، اب عظمت اللہ کے انتقال کے بعد اس کے ورثاء کا اس میں کسی قسم کا کوئی حق متعلق نہیں ہے۔

عن أبی حمید الساعدي، أن رسول الله ﷺ قال: لایحل لامرئ أن یأخذ مال أخیه بغیر حقه، وذٰلک لما حرم الله مال المسلم علی المسلم. (مسند أحمد بن حنبل ٥/٤٢٥، رقم: ٢٤٠٠٣)

لایجوز لأحد أن یأخذ مال أحد بلا سبب شرعي. (قواعد الفقه اشرفی ص: ١١٠، رقم: ٣٦٩، شرح المجلة رستم اتحاد ٦٢/١، رقم: ٩٧، هندیه زکریا قدیم ١٦٧/٢، جدید ١٨١/٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۳۵۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۱۱/۳ھ

مقبوضہ اور فروخت شدہ جائیداد کی قیمت ترکہ میں شامل ہوگی

سوال [۱۱۳۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایوب صدیقی کا انتقال ہوگیا ان کے ورثاء میں تین لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہیں، مرحوم کے پاس تین مکان، ایک آٹے والی چکی اور ایک باغ ہے، ان تمام اشیاء کو ان تمام وارثین کے درمیان کس طرح تقسیم کیا جائے گا؟

نوٹ: والد صاحب کی حیات میں میرے دو بڑے بھائی چکی وغیرہ کے کاروبار میں والد صاحب کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے، اور اب بھی پوری جائیداد ان کے قبضہ میں ہے، اور اس کاروبار میں اس وقت سے اب تک بڑھوتری ہورہی ہے۔

تو دریافت یہ کرنا ہے کہ والد صاحب کے انتقال کے وقت جو جائیداد اوراثاثہ تھا وہ تقسیم ہوگا یا آگے بھی جو ترقی ملی ہے اس کی بھی تقسیم ہوگی؟ شرعی حکم کیا ہے؟

(۲) باپ کے متروکہ جائیداد میں سے باغ دونوں بھائیوں نے فروخت کردیا ہے، کیا اس کی قیمت میں، میں شرعی حقدار ہوں؟

المستفتی: محمد جمال صدیقی ولد ایوب صدیقی ہلدوانی نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں تمام کاروبار وجائیداد شرعاً مرحوم باپ کی ملکیت میں شمار ہوگی، اور جو بیٹے والد کے ساتھ ان کی حیات میں کاروبار و دوکان وغیرہ پر بیٹھتے رہے ہیں، وہ شرعی طور پر باپ کے معاون و مددگار تھے، لہٰذا باپ کی وفات کے بعد انہیں متروکہ جائیداد میں کسی قسم کے مالکانہ تصرف وقبضہ کا اختیار نہ ہوگا، اور باپ کی وفات کے بعد دو بڑے بیٹوں کے باپ کے متروکہ کاروبار وچکی کا انتظام سنبھالنے کی وجہ سے اس میں جو ترقی اور اضافہ ہوا ہے، اس اضافہ سمیت تمام کاروبار وجائیداد شرعی ورثاء کے درمیان حسب حصص شرعیہ نیچے درج کیے ہوئے نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگی۔

میـــــــــــــــــــــــــــت ۱۱

لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی
۲	۲	۲	۱	۱	۱	۱	۱

کل جائیداد ۱۱/ برابر سہام میں تقسیم ہوکر ہر بھائی کو ۲/۲ اور ہر بہن کو ایک ایک سہام ملے گا۔

الإبن إذا كان فی عيال الأب يكون معينا له فيما يصنع، ما اكتبسه الإبن يكون لأبيه إذا اتحدت صنعتهما، ولم يكن مال سابق لهما، و كان الإبن فی عيال أبيه لأن مدار الحكم كونه معينا له. (تکمله شامی، مطلب: واقعة الفتاویٰ زکریا ۱۱/۶۷۷، کراچی ۷/۵۰٤)

لو اجتمع إخوة يعملون في تركة أبيهم و نما المال، فهو بينهم سوية، ولو اختلفوا في العمل والرائ. (شامی، مطلب: اجتمعا فی دار واحدة واکتسبا …… زکریا ٦/٥٠٢، کراچی ٤/٣٢٥)

(۲) آپ کے والد صاحب کے متروکہ جائیداد میں سے جو باغ بڑے بھائیوں نے فروخت کردیا ہے، اس کی قیمت میں آپ بڑے بھائیوں کے ساتھ حقدار ہیں، شرعی طور پر اس میں سے آپ کو بھائیوں کے برابر حصہ ملے گا۔

الإرث جبری لا يسقط بالإسقاط. (تکمله شامی، مطلب: واقعة الفتاویٰ کراچی ٧/٥٠٥، زکریا ١١/٦٧٨)

عن أنس بن مالک –رضی الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: من فر من ميراث وارثه، قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة. (سنن ابن ماجه، باب الحيف فی الوصية، النسخة الهندية ٢/١٩٤، دار السلام رقم: ٢٧٠٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۱۱؍رجب المرجب ۱۴۳۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۴۵۹)	۱۱/۷/۱۴۳۲ھ

شئ مرہون میں وراثت کا حکم

سوال [۱۱۳۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حمید مرزا کا ایک مکان ٦٦ ۳؍گز ۹؍گرہ کا تھا، حمید مرزا نے یہ مکان ایک ہندو مہاجن کے پاس گروی رکھ دیا تھا، پھر ہندو مہاجن کا روپیہ ادا نہ کرسکے تو اس نے مقدمہ کردیا، پھر ایک دوسرے مسلم آدمی سے آٹھ ہزار روپیہ لے کر حمید مرزا نے اس ہندو مہاجن سے چھڑا کر مسلم آدمی کے پاس گروی رکھ دیا تھا، پھر حمید مرزا یہ مکان مسلم آدمی سے چھڑانے سے قبل انتقال کر گئے، پھر مسلم آدمی سے مقدمہ بازی ہوئی، جس کی پیروی سعید مرزا اور ان کی اولادوں نے کی اور تمام اخراجات مقدمہ کے بھی سعید مرزا نے برداشت کیے، حالانکہ مرزا کی

اولاد میں ایک اورلڑکا حفیظ مرزا بھی پاکستان میں تھے، اور اب بھی حیات ہیں اورلڑکی سعادت بیگم بھی تھی، پھر سعید مرزا نے اپنی حیات میں مکان ۱۹۸۰ء میں مسلم مہاجن کو آٹھ ہزارروپیہ دے کرچھڑالیا تھا، واپسی بیع نامہ سعید مرزا کے نام ہوگیا۔

تو دریافت یہ کرنا ہے کہ اس گروی پر رکھے ہوئے مکان کو سعید مرزا نے چھڑایا تھا تو اس میں سعید مرزا ہی حقدار ہوگا یا سعادت بیگم اور حفیظ مرزا کو بھی حصہ ملے گا، اگر سب کو حصہ ملے گا تو جو مقدمہ میں خرچ ہوا اور مسلم مہاجن کو جو روپیہ دیا وہ سعید مرزا کو ملے گا یانہیں؟ اور ہر ایک وارث کو کتنے کتنے گز ملیں گے؟

المستفتی: وحید مرزا محلّہ نئی سڑک مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گروی رکھی ہوئی چیز مالک کی ملکیت سے خارج نہیں ہوتی، اسی طرح مالک کی وفات کے بعد وارثین کی میراث بننے سے خارج نہیں ہوتی، ہاں البتہ جس قرض پر رکھی گئی ہے اس کی ادائیگی میں ہر وارث اپنے حصے کے تناسب سے شریک ہوجائیں گے، لہٰذا اگر ایک وارث نے پیروی کرکے اپنے پیسہ سے چھڑالی ہے تو دوسرے وارثین پر لازم ہے کہ اپنے اپنے حصوں کے تناسب سے قرض میں شریک ہوکر پیروی کرنے والے نے جو خرچ کیا ہے اس کو وہ پیسہ ادا کریں، نیز پیروی کرنے والے کے حصہ سے بھی اسی تناسب سے کاٹا جائے گا، کیونکہ یہ میراث میں سے قرض ادا کرنے کے حکم میں ہے اور قرض جمیع میراث سے ادا کرنا ہوتا ہے۔

ثم تقضیٰ دیونہ من جمیع ما بقی من مالہ ثم تنفذ وصایاہ من ثلث ما بقی بعد الدین ثم یقسم الباقی بین ورثتہ. (سراجی ص: ٤)

لہٰذا مذکورہ مسئلہ میں صرف سعید مرزا حقدار نہ ہوگا، بلکہ سب ورثاء شریک ہوں گے، اور سعید مرزا کو خرچ چکانے کے بعد مذکورہ ورثاء کے درمیان حسب ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگی:

حمید مرزا میــــــــــــــــــــــــت ۵

لڑکا	لڑکا	لڑکی
سعید مرزا	حفیظ مرزا	سعادت بیگم
۲	۲	۱

کل ۵/ سہام میں تقسیم ہوکر سعید، حفیظ کو دو، دو اور سعادت بیگم کو ایک ملے گا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ صفر المظفر ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۶۵۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۷/ ۲/ ۱۴۱۹ھ

موہوبہ مکان میں وراثت جاری نہیں ہوتی

سوال [۱۱۳۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں (نور الحسن) نے اپنی دادی سے ایک مکان اپنی تائی کے نام کرادیا تھا، وہ مکان دادی کے والد کا تھا، اور دادی کے سوا اور کوئی وارث نہیں تھا، تائی کے کوئی لڑکا نہیں تھا، تاؤ کا انتقال ہوگیا تھا، ان کی تین لڑکیاں ہیں: بانو، سلیمہ، نور جہاں، بانو اور سلیمہ کی شادیاں ہوچکی ہیں، نور جہاں نے شادی نہیں کی، مکان ایک منزلہ تھا، اب دو منزلہ ہوگیا ہے، سلیمہ اور بانو نے آج تک اپنی ماں کی کوئی خدمت پیسے سے نہیں کی وہ فالج کے مرض میں مبتلا ہوکر ۲۸/ اگست کو انتقال کرگئیں، میں نور الحسن اور ایک میرا بھائی شمس الحسن اپنی سگی ماں سے ہیں، ایک دوسرا بھائی ابوالحسن دوسری ماں سے ہے، یعنی وہ سوتیلا بھائی ہے، میرے علاوہ کسی بھائی نے تائی کی مدد نہیں کی ہے، میں ان کے ہر آڑے وقت کام آیا ہوں، میں نے مکان تائی کے نام اس لیے کرایا تھا کہ وہ آخر میرے نام کردیں گی، آپ شرعی اعتبار سے تحریر فرمائیں کہ مکان مجھے ملے گا یا نہیں؟ میرے نام بدقسمتی سے ان کی کوئی تحریر نہیں ہے، یا اس کی تقسیم کس طرح ہوگی؟ جواب سے مستفید فرمائیں۔

نوٹ: ہم نے اپنی تائی رفیقاً کے نام جو مکان ہبہ کروایا تھا وہ ایک منزلہ تھا اب اس پر دوسری منزل نور جہاں نے تعمیر کرائی ہے، تو دوسری منزل نور جہاں کی ملکیت ہے یا اس کی بھی شرعی تقسیم ہونی ہے؟

المستفتی: نور الحسن اصالت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نورالحسن کی دادی نے اپنی زندگی میں وہ مکان نورالحسن کی تائی رفیقاً کے نام ہبہ کرکے قبضہ دیدیا تھا، اور رفیقاً نے اپنی حیات میں کسی کے نام کوئی وصیت نہیں کی تھی، اس لیے وہ مکان رفیقاً کے انتقال کے بعدان کی تینوں لڑکیوں بانو، سلیمہ،نورجہاں کے درمیان برابر برابر تقسیم ہوگا۔

الهبة تصح بالإيجاب والقبول والقبض لابد منه لثبوت الملك.

(هدايه، کتاب الهبة، اشرفی ۳/۲۸۳)

رفیقاً کے شوہر کے بھتیجے نورالحسن، شمس الحسن اور ابوالحسن وراثت میں شریک نہ ہوں گے، اورنورجہاں نے اپنی ماں کی موجودگی میں اپنے پیسے سے جواوپری منزل تعمیر کروائی ہے وہ شرعاً ماں کی ملکیت شمار ہوکراس کی بھی تقسیم ہوگی، البتہ نورجہاں کوخرچ کیے ہوئے پیسوں کے واپس لینے کاحق ہوگا۔

والمستحقون للتركة عشرة أصناف فيبدأ بذوى الفروض (إلى قوله) ثم يوضع فى بيت المال. (در مختار مع الشامی، کتاب الفرائض، زکریا ۱۰/۴۹۸- ۵۰۳، کراچی ۶/۷۶۲- ۷۶۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمدقاسمی عفااللہ عنہ
۲۵؍ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۷۹۶)

الجواب صحیح
احقرمحمدسلمان منصورپوری غفرلہ
۲۵/۴/۱۴۱۷ھ

مصلحتاً دوسرے کے نام سے خریدی گئی اشیاء ترکہ میں شامل ہوں گی

سوال [۱۱۳۳۲]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم چھ بھائی وایک بہن: عبدالوحید، عبدالحفیظ، عبدالرشید، عبدالعزیز، سعیداحمد، عبدالحمید، ریحانہ نسرین ہیں۔

والدصاحب ٹھیکیدار تھے، ٹھیکیداری کے زمانے میں انہوں نے ایک پلاٹ اورایک

ٹرک لیا تھا، پلاٹ والدہ کے نام کا ہے، ٹرک دوسرے نمبر کے بھائی کے ذمہ تھا، اور ٹھیکیداری تیسرے نمبر کے بھائی کے ذمہ تھی، خاندان کا مشترکہ کاروبار یہ ہی تھا، تین چھوٹے بھائی اس وقت پڑھتے تھے، ٹرک پہلے ڈرائیور چلاتا تھا، بعد میں دوسرے نمبر کے بھائی ڈرائیوری کرنے لگے اور اس کے ساتھ چھوٹے بھائی کنڈیکٹری کرنے لگے تھے، بہن کی شادی کے لیے والدہ کے نام کا پلاٹ (اس میں سے آدھا پلاٹ) شادی کے وقت والدہ صاحب نے فروخت کردیا تھا، آدھا پلاٹ (۱۸۰۰/اسکوائر فٹ) باقی ہے، ٹرک کی کمائی پر والدین نے بعد میں تین پلاٹ تقریباً ۱۲/۱۲/اسکوائر فٹ کے کچھ سال کے وقفے سے خریدے، اس میں سے دو پلاٹ دوسرے نمبر کے بھائی (عبدالحفیظ) کے نام اور ایک پلاٹ چوتھے نمبر کے بھائی (عبد العزیز) کے نام خریدا گیا، کیونکہ اب ٹرک پر چار بھائی محنت کرنے لگے تھے، اس درمیان دوسرا ٹرک بھی خریدا گیا، والدین کی حیات میں چار بھائی اور ایک بہن کی شادی ہوچکی تھی، دو چھوٹے بھائیوں کی شادی ہونا باقی تھی، والد صاحب کا رہتا ہوا گھر ناکافی ہونے کی وجہ سے تیسرے نمبر کے بھائی (عبدالرشید) نے ایک پلاٹ خود خرید کر خود کا گھر تعمیر کیا، اور اس میں وہ رہنے لگے، اس درمیان والد صاحب کا انتقال ہوگیا، والد صاحب کے انتقال کے بعد دوسرے نمبر کے بھائی (عبدالحفیظ) نے بھی والد کے لیے تین پلاٹوں میں سے ایک پر اپنا گھر تعمیر کرلیا، اور اس میں وہ رہنے لگے، ان کے پاس والد صاحب کا لیا ہوا ایک ٹرک آج بھی موجود ہے، والد صاحب کے انتقال کے تقریباً دو سال بعد والدہ کا بھی انتقال ہوگیا، والدہ کے انتقال کے بعد دوسرا ٹرک کچھ وجوہات کی بنا پر فروخت کرنا پڑا، اس کی فروخت کی گئی رقم ۴۵/ہزار روپئے تینوں چھوٹے بھائیوں کو دی گئی، اس کے بعد سے بڑے بھائی (عبدالحفیظ) نے ٹرک کی کمائی میں سے ایک پیسہ بھی نہیں دیا، تینوں چھوٹے بھائی اپنے اپنے طور پر والد کے انتقال کے بعد کچھ کام (آٹو چلا کر اور پرنٹنگ کا کام) کرکے خود کی فیملی اور والدہ کے ساتھ والد صاحب کے پرانے گھر میں رہنے لگے، اس درمیان بہن کی شادی سے بچا ہوا آدھا پلاٹ والدہ نے تینوں چھوٹے بھائیوں کو دیدیا، اور اس بات کا بڑے بھائیوں اور بہن

کو بھی گواہ بنایا کہ یہ آدھا پلاٹ تینوں چھوٹے بھائیوں کا ہے،اوراس کا تیسرے نمبر کے بھائی (عبدالرشید) خود اقرار کرتے ہیں، یہ بات والدہ مرحومہ نے کئی مرتبہ کہی، اپنی حیات میں انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ تم کورا اسٹامپ پیپر لادو تا کہ ’’میں اس پر سائن کردوں‘‘ کہ یہ پلاٹ تینوں چھوٹے بیٹوں کا ہے،لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا، کیونکہ ہمیں اپنے بڑے بھائیوں پر پورا بھروسہ تھا وہ اس بات سے نہیں پھریں گے، یہ بات سبھی جانتے ہیں، اسی وجہ سے اس پلاٹ کا ٹیکس جب سے وہ لیا گیا تھا،۲۰۱۲ءتک چھوٹے بیٹے نے ادا کیا اوراس کے آنکھنے (مارکنگ) کا خرچ بھی چھوٹے بیٹے نے ادا کیا،اور بڑے بھائی (عبدالرشید)اس بات کے گواہ ہیں، کیونکہ ٹیکس اور پھیر پھار پر جو بھی خرچ آیا ان ہی کے ہاتھوں ادا کیا گیا، اورانہوں نے ہی اس کے کاغذات بھی لا کر چھوٹے بھائی کے پاس دیئے ہیں، والدہ کے انتقال کے بعد تیسرے نمبر کے بھائی (عبدالرشید) نے اپنا مکان فروخت کر کے والدہ کا لیا ہوا پلاٹ جو چوتھے نمبر کے بھائی (عبدالعزیز) کے نام تھا، اپنا گھر تعمیر کرالیا، اب وہ اس میں رہتے ہیں، جبکہ وہ پلاٹ ان کے نام نہیں ہے، دونوں چھوٹے بھائیوں کی شادی تینوں چھوٹے بھائیوں نے اپنی محنت سے کی ان شادیوں میں بڑے بھائیوں نے کچھ مدد نہیں کی، تینوں چھوٹے بھائی والد صاحب کے پرانے گھر میں ہی رہتے ہیں، جوکہ ۶۵۰/اسکوائر فٹ کا ہےاوراب وہ شکستہ ہوگیا ہے، بڑے بھائی (عبدالحفیظ) نے جو گھر تعمیر کیا وہ پلاٹ ان ہی کے نام سے لیا گیا تھا، ان کے نام پر ایک اور پلاٹ لیا گیا تھا، جو ابھی خالی پڑا ہوا ہے، اس کے علاوہ بھی ان دونوں بھائیوں کے پاس اور بھی پلاٹس موجود ہیں، لیکن وہ والدین کے انتقال کے بعد لیے ہوئے تھے، اس سے ہمیں کوئی لینا دینا نہیں ہے، بڑے تینوں بھائی اب یہ کہتے ہیں کہ والد صاحب کا پرانا گھر اور والدہ کے نام کا آدھا پلاٹ ہی سب بہن بھائیوں میں تقسیم ہوگا، باقی نہیں، کیا شرعی اعتبار سے یہ صحیح ہے؟

والدین کی حیات میں مشترکہ کمائی سے خریدے ہوئے پلاٹس (بڑے بھائی کے نام کے) اور ایک ٹرک پر کیا ان ہی دونوں بھائیوں کا حصہ ہے، باقی چھوٹے بھائیوں کا نہیں

ہے؟ کیا والدین کا رہتا ہوا گھر ۶۵۰ /اسکوائرفٹ) کا اور بہن کی شادی میں سے بچا ہوا آدھا پلاٹ (جو کہ والدہ نے اپنے حیات میں تینوں چھوٹے بھائیوں کو دیدیا تھا) کیا ان دونوں کا ہی بٹوارہ ہوگا؟ یا والدین کے حیات میں مشترکہ کمائی سے خریدے ہوئے تمام پلاٹس اور ان پر تعمیر کیے دونوں بھائیوں کے مکانات بھی بٹوارہ میں شامل ہوں گے؟

یہ بات آپ کے علم میں ہو کہ والدین کے انتقال کو تقریباً ۱۴/سال ہو رہے ہیں، اور ان کی جائیداد کا ابھی تک بٹوارہ نہیں ہوا ہے۔ برائے کرم اس مسئلہ کا حل شریعت کے مطابق بتائیے، اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائے۔

المستفتی: عبدالعزیز امراوتی مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ میں خاندانی جائیداد کا بڑا الجھاؤ پیش کیا گیا ہے، شریعت کا حکم یہ ہے کہ باپ کی زندگی میں جتنی جائیداد اور ٹرک وغیرہ خریدے گئے ہیں وہ سب کے سب باپ ہی کی ملک ہیں، جن لوگوں کے نام سے خریدے گئے ہیں وہ مالک نہیں ہوسکتے، لہٰذا باپ نے جو پلاٹ بیوی کے نام سے خریدا ہے اس کا بھی درحقیقت باپ ہی مالک ہے، اور جو ٹرک خریدے تھے، ان کا بھی باپ ہی مالک ہے، پھر عبدالحفیظ کے نام سے ۲/ پلاٹ اور عبدالعزیز کے نام سے ایک پلاٹ خریدا گیا ان کا بھی باپ ہی مالک ہے، اور اس کو شریعت میں بیع التلجئۃ کہا جاتا ہے، اور باپ کا جو پرانا مکان تھا اس کا بھی باپ مالک ہے، لہٰذا باپ کی وفات کے وقت منقولہ وغیر منقولہ ساری جائیداد شرعی طور پر بطور میراث تقسیم ہوگی، اور چونکہ والدہ کا بھی انتقال ہوگیا ہے اس لیے اس کو جو ملتا ہے وہ بھی چھ لڑکوں اور لڑکی کے درمیان ۱۳/حصوں میں تقسیم ہوکر ہر لڑکے کو دو- دو حصے اور لڑکی کو ایک حصہ ملے گا اور جن لوگوں نے پلاٹ کے اوپر مکانات بنا لیے ہیں ان مکانات کی زمین کو موجودہ قیمت لگا کر وارثین کے درمیان تقسیم کرنا ہوگی۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/ ۳۶-۳۷)

بیع التلجئة وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف عدو وهو ليس ببيع بل كالهزل. (شامی، باب الصرف، مطلب: فی بیع التلجئة، زکریا

۷/ ٤٢ ٥، کراچی ٥/ ۲۷۳، معجم لغة الفقهاء کراچی ص: ۱۱۳، قواعد الفقه اشرفی ص: ۲۱۳، معجم المصطلحات والألفاظ الفقهية دار الفضيلة ١/ ٤٠٥) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۹۸۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۳/۲ھ

پرانی اور نئی جائیداد کی تقسیم

سوال [۱۱۳۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک صاحب کا انتقال ہوگیا، اور مرنے کے بعد انہوں نے ایک زمین چھوڑی تھی، اور ورثاء میں تین لڑکیاں، دولڑکے، لڑکیاں شادی شدہ اپنی جگہوں پر تھیں، اور ایک لڑکا سیر وتفریح میں تھا، کہ دوسرے لڑکے نے ان سب وارثوں کی اجازت کے بغیر زمین بیچ دی تھی، اسی موقع پر اس بیچنے والے کو کہیں اور ایک دوسری زمین ہاتھ لگ گئی جس پر قبضہ کر کے اس نے رہائش شروع کردی، اور برابر وہ اس طرح رہتا رہا کہ دولڑکیوں کا انتقال ہوگیا جو کہ اس زمین بیچنے والے کی بہنیں ہیں، اب موجودہ وقت میں اس زمین بیچنے والے کا ایک بھائی ہے جو پہلے تفریح کرنے والا تھا اور ایک بہن، اس وقت ۲۰/ شعبان کو اس زمین بیچنے والے کا بھی انتقال ہوگیا، جبکہ اس کی ارض مسکونہ موجود ہے، جو اسے ہاتھ لگی تھی، تو اس مذکورہ صورت میں اس کے دوسرے ایک بھائی اور بہن کو اس پرانی بیچی ہوئی زمین کی قیمت میں سے کتنا حصہ دلایا جائے اور قیمت دینے میں اس بیچنے کے وقت کا اعتبار کیا جائے یا موجودہ وقت میں زمین کی قیمت دیکھی جائے کیونکہ اب زمین کی قیمت پہلے سے بہت بڑھ چکی ہے، یہ بھی خیال رہے کہ اس زمین بیچنے والے کی دو بہنوں کا انتقال پہلے ہی ہو چکا ہے، جو اس پرانے زمین چھوڑنے والے کی لڑکیاں تھیں، اور اس بیچنے والے کی بہنیں ہیں، اور ان دونوں کی اولاد موجود ہیں، دوسرے کیا اب اس کی موجودہ بہنوں اور دوسرے تفریح کرنے والے بھائی کو اس زمین بیچنے والے کی موجودہ رہائش والی زمین میں حصہ دیا جائے اور کتنا دیا جائے، کیونکہ

اس بیچنے والے کا بھی انتقال ہوگیا ہے، اور یہ رہائش والی زمین چھوڑی ہے جس پر اس زمین بیچنے والے کا لڑکا اور ایک منکوحہ لڑکی رہتی ہے، اولاً پرانی زمین کے احکامات اور ثانیاً موجودہ رہائش والی زمین کے احکامات تحریر فرمائیں؟

المستفتی: اصغر حسین امیر جماعت ہلدوانی نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ میں کل پانچ وارثین ہیں: تین لڑکیاں اور دو لڑکے، ایک لڑکے نے باقی چار وارثین کی اجازت کے بغیر جائیداد فروخت کی ہے، جو اس کے لیے جائز نہیں تھا، لہٰذا جائیداد فروخت کرکے جو رقم آئی ہے اس رقم میں تمام وارثین کا حق متعلق ہے، اور پھر جب اس نے اس رقم سے دوسری جائیداد خریدی ہے تو اس دوسری جائیداد میں تمام وارثین کا حق متعلق ہوگیا، لہٰذا پرانی جائیداد میں سے جو کچھ بچی ہوئی ہے اور نئی جائیداد جس میں رہائش ہے دونوں قسم کی جائیدادوں میں پانچوں کا حق متعلق ہے، اور جو حقدار وفات پاچکے ہیں ان کا حق ان کی اولاد میں منتقل ہوگا، اور جو حقدار زندہ ہیں وہ اپنا حق براہ راست وصول کریں گے، لہٰذا پرانی جائیداد اور نئی جائیداد سات حصوں میں تقسیم ہوکر دو دو حصہ دونوں بھائیوں کو ملے گا، اور ان کے واسطے سے ان کی اولادوں کو اور ایک ایک حصہ تینوں بہنوں کو ملے گا اور بہنوں کے بعد ان کی اولادوں کو ملے گا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ شوال المکرّم ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۱۷۵/۳۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۱۱/۱۳ھ

گھر یا جائیداد میں درخت ہو تو اس کی تقسیم

سوال [۱۱۳۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: دو بھائی زاہد حسین، واجد حسین، برابر کے مکانوں میں رہتے ہیں، زاہد حسین نے اپنے آنگن میں ایک نیم کا درخت لگایا، پھر انہی دونوں مکانوں کے متصل ایک اور مکان

خریدلیا، اوردونوں بھائیوں نے مل کرخریدا، پھر دونوں بھائیوں نے نئی پرانی تمام زمین کوبرابر برابر تقسیم کرلیا، وہ درخت والا حصہ زاہد حسین ہی کے حصہ میں آیا، پھر دونوں بھائیوں نے نئی پرانی دونوں زمینوں کے برابر ایک اور زمین اسی مکان کے پیچھے خرید لی، اب زاہد حسین بعد والی خریدی ہوئی جگہ میں رہتے ہیں اور یہی ان کا حصہ ہے، تووہ درخت جوزاہد حسین نے لگایا تھاوہ زاہد حسین کا ہوگا یادونوں بھائیوں کا مشترکہ ہوگا؟ درخت والا حصہ اب واجد حسین کے پاس ہے، شرعی حکم تحریر فرمادیں؟

المستفتی: زاہد حسین مغل پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گھریاجائیداد میں درخت بھی ہےتواس کی تقسیم میں درخت اسی کی ملکیت ہوتی ہے جس کے حصہ کی زمین میں درخت ہوتا ہے، لہٰذا مذکورہ سوال میں جس درخت کا ذکر ہے وہ درخت واجد حسین کے حصہ میں آیا، اس لیے شرعی طور پر وہ درخت واجد حسین ہی کا ہوگا، اگرچہ تقسیم سے پہلے وہ درخت زاہد حسین نے ہی لگایا ہو۔

ویدخل الشجرة فی قسمة الأراضی وإن لم یذکروا الحقوق والمرافق کما تدخل فی بیع الأراضی. (عالمگیریه، کتاب القسمة، الباب الرابع، زکریا جدید ۵/۲۴۹، قدیم ۵/۲۱۵) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۴۶۴/۳۶)

کھیتی باڑی میں بہنوں کا بھی حق ہے

سوال [۱۱۳۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے والد انتقال فرما چکے ہیں اور والدہ حیات ہیں، ہم تین بہنیں اور دو بھائی ہیں، میری دونوں چھوٹی بہنیں مالی طور پر نہایت کمزور ہیں، حالانکہ میرے والد پنڈٹ نگلہ میں کافی

زمین چھوڑ کر گئے ہیں، جس پر میرے دونوں بھائی قابض ہیں، وہ کافی زمین بیچ بھی چکے ہیں، کاغذات پر مالکان میں وہ صرف اپنا ہی نام دکھاتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ کھیتی باڑی کی زمین میں بیٹی کا کوئی حصہ نہیں ہوتا جبکہ پنڈت نگلہ کی زمین پچھلے کئی سال سے رہائشی علاقہ میں تبدیل ہوچکی ہے، اور اس وقت مرادآباد کے ایک محلّہ کے طور پر جانی جاتی ہے، آپ سے عرض ہے کہ براہ کرم روشنی ڈالیں، شریعت کی رو سے ہمارا کتنا حصہ ہے، یعنی اس زمین میں ہم بہنیں کتنی حصہ دار ہیں؟

المستفتی: سلطانی بیگم زوجہ محمد حسین جھبو کا نالہ کسرول مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کے والد نے انتقال کے وقت جو کھیتی باڑی کی زمین پنڈت نگلہ میں چھوڑی ہے اس میں بھائیوں کے ساتھ بہنوں کا بھی حصہ ہے، اور بھائیوں کا یہ کہنا غلط ہے کہ کھیتی باڑی کی زمین میں لڑکیوں کا حصہ نہیں ہوتا، لہٰذا آپ کے والد صاحب مرحوم نے مرتے وقت بشمول پنڈت نگلہ کی زمین جتنی جائیداد کے مالک تھے سب کی سب شرعی طریقہ پر ان کی اولاد لڑکے لڑکیوں اور بیوی کے درمیان شرعی حصے کے مطابق مندرجہ ذیل طریقے پر تقسیم ہوگی:

شوہر میت ۸

بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی
۱	۲	۲	۱	۱	۱

کل ترکہ ۸؍سہام میں تقسیم ہوکر اسی کے تناسب سے ہر وارث کو اتنا اتنا ملے گا جو اس کے نام کے نیچے درج ہے۔

لأن التركة ......عند الحنفية..... الأموال و الحقوق المالية التی كان يملكها الميت فشمل الأموال المادية من عقارات و منقولات و ديون على الغير. (الفقه الاسلام و أدلته، هدیٰ انٹر نیشنل دیوبند ۸/ ۲٦۸، دار الفكر ۱۰/ ۷۷۲٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

كتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۷۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳؍۴؍۱۴۳۴ھ

کیا بیوی کے حج کیلئے جمع کردہ رقم ترکہ میں شامل ہوگی؟

سوال [۱۱۳۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ منشی بشیر کا انتقال ہوگیا، انہوں نے اپنے پیچھے ایک بیٹا راشد اور ایک بیوی سلمہ اور دو بیٹیاں حبیبہ اور خدیجہ چھوڑے، اور ترکہ میں چار لاکھ روپیہ اور چار مکانات چھوڑے۔

چار لاکھ میں سے دو لاکھ زندگی ہی میں بیوی کے حج کے نام سے اپنے ایک نواسے کے پاس جمع کردیئے تھے، اور بقیہ دو لاکھ بینک میں صراحتاً یہ کہہ کر چھوڑا تھا کہ میرے مرنے کے بعد یہ میری بیوی کی ضروریات میں استعمال ہوگا۔

اور مکانات کی تفصیل یہ ہے کہ چار مکانات میں سے ایک مکان میں اپنے بیٹے کو مع اہل وعیال کے ٹھہرایا تھا، اور ایک میں خود بنفس نفیس مع اہلیہ کے سکونت پذیر تھے، اور دو مکانات خالی تھے، نیز اپنی ایک زمین اپنی حیات ہی میں بیچ کر اپنے لڑکے راشد کو دو لاکھ روپیہ اس نیت کے ساتھ دے چکے تھے کہ بقیہ ترکہ میں اس کا کوئی حصہ نہیں رہے گا۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

(۱) جو دو لاکھ روپیہ زندگی میں اپنی بیوی کے نام حج کے لیے اپنے نواسے کے پاس جمع کیے اس میں دیگر ورثاء کا کوئی استحقاق ہوگا یا نہیں؟

(۲) مابقیہ دو لاکھ روپیہ جس کے متعلق زندگی میں یہ کہہ دیا تھا کہ یہ میرے بعد میری بیوی کی ضرورت میں استعمال ہوگا، اس میں دیگر وارثین کا استحقاق ہوگا یا نہیں؟ جبکہ اپنی زندگی میں اپنے بیٹے راشد کو دو لاکھ روپیہ اس نیت سے دے چکے تھے کہ اب اس کا مابقیہ مال میں کوئی حصہ نہیں ہوگا؟

(۳) مذکورہ چار مکانات میں وارثین کا استحقاق ہوگا یا نہیں؟ اور تقسیم مکانات کی کیا شکل ہوگی؟ مالیت بنا کر تقسیم کریں گے یا مکانات کی تقسیم ہوگی؟

نوٹ: ایک مکان کا اپنے بڑے لڑکے راشد کو مالک بنایا تھا، اور ایک مکان اپنے اور بیوی

کےاستعمال میں رکھاتھا،اس نیت کےساتھ کہ میرے بعدمیری بیوی اس مکان میں رہے گی۔

المستفتی: رضوان عثمان آبادمہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: ترکہ میں جو چار لاکھ روپئے اور چار مکان چھوڑے ہیں، سب کے سب مرحوم کے متروکہ میراث میں شمار ہوں گے، اور بیوی کے حج کے نام سے نواسے کے پاس جو دولاکھ روپئے جمع کردیئے تھے اور بیوی کے حج کو جا کران پیسوں کوخرچ کرنے سے پہلے پہلے مرحوم کا انتقال ہوگیا تو وہ پیسہ بیوی کے نام سے وصیت کے درجے میں ہےاوراسی طرح بیوی کےخرچ کے لیے جو دولاکھ روپئے بینک میں جمع کر رکھا ہےاور بیوی کے نام سے الگ کھاتہ میں جمع نہیں کیا ہےتو وہ پیسہ بیوی کے لیے ہبہ نہیں ہوا، بلکہ وہ پیسہ بھی وصیت کے درجے میں ہے، بیوی چونکہ وارث ہےاوروارث کےحق میں دیگر ورثاء کی اجازت ومرضی کےبغیر وصیت نافذنہیں ہوتی ،لہٰذااگر بیوی کے نام کی مذکورہ وصیت کے نفاذ میں دیگرورثاء کی اجازت نہیں ہےتو وہ چار لاکھ روپئے مرحوم کی میراث میں شامل ہوں گے، البتہ اگردیگرورثاءبخوشی اجازت دیدیں تو بیوی کووہ رقم مل جائے گی۔

عن أبی أمامة الباهلی –رضی الله عنه–قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ كل ذی حق حقه فلا وصية لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصية لوارث، النسخة الهندية ٢/٣٢ دار السلام رقم: ٢١٢٠، سنن أبی داؤد، الوصايا، باب ماجاء فی الوصية للوارث، النسخة الهندية ٢/٣٩٦، دار السلام رقم: ٢٨٧٠)

وقد جاء فی الحديث: الحيف فی الوصية من أكبر الكبائر وفسروه بالزيادة علی الثلث وبالوصية للوارث قال إلا أن يجيزها الورثة بعد موته وهم كبار. (هدايه آخرين، كتاب الوصية، باب فی صفة الوصية، اشرفی ديوبند ٤/٦٥٥)

اوراگراپنےلڑکےراشدکودولاکھ روپئے دےکرقبضہ دےدیا تھاتو وہ اس کا مالک ہوگا مگر یہ شرط لگانا درست نہیں ہے کہ مرنے کے بعد میراث میں راشد کا کوئی حصہ نہ ہوگا اور

راشد کو جو مکان رہنے کے لیے دیا تھا وہ اگر بطور ہبہ نہیں دیا تھا، تو وہ بھی مرحوم کی ملکیت ہے اور بیوی جس مکان میں رہتی تھی اگر بیوی کے نام منتقل نہیں کیا ہے تو وہ بھی مرحوم کی ملکیت میں ہے، لہٰذا چاروں مکانات مرحوم کی میراث میں شامل ہوں گے، اوران چاروں کی تقسیم مرحوم کے شرعی ورثاء کے درمیان ان کی قیمت کے اعتبار سے ہوگی، اور مرحوم کا ترکہ حسب ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا۔

$\frac{۳۲}{۸}$

میــــــــــــــــــــــت

بیوی	لڑکا	لڑکی	لڑکی
سلمہ	راشد	حبیبہ	خدیجہ
$\frac{۱}{۴}$	$\frac{۷}{۱۴}$	۷	۷

مرحوم کا کل ترکہ ۳۲؍حصوں میں تقسیم ہوکر اسی کے تناسب سے ہر وارث کو اتنا اتنا ملے گا جو اس کے نام کے نیچے درج ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۸۸۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۱۲/۱ھ

پہلی بیوی کے نام بیمہ پالیسی میں جمع شدہ رقم کا حکم

سوال [۱۱۳۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: راشد حسین مرحوم نے ایک بیمہ پالیسی اپنے نام کرائی تھی، اس میں نومنی (وارث) کی حیثیت سے انہوں نے اپنی زوجہ ریحانہ (پہلی بیوی) کو نامزد کیا ہے اس کی قسطیں راشد حسین اپنی حیات میں جمع کرتے رہے، پھر پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا، راشد حسین نے دوسری شادی کر لی، اور دونوں بیویوں سے اولاد ہیں، اور سب غیر شادی شدہ ہیں۔

دریافت یہ کرنا ہے کہ بیمہ پالیسی میں جمع شدہ رقم صرف نومنی کی ہوئی؟ بیوی کی

اولادوں کو ملے گی یا پھر دوسری بیوی جو حیات ہے؟ اور سب اولادیں حصہ دار ہوں گی؟ شرعی حکم کیا ہے؟ پہلی بیوی کے بطن سے ایک لڑکا تین لڑکیاں، دوسری بیوی کے بطن سے صرف ایک لڑکا ہے۔

المستفتی: ممتاز حسین محلّہ کٹارشہید مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: نومنی کے ذریعہ صرف ایک وارث کو رقم کا مستحق بنا کر دوسروں کو محروم کرنا شریعت میں معتبر نہیں ہے، بلکہ بعد از وفات نومنی کی رقم کو موجودہ وارثین کے درمیان حسب حصص شرعیہ تقسیم کیا جائے گا، لہٰذا پالیسی میں جو رقم جمع کی جائے گی وہ شرعی ورثاء کے درمیان تقسیم ہوگی اور جمع شدہ رقم پر جو اضافہ ملے گا وہ حلال نہیں ہے، اسے غریبوں کے درمیان بلانیت ثواب تقسیم کر دینا لازم ہے اور مابقیہ جائز رقم پہلی بیوی اور دوسری بیوی کی اولادوں میں اور جو بیوی زندہ ہے اس کے درمیان شرعی حصوں کے اعتبار سے تقسیم ہوگی، جیسا کہ حسب ذیل نقشہ سے واضح ہوتا ہے:

راشد حسین میت ۸

بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی
۱	۲	۲	۱	۱	۱

مرحوم راشد حسین کا ترکہ اس کے وارثین کے درمیان آٹھ برابر سہام میں تقسیم ہو کر ہر وارث کو اتنا اتنا ملے گا جو اس کے نام کے نیچے درج ہے۔

عن أبي أمامة الباهلي –رضي الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول في خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارك وتعالىٰ قد أعطىٰ كل ذي حق حقه فلا وصية لوارث. (سنن الترمذي، باب ما جاء لا وصية لوارث، النسخة الهندية ۲/ ۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبي داؤد، الوصايا، باب ماجاء في الوصية للوارث، النسخة الهندية ۲/ ۳۹۶، دار السلام رقم: ۲۸۷۰)

الإرث جبري لايسقط بالإسقاط. (تكمله شامي، مطلب: واقعة الفتاویٰ

زکریا ۱۱/۶۷۸، کراچی ۷/۵۰۵)

من اجتمع عنده مال حرام ویرید أن یدفع مظلمته عن نفسه فلیس له حیلة إلا أن یدفعه إلی الفقراء. (بذل المجهود، باب فرض الوضوء، سارنپور ۱/۳۷، دار البشائر الإسلامیه ۱/۳۵۹ تحت رقم الحدیث ۵۹، شامی زکریا ۹/۵۵۳، کراچی ۶/۳۸۵)

نوٹ: راشد حسین کی پہلی بیوی جس کا انتقال راشد حسین کی حیات میں ہوگیا تھا، اس کے لیے راشد حسین کی متروکہ جائیداد میں کوئی شرعی حصہ نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم صفر المظفر ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۲۷۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۲/ ۱۴۳۲ھ

بچوں کے نام سے کی گئی پالیسی بھی مرحوم کے ترکہ میں شامل ہوگی

سوال [۱۱۳۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے اپنی زندگی میں دولڑکوں کے لیے مکان تیار کروادیئے وہ اسی میں رہ رہے ہیں، اور تیسرے لڑکے کے لیے بکنگ کروادی تھی، اس کی قسطیں باقی ہیں ابھی اس جگہ پر قبضہ نہیں ہوا ہے، نیز تمام بچوں اور دو پوتیوں کے نام پالیسی بھی کی تھی، اس کی قسطیں زید جمع کرتا تھا، اب زید کے انتقال کے بعد قسطیں (مکان و پالیسی کی) زید کے ترکہ سے جمع کی جائیں گی؟ یا یہ کہ ہر ایک پالیسی والا خود جمع کرے گا؟

المستفتیہ: اھلیہ شعیب رشید اصالت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: زید نے بکنگ کر کے جو دو مکان تیار کروائے ہیں اس کا زید خود مالک ہے، اسی طریقے سے تیسرے بیٹے کے نام سے جو بکنگ کروادی ہے اور اس کی کچھ قسطیں بھی جمع ہو چکی ہیں، اس کا بھی زید مالک ہے، زید نے صرف اس مصلحت سے نام کروایا ہے تاکہ زید کی موت کے بعد اس کی اولاد کے درمیان اختلاف وانتشار پیدا نہ ہو اس لیے

یہ نام کرادینا مالک بنانے کی دلیل نہیں ہے، بلکہ یہ بیع التلجئۃ کی ایک شکل ہے اس لیے جو دو مکان تیار ہو چکے ہیں جن میں دو بیٹے رہ رہے ہیں اور جس مکان کی قسطیں جمع ہونا شروع ہوگئیں ہیں، وہ اس کی قسطوں کے بقدر یہ سب چیزیں زید کی ملکیت اور جائیداد ہیں، وہ سب زید کی اولادوں کے درمیان حصۂ شرعی کے اعتبار سے تقسیم ہوں گی، ایسا نہیں کہ تیار شدہ مکانوں کو اس میں رہنے والے لڑکوں کے لیے ہبہ شمار کرلیا جائے اور باقی اولاد اس سے محروم ہو جائے اسی طرح پالیسی میں جن بچوں اور وارثین کے نام سے جو پیسہ جمع کیے ہیں وہ بھی زید کی ملکیت ہیں، وراثت میں اس کا بھی تناسب کے ساتھ حساب لگانا ضروری ہے، اور بیٹوں کی موجودگی میں پوتے چونکہ غیر وارث ہیں اس لیے پوتوں کے نام سے جو پیسے جمع ہوئے ہیں وہ پوتوں کے لیے ہبہ ہے، اور آئندہ کی پالیسی زید کے ترکہ میں سے جمع نہیں ہوگی، یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ لائف انشورنش کی پالیسی وغیرہ کرانا شرعی طور پر ناجائز اور حرام ہے۔ (ایضاح النوادر/۱۳۱، امداد الفتاویٰ ۳/ ۳۶، ۳۷)

بيع التلجئة وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف عدو وهو ليس ببيع بل كالهزل. (شامي، باب الصرف، مطلب: في بيع التلجئة، زكريا ٧/ ٥٤٢، كراچی ٥/ ٢٧٣، معجم لغة الفقهاء كراچی ص: ١١٣، قواعد الفقه اشرفی ص: ٢١٣، معجم المصطلحات والألفاظ الفقهية دار الفضيلة ١/ ٤٠٥)

وتتم الهبة بالقبض الكامل. (شامي، كتاب الهبة، زكريا ٨/ ٤٩٣، كراچی ٥/ ٦٩٠)

إن أعيان المتوفىٰ المتروكة عنه مشتركة بين الورثة على حسب حصصهم. (شرح المجلة رستم اتحاد ١/ ٦١٠ رقم المادة ١٠٩٢) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ شعبان المعظم ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۲۸)

وارث کے لیے وصیت کردہ ایفڈ یترکہ ہے

سوال [۱۱۳۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: میں رخسانہ بیگم زوجہ رفیق احمد خاں سرسید نگر کرولہ اسلام نگر گلی نمبر ۱۰/ A ڈھیمری روڈ مرادآباد کی باشندہ ہوں، ۱۹۹۶ء میں میری والدہ جن کا نام حسن آراء ہے، اور نگینہ میں رہائش تھی، کا انتقال ہوگیا، انہوں نے اپنے نام حسن آراء اور میرے نام سے ایک ایف ڈی مبلغ پچاس ہزار روپئے کی بڑودہ بینک نگینہ میں کرائی تھی، اور ایف ڈی میں یہ شرط بھی لکھائی تھی کہ میرے انتقال کے بعد یہ روپئے رخسانہ بیگم کو ہی ملیں، اب میرے والد اور بھائی کی نیت خراب ہو رہی ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس روپئے کا حقدار میں ہوں، واضح رہے کہ میری والدہ اپنے انتقال سے قبل کہہ چکی تھی، کہ تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گی، اس لیے اس روپئے کا حقدار میں ہوتی ہوں، یا والدہ کے دیگر ورثاء شوہر (یعنی میرے والد) اور ایک لڑکا اور دو لڑکیاں بھی حقدار ہوں گی، براہ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب تحریر فرمائیں؟

المستفتی: رخسانہ زوجۂ رفیق اسلام نگر، سرسید نگر مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کی والدہ کا ایک ایف ڈی مبلغ پچاس ہزار روپیہ بینک میں آپ کے نام کر کے یہ شرط لگانا کہ میرے انتقال کے بعد یہ روپئے آپ ہی کو ملیں یہ وصیت کے درجے میں ہے اور وارث کے لیے وصیت ناجائز ہے، لہٰذا آپ کے علاوہ دیگر ورثاء بھی اس روپئے کے شرعاً حقدار ہوں گے۔

عن أبی أمامة الباهلی –رضی الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصیة لوارث، النسخة الهندیة ۲/۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، الوصایا، باب ماجاء فی الوصیة للوارث، النسخة الهندیة ۲/۳۹۶، دار السلام رقم: ۲۸۷۰)

ولا لوارثه إلا بإجازة ورثته لقوله علیه السلام: لاوصیة لوارث إلا أن یجیزها الورثة یعنی عند وجود وارث آخر . (شامی، کتاب الوصایا، کراچی

٦/٦٥٥-٦٥٦، زكريا ١٠/٣٤٦، كوئٹه ٥/٤٥٩، الجوهرة النيرة، امداديه ملتان ٢/٣٨٩، دار الكتاب ديوبند ٢/٣٦٩، هدايه رشيديه ٤/٦٤١، اشرفي ديوبند ٤/٦٥٧، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/٤١٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍محرم الحرام ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۳/۶۴۰۳)

مرحوم کے اسکول کی آمدنی جمیع وارثین کے درمیان تقسیم ہوگی

سوال [۱۱۳۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے ایک اسکول کرایہ کے مکان میں بحیثیت بزنس کے کھولا اور اسی اسکول کی آمدنی سے گھر کے اخراجات پورے ہوتے ہیں، اور اس اسکول کی ہیڈ معلّمہ مرحوم کی اہلیہ شروع ہی سے ہیں، اور مرحوم کی بڑی لڑکی بحیثیت معلّمہ کے تھیں، اور بڑی ہونے کی وجہ سے نظام وہی چلا رہی تھیں، اب اس لڑکی کی شادی ہوچکی ہے، باوجود اس کے اسکول کی ساری آمدنی اپنے شوہر اور سسرال والوں پر خرچ کرتی ہیں، اور اسکول کو اپنی ملکیت سمجھ کر ایسا کرتی ہیں، اب سوال یہ ہے کہ از روئے شرع یہ اسکول مرحوم کے مذکر اولاد کا ہے یا مؤنث کا؟ تفصیل سے قرآن وحدیث کی روشنی میں مکمل ومدلل جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: شہزاد خاں کرتپوری، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید نے ایک اسکول کرایہ کے مکان میں بحیثیت بزنس کے کھولا اور اس کی آمدنی سے گھر کے اخراجات پورے ہوتے تھے، تو اب زید کے مرنے کے بعد اس اسکول کی ذمہ داری اس کو حاصل ہوگی جو مرحوم کے پورے گھر کے ذمہ دار ہیں، اور مذکورہ بیٹی کو ٹیچر کی حیثیت سے صرف تنخواہ مل سکتی ہے، پوری آمدنی مرحوم کی ذمہ دار اولاد کے ہاتھ میں آئے گی، اور پھر یہ تمام آمدنی تمام وارثین کے درمیان وراثت کے طریقہ

پر تقسیم ہوگی، اوراس میں مذکورہ لڑکی کا جتنا حصہ بن سکتا ہے اس کو اتنا ہی ملے گا اس سے زیادہ نہیں، اسی طرح لڑکوں کو لڑکیوں سے دوگنا کے حساب سے ملے گا۔

﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ. [النساء: ١٢] ﴾ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۱۴۵)

ایکسیڈنٹ میں ملنے والی رقم کا مستحق کون؟

سوال [۱۱۳۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کا ایک ایکسیڈینٹ حادثہ میں انتقال ہوا، اس کی بیوی نے مقدمہ دائر کیا، تو سرکار سے اب اس کو کچھ پیسہ ملنے والا ہے، اس پیسہ کو لینے میں زید کی بیوی اور زید کے باپ کے درمیان کشمکش ہے تو یہ پیسہ جو گورنمنٹ کی طرف سے اس کے رشتہ داروں کو مدد کے طور پر مل رہا ہے اس کے مستحق کون کون ہیں؟ اور کتنے کتنے کے مستحق ہیں؟ زید کی کوئی اولاد نہیں ہے؟

المستفتی: ڈاکٹر نسیم احمد ٹانڈہ بادلی رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ایکسیڈنٹ میں مرنے والے کے پسماندگان کو حکومت کی طرف سے جو رقم ملنے والی ہے، وہ دیت کے حکم میں ہوکر تمام شرعی ورثاء کے درمیان حصص شرعی کے طور پر تقسیم ہوگی، لہٰذا اس رقم کے حصول کی کوشش میں جو رقم خرچ ہوئی ہے، اولاً خرچ کرنے والے کو اسی میں سے وہ پیسہ ادا کر دیا جائے اس کے بعد بیوی کو حاصل شدہ کل رقم میں سے ایک چوتھائی دیدیا جائے، باقی تین چوتھائی باپ کو ملیں گی۔

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده قال: كان رسول الله ﷺ يقوم دية الخطأ على أهل القرىٰ -إلى- وقال رسول الله ﷺ: إن العقل ميراث بين ورثة القتيل على قرابتهم. (سنن أبي داؤد، باب ديات الأعضاء،

النسخة الهندية ٢/ ٢٢٧ دار السلام رقم: ٤٥٦٤)

ويستحق القصاص من يستحق ميراثه على فرائض الله تعالىٰ يدخل فيه الزوج والزوجة وكذا الدية. (قاضيخان، باب القتل، فصل فيمن يستوفىٰ القصاص، زكريا جديد ٣/ ٣٢٣، وعلى هامش الهندية ٣/ ٤٤٢، حاشية چلپی، مكتبه امداديه ملتان ٦/ ١٢١، زكريا ٧/ ٢٥٧، هنديه زكريا قديم ٦/ ٧، جديد ٦/ ١١)

۲۸/محرم ۱۴۲۱ھ میں ایسا ہی جواب لکھا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ذی قعدہ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۸۵۵/۳۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/۱۱/۱۴۲۳ھ

ایکسیڈنٹ میں ملنے والی معاوضہ کی رقم ترکہ ہے

سوال [۱۱۳۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمد حفیظ عرف ٹلّا کا ایکسیڈینٹ میں انتقال ہوگیا، حکومت سے کچھ رقم ملے گی، تو اس کے ورثاء میں ایک ماں اصغری ایک لڑکا شاکر علی ہے، کتنا کتنا حصہ دیا جائے گا، شریعت اسلامی کی روسے تحریر فرمادیں۔

المستفتی: شاکر علی کندرکی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایکسیڈینٹ میں مرنے والوں کے پسماندگان کو حکومت کی طرف سے جو رقم ملتی ہے، وہ ہندوستان جیسے ممالک میں اگر چہ باضابطہ دیت نہیں ہے، لیکن دیت کے مشابہ ہے، اس لیے شرعی ورثاء کے درمیان میراث کی طرح تقسیم کردی جائے گی، لہٰذا ملی ہوئی رقم ۶/سہام میں تقسیم ہوکر ایک ماں کو اور پانچ لڑکے کو ملیں گے۔

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده قال: كان رسول الله ﷺ يقوم دية الخطأ على أهل القرىٰ -إلى- وقال رسول الله ﷺ: إن العقل

میراث بین ورثة القتیل علی قرابتهم. (سنن أبی داؤد، باب دیات الأعضاء، النسخة الهندیة ۲/ ۲۲۷ دار السلام رقم: ٤٥٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۳۸۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۶/ ۱۱/ ۱۴۲۰ھ

کمپنی کی طرف سے ملنے والی رقم ترکہ میں شامل ہوگی

سوال [۱۱۳۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمد اسماعیل بن مشتاق احمد موضع کوبے پور ضلع فیض آباد یوپی کا ۱۶/ اکتوبر کو انتقال ہو گیا، مرحوم بحرین کی مشہور کمپنی الکبیر میں ملازم تھے، انتقال کے بعد کمپنی مرحوم کے ورثاء کو کچھ دینا چاہتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ مرحوم چار بھائی تھے، اور ماں باپ کے ساتھ ہی چاروں ایک ساتھ رہتے تھے، کھیتی پانی گھر کا سارا نظام مشترک ہے، ایک بھائی کا انتقال تقریباً دس سال پہلے ہو چکا ہے، باقی دو بھائی محمد ظہیر اور محمد صغیر اور مرحوم تینوں ایک ساتھ گھر میں رہ رہے ہیں، محمد ظہیر اور محمد صغیر گھریلو کام کھیتی باڑی، پالیسر وغیرہ دیکھتے ہیں اور مرحوم الکبیر کمپنی میں ملازم تھے، اور گھر کا سارا نظام میل ومحبت کے ساتھ مشترک چل رہا ہے، اور مرحوم نے اپنے پیچھے اپنی بیوی ماجیہ خاتون اور دو لڑکے محمد عمران اور عبدالرحمٰن اور ماں ختم النساء اور دو بھائی محمد ظہیر، محمد صغیر مع ان کی بیویاں اور اولادیں نیز اپنے بڑے بھائی محمد فرقان مرحوم کی بیوی اور اولادوں کو چھوڑا ہے، اس وقت مرحوم کے گھریلو نظام کے ذمہ دار مرحوم کے بھائی محمد ظہیر ہیں، تو الکبیر کمپنی جو رقم دینا چاہتی ہے اس میں ان ورثاء میں سے کس کا کتنا حق بنے گا؟

المستفتی: محمد ظہیر کوے پور، فیض آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: محمد اسماعیل مرحوم کے انتقال پر ”الکبیر“ کمپنی کی طرف سے ملنے والی رقم ان کے شرعی وارثوں کو شرعی حصوں کے اعتبار سے ملے گی، لہٰذا مذکورہ

رقم ۴۸ رحصوں میں تقسیم ہوکر بیوی کو۶ رحصہ والدہ کو۸ رحصہ اور ہرلڑکے کو ۱۷ر۱۷ رحصہ ملیں گے۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ ۱۰/۵۲۴، انوار رحمت ص:۳۵۲)

وإذا اصطلح القاتل و أولياء القتيل على مال سقط القصاص و وجب المال قليلا كان أو كثيرا. (هدايه، كتاب الجنايات، باب القصاص، فيما دون النفس اشرفي ديوبند ٤/٥٧١)

عن ابرهيم، عن علي –رضى الله عنه– في فارسيين اصطدما فمات أحدهما فضمن الحي الميت. (المصنف لإبن أبي شيبة الديات، الرجل يصدم الرجل مؤسسة علوم القرآن ١٤/ ٢٢١، رقم: ٢٨٢٠٥)

نقشہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

حمید مرزا میت ۴۸/۲۴

بیوی	ماں	لڑکا	لڑکا
۳/۶	۴/۸	۱۷/۱۷	۱۷

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۶۸۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۵/۸ھ

حادثاتی موت میں سرکاری معاوضہ میراث ہے یا نہیں؟

سوال [۱۱۳۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کسی حادثہ میں موت ہونے پر حکومت کی طرف سے معاوضہ دیا جاتا ہے اس کا لینا جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حادثاتی موت پر حکومت کی طرف سے ملنے والا معاوضہ دیت کے حکم میں ہے، جس کا لینا جائز اور درست ہے اور اس معاوضہ میں تمام ورثاء کا حق ہوگا، خواہ حکومت نے مخصوص وارثین کے لیے نامزد تعاون کا اعلان کیا ہو یا نامزد تعاون کا اعلان نہ کیا ہو۔ (مستفاد: انوار رحمت ص: ۳۵۲)

عن ابن طاؤس قال: فی الکتاب الذی عند أبی وهو عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی شبه العمد مثل حدیث معمرو: قال فی ذٰلک الکتاب عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم إذا اصطلحوا فی العمد فهو علی مااصطلحوا علیه. (مصنف عبد الرزاق، المجلس العلمی ۹/ ۲۸۳، رقم: ۱۷۲۱۶)

عن طاؤس و کان عنده کتاب من النبی قال فی ذلک الکتاب عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم إذا اصطلحوا فی العمد فهو علی ما اصطلحو علیه فهذا صریح فی أن المال یحتاج إلی اصطلاح. (تکمله فتح الملهم، باب صحة الإقرار بالقتل، اشرفیه دیوبند ۲/ ۳۷۱)

إذا اصطلح القاتل و أولیاء القتیل علی مال سقط القصاص ووجب المال قلیلا کان أو کثیرا –إلی قوله– و أصل هذا أن القصاص حق جمیع الورثة و کذا الدیة. (هدایه، الجنایات، باب القصاص فیما دون النفس، اشرفی ٤/ ٥٧١ – ٥٧٢)

عن عمرو بن عوف المزنی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یترک مفرج فی الإسلام حتی یضم إلی قبیلة قال ابن الأثیر فی النهایة ولایترک مفرج فی الإسلام قیل: وهو القتیل یوجد بأرض فلاة لایکون قریباً من قریة فإنه یودیٰ من بیت المال ولا بطل دمه. (مجمع الزوائد ٦/ ٢٩٣، معجم الکبیر للطبرانی، دار احیاء التراث العربی ١٧/ ٢٤، رقم: ٣٦)

عن ابرهیم، عن علی –رضی الله عنه– فی فارسیین یصطدمان قال یضمن الحی دیة المیت. (المصنف لإبن أبی شیبة، الدیات، الرجل یصدم الرجل، مؤسسة علوم القرآن ١٤/ ٢٢١، رقم: ٢٨٢٠٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۶۰)

سرکاری ملازم کو ملنے والی پنشن میراث ہے یا بیوی کا حق تبرع؟

سوال [۱۱۳۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سرکاری ملازم کی وفات کے بعد اس کی بیوی کے لیے پنشن جاری رہتی ہے، سوال یہ ہے کہ پنشن کی رقم صرف بیوی کا حق ہے؟ یا بطور ترکۂ میت تمام ورثاء کا حق اس سے متعلق ہوگا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سرکار کی طرف سے ملنے والی پنشن صرف بیوی کا حق ہے، اس میں میراث جاری نہ ہوگی، کیونکہ میراث میت کے مملوکہ مال میں جاری ہوتی ہے، جبکہ پنشن میت کی ملک نہیں بلکہ سرکار کی طرف سے محض تبرع اور احسان ہے۔

نیز یہ رقم صرف بیوی ہی کو مل سکتی ہے، اگر بیوی نہ ہو تو یہ رقم نہیں ملتی اور بیوی کی موت پر بند ہوجاتی ہے اور کسی موقع پر ہم نے کسی بڑے کا فتویٰ دیکھ کر میراث جاری ہونے کو لکھا تھا جو صحیح نہیں تھا اب ہم نے اس سے رجوع کرلیا ہے۔

المراد من التركة: ما تركه الميت خاليا عن تعلق حق الغير بعينه.

(البحر الرائق، كتاب الفرائض زكريا ٩/ ٣٦٥، كراچى ٨/ ٤٨٩)

إن الأصل الأول فى نظام الميراث الإسلامى: أن جميع ما ترك الميت من أملاكه ميراث للورثة. (تكملة فتح الملهم اشرفيه ديوبند ٢/ ٤) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۵۱۴)

پنشن میں وراثت جاری ہوگی یا نہیں؟

سوال [۱۱۳۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے نانا ریلوے محکمہ میں ملازم تھے، ان کا انتقال ہوگیا، اس کے بعد میری

نانی کو پنشن ملنے لگی، پنشن کی رقم میں سے کچھ خرچ کرتی رہیں، اور تقریباً تین لاکھ روپئے بچ گئے، جو ان کے اور ان کی بیٹی کے مشترکہ کھاتے میں جمع ہوتی رہی تھی، اب نانی کی حیات میں ہی ان کے ایک بیٹے شکیل مسعود کا انتقال ہوگیا، ان کے بیوی بچے موجود ہیں۔

اب دریافت یہ کرنا ہے کہ مذکورہ تین لاکھ روپئے پنشن کے نانا کے ہیں یا نانی کے؟ اور اس کی تقسیم کس طرح ہوگی؟ نانا، نانی کی اولادوں میں دولڑکے شکیل مسعود، (جو نانا کے بعد اور نانی سے پہلے انتقال کر گئے تھے)، ہلال مسعود، پانچ لڑکیاں: نسرین مسعود، شہناز مسعود، رخسانہ مسعود، نکہت مسعود، شیما مسعود ہیں۔

المستفتی: مدثر حیدر، محلّہ مغل پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پنشن کے بارے میں تاریخ ۱۴رشعبان ۱۴۳۴ھ ''فتویٰ: الف: ۴۰/ ۱۱۲۳۶'' کے جواب میں لکھا جا چکا تھا کہ مرحوم کی میراث ہے جو اس کے سارے ورثاء پر شرعی حق کے اعتبار سے تقسیم ہو جائے گی، لیکن بعد میں تحقیق سے یہ بات سامنے آئی کہ پنشن کا پیسہ دو وجہوں سے میراث اور ترکہ میں شامل نہیں ہوسکتا:

(۱) عمر بھر کی پنشن کا سارا پیسہ اکٹھے یک مشت نہیں مل سکتا۔

(۲) بیوی کب تک زندہ رہے گی کسی کو نہیں معلوم ہے اور بیوی جب تک زندہ رہے گی تب تک اس کے نام سے پنشن کا پیسہ منجانب سرکار آتا رہتا ہے لہٰذا کتنی مقدار پنشن کا پیسہ ہے وہ معلوم اور متعین نہیں ہوسکتا اور میراث میں وہی چیز تقسیم ہوتی ہے جو معلوم اور متعین ہوتی ہے، اسی لیے ملازم کی موت کے بعد اس کی بیوی کے نام سے جو پنشن جاری ہوتی ہے وہ میراث نہیں بن سکتی وہ بیوی کے ساتھ خاص ہے، جب تک وہ زندہ رہے گی سرکار اسی کو دیتی رہے گی، لہٰذا پنشن کا پیسہ تنہا بیوی ہی کا حق رہے گا، وارثین کا حق اس سے متعلق نہیں ہوگا، اور گذشتہ جواب جس میں پنشن کو میراث قرار دیا گیا ہے اس سے ہم رجوع کرتے ہیں۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ میرٹھ ۳۰/ ۱۹۳، امداد الفتاویٰ ۴/ ۳۴۲، فتاویٰ دارالعلوم ۱۷/ ۵۳۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۳۶)

کیا پرائیویٹ فنڈ بیوی کو ملے گا؟

سوال [۱۱۳۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرا بھائی محمد رضوان جس کا ایکسیڈ ینٹ میں انتقال ہو چکا ہے وہ ایک گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر تھا، اس لیے اس کا اسکول میں فنڈ بھی جمع ہے، سوال یہ ہے کہ اس فنڈ کے پیسے میں اس کی بیوی اور بچی کے علاوہ محمد رضوان کے بھائی اور بہنوں کو حصہ پہنچتا ہے یا نہیں؟ محمد رضوان کے ۷/ بھائی، ۴/ بہنیں ہیں؟

المستفتی: غلام محمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سرکار سے جو فنڈ ملنے والا ہے اس پر محمد رضوان کو ملک تام حاصل نہیں ہے، اس لیے اس میں وراثت جاری نہیں ہوگی، اور سرکار کے قانون کے مطابق اس کی بیوی کو اس کا فنڈ ملے گا اور یہ مسئلہ ایکسیڈ ینٹ اور حادثات میں ہلاک ہونے کے نتیجے میں سرکار کی طرف سے جو ملتا ہے اس سے بالکل الگ ہے، دونوں مسئلوں میں فرق ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۴/ ۳۴۱، محمودیہ جدید ڈابھیل ۲۰/ ۴۰۴، کتاب الفتاویٰ ۶/ ۳۶۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۰۱۳)

ایک شخص کے ترکہ سے متعلق چند سوالات کے جوابات

سوال [۱۱۳۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) میری والدہ نے مجھے شادی سے پہلے الگ کر دیا تھا، ۱۹۷۰ء میں مجھے پانچ ہزار روپئے دیئے جو میں نے اپنی ہی محنت سے کمائے تھے، پھر ان روپیوں میں سے میں نے طباعت کی مشین لگائی اور پیکنگ کے گتے کے ڈبے بنانے شروع کیے، اور ۱۹۷۷ء میں اپنی

ہی کمائی سے میں نے شادی کی، اور شادی کے بعد بچوں کی پرورش کا سلسلہ شروع ہوگیا، پڑھائی، لکھائی وغیرہ اور رہائش کا مکان بھی تعمیر کرایا، اور پھر بچوں کی شادی کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا، دولڑکی اور ایک لڑکے کی میں نے شادی کردی ہے اور اب دولڑکی اور تین لڑکے شادی سے باقی ہیں، اور ان کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری ہے، اور جس لڑکے کی میں نے شادی کی تھی وہ لڑکا میرے اس کاروبار میں معاون تھا، جو سرکاری کاغذات میں بھی میری ہی ملکیت چڑھا ہوا ہے، میرے اور بچے بھی اسی کاروبار میں لگے رہتے ہیں، اور سارا مال ابھی میری ہی ملکیت میں ہے، اور کسی بچے کو میں نے اس ملکیت میں سے کوئی حصہ نہیں دیا ہے، کہ اسی دوران میرے شادی شدہ بچہ کا ایک حادثہ میں انتقال ہوگیا اور مرحوم کی شادی سے قبل میں نے مرحوم کے نام سے بینک میں کاروباری روپئے کی لین دین کی خاطر کھاتے کھلوائے تھے، جو میری ہی ملکیت ہے، اور میری ہی مرضی سے وہ روپئے کی لین دین کرتے تھے، آیا اس کے نام سے بینک میں جمع کی ہوئی رقم کا مالک مرحوم کے انتقال کے بعد میں ہی ہوں یا مرحوم ہے؟

(۲) میں نے اپنی ہی ملکیت سے لڑکے کی بیوی کو زیور دیا تھا، لیکن اس کو اس زیور کا مالک نہیں بنایا تھا، تو وہ زیور کس کی ملکیت ہے؟

(۳) بیوہ کا مہر کس کے ذمہ ہے؟

(۴) مہر فاطمی کی مقدار کتنی ہے؟

(۵) شادی کے دو مہینے کے بعد میں نے مرحوم کا انشورنش کرایا اور میں نے ہی اس کی قسط بھی جمع کی تھی، تو وہ کس کی ملکیت ہے؟

(۶) اگر میری ملکیت میں مرحوم کی کچھ ملکیت ہے تو کتنی ہے؟ اور بیوہ کو کتنا حصہ ملے گا؟ جبکہ مرحوم کے کوئی اولاد نہیں ہے؟

المستفتی: محمد اسلام انعام پرنٹنگ پریس، شیرکوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) آپ کا بڑا لڑکا آپ کے کاروبار میں معاون تھا،

اورآپ نے سہولت کی غرض سے بینک میں اس کے نام سے رقم جمع کرائی تھی،تومحض اس کے نام سے جمع کرانے سے بڑالڑکااس کامالک نہیں ہوتاہے،بلکہ اس رقم کے مالک آپ ہی ہیں۔

الأب و ابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيئ فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله لكونه معينا له. (هنديه، الباب الرابع في شركة الوجوه، زكريا جديد ۲/۳۳۲، قديم ۲/۳۲۹، شامي زكريا ٦/٥٠٢، كراچی ٤/٣٢٥)

(۲) اگرزیوردیتے وقت یہ صراحت کردی تھی کہ بطورملکیت نہیں دی ہے بلکہ بطور عاریت دی ہے تو ایسی صورت میں لڑکے کی بیوی اس زیور کی مالک نہیں ہے،اوراگرزیور چڑھاتے وقت کوئی صراحت نہیں کی گئی ہے،تو آپ کی برادری کے عرف کا اعتبار ہوگا،اگر آپ کی برادری میں اور خاندان میں بہوکوجوزیوردیاجاتاہے وہ بطورملکیت دیاجاتاہےتو بہو مالک ہوجائے گی اوراگربطور عاریت دیاجاتاہےتو بہو مالک نہیں ہوگی، بلکہ خسر ہی اس کا مالک رہے گا،اس سلسلے میں آپ کا معاملہ کس پہلو سے منطبق ہےوہ آپ خود ہی سوچ لیں۔

الثابت بالعرف كالثابت بالنص. (رسم المفتی زكريا ص: ١٧٦، شامی زكريا ٦/٥٥٦، كراچی ٤/٣٦٤، البنايه اشرفيه ديوبند ٩/٢٣٨)

وإذا بعث الزوج إلى أهل زوجته أشياء عند زفافها منها ديباج فلما زفت إليه أراد أن يسترد من المرأة الديباج ليس له ذٰلک، إذا بعث إليها على جهة التمليک ......جهز بنته و زوجها ثم زعم أن الذی دفعه إليها ماله وكان على وجه العارية عندها، وقالت هو ملكی جهزتنی به أو قال الزوج ذٰلک بعد موتها ...... وقال فی الواقعات: إن كان العرف ظاهراً بمثله فی الجهاز كما فی ديارنا فالقول قول الزوج. (هنديه، الباب السابع فی المهر، الفصل السادس عشر فی جهاز البنت، زكريا قديم ١/٣٢٧، جديد ١/٣٩٣)

(۳) مہر شوہر کے ذمہ قرض ہےاورقرض کی ادائیگی ضروری ہے،لہٰذا بیوہ کا مہر شوہر کے ترکہ سے ادا کرنا لازم ہے، چنانچہ انشورنش میں جو پیسہ اس کے نام سے جمع ہے،اسی میں سے اولاً بیوہ کا مہر ادا کرنا لازم ہے۔

ثم تقضیٰ دیونه من جمیع ما بقی من ماله. (سراجی ص:٤)

(۴) اورمہر فاطمی کی مقدار ڈیڑھ کلو تیس گرام نوسو ملی گرام چاندی ہے، اور جس دن یہ مہر ادا کیا جائے گا اسی دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ (مستفاد: انوار نبوت/ ٦٥٢، ایضاح الطحاوی ۱۹۳/۳، ایضاح المسائل ص:۱۳۰)

(۵) اوراس کے نام انشورنش کرانے کا مطلب یہی ہے کہ جوقسط باپ نے بیٹے کے نام سے جمع کیا ہے، وہ قسط جمع کرنے کے ساتھ ساتھ باپ کی طرف سے بیٹے کو مالک بناتا ہے، اس لیے آپ اپنی طرف سے قسط جمع کرنے کی وجہ سے اس کے مالک نہیں ہوں گے بلکہ وہ بیٹے کی ملکیت ہے، لہٰذا انشورنش کا جو پیسہ ملے گا اس کا رأس المال حلال اور پاک ہوگا اور اس میں سے اولاً مہر ادا کرنا لازم ہوگا اور جو کچھ بچے گا، وہ میراث میں تقسیم ہوگا اور جو سود ملے گا وہ حلال نہیں ہے، بلکہ وہ حرام ہے، بلانیت ثواب غریبوں کو دیدینا لازم ہے۔

الأب إذا شریٰ خادما للصغیر ونقد الثمن من مال نفسه لا یرجع علیه. (شامی، کتاب النکاح، باب المهر، مطلب: انفق علی معتدة الغیر، کراچی ۱۵۵/۳، زکریا ٣٠٧/٤)

من ملک بملک خبیث ولم یمکنه الرد إلی المالک فسبیله التصدق علی الفقراء ...... قال إن المتصدق بمثله ینبغی أن ینوی به فراغ ذمته ولا یرجوا به المثوبة. (معارف السنن، اشرفی دیوبند ٣٤/١)

(٦) آپ کی ملکیت میں سے کسی چیز کا آپ کی زندگی میں کوئی مالک نہیں ہے، لہٰذا نہ مرحوم ہوں گے، نہ دوسری اولاد، نہ ہی بیوہ، بلکہ آپ کی موت کے بعد آپ کی ملکیت میراث بنے گی۔

الترکة مابقی بعد المیت من ماله صافیا عن تعلق حق الغیر بعینه. (حاشیه سراجی ص:٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰٦۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/۴/۱۴۳۴ھ

میت کی متروکہ جائیداد اور زیورات کی تقسیم

سوال [۱۱۳۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میری ہمشیرہ امینہ بی بی اسماعیل بیوریا کا انتقال ہوا، مرحومہ نے ترکہ میں ایک مکان ۴۱۲۲۵؍ اور کچھ چھوٹے چھوٹے زیورات اور ایک مخصوص زیور جس کو گجراتی میں کان سلا کہتے ہیں، چھوڑا ہے۔

اب دریافت طلب امور یہ ہیں:

(۱) مکان کی حیثیت یہ ہے کہ وہ والدین کی جانب سے امینہ بی بی اور ان کی بہن فاطمہ بی بی اسماعیل بیوریا کو مشترکہ طور پر ملا تھا، مرحومہ نے اپنی بہن کو اس مکان کا آدھا حصہ دیئے جانے کی وصیت کی ہے۔

(۲) اور جو چھوٹے چھوٹے زیورات ہیں ان میں پرچیاں لکھوا کر رکھوادی ہیں ان کے متعلق کوئی صراحت نہیں کی ہے ان کا کیا حکم ہے؟

(۳) اور مخصوص زیور کے متعلق یہ وصیت کی ہے کہ اس کے ذریعہ میری نماز کا فدیہ اور تجہیز وتکفین کا خرچ پورا کر کے بقیہ خیرات کر دیا جائے۔

(۴) مرحومہ نے مندرجہ ذیل ورثاء چھوڑے ہیں: شوہر، ماں، بیٹا، بیٹی، ان کے درمیان مرحومہ کا ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا؟

(۵) اگر کوئی وارث تقسیم وراثت کے وقت بلانے پر حاضر نہ ہو تو اس کے حصہ کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: محمد اسماعیل بیوریا، گجرات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: وصیت نامہ بار بار پڑھا گیا اور اس کے ذیل میں جو سوالات ہیں وہ بھی بار بار پڑھے گئے یہ ایسی گول مول تحریر ہے جس سے اصل مقصد

واضح نہیں ہوتا ہے، لیکن پھر بھی وصیت نامہ اور سوال سے جو مقصد سمجھ میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ مرحومہ اور ان کی بہن کو والدین کی طرف سے ایک مکان ملا، آدھا مرحومہ کا آدھا مرحومہ کی بہن کا، اور دونوں حصے مرحومہ کے قبضے میں رہے، اور مرحومہ نے وصیت نامہ میں بہن کا حصہ بہن اور اس کے ورثاء کو منتقل کردینے کی وصیت کی ہے، اگر وصیت نامہ کا یہی مقصد ہے تو شرعی طور پر یہ وصیت جائز نہیں بلکہ لازم اور واجب ہے، اور اس وصیت کے مطابق بہن کا نصف حصہ اس کو یا اس کے ورثاء کو دیدینا واجب ہے۔

عن عبد الله بن عمر -رضی الله عنهما- أن رسول الله ﷺ قال: ما حق امرئ مسلم له شيئ يوصی فيه يبيت ليلتين إلا ووصيته مكتوبة عنده.
(صحيح البخاری، باب الوصايا، النسخة الهندية ۱/۳۸۲، رقم: ۲۶۵۷، ف: ۲۷۳۸، صحيح مسلم، كتاب الوصية، النسخة الهندية ۲/۳۸-۳۹، بيت الأفكار رقم: ۱۶۲۷)

اور دوسری یہ بات سمجھ میں آئی کہ مرحومہ کے چھوٹے چھوٹے کچھ زیورات ہیں جن میں پرچیاں لکھ کر رکھی ہوئی ہیں، اور تیسری بات یہ سمجھ میں آئی کہ مرحومہ کو والد نے جو زیور اپنی طرف سے دیا تھا وہ تجہیز وتکفین میں خرچ کردیں، اور جو بچے اس کو خیرات کردیں، تو اب دیکھنا یہ ہے کہ دونوں قسم کے زیورات سے مرحومہ کی تجہیز وتکفین کے بعد جو کچھ بچا رہے اس کا ایک تہائی کار خیر میں خیرات کردیں، باقی دو تہائی شرعی ورثاء کے درمیان تقسیم کرنا لازم ہوگا، اسی مکان میں سے مرحومہ کا جو آدھا حصہ ہے وہ بھی شرعی وارثین کے درمیان تقسیم ہوگا، مذکورہ نصف مکان اور زیورات کے دو ثلث مذکورہ ورثاء کے درمیان شرعی طور پر تقسیم ہوجائیں گے۔

ثم ديونه التي لها مطالب من جهة العباد ثم وصيته من ثلث ما بقی ثم يقسم الباقی بين ورثته. (تنوير الأبصار مع الدر المختار، كتاب الفرائض، زكريا ۱۰/۴۹۳ - ۴۹۷، كراچی ۶/۷۶۰-۷۶۱)

اور تقسیم کے وقت جو وارث موجود نہ ہو اس کا حصہ محفوظ کرلیا جائے اور اس کا حصہ اس کو کسی بھی طریقہ سے پہنچادیا جائے، اور مذکورہ ورثاء کے درمیان مذکورہ ترکہ حسب ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

۳			۳۶ / ۱۲
میـــــــت			
شوہر	ماں	بیٹا	بیٹی
۳ / ۹	۲ / ۶	۷ / ۱۴	۷

مرحومہ کا کل ترکہ ۳۶ ر سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا ملے گا جو اس کے نام کے نیچے درج ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳ر جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۱۴/۶۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۶/۳ھ

شوہر کے انتقال پر جہیز، زیورات اور بچے کا حکم

سوال [۱۱۳۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید اور ہندہ کی شادی تقریباً ۳ر سال قبل ہوئی تھی، ہندہ کے والد صاحب نے جہیز میں بہت سارا سامان اور سونا دیا تھا، زید کے والد (سسر) نے بھی اپنی بہو ہندہ کو ہدیۃً کافی سونا دیا تھا، تقریباً ایک سال کے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا، اس کے دو سال کے بعد زید کا انتقال ہوگیا، اب دیا ہوا جہیز اور سونا اور سسرال سے دیئے ہوئے سونے کا مالک کون ہوگا ؟

(۱) شادی کے تقریباً تین سال بعد زید کا انتقال ہوگیا، زید نے اپنی ملکیت میں کافی بڑا کاروبار جس میں کافی اثاثہ اور زمین وغیرہ چھوڑی اور باپ کے ساتھ بھی کاروبار میں شرکت تھی، لہٰذا ان میں کون کون کتنے حصے کا مالک ہوگا، اور زید کے ماں باپ، بھائی بہن، بیوی اور اولاد کو کتنا حصہ ملے گا؟

(۳) ہندہ کے ہمراہ دو سال کا بچہ ہے اس کی پرورش کس کے ذمہ ہوگی؟ ہندہ اگر نکاح ثانی کرتی ہے تو بچہ اپنے ساتھ رکھ سکتی ہے یا نہیں ؟ اور اس کی پرورش کا حق کس پر ہوگا ؟

(۴) ہندہ کے والد کا دیا ہوا جہیز اور سونا اس کے سسر یعنی زید کے والد صاحب کے

پاس ہے، ہندہ نے اپنے جہیز اور سامان کا مطالبہ کیا تو زید کے والد صاحب نے کہا کہ لڑکا ہمیں دے دو اور اپنا جہیز کا سامان لے جاؤ، کیا ان کا یہ شرط رکھنا صحیح ہے؟

آپ سے درخواست ہے کہ براہ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کے ساتھ جواب دے کر ممنون فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: محمد الیاس بیگ شہید نگر آگرہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) ہندہ کے والد نے جہیز میں جتنا سامان اور سونا وغیرہ دیا تھا وہ سب ہندہ کی ملکیت ہے، اس میں سسرال والوں میں سے کوئی مالک نہیں ہے، اور زید کے خسر (سسر) نے ہدیۃً جو زیور دیا تھا، وہ بھی ہندہ کی ملکیت میں ہے، لہٰذا ان سب چیزوں کی تنہا ہندہ مالک ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ ڈابھیل ۱۲/ ۱۱۵)

المختار للفتوىٰ أن يحكم بكون الجهاز ملكا لا عارية، لأنه الظاهر الغالب إلا في بلدة جرت العادة بدفع الكل عارية فالقول للأب. (شامي، باب المهر، مطلب: في دعوىٰ الأب أن الجهاز عارية، زكريا ٤/ ٣٠٩، كراچی ٣/ ١٥٧)

حكم الهبة ثبوت الملك للموهوب له غير لازم. (تاتارخانية زكريا ١٤/ ٤١٣، رقم: ٦١٥٣٧)

(۲) زید کے انتقال کے وقت اس نے اپنی ملکیت میں جو کاروبار، اثاثہ، زمین اور روپیہ پیسہ چھوڑا ہے، وہ سب کا سب زید کی طرف سے وارثین کے لیے میراث ہے، چونکہ زید کے ماں باپ زندہ ہیں اس لیے زید کے بھائی بہن وارث نہیں بنیں گے، لہٰذا زید کا کل سرمایہ چوبیس حصوں میں تقسیم ہوکر اس کی بیوی کو تین سہام، اس کے باپ کو چار سہام، اور ماں کو چار سہام ملیں گے، باقی تیرہ سہام زید کے لڑکے کو باپ کی میراث کے طور پر ملیں گے۔

(۳) زید کے بیٹے کی پرورش کا حق تا نکاح ثانی زید کی بیوی کو حاصل ہوگا، اور اگر زید کے خاندان میں دوسرا نکاح کرتی ہے تب بھی زید کی بیوی کو حاصل ہوگا، اور اگر اجنبی سے نکاح کرتی ہے تو بچہ کی نانی کو حق پرورش حاصل ہوگا۔

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده أن امرأة قالت: يا رسول الله! إن ابني هذا كان بطني له وعاء، وثديي له سقاء، وحجري له حواء، و إن أباه طلقني و أراد أن ينزعه مني، فقال لها رسول الله صلى الله عليه وسلم: أنت أحق به مالم تنكحي. (سنن أبي داؤد / الطلاق، باب من أحق بالولد، النسخة الهندية ۱/ ۳۱۰، دار السلام رقم: ۲۲۷۶)

الأم والجدة أحق بالغلام حتى يستغني وقدر بسبع سنين -إلى- وإنما يبطل حق الحضانة لهؤلاء النسوة بالتزوج إذا تزوجن بأجنبي. (شامی، الباب السادس عشر في الحضانة زكريا قديم ۱/ ۵۴۱، جديد ۱/ ۵۹۲-۵۹۳)

(۴) زید کے والد کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ لڑکا ہمیں دیدو اور اپنا جہیز کا سامان لے جاؤ، بلکہ جہیز کا سامان اور سونا وغیرہ جو ہندہ کی ملکیت میں ہے وہ لے جانے کا حق ہر وقت ہندہ کو حاصل ہے، اس پر پابندی لگانے کا حق کسی کو نہیں ہے، ہاں البتہ یہ بات الگ ہے کہ دونوں خاندان کے لوگ آپس کی رضامندی اور مشورے سے کوئی بات طے کرلیں۔

عن أبي حرة الرقاشي عن عمه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفسه منه. (مسند أبي يعلىٰ الموصلي، دار الكتب العلمية بيروت ۲/ ۹۱، رقم: ۱۵۶۷، مسند أحمد بن حنبل ۵/ ۷۲، رقم: ۲۰۹۷۱، مسند الدار قطني، البيوع، دار الكتب العلمية بيروت ۳/ ۲۲، رقم: ۲۸۶۲-۲۸۶۳)

عن سعيد بن زيد بن عمرو بن نفيل أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من اقتطع شبرا من الأرض ظلما طوقه الله إياه يوم القيامة من سبع أرضين. (مسلم شريف، كتاب المساقات والمزارعة، باب تحريم الظلم وغصب الأرض، النسخة الهندية ۲/ ۳۲، بيت الأفكار رقم: ۱۶۱۰، صحيح البخاري كتاب المظالم، باب إثم من ظلم شيئا من الأرض، النسخة الهندية ۱/ ۳۳۲، رقم: ۲۳۸۸، ف: ۲۴۵۲، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب من يأخذ الشيئ من مزاح، النسخة الهندية ۲/ ۶۸۳، دار السلام رقم: ۵۰۰۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۳۸۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۴/۳۰ھ

جہیز، مہر، منگنی وغیرہ کی رقومات کا حکم

سوال [۱۱۳۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میری بیٹی کی شادی تقریباً چھ ماہ قبل علی گڈھ میں محمد جاوید خاں مرحوم ولد محمد یوسف خاں کے ساتھ ہوئی تھی، جاوید مرحوم کا حادثہ میں انتقال ہوگیا، میں نے اپنی بیٹی کو شادی کے وقت نو لاکھ تیس ہزار روپئے، گاڑی کے واسطے اور دو لاکھ بیس ہزار روپئے فرنیچر و دیگر الیکٹرانک سامان کے واسطے اور جہیز کے دیگر سامان دیئے تھے، مرحوم نے ملے ہوئے نقد روپئے سے اپنے بھائی کی شادی اور دیگر ضروریات میں صرف کرلیا ہے، تقریبا تین لاکھ روپئے اپنے بہنوئی کو بطور قرض دیا ہے اور چار لاکھ روپئے اپنے والد کی معرفت ایک زمین کے لیے پیشگی دیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ:

(۱) میں اتنی ساری رقومات اور جہیز کے سامان کو مرحوم جاوید کے والد سے اور ان کے بہنوئی سے از روئے شرع مطالبہ کرکے حاصل کرسکتا ہوں؟

(۲) مہر کی رقم سو گرام سونا اور گیارہ ہزار روپئے نقد تھی کیا میں از روئے شرع مرحوم جاوید کے والد سے یا مرحوم کی جائیداد اور نقد جو بینک میں ہے اس سے حاصل کرسکتا ہوں؟

(۳) مرحوم جاوید کے ترکہ میں سے میری بیٹی کو کتنا حصہ ملے گا جبکہ بچے نہیں ہیں؟

(۴) مرحوم جاوید کو منگنی میں ایک لاکھ روپیہ نقد اور ایک عدد ہیرے کی انگوٹھی دی تھی، مرحوم جاوید کی طرف سے شادی میں جو زیور آیا تھا اس کا کیا ہوگا؟

(۵) مرحوم جاوید نے اپنے کمائے ہوئے روپئے سے علی گڈھ میں ایک مکان اور زمین اپنے والد اور والدہ کے نام سے خریدی کیا اس مکان اور زمین میں ترکہ سے حصہ ملے گا؟

المستفتی: حسن افروز بنکی چک گورکھپور یوپی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) نو لاکھ تیس ہزار روپئے گاڑی کے واسطے اور

دولاکھ بیس ہزار روپئے فرنیچر اور دیگر الیکٹرانک سامان وغیرہ کے واسطے جو دیا ہے یہ کل گیارہ لاکھ پچاس ہزار روپئے ہوئے، یہ ساری رقم لڑکی کے جہیز میں شامل ہے، اور جہیز کے دیگر جو سامان دیئے تھے وہ بھی لڑکی کے جہیز میں شامل ہیں، یہ سب کے سب لڑکی کی ملکیت ہیں، اور اس پیسے کو آپ کے دادا مادا اور لڑکی کے سسرال والوں نے دیگر چیزوں میں جو خرچ کردیا ہے وہ سارے پیسے مرحوم کے ترکہ میں سے مرحوم کے والد سے آپ کو وصول کرنے کا حق ہے۔

إن كل أحد يعلم أن الجهاز ملك المرأة و أنه إذا طلقها تأخذه كله و إذا ماتت يورث عنها. (شامی، باب المهر، مطلب: فی دعویٰ الأب أن الجهاز عارية، زكريا ٣١١/٤، كراچی ١٥٨/٣)

أما لو مات فادعت ورثته فلا خلاف فی كون الجهاز للبنت. (شامی زكريا ٣٠٩/٤، كراچی ١٥٧/٣)

(۲) مہر میں جو سو گرام سونا اور گیارہ ہزار روپئے نقد طے ہوئے ہیں، وہ لڑکی کا حق شرعی ہے، مرحوم کی جائیداد اور نقدی رقم جو بینک میں ہے اس میں سے یہ مہر وصول کرنا لڑکی کے لیے بلا تردد جائز اور درست ہے، اور مرحوم کے وارثین پر لازم ہے کہ لڑکی کا طے شدہ مہر مرحوم کے ترکہ میں سے ادا کریں۔

المرأة تأخذ مهرها من التركة من غير رضا الورثة، إن كانت التركة دراهم و إن كانت التركة شيئا يحتاج إلى البيع فيبيع ما كان يصلح ليستوفى صداقها. (خلاصة الفتاویٰ، الفصل السابع فی الدعویٰ والشهادة، اشرفيه ديوبند ٢٤١/٤)

(۳) مرحوم کے ترکہ میں سے دین کی ادائیگی اور جہیز کی مذکورہ اشیاء کی ادائیگی کے بعد جو کچھ بھی ترکہ بچے گا اس کو چار حصوں میں تقسیم کرکے ایک حصہ آپ کی بیٹی کا ہے۔

﴿وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ﴾ . [النساء: ١٢]

(۴) اگر عرف میں منگنی کے موقع پر جو کچھ دیا جاتا ہے وہ بطور ہبہ ہوتا ہے تو مرحوم جاوید کو جو ایک لاکھ روپیہ اور ہیرے کی انگوٹھی دی گئی ہے وہ بطور ہبہ ہے، اور مرحوم جاوید کی

ملکیت ہے اور شادی کے موقع پر دلہن کو جو زیورد یا جاتا ہے وہ اگر برادری کے عرف میں بطور ملکیت دیا جاتا ہے تو دولہن ان زیورات کی مالک ہے، اور اگر برادری کے عرف میں بطور ہبہ نہیں دیا جاتا ہے اور دولہن کو مالک نہیں بنایا جاتا ہے، بلکہ واپس لے لیا جاتا ہے تو وہ بطور عاریت ہے، لہٰذا جو بھی شکل آپ کی برادری کے عرف میں ہے اس کا اعتبار کرنا ضروری ہے۔

الثابت بالعرف كالثابت بالنص. (رسم المفتی، مظاهر علوم سعيديه ص: ۹۵، زکریا ص: ۱۷۶، ۱۷۳، شامی زکریا ۶/ ۵۵۶، شامی کراچی ۴/ ۳۶۴)

(۵) مرحوم جاوید کے بھائی بہنیں بھی ہیں، اور اس کو معلوم ہے کہ بھائی بہن بھی ماں باپ کے وارث ہوتے ہیں، اس کے باوجود اس نے ماں باپ کے نام سے جو جائیداد خرید لی ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ماں باپ کے نام سے مصلحتاً بیع تلجئہ نہیں کرنا چاہتا ہے بلکہ بیع قطعی کر دینا چاہتا ہے اس لیے اس جائیداد کے ماں باپ ہی مالک ہیں جو ماں باپ کے نام سے خریدی گئی ہے۔

إن الملكة تثبت بمجرد العقد إذا استجمع البيع شرائط الانعقاد والصحة واللزوم والنفاذ. (شرح المجلة لخالد اتاسی ۲/ ۳۵۷) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ رجب المرجب ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۱۸۱)

مرحومہ کے زیورات، مہر، جہیز وغیرہ کی شرعی تقسیم

سوال [۱۱۳۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میری بیوی حمل سے تھی اور بچے کی ولادت کے لیے اپنے میکہ لکھنؤ بخوشی گئی تھی، وہاں اچانک انتقال ہو گیا، کچھ دن ہوئے، میرا بیٹا ہے تقریباً ۵/ سال کا جو پیدائشی طور پر ٹانگوں سے مفلوج ہے اس سے چلا پھرا نہیں جاتا، اس وقت اپنے ننہال میں ہے، جس وقت مرحومہ اپنے میکے لکھنؤ گئی تھی میرا اور اپنے گھر کا سارا زیور لے کر اپنے میکے گئی تھی، اور میرے زیور مانگنے پر میرے سسرال والے زیور دینے سے انکار کر رہے ہیں، اور کہہ رہے ہیں کہ ان

سارے زیورات پرلڑکا حقدار ہے تمہارا حق نہیں ہے، اگر میں بچہ کا باپ ہوں اور پرورش میں کروں تو کیا میرا حق نہیں ہے زیور اور بچے پر؟

المستفتی: محمد وسیم عرف پپو، اصالت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: لڑکی کو میکہ کی طرف سے جو زیورات ملے ہوئے ہیں وہ لڑکی ہی کی ملکیت ہیں، اور شوہر کی طرف سے جو زیورات دیئے گئے ہیں وہ اگر بطور ملکیت دیئے گئے ہیں تو وہ بھی لڑکی کی ملکیت میں شمار ہوں گے اور اگر مالکانہ طور پر نہیں دیئے ہیں مگر آپ کے معاشرہ میں یہی رواج ہے کہ جو زیورات دیئے جاتے ہیں وہ لڑکی کے ہو جاتے ہیں تو ایسی صورت میں یہ سب لڑکی کی طرف سے متروکہ میراث میں شمار ہوں گے اور ان زیورات کے علاوہ الگ سے اگر مہر متعین ہو چکا ہے اور اس کی ادائیگی نہیں ہوئی ہے تو شوہر کے اوپر مہر بھی بطور قرض کے لازم ہے اور بیوی کی موت کے بعد یہ ساری چیزیں اس کی متروکہ میراث ہیں، وہ کل بارہ حصوں میں تقسیم ہوکر تین حصے شوہر کو ملیں گے، دو، دو حصے ماں باپ کو ملیں گے باقی پانچ حصے مرحومہ کے لڑکے کو ملیں گے۔ (مستفاد: امداد المفتیین /۵۶۰-۵۶۱)

فإن كل أحد يعلم أن الجهاز ملك المرأة و أنه إذا طلقها تأخذه كله و إذا ماتت يورث عنها. (شامی، باب المهر، مطلب: فی دعویٰ الأب أن الجهاز عارية، زكريا ٤/٣١١، كراچی ٣/١٥٨)

والعرف فی الشرع له اعتبار لذا عليه الحكم قد يدار. (شامی، مطلب: فی السفر بالزوجة، زكريا ٤/٢٩٥، كراچی ٣/١٤٧)

المختار للفتویٰ أن يحكم بكون الجهاز ملكا لا عارية، لأنه الظاهر الغالب إلا فی بلدة جرت العادة بدفع الكل عارية. (شامی، باب المهر، مطلب: فی دعویٰ الأب أن الجهاز عارية، زكريا ٤/٣٠٩، كراچی ٣/١٥٧، الأشباه و النظائر قديم ص: ١٧٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۴۵۶ ۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۳/۲ھ

٤ باب الوصية قبل الموت

تقسیم ترکہ قبل نفاذ وصیت کا حکم

سوال [۱۱۳۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمد زبیر کا کچھ دن پہلے انتقال ہوگیا، ان کے کوئی اولاد نہ تھی اور ان کی بیوی حیات ہے، زبیر کا ایک ہی بھائی اقبال تھا، جس کا ان کی زندگی ہی میں انتقال ہوگیا تھا، اقبال کی بھی کوئی اولاد نہ تھی، زبیر کی ایک ہی بہن تھی جس کا ان کی زندگی میں انتقال ہوگیا، البتہ مرحومہ بہن کی اولاد حیات ہے، زبیر کی والدہ والد کا بھی انتقال ہوگیا تھا، مرحومہ بہن کی اولادوں میں تین لڑکے، تین لڑکیاں ہیں۔

زبیر کی والدہ نے ان کے والد سے ۱۹۴۰ء میں طلاق لے کر دوسرا نکاح کرلیا تھا، ان کے والد نے دوبارہ شادی نہیں کی، زبیر کی والدہ کا اپنے دوسرے شوہر سے منصور نامی ایک بیٹا حیات ہے، چنانچہ منصور زبیر کا سوتیلا بھائی ہوا، یعنی ایک ماں اور دو باپ۔

تو دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا منصور کو زبیر کا وارث سمجھا جائے گا، یا ان کی مرحوم بہن کی اولاد ان کی وارث ہے، مرحومہ بہن کے تین لڑکے، تین لڑکیاں ہیں، دونوں کے وارث نہ ہونے کی صورت میں کیا ہمیں ان کے خاندان میں وارث تلاش کرنا ہوگا، کسی بھی وارث کے نہ ملنے کی صورت میں کیا ان کی میراث راہِ خیر میں خرچ کی جاسکتی ہے؟

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ زبیر اپنی زندگی میں اپنے کاروباری پارٹنر سے بارہا یہ بات کہتے تھے کہ میری بہن کا انتقال ہو چکا ہے، میرے بھائی کی کوئی اولاد نہیں، اور میری بہن کی اولاد میری وارث نہیں ہوسکتی، منصور کے متعلق ان کے ذہن میں کوئی شبہ نہیں تھا، اس لیے کہ وہ ان کے باپ کی اولاد نہیں، اس وجہ سے وہ ان کا وارث نہیں ہوسکتا، کیونکہ ان کے خیال میں وارث باپ کے تعلق سے ہوتا ہے، ماں کے تعلق سے نہیں، وہ اپنے پارٹنر

سے بار ہا یہ کہتے تھے کہ میرا بیوی کے علاوہ کوئی وارث نہیں، نیز ان کی بیوی کو اس کا حق دینے کے بعد باقی رقم مساجد اور ہسپتالوں وغیرہ میں خرچ کردی جائے؟

المستفتی:عبداللہ بلرامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زبیر کا ماں شریک بھائی جس کو اخیافی بھائی کہا جاتا ہے وہ زبیر کا شرعی وارث ہے، لہٰذا اس کی وصیت کے مطابق اولاً کل مال کا ایک تہائی حصہ مساجد کے لیے الگ کرلیا جائے اسکے بعد بقیہ مال میں سے ایک چوتھائی اس کی بیوی کو ملے گا، اور اخیافی بھائی کے اصحاب رد میں سے ہونے کی وجہ سے بقیہ سارا ترکہ منصور کو مل جائے گا۔

﴿وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ. [النساء: ١٢]﴾

عن عبد الله بن عمر أن عمر بن الخطاب رضی الله عنه سئل عن الوصية؟ فقال عمر: الثلث وسط من المال، لا بخس ولا شطط. (السنن الکبریٰ للبیهقی، باب الوصية بالثلث، دار الفکر ٩/٣٦٩، رقم: ١٢٨٣٩)

ما فضل عن فرض ذوی الفروض ولا مستحق له يرد على ذوی الفروض. (سراجی ص: ٤٣)

ولا يضرب الموصیٰ له بأكثر من الثلث عند أبی حنيفةؒ. (در مختار مع الشامی، باب الوصية بثلث المال زکریا ١٠/٣٦٣، کراچی ٦/٦٦٨)

والوصية تصرف فی ثلث المال. (بدائع زکریا ٦/٤٢٣، کراچی ٧/ ٣٣٠)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍شعبان المعظم ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۴۷۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۸/۱۴ھ

مرض الوفات کی وصیت کا حکم

سوال [۱۱۳۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تسنیم کوثر نام کی ایک خاتون کی وفات ۲۷؍اپریل ۲۰۱۳ء کو ہوگئی، ان خاتون کے چار بھائی حیات ہیں، حسن مسعود، ان سے بڑے ہیں، اور ارشد متین، سرور، ندیم ان سے چھوٹے ہیں، تسنیم کوثر طلاق شدہ تھیں ان کی کوئی اولاد نہیں تھی، اور لگ بھگ پندرہ سال پہلے مع جہیز کے سامان کے میکے آگئی تھیں، ان کا پورا خرچ مسرور نام کے بھائی اٹھاتے تھے، اور ہر ماہ خرچ کے لیے لگ بھگ ۵۵۰۰ سو روپئے دیتے تھے، مئی ۲۰۱۲ء میں تسنیم کوثر کو دل کا دورہ پڑا تو مسرور نے ہی ان کے علاج معالجہ پر لگ بھگ ساڑھے تین لاکھ روپئے خرچ کیے، دوسرے بھائی حسن اور ارشد اور ندیم نے نہ تو علاج پر کوئی روپیہ خرچ کیا اور نہ ہی کوئی ماہ واری خرچ دیتے تھے، کبھی کبھار عید، بقرعید پر حسن اور ارشد نے ۱۰۰، ۲۰۰ روپئے یا ایک جوڑی کپڑے بنائے ہوں گے، تسنیم نے اپنی وفات سے کچھ دن پہلے اپنی دو تایازاد بہنوں اور خالہ سے کہا کہ میرا جو زیور ہے میری وفات کے بعد میرے بھائی مسرور کو دیدیا جائے، اور وہ زیور بھی تایازاد بہنوں کے حوالہ کردیا، اس کے علاوہ ان کے پاس کچھ نقدی بھی تھی، جو مسرور نے تسنیم کو خرچ کے لیے دیئے تھے، ویسے کے ویسے ہی تایازاد بہنوں کے پاس رکھوادیئے، اس کے علاوہ تسنیم کے سامان میں بھی کئی جگہ روپئے رکھے ملے، کچھ اس حالت میں جیسے مسرور نے خرچ کے لیے دیئے تھے، اور کچھ ٹکڑوں میں جگہ جگہ رکھے ملے، اس کے علاوہ تسنیم کا گھریلو سامان جو جہیز کا اور ان کا خریدا ہوا ہے، تو سوال یہ ہے کہ:

(۱) کیا مسرور تایازاد بہنوں کے پاس رکھا زیور، پیسے لے سکتا ہے؟ یا یہ زیور اور روپئے سب بھائیوں میں بانٹے جائیں گے؟

(۲) گھر میں جگہ جگہ جو روپئے ملے ہیں جو مسرور نے ہی دیئے ہیں، وہ روپئے مسرور لے سکتا ہے یا یہ روپئے بھی سب بھائیوں میں تقسیم ہوں گے؟

(۳) مسرور نے تسنیم کے استعمال شدہ ۶، ۷؍جوڑی کپڑے اور ایک نیا جوڑا ثواب

کی نیت سے بغیر دوسرے بھائیوں سے پوچھے غرباء کو دیدئے، اس میں کوئی گناہ یا حق تلفی تو نہیں ہے؟

(۴) تسنیم کے پاس باورچی خانہ میں مسالا وغیرہ اور گھریلو سامان ہے جو مسرور کے دیئے روپیوں سے خرید اگیا ہے وہ مسرور لے سکتا ہے یا وہ سامان بھی سب میں بٹے گا؟

نوٹ: تسنیم اور مسرور پہلے تو ساتھ ہی رہتے تھے لیکن ۱۲؍سال سے مسرور دوسرے شہر میں رہتے ہیں اور تسنیم کے پاس ہر مہینہ آتے رہتے تھے۔

المستفتی: احسن مسرور دیووہار کالونی سول لائن مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تسنیم کوثر کا خرچہ مسرور صاحب نے جو اٹھایا ہے وہ ان کی طرف سے تبرع ہے، جس کے عوض وہ کسی چیز کے حقدار نہیں ہوتے ہیں، اور تسنیم کوثر نے زیورات کی وصیت جو مسرور صاحب کے نام سے کی ہے وہ دیگر ورثاء کی رضامندی پر موقوف ہے، اور گھر میں جگہ جگہ جو روپئے ملے ہیں تو چوں کہ مسرور صاحب نے تسنیم کوثر کو ہبہ کرکے قبضہ دیدیا تھا جس بناء پر وہ ان کی مالک بن چکی تھیں لہٰذا اب ان کی وفات کے بعد وہ ترکہ شمار ہوگا، اسی طرح ان کے کپڑے اور باورچی خانہ میں رکھے مسالہ جات وغیرہ یہ سب تمام شرعی ورثاء کے درمیان تقسیم ہوں گے اور کپڑے جو مسرور صاحب نے فقراء کو دیدیئے ہیں اس میں چونکہ تمام ورثاء کا حق تھا اس لیے مسرور صاحب ان کپڑوں کی قیمت ادا کریں جو ترکہ میں شامل ہوگا۔

وتتم الهبة بالقبض الكامل لقوله عليه السلام لاتجوز الهبة إلا مقبوضة. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دار الكتب العلمية بيروت ۳/ ۳۹۱، مصری قديم ۲/ ۳۵۳، شامی كراچی ۵/ ۶۹۰، زكريا ۸/ ۴۹۰، الفتاویٰ التاتارخانية زكريا ۱۴/ ۴۲۱، رقم: ۲۱۵۶۳، شرح المجلة رستم اتحاد ۱/ ۴۷۳، رقم المادة: ۸۶۱)

إقرار المريض لوارثه لايجوز إلا بإجازة بقية الورثة. (هنديه، الباب السادس فی أقارير المريض و أفعاله، زكريا جديد ۴/ ۱۸۱، قديم ۴/ ۱۷۶)

ثـم لـلـرجـوع مـوانـع ...... قال أو بموت أحد المتعاقدين لأن بموت الموهوب له ينتقل الملك إلى الورثة. (بناية اشرفيه ديوبند ١٠/ ١٩٠)

التـركة فـي الاصـطـلاح مـا تركه الميت من الأموال صافيا عن تعلق حق الغير بعين من الأموال. (شامی كراچی ٦/ ٧٥٩، زكريا ١٠/ ٤٩٣)

ثـم يـقسم الباقي بين ورثته بالكتاب والسنة وإجماع الأمة. (سراجی ص: ٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ جمادی الثانیہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۱۶۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/ ۶/ ۱۴۳۴ھ

مرض الموت میں پورا مکان مہر میں دینے کا حکم

سوال [۱۱۳۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اسلام الدین کی ملکیت میں صرف ایک مکان تھا جس کی قیمت تقریباً ڈھائی لاکھ روپیہ ہے، انہوں نے اپنے مرض الموت میں انتقال سے چند روز قبل یہ پورا مکان اپنی بیوی کو مہر میں دیدیا جبکہ ان کا مہر صرف مہر فاطمی ہے تو کیا مرض الموت میں ڈھائی لاکھ روپیہ کی مالیت کا مکان مہر میں دینا درست ہے، جبکہ اسلام الدین کے ورثاء میں ایک بیوی، ایک لڑکا اور پانچ لڑکیاں ہیں؟

المستفتی: محمد اسلم متولی جامع مسجد عمری کلاں مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مرض الموت میں شوہر نے مہر کے عوض میں جو ڈھائی لاکھ کی مالیت کا مکان بیوی کو دیدیا تھا یہ وصیت کے حکم میں ہے اور وارث کے لیے شرعاً وصیت جائز نہیں ہے، لہٰذا بیوی کو مکان نہیں ملے گا، بلکہ اس مکان کی قیمت میں سے بقدر مہر ملے گا، مہر فاطمی کی مقدار ڈیڑھ کلو تیس گرام نو سو ملی گرام چاندی ہے اس کی قیمت بازار سے

معلوم کرلی جائے، گیارہ، بارہ ہزاراس کی قیمت بنتی ہے،لہٰذا مذکورہ مکان کی قیمت میں سے ہی گیارہ، بارہ ہزارروپیہ مہر میں دیاجاسکتا ہے، باقی مکان یا مکان کی پوری قیمت تمام ورثاء کے درمیان شرعی حصوں کے اعتبار سے تقسیم ہوگی،جس میں مرنے والے کی بیوی کا بھی حصہ ہوگا۔(مستفاد:امدادالفتاویٰ۴/۳۳۱)

عن أبی أمامة الباهلی –رضی الله عنه–قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصیة لوارث، النسخة الهندیة ۲/۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، الوصایا، باب ماجاء فی الوصیة للوارث، النسخة الهندیة ۲/۳۹۶، دار السلام رقم: ۲۸۷۰، سنن ابن ماجه، لاوصیة لوارث، النسخة الهندیة ۲/۱۹۴ دار السلام رقم: ۲۷۱۳)

والهبة من المریض للوارث فی هذا نظیر الوصیة لأنها وصیة حکما. (هدایه، کتاب الوصایا، باب فی صفة الوصیة، اشرفی ۴/۶۵۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیراحمدقاسمی عفااللہ عنہ	الجواب صحیح
۱/رجب المرجب ۱۴۲۵ھ	احقرمحمدسلمان منصورپوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر:۳۷/ ۸۴۵۵)	۱۴۲۵/۷/۸ھ

پورے ترکہ کوکارِخیر میں وصیت کرنے کی شرعی حیثیت

سوال [۱۱۳۵۶]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میری ہمشیرہ مشکاۃ جہاں بیوہ راحت علی مرحوم نے مجھے اورظفرعلی کو بلاکرکہا کہ میرے مکان کوفروخت کردو،اس کوفروخت کرکے چارحصہ کرو،ایک حصہ خودنفیس الرحمٰن کوجو کہ بیوہ کے بھائی ہیں کودینااوردوسراحصہ اللہ کے نام کاکردینا،اورتیسراحصہ ظفرعلی کےلڑکے عدن کودینا،اورچوتھاحصہ میرے اوپراورمیرے موت گڑھے کے لیے رکھ دینا۔

اب ان کاانتقال ہوگیا،وہ مکان ابھی تک فروخت نہیں ہواہے،ان کی کوئی اولادبھی

نہیں ہے، شرعی اعتبار سے اس مکان کی تقسیم ان کی بتلائی ہوئی وصیت کے مطابق ہوگی یا اس میں وارثین کو بھی شامل کیا جائے گا؟ بیوہ کی ایک بہن ایک بھائی حیات ہیں، جن کی اولادیں بھی ہیں، ان کی حیات میں ایک بھائی کا انتقال ہو چکا جن کی ایک بیوہ، ایک لڑکا، اور تین لڑکیاں ہیں، جن کی شادیاں ہو چکی ہیں، تینوں کا انتقال ان کی حیات میں ہو چکا تھا، جن کی اولادیں زندہ ہیں، اور سب کی شادیاں ہو چکی ہیں؟

المستفتی: نفیس الرحمٰن ولد شفیق الرحمٰن مسجد قلعہ والی رامپور یو پی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بیوہ نے جو وصیت کی ہے وہ وصیت ترمیم ہو کر کے نافذ ہوگی، اس کی شکل یہ ہوگی کہ مکان کی پوری قیمت میں سے جتنے پیسہ کی بیوہ کے کفن دفن میں ضرورت پڑے اس پر خرچہ کیا جائے اس کے بعد باقی سارے پیسے ۱۸؍حصوں میں تقسیم ہو کر تین حصے کار خیر میں خرچ ہوں گے، اور تین حصے بھتیجے عدن کو ملیں گے اور یہ تین حصے تہائی میں وصیت نافذ ہونے کی وجہ سے ملیں گے، اس کے بعد بقیہ بھائی کو آٹھ حصہ اور بہن کو چار حصہ اس طریقہ پر تقسیم ہوگا:

۱۸/۳   میــــــــت   ۶

کار خیر	بھتیجا	بھائی	بہن
۱/۶		۲/۱۲	
۳	۳	۸	۴

مذکورہ ورثاء میں سے ہر ایک کو بیوہ کے ترکہ میں سے اتنا اتنا ملے گا جو ان کے نیچے درج ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۵۷)

وارث کے حق میں ہبہ پر شرعی ثبوت کے ساتھ وصیت کا ثبوت ہو تو؟

سوال [۱۱۳۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں، پانچوں شادی شدہ ہیں، میری دونوں لڑکیوں نے کبھی کوئی مالی مطالبہ نہیں کیا اور نہ آئندہ کوئی مالی مطالبہ کرنا چاہتی ہیں، البتہ ان دونوں لڑکیوں کی حق شناسی کی جاتی ہے، ایک ہمارا رہائشی مکان ہے، جس کو ابھی اولادوں میں تقسیم نہیں کیا ہے، جس کی قیمت اندازاً چار لاکھ روپیہ ہے، میرے بڑے دونوں لڑکے اپنے وطن سے باہر کاروبار کے سلسلے میں تقریباً ۳۵ر سال قبل چلے گئے، ان دونوں لڑکوں کا کاروبار میرے شوہر نے ہی اپنے پاس سے کرایا، حالانکہ جس وقت میرے بڑے دونوں لڑکے ہمارے پاس سے باہر گئے اس وقت ہمارے کاروبار کی پوزیشن بہت کمزور تھی، یہاں تک کہ ہم اس وقت ایک لاکھ کے مقروض تھے، اس کے بعد میرے شوہر اور میرے تیسرے بیٹے محمد سلطان کی جدو جہد سے کاروبار سنبھلا، کاروبار سنبھلنے کے بعد میرے بڑے دونوں لڑکے جو باہر چلے گئے وہ دونوں میرے شوہر سے وقتاً فوقتاً کثیر رقم لیتے رہے، یہاں تک کہ ان دونوں کی طرف تقریباً چار لاکھ روپیہ پہنچ گئے، جبکہ ان دونوں بڑے لڑکوں نے میری اور نہ میرے شوہر کی کوئی خدمت کی، بلکہ بڑے لڑکے کی بداخلاقی کی وجہ سے میرے شوہر اس سے بہت تنگ آکر لفظ عاق کا استعمال کردیا کرتے تھے، میرے شوہر میرے چھوٹے بیٹے محمد سلطان کی خدمت اور کاروبار کی محنت کی وجہ سے ۱۹۹۳ء میں فیکٹری کا نصف حصہ جس کی قیمت اس وقت پچھتر ہزار روپیہ ہوگی، میرے چھوٹے بیٹے محمد سلطان کو ہبہ کردی، بقیہ نصف حصہ میرا چھوٹا بیٹا محمد سلطان اپنی کمائی سے پہلے ہی حاصل کر چکا تھا، میرے شوہر نے ایک آراضی جس کی قیمت اندازاً پچاس ہزار روپیہ ہوگی وہ چھوٹے بیٹے محمد سلطان کو ہبہ کی۔

تیسری فیکٹری سے متعلق آمد ۱۹۹۵ء میں جو تقریباً ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ ہوگی، میرے چھوٹے بیٹے محمد سطان کے نام میرے شوہر نے وصیت کی اس کے بعد میرے شوہر کا

۲۰۰۰ء میں انتقال ہوگیا، اب بڑے دونوں لڑکے یہ سوال کرتے ہیں کہ صرف چھوٹے بیٹے محمد سلطان ہی کے نام ہبہ اور وصیت جائیداد وکاروبار کی کیوں کی ہے، جبکہ ہم بھی موجود ہیں حالانکہ بڑے دونوں لڑکوں کی کمائی ہمیں ۲۵ رسال سے حاصل نہیں ہے اور نہ ہمیں کوئی کمائی دی ہے، یہ سب محنت میرے شوہر اور میرے چھوٹے لڑکے محمد سلطان کی ہے جس کو ہبہ و وصیت کیا ہے، جبکہ رہائشی مکان ابھی باقی ہے، اس کو میں اپنی اولاد میں تقسیم کی نیت رکھتی ہوں، ایسی صورت میں میری اور میرے چھوٹے بیٹے محمد سلطان کی شرع کی رو سے کیا غلطی ہے اور میرے شوہر کا میرے چھوٹے بیٹے محمد سلطان کے نام ہبہ و وصیت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: بھوری بیگم کانٹھ امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کے شوہر نے اپنی زندگی میں چھوٹے بیٹے محمد سلطان کو جو فیکٹری کا نصف حصہ اسی طرح دیگر آراضی جو ہبہ کی ہیں اگر اس ہبہ کا شرعی ثبوت ہے یعنی تحریری شکل میں موجود ہے، اور قبضہ بھی محمد سلطان کو دیدیا ہے تو ایسی صورت میں ہبہ درست ہے اور اس میں دیگر ورثاء کا حق نہ ہوگا بلکہ محمد سلطان ہی اس کا مالک ہوگا۔

وتتم الهبة بالقبض الكامل . (در مختار على الشامى، كتاب الهبة، زكريا ۸/۴۹۳، كراچى ۵/۶۹۰)

البتہ ہبہ کے علاوہ محمد سلطان کے نام جو وصیت کی ہے اس کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں ہے بلکہ وہ کالعدم ہے اس میں بڑے دونوں لڑکے بھی برابر کے حقدار ہوں گے۔

عن أبى أمامة الباهلى -رضى الله عنه- قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول فى خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارك وتعالىٰ قد أعطىٰ كل ذى حق حقه فلا وصية لوارث . (سنن الترمذى، باب ما جاء لا وصية لوارث، النسخة الهندية ۲/۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبى داؤد، الوصايا، باب ماجاء فى الوصية للوارث، النسخة الهندية ۲/۳۹۶، دار السلام رقم: ۲۸۷۰، سنن ابن ماجه، لاوصية

لوارث، النسخة الهندية ۲/ ۱۹٤ دار السلام رقم: ۲۷۱۳)

لہٰذا ہبہ کے علاوہ جائیداد وغیرہ جن کی مرحوم نے وصیت کی تھی یا جو کچھ جائیداد مال نقدی وغیرہ بوقت موت مرحوم کی ملک میں تھی، وہ سب درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگی:

۶۴ / ۸

میــــــــــــــت

بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی
۱/۸	۱۴	۱۴	۱۴	۷	۷

مرحوم کا کل ترکہ ۶۴/ سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا ملے گا جو اس کے نیچے درج ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ ربیع الاول ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۰۸۹)

وراثت کے متعلق وصیت بنانا

سوال [۱۱۳۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) اگر کوئی اپنی زندگی میں اپنی وراثت سے متعلق وصیت بنانا چاہے تو وہ بنا سکتا ہے یا نہیں؟ کیا وہ اپنی مرضی سے اپنی جائیداد کا بٹوارہ کرسکتا ہے؟ اگر کرسکتا ہے تو اس بٹوارہ کا طریقہ ارسال فرمائیں۔

(۲) اپنی وراثت سے وہ اولاد میں سے کسی کو بطور ہدیہ دے سکتا ہے یا نہیں؟ اگر دے سکتا ہے تو کتنا دے سکتا ہے؟

(۳) وراثت درج ذیل ہے اس کی تقسیم کس طرح کی جائے، وارث کل چار ہیں: لڑکا، لڑکی شادی شدہ، لڑکی شادی شدہ، بیوی۔

جائیداد کی تفصیل: الف: زراعت کل ۶۱۴/ آر جو ایک ساتھ نہیں الگ الگ ۵/

ٹکڑوں میں ہے،ان کی تفصیل: ۸۱/آر،۸۹/آر، ۱۵۸/آر،۱۸۴/آر،۱۰۲/آر، کل۶۱۴/آر جن کی مجموعی قیمت ۶۱۴۰۰۰۰ روپے ہے، اور مکانات کی کل قیمت تقریباً اٹھارہ لاکھ روپے، کل اناسی لاکھ چالیس ہزارروپے ہوئے۔

(۴) اگرلڑکیوں میں صرف زراعت تقسیم کرنا ہوتو کیاایسا کیاجاسکتا ہے،مکانات کے عوض اتنی قیمت کی زراعت دی جاسکتی ہے، اگر ہاں تو لڑکیوں کے حصے میں کل زمین زراعت کتنے آر دینا ہوگی؟

المستفتی: قاضی حمیدالدین،افضل الدین قاضی محلّہ تھاعیسر شید پوردھولیہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۳) آدمی کے مرنے سے پہلے اس کی جائیداد وراثت نہیں بنتی ہے اور وارثین کے بارے میں دوسرے ورثاء کی مرضی کے بغیر وصیت درست نہیں ہوتی ہے، ہاں البتہ اتنی بات کی گنجائش ہے کہ مرنے کے بعد جس وارث کووراثت میں جتنا مل سکتا ہے اتنے حصہ پر ہروارث کواستعمال کے لیے قبضہ دے دیا جائے، مالک نہ بنایا جائے تاکہ مرنے کے بعد ہروارث کے اپنے اپنے حصہ پر پہلے سے قابض ہونے کی وجہ سے ان کے درمیان میں کوئی جھگڑااوراختلاف واقع نہ ہوسکے، اگرسائل کے مرنے کے وقت سوالنامہ میں ذکرکردہ چاروں ورثاءزندہ رہتے ہیں تو ۷۹۴۰۰۰۰/روپے درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوں گےاورزراعت کی زمین اوررہائشی مکانات ہرایک میں لڑکی کا بھی حصہ ہوتا ہے جوذیل کے نقشہ سے واضح ہوجائے گا۔

تداخل ترکہ:

میت

	بیوی	لڑکا	لڑکی	لڑکی
سہام	۱/۴	۱۴	۷/۷	۷
ترکہ	۹۹۲۵۰۰/روپے	۳۴۷۳۷۵/روپے	۱۷۳۶۸۷۵/روپے	۱۷۳۶۸۷۵/روپے

(۴) لفظ آر یہاں مرادآباد میں مستعمل نہیں ہے اور نہ ہمیں اس کا معنی معلوم ہے، لہٰذا ترکہ کو اوپر کے نقشہ کے مطابق تقسیم کیا جائے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۰۸۹۰)

وارثین کے حق میں وصیت نافذ نہیں ہوتی

سوال [۱۱۳۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ہمارے والد صاحب نے کما کر کھیت ومکان خریدا، اس کے بعد ہمارے بڑے بھائی صاحب محمد قیس گھر سے بٹوارہ کر کے الگ ہو گئے، الگ ہونے کے بعد ہمارے والد صاحب نے ایک اور مکان خریدا جو خود چھوٹے بھائی محمد فیروز کے نام بیع نامہ ہے اور ہم لوگ دو بھائی: محمد قیس، محمد فیروز اور چار بہنیں ہیں اور والد، والدہ باحیات ہیں، والد صاحب کو فکر ہوئی کہ اپنی زندگی میں مسئلہ حل کر دیں، تو انہوں نے چند لوگوں کے سامنے جھگڑا ختم کرنے کے لیے ۹۰ ڈسمل آراضی بڑے بھائی محمد قیس کے نام سے رجسٹرڈ وصیت کر دی، اور ۹۸/ ڈسمل آراضی جو میری ماں کے نام سے تھی چھوٹے بھائی محمد فیروز کے نام سے رجسٹرڈ وصیت کر دی اور والد، والدہ چھوٹے بھائی محمد فیروز کے ساتھ رہتے ہیں، اور دو مکان جو بٹوارہ سے پہلے کے تھے سب بڑے بھائی محمد قیس کے نام وصیت کر دی، جبکہ بڑے بھائی محمد قیس والد صاحب کے سخت نافرمان ہیں، اور والد صاحب کا کہنا ہے کہ اپنی زندگی میں دین یا دنیا کی میری کوئی بات نہیں مانی ہے یہاں تک کہ والد صاحب کو اور والدہ صاحبہ کو اور چھوٹے بھائی محمد فیروز کی اہلیہ اور ان کے بچوں کو اس گھر سے نکال کر قبضہ کر لیا، جس کو والد صاحب نے اپنی کمائی سے خریدا اور بنایا تھا، اور وہ مکان جو بٹوارہ کے بعد محمد فیروز اور والد صاحب نے مل کر خریدا تھا اور محمد فیروز کے نام بیع نامہ بھی ہے، وہ چھوٹے بھائی محمد فیروز کو دیدیا، اور

والد صاحب نے اپنی زندگی میں کئی بار کھیت اور زمین کو خریدا، لیکن اپنی مرضی سے نفع کے تحت کبھی ضرورت کے تحت فروخت کردیا، اب سوال یہ ہے کہ یہ جس انداز سے بٹوارہ ہوا ہے، کیا اس میں بہنوں کا بھی حق ہے؟

(۲) بٹوارہ میں جو کمی زیادتی ہوئی ہے کیا شریعت کے حساب سے جائز ہے یا نہیں؟

(۳) یہ زمین جائیداد جو اپنی ضرورت کے لیے یا نفع کے لیے والد صاحب نے فروخت کیا کیا وہ ناجائز ہے یا جائز؟

المستفتی: محمد فیروز بن سیف اللہ مہراج گنج یو پی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: باپ نے جھگڑے کو نمٹانے کے لیے دونوں لڑکوں کے نام سے جائیداد کی جو رجسٹری وصیت کردی ہے، شرعی طور پر وارثین کے حق میں وصیت نافذ نہیں ہوئی، چاہے جس کے نام وصیت کی ہے، وہ فرمانبردار ہو یا نافرمان، لہٰذا باپ کی وفات کے بعد وصیت شدہ تمام جائیداد میراث بن جائے گی، اور بھائیوں کے ساتھ بہنیں بھی میراث میں شریک ہوجائیں گی، لہٰذا اگر ماں باپ دونوں گذر جائیں اور صرف بیٹے اور بیٹیاں زندہ ہوں تو کل جائیداد آٹھ سہام میں تقسیم ہوکر دونوں بھائیوں کو دو دو حصے ملیں گے اور چاروں بہنوں کو ایک ایک حصہ ملے گا، ہاں البتہ چھوٹے بھائی فیروز کے نام سے جو مکان باپ اور فیروز کے مشترکہ پیسے سے خرید کر فیروز ہی کے نام سے بیع نامہ رجسٹری کردی گئی، اس کا مالک فیروز رہے گا، اس لیے کہ یہ وصیت نہیں ہے بلکہ فیروز کے نام سے خریدا گیا ہے تاہم اگر باپ اپنی زندگی میں تقسیم کرکے مالک بنانا چاہتا ہے تو لڑکیوں کو لڑکوں کے برابر دینا لازم ہوجائے گا، ورنہ باپ گنہگار رہوگا۔

عن أبی أمامة الباهلی -رضی الله عنه- قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ كل ذی حق حقه فلا وصية لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصية لوارث،

النسخة الهندية ۲/ ۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، الوصايا، باب ماجاء فی الوصية للوارث، النسخة الهندية ۲/ ۳۹٦، دار السلام رقم: ۲۸۷۰، سنن ابن ماجه، لاوصية لوارث، النسخة الهندية ۲/ ۱۹٤ دار السلام رقم: ۲۷۱۳)

ولاتجوز لوارثه لقوله عليه السلام: إن الله أعطى كل ذی حق حقه ألا لاوصية لوارث ولأنه يتأذى البعض بإيثار البعض ففی تجويزه قطيعة رحم. (هدايه، كتاب الوصايا، باب فی صفة الوصية اشرفی ٤/ ٦۵۷)

والقبض الكامل فی المنقول ما يناسبه وفی العقار ما يناسبه. (شرح المجلة رستم اتحاد ۱/ ٤٦۲ - ٤٦۳)

لابأس بتفضيل بعض الأولاد فی المحبة لأنها عمل القلب وكذا فی العطايا إن لم يقصد به الإضرار وإن قصده فسوىٰ بينهم يعطی البنت كالإبن عند الثانی، وعليه الفتوىٰ، وتحته فی الشامية: أی علی قول أبی يوسفؒ: من أن التنصيف بين الذكر والأنثیٰ أفضل من التثليث الذی هو قول محمدؒ.

(شامی، كتاب الهبة زكريا ۸/ ۵۰۱- ۵۰۲، كراچی ۵/ ٦۹٦، هنديه زكريا قديم ٤/ ۳۹۱، جديد ٤/ ٤۱٦، قاضيخان زكريا جديد ۳/ ۱۹٤، وعلی هامش الهندية ۳/ ۲۷۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶؍ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۴۹۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶/ ۳/ ۱۴۲۹ھ

وارث کے حق میں وصیت

سوال [۱۱۳۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید نے اپنے انتقال کے وقت ترکہ میں ایک مکان چھوڑا اور کچھ نقد روپیہ چھوڑا، اور وارثوں میں ایک حقیقی بھائی ایک حقیقی بہن اور منجھلے حقیقی بھائی کی اولاد اور اپنی لڑکی

کی اولاد یہ سب وارث چھوڑے، زید کی بیوی کا اور اس کی لڑکی کا اور منجھلے بھائی کا زید کی حیات میں انتقال ہو چکا تھا،لڑکی کی اولاد میں چار لڑکیاں (زید کی نواسی ہیں) منجھلے متوفی بھائی کی اولاد میں تین لڑکے، ایک لڑکی (زید کے بھتیجے اور بھتیجی) چار ہیں۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید کا یہ مذکورہ ترکہ (مکان اور نقدی روپیہ) ان مذکورہ ورثاء میں کس طرح تقسیم ہوگا؟ کس کس کو ملے گا؟ اور کس کس کو نہیں ملے گا؟ اور جس کو ملے گا تو کتنا ملے گا؟

(۲) زید نے جو مکان ترکہ میں چھوڑا ہے اس پورے مکان کی اپنی زندگی میں اس نے اپنے منجھلے متوفی بھائی کے تین لڑکوں میں سے بڑے لڑکے محمد طفیل کے نام وصیت کردی تھی کہ تا زندگی میرا اور میرے مرنے کے بعد تیرا ہے، تو اب یہ وصیت شرعاً مانی جائے گی یا نہیں؟ اس مسئلہ کے جواب باصواب سے مشرف فرما کر عند اللہ ماجور ہوں اور سب باتوں کا جواب تفصیل سے سمجھا کر تحریر فرمائیں؟

المستفتی: رحمت اللہ دوکاندار ہلدوانی نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۲) برتقدیر صحت واقعہ وبعد ادائے حقوق متقدمہ علی الارث زید نے جو مکان اپنے منجھلے بھائی کے لڑکے محمد طفیل کے نام وصیت کیا تھا وہ شرعاً معتبر ہے، اس لیے کہ وہ میت کا شرعی وارث نہیں ہے، اور غیر وارث کے لیے وصیت جائز ہے۔

عن عبد الله بن عمر أن عمر بن الخطاب رضي الله عنه سئل عن الوصية؟ فقال عمر: الثلث وسط من المال، لا بخس ولا شطط. (السنن الکبریٰ للبیهقی، باب الوصية بالثلث، دار الفکر ۹/۳۶۹، رقم: ۱۲۸۳۹)

وتجوز بالثلث للأجنبي عند عدم المانع وإن لم يجز الوارث ذٰلک. (در مختار مع الشامی، کتاب الوصية، باب الوصية بالثلث، زکریا ۱۰/۳۳۹، کراچی ۶/۶۵۰)

لہٰذا اگر ورثاء اجازت دیدیں تو پورا مکان محمد طفیل کو مل جائے گا، ایسی صورت میں صرف نقد روپئے ترکہ شمار ہوں گے، اور اگر ورثاء پورے مکان میں نفاذ وصیت کی اجازت

نہیں دیتے تو مکان اور روپیوں کو جمع کرکے اس کے تین حصے کریں گے، جن میں سے ایک ثلث میں وصیت نافذ ہوگی، لہٰذا ایک ثلث کے بقدر جتنا مکان آتا ہے وہ محمد طفیل کو ملے گا باقی دوثلث میں وراثت جاری ہوگی۔

فإن الموصی إذا ترک ورثه فإنما لا تصح بما زاد علی الثلث والمراد بعدم الصحة عد النفاذ حتی لا ینفذ بل یتوقف علی الإجازة. (البحر الرائق، کتاب الوصایا، زکریا ۹/ ٤۲۱، کوئٹہ ۸/ ٤۰٤، شامی زکریا ۱۰/ ۳۳۹، کراچی ٦/ ٦۵۰)

(۱) سوال میں مذکورلوگوں میں سے صرف حقیقی بھائی بہن وارث ہوں گے جن کے درمیان کل ترکہ درج ذیل نقشے کے مطابق تین حصوں میں تقسیم ہوکر دوحصہ بھائی کو، ایک حصہ بہن کو مل جائے گا۔

زید میـــــــــــــــــــــــــت ۳

حقیقی بھائی	حقیقی بہن
۲	۱

فللذکر مثل حظ الأنثیین، الأقرب فالأقرب (إلی قوله) ثم جزء أبیه أی الإخوة ثم بنوهم وإن سفلوا. (سراجی ص: ۲۲ باب العصبات) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ٦۰۹۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۴/۳ھ

والدہ کی موت کے بعد وصیت کا حکم

سوال [۱۱۳٦۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میری والدہ کے پاس دو دو کانیں اور دو مکانات تھے، انہوں نے اپنی زندگی میں اپنی دوکانیں اپنے دولڑکوں محمد یامین، محمد سرفراز کو دیدی تھیں، اور دو مکان چار لڑکے: تنویر احمد، سلیم احمد، محمد عمر فاروق، تسلیم احمد، تین لڑکیاں: شاہین بانو، پروین بانو، مبین بانو، کو دیدیئے

تھے،اور قبضہ بھی دیدیا تھا،لیکن اس کے ساتھ ہی ایک تحریر وصیت نامہ کے طور پر یہ لکھی تھی کہ ان دوکانوں اور مکانوں کی زندگی بھر میں مالک رہوں گی، اور میرے انتقال کے بعد دو دوکانیں بڑے لڑکے محمد یامین اور محمد سرفراز کوملیں گی، اور دونوں مکانات چار لڑکے اور تین لڑکیوں کوملیں گے، پھر والدہ کا انتقال ہوگیا،تو اب دریافت یہ کرنا ہے کہ والدہ کی وصیت کے مطابق تقسیم ہوگی یا دونوں دوکانوں اور دونوں مکانوں کی تقسیم حسب حصص شرعیہ ہوگی؟ شرعی حکم تحریر فرمادیں؟

المستفتی: محمد عمر فاروق ہلدوانی نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگرسوال نامہ واقعہ کے مطابق صحیح اور درست ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ والدہ نے بڑے دونوں لڑکوں کو دوکان استعمال کے لیے دی اور حقیقت میں والدہ ہی مذکورہ ساری جائیداد کی مالک ہے اور مرنے کے بعد جن کے قبضہ میں جو جائیداد ہے ان کے مالک ہونے کی جو وصیت کی ہے اس وصیت کا سارا مدار والدہ کی وفات کے بعد ورثاء پر ہے، اگر سارے ورثاء اس کے نفاذ کی بخوشی اجازت دیتے ہوں تو وہ نافذ ہوگی ، ورنہ وہ وصیت باطل ہو جائے گی ، اور سوالنامہ سے یہ بات واضح ہورہی ہے کہ سارے ورثاء اس وصیت نامہ پر راضی نہیں ہیں، اس لیے دونوں دوکان اور دونوں مکان والدہ کی میراث شمار ہوکر ساری اولادوں میں شرعی حصوں کے حساب سے تقسیم ہوں گے، اس میں دوکانوں کی قیمت لگا کر تقسیم کی جائے اور مکان اگر بڑے بڑے ہیں تو گزوں کے حساب سے تقسیم کردیئے جائیں، اگر چھوٹے ہیں تو قیمت کے حساب سے تقسیم کردیئے جائیں،لہٰذا والدہ کی وفات کے بعد مذکورہ ورثاء کے درمیان دونوں دوکان اور دونوں مکان درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوں گے۔

۱۵

میـــــــــــــــــــــــــــــــــت

لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی
۲	۲	۲	۲	۲	۲	۱	۱	۱

مرحومہ کا ترکہ ۱۵ر حصوں میں تقسیم ہوکر اسی کے تناسب سے ترکہ میں سے لڑکوں کو دو

دو حصے اور لڑکیوں کو ایک ایک حصہ ملے گا۔

عن أبی أمامة الباهلیؓ قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول: فی خطبته عام حجة الوداع ...... إن الله أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث. (سنن الترمذی، باب ماجاء فی الوصیة للوارث، النسخة الهندیة ۲/۳۲، دار السلام رقم: ۲۱۲۰)

عن عبد الله ابن عباسؓ قال: قال رسول الله ﷺ: لاتجوز الوصیة لوارث، إلا إن شاء الورثة. (السنن الکبریٰ للبیهقی باب نسخ الوصیة للوالدین والأقربین، دار الفکر ۹/۳۵٦ -۳۵۷ -۳۵۸، رقم: ۱۲۷۹۷- ۱۲۷۹۸ - ۱۲۸۰۳، سنن الدار قطنی، دار الکتب العلمیة بیروت ٤/۸٦ رقم: ۲٤۵۱ - ۲٤۵۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۲۵ رصفر المظفر ۱۴۳۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۴۴۹)	۱۴۳۵/۲/۲۵ھ

مورث کا بیٹوں کو مکان کی وصیت کرنا

سوال [۱۱۳٦۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) بارہ سال قبل زید کا انتقال ہوا، زید نے اپنے ترکہ میں ایک مکان جس میں ۴ رکمرے، دو دوکانیں، ایک ہال، ایک دوچھتی چھوڑی، اپنی زندگی میں زید نے اپنے تمام اہل خانہ کے سامنے اس مکان کو اپنے بیٹوں کے لیے خاص کر دیا تھا، زید کی بیوی بیٹے اور بیٹیاں اس پر گواہ ہیں۔

(۲) زید کے ورثاء میں تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں، بیٹیاں مکان مذکورہ میں اپنے حصہ کا مطالبہ کر رہی ہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں حصہ کی تقسیم کس طرح ہوگی؟

(۳) اگر زید کی بیٹیاں اپنا حصہ معاف کرنا چاہیں تو شرعاً معافی کا طریقہ کیا ہوگا؟

المستفتی: رشیدہ خاتون معرفت: محمد نعیم چابک سوار دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سوالنامہ سے معلوم ہوا کہ زید نے بیٹوں کو ہبہ

کرکے قبضہ نہیں دیا ہے، بلکہ مرنے کے بعد یہ مکان خاص طور پر بیٹوں کو ملنے کی وصیت کی ہے اور وارثین کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہوتی ہے، اس لیے مذکورہ مکان میں تمام شرعی ورثاء کا حق ان کے حصوں کے اعتبار سے موجود ہے، اور بیٹیوں کا اس مکان میں اپنے حصہ کا مطالبہ کرنا قرآن وحدیث کی روشنی میں صحیح اور درست ہے، لہٰذا مذکورہ مکان ۸۸/سہام میں تقسیم ہوکر زید کی بیوی کو ۱۱/اور لڑکوں کو چودہ چودہ اور لڑکیوں کو سات سات سہام ملیں گے۔

سوال نامہ میں تیسرا سوال قائم کیا گیا کہ اگر بیٹیاں معاف کریں تو معاف کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب بیٹیاں اپنے حق کا مطالبہ کررہی ہیں تو معاف کرنے کا طریقہ معلوم کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، ان کا حق ان کو دیدیا جائے۔

عن أبی أمامة الباهلی –رضی الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصیة لوارث، النسخة الهندیة ۲/۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، الوصایا، باب ماجاء فی الوصیة للوارث، النسخة الهندیة ۲/۳۹۶، دار السلام رقم: ۲۸۷۰، سنن ابن ماجه، لاوصیة لوارث، النسخة الهندیة ۲/۱۹٤ دار السلام رقم: ۲۷۱۳)

عن عبد الله ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ: لاتجوز الوصیة لوارث، إلا إن شاء الورثة. (السنن الکبریٰ للبیهقی باب نسخ الوصیة للوالدین والأقربین، دار الفکر ۹/۳٥٦ – ۳٥۷ – ۳٥۸ رقم: ۱۲۷۹۷ – ۱۲۷۹۸ – ۱۲۸۰۳، سنن الدار قطنی، دار الکتب العلمیة بیروت ٤/۸٦ رقم: ۲٤٥۱ – ۲٤٥۲)

الإرث جبری لا یسقط بالإسقاط. (تکملة رد المحتار، مطلب: واقعة الفتاویٰ کراچی ۷/٥۰٥، زکریا ۱۱/٦۷۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/رجب المرجب ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۲۱۰/۴۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۸/۱۴۳۴ھ

اولاد کو محروم کر کے پوری جائیداد بیوی کے نام وصیت کرنا

سوال [۱۱۳۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے والد صاحب نے بڑے بھائی سے تین چار بیویاں چھڑائیں اور بیوی کو نہ چھوڑنے کے سلسلے میں عرصۂ دراز تک ان سے ناراض رہے، پھر یہی سلسلہ میرے ساتھ کرنا چاہا، جبکہ بیوی میں کوئی کمی نہیں، میں نے اس سلسلے میں کہا نہیں مانا، تو وہ مجھ سے ناراض رہے، عرصۂ دراز کے بعد سخت بیمار ہو گئے، میں نے اپنی جانب سے علاج ومعالجہ میں کوئی کمی نہیں کی، جبکہ اس وقت بڑے بھائی بمبئی میں تھے، لیکن چونکہ وہ بیوی کو چھوڑنے کے سلسلے میں کہا نہ ماننے پر مجھ سے ناراض تھے، اس لیے اپنی کل جائیداد جو تقریباً ۳۰/۳۵ بیگہ ہے، میری والدہ کے نام وصیت کردی، کہ جب تک یہ زندہ ہے تو تمام جائیداد کی یہ مالک ہے، اور اس کے مرنے کے بعد بڑے لڑکے عبد السلام کا لڑکا اس کا مالک ہے، اور یہ وصیت رجسٹرڈ کرادی، جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ حاجی جی نے ایسا کیا ہے جبکہ مولوی عبد الغفار بھی ہر دکھ درد میں ان کے شریک رہے تو انہوں نے والد صاحب سے کہا تو اس پر انہوں نے کہا کہ یہ وصیت میں ختم کرادوں گا، لیکن ان کو اتنا وقت نہیں ملا اور انتقال کر گئے۔

اب اس میں دریافت طلب امر یہ ہے کہ والد کا مذکورہ کہا نہ ماننے کی وجہ سے کیا شرعاً بیٹا نافرمان ہو گیا کہ جس کی وجہ سے عاق اور محروم کرنا درست ہو، نیز مذکورہ وصیت کی کیا حیثیت ہے؟ کیا اس میں دیگر ورثاء کا حق ہے یا نہیں؟ وارثین میں دو بھائی: عبد السلام، عبد الغفار، ایک بہن: نور جہاں، اور بیوی ہے، حدیث وفقہ کی روشنی میں جواب سے نوازیں کہ کس کو کتنا حصہ ملے گا؟

المستفتی: عبد الغفار رشیدی گنگوہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب لڑکا مطیع وفرمانبردار اور خدمت گذار رہے اس کے باوجود باپ ناراض ہے، تو بیٹا نافرمان نہیں کہلائے گا، نیز شریعت کے اندر نافرمان بیٹے کو بھی وراثت سے عاق کرنے سے عاق نہیں ہوتا ہے۔

الإرث جبری لا یسقط بالإسقاط. (تکملة رد المحتار، مطلب: واقعة الفتاویٰ کراچی ۷/۵۰۵، زکریا ۱۱/۶۷۸)

اور بیوی چونکہ شرعی وارث ہے اس لیے وارث کے حق میں شریعت اسلامیہ میں وصیت معتبر نہیں ہوتی ہے،اس لیے مذکورہ وصیت شرعاً نافذ نہیں ہوگی، جب بیوی کے حق میں نافذ نہیں ہوئی تو اس کے بعد پوتے کے حق میں بھی نافذ نہیں ہوئی،لہٰذا مرحوم کا ترکہ ان کے وارثین کے درمیان ان کے حقوق کے مطابق تقسیم ہوگا،جس میں عبدالغفار بھی اپنے حصہ کا برابر کا شریک ہوگا۔

عن أبی أمامة الباھلی -رضی اللہ عنه-قال: سمعت رسول اللہ ﷺ یقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن اللہ تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصیة لوارث، النسخة الهندیة ۲/۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، الوصایا، باب ماجاء فی الوصیة للوارث، النسخة الهندیة ۲/۳۹۶، دار السلام رقم: ۲۸۷۰، سنن ابن ماجه، لاوصیة لوارث النسخة الهندیة ۲/۱۹۴ دار السلام رقم: ۲۷۱۳)

لہٰذا مرحوم کا ترکہ حسب ذیل طریقہ سے تقسیم ہوگا:

۲۰/۴

میــــــــــــــــــــــــــت

بیوی	بیٹا	بیٹا	بیٹی
۱		۳	
۵	۶	۶	۳

مرحوم کا کل ترکہ ۲۰؍سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا ملے گا جو اس کے نیچے درج ہے۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۷۰۴۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱/۲۴ھ

ایک بیوی اور اس کی اولاد کے لیے میراث سے متعلق وصیت کرنا

سوال [۱۱۳۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: پہلی بیوی سے ۹/ اولاد ہیں، جس میں پانچ بیٹیاں اور چار بیٹے ہیں، ایک کنوارے بیٹے کا انتقال ہوگیا ہے اور ایک بیٹی شادی شدہ کا انتقال ہوگیا ہے جس کی تین اولاد ہیں، جس میں دو بیٹے ایک بیٹی ہے، دوسری بیوی سے چار اولاد، تین لڑکی اور ایک لڑکا موجود ہیں۔

ہم سب پہلی بیوی کے بچے ہیں، ہم سب اپنے والدین کے ساتھ رہتے ہیں، جب ہماری والدہ کی شادی ہوئی تو ہمارے والد کرایہ کے مکان میں رہتے تھے، اپنی ذاتی کوئی جائیداد نہیں تھی، ہماری والدہ نے برابر محنت کی اور اسی محنت سے یہ جائیداد خریدی، اس جائیداد کے علاوہ ہمارے پاس ایک دادالٰہی دوکان ہے۔

جب ہمارے والد کی دوسری شادی ہوئی تو ہماری والدہ کو ان کی شادی کا پتہ نہیں چلا، کچھ سالوں کے بعد جب ان سے اولاد ہوئی تب ظاہر ہوا کہ ہمارے والد نے دوسری شادی کی ہے، ہماری دوسری والدہ کو شروع ہی سے مانگ کر کھانے کی عادت تھی، جس کی وجہ سے ہمارے والد اور ان کی دوسری بیوی سے تناؤ پیدا ہوا، اکثر اس بات کا جھگڑا ہوتا تھا کہ تو مانگ کر کھانا چھوڑ دے، جب کہ میں تیرا پورا خرچہ اٹھاتا ہوں تو بھیک مانگ کر مجھے بدنام کیوں کرتی ہے، اسی وجہ سے کئی بار وہاں لاکر اپنے سامنے رکھا مگر ہر بار وہ موقعہ دیکھ کر گھر سے فرار ہوگئی، کتنی بار ایسا کرنے پر وہ باز نہیں آئی تو بچوں کو اپنے پاس بلاکر رکھ لیا، مگر بچوں کو انہوں نے ہمارے والد کے پاس رہنے نہ دیا، کیونکہ ان کی بھیک مانگنے پر خلل پڑ رہا تھا اور وہ بہت بہلا و پھسلا کر بچوں کو اپنے ساتھ ہی لے گئی، جب بچہ بڑا ہوا ان کی شادی کا جب وقت آیا تب بھی ہمارے والد سے کسی طرح کا مشورہ نہیں کیا اور ان کی دخل اندازی ان کو گوارہ نہیں ہوئی، اور اکیلے ہی اپنی مرضی سے رشتہ کر کے ان کی شادی کی، ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے اپنی دوسری بیوی اور بچوں سے یہ کہہ دیا کہ اگر تم لوگ میرے ساتھ رہو گے تو میرے مال میں

حق رہے گا ورنہ تم میرے مال سے محروم رہو گے۔

یہ سب کہنے کے باوجود ان پر کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ لوگ بھیگ مانگ کر کھاتے رہے، کسی نے اگر پوچھا کہ تمہارے باپ کہاں ہیں؟ تو کہہ دیا کہ میرے باپ مر گئے، اس بات کو گذرے ہوئے ۲۰/سال سے زیادہ ہو چکے، اور کسی طرح کا کوئی لین دین، تعلق نہیں رہا۔

جب ہمارے والد ۱۹۹۷ء میں حج کو جارہے تھے تو جاتے وقت لکھت روپ میں اور زبانی وصیت کی جس میں انہوں نے پہلی بیوی کی ۹/اولادوں کے نام وصیت کی جس میں انہوں نے دوسری بیوی اور ان کی اولادوں کے نام کسی طرح کا تحریری یا زبانی کوئی حصہ نہیں دیا، اور یہاں تک کہہ دیا کہ ۱۹۷۴ء میں جب پہلا حج کیا تھا تب انہیں بلا کر کہا کہ میں تیرے مہر کے بدلے تجھے حج کرا دوں گا مگر انہوں نے حج کرنے سے انکار کر دیا، اور کہا کہ میرے مہر کے روپئے سے زیور بنا دیجئے، انہوں نے جانے سے پہلے ہی مہر کے بدلے زیور بنا دیا تھا، مگر چار سال پہلے ہمارے والد کی موت کی خبر انہوں نے سنی تو انہوں نے اپنے مہر اور جائیداد میں حصہ کا زبانی دعویٰ کیا کہ مجھے جائیداد میں حصہ چاہیے، اور جائیداد وکل آمدنی کا بھی حصہ چاہیے، جبکہ ہمارے والد نے جو وصیت کی اس میں اس کا کسی طرح کا کوئی ذکر نہیں کیا، مگر جو ایک دادا الٰہی دوکان ہے اس کا وصیت میں کوئی ذکر نہیں پہلی بیوی سے تین لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں اور دوسری بیوی سے ایک لڑکا تین لڑکیاں باپ کی موت کے وقت سے باحیات ہیں، اور جو کچھ بھی وصیت ہے اس کا ان سے گھر کا داماد اور بیٹے اور بیٹے کا ایک دوست گواہ ہے، ان کے سامنے یہ وصیت کی گئی ہے۔

المستفتی: محمد صادق بھٹی محلہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرحوم نے دوسری بیوی اور اس کی اولاد کے بارے میں وراثت سے متعلق جو وصیت کی ہے وہ معتبر نہیں ہے۔

عن أبي أمامة الباهلي –رضي الله عنه– قال: سمعت رسول الله

صلی اللہ علیہ وسلم **یقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث.** (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصیة لوارث، النسخة الهندیة ۳۲/۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، الوصایا، باب ماجاء فی الوصیة للوارث، النسخة الهندیة ۳۹٦/۲، دار السلام رقم: ۲۸۷۰، سنن ابن ماجه، لاوصیة لوارث، النسخة الهندیة ۱۹٤/۲ دار السلام رقم: ۲۷۱۳)

اور بیوی بدچلنی کی وجہ سے گنہگار تو ضرور ہوگی لیکن وراثت سے محروم نہیں ہوگی۔

الإرث جبری لا یسقط بالإسقاط. (تکملة رد المحتار، مطلب: واقعة الفتاویٰ، کراچی ۵۰۵/۷، زکریا ٦۷۸/۱۱)

ہاں البتہ پہلی بیوی نے جو اپنی محنت سے مکان خریدا ہے وہ اس کا اپنا ہے، اس میں کسی کا حق نہیں ہوگا، مگر دادالٰہی جو دوکان ہے اس میں سب کے لیے حق وراثت جاری ہوگا، لہٰذا چاروں لڑکے اور ساتوں لڑکیاں وراثت کی حقدار ہوں گی، اور مرحوم کی دادالٰہی جائیداد یا اس کا بینک بیلینس وغیرہ اگر موجود ہو تو سب درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا۔

۲۴۰ / ۱۲۰ / ۸

میـــــــــت

بیوی	بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی
۱ / ۱۵ / ۳۰					۷ / ۱۰۵ / ۲۱۰							
۱۵	۱۵	۲۸	۲۸	۲۸	۲۸	۱۴	۱۴	۱۴	۱۴	۱۴	۱۴	۱۴

کل ترکہ دوسو چالیس سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا ملے گا جو اس کے نام کے نیچے لکھا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ شعبان المعظم ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۴۸۳/۳۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۸/۱۴ھ

مرحوم کا بھتیجوں کے لیے وصیت کرنا

سوال [۱۱۳۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید لا ولد ہے، ایک بیوی، دو بھتیجے، دو بھتیجی، ایک حقیقی بہن چھوڑ کر انتقال کر گیا، جھگڑا یہ ہے کہ زید کی عمر اسی یا پچاسی سال ہے، اس نے آخری وقت میں اپنے بھتیجوں کے نام ساری زمین کی رجسٹرڈ وصیت کی، اس وقت زید کی بیوی موقع پر موجود تھی، بعدہٗ بیوی نے کسی کے کہنے سے کہا کہ میرا حق تلف ہو گیا، علماء نے بتایا کہ چوتھائی حق ہے، زید نے کہا کہ بیوی کے نام زمین کرے گا، زید اور بیوی اور بیوی کا بھائی تینوں گئے، زید بیوی کے نام ساری زمین کا بیع نامہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا، لیکن رقم نہ ہونے کی وجہ سے آدھی زمین کا بیع نامہ ہو گیا، کچھ دن کے بعد میں دین دار لوگوں نے رائے دی کہ اس جائیداد کو اللہ کی راہ میں دیدیں تو زید نے زبانی وصیت بھی کی بیعنامہ لکھنے کے لیے تیار رہے، لیکن کمزوری کی وجہ سے نہ جا سکے اور بیوی سے تاکید کی کہ ساری زمین اللہ کی راہ میں جانی چاہیے، عقل کی اور بدن کی کمزوری کی وجہ سے نماز نہ پڑھی، کچھ رشتہ داروں نے معلوم کر کے ڈیڑھ سال کی نمازوں کے فدیوں کی وصیت کرادی، اور انتقال کر گئے، بھتیجوں کے نام رجسٹری دس ماہ پہلے ہوئی، بیوی کے نام بیعنامہ ڈیڑھ مہینہ پہلے، زبانی وصیت اللہ کی راہ میں ایک مہینہ پہلے کی، کل زمین ساڑھے تیرہ بیگہ ہے، معلوم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ رجسٹری کا اعتبار ہوگا یا بیع نامہ کا، یا اللہ کی راہ میں زبانی وصیت کا؟

(۲) مرض الموت کی مدت کتنی مانی جائے گی؟

(۳) ورثاء میں میراث کی تقسیم کب ہوگی؟، ابھی زید کی بیوی زندہ ہے اس کی کوئی آمد نہیں ہے علاوہ اس زمین کے؟

المستفتی: محمد سجاد حسین نور پور عرب بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مسئولہ صورت میں زید کے بھتیجے اس کے شرعی

وارث ہیں، لہٰذا ان کے حق میں کی گئی وصیت کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں ہے، اور بیوی کے نام جو آدھی زمین کا رجسٹرڈ بیع نامہ کرایا ہے وہ بیوی کے حق میں ہبہ ہے اور شرعی طور پر بیوی اس کی مالک ہو چکی ہے، اس لیے کہ مالک بنانے ہی کی غرض سے یہ رجسٹری کرائی گئی ہے، اور بقیہ آدھی جائیداد شوہر کی ملکیت میں باقی رہی، اس کے بعد اس نے اپنی چھوٹی ہوئی نمازوں کے لیے فدیہ کی جو وصیت کی ہے وہ مابقیہ آدھی جائیداد کے ثلث میں نافذ ہوگی، لہٰذا اپنی ڈیڑھ سال کی چھوٹی ہوئی نمازوں کا فدیہ ادا کرنے کی صورت یہ ہے کہ پونے سات بیگہ زمین بیوی کو دینے کے بعد مابقیہ پونے سات بیگہ زمین کو تین حصوں میں کر کے ایک حصہ فروخت کر کے اس کی قیمت کے ذریعہ چھوٹی ہوئی نمازوں کا فدیہ ادا کر دیا جائے، باقی دو حصہ شرعی وارثوں کے درمیان تقسیم ہوگا، بقیہ جائیداد ۸/ حصوں میں تقسیم ہو کر بیوی کو دو، بہن کو چار، اور مرحوم کے بھتیجوں کو ایک ایک ملے گا۔

عن أبی أمامة الباهلی –رضی الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک و تعالیٰ قد أعطیٰ كل ذی حق حقه فلا وصية لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصية لوارث، النسخة الهندية ۲/ ۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، الوصايا، باب ماجاء فی الوصية للوارث، النسخة الهندية ۲/ ۳۹٦، دار السلام رقم: ۲۸۷۰، سنن ابن ماجه، لاوصية لوارث النسخة الهندية ۲/ ۱۹٤ دار السلام رقم: ۲۷۱۳)

إذا وهب أحد الزوجين لصاحبه لا يكون له حق الرجوع. (الفتاویٰ التاتارخانية زكريا ۱٤/ ٤٤۹، رقم: ۲۱٦۷۰)

عن أبی منصور قال: قال إبراهيم: إذا وهبت المرأة لزوجها، أو وهب الرجل لامرأته فالهبة جائزة، وليس لواحد منهما أن يرجع فی هبته. (شرح معانی الآثار، باب الرجوع فی الهبة، دار الكتب العلمية بيروت ۳/ ۳۵۵، رقم: ۵۷۰۳)

ومات وعليه صلوات فائتة وأوصیٰ بالكفارة (در مختار) بأن كان لايقدر علی أدائها ولو بالإيماء فيلزمه الإيصاء بها يعطی لكل صلاة نصف

صاع من بر كالفطرة وكذا حكم الوتر من ثلث ماله. (شامی، باب قضاء الفوائت، مطلب: فی إسقاط الصلاة عن الميت، زكريا ٢/ ٥٣٢-٥٣٣، كراچی ٢/ ٧٢، الموسوعة الفقهية ٢١/ ١٤٩) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۳۵۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/ ۴/ ۱۴۳۲ھ

پھوپھی کا اپنا حصہ بھتیجوں کے نام وصیت کرنا

سوال [۱۱۳۶٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محترمہ رئیسہ خاتون اپنے حصہ اور بھائی سے ترکہ میں ملے ہوئے حصہ کی اپنے بھتیجوں کے نام وصیت کرنا چاہتی ہیں، شرعاً حکم کیا ہے؟

المستفتی: حاجی مطیع الرحمٰن مفتی ٹولہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: شرعی مسئلہ یہ ہے کہ کسی بھی وارث کے حق میں اس وقت تک وصیت درست نہیں ہوتی ہے کہ جب تک دوسرے ورثاء راضی ہو کر اس کی اجازت نہ دیدیں، اس کے برخلاف اگر دوسرے ورثاء بخوشی اجازت دیدیں یا دوسرے کوئی وارث نہیں ہیں بلکہ جن کے حق میں وصیت کی جارہی ہے وہی ورثاء ہیں، اور ان کے درمیان برابری کی وصیت ہے تو ایسی صورت میں وارثین کے حق میں بھی وصیت درست ہوجاتی ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں صرف یہی پانچ بھتیجے وارث ہیں، اور کوئی وارث نہیں ہے، لہٰذا ان کے درمیان وصیت درست ہوجائے گی۔

عن عبد الله ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ: لاتجوز الوصية لوارث، إلا إن شاء الورثة. (السنن الكبرىٰ للبيهقی، باب نسخ الوصية للوالدين والأقربين، دار الفكر ٩/ ٣٥٦-٣٥٧-٣٥٨ رقم: ١٢٧٩٧ - ١٢٧٩٨ - ١٢٨٠٣، سنن الدار قطنی،

دار الكتب العلمية بيروت ٤/٨٦، رقم: ٢٤٥١ - ٢٤٥٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍شعبان المعظم ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۱۵۹)

شوہر کا بیوی واولاد کے لیے میراث میں وصیت کرنا

سوال [۱۱۳۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے والد صاحب کو دادا کے انتقال کے بعد ترکہ میں جو مکان ملا تھا، والد صاحب نے زندگی ہی میں آدھے مکان کی وصیت ہماری والدہ کے نام کی تھی، اور باقی آدھا حصہ اولادوں کے نام وصیت کردیا تھا۔

تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ ہمارے والد صاحب کی یہ وصیت شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اگر یہ درست نہیں تو ہم دو بھائی، دو بہن اور والدہ میں سے کس کو کتنا حصہ ملے گا؟

المستفتی: محمد رئیس محلّہ نواب پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کی والدہ آپ کے والد کی وارث ہوتی ہیں، اسی طرح آپ لوگ بھی اپنے والد کے وارث شرعی ہیں، اس لیے والد صاحب نے جو وصیت کی ہے وہ نہ تو آپ کی والدہ کے حق میں نافذ ہوگی اور نہ ہی آپ لوگوں کے حق میں، اس لیے کہ دوسرے وارثین کی اجازت کے بغیر اس طرح کی وصیت شرعاً معتبر نہیں ہے، لہٰذا آپ کے والد کا جو دادا الٰہی مکان ہے وہ شرعی وارثین کے درمیان تقسیم ہوگا، جس میں آپ کی والدہ اور آپ سب لوگ شامل ہوں گے، بشرطیکہ اس مکان میں آپ کے والد کے کوئی اور شرعی وارث کسی بھی جانب کے موجود نہ ہوں، لہٰذا مذکورہ وارثین کے درمیان وہ مکان درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا۔

۴۸/۸
میــت

بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی
۱/۶	۱۴	۷/۱۴	۷	۷

مرحوم کا کل ترکہ ۴۸ رحصوں میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنے ملیں گے جو اس کے نام کے نیچے درج ہیں۔

عن عبد الله ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ: لاتجوز الوصية لوارث، إلا إن شاء الورثة. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، باب نسخ الوصية للوالدين والأقربين، دار الفكر ٩/٣٥٦ -٣٥٧ -٣٥٨، رقم: ١٢٧٩٧ -١٢٧٩٨ - ١٢٨٠٣، سنن الدار قطني، دار الكتب العلمية بيروت ٤/٨٦، رقم: ٤٢٥١ - ٤٢٥٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷ رجمادی الثانیہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۴ ۱۰۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۶/۷ھ

مرحوم بیٹی کا حصہ اس کی لڑکی کے لیے وصیت کرنا

سوال [۱۱۳۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) عقیلہ خاتون کا انتقال ہوگیا، ان کے ورثاء میں دو لڑکے، معروف علی، مرغوب علی، تین لڑکیاں: شہناز فاطمہ، شیما خاتون، اسماء خاتون، ایک مرحومہ بیٹی شاذیہ خاتون کی لڑکی درخشاں عروج نواسی ہے، جسے عقیلہ خاتون نے پالا ہے، شرعاً کس کو کتنے حصے ملیں گے؟

(۲) عقیلہ خاتون نے اپنی حیات میں گواہان منور علی معراج علی کے سامنے وصیت کی تھی، میں اپنی مرحومہ لڑکی شاذیہ کا حصہ اپنی نواسی درخشاں عروج کو دوں گی؟

المستفتی: شیما، شہناز، اسماء، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: بر تقدیر صحت سوال وعدم موانع ارث وبعد ادائے

حقوق ماتقدم،مرحومہ کا ترکہ حسب حصص شرعیہ تقسیم کیا جائے گا، اورانہوں نے گواہوں کے سامنے نواسی کے لیے جو وصیت کی ہے اس وصیت کی مقدار بیٹی کا جو شرعی سہام بنتا ہے وہی بتایا ہے، اور بیٹی کا شرعی سہام ایک ثلث سے کم ہی ہے، لہٰذا ایک بیٹی کا جو حصہ بنتا ہے، وہ نواسی کو بھی دیا جائے گا، اس کے بعد بقیہ ترکہ درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا، اور اس نقشہ میں نواسی کو ملنے والا وصیت کا حصہ بھی بتایا جار ہا ہے تا کہ اس میں کوئی کمی زیادتی نہ ہو سکے:

عقیلہ خاتون میت ۸

لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی	نواسی موصی لہا
معروف	مرغوب	شہناز	شیماء	اسماء	درخشاں
۲	۲	۱	۱	۱	۱
					حصۂ وصیت

کل ترکہ آٹھ برابر سہام میں تقسیم ہوکر لڑکوں کو ۲/۲، لڑکیوں کو ایک ایک اور نواسی موصیٰ لہا کو ایک سہام ملے گا۔

عن عبد الله بن عمر أن عمر بن الخطاب رضی الله عنه سئل عن الوصية؟ فقال عمر: الثلث وسط من المال، لابخس ولا شطط. (السنن الكبرىٰ للبيهقي، باب الوصية بالثلث دار الفكر ۹/۳٦۹ رقم: ۱۲۸۳۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۱۱؍ربیع الاول ۱۴۳۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۳۱۰/۳۹)	۱۴۳۲/۳/۱۱ھ

بھانجہ اور بہن کے حق میں وصیت اور ترکہ کی تقسیم

سوال [۱۱۳٦۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ محمد خورشید صاحب کا انتقال ہوگیا، ان کے ورثاء میں تین بھائی: محمد شاہد، محمد اختر، محمد اقبال، اور پانچ بہنیں: بیگم جہاں، روشن جہاں، رونق جہاں، نزہت جہاں، عشرت جہاں ہیں، انتقال سے پہلے انہوں نے یہ وصیت کی کہ آدھا مال میرے بھانجے منصور احمد اور

آدھا مال میری بہن نزہت جہاں کو دیدیا جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان کی وصیت نافذ ہوگی یا نہیں؟ اگر نافذ ہوگی تو کتنے میں؟ اور وارثین شرعی وراثت کے حق دار ہوں گے یا نہیں؟ واضح فرمائیں۔

المستفتی: منصور احمد محلّہ بھٹی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خورشید صاحب نے انتقال سے پہلے جو اپنے بھانجے منصور احمد اور بہن نزہت جہاں کے لیے وصیت کی تھی وہ شرعاً صرف بھانجے کے حق میں ایک تہائی مال میں نافذ ہوگی اور بہن کو وصیت کی وجہ سے کچھ نہیں ملے گا، البتہ شرعاً جو اس کا حق بنتا ہے وہ اس کو ضرور ملے گا، اور ایک تہائی مال بھانجے منصور احمد کو دینے کے بعد بقیہ مال مذکورہ شرعی ورثاء میں حسب ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

۳۳/۳

میـــــــــــــــــــــــــــــــــت

بھانجہ موصی لہ	بھائی	بھائی	بھائی (۲)	بہن	بہن	بہن	بہن	بہن
۱/۱۱	۴	۴	۴	۲	۲	۲	۲	۲

کل جائیداد ۳۳ر سہام میں تقسیم ہوکر ایک تہائی بطور وصیت یعنی ۱۱ر سہام منصور احمد کو اور ما بقیہ ۲۲ر سہام میں سے بطور میراث کے ہر ایک بھائی کو ۴، ۴ر اور ہر ایک بہن کو ۲، ۲ر کے حساب سے ملیں گے۔

ولو كان الإبن الذى لم يوص أجاز جميع وصية أبيه ولم يجز الآخر وصية الأجنبى يأخذ ثلث المال بغير إجازة؛ لأن الثلث محل الوصية، ووصية الأجنبى أقوىٰ من الوصية للوارث، والضعيف لايزاحم القوى فلهذا أخذ الثلث. (المبسوط للسرخسي، دار الكتب العلمية بيروت ۳/۲۹)

ولو أوصىٰ لوارثه ولأجنبى صح فى حصة الأجنبى و يتوقف فى حصة الوارث. (خانية، فصل فيمن تجوز وصيته و فيمن لا تجوز و صيته، زكريا جديد ۳/۳٦٦،

وعلی هامش الهندية ٣/٤٩٦)

أو أوصت لكل واحد منهما بنصف المال يأخذ الأجنبي أولا ثلث المال بلا منازعة؛ (إلى قوله) لأن الوصية بقدر الثلث مقدم على الميراث.

(خانية، فصل فيمن تجوز وصيته وفيمن لا تجوز وصيته، زكريا جديد ٣/٣٦٧، وعلی هامش الهندية ٣/٤٩٧، المبسوط للسرخسي ٢٧/١٧٥-١٧٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍صفر المظفر ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۱۸۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۲/۲۷ھ

مؤنث اولاد کو محروم کر کے نرینہ اولاد کے لیے وصیت کرنا

سوال [۱۱۳۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عبد اللطیف خاں کی ایک جائیداد ہے، واقع اصالت پورہ مرادآباد میں جو کہ عمارتی ہے، ان کے چھ لڑکے عاجز علی خاں، احسان علی خاں، قیصر علی خاں، کوثر علی خاں، قمر علی خاں، خورشید علی خاں، اور تین لڑکیاں: جمیلہ، شاہجہاں، سلمہ ہیں، اور مکان میں دوسوسات گز آراضی ہے، اب عبد اللطیف خاں نے اپنی تمام جائیداد کے بارے میں چھ بیٹوں کے حق میں وصیت لکھ دی کہ ان کے مرنے کے بعد چھ بیٹوں کے درمیان مذکورہ جائیداد برابر برابر وصیت نامہ کے مطابق تقسیم ہوگی، اور دو لڑکیوں کی (جمیلہ، شاہجہاں) کی شادی ہوگئی اور ایک لڑکی سلمہ نابالغہ تھی، اس کی شادی کے خرچہ واخراجات کی بھائیوں کے ذمہ وصیت کی۔

(۱) اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عبد اللطیف خاں کی وفات کے بعد اس کی وصیت نافذ ہوجائے گی یا نہیں؟ جبکہ وصیت کے مطابق تینوں لڑکیاں وراثت سے محروم ہوجاتی ہیں؟

(۲) دوسرا سوال اس میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ باپ کی وصیت کے مطابق چھ لڑکوں نے مذکورہ جائیداد تقسیم کرلیا، عاجز علی خاں کی وفات کے بعد صرف چھ لڑکیاں تھیں، ان کی کوئی نرینہ اولاد نہیں رہی، ان کی وفات کے بعد چھ لڑکیوں نے اپنا حصہ کوثر علی خاں کے نام

رجسٹری ہبہ کردیا،تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عاجز علی خاں کی تمام جائیداد صرف اس کی لڑکیوں کو ملے گی یا مرحوم کے بھائیوں کا بھی کچھ حصہ ہے؟

المستفتی: کوثر علی خاں اصالت پورہ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) عبداللطیف خاں کا اپنی تینوں لڑکیوں کو نہ دے کر مرنے کے بعد ساری جائیداد اپنے چھ لڑکوں کو دینے کی وصیت کرنا شرعی طور پر جائز نہیں ہے،لہٰذا مؤنث ورثاء کو محروم کر کے نرینہ اولاد کے لیے جو وصیت کی گئی ہے وہ صحیح نہیں ہوئی۔

عن أبی أمامة الباهلی -رضی الله عنه- قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصیة لوارث، النسخة الهندیة ۲/۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، الوصایا، باب ماجاء فی الوصیة للوارث، النسخة الهندیة ۲/۳۹۶، دار السلام رقم: ۲۸۷۰، سنن ابن ماجه، لاوصیة لوارث النسخة الهندیة ۲/۱۹٤ دار السلام رقم: ۲۷۱۳)

اس لیے عبداللطیف خاں کی وفات کے بعد ان کی جائیداد اسلامی شریعت کے مطابق لڑکے اور لڑکیاں سب کے درمیان حصۂ شرعی کے اعتبار سے تقسیم ہوگی،لڑکوں کو لڑکیوں کے مقابلہ میں دوگنا ملے گا،اور کل ترکہ پندرہ سہام میں تقسیم ہوکر ہر ایک لڑکے کو دو، دو اور ہر ایک لڑکی کو ایک ایک ملے گا جو درج ذیل نقشہ کے مطابق ہوگا:

عبداللطیف میت ۱۵

لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی
۲	۲	۲	۲	۲	۲	۱	۱	۱

(۲) دوسرے سوال میں یہ جو لکھا گیا ہے کہ عاجز علی کی چھ لڑکیوں نے ان کے مرنے کے بعد پورے ترکہ پر قبضہ کر کے کوثر علی کے نام ہبہ رجسٹری کردیا ہے، درست نہیں ہے، بلکہ عاجز علی کے وارثین میں اس کی لڑکیوں کے ساتھ اس کے بھائی اور بہنیں بھی ہوں

گے، اور کل ترکہ دو تہائی لڑکیوں کو ملے گا اور ایک تہائی بھائی بہنوں کو ملے گا، لہٰذا کل ترکہ ۱۱۷/ سہام میں تقسیم ہوکر اس کی لڑکیوں کو ۱۳، ۱۳/ سہام ملیں گے، اور بھائیوں کو چھ چھ اور بہنوں کو تین تین سہام ملیں گے، جو درج ذیل نقشہ سے واضح ہوتا ہے:

۱۱۷/۳

عاجز علی میـــــــــــــــــت

لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	بھائی	بھائی	بھائی	بھائی	بھائی	بہن	بہن	بہن
				۲						۱			
۱۳	۱۳	۱۳	۱۳	۱۳	۱۳	۶	۶	۶	۶	۶	۳	۳	۳

لہٰذا پچھلی تقسیم اور عبداللطیف کی وصیت کو منسوخ کرکے اس کے ترکہ کو اسی طریقہ سے تقسیم کرنا چاہیے جو اوپر کے نقشہ میں شریعت کا حکم لکھا گیا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۸۶۲/۳۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۶/۲۳ھ

ہبہ شدہ مکان کے علاوہ میں وراثت اور وصیت کا نفاذ

سوال [۱۱۳۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بیوہ بلقیس اپنے والد کے ترکہ سے ملے ہوئے ایک مکان کی مالک تھیں اور بلقیس لاولد نے اپنے لے پالک لڑکے جاوید کے نام کل مکان کی وصیت کی، لیکن یہ مسئلہ معلوم ہونے کے بعد کہ وصیت صرف ایک تہائی میں نافذ ہوتی ہے، بلقیس نے اپنے کل مکان میں سے باقی دو تہائی حصے جاوید کے نام ہبہ کردیئے، اور جاوید اسی وقت سے آج تک اس پر قابض بھی ہے، نیز بلقیس نے انتقال کے وقت ایک بھائی محمد شریف اور ایک بہن کو چھوڑا، لہٰذا وصیت کتنے حصے میں نافذ ہوگی اور کس کو کتنا ملے گا؟

المستفتی: جاوید اکرم پیر غیب مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر بلقیس پورے مکان کی شرعی طور پر مالک تھی

اوراس نے اس کے دوتہائی حصے ہبہ کرکے لے پالک کو قبضہ دیدیا ہے اور لے پالک اس پر قبضہ کرکے رہ رہا ہے تو وہ مکان کے دوتہائی کا شرعی طور پر مالک بن چکا ہے، اور باقی ایک تہائی بلقیس کی ملکیت میں رہا ہے، اور اسی ایک تہائی کی مرتے دم تک ترکہ کی حیثیت رہی ہے، تو گویا کہ اس کی کل ملکیت ایک تہائی رہی جب اس کی وصیت کردی تو شرعی طور پر اس کے تہائی حصہ میں مالک ہوسکتا ہے، لہٰذا اس کے تہائی حصے میں سے جس کی وصیت کردی تھی، تین حصے کرکے ایک حصہ وصیت کی بنا پر لے پالک کو ملے گا، اور باقی دو حصے وارث کا حق ہیں، لہٰذا مکان کے نوحصے کرکے چھ حصے کا مالک ہبہ کی بنیاد پر اور ایک حصہ کا وصیت کی بنیاد پر لے پالک ہوگیا، لہٰذا لے پاک کے کل سات حصے ہوگئے اور باقی ۲؍ حصے وارثین کے درمیان تقسیم ہوں گے۔

عن عبد الله بن عمر أن عمر بن الخطاب رضی الله عنه سئل عن الوصية؟ فقال عمر: الثلث وسط من المال، لا بخس ولا شطط. (السنن الکبریٰ للبیهقی، باب الوصیة بالثلث، دار الفکر ۹/ ۳۶۹، رقم: ۱۲۸۳۹)

ولو قال جعلت لک هذه الدار ...... فاقبضها فهو هبة. (عالمگیری، کتاب الهبة، الباب الأول جدید ٤/ ۳۹٦، قدیم ٤/ ۳۷۵) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ ربیع الاول ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۵۸۳/۳۶)

۵ باب موانع الإرث

اہل اسلام کے حق میں اختلاف دارین موانع ارث نہیں

سوال [۱۱۳۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میری حقیقی والدہ سے دو اولادیں ہوئیں، ایک میں اور ایک میری بہن، ہمارے بچپن میں ہماری حقیقی والدہ کا انتقال ہو گیا، بہن کی شادی کے بعد ہمارے والد نے دوسری شادی کرلی، دوسری ماں سے ایک لڑکی تولد ہوئی، اس کے بعد میری یہ دونوں بہنیں یعنی سگی اور سوتیلی اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ پاکستان چلی گئیں میری سوتیلی ماں بھی اپنی بیٹی کی محبت میں پاکستان چلی گئی، اور انہوں نے بھی وہیں سکونت اختیار کرلی، ان کے جانے کے لگ بھگ دس برس بعد میرے والد کا انتقال یہیں پر انڈیا میں ہو گیا، میرے والد کی ایک داد الٰہی جائیداد جوان کو وراثت میں ملی تھی، مرحوم نے چھوڑی، شریعت کی رو سے جس کا مالک واحد میں ہی ہوتا ہوں، جسے اب میں فروخت کررہا ہوں، حقیقی بہن اور ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے، دوسری بہن کے شوہر کا بھی انتقال ہو گیا ہے، بچے موجود ہیں تو فروخت شدہ جائیداد کا روپیہ کس طرح تقسیم کیا جائے؟

المستفتی: محمد فاروق چندوسی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دونوں بہنیں پاکستان چلی جانے کی وجہ سے وراثت سے محروم نہ ہوں گی، بلکہ ان کا حق بدستور باقی رہے گا، اور ان کی وفات کے بعد ان کا حق ان کے شرعی ورثاء کو ملے گا، ہاں البتہ وہ سب مل کر بخوشی اگر آپ کو دیدیں گے تب آپ کو مل سکتا ہے ورنہ نہیں۔

ولیس اختلاف الدار بمانع من الإرث عند الشافعي أصلا وهو عندنا مانع فیما بین الکفار دون المسلمین. (شریفیه ص: ۱۹، تاتارخانیة زکریا ۲۰/ ۲۱۷

رقم: ۳۳۰۸۳، سکب الأنهر، دار الکتب العلمیة بیروت ۴۹۸/۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۳۱۶)

اختلاف دارین کی وجہ سے مسلمانوں کے درمیان موانع ارث کا حکم جاری نہیں ہوتا

سوال [۱۱۳۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ رحیم اللہ کے چھ صاحبزادے تھے: منشی عبد الرحیم، حکیم عبد الرحمٰن، منشی عبد الکریم، حکیم عبدالحکیم، منشی عبد العزیز، شیخ عبد اللہ ان سب کا انتقال ہو چکا ہے، اوران کی اولاد زیادہ تر پاکستان جا چکی، اب منشی عبد العزیز اور منشی عبدالحکیم صاحب کی اولا د یہاں پر تھیں، اسی کے متعلق جناب سے استفسار ہے کہ حکیم عبدالحکیم کے ایک بیٹے عبدالحمید تھے جو لاولد تھے، اوران کے ساتھ کوئی دوسرا نہ تھا، ساری زندگی تنہائی میں گذاری، اپنی روٹی خود پکا کر کھاتے تھے، کسی سے کوئی رابطہ وتعلق نہ تھا، مگر اخیر میں جب خود پکانے سے معذور ہو گئے تو ان کے چچازار بھائی کے لڑکے مولانا حسین احمد صاحب نے ان کی کافی خدمت کی، اوران کا ایک جو بہت بڑا مکان تھا اور سات آٹھ بیگہ زمین تھی، بڈھانہ لے کر ان کا ہبہ اپنے نام کرالیا۔

تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہبہ کرنے والے نے جبکہ شئ موہوب پر قبضہ نہیں کرایا اور اپنا قبضہ اس مکان سے نہیں ہٹایا اور ہبہ کرنے کے لیے جب گئے تو اپنا تالا لگا کر گئے اور تالی اپنے پاس رکھی، اورآ کر پھراسی مکان میں قیام کیا، اوران کا سامان اسی میں تھا، تو یہ ہبہ صحیح ہوا یا نہیں؟ کیا اس مکان میں شرعی طور سے حاجی حنیف صاحب کے لڑکے خورشید، انیس اور رئیس کو بھی ملے گا یا نہیں؟ جو کہ ان کے چچا زاد بھائی کے لڑکے ہیں، ان کے عصبہ میں پانچ ہیں، حافظ ظریف احمد اور مولوی حسین احمد، پسران حافظ شریف احمد اور خورشید احمد، انیس احمد رئیس احمد پسران حاجی محمد حنیف، یہ پانچوں عصبہ کے درجے میں ہیں، کیا یہ پانچوں زمین اور مکان کے حصہ دار بنیں گے، یا فقط مولوی حسین احمد صاحب؟

المستفتی: محمد شعبان بستوی، کاندھلہ مظفر نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ سوال کے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ عبدالحمید صاحب نے مولانا حسین احمد صاحب کو جو جائیداد ہبہ کی ہے وہ دو قسموں پر ہے: (۱) سات آٹھ بیگہ زراعت کی زمین اگر ہبہ نامہ رجسٹری کرنے کے بعد عبد الحمید نے مولانا حسین احمد کو زمین پر قبضہ دیدیا ہے اور انہوں نے اپنے اختیار سے زمین میں تصرف کرلیا ہے، تو اس زمین کا ہبہ شرعاً تام ہو چکا ہے، لیکن سوال نامہ میں زمین کے قبضہ کے بارے میں صاف وضاحت نہیں ہے، اس لیے سائل خود حالات کا جائزہ لے لے۔

رجل قال لختنه: (ایں زمین ترا) فاذهب فازرعها فإن قال الختن عند ما قال هذه المقالة قبلت صارت الأرض له فيتم بالقبول. (عالمگیری، کتاب الهبة، الباب الأول، زکریا قدیم ٤/ ٣٧٥، جدید ٤/ ٣٩٧، فتاویٰ قاضیخان جدید زکریا ٣/ ١٨١، وعلی هامش الهندية زكريا ٣/ ٢٦٣، فتاویٰ بزازیه جدید زکریا ٣/ ١٢٦، وعلی هامش الهندية زكريا ٦/ ٢٤١، تاتارخانية زكريا ٤/ ٤٢٨، رقم: ٢١٥٩٤)

المراد بالقبض الكامل فى المنقول ما هو المناسب وفى العقار أيضا ما يناسبه. (مجمع الأنهر قديم ٢/ ٣٥٤، جديد دار الكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩٢)

اور اگر زمین پر پوری طرح قبضہ نہیں دیا گیا ہے بلکہ عبدالحمید کے تصرف میں وہ زمین رہی ہے تو ہبہ درست نہ ہوگا اور یہ زمین عبدالحمید کے حقیقی بھتیجے جو قاضی عبدالوحید کی اولاد ہیں انہیں کی وراثت میں منتقل ہوجائے گی، اور اختلاف دارین کی وجہ سے مسلمانوں کے درمیان موانع ارث کا حکم جاری نہیں ہوتا ہے، بلکہ اختلاف دارین کے باوجود وراثت کا تعلق بدستور باقی رہتا ہے، اس لیے عبدالحمید کے چچازاد، تایازاد بھائی کی اولاد عصبہ نہیں ہوگی، جن کا نام سوالنامہ میں مذکور ہے۔

وهو عندنا مانع فيما بين الكفار دون المسلمين لثبوت التوارث بين أهل البغي و أهل العدل (شريفيه) وتحته فى هامشه: وأما فى حق المسلمين فقد لايكون مانعا كأهل البغي والعدل (إلى قوله) يرث كل واحد عن صاحبه. (شريفيه شرح سراجي ص: ٢٠- ١٩، تاتارخانية زكريا ٢٠/ ٢١٧، رقم:

۳۳۰۸۳، سکب الأنھر، دار الکتب العلمیة بیروت ٤/٤٩٨)

(۲) مکان کے بارے میں حکم شرعی یہ ہے کہ اگر مولانا حسین احمد نے قاضی عبد الحمید صاحب کے ساتھ اسی مکان میں رہائش اختیار نہیں کی ہے، بلکہ مولانا حسین احمد کی کوئی الگ سے رہائش ہے اور صرف عبدالحمید کی خدمت کر کے رہنے کے لیے اپنی رہائش گاہ چلے جاتے ہیں تو ایسی صورت میں جبکہ مکان کی تالی وغیرہ مولانا حسین احمد کے حوالہ نہیں کی ہے اور عبدالحمید کا سامان بھی اسی مکان میں ہے تو شرعی طور پر مکان کا ہبہ تام نہیں ہوا، عبدالحمید کے مرنے کے بعد اس کے شرعی ورثاء کو وہ مکان ملے گا، اور شرعی ورثاء وہ نہیں کہ جن کا نام سوالنامہ میں مذکور ہے، بلکہ عبدالحمید کے شرعی ورثاء اس کے حقیقی بھتیجے ہیں، جو پاکستان میں رہتے ہیں، انہیں کو یہ مکان ملے گا، اس لیے کہ ایسے آدمی کے قبضۂ کامل کے لیے مکان خالی کر کے تالی بھی حوالہ کردینا لازم ہے جو واہب کے ساتھ نہیں رہتا ہے۔

رجل وهب دارا لرجل فيها متاع الواهب وسلم لايجوز لأن الموهوب له مشغول بما ليس بهبة فلا يصح التسليم. (قاضیخان جدید زکریا ۳/۱۸۵، وعلی ھامش الھندیة زکریا ۳/۲٦۸، ھندیه زکریا قدیم ٤/۳۸۰، جدید ٤/٤۰۲، الجوھرة النیرة، امدادیه ملتان ۲/۱۱، دار الکتاب دیوبند ۲/۱۰، مجمع الأنھر قدیم ۲/۳٥٤، جدید دار الکتب العلمیة بیروت ۳/٤۹۱)

لو كان لرجل دارا وفيها أمتعة فوهبها من رجل لايجوز لأن الموهوب مشغول بما ليس بموهوب فلا يصح التسليم. (شامی کراچی ۸/٤۳۸، زکریا ۱۲/٥۸٥)

اور اگر مولانا حسین احمد نے عبدالحمید کے ساتھ اسی مکان میں رہائش اختیار کر رکھی ہے، اور عبدالحمید نے اپنی پوری کفالت حسین احمد کے حوالے کر رکھی ہے، اور اسی نے اس کی تمام ضروریاتِ زندگی کا ذمہ لے رکھا ہے، اور موت تک عبدالحمید کو حسین احمد نے اپنی کفالت میں رکھ رکھا ہے، اور مکان کو پوری طرح اپنے تصرف میں لے لیا ہے، اور سارے اختیارات اور اقتدار حسین احمد کے ہاتھ میں منتقل ہو چکے ہیں تو ایسی صورت میں مسئلہ ہبہ میں ان دونوں کی حالت زوجین کی طرح ہے، کہ جس طرح اگر بیوی نے شوہر کے ہاتھ مکان ہبہ کر دیا ہے، اور خود شوہر کے ساتھ اس میں رہتی ہے، اور اس کا سامان بھی اسی میں ہے، تو ایسی صورت میں شوہر کا قبضہ

کامل سمجھا جاتا ہے، تو یہاں بھی ایسا ہی ہوگا، اس لیے کہ عبدالحمید کو حسین احمد کی کفالت ہی میں اس کے تابع ہو کر رہنا ہے اور اس کا ساز وسامان بھی وہیں رہے گا، اب سائل خود حالات کا جائزہ لے لے، اس لیے کہ سوالنامہ میں ان دونوں پہلوؤں کی پوری وضاحت نہیں ہے۔

ولو وهبت امرأة دارها من زوجها وهي ساكنة فيها وزوجها أيضا ساكن فيها جازت الهبة ويصير الزوج قابضا للدار لأن المرأة و متاعها فی يد الزوج فصح التسليم. (مجمع الأنهر قديم ۲/ ۳۵٤، جديد دار الكتب العلمية بيروت ۳/ ٤۹۱، شامي كراچی ۸/ ٤۳۸، زكريا ۱۲/ ۵۸۵، فتاویٰ قاضیخان جديد زكريا ۳/ ۱۸۵، وعلى هامش الهندية زكريا ۳/ ۲٦۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۷۶۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/ ۶/ ۱۴۲۱ھ

پاکستان ہجرت کرنے سے حق میراث ختم نہیں ہوتا

سوال [۱۱۳۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسمیٰ بشیر احمد کی چھ اولاد تھیں، تین لڑکے: ضمیر احمد، رئیس احمد، گلزار احمد، تین لڑکیاں: شاہ جہاں بیگم، مصطفائی بیگم، تارہ بیگم، انہوں نے بوقت انتقال دو مکان ترکہ میں چھوڑے، اور دیگر نقدی رقم اور سونا چاندی وغیرہ ترکہ میں چھوڑا، اتفاق سے ان کے انتقال کے وقت میں ان کا لڑکا رئیس احمد مذکورہ جائیداد اور دیگر ترکہ پر قابض رہا تو کیا شرعی طور پر رئیس احمد کے قابض رہنے کی وجہ سے دوسری اولاد اپنے حق سے محروم ہو جائے گی، یا ان کو شرعی طور پر اپنا حصہ مل سکتا ہے، جو شرعی حکم ہو تحریر فرمایا جائے، اور ضمیر احمد، گلزار احمد، مصطفائی بیگم، تارہ بیگم یہ لوگ پاکستان ہجرت کر گئے، اور یہاں انڈیا میں شاہجہاں بیگم اور رئیس احمد دو ہی رہے، تو کیا پاکستان جانے کی وجہ سے وراثت سے محروم ہوں گے، یا ان کا حصہ ان کو ملے گا، نیز شاہ جہاں بیگم کو بھی کچھ نہیں دیا، کیا ان کو بھی اپنا حصہ مل سکتا ہے یا نہیں؟

اس طرح بشیر احمد کی بیوی خوشنودی بیگم کے بھی دو مکان ایک مکان ان کو بحق مہر ملا تھا، اور دوسرا خریدا گیا تھا اور بوقت انتقال اپنی ساری اولاد کے لیے انہوں نے وصیت نامہ تحریر کر دیا ہے کہ سب اولاد کو اپنا اپنا حصہ ملے، لیکن رئیس احمد نے باپ اور ماں دونوں کے تمام ترکہ پر تنہا قبضہ کر رکھا ہے، دیگر وارثین کو ان کا حصہ نہیں دے رہا ہے، تو شرعی طور سے رئیس احمد کے بارے میں کیا حکم ہے؟ جو بھی شرعی حکم ہو تحریر فرمائیں؟

المستفتی: ضمیر احمد مقیم گوئیاں باغ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ماتقدم وعدم موانع ارث بشیر احمد مرحوم اور ان کی زوجہ خوشنودی بیگم کا ترکہ ان کی اولاد میں سے ہر ایک کو بقدر حصص شرعیہ ملے گا، رئیس احمد کے لیے، دوسرے وارثین کے حقوق کو دبا کر رکھنا جائز نہیں ہے، پاکستان ہجرت کر کے جانے کی وجہ سے شرعاً ان کے حقوق میں کوئی فرق نہیں آئے گا، اگر رئیس احمد مسئلہ معلوم ہونے کے بعد بھی دوسرے بھائی بہنوں کے حقوق رکھے اور ان کا حق ان کو نہ دے تو قرآنی وعید کے مطابق رئیس احمد کا انجام عنداللہ سخت خطرناک ہے۔

﴿وَلَا تَأْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَا اِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوْا فَرِيْقًا مِنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. [البقرة: ۱۸۸]﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: کہ آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق اور ناجائز طریقے سے مت کھاؤ اور ان کے جھوٹے مقدمہ کو حکام کے یہاں اس غرض سے رجوع مت کرو کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ ظلم و ناجائز طریقے سے کھا جاؤ، جبکہ تم کو اپنے ظلم اور جھوٹ کا علم بھی ہو۔ (معارف القرآن ۱/۴۰۱)

﴿يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَأْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا، وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا. [النساء: ۲۹-۳۰]﴾

ترجمہ ومطلب: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: کہ اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے

کا مال ناحق اور ناجائز طریقہ پر مت کھاؤ، لیکن جب آپس کی رضامندی سے تجارت اور خریداری کے طور پر ہو، تو کوئی مضائقہ نہیں، اور تم ایک دوسرے کو قتل بھی مت کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم پر بڑے مہربان ہیں، اور قرآنی ہدایت کے باوجود اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرے اور جان بوجھ کر تعدی اور ظلم کی راہ سے کسی کا مال ناحق لے لے یا کسی کو ناحق قتل کر دے تو ہم عنقریب اس کو جہنم میں داخل کریں گے، برادری اور کنبہ کے لوگوں کو چاہیے کہ مظلوم کا حق دلوادیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢٥ر صفر المظفر ١٤١١ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٢٦/ ٩١٣٩)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
٢٦/ ٢/ ١٤١١ھ

ہندو مذہب اختیار کرنے والی لڑکی وراثت سے محروم ہو جائے گی

سوال [١١٣٧٥]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے والد مختار احمد خاں کا انتقال ہو گیا ہے، انہوں نے ایک دوکان جو سنبھلی گیٹ چوراہے پر ہے، وہ دوکان میرے والد کے نام سے ہے، میرے والد کی اولاد میں دو لڑکیاں اور تین لڑکے ہیں، جس میں سے ایک لڑکی نے والد کی حیات میں ہندو مذہب اختیار کر لیا تھا، اور ہندو لڑکے سے شادی کر لی تھی، وہ دوکان ہمیں بیچنی ہے، دوکان ١٦ر گز میں ہے، جس کی قیمت ٢١ر لاکھ روپئے طے ہوگئی ہے، مجھے قرآن وحدیث کی روشنی میں بتایا جائے کہ ایک لڑکی نے جو غیر مذہب قبول کیا ہے، اس کا حصہ بنتا ہے یا نہیں؟ اور باقی جو ایک لڑکی اور تین لڑکے ہیں، ان کا شریعت کے حساب سے کتنا حصہ بنتا ہے؟

المستفتی: امتیاز احمد اصالت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جو لڑکی ہندو مذہب اختیار کر کے مرتد ہوگئی ہے، شریعت میں وہ مسلم ماں باپ کی وارث نہیں ہوگی، وہ محروم الارث بن گئی ہے، لہٰذا ممتاز احمد

کے وارثین کی فہرست سے وہ خارج ہوگئی ہے، اور ممتاز احمد کی مذکورہ جائیداد شرعی وارثین کے درمیان درج ذیل طریقہ کے مطابق تقسیم ہوگی:

۱/۷ تداخل ۱۶/ گز دوکان کی قیمت ۳۰۰۰۰۰/۲۱۰۰۰۰۰

ممتاز احمد میت

	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی
سہام	۲	۲	۲	۱	مرتدہ
ترکہ	۶۰۰۰۰۰	۶۰۰۰۰۰	۶۰۰۰۰۰	۳۰۰۰۰۰	محروم

مذکورہ نقشہ کے مطابق ۲۱/ لاکھ روپئے میں سے ہر لڑکے کو ۶/ لاکھ اور مسلم لڑکی کو ۳/ لاکھ روپئے ملیں گے، اور ہندو مذہب اختیار کرنے والی لڑکی کو کچھ نہیں ملے گا۔

عن أسامة بن زيد رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لايرث المسلم الكافر ولا الكافر المسلم. (ترمذی شريف، أبواب الفرائض، باب ما جاء في إبطال الميراث بين المسلم والكافر، النسخة الهندية ۲/ ۳۱، دار السلام رقم: ۲۱۰۷)

المانع من الإرث أربعة: الرق وافرا كان أو ناقصا ...... واختلاف الدينين، وفي الخانية: يقول عليه السلام لايتوارث أهل ملتين شيئ. (سراجی ص: ۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ شوال المکرم ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۶۵۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۱۰/۱۶ھ

مرتدہ کا اپنا حصہ بھتیجے کے نام کرنا

سوال [۱۱۳۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے دو لڑکے ہیں: عمر، بکر، ایک لڑکی عابدہ، عابدہ باپ کی زندگی میں مرتدہ ہو کر کسی غیر مسلم لڑکے کے ساتھ کہیں چلی گئی، پھر زید کا انتقال ہوگیا تو زید کے انتقال کے بعد

عابدہ نے کوٹ میں جا کر بھتیجا کو اپنا حصہ لکھ دیا، تو کیا عابدہ کے مرتد ہونے کے بعد بھتیجا کو اپنا حصہ دیدینا صحیح ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: محمد افتخار بانکوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: باپ کی زندگی میں لڑکی عابدہ کے مرتد ہوجانے کی وجہ سے وہ باپ کے متروکہ مال میں سے کسی بھی حصہ کی حقدار نہیں ہوگی، اس لیے بھتیجہ کو اپنا حصہ دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا، بلکہ زید کے انتقال کے بعد صرف دو لڑکوں کے موجود ہونے کی وجہ سے کل مال دو حصوں میں تقسیم ہوکر آدھا آدھا دونوں بھائی کو مل جائے گا اور عابدہ میت کے حکم میں ہوگی۔

عن أسامة بن زيدؓ أن رسول الله ﷺ قال: لايرث المسلم الكافر ولا الكافر المسلم. (ترمذی شريف، أبواب الفرائض، باب ما جاء فی إبطال الميراث بين المسلم والكافر، النسخة الهندية ٢/٣١، دار السلام رقم: ٢١٠٧)

لاخلاف بين فقهاء المذاهب فی أن المرتد لايرث أحدا لأنه صار فی حكم الميت وكذٰلک المرتدة لا ترث أحدا. (الموسوعة الفقهية ٣/٢٥، عالمگيری زكريا قديم ٦/٤٥٥، جديد ٦/٤٤٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍صفر المظفر ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۲۴۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۲/۱۵ھ

عیسائی مسلمان کا وارث نہیں

سوال [۱۱۳۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عبد الرحمٰن مرحوم نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں پہلی شادی عیسائی عورت سے کی، اس سے ایک لڑکی ہے اور دوسری شادی بھی عیسائی عورت سے کی، اس سے دو لڑکیاں

ہیں، بیوی اب تک عیسائی ہے، اور دونوں بچیاں مسلمان ہوگئیں، ایک نے مسلمان مرد سے شادی کی، اور ایک نے عیسائی مرد سے شادی کی، اور یہ تینوں موجود ہیں، اور تیسری شادی مسلمان عورت سے کی اس سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے، پہلی بیوی کا شوہر کی موجودگی میں انتقال ہوگیا، اور تیسری بیوی کا شوہر کے انتقال کے بعد اب ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا، ترکہ میں صرف آٹھ کمرے چھوڑے ہیں؟

المستفتی: قمرسلطان اصالت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرحوم عبدالرحمٰن کی وہ بیوی جو عیسائی ہے اور مذہب اسلام کو مرحوم کی حیات تک اختیار نہیں کیا ہے تو وہ اختلاف دین کی وجہ سے عبدالرحمٰن کے ترکہ سے محروم ہوجائے گی البتہ عیسائی بیوی سے پیدا شدہ دونوں مسلمان لڑکیاں شرعاً وارث ہوں گی۔

عن أسامة بن زيدؓ أن رسول الله ﷺ قال: لايرث المسلم الكافر ولا الكافر المسلم. (ترمذی شریف، أبواب الفرائض، باب ما جاء فی إبطال الميراث بين المسلم والكافر، النسخة الهندية ۲/ ۳۱، دار السلام رقم: ۲۱۰۷)

لايورث اليهودى والنصرانى من المسلم (إلى قوله) **وهذا هو الموافق لمذهب الجمهور.** (شامي زكريا ۱۰/ ۵۰۶)

لہٰذا اس صورت میں مرحوم عبدالرحمٰن کا ترکہ درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

میت ۴۸/ ۸

بیوی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکا
۱					
۶	۷	۷	۷	۷	۱۴

مرحوم کا ترکہ ۴۸/ سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا ملے گا جو اس کے نام کے نیچے درج ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۸۲۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۲۰/ ۶/ ۱۴۱۹ھ

جائیداد کی تقسیم سے متعلق چند سوالات وجوابات

سوال [۱۱۳۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ہمارے والد صاحب چار بھائی تھے، بہن کوئی نہیں، ہمارے دادا کا انتقال ہوا، تو دادی اوران کے چار فرزند تھے، مگر ایک فرزند بنام اکرام حسین شروع ہی میں پاکستان چلے گئے تھے، غالباً ۱۹۴۸ء میں، حکومت ہند کے قانون کی رو سے ایسے شخص کا ہند میں کوئی حصہ نہیں، شرعی لحاظ سے کیا حکم ہے؟

(۲) آراضیٔ مسکونہ اور زرعی زمینات میں نام ۳؍ ہی بھائیوں کا درج ہے، جو پاکستان منتقل ہو گئے ان کا نام کاغذات میں درج ہی نہیں، حکم کیا ہے؟

(۳) ہمارے بڑے تائے انہوں نے ہماری تائی کو بمعاوضہ مہر اپنے حصہ کی بیع کردی تھی، جس کی تحریر موجود ہے، یہ لاولد تھے، البتہ ان کے دوسرے بھائیوں کی اولاد ہے، پاکستان والے بھائی کی بھی اور ہند میں مقیم ان کے دونوں بھائیوں کی بھی اولاد ہے، شرعاً حکم کیا ہے؟

(۴) تائے مرحوم نے جو مکان ہماری تائی کو زرمہر کے عوض دیا تھا، تائی مرحومہ کا بھی انتقال ہو گیا وہ تو لاولد تھیں، لیکن ان کے دیوروں کی اولاد ہے، اور مرحومہ کے بھائیوں کی اولاد ہے، ۲؍لڑکے، ۳؍لڑکیاں، حکم شرعی کیا ہے؟

(۵) مرحومہ تائی نے ایسا کیا کہ ان کو تائے مرحوم نے جو مکان بیع کیا تھا بمعاوضہ مہر، تائی مرحومہ نے اپنے دیور الطاف حسین کے ۲؍بیٹوں کو اپنے مکان کی وصیت تحریر کردی، دوسرے دیور کی اولاد کے حق میں نہیں کی، تو یہ وصیت شرعاً کس طرح اور کس حد تک نافذ ہوسکتی ہے؟ یعنی جن کو وصیت میں مکان لکھ دیا ہے وہ حقدار ہیں یا مرحومہ کے بھتیجے اور بھتیجیاں، ۲؍بھتیجے ہیں اور ۳؍بھتیجیاں، ان کا بھی کچھ حق مرحومہ کے مکان میں ہے یا دوسرے دیور کی اولاد کا بھی کچھ حصہ ہے؟

(۶) ہماری مرحومہ دادی نے دادا مرحوم کے انتقال کے بعد ایک قطعۂ آراضی خریدا تھا، مرحومہ کی اولاد میں چار لڑکے تھے، ۳؍ہندوستان میں ایک پاکستان میں، دادی مرحومہ کا

ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا ؟

(۷) اب جس وقت یہ فتویٰ منگایا جارہا ہے ہماری دادی کے ۴ رلڑکے یعنی ہمارے والد جو سب سے چھوٹے تھے اور ہمارے تینوں تائے ۲ ر ہندوستان میں ایک پاکستان میں، انتقال کر چکے ہیں، البتہ ان کی اولادیں ہیں، پہلے لکھا جا چکا ہے کہ بڑے تائے لا ولد تھے، دو تائے کی اولاد ہے، ہمارے والد کی بھی اولاد ہے، تقسیم کس طرح ہو کہ اللہ تعالیٰ بھی خوش ہوں، کسی کو محرومی کا احساس بھی نہ ہو؟

المستفتی: محمد خالد عفی عنہ، امن نگر یعقوب پورہ حیدر آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۲) آپ کے جو چچا پاکستان چلے گئے تھے شریعت کی رو سے آپ کے دادا کی میراث میں وہ بھی برابر کے شریک ہیں، اور سرکاری کاغذات میں نہ ہونے کی وجہ سے وہ وراثت سے محروم نہ ہوں گے، اور اب چونکہ ان کا انتقال ہو چکا ہے اس لیے ان کا حصہ ان کے وارثین کو مل جائے گا۔

اختلاف الدار لایؤثر فی حق المسلمین. (شامی، کتاب الفرائض، کراچی ۷٦۸/٦، زکریا ۵۱۰/۱۰، شریفیه ۱۹/، تاتارخانیة زکریا ۲۱۷/۲۰، رقم: ۳۳۰۸۳)

(۳-۴-۵) جب بڑے تایا نے اپنا حصہ آپ کی تائی کو بمعاوضہ مہر دیدیا تھا تو تائی اس کی شرعی طور پر مالک ہو چکی ہیں اور انہوں نے اپنے حصہ کے متعلق دیور کے دو بیٹوں کے متعلق وصیت کردی تھی تو ان کے حصہ کو تین حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ ان کو مل جائے گا جن کے نام وصیت کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وصیت اجنبی کے لیے ایک تہائی میں ہو جاتی ہے، اور دیور کے بیٹے حقیقی وارث نہیں ہیں، اس لیے ایک تہائی میں وصیت صحیح ہوگئی، اور باقی دو تہائی مرحوم کے بھتیجوں کو ملیں گے، جتنے بھی بھتیجے زندہ ہیں ان کی تعداد کے حساب سے دو تہائی ان کے درمیان تقسیم ہوں گے۔

وتجوز بالثلث للأجنبی عند عدم المانع. (در مختار مع الشامی، کتاب الوصایا، کراچی ٦۵۰/٦، زکریا ۳۳۹/۱۰، عالمگیری زکریا قدیم ۹۰/٦، جدید ۱۰٦/٦)

(۶) آپ کی دادی نے جو آراضی دادا کے انتقال کے بعد خریدی تھی وہ چار حصوں میں تقسیم ہو کر چاروں لڑکوں میں سے ہر ایک کو ایک ایک حصہ مل جائے گا، اور ہر ایک کا حصہ اب ان کی اولادوں کو مل جائے گا، اور وہ حصہ اولادوں کے درمیان تقسیم ہوگا، اور یہ کیسے تقسیم ہوگا اس کے لیے ساری اولادوں کی تفصیل اور مرنے والوں کی ترتیب وغیرہ بیان کرنی ضروری ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰؍ صفر المظفر ۱۴۳۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۷۳۸/۳۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۰/۲/۲ھ

٦ باب ذوی الفروض

والدین کی میراث میں بیٹی کا حصہ

سوال [۱۱۳۷۹]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: والدین کی میراث میں کیا بیٹی کا حصہ ضروری ہے؟ اگر ہے تو کتنا ہے؟

المستفتی: زواراحمد مال پوری، جے پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: والدین کی میراث کاحقدار جس طرح بیٹا ہوتا ہے بالکل اسی طرح بیٹی بھی ہوتی ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ بیٹی کو بیٹا کے مقابلے میں نصف ملتا ہے۔

﴿ یُوْصِیْکُمُ اللّٰهُ فِیْ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ فَاِنْ کُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَیْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَکَ. [النساء: ۱۱] ﴾ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٦/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳٦/۷٦۴۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۵/۹ھ

باپ کی میراث میں بیوی اور بیٹی کا حصہ

سوال [۱۱۳۸۰]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک صاحب کچھ جائیداد کے مالک تھے، جس میں آبائی ترکہ کے حصہ کی اور کچھ ان کی خرید شدہ ملکیت تھی، ان صاحب کا انتقال ہوگیا، ان کے انتقال پر ان کی اولاد اور ان کی بیوہ حسب حصہ الگ الگ مالک بنے اب ان ہی صاحب کے ایک لڑکے کا دور دراز حادثہ میں انتقال ہوگیا، جس کی ایک بیوی ایک بچی موجود ہے، اس لڑکے کے حصہ کی مالک اس کی بیوہ

اور بچی ہی ہوگی یا بقیہ بھائیوں بہنوں اور ماں کو بھی اس کے حصہ میں سے کچھ ملے گا؟ براہ کرم وضاحت فرمائیں۔

المستفتی: سید محمد طیب حسن مدرس اردو سیکشن مدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت سوال حادثہ میں فوت ہونے والے کی بیوی کو اس کی کل ملکیت کا آٹھواں حصہ اور لڑکی کو نصف حصہ اور باقی مرحوم کے بھائی، بہن اور ماں کو حصص شرعیہ کے اعتبار سے ملے گا۔

والعصبة كل من يأخذ ما أبقته أصحاب الفرائض. (سراجی ص:٤) **فقط** واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸ر صفر المظفر ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۳۴۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/۲/۱۴۱۶ھ

والدین کے ترکہ میں بہنوں کا حصہ

سوال [۱۱۳۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہماری بہنوں کی شادی کے موقع پر بہنوں کو اسکوٹر، سونے چاندی کی اشیاء اور تانبے کے پیتل کے برتن وغیرہ بنے تھے، اور اس تصور سے مذکورہ اشیاء دی جاتی ہیں کہ لڑکیوں کو وراثت تو دی نہیں جاتی، اس لیے جہیز کے موقع پر جتنا دینا چاہیے اس سے زائد دیدیا جائے تاکہ ان کا حق والد کی زندگی میں ہی ادا ہوجائے۔

سوال طلب امر یہ ہے کہ ہمارے والد کی وفات ہوچکی ہے، ہم اپنی بہنوں کو شرعی ضابطہ کے مطابق وراثت دینا چاہتے ہیں، اگر ہم جہیز کے موقع پر دی گئی اشیاء وضع کر کے پھر جتنا حصہ بنتا ہو دیدیں، تو کیا جائز ہے؟ ان کی حق تلفی تو شمار نہ ہوگی؟

المستفتی: محمد اسلم محمد پور، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو سامان والدین کی طرف سے لڑکی کو جہیز میں دیا جاتا ہے وہ لڑکی کے لیے والدین کی طرف سے ہبہ اور عطیہ ہوتا ہے، اسی طرح والدین کے نہ ہونے کی صورت میں بھائیوں اور رشتہ داروں کی طرف سے جو سامان جہیز میں دیا جاتا ہے وہ عطیہ اور تبرع ہوتا ہے، چاہے سامان دیتے وقت اس بات کی نیت کر لی ہو کہ یہ وراثت کا بدل ہے، تب بھی وہ عطیہ ہی ہوتا ہے، لہٰذا والدین کی وفات کے بعد متروکہ مال میں بہنوں کی میراث پوری پوری باقی رہتی ہے، شرعی طور پر ان کی میراث انہیں کا حق ہے ان کو نہ دینے والے سے اللہ کے دربار میں ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا اور ان کے گلے میں سات زمینوں کا طوق ڈال دیا جائے گا، اور قیامت کے دن ان کو جنت کے حصوں سے محروم کردیا جائے گا۔ (مستفاد: انوار نبوت ص: ۷۰۰)

﴿وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيْبًا مَفْرُوْضًا. [النساء: ۷]﴾

عن سعيد بن زيد قال سمعت رسول الله ﷺ يقول: من أخذ من حق امرئ من المسلمين شبرا بغير حق طوقه الله تعالىٰ يوم القيامة سبع أرضين. (المعجم الأوسط، دار الفكر ٦/١٦٧، رقم: ٨٣٨٣، صحيح مسلم، باب تحريم الظلم و غصب الأرض وغيرها، النسخة الهندية ٢/٣٢ بيت الأفكار رقم: ١٦١٠، بخارى شريف، باب إثم من ظلم من الأرض شيئا ١/٣٣٢، رقم الحديث: ٢٣٨٨، ف: ٢٤٥٢)

عن أنس بن مالك رضـ قال: قال رسول الله ﷺ: من فر من ميراث وارثه قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة. (ابن ماجه أبواب الوصايا، باب الحيف فى الوصية، النسخة الهندية ٢/١٩٤، دار السلام رقم: ٢٧٠٣، سنن سعيد بن منصور، باب من قطع ميراثا فرضه الله، دار الكتب العلمية بيروت ١/٩٦، رقم: ٢٨٥-٢٨٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۷۹۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۵/۵ھ

ایک لڑکے اور تین لڑکیوں کے درمیان ترکہ کی تقسیم

سوال [۱۱۳۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عبدالعزیز نے ایک مکان اپنی حیات میں صرف نچلی منزل تعمیر کروائی تھی، دوسری اور تیسری منزل اس کے فرزند نے اپنی کمائی ہوئی رقم سے مکمل کروائی ہے، عبدالعزیز مرحوم کی میراث کے حسب ذیل حقدار ہیں، ایک لڑکا اور تین لڑکیاں، اب عبدالعزیز کا انتقال ہوگیا، تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) مکان جناب عبدالعزیز صاحب نے اپنی حیات میں اپنے خود کے پلاٹ پر خود اپنی ذاتی رقم سے نچلی منزل ۱۹۶۶ء میں بنوائی تھی۔

(۲) بعد میں دوسری منزل موصوف کی حیات میں ان کے فرزند ممتاز احمد نے اپنی خود کی کمائی سے ۱۹۶۷ء میں تعمیر کروائی تھی۔

(۳) ۱۹۹۰ء میں تیسری منزل بھی ممتاز احمد نے خود کی کمائی سے والد صاحب کے انتقال کے بعد بنوائی تھی۔

(۴) عبدالعزیز عرف مدار صاحب مرحوم کے صرف ایک لڑکا اور تین لڑکیاں ہیں، اس مکان کا بٹوارہ لڑکے اور لڑکیوں میں کس طرح ہوگا؟

المستفتی: ممتاز احمد ناگپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرحوم عبدالعزیز کے لڑکے ممتاز احمد نے باپ کی حیات میں اپنی کمائی سے جو پہلی منزل تعمیر کرائی ہے وہ شرعاً باپ ہی کی ملکیت شمار ہوگی، اور باپ کے انتقال کے بعد جو دوسری منزل تعمیر کرائی ہے وہ اگرچہ ممتاز احمد کی ملکیت ہے لیکن تقسیم میراث سے پہلے اس طرح تعمیر کرانا صحیح نہیں تھا۔

ولایجوز لأحد أن یتصرف فی نصیب الآخر إلا بإذنه. (هدایه، کتاب

الشركة، اشرفي ديو بند ٢/ ٦٢٤)

لايجوز لأحد أن يتصرف فى ملك غيره بلا إذنه أو وكالة منه أو ولاية عليه وإن فعل كان ضامنا. (شرح المجلة رستم اتحاد ١/ ٦١ رقم المادة: ٩٦)

تاہم اب کل مکان کی قیمت لگائی جائے گی اور اس اوپری منزل کی قیمت الگ کر کے ممتاز احمد کو دیدی جائے گی، اور نچلی اور پہلی منزل کی قیمت مرحوم عبد العزیز کے وارثوں کے درمیان پانچ حصوں میں تقسیم ہوگی، دوحصہ ممتاز احمد کو ملیں گے اور ایک ایک حصہ ہرلڑکی کو ملے گا۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/شعبان المعظم ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۴۹۹۳)

والدہ کے زیور کی بھائی اور پانچ بہنوں کے درمیان تقسیم

سوال [۱۱۳۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) میرے والد اور والدہ کا انتقال ہوگیا ہے، میری والدہ کا کچھ زیور ہے اس کو میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں، میری پانچ بہنیں ہیں، کس طرح تقسیم کیا جائے؟

(۲) ایک بہن کو والدہ نے اپنی زندگی میں تین چوڑیاں دیں تھیں، اب جو زیور بچا ہے اس میں سے حصہ دیا جائے گا یا نہیں؟

المستفتی: رضوان علی خاں مغلپورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) برتقدیر صحت سوال وبعد ادائے حقوق ما تقدم علی الارث وعدم موانع ارث مرحومہ کا کل ترکہ درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

میـــــــــــــــــــــــــــــــت ۷

بیٹا	بیٹی	بیٹی	بیٹی	بیٹی	بیٹی
۲	۱	۱	۱	۱	۱

مرحومہ کا کل ترکہ ۷؍سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا اتنا ملے گا جو اس کے سامنے درج ہے۔

(۲) آپ کی والدہ نے بہن کو تینوں چوڑیاں اگر بطور ہبہ دی تھیں تو ایسی صورت میں وہ اس کی اسی وقت مالک بن گئی تھی، والدہ کو چاہیئے تھا کہ اسی وقت اور لڑکیوں کو بھی برابر دیدیتیں اس لیے نہ دینے میں والدہ گنہگار رہوں گی اس لیے کہ اس بہن کو بقیہ ترکہ میں سے بھی حصہ ملے گا تو ایسی صورت میں دیگر ورثاء کے مقابلے میں اس بہن کو زیادہ ملے گا۔

وتتم الهبة بالقبض الكامل لقوله عليه السلام لاتجوز الهبة إلا مقبوضة. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دار الكتب العلمية بيروت ۳/۳۹۱، مصری قديم ۲/۳۵۳، شامی كراچی ۵/۶۹۰، زكريا ۸/۵۲۰، الفتاوىٰ التاتارخانية، زكريا ۱۴/۴۲۱، رقم: ۲۱۵۶۳، شرح المجلة رستم اتحاد ۱/۴۷۳، رقم المادة: ۸۶۱)

ولو وهب جميع ماله من ابنه جاز وهو آثم. (بزازيه، الجنس الثالث فی هبة الصغير، زكريا جديد ۳/۱۲۳ وعلى هامش الهندية ۶/۲۳۷، قاضيخان زكريا جديد ۳/۱۹۴ وعلى هامش الهندية ۳/۲۷۹، هنديه زكريا قديم ۴/۳۹۱، جديد ۴/۴۱۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۹۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/۵/۱۴۳۴ھ

بھائی بہنوں کے درمیان جائیداد کی تقسیم کا ایک مسئلہ

سوال [۱۱۳۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کا انتقال ہوگیا اس نے چار ایکڑ زمین اور ورثین میں چار لڑکے، تین لڑکیاں چھوڑیں، اب یہ زمین گیارہ حصوں میں تقسیم ہوکر ہر ایک لڑکے کو ۲؍ حصے اور ہر ایک لڑکی کو ۱؍ حصہ ملنا چاہیے، لیکن ان چار لڑکوں نے اس طرح تقسیم نہیں کیا بلکہ ہر ایک لڑکے نے ایک ایک ایکڑ لے کر اس پر قبضہ کرلیا اور بہنوں کو نہیں دیا، بعد میں ان میں سے ایک لڑکے کو اللہ نے

توفیق دی اور وہ کہتا ہے کہ میرے دوسرے بھائی اپنی بہنوں کو حصہ دیں یا نہ دیں، لیکن میرے قبضہ میں جو ایک ایکڑ زمین ہے، اس میں تین بہنوں کا بھی حصہ ہے، میں تینوں بہنوں کا اس میں سے حصہ دوں گا، تو اس ایک بھائی کے قبضہ میں جو ایک ایکڑ زمین ہے اس کے کتنے حصے ہوں گے، ۱۱/ حصے یا ۵/ حصے، ایک عالم کا کہنا ہے کہ اس ایک بھائی کے قبضہ میں جو ایک ایکڑ زمین ہے اس میں صرف پانچ حصے ہوں گے، ۲/ حصے اس بھائی کو اور تینوں بہنوں کو تین حصے اور چونکہ دوسرے بھائیوں نے اپنے حصہ کے بقدر بلکہ اس سے زائد پر قبضہ کیا ہے، اس لیے اس بھائی کے قبضے کی ایک ایکڑ زمین میں دوسرے بھائیوں کا حصہ نہیں اس طرح ہر بھائی اپنی قبضہ کی ایک ایکڑ زمین میں پانچ حصہ کر کے ۲/ حصہ وہ خود رکھے اور تین حصہ تین بہنوں کو دے۔

دوسرے ایک عالم صاحب کہتے ہیں کہ جس طرح مجموعی طور پر ۴/ ایکڑ زمین میں ۱۱/ حصہ ہوئے، اسی طرح ہر بھائی نے انفرادی طور پر ایک ایک ایکڑ زمین پر قبضہ کیا ہے ہر ایک بھائی جب اپنی تین بہنوں کو حصہ دے گا تو ہر ایک بھائی اپنے زیر قبضہ ایک ایکڑ زمین کے بھی ۱۱/ حصے کرے گا، ۲/۲/ حصے ہر بھائی کے، لیکن چونکہ ہر ایک بھائی نے اپنا حصہ وصول کر لیا ہے اس لیے ان کا وہ حصہ ان کے پاس نہ جاتے ہوئے خود اسی کے پاس رہے گا، اس طرح آٹھ حصے خود اس بھائی کے پاس رہیں گے اور ۳/ حصہ تینوں بہنوں کو دینا ہوگا، اب آپ فیصلہ فرمائیں کہ کس کی بات حق ہے؟

المستفتی: عتیق الرحمٰن مدرسہ اسلامیہ دار العلوم ناگپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صحیح صورت یہی ہے جو دوسرے عالم صاحب نے بتائی ہے کہ ہر بھائی اپنے ایک ایکڑ کو ۱۱/ حصوں میں تقسیم کر دے، اور اس میں سے آٹھ حصے اپنے پاس رکھ لے اور تین حصے تینوں بہنوں کو ایک ایک کر کے دیدے، جب ایک بھائی دیدے گا اس کے بعد اگر اللہ نے دوسرے بھائیوں کے دل میں ڈال دیا تو وہ بھی اس طریقہ سے اپنے ایک ایکڑ میں سے بہنوں کو گیارہ سے تین حصے دیں گے، گویا کہ چار ایکڑ زمین چوالیس حصوں میں تقسیم ہو کر ہر بہن کو چار حصے اور ہر بھائی کو آٹھ آٹھ حصے ملیں گے، اور جو بھائی اپنے قبضے کے ایک

ایکڑ میں سے گیارہ حصے کرکے تین حصے نکال کر بہنوں کو دیدے گا وہ اپنے ذمہ سے بری ہو جائے گا، اور دوسرے بھائیوں کے اوپر ذمہ داریاں باقی رہ جائیں گی۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍رجب المرجب ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۷۵۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸؍۷؍۱۴۲۳ھ

والدین، تین بیٹے اور ایک بیٹی کے درمیان ترکہ کی تقسیم

سوال [۱۱۳۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے بیٹے سلطان حسین کا انتقال ہوگیا، میں اس کا باپ اور میری بیوی زندہ ہیں، یعنی ماں بھی زندہ ہے، سلطان حسین مرحوم کے تین بیٹے ایک بیٹی اور ان کی بیوی جوہر جہاں بھی زندہ ہیں، سلطان حسین میونسپل بورڈ کے اسکول میں اردو ٹیچر تھے، ان کی ایک ماہ کی تنخواہ اور فنڈ بیمہ کے روپیہ نگر نگم کو دینے ہیں، اس کے علاوہ مرحوم کی جائیداد میں زمین بھی ہے، مہربانی کرکے آپ فرائض نکال دیجئے کہ کس کو کتنا حصہ ملے گا، آپ کے اس فرائض کو سرکار میں پیش کیا جائے گا، تاکہ ہر شخص اپنا اپنا مال وجائیداد جائز طریقے سے حاصل کرسکے، اس کے علاوہ بیوی جوہر جہاں کو چھوڑے ہوئے تقریباً بیس سال ہو چکے ہیں، مرحوم کا بیوی سے بیس سال سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ دونوں ۲۰؍سال سے الگ الگ رہتے تھے، مرض میں بھی بیوی سے ۲۰؍سال سے کوئی تعلق نہیں رہا۔

ایسی حالت میں بتائیں کہ بیوی مرحوم کے نکاح میں تھی یا نہیں؟ بیوی اب وارث رہی یا نہیں، اس کا بھی خلاصہ فرائض میں نکالنے کی مہربانی کریں، بڑا لڑکا اور بڑے لڑکے سے چھوٹی بہن اور سب سے چھوٹا لڑکا اپنی ماں جوہر جہاں کے پاس بچپن سے ہی رہتے آئے ہیں، مگر بڑے لڑکے اور لڑکی سے چھوٹا لڑکا جواہر سلطان بچپن سے اپنے باپ کے پاس رہتا تھا، اور باپ کی خدمت کرتا تھا، اور آخروقت تک اس نے اپنے باپ مرحوم کی خدمت کی ہے، لہٰذا ایسی

حالت میں مرحوم کے پاس موجود لڑکے کا کیا حق بنتا ہے، اور یہ بھی بتا دیں کہ مرحوم کی جگہ پر ملنے والی نوکری پر اس لڑکے کا حق بنتا ہے یا ان کا جو اپنی ماں کے پاس رہتے آئے ہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ما تقدم وعدم موانع ارث مرحوم کا کل ترکہ اوراثاثہ درج ذیل نقشہ کے مطابق بٹے گا:

۱۶۸ / ۲۴

مرحوم میــــــــــــــــــــــــــــــــت

بیوی	ماں	باپ	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی
۳	۴	۴				
۲۱	۲۸	۲۸	۲۶	۲۶	۲۶	۱۳

کل ترکہ ۱۶۸/ سہام میں تقسیم ہوکر بیوی کو ۲۱/ ماں باپ کو ۲۸/ ۲۸/، لڑکوں کو ۲۶/ ۲۶/ ۲۶/، لڑکی کو ۱۳/ ملیں گے، اگر بیوی کو طلاق نہیں دی ہے تو چاہے میکے میں رہتی ہو وہ وارث بن جائے گی، نیز جو بچے باپ کے ساتھ رہتے تھے اور جو ماں کے ساتھ رہتے تھے ان کے درمیان میراث تقسیم ہونے میں کوئی فرق نہیں ہے، سب برابر کے حقدار ہوں گے اور سرکاری نوکری میں فرق نہ ہوگا، البتہ حکومت جس کو چاہے دے سکتی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۱۴/ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۵۰۶۰)

بیوی کا شوہر کے ترکہ میں کتنا حصہ ہے وغیرہ سے متعلق چند سوالات؟

سوال [۱۱۳۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زینت جو اپنے شوہر کے ایک حادثے میں فوت ہوجانے کی وجہ سے بیوہ ہوچکی ہے اور حاملہ ہونے کی وجہ سے اس کی مدتِ عدت وضع حمل ہے، اس سے متعلق جواب طلب امور یہ ہیں:

الف: شوہر جس کے پس ماندگان میں والدین اور دو شادی شدہ بڑے بھائی ہیں جن

کی علیحدہ علیحدہ فیملیاں ہیں، مرحوم کی پہلی زوجہ جو موجودہ زوجہ سے پہلے ہی فوت ہوچکی تھی اس سے ایک بیٹی ہے، اس صورت میں بیوہ کا، شوہر کی موروثی وذاتی ملکیت میں کیا حصہ ہوگا؟

ب: کیا بیوہ ایام عدت میں اپنے والد کے گھر (جہاں والدین اور ایک غیر شادی شدہ بھائی ہے اور کسی نامحرم کی آمدورفت بھی نہیں ہے) گزار سکتی ہے؟

ج: اگر وہ ایام عدت والد کے گھر گزارتی ہے تو کیا شوہر کے ترکہ سے محروم کی جا سکتی ہے؟ کیا ان ایام کا نان ونفقہ وہ شوہر کی ذاتی ملکیت سے حاصل کرنے کی حق دار ہوگی؟

د: شوہر پر کچھ قرض بھی ہے، یہ قرض اس کی چھوڑی ہوئی املاک سے ادا کیا جائے یا اس کی ادائیگی کے لیے حادثہ کے عوض کے طور پر ملنے والی رقم کا انتظار کیا جائے، یہ بھی وضاحت کرنے کی زحمت فرمائیں کہ اس رقم پر کس کا حق ہوسکتا ہے، یا تنہا بیوی ہی حقدار ہے؟

ہ: شادی میں شوہر کی جانب سے جو زیور بیوہ کو دیا گیا، اب اس کا حق دار کون ہے؟ اسی طرح جہیز کے متعلق بھی تحریر فرمائیں، اگر وہ مستقل طور پر والد کے گھر رہائش اختیار کرتی ہے تو کیا اپنا جہیز لانے کی حق دار ہے؟

و: شوہر کے والدین یا بھائیوں کو یہ حق حاصل ہے کہ بیوہ کے اپنے والد کے گھر چلے جانے کی صورت میں اس کو شوہر کے ترکہ سے محروم کردیں اور مرحوم کی ذاتی ملکیت پر خود قابض ہوجائیں؟ جواب کافی شافی عنایت فرمائیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔

المستفتی: محمد حنیف انصاری محلہ ہلالی سرائے سنبھل مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) زیر بحث مسئلہ میں مرحوم کے ترکہ میں سے اولاً اس کا سارا قرضہ ادا کیا جائے گا، اور قرضہ ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچے گا اس میں سے مرحوم کی بیوہ کا کل مال کا آٹھواں حصہ ہے اور مرحوم کے ماں باپ میں سے ہر ایک کو کل مال کا چھٹا چھٹا حصہ ملے گا اور مرحوم کی بیوہ کے پیٹ میں جو بچہ ہے اس کو لڑکا ماننے کی صورت میں مرحوم کی بیٹی بھی بیٹے کے ساتھ عصبہ بن جائے گی، اور مرحوم کے بھائی بہن سب محروم ہو

جائیں گے، چاہے بھائی بہن، شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ ہوں، ان کو کوئی حصہ نہیں ملے گا، مسئلہ درج ذیل نقشہ کے مطابق بنے گا۔

۷۲/۲۴
میــــــــــــــــــــــــــــــــــــت

بیوہ	ماں	باپ	لڑکی	حمل
۳	۴	۴	۱۳	
۹	۱۲	۱۲	۱۳	۲۶

اور اگر حمل کو لڑکی فرض کی جائے تو مرحوم کی بیوہ کو کل مال کا آٹھواں حصہ اور ماں باپ کو چھٹا چھٹا حصہ اور دونوں لڑکیوں کو کل مال کے دوثلث ملیں گے، جو درج ذیل نقشہ کے مطاق ہوگا:

۲۷/۲۴
میــــــــــــــــــــــــــــــــــــت

بیوہ	ماں	باپ	لڑکی	لڑکی
۳	۴	۴	۸	۸

مرحوم کا مسئلہ عائلہ ۲۷ ؍سے بن کر بیوہ کو تین ماں باپ کو چار چار اور دونوں لڑکیوں کو آٹھ آٹھ ملے، اور مرحوم کے بھائی بہن اب بھی محروم ہو جائیں گے، حمل کی دونوں شکلیں آپ کے سامنے لکھ دی ہیں، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ وضع حمل تک انتظار کریں، اور وضع حمل کے بعد جو بھی شکل بنے اس کے مطابق ترکہ تقسیم کرلیں۔

(۲) بیوہ کے لیے شوہر کے گھر پر ہی عدت گزارنا لازم ہے، ہاں البتہ اگر اپنی جان، یا مال یا آبروریزی کا خطرہ ہو تو ماں باپ کے گھر جا کر عدت گزار سکتی ہے۔

وعلى المعتدة أن تعتد في المنزل الذي يضاف إليها بالسكنىٰ حال وقوع الفرقة والموت. (هنديه، الباب الرابع عشر في الحداد، زكريا قديم ۱/ ۵۳۵، جديد ۱/ ۵۸۷)

وتعتدان أي معتدة طلاق و موت في بيت وجبت فيه و لاتخرجان منه إلا أن تخرج أو ينهدم المنزل أو تخاف انهدامه أو تلف مالها. (شامي، باب العدة، مطلب: الحق أن على المفتي أن ينظر في خصوص الوقائع زكريا ۵/ ۲۲۵، كراچی ۳/ ۵۳۶)

(۳) ایام عدت چاہے شوہر کے گھر گزارے یا ماں باپ کے گھر بہر صورت شوہر کے

ترکہ سے محروم نہیں ہوگی، بلکہ شوہر کے ترکہ میں سے جو اس کا حق شرعی ہے وہ ہر حال میں اس کو ملے گا، اور ایام عدت کا نان ونفقہ شوہر کے مال میں سے الگ سے نہیں ملے گا بلکہ شوہر کے ترکہ میں سے میراث کی شکل میں جو ملتا ہے صرف وہی ملے گا۔ (مستفاد: کفایت المفتی ٣١٢/٨)

الحق متی یثبت لایبطل بالتاخیر ولا بالکتمان. (قواعد الفقه ص:٧٧)

لانفقة للمتوفیٰ عنها زوجها سواء کانت حاملا أو حائلا. (هندیه، الباب السابع عشر فی النفقات، الفصل الثالث فی نفقة المعتدة، زکریا جدید ١/٦٠٥، قدیم ١/٥٥٨)

(٤) راجح قول کے مطابق حادثہ کے عوض میں جو کچھ ملتا ہے وہ دیت کے حکم میں ہو کر وارثین کے درمیان حق شرعی کے طور پر تقسیم ہوگا، جو ماقبل کے نقشہ میں واضح کیا جا چکا ہے، اور ہر حال میں تقسیم وراثت سے پہلے اس کا پورا قرض ادا کرنا لازم ہے، اس میں اس کا چھوڑا ہوا ترکہ بھی ہوگا، اور حادثہ کے عوض میں ملنے والے پیسے بھی شامل ہوں گے۔ (مستفاد: انوار رحمت/ ٣٥١)

ثم تقدم دیونه التی لها مطالب من جهة العباد. (شامی، کتاب الفرائض، زکریا ١٠/٤٩٥، کراچی ٦/٧٦٠)

(٥) شادی کے موقعہ پر شوہر کی طرف سے بیوہ کو جو زیورات ملے ہیں اگر شوہر نے بیوہ کو اس کا مالک بنادیا تھا یا شوہر کی برادری میں بطور تملیک دینے کا رواج ہے تو وہ بیوہ ہی کا ہوگا، اور اپنے ساتھ لانے کی حق دار ہوگی، اور جہیز کا سامان بہر صورت بیوہ کی ملکیت ہے، اس میں کسی دوسرے کا حق متعلق نہیں، اور لڑکی چاہے شوہر کے گھر عدت گذارے یا والد کے گھر، ہر صورت میں اس کو جہیز ملے گا، نیز اگر شوہر نے مہر ادا نہیں کیا تھا تو تقسیم ترکہ سے پہلے شوہر کے ترکہ میں سے بیوہ کا مہر ادا کرنا بھی لازم ہے، اس کے بعد بقیہ ترکہ وارثین کے درمیان اسی طریقہ سے تقسیم ہوگا جو اوپر نقشہ میں مذکور ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ ڈابھیل جدید ٢٠/ ٢٦٧-٢٦٩)

جهز ابنته بجهاز و سلمها ذٰلک لیس له الاسترداد منه ولا لورثته بعده إن سلمها ذٰلک فی صحته وبه یفتیٰ. (شامی، باب المهر، مطلب: فی دعویٰ الأب أن الجهاز عاریة زکریا ٤/٣٠٨، کراچی ٣/١٥٧)

(۶) بیوہ کو اس کا حصۂ شرعیہ دینا ہر حال میں لازم ہے، چاہے وہ شوہر کے گھر میں عدت گزارے یا کسی اور جگہ، کسی صورت میں اس کا حق باطل نہ ہوگا۔

الحق متى يثبت لايبطل بالتاخير و لا بالكتمان. (قواعد الفقه ص:۷۷)

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ربیع الاول ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۵۳۰)

میت کے ترکہ میں بیوی اور بھتیجوں کو کتنا ملے گا؟

سوال [۱۱۳۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کسی شخص کی کوئی اولاد نہ ہو اس کے انتقال کے بعد صرف ایک بیوہ حیات ہو تو وہ کتنے حصہ کی حقدار ہوگی، جبکہ مرحوم کے دو حقیقی بھائیوں کی اولادیں بھتیجے موجود ہیں؟

(۲) کسی شخص کے انتقال کے بعد ان کے دو حقیقی بھائیوں میں سے ایک بھائی کے صرف ایک پسر و دوسرے بھائی کے پانچ پسر موجود ہوں تو شرعاً کس کو کتنا حصہ ملے گا؟

(۳) کسی شخص کے پاس اس کی اپنی دادا الٰہی جائیداد صحرائی وسکنائی باغات وغیرہ ہوں اور اس کا انتقال ہو جائے تو اس کی بیوہ اور حقیقی بھتیجوں کو کتنا حق ملے گا؟

المستفتی: راشد خاں محلّہ گھیر میاں خاں رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مرحوم کی اولاد نہیں ہے تو ایسی صورت میں بیوی کو کل مال کا ایک چوتھائی ملتا ہے لہٰذا مذکورہ صورت میں ایک چوتھائی بیوی کو ملے گا، بقیہ حقیقی بھائیوں کی نرینہ اولاد کو ملے گا۔

الربع للواحدة فصاعدة عند علم الولد وولد الابن و إن سفل. (سراجی ص:۷)

اور سوال نامہ میں درج شدہ صورت میں مرحوم کی جائیداد درج ذیل طریقہ سے تقسیم ہوگی:

٨/٤

مرحوم میت

بھتیجا	بھتیجا	بھتیجا	بھتیجا	بھتیجا	بھتیجا	بیوی
						١/٢
١	١	١	١	١	١	٢

کل ترکہ ٨/ سہام میں تقسیم ہوکر بیوی کو ٢/ اور ہر ایک بھتیجا کو ایک ایک ملے گا، اور ایک بھائی کے جو ایک پسر ہے اس کو اتنا ہی ملے گا جو دوسرے بھائی کے پانچ لڑکوں میں سے ایک کو ملتا ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢٤/ ربیع الثانی ١٤١٥ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣١/ ٣٩٧٨)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
٢٤/٤/١٤١٥ھ

شوہر اور والدین کے درمیان ترکہ کی تقسیم

سوال [١١٣٨٨]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ اقبال احمد ولد الطاف حسین نے اپنے نکاح کے وقت اپنا نصف مکان رقبہ تقریباً ٢٥/ مربع گز واقع محلہ اصالت پورہ کا بیع نامہ اپنی زوجہ فرید النساء بالعوض دین مہر بیع قطعی کیا تھا، اس کے بعد فرید النساء کی لاولد موت واقع ہوگئی، لہٰذا مرحومہ فرید النساء کے حصۂ مکان میں شوہر اقبال احمد وفرید النساء کے والد عابد حسین شرعاً کتنے کتنے حصے کے مالک ہوں گے، علاوہ مذکورہ بالا اشخاص کے فرید النساء کے حصۂ مکان میں اور کوئی وارث شرعاً ہوتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد طاہر اصالت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ما تقدم وعدم موانع ارث فرید النساء کے مذکورہ ترکہ میں سے نصف اس کے شوہر اقبال احمد کو ملے گا، نیز اس مکان کے علاوہ اگر کوئی دوسری چیز ہے، مثلاً زیورات وغیرہ تو اس کا بھی نصف حصہ شوہر کو ملے

گا، اسی طرح اگر فرید النساء کی ماں بھی زندہ ہے تو بقیہ نصف میں سے ایک تہائی ماں کو ملے گا، اور دو تہائی باپ کو ملے گا، اور اگر ماں زندہ نہیں ہے بلکہ فرید النساء سے پہلے گذر گئی ہے تو بقیہ نصف مکمل باپ عابد حسین کو ملیگا ،اور زیورات وغیرہ میں سے بھی اسی تناسب سے ملے گا۔

وثلث ما بقي بعد فرض أحد الزوجين وذلک في مسئلتين زوج و أبوين. (سراجي ص:۱۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۶۱۳۳)

شوہر کی دو حالتیں ہیں

سوال [۱۱۳۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بعض جگہوں پر یہ دستور ہے کہ لڑکی کے انتقال کے بعد اگر اس کی اولاد نہ ہو تو اس کے میکہ والے لڑکی کو دیا ہوا کل سامان واپس لے لیتے ہیں۔

دریافت یہ کرنا ہے کہ میکہ والوں کا کل سامان لے لینا درست ہے یا نہیں یا اس مال میں شوہر کا بھی حصہ ہے؟

المستفتی: محمد مصطفیٰ کمال ٹانڈہ بادلی، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: میکے کی طرف سے لڑکی کو جو سامان دیا جاتا ہے وہ کل کا کل لڑکی کی ملکیت ہے، اور جب لڑکی کا انتقال ہو جائے تو بچے ہونے کی صورت میں لڑکی کی کل ملکیت میں سے ایک چوتھائی شوہر کا حق ہے، میکے والوں کو تین چوتھائی لے جانے کا حق ہوتا ہے، اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں کل مال کا نصف حصہ شوہر کا حق ہوتا ہے، اور باقی نصف میکے والوں کو لے جانے کا حق ہوتا ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُنَّ وَلَدٌ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ. [النساء: ۱۲] ﴾ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ محرم الحرام ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۵۸۲)

بیوی کے متروکہ مال میں شرعی حق

سوال [۱۱۳۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسماۃ اللہ دی کے پہلے شوہر عبد العزیز سے عبد الرشید، محمد حنیف، عبد الوحید، خاتون یہ چار اولاد ہوئیں، شوہر اول کے انتقال کے بعد دوسرے شوہر عبد المجید سے دو لڑکی شمو اور شہناز ہوئیں، اللہ دی اور ان کے شوہر عبد المجید اس وقت جس نئے تعمیر شدہ مکان میں رہتے ہیں نئی تعمیر سے پہلے پرانی تعمیر کی حالت میں یہ مکان کسی بنیے کے پاس گروی (رہن) رکھا ہوا تھا، یہ مکان دراصل اللہ دی کے والد بشیر احمد کا تھا اور انہوں نے ہی گروی رکھا تھا، اللہ دی کے نانا کا الگ ایک مکان تھا، جو اللہ دی کے نام تھا، اللہ دی نے اپنے نانا کا مکان بیچ کر یہ گروی رکھا ہوا مکان چھڑا لیا، پھر اس کو نئے طریقہ سے بنایا گیا، اس مکان کی تعمیر کے لیے اللہ دی کے شوہر ثانی عبد المجید نے اپنا ذاتی مکان بیچ کر اس کی قیمت میں سے بھی دو تہائی سے زیادہ پیسہ دیا، اور دس ہزار روپیہ نقدا لگ دیا، ۲۵ / کٹے سیمینٹ کے اور چار چوکھٹ اور ایک ونڈو یہ سب نقد اور سامان عبد المجید نے اس کی تعمیر کے لیے دیا، عبد المجید کے علاوہ محمد حنیف اور عبد الوحید (جو پہلے شوہر کی اولاد ہیں) کا بھی پیسہ اس میں لگا، جتنا بھی لگا، اس مکان کی پہلی اور دوسری منزل کی تعمیر تو عبد المجید اور عبد الوحید اور محمد حنیف ان تینوں کی شرکت سے ہوئی، اس کے بعد عبد الوحید کا انتقال ہو گیا تھا، اس لیے تیسری منزل عبد المجید اور محمد حنیف نے مل کر بنائی، اس تیسری منزل کی تعمیر میں بھی ۲۵ / ہزار روپیہ عبد المجید نے دیئے، دوسرے یہ کہ عبد المجید محمد حنیف کا سامان جو باہر دہلی وغیرہ لے جا کر بیچتے تھے، تو اس کے پیسے سے کچھ

اچھے پڑتے کے سودے محمد حنیف کو لا کر دیتے تھے، اور ان کے نفع میں دونوں کا حصہ ہوتا تھا، ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۰ء تک ان دونوں کا یہ کاروباری سلسلہ چلتا رہا، اور اس کا جو بھی نفع عبد المجید کے حصہ کا ہوتا تھا وہ بھی برابر تیسری منزل کی تعمیر میں لگتا رہا، محمد حنیف نے ان سودوں کے نفع کا کوئی حساب عبد المجید کو الگ سے نہ دیا اور نہ سمجھایا، بلکہ عبد المجید نے جب بھی پوچھا کہ ان سودوں کے پڑتے کا کیا حساب ہے تو محمد حنیف نے یہی جواب دیا کہ یہ سب اس میں یعنی مکان کی تیسری منزل میں لگ گیا، تو عبد المجید کو بھی اس پر کوئی خلش یا اعتراض نہ ہوا، کیونکہ ایک گھر کی بات تھی، بہر حال ۱۹۹۲ء تک مکان کی تیسری منزل بھی مع پلاسٹر فرش کے مکمل ہو گئی تھی اب اللہ دی بہت کمزور ہو چکی ہیں اور آئے دن بیمار رہتی ہیں، ان کے شوہر عبد المجید کا کہنا اپنی بیوی سے یہی ہے کہ یہ مکان تمہارا ہے، ہم سب نے مل کر اسے بنایا ہے، اس مکان میں میرا کیا حق ہے؟ اور کتنا ہے؟ تم اپنی زندگی میں اس مسئلے کو طے کردو تو وہ یہ جواب دیتیں ہیں کہ تمہارا اس مکان میں کوئی حق نہیں ہے، بس اس میں رہتے رہو، کل کو اللہ دی کے انتقال کے بعد اللہ دی کے لڑکے نے اس مکان سے عبد المجید کو بے دخل کر دیا تو وہ بے چارے کہاں جائیں گے اس لیے آپ کو زحمت دی گئی ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس مکان میں اس وقت اللہ دی کی زندگی اور اللہ دی کے انتقال کے بعد عبد المجید کا کیا حق نکلتا ہے، محترم سے گذارش ہے کہ اس کو کسی قدر وضاحت کے ساتھ سمجھا کر تحریر فرمائیں؟

المستفتی: عبد المجید کباڑی، ہلدوانی نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عبد المجید نے اس مکان کی تعمیر وغیرہ میں جو خرچ کیا ہے وہ اگر اللہ دی کے حکم سے کیا ہے تو ایسی صورت میں جتنا پیسہ عبد المجید نے اس مکان میں خرچ کیا ہے پورے مکان کی قیمت لگا کر اتنے حصہ کے بقدر عبد المجید مالک ہوگا، اور اللہ دی کے مرنے کے بعد کل مکان میں سے چوتھائی حصہ کا مالک بھی شرعی وراثت کی بناء پر عبد المجید ہوگا، اس لیے اس شبہ کی ضرورت نہیں کہ اللہ دی کے مرنے کے بعد اللہ دی کی اولاد عبد

المجید کو اس مکان سے بے دخل کر کے نکال سکے گی۔

﴿فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ. [النساء: ۱۲] ﴾ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱ر ذی قعدہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۹۴۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱/۱۱/ ۱۴۲۱ھ

شوہر کے انتقال کے بعد بیوی کس کس چیز کی مالک ہوگی؟

سوال [۱۱۳۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کشوری بیگم زوجہ اشفاق حسین مرحوم ان کے تین لڑکے شمشاد حسین سرفراز حسین، محمد یاسین، ایک لڑکی خیر النساء، گذشتہ سال میری شادی فوزیہ قدیر بنت محمد قدیر، محمد یاسین مرحوم بن اشفاق حسین سے ہوئی تھی، شادی کے آٹھ ماہ بعد میرے شوہر محمد یاسین کا انتقال ہو گیا، ان کے انتقال کے ایک ماہ بعد محمد یاسین مرحوم کے والد اشفاق حسین کا انتقال ہو گیا، میری شادی کے وقت میرے شوہر نے کچھ زیور اور کچھ کپڑے چار آدمیوں میں دیئے تھے، (میرے شوہر اپنے بھائیوں سے الگ رہتے تھے، شادی سے پہلے بھی) اور کچھ تحفہ میرے شوہر نے تنہائی میں (منھ دکھائی) دیئے تھے، اور کچھ تحفہ ونقد ان کے رشتہ داروں نے دوستوں نے مجھے منھ دکھائی میں دیئے تھے، میں نے عدت بھی اپنے میکے میں مکمل کی ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ میرے شوہر کے انتقال کے بعد جو زیورات وکپڑے چار آدمیوں میں دیئے گئے تھے ان پر کس کا حق ہے؟ اور جو میرے شوہر نے مجھے منھ دکھائی میں اور رشتہ داروں، دوستوں نے تحائف میں نقد روپیہ، زیور، کپڑے منھ دکھائی میں دیئے ہیں ان پر کس کا حق ہے؟ میری کوئی اولاد نہیں ہے، ان کا ایک مکان ہے جو کہ کشوری بیگم کے نام ہے، ان کا انتقال میرے شوہر سے پہلے ہو گیا تھا، اس مکان میں میرا کتنا حصہ ہوتا ہے؟

المستفتیہ: فوزیہ قدیر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جو زیور شوہر نے دیا ہے وہ اگر مالکانہ طور پر دیا

ہے تو آپ اس کی مالک ہیں اور جو تحفہ اور نقد روپیہ منہ دکھائی میں کسی نے بھی دیا ہے وہ سب آپ کی ملکیت ہے اور جو کپڑا وغیرہ دیا گیا وہ بھی آپ کی ملکیت ہے اور شوہر نے منہ دکھائی میں تنہائی میں جو کچھ بھی دیا ہو وہ بھی آپ کی ملکیت ہے۔ (مستفاد: محمود یہ ڈابھیل۱۲/ ۱۲۶)

إذا بعث الزوج إلى أهل زوجته أشياء عند زفافها، منها ديباج فلما زفت إليه، أراد أن يسترد من المرأة الديباج، ليس له ذٰلك إذا بعث إليها على جهة التمليك. (هنديه، كتاب النكاح، باب المهر، الفصل السادس عشر في جهاز البنت، زكريا قديم ۱/ ۳۲۷، جديد ۱/ ۳۹۳)

ماں کشوری کی میراث کی جائیداد میں شوہر کو جو کچھ بھی ملے گا اس کا چوتھائی آپ کو ملے گا۔

والربع: للمرأة إذا لم يكن للميت ولد ولا ولد ابن. (مختصر القدوری، كتاب الفرائض ص: ۲۹۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ شوال ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۷۹۴/۳۹)

بیوی اولاد کی عدم موجودگی میں شوہر کے چوتھائی حصہ کی حقدار

سوال [۱۱۳۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہماری بہن کی شادی کو بارہ سال ہو گئے لیکن اللہ کی مرضی کہ اولاد کوئی نہیں ہے اور تقریباً چار ماہ پہلے ہمارے بہنوئی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے، ہماری بہن اس وقت عدت میں ہیں، ہمارے بہنوئی کے دو بھائی اور ہیں، یعنی یہ کل تین بھائی تھے، ہماری بہن کی اب یہ خواہش ہے کہ باقی زندگی اب میں یہیں گذار دوں گی، یعنی فی الحال دوسرا نکاح کرنے کا ارادہ نہیں ہے، جبکہ ہمارے بہنوئی کے بھائی اور ان کی بیویاں یہ چاہتی ہیں کہ یہ عدت پوری کر کے اپنے میکے چلی جائیں یا پھر کہیں نکاح کر لیں، اور یہ مکان پراپرٹی، بینک بیلینس جو ہے وہ سب ہمارا ہو جائے، اس لیے وہ دونوں مل کر بات بات پر جھگڑا کر رہی ہیں، آپ سے

درخواست ہے کہ جواب تحریر فرمادیں کہ ہماری بہن اس پراپرٹی، مکان اور بینک بیلینس میں کتنے کتنے حصہ کی حقدار ہے؟

المستفتی: محمد ریحان اصالت پورہ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شوہر کے انتقال کے بعد اگر شوہر سے کوئی اولاد نہ ہو تو بیوی اس کے کل ترکہ کے چوتھائی حصہ کی حقدار ہوتی ہے اور یہ اس کا شرعی حق ہے، جائیداد، بینک بیلینس وغیرہ سب چیزوں میں چوتھائی حصہ اس کا ہے، بیوی نے دوسری شادی کرلی ہو تب بھی اس کا حق باقی رہے گا، دوسری شادی نہ کی ہو تب بھی اس کا حق بدستور باقی رہے گا، اس کے حق پر کسی کو دخل اندازی کرنے کا حق نہیں ہے۔

﴿**ولهن الربع مما تركتم إن لم يكن لكم ولد، فإن كان لكم ولد فلهن الثمن.** [النساء: ١٢]﴾

أما للزوجات فحالتان: الربع للواحدة فصاعدا عند عدم الولد. (سراجی ص:١٢)

والربع لها عند عدمهما. (در مختار مع الشامی، کتاب الفرائض، زکریا ١٠/٥١٢، کراچی ٦/٧٧٠) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍شعبان المعظم ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۷۸۶)

ورثاء میں محض ایک بہن موجود ہو تو تقسیم ترکہ

سوال [۱۱۳۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ماں بدھو نے اپنا ترکہ اپنی دو لڑکیاں: نینا وکمیا کے نام کردیا، اس کے بعد بدھو کا انتقال ہوگیا، پھر کمیا کا انتقال ہوگیا، بوقت انتقال ان کے شوہر بھی حیات نہیں تھے، ان کی

بہن نینا حیات تھی، اور کمیا کی ایک لڑکی نظیرن تھی جو اپنی ماں کمیا کی حیات ہی میں انتقال کرگئی تھی، نظیرن نے اپنے دو بچے چھوڑے ایک لڑکا عبد الکریم اور ایک لڑکی حسینی بیگم، تو معلوم یہ کرنا ہے کہ کمیا کا ترکہ از روئے شرع کس کس کو ملے گا؟

المستفتی: عبد الکریم حسینی بیگم بارہ دری مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سائل سے بار بار معلوم کیا گیا کہ کمیا کے باپ دادا کی اولاد میں سے کوئی مرد زندہ ہے یا نہیں؟ تو جواب ملا کہ کوئی بھی مرد نہیں ہے، اگر واقعہ ایسا ہی ہے تو کمیا کا سارا ترکہ اس کی بہن نینا کو ملے گا۔

أحدها أن يكون في المسئلة جنس واحد ممن يرد عليه عند عدم من لا يرد عليه فاجعل المسئلة من رؤسهم. (سراجی ص: ٤٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ / ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ٦١٣٦)

ایک لڑکا و لڑکی کے درمیان ترکہ کی تقسیم

سوال [۱۱۳۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جناب محبّ علی کا انتقال ہو گیا، ان کے انتقال کے بعد ان کے ورثاء نے آپسی رضا مندی سے محبّ علی کی بیوی مبارک النساء کو ۱۷۹ گز دیدی اور انہوں نے اس پر قبضہ کرلیا، اور محبوب علی کو ۲۰۸ / گز زمین دیدی گئی، اور وہ ۲۰۸ / گز زمین اپنے بھتیجوں کے نام رجسٹرڈ کر کے انتقال کر گئے، اور ۴۵۷ / گز زمین مصطفیٰ اور شہنشاہ بانو دونوں کی مشترکہ تھی، لیکن تقسیم کے وقت یہ بات کاغذات میں تحریر نہیں کی گئی کہ ۴۵۷ / میں سے مصطفیٰ کی زمین کتنی ہے اور شہنشاہ بانو کی کتنی ہے تو اب شہنشاہ بانو کو شرعاً کتنی زمین ملے گی؟

المستفتی: اعظم علی پیرزادہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق وعدم موانع ارث اگر ۴۵۷ ؍گز زمین مصطفیٰ اور شہنشاہ بانو کو باپ کی وراثت میں ملی ہے تو ان دونوں کے درمیان مذکورہ زمین تین حصوں میں تقسیم ہو کر دو مصطفیٰ کو اور ایک شہنشاہ بانو کو ملے گا اور ۴۵۷ ؍میں سے -۳۰۴ گز مصطفیٰ کو اور -۱۵۲ ؍گز شہنشاہ بانو کو ملیں گے۔

﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ. [النساء: ۱۲]﴾ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍شعبان المعظم ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۳۵۷۸)

مرحومہ کے وارثین میں شوہر، لڑکا اور باپ ہو تو ترکہ کی تقسیم

سوال [۱۱۳۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے فرزند محمد عارف کا نکاح ورخصتی سہانہ بی بنت صابر حسین سیالکوٹ لاجپت نگر کے ساتھ ۹؍۱۰؍۲۰۰۱ء بروز منگل کو ہوئی، پہلا بچہ جو لڑکا ہے، کی پیدائش مؤرخہ: ۲۸؍۷؍۲۰۰۲ء کو ہوئی تھی، دوسرے بچے کی پیدائش میں سہانہ بی کا ۱۹؍۶؍۲۰۰۴ء کو انتقال ہو گیا، بچہ ماں کے پیٹ ہی میں انتقال کر گیا۔

دریافت یہ کرنا ہے کہ جو جہیز وغیرہ رخصتی پر سہانہ بی کے گھر والوں نے دیا تھا اب اس میں کس کس کا حصہ ہے؟ سہانہ کے ورثاء میں اس کے والد اور ایک لڑکا اور شوہر ہے؟

المستفتی: نزاکت حسین نواب پورہ بازار مفتی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سہانہ بی کے گھر والوں نے جو جہیز وغیرہ رخصتی کے وقت دیا تھا اس کی مالک چونکہ سہانہ بی تھی اس لیے اس کے انتقال کے بعد مرحومہ کا شوہر اور بچہ اور مرحومہ کا

باپ وارثین میں شامل ہوں گے، بارہ حصہ کرکے تین حصہ شوہر کو اور دو حصہ باپ کو، باقی سات حصہ مرحومہ کے بیٹے کو ملیں گے۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۵/ ۱۲۷، جدید زکریا مطول ۱۳/ ۳۷۶-۳۷۷)

أن الجهاز للمرأة إذا طلقها تأخذه كله و إذا ماتت يورث عنها.

(شامی، باب المهر مطلب: فی دعویٰ الأب أن الجهاز عارية، زکریا ۴/ ۳۱۱، کراچی ۳/ ۱۵۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ رجب المرجب ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۴۴۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸/ ۷/ ۱۴۲۵ھ

تین بیٹے، دو بیٹیاں اور بیوی کے درمیان ترکہ کی تقسیم

سوال [۱۱۳۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ وجاہت علی حیات ہیں، ان کی جائیداد میں ۳/ مکان، ۳/ دوکانیں اور ان کی بیوی بھی حیات ہے، ان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں حیات ہیں، ان کی پانچ اولاد کو ترکہ میں سے کتنا کتنا حصہ ملے گا؟ اس بارے میں تفصیل سے تحریر فرمائیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: وجاہت علی کے انتقال کے بعد ان کا ترکہ سوالنامہ میں مذکورہ ورثاء کے درمیان درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

$\frac{64}{8}$ میت

بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی
$\frac{1}{8}$					
۸	۱۴	۱۴	۱۴	۷	۷

کل ترکہ ۶۴/ سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا ملے گا جو اس کے نام کے نیچے درج ہے اور اس کی زندگی میں کسی بھی لڑکے اور لڑکی اور وارثین کو کوئی حصہ نہیں مل سکتا، ساری

جائیداد کا مالک خود وجاہت علی ہے اور اس کو زندگی میں جائیداد تقسیم کرنے پر زور وزبردستی یا دباؤ ڈالنے کا کسی کو کوئی حق نہیں ہے۔

المالک هو المتصرف فی الأعیان المملوکة کیف شاء من الملک. (بیضاوی شریف رشیدیه ۱/۷)

الملک ما من شانه أن یتصرف فیه بوصف الاختصاص. (الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۲۹/۱٤، شامی زکریا ۱۰/۷، ۲۳۵، کراچی ٤/۵۰۲، ۵/۵۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/رجب المرجب ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۵۰۹)

بیوی چچیرے بھائی میں ترکہ کی تقسیم

سوال [۱۱۳۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ دو بھائی تھے جس میں بڑے بھائی کا نام رفیق احمد اور ان کی بیوی کا نام انتخاب بیگم اور چھوٹے بھائی کا نام نفیس احمد اور ان کی بیوی کا نام فیاضی بیگم تھا، ان دونوں بھائیوں کا اپنا زرخرید مکان ہے، جس میں چھوٹے بھائی نفیس احمد نے اپنے مکان کو اپنی بیوی فیاضی بیگم کے نام وصیت کردی تھی، اور بڑے بھائی رفیق احمد اپنی بیوی کے نام اپنا آدھا مکان کرنا چاہتے تھے، اسی دوران ۱۹۸۰ء میں عید آگئی، اور عید کی نماز کے لیے عیدگاہ گئے تو وہیں دوران فسادِ مرادآباد گولی لگنے کی وجہ سے جان بحق ہوگئے اور مکان کا معاملہ ادھورہ رہ گیا، پھر چھوٹے بھائی نفیس احمد اور ان کی بیوی کا بھی انتقال ہوگیا، اس وقت رفیق احمد کی بیوی انتخاب بیگم موجود ہیں، اور اس مکان کے حصۂ تحتانی میں کرایہ دار رہتے ہیں، اور اب تک کرایہ دار اپنا کرایہ اس بیوہ انتخاب بیگم کو دیتے رہے اور بیوہ ان کو وصول کر کے کرایہ کی رسید بھی دیتی رہی، لیکن اب ڈھائی سال سے رفیق احمد اور نفیس احمد کے چچیرے بھائی انیس احمد نے کرایہ داروں سے کہا کہ مکان کا مالک میں ہوں اور اس نے بیوہ کو کرایہ دینے سے کرایہ داروں کو منع کردیا اور بیوہ

اب معذور ہے، ضعیف ہے تو اب سوال یہ ہے اس مکان میں کیا صرف چچیرے بھائی وغیرہ کا حق ہے یا اس بیوہ بھی کا حق ہے، مسئلہ وضاحت کے ساتھ تحریر فرمائیں؟

المستفتیہ: انتخاب بیگم محلّہ پیرزادہ مرادآباد یوپی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت سوال اگر رفیق احمد کی کوئی اولاد، بھائی وغیرہ نہیں ہے تو رفیق احمد کے حصہ میں سے چوتھائی حصہ کی حقدار انتخاب بیگم ہوگی، اور بقیہ تین چوتھائی رفیق احمد کے چچیرے بھائیوں کو مل جائے گا، لہٰذا بیوہ انتخاب بیگم کو بالکلیہ محروم کردینا جائز نہیں ہوگا، ایک چوتھائی کی مالک بیوہ مذکورہ ہوگی، لہٰذا اتنے کا کرایہ اسی کو ملے گا۔

﴿وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ. [النساء:١٢]﴾

أما للزوجان فحالتان: الربع للواحدة فصاعدة عند عدم الولد.

(سراجی ص: ١٠)

نیز محض نام کرنے یا مالک بنانے کے ارادے سے شرعاً ملکیت مستقل نہیں ہوتی ہے۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۱۲۱۹)

بیوی، تین لڑکیوں اور دو بھائیوں کے درمیان ترکہ کی تقسیم

سوال [۱۱۳۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ تین بھائی شرکت میں کاروبار چلا رہے ہیں اور پوری ملکیت میں برابر کے شریک ہیں، اسی دوران ایک بھائی کا انتقال ہوگیا، مرحوم نے ایک بیوہ اور تین لڑکیاں شادی شدہ چھوڑی ہیں اور دو بھائی، قرآن وسنت کی روشنی میں ارشاد فرمائیں کہ مرحوم کا ترکہ کس

طرح تقسیم ہوگا، لڑکیوں کو کتنا؟ بیوہ کو کتنا؟ بھائیوں کو کتنا کتنا ملے گا؟

المستفتی: حاجی عبدالحکیم صاحب سیفی حسن پور جے پی نگر امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: برتقدیر صحت سوال وبعد ادائے حقوق متقدمہ علی الارث مرحوم کے ترکہ کا دوثلث لڑکیوں کو ملے گا اور بیوی کو اس کا ثمن اور جو مال اس کے بعد بچے گا وہ بھائیوں کو مل جائے گا، لہٰذا مرحوم کا کل ترکہ درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

۱۴۴/۲۴ میــــــــــت مضروب ۶

بیوی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	بھائی	بھائی
۳/۱۸	(۱۶) ۳۲	۳۲	۳۲	(۵) ۱۵	۱۵

یعنی مرحوم کا کل ترکہ ۱۴۴ر سہام میں تقسیم ہوکر بیوی کو ۱۸ر تینوں لڑکیوں کو ۳۲/۳۲/۳۲ر اور بھائیوں کو ۱۵/۱۵ر سہام ملیں گے۔

﴿ فَإِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ. [النساء: ۱۱] ﴾

﴿ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ. [النساء: ۱۲] ﴾

عن جابر بن عبد اللّٰہ ؓ قال جاء ت امرأة سعد بن الربيع بابنتيهامن سعد ؓ إلى رسول الله ﷺ: فقالت يا رسول الله ﷺ: هاتان ابنتا سعد بن الربيع، قتل أبوهما معك يوم أحد شهيدا و إن عمها أخذ مالهما، فلم يدع لهما مالا ولا تنكحان إلا ولهما مال، قال: يقضى الله فى ذٰلك فنزلت آية الميراث فبعث رسول الله ﷺ إلى عمهما، فقال: أعط ابنتى سعد الثلثين وأعط أمهما الثمن و ما بقى فهو لك. (ترمذی شریف، باب ما جاء فی میراث البنات، النسخة الهندية ۲/ ۲۹ دار السلام رقم: ۲۰۹۲) **فقط واللّٰہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸ر محرم الحرام ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۹۸۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/۱/۱۴۲۰ھ

باپ کی جائیداد میں علاتی بہن کا حصہ

سوال [۱۱۳۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) احقر کے والد مرحوم کا انتقال ہو چکا ہے، وارثین میں ہماری والدہ ہیں، اور ہم دو بھائی ہیں اور پانچ بہنیں ہیں، اور ایک علاتی بہن ہے، مرحوم کا ترکہ مذکورہ وارثین میں کس طرح تقسیم ہوگا؟

(۲) ہماری علاتی بہن جو ہمارے والد صاحب کی پہلی بیوی سے ہیں اور سب سے بڑی بہن ہیں جن کا بچپن ہی سے ہمارے یہاں آنا جانا بھی نہیں ہے، کیا ان کو بھی ترکہ دینا ضروری ہوگا، اگر ضروری ہو اور وہ نہ لیں تو کیا کرنا ہوگا؟ اسی طرح اگر ہمارے بھائی بہن وغیرہ نہ دیں تو ہماری کیا ذمہ داری ہوگی؟ کیونکہ بڑا بھائی میں ہی ہوں؟

(۳) اسی طرح اگر ہمارا چھوٹا بھائی وراثت کو شرعی طور پر تقسیم کرنے پر راضی نہ ہو اور رواج کی بنا پر دونوں بھائیوں کے ہی پاس وراثت رکھنے کے لیے کہے تو ایسی صورت میں میری ذمہ داری کیا ہوگی؟ کیا میں خود وراثت نہ لوں تو میں اس سے بری ہو جاؤں گا؟

المستفتی: مجیب الرحمٰن غوری نوادہ سمدھن قنوج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: برتقدیر صحت سوال وعدم موانع ارث وبعد ادائے حقوق ما تقدم مرحوم کا ترکہ ان کے وارثین کے درمیان درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

مرحوم میت $\frac{۸۰}{۸}$ (۷)

بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی (دوسری بیوی سے)
$\frac{۱}{۱۰}$	۱۴	۱۴	۷	۷	۷	۷	۷	۷

مرحوم کا کل ترکہ ۸۰؍ برابر سہام میں تقسیم ہو کر ہر وارث کو اتنا اتنا ملے گا جو اس کے نیچے درج ہے، نیز آپ کی علاتی بہن جو میت کی صلبی لڑکی ہے، وہ اپنے باپ کے ترکہ میں

پوری پوری حقدار ہے، اگر بھائی اپنی بہن کومحروم کریں تو سخت گنہگار رہوں گے، اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سات زمین کا طوق ان کے گلے میں ڈالے گا۔

عن سعيد بن زيدؓ قال سمعت رسول الله ﷺ يقول: من أخذ من حق امرئ من المسلمين شبرا بغير حق طوقه الله تعالىٰ يوم القيامة سبع أرضين. (صحيح مسلم، باب تحريم الظلم وغصب الأرض وغيرها، النسخة الهندية ٢/٣٣، بيت الأفكار رقم: ١٦١٠، صحيح البخارى، باب إثم من ظلم من الأرض شيئا، النسخة الهندية ١/٣٣٢، رقم: ٢٣٨٨، ف: ٢٤٥٢)

عن أنس بن مالك -رضى الله عنه- قال: قال رسول الله ﷺ: من فر من ميراث وارثه، قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة. (سنن ابن ماجه، باب الحيف فى الوصية، النسخة الهندية ٢/١٩٤، دار السلام رقم: ٢٧٠٣)

(۳) انتہائی مجبوری میں آپ کے حصے میں بہن کی میراث میں سے جتنا حصہ آرہا ہے اتنا حصہ آپ اس کوادا کردیں۔

إن أعيان المتوفى المتروكة عنه مشتركة بين الورثة على حسب حصصهم. (شرح المجلة، رستم اتحاد ١/٦١٠، رقم المادة: ١٠٩٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۹۳۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۳/۹ھ

بہن اور چچازاد بھائیوں کے درمیان تقسیم ترکہ کا طریقہ

سوال [۱۱۴۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرا کوئی لڑکا نہیں ہے، نہ لڑکی ہے، یعنی میں لاولد ہوں، میری ایک سگی بہن ہے، جو پاکستان میں ہے، ان کے دو بچے اور ایک بچی ہے، میرے والد کے بھائی کے لڑکوں کے لڑکے ہیں، یعنی چچازاد بھائی کے لڑکے ہیں، نہ میری اہلیہ موجود ہے اور نہ اہلیہ کا کوئی

بھائی، باپ موجود ہے، اہلیہ کے خالہ زاد بہن کے لڑکے ہیں، جن میں سے ایک کو میں نے لے پالک متبنٰی بنا رکھا ہے، میری دوسری اہلیہ کے ایک لڑکا تھا، پہلے شوہر سے، کیا مذکورہ لوگوں میں سے کوئی میرا وارث ہوسکتا ہے؟

المستفتی: کلیم احمد، شیام لال لائن ٹیا برج کلکتہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کے انتقال کے بعد اگر آپ کی سگی بہن زندہ رہے تو کل ترکہ کا نصف حصہ آپ کی بہن کو ملے گا، بقیہ آپ کے چچا زاد بھائی کے لڑکوں کو ملے گا، اور اگر آپ کی سگی بہن کا انتقال آپ سے پہلے ہوجائے تو آپ کا سارا ترکہ آپ کے چچازاد بھائی کے لڑکوں کو ملے گا۔

ثم جزء أبیه أی الإخوة ثم بنوهم و إن سفلوا ثم جزء جده أی الأعمام ثم بنوهم و إن سفلوا. (سراجی ص:۳۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ذیقعدہ ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۸۹۵۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۱۱/۱ھ

لا پتہ بیٹے کی عدم موجودگی میں وراثت کی تقسیم

سوال [۱۱۴۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ناظم کا انتقال ہوگیا، ان کے ورثاء میں ایک لڑکا ناظر (جو سترہ سال سے لا پتہ ہے) اور ایک لڑکی ناظمہ اور چار بھائی: سلیم احمد، تسلیم، خورشید، عالم ہیں۔

دریافت یہ کرنا ہے کہ مرحوم ناظم کی جائیداد کس طرح تقسیم ہوگی، ناظر لڑکا جو لا پتہ ہے اس کا حصہ کس کو ملے گا؟ اور ناظم مورث کے بھائیوں کو لڑکے کے لا پتہ ہونے کی وجہ سے ملے گا یا نہیں؟ شرعی تقسیم فرمادیں۔

المستفتی: محمد سلیم پیر کا باز رکرولہ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرحوم ناظم کی کل جائیدا د ۳؍حصوں میں تقسیم ہوکر ایک حصہ لڑکی کو دیا جائے گا، اور بقیہ دو حصے مفقود الخبر لڑکے کے ہیں اس کا حصہ محفوظ رکھنا ضروری ہوگا، جب تک پورے طریقے سے اس کے مرنے کا یقین نہ ہو جائے، اور محفوظ رکھنے کی بہتر صورت یہ ہوگی کہ اس کا حصہ سرکاری بینک میں محفوظ کردیا جائے، تاکہ اس کے حصے میں کوئی گڑبڑی پیدا نہ ہوسکے، اور جب اس کی موت کا یقین ہو جائے تو اس کا حصہ اول دو حصوں میں تقسیم ہوکر آدھا اس کی حقیقی بہن کو مل جائے گا، پھر اس کے بعد جو ایک حصہ بچے گا اس میں اس کے چچا و تایا برابر کے شریک ہو جائیں گے۔

فإذا مات واحد من أقاربه يوقف نصيبه إلى أن يظهر حاله حي أم ميت لإحتمال الحياة والموت للحال. (بدائع الصنائع، کتاب المفقود، زکریا ۲۸۷/۵، کراچی ۱۹۶/۶، تبیین الحقائق، امدادیه ملتان ۳۱۲/۳، زکریا ۲۳۲/٤، هندیه زکریا قدیم ٤٥٦/٦، جدید ٤٤٨/٦)

هو غائب لم يدر أحي هو فيتوقع قدومه أم ميت (إلى قوله) فلا ينكح عرسه ولا يقسم ماله. (در مختار، کتاب المفقود کراچی ۲۹۲/٤، زکریا ٤٥٧/٦)

ويوقف ماله حتى تصح موته أو تمضى عليه مدة ...... ففى ظاهر الرواية أنه إذا لم يبق أحد من أقرانه حكم موته ...... المفقود موقوف الحكم فى حق غيره حتى يوقف نصيبه من مال مورثه كما فى الحمل ...... وماله لورثته الموجودين عند الحكم بموته. (شریفیه ص:۱۵۲-۱۵۳، شامی زکریا ٤٥٦/٦، کراچی ۲۹۲/٤)

أن القاضي يحفظ ماله يقيم من ينصبه للحفظ لأنه مال لا حافظ له لعجز صاحبه عن الحفظ فيحفظ عليه القاضي نظراً له، كما يحفظ مال الصبى والمجنون الذى لا ولى لهما. (بدائع، کتاب المفقود، زکریا ۲۸۷/۵، کراچی ۱۹۶/٦، تبیین الحقائق زکریا ۲۲۹/٤، امدادیه ملتان ۳۱۰/۳)

لو أخذ القاضي وديعة المفقود ممن هى بيده ووضعها عند ثقة لا

بأس به. (شامی، کتاب المفقود زکریا ٦/٤٥٧، کراچی ٤/٢٩٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰/ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۵۱)

گم شدہ کا مال ورثاء کے درمیان تقسیم کرنا

سوال [۱۱۴۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید تقریباً آٹھ سال سے پتہ نہیں کہ کہاں چلا گیا ہے، زید کے ساتھ میں اس کی بیوی اور ایک لڑکی تقریباً ۱۳/سال کی ہمراہ ہیں، یہ تینوں شخص روپوش ہیں، زید نے اپنی آراضیٔ صحرائی کا اپنے بڑے بھائی کو مختار بنا دیا، تقریباً عرصہ ۳۵/سال ہو گئے ہیں اب تک اس زمین کو یہی بوجوت رہے ہیں، پہلے اس زمین کی آمد نصف اپنے بھائی کو دیتے رہے، اب ان کے بعد زید کی لڑکی کو جو اس سے پہلے بیوی کی تھی، کل آمد دیتے رہے۔

اب عرصہ ایک سال کا ہوگیا، اس لڑکی کا بھی انتقال ہوگیا، اس نے اپنے ورثاء میں ٦/بچے چھوڑے، ۴/لڑکے اور ۲/لڑکیاں اور زید کے کوئی لڑکا نہیں ہے، نہ اس بیوی سے اور نہ جو ہمراہ زید کے ہے اس بیوی سے، زید کے چار بھائی ہیں، دو بڑے بھائی ان کے سامنے گذر چکے ہیں اور دو حقیقی بھائی حیات ہیں اور جو دو بھائی انتقال کر چکے ہیں ان سے دونوں کے ایک ایک لڑکا موجود ہے، اور وہ اپنے اپنے حصہ پر قابض ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ شرعاً جس کا جتنا حصہ ہوا ظہار فرمائیں؟

المستفتی: رشید احمد افضل گڈھ بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ سوال اگر صحیح ہے تو زید شرعاً مفقود (گم شدہ) کے حکم میں ہے اور شریعت میں اس کا حکم یہ ہے کہ اس کی ملکیت کی تمام اشیاء جائیداد

اور نقدی رقوم وغیرہ سب حاکم عادل کے مشورہ سے محفوظ رکھنا واجب ہے، اس زمانہ میں بہتر صورت یہ ہے کہ اس کے نام بینک میں جمع کر دیا جائے، اور جب پورے علاقہ سے اس کے ہم عصر سب لوگ فوت ہو جائیں تو اس کا ترکہ شرعی ورثاء میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، اس سے قبل نہیں، اور فی الحال زید سے بڑے بڑے حضرات زندہ ہیں اس لیے زید پر موت کا حکم لگا کر تقسیم ترکہ کا حکم لگانا جائز نہیں ہوگا۔

إذا غاب الرجل فلم يعرف له موضع ولا يعلم أحي هو أم ميت نصب القاضي من يحفظ ماله ويقوم عليه ويستوفي حقه لأن القاضي نصب ناظرا لكل عاجز عن النظر لنفسه والمفقود بهذه الصفة وصار كالصبي والمجنون.

(هدايه، باب المفقود ۲/ ۶۲۰)

ويوقف ماله حتى تصح موته أو تمضي عليه مدة واختلف الروايات في تلك المدة ففي ظاهر الرواية أنه إذا لم يبق أحد من أقرانه حكم بموته.

(شريفيه ص: ۱۳۷، سراجی ص: ۶۱، الدر المختار كراچی ٤/ ۲۹۲، زكريا ٦/ ٤٥٦)

اوراب اس کی ملکیت کا نگراں وہی ہوگا جس کو اس نے مختار بنایا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ صفر المظفر ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۶۴۸)

لاپتہ وارث کا حصہ محفوظ رکھا جائے گا

سوال [۱۱۴۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے اپنی زندگی میں چند افراد کے درمیان وصیت کی کہ میرا ایک مکان اور ایک لڑکی (لالی) اور یہ چند ہزار روپیہ نقد ہیں، عمر کو سونپ رہا ہوں، کہ میرے بعد عمر میری لڑکی اور جائیداد کی دیکھ بھال کریں اور اگر کہیں اس لڑکی کا رشتہ ہو جائے تو یہ ترکہ اس کے بچوں کو سونپ دیں، یا پھر جیسا مناسب سمجھیں کریں، زید کے مرنے کے بعد عمر اس لڑکی اور

متروکہ سامان کو اپنے گھر لے آیا اور کچھ دنوں بعد اس لڑکی کا نکاح کردیا لیکن نکاح کے کچھ دنوں بعد سے وہ لڑکی لاپتہ ہے، جس کو قریب دس سال سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا، اس کا حقیقی وارث تو کوئی نہیں، لیکن بکر کا کہنا ہے کہ میں اس کا وارث اور رشتہ دار ہوں، لہٰذا جواب طلب امر یہ ہے کہ عمر اس مکان کو کیا کرے؟ اس نام نہاد رشتہ دار کے حق میں دستبردار ہوجائے یا کسی ادارے کو وقف کردے، کیونکہ زید مکمل طور پر عمر کو مختار بنا گیا تھا، کہ میرے مرنے کے بعد عمر کو پورا اختیار ہوگا، جیسا چاہے کرے، بکر جیسے دور کے رشتہ دار اور بھی ہیں؟

المستفتی: احمد حسن ہلدوانی، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکور جائیداد اور نقدی رقوم زید کے دوسرے وارث نہ ہونے کی صورت میں سب کی حقدار زید کی لڑکی ہے، اور لڑکی کے گم ہوجانے کے بعد عمر پر لازم ہے کہ اس کی جائیداد اور رقوم کی حفاظت کا معقول انتظام اتنے عرصہ تک کے لیے کریں کہ جتنے میں مذکورہ لڑکی کی ہم عصر عورتیں فوت ہوجائیں، اس کے لیے بہترین صورت یہی ہے کہ جائیداد کو نقدی شکل میں لاکر مذکورہ گم شدہ لڑکی کے نام بینک میں جمع کردیئے جائیں یا مکان نام کردے، اور بکر کی رشتہ داری زید کے ساتھ کس طرح ہے اس کی تفصیل معلوم ہونے پر کچھ لکھا جاسکتا ہے، نیز لڑکی کے شوہر کا حال بھی معلوم ہونا ضروری ہے۔

المفقود حي في ماله حتى لا يرث منه أحد و ميت في مال غيره حتى لا يرث من أحد ويوقف ماله حتى تصح الخ. (شريفيه ص:۱۳۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۶۸۸)

مفقود الخبر لڑکے کا حصہ کیا کیا جائے؟

سوال [۱۱۴۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ زید نے نکاح کیا جس سے تین لڑکے اور پانچ لڑکیاں پیدا ہوئیں، الحمدللہ سبھی باحیات ہیں، اب زید کی بیوی کا انتقال ہوگیا، اس کے بعد زید نے نکاح ثانی کیا تو زید کے اس بیوی سے تین لڑکے پیدا ہوئے اورالحمدللہ تینوں باحیات ہیں، لیکن زید کی پہلی بیوی کا ایک لڑکا جو سب سے بڑا تھا، وہ اپنی والدہ صاحبہ کی زندگی میں گھر سے فرار ہوگیا تھا، اورکئی سالوں تک مفقود الخبر رہا، گھر کے کسی آدمی کو اس کی خبر نہیں تھی، کہ وہ کہاں ہے، اوراس کے والد یعنی زید اورزید کے بھائی سبھی ان کی تلاش میں لگے رہے، مگر کہیں سے اس کی کوئی خبر نہ ملی۔

اب اس کی والدہ کا یعنی زید کی پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا ہے، اس کے بعد زید کو کسی طرح سے پتہ چلا کہ وہ لڑکا دہلی جیل میں ہے، چنانچہ زید اورزید کے بھائی دہلی جاکر اسے رہا کرواکر گھر لے آئے، مگر وہ لڑکا بہت کم اپنے گھر پر رہتا تھا، ہمیشہ فرار رہتا تھا، ہفتہ پندرہ روز پر اپنے گھر آتا تھا، اورایک دوروز رہ کر پھر بھاگ جاتا تھا، اور چور ڈاکوؤں کے ساتھ رہتا تھا، اوراس کا مشغلہ ہی چوری کرنا ہوگیا تھا، اب تقریباً ۱۵ر سال سے اپنے گھر نہیں آیا ہے، اور نہ اس کی کوئی خبر ہے، اوراب زید کی دوسری بیوی کا بھی انتقال ہوگیا ہے اورتقریباً ایک سال کے بعد زید شوہر کا بھی انتقال ہوگیا، آپ سے گذارش ہے کہ زید نے جو وراثت چھوڑی ہے اسے کس طرح تقسیم کیا جائے، اوراس لڑکے کا جو پندرہ سال سے لاپتہ ہے کیا کیا جائے؟ حصہ رکھا جائے یا نہیں؟ اگر رکھا جائے گا تو کتنا رکھا جائے گا؟ اورکس کے پاس رکھا جائے گا؟ اورکب تک رکھا جائے گا؟

المستفتی: محمد زبیر دولت باغ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق وعدم موانع ارث زید کا مال ۷ار سہام میں تقسیم ہوکر دو دولڑکوں کو اورایک ایک لڑکیوں کو ملے گا، مرحوم زید کا جو لڑکا مفقود ہے اس کے حصے کو کسی امانت دار کے پاس اس وقت تک محفوظ رکھا جائے گا جب تک ان کی عمر نوے سال نہ ہوجائے، اس کے بعد بھی اگر واپس نہ آئے تو اس کو مردہ

تسلیم کرکے اس کے مال کو ان کے وارثوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے گا۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ ۶/۲۷۲، جدید زکریا ۲۷۳/۱۰)

المفقود حي في ماله حتی لا یرث منه أحد ...... واختلف الروایات في تلک المدة...... وقال بعضهم تسعون سنة وعلیه الفتویٰ. (سراجی فی المیراث ص:۲۹) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/صفر المظفر ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۰۶۴/۳۵)

لاپتہ شخص کا باپ کی میراث میں حصہ اور ورثاء کا اس کو فروخت کرنے کا حکم

سوال [۱۱۴۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ رفیع احمد کے والد کا انتقال ہوا، والد کی متروکہ جائیداد رفیع احمد کے تین بھائی، چار بہنیں اور رفیع احمد کی اولاد کے درمیان تقسیم ہوئی، واضح رہے کہ تقسیم جائیداد کے وقت رفیع احمد گھر پر موجود نہیں تھے، کیونکہ رفیع احمد اپنے والد صاحب کے انتقال سے پہلے گھر سے لاپتہ ہو گئے تھے، اور بارہ سال کا عرصہ گذر گیا ہے، اب تک رفیع احمد گھر نہیں آئے، اس وقت نہ ہی ان کا کوئی پتہ ہے، اور نہ ہی یہ معلوم ہے کہ وہ بقید حیات ہیں یا نہیں؟ اس لیے تقسیم میراث کے وقت رفیع احمد کی اولاد ان کے قائم مقام تھی اور رفیع احمد کا میراث میں جو حصہ تھا وہ ان کی اولاد کو ملا، اب ان کی اولاد میراث سے حاصل شدہ جائیداد کو فروخت کرنا چاہتی ہے تو کیا رفیع احمد کی اولاد اس جائیداد کو فروخت کر سکتی ہے یا نہیں؟ کیا ان کے آنے کا انتظار کرنا ضروری ہے یا فی الفور بیچ سکتے ہیں؟

المستفتی: ناصر کلیم، محلّہ مرزا ہادی پورہ، مئوناتھ بھنجن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: رفیع احمد چونکہ باپ کی زندگی سے لاپتہ ہے، اس

لیے باپ کے انتقال کے بعد رفیع احمد کی اولاد شرعاً میراث کی حقدار نہ ہوگی، اور نہ ہی انہیں فروخت کرنے کا حق ہوگا، بلکہ رفیع احمد کے حصے کو محفوظ رکھا جائے گا، اور جب ان کی موت کا یقین ہوجائے تو ان کا حصہ باپ کے وارثین میں حسب حصص شرعیہ تقسیم ہوجائے گا، اس وقت وارثین اس جگہ میں رہ سکتے ہیں لیکن فروخت نہیں کرسکتے۔

ولایرث المفقود أحدا مات فی حال فقده؛ لأن بقاءه حیا فی ذٰلک الوقت یعنی وقت موت ذٰلک الأحد باستصحاب الحال وهو لایصلح حجة فی الاستحقاق بل فی دفع الاستحقاق علیه، ولذا جعلناه حیا فی حق نفسه فلا یورث ماله فی حال فقده میتا فی حق غیره فلا یرث هو غیره .

(فتح القدیر، کتاب المفقود، دار الفکر ۶/۱۴۹، زکریا ۶/۱۴۰، کوئٹه ۵/۳۷۴)

وأما حال المفقود فعبارة مشائخنا رحمهم الله عن حاله أنه حی فی حق نفسه میت فی حق غیره (إلی قوله) ولکن معنی هذه العبارة أنه تجری علیه أحکام الأحیاء فیما کان له فلا یورث ماله ولا تبین امرأته کأنه حي حقیقة وتجری علیه أحکام الأموات فیما لم یکن له فلا یرث أحدا کأنه میت حقیقة. (بدائع الصنائع، کتاب المفقود، زکریا ۵/۲۸۷، کراچی ۶/۱۹۶)

وأما الموقوف من ترکة غیره فإنه یرد علی ورثة ذٰلک الغیر ویقسم بینهم کأن المفقود لم یکن. (عالمگیری، الباب الثامن فی المفقود والأسیر، زکریا قدیم ۶/۴۵۶، جدید ۶/۴۴۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍شعبان المعظم ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۸۹۲۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۸/۳ھ

ایک نواسے کے علاوہ کوئی نہ ہو تو کیا حکم ہے؟

سوال [۱۱۴۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: واضح ہو کہ مسمیٰ محمود حسین ولد عبد الکریم بخش ساکن محلّہ لال مسجد باڑہ شاہ صفا مرادآباد کا انتقال جب ہوا توان کے خاندان میں ان کا کوئی حقیقی عزیز حیات نہ تھا، سائل مسمیٰ مقصود عالم جوکہ مرحوم کا نواسہ ہوتا ہے، صرف وہی حیات تھا اور ہے، مرحوم کی جملہ اولاد و بی بی مرحوم کی حیات ہی میں سب انتقال کر گئے، اس لیے میرا یہ کہنا ہے کہ میں مرحوم کے ترکے کا تنہا قانوناً وشرعاً مالک ہوں یہ میرا کہنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: مقصود عالم ولد عبدالسلام نئی بستی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ما تقدم وعدم موانع ارث اگر محمود حسن مرحوم کے مقصود عالم کے علاوہ کوئی دوسرا شرعی وارث نہیں ہے تو محمود حسین مرحوم کا جملہ ترکہ مقصود عالم نواسۂ مرحوم کو ملے گا۔

وذوی الأرحام أصناف أربعة: الصنف الأول ينتمي إلى الميت وهم أولاد البنات (إلى قوله) وأقرب الأصناف، الصنف الأول (إلى قوله) كترتيب العصبات. (سراجی ص:۴۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍رجب المرجب ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۸۲/۲۴)

کیا سسر شرعی وارث ہے؟

سوال [۱۱۴۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ایک خاتون کا انتقال ہوگیا، اس نے اپنے ورثاء میں ایک لڑکی چھوڑی، شوہر ماں اور باپ کو چھوڑا، اس کا ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا۔

(۲) مرحومہ کے ساس سسر یعنی شوہر کے ماں باپ کو بھی اس کے مال سے کچھ حصہ ملے گا؟

(۳) شوہر کی طرف سے جو زیور اور بری، دولہن کو دی گئی تھیں، کیا یہ بھی مرحومہ کے

ترکہ میں شامل ہوں گی؟ جبکہ زیور کے بارے میں ہماری بستی کا عرف ورواج یہ ہے کہ اس کا مالک شوہر یا اس کے ماں باپ سمجھے جاتے ہیں، اور بری کا مالک دولہن کو ہی سمجھا جاتا ہے، کسی بھی وقت دولہن سے بری واپس نہیں لی جاتیں؟

(۴) مرحومہ کی بیٹی کی عمر تقریباً ڈیڑھ برس ہے اس کی پرورش کا حق کس کو ہے، جبکہ اس بچی کی نانی مصر ہے کہ میں ہی اس کو پالوں گی، اور اس بچی کا باپ اور دادی بھی کہتی ہیں کہ ہم اس بچی کو پالیں گے؟

(۵) اگر شوہر نے مہر ادا نہیں کیا تو کیا مہر بھی مرحومہ کے ترکہ میں شامل ہوگا؟

المستفتی: ناصر حسین نگلیا عمری کلاں مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: برتقدیر صحت واقعہ وبعد ادائے حقوق متقدمہ علی الارث وعدم موانع ارث مرحومہ کا ترکہ درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

$\frac{13}{12}$

میت

شوہر	بیٹی	ماں	باپ
۳	۶	۲	۲

کل ترکہ ۱۳ر سہام میں تقسیم ہوکر ۳ر سہام شوہر کے اور ۶ر بیٹی کے اور دو، دو ماں باپ کے ہوں گے۔

(۲) مرحومہ کی ساس سسر کا مرحومہ کے ترکہ میں کوئی حصہ نہیں۔

ویستحق الإرث برحم و نکاح صحیح وولاء. (در مختار مع الشامی، کتاب الفرائض، زکریا ۱۰/ ۴۹۷، کراچی ۶/ ۷۶۲)

(۳) جب آپ کے عرف میں زیورات دولہن کی ملک نہیں سمجھے جاتے، شوہر یا اس کے والدین ہی ان کے مالک ہوتے ہیں، تو زیورات مرحومہ کا ترکہ نہ بنیں گے، اور بریاں اگر دولہن کی سمجھی جاتی ہیں تو بریاں ترکہ میں داخل ہوں گی۔

قلت ومن ذلک ما یبعثه إلیها قبل الزفاف فی الأعیاد والمواسم من

نحو ثياب و حلي و كذا ما يعطيها من ذٰلك أو من دراهم أو دنانير صبيحة ليلة العرس ويسمیٰ في العرف صبحة. (شامی، باب المهر، مطلب: فيما يرسله إلى الزوجة، زكريا ٤/٣٠٣، كراچی ٣/١٥٣)

(۴) باپ اگر نانی کی پرورش پر راضی نہیں ہے اور نہ خرچہ دینے کو تیار ہے بلکہ دادی کی پرورش پر راضی ہے تو ایسی صورت میں بچی کو دادی کی پرورش میں دینے کی گنجائش ہے۔

أرادت أم أمه تربيته بأجر و أم أبيه ترضیٰ بذٰلك مجانا فأجبت بأنه يدفع للمتبرعه. (شامی، باب الحضانة، زكريا ٥/٢٥٧، كراچی ٣/٥٥٩)

(۵) شوہر نے اگر مہر ادا نہیں کیا، اور نہ ہی مرحومہ نے معاف کیا تو مہر بھی مرحومہ کے ترکہ میں داخل ہوگا اور مذکورہ وارثین میں سے ہر ایک کو اپنے حصہ کے تناسب سے ملے گا۔

وموت أحدهما كحياتها في الحكم أصلا وقدرا لعدم سقوطه بموت أحدهما. (در مختار مع الشامی، مطلب: مسائل الإختلاف في المهر زكريا ٤/٢٩٩، كراچی ٣/١٥٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۱۸۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۵/۶/۱۴۲۰ھ

۷ باب العصبات

ترکہ میں سب لڑکے برابر حقدار ہیں

سوال [۱۱۴۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے تین لڑکے عمر، بکر خضر ہیں، جن میں عمر شادی شدہ ہے گھر کے سارے لوگ مشترکہ رہتے ہیں، مع عمر واہلیہ، زید کا پیتل کا کاروبار ہے، جس میں بکر اور خضر بھی شریک ہیں، اور اس کے ذریعہ سے گھر کے سارے اخراجات وضروریات پورے ہوتے ہیں، جبکہ عمر کا کاروبار الگ ہے، اوراس سے گھر کے اخراجات کا کوئی تعلق نہیں ہے، اب زید کے انتقال کے بعد زید کا کاروبار بکر اور خضر سنبھالتے ہیں، معلوم ہو کہ عمر کو کاروبار زید نے کرایا تھا، لہٰذا دریافت یہ کرنا ہے کہ وراثت کو تقسیم کے وقت زید کے کاروبار میں کیا عمر کی حصہ داری ہے؟ شرعی حکم سے آگاہ فرمائیں؟

المستفتی: فہیم احمد مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: موت کے وقت جو سرمایہ زید نے چھوڑا تھا اس میں عمر بھی بکر وخضر کی طرح میراث کا حقدار ہے۔

الأب و ابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيئ فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله لكونه معينا له ألا ترىٰ لو غرس شجرة تكون للأب (إلى قوله) وفي الخانية: زوج بنيه الخمسة في داره وكلهم في عياله واختلفوا في المتاع فهو للأب وللبنين الثياب التي عليهم لا غير. (شامي، الشركة، مطلب: اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ...... زكريا ٦/٥٠٢، كراچی ٤/٣٢٥، هنديه زكريا جديد ٢/٣٣٢، قديم ٢/٣٢٩، شرح المجلة رستم ٢/٧٤١، رقم: ١٣٩٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ربیع الاول ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۵۴۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۳/۴ھ

دولڑکوں کے درمیان تقسیم کا طریقہ

سوال [۱۱۴۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید کی ملکیت میں ایک دوکان جس کی مقصر ۸۰/ فٹ ہے، قیمت تقریباً تیس لاکھ روپئے ہے اور ایک مکان جس کی مقصر ۶۴ ۵ فٹ ہے، قیمت تقریباً آٹھ لاکھ ہے، زید کے دولڑکے ہیں بڑے لڑکے کا نام خالد اور چھوٹے لڑکے کا نام ابوبکر ہے، زید کی مملوکہ دوکان اور مکان میں خالد بڑا لڑکا اور ابوبکر چھوٹا لڑکا برابر کے حقدار ہوں گے یا کم وبیش کے؟

(۲) زید کے پاس ایک دوکان ہے جس کی قیمت تیس لاکھ روپئے ہے اور ایک مکان ہے جس کی قیمت آٹھ لاکھ روپئے ہے، زید کے دو بیٹے ہیں، زید نے پوری دوکان اور مکان کا وہ حصہ جس کی قیمت تین لاکھ روپیہ ہے چھوٹے بیٹے کو دیدیا اور مکان کا وہ حصہ جس کی قیمت پانچ لاکھ روپیہ ہے وہ بڑے لڑکے کو دیدیا، اس طرح تقسیم کرنے سے زید غیر عادل کہلائے گا یا نہیں؟ اور عنداللہ مجرم ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: عبادالرحمٰن جسپور ادھم سنگھ نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) حسب تحریر سوال زید کی مملوکہ دوکان و مکان میں اس کی وفات کے بعد اس کے دونوں لڑکے اپنے حصص شرعیہ میں برابر کے حقدار ہوں گے، یعنی ترکہ میں شرعاً لڑکوں کا جو حصہ بن رہا ہے وہ ان دونوں لڑکوں میں برابر تقسیم ہوگا، وارثین کی پوری فہرست سوالنامہ میں مذکور نہیں ہے، بریں بنا زید کی ملکیت سے لڑکوں کے شرعی حصے کی صحیح تعیین یہاں ممکن نہیں ہے، اب اگر واقعی میں ان دونوں لڑکوں کے علاوہ کوئی لڑکی یا بیوی وغیرہ زید کی وفات کے وقت موجود نہیں رہی ہے تو دونوں کو آدھا آدھا ملے گا، اور اگر بیوی اور لڑکیاں بھی موجود ہیں تو ان کے ناموں کی وضاحت سے پہلے ہر ایک کے حصص کی تعیین نہیں ہوسکتی۔

﴿يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيۡ اَوۡلَادِكُمۡ لِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ. [النساء: ۱۱] ﴾

وإيثار اسمی الذکر والأنثیٰ (إلی قوله) للتنصيص علی استواء الصغار والكبار من الفريقين فی الاستحقاق من غير دخل للبلوغ والكبر فی ذٰلک أصلا. (روح المعانی، سورة النساء تحت رقم الآية:۱۱، زکریا ۳۳۹/۳)

وعصبة من يأخذ الكل إذا انفرد –إلی قوله– أولی العصبات بالميراث الابن. (البحر الرائق، کتاب الفرائض، کوئٹه ۴۹۷/۸، زکریا ۳۸۱/۹)

(۲) زندگی میں ہبہ کرتے وقت اولاد میں برابری کرنا باپ پر لازم ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں اگر باپ نے برابری کا معاملہ نہیں کیا ہے تو باپ شرعاً گنہگار رہوگا۔

ويكره تفضيل بعض الأولاد علی البعض فی الهبة علی الصحة. (البحر الرائق، کتاب الهبة، کوئٹه ۲۸۸/۷، زکریا ۴۰۰/۷)

أخرج المسلم حديثا طويلا طرفه هذا: فقال رسول الله ﷺ: يا بشير ألک ولد سوی هذا، قال نعم، فقال أكلهم وهبت له مثل هذا، قال: لا، قال: فلا تشهدنی إذا، فإنی لا أشهد علی جور. (تکملة فتح الملهم، کتاب الهبات، باب کراهة تفضيل بعض الأولاد، اشرفيه ديوبند ۷۵/۲)

وفی رواية: فاتقوا الله واعدلوا فی أولادكم. (تکملة فتح الملهم، اشرفيه ديوبند ۷۴/۲، مسلم شريف ۳۷/۲، رقم: ۱۶۲۳، بخاری شريف ۳۵۲/۱،رقم: ۲۵۱۵، ف: ۲۵۸۷)

روی البخاری تعليقا: وقال النبی ﷺ: اعدلوا بين أولادكم فی العطية. (صحيح البخاری ۳۵۲/۱)

وإن وهب ماله كله لواحد جاز قضاء وهو آثم كذا فی المحيط. (البحر الرائق، کتاب الهبة، کوئٹه ۲۸۸/۷، زکریا ۴۹۰/۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍صفر المظفر ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۸۸۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۲/۱۴ھ

ماں کے ترکہ میں سوتیلے بیٹے کا حصہ

سوال [۱۱۴۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا ماں کے ترکہ میں سگے بیٹوں کے ساتھ وہ سوتیلا بیٹا بھی برابر کا شریک ہوگا کہ جس کا باپ تو یہی تھا جس کے اور بیٹے ہیں لیکن ماں یہ نہیں تھی یعنی ان بھائیوں میں ایک بھائی صرف باپ شریک ہے، ماں شریک نہیں؟

المستفتی: فخر الاسلام امام مسجد سرائے ترین سنبھل

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: میت کے ترکہ میں میت کے شوہر کا بیٹا شریک نہیں ہے، کیونکہ میت سے جزئیت کا تعلق نہیں، لہٰذا وہ وارث نہ ہوگا۔

ثم العصبات بأنفسهم أربعة أصناف جزء الميت ثم أصله إلى آخره.

(رد المحتار، كتاب الفرائض، زكريا ١٠/٥١٨، كراچی ٦/٧٧٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶؍محرم الحرام ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۹۸٦)

شرعی گواہ یا رجسٹری کے بغیر محض دعویٰ سے ملکیت ثابت نہ ہوگی

سوال [۱۱۴۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اصغری بیگم کا انتقال ہوگیا، ورثاء میں کوئی اولاد نہیں تھی، صرف ۴؍ بھتیجے: شوکت حسین (جنہیں اصغری نے گود لے کر پالا تھا)، محمد علی، احمد علی، واجد علی، تین بھتیجیاں: زیب النساء، مہر النساء، شاہد النساء کو چھوڑا، وہ اپنا کل ترکہ اپنے گود لیے ہوئے لڑکے شوکت حسین کو دینا چاہتی تھی، اور پوری زندگی یہ کہتی رہی کہ میں نے اپنا حصہ تجھے دیدیا، شرعاً بتائیں ان کا

ترکہ سب بھتیجوں، بھتیجیوں کو ملے گا یا صرف شوکت حسین کو ملے گا؟

المستفتی: شوکت حسین باڑہ صفا مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شوکت حسین کو دینا شرعی گواہ یا رجسٹری وغیرہ کے ذریعہ سے ثابت نہ ہو تو اس کہنے کے دعویٰ سے شوکت حسین کو تمام ملکیت نہیں ملے گی بلکہ چاروں بھتیجوں میں برابر برابر تقسیم ہوگی اور بھتیجیاں شرعی طور پر وارث نہیں ہیں۔

والعصبة كل من يأخذ ما أبقته أصحاب الفرائض وعند الانفراد يحرز جميع المال. (سراجی ص: ٤، البحر الرائق زكريا ٣٨١/٩، كوئٹه ٤٩٧/٨، شامی زكريا ٥١٨/١٠، كراچی ٧٧٤/٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ر ربیع الاول ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۶۹۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۳/۲۲ھ

اولاد کی عدم موجودگی میں بھائیوں کو حصہ ملے گا یا نہیں؟

سوال [۱۱۴۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے اپنے ذاتی پیسے سے ایک مکان خریدا، اس مکان میں اس کے بھائیوں کا کوئی حق نہیں ہے، اب اس کا انتقال ہوگیا اور اس کی اولاد کوئی نہیں ہے، البتہ بیوی ہے، اور اس کے دو بھائی ہیں، اب اس شخص کی طرف سے اس کے بھائی وارث ہونے کا دعویٰ کر کے اس مکان میں سے اپنا حصہ مانگ رہے ہیں تو کیا اس شخص کے بھائیوں کا اس متروکہ گھر میں سے اپنا حصہ مانگنا درست ہے اور کیا وہ وارث بنیں گے جبکہ اس کی بیوی بھی موجود ہے؟

المستفتی: محمد سفیان قاسمی گودی حمیر پور مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں جبکہ مرحوم کی صرف ایک

بیوی ہے اوراولاد و والدین میں سے کوئی نہیں ہے، تواس کے دونوں بھائیوں کا وارث ہونے کا دعویٰ کرنا درست ہے، چنانچہ مرحوم کا کل ترکہ ۸/ سہام میں تقسیم ہوکر بیوی کو دو حصے اور دونوں بھائیوں کوتین تین حصے ملیں گے۔جیسا کہ مندرجہ ذیل نقشہ سے واضح ہے:

۸/۴ میـــــــــــت

بیوی	بھائی	بھائی
۱/۲	(۳)	
۲	۳	۳

والعصبة كل من يأخذ ما أبقته أصحاب الفرائض وعند الانفراد يحرز جميع المال. (سراجی ص: ٤، البحر الرائق زكريا ٩/٣٨١، كوئٹه ٨/٤٩٧، شامی زكريا ١٠/٥١٨، كراچی ٦/٧٧٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفااللہ عنہ

۳/ رجب المرجب ۱۴۳۴ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۱۷۹)

کیا چچازاد بھائی اور بہن وارث ہوسکتے ہیں؟

سوال [۱۱۴۱۳]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مشیت اللہ کی خریدکردہ جائیداد ہے، اور پہلی بیوی کی کوئی اولاد پیدانہیں ہوئی، دوسری بیوی آمنہ بیگم زندہ ہے، اس سے بھی کوئی بچہ پیدانہیں ہوا، مشیت کا کوئی قریبی رشتہ دارنہیں ہے، سگے چچیرے بھائی اور بہن ہیں، مشیت اللہ کی جائیداد میں سگے چچیرے بھائی اور بہنوں کو بھی حصہ پہنچتاہے یانہیں؟

المستفتی: محمدایوب کاشی پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت سوال مشیت اللہ کی دوسری بیوی کوکل

جائیداد میں سے چوتھائی ملے گا، باقی تین چوتھائی چچازاد بھائیوں کے درمیان برابر تقسیم ہوگا، اور چچازاد بہنوں کو کچھ نہیں ملے گا۔

والعصبة كل من يأخذ ما أبقته أصحاب الفرائض وعند الانفراد يحرز جميع المال. (سراجی ص: ٤، البحر الرائق زکریا ٣٨١/٩، کوئٹه ٤٩٧/٨، شامی زکریا ٥١٨/١٠، کراچی ٧٧٤/٦) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ شوال المکرّم ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۰۹/۲۴)

اصحاب الفروض نہ ہونے کی صورت میں چچازاد بھائی کا حصہ

سوال [۱۱۴۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ محمودہ کا انتقال ہوا، ان کی نہ کوئی اولاد ہے اور نہ ہی شوہر ہے، صرف ایک چچازاد بھائی وقار الحسن حیات ہیں، تو محمودہ خاتون کا ترکہ کس کو ملے گا؟

المستفتی: مولوی عبدالعزیز بچھرایوں مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ما تقدم وعدم موانع ارث محمودہ خاتون کا کل ترکہ ایسی صورت میں اس کے چچازاد بھائی وقار الحسن کو ملے گا، اس لیے کہ جب ذوی الفروض میں سے کوئی وارث موجود نہیں ہے اور ایک شخص عصبات میں سے موجود ہے تو ساری جائیداد وترکہ اسی کو ملے گا۔

والعصبة كل من يأخذ ما أبقته أصحاب الفرائض وعند الانفراد يحرز جميع المال. (سراجی ص: ٤، البحر الرائق زکریا ٣٨١/٩، کوئٹه ٤٩٧/٨، شامی زکریا ٥١٨/١٠، کراچی ٧٧٤/٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶۴۲/۲۷)

بھتیجا کے وارث بننے کی شکل

سوال [۱۱۴۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ منور حسین نے اپنی زندگی میں اپنا ایک مکان اپنی بیوی فراغت النساء کے نام ہبہ زبانی کردیا تھا، اور ایک تحریر بطور یادداشت دو گواہوں: شمس الاسلام، سکندر ضیاء کے سامنے لکھ دی تھی، اور قبضہ ودخل بھی دیدیا تھا اس کے بعد فراغت النساء مکان کا کرایہ وصول کرتی تھیں، پھر منور حسین کا انتقال ہوگیا۔

دریافت یہ کرنا ہے کہ یہ ہبہ مکمل ہوگیا یا نہیں؟ پھر فراغت النساء کا بھی انتقال ہوگیا، اگر ہبہ مکمل ہوگیا تو فراغت النساء کے ورثاء میں اب صرف دو بھتیجے: انوارالحسن، سکندر ضیاء، چھ بھتیجیاں: چاند، شبانہ، فرزانہ، رانا، شاہانہ، رخسانہ ہیں، اولاد کوئی نہیں ہے؟

اور اگر ہبہ مکمل نہیں ہوا ہے تو منور حسین ہی اس مکان مذکورہ کے مالک قرار پائیں گے، تو ان کے انتقال پر ان کے ورثاء میں ایک بیوی فراغت النساء اور ماموں زاد بھائی بہن ہیں، ماموں زاد بھائی چار ہیں: صابر حسین، اختر حسین، ذاکر حسین، ساغر حسین، اور ماموں زاد بہنیں پانچ ہیں: چندہ بیگم، رئیسی بیگم، نویسی بیگم، ببن بیگم، نور جہاں، شرعی حکم تحریر فرمادیں؟

المستفتی: انوارالحسن فیض گنج مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر واقعی فراغت النساء کو ہبہ کرکے قبضہ دیدیا تھا اور اس کے سرکاری کاغذ بھی تیار کردیئے تھے، تو ایسی صورت میں فراغت النساء اس کی مالک ہوچکی ہے، اور فراغت النساء کی وفات کے بعد جبکہ بوقت وفات اس کے بھائی اور بہنیں کوئی موجود نہ ہوں تو اس کے حقیقی بھتیجے وارث ہوں گے اور بھتیجیاں وارث نہیں ہوتیں، لہٰذا سوالنامہ میں صرف دو بھتیجوں کا ذکر ہے، اگر ان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے تو مذکورہ مکان دونوں بھتیجوں کے درمیان نصفا نصفی تقسیم ہوگا۔

وتتم الهبة بالقبض الكامل . (شامی، کتاب الهبة کراچی ٥/ ٦٩٠، زکریا ٨/ ٤٩٣)

وتتم الهبة بالقبض الكامل لقوله عليه السلام لاتجوز الهبة إلا مقبوضة. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دار الكتب العلمية بيروت ٣/ ٣٩١، مصری قدیم ٢/ ٣٥٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۱۱۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۵/۱۴۳۴ھ

کیا ماموں زاد بھائی بہن وارث ہوسکتے ہیں؟

سوال [۱۱۴۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مشیت اللہ کی خود خرید کردہ جائیداد ہے اور اس کی پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا، کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی، دوسری بیوی سے بھی کوئی اولاد نہیں ہے، دوسری بیوی آمنہ بیگم ہے، جو زندہ ہے، مشیت اللہ کا کوئی قریبی رشتہ دار نہیں ہے، اس وقت مشیت اللہ کے سگے ماموں زاد بھائی اور بہنیں ہیں، مشیت اللہ کی جائیداد میں سگے ماموں زاد بھائی اور بہنوں کا حصہ ہوتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالرشید، کاشی پور نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ماتقدم وعدم موانع ارث اگر مشیت اللہ کے آبائی کوئی رشتہ دار زندہ نہیں ہیں صرف نہیالی رشتہ داروں میں ماموں زاد بھائی بہن زندہ ہیں تو کل جائیداد کو ۴؍ سہام میں تقسیم کر کے ایک موجودہ بیوی کو ملے گا، باقی تین ماموں زاد بھائی بہنوں کو ملے گا۔ (سراجی باب ذوی الارحام) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ شوال المکرّم ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۹۳۳)

بھانجے کے وارث ہونے کی شکل

سوال [۱۱۴۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص کا انتقال ہوا، اس کے ورثاء میں ذوی الفروض اور عصبات میں سے کوئی نہیں ہے، ذوی الارحام میں صرف بھانجے اور بھتیجے کی لڑکی ہے تو اس کی وراثت کس طرح تقسیم ہوگی؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اس صورت میں صرف بھانجے وارث ہوں گے اور بھتیجے کی لڑکی محروم ہو جائے گی، کیونکہ ذوی الارحام میں جو اقرب الی المیت ہوتا ہے وہ اولیٰ بالمیراث ہوتا ہے۔

الحكم فيهم كالحكم في الصنف الأول أعني أولٰهم بالميراث أقربهم إلى الميراث. (سراجی فصل فی الصنف الثالث ص:۴۹)

وتحته في الشريفية بنت الأخت أولى من ابن بنت الأخ لأنها أقرب. (شریفیه ص:۱۲۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍ربیع الاول ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/۱۶۹۱)

کیا بھانجہ وارث ہوسکتا ہے؟

سوال [۱۱۴۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ محمد احمد کا انتقال ہوگیا، یہ غیر شادی شدہ تھا، اس کا ایک بھائی مشکور احمد تھا، اس کا انتقال محمد احمد سے پہلے ہو چکا تھا، اور مشکور احمد کی کوئی اولاد نہیں ہوئی، صرف بیوی موجود ہے اور محمد احمد مرحوم کی دو بہنیں تھیں: محمدی، انیسہ خاتون، محمدی کے شوہر کا انتقال محمدی سے پہلے ہو چکا تھا، نیز محمدی کے دو بیٹے ہیں: محمد جاوید، محمد پرویز، محمد پرویز کا انتقال بھی محمدی سے

پہلے ہو چکا تھا، اورانیسہ خاتون کے شوہر کا انتقال بھی انیسہ خاتون سے پہلے ہو چکا تھا، اوران کے بھی دو بیٹے ہیں: محمد عاصم، محمد ناظم، شریعت کی روشنی میں کس کو کتنا حصہ ملے گا؟

نوٹ: محمد احمد کی دونوں بہنوں محمدی، انیسہ خاتون کا انتقال محمد احمد سے پہلے ہو چکا تھا۔

المستفتی: شجاع الرحمٰن سنبھلی گیٹ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: محمد احمد کے ورثاء میں اپنے خاندان کا کوئی بھی مرد زندہ نہیں ہے، اور اسی طرح اس کی کوئی بہن بھی زندہ نہیں رہی، بلکہ اس کی موت کے وقت ایک بہن محمدی کا ایک بیٹا محمد جاوید زندہ رہا، اور دوسری بہن انیسہ خاتون کے دو بیٹے محمد عاصم، محمد ناظم زندہ رہے ہیں، لہٰذا محمد احمد کا سارا ترکہ محمد جاوید، محمد عاصم اور محمد ناظم جو اس کے حقیقی بھانجے ہیں ان تینوں کے درمیان تقسیم ہو جائے گا، لہٰذا ۲۷۰۰۰/ روپئے ان تینوں کے درمیان درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوں گے۔

میـــــت ۳ تداخل ۹۰۰۰/۲۷۰۰۰ روپئے

	بھانجہ محمد جاوید	بھانجہ محمد عاصم	بھانجہ محمد ناظم
سہام	۱	۱	۱
ترکہ	۹۰۰۰روپیہ	۹۰۰۰روپیہ	۹۰۰۰روپیہ

کل ۲۷۰۰۰/روپیہ مذکورہ تینوں میں سے ہر ایک کو ۹۰۰۰/ روپیہ ملیں گے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ ذی قعدہ ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۵۳۱/۳۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۱۱/۱۹ھ

ماموں، خالہ وغیرہ شرعی وارث ہیں یا نہیں؟

سوال [۱۱۴۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: (۱) مسماۃ فاطمہ زوجہ عبدالحمید مرحوم نے اپنے انتقال پر ایک مکان چھوڑا ہے، اورورثان میں چارلڑکیاں اورلڑکا چھوڑا، تقسیم پران میں سے کس کو کتنا حصہ ملے گا؟

(۲) یہ پانچوں بہن، بھائی شادی شدہ ہیں اور لاولد ہیں، لڑکے نے شادی کے بعد اپنی بیوی کو طلاق دیدی تھی، دوبارہ شادی نہیں کی، اس لیے وہ لاولد رہا، چاروں بہنیں بھی لاولد ہی ہیں، اب اس لڑکے کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔

لہٰذا یہ بتانے کی زحمت فرمائیں کہ اس لڑکے کے حصہ کا مالک کون ہوگا؟ چاروں بہنوں میں تقسیم ہوگا یا کسی اور وارث کو بھی پہنچتا ہے، جیسے کہ اس کے چچا یا تایا کی اولادیں ہیں، ننہال میں ماموں وغیرہ اورخالاؤں کی اولادیں ہیں، ان کو تو کچھ نہیں ملے گا؟ اگر ملے گا تو کتنا حصہ ان میں تقسیم ہوگا

المستفتی: محمد شمیم قریشی، اصالت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فاطمہ کا مکان اولاً چھ حصوں میں تقسیم ہوکر بیٹے کو دو اور چاروں بیٹیوں کو ایک ایک ملے گا، اوراس کے بعد جب بیٹا لاولد فوت ہوگیا، اوراس کی بیوی بھی نہیں ہے تو ایسی صورت میں بیٹے کے دونوں حصے چھ حصوں میں تقسیم ہوکر چاروں بہنوں کو ایک ایک حصہ ملے گا اور باقی دو حصے بیٹے کے تایا، چچا کی نرینہ اولاد کو ملیں گے اور تایا چچا کی نرینہ اولاد کے نام بنام تفصیل سامنے آجائے تو ان کے بارے میں لکھا جا سکتا ہے کہ کس کو کس طریقہ سے کتنا ملے گا؟ اور بیٹے کے ننہال والوں کو نہ اس کی ماں کی طرف سے کچھ پہنچے گا اور نہ اس کی طرف سے لہٰذا ماموں، خالہ اوران کی اولاد میں سے کوئی بھی اس مکان میں کسی بھی حصہ کا حقدار نہ ہوگا۔

﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ [النساء: ۱۱] فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۳۰ رشوال المکرّم ۱۴۳۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۵۰۴/۳۹)	۱۴۳۲/۱۰/۳۰ھ

اکلوتے علاتی بھائی کا نصف میراث کا دعویٰ کرنا

سوال [۱۱۴۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے، میرے شوہر کے ایک لڑکا پہلی بیوی سے ہے، اور مجھ سے دولڑکے اور ایک لڑکی ہے، لیکن پہلی بیوی والا لڑکا کہتا ہے کہ والد صاحب کے حصہ سے مجھے آدھا ملے گا، آپ سے گذارش ہے کہ شرعاً اس کو کتنا ملے گا اور مجھے اور میری اولاد کو کتنا ملے گا؟

المستفتیہ: نورجہاں بیگم کرولہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: برتقدیرِ صحت سوال وعدم موانع ارث وبعد ادائے حقوق ما تقدم مرحوم کا ترکہ درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

میـــــــــــــــــــــــــــــــت ۸

بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی
۱	۲	۲	۲	۱

مرحوم کا کل ترکہ ۸ر سہام میں تقسیم ہوکر بیوی کو ایک سہام اور لڑکوں کو دو، دو اور لڑکی کو ایک سہام ملے گا، پہلی بیوی کے لڑکے کا یہ کہنا کہ والد صاحب کے ترکہ میں سے میں اکیلا آدھے کا حقدار ہوں، صحیح ودرست نہیں ہے، بلکہ والد صاحب کے ترکہ میں سے اس کو بھی دیگر لڑکوں کی طرح دو ہی سہام ملیں گے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶ر جمادی الثانیہ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۲۷۷)

پاگل بھائی کی دیکھ بھال اور جائیداد کی تقسیم

سوال [۱۱۴۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: زید جسمانی وذہنی طور پر کمزور و گونگا بھی ہے، اچھا برا سوچنے وسمجھنے کی صلاحیت اس کو بالکل نہیں ہے، اس کی عمر تقریباً ۵۴/سال ہے، اس کی کوئی اولاد نہیں ہے، کیونکہ اس کی شادی نہیں ہوئی ہے، اور وہ اپنے حقیقی بھائی کی سرپرستی میں انہیں کے ساتھ رہتا ہے، زید کے چار بھائی ہیں، جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

(۱) دو بھائی حقیقی جو زید کی ماں سے ہیں اور ایک بہن جو حیات ہیں۔

(۲) دو بھائی جن کا انتقال ہو چکا ہے، دوسری ماں سے ہیں اور ان کی اولادیں حیات ہیں، زید کی ایک چھوٹی سی جائیداد ہے جس کا وہ تنہا مالک ہے یہ جائیداد اس کو والد سے بذریعہ ہبہ تحریری ملی تھی۔

سوال یہ ہے کہ مندرجہ حالات میں زید کی دیکھ بھال و زید کی ملکیت کا ترکہ کس کو جاتا ہے؟ اور کتنا جاتا ہے؟ زید کی حیات میں یا زید کی وفات کے بعد؟

المستفتی: محمد تحسین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: زید کی دیکھ بھال اس کے حقیقی بھائیوں کے ذمہ ہے، اس کی زندگی میں شرعاً اس کی جائیداد تقسیم نہیں ہوگی، اس کی جائیداد کا وہی تنہا مالک رہے گا، ہاں البتہ دونوں حقیقی بھائیوں اور حقیقی بہن کی زندگی میں زید کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کی جائیداد پانچ حصوں میں تقسیم ہو کر ہر بھائی کو دو، دو اور بہن کو ایک حصہ ملے گا۔

﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ. [النساء: ١١]﴾ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۴/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۹۷۵۶/۳۸)

ورثاء میں صرف ایک لڑکی ہو تو کیا حکم ہے؟

سوال [۱۱۴۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ برکتی بیوہ نواسی صاحب کا انتقال ہوا، ورثاء میں صرف ایک لڑکی چھوڑی، جس کا اب انتقال ہوگیا ہے، اوراس کے ایک لڑکا شفیع احمد اور ایک لڑکی حشمہ موجود ہیں، اسی طرح مرحومہ برکتی کے دیور کی اولاد بھی ہے، جن میں سے دولڑکے منشی اور شوکت علی کا انتقال ہوگیا ہے، اور دولڑکے محمد جان اور عبدالعزیز زندہ ہیں، فریقین میں سے کون مرحومہ کا وارث بنے گا؟ ازروئے شرع جائیداد کی تقسیم فرما کر ممنون فرمائیں؟

المستفتی: شفیع احمد رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ما تقدم وعدم موانع ارث برکتی مرحومہ کا کل ترکہ مرحومہ کی لڑکی کو ملے گا، لڑکی کے انتقال کے بعد اس کے لڑکے اورلڑکی کی طرف منتقل ہوجائے گا، لہٰذا کل ترکہ ۳/سہام میں تقسیم ہوکر لڑکے شفیع احمد کو ۲/ اورلڑکی حشمہ کو ایک ملے گا، برکتی کے دیور کی اولاد کو شرعاً کچھ نہیں ملے گا۔

الرد ضد العول ما فضل من فرض ذوی الفروض ولا مستحق له يرد على ذوی الفروض بقدر حقوقهم (إلى قوله) ثم مسائل الباب على أقسام أربعة: أحدها أن يكون فی المسئلة جنس واحد ممن يرد عليه عند عدم من لا يرد عليه فاجعل المسئلة من رؤسهم وفی هامشه: وحينئذ تكون المسئلة واحدة. (سراجی ص:۳۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۲۰۰/۲۴)

پوتوں کا پھوپھیوں کو حصہ دینا

سوال [۱۱۴۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک زمیندار صاحب ثروت شخص ہے، اوراس کے کچھ بڑے لڑکے اور کچھ

لڑکیاں ہیں، زید اپنی حیات میں اپنی جائیداد تقسیم کرتا ہے، لڑکوں کو حصہ دیتا ہے، اور لڑکیوں کو حصہ نہیں دیتا ہے، اور پھر تقسیم کے بعد دنیا سے کوچ کر جاتا ہے، پھر زید کے لڑکے بھی اپنی بہنوں کو حصہ نہیں دیتے اور انتقال کر جاتے ہیں، بہرحال وہ جائیداد زید کے پوتوں کے نام آجاتی ہے، زید کی لڑکیوں کی حیات میں، تو کیا اس صورت میں پوتوں کو اپنی پھوپھی کا حصہ دینا لازم اور واجب ہے؟ اور نہ دینے کی صورت میں گنہگار زید ہے یا بیٹے، اور پوتے سب شریک ہیں؟

المستفتی: محمد شہزاد بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر زید نے اپنی زندگی میں جائیداد لڑکوں کو بطور ہبہ مالک بنا کر کے قبضہ میں دیدی ہے تو لڑکے اس جائیداد کے مالک ہو جائیں گے، مگر لڑکیوں کو نہ دینے کی وجہ سے زید سخت گنہگار رہوگا، اور اگر زید نے ہبہ کر کے مالک نہیں بنایا ہے، صرف وصیت کی ہے کہ مرنے کے بعد جائیداد کے مالک لڑکے ہوں گے، لڑکیاں نہیں ہوں گی تو شرعاً ایسی وصیت معتبر نہیں ہے، اور زید کے مرنے کے بعد لڑکیوں کو جائیداد میں سے شرعی حق کے مطالبہ کا حق حاصل ہوگا اور نہ دینے کی صورت میں لڑکے لڑکیوں کے حقوق کے غاصب شمار ہوں گے، اور اللہ کی طرف سے سخت پکڑ ہوگی، اسی طرح جب پوتوں کو معلوم ہے کہ ان کی پھوپھیوں کا حق دبایا گیا ہے، تو ان کا فرض بنتا ہے کہ پھوپھیوں کا حق نکال کر دیدیں اگر نہیں دیں گے تو پوتے بھی گنہگار رہوں گے۔

وتتم الهبة بالقبض الكامل (تحته في الشامية) فيشترط القبض قبل الموت. (در مختار مع الشامی، کتاب الهبة، زکریا ۸/۴۹۳، کراچی ۵/۶۹۰)

لايتم التبرع إلا بالقبض. (قواعد الفقه اشرفی ص: ۱۰، قاعده: ۲۶۲)

عن أنس بن مالك –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: من فر من ميراث وارثه، قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة. (سنن ابن ماجه، باب الحيف في الوصية، النسخة الهندية ۲/۱۹۴، دار السلام رقم: ۲۷۰۳)

عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ: لاتجوز وصية لوارث، إلا

إن شاء الورثة. (السنن الكبرىٰ للبيهقى، باب نسخ الوصية للوالدين والأقربين، دار الفكر ۹/ ۳۵٦، رقم: ۱۲۷۹۷ - ۱۲۷۹۸، سنن الدار قطنى، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ۸٦، رقم: ۲٤٥۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ ر محرم الحرام ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۹۲۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۱/۶ھ

۸ باب استحقاق الإرث و عدمه

اولاد کو زندگی میں تقسیم کے مطالبہ کا حق نہیں

سوال [۱۱۴۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: نذیر احمد کے دو بیٹے، فیروز وجمشید، چار بیٹیاں اور بیوی زبیدہ ہیں، نذیر نے احمد اپنی پشتینی زمین میں سے بیچ کر چاروں لڑکیوں کو ان کا حق وحصہ دیدیا اور فیروز کو اس کے مطالبہ پر چار لاکھ روپیہ قرض دیا، نذیر احمد کا فیروز سے کچھ اختلاف ہوگیا، نذیر احمد نے قرض کی رقم کا تقاضہ شروع کر کے تقریباً پچاس ہزار روپیہ حاصل کیا، اس کے بعد نذیر احمد نے ایک پنچایت بلائی، جس میں اپنے ہم موافق عبد السبحان، شفیع احمد، اور محمد کو پنچ منتخب کیا، فیروز پریشان حال نے مولوی احمد اللہ کو پنچایت میں شامل کروایا، (نذیر احمد کے پاس تین منزلہ مکان تقریباً ۳۲ رکڑی رقبہ کا، ایک نیم تعمیر شدہ مکان ۸ رکڑی رقبہ کا ایک احاطہ، چاربسہ کی ایک دوکان تقریباً تین کڑی رقبہ کی، ایک ماروتی کار کے علاوہ گھریلو تمام اثاثہ ہیں) پنچایت میں نذیر احمد اور ہم موافق کا جارحانہ رویہ رہا، فیروز کو بری طرح گھر سے نکالنا چاہا، مگر مولوی احمد اللہ کی زبردست کوششوں سے نذیر احمد فیروز کو صرف ۸ رکڑی کا نیم تعمیر شدہ مکان اور تین کڑی رقبہ کی دوکان مع رجسٹری دینے پر آمادہ ہوئے، موقع کی نزاکت دیکھ کر مولوی احمد اللہ نے ۴/۶/ ۲۰۰۶ء کو ایک پنچایت نامہ لکھا جس کی فوٹو کاپی استفتاء کے ساتھ منسلک ہے:

(۱) پنچ نامہ پر ایک فریق زبیدہ کے دستخط نہیں ہیں۔

(۲) زبیدہ کے ذریعہ فیروز کے مکان کی رجسٹری ہونا طے تھی، مگر زبیدہ نے پنچوں سے رجسٹری کرنے سے انکار کردیا۔

(۳) نذیر احمد نے جمشید کو ۳۲ رکڑی رقبہ کا تین منزلہ مکان نیز فیروز کے علم کے بغیر چاربسہ کا احاطہ ماروتی کار وگھریلو تمام اثاثہ بھی دیدیا۔

(۴) نذیر احمد دماغی مریض تھے، مستقل زیر علاج رہتے تھے، ۲۰۰۸/۱۰/۲۳ء کو انتقال کر گئے۔

(۵) پنچایت میں ہی فیروز نے نذیر احمد کو ایک لاکھ روپئے نقد لوٹا دیئے۔

(۶) پنچ نامہ میں نذیر احمد کے دونوں مکان و دوکان اور احاطہ کے رقبہ اور مالیت کا ذکر نہیں ہے، اب سوال یہ ہے کہ:

(۱) کیا ایک فریق زبیدہ کے دستخط کے بغیر یہ پنچ نامہ شرعی طور پر درست ہے؟

(۲) کیا زبیدہ کے ذریعہ پنچنامہ کی خلاف ورزی سے اس کی شرعی حیثیت باقی ہے؟

(۳) کیا نذیر احمد کے دباؤ میں پنچوں کے ذریعہ لیا گیا فیصلہ شرعی ہے؟

(۴) کیا نذیر احمد کے ذریعہ فیروز کو دیا گیا حصہ شریعت کے مطابق ہے؟

المستفتی: فیروز کمال صدر چوک مئوناتھ بھنجن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نذیر احمد اپنی زندگی میں اپنی ساری جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ کے خود مالک ہیں اور ان کی زندگی میں ان کی اولاد میں سے کسی کو کسی قسم کے حق کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہے، سوالنامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فیروز احمد کا بیٹا ہے اور بیٹا باپ کی جائیداد میں فریق نہیں ہوتا ہے اور زبیدہ فیروز کی ماں ہے، فریق نہیں ہے، اس لیے پورے سوالنامہ کے جواب کا حاصل یہی ہے کہ دونوں بیٹوں میں سے کسی کو بھی فریق بن کر باپ سے کسی بھی طرح کے حق کے مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے، ہاں البتہ باپ اپنی مرضی سے بخوشی کچھ دینا چاہے تو باپ کو اختیار ہے اور باپ کے اوپر کسی کا دباؤ ڈالنا جائز نہیں ہے اور باپ کا فریق بن کر کے جائیداد دلوانے کے لیے پنچ نامہ جو بنوایا گیا ہے وہ غیر شرعی ہے اس لیے کہ باپ کے اوپر پنچوں کے ذریعہ سے دباؤ ڈالنے کا حق نہیں ہے۔

قال مشائخ بلخ: الإرث يثبت بعد موت المورث. (البحر الرائق، كتاب الفرائض، زكريا ۹/۳٦٤، كوئٹه ۸/٤۸۸، الفتاویٰ التاتارخانية زكريا ۲۰/۲۱٥، رقم: ۳۳۰۷۸، الموسوعة الفقهية الكويتية ۱۱/۲۱٤)

وفی الخانية: زوج بنيه الخمسة فی داره و کلهم فی عياله واختلفوا فی المتاع فهو للأب وللبنين الثياب التی عليهم لا غير. (شامی، مطلب: اجتمعا فی دار واحدة واکتسبا...... زکريا ٦/٥٠٢، کراچی ٤/٣٢٥)

إذا کان الولد فی عيال أبيه ومعينا له يکون جميع ما تحصل من الکسب لأبيه. (الفتاویٰ الکاملية ص: ٥١، بحواله فتاویٰ عثمانی ٣/٥٢)

المالک هو المتصرف فی الأعيان المملوکة کيف شاء من الملک. (بيضاوی شريف رشيد ١/٧، شرح المجلة رستم اتحاد ١/٦٥٤، رقم المادة: ١١٩٢، البنايه اشرفيه ديوبند ٨/٢١٩)

لايجوز التصرف فی مال غيره بلا إذنه ولا ولايته. (شامی، کتاب الغصب، مطلب فيما يجوز من التصرف بمال الغير...... زکريا ٩/٢٩١، کراچی ٦/٢٠٠، الموسوعة الفقهية الکويتية ٢٨/٢٩٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۱۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۹۷)	۱۳/۵/۱۴۳۴ھ

موت سے پہلے کسی کے مال میں وراثت جاری نہیں ہوتی

سوال [۱۱۴۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں اپنے والدین کی سب سے بڑی اولاد ہوں، میرے دو چھوٹے بھائی اور ایک لے پالک بہن ہے، میں شادی شدہ ہوں، میرا کھانا پینا، والدین سے الگ ہے، لیکن ابھی سب لوگ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں، میری والدہ میری بیوی کو بہت پریشان کرتی ہیں، اور بھائیوں سے بھی گالیاں دلواتی ہیں، وہ چاہتی ہیں کہ میں یہ گھر چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں، اور میں اس حالت میں نہیں ہوں کہ کہیں کرایہ کا مکان لے سکوں:

(۱) دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا ان حالات میں جبکہ آپس میں نبھاؤ نہیں ہو پارہا ہے، والدین

کی یہ ذمہ داری ہے کہ مکان تقسیم کردیں تاکہ آپسی لڑائی جھگڑا ختم ہوجائے، اور سکون نصیب ہو۔

(۲) میرے والد نے اپنے دادا الٰہی مکان میں سے تقریباً ۲۵؍گز جگہ مجھے دیدی تھی، جس کی قیمت ڈیڑھ لاکھ روپیہ تھی، میں نے اس پر قبضہ کر کے تعمیر شروع کردی تھی، لیکن پھر تایا وغیرہ سے تنازع ہوا اور مجبور ہوکر والد صاحب نے ان کے ہاتھ فروخت کردی اور اس کی قیمت سے والد صاحب نے دونوں چھوٹے بھائیوں کو کاروبار کرادیا، اس میں سے مجھ کو کچھ نہیں دیا، تو کیا شرعاً یا اخلاقاً مجھے بھی حصہ ملنا چاہیے یا نہیں؟

(۳) ایک مکان والدہ کے نام ہے جس کی قیمت ساڑھے تین لاکھ روپیہ ہوگی، کیا اس میں میرا حق ہوتا ہے یا نہیں؟

(۴) والدہ کہتی ہیں کہ اگر میرے پاس رہنا ہے تو بیوی کو طلاق دو تو کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد عارف اصالت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) انتقال سے پہلے پہلے مکان باپ کی ملکیت ہے، کسی وارث کا اس میں کوئی حق نہیں ہے، اس لیے شرعاً باپ کی یہ ذمہ داری نہیں کہ وہ مکان اپنی اولاد کے درمیان تقسیم کرے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۴/ ۴۳۸، جدید ڈابھیل ۲۰/ ۲۳۷)

إن حقيقة الملک للوارث تثبت عند موت المورث وقبل الموت تثبت مجرد حق الملک. (البنايه، كتاب الفرائض، اشرفيه ديوبند ۱۳/ ۳۹٤)

قال مشائخ بلخ: الإرث يجري بعد موت المورث. (الفتاوىٰ التاتارخانية ۲۰/ ۲۱۵، رقم: ۳۳۰۷۸)

(۲) جب آپ کے والد نے ۲۵؍گز جگہ آپ کو دیدی اور آپ نے اس پر قبضہ بھی کرلیا تو اس جگہ کے آپ مالک ہوگئے، جب والد صاحب نے آپسی نزاع کی وجہ سے وہ جگہ فروخت کردی تو ان پر لازم تھا کہ اس کی قیمت آپ کو دیتے، والد صاحب کا اس زمین کو فروخت کر کے اس کی قیمت سے چھوٹے بھائیوں کو کاروبار کرانا شرعاً جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۷/ ۲۵۴)

عن سمرة رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم: قال: إذا كانت الهبة لذي رحم محرم لم

یرجع فیها. (مستدرك حاکم، کتاب البیوع، مکتبه نزار مصطفیٰ الباز جدید ٣/٨٧٦، قدیم ٢/٦٠، رقم: ٢٣٢٤)

ولایرجع فی الهبة من المحارم بالقرابة کالأباء والأمهات وإن علوا، والأولاد وإن سفلوا، وأولاد البنین و أولاد البنات فی ذٰلک سواء. (فتاویٰ خانیة، فصل فی الرجوع فی الهبة، زکریا جدید ٣/١٨٨، وعلی هامش الهندیة ٣/٢٧٢، شامی زکریا ٨/٥١٢، کراچی ٥/٧٠٤)

(٣) جومکان والدہ کے نام ہے، ان کے انتقال سے پہلے کسی وارث کا اس میں کوئی حق نہیں ہے، ان کے انتقال کے بعد حسب ضابطہ شرعیہ آپ کا بھی اس میں حق ہوگا۔
(مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ١٤/ ٤٤١، ڈابھیل ٢/ ٢٣٧)

لأن حقیقة الملک للوارث تثبت عند موت المورث وقبل الموت تثبت مجرد حق الملک. (البنایه، کتاب الفرائض، اشرفیه دیوبند ١٣/ ٣٩٤)

قال مشائخ بلخ: الإرث یجری بعد موت المورث. (الفتاویٰ التاتارخانیة ٢٠/ ٢١٥، رقم: ٣٣٠٧٨)

(٤) بلاوجہ شرعی طلاق دینا کفران نعمت ہے، جواللہ تعالیٰ کوازحد ناپسند اور مبغوض ہے، اگر بیوی میں اخلاقی، معاشرتی کسی قسم کی خرابی نہیں ہے، اور بلاوجہ آپ کی والدہ آپ کوطلاق دینے پر مجبور کررہی ہیں تو ایسی صورت میں آپ پران کی اطاعت ضروری نہیں ہے، بلاوجہ بیوی کوطلاق دیناظلم اور قابل مواخذہ فعل ہے، اس لیے آپ کے لیے اپنی بیوی کوطلاق دینا جائز نہیں ہے، آپ کسی اور طریقے سے اپنی ماں کوخوش کرنے کی کوشش کریں۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ٤/ ١٥، ڈابھیل ١٩/ ٣٢)

وأما الطلاق فإن الأصل فیه الحظر ...... والإباحة للحاجة إلی الخلاص فإذا کان بلا سبب أصلا لم یکن فیه حاجة إلی الخلاص بل یکون حمقا و سفاهة رأی و مجرد کفران النعمة. (شامی، کتاب الطلاق زکریا ٤/ ٤٢٨، کراچی ٣/ ٢٢٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٢ر رجب المرجب ١٤٢٣ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٠/ ٧٧٤٩)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٢/ ٧/ ١٤٢٣ھ

باپ کی وفات کے بعد جائیداد سے اولاد کا حق متعلق ہوتا ہے

سوال [١١٤٢٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک مکان جو ٦٢ رگز کی آراضی میں تین منزل بنا ہوا ہے، میرے نام رجسٹری شدہ ہے، میرے شوہر بھی حیات ہیں، میرے تین لڑکے ہیں جن میں سے دو بڑے لڑکوں کی شادی ہوگئی ہے، اور ابھی چھوٹا لڑکا کنوارا ہے، میری چھ لڑکیاں ہیں ان میں سے ایک شادی شدہ لڑکی کا انتقال ہوگیا ہے، اس کے بچے حیات ہیں، میری باقی پانچوں لڑکیاں بھی شادی شدہ ہیں۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس مکان میں سے ہم دونوں میاں بیوی اور ہمارے لڑکوں اور لڑکیوں کا کتنا کتنا حصہ بنتا ہے، یہ مکان دو منزل تک میرے شوہر نے بنوایا ہے، اور تیسری منزل پر ایک ایک کمرہ ہمارے شادی شدہ دونوں لڑکوں نے بنوایا ہے، ہمارے ان دونوں لڑکوں کا کہنا ہے کہ ہم نے جو اس مکان میں کمرہ وغیرہ بنوانے میں روپیہ خرچ کیا ہے، ہمارے حصوں کے ساتھ ہمیں وہ روپیہ بھی واپس ملنا چاہیے، واضح ہو کہ ہمارے یہ دونوں لڑکے ہمارے اسی مکان میں اپنے بچوں کے ساتھ رہتے ہیں، آپ سے التماس ہے کہ از روئے شرع مطلع فرمائیں کہ اس مکان میں کس کا کتنا حصہ بنتا ہے؟ کیا دونوں بیٹوں کو وہ روپیہ بھی واپس دینا ضروری ہے، جو انہوں نے اس مکان میں کمرہ وغیرہ بنوانے میں لگایا ہے؟

المستفتی: ڈاکٹر عبدالرشید ساکن محلّہ کٹار شہید مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ مکان کے مالک آپ تنہا ہیں، آپ کی حیات میں آپ کی اولاد کا وراثت کا مطالبہ درست نہیں ہے، اس لیے کہ اولاد کا حق اس مکان میں آپ کی وفات کے بعد متعلق ہوگا اور اوپر کے دونوں کمرے اگر مذکورہ دونوں بچوں نے باپ کی فیملی میں رہ کر کما کر کے بنائے ہیں تو وہ دونوں کمرے بھی باپ ہی کی ملکیت ہیں، تو ایسی صورت میں بیٹوں کا ان کمروں کی تعمیر میں خرچہ کا الگ سے مطالبہ کرنا درست نہیں ہے،

اور باپ کی زندگی میں پورا مکان تینوں منزلوں کے ساتھ باپ ہی کی ملکیت ہے، اس میں کسی کا حق نہیں ہے، اور زندگی میں باپ سے حصہ مانگنے کا حق کسی بھی اولاد کو نہیں ہے، اور باپ اپنی زندگی میں اپنی ملکیت میں جس طرح چاہے تصرف کرسکتا ہے اور اگر آپ نے اپنے شوہر کو زمین پر تعمیر کی اجازت دی ہے تو اگر چہ زمین آپ کی ہے مگر عمارت شوہر کی شمار ہوگی، لہٰذا اس عمارت میں اولادوں کا حصہ داری کا دعویٰ کرنا درست نہیں ہے۔

قال مشائخ بلخ: الإرث يجری بعد موت المورث. (الفتاویٰ التاتارخانية ۲۰/ ۲۱۵، رقم: ۳۳۰۷۸)

وفی الخانية: زوج ...... بنيه الخمسة فی داره و كلهم فی عياله واختلفوا فی المتاع فهو للأب وللبنين الثياب التی عليهم لا غير. (شامی، مطلب: اجتمعا فی دار واحدة واكتسبا...... زكريا ۶/ ۵۰۲، كراچی ۴/ ۳۲۵)

إذا كان الولد فی عيال أبيه ومعينا له يكون جميع ما تحصل من الكسب لأبيه. (الفتاویٰ الكاملية ص: ۵۱، بحواله فتاویٰ عثمانی ۳/ ۵۲)

المالک هو المتصرف فی الأعيان المملوكة كيف شاء من الملک. (بيضاوی شريف رشيديه ۱/ ۷، شرح المجلة رستم اتحاد ۱/ ۵۶۴، رقم المادة: ۱۱۹۲، البنايه اشرفيه ديوبند ۸/ ۲۱۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

كتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۹۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/ ۵/ ۱۴۳۴ھ

ترکہ میں بلاثبوت دعویداری کالعدم ہے

سوال [۱۱۴۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: دس سال پہلے میں اور میری والدہ مکان کے سلسلے میں بہت پریشان تھیں، لوگوں کی بڑی خوشامد کی تو انہوں نے والدہ صاحبہ کو ایک مکان رہنے کے لیے دیدیا، دیتے وقت انہوں نے والدہ صاحبہ سے کہا کہ تم اکیلی ہو تمہارے ساتھ کون رہے گا، تو انہوں نے کہا کہ

میری بیٹی چمن رہے گی، لکھت میں میرا نام ہے یا نہیں، اس بارے میں یقین سے ابھی نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ کاغذ ہمارے پاس نہیں ہے، جنہوں نے مکان دیا ہے، ان کے پاس ہے، کاغذ ملنے پر پتہ چلے گا، والدہ صاحبہ کے صحن میں میں نے اپنے پیسے سے دو کمرے بنوائے اور میں اس میں رہنے لگی، کچھ دنوں کے بعد میری والدہ صاحبہ نے بہت سے لوگوں سے میری بیٹی کے لیے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ مکان میرے مرنے کے بعد میری نواسی آبگینہ کا ہے، انتقال سے پندرہ دن پہلے والدہ صاحبہ نے اپنے بڑے داماد سے کہا کہ یہ مکان میں مسجد کے نام کروں گی، پھر ان کا انتقال ہو گیا، انتقال کے چار پانچ روز کے بعد میرے بھانجے داماد نے کہا کہ مرحومہ کہہ کر گئی ہے، کہ سب تمہارا ہے، میری والدہ صاحبہ کے کچھ زیور اور کچھ روپے موجود ہیں، ایک پوتا اور دو بیٹیاں ہیں، چمن بیگم، پھول بیگم، پھول بیگم کے تین لڑکیاں ہیں، چمن بیگم کے دو لڑکیاں ہیں اور دو لڑکے ہیں، لہٰذا علماء دین اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟

المستفتیه: چمن بیگم رفعت پورہ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفیق: آپ کی والدہ کی طرف منسوب کر کے دعویٰ کرنے والے کئی طرح کے لوگ ہیں، اور کئی قسم کا دعویٰ ہے، اور کسی قسم کے دعویٰ کے لیے شرعی ثبوت نہیں ہے، اور نہ ہی کوئی معتبر دستاویز ہے، اس لیے ان دعویٰ داروں میں سے کسی کو نہیں ملے گا بلکہ شرعی ورثاء کے درمیان حصص شرعی کے طور پر تقسیم ہوگا، اگر دینے والے نے آپ کی والدہ کے ساتھ آپ کا نام بھی کاغذ میں لکھا ہے، اور دونوں کا برابر لکھا ہے، تو نصف آپ کا اور نصف والدہ کے ورثاء کا ہے جس میں آپ بھی شامل ہوں گی، آپ اپنی والدہ کی اولاد کی تعداد اور تفصیل تحریر فرمائیں اس کے بعد تقسیم کا نقشہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

إنه متی عرف بثبوت الشيء من طریق الإحاطة والتیقن فهو علی ذٰلک مالم یتیقن بخلافه. (قواعد الفقه اشرفی دیو بند ص: ۲۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۱۱ر صفر المظفر ۱۴۲۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۹۲۱)	۱۴۲۴/۲/۱۲ھ

مرحوم کی ملکیت میں اپنا دعویٰ کرنا

سوال [۱۱۴۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے پانچ ایکڑ زمین ترکہ میں چھوڑی، زید کی وفات کے بعد ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ یہ میری زمین ہے، لیکن دعویدار کے پاس کوئی سرکاری کاغذات وغیرہ نہیں ہیں، اسی طرح دوسرے شخص نے دعویٰ کیا کہ اس زمین میں دو ایکڑ زمین میری ہے، اس لیے کہ زید نے مجھ سے روپئے قرض لیے تھے، اور کہا تھا کہ میں واپس کردوں گا، ورنہ میری دو ایکڑ زمین لے لینا، اس دعویدار کے پاس بھی کوئی سرکاری کاغذات ثبوت کیلئے نہیں، تیسرے شخص نے کہا کہ میری بھی ایک ایکڑ زمین اس میں ہے، اس کے پاس بھی کوئی ثبوت کیلئے نہیں ہے، زید کے لڑکے نے کہا کہ پوری زمین میرے والد صاحب کی تھی، لہٰذا پوری زمین کا مستحق میں ہوں، زید کی بیماری طویل تھی، زمانۂ مرض میں ہم کو یا کسی بااثر آدمی کو کیوں نہیں بتلایا گیا نیز اب بھی اگر کوئی سرکاری ثبوت پیش کردے تو میں زمین دینے کے لیے تیار ہوں، زید نے جس شخص سے زمین خریدی تھی سرکاری کاغذات ابھی اس کے پاس ہی ہیں، البتہ اس کا کہنا ہے کہ میں نے اپنی زمین زید کو فروخت کی تھی، اور زید کئی سالوں سے وفات تک زمین کو بوتا رہا، اب ایسی صورت میں دعویداروں کو کچھ حصہ ملے گا یا پوری زمین زید کے لڑکے کو ملے گی؟

المستفتی: محمد ناظم الدین اکولہ، ناسک مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: شریعت میں کسی مرحوم کی ملکیت میں حق ثابت کرنے کے لیے شرعی ثبوت لازم ہے، اور شرعی ثبوت سرکاری کاغذات یا شرعی گواہ کا ہونا لازم ہے اور سوالنامہ میں مذکورہ تینوں مدعیوں میں سے کسی کے پاس بھی ایسا شرعی ثبوت موجود نہیں ہے، اس لیے ان تینوں دعویٰ کرنے والوں میں سے کسی کو بھی اس زمین میں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا، اور ساری زمین زید کے لڑکے ہی کی شمار ہوگی۔

وإذا ادعى الرجلان أرضا يعني يدعي كل واحد منهما أنها في يده لم يقض أنها في يد واحد منهما حتى يقيما البينة (إلى قوله) فلا تستحق لأحدهما بغير حجة. (هدایه، قبیل باب دعوى النسب ۳/۲۲۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۸۸۵۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۶/۱۲ھ

تمام شرعی ورثاء کو حصۂ وراثت دینا لازم

سوال [۱۱۴۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے چودہ بیگہ آراضی چھوڑی، اپنے وارثوں میں تین لڑکے عامر، شاہد، اور راغب چھوڑے، اور ایک لڑکی زاہدہ چھوڑی، لیکن لڑکی زاہدہ کا حصہ زید نے اپنی زندگی میں کچھ چیز یا رقم دے کر ادا کر دیا، باقی رہے، تین لڑکے عامر، شاہد اور راغب یہ چودہ بیگہ زمین کے برابر کے حصہ دار ہوئے، عامر نے جب انتقال کیا تو اپنے وارثوں میں دو بیویاں اور پانچ لڑکے چھوڑے اور دو لڑکیاں چھوڑیں۔ اور شاہد نے تین لڑکے اور دو لڑکیاں چھوڑیں۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ شاہد اور راغب کے لڑکے اس چودہ بیگہ آراضی پر قابض ہیں جو کہ زید نے چھوڑی ہے اور عامر کی اولاد بھی اس زید کے ترکہ کی برابر کی حصہ دار ہے، کیونکہ یہ ان کے ہی باپ اور دادا کا ترکہ ہے، عامر کے لڑکے شاہد اور راغب کے لڑکوں سے اپنے حصے کو علیحدہ کرنا چاہتے ہیں، جو کہ ان شاہد و راغب کی اولادوں کے ساتھ مشترک ہے، جو چاہتے ہیں وہ کرتے ہیں ان کو نہ تصرف دینا چاہتے ہیں، اور نہ زمین کا ماحصل دیانتداری سے دیتے ہیں، اس وجہ سے عامر کے لڑکے فائق وشائق وناظم وطاہر اپنے تیسرے حصے کو جو عند اللہ ان کا ہے، علیحدہ کرنا چاہتے ہیں، لیکن ان دونوں چچاؤں کے لڑکے اس تیسرے حصہ کو تقسیم کر کے نہیں دینا چاہتے، لہٰذا بحوالہ کتب معتبرہ حکم شریعت بتایا جائے کہ تیسرا حصہ جو کہ زید کی متروکہ جائیداد میں فائق وشائق وناظم وطاہر کا ہے اس کو تقسیم کرنا ضروری وواجب

ہے یا نہیں؟ اور نہ تقسیم کرنے کی صورت میں تقسیم نہ کرنے والوں کے لیے حکم شرعی کیا ہے؟

المستفتی: عبد الحفیظ محلّہ کٹکوئی امروہہ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عامر کی اولاد کا حق ان کو علیحدہ تقسیم کر کے دیدینا واجب اور لازم ہے، اور اگر دوسرے شرکاء ان کے حقوق تقسیم کر کے ان کو حوالہ نہیں کریں گے تو سخت گنہگار ہوں گے۔

إذا كان كل واحد من الشركاء ينتفع بنصيبه قسم بطلب أحدهم لأن القسمة حق لازم فيما يحتملها عند طلب أحدهم. (هدايه، كتاب القسمة، فصل فيما يقسم ولا يقسم، اشرفی دیوبند ٤/٤١٣) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ر ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۴۲٦۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۱۲/۲۳ھ

جائیداد میں بیٹوں کے درمیان برابری ضروری ہے

سوال [۱۱۴۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جب میرے شوہر بیمار ہوئے ۱۹۸٦ء یا ۱۹۸۵ء میں اور ان کی حالت ناساز ہوئی تو انہوں نے میرے بیٹے محمد افضل عرف جلال کو بلوایا اور یہ کہا کہ میری طبیعت خراب ہے، کسی وقت بھی کچھ بھی ہوسکتا ہے، اگر اس درمیان کچھ بھی ہوجاتا ہے اور میں اللہ کو پیارا ہو جاتا ہوں تو میرے بعد جو میرے بچے اور بچیاں ہیں ان کی تم پرورش اور جائیداد وغیرہ کا بٹوارہ کیسے کروگے، کیونکہ یہ بچے چھوٹے ہیں، اور اسکول جاتے ہیں اور کسی روزگار میں شامل نہیں ہیں، میرے بعد جو کچھ بھی ہے شہر سے کرولہ تک ان سب کے تم اور وہ برابر کے مالک ہو یہ میرے شوہر نے کہا تو میرا بیٹا افضل عرف جلال نے یہ کہا کہ یہ معاہدہ مجھے منظور نہیں ہے، اگر برابر سے بانٹنا ہے تو آج ہی اور ابھی بانٹیے تو میرے شوہر نے کہا کہ یہ بچے ہیں روزگار

کیسے چلے گا؟ کاروبار کیسے چلے گا؟ اس کا حل کیا ہے؟ تو میرے بیٹے نے جواب دیا کہ برابر سے بانٹنا ہے، تو آج ہی بانٹو، ابھی میرے جسم کے اندر طاقت اور جان ہے، اور کمانے کی طاقت اور قوت رکھتا ہوں، چونکہ جب آپ کے بچے بڑے ہوں گے اور برابر سے بانٹوں گا تو میں نے کیا کمایا؟ تو میرے شوہر نے کہا: کہ اس کا حل کیا ہے بتاؤ؟ تو میرے بیٹے نے کہا کہ وہ کام کروں گا جو ایک باپ اپنی اولاد کے لیے کرتا ہے، ان کی شادی کروں گا، انہیں مکان دوں گا، رہنے کے لیے، انہیں کاروبار کراؤں گا جو بھائی ساتھ رہے گا اسے ساتھ رکھوں گا، یہ بات میرے بیٹے نے میری موجودگی میں میرے بڑے بھائی محمد سلطان کی موجودگی میں میری نند سروری کی موجودگی میں کہی، کہ یہ ساری ذمہ داری پوری کروں گا، لیکن برابر سے نہیں بانٹوں گا، اس لیے میرے شوہر نے اقرار کیا، راضی اور خوشی سے میرے بیٹے کی اس بات کو، ہم تینوں میں سے ایک اللہ کو پیارا ہو گیا اور میرے بیٹے نے جو وعدہ اپنے باپ سے کیا تھا وہ بخوبی انجام دیا، اور میں اپنے بیٹے سے راضی ہوں اور اس نے یہ کام انجام دے دیا، اب جو جائیداد میرے نام ہے اور میرے شوہر کے نام ہے اس جائیداد میں میرے چھوٹے بیٹے ہیں ان کا کتنا حق بنتا ہے؟ میری اور میرے شوہر کی جو جائیداد ہے اور جس پر میرے بیٹے نے کہا تھا کہ میں برابر کا نہیں دوں گا، کیا اس جائیداد میں میرے چھوٹے بچوں کا حق برابر کا ہے یا نہیں؟

نوٹ: میرے بیٹے محمد افضل عرف جلال نے جو وعدہ میرے شوہر سے کیا تھا وہ میرے ایک بیٹے محمد معظم کے ساتھ پورا نہیں کیا تو اس بیٹے کا کتنا حق بنتا ہے، اس جائیداد میں جو میرے اور میرے شوہر کے نام ہے؟

المستفتیہ: شاہجہاں چاندوالی مسجد گل شہید مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ بغور پڑھا گیا اس کا حکم شرعی یہی ہے کہ باپ کی موت کے بعد اس کی تمام جائیداد میں اس کے لڑکے برابر کے حقدار ہوں گے، اور بڑے بیٹے افضل نے جو کہا ہے کہ میں برابر نہیں دوں گا، اور اس کو باپ نے قبول کیا ہے تو اس کو باپ کی طرف سے بڑے بیٹے افضل کو زیادہ دینے کے بارے میں وصیت کے درجہ میں

قرار دیا جاسکتا ہے، اور کسی ایک وارث کو زیادہ دینے اور دوسرے وارث کو کم دینے کی وصیت شریعت میں نافذ نہیں ہوتی؛ اس لیے چھوٹے بیٹے معظم کو بھی بڑے بیٹے افضل کے برابر ملے گا، چھوٹے بیٹے کے حق میں کمی کرنے کا حق کسی کو نہیں۔

اسی طرح جو ماں کے نام کی جائیداد ہے اس میں بھی سب بیٹے برابر کے حقدار ہوں گے، البتہ بیٹیاں ماں باپ کی میراث میں بیٹوں کے آدھے کا حقدار ہوتی ہیں۔

﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ. [النساء: ۱۱]﴾

قال الآلوسی فی تفسیره: وإیثار اسمی الذکر والأنثیٰ للتنصیص علی استواء الکبار والصغار من الفریقین فی الاستحقاق من غیر دخل للبلوغ والکبر فی ذٰلک أصلا. (روح المعانی، سوره نساء زکریا ۳/۳۳۹)

عن أبی أمامة الباهلی –رضی الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصیة لوارث، النسخة الهندیة ۲/ ۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، الوصایا، باب ماجاء فی الوصیة للوارث، النسخة الهندیة ۲/ ۳۹٦، دار السلام رقم: ۲۸۷۰، سنن ابن ماجه، لاوصیة لوارث، النسخة الهندیة ۲/ ۱۹٤ دار السلام رقم: ۲۷۱۳، مصنف عبد الرزاق، المجلس العلمی بیروت ٤/ ۳٤۸، رقم: ۷۲۷۷)

الإرث جبری لا یسقط بالإسقاط. (تکملة رد المحتار، مطلب: واقعة الفتاویٰ، کراچی ۷/ ۵۰۵، زکریا ۱۱/ ٦۷۸)

ولاتجوز لوارثه لقوله علیه السلام إن الله أعطی کل ذی حق حقه ألا لاوصیة للوارث، ولأنه یتأذی البعض بإیثار البعض ففی تجویزه قطیعة الرحم. (هدایه کتاب الوصایا، رشیدیه ٤/ ٦٤١، اشرفی دیوبند ٤/ ٦۵۷)

لو اجتمع إخوة یعملون فی ترکة أبیهم و نما المال فهو بینهم سویة ولو اختلفوا فی العمل والرائ. (شامی، مطلب اجتمعا فی دار واحدة واکتسبا ...... زکریا ٦/ ۵۰۲، کراچی ٤/ ۳۲۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ شوال المکرّم ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۱۸۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵؍ ۱۰؍ ۱۴۳۱ھ

باپ سے ملی ہوئی جائیداد میں بیٹوں کا برابر کا حصہ

سوال [۱۱۴۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے والد صاحب دو بھائی تھے، ایک کا نام طارق دوسرے کا نام عابد تھا، والد سے ملا ہوا ایک مکان گاؤں کے اندر تھا، یہ مکان طارق نے لے لیا اور دوسرے بھائی عابد سے کہا کہ آپ گاؤں کے پڑوس والے کھیت میں مکان بنالو، عابد نے کھیت والی زمین میں مکان بنالیا جو کافی بڑی زمین تھی، اور گاؤں کے اندر والے مکان سے تقریباً چار گنا تھی، مکان بننے کے بعد اچھی خاصی زمین بچ گئی، جس میں دونوں بھائی الگ الگ کھیتی کرتے رہے، پھر چک بندی ہوئی اور چک بندی میں دونوں بھائی طارق اور عابد کے نام درج ہوگئے، لیکن بعد میں آبادی سے متصل ہونے کی وجہ سے اس میں کھیتی کا کام نہیں ہو پا رہا تھا، اور جس کا مکان وہاں تھا اسی کے قبضہ میں رہی۔

تو دریافت یہ کرنا ہے کہ مکان تعمیر ہونے کے بعد باقی ماندہ زمین میں طارق اور عابد دونوں بھائیوں کا شرعاً حصہ ہے یا عابد جس کے قبضہ میں ہے اسی کی زمین رہے گی؟ شرعی حکم واضح فرمادیں۔

المستفتی: عابد خیر آباد سیتا پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: باپ سے ملی ہوئی جائیداد میں طارق اور عابد دونوں بھائیوں کا برابر حصہ ہے، اور محض عابد کے اس زمین پر قبضہ کرنے کی وجہ سے عابد اس زمین کا تنہا مالک نہیں ہے، بلکہ دوسرے بھائی کا بھی اس میں شرعی حصہ ہے، اور دونوں اس زمین کے آدھے آدھے حصے کے مالک ہیں، اور سوالنامہ سے معلوم ہوا کہ چک بندی میں بھی دونوں بھائیوں کے نام درج ہیں؛ اس لیے دونوں بھائی برابر کے شریک ہوں گے۔

أن أعيان المتوفى المتروكة عنه مشتركة بين الورثة على حسب حصصهم. (شرح المجلة رستم اتحاد ۱/ ۶۱۰، رقم المادة: ۱۰۹۲)

فشركة الأملاك العين يرثها رجلان و يشتريانها فلا يجوز لأحدهما

أن يتصرف في نصيب الآخر إلا بإذنه وكل واحد منهما في نصيب صاحبه كالأجنبي . (هدايه، كتاب الشركة، اشرفي ديوبند ٢/٦٢٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ جمادی الثانیہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۱۵۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۶/۲۴ھ

جہیز اور زیورات میراث کا بدل نہیں

سوال [۱۱۴۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک زمین دار شخص ہے، اس کے لڑکے لڑکیاں بھی ہیں، زید لڑکوں کو تو زمین میں سے حصہ دیتا ہے، مگر لڑکیوں کے بارے میں کہتا ہے کہ میں اس کے حصہ کا جہیز وزیورات دیتا ہوں، کیا اس صورت میں زید لڑکیوں کا حصہ ادا کرنے والا ہوگا اور گناہ سے بری ہوجائے گا؟

المستفتی: محمد ارشد بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جہیز وزیورات لڑکیوں کو دینا صلہ رحمی اور حسن سلوک ہے، اس کی وجہ سے زید کے مرنے کے بعد اس کی میراث جو من جانب اللہ لڑکیوں کا واجبی حق ہے وہ اس سے محروم نہیں ہوں گی، ان کو اپنا حق شرعی ملے گا۔

عن سليمان بن موسىٰ قال: قال رسول الله ﷺ: من قطع ميراثا فرضه الله، قطع الله ميراثه من الجنة. (سنن سعيد بن منصور، باب من قطع ميراثا فرضه الله، دار الكتب العلمية بيروت ١/٩٦، رقم: ٢٨٥-٢٨٦)

عن أنس بن مالك –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: من فر من ميراث وارثه، قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة. (سنن ابن ماجه، باب الحيف في الوصية، النسخة الهندية ٢/١٩٤، دار السلام رقم: ٢٧٠٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ محرم الحرام ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۰۹۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۱/۱۳ھ

حفاظت کی غرض سے جائیداد کسی وارث کے نام کرنے سے وہ مالک نہ ہوگا

سوال [۱۱۲۳۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: حسن خاں عندالوفات تین لڑکے: قبول خاں، مقبول خاں گورا خاں، ایک بیوی: بکی بی بی کو چھوڑ کر رخصت ہوئے، بعد وفات جس وقت سرکاری بندو بست آیا، قبول خاں بڑے بھائی کے عمر دراز ہونے کی وجہ سے اور دیگر دونوں بھائیوں کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے زمین و جائیداد کا پٹہ قبول خاں کے نام ہوگیا، تینوں بھائی اور ان کی والدہ ایک ساتھ زندگی گذارتے رہے، بعدہٗ قبول خاں عندالوفات اپنے لڑکے تجمل خاں اور والدہ بکی بی بی اور دونوں بھائی مقبول خاں، گورا خاں کو چھوڑ کر رخصت ہوئے، مذکورہ زمین و جائیداد میں جو بنام قبول خاں تھی اس کو تجمل خاں اور ان کے دونوں چچا مقبول خاں، گورا خاں برابر سرابر عمل دخل کرتے رہے، اور آپس میں بنٹن پتر بھی کر لیے اور بکی بی بی کی پرورش بھی کرتے رہے، اسی دوران جب سرکاری چک بندی آئی تو تجمل خاں حسب تقسیم مذکورہ بالا یعنی اپنے دونوں چچاؤں کے نام منظوری دینے گئے، لیکن کچھ لوگوں کے یہ کہنے پر کہ تیرے باپ کے نام پر زمین جائیداد ہے، اس لیے تو اس کا حقدار ہے، اب وہ یکسر مکر گئے، اور دونوں چچاؤں کا نام کٹوا کر اپنا نام درج کروا لیا، اور ساری زمین جائیداد پر عمل دخل کرنے کے لیے کوٹ میں مقدمہ دائر کر چکے ہیں۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ قبول خاں کے بڑے بھائی ہونے کے ناطے حسن خاں کی زمین ان کے نام ہوگئی، اور ایسے معاملے ہمارے علاقہ میں کئی ایک ہوئے بھی ہیں اب کیا قبول خاں شرعاً اپنے باپ حسن خاں کی پوری زمین کے مالک ہو سکتے ہیں؟ اور کیا دونوں بھائیوں مقبول خاں، گورا خاں اور والدہ بکی بی بی یہ تینوں حسن خاں کی زمین سے محروم ہو سکتے ہیں؟ اور اگر زمین و جائیداد کے حصہ سے محروم نہیں ہو سکتے تو پھر قبول خاں کے لڑکے تجمل خاں کا باوجود بنٹن پتر اور چچاؤں کے عمل دخل کو مانتے ہوئے ان کو محروم کرنے کے لیے مقدمہ دائر کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: عبدالحنان کٹک اڑیسہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کسی مصلحت اور جائیداد کی حفاظت کی غرض سے کسی وارث کے نام کردینے کی وجہ سے وہ وارث پوری جائیداد کا تنہا وارث اور مالک نہیں بن سکتا، بلکہ اس میں سب کا حق بدستور باقی رہتا ہے، مذکورہ مسئلہ کے حالات سے صاف واضح ہے کہ خود تجمل خاں بھی ایک زمانہ تک اپنے آپ کو تنہا مالک نہیں سمجھتا تھا، لہٰذا تجمل کے لیے اپنے چچاؤں کا حق روک لینا اور مزید مقدمات قائم کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، محض اپنا نام درج کردینے کی وجہ سے وہ جائیداد کا حقیقی مالک نہیں ہوا، چچاؤں کا حق چچاؤں کو دیدینا لازم ہوگا۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/ ۳۱)

بيع التلجئة ويأتي متنافي الإقرار وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف عدو وهو ليس ببيع في الحقيقة. (شامي، باب الصرف، مطلب: في بيع التلجئة زكريا ٧/ ٥٤٢، كراچی ٥/ ٢٧٣، بدائع الصنائع زكريا ٤/ ٣٨٩، كراچی ٥/ ١٧٦، المبسوط، دار الكتب العلمية بيروت ٢٤/ ١٢٢) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ صفر المظفر ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۲۲۴)

بیوہ عورت کا اپنا مکان بیچ کر زندگی گزارنا

سوال [۱۱۴۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مشکوٰۃ جہاں بیوہ راحت علی مرحوم کے پاس ایک مکان ہے، بیوہ کے کوئی اولاد نہیں ہے، بیوہ اپنے مکان کو فروخت کرکے اس کے پیسے سے اپنی زندگی گذارنا چاہتی ہے اور اپنی زندگی میں اس کو فروخت کردینا چاہتی ہے، تاکہ مرنے کے بعد خاندانی جھگڑے پیدا نہ ہوں، کیا ان کی زندگی میں وارثین حقدار ہوں گے یا نہیں؟

بیوہ کے رشتہ داروں میں ایک بھائی ایک بہن حیات ہیں، جن کی اولادیں بھی ہیں، ایک

بھائی کا انتقال ہو چکا ہے، ان کی بیوہ، ایک لڑکا اور دو لڑکیاں ہیں، جن کی شادیاں ہو چکی ہیں، تین بہنوں کا انتقال ہو چکا ہے، جن کی اولادیں زندہ ہیں، اور سب کی شادیاں ہو چکی ہیں؟

المستفتی: ظفر علی محلّہ پنجابیان رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مشکوٰۃ جہاں جب تک زندہ ہے، اپنے مکان کی خود مالک ہے اس کی زندگی میں اس کا کوئی رشتہ دار وارث نہیں بن سکتا، وہ اپنی زندگی میں جیسے چاہے تصرف کر سکتی ہے، اس میں کسی کو دخل دینے کا حق نہیں، چاہے بیچ کر کے کارِ خیر میں پیسہ خرچ کرے یا اپنی ذات پر خرچ کرے۔

قال مشائخ بلخ: الإرث یجری بعد موت المورث. (الفتاویٰ التاتارخانیة ۲۰/ ۲۱۵، رقم: ۳۳۰۷۸)

المالک هو المتصرف فی الأعیان المملوکة کیف شاء من الملک. (بیضاوی شریف رشیدیه ۱/ ۷)

کل یتصرف فی ملکه کیف شاء. (شرح المجلة رستم اتحاد ۱/ ٦٥٤، رقم المادة: ۱۱۹۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۰۶)

والدہ نے مکان چار لڑکوں کے ہاتھ فروخت کر دیا تو دیگر ورثاء کا اس میں حق نہیں

سوال [۱۱۴۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: حکیم صاحب مرحوم کی آٹھ اولادیں ہیں، دو لڑکیاں، چھ لڑکے، دو لڑکیوں اور دو بڑے لڑکوں کی شادی حکیم صاحب نے اپنی بذات خود کمائی سے اپنی حیات میں ہی کر دی تھی، شادی کے بعد وہ دونوں بڑے لڑکے حکیم صاحب سے الگ ہو گئے اور حکیم صاحب سے الگ

ہونے کے بعد جوان دونوں شادی شدہ لڑکوں نے کمایا وہ صرف اپنی ذات خاص پر خرچ کیا، حکیم صاحب نے ان دونوں شادی شدہ لڑکوں کی کمائی سے کوئی واسطہ نہیں رکھا، حکیم صاحب سے ان دونوں شادی شدہ لڑکوں کی جتنی مدد ہوسکی یہ مدد کرتے رہے، ان چاروں شادی شدہ اولادوں کی شادی کے تقریباً آٹھ برس کے بعد حکیم صاحب نے ایک اور زمین خریدی، اور اس زمین کو اپنے چار چھوٹے لڑکوں کے نام کردیا، جس وقت یہ زمین خریدی اس برس چار چھوٹے لڑکوں میں سے صرف ایک ہی لڑکا بالغ تھا، اور باقی اس کے نابالغ لڑکے تھے، زمین خریدنے کے کچھ عرصہ بعد حکیم صاحب نے اس مکان کو تعمیر کرنے کے لیے سوچا اور ایک نقشہ ان چاروں لڑکوں کے نام سے بنوایا جن چار لڑکوں کے نام پر زمین تھی، اور مکان تعمیر کرانا شروع کردیا، مکان کی تعمیر ہوگئی، لیکن پیسوں کی کمی کی وجہ سے یہ مکان نامکمل رہ گیا۔

چونکہ اس مکان کا پلاسٹر فرش، کواڑ وغیرہ مکمل نہ ہوسکے، بعد میں اس نامکمل مکان کو حکیم صاحب کے ایک لڑکے نے جس کا نام اس مکان کے بیع نامہ میں لکھا ہوا ہے، اپنی کمائی سے مکمل کرادیا، مکان مکمل ہونے کے بعد حکیم صاحب نے ایک اور لڑکا جو بالغ تھا، شادی کردی، اور اس کے کچھ عرصہ کے بعد حکیم صاحب انتقال فرما گئے، لیکن حکیم صاحب اپنے تین لڑکوں کی شادی اپنی حیات میں نہ کرسکے، اور وہ تینوں لڑکے آج بھی غیر شادی شدہ ہیں، اور انہیں میں وہ لڑکا بھی ابھی غیر شادی شدہ ہے جس نے اس نامکمل مکان کو اپنی مزدوری کی کمائی سے مکمل کرادیا تھا، لہٰذا علماء دین سے گذارش ہے کہ وہ مذکورہ امور کی تمام باتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے اس مسئلہ کا تفصیل سے جواب لکھیں، کہ ان دو مکان اور ایک زمین کے علاوہ مکان میں باقی وہ اولادیں بھی حقدار ہیں جن کا اس مکان کے بیع نامہ میں کوئی نام نہیں لکھا ہوا ہے، یا صرف وہ چار لڑکے ہی ان میں حقدار ہیں جن کے نام یہ مکان، زمین حکیم صاحب نے اپنی حیات میں اپنی خوشی سے بغیر کسی کے بہکائے ہوئے کردی تھی؟

المستفتی: سلیم احمد کچا باغ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بیع نامہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم

صاحب مرحوم نے مذکورہ مکان، مذکورہ چاروں لڑکوں کے نام کسی مصلحت وغیرہ کے پیش نظر نہیں کیا ہے، بلکہ انہیں کے بدست قیمت دلا کر انہیں کو اس کا مالک بنانا مقصود ہے، اس لیے مذکورہ مکان کے حقدار یہی چاروں لڑکے ہوں گے، اس میں دوسرے ورثاء کا کوئی حق نہیں ہوگا۔(مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/۳۷) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/۱۵۶۷)

باپ بیٹے نے مل کر جس مکان کو چھڑایا ہو اس میں لڑکیاں حقدار ہیں یا نہیں؟

سوال [۱۱۴۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مکان نایاب بیگم زوجہ حبیب الرحمٰن نے اپنا ۱۹۶۳ء میں رہن رکھا، ۵۰۰/ روپیہ میں پانچ سال کے لیے، پھر بیماری کی وجہ سے نایاب بیگم کا ۱۹۶۳ء میں انتقال ہوگیا، اس کے بعد حبیب الرحمٰن نے اپنی اور اپنے بچوں کی مزدوری سے رہن رکھا ہوا مکان واپس کرلیا، ۱۹۶۷ء میں جبکہ حبیب الرحمٰن کے ۴/لڑکے ۲/لڑکیاں ہیں، سب بچوں کی شادی ہو چکی ہے، اب لڑکوں کا کہنا ہے کہ اس مکان میں لڑکیوں کا کوئی حصہ نہیں ہے، نہ قانوناً نہ شرعاً، مکان کی آراضی ۱۰۴/گز ہے، لہٰذا آپ بتائیے کہ شرعاً ہر ایک کا کس قدر حق ہوگا؟

المستفتی: محمد فاروق

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب باپ بیٹے نے مل کر رہن چھڑوایا ہے اور بیٹے اس وقت باپ کی فیملی میں تھے تو اس وقت کی حاصل شدہ تمام جائیداد کا مالک باپ ہی ہوگیا، لہٰذا مذکورہ مکان بھی شرعاً باپ ہی کی ملکیت سے چھڑایا گیا ہے، اس لیے باپ کے تمام ورثاء لڑکے لڑکیاں سب حقدار ہوں گے، کل ۸/سہام میں تقسیم ہو کر لڑکوں کو دو، دو اور لڑکیوں کو ایک ایک حصہ ملے گا۔

الأب و ابنه يكتسبان فی صنعة واحدة ولم يكن لهما شيئ فالكسب كله للأب إن كان الابن فی عياله لكونه معينا له. (شامی، الشركة، مطلب: اجتمعا فی دار واحدة واكتسبا …… زكريا ٦/٥٠٢، كراچی ٤/٣٢٥، هنديه زكريا جديد ٢/٣٣٢، قديم ٢/٣٢٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۴۳۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶/۴/۱۴۱۶ھ

جن لڑکوں نے باپ سے قرض لے کر مکان بنایا اس میں دیگر ورثاء کا حق نہیں

سوال [۱۱۴۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ باپ کے کاروبار سے ایک بیٹے نے ۵۰/ ہزار روپئے لے کر ایک مکان خریدا اور وہ ۵۰/ ہزار روپئے کچھ عرصہ میں تھوڑے تھوڑے کر کے ماں باپ کو واپس کردیئے، اسی طرح چھوٹے بیٹے نے باپ کے کاروبار سے ۵۰/ ہزار روپئے کے قریب لے کر ایک مکان خریدا اور کچھ عرصہ میں ماں باپ کو وہ روپئے واپس کردیئے، کیا ان دونوں مکانوں میں ماں باپ کے دوسرے ورثاء حقدار رہوں گے؟

اور ماں باپ کے وارثین میں ۴/ لڑکے اور ۲/ لڑکیاں ہیں اور یہ دونوں مکان ان دونوں لڑکوں کی اپنی ملکیت ہے، لہٰذا ماں باپ کا ترکہ ۴/ لڑکوں اور ۲/ لڑکیوں کے درمیان کس طرح تقسیم ہوگا؟ واضح فرمائیں۔

المستفتی: عبد الرحمٰن محلّہ پیر غیب مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ سے پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ دونوں بیٹوں نے باپ سے ۵۰/۵۰/ ہزار روپئے بطور قرض لیے ہیں اور بطور قرض لے کر اپنے اپنے ناموں سے مکان خرید لیے اور بعد میں باپ کو ۵۰/۵۰/ ہزار روپئے لیا ہوا قرض ادا کردیا ہے

تو ایسی صورت میں یہ دونوں مکان خریدنے والے لڑکوں کی ملکیت شمار ہوں گے، اور باپ کے کسی دیگر وارث کا حق ان دونوں مکانات میں متعلق نہیں ہوگا۔

اعلم أن أسباب الملک ثلاثة: ناقل کبیع وهبة وخلافة کإرث و إصالة وهو الاستیلاء حقیقة بوضع الید أو حکما بالتهیئة کنصب شبکة الصید. (در مختار مع الشامی، کتاب الصید زکریا ۱۰/۴۷، کراچی ٦/٤٦٣)

لأن منفعة النفل تخصه و منفعة الکسب له. (مجمع الأنهر، کتاب الکراهیة، فصل فی الکسبط دار الکتب العلمیة بیروت ٤/١٨٥، مصری قدیم ٢/٥٢٨، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ١٢/١٥٢، ٣٣/١٠٦)

إن القرض تبرع ألا یریٰ أنه لایقابله عوض للحال. (بدائع الصنائع، فصل فی شرائط رکن القرض، کراچی ٧/٣٩٤، زکریا ٦/٥١٩)

المالک هو المتصرف کیف شاء. (بیضاوی شریف، مکتبه رشیدیه ١/٧)

المراد من الترکة ما ترکه المیت خالیا عن تعلق حق الغیر. (البحر الرائق، کتاب الفرائض، زکریا ٩/ ٣٦٥، کوئٹه ٨/٤٨٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٦/شعبان المعظم ١٤٣٥ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٤١/١١٦٢٨)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٤٣٥/٨/٦ھ

قرض لے کر دوکان کھولنے والے کا انتقال ہوجائے تو دوکان کس کو ملے گی؟

سوال [١١٤٣٨]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسماۃ ریحانہ پروین کا نکاح ابو الکلام عرف منے ولد قدرت اللہ صاحب سے ہوا، قدرت اللہ صاحب نے بہو مسماۃ ریحانہ پروین کو زیور چڑھایا، اور ریحانہ پروین کے والد نے بھی زیور چڑھائے، ریحانہ پروین اور ابو الکلام عرف منے ولد قدرت اللہ کے تعلقات باہم آخر تک باقی رہے۔

لیکن قدرت اللہ صاحب اپنی بہو سے ناراض ہو گئے اور اپنا چڑھایا ہوا زیور واپس لے لیا، اب ریحانہ پروین کے پاس صرف اپنے والد کا زیور باقی ہے۔

درمیان میں ابوالکلام عرف منے نے اپنی بیوی ریحانہ پروین سے ان کا زیور بطور قرض لے کر دوکان کی اور اسی کے ساتھ ریحانہ پروین کے پدر بزرگوار جناب محمد اسلام صاحب نے اپنے داماد ابو الکلام صاحب کو ۵۵/ ہزار روپئے بطور قرض دوکان کرنے کے لیے دیئے، ابو الکلام صاحب کا انتقال ہو چکا ہے، مرنے سے قبل انہوں نے اس کا اقرار کیا کہ یہ دوکان میری بیوی کی ہے، اسی کے حوالے کر دی جائے، اس لیے کہ اس میں سب روپئے اسی کے لگے ہیں۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ دوکان کا مالک کون ہوگا؟ بیوی یا دوسرے حضرات؟ ابوالکلام کے والد قدرت اللہ، بہن گلزار بیگم، عشرت بیگم، ریموری بیگم، زینت بیگم، گلنا بیگم، اور نانا چچا کی اولاد بھی ہیں؟

المستفتی: محمد اسلم محمد اکرم، اصالت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مذکورہ میں دوکان میں سے ۵۵۰۰/ ہزار روپیہ کی مالیت ابو الکلام کے خسر ریحانہ کے والد جناب محمد اسلم صاحب کو ملے گی، اور مابقیہ بیوی ریحانہ کو ملے گی، دوسروں کا کوئی حق نہیں ہوگا۔

أو كان الكل دين المرض وهو ما كان ثابتا بإقراره في مرضه فإنه يصرف الباقي إليهم على حسب مقادير ديونهم. (الموسوعة الفقهية الكويتية ۳/ ۱۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ شوال المکرّم ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۳۰/۲۴)

کیا باپ کی زندگی میں ذاتی محنت سے خریدی گئی جائیداد میں دوسرے ورثاء شریک ہیں؟

سوال [۱۱۴۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: (۱) مثلاً زید دو بھائی اور چار بہنیں ہیں، سبھی صاحب اولاد ہیں، زید کی دو بہنوں کا انتقال والد کی موجودگی میں ہی ہو چکا ہے، کیا ان دو بہنوں کا حق والد کی جائیداد میں یا ان کی اولاد کا حق نانا کی جائیداد میں پہنچے گا یا نہیں؟

(۲) زید نے والد کی موجودگی میں اپنی محنت کی کمائی سے کچھ جائیداد اپنے نام سے خریدی ہے، کیا اس میں بھی دوسرے بھائی اور بہنوں کا حق ہوگا یا نہیں؟

(۳) اب والد کا انتقال ہوگیا ہے، دو بھائی اور دو بہن موجود ہیں، والد کی جائیداد میں اور موجودہ رقم جو چھوڑ گئے ہیں اس میں بھائیوں کو کتنا اور بہنوں کو کتنا کتنا ملے گا؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں مفصل جواب سے نوازیں۔ عین کرم ہوگا۔

نوٹ: واضح رہے کہ مرحوم کی بیوی کا انتقال بھی مرحوم سے پہلے ہو چکا تھا۔

المستفتی: محمد جمیل، گلشہید نزد چاند والی مسجد مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) زید کی جن دو بہنوں کا باپ کی حیات میں انتقال ہوا ہے، باپ کے انتقال کے بعد متروکہ جائیداد میں ان کا کوئی حق نہیں ہے، اسی طرح زید کے بھائی بہن کی موجودگی میں بہن کی اولاد یعنی بھانجوں وغیرہ کا نانا کی جائیداد میں کوئی حق نہیں ہے۔

وشروطه ثلاثة: موت مورث حقيقة أو حكما كمفقود أو تقديراً كجنين فيه غرة ووجود وارثه عند موته حيا و حقيقة أو تقديرا. (شامی، کتاب الفرائض، زکریا ۱۰/ ۴۹۱، کراچی ۶/ ۷۵۸)

(۲) حسب تحریر سوال زید نے والد کی حیات میں اپنی ذاتی محنت سے جو جائیداد خریدی ہے، شرعاً اس میں کسی دوسرے کا کوئی حق نہیں ہے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله عليه: أقول سئل في ابن كبير ذي زوجة و عيال، له كسب مستقل حصل بسببه أموالا مات: هل هي لوالده خاصة، أم تقسم بين ورثته؟ أجاب هي للإبن تقسم بين ورثته. (تنقیح الفتاویٰ

الحامدية ۲/ ۱۷، بحواله محموديه ڈابھیل ۲۰/ ۴۱۱)

(۳) بتقدیر صحت سوال وعدم موانع ارث و بعدادائے حقوق ما تقدم مرحوم کی جائیداد وارثین کے درمیان درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگی:

مرحوم میت ۶

لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی
۲	۲	۱	۱

مرحوم کے ترکہ میں سے ہر وارث کو اتنا اتنا ملے گا جو اس کے نیچے درج ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ رجب المرجب ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۱۵۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴؍ ۷؍ ۱۴۳۱ھ

موروثہ جائیداد وارث کا حق ہے، دیگر لوگوں کو اس میں دباؤ کا حق نہیں

سوال [۱۱۴۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کی زندگی میں اس کی ایک شادی شدہ لڑکی کا انتقال ہو گیا، مرنے والی نے کچھ اولاد چھوڑی، پھر زید کا انتقال ہوا، زید نے مرتے وقت تین لڑکیاں، دو بھائی، ایک بہن چھوڑی، زید کے بھائی نے زید کی تینوں لڑکیوں اور چوتھی لڑکی کی اولاد کو اپنے حساب سے اس شرط پر موروثہ جائیداد پر قبضہ دیا کہ تم چاروں متوفی کے محلّہ کی مسجد کو دس دس ہزار روپیہ دوگی، چنانچہ شرط کے مطابق دو لڑکیوں اور تیسری کی اولاد نے جمع کر دیا، مگر تیسری لڑکی کہتی ہے، میں چچا کے پاس جمع نہیں کروں گی، بلکہ اپنی مرضی سے صرف کروں گی، اور جس مسجد کو چاہوں گی دوں گی، بالآخر اس لڑکی نے ایک اجنبی آدمی کے پاس دس ہزار روپیہ جمع کر دیا، اور کہا کہ فتویٰ منگا لیا جائے، فتویٰ جیسے کہے ویسے کر لیا جائے، نیز یہ بھی ملحوظ رہے کہ جو روپیہ مسجد کے نام سے جمع ہوا ہے اس کے سلسلے میں پنچایت میں دو فریق ہو گئے، ایک کہتا ہے کہ

بستی کی تمام مساجد کو دیا جائے، دوسرا کہتا ہے کہ صرف متوفی کے محلّہ کی مسجد کو دیا جائے، مندرجہ ذیل چند امور جواب طلب ہیں:

(۱) زید کی وراثت کس طرح تقسیم کی جائے؟

(۲) جمع شدہ چالیس ہزار روپیہ کو متوفی کے بہن بھائی تقسیم کرنے کا حق رکھتے ہیں؟

(۳) چچا کا یہ شرط لگانا کہ ہم موروثہ جائیداد پر لڑکیوں کا قبضہ اس وقت کرائیں گے جبکہ دس دس ہزار روپیہ مسجد کو دیں، اس شرط کی شرعاً کیا حیثیت ہے؟

(۴) کیا جمع شدہ تمام روپیہ متوفی کے محلّہ کو دیا جائے یا بستی کی جملہ مساجد پر تقسیم کر دیا جائے؟

المستفتی: مولانا ابوسعد دونکپوری ٹانڈہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق متقدمہ علی الارث وعدم موانع ارث زید کا ترکہ درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

زید میت　$\frac{۴۵}{۳}$

لڑکی	لڑکی	لڑکی	بھائی	بھائی	بہن	متوفی لڑکی کی اولاد
	(۲)		(۱)			
۱۰	۱۰	۱۰	۶	۶	۳	محروم

زید کا کل ترکہ ۴۵ ر حصوں میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا ملے گا جو اس کے نیچے درج ہے، اور متوفیٰ لڑکی کی اولاد اس لیے محروم ہے کیونکہ اس کا انتقال زید کی زندگی میں ہوگیا تھا۔

(۲) جمع شدہ چالیس ہزار روپیہ زید کے بھائی بہن تقسیم کرنے کا حق نہیں رکھتے، اس لیے کہ یہ روپیہ زید کی لڑکیوں کی ملک ہے۔

عن أبي حرة الرقاشي عن عمه أن رسول الله ﷺ قال: ألا! لا يحل مال امرئ إلا بطيب نفسٍ منه. (شعب الإيمان للبيهقي، دار الكتب العلمية بيروت ۳۸۷/٤، رقم: ٥٤٩٢، السنن الكبرىٰ للبيهقي دار الفكر بيروت ٥٠٦/٨، رقم: ١١٧٤٠)

ولهذا لايجوز لأحد أن يتصرف في ملك الغير بغير إذنه. (قواعد الفقه اشرفی ص: ۱۱۰)

(۳) چچا کا یہ شرط لگانا کہ ہم موروثہ جائیداد پر قبضہ اس وقت کرائیں گے جبکہ دس دس ہزار روپئے مسجد میں دیں، یہ شرط باطل ہے، اس کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں، بلکہ لڑکیوں کو اختیار ہے، کہ وہ جہاں چاہیں جس طرح چاہیں، صرف کریں، کسی کو مشورہ اور دباؤ کا حق نہیں اور جمع شدہ تمام روپیہ مالکوں کو واپس کر دینا لازم ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۶/ ۲۱۸، ڈابھیل ۱۵/ ۱۵۷)

ولهذا لايجوز لأحد أن يتصرف في ملك الغير بغير إذنه. (قواعد الفقه اشرفی ص: ۱۱۰)

المالك للشيئ هو الذي يتصرف فيه باختياره و مشيئته. (بدائع الصنائع، النكاح، فصل فی بيان ما يبطل به الخيار، زكريا ۲/ ۶۳۸، كراچی ۲/ ۳۲۷)

الملك ما من شانه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص. (شامی مطلب: فی تعريف المال، زكريا ۷/ ۲۳۵، كراچی ۵/ ۵۰، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۹/۱۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۲۸ ربیع الاول ۱۴۲۰ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۰۸۸)	۲۸/۳/ ۱۴۲۰ھ

داماد کے علاج میں خرچ کی ہوئی رقم کا مطالبہ ترکہ سے کرنا

سوال [۱۱۴۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ محمد بلال ولد عبد المتین ساکن محلّہ بھٹی مرادآباد عمر تقریباً ۳۰ سال کا مؤرخہ: ۱۰/ نومبر ۲۰۰۶ء کو ایک سال کی بیماری کے بعد انتقال ہوگیا، بلال میرے خالہ زاد بھائی تھے، بچپن سے اب تک میں بلال کی والدہ جو کہ میری حقیقی خالہ ہیں کے ساتھ رہتا چلا آرہا ہوں، بلال

میرے ساتھ کاروبار میں شریک تھے، شادی سے قبل ایک ساتھ رہتے تھے، جب وہ شیر خوار تھے، تو بلال کے والد نے ان کی والدہ کو طلاق دیدی تھی، بلال کا کوئی سگا بھائی یا سگی بہن نہیں ہے، والدہ، والد حیات ہیں، والد نے طلاق کے بعد سے طلاق نامہ کے مطابق کسی بھی مطالبہ کی آج تک کوئی ادائیگی نہیں کی، اور نہ ہی بچہ کی پرورش کی اور نہ ہی دورانِ زندگی بلال سے کوئی رابطہ قائم کیا، البتہ بعد انتقال شکل ضرور دیکھی، بلال کی والدہ حیات ہیں، بیوی بھی حیات ہے، اور عدت میں ہے، لیکن اولاد کوئی نہیں ہے۔

(۱) مرحوم پر اس کے سسر نے بیماری کے دوران کچھ پیسہ اس کے علاج میں خرچ کیا تھا کیا وہ پیسہ قرض مانا جائے گا یا نہیں؟

(۲) بیوی کو دورانِ زندگی مہر کی ادائیگی نہیں کی گئی تھی، پہلے قرضہ کی ادائیگی ضروری ہے، یا مہر کی؟

(۳) اگر کچھ میراث بچتی ہے تو والد کا حق کتنی فیصدی اور بیوی کا حق کتنی فیصدی نکلتا ہے؟

(۴) بلال کے والد نے پیدائش سے انتقال تک اس پر کوئی پیسہ خرچ نہیں کیا اور نہ کوئی رابطہ رکھا، ایسے حالات میں کیا مرحوم کی میراث میں سے اس کے والد کا کوئی حق نکلتا ہے؟ اگر نکلتا ہے تو کتنی فیصدی؟

المستفتی: ہمایوں قمر ولد محمد کفیل محلّہ بھٹی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) اگر خسر نے بیماری کے موقع پر علاج میں جو خرچ کیا ہے اس کے بارے میں اس بات کی وضاحت نہیں کی ہے کہ یہ بطور قرض کے خرچ کیا جارہا ہے، تو یہ خرچ تبرع اور ہدیہ شمار ہوگا، قرضہ نہیں مانا جائے گا۔

هي تمليك العين مجانا أي بلا عوض. (شامی، کتاب الهبة، زکریا ۸/۴۸۸، کراچی ۵/۶۸۷)

(۲) اگر خسر کے علاج والا پیسہ تبرع اور ہدیہ میں شمار ہو جائے تو وہ قرض ہی شمار نہیں ہے، اس لیے بیوی کا مہر جو کہ قرض ہے اس کی ادائیگی بہر حال لازم رہے گی۔

إن المهر قد وجب بالعقد وصار دينا في ذمته. (بدائع، باب المهر، زكريا ٢/ ٥٨٤، كراچی ٢/ ٢٩١)

(۳-۴) چاہے بلال کے والد نے بلال پر کچھ بھی خرچ نہ کیا ہو شرعی طور پر پھر بھی بلال کے والد بلال کے شرعی وارث شمار ہوں گے، کل ترکہ چار سہام میں تقسیم ہوکر بلال کی بیوی کو مہر کے علاوہ ایک اور بلال کی ماں کو ایک اور بلال کے باپ کو دو ملیں گے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍شوال المکرّم ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۱۳۶/۳۸)

مرحوم کے ترکہ سے شادی کا خرچہ الگ سے نہیں ملے گا

سوال [۱۱۴۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے تمام بچوں کی شادی کردی ہے، ایک لڑکا غیر شادی شدہ ہے، اس کی شادی زید کے ترکہ سے کی جائے گی یا وہ اپنی کمائی سے کرے گا؟

المستفتی: اہلیہ شعیب رشید اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: غیر شادی شدہ لڑکے کو شادی کا خرچہ ترکہ میں سے الگ سے نہیں ملے گا، بلکہ اس کو دیگر لڑکوں کی طرح حصۂ شرعی ملے گا، ہاں البتہ اس کی شادی کے وقت میں اس کے دوسرے بھائیوں کا اخلاقی فریضہ ہے، کہ اس کی شادی میں اپنی جیب خاص سے خرچ کرنے میں بھرپور حصہ لیں۔

أن أعيان المتوفى المتروكة عنه مشتركة بين الورثة على حسب حصصهم. (شرح المجلة رستم اتحاد ١/ ٦١٠، رقم المادة: ١٠٩٢)

ولا يجوز لأحدهما أن يتصرف في نصيب الآخر إلا بأمره وكل واحد منهما كالأجنبي في نصيب صاحبه. (فتاویٰ عالمگیریہ، کتاب الشركة،

الباب الأول زكريا جديد ۲/ ۳۱۱، قديم ۲/ ۳۰۱، هدايه اشرفی ۲/ ٦٢٤)

تتعلق بتركة الميت حقوق أربعة مرتبة (إلى قوله) ثم يقسم الباقي بين ورثته بالكتاب والسنة وإجماع الأمة. (السراجي في الميراث ص:۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/شعبان المعظم ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۲۸)

بھائی کا اپنی لڑکیوں کے نام بیع نامہ رجسٹری کرانا

سوال [۱۱۴۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: پیر بخش کے چار لڑکے تھے، پیر بخش نے اپنے چاروں لڑکوں کو اپنی زندگی میں حصہ دے کر جائیداد تقسیم کردی تھی، پھر پیر بخش کے بڑے لڑکے کلوا جن کے صرف تین لڑکیاں ہیں، انہوں نے اپنی زندگی میں اپنی جائیداد اپنی تینوں لڑکیوں کے نام بیع نامہ رجسٹری کرادیا، پھر ان کا انتقال ہوگیا، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ اس میں بڑے لڑکے کے بھائی یا بھتیجوں کا کچھ حق ہے یا نہیں؟ شرعی حکم تحریر فرمادیں؟

المستفتی: محمد صدیق، کوری روانہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بڑے لڑکے کلوا کو اپنی زندگی میں اپنی جائیداد اور ملکیت کے بارے میں ہر طرح کا اختیار رہا ہے، اور شریعت نے اس کو اختیار دیا ہے کہ اپنی جائیداد اپنی زندگی میں فروخت کردے، یا کسی کو دیدے یا اپنے پاس رکھے، جب اس نے اپنی زندگی میں تینوں لڑکیوں کے نام بیع نامہ رجسٹری کردیا تھا، تو وہ جائیداد ان لڑکیوں کی ملکیت بن گئی اس جائیداد میں اب کلوا کے کسی وارث کا حق متعلق نہیں رہا، لہٰذا کلوا کے مرنے کے بعد اس کے بھائی یا بھتیجوں کو حق شرعی کے مطالبہ کرنے کا حق باقی نہیں رہا، اس لیے کہ حق شرعی ہی باقی نہیں رہا۔

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء من

الملک. (بیضاوی شریف رشیدیه ۱/ ۷)

لایجوز لأحد من المسلمین أخذ مال أحد بغیر سبب شرعی. (شامی، کتاب الحدود، مطلب: فی التعزیر بأخذ المال، کراچی ٤/٦١، زکریا ٦/ ١٠٦، البحر الرائق کوئٹه ٥/ ٤١، زکریا ٥/ ٦٨، هندیه زکریا قدیم ٢/ ١٦٧، جدید ٢/ ١٨١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۹۸۹/۳۸)

باپ کی جائیداد کسی ایک بھائی کی بیوی کے مہر میں دینا ممنوع

سوال [۱۱۴۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قاری عبد الکریم اور عبد الحکیم دونوں بھائی ۹۰؍ گز جگہ میں بنے ہوئے مکان کے مالک تھے، عبد الحکیم کے چار لڑکے (عبد الوحید، رفیق، شفیق اور شاہد) ہیں اور دو لڑکیاں ہیں، عبد الحکیم اور ان کی بیوی کا انتقال ہوگیا اور گھر کی ذمہ داری بڑے لڑکے عبد الوحید پر آ گئی، عبد الوحید نے اپنے چھوٹے بھائی رفیق احمد کی شادی اور ان کی بیوی کے مہر میں اپنے باپ کا حصہ لکھوا دیا، پختگی کے لیے رجسٹری کرادی، اور گواہ کے طور پر اپنے دونوں بہنوئیوں کے دستخط کرادیئے اور قاری عبد الکریم نے اپنا حصہ عبد الحکیم کے پوتے کے نام کردیا، صورت مذکورہ میں مندرجہ ذیل مسائل دریافت طلب ہیں:

(۱) جبکہ باپ کے حصے کی تقسیم نہیں ہوئی ہے، تو کیا دونوں بہنوئیوں کے دستخط کردینے سے بہنوں کی طرف سے اجازت شمار ہوگی یا نہیں؟

(۲) اگر بہنوں کی جانب سے اجازت شمار نہ ہو تو کیا خود عبد الوحید جس نے مکان مہر میں لکھوایا ہے اس کا حصہ اور جس کی بیوی ہے اس کا حصہ حق مہر میں دیا جائے گا یا نہیں؟

(۳) اگر دونوں کا حصہ مہر میں دینا واجب ہے تو چونکہ باپ کا پورا حصہ مہر میں لکھوایا تھا اس لیے مہر میں کچھ اور بھی دیا جائے گا؟

(۴) اگر عبدالوحید اور شوہر کا حصہ بھی مہر میں واجب نہ ہو تو پھر رفیق احمد کی بیوی کا مہر کیا ہوگا؟

المستفتی: نفیس احمد امروہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سائل اگر اپنے بیان میں سچا ہے تو مذکورہ مکان میں بھائیوں اور بہنوں کا شرعی حق ہے، پورا مکان دین مہر میں شمار نہیں ہوگا، بلکہ عبدالوحید اور رفیق احمد کا حصہ دین مہر میں شمار ہو سکتا ہے، باقی دو بھائیوں اور دو بہنوں کے حصے دین مہر میں شمار نہیں ہوں گے، بلکہ ان کے حصے ان کے لیے بدستور مکان میں جاری رہیں گے، لہٰذا مذکورہ مکان میں سے عبدالوحید اور رفیق احمد کا حصہ دین مہر میں شمار کر کے مکان کے بقیہ حصے دیگر ورثاء کے حق میں باقی رہیں گے، جو حسب ذیل نقشہ سے واضح ہوتا ہے۔

میت ۲/۱۰ توافق/۵ ترکہ ۹/۴۵ گز

بھائی	بھائی	بھائی	بھائی	بہن	بہن
عبدالوحید	رفیق	شفیق	شاہد	فاطمہ	رقیہ
۲	۲	۲	۲	۱	۱
۹رگز	۹رگز	۹رگز	۹رگز	۴رگز ۱/۲	۴رگز ۱/۲

اور سوالنامہ میں رجسٹری کی نقل کے نام سے جو کاغذ منسلک کر دیا گیا ہے یہ سرکاری رجسٹری کا کاغذ نہیں ہے، بلکہ اس کو رجسٹری کا کاغذ کہنا ہی درست نہیں ہے۔

لایجوز لأحد أن یتصرف في ملک غیرہ بلا إذنہ أو وکالة منہ أو ولایة علیہ وإن فعل کان ضامنا. (شرح المجلة تسلیم رستم باز ۱/ ۶۱، رقم المادة: ۹۶/) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍شعبان المعظم ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۶۲۲/۴۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۸/۴ھ

ماں کے انتقال کے بعد بڑی بیٹی کی بھی موت آجائے تو اس کی اولاد وارث ہوگی یا نہیں؟

سوال [۱۱۴۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسماۃ حفیظن خاتون کا انتقال ہوگیا، بوقت انتقال انہوں نے وارثین میں صرف چار لڑکیاں چھوڑیں، اور ترکہ میں جو زمین چھوڑی تھی اس پر لڑکیوں کے چچا زاد بھائی نے جبراً قبضہ کرلیا، ان چاروں لڑکیوں میں سے ایک بڑی لڑکی قمر جہاں نے اپنے ذاتی روپیہ سے اس زمین کے بارے میں چچازاد بھائی پر مقدمہ دائر کردیا، اور زمین کا فیصلہ لڑکیوں کے حق میں ہوگیا، لیکن ان میں سے بڑی لڑکی کلثوم بیگم کا مقدمہ سے پہلے انتقال ہوگیا تھا، البتہ ان کی اولاد اور شوہر باحیات ہیں، مقدمہ جیتنے پر حکومت نے باقی تینوں زندہ لڑکیوں کے نام اس زمین کا فیصلہ کردیا، تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس زمین میں کلثوم بیگم کی اولاد کو حصہ ملے گا یا نہیں؟ اور بقیہ تینوں لڑکیوں کو کتنا کتنا حصہ ملے گا؟ اور مقدمہ میں جو قمر جہاں کا روپیہ خرچ ہوا ہے، اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟ نیز قمر جہاں کا مقدمہ میں جو روپیہ خرچ ہوا ہے اس کا حساب اس کے پاس نہیں ہے کہ کتنا خرچ ہوا ہے؟ اگر اس خرچ کے ذمہ دار تمام شرکاء ہوں گے تو اس کی ادائیگی کی کیا شکل ہوگی؟

المستفتی: محمد مبین و مستقیم ٹھیکری، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مذکورہ زمین اور جائیداد مسماۃ حفیظن ہی کی ملکیت ہے اور اس کا ان چاروں لڑکیوں کے علاوہ کوئی دوسرا شرعی وارث بھی نہیں ہے، تو مذکورہ زمین چاروں لڑکیوں کے درمیان برابر تقسیم ہوگی، اور کلثوم بیگم جن کا انتقال مسماۃ حفیظن کے مقدمہ کی ڈگری سے پہلے ہو چکا ہے وہ بھی اس زمین میں برابر کی شریک ہیں، اس کا حصہ اس کے وارثین یعنی اس کے شوہر اور اس کی اولاد کو ملے گا، اور مقدمہ میں جو قمر جہاں کا پیسہ خرچ ہوا ہے اس پیسہ میں زندہ تینوں لڑکیاں اور کلثوم بیگم کے ورثاء برابر کے شریک ہوں گے، لہٰذا مقدمہ کے خرچہ کو چار حصہ کرکے ہر ایک، ایک ایک حصہ کا ذمہ دار ہوگا،

لہٰذا قمر جہاں کے علاوہ باقی تینوں لڑکیوں کے حصہ میں خرچہ مقدمہ کی جو ذمہ داری عائد ہوئی ہے وہ قمر جہاں کو ادا کریں، اب رہی یہ بات کہ مقدمہ میں کتنا خرچ ہوا اس کی ایک مقدار تخمیناً قمر جہاں بتلا دے، اسی کے مطابق خرچہ کی مقدار کا اعتبار کیا جائے گا۔

ورجع على شريكه بحصته منه أى من الثمن إذا أدى من مال نفسه.

(البحر الرائق، كتاب الشركة كوئٹه ٥/١٧٦، زكريا ٥/٢٩٤، هدايه اشرفى ديوبند ٢/ ٦٣٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۵۹۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۴/۱۴ھ

کیا دوسری شادی کرنے کے بعد لڑکیوں کا حصہ ختم ہوجائے گا؟

سوال [۱۱۴۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: والد محترم کے تین لڑکے، ایک لڑکی ہے، ترکہ میں ۴۸/ بیگہ زمین ہے، تقسیم کے وقت ان تینوں بھائیوں نے بہن کو زمین میں حصہ میں دینے سے انکار کردیا، وجہ یہ ہوئی کہ لڑکی کی شادی باپ کی موجودگی میں ہوگئی تھی، شوہر کا انتقال ہوگیا، پھر لڑکی نے دوسری شادی کرلی، تو کیا دوسری شادی کرنے کے بعد لڑکیوں کا حصہ شرعاً ختم ہوجاتا ہے یا نہیں؟

المستفتیہ: بی بی شاہین مغل پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خدائی حکم کے مطابق لڑکی کی شادی خواہ والد کی موجودگی میں ہوئی یا ان کے انتقال کے بعد ہوئی ہو، بہرصورت لڑکی کو اپنے والد کے ترکہ سے حصہ ملے گا، شادی کرنے سے ان کا حق ساقط نہیں ہوتا، بدستور باقی رہتا ہے، ان کی میراث دبانا سخت گناہ ہے۔ (مستفاد: معارف القرآن ۲/ ۳۲۱، فتاویٰ محمودیہ قدیم ۸/ ۳۵۶، ڈابھیل ۲۰/ ۳۴۷)

﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ. [النساء: ١١]﴾

یعنی اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے میراث پانے کے باب میں وہ یہ کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔ (معارف القرآن ۲/ ۳۱۹)

بین الأخ والأخت للذکر مثل حظ الانثیین. (المبسوط، دار الکتب العلمیة بیروت ۲۸/ ۰ ۲۱)

لہٰذا والد کی زمین میں تین لڑکے اور ایک لڑکی کے درمیان بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ماتقدم وعدم موانع ارث درج ذیل طریقہ سے تقسیم ہوگی:

مسئلہ ۷ — تباین — ترکہ ۴۸ ؍بیگہ زمین — میت

لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی
۲	۲	۲	۱
۱۳ ۵/۷	۱۳ ۵/۷	۱۳ ۵/۷	۶ ۶/۷

کل ترکہ ۷ ؍سہام میں تقسیم ہو کر ہر لڑکے کو ۱۳- ..... اور لڑکی کو ۶- ..... سہام ملیں گے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴ ؍رجب المرجب ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۱۱۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶ ؍۷ ؍۱۴۱۵ھ

لڑکیوں کو صحرائی زمین میں حصہ ملے گا یا نہیں؟

سوال [۱۱۴۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عبد السلام کا انتقال ہوگیا، ان کے ورثاء میں ایک بیوی، شہزادی بیگم اور ۵ ؍لڑکے دو لڑکیاں ہیں، ہر ایک وارث کو کتنے کتنے حصے ملیں گے، اور لڑکیوں کو صحرائی زمین میں حصہ ملے گا یا نہیں؟ شرعی حکم تحریر فرمائیں۔

المستفتی: حبیب الرحمٰن اصالت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: برتقدیر صحت واقعہ وبعد ادائے حقوق ماتقدم علی

الارث مرحوم عبد السلام کا ترکہ درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا۔

۹۶/۸

میت

بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکا (۷)	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی
۱/۱۲							
۱۲	۱۴	۱۴	۱۴	۱۴	۱۴	۷	۷

مرحوم کا کل ترکہ ۹۶ر سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا ملے گا جو اس کے نیچے درج ہے۔

(۲) میت کی متروکہ ہر چیز میں خواہ وہ جائیداد ہو یا غیر جائیداد، صحرائی ہو یا غیر صحرائی، ہر وارث کا حق متعلق ہوتا ہے، اس میں لڑکے اور لڑکی کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے، یہ الگ بات ہے کہ لڑکے کو لڑکی کے مقابلہ میں دوگنا ملتا ہے۔

ثم يقسم الباقي بين ورثته الذين ثبت إرثهم بالكتاب والسنة. (در مختار، كتاب الفرائض زكريا ١٠/ ٤٩٧، كراچی ٦/٧٦١-٧٦٢، مجمع الأنهر مصری قديم ٢/٧٤٧، دار الكتب العلمية بيروت ٤/٤٩٥، البحر الرائق كوئٹه ٨/٤٨٩، زكريا ٩/٣٦٧، سراجی ص: ٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹ر رجب المرجب ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۶۸۴۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۷/۱۴۲۱ھ

کیا ماں کے مال کی حقدار صرف لڑکیاں ہیں؟

سوال [۱۱۴۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک لڑکی کو اس کے مرحوم باپ نے ایک قطعہ زمین صحرائی (کاشت کی) دی تھی، اس لڑکی کا انتقال ہوگیا، اس کے لڑکا اور لڑکیاں ہیں، لڑکیاں کہتی ہیں کہ ماں کے مال کی صرف لڑکیاں ہی مالک ہیں، لڑکا نہیں، کیا یہ صحیح ہے؟

(۲) ۸ر سال سے جو لوگ لڑکے کے حقوق (حصہ) لڑکیوں کو دے رہے ہیں اور

لڑکےکواس کے حصہ سے محروم کر رکھا ہے کیا وہ لوگ بھی حقوق العباد کو غصب کرانے میں اللہ اور رسول کے مجرم ہیں یا نہیں؟ اورانہیں ایسا کرنا چاہیے تھا یانہیں؟

(۳) یتیم بچوں اور بیوی کے عزیز وا قارب پر کچھ حقوق ہیں یانہیں؟

المستفتی: محمد سمیع سہس پور بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ماں کے ترکہ کی صرف لڑکیاں حقدار ہیں، اللہ تعالیٰ نے جس طرح باپ کے ترکہ کے حقدار لڑکےاور لڑکی دونوں کو بنایا ہےاسی طرح ماں کے ترکہ کے حقدار بھی دونوں کو بنایا ہےاللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿**يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ.** [النساء: ۱۱] ﴾

﴿**وقوله تعالیٰ: وَلِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيْبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ.** [النساء: ۱۲] ﴾

(۲) اگر دینے والے زندہ ہیں اور بحالت صحت اپنی زندگی میں دے دیں تو اس میں لڑکوں کے حقوق ابھی متعلق نہیں ہوئے، بلکہ مرنے کے بعد ہی متعلق ہو سکتے ہیں، وہ لوگ اپنے مال کے خود مالک ہیں جس طرح چاہیں صرف کر سکتے ہیں۔

المالک هو المتصرف فی الأعيان المملوكة كيف شاء من الملک. (بيضاوی شريف رشيديه ۱/۷)

البتہ تمام اولاد کے ساتھ برابری نہ کرنے کا گناہ ہوگا۔

ولو وهب فی صحته كل المال للولد جاز و أثم. (در مختار، كتاب الهبة، زكريا ۸/۵۰۲، كراچی ۵/۶۹۶، هنديه زكريا قديم ۴/۳۹۱، جديد ۴/۴۱۶، قاضيخان زكريا جديد ۳/۱۹۴، وعلى هامش الهندية ۳/۲۷۹)

(۳) جی ہاں حقوق ہیں کہ اگر وہ مستحق زکوٰۃ ہیں تو زکوٰۃ نیز نفلی صدقہ وخیرات کرتے رہیں، اور اگر یتیم اور بیوہ حقیقی بھائی بہن یا ذورحم محرم ہیں تو ان کا نفقہ با قاعدہ ادا کرنا لازم ہوتا ہے، جبکہ یہ لوگ نادار ہوں۔

النفقة لكل ذى رحم محرم إذا كان صغيرا فقيرا أو كانت امرأة بالغة فقيرة أو كان ذكرا بالغا فقيرا زمنا أو أعمىٰ. (هدايه، كتاب الطلاق، باب النفقة، اشرفی دیوبند ۲/ ٤٤٦) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ ؍شوال المکرّم ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۶۷۲)

والدہ کی موت سے قبل فوت شدہ لڑکیوں کا حصہ

سوال [۱۱۴۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میری والدہ حنیفہ خاتون کا ۴؍ ماہ قبل انتقال ہوگیا، میری والدہ حنیفہ خاتون کے تین لڑکے: محمد شاہد، محمد راشد، محمد ماہر، اور دولڑکیاں: شکیلہ عظمی، شاہدہ عظمیٰ۔ محمد شاہد وشکیلہ کا انتقال والدہ کی زندگی میں ہی ہوگیا تھا، اب ہماری والدہ کے انتقال کے بعد ان کے حصے میں سے محمد شاہد وشکیلہ عظمیٰ کا حصہ بنتا ہے یا نہیں؟ اگر حصہ بنتا ہے تو کتنا ہے؟ استدعا کرتا ہوں کہ حصص قائم فرما کر اس کی وضاحت فرمادیں۔

المستفتی: محمد ماہر ولد عبدالسلام

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: برتقدیر صحت سوال وعدم موانع ارث وبعد ادائے حقوق ماتقدم مرحومہ حنیفہ خاتون کی زندگی میں جن وارثوں کا انتقال ہوگیا وہ حنیفہ خاتون کی وفات کے بعد شرعاً ان کے وارث نہیں ہوں گے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ میرٹھ ۳۰/ ۸۶)

الإرث يثبت بعد موت المورث. (البحر الرائق، كتاب الفرائض کوئٹہ ۸/ ٤٨٨، زکریا ۹/ ٣٦٤)

وهل إرث الحى من الحى أم من الميت؟ المعتمد الثانى: (في الدر المختار) وتحته فى الشامية: لأن التركة فى الاصطلاح ما تركه الميت من

الأموال. (شامی، کتاب الفرائض، زکریا ۱۰/ ٤٩٣، کراچی ٦/ ٧٥٨)

البتہ حنیفہ خاتون کی وفات کے وقت جو دولڑکے اور ایک لڑکی زندہ رہیں وہ حنیفہ خاتون کے وارث ہوں گے، لہٰذ حنیفہ خاتون کا کل ترکہ پانچ حصوں میں تقسیم ہو کر دو، دو حصے دونوں لڑکوں کو اور ایک حصہ لڑکی کو ملے گا۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ میرٹھ ۳۰/ ۲۲۱)

ومع الابن للذكر مثل حظ الانثيين. (سراجی ص:۱۲)

وإذا اختلط البنون والبنات عصب البنات فيكون للابن مثل حظهما.

(البحر الرائق کوئٹہ ٨/ ٤٩٤، زکریا ٩/ ٣٧٥)

جیسا کہ حسب ذیل نقشہ سے واضح ہے:

۵
میـــــــــــــــت

لڑکا	لڑکا	لڑکی
محمد ماہر	محمد راشد	شاہدہ نجمیٰ
۲	۲	۱

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۳۷۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۴/۲۸ھ

کیا وراثت میں جنین کو بھی حصہ ملے گا؟

سوال [۱۱۴۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جناب مشرف سعید خاں صاحب نے نعیمہ خاتوں بنت محمد حسین مہدی محلّہ طویلہ سے نکاح کیا، ان کے پیٹ سے سعید کے دولڑکے شاہ باز، جانباز پیدا ہوئے، اس کے بعد ان کی اہلیہ نعیمہ خاتون کا انتقال ہوگیا، مشرف سعید خاں نے دوسری شادی پروین خاتون بنت بھورے سے کی، شادی کے نتیجہ میں دوسری بیوی حاملہ ہوئیں اسی درمیان مشرف سعید کا بھی

انتقال ہوگیا، مشرف کا لوگوں پر کچھ قرضہ بھی ہے، اوران کی والدہ زبیدہ بھی حیات ہیں، لہٰذا اب ان کے ترکہ میں کس کا کتنا حق ہوگا؟ نیز مہر کی بھی دونوں قسموں کی بھی وضاحت فرمائیں؟

المستفتی: محمد مظفر حسین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: بشرط صحت سوال وبعدا دائے ماتقدم وعدم موانع ارث مشرف سعید کا ترکہ شرعی ورثاء میں اور حمل کے حق میں اس طرح تقسیم ہوگا کہ موجودہ بیوی کے پیٹ میں جو حمل ہے اس کو ایک لڑکا مان لیا جائے اور اس کا حصہ اس کے حق میں جو زیادہ خیرخواہ ہوگا اسی کے پاس بطور امانت رکھا جائے، اگر ایک لڑکا ہی پیدا ہوتا ہے تو وہ حصہ اس کا ہوگا، اور اگر ایک لڑکی پیدا ہوتی ہے تو لڑکی ہونے کے اعتبار سے اس کا حصہ جو بن سکتا ہے وہ اس کو دیدیا جائے اور بقیہ دیگر ورثاء کے درمیان ان کے حقوق کے بقدر تقسیم کردیا جائے اور فی الحال ترکہ درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

مشرف سعید میت ۷۲/۲۴

بیوی	ماں	حمل	لڑکا	لڑکا
۳	۴			
۹	۱۲	۱۷	۱۷	۱۷

کل ترکہ میں سے پہلے اس کا قرض ادا کردیا جائے اس کے بعد بقیہ ترکہ ۷۲؍سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا ملے گا جو اس کے نیچے درج ہے اور حمل کو بھی لڑکا ہی فرض کرلیا گیا ہے۔

إنه يوقف نصيب ابن واحد أو بنت واحدة و عليه الفتوىٰ ويوخذ الكفيل. (سراجی ص: ۸۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۲۵۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۴/۱۴۱۸ھ

بیوی کے مال میں بچوں کا حصہ ہے یا نہیں؟

سوال [۱۱۴۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: رشیدہ کی شادی نظام الدین سے بارہ سال قبل ہوئی تھی، اوراس کے پانچ بچے ہیں، پھر نظام الدین نے رشیدہ کی ایسی پٹائی کی کہ اس میں رشیدہ کی جان چلی گئی، فریقین میں باہمی مصالحت ہوئی، جس میں دس ہزارروپئے مہر کا دیا، حالانکہ مہر معین پندرہ ہزارروپیہ تھا، اور جہیز کے بدل کے طور پر بیس ہزارروپئے دیئے اور یہ رقم نظام الدین نے رشیدہ کے والد کوادا کی۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا اس رقم میں رشیدہ کے بچوں کا حصہٴ وراثت ہے اوراگر ہے تو کتنا؟

المستفتی: شاکر علی دڑھیال رام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگررشیدہ کے والد کے ساتھ والدہ نہیں ہیں تو کل مال کے چھ حصے کر کے ایک حصہ رشیدہ کے والد کو ملے گا، بقیہ رشیدہ کے بچوں کو ملے گا، اوراگر رشیدہ کی ماں بھی زندہ ہے تو چھ حصہ میں سے ایک حصہ ماں کوایک حصہ باپ کواور بقیہ چار حصے بچوں کوملیں گے، اورلڑکوں کولڑکیوں کے مقابلہ میں ڈبل ملے گا، اگر بچوں کی تفصیل سوالنامہ میں بیان کردی جاتی تو ہرایک کا حصہ بھی الگ الگ کر کے بیان کردیا جاتا۔

ومع الابن للذکر مثل حظ الانثیین وھو یعصبھن. (سراجی ص: ۱۲)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/صفر المظفر ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۹۳۲/۳۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۲/۲۱ھ

دوسری بیوی کی اولاد کی جائیداد میں پہلی بیوی کی اولاد کا حق ہے یا نہیں؟

سوال [۱۱۴۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ میرے والد محمد حسین نے اپنی حیات میں دوشادیاں کیں، پہلی شادی جمیلہ سے کی، ایک لڑکی اور دولڑکے پیدا ہوئے، تینوں بچوں کے بعد جمیلہ کا انتقال ہوگیا ہے، اس کے بعد والد صاحب نے دوسری شادی افروزہ سے کی، اوران سے پانچ لڑکے پیدا ہوئے، اس کے بعد میرے والد محمد حسین کا انتقال ہوگیا، اوراب جو دوسری بیوی کے پانچ لڑکے ہیں، انہوں نے اپنے والد کے انتقال کے پانچ سال بعد اپنے پیسوں سے ایک جگہ خریدی، اس جگہ کے بارے میں جمیلہ کے دو بچے کہتے ہیں کہ اس میں ہمارا بھی حق ہے، جبکہ پہلی بیوی اوردوسری بیوی کی اولادیں الگ الگ ہیں، لہٰذا مفتی صاحب سے گذارش ہے کہ ہماری صحیح رہنمائی فرمائیں۔

المستفتی: محمد اسماعیل نئی بستی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جبکہ باپ محمد حسین صاحب کے انتقال کے بعد دوسری بیوی کی اولاد نے اپنے پیسوں سے جگہ خریدی ہے تو وہ جگہ دوسری بیوی کی اولاد کی ہوگی اس میں پہلی بیوی کی اولاد کا شرعاً کوئی حق نہیں ہے، ان کے لیے مذکورہ جگہ میں حق کا دعویٰ کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

لایجوز لأحد أن یتصرف فی ملک الغیر بغیر إذنه، لایجوز لأحد من المسلمین أخذ مال أحد بغیر سبب شرعی. (قواعد الفقه اشرفی ص:۱۱۰، رقم: ۲۶۹- ۲۷۰) فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍شوال المکرّم ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۴۴۶/۲۵)

پہلی بیوی کے لڑکے کا شوہر کی جائیداد میں حصہ

سوال [۱۱۴۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرا نکاح محمد اخلاق ولد منشی کریم سے ہوا تھا، ڈھائی سال نکاح میں رہی انہیں

سالوں میں میرے ایک لڑکا ظہیر عالم پیدا ہوا اور کچھ مہینوں بعد گھریلو جھگڑوں کی وجہ سے تقریباً تیس سال پہلے مجھے طلاق ہوگئی، تب ہی انہوں نے دوسری شادی کر لی تھی، اور دوسری بیوی سے تین لڑکے: شاہنواز، آفتاب عالم، شان عالم، اور دو لڑکیاں: شہناز اور فاطمہ پیدا ہوئیں۔

لہٰذا جاننا چاہتی ہوں کہ میرے لڑکے ظہیر عالم کا اپنے والد کی ملکیت میں کتنا حق بنتا ہے؟ ان کے پاس ۴۵/ گز کا مکان ہے، جس کی قیمت تقریباً بارہ لاکھ ہوگی، میرے شوہر ابھی حیات ہیں؟

المستفتیہ: اختری بیگم قاضی ٹولہ عباسی اسکول مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کا بیٹا ظہیر عالم اپنے والد کا شرعی وارث ہے، لیکن وراثت والد کی زندگی میں نہیں ملتی ہے، والد کے انتقال کے بعد اس کو اپنا شرعی حصہ ہر چیز میں ملے گا، جس مکان کا سوالنامہ میں ذکر ہے، والد کی موت کے وقت اگر وہ مکان موجود ہو تو اس میں بھی حصہ ہوگا اور اس کے علاوہ دیگر جائیداد، روپیہ پیسہ ہر چیز میں اس کا شرعی حق ثابت ہو جائے گا، دوسری بیوی کے لڑکوں میں سے ہر ایک کو جتنا ملے گا اتنا ہی ظہیر عالم کو ملے گا۔

یشترط لثبوت الحق فی المیراث ثلاثة شروط: وهی موت المورث وحیاة الوارث ومعرفة حق القرابة. (الفقه الاسلامی و أدلته، هدیٰ انٹر نیشنل دیوبند ۸/۲۵۳)

وشروطه: ثلاثة: موت مورث حقیقة أو حکما کمفقود. (شامی، کتاب الفرائض، زکریا ۱۰/ ۴۹۱، کراچی ۶/ ۷۵۸) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰/ رجب المرجب ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۰۹)

پہلی بیوی کا لڑکا شرعی وارث ہے یا نہیں؟

سوال [۱۱۴۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے تین نکاح ہوئے، پہلی بیوی ایک سال رہ کر ماں باپ کے یہاں چلی

گئی پھر واپس میرے پاس نہیں آئی، اس سے ایک لڑکا ہے، تین سال کے بعد کورٹ سے طلاق ہوئی، اس نے کورٹ میں لکھ کر دیا کہ مجھے اور میرے بچہ کو پرورش کے لیے شوہر کی طرف سے کچھ نہیں چاہیے، مہر اور عدت کے پیسے بھی لوٹا دیئے، اب اس کا انتقال ہوا ہے۔

میرے اس لڑکے کی عمر ۴۳ رسال کی ہے، اس درمیان میں نے لڑکے کے لیے گاؤں میں پلاٹ لیا تھا، تو اس لڑکے نے لینے سے صاف انکار کیا، لڑکے کے نانا نے لڑکے کو چھ کمرے کا پلاٹ مکان بنا کر دیا ہے، اندازاً اس کی قیمت دس لاکھ روپئے ہے، اس کے بعد میں نے دوسرا نکاح کیا، دوسری بیوی زندہ ہے اور وہ میرے نکاح میں ہے، ان سے میری کوئی اولاد زندہ نہیں ہے، میں نے اس کے نام پر ایک مکان اور دوکان لی ہے، پھر میں نے تیسرا نکاح کیا، ان سے میرا ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے، اور دونوں شادی شدہ ہیں، میں نے تیسری بیوی کے نام پر ایک مکان لیا ہے، پہلی بیوی کے لڑکے کو وراثت سے بے دخل کرنے کی نیت سے میں نے دوسری اور تیسری بیوی کے نام سے مکان نہیں خریدے تھے، بلکہ لڑکے کے آنے سے پہلے ہی میں نے دونوں بیویوں کو الگ الگ رکھ کر ان کے نام پر مکان خرید لیے تھے، اس وقت لڑکا آ کر مجھے ملے گا، اس کی مجھے کوئی امید نہیں تھی۔

اب معاملہ یہ ہے کہ میرے نام پر کوئی بھی پراپرٹی نہیں ہے، صرف دولاکھ کا سونا ہے، اب اس حالت میں کیا کرسکتا ہوں؟ تاکہ قیامت کے دن میری پکڑ نہ ہو، جواب قرآن و حدیث کی روشنی میں مطلوب ہے۔

المستفتی: ڈاکٹر بشیر پونہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پہلی بیوی کے بطن سے جو لڑکا پیدا ہوا ہے اس سے ناامید ہوکر جو جائیداد آپ نے دوسری اور تیسری بیوی کے نام کردی ہے وہ جائیداد انہیں لوگوں کی ملکیت بن گئی ہے، اس جائیداد میں پہلی بیوی کے لڑکے کا کوئی حق باقی نہیں رہا۔

تنعقد الهبة بالإيجاب والقبول وتتم بالقبض الكامل لأنها من التبرعات والتبرع لا يتم إلا بالقبض، والقبض الكامل فى المنقول ما يناسبه

و فی العقار ما يناسبه، فقبض مفتاح الدار قبض لها والقبض الكامل فيما يحتمل القسمة بالقسمة حتى يقع القبض على الموهوب بالإصالة، من غير أن يكون بتبعية قبض الكل وفيما لا يحتمل القسمة بتبعية الكل والتمكن من القبض كالقبض. (شرح المجلة اتحاد بکڈپو دیوبند ١/٤٦٢، رقم المادة: ٨٣٧)

ہاں البتہ آپ کی ملکیت میں دو لاکھ کا جو سونا ہے، یا کوئی دیگر مملوک ہے، آپ کے مرنے کے بعد ان میں پہلی بیوی کا لڑکا بھی شرعی وراثت کا حق دار ہوگا، آپ کی موت کے وقت جو بھی شرعی وارث موجود ہوں گے، وہ سب آپ کے متروکہ مال میں وارث بنیں گے، سوالنامہ کے مطابق آپ کے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہیں، آپ کا ترکہ ۸۰؍سہام میں تقسیم ہوکر دونوں بیویوں میں سے ہر ایک کو ۵/۵؍ ملیں گے، اور بیٹی کو ۱۴؍، دونوں بیٹوں کو ۲۸/۲۸؍ ملیں گے، جیسا کہ حسب ذیل نقشہ سے واضح ہوتا ہے:

۸۰/۸

میت

	بیوی	بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکی
	۱		۷		
سہام	۵	۵	۲۸	۲۸	۱۴

کل ترکہ ۸۰؍سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو سہام میں اتنا اتنا ملے گا جو ان کے نام کے نیچے سہام کے سامنے درج ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۹۹۰/۴۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۴/۱۲ھ

دونوں بیویوں کی اولاد وارث ہوگی

سوال [۱۱۴۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کی ملکیت میں ستائیس بیگہ زراعت کی زمین ہے، اور ایک مکان ہے جس

میں سات دوکانیں ہیں، اور زید کی دوشادیاں ہوئی ہیں، پہلی بیوی وفات پاچکی ہے، جس سے ایک لڑکا ہے، دوسری بیوی سے ایک لڑکا دولڑکیاں ہیں، زید کی خواہش ہے کہ اپنی زندگی میں ہی جائیداد تقسیم کردوں، اور یہ چاہتا ہے کہ کسی حصہ دار کواس کی خدمت کی وجہ سے کچھ زیادہ دے دوں، تقسیم جائیداد کس طرح ہوگی؟ اور کسی حصہ دار کواس کے حصہ سے زیادہ دینا شرعاً درست ہے یانہیں؟

المستفتی: محمد افضل خاں شاجہاں پور میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کی جائیداد صحرائی اور سکنائی اس کی موت کے بعداس کی شرعی اولاد کے درمیان شرعی حصوں کے حساب سے تقسیم ہوگی، پہلی بیوی کا لڑکا اور دوسری بیوی کے لڑکے دونوں کو برابر حصہ ملے گا، اور دونوں لڑکیوں کولڑکوں کے حصے کے مقابلے میں آدھا آدھا ملے گا، اور جو بیوی زندہ ہے، اس کوکل مال کا آٹھواں حصہ ملے گا جو درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگی:

۴۸ / ۸

میـــت

بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی
۱ / ۶	۱۴	۱۴ (ے)	۷	۷

کل جائیداد ۴۸ رسہام میں تقسیم ہوکر زندہ بیوی کو چھ اورلڑکوں کو چودہ، چودہ اور لڑکیوں کوسات سات ملیں گے، اور اگر زید اپنی زندگی میں اولاد کے درمیان جائیداد تقسیم کرکے دیدینا چاہتا ہے تو لڑکیوں کوبھی لڑکوں کے برابر ملے گا، لہٰذا بیوی کو جتنا دینا چاہے دیدے، اس کے بعد بقیہ جائیداد چار سہام میں تقسیم ہوکر دولڑکوں اور دولڑکیوں کے درمیان برابر برابر تقسیم ہوجائے گی، اور کسی بچے کوکسی بچے سے زیادہ دینے سے باپ گنہگار رہوگا۔

لا بأس بتفضيل بعض الأولاد فی المحبة لأنها عمل القلب وكذا في العطايا إن لم يقصد به الإضرار وإن قصده فسویٰ بينهم يعطى البنت كالابن

عنـد الثاني وعليه الفتویٰ، ولو وهب فی صحته كل المال للولد جاز و أثم، وتحتـه فـی الشـامية: قـوله: وعليه الفتویٰ: أی علی قول أبی يوسف من أن التنـصيف بيـن الـذكـر والأنثیٰ أفـضـل من التثليث الذی هو قول محمدؒ.
(شامی، كتاب الهبة زكريا ۸/ ۵۰۱-۵۰۲، كراچی ۶/ ۶۶۹، هنديه زكريا قديم ۴/ ۳۹۱، جديد ۴/ ۴۱۶، قاضيخان زكريا جديد ۳/ ۱۹۴، وعلی هامش الهندية ۳/ ۲۷۹)

ہاں البتہ اگر کسی کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہ ہو تو کسی کی زیادہ خدمت کرنے کی بنا پر اس کو کچھ زیادہ دینے سے باپ گنہگار نہ ہوگا۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ ڈابھیل ۲۰/ ۲۷۸)

لا بـأس بأن يعطیٰ من أولاده من كان عالما متأدبا ولا يعطیٰ منهم من كان فاسقا فاجرا. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دار الكتب العلمية بيروت ۳/ ۴۹۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ صفر المظفر ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۴۵۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۲/۱۲ھ

ٹھیکیداری میں سے دونوں بیویوں اور ان کی اولاد کو حصہ ملے گا

سوال [۱۱۴۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فضل الحق کی شادی ہندہ سے ہوئی تھی، اس سے ایک لڑکا ریاض الحق پیدا ہوا، پھر بیوی کا انتقال ہوگیا، تو فضل الحق نے دوسری شادی زینب سے کی، جس سے تین لڑکے: شمس الحق، ضیاء الحق، رضوان الحق، اور دو لڑکیاں: خورشیدہ اور سلمیٰ پیدا ہوئیں، فضل الحق ٹھیکہ کا کام کرتے تھے، باپ ہی کی زندگی میں بڑے بیٹے ریاض الحق بھی باپ کے ساتھ لگ گئے تھے، اب باپ کا انتقال ہوگیا ہے، تو کیا مذکورہ ٹھیکہ میں دیگر ورثاء کا بھی حق ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو ہر ایک کا کتنا کتنا؟

المستفتی: رضوان الحق

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ریاض الحق باپ کی زندگی میں ان کے ساتھ مل کر جو

ٹھیکہ کررہے تھے، وہ درحقیقت باپ ہی کی ملک ہے، اب جبکہ باپ کا انتقال ہوگیا تو دونوں بیویوں کے بطن اور فضل الحق کے نطفہ سے جو اولاد ہیں، وہ سب باپ کے ٹھیکہ میں شرعی حقدار ہیں، البتہ لڑکوں کو لڑکیوں کے مقابلے میں دوگنا ملے گا، اور فضل الحق کی تمام جائیداد (ٹھیکہ وغیرہ) ان کے ورثاء کے درمیان مندرجہ ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگی۔ (مستفاد: عزیز الفتاویٰ ۱/۱۵۶)

الأب و ابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيئ فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله لكونه معينا له. (شامی، باب الشركة، مطلب: اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ...... زكريا ٦/٥٠٢، كراچی ٤/٣٢٥، هنديه زكريا جديد ٢/٣٣٢، قديم ٢/٣٢٩)

$\frac{۸۰}{۸}$

میـــــــت

بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی
زینب	ریاض الحق	شمس الحق	ضیاء الحق	رضوان الحق (۷)	خورشیدہ	سلمیٰ
۱/۱۰	۱۴	۱۴	۱۴	۱۴	۷	۷

فضل الحق کا کل ترکہ ۸۰؍ سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا ملے گا جو اس کے نام کے نیچے درج ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۸۳۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲/ ۶/ ۱۴۲۶ھ

کیا شوہر کے بنائے ہوئے ہوٹل میں خسر بھی وارث ہے؟

سوال [۱۱۴۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے شوہر نے ایک پلاٹ خریدا جس کی رجسٹری انہیں کے نام ہے، اس میں ایک مسافر ہوٹل تعمیر کرایا، اور تعمیر میں کافی صرفہ ہوا اور تین لاکھ تہتر ہزار آٹھ سو دس روپئے قرض کے باقی رہے، شوہر صاحب اس کو ادا نہ کرسکے حتی کہ وہ شہید ہوگئے، یہ تمام قرضہ میں نے اپنے

والدین اور بھائیوں سے لے کر ادا کیا، اس وقت اس ہوٹل کو میں اور میرے دولڑکے چلارہے ہیں، شریعت کی روشنی میں بتائیے کہ اس ہوٹل اوراس کی آمدنی کا کون کون حقدار ہے؟

المستفتی: نرگس جہاں آگرہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگرسوال واقعہ کے مطابق ہے تو وہ ہوٹل آپ کے شوہر کی ملکیت ہے، لہٰذا آپ کے شوہر کے انتقال کے بعد اس کے شرعی ورثاء اس میں حقدار ہوں گے۔

ثم یقسم الباقي بعد ذلک بین ورثته أي الذین ثبت إرثهم بالکتاب أو السنة. (الدر المختار مع الشامی، کتاب الفرائض زکریا ۱۰/ ۴۹۷، کراچی ۶/ ۷۶۱-۷۶۲، مجمع الأنهر مصری قدیم ۲/ ۷۴۷، دار الکتب العلمیة بیروت ۴/ ۴۹۵، البحر الرائق کوئٹہ ۸/ ۴۸۹، زکریا ۹/ ۳۶۷، سراجی ص: ۵)

اورشرعی ورثاء میں آپ کے شوہر کا باپ بھی شامل ہے، ان کا بھی چھٹا حصہ ہے اور جو قرضہ آپ نے ادا کیا ہے اس قرضہ کی ادائیگی میں آپ کے خسر کو بھی　قرض کی ادائیگی کا باربرداشت کرنا پڑے گا، اگر الگ سے وہ اس کو ادا نہ کریں تو ان کے حصہ میں مجریٰ کر سکتے ہیں، اور بقیہ　میں آپ اورشوہر کی اولاد شرعی حصوں کے اعتبار سے شریک ہوں گے، اور شرعی حصوں کی تعیین جب ہی ہوسکتی ہے جب آپ کے شوہر کی نرینہ اور مؤنث تمام اولاد کی نشاندہی کر دی جائے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۲؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۴۰)	۱۴۲۱/۵/۲ھ

شوہر کے انتقال کے بعد عورت دوسری جگہ نکاح کرنے سے وراثت سے محروم نہیں ہوتی

سوال [۱۱۴۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمد حسین کا انتقال ۱۹۹۰ء میں ہوا تھا، مرحوم کے دولڑکے غیور حسین اور محمد سلمان

ایک لڑکی مزمل اور ایک بیوی ہے، (بیوی نے ۱۹۹۷ء کو دوسرا نکاح کرلیا تھا، مرحوم نے ایک مکان ۲۸ رگز مربع دومنزلہ، ایک مکان ۵۲ رگز مربع دومنزلہ اور ایک مکان ۹۷ رگز مربع دو منزلہ چھوڑا، کل جگہ ۱۷۷ رگز مربع ہوئی، اور یہ سب جگہیں تارے والی مسجد پیرزادہ میں واقع ہیں، ازروئے شرع کس وارث کو کتنا حصہ دیا جائے گا؟ واضح فرمائیں۔

المستفتی: مزمل بنت محمد حسین پیرزادہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شوہر کے انتقال کے بعد بیوی شوہر کی شرعی وارث بن جاتی ہے بعد میں کسی سے شرعی نکاح کرلینے کی وجہ سے بیوی میراث پانے سے محروم نہ ہوگی، اس کی میراث کا حصہ اس کے شرعی حق کے طور پر بدستور باقی رہتا ہے۔

(مستفاد: فتاویٰ محمودیہ جدید ۲۰/ ۲۸۶، کفایت المفتی قدیم ۸/ ۳۸۸، جدید زکریا مطول ۱۳/ ۲۷۵)

ویستحق الإرث بإحدیٰ خصال ثلاث: بالنسب وهو القرابة و السبب وهو الزوجية والولاء. (هنديه، كتاب الفرائض، الباب الأول زكريا قديم ٦/٤٤٧، جديد ٦/٤٤٠)

وفي فتح القدير: قوله: (والشيئ بانتهائه يتقرر) لأن انتهائه عبارة عن وجوده بتمامه فيستعقب مواجبه الممكن إلزامها من المهر والإرث والنسب.

(فتح القدير، كتاب النكاح، باب المهر، زكريا ٣/ ٣١٠، دار الفكر ٣/ ٣٢٢، كوئٹه ٣/ ٢٠٩)

لہٰذا محمد حسین مرحوم کی مذکورہ وارثین کے درمیان ۱۷۷ رگز زمین درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگی جس میں بیوی بھی اپنے پورے حصہ کی حقدار ہوگی۔

مرحوم میـــــــــت ۴۰/۸ تباین ترکہ ۱۷۷ رگز

	بیوی	لڑکا غیور حسن	لڑکا محمد سلمان	لڑکی مزمل
	۱/	(۷)		
سہام	۵	۱۴	۱۴	۷
ترکہ	۵/۴۰ ۲۲ رگز	۳۸/۴۰ ۶۱ رگز	۳۸/۴۰ ۶۱ رگز	۲۹/۴۰ ۳۰ رگز

مرحوم محمد حسین کی ۷۷ارگز زمین ۴۰؍حصوں میں تقسیم ہو کر ہر ایک وارث کو اتنے گز ملیں گے جو اس کے نام کے نیچے سہام کے سامنے درج ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۶۳۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۶/۲۰ھ

شوہر سے الگ رہنے کی وجہ سے بیوی وراثت سے محروم نہیں ہوگی

سوال [۱۱۴۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ محمد میاں ساکن پیر غیب کا چند ماہ پہلے انتقال ہو گیا ہے، محمد میاں کی شادی تقریباً ۱۵؍سال کا عرصہ ہوا ہوئی تھی، اور شادی کے بعد محمد میاں کی شریک حیات سے ایک مردہ بچہ بھی پیدا ہوا تھا، اس کے بعد دونوں لوگوں میں کشیدگی پیدا ہوگئی، اور تقریباً ۱۴؍سال سے محمد میاں کی بیوی اپنے میکے یعنی والد کے گھر پر ہے، دونوں لوگوں کے درمیاں طلاق بھی نہیں ہوئی تھی، محمد میاں کے تین سگے بھائی حیات ہیں۔

معلوم یہ کرنا ہے کہ محمد میاں کے مال یعنی زیور وغیرہ میں اس کی بیوی کو کیا حق پہنچتا ہے، کیونکہ محمد میاں کے انتقال کے بعد ان کی بیوی کا جہیز واپس کیا جا رہا ہے؟

المستفتی: محمد یوسف ولد محمد جان پیر غیب مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: محمد میاں کے چونکہ کوئی اولاد نہیں تھی، اور نہ ہی انہوں نے اپنی بیوی کو طلاق دی تھی، اس لیے محمد میاں کی بیوی ان کے کل ترکہ سے شرعاً چوتھائی حصہ کی حقدار ہے، اس کے بعد بقیہ مال محمد میاں کے تینوں بھائیوں کے درمیان برابر برابر تقسیم ہوگا۔

﴿وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ. [النساء: ١٢]﴾

وللزوجة الربع ...... حيث لا ولد ومع الولد أو ولد الإبن و إن سفل. (البحر

الرائق، کتاب الفرائض، کوئٹه ۸/ ۴۹۳، زکریا ۹/ ۳۷٤، سراجی ص:۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷رشوال المکرّم ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۹۲۱)

ناشزہ نفقہ کی مستحق نہیں ہے لیکن وراثت کی حقدار ہے

سوال [۱۱۴۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کا انتقال ہوا، اور اس نے ایک بیوی اور ایک لڑکا چھوڑا، بیوی نا اتفاقی کی بنا پر ۶/ ۷ رسال سے اپنے باپ کے گھر رہتی تھی، اس دوران زید نے ماں اور بیٹے کو نفقہ کے طور کچھ نہیں دیا، تو اب یہ بیوی اور لڑکا اس کے وارث بنیں گے یا نہیں؟ اور اس مدت کا نفقہ میت کے مال سے دیا جائے گا یا نہیں؟

المستفتی: سعید الرحمٰن اصالت پورہ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جبکہ زید نے اپنی بیوی کو طلاق نہیں دی یا شرعی تفریق سے نکاح سے الگ نہیں کیا، تو شرعاً بیوی زید کی وارث ہوگی، اگرچہ بیوی نافرمان رہی ہو، گذشتہ سالوں کا نان ونفقہ فرمانبردار بیوی کے لیے بھی شوہر پر واجب نہیں ہوتا۔

إذا مضت مدة لم ينفق الزوج عليها، وطالبته بذٰلك فلا شيئ لها.

(هدايه، كتاب الطلاق، باب النفقة، اشرفی دیو بند ۲/ ٤٤٠)

نیز لڑکا اس کا عصبہ بنے گا، ماں باپ و بیوی کو شرعی حصہ دینے کے بعد بقیہ سارا مال لڑکے کو ملے گا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰رذی قعدہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۹۷۸)

شوہر کی جگہ بیوی کا ترکہ کا مطالبہ کرنا

سوال [۱۱۴۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: راقم کے والد حاجی نذیر احمد صاحب کانپور کے باشندہ تھے، اور تین چھوٹے بڑے پختہ وغیر پختہ مکان کے مالک تھے، انہوں نے اپنی حیات میں دو کچے مکان جس کی قیمت ڈھائی ہزار روپیہ ہے ۶۰-۱۹۵۹ء میں فروخت کر دیئے تھے، اور پوری رقم میرے بڑے بھائی کو دے کر یہ تاکید کی کہ وہ کبھی بھی اپنا دعویٰ میرے پختہ مکان پر نہیں کریں گے، چونکہ مملوکہ ملکیت دوسرے تین بھائی کی ہوگی، میرے بڑے بھائی تاحیات یہ بات مانتے رہے، اور کہتے رہے اور اپنی اہلیہ (میری بھابھی) جو حیات ہیں ان سے تاکید کی کہ جو رقم فروخت کردہ مکان سے حاصل ہوئی ہے، اس سے انہوں نے مرادآباد میں ایک قطعہ مکان خرید لیا ہے اور فروخت شدہ مکان کی قیمت کسی بھائی یا بہن کو نہیں دی ہے، لہٰذا تیسرے مکان میں ان کو کوئی حق نہیں ملے گا۔

ہم چاروں بھائی ریلوے ملازم تھے، اور مرادآباد میں رہ رہے تھے، لہٰذا ہم نے آپس میں طے کیا کہ اب کانپور جانا ممکن نہ ہوگا، اور کرایہ دار بھی مکان خالی نہیں کرے گا، لہٰذا فروخت کر دیا گیا، اور از روئے شرع رقم تین بھائیوں اور بہنوں میں تقسیم کر دی، جب اسی مکان مملوکہ کا میری بھابھی کو علم ہوا کہ فروخت ہو گیا تو اپنے شوہر کے تاکید کیے ہوئے الفاظ سے مکر گئیں، اور دعویٰ کرتی ہیں کہ فروخت شدہ رقم میں ان کا بھی حصہ ہوتا ہے؟

المستفتی: نصیر الدین ہمگری کالونی کانٹھ روڈ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب والد صاحب نے اپنی زندگی میں اپنے بڑے لڑکے کو دو مکان یہ کہہ کر دیدئے تھے کہ بقیہ مکانوں میں اس کا کوئی حصہ نہیں رہے گا، اور اسی کے مطابق آپ کے بڑے بھائی نے بھی اپنی زندگی میں کبھی ان بقیہ مکانوں پر استحقاق کا دعویٰ نہیں کیا، لہٰذا اب آپ کی بڑی بھابھی کے لیے بھی ان بقیہ مکانوں پر استحقاق کا دعویٰ کرنا صحیح

نہیں اور اگر وہ پھر بھی بقیہ مکانوں پر استحقاق کا دعویٰ کرے تو ان مکانوں کو بھی شامل کیا جائے۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۷/۲۵۴)

وحكما أنها (الهبة) لاتبطل بالشروط. (در مختار مع الشامی، کتاب الهبة، زكريا ۸/ ٤٩٠، کراچی ٥/٦٨٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ٦٩٩١)

مرحوم کی بیوی کا زندگی میں ہی حصہ مانگنا

سوال [۱۱۴۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے والدین مشتاق حسین اور زیتون بیگم کے نام ۹۰؍گز زمین ہے اور میرے بھائی اشتیاق حسین کا انتقال ہو چکا ہے، اس کی بیوی اپنے شوہر کا حق مانگ رہی ہے، جبکہ والدین حیات ہیں تو کیا مرحوم بیٹے کی بیوی اور بچوں کو حق ملے گا، اگر میرے والدین زندگی میں تقسیم کرنا چاہیں تو موجودہ تین لڑکے اور تین لڑکیوں کے درمیان کس طرح تقسیم کریں اور مرحوم بیٹے کی بیوی بچوں کو کتنا کتنا دیں؟

المستفتی: ممتاز حسین اصالت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب اشتیاق حسین مرحوم اپنے والدین کی زندگی میں فوت ہو گیا ہے، اور اشتیاق حسین مرحوم کے دوسرے بھائی زندہ ہیں، تو ایسی صورت میں اشتیاق حسین مرحوم کی بیوی اور بچے اشتیاق حسین کے والدین کے وارث نہیں بنیں گے، ہاں البتہ اگر اشتیاق حسین کے والدین اس کی بیوی اور بچوں کو بطور تحفہ کچھ دیدیں تو اس کے مالک ہو سکتے ہیں اور یہ ایک صلہ رحمی کے طور پر والدین کی طرف سے اچھا اور بہتر اقدام ہوگا، اور اشتیاق حسین کی بیوی اور بچوں کو اپنی مرضی سے بطور صلہ رحمی کچھ دینے کے بعد بقیہ جائیداد

اپنی زندگی میں موجودہ اولاد کے درمیان تقسیم کرنا چاہیں تو ماں باپ کو اختیار ہے کہ تقسیم کردیں، مگر زندگی میں تقسیم کرنے میں لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے برابر دینے کا حکم ہے، نیز مرحوم کے نابالغ بچوں کے اخراجات حسب استطاعت دادا پر لازم ہیں۔

وإن قصد به الإضرار سوّیٰ بينهم يعطي الابنة مثل ما يعطى للابن وعليه الفتویٰ. (هنديه، الباب السادس في الهبة للصغير، زكريا قديم ٤/٣٩١، جديد ٤/٤١٦، قاضيخان زكريا جديد ٣/١٩٤، وعلى هامش الهندية ٣/٢٧٩)

قلت: اعلم أنه إذا مات الأب فالنفقة على الأم والجد على قدر ميراثهما أثلاثا في ظاهر الرواية، وفي رواية على الجد وحده كما سيأتي. (شامي، مطلب: الكلام على نفقة الأقارب، زكريا ٥/٣٣٩-٣٤٠، كراچی ٣/٦١٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۵۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۴/ ۱۴۳۴ھ

بیوی کا شوہر کے والد کی جائیداد میں کوئی حصہ نہیں ہے

سوال [۱۱۴۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمد عظیم کی شادی ۵/ سال پہلے ہوئی تھی، اس کی بیوی کا نام مہ جبیں بیگم ہے، ابھی چار مہینہ پہلے اچانک محمد عظیم کا انتقال ہوگیا، اب سوال یہ ہے کہ محمد عظیم کے والد اور والدہ دونوں زندہ ہیں، اور اس کے کوئی اولاد پیدا نہ ہوسکی، اور اس کی بیوی مہ جبیں بھی زندہ ہے اور اس کی کوئی جائیداد ماں باپ سے الگ نہیں ہے، محمد عظیم کے والد صفدر حسین کے پاس اپنی ملکیت میں مکان اور زمین جائیداد موجود ہے جو صفدر حسین کی اپنی خریدی ہوئی ہے، اور محمد عظیم کی سسرال والے کہتے ہیں کہ مرحوم بیٹے کے باپ کی جائیداد میں سے اس کی بیوی مہ جبیں کو حق ملنا چاہیے، جبکہ صفدر حسین کے تین بیٹے اور تین بیٹیاں بھی موجود ہیں، شریعت کا جو بھی حکم ہو اس کو واضح کیجئے؟

المستفتی: صفدر حسین گھاس منڈی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صفدر حسین کے بیٹے محمد عظیم کی بیوی مہ جبیں صفدر حسین کی نہ شرعی وارث ہے اور نہ ہی صفدر حسین کی جائیداد میں کسی قسم کی حقدار ہے، اور مہ جبیں کے میکے والوں کا مطالبہ شرعاً اور قانوناً دونوں اعتبار سے غلط ہے۔

لایجوز لأحد من المسلمین أخذ مال أحد بغیر سبب شرعي. (شامی، کتاب الحدود، مطلب: فی التعزیر بأخذ المال، کراچی ٤/٦١، زکریا ٦/١٠٦، البحر الرائق کوئٹه ٥/٤١، زکریا ٥/٦٨، هندیه زکریا قدیم ٢/١٦٧، جدید ٢/١٨١)

ولایجوز التصرف فی مال غیره بلا إذنه ولا ولایته. (در مختار مع الشامی ٩/٢٩١، کراچی ٦/٢٠٠)

وشروطه ثلاثة: موت مورث حقیقة أو حکما ...... ووجود وارثه عند موته حیا حقیقة أو تقدیرا. (شامی، کتاب الفرائض، زکریا ١٠/٤٩١، کراچی ٦/٧٥٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍ شوال المکرّم ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۴/۱۰۴۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۱۰/۱۶ھ

مطلقہ بیوی کی اولاد شرعی وارث ہیں لیکن مطلقہ وارث نہیں

سوال [۱۱۴۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے پہلے سسر کا نام انوار حسین تھا اور ان کی بیوی کا نام مہر بانوں ہے، میرے سسر انوار حسین نے میری ساس مہر بانو کو طلاق دیدی تھی، میرے سسر انوار حسین کے دو لڑکیاں تھیں، دونوں لڑکیوں بچپن ہی سے اپنی نانی کے یہاں والدہ ماجدہ کے ساتھ پرورش پائی، دونوں لڑکیاں جوان ہوگئیں، بڑی لڑکی کی مجھ سے (خود سکندر) علی کے ساتھ شادی ہو گئی، میری ایک چھوٹی سالی باقی رہ گئی ہے، جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے، میرے سسر

انوار حسین نے دوسری شادی کرلی، جس سے ایک لڑکا پیدا ہوا، اس کی عمر تقریبا ۷/۸/سال ہے وہ میرا سوتیلا سالا ہوتا ہے، میرے سسر نے ایک مکان دہلی اور ایک مکان امروہہ میں چھوڑا ہے، اور میرے سسر انوار حسین ہمدرد دواخانہ میں نوکری کرتے تھے، ان کا فنڈ اور بیمہ ہے، میری بیوی اور میری سالی اور میرا سوتیلا سالا ملکیت جائیداد میں اور نقدی میں کون کتنے کا مالک ہوتا ہے اس کا آپ ہمیں حساب بنادیں؟

نوٹ: سسر کے ورثاء میں ابھی دوسری بیوی بھی زندہ ہے اور ایک لڑکا اور مطلقہ بیوی سے دولڑکیاں موجود ہیں۔

المستفتی: سکندر علی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت سوال وبعدادائے حقوق ماتقدم وعدم موانع ارث انوار حسین مرحوم کا کل ترکہ شرعی ورثاء کے درمیان درج ذیل طریقے سے تقسیم ہوگا:

$\frac{۳۲}{۸}$

انوار حسین میــــــــــــــــــــــــــــــت

زوجہ ثانیہ	لڑکا	لڑکی	لڑکی
$\frac{۱}{۴}$	۱۴	$\frac{۷}{۷}$	۷

کل ترکہ ۳۲/سہام میں تقسیم ہوکر زوجۂ ثانیہ کو ۴/ اور لڑکے کو ۱۴/ اور دونوں لڑکیوں میں سے ہر ایک کو سات سات سہام ملیں گے، پہلی بیوی جس کو طلاق دے چکا ہے، اس کو کوئی حق نہیں ملے گا، اور اس کے بطن سے انوار حسین کی جو دولڑکیاں پیدا ہوئی ہیں ان کو اپنے باپ کے ترکہ میں سے پورا پورا حق ملے گا، ماں کو طلاق دینے سے اولاد محروم نہیں ہوسکتی۔

﴿ يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ اَوۡلَادِكُمۡ لِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ . [النساء: ۱۱] ﴾

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶۳۹/۲۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۲/۴/۱۴ھ

مطلقہ اوراس کے بیٹے کا شوہر کی جائیداد میں حصہ

سوال [۱۱۴۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ارشد علی ولد فرزند علی ساکن محلّہ سرائے کشن لال مرادآباد میرے فرزند ارجمند جن کا نام فیضان علی تھا، جن کی شادی ۲۷/مئی ۲۰۰۰ء میں ہمراہ روبینہ بنت علی جان صاحب ساکن محلّہ شاہ آباد گیٹ رامپور سے ہوئی تھی، میاں بیوی کے درمیان کسی بات کو لے کر تکرار ہوگئی، اس نے اتنا طول پکڑا کہ طلاق کی نوبت آگئی، ۲۰۰۹ء میں طلاق واقع ہوگئی، بہر کیف اس درمیان ۲۶/مئی ۲۰۱۴ء میں اچانک طبیعت بگڑنے کی صورت میں عزیزم فیضان علی کا انتقال ہوگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

غور طلب امر یہ ہے کہ اب عزیزم فیضان علی کی مطلقہ بیوی روبینہ اپنے حق کا مطالبہ کررہی ہے، اور مکان میں رہائش بھی کرنا چاہتی ہے، کیا یہ روبینہ کے لیے جائز ہے، اور عزیزم فیضان علی کے نام سے کوئی جائیداد نہیں ہے، نیز عزیزم فیضان علی کے صاحبزادے صبور علی والدہ کے ساتھ ہیں، لہٰذا آنجناب سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ جواب عنایت فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں کہ فیضان علی مرحوم کی مطلقہ بیوی کا مجھ سے حق کا مطالبہ کرنا شرعاً جائز ہے یانہیں؟ اسی طرح مرحوم فیضان علی کے بیٹے کا بھی میری جائیداد میں حق ہے یانہیں؟

المستفتی: ارشد علی ولد فرزند علی محلّہ سرائے کشن لال مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب فیضان علی نے اپنی موت سے کئی سال پہلے اپنی بیوی روبینہ کو طلاق دے کر زوجیت سے الگ کردیا ہے تو اسلامی شریعت میں روبینہ کا فیضان علی کے ساتھ کوئی رشتہ باقی نہیں رہا، لہٰذا فیضان علی کی وفات پر روبینہ کسی طرح اس کی وارث نہیں بن سکتی، نیز سوال نامہ میں اس بات کا ذکر ہے کہ فیضان علی کی ملکیت میں کوئی بھی چیز نہیں رہی ہے، اس لیے فیضان علی کے بیٹے صبور علی کو باپ کا ترکہ نہ ہونے کی وجہ سے کچھ

نہیں ملے گا، اگر باپ کا کچھ بھی ترکہ ہے تو صبور علی کو اپنے باپ کی شرعی میراث ملے گی، مگر روبینہ کو کوئی چیز نہیں ملے گی، نیز دادا کے اوپر اپنے پوتے کی پرورش کا خرچہ لازم ہوتا ہے، بشرطیکہ دادا کی پرورش میں رہے اور دادا اپنی مرضی سے پوتے کے نام کچھ جائیداد کرنا چاہے تو پوتے کو مل سکتی ہے، ورنہ پوتے کو دوسری اولاد کی موجودگی میں کچھ نہیں ملے گا، نیز ابھی دادا خود زندہ ہے، اس لیے اس کی جائیداد میں سے کسی کو مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے۔

وأجمعوا أنه لو طلقها في الصحة في كل طهر واحدة ثم مات أحدهما لايرثه الآخر. (فتح القدير، باب طلاق المريض، زكريا ١٢٩/٤، كوئٹه ٢/٤، دار الفكر ١٤٥/٤)

قوله طلقها رجعيا أو بائنا في مرض موته ومات في علتها ورثت وبعدها لا ...... لأن النكاح في العدة يبقى في حق بعض الآثار فجاز أن يبقى في حق إرثها عنه بخلاف ما بعد الانقضاء لأنه لا إمكان، والزوجية في هذه الحالة ليست بسبب لإرثه عنها، فيبطل في حقه خصوصا إذا رضي به. (البحر الرائق، باب طلاق المريض، زكريا ٧٠/٤، كوئٹه ٤٢/٤، البنايه اشرفيه ديو بند ٤١/٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ ذی قعدہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۶۷۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۱۱/۱۴۳۵ھ

عدت مکمل ہونے کے بعد مطلقہ کا سابق شوہر اس کا وارث نہیں

سوال [۱۱۴۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کی دو بیویاں تھیں، پہلی بیوی کو طلاق دیدی، بعد طلاق زید نے دین مہر دینا چاہا مگر اس نے مہر لینے سے انکار کر دیا کہ قیامت میں لوں گی، زید نے مطلقہ کو مہر دینے کی بارہا کوشش کی مگر ہر بار وہ مہر لینے سے انکار ہی کرتی رہی اور معاف بھی نہیں کیا، حتی کہ بیوی کا انتقال ہو گیا، لہٰذا بتایا جائے کہ اس کی مہر کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی؟

آپ نے تحفۂ خواتین ماہ ربیع الاول ۱۴۲۵ھ دینی مسائل اوران کا حل کے جواب

میں لکھا ہے کہ مسئولہ صورت میں وہ مہر بیوی کے ترکہ میں شامل ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ مرحومہ کے وارث کون ہوں گے، والدین بھائی وغیرہ، یا مرحومہ کی اولاد اور شوہر وغیرہ، کیونکہ مرحومہ کے شوہر کے علاوہ دولڑکے، دولڑکیاں بھی ہیں، جو شادی شدہ ہیں، اور زید سے علیحدہ رہتے ہیں۔

الغرض اگر ورثاء بھی اس مہر کو بوجہ رنجش لینے سے انکار کردیں تو ایسی صورت میں اگر زید اس دین مہر کو جس کی مقدار صرف گیارہ سو روپیہ ہے، بطور صدقہ جاریہ کے ایک مشت کسی مسجد یا مدرسہ میں دیدے تو مہر ادا ہو جائے گا یا نہیں؟ اور زید اس قرض سے سبکدوش ہو کر عند اللہ بری ہو جائے گا یا نہیں؟ نیز یہ بھی بتایا جائے کہ ورثاء میں کن کن کو کتنا کتنا حصہ ملے گا؟ اور دین مہر کی کل رقم صرف گیارہ سو روپیہ ہے۔

المستفتی: ریاض الدین پورنیہ بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مسئولہ صورت میں مرحومہ بیوی کا مہر اس کے شرعی وارثین میں تقسیم ہوگا، اور اس کے وارثین میں والدین اور اولاد شامل ہیں، طلاق دینے والا شوہر عدت کے بعد اس کا وارث نہ ہوگا، لہٰذا مہر کی کل رقم چھ حصوں میں کر کے ایک ایک حصہ والدین کو ملے گا، اور بقیہ حصے میں لڑکے اور لڑکیاں "لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ" کے ضابطہ سے مستحق ہوں گے، اگر سب وارثین کی مرضی سے یہ رقم صدقہ جاریہ میں لگا دیں تو درست ہے مگر سابقہ شوہر کو ورثاء کی مرضی کے بغیر اسے کسی جگہ استعمال کا حق نہیں ہے۔

﴿ يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ . [النساء: ١١] ﴾

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ذی قعدہ ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۸۹۵۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/۱۱/۱۴۲۶ھ

بہن کے حصے میں بھائی کا حق

سوال [۱۱۴۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں اپنی بہن اور بہنوئی کے گھر رہتا تھا، بہنوئی کے ساتھ کام کرتا تھا، وہ لوگ اپنی اولاد کی طرح مجھے رکھتے تھے، میں بھی اولاد کی طرح ان کے ساتھ کام کرتا تھا، بہنوئی کوشگر کی بیماری تھی، وہ بہت کمزور ہو گئے تھے، ۱۹۸۳ء میں ان کا انتقال ہو گیا، بچوں کی ساری ذمہ داری میرے سر پر آ گئی، میری بہن بولی کہ بھائی ان لڑکیوں کا تو ہی باپ ہے، اور تو ہی بھائی بھی ہے، تو میں نے ان لڑکیوں کی خاطر اپنی شادی بھی نہیں کی ہے، اس کے بعد بہن کا بھی انتقال ہو گیا، بہن کے مرنے کے تین سال بعد دونوں لڑکیوں کی شادی کی، ۳۵ر سال تک میں بمبئی میں رہتا رہا، اب میں نے اپنی شادی کی تو ان لوگوں نے مجھے بمبئی سے نکال دیا، اور کہا کہ تمہارا کوئی کام نہیں ہے، میرے بہن بہنوئی، دو کروڑ بیس لاکھ روپئے کی پروپرٹی چھوڑ کر گئے ہیں، میری بہن کے لڑکا کوئی نہیں تھا، پانچ لڑکیاں تھی، ان کے مال میں میرا کچھ حصہ نکلتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: ابوشحمہ اصالت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بہن کا جو سرمایہ اس کا اپنا ذاتی تھا، اور شوہر کی دولت میں سے بہن کا حق آٹھواں حصہ بھی ہے، یہ آٹھواں حصہ اور بہن کا دیگر ذاتی سرمایہ تین حصوں میں تقسیم ہو کر دو حصہ پانچوں لڑکیوں کو ملیں گے اور بقیہ ایک حصہ بھائی کے عصبہ ہونے کی وجہ سے اس کو ملے گا، اور سالہ بہنوئی کا وارث نہیں ہوتا۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۳ر شعبان المعظم ۱۴۳۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۴۷۳)	۱۴۳۲/۸/۱۴ھ

بہن کے نام ایف ڈی میں بھائی کا حصہ

سوال [۱۱۴۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: میرے والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے، ہم دو بہن بھائی ہیں، میرے والد صاحب کی ایک ایف ڈی ہے جس میں میری بہن نومنی ہے، کیا اس ایف ڈی کی رقم میں میرا کوئی حق بنتا ہے؟

المستفتی: محمد توقیر محلّہ بھٹی مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: ایف ڈی کی پالیسی میں محض نومنی یا کسی کے نام سے اس کو نامزد کرا دینے سے دیگر ورثاء کا حصہ سوخت یا ختم نہیں ہوجاتا بلکہ شرعاً سب وارثین حسب حصص شرعیہ اس میں شریک ہوں گے، اور اس ایف ڈی میں جو سود کی رقم آئے گی وہ حرام اور ناجائز ہے، کسی کے لیے بھی حلال نہیں ہے، اگر انکم ٹیکس یا سیل ٹیکس وغیرہ لازم ہے تو اس میں دے سکتے ہیں، ورنہ نادار فقراء کو بغیر نیت ثواب صدقہ کر دینا لازم ہے، اور رأس المال جو جمع کیا گیا ہے وہ وارثین کے درمیان حصص شرعیہ کے مطابق تقسیم ہوگا۔

وتتم بالقبض الكامل لأنها من التبرعات، والتبرع لايتم إلا بالقبض. (شرح المجلة، رستم ١/ ٤٦٢)

وتتم الهبة بالقبض الكامل لقوله عليه السلام لاتجوز الهبة إلا مقبوضة. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دار الكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩١، مصرى قديم ٢/ ٣٥٣، شامى كراچى ٥/ ٦٩٠، زكريا ٨/ ٥٢٠، الفتاوىٰ التاتارخانية زكريا ١٤/ ٤٢١، رقم: ٢١٥٦٣، شرح المجلة رستم اتحاد ١/ ٤٧٣، رقم المادة: ٨٦١)

من ملك بملك خبيث ولم يمكنه الرد إلى المالك فسبيله التصدق على الفقراء. (معارف السنن، اشرفى بكڈپو ديوبند ١/ ٣٤)

والحيلة عند الحنفية في جواز ذٰلك مع الكراهة أن يتصدق بها على الفقير. (الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٦/ ٢٤٤) فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۵۵)

ربیب وارث نہیں ہے

سوال [۱۱۴۶۹]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے ایک رانڈ عورت سے نکاح کیا تھااس کے ساتھ ایک بچہ نادان آیا تھا، میں نے اس کو پال پوس کر بڑا کیا، اب ایک بچہ اسی بیوی سے میرے نطفہ سے پیدا ہوا ہے تو کیا بیوی کے ساتھ آیا ہوا بچہ میرے مال کا حقدار ہوسکتا ہے، ان دونوں بھائیوں میں بہت دشمنی چل رہی ہے، تو پہلے والے لڑکے کو جدا کرکے اس کو ہٹا سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: محمد اسجد گلاب باڑی کٹ گھر مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو بچہ بیوی کے ساتھ آیا تھا وہ شرعی طور پر آپ کا وارث نہیں ہے، آپ کی دولت میں شرعی طور پر کسی حصہ کا حقدار نہیں ہے، اور جو لڑکا آپ سے پیدا ہوا ہے وہ آپ کا وارث ہے اور جو بچہ بیوی کے ساتھ آیا ہے وہ آپ کے خاندان کا فرد نہیں ہے اور اس کے لیے قرآن وحدیث اور فقہ سے وراثت ثابت نہیں ہے، اور اپنی اولاد کے لیے ثابت ہے۔

﴿قال اللّٰہ تعالی: يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ. [النساء: ۱۱]﴾ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ربیع الثانی ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۹۶۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۴/۸ھ

بھتیجے کو حصہ دینے کی شرعی حیثیت

سوال [۱۱۴۷۰]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ عائشہ خاتون کا انتقال ہوا، اس کے ورثاء میں پانچ لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہیں جبکہ ایک لڑکا شمیم والدہ کی حیات میں ہی انتقال کرگیا تھا، جس کا ایک لڑکا محمد وسیم ہے، مرحومہ

محمد شمیم کے بھائی اپنے بھتیجے کو بخوشی حصہ دینا چاہتے ہیں، مفتی صاحب سے درخواست ہے کہ ہر وارث کو کتنا ملے گا؟ واضح فرمائیں۔

المستفتی: محمد ندیم گل شہید مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عائشہ خاتون کے وارثین میں شرعی طور پر اس لڑکے کی اولاد شامل نہیں ہے، جس کا انتقال عائشہ کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا، لیکن اگر سارے وارثین اپنی رضامندی سے مرحوم لڑکے کی اولاد کو بھی اتنا دینا چاہتے ہیں جتنا ایک بھائی کا حصہ بن سکتا ہے، تو وارثین کی طرف سے یہ ایک بہترین صلہ رحمی کا اقدام ہے، ان شاء اللہ اس سے تمام وارثین من جانب اللہ اجر وثواب کے مستحق ہوں گے۔

عن أبی هريرة –رضی الله عنه– عن النبی ﷺ قال: من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليصل رحمه. (بخاری، باب إكرام الضيف وخدمته إياه بنفسه، النسخة الهندية ۲/۹۰۶، رقم: ۵۹۰۰، ف: ۶۱۳۸)

عن أنس بن مالك –رضی الله عنه أن رسول الله ﷺ قال: من أحب أن يبسط فی رزقه وينسأ له فی أثره فليصل رحمه. (بخاری شريف، باب من بسط له فی الرزق لصلة الرحم، النسخة الهندية ۲/۸۸۵، رقم: ۵۷۵۲، ف: ۱۵۹۸۶)

اور کل ترکہ درج ذیل طریقہ پر تقسیم ہوگا:

۱۵
میـــــــت

لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی
۲	۲	۲	۲	۲	۱	۱	۱	۱	۱

کل ترکہ ۱۵/سہام میں تقسیم ہو کر مرحوم کے زندہ لڑکوں میں سے ہر لڑکے کو ۲/۲ اور لڑکیوں کو ایک ایک ملے گا، اور مرحوم لڑکے کی اولاد کو دینے کی صورت میں کل ترکہ ۱۷/سہام میں تقسیم ہو کر ہر ایک کو ۲/۲ اور لڑکیوں کو ایک ایک ملے گا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/جمادی الثانیہ ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/۱۲۰۷۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۶/۵ھ

پوتا شرعی وارث ہے یا نہیں؟

سوال [۱۱۴۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا دادا، پردادا کی موروثی جائیداد میں بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتا پوتی کا بھی حق ہوتا ہے؟

ایک بیٹا اپنے باپ سے یہ کہہ کر اپنا حق جائیداد سے مانگ رہا ہے کہ یہ ہمارے دادا کی موروثی جائیداد ہے اس میں میرا بھی حق ہے، جبکہ باپ کہتا ہے کہ بیٹا میرے مرنے کا انتظار کرو، جب تک میں زندہ ہوں تمہارا کوئی حق نہیں، بس رہتے رہو، مہربانی فرما کر جتنی جلدی ممکن ہو ارشاد فرمائیں نوازش ہوگی؟

المستفتی: ماسٹر عبدالحق ہلدوانی نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دادا، پردادا کی موروثی جائیداد میں بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتا، پوتی کا کوئی حق نہیں ہوتا ہے، اور یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ موروثی جائیداد میں سے جو ملا ہوا ہے، اس میں اور خود کی خریدی ہوئی جائیداد میں ملکیت کے اعتبار سے اور آئندہ نسلوں میں وراثت جاری ہونے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوتا ہے، جس طرح خود کی خریدی ہوئی جائیداد میں سے بیٹے کی موجودگی میں پوتے وارث نہیں ہوتے ہیں، اسی طرح موروثی جائیداد میں بیٹے کی موجودگی میں پوتے وارث نہیں ہوں گے، لہٰذا بیٹے نے باپ سے موروثی جائیداد میں سے اپنا حق جائیداد کا جو مطالبہ کیا ہے وہ ناجائز مطالبہ ہے، کیونکہ باپ کے ہوتے ہوئے موروثی جائیداد میں سے بیٹا کسی بھی حصہ کا حق دار نہیں ہوتا ہے، باپ کو اختیار ہے کہ اپنی زندگی میں بحالت صحت موروثی جائیداد میں مکمل طور پر مالکانہ تصرف کرنا چاہے یا بیچ کھائے یا کسی کو تحفہ میں دیدے۔

عن المغيرة عن أصحابه في قول زيد بن ثابت و علي بن أبي طالب و ابن مسعود رضي الله عنهم إذا ترك المتوفىٰ ابنا فالمال له، وقوله: إذا

ترک ابنا وابن ابن فلیس لابن الابن شيئ، وكذٰلك إذا ترك ابن ابن و أسفل منه ابن ابن و بنات ابن أسفل فليس للذي أسفل من ابن الابن مع الأعلى شيئ، كما أنه ليس لابن الابن شيئ. (السنن الكبریٰ للبيهقي، كتاب الفرائض، باب ترتيب العصبة، دار الفكر ۹/ ۳۰۲، رقم: ۱۲۶۲۹)

يحجب الأبعد بالأقرب كالابن ويحجب أولاد الابن. (الدر المنتقیٰ في شرح الملتقیٰ، كتاب الفرائض، دار الكتب العلمية بيروت ۴/ ۵۱۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۲۰۰۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/ ۴/ ۱۴۳۶ھ

مشترکہ حادثہ میں وفات پانے والا وارث ہے یا نہیں؟

سوال [۱۱۴۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کہ میری شادی تقریباً ۱۴/ سال قبل مولانا قمر الدین ولد جناب مولانا امام الدین صاحب کے ساتھ ہوئی تھی۔

(۲) تین سال تک ہم زوجین اپنے ساس وخسر کے ساتھ مشترکہ طور پر رہتے رہے۔

(۳) اس کے بعد چند گھریلو وجوہات کی بنا پر ہمارے خسر نے ایک علیحدہ مکان ہمارے شوہر کو دے کر ہمیں مشترکہ نظام خانہ زندگی سے الگ کر دیا۔

(۴) مکان کا مکمل مالک وقابض اپنے بیٹے کو بنا دیا تھا، اور اپنے حق سے دستبردار ہو گئے تھے، اور بذات خود اپنے دوسرے بیٹے شرف الدین کے ساتھ دوسرے مکان میں رہائش پذیر تھے، اور وہ حصہ اس حصہ سے رقبۃً بڑا ہے، جو میرے شوہر کو دیا تھا، نیز ان کے دو ہی لڑکے تھے، ایک لڑکے کا انتقال ہو گیا تھا۔

(۵) مکان میں کچھ تعمیرات بھی ہمارے شوہر نے کرائی۔

(۶) ہمارے شوہر اپنے والد کے مدرسہ میں تنخواہ دار ملازم تھے۔

(۷) ہمارے شوہر چند وجوہات کی بنا پر والد کے مدرسہ سے مستعفی ہو کر نینی تال امامت کرنے کے لیے چلے گئے، تقریباً ڈیڑھ سال تک انہوں نے امامت کی اور ہم اپنے والد کے گھر چلے آئے، دوران قیام نینی تال مکان پر ہمارے شوہر ہی دخیل وقابض رہے۔

(۸) اس کے بعد ہمارے خسر کو پھر ان کی سخت ضرورت محسوس ہوئی تقریبا ۱۲ رنفر کا ایک وفد اپنے لڑکے مولانا قمر الدین کو بلانے کے لیے روانہ کیا ہمارے شوہر آنے کے لیے تیار نہیں تھے، لیکن وہ چند شرطوں کے ساتھ آ گئے، جن کا ہمیں علم نہیں ہے۔

(۹) گذشتہ سال ہمارے شوہر اور ان کے والد مولانا امام الدین صاحب ایک حادثہ میں ایک ساتھ شہید ہو گئے، ان کے بعد حتمی طور پر یہ معلوم نہیں کہ پہلے کس کا انتقال ہوا، پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق ہمارے شوہر کا انتقال پہلے قرار دیا گیا۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ مولانا امام الدین کی جائیداد میں ہمارے شوہر حقدار ہوں گے یا نہیں؟ انہوں نے کافی جائیداد چھوڑی اور اپنے انتقال پر ایک بیوی ایک لڑکا اور ۲ رلڑکیاں چھوڑیں، نیز ہمارے مرحوم شوہر پر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا شرعاً اعتبار کیا جائے گا یا نہیں؟

(۱۰) ہمارے خسر نے جو مکان اپنے لڑکے کو دیدیا تھا اس میں ہم اور ہمارے بچے حقدار ہوں گے یا نہیں؟ شریعت کی روشنی میں جواب مرحمت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

المستفتی: بیوہ مولانا قمر الدین مرحوم رام نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا قمر الدین صاحب مرحوم کو باپ نے جو مکان دیا ہے وہ مالکانہ طور پر دے کر علیحدہ کر دیا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ مولانا قمر الدین صاحب ان کے والد حضرت مولانا امام الدین صاحب مرحوم کا مدرسہ بھی چھوڑ کر نینی تال جا کر امامت کرنے لگے اور باپ کے اپنے مدرسہ میں بلانے کے باوجود آنے کے لیے تیار نہیں تھے، اور دس بارہ نفری لوگوں کو سفارشی بنا کر کے بلایا گیا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مولانا قمر الدین صاحب ان کے والد حضرت مولانا امام الدین صاحب کی فیملی سے بالکل الگ تھلگ رہے ہیں، لہٰذا اس علیحدگی میں جو مکان مولانا

قمرالدین صاحب کو دیا گیا ہے وہ شرعی طور پر باپ کی طرف سے ہبہ ہے اور ہبہ پر مالکانہ قبضہ بھی ثابت ہو چکا ہے، اس لیے وہ مکان مولانا قمرالدین کی ملکیت ہے۔

وتصح بإيجاب ...... وبقبول ...... وتتم الهبة بالقبض الكامل. (در مختار مع الشامی، کتاب الهبة، زکریا ۴۹۳/۸، کراچی ۶۹۰/۵)

ويتم بالمالك وحده والقبول شرط ثبوت الملك للموهوب له.

(هنديه، كتاب الهبة، الباب الأول، زكريا جديد ۳۹۵/٤، قديم ۳۷٤/٤)

اب رہی مشترکہ حادثہ میں دونوں کی موت واقع ہونے کی صورت جبکہ حتمی طور پر باپ کی موت کا پہلے ہونا ثابت نہیں ہے، اسی طرح بیٹے کی موت کا بھی پہلے ہونا ثابت نہیں ہے تو ایسی صورت میں ایک دوسرے کے وارث بنیں گے یا نہیں؟

تو حکم شرعی یہ ہے کہ نہ بیٹا باپ کا وارث بنے گا اور نہ ہی باپ بیٹے کا وارث بنے گا اور پوسٹ مارٹم کے ذریعہ سے تقدم وتأخر کو ثابت کرنا شرعاً معتبر نہیں ہے، کیونکہ حق وراثت میں جہالت مورث اور جہالت وارث دونوں ہی مانع وراثت ہیں، لہٰذا جب مولانا قمر الدین کا بیٹا موجود ہے، اور حضرت مولانا امام الدین صاحب کا بھی ایک بیٹا موجود ہے تو ایسی صورت میں مولانا قمرالدین کی جائیداد میں بھی مولانا امام الدین کے بیٹے اور بیٹیاں وارث نہیں بنیں گے، اسی طرح مولانا امام الدین صاحب کی جائیداد میں بھی مولانا قمر الدین کے بیٹے اور بیٹیاں اور بیوی وارث نہیں ہوں گے، ہاں البتہ مولانا قمرالدین کی ماں قمرالدین کی جائیداد میں چھٹے حصے کی حقدار رہے گی۔

وبقي من الموانع جهالة تاريخ الموتىٰ كالغرقىٰ والهدمىٰ والقتلىٰ ومنها جهالة الوارث. (در مختار مع الشامی، کتاب الفرائض، زکریا ۵۱۰/۱۰، کراچی ۷۶۸/۶)

إذا ماتت جماعة بينهم قرابة ولا يدرى أيهم مات أولا كما إذا غرقوا في السفينة معا ...... ولم يعلم التقدم والتأخر في موتهم جعلوا كأنهم ماتوا معا، فمال كل واحد منهم لورثته الأحياء ولايرث بعض هؤلاء الأموات من

بعض هذا هو المختار عندنا. (الشريفيه ص:۱۵۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ جمادی الثانیہ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۰۹۳)

نومسلمہ اور اس کے بچوں کو حصہ ملے گا یا نہیں؟

سوال [۱۱۴۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کی دو بیوی ہیں، دونوں حیات ہیں پہلی بیوی جس سے زید کا نکاح ۲۰۰۵ء میں ہوا تھا، نکاح کے بعد اس سے ایک لڑکا ہے، جس کا نام محمد کفیل حمزہ ہے۔

دوسری بیوی نومسلمہ ہے، ایمان لانے سے پہلے اس کے بطن سے زید کے دو بچے ہیں، ایک لڑکی اور ایک لڑکا، نکاح کے تین ماہ کے بعد ایک لڑکی زید سے اور پیدا ہوئی، زید کی اپنی کوئی جائیداد نہیں ہے، اگر والد کی جائیداد میں سے آگے چل کر کوئی حصہ زید کو پہنچتا ہے تو مندرجہ بالا بچوں کا اس حصہ میں سے کس کو شرعی طور پر کتنا حصہ ملے گا؟

المستفتی: محمد یامین جھبو کا نالہ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں زید کو جو کچھ بھی والد کی طرف سے ملے گا اس میں صرف زید کی پہلی بیوی سے پیدا شدہ محمد کفیل حمزہ ہی شرعاً حقدار ہوں گے، اور نومسلمہ بیوی سے نکاح سے پہلے جو اولاد ہوئی ہے یا نکاح کے تین مہینہ بعد جو لڑکی پیدا ہوئی ہے وہ سب اس کی وارث نہیں ہوں گی، اس لیے کہ شرعاً ان بچوں کا نسب زید سے ثابت نہیں ہوا، بشرطیکہ زید کی نومسلمہ بیوی نے آخری بچہ کی ولادت سے تین مہینہ پہلے ہی ایمان لاکر زید سے نکاح کیا ہو، لیکن اگر زید کی نومسلمہ بیوی نے تینوں بچوں کی پیدائش سے پہلے خفیہ طور پر اسلام لاکر زید سے نکاح کرلیا تھا، اور پھر یہ بچے پیدا ہوئے ہیں، اور بعد میں جو نکاح ہوا ہے وہ نکاح صرف ظاہراً لوگوں کو دکھانے کے لیے ہوا ہے، تو زید کے وہ سارے بچے بھی زید کے وارث قرار

پائیں گے، اور یہ سب باتیں اسی وقت صحیح طور پر معلوم ہوسکتی ہیں جب زید سے براہ راست اس بارے میں گفتگو کی جائے۔ (مستفاد: کفایت المفتی جدید ۸/ ۲۸۸، فتاویٰ دار العلوم ۱۷/ ۵۳۹)

عن أبي هريرة رضی الله عنه قال: قال النبی ﷺ: الولد للفراش وللعاهر الحجر. (بخاری شریف، باب للعاهر الحجر، النسخة الهندية ٢/ ١٠٠٧، رقم: ٦٥٦٠، ف: ٦٨١٨)

ويستحق الإرث برحم و نكاح صحيح فلا توارث بفاسد ولا باطل اجماعا و ولاءً. (در مختار مع الشامی، کتاب الفرائض، زکریا ١٠/ ٤٩٧، کراچی ٦/ ٧٦١، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ٤٩٥، مصری قديم ٢/ ٧٤٧)

وإذا تزوج الرجل امرأة فجاءت بولد لأقل من ستة أشهر منذ يوم تزوجها لم يثبت نسبه. (هدايه، کتاب الطلاق، باب ثبوت النسب، اشرفی دیوبند ٢/ ٤٣٢، هنديه زكريا قديم ١/ ٥٣٦، جديد ١/ ٥٨٨) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍ محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۵۶)

تقسیم میراث سے متعلق ایک سوال

سوال [۱۱۴۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں آپ سے شرعی طور پر وراثت کی تقسیم کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتی ہوں، تاکہ میں احکام شرعیہ کے مطابق اپنی ملکیت کو تقسیم کرسکوں، پہلے تو یہ عرض کرنا مناسب ہوگا کہ میرے پاس جو آراضی ہے وہ میرے والد محترم نے ۱۹۶۵ء میں ۱۶۵؍ گز جگہ تین لڑکیوں کے نام سے خریدی تھی (جس میں ایک میرے نام اور دو میری دوسری بہنیں ہیں) اس آراضی سے ہونے والی آمدنی کو میرے والد اور بھائی لوگ وصول کرتے رہے (میرے تین بھائی ہیں اور ہم سب چھ بہنیں ہیں) ۱۹۶۵ء میں میری شادی ہوگئی اور میں اپنی سسرال چلی گئی، میرے دو بچے ہیں، ایک لڑکا جس کی عمر اس وقت ماشاء اللہ ۱۷؍ سال مکمل

ہونے جارہی ہے اوراس سے دوسال بڑی ایک لڑکی جس کی عمر ۱۹/سال ہے، اوراس کی شادی کو بھی ماشاء اللہ ایک سال مکمل ہو چکا ہے، اس آراضی پر ہمارے ایک کرایہ دار نے قبضہ کرلیا جس کو خالی کرانے میں میرے والد اور بھائی لوگوں کو کافی مشکلات پیش آرہی تھیں، چنانچہ انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم اس جگہ کو خالی کرالو، پھر والد نے مجھ سے کہا: اور اللہ کے حکم سے اس جگہ کو میں نے ۱۹۸۸ء میں خالی کرالیا، حالات کے تقاضہ کے تحت وہاں مجھے رہنا پڑا، جگہ بہت اجاڑ اور سنسان اور دیہاتی ہے، مگر اللہ کے سہارے وہاں رہی، ۱۹۸۹ء میں اسکول کی بنیاد ڈالدی، اسکول کی بلڈنگ اور تمام فرنیچر اور ضروری سامان میں نے خود ذاتی پیسہ سے تیار کیا، اوراس جگہ پر رہنے کے لیے بھی کچھ حصہ صحیح کرنا پڑا، جس کو میں نے خود کیا، لیکن یہ سب کام بنا کسی لالچ وغرض کے کرتی رہی، اور نیت یہ تھی کہ جس وقت بھی والد محترم مجھ سے جگہ مانگیں گے فوراً دیدوں گی، میرے والد کی اور بھی بہت ملکیت ہے، جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے، ۶/بیگہ زمین ایک بھائی کے نام پر اور ۱۲/بیگہ زمین ایک بھائی کے نام پر خریدی گئی، تین بیگہ زمین دوسرے بھائی کے نام سے، ۲۰/بیگہ زمین والدہ کے نام سے، تین بیگہ زمین دو بہنوں کے نام سے، ۴۵/بیگہ باغ والدہ اور میری چار بہنوں کے نام سے، ۴۰/بیگہ کھیت والدہ اور چار بہنوں کے نام سے، ایک کوٹھی میرے والد کے نام سے جس میں تینوں بھائی مقیم ہیں۔

غرض ایک دن میرے والد نے ہم تین بہنوں کے نام سے جو آراضی ۱۶۵/گز جس کا ذکر کرچکی ہوں اس کو پورا کا پورا میرے نام، ان دونوں بہنوں نے اپنا حصہ بھی ہبہ کردیا، جو کہ ہبہ زبانی کے علاوہ تحریری بھی ہے، جس پر ان کے شوہروں اور دو دو گواہوں کے دستخط بھی موجود ہیں، میری ان دونوں بہنوں کو اس جگہ کے بدلے دوسری جگہ دیدی گئی، اور یہ جگہ مجھ کو یہ کہہ کردی گئی کہ اس کو میں نے اپنی محنت سے اس کرایہ دار سے خالی کرایا جس کو خالی کرانے میں کافی مقدمہ داری اور پریشانی کا سامنا تھا، دوسرے یہ وہاں اکیلے بچوں کو لے کر رہی (میرے شوہر میرے ساتھ نہیں ہیں، جب میں اس جگہ آئی تو اس وقت میری بچی ۹/سال اور بیٹا ۷/سال کا تھا اسکول قائم کیا، اور یہ اسکول اسی طرح چلتا رہا، یہ اسکول میں نے اپنی والدہ

کے نام سے قائم کیا ہے، یہاں دیہات میں آبادی مسلم ہے، یہاں کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے میں نے اسکول قائم کیا کیونکہ یہاں کوئی اسکول نہیں تھا۔

(۱) اب آپ مجھے اسلامی رو سے یہ بتانے کی تکلیف کریں کہ ان دونوں بہنوں کا اس پر کوئی شرعی حق تو نہیں ہے؟

(۲) اگر اس جگہ کو میں پورا کا پورا قوم کے نام یعنی اسکول کے نام کردوں تاکہ اسی طرح یہ آگے چلتا رہے تو مجھ سے کسی کی حق تلفی تو نہ ہوگی؟

(۳) میرے دو بچوں کا اس میں کہاں تک اور کتنا حصہ ہوسکتا ہے؟

(۴) میرے قرض، نماز، روزہ، اورزکوۃ، حج وغیرہ کا فدیہ میری موت کے بعد اس جائیداد میں سے کس طرح سے ادا ہوسکتا ہے؟

(۵) والد کی جس خرید جائیداد کی تفصیل میں نے اوپر عرض کی ہے اس میں سے بہنوں اور بھائیوں کا کس طرح ورثاء میں شمار ہوگا؟

(۶) جو جگہ الگ الگ بھائیوں کے نام سے خریدی گئی ہے کیا وہ ورثاء میں تقسیم ہوتے وقت والد کی ملکیت میں سمجھی جائے گی، یا صرف وہی ملکیت والد کی سمجھی جائے گی، جو اس وقت ان کے نام پر ہے، والد صاحب اگر اپنی حیات میں والدہ یا کسی بھائی بہن کا حصہ فروخت کردیں تو اس پر ان کا اختیار ہوگا، والد کے بعد بچی ہوئی جائیداد کس طرح تقسیم ہوگی؟ امید ہے کہ آپ شرعی نقطۂ نظر سے سمجھا کر ہمیں راستہ دکھائیں گے، جس کو اپنا کر ہم اپنا فرض ادا کرسکیں، اور ہم سے کوئی ایسی بھول نہ ہوجائے جس سے اللہ کے حضور ہماری پکڑ اور رسوائی ہو۔

المستفتیه: ایک مسلم خاتون

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) ان بہنوں نے آپ کو بخوشی ہبہ کردیا ہے اور اس پر آپ کا قبضہ بھی ہے، اب آئندہ ان بہنوں کا اس میں کوئی حق باقی نہیں رہا۔

الهبة عقد مشروع (الی قوله) والقبض لابد منه لثبوت الملك.

(هدایه، کتاب الهبة، اشرفی ۳/ ۲۸۳، رشیدیه ۳/ ۲۶۷)

(۲) اسکول کوئی خالص دینی ادارہ نہیں ہے اس لیے پورا کا پورا قوم کے نام کرکے اپنے بچوں کو بے سہارا بنانا اچھی بات نہیں بلکہ ایسا کیا جائے کہ پورا اسکول بچوں کے نام کر دیا جائے، اور بچے اس کی فیس سے گذارا کرسکیں، بچوں کو بے سہارا چھوڑنے سے حضور ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

عن عامر بن سعد، عن أبيه رضی الله عنه قال: مرضت عام الفتح -إلی- إنک إن تذر ورثتک أغنياء خير من أن تذرهم عالة يتكففون الناس، وإنک لن تنفق نفقة إلا أجرت فيها. (سنن الترمذی، باب ما جاء فی الوصية بالثلث، النسخة الهندية ۲/ ۳۳ دا السلام رقم: ۲۱۱٦، مسند أحمد بن حنبل ۱/ ۱۷۹، رقم: ۱٥٤٦، مسند البزار مكتبه العلوم والحكم ۳/ ۲۹۳، رقم: ۱۰۸٥)

(۳) آپ اپنی زندگی میں جتنا چاہے دے سکتی ہیں، آپ کو اختیار ہے۔

(۴) آپ اپنی زندگی ہی میں تمام امور کا فرض اور قرض دونوں ادا کردیں، موت کے بعد کی خبر نہیں، اگر حج فرض ہے، کسی محرم کو ساتھ لے کر ضرور حج کرلیجئے، ہر سال کی زکوٰۃ ہر سال ادا کیجئے، اگر باقی رہی ہے تو اول فرصت زکوٰۃ وقرض ادا کردینا لازم ہے۔

(۵) جو جگہ دوسرے بھائی بہنوں کے نام کرکے قبضہ دیدیا ہے وہ ان کی ملکیت ہے، اس میں دوسروں کا حق نہیں۔

(٦) جو جائیداد والد کے نام مزید باقی ہیں ان میں والد کے مرنے کے بعد سب اپنے اپنے حصۂ شرعی کے حقدار ہوں گے اور والد صاحب نے جو جائیداد بھائی بہنوں میں سے کسی کو دے کر قبضہ دیدیا ہے اس کو اپنے اختیار سے فروخت کرنے کا والد صاحب کو حق نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ محرم الحرام ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۶۳۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹/ ۱/ ۱۴۱۷ھ

۹ باب الحجب والحرمان

وارث شرعی کومیراث سے محروم کرنے کا حکم

سوال [۱۱۴۷۵]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مرحوم عبداللہ صاحب کی دواہلیہ ہیں، بڑی اہلیہ سے دولڑکے ہیں اور چھوٹی اہلیہ سے تین لڑکے ہیں، عبداللہ کے انتقال کے بعد جائیداد کی تقسیم کے وقت جائیداد کے ۴؍حصے کیے گئے، پانچویں بھائی کوحصہ میں شریک اس لیےنہیں کیا گیا کہ وہ سرکاری ملازم انجینئر تھے اوراپنی تنخواہ مشترکہ خاندان میں نہیں دیتے تھے،تو ان کی معقول تنخواہ کو ہی ایک تصورکر کے جائیداد کی تقسیم عمل میں آئی، عبداللہ صاحب کی بڑی اہلیہ کی اولاد میں جائیداد کے دوحصے اور چھوٹی اہلیہ کی اولاد میں جائیداد کے دوحصے آئے جبکہ انہیں تین حصے ملنے چاہیے تھے،لیکن چونکہ ایک بھائی کی تنخواہ کوہی ایک حصہ تصورکیا گیا تھااس لیے دوحصے ملے،اس کے بعد بڑی اہلیہ کے دونوں لڑکوں میں تقسیم ہوگئی ،اوراب چھوٹی اہلیہ کے تین لڑکوں میں تقسیم کا معاملہ در پیش ہے،تو وہ بھائی جن کی تنخواہ کوایک حصہ مانا گیا تھا وہ اب باقی دو بھائیوں کے حصہ میں آئی جائیداد میں حصہ کےطلب گار ہیں، جبکہ انہوں نےکبھی بھی اپنی تنخواہ مشترکہ خاندان میں نہیں دی ہے،توجب پہلے ہی باپ کی جائیداد میں انہیں حصہ نہیں دیا گیاتو اب بھائیوں میں تقسیم کے وقت کیاان کاحق بنتا ہے؟ کیاان کا جائیداد میں اپنا حصہ طلب کرنا درست ہے؟

مزید تفصیل یہ ہے کہ مرحوم عبداللہ کی چھوٹی اہلیہ کے تین لڑکے بکر،عمراور زید ہیں، والد کے انتقال کے بعدان کی متروکہ تجارت ومکان کی تقسیم نہیں ہوئی،تینوں بھائی بکرعمراور زید نے آپسی رضامندی سے بغیرکسی معاہدہ کےتجارت کوجاری رکھا، تاہم بکراورزیدہی نے تجارت میں مکمل وقت دیا،عمراپنی سرکاری ملازمت میں مصروف رہے، دفتری اوقات کے بعدکا ۲۵؍فیصد وقت تجارت میں دیا کرتے تھےلیکن دوسرے شہروں کوتبادلہ کی صورت میں

اتنا وقت بھی نہ دے پاتے، درمیان ملازمت وہ معطل کیے گئے اس کے بعد تجارت میں پورا وقت دیتے، بکر کے پانچ لڑکوں میں سے تین لڑکے اپنے والد کے ساتھ تجارت سے جڑ گئے، اور گذشتہ بیس سالوں سے تجارت کے فروغ میں سرگرم ہیں، ان کی محنت سے مزید دو نئے تجارتی مراکز قائم ہوئے، جبکہ دوسرے بھائی زید کے لڑکے تعلیم حاصل کر کے کمپنی میں ملازمت کرنے لگے، بکر کے تین لڑکے جو گذشتہ بیس سال سے محنت کر رہے ہیں، انہوں نے اب تک کوئی شراکت یا معاوضہ نہیں لیا، اور نہ ایسا کوئی معاہدہ تجارت سے جڑنے سے قبل طے پایا تھا، لیکن مسلسل محنت کر کے خرید وتجارتی مراکز قائم کیے۔

عمر کی سرکاری ملازمت سے ملنے والی تنخواہ سے متعلق یہ معاہدہ طے پایا تھا کہ وہ گھر کے خرچ کی ذمہ داری لیں گے، تاہم انہوں نے ایسا نہیں کیا اور اپنی تنخواہ کی رقم خود ہی جمع کر کے اپنے لیے ایک مکان بنا کر کرایہ پر دیدیا، اور ایک پلاٹ بھی خریدا اور معاہدہ کے مطابق گھر خرچ کے لیے کچھ نہیں دیا، بلکہ اپنا اور اپنے اہل وعیال کا مکمل خرچ مشترکہ خاندان اور مشترکہ تجارت سے ہی پورا کرتے رہے، ان کے لڑکے نے بھی علیحدہ تجارت شروع کی، اور اس کی آمدنی بھی مشترکہ خاندان میں جمع نہیں ہو رہی ہے وہ خود ہی جمع کر رہے ہیں، زید کے لڑکوں کی تعلیم کا خرچ اسی مشترکہ خاندان وتجارت سے ہی ہوا، بڑے لڑکے کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد ملازمت ملی تو اس لڑکے کی تنخواہ بھی مشترکہ خاندان میں جمع نہیں ہوتی بلکہ وہ بھی خود ہی جمع کر رہے ہیں، مرحوم عبداللہ کی وفات سے تا حال تمام معاملات جیسے تعلیم، شادی، بیاہ اور دیگر تمام اخراجات تینوں بھائیوں نے مشترکہ تجارت کی آمدنی سے ہی پورے کیے ہیں، برائے کرم وراثت کی تقسیم کے معاملہ کے شریعت کی روشنی میں مدلل حوالوں کے ساتھ جلد سے جلد جوابات عنایت فرمائیں؟

المستفتی: ایم اے، اتچ اطہر وقف بورڈ گلبرگہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) عبداللہ کی دوسری بیوی کے تین لڑکے زید عمر بکر میں سے عمر کو سرکاری ملازمت کی وجہ سے اپنے والد عبداللہ کی وراثت سے جو محروم رکھا گیا ہے وہ شرعاً غلط ہے، اور وہ اپنے والد کے متروکہ مال میں سے ہر صورت میں شرعی میراث کے حقدار

ہیں، اور مذکورہ خاندان میں عبداللہ کی میراث کی تقسیم شرعی طور نہیں ہوئی ہے اس لیے کہ عبداللہ کی دونوں بیویاں بھی اس کی میراث کی شرعی وارث ہیں، اسی طرح اگر عبداللہ کی دونوں بیویوں میں سے کسی کے بطن سے عبداللہ کی کوئی لڑکی بھی ہے تو وہ بھی اپنے شرعی حصہ کی حقدار ہے۔

ثم يقسم الباقي بين ورثته أى الذين ثبت إرثهم بالكتاب أو السنة. (در مختار، كتاب الفرائض، زكريا ١٠/ ٤٩٧، كراچی ٦/ ٧٦١-٧٦٢، مجمع الأنهر مصرى قديم ٢/ ٧٤٧، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ٤٩٥، البحر الرائق كوئٹه ٨/ ٤٨٩، زكريا ٩/ ٣٦٧، سراجى ص:٦)

المجمع على توريثهم من الذكور عشرة ...... الابن. (تاتارخانية ٢/ ٢٢٣، رقم: ٣٣٠٩٥)

فريق لايحجبون هذا الحجب بحال ألبتة وهم ستة ثلاثة من الرجال الابن. (شريفيه ص:٥٨، تاتارخانية ٢٠/ ٢٦٠، رقم: ٣٣٢٠٢، شامى زكريا ١٠/ ٥٢٠، كراچی ٦/ ٧٧٩)

(۲) اور عبداللہ کی دوسری بیوی کے تینوں لڑکے زید عمر بکر نے بلا کسی معاہدہ کے مشترکہ کاروبار آپسی رضامندی سے جو شروع کیا ہے اس کاروبار کے رأس المال اور نفع دونوں میں تینوں بھائی برابر کے شریک ہوں گے، لہٰذا پوری تجارت کو تین حصے کر کے تینوں بھائیوں کا ایک ایک حصہ شمار ہوگا، اگرچہ ان میں سے کسی کی محنت زیادہ اور کسی کی محنت کم رہی ہو، اس لیے کہ آپس کی رضامندی سے ایسا ہوتا رہا ہے۔

وكذا لو اجتمع إخوة يعملون فى تركة أبيهم و نما المال فهو بينهم سوية ولو اختلفوا فى العمل والرائ. (شامى زكريا ٦/ ٥٠٢، كراچی ٤/ ٣٢٥)

إذا بذر بعض الورثة الحبوب المشتركة بإذن الكبار ...... فى الأرض الموروثة تصير جملة الحاصلات مشتركة بينهم. (شرح المجلة، اتحاد بكڈپو ديو بند ١/ ٦٠٩، رقم: ١٠٨٩)

(۳) بکر کے تینوں لڑکوں نے از خود محنت کر کے الگ سے تجارتی جو نئے مراکز قائم کیے ہیں اس کے مالک بکر کے ہی لڑکے ہوں گے اور اس درمیان عمر نے گھر کا چونکہ خرچہ نہیں اٹھایا ہے اس لیے عمران نئے مراکز میں شریک نہیں ہوں گے۔

لو تصرف أحد الورثة مبلغا من نقود التركة قبل القسمة بدون إذن الآخرين و عمل فيه و خسر كانت الخسارة عليه كما أنه إذا ربح لايسوغ لبقية الورثة أن يقاسموه الربح. (شرح المجلة، رستم اتحاد بکڈپو دیوبند ۱/ ۶۱۰، رقم: ۱۰۹۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۴۲)

قانوناً بے دخلی کی وجہ سے حق وراثت ختم نہیں ہوتا

سوال [۱۱۴۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں اپنے شوہر اوران کے گھر والوں کے لیے آپ سے فتویٰ چاہتی ہوں، مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی سے پہلے ۲۰۰۸ء میں ہی میرے شوہر کے کاروبار میں نقصان ہوگیا تھا، جس وجہ سے ان پر کافی قرض ہوگیا تھا، اوراسی وجہ سے انہیں گھر چھوڑنا پڑا تھا، قرضداروں نے میرے شوہر کے نہ ہونے پر ان کے والد صاحب کو پریشان کیا تھا جس کی وجہ سے غصہ میں والد صاحب نے ان کو اپنی جائیداد سے قانوناً بے دخل کردیا تھا، اخبار میں چھپوادیا تھا، اس کے بعد ۲۰۰۹ء میں ان سے ہماری شادی کی، ہم ان ہی کے گھر میں ان کے ساتھ رہتے تھے، میرے شوہر نے دوسرا کاروبار شروع کیا، اس دوران میرے شوہر کا ذہنی توازن خراب ہوگیا اوران کو پھر نقصان ہوگیا، کاروبار بھی انہوں نے خود شروع کیا تھا، نقصان ہونے کی وجہ سے والد صاحب بھی ناراض ہوگئے تھے، جس وجہ سے انہوں نے ہم سے دوسال تک کوئی تعلق نہیں رکھا، اور میرے شوہر کے بہن بھائیوں سے بھی تعلق رکھنے کو منع کردیا تھا کہ ہم سے کوئی نہ ملے، اور جھوٹ لکھوادیا کہ میرے شوہر نے ان کے ساتھ اوراپنے بھائیوں کے ساتھ مار پیٹ کی جبکہ میرے شوہر اپنے والد کی بہت عزت کرتے تھے، شادی کے بعد بھی اگر کبھی انہوں نے مارا یا چار لوگوں کے سامنے میرے شوہر کو بہت بے عزت کیا پر میرے شوہر نے

انہیں کوئی جواب نہیں دیا، اس کے بعد بھی انہوں نے یہ سب کیا۔

ڈیڑھ سال پہلے ان کے والد جب بیمار ہوئے تو میرے شوہر کو یاد کیا اور ہمیں بلوایا اور ہم سے کہا کہ میں نے تمہیں معاف کیا، جو غلط فہمیاں ہوئی تھیں تم مجھے معاف کردو، آٹھ دن بعد والد صاحب کا انتقال ہوگیا، میرے شوہر کے چھوٹے بھائی نے انہیں یہ بات بتائی کہ والد صاحب تم سے تعلق رکھنے کو منع کرگئے ہیں، ہم لوگ وہاں سے آگئے، ان کے بعد ان لوگوں نے ہم سے کوئی واسطہ نہیں رکھا، ہم نے بات کرنے کی کوشش کی بھی تو ہم سے بات نہیں کی گئی، وہ لوگ ہم سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے، اس وقت میرے شوہر بیمار ہیں انہیں کینسر ہوگیا ہے، میرے شوہر اپنی بہنوں اور بھائیوں سے بات کرنا چاہ رہے ہیں، ملنا چاہ رہے ہیں پھر انہوں نے صاف کہہ دیا کہ اس بھائی کے لیے ہمارے دل میں کوئی جگہ نہیں ہے، میری دو چھوٹی چھوٹی بچیاں ہیں اور کوئی میری مدد کو تیار نہیں ہورہا ہے، میری آپ سے گذارش ہے کہ آپ ہمیں اس بات کا فتویٰ دیں کہ اگر وہ ہم سے تعلق نہیں رکھتے تو گنہگار کون ہوتا ہے؟ میرے شوہر کے والد یا ان کی بہنیں بھائی، ہمارے مذہب میں تعلق ختم کرنا کیسا مانا جاتا ہے؟ اور کیا تعلق ختم کرنے والے کی بخشش ہوتی ہے یا نہیں؟ میرے شوہر کا اپنے والد کی جائیداد میں حق ہوتا ہے یا نہیں؟ اور ہمیں ان سے اپنا حصہ مانگنا چاہیے یا نہیں؟ کیونکہ ایسا کرنے سے دوریاں اور بھی بڑھ سکتی ہیں؟

آپ سے گذارش ہے کہ دونوں مسئلوں پر غور کرکے ہمیں فوراً فتویٰ دیدیں آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔

المستفتی: آفرینہ عامر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت سوال اگر کسی آدمی سے غلطی ہوجائے اور وہ اپنی غلطی پر نادم وشرمندہ ہو تو اسے معاف کردینا چاہیے، اور بھائیوں کے لیے قطع تعلق و ترک کلام جائز نہیں ہے، اور جبکہ بھائی اس وقت کینسر کے مرض میں جوجھ رہا ہے اسے بھائیوں کی ہمدردی کی سخت ضرورت ہے اور بھائیوں پر والد صاحب کے منع کرنے کو لازم پکڑنا جائز نہیں ہے اور والد صاحب کی جائیداد میں آپ کے شوہر کا بھی حصہ ہے، اس لیے کہ صرف قانوناً

بے دخل کردینے کی وجہ سے آدمی حق وراثت سے محروم نہیں ہوتا ہے، کیونکہ وراثت ایک منجانب اللہ ثابت شدہ حق ہے، بندوں کو وہ حق ختم کرنے کا حق نہیں ہے، لہٰذا بہرصورت آپ کا شوہر اپنے باپ کا شرعی وارث ہے اور شرعی طور پر جو بھی اس کا حصہ بنتا ہے وہ اس کو ملے گا۔

إن ميراث من ورثه الله تعالىٰ فی كتابه ثابت لايستثنى منه إلا بسنة أو إجماع. (تفسير قرطبی، سورة النساء تحت رقم الآية: ۱۱، دار الكتب العلمية المصرية القاهرة، جزء ٥، ٣/٥٩، دار الكتب العلمية بيروت ٥/٤٠)

عن عمران بن حصين قال قال رسول الله ﷺ: لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق. (المعجم الكبير للطبرانی، دار إحياء التراث العربی بيروت ١٨/١٧٠، رقم: ٣٨١)

عن أبی هريرة رضی قال: قال رسول الله ﷺ: لايحل لمسلم أن يهجر أخاه فوق ثلاث فمن هجر فوق ثلاث فمات دخل النار. (سنن أبی داؤد، الأدب، باب فی هجرة الرجل أخاه، النسخة الهندية ٢/٦٧٣، دار السلام رقم: ٤٩١٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۵۵۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/۵/۱۴۳۵ھ

دوسرے کو مالک بنائے بغیر اپنا حق چھوڑنے سے حق باطل نہیں ہوتا

سوال [۱۱۴۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک حویلی سنبھل کھگو سرائے میں حکیم الدوالی مشہور ہے جس کے مالک تین بھائی رہے، اول عنایت اللہ، منجھلے استاذ حکیم اللہ، چھوٹے کلیم اللہ عرف کلو۔

تو استاذ عنایت اللہ اپنی سسرال میں چلے گئے، کیونکہ مال وغیرہ نہیں تھا، حویلی مذکورہ بالا دونوں چھوٹے بھائی کے واسطے بغیر کسی معاوضہ کے چھوڑ گئے، مرمت تینوں بھائی زندگی بھر کراتے رہے، بہر حال تین بھائیوں کا انتقال ہو گیا، حویلی میں حکیم اللہ وکلیم اللہ عرف کلو کی اولاد رہتی چلی آرہی ہے، وقت کی ستم ظریفی نے حکیم اللہ استاذ کی اولاد کو تنگ کیا، لہٰذا برضا مندی کنبہ انہوں نے

اپنا حصہ ایک تہائی دوسرے برادر کے ہاتھ فروخت کردیا، اور ترک سکونت کرلی اب بقیہ حصوں پر کلیم اللہ کی اولاد مستفید ہورہی ہے، عنایت اللہ کے پوتوں کو کثرت اولاد کے باعث اب اپنی جگہ کی ضرورت پیش پیش ہے، چنانچہ اپنے چچازادوں سے سوال کیا ہے، انہوں نے جواب دیا کہ جو حویلی میں شریک تھے وہ اپنا حصہ فروخت کرگئے، آپ صرف کنبہ دار ہیں نہ کہ مالک مال، لہٰذا اب ہم فساد جھگڑے شیطانیت سے بچنے کے واسطے شرعی فیصلہ چاہتے ہیں کہ اگر عنایت اللہ کی اولاد، پوتے وغیرہ حویلی میں یا ترکہ میں حقدار ہیں تو شریعت کے فیصلہ کے واضح حکم سے آگاہ فرمائیں، ورنہ کسی ملک پر خدا بے ایمان نہ کرے، اور ہر شیطانیت سے محفوظ فرمائیں؟

المستفتی: منشی محمد رفیق سرائے ترین مسجد رستم خاں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر عنایت اللہ نے بصراحت اپنے حصہ کا مالک دوسرے بھائیوں کو نہیں بنایا تھا تو پورے مکان کا ایک تہائی حصہ عنایت اللہ کی اولاد کو (پوتے و پوتیوں وغیرہ) کو ملے گا اور ایک تہائی حکیم اللہ کی اولاد کو ملے گا، جو وصول کرچکا ہے، اسی طرح کلیم اللہ کی اولاد بھی ایک تہائی حصہ میں شریک ہے، لہٰذا شرعی رو سے کلیم اللہ کی اولاد پر لازم ہے کہ ایک تہائی حصہ عنایت اللہ کی اولاد کے حوالہ کردے اور ہر فرد کو کتنا کتنا مل سکتا ہے وہ ورثا کی تعداد اور نام لکھنے پر بتلایا جاسکتا ہے۔

نوٹ: اگر عنایت اللہ نے دوسرے بھائیوں کو اپنے حصہ کا مالک بنادیا ہے تو مسئلہ کی نوعیت دوسری ہوگی۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/۲۲۵)

”ہم لوگ وراثت نہیں لیں گے“ کہنے سے حق وراثت ساقط نہیں ہوگا

سوال [۱۱۴۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ ہم چھ بھائی ہیں، اور تین بہنیں ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ جس وقت والد صاحب حیات تھے اس وقت بہن سب یہ کہہ رہی تھیں کہ والد صاحب کیا کیا حساب لگاتے رہتے ہیں ہم کو حصہ نہیں دیجئے، اور نہ ہم سب لیں گی، اور اب ہم سبھی بھائیوں میں لڑائی ہونے سے ۲/ بہن حصہ لینے کو تیار ہے اور بہن کی تمام ہی باتوں کے گواہ رشتہ دار ہیں، کیا ایسے حالات میں بہنوں کو حصہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

اور تینوں یہی جواب دیا کرتی تھیں کہ ہم کو حصہ نہیں چاہیے، آپ سبھی بھائیوں کو برابر بانٹ دیں اور اب والد صاحب کے مرنے کے بعد بھائیوں میں لڑائی ہونے سے ۲/ بہن حصہ لینے کو تیار ہیں، کیا حصہ دینا جائز ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں، کل جگہ کی پیمائش ۱۹۹/ گز ہے۔

المستفتی: محمد توصیف محلّہ مغل پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: باپ کی زندگی میں بہنوں نے جو یہ کہا ہے کہ ''ہم لوگ وراثت نہیں لیں گے'' اس کہنے کی وجہ سے ان کا حق وراثت ساقط نہیں ہوگا، اس لیے کہ خود باپ کو بھی اختیار نہیں تھا، بلکہ مرنے کے بعد حق وراثت متعلق ہوتا ہے، نیز اگر باپ کے مرنے کے بعد بھی کسی بہن نے کہہ دیا ہے کہ ''ہم نہیں لیں گے'' تب بھی حق ساقط نہ ہوگا، بلکہ اس کا حق اس کے قبضے میں آجانے کے بعد پھر اپنے اختیار سے کسی بھائی کو یا کسی اور کو دیدے، تب حق منتقل ہوسکتا ہے۔

لو قال الوارث تركت حقي لم يبطل حقه، إذ الملك لا يبطل بالترك.

(تکملہ رد المحتار، مطلب: فی حادثۃ الفتاویٰ، زکریا ۱۱/ ۶۷۸، کراچی ۷/ ۵۰۵)

لہٰذا بہنوں کا حق وراثت بدستور باقی ہے، اور باپ کی موت کے بعد چھ بھائی اور تین بہنوں کے درمیان جائیداد درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگی، بشرطیکہ مرحوم کی بیوی پہلے ہی فوت ہوگئی ہو۔

۱۵ تباین ترکہ ۱۱۹ گز

میت

	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی
سہام	۲	۲	۲	۲	۲	۲	۱	۱	۱
ترکہ	۱۵ ۱۳/۱۵ گز	۱۵ ۱۳/۱۵ گز	۱۵ ۱۳/۱۵ گز	۱۵ ۱۳/۱۵ گز	۱۵ ۱۳/۱۵ گز	۱۵ ۱۳/۱۵ گز	۷ ۱۴/۱۵ گز	۷ ۱۴/۱۵ گز	۷ ۱۴/۱۵ گز

باپ کا ترکہ ۱۵ سہام میں تقسیم ہوکر اسی کے تناسب سے ۱۱۹ر گز میں سے ہر ایک کو اتنا ملے گا جو اس کے نیچے ترکہ کے سامنے درج ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ر صفر المظفر ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۴۸۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۲/۲۶ھ

اپنا حق نہ لینے سے وراثت سے محروم نہیں ہوتا

سوال [۱۱۴۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (الف) ہمارے والد مرحوم کے انتقال کو پانچ سال گذر گئے، ان کی کمپنی کو ان کی زندگی میں ان کے بڑے بیٹے چلا رہے تھے، اور اب بھی چلا رہے ہیں اور دوسرے چھوٹے بھائی تعلیم حاصل کررہے تھے، اور اب بھی کررہے ہیں، اور نفع میں سب بھائی برابر کے شریک ہیں، بڑے بھائی کا کہنا ہے کہ میں نے پانچ سال محنت کی، کیا اس محنت کے بدلہ ترکہ میں سے تنخواہ کے طور پر ماہانہ کچھ رقم شریعت کی رو سے مل سکتی ہے یا نہیں؟

(ب) مرحوم کی زندگی ہی میں پہلی بیوی اور دوسری بیوی کے درمیان جھگڑا ہوگیا جو بعد میں اتنا بڑھ گیا کہ دوسری بیوی (جو سرکاری ملازمہ ہے) اس کو جھگڑا ختم کرنے کے لیے اپنے شوہر کے سامنے یہ اقرار کرنا پڑا کہ میرے شوہر کی جائیداد میں میرا کوئی حصہ نہیں ہے، پھر اس کو رجسٹریشن کرایا جو ابھی موجود ہے، تو کیا شریعت کی رو سے ترکہ میں دوسری بیوی کا حصہ ہے یا نہیں؟

(ج) دوسری بیوی کے ترکہ میں شرکت وعدم شرکت کی صورت میں ترکہ مذکورہ وارثین کے درمیان کیسے تقسیم ہوگا؟

نوٹ: مرحوم کے ورثاء میں دو بیویاں چھ بیٹے، چار بیٹیاں ہیں۔

المستفتی: عبدالسلام مہاراشٹری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (الف) بڑے بھائی نے باپ کی فیملی میں رہ کر جو محنت کی ہے اس محنت کی الگ سے ماہانہ یا سالانہ کوئی اجرت نہیں ملے گی بلکہ جو کچھ کمایا ہے وہ باپ کی ملکیت ہے، اور شریعت میں بیٹے کو باپ کا معاون سمجھا جاتا ہے، مگر اس میں الگ سے بیٹے کی کوئی ملکیت نہیں ہوتی، لہٰذا ماہانہ یا سالانہ تنخواہ کے طور پر کوئی رقم بڑے بھائی کو نہیں ملے گی۔

الأب و ابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيئ فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله لكونه معينا له. (شامی، الشركة، مطلب: اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ...... زكريا ٦/٥٠٢، كراچی ٤/٣٢٥، هنديه زكريا جديد ٢/٣٣٢، قديم ٢/٣٢٩)

(ب) شوہر کی زندگی میں بیوی شوہر کے مال کی مالک نہیں ہوتی تو اس کو ساقط کرنے کا حق بھی نہیں ہے، لہٰذا بیوی نے اپنا حق نہ لینے کا جو رجسٹریشن کرایا تھا، شریعت میں اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے، شوہر کے مرنے کے بعد وہ غیر اختیاری طور پر شوہر کی وارث بن گئی، لہٰذا دوسری بیوی کو بھی وراثت میں اتنا ملے گا جتنا پہلی بیوی کو ملے گا۔

يتفق الفقهاء على عدم صحة الإسقاط قبل وجوب الحق وقبل وجود سبب الوجوب لأن الحق قبل ذٰلك غير موجود بالفعل فلا يتصور ورود الإسقاط عليه فإسقاط مالم يجب و لا جرىٰ سبب وجوبه لا يعتبر إسقاطا.

(الموسوعة الفقهية ٤/٢٥١)

(ج) مرحوم کا ترکہ درج ذیل نقشہ کے اعتبار سے تقسیم ہوگا:

۱۲۸
۸

میـــــــــــــــــــــــــــــــت

بیوی	بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی
(۱)						(۷)					
۸	۸	۳۲	۳۲	۳۲	۳۲	۳۲	۳۲	۱۶	۱۶	۱۶	۱۶

بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ماتقدم وعدم موانع ارث مرحوم کا کل ترکہ ۱۲۸ر سہاموں میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا ملے گا جو ہر ایک کے نیچے درج ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ر جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۷۲۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۶/۲۹ھ

”آخرت میں اپنا حق لوں گی“ کہنے سے وراثت سے محرومی نہیں ہوتی

سوال [۱۱۴۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک لڑکی جس کا نام خالدہ تھا اور والد کا نام محمد حامد تھا، خالدہ اپنے والد کی واحد اولاد تھی، کہ ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا اور والد نے دوسری شادی کرلی، شادی کے بعد خالدہ کی پرورش اس کے خالو نے کی، والد نے سرپرستی سے ہاتھ اٹھالیا تھا، جبکہ والد صاحب خود ثروت اور جائیداد والے آدمی تھے۔

خالدہ کی شادی اس کے والد نے اپنے سالے کے ساتھ کردی، خالدہ کی والدہ کا ایک ذاتی مکان بھی تھا، جوکہ آج بھی موجود ہے، خالدہ نے اپنی سوتیلی ماں سے اس مکان کا مطالبہ کیا کہ میری والدہ کا مکان ہے، مجھے دیدو، مگر سوتیلی ماں نے منع کردیا، اس پر خالدہ نے کہا کہ اب میں خدا کے یہاں لوں گی، خالدہ کے آٹھ بچے ہیں، ۵ر لڑکے تین لڑکیاں، سب بچوں کی شادی ہوگئی ہے، ۴ر لڑکوں کا انتقال ہوگیا ہے، خالدہ کی والدہ اور والد کا بھی انتقال ہوگیا ہے اور خود خالدہ کا بھی انتقال ہوگیا ہے، خالدہ کے سوتیلے بہن بھائی تھے، انہوں نے بھی خالدہ کو کچھ حصہ نہیں دیا، کچھ جائیداد فروخت کی تھی، اس میں سے کچھ روپیہ دے رہے تھے، تو خالدہ کی اولاد نے نہیں لیے، اس لیے کہ ان کی والدہ نے یہ کہا تھا کہ خدا کے گھر لوں گی، خالدہ کی لڑکیوں میں سے ایک لڑکی بہت غریب ہے، اور یہ چاہتی ہے کہ اس کی والدہ کا روپیہ جوکہ اب بھی بینک میں موجود ہے، وہ اسے مل جائے جو اس کے حصہ کا ہے، اور اس کی بڑی بہن بھی یہ چاہتی ہے کہ میں اپنے حصہ کا روپیہ بھی اپنی غریب بہن کو دیدوں، اس سے کوئی خرابی تو نہیں آئے گی، اور

والدہ کی ناراضگی کا سبب تو نہیں بنے گا، کیونکہ والدہ کا ۲۵ر سال قبل انتقال ہو چکا ہے؟

المستفتی: محمد عاکف رفعت پورہ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوتیلی والدہ کے نہ دینے کی وجہ سے اور خالدہ کا رنجیدہ ہو کر یہ کہہ دینا کہ میں آخرت میں لوں گی، اس سے خالدہ کا حق اپنی ماں کی میراث میں سے ختم نہ ہوگا، بلکہ صورت مذکورہ میں سوتیلی والدہ خالدہ کے حقوق کی غاصبہ ہے اور اس میں خالدہ کا حق بحالہٖ باقی ہے، اگرچہ خالدہ نے یہ کہہ دیا ہو کہ میں آخرت میں لوں گی، لہٰذا خالدہ کے ورثاء کے لیے اس میں سے اپنا اپنا حق حاصل کر لینا جائز اور درست ہوگا۔

الحق متی یثبت لا یبطل بالتاخیر ولا بالکتمان. (قواعد الفقہ، اشرفی دیو بند ص:۷۷) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ر ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۴۲۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/۴/۱۴۱۴ھ

اولاد کو عاق کرنے سے وہ وراثت سے محروم نہیں ہوتی

سوال [۱۱۴۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید جو قاری ودیندار ہونے کے ساتھ ساتھ کئی دینی اداروں میں عرصہ دراز تک خدمات بھی انجام دے چکا ہے، اس کی بیوی ہندہ شوہر کی بے حد نافرمان اور زبان دراز ہے، چوری کرنے اور جھوٹ بولنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی، آئے دن گھر میں جھگڑا رکھتی ہے، شوہر کو منہ نہیں لگاتی، شب وروز بے حجاب گھومتی پھرتی، اور معمولی معمولی کاموں سے بے پردہ سڑکوں پر گھومتی ہے، اپنے اور اپنی اولاد کے عیوب پر پردہ ڈالنے کی غرض سے اپنے شوہر پر طرح طرح کے الزامات اور تہمتیں لگاتی رہتی ہے، کہیں کہتی ہے کہ میرا آدمی جھوٹ بولتا ہے، کہیں کہتی ہے کہ میرا آدمی اغلام باز ہے، کہیں کہتی ہے کہ میرا آدمی چور ہے، وغیرہ وغیرہ،

جبکہ یہ سارے عیوب اور ان سے بھی کہیں زیادہ ہندہ اور اس کی اولاد میں موجود ہیں، ہاں ہندہ کی اس بکواس سے زید سماج کی نظروں سے ضرور گر گیا ہے۔

زید اور ہندہ سے پیدا ہونے والی تین لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے دو لڑکیاں اور لڑکے کی شادی ہندہ اپنی مرضی سے کر چکی ہے، اگرچہ شادیوں کے جملہ مصارف زید ہی نے برداشت کیے، ماں نے اپنی اولاد کی تربیت بھی اس ڈھنگ سے کی ہے کہ جو عیب ماں کے اندر ہیں اس سے کہیں زیادہ اولاد میں موجود ہیں، حد تو یہ ہے کہ لڑکیاں اجنبیوں سے تعلقات قائم کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتیں، چوری کرنے اور جھوٹ بولنے میں پوری مہارت حاصل ہے، لڑکا اپنے باپ زید کے مقابلہ پر کئی مرتبہ آچکا ہے، اور اس میں بھی باپ کی نافرمانی تو درکنار جھوٹ بولنے، چوری کرنے کی بری عادتیں پورے ثبوت وشواہد کے ساتھ موجود ہیں، زید اگر کوئی اصلاحی پہلو اختیار کرتا ہے تو پھر ہندہ اور اس کی ساری اولاد زید کا ہر طرح مقابلہ کرتے ہیں، حد تو یہ ہے کہ لڑکے نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ میرے باپ کی میری عورت پر غلط نظر ہے، زید کے والد جو پوری بستی کے مسلّم بزرگ تھے وہ بھی ہندہ اور اس کی اولاد کے کارناموں سے اس قدر عاجز تھے کہ اپنی عمر کے آخری حصہ میں ہندہ سے بے تعلق ہو گئے تھے، اور اسی میں وہ اللہ کو پیارے ہو گئے، زید کا کہنا ہے کہ جس بیوی اور اولاد نے میرے لیے اس دنیا میں جینا حرام کر دیا ہے اور مجھے اس قدر ذلیل کر دیا ہے کہ مجھے سماج میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا، ان کو میں اپنے مال و جائیداد میں سے کچھ نہیں دوں گا، اس لیے آپ سے درخواست ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت سے تحریر فرمادیں کہ ایسی بیوی اور لڑکیوں اور لڑکوں کا کوئی حصہ زید کے مال میں ہے یا نہیں؟ زید کا اپنا فیصلہ یہ کہاں تک درست ہے کہ میں لڑکے کو عاق کر کے اپنی جائیداد وغیرہ دینی مدارس ومساجد کو وقف کروں گا؟

المستفتی: مولوی ظفر احمد قاسمی، محلّہ منہاران ٹانڈہ بادلی رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ہمارے ہندوستان میں اولاد کو عاق کرنے اور میراث سے ناحق قرار دینے کا جو طریقہ ہے، اس کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں ہے، موت

کے بعد عاق شدہ اولاد بدستور میراث کی حقدار رہیں گی، اگر اولاد نافرمان اور باغی ہیں تو ان کو محروم کرنے کی یہ شکل صحیح ہوسکتی ہے کہ اپنی زندگی میں ہی ساری جائیداد صدقہ کردے یا کسی کو ہبہ کر کے قبضہ دیدے، اور عاق کرنے کا کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوتا ہے۔

الإرث جبری لا یسقط بالإسقاط. (تکملة رد المحتار، مطلب: واقعة الفتاویٰ، کراچی ۷/۵۰۵، زکریا ۱۱/۶۷۸)

لابأس بأن یعطی من أولاده من کان عالما متأدبا ولایعطی منهم من کان فاسقا فاجرا. (مجمع الأنهر، دار الکتب العلمیة بیروت ۳/۴۹۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍محرم الحرام ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/۲۹۹۰)

اپنے بیٹے کو عاق کرنے کی صورت کیا ہوگی؟

سوال [۱۱۴۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں عاق کے متعلق معلومات کرنا چاہتا ہوں، یہ کس پارے میں یا کس حدیث میں تحریر ہے؟ اور کن حالات کے لیے مناسب ہے؟ فتاویٰ عالمگیری میں اگر جائز ہے تو اس کا اردو میں ترجمہ چاہتا ہوں اگر کوئی شخص عاق کرنے سے ترکہ سے محروم نہیں ہوسکتا پھر اس کے جائز ہونے کا کیا فائدہ، بہت سی اولادوں میں سے صرف ایک ہی بیٹا اگر عاق کردینے کے قابل ہو اور جائیداد صرف ایک ہی ہو اس کے مدنظر جواب درکار ہے؟

المستفتی: حاجی سراج الدین محمد علی روڈ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: عاق کرنے کے بارے میں قرآن وحدیث میں کہیں حکم نہیں ہے، اگر آپ لڑکے کے نافرمان ہونے کی وجہ سے اس کو ترکہ سے محروم کرنا چاہتے ہیں تو اپنی زندگی میں اپنی جائیداد فرمانبردار اولاد کو ہبہ کر کے قبضہ دیدیجئے، یا کسی کارِ

خیر میں لگا دیجئے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۴/ ۳۱۸)

لابأس بأن يعطى من أولاده من كان عالما متأدبا ولايعطى منهم من كان فاسقا فاجرا. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دار الكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩٧، عالمگيری زكريا قديم ٤/ ٣٩١، جديد ٤/ ٤١٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍محرم الحرام ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۶۱۵)

زندگی میں اپنی اولاد کو محروم الارث کرنا

سوال [۱۱۴۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص مسمیٰ شوکت علی جو کہ مراد آباد کے رہنے والے تھے، اپنی خاندانی جائیداد کو اپنے لڑکوں کو نہ دے کر دیگر تین لوگوں کو جن میں سے دو لے پالک ہیں اور ایک بہن کا لڑکا ہے، ان لوگوں کو وصیت کردی، جبکہ ان کی بہن اپنا حصہ بذریعۂ رجسٹری تقریباً ۴۰؍سال پہلے شوکت کے چچا کو فروخت کرچکی ہے، حاجی شوکت علی کی کل اولاد صرف دو لڑکے ہیں اور بیوی پہلے ہی انتقال کرچکی ہے، ان دونوں لڑکوں کو شوکت علی نے عاق کردیا ہے، شوکت علی کا انتقال ہوگیا ہے۔

المستفتی: ہادی حسن پیرزادہ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زندگی میں اپنی اولاد کو عاق اور محروم الارث کردینے سے شرعی طور پر اولاد وراثت سے محروم نہیں ہوتی، اس لیے شوکت علی کے دونوں لڑکے بدستور وارث رہیں گے۔ (امداد الفتاویٰ ۴/ ۳۶۴)

الإرث جبري لا يسقط بالإسقاط. (تكملة رد المحتار، مطلب: واقعة الفتاویٰ، كراچی ٧/ ٥٠٥، زكريا ١١/ ٦٧٨)

اور اجنبی کے حق میں کل ترکہ میں سے ایک ثلث سے زائد پر وصیت جاری نہیں ہوتی۔

عن سعد بن وقاص حديثا طويلا و طرفه: فقلت: أوصى بالنصف، قال: النصف كثير، قلت: فالثلث، قال: الثلث، والثلث كثير أو كبير، قال: فأوصى الناس بالثلث فجاز ذلک لهم. (صحيح البخاري، الوصايا، باب الوصية بالثلث ١/٣٨٣، رقم: ٢٦٦٣، ف: ٢٧٤٤)

لا تجوز بما زاد على الثلث. (هدايه، كتاب الوصايا، رشيديه ٤/٦٣٨، اشرفى ديوبند ٤/٦٥٤، مجمع الأنهر، دار الكتب العلمية بيروت ٤/٤١٩)

لہٰذا شوکت علی کا کل ترکہ تین سہام میں تقسیم ہوکر ایک سہام ان تمام لوگوں کو ملے گا جن کے حق میں وصیت کی ہے اور باقی دو سہام دونوں لڑکوں کو برابر برابر ملیں گے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍ محرم الحرام ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۳۷۹۸)

نافرمان لڑکے کو وراثت سے محروم کرنا

سوال [۱۱۴۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں، پہلی بیوی سے، میری بیوی کو گذرے ہوئے چالیس سال سے زائد ہوگئے، قریب پندرہ سال کے بعد میں نے دوسری شادی کرلی، میری دوسری بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہے اور میری دوسری بیوی حیات ہے، میں نے اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی کردی ہے، میرے لڑکوں نے علیحدہ علیحدہ اپنے اپنے مکان بنالیے ہیں، آج میرے پاس صرف پرانے مکان کا حصہ ہے، جو کہ ہمارے دادا کا ہے، اب کوئی ذریعہ نہ ہوتے ہوئے میں اپنے اس حصہ کو فروخت کررہا ہوں، میرا ایک لڑکا جو کہ نہایت بدتمیز اور مجھے بے ساختہ غلط الفاظ سے بولتا ہے، بیجا الفاظ میں، لہٰذا اس جائیداد میں سے شریعت کی روشنی میں میرے لڑکوں اور لڑکیوں کا کتنا فی صد حصہ ہوتا ہے، اور میری دوسری بیوی کے لیے شرع سے کیا حکم ہے؟ نیز ایسے بدلحاظ اور والد کے ساتھ زبان درازی کرنے والے لڑکے کا شرعاً حکم کیا ہے؟

المستفتی: محمد ظفر عرف پٹن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: باپ اپنی زندگی میں سارے مکان کا خود مالک ہے اس کی اولادوں میں سے کسی کا کوئی حق یا حصہ اس کی جائیداد میں نہیں ہے، اور باپ کو پورا پورا اختیار ہے کہ اپنے مکان اور جائیداد کو جس طرح چاہے استعمال کرے، چاہے فروخت کردے یا ہبہ کردے یا کسی کو تحفہ میں دیدے، چاہے بیچ کر اپنے استعمال میں لے لے، سارے اختیارات باپ کو حاصل ہیں، غرضیکہ باپ کی زندگی میں بیٹوں میں سے کسی کا کوئی حق اس کی جائیداد میں نہیں ہے، جو بیٹا باپ کے ساتھ بدتمیزی کرتا ہوا سے کچھ نہ دے کر دوسرے بیٹوں، بیٹیوں اور موجودہ بیوی کو جس قدر چاہے دینے کا حق ہے۔

كل يتصرف في ملكه كيف شاء. (شرح المجلة رستم اتحاد ١/٦٥٤، رقم المادة: ١١٩٢)

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء من الملك. (بيضاوى شريف رشيديه ١/٧)

لابأس بأن يعطى من أولاده من كان عالما متأدبا ولايعطى منهم من كان فاسقا فاجرا. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة قديم ٢/٣٥٨، دار الكتب العلمية بيروت ٣/٤٩٧، هنديه زكريا قديم ٤/٣٩١، جديد ٤/٤١٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍رجب المرجب ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۱۳۳)

قانونی پیچیدگی کی وجہ سے لڑکیوں کو وراثت سے محروم کرنا

سوال [۱۱۴۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے دو لڑکے، دو لڑکیاں ہیں، میں زمین اور گھر وغیرہ بانٹنا چاہتا ہوں، تاکہ میرے بعد ان میں کوئی نزاع نہ ہو، لڑکیاں شادی شدہ ہیں، لڑکے بھی اپنے پیروں پر ہیں،

اور چونکہ زمینداری ختم ہوگئی ہے، سب کاشتکار ہیں، ہم چونکہ اب زمین کے مالک نہیں ہے، بلکہ موروثی دار ہیں، اس لیے گورنمنٹ قانون کے بموجب اب لڑکیوں کو حصہ نہیں مل رہا ہے، آپ لکھیں کہ میں صرف لڑکوں میں بانٹ دوں یا جو شریعت کا حکم ہو اس پر عمل کروں؟

المستفتی: محمد عقیل خاں غازی آبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اپنی زندگی میں اگر مالیت تقسیم کریں تو سب کو برابر برابر تقسیم کریں، اور حکومت کے اس قانون کی وجہ سے لڑکیاں زمین کی وراثت سے محروم نہ ہوں گی۔

وإن قصده فسویٰ بینهم یعطی البنت کالابن عند الثاني وعلیه الفتویٰ. (در مختار مع الشامي، کتاب الهبة کراچی ۵/۶۹۶، زکریا ۸/۵۰۱، هندیه زکریا قدیم ۴/۳۹۱، جدید ۴/۴۱۶، قاضیخان جدید ۳/۱۹۴، وعلی هامش الهندیة ۳/۲۷۹) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۱۹؍صفر المظفر ۱۴۲۰ھ	احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۰۳۶)	۱۴۲۰/۲/۱۹ھ

والد کا اپنی لڑکیوں کو وراثت سے محروم کرنا

سوال [۱۱۴۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میت یعنی عبد القیوم اپنے پیچھے تین لڑکے: انور، اکبر، ارشد اور تین لڑکیاں: جہاں آرا، سائرہ، طاہرہ اور بیوی: افسری بیگم کو چھوڑا۔

عبد القیوم کی حیات میں ۱۹۷۴ء میں عبد القیوم کے پاس ایک رہائشی مکان دو آراضی اور سوا دو لاکھ روپیہ نقد تھے، ۱۹۷۴ء میں عبد القیوم نے اپنے تینوں لڑکے انور، اکبر اور ارشد کے ساتھ مل کر سوا دو لاکھ روپیہ سے کاروبار شروع کیا اور تینوں بیٹے باپ کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹاتے رہے، کاروبار آگے بڑھتا گیا، دورانِ کاروبار اسی کاروباری رقم سے کچھ آراضی کھیتی کی خریدی گئی اور ایک فیکٹری پیتل کی، ایک قالین کی اور ایک کولڈ اسٹور بنا، اور

اکتوبر ۱۹۸۸ء میں پانچ کروڑ روپئے نقد بچے، اور اکتوبر ۱۹۸۸ء میں ہی لڑکوں کے درمیان کاروبار کا بٹوارہ کیا، اور عبدالقیوم نے اپنے بڑے لڑکے انور کو کاروبار سے الگ کردیا، اور خود اپنے دونوں چھوٹے لڑکے اکبر اور ارشد کے ساتھ کاروبار کرتے رہے، اور ۱۹۸۸ء میں نقد بچے پانچ کروڑ روپئے اپنے تینوں لڑکوں انور، اکبر اور ارشد میں برابر تقسیم کردیئے، نہ اپنے لیے کچھ رکھا اور نہ ہی اپنی بیوی اور لڑکیوں کو کچھ دیا۔

عبدالقیوم نے کولڈ اسٹور فروخت کرنے کا ارادہ کیا اور چاروں باپ بیٹوں کی اتفاق رائے سے نوے لاکھ روپئے کولڈ اسٹور کی قیمت مع تمام مشینری طے ہوئی، اور انور نے کولڈ اسٹور مع تمام مشینری خریدا، اور تینوں بھائیوں میں پانچ کروڑ کی تقسیم شدہ رقم میں سے اپنے حصہ کی رقم سے کولڈ اسٹور کے عوض اپنے دونوں بھائیوں اکبر اور ارشد کو تیس تیس لاکھ روپیہ کرکے کل ساٹھ لاکھ روپئے دیدئے، جبکہ عبدالقیوم نے کولڈ اسٹور کی فروخت شدہ رقم نوے لاکھ روپئے میں سے کچھ نہیں لیا، اور نہ ہی اپنی بیوی اور تینوں لڑکیوں کو کچھ دیا۔

انور نے تقسیم شدہ اپنے حصے کی رقم سے کاروبار الگ کرنا شروع کیا، اکبر اور ارشد نے بھی اپنے اپنے حصہ کی رقم سے کاروبار الگ شروع کیا، عبدالقیوم یعنی والد اپنے دونوں چھوٹے بیٹے اکبر وارشد کے کاروبار میں ساتھ رہے۔

دسمبر ۱۹۹۰ء کار حادثہ میں عبدالقیوم یعنی والد کا اور ۲۰۰۶ء میں عبدالقیوم کی بیوی افسری بیگم یعنی والدہ کا انتقال ہوگیا، اس وقت عبدالقیوم کے وارثین میں عبدالقیوم کے تین لڑکے: انور، اکبر، ارشد اور تین لڑکیاں: جہاں آرا، سائرہ، طاہرہ باحیات ہیں۔

(۱) عبدالقیوم کی مذکورہ بالا جائیداد غیر منقولہ میں کس کس وارث کا کتنا حصہ ہے؟

(۲) چونکہ عبدالقیوم نے مذکورہ بالا رقم ۱۹۸۸ء میں اپنے تینوں لڑکوں میں برابر تقسیم کردی ہے، اپنی تینوں لڑکیوں کو کچھ نہیں دیا ہے، مذکورہ بالا رقم میں سے کسی رقم میں عبدالقیوم کی تینوں لڑکیوں کا حصہ بنتا ہے، یا نہیں؟ اگر بنتا ہے تو کس کس رقم میں بنتا ہے اور کتنا کتنا بنتا ہے؟

(۳) اگر عبدالقیوم کی لڑکیوں کا مذکورہ بالا رقم میں حصہ بنتا ہے تو انور کو ۱۹۸۸ء اکتوبر میں عبدالقیوم نے پانچ کروڑ کی تقسیم شدہ رقم میں سے ۱۶۶۶۶۶۶۶/ روپئے اور فروخت کیے گئے کولڈ

اسٹور کی رقم میں سے تیس لاکھ روپئے دیئے ہیں، ان دونوں رقموں میں عبد القیوم کی تینوں لڑکیوں کا کتنا کتنا حصہ بنے گا؟ کتاب وسنت کی روشنی میں مفصل ومدلل جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد انور ڈپٹی گنج مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: سوالنامہ شروع سے آخر تک بغور پڑھا گیا ہے اس کا ماحصل یہ نکلا کہ ۱۹۷۴ء سے والد نے بیٹوں کو ساتھ میں لے کر جو کاروبار کیا تھا وہ کاروبار مع نفع کے سب عبد القیوم صاحب کی ملکیت ہے، اور ۱۹۷۴ء سے اکتوبر ۱۹۸۸ء تک جتنا بھی کمایا گیا ہے اور جتنی جائیدادیں خریدی گئی ہیں، وہ سب کی سب عبد القیوم صاحب کی ملکیت ہیں اور شرعی طور پر تینوں بیٹے باپ کے معاون ثابت ہوں گے۔

إذا عمل رجل في صنعة هو وابنه الذي فی عياله فجميع الكسب لذٰلک الرجل وولده يعد معينا له وكذا إذا أعانه ولده الذي في عياله عند غرسه شجرة فتلك الشجرة للأب لايشاركه ولده فيها. (شرح المجلة، رستم باز، اتحاد دیوبند ۲/۷۴۱، رقم المادة: ۱۳۹۸، شامی کراچی ۴/۳۲۵، زکریا ۶/۵۰۲، هندیه زکریا قدیم ۲/۳۲۹، جدید۲/۳۳۲)

وفي الخانية: زوج ...... بنيه الخمسة فی داره وكلهم فی عياله واختلفوا فی المتاع فهو للأب وللبنين الثياب التي عليهم لا غير. (شامی، مطلب: اجتمعا فی دار واحدة واكتسبا...... زكريا ۶/۵۰۲، كراچی ۴/۳۲۵)

اورسوالنامہ سے واضح ہوتا ہے کہ اکتوبر ۱۹۸۸ء میں والد نے جائیداد منقولہ میں سے پانچ کروڑ روپئے تینوں بیٹوں کے درمیان تقسیم کر کے مالک بنا دیا ہے اور سوالنامہ میں جائیداد غیر منقولہ کا تذکرہ موجود ہے، مگر اس کی تقسیم کا ذکر موجود نہیں ہے، اور تینوں لڑکیوں اور بیوی کو کچھ نہیں دیا اور تینوں لڑکیوں اور بیوی کو کچھ نہ دینے کی وجہ سے عبد القیوم صاحب ضرور گناہ گار ہوں گے، لیکن جو پانچ کروڑ روپیہ لڑکوں کے درمیان تقسیم کر کے مالک بنا دیا گیا ہے تو شرعی طور پر تینوں لڑکے اپنے اپنے حصوں کے مالک بن چکے ہیں اور ان کے مذکورہ حصوں

میں باپ کے مرنے کے بعد تینوں لڑکیوں اور بیوی کا کوئی حق متعلق نہیں رہا، ہاں البتہ عبد القیوم صاحب کی وفات کے وقت ۱۹۸۸ء سے پہلے خریدی ہوئی جو غیر منقول جائیداد موجود رہی ہے جس کا سوالنامہ میں تذکرہ ہے تو وہ عبدالقیوم صاحب کی متروکہ میراث ہوگی، شرعی طور پر وہ غیر منقول جائیداد تینوں لڑکوں اور تینوں لڑکیوں اور بیوی کے درمیان بطور میراث تقسیم ہونا ضروری ہے، اور تقسیم کی صورت یہ ہوگی کہ کل جائیداد غیر منقولہ ۷۲/سہاموں میں تقسیم ہوکر ۹/سہام عبدالقیوم کی بیوی کے لیے اور ۱۴/۱۴/سہام تینوں بیٹوں کے لیے اور ۷/ ۷/سہام تینوں لڑکیوں کے لیے لازمی ہیں۔

الملک ما من شانه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص. (شامی مطلب: فی تعریف المال زکریا ۷/۲۳۵، کراچی ۵/ ۵۰)

كل يتصرف فی ملكه كيف شاء. (شرح المجلة رستم اتحاد ۱/ ۶۵۴، رقم المادة: ۱۱۹۲)

وتتم الهبة بالقبض الكامل لقوله عليه السلام لاتجوز الهبة إلا مقبوضة. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دار الكتب العلمية بيروت ۳/ ۳۹۱، مصری قديم ۲/ ۳۵۳، شامی کراچی ۵/ ۶۹۰، زکریا ۸/ ۴۲۰، الفتاویٰ التاتارخانية زكريا ۱۴/ ۴۲۱، رقم: ۲۱۵۶۳، شرح المجلة رستم اتحاد ۱/ ۴۷۳، رقم المادة: ۸۶۱)

يكره تفضيل بعض الأولاد على البعض فی الهبة حالة الصحة –إلی– وإن وهب ماله كله لواحد جاز قضاء وهو آثم. (البحر الرائق کوئٹہ ۷/ ۲۸۸، زکریا ۷/ ۴۹۰)

رجل وهب في صحته كل المال للولد جاز في القضاء ويكون آثما فيما صنع. (هنديه زكريا قديم ۴/ ۳۹۱، جديد ۴/ ۴۱۶)

إن التركة فی الاصطلاح: ما تركه الميت من الأموال صافيا عن تعلق حق الغير بعين من الأموال. (شامی، کتاب الفرائض، زکریا ۱۰/ ۴۹۳، کراچی ۶/ ۷۵۹، حاشیہ سراجی ص: ۴)

اور انورقیوم نے جو کولڈ اسٹور خرید لیا ہے وہ ان کی اپنی ملکیت ہوگئی ہے اس میں کسی کا

کوئی حق متعلق نہیں ہے، اور باپ سے انور قیوم کی دیگر بیٹیوں کی طرح جو رقم یعنی ۱۶۶۶۶۶۶۶/روپیہ ملا ہے اس کا انور قیوم شرعی طور پر مالک ہو چکا ہے،اس میں عبدالقیوم کی لڑکیوں کا کوئی حصہ متعلق نہیں ہے،اوراس طرح کولڈاسٹور کی رقم میں سے جو تیس لاکھ روپیہ ملا ہے اس میں بھی بیوی اور بیٹیوں کا کوئی حق متعلق نہیں ہے، نیز تینوں بیٹوں کو غیر منقول جائیداد میں سے جو کچھ بھی باپ نے مالک بنا کر قبضہ دیدیا ہے ان جائیدادوں کے بھی تینوں بیٹے شرعی طور پر مالک ہو چکے ہیں، یہ بات الگ ہے کہ باپ کے اوپر لازم تھا کہ اپنی بیٹیوں کو بھی دیتا،مگر باپ نے بیٹیوں کو نہیں دیا،اس کا گناہ باپ کے سر ہوگا،اوراس کی وجہ سے بیٹے گنہگار نہیں ہوں گے،اوراللہ کے دربار میں بیٹوں سے سوال نہیں ہوگا،تاہم اگرانور قیوم اپنی مرضی سے اتنا پیسہ نکال کر کے بہنوں کو دینا چاہیں جو باپ کی طرف سے بہنوں کا حصہ بیٹھتا ہے تو وہ انور قیوم کی طرف سے بہنوں کے لیے تبرع ہوگا اوراللہ کی ذات سے امید کی جاتی ہے کہ اللہ کے دربار میں اتنے حصۂ مالیت کے متعلق باپ سے باز پرس نہیں ہوگی۔

إن الملكية تثبت بمجرد العقد إذا استجمع البيع شرائط الإنعقاد والصحة واللزوم والنفاذ. (شرح المجلة للأتاسی ۳۵۷/۲، بحواله محموديه ڈابهيل ۱۴۲/۲۰)

وتتم الهبة بالقض الكامل. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دار الكتب العلمية بيروت ۳۹۱/۳، مصری قديم ۳۵۳/۲، شامی كراچی ۶۹۰/۵، زكريا ۵۲۰/۸، الفتاویٰ التاتارخانية زكريا ۴۲۱/۱۴، رقم: ۲۱۵۶۳، شرح المجلة رستم اتحاد ۴۷۳/۱، رقم المادة : ۸۶۱)

يملك الموهوب له الموهوب بالقبض فالقبض شرط لثبوت الملك. (شرح المجلة رستم اتحاد ديوبند ۴۷۳/۱، رقم: ۸۶۱)

رجل وهب في صحته كل المال للولد جاز فی القضاء ويكون آثما فيما صنع. (هنديه زكريا قديم ۳۹۱/۴، جديد ۴۱۶/۴) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۱۰۶/۴۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۵/۱۹ھ

لڑکیوں کو میراث سے محروم کرنا

سوال [۱۱۴۸۷]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہندوستان میں بعض جاہل مسلمان لڑکیوں اور نکاح ثانی کرنے والی عورتوں کو میراث سے محروم رکھ کر منوجی کے قاعدے اور رواج کے مطابق صرف بیٹوں کو جائیداد دلانا چاہتے ہیں اور لڑکیوں کے بارے میں ان کا بہانہ یہ ہوتا ہے کہ شادی غمی تیوہار وغیرہ تقریبات میں ہم ان کو کچھ نقد وجنس دے کر ان کا حق ادا کر چکے ہیں، شریعت مطہرہ میں باپ کے مال اور جائیداد میں میراث کا کیا حکم ہے؟ اگر کوئی باپ مرتے وقت وصیت نہ کر سکا ہو اور دو بیٹے اور ایک بیٹی چھوڑ گیا ہو تو اس کے مال کی تقسیم کس طرح ہوگی؟ اللہ تعالیٰ آپ کو حق بات لکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

المستفتی: محفوظ علی گوہر مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: لڑکیوں کو میراث سے محروم رکھنا صریح نص قطعی کے خلاف ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں لڑکیوں کو حصہ دلانے کو بڑی اہمیت کے ساتھ بیان فرمایا اور مستقلاً ان کے حصوں کو بیان فرمایا اور جو لوگ لڑکیوں اور بہنوں کو حصہ نہیں دیتے اور وہ یہ سمجھ کر بادل ناخواستہ شرماشرمی میں معاف کر دیتی ہیں کہ ملنے والا تو ہے نہیں تو کیوں برائی مول لیں تو ایسی معافی شرعاً معافی نہیں ہوتی، ان کا حق ذمہ میں واجب رہتا ہے، یہ میراث دبانے والے سخت گنہگار رہیں اور شادی بیاہ میں جو خرچ کیا جاتا اسے ترکہ میں سے شمار کرنا غلط ہے، اس سے حق وراثت لڑکیوں کا ساقط نہیں ہوتا ہے اور اسی طرح بیوہ عورتوں کو نکاح ثانی کرنے پر شوہر اول کی میراث سے محروم کرنا سراسر ظلم ہے۔ (مستفاد: اصلاح الرسوم/۱۴۰، معارف القرآن ۲/۳۲۱)

إن الميراث يشترك فيه الرجال والنساء والكبار والصغار وكان العرب في الجاهلية لايورثون البنات ولا النساء ولا الصبيان شيئا من الميراث ولا يورثون إلا من جاز الغنيمة وقاتل على ظهور الخيل ...... جاء الإسلام

فأبطل هذه العادة القاسية و أنزل سبحانه حكم توريث النساء بقوله ”لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا“. (تكملة فتح الملهم، كتاب الفرائض، الميراث حق الرجال و النساء، اشرفيه ديو بند ٢/٥)

عن أنس بن مالك –رضى الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: من فر من ميراث وارثه، قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة. (سنن ابن ماجه، باب الحيف فى الوصية، النسخة الهندية ٢/١٩٤، دار السلام رقم: ٢٧٠٣)

اور باپ اگر مرتے وقت اپنے وارثین میں صرف دو بیٹے اور ایک بیٹی چھوڑ گیا ہو اور کوئی دوسرا وارث نہ ہو تو باپ کا ترکہ پانچ سہام میں تقسیم ہو کر دونوں بیٹوں کو دو، دو حصے اور ایک بیٹی کو ایک حصہ ملے گا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۴۲۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۶/۲۳ھ

لڑکیوں کی شادی کرانے سے وہ وراثت سے محروم نہیں ہوتیں

سوال [۱۱۴۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید ۳؍ بھائی اور ۴؍ بہنیں ہیں، والد مرحوم نے سب بھائی بہنوں کی شادی اپنی حیات میں کردی تھی، والد صاحب کی وفات ہوئے ۲۴؍ سال ہو گئے ہیں، اور والدہ صاحبہ کی وفات ہوئے ۱۱؍ سال ہو گئے ہیں، والد صاحب کی حیات میں کسی بہن نے کوئی حصہ نہیں مانگا، نہ والدہ کی حیات میں، اب ایک بہن حصہ مانگ رہی ہے، جو کہ والد صاحب کے مکان میں مع شوہر اور بچوں کے رہ رہی ہے، والد صاحب نے ایک وصیت لکھی تھی، جو ساتھ میں منسلک ہے، جس میں لکھا ہے کہ لڑکیوں کی شادی کردی ہے، جن سے اب کوئی لینا دینا نہیں رہا، وہ اپنے اپنے گھروں میں آرام سے رہ رہی ہیں اور میری جائیداد میں تینوں بیٹے برابر کے حقدار ہیں، لہٰذا قرآن وحدیث کی روشنی میں مسئلہ واضح فرما دیں کہ ان بھائیوں اور بہنوں کے

درمیان ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا؟ اور جس مکان میں ایک بہن رہ رہی ہے اس میں بقیہ بھائی بہنوں کا حصہ ہوگا یا نہیں؟ اگر ہے تو کس حساب سے تقسیم ہوگا؟

المستفتی: محمد اسلم سیتا پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کے والد صاحب نے اپنی لڑکیوں کی شادی میں جو روپئے خرچ کیے ہیں وہ ان کی طرف سے تبرع اور احسان ہے اس کی وجہ سے لڑکیوں کا حق میراث ساقط نہیں ہوگا، لہٰذا والد صاحب نے جو وصیت کی ہے وہ شرعاً معتبر نہیں، بلکہ والد صاحب کی تمام جائیداد اور وہ مکان جس میں ایک بہن مع شوہر کے رہ رہی ہے دس حصوں میں تقسیم ہوکر دو، دو حصے بھائیوں کو اور ایک ایک حصہ بہنوں کو ملے گا۔

﴿**قال الله تعالیٰ: لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ.** [النساء: ۱۱]﴾

عن أبی أمامة الباهلی –رضی الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصیة لوارث، النسخة الهندیة ۳۲/۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، الوصایا، باب ماجاء فی الوصیة للوارث، النسخة الهندیة ۳۹۶/۲، دار السلام رقم: ۲۸۷۰، سنن ابن ماجه، لاوصیة لوارث، النسخة الهندیة ۱۹٤/۲ دار السلام رقم: ۲۷۱۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ شوال المکرم ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۲۶۰/۴۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/۱۰/۱۴۳۴ھ

مرضی سے نکاح کرنے کی بنا پر جائیداد سے محروم کرنا

سوال [۱۱۴۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید جو کہ ایک عاقل و بالغ ہے اس نے اپنی برادری اور اپنے میل کی ایک لڑکی سے

نکاح کرنے کے لیے اپنے والدین سے مشورہ کیا، مگر والدین اس نکاح کے لیے تیار نہیں ہوئے، تو خود اس نے والدین کے نا چاہتے ہوئے اس لڑکی سے نکاح کرلیا، جس سے ناراض ہوکر والدین نے زید کو اپنی کل جائیداد منقولہ وغیر منقولہ سے بے دخل کر دیا، اور زید کے ایک بھائی کو بھی اس شبہ میں کہ اس نے نکاح میں شرکت کی ہے، بے دخل کر دیا، اس کے بعد زید کی والدہ حج کو چلی گئیں، زید کے کچھ رشتہ داروں نے زید کی والدہ کو مشورہ دیا کہ وہ زید سے ملاقات کر کے چلی جائے لیکن زید کی والدہ نے اس سے ملنے کو منع کر دیا، چاہے حج ہو یا نہ ہو، تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید کے والدین کا بے دخل کرنے کا معاملہ صحیح ہے یا نہیں؟ کیا اس طرح بے دخل کرنے سے شرعی طور پر زید بے دخل ہوجائے گا اس طرح کرنے سے زید کی والدہ کے حج میں تو کوئی خرابی نہیں آئے گی؟ کیا شرعی طور پر والدین کو بے دخل کرنے کا حق ہے یا نہیں؟

المستفتی: نزاکت علی ولد حافظ شرافت علی، ٹانڈہ بادلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عاقل وبالغ لڑکے لڑکی کو شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ اپنی پسند اور مرضی کے مطابق نکاح کریں، اور ماں باپ کو ان کی پسند پر راضی ہو جانا چاہیے، اس لیے کہ انہیں کو آپس میں نبھاؤ کرنا ہے اس لیے ماں باپ کو اس نکاح پر سختی نہیں کرنی چاہیے، نیز شریعت میں جائیداد سے بے دخل کرنے کا اعتبار نہیں ہے، بلکہ والدین کے انتقال کے بعد ہر ایک اولاد کو اپنا حق میراث حاصل کرنے کا حق باقی رہتا ہے، اور دوسری طرف اولاد پر بھی ضروری ہے کہ والدین کو ہر طرح سے خوش رکھیں، اور ان کی ناراضگی سے بچنے کی کوشش کریں، نیز اولاد سے ناراضگی کی حالت میں والدہ نے جو حج کیا ہے اس حج میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

﴿**قال اللّٰہ تعالیٰ: وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا.** [الأحقاف: ١٥]﴾

عن سليمان بن موسىٰ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من قطع ميراثا فرضه الله، قطع الله ميراثه من الجنة. (سنن سعيد بن منصور، باب من قطع ميراثا فرضه الله،، دار الكتب العلمية بيروت ١/٩٦، رقم: ٢٨٥-٢٨٦)

عن أنس بن مالك –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من

فر من میراث وارثه، قطع الله میراثه من الجنة یوم القیامة. (سنن ابن ماجه، باب الحیف فی الوصیة، النسخة الهندیة ۲/ ۱۹٤، دار السلام رقم: ۲۷۰۳)

إذا زال الصغر زالت الولایة عندنا. (تاتارخانیة زکریا ٤/ ۸۷، رقم: ٥٦٠٨)

الإرث جبری لا یسقط بالإسقاط. (تکملة رد المحتار، مطلب: واقعة الفتاویٰ، کراچی ۷/ ٥٠٥، زکریا ۱۱/ ٦۷۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍محرم الحرام ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۲۵۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۱/۹ھ

کیا شادی کے بعد لڑکیوں کا کوئی حصہ نہیں ہے؟

سوال [۱۱۴۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے نانا مرحوم محمد محسن کے وارثوں میں دو بیٹے محمد شبیر عالم اور محمد عمران عالم اور دو لڑکیاں ہیں، نانی بھی بقید حیات نہیں ہیں، نانا مرحوم کی چھوڑی ہوئی وراثت میں، رہائش کی زمین، پیداوار کی زمین، باغیچہ اور تالاب ہیں، نانا کے انتقال کے بعد دونوں بھائیوں نے چھ زمینوں کو بیچ کر آپس میں تقسیم کرلیا، اور جو زمین بچی اسے دونوں بھائیوں نے غلط طریقے سے اپنے اپنے نام کاغذات بنوالیے ہیں۔

اس میں دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ دو لڑکیوں جن میں ایک میری والدہ اور ایک خالہ ہیں، کو میرے نانا کی وراثت میں سے کیا حصے ملے گا؟

نیز جب تقسیم وراثت کی بات آتی ہے تو محلّہ ٹولہ کے لوگ کہتے ہیں کہ شادی کے بعد بیٹیوں کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، اس سلسلے میں شرعی ہدایات سے روشناس کرا کر ممنون فرمائیں؟

المستفتی: محمد جاوید اختر سمری بختیار پور سہرسہ بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: برتقدیر صحت سوال مسئولہ صورت میں جبکہ آپ

کے نانا محمد محسن نے اپنی زندگی میں بیٹیوں کو اپنی جائیداد کا کوئی حصہ مالکانہ طور پر نہیں دیا ہے تو ایسی صورت میں اس جائیداد میں ان کی تمام اولاد (بیٹوں، بیٹیوں) کا حق ہوگا صرف بیٹوں کا اس پر قابض ہونا اور بیٹیوں کو محروم کر دینا بڑا ظلم اور سخت گناہ ہے اور بیٹیوں کو اپنے حق کے مطالبہ کا اختیار حاصل ہے، بریں بنا بیٹوں کو چاہیے کہ وہ والد کا ترکہ سبھی موجودہ وارثین میں حسب حصص شرعیہ تقسیم کریں، تاکہ آخرت کی جواب دہی سے محفوظ رہ سکیں اور آپ کے نانا مرحوم کا سارا ترکہ درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

محمد محسن میـــــ۶ـــــت

لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی
۲	۲	۱	۱

آپ کے نانا مرحوم کا کل ترکہ ۶ر حصوں میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو ترکہ میں سے اتنا ملے گا جو اس کے نام کے نیچے درج ہے۔

﴿ **يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيۡ اَوۡلَادِكُمۡ لِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ.** [النساء: ١١] ﴾

الإرث جبری لا يسقط بالإسقاط. (تكملة رد المحتار، مطلب: واقعة الفتاویٰ، کراچی ٥٠٥/٧، زكريا ٦٧٨/١١)

عن سعيد بن زيد قال سمعت رسول الله ﷺ يقول: من أخذ من حق امرئ من المسلمين شبرا بغير حق طوقه الله تعالیٰ يوم القيامة سبع أرضين.

(المعجم الأوسط، دار الكتب العلمية بيروت ١٦٧/٦، رقم: ٨٣٨٣، صحيح بخاری، كتاب المظالم، باب إثم من ظلم شيئا من الأرض ٣٣٣/١، رقم: ٢٣٨٨، ف: ٢٤٥٢، مسلم، كتاب المساقات والمزارعة، باب تحريم الظلم و غصب الأرض، النسخة الهندية ٣٣/٢، بيت الأفكار رقم: ١٦١٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴ر محرم الحرام ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۵۹۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۱/۱۵ھ

شادی میں ملنے والے زیورات وغیرہ میراث کا بدل نہیں

سوال [۱۱۴۹۱]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اللہ بخش کے تین بیٹے محمد شاہد، عبدالسلام، عبدالقیوم، دو بیٹی: سعیداً اور مجیداً، اللہ بخش مرحوم کی بیوی امیراً، اپنے انتقال کے وقت اللہ بخش نے مذکورہ بالا ورثاء چھوڑے۔

پھر سعیداً کا انتقال ہوا اس کے ورثاء میں ماں اسیرن، تین بھائی: محمد شاہد، عبدالقیوم، عبدالسلام، ایک بہن مجیداً، پھر امیراً کا انتقال ہوگیا، اس کے ورثاء میں تین لڑکے، ایک لڑکی مذکورہ بالا ہیں۔

اب دو بھائی عبدالسلام، عبدالقیوم ایک بہن مجیداً حیات ہیں، مجیداً اپنی سسرال میں ہے، اللہ بخش کے تینوں لڑکے ان کی وفات کے بعد اپنے حصہ پر قابض رہے، عبدالقیوم نے اپنے بڑے بھائی محمد شاہد سے اپنا مکان بنانے کے بہانے سے رہنے کیلئے مانگا، جس میں کچھ حصہ عبد السلام کا بھی ہے، اس پر عبدالقیوم نے قبضہ کر رکھا ہے، عبدالقیوم نے جب اپنا مکان بنالیا تو اس سے کئی بار مکان خالی کرنے کی بات کی گئی اس نے انکار کر دیا اور اپنا مکان کرایہ پر اٹھا رکھا ہے، اس درمیان محمد شاہد کی طبیعت خراب ہوئی تو انہوں نے اپنے علاج کی وجہ سے اپنا حصہ اپنے چھوٹے بھائی عبدالسلام کو فروخت کر دیا، اس کے بعد محمد شاہد کا انتقال ہوگیا، ان کے انتقال کے بعد مرحوم کے مکان میں جو کہ عبدالسلام نے خرید لیا ہے، عبدالقیوم اور بہن مجیداً حصہ مانگ رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مرحوم محمد شاہد کے مکان میں عبدالقیوم اور مجیداً کا حصہ ہے یا نہیں؟ جبکہ مرحوم نے اپنا حصہ اپنی زندگی میں اپنے بھائی عبدالسلام کو بیچ دیا ہے، جس کا رجسٹری بیعنامہ بھی ہے؟

(۲) اگر بہن کا حصہ اللہ بخش کے مکان میں نکلتا ہے تو عبدالسلام نے تقریباً پچاس ہزار روپیہ اپنی بہن مجیدا کو بھات میں کپڑے زیور نقد کی صورت میں دیئے ہیں تو ان کا کیا ہوگا؟

المستفتی: عبدالسلام آزادنگر ہلدوانی نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ما تقدم و

عدم موانع ارث اللہ بخش کا مال متروک درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

۱۳۴۴۰
۲۶۸۸
۳۸۴
۶۴
۸

اللہ بخش میـــــــت

لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی	بیوی
شاہد	عبدالسلام	عبدالقیوم	سعیداً	مجیداً	امیراً
۱۴	۱۴	۱۴	۷	۷	۱
۸۴	۸۴	۸۴		۴۲	۸
۵۸۸	۵۸۸	۵۸۸		۲۹۴	۴۸
	۲۹۴۰	۲۹۴۰		۱۴۷۰	

۶
۴۲۶
۶

سعیداً میـــــــت — تداخل — ۱/۷

ماں	بھائی	بھائی	بھائی	بہن
امیراً	شاہد	عبدالقیوم	عبدالسلام	مجیداً
۱	۱۰	۱۰	۱۰	۵
۷	۷۰	۷۰	۷۰	۳۵
		۳۵۰	۳۵۰	۱۷۵

امیراً میـــــــت ۷ — تباین — ۵۵

لڑکا شاہد	لڑکا عبدالقیوم	لڑکا عبدالسلام	لڑکی مجیدا
۲	۲	۲	۱
۱۱۰	۱۱۰	۱۱۰	۵۵
	۵۵۰	۵۵۰	۲۷۵

شاہد میـــــــت ۵ — تباین — ۷۶۸

بھائی عبدالقیوم	بھائی عبدالسلام	لڑکی مجیداً
۲	۲	۱
۱۵۳۶	۱۵۳۶	۷۶۸

۱۳۴۴۰

المبلغ

شاہد الأحیاء

بھائی عبدالسلام	بھائی عبدالقیوم	لڑکی مجیداً
۵۳۷۶	۵۳۷۶	۲۶۸۸

مورث اعلیٰ کا ترکہ ۱۳۴۴۰/سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا ملے گا جو اس کے نام کے نیچے درج ہے، نیز اللہ بخش کی جائیداد میں تینوں بیٹوں کے ساتھ بہن مجیداً کا بھی حق ہے، لیکن اللہ بخش کے تینوں بیٹوں نے اپنی بہن کو حصہ دیئے بغیر پوری جائیداد پر قبضہ کرنے کے ساتھ بہن کا حصہ ہڑپ کرلیا اور بہن کو کچھ نہیں دیا، یہ ناجائز اور حرام ہے، اور بہن کے ساتھ خیانت ہے، نیز عبدالسلام نے اپنی بہن مجیداً کی شادی میں جو زیورات بھات وغیرہ دیئے تھے، اور دیتے وقت اس کی صراحت نہیں کی تھی کہ میراث کا جو حصہ ہے وہ تمہاری شادی میں خرچ کیا جارہا ہے، اور بہن نے اسے بخوشی قبول کرلیا ہے، اس لیے مجیداً کی شادی میں جو خرچ ہوا ہے وہ بہن کا حصہ شرعی شمار نہیں ہوگا، نیز سوال میں ذکر کردہ صورت میں عبدالسلام سے عبدالقیوم اور بہن مجیداً دونوں مطالبہ کررہے ہیں تو مجیداً کا مطالبہ تو درست ہے لیکن عبد القیوم نے جبکہ اپنے حصۂ شرعی پر قبضہ کرلیا ہے تو اب عبدالسلام سے مطالبہ بیجا مطالبہ ہے، اور عبدالسلام کے لیے محمد شاہد سے اس کا حصہ خریدنا، جبکہ اس میں بہن کا حصہ نہ ہو تو جائز ہے۔

عن سعيد بن زيد قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من أخذ من حق امرئ من المسلمين شبرا بغير حق طوقه الله تعالىٰ يوم القيامة سبع أرضين.

(المعجم الأوسط ، دار الكتب العلمية بيروت ١٦٧/٦ ، رقم: ٨٣٨٣، بخاری، كتاب المظالم، باب إثم من ظلم شيئا من الأرض ٣٣٣/١ ، رقم: ٢٣٨٨ ، ف: ٢٤٥٢، مسلم، كتاب المساقات والمزارعة، باب تحريم الظلم و غصب الأرض، النسخة الهندية ٣٣/٢، بيت الأفكار رقم: ١٦١٠)

عن أنس بن مالك –رضى الله عنه– قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من فر من ميراث وارثه، قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة. (سنن ابن ماجه، باب

الحیف فی الوصیة، النسخة الهندیة ۲/۱۹٤، دار السلام رقم: ۲۷۰۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۰۱۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۷/۵/۲۴ھ

لڑکیوں اور بہنوں کو وراثت سے محروم کرنا

سوال [۱۱۴۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کلام پاک کے حکم کے تحت شرع محمدی میں ترکہ میں لڑکی اور لڑکا وبیوہ کا کتنا کتنا حصہ ہے؟

(۲) مروجہ قانون میں زرعی آراضی میں اور چکبندی میں عورت کا حصہ نہیں رکھا گیا ہے، تو اس سلسلے میں شرعی حکم کیا ہے؟

وہ شخص جو اپنی بہنوں یا والدہ کو دیہی وزرعی آراضی میں مروجہ قانون زمینداری خاتمہ و چک بندی کے تحت حصہ نہیں دیتا ہے اس کے متعلق شرعی احکامات کیا ہیں، یا اکثر رہائشی مکان میں لڑکی کو حق نہیں دیتے ہیں ان کے متعلق بھی شرعی حکم تحریر فرمائیں، نیز جو شخص زرعی آمدنی وصول کر کے لڑکی کو نہ دے کر صرف لڑکے کو دیتا ہے اس کے متعلق بھی تحریر فرمائیں کہ شرعاً کیا حکم ہے؟

آنجناب سے گذارش ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل جواب تحریر فرمائیں کیونکہ خادم کے وکالت کے پیشہ کے اندر اکثر و بیشتر یہ سوالات آتے ہیں، اور لوگ بہن و عورت کو حصہ دینے سے مروجہ قانون کا سہارا لیتے ہیں؟

المستفتی: خواجہ محمد رائق محلّہ کٹرہ لکھنؤ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: لڑکیوں اور بہنوں کو وراثت سے محروم کردینا اسلامی شریعت میں جائز نہیں ہے، حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص کسی وارث کو وراثت سے محروم کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو جنت سے محروم کردے گا، اس لیے جو شخص خاتمہ زمینداری اور چک بندی کے بعد

بھی لڑکیوں یا بہنوں کا شرعی حق نہیں دے گا، وہ سخت ترین عذابِ الٰہی کا مستحق ہوگا۔

عن أنس بن مالک –رضی الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: من فر من میراث وارثه، قطع الله میراثه من الجنة یوم القیامة. (سنن ابن ماجه، باب الحیف فی الوصیة، النسخة الهندیة ۲/۱۹٤، دار السلام رقم: ۲۷۰۳)

عن سعید بن زید بن عمرو بن نفیل ان رسول الله ﷺ قال: من اقتطع شبرا من الأرض ظلما طوقه الله إیاه یوم القیامة من سبع أرضین. (مسلم شریف، کتاب المساقات والمزارعة، باب تحریم الظلم وغصب الأرض، النسخة الهندیة ۲/۳۲، بیت الأفکار رقم: ۱٦۱۰، صحیح البخاری کتاب المظالم، باب إثم من ظلم شیئا من الأرض، النسخة الهندیة ۱/۳۳۲، رقم: ۲۳۸۸، ف: ۲٤۵۲، سنن أبی داؤد کتاب الأدب، باب من یأخذ الشیئ من مزاح، النسخة الهندیة ۲/٦۸۳، دار السلام رقم: ۵۰۰۳)

نیز زرعی آمدنی وصول کر کے باپ اپنی زندگی میں صرف لڑکوں کو ہبہ کر کے مالکانہ قبضہ دیدیا کرتا ہے اور لڑکیوں کو کچھ بھی نہیں دیتا ہے تو اولاد کے ساتھ بے انصافی کی وجہ سے باپ گنہگار ہوگا۔

ولو وهب فی صحته کل المال للولد جاز و أثم. (در مختار، کتاب الهبة زکریا ۸/۵۰۲، کراچی ۵/٦۹٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱٦/ ذی قعدہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۵۵۱۸/۳۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۱۱/۱٦ھ

تنہائی میں بہنوں سے حصہ نہ لینے کا اقرار کرانا

سوال [۱۱۴۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم پانچ بہن بھائی ہیں، میں سب سے چھوٹا ہوں، خاندانی بٹوارے میں باپ کی جو جائیداد ملی تو بڑے بھائی نے تینوں بہنوں سے الگ الگ بلا کر پوچھا کہ تم اپنا حصہ لوگی یا نہیں؟ بڑے بھائی نے الگ الگ بلا کر اس لیے پوچھا کہ بقول بھائی کے وہ لوگ ایک

دوسرے کے دباؤ میں آکر منع نہ کردیں، جو اصل بات ان کے دل میں ہو وہی کہیں، تو تینوں نے الگ الگ انکار کردیا کہ ہم اپنا حصہ نہیں لیں گی۔

اس بیچ دس سال کے وقفہ میں بڑے بھائی نے تین بار زمین بیچی اس کا پیسہ ہم دونوں بھائیوں میں ہی تقسیم ہوا، ابھی کچھ ماہ پہلے جب میں نے کچھ زمین بیچنے کا اردہ کیا تو تینوں بہنوں نے اپنا حصہ مانگا، جبکہ بڑے بھائی نے زمین بیچی تو کسی نے نہیں مانگا، جب میں نے کہا کہ بڑے بھائی نے زمین بیچی تب تم تینوں نے کچھ نہیں کہا، اب میں بیچ رہا ہوں تو تم کیوں مانگ رہی ہو، تو کہا: تم دونوں میں جو اختلاف ہوگیا ہے تو میں نے کہا کہ تم نے بٹوارے کے وقت پوچھے جانے پر یہ شرط نہیں رکھی تھی، کہ ہم دونوں میں اختلاف ہو جائے گا، تو ہم بہنیں اپنا اپنا حصہ مانگ لیں گی۔

کیا شرعی لحاظ سے ایک بار انکار کرنے کے بعد دوبارہ حصہ مانگنا درست ہے، کیا اسلام میں زبان اور نیت کی کوئی اہمیت نہیں ہے، انسان کی زبان ہی تو سب کچھ ہے، اگر زبان کی اہمیت نہیں تو کیا یہ بات طلاق میں بھی لاگو ہوسکتی ہے، شروع سے ابھی تک رہائشی مکان ساری جائیداد پر جس میں کھیت، باغ، مکان کا کرایہ سب آتے ہیں، بڑے بھائی کا قبضہ ہے، پہلے جب بہنوں نے اپنا حصہ لینے سے منع کردیا تو بڑے بھائی اس بات سے راضی تھے، اور اپنی مرضی سے زمین بیچتے رہے، اور جب مجھ سے اختلاف ہوگیا وہی بھائی اور بھتیجے کہتے ہیں کہ بہنوں کو حصہ دو، اب جائیداد میں تو شرع کی بات کرنے لگے، رہائشی مکان کے بارے میں کہتے ہیں کہ میں اپنی مرضی سے دوں گا اپنے پیسہ کے لحاظ سے، میں آبائی شہر سے دوسرے شہر میں رہتا ہوں، ان مسئلوں کا شرعی حل کیا ہے؟

المستفتی: ڈاکٹر ایم ایم عالم فیضی کلینک بلرامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حق وراثت کی بناپر میراث میں وارثین کو جو بھی ملتا ہے وہ انسان کے اختیار سے نہیں ملتا، اس کا اصل اختیار اللہ تعالیٰ کو ہے اور وارثین غیر اختیاری اور اضطراری طور پر میراث کے مالک ہوتے ہیں، لہٰذا میت کے مرنے کے بعد اس کا ترکہ وارثین کے درمیان تقسیم کرکے ہر ایک کے قبضہ میں منتقل کردینا لازم اور واجب ہوتا

ہے،اور تقسیم کرکے قبضہ میں دینے سے پہلے زبانی معافی کا اقرار کروانے سے معاف نہیں ہوتا ہے، لہٰذا بہنوں کو الگ الگ تنہائی میں بلا کر جوان سے اس بات کا اقرار کروایا ہے کہ وہ اپنا حصہ لینے سے انکار کردیں،تو ان کے قبضے میں آنے سے پہلے محض لینے سے انکار کردینے سے ان کا حق ساقط نہیں ہوتا ہے، بدستور باقی رہتا ہے، اس لیے تنہائی میں بہنوں سے نہ لینے کا جو اقرار کرایا گیا ہے اس سے بہنوں کا حق ختم نہیں ہوا ،لہٰذا بڑے بھائی کے حصے میں بہنوں کا جو حق آیا ہے اس کا دینا بڑے بھائی پر لازم ہے،اور چھوٹے بھائی کے حصے میں بہنوں کا جو حق آیا ہے اس کا دینا چھوٹے بھائی پر لازم ہے،اور بہنوں کا بعد میں مطالبہ کرنا شرعی طور پر ناجائز نہیں ہے، بلکہ جائز ہے، لہٰذا بھائیوں پر لازم ہے کہ بہنوں کا حصہ بہنوں کو بے غرض ہوکر دیدیں۔

لو قال الوارث: ترکت حقی لم یبطل حقه إذا الملک لا یبطل بالترک، وتحته فی حاشیة الحموی: لو قال وارث: ترکت حقی لی إلی آخر کلامه، وفیه التصریح بأن إبراء الوارث من إرثه فی الأعیان لایصح. (الأشباه والنظائر، الفن الثالث ۲/ ۱۶۰)

الإرث جبری لا یسقط بالإسقاط. (تکملة رد المحتار، مطلب: واقعة الفتاویٰ کراچی ۷/ ۵۰۵، زکریا ۱۱/ ۶۷۸)

یتفق الفقهاء علی عدم صحة الإسقاط قبل وجوب الحق وقبل وجود السبب الوجوب لأن الحق قبل ذٰلک غیر موجود بالفعل فلا یتصور ورود الإسقاط علیه فإسقاط مالم یجب ولا جری سبب وجوبه لایعتبر إسقاطا.
(الموسوعة الفقهیة الکویتیة ٤/ ۲۵۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍صفر المظفر ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۴۶۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۲/۲۳ھ

بیٹے کی موجودگی میں بہن وارث نہیں

سوال [۱۱۴۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: لطیفہ خاتون نے اپنے دو مکان میں سے ایک ایک اپنی اولاد وں لڑکا ضیاء الرحمٰن اورلڑکی انور جہاں کو اپنی زندگی میں دے کر قابض و مالک بنا دیا تھا، دونوں اپنے اپنے مکان میں رہنے لگے، پھر لطیفہ کا انتقال ہو گیا اور تقریباً ۱۶؍سال ضیاء الرحمٰن اسی مکان میں رہتے رہے، اس درمیان ان کی بہن انور جہاں نے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔

کیا اب ضیاء الرحمٰن جو انتقال کر چکے ہیں، تو وہ اس کے مکان میں اپنا حصہ طلب کرسکتی ہے؟ جبکہ ضیاء الرحمٰن کے ورثاء میں ان کا ایک لڑکا زعیم الرحمٰن عمر ۱۶؍سال موجود ہے۔

تو دریافت یہ کرنا ہے کہ شرعاً ضیاء الرحمٰن کے ترکہ اور مذکورہ مکان میں ضیاء الرحمٰن کی بہن کا حصہ ہے یا نہیں؟ یا سارا ترکہ و مکان ضیاء الرحمٰن کے لڑکے زعیم کو ملے گا؟ شرعی حکم تحریر فرمادیں۔

المستفتی: زعیم الرحمٰن محلّہ بھٹی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق جب لطیفہ خاتون کا دیا ہوا مکمل مکان ضیاء الرحمٰن کی ملکیت تھا تو اب ضیاء الرحمٰن کی موت کے بعد ضیاء الرحمٰن کا مکان اس کے شرعی ورثاء کو ملے گا اور شرعی ورثاء میں حقیقی بیٹے کی موجودگی میں حقیقی بہن وارث نہیں بنتی، اس لیے ضیاء الرحمٰن کے مکان میں اس کی بہن انور جہاں کا کوئی حق باقی نہیں رہا، بلکہ اس کا بیٹا زعیم الرحمٰن ہی اس کا وارث و مالک ہوگا۔

عن زید بن ثابت قال: ومیراث الإخوة للأب و الأم إنهم لا یرثون مع الولد الذکر ولا مع ولد الابن الذکر و لا مع الأب شیئا. (السنن الکبریٰ للبیهقی، دار الفکر بیروت ۹/۲۸۸، رقم: ۱۲۵۸۱)

وبنو الأعیان والعلات کلهم یسقطون بالابن وابن الابن و إن سفل. (سراجی ص:۱۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۱۷۔۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۵/۲۷ھ

بھائی کا بہن کو حصہ دینے میں ٹال مٹول کرنا

سوال [۱۱۴۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے والد نے آدھا مکان بیچ دیا تھا اور آدھا بچا ہوا مکان میرے بھائی کے پاس ہے، میری والدہ کا انتقال ہو چکا ہے، میں نے ساری زندگی ان کی خدمت کی جو آخری خدمت ہوتی ہے، وہ بھی میں نے اپنی والدہ کی کرلی، وہ اپنی زندگی میں اپنے آدھے حصے کے پیسوں کے متعلق بھائی سے کہہ چکی تھیں کہ میری بیٹی کو اس کے پیسے دیدینا اور اس مکان میں جو میرا حصہ بنتا ہے اس کے پیسے بھی دینے کو کہہ گئی تھیں، اور مجھے کہا تھا کہ بیٹی تو دستخط کر دینا، بھائی تجھے بعد میں پیسے دے گا، لیکن یہ سب انہوں نے منھ زبانی کہا تھا، لکھت میں بھائی کو کر دیا تھا، لہٰذا اب آپ مجھے یہ بتایئے کہ شرعاً میں اس حصے کے پیسوں کی حقدار ہوں یا نہیں؟ گیارہ سال ہو گئے، اس مکان کی رجسٹری ہوئے اور چھ سال ہو گئے ماں کے انتقال کو، میں بہت غربت میں ہوں، میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے، اور پندرہ سال سے مستقل بیمار ہوں، مجھے بتایئے کہ میں وہ پیسے مکان کے حصے کے بھائی سے مانگوں یا نہیں؟

المستفتیه: ثریا سخاوت

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کو بھائی سے اپنے حصہ کے پیسے کا مطالبہ کرنا بلاشبہ جائز اور درست ہے، اور بھائی کے اوپر بھی لازم ہے کہ آپ کا پورا حصہ یا اس کی قیمت بلا کسی ٹال مٹول کے آپ کو جلد ادا کر دے ورنہ بھائی سخت گنہگار ہوگا۔

عن أنس بن مالک –رضی الله عنه– قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: من فر من میراث وارثه، قطع الله میراثه من الجنة یوم القیامة. (سنن ابن ماجه، باب الحیف فی الوصیة، النسخة الهندیة ۲/۱۹٤، دار السلام رقم: ۲۷۰۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳ر شعبان المعظم ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۲۳۱)

دو بھائیوں کا پوری جائیداد پر قبضہ کر کے باقی بھائی بہنوں کو حصہ نہ دینا

سوال [۱۱۴۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ والدین کا انتقال ہوگیا، ان کے ورثاء میں تین لڑکے، تین لڑکیاں ہیں، ایک بھائی دماغی اعتبار سے معذور ہے، دو بھائیوں نے تمام جائیداد کم وبیش لے لی، بہنوں کو کچھ بھی نہیں دیا، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ والدین کی جائیداد میں بھائی بہنوں کو کس قدر حصے ملیں گے؟

(۲) میرے والد نے انتقال سے پہلے بارہ تولہ سونا میرے پاس رکھا تھا اس کے بعد میں نے دو تین مرتبہ یہ زیور والد کو واپس کرنا چاہا، لیکن انہوں نے اسے نہیں لیا اور کہا کہ اسے اپنے پاس رکھ لے، اور میری بات مان لے، میں یہ دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ زیور میرا ہی رہے گا، یا سب بھائی بہنوں کا حصہ ہوگا؟ شرعی حکم تحریر فرمائیں۔

المستفتی: کاشف محلہ اصالت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شرعی اعتبار سے لڑکیاں بھی میراث کی حقدار ہوتی ہیں، لہٰذا ان کو حق وراثت سے محروم کرنا کسی بھی صورت میں جائز اور درست نہیں، اور مرحوم کا کل ترکہ نو حصوں میں تقسیم ہوکر لڑکوں کو دو، دو اور لڑکیوں کو ایک ملے گا، اور ترکہ کے اندر وہ زیور بھی شامل ہوگا جو باپ نے سائلہ کے پاس رکھا تھا، اس لیے کہ زیور سائلہ کو بطور ہدیہ دینا ثابت نہیں بلکہ بطور حفاظت رکھنا ثابت ہے، اس میں دونوں سوالوں کے جوابات ہوگئے۔

﴿**قال اللّٰہ تعالیٰ: لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ**. [النساء: ۱۱]﴾

عن سعید بن زید قال سمعت رسول اللّٰہ ﷺ یقول: من أخذ من حق امرئ من المسلمین شبرا بغیر حق طوقه اللّٰہ تعالیٰ یوم القیامة سبع أرضین. (المعجم الأوسط، دار الکتب العلمیة بیروت ۱۶۷/۶، رقم: ۸۳۸۳، صحیح البخاری، کتاب المظالم، باب إثم من ظلم شیئا من الأرض ۳۳۳/۱، رقم: ۲۳۸۸، ف: ۲۴۵۲، مسلم، کتاب المساقات والمزارعة، باب تحریم الظلم و غصب الأرض، النسخة الهندیة ۳۳/۲، بیت الأفکار رقم: ۱۶۱۰)

عن أنس بن مالک –رضی الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: من فر من ميراث وارثه، قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة. (سنن ابن ماجه، باب الحيف في الوصية، النسخة الهندية ۲/ ۱۹٤، دار السلام رقم: ۲۷۰۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ ذی قعدہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۶۹۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۱۱/۵ھ

والدین کی موجودگی میں بھائی بہن محروم

سوال [۱۱۴۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے لڑکے محمد اسلام کا تقریباً تین ماہ قبل انتقال ہوگیا، جن کے وارثین میں ماں باپ اور پانچ بھائی اور دو بہنیں حیات ہیں، اوران کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی، مرحوم نے ترکہ میں ایک مکان تقریباً ۳۰۰ رگز کا چھوڑا، یہ مکان چھ بھائیوں کوان کے والد نے خرید کر دیا تھا، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ ان کے ترکہ کے شرعاً کون کون حقدار ہیں

المستفتی: بشیر احمد مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: برتقدیر صحت سوال مرحوم کے شرعی وارث صرف والد اور والدہ ہیں، بھائی بہن باپ کی موجودگی میں وارث نہیں ہوں گے، لہٰذا سوال میں مذکور مکان میں سے محمد اسلام کا جوایک حصہ تھا اس کے شرعاً تین حصے کرکے ایک حصہ مرحوم کی والدہ کا اور دو حصے مرحوم کے والد کو ملیں گے۔

عن زيد بن ثابت قال: وميراث الإخوة للأب و الأم إنهم لايرثون مع الولد الذكر ولا مع ولد الابن الذكر و لا مع الأب شيئا. (السنن الكبریٰ للبيهقي دار الفكر بيروت ۹/ ۲۸۸، رقم: ۱۲۵۸۱)

وبنو الأعيان والعلات كلهم يسقطون بالابن وابن الابن و إن سفل

وبالأب بالاتفاق. (سراجی ص: ۱۱)

ولـلأم ثـلـث الكل عند عدم هؤلاء المذكورين. (سراجی ص:۱۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ ذیقعدہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ٦٩۴۲)

والد کی موجودگی میں بھائی وراثت سے محروم ہو جاتا ہے

سوال [۱۱۴۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میری شادی ۲۸/ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو ہوئی تھی، منکوحہ ولیمہ کے دن سے بیمار تھی، اسی دن سے علاج شروع ہو گیا تھا، اور برابر علاج چلتا رہا، تین ماہ دیگر ڈاکٹروں سے علاج میں کراتا رہا، لیکن کوئی مناسب حل نہ ملنے پر مجبوراً ہرتھلہ روڈ پر موجود ہوسپٹل میں ۱۵/ روز وہاں علاج چلتا رہا، اسی دوران ڈاکٹروں کی رپورٹوں سے پتہ چلا کہ میری منکوحہ کو کینسر کا موذی مرض ہے اس کے بعد تمام ہی منکوحہ کے رشتہ داروں کی رائے ومشورہ سے منکوحہ کو دہلی آل انڈیا میں علاج کرانے کے واسطے لے گیا، وہاں پر لگ بھگ تین ماہ تک علاج چلتا رہا، اس پر بھی میری منکوحہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، ڈاکٹروں نے آپریشن کرانے کو کہا، تب میں نے اپنی سسرال والوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے بھی یہی جواب دیا کہ آپریشن ہی کرا لو، تب میں نے اپنی منکوحہ کو دہلی آل انڈیا میں داخل آپریشن کے لیے کر دیا، آپریشن کے تین دن بعد ہی میری منکوحہ کا انتقال ہو گیا، سارے علاج وغیرہ میں جو رقم صرف میں آئی وہ تنہا میری تھی۔

بیماری کے دوران جب میری منکوحہ کو اپنی حالت غیر مناسب محسوس ہوئی تب انہوں نے مجھ سے کہا، آپ کسی طرح سے مجبور وپریشان نہ ہوں اور نہ ہی میرے علاج کے لیے کسی سے ادھار یا قرض لینا، اگر روپیہ کی ضرورت پڑے تو چاہے آپ میرے جہیز کی کوئی بھی چیز بیچ کر رقم کا انتظام کر لیں، کیونکہ میرے جہیز میں لگی رقم تنہا میری ہی اپنی ہے اسی دوران میری

منکوحہ کے بڑے بھائی نے ایک ہزار روپیہ مجھے اپنی بہن کے علاج کے لیے دینے کی کوشش کی اس پر میری منکوحہ نے اپنے بڑے بھائی سے کہا کہ مجھے کسی کے احسان وروپیہ کی ضرورت نہیں، اور نہ ہی میں اپنے اوپر اپنے بھائی کا کسی بھی طرح کا قرضہ پسند کروں گی، میں اپنے علاج کے لیے سارا جہیز بیچ سکتی ہوں، کیونکہ شادی میں جو بھی سامان وخرچہ کیا گیا ہے، وہ میری اپنی ملکیت تھی، میری منکوحہ کسی اسکول میں ٹیچر تھی، میری منکوحہ کے بڑے بھائی سامان واپس لینا چاہتے ہیں، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ شرعی مسئلہ ہے، سامان واپس لینے کا، لیکن میری منکوحہ کے والد سامان واپس لینے کو منع فرماتے ہیں، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ تم نے علاج میں کوئی کمی نہیں چھوڑی، اپنی جانب سے بہت کوشش کی، روپیہ اور وقت بھی بہت خرچ کیا، مگر خدا کو یہی منظور تھا، اس مسئلہ پر غور فرما کر جواب دینے کی مہربانی کریں، سامان واپس دیا جائے یا نہیں؟ کیونکہ یہ میری منکوحہ کا سامان ہے۔

نوٹ: اس جہیز کو لینے کا بھائی حقدار ہوسکتا ہے یا نہیں؟ نیز مرحومہ کی والدہ کا انتقال پہلے ہو چکا ہے۔

المستفتی: فیاض الحسن خاں محلّہ گوئیاں باغ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت سوال اگر مرحومہ کی حقیقی والدہ نہیں ہیں اور صرف والد اور بھائی زندہ ہیں تو مرحومہ کی ساری ملکیت جہیز ودیگر ترکہ دو حصوں میں تقسیم ہوکر ایک حصہ شوہر کو ملے گا اور ایک حصہ باپ کو اور مرحومہ کا بھائی شرعاً محروم ہوگا، اس کو حصہ نہیں ملے گا۔

عن زید بن ثابت قال: ومیراث الإخوۃ للأب و الأم إنهم لایرثون مع الولد الذکر و لا مع ولد الابن الذکر و لا مع الأب شیئا. (السنن الکبریٰ للبیهقی، دار الفکر بیروت ۹/۲۸۸، رقم: ۱۲۵۸۱)

وبنو الأعیان و العلات کلهم یسقطون بالابن و ابن الابن و إن سفل وبالأب بالاتفاق. (سراجی ص: ۱۱)

المالک هو المتصرف فی الأعیان المملوکة کیف شاء من

الملک. (بیضاوی شریف رشیدیه ۱/۷)

اور اگر مرحومہ کے باپ اپنا حق داماد کو دینا چاہیں تو داماد کو لینے کا حق ہے، اور اس میں مرحومہ کے بھائی وغیرہ کو اعتراض کا حق نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/۲۶۵۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۲/۴/۱۹ھ

باپ کی موجودگی میں بہن بھائی کو وراثت میں سے کچھ نہ ملے گا

سوال [۱۱۴۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کا ایکسیڈینٹ موٹر سائیکل پر پیچھے بیٹھے ہوئے ایک ٹرک سے ہو گیا، جس میں دو تین دن کے بعد زید کی موت واقع ہو گئی، ہوسپٹل میں ایکسیڈینٹ کے بعد پولیس نے داخل کیا، اس واسطے یہ کیس بھی پولیس کیس ہے، زید کی موت کے بعد زید کے والد نے عدالت میں پولیس کے کہنے سے اور دیگر احباب کے کہنے سے اس کے معاوضہ کا دعویٰ کیا، جس کا معاملہ دہلی عدالت میں زیر غور ہے، اب یہ بات معلوم کرنی ہے کہ یہ کیس کرنے پر جو روپیہ عدالت کے فیصلہ کے مطابق گورنمنٹ زید کے والد کو دے گی اس روپیہ کو لینا درست ہے یا نہیں؟

اگر درست ہے تو پھر اس روپیہ کو کسی مدرسہ یا مسجد یا کسی غریب کو بھی دے سکتے ہیں یا نہیں؟ نیز متولی زید کے کوئی برادر حقیقی نہیں بلکہ دو تین حقیقی بہنیں ہیں اور ایک والد ہیں، بہنوں میں ایک بیوہ بھی، تو وہ روپیہ بہنوں اور والد کے درمیان کس طرح تقسیم کیا جائے، بہن تینوں ہی نادار ہیں، زید اپنی حیات میں ان کی مدد کیا کرتا تھا؟

المستفتی: سید منصور علی قصبہ ہسن پور بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کے والد کے لیے اس روپیہ کا لینا شرعاً درست ہے، اور وہ روپیہ زید کے شرعی ورثاء کے درمیان حصص شرعی کے اعتبار سے تقسیم ہوگا،

اگر زید کے بیوی واولاد نہیں ہے تو مذکورہ صورت میں کل روپیہ زید کے والد کو ملے گا، اور شرعاً باپ کی موجودگی میں بہنوں کو حصہ نہیں ملتا ہے، البتہ باپ اپنی مرضی سے بہنوں کو دینا چاہے تو دے سکتا ہے، نیز مسجد میں بھی دینا لازم نہیں ہے بلکہ والد کی مرضی ہے کہ وہ جہاں چاہے جس طرح چاہے خرچ کرے۔

عن علي قال: تقسم الدية على ما يقسم عليه الميراث. (سنن سعيد بن منصور، دار الكتب العلمية بيروت ١/١٠٠، رقم: ٣٠٨)

والولاية حكمها حكم سائر الأموال فلهٰذا لو أوصىٰ بثلث ماله تدخل الدية فيه. (تبيين الحقائق، كتاب الجنايات، فصل و إن صولح على مال، امداديه ملتان ٦/١١٤، زكريا ٧/٢٤٣)

قوله وكذٰلك الدية لوارثه بينهم. (حاشيه چلپى على التبيين امداديه ملتان ٦/١١٤، زكريا ٧/٢٤٢) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰؍ربیع الاول ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/۱۶۴۱)

مرحوم کی بیوی کا مرحوم کے والد سے جائیداد مانگنا

سوال [۱۱۵۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) میرے بیٹے شرافت حسین کا انتقال ہوگیا ہے اس نے اپنے پیچھے بیوی اور ایک لڑکا، ایک لڑکی چھوڑی ہے، اور ہم والدین بھی حیات ہیں، ہمارے دو لڑکے اور چھ لڑکیاں ہیں۔

تو دریافت یہ کرنا ہے کہ شرافت حسین کی بیوی میری جائیداد میں شرافت حسین کے حصہ کا مطالبہ کرتی ہے، تو شرعاً میری جائیداد میں شرافت حسین کی بیوی یا اس کے بچوں کا کوئی حق ہے یا نہیں؟ جبکہ ہمارے دیگر لڑکے اور لڑکیاں موجود ہیں، شرعی حکم تحریر فرمائیں۔

(۲) اور جو جائیداد شرافت حسین کے نام ہے، اس میں شرعاً کون کون لوگ حقدار ہوں گے؟

المستفتی: لیاقت حسین تحصیل اسکول مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب آپ کی زندگی میں آپ کے بیٹے شرافت حسین کا انتقال ہو چکا ہے اور آپ کے دوسرے لڑکے بھی موجود ہیں تو ایسی صورت میں آپ کے مرنے کے بعد آپ کی جائیدا د میں شرافت حسین کی بیوی اور اولا د کوئی بھی حصہ پانے کے حقدار نہیں ہوں گے، اور آپ کی زندگی میں آپ کی جائیداد اور دولت میں سے کسی بھی شخص کو حصہ مانگنے کا حق نہیں، نہ موجودہ لڑکوں کو حق ہے اور نہ کسی اور کو۔

بیانه: أن شرط الإرث وجود الوارث حیا عند موت المورث. (شامی، کتاب الفرائض، کراچی ۶/۷۶۹، زکریا ۱۰/۵۱۱)

وقال مشائخ بلخ: الإرث یجری بعد موت المورث. (الفتاویٰ التاتارخانیة ۲۰/۲۱۵، رقم: ۳۳۰۷۸)

اور شرافت حسین مرحوم کی جائیداد اور ترکہ اس کے وارثین کے درمیان تقسیم ہوگا، اور اس کے وارثین میں ماں باپ، بیوی اور اس کی اولاد شامل ہوں گی، جو درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا۔

۷۲/۲۴

میت

لڑکی	لڑکا	باپ	ماں	بیوی
	۱۳	۴	۴	۳
۱۳	۲۶	۱۲	۱۲	۹

مرحوم شرافت حسین کا ترکہ ۷۲/سہام میں تقسیم ہو کر بیوی کو ۹/سہام ماں باپ کو بارہ بارہ سہام اور لڑکے کو ۲۶/ اور لڑکی کو ۱۳/سہام ملیں گے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ربیع الاول ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۰۹۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۳/۴ھ

حقیقیات کی موجودگی میں علاتیات محروم ہو جاتے ہیں

سوال [۱۱۵۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: زید کا انتقال ہوا، زید کے وارثین میں سے ایک حقیقی بھائی اور بہن ہے اور ایک باپ شریک بھائی اور ایک بہن ہے، زید کے پاس ۳۰۰؍ ڈسمل زمین تھی تو کیا زید کے باپ شریک بھائی بہن کو کچھ ملے گا یا نہیں؟ اور کس کا کتنا حصہ ہوگا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت سوال اگر زید کے حقیقی بھائی اور بہن موجود ہیں تو ان کی موجودگی میں علاتی (باپ شریک) بھائی بہن کو وراثت میں کوئی حصہ زید کے ترکہ سے نہیں ملے گا۔

عن علي رضي قال: قضى رسول الله ﷺ: أن أعيان بني الأم يتوارثون دون بني العلات. (سنن الترمذی، باب ما جاء فی میراث الإخوة فی الأب و الأم، النسخة الهندية ۲/ ۲۹، دار السلام، رقم: ۲۰۹۵)

إن أعيان بني الأم يتوارثون دون بني العلات. (سراجی ص:۲۲)

اور اگر حقیقی بھائی و بہن صرف دو ہی ہیں تو کل زمین تین حصوں میں تقسیم ہوکر دو حصے بھائی کو اور ایک حصہ بہن کو ملے گا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ ذیقعدہ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۶۹۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۱۱/۷ھ

حقیقی اولاد کی موجودگی میں سوتیلی اولاد وارث نہیں ہوتی

سوال [۱۱۵۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے والد سلطان حسین نے ہماری والدہ حسین بانو کے دین مہر کے عوض میں باغ و مکان دیدیا، اب اس باغ و مکان میں ہماری سوتیلی بہن میمونہ خاتون کے بچوں کا کوئی حصہ بنتا ہے یا نہیں؟ میمونہ خاتون کا انتقال ہو چکا ہے؟

المستفتی: اقبال حسین ولد سلطان حسین نواب پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حقیقی اولاد کی موجودگی میں سوتیلی اولاد محروم ہو جاتی ہے، اس لیے سوالنامے میں درج شدہ صورت میں میمونہ خاتون کی اولاد کو حسین بانو کے دین مہر کے مکان وباغ میں سے کچھ بھی نہیں مل سکتا۔

عن عليؓ قال: قضی رسول الله ﷺ: أن أعيان بني الأم يتوارثون دون بني العلات يرث الرجل أخاه لأبيه و أمه دون إخوته لأبيه. (سنن ابن ماجه، باب ميراث العصبة، النسخة الهندية ۲/۱۹۶-۱۹۷، دار السلام رقم: ۲۷۳۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ ر شوال المکرّم ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۹۴۸)

حقیقی بھائی کی موجودگی میں علاتی بھائی محروم

سوال [۱۱۵۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید نے دو شادیاں کیں، پہلی بیوی سے زیب النساء، محمد خالد اور محمد عارف تھے، دوسر بیوی سے محمد زاہد، بدرالدین وغیرہ ہیں، مسماۃ زیب النساء کا انتقال ہوگیا، جو کہ پہلی بیوی کی اولاد تھیں، مسماۃ مذکورہ بیوہ کی اولاد تھی، ان کا ترکہ ان کے حقیقی بھائی کو صرف ملے گا، یا زید کی دوسری بیوی کی اولاد کو ملے گا؟ سوتیلے بہن بھائی کو نہیں ملے گا؟

المستفتی: محمد ساکن محلّہ رفعت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حقیقی بھائی بہن کی موجودگی میں سوتیلے بھائی بہن کو کچھ نہیں ملتا ہے، سارا ترکہ ماں باپ شریک بھائی بہن کو مل جائے گا، صرف باپ شریک علاتی بھائی بہن کو نہیں ملے گا، لہٰذا زیب النساء کا سارا ترکہ محمد خالد، محمد عارف کو مل جائے گا، اور محمد زاہد وبدرالدین وغیرہ محروم ہو جائیں گے۔

عن علي رضی اللہ عنہ قال: إن تقرؤن من بعد وصية يوصى بها أو دين، وإن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم قضى بالدين قبل الوصية، وأن أعيان بني الأم يتوارثون دون بني العلات، يرث الرجل أخاه لأبيه و أمه، دون أخيه لأبيه. (منسد أحمد بن حنبل ١/ ١٤٤، رقم: ١٢٢٢)

يرجحون بقوة القرابة أعنى به ذا القرابتين أولى من ذى قرابة واحدة ذكرا كان أو أنثىٰ لقوله عليه السلام: أن أعيان بنى الأم يتوارثون دون بنى العلات. (سراجى ص:٢١، شريفيه ص:٤٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۱۲۴۲)

بھائی کی موجودگی میں بھتیجوں کا حصہ

سوال [۱۱۵۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اشتیاق حسین صاحب کا انتقال ہوگیا ان کے ورثاء میں ایک حقیقی بھائی دلاور حسین ہے، اور اشتیاق حسین کی شادی نہیں ہوئی تھی، اس لیے بیوی بچے نہیں تھے، مذکورہ بالا بھائی دلاور حسین کے علاوہ ۹/ بھتیجے اور ۱۵/ بھتیجیاں ہیں، کیا بھائی کی موجودگی میں بھتیجوں کو بھی حصہ ملے گا یا نہیں؟ جواب تحریر فرمادیں، اور ہر ایک کو کیا ملے گا؟

المستفتی: دلاور حسین مغلپورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ما تقدم وعدم موانع ارث اشتیاق حسین کا وارث صرف اس کا بھائی دلاور حسین ہے اور بھائی کی موجودگی میں بھتیجے اور بھتیجیاں وارث نہیں ہوتی ہیں، لہٰذا بھتیجے اور بھتیجیوں کو ان کے تایا دلاور حسین کے ترکہ سے کچھ نہیں ملے گا اور سارا ترکہ تنہا بھائی دلاور حسین کو مل جائے گا۔

الأقرب فالأقرب يرجحون بقرب الدرجة أعنى أولٰهم بالميراث

–إلى– ثم جزء أبيه إى الإخوة ثم بنوهم. (السراجی فی المیراث ص: ۲۲)

قال رحمه الله: ثم الأخ لأب و أم ثم الأخ لأب ثم ابن الأخ لأب و أم ثم ابن الأخ لأب. (تبیین الحقائق، کتاب الفرائض، زکریا ۴۸۶/۷، امدادیه ملتان ۲۳۸/۶، المبسوط، دار الکتب العلمیة بیروت ۲۱۹/۴، ۱۷۴/۲۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۳۹۹/۴۰)

بھائی کی موجودگی میں بھتیجا، بھتیجی، چچازاد، خالہ زاد محروم ہوں گے

سوال [۱۱۵۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید غیر شادی شدہ تھا نہ اس نے کسی کو اپنا متبنیٰ بنایا تھا، جس وقت اس کا انتقال ہوا، اس وقت اس کے ایک حقیقی بھائی، چار سگے بھتیجے، چار سگی بھتیجیاں، ایک چچیرہ بھائی، چار خلیرے بھائی، اور تین خلیری بہنیں موجود ہیں، متوفی نے پانچ لاکھ روپئے بینک بیلینس اور ایک مکان ترکہ میں چھوڑا ہے، موجودہ رشتہ داروں میں سے متوفیٰ کے مال سے کس کو کتنا حصہ شریعت مطہرہ کی رو سے پہنچے گا؟

المستفتی: ڈاکٹر محمد انور مسجد مسلم کالونی پٹیالہ پنجاب

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر سائل کا سوال اپنی جگہ درست ہے تو ایسی صورت میں اس کی ساری جائیداد اور بینک بیلینس وغیرہ سب چیزوں کا تنہا اس کا حقیقی بھائی وارث بنے گا، اور اس کے علاوہ بھتیجے، بھتیجیاں، چچا زاد، خالہ زاد بھائی بہنوں میں سے کسی کو حق وراثت حاصل نہیں ہوگا۔

ویسقط بنو العلات أیضا بالأخ لأب و أم. (سراجی ص: ۱۷) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۶۹۰/۳۹)

کیا بھتیجی باپ کے واسطے سے دادا کی وارث بن سکتی ہے؟

سوال [۱۱۵۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم اپنے والد صاحب کے دولڑکے تھے، ایک بڑے والے ۱۹۵۷ء میں حج کے لیے ہمراہ والدہ صاحبہ کے گئے تھے، وہاں سے واپس آنے کے بعد چالیسویں دن انتقال ہو گیا، انہوں نے اپنی اولاد میں دولڑکیاں اور ایک بیوی کو چھوڑا، بیوی اور بڑی لڑکی کا بعد میں انتقال ہو گیا، چھوٹی لڑکی فاطمہ حیات رہی، والد صاحب کے انتقال کے وقت وہ فاطمہ پانچ برس کی تھی، اس کی خدا کے فضل سے پرورش ہوئی اور باعزت طور سے شادی چچا نے یعنی احمد نبی نے کی تھی، والد کا انتقال شادی سے پہلے ہی ہو چکا تھا، ۱۹۶۳ء میں دادا کا انتقال ہوا، اور شادی فاطمہ کی ۱۹۶۶ء میں ہوئی ہے، اب میری بھتیجی فاطمہ کا مطالبہ ہے کہ میرے والد صاحب مرحوم کا حصہ مجھے دیا جائے، اب آپ سے گذارش ہے کہ از روئے شرع میری بھتیجی کو برادر مرحوم کا حصہ پہنچتا ہے یا نہیں؟ چونکہ ہمارے والد صاحب بعد انتقال ہمارے بھائی کے لگ بھگ چھ سال حیات رہے، والد صاحب نے اپنی زندگی میں تمام جائیداد وترکہ کا مجھے مالک بنادیا تھا، مجھے فاطمہ کے بارے میں والد صاحب نے شادی اور پرورش کی وصیت کی تھی، اس کو میں نے پورا کر دیا، آپ اس کا پورا خلاصہ فرمادیں۔

المستفتی: احمد نبی نگلیہ عاقل رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ما تقدم وعدم موانع ارث آپ کے والد کا وارث اگر آپ کے علاوہ بوقت وفات اور کوئی نہیں تھا تو صرف آپ ہی وارث ہوں گے، اور آپ کی بھتیجی آپ کے والد کی وارث نہیں ہے، وہ باپ کے واسطے سے دادا کی وارث نہیں ہو سکتی۔

ويسقطن بالا بن. (سراجی ص:۱۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ رشوال المکرّم ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۶۹۲۲/۳۵)

بھتیجے کی وجہ سے بھتیجیاں، بھانجے اور بھانجیاں محروم ہوجاتی ہیں

سوال [۱۱۵۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عطاء اللہ کا انتقال ہوگیا ہے، اس کے ورثاء میں صرف تین حقیقی بھانجے: وحید الدین، فاروق، نایاب اور چھ بھانجیاں: منی، مودا، ہاجرہ، حسینہ، زرینہ، امینہ موجود ہیں، اور عطاء اللہ کے حقیقی بھتیجے تو نہیں ہیں، البتہ چچا کے دولڑکے: (۱) جمیل (۲) نبیل، دولڑکیاں: جمیلہ، شکیلہ (منی) ہیں تو کیا ان بھتیجوں کو بھی شرعاً حق ملے گا یا نہیں؟

المستفتی: عبدالعزیز بچھرایوں، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: بشرط صحت سوال وبعدا دائے ماتقدم وعدم موانع ارث عطاء اللہ مرحوم کے ترکہ کے لیے سوالنامہ کے ذکر کردہ افراد میں سے صرف چچا زاد بھائی کے لڑکے وارث بنیں گے، بھانجے، بھانجیاں اور چچا زاد بھائی کی لڑکیاں شرعاً وارث نہیں بن سکتے، لہٰذا عطاء اللہ مرحوم کا کل ترکہ دو سہام میں تقسیم ہوکر ایک جمیل کو اور ایک نبیل کو ملے گا، ان کے علاوہ اور کوئی وارث نہ ہوگا۔ (مستفاد: شریفیہ ص:۴۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۳۷۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۳/۹ھ

شوہر کا بھتیجہ وارث نہیں ہے

سوال [۱۱۵۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: الطاف حسین نے ستر گز کا ایک مکان خرید کر آدھا ۳۵؍گز بیوی کو ہبہ کیا اور آدھا مکان ۳۵؍گز بیوی کے مہر میں ادا کیا، اس طرح ۷۰؍گز مکان کی رجسٹری بیوی شہیدن کے نام کرادی، اب شہیدن کا انتقال ہوگیا، ان کے وارثین میں دو بھائی محمد علی اور نیاز علی ہیں،

جبکہ شوہر الطاف حسین کا ایک حقیقی بھتیجہ طاہر حسین بھی موجود ہے، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ ہر وارث کو کتنا کتنا حصہ ملے گا؟ اور طاہر حسین وارث بنے گا یا نہیں؟

المستفتی: نسیم اختر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: برتقدیر صحت سوال وعدم موانع ارث وبعد ادائے حقوق ما تقدم مرحومہ کا ترکہ ان کے ورثاء کے درمیان درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

شہیدن میت ۲	تداخل	۳۵/۷۰ گز
بھائی محمد علی		بھائی نیاز علی
۱/۳۵		۱/۳۵

مرحومہ کا کل ترکہ دو برابر سہام میں تقسیم ہوکر ہر ایک کو ایک ایک حصہ ملے گا، نیز ہبہ کے ذریعہ سے اور دین مہر کے ذریعہ سے شہیدن پورے مکان کی تنہا مالک ہوچکی تھی، اور طاہر حسین کا شہیدن مرحومہ کے ساتھ کسی قسم کا رشتۂ وراثت نہیں ہے، اس لیے طاہر حسین کو شہیدن کے ترکہ میں سے کچھ نہیں ملے گا۔

ویستحق الإرث بإحدی خصال ثلاث بالنسب وهو القرابة والسبب وهو الزوجية والولاء. (هنديه، كتاب الفرائض، الباب الأول زكريا جديد ٦/٤٤٠، قديم ٦/٤٤٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۹۲۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۳/۸ھ

چچا زاد بھائی، حقیقی بہن کی وجہ سے محروم ہوجائے گا

سوال [۱۱۵۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: زید کا انتقال ہوا، ورثاء میں ایک بیوی دو دختران ایک ہمشیرۂ حقیقی اور تین چچازاد بھائی ہیں، از روئے شرع زید کے وارث کون کون ہوں گے؟ اور ترکہ کس کا کس قدر ہوگا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب ورثاء میں لڑکیوں کے ساتھ حقیقی بہن بھی ہو اور پھر مرنے والے کے سگے بھتیجے یا چچازاد بھائی یا بھتیجے بھی ہوں، تو ایسی صورت میں عصبہ بنفسہ اور عصبہ مع غیرہ کا تعارض ہوتا ہے، لیکن اس میں ایک اصول یہ ہے کہ جو قریب ترین وارث ہوتا ہے اسی کو وراثت ملتی ہے اور دور والا محروم ہوتا ہے، لہٰذا چچازاد بھائی عصبہ بنفسہ ہونے کے باوجود حقیقی بہن کی وجہ سے محروم ہوجائیں گے، اب مذکورہ ورثاء کے درمیان میت کا ترکہ چوبیس برابر سہام میں تقسیم ہوکر بیوی کو تین سہام اور دونوں لڑکیوں کو ۸/۸، کل ۱۶/ سہام ملیں گے، باقی بچے پانچ، یہ پانچ سہام بہن کو مل جائیں گے اور سارے چچازاد بھائی محروم ہوجائیں گے۔

إذا اجتمعت العصبات بعضها عصبة بنفسها و بعضها عصبة بغيرها و بعضها عصبة مع غيرها فالترجيح منهابالقرب إلى الميت لابكونها عصبة بنفسها حتى أن العصبة مع غيرها إذا كانت أقرب إلى الميت من العصبة بنفسها كانت العصبة مع غيرها أولىٰ. (هنديه، الباب الثالث فى العصبات، زكريا قديم ٦/ ٤٥٢، جديد ٦/ ٤٤٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۱۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۷ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۸۳۵)	۱۴۱۷/۵/۱۹ھ

شوہر اور ماں باپ کی موجودگی میں بھائی بہن نانا اور خالائیں محروم

سوال [۱۱۵۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کی ابھی چند دنوں پہلے زینب سے شادی ہوئی تھی، اور زینب کی شادی ننہال والوں نے کی تھی، باپ سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا، اب زینب کا کسی بیماری میں انتقال ہوگیا

اورزینب نے بہت سارا مال چھوڑا، جو جہیز میں دیا جاتا ہے، جیسے زیور، کپڑا وغیرہ، یہ تو زینب کی ملکیت والا مال ہے اور کچھ مال تو ایسا ہے جس میں میاں بیوی دونوں شریک ہیں اور کچھ مال تو ایسا ہے جس میں تقسیم نہیں ہوسکتی، تو کن کن مالوں میں وراثت جاری ہوگی، اور جس میں وراثت نہیں جاری ہوگی، اس مال کا کیا حکم ہوگا؟ ورثاء کی تعداد یوں ہے، شوہر، ماں باپ ایک حقیقی بھائی، ایک ماں شریک بھائی، ایک ماں شریک بہن، ایک نانا، تین خالائیں، ان میں سے کن کن لوگوں کو کتنا کتنا حصہ ملے گا؟ زید نے جو زیور اپنی بیوی کو دیا تھا کچھ پیسہ قرض لے کر زیور بنوایا تھا اور وہ قرض ابھی تک ادا نہیں کیا تو کیا اس قرض کو ترکہ کے مال سے ادا کیا جائے گا یا زید اپنی طرف سے قرضہ ادا کرے؟

المستفتی: محمد سرور اعظمی متعلم دار العلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (الف) لڑکی کو رخصت کرتے وقت جو سامان دیا جاتا ہے اس کو عرف میں جہیز کہتے ہیں اور جہیز کا سامان لڑکی کی ملکیت ہوا کرتا ہے، چاہے جس کسی نے بھی وہ سامان دیا ہو، ملکیت لڑکی کی ہو جاتی ہے، لہٰذا زینب کے مرنے کے بعد وہ ساری ملکیت اس کے شرعی ورثاء کے درمیان شرعی حصوں کے اعتبار سے تقسیم ہوگی، اور زیر نظر مسئلے میں زینب کے شرعی وارث صرف تین ہیں، اس کا شوہر زید اس کی ماں اور اس کا باپ، زینب کی ملکیت کے زیورات اور جہیز کے سارے سامان ان ہی تینوں کو ملیں گے، اگر چہ سامان دینے والے اس کے ننہال والے کیوں نہ ہوں اور اس کے حقیقی علاتی بھائی بہنیں اور خالائیں محروم ہو جائیں گی۔

وأما إذا جرت فی البعض یکون الجهاز ترکة یتعلق بها حق الورثة وهو الصحیح. (شامی، مطلب فی دعویٰ الأب أن الجهاز عارية، زکریا ٤/ ٣٠٩، کراچی ٣/ ١٥٧)

اب شرعی ورثاء کے درمیان اس کی تمام ملکیت درج ذیل طریقہ سے تقسیم ہوگی:

$\frac{٦}{٢}$
میـــــــــــــــــــــــــت

شوہر	ماں		باپ
		(۱)	
$\frac{١}{٣}$	١		١

(ب) اگر زید نے بیوی کو یہ زیورات بطور عاریت خرید کر دیئے ہیں تو اصل مالک زید ہے، زید کو یہ حق ہے کہ اس زیور کو بیچ کر قرضہ ادا کرے۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍صفر المظفر ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۲۵۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۲/۱۹ھ

بیٹے کی موجودگی میں پھوپھی محروم

سوال [۱۱۵۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے والد جناب عبدالستار خان صاحب مرحوم نے اپنے انتقال پر چار دختران اور دو بیٹے بطور وارث چھوڑے، میرے والد کی ایک بہن بھی حیات ہیں، جن کی شادی ہو چکی ہے، میرے والد نے جائیداد سکنائی میں دو مکانات چھوڑے ہیں: مکان واقع بریلی آراضی ۲۹۲ ر گز ہے، یہ مکان میرے والد نے محکمہ کسٹوڈین سے اپنی ذاتی آمدنی سے خرید لیا ہے، یہ مکان میرے والد کے عزیزوں کا ہی تھا، جو تقسیم کے وقت پاکستان منتقل ہو گئے تھے، تو اس مکان میں میری پھوپھی کا بھی کوئی حصہ نکلتا ہے، اگر نہیں تو ہم وارثان کے کتنے کتنے سہام ہوں گے؟

المستفتی: عبدالقادر خاں بروالان مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کے والد کے جواعزہ پاکستان چلے گئے ہیں اس مکان میں ان کا بھی حصہ ہے، ان کا حصہ الگ کرنے کے بعد جو آپ کے والد کا حصہ بچے گا اس میں آپ کی پھوپھی آپ کے والد کی وارث نہیں بنے گی، ہاں البتہ اگر وہ مکان آپ کے دادا کا ہے تو آپ کی پھوپھی کو بھی آپ کے والد کا آدھا حصہ ملے گا، لہٰذا مسئولہ مکان میں جو حصہ آپ کے والد کا ہے وہ درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

میت ۸

بیٹا	بیٹا	بیٹی	بیٹی	بیٹی	بیٹی
۲	۲	۱	۱	۱	۱

کل مال ۸/ حصہ میں تقسیم ہوکر بیٹوں کو ۲،۲/ اور بیٹیوں کو ایک ایک سہام ملیں گے۔
فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۹۹۵)

میت کی اولاد کی موجودگی میں اخیافی بھائی کا حصہ

سوال [۱۱۵۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید تین بھائی ہیں: زید، ذکی، زبیر، ان میں زبیر مابقیہ دونوں کے ربیب کی شکل میں بھائی ہے، کہ ماں ایک اور باپ الگ ہے، اور خود زید وذکی یہ دونوں آپس میں سوتیلے بھائی ہیں، اب مسئلہ یہ ہے کہ زید وذکی کی حیات میں زبیر کا انتقال ہوگیا تو کیا ان کے مال میں دونوں بھائیوں کا حق ہوگا؟ جبکہ زبیر کی اولاد بھی موجود ہے، نیز اس سے کچھ دن بعد ذکی کی وفات ہوگئی (جو لاولد ہے) تو ان کے ترکہ کا مستحق زید ہوگا، جبکہ وہ سوتیلا بھائی ہے؟ چونکہ فی الحال نہ باپ نہ ماں، نہ بیوی ہے، اور کیا ان کے علاوہ اور کوئی مستحق میراث رشتہ دار ہے یا نہیں؟ نیز زبیر کی اولاد کو بھی حق میراث حاصل ہوگا؟ خلاصہ کے طور پر نقشہ ملاحظہ ہو:
عارف کے تین لڑکے:

(۱) ذکی: یہ سوتیلا بھائی (۲) زید: ماں ایک (۳) زبیر: ربیب ہے۔

عارف سے پہلے شوہر سے زبیر کی پیدائش ہے، نیز ذکی کا سالہ (بیوی کا بھائی) میراث سے حق الخدمت کا طالب ہے، کیا شرعاً اس کا حق اس میں لگے گا؟

المستفتی: محمد عمران کٹیہاری بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئلہ کی وضاحت یوں ہے کہ زید زبیر کا ماں شریک بھائی ہے اور جب زبیر کی اولاد موجود ہے اور ان میں نرینہ اولاد بھی ہو تو زید زبیر کا

وارث نہیں بنے گا، بلکہ زبیر کا سارا ترکہ اس کی اولاد میں حصۂ شرعی کے مطابق تقسیم ہوگا، اور ذکی کی زبیر کے ساتھ کسی طور پر قرابت داری نہیں ہے اس لیے ذکی زبیر کا کسی طرح سے بھی وارث نہیں بن سکتا، جب ذکی لا ولد فوت ہوگیا اور زید ذکی کا علاتی بھائی ہے، لہٰذا ذکی کا سارا ترکہ اس کے علاتی بھائی زید کو ملے گا، اور زبیر کی اولاد ذکی کی کسی طرح کی قرابت دار نہیں ہے اس لیے زبیر کی اولاد ذکی کی کسی طرح کی وارث نہیں بنے گی۔

وأما لأولاد الأم فأحوال ثلاث (إلى قوله) ويسقطون بالولد و هو الابن وإن سفل. (سراجی: ص:۱۰-۱۱)

الأقرب فالأقرب يرجحون بقرب الدرجة أعنى أولٰهم بالميراث جزء الميت أى البنون ثم بنوهم و إن سفلو. (سراجی ص: ۲۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۱۳۰)

مرحومہ بیٹی کے لڑکے کا نانی کی جائیدا میں حصہ

سوال [۱۱۵۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میری والدہ کا انتقال ہوگیا ہے ان کی چار لڑکیاں ہیں، لڑکا کوئی نہیں تھا، مرحومہ نے اپنے پیچھے کچھ جائیداد چھوڑی ہے، مرحومہ کی حیات میں ان کی سب سے بڑی بیٹی کا انتقال ہو چکا ہے، باقی تین بیٹیاں حیات ہیں، جس بیٹی کا انتقال والدہ مرحومہ کی موجودگی میں ہوا تھا، ان کے دو بیٹے تھے، جس میں سے ایک بیٹا بھی گذر چکا ہے، اور ایک حیات ہے، کیا مرحومہ بیٹی کا حیات بیٹا اپنی نانی کی جائیداد میں حصہ دار ہے یا نہیں؟ جبکہ اس بیٹے کی والدہ کا انتقال اس کی نانی کی حیات ہی میں ہو چکا تھا؟

المستفتیہ: بیوہ حاجی عبد الودود مرحوم فیض گنج مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب مرحومہ کی بیٹی کا انتقال ان کی زندگی میں ہو

چکا تھا، تو فوت شدہ بیٹی کا لڑکا جو مرحومہ کا نواسہ ہے وہ مرحومہ کا شرعی وارث نہیں بن سکتا، بلکہ مرحومہ کی جائیداد اور ترکہ مرحومہ کی موت کے وقت جولڑکیاں زندہ تھیں صرف انہیں کو ملے گا، ہاں البتہ اگر مرحومہ کا کوئی حقیقی یا علاتی بھائی یا بھتیجا زندہ ہوتا تو زندہ بیٹیوں کو دوتہائی دینے کے بعد ایک تہائی مرحومہ کے بھائی یا بھتیجے کو مل سکتا تھا، لیکن سوالنامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحومہ کا کوئی بھائی یا بھتیجا وغیرہ موجود نہیں ہے، تو ایسی صورت میں مرحومہ کی جائیداداور سرمایہ مرحومہ کی تینوں زندہ لڑکیوں کے درمیان برابر تقسیم ہوگا۔

أحدها أن يكون في المسئلة جنس واحد فمن يرد عليه عند عدم من لا يرد عليه فاجعل المسئلة من رؤسهم. (سراجی ص:٤٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۴۱۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۶/۲۲ھ

بیٹی کی موجودگی میں نواسی محروم

سوال [۱۱۵۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ذکیہ خاتون کا انتقال ہوگیا، ان کے ورثاء میں ان کے شوہر حافظ سلامت جان لڑکے ولی الرحمٰن، مطیع الرحمٰن، لڑکیاں: شائستہ جمال، صابرہ خاتون، انہوں نے ایک کوٹھے کا مکان چھوڑا، ذکیہ خاتون نے اپنا مکان اپنے ذاتی پیسے سے اور دونوں بیٹوں کے پیسے سے مل کر بنایا، تیسری منزل کا مکان ان کے بڑے لڑکے ولی الرحمٰن نے بنایا ہے، چھوٹے لڑکے مطیع الرحمٰن دہلی میں رہتے تھے، اب مطیع الرحمٰن بھی دہلی سے آگئے ہیں، ذکیہ خاتون نے ایک نواسی پالی ہے جس کا نام حمیرہ ہے، حمیرہ کے باپ نے شائستہ جمال کو طلاق دیدی تھی، شائستہ نے دوسری شادی کرلی، حمیدہ کی ماں شائستہ جمال اور باپ دونوں حیات ہیں، حمیرہ کا باپ سے کوئی واسطہ قائم نہیں ہے، حمیرہ نانی، نانا ہی کے زیر سایہ پلی ہے، اس کی تقسیم کس طرح ہوگی؟

المستفتی: محمد انور، کمبل کا تعزیہ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ماتقدم وعدم موانع ارث ذکیہ خاتون کا ترکہ مذکورہ وارثین کے درمیان درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

ذکیہ خاتون میت — $\frac{۲۴}{۴}$

زوج	ابن	ابن	بنت	بنت	نواسی
سلامت جان	ولی الرحمٰن	مطیع الرحمٰن (۳)	شائستہ	صابرہ	حمیرہ محروم
$\frac{۱}{۶}$	۶	۶	۳	۳	

ذکیہ خاتون کا ترکہ ۲۴/سہام میں تقسیم ہوکر ترکہ میں سے ہر وارث کو اسی تناسب سے اتنا ملے گا جو ان کے نام کے سامنے درج ہے، البتہ نواسی حمیرہ خاتون اپنی والدہ کے حیات ہونے کی وجہ سے محروم ہوگی، اور ولی الرحمٰن و مطیع الرحمٰن نے والدہ کے ساتھ گھر کی تعمیر میں روپئے اس شرط پر خرچ کیے ہیں کہ تقسیم وراثت کے وقت خرچ کی ادائیگی کے بعد وراثت تقسیم ہوگی، تو اس صورت میں خرچ ادا کرنے کے بعد وراثت تقسیم کی جائے گی، اور اگر بلا معاہدہ خرچ کیے ہیں تو یہ تبرع اور احسان ہے، لہٰذا دوسرے ورثاء بھی اس میں برابر کے شریک ہوں گے اور بڑے لڑکے ولی الرحمٰن نے جو والدہ کی اجازت سے اپنے ذاتی پیسہ کے ذریعہ تیسری منزل کی تعمیر کی ہے اس میں کسی کا حق نہیں، لہٰذا تقسیم وراثت کے وقت تیسری منزل کی قیمت کو بھی مستثنیٰ کیا جائیگا۔

(مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۱/ ۴۲۷، جدید ڈابھیل ۲۰/ ۳۱۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۱۵۳)

سوتیلی وعلاتی بہن کا میراث میں حصہ

سوال [۱۱۵۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: (۱) احقر کے والد مرحوم کا سات سال قبل انتقال ہو گیا، مگر ابھی وراثت تقسیم نہیں ہوئی، سوال یہ ہے کہ والد صاحب کی پہلی شادی تقریباً چالیس سال پہلے ہوئی تھی، اور ایک لڑکی پیدا ہوئی، پھر والد صاحب نے طلاق دیدی، وہ لڑکی بھی اپنی ماں کے ساتھ چلی گئی، پھر دوسری شادی ہوئی، جس سے ہم لوگ ہیں، اس پہلی بیوی کی لڑکی کو ہم لوگ اچھی طرح جانتے تک نہیں ہیں، کیا والد صاحب کی وراثت میں اس کو بھی حصہ دینا ضروری ہے؟ تو اگر زمین کا معاوضہ اس کو دیدیا جائے تو کیا یہ جائز ہے؟

(۲) والد صاحب کے انتقال کے وقت ہم دو بھائی اور پانچ بہنیں ہیں جن میں سے دو کی شادی ہو چکی ہے، اور ہماری والدہ ہے، والد صاحب کی پہلی بیوی کی لڑکی، یعنی ہماری سوتیلی بہن، والد کا مکان اور زمین ان ورثاء میں کیسے تقسیم کیا جائے؟

(۳) والد صاحب کے انتقال کے بعد ہم دونوں بھائیوں نے کمانا شروع کیا اور اپنی کمائی سے والد صاحب کے گھر کو پختہ اور عمدہ بنایا ہے، تو کیا یہ جائز ہے کہ مکان کی زمین کی قیمت لگا کر سب وارثوں میں تقسیم کر دی جائے، اور عمارت صرف ہم دونوں بھائیوں کی ہی رہے، واضح رہے کہ ہم دونوں بھائی کماتے رہے اور خرچہ وغیرہ کر کے جوڑتے رہے، والدہ اور وہ تین بہنیں خود کما کر اپنا خرچہ چلاتی رہیں؟

المستفتی: محمد نسیم سمدھن، ضلع قنوج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) آپ کی سوتیلی علاتی بہن آپ کے والد صاحب کی نسبی حقیقی وارث ہے، اس کا درجہ وراثت میں ایسا ہی ہے جیسا آپ لوگوں کا، لہٰذا والد صاحب کے ترکہ میں سے اس کو حصہ دینا ضروری ہے، اور اس کی وراثت ان تمام جائیداد اور اموال سے متعلق ہے، جو آپ کے والد کے ترکہ میں شامل ہے، چاہے وہ زمین ہو یا روپیہ پیسہ، لہٰذا اس کا حق ہے، کہ اپنے والد کے ترکہ میں سے بعینہ حصہ لے البتہ اگر وہ زمین کے بدلے معاوضہ لینے پر بخوشی راضی ہو جائے تو جائز ہے۔

﴿يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً

﴿فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ. [النساء: ١١]﴾

إذا لم يكن في التركة دين وقد ترك الزوج دراهما وعروضا وصولحت على دراهم إن كان ما أخذت من الدراهم أكثر من نصيبها جاز ويجعلوا المثل من الدراهم بالمثل والباقي بمقابلة العروض. (هنديه، الفصل الثالث والعشرون في الصلح، زكريا قديم ٦/٤٢٤، قديم ٦/٤٢٦)

(۲) برتقدیر صحت سوال وبعد ادائے حقوق متقدمہ وعدم موانع ارث آپ کے والد کا ترکہ حسب ذیل نقشہ کے مطاق ہوگا:

$\frac{۸۰}{۸}$

میت

بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی
$\frac{۱}{۱۰}$	۱۴	۱۴ (۷)	۷	۷	۷	۷	۷	۷

آپ کے والد کے انتقال کے بعد ترکہ میں چھوڑا ہوا مکان اور زمین ۸۰/سہام میں تقسیم ہوکر ہر ایک وارث کو اتنا اتنا ملے گا جو اس کے نیچے درج ہے، بیوی کو ۱۰/سہام، دونوں لڑکوں کو ۱۴/، ۱۴/سہام اور چھ لڑکیوں کو ۷/۷/ ملے گا۔

(۳) آپ والد صاحب کے انتقال کے بعد جو پیسہ آپ لوگوں نے مذکورہ مکان میں لگایا ہے اس وقت اس کو مجریٰ کر سکتے تھے، جب پیسہ لگانے سے پہلے تمام وارثین سے اس کی اجازت لی ہوتی، آپ لوگوں نے تمام وارثین سے اجازت نہیں لی اس لیے آپ لوگوں کی طرف سے تبرع ہوگا، اسی طرح والدہ کے انتقال کے بعد تمام وارثین کا حق متعلق ہو چکا تھا، اور آپ لوگ خود اس مکان میں رہنے لگے، آپ لوگوں کے رہنے پر دوسرے وارثین نے اشکال نہیں کیا، اس لیے آپ لوگوں کا رہنا بھی ان کی طرف سے تبرع ہے، ورنہ سب کو والد کے انتقال کے بعد سے آج تک کی رہائش کا کرایہ کا مطالبہ کرنے کا حق تھا، اس لیے جانبین سے تبرع سمجھا جائے گا، پیسہ لگانا آپ لوگوں کی طرف سے تبرع ہے، اور کرایہ نہ لینا ان لوگوں کی طرف سے تبرع ہے، اس لیے زمین اور مکان میں تمام وارثین کا حق شمار ہوگا، پورے مکان کی قیمت لگا کر مذکورہ نقشہ

کے مطابق تقسیم کردی جائے یا مکان کو گزوں کے حساب سے تقسیم کر کے، ہر ایک کے حوالے کردیا جائے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۱/۴۴۵، جدید ڈابھیل ۱۴/۱۹۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ جمادی الثانی ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۰۹۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/۶/۱۴۲۴ھ

کیا بہنوں کی موجودگی میں بھانجے یا بھانجی کو حصہ ملے گا؟

سوال [۱۱۵۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے والد صاحب نے اپنے سرمایہ سے ایک مکان خریدا، ہمارے والد صاحب کا لگ بھگ ۱۸/ سال پہلے انتقال ہوگیا، والد صاحب کے کوئی اولاد نرینہ نہیں ہے، صرف ہم دو بہنیں بڑی قمر جہاں، چھوٹی چندا بی، بڑی بہن سے کہا اس مکان کی تقسیم کرلو، ہماری بہن اور بہنوئی صاحب نے کہا: تقسیم کیا کرنا، آدھا تمہارا، آدھا ہمارا، کچھ عرصہ بعد ہمارے بہنوئی کا بھی انتقال ہوگیا، اس کے بعد اپنی بہن سے کہا کہ اب مکان کی تقسیم کرلو، تو کہنے لگیں جس کی اولاد زیادہ ہوجائے وہ زیادہ حصہ کی حقدار ہے، اور جس کی اولاد کم ہو وہ کم کی حقدار ہے، ہماری بہن کے سات لڑکے دو لڑکیاں ہیں، اور میرے دو بچے ایک لڑکا، ایک لڑکی ہے، اس کے باوجود دوسرے لوگوں سے کہلوایا تو کہنے لگیں کہ میرے بڑے لڑکے سے بات کرو، سب کچھ وہی کرے گا، میں نے اپنے بھانجہ سے کہا تو کہنے لگا میں یہ جگہ نہیں دوں گا، یہ حصہ نہیں دوں گا، یہ چیزیں نکال کر تقسیم کرلو، کیا شرعاً ایسا ہی ہوتا ہے کہ جس کے بچے زیادہ ہوں اس کو زیادہ ملے گا، اور جس کے کم بچے ہوں تو اس کو کم ملے گا، یا برابر تقسیم ہونا چاہیے؟

المستفتی: چندا بی فیل خانہ، تحصیل اسکول مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: برتقدیر صحت واقعہ مرحوم کے وارثین میں چونکہ صرف آپ ہی دو بہن ہیں، اس لیے ان کے کل ترکہ کی شرعاً حقدار آپ دونوں بہنیں ہیں،

بھانجی، بھانجوں کا کوئی دخل اس میں نہیں ہے، لہٰذا شرعاً کل ترکہ دو حصوں میں تقسیم ہو کر ایک حصہ آپ کا اور ایک آپ کی بہن کا حصہ ہوگا۔

کما لو ترک بنتین ...... فاجعل المسئلة من اثنتین. (سراجی ص: ٤٤)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ ذی قعدہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۹۴۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۱۱/۱۲ھ

بیٹے کی موجودگی میں نواسے، نواسیاں محروم

سوال [۱۱۵۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: احمد نور نے اپنے انتقال کے وقت ایک لڑکا محمد جعفر اور نواسہ نزاکت حسین، نواسی ناظمہ کو چھوڑا، جبکہ احمد نور کی موجودگی میں ان کی دو بیویاں اور ایک لڑکی زاہدہ کا انتقال ہو گیا تھا، نواسی وارث ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: محمد عارش انصاری، چوک پختہ باغ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ احمد نور کی وفات کے وقت نہ اس کی کوئی بیوی زندہ تھی اور نہ ہی کوئی لڑکی صرف ایک لڑکا محمد جعفر زندہ تھا، لہٰذا احمد نور کی ساری جائیداد اور ترکہ سب محمد جعفر کو میراث کے طور پر ملے گا، اور محمد جعفر کی موجودگی میں احمد نور کے نواسے اور نواسیاں وارث نہیں بن سکتے۔

الأقرب فالأقرب أی یرجحون بقرب الدرجة أعنی به أولٰهم بالمیراث الذی یستحق بالعصوبة جزء المیت أی البنون ثم بنوهم و إن سفلوا. (شریفیه ص: ٤٦، مطبع مصطفائیه) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ ذی الحجہ ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۵۵۶)

شوہر کے انتقال کے بعد دوسری جگہ نکاح کرنے سے بیوہ وراثت سے محروم نہیں ہوتی

سوال [۱۱۵۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عورت نے اپنے شوہر کے مرنے کے بعد، عدت گذار کر دوسرے شخص سے نکاح کرلیا ہے تو کیا دوسری جگہ نکاح کرنے کی وجہ سے سابق شوہر متوفی کے ترکہ میں سے میراث میں جو حق ملتا ہے وہ باقی رہے گا یا ساقط ہو جائے گا؟ مدلل جواب دیں۔

المستفتی: محمد یوسف ہلدوانی نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خدائی حکم کے مطابق دوسرے سے نکاح کرنے کی وجہ سے سابق شوہر کے ترکہ سے حق وراثت ساقط نہیں ہوتا، بدستور باقی رہتا ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی: ۳۸۰/۸) جو ذیل کے دلائل سے مدلل ہوسکتا ہے۔

﴿وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَا اَوْ دَيْنٍ. [النساء: ۱۲] **﴾**

أسباب الإرث ثلاثة: نسب و نكاح وولاء، فالنسب: القرابة يرث بعضهم بعضا، والنكاح: هو أن يرث أحد الزوجين من صاحبه بسبب النكاح. (تفسير خازن ۳۲۹/۱)

لأن النبي صلى الله عليه وسلم قضى لبروع بنت وا شق بالميراث وكان زوجها مات عنها قبل أن يدخل بها صداقا. (أوجز المسالك قديم ۳۹۹/۵)

إذا ثبت صحة النكاح ثبت الميراث لعموم الآية. (أوجز المسالك قديم ۳۹۹/۵)

ونكاح صحيح و لو بلا وطئ ولا خلوة إجماعا. (شامی، كتاب الفرائض، كراچی ۷٦۲/٦، زكريا ۴۹۷/۱۰، كوئٹه ۵۳۸/۵)

الحق متى يثبت لا يبطل بالتاخير والكتمان. (قواعد الفقه ص: ۷۷)

الحق لا يزول بتقادم الزمان. (قواعد الفقه ص: ۷۷)

وجوب الحق لا يفوت بالتاخير. (قواعد الفقه ص: ١٣٦)

عبارت نمبر ۱: مطلب یہ ہے کہ سورہ نساء آیت نمبر ۱۲/ میں اللہ تعالیٰ کا یہی حکم دیتا ہے کہ شوہر کی موت کے فوراً بعد بیوی کا دین مہر اب تک ادا نہیں کیا گیا ہے تو کل ترکہ میں سے اولاً دین مہر بیوی کو ادا کیا جائے اس کے بعد اگر وصیت نہ کی ہو تو کل ترکہ میں سے اولاد نہ ہونے کی صورت میں بیوہ ایک چوتھائی مال کی حقدار ہے، اور اولاد کی موجودگی میں کل ترکہ میں سے آٹھویں حصہ کی حقدار ہے۔

عبارت نمبر ۲: عبارت کا مطلب ہے کہ ثبوتِ ارث کے لیے شریعت اسلامی نے تین امور کو سبب قرار دیا ہے: نسب اور، قرابت کا تعلق، رشتۂ زوجیت، مالک ومملوکیت کا تعلق ان میں سے میاں بیوی میں سے ہر ایک دوسرے کا صرف نکاح کی سبب سے وارث ہو جاتا ہے۔

عبارت نمبر ۳: جو کہ حدیث ہے۔

عبارت نمبر ۴-۵: کا مطلب ہے کہ صرف سحت نکاح کی وجہ سے حق وراثت ثابت ہو جاتا ہے، اگر چہ میاں بیوی آپس میں ہمبستر بھی نہ ہو پاتے ہوں۔

عبارت نمبر ۶-۷-۸: عبارت کا مطلب یہ ہے کہ خدائی قانون میں جب حق ثابت ہو جاتا ہے تو وہ حق صاحب حق کے تصرف کے بغیر ساقط نہیں ہوسکتا ہے، چاہے صاحب حق کے ذاتی حالات میں تغیرات بھی ہو جائیں، مثلاً صاحب حق کا انتقال ہو جائے، یا وطن بدل دیں یا دوسری ازدواجی زندگی وغیرہ اختیار کرلیں، کسی بھی صورت میں حق باطل نہیں ہوسکتا ہے، لہٰذا مذکورہ دلائل سے بیوی کا حق وراثت دوسرے شخص سے نکاح کے بعد بھی ثابت رہنا واضح ہو چکا ہے، خدائی حکم یہی ہے کہ مرنے کے بعد فوراً وراثت تقسیم کی جائے، تقسیم میں تاخیر کرنا خود وارثین کی کوتاہی ہے، اس کوتاہی کی وجہ سے بیوی کا نہ حق میراث ساقط ہوسکتا ہے، اور نہ دوسرے شخص سے حق نکاح مؤخر ہوسکتا ہے، کہ جو حق اللہ تعالیٰ نے بیوہ کے لیے سورۂ بقرہ آیت: ۲۳۴-۲۳۵ میں ثابت فرمایا ہے۔ ''نیز وراثت سے محروم ہونے کے تمام اسباب نو میں منحصر ہیں: (۱) غلامیت (۲) قتل (۳) اختلاف مذہب دین (۴) کفار میں اختلاف ملک (۵) ردت

(۶) جہالت تاریخ (۷) جہالت وارث (۸) لعان (۹) نبوت۔

ان اسباب میں سے کوئی بھی بیوی کے دوسرے شخص سے نکاح کرنے میں صادق نہیں آتا، لہٰذا ہر حال میں بیوی کا حق وراثت باقی رہے گا، حتی کہ بیوی کی موت کے بعد اس کے ورثاء کو وہ حق مل جائے گا۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۶۸۶)

داماد شرعی وارث نہیں اور لا پتہ وارث کا حق محفوظ رکھا جائے گا

سوال [۱۱۵۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسماۃ پیاری مرحومہ کے ایک لڑکا رشید اور ایک لڑکی خاتون تھی، لڑکا آٹھ سال کی عمر میں پاکستان چلا گیا تھا، آج اکتیس سال ہو گئے، اس کا پتہ نہیں، زندہ ہے یا انتقال ہو گیا، کچھ معلوم نہیں، اور لڑکی مسماۃ خاتون کا انتقال مسماۃ پیاری مرحومہ کی زندگی میں ہی ہو گیا، اب مسماۃ پیاری مرحومہ کے انتقال کے وقت داماد مہدی حسن اور خاتون کی اولاد کا صاحبزادہ اور تین لڑکیاں: رئیسہ، زیتون اور چھوٹی تھیں، مسماۃ پیاری مرحومہ کے نواسے نواسیاں کے علاوہ پانچ بھتیجے: بدن، مند، رافت خاں، کلو اور زاہد اور دو بھتیجیاں: نسیم جہاں، چھوٹی بھی ہیں، مسماۃ پیاری مرحومہ نے اپنی جائیداد اپنی زندگی میں تیس ہزار روپئے میں فروخت کر دی تھی، اور پچیس ہزار روپئے زندگی میں خرچ کیے تھے، اور باقی پانچ ہزار روپئے حاجی بشیر احمد صاحب کے پاس امانت ہیں۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان حالات میں مسماۃ پیاری مرحومہ کا ترکہ ان ورثاء کے درمیان کس طرح تقسیم ہوگا؟ اور کس کس کو کتنا حق پہنچتا ہے؟

المستفتی: مہدی حسن محلّہ برولان، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ساس کے ترکہ میں سے داماد کو کچھ نہیں ملتا، سوالنامہ

میں درج شدہ صورت میں مسماۃ پیاری مرحومہ کا تمام ترکہ لڑکے رشید کو ملے گا، اگر فی الحال کراچی پاکستان میں اس کا پتہ نہیں چل رہا ہے، تو اس کا حق کسی معتمد علیہ شخص کے پاس محفوظ رکھا جائے۔

سوالنامہ سے پتہ چلتا ہے کہ فی الحال رشید کی عمر ۳۹ ر سال ہوگئی، اگر پتہ نہ چلے تو مزید ۵۱ ر سال تک اس کا حق محفوظ رکھنا لازم ہے، اس کے بعد دوسرا حکم ہوسکتا ہے۔

ففی ظاهر الرواية: إذا لم يبق أحد من أقرانه حكم بموته (وقوله) وقال بعضهم تسعون سنة وعليه الفتویٰ، (وقوله) وموقوف الحكم فی حق غيره حتی يوقف نصيبه من مال مورثه كما فی الحمل. (سراجی ص: ٦٢)

فإن كان المفقود ممن يحجب الحاضرين لم يصرف إليهم شيئ بل يوقف المال كله. (شريفيه ص: ١٣٨)

نیز بھتیجے، بھتیجیاں اور نواسے، نواسیوں وغیرہ کو مذکورہ صورت میں کچھ نہیں مل سکتا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ ر جمادی الثانیہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۵۴۷)

والدین کا متوفیہ بچی کے علاج میں خرچ شدہ روپیوں کا مطالبہ کرنا

سوال [۱۱۵۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میری بیٹی کا ایک ماہ پہلے انتقال ہو چکا ہے اس کا ایک لڑکا ہے، تین سال شادی کو ہوئے ہیں، میری بیٹی کی طبیعت خراب تھی، اس میں خرچ میں نے کیا ہے اور میرے داماد نے بھی کیا ہے اور میری دوسری بیٹی نے بھی، اور میں بہت غریب ہوں، دوسری لڑکی جوان گھر میں شادی کرنے کو ہے اور میں بیوہ ہوں، میرا کوئی سہارا نہیں ہے، ایک بھائی مجبور ہے، ٹانگ میں پولیو ہے، داماد سے سامان مانگ رہی ہوں تو وہ دینے سے انکار کر رہا ہے، اور داماد مجھ سے اپنا حصہ مانگ رہا ہے، اور اپنے لڑکے کا بھی حصہ مانگ رہا ہے اور مجھ کو ۲ ر پرسینٹ

دینے کو تیار ہے، مہر زبردستی معاف کرایا ہے، پہلے لڑکی نے منع کیا، پھر لوگوں کے کہنے پر کہہ دیا، لڑکی کو تکلیفیں بہت دی ہیں، ان لوگوں کے کہنے سے میں نے معاف کر دیا ہے، دل سے معاف نہیں کیا ہے، میرے اوپر قرضہ ہے، جو شادی کے لیے لیا تھا، لڑکے کا اور اس لڑکی کے شوہر کا جہیز میں کوئی حصہ ہے یا نہیں؟ شوہر باحیثیت ہے، زمین جائیداد سب کچھ ہے، بس نیت خراب ہے، سامان دینے کو تیار نہیں ہے، داماد نے زبردستی لڑکی والوں سے جہیز کے پیسے فرنیچر کے ۲۲ ؍ ہزار روپئے منگائے، لڑکی والوں کی حیثیت نہیں تھی، لیکن پھر بھی کسی طرح انتظام کر کے ان کی مانگ پوری کر دی، لڑکی والوں نے سوٹ کی سلائی کے لیے بھی پیسے بھیجے تھے، پھر بھی انہوں نے دوبارہ پیسے منگائے اور ہمیں ناحق دبا رکھا ہے۔

المستفتی: چمن آرا، محلّہ بھٹی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ نے شادی شدہ لڑکی کے علاج میں جو کچھ خرچ کیا ہے اگر خرچ کرتے وقت آپ نے لڑکی سے یہ کہہ دیا ہو کہ ہم بطور قرض خرچ کر رہے ہیں بعد میں تمہارے مال سے وصول کریں گے، تو اب لڑکی کے ترکہ میں سے آپ وصول کر سکتی ہیں اور اگر کچھ کہے بغیر آپ نے خرچ کیا ہے تو اب نہیں لے سکتی ہیں، نہ اپنے داماد سے اور نہ اس کے ترکہ سے اسی طرح اگر آپ نے داماد سے یہ کہہ دیا کہ میں اپنا خرچ تم سے وصول کروں گی، اور اس نے اقرار کر لیا ہے تو اب آپ اس سے وصول کر سکتی ہیں اور اگر نہیں کہا ہے تو اب نہیں لے سکتی ہیں اور لڑکی کو شادی کے وقت جو مال و اسباب بطور جہیز دیا گیا تھا وہ سب اس لڑکی کی ملکیت ہے اور اس کے ترکہ میں شامل ہے اس سے داماد کو محروم کرنا گناہ اور ظلم ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۸/۳۳۷)

جهز ابنته بجهاز و سلمها ذٰلک لیس له الاسترداد منها و لا لورثته بعده إن سلمها ذٰلک فی صحته هذا إذا کان العرف مستمرا أن الأب یدفع مثله جهازا لا عاریة. (شامی، مطلب: انفق علی معتدة الغیر، کراچی ۳/۱۵۵، زکریا ۴/۳۰۶)

والأم کالأب فی تجهیزها. (شامی، زکریا ۴/۳۰۹، کراچی ۳/۱۵۷)

المختار للفتویٰ أن یحکم بکون الجهاز ملکا لا عاریة لأنه الظاهر الغالب. (شامی، مطلب: فی دعویٰ الأب أن الجهاز عاریة، زکریا ۳۰۹/٤، کراچی ۱۵۷/۳)

اور مرحومہ نے وارثین میں شوہر ایک لڑکا اور ماں کو چھوڑا ہے، تو شوہر کو ترکہ کا ایک چوتھائی اور ماں کو چھٹا حصہ اور باقی لڑکے کو ملے گا اور مرحومہ کا ترکہ مندرجہ ذیل نقشہ کے اعتبار سے تقسیم ہوگا:

میـــــــــــت ۱۲

شوہر	ماں	لڑکا
۳	۲	۷

مرحومہ کا ترکہ ۱۲/سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا ملے گا جو اس کے نام کے نیچے درج ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/شوال المکرّم ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۱۶۷/۳۷)

بیٹے کی موجودگی میں محروم پوتی اور بیوہ بہو کے ساتھ صلہ رحمی کا طریقہ

سوال [۱۱۵۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خسر کے باحیات ہونے کی صورت میں اس کی بہو جو بیوہ ہے اور عمر تیس برس کے قریب ہے اور غیر رسمی رجحان کے تحت ابھی تک شادی نہیں کی ہے اور اپنے والد کے پاس رہتی ہے، تین سال بعد مارچ میں اس کے وراثت مانگنے پر آپ کا فتویٰ الف: ۸۱۷۱/۳۶/ آیا ہے کہ اس کا اور اس کی دو بیٹیوں کا کوئی حصہ نہیں ہے، ایسی صورت میں باپ کے علاوہ کیا خسر پران کی پرورش کی کوئی ذمہ داری شرعاً عائد ہوتی ہے جس کے لیے خسر کو مجبور کیا جائے۔

اگر اس کا واضح جواب نہیں ہے تو اسے نہ لکھا جاوے کیونکہ مخالف کو اس سے شبہات پیدا کرنے کا موقع فراہم ہوتا ہے، جبکہ صلہ رحمی رحم وکرم پر ہے جس پر سب کا اتفاق ہے، ذمہ

داری ہاں یا نہ میں ضرور لکھی جائے؟

المستفتی: محمد ابراہیم خاں پرمیشرا پورا کسرڑ وامہاراج گنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ۷/محرم الحرام کوآپ کے جس سوال کا جواب لکھا گیا تھا اس میں صرف ایک ہی سوال تھا، آنجناب نے جو یہ فرمایا کہ دو سوال ہیں، ایک کا جواب نہیں لکھا ہے، ایسا سوال ہمارے پاس نہیں آیا، اگر آپ نے بھیجا ہوگا تو ہ آپ جانیں، ہاں اس سوال کے آخر میں اتنی بات تھی کہ اگر پوتیوں کو دادا کے ترکہ اور جائیداد میں سے کوئی حق نہیں ہوتا تو پھر دادا کے ذمہ کیا ہے؟ اگر اس سے دوسرا سوال مراد ہے کہ دادا کے ذمہ کیا ہے تو اس کا جواب ہم نے اسی استفتاء کے ضمن میں لکھ دیا تھا، کہ صلہ رحمی کے طور پر حقیقی پوتیوں کو اتنا دیدینا چاہیے جس سے صلہ رحمی کا حق بھی ادا ہو اور ان کی ضرورت بھی پوری ہو جائے، اور اب آپ نے دو سوالات الگ الگ لفافہ میں روانہ کیے، ایک میں ہمارے پچھلے فتاویٰ کے حوالہ سے لکھا ہے، خسر کے مال میں بہو کا کوئی حصہ نہیں، جیسا کہ ہم نے لکھا ہے، اور اس کی دونوں بیٹیوں کا بھی کوئی حق واجب دادا کے مال میں نہیں ہے، تو کیا دادا کے اوپر پوتیوں کی شرعی کوئی ذمہ داری ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے استفتاء میں ہم نے جو صلہ رحمی کے طور پر دینے کی بات کہی وہ نفقہ اور خرچہ کے علاوہ جائیداد میں سے دینے کو لکھا ہے کہ دادا کی وفات کے بعد دادا کے ترکہ میں سے پوتیوں کو کچھ نہیں ملتا ہے؛ اس لیے زندگی میں صلہ رحمی کے طور پر کچھ دیدے، لیکن اب سوال یہ پوچھا جارہا ہے کہ زندگی میں دادا پر کیا لازم ہے؟ تو دادا پر زندگی میں دونوں پوتیوں کا نان ونفقہ ویسا ہی لازم ہے جیسا کہ باپ پر لازم تھا، اسی طرح شادی بیاہ دادا پر لازم ہے، اور دادا کے فوت ہوجانے کے بعد چچا پر لازم ہے، اور یہ نان ونفقہ کی ذمہ داری صلہ رحمی کے طور پر نہیں ہے، بلکہ قانون شریعت واحکام شریعت کے مطابق ہے

ولو وجد معها أی مع الأم جد لأب بأن کان للفقیر أم وجد للأب و أخ عصبي أو ابن أخ أو عم کانت النفقة علی الجد وحده کما صرح به الخانیة. (شامی، کتاب الطلاق، باب النفقة مطلب: ضابط فی حصر أحکام نفقة

الأصول والفروع، کراچی ۳/ ۶۲۵، زکریا ۵/ ۳۵۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ صفر المظفر ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۹۲۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۲/۱۷ھ

محروم پوتی اور بیوہ کو بطور صلہ رحمی کچھ دینے کا شرعی حکم

سوال [۱۱۵۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے لڑکے شبیر احمد کا انتقال ہو گیا، ایک لڑکا لا پتہ ہے، ۴؍ لڑکے، سات لڑکیاں حیات ہیں، ابھی پوری خاندانی جائیداد میرے والد محترم کے نام سے ہے جو باحیات ہیں، میں نے ابھی جلد ہی صرف ۲۵؍ ڈسمل کھیت خریدا ہے، شبیر احمد مرحوم کے دو لڑکیاں ہیں جو میری پوتی ہیں، شبیر احمد پہلے سے مجھ سے الگ ہو کر زندگی گذارتے تھے، اب شبیر احمد کی بیوی جو میری بہو ہے، مجھ سے وراثت چاہتی ہے جبکہ میں باحیات ہوں، میرے دوسرے چار لڑکے اور سات لڑکیاں بھی ہیں، ایسی صورت میں میری بہو و پوتیوں کا میری یا میرے والد محترم کے نام والی جائیداد میں کتنا حصہ ہوتا ہے، مجھے بتایا جائے کہ جو شرعی حق ہو، اسے میں ادا کروں، اگر حق نہیں ہوتا ہے تو پھر میرے ذمہ کیا ہے؟ اسے بھی واضح کیا جائے؟

المستفتی: محمد ابراہیم خاں ساکن پرمیشرا اکسرٹ وامہراج گنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب ابراہیم خود زندہ ہے تو اس کی جائیداد اور سرمایہ میں سے کسی شئ میں حق کا مطالبہ کرنا کسی کے لیے جائز نہیں، نہ اس کے موجود لڑکے، لڑکیوں کو اس میں کوئی حق ہے اور نہ ہی مرحوم کے لڑکے شبیر احمد کی بیوی اور لڑکیوں کو کوئی حق ہے، بلکہ ابرہیم کی موت کے بعد بھی شبیر احمد کی بیوی اور اولاد کو ابراہیم کی جائیداد اور سرمایہ میں سے کچھ نہیں مل سکتا ہے، کیونکہ حقیقی اور صلبی اولاد کی موجودگی میں اسلامی شریعت میں پوتے اور پوتیوں کو میراث نہیں ملتی اور بہو اپنے خسر کی وارث نہیں ہوتی۔

لايجوز لأحد أن يأخذ مال أحد بغير سبب شرعي. (قواعد الفقه، اشرفی دیو بند ص:۱۱۰)

الأقرب فالأقرب يرجحون بقرب الدرجة أعني أولٰهم بالميراث جزء الميت أي البنون ثم بنوهم. (سراجی ص:۲۲)

مستفتی نے سوال نامہ میں یہ سوال کیا کہ اگر کوئی شرعی حق نہیں ہوتا ہے تو صلہ رحمی اور ہمدردی کے طور پر کیا حق لازم ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ شبیر احمد کی بیوہ اور اس کی لڑکیاں جو ابراہیم کی حقیقی پوتیاں ہیں، ان کے ساتھ صلہ رحمی کا معاملہ کرنا لازم اور ضروری ہے، لہٰذا صلہ رحمی کے طور اپنے سرمایہ اور جائیداد میں سے کچھ دیدینا چاہیے، ان کے ساتھ قطع رحمی کسی طرح روا نہیں، اور صلہ رحمی کے طور پر کتنا دینا چاہیے؟ اس کی مقدار متعین نہیں، بلکہ اتنا دیدے جس سے ان کا دل خوش ہوجائے۔

عن محمد بن جبير بن مطعم عن أبيه قال: قال رسول الله ﷺ: لايدخل الجنة قاطع. (ترمذی، أبواب البر والصلة، النسخة الهندية ۲/۱۳، دار السلام رقم: ۱۹۰۹)

عن سهل بن سعد قال: قال رسول الله ﷺ: أنا و كافل اليتيم في الجنة كهاتين و أشار بإصبعيه. (ترمذی، أبواب البر والصلة، باب ما جاء فی رحمة اليتيم وكفالته، النسخة الهندية ۲/۱۳، دار السلام رقم: ۱۹۱۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍محرم الحرام ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۸۷۱)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷؍۱؍۱۴۲۴ھ

پوتے و بہو کے حصۂ وراثت، نان ونفقہ اور زیورات کا حکم

سوال [۱۱۵۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید اور اس کا بھائی اپنے والدین کے ساتھ مشترک رہتے تھے، اور مشترک قیام و طعام کا نظم تھا، نیز زید اور اس کا بھائی گھر کے نظام کے تحت الگ الگ مکانات میں رہتے

تھے، ضابطہ میں زید کے والدین نے اپنی کوئی بھی جائیداد یا ملکیت تقسیم نہیں کی ہے اور نہ ہی زید کی باضابطہ الگ سے کوئی اپنی نجی ملکیت ہے، زید اور اس کا بھائی دونوں شادی شدہ ہیں اور دونوں کے بچے بھی ہیں، اتفاق ایسا ہوا تقریباً آٹھ ماہ پہلے ۲؍شوال المکرّم کو زید کا اچانک انتقال ہوگیا، زید نے اپنے پیچھے بیوہ اہلیہ اور ایک دوسال کا بیٹا چھوڑا، زید کے انتقال کے تقریباً ساڑھے چار ماہ بعد مزید ایک لڑکی پیدا ہوئی، دونوں بچے بقید حیات ہیں، زید کی اہلیہ کو شادی کے موقع پر جو زیور زید کے والد کی طرف سے چڑھایا گیا تھا وہ بھی موجود ہے، اسی طرح جو سامان جہیز کے طور پر زید کے خسر نے اپنی بیٹی کو دیا تھا وہ بھی موجود ہے، اتفاق ایسا ہو رہا ہے کہ زید کے والد اور ان کے عزیز متعلقین کی طرف سے مسلسل اس طرح کی خبریں ہیں کہ زید کے سسر اپنی لڑکی کے بارے میں تصفیہ کرلیں، مندرجہ بالا صورت حال کی روشنی میں زیر تحریر چند باتوں کے قرآن وحدیث کی روشنی میں جوابات مطلوب ہیں:

(۱) زید کے والد کی جائیداد و ملکیت میں سے زید مرحوم کے لڑکے لڑکی اور بیوی کو کچھ حق پہنچتا ہے یا نہیں؟

(۲) زید کے لڑکے لڑکی اور بیوہ اہلیہ کے نان ونفقہ و پرورش کی ذمہ داری کس پر ہے، نیز بچوں کا حقدار کون ہے؟

(۳) زید کے والد نے شادی کے موقع پر جو زیور زید کی بیوی کو چڑھایا تھا وہ زید کی حیات اور مرنے کے بعد تک اس کی بیوی کے پاس ہے، اب اس کی حیثیت کیا ہے، اور کس کی ملکیت ہے، اسی طرح جو جہیز زید کی اہلیہ کو شادی کے موقعہ پر اس کے والد کی طرف سے ملا تھا وہ بھی اسی کے پاس ہے، اب اس کی حیثیت کیا رہے گی؟ اور آئندہ وہ کس کی ملکیت ہے؟

المستفتی: محمد ناصر دھامپور بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) زید مرحوم کے والد ابھی زندہ ہیں اور انہوں نے اپنی جائیداد اور دوسری مملوکہ چیزیں اپنی اولاد کے درمیان تقسیم نہیں کی ہیں تو زید کے والد کی جائیداد اور ملکیت میں زید کی بیوہ اور لڑکے لڑکیوں کا کوئی حق نہیں، اسی طرح ان کے

انتقال کے بعد بھی ان کے ترکہ میں سے زید کی بیوہ اور اولاد کو کوئی حصہ نہیں ملے گا، ہاں البتہ زید کے والد اپنی خوشی سے پوتے اور پوتیوں کو کچھ دینا چاہیں تو وہ ان کی مرضی ہے۔

وشروطه ثلاثة: موت مورث حقيقة أو حكما و وجود وارثه عند موته حيا حقيقة أو تقديراً والعلم بجهة إرثه. (شامی، کتاب الفرائض، کراچی ٧٥٨/٦)

كل يتصرف فى ملكه كيف شاء. (شرح المجلة رستم اتحاد ٦٥٤/١، رقم المادة: ١١٩٢)

(۲) جب زید کے انتقال کے وقت اس کی ملکیت میں کوئی چیز نہیں تھی تو بیوہ کے نان ونفقہ کی ذمہ داری اس کے میکہ والوں پر ہے، اور بچوں کے ضروری خرچ واخراجات کی ذمہ داری ان کے دادا پر ہے، اور جب تک بیوہ کسی اجنبی جگہ (بچوں کے غیر محرم سے) نکاح نہ کرلے، بچوں کی پرورش کا حق بیوہ ہی کو ہے، اور اگر اجنبی جگہ نکاح کرلے گی تو پھر پرورش کا حق بچوں کی نانی کو حاصل ہوگا، اور اگر نانی تیار نہ ہو تو دادی کو ہوگا۔

وكذا تجب النفقة لولده الكبير العاجز عن الكسب كأنثىٰ مطلقا وفى الشامي: أى ولو لم يكن بها زمانة تمنعها عن الكسب فمجرد الأنوثة عجز إلا إذا كان لها زوج فنفقتها عليه ما دامت زوجة. (شامی، کتاب الطلاق، باب النفقة کراچی ٦١٤/٣، زکریا ٤٩١/١٠)

إذا مات الأب فالنفقة على الأم والجد على قدر ميراثهما أثلاثا فى ظاهر الرواية، وفى رواية: على الجد وحده. (شامی، باب النفقة، مطلب: الكلام على نفقة الأقارب کراچی ٦١٤/٣، زکریا ٣٣٩/٥)

ولو وجد معها جد لأب بأن كان للفقير أم و جد لأب و أخ عصبى أو ابن أخ أو عم كانت النفقة على الجد وحده. (شامی زکریا ٣٥٨/٥، کراچی ٦٢٥/٣)

أحق الناس بحضانة الصغير حال قيام النكاح أو بعد الفرقة الأم (إلى قوله) وإن لم يكن له أم تستحق الحضانة بأن كانت غير أهل للحضانة أو متزوجة بغير محرم أو ماتت فأم الأم أولىٰ من كل واحدة وإن علت فإن لم يكن للأم أم فأم

الأب أولیٰ. (هندیه، الباب السادس عشر فی الحضانة زکریا قدیم ۱/ ۵٤۱، جدید ۱/ ۵۹۲)

(۳) شادی کے موقع پر سسرال والوں کی طرف سے جو زیورات زید کی اہلیہ پر چڑھائے گئے تھے اگر ان کی برادری اور خاندان میں بہو کو مالک بنادینے کا رواج ہے تو وہ بیوہ کی ملکیت ہیں اور میکہ والوں کی طرف سے جو زیورات اس کو ملے تھے وہ ہر حال میں بیوہ ہی کی ملکیت ہیں۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ جدید ڈابھیل ۲۰/ ۲۶۹)

قلت: ومن ذٰلک ما یبعثه إلیها قبل الزفاف فی الأعیاد والمواسم من نحو ثیاب و حلی و کذا ما یعطیها من ذٰلک أو من دراهم أو دنانیر صبیحة لیلة العرس ویسمی فی العرف صبحة،فإن کان ذٰلک تعورف فی زماننا کونه هدیة لا من المهر ولا سیما المسمی صبحة. (شامی، کتاب النکاح، باب المهر، مطلب: فیما یرسله إلی الزوجة، کراچی ۳/ ۱۵۳، زکریا ٤/ ۳۰۳)

المختار للفتویٰ أن یحکم بکون الجهاز ملکا لا عاریة لأنه الظاهر الغالب. (شامی، مطلب: فی دعویٰ الأب أن الجهاز عاریة کراچی ۳/ ۱۵۷، زکریا ٤/ ۳۰۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۶۴۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲/ ۶/ ۱۴۲۹ھ

دادی کی جانب سے پوتوں کو ملی ہوئی زمین میں پوتیوں کا حصہ ہے یا نہیں؟

سوال [۱۱۵۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کے ماں باپ نے زید کو اپنے سے علیحدہ کر دیا، گھر میں چھپر پڑے تھے، زید کو زمین وغیرہ کاشت والی نہیں دی، زید کے دو لڑکے، تین لڑکیاں تھی، بغیر کسی لڑکے لڑکی کی شادی کیے ہوئے زید کا انتقال ہو گیا، پڑوسیوں نے زید کی ماں سے کہا کہ ان بچوں کی پرورش کے لیے اور اپنی بیوہ کے گذارہ کے لیے کچھ کاشت کی زمین دیدو، جس سے ان لوگوں

کا گذارا ہوتا رہے، تو زید کی ماں نے کہا کہ میں زمین بالکل نہیں دوں گی، چاہے جس طرح ان کا گذارہ ہو، مجبوراً زید کی بیوی نے دوسرا نکاح کرلیا، کچھ عرصہ کے بعد بڑے پوتے کو زمین وگھر دیا، اس کے بعد چک بندی میں دونوں پوتوں کے نام آدھی آدھی زمین ملی، گھر کی زمین چھوٹے بھائی نے نہیں لی، وہ بڑے بھائی کے پاس رہی، اب زید کی لڑکیوں کا اس میں حصہ بنتا ہے یا نہیں؟ تو اس کی تشریح فرمائیں۔

المستفتی: منیر احمد چھاؤ جھکھیری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر زید کے انتقال کے وقت مذکورہ زمینوں میں سے کوئی بھی اس کی ملکیت میں نہیں رہی، اور زندگی کے گذر جانے کے بعد ہی مذکورہ زمین دونوں لڑکوں کو مذکورہ طریقے سے ملی ہے تو اس میں لڑکیوں کا شرعاً کوئی حق نہیں ہے، اس لیے کہ اس زمین کا تعلق زید کے ترکہ سے نہیں ہے، اور لڑکیاں زید کے ورثاء میں سے ہیں، اور زید نے وراثت میں مذکورہ زمین نہیں چھوڑی ہے۔

الملک الثابت للوارث هو الملک الذی کان للمورث. (قواعد الفقه اشرفی دیو بند ص: ۱۲۸)

الـمـلـک لایثبت ابتداءً بغیر سبب الحرة. (قواعد الفقه اشرفی دیو بند ص: ۱۲۸) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۳۰۷۵)

پوتے کے نام جائیداد کرنے کی شرعی حیثیت

سوال [۱۱۵۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: دو بھائی تھے، جس میں بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا اور ان کے والد ابھی زندہ

ہیں، بڑے بیٹے نے پانچ بچے چھوڑے ہیں، ایک لڑکی اور چار لڑکے، دادا پہلے سے ہی اپنے بڑے بیٹے اور ان کے بچوں کے ساتھ رہتے تھے، بیٹے کے انتقال کے بعد بھی وہ اپنے پوتوں اور ان کی ماں کے ساتھ رہتے رہے، اور ان بچوں سے بہت لگاؤ رکھتے تھے، جب کہ وہ خود بہت مریض رہتے تھے، نظر بھی بہت کمزور تھی، ان کی خدمت ہمارا فرض تھا، بیٹے کے انتقال کے بعد دادا نے مکان تو پوری طرح نام کر دیا، اس پر ان کے چھوٹے بیٹے نے اعتراض بھی کیا، مگر وہ نہیں مانے، اب بچی جنگل کی زمین، اس میں انہوں نے میرے بچوں کا نام ڈلوا دیا، جو کہ شرکت میں رہا، زمین تقریباً نو بیگہ ہے، ایک تو ساڑھے پانچ یا چھ دوسری تین بیگہ ہے، بیٹے کے چھ سال بعد دادا کا بھی انتقال ہو گیا، ان چودہ سالوں میں چچا نے دوبار اپنی مرضی سے تقسیم کی بات اٹھائی، پہلی بار اپنی مرضی سے سڑک والی تین بیگہ زمین لی، اب بچی دوسری زمین جو کہ اندر ہے، وہ بچوں کو دیدی، خیر کوئی بات نہیں، بچے اس زمین کو کسی گاؤں والے کو ٹھیکہ پر اٹھا دیتے تھے، قریب سات سال تک اسی طرح چلتا رہا۔

اس کے بعد تقسیم کی بات خاندان والوں سے کہی، ہماری تقسیم کرادو، یہ خبر میرے پاس بار بار آتی رہی، میں نے جواب دیا تقسیم تو ہو گئی، اب کیسی تقسیم؟ بار بار بات کو ٹالنا چاہا، نہیں مانی گئی، بات سر پر آگئی، نہیں تقسیم دوبارہ ہونی ہی ہے، چچا نے ساتھ میں یہ شرط رکھی دونوں زمین کی الگ کوئی حیثیت نہیں رکھی جانی ہے، بیگہ برابر کی جائے گی، یعنی باہر جو تین بیگہ ہے اس میں برابر کرنے کے لیے اندر سے شامل کی جائے گی، قیمت نہیں لگے گی، بیگہ برابر ہونی ہے اس طرح دو حصے اپنی مرضی سے بنائے گئے، خیر خاندان کے دو لوگوں کے بیچ بیٹھ کر بات طے ہونا قرار پائی، دونوں لوگوں نے بات رکھی، حصہ آپ نے بنائے ہیں، پنچایت کا اصول ہے، ایک آدمی نے حصہ بنایا، پسند کرنے کا حق دوسرے کو ہوتا ہے، دونوں لوگوں نے یہ بات کہی، چچا نے کہا ٹھیک ہے، اب بچوں سے اور ان کی ماں سے حصہ معلوم کیا گیا، بتاؤ! کون سا حصہ لینا ہے، اس پر ہم نے کہا اچھی طرح یہ بات صاف کرلو، پہلے کا طے آج بدلا جا رہا ہے آج کا طے آئندہ بدلا جائے گا تب میں بتاؤں گی، ان لوگوں نے کہا، جب ہمارے سامنے طے ہو رہا ہے تو بدلا کیوں جائیگا؟ چچا نے بھی

کہا، بدلا کیوں جائے گا؟ تین بار میرے یہ جملے دوہرانے پر ایک ہی جواب ملتا رہا کیوں بدلا جائے گا، ہمارے سامنے طے ہورہا ہے، تو اس کے بعد پھر معلوم کیا، اب بتاؤ کون سا حصہ لینا ہے، میں نے کہا تین بیگہ والی میں جو شامل ہو کر مل رہا ہے وہ حصہ لینا ہے، جواب ملا ٹھیک ہے۔

اس تقسیم کے مطابق دونوں اپنی اپنی زمین پر قابض رہے اور سات سال تک پھر اسی طرح اپنا اپنا اناج لیتے رہے، تین بیگہ والی زمین بچے رشتہ کے چچا کے مشورہ سے گاؤں کے آدمی کو زمین اٹھا دیتے تھے، اس سے انکا کوئی تعلق نہیں، شرکت والی میں جتنا اناج چچا دیتے (یعنی بھیج دیتے) ہم رکھ لیتے، خیر کوئی بات نہیں، تقسیم کے مطابق پھر سات سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا، بغیر کسی وجہ کے آٹھواں سال آنے پر شرکت والی زمین کے گیہوں نہیں دیئے، میرا بچہ اور میں معلوم کرنے دونوں ان کے گھر گئے، جواب ملا تم نے لے تو لیے، باہر والی کے، یعنی تین بیگہ والی کے اس کے بعد جو تقسیم میں موجود تھے، ان سے کہا گیا، جواب ملا وہ پھر سے تقسیم چاہتا ہے، جسے ہم نے کہا یہ بات پہلے ہی آپ کے سامنے طے ہوئی تھی، آئندہ بدلا نہ جائے، بار بار ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے، آخر کتنی بار تقسیم ہوگی، گیہوں کو سمیٹ کر اپنے گھر بیٹھ گئے۔

اب پھر وہی پریشانی سامنے ہے، تقسیم کا بار بار دباؤ بنایا جارہا ہے، یعنی کافی حد تک مجھے اور میرے بچوں کو پریشان کیا جارہا ہے، میری نظر میں سچ اور حق یہ ہے جو طے ہو گیا، اسی پر ہمیں آمادہ رہنا چاہیے، انسان کی زبان ہی سب کچھ ہے، کچھ لوگ کہتے ہیں، کیوں نہیں لکھوائی تھی، میں نے سوچا، جب بڑوں کے بیچ بیٹھ کر ایک بات طے ہو رہی ہے، اس پر بھروسہ کیا اور نہ میرے حالات تھے، نام کرانے میں بھی کافی پیسہ خرچ ہوتا ہے، جبکہ میرے سر تین بھائی تھے، ان کی تقسیم بھی زبانی چلی آرہی ہے، کبھی کسی نے اس طرح نہیں کیا، جیسا ہمارے ساتھ ہورہا ہے، باپ کے نہ ہونے سے دوسرے اب تو دادا بھی نہیں، ایک چچا گھر میں وہ بھی ہر وقت پریشان کرنے پر آمادہ ہیں، اگر دادا نام نہ ڈلواتے تو شاید چچا یہ بھی نہیں دیتا، یہ بھی اس مالک کا رحم وکرم ہے کہ زمین میں نام ڈلوا گئے اور مکان پوری طرح نام کر گئے، زمین کی تقسیم کا یہ تیسرا نمبر ہے، کیا ایمانداری یا سچائی ایسے لوگوں کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی، جو لکھا ہے اس میں ایک

ایک بات حقیقت ہے، پہلے یہ تین بیگہ چچا نے لی، دوبارہ تقسیم میں یہ تین بیگہ میرے بچوں کے پاس آ گئی، اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ تقسیم کے دو سال بعد تین بیگہ والی یعنی بچوں والی زمین کے برابر مکان بن گئے، آبادی میں آ گئی، جس کی وجہ سے اس کی قیمت اب بڑھ گئی، اس بات سے پریشان ہو کر وہ تقسیم چاہتا ہے، جو لوگ تقسیم میں موجود تھے، وہ اپنی جان یہ کہہ کر بچا رہے ہیں کیا کریں نہیں مان رہا، تو پھر سے تقسیم کر لو، انہیں آٹھ سال پہلے کا کوئی وعدہ یاد نہیں جو کہ تین بار دوہرایا گیا، گواہوں کو بھی اپنی ڈوڑ میں لیے ہوئے ہیں، وہ بھی کہتے ہیں، پھر سے تقسیم کرو، میرے بچے اور میں اس بات کو لے کر بہت پریشان ہیں، آپ جلد سے جلد سچ کا فیصلہ دیں، جسے میں ان کے سامنے رکھ سکوں، آبادی میں آنے سے قیمت کا کافی فرق ہو گیا ہے؟

یاد رہے، ہر بار انہوں نے اپنی طرف سے ہی تقسیم کی، اور اپنی مرضی کے موافق، جبکہ ہم نے ایک بار بھی کچھ نہیں کیا، اب ہماری کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم کو ناجائز طریقے سے زیر کرایا جا رہا ہے۔

شریعت محمدی ﷺ کیا کہتی ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں حق اور سچ کا فیصلہ چاہتی ہوں؟ برائے کرم جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتیہ: نرگس جہاں نزد نظام والی مسجد سنبھل

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پوتے پوتیاں بیٹے کی موجودگی میں اپنے دادا کے وارث نہیں ہوتے ہیں، ہاں البتہ دادا نے اپنی زندگی میں قانونی اور عملی طور پر جو چیز پوتے پوتیوں کو ہبہ کر کے قبضہ دیدیا ہے وہ چیز پوتے پوتیوں کی ملکیت ہے، سوالنامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پوتے پوتیوں کے لیے دادا نے مکان ہبہ کر کے رجسٹری کر دیا ہے، اس لیے پوتے پوتیاں مکان کے اتنے حصے کے مالک ہیں جتنا ان کے نام کر دیا ہے، اور اگر پورا مکان نام کر دیا ہے تو پورے ہی کے مالک ہیں۔

وتتم الهبة بالقبض الكامل لقوله عليه السلام لاتجوز الهبة إلا مقبوضة. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دار الكتب العلمية بيروت ۳/ ۳۹۱، مصری قديم

۳۵۳/۲، شامی کراچی ٥/٦٩٠، زکریا ٨/٥٢٠، الفتاویٰ التاتارخانیة زکریا ١٤/٤٢١، رقم: ٢١٥٦٣، شرح المجلة رستم اتحاد ١/٤٧٣، رقم المادة ٨٦١)

اور سوالنامہ سے واضح ہوتا ہے کہ صحرائی جائیداد میں پوتوں کا صرف نام ڈالا ہے، ہبہ کر کے قبضہ نہیں دیا ہے، اور اس کی بھی صراحت نہیں کی کہ کتنے بیگھے پوتوں کے نام کیے ہیں اور ہبہ کے صحیح ہونے کے لیے قبضہ شرط ہوتا ہے اور جائیداد میں قبضہ کے صحیح ہونے کے لیے وہ جائیداد متعین ہونا لازم ہے اور سوالنامہ سے واضح ہوتا ہے کہ پوتوں کے نام سے جو جائیداد کی گئی ہے وہ متعین نہیں ہے، بلکہ جائیداد کی تعیین کیے بغیر صرف نام ڈال دیا ہے، اس لیے شرعی طور پر جائیداد کا ہبہ درست نہیں ہوا ہے، اور اگر دادا نے وصیت کے طور پر نام ڈلوایا ہے تو ایک تہائی میں وصیت نافذ ہوتی ہے، اب اس اعتبار سے مقامی لوگ اس مسئلے کو بہتر انداز سے حل کر دیں۔

وتتم بالقبض الكامل لأنها من التبرعات، والتبرع لايتم إلا بالقبض، والقبض الكامل فى المنقولة ما يناسبه وفى العقار ما يناسبه. (شرح المجلة ١/٤٦٢-٤٦٣، رقم: ٨٣٧)

ولا يشترط القبض بالبراجم لأن معنى القبض هو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفا وعادة وحقيقة. (بدائع الصنائع زکریا ٤/٣٤٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۱۳۲/۴۰)

پوتے شرعی وارث نہیں

سوال [۱۱۵۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمد نور کا انتقال ہوگیا، ان کے ورثاء میں پانچ لڑکے: عبد الواحد، عبد المجید، محمد ذاکر، محمد یاسین، محمد یامین، اور تین لڑکیاں: صابرہ بیگم، زرینہ بیگم، سردار بیگم ہیں۔

دریافت یہ کرنا ہے کہ محمد نور اپنے دوسری بیوی کے بڑے لڑکے عبد المجید کے ساتھ

تجارت کرتے رہے، اور دونوں نے مشترک طور پر بہت سی جائیدادیں بھی خریدیں، لیکن تمام جائیدادوں میں نام اپنے والد محمد نور کا ہی ڈلواتے رہے، اس کے بعد عبدالمجید کا محمد نور کے سامنے ہی انتقال ہوگیا، اور انہوں نے صرف ایک لڑکا ایک دن کا چھوڑا، اور لڑکے کی ماں دو دن کا لڑکا چھوڑ کر اپنے والدین کے گھر چلی گئی، لڑکے کی پرورش دادا، دادی نے کی، اچانک کئی سال کے بعد دادا کا انتقال ہوگیا، کیا ایسی صورت میں عبدالمجید نے جو مشترکہ جائیدادیں خریدیں اور والد کا نام ڈلواتے رہے تو اس میں عبدالمجید کا لڑکا حق دار ہوگا یا نہیں؟

کیا قرآن وحدیث میں اس سلسلے میں کوئی صراحت ہے کہ دادا کی اولاد نرینہ یعنی لڑکے کی موجودگی میں دادا کے پوتے محروم ہو جاتے ہیں وہ دادا کے وارث نہیں بن سکتے، قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب لکھ دیں۔

المستفتی: اقبال حسین ولد عبدالمجید کٹا باغ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب عبدالمجید کا انتقال اس کے باپ کی موجودگی میں ہو چکا ہے اور عبدالمجید کے دیگر بھائی بھی موجود ہیں، تو ایسی صورت میں عبدالمجید کے باپ کے انتقال کے بعد عبدالمجید کے باپ کی ملکیت اور ترکہ میں سے عبدالمجید کی اولاد کو میراث کے طور پر کوئی چیز نہیں ملے گی، ہاں البتہ عبدالمجید کے بھائی بہن اپنی خوشی سے عبدالمجید کی اولاد کو کچھ دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں، اور وہ بھی ان کی مرضی پر موقوف ہے، یا عبدالمجید کے باپ نے مرنے سے پہلے اپنی زندگی میں بطور ہبہ اپنے پوتے کو کچھ دے دیا ہوتا یا اس کے نام کی کوئی وصیت کردی ہوتی تو اس کو کچھ مل سکتا تھا، وراثت اور میراث کے طور پر اس کو کچھ نہیں ملے گا۔

﴿**يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيْ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ** . [النساء: ١١] ﴾

ولايرث ولد الابن مع الابن. (بخاری شریف، کتاب الفرائض، باب میراث ابن الابن إذا لم يكن ابن ٢/ ٩٩٧)

فإن اجتمع الولد للصلب وولد الابن مكان في الولد للصلب ذكر فإنه لا

میراث معه لأحد من ولد الابن فإن لم یکن فی الولد للصلب ذکر وکانت اثنتین فأکثر من ذٰلک من البنات للصلب فإنه لا میراث لبنات الابن معهن. (مؤطا إمام مالك، کتاب الفرائض، میراث الصلب، اشرفی دیوبند ص:۳۲۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍شعبان المعظم ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۰۹۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۷/۸/۱۷ھ

والد کی حیات میں وفات پانے والی اولا د وارث نہیں

سوال [۱۱۵۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عبد الستار کے نو لڑکیاں تھیں، ان میں سے ایک لڑکی بلقیس کا والدین کے سامنے ہی انتقال ہو گیا۔ تو دریافت یہ کرنا ہے کہ بلقیس کو والد کے ترکہ سے حصہ ملے گا یا نہیں؟

المستفتی: امیر دولہا نئی بستی مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: والدین کی موجودگی میں جو اولاد فوت ہو جاتی ہے وہ والدین کی وارث نہیں بنتی، اور نہ ہی اس کی اولاد وارث بنتی ہے، لہٰذا بلقیس جب والدین کی زندگی میں فوت ہوگئی ہے تو بلقیس یا اس کی اولاد والدین کی جائیداد کی وارث نہیں بنے گی۔

إن شرط الإرث وجود الوارث حیا عند موت المورث. (شامی، کتاب الفرائض، زکریا ۱۰: ۵۱۱، کراچی ۶/۷۶۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۶۷۸)

الجوب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۵/۹ھ

مرحوم بیٹے کی بیوی اور اولاد کا حصہ

سوال [۱۱۵۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: رحمت اللہ کے تین لڑکے ہیں: مبین، نور محمد، امین، مذکورہ لڑکوں میں سے مبین کا انتقال ہوگیا، رحمت اللہ کی موجودگی میں، اس کے آٹھ سال کے بعد رحمت اللہ کا انتقال ہوا، مبین کی اولاد میں صرف ان کی ایک لڑکی ہے، جس کی شادی نور محمد اور امین نے مل کر کردی، اب مبین کی بیوہ باقی رہ گئی، تو اس بیوہ کو رحمت اللہ کی میراث میں سے کتنا حصہ ملے گا؟

المستفتی: محمد ندیم امروہا کانٹھ شاہجہاں پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں رحمت اللہ کے لڑکوں میں سے جس لڑکے کا انتقال ان کی حیات میں ہوگیا تھا، رحمت اللہ کی وفات کے بعد اس لڑکے کی بیوہ اور بیٹی کا ان کے ترکہ میں کوئی شرعی حصہ نہیں ہے، کیونکہ یہ دونوں رحمت اللہ کے شرعی وارثین میں داخل نہیں ہیں۔

إن شرط الإرث وجود الوارث حیا عند موت المورث. (شامی، کتاب الفرائض زکریا ۱۰: ۵۱۱، کراچی ٦/٧٦٩)

وبنات الابن کبنات الصلب ...... ویسقطن بالابن. (سراجی ص: ۱۲-۱۳)

ورثته أی الذین ثبت إرثهم بالکتاب أو السنة ...... أو الإجماع ...... ویستحق الإرث برحم و نکاح وولاء والمستحقون للترکة عشرة أصناف مرتبة. (شامی، زکریا ۱۰/۴۹۷-۴۹۸، کراچی ٦/٧٦٢)

ویستحق الإرث بإحدیٰ خصال ثلاث بالنسب وهو القرابة والسبب هو الزوجیة والولاء. (هندیه، قبیل الباب الثانی فی ذوی الفروض زکریا قدیم٦/٤٤٧، جدید ٦/٤٤٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۴۲۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۵/۲۹ھ

کیا لڑکے کی موجودگی میں پوتوں کو حصہ ملے گا؟

سوال [١١٥٢٩]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (١) منی بیگم کا انتقال ہوگیا، اس کے ورثاء میں شوہر عبد اللہ، ایک لڑکا عبد الغنی ہے، دوسرا لڑکا عبد المجید تھا جو اپنے ماں باپ کی زندگی میں انتقال کر گیا تھا، (اس کا ایک لڑکا عبد الحکیم ہے) تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ منی بیگم کی جائیداد میں ان کے پوتے عبد الحکیم کا حصہ ہے کہ نہیں؟

(٢) پھر عبد اللہ کا انتقال ہوگیا، ان کے ورثاء میں صرف ایک لڑکا عبد الغنی تھا، اور دوسرے لڑکے عبد المجید مرحوم کا لڑکا عبد الحکیم ہے، جو عبد اللہ کا پوتا تھا، اسے شرعاً حصہ ملے گا یا نہیں؟

المستفتی: محمد سلیم، اندرا چوک، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب عبد المجید کا انتقال اپنے والدین کی زندگی میں ہوگیا ہے تو اس کی اولاد اپنے دادا، دادی کی وارث نہیں بنے گی، جبکہ عبد المجید کا حقیقی بھائی عبد الغنی زندہ ہے، لہٰذا عبد المجید کا لڑکا عبد الحکیم عبد اللہ کا وارث نہیں بنے گا، ہاں البتہ اگر عبد اللہ نے اپنی حیات میں اپنی مرضی سے اپنے پوتے کو بطور ہبہ کچھ دیدیا ہوتا تو مل سکتا تھا۔

العصبات بأنفسهم أربعة أصناف، الأول جزء الميت (قوله) فيقدم في هذه الأصناف والمدرجين فيها الأقرب فالأقرب أي يرجحون بقرب الدرجة أعني به أولٰهم بالميراث يستحق بالعصوبة جزء الميت أي البنون ثم بنوهم. (شريفيه ص: ٤٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٧ / شوال المکرّم ١٤٣٣ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٩/ ١٠٧٩٥)

بیٹے کی موجودگی میں یتیم پوتے محروم

سوال [۱۱۵۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے تین لڑکے ہیں: عمر، بکر، حمید۔ عمر کی چند اولادیں ہیں، اس کا انتقال ہوگیا ہے تو اب سوال یہ ہے کہ جب عمر کا انتقال ہوگیا تو عمر کی حقیقی اولاد کو وراثت ملے گی یا نہیں؟ اگر نہیں ملے گی تو آخر ایسا کیوں ہے؟ حالانکہ وہ مال کے زیادہ محتاج ہیں اور یتیم کا شریعت میں بہت زیادہ خیال کیا گیا ہے، اور یہاں وراثت سے محروم کیا جارہا ہے، ہندو لوگ اس کی وجہ سے بہت برا بھلا کہتے ہیں، تو ان کو خاموش کرنے کے لیے کیا جواب دیں؟

المستفتی: انوارالاسلام مدناپوری مغربی بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مرنے والے کی کوئی اولاد موجود ہو تو پوتا خواہ یتیم ہو یا اس کا باپ زندہ ہو، کسی بھی صورت میں وراثت کا حقدار نہیں ہوتا ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں عمر کے انتقال کے بعد عمر کی اولاد کو زید کے مال سے وراثت نہیں ملے گی، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام بلکہ کسی بھی مذہب وملت میں میراث کی تقسیم کا معیار حاجت وضرورت پر نہیں ہے، بلکہ رشتہ داری وقرابت کے درجات پر ہے، کہ قریب کے ہوتے ہوئے بعید کو محروم سمجھا جائے، لہٰذا حقیقی بیٹوں کے ہوتے ہوئے ان کے حصہ میں کمی کرکے پوتوں کو دینا ضابطہ شریعت کے خلاف ہوگا، اب رہا یتیم کی پرورش کا مسئلہ تو شریعت نے دادا کو اس کا پورا اختیار دیا ہے کہ اپنی زندگی میں پوتوں کو اتنا دے کر مالک بنا سکتا ہے جتنا دوسری اولاد کو میراث میں مل سکتا ہے، یا اس سے زیادہ بھی دے سکتا ہے، اس پر شریعت کی طرف سے دادا پر کوئی دار وگیر نہیں ہے، لہٰذا اگر ہندوؤں کو اعتراض کرنا ہے تو دادا پر کریں، شریعت پر نہ کریں، شریعت نے دادا کو اختیار دے رکھا ہے، لیکن اگر دادا نے زندگی میں پوتوں کو نہیں دیا ہے تو قانون شرعی کے مطابق دادا کے قریب تر وارثین کو دادا کی وراثت ملے گی، اور وہ دادا کے بیٹے

اور بیٹیاں ہیں اور پوتے، پوتیاں دور کے رشتہ دار ہیں، اس لیے ان کو نہیں ملے گا۔

عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ: ألحقوا الفرائض بأهلها فما بقي فهو لأولى رجل ذكر. (بخاری شریف، کتاب الفرائض، باب میراث ابن الابن إذا لم یکن ابن ۲/۹۹۷، رقم: ٦٤٧٨، ف: ٦٧٣٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم رجب المرجب ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۷۲۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۷/۱۴۲۳ھ

دادا کی جائیداد میں پوتوں کا حصہ

سوال [۱۱۵۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے والد کا انتقال ۲۰۰۴ء میں ہوا ہے، اور میرے دادا صاحب کا انتقال ۱۷/ اپریل ۲۰۰۷ء کو معلوم ہوا ہے، معلوم یہ کرنا ہے کہ میرے دادا صاحب کے ذاتی مال میں (ایف ڈی بینک بیلینس وغیرہ میں ہمارا یعنی میری والدہ اور ایک پوتا ایک پوتی کا) حصہ ہے یا نہیں؟ اور ہم سب کے علاوہ دولڑکے محمد فاہم، محمد ناظم ہیں، میرے دادا کا جو مکان ہے، وہ اولاد در اولاد وقف ہے، جس کے کاغذات بھی میرے پاس محفوظ ہیں، اور جس میں ہم رہتے ہیں وہ کرایہ کا مکان ہے۔

معلوم یہ کرنا ہے کہ دادا والے مکان میں ہمارا حصہ ہے یا نہیں؟ جو اولاد در اولاد وقف ہے؟

المستفتی: محمد سالم شمسی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب آپ کے والد کا انتقال آپ کے دادا سے پہلے ہو گیا ہے اور دادا کے آپ کے والد کے علاوہ دولڑکے زندہ ہیں تو ایسے حالات میں آپ کے دادا کی وفات کے بعد ان کے ترکہ میں سے آپ، آپ کی بہن، اور آپ کی والدہ میراث پانے کے مستحق نہیں ہیں، ہاں البتہ آپ کے دادا کے دولڑکے محمد فاہم، محمد ناظم اپنی خوشی سے آپ لوگوں کو بھائی کی اولاد ہونے کے صلے میں کچھ دیدیں تو ان کے اختیار کی بات ہے، ان

پر کوئی زور وزبردستی نہیں ہے۔

أخرج البيهقي فى سننه عن زيد بن ثابت وعلي و بن مسعود حديثا طويلاً وطرفه: إذا ترك أبناء و ابن ابن فليس لابن الابن شيئ. (سنن کبریٰ للبيهقي، دار الفكر بيروت ٩/٣٠٢، رقم: ١٢٦٢٩)

فى الهندية: فالأقرب يحجب الأبعد كالابن يحجب أولاد الابن.

(هنديه، كتاب الفرائض، الباب الرابع فى الحجب، قديم ٦/٤٥٢، جديد ٦/٤٤٤)

وفى البحر: ويحجب بالابن أى ولد الابن يحجب بالابن ذكورهم و إناثهم فيه سواء. (البحر الرائق زكريا ٩/٣٧٥، كوئٹه ٨/٤٩٤)

وفى السراجية: الأقرب فالأقرب يرجحون بقرب الدرجة أعنى اولٰهم بالميراث جزء الميت أى البنون ثم بنوهم وإن سفلوا. (سراجى ص:٢٢)

جس مکان کے وقف علی الاولاد کرنے کا ذکر سوالنامہ میں ہے، اور اس کے متعلق سائل وقف کے کاغذات لائے تھے، وہ مکمل نہیں ہیں، اس لیے اس بارے میں کچھ لکھنے سے معذرت خواہ ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰ رصفر المظفر ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۴۸۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۲/۳۰ھ

شرعی وارث کو تسلیم نہ کرنے سے وہ حصۂ وراثت سے محروم نہ ہوگا

سوال [۱۱۵۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمد حسین کی زوجہ زہرہ بی بی، جن کے تین لڑکے ہیں: نظر حسین، حافظ حسین، ذاکر حسین۔

نظر حسین بن محمد حسین کے تین لڑکے: ناصر حسین، ماجد حسین، عطا حسین۔

ذاکر حسین بن محمد حسین کے تین لڑکے: حسرت علی، علی اظہر، علی یاور۔

علی اظہر بن ذاکر حسین کے تین لڑکے: ابرار احمد قاسمی، اخلاق حسین، اظہار حسین۔

علی یاور بن ذاکر حسین کا ایک لڑکا: نفیس احمد۔

شجرہ میں تحریر کردہ حافظ حسین لاولد تھے، ان کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی، انہوں نے اپنا حصہ ۵/آنہ ۴/پائی میں سے ۳/آنہ ۴/پائی حصہ شجرہ میں تحریر کردہ اپنے بھتیجے حقیقی علی اظہر کے حق میں بطورِ حق الخدمت ہبہ کر دیا جسے علی اظہر نے قبول ومنظور کیا، حافظ حسین کے مملوکہ و مقبوضہ بقیہ حصے میں سے ایک آنہ نظر حسین اور ایک آنہ ذاکر حسین کو ملا، اس ہبہ کے بعد حافظ حسین کے دونوں بھائی نظر حسین اور ذاکر حسین کے نام کے ساتھ کھتونی پر علی اظہر کا نام بھی درج ہوگیا، ہبہ نامہ یہ لکھا گیا کہ علی اظہر جو کہ میرا بھتیجا حقیقی ہے اور میرے برادر حقیقی ذاکر حسین کا فرزند صلبی ہے، بطورِ حق الخدمت: ہبہ کرتا ہوں وہ نسل در نسل اور بطن بعد بطن متمتع ہوتا رہے، کبھی کوئی اس پر دعویٰ کرے تو وہ ناجائز اور باطل ہوگا، اور روبرو حاکم کے پیش ہوکر اس کا دعویٰ خارج ہوگا، مگر شجرہ میں تحریر کردہ حسرت علی اور نفیس احمد نے اس پر حقیقت کا دعویٰ دائر کر دیا ہے، اس طرح وہ پریشان وحیران کرنا چاہتے ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ (۱) ان کا یہ دعویٰ شرعاً ناجائز اور باطل ہے کہ نہیں؟

(۲) شجرہ میں تحریر کردہ ذاکر حسین کے انتقال کے بعد ان کے تینوں لڑکوں: علی یاور، علی اظہر، حسرت علی کا نام کھتونی پر درج ہوا، اور وراثتاً داخل خارج ہوا، اور ہر ایک اس پر قابض ودخیل ہوا، شرعاً تینوں کا ایک تہائی حق ہے کہ نہیں؟

(۳) حسرت علی جو کہ شجرہ میں تحریر ہیں، علی اظہر کو اپنا بھائی ہونے کا انکار کرتے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ذاکر حسین نے علی اظہر کو اپنی اولاد صلبی تسلیم کیا ہے اور علی اظہر کے چچا حافظ حسین نے بھی تسلیم کیا کہ اظہر ذاکر حسین کا لڑکا ہے، اور ہبہ نامہ میں صاف طور پر یہ درج ہے اور نظر حسین نے بھی علی اظہر کو اپنا بھتیجا حقیقی یعنی ذاکر حسین کا لڑکا ہونا تسلیم کیا، اور دلچسپ بات یہ ہے کہ داخل وخارج کے وقت حسرت علی اور علی یاور نے بھی علی اظہر کو اپنا برادر حقیقی ہونا تسلیم کیا ہے، اور داخل وخارج بھی کرایا، اور داخل و خارج میں ذاکر حسین کے وارث کی حیثیت سے علی اظہر کا نام درج ہوا۔

چک بندی میں بھی حسرت علی نے علی اظہر کو اپنا بھائی تسلیم کیا، چک بندی ہی میں علی

یاور نے بھی علی اظہر کو اپنا حقیقی بھائی ہونا تسلیم کیا، اور اب ہبہ والی آراضی پر حسرت مقدمہ قائم کر کے بھی علی اظہر کو اپنا حقیقی بھائی ہونا تسلیم کر رہے ہیں، مگر حسرت علی ادھر کچھ دنوں سے انکار کرنے لگے ہیں اور علی اظہر کے وراثت کے حصہ کو ہضم کر لینا چاہتے ہیں، علی اظہر کا تو انتقال ہو گیا ہے، علی اظہر کے حق کا انکار کر کے اپنے بھتیجوں کے حق کا انکار کر کے اپنے بھتیجوں کے حق کو مار لینا چاہتے ہیں، تو کیا حسرت کے انکار کر دینے سے علی اظہر کا حق وراثت منقطع ہو جائے گا آپ سے درخواست ہے کہ ہم تینوں بھائیوں پر رحم کریں اور علی اظہر کے وراثت والے حصہ میں علی اظہر کے تینوں لڑکوں کا حق شرعی ہونا بیان کر دیں؟

المستفتی: ابرار احمد قاسمی انٹر کالج جگن پور فیض آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) واہب حافظ حسین نے اپنی جائیداد میں سے جو حصہ علی اظہر کو ہبہ کر کے اپنی زندگی ہی میں قبضہ کرا دیا تھا تو یہ ہبہ درست وصحیح ہے اور علی اظہر اپنے حصۂ موہوب بہ کا مالک ہے، لہٰذا حسرت علی اور نفیس احمد کا علی اظہر پر حقیت کا دعویٰ کرنا شرعاً ناجائز ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۷/۳۸۱، جدید ڈابھیل ۱۶/ ۴۶۹)

وتتم الهبة بالقض الكامل ولو الموهوب شاغلا لملك الواهب لا مشغولا به (إلى قوله) في محوز مفرغ مقسوم و مشاع لايبقىٰ منتفعا به بعد أن يقسم (إلى قوله) ولا تتم فيما يقسم ولو لشريكه أو لأجنبي (إلى قوله) فإن قسمه و سلمه صح ولو سلمه شائعا لا يملكه فلا ينفذ تصرفه فيه. (در مختار مع الشامي، كتاب الهبة كراچی ٥/ ٦٩٠، زكريا ٨/٤٨٣)

(۲) ذاکر حسین کے ترکہ سے علی اظہر، علی یاور، حسرت علی تینوں برابر کے حصہ دار ہیں، لہٰذا ذاکر حسین کے ترکہ سے علی اظہر کے محروم ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

كما قال في الدر: ويقسم الباقي بعد ذٰلك بين ورثته أي الذين ثبت إرثهم بالكتاب أو السنة (إلى قوله) ويستحق الإرث ولو لمصحف به يفتى برحم و نكاح وولاء، قال الشامي تحت قوله: (أي الذين ثبت إرثهم

بالکتاب) أی بالقرآن وهم الأبوان والزوجان والبنون والبنات. (شامی، کتاب الفرائض، کراچی ٦/٧٦٢، زکریا ١٠/٤٩٧)

أولٰهم بالميراث جزء الميت أى البنون وبنوهم. (سراجی، باب العصبات ص: ١٣)

(۳) حسرت علی جو علی اظہر کے بھائی ہونے کا انکار کررہے ہیں اس کی وجہ سے علی اظہر کے حصۂ میراث پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑے گا، بلکہ مستحق کو اپنا حق ملے گا، لہٰذا یہ انکار بیکار ہے۔

ويستحق الإرث ولو لمصحف به يفتى برحم و نكاح و ولاء. (شامی کراچی ٦/٧٦٢، زکریا ١٠/٤٩٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۱۹۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۶/۹ھ

والد کی موجودگی میں اولاد محروم

سوال [۱۱۵۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں مستری محمد اسحاق ولد مستری عبدالرحمٰن صاحب مرحوم آہنگر ساکن ہلدوانی ضلع نینی تال میں اپنے باپ کا ایک ہی لڑکا ہوں نہ میرا کوئی بھائی ہے اور نہ بہن ہے، ایک بھائی تھا جس کا باپ کی ہی زندگی میں انتقال ہوگیا تھا، اور نہ ہی میرا کوئی چچا یا تایا ہے، میرے باپ نے جائیداد چھوڑی ہے، میں اس کو فروخت کرنا چاہتا ہوں، میرے لڑکے اور لڑکیاں کہتی ہیں کہ میرے دادا کی جائیداد میں ہمارا بھی حصہ ہوتا ہے، اس مسئلہ میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ مطلع فرمائیں۔

المستفتی: محمد اسحاق

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: بشرط صحت سوال مذکورہ جائیداد کے مالک آپ ہی ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے آپ کی اولاد آپ کے والد کے ترکہ کی حقدار نہیں ہوسکتی،

آپ کے لیے فروخت کرنا شرعاً جائز ہوگا، لیکن یہ بے رحمی کی بات ہے کہ باپ اپنی زندگی میں ساری جائیداد فروخت کر ڈالے اور اولاد محروم رہ جائے۔

أخرج البيهقي في سننه عن زيد بن ثابت وعلي و ابن مسعود حديثا طويلاً وطرفه: إذا ترك أبناء و ابن ابن فليس لابن الابن شيئ. (سنن کبریٰ للبيهقي، دار الفكر بيروت ۹/۳۰۲، رقم: ۱۲۶۲۹)

الأقرب فالأقرب يرجحون بقرب الدرجة أعني اولٰهم بالميراث جزء الميت أي البنون ثم بنوهم وإن سفلوا. (سراجی ص:۲۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍ رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۱۵۴)

زنا سے پیدا شدہ بچہ وراثت کا حقدار نہیں

سوال [۱۱۵۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ایک شخص ببو شادی شدہ ہے، صاحب اولاد ہے، وہ ایک غیر مسلمہ عورت سے ملتا ہے، زنا کا صدور بھی ہوتا ہے، غیر مسلمہ کا شوہر انتقال کر چکا ہے۔

تو دریافت یہ کرنا ہے کہ غیر مسلمہ عورت سے اب جو بچے ہو رہے ہیں وہ ببو کی اولاد شمار ہوگی یا نہیں؟ اور ببو کی وراثت میں حصہ پائے گی یا نہیں؟

(۲) اور اگر یہ عورت مسلمان ہوکر ببو کے نکاح میں آجائے تو یہ بچے بھی ساتھ آئیں گے، تو پھر وراثت میں حق ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: بھائی راشد شاہ آباد رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) ببو کے غیر مسلمہ عورت کے ساتھ زنا کرنے کے نتیجے میں جو اولاد پیدا ہوئی ہے وہ ببو کی اولاد ہرگز شمار نہ ہوگی، کیونکہ زنا سے پیدا شدہ اولاد ثابت

النسب نہیں ہوتی، نیز یہ اولا دبہو کی وراثت کی حقدار بھی نہ ہوگی ۔(مستفاد: فتاویٰ محمودیہ ۹/۱۹۱)

الـوطئ فيه زنا لايثبت به النسب. (رد الـمـحتار، كتاب الطلاق، قبيل باب الحضانة كراچی ۳/ ٥٥٥، زكريا ٥/ ٢٥٢)

ولـد الزنا واللعان بجهة الأم. (در مختـار، كتاب الفرائض، باب توريث ذى الأرحام، كراچی ٦/ ٧٩٩، زكريا ١٠/ ٥٥٨)

وفى الشامي: تحت بجهة الأم لا شقيقا. (شامی، كراچی ٦/ ٨٠٠،زكريا ١٠/٥٥٨)

عـن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده قال قام رجل فقال رسول الله ﷺ : إن فـلانـا إبـنـى عـاهـر ت بـأمـه فـى الجاهلية فقال رسول الله ﷺ: لادعوة فى الإسلام ذهب أمر الجاهلية الولد للفراش وللعاهر الحجر. (سنن أبى داؤ د، الـطلاق، باب الولد للفراش، النسخة الهندية ١/ ٣١٠، دار السلام رقم: ٢٢٧٤، مسند أحمد بن حنبل ٢/ ٢٠٧، رقم: ٦٩٣٣، مشكوٰة شريف ص:٦٨٨)

(۲) اور اگر یہ غیر مسلمہ جس سے بہو نے زنا کیا تھا مع اولاد کے مسلمان ہوکر بہو کے نکاح میں آجائے تب بھی مذکورہ اولاد کا بہو کی وراثت میں قطعاً حق نہ ہوگا۔

رجل زنىٰ بامرأة وحبلت منه فلما استبان حبلها تزوجها الذى زنىٰ بها فـالـنكاح جائز (إلى قوله) وإن جاء ت به لأقل من ستة أشهر ، وفى الخانية: من وقت النكاح لايثبت به النسب ولاترث منه. (تاتارخانية زكريا ٥/ ٢٦٥، رقم: ٧٨٠٩)

الوطئ فيه زنا لايثبت به النسب. (شامی، كراچی ٣/ ٥٥٥،زكريا ٥/ ٢٥٢)

ويـرث ولـد الزنا واللعان بجهة الأم. (در مختـار كراچی ٦/ ٧٩٩، زكريا ١٠/ ٥٥٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ ربیع الاول ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۲۱۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۳/۴ھ

لے پاک وارث نہیں

سوال [۱۱۵۳۵]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) میں چھ ماہ کی تھی، میری سگی پھوپھی نے مجھے گود لے لیا تھا، بچپن سے ہی سگے والدین کو ماما اور مامی اور پھوپھا، پھوپھی کو پاپا امی کہتی ہوں، شادی تک پاپا امی (پھوپھا پھوپھی) کے ساتھ رہتی تھی اور شادی کے بعد انہیں کے گھر آنا جانا تھا، ماہ رمضان میں میری امی (پھوپھی) کا انتقال ہوگیا، پاپا (پھوپھا) گھر میں اکیلے رہنے لگے تو امی کے زیور اور گھر کا کچھ سامان مجھے دیدیا، جن کے بارے میں میرے شوہر کہتے ہیں کہ اس پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے، بلکہ یہ ان کے شرعی ورثاء کا حق ہے، تو ہمیں بتائیں کہ میری امی (پھوپھی) کے ورثاء میں ان کے دو سگے بھائی، دو بہنیں اور ایک شوہر ہیں تو کس کو کتنا ملے گا؟

(۲) اور میرے شوہر مجھے پاپا (پھوپھا) کے گھر رہنے بھی نہیں دیتے، کہتے ہیں کہ پاپا اور تمہارا ایک ہی گھر میں رہنا جائز نہیں ہے، چاہے تمہارے ساتھ نوکرانی اور بچے ہوں یا نہ ہوں تو کیا میں اپنے پاپا (پھوپھا) کے ہمراہ ایک مکان میں رہ سکتی ہوں؟ یا شرعاً ممانعت ہے؟

المستفتیہ: غوثیہ عالم محلّہ بھٹی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) آپ کی پھوپھی کی موت کے وقت مذکورہ زیورات ان کی ملک میں تھے تو وہ زیورات ان کے شرعی ورثاء کو ملیں گے، اور آپ ان کی شرعی وارث نہیں ہیں، بلکہ ان کے شرعی وارث سوالنامہ میں ذکر کردہ دو سگے بھائی، دو سگی بہنیں اور ان کے شوہر ہیں، لہٰذا مذکورہ زیورات اور دیگر ترکہ جو آپ کے پھوپھی کی ملکیت تھا ان کے شرعی وارثین کے درمیان درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

۱۲/۱۲

میت

شوہر	حقیقی بھائی	حقیقی بھائی	حقیقی بہن	حقیقی بہن
۱/۶		۱/۲		
۶	۲	۲	۱	۱

مرحومہ کا کل ترکہ بارہ سہام میں تقسیم ہوکر چھ سہام شوہر کو اور دو، دو دونوں بھائیوں کو اور ایک ایک سہام دونوں بہنوں کو ملیں گے۔

إن الجهاز ملك المرأة وأنه إذا طلقها تأخذه كله وإذا ماتت يورث عنها ولايختص بشيئ منه. (شامی، باب النفقة، مطلب: فيما لوزفت إليه بلا جهاز کراچی ۳/۵۸۵، زکریا ۶/۲۹۹)

وأما إذا جرت فی البعض يكون الجهاز تركة يتعلق بها حق الورثة وهو الصحيح. (شامی، مطلب فی دعویٰ الأب أن الجهاز عارية زکریا ۴/۳۰۹، کراچی ۳/۱۵۷)

(۲) آپ کے پھوپھا آپ کے شرعی محرم نہیں ہیں، اس لیے ان کے ساتھ تنہائی میں ایک گھر میں شب باشی کرنا آپ کے لیے جائز نہیں ہے، لہٰذا آپ کے شوہر جو کہہ رہے ہیں وہ شرعی طور پر صحیح اور درست ہے، نیز گھر میں نوکرانی ہوتب بھی پھوپھا آپ کے لیے غیر محرم ہیں۔

أيتهما فرضت ذكرا لم تحل للأخرىٰ أبدا لحديث مسلم: لا تنكح المرأة على المرأة، وفی الشامية: ولا على خالتها ولا إبنة أخيها ولا إبنة أختها. (شامی زکریا ۴/۱۱۷، کراچی ۳/۳۸-۳۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۸۹۷۲)

متبنیٰ کو وراثت میں حصہ نہیں ملے گا

سوال [۱۱۵۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: احمد سلیم کا انتقال ہوا اور ان کی بیوی عائشہ خاتون کا انتقال ان سے پہلے ہو چکا تھا، احمد سلیم سے کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی، اور احمد سلیم کے ایک بھائی جمال احمد اور دو بہنیں ثریا اور نسرین باحیات ہیں، اور یہ بات بھی واضح ہو کہ احمد سلیم نے عقیل احمد کے لڑکے علیم احمد کے خرچۂ اخراجات کی کفالت کی ہے، صرف خرچۂ اخراجات کی کفالت کی وجہ سے علیم احمد، احمد سلیم کی

میراث کا مستحق ہو جائے گا یا نہیں؟ جبکہ عقیل احمد نے علیم احمد کو کوئی جائیداد وغیرہ ہبہ نہیں کی اور نہ ہی اس کے لیے کوئی وصیت کی ہے، اب اس سلسلے میں شریعت کا جو حکم ہے واضح فرمائیں۔

المستفتی: سید جمال احمد محلّہ مغل پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ احمد سلیم کے شرعی وارث صرف اس کا بھائی جمال احمد اور اس کی دو بہنیں ثریا اور نسرین ہیں، اور ان تینوں کے علاوہ اس کا کوئی شرعی وارث نہیں، لہٰذا احمد سلیم کے اوپر اگر قرض ہے تو سب سے پہلے اس کے قرض کی ادائیگی لازم ہے، اس کے بعد اگر کوئی وصیت ہے تو ایک تہائی مال میں سے وصیت پوری کرنی لازم ہوتی ہے، اگر قرض اور وصیت نہیں ہے تو سارے ترکہ ان ہی تینوں کے درمیان شرعی حصوں کے اعتبار سے تقسیم ہوگا، لہٰذا کل ترکہ چار حصوں میں تقسیم ہوکر دو حصے احمد سلیم کے بھائی جمال احمد کو ملیں گے، اور ایک ایک حصہ ان کی دو بہنیں ثریا اور نسرین کو ملے گا، اب رہا عقیل احمد کے بیٹے علیم احمد جن کی کفالت احمد سلیم نے کی تھی یا احمد سلیم نے جسے اپنا متبنیٰ (لے پالک) بنایا تھا، تو شرعی طور پر لے پالک شرعی میراث کا حقدار نہیں ہوتا ہے، اس لیے علیم احمد کو سلیم کے ترکہ میں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ میرٹھ ۳/۱۰۸-۱۱۰، معارف القرآن ۷/۸۴)

یبدأ بتجهیزه من غیر تبذیر ولا تقتیر، ثم تقضی دیونه من جمیع ما بقی من ماله ثم تنفذ وصایاه من ثلث ما بقی بعد الدین ثم یقسم الباقی بین ورثته بالکتاب والسنة وإجماع الأمة. (سراجی مکتبہ بلال دیوبند ص:۳)

والمتبنیٰ لایلحق فی الأحکام بالابن فلا یستحق المیراث ولایرث عنه. (أحکام القرآن للتهانویؒ ۵/ ۱۸٤)

وما جعل أدعیاء کم أبناء کم فلایثبت بالتبنی شیئ من أحکام البنوة من الإرث وحرمة النکاح وغیر ذٰلک. (تفسیر مظهری سورة الأحزاب تحت رقم الآیة: ٤، زکریا قدیم ۷/ ۲۸٤، جدید ۷/ ۲۹۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ذی الحجہ ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۵۵۷)

مورث کی اولاد کی موجودگی میں لیپا لک کا حکم

سوال [۱۱۵۳۷]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زیتون نے اپنے ایک بھتیجے نواب جان کو گود لے کر پالا تھا، پھر نواب جان کا انتقال ہوگیا، زیتون بیگم حیات ہے،اب زیتون بیگم اپنے لیپا لک نواب جان کے ورثاء میں اپنی جائیداد اپنی زندگی میں تقسیم کرنا چاہتی ہے،تو نواب جان کے ورثاء میں ایک بیوی دو لڑکے تین لڑکیوں کے درمیان کس طرح تقسیم کرے؟ اور کیا اپنے لیپا لک کی اولادوں کو دینے کا حق ہے یا نہیں؟ شرعی حکم تحریر فرمادیں؟

المستفتی: شفیق کسرول مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر زیتون بیگم کے بھائی یا دوسرے بھتیجے وغیرہ زندہ ہیں تو نواب جان کی اولادوں میں سے کوئی بھی زیتون بیگم کے وارث نہیں بن سکتے، اس لیے زیتون بیگم کو اختیار ہے کہ اپنی زندگی اور صحت کے زمانہ میں اپنی جائیداد نواب جان کی اولادوں کو دینا چاہتی ہے،تو جس کو جتنا چاہے اپنی مرضی سے دے سکتی ہے۔

المالک هو المتصرف فی الأعیان المملوکة کیف شاء من الملک. (بیضاوی شریف رشیدیه ۱/ ۷)

کل یتصرف فی ملکه کیف شاء. (شرح المجلة رستم اتحاد ۱/ ٦٥٤، رقم المادة: ١١٩٢) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ صفر المظفر ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۶۳۰)

کیا باپ کے متروکہ مال میں متبنیٰ بیٹے کا حصہ ہے؟

سوال [۱۱۵۳۸]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: محمد فاضل کی شادی تقریباً چالیس سال قبل ہوئی تھی، لیکن ان کے کچھ عرصہ تک اولاد نہیں ہوئی، اس لیے انہوں نے اپنی سالی کے لڑکے نزاکت کو لے کر پال لیا جب وہ دس گیارہ سال کا ہوگیا، تو محمد فاضل نے دوسری شادی منی بیگم سے کی لیکن اس سے تقریباً پندرہ سولہ سال تک کوئی اولاد نہیں ہوئی، ڈاکٹروں سے علاج کرایا تو انہوں نے کہا کہ ان کے اولاد نہیں ہوگی، لیکن سولہ سال کے بعد منی بیگم سے یکے بعد دیگرے لڑکی پیدا ہوئیں، جن کی اس وقت عمر تقریباً تیرہ، گیارہ سال ہے، لیپا لک نزاکت جس کو محمد فاضل کی پہلی بیوی نے پالا اس کی عمر ۳۸؍سال ہے، اور محمد فاضل کا انتقال ہوگیا تو دونوں بیوی اور دولڑکی اور لیپا لک موجود ہیں، ہر ایک کو کتنا کتنا حصہ ملے گا؟ نیز لیپا لک نزاکت کو بھی کچھ ملے گا یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ سوال میں فاضل کے لیپا لک نزاکت کو اس کی وراثت میں سے کچھ نہیں ملے گا، اس لیے کہ کوئی شخص کسی بچے کو لیپا لک یعنی منھ بولا بیٹا بنالے تو حقیقت میں وہ اس کا بیٹا اور وہ شخص اس کا باپ نہیں بنتا، اس بچے کا حقیقی باپ وہی ہے جس کے نطفہ سے وہ پیدا ہوا ہے اور اس بچے کا نسب بھی اسی حقیقی باپ سے ثابت ہوگا اور اسی کا وارث بنے گا۔

﴿**قال الله تعالیٰ: وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآئَكُمْ اَبْنَآئَكُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ.** [الأحزاب: ٥]﴾

وحرم الإسلام التبنی وأبطل کل آثارہ وذٰلک بقولہ تعالیٰ: وما جعل ادعیاء کم ابناء کم ذٰلکم قولکم بافواھکم. (الموسوعة الفقهية ١٠/١٢١، تفسیر قرطبی، سورۃ الأحزاب تحت تفسیر الآیة: ٤ دار الکتب العلمیة بیروت ١٤/٨٠، تفسیر معارف القرآن ٧/٨٤، تفسیر روح المعانی زکریا ١٢/٢٢٤)

اورمرحوم محمد فاضل کا ترکہ حسب ذیل نقشہ کے اعتبار سے تقسیم ہوگا:

۱۶/۸

میـــــــــــت

بیوی	بیوی	لڑکی	لڑکی
(۱)		(۷)	
۱	۱	۷	۷

مرحوم محمد فاضل کا کل ترکہ ۱۶؍سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا ملے گا جتنا اس کے نام کے نیچے درج ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۸۰۰۸)

متبنیٰ کا باپ کی ملکیت میں کوئی حق نہیں

سوال [۱۱۵۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں سانس کا مریض ہوں اور اب میری حالت نازک ہے، زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، میری پہلی بیوی سے دو لڑکیاں ایک لڑکا ہے، پہلی بیوی کے انتقال کے بعد نکاح ثانی کیا، دوسری بیوی سے بھی دو لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے، لیکن دوسری بیوی کے ساتھ دو سال کی ایک لڑکی آئی، میں نے اس کو اپنے بچوں سے زیادہ عزیز سمجھ کر پالا، اس نے بھی میری بہت خدمت کی، اس کے نکاح میں بھی میں نے متبنیٰ سمجھتے ہوئے اپنی ولدیت لکھائی، میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ یہ لڑکیوں میں برابر کی شریک مانی جائے، اس کے علاوہ میری بیوی کا کیا حق نکلتا ہے؟ سب کی شادی کرچکا ہوں اور سب بال بچے دار ہیں، صرف ایک لڑکے محمد عالم کی شادی نہیں کرسکا ہوں؟

المستفتی: شمس الدین کاشی پور نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جو لڑکی دوسری بیوی کے ساتھ آئی ہوئی ہے وہ شرعی طور پر آپ کے ورثاء میں داخل نہیں ہے، آپ کے مرنے کے بعد وہ آپ کے ترکہ میں سے کسی قسم کے حصہ شرعی کی مستحق نہیں رہے گی، البتہ اگر آپ اپنی زندگی میں اپنے اختیار اور مرضی سے اس کو کچھ دے کر مالک بنادیں گے، اور وہ اس کو اپنے قبضہ میں لے لیتی ہے تو اس کی مالک بن سکتی ہے۔

والقبض لابد منہ لثبوت الملک. (ھدایہ، کتاب الھبۃ، اشرفی دیوبند ۳/ ۲۸۳ رشیدیہ ۳/ ۲۶۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍صفر المظفر ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۶۶۰)

لڑکے کا اپنا حصہ متبنیٰ کے نام ہبہ کرنا

سوال [۱۱۵۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ایک مکان شہزادی بیگم کا ہے ان کا انتقال ہوگیا، ورثاء میں ایک لڑکا عبد الرشید، دولڑکیاں: نفیسہ بیگم، حنیفہ بیگم ہیں، شوہر کا پہلے ہی انتقال ہوگیا تھا۔

(۲) پھر حافظ عبد الرشید نے اپنا حصہ اپنے لیپا لک لڑکے مجاہد حسین (جوان کا چچا زاد بھتیجا بھی ہے) کو رجسٹری ہبہ کر دیا تھا، اور حافظ عبد الرشید کا انتقال ہوگیا۔

(۳) پھر نفیسہ بیگم کا انتقال ہوگیا، اس نے اپنے ورثاء میں تین لڑکے: محمد اسلم، محمد انور، محمد سرور، دولڑکیاں: عشرت جہاں، نصرت جہاں چھوڑی ہیں، شوہر کا پہلے ہی انتقال ہو گیا تھا، ترکہ میں ۸۰؍گز کا مکان ہے۔

اب دریافت یہ کرنا ہے کہ شہزادی کے مکان میں سے ہر ایک مذکورہ وارث کو کتنے کتنے حصے ملیں گے؟

المستفتی: محمد انور محلّہ قاصدی پیر غیب مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ سے واضح ہوا کہ عبد الرشید نے اپنا حصہ مجاہد حسین کے نام ہبہ کر دیا، لیکن ہبہ نامہ میں بہنوں کے حصے کا ذکر نہیں ہے، گویا کہ پورا مکان عبد الرشید کی ملکیت معلوم ہورہا ہے، اور سوالنامہ میں وضاحت ہے کہ عبد الرشید کی دو بہنیں بھی ہیں اس لیے عبد الرشید مذکورہ مکان کے چار حصے کر کے دو حصوں کا مالک ہے، اور اس کی دو بہنیں ایک ایک حصہ کی مالک ہوں گی، اس لیے اگر عبد الرشید کا ہبہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو صاحبین کے قول کے مطابق اس کا ہبہ مجاہد حسین کے حق میں نافذ ہو چکا ہے، لیکن مجاہد کو پورا مکان نہیں ملے گا، بلکہ عبد الرشید کا حصہ یعنی مکان کا آدھا حصہ ملے گا، اور باقی نصف حصہ عبد الرشید کی دونوں بہنوں کا حق ہے، لہٰذا مذکورہ بالا ۸۰؍گز مکان میں سے چالیس

گز مجاہد حسین کو اور بیس بیس گز ہر ایک بہن کو ملے گا، اور نفیسہ بیگم کا انتقال ہو چکا ہے، اس لیے اس کا حصہ بیس گز اس کی اولاد کی طرف منتقل ہو جائے گا، ہر لڑکے کو پانچ گز اور ہر لڑکی کو ڈھائی گز ملے گا۔

وهبة المشاع فيما يحتمل القسمة من رجلين أو من جماعة عندهما صحيحة و عند أبي حنيفة فاسدة و ليست بباطلة حتى يفيد الملك عند القبض. (تاتارخانية زكريا ١٤/ ٤٢٤ رقم: ٢١٥٧٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۰۰۰/۴۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۳/۱۵ھ

۱۰ باب: مالِ حرام میں وراثت کا بیان

کیا سرکاری مقبوضہ زمین میں وراثت جاری ہوگی؟

سوال [۱۱۵۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ سرکاری آراضی جس پر باپ دادا نے قبضہ کررکھا ہے، اس میں لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کا حصہ بنتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: مقصودعلی ٹانڈہ بادلی رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سرکاری زمین پر اگرنا جائز قبضہ ہے، تو سرکار کی زمین سرکار کو واپس کردینی چاہئے، لیکن اگر یہ قبضہ ۳۲ رسال سے زیادہ عرصہ سے چلا آرہا ہے اور سرکار کی طرف سے کوئی دعویٰ نہیں ہے، تو شرعی طور پر قابضین کی ملکیت شمار ہوگی، اوراس میں قابضین کے وارثین کے لیے میراث جاری ہوگی، اوراس جائیداد میں لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کا بھی شرعی حق جاری ہوگا، اورلڑکی کولڑکے کے آدھے کے حساب سے حق جاری ہوگا، اگرایک لڑکی اورایک لڑکا ہے تو تین حصوں میں تقسیم ہوکرلڑکے کو دو اورلڑکی کوایک اوراگر دولڑکے اور دولڑکی ہیں تو چھ حصوں میں تقسیم ہوکرلڑکوں کو دو، دو، اورلڑکیوں کوایک ایک حصہ ملے گا۔

اعلم أنه نقل العلامة ابن الغرس في الفواكه البدرية عن المبسوط: إذا ترك الدعوىٰ ثلاثا و ثلاثين سنة ولم يكن مانع من الدعوىٰ، ثم ادعىٰ لا تسمع دعواه لأن ترك الدعوىٰ مع التمكن يدل على عدم الحق ظاهراً، ومثله في البحر، وفي جامع الفتاوىٰ: وقال المتأخرون من أهل الفتوىٰ لا تسمع الدعوىٰ بعد ستة و ثلاثين سنة . (شامي، كتاب الخنثىٰ، زكريا ١٠/ ٤٦٨، كراچی ٦/ ٧٤٢، زكريا ٨/ ١١٧، كراچی ٥/ ٤٢٢، تنقيح الفتاوىٰ الحامدية، دار الكتب

العلمية بیروت ۲/ ۱۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲ رشوال ۱۴۲۵ ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۷۰/ ۱۱۶۷۱)

لاٹری کی رقم سے خریدی گئی جائیداد کا ورثاء کے لیے استعمال

سوال [۱۱۵۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے والد صاحب لاٹری کا کام کیا کرتے تھے، اسی کی آمدنی سے انہوں نے کچھ جائیداد خریدی ہے، جو تقریباً ۲۱/ بیگھہ ہے، اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

دریافت یہ کرنا ہے کہ یہ زمین ان کے ورثاء کے لیے استعمال کرنا یا اس کو بیچنا اور اس کی رقم سے فائدہ اٹھانا شرعاً کیسا ہے؟ ان کے ورثاء میں تین لڑکے تین لڑکیاں ایک بیوی ہے؟

المستفتی: اقبال مصطفیٰ محلّہ غوری امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: آپ کے مسئلہ کے مطابق اسی طرح کا سوال حضرت تھانویؒ سے بھی کیا گیا تھا جس میں رشوت کے پیسے سے متعلق سوال کیا گیا تھا، کہ رشوت کے پیسہ سے باپ نے مکان خریدا تھا، اس مکان سے اولاد اور وارثین کے لیے فائدہ اٹھانا جائز ہے یا نہیں؟ تو حضرت تھانویؒ نے فتاویٰ شامی کی مختلف عبارتوں سے استدلال کرکے یہ جواب تحریر فرمایا تھا، کہ فتویٰ کی رو سے حلال ہے، گو تقویٰ کے خلاف ہے، یعنی فتویٰ کی رو سے اس سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہے، مگر تقویٰ اور دیانت کے اعتبار سے اس سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے، اور اس سے فائدہ اٹھانے سے اپنے آپ کو دور رکھنا چاہیے۔ (ملاحظہ ہو: امداد الفتاویٰ ۴/ ۱۴۷-۱۴۸)

اور آپ کا مسئلہ بھی تقریباً اسی طرح کا ہے کہ والد نے لاٹری کے پیسہ سے زمین خریدی ہے اس کے بعد ان کی وفات ہوگئی، اب آپ لوگوں کو میراث میں وہ زمین مل گئی ہے،

لہٰذا قانون اورفتویٰ کی رو سے اس زمین کے آپ مالک ہیں،لیکن جب تک اس میں زمین کی قیمت کے بقدر پیسہ صدقہ نہ کردیں گے اس وقت تک اس سے فائدہ اٹھانا آپ لوگوں کے لیے دیانۃً جائزنہیں ہے۔

والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم و إلا فإن علم عين الحرام لا يحل له، ويتصدق به بنية صاحبه وإن كان مالا مختلطا مجتمعا من الحرام ولا يعلم أربابه ولا شيئا منه بعينه حل له حكما، و الأحسن ديانة التنزه عنه –إلى– ومفاده الحرمة وإن لم يعلم أربابه وينبغي تقييده بما إذا كان عين الحرام ليوافق ما نقلناه إذا لو اختلط بحيث لا يتميز يملكه ملكا خبيثا لكن لا يحل له التصرف فيه مالم يؤ د بدله كما حققناه. (شامی، باب البیع الفاسد، مطلب: فیمن ورث مالا حراما زکریا ۷/ ۳۰۱- ۳۰۲، کراچی ۵/ ۹۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍رجب المرجب ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۷۵۳)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲؍۷؍۱۴۳۳ھ

کیا پگڑی میں وراثت جاری ہوگی؟

سوال [۱۱۵۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک جائیداد ہمارے سسر صاحب کے پاس کرایہ پرتھی،ان کا انتقال ہوگیا،ان کے انتقال پر ہمارے سالوں نے اس جائیداد کو پگڑی لے کر خالی کر دیا، ہمارے سسر کی آٹھ لڑکیاں ہیں اور تین بیٹے ہیں، یہ بیٹے اپنی بہنوں سے کہتے ہیں کہ اس پگڑی میں تمہارا حصہ نہیں ہوتا ہے، یہ صرف بھائیوں کا حصہ ہے، بیٹوں کی ماں بھی بیٹوں کے ساتھ ہیں، ان کی بات کو صحیح ٹھہرا رہی ہے،شرع میں بہنوں کا حصہ ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد فہیم مغل پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کرایہ داری سے دست برداری کے عوض میں جو

پیسہ ملا ہے اس میں جس درجہ کا حق بھائیوں کا ہے اسی درجہ کا حق بہنوں کا بھی ہے۔

ونص الجواب الحمد لله رب العالمين نعم إذا مات شخص وله وارث شرعي يستحق خلو حانوت مورثه عملاً بعرف ما عليه الناس وأما إذا مات شخص عليه دين ولم يخلف ما يفي بدينه فإنه يوفى من خلو حانوته. (الحموی علی الأشباہ والنظائر، زکریا ص: ۲۸۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۱۵)

حق کرایہ داری میں وراثت جاری ہوگی یا نہیں؟

سوال [۱۱۵۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک دوکان جو کہ باپ کے نام کرائے پر تھی، باپ کے انتقال کے بعد دوکان کا کرایہ بڑے بیٹے گلزار کے نام ہوگیا، گلزا دوکان کا کرایہ نہ دے پائے، اس لیے دوکان کا کرایہ نامہ (چھوٹا بیٹا) جاوید کے نام کردیا۔

باپ کے چھ بیٹے ہیں اور دو بیٹیاں ہیں، الطاف نے اور ماں نے کرایہ نامہ (چھوٹے بیٹے) جاوید کے نام کرادیا، دوکان کو چلانے والے الطاف ہیں، چھوٹا بیٹا جس کے نام کرایہ نامہ ہے، اب وہ اس دوکان کو بیچنا چاہ رہا ہے تو اس دوکان پر چھ بیٹے اور دو بہنوں کا حصہ ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد جاوید بن محمد کامل امروہہ گیٹ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر کرایہ دار دوسرے کرایہ دار کو اپنے حق کرایہ داری سے دست برداری کے عوض میں پیسہ لے کر کرایہ داری منتقل کردیتا ہے اور اس پر مالک جائیداد بخوشی دستخط کردیتا ہے تو ایسی صورت میں حق کرایہ داری سے دست برداری پر جو پیسہ لیا گیا ہے وہ پیسہ اس کے سارے ورثاء کے درمیان شرعی حصہ کے اعتبار سے تقسیم ہوجائے گا۔

فیجوز فی العقود الاتفاق علی التنازل عن الحق فی التعویض عن الأموال. (الفقه الإسلامی و أدلته، هدی انٹرنیشنل ۹/ ۷٤۱)

فإذا أراد صاحبها النزول عنها لغیره بعوض جعلوا ذٰلک بطریق الفراغ کالنزول عن الوظائف وقدمنا عن المفتی أبی سعود أنه أفتی بجوازه. (شامی، مطلب: فی بیان مشد المسکة زکریا ۷/ ٤۳، کراچی ٤/ ٥۲٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ ذی قعدہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۶۸۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۳/ ۱۱/ ۱۴۳۵ھ

کرایہ کی دوکان میں وراثت

سوال [۱۱۵۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: شرف الدین کا انتقال ہوا، ۵/ ستمبر ۱۹۸۷/ کو، ان کے ورثاء میں تین لڑکے: شاہنواز، محمد جاوید، محمد پرویز، تین لڑکیاں: فریدہ خاتون، افروز جہاں، نیلوفر خاتون تھیں۔

شرف الدین کے پاس میونسپلٹی رامپور کی ایک دوکان ۲۱۲/ گز کی کرایہ پر تھی، ان کے انتقال کے بعد ان کے دولڑکے شاہنواز، محمد پرویز دوکان کا کرایہ ادا کرتے تھے، ۵/ جولائی ۱۹۹۷ء کو ان کے لڑکے محمد جاوید کا انتقال ہوگیا، اس کے ورثاء میں ایک بیوہ شگفتہ ناز، دو لڑکیاں نبیلہ اور مدیحہ اور دو بھائی اور تین بہنیں تھیں، ۱۷/ ستمبر ۱۹۹۷ء میں شاہنواز ومحمد پرویز نے دوکان کا بقیہ کرایہ ادا کرکے وہ دوکان میونسپلٹی سے خرید لی، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ اس دوکان کی ملکیت کس کی مانی جائے گی، اور اس کی تقسیم کس طرح ہوگی؟

المستفتی: شاہنواز رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کرایہ کی جائیداد ہندوستان میں دوقسموں پر ہے: (۱) وہ جائیداد جن کو کرایہ دار سے خالی کرانے کا مالک کو اختیار نہیں ہے۔

(۲) وہ جائیداد جن کو خالی کرانے کا مالک کو اختیار رہتا ہے، جیسا کہ مساجد ومدارس وغیرہ کی جائیداد ہیں، تو جن جائیداد کو خالی کرانے کا اختیار نہیں ہے، ان میں شرعاً کرایہ دار کے تمام ورثاء کا حق متعلق ہو جاتا ہے، خریدنے کی صورت میں حق خریداری سب کو حاصل ہو جاتا ہے، اور رہائش اور منافع حاصل کرنے کی صورت میں حق رہائش اور حق منفعت بھی سب کو حاصل ہو جاتے ہیں، اور جن کو خالی کرانے کا اختیار ہوتا ہے ان کا معاملہ صرف قابض تک محدود رہتا ہے، ان میں ورثاء وغیرہ کسی کا کوئی حق متعلق نہیں ہوتا اور سوالنامہ میں جس جائیداد کا ذکر ہے یہ ان جائیداد میں سے ہے جن کو خالی کرانے کا اختیار نہیں ہے، لہٰذا اشرف الدین کو اس جائیداد کی نیم ملکیت حاصل تھی، اور اس درجہ کی ملکیت اس کے انتقال کے بعد اس کے تمام ورثاء کو بھی حاصل ہوگی، اس لیے خریداری کا اختیار بھی سب کو حاصل ہے، پس جاوید کے ورثاء کو بھی خریداری کا حق تھا، لہٰذا شاہنواز اور محمد پرویز نے اگرچہ پیسہ ادا کر دیا ہے، مگر یہ دونوں جاوید کے ورثاء سے ان کے حصہ کی رقم حاصل کر کے ان کو بھی خریداری میں شامل کر لیں اس لیے کہ ان کو بھی اس کی خریداری میں شرکت کا حق ہے۔

الحق متی ثبت لایبطل بالتاخیر ولا بالکتمان. (قواعد الفقہ اشرفی ص:۷۷)

الثابت بالعرف کالثابت بالنص. (قواعد الفقہ اشرفی ص:۷٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۳؍ ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ٦٢ ٦٣ ٦٣)	۱۴۲۰/۱۱/۳ھ

وراثت میں ملی سودی رقم، اور اس سے خریدے گئے ترکہ کا حکم

سوال [۱۱۵۴٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ صابر کو اپنے والد حامد سے وراثت میں کچھ مال حاصل ہوا اور کچھ زمین بھی ملی ہے، تحقیق یہ ہے کہ جتنا مال ہے وہ بھی سود کا مال ہے اور جو مکان ہے، وہ بھی سود کے پیسے سے خریدا ہوا ہے، اور اسی روپیہ سے بنوایا ہے اور جتنی زمین ہے وہ بھی سود کے مال سے خریدی ہوئی

ہے،صابر یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ اس کے لیے زمین کی پیداوار کا استعمال کرنا، مکان کو استعمال کرنا اور جو نقد مال ہے، اس کا استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ ایک طرف زمین اور مکان اور نقد مال لاکھوں کی قیمت کا ہے، اور دوسری طرف سود کا خیال آتا ہے، مجھے کیا کرنا چاہیے؟

المستفتی: اقبال احمد جامعہ مارکیٹ ککرالہ ضلع بدایوں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ سے واضح ہوتا ہے کہ زمین، مکان، دیگر اموال سب سودی رقم کے ہیں اور آپ کو معلوم بھی ہے کہ سب کے سب سود کے ہیں تو ایسی صورت میں آپ پر واجب ہے کہ جن لوگوں سے سود لیا گیا ہے ان کی رقم ان کو واپس کردیں (یہ حکم بشرط سہولت اور مقدار بھی معلوم ہونے پر ہے) اور اگر اصل مالک معلوم نہ ہو تو بغیر نیت ثواب سب کا صدقہ کردینا ہوگا۔

أخذ مورثه رشوة أو ظلماً إن علم ذٰلک بعینه لا یحل له أخذه وإلا فله أخذه حکماً أما في الدیانة فیتصدق به بنیة إرضاء الخصماء. (شامی، مطلب: فیمن ورث مالا حراما زکریا ۷/ ۳۰۱، کراچی ۵/ ۹۹، بزازیه زکریا جدید ۳/ ۲۰۳، وعلی هامش الهندیة ٦/ ٣٦٠، مجمع الأنهر دار الکتب العلمیة بیروت ٤/ ١٨٧، مصری قدیم ۲/ ۵۲۹) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۳۱۹۲)

وراثت میں ملی سودی رقم کا حکم

سوال [۱۱۵۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمد احمد کا انتقال ہوا، ان کے پچاس ہزار روپئے ایف ڈی میں رکھے ہوئے تھے، اور وہ نینی تال کے بوچڑ خانہ کی مسجد سے متصل ایک کمرہ میں رہتا تھا، اس کے علاوہ بینک

میں بھی کچھ روپے رکھے ہوئے تھے، کل ملا کر ایک لاکھ پچھتر ہزار روپے تھے، ان روپیوں کو حاصل کرنے میں ستائیس ہزار روپیہ خرچ ہوا، باقی ایک لاکھ اڑتالیس ہزار روپیہ موجود ہے، اس میں کچھ سود کا پیسہ بھی ہے جو بینک میں بڑھ گیا تھا، اور مرحوم کے کوئی حقیقی بھائی حقیقی بہن اور کوئی چچا، تایا وغیرہ بھی نہیں تھے، نہ ان کی اولادیں تھیں، نہ مرحوم نے شادی کی، ہاں البتہ مرحوم کے پردادا کے تین لڑکوں کی اولادیں زندہ ہیں، عبدالعزیز، عبدالعزیز کے دو لڑکے تھے، ان میں سے محمد عارف کا انتقال مرحوم سے پہلے ہو گیا تھا، ان کا بیٹا ناظم زندہ ہے اور عبدالعزیز کے دوسرے بیٹے محمد یوسف مرحوم محمد احمد انتقال کے وقت زندہ رہے، محمد یوسف کے بھی دو لڑکے ہیں: عبدالستار، عبدالستار کے دو لڑکے ہیں، محمد یونس اور محمد حنیف مرحوم محمد احمد کے انتقال کے وقت محمد یونس زندہ تھے، اور حنیف کا پہلے انتقال ہو چکا تھا۔

عبدالغفار: عبدالغفار کے دو لڑکوں میں ایک لڑکا محمد فرحین زندہ ہے، جبکہ دوسرا لڑکا منن محمد احمد سے پہلے انتقال کر چکا ہے، حاصل یہ نکلا کہ محمد احمد کے انتقال کے وقت ان پردادا کے تین پڑپوتے زندہ ہیں، محمد یوسف، محمد یونس اور فرحین عرف چھدا، باقی سب کا انتقال ہو چکا تھا، تو بتائیے کہ محمد احمد کا متروکہ پیسہ شرعی ورثاء کے درمیان کس طرح تقسیم ہوگا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مرحوم کے شرعی ورثاء میں محمد یوسف، محمد یونس اور محمد فرحین عرف چھدا شامل ہیں اور ان کے نیچے کے لوگ وارثین میں شامل نہیں ہیں، اور نہ ہی پردادا کی مؤنث اولادیں وارث ہوسکتی ہیں، لہٰذا بر تقدیر صحت سوال وعدم موانع ارث و بعد ادائے حقوق ما تقدم مرحوم کا متروکہ ایک لاکھ اڑتالیس ہزار روپیہ مرحوم کے مذکورہ شرعی ورثاء کے درمیان درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

مسئلہ ۳ — تباین — ترکہ ۱۴۸۰۰۰ روپیہ

میــــــت

محمد یوسف	محمد یونس	محمد فرحین
۱	۱	۱
۱/۳ ۴۹۳۳۳ روپیہ	۱/۳ ۴۹۳۳۳ روپیہ	۱/۳ ۴۹۳۳۳ روپیہ

مرحوم کا کل ترکہ تین سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا اتنا ملےگا جو اس کے نام کے نیچے ترکہ میں سے درج ہے اور ہر ایک کے اپنے حصہ میں جو سود کا پیسہ آیا ہے وہ نادار فقیروں میں بلانیت ثواب صدقہ کردیں، اس کے علاوہ باقی روپیہ اپنی ذاتی ضروریات میں خرچ کرسکتے ہیں۔

من ملک بملک خبیث ولم یمکنه الرد إلی المالک فسبیله التصدق علی الفقراء ...... والظاهر أن المتصدق بمثله ینبغي أن ینوی به فراغ ذمته ولایرجو به المثوبة. (معارف السنن، اشرفیه دیوبند ۱/ ۳٤)

لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبه. (شامی، کتاب الحظر و الإباحة، فصل فی البیع زکریا ۹/ ۵۵۳، کراچی ٦/ ۳۸۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ شوال المکرّم ۱۴۳۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۸۰۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۰/۱۰/۲۹ھ

کیا پگڑی کی رقم میں وراثت جاری ہوگی؟

سوال [۱۱۵۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے دادا نے ایک دوکان کرائے پر لی تھی، دادا کے انتقال کے بعد میرے والد مرحوم نے وہ دوکان سنبھالی اور ایک کیمیکلز کا کاروبار بھی کیا، والد صاحب کی حیات میں ہی وہ دوکان پہلے بڑے بھائی نے سنبھالی اور بعد میں چھوٹے بھائی دوکان پر بیٹھنے لگے، اور بڑے بھائی نے والد صاحب کا دوسرا کاروبار سنبھال لیا، ۱۹۹۲ء میں بابو جی (والد صاحب) کا انتقال ہوگیا اور ہماری والدہ بھی جنت رساں ہوگئیں، ہم تین بہنیں اور دو بھائی ہیں، سب کی شادیاں ہوچکی ہیں، چھوٹے بھائی جن کے پاس دوکان تھی، انہوں نے دوکان خالی کردی اور پگڑی کی شکل میں رقم حاصل کی ہے، کیا اس رقم میں ہم بہنیں بھی حقدار ہیں، جبکہ دونوں بھائیوں نے وہ رقم آپس میں بانٹ لی ہے؟ مہربانی کرکے دینی مشورہ فراہم کریں۔

المستفتیہ: ریحانہ پروین کانٹھ کا پل مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پرانے کرائے دار جن سے دوکان خالی کرانے کا اختیار مالک جائیداد کو نہیں ہوتا ہے ان کرایہ داروں کو جائیداد پر ہندوستانی قانون کے مطابق برقرار رہنے کا حق باقی رہتا ہے، شریعت کے نزدیک یہ قانون غلط اور ناجائز ہے اور کرایہ دار کا خالی نہ کرنا یہ بھی ایک ناجائز عمل ہے؛ لیکن بعض فقہاء نے بدل خلو کے طور پر حق قرار کا عوض لینے کی گنجائش لکھی ہے، اس اعتبار سے خالی کرنے پر پگڑی کی جو رقم ملی ہے، اس میں سب کا حق متعلق ہے، جیسے لڑکوں کا حق ہے ویسے ہی لڑکیوں کا بھی حق ہے، لہٰذا بھائیوں پر لازم ہے کہ بہنوں کو ان کے حصوں کے تناسب سے ان پیسوں میں سے ادا کریں۔

عن زید بن ثابت و علي و ابن مسعود: إذا ترک المتوفی ابنا فالمال لہ (إلی قولہ) فإن ترک بنین و بنات فالمال بینهم للذکر مثل حظ الأنثیین. (السنن الکبریٰ للبیهقی ۹/۳۰۲، رقم: الحدیث ۱۲۶۲۹)

فإذا أراد صاحبها النزول عنها لغیرہ بعوض جعلوا ذٰلک بطریق الفراغ کالنزول عن الوظائف. (شامی، مطلب فی بیان مشد المسکۃ زکریا ۷/۴۳، کراچی ۴/۵۲۴)

ویصیر الخلو فی الحانوت حقا لہ فلایملک صاحب الحانوت إخراجہ منها ولا إجارتها لغیرہ. (شامی زکریا ۷/۳۷، کراچی ۴/۵۲۱) **فقط واللّٰہ** سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ رجب المرجب ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/۱۲۱۴۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/۷/۱۴۳۶ھ

۱۱ باب التصرف فی الترکۃ

لڑکی مرحوم والد کا مکان بیچے تو کیا حکم ہے؟

سوال [۱۱۵۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص حاجی نور محمد کا انتقال تقریباً ۷/سال پہلے ہو چکا ہے، مرحوم نے اپنی ایک جائیداد مراد آباد میں تین منزل عمارت جس میں ۹/کمرے جس کا رقبہ ۱۲۳/گز اور تین بیٹے اور ۵/بیٹیاں: محمد حنیف، محمد رئیس، محمد عمر، صابرہ بیگم، آمنہ، آسیہ، رابعہ، ریشما وارث چھوڑے ہیں، باپ نے اپنی زندگی میں ایک کرایہ دار دوسری منزل پر رکھا تھا جس کا کرایہ وہ خود لیتے تھے، ایک منزل پر ایک بیٹی ریشما رہتی تھی، ایک منزل پر محمد رئیس اپنے بچوں کے ساتھ رہتا ہے، یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ کرایہ دار آج بھی رہتا ہے، اور اس کا کرایہ باپ کے بعد باپ کے کہنے کے مطابق بیٹوں کو دیا جاتا ہے، اب یہ مکان بہنیں بیچنا چاہتی ہیں تو اس مکان کا ترکہ کس طرح نکلے گا؟ جبکہ بھائی مکان بیچنا نہیں چاہتے، جواب سے مستفیض فرمائیں؟

المستفتی: محمد حنیف، محمد رئیس، محمد عمر اصالتپورہ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں مرحوم حاجی نور محمد کی متروکہ جائیداد میں ان کے سبھی وارثین کا شرعاً حق ہے اور لڑکوں پر لازم ہے کہ وہ اپنی بہنوں کو ان کا شرعی حق جلد از جلد ادا کردیں، اور اس کی دو شکلیں ہوسکتی ہیں یا تو اس مکان کو بیچ کر جو رقم ملے، ہر بہن کو اس کے حصہ کی رقم دیدی جائے یا لڑکے اپنی جانب سے بہنوں کے حصہ کی رقم دے کر ان سے ان کا حصہ خرید لیں، الغرض جو بھی شکل ہو جلد از جلد بہنوں کا حق ادا کرنا چاہیے۔

عن ابن عباسؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: الحقوا الفرائض بأهلها. (صحیح البخاری، باب میراث ابن الابن إذالم یکن ابن، النسخۃ الهندیة ۲/۹۹۷، رقم: ٦٤٧٨، ف: ٦٧٣٥)

عن سلیمان بن موسیٰؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: من قطع میراثا

فرضه الله، قطع الله ميراثه من الجنة. (سنن سعيد بن منصور، باب من قطع ميراثا فرضه الله، دار الكتب العلمية بيروت ۱/۹۶، رقم: ۲۸۵-۲۸۶)

اور مکان میں شرعی تقسیم درج ذیل طریقے پر ہوگی :

نور محمد میت ۱۱

لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی
۲	۲	۲	۱	۱	۱	۱	۱

کل ترکہ گیارہ برابر سہام میں تقسیم ہو کر ہر لڑکے کو دو سہام اور ہر لڑکی کو ایک حصہ ملے گا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۰۵۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴/۴/۱۴۳۴ھ

کسی ایک وارث کو ترکہ کی جائیداد کو فروخت کردینا

سوال [۱۱۵۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مرتے وقت مقصود النساء نے تقریباً ۱۳۵/ گز آراضی اور ۱۳۵/ گز میں ایک مکان ایک منزل تقریباً ۲۷۰/ منجملہ آراضی چھوڑی، اولاد میں ایک لڑکا محمد جان، اور چار لڑکیاں: صابرہ خاتون، بانو، طیبہ اور ایک چوتھی لڑکی، کل پانچ اولاد چھوڑیں، محمد جان نے یہ مکان و آراضی چار قسطوں میں فروخت کردی، بوقت فروختگی مکان قسط اول، محمد جان کی چاروں بہنیں موجود تھی، جنہوں نے محمد جان سے بلا جبر وتشدد کے کوئی مطالبہ اپنے حصۂ وراثت کا نہیں کیا اور پھر بعد فروختگی کے اس کا اظہار کیا، اسی طرح دوسری اور تیسری قسط کا معاملہ تھا، تیسری قسط کے فروخت ہونے پر دو بہنیں زندہ تھی، صابرہ خاتون اسی مکان میں رہتی تھی، جس نے اپنے بھائی محمد جان سے کسی قسم کا مطالبہ وحصہ وراثت کا نہیں مانگا، اور مشتری کو بوقت فروختگی کوٹھری کا دخل دیدیا، اور دوسری بہنوں نے بھی اپنا حصۂ وراثت نہیں مانگا، ان چاروں

بہنوں میں دو بہنوں کی اولاد ہے، اور دو بہنیں لاولد فوت ہوگئیں، اب باقی چوتھی قسط پر جو ۱۶/ ۱۰/۶۱ء کوفروخت کی اس وقت صرف ایک بہن صابرہ خاتون موجود تھی، انہوں نے اس مرتبہ بھی کوئی اپنے حصۂ وراثت کا بلاجبر وتشدد کے کوئی مطالبہ نہیں کیا، اور ناہی زندگی میں اظہار کیا۔

دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ ان مذکورہ دو بہنوں کی اولاد اس آراضی اور مکان مذکور میں اپنی اپنی والدہ مرحومہ کے حصوں اور وراثت کا مطالبہ کررہی ہے، کیا شریعت کی رو سے ان مذکورہ بہنوں کی اولاد کو حصہ دیا جائے یا نہیں؟ محمد جان ۱۹۷۵ء میں اور صابرہ خاتون ۱۹۷۸ء میں مرگئے تھے، محمد جان نے یہ مکان فروخت کردیا، اور جن لوگوں نے یہ مکان ان سے خریدا تو یہ تہائی خریداروں پر شرعی طور پر واجب ہے؟

المستفتی: یوسف خاں محلّہ چاہ غوری امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مختلف وجوہات کی بناء پر سوالنامہ میں درج شدہ بہنوں کی اولاد وورثاء کا دعویٰ قضاء مسموع نہیں ہوگا:

(۱) جب محمد جان نے زندگی بھر مالکانہ تصرف کرتے ہوئے مختلف قسطوں میں فروخت کرڈالا اور مذکورہ بہنوں نے بلا جبر وخوف کے اپنے حق کا دعویٰ نہیں کیا، یہاں تک کہ محمد جان کا انتقال ہوگیا، تو بعد کا دعویٰ شرعاً مسموع نہیں ہوگا۔

رجل تصرف زمانا في أرض و رجل آخر يرى تصرفه فيها ثم مات المتصرف ولم يدع الرجل حال حياته لاتسمع دعواه بعد وفاته. (شامی، کتاب الخنثیٰ مسائل شتی، زکریا ۱۰/ ۴۶۸، کوئٹہ ۵/ ۵۲۴، کراچی ۶/ ۷۴۲، تنقیح الفتاویٰ الحامدية، دار الكتب العلمية بيروت ۲/ ۳)

(۲) مدعیان بہنوں نے جب اپنی زندگی میں مطالبہ نہیں کیا تو ان کی وفات کے بعد ورثاء کا دعویٰ شرعاً قابل سماعت نہ ہوگا۔

وفی الحامدية عن الولوالجية: رجل تصرف زمانا فی أرض و رجل آخر يرى الأرض و التصرف ولم يدع ومات على ذٰلک لم تسمع بعد ذٰلک دعوىٰ

ولله فتترک علی ید المتصرف الخ . (شامی، کتاب الخنثیٰ، مسائل شتی، زکریا ۱۰/٤٦٨، کوئٹہ ٥/٥٢٤، کراچی٦/٧٤٢، تنقیح الفتاویٰ الحامدیة، دار الکتب العلمیة بیروت ٢/٣)

(۳) جب **بوقت فروختگی اعزاء واقارب اور ورثاء سکوت اختیار کریں اور کسی قسم کا اقدام نہ کریں تو بعد کا دعویٰ مسموع نہیں ہوا کرتا۔**

باع عقارا أو حیوانا أو ثوبا و ابنه أو امرأته أو غیرهما من أقاربه حاضر یعلم به ثم ادعی الابن مثلاً أنه ملکه لا تسمع دعواه. (الدر المختار زکریا ١٠/٤٦٧-٤٦٩، کراچی ٦/٧٤٢-٧٤٣، کوئٹہ ٥/٥٢٤)

(۴) اگر اجنبی بھی بوقت بیع وتسلیم مبیع خاموش رہے اور مشتری خرید کر اپنا تصرف شروع کر دے تو بعد کا دعویٰ قابل قبول نہیں ہوا کرتا، اور اسی پر فتویٰ بھی ہے۔

الأجنبی سکوته ولو جارا لایکون رضا إلا إذا سکت الجار وقت البیع والتسلیم وتصرف المشتری فیه زرعا و بناء فحینئذ لا تسمع دعواه علی ما علیه الفتویٰ قطعا للإطماع الفاسدة. (الدر المختار، کتاب الخنثیٰ، مسائل شتیٰ، زکریا ١٠/ ٤٦٩، کراچی ٦/٧٤٣، کوئٹہ ٥/٧٢٥)

(۵) سوالنامہ میں درج شدہ صورت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ بہنوں نے بوقت بیع جبر وتشدد نہ ہونے کے باوجود کسی طرح کی پیش کش نہیں کی جس کو ہبہ سکوتی بالقرائن کی دلیل قرار دیا جا سکتا ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/۴۶۹)

(۶) بیعنامہ اور اقرار نامہ میں صاف صاف وضاحت موجود ہے کہ ہر قسم کے موانع سے پاک وصاف ہے جس کی تفصیل بیع نامہ میں موجود ہے، لہٰذا ان تمام وجوہات کی بنا پر سوالنامہ میں درج شدہ بہنوں کے ورثاء کا دعویٰ شرعاً مخدوش اور غیر مسموع ہوگا، بالفرض اگر واقع میں ان بہنوں کا حق تھا اور وہ مظلوم رہی ہیں جس کا کوئی معتبر ثبوت نہیں ہے، تو ان کو اپنا حق آخرت میں ملے گا، دنیا میں ورثاء کو دعویٰ کا حق نہیں ہوگا۔

قالوا: إن الحق لایسقط بالتقادم کما فی قضاء الأشباه فلاتسمع الدعویٰ فی هذه المسائل مع بقاء الحق للآخرة. (شامی زکریا ١٠/٤٦٨،

کراچی ٦/٣ ٧٤، کوئٹه ٥/٤ ٥٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ جمادی الثانیہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۷۵۲)

تقسیم سے قبل وارث کا جائیداد کے کسی حصہ کو فروخت کرنا

سوال [۱۱۵۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کریم بخش کی پانچ اولاد تھیں، چار بیٹے: حشمت اللہ، عظمت اللہ، عبد اللہ، رحمت اللہ، ایک بیٹی: نور جہاں، حشمت اللہ کا انتقال تو باپ کی زندگی میں ہو گیا تھا، کریم بخش کا اپنا ایک ذاتی مکان تھا جو خود انہوں نے اپنی کمائی سے بنایا تھا، ان کا جب انتقال ہوا تو انہوں نے چار مذکورہ اولاد اور اپنی بیوی مسماۃ طھورن، یہ پانچ چھوڑے اور ترکہ میں یہ مکان چھوڑا، کریم بخش مرحوم نے اپنے مکان کے آدھے سے کچھ کم حصہ ۵۰۰/ روپیہ میں کسی کے پاس گروی رکھ دیا تھا، ان کے انتقال کے بعد ان کی بیوی نے خود محنت مزدوری کر کے وہ ۵۰۰/ روپیہ ادا کر کے اس مکان کو چھڑا لیا تھا اور اپنے گذر بسر کے لیے اس مکان کا کچھ حصہ کرائے پر دید یا تھا۔

کریم بخش کے ان تین مذکورہ لڑکوں میں رحمت اللہ سب سے چھوٹا سب سے زیادہ تیز اور گرم مزاج تھا، گھر کے سب لوگوں سے زبردستی اور جھگڑا کر کے اپنی بات منوانا اس کی عادت تھی، کریم بخش کا یہ مکان مین روڈ پر تھا، اور اس مکان کا ایک ایک حصہ بقدر حصہ دونوں بڑے بھائیوں (عظمت اللہ اور عبد اللہ) کی بیویوں کے مہر میں بھی لکھا تھا، ابھی اس مکان کا باقاعدہ بٹوارہ نہیں ہوا تھا، کہ رحمت اللہ نے سب کی مرضی کے خلاف اس مکان کے ایک تہائی حصہ سے بھی زیادہ حصہ کو بیچنے کا ارادہ کر لیا، اور جھگڑا کر کے گھر کے سب لوگوں سے زبردستی اس بات کو منوانے کی کوشش کی کہ اس کو بیچ کر اس کی رقم سے باقی جگہ میں تم سب کے لیے مکان بنواؤں گا اس سے اس کی والدہ نے بھی اور دونوں بڑے بھائیوں کی بیویوں نے بھی

منع کیا، مگر رحمت اللہ نے تمام کو گالیاں بکیں اور کچھ دوسرے لوگوں سے بھی دباؤ ڈلوایا غرضیکہ اس طرح مجبوراً مرضی کے خلاف عبد اللہ کی بیوی نے پھر عظمت اللہ کی بیوی نے بھی اپنی رضا مندی سے دستخط کردیئے، اس طرح تہائی سے بھی زیادہ حصہ مکان کا رحمت اللہ نے بیچ دیا، اوراس کی پوری رقم اپنے قبضہ میں کرلی، اور پھر اس رقم سے سب سے پہلے ایک پھڑ خرید کر اس میں دوکان شروع کردی پھر اس رقم میں سے باقی جگہ کے مین روڈ والے ایک حصہ پر اس نے ایک کوٹھری بنائی اور پھڑ بیچ کر دوکان اس کوٹھری میں رکھدی اور پھر باقاعدہ بٹوارہ کے بغیر ان دونوں بھائیوں (عظمت اللہ، رحمت) نے مین روڈ کی طرف کی بنی ہوئی اور بلا بنی ہوئی جگہ سب اپنے قبضہ میں کرکے مین روڈ کی طرف کی جگہ کو آدھی آدھی بانٹ لی۔

عبد اللہ کے لیے اندر کا حصہ بغیر بنا ہوا جو کھنڈر کی طرح تھا اور ایک تہائی سے بہت کم تھا چھوڑ دیا، عبد اللہ کی بیوی نے سختی سے کہا بھی کہ یہ ناانصافی ہمارے ساتھ کیوں ہورہی ہے، کہ مین روڈ کی طرف کی جگہ سب تم نے لے لی اور ہمیں اندر کی جگہ دیدی اور وہ بھی کم، تو رحمت اللہ نے بگڑ کر کہا کہ ابھی کوئی بٹوارہ تھوڑا ہی ہورہا ہے، اس کے کچھ عرصہ کے بعد عبد اللہ کے لڑکوں نے عظمت اللہ سے اس کی جگہ میں سے آدھی جگہ خریدنا چاہی تو رحمت اللہ نے ان کو نہیں خریدنے دی، اور گالیاں بکنی شروع کردیں۔

رحمت اللہ خود اس کو لینا چاہتا تھا، مگر اس کے پاس پیسے نہیں تھے، اور عظمت اللہ اس کو بیچنا چاہتے تھے، تو عبد اللہ کی بیوی نے یہ سوچ کر کہ عظمت اللہ کسی غیر کو بیچ دیں گے، وہ غیر آدمی پتہ نہیں کیسا ہوگا، اس لیے رحمت اللہ کو لینے کا موقع دیدیا اور اس بیچاری نے اپنا زیور بھی رحمت اللہ کو دیدیا کہ لو یہ زیور کہیں گروی رکھ کر اور پیسہ لاکر خود اس زمین کو خرید لو تو اس طرح یہ زمین اس کو خریدوادی، تو اس عورت کا تو اس رحمت اللہ کے ساتھ یہ حسن سلوک، رحمت اللہ نے اگرچہ پھر یہ زیور گروی رکھا ہوا چھڑا کر اپنی بھابھی کو واپس کردیا، مگر اس زمین کے روپیہ میں سے جس کو وہ سب سے پہلے بیچ چکا ہے، کسی کو بھی ایک پائی نہیں دی، جبکہ اس زمین کے روپیہ میں دونوں بھائیوں (عظمت اللہ اور عبد اللہ) کا اور بہن نور جہاں اور والدہ طہورن سب کا حصہ نکلتا

تھا،اس پیسے سے جو جگہ بنائی یا جو کاروبار کیا اس کا اب تک اکیلا ہی مالک ہے، ۲۵/سال کے عرصہ میں اس نے اس کاروبار کو بہت بڑھالیا ہے، اور زمین کے بیچنے کے بعد باقی بچی ہوئی زمین میں سے بھی ایک تہائی سے زیادہ جگہ پر قابض ہے، جس کا اوپر ذکر ہوا۔

(۱) تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ رحمت اللہ کا یہ مذکورہ سخت رویہ بے حد غلط اور سراسر ظلم اور زیادتی ہے یا نہیں؟

(۲) یہ بھی فرمائیں کہ کریم بخش کے انتقال کے بعد ان کا مذکورہ بالا متروکہ مکان تینوں بیٹوں، ایک بیٹی ایک بیوی ان پانچ وارثوں کے درمیان کس طرح تقسیم ہوگا؟

(۳) اس مکان میں سے ایک تہائی سے بھی زیادہ جگہ جو رحمت اللہ نے سب ورثاء کی مرضی کے خلاف بیچ کر اس کا روپیہ اپنے ہی پاس رکھا اس روپئے میں بھی سب ورثاء کا حصہ تھا تو اس روپیہ سے جو نفع کمایا ہے اس میں بھی سب کا حصہ ہے تو اب رحمت اللہ کے ذمہ سب ورثاء کو ان کا حصہ دینا لازم اور ضروری ہے یا نہیں؟ اور اب رحمت اللہ سب ورثاء کو ان کا حصہ کس طرح دے اور کتنا دے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: کریم بخش کے انتقال کے بعد مذکورہ جائیداد میں اس کے تمام شرعی ورثاء کا حق متعلق تھا، اور رحمت اللہ کا دوسرے حقداروں کی مرضی کے بغیر تقسیم سے قبل جائیداد کے کسی بھی حصہ کو فروخت کرنا جائز نہیں تھا، اور اگر فروخت کردیا تھا تو اس کی قیمت میں تمام ورثاء کا حق تھا، لہٰذا اس کو فروخت کرکے جو بھی چیز اس نے خریدلی ہے اس میں دوسرے ورثاء کا حق تھا، ورنہ فروخت شدہ حصہ اس کے حق میں سے مجریٰ کرکے اس کا حصہ منتقل ہوگا، اور اگر فروخت شدہ اس کے حق سے زیادہ ہے تو جتنا زیادہ ہے اتنے کی قیمت دوسرے ورثاء کو ادا کردینا اس پر شرعاً لازم ہے، ہاں البتہ جس پیسہ سے اس نے اب تک نفع اٹھایا ہے اس نفع میں دوسرے ورثاء کا حق نہیں اور اس نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ سب سراسر ظلم اور بے انصافی ہے، اس لیے تمام ورثاء سے معافی تلافی کرنا اس پر لازم ہے، اور جو حصہ فروخت کرکے اس نے فائدہ اٹھایا ہے وہ حصہ اس کے حق وراثت میں مجریٰ ہوجائے گا

اور جو کچھ حق سے زائد ہے، اس کی قیمت دوسرے ورثاء کو دیدینا لازم ہوگا۔

عن أبی حمید الساعدي، أن رسول الله ﷺ قال: لایحل لامرئ أن یأخذ مال أخیه بغیر حقه، وذٰلک لما حرم الله مال المسلم علی المسلم.
(مسند أحمد بن حنبل ٥/٤٢٥، رقم: ٢٤٠٠٣)

لایجوز لأحد أن یتصرف فی ملک غیره بلا إذنه أو وکالة منه أو ولایة علیه وإن فعل کان ضامنا. (شرح المجلة رستم اتحاد ١/٦١، رقم المادة: ٩٦)

لو تصرف أحد الورثة فی الترکة المشترکة وربح فالربح للمتصرف وحده. (هندیه، الباب السادس فی المتفرقات زکریا قدیم ٢/٣٤٦، جدید ٢/٣٤٣)

اور کریم بخش کا ترکہ اس طرح تقسیم ہوگا:

کریم بخش میت ۸

بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی
۱	۲	۲	۲	۱

کل آٹھ سہام میں تقسیم ہوکر ہر ایک کو اتنا ملے گا جو اس کے نیچے درج ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۳۵۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۱۱/۳ھ

بیوی کی متروکہ جائیداد میں غیر شرعی تصرف کا حکم

سوال [۱۱۵۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) جب حمیدن کے گیارہ شرعی ورثاء موجود ہیں تو کیا حمیدن کے شوہر کو یہ حق پہنچتا ہے کہ حمیدن کی تمام جائیداد صرف ایک وارث کے نام کرادیں، یا کسی غیر کے ہاتھ فروخت کردیں جبکہ دوسرے ورثاء اس سے قطعاً راضی نہیں ہیں؟

(۲) کیا کسی شرعی وارث کے لیے وصیت کرنا جائز ہے؟

المستفتی: محمد طالب محلّہ کٹار شہید مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) حمیدن کے انتقال کے وقت جو کچھ حمیدن کی ملکیت میں تھا وہ اس کے تمام ورثاء کو بقدر حصص شرعیہ پہنچے گا، اس کے شوہر کو یہ حق نہیں ہے کہ تمام ملکیت پر قبضہ کر کے ایک شخص کے نام کرادے یا کسی غیر کے ہاتھ فروخت کر دے، ہاں اگر بالغین ورثاء اپنے حق میں اجازت دیدیں تو جائز ہوگا، ورنہ نہیں۔

وکل ما جاز بإجازة الوارث یتملکه المجاز له. (هدایه، کتاب الوصایا، فی صفة الوصية، اشرفی ٤/٦٥٦، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٣/٢٥٩، البنایه اشرفیه دیوبند ١٣/٣٩٤)

ولا تجوز لوارثه لقوله علیه السلام: إن الله تعالیٰ أعطیٰ کل ذی حق حقه ألا لا وصیة لوارث ولأنه یتأذی البعض بإیثار البعض ففي تجویزه قطیعة الرحم (إلی قوله) إلا أن یجیزها الورثة. (هدایه، کتاب الوصایا، باب فی صفة الوصية، اشرفی ٤/٦٥٤-٦٥٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍محرم الحرام ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/۳۲۸۸)

باپ کے ترکہ سے بھائیوں کی رضامندی سے خریدی گئی زمین کس کی ملک؟

سوال [۱۱۵۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے والدین کے انتقال کے بعد جو کچھ اثاثہ تھا وہ ہمارے سپرد کر دیا گیا، چونکہ گھر میں سب سے بڑا میں ہی تھا، اس لیے سب ذمہ داری میرے سپرد کر دی، بھائیوں کو پڑھایا لکھایا، خرچ وغیرہ سب کرتا رہا، بعد میں ہم نے چھوٹے بھائی کو دیدیا، صرف پانچ فٹ جگہ بازار میں دوکان کی تھی، اس کے بارے میں میں نے کہا: جب تک میں بیٹھوں گا بعد میں

کوئی بھی بیٹھے، لیکن چھوٹے بھائی اس کے لیے تیار نہیں ہوئے، تو ہم انکے اوپر بگڑے کہ تم لوگوں کے ساتھ اتنا کچھ کیا پھر بھی بات نہیں مانتے، اس کے بعد اس جگہ کی قیمت لگائی گئی، فیصلہ ہوا کہ جو چار ہزار روپیہ کی جگہ ہے اور جو مال ہے اس کی قیمت الگ سے جوڑی جائے گی، لیکن ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ دوکان بیچ نہیں سکتے، بغیر پوچھے، اس کے بعد ہم نے سب روپیہ ادا کردیا، اب ہم کو روپیوں کی بہت ضرورت ہے اور ہم اس دوکان کو بیچنا چاہتے ہیں، قیمت اس کی بتیس ہزار روپیہ لگ رہی ہے، بھائیوں سے پوچھا تو بھائی لوگ صرف پندرہ ہزار دے رہے ہیں، ہم نے دوسرے کے ہاتھ بیچ دی، اب بھائی لوگ فساد مچا رہے ہیں کہ کیوں بیچی، اگر روپیہ چاہتے ہو تو چار ہزار ہم سے لے لو، تو ایسی صورت میں ہم پر کیا کیا حق بنتا ہے؟ جبکہ اس جگہ کی قیمت بھائیوں کو دی جا چکی ہے، بعد میں بیچنے کے وقت پوچھا تو کوڑی کے دام لگا رہے ہیں، اب جب بیچ دی تو آواز اٹھا رہے ہیں، شریعت مطہرہ میں جوان کا حق ہم پر ہوتا ہو آپ تحریر فرمادیں، ہمیں منظور ہے؟

المستفتی: عبدالرشید سانڈی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب آپ نے اپنے بھائیوں کی رضامندی سے دوکان اور دوسرے اسباب خرید کر اس پر قبضہ کرلیا تو ان چیزوں پر آپ کی مکمل ملکیت حاصل ہوگئی، لہٰذا آپ اپنی مملوکہ شئ کسی کے ہاتھ کسی بھی قیمت پر فروخت کرسکتے ہیں اور اس پر آپ کے بھائیوں کو اعتراض کرنے کا شرعی حق حاصل نہیں ہے۔

وإذا قبض المشتری المبیع فی البیع الفاسد بأمر البائع وفی العقد عوضان، کل واحد منهما مال، ملک المبیع ولزمته قیمته. (هدایه، باب البیع الفاسد، فصل فی أحکامه، اشرفی دیوبند ۳/ ۶۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ رجب المرجب ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۱۳۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹؍ ۷؍ ۱۴۲۴ھ

لڑکی کا اپنے بھائیوں سے چھپ کر کچھ جائیداد والدین کیلئے ایصال ثواب کرنا

سوال [۱۱۵۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سیدہ کے والدین کے انتقال کے بعد اس کے بھائیوں نے مال اسباب آپس میں تقسیم کرلیا، سیدہ کو کچھ نہیں دیا، اس مال کا ایک بہت ہی معمولی جز بسبھی کی لاعلمی میں سیدہ کے پاس ہے، کیا سیدہ اس جز کو کسی کو بتائے بغیر کسی کار خیر میں والدین کو ایصال ثواب کی نیت سے خرچ کرسکتی ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: بشرط صحت سوال وعدم موانع ارث وبعد ادائے حقوق متقدمہ سیدہ کے والدین کے انتقال کے بعد سیدہ کے والدین کی پوری جائیداد کو پانچ حصوں میں تقسیم کرکے بھائیوں کو دو دو حصہ اور بہن کو ایک حصہ دینا لازم اور ضروری ہے، لہٰذا سیدہ کے بھائیوں کا باپ کی پوری جائیدا داپنے ہی میں بانٹ کرلے لینا اور بہن سیدہ کو کچھ نہ دینا، قرآن کریم کی صریح نص کے خلاف ہے، جو شرعاً جائز نہیں، اور بھائیوں کی لاعلمی کی وجہ سے باپ کی جائیداد کا معمولی سا حصہ سیدہ کے پاس محفوظ ہے، اگر وہ اس کے شرعی حصہ کی مقدار کے برابر ہے تو اس کو اس نیت سے روکے رکھنا جائز ہے کہ وہ اس کا شرعی حق ہے، اور بھائیوں کو اطلاع کردے کہ اس کو اس کا حق قدرتی طور پر مل چکا ہے، اگر وہ حصہ شرعی سے زائد ہے تو اس کو بھائیوں کو دیدے اور اپنے حصہ کو اپنی ذات پر اور دیگر کار خیر میں خرچ کرسکتی ہے۔

﴿**يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيْ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ** . [النساء: ۱۱]﴾

والفتویٰ اليوم على جواز الأخذ عند القدرة من أی مال كان لا سيما فی ديارنا لمداومتهم العقوق. (شامی، کتاب الحجر زکریا ۹/۲۲۱، کراچی ۶/۱۵۱) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/رجب المرجب ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۴۵۱)

میت کا کل ترکہ مسجد میں دینے کی وصیت کرنا

سوال [۱۱۵۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص بہار کے رہنے والے تھے، انہوں نے بہار میں رہتے ہوئے اپنی بیوی کو طلاق دیدی تھی اور اس مطلقہ عورت سے اولا دبھی ہے، دولڑکے تین لڑکیاں، اولاد کی پرورش ماں نے کی ہے، اوراس شخص کی جوملکیت تھی وہ سب اس شخص نے مہر کے عوض مطلقہ کو دیدی تھی اوراس کے بعد وہ قصبہ لاوڑ ضلع میرٹھ میں مؤذن رہے اوراب وہ اپنی جورقم تھی جمع کرتے رہے، اوراولاد سے اپنی زندگی میں قطع تعلق رکھا، اب اس شخص کا انتقال ہوگیا ہے اور تمام اولاد کی شادی ان کے بغیر ہی کی گئی یعنی ان کوشادی کی اطلاع نہیں دی گئی، صرف ایک لڑکا باقی ہے جس کی شادی ابھی نہیں ہوئی ہے، مرنے والے نے جورقم مسجد میں رہ کرکمائی ہے وہ چھتیس ہزار روپئے ہے، اورمرنے والے نے وصیت کی تھی کہ اس رقم کو میرے مرنے کے بعد تمام مسجد میں دیدینا، اب جومرنے والے کی اولا داس رقم کا مطالبہ کررہی ہے، تو کیا یہ تمام رقم مسجد میں رکھیں یا ورثاء کوتقسیم کردیں، یا دونوں میں، اگر دونوں میں تقسیم کرنا ہے تو براہ کرم حصوں کی بالتفصیل تقسیم فرماکر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں؟

المستفتی: ملاجی رئیس الدین قصبہ لاوڑ میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر مرنے والے نے یہ وصیت کی ہے کہ تمام رقم مسجد میں ہی دیدی جائے تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ جب مرنے والے کے حقیقی وارث موجود ہوں تو صرف ایک تہائی میں وصیت نافذ ہوتی ہے، لہٰذا سوالنامہ میں درج کردہ ۳۶ ر ہزار روپئے تین حصوں میں تقسیم ہوکر ایک حصہ مسجد کو وصیت کی بناء پر ملے گا، باقی دوحصے مرحوم کے شرعی اور حقیقی وارثین کوملیں گے، اسی طرح ان ۳۶ ر ہزار روپئے کے علاوہ مرحوم کا اگر دیگر ترکہ ہوتو وہ ورثین کے درمیان تقسیم ہو جائے گا، لہٰذا کل ۳۶ ر ہزار روپئے ۲۱ ر حصوں میں

تقسیم ہوکر سات حصے مسجد کوملیں گےاور باقی چودہ حصے میں سے دو، دو حصے تینوں لڑکیوں کوملیں گےاور چار، چار حصے دونوں لڑکوں کوملیں گے۔

ولاتجوز بمازاد علی الثلث لقول النبی علیه السلام فی حدیث سعد بن أبی وقاص: الثلث، والثلث کثیر بعد ما نفی وصیته بالکل، ولأنه حق الورثة. (هدایه کتاب الوصایا، باب فی صفة الوصیة، اشرفی دیوبند ٤/٥٥-٦٥٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍شعبان المعظم ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۱۲ ۴)

تقسیم وراثت سے پہلے ورثاء کا اپنا حصہ راہِ خدا میں خرچ کرنا

سوال [۱۱۵۵٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میری والدہ محترمہ کا انتقال ہوگیا، ان کے ہم تین وارث ہیں ایک لڑکا، دو بہنیں، ہم لوگوں نے آپس میں باتفاق رائے یہ طے کیا کہ ان کا جو کچھ بھی ہے، روپیہ کپڑے وغیرہ وہ سب اللہ کی راہ میں تقسیم کردیا جائے، تاکہ اس کا مرحومہ کو ثواب ملے، اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم تینوں نے یہ طے کیا کہ جو جیسا مناسب سمجھے، ضرورت کے مطابق خرچ کردے، اس پر تینوں میں سے کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہے، کیا یہ ضروری ہے کہ اس روپیہ و کپڑے وغیرہ کو تینوں ورثاء پہلے شرعی طور پر تقسیم کرلیں اور اس کے بعد اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کریں، برائے مہربانی اس پر تفصیل سے روشنی ڈال کر ہم لوگوں کو صحیح رہنمائی فرمائیں تاکہ جانے انجانے میں کوئی غلط قدم نہ اٹھ جائے؟

المستفتی: سید نظام الدین گھیر سعید خاں مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر سب ورثاء بالغ ہیں اور بخوشی اپنا اپنا حصہ کار خیر میں دینے پر تیار ہیں تو تقسیم سے قبل اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی گنجائش ہے، مگر پھر بھی

بہتر اور افضل یہی ہے کہ اولاً تقسیم کر کے ہر وارث اپنے اپنے حصہ کو قبضہ میں لے لے، اور اس کے بعد آزادانہ طور پر اپنی اپنی ملکیت کو راہِ خدا میں بے تکلف خرچ کر دے۔ (مستفاد: بہشتی زیور ۵/ ۶۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ ربیع الاول ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۷۱۶)

بیٹا باپ کی جائیداد بیچ دے اور پوتا اپنے نام کرالے تو کیا حکم ہے؟

سوال [۱۱۵۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: تمام پور شورا پور ضلع گلبرگہ کے باشندے مرحوم عبد الکریم صاحب چودھری کی ایک موروثی زمین ۱۹۶۶ء میں اس وقت کے مطابق کل سترہ سو روپئے میں مرحوم عبد الکریم صاحب چودھری کی لاعلمی میں عبد الکریم صاحب کے حقیقی بیٹے مرحوم عظمت اللہ چودھری اور بھتیجا عبد الواحد چودھری ایڈوکیٹ نے میونسپلٹی کو فروخت کر دی تھی، چند سال کے بعد فروخت کنندہ کے حقیقی بیٹے عارف الدین چودھری (جو اس وقت تحصیل آفس میں ملازم تھے) نے خرید وفروخت کی باضابطہ قانونی کارروائی کے بغیر کسی طرح سے اس زمین کو اپنے نام کر لیا تھا، اور کاغذی مالکانہ حیثیت حاصل کر لی تھی، اس وقت سے اب تک ۴۶/ برس ہو چکے ہیں، اور اب تک وہ زمین عارف الدین کے نام سے ہی ہے، اس پس منظر میں وضاحت طلب پہلو یہ ہے کہ عبد الکریم چودھری کی طرف سے میونسپلٹی کو زمین فروخت کیے جانے اور عارف الدین صاحب کے اپنے نام سے کرا لینے کے بعد:

(۱) عارف الدین صاحب چودھری اس کے مالک ہوتے ہیں یا نہیں؟

(۲) اور اگر ملکیت ثابت نہیں ہے تو اس زمین کا شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: عارف الدین چودھری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عظمت چودھری اور عبد الواحد چودھری

ایڈوکیٹ نے عبدالکریم چودھری کی لاعلمی میں اس کی موروثی زمین کو جوفروخت کیا ہے وہ بیع درست نہیں ہوئی، وہ زمین بدستور عبدالکریم کی ملکیت میں شمار ہوگی اور پھر بعد میں عبدالکریم کے بیٹے عارف الدین نے تحصیل آفس میں ملازم ہونے کے رشتہ سے اس زمین کو جو اپنے نام کرالیا ہے اس سے وہ اس زمین کا مالک نہیں ہوگا، بشرطیکہ عبدالکریم کے دیگر ورثاء کی طرف سے اس زمین میں حق وراثت کا مطالبہ جاری رہا ہوتو ایسی صورت میں سارے وارثین کو اس زمین سے اپنا اپنا شرعی حصہ وصول کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

عن أبي حرة الرقاشي عن عمه أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل مال امرئ إلا بطيب نفس منه. (شعب الإيمان للبيهقي، دار الكتب العلمية بيروت ٣٨٧/٤، رقم: ٥٤٩٢، السنن الكبرىٰ للبيهقي دار الفكر بيروت ٥٠٦/٨، رقم: ١١٧٤٠)

لايجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي. (شامي، كتاب الحدود، فصل في التعزير بأخذ المال، كراچی ٦١/٤، زكريا ١٠٦/٦، البحر الرائق كوئٹه ٤١/٥، زكريا ٦٨/٥، هنديه زكريا قديم ١٦٧/٢، جديد ١٨١/٢)

لايجوز لأحد أن يتصرف في ملك غيره بلا إذنه أو وكالة منه أو ولاية عليه وإن فعل كان ضامنا. (شرح المجلة رستم اتحاد ٦١/١- ٩٦)

وفي الشرع: الظلم عبارة عن التعدي عن الحق إلى الباطل وهو الجور وقيل هو التصرف في ملك الغير و مجاوزة الحد. (قواعد الفقه اشرفی ديو بند ص:٣٦٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍رجب المرجب ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۷۵۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸؍۷؍۱۴۳۳ھ

ترکہ کے مکان کی کسی وارث نے ازسرنو تعمیر کی تو تقسیم ترکہ کس طرح ہو؟

سوال [۱۱۵۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ زید نے اپنا مکان اپنی بیوی کو مہروں میں لکھ دیا اور مالک بنادیا، زید کی پانچ اولاد تھیں، جس میں تین لڑکے اور دولڑکیاں، دولڑکوں کا انتقال زید کی موجودگی میں ہی ہوگیا تھا، جن کی اولاد موجود ہے، بیوی حیات رہی، اس کا انتقال بعد کو ہوا، تینوں لڑکوں میں سے بڑے لڑکے نے اس مہر والے والدہ کے مکان کو ازسرنو بنایا، دوسرے دولڑکوں نے کچھ نہیں دیا کہ یہ تو والدہ کا ہے، نہ معلوم وہ کس کو دیدے، بہرحال اب صرف بڑا لڑکا حیات ہے، اور دوسرے چھوٹوں کی اولاد ہے، اور ایک لڑکی حیات ہے تو اس مکان میں بڑا لڑکا جس نے اپنے صرفہ سے بنایا تھا اس کا کتنا حصہ ہے؟ اور چھوٹے دولڑکوں کی اولاد کا کتنا حصہ ہے، اور لڑکی کا کتنا حصہ ہے، جو شادی شدہ اور بال بچے دار ہے؟ براہ کرم جلد سے جلد اس کا جواب ارسال فرمائیں تو نوازش ہوگی۔

المستفتی: سید مہربان علی قصبہ ہڈمیاں بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر زید کی بیوی کے انتقال کے وقت صرف بڑا لڑکا موجود تھا تو دو چھوٹوں کی اولاد کو حصہ نہیں ملے گا، اور بوقت انتقال جتنی لڑکیاں زندہ تھیں ان کو ان کے حقوق کے مطابق حصہ ملے گا، نیز مکان میں تعمیر سے پہلے حالت کے اعتبار سے حصص تقسیم ہوں گے۔

إن شرط الإرث وجود الوارث حيا عند موت المورث. (شامی، کتاب الفرائض، زکریا ۱۰/۵۱۱، کراچی ۶/۷۶۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍شوال المکرّم ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۹۱۷)

تقسیم سے پہلے ترکہ میں تصرف، نیز لڑکیوں کی تمام ترکہ میں حصہ داری

سوال [۱۱۵۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید کے انتقال کے بعد اس کے وارثین میں چار لڑکے اور دولڑکیاں ہیں،

متروکہ مال میں منقولہ اور غیر منقولہ دونوں ہیں، از روئے شریعت متروکہ مال کی تقسیم کس طرح ہوگی؟ اور کس حساب سے ہوگی؟

(۲) لڑکیاں صرف منقولہ اموال میں اپنے شرعی حصہ کی مستحق ہیں، یا صرف اموال غیر منقولہ میں یا دونوں میں سے اپنا شرعی حصہ لے سکتی ہیں؟

(۳) از روئے شریعت اموال غیر منقولہ کے تحت زیورات، نقد رقم، لباس، چار پائی، تخت، میز کرسی، برتن، فرش اور دیگر روزانہ کام آنے والی اشیاء آتی ہیں یا نہیں؟

(۴) زید کے انتقال کو گیارہ سال کا عرصہ ہوگیا، لیکن ورثاء میں اس کی متروکہ میراث تقسیم نہیں ہوئی، اتنا عرصہ گذرنے کے بعد میراث کی تقسیم کا نہ ہونا یہ فعل شرعی ہے یا غیر شرعی؟

(۵) متروکہ اموال منقولہ وغیر منقولہ کا ورثاء میں شرعی تقسیم سے قبل کسی بھی وارث کا اپنے ذاتی کام میں لانا اور اس میں تصرف، ترمیم وتوسیع اور اس میں شکست وریخت اور اس کی ہیئت کذائی کی تبدیلی جائز ہے یا نہیں؟

(۶) زید کی غیر منقولہ جائیداد میں سے مکان کے بیرونی حصہ میں بعض ورثاء نے دوکانیں تعمیر کرادی ہیں، اس بارے میں ورثاء میں سے ایک وارث (لڑکی) سے نہ تو مشورہ کیا گیا نہ اس کاروئی سے اسے آگاہ کیا گیا، ایسی صورت میں دیگر ورثاء کا یہ عمل قرآن و حدیث کے مطابق ہے یا نہیں؟ اور جائز ہے یا ناجائز؟

(۷) ورثاء میں سے ایک وارث (لڑکی) اپنے والد مرحوم کی میراث کی تقسیم اور اس کا حق شرعی دیئے جانے کا مطالبہ کرتی ہے، تو اس کا یہ عمل از روئے شریعت جائز ہے یا ناجائز؟ وضاحت فرمائی جائے۔

المستفتی: افتخار احمد، معرفت حکیم عبدالقوی صدیقی جے پور راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱)

زید میـــــــــــــــــــــــــــت ۱۰

ابن	ابن	ابن	ابن	بنت	بنت
۲	۲	۲	۲	۱	۱

زید کا ترکہ مندرجہ بالا نقشہ کے مطابق دس سہام میں تقسیم ہوکر لڑکوں کو دو دو اور لڑکیوں کو ایک ایک سہام ملے گا۔

(۲) لڑکیاں اموال منقولہ اور غیر منقولہ دونوں میں شرعی حصہ کی مستحق ہیں اس لیے کہ ان کا والدین کے ساتھ نسبی رشتہ کا تعلق ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ ۱۱/ ۴۴۱)

ثم يقسم الباقي بين ورثته الذين ثبت إرثهم بالكتاب والسنة. (در مختار، كتاب الفرائض، زكريا ۱۰/ ۴۹۷، كراچى ٦/ ٧٦١-٧٦٢، مجمع الأنهر مصرى قديم ٢/ ٧٤٧، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ٤٩٥، البحر الرائق كوئٹه ٨/ ٤٨٩، زكريا ٩/ ٣٦٧، سراجى ص: ٦)

و يستحق الإرث بنسب و نكاح وولاء. (مجمع الأنهر قديم ٢/ ٧٤٧، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ٤٩٥)

(۳) سوال میں ذکر کردہ تمام چیزیں منقولہ اشیاء میں داخل ہیں، اموال غیر منقولہ میں نہیں، غیر منقولہ اس کو کہتے ہیں کہ جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہ ہوسکیں۔

(۴) انتقال کے بعد وراثت کی تقسیم میں اتنی تاخیر کرنا شرعاً درست نہیں، اس لیے کہ ایسی صورت میں بہت سے وارثین کا حق مارا جاتا ہے، کیونکہ مورث کے مرنے کے بعد اسی وقت سے ہر وارث کو اپنے حصہ سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہوجاتا ہے اور تقسیم نہ ہونے کی صورت میں بہت سے وارث ایسے رہ جاتے ہیں جو اپنے حق سے فائدہ نہیں اٹھا پاتے، مثلاً: شادی شدہ لڑکیاں، اسی طرح وہ لڑکے جو باپ کی فیملی میں نہیں ہیں، وغیرہ وغیرہ بلکہ ان کے حق سے وہی لوگ فائدہ اٹھالیتے ہیں جن کے قبضہ میں میراث ہوتی ہے۔

(۵) وراثت تمام ورثاء کا مشترک حق ہے، جب تک متعین طور پر اپنے حصہ کا پتہ نہ چل جائے محض اپنے ذاتی مفاد کے لیے اس میں ترمیم وتبدیلی اور تصرف کرنا ناجائز ہے، اس لیے فوری طور پر تقسیم کرلینی چاہئے، اس کے بعد اپنے حصہ میں آزادانہ تصرف کریں۔

(۶) دوکانیں تعمیر کرانے میں مضائقہ تو نہیں ہے، مگر اس کا کرایہ تمام ورثاء کو پہنچنا چاہیے، کیونکہ یہ حق مشترک ہے، لہٰذا اس میں لڑکی سے اجازت لینا ضروری تھا، اور اس کی اجازت کے بغیر دوکان بنانا جائز نہیں، اور اگر لڑکی نے اجازت دی ہے تو اس کا حق اس کو پہنچنا ضروری ہے۔

(۷) شرعاً لڑکی اپنے والدین کے ترکہ کی وارث ہوتی ہے، اس لیے اس کا اپنے حق کا مطالبہ کرنا خلاف شریعت اور ناجائز نہیں ہے، بلکہ یہ بالکل عین شریعت کے مطابق صحیح اور درست ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۵۵۶)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/ ۳/ ۱۴۲۱ھ

بھائی بہنوں کی شادی کا خرچہ ترکہ سے مجریٰ کرنا

سوال [۱۱۵۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم پانچ بھائی ہیں اور پانچ بہنیں ہیں، سوال یہ ہے کہ تین بھائی ایک جگہ اور دو بھائی الگ الگ ہیں، جو الگ ہیں یہ بڑے بھائی ہیں، اور تین چھوٹے ہیں جو ایک جگہ ہیں، سب شادی شدہ ہیں اور والد صاحب کا انتقال ہو چکا ہے اور والدہ حیات ہیں اور تین بھائی انہیں کی شرکت میں ہیں اور والد صاحب کے زمانہ میں بڑی بہن اور بڑے بھائی کی شادی ہوئی، اور باقی کچھ شادی موجودگی میں والد صاحب کی ہوئی ہیں، اور کچھ والد صاحب کے انتقال کے بعد ہوئی ہیں، لیکن جو شادی ہوئی، علاوہ دو کے سب خرچ انہیں تین بھائیوں نے کیا ہے، اور دو بھائیوں نے کچھ خرچ نہیں کیا ہے، اب سوال یہ ہے کہ جو ترکہ میں جائیداد ہے، یا کچھ مال ہو تو اس کی تقسیم ازروئے شرع کس طرح ہوگی؟ آیا ان دو بھائیوں کو بھی کچھ ملے گا یا نہیں؟ جبکہ ان کی شادی والد صاحب نے کی، اور انہوں نے کچھ خرچ بھی نہیں کیا، تو ان کا حصہ بھی کچھ جائیداد میں ہوگا یا نہیں؟ اگر ہوگا تو کتنا ہوگا؟ اور جو ان تین بھائیوں نے خرچ کیا ہے وہ بھی مجریٰ ہوگا یا نہیں؟ اور باپ کی جائیداد میں بہنوں کا حصہ ہے یا نہیں؟ اور والدہ کا کیا حصہ ہے؟ اور باقی بھائیوں کا کیا حصہ ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ما تقدم وعدم

موانع ارث آپ کے والد صاحب کا کل ترکہ تمام وارثین کے درمیان درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

$\frac{۹۰}{۶}$

میـــــــــــــــــــــــــــت

ماں	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی
$\frac{۱}{۱۵}$	۱۰	۱۰	۱۰	$\frac{۵}{۱۰}$	۱۰	۵	۵	۵	۵	۵

کل ترکہ ۹۰ ر سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث کو اتنا ملے گا جو اس کے نیچے درج ہے، صورت مسئولہ میں جن لوگوں کی شادی باپ کی موجودگی میں ہوئی ہے، ان کی شادی کا خرچہ باپ کے ترکہ میں کاٹا نہیں جائے گا بلکہ وہ لوگ باپ کے ترکہ میں پوری طرح حصہ دار ہوں گے، چاہے ان لوگوں نے دوسرے بھائی بہنوں کی شادی میں مدد کی ہو یا نہ کی ہو، اور جن بھائی بہنوں کی شادی والد کی وفات کے بعد ہوئی ہے اور ان کی شادی میں بھائیوں نے اپنی طرف سے خرچ کیا ہے تو وہ ان بھائیوں کی طرف سے تبرع اور احسان ہے، یہ خرچ اپنے بھائیوں سے وصول کرنے کا حق نہ ہوگا، ہاں البتہ اگر یہ بات پہلے طے کرلی گئی ہوتی کہ شادیوں میں جو خرچ ہوگا وہ ان بھائی بہنوں کے حصے میں سے کاٹ لیا جائے گا تو گویا بھائیوں نے مدد نہیں کی ہے بلکہ ان کی شادیوں میں قرض دیا ہے، تو ایسی صورت میں ان کے حصہ میں مجریٰ کرنے کی گنجائش ہے، اور اگر ایسی بات پہلے سے طے نہیں ہوئی تو میراث میں سے مجریٰ کرنا جائز نہ ہوگا، لہٰذا باپ کا ترکہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ سب کو پورا پورا حصہ شرعی اعتبار سے ملے گا، ہاں البتہ بہنوں کو بھائیوں کے مقابلہ میں آدھا ملے گا۔

ولایجوز لأحدهما أن يتصرف في نصيب الآخر إلا بأمره وكل واحد منهما كالأجنبي في نصيب صاحبه. (عالمگیری، کتاب الشركة، الباب الأول، الفصل الأول، زکریا قدیم ۲/ ۳۰۱، جدید ۲/ ۳۱۱، هدایه اشرفی دیوبند ۲/ ۶۲۴)

أما إذا كان بغير أمره فلأنه تبرع بإسقاط الحق عنه فلا يملك أن

یجعل ذٰلک مضمونا علیه. (بدائع الصنائع، فصل فی حکم الهبة کرچی ۱۳۲/۶، زکریا ۱۸۹/۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۱۸؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۶۱)	۱۴۲۱/۵/۱۸ھ

شادی کے خرچہ کو متروکہ میراث میں مجریٰ کرنا

سوال [۱۱۵۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: حاجی محمد یاسین صاحب کا انتقال ہوا، ان کے ورثاء میں ان کی بیوی انجم پروین، اور تین لڑکے: تبریز یاسین (۱۷؍سال)، نوید یاسین (۱۸؍سال)، جاوید یاسین (۱۰؍سال) اور دو بیٹیاں: شگفتہ یاسین (۱۸؍سال)، سلمہ یاسین (۹؍سال) ہیں، انتقال کے چار سال بعد شگفتہ یاسین کی اور آٹھ سال بعد تبریز یاسین کی شادی ہوئی اور غیر شادی شدہ بھائی بہنوں نے اس امید سے اجازت دی کہ باپ کے بقیہ متروکہ مال میں سے ہم سب کی شادیاں ہوں گی، اب تبریز جن کی شادی ہو چکی ہے وہ الگ ہونا چاہتے ہیں اور غیر شادی شدہ بھائی بہن یہ چاہتے ہیں کہ پہلے ہماری شادیاں باپ کے متروکہ مال میں سے ہو جائیں جیسا کہ تبریز کی شادی باپ کے متروکہ مال سے ہوئی ہے اس کے بعد جائیداد کی تقسیم شرعی اعتبار سے ہو؟

المستفتی: نوید یاسین ولد حاجی محمد یاسین مرحوم اصالت پورہ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حاجی محمد یاسین کا ترکہ اس کے شرعی ورثاء کے درمیان حسب ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

محمد یاسین میت ۸/۶۴

بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی
انجم پروین	تبریز یاسین	نوید یاسین	جاوید یاسین	شگفتہ پروین	سلمہ یاسین
۱/۸	۱۴	۱۴	۱۴	۷	۷

کل ترکہ ۶۴؍سہام میں تقسیم ہوکر جن ورثاء نے متروکہ میراث سے شادیاں کی ہیں اورغیر شادی شدہ ورثاء نے اس بات پر اجازت دی ہے کہ ان کی شادیاں بھی متروکہ میراث سے ہوں گی ، تو ایسی صورت میں سب کی شادیاں متروکہ میراث سے ہونی چاہئیں، اور ہر ایک کے خرچے میں مساوات کی رعایت بھی ضروری ہے، لہٰذا اگر دوسروں کی شادی سے قبل شادی شدہ افراد الگ ہو جانا چاہیں تو تقسیم ترکہ کے وقت ان کے حصوں سے شادی کا خرچ مجریٰ کرلینا ضروری ہے تاکہ میراث میں سب کے حصے برابر باقی رہیں، لہٰذا ان لوگوں کے حصوں میں سے اتنا کم کردے جتنا شادی میں خرچ ہوا ہو۔

لایجوز لأحد من المسلمین أخذ مال أحد بغیر سبب شرعي. (شامی، کتاب الحدود، مطلب: فی التعزیر بأخذ المال کراچی ٤/٦١، زکریا ٦/١٠٦، البحر الرائق کوئٹه ٥/٤١، زکریا ٥/٦٨، هندیه زکریا قدیم ٢/١٦٧، جدید ٢/١٨١)

لایجوز لأحد أن یتصرف فی ملک الغیر بغیر إذنه. (قواعد الفقه، اشرفی دیوبند ص: ١١٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۰۰۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۲۰/۵/۱۴۲۷ھ

کسی وارث کے مال کو دھوکہ دے کر اپنے نام جائیداد کرانا

سوال [۱۱۵۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محشر بانو کا انتقال ہوا، ان کے ورثاء میں دولڑکے ہیں: وقار علی اور محمد علی، پھر محمد علی کا انتقال ہوا، بوقت انتقال ایک بیوی فردوس جہاں اور ایک لڑکا عمران علی کو چھوڑا، اور جب فردوس جہاں مرض الموت میں مبتلا ہوئی تو بیماری کی حالت میں عمران علی کی عدم موجودگی میں وقار علی کا بیٹا ناصر عرف نستور جمال نے فردوس جہاں کے حصے اور عمران علی کے حصے کا بیع نامہ لکھوا کر فردوس جہاں سے دستخط کروالیے اور اس کی جانکاری عمران علی کو نہیں تھی ، پھر فردوس

جہاں کے انتقال کے بعد اس جعلی بیع نامہ کو دکھا کر پولیس کے ذریعہ عمران علی کو اپنے حصۂ پدری و مادری سے بے دخل کر کے گھر سے نکال دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ ناصر عرف نستور نے فردوس سے بیماری کی حالت میں جو بیعنامہ لکھوایا ہے وہ شرعی طور پر درست ہوا یا نہیں؟ نیز عمران علی کا حصہ اس کی جانکاری کے بغیر جو لکھوالیا ہے وہ بھی درست ہوا یا غلط ہوا؟ شرعی حکم سے آگاہ فرمائیں۔

المستفتی: عمران علی ولد محمد اصغر علی کسرول مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عمران علی کے شہر میں موجود ہوتے ہوئے اس کی ماں سے بیماری کی حالت میں خفیہ طور پر جو دستخط کرائے گئے ہیں وہ محض فریب اور دھوکہ دہی کی بات سمجھ میں آتی ہے، کس حالت اور کس طرح دستخط کرائے ہیں اس کی کوئی وضاحت نہیں اور نہ ہی اس میں باشرع دو عادل گواہوں کی شہادت کا ذکر ہے، ایسی صورت میں یہ محض دھوکہ اور فریب کی خریداری ہے جو شریعت میں جائز نہیں ہے، نیز اس دھوکہ دہی کے باوجود عمران علی کے حق پدری میں وہ بیع کسی طرح معتبر نہیں ہے اور محمد علی کے کل ترکہ کو آٹھ حصوں میں تقسیم کر کے سات حصے عمران علی کا حق ہے اس میں ماں کو کسی قسم کے تصرف کا حق نہیں ہے اگر ماں نے بحالت صحت شرعی گواہوں کی موجودگی میں بھی عمران علی کا حصہ بیچ دیا ہوتا تب بھی وہ بیع معتبر نہیں ہوتی، لہٰذا عمران علی کا حصہ عمران علی کو حوالہ کرنا شرعی طور پر لازم ہے، اور اس کو جو گھر سے نکال دیا گیا ہے وہ محض ظلم و زیادتی پر محمول ہے۔

عن سعید بن زید بن عمرو بن نفیل ان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم قال: من اقتطع شبرا من الأرض ظلما طوقه الله إياه يوم القيامة من سبع أرضين. (مسلم شريف، باب تحريم الظلم وغصب الأرض وغيرها، النسخة الهندية ٢/٣٣، بيت الأفكار رقم: ١٦١٠)

وقال أيضا: من أخذ شبرا من الأرض ظلما فإنه يطوقه يوم القيامة من سبع أرضين. (مسلم شريف، باب تحريم الظلم وغصب الأرض، النسخة الهندية ٢/٣٣، بيت الأفكار رقم: ١٦١٠)

لایجوز لأحد أن یتصرف فی ملک الغیرہ بغیر إذنه. (قواعد الفقه اشرفی دیو بند ص: ۱۱۰) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ ذی قعدہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۰۹۵۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/۱۱/۱۴۳۳ھ

ماں کے لیے یتیم بچوں کے ترکہ کو فروخت کرنے کی اجازت نہیں

سوال [۱۱۵۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے بڑے بھائی قمر علی کا انتقال ۲۲؍ ستمبر ۲۰۱۰ء میں ہو گیا تھا، جنہوں نے اپنے پیچھے اپنی بیوہ اور چار بچے، تین لڑکے، ایک لڑکی کو چھوڑا، بڑا لڑکا ۶؍ سال کا اور باقی دو ۵؍ و ۴؍ سال کے ہیں اور لڑکی تین سال کی ہے، میرے بھائی کی بیوی نے ایک کے بعد ایک جائیداد کو بیچنا شروع کر دیا اب بس ایک رہائشی مکان اور دوکان بچی جبکہ بیچی گئی جائیداد سے تیس ہزار روپئے ماہوار کی آمدنی تھی، مگر بچوں کے مستقبل کو ذہن میں نہیں رکھا، کچھ شواہد سے معلوم ہوا ہے کہ بچی ہوئی جائیداد کو بیچ کر کہیں اور نکاح کرنا چاہتی ہیں۔

اب آپ سے یہ معلوم کرنا ہے کہ کیا باقی بچی جگہ جائیداد بچانے کی نیت سے تاکہ بچوں کا حال ومستقبل خراب نہ ہو، دین وشریعت کی رو سے کچھ کیا جا سکتا ہے؟

المستفتیہ: گل رانا مغل پورہ مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قمر علی کی متروکہ جائیداد میں اس کی بیوی کا حق صرف آٹھواں حصہ بنتا ہے، اور اتنی جائیداد کا اسے بیچنے کا حق ہے، اس کے علاوہ بقیہ جائیداد وترکہ قمر علی کے یتیم بچوں کا حق ہے جس کو بیچنا قمر علی کی بیوہ کے لیے جائز نہیں ہے، اور بیچنے کی صورت میں وہ یتیموں کا ناحق مال کھانے والی ہے، جس کی سزا اللہ رب العزت نے جہنم کو قرار دیا ہے جو جائیداد بیچی گئی ہے اس کی رقم اور بقیہ جائیداد کو آٹھ حصوں میں تقسیم کر کے

آٹھواں حصہ بیوی کا ہے اور بقیہ سارا اولاد کے نام رجسٹری کرا کے محفوظ کردیا جائے تاکہ کوئی شخص اس کو ضائع نہ کرے، اور علاقہ کے بااثر لوگوں پر لازم ہے کہ جائیداد کو بیچنے سے بیوی پر پابندی لگائیں، اور یتیم بچوں کا حق ضائع نہ ہونے دیں۔

وما ملکه الیتیم من مال غیر ترکة أمه فلیس لوصی أمه التصرف فیه منقولا أو غیره لأن الوصی قائم مقام الأم ولیس للأم التصرف فی مال طفلها. (شرح المجلة رست اتحاد ۱/ ۵٤٦ رقم المادة: ۹۷٤)

مرحوم کا ترکہ درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

میت ۸

بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی
۱	۲	۲	۲	۱

مرحوم کا کل ترکہ آٹھ حصوں میں تقسیم ہوگا جس میں سے ایک حصہ بیوی کو اور دو، دو لڑکوں کو اور ایک حصہ لڑکی کو ملے گا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱ر ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۸۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱/ ۴/ ۱۴۳۵ھ

تنہا ایک وارث کو کاروبار اپنے نام رجسٹرڈ کرانا جائز نہیں

سوال [۱۱۵۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے والد محترم مرحوم کا بیڑی کا کاروبار ہے جو والد نے تقریباً ۱۹۵۵ء میں شروع کیا تھا، والد صاحب کے سامنے کاروباری پوزیشن کچھ خراب ہوگئی تھی، والد صاحب کا انتقال ۱۹۸۰ء میں ہوا، والد کا نام جناب اختر الدین صاحب، والدہ کا نام: صابرہ بی، اور بیٹوں کے نام: افسر الدین، سلیم الدین، نسیم الدین، شمیم الدین، نعیم الدین، فہیم الدین، وسیم الدین، بیٹیاں: راشدہ بی، ساجدہ بی، خالدہ بی، اس کے بعد ہم سب لوگ کاروبار میں محنت

کرتے رہے ۱۹۹۳ء کے قریب اس کاروبار میں ایک بھائی نے پیسہ لگایا اور اس کے بعد ایک اور بھائی بھی اس کاروبار میں شریک ہوگئے، پھر ان دونوں نے اس کاروبار کو اپنے نام رجسٹرڈ کرالیا، جس کی خبر گھر میں ان دونوں کے علاوہ کسی کو بھی نہیں تھی، کیا یہ صحیح ہے؟ جب کہ ہم سب لوگ کاروبار میں محنت کرتے رہے، وقتاً فوقتاً تھوڑا بہت پیسہ بھی لگاتے رہے، کیا باقی بھائی بہنوں کا اس کاروبار میں کوئی حق ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کس وارث کا کتنا حق ہے؟ واضح رہے کہ فی الوقت ایک بھائی کا انتقال ہوچکا ہے، وارثین میں بیوی آمنہ بی تین بیٹیاں: اسماء، صائمہ، آسیہ ہیں، میری والدہ کا بھی انتقال دوسال پہلے ہوچکا ہے، البتہ بھائی کا انتقال پہلے ہوا ہے، اور ماں کا انتقال بعد میں ہوا ہے۔

المستفتی: فہیم الدین وبرادران، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: برتقدیر صحت واقعہ مسئولہ صورت میں مذکورہ معاملہ میں قدرے تفصیل ہے، اولاً تو یہ دیکھا جائے گا کہ والدصاحب کے انتقال کے وقت ان کا کل ترکہ کیا تھا؟ اس ترکہ میں ان کے وارثین حسب حصص شرعیہ مستحق ہوں گے، جن میں بیٹیاں اور بیوی بھی شامل ہے، اس کے بعد جو چلتا ہوا کاروبار ہے اس سے جو نفع حاصل ہوگا اس میں وہ سب بھائی اپنے حصوں اور اپنی طرف سے لگائی ہوئی مزید رقم کے تناسب سے حقدار ہوں گے، کسی بھائی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ دوسروں کی مرضی کے بغیر کاروبار اپنے نام رجسٹرڈ کرالے، البتہ اس نفع میں بیٹیوں اور بیوی کا حصہ نہیں ہے، اور اصل ترکہ وارثین کے درمیان درج ذیل تناسب سے تقسیم ہوگا:

اختر الدین میت

بیوی	بیٹا	بیٹا	بیٹا	بیٹا	بیٹا	بیٹا	بیٹا	بیٹی	بیٹی	بیٹی
صابرہ	افسر	نسیم	تسلیم	شمیم	نعیم	فہیم	وسیم	راشدہ	ساجدہ	خالدہ
۱ / ۱۷ / ۳۰۶۰	۱۴	۱۴ / ۲۵۲۰	۱۴ / ۲۵۲۰	۱۴ / ۲۵۲۰	۱۴ / ۲۵۲۰	۱۴ / ۲۵۲۰	۱۴ / ۲۵۲۰	۷ / ۱۲۶۰	۷ / ۱۲۶۰	۷ / ۱۲۶۰

توافق

افسر میــــــــــــــــــــــــــــت

ماں	بیوی	بیوی	بیٹی	بیٹی	بیٹی	بھائی	بھائی	بھائی	بھائی	بھائی	بھائی	بہن	بہن	بہن
صابرہ	آمنہ	اسماء	صائمہ	آسیہ	نسیم	سلیم	تسلیم	شمیم	نعیم	فہیم	وسیم	راشدہ	ساجدہ	خالدہ
۴	۳			(۱۶)										
۶۰/۴۲۰	۴۵/۳۱۵	۸۰/۵۶۰	۸۰/۵۶۰	۸۰/۵۶۰	۲/۱۴	۲/۱۴	۲/۱۴	۲/۱۴	۲/۱۴	۲/۱۴	۲/۱۴	۱/۷	۱/۷	۱/۷

تداخل

صابرہ بی میــــــــــــــــــــــــــــت

بیٹا	بیٹا	بیٹا	بیٹا	بیٹا	بیٹا	بیٹی	بیٹی	بیٹی
نسیم	تسلیم	شمیم	نعیم	فہیم	وسیم	راشدہ	ساجدہ	خالدہ
۲/۴۶۴	۲/۴۶۴	۲/۴۶۴	۲/۴۶۴	۲/۴۶۴	۲/۴۶۴	۱/۲۳۲	۱/۲۳۲	۱/۲۳۲

۲۴۴۸۰
المبلغ
الأحیــــــــــــــــــــــــاء

آمنہ	نسیم	سلیم	تسلیم	شمیم	نعیم	فہیم	وسیم	راشدہ	ساجدہ	خالدہ	اسماء	صائمہ	آسیہ
۳۱۵	۲۹۹۸	۲۹۹۸	۲۹۹۸	۲۹۹۸	۲۹۹۸	۲۹۹۸	۲۹۹۸	۱۴۹۹	۱۴۹۹	۱۴۹۹	۵۶۰	۵۶۰	۵۶۰

مرحوم اختر الدین کا ترکہ ۲۴۴۸۰ رحصوں میں تقسیم ہوکر اس میں سے ہر وارث کو اتنا اتنا ملے گا جو اس کے نام کے نیچے درج ہے۔

لأن التركة ما تركه الميت من الأموال صافيا عن تعلق حق الغير بعين من الأموال. (شامی، کتاب الفرائض، زکریا ۱۰/۴۹۳، کراچی ۶/۷۵۹)

إذا أخذ أحد الورثة مبلغا من نقود التركة قبل القسمة بدون إذن الآخرين وعمل فيه و خسر كانت الخسارة عليه كما أنه إذا ربح لايسوغ لبقية الورثة أن يقاسموه الربح. (شرح المجلة رستم اتحاد ۱/۶۱۰، رقم المادة: ۱۰۹۰، وهكذا في الهندية زكريا قديم ۲/۳۴۶، جديد ۲/۳۴۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍محرم الحرام ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۸۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۱/۱۶ھ

ایک وارث کا دوسرے وارث کے حصہ میں تصرف کا حکم

سوال [۱۱۵٦۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص مسمیٰ حاجی عرفان مرحوم لاولد تھے، بوقت انتقال ان کے ورثاء میں مرحوم کی بیوہ مسماۃ عظمت آپا اور پانچ بھتیجے، جن کی تفصیل اس طرح ہے:

(۱) شاہد علی حقیقی بھائی کے لڑکے جن کے چار بھتیجے: محمد یامین، اسلام الدین، حنیف احمد، شریف، باپ شریک بھائی کے لڑکے ہیں، حاجی عرفان صاحب کے تعلقات ایک بھتیجے شاہد علی سے خوشگوار رہے، اور دوسرے بھتیجوں سے تعلقات بعض ناگفتہ بہ حالات کے پیش نظر ناخوشگوار تھے، جس کی دلیل ان ہر دو قسم کے بھتیجوں کے ساتھ حاجی صاحب مرحوم اور ان کی اہلیہ کا وہ طرز عمل ہے جس کے اہل محلّہ شاہد ہیں، اسی وجہ سے حاجی صاحب نے اپنی جائیداد کی وصیت اپنے بھتیجے شاہد علی کے لڑکے طاہر علی کے نام کردی تھی، مرحوم کی اہلیہ جنّن عظمت آپا کا تعلق بھی شاہد علی اور ان کے بچوں کے ساتھ خوشگوار رہا، اور وہ بھی حسب وصیت اور تعلق کی بنیاد پر حاجی صاحب مرحوم کی صحرائی وسکنائی جائیداد طاہر علی کو دینے کا وعدہ کرتی رہیں، لیکن حالات نے اچانک کروٹ لی، جنّن عظمت نے جنت کمانے کے شوق میں مرحوم شوہر کی ساری جائیداد سارے ورثاء کو محروم کر کے ایک مدرسہ تعلیم القرآن کے نام کردی، واضح ہو کہ یہ مدرسہ جس آراضی پر تعمیر ہے وہ جنّن کے مرحوم شوہر کی عطیہ کی ہوئی ہے، جسے جنّن عظمت آپا نے یہ جائیداد محروم کرنے کے ارادے سے ان کے نام کرنی چاہی ان کے مرحوم شوہر نے بھتیجوں کا وہ گروپ جو اس جائیداد کی جانب سے مایوس تھا، جنّن عظمت کی حمایت میں کھڑا ہو کر حالات کو مزید بگاڑنے لگا، نوبت یہاں تک آئی کہ طاہر علی نے وصیت کو بنیاد بنا کر عظمت آپا کے خلاف عدالت میں دعویٰ کردیا کہ اس کی وصیت میرے نام ہے، لہٰذا یہ جائیداد مجھے دلوائی جائے، ادھر یہ ہوا کہ جس مدرسہ کے نام یہ جائیداد کی گئی ہے اس کے مہتمم جو ایک دیندار اور علاقہ کے معروف عالم دین ہیں (مولانا قاسم) انہوں نے اہتمام سے

استعفیٰ اس بنیاد پر دیدیا کہ جن کو اپنے مرحوم شوہر حاجی محمد عرفان کی جائیداد حاجی صاحب کے ورثاء کے درمیان شرعی تقسیم کیے بغیر مدرسہ کے نام کرنے کا حق نہیں ہے، اور نہ مدرسہ کو وہ جائیداد قبول کرنی چاہیے، انتظامیہ نے استعفیٰ قبول کرلیا، اب شکل یہ ہے کہ طاہر کی جانب سے قائم کیے ہوئے مقدمہ پر مدرسہ اپنا روپیہ پیسہ خرچ کر کے جن عظمت آپا کی طرف سے مقدمہ لڑ رہا ہے، مدرسہ کا پیسہ مقدمہ میں استعمال ہو رہا ہے، لوگ مسئلہ کی اصل صورت حال سے ناواقفیت کی بنا پر یہی سمجھتے ہیں کہ مدرسہ دینی ادارہ ہے اس کو جائیداد ملے گی تو مدرسہ کا فائدہ ہوگا، لہٰذا بہر صورت مدرسہ کا ساتھ دیا جائے، اور اب انتظامیہ نے مقدمہ پر باقاعدہ مدرسہ کی رسید بک لے کر چندہ کرنا شروع کردیا ہے، اسی مدرسہ کے ایک مدرس جو عالم ہیں، بہار کے رہنے والے ہیں وہ بستی کے دیگر علماء کی طرح اس طرح مدرسہ کو جائیداد لینے اور اس پر مقدمہ لڑانے کے لیے مدرسہ کا پیسہ استعمال کرنے کے لیے دبے لفظوں میں منکر تو ہیں لیکن چندہ کرنے والوں کے ساتھ گھومتے پھرتے ہیں اور چندہ کرنے میں شریک ہیں، اور اپنا عذر یہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک پردیسی ہوں، مدرسہ کا تابع ہوں، لہٰذا انتظامیہ جو حکم کرے گی مجھے ماننا پڑے گا۔

جواب طلب امر یہ ہے کہ: (۱) حاجی عرفان صاحب مرحوم کی جائیداد صحرائی وسکنائی کی شرعی تقسیم کی کیا شکل ہوگی؟ کیا حاجی صاحب مرحوم کی وصیت ان کے پوتے طاہر علی کے حق میں شرعاً نافذ ہوگی، اگر ہاں تو کتنے مال میں وصیت نافذ ہوگی، پوری جائیداد میں یا اس کے کتنے حصہ میں؟

(۲) کیا حقیقی بھتیجے اور باپ شریک بھائی کے لڑکے میراث پانے میں برابر کے حق دار ہیں، یا کم وبیش کا فرق ہے؟

(۳) حقیقی بھائی کا صرف ایک لڑکا ہے، اور باپ شریک بھائی کے چار لڑکے ہیں تو کیا سب بھتیجے برابر کے شریک ہیں یا تقسیم میراث میں یہ اعتبار بھی کیا جائے گا، کہ ایک بھائی کا ایک لڑکا آدھی جائیداد اور دوسرے بھائی کے چار لڑکے ہیں، دوسری آدھی میں سب شریک ہوں گے؟

(۴) اگر سب بھتیجے برابر کے شریک ہیں تو ایک بیوہ اور پانچ بھتیجوں میں حاجی کی کل

جائیداد وصیت کے ہوتے ہوئے کس طرح تقسیم ہوگی؟

(۵) کیا حاجی صاحب مرحوم کی بیوہ کو شرعاً یہ حق ہے کہ وہ ساری جائیداد میں تن تنہا تصرف کر کے جس کو جو چاہے دیں اور جس کو چاہے محروم کر دیں؟

(٦) کیا مدرسہ کو اس طرح کی جائیداد قبول کرنے کا حق ہے؟ کیا مدرسہ کی دینی تعلیم اور دین سے ناآشنا منتظمین کو مدرسہ کے لیے اس قسم کی جائیداد لینے کا صرف اس لیے حق ہے کہ یہ دینی ادارہ ہے، مدرسہ کے لیے جو پیسہ لیا جارہا ہے وہ جائز ہے یا نا جائز؟

(۷) اس صورت حال کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ بستی کے سارے علما اس پوری صورت حال میں حاجی عرفان کی بیوہ عظمت آپا کے لیے ساری جائیداد میں تن تنہا تصرف کے حق اور پھر اس سے بڑھ کر جانتے بوجھتے، مدرسہ کی اس جائیداد کو قبول کرنے اور اس سلسلے میں مقدمہ بازی میں عوام کا روپیہ خرچ کرنے کو جائز نہیں مانتے اور عوام اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ آپا عظمت نے کسی کو جائیداد نہ دے کر جنت کمالی ہے کہ ساری جائیداد اللہ کی راہ میں دیدی، لہٰذا کوئی کون ہوتا ہے ان کو روکنے والا؟

اس مکمل صورت حال کو سامنے رکھ کر آپ ہمارے ساتوں سوالوں کا ترتیب وار مفصل ومدلل جواب عنایت فرما دیں، تاکہ اس مسئلہ کو لے کر اس کی شرعی حیثیت کے بارے میں بستی میں جو کنفیوزن اور تردد کی فضاء پائی جاتی ہے وہ آپ کے بے لاگ اور شرعی دوٹوک جواب سے واضح اور متعین ہو جائے۔

نوٹ: یہ وضاحت بھی فرمادیں کہ مذکورہ بالا تفصیل کی روشنی میں اگر مقدمہ (جس کے نام جائیداد کی گئی ہے) مقدمہ جیت جاتا ہے تو اس کے لیے جائیداد محض دنیاوی عدالت میں جیتنے سے جائز ہو جائے گی؟

المستفتی: اہل محلّہ مولویان وقاضیان قصبہ سہس پور بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حاجی عرفان صاحب کی جائیداد میں بھتیجے شاہد علی کے لڑکے طاہر علی کے حق میں شرعاً تہائی مال میں وصیت نافذ ہوسکتی ہے، حقیقی بھتیجہ کے ہوتے

ہوئے...... باپ شریک بھائی کے تمام لڑکے محروم ہوجائیں گے، اور وصیت پوری کرنے کے بعد باقی مال کو چار حصوں میں تقسیم کرکے ایک حصہ بیوی جَبن عظمت آپا کو اور بھتیجہ شاہد علی کو بقیہ تین حصے مل جائیں گے...... اور جَبن عظمت آپا کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ تنہا اس جائیداد میں تصرف کرے اور جس کو چاہے دیدے، اور ورثاء کو محروم کردے، اسی طرح پوری جائیداد مسجد یا مدرسہ میں وقف کردینے کا بھی حق نہیں ہے، اور یہ وہم غلط ہے کہ وارثین کا حق مار کر مدرسہ کو پوری جائیداد وقف کردینے سے جنت کمالی گئی ہے، لہٰذا ایک تہائی میں وصیت نافذ کرنے کے بعد بقیہ جائیداد کو چار حصہ کرکے ایک حصہ جَبن عظمت آپا کی ملکیت ہے وہ صرف اپنی ہی ملکیت کے حصہ کو مدرسہ کے لیے دینا چاہے تو دے سکتی ہے، باقی حصے میں عظمت آپا کا کوئی حق نہیں ہے اور عظمت نے بقیہ حصہ میں تصرف کرکے مدرسہ کو جو دیا ہے وہ دینا صحیح نہیں ہوا ہے، وہ جائیداد حقداروں کو واپس کردینا لازم اور ضروری ہے، نیز حقداروں کے حق مارنے کے لیے اہل مدرسہ کا مقدمہ بازی کرنا قطعاً جائز نہیں ہے، اہل مدرسہ پر لازم ہے کہ حقداروں کے حق کو فوراً واپس کردیں۔

لایجوز التصرف فی مال غیرہ بلا إذنہ ولا ولایتہ. (در مختار مع الشامی، الغصب، مطلب: فیما یجوز من التصرف بمال الغیر زکریا ۹/۲۹۱، کراچی ٦/۲۰۰، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۲۸/۲۹٦، شرح المجلة رستم اتحاد ۱/٦۱، رقم المادة: ۹٦)

لایجوز لأحد أن یأخذ مال أحد بلاسبب شرعی. (قواعد الفقه، اشرفی ۱۱۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ رجب المرجب ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۷/۸۴۷۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/۷/۱۴۳۵ھ

چچا کے کل متروکہ مال میں چچی کا تصرف

سوال [۱۱۵٦٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: میرے چچا اور چچی لا ولد تھے ان کے پاس تقریباً چودہ بیگہ زمین تھی وہ کہا کرتے تھے کہ اگر میرا انتقال ہوگیا تو یہ زمین تیری چچی کی رہے گی، اس کے بعد تو اور تیرے بچے مالک ہوں گے، بلکہ انہوں نے ایک بار وصیت بھی لکھ دی تھی، بہرحال چچا کا انتقال ہوگیا اور اس آراضی کا دنیاوی قانون کے اعتبار سے چچی کے نام داخل خارج ہوگیا، اس لیے چند سال اس کی پیداوار سے بافراغت اپنی بسر اوقات کرتی رہیں، اب چچی آراضی مذکورہ کو مدرسہ اسلامیہ کے نام وقف کرنا چاہتی ہیں، لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ شریعت مطہرہ کی رو سے آراضی مذکورہ میں کچھ میرا بھی حق یا حصہ ہے یا نہیں؟

المستفتی: شاہد علی ولد عزت سہس پور بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چچا کے انتقال کے وقت آپ کے چچا کے بھائیوں اور بہنوں میں سے اگر کوئی زندہ رہا تو شرعی قانون کے مطابق مال کو تین حصہ کر کے ایک حصہ میں آپ کے حق میں وصیت ہوسکتی ہے، اور باقی دو حصہ کے چار حصہ کر کے چوتھائی حصہ چچی کا ہوگا، اور باقی تین حصے چچا کے بھائیوں اور بہنوں کے لیے ہوں گے، اور اگر بھائی بہنیں موجود نہیں تھے تو آپ کے چچا کے جتنے بھتیجے موجود ہیں وہ سب ایک چوتھائی کے بعد مابقیہ تین حصہ کے حقدار ہوں گے، جس میں آپ بھی شامل ہوں گے، مگر یہ تفصیلی وضاحت اس وقت لکھی جاسکتی ہے جبکہ آپ چچا کے بھائی بہن اور بھتیجوں کی پوری وضاحت لکھ دیں گے، اس سے پہلے مکمل جواب مشکل ہے، ہاں البتہ آپ کی چچی کو پوری جائیداد میں تصرف کرنا یا پوری جائیداد مسجد یا مدرسہ میں وقف کردینے کا حق نہیں ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ٨/٣٥٢، جدید زکریا مطول ١٣/٤٤٥)

لایجوز لأحد أن یتصرف فی ملک غیرہ بلا إذنه أو وکالة منه أو ولایة علیه وإن فعل کان ضامنا. (شرح المجلة رستم اتحاد ١/٦١- ٩٦)

لایجوز التصرف فی مال غیرہ بلا إذنه ولا ولایته. (در مختار مع الشامی، الغصب، مطلب: فیما یجوز من التصرف بمال الغیر زکریا ٩/٢٩١، کراچی ٦/٢٠٠،

الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٨/٢٩٦، شرح المجلة رستم اتحاد ١/٦١، رقم المادة: ٩٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍صفر المظفر ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۹۳۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۲/۲۷ھ

والد کے مکان میں اقامت پذیر لڑکی سے کرایہ مانگنا

سوال [۱۱۵۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) مسماۃ ذکیہ بی کے تین بھائی اور تین بہنیں ہیں، آج سے تقریباً ۲۵؍سال قبل جب تینوں بھائی دوسری جگہ رہنے چلے گئے، والد صاحب نے میری پریشانی دیکھ کر مجھ سے کہا کہ یہ میرا گھر خالی ہے تم لے لو اور بنا کر رہو، اور خود والد صاحب بھائیوں کے پاس رہنے چلے گئے، والد صاحب نے مجھے مکان دینے کی نوعیت نہیں بیان کی تھی کہ ہدیہ کے طور پر یا عاریت کے طور پر، میں نے اس وقت والد کے دیئے ہوئے کچے مکان کی پختہ تعمیر کرائی، جس میں اس وقت ساٹھ ہزار روپئے لگے تھے، اب بھائی لوگ اس وقت مکان خالی کرا رہے ہیں، والد کا بھی انتقال ہو چکا ہے اور ایک بہن کا جو شرعی حق بنتا ہے صرف وہی دینے کو تیار ہیں، اور میں نے جو تعمیر میں خرچ کیا اسی طرح گا ہے بگاہے پانچ سال کا مکان ٹیکس بھی بھرا ہے، سب کو کرایہ میں جوڑ رہے ہیں، اب دریافت طلب امر یہ ہے:

(۱) کہ والد نے جو مجھے مکان رہنے کو دیا ہے وہ کس نوع پر شمار ہوگا، کرایہ دینا پڑے گا؟

(۲) متنازعہ مکان جس کو میں نے آج سے ۲۵؍سال قبل تعمیر کرایا، جس کا خرچ ساٹھ ہزار روپیہ لگا تھا، اس کا خرچہ آج کے حساب سے جوڑا جائے گا یا نہیں؟ نیز وہ خرچ مجھے علیحدہ ملے گا یا نہیں؟ جبکہ بھائی لوگ مکان کا کرایہ اس طرح جوڑتے ہیں، ابتداء میں ۱۵؍سال تک دوسو روپئے ماہانہ، اور آخری گیارہ سال کے ایک ہزار روپیہ ماہانہ، جبکہ میں اس وقت ۲۰؍۲۵؍روپیہ ماہانہ کرایہ دیتی تھی، وہ بھی نہ بن پڑتا تھا، تو والد نے مجھے مکان رہنے کے

لیے دیا تھا، جو بھی شریعت کا فیصلہ ہو تحریر فرمائیں؟

المستفتیه: زکیہ بی کھنڈوہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر سوال اپنی جگہ سچائی پر مبنی ہے کہ والد نے بیٹی کو بلا صراحت رہنے کی اجازت دی ہے تو ایسی صورت میں جتنے سال بھی وہاں تعمیر کر کے رہی ہے وہ عاریت اور تبرع کے طور پر شمار کیا جائے گا اس کا کوئی بھی کرایہ کسی کو بھی نہ مقرر کرنے کا حق ہے اور نہ لینے کا حق ہے، اور بھائیوں کی طرف سے کرایہ کا مطالبہ کرنا شرعاً درست نہیں ہے، ہاں البتہ اگر وہ زمین میراث میں شمار کی جائے تو زکیہ بی کی تعمیر کردہ عمارت کی قیمت آج کے حساب سے لگانی ہوگی، آج جس کنڈیشن میں وہ عمارت ہے اس عمارت کی جو بھی قیمت سمجھدار لوگ آکر لگا دیں گے وہ پوری قیمت زکیہ بی کو ادا کرنی بھائیوں پر لازم ہے، اس کے بعد زکیہ بی اپنے حصہ میراث کی اس زمین میں حقدار بھی رہے گی۔

عن أبي أمامة الباهلي –رضي الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول في خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک و تعالیٰ قد أعطیٰ كل ذي حق حقه فلا وصية لوارث. (سنن الترمذي باب ما جاء لا وصية لوارث النسخة الهندية ۲/ ۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبي داؤد الوصايا، باب ماجاء في الوصية للوارث، النسخة الهندية ۲/ ۳۹٦، دار السلام رقم: ۲۸۷۰، سنن ابن ماجه، لاوصية لوارث النسخة الهندية ۲/ ۱۹٤ دار السلام رقم: ۲۷۱۳)

ولا بأس بتفضيل بعض الأولاد في المحبة لأنها عمل القلب وكذا في العطايا. (خانيه زكريا جديد ۳/ ۱۹٤، على هامش الهندية ۳/ ۲۷۹، تاتارخانية ۱٤/ ٤٦۲ رقم: ۲۱۷۲٥، در مختار مع الشامي زكريا ديوبند ۸/ ٥۰۱، كراچی ٥/ ٦۹٦، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٥/ ۲۰۰)

وتعتبر القيمة يوم الوجوب، وقال: يوم الأداء (در مختار) وتحته في الشامية: يعتبر يوم الأداء بالإجماع وهو الأصح. (شامي زكريا ۳/ ۲۱۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲٦ رشوال المکرم ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۵۰۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۱۰/۲٦ھ

تقسیم سے قبل ترکہ میں ہوئے تجارتی نفع کا حکم

سوال [۱۱۵۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید وبکر، خالد وعمر چار بھائی تھے، چاروں وطن میں ساتھ ساتھ رہتے تھے، والد موجود تھے، دونوں بڑوں یعنی زید وبکر کو والد نے ممبئ کمانے کے لیے بھیجا، مہینہ دومہینہ کے بعد بڑا والا بھائی زید واپس گھر چلا آیا اور دوسرا بھائی بکر ممبئ کمانے میں لگا رہا، پھر سال دوسال کے بعد تیسرے نمبر والے بھائی خالد کو بکر نے ممبئ بلایا، دونوں نے مل کر دس بارہ سال کمایا، اس کے بعد نمبر دو والے بھائی بکر نے نمبر ایک والے بھائی زید کے لیے قرض لے کر اور اپنی بیوی کا زیور بیچ کر اور نمبر دو والے بھائی بکر اور نمبر تین والے بھائی خالد نے کما کر پیسہ ایجنٹ کو دیا اور نمبر ایک والے بھائی زید کو کمانے کے لیے دبئ بھیج دیا، پھر زید نے خالد کو دبئ بلایا، دوکان بنائی، اس کے بعد نمبر دو والے بھائی بکر کو بلایا، تین سال تک دوکان میں تھوڑی سی آمدنی تھی، پھر دوسال کے بعد والد کا انتقال ہو گیا، دوکان کی قیمت ۳۲/ ہزار درہم رکھی گئی، بڑے بھائی زید نے آٹھ ہزار درہم اپنا حصہ لے لیا، اور دوکان اور کاروبار سے الگ ہو گیا اور بقیہ تین بھائیوں کا حصہ ایک ساتھ رہا، دوکان کو بکر چلاتا رہا، پھر اسی دوران بکر نے ایک اور دوکان دوسری جگہ اپنے نام کے لائسنس سے بنوالی، اسی دوران پہلی دوکان کا لائسنس جو زید کے نام تھا زید نے بٹوارے کے دوتین سال کے بعد لے لیا، پھر بکر اپنے نام کا لائسنس اس پہلی دوکان پر لگا کر کام کرنے لگا، پھر یہ دوکان دوتین سال کے بعد ٹوٹ گئی اور بکر اپنے نام کے لائسنس کو دوسری دوکان پر لے گیا پھر کما کما کر پورا گھر کا خرچہ دیا، اور اللہ کی رحمت سے آمدنی بہت زیادہ ہوگئی، دوتین دوکان اور بنائی اور کما کر گھر والوں کو سب دیتا رہا، پھر ۱۹۹۶ء میں عمر کا قتل ہو گیا، اس وقت عمر کے سارے بچے نابالغ تھے، سب سے بڑا والا بچہ چھ سات سال کا تھا، اس کو گولی لگ گئی تھی، اس کے علاج پر دس لاکھ روپئے کے قریب خرچ ہوئے جو بکر نے دیئے، اور تیسرے نمبر والا بھائی خالد کے گھر بیٹھ گیا، بکر کما کما کر دس بارہ سال تک

گھر والوں کو دیتا رہا، اور مقدمہ وغیرہ و دیگر اخراجات میں تقریباً آٹھ لاکھ درہم قرض ہوگیا، پھر خالد بٹوارے کے لیے وزٹ ویزا لے کر دبئی آیا تو اس وقت بکر کے ذمہ تقریباً آٹھ لاکھ درہم کا قرض تھا، اور سب دوکان کی قیمت چھ لاکھ تھی، خالد قرض میں حصہ دار بننے کے لیے تیار نہیں ہوا تو اس صورت میں کاروبار میں خالد کا حصہ ہوا یا نہیں؟

عمر کے بیوی بچوں کی دیکھ بھال اور سارے اخراجات بکر اٹھاتا رہا، سب بچے نابالغ تھے، خرچہ ومصارف کا یہ سلسلہ پندرہ سال چلا، بکر کاروبار کرتا رہا، بکر کا لڑکا بھی دس بارہ سال سے بکر کے ساتھ پورے طور پر کاروبار میں لگ کر ڈیوٹی دے رہا ہے، اب بکر کے پاس سترہ لاکھ درہم کی پراپرٹی ہے، عمر کمانے کے لیے کبھی دبئی نہیں آیا، صرف ایک بار گھومنے کے لیے ایک ہفتہ کے لیے دبئی آیا تھا، اب جو یہ سترہ لاکھ درہم کی پراپرٹی بکر کے پاس ہے اس میں عمر کے بچوں کا کتنا حق ہے؟

پندرہ سال کے عرصہ میں عمر کے بچوں کو خصوصی طور پر بڑھا کر خرچہ دیتا رہا، اسی دوران بکر نے عمر کے بیوی بچوں کے لیے تقریباً ۱۰؍ لاکھ روپئے (انڈین) کی زمین وگھر بھی خرید کر دیا ہے۔

المستفتی: عبدالخالق یوا ےای اعظم گڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ میں لکھی ہوئی پوری داستان کا حاصل یہ نکلا کہ باپ کی وفات تک سارے بیٹے کم وزیادہ مشترکہ کاروبار میں شریک رہے ہیں، اور باپ کی وفات کے وقت سوالنامہ کے مطابق ۳۲؍ ہزار درہم کا سرمایہ تھا، اس میں چار بیٹوں میں سے ایک بیٹا اپنا حصہ آٹھ ہزار درہم لے کر الگ ہوگیا، اس سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہر ایک بیٹا، ۸/۸؍ ہزار درہم کا حصہ دار ہے، لیکن درمیان میں خالد کاروبار چھوڑ کر گھر بیٹھ گیا ہے تو جس وقت وہ گھر بیٹھ رہا تھا اس کا حصہ الگ کر کے اس کو دیدینا چاہیے تھا، اور اگر آپس میں رضامندی سے کام چلتا رہا ہے اور خالد کو گھر کی دیکھ بھال کے لیے گھر چھوڑا گیا ہے تو خالد کو کاروبار میں مکمل شریک سمجھا جائے گا، لیکن سوال یہ ہے کہ جب خالد نے اپنی حصہ داری کا دعویٰ کیا تو بکر نے آٹھ لاکھ درہم کا قرض کیسے دکھایا، اور دوکان کی قیمت کل چھ لاکھ درہم کی بن رہی تھی، پھر

سترہ لاکھ درہم کا سرمایہ کہاں سے آگیا ہے؟ اس سے تجارتی اتار چڑھاؤ کی بات سمجھ میں آتی ہے، قرض ادا کرنے کے بعد ایماندارانہ طور پر مشترکہ تجارت میں سے خالد کا جو بھی شرعی حصہ بنتا ہے وہ اس کو دیدینا چاہیے، اور عمر کی موت کے وقت جو بھی سرمایہ تھا اس کا تہائی حصہ عمر کے وارثین کا حق بنے گا، اور بکر نے عمر کے بیوی بچوں کے لیے انڈیا میں جو جائیداد دی ہے اگر وہ عمر کے حصہ سے دی ہے تو اس کا حساب لگا کر کے اس کو عمر کا حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

لو اجتمع إخوة يعملون في تركة أبيهم ونما المال فهو بينهم سوية ولو اختلفوا في العمل والرائ. (شامي، مطلب: اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ولا يعلم التفاوت فهو بينهما بالسوية، زكريا ٦/٢ ٥٠، كراچی ٤/٣٢٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹ر محرم الحرام ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۸۵۵/۳۸)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۱/۱۹ھ

قبل التقسیم ترکہ میں کسی وارث کے تصرف کا حکم

سوال [۱۱۵۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسماۃ نصیباً نے انتقال کے بعد اپنے ورثاء میں شوہر وزیر احمد دولڑکے صدیق احمد وشبیر احمد اور ایک لڑکی بانو بیگم کو چھوڑا، پھر شوہر وزیر احمد کا بھی انتقال ہو گیا، اب صرف دو لڑکے اور ایک لڑکی وارث بچے، صدیق احمد نے تقسیم کے بغیر ہی مکان کا آدھا حصہ ۱۹۶۳ء میں فروخت کر دیا اور اس کے بعد یہ مکان تقریباً پانچ مرتبہ اور فروخت ہوا، آخر میں اسے بائع اول صدیق احمد کی لڑکی شاہجہاں نے خرید لیا، اب صدیق احمد کی بہن بانو بیگم کی جانب سے شبیر احمد کی اولاد نے مسماۃ شاہجہاں بیگم پر مقدمہ دائر کیا ہے کہ اس مکان میں ہمارا بھی حصہ ہے، اب پوچھنا یہ ہے کہ پورے نصف مکان پر جسے شاہجہاں نے خریدا ہے بیع کے احکام جاری ہوں گے یا صدیق کے حصہ کے بقدر ہی بیع مانی جائے گی، حالانکہ تمام خریدنے والے

آدھے مکان کی قیمت دیتے رہے ہیں۔

نوٹ: کل مکان کی آراضی ۱۰-۲۱۳؍مربع میٹر ہے جس میں شاہجہاں نے نصف ۵۵-۱۰۶؍مربع میٹر خریدا ہے۔

المستفتی: سید عاصم علی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب صدیق احمد نے فروخت کردیا تھا اور اس وقت شبیر احمد اور بانو بیگم کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں ہوا ہے اور اس کے بعد یکے بعد دیگرے چار پانچ مرتبہ اس پر خرید وفروخت کا معاملہ چلتا رہا ہے اور نہ شبیر احمد و بانو بیگم یا ان کے ورثاء نے دعویٰ کیا اور نہ ہی اعتراض پیش کیا ہے پھر اب اتنی مدت گذرنے کے بعد ورثاء کی طرف سے دعویٰ شرعی طور پر معتبر نہیں ہے، ہاں البتہ دعویٰ معتبر نہ ہونے کی وجہ سے عنداللہ ان کا حق باطل بھی نہ ہوگا، بلکہ ان کو آخرت میں ملے گا، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ خریدار شاہجہاں ان ورثاء کو بھی ثمن میں سے کچھ دے کر راضی کرلے، اور اسی طرح بائع بھی کچھ دے کر راضی کرلے تاکہ آخرت میں کسی حقدار کا دعویٰ باقی نہ رہے۔

باع عقاراً...... وابنه أو امرأته حاضر يعلم به ثم ادعىٰ الابن مثلاً أنه ملكه لاتسمع دعواه، وتحته في الشامية: رجل تصرف زمانا في أرض ورجل آخر يرى الأرض والتصرف ولم يدع ومات (إلى قوله) وإن لم يسبقه بيع (وقوله) إذا ترك الدعوىٰ ثلاثا و ثلاين سنة ولم يكن مانع من الدعوىٰ ثم ادعىٰ لا تسمع دعواه لأن ترك الدعوىٰ مع التمكن بدل على عدم الحق ظاهراً (وقوله) فلا تسمع الدعوىٰ في هذه المسائل مع بقاء الحق للآخرة. (شامی، کتاب الخنثیٰ، مسائل شتی زکریا ۱۰/۴۶۷، کراچی ۶/۷۴۲، کوئٹہ ۵/۵۲۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ربیع الثانی ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۷۱۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۷/۴/۱۴۱۹ھ

مشترکہ کمائی سے خریدی گئی جائیداد میں سب بھائی برابر کے حقدار ہیں

سوال [۱۱۵۷۰]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے پانچ بھائی ہیں، دو بھائی گھر کا کھیتی باڑی کا کام دیکھتے ہیں، تین بھائی باہر ممبئی، سعودی وغیرہ میں کام کرتے ہیں، کبھی کبھی باہر کے لوگ گھر پر کچھ پیسہ بھیجتے ہیں، ابھی موروثی جائیداد کا بٹوارہ نہیں ہوا ہے، سب مشترک چل رہا ہے، سوال یہ ہے کہ جو بھائی باہر رہ کر کام کررہے ہیں ان کی جو کمائی ہے آیا وہ کمائی ہوئی رقم اور جائیداد کے خود مالک ہیں، کسی اور کا حصہ اس میں نہیں ہے یا وہ مشترک ہے سارے بھائیوں کا اس میں حصہ ہے؟

المستفتی: ماسٹر صدیق عمر گونڈہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حسب تحریر سوال اگر پانچوں بھائی مشترکہ طور پر کمائی کرتے ہیں اور سب ایک ساتھ رہتے ہیں، اور کوئی بھی الگ نہیں ہوا ہے، اور ہر ایک کے درمیان پہلے سے یہی سمجھوتہ رہا ہے کہ ہم سب ایک ساتھ ہیں، ہماری کمائی بھی سب کے درمیان مشترک رہا کرے گی چاہے کسی کی کمائی زیادہ ہو اور کسی کی کمائی کم ہو تو ایسی صورت میں سب اپنی اپنی کمائی اور خریدی ہوئی جائیداد مشترک کرکے تقسیم کرلیں اور تقسیم کے وقت برابر کی تقسیم ضروری ہے، اور ایسے حالات میں عام طور پر بعد میں کسی کی نیت خراب ہوجاتی ہے، اس لیے بھائیوں کے درمیان پہلے سے ایک تحریر مرتب ہونی چاہیے تاکہ سب لوگ اس تحریر کے پابند رہیں اور اگر معاملہ ایسا نہیں ہے، بلکہ ہر ایک اپنی اپنی کمائی اپنے اپنے پاس رکھتے ہیں اور اگر عملاً مشترک نہیں ہیں اور باہر کے رہنے والے گھر پر رہنے والوں کے پاس جو پیسے بھیجتے ہیں، گھر کی ذمہ داری سمجھ کر نہیں بھیجتے ہیں، بلکہ بھائیوں کی مدد سمجھ کر بھیجتے ہیں، تو حکم دوسرا ہوگا، کہ ہر ایک اپنی کمائی کا خود ہی مالک ہوگا، جبکہ باہر جا کر کام کرنے والوں نے باپ کے سرمایہ سے کام شروع نہ کیا ہو اور بہتر یہی ہے کہ وہاں کے قریب کے کسی مفتی سے یا بڑے

عالم کو بیچ میں ڈال کر بھائیوں کے درمیان صلح کی شکل میں تصفیہ کرادیں۔

وکذا لو اجتمع إخوة یعملون فی ترکة أبیهم ونما المال فهو بینهم سویة ولو اختلفوا فی العمل والرائ. (شامی، مطلب: اجتمعا فی دار واحدة واکتسبا ولا یعلم التفاوت فهو بینهما بالسویة زکریا ۶/ ۵۰۲، کراچی ۴/ ۳۲۵) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۲۶۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/ ۴/ ۱۴۲۸ھ

کاروبار میں لگائے گئے ترکۂ میت کے منافع کے حقدار کون؟

سوال [۱۱۵۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ صالحہ خاتون ایک کاروبار میں شریک تھیں، ان کے چھ لڑکیاں اور پانچ لڑکے ہیں، اس میں سے دو لڑکے بھی اسی کاروبار میں شریک تھے، ۲۴؍ اگست ۱۹۹۹ء کو صالحہ خاتون کا انتقال ہوگیا، بعد انتقال ان کے تیسرے لڑکے نے کہا کہ والدہ کی جو بھی رقم کاروبار میں موجود ہے، وہ میں سب کو ادا کردوں گا، اور مجھے والدہ کے برابر شریک کرلیا جائے اس بات کو تسلیم کرلیا گیا، مگر آج تک تیسرے لڑکے نے والدہ کی رقم ورثاء کو ادا نہیں کی، ۲۲؍ اگست سے آج تک کاروبار میں نفع ہوا والدہ کی رقم سے لہٰذا اس نفع کے حقدار تمام ورثاء ہوں گے یا صرف تیسرا لڑکا تنہا حقدار ہوگا جبکہ تیسرے لڑکے نے آج تک والدہ کی رقم ورثاء کو ادا نہیں کی؟

المستفتی: محمد اکبر مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب یہ بات طے ہوگئی ہے کہ والدہ کی شرکت کا سارا سرمایہ ادا کرکے والدہ کی جگہ شریک بن جائے گا، تو جب تک والدہ کے سرمایہ کی قیمت وارثین کو ان کے حقوق کے مطابق ادا نہیں کرے گا، اس وقت تک مذکورہ کاروبار میں والدہ کی جگہ تیسرا لڑکا شریک نہ ہوگا، بلکہ جس دن ادا کرے گا اسی دن سے شریک شمار کیا جائیگا، لہٰذا والدہ کی وفات کے

بعداب تک جونفع ہوااس میں تمام ورثاء اپنے اپنے حقوق کے مطابق حقدار ہوں گے۔

الحق لایسقط بتقادم الزمان. (قواعد الفقه اشرفی دیوبند ص:۷۷) **فقط واللہ** سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍شوال المکرّم ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۹۱۵)

تقسیم سے قبل ترکہ میں ہونے والا نفع سب ورثاء کے درمیان مشترک ہے

سوال [۱۱۵۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے شوہر نے اب سے بیس سال قبل ایک فرم ایکسپورٹ کی دوکان ایک شخص کے ساتھ کھول کر ایکسپورٹ کا کاروبار شروع کیا، لگ بھگ دس سال بعد میرا لڑکا اسکول سے تعلیم پا کر آیا تو میرے شوہر نے اس شخص کے ساتھ پارٹنر شب ختم کرکے اپنے بیٹے کو فرم میں ۵۰؍ پرسینٹ کا پارٹنر بنایا اور پچاس پرسینٹ میرے شوہر پر ہوگئے میرے شوہر نے اپنی سب اولادوں کی شادی بھی کرلی، میرے شوہر کا لگ بھگ تین سال قبل انتقال ہوگیا، انہوں نے پیچھے ایک لڑکا اور تین لڑکیاں اور ایک بیوی چھوڑی، میں جاننا چاہتی ہوں کہ میرے شوہر نے فرم، سے یا اپنی الگ انکم سے جو بھی اپنی زندگی میں جائیداد وغیرہ خرید کر اس کو تعمیر کیا، فرم و رہائش کے مکان میں پیسہ لگایا وہ کس کا مانا جائے گا، وہ کس طرح تقسیم کیا جائے گا، اور یہ کہ میرے لڑکے نے تین سال گذر جانے پر بھی حق داروں کو حق ادا نہیں کیا ان کے انتقال کے بعد ان کے سرمایہ سے جو بھی کاروبار آج تک ہوا ہے ان کے نفع میں وارثوں کا حق بنتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: رضاء الرحمٰن عبداللہ جوادتمبا کووالا مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں جو صورت ذکر کی گئی ہے اس میں آپ کے شوہر نے اپنی ملکیت سے جو بھی کچھ خریدا اور جائیداد تیار کی اور تعمیر وغیرہ کرائی ہے وہ

سب ان کے شرعی ورثاء کا حق ہے جو ان کے درمیان تقسیم ہوگا اور اب تک آپ کے بیٹے نے جو دیگر ورثاء کا حق نہیں دیا ہے اس کی وجہ سے گنہگار ہوں گے، اس کے لیے ان کو اپنی ماں اور بہنوں سے معافی تلافی لازم ہے، اور اب تک باپ کے سرمایہ سے جو بھی کچھ کاروبار ہوا ہے اس کے نفع میں سب ہی ورثہ شریک ہوں گے اور تقسیم کی تاریخ کے دن جو بھی مرحوم کا ترکہ اور اس کا نفع ہے سب اس کے شرعی ورثاء کے درمیان درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

۴۰/۸

میت

بیوی	لڑکا	لڑکی		لڑکی	لڑکی
۱/۵	۱۴	۷	۷/۳۵	۷	۷

کل ترکہ ۴۰/ برابر حصوں میں تقسیم ہوکر بیوی کو پانچ حصے، لڑکے کو ۱۴/ حصے اور ہر لڑکی کو ۷/۷/ حصے ملیں گے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۸/۲۹۷، جدید زکریا مطول ۱۳/ ۴۴۹، فتاویٰ محمودیہ جدید ڈابھیل ۲۰/ ۳۰۹)

التركة في الاصطلاح ما تركه الميت من الأموال صافيا عن تعلق حق الغير بعين من الأموال. (شامي، كتاب الفرائض، زكريا ١٠/٤٩٣، كراچی ٦/٧٥٩)

وكذا لو اجتمع إخوة يعملون في تركة أبيهم ونما المال فهو بينهم سوية ولو اختلفوا في العمل والرائ. (شامي، مطلب: اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ولا يعلم التفاوت فهو بينهما بالسوية، زكريا ٦/٥٠٢، كراچی ٤/٣٢٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ شعبان المعظم ۱۴۳۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۷۸۰)

ترکۂ مشترک سے خریدی گئی زمین میں دوسرے ورثاء کا حصہ ہے یا نہیں؟

سوال [۱۱۵۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں : کہ مختار احمد، وکیل احمد، افتخار احمد تین بھائی ہیں والد کا انتقال ہوگیا، جبکہ افتخار احمد ابھی گود ہی میں تھے، اور مختار احمد شروع ہی سے الگ ہوگئے اور وکیل احمد چھوٹے بھائی افتخار احمد کو لے کر والدہ کے ساتھ رہنے لگے، وکیل احمد عمر میں بڑے اور گھر کے ذمہ دار اور کاروبار کے مالک تھے، کچھ مدت کے بعد وکیل احمد نے جنگل کا کام شروع کیا، بمبئی بھی رہے، پھر ایک دوکان بستی شہر میں کی اور دوسری گاؤں کے قریب مہولی بازار میں کی، افتخار احمد جب کاروبار دیکھنے کے لائق ہوگئے تو وکیل احمد نے بستی کی دوکان ان کے سپرد کرکے خود مہولی بازار کی دوکان پر بیٹھنے لگے، دونوں دوکانوں کی آمدنی سے مہولی بازار میں گھر بنا اور مشترکہ آمدنی سے بستی میں زمین خریدی گئی اس کے بعد وکیل احمد مسلسل بیمار رہنے لگے، حتی کہ دماغ سے معذور ہوگئے، اب سارا بار افتخار احمد کے اوپر پڑا۔

ادھر وکیل احمد کے لڑکے نااہل اور غیر ذمہ دار ہوگئے، مگر اب تک دونوں بھائی باقاعدہ الگ نہیں ہوئے ہیں، اگر چہ رفتہ رفتہ افتخار احمد نے اپنا انداز بالکل بدل دیا، اپنی لڑکی کی شادی میں تقریباً دولاکھ روپئے خرچ کرڈالے اور وکیل احمد کی لڑکی کی شادی میں دس ہزار روپیہ روپئے خرچ کیے، وکیل احمد کے لڑکے نے کئی مرتبہ دوکان کھولی مگر ناکام رہے، بالآخر لون پر ٹریکٹر نکال لیا، اور افتخار احمد نے اس کو اس اقدام سے روکنے میں خاصی دلچسپی نہیں لی، ورنہ غالبًا یہ کام نہ ہوتا اور اب اس سے بالکل بری ہونا چاہتے ہیں کہ ہمارا اس سے کوئی مطلب نہیں تم اپنے حصے کی زمین وجائیداد بیچ کر قرض ادا کرو، مجبور لڑکے نے اپنے چچا مختار احمد کے ہاتھ گاؤں والا گھر بیچ دیا، جس پر افتخار احمد کو بہت اعتراض ہوا، پھر اس نے بستی کی زمین فروخت کرنی چاہی، چند قریبی خیر خواہ اور سمجھ دار لوگوں نے بیچ میں پڑ کر ڈیڑھ لاکھ میں افتخار احمد کے ہاتھ اس کا سودا کرادیا، واضح رہے کہ اب تک دونوں بھائی عرفاً ایک ہی میں ہیں، جائیداد اور جملہ املاک کا باقاعدہ تفصیلی بٹوارہ نہیں ہوا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

(۱) کیا موجودہ صورتحال میں افتخار احمد کی بستی کی دوکان سے حاصل ہونے والی آمدنی میں وکیل احمد کا حصہ ہے یا نہیں؟ جبکہ وکیل احمد نے ہی ان کو پالا پوسا پڑھایا، لکھایا، شادی بیاہ

کیا، اور دوکان کھول کر ان کے ذمہ کی اور اب دماغ سے معذور معطل ہو کر لاچار پڑے ہیں؟

(۲) افتخار احمد کا وکیل احمد کو بستی کی دوکان مال نقدی وغیرہ میں حصہ نہ دینا کیسا ہے؟ جائز یا ناجائز حق بنتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: علی احمد خاں کبیر نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ میں ذکر کردہ تمام جائیداد دونوں بھائیوں کے درمیان مشترکہ سلسلہ آمدنی سے خریدی گئی ہیں، شروع میں بڑے بھائی وکیل احمد کی محنت زیادہ رہی، بعد میں چھوٹے بھائی افتخار احمد کی محنت اور عمل دخل زیادہ رہا بھائیوں کے درمیان مشترک کاروبار میں ایسا ہوتا رہتا ہے، لہٰذا اب تک کی جتنی آمدنی خرچہ، اخراجات عمل میں آئے ہیں سب مشترکہ کاروبار اور جائیداد سے متعلق ہی شمار ہوں گے اور اب جائیداد کاروبار، آمدنیاں اور دوکان کے سرمائے تقسیم ہوں گے، تو دونوں بھائیوں کے درمیان نصف نصف برابر برابر تقسیم ہوں گے کسی کو کسی سے زیادہ نہیں ملیں گے، لہٰذا بستی کی دوکان اور مہولی بازار کی دوکان دونوں کا سرمایہ دونوں بھائیوں کے درمیان آدھا آدھا تقسیم ہوگا، بستی کی دوکان بھی آدھی آدھی ہوگی، اور مہولی بازار کی دوکان بھی آدھی آدھی ہوگی۔

وكذا لو اجتمع إخوة يعملون في تركة أبيهم ونما المال فهو بينهم سوية ولو اختلفوا في العمل والرائ. (شامي، مطلب: اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ولا يعلم التفاوت فهو بينهما بالسوية، زكريا ٦/٥٠٢، كراچی ٤/٣٢٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۹۹۸)

میت کے ترکہ میں تجارت کی صورت میں شرکت کا حکم

سوال [۱۱۵۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل

کے بارے میں : حاجی حشمت حسین مرحوم نے اپنے انتقال کے بعد اپنی پہلی بیوی الفت خاتون (جن کا انتقال مرحوم حشمت حسین کی زندگی میں ہی ہوگیا تھا) سے پانچ بیٹے: عشرت حسین، مسرت حسین، عظمت حسین، نصرت حسین وفرحت پرویز اور دولڑکیاں: نفیسہ، شفیقہ۔

زوجۂ ثانیہ: بیوہ عقیلہ خاتون (جو ابھی حیات ہیں) سے دولڑکے نابالغ: شفقت حسین ورفعت حسین چھوڑے۔

انتقال کو تقریباً ۳۱ ربرس گذر چکے، انتقال کے بعد مرحوم حشمت حسین نے جو کاروبار چھوڑا تھا اس پر مسرت حسین، عظمت حسین، نصرت حسین وفرحت پرویز قابض رہے، اور آج تک چھوڑے گئے کاروبار یا اس سے متعلق کسی بھی جائیداد کو تقسیم نہیں کیا گیا ہے، والد کے انتقال کے بعد ایک عارضی تقسیم کر کے صرف عشرت حسین کو ان کا حصہ ادا کر دیا گیا تھا، زوجہ ثانیہ بیوہ عقیلہ خاتون کے دو نابالغ بیٹے شفقت حسین ورفعت حسین کی پرورش شادیوں اور رفعت حسین کی تعلیم کی ذمہ داری بھی عشرت حسین، عظمت حسین، نصرت حسین اور فرحت پرویز نے اٹھائی، اور رفعت حسین کی رہائش کے واسطے ایک کمرہ بھی اس حصہ پر تعمیر کروایا جو حصہ زوجہ ثانیہ بیوہ عقیلہ خاتون کے مہر میں لکھا ہوا ہے۔

اب جب تقسیم کی بات کہی جاتی ہے تو جائیداد اور کاروبار پر قابض چاروں بھائی: مسرت حسین، عظمت حسین، نصرت حسین، فرحت حسین کہتے ہیں کہ زوجہ ثانیہ بیوہ عقیلہ خاتون کے دونوں بیٹے شفقت حسین ورفعت حسین کو کاروبار کے حصوں کی وہ رقم ادا کی جائے گی جو ہم نے والد کے انتقال کے بعد اپنے بھائی عشرت حسین کو ان کے حصوں کی ادا کی تھی، اور کہتے ہیں کہ ہم نے اسی وقت بیوہ عقیلہ خاتون کے دونوں نابالغ بیٹوں شفقت حسین ورفعت حسین کے حصوں کی رقم بھی اپنے پاس محفوظ کر لی تھی، اور آج تک وہی رقم ہمارے پاس محفوظ ہے، اور چاروں بھائی مسرت حسین، عظمت حسین، نصرت حسین، فرحت پرویز کا کہنا ہے کہ ہم تقسیم سے پہلے زوجۂ ثانیہ بیوی عقیلہ خاتون کے دونوں بیٹوں شفقت حسین ورفعت حسین سے وہ رقم وصول کریں گے جو ہم نے ان کی شادیوں اور رہائشی کمرے کی تعمیر میں خرچ کی ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ جس کاروبار اور اس سے متعلق کسی جائیداد کو جب آج تک تقسیم ہی نہیں کیا گیا ہے اور نہ ہی آج تک تقسیم کی بابت بتایا گیا اور نہ ہی تقسیم کیا گیا، نہ کوئی حصہ اور رقم ادا کی گئی تو اس کاروبار اور اس سے متعلق جائیداد کو کس طرح تقسیم کیا جانا چاہیے، اور اس کاروبار و جائیداد پر مرحوم حشمت حسین کی زوجہ ثانیہ بیوہ عقیلہ خاتون اور ان کے دونوں بیٹوں شفقت حسین ورفعت حسین کا کتنا حق بنتا ہے؟ اور کیا شفقت حسین ورفعت حسین کو اپنی شادیوں، تعلیم اور رہائشی کمرہ کی تعمیر پر خرچ کی گئی رقم ان چاروں بھائیوں مسرت حسین، عظمت حسین، نصرت حسین وفرحت پرویز کو لوٹانی پڑے گی؟ مہربانی فرما کر شریعت کی روشنی میں بالوضاحت بیان فرمادیں؟

المستفتی: رفعت حسین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حشمت حسین کے انتقال کے بعد مال پر قابض چاروں لڑکوں کو چاہیے تھا کہ حشمت حسین کے تمام شرعی ورثاء کے درمیان ان کا ترکہ اسی وقت شرعی ضابطہ کے مطابق تقسیم کر دیتے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا، جس کی وجہ سے وہ عند اللہ گنہگار ہوئے، مورث اعلیٰ کے انتقال کے بعد اس کا تمام ترکہ وارثوں کی ملکیت بن جاتا ہے، لہٰذا شرعی حصوں کے مطابق اس کی تقسیم ہونی چاہیے تھی، افسوس کہ ۳۱ر سال گذر چکے اور شرعی تقسیم عمل میں نہیں آئی اور مشترک کاروبار چل رہا ہے، جس میں دونوں بیویوں کی اولاد شریک کاروبار ہے، اور سوال میں جس تقسیم کا ذکر کیا گیا ہے اس کا شرعاً اعتبار نہیں ہے، لہٰذا تمام ورثاء کو ایک جگہ بیٹھ کر قرآن وحدیث کے مطابق موجودہ کاروبار کی مالیت اور جائیداد وغیرہ کی موجودہ مالیت کا حساب لگا کر کل ترکہ کو حصص شرعیہ کے مطابق تقسیم کرنا چاہیے، اس لیے کہ باپ کی وفات کے بعد کاروبار میں جو ترقی ہوئی ہے وہ باپ کی مالیت کو رأس المال بنا کر ہوئی ہے، اور عارضی تقسیم کے وقت اگر عشرت بھائی کو تمام پونجی تقسیم کر کے جو شرعی حصہ بنتا ہے وہی عشرت کو دیا ہے تب تو عشرت مزید کسی چیز کا حقدار نہیں، اگر حساب شرعی کے اعتبار

سے وہ کم ہے تو اس کو پورا کرنا واجب ہے، اور رفعت وشفقت یہ چونکہ آخر تک شریک کاروبار رہے ہے، اس لیے اب جبکہ ۳۱؍سال کے بعد جائیداد وغیرہ کی تقسیم ہوگی تو عشرت کو مستثنیٰ کرنے کے بعد باقی سب بھائی چھوٹے بڑے کاروبار جائیداد روپیوں، فرم وغیرہ میں برابر کے شریک ہوں گے، البتہ زوجہ ثانیہ عقیلہ کو جو آٹھواں حصہ مہر میں دیا گیا تھا وہ اس کا حق ہے، وہ تقسیم میں شامل نہیں ہوگا، اور اس حصہ پر رفعت حسین کی رہائش کے لیے جو تعمیر وغیرہ کی گئی ہے اس خرچ کو اگر سب لوگوں نے بخوشی کیا ہے اور خوشی سے تعمیر کر دیا تھا، تو ان سب لوگوں کی طرف سے تبرع واحسان ہے، اس کا کوئی معاوضہ نہیں ہے، اور اگر خرچ وتعمیر کے وقت یہ بات طے کرلی گئی تھی کہ اس خرچہ کا حساب لگایا جائے گا، تب حساب لگانا جائز ہے، اسی طرح تعلیم اور شادی وغیرہ میں جو خرچ کیا گیا ہے وہ بھی تبرع واحسان ہے، اس کے مطالبہ کا شرعاً حق نہیں ہے اور سوال میں یہ جو لکھا گیا ہے کہ رفعت وشفقت کے حصہ کی رقم تقسیم کر کے محفوظ رکھ دی گئی تھی تو یہ ایک عجیب معمہ ہے، آج ۳۱؍سال کے بعد یہ بات کہی جا رہی ہے جبکہ کم از کم ۱۹/۱۸؍سال پہلے یہ دونوں بالغ ہو چکے ہوں گے، اس لیے یہ معمہ سمجھ میں نہیں آیا ہے۔

ولا یجوز لأحدهما أن یتصرف فی نصیب الآخر إلا بأمره وکل واحد منهما کالأجنبی فی نصیب صاحبه. (هندیه، کتاب الشرکة، الباب الأول، الفصل الأول زکریا قدیم ۲/ ۳۰۱، جدید ۲/ ۳۱۱، هدایه اشرفی دیوبند ۲/ ۶۲۴)

أما إذا کان بغیر أمره فلأنه تبرع فلا یملک أن یجعل ذٰلک مضمونا علیه. (بدائع، فصل فی حکم الهبة زکریا ۵/ ۱۸۱، کراچی ۶/ ۱۳۲)

وکذا لو اجتمع إخوة یعملون فی ترکة أبیهم ونما المال فهو بینهم سویة ولو اختلفوا فی العمل والرائ. (شامی، مطلب: اجتمعا فی دار واحدة واکتسبا ولا یعلم التفاوت فهو بینهما بالسویة زکریا ۶/ ۵۰۲، کراچی ۴/ ۳۲۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍شعبان المعظم ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۳۶۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۹/۱۷ھ

۱۲ باب التخارج

بدلِ صلح میں وراثت جاری ہوگی

سوال [۱۱۵۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ان حالات میں ملا ہوا معاوضہ مسجد یا مدرسہ میں لگا یا جاسکتا ہے یا نہیں؟ حالات اور واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کا گلا گھونٹ کر جان سے مار ڈالا، اور پھر اقبال جرم بھی کرلیا، چند مصلحتوں اور حالات کے تحت محلّہ کے لوگوں نے معاملہ تھانہ یا عدالت میں نہ جانے دیا، محلّہ کے لوگوں نے اپنے ہی درمیان اس معاملہ کو طے کیا کہ مرحوم کی تمام تر اشیاء، زیورات جو بوقت نکاح مرحومہ کے بھائی اور اس کی والدہ نے دی تھی، مرحوم کے بھائی اور والدہ کو واپس دلایا گیا، اور بطور سزا مبلغ ۸۰۰۰/ روپیہ جرمانہ نقد کی صورت میں مرحوم کے بھائی اور اس کی والدہ کو دلائے گئے، مرحومہ سے ایک بچہ بھی ہے جس کی عمر تقریباً دس ماہ ہے، بچہ کی پرورش اس کے باپ پر ہوگی، مرحومہ کا بھائی اور والدہ اس رقم کو لے کر صدقۂ جاریہ میں لگانا چاہتے ہیں، تا کہ ایصال ثواب پہنچتا رہے، برائے کرم حالات پر گہری روشنی ڈال کر جواب سے جلد از جلد مطلع فرمائیں نوازش ہوگی۔

المستفتی: جلیل احمد سیوہارہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: وإذا اصطلح القاتل و أولياء القتيل على مال سقط القصاص ووجب المال قليلا كان أو كثيرا،......لأنه حق ثابت للورثة، وقول البناية: هو الدية على قدر حصصهم في الميراث. (هدایه، كتاب الجنايات، اشرفی دیوبند ٤/ ٥٧١، بنایه قدیم ٤/ ٤٦٥، ٣/ ٥٠٨، اشرفیه دیوبند)

ان عبارات سے چند امور معلوم ہوئے:

(۱) اس طرح صلح کر کے مقتول کے ورثاء کے لیے قاتل سے مال کی خاص مقدار کا

حاصل کرنا شرعاً جائز ہے، چاہے مال کی مقدار دیت مغلظہ سے کم ہو یا زیادہ۔
(۲) مقتول عورت کے شرعی ورثاء یافتہ رقم کے حقدار رہوں گے۔
(۳) تقسیم میراث کی طرح یافتہ رقم بھی ورثاء کے درمیان ان کے حصوں کے بقدر تقسیم ہوگی۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/ ۴۱۹)

نیز مرحومہ کے بچہ کی پرورش کے تمام اخراجات باپ پر لازم ہے، البتہ مرحومہ کی ماں کو شوہر سے خرچ لے کر سات سال تک پرورش کا حق حاصل ہے۔

والحاضنة أما أو غيرها أحق به أی بالغلام حتی يستغنی عن النساء وقدر بسبع و به يفتیٰ. (الدر المختار مع الشامی زکریا ۵/ ۲۶۷، کراچی ۳/ ۵۶۶)

لہٰذا یافتہ رقم موجودہ شرعی ورثاء کے درمیان درج ذیل طریقے سے تقسیم ہوگی:

میـــــــــــــــــــــت ۶

والدہ	لڑکا	بھائی	قاتل شوہر
۱	۵	محروم	محروم

۸۰۰۰/ روپیہ چھ سہام میں تقسیم ہو کر ایک حصہ والدہ کو اور پانچ حصے بچہ کو ملیں گے، بھائی اور شوہر محروم ہوں گے، اب والدہ اپنا حصہ اپنی خوشی سے مدرسہ یا مسجد میں لگا سکتی ہے، بچہ کا حصہ محفوظ رکھنا واجب ہے، اس کو مدرسہ یا مسجد میں دینا جائز نہیں ہوگا، اسی طرح سامان وزیورات اور مہر سب ۶/ سہام میں تقسیم ہو کر والدہ کو ایک اور بچہ کو ۵/ سہام ملیں گے، اور بچہ کے حقوق بالغ ہونے تک محفوظ رکھنا لازم ہے، والدہ اپنے حقوق میں سے جتنا چاہے ایصال ثواب کر سکتی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۶۶۵)

تخارج کے بعد ترکہ میں حق نہیں رہتا، اور تقسیم کے وقت کی قیمت کا اعتبار ہے

سوال [۱۱۵۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: والدصاحب کے انتقال کے بعد ایک کھیت فروخت کرکے قرضہ ادا کردیا تھا اور انتقال کے بعد گھر کا اکثر خرچہ بڑے بھائیوں نے اپنی تنخواہ سے پورا کیا تھا تو اس کا کیا حکم ہوگا؟ اگر تقسیم میں قیمت لگا سکتے ہیں تو کونسی قیمت کا اعتبار ہوگا؟ انتقال کے وقت کی قیمت کا اعتبار ہوگا؟ یا تقسیم کے وقت کی قیمت کا؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد یوسف قاسمی اسلام پوری پنچ محل

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر عبدالحق اتنا لے کرا لگ ہوا ہے جو اس کے حق سے کم ہے تو باب تخارج کے قاعدے سے درست ہو چکا ہے اور اگر زیادہ لیا ہے تو نابالغ کی حق تلفی کی وجہ سے درست نہیں ہوا ہے، دوبارہ شرعی تقسیم لازم ہے۔

بھائیوں نے اپنی تنخواہ سے جو خرچ کیا ہے شرعاً اب اس کا حساب نہیں لگایا جائے گا۔

لارجوع فيما تبرع عن الغير. (قواعد الفقه اشرفی ص:۱۰٦)

تقسیم میں جو قیمت لگائی جائے گی اس میں تقسیم کے وقت کے اعتبار سے اصل متروکہ کی قیمت لگائی جائے گی۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۴/ ۲۶۸)

وجاز دفع القيمة، وفي الشامي: يعتبر يوم الأداء بالإجماع، وهو الأصح فهو تصحيح للقول الثاني الموافق لقولهما، وعليه فاعتبار يوم الأداء يكون متفقا عليه عنده و عندهما. (الدر المختار مع الشامی، كتاب الزكاة، باب زكاة الغنم زكريا ۳/ ۲۱۰-۲۱۱، كراچی ۲/ ۲۸٦، فتح القدير زكريا ۲/ ۲۲۷، دار الفكر ۲/ ۲۱۹، كوئٹه ۲/ ۱٦۷، بدائع الصنائع زكريا ۲/ ۱۱۵، كراچی ۲/ ۲۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ / ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۷۷۴)

تقسیم کے بعد ایک فریق کا دوسرے سے نیک نامی کے نام پر رقم طلب کرنا

سوال [۱۱۵۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کہ عمر، بکر اور زید یہ تینوں بھائی مشترک ملکیت اور کاروبار میں برابر کے شراکت دار ہیں، کسی وجہ سے یہ اشتراک اختلاف کا سبب بنا تو عمر، بکر اور زید نے آپس میں مل کر اور کچھ بزرگوں کو ثالث بنا کر تمام ملکیت اور کاروبار کو تینوں شرکت داروں نے اتفاق رائے سے آپس میں برابر برابر تقسیم کرلیا، ہر چیز کی موجودنرخ کے حساب سے قیمت طے کی گئی اور اس طے شدہ قیمت میں جس بھائی نے جو چیز لینی چاہی اتفاق رائے سے لے لی، اس تقسیم میں ایک فیکٹری بھی شامل ہے جس کو عمر نے زید اور بکر کو طے شدہ قیمت ادا کر کے لے لیا تھا، اس کے ساڑھے نو ماہ بعد زید اور بکر اس فیکٹری کی نیک نامی کا معاوضہ طلب کررہے ہیں جبکہ تقسیم کے وقت فیکٹری کی پوری قیمت لگائی گئی تھی، اور اس وقت فیکٹری کی قیمت میں نیک نامی کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی، اور نہ کوئی الگ سے قیمت لگائی گئی تھی، لیکن سرکاری نقطۂ نظر سے نیک نامی کی مد شامل کررہے ہیں، جبکہ آج تک مشترکہ ملکیت کا بٹوارہ ان کے درمیان اسلامی نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے۔

سوال طلب امر یہ ہے کہ زید، بکر جو نیک نامی کا معاوضہ طلب کررہے ہیں آیا یہ صحیح ہے یا نہیں؟ از روئے شرع جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد عطاء اللہ ناگ پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب آپ کی تراضی سے حقوق تقسیم کر کے ہر صاحب حق نے اپنا حق وصول کرلیا ہے اور فیکٹری کی طے شدہ قیمت ادا کر کے عمر نے اپنے قبضہ میں لے لی ہے اور بوقت تقسیم کسی کو کوئی اشکال بھی نہیں رہا ہے اور تقریباً ساڑھے نو ماہ بعد فیکٹری کی عمدگی اور نیک نامی میں اپنے حق کا دعویٰ کرنا شرعی طور پر باطل ہے اور شرعاً اس دعویٰ کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔

ولو اختلفا في التقويم لم يلتفت إليه، لأنه دعوىٰ الغبن ولا معتبر به في البيع، فكذا في القسمة لوجود التراضي. (هدايه، باب دعوىٰ الغلط في القسمة والاستحقاق فيها اشرفي ديوبند ٤/ ٤٢٠، البنايه اشرفي ديوبند ١١/ ٤٥٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰/ ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۴۸۴)

رقم کے ذریعہ مصالحت کرنے والوں کا جائیداد میں کوئی حصہ نہیں

سوال [۱۱۵۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: باپ کے انتقال کے بعد بیٹیوں نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ باپ کے چھوڑے ہوئے مکان میں ہمارے حصوں کی رقم دیدی جائے بیٹوں نے اپنی بہنوں سے کہا کہ تم سب بہنیں باہم مشورہ کر کے بتاؤ کہ تمہیں اپنے اپنے حصے کے بدلے ہر ایک کو کتنی کتنی رقم لینی ہے بہنوں نے باہم مشورہ کر کے اپنے بھائیوں سے کہا کہ وہ پانچ پانچ ہزار روپیہ لینے پر راضی ہیں، بھائیوں نے اپنی بہنوں کو پانچ پانچ ہزار روپئے دیدیئے، اب ایک لمبی مدت کے بعد بھائیوں نے وہ مکان بیچنا چاہا تو اب کسی بہن کو کیا یہ کہنے کا حق ہے کہ اس وقت یہ مکان جتنی قیمت کا فروخت ہوا اتنی رقم میں سے میرا حصہ مجھے دیا جائے؟

المستفتی: مصباح الدین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: برتقدیر صحت سوال جب بہنوں میں سے ہر ایک نے اپنی رضا مندی اور خوشی سے والد کے متروکہ مکان میں سے اپنے حصے کے مقابلہ میں پانچ پانچ ہزار روپئے نقد رقم لے لی ہے تو ایسی صورت میں اب اس مکان میں بہنوں کا حق نہیں رہا، بعد میں اگر وہ مکان زیادہ قیمت میں فروخت ہوتا ہے تو کسی بہن کو شرعاً یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ اب یہ مکان جتنی قیمت میں فروخت ہو رہا ہے اس میں سے میرا حصہ دیا جائے۔
(مستفاد: فتاویٰ دارالعلوم ۱۷/ ۵۰۶)

إذا كانت التركة بين ورثة فأخرجوا أحدهما منها بمال أعطوه إياه والتركة عقار أو عروض صح قليلا كان ما أعطوه أو كثيرا (إلى قوله) لأنه بيع الجنس بخلاف الجنس فلا يشترط التساوي ويعتبر التقابض في المجلس. (عالمگیری، الباب الخامس عشر في صلح الورثة والوصي زكريا قديم ٤/ ٢٦٨، جديد ٤/ ٢٧٥)

أخرجت الورثة أحدهم عن التركة وهي عرض أو هي عقار بمال

أعطاه له أو أخرجوه عن تركة هي ذهب (إلى قوله) صح في الكل صرفا للجنس بخلاف جنسه قل ما أعطوه أو كثر. (شامي، فصل في التخارج زكريا ۸/۷۲۵، کراچی ۵/۶۴۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍رجب المرجب ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۱۹۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴؍۷؍۱۴۳۴ھ

مصالحت علی المال کے بعد بقیہ مال کی دو بھائیوں کے درمیان تقسیم

سوال [۱۱۵۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے والد صاحب کا انتقال ہوگیا، انہوں نے اپنے انتقال پر صرف دو لڑکے اور چار لڑکیاں چھوڑیں، ترکہ میں دو مکان چھوڑے، ایک تین منزلہ، دوسرا بغیر تین منزلہ، اور اس مکان کو چاروں لڑکیوں نے بھائیوں کی مرضی سے اپنے حصہ کے بدلے لے لیا، لہٰذا تین منزلہ مکان کی ہم دو بھائیوں کے درمیان تقسیم کس طرح ہوگی؟ شریعت کا اس سلسلے میں کیا حکم ہے؟

المستفتی: عطاء الرحمٰن تمبا کو والان، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب چاروں لڑکیوں نے اپنے والد سے ملنے والی جائیداد پر ایک مکان لے کر مصالحت کر لی تو باقی تین منزلہ مکان کی تقسیم صرف دو بھائیوں کے درمیان آدھی آدھی ہوگی۔

التخارج والمراد ههنا به أن يصالح الورثة على إخراج بعضهم عن الميراث بشيئ معلوم من التركة وهو جائز عند التراضي. (شريفيه ص: ۸۶) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ربیع الاول ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۵۸۰)

انداز اً بہن کو اس کا حصہ دینے کی شرعی حیثیت

سوال [۱۱۵۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگرکوئی بھائی اپنی بہن کا حق دینے کے بجائے اندازاً باہم رضامندی سے نیز اس حق پر بہن کا قبضہ کیے بغیر ایک مقدار خاص پر صلح کرلے تو یہ درست ہے یا نہیں؟ یا پھر بہن کو قبضہ دینا (زمین میں تخلیہ وگھر وغیرہ خالی کرنا) ضروری ہے، ساتھ میں یہ بھی ظاہر کردے کہ اگر بہن ازخود قبل قبضہ اپنا حق معاف کردے تو پھر کیا حکم ہے؟ ایسے مسائل کی وجہ سے معاشرہ تباہ ہے؟

المستفتی: محمد عمران کٹھاری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہمارے ہندوستان میں عام مزاج بن چکا ہے کہ بہن کا حصہ کسی بھی حیلہ سے مارلیا جائے، کبھی بہن پر دباؤ ڈالا جاتا ہے، جس سے وہ شرما حضوری سے معاف کردیتی ہے، اور کبھی ایسا کیا جاتا ہے کہ بہن کا حق بنتا ہے اس حق کو کھل کر اسے دیئے بغیر اس کے حصہ کے مقابلے میں معمولی چیز پر صلح کرانے کی کوشش کرتے ہیں اور بہن بھی اس لیے مجبور ہوجاتی ہے کہ اس کے قبضہ میں کچھ نہیں ہوتا، سب کچھ بھائی کے قبضہ میں ہوتا ہے اور بہن بھی یہ سوچ لیتی ہے کہ جو بھی مل رہا ہے وہ غنیمت ہے، اگر نہ لے تو کہیں وہ بھی ہاتھ سے نہ نکل جائے اور بھائی سے تعلقات بھی خراب ہوجائیں، ان وجوہات کی بناء پر بہن کو مجبوراً راضی ہونا پڑتا ہے، اور بھائی اس کا نام دیتا ہے کہ بہن نے بخوشی اتنے پر صلح کرلی ہے، آخر ایسا کیوں نہیں ہوتا ہے کہ سارا بہن کے قبضہ میں دیدیا جائے اور بھائی اس طرح کی چیز پر صلح کرلے جس طرح کی چیز دے کر بہن سے صلح کی جاتی ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نام کی صلح ہے، حقیقت میں بہن کا حصہ مارلینے کے لیے حیلہ ہے اس لیے بلاکسی حیلہ جوئی کے بہن کا حصہ بہن ہی کو دیدیا جائے ورنہ قیامت کے دن ساتوں زمینوں کا طوق ڈالا جائے گا۔

عن سعید بن زید قال: سمعت النبی ﷺ یقول: من أخذ شبرا من

الأرض ظلما فإنه يطوقه الله إياه يوم القيامة من سبع أرضين. (مسلم شريف، باب تحريم الظلم وغصب الأرض، النسخة الهندية ۲/۳۳، بيت الأفكار رقم: ۱۶۱۰)

عن أنس بن مالك –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: من فر من ميراث وارثه، قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة. (سنن ابن ماجه، باب الحيف في الوصية، النسخة الهندية ۲/۱۹٤، دار السلام رقم: ۲۷۰۳، سنن سعيد بن منصور، دار الكتب العلمية بيروت ۱/۹٦، رقم: ۲۸۵-۲۸٦) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۱۲۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ

بہنوں کو زمین کے بدلے آٹھ سال بعد اس کی قیمت دینا

سوال [۱۱۵۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے والد صاحب کا انتقال اپریل ۲۰۰۴ء میں ہوا، وارثین میں ایک بیوی تین لڑکے، دو لڑکیاں چھوڑیں، والد صاحب نے وراثت میں جو جائیدادیں چھوڑی ہیں، ان جائیدادوں سے متعلق انتقال ہی کے سال میں بھائی صاحبان نے خود قیمت لگا کر ہمارا حصہ روپیوں کی شکل میں بنا دیا تھا، جو رقم ۲۰۰۴ء میں بھائی صاحبان نے بنائی، ان کا پہلا آفر تھا، کچھ جائیدادوں کا حصہ اپنے ناموں میں کرالیں، نہیں تو اگلے تین سال میں روپیوں کی شکل میں بھائی صاحبان نے ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا، چونکہ ہم بہنیں عورت ذات کیسے جائیدادوں کی دیکھ ریکھ کرتیں، اس لیے ہم بہنیں تین سال والی بات پر مہلت دینے کو تیار ہوگئیں، مگر انہوں نے تین سال کی مدت میں رقم نہیں ادا کی، اور اب آٹھ سال بعد ان میں سے ایک جائیداد فروخت کر کے ہمیں روپیہ دیا جو کہ کئی گنا زائد قیمت پر فروخت ہوئی، ہمارا یہ کہنا ہے کہ ان آٹھ سالوں کے دوران جائیدادوں کی قیمت ۲۰۰۴ء کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ ہوگئی ہیں، کیا ہمیں شریعت آج کے ریٹ لگوانے کا حق دیتی ہے؟

(۱) والد صاحب کی جائیدادیں ایک بیوی، تین لڑکے، دو لڑکیوں کے درمیان کس حساب سے تقسیم ہوگی؟

(۲) ستمبر ۲۰۰۹ء میں والدہ کا انتقال ہوا، والدہ کی وراثت تین لڑکے اور دو لڑکیوں کے درمیان کس حساب سے تقسیم ہوگی؟

(۳) اسی طرح والدہ کی جائیداد کی قیمت ۲۰۰۹ء کی جگہ آج کی موجودہ قیمت کے حساب سے لگے گی یا نہیں؟

(۴) جائیدادوں کی جو رقم ۲۰۰۴ء کی بھائی صاحبان نے بنائی تھی، تاخیر سے ادائیگی کا وہ دس فیصد اضافہ کر کے دے رہے ہیں، ہمارے لیے یہ اضافی رقم لینا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: دختران عبدالمجیب صاحب، پیرزادہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ما تقدم وعدم موانع ارث مورث اعلیٰ کا ترکہ درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

مورث اعلیٰ میـــــت ۶۴/۸

بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکا		لڑکی	لڑکی
۱/۸	۱۴	۱۴	۱۴	(۷)	۷	۷

بیوی میـــــت ۸ تماثل ۸

لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی
۲	۲	۲	۱	۱

المبلغ ۶۴ الاحیـــــاء

لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی
۱۶	۱۶	۱۶	۸	۸

مورث اعلیٰ کا کل ترکہ ۶۴ رسہام میں تقسیم ہو کر ہر وارث کو اتنا اتنا ملے گا جو اس کے نیچے

درج ہے، چونکہ بہنوں کو والد کی میراث میں سے کچھ نہیں دیا گیا ہے اس لیے والد کی وفات کے بعد جو پیسہ دینے کے لیے طے کیا گیا تھا، اور بعد میں اتنے عرصہ تک وہ پیسہ نہیں دیا گیا ہے، تو اس کا اعتبار نہیں ہوگا، بلکہ آج کے زمانے میں جو بھی بہنوں کا والد کی جائیدا میں حصہ بنے گا وہی دینا لازم ہوگا یا ادائیگی کے وقت میں اس کی جو بھی قیمت بنے گی وہی قیمت بہنوں کو دینا لازم ہوگی۔

وعندهما في الفصلين جميعا يؤدى قيمتها يوم الأداء. (بدائع الصنائع، فصل صفة نصاب التجارة، كراچی ۲/۲۳، زکریا ۲/۱۱۵)

وعندهما يوم الأداء. (هنديه، الباب الثالث في زكاة الذهب زكريا قديم ۱/۱۸۰، جديد ۱/۲٤۱، البحر الرائق زكريا ۲/٤۰۰، كوئٹه ۲/۲۲۹)

تعتبر القيمة يوم الوجوب، قالا: يوم الأداء ...... وهو الأصح و يقوم في البلد الذي المال فيه ولو في مفازة ففي أقرب الأمصار إليه، وتحته في الشامية: قوله: هو الأصح ...... ذكر في البدائع: أنه قيل أن المعتبر عنده فيها يوم الوجوب وقيل يوم الأداء، وفي المحيط يعتبر يوم الأداء بالإجماع وهو الأصح فهو تصحيح للقول الثاني الموافق لقولهما وعليه فاعتبار يوم الأداء يكون متفقا عليه عنده وعندهما. (شامی، الزكاة، باب زكاة الغنم كراچی ۲/۲۸٦، زكريا ۳/۲۱۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۵۰۹/۴۰)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۳/۲۹ھ

ایک وارث کا مکان پر صلح کرنا

سوال [۱۱۵۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے والد صاحب کا انتقال ہوگیا، ان کے ورثاء میں ایک بیوی اور چھ لڑکے: محمد مختار، عبد المنان، عبد الحنان، عبد الرحمٰن، حفظ الرحمٰن، محمد ابراہیم ہیں، انہوں نے

ترکہ میں ایک کرایہ کا مکان رکھیال روڈ پر چھوڑا جسے والد کے انتقال کے بعد محمد مختار کے علاوہ ہم پانچ بھائیوں نے خرید لیا تھا، پھر اب بیچ دیا ہے، دوسرا مکان انصارنگر میں ہے، جس کی زمین والدصاحب کی تھی، اوراس پر مکان تعمیر کرانے میں سب بھائی شریک تھے، تیسرا مکان باپونگر میں ہم سب بھائیوں نے مل کر خریدا لیکن اس کی آدھی رقم محمد مختار بھائی نے تنہا ادا کی اور بقیہ آدھی ہم سب پانچ بھائیوں نے ادا کی پھر مختار بھائی نے کہا کہ انصارنگر والا مکان مجھے دیدو اور کہیں مجھے کچھ نہیں چاہیے تو انہیں ہم پانچ بھائیوں نے وہ مکان دیدیا اب وہ رکھیال روڈ والے مکان میں سے اور باپونگر والے مکان میں بھی حصہ مانگتے ہیں۔

تو کیا شرعاً انہیں مصالحت کے مطابق انصارنگر والا مکان ہی ملے گا یا سب مکانوں میں حصہ دار ہوں گے؟ اور جس مکان (انصارنگر) پر انہوں نے مصالحت کی ہے وہ بھی حسب حصص شرعیہ تقسیم ہوگا، شرعی حکم سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی: عبدالمنان رکھیال روڈ احمد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ واقعۂ مصالحت اگر صحیح ہے تو اب مصالحت کرنے کے بعد شریعت کی رو سے محمد مختار کو صرف انصارنگر کا مکان ہی ملے گا کیونکہ محمد مختار نے انصارنگر کے مکان پر مصالحت کرلی ہے، اور وہ بقیہ میراث سے دست بردار ہو چکا ہے، لہٰذا اب اس کو بقیہ میراث سے کچھ نہ ملے گا، اور بقیہ میراث دوسرے وارثین کے درمیان ہی تقسیم ہوگی، اور رکھیال روڈ کا مکان چونکہ مورث کی ملکیت میں نہیں تھا بلکہ اس مکان کو محمد مختار کے علاوہ پانچ بھائیوں نے مل کر خریدا تھا اس لیے یہ مکان صرف پانچ بھائیوں کو ملے گا، محمد مختار کو نہ ملے گا، کیونکہ میراث میں وہی چیز ملتی ہے جو مورث کی ملکیت میں ہو، اور رکھیال روڈ کا مکان والد مرحوم کی ملکیت میں نہیں تھا۔

إذ الوارث إنما یملک ما کان علی ملک المورث فما لم یملکه یستحیل وراثته. (بدائع الصنائع، فصل فی بیان ما ینتهی به عقد الإجارة کراچی ۴/۲۲۲، زکریا ۴/۹۰)

ولو أخرجوا واحدا من الورثة فحصته تقسم بین الباقی علی السواء،

إن كان ما أعطوه من مالهم غير الميراث وإن كان المعطى مما ورثوه فعلى قدر ميراثهم يقسم بينهم وصلح أحدهم عن بعض الأعيان صحيح. (شامی، فصل في التخارج زكريا ۸/۲۷ ٤-۸ ٤۲، كراچی ٥/٦٤٤، مجمع الأنهر مصری قديم ۲/۳۲۰، دار الكتب العلمية بيروت ۳/٤٤١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۱۶۴۰)

جائیداد نہ دے کر لڑکیوں کو ان کے حصہ کی قیمت دینا کیسا ہے؟

سوال [۱۱۵۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ حاجی بنن کا انتقال ہوگیا، ان کے ورثاء میں ایک بیوی سعیدہ خاتون سات لڑکے: شفاعت احمد، سہراب احمد، مہتاب احمد، شاہنواز احمد، سرفراز احمد، ذو الفقار احمد، مسعود احمد، تین لڑکیاں: عالم جہاں، بدر جہاں، چاندنی بیگم ہیں۔

حاجی بنن خاں مرحوم اپنی حیات میں یہ طے کر چکے تھے اور سب بھائی بہنوں کو بٹھا کر کہا تھا کہ سب لڑکوں کو مکان میں حصہ ملے گا، اورلڑکیوں کو ان کے حصے کی رقم دیدینا، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ بہنوں کو والد کی ہدایت کے مطابق ان کے حصہ کی رقم دی جائے گی یا مکان میں جو حصہ آئے گا وہی دینا ضروری ہے، اگر قیمت دینی ہوتو اس وقت کی قیمت دی جائے یا موجودہ وقت جب تقسیم ہورہی ہے اسی وقت کی قیمت دینی ہوگی؟ ترکہ میں کل مکان ۶۷۴/ گز کا ہے شرعی حکم تحریر فرمادیں؟

المستفتی: مہتاب احمد خاں محلہ مغل پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگرسب ورثاء کے درمیان عین مکان تقسیم کرنے میں تنگی کا خطرہ ہے اور باپ حاجی بنن خاں نے اسی مصلحت سے اس بات کی وصیت

کردی ہے کہ لڑکیوں کو ان کے حصہ کی قیمت دیدی جائے، تاکہ مکان کی رہائش میں تنگی نہ پڑے، تو ایسی صورت میں مکان کی صحیح اور مناسب قیمت لگا کر لڑکیوں کو اپنے اپنے حصہ کی قیمت دے دینا شرعاً جائز اور درست ہے، اور اس میں اس دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا جس دن ان کی جائیداد کی قیمت ان کو دی جائے گی۔

إذا كانت التركة بين ورثة فأخرجوا أحدهم منها بمال أعطوه إياه والتركة عقار أو عروض صح قليلا كان أو كثيرا . (مختصر القدوری، کتاب الصلح ۱۳۵، هدایه فصل فی التخارج، اشرفی ۳/ ۲۵۶)

ولو أخرجت الورثة أحدهم عن التركة وهي غرض أو هي عقار بمال (إلى قوله) صرفا للجنس بخلاف جنسه قل أو كثر. (تکمله شامی، فصل فی التخارج، زکریا ۱۲/ ۳۴۸-۳۳۹، کراچی ۸/ ۲۶۱)

ثم قول أبي حنيفة فيه إنه تعتبر القيمة يوم الوجوب وعندهما يوم الأداء. (فتح القدیر، کتاب الزکاة، فصل فی العروض، دار الفکر ۲/ ۲۱۹، زکریا ۲/ ۲۲۷، کوئٹه ۲/ ۱۶۷،ومثله فی حاشیة الطحطاوی علی المراقی ۱/ ۲۱۸، ونحوه فی التاتارخانیة، زکریا ۳/ ۱۷۰، رقم: ۴۰۱۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ محرم الحرام ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۹۲۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۱/۵ھ

شوہر کا بیوی کے بھائیوں سے ان کا حصہ خریدنا

سوال [۱۱۵۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے شوہر کا ۱۳؍ سال ہوئے انتقال ہوگیا، میرے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہے، تینوں بچوں کی شادی ہوچکی ہے، میرے والد نے اپنے سب بچوں کے نام ایک ایک مکان کردیا تھا، سب اپنے حصہ کے گھروں میں رہتے ہیں، میرے والد کے پاس ایک مکان الگ

سے فالتو تھا، یعنی کسی کے نام نہیں تھا، میرے والد کے مرنے کے بعد اس مکان میں سب بہن بھائی اور میں خود بھی حصہ دار ہوگئی، میرے شوہر نے میرے سب بھائی بہن سے رقم دے کر ان کے حصے میرے نام سے خرید لیے اور سب سے رجسٹری کرالی، اس کے خرچہ میں کافی پیسہ میں نے بھی اپنے پاس سے ڈالا تھا، اب مسئلہ یہ ہے کہ کیا میں اس مکان کی تنہا مالک ہوں یا نہیں؟ کیا اس کو تقسیم کرنے کا مجھے حق حاصل ہے یا نہیں؟ یا اس مکان میں وراثت چلے گی؟ کیا میں اپنی مرضی سے اپنے بچوں کی ضروریات کے حساب سے جسے جتنا چاہوں دے سکتی ہوں، اور اپنے لیے بھی رکھنے کی حقدار ہوں؟ برائے مہربانی شرعی مسئلہ کیا ہے؟ بتائے کہ کتنا حق بنتا ہے؟ اور کسی کا حق تو کٹتا نہیں؟

المستفتیه: گوہر جہاں محلّہ بھٹی مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب آپ کے شوہر نے مذکور مکان میں سے آپ کے بھائی بہنوں کے جو حصے تھے ان حصوں کی قیمت دے کر ان سے آپ کے نام سے مکان خرید لیا ہے اور خریدنے میں آپ کا اپنا ذاتی پیسہ بھی شامل رہا ہے تو ایسی صورت میں اس پورے مکان کی آپ تنہا مالک ہیں، اس میں کسی دوسرے کا حق نہیں ہے، نہ آپ کے شوہر کے وارثین کا کوئی حق ہے، نہ آپ کے بھائی بہن کا کوئی حق ہے؟ لہٰذا آپ اپنی مرضی سے جس طرح چاہیں اس مکان میں تصرف کر سکتی ہیں۔

المالک هو المتصرف فی الأعیان المملوکة کیف شاء من الملک.

(بیضاوی شریف رشید ۱/ ۷، وهکذا فی شرح المجلة رستم اتحاد ۱/ ٦٥٤، رقم المادة: ١١٩٢، البنایه اشرفیه دیو بند ۸/ ۲۱۹، بدائع زکریا ۲/ ٦٣٨، کراچی ۲/ ۳۲۷، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۱٤/ ۲۹، شامی ٥/ ۱۰، کراچی ٤/ ٥٠٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ رجب المرجب ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۱۹۹)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۶؍ ۷؍ ۱۴۳۴ھ

دونوں بہنوں کا جائیداد کے عوض پچاس پچاس ہزار پر مصالحت کرنا

سوال [۱۱۵۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مرحومہ فاطمہ اپنے پیچھے ایک بیٹا زید اور دو بیٹیاں زینب اور عائشہ چھوڑ جاتی ہے، ترکہ میں مکان کی چوحدی کی زمین کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا، ورثاء کی تقسیم سے متعلق پیش کش پر دونوں بہنوں نے یہ کہا کہ ہم اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ مکان کو ہم الگ نہیں بانٹیں گے، اور ہم لوگ اپنے حصہ میں آنے والی جائیداد کو آپ کے نام لکھ دیتے ہیں آپ ہمیں پچاس پچاس ہزار روپیہ مدد کے طور پر دیدیں اس پر بھائی زید راضی ہوگیا اور کہا کہ اگر میں مرجاتا ہوں تو میرے بیٹوں پر یہ حق ہوگا کہ وہ اس رقم کو ادا کریں، اور اپنے بیٹوں کو گواہ بنایا بعد میں جب زینب اور عائشہ کی اولادوں کو سارے معاملہ کا پتہ چلا تو انہوں نے اپنی ماں سے دوبارہ اس مسئلہ پر بات کرنے کو کہا، مگر زینب اور عائشہ اپنے بھائی کے ساتھ کیے ہوئے معاملہ پر اٹل رہی۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بشرط صحت سوال وبعد ادائے حقوق ما تقدم وعدم موانع ارث مرحوم فاطمہ کا ترکہ مذکورہ وارثین میں درج ذیل نقشہ کے اعتبار سے تقسیم ہوگا:

۲/۴

فاطمہ میت

لڑکا	لڑکی	۵۰/ہزار	لڑکی	۵۰/ہزار	بھائی	تین بہنیں
زید	زینب	پر مصالحت	عائشہ	پر مصالحت		
۲	۱		۱			

جب زینب اور عائشہ نے ماں کی طرف سے ملنے والی جائیداد پر اپنے بھائی زید سے پچاس پچاس ہزار روپیہ لے کر مصالحت کر لی، جیسا کہ سوال سے معلوم ہوتا ہے تو اب روپے کی ادائیگی کے بعد زید ترکہ میں ملی ہوئی پوری جائیداد کا مالک ہے لیکن جب تک روپیوں کی ادائیگی نہ ہوگی، اس وقت تک زید پوری جائیداد کا مالک نہ ہوگا۔

وإذا كانت التركة بين ورثة فأخرجوا أحدهم منها بمال أعطوه إياه

والتركة عقار أو عروض جاز قليلا كان ما أعطوه أو كثيرا . (مختصر القدوری، کتاب الصلح ۱۳۵، ہدایہ فصل فی التخارج اشرفی ۳/۲۵٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍صفر المظفر ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳٦/ ۷۵۱۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴؍۲؍۱۴۲۳ھ

(۱۳) باب المناسخة

مناسخہ کا ایک مسئلہ

سوال [۱۱۵۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید کا انتقال ہوا، اس نے ورثاء میں زوجہ زینب، ماں رحیمہ، باپ عبد اللہ، حقیقی بہن ذاکرہ، علاتی بہن، زاہدہ اور اخیافی بہن زہدہ کو چھوڑا۔

(۲) اس کے بعد رحیمہ کا انتقال ہوا، اس نے شوہر عبد اللہ، حقیقی بیٹی ذاکرہ اور اخیافی بیٹی زہدی اور چچا راشد کو چھوڑا۔

(۳) اس کے بعد عبد اللہ کا انتقال ہوا اس نے ورثاء میں بیوی ہندہ، دو بیٹیاں: ذاکرہ اور زاہدہ اور ایک بھائی رشید کو چھوڑا۔

(۴) اس کے بعد ذاکرہ کا انتقال ہوا اور اس نے شوہر لئیق، علاتی بہن زاہدہ اور اخیافی بہن زہدی کو چھوڑا۔

(۵) اس کے بعد زاہدہ کا انتقال ہوا اس کے ورثاء میں شوہر ندیم، دو بیٹیاں: نعیمہ، نفیسہ اور چچا رشید ہیں۔

(۶) اس کے بعد زہدی کا انتقال ہوا، اس کے ورثاء میں شوہر ماجد، تین بیٹیاں: ماجدہ، مجیدہ اور ساجدہ اور باپ عبد المجید ہیں۔

مفتی صاحب سے گذارش ہے کہ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں کہ کس وارث کو کتنا حصہ ملے گا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: برتقدیر صحت سوال وبعد ادائے حقوق ماتقدم علی الارث وعدم موانع ارث مرحوم زید کا ترکہ ان کے شرعی ورثاء کے درمیان درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا۔

۱۵۷۲٤۸
٤۰۳۲
۵۷٦
۷۲
۱۲

زید میـــت

زوجة	ام	اب	اخت لأب وأم	اخت لاب	اخت لأم
(زینب)	(رحیمة)	(عبد اللّٰه)	(ذاکره)	(زاهده)	(زهدی)
۳	۲	۷			
۱۸		٤۲			
۱٤٤					
۱۰۰۸					
۳۹۳۱۲					

٦/١٢ — ١/٢

تداخل

رحیمة میـــت

زوج	بنت	بنت (اخت لام)	عم
(عبد اللّٰه)	(ذاکره)	(زهدیٰ)	(راشد)
٣	٤	٤	١
	٣٢	٣٢	٨
		٢٢٤	٥٦
			٢١٨٤

٨/٢٤ — ١٥/٤٥

توافق/٣

عبد اللّٰه میـــت

زوجة	بنت	بنت	أخ
(هنده)	(ذاکره)	(زاهده)	(رشید)
٣	٨	٨	٥
٤٥	١٢٠	١٢٠	٧٥
٣١٥		٨٤٠	٥٢٥
١٢٢٨٥			٢٠٤٧٥

٧/٦

ذاکره میـــت تباین ١٥٢

زوج (لئیق)	اخت لأب (زاهده)	أخت لأم (زهدیٰ)
٣/٤٥٦	٣/٤٥٦	١/١٥٢
١٧٧٨٤		

١/١٢

زاهده میـــت تداخل ١٠٨/١٢٩٦

زوج (ندیم)	بنت (نعیمه)	بنت (نفیسه)	عم (رشید)
٣/٣٢٤	٤/٤٣٢	٤/٤٣٢	١/١٠٨
١٢٦٣٦	١٦٨٤٨	١٦٨٤٨	٤٢١٢

٣٩/١٣/١٢

زهدیٰ میـــت تباین ٣٧٦

زوج (ماجد)	بنت (ماجده)	بنت (مجیده)	بنت (ساجده)	اب (عبد المجید)
٣/٩	٨/٣٠٠٨	٨/٣٠٠٨	٨/٣٠٠٨	٢/٦
٣٣٨٤				٢٢٥٦

١٥٧٢٤٨

الـــــمبـــلـــغ

الأحیـــاء

زینب	راشد	ہندہ	رشید	لئیق	ندیم	نعیمہ	نفیسہ	ماجد	ماجدہ	مجیدہ	ساجدہ	عبدالمجید
۳۵۳۱۲	۲۱۸۴	۱۲۲۸۵	۲۸۶۸۷	۱۷۷۸۴	۱۲۶۳۶	۱۶۸۴۸	۱۶۸۴۸	۳۳۸۴	۳۰۰۸	۳۰۰۸	۳۰۰۸	۲۲۵۶

ہروارث کومرحوم کے ترکہ میں سے اتنا اتنا حصہ ملے گا جو اس کے نیچے درج ہے، نیز اس سوال کا نقشہ ’’فتاویٰ تاتارخانیہ ۲۰/۳۱۴-۳۱۵‘‘ میں بھی موجود ہے۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۴/ رجمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ

(الف فتویٰ نمبر:۳۰/۲۶۵)

۱٤ متفرقات

تقسیم ترکہ

سوال [۱۱۵۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص اپنے وطن سے برسوں پہلے شہر احمد آباد میں آئے، یہاں قیام کیا، کاروبار مٹھائی کا شروع کیا، اولاد میں ۱۰/لڑکے اور ۲/لڑکیاں ہیں، کاروبار بڑھتا گیا، البتہ کاروبار کی ۲/ دوکانیں اور ایک کوٹھری کرایہ پر ہیں، اور جائیداد میں ۳/ ذاتی مکان، اچھی خاصی نقدی، تانبہ، پیتل کے برتن وغیرہ اور مٹھائی بنانے کے برتن اور آلات چھوڑے ہیں، ان دس لڑکوں میں سے دو نے والد صاحب سے اپنا حق مانگ لیا، اور دونوں نے حصہ لینے کے بعد کہہ دیا کہ اب تم پر ہمارا حق نہیں، ایک لڑکا نافرمان ہی رہا، اور والد صاحب سے الگ رہا چوتھے لڑکے نے سرکاری گناہ کیے تھے، جس میں اس کو چھڑوانے میں کئی لاکھ خرچ ہوا، اور انہوں نے کہا تھا کہ میں یہ پورا قرض ادا کروں گا، قرض تو ادا نہیں کیا البتہ والد صاحب سے بغاوت پر رہا، سب سے بڑا لڑکا شادی کے بعد الگ ہوگیا، اس نے اپنا ذاتی کاروبار شروع کیا، الگ رہنے لگا، اب بھی الگ رہتا ہے۔

ان میں سے ایک لڑکا اپنی ذاتی رقم سے سعودی گیا اور قریب ۲/سال ملازمت کی، اس میں اچھی کمائی کر کے وہ اپنے والد صاحب سے الگ ہوگیا، اور اپنا ذاتی کاروبار کرنے لگا، جس میں اس نے والد صاحب سے کسی قسم کا مالی وذاتی تعاون نہیں لیا، البتہ والد صاحب کے ساتھ حسن سلوک میں کوئی کمی نہیں کی، اس درمیان زید نامی شخص نے اپنی دونوں لڑکیوں کی شادی بھی کردی، اول دو لڑکوں نے اپنا حق لینے کے بعد اپنی مرضی سے شادی کی، نمبر ۳/ جو نافرمان ہے، اس نے شادی نہیں کی، ہاں زید کی بیوی قریب ۲۰/سال پہلے دنیا سے رخصت ہوگئی، لہٰذا مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات بالتفصیل تحریر فرمادیں، کہ ہم غیر عالموں کو ایک ایک سوال کا جواب سمجھ میں آئے۔

نوٹ: ۲۰/سال پہلے تمام لڑکے کاروبار میں محنت میں برابر شریک تھے۔

(۱) مرحوم زید کے مال میں سے ۱۰/لڑکے اور ۲/لڑکیاں سب کو میراث میں حصہ ملے گا یانہیں؟ اگر ملے گا تو کتنا ملے گا؟

(۲) جن دولڑکوں نے اپنا حصہ لیا اور کہہ دیا کہ ہمارا کوئی حق نہیں، ان کو ملے گا یانہیں؟

(۳) جولڑکا (عاق) نافرمان ہے اس کو ملے گا یانہیں؟

(۴) ایک لڑکے نے سرکاری گناہ میں ملوث ہوئے خرچ کی رقم واپس کرنے کا وعدہ کیا تھا اس سے اس کو لیا جائے گا یانہیں، یا پھر اس کو میراث میں سے رقم میں کمی کی جائے گی یانہیں؟

(۵) کرائے کی دو دو کانیں اور ایک کوٹھری میراث میں گنتی کی جائے گی یانہیں؟

(۶) مرحوم زید قریب ۱۰/سال بیمار رہے وفات سے تقریباً ۲/سال پہلے بیمار ہوئے ڈاکٹر نے ناامیدی ظاہر کردی، پھر بھی کچھ طبیعت ٹھیک ہوئی تو اسی بیماری میں انہوں نے اپنے ۴/لڑکوں کے متعلق وصیت نامہ لکھوایا تو یہ وصیت نامہ بیماری کی حالت میں لکھوایا تو شرعاً معتبر ہے یانہیں؟

(۷) دونوں دوکانیں اچھی چلتی ہیں تو کاروبار کی گڈویل Goodwel کا اعتبار ہوگا یانہیں؟

(۸) اگر یہ ۴/لڑکے میراث میں سے دوسروں کو حق نہ دیں تو شرعاً کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد طارق مٹھائی والے

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱تا۳) زید کے ترکہ میں سے اس کی مذکرو مؤنث دونوں اولادوں کو حصہ ملے گا، کل مال متروکہ ۲۲/حصوں میں تقسیم ہوکر لڑکوں کو دو، دو اورلڑکیوں کو ایک ایک ملے گا، اور جن لڑکوں نے اپنا حصہ کہہ کر پیشگی لے لیا تھا وہ تبرع شمار ہوگا اس کی وجہ سے وہ ترکہ سے محروم نہیں ہوں گے، اس لیے کہ ترکہ میت کے چھوڑے ہوئے مال کو کہتے اور جولڑکا نافرمان ہے وہ بھی شرعی وارث بنے گا۔

﴿قال اللہ تعالی: لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ. [النساء: ١٢]﴾

لأن التركة ما تركه الميت من الأموال صافيا عن تعلق حق الغير بعين من

الأموال. (شامی، کتاب الفرائض، زکریا ۱۰/۴۹۳، کراچی ٦/٧٥٩، حاشیه سراجی ص: ٤)

(۴) حسب تحریر سوال اگر مذکورہ لڑکے نے سرکاری گرفت سے بچنے کے لیے اپنے اوپر کیے گئے خرچ کو باپ کا خرچ سمجھا تو اس پر لازم ہے کہ وہ رقم والد کے انتقال کے بعد ان سب ورثاء میں حسب حصص شرعیہ تقسیم کرے یا والد کی طرف سے ملنے والے حصہ میں سے یہ رقم منہا کرالے۔

إن الواجب فی باب القرض رد مثل المقبوض. (بدائع الصنائع، کتاب الفرائض، فصل فی شرائط رکن القرض، زکریا ٦/٥١٨، کراچی ٧/٣٩٤)

(۵) جو دوکانیں اور ایک کوٹھری کرایہ پر دے رکھی تھی، وہ بھی میراث میں شمار ہوکر سب ورثاء کو ان کے شرعی حصص کے مطابق ملے گی۔

لأن الترکة ما ترکه المیت من الأموال صافیا عن تعلق حق الغیر بعین من الأموال. (شامی، کتاب الفرائض زکریا ١٠/٤٩٣، کراچی ٦/٧٥٩، حاشیه سراجی ص: ٤)

ثم یقسم الباقی بین ورثته بالکتاب والسنة وإجماع الأمة. (سراجی ص: ٤-٥)

(٦) باپ نے اپنے مرض الوفات میں چار بیٹوں کے نام جو وصیت نامہ لکھوایا ہے اس کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں ہے کیونکہ وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہوتی، البتہ دیگر ورثاء اگر راضی ہوں تو اس کا نفاذ ہوسکتا ہے۔

عن أبی أمامة الباهلی -رضی الله عنه- قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصیة لوارث، النسخة الهندیة ٢/٣٢ دار السلام رقم: ٢١٢٠، سنن أبی داؤد، الوصایا، باب ماجاء فی الوصیة للوارث، النسخة الهندیة ٢/٣٩٦، دار السلام رقم: ٢٨٧٠)

عن عبد الله بن عباس -رضی الله عنه- قال: قال رسول الله ﷺ: لاتجوز الوصیة لوارث إلا إن شاء الورثة. (السنن الکبریٰ للبیهقی، باب نسخ الوصیة للوالدین والأقربین، دار الفکر ٩/٣٥٦، ٣٥٧، ٣٥٨ رقم: ١٢٧٩٧، ١٢٧٩٨، ١٢٨٠٣، سنن الدار قطنی، دار الکتب العلمیة بیروت ٤/٨٦، رقم: ٢٤٥١، ٢٤٥٢)

(۷) کاروبار گڈویل یعنی نام کی حیثیت کو عرف میں قابل قیمت مان لیا گیا ہے اس لیے اس کی قیمت لگا کر ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۴/ ۱۷، نظام الفتاویٰ ۱/ ۱۳۲، ایضاح النوادر ص: ۴۸)

(۸) اگر چار لڑکے ساری جائیداد کو آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں اور دوسرے ورثاء کو ان کا حق نہیں دیتے ہیں تو یہ دوسرے ورثاء کے مال کو غصب کرنے والے شمار ہوں گے جس پر حدیث شریف میں بہت سخت وعید وارد ہوئی ہے۔

عن أنس بن مالک –رضی الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: من فر من میراث وارثه، قطع الله میراثه من الجنة یوم القیامة. (سنن ابن ماجه، باب الحیف فی الوصیة، النسخة الهندیة ۲/ ۱۹٤، دار السلام رقم: ۲۷۰۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ / جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۵۳۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۵/۲۲ھ

تقسیم ترکہ کی ایک صورت

سوال [۱۱۵۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسماۃ اللہ دی کی پہلے شوہر عبد العزیز سے (عبد الرشید، محمد حنیف، عبد الوحید اور خاتون) چار اولادیں ہوئیں، شوہر اول کے انتقال کے بعد دوسرے شوہر عبد المجید سے دو لڑکی شمو اور شہناز ہوئیں، اللہ دی اور ان کے شوہر عبد المجید اس وقت جس نئے تعمیر شدہ مکان میں رہتے ہیں، نئی تعمیر سے پہلے پرانی تعمیر کی حالت میں یہ مکان کسی بنئے کے پاس گروی رہن رکھا ہوا تھا، یہ مکان دراصل اللہ دی کے والد بشیر احمد کا تھا، اور انہوں نے ہی گروی رکھا تھا، پھر اس کو نئے طریقہ سے بنوایا گیا، اس مکان کی تعمیر کے لیے اللہ دی کے شوہر عبد المجید نے اپنا ذاتی مکان بیچ کر اس کی قیمت میں سے بھی دو تہائی سے زیادہ پیسہ اور دس ہزار روپیہ نقد الگ دیا، ۲۵/ کٹے سیمنٹ کے اور چار چوکھٹ اور اور ایک دو ونڈو یہ سب نقد اور سامان عبد

المجید نے اس کی تعمیر کے لیے دیا،عبد المجید کے علاوہ محمد حنیف اور عبد الوحید (جو پہلے شوہر کی اولاد ہیں) کا بھی پیسہ اس میں لگا جتنا بھی لگا،اس مکان کی پہلی اور دوسری منزل کی تعمیر تو عبد المجید اور محمد حنیف نے مل کر کرائی،اس تیسری منزل کی تعمیر میں بھی ۲۵ر ہزار روپیہ نقد عبد المجید نے دیئے۔

اور دوسرے یہ کہ عبد المجید محمد حنیف کا سامان جو باہر دہلی وغیرہ میں لے جا کر بیچتے تھے،تو اس کے پیسے سے کچھ دنوں تک ان دونوں کا یہ کاروباری سلسلہ چلتا رہا،تو اس کا جو بھی نفع عبد المجید کے حصہ کا ہوتا تھا،وہ بھی برابر تیسری منزل کی تعمیر میں لگتا تھا،محمد حنیف نے ان سودوں کے نفع کا کوئی حساب عبد المجید کو الگ سے نہ دیا اور نہ سمجھایا بلکہ عبد المجید نے جب بھی پوچھا کہ ان سودوں کے پڑتے کا حساب کیا ہے،تو محمد حنیف نے یہی جواب دیا کہ یہ سب اس میں (یعنی مکان کی منزل میں) لگ تو گیا،عبد المجید کو بھی اس پر کوئی خلش یا اعتراض نہیں ہوا، کیونکہ ایک ہی گھر کی بات تھی،بہر حال ۱۹۹۲ء تک مکان کی تیسری منزل بھی مع پلاسٹر وفرش کے مکمل ہوگئی تھی۔اب اللہ دی بہت کمزور ہو چکی ہیں،آئے دن بیمار رہتی ہیں،ان کے شوہر عبد المجید کا کہنا ہے کہ یہ مکان تمہارا ہے،ہم سب نے مل کر اس کو بنایا ہے،اس مکان میں میرا کیا حق ہے،اور کتنا ہے،تم اپنی زندگی میں اس مسئلہ کو طے کر دو،تو وہ جواب دیتی ہیں کہ تمہارا اس مکان میں کوئی حق نہیں،بس اس میں رہتے رہو کل کو اللہ دی کے انتقال کے بعد اللہ دی کے لڑکے نے اس مکان سے عبد المجید کو بے دخل کر دیا تو وہ بیچارے کہاں جائیں گے،اس لیے آپ کو زحمت دی گئی ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس مکان اس وقت (یعنی اللہ دی کی زندگی میں) اور اللہ دی کے انتقال کے بعد عبد المجید کا کیا حق نکلتا ہے،اس کو سمجھا کر کسی قدر وضاحت کے ساتھ تحریر فرمائیں،عین نوازش ہوگی،اللہ پاک آپ کو اس کا اجر جزیل عطا فرمائے

المستفتی: عبد المجید کباڑی،بھارت اسٹور ہلدوانی نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سوال میں اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ مکان کو گروی سے کس نے چھڑایا،لیکن پورے سوالنامہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ مکان مسماۃ اللہ دی کو اس کے والد بشیر احمد سے بطور وراثت مل گیا تھا،پھر اس مکان کی تعمیر میں عبد

المجید، عبدالوحید، محمد حنیف یہ تینوں شریک رہے ہیں۔

لیکن تینوں نے کتنا کتنا خرچ کیا ہے، اس کی وضاحت نہیں ہے بلکہ مشترکہ کمائی سے کم زیادہ تینوں نے خرچ کیا ہے اس لیے نئی تعمیر شدہ حصہ میں دوسری منزل میں عبدالوحید اور محمد حنیف کا برابر پیسہ شمار کیا جائے گا، لہٰذا نئی تعمیر کی ایک مناسب قیمت لگائی جائے، اور دوسری منزل کی الگ قیمت لگائی جائے، اور تیسری منزل کی الگ، دوسری منزل تک میں تینوں برابر شریک ہوں گے، اور عبدالوحید کے انتقال پر اس کا حصہ اس کی ماں اور اس کے دونوں بھائی اور بہن خاتون کے درمیان شرعی طور پر تقسیم ہوگا۔

یہ اس صورت میں ہے کہ جبکہ عبدالوحید بغیر شادی شدہ فوت ہو گیا ہو، اور اگر عبدالوحید شادی شدہ ہو تو اس کی بیوی اور اولاد بھی ورثاء میں شریک ہوں گے، اور اگر اولاد میں کوئی لڑکا بھی ہو تو اس کے بھائی اور بہن وارث نہیں بنیں گے، ورثاء کی تفصیل سوالنامہ میں نہیں ہے، اس لیے فیصلہ کا جواب نہیں لکھ سکا، اور عبدالوحید کے بعد دوسری منزل تک اس کے حصہ کو مجریٰ کرنے کے بعد باقی دوسری منزل اور تیسری منزل تک ملبہ میں عبدالمجید، محمد حنیف برابر شریک ہوں گے اور زمین میں کسی کا حق نہیں ہوگا، مکمل اللہ دی کی ہے، اللہ دی کی وفات کے بعد عمارت کی زمین اللہ دی کے ورثاء میں شرعی طور پر تقسیم ہوگی۔

$\frac{۲۸}{۴}$

اللہ دی میـــــــــــــــــــــــــــــــــــــت

شوہر	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی
$\frac{۱}{۷}$	۶	۶	۳	۳	۳

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ / جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۰۵۴)

والد کی جائیداد کی ۲۷؍سال بعد تقسیم

سوال [۱۱۵۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: والد محترم کی حیات ۱۹۸۱ء سے میں ہی ان کی تجارتی دوکان سنبھال رہا ہوں، خرید وفروخت سب پر میرا ہی قبضہ تھا (اگر چہ صراحتاً والد صاحب مرحوم نے مجھے یہ نہیں کہا کہ یہ تجارت تیری ہے، میں نے دوکان تیرے حوالہ کردی) مگر کاروبار کے سلسلے میں اپنے تمام اختیارات انہوں نے میرے حوالہ کردیئے تھے، بلکہ زندگی کے آخری سالوں میں دوکان کا حساب وکتاب بھی مجھ سے لینا چھوڑ دیا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ جو تجارت میں تقریباً ستائیس سال سے سنبھال رہا ہوں، والد مرحوم کی حیات میں سات سال اور پھر ان کے انتقال کو آج بیس سال گذر گئے، اس کی آمدنی کا کیا حکم ہے؟ کیونکہ اس تجارت کی آمدنی سے میں نے ایک بہن کا نکاح اور خود اپنا نکاح بھی کیا، نیز اسی کی آمدنی سے گھر کے تمام اخراجات کے علاوہ کئی حج اور عمرے بھی میں نے کیے ہیں، اگر یہ ساری تجارت والد صاحب کا ترکہ شمار ہوگی تو اب تک اس میں جو تصرف (دانستہ ونادانستہ) مجھ سے ہو چکے ہیں ان کو میں کیسے اور کس حساب سے تمام وارثین (شرکاء) کو ادا کروں، تفصیلی جواب دیں تاکہ میں اہل حقوق کا حق ادا کرکے عند اللہ وعند الناس مؤاخذہ آخرت سے بری ہو جاؤں؟ نیز والدین کی استعمال شدہ گھریلو اشیاء بھی فی الحال میرے ہی استعمال میں ہیں جو لاعلمی سے ہنوز تقسیم نہیں ہوسکیں، اس کے متعلق بھی حکم شرعی بیان فرمادیں۔

المستفتی: رشید احمد سعد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ اس بات کو دیکھ لیں کہ جب آپ کے والد صاحب کا انتقال ہورہا تھا اس وقت تجارتی دوکان کا سرمایہ کتنا رہا ہے وہ سب کا سب آپ کے والد کا ترکہ شمار ہوگا، چاہے والد نے آپ کو ذمہ دار بنا دیا ہو پھر بھی ملکیت والد ہی کی

ہوگی، اور والد کے انتقال کے بعد اس تجارتی سرمایہ کے سہارے سے آپ نے کتنا کمایا، اس کو دیکھ لیں، اور آج موجود حالات میں کتنا باقی ہے، اس کو دیکھ لیا جائے، اگر فی الحال جو سرمایہ موجود ہے وہ والد صاحب کے انتقال کے وقت کے سرمایہ سے کم نہیں ہے تو بہنوں سے بات چیت کر کے آپس کی تراضی سے موجودہ سرمایہ کو شرعی طور پر تقسیم کرلیں۔

اور جو آپ نے حج وعمرہ میں خرچ کیا اور اپنی شادی کی اور بہنوں کی شادی کی ہے، ان سب کو والد صاحب کے سرمایہ کے سہارے پر حاصل کیے گئے، منافع میں سے شمار کیا جائے گا، لیکن یہ منافع آپ کی محنت سے حاصل ہوئے ہیں، اس لیے اس میں آپ ہی کا حق ہے، لہٰذا والد صاحب کی وفات کے وقت کی مالیت آج کی موجودہ مالیت سے زیادہ نہیں ہے، تو موجودہ حالت میں جو کچھ بھی سرمایہ ہے اس کو آپس کی تراضی سے تقسیم کرلیں چونکہ آپ کے معاملات لمبی مدت تک کے درمیان الجھے ہوئے ہیں، اس لیے ہم اس سے مزید وضاحت سے لکھنے سے قاصر ہیں، آپس کی صلح، رضامندی سے کم وزیادہ کی معافی کے ساتھ معاملہ صاف کرلینا چاہیے۔

الأب و ابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيئ فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله لكونه معينا له (إلى قوله) فإن قالوا هم أو امرأته بعد موته إن هذا استفدناه بعد موته فالقول لهم، وإن اقروا أنه كان يوم موته فهو ميراث من الأب. (شامي، الشركة، مطلب: اجتمعا في دار واحدة واكتسبا …… زكريا ٦/٢ ٥٠، كراچی ٤/٣٢٥، هنديه زكريا جديد ٢/٣٣٢، قديم ٢/٣٢٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ / جمادی الثانیہ ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۶۵۴)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۶/۲۸ھ

عورت کا ملکیت کا دعویٰ بلا دلیل معتبر نہیں

سوال [۱۱۵۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کی شادی مسماۃ بنت فلاں سے عرصہ چار ماہ قبل ہوئی تھی، زید شادی ہونے

کے۱۲؍دن بعد ایکسیڈ ینٹ میں جاں بحق ہوگیا، مسماۃ کو جبراً عدت گزارنے کے لیے مرحوم کے والدین نے اپنے گھر پر روک لیا، دوران عدت مسماۃ کی والدہ نانی اور بہنیں برابر مسماۃ کے پاس رہی ہیں، مسماۃ نے اپنی والدہ نانی یا بہنوں کے بہکانے میں ہم والدین سے یہ کہنا شروع کردیا کہ مرحوم نے اپنا لیپ ٹاپ موبائل، زیورو غیرہ مجھے دیدیا تھا جبکہ اس طرح کی کوئی بھی بات مرحوم نے اپنی زندگی کے ان بارہ دنوں میں اپنے ماں باپ یا اور کسی رشتہ دار سے نہیں بتائی تھی، خدا ہم وارثین کا گواہ ہے، نکاح کے وقت قاضی کے سامنے روبرو گواہان ووکیل مہر کے مبلغ ۲۵؍ ہزار نقد دیدئے گئے تھے، مہر باقی نہیں رہا تھا، زید مرحوم کے پاس یا نام سے کوئی بھی منقول یا غیر منقول نقدی یا جائیداد نہیں ہے، مرحومہ کے والدین نے جو باحیات ہیں، شادی کی سبھی ضروریات اور انتظامات سنبھالے، مسماۃ مرحومہ مندرجہ بالا اشیاء پر اپنا حق جتا کر ہم والدین سے لینا چاہتی ہیں اور عدت پوری ہونے کے بعد اپنے میکہ جانا چاہتی ہے، مرحوم کے والدین ذہنی کشمکش کا شکار ہے۔

مندرجہ بالا مختصر حالات کی روشنی میں ہم والدین کو نیچے لکھے سوالات کے جوابات قرآن وحدیث کی روشنی میں دینے کی زحمت گوارہ کریں، ہم نے مندرجہ بالا تحریر حقائق کی روشنی میں خدا کو حاظر وناظر مان کر لکھی ہے: سوال یہ ہے:

(۱) کیا مہر نقد دینے کے بعد بھی مہر باقی رہا؟

(۲) مرحوم نے جو اشیاء لیپ ٹاپ، موبائل شادی کے زیورات وغیرہ چھوڑے ہیں کیا ان پر مسماۃ کا حق ہوتا ہے، جبکہ والدین باحیات ہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) جب ۲۵؍ ہزار روپئے نقد ادا کردیئے گئے ہیں تو اس سے مہر کی ادائیگی ہوچکی ہے، شرعاً دوبارہ مطالبہ کا حق نہیں ہے، بشرطیکہ مہر کی مقدار اتنی ہی رہی ہو۔

عن أبی حرۃ الرقاشی عن عمه أن رسول اللّٰه ﷺ قال: لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفس منه. (شعب الإیمان للبیهقی، باب فی قبض الید عن

الأموال المحرمة، دار الكتب العلمية بيروت ٣٨٧/٤، رقم: ٥٤٩٢، السنن الكبرىٰ للبيهقي، دار الفكر بيروت ٥٠٦/٨، رقم: ١١٧٤٠، مسند أحمد بن حنبل ٧٢/٥، رقم: ٢٠٩٧١، سنن الدار قطني، دار الكتب العلمية بيروت ٢٢/٣، رقم: ٢٨٦٢)

(۲) مرحوم کی ملکیت میں جو لیپ ٹاپ اور زیورات وغیرہ ہوں ان کو چار حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ مرحوم کی بیوی کا حق ہے اور ایک حصہ مرحوم کی ماں کا حق ہے، اور دو حصے مرحوم کے والد کا حق ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍شوال المکرّم ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۶۵۸)

وراثت سے متعلق چند سوالات کے جوابات

سوال [۱۱۵۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) شریعت اور قرآن وحدیث میں وراثت کے بارے میں کیا فرمایا اللہ نے اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے؟

(۲) کیا وراثت کا مال باپ کے مرنے کے بعد ماں کا ہو جاتا ہے اور ماں کے مرنے کے بعد وراثت بٹنی چاہئے ؟

(۳) دوکان، مکان اور کچھ قیمتی سامان جس کی قیمت پچاس سے ساٹھ لاکھ کے قریب ہوتی ہے، جو ہمارے والد موت کے وقت چھوڑ گئے تھے، اب ہم تین بھائی اور ایک بہن اور ماں ہیں، اب ہم سب میں سے کس کو کتنا حصہ ملے گا، کس طرح سے تقسیم کریں آپ ہمیں حساب بتائیں؟

(۴) دو سال ہمارے والد کے انتقال کو ہو گئے، ہمارے والد کے ساتھ والد کی ہی دوکان میں چھوٹا بھائی کاروبار کرتا تھا، والد کے انتقال کے بعد بھی چھوٹا بھائی ہی کاروبار کر رہا ہے، اب سوال یہ ہے کہ اس دوکان میں والد کے انتقال کے وقت ایک سے ڈیڑھ لاکھ کا مال تھا، اس مال اور اس مال کے منافع میں اور دو سال میں اس مال کو بڑھایا گیا، کیا ان سب میں

ماں اور تین بھائی اور ایک بہن کا بھی حصہ ہوگا؟

(۵) بیٹی کی شادی کے وقت باپ نے بطور تحفہ پچیس ہزار روپے دیئے تھے، تو کیا بیٹی اپنا اور وراثت کا حصہ مانگ نہیں سکتی؟ کیا اس کے حصہ میں وہ پچیس ہزار بھی کاٹے جائیں گے؟ اور اگر بیٹی غریب ہے اور وہ اپنا حق مانگتی ہے تو کیا وہ گنہگار رہے؟

(۶) بارہ سال قبل بڑے بیٹے کو والد نے گھر سے خود نکال دیا، کیونکہ دونوں کے درمیان دین کو لے کر بہت انتشار تھا، والد جماعت اہل حدیث کے خیال کے تھے اور بیٹا جماعت دیوبند خیالات کا تھا، تو کیا اس بیٹے کا وراثت میں کچھ حق نہیں ہے اور اگر وہ حق مانگے تو وہ گنہگار رہے؟

(۷) دوکان اور گھر کے مالک ہمارے والد ہی تھے، اور گھر میں دو بھائی ساتھ ہی تھے، ان بھائیوں کا کہنا ہے کہ ہم والد کے ساتھ تھے، اس لیے یہ سب مال ہمارا ہے، اور ماں کا بھی یہی کہنا کہ یہ سب مال میرا ہے، اور ماں سب کچھ اپنے نام کروانا چاہتی ہے، اور ماں یہ کہتی ہے کہ جسے لینا ہو میرے مرنے کے بعد لے، میرے زندہ رہتے ہوئے نہیں ملے گا، حالانکہ والد کے مرتے ہی وراثت کے سلسلے کو لے کر بہت جھگڑا اور بہت انتشار ہوا ہے، پولیس اسٹیشن تک ماں لے کر چلی گئی ہے تو کیا ماں کا یہ فیصلہ صحیح ہے، اور وراثت نہیں بٹنے سے آپس میں خون خرابے تک بات جا رہی ہے تو ماں کو کیا کرنا چاہیے؟

(۸) ماں کو خرچ کوئی بھی بیٹا نہیں دے رہا ہے، ماں کا خرچ اسی دوکان سے پورا ہو رہا ہے جو باپ چھوڑ گیا، تو جو بیٹا باہر ہے، صرف اس کے حصے میں ہی ماں کا ہر مہینے کا خرچ نکالا جائے گا، یا سب بیٹوں کو دینا ہوگا؟

ماں کا ہر مہینے کا خرچ کوئی بھی بیٹا نہیں دیتا ہے جو بیٹا گھر میں ہے وہ بھی نہیں دیتا جو باہر ہے، وہ بھی نہیں دیتا ہے تو کیا وراثت کی تقسیم کے وقت تینوں بیٹوں سے اور بیٹی سے باپ کے انتقال سے لے کر وراثت بٹنے تک ماں کا خرچ لینا ہوگا، باپ کے انتقال سے وراثت کے تقسیم ہونے تک کیا تینوں بیٹے اور ایک بیٹی سے بھی خرچ لینا ہوگا، اور ماں بیٹی سے بھی خرچ مانگ رہی ہے، اس دوران اگر کسی اولاد کا انتقال ہو جائے تو کیا حکم ہے، تو کیا مرنے والے کی جو اولاد ہے اس کو ملے گا، اور اگر ایک بیٹا یوں کہے کہ میں نہ تو شریعت کو مانتا ہوں اور نہ کسی

مولانا کو جانتا ہوں، نہ کسی عالم کی بات سنتا اور نہ ہی قانون کی بات مانوں گا تو جو یہ کہے اس کا کچھ علاج ہے، کیا وہ گناہ کرر ہا ہے، جو شریعت کو نہ مانے اس پر کیا وعید ہے؟

(۹) دو بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہوں اور باپ نے حیات میں ہی ایک بیٹے کے نام یہ ساری جائیداد کردی ہو تو کیا باقی اولادوں کا اس مال پر کچھ بھی حق نہیں ہے اور کیا باپ نے یہ صحیح کیا ہے؟، اگر بے اولاد ہو اور شوہر نے بہت سارا مال چھوڑا ہو تو کیا پورا مال بیوی کا ہوگا؟ یا ان دونوں کے رشتہ داروں کا بھی کچھ حق ہے؟

(۱۰) برائے مہربانی قرآن وحدیث کے حوالے سے آپ ان سارے سوالوں کا جواب تفصیل سے دیں، کیونکہ آپ کے ہی جواب سے بہت سارے گھروں کا انتشار ختم ہو جائے گا، اور سب کی سمجھ میں ہر بات آجائے گی، کیونکہ ساری دنیا ابھی دین سے دور ہوتی جارہی ہے نہ خدا کا حکم جانتی ہے نہ نبی کا فرمان، اگر آپ لوگ اس کا ذریعہ بنتے ہو تو بہت ہی اچھا ہوگا، اللہ آپ کو اس کی جزائے خیر دے، آپ کے ان جوابات سے بہت سارے جھگڑے اور فساد کا انتشار ختم ہوگا، اور ذرا جلدی کیجئے؟

(۱۱) اگر اولاد نافرمان ہو تو باپ اپنی اولاد کو وصیت کر کے وراثت سے محروم کرسکتا ہے؟

(۱۲) کیا شرعی طور پر اس کی اجازت ہے کہ آدمی اپنا پورا مال اللہ کی راہ میں لگادے اور اپنی اولاد کو وراثت سے محروم کردے؟

(۱۳) اپنے شرعی حق نہ ملنے پر کیا قانونی لڑائی لڑنے کی اجازت ہے؟

المستفتی: انصار شیخ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) وراثت تقسیم کرنے کے متعلق اللہ تعالیٰ نے عدل وانصاف اور امانت ودیانت کا حکم فرمایا ہے:

﴿وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوْ الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوْفًا. [النساء: ۸]﴾

﴿بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ. [الحجرات: ۹]﴾

(۲) باپ کے مرنے کے بعد میراث کا مال سب کا سب ماں کا نہیں ہوتا ہے، بلکہ تمام شرعی ورثاء اس کے وارث ہوتے ہیں، مرنے والے کی بیوی کل مال کے آٹھویں حصہ کی حقدار ہوتی ہے بقیہ مال لڑکے اور لڑکی کے درمیان ''**للذکر مثل حظ الانثیین**'' کے اعتبار سے تقسیم ہوتا ہے، یعنی ہر لڑکے کو لڑکی کے مقابلے میں دوگنا ملتا ہے۔

﴿**فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ**. [النساء: ۱۲] ﴾

﴿**يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ**. [النساء: ۱۱] ﴾

(۳) برتقدیر صحت سوال وعدم موانع ارث وبعد ادائے حقوق ماتقدم دوکان ومکان اور قیمتی سامان اور نقدی، مرحوم کا کل ترکہ ۸/ برابر سہام میں تقسیم ہو کر بیوی اور لڑکی کو ایک ایک اور ہر لڑکے کو دو، دو ملیں گے۔ جیسا کہ حسب ذیل نقشہ سے واضح ہے:

میــــــــــــــــــــــــــــت ۸

بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی
۱	۲	۲	۲	۱

(۴) وراثت تقسیم کرنے کا حکم اس وقت ہوتا ہے جب آدمی کا انتقال ہو جاتا ہے، لہٰذا دوکان اور ان کا سرمایہ جو کچھ بھی والد صاحب کے انتقال کے وقت رہا ہے، اس کو اسی وقت تقسیم کرنا ضروری ہے، اور اسی وقت کا حساب لگانا چاہیے، اگر اس وقت تمام وارثین کے مانگنے کے باوجود تقسیم نہیں ہوا ہے، اور دو سال کے درمیان اس سے نفع بڑھا ہے، تو نفع حاصل کرنے والے کے محنتانہ کو مجری کر کے بقیہ نفع تقسیم کرلیا جائے۔

تتعلق بتركة الميت حقوق أربعة مرتبة ...... ثم يقسم الباقي بين ورثته. (سراجی ص:٤)

وشروطه ثلاثة: موت مورث حقيقة أو حكما كمفقود أو تقديرا كجنين ووجود إرثه عند موته حيا حقيقة أو تقديراً كالحمل، والعلم بجهة إرثه. (شامی، كتاب الفرائض، زكريا ١٠/ ٤٩١، كراچی ٦/ ٧٥٨)

(۵) بیٹی کی شادی میں جو کچھ بھی خرچ ہوتا ہے اور جو کچھ بھی اس کو دیا جاتا ہے وہ ماں باپ کی

طرف سے تبرع ہوتا ہے، اس کو میراث سے کٹوتی کرنا جائز نہیں ہے، بیٹی باپ کے ترکہ میں میراث پانے کی پوری طرح حقدار ہوتی ہے، اس کو نہ دینے میں اس کے بھائی سخت گناہ گار ہوں گے۔

عن سعيد بن زيد بن عمرو بن نفيل ان رسول الله ﷺ قال: من اقتطع شبرا من الأرض ظلما طوقه الله إياه يوم القيامة من سبع أرضين. (مسلم شريف، كتاب المساقات والمزارعة، باب تحريم الظلم وغصب الأرض، النسخة الهندية ٢/٣٢، بيت الأفكار رقم: ١٦١٠، صحيح البخارى، كتاب المظالم، باب إثم من ظلم شيئا من الأرض، النسخة الهندية ١/٣٣٢، رقم: ٢٣٨٨، ف: ٢٤٥٢، سنن أبى داؤد، كتاب الأدب، باب من يأخذ الشيئ من مزاح، النسخة الهندية ٢/٦٨٣، دار السلام رقم: ٥٠٠٣)

عن أنس بن مالك –رضى الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: من فر من ميراث وارثه، قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة. (سنن ابن ماجه، باب الحيف فى الوصية، النسخة الهندية ٢/١٩٤، دار السلام رقم: ٢٧٠٣، سنن سعيد بن منصور، باب من قطع ميراثا، فرضه الله، دار الكتب العلمية بيروت ١/٩٦، رقم: ٢٨٥-٢٨٦)

(٦) باپ اور بیٹے کے درمیان مسلکی اختلاف کی وجہ سے یا بیٹے کو فیملی سے الگ کر دینے کی وجہ سے بیٹا باپ کی وراثت سے محروم نہیں ہوتا ہے، دوسرے بیٹوں کی طرح یہ بھی برابر کا حقدار ہوگا۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۴/ ۳۱۸)

عن النعمان بن بشير أن رسول الله ﷺ قال: ألک بنون سواه؟ قال: نعم، قال فكلهم أعطيت مثل هذا، قال: لا، قال: فلا أشهد على جور. (مسلم شريف، باب كراهة تفضيل بعض الأولاد فى الهبة النسخة الهندية ٢/٣٧، بيت الأفكار رقم: ١٦٢٣)

(٧) آدمی کے مرنے کے بعد نہ اس کی بیوی سارے مال کی حقدار ہوتی ہے، اور نہ اس کے ساتھ رہنے والے کل مال کے حقدار ہوتے ہیں، بلکہ تمام شرعی وارثین وراثت کے حقدار ہوتے ہیں، لہٰذا جو دو بیٹے ساتھ رہتے ہیں ان کو جتنا جتنا ملے گا، اتنا اتنا اس بیٹے کو بھی ملے گا جو باپ سے الگ رہتا ہے، اور بیوی کو صرف آٹھواں حصہ ملے گا، اس سے زیادہ کی وہ حقدار نہیں ہے۔

أن أعيان المتوفىٰ المتروكة عنه مشتركة بين الورثة على حسب

حصصهم. (شرح المجلة رستم اتحاد ۱/ ۶۱۰، رقم المادة: ۱۰۹۲)

﴿ **فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ**. [النساء: ۱۲] ﴾

(۸) باپ کے مرنے کے بعد ماں کا خرچ جوان بیٹوں پر لازم ہے اگر تینوں بیٹے کمانے کے لائق ہیں، تو تینوں پر ماں کا خرچ لازم ہے، ہاں البتہ اگر کوئی زیادہ کماتا ہے اور کوئی کم تو زیادہ کمانے والے پر اپنی حیثیت کے اعتبار سے زیادہ اور کم کمانے والے اپنی حیثیت کے اعتبار سے کم خرچ دیں گے، مہینہ، ہفتہ اور دنوں کے اعتبار سے خرچ کا طریقہ بنالیا جائے، نیز اگر ماضی میں خرچ نہیں دیا ہے تو ماضی کا خرچ ماں کو مانگنے کا حق نہیں ہے، البتہ بعد کا خرچ مانگنے کا حق ہے، ہاں اگر ماں پر قرض ہو چکا ہے تو قرض ادا کرنے کے ذمہ دار بھی اس کے بیٹے ہیں۔

أشار بقول: ولأبويه إلى أن جميع ما وجب للمرأة يجب للأب والأم علی الولد من طعام و شراب و كسوة و سكنیٰ حتى الخادم . (البحر الرائق، باب الطلاق، باب النفقة کوئٹه ۴/ ۲۰۶، زکریا ۴/ ۳۵۱)

لأن النفقة تختلف بحسب اليسار والإعسار . (البحر الرائق، باب النفقة کوئٹه ۴/ ۱۸۶، زکریا ۴/ ۳۱۵)

تنقیح: اس سوال میں یہ بھی پوچھا گیا ہے کہ اس دوران اگر کسی کا انتقال ہو جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ تو اس کا جواب اس وقت تک نہیں لکھا جائے گا جب تک میت کے ورثاء کی تفصیل نہ لکھی جائے، نیز بحث و جھگڑے کے درمیان شریعت کو ماننے یا نہ ماننے کی جو باتیں کہی گئی ہیں اس سے توبہ کرنا ضروری ہے، اور مال کی بنیاد پر ایک دوسرے پر الزام تراشی کرنا نہایت غلط بات ہے۔

(۹) اگر باپ نے زندگی میں ایک بیٹے کے نام ساری جائیداد کر کے اس کو قبضہ دیدیا ہے تو وہ اس کے نام ہبہ ہو گیا ہے، دوسری اولادوں کا اس میں حق نہیں ہے، مگر اس کی وجہ سے باپ گناہ گار ہوگا۔

ویکره تفضيل بعض الأولاد على البعض فی الهبة حالة الصحة ...... فإن وهب ماله كله لواحد جاز قضاء وهو آثم. (البحر الرائق، کتاب الهبة زکریا ۷/ ۴۹۰، کوئٹه ۷/ ۲۸۸، قاضیخان زکریا جدید ۳/ ۱۹۴، وعلی هامش الهندیة ۳/ ۲۷۹، هندیه زکریا قدیم ۴/ ۳۹۱، جدید ۴/ ۴۱۶)

تنقیح: آگے جو مزید فرضی سوالات کرر کھے ہیں ان کے جوابات دینے کے لیے ہمیں موقع نہیں ہے، اور استفتاء میں اس طرح کے سوالات نامناسب ہیں، کبھی سوال کیا جا رہا ہے کہ دو بیٹے، پانچ بیٹیاں اور کبھی کیا جا رہا ہے کہ ۳/ بیٹے ایک بیٹی وغیرہ، اس طرح کے فرضی سوالات کا جواب ہم نہیں دیا کرتے، ایسے سوالوں کا جواب دیا جاتا ہے جو واقعی ہوں۔

ایک ضروری ہدایت: سائل سے گذارش ہے کہ ایک استفتاء میں زیادہ سے زیادہ ۳/ سوال کی گنجائش ہوتی ہے، ورنہ اصلاً ایک سوال اور اگر مناسبت ہو تو دو سوال، اور آپ نے تیرہ سوال کر ڈالے ہیں جن میں کئی سوالات اگر مگر کر کے فرضی ہیں، تین سے زائد سوال ہونے کی صورت میں ہم جواب کے پابند نہیں ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح
۲۲/محرم الحرام ۱۴۳۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۸۶۶)	۲۲/۱/۱۴۳۱ھ

مرحوم کے ترکہ کی تقسیم اور اس کے زیورات وغیرہ میں زکوٰۃ کا حکم

سوال [۱۱۵۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے لڑکے سیف الرحمٰن کا انتقال ان کی شادی کے تقریباً ۵/ ماہ بعد ہو گیا تھا ان کی املاک کی تفصیل درج ہے:

(۱) فرم میں ان کے حصہ کی رقم کی تقسیم؟

(۲) ان کی زمین وجائیداد کی تقسیم

(۳) جو زیور ان کی اہلیہ کو بری میں دیا گیا تھا جس پر مالکانہ حقوق دونوں میاں بیوی کے تھے، اس سے ماں باپ کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

(۴) جو زیور تحائف کی شکل میں سیف الرحمٰن کے دوستوں نے ان کی اہلیہ کو دیئے تھے، ان ساری املاک میں سیف الرحمٰن کی اہلیہ کا شرع میں کتنا حصہ نکلتا ہے، اور ان کے زیورات وغیرہ کی زکوٰۃ کی ادائیگی کس کے ذمہ ہوگی؟

المستفتی: حفظ الرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سیف الرحمٰن مرحوم کے فرم میں جوحصہ ہے اس کی رقم اوران کی زمین وجائیداد کل چارحصوں میں تقسیم ہوکرایک حصہ ان کی بیوی کو ملے گا اور ایک حصہ ان کی والدہ کو ملے گا اور دوحصہ سیف الرحمٰن کے والد کوملیں گے۔

﴿**وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ.** [النساء: ١٢]﴾

والربع لها عند عدمهما. (در مختار، کتاب الفرائض، زکریا ۱۰/۵۱۲، کراچی ٦/٧٧٠)

اور جو زیورات سیف الرحمٰن کے والد نے ان کی اہلیہ کو بری میں بطور ملکیت دیئے ہیں، وہ تمام زیورات سیف الرحمٰن کی اہلیہ کی ملکیت ہیں، ان میں کسی دوسرے کا حق نہیں ہے، نیز جو زیورات سیف الرحمٰن کے دوستوں نے ان کی اہلیہ کودیئے ہیں وہ تمام زیورات سیف الرحمٰن کی اہلیہ کی ملکیت ہیں،ان میں کسی دوسرے کا حق نہیں ہے، اوران تمام زیورات کی زکوٰۃ سیف الرحمٰن کی اہلیہ کے ذمہ لازم ہے۔

وكذا ما يعطيها من ذٰلك أو من دراهم أو دنانير صبيحة ليلة العرس ويسمىٰ في العرف صبحة فإن كل ذٰلك تعورف في زماننا كونه هدية لا من المهر.

(شامی، کتاب النکاح، باب المهر، زکریا ٤/٣٠٣، کراچی ٣/١٥٣) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹رشعبان ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۶۹۰۰)

تقسیم ترکہ سے متعلق چند سوالات کے جوابات

سوال [۱۱۵۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ(۱) زید کا ایکسیڈینٹ ہوا، کچھ علاج کے بعد زید لا ولد ہی انتقال کرگیا، اس نے اپنے پیچھے ایک بیوی عفت جہاں اور باپ شمیم الدین اور تین بھائی: محمد شاہد، محمد عمران، محمد فرحان چھوڑے، لہٰذا جواب طلب امر یہ ہے کہ زید کا ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا؟

(۲) عفت جہاں کے پاس جو زید کی چھوڑی ہوئی رقم ہے اس کے بارے میں عفت جہاں کا کہنا ہے کہ میرے شوہر زید نے اپنی زندگی میں ہی مجھ کو اس کا مالک بنا دیا تھا، وہ خالص اور خالص میری رقم ہے، اس بیان پر شریعت کیا کہتی ہے؟

(۳) زید مرحوم کا جو باقی ترکہ اور کاروبار میں لگی رقم ہے اس کا کیا حکم ہے؟

(۴) شوہر سے وصول ہونے والی رقم میں مہر کا کیا حکم ہے؟ شوہر کے ترکہ سے اس رقم کو لیا جائے گا یا نہیں؟

(۵) زید مرحوم کے تینوں بھائی نے مل کر زید مرحوم کا علاج کرایا، لیکن وہ صحت یاب نہ ہو سکے اور انتقال کر گئے، اب یہ تینوں بھائی، مرحوم بھائی کی بیوہ عفت جہاں سے علاج میں خرچ ہونے والی رقم کا مطالبہ کرتے ہیں یہ اخلاقاً و شرعاً کہاں تک درست ہے؟

(۶) شوہر کی طرف سے جو زیور شادی پر بیوی کو چڑھایا جاتا ہے اس کا کیا حکم ہے؟

(۷) اب زید کا باپ شمیم الدین بھی انتقال کر چکا ہے، ورثاء میں صرف تین لڑکے ہیں؟

(۸) شوہر اپنی زندگی میں بیوی کو جو زیور یا پیسہ شادی کے بعد دے اس کا مالک کون ہوگا؟

المستفتی: رئیس احمد آزاد نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۷) زید مرحوم کا ترکہ مندرجہ ذیل نقشہ کے مطابق اولاً چار حصوں میں تقسیم ہو کر ایک حصہ بیوی عفت جہاں کو اور تین حصہ ان کے باپ شمیم الدین کو ملے گا اور شمیم الدین کے انتقال کے بعد ان کے یہ تینوں حصے ان کے تین لڑکوں کے درمیان برابر برابر تقسیم ہو جائیں گے۔

زید میــــــــت ۴

زوجہ	اب	اخ	اخ	اخ
عفت جہاں	شمیم الدین	شاہد	عمران	فرحان
۱	۳	محروم	محروم	محروم

شمیم الدین میت ۳ ۳

ابن	ابن	ابن
شاہد	عمران	فرحان
۱	۱	۱

المبلغ ۴

میت

عفت جہاں	شاہد	عمران	فرحان
۱	۱	۱	۱

(۲) زید کی چھوڑی ہوئی رقم کے بارے میں عفت جہاں کا کہنا کہ میرے شوہر زید نے مجھے اپنی زندگی میں مالک بنادیا تھا تو اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ چونکہ یہ رقم زید کی بیوی کے قبضہ میں ہے اور زید کے بھائیوں کی طرف سے اس رقم پر حق میراث کا دعویٰ ہے اور زید کی بیوی انکار کررہی ہے، اور اپنی ملکیت کا دعویٰ کررہی ہے ایسی صورت میں زید کے بھائیوں پر اس بات پر گواہ پیش کرنا لازم ہے کہ وہ زید کی رقم ہے، اگر ان کے پاس شرعی گواہ نہیں ہیں تو زید کی بیوی کا حلفیہ بیان معتبر ہوگا، اگر وہ حلفیہ بیان دیدے کہ وہ اس کی ملکیت ہے تو اس کی ملکیت شمار ہوگی۔

(۳) زید مرحوم کا جو باقی ترکہ اور کاروبار میں لگی رقم ہے اس کو مذکورہ نقشہ کے مطابق وارثین میں تقسیم کیا جائے گا۔

(۴) شوہر کے ترکہ سے مہر کی ادائیگی لازم ہے۔

(۵) زید مرحوم کے بھائیوں نے مل کر جو رقم زید کے علاج میں خرچ کی تھی اس وقت اگر یہ بات پہلے سے طے ہوچکی تھی کہ زید اس کو اپنے مال سے ادا کرے گا تو بھائیوں کو زید کے ترکہ سے مطالبہ کرنے کا حق ہوگا، اور اگر اس طرح کی کوئی بات پہلے سے طے نہیں ہوئی تھی تو شرعاً زید کے بھائیوں کی طرف سے بیماری میں جو خرچ ہوا ہے وہ تبرع اور صلہ رحمی میں شمار ہوگا، اور اب زید کی بیوی سے مطالبہ کا حق نہیں ہوگا۔

(۶) شوہر نے شادی کے وقت جو زیور بیوی کو دیا تھا اگر وہ بطور ملکیت دیا تھا تو بیوی اس کی مالک ہوچکی ہے، اور اگر بطور ملکیت نہیں دیا تھا اور کوئی صراحت نہیں کی تھی تو برادری میں جو اس سلسلے میں معمول متعارف ہے اسی پر عمل ہوگا، اگر برادری میں یہ بات متعارف ہے کہ جو زیور

دولہن کودیا جاتا ہے دولہن اس کی مالک ہوتی ہے تو بیوی اس کی مالک ہوجائے گی، اوراگر برادری میں یہی دستور ہے کہ جو زیور بیوی کو دیا جاتا ہے وہ عاریت شمار ہوتا ہے تو شوہر اس کا مالک ہوگا۔

(۸) شوہر شادی کے بعد مہر سے الگ جو زیور بنا کر دیتا ہے وہ عام طور پر بطور ملکیت خوشی کے ماحول میں بنا کر دیتا ہے اس لیے جو پیسہ یا زیور زندگی میں شادی کے بعد دیا ہے وہ بیوی کی ملکیت ہوگی، ہاں البتہ اگر صاف اور واضح طریقہ پر شوہر نے یہ کہہ کر دیا ہے کہ اس کا مالک میں ہی رہوں گا تم کو صرف بطور عاریت دے رہا ہوں، تو وہ شوہر کی ملکیت ہوگی، مگر روپیہ پیسہ اس طرح نہیں دیا جاتا ہے، اس لیے روپیہ بہرحال عورت کی ملکیت ہی میں داخل ہوگا۔

وإذا مات أحدهما ثم وقع الاختلاف بين الباقي وورثة الميت فعلى قول أبي حنيفة و محمد ما يصلح للرجال فهو للرجل إن كان حيا ولورثته إن كان ميتا و ما يصلح للنساء فهو على هذا، وما يصلح لهما فعلى قول محمد هو للرجل، إن كان حيا ولورثته إن كان ميتا، وقال: أبو حنيفة: المشكل للباقي منهما وما كان من متاع التجارة والرجل معروف لتلك فهو للرجل كذا في المحيط. (هنديه، الفصل السابع عشر في اختلاف الزوجين في متاع البيت زكريا جديد ۱/۳۹۵، قديم ۱/۳۲۹)

ثم تقضىٰ ديونه من جميع ما بقي من ماله. (سراجی ص: ٤)

القول قول القابض في مقدار ما قبضه. (الأشباه والنظائر ص: ۱۱۰)

القبض مؤكد للملك في المقبوض. (هدايه اشرفی ۲/ ۳۳۱)

القول قول القابض ضمينا أو أمينا لأنه أعرف بمقدار المقبوض. (نصب الراية ٤/۲۸۳)

الثابت بالعرف كالثابت بالنص. (قواعد الفقه ص: ۷٤)

لايرجع في الهبة من المحارم بالقرابة كالآباء والأمهات إلى قوله وكذٰلك الإخوة والأخوات. (تاتارخانية زكريا ١٤/٤٤٩، رقم: ۲۱٦۷۱)

عن سمرةؓ عن النبي ﷺ قال: إذا كانت الهبة لذي رحم محرم لم

يرجع فيها. (المستدرك للحاكم مكتبه نزار مصطفى الباز ۸۷٦/۳، رقم: ۲۳۲٤)

البينة على المدعي واليمين على من أنكر. (قواعد الفقه اشرفى ص:٦٦)

بیوی کے جہیز کا سامان اور مہر کی ادائیگی، اس کے نام کا زیور اور اس کے نام کی نقد رقم کے علاوہ باقی جو ملکیت کا ترکہ زید نے چھوڑا ہے وہ حسب ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

زید میت ۴

زوجہ	اب	اخ	اخ	اخ
عفت جہاں	شمیم الدین	شاہد	عمران	فرحان
۱	۳	محروم	محروم	محروم

بیوی کو دیئے ہوئے روپیہ اور زیور کے علاوہ زید کی ملکیت کا جو بقیہ ترکہ ہے وہ مذکورہ نقشہ کے مطابق چار حصوں میں تقسیم ہو کر بیوی کو ایک اور باپ کو تین ملیں گے، اور بھائی محروم ہو جائیں گے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۴۰۷)

تقسیم ترکہ کے ایک مسئلہ کی وضاحت

سوال [۱۱۵۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) میں آس محمد پسر محمد عمر خاں کی پیدائش اصیل پور، موانہ ضلع میرٹھ میں ہوئی۔

(۲) جب میری عمر تین سال ہوئی تو مجھے میرے پھوپھا پھوپھی اپنے گھر کٹھور، موانہ ضلع میرٹھ میں لے آئے۔

(۳) پھوپھا پھوپھی کے کوئی اولاد نہیں ہوئی، اور مجھے اولاد مانکر تعلیم حاصل کرائی، اور شادی وغیرہ سب کام کیے۔

(۴) میرے پھوپھا جی نے اپنی ملکیت سے کچھ زمین بذریعہ بیع نامہ میرے نام

کردی، جوقریب ۲۰/بیگہ کچی ہے۔

(۵) پھوپھا جی کا انتقال ۲۰۰۳ء میں یعنی ۸/سال پہلے ہوگیا، اور ملکیت پھوپھی جی کے نام پرآ گئی، اوراس ملکیت کی وصیت میرے نام پر پھوپھی جی نے کردی، اس وصیت کا اعتراض میرے پھوپھا جی کے خاندان والوں نے نہیں کیا، اور پھوپھی کا بھی انتقال ۱۶/ جنوری ۲۰۱۰ء کو ہوگیا اور ملکیت میرے نام آ گئی۔

(۶) کہنا یہ ہے کہ میرے حقیقی والدہ کا انتقال اصیل پور میں ۸/دسمبر ۱۹۸۵ء میں اور حقیقی والد کا انتقال اصیل پور میں ستمبر ۱۹۸۶ء میں ہو گیا۔

(۷) میرے حقیقی والد کی ملکیت ۳/حصوں میں تقسیم ہوگئی، کیونکہ ہم تین بھائی اور ایک بہن ہیں اور جو حصہ میرا ہے وہ میں نے اپنے دونوں بھائیوں کو بونے یعنی گزربسر کرنے کو دیدیا ہے، بھائیوں کا انتقال ہو چکا ہے، میں اپنا حصہ اپنے بھتیجوں سے لے رہا ہوں کیا یہ جائز ہے؟

(۸) میرے ایک لڑکا اور ۵/لڑکیاں ہیں، میرا لڑکا بڑا بداخلاق اوراس کی بیوی اور زیادہ بداخلاق ہے، مدتوں سے الگ رہ رہے ہیں، لڑکے کو ۱۲/بیگھہ کچی زمین اور ایک مکان ایک دوکان بازار میں دیدی ہے، مگر پھر بھی میری بےعزتی کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ تیرا کچھ بھی نہیں ہے، سب کچھ ہمارا ہے، اورلڑکیوں کو برا بھلا کہتے ہیں، لڑکیوں کی شادی ہو چکی ہے۔

(۹) اب میں ان حالات میں بڑا پریشان ہوں اور جی چاہتا ہے کہ میں خودکشی کرلوں مگر اللہ سے ڈر لگتا ہے۔

اب مندرجہ بالا (اوپر) کی باتوں کو دیکھتے ہوئے جی چاہتا ہے کہ میں اپنی ملکیت سے کچھ نہ دے کر کسی اور کو دوں، یا پھر پوتوں کو دوں، اب محترم بتایئے کہ اس ملکیت میں جو مندرجہ ذیل ہے، سب کا سب میرا حق ہے یا نہیں؟ اسی میں سے کچھ حصہ بیچ کر اپنے اور اپنی بیوی کے خرچہ میں لے سکتا ہوں؟ تحریر فرمائیں۔

حقیقی باپ سے:	۷/بیگہ زمین جنگل میں	(اس میں پورا حق ہے یا نہیں؟)
پھوپھا جی سے	۲۰/بیگہ زمین جنگل میں	(اس میں پورا حق ہے یا نہیں؟)

پھوپھی جی سے ۴/ بیگہ زمین جنگل میں اور (اس میں کتنا حق ہے؟)
ایک مکان، ایک دوکان
۳۱/ بیگہ پکی

عرض خدمت ہے کہ مندرجہ بالاملکیت کا کتنا حق میرا ہے؟ اگر پورا ہے تو میں کسی کو بھی دے سکتا ہوں، اور لڑکیوں کو اس ملکیت سے کتنا؟ تحریر تفصیل سے لکھیں۔

المستفتی: آس محمد ولد محمد عمر قصبہ کٹھور، ضلع میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پھوپھا نے اپنی زندگی میں جو ۲۰/ بیگہ بیع نامہ کرکے آپ کو دیدی ہے، شرعی طور پر اس ۲۰/ بیگہ کے آپ مالک ہیں، اور پھوپھی نے اپنی ملکیت کی جو وصیت آپ کے حق میں کی ہے کہ اس سلسلے میں اگر پھوپھی کے شرعی وارثین بخوشی وصیت شدہ جائیداد آپ کو دینے پر راضی ہیں تو اس کے بھی آپ مالک ہوجائیں گے، اور اگر راضی نہیں ہیں تو پھوپھی کی ملکیت کی ایک تہائی میں وصیت نافذ ہوجائے گی، اور آپ ایک تہائی کے وارث ہوسکتے ہیں، حقیقی والد اور والدہ کی جائیداد جو تین حصوں میں تقسیم ہوئی وہ شرعاً غلط ہوئی، بلکہ آپ کے ماں باپ کی جائیداد سات حصوں میں تقسیم ہوگی، دو، دو حصے تینوں بھائیوں کو اور ایک حصہ بہن کا ہے، لہٰذا آپ ماں باپ کی جائیداد کے سات حصوں میں سے صرف دو حصہ کے مالک ہوسکتے ہیں، اور ایک حصہ بہن کو دینا سب پر لازم ہے۔

عن أبی أمامة الباهلی –رضی الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول فی خطبته عام حجة الوداع، إن الله تبارک وتعالیٰ قد أعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث. (سنن الترمذی، باب ما جاء لا وصیة لوارث، النسخة الهندیة ۲/ ۳۲ دار السلام رقم: ۲۱۲۰، سنن أبی داؤد، الوصایا، باب ماجاء فی الوصیة للوارث، النسخة الهندیة ۲/ ۳۹٦، دار السلام رقم: ۲۸۷۰، سنن ابن ماجه، باب لاوصیة لوارث، النسخة الهندیة ۲/ ۱۹٤ دار السلام رقم: ۲۷۱۳)

اور آپ کے جو دو حصے بنتے ہیں وہ آپ اپنے بھتیجوں سے لے سکتے ہیں اور آپ نے

اپنے ایک لڑکے اور پانچ لڑکیوں کے بارے میں جو لکھا ہے اور اس سلسلے میں آپ نے جو پوچھا ہے اس میں آپ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکیوں کی شادی ہونے کے بعد لڑکیاں باپ کی وارث نہیں ہوتیں صرف لڑکا ہی وارث ہوتا ہے، اس لیے آپ نے لڑکے کو بارہ بیگہ زمین اور ایک مکان اور ایک دوکان بازار میں دیدی، ایسا کرنا اور ایسا سمجھنا شرعی طور پر غلط ہے، جس طرح لڑکا باپ کی جائیداد کا وارث بنتا ہے اسی طرح لڑکیاں بھی باپ کی جائیداد کی وارث بنتی ہیں، لہٰذا آپ کے مرنے کے بعد آپ کی کل جائیداد سات حصوں میں تقسیم ہوکر دو حصہ لڑکے کو اور ایک ایک لڑکیوں کو ملے گا، بشرطیکہ آپ کی بیوی کا انتقال پہلے ہو چکا ہو، اور اگر بیوی زندہ ہے تو بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا، تو آپ کی کل جائیداد آٹھ حصوں میں تقسیم ہوکر ایک حصہ بیوی کو دو حصہ لڑکے کو اور ایک ایک حصہ لڑکیوں کو ملے گا، اور آپ کے مرنے سے پہلے آپ کی کسی بھی جائیداد کا نہ آپ کا بیٹا حقدار ہے نہ آپ کی بیٹیاں نہ آپ کی بیوی، بلکہ مکمل طور پر مالکانہ حق آپ ہی کو حاصل ہے، آپ کے بیٹے کو اس بارے میں آپ کے اوپر کسی بھی طرح نہ اعتراض کا حق ہے اور نہ آپ سے مطالبہ کرنے کا حق ہے، آپ اس میں جیسے چاہیں تصرف کر سکتے ہیں۔

وإذا أوصىٰ بأكثر من ثلث ماله لأجنبي فهذه الوصية فيما زاد على الثلث لاتجوز إلا بإجازة الوارث. (تاتارخانية ١٩/ ٣٨١ رقم: ٣١٨٥٩)

أخرج الدارمي عن الحسن في الرجل يوصي بأكثر من الثلث فيرضى الورثة قال هو جائز. (مسند الدارمي، دار المغني ٤/ ٢٠٣٦، رقم: ٣٢٣٧)

كل يتصرف في ملكه كيف شاء. (شرح المجلة رستم اتحاد ١/ ٦٥٤، رقم المادة: ١١٩٢)

المالك هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء من الملك. (بيضاوی شريف، رشيديه ١/ ٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۳۹۲)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۴/۲۹ھ

مرحوم کی بیوی سے شادی کر کے مرحوم کے ترکہ سے اس کو محروم کر دینا

سوال [۱۱۵۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) حافظ عبدالستار صاحب انصاری اپنی لاولد اہلیہ کے انتقال کے بعد بہار سے ایک انصاری خاندان کی لڑکی مسماۃ صابرہ خاتون کو نکاح شرعی کے ذریعہ زوجہ بنا کر بجنور لائے، یہاں تک کہ سولہ سال بعد حافظ صاحب کا انتقال ہو گیا، انتقال کے وقت حافظ صاحب نے ایک مکان پندرہ ہزار کے زیورات، انیس ہزار نقد روپیہ اپنے اور اپنی بیوی بچوں کے سلے اور بغیر سلے بہت سے جوڑے، چار کوئنٹل گندم، چینی، تیل، چاول، لحاف گدے اور بہت سا خانگی سامان اور پانچ عدد چھوٹے بچے چھوڑے، صابرہ خاتون نے عدت کے ایام پورے کیے تو خاندان کے کچھ لوگوں نے ہنگامی مجلس قائم کر کے فی الفور ایک غیر ذمہ دار اور ناکارہ لڑکا محمد راشد سے عقد ثانی کرا کر صابرہ کو خالی ہاتھوں مکان سے بے دخل کر کے باہر نکال دیا ہے، جس کا بظاہر محمد راشد سمیت کوئی پرسان حال نہیں ہے، صابرہ کا نکاح بہار میں ہوا تھا، اس کی مہر کی مقدار کے بارے میں کوئی ثبوت نہیں ہے، ایسی صورت میں صابرہ کا مہر حافظ صاحب کے وارثین پر خصوصاً جن کے قبضے میں ان کا مال ہے واجب ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کی کتنی مقدار طے کی جائے؟

(۲) عدت کے بعد اچانک شور ہوا کہ صابرہ ایک بدکار اور زانیہ عورت ہے لیکن اس کے ثبوت کے لیے کوئی شرعی اور عینی شاہد نہیں ہے اتنا ثبوت ملتا ہے کہ صابرہ حافظ صاحب کے بھتیجے محمد راشد (شوہر ثانی) کو دل سے چاہتی ہے وہ راشد کو کھانا کھلاتی ہے اور اس کے پاس آتی جاتی ہے اور کبھی راشد اس کے پاس آتا جاتا تھا؟ دونوں کو تنہا مکان میں بیٹھے بات چیت کرتے بھی متعدد بار دیکھا گیا ہے، ان حالات میں دونوں یا کسی ایک کو زانی قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

(۳) صابرہ سے کل مال واسباب کے ساتھ پانچ بچوں (بڑی لڑکی گیارہ سال،

چھوٹا لڑکا تقریباً ۳ ر سال) کو لے لیا گیا ہے، اہل محلّہ نے طے کیا ہے کہ مکان کا آٹھواں حصہ چھوڑ کر باقی پورا مکان تین سالہ بچے کو بالغ ہونے پر دیا جائے گا، اور زیورات شادی کے موقع پر لڑکے یا لڑکیوں کو دیئے جائیں گے، باقی کل روپیہ و خانگی سامان بھی بچوں پر خرچ کیا جائے گا، یہ بھی طے ہوا ہے کہ بچوں کی پرورش جس کے سپرد کی گئی ہے وہ بچوں کے لیے عمومی امداد اور خصوصی چندہ بھی فراہم کرے گا، یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بچوں کے فراق میں صابرہ دن رات روتی ہے، اور لوگوں کے سامنے اپنی خواہش ظاہر کرتی ہے کہ پانچوں بچوں کو مستقبل میں ہدایت یافتہ بنانا ہے، ایسی صورت میں بچوں کی پرورش کے لیے ماں کو ترجیح دی جائے گی یا اس کی اجازت کے بغیر پانچوں بچے دوسرے کے حوالے کیے جاسکتے ہیں؟ خواہ وہ حافظ صاحب کا قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو؟

(۴) پلان شدہ اور ہنگامی عقد ثانی کے بعد محمد راشد اپنی بیوی صابرہ کو مار پیٹ کر اور بھوکا پیاسا رکھ کر ہفتہ عشرہ میں طلاق دینے کا فیصلہ کر چکا ہے، جو کہ یقینی ہے، ایسی صورت میں صابرہ کو مکان کا آٹھواں حصہ دینا طے کیا گیا ہے؟ اور کچھ نہیں۔

سوال یہ ہے کہ حافظ صاحب کے سیکڑوں شاگردوں کے ذریعہ جو سامان اور قیمتی ہدایا ان کے اور ان کی بیوی بچوں کے لیے آئے ہیں یا حافظ صاحب کی ذاتی رقم سے جو سامان گھر میں ہے اس میں بھی آٹھواں یا کم وبیش حصہ شرعاً صابرہ کو ملے گا یا نہیں؟

(۵) اگر راشد نے اپنی رضا و رغبت سے پچاس مسلمانوں کے سامنے کوئی چیز اپنے چچا یا چچی کو زبانی ہبہ کر دی تھی تو وہ کچھ مہینوں کے بعد یہ کہہ کر کہ ہبہ تحریر میں نہیں ہے، زبانی ہبہ کو رد کر سکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد یامین قاضی ٹولہ بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حافظ عبد الستار صاحب مرحوم کا کل ترکہ اس کے شرعی ورثاء کے درمیان حسب ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

۴۸/۸

حافظ عبدالستار میت

بیوی	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی	لڑکی
۱/۶	۱۴	۷	۷	۷	۷

(۷)

کل ترکہ ۴۸ر سہام میں تقسیم ہوکر ہر چیز میں سے بیوی کو ۶ر، لڑکے کو چودہ اور لڑکیوں کو ۷ر۷ر سہام ملیں گے، بھائی یا بھتیجے وغیرہ کو مکان نقد رقم، زیورات، سامان، وغیرہ میں سے کوئی چیز شرعاً نہیں ملے گی، صابرہ اور اس کی اولاد کو مکان سے بے دخل کرنا سخت ظلم اور زیادتی ہے، نیز دوسرے شخص سے نکاح کرنے کی وجہ سے یا اس کے اعمال خراب ہونے کی وجہ سے حق سے محروم نہ ہوگی، نیز اس کے مہر کی مقدار اگر معلوم نہیں ہے تو مہر مثل اس کا حق ہوگا، وہاں ایسی عورت کا مہر کیا بن سکتا ہے، اس کو دیکھ لیا جائے، اگر حافظ صاحب کے مال و مکان پر بھائی یا بھتیجوں نے قبضہ کر رکھا ہے تو شرعی طور پر وہ لوگ حافظ صاحب کے وارثین نہیں ہیں، ورثاء صرف وہی لوگ ہیں جو نقشہ میں درج ہیں۔

(۲) محض آنے جانے کی وجہ سے زنا کا الزام لگانا جائز نہیں ہے، اگر اسلامی حکومت ہوتی تو الزام لگانے والوں پر ۸۰/۸۰ر کوڑے لگائے جاتے۔

﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا. [النور: ٤]﴾

(۳) بچوں کی پرورش کا حق سب سے زیادہ بچوں کی ماں کو پہنچتا ہے، مستفتی سے زبانی معلوم ہوا کہ راشد نے طلاق دیدی ہے اور دوسرے شخص کے یہاں صابرہ نے پناہ لی ہے ایسی صورت میں بچوں کا حق ماں ہی کو پہنچتا ہے، اور ترکہ وملکیت کے بارے میں جو فیصلہ کیا گیا ہے وہ شرعاً باطل ہے، مذکورہ نقشہ کے خلاف جو فیصلہ ہوگا وہ شرعاً معتبر نہ ہوگا۔

(۴) جو ہدایا حافظ صاحب کو ملے ہیں وہ سب میراث میں شامل ہوجائیں گے۔

(۵) راشد نے جو کچھ بھی دیا ہے چچا کے مرنے کے بعد یا صابرہ سے شادی یا طلاق کے بعد واپس لینے کا حق نہیں ہے۔

فلا رجوع فيها (إلى قوله) أو يموت أحد المتعاقدين (إلى قوله) وكذٰلك ما وهب أحد الزوجين للآخر للمقصود فيها الصلة (وقوله) ولو أبانها بعد ما وهب فلا رجوع. (هدایه، باب ما لم یصح رجوعه و ما لایصح، اشرفی ۲۸۹/۳-۲۹۰)

ہاں البتہ خاص طور پر صابرہ کو شادی سے قبل جو دیا تھا اس کو واپس لینے کا مسئلہ وہ بھی واپس لینا ایسا ہے جیسا کہ کتے نے قے کر کے دوبارہ چاٹ لی ہے۔

عن ابن عمر -رضی الله عنه- أن رسول الله ﷺ قال: مثل الذی يعطی العطية ثم يرجع فيها كالكلب أكل حتى إذا شبع قاء ثم عاد فرجع فی قيئه. (سنن الترمذی، باب ماجاء فی كراهية الرجوع فی الهبة، النسخة الهندية ۲/ ۳٤، دار السلام رقم: ۲۱۳۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۲۸۰)

ایک شخص کے ترکہ سے متعلق چند سوالات کے جوابات

سوال [۱۱۵۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کے دو بیٹے ایک زوجہ سے ابوبکر اور عمر ہیں، دوسری زوجہ سے ایک بیٹا خالد ہے، زید نے ترکہ میں ایک مکان اور کچھ صحرائی زمین چھوڑی، ایک مدت کے بعد اس کے بیٹے خالد نے صحرائی زمین سے اپنا حصہ لے کر قبضہ کیا اور علیحدہ ہو گیا، خالد نے مکان کا اپنا حصہ عمر (علاتی بھائی) کو فروخت کر کے بے دخلی یعنی علاحدگی اختیار کی اور عمر نے خالد سے اس کا حصۂ مکان خریدتے وقت کہا کہ بڑے بھائی ابوبکر کے بچے زیادہ ہیں، ان کو ضرورت ہے، چنانچہ یہ مکان ابوبکر اور ان کی اولاد کے استعمال میں رہا، اور ہے، اور صحرائی زمین جو ابوبکر اور عمر کے حصے میں آئی، اس پر بھی عمر کی مرضی سے قبضہ اور تصرف ابوبکر اور ان کی اولاد کا رہا اور ہے، ابوبکر نے صحرائی زمین میں باغ لگوایا، اور اس کے تمام مصارف خود برداشت کیے

اوراس باغ کی آمدنی اسی قدیم رہائشی مشترک مکان کے تعمیری اخراجات میں صرف ہوتی رہی، مگر جب فاضل رقم بچی تو عمر کو دی گئی، اس نے لی، واضح ہو کہ عمر نے کوئی شادی نہیں کی، بلکہ اپنی زندگی کا ایک طویل حصہ اپنے بھائی ابوبکر کے ساتھ گذارا، ایک عرصہ تک کاروبار بھی مشترک رہا، عمر نے ایک موقوفہ زمین کرایہ پر لے کر اپنی رقم سے دوکان بنائی، اوراس میں کام کرتا رہا، ایک مدت کے بعد اپنے بھائی ابوبکر کو بھی اس کاروبار میں شریک کیا اورآمدنی دونوں تقسیم کرتے رہے، اورعمر نے متعدد باراس امر کا اعتراف کیا کہ میرے پاس پیسہ جب سے جمع ہوا ہے جب سے بھیا (ابوبکر) دوکان پر آئے، کچھ دنوں کے بعد اس دوکان کی کرایہ داری میں عمر کے نام کے ساتھ ان کے بڑے بھتیجہ (ابوبکر کے بڑے بیٹے) کا نام بھی درج کرادیا گیا ہے، نیز کچھ عرصہ بعد ابوبکر کی جگہ ان کا چھوٹا بیٹا عمر کے ساتھ اسی کرایہ کی دوکان میں کام کرنے لگا، اس کے بعد یہ نوعیت رہی کہ عمر اس دوکان پر بیٹھتے ضرور تھے مگر آمدنی سے دستبردار ہوگئے، اوران کا چھوٹا بھتیجا ہی ان کی مرضی سے قابض ومتصرف رہا، اور ہے، اس کے بعد عمر نے ایک قطعۂ آراضی خرید کر اس میں ایک دوکان اوراس کے اوپر مکان اپنے بڑے بھتیجے (ابوبکر کے بڑے بیٹے) کی نیت سے بنوایا، لیکن اس بھتیجے کو باہر ملازمت مل گئی، اس لیے یہ ذاتی دوکان خالی پڑی رہی، چنانچہ عمر نے کرایہ والی دوکان اپنے چھوٹے بھتیجے کو چھوڑ کر اس نئی بنائی ہوئی دوکان پر کام شروع کردیا، اورتادمِ آخر یہ دوکان عمر کے قبضہ میں اور تصرف میں رہی، اوراس کے علاوہ عمر نے اپنی ہی رقم سے مذکورہ آبائی مشترک مکان سے بالکل متصل ایک جگہ خرید کر اپنے خرچ سے ایک دومنزلہ بیٹھک بنائی، جو عمر اوران کے بڑے بھائی ابوبکر نیز ابوبکر کی اولاد کے استعمال میں رہی، اور ہے، ان سب حالات میں عمر بوجہ مجرد ہونے کے عملاً بیشتر معاملات دنیوی، رہائش اورخوردونوش وغیرہ میں اپنے بھائی ابوبکر اوران کے بعد ان کے چھوٹے بیٹے کے ساتھ رہے، یہاں تک کہ انہوں نے ایک موقعہ پر بینک کے اپنے کھاتے میں اپنے چھوٹے بھتیجے کا نام بھی شاید اس مصلحت سے درج کرا دیا کہ کبھی طبیعت زیادہ ناساز ہونے پر مطلوبہ رقم وہاں سے نکال کر ان کے خرچ کے لیے وہاں سے

لاسکیں، نیز عمر نے متعدد بار اپنے دونوں بھتیجوں کو معتد بہ رقمیں دیں کہ اپنے پاس رکھو۔

معلوم ہو کہ اب عمر کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ اپنی زندگی میں بار بار متفرق مواقع پر مختلف حضرات کے سامنے (جن میں سے بعض اس کے اعزاء اور خاص راز دار اور اعتماد کے احباب بھی شامل ہیں) یہ جملہ کہتے رہتے تھے۔

(۱) میں کیا کروں گا جو کچھ ہے سب انہیں کا ہے (دونوں بھتیجوں کا)

(۲) اور میں یہ دوکان فروخت کر کے کیا کروں گا ایک دوکان بڑے بھتیجے کے لیے بنوائی تھی وہ باہر چلا گیا، اور یہ چھوٹا یہاں ہے، میرے مرنے کے بعد جیسے چاہیں گے کرلیں گے۔

(۳) سب کچھ انہیں کا ہے۔

(۴) نیز ایک بھتیجہ سے بھی کہا کہ سب کچھ تمہارا ہی ہے۔

(۵) ایک بھتیجے کے ختم قرآن شریف کی تقریب میں خاندان کے سب چھوٹوں کو انعام دیا، مگر ان دو حقیقی بھتیجوں کو نہیں دیا، اعزاء نے کہا ان کو کیوں نہیں دیا، تو کہا کہ ان کو کیا دوں ان کا تو سب کچھ ہے ہی۔

(۶) کبھی کسی کے یہ دریافت کرنے پر کہ جمع شدہ جائیداد و مال آپ کے بعد کس کا ہو گا؟ کہتے کہ یہ میرے بھتیجے نہیں ہیں جو میری خدمت کر رہے ہیں! انہیں کا ہوگا، سب کچھ میرے ان بھتیجوں کا ہی ہے، مگر انہوں نے تحریری طور پر بھتیجوں کے نام کچھ نہیں کیا، شاید اس خیال سے کہ اگر میں نے ان کے نام زندگی میں کر دیا تو میری خدمت کا نفسیاتی دباؤ ختم ہو جائے گا، اور میرے ہاتھ کٹ جائیں گے، مگر زبان سے برابر یہی کہتے رہے کہ سب کچھ ان ہی کا ہے۔

(۷) اور ایک مرتبہ کسی کے اس کہنے پر کہ آپ کی یہ ذاتی دوکان، آپ کی علالت کی وجہ سے بند پڑی رہتی ہے اس میں تو آپ اپنے بڑے بھائی کے نواسوں کو کمپیوٹر وغیرہ کا سینٹر کھلوا دیجئے، تو اس پر خاموشی اختیار کی اور کوئی جواب نہیں دیا، سائل کا تأثر یہ ہے کہ مجھے محسوس ہوا کہ نواسوں کے بارے میں ان کی مرضی نہیں ہے، پھر سائل نے کہا کہ پھر اس دوکان کو بیچ دیجئے تو کہا: میرے بھتیجوں کو تکلیف ہوگی، پتہ نہیں ان کا کیا ارادہ ہے کیا کام کریں گے، سب

کچھ تو انہیں کا ہے، میں بیچ کر کیا کروں گا۔

(۸) ایک صاحب سے ایک بار کہا کہ جو کچھ ہے میں بھتیجہ کو دے دوں گا، آخر وہ دوکان (کرایہ کی) پر بیٹھا ہے، میرا نام تو چل رہا ہے۔

جب انہیں حالات کچھ آخری سے محسوس ہوئے تو انہوں نے بھتیجے سے کہہ کر بھتیجی کو بلایا کہ اس نے میری بہت خدمت کی اور اس کو اپنے پاس بٹھا کر برابر دیکھتے رہے۔

(۹) ایک بار ان سے کسی نے پوچھا کہ تمہارے بعد یہ دوکان وغیرہ یعنی تمہارا مال کس کا ہوگا؟ تو انہوں نے بڑی ناگواری سے جواب دیا کہ لوگ مجھ سے یہ پوچھتے کیوں ہیں؟ کیا یہ میرے بھتیجے نہیں ہیں، یہ سب کچھ انہیں کا ہے۔ ان سب باتوں کے تحریری اور زبانی گواہ موجود ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مندرجہ بالا تفصیلات اور طرز عمل کی روشنی میں ان کی زبان سے اقرار شدہ مندرجہ بالا الفاظ کیا شرعاً اپنے ظاہر پر محمول ہو کر ہبہ کے زمرہ میں شمار ہوں گے، یا وصیت کے زمرہ میں شامل ہوں گے، جب کہ ان کے بیشتر ترکہ پر ان کی حیات ہی سے قبضہ بھی بھتیجوں کا ہی ہے، اور وہ اس پر مطمئن تھے، یا عندالشرع یہ الفاظ اپنے ظاہر پر محمول نہ ہوں گے، اور پھر کیا اس میں میراث کے قانون پر عمل ہوگا، واضح ہو کہ مندرجہ بالا واقعہ پر میراث کا کوئی تنازع نہیں ہے، نہ کوئی دعویدار ہے، کیونکہ اقارب واجانب سب کا مرحوم کے برملا کہنے کی وجہ سے یہی ذہن ہے کہ سب کچھ بھتیجوں کا ہے، عمر کے ورثاء مندرجہ ذیل ہیں:

اگر میراث کا قانون نافذ ہوگا تو کس کو کتنا کتنا حصہ ملے گا؟

باپ شریک تین بہنیں، حقیقی دو بھتیجے، حقیقی پانچ بھتیجیاں، باپ شریک ایک بھتیجا، باپ شریک دو بھتیجیاں، ایک حقیقی بھانجہ

المستفتی: علی انور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو جائیداد عمر نے کسی کے نام سے نہیں خریدی ہے بلکہ خود اپنے نام سے خریدی ہے وہ عمر ہی کی تادم حیات ملکیت ہے، اور اس کے مرنے کے بعد

اس کی خرید کردہ زمین اور اس پر تعمیر کیا گیا مکان اور اس کے اوپر تعمیر کی گئی دوکان اور آبائی جائیداد میں سے اس کا شرعی حصہ یہ سب اس کی متروکہ جائیداد ہے جو اس کے شرعی ورثاء کے درمیان تقسیم ہوگی اور سوالنامہ میں جن لوگوں کا نام درج ہے ان میں سے کون وارث بنے گا اور کون وارث نہیں بنے گا؟ کس کا کتنا حصہ ہوگا وہ حسب ذیل نقشہ سے ملاحظہ فرمائیے:

میت ۱۸/۳

علاتی بہن	علاتی بہن	علاتی بہن	حقیقی بھتیجہ	حقیقی بھتیجہ	۵/حقیقی بھتیجیاں	علاتی بھتیجا	۲/علاتی بھتیجیاں	حقیقی بھانجہ
	(۲)		(۱)		محروم	محروم	محروم	محروم
۴	۴	۴	۳	۳				

عمر کی کل جائیداد ۱۸/سہام میں تقسیم ہوکر ہر ایک علاتی بہن کو ۴/۴/اور ہر ایک حقیقی بھتیجہ کو ۳/۳/ملیں گے، اور اس کے علاوہ سب لوگ محروم ہو جائیں گے، اب اس کے بعد سوالنامہ میں درج کیے گئے نکات پر غور کرنے کے بعد ان کا شرعی حکم مندرجہ ذیل ہے:

(۱) زید کی جائیداد اس کی نرینہ اور مؤنث اولاد کے درمیان تقسیم ہوگئی ہے۔

(۲) خالد نے صحرائی زمین میں سے اپنے حصہ پر قبضہ کرلیا، اور مکان میں سے اپنا حصہ عمر کے ہاتھ فروخت کردیا، لہٰذا سوالنامہ کے مطابق اس کا معاملہ صاف ہے۔

(۳) عمر نے کرایہ کی دوکان سے متصل زمین خرید کر اپنی دوکان بنالی یہ اس کی ملکیت ہے۔

(۴) آبائی مکان سے متصل زمین خرید کر دومنزلہ عمارت بنائی، یہ بھی اس کی ملکیت ہے۔

(۵) جو رقمیں دونوں بھتیجوں کو دی ہیں وہ عمر کی طرف سے بھتیجوں کے لیے ہبہ ہیں۔

(۶) ''جو کچھ ہے بھتیجوں کا ہے'' صرف اتنا کہنا کافی نہیں، جبکہ شرعی گواہ بنا کر باضابطہ طور پر دونوں بھتیجوں کو ہبہ کرکے قبضہ نہ دیا ہو، اس لیے موقعہ بموقعہ کہتے رہنے سے شرعاً وقانوناً ہبہ کا ثبوت نہیں ہوگا۔

(۷) ''ان کو کیا دوں سب کچھ تو انہیں کا ہے'' اتنا کہنے سے دولت کا ہبہ نہیں ہوتا ہے جب تک قبضہ دے کر باضابطہ ہبہ نہ کیا جائے، اور خود قبضہ سے دستبردار نہ ہوجائے۔

(۸) ”جو کچھ ہے بھتیجوں کو دے دوں گا“ اور دوسروں کو دینے سے بھتیجوں کو تکلیف ہوگی، محض اس طرح کہنے سے نہ ہبہ درست ہوسکتا ہے اور نہ ہی بھتیجے اس کہنے کی وجہ سے مالک ہوسکتے ہیں۔

(۹) بھتیجی کو بلا کر یہ کہنا کہ اس نے میری بہت خدمت کی اور اس کو برابر دیکھتے رہنے سے نہ وہ بھتیجی وارث بن سکتی ہے اور نہ اس کی ملکیت میں کوئی چیز اس عمل کی وجہ سے منتقل ہوسکتی ہے۔

(۱۰) ”کیا یہ میرے بھتیجے نہیں ہیں، سب کچھ انہیں کا ہے“ اتنا کہنے سے نہ ہبہ کا ثبوت ہوسکتا ہے اور نہ ہی بھتیجے جائیداد کے مالک ہوسکتے ہیں۔

(۱۱) ان سب ورثاء کے تحریری اور زبانی گواہ کا کیا مطلب ہے، کیا اس نے بھتیجوں کی ملکیت میں منتقل کرنے کے لیے کوئی ہبہ نامہ یا بیعنامہ تحریر کروایا تھا، اگر کوئی تحریری ہبہ نامہ یا بیع نامہ لکھوایا ہے تو اس کو پیش کیا جائے، اس کو دیکھنے کے بعد شرعی حکم پر غور کیا جاسکتا ہے۔
فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ربیع الاول ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۲۳۱/۳۸)

باقر حسین کے ترکہ سے متعلق چند سوالات کا شرعی حکم

سوال [۱۱۵۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ۱۹۶۵ء میں محمد باقر کے انتقال کے وقت ان کی بیوی اور تین لڑکے: محمد احمد، سید احمد، محمد حسین، اور چار لڑکیاں: شریفن، فاطمہ، تقدیرن، سکینہ بطور وارث شرعی موجود تھے، کاروبار مشترک تھا۔

(۲) والدہ محترمہ کے انتقال کے وقت ہم تین بھائی اور تین بہنیں بطور وارث شرعی موجود تھے، ایک بہن شریفن کا انتقال والدہ کی وفات سے قبل ہوگیا تھا، اس وقت بھی کاروبار مشترک تھا۔

(۳) ہماری مشترکہ فیملی تھی، والد صاحب مرحوم کپڑے کی بنائی کر کے گھر کا خرچہ پورا کرتے تھے، اور ہم سبھی لوگ والد صاحب کا ہاتھ بٹاتے تھے، بڑے بھائی محمد صاحب نے تمباکو کی دوکان ۱۹۴۴ء میں کی جس کی آمدنی سے شادیاں اور گھریلو ضروریات پوری ہوئیں، اس کے بعد

۱۹۵۹ء میں میں نے کپڑے کی دوکان کی جس کی آمدنی مشترک تھی، اور کچھ منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد مثلاً کھیت وغیرہ خریدے گئے، بڑے بھائی محمد احمد تمبا کو کی دوکان کی دیکھ ریکھ کرتے تھے، کاروبار متأثر ہوا تو میری کپڑے کی دوکان سے گھریلو اخراجات پورے ہوتے رہے۔

۱۹۶۵ء میں والد کا انتقال ہوگیا، فیملی مشترکہ تھی، اور یہ سلسلہ ۱۹۸۲ء تک چلتا رہا، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ مشترکہ آمدنی وکاروبار کی تقسیم کس طرح ہوگی؟ والد مرحوم نے اپنی حیات میں میری شریک حیات کو سات تولہ سونا دیا تھا، جس کو میرے بڑے بھائی نے والد کے انتقال کے بعد لے لیا، اسی طرح اہلیہ کو جہیز میں ملی بعض اشیاء مثلاً سائیکل وغیرہ پر بھی بڑے بھائی کا قبضہ رہا۔

۱۹۸۲ء میں ایک عارضی تقسیم اس طرح عمل میں آئی کہ گھریلو استعمال اشیاء کے تین حصے کر کے ایک تہائی حصہ بڑے بھائی نے مجھے دیدیا اور تقریباً سو چیزوں کی تقسیم نہیں کی، مکان پختہ تھا، جس میں دونوں بھائی رہائش پذیر تھے، شادی کے بعد چوتھائی مکان جو خام تھا اس میں میری رہائش تھی، ۱۹۸۲ء میں بوقت نزاع وہی چوتھائی حصہ مکان مجھے دیا گیا جبکہ مکان والد مرحوم نے خریدا تھا، اس کی رجسٹری بھی والد صاحب کے نام ہے، اور مشترک تیس بیگہ زمین میں مجھے دس بیگہ زمین بھی دی گئی، بڑے بھائی محمد احمد کا کہنا ہے کہ سارا کاروبار ہماری محنت، ہمارے پیسے اور ہمارے تجربے سے ہوا، اس لیے ۱۹۸۲ء تک جتنی منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد ہے اس کے وہ تنہا مالک ہیں، جو کچھ بھی تمہیں دیا گیا محض تبرعاً دیا گیا، استحقاقاً نہیں، جبکہ ۱۹۶۵ء میں والد مرحوم کے انتقال کے بعد کپڑے وغیرہ کی دوکان کی مشترکہ آمدنی سے متعدد اشیاء خریدی گئی، مثلاً تیس بیگہ کھیت تینوں بھائی کے نام سے لیا گیا، جس کا مشترکہ بیع نامہ بھی کرایا گیا:

(۱) اب معلوم یہ کرنا ہے کہ والد مرحوم کے انتقال کے وقت کی جائیداد کس طرح تقسیم ہوگی؟

(۲) والدہ مرحومہ کے انتقال کے بعد وراثت کی تقسیم کی کیا صورت ہوگی؟

(۳) والد صاحب مرحوم نے میری شریک حیات کو سات تولہ سونا جو ہبہ کیا تھا اور

اس پر اہلیہ کا قبضہ بھی ہو گیا تھا، کیا یہ صحیح ہے؟

(۴) بڑے بھائی کا اہلیہ سے والد کا ہبہ کردہ سونا لینا شرعاً جائز ہے؟

(۵) پختہ مکان کا حصہ بڑے بھائیوں کے قبضہ میں ہے، کیا یہ شرعاً صحیح ہے؟

(۶) اہلیہ کے جہیز کی اشیاء پر قبضہ کرنا (مشترکہ فیملی کی دلیل ہے) کیا یہ شرعاً صحیح ہے؟

(۷) بڑے بھائی کا یہ کہنا ہے کہ سارا کاروبار ہماری ذہانت، مالیت، تجربہ سے ہوا ہے، اس لیے کل جائیدا دمنقولہ وغیر منقولہ کے ہم مالک ہیں، ان کا یہ دعویٰ شرعاً درست ہے؟

(۸) ۱۹۸۲ء میں جو عارضی تقسیم ہوئی تھی کیا وہ شرعاً قطعی تقسیم سمجھی جائے گی؟

(۹) آج مؤرخہ ۷/ اکتوبر تک باضابطہ تقسیم نہیں ہوئی ہے تو کیا بڑے بھائی کا اپنی منقولہ وغیر منقولہ اشیاء کی وصیت یا ہبہ کرنا اپنی لڑکی کے لیے صحیح ہے؟

(۱۰) منگل کے بازار قصبہ محمد لکھیم پور میں ایک مکان والد صاحب کی حیات میں مشترکہ آمدنی سے خریدا گیا اور بڑے بھائی کے نام سے رجسٹری کرائی گئی تو کیا وہ اس مکان کے شریک و مالک ہو گئے؟

(۱۱) کپڑے کی دوکان مشترکہ تھی، اس کی آمدنی بھی مشترکہ تھی، بعد میں کاروبار متأثر ہوا، دوکان پر قرضہ آگیا، تو اس قرضہ کی ادائیگی شرعاً کس کے ذمہ ہوگی؟ برائے مہربانی دلائل شرعیہ کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد حسین قاسمی محلّہ دیوی استھان قصبہ محمدی لکھیم پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) محمد باقر کی متروکہ جائیداد ۸۰/ سہام میں تقسیم ہو کر ان کی بیوی حمیدہ کو دس سہام، ہر مذکر اولاد کو چودہ چودہ سہام اور ہر مؤنث اولاد کو سات سات سہام ملیں گے، پھر شریفن جس کا انتقال باقر کے بعد ہوا ہے، اس کے سات سہاموں کے جو اس کو والد سے ملے ہیں، ۴۵/ سہام ہو کر اس کی ماں کو ۹/، اس کے ہر بھائی کو دس اور ہر بہن کو پانچ پانچ سہام ملیں گے۔

(۲) پھر حمیدہ جن کا انتقال سب سے آخر میں ہوا ہے ان کا ترکہ نو سہاموں میں تقسیم ہوکر ان کے ہر لڑکے کو دو اور ہر لڑکی کو ایک سہام ملے گا۔

(۳) اگر باقر حسین نے اپنے بیٹے محمد حسین کی بیوی کو سات تولہ سونا بطور ملکیت دیدیا تھا تو ایسی صورت میں محمد حسین کی بیوی اس سونے کی مالک ہے، اس میں محمد احمد اور دوسرے کسی وارث کا کوئی حق نہیں ہے، نیز اسی طرح سے محمد حسین کی سسرال کی طرف سے بطور جہیز جو مردانہ یا زنانہ سامان آیا ہے اس میں بھی محمد احمد، اور دوسرے بھائی، بہنوں کا کوئی حق نہیں ہے، بلکہ یہ محمد حسین کی بیوی کا حق ہے۔

وتتم الهبة بالقض الكامل. (مجمع الأنهر، كتاب الهبة، دار الكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٩١، مصري قديم ٢/ ٣٥٣، شامي كراچي ٥/ ٦٩٠، زكريا ٨/ ٥٢٠)

والمختار للفتوىٰ بكون الجهاز ملكا لا عارية لأنه الظاهر الغالب.

(شامي، مطلب في دعوىٰ الأب أنه الجهاز عارية زكريا ٤/ ٣٠٩، كراچي ٣/ ١٥٧)

(۴-۵) محمد حسین کی بیوی کے جہیز پر محمد احمد قبضہ کرے یا نہ کرے فیملی شرعی طور مشترک ہے، اور جہیز کے سامان پر محمد احمد یا کسی اور کو حتی کہ شوہر کو بھی بیوی کی اجازت کے بغیر تصرف اور قبضہ کا حق نہیں ہے۔

لايجوز لأحد أن يأخذ مال أحد بلا سبب شرعي، ولايجوز لأحد أن يتصرف في ملك أحد بغير إذنه. (قواعد الفقه اشرفي ص: ١١٠)

(۶) عارضی تقسیم کے وقت پختہ مکان کو اگر تقسیم میں رکھا گیا ہے اور دو بھائیوں کو پختہ مکان اور ایک بھائی کو خام مکان دیا گیا ہے اور اس طرح تقسیم آپسی رضامندی سے ہوئی ہے تو وہ تقسیم صحیح ہوگئی ہے، لیکن اگر تقسیم آپسی رضامندی سے نہیں ہوئی ہے بلکہ زور اور دباؤ سے اس طرح تقسیم ہوئی ہے یا اس پختہ مکان کو تقسیم ہی نہیں کیا گیا ہے، تو ان دونوں صورتوں میں مکان میں تمام وارثین کا حق ہے، جس میں تینوں بھائیوں اور تینوں بہنوں کا حصہ ہے، لہٰذا وہ مکان نو حصوں میں تقسیم ہوکر ایک ایک حصہ بہنوں کو اور ۲/۲ حصہ بھائیوں کو ملیں گے۔

(۷) باپ کی موجودگی میں اور باپ کی وفات کے بعد مشترکہ فیملی میں رہ کر بڑے

بھائی کی ذہانت، مالیت اور تجربہ سے جو مال حاصل ہوا ہے وہ باپ کی زندگی میں باپ کی ملکیت ہے، اور باپ کی وفات کے بعد مشترکہ فیملی کی ملکیت ہے، اور بڑے بھائی کا دعویٰ جو سوالنامہ میں ہے، وہ شرعی طور پرنا جائز ہے۔

الأب و ابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيئ فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله لكونه معينا له. (شامی، الشركة، مطلب: اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ...... زكريا ٦/٥٠٢، كراچی ٤/٣٢٥، هنديه زكريا جديد ٢/٣٣٢، قديم ٢/٣٢٩، شرح المجلة، رستم اتحاد ٢/٧٤١، رقم المادة: ١٣٩٨)

لو اجتمع إخوة يعملون في تركة أبيهم ونما المال فهو بينهم سوية ولو اختلفوا في العمل والرائ. (شامی، مطلب: اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ولا يعلم التفاوت فهو بينهما بالسوية زكريا ٦/٥٠٢، كراچی ٤/٣٢٥)

(۸) ۱۹۸۲ء میں جو عارضی تقسیم ہوئی ہے، اگر وہ تقسیم آپس کی تراضی ورضامندی سے ہوئی ہے تو جتنی اشیاء کی تقسیم ہوئی تھی، اس حد تک تقسیم درست ہے، اور اس کے علاوہ جتنی اشیاء تقسیم سے رہ گئی ہیں، ان کی شرعی تقسیم لازم اور ضروری ہے۔

عن عبد الله بن عمرو بن عوف المزني عن أبيه عن جده أن رسول الله ﷺ: قال الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا أو أحل حراما والمسلمون على شروطهم إلا شرطا أحل حراما أو حرم حلالا. (ترمذی، الأحكام، باب ماذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/٢٥١، دار السلام رقم: ١٣٥٢)

(۹) آپس کی تراضی سے جن اشیاء کی تقسیم ہوئی ہے اور تقسیم کے بعد ہر ایک نے اپنے اپنے حصہ پر قبضہ کرلیا ہے تو ہر شخص اپنے حصے کی چیزوں کے بارے میں وصیت یا ہبہ کرنے کا حق رکھتا ہے، اور جن اشیاء کی اب تک تقسیم نہیں ہوئی ہے، ان میں سے کسی چیز کے بارے میں تقسیم سے پہلے وصیت یا ہبہ کرنا جائز نہیں ہے، نیز اس سے ہٹ کر ایک الگ مسئلہ یہ بھی ہے کہ وارث کے حق میں ہبہ تو جائز ہے وصیت جائز نہیں ہے۔

لايجوز لأحد أن يأخذ مال أحد بلا سبب شرعي، ولايجوز لأحد أن

يتصرف في ملك أحد بغير إذنه. (قواعد الفقه اشرفی ص:۱۱۰)

(۱۰) باپ کی زندگی میں جو چیزیں خریدی جاتی ہیں، اگر باپ کسی مصلحت سے کسی بیٹے یا بیٹی کے نام کردیتا ہے تو اس کو بیع تلجئہ کہا جاتا ہے، اس سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی ہے، شرعی طور پر اس کا مالک باپ ہی ہوا کرتا ہے، اس لیے وہ مکان باپ محمد باقر کی ملکیت ہے، اوران کی وفات کے بعد تمام ورثاء کا اس سے حق متعلق ہے۔

بيع التلجئة وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف عدو وهو ليس ببيع بل كالهزل. (شامی، باب الصرف، مطلب: في بيع التلجئة زكريا ٧/٥٤٢، كراچی ٥/٢٧٣، بدائع الصنائع زكريا ٤/٣٨٩، كراچی ٥/١٧٦، هندية زكريا قديم ٣/٢٠٧، جديد ٣/١٩٦)

(۱۱) جب مشترکہ زندگی میں مشترکہ دوکان میں نقصان یا قرضہ آگیا تو اس نقصان اور قرضہ کی ذمہ داری پوری مشترکہ فیملی پر ہے، اس لیے اس قرضہ کی ادائیگی میں تمام بھائی بہن اپنے اپنے حصہ کے بقدر شریک ہوں گے۔

والوضيعة على قدر المالين متساويا و متفاضلا لأن الوضيعة اسم لجزء هالك من المال فيقدر بقدر المال. (بدائع الصنائع، فصل في بيان شرائط جواز أنواع الشركة كراچی ٦/٦٢، زكريا ٥/٨٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍شعبان المعظم ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۷۹۴/۳۶)

ترکہ کی تقسیم سے متعلق ایک سوال اور جواب

سوال [۱۱۵۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میرے والد حاجی محمد وصی کا انتقال ۱۹۷۸ء میں ہوا، اس وقت ان کے ترکہ میں ایک کارخانہ، کلکتہ، ہینڈلوم کے نام سے، دو احاطہ چار مکان تھے، اور کرایہ کی تین دوکانیں

تھیں: ہندوستان اینڈ کمپنی سندیلہ، انڈین میڈیکل اسٹور سندیلہ، فرینڈس فارما لکھنؤ، ورثاء میں ہم چھ بھائی: اعجاز الحق، اظہار الحق، معراج الحق، افضال الحق، تنویر الحق، احسان الحق، اور تین بہنیں: حمیرہ، عذراء خاتون، بشریٰ خاتون تھے، ۱۹۸۴ء میں مذکورہ ترکہ کو ہمارے درمیان ماموں نے تقسیم کیا، تقسیم کے وقت تمام دوکانوں کے سامان اور مکانات کی قیمت لگائی گئی جو حسب ذیل ہے:

(۱) ہندوستان اینڈ کمپنی	158000	اعجاز الحق کے قبضہ میں
(۲) انڈین میڈیکل اسٹور	40000	معراج الحق کے قبضے میں
فرینڈس فارما	43000	اظہار الحق کے قبضے میں
کلکتہ ہینڈلوم	162000	// //
جائیداد کی قیمت	403000 روپئے	

(۱) مکان	20000	معراج الحق کو دیا گیا	
(۲) کلکتہ ہینڈلوم	25000	اظہار الحق کو دیا گیا	
(۳) احاطہ	15000	تنویر الحق کو دیا گیا	
(۴) احاطہ	15000	احسان الحق کو دیا گیا	403000
(۵) مکان حنیف کے	25000	اعجاز الحق کو دیا گیا	160000
پیچھے والا			563000
(۶) آبائی مکان	60000	بالائی منزل افضال الحق تحتانی منزل اظہار الحق	
کل	160000		

مذکورہ ورثاء میں بشریٰ خاتون، افضال الحق، تنویر الحق، احسان الحق غیر شادی شدہ تھے، اس لیے تقسیم کے وقت ان کی شادیوں کے لیے کچھ رقم نکالی گئی:

(۱) بشریٰ خاتون کے لیے	25000
(۲) افضال الحق کے لیے	15000

(۳) تنویر الحق کے لیے	15000	563000
(۴) احسان الحق کے لیے	15000	70000
کل	70000 روپئے	493000

شادی کے لیے رقم نکالنے کے بعد ما بقیہ رقم کو چھ جگہ تقسیم کر کے ہر بھائی کو 82166 روپے دیئے گئے، اور کرایہ کی دو کانوں میں ہندوستان اینڈ کمپنی اعجاز الحق کو، انڈین میڈیکل اسٹور معراج الحق کو اور فرینڈس فار ما لکھنؤ اظہار الحق کو دی گئی، واضح رہے کہ ان دونوں کے سامان کی قیمت لگا کر ان کی موجودہ حیثیت کو نظر انداز کر دیا گیا، نیز ماموں صاحب نے زبانی طور پر کہہ رکھا تھا کہ ہر ایک کی شادی کے وقت متعینہ رقم کے علاوہ جو بھی خرچ آئے گا وہ بڑے بھائی اعجاز الحق اور اظہار الحق کے ذمہ ہوگا، چنانچہ بشریٰ خاتون، افضال الحق اور تنویر الحق کی شادی میں ایسا ہی ہوا کہ انہوں نے شادی کے لیے اپنی جیب سے کچھ روپئے ادا نہیں کئے، جبکہ احسان الحق کی شادی کے وقت ۱۹۹۷ء میں ان کی جیب خاص سے اظہار الحق نے ۵۰۰۰ ۷/ روپئے نقد لیے۔

مندرجہ ذیل و بالا تفصیل کو سامنے رکھ کر شرعی فیصلہ مطلوب ہے جو کچھ بھی شریعت کا فیصلہ ہے ہم سارے بھائی اس کو تسلیم کریں گے۔ (ان شاء اللہ)

(الف) تقسیم کے وقت احسان الحق موجود نہیں تھے۔

(ب) اس وقت احسان الحق کی عمر ۱۶/ سال تھی اور وہ اپنے بڑے بھائیوں کے ماتحت تھے۔

(ج) مذکورہ تقسیم میں مکانات کی جو قیمت لگائی گئی ہے وہ اس وقت کے لحاظ سے بھی بہت کم ہے۔

(د) دونوں احاطوں کی قیمت ۱۵۰۰۰/ روپئے لگائی گئی جبکہ ان میں سے ایک دوسرے سے طول وعرض اور قیمت کے حساب سے دوگنا ہے۔

(ہ) مذکورہ تقسیم کے وقت جو بھائی جس دوکان یا کارخانہ پر قابض تھا وہ اسی کے

حوالہ کردیا گیا، چھوٹے بھائیوں کو مستقل نظر انداز کردیا گیا۔

(و) ۱۹۷۶ء میں والدہ کا انتقال ہوگیا تھا، ان کا تمام زیور بھائیوں کے مشورہ سے ماموں نے بشریٰ خاتون کو دیدیا تھا۔

(ز) اعجاز الحق واظہار الحق کے ذمہ معراج الحق کی جو رقم تھی اس کی ادائیگی کا وقت چھ ماہ متعین کیا گیا تھا لیکن ان دونوں نے تقسیم کے بعد دس سال کے عرصہ میں وہ رقم ادا کی، تقسیم کے وقت احسان الحق، تنویر الحق، افضال الحق بے روزگار تھے۔

نوٹ: مذکورہ ترکہ کے علاوہ ایک بڑا مکان جس کو تین حصہ کرکے والد صاحب نے اپنی زندگی میں اپنی تینوں لڑکیوں کو دیدیا تھا۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ مذکورہ تقسیم اگر درست ہے تو واضح فرمائیں اور اگر صحیح نہیں ہے تو صحیح تقسیم فرمائیں؟

المستفتی: معراج الحق، افضال الحق، تنویر الحق سندیلہ ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سائل نے جو تفصیلات لکھی ہیں اس تفصیل سے بھی اصل حقیقت سے واقف نہ ہوسکے، ہم شریعت کی ایک اصولی بات پیش کرسکتے ہیں کہ باپ کی وفات کے بعد اس کی میراث میں سے ہر وارث کو اس کا شرعی حق ملنا لازم ہے، اور جتنی جائیداد اور بیلینس وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے ان سب کے اندر ہر ایک کا شرعی حق متعلق ہے، ہاں البتہ آپس میں شرعی حق متعلق ہونے کے بعد متروکہ مال میں آپسی تبادلہ یا آپس کی قیمت کا لین دین کرکے معاملہ صاف کرنا درست ہے اس لیے مذکورہ وارثین کے شرعی سہام ہم بنادیتے ہیں اگر ان سہاموں کے مطابق پہلی والی تقسیم ہوئی ہے تو وہ صحیح ہے، اور اگر نہیں ہوئی ہے تو اسی کے مطابق تقسیم کی جائے:

میت ۱۵

لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی	لڑکی
۲	۲	۲	۲	۲	۲	۱	۱	۱

کل ترکہ ۱۵ر سہام میں تقسیم ہوکر ہر وارث بھائی کو دو، دو اور ہر ایک بہن کو ایک ایک ملیں گے، اور تقسیم میں اسی نقشہ کی پابندی لازم ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ر جمادالاولیٰ ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۰۱۵)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۷/۵/۳۰ھ

متوفیہ کے ترکے اور بچے کا حکم

سوال [۱۱۵۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ (۱) میری اہلیہ کا انتقال ہوگیا، ورثاء میں شوہر، ایک لڑکا، ایک لڑکی، ماں باپ کو چھوڑا، ترکہ میں کچھ سامان ہیں، مہر وغیرہ میرے ہی پاس ہے، ترکہ کی تقسیم کس طرح ہوگی؟

(۲) لڑکے کی عمر تقریباً دس سال ہے، اور لڑکی کی عمر تقریباً پانچ سال ہے ان بچوں کی پرورش کی ذمہ داری کس پر ہے؟ دادا، دادی یا نانا، نانی پر؟

المستفتی: احمد حارث رفعت پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) آپ کی اہلیہ کے انتقال کے وقت ان کی ملکیت میں جو چیزیں موجود تھیں وہ تمام چیزیں ان کے ورثاء کے لیے میراث ہیں، اسی طرح آپ کی اہلیہ مرحومہ کا جو مہر آپ کے پاس ہے وہ بھی میراث میں شامل ہوگا، اور تمام شرعی وارثین کے درمیان درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

۳۶/۱۲
میــــــــــــــــــــــــــــــــــت

شوہر	ماں	باپ	لڑکا	لڑکی
۳	۲	۲	(۵)	
۹	۶	۶	۱۰	۵

مرحومہ کا کل ترکہ سامان اور مہر وغیرہ ۳۶ر سہام میں تقسیم ہوکر شوہر کو نو حصے، ماں باپ کو چھ چھ حصے اور لڑکے کو دس اور لڑکی کو پانچ حصے ملیں گے۔

إن جميع ما ترك الميت من أملاكه ميراث للورثة سواء كان من أشياء استعماله الشخصية كالثياب والأواني أو من أشياء يمكن الاسترباح منها كالأرض وعروض التجارة والنقود. (تكملة فتح الملهم اشرفيه ديو بند ٢/ ٤)

أن أعيان المتوفىٰ المتروكة عنه مشتركة بين الورثة على حسب حصصهم. (شرح المجلة رستم اتحاد ١/ ٦١٠، رقم المادة: ١٠٩٢)

(۲) لڑکا جب دس سال کا ہو چکا ہے تو اس کی پرورش کی ذمہ داری نہ دادا، دادی پر ہے نہ نانا، نانی پر بلکہ وہ آپ کے پاس ہی رہے گا کیونکہ آپ ہی اس کی تعلیم وتربیت کا بہتر انتظام کر سکتے ہیں، رہی بات لڑکی کی تو جو نانی اگر چاہے تو اس کو حق پرورش مل سکتا ہے، البتہ خرچ کی ذمہ داری آپ کے اوپر ہوگی، آپ جس معیار کا خرچ اپنی بچی پر کرنا چاہیں اسی معیار کا خرچ نانی کر سکتی ہے اس سے زائد نہیں، اور پڑھائی کے بارے میں جس خرچہ کے ذریعہ جس اسکول میں آپ چاہیں گے اس کی اسی اسکول میں اسی خرچہ کے ساتھ پڑھائی ہو سکتی ہے، نانی کو صرف اپنے پاس رکھنے کا حق ہے، ورنہ پھر دادی ہی کے پاس رہے گی۔

الحضانة تثبت للأم...... ثم أي بعد الأم بأن ماتت أو لم تقبل أو سقطت حقها أو تزوجت بأجنبي أم الأم ثم أم الأب، وفي كتب الشافعية: مؤنة الحضانة في مال المحضون لوله وإلا فعلى من تلزمه نفقته وقواعد تقتضيه فيفتى به. (در مختار مع الشامي، كتاب الطلاق، باب الحضانة، زكريا ٥/ ٢٦٢، كراچی ٣/ ٥٦٢)

وتجب النفقة بأنواعها على الحر لطفله يعم الأنثى والجمع الفقير. (شامي، باب النفقة، زكريا ٥/ ٣٣٦، كراچی ٣/ ٦١٢)

وبعد الفطام يفرض القاضي نفقة الصغار على قدر طاقة الأب وتدفع إلى الأم حتى تنفق على الأولاد فإن لم تكن الأم ثقة تدفع إلى غيرها لينفق على الولد. (هنديه، الفصل الرابع في نفقة الأولاد زكريا قديم ١/ ٥٦١، جديد ١/ ٦٠٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۵۲۷)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/ ۴/ ۱۴۲۹ھ

جائیداد کی تقسیم میں نزاع اور اس کا حل

سوال [۱۱۶۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید مرحوم کے ورثاء: اہلیہ (مرحومہ)، بڑا بیٹا (مرحوم) اس کی اہلیہ اور ایک بیٹی، منجھلا بیٹا، چھوٹا بیٹا، پانچ بیٹیاں۔

زید کے انتقال کے بعد بڑے بیٹے نے والدہ کی نگرانی میں ترکہ کے تعلق سے جو حصہ کیا تھا وہ درج ذیل ہے:

زید کی کل پراپرٹی اس طرح ہے: ایک آبائی مکان اور ۳/ ہزار اسکوائر فٹ پر مشتمل ایک پلاٹ جس پر آج ایک چار منزلہ عمارت بنی ہوئی ہے۔

زید نے ۱۹۶۲ء میں آٹھ لوم کی شکل میں ایک کارخانہ، بڑے بیٹے کو تجارت کی غرض سے ذمہ داری کے لیے دیا تھا، اس کارخانے پر بڑے بیٹے نے خود کی محنت اور بھائیوں کے تعاون سے کل ۷۲/ لوم کئے۔

بڑے بیٹے کا نظریہ یہ تھا کہ ہر بھائی کا اپنا ۲۴/ لوم کا کارخانہ ہونا چاہیے، سو آج اس شکل میں موجود ہے، جس میں چھوٹے بھائی کا ۱۲/۱۲/ لوم کی شکل میں دو گالے اور دو بھائیوں کا ۲۴/۲۴/ لوم کی شکل میں ایک ایک گالے ہیں۔

بڑے بھائی اور منجھلے بھائی کی ۲۴/۲۴/ لومی لاگت ۲۰/۲۰/ لاکھ روپئے ہیں، اور یہ دونوں گالے Ownenship کے ہیں، جبکہ چھوٹے بھائی کے ۱۲/۱۲/ لوم کے دونوں گالے کرایہ کی زمین پر ہیں جو اس نے اپنی مرضی سے لیے ہیں، اس کی لاگت تقریباً ۱۸/ لاکھ روپئے ہے، حالانکہ اس سے کہا گیا تھا کہ وہ بھی Ownenship کا گالا لے لے۔

بڑا بھائی اور چھوٹا بھائی کارخانے کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھے، منجھلا بھائی ٹیچنگ کے پیشے سے منسلک ہے، بڑے بھائی نے والدہ کی خیاتی اور نگرانی میں پانچوں بہنوں کو ۲/۲/ لاکھ روپئے ترکہ کے حصے کے طور پر دیدئے ہیں، جس جگہ چار منزلہ بلڈنگ واقع ہے وہ

بلڈنگ بڑے بھائی نے اپنے رشتہ دار سے ۱۴/ لاکھ روپئے قرض لے کر تعمیر کرنا شروع کی، اس درمیان میں اس بلڈنگ کی دو منزلہ تعمیر ہوگئی، جس میں گراؤنڈ فلور پر دو کانیں ہیں اور دو منزلے پر فلیٹ ہیں، بڑے بھائی کو ۱۴/ لاکھ روپئے قرض ادا کرنے کی ہمیشہ بے چینی رہتی تھی۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ۲۴/ ۲۴/ رلوم اور ۱۲/ ۱۲/ رلوم کے دو گالوں سے پہلے صرف ۲۴/ رلوم اور ۱۲/ رلوم کے گالے کی کل پراپرٹی تھی، اور یہ قرض اسی دور کا تھا، اس لیے ۱۴/ لاکھ روپئے میں بیچ دیا، اور اس قرضہ کو ادا کر دیا، ایسی صورت میں گھر کے خرچ کے لیے اس نے چھوٹے بھائی سے کہا کہ تم اپنے گھر کا خرچ جو ۱۲/ رلوم کا گالا ہے اس کی انکم سے چلانا، اسی درمیان چار منزلہ کے دوکان کا ایک گالہ بکنے پر اس کے تمام روپئے بلڈنگ کی مزید تعمیر میں لگا دیئے، اس وقت ان کے پاس صرف ۳۰/ ہزار روپئے نقد صورت میں موجود تھے، منجھلے بھائی سے انہوں نے کہا کہ تمہیں اپنے گھر کا خرچ اپنی تنخواہ میں پورے سال چلانا ہے، اور میں جو ۳۲/ ہزار میرے پاس موجود ہیں اس سے اپنے گھر کا خرچ سال بھر چلا لوں گا، اس طرح ۱۲/ رلوم کی انکم سے چھوٹے بھائی کے گھر کا خرچ چلتا رہا، بڑے بھائی نے ۳۰/ ہزار روپئے جو اس کے پاس موجود تھے، اس سے اپنا سال بھر کا خرچ چلایا، اور منجھلے بھائی نے اپنی تنخواہ سے پہلے دوسرے منزلے کی تعمیر کے بعد بڑے بھائی نے تیسرے اور چوتھے منزلے کی تعمیر کو Dvelopment پر دیدیا۔

چار منزلہ بلڈنگ کی تمام دو کانیں فروخت کر دی گئیں، اور اس چار منزلہ عمارت میں تین فلیٹ کو چھوڑ کر تمام فلیٹ فروخت کر دیئے گئے، انہی روپیوں سے یہ تمام تعمیر ہوئی اور بڑے بھائی نے پہلے خود حج کیا اور بعد میں دونوں بھائیوں کو حج کے لیے بھیجا، جو تین فلیٹ فروخت نہیں کیے گئے ان میں ایک گراؤنڈ فلور تھا، دوسرا دوسرے منزلے پر، اور تیسرا تیسرے منزلے پر تھا، بڑے بھائی کا ارادہ آبائی مکان کو بھی نئے سرے سے تعمیر کرنے کا تھا، جس کے لیے اس نے ۳/ لاکھ روپئے کی رقم اپنے پاس جمع رکھی تھی، بقیہ رقم کا انتظام گراؤنڈ فلور اور تیسرے منزلے کے فلیٹ کو بیچ کر ہونا تھا، اس نے والدہ کی موجودگی میں دونوں بھائیوں سے یہ پوچھ لیا کہ کون کہاں رہنا چاہتا ہے؟ کیونکہ ایک فلیٹ دوسرے منزلے پر راہی منزل

میں موجود تھا، اس لیے اس کا ماننا تھا کہ اگر آبائی مکان تعمیر کیا جائے گا تو اس میں اتنے ہی منزلے بنائے جائیں گے، جتنے کی ضرورت ہے۔

اس درمیان بڑے بھائی کا ۲۰/مئی ۲۰۰۴ء کو اچانک انتقال ہوگیا، اس کے بعد والدہ نے چھوٹے بیٹے سے اس کی اپنی مرضی معلوم کی، کہ وہ کس بلڈنگ میں رہنا چاہتا ہے، اس نے اپنی والدہ سے کہا کہ وہ چار منزلہ بلڈنگ کے دوسرے منزلے کے فلیٹ میں رہنا چاہتا ہے، جس کا کل رقبہ ۱۱/سو اسکوائر فٹ ہے، اور جس کی آج کی walution ۳۵/ سے ۴۰/ لاکھ کے درمیان ہے، بڑے بھائی نے جب اپنی حیات میں منجھلے بھائی سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں رہنا چاہتا ہے؟ تو اس نے یہ کہا تھا کہ وہ اس آبائی مکان میں رہنا چاہتا ہے جسے نئے سرے سے تعمیر کیا جائے گا، آبائی مکان صرف دو منزلوں پر مشتمل ہے جس کے دونوں فلیٹ کا رقبہ ۵۰ ۷-۵۰ ۷/اسکوائر فٹ ہے، اور جس کی آج کی walution ۲۱/ لاکھ روپئے ہوتی ہے، آبائی مکان کے گراؤنڈ فلور پر چار دوکانیں ہیں، دوکان (۱) کا رقبہ ۱۰۰/اسکوائر فٹ، (۲) کا رقبہ ۹۵/ (۳) کا رقبہ ۹۰/ اور (۴) کا رقبہ ۱۱۰ اسکوائر فٹ ہے، ہر دوکان کی آج کی waluation تقریباً چار لاکھ روپئے ہے، اور ایک ۱۰۰/اسکوائر فٹ کا کمرہ جس کی آج کی waluation ۳/ لاکھ روپئے ہے ان دو منزلوں کی تعمیر میں بڑے بھائی کے پاس رکھا ہوا ہے، ۳/ لاکھ روپیہ، گراؤنڈ فلور کے فلیٹ کو بیچ کر حاصل کیا ہوا ۱۰/ لاکھ روپیہ اور تیسرے منزلے کے فلیٹ کو بیچ کر ساڑھے سات لاکھ روپئے یعنی کل ساڑھے بیس لاکھ روپئے کا خرچ آیا۔

بڑے بھائی نے علماء سے مشورہ کر کے والدہ کی حیات میں اس طرح جائیداد کا حصہ کر دیا کہ پانچوں بہنوں کو ۲/۲/ لاکھ روپئے تینوں بھائیوں کو ۲۴/۲۴/ لوم اور ایک ایک فلیٹ۔

بڑے بھائی کے انتقال کے بعد آبائی مکان کی تعمیر منجھلے بھائی نے کی تھی، دوکان ۱/ بھابی کے حصے میں دے دی گئی، دوکان ۲/ منجھلے بھائی کے حصے میں، اوپر دوکان ۳/ چھوٹے بھائی کے حصے میں دیدی گئی، اور چوتھی دوکان والدہ کو دی گئی تا کہ اس سے ان کے علاج و معالجہ کا خرچ چلتا رہے، والدہ اور بڑے بھائی نے یہ طے کیا تھا کہ جو بھی چار منزلہ بلڈنگ کے

فلیٹ میں رہے گا اس کا حق اس بلڈنگ تک محدود رہے گا، اور جو بھائی آبائی مکان کی بلڈنگ میں رہے گا اس کا آبائی مکان تک، کیونکہ دونوں کی waluation میں فرق تھا۔

اس تقسیم کو تینوں بھائیوں اور بہنوں نے والدہ کی حیات میں تسلیم کرلیا تھا، اس کے گواہ گھر کے افراد ہیں، ۱۶؍نومبر کو ۲۰۰۸ء کو والدہ کا انتقال ہوگیا۔

۲۰۱۳ء میں چھوٹے بھائی کا کہنا کہ وہ اس تقسیم کو نہیں مانتا، اس تقسیم میں اس کے کہنے کے مطابق کئی باتیں شامل نہیں ہیں، اس لیے ان کو بھی شامل کیا جائے، جبکہ والدہ اور بڑے بھائی کی حیات میں اس نے اس تقسیم پر کبھی اعتراض نہیں کیا، ٹیچنگ کے پیشے سے جو تنخواہ منجھلے بھائی کو ملا کرتی تھی اس بابت والدہ اور بڑے بھائی کا یہ کہنا تھا کہ وہ کچھ سالوں ۱۰۰۰؍ روپئے، ۱۲۰۰؍روپئے اور ۱۵۰۰؍روپئے کی رقم والدہ کے پاس جمع کرے جس کو وہ چولہا الگ ہونے تک یعنی ۱۹۹۹ء تک دیتا رہا، اس وقت اس کی تنخواہ اسکول کی Paysheet کے مطابق ۱۰۲۴۲؍دس ہزار دوسو بیالیس روپیہ تھی، منجھلا بھائی اسی تنخواہ سے اپنا ذاتی خرچ بھی اٹھاتا تھا، اور گھر سے کوئی رقم نہیں لیتا تھا۔

تقسیم پر چھوٹے بھائی کے اعتراضات:

(۱) اسے دوکان چھوٹی دی گئی۔

(۲) اس کا کہنا ہے کہ منجھلا بھائی جو ٹیچنگ کرتا ہے اس کی تنخواہ کو بھی پراپرٹی کی تقسیم میں شامل کیا جائے۔

(۳) کارخانے کی Valuation کا فرق بھی شامل حال رکھا جائے۔

(۴) چھوٹا بھائی چارمنزلہ عمارت کے اپنے فلیٹ میں ورثاء کے لیے کسی حق کو تسلیم نہیں کرتا۔

درج بالا اعتراضات چھوٹے بھائی نے والدہ اور بڑے بھائی کی حیات میں کبھی نہیں اٹھائے، اس کے گھر کے تمام افراد گواہ ہیں۔

نوٹ: آبائی مکان کا کمرہ بڑے بھائی اور منجھلے بھائی کے تصرف میں ہے، ماں کے قبضہ میں جو دوکان تھی وہ انہوں نے اپنی زندگی ہی میں فروخت کردی تھی، منجھلے بھائی ٹیچنگ کے ساتھ ساتھ کاروبار بھی دیکھا کرتے تھے، اوران کی تنخواہ کی آمدنی اجمال میں جمع ہوتی تھی۔

استدعا: بھائیوں کے درمیان ناچاقی دن بدن سنگین ہوتی جارہی ہےاس لیے بصد ادب گذارش ہے کہ ممکن اولین فرصت میں مسئلہ کا واضح حل عنایت فرمائیں، کرم ہوگا۔

المستفتی: محمد فراز

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوالنامہ میں گھریلو جھگڑے اول الجھاؤ کی پیچیدہ باتیں درج ہیں، جس کا حاصل اور آخری نتیجہ یہی سمجھا گیا ہے کہ چھوٹے بھائی کو بڑے بھائیوں کی طرف سے کی گئی تقسیم میں اشکال ہے، اور سوالنامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم میں قیمت کے اعتبار سے برابری کا خیال نہیں رکھا گیا، بلکہ ہر ایک کو الگ الگ گالے اور الگ الگ رہائش دی گئی ہے جس میں لوم کے اعتبار سے برابری کا خیال نہیں رکھا گیا اور رہائشی مکانات کی تقسیم میں بھی قیمت کا لحاظ نہیں کیا گیا، اس لیے کسی سمجھ دار آدمی کو بیچ میں ڈال کر تمام جائیداد کی قیمت کا حساب لگا کر تقسیم کیا جائے، اور اس کے بعد جس کو زیادہ اشکال ہو اسے ان حصوں میں سے ایک حصہ لینے کے لیے اختیار دیا جائے تا کہ جھگڑا اور نزاع ختم ہو جائے اور تقسیم کے اندر شرعاً قرعہ ڈالنے کی بھی اجازت ہوتی ہے کہ جس کے نام سے جو حصہ نکلے وہ وہی حصہ لے لے، اور چھوٹے بھائی کا یہ کہنا درست ہے کہ کارخانے کی Valuatiion کا خیال رکھا جائے۔

لیکن یہ کہنا درست نہیں ہے کہ جس فلیٹ میں وہ رہتا ہے اس میں دوسروں کا حق شامل نہیں ہے، بلکہ اس میں اور دوسرے بھائی جن فلیٹوں میں رہتے ہیں یا آبائی مکان میں رہتے ہیں ان سب کا تقسیم میں شامل ہونا لازم ہے، اور منجھلے بھائی کی ٹیچری کی تنخواہ کی جو بات کہی جاتی ہے، اس کے بارے میں حکم شرعی یہ ہے کہ جب تک سب لوگ ایک ساتھ رہ رہے ہیں اس وقت تک ٹیچری کے ذریعہ سے جو تنخواہیں اسے ملی ہیں وہ بھی مجموعی آمدنی میں شامل کر کے تقسیم میں داخل کرنی چاہیے، اور تقسیم ہو جانے کے بعد اس کی ٹیچری کی تنخواہ میں کسی دوسرے بھائی کا حق نہیں ہوگا، نیز مشترک رہتے ہوئے جن دیگر بھائیوں نے جو کمایا ہوگا اس میں منجھلے بھائی کا بھی حق ہوگا۔

وفی الخیریة: فی زوج امرأة و ابنها اجتمعا فی دار واحدة و أخذ کل منهما یکتسب علی حدة و یجمعان کسبهما ولایعلم التفاوت ولا

التساوی و لا التمییز فأجاب بأنه بینهما سویة، و کذا لو اجتمع إخوة یعملون فی ترکة أبیهم ونما المال فهو بینهم سویة ولو اختلفوا فی العمل والرائ.
(شامی، مطلب: اجتمعا فی دار واحدة واکتسبا ولا یعلم التفاوت فهو بینهما بالسویة زکریا ٦/٥٠٢، کراچی ٤/٣٢٥، شرح المجلة رستم اتحاد ٢/٧٤١ رقم المادة: ١٣٩٨، هندیه زکریا قدیم ٢/٣٢٩، جدید ٢/٣٣٢) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٧/شعبان المعظم ١٤٣٤ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٤٠/ ١١٢٦٧)

الجواب صحیح
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٤٣٤/٨/١٧ھ

سب ہی ناظرین سے گذارش ہے کہ عنداللہ شرف قبولیت اور خاتمہ بالخیر کی دعاء فرمائیں۔

ربنا تقبل منا انک أنت السمیع العلیم، وتب علینا إنک أنت التواب الرحیم، اللهم وفقنا لما تحب و ترضیٰ عدد ما تحب و ترضیٰ، وصلی الله تعالیٰ علی حبیبه سیدنا و مولانا وسندنا وإمامنا محمد و علیٰ آله و أصحابه أجمعین.

یارب صل و سلم دائما أبداً ☆ علی حبیبک خیر الخلق کلهم

الله أکبر کبیرا والحمد لله کثیرا وسبحان الله بکرة و أصیلا.
(صحیح مسلم، النسخة الهندیة ١/ ٢٢٠، بیت الأفکار رقم: ٦٠١، سنن الترمذی، النسخة الهندیة ٢/١٩٩، دار السلام رقم: ٣٥٩٢)

شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
خادم جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد (یوپی) الہند

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ

فتاویٰ قاسمیہ

منتخب فتاویٰ

حضرت مولانا مفتی شبیر احمد القاسمی

خادم الافتاء و الحدیث جامعہ قاسمیہ

مدرسہ شاہی مرادآباد، الہند

(جلد ۲۶)

المجلد السادس و العشرون

فهارس مسائل

۱ ——— ۱۱۶۰۰

ناشر

مکتبہ اشرفیہ، دیوبند، الہند

01336-223082

فتاویٰ قاسمیہ

صاحب فتاویٰ

حضرت مولانا مفتی شبیر احمد القاسمی

پہلا ایڈیشن محرم الحرام ۱۴۳۷ھ

ناشر

مکتبہ اشرفیہ، دیوبند، ضلع سہارنپور، الہند

01336-223082

ASHRAFI BOOK DEPOT

DEOBAND, SAHARANPUR, INDIA

Phone: 01336-223082

Mob. : 09358001571،08810383186

مکمل اجمالی فہرست ایک نظر میں

فہرست مضامین

مقدمة التحقيق

	الفصل الثالث: چند اہم محدثین کا تعارف	۸۸

الفصل حادی عشر: چنداردوفتاوی کی نشاندہی	۳۰۷

۱/ کتاب الإیمان والعقائد

۱/ باب ما یتعلق بالإیمان والإسلام ۳۶۷

۲/ باب ما یتعلق باللّٰہ تعالیٰ وصفاته ۳۷۹

☐	٦/ باب ما يتعلق بالارتداد	۴۶۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

۱/ بقية كتاب الإيمان والعقائد

۱۱/ باب ما یتعلق بالملائکة و الجن ۶۳

❑	۱۵ / باب الفرق الضالة	۲۸۲

۲۹۴	۱۶ / باب في الشيعية	❐

۳۰۹	۱۷ / باب في القادياني	❐

۱۸/ باب في البريلوية ۳۱۳

۱۹/ باب في المودودية وغيرها ۳۲۰

۲۰/ باب مايتعلق بأهل الكتاب ۳۳۳

۲/ کتاب التاریخ والسیر

۳/ کتاب البدعات والرسوم

❑ ۳/ باب: ماہ ربیع الاول کی رسومات ۴۵۴

❐ ۴/ باب: ماہ ربیع الاول کی بدعات ۴۹۲

○❖○

فہرست مضامین

۳/ بقیۃ کتاب البدعات والرسوم

۹/ باب: رسومات جنائز

۱۰/ باب: فاتحہ، نیاز، عرس اور مزار کی بدعات

١١/ باب: فرائض پنجگانہ اور عیدین کے بعد کی رسومات

❑ ۱۲/ باب: رسومات نکاح

❑ ۱۳/ باب: متفرق بدعات ورسوم

۴/ کتاب العلم

۱/ باب ما یتعلق بطلب العلم

۲/ باب ما یتعلق بالإفتاء و آدابہ

۳/ باب ما یتعلق باصطلاحات العلم

۴/ باب ما يتعلق بتعليم النساء

۵/ باب ما یتعلق بالکتابة و آدابها و آحکامها

۶/ ماب ما يتعلق بالقرآن الكريم

۱/ فصل في علوم القرآن

۲/ فصل في تفسير القرآن

۳/ فصل في تجويد القرآن الكريم

۴/ فصل في تلاوة القرآن وآدابه

○❖○

فہرست مضامین

۴/بقية كتاب العلم

۵/فصل في كتابة القرآن وأحكامه

مسئلہ نمبر .... صفحہ نمبر

۶/ فصل في قراءة القرآن و اهداء الثواب

۷/ فصل في الأجرة والهدايا على تلاوة

۸/باب ما یتعلق بالحدیث و شرحہ

۹/ باب مایتعلق بالاحادیث الضعیفة والموضوعة

۱۰/ باب الوعظ والنصیحة

۵/ کتاب الدعوۃ والتبلیغ

۱/ باب الدعوۃ ومتعلقاتها

۲ / باب: مستورات کی جماعت

❏	٦/ کتاب السلوک والإحسان	۵۲۲

□	۷/ کتاب الأدعية والأذكار	۵۹۳

فہرست مضامین

۸/ کتاب الطهارة

❐	۱/ باب ما یتعلق بالوضوء	۳۳

۲/ باب ما يتعلق بالاستنجاء ۸۱

۳/ باب ما يتعلق بالغسل ۹۱

۴/ باب ما یتعلق بالمیاہ والآبار ۱۰۸

۸/ باب أحكام المعذورين ۲۱۲

۹/ باب الحيض ۲۲۷

۹ / کتاب الصلوۃ

۹/ بقیة کتاب الصلوٰة

مسئلہ نمبر: ## ۶/ باب السترة صفحہ نمبر

۷/ باب صلوٰۃ المساجد

۸/ باب الجماعة

٩ / باب الإمامة

(١) فصل: فی أوصاف الإمام

۲/فصل: في النيابة عن الإمام

۳/ فصل: في إمامة الصبي

۴/ فصل: فی إمامة تارک الصلاة

۵/ فصل: في إمامة الفاسق

۶/الفصل: فی اقتداء الحنفی بغیرہ

۷/فصل: غلط خواں کی امامت

۸/ فصل: في إمامة المعذور

۹ / فصل: في عزل الإمام وتحقيره

فہرست مضامین

۹/ بقیة كتاب الصلاة

۱۰/ باب تسوية الصفوف

۱۱/ باب مدرک، مسبوق، لاحق

۱۲/ باب القراءة

١٣/ باب الجمع بين الصلوٰتين

۱۴/ باب صلوۃ النساء

۱۵/ باب ما يكره في الصلاة ومالايكره

۱۶/ باب ما یفسد الصلاة وما لا یفسد

۱۷/ باب قضاء الفوائت

۱۸/ باب الحدث في الصلاة

۱۹/ باب سجود السهو

۲۰/ باب سجود التلاوۃ

فہرست مضامین

۹/ بقیة كتاب الصلاة

☐	۲۱/ باب الدعاء والذکر بعد الصلوۃ	۲۹

❏	۲۲/ باب الوتر	۱۱۱

الفصل الأول: في الوتر

الفصل الثاني: في القنوت النازلة　۱۵۰

۲۳/ باب إدراک الفريضة　۱۶۶

۲۴/ باب السنن والنوافل ۱۸۵

الفصل الأول في صلاة التراويح

الفصل الثاني: في أجرة التراويح ۴۲۲

۲۶/ باب صلاة المسافر ۵۷۸

فہرست مضامین

۹/ بقیة كتاب الصلاة

۲۷/ باب صلاة المريض

۲۸/ باب الجمعة

(۱) فصل في الفضائل ووقتها

۲/ فصل في شرائط الجمعة

۳/ فصل في أذان الجمعة

۴/ فصل في الخطبة

۱/ فصل في الإمامة والقضاء وغيرها

۲/ فصل في صلاة العيدين

۳/ فصل في صلاة العيد في المسجد

۴/ فصل في تكبيرات التشريق

۵/ فصل في من يجب عليه صلاة العيد

٦/ فصل في الدعاء، و المصافحة

۱۰/ كتاب الجنائز

۱/ باب الجنائز و متعلقا تها

۲/ باب غسل المیت

۳/ باب تکفین المیت

۴/ باب فضل صلوۃ الجنازۃ وغیرھا

۵/ باب تعجیل صلاة الجنازة وتأخیرها

۶/ باب صلاة الجنازة في المسجد

۷/ باب من يستحق بالصلاة على الميت

۸/ باب من يصلىٰ عليه ومن لا يصلىٰ عليه

۹/ باب حمل الجنازۃ

فہرست مضامین

۱۰/بقیة کتاب الجنائز

مسئلہ نمبر: ## ٦/باب صلاة الجنازة صفحہ نمبر

۱۱ / باب القبور

۱۲/باب التدفین

۱۳ / باب الدعاء بعد الدفن وغیرہ

۱۴ / باب إلقاء الأشجار والعطور......

❏ ۱۵/ باب البناء علی القبور

❏ ۱۶/ باب التعزیة و الحداد (سوگ منانا)

۱۷ / باب زیارۃ القبور

۱۸/باب ایصال الثواب للمیت

❏ ۱۹ / باب الشهيد

۱۱ / کتاب الزکوٰۃ

۱ /باب الزکاۃ ومتعلقاتہا

۲/باب وجوب الزکاۃ

۳/باب زكاة الذهب والفضة والحلي

۴/باب أموال التجارة

۵/باب أداء الزکوٰۃ

٦/باب المصرف

۱۱/ بقیة کتاب الزکوٰۃ

مسئلہ نمبر:　۷/ باب: مدارس میں زکوٰۃ صرف کرنے کا بیان　　صفحہ نمبر

۸/ باب: حیلۂ تملیک

۹/ باب: مدز کوٰۃ تنخواہ یا تعمیر میں صرف کرنے کا حکم

۱۰/ باب: سفراء کے احکام

۱۱/ باب: مکاتب میں زکوٰۃ صرف کرنے کا حکم

۱۲/ باب: اسکول میں زکوٰۃ کی رقم صرف کرنے کا حکم

۱۳ / باب العشر والخراج

(۱۲) کتاب الصدقات

۱۳/ کتاب الصوم

❑ ۱ /باب الصوم و متعلقاته

۲/باب رؤیۃ الھلال

❑ ۳/ باب السحور والإفطار

۴/باب مایفسد الصوم ومالا یفسد

۵/ باب القضاء والکفارۃ والفدیۃ

٦/باب الاعتکاف

۸/باب صدقة الفطر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

۱۴/ کتاب الحج

□	۱ / باب من يجب عليه الحج	۳۲

۲ / باب اشتراط المحرم للمرأة ۱۱۲

۳/ باب رسومات الحج ۱۷۱

۴/ باب المیقات والإحرام ۱۸۴

❏	۵/ باب الإفراد والقران والتمتع	۲۱۰

۶/ باب ما یتعلق بالطواف　۲۴۷

❑	۷/ باب مسائل منی ومزدلفہ وعرفات	۲۸۶

۱۵/ کتاب النکاح

❐	۱/ باب فضائل النکاح وغیرھا	۴۸۵

۲/ باب الخِطبة	۵۲۷

۳/ باب الإطعام في النكاح	۵۳۷

۵/ باب الأجرة في النكاح ۶۷۷

☐	۶/ باب من أحق بالإنكاح	۷۰۴

۹/ باب نکاح المکره ۷۴۵

فہرست مضامین

۱۵/ بقية كتاب النكاح

۱۰/ باب الشهود والتوكيل في النكاح

مسئلہ نمبر .... صفحہ نمبر

۱۱/ فون، انٹرنیٹ اور کورٹ میرج کا نکاح

۱۲/ باب النکاح الصحیح

۱۳/ باب من یحل نکاحه

۱۴/باب نکاح الحاملة والمزنية

۱۵/ باب من لا یحل نکاحه

۱۶/ باب استبراء الرحم

۱۷/ باب المحرمات

۱۸/ باب المحرمات بالصهرية

۱۹/باب الجمع بین المحارم

۲۰/ باب النكاح الفاسد والباطل

۲۱/ باب نكاح منكوحة الغير

۲۲/ باب نکاح المعتدة

۲۲/ باب نکاح المطلقه

۲۴/ باب الولایة والکفاءة

۲۴/ باب خیار البلوغ

۲۵/ باب المهر

❍❖❍

فہرست مضامین

۱۶/ کتاب الرضاع

۱۷/ کتاب الطلاق

۱/ باب صفة الطلاق و من أحق به

۲/ باب إباحة الطلاق

۳/ باب مطالبة الطلاق

۴/ باب وقوع الطلاق

۵/ باب طلاق الحامل والحائض

۶/ باب طلاق الهازل والغاضب

۷/ باب طلاق السکران والجنون

۸/ باب طلاق المکرہ

۹/باب الطلاق بالألفاظ المصحفة

۱۰/ باب عدم وقوع الطلاق

۱۱/ باب وعد الطلاق

۱۲/ باب الطلاق الصریح

۱۳/ باب الکنایة

❍❖❍

فہرست مضامین

۱۷/ بقية كتاب الطلاق

۱۴/ باب الرجعة

۱۵/ باب طلاق البائن

۱۶/ باب الطلاق بالکتابة

۱۷/ باب الطلاق الثلاث

مطلقہ خواتین کے مسائل کا تحقیقی جائزہ

طلاق غضبان اور طلاق بدعی کا تحقیقی جائزہ

۱۸/ باب الشهادة في الطلاق

۱۹؍ باب الحلالة

❁ ❁ ❁

فہرست عناوین

(۲۱) باب تفویض الطلاق ۱۸۱

	(۲۲) باب الفسخ و التفریق	۱۹۱

(۲۵) باب الطلاق علی المال ۴۱۳

(۲۷) باب النفقة والسكنى ۶۲۳

(۲۸) باب ثبوت النسب ۶۸۴

(۲۹) باب الحضانة ۱۹ ٧

فہرست عناوین

(۲) باب النذور ۷۰

۱۹ کتاب الحدود

(۱) باب القصاص والدیة ۱۲۶

(۲) باب التعزير ۱۴۹

۲۰ كتاب الجهاد

(۱) باب الهجرة ۱۶۴

۲۱ کتاب اللقطة

۲۲ کتاب الإمارة والسياسة ۱۸۷

۲٤ كتاب الوقف

(۱) باب ما يتعلق بنفس الوقف ۳۰۱

(۵) باب استبدال الأوقاف ۴۶۲

۲۴/ بقیة کتاب الوقف

مسئلہ نمبر: الفصل الثالث: مسجد قدیم صفحہ نمبر

الفصل الرابع: تعدد مساجد

الفصل الخامس: امام ومؤذن کے احکام

☐ ۶/ الفصل: مسجد میں سونے اور ٹھہرنے کا بیان

☐ ۷/ الفصل: توسیع مسجد سے متعلق احکام

۸/ الفصل: مسجد میں تصرف کرنے کا بیان

۱۰/۱۔الفصل العاشر: ایک مسجد کی اشیاء کا دوسری مسجد میں استعمال.........

۱۱/۱۔الفصل الحادي عشر: اشیاء مسجد کا استعمال

☐ ۱۲/ الفصل الثانی عشر: مسجد کی رقم کا دوسری جگہ استعمال ....

❑ ۱۳/ الفصل الثالث عشر: مساجد کی چیزیں کرایہ پر دینے کا بیان ....

□ ۱۴/۱ الفصل الرابع عشر: مسجد کی اشیاء کی خرید وفروخت ....

❑ ۱۶/۱ الفصل السادس عشر: سرکاری زمین میں تعمیر مسجد

❑ ۱۷/۱ الفصل السابع عشر: مسجد میں سرکاری امداد کا حکم

۱۸/ الفصل الثامن عشر: دوسرے کی زمین میں مسجد کی تعمیر............

۱۹/الفصل التاسع عشر: مسجد میں چندہ کا بیان

❏ ۲۰/الفصل العشرون: مسجد میں صدقات کا حکم

❑ ۲۱/ الفصل الحادی والعشرون: مسجد میں تعلیم

❑ ۲۲/ الفصل الثانی والعشرون: مسجد کے مائک سے اعلان ....

❑ ۲۳/ الفصل الثالث والعشرون: غیر مسلم کا مسجد میں داخل ہونا........

❑ ۲۴/ الفصل الرابع والعشرون: مسجد میں حرام مال لگانا........

❐ ۲۸/ الفصل الثامن والعشرون: مسجد میں بدبودار چیز داخل کرنے کا بیان............

۷/باب المصلی

۸/باب المقبرة

❐ ۱/الفصل الاول : فی المکروہ والمستحب

❏ ۲/الفصل الثانی: فی المصارف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

۲۴/ بقیة كتاب الوقف

۳۲	۹/ باب المدارس	☐

الفصل الأول: في المدارس

مسئلہ نمبر — صفحہ نمبر

□ الفصل الثاني: في التولية ۶۹

☐	**الفصل الثالث : في المدرسين**	۸۶

❏	**الفصل الرابع:**	۱۱۷

مدارس میں سرکاری اور غیر مسلم کا مال صرف کرنے کا حکم

☐	**الفصل الخامس: في التصرف**	۱۳۸

□	**الفصل الثامن: في المشاهرة**	۱۹۵

۲۵/ کتاب البیوع

☐	۱/ باب البیع الصحیح	۲۴۸

۴/ باب البیع الفاسد، والباطل، والمکروہ	۳۹۰

❐	۵/ باب حط الثمن وزيادته نقدا و نسيئة	۵۰۱

٦/ باب المرابحة ۵۲۳

۷/ بيع التلجئة ۵۳۲

۹ / باب السلم ۵۸۷

❑	۱۰/ باب الاستصناع	۶۰۹

۱۳/ باب المزارعة ۷۱۳

فہرست مضامین

۲۶/ کتاب الشرکۃ والمضاربۃ

۱/ باب شرائط الشرکۃ

۲/ باب شرکة العنان

۳/ باب شركة الوجوه

۴/ باب الشركة الفاسدة

۵/ باب المضاربة

۲۷/ کتاب الربوا

۱/ باب ما یتعلق بنفس الربوا

۲ / باب البنوک

۳/ مسلم فنڈ

۴/ باب کاروبار میں سودی شکلیں

۵/ باب پرائیویڈنٹ فنڈ

۶/ بیمہ کے احکام

۷/ باب القمار

۸/ باب الرشوۃ

۹ / باب سودی رقم کا مصرف

۱۰/ باب سرکاری ٹیکس

فہرست مضامین

۲۷/ بقیة کتاب الربوا

۱۱/ باب القرض

۲۸/ کتاب الدیون

۲۹/ كتاب الوديعة والأمانة والضمان

۳۰/ کتاب الهبة

☐	۱/ باب شرائط الھبة	۱۷۸

۲/ باب ما یجوز من الهبة و مالا یجوز ۲۳۴

٣/ باب هبة المشاع ۲۷۸

۴/ باب الرجوع في الهبة ۳۱۵

۸/ باب هبة المريض ۵۰۶

۳۱/ کتاب الإجارة

۱/ باب الإجارة الصحيحة ۵۱۲

۲/ باب الإجارة الفاسدة ۶۱۲

❏	۴/ باب في فسخ الإجارة	۶۹۳

❐	۵/ باب الاستئجار علی الطاعات	۷۰۶

❐	٦/ باب الاستئجار علی المعصیة	۷۲۲

فہرست عناوین

مسئلہ نمبر	۳۲ کتاب الغصب	صفحہ

۳۳ کتاب الرہن ۶۵

۳۵ کتاب الذبائح

(۴) باب التضحية عن الغير ۳۰۹

(۵) باب الشركة في الأضحية ۳۲۱

۳۸ کتاب الحقوق

فہرست مضامین

۳۸/ بقیة کتاب الحقوق

مسئلہ نمبر	٤/باب حقوق الزوجین	۳۱

۵/باب الحضانۃ ۱۰۲

	۳۹ / کتاب الرؤیا	۱۹۲

۴۰/ کتاب الطب والرقیٰ

۱/باب ما یتعلق بالطب وغیرہ

	۲ /باب أعضاء الإنسان وأجزائه	صفحہ

۳ / باب ما يتعلق بحمل المرأة و موانعه

٤/باب التداوی بالمحرم

۵/باب الرقیة

رقم المسئلۃ	۲ / باب الصلۃ و المقاطعۃ	صفحہ

۳/ باب اللباس

٤/ باب الزينة

۵/ باب الحجاب

۶/ باب مایتعلق بالشعر (بالوں سے متعلق)

۷/ باب ما يتعلق باللحية

فہرست مضامین

۴۱/ بقیة کتاب الحظر والإباحة

۸/ باب: کھانے کی سنتوں اورآداب وغیرہ کا بیان

۹/ باب: حلال وحرام اشیاء کا بیان

۱۰/ باب: حلال وحرام جانور

۱۱/ باب الإنتفاع بالحیوانات

۱۲/ باب ما یحل قتله و ما لا یحل

۱۳/ باب الخمر والدخان

۱۴/ باب في الهدايا والضيافات

۱۵/ باب الموالات مع الکفار

اہل کتاب اور ان سے متعلق احکام کا تحقیقی جائزہ

۱۶/ باب المال الحرام ومصرفه

۱۷/باب الأدب

معذوروں اور بوڑھوں کے حقوق کا تحقیقی جائزہ

۱۸/ باب اللهو واللعب

۱۹/ باب استعمال الذهب والفضة وغيرها

۲۰/ باب کسب الحلال والحرام

۲۱/باب المعاصي و التوبة

۲۲/باب ما یتعلق بالسحر

۲۳/ باب الشعر والغناء

۲۴/ باب جھوٹ، غیبت، چوری وغیرہ کا بیان

۲۵/ باب التصاویر

۲۶/ باب ٹیلی ویژن اور میڈیا

۲۷/ باب الأسماء والكنى

۲۸/ باب الجوالة والانترنيت

۲۹/باب المتفرقات

فہرست عناوین

(۴) باب الوصية للأقرباء وغيرهم	۷۷

	٤٣ کتاب الفرائض	
	(۱) باب ما یتعلق بنفس الفرائض	۱۴۴

(۱۰) باب: مالِ حرام میں وراثت کا بیان	۵۲۸

(۱۱) باب التصرف فی الترکۃ	۵۳۸